پہلا حصہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ترتیب:

ایم۔ طلحہ عامر

آوارہ گرد

عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنی اپنی عقیدت کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، وہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر تو وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

جہاں میں تھا، وہاں کی دنیا ہی الگ تھی۔ یہ نہ جیل خانہ تھا، نہ یتیم خانہ اور نہ ہی اس کا تعلق جرائم سے تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی دنیا تھی، سب سے الگ تھلگ جہاں ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔ یہ خوشی، چاہے تلخ حقائق کو مان کر یا انہیں سہہ کر یا پھر مصلحت کوشی کے نام پر سہی... بس ہم سب مل جل کر اور خوش رہتے تھے۔

یہاں ہمیں کھانے کو بھی ملتا، پینے کو بھی اور پہننے کو بھی۔ ہمیں یہاں پڑھایا لکھایا بھی جاتا تھا۔ کسی حد تک دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں کی منتظمہ جانے کیا نام تھا مگر سب بچوں میں وہ "آپاجی" کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کا رویہ بھی ہم سے محبت بھرا ہوتا تھا۔ ان کی عمر چالیس، پینتالیس کے بیچ رہی ہوگی۔ جسم بھاری، رنگ گورا اور ناک پر نظر کے چشمے نے ان کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا تھا۔ وہ بڑی نرم آواز میں ہم سب سے مخاطب ہوتیں، قد بھی چھوٹا سا تھا۔ ہم بارہ بارہ، تیرہ تیرہ سال کے بچے، ان کے برابر کے

ہی قد میں نظر آتے۔

ایک باقاعدہ نظم وضبط یہاں پایا جاتا تھا۔ ہفتے میں ایک بار ہمیں باہر بھی سیر وتفریح کی غرض سے لے جایا جاتا۔ اس مقصد کے لیے کوسٹر استعمال ہوتی تھی۔ ایک بڑے سے ہال میں ٹی وی بھی دکھانے کا بندوبست تھا۔ ہفتے میں ایک بار کوئی اچھی سبق آموز فلم دکھائی جاتی تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود..... دیگر بچوں کی طرح میرے ذہن میں بھی ایک اداس کردینے والا سوال ضرور ابھرتا تھا..... کہ اولاد تو ماں باپ کی آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا قرار ہوتی ہے۔ ان کا مان اور ان کا فخر ہوتی ہے تو پھر... پھر کیوں... وہ ہمیں زبردستی... ہماری مرضی کے خلاف ہمیں روتا دھوتا یہاں چھوڑ گئے تھے؟

میرا اپنا باپ بھی مجھے یہاں چھوڑ گیا تھا۔ جب میں اس کے ساتھ اس کی انگلی تھامے گھر سے خوشی خوشی نکلا تو میں بہت مسرور تھا کہ وہ مجھے باہر سیر وتفریح کی غرض سے لے کر نکلا ہے۔ ہم ایک بس میں بیٹھے اور پھر ایک طویل سفر شروع ہوگیا۔ ”ابا! ہم کدھر جارہے ہیں؟“ بس میں ساتھ بیٹھے اپنے باپ سے میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی میرا معصوم سا ذہن ذرا چونکا۔ مجھے باپ کے چہرے پر صدیوں کی تھکن کی لکیریں سی گندھی ہوئی دکھائی دیں۔ بہت کرب تھا اس کی آنکھوں میں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خاموش رہا۔ پتا نہیں کیوں ابا آج مجھے کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ گھر میں ایک وہی تو تھا جو مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ مجھے کاندھے پر بٹھاتا۔ میرے لیے ٹافی گولیاں لاتا۔ شام کو جب بابا کام سے لوٹتا تو مجھے دیکھتے ہی اور میری ضد پر ذرا بھی ستائے بغیر مجھے باہر لے جاتا، چیزیں دلاتا۔ مجھے انڈوں کا پیکٹ تو ضرور لیتا تھا۔

بچپن کے دھندلے دھندلے شعور میں مجھے ایک ہی پیار کرنے والی ایک اور شخصیت کا خاکہ بھی ابھرتا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی، بہت پیار کرتی تھی، مجھے ساتھ سلاتی تھی... میں اس کی چھاؤں میں بڑی ٹھنڈک اور سکون و آرام محسوس کرتا تھا... پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک اس کی جگہ ایک دوسری عورت نے لے لی۔ یہ پچھلی والی سیدھی سادی عورت سے بہت مختلف تھی۔ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ بڑا ناگوار ہوتا تھا، ایک معصوم بچہ... محبت ونفرت کی زبان خوب سمجھتا ہے۔ میں بھی سمجھ گیا۔ پہلے والی عورت مجھ سے بے حد محبت کرتی تھی جسے میں ماں کہتا تھا۔ وہ عورت... جو بڑی کج ورنج کے ساتھ اور تنک تنک
تھی، مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ پھر اس نے میری ماں
کیوں لی؟ میری ماں کہاں گئی؟ پچھلی بار دوسری عورت
مار کھانے کے بعد میں نے باپ سے روتے ہوئے
تھا۔

”بتا کیوں نہیں دیتے رشید کہ اس کی ماں
ہے۔“ اس عورت نے تنک کر میرے باپ سے کہا۔ باپ
شاید تنگ آگیا تھا۔ ”ہاں... ہاں... تیری ماں
ہے۔“

میں مرنے کے مفہوم سے بھی نہ آشنا تھا۔ کیسی
بات ہے بعض سمجھ اپنے آپ ہی...... سمجھ میں آجا
تھی۔

میں بھی سمجھ گیا تھا۔ مجھے پیار کرنے والی، مجھے
سینے سے لگانے والی ماں مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ
ہے۔ میں وہ خلا اپنے باپ کی ذات سے بھرنے کی کو
کرنے لگا کیونکہ وہی مجھے پیار کرتا تھا۔ لیکن ماں تو پھر
تھی، تاہم ایسے میں مجھے باپ کا دم بھی غنیمت تھا۔ بس ایک
مقام پر رک گئی۔ باپ مجھے لے کر نیچے اتر آیا۔ یہ عجیب
جگہ شہر سے دور.... ہم ایک تانگہ نما رکشے میں سوا
ہوئے جسے آج کل چنگ چی کہا جاتا ہے۔

وسیع وعریض رقبے میں پھیلی ہوئی اس عمارت
گیٹ سے اندر داخل ہوکر اترے۔ یہاں اور بھی میری
کے بچے نظر آئے۔ باپ پوچھتا پاچھتا مجھے ایک کمرے
لے آیا۔ وہاں ایک خاتون میز کرسی لگائے بیٹھی تھی۔
”آپا جی“ تھیں۔

انہوں نے ایک رجسٹر میں میرا نام درج کیا۔
جب میرا باپ مجھے چھوڑ کر جانے لگا تو میں نے گھبرا کر اس
ہاتھ پکڑ لیا...

”ابا! مجھے چھوڑ کر کہاں جارہے ہو؟ تم تو مجھے باہ
گھمانے پھرانے کے لیے لائے تھے؟“

میں نے دیکھا، میری بات پر باپ کی آنکھیں بھیگ
گئیں۔ وہ دھیرے سے میرا ہاتھ چھڑا کر بولا۔

”اب تم یہیں رہو گے۔ میں تم سے ملنے آ
رہوں گا۔“ پھر اس سے کھڑا نہیں رہا گیا۔ لوٹا چلا گیا۔ میں
رونے لگا۔ ابا... ابا... ہو کہتا... اس کے پیچھے دوڑا
”ابا۔ ماں تو مرگئی... تو تو زندہ ہے۔ پھر کیوں مجھے خو
سے الگ کررہا ہے؟“

وہ چلا گیا۔ آپا جی نے مجھے تھام لیا۔ میں ہچکیوں سے

ہے پکارنے... پھر دیگر بچوں کے پاس
میں گھرا گیا۔ مگر یہاں بہلانے کی بہت چیزیں
ہوئے تھے۔ جھولے تھے۔ میں بچہ ہی تو تھا، بہل
بچوں کو بہلانے کے لیے سب کچھ تھا مگر ماں
تھے۔ ادارے کی ایک اچھی بات تھی جو کچھ نیا
جاتا۔ آپا جی اسے چند دن اپنے ساتھ ساتھ
کوشش کرتی تھیں تاکہ بچہ زیادہ اداسی محسوس نہ
اور جلدی سنبھل جائے۔ اب آپا جی ہی ہماری ماں
تھیں۔

میں نیا بچہ تھا، اس لیے آپا جی مجھے اپنے قریب رکھتی
تھیں۔ میں شروع میں تو چپ چپ رہا پھر مختلف سوالات
کرکے آپا جی کا سر کھانا شروع کردیا۔ مگر آفرین ہے اس
خاتون پر... ایک ذرا بل تک اپنی پیشانی پر نہیں لائیں اور
کی محبت، بڑے پیار سے میرے سارے سوالات کے
جواب دیتیں۔

ایک دن میں نے پوچھا۔ ”آپا جی! کیا ہم اس طرح
ساری عمر ادھر ہی رہیں گے؟“ وہ جواباً بولیں۔

”جب تک اللہ چاہے گا تم سب یہاں ہنسی خوشی
رہو گے۔“

”ہمارے ماں باپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ جاتے
ہیں؟ کیا ہم شریر ہوتے ہیں اس لیے؟“

”ان کی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں اس لیے۔“

میں نے اپنی عمر اور معصومانہ فہم وفراست کے مطابق
آپا جی سے کہا۔

”آپا جی! بچے تو شرارتی ہوتے ہی ہیں بلکہ شرارتی
بچے تو اپنے اماں ابا کو زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔“

آپا جی میرے سوال پر مسکرا دیتی تھیں۔ وہ مجھے بہت
پیار کرتی تھیں۔ میں تھا بھی دوسرے بچوں سے مختلف۔ اپنی
عادات واطوار کے حوالے سے ہی نہیں بلکہ فہم وادراک سے
بھی... کئی بار میں ایسے بڑے بڑے پرمغز سوال داغ
دیا کرتا تھا کہ ایک لمحے کو آپا جی بھی حیرت آمیز پریشانی میں
مبتلا ہوجاتیں۔ مثلاً ایک دن میں نے کہہ دیا۔

”آپا جی! مجھے پتا ہے کہ ہمارے ماں باپ ہمیں
یہاں کیوں چھوڑ جاتے ہیں؟ انہیں بچوں سے زیادہ اپنی
غرض اور اپنی خوشیاں عزیز ہوتی ہیں... ہیں نا...
جی؟“ میں معصومیت اور بھولپن سے ان کا چہرہ تکنے لگا۔ دکھ
کی ایک لکیر ان کے چہرے پر ابھری پھر فوراً ہی وہ
کی حلیم طبع مسکراہٹ سے کہتیں۔

”بیٹا! اس طرح مت سوچا کرو۔ بس خوش رہا کرو۔“ پھر وہ بات بدلتے ہوئے مجھ سے کہتیں۔

”آؤ... آج تمہیں بڑے بچوں سے ملواتی ہوں۔“

”بڑے بچے؟“ میں گومگو انداز میں بڑبڑا کر رہ جاتا۔

آپا جی مجھے باؤنڈری وال کے .... اندر ہی بنی ہوئی ایک دوسری بلڈنگ میں لے آئیں۔ یہاں پہنچ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ یہاں مجھے بوڑھے ضعیف لوگ نظر آئے۔ کوئی کھانس رہا تھا، کسی نے اپنی کمر پکڑ رکھی تھی۔ کوئی دھوپ سینک رہا تھا۔ کچھ کرسی پر بیٹھے کتاب یا اخبار کے مطالعے میں مصروف تھے۔

”آپا جی! یہ تو سب بڑے ہیں۔“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں! یہ بڑے ہیں مگر بوڑھے ہیں۔ بچوں اور بوڑھوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔“ وہ جواباً کہتیں۔

میرا معصوم ذہن ان بوڑھوں کو یہاں دیکھ کر بری طرح الجھ سا گیا۔ میں نے پوچھا۔

”آپا جی! کیا ان کے بھی ماں باپ...“ میں اتنا ہی کہہ پایا۔ اور آپا جی ایک دم بجھی ہوئی آواز میں بولیں۔

”نہیں، یہ تو بے چارے خود کسی کے ماں باپ ہیں۔“

”تو کیا ان کے بچوں نے انہیں گھر سے نکال دیا؟“ میرے فہم وادراک نے جوش مارا۔

”ہاں۔“

”اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔ یہ ہمیں گھر سے نکال کر یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ اب ان کے بچے بھی انہیں یہاں چھوڑ گئے۔ بہت اچھا کیا۔“

میرے اندر سے ایک خوابیدہ آتش فشاں کا غبار سا ابلا۔ آپا جی مجھے ٹوکتیں۔

”ایسا مت کہو... بچے! یہ بُری بات ہے۔“

”یہ بری بات نہیں ہے۔ یہ بچہ بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

دفعتاً عقب سے ایک کمزور آواز ابھری۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ سفید بے داغ اور عام سے شلوار کرتے میں وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ رنگت سانولی، جسم کمزور، سر کے بال سفید اور اُڑے سے تھے۔ بھویں اور مونچھیں بھی سفید تھیں۔ قد لمبا تھا۔ تاہم اس عمر میں بھی

ان کی گرمجوشی تھی۔

"ارے سرمد بابا...... کیسے ہیں آپ؟" آپا جی انہیں دیکھ کر خوش دلی سے بولیں۔

"ٹھیک ہوں بیٹی۔" سرمد بابا نامی وہ بوڑھا بولا مگر ہنوز ان کی گھنی سفید بھنوؤں سے ڈھکی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"بہت پیارا بچہ ہے اور سینٹر میں شاید نیا آیا ہے۔" وہ نہایت شفقت اور پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

"جی ہاں۔" آپا جی نے مختصر جواب دیا۔

"کیا نام ہے اس پیارے بچے کا؟"

"شہزاد احمد خان۔" آپا جی نے میرا نام بتایا۔

"مگر ہم اسے شہزاد احمد خان عرف شہزی کہیں گے۔" سرمد بابا نامی اس عمر رسیدہ شخص نے بڑے عجیب سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر کہا۔

جانے کیوں مجھے اس طرح اپنا نام دہرانے پر.... فخر سا محسوس ہوا جیسے میں کوئی بڑا تیس مار خان ہوں۔

"یہ ہمارے ادارے کا سب سے پیارا، معصوم اور ذہین بچہ ہے بابا!" آپا جی نے گویا فخر سے بتایا تو سرمد بابا بغور مجھے تکتے ہوئے بولے۔

"بے شک اس کے چہرے اور آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔"

وہ دونوں میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے اپنی تعریفیں سننے میں مزہ آرہا تھا۔ بچوں کی نفسیات ہوتی ہے، گھر میں اس کے بارے میں اس کی موجودگی میں باتیں ہورہی ہوں تو بچے کو بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔

آپا جی کے بعد مجھے اب سرمد بابا بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ انہوں نے تو باقاعدہ میری طرف دوستی کا بھی ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس روز کے بعد سے میری ان سے بڑی پکی دوستی ہوگئی۔ میں روز ان سے ملتا تھا۔

بوڑھے اور بچے کی دوستی کا یہ امتزاج بہت عجیب اور انوکھا تھا۔

"بابا جی! آپ کی عمر کتنی ہے؟" اب میرے سوالوں کی توپ کا رخ سرمد بابا کی طرف ہوگیا تھا۔

"پینسٹھ سال...... مگر ہائے بڑھاپا...... اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا ہوں۔ مگر یہ بات بھی نہیں، شاید دکھ نے میری اصل عمر کے مقابلے میں میری جسمانی عمر بڑھا دی ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

"بابا! آپ کو کیا دکھ ہے؟"

"شہزی بیٹا...... بسا اوقات بات دکھ کی بھی
ہوتی، دکھ کی نوعیت کی ہوتی ہے۔ کچھ دکھ وقت کے سا
دب جاتے ہیں لیکن ہرے رہتے ہیں۔ مجھے اس بات کا
نہیں کہ میرا اپنا جوان سگا بیٹا مجھے یہاں چھوڑ گیا ہے۔
اس بات کا بھی دکھ نہیں کہ اس نے بڑی چالاکی سے میرا
روپیا پیسا، میرا کاروبار اپنے نام کروا لیا تھا۔ باپ ہوں
کوئی غیر میری دولت چھین لیتا تو مجھے زیادہ دکھ ہوتا،
بچے نے کیا نا...... مجھے کوئی دکھ نہیں۔ یوں بھی میرا سب
اسی کا ہی تھا۔"

"تو پھر آپ کو کس بات کا دکھ ہے بابا......؟"
ان کی عجیب وغریب باتوں میں مزہ آرہا تھا۔

"تم بھی جب تک بات کی تہہ تک نہ پہنچ جاؤ چین نہیں
سکے...... سنو۔" وہ مسکرا کر بولے۔

"دکھ مجھے خود اپنے آپ پر ہے کہ میں نے بھی ا
ماضی میں اپنے بیچے بوڑھے باپ کے ساتھ بھی کچھ کیا تھا

"مگر سرمد بابا...... مجھے میرا باپ اس عمر میں کیو
...... یہاں چھوڑ گیا؟ میں نے تو کچھ......"

"بیٹا! تقدیر کی طرز نگاری اسی کو کہتے ہیں۔ یہ بھی ا
کہانی ہے، کبھی سہی۔" وہ بڑے گہرے لہجے میں
بولے۔

"ہم سب اپنی اپنی لکھی ہوئی تقدیروں کے جال
میں جکڑے ہوتے ہیں۔ ماہ وسال کی گردش کے ساتھ
سب ایک طرح کے مکافاتِ عمل کی زد میں بھی رہتے ہیں
بھلائی کرنے والوں کو اچھا صلہ اور برائی کرنے والوں کو
صلہ ملتا ہے...... اور ضرور ملتا ہے۔"

مجھے سرمد بابا کی کچھ بات سمجھ میں آئی، کچھ نہیں۔ میں
بولا۔ "تو بابا! میں نے کیا برائی کی تھی جو میرا اپنا باپ مجھے
یہاں چھوڑ گیا؟"

"بھائی تم نے نہیں کی...... تم تو خود ابھی بچے ہو......
معصوم بچے...... فرشتہ صفت...... بھائی تمہارے باپ
کی جو اپنے لختِ جگر کو خود سے جدا کر کے کہیں بیچ کی
کر گیا۔"

سرمد بابا...... پہلے آدمی تھے جنہوں نے میرے
باپ کو برا کہا تھا۔ ورنہ آپا جی میرے باپ کے اس گل
مجبوری کہہ کر ٹال دیا کرتی تھیں۔

کچھ روز گزرے، میرا باپ مجھ سے ملنے آیا۔
میرے لیے بہت ساری چیزیں لایا تھا، میں سب کچھ بھلا

سے لپٹ گیا۔ اس نے بھی مجھے خود سے لپٹا لیا اور مجھے پیار کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"بابا اب مجھے یہاں سے لے جاؤ نا...... اب میں ضد نہیں کروں گا۔ نئی امی کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔ اب میں شریف بچہ بن گیا ہوں۔"

میں کہتا رہا اپنے باپ کو کسی طرح مناتا رہا۔ اس کا چہرہ درد سے بھرتا رہا۔ وہ بولا۔ "میرے بچے! تم کدھر گم تھے؟ تم تو اچھے بچے ہو مگر ابھی تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔"

وہ ایک بار پھر مجھے روتا دھوتا چھوڑ کر چلا گیا۔ میں پھر اداس اور غمگین ہوگیا۔ باپ جب بھی آتا اور ایسے لوٹ جاتا تو میری یہی کیفیت ہوجاتی۔ مگر پھر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھل جاتا۔

میری شخصیت میں واضح طور پر تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب میرے باپ نے بھی رفتہ رفتہ آنا چھوڑ دیا۔ پہلے وہ ہفتے چھ دن میں آجایا کرتا تھا۔ پھر مہینے بعد آنے لگا۔ پھر ایک سال گزرنے کے بعد...... اور میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے آنا ہی چھوڑ دیا۔ میں باپ کو یاد کرتا رہا۔ باپ نے ساتھ چھوڑا تو ماں کی یاد آئی مگر ماں تو پہلے ہی مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

پھر اس کے بعد سے میری فطرت، میرا مزاج دیگر بچوں سے مختلف ہونے لگا۔ میں خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ آپا جی نے ہی نہیں، سرمد بابا نے بھی میری ان کیفیات کو محسوس کرلیا۔ آپا جی تو خیر شروع ہی سے میرے لیے مہربان خاتون تھیں۔ بس مجھے دوسرے بچوں کی بہ نسبت زیادہ چاہتی تھیں۔ بقول ان کے میں اس ادارے کا سب سے پیارا اور معصوم صورت بچہ تھا۔ اور اب اداس اور خاموش طبیعت نے تو مجھے دیگر بچوں سے اور بھی مختلف بنادیا تھا۔ اب آپا جی کے بہلانے سے بھی میرا دل نہیں بہلتا تھا۔

سرمد بابا وہ واحد آدمی تھے جن سے مل کر میری طبیعت کھل جاتی تھی۔ دیگر بچے دوسری تفریحات میں اپنا دل بہلایا کرتے تھے، میں سرمد بابا کے پاس آجاتا تھا۔ سرمد بابا سے میرے دل لگنے کی وجہ شاید یہی تھی کہ ان کی شخصیت میرے احساسِ محرومی کا کسی حد تک مداوا کرتی تھی۔ ماں تو میری مرچکی تھی مگر باپ زندہ ہوتے ہوئے بھی مرگیا تھا۔ مرے ہوئے پر صبر آجاتا ہے مگر زندہ آدمی کا منہ موڑ لینا دل کو بہت تکلیف دیتا ہے۔

انہی دنوں دو نئے مزید بچوں کا اضافہ ہوا۔ وہ بھی تقریباً میرے ہم عمر ہی تھے۔ ایک کا نام اشرف معلوم ہوا، دوسرے کا بلال...... ابتدا میں وہ بھی روئے، اداس ہوئے پھر رفتہ رفتہ آپس میں گھل مل گئے۔ میری ان سے دوستی ہوگئی۔ چند دنوں میں ہی بلال اور اشرف نے پر پرزے نکال لیے۔ وہ ادارے کے شرارتی بچوں کے طور پر مشہور ہونے لگے۔ آپا جی کا ناک میں دم کردیتے۔ مگر ایسے بچوں کو سدھارنے کے لیے دو آدمی...... رکھے ہوئے تھے جو بچوں کی عمر کے مطابق انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ چھوٹی موٹی سزا بھی دیتے۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کا اشتیاق ہوا۔ بلال نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے ماں باپ کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ اسی لڑائی میں باپ اشتعال میں آکر مجھے بھی پیٹنے لگتا۔ ماں تڑپ جاتی اور باپ سے لڑنا بھول کر اسے سنبھالنے کو لپکتی، پھر باپ کا یہی وتیرہ بن گیا۔ لڑائی ماں سے ہوتی، وہ مجھے مارنے لگتا۔ اس طرح وہ میری ماں کو بلیک میل کیا کرتا تھا۔ پھر تنگ آکر ماں مجھے یہاں چھوڑ گئی۔ اشرف کی کہانی زیادہ دلدوز اور دردناک تھی۔

اشرف کا تعلق بھی بہت ہی غریب گھر سے تھا۔ جہاں پہلے ہی اس کے بھائی بہن موجود تھے۔ اس نے اپنے بارے میں یہ لرزہ خیز انکشاف کیا کہ ایک روز بابا مزدوری کر کے گھر لوٹے۔ ماں کے ساتھ تو اکثر جھگڑا کرتے ہی تھے۔ غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ اس روز رات کو گھر پہنچ کر خلاف توقع میری ماں سے انہوں نے جھگڑا کیا، نہ بچوں کے ساتھ مار پیٹ کی، کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس کھوئے کھوئے سے رہے اور صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئے۔

میرے علاوہ دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی جو مجھ سے چھوٹے تھے۔ تین جھلنگا چارپائیوں میں ہم سوتے تھے۔ کسی آہٹ پر رات کے نصف پہر میری آنکھ کھلی تو میں بری طرح دہل گیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذبح کی ہوئی لاشیں چارپائیوں پر پڑی دیکھیں اور باپ اس وقت مجھے قصائی کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے پھل والا خون آلود چھرا تھا۔ میں لیٹے لیٹے پھٹی ہوئی آنکھوں سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا میں اپنی جگہ گُن ہوگیا تھا۔ باپ میری طرف بڑھنے لگا۔ اچانک میری ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میرے خونی باپ نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ماں بھی کم صحت مند نہ تھی، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی بپھری ہوئی شیرنی بن گئی۔ اس نے اپنی جان کی پروا کیے

بتیر، چلا کر مجھے بھاگ جانے کو کہا۔ میں نے گھر سے نکلتے ہوئے باپ کے یہ الفاظ سنے تھے جو وہ میری ماں کو قتل کرنے کے دوران کہہ رہا تھا۔ "تو بدذات عورت، تیرا ابھی یہی حشر کروں گا۔ کس کے بچے تھے... یہ... یہ میرے بچے نہیں تھے۔"

"پھر میری ماں کی گلی کے باہر تک ایسی چیخ سنائی دی جیسے اسے ذبح کیا جا رہا ہو۔"

اشرف یہ بتا کر چپ ہو گیا۔ ہمارے معصوم ذہن تھے، ابھی ہمیں ان باتوں کا کیا پتا تھا۔

بلال اور اشرف یہاں بہت خوش تھے، میری ان سے دوستی ہو گئی تھی۔

""اطفال گھر" نامی اس ادارے میں صرف ہم بچے ہی نہیں تھے، بچیاں بھی تھیں۔ جب ہم تیرہ چودہ برس کی عمروں کو پہنچے تو ان بچیوں کا الگ پورشن بنا دیا گیا جس کی دیوار ہمارے پورشن کے ساتھ ہی ملی تھی۔ بچپن میں ہی ساتھ کھیلے کودے تھے، ان سے بھی انسیت ہو گئی تھی۔ جب انہیں ہم سب سے الگ کر دیا گیا تو ہمارا اداس ہو جانا ایک فطری بات تھی۔ میری بھی ایک بچی سے دوستی تھی، اس کا نام عابدہ تھا۔ اس کی کہانی پتا نہیں کیا تھی۔ مگر وہ مجھے اچھی لگتی تھی، اس نے مجھے اپنا نام عابدہ بتایا تھا۔

عابدہ، پتا نہیں کون تھی۔ آپا جی نے بتایا کہ اسے کسی نے اغوا کیا تھا... اور پھر کسی طرح یہاں پہنچی۔ (قوت گویائی سے محروم۔) عابدہ سے مجھے بہت گہری انسیت تھی۔ بچپن کے جذبات انسیت کے نام پر ہی پہچانے جاتے ہیں۔ پورشن الگ ہونے کے باعث ہم اداس تو ہوئے تھے مگر یہ اداسی وقتی ثابت ہوئی تھی... کیونکہ ہم بہرحال رہتے تو ایک ہی جگہ پر تھے۔

ایک روز سرمد بابا بیمار پڑ گئے۔ وہ ہر وقت اپنے دالان کے ایک کونے پر چارپائی پکڑ کر بیٹھ جاتے اور اپنا سینہ پکڑے کھانستے رہتے۔ میں نے آپا جی سے سرمد بابا کی حالت زار کا ذکر کیا۔ میری کچھ کوششوں سے وہاں ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا۔ اپنے میڈیکل باکس سے ایک انجکشن نکال کر انہیں بازو پر لگایا پھر کچھ دوائیں تجویز کر کے چل دیے۔ دوائیں اگلے دن منگوا لی گئیں۔ میں زیادہ تر وقت سرمد بابا کے ساتھ گزارنے لگا۔ ان کی تیمارداری کرتا، ان کا خیال رکھتا۔ وہ مجھ سے بہت متاثر ہوئے۔ میری توجہ اور دیکھ بھال کے باعث وہ جلد ہی رو بہ صحت ہو گئے۔ وہ مجھے پیار سے کاکا کہنے لگے۔ بولے۔

"میں اپنے بیٹے حامد کو بھی کاکا ہی کہتا تھا۔ تم بھی میرے لیے... میرے اپنے بیٹے کی طرح ہو... اس سے بڑھ کر۔"

کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ اس کی وجہ جانتا تھا۔ بڑی بےچینی اور مصیبت میں لیا۔

"بابا! کیا آپ اب بھی اپنے بیٹے حامد سے کرتے ہیں؟" وہ جواباً ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"ہاں بیٹا... بھلا ماں باپ اپنی اولاد سے کر سکتے ہیں؟"

"اس کے باوجود بھی بابا... کہ اس نے آپ اپنے گھر سے نکال دیا؟" میرے لہجے میں معصومانہ تھی۔

"ہاں کاکا! اس کے باوجود بھی۔"

"آپ کو کیا بیٹا یاد آتا ہے؟"

"ہاں مگر مجھے اپنے دو چھوٹے پوتا پوتی بہت یاد آ ہیں، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، بہت مانوس مجھ سے... میرے بغیر تو وہ بھی اداس رہتے ہوں گے۔"

میں چپ ہو گیا۔ میں سرمد بابا کو زیادہ دکھی ہوتا دیکھ سکتا تھا اس لیے انہیں کم ہی اس سلسلے میں کریدا کرتا۔

☆☆☆

وقت کا کام چلتے رہنا ہے... رکنا نہیں اسے وقت ہی کیوں کہا جاتا۔ کوئی قلم تھی جو اپنی ابتدا انتہا کی طرف گامزن تھی۔ ایک دور تھا جو زیست رواں تھا عہد تھا، جو اپنے انتہا کے سفر پر رواں دواں تھا۔ ایک زما جو گزر رہا تھا۔ "اطفال گھر" بھی وقت کے ان انداز و اطوار کی زد سے نہ بچ سکا۔

اطفال گھر کے بچے لڑکپن میں داخل ہونے تھے۔ ان میں چند ایسے خوش نصیب بچے بھی تھے جنہیں میں ان کے ماں باپ یا وارث واپس لے جا چکے بہت سوں کے تو سرپرست ہی نہیں تھے، یا لاپتا تھے۔ لاپتا میں میرا باپ بھی شامل تھا...

بات صرف وقت کی تبدیلی کی ہی نہ تھی بلکہ ان کی تبدیلی کی بھی تھی۔ ہمارے اندر بھی تبدیلی آ زندگی کے محسوس کرنے والے سارے رنگ اب ایک ڈھنگ میں بدلنے لگے تھے۔ میری مسیں بھیگنے لگی محسوسات کو اظہار کی زبان ملنے لگی تھی۔ شعور میں لڑ

ں در آنے لگیں۔ دل میں کچھ کرنے کی امنگیں بیدار نے لگی تھیں۔ آٹھ سال کی عمر سے بارھویں سال میں قدم رکھنے کے بعد جب اٹھارھویں سال میں قدم رکھا تو... اپنی تبدیلی پر خود حیران تھا۔ وقت کی بھی تو طرفہ کاری ہوتی ہے، کہاں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت گزر ہی نہ رہا ہو... رکا ہوا ہو... اور پھر لگتا ہے گویا ایک زقند بھرتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہو۔

☆☆☆

"اطفال گھر" نامی اس ادارے کے روح رواں ملک کے ایک معروف سماجی شخصیت حاجی محمد اسحاق تھے۔ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا۔ درمیانہ قد، بارعب چہرہ، سادہ لباس... اپنی وضع قطع سے وہ پرہیزگار اور متقی انسان نظر آتے تھے۔

اس روز "بڑے بچوں" کی چھانٹی ہو رہی تھی۔ ان میں "بڑی بچیاں" بھی شامل تھیں۔ ان کا باقاعدہ الگ رجسٹر تیار کیا جا رہا تھا۔ اور نئے سرے سے اندراج ہو رہا تھا اور یہ ساری کارروائی، حاجی محمد اسحاق کی موجودگی میں ہو رہی تھی اور ان کے آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

یہ ایک ہال کمرا تھا۔ پہلے "بڑے بچوں" کو نمٹایا جا رہا تھا۔ ایک صوفے پر حاجی صاحب براجمان تھے۔ ان کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم کی عینک چڑھی ہوئی تھی۔ انہوں نے خود بھی ایک ڈائری اپنی گود میں کھول رکھی تھی۔ ان کے بائیں ہاتھ پر بڑی سی میز تھی۔

وہاں ایک پختہ عمر کا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا رجسٹر کھول رکھا تھا۔ یہ مشتاق صاحب تھے، حاجی صاحب کے سیکریٹری۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر آپا جی براجمان تھیں۔ انہوں نے بھی ایک ایسا ہی رجسٹر کھول رکھا تھا۔ ایک عمر رسیدہ خاتون کے علاوہ دو اور افراد بھی تھے۔

ہر لڑکے کا باری باری نام پکار کے بلایا گیا۔ پھر جب میرا نام پکارا گیا۔ میں آگے بڑھا۔ ایک شخص جو پاس کھڑا نگرانی کر رہا تھا، میرے قریب آ گیا۔ وہ مجھے ایک قریب کی دیوار کی طرف لے گیا۔ پھر بہ آواز بلند میرا اندراج ہونے لگا۔

عام لڑکوں کے مقابلے میں میرا ڈیل ڈول غیر معمولی تھا۔

پھر مجھے جانے کی اجازت مل گئی۔

یہ عمل لگ بھگ صبح دس بجے شروع ہوا اور ایک بجے تک نمٹا لیا گیا۔ حاجی صاحب اپنی لمبی سی گاڑی میں چلے گئے۔

عابدہ نے بھی خوب رنگ روپ نکالا تھا۔ کتابی چہرہ، ستواں ناک، حسن دل آرا میں معصومیت کی آمیزش... بڑی بڑی کجراری آنکھیں، بال گھنے اور بھورے مائل، سرو قامت اور متناسب جسامت۔

میں اگر اپنے ڈیل ڈول اور وجاہت کے لحاظ سے اپنے لڑکوں کے گروپ میں نمایاں تھا تو وہ بھی اپنی غیر معمولی خوبصورتی اور پرکشش شخصیت کے باعث لڑکیوں میں ممتاز تھی۔ یہ عجب اتفاق کی ہی بات تھی کہ جس روز حاجی صاحب آئے تھے، اس روز ہماری گروپ بندی بھی کر دی گئی تھی جس کے مطابق ہم جوان لڑکوں کے گروپ کا مانیٹر مجھے بنایا گیا تھا جبکہ لڑکیوں کے گروپ کی پریفیکٹ عابدہ کو بنایا گیا تھا۔ وہ اپنی عمر کے سولھویں برس میں قدم رکھ چکی تھی۔

عابدہ تو میرے بچپن کی پسند تھی اور میں بھی اسے اتنا ہی پسند تھا۔

بلال اور اشرف میرے قریبی دوست تھے مگر ان دونوں کا مزاج مجھ سے مختلف تھا۔ بہرحال کوئی تو وجہ تھی جس کی وجہ سے ہم تینوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔

آپا جی ہی کی زبانی ہمیں پتا چلا کہ بہت جلد حاجی صاحب دوبارہ دورے کے لیے اطفال گھر آنے والے ہیں۔ اس بار ان کے دورے کی وجہ بہت اہم تھی۔ آپا جی کے اس اعلان کے بعد لڑکوں میں ہی نہیں، لڑکیوں میں بھی ایک بے چینی اور سنسنی پھیل گئی۔ ایک افواہ تھی جو گردش کرنے لگی تھی مثلاً اس بار حاجی صاحب... جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے مستقبل اور آگے ٹھکانے کا بندوبست کریں گے یا پھر انہیں "اطفال گھر" سے کسی طرح چلتے سے بے دخل کر دیا جانے والا تھا وغیرہ۔ کیونکہ ظاہر ہے اب ہم "اطفال" نہیں رہے تھے۔

"یار! اچھی بات ہے، میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

بلال نے کہا تو اشرف اس کی تائید میں بولا۔ "کہتا تو ٹھیک ہے، اب یہاں رہنے کی ہمیں عادت سی ہو گئی ہے۔"

بلال دبلا پتلا اور دبے ہوئے قد کا لڑکا تھا جبکہ اشرف لمبے قد کا اور میری طرح کسرتی بدن کا مالک تھا۔

"تو کیا کہتا ہے شہزی؟" اشرف نے مجھے ٹہوکا دیا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ دونوں ہر وقت دوسرے گروپ کی لڑکیوں ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہتے

تھے۔ تاہم عابدہ کے سلسلے میں تمام بچے یہ جانتے تھے کہ وہ میری پسند ہے۔

میں نے کہا۔ "یار! زندگی عمل کا نام ہے۔ ہمیں اب اطفال گھر کے "پنجرے" سے نکلنا چاہیے۔ اپنے زورِ بازو پر کام کرنا چاہیے۔ مجھے اب یہاں الجھن ہوتی ہے۔"

میری بات پر بلال بولا۔ "باہر کی زندگی بڑی مشکل ہے۔ یہاں ہم مزے میں ہیں۔ کرنے کا تو جی کرے گا۔"

"سچ۔" اشرف بھی اپنے مخصوص لہجے میں اس کی تائید میں کہا۔

"کھانا، پینا، رہنا، سونا سب فری۔ چھوٹا موٹا کام کرنے پر خرچی بھی مل جاتی ہے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں چند نوٹ تھما کر باہر کی دنیا بھی گھوم آتے ہیں۔ بس لڑکیوں کے معاملے میں تھوڑی کمی ہوتی ہے۔ ورنہ تو نسرین، شہرین اور نوشین بھی ہمارے ساتھ باہر جانے کو تیار ہیں۔"

"یار شہزی! تمہارا دل نہیں کرتا، عابدہ کے ساتھ باہر نکلنے کو؟" اشرف آخر میں مجھ سے کہا۔

"بزدل ہے۔ کسی لڑکی کو باہر کیا لے کر جائے گا۔ خود تو پہلے باہر نکل کر دکھائے۔" بلال نے مجھ پر طنز کیا تو میں نے کہا۔

"خاطر جمع رکھو۔ اب تمہارے یہ سارے حربے ختم ہونے والے ہیں۔ عنقریب حاجی صاحب ہمارے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے والے ہیں۔ اب ہم یہاں رہنے کے اہل نہیں رہے ہیں۔"

"اس کا حل بھی ہم نے سوچ رکھا ہے۔" اشرف معنی خیز لہجے میں بلال کی طرف دیکھ کر رازدارانہ مسکراہٹ سے بولا۔ گویا بلال بھی اس کا رازداں تھا مگر میں چونک گیا۔

"کیسا حل؟"

"اگر اس بڈھے کھڑوس نے ایسا کوئی فیصلہ کیا بھی تو ہم بغاوت کر دیں گے۔ یہاں سے نکل جائیں گے۔" بالآخر اشرف نے کہا۔ حاجی صاحب کے بارے میں ان کا یوں مذاق اڑانا مجھے سخت ناگوار گزرا تھا مگر انہیں سمجھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں چپ رہا۔

"اطفال گھر" میں لڑکوں اور لڑکیوں سے ملنے کی سختی سے ممانعت تھی مگر پھر بھی ہم تینوں چھپ چھپا کر یہ کام کر جاتے تھے۔ اشرف اور بلال کی تو کئی لڑکیوں سے دوستی تھی لیکن میں صرف عابدہ سے ہی ملتا تھا۔ اب وہی میرا سب کچھ تھی اور میں اس کا۔

اس معاملے پر وہ بھی کچھ متوحش اور فکرمند تھی۔ اس روز جب ہم کھڑکی کے درمیان ... چوری چھپے باتیں کر رہے تھے تو اس نے اپنے خدشے کا اظہار مجھ سے کیا۔

"شہزی! میں نے سنا ہے، ہمیں اب یہاں سے نکالا جانے والا ہے۔"

"سنا تو میں نے بھی یہی ہے لیکن ...... کم از کم لڑکیوں کے لیے ایسا کوئی فیصلہ نہیں کیا جا رہا۔" میں نے کہا۔

"لیکن تم۔" اس کی آنکھوں میں اتری ہوئی بے کلی اور تشویش میرے نام کی تھی۔ میں اس کی بیقراری اس کی آنکھوں سے بھانپ گیا تھا۔

"تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟ میں بھلا تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا؟" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اس کی مسکراہٹ میں اب ایک طمانیت احساس تھا۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ سلاخوں وا کھڑکی کے راستے میں اس کے نرم نرم ہاتھوں کو سہلاتا رہا۔ پھر میں اپنے پورشن کی طرف لوٹ آیا۔

ان ماہ و سال نے سرمد بابا سے بھی خراج وصول تھا۔ وہ اور زیادہ ضعیف اور کمزور ہو گئے تھے تاہم خود کو فٹ رکھنے کے لیے وہ روزانہ واک کرتے۔ اس سلسلے میں میں نے سرمد بابا سے بھی ذکر کیا تھا کہ ان کے خیال کے مطا حاجی صاحب ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والے تھے؟ ظاہر ہے وہ بھی قیاس آرائی کے علاوہ اور کیا کرتے۔

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ہم لوگوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر وغیرہ بھی سکھ جاتا تھا۔ تاکہ ہم عملی میدان میں بھی قدم رکھ سکیں۔ مقصد کے لیے..... ہمیں مختلف ٹولیوں میں بانٹ کر مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں میں بھی کام پر لے جایا جاتا تھا۔ ہماری دو لڑکوں کی ٹولی میں بلال شامل تھا جبکہ اشرف دوسری ٹولی میں تھا۔ وہاں سے ہمیں ڈیلی ویجز کے طور پر پیسے مل جایا کرتے تھے۔ ہم ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتے تھے۔

اس روز ہم شام گئے واپس لوٹے۔ میں ہر روز سے ہی نہیں سرمد بابا سے بھی ضرور ملا کرتا تھا۔ اس عابدہ سے کھڑکی میں ملاقات کرنے کے بعد جب میں بابا سے ملنے پہنچا تو ہمیں ایک چونکا دینے والی خبر ملی۔ آج صبح ہی کوئی خاتون، دو بچوں کے ساتھ گھر آئی تھیں اور سرمد بابا کو اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

تشویش ہوئی۔ میں الجھا الجھا سا آپاجی کے آفس روم میں آیا مگر وہ آرام کرنے کے لیے اپنے پورشن میں جا چکی تھیں۔

ناچار میں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ میں ایک تجسس آمیز الجھن کا شکار تھا۔ بابا ایسے کیسے چلے گئے؟ وہ عورت کون تھی؟ شاید ان کی جاننے والی ہو۔ مگر وہ کم از کم مجھے تو کچھ بتا کر جاتے۔ ایسے کیسے چلے گئے تھے وہ؟ تاہم یہ خوشی کی بات بھی تھی کہ چلو... بابا جہاں گئے ہوں گے اپنی خوشی سے ہی گئے ہوں گے۔ بھلا میرا ان کے ساتھ رشتہ ہی کیا تھا۔ اب تک اطفال گھر میں ایسا ہوتا آیا تھا، لوگ آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ پھر..... میں خوش بھی تھا کہ چلو بے چارے اپنوں میں ہی گئے ہوں گے۔ شاید ان پہ کسی کو رحم آ گیا ہو۔ اب آخری عمر اپنوں میں گزاریں گے۔

☆ ☆ ☆

انسان کے دل ہی میں نہیں سوچ اور ذہن میں بھی ایک طرح کی نزاکت ہوتی ہے۔ انسان کو سماجی درندہ ایسے ہی نہیں کہا گیا۔ سماج جیسے انسانوں میں مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے۔ اطفال گھر میں بھی ہم سب مل جل کر رہتے آئے تھے۔ کئی لوگوں سے پرانی انسیت بھی ہو گئی تھی۔ کوئی اچانک ساتھ چھوڑ دیتا تو دکھ سا ہوتا۔ یہی سبب تھا کہ سرمد بابا کے یوں اچانک چلے جانے سے میں بھی اداس تھا۔ عابدہ بھی اداس ہو گی۔

حالات اشارہ کر رہے تھے کہ اطفال گھر کے حالات نے والے تھے..... اس کا اندازہ اس جانکاہ خبر کے بعد ہوا۔

جن دنوں حاجی صاحب نے اطفال گھر کا دوبارہ کرنا تھا اور بڑے بچوں اور بڑی بچیوں سے متعلق حتمی فیصلہ آنا تھا، اس کے ایک روز قبل ان کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔

پھر تو جیسے پورے اطفال گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ کیا ، کیا بچے کیا جوان..... حتیٰ کہ ادارے کے عملے کے افراد بھی حاجی صاحب کی اچانک موت پر پریشان اور تشویش زدہ ہو گئے۔ ایک سوالیہ نشان تھا جو ہر ایک کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا کہ... اب کیا ہو گا؟ اب اس ادارے کا والی وارث کون ہو گا؟ اور اب جو ہو گا؟ کیسا ہو گا؟ وغیرہ۔ کیونکہ حاجی صاحب کی میں ہر کوئی بہت خوش اور آرام و سکون سے تھا۔

بے چارے بڈھوں کو زیادہ اپنی فکر ہو رہی تھی کہ پتا نہیں اب ان کا اس عمر میں کیا بننے والا تھا؟ جبکہ آپا جی کو بچوں کی فکر ستا رہی تھی اور جوان لڑکیوں کی بھی۔ جبکہ ہم نوجوان اس فکر و تشویش سے قدرے آزاد تھے کیونکہ اب ہم نے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھ لیا تھا۔ تاہم ایک بے نام سا تجسس تھا کہ اب کیا ہونے والا تھا؟

اس ادارے میں اب جو کچھ ہونے والا تھا، وہ ہماری سوچ سے بھی زیادہ مکروہ، کریہہ اور بھیانک تھا۔

حاجی صاحب کی موت کے بعد سب کچھ ایک دم ہی بدل گیا تھا۔ اطفال گھر کی جو کبھی ایک الگ دنیا تھی، بہت آرام دہ اور پُرسکون جگہ..... جیسے یہاں کسی مہربان اور رحم دل بادشاہ کی حکمرانی ہو۔ مگر اب جیسے کوئی سخت گیر حکمران نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی تھی۔ بہت واضح تبدیلی دیکھنے میں آنے لگی۔ جیسے کوئی ہماری اس پُرسکون، آرام دہ اور ننھی سی دنیا پر غاصبانہ قبضہ کر بیٹھا ہو اور جلد سے جلد اپنا تسلط جمانے کی کوشش و جستجو میں ہو۔

سب سے پہلے عملے کے وہ لوگ رفتہ رفتہ تبدیل کیے گئے..... بہ الفاظِ دیگر نکالے جانے لگے..... جو عرصے سے یہاں کام کر رہے تھے۔ ان کی جگہ عجیب و غریب صورت افراد نے لے لی تھی، چند عورتیں بھی تھیں جو اپنی مردوں کی طرح خرانٹ صورت تھیں۔ آپا جی تو اس طرح غائب کر دی گئیں کہ جیسے کبھی اطفال گھر میں بھی ان کا وجود ہی نہ رہا ہو۔ حالانکہ وہ سب بچوں کی "ماں" کہلاتی تھیں اور ہم سب بھی گویا ان کی گود میں کھیل کر جوان ہوئے تھے۔

ایک خوف کی فضا تھی جو اس ادارے پر دھیرے دھیرے طاری ہوتی جا رہی تھی۔ ہر کوئی جیسے اپنے ارد گرد کے ماحول سے ڈرا ڈرا اور سہما سہما تھا جیسے ابھی کچھ ہونے والا تھا۔

بالخصوص جوان لڑکیوں کا گروپ زیادہ حواس باختہ اور سراسیمہ تھا۔ وہ ہم سے زیادہ خوف اور تشویش آمیز بے چینی کا شکار تھیں۔ بالخصوص عابدہ..... مگر اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں جبکہ خود میری اپنی دل و دماغ کی کیفیات اگرچہ ان سب سے مختلف نہ تھیں لیکن میرے دل و دماغ میں خوف کی جگہ پریشانی اور فکر تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب یہاں کچھ غلط ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ عملے کے نام پر جو افراد یہاں تعینات کر رکھے تھے، وہ ہمیں ہمدردی کی نگاہ سے کم قصائی کی نظر سے زیادہ دیکھا کرتے تھے۔ ان کی صورتیں بھی ایسی

نرم و ملائم Smooth شیو!
مجھے Confidence گھر ہو یا پھر کھیل کا میدان
My Secret to Win!
TOUCHME
TOUCHME
SHAVING CREAM
For All Skins
شیونگ کریم

تھیں کہ دیکھ کر خوف آتا تھا۔ سب کے سب ہٹے کٹے مشٹنڈے اور پہنچے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ کسی کسی ہمیں تو ان کے پاس اسلحے کی جھلک بھی نظر آ گئی تھی۔ آپا جی کی جگہ جو عورت آئی تھی، وہ شکل و صورت سے انہی کے قبیل کی نظر آتی تھی، نہایت کالی موٹی اور بھدی، مگر یہاں کا سارا نظام یہ اقبال تو دیگر... نگرانی... ایک لحیم شحیم اور سیاہ رنگت کے حامل شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ان سب کا سرغنہ تھا۔ بعد میں ہمیں اس کا نام مع عرفیت کے معلوم ہوا جو اس کی شخصیت سے ہم آہنگ تھا، دلشاد خان عرف استاد کنگل... وہ ہمیں ایسی نظروں سے گھور کے دیکھا کرتا تھا جیسے ہمیں نظروں ہی نظروں میں تول رہا ہو۔

ہمیں اب کام پر بھی نہیں بھیجا جاتا۔ شاذ ہی باہر لے جایا جاتا۔ گیٹ اور چار دیواری کے اوپر خاردار باڑھ نصب کر دی گئی تھی۔ پہرے پر انہی کے بدمعاش صورت آدمی رہا کرتے تھے۔ ٹی وی، پڑھنا لکھنا، کتابیں اور ایسی دیگر مہربان چیزیں ختم کی جا چکی تھیں۔ بوڑھوں کو تو ابتدائی چند دنوں میں ہی نکال باہر کیا گیا تھا۔ البتہ بچے اور ہم عمر لڑکے لڑکیاں اپنی تعداد میں موجود تھے۔

مجھے دال میں کالا نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔ یہ اطفال گھر... اب اطفال گھر کم رہا تھا گویا ایک جیل خانہ بن کر رہ گیا تھا۔ یا پھر اوباش اور گینگسٹر لوگوں کا اڈا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر عابدہ کی... ہونے لگی۔ اس صورتِ حال سے وہ بہت زیادہ خوف زدہ اور متوحش تھی۔ ایک دن میں نے یونہی گیٹ سے باہر نکلنا چاہا تو وہاں متعین ایک کرخت صورت پہرے دار نے مجھے خونخوار لہجے میں جھڑک دیا اور تنبیہ بھی کر ڈالی کہ میں دوبارہ ان کی اجازت کے بغیر گیٹ سے باہر تو کیا گیٹ کے قریب بھی آنے کی جرأت نہ کروں۔

اب میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کر دی۔ ہمیں ہال کمرے میں ہر وقت بند کر کے رکھا جانے لگا تھا، گویا ہم قیدی ہوں۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا مگر کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک روز میں نے سب لڑکیوں کے پورشن کا چوری چھپے رخ کیا تو عین اس وقت جب میں پورشن کی دیوار والی مطلوبہ کھڑکی سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ میری کمر پہ چابک پڑا۔ میں درد اور اذیت سے بلبلا کر رہ گیا۔ ایک سرخ لکیر تھی جو میری پیٹھ پر نمودار ہو گئی تھی جس کی جلن میں کئی دنوں تک سہتا رہا تھا۔ اب مجھے احساس ہو گیا تھا کہ یہ اطفال گھر اب بردہ فروشوں کا اڈا بن چکا تھا۔ ہم سے بیگار لیا جانے لگا۔ ہمیں سویرے ایک بند کنٹینر والے ٹرک سے کسی نامعلوم مقام لے جایا جاتا، وہاں پتھر کوٹنے کا سخت کام لیا جاتا تو کہیں اینٹوں کے بھٹے پر سخت کوشی کروائی جاتی۔ میں تو خیر ان سختیوں کو جھیل ہی رہا تھا مگر بلال اور اشرف کی حالت زیاد پتلی ہو رہی تھی۔ کیونکہ وہ دونوں آرام طلب تھے۔ یہ سختیاں جھیلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بھی انکشاف سننے میں کہ چھوٹے معصوم بچوں سے بھیک منگوانے کا بھی کام لیا جاتا تھا۔

انہی دنوں میں نے بلال اور اشرف کو ساتھ ملایا۔ کہ ہمیں یہاں سے فرار ہونا چاہیے۔

اس کی ہم نے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ میرا ار سب کو یہاں سے آزاد کروانے کا تھا مگر اشرف اور بلا نے اختلاف کیا کہ یہ ابھی مشکل ہو گا۔ لہٰذا فی الحال پہلے آسانی کے ساتھ اس جہنم سے فرار ہوا جائے، اس بعد... باہر نکل کر پولیس سے مدد لی جا سکتی تھی۔ اس بات میں وزن تھا، میں نے اختلاف نہیں کیا... مگر میں عابدہ کو ان بھیڑیا صفت لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بلال اور اشرف سے بارے میں صاف صاف کہہ دیا۔ وہ کچھ سوچ کر را ہو گئے۔

گویا جان جوکھم میں ڈال کر ایک دن چوری میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف ملاقات کر ہی لی اور ا اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔

ساتھ ہی اس نے بھی کئی لرزہ خیز انکشافات ک ہوئے مجھے یہ بتا کر جان لیوا تشویش میں مبتلا کر ڈالا ک یہ بدکردار لوگ ان پر بھی بُری نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ چند جوان لڑکیوں کو جانے کدھر غا بھی کر چکے ہیں۔ شنید تھی کہ پہلے ان معصوم لڑکیوں کو ا نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا، اس کے بعد کہیں فروخت ک تھا۔

عابدہ کی زبانی یہ سب سننے کے بعد میں نے لے کر یہاں سے فرار ہونے کا پختہ عزم کر لیا تھا اور تھی کہ چاہے جان چلی جائے اپنے ارادے سے نہیں آؤں گا۔

”شمشیر! مجھے اب یہاں بہت ڈر لگنے لگا ہے سب بتانے کے بعد عابدہ خوف سے لرزتے لہجے کھڑکی کی فولادی سلاخوں سے اس نے اپنا

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

ہاتھ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کے نرم و نازک ہاتھ کی کپکپاہٹ نے جیسے میرے وجود تک کو لرزہ براندام کر دیا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ وقت کم تھا۔ قصائی صورت کوئی پہرے دار ہمیں کھڑکی سے یوں باتیں کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

"عابدہ! تم حوصلہ رکھو، اب تم ہی میری ہمت اور میرا عزم ہو جس کے بل بوتے پر آج رات ہی میں نے تمہارے ساتھ اس جہنم سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ میں تمہیں یہی بتانے آیا ہوں۔"

میری بات پر اس کی کاجل آنکھوں میں سہمی ہوئی سراسیمگی قدرے ماند پڑی۔ وہ بولی۔ "کیا واقعی..... تم سچ کہہ رہے ہو شہزی؟" "لیکن..... یہ سب کیسے ممکن ہوگا؟ یہاں اب ان خونخوار صورت والے سفاک پہرے داروں نے تو ایک دوسرے سے بات تک کرنے پر پابندی عائد کر دی ہے۔" اس کے لہجے میں غیر یقینی در آئی۔ میں نے ازراہِ تشفی کہا۔

"مجھے بھی معلوم ہے لیکن ہم نے ساری پلاننگ کر لی ہے۔ یہاں تک بھی آج پہنچا ہوں تو یہ بھی ہماری منصوبہ بندی کا ایک حصہ ہے۔"

"ہم کون؟..... کیا اور بھی.....؟"

"ہاں! بلال اور اشرف بھی میرے ساتھ ہیں۔"

"مگر ہمارے ہال کمرے کا دروازہ تو لاک ہوتا ہے؟"

"یہ کام اشرف بہ آسانی کر لے گا۔ اسے بند تالے کھولنے کا ہنر آتا ہے۔"

"سچ کہا؟" پہلی بار عابدہ کے چہرے پر خوشی امید— بن کر چمکی تھی۔

"بس! اب میں چلتا ہوں..... ابھی کسی سے ذکر مت کرنا۔ ایک بار باہر نکل جائیں تو یہاں پھنسے ہوئے سب لوگوں کو آزاد کروا لیں گے۔"

میں نے کہا اور پھر اس کا نازک ہاتھ تھپتھپا کر اپنے پورشن میں آ گیا۔

ہم تینوں ہال کے ایک کونے میں اپنے بستروں پر بیٹھے تھے۔

"تسلی کروا آئے ہو عابدہ کی۔" بلال نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اشرف عجیب سی مسکراہٹ سے بولا۔ "بے چاری عابدہ! میرا خیال ہے اسے تمہاری مہم جوئی کا یقین نہیں آ رہا ہوگا؟"

"ہاں یار! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میں نے جھینپی مسکراہٹ سے تائید کی۔ وہ پھر عجیب سے انداز میں مگر بولا کچھ نہیں۔

"مگر میں نے اس کی تسلی کروا دی ہے۔" پھر طلب انداز میں باری باری بلال اور اشرف کی طرف بولا۔

"یار..... تم دونوں کو کیا لگتا ہے؟ ہم چاروں آسانی آج رات نکل جائیں گے یہاں سے؟"

"ہمارا منصوبہ بے داغ ہے۔ تم کیوں فکر کر ہو؟" بلال نے بے لاپروائی سے کہا۔

"صرف تالے کھولنے کی بات ہے۔ وہ میرے زتے، بس تم اور عابدہ وقت کا خیال رکھنا۔ ایک ضائع مت کرنا۔ تمہیں معلوم ہے نا..... کیا کر تمہیں؟"

"بالکل یاد ہے۔" میں نے جوش سے کہا۔

مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ رات کے ایک مقررہ پہر لڑکیوں کے پورشن کی طرف جا کر عابدہ کو نکالنا تھا۔ اشرف کہ وہ اس سے ذرا دیر قبل اس طرف جا کر کھول دے گا۔ پھر بلال سے جا ملنے کا جو تا چار دیواری کے جنوبی سمت والے اس دروازے آزمائی کرنا چاہتا تھا جہاں سے روز ادھر کچرا اٹھا ٹریکٹر ٹرالی اندر داخل ہوتی تھی۔ وہاں صرف ایک پہرے دار تھا جو گاہے بگاہے گشت کے دوران بیڑی پینے کے لیے ذرا فاصلے پر بنی ایک کوٹھڑی کا رخ کر وہاں تین مزید پہرے داروں کی رہائش تھی۔ یہی ہوگا، جب بلال یا اشرف، دروازے پر زور آزمائی رکھتے تھے۔

"فرار" کا یہ منصوبہ خالصتاً بلال اور اشر ترتیب کردہ تھا۔ مجھے صرف اپنے ہاتھ پاؤں ہلا غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی بات پر ان سے ورنہ تو میں پہلے ہی یہ ذکر کر چکا ہوں کہ میری ان سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نہ صرف سوچ اور فطرت کے حوالے سے وہ دونوں ایک تھے فطرت کی۔ جب سے "انقلابی گھر کے" حالات ہوئے تھے، میں نے محسوس کیا تھا کہ اس ماحول اور اشرف کے مزاج اور اطوار میں کچھ الگ تبدیلی تھی۔ جسے میں بہ آسانی کسی حماقت یا تائید

تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اس بدلتے ماحول سے خوش تھے۔ اندازہ مجھے تب ہوا۔ جب دونوں نے قصائی صورت پہرے داروں اور بالخصوص استاد گنگل کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش چاہی تھی۔ بلال اور اشرف نے ان کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کے ساتھ ان کا بندۂ بے دام یا واضح الفاظ میں ان کا "کارپرداز" بننے کا اشارہ دیا تھا۔ میرے نزدیک یہ ضمیر فروشی اور اپنی عزتِ نفس، اپنی آزادی کو ایک جابر اور مطلق العنان آدمی کے پاس گروی رکھنے کے مترادف تھا۔

یہ محسوس کر کے مجھے ان دونوں سے نفرت سی ہونے لگی تھی مگر میں نے ابھی اس کا دونوں کے سامنے اظہار نہیں کیا تھا۔ ممکن تھا کہ میں غلطی پر ہوں مگر جب ان دونوں نے ایک روز اچانک فرار کے منصوبے پر میری رائے لینا چاہی تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ بے شک ایسا منصوبہ میرے دل و دماغ میں بھی پل رہا تھا لیکن..... جب بلال اور اشرف نے پہل کی تھی، تو میں اس پر سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ اور ان دونوں کے بارے میں مجھے اپنے تجزیے کی نفی کرنا پڑی تھی۔

بہرطور..... رات کا بے چینی سے انتظار کیا جانے لگا..... اوائل سرما کی سرد راتیں تھیں اور شام میں ہی رات کا گمان ہوتا تھا۔ تاہم رات کے ایک مقررہ پہر..... جب انقلابی گھر کے در و دیوار پر شعور کے سناٹے اترنے لگے اور ہال کمرے کی بتیاں گل ہو گئیں تو منصوبے کے مطابق سب سے پہلے اشرف حرکت میں آیا۔ دیگر بستروں پر ہماری عمروں کے لڑکے گہری نیند میں مستغرق تھے۔ اشرف دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر کی سن گن لی پھر سیدھے ہاتھ کی دیوار کی جانب سرک گیا۔ میں اور بلال اپنے کونے والے بستروں پر دبکے اس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک کھڑکی کے قریب گیا جہاں آہنی سلاخیں نصب تھیں۔ بعد میں پتا چلا وہ اور بلال چند روز پہلے ہی سے اس پر زور آزمائی کر چکے تھے اور اب صرف انہیں اپنی جگہ سے اکھیڑنے کی دیر تھی۔ اشرف یہ کام نمٹا کر کھڑکی کے راستے دوسری طرف کود گیا۔ ہال میں مدھم روشنی تھی۔ میرے چہرے پر سنسنی کے آثار تھے اور میں بڑی حیرت اور تشویش کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اشرف کی یہ مہم جوئی دیکھ رہا تھا، جبکہ بلال کے چہرے پر ایسے تاثرات نہ تھے، جس پر مجھے حیرت تھی۔ وہ شاید مطمئن تھا، مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ بلال اور اشرف کی میدان کے کچے سمتوں میں کھلاڑی تھے، اور مجھے ان سے اختلاف بھلا کر کے ان سے کچھ سیکھنا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اشرف لوٹ آیا اور میرے قریب آ کر سرگوشی میں بولا۔

"چلو، نکلو باہر..... اب تمہاری باری ہے۔ جیسا کہا ہے، ویسا ہی کرنا ہے۔ چلو اٹھو۔" ان کی کارکردگی دیکھ کر میرے اندر جوش و جذبہ جاگا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ کھڑکی کے راستے باہر نکلا، اور پتلی گلی کی دیوار سے چپکا چپکا لڑکیوں والے پورشن کی طرف بڑھا۔ اشرف کی ہدایت کے مطابق دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں پہرے دار نہ تھا، شاید وہ گشت کرتا ہوا تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھیوں کے پاس جا چکا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی بند تھی۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے چھوا تو حیران رہ گیا۔ وہ ڈھیلی تھیں، بس اکھیڑنے کی دیر تھی۔ اشرف کی بتائی ہوئی ساری باتیں درست ثابت ہو رہی تھیں۔ اس نے بڑی چابک دستی، ہوشیاری اور مہارت سے ان سلاخوں کو بھی ہلا جلا کر ڈھیلا کر دیا تھا اور دریچے پر میں نے ہلکے سے دستک دی۔ سب اشرف کے .... طے شدہ منصوبے کے مطابق ہو رہا تھا۔ دریچہ کھلا، عابدہ کا چہرہ نمودار ہوا۔

"میں سلاخیں اکھیڑ رہا ہوں، تم باہر نکلنے کو تیار ہو؟" میں نے عابدہ کا چہرہ دیکھتے ہی سرگوشی کی۔ وہ کچھ نروس سی تھی۔ بس اثبات میں سر ہی ہلا سکی۔ میں نے بے آہستگی مگر بڑے آرام سے چار پانچ سلاخیں نکال دیں۔ ہال میں خاموشی تھی، شاید باقی لڑکیاں گہری نیند میں تھیں۔ دفعتاً مجھے عابدہ کے عقب میں ایک اور چہرہ دکھائی دیا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ اسے کیا..... بلکہ میں تو ہال کی ساری لڑکیوں کو ہی پہچانتا تھا مگر جانتا صرف عابدہ کو ہی تھا۔ مگر اس وقت عابدہ کے ساتھ میں کسی دوسری لڑکی کا چہرہ دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے بری طرح چونک پڑا..... اور سرگوشی سے عابدہ سے بولا۔ "یہ کیا؟" میرے اس مختصر استفساریہ جملے میں تنبیہ بھی تھی۔

"یہ..... یہ..... میری عزیز اور قریبی سہیلی شکیلہ ہے۔"

"لیکن میں اس وقت اسے بھی..... میرا مطلب ہے....." مجھ سے مکمل کہا گیا۔ وقت کم تھا..... عابدہ نے پتا نہیں کیوں یہ حرکت کر ڈالی تھی۔

"تم فکر نہ کرو شہزی!" عابدہ میرا اضطراب بھانپ

کر بولی۔ ''شکیلہ تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتی ہے۔''

''جلدی کہو، وقت کم ہے اور تم... باہر آؤ پہلے۔'' میں نے کہا مگر شکیلہ سامنے آ کر مجھ سے دھیمی آواز میں بولی۔

''شہزی بھائی! اللہ آپ کو کامیاب کرے۔ مجھے عابدہ نے سب بتا دیا ہے۔ آپ لوگ ہماری بھی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن پلیز... کیا آپ شوکت کو اطلاع دے سکتے ہو؟''

''شوکت؟'' میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ پھر مجھے شوکت حسین عرف شوکی یاد آ گیا۔ میں بولا۔ ''دیکھو شکیلہ! میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ پتا نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ مگر تسلی رکھو ہم یہاں سے نکلنے کے بعد...'' اچانک مجھے کی سے باہر ہال کمرے کے نیم تاریک برآمدے کی جانب سے ہلکے قہقہے کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک گیا۔ عابدہ نے جلدی سے شکیلہ کو پرے ہٹایا۔ اس سے کچھ کہا۔ پھر کھڑکی کے راستے باہر آ گئی۔ مجھے سلاخیں بھی دوبارہ نصب کرنا تھیں۔ یہ منصوبے کا حصہ تھا۔ چند ثانیے کی دھڑکتی خاموشی کی سن گن لینے کے بعد میں جلدی جلدی اکھڑی ہوئی سلاخیں دوبارہ کھڑکی کی چوکھٹ میں نصب کرنے لگا۔ اس اثنا میں شکیلہ نے کواڑ بند کر دیے تھے۔

''یہ کیا بے وقوفی تھی؟'' میں نے ہولے سے عابدہ کے کان میں سرگوشی کی۔ ''یہ لڑکی ہمارا راستہ کھوٹا کر سکتی تھی۔''

''ایسی بات نہیں ہے... میں تمہیں سمجھا دوں گی۔'' صورتحال کی نزاکت سے عابدہ کی ہوشیاری لوٹ آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ شکیلہ بھی شوکت حسین نامی ایک لڑکے کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا رہی تھی اور اس کا ارادہ تھا کہ شوکت حسین بھی ان کے ساتھ شامل ہو جائے لیکن وہ پہلے ہماری کارروائی کا انجام دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ شوکت حسین جو اس وقت ہال میں اپنے بستر پر کسی کونے میں بظاہر سو رہا تھا، درحقیقت ہمارے منصوبے سے آگاہ تھا مگر... یہاں میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ اگر وہ واقف تھا تو پھر اس نے ہم سے اب تک بات کیوں نہیں کی؟ شوکت حسین عرف شوکی مجھے یاد آ گیا تھا، گویا شکیلہ اس کی محبوبہ یا دوست تھی، اور عابدہ نے اسے بھی اپنے راز میں شامل کر لیا تھا۔ میری کریدنے پر عابدہ نے بتایا کہ شکیلہ کو اس منصوبے کے بارے میں بتانا اس کی ایک جذباتی مجبوری تھی۔ ان تین بدنصیب لڑکیوں والے بھیانک واقعے کے بعد شکیلہ بہت مایوس اور خوف زدہ تھی۔ وہ اپنی کلائی کی نس کاٹ کر خودکشی کرنا چاہتی تھی۔ ایک لڑکیوں نے بھی پہل کی تھی مگر عابدہ نے انہیں جینے کا حوصلہ دیا تھا اور لرزہ خیز اقدام سے انہیں باز کی خاطر بتا دیا تھا کہ وہ اور میں یہاں سے فرار ہو بعد ان کی آزادی کے لیے بھی کچھ کر پائیں گے۔

عابدہ نے یہ غلط کیا تھا یا صحیح، ابھی اس پر تجزیہ وقت نہ تھا۔ میں منصوبے کے مطابق عابدہ کو لے کر دونوں پورشن کے درمیان والی تنگ سی جگہ سے ہوتا اس مقام پر پہنچ کر رک گیا جہاں مجھے بلال کا انتظار کرنا پھر اس کے ساتھ ہم نے مذکورہ دروازے کی جانب باغ کی آڑ کا سہارا لیتے ہوئے بڑھنا تھا۔

ہمیں وہاں رکے جب کافی دیر گزر گئی اور بلال تو مجھے پریشانی کے ساتھ تشویش لاحق ہونے لگی۔ کیوں نہیں آیا تھا؟ اس کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ تک میں بلال اور اشرف کی سوچ کے مطابق قدم اٹھا جب وہ نہ آیا تو میں نے خود ہی آگے بڑھنے کا فیصلہ جب میں لپکا باغ کا سہارا لیتے ہوئے چور دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے حیرت و پریشانی دوہرا جھٹکا لگا۔ وہاں منصوبے کے مطابق اشرف کو حال کرنے کے لیے پہلے سے موجود ہونا تھا مگر وہ بھی سے غائب تھا۔ کئی سنسناتے ہوئے خیال بجلی کے قمقموں طرح میرے اندر جلنے بجھنے لگے۔ یہی وہ وقت تھا، مجھے احساس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ اب سب کچھ صرف اپنے پر تھا۔ فرار کے اس منصوبے میں اب عابدہ اور تنہا تھے۔ ایک بات میرے حق میں تھی۔ وہ یہ کہ دروازے کی جانب کوئی پہرے دار نہ تھا۔ شاید وہ کہیں کھسک گیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بلال اور اشرف کی عین وقت پر ناموجودگی میں مجھے خود فیصلہ کرنا مشکل آ رہا تھا۔ تاہم وقت اور حالات نے مجھے یہ کرنا سکھا دیا۔ میں نے عابدہ کو وہیں رکے رہنے کا کہا اور پودوں کی آڑ لیتا ہوا چور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں پہلے دروازے کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ آیا میں اسے کھو کی پوزیشن میں ہوں بھی یا نہیں۔

دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اس کا جائزہ لیا۔ اس پر تالا پڑا ہوا تھا مگر اس طرح کہ اس کا کنڈا کھلا تھا۔ مجھے خوشی بھی ہوئی اور اچنبھا بھی۔ یہ کیا چکر تھا اشرف اپنا ''کام'' کر چکا تھا؟ یعنی تالا کھولنے کی داری اس کی تھی پھر وہ کہاں گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم

دیکھنے کے لیے پلٹ گیا چاہتا تھا کہ اس سنہری موقع دیکھے کر نکل جاؤں۔ بلال اور نہیں بھی وہ جہاں کہیں ہوں گے، پھر میں یہاں سے فرار ہونے کے بعد بیٹھا رہوں گا۔ باہر رہ کر میں ان سب کی لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

یہ ساری باتیں چند لمحوں میں سوچنے کے بعد میں پلٹا اور عابدہ کو وہیں سے آنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ میری جانب ہی متوجہ تھی، اشارہ پا کر میری جانب لپکی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی ہم دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک گویا روشنی کا طوفان ہم پر آن پڑا۔ ہماری آنکھیں چندھیا گئیں، اس تحیر ''[illegible] آفت'' میں ہماری نکلتے ہوئے وجود بھی گویا خیرہ ہو گئے۔ بے چاری عابدہ کے حلق سے تو دبی دبی چیخ بھی خارج ہو گئی۔

دلشاد خان عرف استاد ککل اپنے پانچ چھ خونخوار حواریوں کے ساتھ ہم سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ایک حواری کے ہاتھ میں بڑی سی چارجنگ لائٹ تھی۔ استاد ککل کے ہونٹوں پر بڑی سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے حلق سے حد انتہائی طنز سے آمیز... آواز برآمد ہوئی۔

''بہت پکی جوڑی ہے دونوں کی... لیلیٰ مجنوں یاد آ گئے۔'' مجھے اس کی آواز زہر میں ڈوبی محسوس ہوئی۔

اس کے ساتھ حواریوں نے ہم پر گنیں تان رکھی تھیں۔ میں اور عابدہ اپنی جگہ پر کھڑے رہ گئے۔ عابدہ کا لرزیدہ بدن میرے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پھر استاد ککل کے ایک اشارے پر گن بردار حواری ہماری جانب بڑھے۔ ایک نے بڑی بے رحمانہ خونخواری سے عابدہ کو مجھ سے کھینچ کر علیحدہ کیا۔ وہ چیخی، میں نے اسے کھینچنے والے کے جبڑے پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر شاید اسے پہلے ہی مجھ سے اس حملے کی توقع تھی۔ اس سے پہلے اس کی لات حرکت میں آ چکی تھی جس نے مجھے لڑکھڑا کر اس کے دونوں ساتھیوں کی طرف دھکیل دیا۔ میری سنبھلنے کی کوشش کے دوران ہی وہ مجھ پر پوری طرح حاوی ہو چکے تھے۔ میں بے بس تھا۔ اور بڑی زخمی نظروں سے عابدہ کو ان کے شکنجے میں پھڑپھڑاتا دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی چڑیا شکرے کے چنگل سے نکلنے کی بے بس سی کر رہی ہو۔

''چھوڑ دو... اس کو... چھوڑ دو...'' عابدہ کی حالت دیکھ کر میرے حلق سے جس قسم کی دہشت خوں رنگ انداز کی غراہٹ برآمد ہوئی تھی، وہ خود میرے لیے اجنبی تھی۔

ککل خان میری بے بسی پر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ چند قدم قریب آیا اور اپنے بھاری ہاتھ کا ہتھوڑا نما گھونسا میرے جبڑے پر رسید کر دیا۔ میرے حلق سے مارے اذیت کے کربناک سی کراہ خارج ہوئی اور پورا دماغ گویا میرا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔ سر سینے کی طرف جھول گیا... اور میری باچھیں میرے ہی خون سے رنگین ہو گئیں۔ مجھے تکلیف میں دیکھ کر عابدہ چیخ پڑی تھی اور ککل خان سے میرے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگی... ککل خان نے پلٹ کر اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ عابدہ کی آواز بند ہو گئی۔ ''لے جاؤ اس کو۔'' وہ غرا کر اپنے ساتھی سے بولا۔ میرا دماغ گھونسے لگنے کے باعث ابھی تک جھنجھنایا ہوا تھا۔ میں خاصی دیر تک بے حواس رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں پہلے کبھی ایسے حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ بھلا ایک ''اطفال گھر'' میں رہنے والے بچے سے جوان ہونے تک لڑکے میں کتنا حوصلہ ہو سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے خود کو بے ہوش ہونے نہیں دیا تھا۔ عابدہ کے بے سدھ وجود کو شیطانی حواری کے سہارے جھولتا دیکھ کر میرے وجود میں چنگاریاں سی بھڑکنے لگیں۔ اس وقت ککل خان نے بڑے وحشیانہ انداز میں اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی اور اپنا بھاری بھرکم چہرہ میری ڈوبتی نظروں کے سامنے لاتے ہوئے درندوں کی سی غراہٹ سے بولا۔ ''میں تجھے عبرت کا نشان بنا دوں گا، تاکہ دوسرے یہ غلطی کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں... لے جاؤ اسے بھی۔''

ایک تنگ و تاریک بند کوٹھری میں مجھے پھینک دیا گیا۔ تھوڑی دیر تک میں اسی طرح مرے پڑے بے سدھ سے وجود کی طرح پڑا رہا۔ پھر بجلی کی چٹ کی آواز ابھری۔ کمرے میں روشنی ہو گئی۔ پتا چلا آخر باہر والوں کا مستقل ٹھکانا یہ کمرا تھا جس کی چھت قدرے بلند تھی۔ اس بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ لائٹ انہی دونوں میں سے ایک نے آن کی تھی جو مجھے یہاں لائے تھے۔ ککل خان بھی وہاں آ گیا تھا۔ عابدہ کو پتا نہیں ان ظالموں نے کہاں رکھا تھا۔ ککل

خان نے اپنے ان دونوں مذکورہ حواریوں کو اشارہ کیا۔ جانی پہچانے کھلونے کی طرح دونوں حرکت میں آگئے۔ کمرے میں جو جالا بکھرا ہوا تھا، اس سے کچھ خوف کا تاثر ابھرتا تھا۔ اب پتا چلا تھا کہ یہ کمرا کس لیے استعمال ہوتا تھا۔ میرے منہ پر پٹی باندھ دی گئی۔ ہاتھ پاؤں بھی رسّی ڈور سے باندھ دیے گئے۔ میں نے مزاحمت کرنا چاہی تو اس کے جواب میں مجھ پر تابڑ توڑ گھونسوں کی بارش کر کے نڈھال کردیا گیا۔ ساری رات مجھے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر علی الصباح مجھے میدان میں لکڑی کا عارضی آٹھ فٹ لمبا چوکھٹا بنا کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ اسی پر بس نہ ہوا تو مجھ پر ایک حواری نے ہنٹروں کی بارش کردی۔ میں پہلے ہی ادھ موا ہوا جا رہا تھا، اب یہ ایک نئی اذیت تھی۔ دل و دماغ پہلے ہی ماؤف تھے۔ مجھے پہلے رات گئے تک اتنی سخت اذیتوں اور تشدد سے گزارا گیا تھا کہ اب پورا جسم ہی سن ہو کر بے حس ہوگیا تھا۔ اب کسی نئی اذیت یا تکلیف کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

منگل خان نے اسی طرح گویا میری حالتِ زار کو اور مجھے نشانِ عبرت بنا کر دیگر لڑکوں کے سامنے پیش کیا تھا کہ وہ بھی ایسی جرأت نہ کرسکیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ اس ہال کمرے میں پھینک دیا گیا۔ زخم جب تک گرم رہے، اتنی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا، پھر جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو شدید ٹیسوں کی صورت میں جاگنے لگتا ہے۔ یہی حال میرا ہوا۔ جسم میں خون کی گردش اور تیزی معمول پر آئی تو پورا بدن جیسے پھوڑا بن گیا۔ میرے حلق سے مارے درد و اذیت کے چیخیں تک نکل گئیں۔ میں کونے کے بستر پر کسی زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ کچھ لڑکے ہمدردی کے لیے مجھ سے پتا نہیں کیا کیا کہتے رہے۔ مجھے اس کا بھی ہوش نہ تھا۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میرے زخمی وجود میں ٹھنڈک بھرنے لگی ہو۔ کوئی تھا جو جانے کہاں سے میرے لیے دوائی اور مرہم پٹی کا سامان چرا لایا تھا اور باقاعدگی سے مجھے مرہم پٹی کرتا تھا۔ یہی نہیں اور درد کش دوا بھی مجھے کھلاتا تھا۔

تیسرے چوتھے روز میری حالت سنبھلی تو میں نے اپنی نیم جان آنکھوں کے سامنے ایک نیم شناسا چہرہ دیکھا اور جیسے یکلخت میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دوبارہ سے عود کر بحال ہونے لگی۔

اپنے فرار کی ناکامی کا میرے ذہن میں جو پہلا سبب ابھرا تھا، وہ یہی شخص تھا۔ یعنی شوکت حسین... یہ شکیل کا پرانے فرینڈ تھا۔ اور اسی روز رات کو عابدہ نے مجھے شوکت حسین کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ دونوں کی مخبری کے باعث انکشاف ہوا ہوگا۔

اقبال گھر کی چار دیواری میں محدود زندگی گز والے آدمی کی عقل بھی اس حد تک کام کرسکتی تھی کہ اس بغیر سوچے مجھے شوکت حسین اور شکیل کو اس کا قصو ٹھہرا دیا۔ حالانکہ سوچتا تو یہ بات میری سمجھ میں آسکتی تھی انہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم سب تو ایک کشتی کے سوار تھے اور پھر میرے اور عابدہ وغیرہ کے فر سے خود ان کے لیے بھی تو فائدہ تھا۔ پھر ان تین دنوں شوکت حسین ہی تھا جس نے میرا خیال رکھا اور اب میری حالت قدرے بہتر تھی۔ فطری طور پر ایک خلوص کی دل گھر کرتی ہے، لیکن میں زود فہم بھی تھا، عقل سلیم بھی استعما کرتا آئی تھی۔ جب میں نے شوکت حسین سے اپنی نفرت اظہار کرنا چاہا تو وہ ناراض ہونے کے بجائے مسکرا دیا۔ دستور میرے ساتھ دوستانہ لب و لہجہ اپنائے رکھتے ہو بولا۔ "شہزی! مجھے غلط مت سمجھو۔ شکیل نے مجھے پہلے سب بتا دیا تھا۔ میں چاہتا تو خود بھی تمہارے فرار کا منصو میں شمولیت اختیار کرلیتا۔ شکیل کا مجھ پر بھی دباؤ تھا مگر میں نے ایسا دانستہ نہیں کیا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے اسے نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ اگر اس منصوبے میں صرف تم اور عابدہ ہوتے تو یقیناً میں اور شکیل تمہارے ساتھ شامل ہونے میں کوئی عار نہیں سمجھتے... مگر تمہارے ساتھ... بلال اور اشرف کو دیکھ کر میں نے مصلحتاً چپ سادھ رکھی تھی اور پھر میرا شک درست ثابت ہوا۔"

بلال اور اشرف کے ذکر پر میں نے ان کے متعلق سوچنا چاہا۔ "ان دونوں پر تمہیں کس بات کا شبہ تھا؟"

"پہلے یہ سوپ پی لو دوست! بڑی مشکل سے تمہارے لیے کچن سے چرا کر لایا ہوں..." شوکت حسین نے مسکرا کر کہا اور ایک پیالہ میری طرف بڑھا دیا۔ مجھے اپنے اندر طاقت کی بحالی کا احساس ہوا۔

میں نے شوکت .... کی باتوں پر غور کیا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا تھا کیونکہ اس کی باتوں میں مجھے وزن محسوس ہوا تھا۔

میرے سوال دہرانے پر اس نے ایک نظر ہال پر ڈالی۔ ہال میں ہم دو ہی تھے، بولا۔ "کمال ہے دوست ل تو تمہارے قریبی دوست تھے تم ان کی دگی کچھ پاتے؟"

یں سمجھ پایا ہوں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔" میں نے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنے جسم کو ورزشی انداز میں وڑ کر وارم اپ کرنے لگا۔ وجود میں ابھی تک ٹیسیں ٹھی تھیں مگر اب قابل برداشت تھیں۔ زخم بھی قدرے گئے تھے۔ میں نے شوکت حسین کا شکریہ ادا کیا اور "دوست! تم نے مجھ پر بلاشبہ احسان کیا... اور میں پنی کم عقلی کے باعث تم پر شبہ... رہی بات بلال اور کی تو میں ان کی فطرت وغیرہ کو اچھی طرح جانتا ں... مگر یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایسی ری کے مرتکب کیونکر ہوسکتے ہیں لیکن ابھی میں ان دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے عابدہ کی فکر ق ہو رہی ہے۔ تم عابدہ کے بارے میں کچھ جانتے ہو... کہ وہ کس حال میں ہے؟"

میری بات پر شوکت .... مسکرایا... پھر بولا۔ "اشرف اور بلال کے بارے میں تمہیں سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ان دونوں کے مکروہ چہرے ہم سب کے سامنے بے نقاب ہوچکے ہیں۔ رہی بات عابدہ کی تو شکیل کے مطابق وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

مجھے عابدہ سے متعلق اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا۔ کیونکہ منگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے خیر کی کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ میرے چہرے پر الجھن کے تاثرات بھانپ کر شوکت بولا۔ "عابدہ کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا... مگر دوست! اصل بات تشویش ناک ہے، جو شکیل نے مجھے بتائی ہے..." ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ہال کمرے کے دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ ہم دونوں چونک کر دروازے کی طرف تکنے لگے۔ پھر منگل خان اور اس کے دو حواریوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر شوکت حسین فوراً میرے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکائے اپنے بستر کی جانب بڑھا۔

"کیوں بے بلونگڑے! اب تیری باری ہے۔" ساتھ ہی منگل خان نے اس کی گردن پر ہاتھ مارا اور غراتی ہوئی آواز میں بولا پھر اسے لات رسید کردی۔ شوکت ہال کے بیچ فرش پر جا گرا.... لوہے کے بیڈ کا کونا اس کی پیشانی سے ٹکرایا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ نکلا۔ منگل خان نے ایک اور لات اسے رسید کردی۔ اور اسے فرش پر چت لٹا کر اپنے پاؤں کے موٹے سول والے بوٹ کی ایڑی اس کے جبڑے پر رکھ دی۔

"خبردار جو آئندہ میں تم دونوں کو گھسر پھسر کرتے دیکھوں۔"

پھر وہ میری جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے بڑھا۔ میں اپنے بستر کے قریب خاموش کھڑا ہوکر اس کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔

وہ وحشیانہ نظروں سے مجھے چند ثانیے گھورتا رہا۔ پھر بغور میرا سر سے پیر تک جائزہ لینے کے بعد بولا۔ "بڑا ڈھاکڑ جوان ہے رے تو... اتنی مار پڑنے کے باوجود اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔" میں کچھ نہیں بولا اور منتظر رہا کہ وہ مزید مجھ سے کیا کہنے والا ہے۔

"اب دوبارہ تو ذلیل حرکت نہیں کرے گا... ہاں؟"

مجھے اس بار اس کے لہجے میں نرمی کا احساس ہوا۔ میں تب بھی چپ رہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تجھے یہاں کیا تکلیف ہے؟ تیرا پورا بچپن یہاں گزرا ہے۔ پھر کیوں یہاں سے فرار ہونا چاہتا ہے؟" وہ جیسے کسی مقصد کے لیے شاید میرے سامنے اپنی کینچلی بدل رہا تھا۔

بوڑھے سردار بابا کے ساتھ رہتے ہوئے میں نے ان سے عقل و سمجھ بوجھ اور دنیاداری کی بھی بہت سی باتیں سیکھی تھیں۔ وہ اب وقت کے ساتھ ساتھ... "اثر پذیر" ہو رہی تھیں۔ منگل خان کے اس طرح کینچلی بدلنے پر میں پہلے حیران ہوا تھا۔

"دیکھو شہزی! تم دوسرے کاکوں (لڑکوں) کے مقابلے میں مجھے زیادہ ہی دلیر، صحت مند اور قد آور جوان لگتے ہو اور سخت جان بھی... تمہاری یہ خوبیاں مجھے پسند آئی ہیں لیکن... یہاں سے جانے یا بھاگنے کا خیال... دل سے نکال دو۔"

"کیا ہمیں ساری عمر قیدی بنا کر یہاں رکھا جائے گا اور... بیگار لی جاتی رہے گی ہم سے؟" بالآخر ہمت کرکے میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میں پہلی بار آج آمنے سامنے منگل خان سے مخاطب ہوکر بولا تھا۔ گویا اس کے سامنے اڑنے کی ایک قسم ٹھونک دی تھی میں نے۔

"ساتھی بن کر بھی رہ سکتے ہو... جیسے تمہارے وہ دونوں ساتھی..." وہ ہمدردی میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"بلال اور اشرف کی بات کررہے ہو؟" میں نے اس کی ادھوری بات کا مطلب جان کر کہہ دیا۔

"ہاں۔" اس کا جواب اثبات میں پا کر میرے پورے وجود میں اشرف اور بلال کے لیے نفرت کی ایک لہر

دوڑ گئی۔ گویا شوکت.... کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ اور اب میرا یہ تجزیہ بھی کہ در حقیقت بلال اور اشرف نے خود کو گگل خان وغیرہ کے سامنے سرخرو کرنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ مجھے اور عابدہ کو فرار پر اکسا کر۔ ان شیطانوں نے ہمیں استعمال کیا تھا۔ گگل خان کی ہمدردیاں سمیٹنے کے لیے۔ یہ طاقت کی نہیں مکاری کی جنگ تھی۔ بلال اور اشرف نے دماغ کی جنگ لڑی تھی اگر مجھے یہ جنگ جیتنا تھی تو خود کو زبردست کے سامنے زیر دست بنائے رکھنا تھا۔

گگل خان تھوڑی دیر بکواس کرنے کے بعد چلا گیا۔

میں شوکت.... کی طرف بڑھا۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ سچا آدمی تھا۔ میں نے فوراً بستر کی ایک چادر کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کی پیشانی والے زخم پر رکھ دیا اور اسے سنبھالا۔ "میری وجہ سے تمھیں یہ چوٹ آئی۔ میں اس پر شرمندہ ہوں۔" میں نے کہا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

"کوئی بات نہیں، نہ جانے کتنی اور ایسی چوٹیں میرے مقدر میں لکھی ہیں۔ تم نے دیکھ لیا نا بلال اور اشرف کا اصل چہرہ"

"ہاں۔" میں نے مختصراً کہا۔

"مجھے ابتدا ہی سے ان دونوں پر شبہ تھا۔ انھوں نے خود کو ان خبیث درندہ صفت شیطانوں کی غلامی میں دے دیا ہے۔"

شوکت.... نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا اور اپنی پیشانی کی چوٹ سہلانے لگا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

بلال اور اشرف اب ہمارے ساتھ نہیں رہتے تھے یعنی ہم سے الگ کر دیے گئے تھے۔ وہ اب گگل خان کے حواریوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ مگر ابھی ان دونوں کی حیثیت ان کے نوکروں اور غلاموں کی سی تھی۔ تاہم یہ کیا کم بات تھی کہ دونوں نے گگل خان کا اعتبار جیت کر پالا مارا تھا۔ میں عابدہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر ہم پر اور بالخصوص مجھ پر کڑی نگرانی رکھی جاتی تھی۔ دیکھے دنوں کے انتظار میں صبر اور مستقل مزاجی عقل و فراست کے اہم اصولوں میں شمار ہوتی تھی۔ مرشد بابا کی اس نصیحت پر میں اب کاربند رہتے ہوئے کوئی مضبوط پلاننگ بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ.... ہم پر مسلط کیا جانے والوں کی طاقت کا مجھے اب اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا۔

اس روز میری بلال اور اشرف سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ہمیں ایک بڑے سے بند ٹرک میں کہیں لے جایا گیا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔ ایک ویرانے میں لا کر ہمیں اتارا گیا۔ ہمارے پیروں میں فولادی زنجیروں ڈالے ہوئے تھے۔ ایک خشک نالے کی ریت کر.... وہاں پہلے سے موجود ٹریکٹر ٹرالیوں پر لا مطلب کا م تھا۔ مگر ہمارے لیے اب یہ سخت کوشی رہی تھی۔ ایذیوں کے ٹھوں پر ہم نے اس طرح کی مسلسل جفاکشی کی تھی۔ پتھر بھی توڑے تھے کا کام کیا تھا۔ آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی سستانے کے لیے ایک طرف بیٹھ گیا۔ گگل خان ہوادی ہاتھ میں ہنٹر لیا ایک ٹیلے پر نگاہ رکھے تھے۔ بچے کے ہاتھوں میں اسلحہ بھی نظر آتا تھا۔ صرف دیر کے لیے سستانے کی اجازت دی جاتی ایک سیکنڈ بھی دیر ہو جاتی تو چابک لہراتا ہنٹر ہماری پشت پڑتا اور بلبلا کر ہم دوبارہ جان توڑ مشقت میں جاتے تھے۔ میں اپنی مقررہ مدت کی مہلت پر ایک خشک نالے کی ڈھلان پر جا بیٹھا۔ میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا آج مجھے تکلیف کا کچھ زیادہ ہی احساس ہو رہا تھا۔ شاید کی وجہ وہ تشدد تھا جو کچھ دن پہلے مجھ پر کیا گیا تھا۔

میری سستانے کی مہلت ختم ہوئی تھی کہ مجھ تک نہیں جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے نالے کی ڈھلان پر کسی تیز لمبی شخص کا سایا ابھرتے دیکھا اور کھڑا ہوا۔ اس وقت "شاکیں" کی سنسناتی آواز فضا ابھری تھی۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے میں بیٹھا سانس لے رہا تھا عین اس جگہ پر ہنٹر کی ضرب پڑی میں دوبارہ کام میں جت گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ہنٹر کی جان لیوا ضرب سے محفوظ رہا۔

"بڑے بُرے حالوں میں ہو یارے!" کام دوران ایک زہر بجھی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ نے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ دونوں مردود میرے سامنے کھڑے تھے۔ بلال عرف بالا اور اشرف۔ بالے نے سے اخلاق کہے تھے۔ دونوں نے چست پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ ہونٹوں میں اٹکے ہوتے تھے۔ ہاتھ سگریٹ، اشرف نے سیاہ چشمہ بھی لگا رکھا تھا۔ دونوں "مور" دیکھ کر لگتا تھا وہ اب ہماری طرح قیدی یا بیگاری رہے تھے اور خوب مزے میں تھے۔

میں نے یہ شکل اپنی اندرونی کوفت ہوئی کیفیات قابو پاتے ہوئے ان کی طرف مسکرا کر یوں دیکھا جیسے ان سے کوئی شکایت نہیں اور بولا۔ "جو قسمت میں دوست اور کی بھگتنا تو پڑتا ہے، سو بھگت رہا ہوں۔"

"یہ شاعری بھی شروع کر دی ہے...؟" سگریٹ کا گہرا کش لیا اور فلسفیانہ لہجے میں دست کچھ نہیں ہوتی، سارا کھیل دماغ کا ہے اس نے اپنی انگلی سے اپنی کنپٹی ٹھونکی۔ "تم بھی کو استعمال کرو.... اور ہماری طرح مزے کرو۔" استاد کو تو تم پسند بھی آ گئے ہو۔" اس بار بالے اس کی بات پر میں اندر سے چونکا۔ گویا گگل خان طرف سے خاصی قرابت داری استوار ہو چکی تھی۔ جواباً اسی طرح گرم توے پر بیٹھی روٹی جیسی مسکراہٹ سے بولا۔

"ہاں یار، باتیں تو تمہاری بھی ٹھیک ہی ہیں مگر میں شاید تمہارے استاد کے معیار پر پورا نہ اتر سکوں۔"

"ارے ہم کون سا تیس مار خان تھے پھر ان کے ٹیم میں شامل ہو کر یہ داداگیری ہمیں بھی آ گئی ہے۔ تم بھی استاد کے دل و دماغ پر اپنا اعتماد بٹھانے کی کوشش کرو۔" اشرف مکاری.... سے مسکراہٹ سے بولا۔

میرا استاد زبردست تھا اور میں زیر دست۔ مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا۔ اب میرا مقصد صرف عابدہ نہیں رہی تھی بلکہ میں نے یہاں رہنے والے ان سب قیدی لڑکا لڑکیوں اور بچوں کو چھڑانے کا عزم کر رکھا تھا۔ کیونکہ یہ ظالم نہ صرف ہم سے بلکہ معصوم بچوں سے بھی بیگار لیتے تھے۔ بلکہ ان بچوں سے بھیک بھی منگواتے تھے۔ بقول شوکی کے اصل لوگ یہ نہیں تھے جو گگل کی صورت میں نظر آتے تھے، ان کی پشت پر بااثر لوگ تھے۔ گگل خان تو محض ان کی کٹھ پتلیاں تھے۔

"کیا سوچنے لگے؟" بالے نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں خیالات کے چنگل سے نکلا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس طرح میں تمہارے استاد پر اپنا اعتماد قائم کروں کہ اسے میری وفاداری پر یقین آ جائے۔ اور میں بھی تم دونوں کی طرح خوب مزے کروں۔ سچ پوچھو تو میں اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔"

"یہ ہوئی نا.... شیروں والی بات۔" اشرف چہک کر بولا۔ بالے کے چہرے پر بھی معنی خیز مسکراہٹ آئی۔ دونوں بے خبر تھے کہ میرے دل و دماغ میں ان کے لیے [illegible] ہوا لاوا ابل پڑنے کو بے چین تھا۔ میرا بس چلتا تو ان دونوں حرام کے پلوں کی گردنیں مروڑ دیتا۔

"اس کے لیے تمہیں بہت آسان کام کرنا پڑے گا۔" بالا بولا۔ "اپنے لوگوں پر نظر رکھو اور پھر کسی کی فرار ہونے کی کوشش ناکام بنا دو۔"

"یعنی اس طرح دھوکے سے ان کی مخبری کروں، جس طرح تم دونوں نے میرے اور عابدہ کے ساتھ کیا تھا؟" ... میرے اندر کا آتش فشاں آخر پھٹ ہی پڑا۔

"دوست، مطلب براری کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے۔" اشرف.... ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے خود پر قابو پایا..... اور جبراً مسکراہٹ سے بولا۔ "ہاں، میں نے تمھی سے تو یہ سبق سیکھا ہے۔ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو قربانی کا بکرا بناؤ۔ میں اس طرح اپنا مقصد حاصل کروں گا۔ مجھے تم دونوں سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں ہے بلکہ تم دونوں کا مشکور ہوں کہ تم نے مجھے یہ سب سکھایا۔ مجھے لگتا ہے کچھ لوگ فرار کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ میں ان پر نظر رکھوں گا۔"

"یہ کی نا جی داروں والی بات۔ لگے رہو۔ ایک دن ہماری جگہ آنے پر کامیاب ہو جاؤ گے۔" دونوں یہ کہہ کر ہنستے ہوئے چلے گئے۔ میں نے دل ہی دل میں ان دونوں پر لعنت بھیجی اور کام میں لگ گیا۔

ایسا سب کچھ میں نے دانستہ اور دونوں سے کہا تھا تاکہ وہ اپنے استاد یعنی گگل خان سے میرے سلسلے میں اس طرح کی باتیں کرتے رہیں۔ اور وہ مجھ پر ہی نہیں عابدہ پر بھی نرمی کا ہاتھ رکھیں.... مگر ایسا کب تک چلتا.... مجھے جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔

میں نے رفتہ رفتہ اشرف اور بالے سے راہ و رسم بڑھانی شروع کر دی۔ میں انھیں کریدنے کی زیادہ کوشش کرتا تھا۔ ان دونوں کا در پردہ کام ہی یہی تھا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوتے تھے اور میں نے ان دونوں کو اپنی حمایت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ ان سے باتوں باتوں میں پوچھنے کی کوشش کرتا تھا کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ آیا کہ بس یہی لوگ تھے یا ان کی پشت پر اور بھی لوگ تھے.... تو وہ کون تھے اور کہاں تھے؟

غرضیکہ وہ دونوں بھی مجھے اس سلسلے میں بتانے سے معذور تھے۔

لیکن سوچنے کی بات میرے نزدیک یہی تھی کہ اچھا بھلا مشہور و معروف اور معتبر نظر آنے والا ادارہ "اطفال گھر" حاجی اسحاق کے مرحوم ہوتے ہی یکدم جرائم پیشہ افراد کے ہتھے کیسے چڑھ گیا تھا؟ اور اگر چڑھ بھی گیا تھا تو ابھی تک معمول کے مطابق یہاں شہر کی کسی اعلیٰ معتبر اور معزز شخصیت

نے بھی کوئی وزٹ نہیں کیا تھا؟ حالانکہ اس سے پہلے شہری کی نہیں بلکہ ماضی میں ملک کی بڑی اہم سیاسی و غیر سیاسی اور سماجی شخصیات نے دورہ کیا تھا بلکہ ادارے کی ترقی و ترویج کے لیے خطیر رقم عطیے بھی کی جاتی رہی تھی۔

ابھی میں اس جلسے میں غور و فکر کر ہی رہا تھا کہ ایک تعطل ٹوٹ گیا۔ شہر کی ایک بڑی کاروباری شخصیت ادارے کو ایک بڑی رقم کے چندے کا چیک دینے کے لیے عنقریب دورہ کرنے والی تھی۔

اس خبر پر مجھے اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری طرح دوسرے بھی حیران تھے اور خوش بھی۔ ہمیں ایسا لگا تھا جیسے ہمارا کوئی نجات دہندہ آنے والا ہو... جو ہمیں اس جہنم سے نکالنے والا تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ آخر گل خان اور اس کے حواری یہ کیونکر چاہیں گے کہ باہر کا کوئی آدمی اور وہ بھی شہر کی کوئی معروف کاروباری شخصیت یہاں کا دورہ کرے اور ان کے کالے کرتوتوں سے آگاہ ہو سکے کیونکہ یہاں سب جو کچھ ہو رہا تھا یا کیا جا رہا تھا، وہ سب بیرونی دنیا سے خفیہ رکھا جا رہا تھا۔ تو پھر یہ لوگ اتنا بڑا رسک کس طرح لے رہے تھے اور کیوں؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی، خطیر رقم کی صورت ملنے والے چندے کا لالچ یا پھر وہ کسی اہل شخصیت کو دورے سے منع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

ہم اس نجات دہندہ کے بے چینی سے منتظر تھے بلکہ آپس میں کبھی ہم نے ایک خفیہ نشست جمانے کے دوران یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ آنے والی شخصیت کو حلق پھاڑ پھاڑ کر ان درندوں کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتا دیں گے۔ کیا یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ممکن تھا؟ کیا دلشاد خان عرف استاد گل ویسا ہی بے وقوف تھا؟

اشرف اور بالے کی مہربانی سے میں نے عابدہ سے کھڑکی کی طرف چوری چھپے ملاقات کی۔ اس رات ناکامی کے بعد سے میری عابدہ سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کا چہرہ پژمردہ تھا، مجھے دیکھ کر کھل اٹھا۔ شکیلہ بھی اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ "عابدہ! تم ٹھیک تو ہونا... تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی ان بھیڑیوں نے؟"

"نہیں... لیکن... شہزی! حالات بہت خراب ہونے والے ہیں۔" عابدہ نے گویا انکشاف کیا۔ نہ جانے کیوں یہ بری خبر مجھے اپنے حوالے سے کم عابدہ کے حوالے سے زیادہ پریشان کر دیتی تھی۔

"کیا ہوا، خیریت؟ کیا ہونے والا ہے؟" میں نے پریشان لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے ایک نگاہ اپنے ساتھ کھڑی شکیلہ پر ڈالی اسے بولنے کا خاموش اشارہ کیا۔ وہ کھڑکی کے قریب بولی۔ "شہزی بھائی! پہلے یہ تو بتائیں شوکی کیسا ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ عنقریب وہ بھی تم سے آ ملے۔" میں نے اسے شوکت حسین کے سلسلے میں تسلی پھر پوچھا۔ "شکیلہ بہن کیا ہونے والا ہے... خیر ہے؟"

"ہمیں شبہ ہے خدا کرے غلط ہو۔ عنقریب ہم سے چند خوبصورت لڑکیوں کو کسی نامعلوم مقام کی طرف جایا جانے والا ہے۔" اس کی بات پر میرا دماغ بھک اڑ گیا۔ "کک... کیا مطلب؟ اور... تمہیں... اس بات کا شبہ کیسے ہوا؟"

"اب تک تو شبہ ہی ہوا ہے مگر خطرہ کچھ ایسا ہی وہ بتانے لگی۔ "میں نے اور عابدہ نے ان دونوں عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا بھی تھا۔" چند دنوں میں دو بار کچھ لوگ اندر آئے تھے جنہوں سب لڑکیوں کو بڑی تولتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا وقت ہمیں قطار کی صورت میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ ہمیں تشویش ہوئی... پھر جب ہم نے نگراں عورتوں کی سنیں تو انہیں یہی کہتے سنا نہ جانے کن پانچ خوش لڑکیوں کی قسمت پھوٹنے والی ہے۔ دوسری جا بولی۔ پانچ میں سے دو تو پکی ہیں۔ ایک دوسری شکیلہ۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ شکیلہ کے میں عابدہ کمزور دل کی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پڑے۔ وہ ایک دم ہی ہراساں نظر آنے لگی۔ شکیلہ جو کچھ بتایا تھا، اس میں شک و شبے کی کوئی گنجائش ہونے والا تھا... کب؟ یہ ابھی پتا نہیں چل میرے پاس وقت کم تھا۔ دوسری بار اگر پکڑا جاتا تو ساتھ یقیناً ان دونوں کی بھی شامت آ جاتی۔ میرے عابدہ کو اور پھر شکیلہ کو تسلی دینے کے سوا اور کیا تھا واپس لوٹ کر شوکت حسین کو یہ خبر دی۔ وہ بھی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھ سے سخت خفا ہے نے اس کی وجہ پوچھی تو وہ بے اختیار ایک گہری کر رہ گیا۔ وہ مجھ سے اس بات پر خفا تھا کہ میں اور بالے سے ابھی تک دوستانہ تعلقات استو

بکہ جڑ کا جان گیا تھا کہ اب وہ دونوں ہم میں سے تھے۔ ہم پر مسلط کیے جانے والے درندہ صفت کے آلۂ کار بن چکے تھے۔ میں نے شوکت حسین کی دور کرنے کی غرض سے کہا۔

"ان دونوں نے بھیڑیے اور عابدہ کے ساتھ بہت برا مگر اس سے بھی بڑا جرم ان کا یہی ہے کہ وہ ان لوگوں جڑ گئے ہیں جنہوں نے ہم پر عرصۂ حیات تنگ رکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر میں نے ان کے ساتھ تعلقات استوار کر رکھے ہیں تو اس میں ایک مصلحت ہے۔ کڑوی مصلحت، بالکل اسی طرح جیسے کسی بیماری کو دور کے لیے کڑوی گولی نگلی جاتی ہے۔"

"صاف اور سیدھی بات کرو شہزی!" شوکی سنجیدگی بولا۔ "کیا تم بھی ان کے ذریعے ساتھی بننا چاہتے ہو؟ تم بھی اشرف اور بالے کی طرح ہم میں سے کسی کی مخبری کرو گے..."

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم ایسی ناسمجھی والی باتیں کرو گے۔ شوکی!" میں نے بڑے دکھ کے ساتھ اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ جاری گرما گرم بحث پر ہال میں موجود اور لڑکے بھی ہمارے گرد جمع ہونے لگے تھے۔ وہ سب میری طرف کڑوی اور غصیلی نظروں سے گھور رہے تھے۔ شوکی نے بہت بے وقت یہ فضول بحث چھیڑ دی تھی۔

"اس سے اب بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔" ایک لڑکے نے کہا۔

"تم لوگ مجھے غلط سمجھ رہے ہو... ایسا نہیں ہے۔" میں نے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی۔ مگر شوکی سمیت کوئی میری بات سننے کو تیار نہ تھا۔ سب مجھے اپنا دشمن سمجھ رہے تھے۔ ان نادانوں کو کیا پتا تھا کہ میں تو خود ان سب کی اس نجات دلانے کی فکر و پریشانی میں مبتلا تھا۔ میں مگر یہ بات بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ... یہ میری ایک ہے۔

بعض جوشیلے قسم کے نوجوانوں کو مجھ پر طیش آیا اور وہ مارنے کو بھی لپکے مگر شوکت حسین نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ تاہم وہ بھی اب مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ نے میرے زخموں پر مرہم رکھا اور تشدد کے بعد میری دیکھ بھال کی تھی۔ اس کا یہ احسان میں نہیں بھول سکتا تھا مگر ذرا سی غلط فہمی کے باعث اس نے مجھے بھی ان درندہ لوگوں میں شمار کر لیا تھا۔

میں ان سے مایوس ہو کر اپنے کونے والے بستر پر جا بیٹھا۔ اب ان کا لیڈر میں نہیں شوکت حسین تھا۔ یہ لوگ اب جب بھی آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتے، مجھے خود سے دور رکھتے۔ نہ مجھ سے کوئی بات کرتے، نہ کسی گفتگو وغیرہ میں شامل کرتے۔ یہ مجھے غدار اور اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے۔ یہی حال شوکی کا بھی تھا۔ تنگ آ کر میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

جس کاروباری شخصیت نے یہاں کا دورہ کرنا تھا، اس کا نام... مجھے اشرف اور بالے کے ذریعے سیٹھ حضور (ڈانگ) معلوم ہوا تھا۔ اسے تین چار روز میں...... یہاں کا دورہ کرنا تھا۔ میں نے اشرف اور بالے سے یہ بات معلوم کرنا چاہی تھی کہ کیا ایسا ہونا ان کے "مفادات" کے خطرے کا باعث نہیں بن سکتا تھا؟ اس پر جواب دینے کے بجائے ان دونوں نے محض معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تھا۔ وہ وقت قریب آیا تو حالات نے ایک دم پلٹا کھایا۔ نہ جانے کدھر سے مزید بچے، نوجوان لڑکے لڑکیاں، گاڑیاں بھر بھر کے لائے گئے، جبکہ ہمیں یعنی پرانے لوگوں کو ایک الگ ہال کمرے میں بند کر دیا گیا۔ یہ ہال کمرا کم گودام زیادہ نظر آتا تھا۔ نہ اس کی دیواروں میں کھڑکیاں تھیں، نہ دروازے، بس ایک بڑا سا چوبی گیٹ تھا۔ اور بلند چھت کے قریب والی دیوار پر چھوٹا سا روشن دان... جہاں اندھیرا کر دیا گیا تھا۔

پھر وزٹ والے دن ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ ہونٹوں پر اسکاچ ٹیپ چپکا دیا گیا۔ ساتھ ہی ہمیں دھمکیاں بھی دی گئیں کہ کسی نے بھی کوئی غلط حرکت کی تو اس کی خیر نہ ہوگی۔ مجھے ان کی چالاکی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی

ادھیڑ عمر کی بیگم [illegible] بہت بحث کرتے
تھے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کہا "
تمہارے [illegible] جنت [illegible]
پہنچ [illegible]
"کیا؟" بیگم حیرت سے بولیں۔ "ان [illegible]
[illegible]

محمد کریم گلشن

تھی مگر اب بھی میں الجھا الجھا سا تھا۔

سارے لڑکے رسن بستہ حالت میں کونوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ تاہم میں ذرا ہمت کر کے بند دروازے کی باریک جھری سے آنکھ چپکائے سب کچھ دیکھتا رہا۔ مجھے اب باہر کا سارا ماحول ہی بدلا بدلا نظر آنے لگا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں لگائی جارہی تھیں۔ نئے آنے یا لائے جانے والے بچے، جوان لڑکیاں، لڑکے آزادی کے ساتھ باہر میدان میں گھوم پھر رہے تھے اور بہت خوش نظر آرہے تھے۔ گل خان اور اس کے حواری بھی ڈھنگ کی حالت میں تھے۔ یعنی ان کے پاس خلاف معمول کوئی اسلحہ نظر نہیں آرہا تھا اور وہ شریفانہ لباس اور شریفانہ صورتیں بنائے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ مجھے اب سب کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔ ہمیں اس لیے یہاں ذرا دھمکا کر بند کر دیا گیا تھا کہ کہیں ہم آنے والی شخصیت سے ان کے کالے کرتوتوں کی شکایت نہ کر دیں اور ان کے مکروہ چہرے بے نقاب نہ کر دیں۔

ہمارے گودام نما قید خانے کے بڑے سے چوبی گیٹ کے سامنے ہی وہ میدان تھا جہاں اسٹیج اور ڈائس وغیرہ لگانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ میں بند دروازے کے قریب ہی بیٹھا باہر کی کارروائی کا منظر دیکھتا رہتا تھا۔ امید کی جوت جاگی تھی وہ بھی اب بجھ گئی تھی۔ شوکت حسین بھی میری طرح یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے بھیانک چہرے پر کس چالاکی اور مکاری سے نہ صرف نقاب ڈالی تھی بلکہ اس کاروباری شخصیت یعنی سیٹھ منظور وڑائچ سے ایک بھاری رقم چندے کی صورت میں بھی وصول کرنے والے تھے۔

بہرحال وہ وقت بھی آگیا جب اس شخصیت نے دورہ کرنا تھا۔ اسٹیج پر صوفے اور کرسیاں لگائی جاچکی تھیں۔ مجھ سمیت چند اور لڑکے بھی میری تقلید کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح گھسٹ کر بند گیٹ کی طرف آن پہنچے۔ ان میں شوکی بھی تھا۔ میں دم سادھے اپنی آنکھ جھری سے چپکائے سامنے کا منظر دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے باہر مرکزی گیٹ تک کا بھی منظر واضح تھا۔

سب لوگ جن میں "عملے" کے لوگ بھی تھے، مہمان کے استقبال کے لیے ہاتھوں میں پھولوں کے گل دستے تھامے کھڑے تھے۔ اشرف اور بالا بھی ان میں شامل تھے۔ معاً ایک لمبی سی نئے ماڈل کی چمچماتی کار اندر داخل ہوئی۔ میری نظر کار پر تھی۔ یقیناً میری طرح یہاں موجود اور لڑکوں کی آنکھوں میں بھی حسرت سمٹ آئی تھی۔ اس بات کی کہ ہم کتنے بےبس تھے اور اپنے نجات دہندہ سے چیخ چیخ کر حالتِ زار اور یہاں پر ہونے والے مظالم کی داستان اسے سنانے سے قاصر تھے۔

کار رک گئی، باوردی ڈرائیور اُترا۔ اس نے سے دروازہ کھولا تو ایک عمر رسیدہ شخص بیش قیمت سو برآمد ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک اور سیکریٹری ٹائپ آدمی اترا تھا مگر میری نظریں اس معزز مہمان پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنی وضع قطع سے مہمان خصوصی ہی نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی یکلخت جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ میری دم بخود نظریں جس معزز مہمان سیٹھ منظور وڑائچ پر جم کر رہ گئی تھیں، جو کوئی نہیں سرمد بابا تھے۔

☆☆☆

سرمد بابا... کو پہچانتے ہی میری آنکھوں کی بے اور حسرت انتہا کو پہنچ گئی۔ فرطِ جوش سے میرا وجود بھی سر ہونے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوٹھری کے اس مض بند دروازے کو دیوانہ وار اپنے سر کی ٹکروں سے توڑ ڈالو رسن بستہ وجود کو ایک بپھری ہوئی انگڑائی لے کر جکڑ بند سے آزاد کر دوں۔ اور میں نے ایسی کوشش کرنا بھی چاہ کیونکہ اب ہم بچے کہاں رہے تھے، میں خود ایک کڑیل نوجوان کے روپ میں ابھرا تھا۔ میرے ساتھ جوان مرد بن چکے تھے۔ چاہتے تو مل کر اپنے راستے کی د توڑنے یا گرانے کی کوشش کر سکتے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا شوکت نے آنکھوں ہی آنکھوں سے میرے اندر کی بھ ہوئی بے چینی بھانپ لی تھی مگر دوسرے ہی لمحے ذاتی تجا اور فلاسفی کے باعث پروان چڑھتی شقاوت قلبی کے با فوراً اس نے میری طرف سے نظریں پھیر لیں۔

سرمد بابا المعروف سیٹھ منظور وڑائچ اب ڈائس کھڑے، خطاب کر رہے تھے۔ ان کے سامنے لاوا اور یتیم بچوں کو باقاعدہ کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔ اور سرمد اس ادارے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلا ملا رہے تھے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب یہ ادارہ محض ا جرائم پیشہ لوگوں کا اڈا بن چکا تھا۔

ایک مضبوط امید میرے اندر جاگی۔ ہاں... بابا... کو ان سے لائے جانے والے لڑکے لڑکیوں کی دکھا کر دھوکا تو دیا جا سکتا تھا مگر اس تعلق کو اس رشتے جذبے کو کس طرح دھوکا دے سکتے تھے جو میرے اور بابا کے بیچ بہت پہلے سے استوار ہو چکا تھا... مجھے یق

MARHABA
ROSE WATER
100%
FRAGRANT MOISTURIZER
& ANTI-INFLAMMATORY
MARHABA
ROSE WATER
MARHABA
Marhaba Laboratories
UAN 111 152 152
www.marhaba.com.pk

اچھی طرح سے کہ سرمد بابا نے مجھے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر رکھا تھا۔ یہ بات ننگل خان اور اس کے ساتھی حواریوں کے سان وگمان میں بھی نہ تھی کہ سیٹھ منظور وڑائچ یعنی سرمد بابا اور میرے بیچ کیا رشتہ تھا۔ بے شک سرمد بابا نے یہاں اپنے بڑھاپے کے چند سال بتائے مگر ان چند سالوں میں انہوں نے مجھے برسوں کا مان دیا تھا۔

میں اب حیرانی سے جھری کے پار ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد وہ جہاں بھی رہے تھے اب تک یقیناً اچھے ساتھیوں اور اچھے ماحول میں رہے ہوں گے۔ جبھی اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی صحت ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھی۔ وہ زندہ دل انسان تھے۔ یقیناً پہلے کے مقابلے میں اب انہیں جسمانی اور ذہنی آرام و خوشی نصیب ہوتی رہی تھی۔

سرمد بابا یعنی سیٹھ منظور وڑائچ یہی ان کا اصل نام رہا ہوگا۔ وہ تقریر کرنے کے دوران مائیک پر کہہ رہے تھے۔ ”شاید بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہوں گے کہ میں نے بھی ماضی قریب کے چند سال یہاں گزارے ہیں مگر میں دیکھ رہا ہوں ان چند سالوں میں محلے کے پرانے لوگ نظر نہیں آ رہے۔ خیر... جو ہیں میں انہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ وہ ماسی صاحب کے انتقال کے باوجود اس ادارے کا نظم و نسق بہ احسن و خوبی درست خطوط پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔“ ننگل خان وغیرہ نے بھی باری باری مختصراً خطاب کیا۔ اس کے بعد سرمد بابا کو وزٹ کرانے کے لیے ادارے کے مختلف پورشن میں لے گئے۔ اپنے خطاب کے آخر میں انہوں نے ادارے کو اپنی جانب سے ایک خطیر رقم کا چیک بطور چندہ بھی دیا تھا۔

سرمد بابا میری نظروں سے غائب ہو گئے تھے اور ایک بار پھر مایوسیوں کے اندھیرے میرے اندر کالے بادلوں کی طرح چھانے لگے۔ مجھے سرمد بابا سے پوری امید تھی کہ وہ اپنے خطاب کے دوران میرا ذکر ضرور کریں گے۔ وہ یہاں کے مکینوں کو جب مجھے ان سے ملانے کا کہیں گے تو ان کے پیروں تلے زمین سرک جائے گی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ”کیا سرمد بابا مجھے بھول گئے تھے؟“ ایک تکلیف دہ خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

کافی دیر بعد میں نے سرمد بابا کو کچھ لوگوں کی معیت میں دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا اور اس بار وہاں بارعب چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ وہ اسٹیج پر رکھے صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔ ان کا سیکریٹری ننگل خان سے کچھ باتیں کر رہا تھا اور ننگل خان کا انداز کسی بے دام طرح تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے آخر میں سرمد با جھک کر کچھ کہا اور اسٹیج سے نیچے اتر آیا۔ پھر میں ہی دروازے سے پاس آ رہا آنکھیں چپکائے ہوئے دیکھ بھی بری طرح ٹھٹک گئے۔ پھر یک بیک کھلبلی چالی بھر گئی۔ مگر بندوں کے باعث ہم سب جتنی تیزی ساتھ رینگ رینگ کر دروازے سے دور ہو سکتے تھے رہے کیونکہ اسٹیج سے اترنے کے بعد ننگل خان کا رخ گودام کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دھڑ سے دروازہ ننگل خان اندر داخل ہوا۔ چہرے پر خوشگواری لوٹ آئی تھی پھر اس کی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ وہ طرف لپکا۔ ذرا ہی دیر بعد اس کے تین حواری بھی داخل ہوئے۔ ان میں سے دو اشرف اور بالا تھے۔

”تم... شہزاد احمد خان میری بات غور سے سنو تک کی ساری صورت حال تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی لیے میں کچھ بات نہیں کروں گا۔ سیٹھ صاحب تمہیں ہیں۔ کیا کہتے ہو تم؟“ ننگل خان نے کھردرے اور لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ مگر میں نا سمجھی میں ایکٹنگ کرنے لگا۔ ”تم سمجھاؤ اسے اچھی طرح۔“ خان نے مجھے الجھن میں مبتلا دیکھ کر جھنجھلاتے انداز میں اور بالے سے کہا تو وہ دونوں فوراً حکم کے غلام جیسے جانب بڑھے۔ سب سے پہلے بالا مجھ سے بولا۔

”سنو شہزادے! یہی وقت ہے تمہاری استادی کے ساتھ وفاداری دکھانے کا۔ ہمیں بھی یہ حقیقت کہ سیٹھ منظور سرمد بابا کے نام سے یہاں چند سال تھے اور تمہاری ان سے بہت قرابت داری تھی۔ اب خود ہی کہ تمہارے سلسلے میں انہیں مطمئن کیا جا سکے تو یہاں سے اشرف نے بات اچک لی اور مجھ سے

”ہم نے تمہارے سلسلے میں سرمد بابا کو کہ تم یہاں سے جا چکے ہو۔ مگر چونکہ ہم یہ کہہ کر چھڑا سکے تھے کہ تم بھاگ گئے ہو۔ اس طرح ان کی میں ادارے کی نیک نامی ساکھ خراب ہو سکتی انہیں یہ یاد کرانا پڑا کہ تم اب ادارے سے نکل جگہ نوکری کر رہے ہو۔ اور اپنی زندگی سے خوش بابا بضد ہیں کہ اگر تم جا چکے تھے تو اس کا ریکارڈ چاہیے تھا سو ہمیں اس سلسلے میں انہیں اثبات دینا پڑا۔ اب ہم تمہیں خاموشی اور آزادی کے سے باہر نکال رہے ہیں۔ اس کے بعد تمہیں کا

مین گیٹ سے اندر لے جایا جائے گا۔ اور سرمد بابا سے ملوا کر ان کی تسلی کروا دی جائے گی لیکن تم نے انہیں وہی کچھ کہنا ہوگا جو تمہیں پہلے سے بتایا گیا ہے۔“

”اور یاد رکھنا اگر تم نے ذرا بھی چالاکی کرنے یا ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تو بھیانک انجام تو تمہارا مقدر ہوگا ہی مگر اس سے پہلے تمہاری معشوقہ کا حشر برا کر کے رکھ دیں گے۔“ آخر میں ننگل خان نے بڑے بھیانک لہجے میں مجھے تنبیہ بھی کر دی۔

میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ”شہزادے... یہی وقت ہے دانائی جنگ لڑنے کا۔ وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اور قوت فیصلہ بھی۔ آگے تمہاری قسمت۔“

میں نے فوراً ہامی بھرتے ہوئے ننگل خان سے کہا۔ ”استاد! تم تو مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ اب تک اشرف اور بالے کی طرح میں بھی تمہاری وفاداری کا دم بھرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر افسوس اب تک مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ مگر اب میں اس سنہری موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔“

”کیا کہا تھا میں استاد!“ دفعتاً اشرف نے ننگل خان سے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”یہ ہماری بات مان جائے گا۔“

”ہاں، ویسے بھی اس کے پاس ہماری بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ ننگل خان نے طاقت کے زعم اور پُرغرور لہجے میں کہا۔ مجھے تھوڑی سی مایوسی تو ہوئی، تاہم ناامید نہ ہوا۔

یہ سب باتیں مجھے ایک کمرے میں لے جانے کے بعد [illegible] ہوئی تھیں۔ جبکہ باقی لڑکوں کو مجھ سے دور [illegible] دیا تھا۔ اب وہ سب [illegible] رہے کہ میں اپنی آزادی کی خاطر ان کے ساتھ کوئی خفیہ قسم کی سازباز کر رہا ہوں۔

مجھے نہایت ہوشیاری اور راز داری کے ساتھ گودام سے باہر نکالا گیا۔ ظاہر ہے اب میرے ہاتھ پاؤں آزاد کر دیے گئے تھے۔ سامنے اسٹیج تھا اس لیے اب درمیان میں ایک اور قنات کھڑی کر کے دیوار سی بنا دی گئی تھی۔ یہ کام ننگل خان کے حواری پہلے ہی کر چکے تھے۔

مجھے ایک نسبتاً بہتر کمرے میں لایا گیا۔ یہاں میں کپڑے تبدیل کر کے جتنی جلدی تیار ہو سکتا تھا، ہو کے دوسرے سے باہر آ گیا۔ میرے ہمراہ خود ننگل خان اور کے حواری بھی تھے۔ پھر ان کا ایک حواری کار لے آیا۔ میں سوار کیا گیا۔ اور کار گھما کر مین گیٹ کے سامنے مجھے عزت و احترام کے ساتھ اندر لایا گیا۔ اسٹیج کے

[illegible] نوجوان سے [illegible]
[illegible] بولا۔
اے اللہ! تیری صورت میرے مرحوم شوہر
سے کتنی مشابہ ہے۔ جھک کر اس نے نوجوان کو [illegible]
[illegible]
پھر دیر کے بعد جب نوجوان نے اپنا جیب کا ہاتھ ڈالا تو
بٹوہ غائب تھا۔

[illegible]

سامنے کار روک دی گئی۔ مجھے اتارا گیا اور پھر میں اس اسٹیج کے عقب سے گزرتا ہوا اوپر سرمد بابا کے پاس جا پہنچا۔ بابا نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگانے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے اور میں جیسے ان کے بازوؤں میں بھر گیا۔ میری آنکھیں بھی بھر آئیں۔ میں نے دیکھا سرمد بابا کی بوڑھی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئی تھیں۔ سرمد بابا سے بظاہر میرا کوئی خون کا رشتہ نہ تھا۔ مگر انسان کے قابل احترام جذبات کو محض انسانی رشتوں ناتوں میں نہیں تولا جاتا۔

سرمد بابا نے بھی مجھے اپنی ہی اولاد کی طرح خود سے بھینچ لیا تھا۔ انہیں بہت سی باتیں کرنا تھیں مگر وقت نہیں تھا۔ ننگل خان نے کچھ ہدایتیں مجھے بعد میں کار میں سوار ہوتے وقت بھی دی تھیں۔

سرمد بابا کو میں نے وہی کچھ بتایا جو مجھ سے کہا گیا تھا اور انہیں میرے بارے میں جیسا بتایا گیا تھا... جبکہ میرے استفسار کرنے کے باوجود بابا نے اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا کہ ان کی اچانک کس طرح کایا کلپ ہو گئی تھی۔ نیز وہ مہربان عورت کون تھی جو ایک دن ان کا سہارا بنی اور انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ بابا مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے پھر کسی وقت کا کہہ کر ٹال دیا۔ انہوں نے مجھے اپنا سیل فون نمبر لکھ کر دیا۔ وہ میں نے ذہن نشین کر لیا۔ اس دوران میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بابا سے مدد کا کہہ سکوں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ ننگل خان، اس کے حواری اور بطور خاص اشرف اور بالا کی ”گدھ“ نظریں نہ صرف میری ایک ایک حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں، بلکہ وہ میری آواز کا بھی دھیان رکھے ہوئے تھے کہ میں سرمد بابا سے ایک ذرا سرگوشی بھی نہ

کرسکوں۔ یہ کیسی بےبسی تھی۔ بابا۔۔۔ میرے ہی تھی یہاں تو ہم سب بدنصیبوں کے لیے نجات دہندہ بن گئے تھے میں انہیں ایک لفظ تک بھی مدد کے لیے نہ کہہ سکا۔

یوں بھی اگر تھوڑا بہت ہی چاہتا، تو ان بگھیاریا صفت لوگوں سے خیر کی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ بہرحال مرد بابا کا دیا ہوا سیل فون نمبر میرے لیے امید کی ایک کرن ضرور تھا جسے میں نے فوراً اور اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا، اور میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ مرد بابا کے رخصت ہوتے ہی مجھ سے وہ کاغذ چھین لیا گیا تھا جس پہ ان کا سیل۔۔۔ نمبر درج تھا۔

☆ ☆ ☆

اس اہم ترین مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی میں اب تک کنگل خان پر اپنا اعتماد اور (مجبوری) وفاداری نہیں جتا سکا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک بار یہاں سے فرار کی کوشش کرچکا تھا۔ گویا مجھے اب بھی قیدیوں کی طرح ہی بیگار پر رکھا جارہا تھا۔ میرے ہم جولیوں نے اگرچہ مجھ سے بات چیت ترک کررکھی تھی۔ اور مجھے ہر وقت ان کی چبھتی ہوئی نظروں کا سامنا رہتا تھا۔ مگر اس روز شوکت عرف شوکی مجھ سے بات کیے بنا نہ رہ سکا۔ ایک زہر آلود اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔

"اب کون سی نئی ساز باز کررہے ہو ان لوگوں کے ساتھ؟"

"میں کوئی ساز باز نہیں کررہا۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ میں اس وقت اپنے بستر پر بیٹھا تھا۔ شوکت حسین نے میرے بیڈ کی پائنتی پر ایک پاؤں ٹکادیا تھا اور بڑے استغنا کے ساتھ بات کررہا تھا۔ یہ لوہے کی پائپوں والے اسپرنگ کے بیڈ تھے۔

"اچھا؟" وہ بدستور طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کوئی تو نئی کھچڑی تم ان کے ساتھ مل کر پکا ہی رہے ہو۔ کہاں لے کر گئے تھے تمہیں یہ لوگ اس دن؟"

"تم سے مطلب؟" اس کے مستقل طنزیہ اور روکھے لہجے نے۔۔۔ بالآخر میرے خون کو بھی گرما دیا تھا۔ "اچھا اب تم اپنی ٹانگ ہٹاؤ میرے بیڈ پر سے بستر کی چادر میلی ہورہی ہے۔"

شوکت اپنا پاؤں ہٹانے کے بجائے انتہائی بے دردی سے اپنے جوتے کو میرے بستر کی چادر سے صاف کرنے لگا اور انتہائی نفرت آمیز لہجے میں۔۔۔۔ بولا۔ "جن کا ضمیر ہی میلا ہوا نہیں بھلا چادر کے میلے ہونے کا کیا غم ہوسکتا ہے۔"

"شوکی! میں کہہ رہا ہوں میرے بستر سے اپنا پاؤں ہٹاؤ۔" اس بار میرے اندر لاوا کھولنے لگا تھا اور میں نے خوب چبا چبا کر یہ الفاظ ادا کیے۔۔۔۔ میری نظریں اس کے چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔ اس نے پھر بھی اپنا پاؤں نہیں ہٹایا تو۔۔۔ جیسے میرے اندر غیظ و غضب کی آگ سی بھڑک اٹھی۔ میں اس سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے بدستور طنزیہ اور تضحیک آمیز رویے نے مجھے اس سے لڑنے پر مجبور کر ہی دیا۔ میں بیڈ پر بیٹھے بیٹھے حرکت میں آیا اور ایک زوردار ٹانگ کی ٹھوکر اس کی ٹانگ پر رسید کردی، جو میرے بیڈ پر ٹکی ہوئی تھی۔ نتیجتاً شوکی کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ وہ لڑنے پر اتر آیا تو میں بھی بستر سے اٹھ کر اس کے مدمقابل آن کھڑا ہوا۔ صحت میں وہ مجھ سے کچھ زیادہ تھا البتہ قد میں مجھ سے مار کھا جاتا تھا۔ اپنے لیڈر کے ساتھ مجھے جھگڑتے دیکھ کر باقی لڑکے جو مجھ پہ پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھے تھے، مشتعل جتھے کی صورت میں میری طرف لپکے تو شوکی نے فوراً ایک ہاتھ کے اشارے سے ان کی میری طرف بڑھتی پیش قدمی کو روک دیا۔

"اس ضمیر فروش بزدل آدمی کے لیے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔" اس کے ان الفاظ نے میرے تن بدن میں آگ لگادی اور پھر میں اس پہ دیوانہ وار جھپٹ پڑا۔

میرے ایک ہاتھ کا گھونسا اس کے چہرے پہ پڑا۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، وہ اپنے حلق سے کراہ آمیز آواز نکالتا ہوا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خون کی سرخی نمودار ہوئی۔ اور وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پہ لپکا۔ اور اپنے جسم کی ٹھوکر لگائی، شکر تھا کہ میرے عقب میں بستر تھا۔ میں اس پہ پشت کے بل جا گرا۔ وہ مجھ پہ کودا تو جب تک میں اپنی دونوں ٹانگیں اوپر اٹھا چکا تھا۔ شوکت حسین میری ٹانگوں سے ٹکرایا تو میں نے اسے پرے اچھال دیا۔

دوبدو لڑائی یا ہاتھا پائی میں یہ بات فطری ہوتی ہے کہ انسان لڑائی بھڑائی کا ماہر نہ بھی ہو مگر اپنے دفاع اور چوٹ کھانے پر اپنے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہی ہے۔ یہی حال میرا تھا۔ میں بھی کوئی ماہر جنگجو نہ تھا تاہم میری فطرت میں قدرتی طور پر ایک ٹھہراؤ اور ہوش مندی کا رنگ زیادہ تھا۔ ایسی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں جنہیں غصہ بہت کم آتا ہے مگر جب آتا ہے تو پھر اس کی انتہا بھی دیکھنے کی ہوتی ہے۔ قدرت نے میری فطرت میں یہ دونوں خوبیاں رکھی تھیں۔ اپنے دونوں ہی پیروں سے شوکی کو میں نے اچھالا تو وہ

سیدھا اپنے ساتھیوں کے قدموں تلے جاگرا۔ میں بستر سے اتر کر کھڑا ہوگیا۔ شوکی کا چہرہ طیش سے سرخ ہورہا تھا۔ یہی حالت اس کے ہم خیال لڑکوں کی بھی تھی۔ شوکت اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور جارحانہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہوش میں آؤ شوکی! میں لڑائی سے ڈرتا نہیں ہوں لیکن ہمارے بیچ لڑائی مناسب نہیں۔"

مگر وہ پھر مجھ پر جھپٹا اور میرے گریبان پہ ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ ہم دونوں اپنے وجود کا زور لگا کر ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم کوئی ماہر لڑاکا نہ تھے۔ یہ خالصتاً "دیسی مارکہ" لڑائی تھی۔ مگر جب میں نے شوکی کو دوبارہ زک پہنچائی تو میرے اندر ایک ولولہ جاگا۔ ایسا ولولہ جو لڑنے والے کو خود اعتمادی بخشتا ہے۔ شوکی نے مجھے اڑنگا لگانے کی کوشش کی، اس میں وہ کامیاب بھی رہا کیونکہ میں گرنے کے انداز میں لڑکھڑا گیا۔ مگر جانے یہ میری عقل مندی تھی یا پھر عام سی لڑائی میں اپنا دفاع کرنے کا فطری انداز تھا کہ میں نے اس کا گریبان نہ چھوڑا تھا، نتیجتاً شوکی بھی میرے ساتھ گرا تو میرے بجائے وہ زد میں آگیا۔ وہ زمین پہ جا پڑا۔ میں اس کے اوپر تھا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ پختہ فرش سے ٹکرایا نتیجتاً اسے چکر آگئے ہوں گے۔ میں نے اس کے سینے پر سوار ہو کے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی۔ اب دیگر لڑکوں سے میرے ہاتھوں اپنے لیڈر کی پٹائی نہیں دیکھی گئی۔ وہ شور مچاتے ہوئے بیک وقت مجھ پر پل پڑے۔ میں اتنے ساروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ سب غصے اور جنون میں بھرے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ میں حلق کے بل چیخنے لگا تو میری چیخ و پکار سے کئی حواری ہاتھوں میں ہنٹر تھامے یک لخت اندر داخل ہوئے۔ ان میں بالا اور اشرف بھی تھے۔ ہنٹر مار مار کر انہوں نے مجھے لڑکوں سے چھڑایا۔ میں نیم بے ہوش سا ہوگیا تھا۔ اشرف اور بالے نے مجھے سنبھالا دیا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ لوگ اس شبے پر مجھے مار رہے تھے کہ میں تم لوگوں کا ساتھی اور مخبر ہوں۔" میں نے ہانپتے ہوئے انہیں بتایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ تنہا ایک بہتر کمرے میں لاکر مجھے بستر پر لٹادیا گیا۔ وہاں استاد کنگل خان موجود تھا۔ بالے اور اشرف نے میری طرف داری میں ساری بات سمجھائی۔ شاید اب کنگل خان مجھ سے کچھ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ مجھے چند دن اس کمرے میں رہنے دیا۔ اچھا کھانا پینا اور دیکھ بھال کی گئی۔ مجھے ان دنوں بیگار پر بھی نہیں لے جایا گیا۔ پھر اشرف اور بالا نے آکر مجھے بتایا کہ استاد کنگل خان تم سے خوش ہے۔ اب تم بھی ہم دونوں کے ساتھ کام کروگے۔ میں نے پہلے تو دل ہی دل میں کنگل خان پھر بالا اور اشرف پہ لعنت بھیجی اور بظاہر خوشی سے بولا۔

"تم دونوں نے دوستی کا حق ادا کردیا۔ میں خوش ہوں تمہارے ساتھ رہ کر۔" لیکن بالا اور اشرف نے واضح لفظوں میں مجھے یہ بھی بتادیا کہ ابھی ان کی۔۔۔ اصل حیثیت ویسی نہیں ہوئی تھی جیسی کنگل خان کے اپنے حواریوں کی تھی بلکہ بالا اور اشرف خود ابھی تک کنگل خان کے حواریوں کے تابع تھے۔ اور انہیں یعنی بالا اور اشرف کو ویسی آزادی بھی نہ تھی کہ وہ بغیر کسی کو بتائے عمارت کی اس چاردیواری سے باہر قدم بھی رکھیں۔ ویسے ان کی باتیں سن کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی تھی تاہم میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ مجھے کم از کم بیگار کرنے اور اس ہال کمرے سے آزادی مل گئی تھی۔ میں چاردیواری کے اندر کسی حد تک آزاد گھومتا پھرتا تھا۔ تاہم اندر کے چھوٹے موٹے کام نمٹانا بھی میری ذمے داری میں تھا۔ یہاں پر کھانا پکانے بنانے اور صفائی کرنے والے بھی کنگل خان کے اپنے ہی آدمی تھے، مگر اب یہ کام ہم تینوں کو کرنا پڑتے تھے۔ میں اس میں بھی خوش تھا۔ ہم تینوں کو رہنے اور سونے کے لیے ایک ہی بڑا کمرا دیا گیا تھا۔ اچھی سہولت کی ہر شے موجود تھی۔ سگریٹ وغیرہ تو میں نہیں پیتا تھا۔ اب ہمارا کام بیگار پر لڑکوں اور بچوں کی نگرانی کرنا بھی ہوتا اور ساتھ ساتھ حواریوں کو پانی پلانے کا کام بھی ہمارے ذمے ہوتا۔ ظاہر ہے جاں گسل بیگار کاٹنے سے یہ کام قدرے بہتر تھا۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ اشرف اور بالا کی باتیں غلط نہیں۔ ہمیں واقعی ابھی وہ حیثیت حاصل نہ تھی جو کنگل خان کے حواریوں کو تھی۔ خیر۔۔۔ سردست میرے لیے یہ بھی بہت تھا کہ چاردیواری کے اندر کسی حد تک ہاتھ پاؤں ہلانے کی تو آزادی تھی۔ اس دوران میں نے عابدہ سے بھی ایک بار ملنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں چھپتے چھپاتے کوٹھری کے نزدیک پہنچا تو مجھے دیگر لڑکیوں کی جھلک دکھائی دی۔ ایک سانولی سی لڑکی کو رازداری سے پاس بلا کر میں نے دھڑکتے دل سے عابدہ کے بارے میں پوچھا تو ایک سنسنی خیز اور دل ہلا دینے والا انکشاف سامنے آیا۔ یہ ثریا تھی، وہ بولی۔ "شہزاد بھائی! عابدہ سمیت پانچ لڑکیوں کو راتوں رات غائب کردیا گیا ہے۔"

"[illegible] کیا؟" یہ سن کر میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ "یہ... یہ... کیا کہہ رہی ہو تم؟ کب... کب ہوا یہ سب...؟" میں نے آفت زدہ لہجے میں پوچھا۔

"کل رات کی بات ہے۔" وہ بتانے لگی۔ "ہم سب سو رہے تھے کہ اچانک شور کی آواز سے سب سے پہلے میری ہی آنکھ کھلی تھی۔ وہ عورتیں اور تین [illegible] مردوں کے ساتھ اندر داخل ہوئی تھیں انہوں نے شاید پہلے ہی سے پانچ لڑکیوں کا انتخاب کر رکھا تھا۔ ہم سب خوف زدہ تھے۔ ہمیں دھمکا کر خاموش رہنے اور اپنے اپنے بستروں پر پڑے رہنے کا حکم دیا گیا۔ پھر ہم میں سے پانچ بدنصیب لڑکیوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ کھینچ کر وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے۔"

"کدھر لے جا رہے تھے وہ انہیں؟" میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ "ہم نہیں جانتے۔ لیکن اندازہ ہے ان لڑکیوں کو کوئی لینے کے لیے آیا تھا۔ اور...... اور......" ثریا کا دل ڈوب گیا۔ اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر وہ رو پڑی۔ شاید اسے اپنا انجام بھی ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔ میں اسے کھوکھلی تسلی ہی دے سکتا تھا۔ ثریا نے ملنے کے بعد مجھے عابدہ سمیت لڑکیوں کے نام بھی بتائے تھے، شکیلہ بھی ان میں شامل تھی۔ یہ شوکت حسین عرف شوکی کی منظورِ نظر تھی۔ ثریا روہانسی ہو کر مجھ سے بولی۔ "شہزی بھائی! تم کچھ کرو نا... عابدہ اور شکیلہ نے تو تمہارے حلیے میں ہمیں بڑی تسلی دے رکھی تھی کہ تم... اور شوکت بھائی (شوکی) مل کر ہم سب کو یہاں سے نکالنے کا عزم کیے ہوئے ہو۔"

اس کی بات سن کر میرے دل پر گھونسا لگا۔ ان بے چاریوں نے مجھے جانے کیا سمجھ لیا تھا۔ سچ کہا ہے کسی نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا... میں بھی تو تنکا ہی تھا ان کے لیے... کیونکہ میں ایک بار عابدہ کے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اگر میں اور عابدہ اس رات منحوس چار دیواری سے نکل جانے میں کامیاب ہو جاتے تو ان سب کے لیے بھی کچھ کر سکتے تھے۔ ابھی میں روتی دھوتی ثریا سے تسلی آمیز جملے کہنا ہی چاہتا تھا کہ ایک زوردار بھاری ہاتھ میری گدی پر پڑا۔ میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ ثریا چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ وہ ایک ہٹا کٹا حواری تھا جس نے مجھے ثریا سے باتیں کرتے بھانپ لیا تھا۔ اس نے مجھے اسی طرح گردن سے پکڑ کے گل خان کے سامنے پیش کر دیا۔ وہاں اشرف اور بالا بھی موجود تھے گر ان کے بشروں پر سرد مہری طاری تھی جبکہ گل خان میری طرف... خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا... پھر اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

"کیوں بے لنڈے! ادھر کوٹھڑی میں کس سے ملنے گیا تھا؟ تیری معشوقہ تو اب گئی تیرے سے دور... پتا چل گیا تجھے یا نہیں۔"

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "استاد! میری معشوقہ تو اسی دن سے ہی مجھ سے ناراض ہو گئی تھی جب میں نے اسے فرار کرانے کے لالچ میں اس کے ساتھ یاری لگائی تھی۔ اب ایک لڑکی پھنسائی ہے۔"

"ہوں۔" میری بات سن کر گل خان کے مکروہ حلق سے ہنکارا ابھرا۔ میں نے کوشش چاہی تھی کہ کسی طرح اس مردود کو میرے اور عابدہ کے درمیان تعلق خاطر کی بھنک نہ پڑے، لیکن میں اشرف اور بالا کی طرف سے کچھ خائف تھا کیونکہ یہ دونوں خبیث عابدہ کے میرے ساتھ تعلق کی سنجیدگی سے بخوبی واقف تھے۔

"بڑی کلول بازیاں کرتا ہے لڑکیوں کے ساتھ۔" گل خان ہنسا۔ میں خوش تھا۔ وہ میرے جھانسے میں آ رہا تھا ورنہ مجھے ڈر تھا کہیں اس جرم میں مجھ سے یہ قلیل آزادی بھی نہ چھین لی جائے مگر دوسرے ہی لمحے گل خان کا بھاری ہاتھ حرکت میں آیا اور "چٹاخ" کی زوردار آواز کمرے میں گونج گئی۔ میرے بائیں گال پر گل خان کے بھاری تھپڑ کا نشان چھپ گیا تھا۔

"خبردار! جو آئندہ کوٹھڑی کی طرف بھی گیا... ورنہ چیر کر رکھ دوں گا تجھے۔" وہ وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔

"معاف کر دو استاد! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" اپنے اندر کے غبار پر قابو پاتے ہوئے میں نے اس کی منت کی۔

پھر وہ قریب کھڑے اشرف اور بالے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے تحکمانہ بولا۔ "سنبھالو اپنے لنڈے کو... اسے میں نے تم دونوں کی سفارش پر باہر نکالا تھا اب اگر اس نے دوبارہ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو اس کے ساتھ تم دونوں کی بھی خیر نہیں ہوگی۔"

اشرف اور بالا مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آئے اور غصے سے مجھے بستر پر پٹخ دیا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ یہ کیا کر رہے تھے تم۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گے۔" اشرف نے تیکھے لہجے میں کہا۔

بالے نے بھی کچھ برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "

ں شہزی، اب اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو دوبارہ قیدی بنا دیا جائے گا سمجھے تم۔"

"یار! ہم آزاد کب ہیں؟" میں نے بستر پر سنبھل کر ہوئے تلخ لہجے میں کہا... اب مجھے اپنے فرار پر مشکل ہو گیا تھا اور میں باقاعدہ پھٹ پڑا تھا۔ "یہ بھی زندگی ہے تمہاری؟ جو قید سے بھی بدتر ہے۔ یہ غلامی کی ی ہے۔ کیا تم دونوں کے ضمیر مردہ ہو گئے ہیں؟ یہاں معصوم لوگ قیدی بنا لیے گئے اور پھر روز ان کے ساتھ وروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ تمہیں ان وموں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا؟ اللہ سے ڈرو۔ وہ ہے اور تمہارے جیسے ضمیر فروشوں کی رسی دراز ضرور کرتا ہے مگر ڈھیل نہیں کرتا۔ جب کھینچتا ہے تو پھر کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ وقت کے آنے سے پہلے تم دونوں سنبھل جاؤ اور میرا ساتھ دو۔ یہاں معصوم جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ جن کی پاک ی نہ کر وہ شیطان لوگ کھلونا بنا کر کھیلتے ہیں۔ ان کا ساتھ دینے پر یہ گناہ بھی تمہارے سر جائے گا۔ تم بھی ان کے بار کے شریک گناہ ٹھہرائے جاؤ گے۔ خدا کے لیے ہوش کے ناخن لو۔ اور مجھے بتاؤ کل رات ان پانچ معصوم جوان لڑکیوں کو کہاں لے جایا گیا ہے جن میں عابدہ بھی شامل تھی۔" میں کہتے کہتے ہانپ گیا۔ وہ دونوں بغور میرے چہرے پر نظریں جمائے..... کھڑے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد اشرف میری طرف چند قدم بڑھا اور ایک ٹانگ بستر پر رکھ کر ذرا آگے جھک کر مجھ سے بولا۔

"تم کس ضمیر نام کی چڑیا کی بات کر رہے ہو شہزی! پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کا ضمیر کہاں سو گیا تھا جو ہمیں جنم دینے کے بعد یہاں پھینک گئے تھے۔ تم بھی تو تھے، تمہارا اپنا سگا باپ تمہیں یہاں چھوڑ گیا تھا۔ ہمیں یاد ہے تم ے جب نئے آتے تھے تو کس طرح گڑگڑا کے آنسو بہایا کرتے تھے۔ پھر اس نے آنا بھی چھوڑ دیا۔ یہ دنیا صرف اپنے اپنے مفادات کو عزیز رکھنے کا ٹھکانا ہے۔ رہی بات آزادی کی تو ہم اب بھی آزاد ہیں۔ کھلا کھاتے پیتے ہیں۔ موج کرتے ہیں۔ تھوڑے دنوں بعد ہمیں باہر کی آزادی سے آنے جانے دیا جائے گا۔"

اشرف نے اپنی بات پوری کی..... تو بالا بھی میری طرف بڑھا۔ اور بولا۔ "عابدہ کو بھول جاؤ، ہوش کے ناخن لو۔ [illegible] گم کر دیں۔ تم نہیں جانتے یہ لوگ کس قدر طاقت ور ہیں اور کیسی طاقت ہے عیش و آرام کی زندگی کی ضمانت ہے۔ تمہیں بھی ہمارا یہی مشورہ ہے کہ بے وقوفی کی روش چھوڑ دو۔ ان کے ساتھ نباہ کر لو، پھر دیکھو تم کس طرح عیش اور مزے کرو گے۔"

ان دونوں کی باتوں پر مجھے ازحد افسوس ہوا، تب مجھے اندازہ ہوا کہ ان کے ضمیر مردہ ہو چکے ہیں۔ عارضی عیش و آرام نے ان کو بے حس بنا دیا تھا، ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو زنگ لگا دیا تھا۔ انہیں مزید سمجھانا بے کار تھا۔ اس لیے میں نے بھی چپ سادھ لی مگر وہ دونوں خاموش نہیں ہوئے۔ اشرف بولا۔ "دیکھو شہزی! اگر تمہارے یہی خیالات ہیں تو کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے ہم سے جدا ہو جاؤ۔ بے شک ہم بچپن سے جوانی تک ساتھ رہے ہیں مگر اب حالات مختلف ہیں۔ اب ہمارے بیچ مفادات کی جنگ چھڑ گئی ہے۔ ہم تمہیں صاف صاف یہ بات بتا دینا چاہتے ہیں کہ اگر تم نے ذرا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو استاد گل یا ان کے حواریوں سے پہلے ہم دونوں تمہیں کڑی سزا سے دوچار کر دیں گے۔ ورنہ تمہاری وجہ سے ہمیں ان لوگوں کا عتاب سہنا پڑے گا۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اسے بھی تم ہمارا خود پر بہت بڑا احسان سمجھو کہ تمہیں پہلے سے آگاہ

Alternative & Integrated medicine
B2C Online
[illegible]

کر رہے ہیں۔"

اس کی بات پر میں نے نفرت سے دونوں کی طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"خدا کے لیے... مجھے عابدہ کے بارے میں بتادو... اسے کدھر لے جایا گیا ہے۔"

"ہمیں نہیں معلوم..." بالا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "اگر پتا ہوتا بھی تو ہم تمہیں کیوں بتاتے۔" اس کے بعد کمرے سے جاتے جاتے آخر میں بالے نے کہا۔ "اب تمہیں بھی اپنی نگرانی میں رکھنا پڑے گا۔" پھر دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

دونوں جاتے جاتے باہر سے کمرا بند کر گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کمرے سے باہر نکلنا چاہا تو وہ باہر سے بند پایا۔ میں دوبارہ اپنے بیڈ پر آبیٹھا۔ عابدہ کی طرف سے مجھے شدید بے چینی اور تشویش ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں ان خبیث شیطانوں نے عابدہ سمیت ان پانچوں لڑکیوں کا کیا حشر کیا تھا؟ مجھے سخت پچھتاوا سا ہونے لگا کہ میں اس سے پہلے کچھ نہ کرسکا اور اب بھی کیا کر رہا تھا۔ کیا تھا میرے بس میں...؟

میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہونے لگیں۔ میرے اندر خطرناک و جارحانہ جذبات ابھرنے لگے۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب میرے پاس وقت کم رہ گیا تھا کہ میں کسی موقع کا انتظار کروں یا کسی چال کو بروئے کار لاسکوں۔ یہ لوگ میری سوچ سے بھی زیادہ مکار، ہوشیار اور چالاک ثابت ہوئے تھے۔ یہی وقت تھا کچھ کرنے کا۔ فیصلہ کن عملی قدم اٹھانے کا۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا تھا۔

کھڑکی سے باہر شام اتر رہی تھی اور میری بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں اس طرح ٹہلنے لگا جیسے سب کچھ میرے حکم کے ایک اشارے پر منتظر ہو مگر میں تو خود حکم کا غلام تھا۔

جب باہر شام گہری ہونے لگی تو اشرف اندر داخل ہوا... بالا اس کے ہمراہ نہیں تھا مگر میں اشرف کو دیکھ کر چونک پڑا۔ کیونکہ میں نے آج پہلی بار اس کے ہاتھ میں ایک کلاشنکوف رائفل دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ مسرور سا نظر آرہا تھا۔ وہ بار بار گن پر یوں ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے وہ اس کا کوئی بہت ہی پالتو جانور ہو۔

"یہ گن کہاں سے لی تم نے؟" میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس سے پوچھا۔ وہ اس وقت خوشی کے نشے چور تھا، بولا۔ "استاد نے دی ہے۔ یہ اب میری ہے۔ یہ پہلا موقع ہوگا کہ آج رات استاد مجھے اپنے ایک خاص مہم پر لے جارہا ہے۔" فخر و انبساط سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں مہم والی بات پر چونکے بنا نہ اور پوچھ بیٹھا۔

"مہم؟ کیسی مہم؟"

"تم سے مطلب؟ اپنے کام سے کام رکھو تم یکدم سنبھل گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ پھر گن ایک دیوار سے لگا کر رکھ دی۔ میں نے اس کی تعریف ہوئے کہا۔

"واہ... میرے یار! لگتا ہے تمہاری خوب لاٹ گئی ہے مگر تمہیں تو یہ گن چلانی نہیں آتی۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ مجھے گن نہیں آتی۔" وہ میری طرف گھور کر بولا۔ "یہ کلاشنکوف ہے سے خطرناک گن مگر استعمال میں بھی سب سے آسان صرف اس کا میکنزم سمجھ کر بھی اسے بہ آسانی چلایا جا ہے۔"

"اچھا!" میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ "کیا تم سمجھ لیا ہے چلانا؟"

"ہاں! یہ دیکھو..." اس نے فخر سے کہا اور دو گن اٹھائی۔ پھر مجھے بتانے لگا کس طرح میگزین ا جاتا ہے۔ کب اور کیسے اسے برسٹ اور سنگل شاٹ پر کرکے فائر کیا جاتا ہے۔ اس دوران میں نے اس کے سے گن بھی لی، وہ خاصی وزنی تھی۔ اسلحہ اٹھانے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ گن کی آہنی ٹھنڈک کا لمس پاتے ہی اپنے مجھے ایک طاقت کا نشہ سا محسوس ہونے لگا۔ یہی تو وہ طاقت تھی جو اگر کمزور اور لاغر انسان کے ساتھ ہو تو وہ سے کئی گنا زیادہ طاقتور و تنومند و آور پر غالب آسکتا

پھر اس نے گن میرے ہاتھ سے لے کر دوبارہ سے لگادی۔ پھر اپنی قمیص اوپر کو اٹھادی۔ میری آ پھیل گئیں۔ اس کی شلوار کے نیفے میں چار پانچ میگزین بھی اڑسے ہوئے تھے۔

"واہ میرے یار! تم تو بڑے دھانسو انسان بن ہو۔" میں اس کی تعریف کرتا رہا اور وہ مسرور سا ہو جتاتا رہا جو میں اس سے جاننا چاہتا تھا۔ اس نے بتایا با اس کے ہمراہ تھا۔ پانچ حواری اور تھے۔ تھوڑی دیر بالا بھی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔

کر چونک گیا۔ اس کے چہرے پر وہ جوش اور تھی جو اشرف کے چہرے سے واضح تھی۔ اس کی چینی اور خوف آمیز تشویش طاری تھی۔ "کیا بات ہے؟ تم اس مہم پر جانے سے خوش نہیں نظر آتے؟" دانستہ اسے بھی کہا۔ میری بات کا جواب دینے بجائے صرف ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ اشرف سے ب ہوا۔

"کیا تم نے اسے بتادیا ہے؟"

"میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر یہ صرف اتنا ہی سمجھ سکا ہے۔" اشرف بے پروائی سے بولا۔ "زیادہ تفصیل نہیں بتائی ہے۔"

"ہمیں تابعداروں کے طور پر استعمال کرنے کے لیے جایا جارہا ہے اشرف!" بالا مجھ سے پہلو تہی کرتے ہوئے بدستور اشرف سے مخاطب رہا۔ اس کے لہجے میں ی اور تلخیاں تھیں۔

"اب ان کے ساتھ رہتے ہوئے یہ تو کرنا پڑے گا۔" اشرف کا انداز بدستور لاابالی تھا۔

"یہ ہمیں قربانی کا بکرا بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس مہم میں۔" بالا نے اسے ہوش دلایا۔

"ہم ایسے کب تک... یہ لوگ بھی تین سے چار ہوں گے۔ تو یسے ہی خوف زدہ ہو رہے ہو۔ استاد ہمیں ٹرینڈ کرنا چاہتا ہے، ایسی مہمات میں بھیج کر۔ میں استاد کو جانتا ہوں، چلے ہوئے کارتوسوں کے علاوہ وہ نئے کارتوسوں پر بھی بھروسا کرتا ہے۔ اس مہم کی کامیابی کے بعد مجھے پورا یقین ہے ہماری حیثیت بدل جائے گی۔ پھر استاد گل خان کے ہوتے ہوئے ہم پر کوئی حکم نہیں چلا سکے گا۔"

"اگر اس مہم سے زندہ بچے تو۔" بالا نے کہا۔

جب رات سر پر اتری تو وہ دونوں اپنی گنیں تانے کمرے سے نکل گئے اور جاتے ہوئے کم بخت حسب معمول باہر سے دروازے کو پلٹ کر گئے۔ میرے اندر... ات بگل بھی رہی۔ پتا نہیں یہ لوگ کیسی مہم پر گئے تھے؟ اور کیا یہ خصلت گل خان واقعی اشرف اور بالے کو کسی خطرناک مہم میں استعمال کرنا چاہتا تھا؟

ایک بٹا دو

تین دیہاتی بس میں سوار ہوئے۔ بس میں رش کی وجہ سے ان میں سے ایک چھت پر چڑھ گیا۔ کنڈیکٹر نے باقی جو دو بس کے اندر تھے، پوچھا۔ "کتنی سواری؟"
ایک دیہاتی نے جواب دیا۔ "ایک بٹے دو۔"
کنڈیکٹر نے حیران ہوکر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"
دیہاتی پھر بولا۔ "ایک اوپر، دو نیچے۔"

(مرسلہ: مسعود افضل، کراچی)

وقت تیزی سے گزر رہا تھا، نیند میری آنکھوں سے دور تھی۔ کھڑکی کے راستے ہی میں سامنے آکر بھی کبھی باہر کا جائزہ لے لیا کرتا تھا جہاں چند حواریوں کے گشت کرنے سے کچھ نظر آتا تھا۔ باقی عمارت میں اندھیرا تھا۔ دیکھو میدان تھا۔ احاطے میں روشنی نظر آتی تھی۔ میں واپس بیڈ پر آکر لیٹ گیا۔ میں بھی نیند کے زیر اثر رہا اور غالباً ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ شور سے میں جاگ پڑا۔ کھڑکی کے راستے کسی گاڑی کی تیز روشنی میرے کمرے کی اندرونی دیوار پر پڑا سا روشن ہالہ سا بنا کر غائب ہو گئی۔ میں بستر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس پہنچا۔ دو گاڑیاں تھیں۔ ایک کار، ایک جیپ۔ تنبیر ڈ والی جیپ کے اندر سے حواری اترے، ان میں اشرف بھی تھا، بالا نظر نہیں آرہا تھا۔ سب اسلحہ بردار تھے۔ جیپ میں دو حواری اور اشرف سوار تھے، وہ جیپ سے اترے اور کار کی طرف لپکے۔ کار کے اندر سے بھی دو حواری اترے۔ تبھی دروازہ کھلا... اور کسی شخص کو بازوؤں سے پکڑ کر باہر نکالا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے اور وہ معمولی زخمی نظر آرہا تھا۔ ایک ہی خیال میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ لوگ کہیں مار دھاڑ کرکے کسی کو زبردستی اغوا کرلائے تھے۔ مگر بالے کو غائب پاکر مجھے تشویش سی ہونے لگی۔

میں نے اپنے کمرے کی لائٹ گل کردی تھی اور واپس بستر پر آکر بیٹھ گیا اور اشرف کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر بعد اشرف لوٹا تو اکیلا لوٹا۔ اس کے چہرے سے فتح اور خوشی کا جوش بھی تھا اور کبھی کبھی آنکھوں میں دکھ بھی۔

"بالا کدھر ہے؟" میں نے فوراً اس سے پوچھا۔ اندر آتے ہی میں نے کمرے کی لائٹ آن کردی تھی۔

"تم ابھی تک سوئے نہیں؟" وہ مجھ سے قدرے چونک کر بولا اور تھکے تھکے انداز میں اس نے گن دیوار سے لگادی۔

"میری بات کا جواب دو۔" میں نے سرد نظروں سے اسے گھورا۔

"چھوڑ گیا، وہ مرگیا۔" اشرف افسردہ لہجے میں بے

ظاہر بے پروائی سے بولا۔ مگر میں محسوس کرسکتا تھا، اس کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"وہ کام آگیا۔ مر گیا وہ۔" اشرف نے ...... سنگ دلی سے کہا۔ مگر اس میں کاٹ دار غم بھی تھا اور حالات کی تلخی بھی۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ کچھ بھی تھا، بالے کا ہمارا ساتھ بچپن کا تھا۔ سات آٹھ سال کی عمر میں جب پہلی بار میں یہاں لایا گیا تھا تو اس کے چند دنوں بعد بالترتیب بالا اور اشرف بھی لائے گئے تھے۔ پہلے روز گھبرا کر وہ دونوں روتے رہے تھے۔ میں نے ہی انہیں بہلانے اور باتیں کرنے کی کوشش کی تھی۔ پھر ہم گھل مل گئے تھے۔ بنیادی طور پر تو ہم تینوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ ہمارا بچپن ایک تلخ اور عبرت ناک سبق سے شروع ہوا تھا۔

"تمہیں افسوس نہیں ہوا اشرف؟ بالا ہمارا بچپن کا دوست تھا۔" میں نے اشرف کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یار تھا وہ ہمارا، بھلا دکھ کیسے نہیں ہوگا مگر شاید اس کے مقدر میں اسی طرح کی موت لکھی تھی۔" وہ بولا۔

"تم تو مقدر کو مانتے ہی نہیں تھے، اب مقدر کا خیال کیسے آرہا ہے تمہیں؟" میرے لہجے میں طنز تھا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔"

"اچھا یار اب سو جاؤ، دماغ مت خراب کرو۔ جاؤ اپنے بستر پر۔" اشرف بیزار کن برہمی سے بولا۔

"تم کس کی نوکری کر رہے ہو؟"

"تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔"

"یار! خفا کیوں ہوتے ہو؟ اب تو صرف ہم دونوں ہی پرانے دوست باقی بچے ہیں۔ بالا تو گیا بے چارہ۔"

میری بات پر اشرف غم سے پھٹ پڑا۔ اسے واقعی بالے کی موت کا دکھ تھا مگر اپنی فطرت سے بھی مجبور تھا۔ یہ جرائم پیشہ لوگ شاید اس کی مجبوری بن چکے تھے مگر شاید اس کے اندر تھوڑی بہت انسانیت باقی تھی۔ وہ بے اختیار میرے گلے لگ کر رو پڑا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میرے خیال میں اس طرح کے جذبات سے اشرف کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ "یار! تو بار بار بالے کا ذکر کیوں کرتا ہے؟ سب کو مرنا ہے آخر ایک دن۔"

وہ شاید اس طرح کہہ کر خود کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے آہستگی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کیا اور بولا۔ "ہاں مرنا تو آخر سب کو ایک دن ہے ہی مگر اس طرح نہیں۔ دیدہ و دانستہ خود کو موت کے منہ میں پھینکنا، خودکشی کے ہی مترادف ہے۔"

"تو چپ نہیں رہ سکتا آج کی رات؟" وہ برہمی

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اشرف! چھوڑ

سب کچھ۔ ایسے کاموں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

کہ میں اپنی ذاتی غرض و غایت کے لیے تم سے

مانگ رہا۔ یہاں موجود معصوم اور بے گناہ قیدی

آزادی کے لیے تم سے مدد اور تعاون کا خواہاں ہوں

"میں بہت دور نکل چکا ہوں، شہزی! میری

ناممکن ہے۔ میں اپنی اس دنیا میں خوش ہوں۔" وہ

"خبردار تم کوئی ایسی ویسی حرکت مت کرنا کہ مجھے

پر بھی انگلی اٹھ جائے۔ جاؤ اب سو جاؤ۔"

اگلے دن اشرف نے میرے لیے ایک نیا

تیار رکھا تھا۔ "استاد نے اس نئے قیدی کی نگرانی تمہا

حوالے کی ہے۔"

"اچھا۔" میں طنز آمیز حیرت سے بولا۔ "ایک

قیدی دوسرے قیدی کی کیا نگرانی کرے گا۔"

"زیادہ ۔۔ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں

کام کرو۔" وہ جھلا کر بولا۔ میں تلخ مسکراہٹ کے

کمرے سے نکل گیا۔

مجھے کیا کرنا تھا، یہ سب اشرف نے مجھے

تھا۔ میں وہاں پہنچا جدھر مغوی کو رکھا گیا تھا۔ یہ ایک

کمرا تھا۔ یہ اس پورشن کا حصہ تھا جہاں پہلے بوڑھوں کو

جاتا تھا۔ انہیں ٹھکانے لگانے کے بعد یہ حواریوں کی رہائش

طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں مغوی

رکھا گیا تھا۔ میں اس کمرے میں پہنچا۔ مغوی کے سوا کمرا

شے سے خالی تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باند

گئے تھے اور ایک کونے میں وہ دیوار سے ٹیک لگائے

تھا۔ میں بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ اسے پکی عمر کا مرد تو

کہا جاسکتا تھا، مجھ سے کچھ سال ہی بڑا تھا۔ جسم چھریرا

مونچھیں باریک۔ چھوٹے بال، رنگ سانولا قدرے صاف

آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ایک عجیب بات جو اس کی

میں میں نے محسوس کی تھی، وہ نڈر اور دلیر معلوم ہوتا تھا

میرا اس کے بارے میں ایک عام سا اندازہ تھا۔ وہ مغوی

اور بظاہر کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ ہوسکتا تھا۔ کل ر

اسے ایک خطرناک مقابلے میں اغوا کرکے ہی لایا گیا تھا

باوجود اس کے خوف کا ایک ذرا شائبہ تک اس کے چہرے

پہ نہ تھا۔

مجھے یوں اپنی جانب بے دھڑک تکتا دیکھ کر وہ

کاری کی جانب گیا۔

ان کے قبیل کا کوئی لگتا۔ کیا نام ہے تیرا لڑکے؟"

پر میں کچھ گڑبڑا گیا۔ وہ مجھے گھور رہا تھا۔

"شہزی۔"

"شہزی!" وہ مسکرایا۔ "یہ کیسا نام ہے بھلا۔ آدمی تو

نظر آتا ہے پھر یہ شہزی وہزی..." وہ ہنسا۔

"شہزاد احمد خان نام ہے میرا۔" میں نے اس بار

لہجے میں اپنا پورا نام بتایا۔

"شہزادا... یہ ہوئی نہ بات۔ شہزاد احمد خان،

شہزاد کیوں شہزادے۔ کب سے ہے ان لوگوں

کے ساتھ؟"

"اب تم اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو؟ کیا نام

تمہارا؟ ان لوگوں کی تمہارے ساتھ کیا دشمنی ہے؟"

"اوخیر..." وہ ہنس کر بولا۔ "میرا نام پوچھتا ہے،

خیر نام ہے میرا۔ جن کی تو میں ان کا نہیں ہوں شہزی، یہ

عجیب سا نام تھا اس کا۔ میں نے پوچھا۔ "میرا

آخری سوال تم گول کر گئے۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں

معاملہ دشمنی کا ہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "تیرا سوال معاملہ بہت لمبا ہے۔ تیری سمجھ

میں آنے والا نہیں۔ تو بتا، چودھری ممتاز جانتا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر نفی میں

سر ہلایا۔

"سردار الف خان کو؟"

"نہیں۔"

"اس کے بیٹے کا نام سنا ہے؟"

"نہیں۔"

"قسم سے لا کی تو ان کا آدمی بھی نہیں ہے اور نہ ہی ان

کا وفادار... تو تو مجھے خود ان کا قیدی نظر آتا ہے۔"

میرے بارے میں اس کا اندازہ سو فیصد درست

تھا۔ وہ مجھے کام کا آدمی لگا۔

"کیوں شہزادے؟ میں نے غلط تو نہیں کہا۔"

"تمہاری بات سچ ہے۔" میں نے دھیرے سے

کہا۔ وہ بولا۔ "یہ کون سی جگہ ہے؟ یہاں کیا ہوتا رہتا ہے؟"

مجھے حیرت ہوئی۔ اسے اپنی کوئی فکر نہ تھی، وہ یہاں کے

بارے میں اس طرح سوال پوچھے جا رہا تھا جیسے یہاں تحقیق

کرنے کے لیے آیا ہو۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں یہاں کے

بارے میں بتایا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اوخیر... چودھری ممتاز اب ایسا گھٹیا کام بھی کرنے لگا ہے۔ حیرت ہے۔ بتا تو یہاں آیا ہے یا بھیجا گیا ہے، تجھے میرے پاس؟" اول خیر نامی شخص نے بھویں سکیڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے بھیجا گیا ہے۔ تم پر نظر رکھنے کے لیے۔" میں نے جواب دیا۔

"ادھر آ... یہاں بیٹھ میرے پاس۔"

"میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھ پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میرے عقب والا دروازہ کھلا۔ میں چونک کر پلٹا۔ وہاں اشرف تھا۔ گن ہر وقت اس کے پاس یوں رہتی تھی جیسے بچے کے ساتھ اس کا کوئی پسندیدہ کھلونا ہو۔ اس نے ایک تیز نظر مجھ پر پھر اول خیر پر ڈالی۔ پھر درشتی سے میری طرف مڑ کر بولا۔ "تم کیا باتیں کر رہے تھے اس کے ساتھ؟"

"کچھ نہیں۔"

"کیا مطلب کچھ نہیں۔" وہ کھردری درشتی سے بولا۔ "استاد نے تمہیں یہاں اس کی نگرانی کے لیے بھیجا ہے، اس کے ساتھ بات چیت کے لیے نہیں۔ سمجھے تم؟" مجھے اشرف کا یک دم یوں مجھ پر حاکمانہ انداز میں برہم ہونا انتہائی ناگوار گزرا۔

"کیا ہے تو ابھی کرائے کے ٹٹو، تیری بات میں، تیرے لہجے میں ابھی وہ مردوں والی گونج نہیں آئی۔" اول خیر تضحیک آمیز لہجے میں اشرف کو گھور کر بولا۔ "کیا تمہارا وہ دو ٹکے کا استاد دنگل خان، جنگل خان اتنا ہی کم عقل ہے کہ اس نے ایک قیدی کی نگرانی کے لیے دوسرے قیدی کو یہاں بھیج دیا۔"

اس کی بات سن کر اشرف کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں کمرے سے باہر آگئے، اندر سے اول خیر کا قہقہہ سنائی دیا۔ اشرف نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر یکلخت اس کا لہجہ بدل گیا۔ وہ معذرت خواہانہ لہجے میں مجھ سے بولا۔ "معاف کرنا یار، یہ میری مجبوری تھی۔"

"کیا مطلب کیسی مجبوری؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دوستانہ انداز میں میرے کاندھے پر ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔ "آؤ میرے ساتھ۔"

وہ مجھے دنگل خان کے پاس لے گیا۔ خلاف توقع

کنگل خان اپنے کمرے میں اکیلا تھا اور اس کے چہرے پر برہمی کے آثار بھی نہیں تھے۔ اشرف نے آگے بڑھ کر زیرِلب اس کے کان میں کچھ کہا جس پر کنگل خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اس نے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"دیکھو شہزادے! تم ہماری وفاداری کا دم بھرتے ہو۔ اس لیے تم پر ہمیں بھروسا کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے جان بوجھ کر تمہیں اس قیدی کی نگرانی کے لیے بھیجا تھا۔" وہ لمحہ بھر کو رکا۔ اس کا لہجہ مجھے کچھ پراسرار سا محسوس ہوا

وہ بستر سے اٹھا اور چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا عام سا شلوار کرتا پہن رکھا تھا۔ شاید وہ سونے کی تیاری میں تھا۔ میرے کاندھے پر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو کاکا! اشرف تمہاری بہت سفارش کرتا ہے کہ تم کبھی نہ کبھی ہمارے کام آسکتا ہے۔ شاید اس کا وقت آگیا ہے۔ مجھے اندازہ ہے اس بات کا کہ تم اب بھی خود کو ہمارا قیدی سمجھتے ہو۔ حالانکہ تجھ سے ہم نے بیگار لینی بھی چھوڑ دی ہے مگر اب اس کے صلے میں تم نے ہمارا ایک اہم کام کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں تم نے اس قیدی کے ساتھ کیا باتیں کی ہوں گی۔ ضرور اپنا بھی دکھڑا اسے سنایا ہوگا کہ خود تیری اپنی بھی حیثیت یہاں ایک قیدی کی سی ہے اور یہی میں چاہتا بھی تھا۔" مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ بہت مکار اور چالاک ثابت ہوا تھا۔ جس بات پر میں حیرانگی محسوس کر رہا تھا، وہ اس کا پہلے سے علم رکھتا تھا۔ آگے بولا۔

"تم نے ابھی ہمارا بس اتنا ہی کام کرنا ہے کہ اس قیدی کے ساتھ اسی طرح کی خفیہ قسم کے ہمدردانہ تعلقات قائم رکھو۔ اس طرح کہ بہت جلد وہ تمہیں اپنا راز داں سمجھنے لگے۔ یہاں تک کہ بہت جلد تمہاری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دے اور وہ تمہارے ساتھ یہاں سے فرار ہونے کی مشترکہ منصوبہ بندی کرنے پر بھی آمادہ ہو جائے۔" وہ رکا۔ میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ کچھ بات سمجھ میں بھی آرہی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی فی الحال تم اتنا کرو، باقی ہدایت تمہیں ملتی رہے گی۔ لیکن خبردار کسی چالاکی کو دل میں مت لانا، میرے پاس کام نکلوانے کے اور بھی طریقے ہیں۔ نہ ہی مجھ سے جھوٹی باتوں کا تبادلہ کرنا۔ جو باتیں اس کے ساتھ تم طے کرو گے اس سے مجھے آگاہ کرتے رہو گے... سمجھے تم؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے مجھے رخصت کر دیا۔ اشرف کو کنگل خان نے اپنے پاس روک لیا تھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔

یہ سب کچھ اتنا سیدھا اور آسان نہ تھا، جو کنگل خان نے مجھ سے کہا تھا۔ [illegible] کنگل خان اتنا سیدھا آدمی نہیں تھا کہ وہ مجھ پر اتنا بھروسا کرنے لگتا مگر یہ مجھے نظر آرہا تھا کہ وہ موقع محل کے مطابق مجھے استعمال کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ قیدی اول خیر سے مجھے قریب ہونے کا موقع دیا اگرچہ اس کے کسی خفیہ مفاد کا حصہ ہی تھا مگر مجھے یقین تھا کہ ہماری گفتگو کی بھی نگرانی کی جاتی ہوگی۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ میرے لیے کچھ کرنے کا اتنا موقع کافی تھا۔ میری اپنی مرضی بھی یہی تھی، اول خیر کی مدد سے یہاں سے صرف ایک بار فرار ہو جاؤں۔ اندر سے باہر کی دنیا کا باسی بن جاؤں اور کسی طرح سردار بابا سے جا ملوں۔ اس کے بعد ان سب کا شیرازہ بکھر جائے گا اور عابدہ کا ان کی گرفتاری کے بعد سراغ لگانا مشکل نہ ہوگا۔ مگر یہ کرنے کے لیے مجھے ہوشیاری سے کام لینا ہوگا۔

یہ اس روز رات کا ذکر تھا۔ اشرف کافی دیر بعد کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں دانستہ سوتا بن گیا۔ پلکوں کے کھلے ہونے کے باعث میں نیچی نیچی آنکھوں سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ لیکن اس نے روشنی بجھا دی۔ چند لمحے وہ بیٹھے بیٹھے میری طرف تکتا رہا۔ میں بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرے گہری نیند میں سوتے رہنے کا یقین کر لینا چاہتا ہو کیونکہ اس نے ہولے سے دو تین بار پکارا بھی تھا مگر میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کے مجھے ہولے ہولے انداز سے پکارنے کا مطلب ہی میں سمجھ گیا تھا۔

جب اسے تسلی ہو گئی تو وہ اپنی جیبیں خالی کرنے لگا جن میں رومال، کچھ روپے اور چابیاں بھی تھیں۔ مجھے [illegible] قمیص کی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں نے کن انکھیوں کی آنکھ سے دیکھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون نظر آیا جسے دیکھتے ہی میرے اندر سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے بھی اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر وہ لیٹ گیا۔ میرے [illegible] ہونے لگی۔ اور [illegible] سردار بابا کا سیل نمبر میرے دماغ میں گردش کرنے لگا۔

ابھی تک اندھیرا تھا۔ ایک خطرناک سنسناتا ہوا خیال میرے جاگتے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ یہ سیل فون ہم سب کی آزادی کا بگل بجا سکتا تھا مگر کیسے؟ کیا یہ اتنا ہی آسان کام تھا؟ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ مشکل کام کیے بغیر یہاں سے آزاد ہونا بھی ممکن نہ تھا اور مجھے یہ مشکل اور خطرناک کام آج رات ہی کرنا تھا۔

کمرے میں میرے ساتھ صرف اشرف تھا جو اب سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کے سیل فون کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس قید خانے کی چابی تھی۔ یہی سبب تھا میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز تر ہونے لگی تھی۔

ہر سو خاموشی طاری تھی۔ ایسی خاموشی جیسے اچانک کوئی بڑا طوفان اٹھنے والا ہو۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا دورانیہ میرے لیے گویا صدیوں کے برابر محسوس ہوا تھا۔ میں نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ دبے لیٹے کروٹ کے بل ساتھ والے بستر پر اشرف کو پشت کے بل سوتے دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔ وہ خراٹے لینے کا عادی تو نہ تھا مگر اس کے سینے کا زیروبم بتاتا تھا کہ وہ گہری نیند میں ہے۔

تب میں آہستگی کے ساتھ اٹھا۔ میں ایک خطرناک قدم اٹھانے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے ایسا مشکل کام [illegible] تھا۔

جب میں آہستگی کے ساتھ اپنی چارپائی سے اٹھا تو وہ ہولے سے چرچرائی تھی۔ کمرے میں زیرو واٹ کا بلب روشن تھا۔ [illegible] سردی کا احساس بھی کچھ کم تھا۔

میں آہستگی سے آگے بڑھا اور قدرے جھک کر ایک ہاتھ اشرف کے تکیے کے نیچے کھسکا دیا۔ اچانک اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی، میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جاگا نہیں تھا۔ میری طرف اس نے کروٹ لی تھی۔ میں نے فوراً ہاتھ تکیے کے نیچے سے کھینچ لیا۔ پھر اس کے سر کے پچھلے حصے کی طرف سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو میری سرکش انگلیوں سے سیل فون ٹکرا گیا۔ میری آنکھوں میں مخصوص چمک ابھری۔ نہایت آہستگی کے ساتھ میں نے سیل فون نکال لیا۔

مجھے اعتراف تھا کہ سیل فون جیسی شے کو آج میں پہلی بار چھو رہا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ مجھے اس کے بارے میں بالکل ہی پتا نہ تھا۔ یہ میں نے آپا جی کے علاوہ کسی وقت کے محلے کے چند افراد کے پاس بھی دیکھا تھا اور اس کے استعمال کا بھی مجھے علم تھا۔ میں سیل فون لینے میں کامیاب ہو کر سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ میں نے پہلے تو بمشکل اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پایا پھر اس کے بعد دھڑکتے دل کے ساتھ سردار بابا کے سیل فون کا نمبر ملانے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس وقت سردار بابا بھی گہری نیند میں تھے یا اپنے موبائل فون کی کال پر وہ اسے رات کے اس دورانیے اٹینڈ بھی کریں گے یا نہیں۔ اگر میں موقع نہیں گنوا سکتا تھا۔ نمبر ملانے کے بعد میں نے فون کان سے لگایا مگر دوسرے ہی لمحے میرا دل مایوسی سے بھر گیا۔ مجھ پر شدید جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ کیونکہ دوسری طرف سے پاور آف ہونے کی اطلاع مل رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا اب کیا کروں؟ یہ فیصلہ کن گھڑی تھی، موقع سے فائدہ اٹھانے کا وقت تھا۔ اب نہیں تو کبھی نہیں کے مصداق۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میں جتنی جلدی لکھ سکتا تھا، سردار بابا کے سیل فون نمبر پر ایک ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کر دیا۔ زیادہ تفصیل تو نہیں لکھ سکتا تھا تاہم [illegible] میں سوتے ہوئے مختصراً صراحت کے ساتھ یکے بعد دیگرے دو تین ایس ایم ایس لکھ کر سینڈ کر دیے۔ اس کے بعد میں نے سب کچھ مٹا دیا۔ کیونکہ یہ سیل فون میرا نہیں تھا، اشرف کا تھا اور یقیناً یہ کنگل خان کا ہی ہوگا۔ وہ اب شاید اشرف پر مکمل بھروسا کرنے لگا تھا۔ اشرف کا سیل فون ہاتھ میں پکڑے میں سوچتا رہا۔ فوری طور پر مدد کے لیے اور کسے فون کرنا چاہیے تھا؟ سردار بابا کے سوا کسی کا نمبر مجھے نہیں معلوم تھا۔ میری معلومات بھی محدود تھی کہ کسی ایمرجنسی کال نمبر پر مدد لے سکتا تاہم مجھے امید تھی، سردار بابا جب بھی یہ ایس ایم ایس پڑھیں گے فوراً حرکت میں آجائیں گے۔ میں نے احتیاطاً آخر میں انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ سیل چوری چھپے حاصل کر کے استعمال کر رہا ہوں لہٰذا دوبارہ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہوگا اس لیے آپ جو کارروائی کر سکتے ہیں کر لیں۔

دل کو کچھ تسلی ہوئی اب میں یہ سیل فون اسی طرح خاموشی کے ساتھ دوبارہ اشرف کے تکیے کے نیچے رکھ دینا چاہتا تھا تاکہ میری یہ "ہم جوئی" مکمل طور پر خفیہ رہ سکے۔ چنانچہ یہ سوچ کر میں نے آہستہ سے باتھ روم کا دروازہ کھولا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے اشرف کھڑا میری طرف زہرناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

☆☆☆

وہ شاید رات کے کسی پہر جاگ چکا تھا۔ ممکن ہے اسے بھی کوئی فطری حاجت محسوس ہوئی ہو اور وہ دروازے کے

باہر میرے نکلنے کا منتظر تھا، مگر میرے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کر اسے صورتِ حال کا ادراک کرنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔

"میرے سیل پر کس سے بات کر رہے تھے تم؟" وہ خطرناک لہجے میں بولا اور ساتھ ہی جھپٹ کر اپنا سیل فون میرے ہاتھ سے لے کر اس کا ڈیٹا چیک کرنے لگا۔ میرا بھانڈا پھوٹ گیا تھا مگر میں نے دروغ گوئی سے کام لیا اور ہنس کر بولا۔

"معاف کرنا یار! بس ایسے ہی ذرا کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔"

میرا جھوٹ پکڑا جا چکا تھا، اس نے نفرت سے ہونٹ بھینچ کر میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا اور غصے سے بولا۔ "اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، کوئی لحاظ نہیں کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اس کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ میں جو پہلے ہی اس کے تھپڑ مارنے پر بپھر چکا تھا کسی چیتے کی طرح فراٹا بھرا اس پر جھپٹا اور ایک زبردست ٹھوکر اسے رسید کر ڈالی۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھا کہ میں اس پر یوں لوٹ پڑنے کی جرأت و ہمت بھی کر سکتا ہوں۔ نتیجتاً وہ سنبھل نہ سکا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ سیل فون ہاتھ سے چھوٹ کر پختہ فرش پر گرا اور کھل گیا۔ وہ دیوار سے ٹکرا کے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری طرف پلٹا اور مجھے ٹانگ رسید کرنا چاہی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ اپنے دفاع میں بے شک یہ میری لاشعوری حرکت تھی، جو سودمند ثابت ہوئی تھی۔ اس کی ٹانگ پکڑ کر میں نے مروڑ ڈالی۔ مگر اس نے بھی سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی اور ہم دونوں ایک بار پھر دست و گریباں ہو گئے۔

کامیابی کی خاطر میرا اشرف پر قابو پانا لازمی تھا۔ ورنہ وہ ٹنگل خان کے سامنے میرا راز فاش کر سکتا تھا۔ بڑی ہی اذیت ناک گھڑیاں اور قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد مجھے ایک خاطر خواہ کامیابی ملی تھی۔ میں جان لڑا کر بھی اپنی اس "حتمی" کامیابی کو ضائع نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ اشرف میرا ہم عمر اور ڈیل ڈول میں میرا ہم پلہ ہی تھا۔ مگر اس وقت میرے دل و دماغ میں ایک نیک جذبے کا جوش جنون بن کر سمایا ہوا تھا۔ میں اسے پوری قوت سے دھکیلتا ہوا پلنگ پر جا گرا۔ وہ اب میرے نیچے تھا، اس نے میرے پیٹ پر گھونسا رسید کر دیا۔ درد کی لہر نے مجھے چند ثانیوں کے لیے ڈھیلا کر دیا۔ اس بدبخت کے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ وہ مجھے خود پر سے دھکیل کر یکدم دیوار سے لگی گن کی طرف لپکا۔ گن اس کے قبضے میں آجاتی تو میں بے بس ہو سکتا تھا۔ اپنی تکلیف بھلا کر میں بھی اس کی جانب لپکا۔ تب تک اس نے گن اچک لی۔ ابھی اس کا رخ میری جانب کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے بے اختیار ٹانگ چلائی جو گن کی نال پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کا رخ بدل گیا۔ دوسری ٹانگ اس کے پیٹ پر پڑی جو زوردار ثابت ہوئی جس نے اسے دھکیل کر دیوار سے ٹکرا دیا اور..... گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس نے سنبھلتے ہی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے کے ساتھ ٹانگ آگے کر کے اڑنگا ڈال دیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ میں نے سے گن اٹھا کر اسے نال سے پکڑا اور لٹھ کی طرح گھما کر گن کا کندہ پوری قوت سے زمین بوس اشرف کے سر کے پر پڑا اور آواز نکالے بغیر وہ ڈھیر ہو گیا۔ جانے وہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرے نزدیک وہ بھی طالبوں کے ٹولے میں شامل تھا اور رعایت کا مستحق نہ تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے وجود کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور بیڈ کے نیچے سرکا دیا۔ اس کے تکیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا اٹھایا۔ زمین پر اس کا سیل فون بھی اچک لیا۔ وہ ایک سستا والا سیٹ تھا، گرنے سے کھل گیا تھا اور اس کی بیٹری باہر نکل آئی تھی۔ میں نے اسے اصل حالت میں لا کر آن کر دیا اور گن اٹھالی۔

انسان کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ عملی میدان میں آنے کے بعد ہی ہوتا ہے جبکہ میدانِ عمل میں چھپی صلاحیتوں کو از خود ہی جلا بخشتے ہیں۔ اس وقت میرا پھرتی سے کام کر رہا تھا۔ میرے رونگٹے پھرتی تھی رگ میں شاید درست وقت پر درست فیصلہ کر میں اب گن سمیت، اول خیر کے کمرے میں جانا چاہتا تھا اسے میری مدد کی اور مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ نے وقت دیکھا، رات کا آخری پہر تھا۔ میں نے دروازہ کھول کر پھرتی سے باہر جھانکا۔ سرد ہوا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ جدھر اول خیر کو رکھا گیا تھا وہ مقام یہاں سے سامنے کی طرف چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ کسی حواری کی ناموجودگی کے آثار دیکھ کر سنبھالے باہر آگیا اور تیزی کے ساتھ چھپتا چھپاتا قیدخانے کی کچی دیوار سے جا چپکا۔ چند گن لینے کے بعد میں دھیرے دھیرے کھسکتا لیتا ہوا اصلی دروازے کی طرف سرکنے لگا۔ دیکھنے پر مجھے مین گیٹ کے قریب چند مسلح حواری

اس طرف جانے کی مجھے بھی سختی سے ممانعت تھی۔ کمرے کے دروازے پر آ کر میں نے چابی لگائی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مدھم روشنی میں مجھے فرش کے وسط میں اول خیر ترچھا نظر آیا۔ شاید وہ ٹنگل خان وغیرہ کا کوئی خطرناک دشمن تھا اسی لیے اس کے ہاتھ پاؤں سخت قسم کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ بے چارہ اس حالت میں ہی شاید سو پڑا تھا۔

ذرا سی آہٹ پر وہ بیدار ہو گیا۔ پھر مجھے پہچان کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "کا کے تو؟ خیریت ہے... اس وقت اور یہ گن؟"

"اول خیر! تیاری پکڑ۔ میں تیرے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہوں پر مجھے دھوکا مت دینا۔ یہ صرف میرا نہیں ان کئی مظلوم اور معصوم قیدیوں کی آزادی کا سوال ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟" میرے لب و لہجے میں عجب قسم کا جوش سرایت کر آیا تھا۔

"او خیر کا کے! میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ تو واقعی بہادر نوجوان ہے۔" وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ "ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کر اول خیر کوئی احسان باش سے کا احسان فراموش نہیں ہے۔"

میں نے گن زمین پر رکھی اور جلدی جلدی اس کے بند کھولنے لگا۔ آزاد ہوتے ہی اس نے ایک انگڑائی لی سب سے پہلے گن پر قبضہ جمالیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ بولا۔ "کا کے! تو ادھر ہی ٹھہر... میں چار کو لٹا کر آتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ "ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ ورنہ میری ساری محنت اکارت جائے گی۔ ابھی وقت ی مٹھی میں ہے۔ دو چار کو مارنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ یہ لوگ بہت خطرناک اور منظم حالت میں ہیں۔"

"کیا چاہتا ہے تو بول؟" اول خیر بولا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ میں اس سلسلے میں سرمد بابا کو فون کر چکا ہوں یعنی ان کے ذریعے انہیں یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر چکا ہوں۔

وہ سن کر بولا۔ "کا کے! تیرے سے زیادہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔ یہ خطرناک ہی نہیں بااثر بھی ہیں۔ ان کو تو سمجھ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پولیس کا پہنچنے سے پہلے ہی کوئی کارروائی ادار کر دے گی۔" وہ رکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "سیل فون تیرے پاس ہے اس وقت؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"پھر لا۔ ابھی لوہے کو لوہے سے کاٹتے ہیں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے سیل فون نکال کر اسے تھما دیا۔

سیل فون لے کر اس نے فوراً ایک نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی دبے دبے جوش سے وہ دوسری طرف کسی سے باتیں کرتا رہا۔ پھر درمیان میں مجھ سے مخاطب ہو کر اس علاقے کا محلِ وقوع پوچھا جو میں نے اسے بتا دیا۔ اس کے بعد مزید تھوڑی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"تم اپنے کسی ساتھی سے باتیں کر رہے تھے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "وہ کسی بھی وقت آندھی طوفان کی طرح یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

مجھے تھوڑی تشویش سی ہوئی۔ میں نے کہا۔ "اس طرح جنگ کی صورت سے معصوم قیدی زد میں آسکتے ہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا اول خیر۔"

"او خیر... کا کا۔" وہ مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "تو فکر نہ کر... میں نے اپنے ساتھیوں کو سب سمجھا دیا ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے، وہ آتے ہی ہلا بول دیں گے... ہرگز نہیں۔ آؤ ہم تب تک اپنی کارروائی کرتے ہیں۔" اس نے مجھے بھی شامل کر لیا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ میرا خیال تھا وہ ابھی جا کر ٹنگل خان سے بھڑ جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ باہر آتے ہی اس نے سب سے پہلے مجھ سے قیدیوں کے کمروں کا پوچھا۔ میں نے اسے بتا دیا۔

"ان سب کو پہلے ایک جگہ اکٹھا کرنا ہوگا... آؤ۔" وہ بولا۔

ہر طرف صبح کاذب کی ملگجی سی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ صبح ہو رہی... ہر طرف ٹہلنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم دونوں اس وقت دیوار کے کچی حصے کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ سامنے احاطے کی بلند و بالا دیوار تھی۔ یہی راستہ... گلی کی صورت میں تینوں ہال کمروں کی کچی دیوار تک لے جاتا تھا۔

دفعتاً ہمیں شور کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں بری طرح ٹھٹک گئے۔ "کا کا... کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے شاید۔" اول خیر نے ہولے سے سرگوشی کی۔ میں بولا۔ "کیا تمہارے ساتھیوں نے دھاوا تو نہیں بول دیا؟"

"نہیں، انہیں پہنچنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔" وہ رکا۔ پھر بولا۔ "تم ایک کام کرو... جتنی جلدی ہو سکے،

سارے قیدیوں کو جا کر ہوشیار اور چوکنا کر دو اور خبردار بھی کر دو کہ کوئی بھی اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلے۔ یہ خوش خبری بھی انہیں جا کر دے دو۔ ان کی آزادی کچھ لمحوں کے فاصلے پر ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چھپتا چھپاتا دیوار کی آڑ لیتا ہوا سب سے پہلے لڑکیوں کے ہال کمرے کی کھڑکی کی جانب پیش قدمی کی۔ ایک مقام پر میں نے دیوار کی آڑ سے مرکزی احاطے کی طرف دیکھا۔ یہاں مختصری عمارت میں میرا اور اشرف کا کمرا تھا اور کچھ حواری وہاں جمع تھے۔ غل دہیں مچا ہوا تھا۔ میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ انہوں نے اشرف کو یقیناً بے ہوش یا مردہ حالت میں دیکھ لیا تھا اور اب یقیناً میری تلاش کا ارادہ رکھتے ہوں گے۔ اب ان کے ہتھے چڑھنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی ہدایت پر تیزی سے عمل کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں ذرا دیر بعد غضب کا رن پڑنے والا تھا۔ سردار بابا بھی یقیناً میرا ایس ایم ایس پڑھنے کے بعد اپنی کسی کوشش میں مصروف ہو گئے ہوں گے جبکہ اول خیر کے ساتھی بھی یہاں بقول اس کے ایک بڑے دھچکے کی صورت میں پہنچنے والے تھے۔ اول خیر اور اس کے ساتھی بھی مجھے گل خان اور اس کے حواریوں کے قبیل کے ہی لگتے تھے۔ گویا یہ جنگی گروپ یعنی کوئی پرانی گینگ وار تھی جو بہت پہلے اول خیر اور گل خان کے مابین چھڑی ہوئی تھی۔

لڑکیوں کے ونگ میں پہنچ کر میں نے سب کو خبردار کر دیا۔ وہ سب خوش بھی تھیں اور سراسیمہ بھی کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا۔ وہاں سے میں سیدھا لڑکوں کے ونگ میں پہنچا تو ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ کیونکہ دو تین مسلح حواری پہلے سے اندر موجود تھے اور ان سے درشت لہجے میں میرے بارے میں ہی پوچھ رہے تھے۔ میں ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ ہال سے نکل گئے تو میں اندر کود پڑا۔ شوکت حسین اور اس کے ساتھی مجھے دیکھ کر حیران ہوئے، میں نے یہاں بھی وہی کچھ دہرایا۔ ان کے سب کے چہرے آزادی کے جوش سے سرخ ہو گئے۔ شوکی کچھ پشیمان نظر آتا تھا، آج شاید اس کی میرے بارے میں غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ میں نے شوکی سے کہا۔ "شوکی تم ایک کام کرنا ذرا جلدی۔" وہ پورے جوش کے ساتھ تن گیا۔ میں بولا۔

"تم اپنے ساتھ چند لڑکوں کو لے کر کسی طرح بچوں اور بچیوں کے پاس پہنچو۔ انہیں سنبھالنا ضروری ہے کہیں بوکھلاہٹ میں وہ باہر کی طرف نہ دوڑ پڑیں۔" وہ میری بات سمجھ گیا۔ وقت کم تھا، میں زیادہ بات نہ کر سکا اور پلٹ گیا۔

میرا رخ اول خیر کی طرف تھا لیکن اس نے مجھے کھلے میں آنے سے منع کر رکھا تھا۔ ٹھیک اس وقت برسٹ آواز ابھری۔ یکدم لڑکیوں کے ونگ کی طرف شور کچھ دوڑتے قدموں اور زور زور سے بولنے کی آ سنائی دیں۔ برسٹ چلنے کی آواز مجھے اس سمت سے سنا تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے میں ... خیر کو چھوڑ کر آیا تھا جانے اس پر کسی نے فائر کیا تھا... یا کا سامنا اول خیر کی تھی۔ ابھی میں ٹھیک سے کچھ ا نہیں قائم کر سکا تھا کہ دفعتاً مذکورہ سمت سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے ایک جگہ سے ابھر کر اس دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اول خیر جس مختصر عمارت کے میں مقید تھا، اب اس کی چھت پر نظر آ رہا تھا جبکہ آٹھ د افراد اس عمارت کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ دو تین افرا بھی لا چکا تھا، جو چھت میں یوں نظر آ رہے تھے۔ مجھے کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ ایک جنگ کی ابتدا اب ہو چکی جانے اول خیر سے کیا غلطی ہوئی تھی کہ وہ وقت سے پہلے ان کی نظروں میں آ چکا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا اس کے گر اور خونی حواریوں کا گھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر یہی صو حال رہتی تو بہت جلد گل خان کے بھیڑیا صفت حو اسے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے۔ ابھی تو وہ چھت پر کسی حد تک محفوظ تھا۔

اچانک میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی دو دیوا کے درمیانی راستے پر کسی کے دوڑتے قدموں کی آواز آگے بڑھا تو کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔ ہم دونوں گرتے گرتے کوئی مسلح شخص تھا، اور اس کے عقب میں دو اور بھی مسلح تھے۔ یہ تینوں شاید اس راستے سے دوڑ کر عمارت کی پر چڑھنا چاہتے تھے تاکہ دوسری چھت سے اول خیر آسانی گولیوں کی زد میں لیا جا سکے۔ مگر بدقسمتی سے میں کے نرغے میں آ گیا۔ لیکن گرتے ہی میں نے نہ صرف حواسوں کو قابو میں رکھا تھا بلکہ زمین پر پڑی گن کی جھپٹا بھی تھا، جو مجھ سے ٹکرانے والے شخص کے ہاتھ چھوٹ گئی تھی جب تک اس کے باقی دو ساتھی صورت سمجھتے میں نے گن سنبھالتے ہی ان کی طرف رخ کر ٹریگر دبانے سے پہلے میں یہ اطمینان کر چکا تھا کہ وہ پر سیفٹی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے گن کا پہلا برسٹ دو لوگوں پر برسایا تھا۔ میری گن وحشی درندے کی آنکھیں اندھا دھند میں دھاڑی تھی، اور گولیوں کی بوچھاڑ دونوں کی ٹانگیں چھلنی کر کے رکھ دیں۔ وہ چیخیں

ے۔ میں نے لیٹے لیٹے تیسرے دشمن پر اس شخص کی ل۔ برق رفتاری سے کروٹ بدلی تو وہ تب تک کھڑا ہو چکا تھا اور پر دبانے کے لیے پر تول رہا تھا۔ دوسری بار ٹریگر میری انگلی نے جنبش کی اور ایک آتشیں لکیر میری گن سے لا۔ وہ بھٹی ہو کر مجھ سے محض چار انچ کے فاصلے پر دھپ سے گرا۔ اشرف سے میں نے جس طرح اس گن کو چلانے اور اس کا میکنزم سمجھا تھا، اب میرے کام آ رہا تھا۔

میں گن سنبھالے تیزی سے اس عمارت کی جنوبی دیوار کی سمت لپکا جس کی چھت پر اول خیر چٹان سے چھوڑ رہا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ اب صرف اپنے دفاع کی پوزیشن میں تھا، حملہ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ نیچے عمارت کے گرد کئی مسلح افراد اکٹھے ہو چکے تھے۔ میں جس دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا، یہ لڑکیوں کے ہال کمرے کی دیوار تھی۔ جنگ شاید کل اور وقت ... ہو چکی تھی۔ میرا اس وقت رواں رواں طرح جوش سے سنسنا رہا تھا۔ رگوں میں دوڑتا لہو ... کسی لاوے کی طرح جھلس رہا تھا۔ یکا یک سوچ کر میں نے ان تینوں حواریوں کی پیش قدمی پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور ہال کمرے کی چھت پر چڑھنے سے پہلے میں نے فاضل میگزین بھی حواریوں کے بے سدھ وجود سے حاصل کر لیے تھے۔

چھت پر آتے ہی میں نے پوزیشن بنالی۔ چھت کے گرد ... فٹ کی چار دیواری تھی۔ بالکل سامنے مجھے مختصری عمارت کے کمرے کی چھت نظر آ رہی تھی، جہاں اول خیر اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا۔ اچانک میں نے دیکھا۔ چند افراد سیڑھی کے ذریعے چھت کی جانب بڑھ رہے تھے، جس سمت میں چھت پر پہنچا تھا۔ جبکہ اول خیر بے خبر تھا کہ اس ے عقب میں موت نے سیڑھی اس تک پہنچا ڈالی تھی۔

میں نے وہیں سے ان کا نشانہ لیا۔ اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کی مہیب تڑتڑاہٹ ابھری۔ جانے میرا نشانہ ٹھیک بھی لگا تھا یا نہیں، البتہ دیوار سے لگی کھڑی لکڑی کی سیڑھی ضرور ہل گئی تھی۔ ایک لمحے کو یہ ہوا کہ سیڑھی پر موجود افراد کا توازن بگڑ گیا اور پھر وہ سیڑھی سمیت نیچے آ رہے۔ ... وہ یہ ہوا کہ اول خیر کو اندازہ ہو گیا کہ ساتھ والی چھت پر اس کا ہمدرد کمک میں موجود تھا۔ مگر اس فائر کے ... مجھ پر بھی دھنا دھن گولیاں برسائی جانے لگیں۔ مگر ... دیکھا نہ تھا... خود کو نہ صرف نیچے جھکا لیا بلکہ ... فائرنگ سے گھبرا کر میں نے خود کو چھت کے فرش پر لیا۔ شائیں شائیں کی سنسناتی آوازوں سے میرا سانس لتا گیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ جس دیوار کو تھوڑی دیر پہلے میں مورچہ بنائے ہوئے تھا وہ دیوار ہی اڑ گئی تھی، اور لیٹے لیٹے بھی مجھے دوسری چھت اور اس پر پوزیشن سنبھالے بیٹھا اول خیر بھی صاف نظر آ گیا۔ غالباً اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور ہاتھ کا کوئی مخصوص اشارہ بھی مجھے کر رہا تھا۔ مجھے یہی سمجھ میں آ سکا تھا کہ وہ مجھے یا تو مزید فائرنگ سے روکنا چاہتا تھا یا پھر نیچے چھت سے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ تاہم میں نے اس کے اشارے کی پروا کیے بغیر تھوڑا سا آگے سرک کر نیچے کا منظر دیکھا۔ نصف سے زائد مسلح افراد میری سمت دوڑ رہے تھے۔ وہ نیچے میرے گرد گھیرا ڈالنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ مجھے بے دریغ فائرنگ کا سامنا کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا، شاید یہی وجہ تھی کہ بے چارہ اول خیر میری اس حرکت سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا اور مجھے پلٹنے کا اشارہ کیے جا رہا تھا۔

میں نے چھت کا جائزہ لیا۔ یہ چھت جتنی تھوڑی تھی، اتنی کمزور بھی۔ ... یہاں رہتے ہوئے میں خود کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ میرے دل میں اور تو کچھ نہیں آیا، البتہ تیزی کے ساتھ جھکے ہوئے انداز میں اسی طرف آ گیا، جہاں سے میں اوپر پہنچا تھا۔ یعنی یہاں وہی چوبی سیڑھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے تھوڑا سر ابھار کر نیچے جھانکا۔ سر دست مجھے کوئی نظر نہ آیا تو میں نے جلدی سے سیڑھی کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے کھسکا دیا تاکہ کوئی اوپر نہ آ سکے۔

دفعتاً گولیوں کی گھن گرج ابھری۔ میں جیسے کے تیسے ٹھٹک گیا۔ سر گھما کر دوسری جانب دیکھا، اول خیر جوابی فائرنگ کر رہا تھا۔ پھر وہ تیزی کے ساتھ پیچھے کو پلٹا۔ میں قدرے محفوظ تھا مگر اول خیر خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ نیچے موجود مسلح افراد اس پر گولیاں داغ رہے تھے۔

اچانک ایک اور سمت سے مجھے ٹھہر ٹھہر کے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ بالکل مختلف یعنی تیسری سمت تھی۔ میں نے ذرا سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا جہاں مرکزی گیٹ تھا۔ وہاں افراتفری کا منظر نظر آیا اور ابھی اس سلسلے میں اندازے ہی قائم کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے بڑا سا مرکزی لوہے کا گیٹ ٹوٹ کر گرا۔ ایک بڑا ٹرک اندر داخل ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے دو تین جیپ نما گاڑیاں تھیں۔ ان میں مسلح لوگ سوار تھے اور بڑی بے رحمی سے گولیاں برساتے ہوئے ادھر موجود افراد کو نشانہ بنا رہے تھے۔ ذہن میں پہلا ابھرنے والا میرا خیال تھا کہ یہ لوگ اول خیر کے ساتھی تھے، گویا جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔

مجھے یہ سب کچھ کسی تاریخی فلم کا منظر ہی لگتا تھا جس میں ایک بادشاہ کی شکست کو کچھ لمحے کی دیر تھی اور دشمن اس کے قلعے کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

یہ "اطفال گھر" جو کبھی لاوارث، یا والدین اور معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے معصوم بچوں کی محفوظ پناہ گاہ ہوا کرتا تھا، کبھی اس طرح خونی جنگ کا منظر بھی پیش کرسکتا تھا، اس کا میں نے سوچا تو در کنار کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس وقت یہ سوچ کر میرا دل دکھ سے بھرنے لگا کہ شاید اب اس اطفال گھر کا وجود ہی نہیں، اس کی کہانی بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہونے والی تھی۔ نہ جانے اب کون ان معصوم بچوں کا پالن ہار بنے گا؟ یہ بچے اب کہاں جائیں گے۔ جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم اور لاوارث کہلاتے تھے۔

میری طرف بڑھنے والے حواریوں کو اب اس نئی صورتِ حال کے باعث اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے اور وہ سب تتر بتر ہو گئے تھے میں نے ٹہنیوں پر پاؤں ٹکا کر خود کو واپس زمین پہ اتارا اور اس عمارت کی طرف پیش قدمی کی جہاں اول خیر بھی اس طرح کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے نیچے اتر چکا تھا۔

میں اول خیر سے ملنے کو بے چین تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ گگل خان مرنے نہ پائے۔ کیونکہ مجھے اس سے عابدہ اور شکیلہ سمیت ان پانچوں بدنصیب لڑکیوں کا پتا چلانا تھا جنہیں وہ خبیث نہ جانے کہاں غائب کرچکا تھا۔

"او... خیر... کاکا اچھا مارا ہے تو نے چھوٹا آہستہ... ابھی کیا ہے تو... بیچ کس ہے۔ پتا کل تجھے میں بتاؤں گا۔"

مجھ سے ملتے ہی وہ اپنی بولی میں نہ جانے کیا کہتا چلا گیا۔ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اپنے ساتھیوں سے کہو گگل خان کو جان سے نہ ماریں۔"

وہ درمیان میں بول پڑا۔ "وہ جانتے ہیں اپنا کام تو فکر نہ کر۔ بس اب نکلنے کی تیاری کر۔ آ... میرے ساتھ... ذرا گگل خان سے دو دو ہاتھ کر لیتے ہیں۔"

ہم دونوں گگل خان کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ اول خیر کے جنگی گروپ نے یہاں آکر تہلکہ مچا دیا تھا۔ گگل خان کے حواری اب اپنی جانیں بچانے کی فکر میں تھے۔ شوکت حسین میری ہدایت پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ اس نے سارے چھوٹی بڑی عمر کے قیدیوں کو اپنے اپنے کمروں تک محدود اور محفوظ کر رکھا تھا۔ اول خیر کے ساتھیوں کی ایک جیپ تیزی سے ان کے قریب آئی۔

"چھوڑ دے استاد! وہ حرامی کا بچہ گگل خان اپنی کار فرار ہوگیا۔" جیپ میں سوار چار پانچ افراد میں سے ایک اسے بتایا تو میرا دماغ گگل خان کے فرار پر تپ کر رہ گیا

"کس طرف گیا ہے وہ؟" اول خیر نے پوچھا۔

"نکو اور حمزہ اس کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔" دوسرے ساتھی نے بتایا۔ "ماما پور والی روڈ پہ گیا ہے وہ۔"

"سب اترو جیپ سے جلدی۔" ساتھ اول خیر نے حکم کیا۔ وہ سب فوراً حکم کی تعمیل میں چھلانگیں مار کے نیچے اتر

"چل کاکا! سوار ہوجا۔" اول خیر نے جیپ اسٹیئرنگ سنبھال لیا اور میں نے اس کے برابر والی سیٹ

تھوڑی دیر بعد جب ہم اطفال گھر کے ٹوٹے ہو مرکزی گیٹ سے نکلے تو اچانک پولیس سائرن کی تیز ہماری سماعتوں سے ٹکرائی۔ سامنے سے پولیس کی موبائل گاڑیاں ہمارے راستے کے عین سامنے سے چلی آرہی تھیں۔ ان کا رخ ہماری طرف تھا۔ میں نے دیکھ اول خیر کے چہرے پہ پہلی بار پریشانی اور تشویش کے آ نمودار ہوئے اور میں سوچنے لگا۔ اول خیر بھی گگل خ گروپ کی طرح چھپا جرائم کی دنیا سے تعلق رکھتا تھا۔ اس پکڑے جانے کا مطلب تھا ہمیں ایک مجرم کے ساتھی طور پہ گردانا جاتا۔ مجھے اب اپنی پریشانی لگ گئی۔

"لے کاکے! اسٹیل، سیٹ پہ مضبوطی کے ساتھ ہوجا۔ ورنہ لمبے رولے (پریشانی) میں پڑ جائیں گے" اول خیر نے کہا اور پھر بڑی پھرتی کے ساتھ اسٹیئرنگ کا جیپ دائیں جانب ایک خشک نالے میں اتر گئی۔ ت سے پولیس نے ہم پر فائر کھول دیا۔

"کاکے! نیچے جھک جا" اول خیر چلایا اور میں نے ہی کیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے سماعت میں دھماکے کی ابھری۔ کوئی چلی ہوئی گولی جیپ کے کسی ٹائر کو برسٹ تھی۔ جیپ اس وقت خشک نالے کی ڈھلان اتر رہی ٹائر برسٹ ہونے کی صورت میں الٹ گئی۔ اول خیر کا پتا نہ چلا البتہ میں جیپ سے اچھل کر خشک نالے کی زمین پہ جا پڑا۔ میرے اردگرد آناً فاناً پولیس کی نفری ہوچکی تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے
جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

موقع شناس

سلیم انور

دیانت داری سے دوستی نبھانے کی ریت بھی بدل چکی ہے... بعض اوقات جنہیں ہم اپنے مخلص اور محبت کرنے والے دوست سمجھتے ہیں... وہ دراصل مفادات کی تلاش میں چھپے موقع پرست... فریب کار ہوتے ہیں... مغرب کی گہما گہمیوں میں گم کردینے والے لوازمات سے بھرپور کہانی... ہر چہرے کے پیچھے ایک نیا چہرہ، نئی کہانی تھی۔

چابک دستی اور ہوشیاری سے کھیل گئی بازی کا چونکا دینے والا اختتام

وہ چوبیس پچیس سال دراز قامت دبلی پتلی عورت تھی۔ اس نے اپنی ہم عمر دو خواتین کو بار کے آخر میں بیٹھے ہوئے تاڑ لیا تھا جو دیکھنے میں دولت مند لگ رہی تھیں۔ اس نے اپنی مارٹینی کا گلاس اٹھایا اور ٹہلتے ہوئے ان کے برابر جا بیٹھی۔ "کیا آپ خواتین کو دوستوں کی تلاش ہے؟"

وہ دونوں خواتین میری اور سلویا تھیں جنہوں نے اس نائٹ کلب کے فیشنی ہونے کے باوجود بے موقع دیدہ زیب لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

قسط :2

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا

ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

میری سانس بُری طرح پھولی ہوئی تھی، خشک نالے کی بھُربھُری مٹی کا غبار ناک اور منہ کے راستے داخل ہو کر شدید گھٹن کا باعث بن رہا تھا۔ ہماری جیپ ایک طرف الٹی پڑی تھی، اس کے چاروں پہیے گھوم رہے تھے۔ میرے حواس قدرے بحال ہوئے۔ آٹھ دس پولیس والے میرے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے، دو نے مجھے بے دردی سے دبوچ کر کھڑا کر دیا تھا۔

اطفال گھر میں اپنا بچپن اور جوانی گزارتے کے دوران میں کبھی بھی ایسے حالات سے دو چار نہیں ہوا تھا، جس صورتِ حال سے اس وقت میں دو چار تھا۔ اطفال گھر میں ہر ہفتے دکھائی جانے والی سبق آموز فلموں میں' میں نے پولیس کا مثبت اور منفی دونوں کردار دیکھے تھے۔ کسی مجرم کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے تھے، قانون کی گرفت میں آنے کے بعد مجرم کو عمر قید اور پھانسی تک کی سزا بھی ہوتے دیکھی تھی، بے گناہ بھی پکڑے جاتے تھے۔ جیل کا ماحول بھی

دکھایا جاتا تھا، یہی وہ سارے عوامل تھے، جنہوں نے میرے اندر پولیس کا ایک خوفناک تاثر قائم کر رکھا تھا اور اب یہی خوف میرے دل ودماغ پر بھی مسلط تھا۔ کیونکہ میرا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے نالے سے باہر لے آئے۔ موبائل کے قریب ایک خرانٹ پولیس والا اپنی وردی اور دبدبے کے باعث... مجھے غصہ ور انسپکٹر ہی نظر آرہا تھا۔ عام پولیس والوں کی وردی کے مقابلے میں اس کی وردی پر کچھ اضافی قسم کے ستارے نظر آرہے تھے، ہولسٹر میں ریوالور اڑسا ہوا تھا۔ توند بھی کچھ باہر کو ابھری ہوئی تھی۔

"بٹھاؤ اسے گاڑی میں۔" ایک خونخوار سی نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد اس نے اپنے ماتحت کو حکم دیا۔ پھر مجھے ہتھکڑیاں ڈال کر موبائل کے پچھلے حصے میں سوار کرا دیا۔ موبائل اسٹارٹ ہو کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں ان پولیس والوں سے اپنی صفائی میں کیا بات کروں؟ ساتھ ہی مجھے اول خیر کا خیال آیا جو نہ جانے کب جیپ سے فرار ہو گیا تھا۔ شاید اس کے تجربے نے اسے بچا لیا تھا جبکہ میں ناتجربہ کاری کے باعث مار کھا گیا۔ پولیس کے چھاپے کے حوالے سے میرا دھیان سرمد بابا کی طرف بھی گیا۔

حالات کی "جھپکا جھپکی" کے بعد میرے حواس مرحلہ وار سنبھل رہے تھے، یہ خیال میرے لیے طمانیت بخش تھا کہ ضرور پولیس نے سرمد بابا کے ایما پر یہ کارروائی کی ہوگی اور اب وہی میری گلوخلاصی کا موجب بن کر پولیس والوں کی غلط فہمی کا ازالہ بھی کرتے کہ میں بے گناہ تھا۔ نہ ہی ان مجرموں کا ساتھی تھا جنہوں نے حاجی اسحاق کے مرنے کے بعد پورے اطفال گھر کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ کچھ میری عقل نے بھی کام کرنا شروع کیا تو فوراً ہی ایک تشویش ناک خدشہ ابھرا کہ پولیس کے ہوتے ہوئے فرار کی کوشش بے گناہ کو بھی مجرم بنا ڈالتی ہے، شاید یہی میرے ساتھ ہوا تھا۔ تو پھر اس کا مطلب تھا کہ اول خیر کا پولیس کے ہتھے نہ چڑھنا میرے لیے تقدیر کی ایک خوش کن مصلحت تھی اس لیے میں نے اول خیر کے سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔

میں اب ایک جہنم سے باہر تھا مگر ہائے ری قسمت... باہر آ کر بھی میرے نصیب میں قید ہی لکھی تھی۔

پولیس موبائل شہر کی بھری پری اور شور مچاتی ٹریفک سے لبریز سڑکوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک مقام پر رک گئی۔ مجھے نیچے اتارا گیا۔ یہ ایک تھانے کا وسیع وعریض احاطہ تھا۔ وہاں مجھے دو تین اور گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں اور ان میں سے بھی کچھ ہتھکڑی لگے آدمیوں کو اتارا جا رہا تھا۔ میں بغور ان کے چہرے دیکھ کر ان چہروں کو تلاشتا رہا جن کی گرفتاری کی مجھے توقع تھی۔ یعنی گگل خان اور اس کے خونخوار ساتھی۔ مگر یہ چہرے میرے لیے غیر شناسا ہی ثابت ہوئے۔

مجھے سلاخ دار کوٹھری میں ڈال دیا گیا جس کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں پہلے ہی سے چار پانچ قیدی موجود تھے۔ وہ سب لوگ چہروں سے خرانٹ اور پہنچے ہوئے بدمعاش ہی نظر آرہے تھے۔ جن کی آنکھوں سے وحشت سی ٹپک رہی تھی۔ مجھے ان کے درمیان نجانے کیوں ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ کوٹھری کے باہر راہداری میں آتے جاتے پولیس والوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ مجھے اس سارے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی، ہول سا آرہا تھا۔

"اوئے لمڈے؟ تو کون ہے؟ اور کہاں سے پولیس کے ہتھے چڑھا ہے؟" دفعتاً ایک پاٹ دار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی، میں ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ چار، پانچ چہروں میں بولنے والے کا چہرہ تلاشنے کے لیے ہونق سا بن گیا۔

"کچا دانہ لگتا ہے۔ کہیں یہ سالا وہ لمڈے باز تو نہیں۔" ایک اور نے میری جانب تکتے ہوئے گھٹیا قسم کا تبصرہ کیا۔

"ابے بولتا کیوں نہیں، زبان تالو سے چپکی ہوئی ہے کیا؟" تیسرے نے بھی اپنی بھاری آواز کے زور پر جیسے مجھے جھنجوڑا۔

"مجھے اطفال گھر سے پکڑ کر لائی ہے پولیس۔" بالآخر میں نے بتایا۔ دل ودماغ اور حواسوں کی عجیب کیفیات ہونے کے باعث مجھے اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔

"اطفال گھر سے؟" ایک آدمی کے منہ سے نکلا اور سب کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ پھر پہلی آواز والا مخاطب ہوا۔ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آگیا اور اپنی وحشت ناک نظروں سے مجھے گھور کر بولا۔

"کیا تو... گگل خان کا ساتھی ہے؟"

"نن... نہیں۔ ساتھی تو نہیں ہوں... مگر اس کی قید میں ضرور تھا۔" میں نے جواب دیا۔ خود کو میں نے سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

دوسرا مخاطب بھی میرے قریب آ کر بولا۔ "کاکا۔ تجھے پولیس نے کیوں پکڑا؟" اس کے لہجے میں چوٹ عیاں تھی۔

"میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی، پولیس نے مجھے مجرموں کا ساتھی سمجھ کر دھر لیا۔" میں نے بتایا۔

"اس لمڈے سے اپنے چھوٹے استاد کا پوچھ۔" تیسرے نے لقمہ دیا۔ اور "چھوٹے استاد" کے ذکر پر میں چونک گیا۔ کیونکہ معرکے کے دوران، اول خیر کے ایک ساتھی نے اسے چھوٹے استاد کہہ کر ہی پکارا تھا۔ تو کیا یہ لوگ اول خیر کے ساتھی تھے؟

"اوئے، ایک بات بتا۔" پہلے والے نے اس بار دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "تجھے معلوم ہوگا، گگل خان نے اپنے اڈے (اطفال گھر) میں کسی آدمی کو قید کیا ہوا تھا؟" اس کے سوال پر میرے ذہن نے جھٹکا کھایا۔ بلاشبہ اس کا سوال اول خیر کے حوالے سے تھا۔ میں نے جواب دینے کے بجائے اس سے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

"کیا تم اول خیر کے ساتھی ہو؟"

میرے اس سوال پر جیسے بارہ بائی بارہ کی اس کوٹھری میں سماعت شکن بم پھٹ پڑا۔ وہ سب میرے منہ سے اول خیر کا نام سن کر چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے اور میرے گرد گھیرا ڈال لیا۔

"ہاں! ہم اسی کی بات کر رہے ہیں۔ وہ ہمارا چھوٹا استاد ہے بتا وہ کہاں ہے؟"

اول خیر کے حوالے سے خطرناک صورت نظر آنے والوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر میری ہمت سوا ہونے لگی اور میں بولا۔ "مجھے اول خیر کی نگرانی پر مامور کیا گیا تھا۔"

"تیری یہ جرأت۔" ان میں سے ایک آدمی بپھر پڑا اور خونخوار غراہٹ کے ساتھ میرا گریبان پکڑ لیا۔ وہ میرے قد کے برابر لمبا تھا۔ میں گھبرا سا گیا مگر پہلے والے نے فوراً اپنے ساتھی کے ہاتھ سے میرا گریبان چھڑوا دیا اور بولا۔

"آنکھوں کے اندھوں کچھ تو عقل سے کام لو۔ اس گگل خان نے سب لڑکوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔"

تسلی ہوتے ہی کہ یہ لوگ اول خیر کے آدمی تھے، میں نے انہیں دھیمے لہجے میں ساری تفصیل سنا ڈالی۔

آخر یہ جملہ میرے منہ سے ادا ہونے کے بعد کہ گرفتاری کے عین وقت اول خیر نجانے کدھر غائب ہو گیا... جس کا شاید پولیس والوں کو بھی علم نہ ہو سکا... اور وہ مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئی تو پہلے والے آدمی نے یکدم میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور مرتعش آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ "خبردار! یہ بات انسپکٹر روشن خان کو نہیں پتا چلنی چاہیے۔"

میں نے ہولے سے اثبات میں... سر ہلا دیا۔ جس شخص نے مجھے گریبان سے پکڑا تھا، عقیدت سے اس نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ میرے لیے اب ان کی آنکھوں میں بڑی عقیدت اور احترام والے تاثرات امڈ آئے تھے۔ ایک بے حیثیت اور کمزور سے نظر آنے والے لڑکے نے چار پانچ منجھے ہوئے خرانٹ صورت جرائم پیشہ افراد کے سامنے میری ایک دم ہی کایا پلٹ دی تھی۔ پتا نہیں اس بات پر مجھے فخر یا خوشی محسوس کرنی چاہیے تھی یا نہیں، تاہم میں خاموش رہا۔ پہلے والے آدمی نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دھیمی آواز میں کچھ کھسر پھسر کی اس کے بعد وہ سب اِدھر اُدھر ہو کر زمین پر دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گئے۔ ان کے بشروں سے میرے لیے بھی ایک مرعوبیت جھلکنے لگی تھی۔ میری بات پر یقین کرنے کا ان کے پاس ٹھوس جواز تھا، ورنہ یہ اتنی آسانی سے یقین کرنے والے کہاں تھے۔ پہلا والا ساتھی، شاید اب اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کے ایک کونے میں لے گیا اور مجھے اپنے ساتھ لے کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"سن! ذرا غور سے میری بات سننا۔" وہ عجیب دھیمے اور اسرار بھرے لہجے میں بولا۔

"پہلے اپنا نام تو بتا؟"

"شہزاد احمد خان۔ عرف شہزی۔" میں نے اپنا نام مع عرفیت کے اسے بتایا... اس نے کہنا شروع کیا۔

"تو اتنی بڑی بات جھوٹ بھی نہیں کہہ سکتا... چھوٹا استاد فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے تو وہ جلد ہم سے یا بڑے استاد سے رابطہ کرے گا اور تو نہیں جانتا اپنے چھوٹے استاد کو، وہ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن ہے۔ لیکن جو آڑے اور مشکل وقت میں اس کے کام آ کر اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے... تو سمجھ اس نے چھوٹے استاد کو خرید لیا۔ اور یہی کام تو نے کیا ہے۔ اب تیری مدد اور خاطری ہمارے ذمے واجب ہو چکی ہے۔ اس کے لیے چھوٹے استاد کے سامنے باقاعدہ جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اس معاملے میں استاد اپنے ساتھی کی بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتا۔"

وہ ذرا رکا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ اب مجھ سے کوئی اہم بات کرنے والا ہو۔ میں بھی کچھ بولے بغیر ہمہ تن گوش رہا۔ وہ آگے بولا۔

"دیکھ یہ... جو ہے نا... انسپکٹر روشن خان (ایک

تندی گالی)۔۔۔ اسے ہم جانتے ہیں۔۔۔ تو نہیں۔۔۔ یہ نسلِ خنزیر۔۔۔ گنگل خان سے ملا ہوا ہے۔ وہ بہت جلد اس خنزیر انسپکٹر کو اس بات سے آگاہ کردے گا کہ چھوٹا استاد (اول خیر) تیرے ساتھ تھا اور تیرے ساتھ ہی فرار۔۔۔"

"مگر ایسا نہیں ہے۔" میں نے فوراً اس کی تصحیح کی۔ البتہ میں اس کی اس بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا کہ انسپکٹر، گنگل خان والوں سے ملا ہوا ہے۔

"کیا مطلب ہے تیرا اس بات سے؟" اس نے بھویں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ میں بولا۔

"جب تم لوگوں نے حملہ کیا تھا تو۔۔۔ گنگل خان پسپا ہوکر پولیس کے آنے سے پہلے ہی باٹا پور والی روڈ کی طرف کار لے کر فرار ہوچکا تھا۔ یہ بات تمہارے ہی ایک ساتھی نے اول خیر کو بتائی تھی۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے لیکن گنگل خان سمیت اس کے آدمی کو تو یہ حقیقت معلوم ہی ہے ناں کہ چھوٹا استاد قیدی مدد سے فرار ہوا ہے۔" وہ بولا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسپکٹر روشن خان کو مطلع کیا جائے گا اس سلسلے میں اور پھر وہ کمینہ تیرے دوالے پیچھے پڑ جائے گا۔ وہ تجھ پر تشدد بھی کرسکتا ہے۔۔۔ ہمیں تو یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں وہ نسلِ خنزیر۔۔۔ تجھے۔۔۔ پکڑ کر دوبارہ گنگل خان والوں کے حوالے نہ کردے۔"

اس کی آخری خدشہ دلانے والی بات پر میرے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی۔ کیونکہ اس ساری صورتِ حالات کے بعد میرا ایک بار پھر گنگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں کے ہتھے چڑھنا جان لیوا حد تک خطرناک ہوسکتا تھا۔ کیونکہ میں ان کی بربریت کو ایک بار سہہ چکا تھا۔ میں پھر سے اندیشوں اور خدشات میں گھر گیا کہ شاید میرا مشن ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔۔۔ وہاں سے کوئی بھی قیدی آزاد نہیں ہوسکا تھا، شوکی اور ثریا وغیرہ کی حسرت آمیز صورتیں میرے چشمِ تصور میں گھوم گئیں اور میں بے چین سا ہوگیا۔

"۔۔۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔۔۔ میں تو سمجھا تھا کہ پولیس نے یقیناً سرمد بابا کی نشاندہی پر چھاپا مارا تھا اور وہ ہماری مدد کرنے آئی تھی؟"

"تمہارے سرمد بابا نے اس سلسلے میں کچھ کیا ہو۔۔۔ یا نہیں۔۔۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ۔۔۔ پولیس تمہاری نہیں بلکہ گنگل خان والوں کی مدد کی غرض سے آئی تھی۔ تم دیکھ نہیں رہے۔ یہاں ہم لوگوں کے سوا گنگل خان کا کوئی ساتھی۔۔۔ قید میں نظر نہیں آرہا۔"

اس کے اس انکشاف پر میں اندر سے ہل گیا۔ اس آدمی کی یہ ساری باتیں جو کہ قیاسات پر مبنی تھیں، اگر درست تھیں۔ تو اس کا مطلب تھا کہ میں آسمان سے گر کر کھجور میں آن اٹکا تھا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر سرمد بابا نے اس سلسلے میں کیا کیا تھا۔

کیا انہوں نے ابھی تک میرا وہ خفیہ ایس ایم ایس پڑھا نہیں تھا، یا پھر وہ کسی وجہ سے پڑھے بغیر ان کے سیل فون سے زائل ہوگیا تھا یا پھر۔۔۔ اس سلسلے میں میرا دماغ گھوم کر چکر سا ہوگیا۔

"تو ادھر ہی بیٹھا رہ۔۔۔ میں اپنے ساتھیوں سے بات کرکے آتا ہوں۔۔۔" معاً اس آدمی نے کہا تو فوراً ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے پیشِ نظر میں نے کہا۔

"ٹھہرو۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ارشد۔۔۔"

"اگر تمہاری یہ بات درست بھی ہو کہ پولیس درحقیقت، گنگل خان کے آدمیوں کو سپورٹ کرنے آئی تھی تو پھر گنگل خان کو فرار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اور سرمد بابا کو میرا کیا ہوا خفیہ میسیج ضائع چلا گیا؟ میں تو اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ۔۔۔"

"اوے کاکا ابھی یہ سب باتیں چھوڑ۔ وقت کے ساتھ تجھے سمجھ میں آجائیں گی، پہلے ابھی کی فکر کر۔۔۔" ارشد نے میری بات کاٹی۔ "تو نہیں جانتا۔۔۔ ہم سے زیادہ تو تو خطرے میں ہے اس وقت۔ ہمیں تو اب خود سے زیادہ تیری فکر ستانے لگی ہے۔ ٹھہر، میں آتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ جو ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے، ارشد مجھے ایک بار پھر تشویش میں ڈال گیا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ سلاخ دار دروازے پر ایک سنتری نے ڈنڈا بجایا۔ مخاطب میں ہی تھا۔

"اوے۔۔۔ لڑکے، چل باہر نکل۔۔۔" میں اٹھ کھڑا ہوا تو میرے ساتھ ارشد کے ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے سنتری سے پوچھا۔ "اس لڑکے کو کدھر لے جانا چاہتے ہو؟"

"تم اپنے کام سے مطلب رکھو۔۔۔ ہٹو آگے سے۔۔۔ آنے دو لڑکے کو۔" اس کے ساتھ کھڑے دوسرے سنتری نے درشت آواز میں کہا۔ تو فوراً ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا۔ میں نے حالات کو تجزیہ کرتے ہوئے فوراً کہا۔

"میرے ساتھ اپنا کوئی تعلق ظاہر مت کرنا۔ ایسا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے جو انسپکٹر کو شک میں مبتلا کردے گا۔"

یہ کہتا ہوا میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ارشد کو شاید میری بات سمجھ میں آگئی۔ اس نے بھی تحمل مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور بات بدلنے کی غرض سے معنی خیز انداز میں سنتری سے بولا۔

"سنتری بادشاؤ! یہ لڑکا بڑی اچھی چپی کرتا ہے۔ خدمت شدمت کے لیے یہ اچھا تھا کہ ہمارے پاس ہی رہتا۔ کہیں دوسری بیرک میں تو اس کو نہیں رکھنے کا ارادہ ہے؟"

سنتری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ مجھے تسلی تھی کہ ارشد نے میرے بروقت ہوشیار کرنے پر عقل مندی کا ثبوت دیا ہے۔ سنتری مجھے لے کر سیدھا انسپکٹر کے کمرے میں پہنچا۔

انسپکٹر روشن خان اپنی گھومنے والی کرسی میں دھنسا مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی تیز نظریں جیسے میرے چہرے میں کچھ کھوج رہی تھیں۔ اس نے دونوں سنتریوں کو جانے کا اشارہ کرنے کے ساتھ یہ حکم بھی دیا کہ بغیر اجازت کوئی اندر داخل نہ ہو۔

ان کے جانے کے بعد اس نے اپنی بڑی سی میز پر ایک سیاہ موٹے رول کو اٹھایا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس کی میز کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ وہ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ انسپکٹر کا ایک جملہ بڑی آسانی سے ارشد کے انکشافات کی تائید و تردید کرنے والا تھا۔

"اول خیر کو جانتا ہے؟" سانپ کی پھنکار سے مشابہ سنسنی پھیلاتی آواز میری [illegible]۔۔۔ سماعتوں میں اُتری۔

"جی۔۔۔ انسپکٹر صاحب! جانتا ہوں۔" بہ سرعت کام کرتے ذہن نے مجھے یہی جواب اگلنے پر مجبور کیا تھا۔

"کب سے جانتا ہے؟" دوسری بار پھنکار سے مشابہ آواز ابھری۔

"یہی کوئی دس بارہ دنوں سے۔"

"دس بارہ دنوں سے یا دس بارہ مہینوں سے؟"

"میں سمجھا نہیں۔۔۔ انسپکٹر صاحب؟" میں نے الجھ کر کہا۔

"پھٹاک" کی زوردار آواز سے اس نے میز پر اپنا موٹا سیاہ رول مارا اور میں لمحے بھر کو کپکپا گیا۔ یہ میرا فطری ردِعمل تھا۔

"میں نے فارسی نہیں بولی۔ جو تیری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"صاحب جی! میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ جو سچ تھا وہ میں نے بتادیا۔ ورنہ میں یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ میں اول خیر کو نہیں جانتا۔"

بظاہر سیدھے سادے انداز میں میرے جواب میں چھپی ہوشیاری کو انسپکٹر روشن خان نہیں سمجھ پایا تھا، لہذا اس نے اگلا سوال کیا۔

"وہ تیرے ساتھ فرار ہوا تھا؟"

"فرار۔۔۔" میں نے الجھنے کی اداکاری کی۔ "میں تو لڑائی جھگڑے سے گھبرا کر بھاگا تھا۔ بڑی زبردست مارا ماری ہورہی تھی صاحب جی۔ شاید اول خیر کے ساتھیوں کے گروپ نے اطفال گھر پر حملہ کردیا تھا۔ گنگل خان کے آدمی اسے اغوا کرکے جو لائے تھے۔ اس کی نگرانی میرے سپرد کی گئی تھی مجھے اپنی جان کا خوف کھائے جارہا تھا، کیا کرتا۔"

"ہوں۔۔۔"

"مجھے اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔" وہ خوں ناک انداز میں بولا۔ اور میں اندر سے کھٹک گیا۔ شاید اس بدبخت نے میری کوئی غلطی پکڑ لی تھی۔

"تیرے ساتھ جیپ میں اول خیر بھی تھا؟"

"صاحب جی! یہ میں نے آپ سے کب کہا کہ فرار ہوتے وقت اول خیر میرے ساتھ نہیں تھا۔" جو غلطی انسپکٹر نے میری پکڑی تھی اس کا فوری طور پر مجھے بھی احساس ہوگیا تھا کیونکہ مجھے گاڑی چلانا نہیں آتی تھی۔۔۔ اگر میں اسے یہ بتانے سے انکار کردیتا تو پھر انسپکٹر کا اگلا سوال یہ ہوتا کہ کیا مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔ صورتِ حال گمبھیر تھی جو مجھے از خود سچ اگلنے پر مجبور کررہی تھی اور ارشد کی ساری نصیحتیں محتاط رہنے کی تدبیریں الٹی ہورہی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے تیرے ساتھ اس وقت جیپ میں اول خیر بھی تھا۔"

"جی صاحب! بھلا مجھے جیپ چلانی کب آتی ہے۔ ڈرائیونگ وہی کررہا تھا۔ کیا وہ بھی پکڑا گیا ہے؟" میں نے ہونق ہوکر پوچھا۔

"یا تو تو بہت سیدھا سادہ بن رہا ہے یا پھر تو بہت زیادہ چالاک اور ہوشیار ہے۔" بالآخر انسپکٹر روشن نے غصیلے انداز میں ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ شاید میرے سیدھے سادے لہجے نے اسے اندر سے واقعی چکرا کر رکھ دیا تھا۔

"تو نے اس وقت کیوں نہیں بتایا ہمیں کہ اول خیر بھی تیرے ساتھ تھا؟" انسپکٹر نے اگلا سوال داغا۔

ارشد کی باتوں کی روشنی میں اور انسپکٹر کے سوالوں

www.paksociety.com

نے مجھ پر یہ آشکارا کر دیا تھا کہ پولیس کی وردی میں بظاہر یہ قانون کا رکھوالا گنگل خان والوں کا ''راتب خور'' تھا۔ اور یقیناً اس سلسلے میں اسے کسی نے بعد میں ''بریف'' کیا ہوگا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''سس... صاحب جی میں تو سمجھا تھا اول خیر بھی گرفتار ہو گیا ہوگا۔ مجھے تو خود اس وقت اپنا ہوش ہی کہاں تھا۔ جب ہماری جیپ خشک نالے میں الٹی تھی اس کے ساتھ میرا دماغ بھی الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ پھر قانون کے ہتھے چڑھنے پر تو میں مزید خوف زدہ ہو گیا تھا۔ لیکن صاحب جی! اگر اول خیر بھی مجرم تھا۔ تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو لڑائی کے دوران جیپ لے کر فرار ہو رہا تھا تو میں چھلانگ لگا کر اس میں سوار ہو گیا۔ وہاں اطفال گھر کے دیگر لڑکے اور بچے بھی خوف زدہ ہو کر جس کا جہاں منہ اٹھا بھاگ رہا تھا۔ بڑی خطرناک جنگ چھڑی تھی۔ صاحب جی مجھے تو ابھی تک ہول آ رہا ہے۔ مجھے آپ نے یقیناً آزاد کرنے کے لیے ہی بلایا ہے نا؟'' میں نے آخر میں بڑی لجاجت کے ساتھ اس سے کہا۔ میں نے دیکھا میری باتیں سن کر انسپکٹر روشن خان کے چہرے پر الجھن کے آثار تیرنے لگے تھے۔ ورنہ تھوڑی دیر پہلے اس کے خرانٹ چہرے پر جس قسم کے خونخوار تاثرات نظر آ رہے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے کسی بھی وقت بدترین تشدد کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اب بھی بلا سر سے ٹلی نہیں تھی۔

''ہوں...ں...ں''۔

چند لمحوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اس نے ایک گہری ہنکار بھری... نجانے کیوں اس کے بعد مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔ وہ ابھی مجھ سے مزید کچھ کہنے والا ہی تھا کہ اچانک اس کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔ اس نے کھڑے کھڑے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب سے غالباً شناسا سا آواز سنتے ہی اس کے چہرے کا سارا رعب کافور ہونے لگا۔ شاید دوسری جانب اس سے زیادہ بھاری شخصیت موجود تھی۔

''جی... جی... سر... نن... نہیں... پانچ ... ہی بندے پکڑے گئے ہیں۔'' اس کا لہجہ مؤدبانہ ہو گیا۔ میرے اندر دھکڑ پکڑ سی شروع ہو گئی۔

''بالکل نہیں... سر بالکل نہیں... اس نام کا تو کوئی نوجوان ہماری پکڑ میں نہیں آسکا... ایک نوجوان کو غلطی سے مجرموں کا ساتھی سمجھ کر پکڑ لیا تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ تو بے چارہ خود اطفال گھر سے تعلق رکھتا تھا... پھر کیا! ظاہر ہے اسے چھوڑنا پڑا۔ جی جی بالکل اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔'' اس نے بتایا اور اس دوران ریسیور کان سے لگائے ہوئے دزدیدہ نظروں سے میری جانب بھی دیکھا۔ میرے اندر جیسے کوئی پٹاخا چھوٹا۔ یہ کسی نوجوان کی بات کر رہا تھا؟ جسے اس نے چھوڑ دیا تھا؟ میرا دھیان اپنی طرف ہو گیا۔ ذہن میں اٹھنے والے اچانک ایک خوشگوار احساس سے میں نے اندازہ لگایا۔ شاید اس کے افسر کو پتا چل گیا تھا کہ مجرموں کے ٹولے کے ساتھ ایک بے گناہ نوجوان کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے وہ نوجوان میرے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ گویا اب یہ مجھے اس فون کے بعد فوری طور پر رہا کرنے والا تھا۔

''نہیں نہیں جی آپ زحمت نہ کریں آنے کی۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ میں بھی تھوڑی سی کاغذی کارروائی نمٹانے کے بعد ان پانچوں کو رہا کر دوں گا۔ آپ فکر نہ کرو جی۔''

انسپکٹر نے کہا اس کے بعد شاید دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ کیونکہ اس کے بعد انسپکٹر نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر رول ہاتھ میں پکڑے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ وہ مجھ سے اس طرح غافل ہو گیا کہ جیسے میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ پھر رول میز پر رکھا اور اپنی بھاری چیئر پر گر گیا۔ ریسیور اٹھا کر ایک نمبر ملایا مگر پھر خود ہی نمبر کاٹ دیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھنے کے بعد اس نے میز کی دراز سے سیل فون نکالا اور نمبر پنچ کرنے لگا، رابطہ ہوتے ہی بولا۔

''او چوہدری صاحب وہی ہوا جس کا آپ کو پہلے سے اندازہ تھا مگر آپ فکر نہ کریں یہ پانچوں ویسے بھی کام کے نہیں ہیں۔ ایک دانہ کام کا ہاتھ لگا ہے۔ اس کے بارے میں، میں نے صاحب کو ابھی کچھ نہیں بتایا... نہیں، چوہدری صاحب آپ بے فکر رہو۔ معاملہ ابھی میرے ہاتھ ہی تک رہے تو اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ آپ کیوں خود کو قانون کی نظروں میں لاتے ہو۔ دیکھ ہی رہے ہو آپ معاملہ دونوں طرف سے گھر کا ہے۔ ان کی بھی پہنچ اوپر تک ہے اور کہا ناں جی ابھی میں زیادہ تفصیل بیان کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں مگر آپ فکر نہ کریں۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ سیل میز پر رکھنے کے بعد اس نے ٹیبل بیل بجائی، وہی دونوں پولیس والے اندر آگئے۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ بولا۔ ''اس کو لاک اپ نمبر تین میں لے جا کر بند

کر دو۔''

''چلو اوئے آگے لگ۔'' انہوں نے مجھے دھکیلا۔

مجھے اس بار جس سلاخ دار کوٹھڑی میں رکھا تھا وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

اس امر پر مجھے تشویش آمیز حیرت ہونے لگی۔ پتا نہیں یہ کمبخت انسپکٹر روشن خان میرے ساتھ اب کیا کرنے والا تھا؟ نجانے وہ کس چوہدری کو کون سے کام کی تسلیاں دے رہا تھا؟ جہاں تک میرا ذہن کام کر رہا تھا، اس کے مطابق اول خیر کے ان پانچوں آدمیوں کی رہائی کے سلسلے میں کوئی تگڑی سفارش یا ضمانت دی جا چکی تھی — اب وہ سب چھوٹنے والے تھے مگر اس بات کی اطلاع سے انسپکٹر روشن خان اپنے سیل فون پر نجانے کس چوہدری کو باخبر کرتے ہوئے اسے تسلی بھی دے رہا تھا کہ جن پانچ آدمیوں کو وہ (شاید مجبوراً) رہا کرنے والا تھا، وہ کام کے نہیں تھے مگر جو کام کا تھا، اس انسپکٹر نے گول کر دیا تھا۔ جبکہ کسی چوہدری کو بتاتے وقت اس نے تسلی دی تھی کہ وہ اس کے قبضے میں تھا۔ اور وہی کام کا آدمی ہے، وہ کام کا آدمی کون تھا؟ میں؟ شاید اس کا جواب میرے پاس اثبات میں ہوتا، جس کے سبب مجھے اب علیحدہ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو پھر معاملہ میرے لیے میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر تھا۔ میں موجودہ حالات کے تناظر میں گہرائی تک سوچنے لگا۔

مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ میں تو اپنی رہائی کے لیے پُرامید تھا، وہ اب کھٹائی میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔ اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا اور کس قسم کا کام لیا جانے والا تھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ میں تن بہ تقدیر ہو کے اپنے حالات زندگی کے آئندہ آنے والے ان دنوں کا شمار کرتا... جو کتنے سہانے اور کتنے کڑے ہو سکتے تھے۔

دفعتاً ایک تشویش آمیز... سنسنی خیز لہر میرے وجود میں دوڑ گئی، ایک متوحش سا وسوسہ میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا تھا کہ کہیں میری چال الٹا میرے گلے کا پھندا تو نہیں بن گئی تھی؟ یعنی اگر میں انسپکٹر کے سامنے ان پانچوں قیدیوں کے بارے میں بتا دیتا تو شاید میں بھی چھوٹ جاتا۔

☆☆☆

ابھی مجھے اس نئی کوٹھری میں تھوڑی دیر ہی گزری ہوگی کہ اچانک مجھے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ میں فرش سے اٹھ کر سلاخ دار دروازے سے آن چپکا۔ میرے سامنے راہداری تھی۔ دائیں جانب اِکا دُکا اسٹور نما مختصر سے کمرے تھے۔ جن کے دروازے بند تھے۔ بائیں جانب کھلی راہداری تھی اور ایک حد تک ہی میں آگے تک دیکھ سکتا تھا۔ کچھ سادہ اور وردی پوش آدمی نظر آ رہے تھے۔ شور کچھ آدمیوں کا تھا۔ وردی پوش پولیس والے انہیں سنبھالنے اور دھکیلنے کی کوشش کر رہے تھے، شاید کچھ قیدیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ معاملہ کیا تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ اور چند گالی گلوچ کے الفاظ بھی سنائی دیے۔ قریباً دس بارہ منٹوں تک یہ شور ختم گیا۔

میں پلٹ کر دوبارہ ایک کونے میں فرش پر دیوار کے ساتھ پشت لگائے بیٹھا رہا۔ چند منٹ مزید بیت گئے تو میں نے راہداری میں اپنی کوٹھری کے قریب قدموں کی چاپ سنی یوں بھی میں خالی خالی نظروں سے اس طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ انسپکٹر روشن اور اس کے ہمراہ ایک سپاہی کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''ادھر آ اوئے۔'' اس کے ہمراہ سپاہی نے مجھے اٹھ کر آنے کا اشارہ کیا۔ میں قریب پہنچا۔ انسپکٹر روشن... خار کھائی نظروں سے میری طرف گھورے جا رہا تھا۔ پھر دفعتاً اس نے سلاخوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر میرا گریبان دبوچ لیا۔ اور مجھے اس زور سے جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا کہ درمیان میں حائل آہنی سلاخوں سے میری پیشانی ٹکرا گئی۔ میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی خارج ہوئی ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجنا گیا۔ اور آنکھوں کے سامنے کرمرے سے ناچنے لگے۔ اس حالت کے دوران میں ایک غراتی ہوئی بھیڑیے سے مشابہ آواز گالی کے ساتھ ابھری تھی۔

''اوئے۔ تو تو کہہ رہا تھا اول خیر اور اس کے گروپ سے تیرا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تو سب تیرے باپ نکلے۔'' انسپکٹر نے تندخو انداز میں کہا۔

دوبارہ حواس بحال ہونے تک میں نے یہ کریہہ الفاظ سنے اور اس تضحیک کے باعث میرا وجود انگارہ سا بننے لگا۔ آہنی سلاخوں سے پیشانی ٹکرانے کے باعث وہاں اینٹھن سی محسوس ہو رہی تھی۔ تاہم چوٹ قابلِ برداشت تھی۔

''میں نے صحیح کہا تھا انسپکٹر...'' میرے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی، وہ مجھے اجنبی سی لگی تھی، نجانے کیوں باپ والی بات نے مجھے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہی تو میری زندگی کا وہ ایک لفظ تھا جس نے ایک عرصے سے میرے اندر کسی بڑے طوفان کی آمد سے پہلے ایک اضطراری اور بے چین خاموشی کا سا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔

انسپکٹر نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شاید کچھ کرنے کے موڈ

میں آیا تھا۔ کیونکہ اس وقت مزید دو پولیس والے وہاں آن دھمکے۔ ان کے ہاتھ میں ہتھکڑی اور کپڑے کا ایک بڑا سا تھیلا تھا۔ پہلے والے سنتری نے لمبی سی چابی آہنی چوکھٹے کے اندر ڈال کے دروازہ کھولا، تینوں سنتری جارحانہ انداز میں اندر داخل ہوئے، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے قابو کر کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیے۔ اس کے بعد ہتھکڑی لگا دی گئی۔ اور دوسرے سنتری نے تھیلا میرے سر پہ ڈال دیا۔ اب میں دیکھنے سے قاصر تھا۔ بولتا بھی تو آواز گھٹی گھٹی سی برآمد ہوتی، مجھے باہر نکالا گیا۔۔۔ اور مختلف راستوں سے گزارنے کے بعد کسی گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔

کئی مخدوش خیالات میرے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگے، نجانے یہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ اور کیوں؟

”اطفال گھر“ میں دکھائی جانے والی سبق آموز فلموں میں پولیس کا مثبت کردار دکھایا جاتا تھا تو کچھ منفی پہلو بھی دکھائے جاتے تھے۔

ایک فلم میں، میں نے پولیس کا منفی و مثبت دونوں کردار دیکھے تھے، منفی کردار کے مطابق اس فلم میں ایک بے گناہ قیدی کو کس طرح پھنسایا جاتا ہے اور وقت پڑنے پر بے گناہ کو جعلی پولیس مقابلے میں قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ یا تھانے میں ہی زہر دے کر ہلاک کر دیا جاتا۔

میرے دل و دماغ پر یہاں بھی کچھ ایسے ہی خیالات کی یلغار تھی۔ نجانے یہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے؟ مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔ تھانے سے روانہ ہوتے ہوئے ایک بات اور میں نے محسوس کی تھی، پولیس موبائل کی سواری اور طرح کی تھی، اس بار مجھے ایک کار میں سوار کرایا گیا تھا۔ یہ یقیناً چھپے کی بات تھی۔ اب پتا نہیں یہ پولیس کار تھی یا پرائیویٹ۔ بہرحال نصف گھنٹے کی درمیانی رفتار کے ہموار سفر کے بعد کار اب نسبتاً ناہموار راستے پر گامزن تھی۔ جھٹکوں اور ہچکولوں سے ہی اندازہ ہوتا تھا، مگر آگے جا کر یہ راستہ بھی قدرے ہموار ہو گیا تھا۔ تاہم پائیدان پر میرے جمے ہوئے پیروں کی ترتراہٹ سے۔۔۔۔ اندازہ ہوا کہ یہ پختہ سڑک نہ تھی بلکہ کوئی کچا راستہ تھا۔ جسے سڑک کے طور پر ہموار کیا گیا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کار کسی مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ دروازے کھلے مجھے نیچے اتارا گیا۔ ایک سنتری کے سہارے چند قدم چلا پھر کھڑا کر دیا گیا۔ کسی بھاری دروازے کے کھلنے کی جھٹکے دار آواز سنائی دی، مجھے آگے دھکیلا گیا۔ اندر سناٹا محسوس ہوا۔ پھر شاید کسی کمرے میں مجھے لایا گیا تو یکدم میرے اوپر سے کپڑا ہٹا دیا گیا۔ سب سے پہلے میرے نتھنوں سے ایک تیز اور ناگوار سی بو ٹکرائی جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر ہی رہا کہ یہ کس کی ہو سکتی تھی۔

اب کھلی آنکھوں سے میں اپنے اردگرد جو ماحول دیکھ رہا تھا وہ مجھے لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

یہ ایک۔۔۔ بلند چھت والا ہال نما کمرا کوئی عقوبت خانہ ہی نظر آ رہا تھا۔ مجھے کمرے کے وسط میں کھڑا کر دیا گیا۔ در و دیوار سالخوردہ اور پرانی طرز کے تھے، دیواروں ہی نہیں فرش کا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ دل و دماغ پر ہیبت طاری کرنے والی عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ پورے کمرے میں نہ کوئی کھڑکی تھی اور نہ ہی روشن دان۔ کمرے میں ہر طرح کے آلات نظر آ رہے تھے۔ جو یقیناً تشدد اور ایذا رسانی کے لیے تھے۔

غرضیکہ۔۔۔ سب چیزیں دیکھنے کے بعد مجھے اپنے جسم سے روح کا ناتا ٹوٹتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ میرے ہراساں ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ ”کیا یہ اس جنونی ایس ایچ او روشن خان کا نجی ٹارچل سیل تھا؟ میرے اس لرزہ خیز خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

انسپکٹر روشن اپنے ساتھ صرف تین سنتریوں کو لایا تھا۔ روشن خان تو ایک طرف رکھی چھوٹی میز کرسی پر براجمان ہو گیا باقی تینوں سپاہی کھڑے رہے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہنوز ہتھکڑی تھی۔ میرے سامنے کی کرسی پر روشن خان موجود تھا اور میری طرف کچھ ایسی سنسناتی نظروں سے گھور رہا تھا جیسے وہ میرے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ میں اس جگہ سے کتنا خوف زدہ ہوں پھر اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ وہ حرکت میں آیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اس کی میز کے قریب کھڑا کر دیا۔ سپاہی نے میری ہتھکڑیاں کھول دی تھیں۔ پھر ایک اسٹول کھسکا کر میرے قریب کر دیا۔ جس کا اشارہ پا کر میں اس پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد انسپکٹر نے اپنی پتلون کی جیب سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور قلم بھی۔ کاغذ اس نے میرے سامنے میز پر پھیلا کر اس پر قلم رکھ دیا۔ وہ اردو میں ٹائپ کیا ہوا اسٹامپ پیپر تھا جس پر چند سطروں میں بہت مختصر عبارت درج تھی۔ انسپکٹر نے مجھے اسے پڑھنے کو کہا۔ میں پڑھنے لگا۔

”میں شہزادا احمد خان عرف شہزی، ولدیت نامعلوم، میرا تعلق کبیل دادا، مختاری بیگم کے گینگ گروپ سے ہے، مختاری بیگم نے مجھے چوہدری ممتاز کو ٹارگٹ کلنگ پر مامور کیا تھا۔ اور میری مدد اس گینگ گروپ کا نائب اول خیر کر رہا تھا۔ جس کی مدد سے ہم نے پہلے نیو ملتان میں چوہدری ممتاز کی رہائش گاہ پر حملہ کیا، ناکامی کی صورت میں کچھ روز بعد ہمیں پتا چلا کہ ممتاز خان اپنے فلاحی ادارے اطفال گھر کے دورے پر آیا ہوا ہے تو ہم نے وہاں ہلا بول دیا۔ وہاں بھی ناکامی کی صورت میں فرار ہوتے وقت اول خیر تو نکل جانے میں کامیاب ہو گیا مگر میں پکڑا گیا۔ یہ میرا بیان باقاعدہ ہوش و حواس حلفیہ بیان ہے، جسے ایک طرح سے مختاری بیگم کے گینگ گروپ سے ”بیزاری نامہ“ بھی سمجھا اور پڑھا جائے اس رعایت سے وعدہ معاف گواہ کے طور پر انسانی ہمدردی کے ناتے مجھ پر رحم کیا جائے اور کڑی سزا سے بچایا جائے۔“

نیچے میرا نام تھا۔

یہ سب پڑھ کر میں ششدر رہ گیا۔ یہ کیا تھا؟ میرا اپنا حلفیہ بیان۔۔۔؟ یا پھر کسی اور کے لیے تھا؟

میں نے ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر سے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے کریہہ صورت انسپکٹر روشن کی طرف دیکھا تو اس کے بدہیئت ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔

”اس پر اپنے دستخط کر دو یا اپنا نام لکھ دو۔ ساتھ ہی دائیں ہاتھ کا انگوٹھا بھی لگا دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میز کی دراز میں سے اسٹیمپ پیڈ بھی نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

”لل۔۔۔ لل۔۔۔ لیکن۔۔۔ انسپکٹر۔۔۔۔۔۔ صاحب! یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ کیا ہے۔۔۔ آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میرا تو ان ناموں کے افراد سے تعلق تو ایک طرف رہا، میں تو انہیں جانتا تک نہیں ہوں۔“ سوکھے پڑتے میرے حلق سے یہ الفاظ اٹک اٹک کر برآمد ہوئے۔

”یہ کمرا دیکھ رہے ہو تم۔“ انسپکٹر روشن کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”یہ کمرا نہیں ہے، ایک اذیت گاہ ہے جہاں پر پتھر بھی بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں، تم پتھر ہو نہ عادی مجرم۔۔۔ جو یہ تشدد سہہ سکو۔۔۔ بہتر یہی ہے کہ۔۔۔ خاموشی کے ساتھ اس پر اپنا نام اور انگوٹھا لگا دو۔“

”اس کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟“ میں نے اپنے اندر کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

”تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔۔۔“ وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔

”آپ مجھے رہا کر دو گے انسپکٹر صاحب! پھر کیا یہ لوگ مجھے زندہ چھوڑیں گے، جن کے خلاف میں یہ جھوٹا بیان دے رہا ہوں؟“ میں نے اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

”تمہیں مکمل تحفظ دیا جائے گا۔“ وہ لالچ دیتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے اس بیان کے بعد اس گینگ گروپ کا وجود ہی ختم ہو کر رہ جائے گا۔ میں ویسے بھی تمہاری ہسٹری سے واقف ہوں۔ تمہارا اس دنیا میں اور کوئی نہیں، چوہدری ممتاز صاحب تمہیں مالا مال کر دیں گے۔ تم اگر چاہو تو ان کی مستقل ملازمت بھی اختیار کر سکتے ہو۔ ساری زندگی عیش کرو گے۔ تمہارے جیسے چٹے ماضی والے نوجوانوں کی وہ بہت قدر کرتے ہیں۔ اب بولو کیا کہتے ہو؟“

”کیا مجھے صرف اس بیان پر دستخط کرنے ہوں گے یا اور بھی کچھ کرنا پڑے گا؟“

”خاصے سمجھدار ہو، فوراً ہی معاملے کی تہ تک جا پہنچے۔ ہاں۔۔۔ اس پر دستخط کرنے کے بعد تمہیں عدالت میں بھی جج کے سامنے یہ بیان زبانی کلامی دینا پڑے گا۔“

”کیا مجھے کچھ سوچنے کا موقع دے سکتے ہیں۔“ بالآخر میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچتا بن گیا، پھر اپنی کالی موٹی بالوں سے ڈھکی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”صرف پندرہ منٹ۔“

”ٹھیک ہے مگر میں یہ پندرہ منٹ تنہائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک اور شرط رکھی، وہ بھی منظور کر لی گئی، انسپکٹر روشن نے کھڑے ہوئے سپاہی کو کوئی اشارہ کیا۔ اس نے وہی ہتھکڑی دوبارہ میرے ہاتھوں میں لگا دی۔ میں اسٹول پر بیٹھا رہا۔ وہ چاروں باہر نکل گئے۔

ایسے ہی وقت میں سرمد بابا کی نصیحت مجھے یاد آنے لگی۔ ”شہزی بیٹا! مدِمقابل جب زبردست اور طاقتور ہو تو اسے دماغی جنگ سے زیر کیا جا سکتا ہے۔ بچپن میں نصابی کتابوں میں ایک شیر بکری کی کہانی بہت مشہور ہوئی جو خود کو شیر کا نوالہ بننے سے محفوظ رکھنے کی خاطر اسے بڑی چالاکی سے ایک کنویں کے قریب لا کر اسے اندر چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ کہانی یا سبق۔۔۔ کسی کی زندگی کا تجربہ ہوتا ہے۔“

استاد سکھانے کے بعد امتحان لیتا ہے اور وقت و حالات امتحان لینے کے بعد سکھاتے ہیں۔ میں ایسے ہی امتحان سے گزر رہا تھا۔ یک عقل وہ ہوتی ہے جو حالات کی بھٹی میں پک کر کندن بنتی ہے، اور ایک عقل وہ ہوتی ہے جو گویا وراثت کے طور پر اللہ کی طرف سے ودیعت ہوتی

ہے۔ اسے عقلِ سلیم یعنی کامن سینس کہا جاتا ہے، اس وقت وہ عقل میرے کام آرہی تھی۔ بے شک میں بے گناہ تھا، مظلوم بھی اور زبردست کے آگے زیردست تھا۔ اس پر بھی میرا ایمان پختہ تھا کہ اللہ مظلوم اور بے گناہ انسان کی مدد ضرور کرتا ہے۔ مگر صرف ایمان رکھنے سے سب کچھ حاصل نہیں ہوجاتا۔ اس کے لیے ہاتھ پاؤں چلانا پڑتے ہیں، دماغ کو کھنگالنا پڑتا ہے شاید اس لیے کہا جاتا ہے کہ ہمتِ مرداں مددِ خدا۔

یہ عیار انسپکٹر جس ناپاک عزائم کے ساتھ مجھے اپنے نجی ٹارچر سیل میں لایا تھا یقیناً اس کی پشت پر کوئی بڑا ہاتھ تھا، قانون کی وردی میں بظاہر نظر آنے والا قانون کا یہ رکھوالا اپنے فرائضِ منصبی کی پاسداری میں کتنا سچا تھا، اس کا پوری طرح سے مجھے اب اندازہ ہوا ہے۔ لیکن شاید قانون کا یہ کالا رکھوالا خود کو زیادہ عیار و چالاک سمجھتا تھا یا پھر میرے سوچنے کی غلطی تھی۔ کہ قانون کی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والے کالے کوٹ میں ملبوس وکیل اور ان وکیلوں کے پرمغز دماغوں کا نچوڑ ایک جج ایسے بیان پر کتنا یقین کرسکتا تھا؟ جو ان کی غیر موجودگی میں تحریری طور پر ان کے سامنے رکھا جائے؟ میری عقلِ سلیم میں کیا سمایا تھا، میں یہ سب کچھ اس تناظر میں بھی سوچ رہا تھا، اور میں نے ایک فیصلہ کرلیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد جب وہ جلاد صفت انسپکٹر اپنے تین ہمنوا سنتریوں کے ساتھ اندر داخل ہوا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے کہا۔ ”میں اس جھوٹے بیان پر دستخط نہیں کرسکتا۔“

اس کے بھاری ہاتھ کا ایک زبردست گھونسا میرے چہرے پر پڑا... میں اسٹول سمیت پیچھے الٹ گیا۔ میرا نچلا ہونٹ دانتوں میں آکر پھٹ گیا اور اب بھل بھل خون بہنے لگا... جلاد صفت انسپکٹر خونخوار بھیڑیے کی طرح غرا رہا تھا۔ اس نے اپنی دونوں آستینیں چڑھالی تھیں اور مجھے ٹھوکریں لاتیں اور گھونسیں مارنے لگا۔ میں گل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے اس طرح کی ماریں کھاتا رہا تھا شاید اس لیے میرے اندر اس کی مار سہنے کی مدافعت موجود تھی، میں سہتا رہا، چلاتا چیختا رہا، اس کے بعد میری شرٹ پھاڑ دی گئی۔ سانپ جیسے چوڑے پھن والے لتر میری ننگی پیٹھ پر برسائے گئے۔ پھر میرا سر لوہے کی بونگ میں پھنسا دیا گیا۔ مجھے اپنی کھوپڑی پھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی، اس انسانیت سوز تشدد کو سہنا میری مجبوری تھی، وہ اذیت جس نے میری روح تک کو بچپن سے لے کر اب تک زخمی اور چھیر چھیر کرڈالا تھا۔ اور جس زخم کے سامنے مجھے دنیا کی ایذا ہیچ لگتی... وہ تھی میرے اپنے سگے باپ کا مجھے دھتکار دینا۔ اپنی شناخت جس کا میں حقدار تھا۔ اس سے جدا کرکے ایک نئی نویلی عورت کی خاطر اپنے جگر کے ٹکڑے کو خود سے اکھاڑ پھینکنا۔ یہی وہ اذیت تھی جسے جب بھی یاد کرتا، میں دکھ و کرب کی ایک لہر عذاب میرے پورے وجود کو ابلتے آتش فشاں کے دہکتے لاوے میں بدلنے لگتی۔ اس نے میرے اندر انسپکٹر کے اس تشدد کو سہنے کی ایسی قوتِ مدافعت پیدا کردی تھی کہ میں یہ تشدد سہتا چلا گیا۔ کسی موذی وبائی بیماری کے بچاؤ کے لیے حفظِ ماتقدم کے طور پر ویکسین استعمال ہوتی ہے۔ یہ ویکسین اسی بیماری کے وائرس یا جراثیم سے ہی بنتی ہے، جسے انجکشن کے ذریعے خون میں منتقل کیا جاتا ہے، تاکہ ہمارے جسم کے قدرتی مدافعتی نظام اس جراثیم سے جنگ کرنے اسے ختم کرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ یہ جراثیم ویکسین کے ذریعے بہت کمزور کرکے خون میں شامل کیا جاتا ہے، اور قدرتی مدافعتی نظام اسے آنِ واحد میں ختم کردیتا ہے۔ پھر اس کے اندر اصل جراثیم کو مارنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ ”ویکسین“ کا خاص طبی اصول ہے، میں نے بھی اپنے ازلی دکھ کو ویکسین کے طور پر ہی استعمال کیا تھا اور پولیس کا یہ ناروا تشدد سہنے میں کامیاب رہا تھا۔

روشن خان پر جنون سوار ہوگیا تھا۔ اس کی بنٹے جیسی ابھری آنکھوں سے خونخواری اور درندگی دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی بے گناہ اور نہتے آدمی پر تشدد کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہوگا۔

اس کے بعد ایک دیوار گیر آہنی اسٹینڈ کے قریب مجھے گھسیٹ کر لے جایا گیا۔ وہاں زنگ آلود فولادی زنجیریں اور آہنی کڑوں سے مجھے جکڑ کر جالی دار شکنجے میں جکڑ دیا گیا اور تب تک شکنجے کو تنگ کیا جاتا رہا کہ میری ہڈیاں کڑکڑانے لگیں۔ جب ہڈیاں چٹخنے کے بالکل قریب محسوس ہونے لگیں تو میں نے ہانپتے ہوئے بمشکل کہا۔

”بب... بس... کرو... ختم... خدا کا واسطہ... انسپکٹر! بس کرو... میں اب مزید تکلیف نہیں سہہ سکتا۔“

میری داد فریاد پر تشدد کا یہ غیر انسانی اور بہیمانہ عمل روک دیا گیا۔ بدبختوں نے.... میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی نہیں کھولی تھیں۔ جو میری جسمانی اذیتوں میں اضافے کا باعث بن رہی تھیں۔

تھوڑی دیر تک میں ننگی اینٹوں کے سیلن زدہ فرش پر عضوِ معطل کی طرح پڑا گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ اس کے بعد مجھ پر پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی گئی، جلتے سلگتے زخموں کی اینٹھن میں برائے نام ہی کمی محسوس ہوئی۔ اس کے بعد کہیں جاکر میرے دونوں ہاتھ آزاد کردیے گئے اور مجھے دوبارہ بازوؤں سے پکڑ کر اسٹول پر بٹھا دیا گیا۔

”اب اگر تو نے انکار کیا تو میرے ہاتھوں بڑی اذیت ناک موت مرے گا۔“

میری زخم زخم سماعتوں سے اس جلاد صفت انسپکٹر روشن خان کی غراتی ہوئی آواز ٹکرائی تو... میں نے ہانپتے اور کراہتے ہوئے اپنے سر کو اوپر نیچے حرکت دی۔

اسٹیمپ پیپر میرے سامنے تھا۔ میں نے اپنے لرزیدہ ہاتھوں سے قلم اٹھایا اور اپنا نام لکھا اور دستخط کرنے کے بعد انگوٹھا بھی لگا دیا۔

یہ سب کرنے کے بعد انسپکٹر روشن کا چہرہ غرور اور فاتحانہ مسرت سے مزید مکروہ اور شیطانی محسوس ہونے لگا...

گھنٹے ڈیڑھ کے بعد مجھے نجی ٹارچر سیل سے نکال کر دوبارہ ناڑپورہ کے لاک اپ میں پھینک دیا گیا۔ مجھے اب کورٹ میں اپنی پیشی کا شدت سے انتظار تھا۔

شاید چند دنوں میں مجھے کورٹ میں پیش کیا جانے والا تھا، اس دوران میرے زخموں کی مرہم پٹی وغیرہ بھی باقاعدگی سے کی جاتی رہی مگر میں نے یہ زخم مرہم پٹی کرنے کے لیے نہیں سہے یا کھائے تھے۔ لہٰذا مرہم پٹی کرکے جانے والے سپاہی کے بعد خود کو اپنے ہاتھوں گزند پہنچاتا، خود گزیدگی کا یہ عمل کس قدر امتحان طلب اور کٹھن ہوتا ہے، یہ میں ہی جانتا تھا۔ میں اپنے کچھ گہرے تخلی زخموں کو بھرنا نہیں چاہتا تھا۔ چھٹے روز بالآخر مجھے عدالت میں پیش کرنے کے لیے لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ انسپکٹر نے کچھ مزید مجھے سمجھا دیا کہ مجھے اپنے تحریری بیان کے بعد اور کیا کہنا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ میں غلطی پر تھا یا... یہ راتب انسپکٹر... بے وقوف تھا... یا پھر... وہ لوگ گھاس کھا گئے تھے، جنہوں نے اس جلاد صفت جنونی انسپکٹر کے ذریعے مجھے اپنے دشمنوں کے خلاف بارودی کارتوس کے طور پر استعمال کرنا چاہ رہے تھے۔ کیا ان کی عقل میں یہ بات نہیں سما رہی تھی کہ میں کورٹ میں نہ صرف اپنے تحریری بیان سے مکر سکتا تھا بلکہ روشن خان کا کچا چٹھا بھی بیان کرسکتا تھا۔ ان کے اس اطمینان اور تسلی سے اب مجھے بھی نامعلوم سی بے چینی اور تشویش سی ہونے لگی۔ انہیں کیونکہ اس بات پر پورا یقین تھا کہ میں وہاں الشان کے خلاف پھٹ پڑنے کے بجائے وہی بیان دوں گا جو یہ چاہتے ہیں یا پھر یہ مجھے اب تک ”اطفال گھر“ سے بھاگا ہوا ایک کمزور اور خوف زدہ سا ”بچہ“ سمجھتے تھے؟ پولیس موبائل میں مجھے کورٹ لے جایا گیا۔ دوسری پیشی پر میری حاضری ہونا تھی۔ جب اس کا اعلان ہوا تو یکدم اس جنونی جلاد صفت انسپکٹر نے میرے کانوں میں ایک ایسی سنسناتی ہوئی سرگوشی کی جس نے مجھے میرے بدترین خدشات اور نامعلوم سی تجسس آمیز بے چینی کو گویا سرنگوں کرڈالا۔

”دیکھ اوئے۔ ہم سب سمجھتے ہیں کہ تیرے دل و دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ اب بھی تیرے دماغ میں کوئی ٹیڑھ چالاکی ہے تو اسے نکال پھینک۔ تو ابھی بچہ ہے ہمارے سامنے۔ اطفال گھر سے نکلا ہوا نہیں بلکہ انڈے سے نکلا ہوا۔ مجھ سے بھی زیادہ خطرناک لوگوں کی تجھ پر شکرے جیسی نظریں ہیں کورٹ میں وہی کچھ کہنا ہوگا تو نے جس کا تجھے حکم دیا گیا ہے.... اب کورٹ میں داخل ہونے سے پہلے ایک چھوٹا سا منظر بھی دیکھ لے۔“

جب مجھے وسیع احاطے سے گزار کر کورٹ کے برآمدے کی طرف لے جایا جارہا تھا تو انسپکٹر نے پھر سنسناتی ہوئی سرگوشی میرے کان میں انڈیلی۔

”اس طرف دیکھ... غور سے ذرا...“

میں نے دم بخود نظروں سے اس کے اشارے کی سمت دیکھا۔ مجھ سے ذرا فاصلے پہ ایک بیجی رنگ کی بیش قیمت نئے ماڈل کی گاڑی کھڑی تھی، اس کے شیشے بلائنڈڈ تھے پھر عقبی نشست کی کھڑکی کا شیشہ خودکار انداز میں نیچے کو سرک گیا۔

پھر میری کھلی آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا، وہ منظر نہیں، میرے بچپن کی معصوم اور دھتکاری ہوئی زندگی کا خراج تھا۔ میری وہ واحد خوشی اور مسرت تھی، میرے جینے کا باعث تھی... عابدہ دو خطرناک گھنی مونچھوں والے بھیڑیا صفت مردوں کے درمیان بیٹھی مجبور نگاہوں سے میری جانب تک رہی تھی۔ دونوں گن بردار تھے، ایک نے اپنی گن کی جھلک مجھے کھڑکی کے راستے دکھا دی تھی۔ دوسرے شخص کو میں پہچانتا تھا۔ وہ اشرف تھا، اس کے چہرے پر بڑی زہر آلود مسکراہٹ تھی۔

عابدہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف تکے جارہا تھا۔ گویا ہم دونوں کو ایک دوسرے کی قابلِ رحم حالت دکھا کر دیدۂ عبرت نگاہ بنایا جارہا تھا کہ زبردست کے

آگے زبردست کی نہیں چلتی... تم کو وہی کرنا ہے، جو ہم چاہیں گے۔

عابدہ کو دیکھ کر تو میں جیسے اپنے اردگرد سے ہی بےخبر ہوگیا تھا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب کھڑکی کا شیشہ دوبارہ بند ہوگیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے ریورس ہوکر ایک طرف غائب ہوگئی۔ کوئی بٹن دبا تھا کہ اسکرین سے وہ منظر غائب کردیا گیا۔ اشرف کو دیکھ کر میرے وجود میں نفرت کی تندو زہریلی لہر ابھری تھی۔ میرے اور عابدہ کے درمیان تعلقِ خاطر کو اس کمینے اور خبیث انسان کے علاوہ اور کون جان سکتا تھا؟

"تم ہمارا اشارہ سمجھ چکے ہوگے۔" روشن خان نے مجھے آگے دھکیلتے ہوئے پھر سرگوشی کی۔ "وہ لڑکی تمہارے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے، یہ مجھ سے زیادہ وہ لوگ جانتے ہیں جن کے قبضے میں اس وقت اس کی عزت اور جان ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ تمہارے بیان بدلنے سے ہمارا اتنا بڑا نقصان نہ ہوگا جتنا کہ تمہارا ناقابلِ تلافی نقصان ہوجائے گا۔ چلو آگے۔"

میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہورہی تھی۔ دل کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا تھا۔ چلنے کی سکت ختم ہونے لگی تھی۔ ٹانگیں کپکپانے لگی تھیں۔ شاید مجھ سے زندگی کی بھیانک غلطی ہوگئی تھی، میں خود کو چالاک و ذہین سمجھتا تھا مگر میرے دشمن تو میری سوچ سے بڑھ کر مکار اور عیار ثابت ہورہے تھے، کسی طرح عین وقت پر مجھے ذہنی طور پر ٹارچر کیا گیا تھا۔ اب میں کیا کروں؟

کورٹ کا داخلی دروازہ اب صرف چند قدموں کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا، یہ منحوس دروازہ مجھ سے دور ہی رہے اس تک پہنچنے کا فاصلہ کبھی ختم نہ ہو، مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے پولیس نہیں، جہنم کے فرشتے مجھے جہنم کے دروازے کی جانب گھسیٹ رہے ہوں۔

بالآخر لرزیدہ قدموں سے عدالت کا دروازہ پار کرنا ہی پڑا۔ آگے ایک پل صراط منتظر تھا۔ اب وہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا، جو میں چاہتا تھا۔ اب میں جج صاحب کے سامنے چلّا چلّا کر اپنی دادفریاد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اپنی سکت اور قوتِ برداشت سے زیادہ جو تشدد سہا تھا، وہ سب مجھے رائگاں جاتا محسوس ہورہا تھا۔ کاش! میں گونگا ہوجاؤں۔ کاش... میری قوتِ گویائی سلب ہوجائے اور میں وہ جھوٹا بیان نہ دے سکوں... جو کسی بےگناہ کے گلے کا پھندا یا کسی بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بننے والا تھا۔

کاش... کاش... مایوسیوں اور ناامیدوں کے اندھیارے بڑھنے لگے۔ اس دوران میں مجھے کٹہرے میں لاکر کھڑا کردیا گیا۔ کمرائے عدالت میں خاموشی تھی کچھ وکیل ایک طرف مستطیل میز پر موجود نظر آئے۔ جج صاحب بارعب نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے۔ کسی وکیل نے میرے بارے میں نجانے کس کس جرم کی ایک طویل فہرست سے جج کو آگاہ کیا۔ ایسے خطرناک جرائم جن کا میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے جھوٹے بیان میں بار بار کبھی مختاری بیگم، کبیل دادا اور اول خیر کا نام آرہا تھا، ان کے ساتھ میرے دیرینہ تعلقات کو جوڑا جارہا تھا، اور اب رہی سہی کسر خود میں اپنی زبان سے پوری کرنے والا تھا۔ پھر کیا باقی رہتا، سب کچھ شاید ختم ہوجاتا۔

"مایوسیوں کے اندھیروں کی انتہا میں ایک امید کی ٹمٹماتی جوت ضرور نظر آتی ہے کاکے! جسے صرف وہی لوگ دیکھ سکتے ہیں جو اللہ پر یقین کامل رکھتے ہیں، کہ مایوسی کفر ہے، اس ذات پاک کے ہوتے ہوئے اللہ کو ایک بار پکار کے دیکھو... بےآسرا کم مایہ اور مظلوموں کی تو وہ سب سے پہلے سنتا ہے۔ اللہ سے مدد مانگو۔"

سرمد بابا کے یہ الفاظ میری سماعتوں میں گونجنے لگے۔ اسی وقت میں نے دل کی عمیق گہرائیوں سے مدد کے لیے اللہ کو پکارا۔

"یااللہ! میری مدد فرما۔ میں کتنا مظلوم ہوں، تو بھی جانتا ہے، مگر عابدہ... وہ تو مظلومیت کی تصویر ہے، تو ہی اس کی حفاظت فرمانا... مگر میں تیرے آسرے تجھ سے امید کے واسطے ظالموں کے آگے سینہ سپر ہوجاؤں گا۔"

دعا مانگنے کے بعد میں نے عابدہ کو اللہ کے حوالے چھوڑ دیا۔ اور جب جج نے مجھ سے گمبھیر لہجے میں یہ کہا۔

"تم اپنی صفائی اور بیان میں کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس کے سامنے میرے بیان کا کاغذ موجود تھا۔

"جج صاحب! میری قمیص اتاری جائے۔" بالآخر میں نے کہا۔ کمرائے عدالت میں کچھ ہلچل سی مچی۔ میں نے ترچھی مگر سنسناتی نظروں سے قریب موجود انسپکٹر روشن کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ جو تھوڑی دیر قبل اپنی متوقع فتح کے باعث کھلا ہوا تھا، یک دم مسخ ہونے لگا۔ عدالت میں لوگوں کی بھنبھناہٹ کا شور بڑھنے لگا تو جج صاحب نے ہتھوڑا مار کر "آرڈر... آرڈر" کہا۔ پھر انہوں نے ایک اہلکار کو حکم دیا جس نے فوراً تعمیل کرتے ہوئے میری شرٹ اتار دی۔ میرے جسم پر تشدد کے نیل اور زخم سب کو نظر آگئے۔ میں نے اپنی شلوار بھی اتارنے کی اجازت چاہی تو ایک کالے کوٹ والے وکیل نے اعتراض کرنا چاہا۔ مگر جج صاحب "آبجیکشن اوور رول" کہہ کر اعتراض مسترد کردیا۔ تاہم میں نے جج صاحب سے کہہ دیا تھا کہ میں نے زیرجامہ (جانگیہ) پہن رکھا ہے۔ جج صاحب سمجھدار انسان تھے، میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سمجھ چکے تھے۔

میری شلوار اتاری گئی تو وہاں بھی گھٹنوں اور پنڈلیوں پر نیل اور چوٹوں کے نشان تھے۔

"جج صاحب! اس وقت میں ہی اپنا وکیل ہوں، میں قانون کو نہیں جانتا لیکن اپنے عام شہری حقوق سے واقف ضرور ہوں۔" میری آواز میں رفتہ رفتہ جذباتی رقت اتر رہی تھی۔ "جج صاحب آپ سمیت سب کو یہ نشان نظر آگئے ہیں تو میں اب اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی اجازت چاہوں گا۔"

جج صاحب نے سر کے خفیف اشارے سے مجھے بولنے کی اجازت دی۔ اور پھر میں رکا نہیں چلتا چلا گیا۔ اطفال گھر سے لے کر اب تک کی ساری روداد سچ سچ بیان کرڈالی اور عابدہ کے متعلق بھی سب کچھ سچ بتادیا۔ سرمد بابا موجودہ سیٹھ منظور وڑائچ کا بھی ذکر کرڈالا۔ جو اب ایک معروف کاروباری معتبر شخصیت بن چکے تھے، انسپکٹر روشن خان کی نجی ٹارچر سیل کے بارے میں بھی بتادیا۔

"جج صاحب میں نے جو کہا ہے سچ کہا ہے مگر اس سچ کی سزا مجھے ایک بےگناہ اور معصوم لڑکی عابدہ کی عزت اور جان کو خطرے میں ڈالنے کے بعد... ملنے والی ہے۔ اب میں آپ کے قانون کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرتا ہے۔ جج صاحب آپ سمیت اس کمرائے عدالت میں موجود لوگوں سے ہاتھ جوڑ کر میری التماس ہے کہ وہ میری معصوم اور بےگناہ عابدہ کی عزت اور جان کی خیر کے لیے دعائیہ کلمات ضرور ادا کردیں کہ مجھے ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنے اللہ کی طاقت اور سچ کی فتح پر پورا یقین ہے۔ بس! جج صاحب! مجھے اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہنا۔"

میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ میرا وجود شدید جذباتیت سے کانپ رہا تھا، آنکھیں آنسوؤں سے تربتر تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب عدالت سے میں نے دو افراد کو تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر نکلتے دیکھا۔ چند اور لوگوں نے بھی سرسری نگاہ ان پر ڈالی تھی تاہم پورے ہال کمرے کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ جلاد صفت انسپکٹر روشن کا چہرہ دھواں دھواں ہورہا تھا۔ روشن خان اور اس کے سرکردہ ساتھیوں کے... سان وگمان میں بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ جو چال انہوں نے عین وقت پر چلی تھی، وہ بُری طرح پٹ جائے گی۔

وہاں شہر کے معززین کے علاوہ انسانی حقوق کی تنظیم سے وابستہ افراد بھی موجود تھے، صحافی برادری سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی تھے جو سب کے سب میرے حامی بن چکے تھے۔

جج صاحب نے اس وقت انسپکٹر روشن خان کی گرفتاری کے احکامات جاری کرتے ہوئے ایک نئے تفتیشی افسر کو کیس پر تعینات کرنے کے بعد اطفال گھر پر چھاپے اور چوہدری ممتاز سمیت گگل خان کی بھی گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیے۔

کمرائے عدالت میں زبردست کھلبلی مچ گئی تھی، انسپکٹر روشن مجھے بڑی خونخوار اور کھاجانے والی نظروں سے گھورے جارہا تھا، جج صاحب اٹھ کر اپنے چیمبر میں جاچکے تھے۔ مجھے نئے تفتیشی افسر کے حوالے کردیا گیا۔ برآمدے تک آنے پر صحافیوں کی فوج نے مجھے گھیرلیا۔ میں کھل کر جو انہیں بتاسکتا تھا بتاتا رہا پھر اس کے بعد مجھے ایک بڑی سی سرکاری جیپ میں سوار کرادیا گیا۔ میں اب قانون کا قیدی نہ تھا بلکہ اس کی کسٹوڈی میں تھا اور بہت جلد مجھے سرمد بابا یعنی سیٹھ منظور وڑائچ کے حوالے کیا جانے والا تھا۔

☆☆☆

میں اب آزاد تھا مگر میرا دل ودماغ ایک نامعلوم سی قید میں جم کر رہ گیا تھا۔ میں اندر سے ٹوٹ ٹوٹ سا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میرا سب کچھ ختم ہوگیا ہو۔ جیسے جیسے میں نے اپنی آزادی کے بدلے میں کسی معصوم اور بےگناہ زندگی کی عزت وجاں کا سودا کرلیا ہو۔ دماغ قلابازیاں کھا رہا تھا، ضمیر تسلیاں دے رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی آزادی کے لیے نہیں بلکہ سچ کی خاطر کیا ہے۔ اللہ کی ذات پر بھروسا کرکے اس کی رحمانیت کی ایک پُرامید آس کے بل بوتے پر کہ اب وہی عابدہ کی عزت وجاں کا حافظ وناصر ہے۔

میرے نصیب کی بھی کیسی ستم کاری تھی، بچپن میں ایک عورت کی خاطر باپ نے مجھے خود سے دور کردیا، اطفال گھر میں پلا بڑھا پھر جب اطفال گھر کو ایک جہنم گھر میں بدلا گیا تو بڑی مشکل سے وہاں سے رہائی ملی تو تقدیر کی طرفہ کاری نے مجھے ایک دوسرے جہنم میں دھکیل دیا۔ وہاں کی صعوبتیں سہتا ہوا آزاد ہوا تو اپنی ذات کا قیدی بن گیا۔ نیتوں کے حال اللہ جانتا ہے۔ میں عابدہ کی خاطر ہر طرح کی صعوبت والام سہہ جانے کی سکت رکھتا تھا۔ مگر یہ معاملہ

سچ کے جھوٹ پر ختم کا تھا، یہ میری آزادی کی جنگ نہیں تھی، حق و باطل کی جنگ تھی۔ اب میری چشمِ تصور میں عابدہ کا چہرہ تھا کہ اب وہ جانے کس حال میں ہوگی۔

وقت گزرنے کا مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ ایک مقام پر گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ نئے تفتیشی افسر کے ہمراہ دو اہلکار اور ڈرائیور تھے، تفتیشی افسر گورا چٹا پکی عمر کا دراز قامت شخص تھا۔ شکل و صورت سے اچھا ہی دکھائی دیتا تھا، اس کا نام مجھے انسپکٹر ریاض باجوہ معلوم ہوا تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ نرم اور دوستانہ تھا۔ شاید وہ میری دلی کیفیات سے واقف تھا، یہی سبب تھا کہ ایک گہری پُرسوچ تفکر کی پرچھائیں اس کے چہرے کو گہری متانت بخش رہی تھیں ایک بالکل نئی طرز کی عمارت کے احاطے میں جیپ رکی تھی اور ہم نیچے اتر آئے۔

یہ مجھے پولیس سے ملتا جلتا ہی کوئی محکمہ معلوم ہوتا تھا، ان کی وردیاں بھی تھوڑی مختلف تھیں۔ یہاں اور بھی وردی پوش افراد نظر آرہے تھے، کچھ مسلح کچھ غیر مسلح۔ مجھے ایک صاف ستھرے کوریڈور سے گزار کر ایک بڑے آفس روم میں لایا گیا۔ ایک بڑی سی میز پوش والی میز کے عقب میں بھاری بھرکم چیئر تھی، مجھے اشارے سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا کہہ کر ریاض باجوہ اپنی چیئر پر براجمان ہوگیا۔ اس نے پہلے میرے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں منگوائیں، ان کا مجھے اب کہاں ہوش رہا تھا، مگر ریاض صاحب کے اصرار پر میں نے کچھ بسکٹ اور ایک کیک کا ٹکڑا کھالیا۔ چائے پی پھر ریاض باجوہ نے مجھ سے ساری تفصیل دوبارہ پوچھنے کے بعد قلم بند کرڈالی، اس نے سرمد بابا کا سیل نمبر مجھ سے لیا۔ اور ان سے رابطہ کیا۔ سچی بات تھی مجھے اب سرمد بابا سے بھی کوئی امید نہ رہی تھی۔ بلکہ مجھے کسی سے کوئی امید نہ رہی تھی۔ میری حالت ہارے ہوئے جواری کی سی تھی، جو اپنی ساری پونجی ایک جوئے میں ہار چکا ہو۔ سرمد بابا سے مجھے شکایت نہ تھی کہ انہوں نے میرے ایس ایم ایس پر ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ ممکن تھا وہ مس ہوگیا ہو۔ مگر اب کیا فائدہ، پلوں کے نیچے سے تو بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

”نوجوان! تمہارے سچے جذبے کی میں قدر کرتا ہوں مگر تم بہت زیادہ مایوس اور افسردہ نظر آرہے ہو؟“

باجوہ نے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

شاید سرمد بابا سے اس کا رابطہ نہ ہوسکا تھا۔ میں نے پوچھ لیا۔

”کیا سیٹھ صاحب سے بات نہیں ہوسکی؟“

”تھوڑی دیر بعد بات کرتا ہوں۔ ان کا نمبر مصروف جارہا ہے۔“ باجوہ نے جواب دیا۔

”کیا سیٹھ صاحب (سرمد بابا) سے رابطہ ضروری ہے؟“

”یقیناً۔“ وہ بولا۔ ”کورٹ میں تم نے خود ہی ان کا حوالہ دیا تھا اور یہ تمہارے لیے ضروری ہے۔ مجھے رپورٹ میں اس کا ذکر کرنا ہے۔ وہ ایک طرح سے تمہاری ضمانت ہوگی۔“ میں خاموش رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ رابطہ کیا۔ اس بار رابطہ ہوتے ہی باجوہ صاحب نے مختصراً الفاظ میں انہیں میرے متعلق دیگر معلومات فراہم کیں پھر سیل فون میری طرف بڑھادیا۔ میں نے فون لے کر کان سے لگایا اور سلام کیا۔

”شہزی! میرے بچے۔ تم... تم... ٹھیک تو ہونا...؟ یہ... یہ سب کیا ہے؟ تم اطفال گھر سے کیوں نکال دیے گئے...؟“ سرمد بابا نے انتہائی شفقت سے پوچھا۔

ان کا مجھے اس طرح پکارنا... نہ جانے کیوں میرے اندر کی ازلی کسک کو بیدار کرنے کا باعث بننے لگا۔ میں نے حلق میں تیرتی رقت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جی بابا! میں ٹھیک ہوں...“

”تمہارا لہجہ بتارہا ہے کہ تم ٹھیک نہیں ہو، وہیں رکے رہو۔ میں ابھی پہنچتا ہوں، ذرا اس آفیسر کو فون دو۔“ وہ فوراً بولے۔ میں نے سیل فون باجوہ صاحب کی طرف بڑھادیا۔ تھوڑی دیر تک وہ انہیں کچھ بتاتے رہے۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

”وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔“ سیل فون میز پر رکھنے کے بعد باجوہ صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ میں نے آہستگی سے سر کو جنبش دی۔ نصف گھنٹے بعد بیش قیمت سوٹ میں ملبوس سرمد بابا اندر داخل ہوئے، میں انہیں دیکھ کر کھڑا ہوا۔ انہوں نے بے اختیار مجھے خود سے لپٹا لیا۔ میرے جیسے باپ کے پیار اور شفقت کو ترسے ہوئے انسان کے لیے ان کی یہ قربت مجھے انتہائی جذباتی کرگئی اور میں بے اختیار رو دیا۔

بہت آہستگی سے انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کرکے دوبارہ کرسی پر بٹھایا پھر باجوہ صاحب سے ہاتھ ملایا۔ میں ان کے چہرے کو دیکھ رہا تھا، وہ میرے لیے اس قدر پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے، جیسے میرا ان سے خونی رشتہ ہو۔ میرا اپنا حقیقی سگا باپ جو میری ساری زندگی کا ایک سوالیہ نشان تھا، وہ کہاں تھا؟ میں اسے تلاش کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ وقت اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر کئی ایسے سوالات سر ابھارا کرتے تھے، جن کے جوابات میں اپنے باپ سے سننا اور پوچھنا چاہتا تھا۔ اولاد، ماں باپ کے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے، مجھے اس کا اندازہ تھا، میں اپنے سگے باپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں اس پر بار کیوں تھا؟

ایک یہ سرمد بابا تھے جو مجھ سے باپ جیسی محبت کرتے تھے، باجوہ صاحب نے انہیں اب تک کی ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ میں دیکھ رہا تھا، سرمد بابا ازحد فکرمند اور تشویش زدہ نظر آرہے تھے، یہ سب سننے کے بعد انہوں نے اپنا سر تھام لیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”بیٹا! تم بالکل فکر نہ کرو۔ ضرورت پڑنے پر میں اعلیٰ سے اعلیٰ وکیل کروں گا تمہارے لیے۔“ پھر وہ باجوہ صاحب سے مخاطب ہوئے۔

”مجھے ایک بات کا ڈر ہے باجوہ صاحب! شہزاد کو جس خطرناک چکروں میں پھانسا گیا ہے۔ کیا وہ اتنی آسانی سے نکل پائے گا؟ اور اس معصوم بچی عابدہ کا کیا ہوگا؟“

”آپ بے فکر رہیں۔ وہ لوگ اب عابدہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچاسکتے، شہزاد کے عدالت میں اس بیان کے بعد سب پہاڑ کے نیچے آجائے گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ سرمد بابا دعائیہ لہجے میں بولے مگر میں عابدہ کی طرف سے جانے کیوں مایوسی کا شکار تھا۔ شاید مجھے خدشہ تھا کہ وہ جن لوگوں کے قبضے میں تھی، وہ کم خطرناک لوگ نہ تھے، اور عدالت میں ان کے خلاف بیان نے جلتی پر تیل نے کام کیا ہوگا۔

”کیا میں اسے لے جاسکتا ہوں؟“ تھوڑی دیر بعد ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے بعد سرمد بابا نے رخصت ہونا چاہا تو باجوہ صاحب نے خوش اخلاقی سے مسکرا کر مصافحے کے لیے ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”شیور۔ آپ شہزاد کو لے جاسکتے ہیں مگر بہ وقتِ ضرورت ہمیں اس کی اور آپ کے تعاون کی ضرورت پڑسکتی ہے۔“

سرمد بابا نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر باجوہ صاحب کو تھمادیا جو انہوں نے سنبھال لیا۔

ہم دونوں رخصت ہوگئے۔ باہر ایک لمبی سی نئے ماڈل کی چمچماتی کار کھڑی تھی، باوردی ڈرائیور موجود تھا، اس نے جلدی سے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ ہم دونوں ہی پچھلی نشست پر براجمان ہوگئے تو ڈرائیور نے کار آگے بڑھادی۔

سارے راستے خاموشی رہی، شاید وہ ڈرائیور کی موجودگی میں مجھ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تھے، مجھے تو ویسے ہی چپ سی لگی ہوئی تھی، میرا دل و دماغ عابدہ کی طرف تھا۔ اب کوئی معجزہ ہی اسے ظلم سے بچاسکتا ہے۔ جبکہ میں اپنے تئیں بھی عابدہ کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے میں عملی طور پر کچھ کرنے کے لیے بے چین تھا۔ اب آزادی ملی تو اس بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس تمام ترکشیدہ صورتِ حال کی وجہ سے میرے ذہن میں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں سرمد بابا سے پوچھتا ان کی کایا پلٹ کیسے ہوئی تھی؟ وہ کون خاتون تھیں جو انہیں اطفال گھر کے ”اولڈ ونگ“ سے ایک دن اچانک اپنے ساتھ لے گئی تھیں، پھر اس کے بعد سرمد بابا کو میرا ابھی یارا نہ رہا۔ نہ آئے، نہ میری خیریت پوچھی؟ پھر ایک طویل عرصے بعد سیٹھ منظور وڑائچ کے نام سے اطفال گھر کے دورے پہ آئے تو مجھے پہچان بھی لیا۔ مجھے سرمد بابا کا معاملہ کچھ پُراسرار اور گمبھیر محسوس ہورہا تھا، لیکن مجھے تو اس وقت اپنا ہی ہوش نہ تھا، میرا سارا دھیان عابدہ کی طرف تھا، دل و دماغ شدید بے چینی اور اضطراری کیفیات میں بار بار کروٹیں بدل رہا تھا، جج صاحب نے اگرچہ عابدہ کی بازیابی کے سلسلے میں احکامات جاری کردیے تھے، اور باجوہ صاحب اس سلسلے میں کیا کرنے والے تھے، یہ آگے وقت بتاتا، جبکہ میں اس معاملے میں سردست خود کو بے بس محسوس کررہا تھا۔

کار ایک پوش علاقے میں داخل ہوگئی۔ سڑک کے دورویہ انسانوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت وہ عالیشان بنگلے اور کوٹھیاں نظر آرہی تھیں جنہیں میں بظاہر خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چند منٹ بعد کار ایک پُرشکوہ رہائشی عمارت کے خودکار گیٹ سے اندر داخل ہوئی جہاں ایک گن مین موجود تھا۔ جس نے ”صاحب“ کی کار دیکھتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا تھا۔

کوٹھی بڑی شاندار تھی، باغ، باغیچہ، خوش نما گل بوٹوں کی باڑیں انواع واقسام کے درخت۔ جن کا نظارہ آنکھوں اور دماغ کو تازگی بخش رہا تھا، پورچ میں ایک اور چھوٹی گاڑی بھی موجود تھی، ایک ملازم اندر سے بھاگا ہوا آیا۔ میں اور سرمد بابا کار سے اتر آئے۔ سہ پہر کا وقت

ہوچلا تھا۔ ایک خوبصورت اور بیش قیمت لکڑی کے فینسی محرابی داخلی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تھے، یہ وسیع لاؤنج تھا، بیش قیمت صوفے دھرے تھے، سامنے دیوار پر بڑی ایل سی ڈی نصب تھی۔ وہیں ٹین ایجر لڑکا لڑکی ریموٹ ہاتھ میں لیے بیٹھے کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ دونوں ہی خوب صورت تھے، اور صورتوں کی مماثلت بھائی بہن ہی ظاہر کرتی تھی، ہم پر نظر پڑی تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے، فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

"سلام دادا جان!" دونوں نے سرمد بابا کو دادا کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے ایک جھٹکا لگا۔ پھر میری طرف کچھ الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے سلام کیا اور لڑکے نے بابا سے میرے بارے میں پوچھا۔ "دادا جان! یہ کون ہے؟"

"دانی بیٹا یہ تمہارا دوست... شہزاد۔ یہ اب ادھر ہی رہے گا۔" وہ بولے۔ دونوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد لڑکی نے سرمد بابا سے کہا۔

"دادا، مما، گھر پہ نہیں ہیں۔"

"گھر پہ نہیں ہیں؟ کہاں گئی ہیں؟" سرمد بابا کچھ چونکے۔

"انکل جمال کا فون آیا تھا، آفس کا کوئی کام تھا۔"

"میرے لیے کوئی پیغام؟"

"نہیں دادا! کہہ رہی تھیں کوئی بات ہوگی تو وہ خود آپ سے رابطہ کرلیں گی۔"

"تمہاری مما کی طبیعت تو ٹھیک تھی ناں؟ انہیں کیا ضرورت تھی جانے کی۔ مجھے فون کردیتیں میں چلا جاتا۔" سرمد بابا کچھ فکرمند سے نظر آئے۔

لڑکے نے کہا۔ "دادا! انکل جمال نے پہلے آپ ہی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر آپ کا سیل فون..."

"اچھا... اچھا... ٹھیک ہے۔ میں عارفہ بیٹی سے بات کرلیتا ہوں..." وہ یکدم بولے۔ "آؤ بیٹا۔" آخر میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئے اور مجھے لے کر ایک مختصر راہداری کی طرف بڑھے۔ دونوں لڑکا لڑکی میری طرف تکتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد سرمد بابا مجھے ایک وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ بڑی شاہانہ طرز کا اور جدید اشیا سے مزین یہ کمرا بہت آرام دہ اور پُرسکون نظر آیا۔

"شہزی بیٹا! تم بیٹھو، میں ذرا چینج کرکے آتا ہوں۔" وہ مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے بولے، ملازم ساتھ ساتھ تھا، پھر وہ اس کے ہمراہ دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے، میں ابھی سرمد بابا کے سلسلے میں سوچ بچار ہی کر رہا تھا کہ وہی ملازم دوبارہ وارد ہوا اور سے بولا۔

"آئیے جناب! آپ کو کمرا دکھادوں۔ آپ غسل وغیرہ کرکے فریش ہوجائیں، پھر کھانا لگاتا ہوں۔"

میں نے زندگی میں پہلی بار ایسی شاہانہ اور آرام دہ زندگی کا روپ دیکھا تھا۔ دل و دماغ میں کچھ مرعوبیت سی طاری تھی، میں خاموشی سے اٹھ کر ملازم کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے ایک اندرونی دروازے سے گزار کر جس کمرے میں داخل ہوا، وہ بھی کشادہ اور آرام دہ تھا، ایک بیڈ اور سائڈ میں صوفہ تھا۔ ایک وارڈ روب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ملازم نے مجھ سے کہا۔ "یہاں آپ کے سائز کے کپڑے موجود ہیں، غسل کے بعد وہ پہن لیجیے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیڈ سائڈ پر بیل لگی ہوئی ہے، میں حاضر ہوجاؤں گا۔ ویسے میرا نام اطہر ہے۔ چلتا ہوں۔"

وہ دبلا پتلا چھریرے جسم کا ملازم یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور باتھ روم میں گھس گیا۔

غسل وغیرہ کرکے تازہ دم ہوا، باتھ ٹاول لپیٹ کر باہر نکلا، وارڈ روب کھولی، اپنی پسند کی جینز اور ایک ٹی شرٹ نکال کر پہن لی۔ ٹی شرٹ کچھ ٹائٹ کچھ ڈھیلی تھی مگر بہرحال مجھے آگئی۔ میں نے سرسری نظروں سے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا اور دوبارہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہاں سرمد بابا پہلے سے موجود اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہے تھے، میں خاموشی سے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اطہر نامی وہی ملازم آن وارد ہوا اور ڈائننگ ٹیبل پر کھانا سرو کرنے لگا۔ جب تک اس نے کھانا لگایا، سرمد بابا بھی فون سے فارغ ہوگئے۔

"بیٹا! میں تو کھانا کھا چکا ہوں۔ آؤ تم کھالو، میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے نہایت شفیق لہجے میں بولے۔ وہ اس وقت ہلکے پھلکے لباس میں تھے، میں چپ چاپ سا اٹھا اور کھانے کی ٹیبل پر آگیا۔ کھانا پُرتکلف تھا مگر مجھے کھانے پینے کا کہاں ہوش تھا، سرمد بابا نے ایک چھوٹی سی پیالی میں اپنے لیے تھوڑی سوئٹ ڈش نکال لی تھی، میں بے دلی سے کھانا کھانے لگا، اس دوران میں اطہر ہاتھ میں کارڈلیس پکڑے سرمد بابا کے قریب آیا۔ "سر! آپ کا فون ہے۔" کہہ کر فون تھمایا اور چلا گیا۔

"ہیلو۔" کھانا کھاتے ہوئے میری نظریں یونہی ان کے چہرے پر جم گئیں۔

"ہاں! میں سیٹھ منظور ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟" وہ بولے پھر دفعتاً دوسری جانب سے کچھ ایسی بات سن کر ان کے چہرے پہ الجھن کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہ ریسیور کان سے لگائے ہوئے میرے چہرے کی طرف عجیب سی نظروں سے تکتے ہوئے بولے۔

"ہاں! شہزاد، اس وقت میرے پاس ہی موجود ہے مگر آپ کون ہیں اور شہزاد سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟"

"کون ہے؟ انکل!" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"پتا نہیں کون آدمی ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتا ہے، لو بیٹا! کرو بات۔" میں نے دھڑکتے دل سے فون لیا اور اپنے کان سے لگا کر "ہیلو" کہا۔

"او خیر...! کاکا...! تو اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں تیرے ہاتھ اور پاؤں تک چوم لیتا۔"

یہ اول خیر تھا۔ وہ اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا اور مجھ سے متاثر بھی ہو رہا تھا۔ "کاکا تو نے ہماری خاطر اتنی بڑی مصیبت جھیلی اور قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ تو تو استادوں کا استاد نکلا کاکے۔ پھر ہم نے بھی تیری قربانی رائگاں نہیں جانے دی۔"

اس کی آخری بات پر میں پورے وجود کے ساتھ چونک پڑا۔ "کاکا تیرا ہم پر یہ بہت بڑا احسان ہے، جو ساری عمر ہم نہیں بھولیں گے۔"

"میں نے کوئی احسان نہیں کیا تم پر... جو سچ تھا وہی کہا مگر اس سچ میں ایک دکھ بھی شامل ہے، ایک معصوم زندگی داؤ پر لگ چکی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی، میں سرمد بابا کے سامنے دانستہ اس کا نام لینے سے احتراز کر رہا تھا۔

"او خیر... کاکا تو کیا سمجھتا ہے ہم تجھ سے اتنے دن غافل رہے۔ جب تو عدالت میں ساری کہانی بیان کر رہا تھا، اس وقت تک میرے آدمی کمرائے عدالت میں موجود تھے۔" وہ بتانے لگا۔ "پھر جیسے ہی تو نے عابدہ کے بارے میں بتایا تو وہ دونوں یکدم باہر نکل آئے تھے۔"

"پھ... پھر...؟" میں کسی خیال سے فوراً دھڑکتی آواز میں بولا۔ مجھے یاد آیا تھا عابدہ کے ذکر کے فوراً ہی بعد اس کمرائے عدالت میں غیر ارادی طور پر ان دو افراد پر نگاہ پڑی تھی جو یکدم کمرے سے اٹھ کر باہر نکل گئے تھے، یقینا وہ دونوں اول خیر گینگ گروپ کے آدمی ہی تھے۔

"کاکا! بے غم ہوجا۔ عابدہ بہن ہمارے پاس ہے اور بالکل بھلی چنگی ہے۔" دوسری جانب اول خیر نے جیسے مجھے کائنات کی ایک بہت بڑی اور غیر یقینی خوش خبری سنائی، جس نے گویا مجھے سرتاپا سماعت بنادیا۔ مجھے یقین ہی نہ آیا۔ بولا تو زبان لڑکھڑانے لگی۔

"تت... تم... سس... سچ کہہ رہے ہو۔ تت... کیسی ہے وہ۔ ٹھ... ٹھیک تو ہے نا...؟" میرا ریسیور والا ہاتھ بھی زبان کی طرح کپکپانے لگا۔ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھے سرمد بابا بھویں سکیڑے بہ غور میرے چہرے کی طرف تکے جا رہے تھے۔

"او خیر... کاکا سب ٹھیک ہے ہم بھی یاروں کے یار ہیں۔ اور تیرے جیسے بہادر نوجوان تو ہمارے جگر کے بھی قریب ہوتے ہیں۔ لے... خود بات کرلے۔" دوسری جانب سے اول خیر کی مخصوص آواز ابھری... میں عابدہ سے بات کرنے والا تھا، مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

میں نے اپنی سانس تک روک لی، دل کی دھڑکن جیسے تھم گئی۔ وقت رک گیا۔ سب کچھ تھم گیا۔

"ہیلو، شہزی! یہ میں ہوں، عابدہ..."

وہ آواز نہیں تھی، وہ تو امرت تھا، شہد تھا، گویا اپنی جانِ جاناں دل آرا ہستی کا نرم و نازک لبوں سے پھونکا گیا صور تھا جس نے میرے تنِ مردہ میں، نس نس میں زندگی کو آبشار بنا کر دوڑا دیا تھا۔

"عابدہ... عابدہ..." میں فون پر ہی اسے دیوانوں کی طرح پکارنے لگا۔ "... یہ... یہ... تم ہو... واقعی تم ہو... کیسی ہو...؟ ٹھیک تو ہو ناں... تم... تم...؟"

وفورِ جذبات سے مجھ سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر سرمد بابا کے چہرے کے تاثرات کچھ بدلے، وہاں ہلکی معنی خیز مسکراہٹ نے لے لی۔ وہ تو بہت پہلے سے میرے اس تعلق کو جانتے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں... تم کیسے ہو... یہ لوگ کون ہیں... تمہارے دوست ہیں...؟ مجھے انہی لوگوں نے، ان بھیڑیا صفت لوگوں کے شیطانی چنگل سے بچایا ہے۔"

وہ بولے جا رہی تھی، میں نے اپنی کیفیات پر قابو پایا۔ بولا۔ "ہاں! ہاں! تم ان کے پاس بالکل محفوظ ہو، گھبرانا نہیں، یہ میرے دوست ہی ہیں۔ میں خود ابھی تمہیں لینے کے لیے آتا ہوں۔ ذرا اس آدمی کو فون دو۔"

تھوڑی دیر بعد میں اول خیر سے بات کر رہا تھا۔

"میں... میں... ابھی عابدہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"او خیر... کاکا! تیرے دل کی حالت کا مجھے اندازہ ہے۔" وہ مخصوص انداز میں بولا۔ "عابدہ تیری امانت اور ہمارے لیے محترم ہے اور بالکل محفوظ بھی، جب چاہے مل لے، سیٹھ صاحب سے کہو اپنے گھر کا پتا ذرا تفصیل سے مجھے سمجھا دے۔ میں خود تمہیں لینے آرہا ہوں مگر بتا دینا یہ بھی کہ میری آمد کا اور کسی سے ذکر نہ کرے۔"

سرمد بابا کو ابھی تک میں نے اول خیر کے بارے میں تفصیل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کارڈلیس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے میں نے مختصراً اور کچھ ڈھکے چھپے الفاظ میں اول خیر کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا۔ انہوں نے گومگو سی پُرسوچ خاموشی کے ساتھ اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، پھر کارڈلیس میرے ہاتھ سے لے کر بولے۔ "میں بات کرتا ہوں۔"

پہلے تو انہوں نے اپنی رہائش گاہ کا پتا اول خیر کو سمجھا دیا پھر گہری متانت سے بولے۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم عابدہ بیٹی کو یہاں میرے پاس لے آؤ، شہزی اب میری سرپرستی میں ہے، میں عابدہ کو بھی اپنی سرپرستی میں لینا چاہتا ہوں۔"

سرمد بابا کی اس بات پر میں چونک کر ان کا چہرہ تکنے لگا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سرمد بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کا حکم دیا۔

دوسری جانب سے نجانے اول خیر نے کیا کہا ہوگا، تاہم سرمد بابا بولے۔ "آپ بالکل بے فکر رہیں۔ دونوں میرے پاس محفوظ رہیں گے۔ میں انہیں آج سے نہیں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ لو... شہزاد بیٹے سے بات کرلو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور دھیمی آواز میں بولے۔

"شہزی بیٹا! جو میں نے کہا ہے وہی ٹھیک رہے گا۔ اسے کہو عابدہ کو ادھر ہی لے آئے۔" میں الجھ سا گیا، میں خود عابدہ کے پاس جانے اور اسے دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب ہو رہا تھا کہ کاش! میرے پر لگ جاتے اور میں اڑ کر جا پہنچتا۔ ویسے سرمد بابا کی بات بھی مجھے درست ہی لگی تھی، میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کارڈلیس ان کے ہاتھ سے لے کر اول خیر سے بولا۔

"اول خیر! سیٹھ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

"جیسے تمہاری مرضی، ہم آپس میں مشورہ کرکے تمہیں تھوڑی دیر بعد بتاتے ہیں۔" اول خیر نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میری بے چینی فزوں تر ہوگئی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ رابطہ منقطع نہ ہو، عابدہ سے میں اس وقت تک فون پہ باتیں کرتا رہوں، اس وقت تک اس کی خیریت سے آگاہ رہوں جب تک وہ یہاں نہیں پہنچ جاتی۔

سرمد بابا کا یہ لینڈ لائن نمبر تھا۔ وہ خود بھی معروف کاروباری شخصیت تھے، ان کا نمبر حاصل کرنا، اول خیر والوں کے لیے چنداں مشکل نہ تھا، اول خیر میری وجہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوا تھا۔ جبکہ میں بدقسمتی سے پھنس گیا تھا۔ مگر آفرین ہے اول خیر پر اس کے بعد بھی وہ مجھ سے غافل نہ رہا، سائے کی طرح اس نے اپنے آدمی میرے پیچھے لگا رکھے تھے، حتیٰ کہ کورٹ تک وہ مجھے اپنے ساتھیوں کے ذریعے نظروں میں لیے ہوئے تھا۔ میرے بیان کے فوراً بعد اول خیر کے آدمی حرکت میں آگئے تھے، بعد میں انہوں نے شاید اس گاڑی کو ٹریس کر کے اس پر ہلا بول دیا ہوگا، اور عابدہ کو چھڑا کر اول خیر کے محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہوگا۔

اب جب تک میں عابدہ کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیتا، مجھے قرار نہیں آتا تھا، میں کھانے کی تکمیل سے بھی قبل از وقت اٹھ گیا۔

میں اور سرمد بابا، دوبارہ صوفے پر آن بیٹھے تھے، میں شدید اضطراری کیفیات سے دوچار تھا، عابدہ کی بازیابی اور خیریت کی خوشی اپنی جگہ تھی، پھر بھی دل عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید یہ خوشی کی زیادتی تھی، جو مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ سرمد بابا میری ایک ایک کیفیات کو نوٹ کر رہے تھے۔

"ٹیک اٹ ایزی، بیٹا! میرے پاس تم دونوں بالکل خیریت سے اور محفوظ رہوگے۔" انہوں نے تشفی آمیز لہجے میں مجھ سے کہا۔ وہ بولتے رہے۔ "مجھے تم سے کئی باتوں پر معافی مانگنا ہے، کیا تم میری بات سن رہے ہو شہزی بیٹا؟"

"جی" جج... جی جی... ہاں میں سن رہا ہوں۔" میں خیالات کے بھنور سے ابھر کر بولا۔ "مگر... معافی کی بات کرکے مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"اطفال گھر میں جب میں سخت بیمار پڑ گیا تھا تو تم نے میری تیمارداری کی تھی، بالکل سگی اولاد کی طرح... شاید اس سے بھی بڑھ کر۔ جب مجھے عارفہ بیٹی ایک دن اچانک لینے کے لیے وہاں آن پہنچی تو بعد میں اصولاً مجھے تمہاری خبر گیری لینا چاہیے تھی مگر میں ایسا نہ کرسکا۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکے، میں اب ان کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے بہ دستور اپنی جانب متوجہ پا کر وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"عارفہ، میری بہو ہے۔ میرے بیٹے محمود کی بیوی۔" انہوں نے انکشاف کیا، میں چونک پڑا۔ وہ آگے کہتے رہے۔

"ایک جانکاہ حادثے میں میرے بیٹے محمود کا انتقال ہوگیا تھا۔" ان کی آواز بے اختیار بھرا گئی، میں بھی گم صم سا ہوگیا۔

"وہ چاہے کتنا ہی ناخلف اور سنگ دل سہی... مگر تھا تو میرا بیٹا... میں نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اللہ سے بھی نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا مانگی تھی اس کی مغفرت اور بخشش کے لیے۔ میری بہو عارفہ جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ شوہر کی ناوقت موت نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ بیک وقت گھر اور وسیع و عریض کاروبار کی ذمّے داری اس کے نازک کندھوں پر آن پڑی تھی۔ ایسے میں اسے میری ضرورت پڑی تو مجھے لینے کے لیے اطفال گھر آن پہنچی۔ اور رو کر اس نے سارا حال سنایا۔ مجھ سے معافیاں مانگیں، میں تڑپ گیا اور اس کے ساتھ چلا گیا۔" وہ سانس لینے کو ذرا تھمے... میں دم بہ خود سا ان پر بیتی کہانی سن رہا تھا۔

"عارفہ کی بدنصیبی نے تب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔" سرمد بابا، اپنی بوڑھی آنکھوں کے گوشے رومال سے پونچھنے لگے، مجھے ان پر بے حد ترس آنے لگا، وہ بولے۔

"عارفہ کو جگر کی ایک موذی بیماری لگ گئی تھی... لاپروائی اور شوہر کی موت کے باعث اپنے علاج پر دھیان نہ دے سکی اور اسے جگر کا کینسر ہوگیا۔ جس کا صرف ایک ہی حل تھا، اور وہ تھا جگر کی پیوندکاری۔ ڈاکٹرز نے اسے ٹرانس پلانٹ لیور کا مشورہ دیا تھا، جو امریکا میں ہی بہ احسن و خوبی ممکن ہو سکتا تھا۔ وقت کم تھا کچھ اور پریشانیاں بھی تھیں، اس طرح میں تمہیں نہیں بھولا تھا مگر مجھے تسلی تھی کہ تم "اطفال گھر" جیسے ایک ذمّے دار اور اچھے ادارے میں ہو۔ خدا جانتا ہے، میں نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ جیسے ہی میرے حالات ٹھیک ہوں گے پہلی فرصت میں تمہیں، یہاں اپنے پاس لے آؤں گا، مگر شہزی بیٹا! زندگی کبھی کبھی ایسی الجھی ہوئی ڈور بن کر رہ جاتی ہے کہ انسان اسے سلجھاتا ہی رہتا ہے اور وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا پھر ہوش آتا ہے تو سر پکڑ لیتا ہے اپنا... یہ کیسی بے خبری سی بے خبری ہے کہ کچھ سوچنے، کچھ کرنے کا یارا ہی نہیں رہا۔ اس دوران مجھے حاجی صاحب کے جانکاہ انتقال کی خبر بھی ملی، میں نے اطفال گھر کو اپنی ذمّے داری میں لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ "نئے پنڈ" کے چوہدری ممتاز نامی آدمی نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔ تب میں نے ایک خطیر رقم بہ طور چندے کی صورت میں اطفال گھر کو دینے کے لیے وہاں کا دورہ کیا، اور تم سے ملاقات کی تم تب تک ماشاء اللہ جوان ہو چکے تھے، تاہم میں تمہیں اور تم مجھے پہچان چکے تھے۔ مگر میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اطفال گھر جیسے اتنے اچھے اور پاکیزہ ادارے کی آڑ میں اب وہاں کیا انسانیت سوز گل کھلائے جا رہے تھے۔ تمہاری زبان سے اس ادارے کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات سن کر تو میں بالکل دنگ ہو کر رہ گیا۔" وہ اتنا کہہ کر رکے پھر مسکرا کر بولے۔

"شہزی بیٹا! میرے دونوں پوتے پوتی سے تو تم مل چکے ہو ناں... پوتے کا نام خرم ہے، اور پوتی نیمہ ہے۔ دونوں مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ بس اب تو یہی میرا کل سرمایہ ہیں میرے مرحوم بیٹے کی نشانی ہیں۔"

میں نے ان کے مرحوم بیٹے محمود کے بارے میں ان سے دعائیہ کلمات کہے۔ اور ان کی بیمار بہو سے متعلق بھی زیرلب دعا کرتے ہوئے سرمد بابا سے پوچھا۔

"باجی عارفہ کی طبیعت اگر اس قدر خراب ہے تو آپ کو انہیں فوراً لے کر امریکا روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"ساری کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں شہزی بیٹا۔ چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ میں بھی عارفہ بیٹی کے ساتھ چلا جاؤں مگر عارفہ بیٹی کے پُرزور انکار پر کہ دونوں بچوں کی تعلیم کا حرج ہوگا نجانے کتنا عرصہ عارفہ بیٹی کو وہاں لگے۔ پھر یہاں کچھ کاروباری مجبوریاں بھی ہیں۔ بہرحال تین روز بعد عارفہ بیٹی کی فلائٹ کنفرم ہو چکی ہے۔"

"تو کیا وہ اکیلی جا رہی ہیں، امریکا؟" میرے لہجے میں موہوم سی حیرت تھی۔

"ہاں بیٹا! حالات اور مجبوری نے عارفہ بیٹی کو بہت سخت اور نڈر بنا دیا ہے۔ یہ فیصلہ اس کا ہے کہ وہ اکیلی ہی بہ غرضِ علاج امریکا جائے گی۔ آگے جو نصیب..." سرمد بابا اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مجھے اب سرمد بابا کے دکھوں کا اندازہ ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "بابا کیا میں عارفہ باجی سے مل سکتا ہوں؟ عیادت کرنا چاہتا ہوں ان کی۔"

"ضرور" وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولے۔ "وہ اب گھر پر ہی آرام کرتی ہے۔ اور امریکا روانگی کی منتظر ہے اب میں نے بات کی تھی۔ آفس میں ہمارے بزنس منیجر جمال مرزا نے ایک انتہائی ضروری کام سے انہیں بلایا تھا۔ وہ خود عارفہ بیٹی کو لینے آیا تھا۔ آتی ہوگی۔"

اس طرح باتیں کرتے ہوئے کچھ ساعتیں اور بیت گئیں کہ انٹرکام ..... پہ چوکیدار نے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔

"آ گئے وہ لوگ۔" سرمد بابا نے کچھ پوچھنے کے بعد مجھ سے کہا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" سرمد بابا میری بے چینی بھانپ کر بولے۔ "باہر ہی ان کا استقبال کرتے ہیں۔"

ہم دونوں اس محرابی دروازے سے باہر آ گئے۔ ایک سنگل ڈور منی پجیرو جیپ اندر داخل ہو رہی تھی، میری دھڑکتی نظریں جیپ پر جمی ہوئی تھیں۔ یوں جیسے عابدہ کے جیپ سے نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے اس کی راہ میں استقبال کے لیے آنکھیں بچھا دیں ہوں۔

دروازے کھلے۔ تین افراد کے ساتھ عابدہ اتری، دو آدمی مسلح تھے، ایک غیر مسلح، یہی اول خیر تھا۔ عابدہ مجھے اور میں اسے دیکھ کر ایک دوسرے کی طرف دوڑے اور قریب پہنچ کر میں نے اس کے نرم و نازک پھول سے وجود کو تھامنا چاہا مگر وہ فورِ جذبات کی شدت سے مجھ سے لپٹ گئی اور میں بھی اس سے پیوست ہو گیا۔ اس کے وجود کی مخصوص شناسا خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور خودی کے عالم میں بے خودی طاری ہونے لگی... وہ میرے کشادہ سینے پر اپنا سر رکھے گلنار چہرہ دھیرے دھیرے رگڑ رہی تھی اور مجھے پیار کا امرت اپنے وجود میں اترتا محسوس ہونے لگا۔ وہ ہولے ہولے سسک کر رونے لگی۔ اس کے ریشمی بالوں کی خوشبو کو میں ہونٹوں سے چوم رہا تھا۔

"عابدہ! تت... تم ٹھیک تو ہو نا...؟" بالآخر میں نے آہستگی کے ساتھ اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ آنسوؤں سے لبریز چہرے سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک... تمہیں چشم سلامت دیکھ کر خوشی کی انتہا سے میرے آنسو نہیں تھم رہے ہیں شہزاد۔" میں نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ ان خبیثوں نے کوئی زیادتی تو نہیں کی تھی؟"

"نہیں۔" وہ مستحکم لہجے میں بولی۔ "ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میں مر جاؤں گی۔"

سرمد بابا نے ہولے سے کھنکار کر ہمیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ اب تک وہ سب خاموش کھڑے تھے، میں جھینپی ہوئی ہنسی کے ساتھ اول خیر کی جانب متوجہ ہوا۔

"اوخیر..." وہ اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا اور پھر مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ اس نے دو بار میرا منہ بھی چوم لیا۔ میں نے اس کے دونوں ساتھیوں سے بھی ہاتھ ملایا۔ ان کے انداز میں میرے لیے احترام تھا۔ وہ سرمد بابا سے بھی ملے۔ انہوں نے انہیں اندر آنے اور بیٹھنے کا کہا لیکن اول خیر نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔ وہ اس وقت واپس لوٹنا چاہتا تھا۔ میں کسی سوچ میں الجھا رہا۔

"کاکا! تیری امانت ہم نے تجھ تک پہنچا دی۔ اب ہمیں اجازت دے۔" اول خیر مجھ سے بولا تو میں نے خیالات سے چونک کر کہا۔

"اول خیر! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" میری بات پر اس کے چہرے پہ بے پناہ مسرت ابھر آئی۔

"بھلے کاکا! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ابھی چل وہاں بھی تم سے ملنے کے لیے کچھ لوگ بے چین ہیں۔"

سرمد بابا میری بات پر الجھن کا شکار تھے۔ عابدہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی۔ میں نے پہلے عابدہ کی طرف دیکھا پھر سرمد بابا سے مخاطب ہوا۔

"بابا! میں عابدہ کو آپ کی ذمے داری میں سونپنا چاہتا ہوں۔ آپ سمجھدار ہیں، عابدہ کی موجودگی میں یوں بھی میرا یہاں رہنا مناسب نہ ہوگا۔ مگر میں آپ سے رابطے میں رہوں گا، آتا جاتا بھی رہوں گا۔ عابدہ آپ پر بوجھ تو نہیں بنے گی؟"

"کیسی باتیں کر رہے ہو تم، شہزی بیٹا!" وہ یکدم تڑپ کر بولے۔ تاہم وہ اشارہ سمجھ چکے تھے۔ "تم اور عابدہ میرے لیے اولاد ہی کی طرح ہو، عابدہ میرے پاس رہے گی تو اس سے بڑھ کر مجھ بدنصیب بڈھے کے لیے خوشی کی اور کون سی بات ہو سکتی ہے۔ اللہ نے مجھے صرف بیٹا دیا تھا، وہ بھی اس نے اپنی رضا سے واپس لے لیا۔ عابدہ کو تو میں اپنی بیٹی ہی سمجھوں گا۔" وہ آبدیدہ ہو گئے، اور عابدہ کے سر پہ دستِ شفقت بھی رکھ دیا۔ مجھے تسلی ہوئی، پھر میں نے عابدہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"عابدہ! میرے سامنے کچھ اہم مقاصد ہیں، جنہیں میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم سمجھداری کا ثبوت دو گی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں کچھ باتیں سمجھ میں آ جائیں گی۔"

"لل... لیکن... شہزی...؟" اس نے اضطراری انداز میں کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکی مگر میں اس کی پریشان کن بے چینی کو بھانپ کر محبت ریز مسکراہٹ سے بولا۔

"عابدہ! میری فکر نہ کرو۔ اپنا خیال رکھنا۔ میں تم سے دور نہیں ہو رہا۔ آتا جاتا اور تم سے ملتا جلتا رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔" میرے جانے کے دکھ سے اس کی آنکھیں پھر بھیگنے لگیں۔ مگر میں نے سمجھایا کہ انسان کی زندگی کا مقصد صرف اپنے لیے نہیں ہوتا، تقدیر آپوں آپ کچھ ذمے داریاں انسان کے کندھے پر ڈال دیتی ہے۔ مجھے کچھ مجبور اور بے کس آنکھیں اپنی جانب تکتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ جو مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے ہیں۔ میں کل یا پرسوں آ کر تم سے ملوں گا اور کچھ باتیں پوچھوں گا۔ ابھی تم آرام کرو۔"

اس کے بعد میں سرمد بابا اور عابدہ کو خدا حافظ کہہ کر اول خیر کے ساتھ اس کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

ہم سرمد بابا کی رہائش گاہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ جیپ اول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ اس کے دونوں مسلح ساتھی، عقبی نشستوں پر چوکس بیٹھے تھے۔ اول خیر میرے ساتھ جانے کے فیصلے پر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

"اوخیر... کاکا! تو نے میرے ساتھ آ کر بہت اچھا کیا۔" ایک معروف شاہراہ کی جانب موڑ کاٹنے کے بعد وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "بیگم صاحبہ اور استاد کمیل دادا تجھے دیکھنے اور ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ سچ پوچھ تو ان کی دلی خواہش تھی کہ میں تجھے ساتھ لے آؤں، میں ابھی سب سے پہلے بیگم صاحبہ کو یہ خوش خبری سناتا..." کہتے ہوئے اس نے اپنے سیل فون پر ایک نمبر پنچ کرنا چاہا مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل دیا۔

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے قدرے مسکرا کر پوچھا۔

"بس ایسے ہی، اس کی ضرورت نہیں۔" سنجیدگی سے یہ کہتے ہوئے اس نے سیل فون واپس رکھ لیا۔ میں اول خیر سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا، غالباً اس سے زیادہ عابدہ سے کہ اسے ان پانچ لڑکیوں کے ساتھ کہاں لے جایا گیا تھا؟ باقی لڑکیوں کا کیا ہوا؟ ممکن تھا، اول خیر بھی اس کی تفصیل سے آگاہ ہو۔ عابدہ کے بعد اب وہ لاپتا بدنصیب لڑکیوں کی تعداد چار ہو گئی تھی، ان میں شکیلہ بھی شامل تھی، اطفال گھر کی اب موجودہ پوزیشن کیا تھی؟ اور شوکی سمیت دیگر لڑکے بچے بچیاں لڑکیاں کہاں تھیں؟ ان سب سوالوں کے جواب مجھے اول خیر سے معلوم کرنے تھے۔

ابھی میں نے اول خیر سے بات چھیڑنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتاً ہمارے عقب سے ایک..... ٹرک گھڑگھڑاتا ہوا نمودار ہوا۔ آگے موڑ تھا۔ شاید اول خیر نے اپنی جیپ اس سمت موڑنا تھی۔ اس لیے جیپ کی رفتار اس نے آہستہ کر دی تھی، جبکہ ہمارے پیچھے سے نمودار ہونے والا ..... ٹرک (درمیانے سائز کا ٹرک) بدستور تیز رفتاری سے دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اول خیر نے دائیں جانب مڑنے کا انڈیکیٹر دے رکھا تھا، اصولاً ٹرک کو بھی اپنی رفتار آہستہ کر دینی چاہیے تھی، جبکہ اول خیر کو بھی تسلی تھی کہ ٹرک والا بائیں جانب سے انہیں اوورٹیک کر کے نکل جائے گا یا پھر رفتار دھیمی کر دے گا۔ مگر جانے کیوں میری نظریں عقب نما مرر پر جم سی گئی تھیں۔ طوفانی رفتار سے آنے والے ٹرک کی اسپیڈ میں مجھے بجائے کمی کے بتدریج اضافہ ہی ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جیپ قدرے رک کر دائیں جانب موڑ کاٹ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک دھماکے سے جیسے زلزلہ آ گیا۔ موڑ کاٹتی جیپ کے عقبی حصے سے وہ..... ٹرک ٹکرایا۔ جیپ کو ایک طوفانی جھٹکا لگا، شکر تھا کہ وہ الٹی نہیں تھی، البتہ ٹکر کے باعث جیپ دوسری سڑک پر آ کر پھرکی کی طرح گھومتی ہوئی دوسری جانب سڑک پر آ گئی۔ یہ دو سڑکوں کے درمیان بنا کٹ تھا دوسری جانب کی سڑک سے آتی ہوئی ٹریفک رواں تھی، نتیجتاً گاڑیوں کے ٹائروں کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔ اور ہماری جیپ سے ایک گزرتی ہوئی تیز رفتار کار ٹکرائی، یہ دوسرا دھماکا تھا۔ میرے حواس مختل ہونے لگے، شیشوں کی کرچیاں اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرا گئیں، جن سے چہرے پہ خراشیں پڑ گئیں، مگر اس وقت ان باتوں کا کہاں ہوش تھا۔ بدبخت ٹرک تو تیزی سے نکل گیا تھا۔ ہمیں چوٹیں تو آئی تھیں مگر اول خیر اور اس کے ساتھیوں نے دوبارہ سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ سڑک پر ان گنت گاڑیوں کے ہارن نے شور بپا کر رکھا تھا۔

"ہوشیار! چھوٹے استاد! دشمن...!"

دفعتاً مجھے اول خیر کے ایک آدمی کی خبردار کرنے کی

آواز سنائی دی۔ میں سیٹ پر جھکا ہوا تھا، سر ابھار کر دیکھا۔ اس سمت سے جدھر ہماری جیپ نے آتے ہوئے موڑ کاٹا تھا، ایک کار نمودار ہوئی اور چار پانچ مسلح افراد نمودار ہوئے تو خبردار کرنے والے آدمی نے جیپ کے اندر سے ان پر فائر کھولنا چاہا لیکن ان میں سے دو افراد نے خودکار رائفلوں سے اسے بھون کر رکھ دیا۔ اس کی کرب ناک چیخیں ہمیں سنائی دی تھیں۔ ساتھ ہی گولیوں کی جھپک مجھے اپنے چہرے پہ بھی محسوس ہوئی۔

"دُبکا رے، کاکا! سیدھا مت ہونا۔" مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ اس دوران اول خیر کے دوسرے آدمی نے جوابی فائرنگ کی جبکہ اول خیر بجلی کی پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے رینگ گیا۔ میں خود اگلی سیٹ کے پائیدان میں سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ باہر گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ جاری تھی، یہ شہر کا وسطی علاقہ تھا اس لیے وہاں خاصی جگہ بچ گئی، کئی لوگوں کے چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ باہر آگ اور خون کا کھیل جاری تھا، تابڑتوڑ گولیاں برسنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یکدم سناٹا چھا گیا اور کھٹکا ہوا، جس دروازے سے اول خیر باہر گیا تھا، وہیں سے وہ دوبارہ نمودار ہوا، اب اس کے ہاتھ میں جدید قسم کی گن نظر آرہی تھی۔

"کاکا! جلدی نیچے اتر میرے پیچھے آ... جلدی... جلدی۔" یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑا۔ میں نے تیزی سے حرکت کی اور جیپ سے باہر آگیا۔ دائیں بائیں گاڑیاں رکی ہوئی تھیں لوگ اِدھر اُدھر بھاگ کر جا چکے تھے۔ چند لاشیں بھی سڑک پر پڑی نظر آئیں۔ یہ انہی لوگوں کی تھیں، جنہوں نے بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ ہم پر حملہ کیا تھا، مگر شاید اول خیر کے ہاتھوں خود ہی مار کھا گئے تھے، ان کی کار سڑک کے "کٹ" پر ترچھی کھڑی تھی، اس کا رنگ ڈارک بلیو تھا۔ اول خیر کو میں نے اس کار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میں بھی اس کے عقب میں ہولیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے دروازے کے قریب پہنچ کر اول خیر نے قدرے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

"کاکا۔ پیچھے بیٹھ... جلدی..." یہ کہتے ہی اس نے پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گن برابر کی سیٹ پر پھینکی۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اور چونک پڑا۔ سیٹ پر کسی کا آڑا ترچھا زخمی وجود بے سدھ پڑا تھا۔ تاہم میں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا اور دروازہ بند کرلیا۔ اول خیر نے پھرتی سے کار اسٹارٹ کر کے ایک طرف موڑ کاٹ کے آگے بڑھا دی۔

"یہ لے کاکے سب سنبھال۔" سامنے نظریں مرکوز کرتے ہوئے، اول خیر نے میری طرف ایک پستول بڑھایا۔ جو میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ خاصا وزنی پستول تھا۔

"چلانا آتا ہے؟"

"نن... نہیں... شاید ہاں..."

"سیکھ جائے گا۔"

"یہ... کس کی لاش ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں پہچانا اس سور کی اولاد کو؟"

میں نے ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس کے سر پہ چوٹ آئی تھی ... دائیں ٹانگ کی ران پر گولی لگی تھی، یہی حال بائیں بازو کا تھا، اس کا سر سینے کی طرف مڑا ہوا تھا۔ میں ابھی اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔

"یہ گنگل خان ہے۔" اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا۔ "یہ مرا نہیں ہے، زخمی ہے... اس پر نظر رکھو، ہمیں شکار کرنا چاہتا تھا، خود شکار ہوگیا۔ میرا خیال ہے یہ تجھے اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا..."

"یہ ہمارے لیے کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔" میں نے فوراً کسی خیال کے تحت اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اسے ہر صورت زندہ رکھنا ہوگا اول خیر..."

مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی، پھر میں نے بات بدل ڈالی۔ وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"تمہارے باقی دو ساتھیوں کا کیا ہوا؟"

"دونوں خرچ ہوگئے۔"

"اوہ..."

"ہماری زندگی ایسے ہی ہے کاکا۔ پانی کا بلبلہ..."

اسے اپنے دونوں ساتھیوں کے مرنے کا افسوس تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کی چمک محسوس کی۔ تاہم دوسرے ہی لمحے اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے رکھتے ہوئے دانت بھینچ کر کہا۔ "بدلے میں ان کے چار آدمی بھی گئے۔ گنگل خان ہاتھ لگا ہے، یہ ان کا اہم آدمی ہے۔"

"اول خیر۔ اس مردود کو ابھی نہیں مرنا چاہیے۔" میں نے اپنی بات دہرائی۔

"نہیں مرے گا اور حکم کر کاکے؟" وہ عجیب سے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety twitter.com/paks

لہجے میں بولا۔

''میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا...''

''پوچھنا نہیں بول کاکا! اگلوانا بول۔ اتنا سیدھا نہیں کہ ہمارے سوالوں کے سیدھے طریقے سے جواب دے گا۔''

''کیا تم اس کے منہ سے کچھ نہیں اگلوا سکتے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ کار مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی، سوچنے لگا کیا ان کا ٹھکانا شہر سے کہیں باہر تھا؟

''او خیر... کاکا'' وہ ہنسا۔ ''ہم تو پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، مجھے اس سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔''

''تو پھر یہ شکار تیرے نام ہوا۔'' اول خیر نے قہقہہ لگایا۔ تھوڑی دیر پہلے ہونے والی خوں ریزی نے میری طرح اس کے اعصاب شل نہیں کیے تھے جبکہ میرے دل کی دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب سی تھیں۔

''تم ابھی جا کہاں رہے ہو؟''

''شکار کو ٹھکانے پر چھوڑنے۔''

''کیا تم اپنے اصل ٹھکانے پر نہیں جا رہے ہو؟ میرا مطلب ہے، جہاں مجھے لے کر جانا اور اپنے دوسرے ساتھیوں وغیرہ سے ملانا چاہتے تھے؟''

''تو نے ٹھیک اندازہ لگایا کاکا'' وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ کا یہی حکم ہوتا ہے۔ کوئی اہم شکار ہاتھ لگے تو سیدھا پرانی باؤلی والے ٹھکانے کی طرف پہنچایا جائے۔'' میں نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی، وفعتاً میں نے اول خیر کے چہرے سے ایک عجیب سی پُرسوچ اور گہری سنجیدگی کے تاثرات نوٹ کیے۔ اس کی نظریں کار کی ونڈ اسکرین کے پار ویران سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اچانک اسے بھی احساس ہو گیا کہ میں سر گھمائے اس کے چہرے ہی کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ فوراً میری طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا ہوا کاکا؟ کوئی بات ذہن میں آ رہی ہے؟''

''میرے تو نہیں، البتہ تمہارے چہرے سے ایسا مجھے ضرور لگا ہے اچانک ہی۔'' میں نے کہہ دیا تو وہ فوراً مسکرا کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''او خیر... کاکا! لگتا ہے تیرے ہاتھوں پیروں سے زیادہ تیرا دماغ چلتا ہے۔ تو نے ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ میں اس وقت واقعی کوئی اہم بات سوچ رہا ہوں۔''

''کیا؟'' بے اختیار میں نے بھی پوچھ لیا۔

''ٹھہر ذرا...'' کہتے ہوئے، اس نے ایک بار پھر اپنا سیل فون نکالا اور ایک نمبر پنچ کرنے کے بعد رابطہ ہوتے ہی بولا۔

''استاد! سیٹھ منظور کی رہائش گاہ سے واپسی پر دشمن نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔ کاکا شہزاد بھی ہمارے ساتھ تھا، شیدا اور جمالا مارے گیا۔ ہاں... ہاں... میں اور کاکا شہزاد بالکل ٹھیک ہیں۔ اور بالکل محفوظ ہیں۔ فکرمند نہ ہونا، تھوڑی دیر لگ جائے گی پہنچنے میں۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے حیرت ہوئی اس نے اپنے استاد سے کنگل خان کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا، ابھی میں اس سے کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے کار کی رفتار بتدریج کم کر دی اور تیزی کے ساتھ ایک یوٹرن لیا۔ اب کار دوبارہ شہر کے رخ پر تھی۔

''کاکا! ہم حکم کے غلام ہوتے ہیں۔'' یوٹرن لینے کے بعد وہ مجھ سے بڑے عجیب لہجے میں بولا۔

''تیرا میرا معاملہ ایک دوسرا تعلق بن چکا ہے۔ کاکے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنے لوگوں کو کنگل خان کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ کیونکہ تو نے اس سے نجانے کون سی اہم باتیں اگلوانی ہیں۔ ممکن ہے یہ کام وہاں بھی ہو جاتا مگر اس میں رسک تھا، میرے اوپر کے لوگ کنگل خان کو دیکھتے ہی اس کی موت کا پروانہ جاری کر دیتے۔ یا پھر انتقام کی آگ میں اسے تشدد کے دوران میں ہی ختم کر دیتے۔ اس سلسلے میں ان کے اصول سخت ہیں۔''

میں اس کی بات سے متاثر ہوا تھا، گویا وہ میری خاطر اپنے گروہ کے کڑے اصولوں سے انحراف کر رہا تھا، میں نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا، وہ بلاشبہ یار باش اور دوستوں کے لیے جاں باز تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

''اول خیر! میں تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ میں اس مردود کنگل خان سے ان چار معصوم لڑکیوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا... جنہیں یہ کچھ عرصہ پہلے غائب کر چکا تھا، عابدہ بھی ان میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ میں اطفال گھر کی نئی صورت حالات کے بارے میں جاننا چاہتا اور اب وہاں کے کیا حالات ہیں وغیرہ...''

''اگر عابدہ ان چار بدنصیب لڑکیوں میں شامل تھی تو وہ پھر تمہیں عابدہ سے بھی اس سلسلے میں دریافت کرنا چاہیے

تھا۔'' وہ بولا۔

''یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ظاہر ہے وہ ان لڑکیوں کے بارے میں مکمل تفصیل نہیں بتا سکتی تھی۔ پھر وہ کچھ ایسے حالات کا شکار رہی تھی۔ ابھی میں اس سے کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ تاہم میں اس سے فون پر بھی پوچھ سکتا ہوں... جتنا وہ جانتی تھی۔''

''اتنا میں بھی اس سے پوچھ چکا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''وہ کچھ نہیں جانتی، صرف اس قدر ہی بتا سکی تھی کہ ان لڑکیوں کو نیم بے ہوشی کے عالم میں کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا تھا مگر کچھ دنوں بعد عابدہ کو ان لڑکیوں سے الگ کر کے کسی دوسرے مقام پر رکھا گیا۔ وہ بہت خوف زدہ تھی، اس نے اشرف نامی ایک نوجوان سے رحم کی بھیک مانگی تھی، جسے وہ پہچانتی تھی، تمہاری دوست کی حیثیت سے۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خبیث بھی کنگل خان کا ساتھی بن چکا ہے۔ اور اس مردود اشرف نے ہی کنگل خان وغیرہ کو تمہاری اس کمزوری سے آگاہ بھی کیا تھا، جس کے نتیجے میں انہوں نے بعد میں تم پر جذباتی دباؤ ڈال کر عدالت میں جھوٹے بیان کی تم سے تصدیق کروانی چاہی تھی۔'' اول خیر نے اپنی بات ختم کی۔ اشرف کے لیے میرے دل و دماغ میں نفرت کی لہر سی ابھری تھی، ''یہ اشرف کون تھا کاکا؟'' اول خیر نے پوچھا تو میں نے مختصراً اس خبیث کے بارے میں بتا دیا۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ '' اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا اور اسے مختصراً موجودہ صورت حال سے آگاہ کرنے اور اپنی آمد وغیرہ کے بارے میں مطلع کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تم اپنے جن ساتھیوں کے پاس جا رہے ہو، کیا وہ تمہارے لوگوں سے اس کی شکایت نہیں کر دیں گے؟'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔

''وہاں میرا کوئی ساتھی نہیں، بس! تیرے جیسا ہی ایک یار ہے اپنا... چھتا... نام ہے اس کا۔ یہ بھی کبھی ہمارا ساتھی ہوا کرتا تھا، ہمارے گروہ میں کسی غلطی پر معاف کر دینے کا اصول سرے سے موجود نہیں ہے۔ چھتے سے بھی ایک فاش غلطی ہو گئی تھی، اسے ٹھکانے لگانے کے لیے مجھے مقرر کیا گیا تھا مگر چھتے کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا۔ میرے لیے یہ کڑا فیصلہ تھا۔ ایک طرف تنظیم کا حکم دوسری جانب دوستی، میں نے خود کو خطرے میں ڈال کر اس سالے چھتے کو بچا لیا اور اپنے لوگوں سے یہی کہا کہ میں نے اس کا کام تمام کر ڈالا ہے۔ چھتا ایک بیوہ عورت کی محبت میں گرفتار تھا۔ دو بچے پہلے شوہر سے تھے اس کے۔ اب وہ اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا ہے۔''

''کیا اس میں خطرہ نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ تمہاری تنظیم کے کسی آدمی کی نظروں میں آ گیا تو سب سے پہلے تم اپنے لوگوں کے زیرِ عتاب آؤ گے۔''

''او خیر...'' وہ ہنسا۔ ''کاکا! اپنا کچھ مزاج ہی ایسا ہے۔ دوستوں کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، میری موت بھی ایک دن اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہو گی۔ خیر... چھتے کو بھی اس خطرے کا احساس ہے۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ بدل لیا ہے۔ مگر اب وہ چند روز میں یہ شہر چھوڑ کر کسی اور شہر منتقل ہونے والا ہے۔''

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ یہ دشمنوں کی کار تھی، اول خیر اس سے بھی جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ کار شہر میں داخل ہو چکی تھی، چوک کے قریب ایک کچی آبادی خاصے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی مگر اول خیر نے وہیں ایک طرف کار روک لی۔ اور چھتے سے سیل فون پر بات کر کے اسے ہدایت دینے لگا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ پھر کار ایک کچے راستے پر اتار لی۔ غریب آبادی کے ننگ دھڑنگ بچے ہماری طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے، ٹیڑھی میڑھی گندی گلیوں سے گزرنے کے بعد کار ایک گلی کے سرے پہ واقع گھر کے دروازے پر جا رکی۔ ایک دروازے پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ چھتے نے شاید کچھ عرصہ خود کو روپوش رکھنے کے لیے دانستہ ایسی جگہ کا انتخاب کیا ہو گا۔ ایک چھریرے جسم، لمبوترے چہرے کا گورا چٹا آدمی دروازے پر پہلے ہی سے کھڑا نظر آیا۔ اس کے بال بہت چھوٹے اور کسی جیل کی مدد سے کڑک اور کھڑے کیے ہوئے تھے۔ وہ کلین شیو تھا۔ قد لمبا تھا۔ کار رکتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا۔

''پیچھے شکار موجود ہے۔ جلدی سے بتا کہاں اتارنا ہے؟ اول خیر نے کار کے اندر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔ شاید یہی چھتا تھا۔

''اندر ہی لے آؤ، پروین بچوں کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔''

اول خیر نے مجھے اترنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی اتر آیا۔ زخمی کنگل خان نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا تھا۔ اس کا بہت سا خون بہہ گیا تھا۔ حالت نازک ہو رہی تھی، مجھے تشویش ہونے لگی، کم بخت مر جاتا تو مشکل پڑ جاتی۔

گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد چھتے اور اول خیر نے پچھلی سیٹ سے زخمی گگل خان کو کھینچ کر باہر نکالا اور کھلے ٹاٹ جھولتے دروازے سے اندر لے گئے۔ میں بھی اندر آ گیا۔ مختصر سا نیم پختہ صحن تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ زخمی کو دوسرے کمرے میں لا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا۔

''چھتے!'' اول خیر نے قدرے ہانپتے ہوئے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا۔ ''پہلے اس کی مرہم پٹی کا کچھ بندوبست کر۔ میں تب تک کار سے جان چھڑا کر آتا ہوں۔''

گگل خان کی حالت کے پیش نظر اس نے متفکر لہجے میں کہا۔ ''اول خیر مجھے اس کی حالت بہت خراب لگ رہی ہے۔ یہ کیسے بچے گا؟'' میری بات پر وہ مسکرا کر بولا۔

''فکر نہ کر کاکے۔ یہ اپنا چھتا آدھا ڈاکٹر ہے۔ سب سنبھال لے گا۔'' پھر وہ چھتے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیوں چھتے سنبھال لے گا نا...؟ اسے مرنے نہیں دینا ہے، اس سے ہمیں کچھ ضروری باتیں اگلوانی ہیں۔''

''تم فکر نہ کرو استاد۔ میرے پاس سب سامان موجود ہے۔'' وہ بولا۔

''میں جانتا ہوں بس کاکے کی تسلی کی خاطر کہہ رہا تھا۔'' اول خیر نے مسکرا کر چھتے کا کاندھا تھپتھپایا اور باہر نکل گیا۔

اول خیر کے نکلتے ہی چھتا چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آ گیا۔ پھرتی کے ساتھ ہاتھ بھی چلنے لگے اور زبان بھی۔ میں بھی اس کی مدد کرنے لگا۔ ایک بکس نکال لایا تھا وہ جس کے اندر مرہم پٹی کا سامان تھا۔ ساتھ ساتھ بتاتا جا رہا تھا مجھے مثلاً جب وہ مختاری بیگم کے گروپ میں تھا تو کسی مقابلے وغیرہ میں زخمی ہونے والے ساتھیوں کی مرہم پٹی اس کے ذمے ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ چیرا لگا کر گولی بھی نکال لیا کرتا تھا۔ یہ سب اس نے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں کام کرتے ہوئے سیکھا تھا۔ گگل خان کی مرہم پٹی تو کر دی آخر میں اس کی ٹانگ اور بازو سے گولی نکالنے میں مصروف ہو گیا۔ گگل خان کے منہ سے کراہتی ہوئی آوازیں جب چیخوں میں بدلنے لگیں تو چھتے کی ہدایت پر میں نے اس کے منہ کے اندر ایک کپڑے کا ٹکڑے کا گولا بنا کر ٹھونس دیا۔

بازو کی گولی چھتے نے سرجیکل نائف سے نکال دی تھی مگر ٹانگ کی گولی نہ نکال سکا، وہ ران کے اندر تک گہرائی میں دھنسی ہوئی تھی، بہ قول اس کے اگر وہ گہرائی تک ''چیر پھاڑ'' کرتا تو بڑی نس کے پھٹنے کا خطرہ تھا، جس کے باعث خون روکنا اس کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہو جاتا۔

بہرحال پھر بھی اس نے کافی سارا کام بہ احسن خوبی نمٹا دیا۔ اس کے فرسٹ ایڈ باکس کے اندر ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔

''تو... ادھر ہی ٹھہر میں جب تک زمین پر گرے خون وغیرہ کی صفائی کر دیتا ہوں۔'' چھتے نے مجھ سے کہا۔ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

اس نے گگل خان کے ایک دو انجکشن بھی لگا دیے تھے۔ وہ اب نیم بے ہوش تھا۔

چھتے نے جلدی جلدی جب تک دوسرے کام نمٹائے اتنے میں اول خیر بھی آ گیا۔

گگل خان کی سنبھلتی ہوئی حالت سے مطمئن ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔ ''کیوں کاکا دیکھا چھتے کا کام؟''

''بہت خوب، یہ تو واقعی سرجن ہے۔'' میں نے بھی چھتے کی توصیف کی تو چھتا بولا۔

''ایک گولی میں نہیں نکال سکا مگر میں نے زخم کے اندر ''پیکنگ'' کر دی ہے۔ تاکہ خون بہنا بند ہو جائے، ابھی اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''ایک بات بتا چھتے!'' اول خیر نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''بھابی اور بچے کتنی دیر میں آئیں گے؟''

''آتے ہی ہوں گے، ادھر پاس کے میدان میں منگل بازار لگتا ہے، پروین وہاں کچھ خریداری کے لیے گئی ہے۔''

''تو چند گھنٹوں کے لیے انہیں کسی دوسری جگہ نہیں لے جا سکتا؟''

''اگر میری مزید ضرورت نہیں ہے تو میں پروین اور بچوں کو ان کی خالہ کے ہاں لے جاتا ہوں۔''

''مگر یہ کام رازداری سے ہونا چاہیے۔ ان کو ہمارا پتا نہ چلے۔'' اول خیر نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

''نہیں پتا چلے گا، میں باہر سے ہی انہیں لے جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، بس! اب تو جا...'' اول خیر نے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔ جاتے ہوئے چھتے نے اول خیر کو تاکید کر دی کہ گھر کا تالا لگا جانا باہر سے۔

چھتے کے جانے کے بعد اول خیر نے ایک گہری سانس خارج کر کے مجھ سے کہا۔ ''چل بھئی کاکا بس ہمارے پاس دو تین گھنٹے ہی ہیں جو پوچھنا ہے اس سے پوچھ لے۔''

''مگر یہ تو ہوش میں ہی نہیں ہے۔ کچھ بتائے گا کیسے؟'' میں نے چارپائی پر بے سدھ پڑے گگل خان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہوش میں لے آتے ہیں اسے۔'' یہ کہہ کر اول خیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پانی کا ایک پلاسٹک کا جگ تلاش کیا اور گگل خان کے چہرے پر چھینٹے مارے، تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ آنکھیں کھولتے ہی اس نے ہمیں پہچان لیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش چاہی مگر میں نے اسے گریبان سے دبوچ لیا۔ اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب کرتے ہوئے خوفناک لہجے میں بولا۔

''تم کوئی حرکت نہیں کرو گے، گگل خان! تم سے مجھے بہت سی باتوں کا حساب لینا ہے۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' وہ بھی مجھے غصیلی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ایک نظر اس نے میرے ساتھ کھڑے اول خیر پر بھی ڈالی، مجھے حیرت تھی کہ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ تھا اس کا مطلب تھا وہ آسانی سے زبان نہیں کھولے گا۔

میں نے اس کا گریبان ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ دوبارہ چارپائی پر چت ہو گیا۔

''وہ لڑکیاں کہاں ہیں؟''

''کون سی لڑکیاں؟'' وہ جیسے انجان بن گیا۔

''وہی جنہیں تم نے اس روز کسی کے حوالے کیا تھا، جب میں بھی تمہاری قید میں تھا اور اس میں عابدہ اور شکیلہ بھی تھیں۔''

''عابدہ کو تو یہ کتا لے اڑا۔'' گگل خان نے زہرخند لہجے میں اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں نے طیش میں آ کر ایک گھونسا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ میں نے احتیاط کی تھی کہ اس کی پیشانی کا زخم نہ کھلنے پائے۔

''زبان کو لگام دے کتے کی اولاد۔ عورتوں کے بیوپاری، اپنی ماں بہن کو بھی تو نے ضرور اس طرح ہی کسی کے حوالے کیا ہوگا۔ سیدھی طرح میرے سوالوں کے جواب دے۔ وہ چار بدنصیب معصوم لڑکیاں کہاں ہیں؟''

گھونسا کھانے کے بعد وہ کھا جانے والی نفرت انگیز نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر ایک طرف تھوکتے ہوئے بولا۔ ''تو کل کا لونڈا گگل خان کا منہ کھلوائے گا، ان لوگوں کی شہ پر تو جو کچھ کر رہا ہے نا بہت جلد ان کا حشر بھی تو اپنے ساتھ خراب ہوتا دیکھ لے گا۔''

اس کی دھمکی آمیز بات پر میرا دماغ ایک بار پھر الٹنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے زدوکوب کرتا، اول خیر نے مجھے روک دیا اور بولا۔

''کاکا! میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا... یہ اتنی آسانی سے زبان نہیں کھولے گا... لیکن ٹھہر... ذرا...'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک پلاسٹک کا ڈبا تھا۔ اس کے اندر پسی ہوئی سرخ مرچیں تھیں۔ اول خیر نے بڑی بے رحمی سے گگل خان کی پیشانی کے زخم پر سے پٹی کھینچ لی۔ اس کا زخم پھر کھل گیا.... کپڑے کا گولا اس کے منہ میں ٹھونسا اور ڈبے سے مرچیں نکال کر اس کے کھلے رستے زخم پر یوں چھڑکنے لگا جیسے ہانڈی میں ڈال رہا ہو۔

زخم جو پہلے ہی جلن کا شکار تھا، سرخ مرچیں پڑنے سے اس کی جلن بڑھ گئی۔ گگل خان تکلیف کے باعث اپنا سر ادھر ادھر مارنے لگا۔ اول خیر نے اس پر بس نہ کیا۔ وہ ایک اور ڈبا کچن سے اٹھا لایا۔ اس کے اندر نمک تھا، اب وہ محاورتاً نہیں حقیقتاً گگل خان کے زخم پر نمک چھڑکنے لگا۔ گگل خان کا وجود اینٹھن کا شکار نظر آنے لگا۔ اس نے کئی بار چارپائی سے اٹھنے کی بھی کوشش چاہی مگر میں اسے فوراً دبوچ لیتا۔ کپڑے کا گولہ منہ میں ٹھنسے ہونے کے باعث وہ چیخنے سے بھی قاصر تھا، اس کی جگہ اس کے حلق سے غرغراہٹیں ابھرنے لگیں۔

''کھولتا ہے، منہ اپنا یا تیری آنکھوں کی باری آئے اب...؟'' اول خیر نے غراتے ہوئے کہا مگر گگل خان نے اپنے سر کو اثبات میں نہ ہلایا۔

''کاکا! اس کا سر دبوچ ذرا۔'' اول خیر نے دانت پیستے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں نے فوراً گگل خان کا دائیں بائیں حرکت کرتا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اول خیر نے اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کی مدد سے اوپر کر دیا۔ اور سرخ مرچ آنکھ میں انڈیل دی۔ اس پر بس نہ کرتے ہوئے اول خیر نے اس کی نتھنوں کے اندر بھی سرخ مرچ اور نمک گھسیڑ دیا۔ گگل خان کی حالت دیدنی حد تک ابتر ہونے لگی۔

وہ چارپائی پر مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگا۔ اول خیر نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔

''اگر اب بھی تو نے زبان نہ کھولی تو تیری شلوار اتار کر مرچیں بھر دوں گا... بول...؟''

گگل خان نے تب بھی اپنے سر کو اثبات میں نہیں ہلایا تو اول خیر نے غصے سے ہونٹ بھینچ کر اس کی قمیص اوپر اٹھائی اور ابھی اس کے ازاربند کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گگل خان کا سر تیزی سے اثبات میں ہلنا شروع ہو گیا۔

اول خیر نے زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے اشارہ

کیا۔ میں نے فوراً گنگل خان کے منہ میں ٹھونسا ہوا گولا نکال دیا۔

"پپ... پپ... پانی... لگاؤ میری آنکھ اور زخم پر..." اور ہانپتا ہوا فریاد کرنے لگا۔

"ہرگز نہیں، پہلے ہمارے سوالوں کا جواب دے۔ اس کے بعد..." اول خیر گرجا۔

"میری... میری زندگی کی ضمانت کیا ہے؟" وہ تکلیف کی شدت کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش میں کراہتے ہوئے بولا۔

"تیری تسلی کے لیے یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اس وقت ہم تجھے قتل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہمارے سوالوں کے جواب دے اور نکل جا یہاں سے۔"

اول خیر نے کہا۔ "مگر تجھے سچ بولنا ہے جب تک ہم اس کی تصدیق نہیں کرلیں لیتے تجھے نہیں چھوڑیں گے، یہ بھی یاد رکھنا۔"

"وہ چاروں لڑکیاں فروخت کردی گئی ہیں۔"

"کہاں...؟ اور کس آدمی کو...؟"

"جمعہ خان کو۔"

"وہ کہاں رہتا ہے؟"

"اوکاڑہ میں چنی بائی کے کوٹھے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ ان چاروں لڑکیوں کو ادھر ہی لے گیا ہے۔"

"تو نے کس کے کہنے پر... ان چار بدنصیب لڑکیوں کو ان کے حوالے کیا تھا؟"

"چوہدری ممتاز کے۔ چنی بائی کے کوٹھے کی پشت پناہی چوہدری ممتاز ہی کرتا ہے۔"

"یہ کمینہ نسل خنزیر! جھوٹ بول رہا ہے، اول خیر!" میں پھٹ پڑا۔ "اگر ان لڑکیوں کو جمعہ خان اوکاڑہ لے گیا تھا تو یقیناً عابدہ بھی ان کے ساتھ ہوتی... مگر عابدہ تو ان کے قبضے میں تھی۔"

"ہاں! یہ صحیح ہے۔" گنگل خان کی زبان تکلیف سے بچنے کی خاطر فرفر چل رہی تھی۔ وہ اب مجھ سے مخاطب تھا۔ "تم سے جھوٹا بیان دلوانے کے لیے عابدہ کے ذریعے دباؤ ڈالنے کا حربہ اشرف نے ہمیں دیا تھا۔ جس کے باعث عابدہ کو چوہدری ممتاز نے فوراً اکاڑہ سے واپس بلوالیا تھا۔"

اشرف کے اس حربے کی کارستانی کا مجھے پہلے ہی شبہ تھا، جب میں نے اس روز کورٹ کے احاطے میں اشرف کو عابدہ کے ساتھ گاڑی میں اس کی مجھے جھلک دکھانے کے دوران مسلح آدمیوں کے ہمراہ بیٹھے دیکھا تھا۔ اب اس کی تصدیق ہوتے ہی اشرف کے لیے میرے پورے وجود میں نفرت اور غیظ و غضب کی سنسناتی ہوئی لہر دوڑ گئی۔ یہی وہ کمینہ شخص تھا، جسے میری اس کمزوری کا علم تھا۔

"چنی بائی کے کوٹھے کا پتا بتاؤ۔" اول خیر نے پوچھا۔ اور گنگل خان نے اسے اس کا پتا بتا دیا۔

"اب تو خدا کے لیے مجھے عذاب سے نجات دلا دو۔ مرا جا رہا ہوں میں تکلیف سے۔" وہ کراہا تو اول خیر نے میری طرف دیکھا۔

"میرے آخری سوال کا جواب دو۔" میں نے گنگل خان سے کہا۔ وہ کراہتا رہا۔ میں نے پوچھا۔

"اب اطفال گھر کی تازہ صورتِ حال کیا ہے وہ ابھی تک تمہارے یعنی چوہدری ممتاز کے تصرف میں ہے یا..." میں نے مستفسرانہ انداز میں دانستہ اپنا سوال ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

"ہاں، ہاں سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ نہیں بدلا۔"

"کیا مطلب؟" میں بری طرح چونکا۔ "کیا پولیس نے اطفال گھر کا بھانڈا نہیں پھوڑا ابھی تک؟ اور وہ بچے لڑکے لڑکیاں...؟"

"سب کچھ ویسا ہی .... چل رہا ہے۔" اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کی مرچ بھری آنکھ سے آنسوؤں کی آبشار جاری تھی اور نتھنوں میں مرچ اور نمک کی پھونک، نے اس کی ناک سے رطوبت جاری کردی تھی، چھینکیں مار مار کر اس کا برا حال ہوا جا رہا تھا۔

"ہاں! سب کچھ ویسا ہی ہے۔ چوہدری ممتاز بڑے اثر و رسوخ کا آدمی ہے۔ اب بس کرو۔ خدا کے لیے۔" اس نے فریاد کی۔

اول خیر حرکت میں آیا۔ اور اسے بازو سے تھام کر غسل خانے لے گیا۔ میں کمرے میں ہی کھڑا سوچتا رہا۔ اس نے جو باتیں بتائی تھیں، اس نے میری بے چینی کو بڑھا دیا تھا۔ مجھے شکیلہ سمیت ان چاروں معصوم لڑکیوں کے بارے میں تفکر آمیز تشویش ہونے لگی، جو اوکاڑہ... کی چنی بائی کے کوٹھے پر پہنچا دی گئی تھیں۔ ان میں شکیلہ بھی تھی جو شوکی کی اور عابدہ کی دوست تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ شوکی ایک غلط فہمی کے باعث مجھ سے نفرت کرنے لگا تھا مگر اطفال گھر میں میرے گنگل خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے ٹکرا جانے کے بعد یقیناً اس کی غلط فہمی دور ہوجانی چاہیے تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ میں ان چاروں بدنصیب لڑکیوں کی رہائی کے سلسلے میں کیا کرسکتا تھا؟

اول خیر نے جس طرح اپنے لوگوں یعنی مختاری بیگم اور کھیل دادا وغیرہ کے سخت اور کڑے اصولوں کے مطابق مجھے جو کچھ بتایا تھا، اس کے پیشِ نظر اب میرا ارادہ اول خیر کے ساتھ زیادہ دیر تک نتھی رہنے کا ہونے لگا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میری خاطر میری دوستی کی خاطر بار بار ایک کڑے امتحان سے دوچار ہو۔ اور اپنے ہی گروہ کے زیرِ عتاب آجائے، دیکھا جائے تو یہ والا معاملہ بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے کر بڑا رسک لیا تھا۔ پتا نہیں اب یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا؟ اطفال گھر کے سلسلے میں مجھے تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی کہ بقول گنگل خان کے وہاں کے معاملات و معمولات جوں کے توں تھے، وہاں خونی معرکے کے بعد بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ یعنی وہاں کے کالے دھندوں کو پولیس کی سرپرستی حاصل تھی جن میں وہ راتب خور انسپکٹر روشن خان پیش پیش تھا۔

اپنے باپ کی تلاش بھی میرے لیے ایک ازلی سوالیہ نشان تھا۔ کیا میں اکیلا اور اول خان جیسے کسی تجربے کار آدمی کے بغیر یہ پہاڑ جیسی ذمے داری پوری کرلوں گا۔ اس پر مستزاد، میری چوہدری ممتاز جیسے بااثر اور خطرناک آدمی سے دشمنی کی ابتدا بھی ہوچکی تھی۔ میں کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا، میری تقدیر میں کیا تھا۔ قنوطیت اور مایوسی ایک بار پھر میرے دل و دماغ کو گھیرے میں لینے لگی۔

دفعتاً ایک آواز پر میں بری طرح چونک پڑا۔ بڑی عجیب آواز تھی، وہ خرخراتی ہوئی۔ آواز غسل خانے سے آتی محسوس ہوئی تھی مجھے۔ جدھر اول خیر زخمی گنگل خان کو پانی کے چھینٹے لگانے کے لیے لے کر گیا تھا۔ ایک سنسناتا ہوا خیال میری رگوں میں دوڑ گیا۔ اور پھر جیسے میرے وجود میں بجلی سی بھر گئی، میں گولی کی سی رفتار سے دروازے کی طرف لپکا۔ اور کسی سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا۔ یہ اول خیر تھا۔ مجھے سامنے غسل خانے کے قریب گنگل خان کا بے سدھ وجود نظر آیا، اس طرح کہ اس کے دونوں ہات پاؤں پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں مرچوں بھری آنکھ سرخ انگارہ بنی بہت دہشت ناک منظر پیش کررہی تھی۔ اس کی گردن میں عجیب انداز میں مڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"گگ... کیا ہوا... اسے؟" میں نے متفکر سے کھڑے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔ "گزر گیا جہان سے یہ کاکے!"

"کیا؟ کیسے مرا؟" میں ہونق سا ہوگیا۔

"سالا مردود! اس حالت میں بھی چالاکی کرنے سے باز نہ آیا۔ آنکھیں اور ناک دھونے کے بعد اس نے مجھ پر اچانک حملہ کردیا... جس کی مجھے کم ہی توقع تھی مگر پستول میں نے بھی اس پر تان رکھا تھا، وہ اس نے مجھ سے جھپٹنے کی کوشش کی تھی اور ایک حد تک کامیاب بھی ہوگیا تھا مگر ناتک زخمی ہونے کے باعث وہ لڑکھڑا گیا اور اس کی گردن میرے ایک بازو کے شکنجے میں آگئی، اگر میں جھٹکا لگا کر اس کی گردن کا منکا نہ توڑ ڈالتا تو یہ میرے سینے یا کھوپڑی میں گولی اتار چکا تھا۔"

"اوہ..." بے اختیار میرے ہونٹ تشویش زدہ انداز میں وا ہوئے۔ مجھے گنگل خان یا اس جیسے بے رحم اور مردود آدمیوں کی موت کا کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ تاہم تفکر آمیز لہجے میں اول خیر سے بولا۔ "اب کیا ہوگا؟ اس کی لاش کیسے ٹھکانے لگائیں؟"

"یہی میں سوچ رہا ہوں..." اول خیر گوگو لہجے میں بولا۔

"وہ کار کہاں چھوڑ کر آئے تھے تم؟" میں نے ایک خیال کے تحت فوراً پوچھا جس کا مطلب سمجھتے ہوئے وہ بولا۔

"اس کار کو دوبارہ حاصل کرنا اب ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہوگا۔ ہم ایسی جگہ پر ہیں جہاں میں فون کرکے اپنے کسی ساتھی کو بھی نہیں بلاسکتا مدد کے لیے۔ ایک چھتا ہی بچتا ہے۔ اسے پہلے ہی ایک کام پر لگا رکھا ہے۔"

"ہم دونوں یہ کام نہیں کرسکتے؟" میں نے اس کے متفکر اور پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہی میں سوچ رہا تھا۔ کرنا تو ہمیں پڑے گا یہ کام مگر..." وہ کہتے کہتے رکا... ہم کھلے صحن میں کھڑے تھے اس نے آسمان کی طرف دیکھا پھر ریسٹ واچ پہ نظر ڈالی۔ اس کے بعد سیل فون اٹھا کر چھتے سے رابطہ کیا۔

"چھتے... ہمیں دو تین گھنٹے اور دے سکتا ہے یار!

ہاں بعد میں بتاؤں گا، جو تو سمجھ رہا ہے کچھ ایسی ہی بات ہوئی ہے۔ بس رات گہری ہونے کا انتظار ہے۔ او خیر! میرے یار سب تیرا یہ احسان ہے مجھ پر... اچھا... اللہ حافظ..." کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

"کاکا! ایک مسئلہ تو حل ہوا ذرا رات گہری ہونے دے۔ اس کی لاش کو اٹھا کر کسی طرح باہر لے جانا ہوگا، قریب ہی ایک گندہ نالا بہہ رہا ہے۔ اس مردود کی لاش پھینک دیں گے قصہ ختم۔" میں نے اس کی بات سن کر اپنے

سرکو پرسوچ انداز میں اثباتی جنبش دی تھی۔

اب تک ہم نے دوبارہ گرنے والے خون وغیرہ کو صاف کردیا۔ اس کے بعد اول خیر نے کسی کونے کھدرے سے ایک بوری ڈھونڈ نکالی۔ گگل خان کی لاش اندر گھسیڑ کر لپیٹ دی گئی۔

''چل کاکا! اتنا کام تو نمٹ گیا۔ بس اب ذرا رات کا اندھیرا پھیلنے کی دیر ہے۔'' اول خیر بوری کا منہ رسی سے بند کرتے ہوئے بولا تو میں نے ہلکے سے پوچھا۔

''گگل خان، چوہدری ممتاز کا اہم آدمی تھا، اب تم لوگوں کو اس کے سخت ردِعمل کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ کیا تم اس کی اطلاع اپنے لوگوں کو دو گے؟''

میری بات پر وہ مسکرا کر بولا۔ ''او خیر... کاکا! ہم تو دشمنوں کی طرف سے ہر وقت اور ہر قسم کے ردِعمل کے لیے تیار ہی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کی اطلاع مجھے اپنے لوگوں کو دینا پڑے گی۔''

''کیا بتاؤ گے انہیں کہ...''

''بہت جواب ہیں میرے پاس۔ کچھ بھی بتادوں گا۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ وقت کو نہ دیکھو تو وہ تیزی سے اپنا احساس کراتا ہوا گزر جاتا ہے۔ اور اگر توجہ دو تو گزارے نہیں گزرتا... ہم دونوں رات کی تاریکی پھیلنے کا انتظار کرتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔ کئی بار میرے جی میں آئی کہ اول خیر سے مختاری بیگم اور کپیل دادا کے بارے میں پوچھوں۔ آخر وہ کون تھے؟ اور ان کی چوہدری ممتاز سے کیا دشمنی تھی؟ مگر میں پہلے ہی ان سے دور رہنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ میں شاید نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ شامل کردیا گیا تھا۔ کورٹ میں میرے بیان کے بعد اب دیکھنا یہ تھا کہ قانون انسپکٹر روشن جیسے زرخرید آدمی کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اور چوہدری ممتاز کس حد تک بچتا ہے؟ میرے اس اقدام سے اول خیر کے گروہ کے لوگ خوش تھے، بقول اول خیر کے۔ مختاری بیگم اور کپیل دادا بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ میں نے گومگو سے لہجے میں بالآخر اول خیر سے یہ بات گوش گزار کرڈالی تھی کہ ان لوگوں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔

میری اس بات پر وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میں سمجھا شاید اسے میری بات بُری لگی ہے۔ میں نے اس کا اظہار بھی کرڈالا تو وہ ہنس کر بولا۔

''اوہ نہیں کاکا۔ خیر ہے۔ ایسی بات نہیں، بھلا میں تجھ سے ناراض ہوسکتا ہوں بلکہ یقین کر تو خود میں تجھ سے پہلے ہی اس پہلو پر غور کر چکا ہوں اور مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ تجھے یہ بتاتا۔ لیکن جیسے حالات تیرے پر بیت رہے ہیں وہ تجھے خود ہماری طرف دھکیل رہے ہیں۔ تیرا مقدمہ بھی اب ایک نیا رخ اختیار کرچکا ہے تو بیگم صاحبہ اور استاد کپیل دادا کی ضرورت بن چکا ہے مگر دیکھ کاکا!''

وہ سانس لینے کو رکا پھر گہری متانت سے بولا۔

''بات تیرے تحفظ کی بھی ہے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ تیرا ہمارے ساتھ رہنا ضرورت بن گیا ہے۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے اس مقدمے کے بعد شاید چوہدری ممتاز کی کہانی ختم ہوجائے۔ کیونکہ اس مقدمے کی چینل کے ذریعے کوریج کی جارہی ہے۔ بالخصوص اطفال گھر اور انسپکٹر روشن خان کا تھی ٹارچ سیل کا جس طرح تو نے ذکر کیا تھا کورٹ میں، وہ معمولی بات نہیں ہے۔''

''اول خیر ایک بات بتاؤ۔'' بالآخر میں نے کہا۔ وہ میری طرف تکنے لگا۔ ''یہ تمہاری بیگم صاحبہ کا چوہدری ممتاز سے آخر جھگڑا کس بات کا ہے؟'' میرے استفسار پر اول خیر نے ایک گہری سانس لی۔ پھر بولا۔

''بس... مگر ہم بھی اب یہی چاہتے ہیں کہ یہ کھیڑ چھیتی نال مک جائے تو ہم بھی سکون کی سانس لیں مگر ہماری وفاداری بیگم صاحبہ کے ساتھ ہے۔ ہم مرتے دم تک ان کے ساتھ ہیں۔ ویسے تیری وجہ سے کچھ امید تو ہو چلی ہے کاکا کہ اب کھیل ختم ہونے والا ہے۔''

''کاش ایسا ہی ہو، مجھے بھی اس بات کی خوشی ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اول خیر! مجھے اپنے بھی کچھ ذاتی معاملات نمٹانے ہیں بہت گہرے معاملات۔'' یہ کہتے ہوئے میری نظریں غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہوگئیں۔

وقت گزرا اور رات کی تاریکی پھیل گئی۔ پہلے اول خیر نے باہر نکل کر جائزہ لیا۔ کچی بستی تھی مزدور طبقہ تھا دن بھر کی مشقت طلب اور جان توڑ سخت کوشی کے بعد سب سوئے پڑے تھے۔ پوری بستی پر سناٹا اور تاریکی مسلط تھی۔

''چل کاکا میں بوری اپنے کاندھے پر لاد لیتا ہوں تو گھر کو تالا لگا دے۔'' اول خیر بولا۔

میں نے بوری اٹھوا کر اول خیر کے کاندھے پر رکھوائی، تالا سنبھالا اور باہر تاریک سیلن زدہ سی گلی میں آگئے۔

میں نے گھر کو باہر سے تالا لگایا۔ بستی واقعی تاریک تھی کہیں کہیں دور قریب کے کسی گھر سے روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی، کھلے آسمان پر بھی چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا۔ ٹمٹماتے تاروں کی مقدور بھر روشنی میں ہم دونوں آگے پیچھے دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے نظر آرہے تھے، پھر ہم نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کردیا۔

اس کچی آبادی کی زمین ناہموار تھی، گھر سے نکلتے وقت اول خیر نے فون پر چھتے کو اپنے نکلنے کی اطلاع دے دی تھی۔ اس نے بتایا وہ اپنی بیوی کے کسی رشتے دار کے ہاں ہے اور شاید اب کل صبح ہی گھر لوٹے گا۔

نالا خاصا دور تھا۔ آگے چل کر بوری میں نے اپنے کاندھوں پر اٹھالی، اگرچہ اول خیر نے اعتراض کیا مگر میں نہ مانا۔ حرام خور گگل خان کی لاش کا وزن بھی سوا لاکھ کے مرے ہوئے ہاتھی سے کم نہ تھا۔ گندے نالے تک پہنچتے پہنچتے میں ہانپ گیا۔ نالے کے کنارے پر کچرا اور سخت تعفن پھیلا ہوا تھا۔ ہم کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پلیا پر آگئے۔ ہم نے تاک کر گگل خان کی لاش بوری سمیت نیچے پھینک دی۔ چھپاکا سا ہوا۔ اور بوری گندے کالے پانی پر تھوڑی دیر نظر آتی رہی۔ پھر قدرے نیچے ڈوب کر پانی کی سطح پر پہلے سے تیرتے ہوئے گندے کباڑ میں مدغم ہوگئی۔

''خس کم جہاں پاک۔ چل کاکا! اب نکل لے۔ اسی راستے۔'' اول خیر نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ہم دونوں کچی بستی سے نکل کر پختہ سڑک پر آگئے۔ یہاں خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی، رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کچھ ٹریفک رواں تھا، ٹیکسی تو نظر نہیں آئی، مگر ایک چائے خانہ ٹائپ ہوٹل کے قریب ایک رکشا کھڑا نظر آگیا۔ اس کے اندر ایک من موجی سا آدمی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ رکشے میں ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا تھا، وہ موسیقی کے مزے بھی لے رہا تھا۔

''ہاں چڑا بازار چلنا ہے۔'' اول خیر نے اس سے کہا۔

''بالکل چلے گا۔'' رکشے والے نے چائے کی آخری چسکی لیتے ہوئے کہا اور چھوکرے کو آواز دی۔ اسے دس کا نوٹ اور خالی کپ پکڑا دیا۔

ہم دونوں تب تک رکشے میں بیٹھ چکے تھے۔

رکشا آگے بڑھ گیا۔ چڑا بازار سنسان تھا۔ وہاں اتر کر اول خیر نے رکشے والے کو فارغ کردیا پھر سیل فون پر کسی سے بات کی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لمبی سی جیپ ہمیں لینے آن پہنچی۔ ڈرائیور کے علاوہ اس میں دو آدمی موجود تھے۔ ان میں ایک کو میں فوراً پہچان گیا۔ وہ ارشد

طاہر جاوید مغل

کے رومان انگیز سحر آفریں قلم کا نیا شاہکار

ستاروں پر کمند

چاہتوں کو در و بام میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں
کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہوجاتی ہیں...... روزنوں کو
کریدنے والے اپنے حوصلے سے انہیں دہانہ بنا دیتے ہیں

حسن و عشق اور رقابت و رفاقت کی چاشنی لیے ایک دل ربا داستان

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر اگلے ماہ سے ملاحظہ کریں

تھا۔ وہی ارشد جو مجھے ناز پورہ کے تھانے کے لاک اپ میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ ملا تھا۔ وہ بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملا۔

ہم سب جیپ میں سوار ہو گئے اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ ارشد ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں اور اول خیر عقبی سیٹ پر تھے۔ اول خیر مختصراً موجودہ صورتِ حال کے بارے میں انہیں بتاتا رہا۔ جس کا آخری حصہ ظاہر ہے جھوٹ پر مبنی تھا۔ مثلاً کنگل خان کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ حملہ کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر زخمی ہو کے فرار ہو گیا تھا وغیرہ۔ ارشد نے فون پر ہی کیبل دادا کو تو ساری صورتِ حال بتادی تھی۔

سفر جاری تھا، پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہو گئی۔ جس کے دورویہ بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میرے تصور میں ان کا ٹھکانہ کسی الگ تھلگ مقام پر... اڈے کی صورت میں ہونا چاہیے تھا لیکن جب کار ایک عظیم الشان کوٹھی کی پُرشکوہ عمارت میں داخل ہوئی تو مجھے اپنا خیال غلط محسوس ہوا۔ کوٹھی کی پیشانی پر ”بیگم ولا“ درج تھا۔

ان کے بیچ مجھے نجانے کیوں عجیب سا احساس ہونے لگا۔ پختہ روش کے دائیں بائیں خوش رنگ بوٹوں کی مہک بکھری ہوئی تھی، وسیع باغ بھی نظر آیا۔ پورچ میں ایک شاندار نئے ماڈل کی کار موجود تھی۔ ایک ڈبل ڈور پجیرو تھی۔

ہم نیچے اترے اور ایک وسیع و عریض پُرتعیش ہال کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ارشد مجھے دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اول خیر کے علم میں ہماری شناسائی آچکی تھی۔ کچھ کھانے پینے کی چیزوں کا بندوبست کیا گیا۔ پھر ارشد نے بڑے استاد کے آنے کی اطلاع دی۔

میرے قد کے برابر ایک لمبا تڑنگا مگر بھاری بھرکم جسم والا ایک سانولے رنگ کا شخص اندر داخل ہوا تو مجھے پہلی ہی نظر میں اس پر بن مانس کا گمان ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور بھاری کاندھے جھکے جھکے سے تھے۔ اس کے بال چھوٹے تھے، اس نے ٹائٹ جینز اور اسی طرح کی چست ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس سے اس کا کسرتی جسم واضح ہو رہا تھا۔ اس کے بازو اور سینہ گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے تھے، چہرہ کلین شیو تھا، چہرے مہرے سے کرخت رو انسان نظر آتا تھا۔ بھویں بھی چوڑی اور گھنی تھیں جو آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ ہال کمرے میں صرف اب میں، اول خیر اور ارشد تھے جو اسے دیکھتے ہی مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی بڑا استاد یعنی کیبل دادا ہے۔ وہ میری طرف بھویں سکیڑ کر دیکھ رہا تھا، پھر میری جانب اپنے دونوں بن مانس جیسے بازو پھیلا کر بڑھا۔ اور پُرتپاک انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔

”تیرا پورا نام کیا ہے نوجوان؟“ وہ بولا۔ اس کا لہجہ کھردرا اور آواز بھاری تھی۔ اس کے پوچھنے کے انداز میں میرے لیے فخر بھرا ہوا تھا۔

”شہزاد احمد خان عرف شہزی۔“ میں نے اسے اپنا پورا نام بتایا۔

”بیٹھ جا۔“ وہ اکھڑ سے لہجے میں بولا۔ مگر اس کے بولنے کا انداز ہی ایسا تھا۔ ہم سب بیٹھ گئے۔ وہ سامنے والے ایک بڑے اور آرام دہ صوفے میں دھنس گیا اور اول خیر کی جانب دیکھ کر تحکمانہ انداز سے بولا۔

”ہاں چھوٹے! ہوا کیا تھا؟“ جواباً اول خیر نے وہی تفصیل مختصراً صراحت کے ساتھ اسے بتادی، جو تھوڑی دیر پہلے جیپ میں وہ ارشد کو بتا چکا تھا۔ ”جیپ کی رجسٹریشن کس کے نام تھی، جس پر تم لوگ سوار تھے؟“ کیبل دادا نے اول خیر سے دوسرا سوال پوچھا۔ تو اس نے مؤدبانہ سے لہجے میں بتایا۔

”بے فکر رہو استادا! جیپ کسی اور کے نام رجسٹرڈ تھی جو اس دنیا میں نہیں ہے پولیس کو ہمارا سراغ نہیں مل سکتا۔“

”بہتر!“ کیبل دادا نے اثبات میں سر کو ہولے سے جنبش دی۔ وہ گاہے بہ گاہے میری طرف بھی بہ غور دیکھ رہا تھا۔ بالآخر مجھ سے مخاطب ہوا۔

”شہزاد۔ تو نے بہت بڑا میدان مارا ہے۔ تو نے ہماری خاطر ایک بڑی قربانی دی ہے۔ ہم نے بھی تیری عظیم قربانی کو ضائع نہیں جانے دیا۔ اس کا سہرا اول خیر کے سر جاتا ہے۔ اس نے عابدہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے اپنی جان کی بھی پروانہ کی تھی۔ ادھر سے یہ عابدہ کو چھڑانے کی قسم کھا کر نکلا تھا۔“

”میں اس کے لیے آپ سب کا اور اول خیر کا خاص طور پر مشکور ہوں۔“ میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ ”ویسے میں نے کورٹ میں وہی کچھ کہا تھا جو سچ تھا۔“ میرا لہجہ محتاط تھا۔

”استادا! بیگم صاحبہ جاگ رہی ہیں؟“ اول خیر نے کیبل دادا سے پوچھا۔ ”میرا تو یہی خیال تھا کہ انہیں نہیں جگایا جائے لیکن ان کا اصرار تھا کہ شہزی کی آمد پر انہیں جگا دیا جائے۔“ کیبل دادا بولا۔

”میرا مطلب تھا شہزی کا کا بھی بہت تھکا ہوا ہے یہ بھی ذرا آرام کر لیتا۔ صبح بیگم صاحبہ کی اس سے ملاقات کروا دی جاتی۔“ اول خیر بولا۔ اسی وقت ایک کارندہ اندر داخل ہوا اور بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دی۔

اپنے لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم وجود کے ساتھ صوفے پر آرام سے بیٹھا کیبل دادا ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اول خیر اور ارشد کو بھی کھڑے ہوتے دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اندرونی دروازے سے ایک جوان عورت شاہانہ اور بارعب چال چلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گورا تھا، چہرہ حسین اور دلکش تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹوں کی بناوٹ بڑی رمزیہ، جسم صحت مند تھا، وہ پنجاب کے کسی دیہاتی کھلی ڈلی آزاد فضا کی الھڑ مٹیارن نظر آتی تھی اور بیک وقت ایک مردم مزاج اور دبدبے والی خاتون بھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال مہندی رنگ کے تھے، جو بڑے سلیقے سے پشت پر کھلے ہوئے تھے۔ اس کا عام لباس بھی اس کے پُروقار و پُرشباب وجود پر عجب بہار دکھا رہا تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں— مدِمقابل کو از خود ہی اس کے احترام میں جھک جانے کا تاثر پایا جاتا تھا۔ ورنہ تو میں سمجھا تھا کہ ان کی بیگم صاحبہ کوئی عمر رسیدہ اور چڑچڑی بوڑھی عورت ہوگی، تاہم مجھے اس کے خوب صورت چہرے سے ایک نامعلوم سی سخت گیری اور اس سے زیادہ سرد مہری جھلکتی محسوس ہوئی۔ اس کی آمد پر کیبل دادا سمیت اول خیر اور ارشد مؤدبانہ انداز میں سر اور آنکھیں جھکائے کھڑے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب بیگم صاحبہ کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میری آنکھیں چار ہوئی تھیں کہ اچانک میں نے بیگم صاحبہ کے تنے ہوئے وجود کو واضح انداز میں ایک جھٹکا لیتے ہوئے محسوس کیا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ شاید فرش پر بچھے بیش قیمت دبیز قالین پر ان کا پاؤں رپٹا ہو۔ مگر وہ تو یک ٹک میرے چہرے کو دیکھتی چلی گئی۔ اس کی کشادہ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جس میں حیرت اور ناقابلِ یقین جیسے چونکتے ہوئے ایسے تاثرات تھے جن میں شناسائی ناشناسائی کے درمیان جنگ کی سی کیفیات ہو۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس خاتون کا ایک ہاتھ اپنی پیشانی کو تھامنے کے لیے حرکت میں آیا تو اس کے حلق سے آہ جیسی آواز بھی برآمد ہوئی، مؤدبانہ کھڑے کیبل دادا وغیرہ نے چونک کر سر اٹھایا اور اس کی جانب دیکھا۔ تب تک وہ خاتون چکرا کر گرنے لگی تو کیبل دادا نے بہ سرعت بڑے احترام سے اس خاتون کو سنبھالا اور آرام سے صوفے پر بٹھا دیا۔ ہم سب پریشان ہو گئے۔ کیبل دادا ”بیگم صاحب... بیگم صاحب... کیا ہوا؟“ کہہ کر اسے پکارتا رہا مگر ”بیگم صاحب“ پر نیم غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔

اول خیر اور ارشد حرکت میں آئے ارشد پانی کا گلاس بھر لایا اور کیبل دادا کو تھمایا۔ کیبل دادا نے تھوڑا پانی لے کر بیگم صاحب کے چہرے پر چھینٹے مارے اور بیگم صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔ کیبل دادا نے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کرنا چاہا مگر بیگم صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور پھر مجھ پر نگاہیں جما دیں۔ اور یک ٹک دیکھتی چلی گئی۔ اس بار ان کے چہرے کے تاثرات کیبل دادا سمیت اول خیر اور ارشد سے بھی چھپے نہ رہے، پھر یوں ہوا وہ دم بہ

”کیا تمہیں بے وقوف عورتیں پسند ہیں؟“

”نہیں۔“

”کیا تمہیں سگریٹ نوش خواتین پسند ہیں؟“

”بالکل نہیں۔“

”اور ان کے بارے میں کیا خیال ہے جو کھانا تک نہیں پکا سکتیں؟“

”یار تم کس قسم کی باتیں کر رہے ہو؟“

”تو پھر تم میری بیوی میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟“

☆☆☆

لمبے سفر سے واپسی پر ایک آدمی کتا خانے سے اپنا کتا لینے کے لیے رکا۔

گھر پہنچنے پر اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”میرے خیال میں جارج نے سفر کافی انجوائے کیا ہے۔ یہ راستے بھر اس طرح بھونکتا رہا جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا ہو۔“

اس کی بیوی نے کہا۔ ”وہ تم سے یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم غلط کتا گھر لے آئے ہو۔“

(ج۔ احمد۔ پشاور)

خود سے کبھی میری طرف اور کبھی بیگم صاحبہ کی طرف دیکھنے لگتے۔ جبکہ خود میری اپنی حالت بھی عجیب سی تھی، آخر اس اچھی بھلی رعب داب والی خاتون کو ہوا کیا تھا جو مجھے دیکھتے ہی بے ہوش سی ہونے لگی تھی، میں خود شدید قسم کی حیرت سے دوچار تھا۔

"یہ... یہ کون ہے؟" معاً خاتون نے ایک ہاتھ کا اشارہ میری جانب کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آواز بھی اس کی دورخی شخصیت کی طرح مترنم بھی تھی اور بارعب بھی۔

"یہ وہی نوجوان ہے بیگم صاحبہ! شہزی... شہزاد احمد خان... جس نے کورٹ میں چوہدری ممتاز وغیرہ کے خلاف بیان دیا تھا۔" کبیل دادا نے بتایا۔ تو اول خیر نے بھی آگے بڑھ کر نہایت مؤدبانہ انداز میں میرے سلسلے میں تھوڑی بہت تفصیل سے اسے آگاہ کر دیا جو میرے یقینی خیال کے مطابق پہلے ہی سے بیگم صاحبہ کو آگاہ کی جا چکی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے کل بات کریں گے، ابھی اسے آرام کرنے دو۔" کہتے ہوئے بیگم صاحبہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوئی اسی اثنا میں کبیل دادا نے کسی روبی نامی جواں سال لڑکی کو آواز دے کر بلا لیا تھا، اب وہ بیگم صاحبہ کو سہارا دے کر اس دروازے کی طرف بڑھ گئی جس دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

میں گومگو سے چہرے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کبیل دادا اور اول خیر وغیرہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے مگر بولے کچھ نہیں، تاہم اول خیر نے کبیل دادا سے مجھے لے جانے کی اجازت مانگی۔ اس نے ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

اول خیر مجھے لے کر ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا تو مجھ سے بولا۔ "کاکا یہ کیا چکر تھا؟"

"پتا نہیں۔ میں تو خود حیران ہوں۔" میں نے الجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "بیگم صاحبہ تو مجھے دیکھتے ہی چکرا کر گر پڑیں میں خود گھبرا گیا تھا کیا معاملہ ہے یار؟"

"او خیر... کاکا میں تو خود تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔ میری تو اپنی مت (عقل) ماری گئی ہے۔" وہ بولا پھر بڑے عجیب اور پُراسرار بھرے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔ "کاکا! تیرے میرے درمیان تو کوئی راز نہیں ہے ناں ایک بات بتا۔ کیا تو اس سے پہلے بھی بیگم صاحبہ کو جانتا تھا؟" میں اس کے اس عجیب و غریب سوال پر چونکا اور ہنس پڑا۔

"اول خیر! ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے تو زندگی میں پہلی بار آج تمہاری اس خوب صورت بیگم صاحبہ کو دیکھا ہے۔ میں نے تو اپنی آدھی عمر اطفال گھر کی چاردیواری میں گزار دی ہے۔ اب بھی میری تقدیر میں شاید ناساعد حالات کی قید ہی لکھی ہوئی ہے مگر تم نے مجھ سے یہ عجیب سوال کیوں کر ڈالا؟" میری بات پر اول خیر نے ایک گہری اور اسرار بھری ہوں خارج کی اور بولا۔

"چل کوئی بات نہیں مگر ہمیں ایسا لگا تھا جیسے بیگم صاحبہ مجھے کسی خاص حیثیت سے پہچان رہی ہیں، ممکن ہے انہیں کوئی غلط فہمی ہوا و خیر... کاکا تو آرام کر پریشان نہ ہو کل بات کریں گے۔" کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے اسے روکا۔ میں نے گہری متانت سے کہا۔

"اول خیر! میں کل اوکاڑہ روانہ ہونا چاہتا ہوں۔" میرا لہجہ دوٹوک تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے کل بات کریں گے۔" کہتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا۔

میں چند ثانیے گومگو کے سے انداز میں کھڑا رہا پھر کمرے کا جائزہ لیا جو خاصا کشادہ اور آرام دہ نظر آ رہا تھا۔ میں غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گیا اور بیڈ پر لیٹا تو شدید تھکاوٹ کے باعث نیند نے جلد ہی آن لیا۔ میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

مجھے صبح آٹھ بجے جگا دیا گیا۔ ایک کارندے نے مجھے غسل وغیرہ سے فارغ ہو کے باہر ناشتے کی میز پر آنے کا کہا اور چلا گیا۔

میں نہا دھو کر کمرے سے نکلا اور اس ڈرائنگ روم نما ہال میں آ گیا۔ ایک کونے میں لمبی چوڑی میز تھی، رات کا کھانا بھی ہم نے اسی میز پر کھایا تھا۔ اب ناشتے پر اول خیر اور ارشد میرے منتظر تھے، کبیل دادا نظر نہیں آ رہا تھا۔

"او خیر کاکا سب تندر (نیند) کر لی اچھی طرح؟" اول خیر مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا۔

"ہاں..." میں نے مختصر کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناشتا پُرتکلف تھا۔ آملیٹ، دہی، میٹھی چٹنی، مکھن، ڈبل روٹی روغنی پراٹھے، چائے، جوس دودھ میں نے ڈبل روٹی کے دو سلائس اور تھوڑا سا آملیٹ لیا اور چائے کے ساتھ مختصر سا ناشتا کر کے میز چھوڑ دی اور صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

میرا چہرہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ مجھے ان چار بدنصیب لڑکیوں کی فکر ہو رہی تھی جن میں شکیلہ بھی تھی۔ اول خیر میرے چہرے کی سنجیدگی بھانپ کر ناشتے کی میز سے اٹھ آیا۔

"اول خیر! مجھے جانا ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کاکے تیرے دل و دماغ میں کیا پک رہا ہے۔" وہ بولا۔ "تھوڑا صبر کر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا بلکہ بڑے استاد کبیل دادا سے مدد مانگ کر اوکاڑہ روانہ ہو جائیں گے۔ تنہا تو کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"میرے اکیلے ہونے کی بات چھوڑ دو اول خیر!" میں نے اسی قدر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرے یہاں سے نکلنے کا بندوبست کر دو۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کبیل دادا بھاری انداز میں کھنکارتا ہوا اندر داخل ہوا، اس کے چہرے پر سوچ کے گہرے تاثرات تھے، وہ آ کر ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ ارشد بھی تب تک ناشتے سے فارغ ہو کر ہمارے ساتھ آن بیٹھا تھا۔

اول خیر نے بلاتمہید میری بے چینی اور پریشانی سے کبیل دادا کو آگاہ کیا تو وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔

"اس کا فیصلہ بیگم صاحبہ خود کریں گی!"

"تو پھر آپ بیگم صاحبہ کو جگا کر بتا دیں۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" اس بار میں نے خود براہ راست کبیل دادا سے لب کشائی کی تو وہ میری جانب گھورنے کے انداز سے تکتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بولا۔

"ہولا رہ شہزادے۔ ہولا رہ۔ ان لڑکیوں کا سراغ تو معلوم ہو ہی چکا ہے ناں تمہیں، یہ کام پولیس کے ذریعے بھی ہم کروا سکتے ہیں، یہ اتنا ضروری نہیں ہے۔" مجھے اس کی یہ بات سخت ناگوار گزری، اول خیر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ ان چار بدنصیب لڑکیوں کا سراغ مجھے کسی اور ذریعے سے معلوم ہو چکا ہے ترنگل خان کا ذکر سرے سے گول کرنا پڑا تھا۔

"یہ کام کتنا ضروری اور غیر ضروری ہے، یہ صرف میں جانتا ہوں۔" میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور پولیس یہ کام نہیں کر پائے گی۔ بلکہ الٹا کام بگڑ جائے گا۔" میری بات پر کبیل دادا نے ایک لمحے کو بڑی کرخت نظروں سے میری طرف دیکھا۔ تو کسی بدمزگی یا بحث سے بچنے کی خاطر اول خیر نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے کبیل دادا سے کہا۔

"استاد شہزی کاکا کو دراصل پولیس پر بھروسا نہیں رہا ہے۔ ان چاروں لڑکیوں کی عزت اور جان خطرے میں ہے؟"

"مگر ہم نے اس کی عابدہ کو ان کے چنگل سے چھڑا لیا ہے۔ اب اسے کس بات کی فکر ہے؟" کبیل دادا نے اول خیر کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ جواباً بولا۔

"استاد، اس نے لوگوں کے ساتھ ایک عرصہ ساتھ گزارا ہے اس لیے اسے جلدی ہے... ان کو بچانے کی ذمے داری اس نے اپنے سر خود لی ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے... بیگم صاحبہ سے بات کر لیتے ہیں۔" کبیل دادا نے مجھے تسلی دی۔ "ویسے میرا نہیں خیال کہ بیگم صاحبہ تمہیں ابھی یہاں سے جانے کی اجازت دیں۔ تم ہمارے دشمنوں کے ہتھے بھی چڑھ سکتے ہو، جو ہمارے مفادات کے خلاف ہے۔"

"میں نے کسی کے مفادات کا ٹھیکا نہیں لے رکھا ہے کبیل دادا۔" میں یہ کہتے ہوئے غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اس سخت ردِعمل پر کبیل دادا کی آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری تھی۔ اول خیر اور ارشد پریشان سے نظر آنے لگے۔ ایسے ہی وقت میں کبیل دادا کی غراہٹ سے مشابہ

بدتمیز

ڈکسن اسکاٹ لینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن آیا تو اسے ہاسٹل میں قیام کرنا پڑا۔ کرسمس کی چھٹیوں میں وہ گھر گیا تو اس کی ماں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ "بیٹا! وہاں تم انگریز لڑکوں سے بھی ملتے جلتے ہو گے۔ وہ مزاج میں کیسے ہوتے ہیں؟"

"بدترین!" ڈکسن نے حقارت سے کہا۔ "اسکاٹ لینڈ ان سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ شور اور چیخ و پکار ان کا شیوہ ہے۔ میرے داہنے طرف والے کمرے میں لڑکی رات بھر ہذیانی انداز میں چیختی رہتی ہے۔ بائیں طرف بھی ایک انگریز لڑکی ہے۔ وہ پوری رات دیوار میں نہ جانے کیا ٹھونکتی رہتی ہے!"

"ہائے میرا بچہ!" ماں نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ "ایسے بے ہودہ پڑوسیوں کے ساتھ تمہارا گزارہ کیسے ہوتا ہو گا؟"

"بس ہو ہی جاتا ہے، موم!" وہ بولا۔ "میں انہیں نظرانداز کر دیتا ہوں اور رات بھر یکسوئی سے اپنا ڈرم بجانے کی مشق کرتا رہتا ہوں۔"

کراچی سے اورنگزیب کا جواب

آوازا بھری۔

"تیرا ہم پر اگر احسان نہ ہوتا تو بیگم صاحب کی چھت کے نیچے ایسا بولنے والے کی کھوپڑی میں گولی اتار دیتا۔"

"کیبل دادا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے میں اسے سمجھاتا ہوں۔" اول خیر نے ذرا تیز لہجے میں مداخلت کی، اسی اثنا میں وہی خاتون کمرے میں داخل ہوئی جسے یہ لوگ بیگم صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔

"کیا شور ہے یہ؟" اس کی ترنم میں لپٹی رعب دار آواز گونجی تو کیبل دادا وغیرہ سب احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیگم صاحب شہزی یہاں سے جانا چاہتا ہے۔" کیبل دادا نے..... بتایا تو خاتون نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے شفاف اور دلکش چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو اس کے لہجے میں وہ تحکمانہ پن یا سرد مہری نہ تھی جو اپنے کارندوں سے مخاطب ہوتے وقت اس کے لہجے سے ظاہر ہوتی تھی۔

"کیوں شہزاد صاحب! آپ کو یہاں کوئی تکلیف پہنچی ہے۔ ہمیں بتاؤ؟" میں نے دیکھا۔ اول خیر اور ارشد جبکہ بالخصوص کیبل دادا کے بشروں سے چونکتی ہوئی حیرت کی جھلک ابھری۔

"جی نہیں بیگم صاحب! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے مگر....."

"تو پھر آپ یہاں سے جانا کیوں چاہتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارے دشمنوں کی نظروں میں آپ کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے ہیں اور وہ آپ کی جان کے دشمن ہیں۔"

بیگم صاحب کا اس طرح مجھے آپ سے مخاطب کرنا یقینی طور پر میرے لیے تو اتنا نہیں لیکن کیبل دادا وغیرہ کے لیے ضرور اچنبھے کا باعث بن رہا تھا، یہ بات ان کے تاثرات سے بالکل عیاں تھی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا وہ میری نظروں کا مطلب بھانپ کر بیگم صاحب سے انتہائی احترام سے بولا۔

"بیگم صاحب آپ آرام سے تشریف رکھیں۔ میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں۔"

وہ خاتون نہایت شاہانہ انداز میں چلتی ہوئی صوفے کے قریب آئی اور اس پر براجمان ہو گئی۔

میں بہ دستور محسوس کر رہا تھا کہ یہ پُروقار خوب صورت خاتون میرے لیے نرم رویہ رکھتی ہو۔

اول خیر نے اسے وہ سب بتا دیا جسے سن کر خاتون کے چہرے پہ ایک رنگ سا جھلکا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر توصیفانہ لہجے میں بولی۔

"شہزاد صاحب۔ آپ واقعی ایک بہادر نوجوان ہیں اور باعزم غیور بھی، آج کی دنیا میں بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو اس طرح دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ ہم ذاتی طور پر اور دل سے آپ کے اس جذبے کی قدر کرتے ہیں اور آپ کا یہی مشن ہے تو ہم کبھی نہیں روکیں گے، لیکن کیا آپ کو اس بات کا اندازہ ہے کہ آپ اس وقت ایک خطرے سے بھی دوچار ہیں، آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہے۔ عدالت میں دھواں دھار بیان کے بعد بڑے بڑے اونٹ پہاڑ تلے آنے والے ہیں، آپ ہمارے لیے بھی اہم حیثیت اختیار کر چکے ہیں مگر ہم آپ کے نیک مقصد کے بیچ بھی حائل نہیں ہونا چاہتے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اکیلے یہاں سے نہیں جائیں گے۔ آپ ہمارے جن ساتھیوں کا انتخاب کریں، وہ آپ کے ساتھ کر دیے جائیں گے۔"

خاتون، یعنی بیگم صاحب کی اس بات پر میں آج پہلی بار اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا، اول خیر بھی خوشی سے مطمئن نظر آنے لگا۔ مگر کیبل دادا کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئیں، اس نے اعتراض اٹھایا۔

"بیگم صاحب! اس وقت حالات ہمارے لیے بھی ٹھیک نہیں ہیں۔ ہم بھی حالاتِ جنگ کی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ ایسے میں آپ سب جانتے ہیں کہ یہ نوجوان شہزاد احمد خان ہمارے لیے کس قدر اہم ہے، ہمارے دشمنوں کو بھی اس کی اہمیت کا اندازہ ہے۔ اور وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں گے، دشمنوں پر وار کرنے کا ہمارے ہاتھ ایک موقع آیا ہے۔ جسے ہم اس طرح خود اپنے ہاتھ سے ضائع کر رہے ہیں۔"

"تو کیا ہم اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس نوجوان کے اچھے نیک اور اہم مقصد کو فراموش کر دیں؟" بیگم صاحب نے میری حمایت میں کیبل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ اس نوجوان کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔"

"بیگم صاحب! ہم اس کے ساتھ ناانصافی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو اس کی مدد کریں گے، ٹھیک ہے، اگر اسے ان چاروں مغوی لڑکیوں کا سراغ مل چکا ہے تو یہ ہمیں بتا دے۔ ہمارے ساتھی بہ آسانی یہ کام نمٹا آئیں گے۔"

"میرے آگے صرف یہی ایک مقصد نہیں ہے۔" میں نے کیبل دادا کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ اور معاملات بھی ہیں جو ذاتی نوعیت کے اور فوری حل طلب ہیں۔ اور ویسے بھی میں ہرگز یہ بات پسند نہیں کروں گا کہ میں یہاں نظر بند یا قیدی کی حیثیت سے موجود رہوں... جب کسی کو میری ضرورت پڑے وہ میرے گلے میں رسی ڈال کر مجھے آگے ہانک دے۔ ہر انسان اپنے برے بھلے کا خود ذمّے دار ہوتا ہے۔"

بیگم صاحب میری باتوں کو بڑے دھیان اور توجہ سے سن رہی تھی، اور اس سے کہیں زیادہ غور اور عمیق نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکے جا رہی تھی۔ اول خیر نے بھی میری حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"کاکا شہزی کی ان باتوں کا خیال رکھنا ہمارا اخلاقی فرض بنتا ہے بیگم صاحبا کہ ہم اس کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کریں۔ رہی بات ہم سے مدد مانگنے کی شہزی کے مجھ پر بھی بہت احسانات ہیں۔ اگر مجھے ایک اچھے دوست کی حیثیت سے اپنے مشن میں رکھنا چاہے تو مجھے خوشی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے ہم یہ معاملہ اس پر چھوڑتے ہیں۔" بیگم صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور میں نے ازراہِ احترام قدرے خم ہو کر بیگم صاحب کا ہولے سے شکریہ ادا کیا۔ کیبل دادا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ خوش نہیں۔

"تم نے ناشتا ٹھیک طرح سے کر لیا۔" بیگم صاحب نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے لہجے سے مجھے ایک عجیب طرح کی مٹھاس محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اسے زیرِ لب مسکراتے ہوئے بھی دیکھا۔ وہ اب دھیرے دھیرے آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

"جی ہاں! بیگم صاحب میں نے ناشتا کر لیا۔ بہت پُرتکلف ناشتا تھا۔" وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کیبل دادا سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوئی۔

"کیبل"

"جی بیگم صاحب۔" کیبل دادا فوراً قدرے خم ہو کر مؤدبانہ بولا۔

"آج سے شہزی کے معاملات اول خیر ڈیل کرے گا۔ انہیں ہر قسم کی سپورٹ فراہم کرنا تمہارے ذمّے ہے، سمجھ گئے؟"

"بالکل سمجھ گیا' بیگم صاحبا آپ بے فکر رہیں۔" وہ فوراً بولا پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہو کر جاتے جاتے بولی۔

"تم کو جو تیاری کرنا ہے وہ کر لو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔" یہ کہہ کر وہ شاہانہ چال کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

اگلے ایک گھنٹے کے اندر اندر میں، اول خیر اور ارشد اوکاڑہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ ہم اس گاڑی میں سوار تھے جس پر رات چڑا بازار کے چوک سے ارشد نے مجھے اور اول خیر کو پک کیا تھا۔ یہ اگرچہ پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی مگر اس کی کنڈیشن اچھی تھی اور انجن بھی طاقت ور تھا۔

کیبل دادا نے ہمارے روانہ ہوتے وقت ہمیں دس پندرہ آدمی... ساتھ لے جانے کا مشورہ دیا تھا مگر میں نے اس کا مشورہ رد کر دیا۔ اول خیر بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ کا قائل نہ تھا۔ ویسے بھی ہم کسی جنگی محاذ پر نہیں جا رہے تھے، اول خیر نے صرف ارشد کو ساتھ لے لیا تھا۔ بعد میں اول خیر نے مجھے بتایا تھا کہ میری طرح ارشد بھی اس کا رازدار دوست اور جاں نثار ساتھی ہے۔

ملتان سے اوکاڑہ دو سو پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت ہم ملتان روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ ارشد ڈرائیونگ میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔ ملتان سے خانیوال کا سفر اس نے نصف گھنٹے میں طے کر لیا تھا۔ یہاں سے میاں چنوں، پیرووال، کھنڈہ سے خیرآباد آتے ہوئے بالآخر ہم محسن وال کے ایک روڈ سائیڈ ہوٹل میں رکے۔

ارشد نے جیپ کا بونٹ اٹھا دیا تھا۔ اور ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے میں مصروف ہو گیا جبکہ میں اور اول خیر ہوٹل کے احاطے میں بچھی چارپائی پر پاؤں پسار کر بیٹھ گئے۔ پیش کار لڑکے کو چائے وغیرہ کا آرڈر دینے کے بعد اول خیر مجھ سے بولا۔

"کاکا! بیگم صاحب والا یہ معاملہ کچھ پُراسرار سا لگا نہیں ہے؟"

میں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ یہ ایسا ہی چائے خانہ نما چھپر ہوٹل تھا، جہاں بار بردار ٹرک لگژری مسافر کوچیں تھوڑی دیر کے لیے رکتی تھیں۔ اس وقت دو تین بار بردار اور دس وہیلر ٹرک کھڑے تھے، دو مسافر کوچیں دو ایک لبی لوکل بس کھڑی تھی، اس کی بات پر میں قدرے چونکا اور بولا۔

"کون سا معاملہ؟ میرے لیے تو بیگم صاحب پوری کی پوری ہی پُراسرار شخصیت ہیں۔"

میری بات پر اول خیر بے اختیار ہنس پڑا پھر بولا۔

"اوخیر... کاکا یہ بھی تو نے خوب کہی، ویسے میں کل رات کی بات کر رہا ہوں۔ تو نے بھی تو محسوس کی ہو گی یہ بات بیگم صاحب تجھے دیکھتے ہی عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی مگر کاکے... بات اتنی بھی نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ

ہمارے لیے تو حیرت کی بات یہ ہے کہ اگلے دن یعنی آج صبح بیگم صاحبہ کا رویہ بھی تیرے ساتھ خاصا نرم اور میٹھا میٹھا سا تھا۔ یار کاکا سمجھ نہیں آرہا آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ ورنہ تو کبیل دادا نے جو بحث چھیڑ دی تھی، مجھے ڈر تھا معاملہ بڑھ نہ جائے کیونکہ بیگم صاحبہ کبیل دادا کے مشوروں پر آنکھ بند کرکے عمل کرتی ہے۔ اسے اتنا یقین ہے اس پر مگر آج تو بیگم صاحبہ نے اپنے روایتی مزاج کے بالکل خلاف رویہ رکھا تھا تیرے ساتھ آخر چکر کیا ہے کاکا؟“

میں ہنس دیا بولا۔ ”مجھے کیا معلوم، میں تو خود پہلی بار تیرے سامنے ہی بیگم صاحبہ سے ملا ہوں۔“

اس اثنا میں چائے وغیرہ آگئی، اور ارشد بھی آگیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔

”مجھے بھی سگریٹ دے۔“ اول خیر نے ارشد کے بیٹھتے ہی کہا۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے جیب سے گولڈ لیو کا پیکٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ اول خیر نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لی تو ارشد نے فوراً اس کے سرے کو لائٹر دکھا دیا۔

ارشد نے میری طرف بھی پیکٹ بڑھایا مگر میں نے مسکرا کر انکار میں سر ہلا دیا۔

”میں بھی نہیں پیتا، بس کبھی کبھار موڈ سے سوٹے لگا لیتا ہوں۔“ اول خیر ہنسا۔

وہاں ہم زیادہ دیر نہیں رکے اور آگے بڑھ گئے۔

اسلحے کے نام پر ہمارے پاس صرف پستولیں تھیں۔ ارشد اور میرے پاس پسٹل تھے، جبکہ اول خیر کی شلوار کے نیفے میں جرمن ساختہ میگا رو اڑسا ہوا تھا۔ تینوں ہتھیار لائسنس شدہ یافتہ تھے، ملک کے خراب حالات کے پیشِ نظر آتی جاتی گاڑیوں کی چیکنگ اور تلاشی لی جاتی تھی۔

میاں چنوں سے ساہیوال 84 کلومیٹر یعنی 52 میل تھا۔ چی چاں وطنی اور پھر ہڑپہ کے پانچ ہزار سالہ دفن شدہ شہر کی جھلک دیکھتے ہوئے جب ساہیوال کے قریب قدرے مضافات میں تھے تو ایک مقام پر ہمیں جیپ روکنا پڑی۔

سہ پہر کا وقت ہو چلا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے کھا لیا تھا۔ جیپ روکنے کی وجہ مین شاہراہ پہ واقع ایک بڑا سیاسی جلوس تھا۔ جلوس کے شرکا، ہیوی موٹر سائیکلوں پہ سوار تھے۔ کسی بڑی سیاسی شخصیت کا اجتماع نظر آتا تھا۔

جلوس پوری مین سڑک کو گھیرے آگے بڑھ رہا تھا مسافر کوچیں اور لاریوں سمیت دیگر آنے جانے والی گاڑیوں کو راستہ کھلنے تک سڑک کے کنارے کچے میں روک دیا گیا تھا۔ مجھے اس شعبدے بازی پر حیرت کے ساتھ غصہ آنے لگا۔ میں نے جل کر اول خیر سے کہا۔

”یار خدانخواستہ کسی کو گزرنے کی جلدی یا ایمرجنسی ہو وہ بے چارہ کیا کرے گا؟“

میرے استفسار پر اول خیر ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ”تو اس کی کیا بات کرتا ہے کاکا یہ بے حس سرپھرے لوگ تو کسی ایمبولینس کو گزرنے کا راستہ بھی نہیں دیتے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک عقب سے ایک بلیو کلٹس ہمیں عقب سے ہارن پہ ہارن دینے لگی۔

”کیا یہ اندھا ہے یا اس کا دماغ خراب ہے؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ارشد نے بیک ویو مرر میں دیکھتے ہوئے غصیلے انداز میں کہا۔ پھر ساتھ ہی ایک ہاتھ سے باہر سامنے کی طرف اشارہ بھی کر دیا عقب سے ہارن دینے کی آواز معدوم ہوگئی مگر دوسرے ہی لمحے اس کار سے ایک خوبرو سا نوجوان اتر کر ارشد کے قریب آیا اور ملتجی لہجے میں بولا۔

”یار! پلیز بس تھوڑا سا گاڑی کو سائڈ میں کر لو، میں آگے نکل جاؤں کار میں میری والدہ کی طبیعت سخت خراب ہے، میں اسے ساہیوال کے ایک بڑے اسپتال لے جا رہا ہوں۔“

ارشد کے جواب دینے سے قبل ہی اول خیر نے اس سے کہا۔

”کاکا! ہم اپنی گاڑی ایک طرف کر لیتے ہیں مگر سامنے دیکھ رہے ہو کتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے یہ لوگ تمہیں نکلنے دیں گے؟“

”ضرور میں ان سے درخواست کروں گا، مجھے امید ہے کہ وہ میری مجبوری کو دیکھتے ہوئے انسانیت کے ناتے میری گاڑی نکلنے کا بندوبست کر دیں گے۔“

”چل اوئے... ارشد کاکا! گڈی کو ذرا ہو ٹھلے لا دے، (اور نیچے اتار دے)“

اول خیر نے فوراً ارشد کو ہدایت کی، ہماری گاڑی پہلے ہی پختہ سڑک کی سائڈ میں کچے پر ایک طرف جھکی کھڑی تھی، تاہم ارشد نے کلٹس کو راستہ دینے کے لیے تھوڑی اور نیچے نشیب میں اتار دی۔ اس سے نیچے ایک ندی بہہ رہی تھی، نوجوان نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور تیزی سے اپنی کار کی طرف دوڑا۔ مجھے اس نوجوان پر بڑا ترس آیا۔ میں اس کی بیمار ماں کے لیے دعا ہی کر سکتا تھا۔ کار آگے نکل گئی تو ارشد نے گاڑی تھوڑا آگے بڑھا کر اسے نشیب کے جھکاؤ سے تھوڑا اوپر کر لیا۔ اب وہ بھی چیونٹی کی رفتار سے کلٹس کے پیچھے پیچھے گاڑی بڑھا رہا تھا۔

”اوکاکا! جگاڑ مار رہا ہے۔ یہ سرپھرے سیاسی جیالے متوالے کارکن ہمیں آگے پھر بھی نہیں نکلنے دیں گے۔“

اول خیر شاید ارشد کی چالاکی بھانپ گیا تھا، جو کلٹس کے پیچھے رہ کر اپنی گاڑی بھی آگے نکالنے کے چکروں میں تھا۔

مگر کلٹس کا راستہ چند سیاسی کارکنوں نے روک لیا۔ لڑکا ان سے گزارش کرنے لگا مگر وہ لڑکے آگے نکل گئے ان کے پیچھے لوگوں کا ہجوم تھا۔ لڑکے کو کار نکالنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اس کی پریشانی فزوں تر ہو رہی تھی، معاً ایک نئے ماڈل کی سیاہ ہنڈا سٹی دکھائی دی، اس کار نے کلٹس کا راستہ روک رکھا تھا۔ اس کار پر کارکن پھول پھینک رہے تھے، وہ نوجوان جلدی سے اپنی کار سے اترا... اور دوڑا دوڑا ہنڈا سوک کے نزدیک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا۔ ہماری جیپ بھی قریب ہی تھی، ہم اندر بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے خاموشی سے۔

ہمیں وہ لڑکا ہنڈا سوک کار کی کھڑکی پر جھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کار پر سیاسی جماعت کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ ایک گولڈن پلیٹ پر ایم پی اے لکھا ہوا تھا۔ وہ کسی صوبائی اسمبلی کے ممبر کی کار تھی۔

اچانک میں چونک پڑا۔ کھڑکی پر جھکے ہوئے اس مجبور لڑکے کو اچانک کسی نے گریبان سے پکڑا، یہ ہاتھ اندر سے نمودار ہوا تھا۔ لڑکا ہاتھ جوڑنے لگا۔ وہ اب باقاعدہ روہانسا ہونے لگا تھا۔ شاید اس کی فریاد پر کان دھرنے کے بجائے اس سیاسی شخصیت نے اس کے ساتھ تضحیک آمیز رویہ اپنا رکھا تھا۔ کار کے اندر براجمان اس شخصیت کی جانب اٹھا ہوا تھا اور انگلی کے اشارے سے وہ چیخ چیخ کر اسے شاید برا بھلا کہہ رہا تھا پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سیاسی شخصیت کار کے اندر سے برآمد ہوئی، وہ کوئی نوجوان تھا، کارکنوں نے جو بینر وغیرہ اٹھا رکھے تھے، اس میں ایک پکی عمر کے ساتھ نوجوان کی تصویریں بنی تھیں، شاید دونوں باپ بیٹا تھے، اور نجانے کتنے عرصے سے موروثی سیاست کا مزہ چکھ رہے تھے۔

باپ ایم این اے تھا، اور بیٹا ایم پی اے۔ وہ اس طاقت کے زعم میں باہر نکلا اور اس مجبور نوجوان کے چہرے پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ میں جو یہ منظر دیکھ کر اندر ہی اندر جل اور سلگ رہا تھا، اس ناانصافی اور بے حسی پر بیٹھا نہ رہ سکا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کے گاڑی سے اترا۔

”کیا کر رہا ہے۔ کاکا! ٹھہر...“ مجھے عقب سے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ مگر مجھے یہ آواز کب سنائی دی تھی میں جوشِ غیظ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے اس سیاسی نوسرباز زادے کے ہاتھ کو زور سے جھٹک دیا اور غصے سے بولا۔

”تمہیں شرم نہیں آتی ہے۔ ایک مجبور انسان کو اس طرح اپنی طاقت کے زعم میں زدوکوب کرتے ہوئے۔ اس کی ماں کار میں جاں بہ لب ہے اور یہ تم سے راستہ مانگنے کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تم کیسے عوامی نمائندے ہو؟ تمہارے بینروں پہ عوام کا خادم لکھا ہوا ہے، اور تم عوام کے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہو؟“ میری اس دھواں دھار تقریر اور اس کا ہاتھ نوجوان کے گریبان سے جھٹکنے پر وہ سیاسی نوسرباز زادہ ایک لمحے کو دم بخود رہ گیا۔ شاید اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کے متوالوں اور سرپھرے کارکنوں کے جھرمٹ کے بیچ اس کے ساتھ اس سلوک کی جرأت کر سکتا ہوں۔ یہ اس کی طاقت کا اور غرور پر میری شدید ضرب تھی۔

کچھ میں بھی اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ کسی بے کس اور بے گناہ معصوم انسان پر کسی طاقت ور کو ظلم کرتے دیکھ کر مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا اور گویا پھر میں دیوانہ وار آتشِ غرور میں کود جایا کرتا تھا، یہاں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

احساسِ تذلیل سے ان کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اس کے جوشیلے کارکنوں کا ایک جتھا میری طرف مشتعل ہو کر بڑھا۔ تو فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا، مشتعل کارکن جہاں کے تہاں رک گئے۔ یہ اول خیر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا، ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا، ارشد کے ہاتھ میں بھی پستول تھا، مگر ہم خطرے میں گھرے ہوئے تھے کہیں سے کوئی کارکن اپنی چچہ گیری کا جوہر دکھانے کے لیے یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا ہوگا، اس خدشے کے پیشِ نظر میں نے بھی بجلی کی سی پھرتی دکھائی، اور اپنا پسٹل نکال لیا اور شفقت راجا پر جھپٹا۔

اس کی گردن میرے بائیں بازو کے شکنجے میں اور میرے پسٹل کی مہیب نال اس کی کنپٹی سے لگی تھی۔

”خبردار! کسی نے کوئی ذرا سی بھی حرکت کی تو.... اسے گولی مار دوں گا۔“ میں دھاڑا۔ نجانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔ مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ یہ میری فطرت کا خاصہ تھا کہ ظلم و مظلومیت کا ایسا منظر مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتا تھا۔ میری اس حرکت پر گویا دور قریب، سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

”اس کار کو راستہ دو فوراً اندر اس کی بیمار ماں موجود ہے، جلدی... جلدی...“

میں پھر چیخا۔ سیاسی نوسرباز.... شفقت راجا چند

ا نے تو مجھے خوں ناک نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے کارکنوں کو وہی حکم دیا جو میں چاہتا تھا... کلٹس کار کو نکلنے کا راستہ دے دیا گیا۔ نوجوان بہت خوش نظر آرہا تھا مگر متفکر بھی تھا شاید اسے میری بھی فکر تھی۔ مگر اس کے پاس مجھ سے بات کرنے کا وقت نہ تھا، وہ نکل گیا۔

مجھے اپنی اس خطرناک حرکت کا اچھی طرح احساس تھا کہ میں نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ دے دیا ہے۔ ایک ذرا موقع کے ہی منتظر ہوں گے یہ لوگ اور پھر شاید ہماری تکا بوٹی کروا لتے یہی سبب تھا کہ اول خیر اور ارشد کے چہرے پہ بھی فکرمندی کے آثار تھے۔

"اب ہمیں نکلنے دیا جائے۔ ہٹو آگے سے۔" کہتے ہوئے میں نے شفقت راجا سمیت دھیرے دھیرے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ مشتعل کارکنوں کی آنکھوں میں اترا ہوا خون میں صاف محسوس کرسکتا تھا۔ گویا وہ ایک ذرا موقع کی تاک میں تھے اور پھر ہم تینوں پر ہی پل پڑتے۔

"راجا صاحب کو تم کہیں نہیں لے جاسکتے۔" معاً چار پانچ جوشیلے کارکنوں نے میرا راستہ روک لیا۔

"تمہارے راجا صاحب سے کوئی دشمنی نہیں ہے میری۔ اب مجمع سے نکلنے کے بعد ہم تھوڑی دور جا کر انہیں چھوڑ دیں گے۔"

میں نے کہا تو اس بار شفقت راجا خار کھائے لہجے میں بولا۔ "تم اب نہیں بچ سکتے۔ تمہیں یہ مہم جوئی بہت مہنگی پڑے گی۔ میرے ساتھی کسی بھی صورت میں مجھے تمہارے ساتھ جانے نہیں دیں گے۔" اس کے لہجے کا اطمینان بتا رہا تھا کہ میں نے جو جوا کھیلا تھا وہ مجھے کس قدر مہنگا پڑنے والا تھا مگر میں اس کے جھانسے یا دھمکی میں نہ آیا۔ اور ہاتھ بلند کرکے ایک ہوائی فائر کردیا۔ میرے قریب بڑھنے کی کوشش کرنے والے مذکورہ چار پانچ جوشیلے کارکن پیچھے ہٹ گئے۔

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے راجا صاحب۔" میں شفقت راجا کی طرف دیکھ کر نفرت خیز لہجے میں دھاڑا۔

"کسی بھول اور کسی نشے میں مت رہنا۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر نے بلند آواز میں شفقت راجا کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ "راجا صاحب یہ کاکا تمہارے کارکنوں سے زیادہ سرپھرا اور جنونی ہے۔ آپ کو ہم خبردار کرتے ہیں آپ کسی زعم یا طاقت کے نشے میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا کہ یہ پاگل آپ کو بھی گولی مار دے اور خود کو بھی۔ یہ واقعی ایک پاگل نوجوان ہے اور اسے ہم روحانی علاج کے لیے ساہیوال کے چک جھمرہ کے ایک بابا جی کے پاس لے جارہے ہیں۔ ہم آپ کو چھوڑ دیں گے، میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ ہمیں بس خیر خیریت کے ساتھ یہاں سے نکلنے دیا جائے۔"

اول خیر کی چالاکی پر میرا مسکرانے کو جی چاہا۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے پاگل کہہ کر شفقت راجا کو ہی نہیں بلکہ اس کے کارکنوں کو بھی ایک لمحے کے لیے ڈرا سا دیا تھا۔ اول خیر کا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے اپنی ساری اکڑفوں بھول کر شفقت راجا نے اپنے مشتعل کارکنوں سے وہی کہا جس کی میں اسے ہدایت دے چکا تھا۔

ہمیں اپنی گاڑی میں سوار ہونے کی اجازت مل گئی۔

ہمارے سوار ہوتے ہی ارشد نے جیپ آگے بڑھا دی۔

ذرا دور جا کر شفقت راجا کو سڑک پر اتار کر ہم فوراً آگے بڑھ گئے۔

"اوخیر... کاکا! تیرے ان اچانک دھاکڑ پروگراموں سے مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ بڑے بُرے پھنس گئے تھے۔"

اول خیر نے ایک گہری سانس لے کر ہنستے ہوئے کہا تو ارشد بھی مسکرا کر بولا۔ "چھوٹے استاد تیری چالاکی نے بروقت ہمیں بچالیا۔ ورنہ یہ بات وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ شہزی، کسی بھی صورت میں شفقت راجا پر گولی چلانے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "حد ہوگئی ہے بے حسی کی یار! یہ کیسے خود کو عوامی نمائندے کہتے ہیں۔ اس غریب کی ماں کار میں جاں بہ لب پڑی تھی اور بجائے اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنے کے وہ راجا مہاراجا صاحب جو خود کو "آپ کا خادم" ہونے کے دعویٰ کرتے ہیں۔ الٹا اس نوجوان کے ساتھ تضحیک آمیز برتاؤ کرتا ہے۔ لعنت ہے ایسے جھوٹے دوغلے سیاست دانوں پر۔"

ہمارا سفر اس نے خوشگوار واقعے کے بعد ایک بار دوبارہ خیر خیریت کے ساتھ جاری تھا۔

جب ہم ساہیوال سے آگے نکل گئے اور چک کے قریب سے گزرنے لگے تو اچانک گاڑی چلاتے ہوئے ارشد نے ایک سنسنی خیز اعلان کیا۔

"شاید ہمارا تعاقب کیا جارہا ہے۔" اس اطلاع پر میں نے اور اول خیر نے چونک کر عقب میں مڑ کر دیکھا۔ دو گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھیں۔

"اوئے ارشد! گاڑی دوڑا۔" اول خیر نے اسے ہدایت کی۔ ارشد نے فوراً گاڑی کو ڈبل ٹاپ گیئر میں ڈالا اور اس کی رفتار طوفانی حد تک بڑھا دی۔ اول خیر نے اپنا پستول نکال لیا اور ہاتھ میں پکڑ کر گاڑی کے بالکل پچھلے حصے میں چلا گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، عقبی اسکرین سے میں نے پیچھے کو تیزی سے بھاگتی سڑک کے سامنے نظریں جمادیں۔ ایک پجیرو طوفانی رفتار سے ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آرہی تھی۔ مجھے دونوں گاڑیوں میں خاصی تعداد میں آدمی بیٹھے نظر آرہے تھے۔ یقیناً یہ مسلح بھی تھے۔

مضافاتی سڑک تھی، اور خاصی حد تک ویران بھی وہ ہماری گاڑی کے قریب پہنچتے ہی ہم پر اندھا دھند فائرنگ بھی کرسکتے تھے، ہم ایک اہم مشن پر تھے، اس نئی مصیبت میں پڑنے کے بالکل متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔

"اوئے ارشد! گڈی دوڑا۔ ذرا دھیان سے، کوئی گشتی پولیس کی گاڑی نہ پیچھے پڑ جائے۔"

"بے فکر رہو استاد! میں ایک طرف موڑ کاٹنے والا ہوں ان کو جل دینے کے لیے۔"

"اوخیر کاکا! جلدی کر پھر۔" اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

دفعتاً گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے اپنا توازن سنبھالنے کے لیے میں نے اور اول خیر نے خود کو سنبھالا، گاڑی نے ایک تنگ موڑ کاٹا تھا پھر نشیب میں اتر گئی۔ تھوڑی دیر تک زبردست ہچکولے کھاتی رہی۔ اس کے بعد شاید کسی نیم پختہ سے کچے راستے پر آگئی تھی۔ اب گاڑی کم ہچکولے کھا رہی تھی، مگر ایک بدقسمتی آڑے آگئی۔ دھماکے کی آواز سے ٹائر برسٹ ہوگیا۔ یہ خطرناک صورت حال تھی، راجا کے کارکن ہمارے تعاقب میں تھے، اب پتا نہیں ارشد نے گاڑی کو موڑتے وقت کس قدر پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہوگا کہ ہم ان کی نظروں کے تعاقب سے بچے تھے یا نہیں، تاہم ٹائر برسٹ ہوتے ہی ارشد نے فوراً گاڑی کو بریک لگا دیے تھے، کچے راستے پر ہونے کے باعث گاڑی جلدی جام ہوگئی۔

گرد و غبار کے بگولے نے ہمیں تھوڑی دیر تک گھیرے میں لیے رکھا، پھر ہم گاڑی سے اتر آئے، ہمارے عقب میں تقریباً چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ملتان روڈ نظر آرہا تھا۔

"شاید وہ آگے نکل گئے ہیں۔" اول خیر نے کہا۔ پھر ہم نے گاڑی کا جائزہ لیا۔ پچھلا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ فاضل ٹائر گاڑی میں موجود تھا۔ ارشد فوراً ٹائر بدلنے کے لیے حرکت میں آگیا۔ میں اور اول خیر گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے، یہ بنجر علاقہ تھا۔ اس سے آگے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ جس کچے اور قدرے نشیبی راستے پر ہم اس وقت موجود تھے وہ آگے کھیتوں کے درمیان جا کر گم ہورہا تھا۔ آگے کوئی گاؤں تھا۔

شام اترنے لگی تھی، دور پرے کچھ دیہاتی لوگ نظر آئے تھے، جو پیدل بھی تھے اور بیل گاڑیوں پر بھی۔ ہمارے عقب میں کنڈیارو کی قدِ آدم جھاڑیوں کے بڑے بڑے ڈھینگر پھیلے ہوئے تھے، بائیں جانب ایک کچا کنواں بھی نظر آتا تھا۔

ارشد تیزی سے اپنا کام نمٹانے میں مگن تھا، وقت بچانے کی خاطر اول خیر بھی اس کی مدد میں شامل تھا۔ جبکہ مجھے اول خیر نے گرد و پیش پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی تھی اور میں اس وقت وہی کام کررہا تھا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد جیسے ہی ارشد نے اپنا کام نمٹایا... اچانک گھنے ڈھینگروں کے عقب سے آتی ایک آواز پر میں بری طرح چونک پڑا۔ وہ کسی گاڑی کی آواز تھی، جو ہاتھ جھاڑتے ہوئے اول خیر اور ارشد نے بھی سن لی تھی۔ ہم تینوں نے فوراً پستول نکال لیے، پھر وہ سب کچھ آناً فاناً ہی ہوا تھا، جس کی ہمیں بعید ترین توقع تھی۔ وہی دو گاڑیاں ڈھینگروں کے عقب سے نمودار ہوکر ہمارے بالکل قریب آکر ایک جھٹکے سے رک گئیں، سب سے پہلے پجیرو سے پانچ چھ مسلح افراد اترے۔

ہمیں گھیر لیا گیا اور ناچار ہمیں اپنے محدود اسلحے سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شکر تھا ابھی انہوں نے ہم پر سیدھے فائر نہیں کیے تھے جس کا مطلب تھا سردست یہ ہمیں ہلاک کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔

یہ بات شک و شبے سے بالاتر تھی کہ یہ لوگ شفقت راجا کے ہی کارندے ہوسکتے تھے جو ہمارے تعاقب میں تھے اور کافی ہوشیار اور بیدار دماغ ثابت ہوئے تھے۔

"خبردار! کوئی غلطی نہ کرنا، ورنہ تم تینوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔" ان میں سے ایک لمبا تڑنگا آدمی گرجا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اول خیر نے پوچھا۔

"تم لوگ کون ہو اور ہماری تم سے کیا دشمنی ہے؟"

"بکواس بند کرو۔ چلو گاڑی میں بیٹھو اپنی۔" وہ آدمی اول خیر کو گھورتے ہوئے گرجا۔ پھر اس کے چار پانچ مسلح

آدمیوں نے ہمیں گنوں کی نال سے ٹھوکتے ہوئے گاڑی میں سوار کرادیا۔ ہماری گاڑی اب ان کے قبضے میں تھی مگر یہ واقعی شفقت راجا کے آدمی تھے ۔۔۔۔ مجھ سمیت ہم تینوں کا بڑا قوی تھا یقینی طور پر صورتِ حال گمبھیر ہونے کا ہم تصور کرسکتے تھے۔

ہمیں اپنی ہی گاڑی میں لاد کر یہ لوگ مخالف سمت روانہ ہوگئے اور ملتان روڈ پر آگئے۔ میرے اندر دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی، اول خیر اور ارشد بھی اس نئی خراب صورتِ حال پر پریشان اور متفکر نظر آرہے تھے۔ اپنے مقصد کی منزل کے قریب پہنچ کر بلا وجہ کی قلم ہمارے گلے پڑگئی تھی۔ تینوں گاڑیاں یکساں رفتار کے ساتھ آگے پیچھے دوڑتی ہوئیں ٹھیک اس مقام سے بائیں جانب کچے میں اتر گئیں جہاں ہمارا....

..... شفقت راجا کے سیاسی اجتماع سے واسطہ پڑا تھا۔

یقین تو پہلے ہی تھا، اب تصدیق بھی ہوگئی تھی کہ یہ لوگ انھی کے ہی آدمی تھے۔ کینہ پرور شفقت راجا اپنی تضحیک نہیں بھولا تھا اور ہمارے نکلتے ہی اس نے اپنے آدمی ہمارے تعاقب میں دوڑادیے تھے۔ باقی مجمع یا اس سیاسی اجتماع کے شرکا وغیرہ تھوڑی دور سامنے ایک کچے کے ایک میدان میں نظر آرہے تھے، مگر تینوں گاڑیاں ملتان روڈ سے بائیں جانب ایک نسبتاً چھوٹی ذیلی سڑک پر موڑلی گئیں یہ چک نواں کا علاقہ تھا اور قدرے مضافاتی بھی۔ یہ لوگ وہیں ہمیں لے جارہے تھے۔ ہمارا خیال درست نکلا۔ تینوں گاڑیاں اس ذیلی سڑک پر تیز رفتاری سے فاصلے پاٹتی ہوئیں قریب کوئی چار پانچ کلومیٹر کے بعد دائیں جانب مڑگئیں یہاں جابجا پختہ نیم پختہ مکانات اور گھر نظر آرہے تھے۔ ڈیرا نما وہ پُرشکوہ عمارت یہاں سے ایک چھوٹے دریا کی شاخ پر سے گزرنے کے بعد دکھائی دے گئی۔ جہاں یہ تینوں گاڑیاں روک دی گئیں۔ یہ قرمزی پتھروں سے بنی مستطیل نما عمارت تھی۔ حویلی نما مکان کا رقبہ وسیع عریض رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مکان کے برابر میں چھپر نما سائبان نظر آرہے تھے کچھ لوگ نشستین یوں والی چارپائیوں پر حقہ گڑگڑاتے ہوئے نظر آئے، بھینسیں بندھی ہوئی تھیں، دو تین شکاری کتے بھی بندھے نظر آرہے تھے۔ گاڑیاں رکتے ہی گڑ گڑی جمائے۔ چند افراد تیزی کے ساتھ ہماری طرف بڑھے۔

ہمیں گاڑی سے اتارا گیا اور ایک بیٹھک قسم کے بلند چھت والے کمرے میں لے آئے۔ یہاں سرکنڈوں کے بنے مونڈھے پڑے تھے دو چار ۔۔۔۔ موٹے نشستین پایوں کی خالی چارپائیاں بھی بچھی نظر آئیں، ہم تینوں کو ایک چارپائی پر محصور کرکے بٹھادیا گیا۔ اول خیر نے ان سے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

”او بادشاؤ! گل ختم کرو ہمیں جانے دو ہم ایک ضروری کام سے جارہے ہیں۔ اس کاکے کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“ اول خیر کی بات پر ان دس بارہ مسلح افراد کو لیڈ کرنے والا شخص غصیلی نظروں سے اول خیر کی طرف گھورنے لگا پھر تند لہجے میں بولا۔

”اپنے اس کاکے کو تمہیں پٹا ڈال کر رکھنا چاہیے تھا۔ کیوں کھلا چھوڑا ہے اسے تمہارا فیصلہ اب راجا صاحب ہی کریں گے۔“

”راجا صاحب“ کو ان لوگوں نے راستے میں ہی سیل فون پر مطلع کردیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکے تھے وہ بھی شاید وہاں پہنچنے والا تھا۔ شاید اپنا خطاب اور عوامی خدمت کا، بڑے بڑے جھوٹے دعوے کرنے کے بعد۔۔۔ اسے یہیں آنا تھا۔

تھوڑی دیر گزری اور باہر گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ بیٹھک کا کھلا دروازہ ہماری آنکھوں کے سامنے تھا، اور باہر کا مقدور بھر منظر بھی۔ وہیں ہم نے وہ سیاہ رنگ کی ہنڈا اسٹی کو رکتے دیکھا تھا۔ پھر فوراً شفقت راجا کو بھی جس کا چہرہ غصے سے ہنوز مسخ نظر آرہا تھا۔ اس کے ہمراہ دو تین مسلح محافظ بھی تھے۔ وہ طیش کے مارے پھونکتا ہوا اندر داخل ہوا اور آتے ہی سیدھا میری جانب بڑھا اور خونخوار سی نظروں سے گھورتا ہوا اس نے مجھے تھپڑ مارنے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اول خیر نے جو دانستہ میرے قریب ہوکر بیٹھا تھا۔ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا تھپڑ میرے چہرے تک پہنچنے سے پہلے روک لیا اور خوں ناک غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

”ہتھ ہولا رکھ۔ نوجوان! جو بات کرنی ہے زبان سے کر۔ ہم غلطی پر نہیں ہیں مگر پھر بھی قصہ مکانے کے لیے معافی مانگنے کو تیار ہیں۔ باقی میدان کھلا ہے ہم آپ کے قبضے میں ہیں، ہاتھ کی ریت رکھو یا زبان کی۔“ کہتے ہوئے اول خیر نے شفقت راجا کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔

اس کے ایک مسلح کارندے نے اول خیر کی اس جرأت پر جارحانہ پیش قدمی کرنا چاہی۔ مگر راجا نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

اول خیر کے لہجے یا اس کی بات نے راجا کو شاید کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر وہ اب اس سے مخاطب ہوکے بولا۔

”تم کس کے آدمی ہو؟ اور کون ہو؟“

بات شاید دوسرے رخ پہ جارہی تھی، میں بغور یہ سب سن رہا تھا۔ اول خیر نے جواباً مسکرا کر یار باش سے لہجے میں کہا۔

”او شہزادو! آرام نال بے جاؤ۔ ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے، بس یہ کاکا ذرا پاگل سا ہے۔ اس کے بارے میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔“

”معافی کس بات کی۔۔۔ اول خیر؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔ نہ ہی میں اس نوجوان کو جانتا تھا۔ بس مجھے اس پر ترس آیا اس کی ماں بیمار تھی ان کا فرض بنتا تھا انسانیت کے ناتے یہ لوگ اسے جانے کے لیے نہ صرف راستہ دیتے بلکہ اس کی مدد کی بھی کوشش کرتے۔ یہ تو خود کو عوام کا خادم ان کا نمائندہ کہتے ہیں۔“

میں نے آخر میں شفقت راجا کی طرف دیکھ کر یہ کہا تھا۔ اول خیر میری تقریر سے پھر پریشان آنے لگا۔ کیونکہ اس کے بعد شفقت کے تیور پھر بگڑنے لگے تھے، میری طرف غصے سے گھورتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

”اوئے۔ اس کا دماغ تو ابھی تک آسمان سے نہیں اترا اس کو ابھی اور اسی وقت سبق سکھاؤ اس کے سر کے بال مونچھیں حتیٰ کہ بھنویں بھی منڈھ دو۔ جوتوں کا ہار گلے میں پہنا کر اسی وقت گدھے پر سوار کرواکر اسے مجمع میں لے کر آؤ تاکہ لوگ دیکھ کر عبرت پکڑیں کہ شفقت راجا کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے اور اس پر پستول تاننے والے آدمی کا ہم کیا حشر کرتے ہیں۔“

اس کی یاوہ گوئی پر میں ہی نہیں اول خیر بھی بری طرح بھڑک گیا۔

”راجا صاحب! اس طرح کے جھگڑے ہمارے گھر کی بھی لونڈی ہوتے ہیں آج آپ کی باری ہے کل ہماری ہوگی۔ ٹھیک ہے پھر ہم ہتھیار ڈالتے ہیں۔ اور خود کو آپ کے حوالے کردیتے ہیں آپ کو اجازت ہے کہ آپ جو چاہے ہمارے ساتھ سلوک کرو کیوں کہ اس وقت آپ اپنے ڈیرے پر موجود ہو۔ اپنے آدمیوں کی فوج سمیت۔ اب ایک نہیں تین گدھے لانا اس کاکا کے ساتھ ہم دونوں بھی اپنی مونچھیں اور بھویں منڈوانے کے لیے تیار ہیں۔“ اول خیر نے ارشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شفقت راجا سے نہایت جوشیلے لہجے میں کہا۔ میں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ اول خیر جب بھی کچھ بولتا بہت جچے تلے لب و لہجے میں بولتا تھا۔ جس کا اثر شفقت راجا پر ہوتا تھا۔ یہ بات بھی اس کی جو ایک خوفناک تہدید میں چھپی ہوئی تھی، شفقت راجا کے غم وغصے سے غرور طاقت کو متزلزل کرتی نظر آئی تھی۔

”ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ ویسے سے بھی ہم ایسی دشمنی کی نوبت ہی نہیں آنے دیں گے۔ اس وقت تم تینوں کو جان سے مار کر تمہاری لاشیں ویران کھڈ میں پھینک دیں گے۔“

”او خیر!“ اول خیر اس کی طرف دیکھ کر بڑے ۔۔۔

۔۔۔ اطمینان سے مسکرا کر بولا۔ ”ہم تمہارے قبضے میں ہیں جو چاہے سلوک کرو۔“

”تم دونوں کو جانے کی اجازت ہے۔ مگر اس نوجوان کو یہاں چھوڑنا ہوگا۔“ اس بار شفقت راجا نے جو بہ غور میری طرف خاصی دیر سے پُرسوچ نظروں کے ساتھ گھورے جارہا تھا، بولا۔

”مگر کیوں؟“ اول خیر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”میں اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔“ شفقت دانت پیس کر بولا۔

”آپ کیا کروگے اس کے ساتھ؟“ اول خیر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”وہی کریں گے جو تمہیں ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا گیا ہے۔“ کہتے ہوئے شفقت راجا نے اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو پکار کے تحکمانہ کہا۔

”اوئے، فوراً کھوتا نائی کو لے کر آؤ۔ اور ایک گدھے اور جوتوں کے ہار کا بندوبست کرو۔“

میرے دل و دماغ میں خوفناک زلزلے نے سر ابھارا، سرخ غبار سا میری آنکھوں کے آگے چھانے لگا۔ تذلیل سے قبل ہی احساس تذلیل نے میری یہ حالت کردی تھی تو بعد میں کیا ہوتا، آنے والے طوفان کا تو اول خیر کو بھی اندازہ ہوتا۔

شفقت راجا کے حکم پر دو آدمی فوراً حرکت میں آئے اور پیچھے کو پلٹ گئے۔

اچانک ایک کارندے نے آکر شفقت راجا کے کان میں کچھ کہا۔ میری سلگتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میرا وجود جوار بھاٹے کی زد میں تھا۔

”کیا بکواس کررہا ہے؟ اس مردود کو انہیں یہاں لانے کا کس نے کہا تھا؟“ اپنے کارندے کی بات پر شفقت راجا غصیلے پن سے بولا۔ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک ٹھگنے قد کا سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا وہ پکی عمر کا تھا۔ کڑھائی دار کرتہ اور شلوار پہن رکھی تھی، بائیں کان کی لو

سے چاندی کی بالی چمک رہی تھی، آنکھیں گاڑھی تھیں اور ان میں مخصوص چمک مترشح تھی۔ اسے دیکھتے ہی انتہائی کمینے انسان کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔ اس کے کاندھے پر بڑا سا رومال نما کپڑا تھا۔ الٹے ہاتھ کی انگلیوں میں دو تین موٹے موٹے نگوں والی چاندی کی انگوٹھیاں تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبا ہوا تھا جس کی مٹھی بنا کر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش بھی لیا اور شفقت راجا کی طرف دیکھ کر بڑی خباثت سے مسکرایا۔

”راجا صاحب چنی بائی کا سلام قبول ہو... دام لینے آیا تھا۔“

”چنی بائی“ کا نام سے یکدم میری آتش فشانی کیفیت بدلنے لگی، پورا یقین تھا مجھے کہ اس نام پر ضرور اول خیر اور ارشد بھی اندر سے چونکے ہوں گے۔ یہ چنی بائی ہی تو تھی جس کے اڈے پر شب خون مارنے کے لیے ہم ملتان سے یہاں خاک چھانتے ہوئے آئے تھے۔

میں نے دیکھا شفقت راجا کو اس آدمی کی آمد اس وقت انتہائی ناگوار گزری تھی۔

”تم سے کتنی بار کہا ہے فون پر رابطہ کر کے آیا کرو ہم سے ملنے کے لیے۔“ شفقت راجا نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر کہا تو اس مخصوص حلیے والے آدمی کے چہرے کی ..... کمینی مسکراہٹ یکلخت سرد مہری میں بدل گئی۔ وہ اسی لہجے میں جواباً بولا۔

”یہ بھی خوب کہی راجا صاحب آپ نے... آپ سے رابطہ کرو تو آپ سیل فون اپنا آف کر دیتے ہیں خود ملنے آؤ تو...“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔“ شفقت راجا نے اس کی بات کاٹ کر برہمی سے کہا۔ تو وہ شخص بھی غالباً اپنی اوقات پر اتر آیا۔

”راجا صاحب۔ اس طرح نہیں چلے گا۔ آج میں اپنی پے منٹ لے کر ہی جاؤں گا چنی بائی نے مجھے سختی سے یہ حکم دے کر بھیجا ہے۔ دام دو یا ”دانے“ واپس لے کر آؤ۔“

ان کی بحث نے ہمارے اندر دھکڑ پکڑ مچا رکھی تھی۔ راجا نے انتہائی خونخوار نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا اور الٹے ہاتھ کا زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ بلند چھت والے کمرے تلے دم بخود ماحول میں ”چٹاخ“ کی آواز ابھری تھی، تھپڑ زوردار ثابت ہوا تھا۔ جس کے باعث وہ آدمی چند قدم پیچھے لڑکھڑانے پر مجبور ہو گیا۔ اس وقت شفقت راجا کے موجود مسلح کارندوں نے اس آدمی پر اپنی گنیں تان لیں اور خوں ناک نظروں سے گھورنے لگے، میں نے اس مضروب آدمی کے چہرے اور اس کی چندی چندی آنکھوں سے مترشح ہوتی اس چمک کو نمایاں طور پر محسوس کیا تھا، جن میں نفرت و بغض کا طوفان بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے راجا شفقت سے صرف اس قدر بولا۔

”مجھے جانے کی اجازت ہے راجا صاحب؟“ ان نے زہریلے لہجے میں صرف اتنا پوچھا۔

پھر نجانے کیا ہوا۔ اس چھت تلے ایک ہولناک اور خونی ڈراما محض ایک اشارے پہ ہی کھیلا گیا۔ ایک کارندہ لپک کر مضروب آدمی کے سامنے اچھل کر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں گراری دار چاقو تھا، جسے کھولنے میں اس نے صرف ایک پل ہی ضائع کیا ہوگا، اور دوسرے ہی لمحے اس نے چاقو کا مہیب پھل نہایت بے رحمی سے اس آدمی کے قدرے نکلے ہوئے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ”اوخ“ کی کرب ناک آواز اس آدمی کے حلق سے نمودار ہوئی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ آگے کو جھکا... ناقابلِ برداشت اذیت کے آثار اس کے چہرے کو مزید مکروہ بنا گئے... اور منہ سے خون اگلتا ہوا وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر کے ٹھنڈا ہو گیا۔

”نمٹاؤ اس حرام زادے کو اب اچھی طرح سے۔“ شفقت راجا نے سنگ دلی سے حکم دیا۔

”راجا صاحب! اب ان تینوں کو بھی نمٹانا پڑے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہی ہیں۔“ ایک کارندے نے ہماری طرف جلاد صفت نظروں سے تکتے ہوئے شفقت راجا کو مشورہ دیا۔

”ختم کر دو ان تینوں کو بھی...“ شفقت راجا شدتِ جنوں سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ وہ شاید کوئی خطرناک نفسیاتی مریض ہی معلوم ہوتا تھا۔

یکلخت کئی مہیب گنوں کا رخ ہم تینوں کی طرف اٹھا... اور فضا گولیوں کی خوں رنگ بوچھاڑ سے لرز اٹھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ذہن میں چبھن کا باعث بننے والی ایک انوکھے ذائقے کی منفرد کہانی...

مزاج کی آوارگی اور بے یقینی ہمیشہ خسارے کے سودے میں الجھائے رکھتی ہے... ایک ایسے ہی ضدی اور سرکش کی بے اعتدالیاں... جسے ہر پل ایک نئے جسم و جاں کی تلاش سرگرداں و بے قرار رکھتی تھی...

تلاشِ پیہم

بابر نعیم

ٹونی گیبریل نے بس سے باہر قدم رکھا... طویل سفر کے باعث اس کے جوڑ اکڑ گئے تھے... اس وقت شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ بس کے ماحول کے برعکس فلوریڈا کی کھلی فضا فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ لگیج کمپارٹمنٹ سے اس نے اپنا سفری بیگ وصول کیا اور دو سو میل کی سفری تھکان دور کرنے کے لیے ہوٹل کا رخ کیا۔ رات جوان ہو رہی تھی۔ اس کے پاس ”ملی“ کو تلاش کرنے کے لیے دو گھنٹے تھے۔

☆☆☆

ٹونی کو جو کمرا ملا، وہ پُرتعیش تو نہ تھا تاہم صاف ستھرا تھا۔ اس نے کمرے کا موازنہ پچھلے ہوٹل کے کمرے سے کیا۔ اس کے مقابلے میں یہ کمرا اسے کافی بہتر لگا۔

سب سے پہلے اس نے گرم پانی سے غسل کیا تو تھکے ہوئے بدن کو راحت کا احساس ہوا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ اسے کبھی مکمل آرام نصیب نہیں ہوگا۔

اسے اب تک مکمل آگاہی حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ خود اپنا ”باس“ ہے۔ وہ کسی کا پابند نہیں تھا۔ اپنے فیصلے خود کرتا تھا۔ وہ ایسی راہ پر چل پڑا تھا جہاں موت اور لاقانونیت کا راج تھا۔ جب کوئی گولی اس کے کان کے پاس سے گزر کر کسی بدقسمت کو چاٹ جاتی تو ٹونی اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک تھا وہی کرتا جو اس کا دل کہتا تھا۔

اس وقت اس کے ذہن میں صرف ایک ہی ٹارگٹ تھا۔ گزرتے ہوئے بدتر دنوں میں اس ٹارگٹ نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔

ٹونی نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تو وہ کسی بھوت کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے کام سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے اپنے مقاصد حاصل نہیں کر پاتے تھے... موت اتنی طاقتور نہیں تھی کہ ٹونی کے اندر کی ناقابلِ فہم آگ کو بجھا سکتی۔ اس نے اپنی پکچر خود ہی پینٹ کی تھی... جو ایسے بھوت کی طرح تھی جو اپنی دھن کا پکا تھا۔

ایک عجیب مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی... شاید وہ کچھ بھول گیا تھا لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ وہ کیا بھول چکا ہے۔

☆☆☆

علاقے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ماحول بدل جاتا ہے۔ لوگ بدل جاتے ہیں۔ زندگی کے اہم ساتھی جو وفادار ہوتے

آوارہ گرد

قسط: 3

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا

ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہوتی ہے مگر موت کو آنکھوں کے سامنے... بالکل قریب پا کر یہ کرب انگیز احساس ضرور ہوتا ہے کہ بس! اب آخری وقت آن پہنچا...

ہماری آنکھوں کے سامنے چنی بائی کے آدمی کو انتہائی بے رحمی سے شفقت راجا کے کارندے نے چاقو مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ اس بہیمانہ قتل کے ہم تین چشم دید گواہ اب ان کے رحم و کرم پر تھے۔

بیک وقت کئی گنز ہماری طرف اٹھتی چلی گئیں ۔ کم از کم مجھے تو اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ ابھی گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھرے گی اور میرے وجود میں سلگتی ہوئی اذیتیں تراز و کر دی جائیں گی، گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی آواز ابھری ضرور تھی مگر یہاں نہیں، بیٹھک سے باہر۔ ہم تینوں سے زیادہ شفقت راجا اور اس کے مسلح کارندے بری طرح اچھل پڑے بلکہ شفقت راجا نے تو اپنی قمیص کے اندر

اڑسا ہوا پستول بھی نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازے کی طرف بڑھتے، چار پانچ نقاب پوش مسلح افراد اندر درآئے اور انہوں نے اپنی گنوں کے منہ کھول دیے۔

آناً فاناً شفقت راجا سمیت اس کے کارندے رقصِ اجل میں لہراتے تھرکتے زمین بوس ہو گئے..... کڑے وقت نے جن لوگوں کو ہم پر ملک الموت کی طرح نازل کر رکھا تھا، وقت کی کایا کلپ نے چند ثانیوں کے لیے ہی سہی، انہیں ہماری ڈھال بنا دیا تھا۔ اسی مختصر سی مدت سے فائدہ اٹھا کر اول خیر نے چلّا کر موت کے اِن ہرکاروں سے کہا۔

’’ہم ان کے قیدی ہیں... ہمیں مت مارنا۔‘‘ یہ کہتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔ میں نے اور ارشد نے بھی اس کی تقلید کی۔

فرش پر پہلے سے چنی بائی کے آدمی کی لاش..... پڑی تھی۔ وہ چاروں نقاب پوش خونی نظروں سے ہماری طرف گھورتے رہے۔ اور ہم اپنے انجام کے منتظر رہے۔ پھر شاید بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

اپنے شکاریوں کے ختم ہونے کا یقین کرنے کے بعد وہ چاروں ہرکارے جس طرح چشم زدن میں آئے تھے اسی طرح لوٹ گئے، باہر ہمیں گاڑی کے انجن اسٹارٹ ہونے اور پھر بتدریج دور جاتی آواز سنائی دی تھی۔

’’او... خیر... یہ تو گل ہی مک گئی۔‘‘ اول خیر نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ ’’اپنی گنیں سنبھالو اور نکل چلو۔‘‘ وہ بولا۔ میں اور ارشد حرکت میں آ گئے، ہم نے اپنا اسلحہ قبضے میں کیا اور بیٹھک سے باہر آ گئے۔ سامنے ایک گرے رنگ کی ٹویوٹا اڑتی چلی آ رہی تھی اور جب تک ہم اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے، باہر بکھری ہوئی دو تین آدمیوں کی خون میں لت پت لاشوں کے قریب وہ کار زوردار آواز سے آن رکی۔ اس کے اندر سے ایک جواں سال لڑکی برآمد ہوئی، اس نے ٹائٹ جینز اور پنک کلر کی مہین کرتی پہن رکھی تھی، بال ڈائی کیے ہوئے تھے، رنگت گوری اور آنکھیں کشادہ تھیں۔ دیکھنے میں شوخ اور بولڈ نظر آتی تھی۔

’’گاڑی میں سوار ہو جاؤ جلدی...‘‘ اول خیر چلایا۔ لڑکی بہادر اور شاید ایسے حالات کی عادی ہی نہیں حاضر دماغ بھی تھی، خون میں لت پت پڑی تین لاشوں کو دیکھتے ہی اس نے اپنے بڑے اسکرین والے سیل فون سے ہماری ویڈیو بنانی شروع کر دی۔ گولیوں کی گھن گرج کے بعد قریب کے لوگ بھی اس طرف متوجہ ہو چکے تھے، یہ جانکاہ واقعہ معمولی نہ تھا۔ ہم سب اپنی جیپ میں سوار ہو چکے تھے، اس بار ڈرائیونگ سیٹ اول خیر نے سنبھالی تھی۔ اس نے ہمارے سوار ہوتے ہی گاڑی ایک جھٹکے سے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

’’اس لڑکی نے ہماری اپنے سیل فون پر ویڈیو فلم بنا لی ہے۔‘‘ میں نے تھرائی ہوئی آواز میں انکشاف کیا... ارشد، اول خیر کے برابر بیٹھا تھا۔ میں عقبی سیٹ پر اور گاہے بہ گاہے عقبی اسکرین سے پیچھے جھانکتی سڑک کو دیکھ رہا تھا۔

’’اس لڑکی سے سیل فون چھین لینا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کون تھی، بعد میں ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتی ہے وہ لڑکی۔‘‘ میں چلاتا رہا۔ اول خیر بولا۔

’’کاکا بس ابھی اس مصیبت سے نکلنے کی فکر کرو۔ دوسری مصیبت سے بعد میں نمٹ لیں گے۔‘‘ میں خاموش ہو گیا مگر میری تشویش بجا تھی۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ تھی، میں نہیں جانتا تھا کہ اس لڑکی نے اول خیر یا ارشد کی کس قدر ویڈیو بنائی تھی، لیکن اپنے بارے میں مجھے تشویش ناک حد تک ’’تسلی‘‘ تھی کہ کم از کم میرے چہرے کی وہ بالکل صاف ویڈیو تو بنا ہی چکی ہوگی، کیونکہ اس وقت لڑکی کے زیادہ قریب میں ہی تھا اور غیر ارادی طور پر اپنے پورے چہرے کے ساتھ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

’’اوئے کاکا فکر نہ کر... اس ویڈیو کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔‘‘ گاڑی بھگانے کے دوران شاید عقبی آئینے میں میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے اول خیر نے تسلی دی۔

’’فکر کی بات ہے اول خیر!‘‘ اس بار ارشد نے میری تائید میں کہا۔ ’’ہم کسی معمولی آدمی کے نرغے میں نہیں تھے، شفقت راجا خود بھی ابھرتی ہوئی سیاسی شخصیت ہے، یہ موروثی سیاست سہی مگر اس کا باپ بھی بڑا کھاپڑ سیاست داں ہے۔ تم نے بھی اس کے سیاسی جلوس کا حال دیکھ ہی لیا تھا۔ اب شفقت راجا اپنے دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی پرانی دشمنیاں بھی نسل در نسل چلتی ہیں۔ اس لڑکی کے سیل فون پر ہماری شکلیں عین ایسے وقت میں محفوظ ہو چکی ہیں جبکہ یہ خون ریز واقعہ ہوا ہے۔‘‘

’’کاکا! میں تیری ساری تشویش اور باتیں سمجھ رہا ہوں۔‘‘ اول خیر نے ذیلی سڑک سے مین ملتان روڈ پر آتے ہوئے کہا۔

’’میں اس بارے میں سوچ رہا ہوں... کہ...‘‘

’’اب کیا فائدہ سوچنے کا اول خیر۔‘‘ میں نے اس کی بات کاٹی ’’ہمیں اس وقت لڑکی پر حملہ کر کے اس سے سیل فون چھین لینا چاہیے تھا یہ میڈیا کا دور ہے۔ اول خیر! اور پھر اتنی اہم شخصیت کا قتل اور ہماری فوٹیج... آدھے گھنٹے بعد ہی یہ فوٹیج

ملک کے ہر نجی ٹی وی چینل بڑے فخر سے دکھا رہے ہوں گے اور ہمارے سر پہ کسی اور کی بلائے جان آن پڑی ہے۔‘‘

’’او خیر... کاکے میں نے تیرے بارے میں غلط نہیں کہا تھا کہ تو ایک دم دھاکڑ مرد ہے۔ تیری عقل اور تیری دور اندیش سوچ بہت آگے تک اور وقت سے پہلے دوڑتی ہے۔‘‘ اول خیر اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولا تو میں نے بیزاری سے کہا۔

’’مجھے ہر وقت اپنی تعریفیں پسند نہیں اول خیر! ہم نے اپنے بچاؤ کا ایک اہم موقع کھو دیا ہے۔‘‘

’’اب مٹی ڈالو اس پر، پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں، آگے کی سوچو...‘‘ ارشد نے جھلّا کر کہا تو اول خیر بولا۔

’’ہم ابھی اوکاڑہ پہنچنے والے ہیں... کسی ہوٹل میں ٹی وی دیکھ لیں گے، پتا تو چل جائے گا کہ ہماری کس حد تک فوٹیج آئی ہے۔‘‘

اس صورت حالات میں ہمارا دھیان بھی اپنے اصل مشن سے ہٹ گیا تھا۔ یاد آیا تو میں یکبارگی ذہن میں ابھرنے والے ایک منظر پر بری طرح چونک کر بولا۔

’’تم لوگوں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہمارے سامنے جس آدمی کا شفقت راجا کی بیٹھک میں قتل ہوا تھا، وہ چنی بائی کا خاص آدمی تھا اور وہ اس سے دام کھرے کرنے آیا تھا۔ پولیس یقیناً اس معاملے کو چھپا دے گی۔ یعنی اس کے قتل کو...‘‘

اول خیر اور ارشد نے میری بات شاید سنی ان سنی کر دی۔ سفر پُرتفکر سی خاموشی میں کٹ گیا۔ اوکاڑہ پہنچتے پہنچتے رات ہو چکی تھی۔ اوکاڑہ پر بیک وقت گاؤں اور شہر ہونے کا شبہ ہوتا تھا۔ اس شہر کی وضع قطع ہی کچھ ایسی تھی۔ چنی بائی کے کوٹھے تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔

گاڑی ایک جگہ روک کر میں نے اور اول خیر نے کوٹھے میں داخل ہونے کا پروگرام بنایا، جبکہ ارشد کو وہیں گاڑی میں ہی موجود رہنے کا کہا۔ بھوک تو ہماری اڑ چکی تھی۔

بہرحال ہم دونوں نے اپنا حلیہ درست کیا اور کوٹھے کے دروازے پر جا پہنچے، قریب میں ایک سگریٹ پان کا بڑا سا کیبن بنا ہوا تھا، میں نے اور اول خیر نے پہلے ہی سے اپنی وضع قطع ایسی بنا لی تھی کہ ہم کوئی عام گاہک نظر نہ آئیں، کیبن خوب سجا ہوا تھا، اونچی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔

چاروں طرف ایک عجیب سا ماحول تھا، جو ظاہر ہے میرے لیے نیا ہی تھا، لوگ کیبن پر کھڑے پان سگریٹ خرید رہے تھے، چند ایک مخصوص قسم کے آدمی بھی موجود تھے، جن کا کام گاہکوں کو تاڑنا تھا۔ دائیں بائیں چوباروں پہ گویا بجلیاں سی چمک رہی تھیں۔ سستے اور گاڑھے میک اپ سے تھپے ہوئے ادا فروش چہرے، بھڑکیلے اور چست، کھلے گریبان والے کپڑوں میں ملبوس، نیچے آتے جاتے گاہکوں کو فحش اشاروں سے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے میں منہمک تھیں۔ گلی سے شوقین قسم کے لوگوں کی آوک جاوک جاری تھی۔ ایک طوائف نے مجھے کسی مشہور بھارتی ہیرو کے نام سے پکار کر فحش اشارہ کیا۔ اول خیر کی ہدایت مجھے یاد تھی، ہمیں خود کو ایسا ہی ظاہر کرنا تھا، اور میں نے ’’ایسا ہی‘‘ کیا، یعنی بہ جبر دل و دماغ اس طوائف کی طرف دیکھ کر جوابی اشارہ بھی کیا، انداز میرا بھی اوباشانہ تھا...

ہم دونوں کیبن پہ آ کے رک گئے، اول خیر نے دو سادہ خوشبو پان بنوائے، ایک اس نے منہ میں دبا لیا، دوسرا میری جانب بڑھایا۔ پان کھانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔

معاً ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا آدمی ہمارے قریب آن کھڑا ہوا۔ اور بھویں اچکا کر ہمیں اشارہ کیا پھر مخصوص انداز میں اپنے ایک ہاتھ کی انگلی سے اپنی ناک میں نتھ کی جگہ پر دستک دی۔ میں تو اس کا یہ اشارہ نہیں سمجھ سکا، البتہ اول خیر فوراً سمجھ گیا اور اثبات میں... سر ہلا دیا۔ پان والے کو نوٹ تھمایا اور آدمی کو لے کر ایک طرف آ گیا۔ میں ساتھ تھا۔

’’ہے کوئی اچھا دانہ...‘‘ اول خیر نے پرانے پاپیوں والے انداز میں آدمی سے پوچھا۔ وہ پیشہ ورانہ انداز میں بولا۔

’’ایک دم فس کلاس... بالکل کرینہ کپور... پر ریٹ ہائی ہے۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے ایک نظر میرے چہرے پہ بھی ڈالی تھی، انداز بازاری تھا۔

’’ایک گھنٹے کا پانسو... بہت آرام و سکون کے ساتھ کوئی جلد بازی نہیں۔ دو سو روپے میرا کمیشن الگ ہوگا۔‘‘

’’مال ہمیں ’’تھری ڈی‘‘ چاہیے۔‘‘ اول خیر نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو وہ ادھیڑ عمر شخص سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔

’’صاحب! تھری ڈی والی پسند ڈھونڈنا ذرا مشکل کام ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں ہم خود ڈھونڈ لیتے ہیں۔ چل بے لمڈے۔‘‘ اول خیر نے بے پروا لہجے میں کہا اور مجھے آگے دھکیلا۔ وہ آدمی پیچھے پڑ گیا۔

’’ارے ارے... کدھر؟... ٹھہرو، بات تو کرو... اب اتنا بھی مشکل کام نہیں ہے یہ... مگر جو تم لوگوں کی پسند ہے وہ ذرا مہنگی ہے۔‘‘

''ہمیں دانے سے مطلب ہے، مہنگے سستے سے نہیں۔'' اول خیر بولا اور اپنی جیب سے سو کا ایک کرارا نوٹ نکالتے ہوئے اس کی طرف لہرایا۔

''یہ رکھ لو، ویسے ہمیں معلوم ہے تھرڈ ڈی مال صرف چنی بائی کے کوٹھے پر ملتا ہے، وہاں تک لے چلتے ہو تو بات کرو۔''

سو کے کرارے نوٹ کو دیکھ کے آدمی کی پیک زدہ باچھیں بہہ پڑیں۔ چندی چندی آنکھوں میں حریصانہ چمک ابھری۔ اس نے نوٹ اچکنے کی کوشش کی مگر اول خیر نے ہاتھ اپنا پیچھے کرلیا۔ ''پہلے کام۔''

''ابھی لیے چلتا... آؤ...'' وہ جھٹ سے بولا۔ اول خیر نے نوٹ اسے پکڑا دیا۔ ہم دونوں اس کے عقب میں چلنے لگے۔

''اے او... اپنی موٹی بھینس جیسی بیوی کے پاس لے جا رہا ہے ان دونوں مسٹنڈے شہزادوں کو... مت جانا اس کے ساتھ کالی بلا ہے اس کی بیوی۔'' اوپر ایک چوبارے پر چمگادڑ کی طرح جھولتی جواں سال لڑکی نے چلّا کر کہا مگر وہ آدمی شاید اس جملے بازی کا عادی تھا۔ سنی ان سنی کرتا ہوا ہمارے آگے چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چنی بائی کے کوٹھے پر ہمیں پہنچا دیا۔

''میں ادھر کیبن پر ہی ملتا ہوں، مُنّے میاں نام ہے میرا، اگر چنی بائی سے بات نہ بنے تو آجانا... پھر میں تمہیں ٹیلی بائی کے پاس لے جاؤں گا، وہاں ضرور کام بن جائے گا تمہارا۔'' مُنّے میاں نے کہا اور واپس چلتا بنا۔

ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں دو کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا تھا، بڑا گندہ اور پراگندہ ماحول تھا۔ میرے آگے کوئی نیک مقصد حائل نہ ہوتا تو میں ادھر آنے کا تصور بھی نہ کرتا۔ یہاں آ کے میرے ضمیر اور میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ کہنے کو تو یہ بازارِ حسن تھا، مگر درحقیقت یہ گناہوں کی بستی تھی۔ جہاں اچھے برے خاندان کے سبھی لوگ آتے ہوں گے اور پیسے دے کر یہاں کا گند اور غلاظت... خوشی خوشی اپنے گھر لے جاتے ہوں گے۔

ایک اطفال گھر میں پرورش پانے والے شہزاد احمد خان... عرف شہزی کو اللہ نے غیر معمولی ذہن سے نوازا تھا۔ مجھے اس کا وقت کے ساتھ ساتھ احساس ہو چلا تھا۔ میں نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی مگر یہاں ہوتا کیا تھا، وہ سب ٹی وی پر چلنے والے ڈراموں پروگراموں میں دیکھتا آیا تھا۔ اگرچہ اطفال گھر میں ٹی وی ایک حد تک ہی دکھایا جاتا تھا مگر... ہم چند دوست چوری چھپے ٹی وی روم میں جا کر رات رات بھر ڈرامے، فلمیں اور دستاویزی پروگرام دیکھا کرتے تھے، عام اوقات میں ہمیں صرف سرکاری چینل دکھایا جاتا تھا مگر ہم چوری چھپے تمام ملکی و غیر ملکی نجی چینلز بھی دیکھا کرتے تھے۔

میں بنیادی طور پر خاموش طبع مگر زیادہ سوچنے والا لڑکا تھا۔ ٹی وی کے مختلف رنگ برنگ چینلز میں ہر طرح کے پروگرام آتے تھے، مگر میں نے اپنے ذہن کو بھٹکنے نہیں دیا، ہاں معلومات اور آگہی حاصل کرنے اور سدھار لانے کی خاطر میں یہ پروگرام دیکھا ضرور کرتا تھا۔

نیشنل جیوگرافک چینل میں ایک بھارتی دستاویزی فلم میں نے بھی دیکھی تھی جس میں طوائفوں کی زندگی پر ڈاکیومنٹری دکھائی گئی تھی۔ اسی میں یہ سب بتایا گیا تھا۔

جب تک اطفال گھر کے روحِ رواں حاجی صاحب زندہ تھے وہ ہماری تعلیم پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے، انہی کی توجہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے مناسب حد تک تعلیم بھی حاصل کی تھی، تعلیم نے بھی مجھے شعور عطا کیا تھا، اور پھر دینی تعلیم کی کلاسوں نے مجھے کسی حد تک بصیرت بھی عطا کی تھی جس کے باعث میری فکر و نظر میں شعور و پختگی پروان چڑھی تھی، میں زود فہم ہو گیا تھا، ذرا سی بات پر مضمون کا پورا مفہوم سمجھ لیتا تھا۔ اب اول خیر کی سنگت میں رہتے ہوئے بھی میں بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

یہاں کا ماحول کیا تھا، اس کا مجھے خوب تجربہ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر گزری ایک ٹھسے دار عورت اندر داخل ہوئی۔ وہ بھینس نما عورت تھی اور بھینس ہی کی طرح جگالی کر رہی تھی، ساتھ میں کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی پکڑ رکھی تھی، اس میں شاید اس کی جگالی کرنے کا سامان موجود تھا۔

''ہاں کیا ہے؟ کون ہو تم؟'' اس نے ایک سرسری سی نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے جھٹکے دار لہجے میں پوچھا۔

''او... خیر ہے۔ ذرا بیٹھو تو سہی چنی بائی! ارمان (آہرام) سے باتیں کرتے ہیں، ہم کوئی عام گاہک تھوڑی ہیں، لینے دینے والے لوگ ہیں۔''

اول خیر نے مخصوص لہجے میں اور معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ ذرا دیر بعد ہی دو ہٹے کٹے سیاہ رُو آدمی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے نیلے رنگ کی ٹائٹ جینز اور ہاف آستینوں والی چست ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں، شکل سے ہی

چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ وہ دونوں ہماری طرف بڑی تیز نظروں سے گھور رہے تھے، انہیں دیکھ کر مجھے ہول سا محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں پُراعتماد اور بے نیاز سا دکھائی دینے کی کوشش کرتا رہا۔

''نئے اور فریش دانے چاہیے تھے ہمیں۔'' اول خیر نے ایک اچٹتی سی نظر دونوں غنڈوں پر ڈالی اور چنی بائی سے بولا۔ میں چنی بائی کے چہرے کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ خاصی پریشان اور غصے میں نظر آ رہی تھی، یقیناً اس کی وجہ ہم نہیں ہو سکتے تھے، یا تو اسے اپنے خاص آدمی کے ہلاک ہونے کی خبر مل چکی تھی یا پھر اسے اپنے ''دانوں'' کی قیمت، شفقت راجا سے وصول نہ کرنے کا غصہ تھا۔ جواباً وہ بڑے اکھڑ پن سے بولی۔

''تم جاؤ ابھی... دو تین روز بعد آنا، ابھی میرے پاس بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔''

ایک بازاری عورت کا یوں اکڑنا مجھے ہی نہیں، یقیناً اول خیر کو بھی بری طرح کھلا ہو گا مگر مصلحت سے کام لینا ضروری تھا۔

''ہم نے مال آگے پہنچانا تھا، شفقت راجا کا تو نام سنا ہو گا آپ نے بڑی تگڑی آسامی ہے وہ۔''

میں جانتا تھا اول خیر نے دانستہ شفقت راجا کا نام لیا تھا۔ میں نے دیکھا اس بات کا اس عورت پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ نہ صرف اس پر بلکہ اس کے دائیں بائیں کھڑے کالے سانڈوں کے سیاہ رُوبشروں پہ بھی عجیب سے تاثرات لہرا گئے۔

''تم دونوں شفقت راجا کے لیے کام کرتے ہو؟'' جھریوں بھری چتون پر بل ڈال کر چنی بائی نے ہم دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہم صرف اپنے لیے کام کرتے ہیں میڈم جی!'' اول خیر نے جواب دیا۔ ''شفقت راجا جیسے ہمارے کئی گاہک ہیں۔''

''آخری بار کب ملے ہو شفقت راجا سے تم؟ چنی بائی نے انکشاف کرنے والے انداز میں پوچھنا چاہا۔

میرا اندازہ تھا کہ شفقت راجا کے قتل کی خبر جنگل کی آگ کی طرح صوبے میں ہی نہیں پورے ملک میں گردش کر گئی ہو گی لیکن سرِدست اس ''خبر'' سے ہمارا انجان بنے رہنا ضروری تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں میڈم جی آپ کی بات کا مطلب؟'' اول خیر نے کمال کی اداکاری کی۔ پتا نہیں وہ کون سی چال چلنا چاہ رہا تھا۔

''شفقت راجا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ ابھی چند گھنٹے قبل اسے اس کی بیٹھک میں کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے قتل کر ڈالا ہے۔''

چنی بائی نے بالآخر اپنے تئیں انکشاف کر ہی ڈالا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں، اس میں کوئی شک نہ تھا کہ مختلف نجی ٹی وی چینلز نے یہ اہم خبر نشر کر دی تھی۔ مگر میرے دل کی یکبارگی تیز ہوئی دھڑکنوں کا گماں کچھ اور تھا کہ اس نامعلوم لڑکی نے اپنے سیل فون سے ہماری اتاری فوٹیج میڈیا والوں کے حوالے ابھی تک کی تھی یا نہیں۔ شاید ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا۔ ورنہ چنی بائی نامعلوم حملہ آوروں کا لفظ استعمال نہ کرتی۔

''او خیر...! اس کا مطلب ہے ہمارے پرانے دانوں کے دام گئے ہاتھ سے، یہ تو بڑا نقصان ہو گیا ہمارا کاکا۔ اب کیا کریں؟''

اول خیر نے اپنے چہرے اور آواز کو پُرتشویش بناتے ہوئے میری طرف دیکھا، میں نے بھی اسی انداز میں اپنی بھویں اچکا دیں۔

''کتنا مال تھا تمہارا؟'' چنی بائی نے پوچھا۔

''پورے چار دانوں کا مال تھا میڈم جی لیکن خیر... ہمیں معلوم ہے شفقت راجا نے انہیں کہاں رکھا ہو گا۔ اب یہاں رکنا فضول ہے، ہمیں ابھی اسی جگہ کا رخ کرنا پڑے گا۔ ورنہ مال گیا ہاتھ سے۔ چل اٹھ کاکا۔'' یہ کہتے ہوئے اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گویا چنی بائی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور اب اس کی طرف سے بے نیاز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ٹھہر جاؤ... ہمارا معاملہ بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔'' دفعتاً چنی بائی نے اول خیر سے کہا۔ اب اس کے لہجے سے اکھڑ پن اور سرد مہری عنقا ہو چکی تھی۔ اول خیر ذرا رک کر چنی بائی کے چہرے کی طرف مستفسرانہ نظروں سے گھورنے لگا۔

''کیا تم واقعی جانتے ہو کہ شفقت راجا نے لڑکیوں کو کہاں رکھا ہو گا؟'' چنی بائی نے پوچھا۔

''ہاں بہت اچھی طرح۔ وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں۔ مڈل ایسٹ سے ایک سوداگر کو آنا تھا۔ جو بنگال کے راستے ان سب لڑکیوں کو لے کر جاتا۔'' اول خیر نے ہوا میں تیر چھوڑا۔ چنی بائی کے چہرے پر الجھن سی تیرنے لگی۔

''سوداگر؟ کیا شفقت راجا بھی مال کو آگے سپلائی کرتا تھا؟''

''ہاں! مگر پہلے کچھ روز تک شکار کو خوب نچوڑنے کے

بعد۔ لیکن اب اس کو موت نے نچوڑلیا۔ وقت کم ہے ہمارے پاس میڈم جی۔ آپ نے کچھ کہنا ہے تو...'' اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''تم لوگ تو بڑے پہنچے ہوئے بیوپاری لگتے ہو۔ میں تم سے ہر طرح کا سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' چنی بائی رفتہ رفتہ اپنے روایتی ہتھکنڈے پر اتر آئی، وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔ ''آج کل یہاں کوٹھوں، چوباروں میں پہلے والا مزہ نہیں رہا اس لیے ہم نے بھی بڑا ہاتھ مارنے کے لیے پتن میاں کے مشورے کے مطابق عورتوں کی خرید وفروخت کے کاروبار میں ہاتھ ڈالا اور شفقت راجا کو ایک نہیں دو نہیں پورے پانچ دانے فروخت کرڈالے مگر اس نے ہمیں پے منٹ صرف دو لڑکیوں کی کی، باقی تین کی پے منٹ اس پر واجب تھی کہ آج ہی پتن میاں اپنی پے منٹ لینے کے لیے شفقت راجا کے ہاں گیا تو بدقسمتی سے شفقت راجا کے دشمنوں کی بھینٹ وہ بھی چڑھ گیا۔''

''یہ تو واقعی بہت برا ہوا آپ کے ساتھ۔'' اول خیر نے متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ میں اس کی اداکاری سمجھ رہا تھا۔ اب چنی بائی کو کیا معلوم تھا کہ پتن میاں کو شفقت راجا کے دشمن نے نہیں بلکہ خود اس کے ایک کارندے نے اس کے پیٹ میں چاقو گھونپ کر ہلاک کیا تھا۔

''لیکن شفقت راجا تو اس طرح کا دھندا نہیں کرتا، وہ تو بس ہم سے اچھے اچھے نئے اور فریش دانوں کی فرمائش کرتا، منہ مانگے دام دیتا اور...''

''چھوڑیں اس بات کو میڈم جی!'' اول خیر نے اس کی بات کاٹ کر چالاکی سے کہا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں وہ لڑکیوں کا اچار تو نہیں ڈالتا ہوگا۔ ویسے وہ تم سے لڑکیاں خریدتا کیوں تھا، اپنی ذاتی عیاشی کے لیے یا...؟''

'ہاں! اپنی عیاشی کے لیے بھی اور دوسروں کی دل بستگی کے لیے بھی۔ جن میں بڑے بڑے عیاش افسران اور بیوروکریٹ بھی شامل ہوتے۔''

''خیر، ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میڈم جی! وہ لڑکیوں کا کیا کرتا ہوگا۔ آپ ہمارے بارے میں کیا کہتی ہیں؟ ہم تو پکے بیوپاری ہیں، اس ہاتھ مال لیتے ہیں، اس ہاتھ دام دیتے ہیں۔'' اول خیر نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلانے کے انداز میں باری باری آگے کیے۔ چنی بائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اول خیر اب وہاں سے جانے کی جتنی عجلت دکھانے کی اداکاری کررہا تھا چنی بائی اتنا ہی ہمیں روکنے پر مُصر تھی، یہی نہیں وہ ہمیں لے کر ایک نسبتاً بہتر کمرے میں آگئی، یہاں ذرا ڈھنگ کا فرنیچر نظر آرہا تھا۔ اے سی بھی لگا ہوا تھا، فرش پر قالین اور سامنے پلنگ سا بچھا ہوا تھا۔ سامنے صوفے بچھے ہوئے تھے، عجیب طرح کی خوشبو سی پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ کے عقب میں ایک بڑی کھڑکی تھی اور دو چھوٹی کھڑکیاں صوفے والی دیوار پر جو کھلی پڑی تھیں اور ریشمی پردے لگے ہوئے تھے۔ میں نے وہاں سے کچھ لڑکیوں کو ہنستے کھلکھلاتے گزرتے دیکھا تھا۔

چنی بائی نے ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ پر بیٹھ گئی اور سرخ رنگ کے سنہری کڑھائی والے گاؤ تکیے سے پہلو ٹکادیا۔ دونوں مسٹنڈوں کو بھوؤں کے اشارے سے جانے کا اشارہ کیا، پھر کسی لڑکی کو پکارا۔

''چنبیلی... او چنبیلی اِدھر آ۔''

تھوڑی دیر بعد ایک دبلی پتلی نازک اندام لڑکی ہمارے سیدھے ہاتھ کے دروازے سے جھجک کے اندر داخل ہوئی، اس کا رنگ سانولا مگر چہرے کے نقوش پُرکشش تھے۔ نیلے رنگ کے چست کُرتے اور چوڑی دار سرخ پاجامے میں وہ اسمارٹ لگ رہی تھی۔ لمبی سی چٹیا اس کی تھرکتی بل کھاتی کمر پر ناگ کی طرح لہرا رہی تھی۔

''یہ ہمارے مہمان ہیں، لاہور سے آئے ہیں۔ کچھ ٹھنڈا شنڈا لے آ ان کے لیے۔'' چنی بائی نے چنبیلی نام کی اس لڑکی سے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ چنبیلی نے ایک ادائے دل رُبا کے ساتھ ہماری طرف دیکھا اور پھر مجھ پر نگاہ ڈال کر معنی خیز انداز میں مسکرائی اور اسی طرح تھرکتی ہوئی چلی گئی۔

''بڑی شوخ لڑکی ہے۔ میں نے ہی اسے پالا ہے۔'' چنی بائی نے چنبیلی کے بارے میں مختصراً بتایا۔

''کم عمر بھی ہے۔'' اول خیر نے ایک آنکھ میچ کر بازاری پن سے کہا۔

''تم بتا رہے تھے کہ... شفقت راجا نے لڑکیوں کو کہیں رکھا ہوا ہے، اب تم انہیں کیسے چھڑا کر لاؤ گے؟''

چنی بائی نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ ڈالی۔ وہ اول خیر سے ہی مخاطب تھی وہ جواباً بولا۔

''ہاں! پتا تو ہے۔ اپنے ڈیرے پر ہی انہیں رکھا ہوگا۔ پہلے تو اس کے آدمی سے بات کرنا پڑے گی، وہ کیا کہتا ہے۔ اب پتا نہیں وہ بھی مارا گیا ہے یا زندہ ہے۔''

'کیا اس کا باپ میرا مطلب ہے شفقت راجا کا باپ زبیر خان بھی درپردہ یہی دھندا کرتا ہے، یا...'' چنی بائی نے مستفسرانہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو اول خیر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں مگر اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا علم تو اسے ہوگا؟''

''پھر تمہیں پہلے زبیر خان سے ہی بات کرنی چاہیے۔'' چنی بائی نے اپنی طرف سے مشورہ دیا تو اول خیر نے وہ رد کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ان کے ڈیرے پہ جاؤں گا۔ اور کسی طرح کسی ایسے آدمی سے بات کرنے کی کوشش کروں گا جو ہمارے کام آسکے، میرا خیال ہے کہ یہ کام آسان ہے، میرا مطلب ہے اپنے دانے واپس لینا اب کوئی مسئلہ نہیں۔ شفقت راجا کی موت کے بعد لڑکیاں ان لوگوں کے لیے بیکار ہوگئی ہوں گی۔''

مجھے بے چینی سی لگی ہوئی تھی، معلوم نہیں اول خیر کون سی چال چل رہا تھا، اور چنی بائی کو کس مقصد کی خاطر الجھائے ہوئے تھا، اس کا ڈراما کچھ سمجھ میں بھی آرہا تھا مگر چاہتا تھا کہ اب وہ جلد از جلد مطلب کی بات پر آجائے، تاکہ یہ اونٹ... جو ملتان سے چلا تھا کسی کروٹ بیٹھ جائے، اپنے سیل فون پر ہماری خطرناک فوٹیج بنانے والی لڑکی الگ میرے ذہن پر کسی آسیب کی طرح سوار تھی۔

''آپ کے کتنے دانے چھڑانے ہیں؟ آپ اس کی قیمت لگاؤ، ہم ویسے ہی مال لے جائیں گے، آپ کو قیمت ادا کرکے۔''

بالآخر اول خیر جس مقصد کے لیے اب تک گراؤنڈ بنا رہا تھا اس پر آگیا۔ اس کی بات پر چنی بائی یقیناً اندر سے خوشی کے مارے دہری ہوگئی کیونکہ اس کا اظہار اس کے پھٹکار برساتے عمر رسیدہ چہرے سے عیاں تھا۔

''پانچ لڑکیاں تھیں۔'' چنی بائی نے فوراً بتایا۔

''نام...؟'' اول خیر نے بظاہر بے پروا انداز میں پوچھا۔ جبکہ مجھے یقین تھا کہ میری طرح وہ بھی پہلے اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ ان میں اطفال گھر سے تعلق رکھنے والی وہ چار بدنصیب لڑکیاں شامل تھیں یا نہیں۔

چنی بائی نے ان پانچ میں سے چار لڑکیوں کے نام جو بتائے تھے وہ ہمارے لیے اجنبی تھے۔ ان کے بارے میں بہ قول چنی بائی کہ وہ اس کے کوٹھے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جبکہ پانچویں لڑکی کا نام اس نے شکیلہ بتایا تھا۔ اس نام پر میں چونک اٹھا۔ اول خیر نے جب شکیلہ کے سلسلے میں کچھ کرید کی تو چنی بائی نے ماتھے پر ہتھیلی مار کر کہا۔

''میں تو بہت پچھتائی تھی اس لڑکی کو لے کر... بڑی ہٹیلی لڑکی تھی، پُٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دیتی تھی، میں نے بھی غصے میں اسے آگے کردیا۔''

میں نے شکیلہ کا ناک نقشہ پوچھا تو چنی بائی نے بالکل ویسا ہی اس کا حلیہ بتایا جو اطفال گھر کے پرانے ساتھی، شوکت حسین عرف شوکے کی ساتھی شکیلہ کا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوگئے، مگر یہ سن کر تشویش بھی ہوئی کہ وہ بے چاری شریف زادی کہاں سے کہاں پہنچادی گئی تھی، اب باقی ثریا سمیت اطفال گھر کی باقی تین لڑکیوں کی تلاش کا سوال تھا۔ اول خیر نے بڑی چالاکی سے ان کے بارے میں بھی چنی بائی سے اگلوالیا۔ وہ تینوں بدنصیب ادھر ہی موجود تھیں۔ مگر میں نے چنی بائی کے چہرے سے اندازہ لگایا وہ کچھ چونک سی اٹھی تھی۔ اسی اثنا میں چنبیلی ہاتھوں میں ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی، اور درمیان میں بچھی میز پر وہ ٹرے رکھ دی، اس میں دو شیشے کے گلاس رکھے ہوئے تھے، بڑی ادا سے اس نے وہ باری باری ہماری طرف بڑھائے۔ اس کے بعد ہنستی مسکراتی چلی گئی۔

''چنی بائی! صاف اور سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں پیشہ ور لڑکیوں کی ضرورت نہیں ہے، وہ تو ہمیں لاہور میں بھی مل سکتی تھیں، آپ سمجھ رہی ہیں ناں، میری بات کا مطلب؟''

اول خیر اب پوری طرح مقصد کی بات پر آگیا اور غیر محسوس انداز میں چنی بائی سے نظر بچا کر میرا ہاتھ بھی ہولے سے دبایا ہے، یکبارگی میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ بلاشبہ یہ اشارہ تھا کہ اب اصل عملی کارروائی کا وقت آن پہنچا اور کسی بھی لمحے کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ چنی بائی اچانک بدک بھی سکتی تھی۔ لیکن یہاں اول خیر کا پہلے سے بنایا ہوا ''گراؤنڈ'' کام آگیا۔ چنی بائی بھی معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔ ''ہاں ہاں کیوں نہیں، سمجھ رہی ہوں تمہاری بات کا مطلب، لیکن اس کے دام زیادہ ہوں گے۔''

''دام کی طرف سے تم بے غم ہوجاؤ میڈم جی'' اول خیر نے گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''ذرا دیدار شیدار تو کرا دو۔''

چنی بائی پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکل گئی، وہ شاید ان تینوں کو لینے گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرسراتی سرگوشی کی۔

''کاکے اب ہوشیار۔ وہ جیسے ہی لڑکیاں لائے گی، تو نے چنی بائی کو قابو کرنا ہوگا، گلا دبانے کی بھی ضرورت پڑے تو دبا دینا گلا سالی کا۔''

''ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔'' میں نے تسلی دی۔ میرا

پستول میری جیب میں موجود تھا، میں نے اسے تھپک کر موجودگی کی تسلی بھی کی، اچانک کمرے میں تین چار غنڈے مسٹنڈے آن وارد ہوئے، ان میں پہلے والے دو بدمعاش صورت بھی شامل تھے، دو کے ہاتھ میں ریوالور اور دو بدمعاشوں نے لمبے پھل والے چھرے پکڑے ہوئے تھے، نجانے کہاں ہم سے غلطی ہوگئی تھی اور کب ہماری ذرا سی جلد بازی نے کھیل بگاڑ کر چنی بائی کو شبے میں مبتلا کردیا کہ اس حرافہ نے لڑکیوں کو یہاں لانے کے بہانے اپنے مسلح ہرکارے بھیج دیے۔

سنسنی اور خوف کی تیز لہر میرے وجود میں اتر گئی اور حلق میں سانس سی اٹکنے لگی۔ اول خیر بھی اس صورتِ حال سے لمحہ بھر کو تشویش زدہ سا ہوا پھر ان چاروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اوخیر... کیا کوئی غلطی ہوگئی ہے ہم سے؟''

''کون ہو تم؟ اور کس نے بھیجا ہے یہاں؟'' ایک گنجے سر والے بدمعاش نے اپنے ریوالور کی خوفناک نال ہمارے سامنے لہراتے ہوئے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''ہمیں کیا معلوم؟ اس سے پوچھ لو۔'' اول خیر نے اس طرح بے پروا انداز میں ان سے کہا۔ یہ بے شک چھٹے ہوئے بدمعاش سہی مگر خاص حالات میں ذرا سی بات کے الٹ پھیر کے جھانسے میں غیر ارادی طور پر آجانا عام بات تھی، وہ بھی اول خیر کے جھانسے میں آگئے۔ ذرا پیچھے گردن انہوں نے گھمائی ہی تھی کہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اول خیر کی دونوں ٹانگیں بیک وقت حرکت میں آئیں اور آگے والے دونوں اسلحہ بہ دست غنڈوں کے ہاتھ ریوالور سے خالی نظر آنے لگے۔ میری تو اور کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر موقع سے میں نے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے جو سمجھ میں آیا کر گزرا۔ اپنے سامنے پڑی میز اٹھا کر میں نے ان چاروں غنڈوں پر دے ماری، اول خیر نے جتنی پھرتی سے اپنی جیب سے پستول نکالا تھا، کم وبیش اسی پھرتی سے میرے ہاتھ میں بھی اپنا پستول آچکا تھا۔ پھر بیک وقت ہم دونوں کے پستولوں نے آتشیں قہقہے اگلے اور وہ چاروں قصائی صورت بدمعاش فرش پر تڑپنے لگے۔ میرے ہاتھوں یہ پہلا قتل تھا مگر مجھے اس کا چنداں افسوس نہ تھا۔ یہ لوگ اس انجام کے مستحق تھے۔ اندر متعدد لڑکیوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں ابھریں۔ میرے جسم کا رواں رواں اس وقت تھرتھرا رہا تھا۔ اول خیر کے وجود میں گویا بجلی دوڑنے لگی' وہ تیزی سے اس دروازے کی طرف بڑھا جس دروازے سے چنی بائی نکلی تھی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی، دو تین خواجہ سرا تالیاں پیٹتے ہوئے ہم سے ٹکرائے' چند لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگیں، ہم ہال کمرے میں تھے، اور دائیں بائیں محرابی برآمدے، کچھ طبلچی اور سازندے... کھڑے تھے اور آٹھ دس کے قریب تماش بین بدحواسی میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے، ایک کمرے کی طرف اول خیر نے عقابی نظریں جمائیں تو مجھے بھی وہاں چنی بائی کمرے کا دروازہ بند کرتی دکھائی دے گئی۔ اول خیر اور ہم ملک الموت بنے مذکورہ کمرے کے دروازے پر جا پہنچے اور... اول خیر نے ایک لات مار کر دروازہ توڑ ڈالا۔

چنی بائی سامنے کھڑی تھرتھر کانپ رہی تھی، اول خیر نے آگے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی اور چڑھی ہوئی آنکھوں سے غرا کر بولا۔ ''کھیل ختم میڈم جی! تم جان گئیں کہ ہم کون ہیں۔ ان تینوں لڑکیوں کو ہمارے حوالے کردو۔ ورنہ تمہارے سمیت کوٹھے کو آگ لگادیں گے' باہر ہمارے اور بھی ساتھی موجود ہیں۔'' چنی بائی نے ہکلاتے ہوئے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور ہم اس سمیت کمرے سے نکلے۔

برآمدے کے کونے والے کوٹری نما کمرے میں وہ ہم سمیت داخل ہوئی، اندر روشنی تھی میں نے ثریا سمیت تین لڑکیوں کو ڈرے سہمے انداز میں... کونے میں دیوار سے لگے پایا تو ثریا سمیت باقی دو لڑکیاں مجھے پہچان کر خوشی سے چلّائیں۔ میرا دل خوشی اور آنسوؤں سے بھر گیا۔

''اول خیر! کام ہوگیا۔ اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔'' میں نے جوش سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اور ثریا سمیت قیدی لڑکیوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمولیا۔ اول خیر نے چنی بائی کو دھکا دیا اور ہم باہر کی جانب لپکے۔

گلی میں بھی شور مچ گیا تھا۔ شکر تھا کہ کہیں کوئی قریب میں پولیس کی گشتی موبائل نہیں کھڑی تھی، ارشد گاڑی سمیت تیار تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی اس نے اسٹارٹ رکھی گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

ایک مشن کی کامیابی نے میرا دل خوشی سے بھر دیا تھا مگر دل میں شکیلہ کی طرف سے ابھی کسک باقی تھی۔ تینوں لڑکیاں عقبی سیٹوں پہ بیٹھی رونے لگیں، میں نے اسے دلاسا دیا۔ وہ میری اطفال گھر کی بچپن کی ساتھی تھیں۔ میں نے ثریا سے شکیلہ کے بارے میں بھی پوچھنا ضروری سمجھا تھا، اس نے بھی بہت سسکتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ... شکیلہ کو انہوں نے کسی اور کے حوالے کردیا تھا۔ میں نے ثریا کو تسلی دی... کہ... وہ اس سلسلے میں بے فکر رہے، ہم نے شکیلہ کا بھی کھوج لگالیا ہے۔ ثریا نے یہ انکشاف بھی کیا کہ شکیلہ اصل میں شوکت عرف شوکی کی سگی بہن ہے... یہ بات انہوں نے اطفال گھر میں سب سے چھپائی ہوئی تھی۔

راتوں رات ہمارا سفر جاری رہا اور ہمارا دماغ بھی سوچوں میں سفر کرتا رہا۔ پھر میں نے ہی اول خیر سے کہا۔

''اول خیر! تم اور ارشد... ان لڑکیوں کو لے کر ملتان پہنچو اور انہیں کسی دارالامان میں پہنچا دو اور مجھے کھلاں والی اتار دو۔''

کھلاں والی وہی علاقہ تھا جہاں شام والا خوں ریز واقع پیش آیا تھا۔

''اوخیر... کاکا... تجھے اکیلا کیسے چھوڑ دیں۔ دوبارہ ایسی بات مت کرنا۔'' اول خیر بولا، پھر وہ ارشد کو کچھ سمجھانے لگا۔ کھلاں والی کے ایک روڈ سائڈ چھپر ہوٹل میں ہمیں اتار کر ارشد تینوں لڑکیوں سمیت روانہ ہوگیا۔

اب ہم خطرے کے حوالے سے ایک ''ریڈ زون'' میں تھے، جہاں ایک بڑی سیاسی شخصیت کا جواں سال بیٹا اور ابھرتا ہوا سیاست داں... شفقت راجا کا بے رحمی سے قتل ہوچکا تھا، اس پر مستزاد وقوعے پر ہماری ویڈیو فلم بنانے والی وہ لڑکی... الگ ہمارے لیے خطرے کا الارم بنی ہوئی تھی۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی، یہ سرائے نما ہوٹل تھا جس کی اوپری منزل میں چھوٹے چھوٹے رہائشی کمرے بنے ہوئے تھے، اس کے وسیع کچے احاطے میں ایک مسافر لاری، ایک لگژری کوچ اور دو تین... وہیلر ٹرک کھڑے تھے، اردگرد چارپائیاں بچھی تھیں۔ لوگ انہی چارپائیوں پر بیٹھے چائے اور کھانا کھانے میں مصروف تھے، تمام روڈ سائڈ ہوٹل اسی وضع کے ہوتے ہیں۔ میز کرسیوں کی جگہ زیادہ تر چارپائیاں یا تختے دار پلنگ سجے ہوتے ہیں۔

اول خیر کو بھوک لگی ہوئی تھی، میری بھوک واجبی سی تھی، اول خیر نے کڑاہی گوشت کا آرڈر دیا۔ ہمارے سامنے ملتان روڈ تھا اور وہاں آنے جانے والی تیز رفتار گاڑیوں کی شائیں شائیں گونج رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد گرما گرم کھانا آگیا۔ کڑاہی اور گرما گرم کڑک تنوری روٹیاں دیکھ کر میری بھی بھوک چمک اٹھی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد میرے اور اول خیر کے درمیان ایک بحث سی چھڑ گئی۔ ہم دھیمی آواز میں باتیں کررہے تھے۔

میرے خیال کے مطابق شکیلہ کو چھڑانے کی مہم ایک آدمی کے کرنے کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ اسے تنہا سر کرلوں جبکہ اول خیر مجھے تنہا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرا خیال اس کا یہ تھا کہ میں واپس ملتان لوٹ جاؤں اور بیگم صاحبہ یا سرمد بابا کے ہاں چلا جاؤں اور وہ خود یہ مہم سر کرنے کی کوشش کرے گا، اول تو میں بھی اول خیر کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ شکیلہ اول خیر کو جانتی نہیں تھی، وہ صرف مجھے پہچانتی تھی، یوں بھی شکیلہ کے بغیر میں کیسے ملتان لوٹ سکتا تھا۔ شوکت حسین کو کیا منہ دکھاتا۔ اطفال گھر کی بھی کوئی خیر خبر نہ تھی کہ اب وہاں کے کیا حالات تھے۔ اس کا بھی پتا لگانا میرے اہم مقاصد میں شامل تھا۔ میں چاہتا تھا، جلدی یہ سارے مسائل حل ہوجائیں تا کہ بعد میں، میں اپنے باپ کو تلاش کرنے کی جستجو کروں لیکن پے در پے رونما ہونے والے حالات غیر محسوس طور پر مجھے جکڑتے جارہے تھے یہ مشکل کسی ایک مسئلے سے جان چھوٹتی تو اس کی باقیات میرے تعاقب میں ہوتیں۔

''کاکا! اب اس بحث کو چھوڑ!''

بالآخر اول خیر نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''ابھی میں ہوٹل کے مالک سے کمرا لینے کی بات کرکے آتا ہوں۔ رات یہاں گزار کے ہم صبح زبیر خان کے ڈیرے کا رخ کریں گے، ضروری ہوا تو اپنا حلیہ بھی بدل لیں گے۔'' اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اول خیر نے ایک کمرا رات بھر کے لیے کرائے پر لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے میں آگئے۔ دو چارپائیاں دائیں بائیں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں تھکے ہوئے تھے، لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح سب سے پہلے اول خیر کی آنکھ کھلی۔ اس نے مجھے بھی جگا دیا۔ وہ غسل وغیرہ کرکے تیار ہوچکا تھا۔ میں جب تک نہانے وغیرہ سے فارغ ہوا، اول خیر ناشتے کا آرڈر کرچکا تھا۔ ناشتا کرتے ہی ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔

قریبی دکان سے ہم نے دو چادر نما بڑے رومال خریدے، یہ ایسے ہی رومال تھے جو عام طور پر لوگ تیز دھوپ کی تپش وغیرہ سے بچنے کے لیے سر اور چہرے کو ڈھانپتے ہیں۔ یہ سر اور چہرے کے گرد لپیٹ کر ہم ایک تانگے کی طرف بڑھے تو اچانک میرے دل میں ایک خیال آیا۔

''اول خیر' آؤ ذرا ٹی وی دیکھ لیں۔'' وہ میری بات کا مطلب سمجھ گیا۔ یہاں تقریباً ہر ہوٹل میں ٹی وی کا عام

رواج تھا، بعض ہوٹلوں میں تو باقاعدہ وی سی ڈی لگا کر فلمیں اور گانے بھی چلائے جاتے تھے، مگر اس وقت ٹی وی پر خبریں نشر ہو رہی تھیں، اور لوگوں کی خاصی تعداد میں نے ٹی وی کے آگے بیٹھے دیکھی۔ میرا دل یکبارگی کسی خیال کے باعث تیزی سے دھڑکا۔ ہم بھی آگے ہو کر ٹی وی دیکھنے لگے۔ علاقائی چینل پر ابھی تک زبیر خان کے بیٹے شفقت راجا کے خوں ریز قتل کی خبریں، فوٹیج وغیرہ دکھائی جا رہی تھی۔ نیچے اس خبر سے متعلق پٹی (سلائیڈنگ نیوز بیلٹ) بھی چل رہی تھی، میرا پورا وجود اس وقت آنکھ بنا ہوا ٹی وی پر مرکوز تھ جہاں خبر نشر ہو رہی تھی۔ کچھ صحافی بھی جائے وقوع پر موجود میزبان نیوز کاسٹر کے سوالوں کا جواب دے رہے تھے، شفقت راجا کی تجہیز و تکفین کے مناظر، اس کے باپ زبیر خان سے بات چیت اس طرح کی فوٹیج اور تبصرے وغیرہ نظر آ رہے تھے، میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا، میری دھڑکتی ہوئی پُرتشویش نظروں کے سامنے ابھی تک وہ فوٹیج یا ایسی خبر نہیں آئی تھی... جس میں بتایا جا رہا ہو کہ...

“ہمارے چینل کو موقع واردات کی فوٹیج مل گئی ہیں۔ جن میں راجا کے قاتلوں کو اس کی بیٹھک سے فرار ہوتے ہوئے دکھایا جا رہا ہے وغیرہ۔”

بلاشبہ اگر ایسی کوئی بریکنگ نیوز آ جاتی تو وہ یقیناً میرے اور اول خان کے لیے ایٹم بم پھٹنے سے کم نہ ہوتی مگر شکر تھا کہ ابھی ایسی کوئی بریکنگ نیوز نشر نہیں ہوئی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا اور ہلکی آواز میں بولا۔

“نکل چلو... ابھی تک خیر ہی ہے۔” ہجوم میں آگے بڑھنے لگا تو یکدم اول خیر نے مجھے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ میں نے قدرے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی یک ٹک سی نظریں ہنوز ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں، مجھے حیرت سی ہوئی اور میں نے بھی اس وقت ٹی وی کی طرف دیکھا۔ اور پھر جیسے مجھے اردگرد کا ہوش ہی نہ رہا۔ کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ پورے وجود میں سنسنی پھیل گئی۔

جس خبر کے نہ آنے کی میں دعا مانگ رہا تھا، اب وہی خبر ایک فوٹیج سمیت بار بار بریکنگ نیوز کے طور پر دکھائی جا رہی تھی۔

“معروف سیاسی رہنما... زبیر خان کے بیٹے... شفقت راجا کے قاتلوں کی ویڈیو کلپ آشکارا ہو گئی۔ اس کلپس میں آپ تین مسلح قاتلوں کے چہرے دیکھ رہے ہیں۔”

ایک میزبان نیوز ریڈر اور اینکر پرسن گویا چلّا چلّا کر .... بار بار یہی دہرائے جا رہا تھا۔ “دو چہرے غیر واضح سے ہیں مگر ایک خونی قاتل کا چہرہ آپ صاف طور پر دیکھ پا رہے ہیں۔”

میری دھڑکتی نظریں سب دیکھ رہی تھیں، ویڈیو کلپ بالکل ویسا ہی تھا۔ ہم تینوں شفقت راجا کی بیٹھک سے نکل رہے ہیں۔ اول خیر اور ارشد کے چہروں کے سائڈ پوز تھے جو گاڑی میں سوار ہو رہے تھے، مگر میرا چہرہ بالکل واضح تھا، چینل نے میرا ہی چہرہ... پوری ٹی وی اسکرین پر واضح کر رکھا تھا، اس پر “ریڈ سرکل” بھی بار بار بلنک کر رہا تھا... مزید تفصیل بتائی جانے لگی... اسے سن کر میری تشویش زدہ آنکھیں مزید پھٹ گئیں۔

جس لڑکی نے موقع واردات کے عین وقت پر یہ فوٹیج اپنے سیل فون پر محفوظ کی تھی، وہ درحقیقت... شفقت راجا کی منگیتر خولہ تھی۔ ملتان کے بڑے زمیندار چوہدری الف خان کی اکلوتی بیٹی اور ممتاز خان کی بہن تھی، ٹی وی پر انہیں بھی دکھایا جا رہا تھا۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ کو بھی کلوز اپ کر کے فوکس کیا گیا تھا۔ اور یہ ویڈیو کلپ بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

دفعتاً میرے ہاتھ پر کسی کا دباؤ پڑا، اول خیر تھا... جو میرا ایک ہاتھ دبوچ کر وہاں سے کھینچ کے دوسری طرف لے گیا۔

“او... کاکا! خیر نہیں ہے۔ بات دشمنوں کے دشمن تک چلی گئی ہے، جو پہلے ہی ہم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ بہت برا ہو گیا... ٹھہر ایک منٹ، میں پہلے استاد کیبل دادا سے بات کر لوں...” اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کے بعد فوراً اپنا سیل فون نکالا۔ کیبل دادا سے ساری بات تفصیل سے کہہ ڈالی۔ دوسری طرف سے کیبل دادا نے اس سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر بات منقطع کر لی۔

صورتِ حالات یکدم ہی ہمارے لیے بلکہ .... میرے لیے مخدوش ترین حد تک خطرناک ہو گئی تھی۔ میں گم صم سا ہو گیا تھا، مگر مجھے خود سے زیادہ اپنے دوست کی بہن شکیلہ کی فکر ہو رہی تھی، جبکہ موجودہ حالات بتا رہے تھے کہ اگر میں کھلاں والی کا رخ کرتا تو یہ بات آ بیل مجھے مار... والی مثال بن جاتی، اس لڑکی خولہ نے اس بات کی تصدیق کیے بغیر کہ اس کے منگیتر شفقت راجا کے قاتل ہم نہیں بلکہ کوئی اور تھے، ان کے بہیمانہ جرم کا سارا ملبا ہمارے بلکہ میرے سر

ڈال دیا ہے۔ اور پھر خولہ بھی کوئی معمولی لڑکی نہ تھی۔ یہ چوہدری الف خان کی بیٹی اور ممتاز خان کی لاڈلی بہن تھی، زبیر خان کا خاندان ہمارے دشمنوں کا سمدھیانہ تھا۔ جو پہلے ہی ہم پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ یہ صورتِ حالات بالخصوص میرے لیے خطرناک تھی، اول خیر نے بتایا تھا مجھے کہ کیبل دادا کو بھی اس بات پر ازحد تشویش ہوئی ہے، اور اس نے کہا ہے کہ وہ ابھی چند منٹوں میں “بیگم صاحبہ” (مختاری بیگم) سے سارے معاملات پر مشورہ کر کے اسے فون کرے گا۔

چند منٹوں بعد کیبل دادا نے اول خیر سے رابطہ کیا اور اس سے صرف اتنا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا کہ جتنی جلدی ہو سکے ہم کسی مسافر لاری یا کسی تیز رفتار نان اسٹاپ لگژری مسافر کوچ میں بیٹھ کر ملتان کی راہ لیں اور کسی نئی مہم پر جانے کا سوچیں ہی نہیں، وغیرہ جبکہ میرا ارادہ کچھ اور تھا۔ اب جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا۔ میں اپنی مہم کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، جبکہ اول خیر نے میری بات مانی نہیں تھی، سردست میں نے چپ سادھ لی تھی مگر میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

ہم سڑک کے کنارے آ گئے، پہلی بات یہ تھی کہ... میں اب اول خیر سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ مجھے گم صم پا کر اول خیر جانے کیا سمجھا۔ مجھ سے تشفی آمیز انداز میں بولا۔ “پریشان نہیں ہونا کاکا... بیگم صاحبہ معمولی ہستی نہیں ہیں، وہ سب سنبھال لیں گی۔”

“یہ بات نہیں ہے اول خیر...” میں نے گم صم سے مگر واضح لہجے میں کہا۔

“تو پھر...؟” وہ یکدم چونک کر میرا منہ تکنے لگا جیسے میرے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو۔

“میں کہیں نہیں جا رہا ہوں، مگر تم واپس لوٹ جاؤ... مجھے ہر صورت کھلاں والی جانا ہے۔” میرے اٹل اور مضبوط ب و لہجے نے اول خیر کو حیرت آمیز پریشانی میں مبتلا کردیا۔

“او خیر کا کا... اب یہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ تیرا دماغ تو ٹھیک ہے؟ جانتے بوجھتے ہوئے بھی تو شیروں کی کچھار کا رخ کرے گا۔ نہیں، میں تجھے اس طرح دیدہ و دانستہ جلتی آگ میں نہیں کودنے دوں گا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ میں بیگم صاحبہ کو کیا جواب دوں گا؟”

“اول خیر... تیرا یا تیری بیگم صاحبہ کا مجھ پر کوئی حق نہیں بنتا۔ وہ مجھ پر کسی قسم کا حق نہیں جتا سکتیں۔” میں نے یکدم بدلے ہوئے لہجے میں کہا تو اول خیر کھلے منہ کے ساتھ میرا چہرہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

“او خیر... کاکا... بڑی بات کر دی تو نے اپنے یار کے ساتھ... کیا سمجھتا ہے تو اول خیر کو...؟ میں... وہ اگر بیگم صاحب کا کارندہ ہے تو تیرا جگری دوست بھی تو ہے۔ آگ دی باؤلی وچ میں تجھے ایسے ہی کلا جانے دوں گا؟ ہرگز نہیں۔ میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ کدھر جانا ہے تجھے؟” وہ ایسی باتیں کر کے مجھے لاجواب کر دیا کرتا تھا۔ مگر اس بار معاملہ اور تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے اول خیر اپنے لوگوں کے زیرِ عتاب آئے... میں نے اس حوالے کے ساتھ اس سے بات کی۔

“اول خیر! اس بار بات اور ہے۔ بیگم صاحبہ کا تیرے لیے یہی حکم ہے کہ واپس لوٹ جاؤ۔”

“نہیں کاکا! کیبل دادا نے بیگم صاحبہ کا سختی کے ساتھ یہ حکم دہرایا تھا کہ... میں تمہیں بہت حفاظت کے ساتھ لے کر واپس ملتان پہنچوں بلکہ تمہیں بہ حفاظت ملتان لانے کے لیے انہوں نے کیبل دادا کو بھی ایک کار میں روانہ کر دیا ہے۔ یہ میرے لیے بہت حیرت کی بات ہے۔ کیونکہ آج تک بیگم صاحبہ نے کیبل دادا کو ایسے کسی کام کے لیے “بیگم ولا” سے باہر نہیں نکالا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ کی نگاہوں میں تمہاری کتنی اہمیت ہے۔ اس بات پر یقیناً کیبل دادا کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ لیکن بہرحال... اب کیا کہتے ہو؟” اول خیر نے کہا... ” بیگم صاحبہ کا میری ذات میں غیر معمولی دلچسپی لینا خود میرے لیے باعثِ حیرت ہی نہیں اب باعث الجھن بھی محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سب الف خان والے معاملے کی وجہ سے تھا یا پھر کوئی اور وجہ... میرے پاس اب ان سب باتوں کے سوچنے کا وقت نہ تھا۔ اور صرف ایک بار میں نے میں اول خیر سے بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا، مگر وہ ٹال گیا تھا۔

میں نے اول خیر سے گہری متانت سے کہا۔ “تم کیبل دادا سے رابطہ کر کے اسے بتا دو کہ ابھی ہماری مہم نامکمل ہے، جب تک میں اپنے دوست کی بہن کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔”

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر کے سیل فون کی بیل بجی۔

’’کیبل دادا کا فون آرہا ہے۔ کیا جواب دوں اسے، وہ روانہ ہوچکا ہوگا، ہم سے ہماری پوزیشن پوچھے گا۔‘‘ اول خیر نے اپنے سیل فون کی اسکرین پر کیبل دادا کا نمبر پہچانتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے سردمہری سے کہا۔

’’اسے وہی بتادو، جو میں تمہیں بتاچکا...‘‘

اول خیر نے کیبل دادا کی کال ریسیو کرکے بالآخر اسے میرے عزائم سے آگاہ کردیا۔

ہم سڑک کے کنارے بظاہر بس کے انتظار میں کھڑے تھے... ملتان کی اس ڈبل روڈ پر کافی ہیوی ٹریفک رواں تھی۔

’’لو کاکا! تم سے بات کرنا چاہ رہا ہے، دادا۔‘‘ اول خیر نے چند سیکنڈ بعد اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے ایک نظر اول خیر پر ڈالی اور سیل اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگالیا۔

’’ہیلو۔‘‘

’’شہزی! یہ تم کیا بے وقوفی کرنے جارہے ہو۔‘‘ میرے ہیلو کہتے ہی آواز پہچان کر دوسری طرف سے کیبل دادا کی آواز ابھری۔

’’کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تم کس خطرناک سازش کا شکار ہوچکے ہو۔ تم اپنے ساتھ... اول خیر کو بھی مرواؤگے اور ہمارے لیے بھی مصیبت کھڑی کردوگے، ابھی تمہارا مقدمہ بھی ملتان کی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔‘‘

’’کیبل دادا!‘‘ میں نے گہری متانت سے کہا۔ ’’تمہارا آدمی اول خیر میری طرف سے آزاد ہے۔ میں نے اسے نہیں روکا ہے، باقی میرا جواب وہی ہے جو اول خیر تھوڑی دیر پہلے تمہیں بتاچکا ہے۔‘‘

’’تم کیا پاگل ہوگئے ہو؟‘‘ دوسری طرف کیبل دادا کی چلّاتی ہوئی آواز ابھری۔ ’’یہ بیگم صاحبہ کا حکم ہے، سمجھے تم۔‘‘

’’میں کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوں کیبل دادا۔ اور ذرا اپنی آواز دھیمی رکھو۔‘‘ میں نے سردمہری سے کہا اور سیل اول خیر کی طرف بڑھادیا۔ اول خیر نے سیل لے کر اپنے کان سے لگایا پھر ہٹالیا۔ شاید دوسری طرف سے کیبل دادا نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

اول خیر نے ایک گہری سانس لے کر مجھ سے کہا۔

’’کاکا! ذرا ایک بار پھر سوچ لے... تجھے کیا کرنا ہے۔‘‘

مجھے اول خیر کی یہ بات بری لگی، میں نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے رکھائی سے کہا۔ ’’اول خیر! میرا فیصلہ اٹل ہوتا ہے۔ اس میں دوبارہ سوچنے کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن میرا خیال ہے تمہیں سوچنا چاہیے دوبارہ۔ تمہیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔‘‘

پھر وہی غیروں والی گل... اب تو بھی چپ رہ... جو جی چاہتا ہے کر... میں تیرے ساتھ...‘‘

معاً دوبارہ اس کے سیل فون کی بیل بجی، میں نے بیزاری سے کہا۔ ’’یار! اب اس کو آف کردو۔‘‘

’’او خیر...! یہ تو بیگم صاحبہ کا نمبر ہے... بُرے پھنسے۔‘‘ اول خیر نے اپنے سیل فون پر نمبر پہچانتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات عجیب ہوگئے تھے۔ میں خود بھی ذرا چونکا مگر دوسرے ہی لمحے میں بے پروائی سے سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

دھوپ خوب جم کر نکلی ہوئی تھی، پنجاب کی گرمی بڑی خشک اور چبھنے والی ہوتی ہے۔ حاجی رومال ہمارے سروں اور چہروں کو نصف حد تک ڈھانپے ہوئے تھے، گرم ہوا کے تھپیڑے چلنے لگے تھے، مگر ہم نے چہرے... ڈھانپ رکھے تھے۔

مجھے اول خیر کی انتہائی مودبانہ انداز میں آواز سنائی دی۔

’’جی بیگم صاحبہ! میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اچھا... اچھا... جی... جی۔ بالکل... بات کریں۔‘‘

’’یہ لے کاکا! بیگم صاحبہ تجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے سیل فون میری طرف بڑھادیا۔ میرے چہرے پہ سخت قسم کی بیزاری کے آثار تھے۔ میں نے سیل فون لے کر کان سے لگایا۔

’’جی بیگم صاحبہ! میرے یہ کہتے ہی دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی مترنم سی نرم آواز ابھری۔

’’شہزاد... مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دوں لیکن...‘‘ اس نے کچھ توقف کیا۔ میں خاموشی سے سن رہا تھا اس کی بات۔ دوبارہ اس کی آواز آئی ’’...... تمہاری حیثیت ہمارے کارکن کی نہیں، دوست کی سی ہے۔ اور اس ددستی کے ناتے ہی میں تم سے بات کررہی ہوں، اسے حکم نہیں سمجھنا...... جو کچھ تم کرنے جارہے ہو، بے شک یہ تمہارے سچے نیک عزم کی دلیل ہے مگر انسان کو اپنی حفاظت کے بارے میں بھی سوچنے کا حق ہے، اس ناتے میرا دوستانہ مشورہ ہے تمہارے لیے... کہ تم... ابھی واپس لوٹ آؤ، میرے آدمی یہ کام کردیں گے۔‘‘

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ اول خیر نے جب سیل فون مجھے تھمایا تھا تو اس نے دانستہ سیل فون کا... اسپیکر آن کردیا تھا۔ وہ ساری گفتگو جو بیگم صاحبہ نے مجھ سے کی تھی، وہ اس نے بھی سنی تھی۔

بیگم صاحبہ کی بات اور اندازِ مخاطب نے مجھے ازحد متاثر کیا تھا۔ ورنہ تو میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی کیبل دادا کی طرح میرے ساتھ تحکمانہ رویّہ اختیار کرے گی، لہٰذا میں نے نرمی اور احترام سے کہا۔

’’بیگم صاحبہ! آپ نے دوستوں والی بات کہہ کر میری بڑی عزت کی ہے، میں اس کے لیے آپ کا تہ دل سے مشکور ہوں، درحقیقت میری فطرت میں ... کسی کی غلامی یا کسی کا کارپرداز بننا شامل نہیں ہے۔ میں آزاد پیدا ہوا ہوں اور آزاد زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو... حاجی صاحب کے انتقال کے بعد اطفال گھر میں جس قسم کے حالات پیدا ہونے لگے تھے، میں ان کے خلاف بغاوتِ علم بلند نہ کرتا اور آج میں یوں دربدر ہونے کے بجائے... چوہدری ممتاز کے آلہ کار کی حیثیت سے بڑی عیاشانہ زندگی بسر کررہا ہوتا... رہی بات میرے مقصد کی، تو اس کو حاصل کرنے کا یہی وقت ہے، جو میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔‘‘

میری بات ختم ہوئی تو دوسری جانب لمحے بھر کو پھر سوچ میں ڈوبی خاموشی چھائی رہی پھر دفعتاً ہی مجھے دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی کچھ اس طرح کی بڑبڑاتی آواز سنائی دی جو شاید ان کے دل کی آواز تھی۔

’’بالکل ویسے ہی ہو... تم... ذرا بھی فرق نہیں، ویسے ہی خوددار، جی دار، اور دلیر... اپنے مقصد میں... اپنے عزائم میں پختہ اور سچے...‘‘

’’جی... جی... بیگم صاحبہ میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔‘‘ میں نے قدرے گڑبڑا کر کہا تو یکدم جیسے دوسری جانب سے بیگم صاحبہ نے خود کو سنبھالا ہو۔

’’...پپ... پتا نہیں... کچھ نہیں... کیا کہہ گئی میں... میرا مطلب تھا... تم ایک بہادر نوجوان ہو... اگر تم نے پختہ عزم کر ہی لیا ہے تو تھوڑا انتظار کرلو... میں اپنے آدمی کھلاں والی بھیج رہی ہوں تمہاری مدد کے لیے۔‘‘

’’نہیں بیگم صاحبہ! آپ کا شکریہ۔ آپ کا ایک آدمی اول خیر میرے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہی میرے لیے کافی ہے۔ زیادہ لوگوں کے شامل ہونے سے میرا مشن متاثر ہوسکتا ہے۔ آپ بھی میری کامیابی کے لیے دعا کریں۔ خدا حافظ!‘‘

بات ختم کرکے میں نے سیل فون دوبارہ اول خان کو تھمادیا۔ اس نے فوراً سیل فون میرے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگایا لیکن شاید دوسری طرف سے بیگم صاحبہ نے بھی رابطہ منقطع کردیا تھا۔ وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا... وہاں گمبھیر اور اسرار بھری سوچوں کے سناٹے پھیلے ہوئے تھے۔

یقیناً... میری طرح اول خان بھی سوچ میں پڑگیا تھا کہ آخر بیگم صاحبہ... کا میرے ساتھ... کیسا پُراسرار معاملہ تھا؟ وہ میرے ساتھ... باتیں کرتے ہوئے کچھ عجیب سی ہوجایا کرتی تھی۔

’’او خیر... شاید بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔‘‘ وہ خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا تو میں بدستور اس کی چہرے کی طرف تکتے ہوئے قدرے چونک بولا۔

’’کیا... کیا بات تمہیں سمجھ میں آرہی ہے، اول خیر؟‘‘

’’آں... ہاں... ک... کچھ نہیں۔‘‘ وہ جیسے خیالات کے بھنور سے ابھرا تو میں نے پوچھا۔

’’یار اول خیر... آخر یہ تمہاری بیگم صاحبہ ہے کیا شے؟ تم نے ابھی تک مجھے ان کے بارے میں نہیں بتایا کچھ...؟‘‘

’’بتادوں گا، بتادوں گا۔‘‘ وہ ٹالنے کے انداز میں بولا۔

’’دیکھ اول خیر... ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ بے شک مجھے تمہارے ماضی کے بارے میں علم نہیں، مگر میں نے آج تک اپنے بارے میں تم سے کچھ نہیں چھپایا... بس! میرے دل نے تمہیں سچا یار مان لیا سو مان لیا...‘‘

’’او خیر...‘‘ کہتے ہوئے اول خیر نے مسکرا کر میرا شانہ تھپتھپایا۔ ’’بے شک میرے یار!... تُو تو میرا جگری ہے شہزی کاکا! لہٰذا میں تجھ سے کیا چھپاؤں گا۔ میرا اپنا ماضی کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں... مگر بیگم صاحبہ کی تو پوچھتا ہے تو میں تجھے ضرور ایک دن بتاؤں گا ان کے بارے میں بھی

اور اب تو مجھے بتانا ہی پڑے گا... لیکن اس کے لیے ایک وقت چاہیے۔ پُرسکون اور لمبا وقت...''

میں مسکرا دیا اور بولا۔ ''چل چھوڑ پھر اس بات کو اب یہ بتا... کھلاں والی کے لیے تانگا لیا جائے؟''

''بالکل۔'' اس نے کہا اور پھر ہم ایک تانگے میں سوار ہو گئے۔

☆☆☆

کھلاں والی ملتان روڈ کی دوسری طرف تھا اور یہ وہی نیم پختہ سا راستہ تھا جو اس منحوس بیٹھک تک جاتا تھا، جہاں کل خوں ریزی ہوئی تھی، اول خیر نے ذرا آگے چل کر تانگے والے سے راستہ بدل کر دوسری طرف سے بازار کی طرف چلنے کو کہا۔

ہمیں دور سے ہی بیٹھک کی جانب لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا۔

کچھ دور جا کے ہم تانگے سے اتر گئے۔ ارد گرد کا جائزہ لیا۔ بازار بند پڑا تھا۔ دیگر چھوٹی موٹی دکانوں کا بھی یہی حال تھا۔ یقیناً ایسا سوگ کی وجہ سے تھا۔

بازار سے علاقے کی ویرانی دیکھ کر ہمیں اپنے پہچان لیے جانے کی تشویش ہونے لگی۔ بے شک اس وقت ہم آگ کے ایسے دریا میں کود پڑے تھے، جو ایک طرح سے ہماری ہی لگائی ہوئی تھی۔ چند مقامی لوگوں ہی کی آمد و رفت نظر آتی تھی۔ ہم آگے بڑھے اور پھر یونہی مٹرگشت کے انداز میں اِدھر اُدھر تھوڑی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ یہاں ہمیں کیا کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اول خیر اور میں تبادلہ خیال کر چکے تھے۔ مگر یہ درست تھا کہ اس سلسلے میں ہمارے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل نہ تھا، اور ہوتا بھی کیسے...؟ شفقت راجا ہی نہیں اس کے قریبی حواری بھی قتل ہو چکے تھے، جو لڑکیوں کے بارے میں جانتے تھے یا جنہوں نے ان معصوموں کا چنی بائی سے سودا وغیرہ کیا تھا۔ اب ہم کسے پکڑ کر پوچھتے۔ رہی بات شفقت راجا کے باپ زبیر خان کی، اس سے جا کر ہم نہیں پوچھ سکتے تھے کہ آپ کے فرزند ارجمند جواَب آنجہانی ہو چکے ہیں، اور شاید انہیں مظلوم ' بے گناہ اور شریف زادیوں کا سودا کرنے کے پاداش میں خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی تھی کہ اس نے شکیلہ کو کہاں قید میں رکھا ہوا ہے۔ پہلے تو وہ میری شکل پہچانتے ہی میری گردن ناپ لیتا اور بعد میں میرے سوال کا جواب دیتا بھی کہ نہیں۔

چنی بائی وغیرہ کے کہنے کے مطابق زبیر خان اس دھندے میں ملوث نہ تھا، ممکن ہے باپ کو بیٹے کے اور بیٹے کو باپ کے کرتوتوں کا علم نہ ہو۔ دفعتاً ایک آواز پر میں چونک گیا۔ وہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ مجھ سمیت اول خیر نے بھی بیک وقت مڑ کر دیکھا اور فوراً دکان کے ایک تھڑے کے قریب ہو گئے، وہ کار نئے ماڈل کی تھی۔ اس کی رفتار درمیانی تھی مگر بیچ بازار میں یہ بھی بہت تیز محسوس ہوئی تھی، میں نے فوراً کسی خطرے کے پیشِ نظر اپنے رومال کو درست کیا، کار ہمارے قریب سے گزر گئی، یہ نیلے رنگ کی ہنڈا سٹی تھی۔ اندر مجھے چند خرانٹ صورت بڑی بڑی مونچھوں والے افراد نظر آئے تھے۔ ان کے سینوں سے ذرا اوپر گنز جھانک رہی تھیں، یقیناً ان کا تعلق زبیر خان سے ہی ہو سکتا تھا وہ علاقے کی ایک بھاری بھرکم شخصیت تھی۔

کار تو گزر گئی مگر ہم ایک اور منظر دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئے۔ کار کے پیچھے اڑتے گرد و غبار سے کوئی حواس باختہ سایہ نمودار ہوا۔ یہ کوئی عمر رسیدہ عورت تھی جس کے بکھرے بال مٹی دھول سے اٹے پڑے تھے، حالت بھی اس کی ناگفتہ بہ تھی، میلے چیکٹ کپڑے۔ وہ گرتی پڑتی، پاگلوں کی طرح غالباً کار ہی کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہی تھی۔ کار تو اب نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی، اور اس پر میں نے اور اول خان نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ مگر اس ادھیڑ عمر عورت کی موجودگی ہمارے لیے باعثِ الجھن تھی۔ وہ ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی گر پڑی۔ وہ کپکپاتی آواز میں چلا رہی تھی۔ ''ظالمو... خدا کا تم پر قہر پڑے... میری معصوم جیراں... کو کھا گئے تم...'' اس کے ہاتھ میں پتھر بھی تھے، جو وہ پھینکتی جا رہی تھی، مگر کار تو پتھروں کی زد سے تو کیا نظروں کی زد سے بھی دور جا چکی تھی۔

''شاید بے چاری کوئی پاگل عورت ہے، آگے بڑھ کاکا!'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، مگر شاید اس نے اس عورت کی بات پر غور نہیں کیا تھا، جس نے مجھے اندر سے پہچان لیا تھا۔

دھوپ و گرمی اور تپتی ہوئی زمین پر یہ مصیبت اور غموں کی ماری عورت اب بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس میں اب اٹھنے کی تو کیا بولنے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی، نجانے کتنی دور سے وہ اس کار کے تعاقب میں دوڑی چلی آ رہی تھی اور اب بالآخر بے دم ہو کر گر پڑی تھی۔ میں ابھی اس کی طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک پکی عمر کے آدمی کو لنگی اور کرتے میں دوڑتے آتے دیکھا... وہ شاید اسی ادھیڑ عمر کی عورت کے تعاقب میں تھا۔ اس کی...

حالت بھی ایسی ہی تھی، جیسی کسی غریب کی ہو سکتی تھی۔ پریشانی اور دکھ سے اس کا چہرہ مُتا ہوا تھا۔ اس عورت کے قریب پہنچ کر وہ بھی نڈھال سا ہو کے اس کے قریب ہی گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور اسے سنبھالتے ہوئے سسکنے کے انداز میں بولا۔

''اری' جیراں کی ماں! ان ظالموں کے پیچھے ایسے نہ پڑا وہ تجھے بھی مار ڈالیں گے؟''

میں نے ان کے قریب پہنچنے میں دیر نہیں لگائی اور اس کمزور سے آدمی کو سہارا دینے لگا۔ وہ چونک کر گردن گھما کے میری طرف دیکھنے لگا۔

اول خیر کو میں نے اشارہ کیا۔ وہ عورت کو سنبھالنے لگا۔ پھر ہم دونوں کو سنبھالے ہوئے اس بند دکان کے چبوترے پر لے آئے جس پر چھپر کا سائبان ایستادہ تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر مجھے پانی ایسی کوئی شے کہیں بھی نظر نہ آئی، وہ بازار بند تھا۔ آدمی کو سہارا دے کر بٹھاتے ہوئے میں خود بھی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور بولا۔

''چاچا! کیا معاملہ ہے؟ یہ بے چاری دکھی عورت کون ہے؟'' میرے استفسار پر وہ بے چارہ بند دکان کی دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گیا اور جواباً بے حال سی آواز میں بولا۔

''کیا بتاؤں بیٹا! جہاں فرعون پیدا ہو جائے، وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔''

''یہ تمہاری گھر والی ہے؟''

''ہاں پتر...! یہ بدنصیب میری گھر والی ہے۔''

''یہ لوگ کون تھے، جن کی کار کے پیچھے...'' میرا سوال ادھورا رہ گیا، کیونکہ اس دوران بوڑھے نے ایک غمزدہ آہ... بھری تھی۔

''کیا پوچھتے ہو پتر! اور کیا تمہیں بتاؤں؟ پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا، وہ ہنوز بے حال تھی۔

''یہ زندہ تو ہے نا؟'' ایک مجبور سی آواز میں اس نے اول خیر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس عورت کو اس نے ہی سہارا دے رکھا تھا۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، دفعتاً ایک گدھا گاڑی آتی دکھائی دی۔ ایک نوعمر لڑکا گدھے کی باگیں تھامے ہوئے تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ اس نے گدھے کی رسی کھینچ لی۔ میں چبوترے سے اتر کر اس کی طرف بڑھا۔

''سواری لے کر چلنا ہے۔'' میں اس سے پوچھا۔

اس نے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں پلٹا اور بوڑھے سے بولا۔

''چاچا! تمہارا گھر کہاں ہے، چلو تمہیں ہم چھوڑ دیں تمہارے گھر۔'' وہ بوڑھا کھڑا ہوا۔ اول خیر نے اس کی عمر رسیدہ بیوی کو سہارا دے کر اٹھایا۔ بوڑھے نے گدھا گاڑی والے کو کچھ بتایا۔ لڑکے نے سر کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ پھر ہم بھی ان دونوں کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اول خیر نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ اب تک شاید وہ سمجھ چکا تھا جو میں چاہ رہا تھا۔

گدھا گاڑی کے سفر کے دوران میں گرد و پیش پر بھی نظر ڈالتا رہا۔ بازار ختم ہونے کے بعد کچے پکے اوپلے تھپے گارے مٹی کی دیواروں والے گھروں کا سلسلہ شروع ہوا، پھر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگے، آگے ایک خشک برساتی تالاب تھا، اس کے اندر سے گدھا گاڑی گزری، وہ دوسری جانب ابھری تو ایک سوکھے درخت کے نیچے سرکنڈوں کا جھونپڑی نما گھر دکھائی دیا۔ بوڑھے نے اسی جگہ لڑکے کو گدھا گاڑی روکنے کا کہا۔ ہم نیچے اترے، پھر میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ اشارہ بھانپ کر فوراً اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹے بڑے نوٹ تھے، میں نے چند نوٹ لیے اور پچاس کے نوٹ لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تمہارا کرایہ ہے۔ اگر تم میرا ایک کام اور کرو تو زیادہ بھی ملیں گے؟''

ظاہر ہے کرایہ لڑکے کی سوچ سے زیادہ تھا۔ پچاس کے نوٹ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی، جھٹ سے وہ لے کر بولا۔ ''کہو جی... اور کیا کام ہے؟''

''کہیں سے ٹھنڈا پانی اور کچھ کھانے کا سامان لے آؤ تو۔''

''ابھی حاضر کرتا ہوں جی، آپ فکر نہ کرو۔''

''مگر بازار تو سارا بند ہے، تم کہاں سے لاؤ گے؟''

''اُدھر جی' روڈ پر اسٹور کھلے ہیں۔ وہاں سے لے آؤں گا، اپنا ہی اسٹور ہے۔'' وہ بولا۔

''شاباش! جلدی سے ٹھنڈے پانی کی تین چار بوتلیں اور کیک بسکٹ لے آؤ، بعد میں پیسے دیتا ہوں، تمہاری خرچی الگ سے ہو گی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ اس نے اپنا اسٹور کہا تھا، میں سمجھ گیا تھا، اس کے جاننے والے کا ہو گا۔ اس لیے اسے پہلے پیسے نہیں تھمائے، وہ بھی خوش تھا۔ فوراً اپنا گدھا روڈ کی طرف دوڑا دیا۔

میں حیران پریشان کھڑے بوڑھے کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’چاچا! میں نے تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں منگوائی ہیں۔ کیا تم ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اندر اپنے گھر میں آنے دو گے؟‘‘

’’کیوں نہیں پتر! آؤ آؤ...‘‘ وہ بولا۔ پھر ہم ٹاٹ جھولتے دوازے سے اندر داخل ہو گئے۔

وہاں بجلی کا کوئی دخل نہ تھا۔ بڑی کسمپرسی کا عالم تھا۔ البتہ اندر کا ماحول نسبتاً ٹھنڈا تھا۔ ایسا شاید کچی اور چھپر دار دیواروں کی وجہ سے تھا۔ جس کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ دو چھلنگا سی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ پاگل سی عورت کو ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ جبکہ بوڑھا دوسری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اول خیر نے بیٹھنے کے لیے دوسری چارپائی کی پٹی سنبھال لی جبکہ میں بوڑھے کے ساتھ پائنتی کے قریب بیٹھ گیا۔

’’تم دونوں کون ہو؟ اس پنڈ کے تو نہیں لگتے۔‘‘ بوڑھا ہم دونوں کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ہم نے رومال ہٹا دیے تھے اور اپنا پسینا پونچھنے لگے۔ بوڑھا کب ٹی وی دیکھتا ہوگا، جو میرا چہرہ پہچانتا... خیر میں نے جواباً کہا۔

’’آپ نے ٹھیک کہا چاچا! ہم دونوں اوکاڑہ سے آئے تھے یہاں ایک دوست سے ملنے، وہ نہ ملا، اب واپس جا رہے تھے۔ پھر سنا کہ یہاں کوئی واردات شاردات ہو گئی ہے اس لیے بازار بند تھا سارا!‘‘

’’آہو پتر۔‘‘ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’سیر کو سوا سیر پڑ ہی جاتا ہے، پتر!‘‘ وہ جیسے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔ ’’ظلم کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ خدا کی بے آواز لاٹھی بھی حرکت میں آتی ہے۔ اب مرنے والے کے لیے کیا کہا جائے مگر زبیر خان کے پترے (بیٹے) نے بھی پنڈ والوں پہ کم ظلم نہیں ڈھائے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی بگڑا ہوا، کم تو اس کا باپ بھی نہیں مگر وہ ذرا سیاست سے چلتا ہے۔ لیکن پترے کی تو بات ہی اور تھی۔ شفقت راجا نے پنڈ کے شرفا اور غربا کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔‘‘

’’مگر ابھی ہونے والے الیکشن میں تو دونوں باپ بیٹا جیت چکے ہیں۔‘‘ اول خیر نے پہلی بار لب کشائی کی۔ ’’یہ لوگ اتنے ہی ظالم ہیں تو... پھر بار بار ایک ظالم کو ووٹ دے کر کامیاب کیوں کرتے ہو؟‘‘

بوڑھے نے اول خیر کی طرف دیکھا پھر تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ’’تو نے بھی خوب کہی پتر! ایسے تیرا ناں (نام کیا ہے)؟‘‘

میں نے اول خیر کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔ اس نے اشارہ سمجھ کر اپنا غلط نام بتایا۔

’’او دیکھ پتر! لگتا ہے تو نے بہت عرصہ شہر میں گزارہ ہے۔ پنڈ دیہات کا تمہیں تجربہ نہیں، یہ جو دولت، جاگیر اور اثر و رسوخ ہوتا ہے ناں یہ کسی کو یا تو فرعون بنا دیتا ہے یا پھر خدا! یہ ساری جاگیر... زبیر خان کی ہے۔ وہ بادشاہ ہے اور ہم اس کی رعایا۔ وہ غلط بھی ہوگا تو سچا ہوگا۔ کسی کو جرأت نہیں ہے کہ اس کے خلاف آنکھ اٹھانا تو دور کی بات ہے، سرگوشی میں بھی کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں بولتا۔ کچھ لوگوں نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تھی، ان کا انجام ہم سب پنڈ والوں نے دیکھ لیا تھا۔ اب تو بس ہر کوئی ان کے آگے سے سر جھکائے اور ہاتھ باندھے ہی گزرتا ہے۔ اور پھر یہ شفقت راجا... توبہ توبہ باپ سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ اس نے تو لوگوں کی عزتوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کر دیا تھا... میری جیراں بھی...‘‘

وہ یکدم روہانسا ہو گیا اور آواز میں رقت اتر آئی۔ جیراں شاید اس کی بیٹی تھی پھر بھی میں نے پوچھا۔

’’چاچا! یہ جیراں کیا تمہاری بیٹی تھی؟‘‘

’’ھک ہی کڑی سی میری... ہیریاں والی۔‘‘ (ایک ہی بیٹی تھی میری ہیرے جیسی) اس بار وہ پاگل سی عورت سسک کر یکدم بولی۔

’’پھر اس فرعون شفقت راجا نے اسے اٹھوا لیا... دو دن گزرے۔ اس غیرتاں والی کڑی نے اپنی نس کاٹ کر جان دے دی۔ مسجد کے پاس والی کچی باؤلی کے پاس اس کی لاش ملی تھی۔‘‘ وہ عورت رو رو کر بتانے لگی۔ ’’جس دن میں نے وڈے سائیں کے پتر نہیں... فرعون دے پتر شفقت راجا کے قتل کی خبر سنی تو میرا کلیجا ٹھنڈا ہو گیا۔ میں تو آج بھی اپنی جھولی اٹھا کر ان کو بددعا دیتی ہوں۔ گریب کی آہ... عرش کو ہلا دیتی ہے۔‘‘

’’چل چل... ھن بس کر جیراں دی ماں!‘‘ بوڑھا اپنے آنسو پونچھ کر بیوی سے بولا۔ ’’یہ جیراں کے غم میں پاگل ہو جاتی ہے۔ جب بھی زبیر خان یا شفقت راجا کے آدمیوں پر نظر پڑتی ہے، پاگلوں کی طرح ہنس ہنس کر ان سے کہتی پھرتی ہے۔ ’’میری ہیراں والی دھی... جیراں کا انتقام میرے رب سوہنے نے لے لیا۔ وہ تمہیں بھی نہیں چھوڑے گا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اس جھلی کی حرکت کی وجہ سے وہ اسے بھی نہ نقصان پہنچا دیں غصے میں آ کر۔‘‘

اول خیر نے بوڑھی عورت کو دلاسے تھپکیاں دے کر لٹا دیا چارپائی پر... میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

’’کمال ہے چاچا! یہاں کے کیسے لوگ ہیں؟ شفقت راجا اگر ان کی عزتوں کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا تو پھر...‘‘ میں رک گیا۔ مجھے اپنا سوال فضول ہی لگا۔ وہ کہہ تو چکا تھا کہ وہ لوگ کس طرح ظلم و جبر کی چکی میں پسے ہوئے تھے، غربت اور مجبوری ہی درحقیقت ان کا جرم تھی۔ یہاں مجھے زیردست سے زبردست کا وہی پرانا چکر چلتا ہوا محسوس ہوا تھا جو میں اطفال گھر میں دیکھ چکا تھا اور یہی میری زندگی کا وہ ناقابلِ برداشت منظر تھا، جو میں کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا اور اصل مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ’’چاچا! ایک بات بتاؤ، میں نے سنا ہے کہ... یہ شفقت راجا عورتوں کا بیوپاری بھی تھا؟‘‘

’’ہاں پتر... یہ تو یہاں سبھی کو معلوم ہے۔‘‘ وہ بولا اور مجھے پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔

’’چاچا، اب تو شفقت راجا اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا ہے۔ اب شاید ایسا نہ ہو... لیکن اس کے مرنے کے بعد ان معصوم لڑکیوں کا کیا بنے گا... جو اس کی قید میں ہوں گی؟‘‘

میری بات پر بوڑھے نے پہلی بار چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اول خیر کی طرف...

’’تم دونوں مجھ سے کچھ نہیں چھپاؤ، ڈرنے کی ضرورت نہیں مجھ سے، مجھے سچ سچ بتاؤ تم دونوں یہاں کھلاں والی کس مقصد کے لیے آئے ہو؟‘‘ بوڑھے کی بات پر میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا اور ایک نظر اول خیر پر ڈالنے کے بعد بوڑھے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

’’چاچا! تو تم نے ٹھیک ہی سمجھا۔ ہم دونوں شاید ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ہم یہاں ایک لڑکی کی تلاش میں آئے ہیں۔ وہ میرے دوست کی بہن ہے، اور شریف زادی ہے۔ اسے زبردستی اغوا کیا گیا تھا، ہمیں پتا چلا کہ وہ شفقت راجا کے قبضے میں ہے۔ مگر یہاں اس کی تلاش میں پہنچے تو پتا چلا شفقت راجا ہی دنیا میں نہیں رہا۔‘‘

’’ذرا ٹھہر پتر!‘‘ بوڑھے نے یکدم مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر چارپائی سے اٹھ کر دروازے تک گیا ور باہر نکل گیا میں اور اول خیر... اس کی اس حرکت پر گھبرا سے گئے، ابھی ہم اٹھنے کا ارادہ کر رہے تھے کہ وہ اندر اخل ہوا، اس کے انداز و اطوار سے رازداری جھلک رہی تھی۔ پھر وہ میرے قریب چارپائی پہ آ کر بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔

’’ذرا آہستہ بات کرنا ویسے ڈرنے کی ضرورت نہیں، یہاں کوئی آتا جاتا نہیں ہے۔ یہ کھولی بھی دور بنی ہوئی ہے، اس کے پیچھے پرانا قبرستان ہے۔ سامنے کھیت ہے۔ دائیں بائیں میدان اور ریت کے سوا کچھ نہیں۔‘‘ وہ ذرا خاموش ہوا۔ اب اس کے یکدم اٹھ کر باہر جانے کا مقصد ہماری سمجھ میں آیا تھا۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے گیا تھا کہ کہیں باہر کوئی کھولی کے قریب یا آس پاس موجود تو نہ تھا۔ میں نے اور اول خیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلا دیے۔

’’دیکھ پتر...‘‘ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ’’اب مرنے والے کے بارے میں کیا کہا جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ پنڈ والے شفقت راجا کے قتل پر اندر ہی اندر خوش بھی ہوئے ہوں گے اور جو کالا دھندا کرتا تھا، اس کی موت کے ساتھ ہی سمجھو ختم ہو گیا... مگر رہی تمہاری بات کہ تم اپنے ایک دوست کی بہن کو تلاش کرنے کے لیے آئے ہو، تو اس سلسلے میں، میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔‘‘ اتنا کہہ کر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوا۔ میرے اندر امید جاگی اور بے اختیار دل ہی دل میں اللہ کی اس مصلحت پر اش اش کر اٹھا کہ بے شک سیدھی اور نیک راہ پر چلنے والوں کے لیے اللہ راستے بھی خود ہی آسان کرتا ہے۔

میں اور اول خیر... بوڑھے کی بات پر پوری طرح گوش بر آواز ہو گئے۔

’’شفقت راجا کے ساتھ اس کے وہ سب قریبی ساتھی بھی سمجھو جہنم واصل ہو گئے ہیں، مگر ایک ساتھی اس کا شدید زخمی ہونے کے باوجود زندہ بچ گیا ہے، اور میں اس اتفاق پر حیران ہوں کہ یہ آدمی بھی... شفقت راجا کے اس کالے دھندے کے حوالے سے بہت خاص آدمی تھا اس کا۔ اس کا نام مختار خان تھا اور اسی نے میری معصوم جیراں کو بھی اٹھایا تھا۔‘‘

اپنی بیٹی کا ذکر کرتے ہوئے اس غریب کی بوڑھی آنکھیں اور کپکپاتا لہجہ بھی بھیگنے لگا تھا مگر وہ رکا نہیں، آگے بولتا رہا۔

’’مختار خان، عرف مختارا... جانتا ہے کہ کون سی لڑکی اس وقت کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ وہ ابھی چلنے پھرنے اور بولنے کے قابل نہیں، پولیس بھی اس سے کوئی بیان نہیں لے سکی ہے۔ پتا نہیں کہ بچتا ہے

کہ نہیں مگر پتر! اس کا بچنا ضروری ہے۔" وہ خاموش ہوا تو میں نے اپنی پُرسوچ نظریں گویا ایک ایسے غیر مرئی نقطے پر جمادیں جیسے مجھے وہاں کوئی تحریر لکھی نظر آرہی ہو، شاید یہ میرے شعور کی جھلک تھی وہ جو قبل از وقت مجھے خبردار کردیتی تھی اور میں کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہنے لگا۔

"چاچا، اللہ کا کوئی کام بھی مصلحت سے خالی نہیں ہوتا، نامعلوم دشمنوں کی فائرنگ سے شفقت راجا سمیت اس کے سارے قریبی حواری مارے گئے، مگر مختار خان بچ گیا۔ اسے شاید اللہ نے ہماری مدد کے لیے ہی بچایا ہے تو وہ اب اسپتال میں نہیں مرے گا ہمیں بتا کر مرے گا کہ شکیلہ اور دیگر اغوا کی ہوئی معصوم لڑکیاں کہاں پر ہیں؟"

میرے فلسفیانہ لہجے پر بوڑھے سمیت اول خیر بھی حیرت سے میرا پرسوچ چہرہ دیکھنے لگے۔ میں نے فوراً بات آگے بڑھائی اور بوڑھے سے پوچھا۔ "چاچا تم ہماری کیا مدد کرسکتے ہو۔ کیونکہ فی الحال تو مختار سے ہم نہ مل سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھ سکتے ہیں۔" میرے استفسار پر وہ اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"ہاں! پتر! بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔ تم اگر کسی طرح فارم ہاؤس والے جنگل ڈیرے کا ایک چکر لگا کر دیکھو تو کچھ حاصل کرسکتے ہو۔"

"فارم ہاؤس والا جنگل ڈیرا؟" میں زیرلب بڑبڑایا اور سوالیہ نظروں سے بوڑھے کی طرف دیکھنے لگا تو اول خیر نے پوچھا۔

"کہیں یہ وہ جگہ تو نہیں، جہاں اغوا یا خریدی ہوئی عورتوں کو رکھا جاتا تھا؟"

"ہاں پتر..." بوڑھے نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"یہی وہ جگہ ہے یا اسے تم شفقت راجا کا ایسا خفیہ اڈا بھی کہہ سکتے ہو، جہاں اس طرح کے معاملات طے کیے جاتے تھے۔ مگر اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ پنڈ کے کئی لوگوں نے بےخیالی میں وہاں سے گزرنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں ڈرا دھمکا کر بھگا دیا گیا۔ انہی لوگوں کے ذریعے مجھے اس مقام کا پتا چلا تھا... اپنی جیراں کو تلاش کرنے میں ایک رات چوری چھپے اس طرف گیا تھا میں فارم ہاؤس کے اندر داخل ہونے میں کامیاب بھی ہوگیا تھا۔ جھاڑیوں کی گھنی باڑھ کے عقب میں چھپ کر میں نے فارم ہاؤس کی عمارت دیکھی تھی وہاں جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ کچھ گاڑیاں کھڑی تھیں، جنگلی شکاری کتے غراتے ہوئے اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے، ان کے ساتھ شفقت راجا کے مسلح کارندے بھی تھے، مجھے کچھ باہر کے لوگ بھی نظر آئے۔ میں نے وہاں بہت تفصیل کے ساتھ ان کی... ساری کارروائی دیکھی تھی۔ وہاں کوئی وڈا چوہدری بھی آیا ہوا تھا، کسی دوسرے شہر سے۔ اس کی بڑی آؤ بھگت کی جارہی تھی، ایک بڑی سی گاڑی تھی اور وہاں عورتیں اور لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں، ان میں کچھ تو پیشہ ور دکھائی دے رہی تھیں، کچھ ڈری سہمی ہوئی تھیں، ان لوگوں کی باتیں سننے کے لیے میں تھوڑا ان کے قریب ہوا، کتوں کا بھی مجھے خوف تھا۔ میری بے تاب نظریں اپنی بیٹی جیراں کو تلاش کررہی تھیں، مگر ابھی تک وہ مجھے نظر نہیں آئی تھی، میں ہمت کرکے اور گھنی جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا اور آگے پہنچا۔ شفقت راجا اور وہ چوہدری آپس میں قہقہے لگا رہے تھے، گوشت بھونا جارہا تھا، اور... شراب بھی چل رہی تھی، ان کی باتوں کے دوران مجھے پتا چلا کہ وہ چوہدری نئے پنڈ کا چوہدری الف خان کا بیٹا... چوہدری ممتاز تھا۔" بوڑھا اتنا کہہ کر رکا... الف خان اور ممتاز خان کے نام پر میں چونک اٹھا۔ میری اور اول خیر کی نظریں معنی خیز انداز میں چار ہوئیں۔ اول خیر نے ہولے سے نفی میں اپنے سر کو جنبش دی، میں اس کا اشارہ سمجھ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ چوہدری ممتاز سے متعلق ابھی کوئی بات نہ کرو، اور اس بوڑھے کی سیر حاصل معلومات سے سرِدست استفادہ کرتے رہو۔

بوڑھے نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "وہ دونوں شیطان اغوا کی ہوئی لڑکیوں کے سودے کی باتیں کررہے تھے... اس دوران میں نے شفقت راجا کی زبانی یہ بھی سنا تھا کہ کچھ لڑکیاں اس علاقے سے تعلق رکھتی ہیں، وہ انہیں پہلے یہاں سے رخصت کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ سن کر میرے کان کھڑے ہوگئے، یقیناً ان میں جیراں بھی ہوگی۔ مگر معاملہ ابھی طے نہیں ہو پایا تھا۔ چوہدری ممتاز نامی وہ شخص دوسری بار لڑکیوں کی کھیپ لے جانے کا وعدہ کرکے گیا جو پہلی کھیپ لے کر گیا تھا، اس میں میری جیراں نہ تھی... میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ میری واپسی بڑی مشکلوں سے ہوئی، کیونکہ میں اس وقت شیروں کی کچھار میں گھسا بیٹھا تھا۔ وہاں سے لوٹنے کے بعد میں نے پولیس کو خبر کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا مگر ہائے ری قسمت... ادھر ہی مار کھا گیا۔ کیا پتا تھا کہ پولیس ان امیروں اور پیسے والوں کی سنتی ہے۔ ہم جیسے مسکین مجبور اور غریبوں کو بری طرح دھتکار دیتی ہے۔ شفقت راجا کا نام سن کر علاقے کے تھانے دار نے الٹا مجھ پر چڑھائی کر دی، مجھے پاگل سنکی اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر تھانے سے بھگا دیا گیا۔ غریب کی کون سنتا ہے پترو!" اس کا لہجہ پھر گلوگیر ہونے لگا مگر اس نے بات ختم نہیں کی۔

"...مگر میں نے بھی قسم کھا رکھی تھی، پیچھے نہیں ہٹوں گا، میں نے اوکاڑہ جا کر بڑے افسر سے ملنے کا ارادہ کیا، لیکن پھر بدقسمتی آڑے آئی اور میری تھانے پہنچ کر شکایت کرنے کی خبر شفقت راجا تک پہنچا دی گئی، اس دن جب میں اوکاڑہ جانے کی تیاری کررہا تھا، شفقت راجا کے کارندوں نے میرے گھر پر چڑھائی کردی... ہم بڈھا بڈھی کو بالوں سے پکڑ کر گلیوں میں گھسیٹا گیا اور گھر سے بےگھر کردیا۔ ہم ہاتھ جوڑتے رہے اور رحم کی بھیک مانگتے رہے۔ ہمیں آبادی سے نکال کر یہاں پھینک دیا گیا۔ بڑی مشکلوں سے اپنی اور اپنی بڈھی کی جان بچائی اور زخمی حالت میں کئی گھنٹوں تک ہم ادھر ہی پڑے رہے۔ یہاں ہم نے سرکنڈوں سے چھپروں کی جھونپڑی بنالی۔ دو دنوں تک ہم نے اندر کا رخ نہیں کیا تھا۔ پھر ایک روز مجھے کسی بھلے مانس نے آکر بتایا کہ ادھر آبادی میں مسجد والی کچی باؤلی کے پاس جیراں کی لاش پڑی ہے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی نس کاٹ ڈالی تھی، وہ غیرت والی کڑی تھی، کسی شیطان کے ظلم کا شکار ہونے کے بعد وہیں مرگئی ہوگی۔ میری جیراں کے لیے یہی مشہور کردیا گیا تھا کہ وہ کسی اپنے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھی... مگر وہ ایسی نہیں تھی، میری دھی تھی وہ۔ میں اسے جانتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ اپنی شیطانیت اور اپنے جرم کو چھپانے کے لیے اس بےچاری کو دانستہ بدنام کیا گیا تھا۔"

بوڑھے نے اپنی دکھ بھری داستان سنانے کے بعد خاموشی اختیار کرلی مگر اب وہ سسک سسک کر رونے لگا۔ میں اس کا کاندھا...... تھپتھپاتے ہوئے اسے حوصلہ دینے کے علاوہ اور کیا کرسکتا تھا۔ پھر اول خیر نے بھی بوڑھے سے کہا۔

"چاچا! اب تو اللہ نے تمہاری معصوم جیراں کا حساب شفقت راجا اور اس کے کارندوں سے لے ہی لیا ہے۔ اس سے یقیناً زبیر خان کی نہ صرف کمر ٹوٹی ہوگی بلکہ... اس پنڈ کے غریب معصوم لوگوں نے بھی سکھ کا سانس لیا ہوگا۔ مگر چاچا! تمہاری بڑی مہربانی کہ تم نے ہماری بھی مدد کی... کیونکہ تمہاری جیراں کی طرح اور بھی نجانے کتنوں کی جیراں اس جہنم میں رہائی کی منتظر بیٹھی ہوں گی۔"

بوڑھے نے اپنے کاندھے پر رکھے ایک میلے کپڑے سے چہرہ صاف کیا اور بولا۔

"پترو! میں تمہاری آخری دم تک مدد کروں گا اور خود تمہیں جنگل ڈیرے والے فارم ہاؤس کی طرف لے کر جاؤں گا مگر یہ کام رات کو ہی مناسب ہوگا۔"

"نہیں چاچا! یہ کام ہمیں ابھی نمٹانا ہوگا۔" میں نے کہا اور اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیوں اول خیر! میں سمجھتا ہوں یہی موقع ہے ہمارے پاس... اس وقت وہ سب شفقت راجا اور اپنے سائیں کے کفن دفن میں مصروف ہیں۔ انہیں اپنی پڑی ہوئی ہے۔" اول خیر نے میری بات پر صاد کرنے کے انداز میں سر کو ہولے سے جنبش دی۔

اس دوران میں... گدھا گاڑی والا لڑکا ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے آیا۔ ہم نے اسے کچھ مزید اجرتِ خاص سے نواز کر شکریہ کے ساتھ رخصت کردیا۔ پھر بوڑھے سے اس فارم ہاؤس کے محل وقوع کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے لگے۔

☆☆☆

بوڑھے کا نام بشیر تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اور اول خیر اس کا شکریہ ادا کرکے اس کی جھونپڑی سے نکل پڑے۔

سہ پہر کے چار بج رہے تھے، گرمی جون کی تو تھی مگر حبس کی کیفیت کم تھی یوں بھی جاتے ہوئے موسم کی گرمی تھی۔ جیسے جیسے دن ڈھلنے لگتا، گرمی کم ہوکر ہلکی ٹھنڈ میں بدلنے لگتی۔ میں اور اول خیر چہروں پہ حاجی رومال ڈالے پہلے سے متعین کردہ راستے پر ہولیے۔ بوڑھے نے بتایا تھا کہ وہ فام ہاؤس یہاں سے جنوب مشرق کی سمت تقریباً نو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ تانگا تو ہمیں کوئی نظر نہیں آیا البتہ گدھا گاڑیاں آتی جاتی ضرور دکھائی دے رہی تھیں، جن پر اناج کی بوریاں لدی ہوئی تھیں، ایک خالی گدھا گاڑی کو روک کر ہم نے اس سے نہر والی پلیا تک چلنے کو کہا۔ وہ تیار ہوگیا۔

بوڑھے بشیر کے مطابق نہر والی پلیا چھ سات کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، وہاں سے آگے کوئی تانگا اور سواری جانے کی اجازت نہیں تھی، ہمیں نہر والی پلیا پر اتر کر دائیں جانب نہر کے کنارے کے ساتھ پیدل چلنا تھا، بشیر نے ہمیں اس سمت سے جانے کی نصیحت کی تھی۔

گدھا گاڑی والے نے کرایہ بتایا اور ہم دونوں اس پر سوار ہوگئے کہ پکی عمر کے گدھابان نے گدھے کو ٹٹکارا اور وہ آگے روانہ ہوگیا۔

ہم نے دانستہ آبادی سے ہٹ کر آگے بڑھنے کا راستہ اپنایا تھا۔ ہم چاہتے تو نہر والی پلیا کے قریب اترنے کے

بجائے... شہتیروں والے پل کے پاس ہی اترتے مگر بشیر نے ہمیں یہی تاکید کی تھی، ہمیں نہر والی پلیا کے قریب اتر کر باقی راستہ پیدل ہی طے کرنا تھا۔ اس کی مصلحت ہم سمجھتے تھے، کیونکہ ہم ایک طرح سے نوگوایریا کی طرف بڑھ رہے تھے، یہ سارا علاقہ زبیر خان کی جاگیر میں شمار ہوتا تھا۔

گدھا گاڑی کھیتوں کے درمیان سے ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ نہر والی پلیا تک آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی وہاں کھاد بیج وغیرہ فروخت کرنے والوں کی دکانیں تھیں، دو ایک چھپر نما چائے خانے بھی تھے، جو اَب بند کروا دیے گئے تھے۔ میں اور اول خیر، گدھا گاڑی کے چوبی پھٹے پر بیٹھے دانستہ بیج .... اور کھاد وغیرہ سے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے، تاکہ گدھا گاڑی والے کو ہم پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ یہ ساری باتیں ہمیں بوڑھے بشیر نے سمجھائی تھیں۔

میرے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی، مگر اول خیر کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پنجاب کے بیشتر دیہاتوں کے کچھ بااثر قسم کے لوگوں نے اپنی اپنی جاگیروں میں اس طرح کی اجارہ داریاں قائم کر رکھی تھیں اور ایسا صرف پنجاب میں نہیں، ملک کے ہر صوبے میں تھا، بالخصوص اندرونِ سندھ... وہاں تو جاگیریں باقاعدہ ''اسٹیٹ'' کا درجہ رکھتی تھیں۔ حتیٰ کہ حویلی تک جانے والے راستے پر بھی کسی مقامی یا عام آدمی کو چلنے کی اجازت نہ تھی۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو بنجر اور بیابان علاقہ شروع ہو گیا، خاصا اجاڑ علاقہ تھا، کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ اور سوکھی جھاڑیوں کے جھنڈ بنے ہوئے تھے۔

نہر والی پلیا کے قریب کچھ گہما گہمی نظر آئی تھی، گدھا گاڑی سے اتر کر اول خیر نے اسے اجرت دے کر فارغ کر دیا۔ اور گرد و پیش پہ نظر ڈالتے ہوئے چھپر نما دکانوں کی طرف بڑھ گئے، دو ایک دکانوں میں بیج اور کھاد وغیرہ کے بارے میں پوچھا پھر غیر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ یونہی ٹہلنے کے انداز سے دائیں جانب چل دیے، یہاں نہر کا ریتیلا کنارہ تھا۔ جس کے ساتھ ساتھ خاصی دور تک ببر اور ڈوڈی کے موٹے پتوں والے پودوں کی جھنڈ دار جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں اس کی آڑ میں ہو کر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

میں نے اول خیر کو اب اپنے سیل فون آف کرنے کی ہدایت کر دی تھی، کہیں اس کی رِنگ ٹون کسی کو ہماری طرف متوجہ کرنے کا باعث نہ بنے، مگر موبائل فون آف کرنے سے پہلے اول خیر نے احتیاطاً کیبل دادا سے رابطہ کر کے اسے موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اول خیر نے سائلنٹ پر کر کے اسے وائبریشن پر کر دیا تھا۔

مزید ایک دو کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد بالآخر نہر کے اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں موٹے شہتیروں کو گرا کر پیدل نہر پار کرنے والوں کا راستہ بنایا گیا تھا۔ ہم نہر کے ریتیلے کنارے پر چڑھ گئے، محتاط نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا پھر دھڑکتے دل کے ساتھ شہتیروں پہ چل کر نہر کے دوسری طرف آ گئے۔ وہاں نسبتاً زیادہ جھنڈ دار جھاڑیاں اور درختوں کی بہتات تھی۔

''اول خیر! ہوشیار! ہم نوگوایریا میں داخل ہو چکے ہیں۔'' میں نے سرسراتی سرگوشی سے اول خیر سے کہا۔ وہ بھی دھیمی آواز میں بولا۔

''اوخیر... کاکا فکر کی کوئی بات نہیں، اس وقت ان سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔ سوائے چند آدمیوں کے ان سے ہم نمٹ لیں گے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے اس لیے تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر روانگی کا فیصلہ کیا تھا۔'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہم دو ایک گھنٹے میں اپنی کارروائی نمٹا دیں گے، لیکن واپسی کے بارے میں کچھ دقت ہو سکتی ہے، کیبل دادا کا کیا پروگرام تھا؟ تم نے تو اس سے بات کی تھی ناں۔''

وہ جواباً بولا۔ ''میں نے اسے سب بتا دیا ہے۔ مگر وہ کھلاں والی داخل ہونے کا رسک نہیں لینا چاہتا۔''

''تو پھر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''فکر کی کوئی بات نہیں۔'' وہ ازراہِ تشفی بولا۔ ''کیبل دادا ہوشیار آدمی ہے۔ یہ سارے علاقے مجھ سے زیادہ اس کے دیکھے بھالے ہیں، ہمارا محل وقوع جاننے کے بعد اس نے اپنا پروگرام مجھے بتا دیا ہے۔ وہ ساہیوال سے بیس کلومیٹر مضافات میں چک اڑتالیس کی طرف مڑ جائے گا اور ایک بڑا چکر کاٹ کر... اس نوگوایریا کے جنوب مغرب سے اندر داخل ہو کر ہم سے ملنے کی کوشش کرے گا، تب تک ہم اپنا کام نمٹا چکے ہوں گے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے دعائیہ کلمہ ادا کیا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ بوڑھے بشیر کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے بالآخر ہم فارم ہاؤس کی اس مستطیل نما عمارت کے قریب جا پہنچے جس کے اطراف اور عقب میں کیکر اور بیر کا گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل ڈیرے کے بعد زبیر خان کی جاگیر کی حد ختم ہو جاتی تھی۔

ہم دور سے کھڑے اس عمارت کا جائزہ لینے لگے۔ یہ مٹیالے رنگ کی عمارت تین چار کنال کے رقبے پر محیط تھی۔ چھت پر بڑا سا ڈش اینٹینا نصب تھا، سامنے کے رخ پر تین چار بڑے بڑے دروازے استادہ تھے، درمیان کا دروازہ کھلا تھا، وسیع و عریض احاطے کے گرد خاردار باڑھ تھی، داخلی راستہ کشادہ اور کھلا تھا۔ احاطے کے باہر ایک ٹریکٹر ٹرالی کھڑی نظر آئی۔ اندر ایک پرانے ماڈل کی جیپ تھی۔ کچھ کرسیاں اور دو تین چارپائیاں احاطے میں مذکورہ کھلے دروازے کے سامنے بچھی ہوئی تھیں، دو پیڈسٹل پنکھے تھے، احاطے کے دائیں ... سمت میں ایک چھوٹے سائز کا ٹرک کھڑا تھا۔

چارپائیوں پہ ہمیں صرف دو افراد ہی نظر آئے، جن کے قریب ایک دوسری خالی چارپائی پر ان کی رائفلیں پڑی تھیں۔ ساتھ ہی زنجیر سے دو کتے بندھے ہوئے کچی زمین پر بیٹھے تھے، ان کی زبانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں، اور ہانپتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

''اوخیر... کاکا! لگتا ہے کہ اس طرح معاملہ کچھ ڈھیلا ہوگا۔''

ساری صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرسراتی ہوئی سرگوشی کی۔

ہم دونوں تھوڑی دیر مزید جھاڑیوں میں دبکے رہے۔ آگے پیش قدمی کا ارادہ کرنے ہی والے تھے کہ اچانک عمارت کے کھلے دروازے سے ایک لمبا موٹا شخص جھومتا جھامتا ہوا باہر نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں دیسی شراب کی بوتل تھی، ہمارا وہاں سے فاصلہ لگ بھگ کوئی پچاس ساٹھ فٹ تھا، اس آدمی کا صرف ہمیں قہقہہ ہی سنائی دیا تھا۔

''چل کاکا! آگے بڑھ...'' اول خیر نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا اور پھر دائیں جانب رینگ گیا۔ میں نے بھی فوراً ہی اس کی تقلید کی تھی۔ ہم جھاڑیوں کی اوٹ میں سرکتے رینگتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے میں اس کی طرف آ گئے۔ عقبی دیوار تک ہمیں یہ جھاڑیاں تحفظ فراہم کر سکتی تھیں، اس لیے ہم نے آگے بڑھنے میں چنداں دیر نہ لگائی۔ اس طرف چار کھڑکیاں تھیں جو سب کی سب بند تھیں۔

''کاکا... اس طرف۔'' اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔ ہم دونوں جنوبی سمت کی دیوار کی آڑ لے کر آگے بڑھے۔ سب سے پہلے اول خیر نے دیوار کی آڑ میں دیکھا۔ وہ تینوں اب ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ہم ایک طرح سے عمارت کے احاطے کے اندر داخل ہو چکے تھے، چاہے عقب سے سہی، ٹرک اس مقام پر ہم سے چند گز کی دوری پر تھا۔ ہم فوراً آگے بڑھے اور ٹرک کی اوٹ میں آ گئے، ہمیں ان دونوں کتوں کا بھی ڈر تھا، جو ایک اجنبی پر بھونک کر ان تینوں کو خبردار کر سکتے تھے، اور وہی ہوا... دونوں کتے یکدم اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ٹرک کی سمت منہ کر کے زور زور سے بھونکنے لگے۔ چارپائیوں پر بیٹھے وہ تینوں آدمی بری طرح چونکے۔ میری کنپٹیوں پہ سنسناہٹ ہونے لگی۔ ٹرک کے اندر بھوسا تھا۔ اچانک سے ایک بلی اچھل کر بھاگی، مجھے تسلی ہوئی، کیونکہ وہ تینوں بھی بلی کو دیکھ کر یہی سمجھیں ہوں گے کہ کتے اسے دیکھ کر بھونکے ہیں۔ مگر کتے اب وقفے وقفے سے بھونکنے لگے۔ ایک تو چپ ہو گیا تھا مگر دوسرا کچھ ڈھیٹ قسم کا تھا، اسے ایک کارندے نے ہشکارا دے کر چپ کرایا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا تو اس نے ایک طرف اشارہ کیا جہاں لوہے کے زرعی آلات بکھرے پڑے تھے، اشارہ بھانپ کر میں نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر ہم تیزی سے مذکورہ سمت کی طرف رینگ گئے۔

یہاں سے وہ تینوں کارندے ہمارے بہت نزدیک تھے، ان کی رائفلیں دوسری چارپائی پر رکھی تھیں، اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، اور پھر میں نے اور اول خیر نے پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیے اس کے فوراً ہی بعد جیسے ہمارے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔

''خبردار! کوئی حرکت نہ کرنا ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

آہنی آڑ سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرتے ہی ان تینوں پر گن تانتے ہوئے میں بھیڑیے کے انداز میں غرایا۔ جبکہ اول خیر نے دوسری چارپائی پر رکھی رائفلوں کی طرف پیش قدمی کی تھی، کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پہ اٹھا لیا اور رسی تڑوانے کی کوشش کرنے لگے۔ تینوں کارندوں کے چہرے یکلخت مسخ سے ہو گئے، زیادہ دیدنی حالت لمبے تڑنگے موٹے آدمی کی ہو رہی تھی، جس کا چہرہ سرخ ہو کے مزید بھیانک نظر آنے لگا تھا۔

بعد میں ہم نے اپنے پستول جیبوں میں ڈال کر رائفلیں سنبھال لیں۔

”کون ہو تم لوگ؟ جانتے نہیں تم کس کی جاگیر میں کھڑے ہو؟“ تنومند شخص ہم دونوں پر قہر آلودہ نظریں ڈالتا ہوا غرایا۔

”اپنا منہ بند رکھ ... ذلیل کُتے ورنہ کھوپڑی چھلنی کردوں گا۔“ میں نے خوف ناک لہجے میں غرا کر کہا۔ ”اندر جتنی بھی لڑکیاں موجود ہیں انہیں فوراً باہر لے کر آؤ، جاؤ تم۔“

میں نے دوسرے کارندے سے تحکمانہ درشتی سے کہا مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، ہمیں گھور کر بولا۔

”کون سی لڑکیاں؟ ہمیں کچھ نہیں معلوم۔“ اس کی چالاکی پر مجھے طیش آگیا۔ میں نے رائفل کا رخ اس کے سینے کی طرف گھمادیا تو اول خیر نے یکدم مجھے ایک ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

”ٹھہرو، ابھی نہیں، تم اندر جاؤ، میں یہاں کھڑا ہوں۔“ اس کی بات پر میں نے فوراً حرکت کی اور کھلے دروازے کی طرف بڑھا۔ جب اس لمبے تڑنگے موٹے کے قریب سے گزرنے لگا تو وہ خونخوار سی غراہٹ سے بولا۔

”اس غلطی کا بڑا بھیانک خمیازہ بھگتنا پڑے گا تم دونوں کو۔“ اس کے ان جملوں نے میری کنپٹیاں چٹخا دیں اور میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھام کر اس کا بٹ اس کے جبڑے پر دے مارا۔ چوٹ زوردار ثابت ہوئی یقیناً اس کا جبڑا چٹخ گیا ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک کریہہ ... آواز سے چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔

”وقت ضائع مت کر کاکا۔ ان کی چال میں مت آ اور آگے بڑھ۔“ پیچھے سے اول خیر نے مجھے تاکید کی، میں مضروب کارندے کو غصیلی نظروں سے گھورتا ہوا کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ اندر روشنی تھی، کچھ باہر کی روشنی بھی اس بلند چھت والے ہال کمرے کے روشندانوں سے اندر پڑ رہی تھی۔

میں بری طرح چونکا۔ یہاں ایک طرف آٹھ نو کے قریب لڑکیاں ڈری سہمی بیٹھی تھیں اور سراسیمہ نگاہوں سے میری طرف تکے جا رہی تھیں۔ ان کے نازک پیروں میں آہنی کڑوں کے ساتھ زنجیریں منسلک تھیں۔ میرے لیے یہ بڑا انسانیت سوز منظر تھا مگر مجھے ان میں شکیلہ کہیں نظر نہ آئی تھی۔

میں پریشان اور فکر مند ہوتا۔ تاہم میں نے لڑکیوں کو تسلی دی۔ ”مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اور میرا ایک ساتھی تمہیں یہاں سے چھڑانے کے لیے آئے ہیں۔ باہر ان تینوں کارندوں کو اس نے اپنی گن پوائنٹ پر رکھا ہوا ہے۔ مجھ سے تعاون کرو، تاکہ جلدی سے نکلا جائے۔“ میری بات پر لڑکیوں کے تاریک پڑے چہرے خوشی کی روشنی سے چمک اٹھے۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کی زنجیروں کا جائزہ لیا اور اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایک لڑکی نے میری نظروں اور چہرے کے تاثرات بھانپ کر کہا۔

”اس کی چابی ایک لمبے کالے آدمی کے پاس ہے۔ وہ باہر ہوگا۔“

”اچھا ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔“ میں نے کہا اور اس سے پوچھا۔ ”ایک اور لڑکی شکیلہ نام کی بھی تمہارے ساتھ تھی۔ وہ کہاں ہے؟ میرے دوست کی بہن ہے۔“ میرے استفسار پر وہ سوچتی رہ گئی۔ اسے شاید معلوم نہیں تھا مگر ایک اور لڑکی بولی۔

”کہیں تم بھورے بالوں اور گورے رنگ والی موٹی اور لمبی سی لڑکی کی بات تو نہیں کر رہے ہو جو ملتان کے کسی اطفال گھر نامی ادارے میں ...“

”ہاں ... ہاں وہی۔ میں اسی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر پُر امید لہجے میں کہا۔

”وہ بے چاری تو ...“

”کیا ہوا اُسے؟“ میں نے یکدم دھڑکتے دل اور تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”اسے کئی روز پہلے چند لوگوں کے حوالے کردیا گیا تھا۔“

”کون تھے وہ لوگ؟“ میں اندر سے سلگ اٹھا۔

”میں نہیں جانتی انہیں۔“ وہ بولی۔ میں دانت پیس کر تیزی سے پلٹا اور دروازے سے باہر آیا۔ کتے مسلسل بھونک رہے تھے، بے زبان تھے؟ میں انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تنومند سیاہ رُو ابھی تک اپنا جبڑا سہلا رہا تھا اور چارپائی کی پٹی پر ٹک کر بیٹھا تھا۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اول خیر نے میری طرف دیکھا۔

”لڑکیاں اندر موجود ہیں۔ مگر زنجیروں سے بندھی ہوئی ہیں، چابی ان کے پاس ہے مگر اندر شکیلہ نہیں۔“ میں نے اسے آگاہ کیا اور تنومند کی طرف رائفل کر کے درشتی سے بولا۔ ”چابی دو ... جلدی ...“

اس کا ہاتھ فوراً جیب کی طرف رینگ گیا۔ میں اس کی چال نہیں سمجھ پایا مگر اول خیر تو اس میدان کا پرانا ”پاپی“ تھا۔ ادھار اور خار کھائے آدمی کا اتنی جلدی حکم مان لیتا اسے

فوراً کھٹک گیا۔ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی اس نے مضروب کارندے کو اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے دیکھا چیخ کر اسے خبردار کیا۔

''اپنا ہاتھ وہیں روک لو۔'' وہ تب تک اپنا ہاتھ جیب کے اندر لے جاچکا تھا، صرف باہر نکالنے کی دیر تھی کہ اچانک ایک دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا مضروب کارندے کی جیب کے اندر سے ہوا تھا، جہاں ایک پسٹل موجود تھا اور اس کے ٹریگر پر حرکت کرتی انگلی کی جنبش ہم نہیں دیکھ سکتے تھے، لہٰذا اسے وار کرنے کا موقع مل گیا۔ گولی چلی اور اول خیر کے جانے کہاں لگی کہ وہ چیخ کر چند قدم پیچھے لڑکھڑایا۔ کارندہ زخمی ہونے کے باوجود تیزی سے میری طرف گھوما ہی تھا کہ میں نے برسٹ فائر کردیا۔ وہ بغیر چیخ مارے تیورا کر گرا اور ختم ہوگیا۔ باقی دو کارندوں کی آنکھیں پھیل گئیں، میں ان پر گن تانے اول خیر کی طرف لپکا۔ اسے زخمی ہوکر گرتے دیکھ کر میرا دل جیسے سینے میں گھٹ کر رہ گیا۔

''اول خیر...'' میں چلّا کر اس کی طرف بڑھا اور اس طرح اس کے قریب زمین پر اکڑوں ہوکر بیٹھ گیا کہ سامنے کھڑے ان دونوں کارندوں پہ بھی نگاہ رکھ سکوں۔ یکا یک صورتِ حال تشویش ناک حد تک خراب ہوگئی تھی۔

میں نے اول خیر کا جائزہ لیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو پہ جگر والی جگہ پر لگی تھی، اور وہاں سے اب بھل بھل خون بہہ...... رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اور پھر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی، اسے اس حال میں دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ اس کی موجودگی میرے لیے بڑا سہارا تھی، وہ میرا ایک خاص قسم کا یار باش دوست تھا، اس کا برتاؤ میرے ساتھ سگے بھائیوں سے بڑھ کر تھا، میں دہری تہری ذمے داریوں کی زد میں آگیا تھا۔ قیدی لڑکیوں کو بھی یہاں سے نکالنا تھا اور جاں بہ لب اول خیر کی زندگی بھی بچانا تھی۔ خود میں ایسے ..... دشمنوں کی کچھار میں تھا جن کی خوفناک اور قاتل نظریں، ویڈیو کلپ جاری ہونے کے بعد مجھے بہت بے چینی سے تلاش کررہی ہوں گی۔

''تمہارا ساتھی مرجائے گا۔ گن پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کردو۔ فرسٹ ایڈ کا سامان یہاں موجود ہے اور گاڑی بھی۔'' ایک کارندے نے میری پریشانی بھانپ لی اور چالاکی سے بولا۔ تب میں نے اس کارندے کو بہ غور دیکھا اور پلک جھپکتے ہی اس کے سر پہ پہنچ کر اپنی رائفل کو سنگل شاٹ پہ رکھ کر نال اس کی پیشانی سے ٹکادی اور یکدم اپنے چہرے سے رومال ہٹادیا۔

ملک کے مختلف نجی ٹی وی چینلز میں مجھ سے متعلق وہ ویڈیو کلپ ٹی وی پر بار بار دکھائی جارہی تھی، اور میری شکل اس میں کلوز اپ کرکے اتنی واضح کردی تھی کہ کسی کو مجھے پہچاننے میں ذرا بھی مغالطہ ہونے کا اندیشہ نہ تھا۔ اور پھر یہ تو شفقت راجا کے کارندے تھے، بھلا ان لوگوں نے کیسے میری شکل نہیں دیکھی ہوگی، یہی سبب تھا کہ میری صورت دیکھتے ہی پہلے تو دونوں کو ہلکا سا جھٹکا لگا پھر ان کی آنکھیں اس قدر پھیلتی چلی گئیں، گویا پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔

''مجھے اچھی طرح پہچان لو، اور بتاؤ فرسٹ ایڈ بکس کدھر رکھا ہوا ہے۔'' میں نے وحشت انگیز غراہٹ سے اسے گھور کر کہا۔ مگر وہ جیسے ہکا بکا سا رہ گیا۔

''تت... تم... وہی ہو۔''

''ہاں! وہی ہوں... جلدی بتاؤ۔'' میں دہاڑا۔

''اگر اس دوران میرا ساتھی مرگیا تو تم دونوں کا حشر میں تمہارے تیسرے ساتھی جیسا کروں گا۔''

ان کے سامنے خود کو ظاہر کرنے کا میرا مقصد محض اتنا تھا کہ میری دھاک ان پر بیٹھ جائے اور وقت ضائع کیے بغیر وہ بے چون وچرا میرے احکامات کی تکمیل کرتے رہیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے سامنے کوئی معمولی آدمی تھا... ظاہر ہے جو شفقت راجا جیسے آدمی اور اس کے کارندوں کا اس کی جاگیر میں گھس کر قتل کرسکتا ہے، وہ کیا کم خطرناک ہوگا؟ جبکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ یہ قتل میں نے نہیں کیا تھا اور دوسرے کے گناہ کا سارا ملبا میرے سر ڈال دیا گیا تھا اور یہ خطرناک رسک میں نے اول خیر کی جان بچانے کے لیے ہی لیا تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اطفال گھر سے نکلتے ہی میں پے در پے ان حالات کا شکار ہوکر اس طرح کی مشکلات ومصائب کی لپیٹ میں آجاؤں گا مگر یہ ہوچکا تھا۔ پتا نہیں تقدیر کون سی راہ متعین کرنے والی تھی، مگر میں دیکھ رہا تھا کہ لمحہ بہ لمحہ مجھے لاوا اگلتے ہوئے آتش فشاں دہانے کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ ناکردہ جرائم کے پاداش میں ایسے حالات کا شکار ہونے والا انسان بڑا خطرناک باغی بن کر رہ جاتا ہے۔ اور شاید اب کچھ ایسے ہی جذبات میرے دل و دماغ میں ...... پروان چڑھنے لگے تھے۔ اس وقت مجھے ان کے دیگر کارندوں کے ٹپک پڑنے کا بھی خدشہ درپیش تھا۔

دوسرے کارندے نے اچانک... زمین بوس اول خیر کی طرف چھلانگ لگادی، یہ اس کی ایک خطرناک چالاکی تھی، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں میں اس پر فائر کرنے سے گریز ہی کرتا۔ جبکہ اس کا ہدف وہ رائفل تھی جو تھوڑی دیر پہلے اول خیر کے ہاتھوں میں تھی، مگر اب اس کے ساتھ ہی وہ بھی زمین پر اس کے قریب پڑی تھی۔ مگر وہ چالاکی کرتے ہوئے یہ بات بھول گیا تھا کہ جس انسان کے سر پہ خون سوار ہوجائے وہ اپنے نفع ونقصان کی پروا کم ہی کرتا ہے۔ میں ذہنی وجسمانی طور پر تیار تھا، لہٰذا جیسے ہی دوسرے کارندے نے حرکت کی، میری محتاط اور ٹھٹکی ہوئی آنکھوں میں اس کی ''جھپک'' ابھری اور میں نے اس پر فائر کردیا۔ فقط ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کرکے رکھ دیا۔ گولی اس کے پیٹ میں کہیں دھنس گئی تھی۔

ایک ہی کارندہ بچا تھا، میری دھاک اس پر ایسی بیٹھی کہ وہ پھر بے چون وچرا میرا حکم مانتا چلا گیا۔ بہرطور، اس کے بعد سب کچھ تیزی سے ہوتا چلا گیا۔ اول خیر کے بے سدھ زخمی وجود کو چارپائی پہ ڈالا۔ ادھ موئے کارندے کی جیب سے چابیاں نکالیں، اندر داخل ہو کے ایک لڑکی کا تالا کھولا اور چابی اسے تھما کر فرسٹ ایڈ باکس لیا۔ میں نے کارندے کو وہیں ایک کاٹھ کباڑ والے اسٹور میں بند کرکے باہر سے کنڈی چڑھادی کہ کہیں وہ موقع ملتے ہی میرے ساتھ کوئی چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مگر حالات کی کشاکش میں یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ اندر بند کرنے سے قبل مجھے اس کی تلاشی لینی چاہیے تھی، ہتھیار کے علاوہ ضرور اس کے پاس سیل فون بھی ہوسکتا تھا جس کے ذریعے وہ اپنے ساتھیوں کو یہاں.... ہونے والی کارروائی کے بارے میں آگاہ کرسکتا تھا۔

لڑکیاں سب زنجیروں سے آزاد ہوچکی تھیں۔ میں نے مختصراً انہیں یہ سب بتایا۔ ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر مجھے بتایا کہ وہ نرس ہے۔ (وہ کسی کی محبت کے جھانسے میں آکر برباد ہوئی تھی)

اس نے ہی اول خیر کی ڈریسنگ کی تھی، اس کی مدد کے لیے دو اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

میں نے اول خیر کا موبائل نکال لیا تھا... سائلنٹ پر ہونے کی وجہ سے اس میں دوتین مس کال کمیل دادا کی طرف سے آئی تھیں۔

میں نے فوراً ہی اس سے رابطہ کرکے اسے مختصراً صورتِ حال کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ کہیں قریب ہی موجود تھا اور ہم سے رابطہ کرنے کا بے چینی سے منتظر بھی تھا۔ اول خیر کے زخمی ہونے کا سنتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح ایک بڑی سی مخصوص اور اونچے چوڑے ٹائروں والی جیپ میں وہاں آن پہنچا۔ اس کے ہمراہ چار مسلح افراد بھی تھے۔

انہیں دیکھ کر مجھے کچھ ڈھارس ہوئی، اول خیر کی ڈریسنگ ہوچکی تھی۔ نرس اپنے کام میں ماہر تھی، اور شاید اس نے سرجری سے ہی کام کیا تھا، کیونکہ اس نے زخم پر ٹانکے بھی لگادیے تھے، ساتھ ہی یہ خوشخبری بھی سنائی کہ گولی پہلو کو چھوتی ہوئی آر پار ہوگئی تھی، البتہ جریانِ خون کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ جگر متاثر ہوا ہے۔ اول خیر کو جیپ کی پچھلی سیٹ پر لٹادیا گیا۔ میں نے کمیل دادا سے کہا۔

''تم اول خیر کو لے کر نکل جاؤ اور کسی اچھے اسپتال میں اسے داخل کرادو... میں سامنے کھڑی جیپ میں آرہا ہوں۔ لڑکیوں کو لے کر۔''

میری بات پر کمیل دادا تذبذب کا شکار نظر آنے لگا مگر میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پلٹ گیا۔ جیپ کی چابیاں میں نے موٹے کی لاش سے نکال لی تھیں۔ شکیلہ کے حوالے سے اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا تھا۔ جس کارندے کو میں نے اسٹور میں بند رکھا تھا اسے میں نے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں اس سے شکیلہ کے سلسلے میں کچھ اگلوانا چاہتا تھا۔

کمیل دادا نے احتیاطاً دو ساتھی میرے ساتھ کردیے اور مجھے ''بیگم ولا'' پہنچنے کی ہدایت کرکے روانہ ہوگیا۔ نرس لڑکی اول خیر کے ساتھ تھی۔

میں نے جیسے ہی اندر آکر اسٹور کھولا، کارندے کو سیل فون پر دوسری طرف منہ کیے باتیں کرتے سنا.... میرے پورے وجود میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ آہٹ پر وہ چونک گیا تھا اور اپنا سیل فون چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا تھا۔ مجھے اپنی خطرناک غلطی کا احساس ہوا، مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے یہ پوچھنا اب فضول ہی تھا کہ وہ فون پر کس سے باتیں کررہا تھا۔ میں نے اس کا سیل چھین کر پھینک کے توڑ ڈالا اور اسے دھکیلتا ہوا باہر آگیا۔

ایک ساتھی نے جس کا نام اسلم تھا۔ میری دی ہوئی چابی سے جیپ اسٹارٹ کرلی تھی اور سب لڑکیاں اس میں سوار ہوگئی تھیں۔

دوسرے ساتھی کا نام سلیم تھا۔ دشمن کارندے کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر جیپ میں سوار کرایا گیا اور خود میں ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر آن بیٹھا۔ دفعتاً گولیوں

کی تڑتڑاہٹ اور ایک سے زائد گاڑیوں کے غرانے کی آواز ابھری۔ میں حلق کے بل چیخا۔

''دشمن تعاقب میں نکل چکے ہیں ہمارے، بھگاؤ جیپ۔'' میں نے اسلم سے کہا، اس نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھادی۔

دشمنوں کے تعاقب میں آنے کا سن کر بے چاری لڑکیاں زیادہ خوف اور پریشانی کا شکار ہوگئیں۔ وہ ارشد کی طرح ڈرائیونگ میں ماہر معلوم ہوتا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے ہی اس نے جیپ کا اسٹیئرنگ کاٹ کر کیکر کے جنگل کی طرف دوڑا دیا تھا۔

کسی گولی نے ہماری جیپ کو ابھی نہیں چھوا تھا، یقیناً وہ دور تھے، محض خوف زدہ کرنے کی خاطر فائرنگ کی تھی۔

ہماری جیپ جنگل میں داخل ہوچکی تھی، کیبل دادا وغیرہ اسی جنگل سے داخل ہوئے تھے۔ اسلم نے بتایا یہ جنگل مختصر ہے اور آگے جا کر ایک نیم پختہ سڑک ہے، جو ایک دو کلو میٹر کے بعد ایک لمبا چکر کاٹ کر چک اڑتالیس جانے والی سڑک سے ٹچ ہوتی ہے، وہاں سے ملتان روڈ کی طرف بہ مشکل پانچ چھ کلو میٹر سفر تھا۔ مگر میں ملتان روڈ پر جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ کوئی بعید نہ تھی کہ اب تک میرے بارے میں پولیس کو بھی بتادیا گیا ہو اور ناکابندی کردی گئی ہو۔ اس لیے میں نے اسلم .... کو مذکور راستہ اختیار کرنے سے منع کردیا اور دوسرے راستے پر آگے بڑھنے کا کہا۔ اسلم نے فوراً اثبات میں سرہلا دیا۔

شام تاریکی میں ڈھلنے لگی تھی۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس جلانا ناگزیر تھا مگر خطرہ بھی تھا کیونکہ تعاقب میں آتے دشمنوں کی راہنمائی بھی ہوسکتی تھی۔

دفعتاً عقبی سیٹ سے سلیم کی آواز ابھری۔ ''دشمن تعاقب میں آرہے ہیں۔''

میں اور اسلم ... بیک ویو سائیڈ مرر پر گاہے بہ گاہے نظریں ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے دو تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دے گئیں۔ میری پریشانی اور تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ ہمارے قبضے میں ان کا جو ساتھی تھا اس نے یقیناً سیاق وسباق کے ساتھ میرے بارے میں انہیں بتادیا ہوگا۔ اور اب بھلا وہ لوگ اپنے ''چھوٹے چوہدری'' (شفقت راجا) کے قاتل (ان کی نظر میں) کو کیسے جانے دیتے۔ وہ مجھے پکڑنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔

مجھے سب سے زیادہ تشویش ان لڑکیوں کی تھی۔ مجھے جلد از جلد اس کارندے سے شکیلہ کے بارے میں پوچھنا تھا۔

''اسلم! ہمیں مقابلہ کرنا ہوگا۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں تیار ہوں، سر... لیکن دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے اور معاملہ بھی نازک ہے کہ ان کی مدد کے لیے کسی بھی وقت پولیس انتظامیہ بھی پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا نکل جانا ہی بہتر ہوگا۔ آگے جیسے آپ کا حکم ہو۔'' اس کی بات وزن دار تھی۔ مجھے اس وقت خطرناک مجرم کے روپ میں پیش کیا جارہا تھا۔ کوئی بعید نہ تھی ملک کے سارے اخباروں میں میری تصاویر بھی آچکی ہوں، گویا میرے لیے سردست کہیں بھی جائے اماں نہ تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس وقت میں کسی بھی صورت میں دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔

دفعتاً عقب سے دوبارہ فائرنگ کی آواز ابھری۔ اسلم نے جیپ کو یکدم ٹرن دیا۔

''آپ فکر نہ کریں سر! میں انہیں جُل دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس ذرا اس جنگل سے نکل جائیں۔'' اس نے میری پریشانی بھانپ کر کہا۔ میں چپ رہا۔

اب ٹیلوں ٹبوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اسلم نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے ریلوے لائن آگئی۔ پھاٹک کے ناکے پر اس دور افتادہ علاقہ میں کچھ نہ تھا۔ گویا اپنے رسک پہ ریلوے لائن عبور کرنا تھی، کوئی ٹرین نظر نہیں آرہی تھی۔ اسلم لائن پار کرنا چاہتا تھا، مگر دفعتاً ہی میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ ہم زیادہ دیر دشمنوں کے تعاقب سے بچ سکتے تھے۔ سیل فون کے ذریعے کوئی بھی کہیں بھی لمحہ لمحہ کی خبر دے سکتا تھا۔ اور پھر معاملہ میرے جیسے خطرناک مجرم کا ہو تو وہ کہاں مجھے ہاتھ سے جانے دیتے۔

ریلوے لائن تک جو کچا راستہ جارہا تھا اس کے دائیں جانب نشیب میں خشک نالا نظر آیا۔ جس پر پلیا بنی ہوئی تھی، اور اوپر پٹری گزر رہی تھی، میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور اسلم کو اس پلیا کے نیچے گاڑی سمیت گھس جانے کا حکم دیا...... میرے خطرناک ارادے پر وہ ذرا متذبذب دکھائی دیا۔ تاہم اس نے انکار نہیں کیا۔

''ہیڈ لائٹس بجھادو اور اندر گھس جاؤ۔'' میں نے کہا۔ اس نے سب سے پہلے ساری لائٹس گل کردیں اور کچے راستے کے دائیں جانب نشیب کے خشک نالے میں جیپ اتارلی، اور اندر اندھیری پلیا کے نیچے داخل ہوکر جیپ روک لی۔

''سلیم! اس سوٗر کے منہ پر رومال ٹھونس دو۔ کہیں یہ شور نہ مچانے کی کوشش کرے۔'' میں نے گردن گھما کر کہا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

اب چہار سُو سناٹا طاری تھا۔ اس خشک نالے میں اُگی ہوئی خودرو قدآدم جھاڑیاں ہمیں تحفظ فراہم کررہی تھیں۔ پلیا کے نیچے تو کسی بنکر کا گمان ہوتا تھا۔ یہاں تھوڑا بہت پانی بھی جمع تھا اور جھاڑ جھنکاڑ میں پھیلا ہوا تھا، ہم سب دم بہ خود سے خاموش بیٹھے تھے، میں نے اسلم اور سلیم کو پہلے ہی سیل فون سائلنٹ پر رکھنے کی ہدایت کردی تھی۔ میرا دل اس وقت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جب میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے گاڑیوں کے انجن کے شور کی آواز سنائی دینے لگی۔ کچھ روشنیاں بھی نظر آرہی تھیں، جو یقیناً گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ گاڑیاں شاید اس ناپختہ روش پر آچکی تھیں، جہاں سے گزر کر ریلوے لائن عبور کی جاسکتی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ اس وقت میں ہی نہیں جیپ میں موجود ہر شخص ماسوائے دشمن کارندے کے یہی دعائیں مانگ رہا ہوگا کہ دشمن کی گاڑیاں ریلوے لائن کے دوسری طرف پار ہوجائیں، اور وہی ہوا، قریب سے اور پھر ہمارے سروں کے اوپر سے گزرتی گاڑیوں کا شور جس تیزی سے ابھرا تھا، اسی تیزی کے ساتھ معدوم بھی ہوگیا۔ میں نے سکھ کی سانس لی تھی۔

میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے سلیم سے کہا۔ ''اس سوٗر کا گلا دبوچ کر اس کی لاش ادھر ہی پھینک دو تاکہ ہم آگے بڑھ جائیں۔''

میرے سفاک جملوں کی بازگشت یقینی طور پر دشمن کارندے کی سماعتوں تک بھی پہنچی تھی، میرا مقصد بھی یہی تھا، میری توقع کے عین مطابق وہ دست بندھے ہونے کے باوجود بےچینی سے بڑبڑانے لگا۔ موت کا خوف یکدم اس پر طاری ہوگیا تھا۔ منہ میں رومال ٹھونسا ہوا ہونے کے باعث وہ بول تو نہیں سکتا تھا، مگر بے ہنگم اور لایعنی سی آوازیں ضرور برآمد ہونے لگیں۔ جن کا مفہوم بغیر ادائیگی کے یہ سمجھ آتا تھا کہ وہ ہم سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میرے حکم پر سلیم اس پر جھپٹ پڑا۔ لڑکیاں چیخیں، میں نے انہیں ڈانٹ کر خاموش ہونے کا کہا اور سلیم سے بولا۔ ''ٹھہرو، تم اِدھر آؤ۔''

سلیم میری سیٹ پر آیا اور جیپ کے اندر ہی ہم نے سیٹوں کا تبادلہ کیا۔ میں دشمن کارندے کے پاس جا بیٹھا۔

قابلِ رحم

ایک صاحب: ''میں نے دو شادیاں کیں لیکن دونوں بیویاں مرگئیں، اب کیا کروں؟''
دوسرا: عورت ذات پر رحم۔''

تھوڑی دیر بعد سب لوگ میری چالاکی سمجھ کر خاموش ہوگئے جب میں نے دشمن کارندے کے منہ سے رومال کا گولا کھینچ کر باہر نکالا اور اس سے شکیلہ کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔

پہلے میں نے اس پر موت کی دہشت سوار کرنا چاہی تھی، یہ میں نے دانستہ کیا تھا۔ یہ ساری کارروائی اس اندھیری پلیا کے نیچے ہورہی تھی۔

''کک... کون شکیلہ؟ میں اس نام کی کسی لڑکی کو نہیں جانتا۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ میری اصلیت اور میری خوف ناک کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد وہ مجھ سے خاصا دہشت زدہ تھا۔

''ہاں! یہ شاید مجھے ہی کرنا پڑے گا...۔'' میں اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کا گولا بنانے لگا۔ وہ دہشت زدہ ہوگیا۔

''مجھے مت مارو، میں بیوی بچوں والا ہوں۔'' وہ گھگیانے لگا۔

''تو نے ہمارے لیے بڑی مصیبت کھڑی کردی ہے۔ اپنے ساتھیوں کو فون پر اطلاع دے کر انہیں ہمارے پیچھے لگوایا۔ ویسے بھی ہم تجھے کہاں لیے لیے پھریں گے؟ یہ گاڑی بھی چھوڑنا چاہتے ہیں، تجھے اپنے ساتھ لیے جانے کا رسک نہیں لے سکتے۔ اب تک جتنی گناہ آلود زندگی تو نے گزاری، وہ بہت ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے رومال کا گولا اس کے جبڑے کو دبوچ کر اندر ٹھونسنا چاہا تو وہ آخری بار منت کرتے ہوئے بولا۔

''دے...'' دیکھو اس سارے دھندے میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو صرف حکم کا غلام تھا اور بس۔''

''اچھا۔'' کہتے ہوئے میں نے رومال اس کے منہ میں ٹھونسنے والا عمل روک دیا اور دانستہ کچھ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

''تو پھر میری ایک شرط پوری کرو۔''

''کک... کون سی شرط؟ میں تمہاری ہر شرط پوری کرنے کو تیار ہوں۔''

''مجھے چکر دینے یا بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرنا، کیونکہ مجھے پہلے ہی سے بہت سی باتوں کا علم ہے۔''

میں گھما پھرا کر پانسے پھینکنے لگا۔ ”مجھے ذرا بھی شبہ ہوا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو تو تمہارا گلا دبانے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”پپ... پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ بالآخر اس نے بھینچے بھینچے لہجے میں کہا۔

میں نے اسلم سے گاڑی کی اندرونی لائٹ ذرا دیر کو جلانے کے لیے کہا۔ کھڑکیوں کے شیشے ہم نے چڑھا لیے تھے، کیونکہ گندے نالے کی اس پلیا کے نیچے مچھر بھنبھنا رہے تھے۔

اب میں دشمن کارندے کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھ سکتا تھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”دشمن خان۔“

”ان لڑکیوں میں ایک شکیلہ نام کی لڑکی بھی تھی، تم یقیناً اسے پہچانتے ہو گے کیونکہ ان کی رکھوالی کے لیے تم ہی فارم ہاؤس میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ متعین تھے، مجھے بتاؤ شکیلہ کہاں ہے؟“

اپنے سوال کے اختتام پر میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے پہ جما دیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری پھر بولا۔ ”شش... شکیلہ“

”ہاں! شکیلہ... صحت مند سی اور گوری لڑکی جس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے، اور نقوش تیکھے تھے، میرے دوست کی بہن ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تو اگلی سیٹ سے اسلم کی آواز آئی۔

”سر! اس سے جو پوچھنا ہے جلدی پوچھ لیں، زمین کچی ہے زیادہ دیر کھڑے رہے تو جیپ کے ٹائر دھنس جائیں گے، وزن بہت ہے اس پر اور یہ موقع بھی اچھا ہے نکلنے کا۔ دشمن آگے جا چکے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بس چند منٹ اور... اس نے سچ بولا تو اسے یہیں اتار کر آگے بڑھ جائیں گے، ورنہ ادھر ہی پھینک جائیں گے، لاش کی صورت میں۔“ آخری الفاظ میں نے دانستہ سفاکانہ انداز میں کہے تھے، حالانکہ میرا اسے جان سے مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

”ہاں جلدی بولو مگر سچ۔ وقت کم ہے۔ شکیلہ کہاں ہے۔“ میں دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا... ”شکیلہ کو راجا صاحب نے مٹھو خان کے حوالے کیا تھا۔“

”مٹھو خان......؟“ میں سوالیہ انداز میں بڑبڑایا۔ ”یہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ کیا شکیلہ ابھی تک اس کے قبضے میں ہے؟“

”ہاں... ابھی تھوڑے دن پہلے ہی مٹھو خان کے آدمی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔“

”راجا نے ہی سودا کیا تھا؟“

”ہاں...“

”دوسرے سوال کا جواب دو۔“

”مٹھو خان خوب صورت اور کم عمر لڑکیاں خرید کر اندرون سندھ کے بیوپاریوں کو سپلائی کرتا ہے۔ اور وہ چک چھیالیس میں رہتا ہے۔“

”چک چھیالیس؟“ میں چونکا۔ کیونکہ ہم اس وقت چک اڑتالیس میں موجود تھے۔

”اس کا مطلب ہے، وہ جگہ یہاں سے قریب ہے؟“

”ہاں۔“

”تم کیسے یقین سے کہہ سکتے ہو کہ شکیلہ ابھی تک اس کے قبضے میں ہو گی؟“

”مٹھو خان پوری کھیپ بنا کر روانہ کرتا ہے۔ جو ابھی اتنی جلدی پوری نہیں ہوئی ہو گی۔“

”اب سن میری بات... دشمن!“ میں نے آخر میں موضوع لپیٹتے ہوئے کہا۔

”ایک بار پھر سوچ لے کہ تو نے جھوٹ تو نہیں بولا۔ کیونکہ جب تک... تیری باتوں کی تصدیق نہیں ہو جائے گی تو میرے ساتھیوں کے قبضے میں ہی رہے گا۔ ٹھیک ہے پھر...؟“

”میں نے سولہ آنے سچ کہا ہے۔“ وہ بولا۔ ”مگر... مجھے تو چھوڑ دو۔“

”فکر مت کرو۔ میں اپنے وعدے سے نہیں مکرتا۔ ویسے بھی میری تجھ سے دشمنی نہیں ہے۔ لیکن اگر میری محنت تیرے جھوٹ بولنے کی وجہ سے اکارت گئی تو پھر تجھے گلا دبا کر نہیں اذیتیں دے کر ماروں گا۔“

”اگر تم مجھے زندہ چھوڑنے کا وعدہ کر ہی چکے ہو تو فکر نہ کرو۔ میں نے سچ ہی بتایا ہے۔“

”چک چھیالیس تک تو مجھے مٹھو خان کے ٹھکانے تک پہنچائے گا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے فوراً سلیم کو پیچھے آنے کا کہا اور پھر دشمن کو لیے اگلی سیٹ پر آ گیا۔ اسلم نے فوراً جیپ اسٹارٹ کر کے ریورس کی، اس کا خدشہ

درست ثابت ہونے لگا تھا، نالے کی کیچڑ زدہ زمین پر جیپ کے ٹائر دھنسنے لگے تھے۔ مشکلوں سے جیپ کو باہر نکالا اور آگے بڑھ گئے۔

دشمن اب میرے اور اسلم کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی جانب بندھے رہنے دیے تھے۔ میں نے اسلم سے پوچھا۔

”تم اب کہاں سے ملتان کے لیے نکلو گے مگر اس جیپ سے چھٹکارا پانا بھی ضروری ہے۔“

اس نے مختصراً مجھے محل وقوع سے آگاہ کیا۔

”مجھے چک چھیالیس پر اتار دینا۔ کتنی دور ہے یہاں سے؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سامنے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔

”آپ کو ہم اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ بڑے استاد کا حکم ہی نہیں بیگم صاحبہ کا بھی حکم ہے۔“

”میں اس وقت کسی کے حکم پر یہاں نہیں ہوں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے کس وقت کیا کرنا ہے یہ میں ہی بہتر جانتا ہوں۔“ پھر میں دشمن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اسے راستہ بتاتے چلو۔“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

جیپ تاریک کچے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، کھیتوں اور کچے پکے مکانوں کی آبادی کا مختصر سلسلہ پار کرنے کے بعد چٹیل میدان آ گیا۔ یہ سفر پندرہ سے بیس منٹ میں طے ہوا اور پھر کھیتوں کا سلسلہ آ گیا۔ اس کے بعد باقاعدہ آبادی کے آثار نظر آنے لگے، جیپ کی ہیڈ لائٹ میں راستہ مجھے خاصا کھردرا اور ناہموار نظر آیا۔ یہی سبب تھا کہ جیپ بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ اسلم نے اس کی رفتار فوراً کم کر دی۔

”چک چھیالیس کی حدود شروع ہو گئی ہے۔ اب اس طرف جیپ موڑ لو۔“ دشمن نے ایک طرف اشارہ کیا تو اسلم نے فوراً جیپ اس جانب موڑ لی۔

”سر! گاڑی میں فیول کم ہو رہا ہے۔“ اسلم نے ڈیش بورڈ پر نظر ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”مٹھو خان کا ٹھکانا کتنی دور ہے؟ اس کا محل وقوع بتاؤ۔“ میں نے اسلم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے دشمن سے پوچھا تو وہ بتانے لگا۔

”بس... سامنے اس راستے پر ایک گودام نما عمارت نظر آئے گی، یہ راستہ اب پختہ سڑک میں بدلنے والا ہے جو درحقیقت آبادی کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے۔ دائیں جانب وہ عمارت ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ مٹھو خان نے شکیلہ کو ادھر ہی رکھا ہو گا؟“

”امید تو یہی ہے۔“

”مٹھو خان کی رہائش بھی اس عمارت میں ہے؟“

”اس کی رہائش کا مجھے علم نہیں ہے۔ مگر ٹھکانا اس کا یہی ہے۔“

”اس کے آدمی ہوں گے؟“

”ہاں!“

”کوئی خاص آدمی؟“

”اس کے سارے ہی آدمی خاص ہیں۔“

”یہ والی عمارت ہے۔“ اس نے ونڈ اسکرین سے دائیں جانب اشارہ کیا۔ اسلم غیر ارادی طور پر جیپ روکنے لگا مگر میں نے منع کر دیا۔ کچھ آگے جا کر میرے کہنے پر اس نے جیپ روک لی۔

چک چھیالیس ایک چھوٹا شہر نما قصبہ ہی نظر آتا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے، کم ہی لوگ آتے جاتے نظر آئے، مکان دکانیں اور ان کے درمیان بنی ہوئی ٹیڑھی گلیاں نظر آ رہی تھیں۔ دکانیں بیشتر بند تھیں۔ کچھ ہوٹل یا چائے خانے کھلے تھے، ان میں کچھ لوگوں کا رش نظر آتا تھا۔

میں نے اسلم کی طرف دیکھا۔ وہ میری اگلی مہم پر خاصا فکر مند سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”اسلم! میں یہاں اتروں گا تم لڑکیوں کو ملتان کے کسی دارالامان میں پہنچانے کی کوشش کرنا۔ یہ تمہارا اور بیگم صاحبہ کا مجھ پر احسان ہو گا۔ یہاں تمہیں کوئی پمپ نظر آ جائے گا۔ فیول بھروا کر نکل جاؤ۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”بیگم صاحبہ نے ہمیں آپ کے لیے خاص ہدایت دے کر بھیجا تھا کہ آپ... کو...“

”اسلم۔“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہم سب اس وقت خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ خطرہ تمہیں ہے۔ بیگم صاحبہ سے میرا سلام کہنا اور اس وعدے کے ساتھ کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر ملتان آ کر ان سے ضرور رابطہ کروں گا۔“ پھر میں دشمن سے مخاطب ہو کر بولا۔

”دشمن! اگر تم اللہ کو مانتے ہو تو اس کے نام کی قسم کا یقین بھی کرو گے کسی کا آلہ کار نہیں ہوں، ایک معمولی انسان ہوں.... میں نے تمہارے شفقت راجا کا قتل نہیں

کیا نہ ہی میری ان سے دشمنی ہے... بس! مجھے تم سے اتنا ہی کہنا تھا، یہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

''اسلم! اسے کل تک اپنے ساتھ رکھنا۔ اس دوران میں، میں پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ نہیں پہنچ سکا تو بھی اسے چھوڑ دینا۔ کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔'' اسلم ابھی تک سخت تذبذب کا شکار تھا اور میں اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ لڑکیاں بھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نگاہوں میں میرے لیے احترام و شکر گزاری تھی۔ میں نے ان کے سلسلے میں اسلم کو ہدایت کردی کہ انہیں فوراً کسی دارالامان میں پہنچانے کی کوشش کرے یا پھر جہاں یہ اپنی مرضی سے جانا چاہتی ہیں جانے دیا جائے۔

اسلم نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر جیپ کی باڈی تھپتھپادی اور دور ہٹ گیا۔ ناچار اسلم نے جیپ آگے بڑھادی۔ میں چند ثانیوں تک جیپ اور دور ہوتی بیک لائٹ کو تکتا رہا۔ اس کے بعد میں پلٹا اور... مذکورہ عمارت کی جانب بڑھنے لگا۔

رات گہری ہورہی تھی۔ گردوپیش میں سناٹا طاری تھا... عمارت پر بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ جب میں نزدیک پہنچا تو مجھے اس کے داخلی دروازے پر ایک آدمی سگریٹ پیتا دکھائی دیا۔ وہاں ایک دیوار پر نصب بلب روشن تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا اور اسے سلام کیا۔ وہ اونگھتا ہوا سا محسوس ہورہا تھا۔ میرے مخاطب کرنے پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری جانب تکنے لگا۔

''مجھے استاد مٹھو خان سے ملنا ہے۔''

وہ بہ غور آنکھیں سکیڑ کر میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو اور استاد سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟''

''دام اور کام کے سلسلے میں آیا ہوں، نام میرا ولی بھائی ہے۔ اوکاڑہ سے آیا ہوں۔'' میں نے دانستہ معنی خیز مسکراہٹ سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''مگر استاد تو یہاں نہیں ہے لاہور گیا ہوا ہے۔ دو روز بعد لوٹے گا۔'' وہ بولا۔'' کیا تم نے فون پر ان سے رابطہ نہیں کیا؟''

''میں پہلی بار مٹھو خان سے ملنے آیا ہوں۔ اوکاڑہ کے ایک بڑے زمیندار چوہدری مشتاق نے مجھے بھیجا ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ مٹھو خان نہ ہو تو اس کے کسی ساتھی سے بات کرلینا۔ اندر کوئی تو موجود ہوگا؟'' میں نے چالاکی سے کہا اور اندر کا جائزہ لیا۔ وہاں مجھے کوئی گاڑی وغیرہ کھڑی نظر نہیں آرہی تھی جس کا مطلب تھا کہ میدان صاف ہے، وہ میری بات کے جواب میں بولا۔

''ہاں! تم اِدھر ہی ٹھہرو... میں ذرا اندر بتا کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹا اور عمارت کے اندر غائب ہوگیا۔ میں کھڑا رہا اور عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی، نظر تو گودام ہی کی طرح آرہی تھی، مگر ایک دو مختصر سے رہائشی کمرے چھوٹے سے برآمدے میں نظر آرہے تھے۔ اندر سے ایک ٹھگنے قد کا آدمی نمودار ہوا، پہلا آدمی اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے میرے بارے میں ہی بتا رہا تھا۔ مڑ کر اس نے میری جانب اشارہ بھی کیا تھا۔ اس پر ٹھگنے آدمی نے اس طرف ایک نظر دیکھا بھی تھا، پھر وہ اس کے ہمراہ میری طرف آنے لگا۔ میں سنبھل کر کھڑا رہا۔ میرے قریب آکر وہ غور سے میرا چہرہ دیکھنے لگا پھر پوچھا۔

''ہم کسی چوہدری مشتاق کے آدمی کو نہیں جانتے ہیں۔ تمہیں استاد مٹھو کے بارے میں کس نے خبر دی ہے؟''

''تم نہیں جانتے ہوگے، مگر تمہارا استاد ضرور چوہدری صاحب کو جانتا ہوگا۔ ایک دانے کے بارے میں چوہدری صاحب کی ان سے بات ہوچکی ہے۔ اب مجھے چوہدری صاحب نے رقم دے کر بھیجا ہے۔''

''دانہ...؟'' کہتے ہوئے وہ بغور میرا چہرہ تکنے لگا۔

اس کے اس انداز سے میرے اندر خدشات ابھرے کہ کہیں شمن نے مجھ سے کسی قسم کا جھوٹ تو نہیں بولا تھا مگر وہ ایسی جرأت کیسے کرسکتا تھا۔

''کتنے پیسے لائے ہو؟ اور کون سا دانہ چاہیے۔'' معاً ٹھگنے نے مسکرا کر پوچھا اور میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

''5 لاکھ لایا ہوں شکیلہ نام کی لڑکی کے بارے میں بات ہوئی تھی، جو شفقت راجا سے خرید کر استاد لایا تھا۔''

مجھے اپنی بات میں وزن اور حقیقت پیدا کرنے کے لیے مجبوراً یہ کہنا پڑا۔

''شکیلہ...! لیکن ... خیر... آؤ... میرے ساتھ۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا پھر مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوا تھا، مجھے وہیں لے گیا۔ کمرا مختصر سا تھا۔ ایک پلنگ اور چارپائی بچھی ہوئی تھی، درمیان میں چار کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ اندر پہلے سے موجود دو آدمی تاش کھیل رہے تھے، کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ ایش ٹرے میں بجھے ہوئے سگریٹ پڑے تھے، تھوڑی دیر پہلے تک وہ شاید سگریٹ پی رہے تھے۔

دونوں نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی، پھر کھیل میں مگن ہوگئے، ٹھگنا آدمی مجھے لیے کرسیوں پر جا بیٹھا پھر بولا۔

''جس لڑکی کا تم نے نام لیا ہے اس کا سودا کرنے کے لیے ہی استاد مٹھو لاہور گیا ہوا ہے۔ مگر حیرت ہے تمہارے چوہدری... کیا نام بتایا تھا؟''

''مشتاق صاحب... چوہدری مشتاق'' میں نے کہا۔

''ہاں کیا اس نے استاد مٹھو سے بات نہیں کی تھی فون وغیرہ پر؟''

''میں نے بتایا نا کہ چوہدری صاحب سے استاد کی براہِ راست کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے موقع محل کے مطابق بات کو گھمانے پھرانے کی کوشش کی ...''شفقت راجا کے ذریعے سے بات ہوئی تھی، جن سے تمہارا استاد مٹھو شکیلہ کو خرید کر لایا تھا... مگر بدقسمتی سے پرسوں ان کا قتل ہوگیا... لیکن تمہارا استاد یہی سمجھا ہو کہ ان کی موت کے بعد یہ سودا بھی ختم ہوگیا۔''

''ہاں! یہ بات تو ہمارے علم میں بھی ہے۔'' وہ ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ وہ شفقت راجا کے قاتل کی حیثیت سے پہچان نہ لے۔ کیونکہ میرے کلوزاپ چہرے کی ویڈیو ہر چینل پر دکھائی گئی تھی، مگر... ضروری نہ تھا کہ ہر خاص و عام کو میری صورت یاد رہتی اور پھر اسکرین اور حقیقت میں تھوڑا فرق یوں بھی آہی جاتا ہے۔ شکر تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا ابھی تک۔

''شکیلہ تو اِدھر ہی ہے نا؟'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھ لیا۔ ''میرا مطلب تھا، اگر ہے تو ہم آپس میں سودا طے کرلیتے ہیں۔ بے شک تم اپنے استاد سے بھی فون پر بات کرلو۔''

''لڑکی تو ادھر ہی ہے۔ اور صرف اب وہ ہی بچی ہے مگر یہ بہت ٹیڑھی ہے دو بار خودکشی کی کوشش کرچکی ہے۔ استاد تو اسے خرید کر پچھتا رہا ہے۔ ایسی لڑکیاں ہمارے لیے مصیبت کھڑی کردیتی ہیں۔ تم میرے ساتھ سودا کرلو۔ بعد میں، میں استاد سے بات کرلوں گا۔ رقم لائے ہو؟'' اس نے کہا۔ پانچ لاکھ کی رقم کا سننے کے بعد اس کا رویہ بدل گیا تھا۔

''رقم میرے پاس موجود ہے مگر میں پہلے اپنے مطلب کا دانہ پرکھنا چاہوں گا۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی دھڑکتے دل سے... اس کے ساتھ ہولیا۔ کمرے سے باہر آکر ہم ساتھ والے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میرا خیال تھا وہ کمرے میں داخل ہوگا۔ مگر وہ اس کے سامنے سے گزرتا ہوا ایک نسبتاً بڑے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

میری کچھ جھوٹی سچی باتوں نے اسے مجھ پر بھروسا کرنے پر مجبور کردیا تھا۔ ظاہر ہے شفقت راجا کا حوالہ کم نہ تھا۔ تاہم مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ شکیلہ یہاں موجود تھی، مگر یہ سن کر دکھ بھی ہوا تھا کہ وہ بے چاری کس حال میں تھی، اور دو بار خودکشی کی کوشش بھی کرچکی تھی، کیونکہ میں جانتا تھا شکیلہ ایک شریف زادی تھی۔

لڑکیوں اور عورتوں کی سوداگری کرنے والے کس طرح درونِ خانہ اپنا مکروہ کاروبار چلا رہے تھے، مجھے اس کا بہت قلق تھا۔ ان کی بیخ کنی کرنا انتظامیہ کا کام تھا۔ جو نجانے کیوں اپنے اس فرض سے پہلوتہی کیے ہوئے تھے۔ اپنی مہم کے دوران مجھے اب تک یہی پتا چلا تھا کہ ایسی مجبور لڑکیاں زیادہ تر محبت کے جھانسے میں آکر برباد ہوتی ہیں۔ یہ بھیانک انکشاف بھی میری عملی جدوجہد میں آشکارا ہوا تھا کہ بعض فلاحی اداروں یعنی دارالامان سے ایسی مجبور پناہ گزین لڑکیوں کو حاصل کیا جاتا رہا ہے۔

بہرحال میں نے اپنی شرٹ کے اندر پینٹ کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کی موجودگی کا اطمینان کیا۔ تب وہ ٹھگنا آدمی مجھے لیے مذکورہ گیٹ نما دروازے سے لے کر اندر داخل ہوا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے ہاتھ سے کوئی سوئچ بورڈ ٹٹول کر بٹن آف کیا۔ روشنی ہوتے ہی مجھے آس پاس اناج اور کھاد وغیرہ کی بوریوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ البتہ سامنے کی دیوار سے ایک کونے میں ایک سنگل پٹ والا دروازہ دکھائی دیا تھا جو بند پڑا تھا۔ ٹھگنا آدمی اس طرف بڑھا تھا اور میں اس کے پیچھے تھا۔

دروازے پر تالا نصب تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر اسے کھولا اور اندر داخل ہوا۔ مجھے اس نے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا۔

اندر ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ اس روشنی میں مجھے ایک کونے میں ننگی اینٹوں کے فرش پر کوئی لڑکی ہاتھ پاؤں بندھی بے سدھ پڑی دکھائی دی۔ میں اس کی وضع قطع سے ہی اسے پہچان گیا تھا۔ وہ میرے دوست شوکت حسین عرف شوکے کی بدنصیب بہن شکیلہ ہی تھی۔ میرا دل خون کے

آنسو رو پڑا۔ وہ واقعی شکیلہ ہی تھی، میرے اطفال گھر کی ساتھی۔ میری طرح لاتعداد بدنصیب اور ٹھکرائے ہوئے بچوں کی ہم جولی۔ جو اطفال گھر میں ہی پرورش پاکر جوان ہوئے تھے۔ میں نے عقب میں آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔

''چل اے اٹھ حرام زادی! بہت ڈرامے کر لیے تو نے۔'' ٹھگنے آدمی نے شکیلہ کے جسم کو پاؤں سے ٹھوکر مار کر حقارت سے کہا تو میرے وجود میں چنگاریاں بھرنے لگیں۔ شکیلہ شاید کچھ کچی نیند میں تھی، بے چاری یکدم ہڑبڑا کر اٹھی۔ پہلے اس نے ٹھگنے آدمی پر نگاہ ڈالی، پھر مجھ پر اور جیسے گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ تب تک ٹھگنا آدمی میری طرف پلٹ کر بولا۔

''پہچان لو۔ اچھی طرح سے اپنا دانہ... پھر باہر نکل کر سودا کرتے ہیں۔''

''ہاں، ہے تو وہی۔'' میں نے اپنے اندر کے ابال پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا اور پھر۔ ''فکر نہ کرو ادھر ہی سودا کر لیتے ہیں۔ اپنے پیسے لو... اور دانہ اسی وقت میرے حوالے کر دو۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے کھلے بٹنوں والی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ اس دوران حسب توقع شکیلہ مجھے دیکھ کر چلا اٹھی۔

''شہزی! تم...''

ٹھگنے آدمی کو زبردست حیرت کا جھٹکا لگا۔ تب تک میرا ہاتھ پستول سمیت باہر آچکا تھا۔ اور میں نے وہ اس پر تان کر درندگی سے کہا۔

''تم نے اگر ذرا بھی آوا نکالی تو گولی تمہارا بھیجا پھاڑ دے گی۔'' ٹھگنے آدمی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ شکیلہ مجھے پہچان کر شدت جذبات سے رونے اور سسکنے لگی، میں نے اسے خاموش رہنے کی تاکید کی، پھر ٹھگنے آدمی کی تلاشی لی، اس کی جیب سے ایک چاقو برآمد ہوا، یہ عام پھل کاٹنے والا چاقو تھا، جس کی مدد سے میں نے پہلے شکیلہ کے ہاتھ کی رسی کاٹی اور پھر چاقو اسے تھما دیا تاکہ وہ اپنے پیروں کی رسی بھی کاٹ ڈالے۔ میں نے ٹھگنے پر پستول تانے رکھا تھا۔ وہ بے بسی سے بری طرح پیچ و تاب کھاتا نظر آرہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شکیلہ آزاد تھی۔ میں نے ٹھگنے آدمی کو اس کمرے میں بند کر دیا پھر شکیلہ کو لیے باہر آگیا۔

پستول دوبارہ اپنی جگہ اڑس لیا، باہر وہی آدمی بیٹھا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''جاؤ، اندر جا کر اپنا انعام وصول کر لو اپنے ساتھی سے، سودا ہو گیا ہے۔'' وہ فوراً اندر دوڑا اور میں شکیلہ کو لیے ایک طرف تاریکی میں بڑھتا چلا گیا۔

☆☆☆

شکیلہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی، اس کے کپڑے بری طرح مسخ ہو چکے تھے، چہرے اور ہاتھوں پیروں پہ بھی خراشوں کے نشانات تھے۔ بال بھی بکھرے ہوئے سے تھے۔ اول خیر نے مجھے کچھ روپے دے رکھے تھے، شکیلہ کے ساتھ فی الحال تفصیلی بات چیت کا موقع نہ تھا۔ میں اب اسے جلد از جلد یہاں سے ملتان لے جانا چاہتا تھا۔ پھر سرمد بابا کے ہاں اسے چھوڑنے کے بعد میرا ارادہ ''بیگم ولا'' جانے کا تھا۔ مجھے اول خیر کی خیریت بھی معلوم کرنا تھی۔

شکیلہ اور میرے درمیان البتہ مختصر بات چیت ہوئی تھی اور وہ میری بے حد ممنون تھی۔

میں بائی روڈ ملتان جانے کے بجائے کسی ٹرین وغیرہ کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔ مجھے عابدہ کی بھی فکر تھی، اب تک اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اور سرمد بابا یقیناً میری طرف سے فکر مند اور پریشان ہوں گے۔ کوئی بعید نہیں، انہوں نے ٹی وی پر میری ویڈیو کلپ بھی دیکھ لی ہو۔

بلاشبہ مجھے احساس تھا کہ میں بہت سارے مسائل اور مصائب کا شکار ہو چکا ہوں۔ زبیر خان مجھے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھ رہا تھا، اور سب سے بڑی پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ چوہدری الف خان اور ممتاز خان کا دوست تھا۔ اور میں خود ان دونوں کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا، میرا مقدمہ ملتان کی عدالت میں تھا، اور اب ممتاز خان وغیرہ کو میرے خلاف خم ٹھونکنے کے لیے زبیر خان کے ذریعے بڑا سہل راستہ ہاتھ آیا تھا۔ ملتان میں یقیناً گمبھیر مسائل اور پریشانیوں کا ایک انبار میرا منتظر تھا۔ کوئی بعید نہ تھی کہ پولیس میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہو۔

شکیلہ میرے چہرے کے پریشان کن تاثرات بھانپ کر اس کی وجہ پوچھ رہی تھی مگر میں ابھی اسے کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

کسی سے پوچھ تاچھ کر ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے تو انکوائری آفس سے معلوم ہوا کہ رات بارہ بجے ایک لوکل پسنجر ٹرین یہاں سے خانیوال روانہ ہو گی۔ اس وقت ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے، ٹرین کے آنے میں بیس پچیس منٹ تھے، میں نے خانیوال کے دو ٹکٹ لیے اور پلیٹ فارم

[illegible] کی [illegible] تھا

''[illegible] تم [illegible] پریشان [illegible] نظر [illegible]''

[illegible] پریشانیاں [illegible] بولا۔ ''کوئی خاص بات نہیں، بس ایک ہی فکر ہے کہ تمہیں تمہارے بھائی شوکت حسین کے پاس پہنچا دوں۔''

''میں اب اپنے بھائی کا سامنا نہیں کرسکتی۔'' وہ بولی اور بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ چہرے پہ رکھ کر رو پڑی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا جواب اس کے آنسو اور سسکیاں کافی تھیں، میں بے اختیار ایک سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ عورت کچا برتن ہوتی ہے اور توڑنے والے ظالم ہاتھ بہت طاقت ور... جب تک وہ اطفال گھر کی چہار دیواری میں تھی، وہ اور اس کی عزت محفوظ تھی، مگر اس کی بدقسمتی تھی کہ واصل جہنم گگل خان نے دیگر پانچ لڑکیوں کے ساتھ اس کا بھی سودا کیا تو پھر یہ بدنصیب شکیلہ نجانے کہاں سے کہاں پہنچادی گئی۔ اب شاید میں اس کی جان ہی بچاسکا ہوں یا پھر اسے اس جہنم سے نکال پایا ہوں۔ لیکن اس کے آنسو اور سسکیاں جو اس کی کھوئی ہوئی عزت کا پتا دیتے تھے، اس کے لیے شاید جان سے بڑھ کر تھی کہ وہ اپنے بھائی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے افسوس ہے شکیلہ۔ مجھ سے جو ہوسکا میں نے تمہاری خاطر کیا۔ تم شاید نہیں جانتی ہو کہ... میں نے اس نیک مقصد کے حصول کی خاطر کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی ہوگی... اس دوران ایک بڑی مصیبت کا بھی شکار ہوا، ابھی تم نے مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میں اتنا پریشان کیوں نظر آرہا ہوں... تو اس مصیبت اور مشکل حالات کے باعث ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا اور پھر دھیرے دھیرے اسے ساری بات بتادی۔ یہ سن کر اس کے حلق سے پہلے سے زیادہ تکلیف دہ آہ برآمد ہوئی، پھر اس نے دھیرے سے میرے شانے کو اپنے ہاتھ سے چھوا تو میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے میرے لیے تشکرانہ جذبات عیاں تھے۔ مگر اس کے پردے میں آزردگی اور دکھ کے بھی آثار محسوس ہوتے تھے۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

''ہماری خاطر تمہیں اپنے سر کتنی بڑی مصیبت مول لینا پڑی، شہزی! یہ احسان میں اور شاید وہ کم نصیب لڑکیاں کبھی نہیں بھلاسکتیں۔ مگر مجھے دکھ کے ساتھ تشویش بھی لاحق ہوگئی ہے کہ اب تم کس طرح اس پریشانی سے نجات حاصل کروگے؟''

''تمہارے ساتھ کس نے زیادتی کی تھی؟'' یکلخت میں نے پوچھ لیا۔ اس کا سوال میں نے نظرانداز کردیا تھا۔

''ان میں سے کچھ کو تم جہنم واصل کرچکے ہو۔'' اس نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ''لیکن میری زندگی برباد کرنے والا... ممتاز خان ہی تھا۔ اطفال گھر سے گگل خان نے ہمیں سب سے پہلے ممتاز خان کے حوالے ہی کیا تھا۔ اس وقت عابدہ بھی ہمارے ساتھ تھی! بدقسمتی سے میں اور عابدہ... اس عیاش ...کو زیادہ پسند آگئی تھیں۔''

''کک... کیا... عابدہ... بھی...؟''

عابدہ کے ذکر پر میرے دماغ کی نسیں کھنچ گئیں اور میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر دھڑکتے دل سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔''

اس کی نفی پر میں یکلخت پُرسکون سا ہوگیا۔ عابدہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ کیونکہ میں نے اس ''خدشے'' کے بارے میں اس سے بھی پوچھا تھا اور اس نے مجھے تسلی دی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں پھر مستفسرانہ نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''ممتاز خان کی کمزوری تھی کہ وہ عیاش پرستی میں زبردستی کا قائل نہ تھا۔ بڑی عجیب فطرت کا آدمی تھا وہ مگر شیطان کا دوسرا روپ ضرور تھا۔ جبکہ میں اور عابدہ کسی بھی صورت میں اس کی عیش پرستی کا سامان نہیں بننا چاہتی تھیں۔ اور اس کے سامنے خودگزیدگی اختیار کرنا چاہی تو اس نے ہم پر تشدد کیا۔ مگر اس شیطان کو اس بات کا بھی احساس ہوچکا تھا کہ میں اور عابدہ ایک دوسرے کی قریبی سہیلیاں اور دکھ درد کی ساتھی ہیں۔ اس نے مجھے عابدہ کے حوالے سے بلیک میلنگ کا سہارا لیا اور دھمکی دی کہ اگر میں اس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں اس کی دلبستگی کا سامان کروں تو وہ عابدہ کو کچھ نہیں کہے گا۔ بصورت دیگر وہ اسے اپنے وحشی درندوں کے حوالے کردے گا۔ عابدہ کو میری اس قربانی کا پتا بھی نہیں، لیکن میں نے ممتاز خان کی بات مان لی اور عابدہ کی عزت بچالی ... وہ عابدہ کو چھوڑنے پر بھی رضامند ہوگیا تھا۔ میں نے شرط رکھی تھی کہ جب تک عابدہ آزاد ہونے کے بعد مجھے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دے گی میں اس کی (ممتاز خان کی) بات نہیں مانوں گی، دوسرے روز ممتاز خان نے مجھے خود ہی بتادیا کہ عابدہ کو تمہارے کچھ ساتھی، کارندوں کے چنگل سے چھڑالے گئے ہیں۔ کچھ ایسی نشانیاں اور شواہد جانچنے کے بعد مجھے تسلی ہوگئی تھی کہ اب عابدہ تمہارے پاس بہ خیر و عافیت پہنچ چکی تھی... اس کے بعد میں ممتاز خان کے لیے صرف ایک کھلونا بن کر رہ گئی۔ پھر جب اس کا دل بھر گیا تو مجھے اس نے اوکاڑہ کی ایک نائکا چنی بائی کے ہاتھ فروخت کردیا۔ وہاں سے پھر میرا دوگنے داموں سودا کرادیا گیا اور میں شفقت راجا کے پاس پہنچادی گئی، اور وہاں سے مٹھو خان کے پاس۔

اپنی المناک داستان سنانے کے بعد وہ گردن موڑ کر پلیٹ فارم کے ایک تاریک ویران گوشے کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے اندر ایک جوار بھاٹا سا بیدار ہونے لگا۔ دل ودماغ آندھیوں کی زد میں تھا۔ شکیلہ نے میرے اور عابدہ کے لیے عظیم اور ناقابلِ فراموش قربانی دی تھی، خود کو فنا کر کے عابدہ کو پراگندگی سے بچایا تھا۔ ایسی مثال قربانی تو اب خال خال ہی نظر آتی تھی۔ آج کل کون دوسرے انسان کے لیے اتنی بڑی قربانی دیتا ہے۔ میں نے اب تک شکیلہ کے لیے جو پریشانی اور مصیبت اٹھائی تھی، وہ تو مجھے اس عظیم لڑکی کے سامنے بالکل ہی ہیچ محسوس ہونے لگی۔ شکیلہ کے اس قابلِ لحاظ عمل اور انسانیت پرور قربانی سے میرا دل ودماغ اس کے لیے وفورِ جذبات سے جھیر جھیر ہونے لگا۔

''شکیلہ۔'' میں نے جب اسے ہولے سے پکارا تو میری آواز میں بے حد لرزش تھی۔

وہ ابھی تک تاریک پلیٹ فارم کے ایک ویران گوشے میں کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے خاموش رہی مگر میں جانتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی تھی۔ میں نے بے اختیار اس کے مرمریں شانے پر ملائمت سے ہاتھ رکھ دیا اور اس نے اپنا سر جھکالیا۔ ایک بار پھر مجھے اس کے ہولے ہولے انداز میں سسکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے دوبارہ دل کی عمیق گہرائی سے اسے پکارا۔

''شکیلہ تم بہت عظیم ہو... تم نے عابدہ کی خاطر گویا میری خاطر... اتنی بڑی سزا جھیلی... اتنی بڑی تکلیف اپنے جسم پر ہی نہیں اپنی روح پر بھی برداشت کی، اس کے سامنے تو مجھ پر آنے والی مصیبت کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی، اور ... اور عابدہ کو بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ تم نے اس کے لیے خود کو کیسے قعرِ فنا میں دھکیل دیا۔ مگر نہیں، یہ قعرِ فنا نہیں یہ تو تمہاری ایک نیکی کی اعلیٰ درجے کی معراج ہے جو تم نے اس طرح کی... کہ گویا اس محاورے کی مثال بن گئی۔ نیکی کر... دریا میں ڈال... اللہ ہی تمہیں اس کا اجر دے گا... شکیلہ... لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ... تمہیں اپنے بھائی شوکت حسین سے ضرور ملنا چاہیے۔ دیکھو... بھائی بہن کا رشتہ بہت عظیم ہوتا ہے۔ یہ دنیا میں صرف ایک بار ہی ملتا ہے۔ وہ بھی بے چارہ تمہارے لیے پریشان ہورہا ہوگا۔''

''شہزی!'' مجھ میں بھائی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پارہی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''پگلی ہو تم۔'' میں نے دوستانہ انداز میں اس کا گال تھپتھپایا۔ ''تمہاری نیکی تمہارے اعمال میں لکھ دی گئی، تم نے کوئی گناہ کوئی جرم نہیں کیا۔ اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا کیا گیا اس میں... تمہارا کوئی دوش نہیں، بس! تم میرے ساتھ چلو... اور سب کچھ بھلادو۔'' میں نے ذرا رک کر ایک گہری سانس خارج کی اور خودکلامیہ انداز میں بولا۔ ''پتا ہے وہاں (اطفال گھر) کے ... کیا حالات ہیں۔ اس کا بھی مجھے پتا کرواتا تھا۔ لیکن تم تب تک... سرمد بابا کے پاس رہوگی، وہ بہت اچھے اور نیک انسان ہیں، عابدہ بھی انہی کے پاس ہے۔ پھر آگے کا سوچیں گے۔''

اتنے میں ٹرین آگئی اور ہم اس میں سوار ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین روانہ ہوگئی۔ چونکہ یہ لوکل پسنجر ٹرین تھی اس لیے ہر چھوٹے بڑے اسٹیشن پر رک ... کر چل رہی تھی۔

رات کے دو بجنے والے تھے، میں نے شکیلہ کو برتھ پر لٹادیا اور خود نیچے سیٹ پر اونگھنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

صبح میاں چنو پہنچے تو ہم نے چائے اور بسکٹ کا ناشتا کیا۔ شکیلہ اب برتھ سے اتر کر میرے سامنے والی سیٹ پر آن بیٹھی تھی۔

ٹرین رک چکی تھی، بوگیوں کو انجن سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔ بوگیوں کی چھت پر ربڑ کے بڑے بڑے پائپوں سے پانی بھرا جارہا تھا۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کا رش تھا۔ اسپیکر پر آنے جانے والی ٹرینوں کا اعلان وقفے وقفے سے ہورہا تھا۔

اسٹیشن پر عجیب منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر طرف گہما گہمی اور افراتفری کا عالم ہوتا ہے۔

ایک نوعمر لڑکا ہاتھ میں اخبارات کے پلندے لیے بوگی میں سوار ہوا۔ تو قریب پہنچنے پر اچانک میری نظر اس کے ایک ہاتھ میں جھولتے ہوئے اخبار کی شہ سرخی پر پڑی اور مجھے گویا سانپ سونگھ گیا۔ میں نے یکدم سنبھل کر ہاکر لڑکے سے وہ اخبار خریدا... شہ سرخی کا لب لباب شفقت راجا کے قتل اور مجھ سے تھا۔ مگر اہم خبر جو جلی حروف میں تھی... وہ میرے خلاف ''ڈیتھ وارنٹ'' کی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا۔ بغیر

کسی تحقیق و تفتیش کے میرے خلاف پولیس انتظامیہ نے ڈیتھ وارنٹ جاری کر دیے تھے، یہ ایک المیہ تھا۔ انصاف کے تقاضوں کی پامالی تھی، مجھے ایک خطرناک اشتہاری مجرم ہی نہیں بلکہ دہشت گرد بھی قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ پوری تفصیل کے ساتھ... میرا نام مع عرفیت کے اخبار میں درج تھا اور میری تصاویر بھی تھیں۔ اطفال گھر میں افراتفری اور مارا... ماری بھی میرے کھاتے میں ڈال دی گئی تھی۔ اور نجانے کیا کیا میرے بارے میں لکھا تھا جس کا مجھ سے تعلق ہی نہیں بنتا تھا۔ اس میں ملتان کے معروف صنعت کار سیٹھ منظور وڑائچ یعنی سرمد بابا کا بھی ذکر تھا.... انہیں میر پشت پناہی کرنے والا سرپرست بتایا گیا تھا، یہی نہیں، بیگم ولا کی بیگم صاحبہ، اول خیر اور کبیل دادا کے نام بھی درج تھے، مذکورہ اخبار میں... کھلاں والی کے زبیر خان اور نیو ملتان کے چوہدری الف خان سمیت ممتاز خان کے بھی میرے خلاف بڑے تندوتیز بیان تھے۔ ان کے راتب خور... انسپکٹر روشن خان کا بھی میرے خلاف بیان تھا۔

اخبار میں چھپنے والے اس سفید جھوٹ پر میں نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور مارے طیش کے اخبار کو توڑ مروڑ ڈالا۔ شکیلہ مڑا تڑا...... اخبار مجھ سے لے کر پڑھنے لگی۔

”مم... می... یہ کیا ہے شہزی؟“

یہ ساری اخباری خرافات پڑھنے کے بعد شکیلہ کے چہرے پر تشویش کا جال بن گیا اور وہ متوحش سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولی۔ میں کیا بولتا... خود پریشان تھا اور اس ناانصافی پر اندر ہی اندر کھول بھی رہا تھا۔ سب سے زیادہ میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ عدالت سے چوہدری ممتاز خان کے خلاف مقدمہ بھی خارج کر دیا تھا۔ انسپکٹر روشن کو.... نہ صرف اپنی سابقہ پوسٹ پر بحال کر دیا تھا بلکہ اسے میری تلاشی وغیرہ کے سلسلے میں چارج دیتے ہوئے کچھ اضافی اختیارات بھی خصوصی طور پر تفویض کر دیے گئے تھے۔ یہ وہ تفاصیل تھیں جو اخبار کے اندرونی صفحات میں تفصیل کے ساتھ درج تھیں۔ کھلاں والی سے میرا کیس بھی ملتان کی ہائی کورٹ میں چلانے کا فیصلہ کیا اور ایسا یقیناً ممتاز خان اور زبیر خان کی ملی بھگت سے ہی ہوا ہوگا۔ انسپکٹر روشن خان جیسے راتب خور شخص کو میرے کیس پر متعین کرنا ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیے کو بھیڑوں کی رکھوالی سونپ دی جائے۔

ان تمام باتوں سے متعلق کئی خدشات اور متوقع نتائج کے تشویشناک وسوسے میرے دل و دماغ میں پرورش پانے لگے، انسپکٹر روشن مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا اور ممتاز خان تو اطفال گھر والے واقعے کے بعد سے گویا میرا جانی دشمن بن چکا تھا۔ جب کہ زبیر خان مجھے اپنے بیٹے کا قاتل سمجھے ہوئے تھا۔ ان میں اشرف اور ممتاز خان میری ایک کمزوری سے واقف تھے۔ اور وہ تھی عابدہ... اگرچہ وہ بالکل محفوظ مقام پر تھی۔ اور سرمد بابا بھی معمولی حیثیت کے آدمی.... نہیں تھے مگر پھر بھی جانے کیوں میں عابدہ کی طرف سے سخت بے چینی کا شکار ہونے لگا۔

شکیلہ میری پریشان کن سوچوں کو میرے چہرے سے محسوس کرتے ہوئے مجھے تسلیاں اور دلاسے دینے کی کوشش کر رہی تھی، تھوڑی دیر بعد انجن کی تیز وسل نے مجھے خیالات سے چونکا دیا۔ ٹرین شاید روانہ ہونے والی تھی، میں یونہی کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کی طرف تکنے لگا تو معاً ایک لڑکی کو دیکھ کر بری طرح چونکا... نہ صرف اس لڑکی کو بلکہ اس کے ہمراہ اس نوجوان کو دیکھ کر بھی۔ میں ایک لمحے کے لیے بت سا بن گیا۔

لڑکی وہی تھی جس نے شفقت راجا کی بیٹھک کے باہر میری ویڈیو بنائی تھی اور میڈیا والوں کے سپرد کر دی تھی جبکہ اس کے ہمراہ وہ لڑکا بھی میرا شناسا ہی نکلا۔ یہ وہی لڑکا تھا جس کی خاطر میں نے یہ سارا کھٹراگ مول لیا تھا۔ یہ وہی میرا ہم عمر نوجوان تھا، جب ہم ساہیوال سے اوکاڑہ کی طرف اپنی گاڑی میں جا رہے تھے تو شفقت راجا کے جلوس کے جوشیلے کارکنوں نے اس لڑکے کی کار کو آگے جانے سے روک دیا تھا جس میں اس کی بیمار ماں موجود تھی۔

بڑی عجیب صورت حال تھی۔ ایک لڑکی وہ تھی جس نے ایک .... ویڈیو کلپ جاری کر کے مجھے بڑی مشکل میں پھنسا دیا تھا اور دوسرا لڑکا وہ تھا جس کی وجہ سے میں آج اس حال کو پہنچا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ نظر آ رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ ان دونوں کا آپس میں یقیناً کوئی گہرا رشتہ تھا۔ گارڈ نے دوسری وسل دی اور گاڑی پلیٹ فارم پر رینگنے لگی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

فطرت کی رنگینیوں کے اسیر نوجوان کی زندگی کے جلتے بجھتے قمقمے

تنویر ریاض

چنگاری

انسان ہزار بہانے تراشے... ہزار تاویلیں دے... مگر کچھ لوگوں سے بے تعلقی کے باوجود... ایک تعلق استوار رہتا ہے... چاہے درمیان میں کتنے ہی فاصلے حائل ہوں... وہ ذہن کے دریچے میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں... محبت کی ایک ایسی چنگاری کا فسانہ جو اب تک نہ بجھی تھی...

اسے گیم روم میں داخل ہوتا دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ آخری بار اسے کب دیکھا تھا۔ میرے لیے ان سالوں، مہینوں اور دنوں کا حساب رکھنا ممکن نہیں تھا کہ وہ کتنا عرصہ مجھ سے دور رہی۔ اس دوران میں نہ جانے کتنی بار اسے یاد کیا ہوگا لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کے جانے کے بعد میں نے جوگ لے لیا ہو۔ زندگی ہمیشہ آگے کی جانب بڑھتی ہے اور ماضی ایک بھولی بسری یاد بن کر رہ جاتا ہے۔

میری زندگی میں دو حادثے یکے بعد دیگرے رونما

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 4

مذہبی کلیسا، مسیحی گاڈ، بعرم شمالی اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عزت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب مافیوں کے [illegible] والوں کے ہاتھ آتے ہیں تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام پر رابیوں کو جیسے گھنونے الزامات میں نکالا ہے [illegible] مگر ہو رہا ہے... استحصال کی صورت [illegible] قابل فخر ہے [illegible] وقت اور حالات کے ہاتھوں میں ایک ملاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... [illegible] تا جو میں ہونا چاہیے تھا... وہ پھر [illegible] وہ بھی جاتے چلتے رہے، یہ بھی گھات لگا کر [illegible] اسی وقت [illegible] اس کی ماں تو اماں ہو گئی اور پھر اس پر سب کچھ ہی [illegible] والوں کی خاطر چنانچہ اس پر تنہا تنہا طاقت کی [illegible] دیکھنے والوں میں برابر... بہت برابر [illegible] سمجھ سا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی [illegible] داستان [illegible] دلچسپ

تحیر... سنسنی اور ان سے ابھرتا

ڈوبتا ایک دلچسپ سلسلہ...

ٹرین چلی تو مجھے ہوش آیا۔ مجھ سے سامنے والی سیٹ پر [illegible] مجھے [illegible] وہ نے ان پریشان [illegible] ماشی کا [illegible] بتا دیا۔ [illegible] محفوظ رہوں، [illegible] ہے۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں [illegible] میں [illegible] گھرا ہوا ہوں [illegible] کی وجہ سے میں ان [illegible] تھے میں گھرا تھا... مجھے

اچانک پلیٹ فارم پر نظر آگیا ہے۔ خدا حافظ۔"

میں نے کہا اور میری جیب میں جتنے پیسے تھے، وہ میں نے شکیلہ کے ہاتھ میں تھما دیے۔

ٹرین دھیرے دھیرے رفتار پکڑنے لگی، پلیٹ فارم ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ میں اترا اور چند قدم دوڑتا رہا تاکہ گر نہ پڑوں۔

میں فوراً پلٹا... وہ دونوں مجھے مسافروں کے ہجوم میں کھڑے نظر آگئے۔ وہ ریلوے کے کسی اہلکار سے بات کر رہے تھے، پھر آگے بڑھے۔ میں بھی ان کے تعاقب میں آگے بڑھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں بڑا سا سوٹ کیس تھا جبکہ لڑکی نے چھوٹا سا شولڈر بیگ اٹھا رکھا تھا۔

دونوں ایک ایکسپریس ٹرین کی سلیپر بوگی میں سوار ہو گئے۔ یہ ایکسپریس ٹرین لاہور جا رہی تھی۔ میں بھی ان کے پیچھے ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ٹرین کی روانگی میں شاید ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

دونوں راہداری سے گزرتے ہوئے اپنے مطلوبہ سلیپنگ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو ان کے پیچھے میں بھی تیزی سے اندر گھس آیا اور عقب میں سلائڈنگ ڈور ایک جھٹکے سے بند کر دیا۔

دونوں ابھی اپنا سامان رکھ رہے تھے، دروازہ بند ہونے کی آواز پر چونک کر مڑے۔ دونوں کی [illegible] پر نظر پڑی اور گویا دونوں ہی مجھے پہچان کر بری [illegible] گئے۔ مجھے پہچاننے کے بعد دونوں [illegible] تاثرات رونما ہوئے۔

لڑکا تو مجھے اپنا [illegible] کے بعد ایک خوشگوار سی حیرت [illegible] اس کا ساتھی لڑکی مجھے دیکھتے ہی خوف زدہ سی [illegible]۔

"تم..."

"ہاں، میں..." میں نے لڑکی کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھ کر کہا۔ جبکہ لڑکی کو اس بات پر حیرت ہوئی کہ اس کا ساتھی لڑکا مجھے پہچانتا ہے۔

"تم دونوں آرام سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔" میں نے اس بار لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تت... تم وہی ہو نا... جس نے ملتان والی کے ایک سیاسی جلسے میں پھنسی ہوئی میری کار..."

"ہاں، میں وہی ہوں، اور اسی نیکی کی سزا ابھی بھگت رہا ہوں۔" میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے قبل کہا اور ساتھ ہی تیکھی سی نظروں سے اس کے قریب سیٹ پر سکڑی سمٹی بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں سے شرمندگی اور الجھن کے ملے جلے تاثرات مترشح ہوتے محسوس ہوئے۔ میں نے اس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے مزید بتایا۔ "اس لڑکی کی ایک اندھی ہم جوئی کے باعث تم سے کی گئی میری نیکی الٹا میرے گلے آن پڑی ہے۔ یہ تمہاری کیا لگتی ہے؟"

"یہ میری منگیتر ہے آسیہ اور میرا نام ملک ریحان ہے۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ کیونکہ جس نجی ٹی وی چینل پر موقع واردات کی فوٹیج اور ویڈیو کلپ دکھائی گئی تھی، اس کی اینکر [illegible] مطابق اس خونی واردات کی اپنے سیل پر فوٹیج [illegible] والی [illegible] نام خولہ بتایا گیا تھا۔ جو شفقت راجا کی [illegible] اور [illegible] بڑے زمیندار چودھری الف خان کی [illegible] ممتاز خان کی بہن تھی۔ بات تعجب اور [illegible] والی [illegible]۔ یہی بات میں نے فوراً اس سے [illegible]

[illegible] تھی، خولہ نہیں۔ تم نے یقیناً مجھے [illegible] ہوگا [illegible] نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ [illegible] اپنی بات آگے بڑھائی۔ میں اس الجھن کو سلجھانا چاہتا تھا۔ اس لیے میری پوری توجہ اس لڑکی پر مرکوز تھی۔

"میرا نام آسیہ ہے۔ میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ملک ریحان میرے منگیتر ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور لو میرج کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت اس بات کا بعد میں مجھے بھی احساس ہوا تھا کہ اس فوٹیج کو آشکارا کرنے سے پہلے میں اپنے طور پر تھوڑی بہت تصدیق کر لیتی مگر مجھے اس کا موقع ہی نہ ملا۔ ہمارے چینل کے ڈائریکٹر یاسین ملک اسے فوراً نشر کرنا چاہتے تھے۔ وہ میڈیا کی اس اندھی اور باقاعدہ دوڑ میں آگے نکلنا چاہتے تھے، حالانکہ میں نے انہیں تھوڑا صبر کرنے کو کہا تھا مگر وہ نہ مانے۔ مجھ سے بھی غلطی ہوگئی کہ میں نے اس کا تذکرہ جوش میں آکر ان سے کر ڈالا تھا۔

"بہرحال اب جو انہوں نے دیکھا کہ میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہی ہوں تو انہوں نے میرے علم میں لائے بغیر اس سنسنی خیز خبر کو سب سے پہلے اپنے ٹی وی چینل سے نشر کرنے کے جنون میں ایک غلط قدم اٹھا لیا۔ سوئے اتفاق... نیوز روم کی انچارج مس حفیظ... چودھری

الف خان کی بہن خولہ کی پرانی اور گہری دوست ہے۔ وہ اکثر وہاں آتی جاتی تھی۔ وہ فطرتاً سادہ مزاج ہے۔ اپنے موبائل پر چھوٹے چھوٹے دلچسپ اور کامیڈی ریکارڈ کرنا اس کی ہابی تھی۔ میڈم سفینہ جس پروگرام کی انچارج تھی، اس میں "دوست کلپ" کے عنوان سے اس طرح کی مختصر ویڈیو کلپ تفریح کے لیے دکھائی جاتی تھیں۔ بس وہیں جلد بازی اور میری ہچکچاہٹ کے باعث یاسمین تک سے غلطی ہوگئی۔ یا میڈم سفینہ سے کہ میرے "پروفائل" کے بجائے خولہ کا "پروفائل" مذکورہ کلپ کے ساتھ چل گیا۔ بعد میں پتا چلا تو میں نے احتجاج کیا اور میڈم سفینہ کے ذریعے خولہ سے بھی معذرت کرلی گئی۔ بعد میں اس کی تردید بھی آگئی تھی۔ جو شاید تمہاری نظروں سے نہیں گزری ہو گی۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں تھا۔ اصل مسئلہ تو اپنی جگہ جوں کا توں موجود تھا... اور پھر آسیہ کی طرف دیکھا جو میری طرف ہی... تکے جارہی تھی۔ "آپ مجھے صرف اس سوال کا جواب دیں کہ آپ نے مجھے ایک خونی قاتل ثابت کرنے کے لیے وہ ویڈیو کلپ میڈیا چینلز کو جاری کی تھی۔ کیا آپ نے مجھے یہ خون خرابہ یا قتل کرتے ہوئے [illegible] آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

میرے اس چبھتے سوال پر وہ کچھ گڑبڑ [illegible] فوراً ہی خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ قتل آپ [illegible] نہیں کیا تھا؟ میرا مطلب ہے [illegible] راجا شفقت کا قتل تم نے نہیں کیا [illegible]"

"آپ پہلے میرے [illegible] جواب دیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ گڑبڑ [illegible] میں بولی۔ "اس وقت سچویشن ہی ایسی تھی کہ..."

"کیا تم یہ بھی نہیں سمجھ سکیں کہ تم تین مسلح لوگوں کی آن دی اسپاٹ ویڈیو بنارہی ہو، وہ اگر اس قدر وحشی قاتل ہوتے تو تمہیں بھی فائرنگ کرکے ہلاک کرسکتے تھے۔"

"میرا خیال ہے آسیہ سے واقعی ایک بڑی بھیانک غلطی ہوئی ہے۔" اس بار اس کے منگیتر ریحان نے مداخلت کی۔ "یہ اس وقت اتفاق سے ان کے سیاسی جلوس کی لائیو کوریج وغیرہ کے سلسلے میں وہیں تھی۔ اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ میں بھی اپنی بیمار ماں کو کار میں لیے وہاں سے گزر رہا تھا۔"

"اوہ... تو یہ بات ہے۔" میں نے پھر آسیہ کو کڑی نگاہ سے دیکھا۔ "گویا تم لوگوں کو صرف خبر کی جلدی ہوتی ہے، حقیقت کی نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے بالآخر اصل حقیقت سے آگاہ کردیا۔ اور اس "آگاہی" کو صرف اس حد تک ہی محدود رکھا جس حد تک میرا ان سے تعلق بنتا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ! یہ میں نے کیا کردیا۔" حقیقت جان لینے کے بعد آسیہ باقاعدہ پشیمان سی ہونے لگی۔ "اگر یہ سچ ہے تو واقعی میں نے ایک بڑی بھیانک غلطی کر ڈالی اور اپنے پروفیشن کے منافی کام کیا ہے۔"

"ہاں آسیہ صاحبہ! یہی سچ ہے کہ وہ قتل میں نے یا میرے ساتھی نے نہیں کیا تھا۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "تمہارے منگیتر کی کار جلوس میں پھنسنے سے ساری کہانی کی ابتدا ہوئی تھی [illegible] میں راجا شفقت نے اس معمولی بات کو [illegible] کا مسئلہ [illegible] ہم سے دشمنی مول لی اور اپنے [illegible] کارندوں کے ذریعے [illegible] یرغمال بنا کر اپنی بیٹھک میں [illegible]

میری [illegible] ریحان بھی فکرمند نظر آنے لگا۔ وہ [illegible] میرے سامنے سر جھکائے بیٹھے

[illegible] ایک گہری سانس لی پھر ریحان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "تمہاری ماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

اس نے نہایت ممنون بھرے لہجے اور شرمندہ سی نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری وجہ سے ہی میری ماں کی جان بچ گئی تھی، دوست! اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اگر مجھے مزید دیر ہوجاتی تو..." وہ آگے کہنے کی ہمت نہ کرسکا۔

"خدا کا شکر ہے۔ اللہ نے تمہاری ماں کو زندگی عطا کی۔ شکر ہے میری قربانی ضائع نہیں گئی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اسی وقت ٹرین نے وسل دی۔ میں چونکا۔ میرے پاس ٹکٹ نہ تھا۔ میں بے چین سا ہوگیا۔ میری بے چینی بھانپتے ہوئے ریحان مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"فکر نہ کرو دوست۔ تم اب ہمارے ساتھ چلو گے اور اس وقت تک ہمارے ساتھ رہو گے جب تک آسیہ... اپنے ویڈیو کلپ کی باقاعدہ تردید کا کوئی بندوبست نہیں کردیتی۔" اس کی بات پر مجھے کچھ تسلی ہوئی، ٹرین نے دوسری وسل دی اور حرکت میں آگئی۔ میں نے سیٹ سے کمر ٹیک دی اور سر بھی ٹکا کر تھکے تھکے انداز میں آنکھیں موند لیں۔ میرے کانوں میں ان دونوں کے دھیمے لہجے میں

Digest.pk

باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کے بعد ریحان اٹھ کر میرے قریب آن بیٹھا اور دوستانہ انداز میں اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور بوگی کی چھت کو گھورنے لگا۔

ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ سامنے والی سیٹ پر پشیمان سی بیٹھی آسیہ کبھی میرا اور کبھی ریحان کا چہرہ دیکھنے لگتی۔

”دوست! ہمیں تمہاری دلی کیفیت اور پریشانیوں کا بخوبی اندازہ ہے اس لیے میں نے اور آسیہ نے اس کا ازالہ کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا ہے۔ اب تمہیں زیادہ فکرمند اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس کی بات پر میرے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ممکن ہے آسیہ کو اس حقیقت کا اندازہ ہو مگر شاید اس کے منگیتر ریحان کو نہ تھا اس لیے وہ اس طرح تن بچوں جیسی باتیں کررہا تھا۔ میں نے اس کی طرف سر گھما کر دیکھا اور کہا۔

”ریحان صاحب! غلطی کا تو ازالہ ہو جاتا ہے مگر خطرناک غلطی کا ازالہ مشکل سے ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے۔ آپ لوگوں کو شاید اندازہ نہیں، اس غلطی کی وجہ سے میں کتنے مسائل اور خطرناک حالات کا شکار ہو گیا ہوں۔ ملتان کی ایک عدالت میں میرا کیس بھی چل رہا ہے“ جو میں تفریحاً چیتے ہی والا تھا۔ میری [illegible] سے بچانے کتنے بے گناہ اور معصوم مظلوم [illegible] کے شکنجے سے نجات ملنے والی تھی۔ بدقسمتی سے [illegible] خلاف میں نے حق کی آواز بلند کی [illegible] میرے خلاف [illegible] کے حلیف نکلے۔ انہیں میرے خلاف [illegible] موقع مل گیا اور اب وہ دونوں [illegible] میں اتر آئے تھے اور [illegible]۔“ میری بات پر ریحان کے چہرے پر گہرا [illegible] چھا گئی۔ آسیہ کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئی تھیں۔

”او خدایا! یہ تو مجھ سے واقعی ایک بڑی اور خطرناک غلطی ہو گئی... لیکن...“ فرطِ جذبات سے اس کا لہجہ رندھا ہوا تھا اور وہ جملہ بھی مکمل نہ کرپائی، تاہم کچھ توقف کے بعد بولی۔ ”میں واقعی آپ سے بہت شرمندہ ہوں، شہزاد صاحب! آپ نے ہمارے بارے میں شاید ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے۔ ہم صحافیوں اور اینکر پرسن کو صرف گرماگرم اور سنسنی خیز خبروں کو اڑانے کی جلدی ہوتی ہے حقیقت کی نہیں، اب حقیقت یہی ہے کہ میرا اپنے اس پروفیشن سے ہی دل خراب ہونے لگا ہے۔ میں تو سچے اور نیک عزم کے ساتھ اس فیلڈ میں آئی تھی، تاکہ سماج سدھار کا فرض ادا کرسکوں اور معاشرے میں انسانی رویوں میں پھیلی ہوئی برائیوں کی نشاندہی کرسکوں، جو عام آدمی کی نظروں سے مخفی ہیں۔ لیکن افسوس میں اس کے معیار تک نہ پہنچ سکی... مجھے ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا۔“

مجھے وہ خاصی حساس طبیعت کی محسوس ہوئی... میرا تجربہ تھا ایسے انسان زیادہ جذباتی ہوتے ہیں اور اپنے فیلڈ کاز میں سچے بھی۔ اس نے جرنلزم میں ماسٹر کررکھا تھا اور نہ جانے کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد وہ اس مقام پر پہنچی ہوگی مگر ایک غلطی نے اسے ڈھا کر رکھ دیا تھا۔ میرے پاس اسے دلاسا دینے کے لیے کوئی مناسب الفاظ نہ تھے، میں خود اپنی پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔

”[illegible] ہے کہ تم اب اس فیلڈ کو چھوڑ [illegible] دینا چاہ [illegible]“ ملک۔ ریحان نے اس [illegible] محترمہ بتاتی ہے کہ اس ویڈیو کلپ [illegible] انداز سے ہوئے شہزاد صاحب [illegible] اور انہیں مستقبل میں کس کی مصیبت کو [illegible]“ اس کی بات مکمل ہونے پر میں [illegible] لیا، جو بدستور کسی گہری سوچ [illegible] تھا۔ وہ ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد [illegible] سے بولی۔

”کوشش تو میری پوری یہی ہوگی کہ... تردید اس طرح کی جائے کہ اس کی شہزادی کی زندگی تباہ ہونے پائے، میں کس حد تک ہوم ورک کرکے... ایک لائحہ عمل اس سلسلے میں سوچ لوں گی۔ لیکن...“ اس نے یہ کہتے کہتے کچھ سوچ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور اچانک مجھ سے مخاطب ہو کے مستفسر ہوئی۔

”شہزاد صاحب! کیا آپ نے اب تک کوئی وکیل ہائر کررکھا ہے؟“

”اب تک تو میں نے ایسا کوئی وکیل ہائر نہیں کیا کیونکہ اب تک ملتان کی عدالت میں پراسیکیوٹر ہی میرے حق میں دلائل دیتا رہا ہے جس سے میں خود بھی کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوں۔“

”ارے... تم باجی سے اس سلسلے میں مدد کیوں نہیں لے لیتیں؟“ دفعتاً جیسے ریحان کو کچھ یاد آیا۔

”ہاں! میں یہی سوچ رہی تھی اس لیے میں نے شہزاد صاحب سے یہ سوال پوچھا تھا۔“ اس نے ریحان کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ گھر پہنچتے ہی سب سے پہلے

Digestpk

فون پر ان سے رابطہ کرو اور مشورہ لو۔ وہ بھی تو ملتان ہی میں رہتی ہیں۔"

"کیا آپ کی باجی صاحبہ وکیل ہیں؟" میں نے آسیہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ ایڈووکیٹ ہیں۔ خانم شاہ نام ہے ان کا۔ ملتان میں ہی رہتی ہیں۔ وہ پرنٹ اینڈ الیکٹرانک میڈیا میں لیگل ایڈوائزر بھی رہ چکی ہیں۔ وہ مجھے اس سلسلے میں زیادہ بہتر طور پر گائیڈ کر سکتی ہیں۔" اس نے جواباً کہا۔

"بلکہ میں تو یہ چاہوں گا کہ ہمیں خود جا کر ان سے اس سلسلے میں بات کرنی چاہیے۔" ریحان، آسیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

"یہ بھی ہو جائے گا لیکن فوری طور پر ہمیں پہلے شہزاد صاحب کو تحفظ فراہم کرنا ہے۔ پولیس نہ صرف ان کو تلاش کرتی پھر رہی ہے بلکہ... ان کے خلاف وارنٹ بھی نکل چکا ہے۔ گویا ایک شریف اور امن پسند آدمی کو اس قدر خطرناک اور انتہائی مطلوب مجرم کے طور پر پیش کر دیا ہے کہ اس قانون پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"ایک سے زائد قتل کرنے کی واردات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" آسیہ نے ریحان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور اس پر سوا... جب دشمن پہلے سے دانت گاڑے بیٹھے ہوں۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے ریحان۔ [illegible] لیں گے لیکن ابھی لاہور پہنچتے ہی فوری طور پر [illegible] فون پر ہی رابطہ کر کے اس سلسلے میں [illegible] مشورہ [illegible] چاہیے۔"

اس کی بات پر [illegible] ریحان [illegible] سر کو اثباتی جنبش دی۔

سفر جاری تھا۔ اس [illegible] نے اپنے بیگ سے کچھ کھانے پینے کی اشیا نکالی [illegible] ٹکٹ چیکر بھی آیا تھا۔ میں ہر ایک سے اپنا چہرہ غیر محسوس انداز میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا لاہور تک کا ٹکٹ کٹوا دیا گیا تھا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اطفال گھر کے حوالے سے، آسیہ کو کچھ علم نہ تھا، حالانکہ میرا خیال تھا اسے کچھ نہ کچھ معلوم ہوگا۔ میں نے بھی ان سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے بارے میں بھی انہوں نے دریافت کیا۔ حقیقتاً ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ اب تک کوئی خاص تعارف ہی نہیں ہوا تھا۔ میرا بھلا کیا تعارف تھا۔ میں نے وہی بتا دیا جو میری ذات سے متعلق اور میرے ماضی سے آسیب کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں میرے لیے ہمدردی کے جذبات بھی ابھرے تھے۔

اپنے متعلق ریحان نے یہی بتایا تھا کہ وہ لاہور کے ایک مقامی کالج میں لیکچرار تھا۔ آسیہ اس کی فرسٹ کزن تھی۔ دونوں نے بچپن سے اکٹھے وقت گزارا تھا۔ ریحان کا باپ مر چکا تھا۔ ایک ماں تھی بوڑھی، جبکہ آسیہ کے امی ابو حیات تھے۔ ابو کسی کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھے۔ اس دوران میں مجھے اول خیر کا بھی خیال آیا۔ میں اس کی خیریت جاننا چاہتا تھا۔ مجھے صرف اول خیر کا سیل نمبر ہی یاد تھا۔ میرے پاس تو سیل تھا نہیں، پھر مجھے سرمد بابا سے بھی بات کرنا تھی۔ بالخصوص [illegible] وہ میرے لیے پریشان ہو رہی ہوگی، یقیناً اب تک میرے [illegible] میں نشر ہونے والی خبریں اس نے بھی سنی ہوں [illegible]، ایسی [illegible] کی اطلاع کے ساتھ مجھے سرمد بابا کو تشفی [illegible] بتانا تھا جو ملتان تک پہنچنے والی تھی۔

[illegible] کی کچھ سوچ سے تشفی کو بھانپتے ہو[illegible] میری طرف مستفسرانہ نظروں سے [illegible] توجہ پا کر میں نے اس سے کہا۔ [illegible] اپنا سیل فون مجھے تھوڑی دیر کے لیے دے سکتے [illegible]

"لیں! شیور..." یہ کہتے ہوئے اس نے فوراً اپنی شرٹ کی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے "شکریہ" کہا اور سب سے پہلے اول خیر کا نمبر پنچ کیا۔ ظاہر ہے وہ خود تو فون اٹینڈ کرنے کے قابل نہ تھا، فون وہی ریسیو کر سکتا تھا، جو اس وقت اس کے قریب موجود ہوگا۔ تیسری گھنٹی جانے کے بعد دوسری جانب سے شناسا سی آواز ابھری۔ یہ ارشد تھا۔

"ہیلو۔"

"ہاں۔ ارشد بول رہے ہو؟" میں نے پہلے تصدیق چاہی۔

"ارے... شہزی... تم؟ کہاں ہو؟ کدھر ہو...؟ خیریت سے تو ہو نا... یہ کس کا نمبر ہے؟ تمہارا؟"

میری آواز پہچانتے ہی وہ بولتا چلا گیا۔ میں نے جواباً کہا۔ "میں فی الحال خیریت سے ہی ہوں۔ مجھے پہلے اول خیر کے بارے میں بتاؤ جلدی، وہ کیسا ہے؟" یہ پوچھنے کے دوران میرا دل انجانے وسوسوں سے دھڑکنے لگا۔

"اللہ کا فضل ہوا شہزی! ورنہ چھوٹا استاد گیا تھا۔" دوسری جانب سے ارشد نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے

Digest.pk

بتایا۔

"وہ ٹھیک ہے اب، آرام کر رہا ہے۔ اس کا فون میں نے ہی سنبھال رکھا ہے۔ اب مجھے تو اپنے بارے میں بتا جلدی۔ یہاں سب تیرے لیے پریشان اور تشویش میں مبتلا ہیں... خاص طور پر بیگم صاحب۔"

"یار، بات لمبی ہو جائے گی، ابھی چھوڑ، مناسب وقت پر میں دوبارہ..."

"یار! تو بند کر اپنا فون، میں کال کرتا ہوں تجھے۔"

اس نے میری بات کاٹی۔

"کہاں... ہاں ابھی نہیں، میں بعد میں بات کروں گا... اور میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"تو ٹھیک نہیں ہے شہزی!" وہ تڑپ کر بولا۔ "تو خطروں میں گھرا ہوا ہے، یار تو سمجھتا کیوں نہیں، تو جہاں بھی ہے فوراً ملتان آ جا... یا مجھے بتا تو کہاں ہے۔ ہم تجھے لینے آ جاتے ہیں۔ بیگم صاحب تجھے بلا رہی ہیں۔"

"مجھے صرف اللہ کی ذات بچا سکتی ہے اور اس نے ہی بچنے کا ایک سامان پیدا کر دیا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔"

میں نے رابطہ منقطع کر کے سرمد بابا کا نمبر ملایا۔ میری آواز سن کر دوسری جانب یکدم سناٹا طاری ہو گیا۔ پھر تو [illegible] ارتعاش کی لہروں جیسی سفر کرتی آواز ان کی ابھری۔

"ارے بیٹا! شہزی! تم ٹھیک تو ہو [illegible] کیسے ہو... اور کہاں سے بول رہے ہو؟"

متوقع سوالات کی ایک بوچھاڑ [illegible] ان میں تشویش بھی تھی شفقت بھی اور محبت و نسبت [illegible]

"بابا! میں بالکل [illegible] جلد ملتان آؤں گا۔ عابدہ [illegible] کے بارے میں بتاؤ بابا۔ وہ ٹھیک تو ہے نا بابا؟"

میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ عابدہ کے ذکر پہ جانے کیوں میں رقت زدہ سا ہونے لگا۔ وہ بھی یہ سوچ رہی ہوگی، کیسا عجیب من تھا ہمارا بھی۔ پہلے افلاس کے گھر میں گھٹ گھٹ کر زندگی گزاری پھر وہاں سے باہر کی دنیا نصیب ہوئی تو ہم خوش تھے۔ میں نے بھی عام آدمی کی طرح عابدہ کے ساتھ محبت بھری ہنسی خوشی کی زندگی گزارنے کے سپنے خواب دیکھے تھے۔ یہ کوئی اونچے خواب نہ تھے، بڑے سادہ سے خواب تھے، میں محنت مزدوری کروں گا۔ عابدہ میرے ساتھ رہے گی، میری بیوی بن کر... ہم دونوں چاہے سادہ سہی... ہنسی خوشی، محبت بھری زندگی گزاریں گے، مگر وہ تقدیر ہی کیا کہ جیسا سوچ چاہو ویسا ہو جائے۔ میرے ساتھ تو تقدیر کا ایسا الٹ پھیر ہوا تھا کہ میں ابھی تک چکر در چکر دگرگوں حالات کے بھنور میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

اتفاق اور گمبھیر خاموشی میں مجھے ڈوبا پاکر دوسری جانب سے سرمد بابا کی آواز نے میری سوچوں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ مجھے پکار رہے تھے۔ "شہزی بیٹا... کہاں کھو گئے...؟ میں تمہیں عابدہ کی خیریت سے متعلق بتا رہا ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے مگر تمہارے لیے پریشان اور تشویش زدہ رہنے لگی ہے۔"

"جی بابا! اسے تسلی دیجیے گا۔ آپ اس وقت... دفتر میں؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو انہوں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ "ہاں بیٹا... لیکن... ہم اور عابدہ [illegible] بہت فکرمند اور پریشان ہو رہے ہیں۔ کیا تمہیں اپنے حالات [illegible] اندازہ بھی ہے؟" میں جان گیا ان کا اشارہ [illegible] طرف [illegible] آج کل کے میڈیا نے ملک میں نہیں بلکہ [illegible] ایک کونے سے چڑیا کی آواز تک دنیا [illegible] پہنچنے کا انتظام کر رکھا تھا۔

"[illegible] ابھی... اور..."

"بابا [illegible] مجھے سارے حالات کا بخوبی اندازہ ہے [illegible] ان حالات سے نبرد آزما ہوں۔"

"بیٹا! تمہاری جان کو خطرہ ہے۔" ان کے لہجے کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی، میں نے انہیں تسلی دینے کی کوشش کی اور شکیلہ کے سلسلے میں انہیں آگاہ کرتے ہوئے آخر میں کہا کہ میں بہت جلد ملتان پہنچوں گا... اور رابطہ منقطع کر دیا۔

سامنے کی سیٹ پر ریحان اور آپا خاموش بیٹھے مگر بغور میری یہ فون پہ ہونے والی ساری گفتگو سن رہے تھے۔ میں نے شکریے کے ساتھ ریحان کو اس کا سیل فون تھما دیا۔

ٹرین ذرا لیٹ ہی لاہور پہنچی تھی، شام کے سائے رات کی تیرگی میں بدلنے لگے تھے۔ میں اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے ٹرین سے اترنے اور اسٹیشن کی بلڈنگ سے باہر نکلنے اور ایک ٹیکسی میں سوار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ اس وقت میرا وجود بھی ان دونوں کے لیے کسی بم سے کم نہ تھا... جس کی پن کسی وقت بھی کوئی نکال سکتا تھا، اور پھر میرے ساتھ ان کی بھی خیر نہ ہوتی۔ اس خطرناک حقیقت کا یقیناً میرے ان دونوں نئے خیرخواہوں کو بھی اندازہ ہوگا۔ ان ساری باتوں کے باوجود کہ... میں

آج جس دگرگوں حالات کا شکار تھا، ان کی وجہ یہ دونوں ہی تھے۔ میں پھر بھی ان کا شکر گزار تھا کہ یہ لوگ اپنی غلطی کا ازالہ سچی نیت اور پختہ ارادے سے کرنے کے لیے تیار تو تھے۔ مجھے انہوں نے تنہا نہیں کیا تھا اور مجھے اپنے ہمراہ رکھنے کا رسک بھی لے لیا تھا۔

ٹیکسی نے آدھے گھنٹے بعد ہمیں اقبال ٹاؤن کے ایک بنگلے نما مکان کے سامنے اتار دیا۔ ریحان نے کرایہ دے کر ٹیکسی والے کو فوراً رخصت کر دیا۔ اس کے بعد کال بیل بجادی۔ جواب میں ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے پہلے اندر سے مخاطب ہو کر کچھ پوچھا، اس کے بعد ان دونوں کو پہچان کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ تاہم وہ مجھے عجیب سی نگاہوں سے تکنے لگی۔

ہم اندر آ گئے۔ مجھے ایک کشادہ اور آرام دہ نشست گاہ میں بٹھانے کے بعد دونوں تھوڑی دیر تک مکان کے اندرونی گوشے میں غائب ہو گئے۔ اس کے بعد ریحان ہی اندر سے برآمد ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آسیہ اپنے گھر جا چکی تھی۔ مجھے اس نے میرے کمرے تک پہنچایا۔ میں غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہوا پھر کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر میں اور ریحان آپس میں باتیں کرتے رہے۔ چائے بھی پی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کل شام تک آسیہ باجی خانم شاہ سے رابطہ کرنے اور ساری [illegible] کے بعد ادھر آئے گی۔ اس کے بعد ہی آئندہ [illegible] طے کر پائیں گے۔

ریحان نے مجھے آرام کا مشورہ [illegible] ایک دوسرا سیل فون مجھے د[illegible] اس [illegible] بھی ڈال دی تھی جس نمبر سے [illegible] خواہوں سے رابطہ کیا تھا۔ ممکن تھا وہ اس [illegible] سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ریحان کے پاس ایک اور سم تھی۔

مگر میں نے سوتے وقت اپنا سیل آف ہی کر دیا تھا۔

صبح اٹھا۔ ناشتے کے بعد ریحان نے مجھے اپنی بیمار ماں سے اپنے دوست کی حیثیت سے ملوایا۔ ریحان کی والدہ... سادہ طبیعت کی ایک بزرگ خاتون تھیں۔ انہیں معدے اور جوڑوں کے درد کی تکلیف تھی، اس لیے زیادہ تر ان کا وقت بستر پر ہی گزرتا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ہر وقت ان کی مدد کو موجود رہتی تھی۔ ایک ملازم بھی تھا۔

ریحان نے اپنے اور آسیہ سے متعلق یہ بھی بتایا تھا کہ دونوں کی عنقریب شادی ہونے والی تھی اور اس سلسلے میں تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ نیز دو ایک روز میں تاریخ بھی طے پانے والی تھی۔

وہ دن ہلکے پھلکے انداز میں گزرا۔ ریحان کالج بھی گیا تھا اور دو تین گھنٹے بعد لوٹ آیا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ہم نے ساتھ کھایا۔ پانچ بجے کے قریب آسیہ بھی تازہ خبروں کے ساتھ آن وارد ہوئی۔ اور میں اور ریحان اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں نے باجی سے تفصیلاً بات کی تھی، ان کا بھی یہی کہنا تھا کہ بالمشافہ ملاقات ہی بہتر رہے گی، لیکن موجودہ حالات کے پیش نظر فوری طور پر ان کا مشورہ یہی تھا کہ کسی ذمے دار پولیس آفسر سے ملاقات کر کے شہزاد صاحب کو پہلے اپنی گرفتاری [illegible] ہے۔ لیکن یہ کام بھی کسی وکیل کی سرپرستی میں [illegible] زیادہ بہتر ہوگا۔ جہاں تک رہی بات ویڈیو کلپ کی [illegible] اس کی [illegible] پہلے متعلقہ ٹی وی چینل کی جانب [illegible] کرنا لازمی ہے... مگر ان کا نہیں خیال کہ [illegible] ٹی وی چینل اس کی تردید کی جرأت کر[illegible] میڈیا کی دوڑ میں ہر کوئی ایک دوسرے [illegible] جنون میں مبتلا ہے۔ کسی کی بھلائی [illegible] ایک قدم پیچھے ہٹنا گوارا نہیں [illegible]۔ باجی نے یہ بھی کہا کہ ہم لوگ آپس میں مشورہ [illegible] پھر دوبارہ مجھے آگاہ کر دیں۔ اگر مجھے لاہور بھی آنا [illegible] تو میں آ جاؤں گی۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ ماحول میں چند ثانیے کے لیے پُرسوچ خاموشی طاری رہی پھر ریحان نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور آسیہ سے سوال کیا۔

”تم نے اپنے ٹی وی چینل سے بات کی اس سلسلے میں؟“

”ہاں!“ وہ ایک سرد ہنکاری بھرتے ہوئے بولی۔ ”باجی کی بات درست ثابت ہوئی تھی، انہوں نے ایسی کسی تردید کا شپ چلانے سے انکار کر دیا تھا، نیز مجھے بھی ڈائریکٹر آف پروگرام کی جانب سے یہ سرزنش سننی پڑی کہ اس سلسلے میں اب خاموشی ہی بہتر رہے گی، اور اس کی ذمے داری بھی انہوں نے مجھ پر ہی ڈال دی ہے کہ مجھے مکمل کنفرمیشن کے بعد اس کلپ کو آن ایئر کروانا چاہیے تھا۔“

”تم نے کیا سوچا پھر؟“ ریحان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تردید تو بہر حال کرنا پڑے گی چاہے اس کے لیے مجھے کسی دوسرے ٹی وی چینل سے ہی کیوں نہ رابطہ کرنا پڑے۔ باجی سے بھی فون پر میں نے اس سلسلے میں بات کی

Digest

تھی۔" وہ بتانے لگی۔ "انہوں نے ایک خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ممکن ہے میری ایسی حرکت پر متعلقہ ٹی وی چینل والے مجھ پر مقدمہ بھی کر سکتے ہیں۔ نوکری سے تو خیر ہاتھ دھونا ہی پڑے گا، لیکن... پھر مجھے بھی ایک عدد مقدمے کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔"

"یہ تو واقعی گمبھیر صورت حال ہوگئی ہے۔" ریحان فکرمندی سے بولا۔ اس دوران میں بظاہر خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا مگر میرا ذہن ان باتوں کے تناظر میں کچھ سوچنے میں محو تھا۔

"مجھے نوکری کی پروا نہیں ہے لیکن میں چاہ رہی تھی اس کی تردید بھی متعلقہ ٹی وی چینل ہی کرے تو زیادہ بہتر تھا... ورنہ دوسرے چینل سے اس ویڈیو کلپ کی تردید وہ مطلوبہ اثر نہیں رکھے گی جس کا فائدہ شہزاد صاحب کو پہنچنا چاہیے۔"

"اس صورت میں پھر... شہزاد صاحب کی از خود گرفتاری بھی خطرے سے خالی نہ ہوگی، میرا مطلب تھا اگر ضمانت قبل از گرفتاری ہوجاتی تو زیادہ بہتر تھا۔" ریحان نے کہا۔

"ڈیتھ وارنٹ کی صورت میں اس قسم کی ضمانت ناممکن ہی ہے..." آسیہ جواباً بولی۔ "مگر [illegible] قول شہزاد صاحب گرفتاری از بس ضروری ہے۔ [illegible] مفرور رہتے ہوئے یہ خود کو مجرم ثابت کرنے [illegible] ڈیتھ وارنٹ کی تلوار الگ سر پر لٹکتی [illegible] نہیں نا..." وہ اچانک میری [illegible] ہوئے متاسف سی ہوگئی۔ [illegible] پوچھ لیا۔ "کیا [illegible] کہتے کہتے چپ کیوں ہوگئیں؟"

"میں دراصل شہزاد صاحب کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی لیکن... پاپا جی کو اپنے پیشہ ورانہ تجربات کا اندازہ ہے، جس کے مطابق انہوں نے اس خدشے کا بھی اظہار کر ڈالا کہ... شہزاد صاحب کے دشمن... انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کرسکتے ہیں۔"

"تو... تمہارا مطلب ہے پولیس کے ذریعے..." ریحان سنسناتے ہوئے انداز میں کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔

"ہاں میرا مطلب یہی تھا۔" بالآخر آسیہ نے ایک سرد سی سانس کھینچتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی [illegible] نظروں سے میری طرف بھی دیکھا۔

میرے اندر فکر کی کھچڑی پکی ہوئی تھی۔ مفر کی کوئی راہ نظر نہیں آرہی تھی، مایوسی اور تشویشناک پریشانی نے مجھے کچھ دیر کے لیے گم صم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے ریحان اور آسیہ کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہ تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ یہ دونوں بھی اس معاملے میں بے بس ہی نظر آرہے تھے۔ بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے آسیہ سے مخاطب ہوکر کہا۔

"آسیہ صاحبہ! معاملے کی نزاکت کے پہلوؤں پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سب سے پہلے از بس ضروری ہے کہ اس ویڈیو کلپ کی تردید ہونی چاہیے خواہ وہ کسی اور ٹی وی چینل پر ہی نشر کی جائے۔ میرا نہیں خیال کہ آپ کو دوسرے ٹی [illegible] نظر انداز کرسکیں گے۔ بلکہ وہ ہاتھوں ہاتھ [illegible] لیں گے، [illegible] اس میں دوسرے چینل کی نیک [illegible] دوسری ایک اہم بات یہ ہے کہ جب [illegible] اس ویڈیو کی تردید نشر کرنے پر [illegible] تو آپ اس تردید کو بہ ذات خود [illegible] ایک باقاعدہ پروگرام کا [illegible] اور اس پروگرام میں مجھے بھی شامل [illegible] آنکھ سے سوالاً جواباً کے انداز میں [illegible] ساری حقیقت آن ایئر آگاہ کروں گا۔ مقصد لوگوں کو سچائی بتانا ہوگا اور پھر میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا، اطفال گھر سے لے کر اب تک کی ساری کتھا گوش گزار کردوں گا، بلکہ ان لڑکیوں کو بھی پروگرام میں شامل کرنے کا بندوبست کریں جو میری اس ساری مہم جوئی کی چشم دید گواہ بھی ہیں۔"

میں نے دیکھا۔ میری بات سے آسیہ کا چہرہ جوش سے سرخ ہوگیا۔ وہ بلاشبہ ایک سچی صحافت کی ترجمان تھی اور لوگوں کو حقیقت اور سچ دکھانے کے پختہ اور سچے عزم سے سرشار بھی... یہی سبب تھا کہ میری بات جو باقاعدہ ایک مربوط منصوبہ بندی کی [illegible] وہ یکدم ہی پرجوش نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے بڑی ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"شہزاد صاحب! آپ بلاشبہ بہت ذہین انسان ہیں... آپ نے بالکل صحیح مشورہ دیا ہے۔ اس تردید کو باقاعدہ ایک پروگرام کی صورت میں ہی ٹی وی چینل پر پیش کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے ساتھ وہ تمام لڑکیاں بھی شامل ہوں... جنہیں آپ نے گناہوں کی دلدل میں پھنسنے یا قید ہونے سے بچایا۔ بقول آپ کے... اس روز ملاں والی کی خوں ریز واردات میں راجا شفقت کی بیٹھک میں جس شخص کا پہلے اس کے حوالے کیا

Digest.pk

کے ہاتھوں قتل ہوا تھا' اس کی لاش کا بھی پتا چلنا چاہیے اور اوکاڑہ کی چتی بائی... جس کا وہ آدمی تھا... کیا نام تھا اس کا...؟''

اس نے استفساریہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ فرطِ جوش سے اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔

''چھن میاں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں!'' وہ آگے بولی۔ ''ایسا سنسنی خیز لائیو پروگرام کوئی بھی ٹی وی چینل... ہاتھوں ہاتھ لے گا... میں آج ہی ایک مشہور ٹی وی چینل سے رابطہ کرتی ہوں...'' اتنا کہہ کر وہ رکی اور پھر تائید طلب نگاہوں سے ریحان کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تمہارا کیا خیال ہے ریحان! یہ بہت زیادہ بہتر ہوگا شہزاد صاحب کے لیے؟''

میں نے ریحان کی طرف دیکھا اور تھوڑا چونک سا گیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا! کسی گہری سوچ میں مستغرق پایا۔ تاہم وہ آسیہ کی آواز پر سوچوں کے بھنور سے ابھرا اور نہایت پُرسوچ متانت سے آسیہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''آسیہ! ممکن ہے کہ یہ سب شہزاد صاحب کے لیے بہتر ہو لیکن شاید یہ تمہارے حق میں کچھ اچھا ثابت [illegible]'' میں نے اس کی طرف دیکھا تو آسیہ نے کہا۔

''[illegible] کے حق میں کیا بہتر ہے کیا نہیں' یہ [illegible] ہی ہوگا...'' پھر میری طرف دیکھتے [illegible] اس [illegible] بات جاری رکھی۔ ''میری غلطی [illegible] کا ازالہ [illegible] صاحب کو اس مصیبت سے نجات [illegible] اپنی نوکری کی پروا نہیں ہے۔''

''بات صرف نو[illegible] کی [illegible] مجھے بھی پروا نہیں تھی۔'' وہ بولا۔ ''معاملہ [illegible] جان پر بن جائے گا۔ بالخصوص تمہاری اپنی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف تائید طلب لہجے میں پوچھا۔ ''کیا خیال ہے شہزاد صاحب؟ میں صحیح کہہ رہا ہوں ناں؟'' مجھے اس کا یوں تائید طلب انداز میں استفسار کرنا خالی از مسرت نہیں لگا۔ گویا اس کا مطلب تھا کہ میں بھی اس کی خطرناکی اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے اور اس کی حمایت میں آسیہ کو اس بات سے باز رکھوں۔ مجھے اس کا یہ بدلا ہوا انداز اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا الٹا میں نے اس پر سوال داغ دیا۔

''تو پھر آپ کا کیا خیال ہے ریحان صاحب! اس معاملے کو ادھر ہی چھوڑ دیا جائے؟''

''نن... نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا شہزاد؟'' وہ یکدم گڑبڑا سا گیا۔ ''میں چاہ رہا تھا اس مسئلے کا جب دوسرا حل موجود ہے تو پھر دیدہ و دانستہ اوکھلی میں سر دینے کا کیا فائدہ...؟ ظاہر ہے تم بھی نہیں چاہو گے کہ... آسیہ بھی بلاوجہ تمہارے دشمنوں کی زد میں آئے۔ ایسی خود غرضی کی تو کم از کم میں تم سے امید نہیں رکھوں گا۔''

ریحان نے اچانک ہی کینچلی بدلی تھی۔ بدلتا ہے انسان روپ کیسے کیسے... کے مصداق مجھے اس کی بات پر سخت کی حیرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ گویا مکارانہ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا تھا کہ میں اس کی منگیتر کو اپنے [illegible] کی خاطر کسی خطرے میں نہ ڈالوں۔

میں نے کن [illegible] کی طرف بھی دیکھا اور اسے اپنے منگیتر ر[illegible]ن کی طرف [illegible] کی ہوئی نگاہوں سے تکتے ہوئے پایا [illegible] ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے [illegible] کا لحاظ کیے بغیر کہا۔

[illegible] صاحب! یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے، [illegible] باقاعدہ پروفیشن کی طرح اپنا رکھا اور [illegible] سیاسی میں روپیہ، عزت اور شہرت [illegible] لیکن اس میدان کے کھلاڑیوں کو خطرے سے بھی [illegible] پڑتا ہے۔ یقیناً اس کا اندازہ آسیہ صاحبہ کو ہی نہیں بلکہ ہر اس شخص کو ہوگا جو اس پروفیشن میں آتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ایک دوسرے ٹی وی چینل کی صحافی خاتون اور اینکر پرسن کا حوالہ بھی دیا... جس کی کچھ سیاسی اور بااثر لوگوں سے رنجش ہوگئی تھی اور وہ اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے۔ پھر آخر ایک دوسرے ٹی وی چینل نے اسے ہائر کیا... اور اس کی مداخلت اور تعاون سے اس خاتون صحافی نے اپنے مستقل بچاؤ کی تدبیر بھی کی۔

''کہنے کا مقصد یہ ہے ریحان صاحب کہ اس طرح کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ آسیہ نے بغیر کسی تصدیق اور تحقیق کے پیشہ ورانہ جوش میں آ کر ایک ایسی ویڈیو کلپ لائیو جاری کروی کہ جس سے ایک بے گناہ انسان بلاوجہ ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوگیا... اب اس کا ازالہ تو کرنا چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اپنے تحفظ سے آدمی بے پروا رہے۔ مگر جرأت کا قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کہیں نہ کہیں خطرہ تو مول لینا پڑتا ہی ہے۔''

''میرے کہنے کا مقصد کچھ اور تھا۔'' ریحان پورے دھیان سے میری بات سننے کے بعد بولا۔ اس کے چہرے

Digest.pk

سے لگتا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کھل کر کہنے سے اجتناب برت رہا تھا... ممکن ہے وہ کچھ ایسی باتیں آسیہ سے کرنا چاہتا ہو، جو میرے سامنے نہیں کر پا رہا ہو۔ بہرحال... میں اس کی بات سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بسا اوقات سچ سامنے لانے کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو جاتا ہے، جو ناقابلِ تلافی بھی ہو سکتا ہے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ ہم اس طرح سچ کو سامنے تو لا رہے ہیں۔ مگر دیکھنا یہ کہ اس کے کتنے سودمند اور مثبت اثرات برآمد ہونے کی امید ہو سکتی ہے؟ یا کہیں الٹی آنتیں گلے پڑنے کے مترادف نہ ہو جائے۔"

"میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کروں گی ریحان!" آسیہ نے اس کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔

"سانچ کو آنچ نہیں۔ اس پر میرا ایمان ہے کہ سچ ایک نہ ایک دن اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے۔ پھر شہزاد صاحب کے معاملے میں تو کہیں بھی کھوٹ نہیں۔ وہ بے چارے تو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ... اوکاڑہ جا رہے تھے۔ پر شفقت راجا کو جانتے تک نہیں تھے۔ تمہاری کار اس کے سیاسی جھوٹ میں پھنسی ہوئی تھی اور اندرا کی جان بے سبب پڑی تھی۔ [illegible] سی بھی یہ مقدر الو استان کی جان بھی لے سکتی تھی۔ شہزاد صاحب تحفظ انسانی ہمدردی کے طور [illegible] نے آپ کو ایک مشکل سے نکال کر وہ خود [illegible] باقی رہی کی سر میں نے پوری کر دی [illegible]

[illegible]

اپنے تحفظ [illegible] کا [illegible] بجھ میں اب ریحان کی طرف سے ایک نامعلوم سی [illegible] کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ اب بالکل خاموش ہو گیا تھا... جبکہ آسیہ اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کو باقاعدہ طور پر تشکیل دیتے ہوئے مجھ سے تبادلۂ خیال کرتی رہی۔ جبکہ میرا دھیان ریحان کی طرف لگا رہا۔ اب یہ بات صاف طور پر محسوس ہونے لگی تھی کہ وہ کچھ اور ہی سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بھی جب ذرا وسعتِ نظری سے غور کیا تھا تو ریحان مجھے اتنا غلط بھی نہیں لگا تھا۔ اپنے تحفظ کے بارے میں سوچنا ہر کسی کا حق ہے... مگر میرا خود سے یہ سوال تھا کہ ایسے تحفظ کو میں کیا نام دوں جو دوسرے کی بربادی کا سبب بنے؟

اس وقت میرے سیل فون کی ٹیل گنگنائی۔ یہ سادہ سا موبائل فون سیٹ فوری ضرورت کے پیشِ نظر ریحان نے ہی مجھے دیا تھا۔ ریحان نے مجھے بتایا تھا کہ اس نمبر کی سم میں اس کے بہت کم نمبرز درج ہیں جو نہایت اہم اور خال خال ہی استعمال ہوتے ہیں۔ تاہم احتیاط کے پیشِ نظر اگر ریحان کی کوئی کال ہوتی تو میں وہ اسے تھما دیتا۔ اب جو بیل آ رہی تھی، اسے دیکھ کر مجھے چونکنا پڑا۔ یہ بیگم صاحبہ کی کال تھی۔ میں دونوں سے معذرت کر کے اپنے کمرے میں آ گیا اور بیگم صاحبہ کی کال ریسیو کرتے ہوئے فون کان سے لگا کے دھیرے سے "ہیلو" کہا۔

"...شہزاد؟... تت... تم..." دوسری طرف سے بیگم صاحبہ کی مترنم آواز کو فکر و تشویش کی گرفت میں پا کے میرے اندر [illegible] معصوم سا احساس جاگا۔ باوصف کوشش کے [illegible] میں کوئی [illegible] دے سکا۔ میں جان تو گیا تھا کہ یہ ارشد [illegible] مجھ سے بات کرنے کے فوراً ہی بعد [illegible] سے اس کا ذکر بھی کیا ہو گا۔

[illegible]" دکھی آواز ایک مختصر ترین وقفے [illegible] ... تم... تم آخر [illegible] کوئی مشورہ... [illegible] ایک طرف [illegible] گئے... مگر تم..."

"میں آپ کا [illegible] نہیں ہوں۔ بیگم صاحبہ!" [illegible]

[illegible]

[illegible] میں نے تمہیں بھی اسی نگاہ سے دیکھا ہے [illegible] دوست ہیں اور ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں... تم... تم... ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہو... دشمن کو کوئی چال چلنے کا موقع مل چکا ہے۔"

"مجھے اس کا اندازہ ہے بیگم صاحبہ!" میں نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں ہے تمہیں اس کا اندازہ۔" وہ یکدم بولیں۔ "تمہارے تصور میں بھی نہ ہو گی یہ بات کہ چوہدری ممتاز خان اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے راتب خوار انسپکٹر روشن خان کے ذریعے تمہیں جعلی پولیس مقابلے میں ہلاک کروانا چاہتا ہے۔ جس کی منصوبہ بندی تیار کی جا چکی

Digest.pk

ہے۔ وہ متھو وارنٹ کی آڑ میں تمہیں دیکھتے ہی وہ گولی مارنے کے لیے پاگل جنونیوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ میں... میں... وہ... وہ تمہیں... نہیں کھونا چاہتی... عتیق شاہ...!" وہ بے اختیار فرطِ جذبات سے رو پڑیں۔ ان کے آخری الفاظ پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا اور میرے ذہن کی سوئی ان کے اس آخری جملے پر اٹک گئی۔

"میں... میں... تمہیں... دوسری بار... نہیں کھونا چاہتی... عتیق شاہ۔" پھر وہ جذباتی ہو کر رو پڑیں۔

عتیق شاہ کون تھا؟ پھر میں بیگم صاحبہ کی نگاہ میں کیا تھا؟ کیا مر کر زندہ ہوا تھا؟ یا میں نے کسی عتیق شاہ نامی اجنبی شخص کا دوسرا جنم لیا تھا؟ میں نے اپنے ان الٹے خیالات پر خطِ تنسیخ کھینچ دی۔

دوسری جانب سے معاً ہی بیگم صاحبہ کی ذرا سنبھلی ہوئی آواز ابھری۔

"...معافی چاہتی ہوں شہزی! میں پریشانی اور تفکرات کے باعث تمہارے ساتھ جانے کیا اول فول بک گئی... دراصل میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم جہاں بھی ہو، بے شک خیریت سے سہی لیکن... تم محفوظ نہیں ہو... فوراً سے پیشتر میرے پاس آجاؤ... یا جہاں ہو... مجھے بتادو۔ آندھی طوفان کی طرح میرے کارندے تمہیں لینے کے لیے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

"میں صرف اللہ کی امان ہی میں خود کو محفوظ [illegible] بیگم صاحبہ!" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا [illegible]

"بالکل وہی انداز... وہی [illegible] باتمیز۔" دوسری جانب سے [illegible] بڑبڑائیں۔ ان کا یہ انداز مجھے [illegible] مبتلا کر دیا کرتا تھا۔ آخر وہ ماضی کے کن [illegible] سے اور کس کے ساتھ میرا تعلق جوڑنا چاہتی تھیں؟ آخر وہ مجھے کیا سمجھے ہوئے تھیں؟ ان کے اسرار بھرے انداز سے بھی کبھی تو میں خود الجھ جایا کرتا تھا۔ میں کون تھا آخر؟ میری ذات سے آخر ان کا کیا تعلق تھا؟ اتنے بڑے گینگ کی سربراہ جس کے سامنے سب سر جھکا کے باتیں کرتے تھے، اور وہ خود ان سب کو اپنی جنبشِ ابرو کے اشارے پر رکھتی تھیں مگر میرے ساتھ... ان کا یہ ایسا رویہ کیوں تھا، جبکہ وہ بظاہر دوستی کا جذبہ رکھتی تھیں مگر معاملہ درونِ خانہ کچھ اور ہی تھا؟ وہ مجھے کیا سمجھے ہوئے تھیں آخر...؟ کیا کسی غلط فہمی کا شکار تھیں یا پھر میرے ماضی کا کوئی باب ابھی تک میری نظروں سے اوجھل تھا؟

"میں آپ کو ابھی تک سمجھ ہی نہیں سکا ہوں بیگم صاحبہ!" بالآخر میں نے بھی کہہ ڈالا۔ "مجھے آپ سے بہت الجھن سی محسوس ہونے لگتی ہے بھی کبھی۔" دوسری طرف سے بے اختیار ان کی کھنکتی ہوئی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گئیں اور حسبِ عادت موضوع بدل کر بولیں۔

"شہزی، ضد مت کرو... آجاؤ... مجھے تمہاری بہت فکر ستا رہی ہے۔"

میں یہ سوچتا کہ ممکن ہے وہ مجھے اس لیے اہمیت دے رہی ہوں کہ میں ان کے ازلی دشمن چوہدری الف خان کے خلاف ایک اہم ہتھیار کی حیثیت رکھتا تھا... جس کے ذریعے وہ چوہدری [illegible] خان اینڈ سنز (ممتاز خان) کو زیر کرنا چاہتی تھیں۔

"[illegible] تو جھٹکے [illegible]" میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! آپ [illegible]... میں جہاں بھی ہوں، [illegible] ہاتھ سے [illegible] بیٹھا ہوا ہوں... اپنا بندوبست [illegible] اور [illegible] جھمیلوں سے نجات پانے کی خاطر تگ و دو [illegible] نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ [illegible] چند نیک خواہوں کے پاس بیٹھا [illegible] ماشاء اللہ جلد ہم ایک لاکھ عمل تیار کرنے والے [illegible]... بس آپ ٹی وی دیکھتی رہیں، عنقریب میں ایک اور واردات کا کرنے والا ہوں... خدا حافظ۔" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کر دیا۔

جب نشست گاہ میں داخل ہوا تو میں نے ریحان کو آسیہ کے بالکل قریب اور یوں متوجہ دیکھا جیسے وہ اسے کسی اہم بات پر سمجھانے کے لیے پرزور کوشش میں مصروف ہو... مگر آسیہ کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اس کی کسی بات سے متفق نہیں ہو رہی تھی۔

آخری الفاظ ریحان کے منہ سے پرزور انداز میں برآمد ہوئے... "پلیز... آسیہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو... ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اچانک مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چپ ہو گیا اور آسیہ سے ذرا دور ہو کے بیٹھ گیا۔ میں نے آسیہ کے چہرے کا بغور جائزہ لیا تو چونکے بنا نہ رہ سکا... اس نے جب میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا تو میں نے اس کی آنکھوں میں تشویش کی جھلک دیکھی، پھر وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئی مگر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی... اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مجھے کچھ بے چین اور فکرمند سی دکھائی دے رہی تھی، کبھی اچانک سوچتی ہوئی نگاہوں سے میری طرف تکنے لگتی تو کبھی...

Digest.pk

ریحان کی طرف… واضح طور پر وہ ایک عجیب سی الجھن کا شکار تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے ذرا دیر کے لیے یہاں سے جانے کے بعد دونوں کے درمیان کوئی گرما گرم بحث ہوئی ہو۔ یہی سبب تھا کہ… وہ فوراً وہاں سے چلی گئی۔ میں حیران حیران سی نظروں سے ریحان کی طرف تکتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

جانے کیوں پہلی بار میرے دل کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ میں خود کو یہاں ایک نامعلوم سی الجھن کا شکار ہوتا محسوس کرنے لگا۔ میں بدستور چپ بیٹھا گویا ریحان ہی کے بولنے کا منتظر رہا… مگر… اس نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی اور محض ایک عجیب سی سرد سے انداز کی نظر میرے چہرے پر ڈالنے کے بعد وہ بھی کمرے سے نکل گیا۔ میں ذرا دیر گم صم اور الجھا الجھا سا نشست گاہ میں تنہا بیٹھا رہا پھر اس کے بعد ناچار اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

ابھی کمرے میں آئے مجھے ذرا ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اچانک میرے سیل فون کی بیل گنگنائی۔ میں نے چونک کر اسکرین پر نمبر دیکھا جو میرے لیے اجنبی ہی تھا۔ پہلے پہل میں یہی سمجھا ہو سکتا ہے یہ ریحان کے کسی جاننے والے کی ہو۔ تاہم یہ سوچ کر کہ اگر ایسا ہوا تو [illegible] ریحان کے حوالے کر دوں گا۔ مگر جب فون [illegible] طرف لے جا کر ہیلو کہا اور دوسری جانب [illegible] آواز ابھری تو میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ آسیہ [illegible] تھی۔

☆ ☆ ☆

"شہزاد صاحب [illegible] میں جیسا میرا مطلب [illegible] آپ کے ساتھ؟" اس نے پوچھا۔ انداز [illegible] رازدارانہ تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کا مطلب کیا تھا اس طرح مجھے فون کرنے کا۔ تاہم جواباً بولا۔ "جی ہاں! مگر…"

"میری ایک بات غور سے سنیں۔" وہ فوراً بولی۔ اور میں اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ اس کا انداز بڑا پُراسرار اور عجیب سا تھا۔

"آپ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلے جائیں اور ملتان پہنچنے کی کوشش کریں۔ اپنی باجی خانم شاہ کا میں آپ کو پتا دے رہی ہوں، میں انہیں فون بھی کر دوں گی۔ وہ آپ کی ہر طرح سے بھرپور مدد کریں گی۔"

"کیا مطلب؟ یہاں مجھے کوئی خطرہ ہے؟" میں نے اس کے انداز گفتگو سے کچھ اخذ کرتے ہوئے پوچھا۔

"خطرہ تو آپ کے چاروں طرف ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "بس آپ یہاں سے فوراً نکل جائیں۔"

"یہاں سے آپ کی کیا مراد ہے آسیہ صاحبہ؟" میں نے ذہن میں اچانک ابھرنے والے ایک خیال کے تحت پوچھا۔ "ریحان کے گھر سے یا لاہور سے؟"

دوسری جانب لمحے بھر کو پُرسوچ خاموشی طاری رہی پھر آسیہ کی مبہم سی آواز ابھری۔ "آپ ریحان کی رہائش گاہ سے نکل جائیں۔ اور انہیں اپنے کسی آئندہ کے پروگرام کے متعلق بھی مت بتائیے گا۔"

"کیا آپ کو ریحان کی طرف سے کسی گڑبڑ کا خطرہ ہے؟" بالآخر [illegible] نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے خدشے کو لفظوں [illegible] میں ادا کر ہی دیا۔

"شا[illegible]… ہاں! [illegible] گومگو سے لہجے میں بولی پھر [illegible]۔"

"[illegible] طرف سے آپ اپنا دل خراب مت [illegible] صاحب پلیز… مگر میں آپ کو بھی اندھیرے [illegible] ہوں۔ مگر پلیز…! ابھی آپ [illegible] سے [illegible] جائیے۔ رکھئے… آپ سے [illegible]… تک کوئی غلط قدم بھی اٹھ سکتا ہے۔ میں [illegible] زیادہ نہیں بتا سکتی۔ میں خود ایک امتحان سے گزر رہی ہوں… آپ بھی…"

"مجھے اندازہ ہے آسیہ صاحبہ!" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ میرے چہرے پہ تلخ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ "بہرحال… ٹھیک ہے، آپ کا بہت بہت شکریہ…"

آسیہ نے مجھے اپنی باجی کا پتا اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا اور آخر میں ملائمت سے بولی۔

"شہزاد صاحب میری طرف سے آپ بے فکر رہیے گا۔ میں آپ کی کسی بھی مدد اور تعاون سے پیچھے نہیں ہٹوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ بے گناہ ہیں، یہ مجھے ثابت کرنا ہوگا اور آپ کو بھی…"

میں نے اس کا اثباتی انداز میں شکریہ ادا کر دیا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

میں بیڈ پر بیٹھا سوچوں میں ڈوب گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک ایسی حس رکھی ہے جسے چھٹی حس کہتے ہیں مگر یہ محسوس انہی افراد کو ہوتی ہے جو غیر معمولی احتیاط اور وقت و حالات کی مناسبت سے اپنا دماغ ہر وقت بیدار رکھتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ریحان

Digest.pk

کے ساتھ بیٹھنے والی آخری نشست تک تو مجھے اس کی نیک نیتی پر کوئی شبہ نہ تھا لیکن... اس کے بعد اس کی گفتگو کا بدلا بدلا انداز... اس کا رویّہ اور پھر آسیہ کے ساتھ اس کی پُراسرار گفتگو نے درحقیقت مجھے ریحان کی طرف سے چونکا دیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کی طرف سے میری چھٹی حس نے خطرے کی گھنٹی بجانا شروع کردی تھی۔ اور اب آسیہ کے آنے والے فون نے تو اس پر مہرِ تصدیق ثبت کردی تھی۔

محبت میں انسان خودغرض ہوجاتا ہے۔ ریحان کے یکدم بدلنے کی وجہ سے میں آگاہ تھا۔ جب اسے بعد میں صحیح معنوں میں حالات کی نزاکت کا اندازہ ہوا تو اسے مجھ سے زیادہ آسیہ کی فکر ہونے لگی... اور وہ میرے گمبھیر معاملے سے پہلو تہی کرنے لگا۔ اور میری تھوڑی دیر کی غیر موجودگی کے دوران اس کی اس سلسلے میں یقیناً آسیہ کے ساتھ گرما گرم بحث بھی ہوئی تھی۔ ریحان کو شاید اپنے معاملے میں اب مخلص نہیں پا رہا تھا مگر آسیہ ایسی نہیں تھی، وہ میرے سلسلے میں پُرجوش تھی۔ اسے اس کی بھی پروا نہیں تھی، میرے ساتھ وہ بھی خطرے میں گھر سکتی تھی۔ جبکہ ریحان اس خدشے کے پیشِ نظر آسیہ کو میرے معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کررہا تھا اور شاید اب اس کی ضد سے مجبور ہوکے، الٹا میرے خلاف ہی کوئی قدم اٹھانے کے بارے [illegible] سوچ رہا تھا جس کا اندازہ پہلے ہی آسیہ نے بھی [illegible] میں نے ایسا ہی کرنے کی ٹھانی۔ گویا یہ [illegible] وقت میرے لیے مصیبت بننے والا تھا [illegible] تھا۔ کوئی سامان بھی نہ تھا، تھوڑی [illegible] تھیلا کورے دی گی۔ فقط [illegible] دیا ہوا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا [illegible] بنا خرابی سے ہم [illegible] رابطے میں تو رہ سکتا۔

مزید سوچنے کا وقت نہ [illegible] میں فوراً کمرے سے نکلا۔ صورت حال کی... سنگینی کو محسوس کرکے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی تھی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ گویا خطرہ سر پر آپہنچا ہو۔ درمیان میں نشست گاہ تھی جو خالی تھی۔ ریحان اندر کسی کمرے میں ہوسکتا تھا۔ میں دبے پاؤں نشست گاہ کے خارجی دروازے کی طرف بڑھنے لگا اور قریب پہنچ کر ٹھٹک کر رکا۔ دائیں جانب ایک دوسرے رہائشی کمرے کے بند دروازے سے مجھے کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ بس لمحہ بھر کے لیے میں رکا تو آواز کو پہچان کر میں دوسرا قدم نہیں اٹھا سکا۔

وہ آواز ریحان کی تھی اور شاید وہ دوسری طرف دروازے کے قریب ہی تھا۔ وہ کسی سے غالباً لینڈ لائن فون پر باتیں کررہا تھا۔

''آپ جتنی جلدی ہوسکے آجائیں انسپکٹر صاحب' وہ ادھر ہی ہے۔ میں اسے پہچاننے کے بعد بڑی چالاکی سے اپنے ساتھ یہاں لے آیا ہوں... آپ آسانی سے اسے گرفتار کرسکتے ہیں۔ باقی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔''

یہ سننے کے بعد میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔ کنپٹیاں میں سائیں... سائیں... ہونے لگی۔ میرے بدترین... خدشات کی تصدیق ریحان کی اس گفتگو کو سن کر ہوچکی تھی۔ نیز آسیہ کے بروقت کال کرنے کا سبب بھی معلوم ہوچکا تھا... پھر میں [illegible] کے لیے بھی نہیں رکا... [illegible] گیٹ پر پہنچ [illegible] وہاں [illegible] موجود نہ تھا۔ بغلی دروازہ کھول کر میں [illegible] اور تیز تیز [illegible] سمت ایک طرف کو چل دیا... [illegible] مین شاہراہ پر آگیا۔

میں نے [illegible] وقت دیکھا۔ سہ پہر کے تین بجنے وا[illegible] ایک [illegible] کسی اسٹاپ پر کھڑا تھا۔ [illegible] طرف آنے جانے والی مسافر [illegible] اور دھوپ پڑ رہی تھی۔ کبھی کبھی گرم [illegible] کے تھپیڑے سے بھی چہرے پر محسوس ہوتے تھے، مگر اس [illegible] مجھے خوشگوار [illegible] اور زہر ہواؤں کے جھونکوں سے زیادہ [illegible] معلوم ہو رہے تھے۔ کیونکہ اس بہانے سے میں نے بڑا سا رومال اپنے سر اور چہرے کے ایک حصے پر لپیٹ رکھا تھا۔ مجھے... ریحان پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ ایک حد تک تو میں نے اس کی شخصیت کے اس منفی پہلو کو درگزر کردیا تھا۔ وہ میری مدد کرنے کے بجائے اب اپنی منگیتر آسیہ کے مفاد کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور مجھے نظرانداز کرگیا تھا۔ لیکن اس کا یوں پولیس کو فون کرکے مجھے گرفتار کروانا... بری طرح کھل رہا تھا۔ طیش اور نفرت کی لہر نے مجھے ایک بگولا کردیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ ریحان کو اس طوطا چشمی کا مزہ چکھا کر میں اس کی رہائش گاہ سے کوچ کرتا مگر... پھر آسیہ کے خیال نے مجھے اس جارحانہ حرکت سے باز رکھا۔

لاہور میں میرے بارے پولیس کو اطلاع ملنے کا مطلب تھا پوری انتظامیہ کی توجہ کا رخ لاہور کی طرف ہوجاتا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میرے دشمنوں کا ٹولا بھی اپنے تئیں ادھر کا ہی رخ کرتا... میرے لیے مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں۔ مشکل یہ تھی کہ میری جیب میں رقم نہ تھی۔ سامان کی صورت میں صرف ایک سستا سا موبائل سیٹ تھا مگر میں

Digest.pk

اسے فروخت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ واحد ذریعہ تھا اپنے بہی خواہوں سے رابطے کا۔ اچانک میرے ذہن میں کھٹکا ہوا خیال ابھرا۔ یہ سیٹ تو ریحان کا تھا۔ سم بھی یقیناً اس کے نام ہوگی وہ اسے بلاک بھی کروا سکتا تھا۔

تو کیا اس سے پہلے مجھے مدد کے لیے فوراً اپنے کسی ہمدرد سے رابطہ کر کے مدد مانگ لینی چاہیے تھی۔ مگر اگر یہ اطلاع ہی دے دیتا کہ میں اس وقت کہاں تھا؟ مگر سب سے اہم اور فوری مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میری جیب میں تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی کہ میں ٹھنڈے گلاس کا پانی بھی خرید کر پی لیتا۔

اس وقت صرف آسیہ تھی، جو لاہور میں میری فوری طور پر کوئی مدد کر سکتی تھی۔ یہ سوچ کر میں نے فوراً اس کا نمبر پنچ کیا مگر... وہی ہوا جس کا ڈر تھا مجھے۔ ریحان نے سم بلاک کروا دی تھی۔ کیونکہ دوسری جانب سے کوئی [illegible] لی۔

ریحان کا نمبر مجھے ازبر تھا۔ میں کسی قریبی پی سی او سے بھی بات کر سکتا تھا... مگر اس کے لیے رقم کی ضرورت تھی جو میرے پاس نہ تھی۔

میں نے بالآخر سیٹ فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ اب یہ میرے لیے بیکار تھا۔

لاری اڈے میں بسوں، موٹروں [illegible] کی چیختی چلاتی آوازیں اور ٹریفک کا شور مجھے [illegible] پیدا کر رہا تھا... بہرحال... [illegible] سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا [illegible] تلاش کی تھی، جہاں میں یہ سیل فون فروخت [illegible] کرتا۔

وہاں ڈے [illegible] ہوٹلوں اور چائے خانوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا تو میں اسٹاپ کی حدود سے ذرا باہر نکل آیا۔ یہاں سڑک کنارے چھوٹی دکانوں کی قطاریں دکھائی دیں۔ ان میں زیادہ تر جنرل اسٹور، آٹو پارٹس وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ مجھے موبائل کی ایک شاپ نظر آ ہی گئی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا۔ دکان پر موجود تھے۔ ایک کاؤنٹر پر نائب لڑکا میری طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اسے سیٹ دکھایا اور کہا کہ میں اسے بیچنا چاہتا ہوں۔

"ہم چوری کا مال نہیں خریدتے... آگے جاؤ بھائی۔" وہ یہ کہہ کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے دل کو ایک گھونسا لگا۔ شرم مانگی اور غربت نفس کو لگنے والے اس چرکے نے مجھے پانی پانی کر دیا۔ میں دکان سے باہر نکلتے ہوئے سخت اذیت کا شکار تھا۔ میں کیا تھا۔ میری حیثیت کیا تھی۔ بالکل بھی کسی صفر یا صفر... میرے آگے زندگی کا اتنا بڑا سفر پڑا تھا اور میں ایک جوان مرد تھا۔ مگر میں کیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ زندگی کا سفر کاٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ زادِ راہ تو ہونا ہی چاہیے... جو میرے پاس نہیں تھا۔ عابدہ کی محبت اور [illegible] سے نجات کے بعد تو میں نے سوچا تھا اب عابدہ کے ساتھ باقی زندگی ہنسی خوشی گزاروں گا۔ مگر ہنسی خوشی زندگی کیا ہوتی ہے، اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ آج کا دور پیسے کی نسبت بہت سخت اور کڑا تھا۔ زندگی بسر کرنے کے لیے اب پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور حلال کی روزی کمانا تو [illegible] طلب کار مسلسل [illegible] ہے۔ پھر اچھی تعلیم... [illegible] جو مجھے نوکری کی امید دلاتی ہو۔ [illegible] کوئی ہنر بھی نہیں جانتا تھا میں۔ عابدہ [illegible] زندگی گزارنے کے بہت سے خواب [illegible] اب ان کی حقیقتوں کے تناظر میں [illegible] پردہ آتا ہے۔ چودھری خلیق کی [illegible] تھی، میرے دیدہ و دانستہ دشمن [illegible] ہوئے تھے۔ بے شک میرے بھی [illegible] کی نہیں تھی، مگر کیوں؟ میں ان کی مدد کیوں لیتا؟ ان کے سر پہ بوجھ کیوں بنتا؟ کیا میری ساری زندگی ترس کھاتے اور ہمدردیاں جتاتے ہوئے لوگوں کی جی حضوری میں گزر جائے گی؟

یہ ساری باتیں سوچتے سوچتے میں اس قدر قنوطی اور مایوس سا ہونے لگا کہ جی چاہا اسی وقت خود کو پولیس کے حوالے کر دوں۔ پتا نہیں کیوں آج میں اس ساری بھاگ دوڑ اور مسلسل حالات کی کشاکش سے اس قدر بیزار ہو رہا تھا کہ اس بارے میں بھی مجھے دو گھڑی سوچنا پڑا۔ یہ بھلا ہے... میں جیل چلا گیا تو عابدہ کا کیا ہوگا؟ وہ تو بے چاری زندہ درگور ہو جائے گی۔ میری راہ میں دن رات جاگ کر آنکھیں بچھائے بیٹھی ہے۔ زندگی کی تپتی دھوپ کو خوشی کی ٹھنڈی چھاؤں کی آس میں بیٹھی ہے۔ وہ کون تھا دنیا میں میرے سوا اور میرا بھی کون تھا عابدہ کے سوا... مجھے شدید پیاس محسوس ہونے لگی۔ دھوپ کی تمازت اور گرمی بھی مجھے اب ستانے لگی تھی۔ میں دکان سے باہر نکل کے یونہی بے مقصد کھڑا رہا۔ میرے گردوپیش میں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ ٹریفک کا شور اور ہنگامے کیا گیا تھا کسی کا ایک طوفان بدتمیزی بکھرا ہوا تھا... مجھے اس سارے ماحول سے چڑ ہونے لگی۔

MEDICAM
FLUORIDE ANTICAVITY TOOTHPASTE
HERBAL FRESHNESS
MEDICAM
HERBAL FRESHNESS
Whitens Teeth + An Explosion of Extreme Mint
MEDICAM
HERBAL FRESHNESS
FLUORIDE ANTICAVITY TOOTHPASTE
Herbal Extreme Spearmint

پھر اچانک ہی میں دردناک ماضی میں کھو گیا۔ مشکل، تنگ اور کٹھن حالات میں کسی اپنے خونی رشتے کا یاد آنا بھی لازمی امر ہے۔ ایسا خونی رشتہ جس پر انسان کو فخر ہو، غرور ہو... ایک قسم کی طمانیت ہو۔ میرا تو ایک ہی خونی رشتہ تھا، باپ کا... یہ واحد ایسا خونی رشتہ تھا جس نے شروع دن سے آج تک میرے اندر کے انسان کو زخمی رکھا تھا۔ وہ کیا باپ تھا جس نے محض ایک خوبصورت عورت کے کہنے پر مجھے نکال باہر کیا اور خود سے علیحدہ کرنے کے باوجود مجھ سے اپنی پدرانہ محبت و شفقت بھی جتاتا رہا۔ مجھ سے مل کر اور دل کے بچھڑ کر آنسو بھی بہاتا تھا۔ یقیناً اس نے مجھے... یعنی اپنے لخت جگر کو خود سے دور کرتے وقت بڑے پتھر دل و جگر سے کام لیا تھا۔

ماں... جس کی شبیہ... ایک موہوم سی جھلک... مجھے اپنے لاشعور سے الجھتی ہوئی بھی مجھ کو محسوس ہوتی تھی۔ جو مجھے اپنی ممتا بھری ٹھنڈی چھاؤں میں رکھتی محسوس ہوتی تھی۔ پھر اچانک نیا ہوا، یہ شبیہ بدل گئی، اس کی جگہ ایک خرانٹ عورت نے لے لی۔ جس کی کرختگی سے میں خوف زدہ ہو کے کسی کونے میں دبکا رہتا۔ ایک معصوم بچے کا ننھا سا [illegible] اور ننھا دماغ ہوتا ہوگا... مگر احساسات و جذبات کی [illegible] ہونے سے زیادہ محسوس کرنے لگی ہوئی [illegible] محسوسات میرے لاشعور کے ساتھ چپکے [illegible]

میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر پایا تھا۔ مجھے [illegible] سے نفرت کرنی چاہیے یا محبت [illegible] دشمن تھی... [illegible] جو میر[illegible] تھی۔ اب جبکہ میں سوچنے سمجھنے [illegible] ملنے سے تلاش کرنے کی [illegible] ہر روز بڑھنے لگی تھی اور گزرتے وقت کے ساتھ [illegible] دیتے ہوا ہی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں جیسے ماضی کے گم گشتہ جزیروں کے ویران ساحل سے سر ٹکراتی پُرشور موجوں کے چنگل سے یکلخت آزاد ہو گیا اور چونک کر مڑ کے دیکھا۔

ایک پختہ العمر اجنبی شخص بڑی معنی خیز نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔

"... بیچنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا۔ سیل فون ہنوز میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔

"ہاں!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میرے اندر در ماندہ خیالات اور سوچوں کی یلغار دھیرے دھیرے کم ہو رہی تھی۔

"لاؤ... دکھاؤ... کتنے لو گے۔" اس نے میرے کاندھے سے ہاتھ ہٹا کر میری طرف بڑھایا۔

"پہلے تم قیمت لگاؤ۔" میں نے موبائل سیٹ اس کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی اس کا جائزہ بھی لینے لگا۔ بظاہر وہ ایک عام سا شخص نظر آ رہا تھا۔ شاید دکان پر ہی موجود گاہکوں میں شامل ایسا شکاری جس نے پہلے ہی اپنا شکار میری صورت میں تاڑ لیا تھا اور شاید میری مجبوری کو بھی...

"... پانچ سو سے ایک پائی اوپر نہیں دوں گا۔" وہ اسے خانہ پری کے انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولا۔

"[illegible] پانچ سو [illegible] اس کی طرف دیکھ کر واجبی سی قیمت [illegible] نفع کمانے کی خاطر نہیں بیچ رہا تھا لیکن [illegible] حالت اتنی زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ میں [illegible] امید لگائے بیٹھا تھا۔

"[illegible] کہاں ہو؟" وہ خرانٹ پن سے بولا۔ "[illegible] سیٹ [illegible] ہے کہ باہر قدم رکھو تو اس کی قیمت آدھی [illegible] ہے اور پھر... تمہارے پاس اس کا ڈبا ہوگا [illegible] جلدی بولو۔"

میں نے سوچا۔ پانچ سو بھی غنیمت تھے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے پانچ سو کا نوٹ مجھے پکڑایا اور سیٹ لے کے چل دیا۔

میں نے سب سے پہلے ٹھنڈے پانی کے دو تین گلاس پیے، اس کے بعد سوچنے لگا۔ پہلے کسے فون کروں۔ گھوم پھر کے ذہن میں آسیہ کا نام آیا۔ کیونکہ فوری طور پر اس وقت وہی میری ضرورت تھی۔

ایک قریبی پی سی او جا کر میں نے آسیہ کے نمبر پر رابطہ کیا۔

رابطہ ہوتے ہی وہ جیسے ہڑبڑائی آواز میں بولی۔ "تت... تم... آپ کہاں ہو اس وقت؟ خیریت سے تو ہو نا شہری؟" اس کے بولنے کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ ضرور اسے کسی گڑبڑ کا علم ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ اس قدر پریشان اور بوکھلائی ہوئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں... آسیہ صاحبہ! ایک پی سی او سے بات کر رہا ہوں..." میں نے جواب دیا اور ذہن میں سوچ رہا تھا کہ اسے خود غرض اور احسان فراموش منگیتر ریحان کی دغابازی کے بارے میں آگاہ کر دوں یا نہیں۔ میں تمہیں

Digestpk

چاہتا تھا کہ دونوں کے بیچ کوئی ناچاقی ہو۔

"شکر ہے خدا کا۔" دوسری جانب سے آسیہ کی قدرے طمانیت بھری آواز ابھری مگر دوسرے ہی لمحے بولی۔

"... ریحان کا فون آیا تھا۔ آپ کے خاموشی سے نکل جانے پر وہ بڑے پُرزور اصرار سے آپ کے بارے میں مجھ سے دریافت کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور خاصا برہم بھی ہو رہا تھا۔ لگتا ہے اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے کہ میں نے پہلے ہی آپ کو اس کے عزائم سے باخبر کر کے بھگا دیا ہے۔" لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ "لیکن شہزاد! وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا... اس نے پولیس کو آپ کے سلسلے میں انفارم کر دیا تھا اور اب آپ کے فرار کے بعد وہ خود پولیس کے چکر میں آ گیا ہے۔"

اس کی بات سن کر بے اختیار میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اسے ریحان کی چوری چھپے کسی پولیس انسپکٹر کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں آگاہ کرنے کے بعد بولا۔

"اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا... آسیہ صاحبہ... لیکن میرا نہیں خیال کہ پولیس اسے الجھائے گی... وہ معاملہ نمٹا لے گا... لیکن میرا [illegible] مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"ہاں... ہاں... پولیس... میں تو [illegible] لیے پریشان ہو رہی تھی، اور کسی طرح رابطے [illegible] بھی کر رہی تھی آپ سے..." وہ پُرتشویش [illegible]

"لیکن مجھے [illegible] وہ سم بلاک کرا دی ہو... [illegible] وہ دی تھی۔ خیر...! مسئلہ بتائیں۔"

"میں ملتان جانا چاہتا ہوں... مگر میرے پاس کرائے وغیرہ کے لیے رقم نہیں ہے۔" بتاتے ہوئے مجھے اندر سے شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ بے شک میں آسیہ کی وجہ سے ہی ایک نئی مصیبت کا شکار ہوا تھا مگر پھر بھی اس طرح اپنی مجبوری بتانا مجھے خفت آمیز ندامت سی محسوس ہو رہا تھا۔

"او... مجھے پہلے بتا دیتے آپ۔" دوسری جانب سے وہ بولی۔ "خیر...! آپ فکر نہ کریں پیسوں کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"مگر یہ مجھ پر آپ کا ادھار رہے گا۔ میں آپ کو لوٹا دوں گا۔" میں نے جلدی سے کہہ بھی دیا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

"شہزاد صاحب! آپ ایک عظیم انسان ہیں آپ وہ انسان ہیں جو اپنے لیے نہیں... دوسروں کے لیے جیتے ہیں۔ میں نے آپ سے متعلق کچھ پرانی خبروں کی رپورٹنگ، کالم اور اداریے پڑھے ہیں۔ اور بہت کچھ آپ کی زبانی بھی میں نے سنا ہے اس کے بعد سے تو یقین کیجیے میں خود آپ سے شرمسار ہوں۔ میں آج تک صحافت میں وہ کام نہ کر سکی جو آپ نے اپنے زور بازو سے کر دکھایا... اور وہ ہے... باطل کو حق کی طاقت سے زیر کرنا۔ بلکہ میں تو خود پختہ عزم کر چکی ہوں... کہ آپ کا ہر معاملے میں ساتھ دوں جو برائی کے خلاف برسرپیکار ہو۔ شہزاد صاحب! انسان دنیا میں اسی لیے نہیں آیا کہ بس کھایا پیا اور موج مستی میں گم رہے۔ انسان تو ایک [illegible] کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ جہاں برائی [illegible] دیکھے اسے [illegible] کی کوشش کرے، جہاں ناانصافی [illegible] دیکھے اسے سلجھانے کے لیے کوشش [illegible] نے بھی اسی مقصد کے پیش [illegible] قدم رکھا تھا... قلم اور میرے [illegible] اور برائی کو جو بھی اسے منظر عام پر [illegible] لیکن افسوس کہ آپ کے سلسلے میں مجھ [illegible] ایک بھیانک [illegible] سی ہوئی۔ مگر اب میں نے بھی پختہ عزم [illegible] ہے کہ جب تک میری غلطی کا ازالہ نہیں ہو جاتا آپ کا ساتھ میں نہیں چھوڑوں گی۔"

میں خاموشی سے اس کی طولانی گفتگو سنتا رہا اور اس کے بارے میں اندازہ قائم کرتا رہا۔ پہلے پہل وہ بھی مجھے ریحان کی طرح ثابت قدم اور جذباتی لڑکی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن متوقع خطرات کی یلغار کا اندازہ ہوتے ہی ریحان پیچھے ہٹ گیا تھا جبکہ الٹا میرے خلاف قدم بھی اٹھا چکا تھا۔ اس کا مقصد یقیناً یہی رہا ہوگا کہ سب جھوٹ بھی ہو سکتا ہے یا پھر وہ مجھے گرفتار کروا کر اپنی منگیتر آسیہ کو اس سارے خطرناک چکر سے آزاد کرانا چاہ رہا تھا۔ جس میں پڑنے کا وہ عزم کر چکی تھی۔ جبکہ آسیہ... کے جذبات میں مجھے اب نیک نیتی، جوش اور پختگی کی جھلک محسوس ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک باعزم لڑکی ثابت ہو رہی تھی جو ثابت قدمی کے ساتھ نہ صرف اس مشکل گھڑی میں میرا پورا پورا ساتھ دینے کا گویا عہد کر چکی تھی بلکہ اسے اپنی غلطی کا بھی احساس تھا۔

"ایک پتا نوٹ کریں... اور فوراً سے پیشتر وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔" معاً دوسری جانب سے دوبارہ اس کی آواز ابھری۔

"میں کچھ رقم لے کر وہیں پہنچ رہی ہوں۔ مگر خیال

Digest.pk

رکھنا پولیس آپ کے پیچھے نہ لگے۔ ایک بار پولیس کی نظروں میں آ گئے تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ میں چاہتی ہوں آپ جلد از جلد باجی خانم شاہ کے پاس پہنچ جاؤ... بعد میں وہ بہت کچھ سنبھال لیں گی، اور میں بھی تھوڑے دنوں بعد وہیں آ جاؤں گی۔"

میں نے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور پھر اس کا بتایا ہوا پتا اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے پی سی او والے کو پیسے دیے اور باہر آ گیا۔ یہ بھی میں نے آسیہ کو فون کرنے کا رسک لیا تھا، مگر مجبوری تھی، اس کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا... میری فون کال ریکارڈ بھی کی جا سکتی ہوگی۔

مجھے حیرت تھی کہ کس طرح ایک بے گناہ اور عام سے انسان کو ایک خطرناک مجرم کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ تو آسیہ نے بھی میرے ساتھ سچ اور اصل مجرموں کو بے نقاب کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک باعزم اور سچ پر صادق خاتون تھی۔

آسیہ کے بتائے ہوئے پتے پر میں ایک رکشے کے ذریعے پہنچا۔ یہ ایک ماڈرن ٹائپ ریسٹورنٹ کا پتا تھا جو آبادی سے قدرے الگ تھلگ سی جگہ پر [illegible] واقع تھا۔

چنانچہ آسیہ نے آبادی سے اتنی دور ریسٹورنٹ یوں منتخب کیا تھا۔ مگر اس کی یہ حکمت [illegible] آ رہی تھی [illegible] کہ پولیس وغیرہ کی نظروں [illegible]

[illegible]

[illegible] منتخب ہاں تھا۔ گراؤنڈ فلور پر ہی واقع تھا۔ یقیناً پولیس کا اس ریسٹورنٹ کی طرف کم ہی دھیان جا سکتا تھا۔ شیشے کے بھاری بھرکم دروازے کے قریب پہنچا تو دو باوردی افراد نے ادب سے جھک کر مجھے سلام کیا اور دروازہ کھول دیا۔

اندر سینٹرل اے سی کی ٹھنڈک سے یکدم ہی جسم و جان میں خوشگوار سی تازگی اتر گئی۔

میں چکنے فرش پر پُراعتماد چال چلتا ہوا ایک کونے والی میز پر جا بیٹھا۔ اس وقت تو اتنا خاص رش دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا مگر دن ڈھلنے سے رات گئے تک یقیناً یہاں لوگوں کی آوک جاوک بڑھ جاتی ہوگی۔

میں نے چکن کارن سوپ کا آرڈر دیا اور ساتھ ہی باوردی ویٹر سے کہہ بھی دیا کہ میری ایک ساتھی آنے والی ہے، شاید ہم لنچ بھی کریں... وہ سر ہلا کر مسکراتا ہوا لوٹ گیا۔ پتا نہیں چکن کارن سوپ کتنے کا تھا۔ دو تین سو ہی میری جیب میں تھے۔ اسے بتانے کا مقصد میرا یہ تھا کہ کہیں وہ بل نہ لے آئے، کیونکہ آسیہ آنے والی تھی، رقم کے ساتھ... پھر مجھے بل کی پروا نہ ہوتی۔

بہرحال مجھے بھی بھوک لگی ہوئی تھی... سوپ سے کسی حد تک کام چل سکتا تھا۔ میں آسیہ کا انتظار کرنے لگا اور گاہے بگاہے ہلکے سبز شیشے کی دیوار سے باہر وسیع و عریض احاطے پر بھی نظر ڈال لیتا۔

ذرا دیر بعد [illegible] سوپ کا بڑا سا باؤل رکھ کر چلتا بنا۔ میں آہستہ آہستہ [illegible]

ابھی میں نے [illegible] نصف پیالہ [illegible] ختم کیا تھا کہ آسیہ آ گئی۔ مختصر [illegible] سامنے والی چیئر پر براجمان ہو گئی [illegible] ہاتھ میں بڑا سا پرس تھام رکھا تھا [illegible] اپنی گود میں رکھ لیا [illegible]

"[illegible] ہے؟" میں نے پوچھا۔

"[illegible] کافی ہے۔ کچھ زیادہ دیر تک بیٹھ [illegible] آپ کو بیٹھنے کا مشورہ دوں گی۔" اس نے کہا۔ [illegible] میں تھی۔ اس کی وجہ میں جانتا تھا۔ اسی دوران وہی ویٹر آیا، تو آسیہ نے اسے کولڈ ڈرنک [illegible] کہا۔ وہ چلا گیا۔ اس نے [illegible] آسیہ نے مجھے ایک [illegible]

[illegible]

سیٹ... [illegible] سے نکلنے کی کوشش کریں، اور ملتان پہنچتے ہی... باجی خانم سے ملاقات ضرور کرنا۔" اس نے کہا۔ میں نے یہ ساری چیزیں سنبھال لیں اور اس کا ایک بار پھر تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

وہ کولڈ ڈرنک پینے لگی، میں اپنا سوپ ختم کر چکا تھا اور آسیہ کے چہرے کی طرف یوں ہی تکے جا رہا تھا کہ دفعتاً میں نے اس کا چہرہ متغیر ہوتا محسوس کیا۔ کولڈ ڈرنک پینے کے دوران اس کا چہرہ شیشے کی دیوار کے پار جھانک رہا تھا کہ دفعتاً میں نے اس کی آنکھیں پھیلتی ہوئی دیکھیں۔ چہرے کے تاثرات میں یکلخت خوف آمیز بوکھلاہٹ سی آ گئی۔ نجانے اس نے باہر ایسا کیا دیکھ لیا تھا۔ میں نے بھی قدرے چونک

Digest.pk

گر اس کی نگاہوں کی سمت دیکھا تو مجھے آسیہ کی لرزتی آواز سنائی دی۔

"ششش... شہزاد..."

تب تک میں صورتِ حال کا اندازہ لگا چکا تھا بلکہ سبز رنگ کی شیشے کی دیوار کے پار سامنے وسیع احاطے کے کھلے گیٹ سے پولیس کی ایک پجیرو اور ڈبل ڈور جیپ جس کی چھت پہ بلیو ہوٹر نصب تھا، اور اس کے عقب میں پولیس کی تین موبائلیں بھی اندر گھستی آگئیں۔ میرا پورا وجود سنسنا اٹھا... آسیہ کی طرح گویا مجھے بھی یہ منظر دیکھ کر چند ثانیے کے لیے سکتہ ہو گیا۔

"مائی گاڈ... یہ ہو گیا۔" میری گم صم سماعتوں میں اس کی ہکلاتی ہوئی آواز ابھری۔ خود میرے اپنے اوسان خطا تھے۔ اور میرا رُواں رُواں سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں نے فوراً اپنے مختل حواسوں کو سنبھالا... ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال سے میں نے آسیہ سے کہا۔

"فوراً مجھ سے دور ہو جاؤ... اور اوپر کسی منزل کے ہال میں گھس جاؤ۔"

اس کی سمجھ میں نہ آیا تو میں دانت پیس کر کہا۔ "جلدی جاؤ۔ پولیس تمہارا تعاقب کرتی ہوئی یہاں آئی ہے۔ وقت کم ہے۔ جلدی سے مجھ سے دور ہو جاؤ پلیز۔"

وہ اب کہیں جا کر میری بات کا مطلب [illegible] اور ایک قریبی زینے کی طرف بڑھ گئی جو اوپری [illegible] کی طرف جاتا تھا۔ میں نے چپس اور [illegible] سنبھالے [illegible] چہرے اور سر پہ [illegible] اب یہ پولیس کی موجودگی میں [illegible] مگر اس کا فوری حل میرے [illegible] تھا۔ ویٹر کو بلا کر میں نے پانچ سو کا نوٹ [illegible] سے واش روم کا راستہ پوچھا۔ کوشش میری یہی تھی کہ میرے انداز و اطوار اور چہرے سے بوکھلاہٹ، عجلت یا پریشانی ظاہر نہ ہونے پائے۔ ویٹر نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ میں سیدھا اشارے کی سمت لپکا۔ میں نے البتہ واضح طور پر ویٹر کے چہرے پر ابھرنے والی پُرسوچ لکیریں بھانپ لی تھیں۔

سردست میرے چھپنے کی یہی ایک جگہ تھی۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں جو ہڑبونگ مچنے والی تھی، اس کا مجھے اندازہ تھا۔ واش روم خاصا کشادہ تھا اور دیدہ زیب ٹائلز سے مزین تھا۔ دیوار پر شفاف آئینے نصب تھے، اور نیچے فینسی واش بیسن تھے۔

میں ایک باتھ روم میں گھس گیا۔ یہ سرے سے آخری

سمت کی دیوار پہ تھا اور اندر کموڈ بنا ہوا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا مجھے ایک سلائڈنگ شیشے والی کھڑکی دکھائی دی۔ میں کموڈ پہ پاؤں رکھ کر اس پر چڑھ گیا۔ اسی وقت مجھے واش روم میں داخل ہوتے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ میرا دل گویا سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ کسی بھی وقت میرے باتھ روم کا دروازہ چیک کرنے کی باری آ سکتی تھی، مگر اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا، میں نے سلائیڈنگ شیشے کی کھڑکی کھول لی۔ اور باتھ روم ہی کی اندرونی دیواروں میں نصب پائپوں کے سہارے کھڑکی سے دوسری طرف کود گیا۔ کھڑکی آدم گزار تھی۔ جس کا میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا [illegible] اور عقل مندی میں نے یہ کی تھی کہ اپنے باتھ روم [illegible] اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی ورنہ پولیس [illegible] ہو سکتا تھا [illegible] یہاں سے اس کھڑکی سے کودنے کی [illegible] وہ دستک کے جواب میں آواز نہ [illegible] کا دروازہ توڑ ڈالتے۔

میں [illegible] سمت کودنے سے پہلے روشن دان ٹائپ کا [illegible] جگہ سے ناتا نہیں بھولا تھا، ایک دعا [illegible] کہ جس دوسری سمت میں گرتا... [illegible] مجھے دیکھ نہ لے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ کچن کا کوئی [illegible] چھوٹا سا سرا نظر آتا تھا۔ اور کچن اس کے ساتھ ہی تھا۔ [illegible] حق تھا کیونکہ اسٹور کے بند دروازے کے دوسری طرف مجھے کچھ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے اسٹور کا جائزہ لیا۔ یہاں کوکنگ آئل کے بڑے بڑے کنستر، مصالحے اور آٹے سے بھرے ڈرم، چپس اور دیگر مصالحہ جات کے جار وغیرہ رکھے تھے۔

پولیس سے چھپنے کی فوری طور پر مجھے پناہ تو مل گئی تھی مگر خطرہ ابھی سر پہ بھوت کی طرح مسلط تھا۔ پولیس یہاں بھی تلاشی کے لیے آسکتی تھی بلکہ یقیناً اس نے پورے ریسٹورنٹ کو گھیرے میں لے کر میری تلاش شروع کر دی ہوگی۔

اندرونی سمت میں ہونے کے باعث اسٹور کے اندر دن میں بھی نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی جو میرے لیے سود مند ہی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے تیزی سے جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

دفعتاً کچن کی طرف سے آنے والے شور کی آواز بڑھ گئی... پھر کسی کے منہ سے میں نے "پولیس" لفظ سنا۔ میرا دل یکبارگی جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ شاید پولیس کچن میں داخل ہو گئی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اسٹور میں بھی در آتی۔

Digest.pk

میں فوراً بڑے سے بڑے ڈرم کے ڈھکن کھول کر دیکھنے لگا... ایک میں مقدار بہت نچلی سطح پر تھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس ڈرم کو گرایا اور اس کے اندر سکڑ سمٹ کر سما گیا... اور اس کا منہ دیوار کی طرف کر دیا۔ ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا تھا تاکہ پولیس بھرے ہوئے ڈرموں کے ڈھکن چیک کرنے کے بعد اس گرے ہوئے ڈرم کو خالی سمجھے۔

ادھر میں نے جیسے ہی اپنی کارروائی نمٹائی، اُدھر میری کھلی ہوئی سماعتوں نے فوراً اسٹور کے دروازے کے دھڑ سے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس پر بھاری قدموں کی دھمک سنتے ہی میں نے گویا اپنی سانس تک روک لی۔

"اوئے، یار ملک! او مردود ادھر بھلا کیسے آئے گا... سنے... دیکھ کوئی بھی نہیں ہے۔ چل آ گے..."

معاً مجھے ایک چیختی سی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اپنا ساتھی پولیس والے سے میرے متعلق ہی کہہ رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا مگر اس خوشی کو خاک ہونے میں بھی لمحے کی دیر نہ لگی تھی۔ کیونکہ اس وقت میری جیب میں موجود سیل فون کی "میسج ٹون" گنگنائی۔ مجھے جیسے موت آگئی۔

"اوئے۔ یہ کیسی آواز تھی، موبائل کی لگتی ہے۔" دوسرے پولیس والے کی آواز ابھری۔

"اوئے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ وہ [illegible] ہے۔ اس نے چودھری... کی جیب سے بجا ہو [illegible] نکل... مجھے تو یہاں گھٹن ہو رہی ہے۔"

ذرا دیر بعد جانے [illegible] اور پھر جیسے میرے تن مردہ [illegible] میں سے ڈرم [illegible] نکلتے ہی سب سے پہلے اس منحوس سیل فون کو [illegible] کہ ایک بار اس کی ٹون دوبارہ بجل میرے لیے کسی مصیبت کا باعث نہ بنے۔ یہاں واقعی گرمی اور گھٹن تھی، ظاہر ہے چھوٹے سے بند اسٹور میں اور کیا ہوتا۔ مگر میں خوش تھا۔ میری جان بچ گئی تھی، ابھی ابھی میں پولیس کے نرغے میں آنے سے بال بال بچا تھا۔ دوسرے میری یہی کوشش تھی کہ... پولیس سے میرا کسی قسم کا ٹاکرا نہ ہونے پائے، اس صورت میں میرے ناکردہ جرم سنگینی میں بدل سکتے تھے یعنی میرا قانونی طور پر بعد میں اپنا دفاع کرنا مشکل ہو جاتا۔

میں ابھی ایسے ہی سکڑا سمٹا گرمی اور حبس زدہ گھٹن میں ڈرم کے اندر پڑا رہا۔

کافی دیر گزر گئی، شاید نصف گھنٹے سے بھی زیادہ...

اب کچن میں بھی خاموشی طاری تھی۔ میرا ابھی اپنے اس خفیہ "ٹھکانے" سے نکلنے کا بالکل ارادہ نہ تھا...

مجھے آسیہ کی طرف سے تشویش لاحق تھی۔ میں نے پولیس کو دیکھتے ہی اسی لیے اسے خود سے فوراً دور کر دیا تھا۔ اب وہ کہاں تھی؟ میں نہیں جانتا تھا کوئی بعید نہ تھا وہ پولیس کی زد میں آ گئی ہو اور یہی متوقع تھا کہ پولیس انسپکٹر اسے اب تک اپنے زیرِ تفتیش لا چکا ہو یا لا رہا ہو۔

آسیہ اپنا دفاع خاطر خواہ طریقے سے کر سکتی تھی... میرا معاملہ اور ہوتا۔

میرے اندازے کے مطابق جب مجھے مزید نصف گھنٹا اس طرح [illegible] اس ٹھکانے میں گزر گیا تو میری حالت دیدنی ہو [illegible] پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ گرمی اور گھٹن سے تو [illegible] میرا دل [illegible] لگا تھا۔ میں نے سوچا کم از کم اس ڈرم [illegible]... اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ [illegible] دہرا ہو کر ڈرم میں سمائے رہنے [illegible] باہر نکل کر سیدھا ہوا تو میرا جوڑ جوڑ [illegible] خود کو واپس آتا ہوا... میری کمر اور [illegible] ہاتھ...

[illegible]... اب میں کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں [illegible] کر اسٹور کے دروازے کی طرف دبے پاؤں بڑھا جو کچن کی طرف کھلتا تھا، اور اس وقت بند تھا۔ میں ذرا جھجک کر بے غور اس کی کوئی چور جھری تلاش کرنے لگا۔ مگر ایک تو دروازہ کسی عام ہوٹل کا نہ تھا جو کھلی تختوں کا ہوتا، اس دروازے پر پلائی اور فارمیکا چڑھا ہوا تھا اور ائیر ٹائٹ تھا۔ تاہم کان لگا کر میں نے دوسری جانب سے کچھ سن گن لینے کی کوشش چاہی مگر کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ایک خیال اچانک میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ دروازہ ذرا کھول کر باہر جھانکا جائے، میں نے ایسا ہی کیا۔ شکر تھا دروازہ لاک نہ تھا۔ کنڈی کو ذرا گھما کر میں نے دروازے میں سب سے پہلے باریک سی جھری بنائی۔

کچن خالی نظر آیا جو خاصا وسیع تھا۔ یہاں سے متعدد بار... ریسٹورنٹ کے ہال کا بھی منظر دکھائی دیتا تھا۔ وہاں چند لوگ ہی کھڑے اور بیٹھے نظر آئے مگر پولیس دکھائی نہ دی۔

دفعتاً ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا۔

میرا ارادہ آسیہ سے رابطہ کرنے کا تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ تیسرے وہ کن حالات کا شکار ہو... سرِدست مجھے اس

Digest.pk

ریسٹورنٹ سے نکل جانا چاہیے۔ میں نے اپنی گزشتہ کارروائی کو ریورس کیا اور... دوبارہ... روشن دان نما کھڑکی سے... کود کر دوسری طرف واش روم میں آگیا۔ یہاں بھی کوئی نہ تھا... میں دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں... ریسٹورنٹ میں گنتی کے محض چند ہی لوگ بیٹھے تھے۔ عملے کے لوگ ایک طرف کونے میں مختلف ٹولیاں بنائے کھڑے آپس میں کھسر پھسر کرتے نظر آئے۔ خارجی دروازے کی طرف بڑھنے سے پہلے میں نے شیشے کی دیواروں کے پار دیکھا تھا۔ پولیس جا چکی تھی، اور میرا یہ خدشہ بھی غلط ثابت ہوا تھا کہ جاتے وقت پولیس کے چند اہلکار ادھر قریب ہی گشت کر رہے ہوں گے۔ مگر شکر تھا کہ ایسا کچھ نہیں تھا... اب مجھے ریسٹورنٹ سے باہر نکلنا تھا۔ یہاں اس بات کا خطرہ تھا کہ مجھے یوں نکلتا دیکھ کر عملے کا کوئی شخص... دیکھ کر چونک سکتا تھا۔ مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے روکنے یا ٹوکنے کی کوشش کریں گے۔

لہٰذا میں پُراعتماد چال کے ساتھ بظاہر اطمینان سے چلتا ہوا خارجی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مگر اندر سے میرا دل بری طرح سہما ہوا تھا۔ خارجی دروازے کی طرف بڑھنے کے دوران مجھے کسی کے اونچا بولنے کی آواز آئی تھی اور میرا دل یکبارگی دھڑکا تھا، مگر میں چلتا [illegible] کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

پھر میں نے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی اور ایک ٹیکسی میں سوار ہونے کے بعد کرا[illegible] کیے بغیر ڈرائیور کو... لاری اڈے چلنے کو کہا۔

ایسے گاہک جن [illegible] کھپانا پڑے، ان سے ٹیکسی [illegible] ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نے فوراً ٹیکسی اسٹارٹ [illegible] بڑھا دی۔

☆☆☆

لاری اڈے پہنچ کر میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو منہ مانگا کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ میں نے دانستہ لگژری مسافر کوچ کے بجائے... عام سی لاری کو ترجیح دی تھی اور ملتان جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد یہ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ اس کے مزید نصف گھنٹے بعد بس نے رینگنے کے انداز میں بڑھنا شروع کر دیا۔

لاہور سے ملتان کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ میں نے لاہور سے ملتان واپسی کا سفر دانستہ ملتان روڈ سے نہیں کیا تھا۔ اس راہ پہ پھلاں والی پڑتا تھا۔ اور پھر اس روٹ پر ائرکنڈیشن لگژری مسافر کوچیں سفر کرتی تھیں۔ جن کی خاص طور پر چیکنگ ہوتی تھی، جبکہ میں نے نسبتاً محفوظ راستہ اپنایا تھا، بے شک یہ راستہ طویل تھا مگر میں سمجھتا تھا کہ طوالت کے باوجود یہ میرے لیے محفوظ راستہ تھا۔ میں نے اپنا فون آن کر لیا تھا۔ آسیہ سے تو میں فی الحال رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا بجز اس کے کہ وہ خود مجھ سے ٹیلی فونک رابطہ کرتی، ہاں! ارشد کو فون کرنے کا ارادہ کیا کیونکہ مجھے اپنے دوست اول خیر... کی خیر لینی تھی۔

بس میں پنجابی سرائیکی ریکارڈ چل رہا تھا۔ سستے کرائے والی اس بس میں عام اور غریب ہی سفر کر رہے تھے اور سب اپنے آ[illegible] میں مگن تھے۔ میں کھڑکی والی سیٹ پر تھا۔ میر[illegible] ایک نوعمر لڑکا کانوں سے ائیر فون لگ[illegible] موبائل [illegible] یدہ گانے سننے میں محو تھا۔ میں نے [illegible] اور قدرے کھڑکی کی طرف خود کو جھکا [illegible] اس طرح اپنے کان سے لگا لیا کہ میرا [illegible] ہاتھ [illegible] جائے ہوئے تھا۔ [illegible] فون جا رہی تھی۔ تیسری رنگ پر [illegible]

"ہاں، ارشد! میں بول رہا ہوں شہزاد!" میں نے حتی الامکان اپنی آواز دھیمی رکھی تھی، یوں بھی بس میں ریکارڈ بج رہا تھا۔ جس مسافر کو موبائل پہ کسی سے ضروری بات کرنا ہوتی، وہ اس طرح ہی کر رہا تھا۔ اس لیے مجھ پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا۔

"تت... تم... شش... ٹھیک تو ہو نا...؟ کدھر ہو؟ خیریت سے ہو؟"

میرا جب بھی اپنے کسی بہی خواہ سے رابطہ ہوتا ہے سب سے پہلے وہ یہی سوالات کرتا۔ اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی تصور کرتا تھا کہ ان نامساعد حالات میں بھی ابھی میری تقدیر اتنی ستم کار نہیں ہوئی تھی کہ میں خود کو اکیلا سمجھتا۔

"میں بالکل ٹھیک... اور جلد از جلد ملتان پہنچنے والا ہوں۔ مجھے اول خیر کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کیوں؟" دوسری طرف سے دوبارہ ارشد کی آواز ابھری۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب ہوش بھی آگیا ہے اسے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے سب سے پہلے تمہارے بارے میں پوچھا تھا۔"

"تمہیں اسے میری طرف سے تسلی دے دینی چاہیے تھی تاکہ اس کے ذہن اور طبیعت پر اس کا مثبت اثر

پہنچتا۔"

"ہاں... ہاں وہ تو ظاہر ہے مگر وہ تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔"

"وہ ابھی تک ہاسپٹل میں ہے، یا...؟"

"اسے ڈسچارج کر دیا گیا ہے۔ وہ اب جیجی والا میں ہے۔" ارشد چچا نے بتایا اور بے اختیار میں نے طمانیت بھری سانس لی۔

"تمہارے پاس آخر کتنے نمبر ہیں؟ ہر بار نئے نمبر سے رابطہ کرتے ہو... اور پھر پچھلا نمبر ملتا ہی نہیں ہے تمہارا۔" وہ بولا۔

"اب اس نمبر سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "ادل خیر کو میرا اسلام کہنا... اور فی الحال بہ وقتِ ضرورت میں خود ہی تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔ فون پر زیادہ دیر گفتگو مناسب نہیں، خدا حافظ۔"

میں نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ سیل کی بیل گنگنائی۔ میرا دل یکبارگی یونہی دھڑکا۔ اسکرین پر نمبر اجنبی تھا۔ میں نے کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری جانب سے ابھرنے والی آواز بھی اجنبی ہی تھی مگر یہ ایک نسوانی آواز تھی۔ جس نے مجھے بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

"ہیلو آپ شہزاد احمد خان ہیں؟" اجنبی [illegible] دوسری طرف سے استفسار کیا۔

"جی ہاں! مگر آپ کون؟" [illegible] کا جال سا بن گیا۔

"ایڈووکیٹ خانم [illegible] آسیہ نے آپ کے بار[illegible] بتایا"

خانم شاہ کا نام سنتے ہی [illegible] اختیار میں پرسکون سا ہو گیا۔ اور فوراً انہیں احتراماً سلام کر کے بولا۔

"جی... جی... آسیہ صاحبہ نے آپ کا مجھ سے غائبانہ تعارف کروایا تھا۔ اور" میں اس سے آگے نہ کہہ سکا... وہ بول پڑی تھی۔

"میری بات غور سے سنو مگر پہلے یہ بتاؤ، تم کہاں ہو اس وقت؟ پولیس کے ہتھے تو نہیں چڑھے ہو؟"

"میں اس وقت ایک مسافر بس میں ہوں اور لاہور سے ملتان کے لیے روانہ ہو چکا ہوں..."

"تھینکس گاڈ۔" بے اختیار اس کے دعائیہ الفاظ ابھرے... میں چونک پڑا، وہ بولی۔

"آسیہ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھ سے فون پر رابطہ کیا تھا اور تازہ صورتحال کے بارے میں بتایا تھا۔ سردست وہ تم سے رابطہ نہیں کر سکتی... ایک مجبوری ہے اسے، مگر مجھ سے بات کر کے اس نے مجھے کہا تھا کہ تمہاری خیریت معلوم کر کے اسے بتا دوں..."

"کہیں وہ پولیس کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی ہے؟" میرے لہجے میں تشویش تھی۔

"ایسا ہی سمجھو... ریحان نے خود ہی معاملہ خراب کر دیا تھا اور بلاوجہ خود بھی پولیس کے کھن چکر میں آ گیا اور آسیہ کو بھی پھنسا دیا۔ یہ تو شکر ہوا کہ تم پولیس کے چھاپے کے دوران ریسٹورنٹ میں پکڑے نہیں گئے۔ ورنہ آسیہ بھی گئی تھی، خیر... [illegible] کی گلو خلاصی کروا لی ہے۔ تم ملتان پہنچتے ہی سیدھ[illegible] چلے آنا۔ آسیہ بھی دو ایک روز میں آ [illegible] کا پروگرام [illegible] آپ معلوم ہی ہے۔"

[illegible] سب سمجھ گئی۔ میں بڑے [illegible] ستار ہا۔ وہ چند ثانیے توقف کے بعد [illegible] کرنا ضروری ہے۔ شہزاد! بے حد [illegible] ہو نا۔"

"جی... جی ہاں بالکل خانم صاحبہ!" میں نے فوراً کہا۔ وہ بولی۔

"میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ بہ قول آسیہ کے ملتان میں تمہارے اور بھی بہی خواہ اور ہمدرد ہوں گے مگر ابھی تمہیں فوری طور پر اور سب سے پہلے مجھ سے ملنا ضروری ہے۔ میں فون بند کر رہی ہوں اور آسیہ کو تمہاری خیریت کے بارے میں بتاتی ہوں۔ بے چاری بہت فکرمند ہو رہی تھی اوکے؟... خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" میں نے بھی اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد میں نے سرمد بابا سے بات کی۔ مقصد ان کو اور عابدہ کو اپنے بارے میں تسلی کروانا تھی۔ اور یہ نیا نمبر بھی دینا تھا۔ ساتھ ہی میں نے انہیں اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی بتا دیا۔

"مگر بیٹا! پھر بھی مجھ سے رابطے میں رہنا اور ملتان پہنچتے ہی مجھے فون کرنا۔ یا میں بھی تم سے رابطہ کرتا رہوں گا۔" انہوں نے کہا۔ میں نے جی اچھا کہہ کر سیل آف کر دیا۔ انہوں نے مجھے شکیلہ کی بھی خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔

اس عام سی مسافر بس کی سیٹیں زیادہ واجبی یا آرام دہ نہیں تھیں۔۔۔ میں اس کی پشت گاہ سے ٹیک لگا اور سر ٹکا کر

Digest.pk

دیر کو آنکھیں موند کر سو جاتا۔ ایک تو اس میں جھٹکے اور ہچکولے بہت تھے۔ پھر یہ ہائی وے سڑک نہ تھی، پنجاب کے چھوٹے بڑے قصبوں اور دیہاتوں کی طرف سے گزرنے والی، عام سی سڑک تھی، بہرطور... میرا تحفظ ذہنی چھوٹی چھوٹی مشکلات کو سہنے میں تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔

رات کے کسی پہر بس ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں رکی۔ سارے مسافر اترنے لگے۔ میں بھی اتر گیا۔ مجھے بھوک لگی تھی۔ ہوٹل کے وسیع و عریض کچے احاطے میں کھری چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس پر مسافر لوگ بیٹھے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے اور چائے پی رہے تھے، اور بھی آنے جانے والی مسافر بسیں وہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ میں ہوٹل کے اندر جا کر ایک کونے والی میز پر بیٹھ گیا اور.... چکن کڑاہی اور تندوری نان کا آرڈر دیا۔ ذرا دیر بعد ہی ویٹر نے گرم گرم کھانا میرے سامنے لگا دیا۔

آدھا گھنٹے کا اسٹاپ تھا۔ میں کھانے وغیرہ کھا کے سیر ہو گیا اور پھر سارے مسافر بھی رفتہ رفتہ کھانے پینے سے فارغ ہو کے بس میں سوار ہونے لگے۔ میں بھی اپنی بس میں سوار ہو کے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اچانک میری نگاہ ایک پولیس موبائل پر پڑی [illegible] میں پریشان سا ہو گیا مگر مجھے اس میں کسی [illegible] محسوس نہیں ہوا۔ وہ شاید معمول کے گشت پر [illegible] چائے پینے آئے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کھڑکی کی [illegible] سیٹ تھی۔ اس کے بہت قریب ہی [illegible] آ کے رکی [illegible] پولیس مجھے پہچان سکتی تھی مگر [illegible] نہیں پہچانتے... بہرطور... [illegible] کوشش جاری رہی۔

خدا خدا کر کے [illegible] سوار ہونے لگے۔ پھر ڈرائیور نے بھی کھا پی کر اپنی سیٹ سنبھال لی۔ بس کا انجن اسٹارٹ کیا اور تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہو چکی تھی۔

پیٹ بھر کے کھانا کھانے کے بعد مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی مگر میں بس کی تنی ہوئی سیٹ پر سو نہیں پا رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مسافروں کو بٹھانے کے لالچ میں ان بسوں کی سیٹوں کو جان بوجھ کر تنگ کر کے قصداً زیادہ کر دی گئی تھی۔

میرا سر نیند کے متواتر حملوں کے باعث کبھی دائیں جھولتا کبھی بائیں کرتا۔ آخر میں نے اپنا سر اپنی سہولت اور محدود گنجائش کے مطابق ایک طرف ٹکا دیا اور سو گیا۔

نجانے میں کتنی دیر تک اسی طرح بیٹھے بیٹھے سویا رہا تھا

شہر میں موسیقی

شہر میں موسیقی کی ایک بہت بڑی محفل کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ایک صاحب پروگرام منیجر کے پاس آئے اور پروگرام میں شرکت کی اجازت چاہی۔

منیجر۔ "آپ گانا گاتے ہیں؟"

وہ صاحب۔ "نہیں۔"

منیجر۔ "سارنگی بجاتے ہیں؟"

وہ صاحب۔ "نہیں۔"

منیجر۔ "تو پھر طبلہ بجاتے ہوں گے؟"

وہ صاحب۔ "نہیں۔"

منیجر (جھلا کر)۔ "[illegible] آپ کیا بجائیں گے؟"

وہ صاحب۔ "تالیاں۔"

[illegible] کراچی

خاموشی

[illegible] بات چیت اور بحث و مباحثہ کی رزم گاہ تھی لیکن ان میں چند ایسے بھی تھے جنہوں نے [illegible] اختیار کر رکھی تھی۔ بولنے والوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ "صاحبان اس محفل میں چند گونگے بھی آ گئے ہیں، ان کی خاموشی نے اس باغ و بہار محفل میں قدرے بدمزگی اور یبوست سی پیدا کر دی ہے۔"

ایک کم گو نے محفل میں پہلی بار زبان کھولی۔ بولا۔ "حضرات ان صاحب کا [illegible] اتنا عرض کروں گا کہ خاموشی سے [illegible] اور اگر کہیں پیدا ہو بھی جائیں تو ان کا تدارک آسان ہوتا ہے مگر گفتگو اور زیادہ بولنے سے جو خرابی پیدا ہوتی ہے اس کا تدارک مشکل ہوتا ہے۔" پھر حاضرین محفل سے سوال کیا۔ "کیا آپ نے پانی سے بھری ہوئی مشک دیکھی ہے۔"

حاضرین میں سے چند آوازیں بلند ہوئیں۔ "ہاں دیکھی ہے۔"

اس شخص نے کہا۔ "تب پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ مشک کا منہ باندھ کر ہی اس کا پانی روکا جاتا ہے۔"

کاشف سعید۔ لاہور

کہ اچانک ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی... کچھ شور سنائی دیا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہورہی تھی، ایسا سورج کی روشنی کے باعث تھا۔ بس ایک بار پھر کسی روڈ سائڈ کیبن کے ہوٹل میں رکی تھی۔ میں نے بھی اتر کر چائے بسکٹ کا ناشتا کیا۔ پتا چلا کہ ملتان آنے ہی والا تھا۔ میری منزل قریب تھی۔ یہ میری وہ منزل تھی جو ہر طرف سے خطرات میں گھری ہوئی تھی... مجھے انتہائی محتاط ہوکے وہاں منزل پہ قدم رکھنا تھا۔ شکر تھا کہ اب تک راستے میں کوئی خصوصی قسم کی چیکنگ نہیں ہوئی تھی۔

بس کے اندر چند عورتیں اور مرد مسافر موجود تھے۔ میری سیٹ کی طرف کا حصہ خالی تھا۔ وہ نوعمر لڑکا بھی نیچے اترا ہوا تھا۔

میں نے سیل فون میں سب سے پہلے وقت دیکھا۔ تو نو بج رہے تھے۔

میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا اور خاتم شاہ کا نمبر ری ڈائل کرنے ہی والا تھا کہ ایک SMS موصول ہوا۔ میں نے بے دلی سے ان باکس اوپن کیا تو ایک اجنبی نمبر کا ایس ایم ایس ملا۔ جب پڑھا تو بری طرح ٹھٹکا۔ وہ آسیہ کا تھا۔ صرف اس قدر لکھا تھا۔ "پلیز کال می..."

اب تجانے کب اس نے مجھے [illegible] دانستہ سیل آف کرکے سویا تھا۔ ممکن ہے اس نے [illegible] کال بھی کرنے کی کوشش کی ہو۔ میں [illegible] خاتم شاہ سے رابطے کا ارادہ موخر کیا اور [illegible] کال [illegible] ایس ایم ایس کردیا۔

دوسری [illegible] نمبر تھا جس کی کال آتی، جو میں آسیہ کے نام سے [illegible] کرچکا تھا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو شہزاد صاحب۔ کیسے ہیں آپ؟ کہاں ہیں؟" دوسری جانب سے آسیہ کی آواز آئی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کی مہربانی سے بہت جلد ملتان پہنچنے والا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ اپنے بارے میں بتائیں۔"

"شکر ہے خدا کا... اب تک سب ٹھیک جارہا ہے۔" اس کی قدرے طمانیت بھری آواز آئی۔ "میں بھی آج صبح سویرے ہی جاگ گئی تھی اور ملتان آنے کی تیاری کررہی تھی۔"

میں نے ریسٹورنٹ میں پولیس کے چھاپے کے بعد کے حالات اس سے معلوم کرنے کا ارادہ کیا پھر کچھ سوچ کر بدل دیا۔ تاہم ایک پُراندیشہ خیال کے تحت بولا۔ "اگر آپ ملتان آرہی ہیں تو پلیز اس سلسلے میں ریحان کو کچھ مت بتایئے گا۔ نہ ہی یہ کہ میں ملتان میں آپ کی باجی کے پاس جاؤں گا۔"

"یہ تو اسے معلوم ہی ہے۔" وہ فوراً بولی۔

"دیکھیں! میرے صاحب میں اب ریحان پر بھروسا نہیں کرسکتا... پتا نہیں وہ اپنی جگہ سچا ہے یا غلط مگر میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے متعلق کسی آپ کے پروگرام کا اسے کچھ بھی پتا چلے۔"

"میں [illegible] کا مطلب سمجھ رہی ہوں۔" وہ محتاط ہوکر بولی۔ "[illegible] درحقیقت ریحان کو بھی اپنی غلطی کا خیال [illegible] پڑا تھا [illegible] اس کی بات پہ چونکا۔ وہ بتا رہی تھی [illegible] کے حوالے کرکے یہ سارا قصہ ہی [illegible] مگر آپ نے خاموشی سے نکل آنے [illegible] ریحان سے کچھ پڑگیا... تاہم اس نے [illegible] پولیس کو مطمئن کرنا تو چاہا تھا مگر [illegible] ہوشیار [illegible] اور کچھ سادہ وردی والے مخبروں کو [illegible] سے پیچھے لگادیا۔ اس دوران میں جب ریحان مجھ سے ملا تو میں بھی پولیس کی نظروں میں آگئی۔ ریحان مجھے آپ کے خطرے سے بھیڑیے میں پڑنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔ میں نے ابھی اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ اس دوران میں آپ کا فون آگیا۔ جب میں آپ سے ملنے ریسٹورنٹ پہنچی تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ پولیس میری بھی خفیہ نگرانی کررہی تھی۔ بعد میں آپ نے دانش مندی اور بیدار مغزی سے فوراً حالات کا ادراک کرتے ہوئے، مجھے خود سے دور کردیا۔ اور میں بھی... فوراً ریسٹورنٹ کے دوسرے فلور پر جاکر ایک خالی میز پر جابیٹھی۔ بعد میں پولیس آئی اور انسپکٹر محمود مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا مگر میں نے بہانہ بنالیا تھا کہ میں اپنی کسی دوست کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ چونکہ میں خود بھی رپورٹر ہوں اس لیے وہ مجھے زیادہ تنگ نہیں کرسکتا تھا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ جبکہ ادھر میں آپ کے لیے دعا گو رہی تھی کہ آپ پولیس کے ہتھے نہ چڑھو۔"

آسیہ سے بات کرنے کے بعد میں خاصا مطمئن تھا۔ پھر میں نے خاتم شاہ سے بھی رابطہ کرکے اسے اپنے جلد پہنچنے کی اطلاع دے دی۔

تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہوگئی۔

Digest.pk

ملتان میں بھی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ میں دانستہ لاری اڈے سے ایک اسٹاپ پہلے اتر گیا۔ وہاں سے ایک رکشا لیا اور سیدھا آسیہ کے بتائے ہوئے پتے پر ایڈووکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ پر پہنچا۔

بنگلے نما اس رہائش گاہ کی طرزِ تعمیر جدید خطوط پر کی گئی تھی۔ اس کی بناوٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ بنانے والے نے بڑے ذوق و شوق سے یہ گھر بنایا ہوگا۔ گیٹ پر ایک چوکیدار موجود تھا۔۔۔ بیرونی دیوار سے لگی بیلیں خوب صورت گل بوٹوں والی پھلواری نظر آرہی تھی۔ جس کے دامن میں بنا ہوا لوہے کا یہ سیاہ گیٹ خوب صورت نظر آرہا تھا۔

چوکیدار کو شاید میری متوقع آمد کے بارے میں پہلے سے آگاہ کردیا گیا۔ ایک مختصر سے مگر دیدہ زیب باغیچے سے گزر کر ہم اندر آگئے۔ وہ مجھے ایک ڈرائنگ روم کی طرز کے کمرے میں بٹھا کر چلا گیا۔ میں ایک صوفے پر براجمان ہوگیا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ دائیں جانب چند شیلف تھے جہاں سرخ اور سیاہ جلد والی کتابیں ترتیب سے لگی تھیں۔ دو ایک کتابوں کے عنوان مجھے قانون سے متعلق ہی محسوس ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر گزری کہ ایک نوعمر ملازمہ لڑکی۔۔۔ میرے سے ٹرے میں ٹھنڈے پانی کا جگ گلاس رکھ کر چلی گئی۔

میں نے کانچ کے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا۔ ابھی دوسرا گلاس پانی کا ختم کیا ہی تھا کہ ایک اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے سے ایک مجھولے قد کی چاق چوبند عورت اندر داخل ہوئی۔ اس نے ہلکے اودے رنگ کا کڑھائی والا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کی رنگت صاف تھی۔ اس کے چہرے سے آسیہ کی مشابہت کی جھلک محسوس ہوتی تھی۔

میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا اور اسے سلام کیا۔ اپنا رومال میں پہلے ہی سر سے اتار کر صوفے پر رکھ چکا تھا۔ وہ بہ غور مجھے تکتے ہوئے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں [illegible] ہٹ تھی۔

وہ باشعور [illegible] خاتون ہی نظر آرہی تھی۔۔۔ [illegible] باتیں ہو [illegible] ئیں۔ میں نے اسے آسیہ سے تعلق [illegible] کی دغابازی کے بارے میں بھی آگ [illegible] چاہتا تھا کہ اس سے کوئی بات چھپا [illegible]

[illegible] ناشتا بھی کیا۔ اس کے بعد اس [illegible] تک کے سارے حالات تفصیل

طاہر جاوید مغل
کے رومان انگیز سحر آفریں قلم کا نیا شاہکار
ستاروں پر کمند
چاہتوں کو دریا میں قید کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ انہونیاں بھی کبھی کبھی ہو جاتی ہیں روزنوں کو دیکھنے والے اپنے حوصلے سے انہیں دہانہ بنا دیتے ہیں
حسن و عشق اور رقابت و رفاقت کی چاشنی لیے ایک دل ربا داستان
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
کے صفحات پر شمارہ جولائی 2014ء سے ملاحظہ فرمائیں

کے ساتھ پوچھیے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا البتہ بیگم صاحبہ والا ذکر میں نے مختصر اور عام انداز میں صرف اپنے دوست اول خیر کے حوالے سے کیا تھا۔

میرے حالات جاننے کے بعد وہ مجھ سے خاصی متاثر نظر آنے لگی۔ وہ چند ثانیے۔ گہری سوچ میں ڈوبی رہی اس کے بعد بولی۔

"شہزاد تم واقعی ایک حوصلہ مند اور بہادر انسان ہو۔ تمہارا ایک عمل انسانیت کے عین مطابق ہے۔ تم نے نامساعد حالات کا اب تک جس جواں مردی اور ہمت سے کیا ہے بلاشبہ تم داد کے مستحق ہو۔ تمہارے جیسے ہی انسانوں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ قدرت ایسے انسانوں سے ہی سماج سدھارنے کا کام لیتی ہے۔ اللہ نے تم کو بہت بڑی توفیق بطور نعمت عطا کی ہے۔ جبکہ تمہارا اپنا ماضی کرب کی ایک دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ ایسے میں دوسروں کے لیے جینا تمہارا... ایک قابل لحاظ عمل ہے۔"

خانم شاہ کے ان الفاظ میں میرے لیے جتنی توصیف تھی، وہ اس کے بھی اچھے انسان ہونے کی دلیل تھی۔ میں نے اس پر اس کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اور سادہ سے لہجے میں کہا۔ "میڈم! آپ کا خلوص اور آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ نے مجھے ایسا سمجھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں تو خود [illegible] سا انسان ہوں اور ہر حال میں اللہ کا شکر [illegible] اب پتا نہیں یہ میری فطرت کا حصہ ہے یا میرے [illegible] کے ورد کا شاخسانہ کہ میں کسی پر ظلم و زیادتی ہوتے [illegible] نہیں کرسکتا۔ ظالم جب طاقت [illegible] اور [illegible] اور اس کے سامنے مظلوم ہوں [illegible] مجبور ہوکر اپنے ظلم کے خلاف [illegible]... چپ رہنا مجھے گوارا نہیں ہوتا۔"

خانم شاہ بڑے دھیان سے میری بات سنتی رہی۔ اس کے بعد ہولے سے کھنکھار کر بولی۔ "تمہارے جیسے بہادر اور باعزم نوجوانوں سے ہی ایک دن ملک و قوم کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ ورنہ تو ظلم، ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ نے ہمارے ملک کو ہی نہیں، قوم کو بھی پستی میں گرا دیا ہے۔"

"اس کی وجہ ہمارے ملک کے ابن الوقت اور طالع آزما سیاست داں ہیں۔ جو اپنے ذاتی مفادات اور طاقت و اقتدار کے نشے میں اس قدر گم ہوجاتے ہیں کہ پھر انہیں عام عوام کے بنیادی مسائل حل کرنا تو دور کنار ان کی طرف متوجہ ہونے کی توفیق نہیں ہوتی۔" میں نے آسیہ تک کی اپنی اخباری معلومات کے مطابق کہا۔

"آسیہ پہنچنے والی ہوگی تب تک میں تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہوں گی۔" اس نے اس گمبھیر موضوع کی طرف آتے ہوئے پہلو بدل کر کہا۔ میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تمہارے حق میں ہونے والے آخری مقدمے کے بعد بقول تمہارے ایک تفتیشی افسر مقرر کیا گیا تھا۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

وہ مستفسر ہوئی۔ میں نے کچھ سوچ کر بتایا۔

"انسپکٹر ریاض باجوہ۔"

"او... میں شاید انہیں جانتی ہوں۔ وہ خفیہ پولیس کے ایک فرض شناس اور دیانت دار آفیسر ہیں۔"

خانم [illegible] انہیں اعتماد میں لینا ہوگا... مگر ابھی میں [illegible] سے بات [illegible] وں گی... جب تک اس ویڈیو کلپ کی [illegible] نہیں آجاتی۔ تم ایک کام کرو آسیہ کے [illegible] تک ان تمام لڑکیوں کو یاد کرو جو مستانہ خان [illegible] شفقت راجا کی بربریت کا نشانہ بنتی رہی [illegible]

[illegible] کیے دیتا ہوں..." میں نے یکدم [illegible] سے کہا۔ پھر ایک خیال ذہن میں آتے ہی پوچھا۔ "کیا [illegible] نے بتایا ہے کہ کون سا نجی چینل ایسے پروگرام کی آن لائیو ذمے داری اٹھائے گا۔ ظاہر ہے یہ کام مکمل رازداری سے ہوگا۔"

"ہاں! آسیہ اس سلسلے میں پہلے ہی ایک نجی ٹی وی سے رابطہ کرچکی ہے۔" اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"ایسے میں یہ ایک ایسا پروگرام ہوگا جسے ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے ہر کوئی تیار ہوگا مگر یہ سب کچھ جلدی ہونے کا متقاضی ہے۔ تمہاری متوقع گرفتاری سے پہلے۔ ورنہ اس پروگرام سے قبل تمہاری چھاپا مار گرفتاری... اس پروگرام کی حقیقت کو متاثر کردے گی۔ مگر اس پروگرام کے بعد تمہاری از خود گرفتاری تمہارے حق میں بہتر ہوگی۔"

"جی... یقیناً، آسیہ نے بھی یہی کہا تھا۔" میں نے تائید میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

اس دوران انہوں نے ایک فائل تیار کی، کچھ کاغذات وہ پہلے ہی ٹائپ کروا چکی تھی۔ اس پر میرے دستخط لیے۔ یہ وکالت نامہ تھا۔ سہ پہر تک آسیہ بھی آگئی۔ اس نے بڑے جوش و خروش سے بتایا کہ ایک نجی ٹی وی کا مالک اس پروگرام کو جلد از جلد آن ایئر کرنے کے لیے بے

Digest.pk

چین ہے۔ چنانچہ... آج رات ہی اس حقیقی منظر رکھنے والے ڈرامے کو لائیو ریکارڈ کرنے کا بندوبست شروع کر دیا گیا ہے۔

میں نے مرید بابا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور عابدہ اور شکیلہ سے بھی بات کی۔ نیز ارشد سے بھی رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔ اس سے کہا کہ جن لڑکیوں کو اس نے میری ہدایت کے مطابق ملتان کے دارالامان پہنچایا تھا، انہیں لے کر خانم شادو کی رہائش گاہ تک پہنچے۔ وہ تیار ہو گیا اور وعدہ کیا کہ فوراً اس پر عمل کرے گا۔ آخر میں اس نے کہا ”اول خیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

ارشد اس وقت اول خیر کے قریب ہی تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بستر پر دراز ہے اور مجھ سے بات کرنے کے لیے بے چین بھی۔

اول خیر سے بات کرنے کے لیے خود میرا دل بے چین ہو رہا تھا۔ اس کا مخصوص لب و لہجے سے باتیں کرنا مجھے بھلا کب بھولتا تھا۔

”او... خیر... کاکا!“ دوسری جانب سے اس کی مخصوص تکیہ کلام والی آواز ابھری، لہجے سے کمزوری ظاہر تھی۔ مگر انداز وہی تھی دلدارانہ یار باش اور توانا تھا۔ یہ وہ آدمی تھا جو مجھے بہت عزیز تھا۔

”اول خیر... تم ٹھیک تو ہو نا... یار [illegible] میں جذباتی سی لڑکھڑاہٹ عود کر آئی تھی۔

”اوئے۔ کاکا! میری خیر بہت تھوڑی [illegible] اپنی بتا۔ [illegible] تو بہت پریشان ہوں تیرے لیے [illegible] مجھے سب بتایا تو... میری نیند [illegible] کہاں ہے؟ ادھر آ جا۔ میری آنکھیں [illegible] سامنے آ کر [illegible] ہو جائے۔“

وہ بھی فرطِ جذبات سے [illegible] گیا۔ حالانکہ میں نے ارشد کو منع کیا تھا کہ ابھی اول خیر کو میرے سلسلے میں پورے حالات سے آگاہ نہ کریں۔ لیکن شاید وہ بھی اول خیر کی بے چینی اور ضد سے مجبور ہو گیا ہوگا۔

”یار! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اپنی فکر کرو۔ تمہارے زخم کیسے ہیں اب؟ دیکھو مجھ سے چھپانا مت۔ ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟“ میں نے رسانیت سے کہا۔

”او... خیر! کاکا... ڈاکٹروں نے تو اسے معجزہ قرار دیا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے ضرور کسی ایسے آدمی نے اللہ سے تیری زندگی کی دعا مانگی ہوگی جو تجھے بہت چاہتا ہے۔ پتا ہے... پھر میں نے کیا کہا تھا ڈاکٹروں سے؟“ وہ بولا۔

”کیا کہا تھا؟“ میں مسکراتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”میں نے ان سے کہا تھا ہاں ڈاکٹر صاحب آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دنیا میں ایک ہی ہے میرا یار! شہزاد احمد خان! اس نے ہی پورے جی جان سے مولا کریم سے میری زندگی کی دعا مانگی ہوگی اور ڈاکٹر مسکرانے لگے۔“

”اچھا... تم اب آرام کرو۔ میں بہت جلد تم سے ملنے کے لیے آؤں گا۔ مگر اس سے پہلے مجھے کچھ ضروری کام نمٹانے ہیں۔“ میں نے آخر میں سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو کاکا... تو ایسا کر بیگم صاحب سے بھی رابطہ کر کے اسے اپنی موجودہ صورتِ حال اور پوزیشن سے آگاہ کر دے۔ [illegible] انا میری بات۔ ورنہ وہ سمجھیں گی کہ تو اسے [illegible] بہت [illegible] ہا... سمجھا کر نا یار۔“

”اچھا [illegible] ہے۔ میں ان سے بھی ابھی فون پر بات [illegible]۔“ میں نے کہا۔

[illegible] منقطع ہو گیا۔ میں نے اول خیر کی [illegible] صاحب سے بھی رابطہ کر کے انہیں [illegible] صورتِ [illegible] سے آگاہ کر دیا۔ مگر مجھے ان کی ایک [illegible] ناپسند تھی۔ وہ میرے سلسلے میں کی گئی کوششوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ ہی سمجھتی تھیں کہ میں جو کچھ کر رہا ہوتا ہوں وہ غلط اور خطرے پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس انہیں اپنے آپ پر بڑا زعم تھا۔ ان کی یہ خود پسندی اور خود اعتمادی مجھے پسند نہ تھی۔ لہٰذا اس بار بھی انہوں نے مجھے پھر سمجھا دیا۔

”... ان ساری باتوں کا کوئی فائدہ نہ ہوگا شہزی! اس طرح تم اپنے ساتھ بہت سے ایسے لوگوں کو بھی اپنے خطرناک دشمنوں کی نظروں میں لے آؤ گے جو ان کی دشمنی اور بربریت کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے۔“

”میں قانونی طریقے سے اپنے دشمنوں سے نمٹنا چاہتا ہوں بیگم صاحبہ!“ میں نے سنجیدگی سے مختصراً کہا۔

”قانونی طریقے سے... ہم...“ ان کی طنزیہ آواز ابھری۔ ”تم کون سی دنیا میں رہتے ہو شہزی! یہاں قانون طاقت رکھنے والوں کے لیے ہے، کمزور لوگوں کے لیے نہیں۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ لکڑی سے کاٹنے کی کوشش کرو گے تو لکڑی پچ کر بھربھرا جائے گی۔“

”ہو سکتا ہے آپ کی بات درست ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ قانون اتنا کمزور ہے کہ وہ آنکھوں

Digest.pk

دیکھی حقیقت کو سمجھ سکے گا۔ آج کا دور الیکٹرانک میڈیا کا ہے۔ جو لوگوں کو سچ اور حقیقت دکھانے کے لیے اپنے ہاتھوں میں آئینہ لیے بیٹھا ہے۔ جنہیں کوئی بھی توڑنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ آپ بس میری کامیابی کی دعا کریں۔ ممکن ہو تو کوئی صاحب مشورہ سے بھی نواز دیں۔"

"خدا تمہاری مدد کرے شہزی!" بیگم صاحبہ کی یکدم دل گیری آواز ابھری۔ آج پہلی بار انہوں نے مجھے کچھ اپنائیت سے شہزی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"میں جانتی ہوں تم میری کوئی بات، کوئی مشورہ نہیں مانو گے مگر میں بھی تمہاری ہر ممکن مدد کرنے سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹوں گی... لیکن شہزی! تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا..."

"کیسا وعدہ؟" بے اختیار اور قدرے چونکتے ہوئے میرے منہ سے برآمد ہوا۔

"یہی... کہ تمہیں جب میری مدد کی ضرورت پڑے... یا خدانخواستہ تمہیں کوئی راستہ نہ دکھے تو تم... میرے پاس ضرور آؤ گے، ایک اچھے دوست کے ناتے ہی... کرتے ہو وعدہ...؟" ان کی استفساریہ آواز ابھری۔ ان کی آواز اور لہجے سے محبت چھلک رہی تھی۔

"وعدہ کرتا ہوں میں، بیگم صاحبہ!" میں نے [illegible] ڈالا۔ "ایسا کوئی موقع آیا تو میں بھی آپ [illegible] دوست کی حیثیت سے ضرور یاد کروں گا۔" میں نے [illegible] میری بات پر دوسری جانب سے بیگم صاحبہ نے ایک [illegible] سے مشابہ سانس لی تھی۔ میں خاموش [illegible] رابطہ منقطع ہو گیا۔

بلاشبہ بیگم صاحبہ کی شخصیت [illegible] لیے کچھ اسرار سی تھی لیکن اب میں اسے پُراسرار [illegible] چاہتا تھا۔ میرے دل میں اب ایسی کوئی آرزو نہیں [illegible] تھی کہ... ان کی گمنام شخصیت کو کھوجنے کی سعی کرتا۔

رات تک ساری کارروائی نمٹا دی گئی۔ عابدہ کے سوا شکیلہ سمیت تمام لڑکیاں خالم شاہ کی رہائش گاہ پر پہنچا دی گئی تھیں۔ ارشد ہمارے ساتھ تھا۔

ایک بڑے ہال کمرے میں آن ایئر لائیو پروگرام کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر کپڑا نقاب کی طرح ڈال لیا تھا... مذکورہ ٹی وی چینل کی چند افراد پر مشتمل ٹیم بھی موجود تھی، کیمرا مین بھی تھا اور پروگرام منیجر بھی... پروگرام شروع ہونے میں ابھی چند ہی منٹ تھے کہ اچانک میرے سیل فون کی بیل گنگنائی، اس وقت میں کوئی کال اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہ تھا مگر جب اسکرین پر سرمد بابا کا نمبر دیکھا تو میں اسے رد نہیں کر سکا۔

"میں نے اپنا سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا اور ساتھ ہی سرمد بابا کو سلام بھی کیا۔ مگر دوسری طرف سے فوراً ہی سرمد بابا کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

"شش... شہزی... بیٹا...! ... تت تم کدھر ہو اس وقت؟ اور کیا کر رہے ہو؟"

مجھے ان کی آواز اور لہجے سے ہی تشویش نے آلیا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں اس وقت کہاں اور کیا کرنے والا تھا۔ میں ابھی کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ ان کی دوبارہ بوکھلائی [illegible]۔ "شہزی بیٹا... عابدہ کو اغوا کر لیا گیا ہے... [illegible]"

"کیا... [illegible] عابدہ کے اغوا [illegible] سنتے ہی میرا دماغ بھک سے اڑ گیا اور [illegible] کے حواس چھوڑنے لگے۔ سینے میں [illegible] کی [illegible] میری آتی جاتی سانسیں تک رک [illegible] چند [illegible] سے بولا ہی نہ گیا۔ جب بہ مشکل [illegible] ہی گئی۔

"تت... تب... کس نے اغوا کیا؟"

"کسی نے فون کر کے بتایا تھا۔ تمہارا نمبر بھی مانگ رہے تھے رابطے کے لیے" وہ بتانے لگے۔ "مجھ سے دھمکی آمیز لہجے میں کہہ رہے تھے کہ فوراً تم سے رابطہ کر کے تمہیں وہ پروگرام کرنے سے روک دوں جو تم آسیہ کے ساتھ مل کر کرنے والے ہو... آسیہ کا نمبر بھی مانگ رہے تھے، مجھے اس کا نمبر تو معلوم نہ تھا... مگر تمہارا نمبر میں نے انہیں دے دیا ہے۔"

اس وقت میرے سیل فون میں، سرمد بابا سے بات کرنے کے دوران ہلکی ہلکی بیپ کی بھی آوازیں آنے لگیں جس کا مطلب تھا کہ میری ایک اور کال آ رہی تھی۔ میں نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر سرمد بابا سے کہا۔

"بابا! میرے سیل پہ کسی کی کال آ رہی ہے، شاید انہیں کی ہو، وہ میں اٹینڈ کرتا ہوں بعد میں آپ سے بات کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے جیسے ہی رابطہ منقطع کیا۔ فوراً میرا سیل دوبارہ گنگنا اٹھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کی اور ہیلو کہا۔

"ممتاز خان بات کر رہا ہوں۔ تم شہزاد خان عرف شہزی ہو؟" بڑے دھڑلے والے انداز میں دوسری طرف سے کہا گیا۔ آواز بھاری اور کھردری تھی۔ یہ پہلا موقع نہ

Digest.pk

ممتاز خان مجھ سے مخاطب تھا۔ میرا وجود جیسے سیاہ آندھیوں کی زد میں آنے لگا۔

''ہاں، بول رہا ہوں، کیا بات ہے؟'' میں نے رکی رکی سانسوں کے درمیان کہا۔ میرا رُواں رُواں تھرتھرا رہا تھا خوف سے نہیں، جوشِ غیظ کے باعث۔

''تم نے مجھے بہت تنگ کیا ہے شہزی! جبکہ تمہاری حیثیت ہمارے نوکروں کے برابر بھی نہیں ہے۔'' دوسری طرف سے ممتاز خان نے بڑی فرعونیت سے کہا۔ ''تم اس دو ٹکے کی صحافی لڑکی آسیہ کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف جو گل کھلانے والے ہو، اس کا ہمیں پتا لگ چکا ہے۔ باز آ جاؤ اس حرکت سے اور خود کو پولیس کے حوالے کر دو۔۔۔ عابدہ میرے ان آدمیوں کے قبضے میں ہے جو صرف میرے اشارے کے بے چینی سے منتظر ہیں۔ اندازہ لگا سکتے ہو۔۔۔ وہ عابدہ کا کیا حشر کریں گے؟''

میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اپنے حواسوں پر یہ وقت تمام قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ممتاز خان، عابدہ کا ایک بال بھی بیکا نہیں ہونا چاہیے۔ میری کیا حیثیت ہے، اس کا تمہیں بھی اب اندازہ ہو چکا ہوگا۔۔۔ یہ دشمنی مجھ پر مسلط کی گئی ہے۔ رہی میری پولیس کی حوالگی کی بات تو وہ اپنے بارے میں جو بہتر [illegible] کا وہی کروں گا۔ البتہ تمہاری اس شرط پر غور [illegible] اگر تم عابدہ کو بغیر کوئی آنچ دیے چھوڑ دو تو میں [illegible] میڈیا مہم روک دوں گا۔''

میں اب رفتہ رفتہ ممتاز خان [illegible] باہر آ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے [illegible] کر [illegible] میرے [illegible] موجود آسیہ اور خانم شاہ وغیرہ گم [illegible] تھے، میری باتوں سے اب تک شاید انہیں [illegible] صورتِ حال کا اندازہ ہو چکا تھا۔

''بڑا گھمنڈ تھا تمہیں خود پر۔۔۔ بے ضرر کیڑے۔۔۔''

دوسری جانب سے ممتاز خان کی پُرغیظ اور پُرغرور آواز ابھری۔

''ممتاز خان! اگر میں بے ضرر کیڑا ہوتا تو تم کبھی بھی ایسی بزدلوں والی حرکت نہیں کرتے، تمہارا ایک دھمکی آمیز فون ہی میرے لیے کافی ہوتا۔'' میرے نپے تلے جواب نے اس کی رعونت کو پچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔۔۔ کافی لمحوں کی خاموشی سے اندازہ ہوا تھا مجھے کہ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پُرطیش انداز میں بلبلا کر رہ گیا تھا۔ پھر اس کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔

''۔۔۔ تمہارے جیسے کی کمین تو ہماری دشمنی کے قابل بھی نہیں۔ لیکن چیونٹی کو جب ہاتھی کی سونڈ کا راستہ مل جائے تو اسے کچلنے کے لیے ہاتھی کو پاؤں بڑھانا پڑتا ہے۔ تمہارے ساتھ اس مہم جوئی میں شامل اس دو ٹکے کی صحافی لڑکی کو بھی ہم نے سبق سکھانے کے لیے یہی طریقہ آزمایا ہے۔ اس کا منگیتر ریحان بھی ہمارے قبضے میں ہے، اور تم جانتے ہو اپنے بیٹے کے قتل پر اس کا باپ زبیر خان کس قدر تڑپ رہا ہوگا۔ ریحان اس کے چنگل میں اپنی زندگی یا موت کا منتظر ہے۔''

ممتاز خان کی طرف سے میرے لیے یہ دوسرا شاک تھا۔ میں نے بے اختیار سیل فون اپنے کان سے لگائے ہوئے اپنے سامنے حیران پریشان کھڑی آسیہ کی طرف دیکھا تھا۔

''میری [illegible] بہت [illegible]۔ ہم نے سب کا بندوبست کر دیا [illegible] وقت۔ خود کو پولیس کے حوالے کر دو [illegible] میڈیا پروگرام جس کا تم نے اور آسیہ [illegible] کر رکھا ہے، اس سے بعض آ جاؤ۔''

''تمہاری [illegible] دوسری شرط ماننے کو میں تیار ہوں، ایسا کچھ [illegible] کو اپنی از خود گرفتاری اسی وقت [illegible]۔ جب [illegible] اور ریحان صحیح سلامت ہم تک نہیں [illegible] جاتے۔'' میں نے ایک شرط اس کی مانتے ہوئے دوسری ڈال دی۔

میرے منہ سے ریحان کے ذکر پر آسیہ کے چہرے کا رنگ متوقع تشویش پر فق ہو کر رہ گیا۔ بے اختیار وہ قریب کی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ صورتِ حال کی خطرناک نزاکت کا اسے بھی اندازہ ہو چلا تھا۔

''میں نے اپنی شرائط منوانے کے لیے تمہیں فون کیا ہے، بے ضرر کیڑے! تمہاری شرطیں ماننے کے لیے نہیں۔'' دوسری جانب سے غراتی ہوئی آواز ابھری۔

''صرف دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔ بعد کے نتائج کی ذمے داری تم دونوں پر ہوگی۔'' یہ کہتے کے ساتھ ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

میں نے اس قدر سختی کے ساتھ اپنے دانت بھینچے کہ میرے جبڑے کی ہڈیاں تک ابھر آئیں۔

''کک۔۔۔ کک۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔ شش۔۔۔ شہزاد۔۔۔''

آسیہ نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہکلاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ تو میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

خانم شاہ بھی فکرمند نظر آنے لگی۔ پروگرام کرنے والے بھی ٹی وی کے ارکان وہاں موجود تھے۔ تاہم انہیں

کسی بہانے چلتا کر دیا گیا۔ میرا پورا وجود بے چینی میں جکڑ کر رہ گیا۔

''آخر... اسے ان ساری باتوں کا علم کیسے ہوا؟'' میں مٹھیاں بھینچ کر بڑبڑایا۔

''ہمارے سوا تو کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ ہم...... اس ویڈیو کلپ کا ایک تردیدی پروگرام ممتاز خان اور شفقت راجا کے خلاف لانچ چلانے والے ہیں، تو پھر...'' خانم شاہ پُرسوچ انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گئی، تو آسیہ یکدم بولی۔

''مجھے اندازہ ہے کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟'' اس کی بات پر میں اور خانم شاہ چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''... یاسمین ملک... اس کی وجہ بنا ہوگا۔'' آسیہ جیسے خود کلامیہ بڑبڑائی۔

''یاسمین ملک...؟ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جس نجی ٹی وی چینل کے سیٹ میں کام کر رہی تھی، یہ اس کا مالک ہے اور ڈائریکٹر بھی۔ وہ ویڈیو کلپ اسی نے ہی چلائی تھی، اور بعد میں حقیقت کا علم ہونے پر جب میں نے ان سے اس سلسلے میں تردیدی پروگرام چلانے اور ممتاز خان سمیت۔ بیرخان کے بیٹے شفقت راجہ کا کچا چٹھا کھولنے کا اظہار کیا تو اس نے صاف [illegible] آسیہ سوچتے ہوئے تاثرات کے دوران بتانے [illegible] یاسمین ملک کی اس بات پر غصہ آ گیا تو میں غصے [illegible] میں آ کر اس سے صاف لفظوں میں [illegible] پروگرام نہیں چلائے گا تو [illegible] ہاتھوں ہاتھ لے لے گے۔ [illegible] دھمکی پر اتر آیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس [illegible] نوکری سے برخاست کرنے کی دھمکی دی اور یہ تھا [illegible] طرح اس کی چینل کی ساکھ متاثر ہوگی... اور مفت کی دشمنی مول لینا پڑ جائے گی۔ مگر میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔ میرے عزائم کا اندازہ ہونے کے بعد جب میں نے خود ہی یاسمین ملک کے چینل سے مستعفی دیا تو اس نے مجھ پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا۔ یقیناً اس پر بھی وہ تلملا ہو کے نہیں بیٹھا ہوگا۔ اس نے سب سے پہلے زبیر خان کو مطلع کیا ہوگا اور بعد میں ہو سکتا ہے زبیر خان نے ممتاز خان سے بھی ذکر کر دیا ہو۔''

آسیہ کی بات میں وزن تھا۔ یہ سارا اسی کا اپنے دفاع اور ساکھ کو بچانے کا کھیل تھا۔

مجھے اپنی ستم کار تقدیر پر پھر حیرت ہوئی تھی۔ اطفال گھر میں پرورش پانے والا ایک عام سا لڑکا کتنے بڑے ہاتھیوں کے درمیان الجھ کر رہ گیا تھا کہ مفر کی کوئی راہ نہیں سجھائی دے رہی تھی۔

عابدہ کے اغوا نے میرا دماغ سُن کر دیا تھا۔ ایسے میں مجھے اول خیر شدت سے یاد آنے لگا۔ وہ بے چارہ خود صاحب فراش ہے۔

ایسی بات نہیں تھی کہ اس کے بغیر میں خود کو کمزور سمجھتا تھا۔ بس مجھے اس کی عادت سی ہو گئی تھی، اس کا ساتھ مجھے بہت سہارا سا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سرمد بابا کے ہاں جانا چاہا مگر خانم شاہ نے مجھے روک دیا۔ البتہ بابا کو فون کر کے یہاں بلا لیا گیا تھا۔ عابدہ کے سلسلے میں انہوں نے بتایا تھا اول تو عابدہ [illegible] سے باہر نکلتی ہی نہیں تھی۔ ضرورت پڑنے [illegible] جاتی بھی [illegible] ڈرائیور کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔ [illegible] اپنا روٹین چیک اپ کرانا ہوتا تو وہ [illegible] اپنے ساتھ لے جاتی تھی، اس بار بھی عارف [illegible] روٹین چیک اپ کروا کے عابدہ کے ساتھ [illegible] کار سوار مسلح افراد نے ان کی [illegible] عابدہ کو زبردستی اٹھا کر لے گئے۔ [illegible] متعلقہ تھانے میں اس کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔ [illegible] انہیں حالات کا اندازہ نہ ہو سکا تھا، اس لیے نامعلوم اغوا کاروں کے خلاف ہی انہوں نے رپورٹ لکھوائی تھی۔ اگرچہ ممتاز خان کے فون آنے اور یہ دھمکی دینے کے بعد کہ پولیس کو اس کے بارے میں بھنک بھی پڑی تو نتائج کی ذمے داری ان پر (سرمد بابا) پر ہوگی تو یہ ایک طرح سے ایسا ہی ہوا تھا کہ سرمد بابا نے ممتاز خان کا نام تھانے میں نہیں لیا تھا۔

سرمد بابا سے اس بار تفصیلی ملاقات ہونے پر شکیلہ کے بارے میں بھی انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اپنے بھائی شوکت حسین کے ساتھ چلی گئی تھی۔ شوکت اطفال گھر سے نکل چکا تھا اور اپنی الگ زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی بہن کو پا کر وہ بہت خوش تھا، اور جب شکیلہ نے اسے یہ حقیقت بتائی تھی کہ میں اسے کن کٹھن مراحل سے گزر کر اور اپنی جان جوکھم میں ڈالتے ہوئے ایک جہنم میں گرنے سے بچا لایا ہوں تو شوکت حسین میرا دل سے ممنون و احسان مند تھا اور مجھ سے ملنے کے لیے بے چینی سے منتظر تھا۔ میں خود بھی اس سے ملنا چاہتا تھا۔ اطفال گھر کے اندرونی حالات کی تازہ خبریں وہی مجھے بہ خوبی دے سکتا تھا۔ وہ ایک سپر ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز مین تھا۔ اور جوہر مارکیٹ میں ہی اس نے

Digestpk

JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through

JASOOSI DIGEST SUSPENSE DIGEST MONTHLY PAKEEZA MONTHLY SARGUZASHT

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

کرنے کا ایک چھوٹا سا گھر دے رکھا تھا۔ بہرحال دونوں بہن بھائی اب خوش تھے۔

سرمد بابا اور خانم شاہ قانونی باتوں میں ہی الجھے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عابدہ اور ریحان کے دوبارہ اغوا کے بعد کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ جبکہ آسیہ کی اپنی عقل ماؤف تھی، اس بے چاری کی اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہمارے لیے اچانک ہی نہیں، غیر متوقع بھی تھا، ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ممتاز خان وغیرہ کے خلاف ہماری اس خفیہ کارروائی کا انہیں بروقت پتا چل جائے گا۔ یہ ہماری خوش گمانی ہی تھی، کہ ہم یاسین خلف کو بھول گئے تھے۔ وہ بد طینت شخص تھا جو میرے اور آسیہ کے خفیہ عزائم سے اچھی طرح واقف تھا۔ نہ ہی ہمارے اذہان میں اس خدشے کا شبہ تھا کہ وہ ہمارے دشمنوں کو اس کی خبر بھی دے سکتا ہے۔ یقیناً اس میں اس کا بھی مفاد شامل تھا، کیونکہ اس پروگرام کے جاری ہوتے ہی اس کے... ٹی وی چینل کی ساکھ بھی متاثر ہو سکتی تھی۔

"... مجھے ہی کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔" بالآخر میں نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔ اور اس سلسلے میں بیگم صاحب کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گردش کر [illegible] تھا... اور ان کے وہ الفاظ بھی جو انہوں نے [illegible] تھے کہ... "تمہیں جب بھی میری مدد کی ضرورت [illegible] خدانخواستہ اور کوئی راستہ تمہیں نہ ملے تو [illegible] کی طرح ہی سہی... تم مجھ سے ملنے [illegible] وعدہ کر لیا تھا۔

یہ بھی عجیب اتفاق [illegible] الفاق تو مجھ سے کیے ہوئے نصف گھنٹا بھی نہیں ہوا [illegible] کہ مجھے بیگم صاحب کی مدد کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اپنا وعدہ بھی یاد آ گیا تھا کہ عابدہ کے سلسلے میں، میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا حالانکہ جی تو میرا ابھی چاہتا تھا کہ ابھی ممتاز خان کی نیو ملتان میں واقع عظیم الشان رہائش گاہ پر جا کے دھاوا بول دوں... پھر جو ہو دیکھا جائے گا... لیکن یہ معاملہ جتنا نازک تھا اتنا ہی حساس بھی تھا۔ پھر خود میں بھی قانون کی نظروں میں ایک خطرناک مجرم تھا۔

"تم کیا کرو گے؟" سرمد بابا نے میری بات سن کر چونکتے ہوئے کہا۔

"میں وہی کروں گا جو میں اب تک کرتا آیا ہوں اور آپ لوگ نہیں کر سکتے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"شٹ اپ! یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ تم نڈر ہو کر ممتاز خان یا زبیر کے پیچھے لپک پڑو۔ جبکہ خود تمہارے اپنے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ پہلے اپنے تحفظ کو یقینی بناؤ۔" میں نے کہا۔

"میرے تحفظ کو دشمن نے اب غیر یقینی بنا دیا ہے۔ وہ ہمارے راستے بند کر دیے ہیں جن کی بنا پر میں انہیں قانونی شکنجے میں پھنسانا چاہتا تھا، اس کا اندازہ وہ بھی لگا چکے تھے اس لیے انہوں نے یہ بزدلانہ قدم اٹھایا ہے۔"

"اسی لیے تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ... پہلے اپنے تحفظ کے بارے میں کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔" وہ بولی۔

"میں پہلے تمہاری قبل از وقت گرفتاری ضمانت کروانے کی کوشش کرتی ہوں [illegible] ہے کہ تمہارے [illegible] وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ جس [illegible] سب سے پہلے اپنی از خود گرفتاری پیش کر [illegible]"

"گویا آ [illegible] سب یہ ہے کہ تم بھی ممتاز خان کی بات [illegible] ہے۔" میرے لہجے میں تلخی کی چبھن [illegible]

[illegible] ایک خطرناک مجرم کی صورت [illegible] ہے؟ مگر ایسا کب تک ہوگا۔ خانم [illegible] مجھے بچ نکلا ہے۔ ممکن ہے ممتاز خان بعد میں [illegible] اور ریحان کو بخیریت چھوڑنے پر رضا مند [illegible] جائے۔"

"آپ کی خوش گمانی ہے بابا...!" میں نے کہا۔ "ممتاز خان کو اور کیا چاہیے۔ وہ اس وقت مجھ سے خوف زدہ ہے۔ میں اگر قانون کی گرفت میں چلا گیا تو اسے شہ مل جائے گی۔ میں ایسے لوگوں کی بغض نفرت سے واقف ہوں۔ ایسے لوگ کینہ پرور ہوتے ہیں۔ اس کی چیرہ دستیوں میں اضافہ ہی ہوگا۔ ابھی تو وہ چھپ کر ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں پھر کھل کر ہمارے سامنے آ جائیں گے۔ خدانخواستہ وہ عابدہ اور ریحان کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ کون روکے گا انہیں ایسا ظلم کرنے سے؟ پولیس ہماری بات تسلیم کرے گی؟ ہرگز نہیں، وہ الٹا ممتاز خان کے تحفظ کے لیے ہی موجود ہوگی۔"

سرمد بابا نے میری بات پر اپنا سر خاموشی سے جھکا لیا تھا۔ سمجھتے تھے کہ ایسے حالات کا میں ان سے زیادہ تجربہ رکھتا تھا۔ تاہم خانم شاہ مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

"تو پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"عابدہ اور ریحان کو دشمن کے چنگل سے چھڑوانے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔" میں نے پورے عزم کے ساتھ کہا۔

"کیونکہ ان دونوں کا صحیح سلامت دشمنوں کے چنگل سے بچ کر نکل جانا، دشمنوں کی موت کے مترادف ہوگا... ابھی انہوں نے ہمارے ہاتھ پاؤں گویا باندھ کر رکھ دیے ہیں۔ مجھے بھی ان سے اسی طریقے سے نمٹنا ہوگا۔ یہی ایک راستہ میرے پاس باقی بچا ہے۔"

"تم اکیلے کیا کرلو گے؟" خانم شاہ نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس بار آسیہ نے پرعزم ہو کے کہا۔

"باجی! شہزادہ اکیلا نہیں ہے۔ میں بھی اس کے ساتھ ہوں۔"

"یہ کیا باتیں لے کر بیٹھ گئے ہو تم لوگ۔" معاً سرمد بابا بولے۔ "کس نے کہا کہ شہزادہ بیٹا اکیلا ہے؟ ہم سب اس کے ساتھ ہیں۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا۔"

"میرے پاس ایک راستہ ہے، بابا!" میں نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ "بس آپ لوگ میری کامیابی کی دعا کریں۔ اور جو میں کرنے جارہا ہوں... وہ خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہیں۔" میری بات پر آسیہ سمیت سرمد بابا اور خانم شاہ مجھے یک بیک چونک کر دیکھنے لگے۔

میں نے اسی وقت... اپنا سیل فون نکالا اور بیگم صاحبہ کے سیل فون کا نمبر ملایا۔ پہلی ہی رنگ فون پر... ان کی آواز ابھری تھی۔ "ہیلو؟ شہزادہ...؟"

"جی بیگم صاحبہ!" میں نے ہولے [illegible] نے سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے اتنی جلدی آپ کی مدد کی [illegible] پڑ جائے گی۔"

"یا اللہ خیر... کیا ہوا... [illegible] سے تو ہو ناں... شہزادے؟"

ان کا اس قدر تشو[illegible] مند ہونا میرے لیے بیٹھے ہی الجھنے کا باعث [illegible] اس سوالیہ نشان کے بعد ایک بندگلی سی۔

"خیریت نہیں ہے بیگم صاحبہ!" میں نے کہا اور پھر انہیں ممتاز خان کے فون سے آگاہ کردیا۔ دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی زہر آلودسی آواز ابھری۔

"او... اب وہ اس گھٹیا سطح پر اتر آیا ہے۔ گھٹیا انسان... ممتاز خان سے اس سے بھی زیادہ گھٹیا حرکتوں کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ خیر... تم فکر نہ کرو... اب تو خدا کے لیے میری ایک بات مان لو۔ اپنے اتے پتے سے آگاہ کرو... میں اپنے آدمی تمہیں لینے کے لیے روانہ کررہی ہوں۔ پھر مل بیٹھ کر لائحہ عمل تیار کرتے ہیں، ٹھیک ہے؟"

"جی... بہتر... ہے۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں خود بھی آسکتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں اپنا آدمی روانہ کررہی ہوں۔ کہاں ہو تم اس وقت؟" وہ فکرمند لہجے میں بولیں اور میں نے انہیں ایڈووکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ کے پتے سے آگاہ کردیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک کار مجھے لینے آن پہنچی۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ کمیل دادا ان میں شامل تھا۔ اسے دیکھ کر میں چونکا کیونکہ بیگم صاحبہ عموماً ایسے امور کے لیے کبھی بھی اپنے خاص آدمی آگے نہیں کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ اول خیر اور ارشد کو بھی نہیں، عام سے ہی لوگ یہ کام انجام دیا کرتے تھے، اور کمیل دادا کا تو اول خیر سے پہلے نمبر آتا تھا جو بیگم صاحبہ کا مقرب خاص کارپرداز تھا۔ چنانچہ ان [illegible] مجھے بیگم صاحبہ کی نگاہوں میں اپنی اہمیت کا [illegible] کرکے [illegible] عجیب سی الجھن آمیز ترید لگ جاتی [illegible] ہوتا تھا کہ یہ اہمیت... صرف ان کی [illegible] کی حد تک نہیں تھی، شاید اس کا تعلق [illegible] سے بھی تھا، جو مخل ہونے کے باعث [illegible] تھا۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں [illegible] اور [illegible] کی کہ... یہ بات محسوس کرنے کے [illegible] میں بیگم صاحبہ سے کھنچا کھنچا رہنے لگا تھا۔ کیونکہ [illegible] دل میں ہی نہیں، سانسوں اور حواسوں تک میں صرف اور صرف عابدہ کی ہی صورت اور محبت بسی ہوئی تھی۔ مگر تقدیر کی جانے کیسی طرفہ کاری تھی کہ میں جتنا ان سے دور ہونے اور رہنے کی کوشش کرتا، تقدیر دوبارہ مجھے ان کے پاس لے جاتی۔ پھر جب میں کچھ دھیان دے کر سوچتا تو میں اپنے ہی خیال کی نفی بھی کرتا تھا۔ کیونکہ بیگم صاحبہ کو عابدہ کی حقیقت کا بھی علم تھا۔ اور پھر وہ خود بھی پڑھی لکھی اور سمجھدار خاتون تھیں۔ ان سے بہرحال مجھے کسی عامیانہ حرکت کی توقع نہ تھی۔

میں سرمد بابا اور خانم شاہ کو خدا حافظ اور آسیہ کو تسلی دے کر کمیل دادا کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

میں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے برابر میں کمیل دادا کا ساتھی، جبکہ خود وہ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر موجود تھا۔

بیگم صاحبہ کے آدمیوں میں کمیل دادا واحد آدمی تھا جسے میں ناپسند تھا۔ مگر اس کی مجال نہیں تھی کہ وہ میرے سامنے دم مارتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مجھے لانے کے لیے کمیل دادا کو بیگم صاحبہ کا یہ فیصلہ کتنا کٹھن اور ناقابل برداشت ہوگا۔ مگر حکم حاکم مرگِ مفاجات سے مجبور

ہو کے چلا آیا تھا۔

تھوڑی دیر تک گاڑی میں خاموشی رہی۔ پھر اچانک ہی کپیل دادا نے مجھ سے کہا۔

”تم آخر کس مٹی کے بنے ہوئے ہو؟ تم اپنے کسی معاملے میں بیگم صاحبہ کو اہمیت بھی نہیں دیتے ہو... مگر جب تمہاری دُم پہ کوئی پاؤں رکھتا ہے تو بلبلا کر بیگم صاحبہ کے چرنوں میں چھپنے لگتے ہو۔“ کپیل دادا کی آواز ہی نہیں الفاظ بھی طنز کے زہر میں بجھے تیروں کی طرح میری سماعتوں میں کُھب گئے تھے۔

صاف اندازہ ہوتا تھا کہ کپیل دادا اندر سے میرے ساتھ کس قدر عداوت اور بغض رکھے ہوئے تھا مگر کیوں؟

اس کے الفاظ سے میں تلملا تو گیا تھا مگر پھر بڑی مشکل سے اپنے آپ پہ قابو پاتے ہوئے گندھی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

”مجھے نہ پہلے کسی کے چرنوں میں چھپنے کی ضرورت تھی، نہ اب ہے... میں آزاد پیدا ہوا ہوں اور آزادانہ زندگی گزارنے کا قائل ہوں۔ گلے میں پٹا ڈال کے جاں نثاری کے نام پر کسی کے سامنے دُم ہلانے والے ہر اس آدمی کو بھی اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں، وہ صرف غلامی کرنا جانتے ہیں۔ دوستانہ جذبے کو بھی نہیں سمجھتے۔ میں بیگم صاحبہ کا کارکن یا کار پرداز نہیں ہوں۔ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں [illegible] خواہ بھی۔ مجھے اس پر فخر ہے۔ یہ میرے لیے [illegible] ہے شاید تمہیں حاصل نہیں اس لیے تم...“

”اپنا منہ بند کرلو... اب۔“ یکدم غرّاتی [illegible] آواز میں بولا۔ میرے کرارے [illegible] کے بخیے ادھیڑ ڈالے تھے۔ [illegible] بڑبڑایا۔

”یہ سارا قصور اس [illegible] اول خیر کا ہے۔“

”زبان سنبھال کر بات [illegible] کپیل دادا!“ میں یکدم طیش میں آگیا۔ ”اول خیر مجھے بھائیوں سے بڑھ کر عزیز ہے، کوئی میرے سامنے اسے گالی دے کے میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔“ کپیل دادا بھڑک اٹھا۔

”تم... تم...“ کپیل دادا غضبناک لہجے میں صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ ساتھ ہی اس نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر اپنی انگلیاں بھینچ کر اس کا گھونسا بھی بنالیا تھا۔ میں اس طرح اس سے قطعاً خوف کی پروا کیے بغیر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے آرام سے بیٹھا رہا اور بدستور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”بس... بس... دادا... زیادہ طیش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اپنا ہاتھ نیچے گرالو... ہاتھ میرے بھی بندھے ہوئے نہیں ہیں۔“

”دادا سے تمیز سے بات کرو مسٹر!“ اس بار میرے ساتھ بیٹھے اس کے ساتھی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”بیگم صاحبہ کے بعد ہم دادا کا احترام کرتے ہیں۔ تم بھی نہیں جانتے کہ دادا کی حیثیت بیگم صاحبہ کی نظروں میں کس قدر اہم ہے۔“

”مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ تم لوگوں کا معاملہ ہے کہ کون کسے کس حیثیت سے جانتا ہے۔“ میں نے بھی اس کے کسیلے چہرے کی طرف گھور کر کہا۔ ”میں خاموش بیٹھا تھا، تمہارے دادا کو ہی میرے ساتھ پہلے چونچ لڑانے کا شوق چرایا تھا۔“

”بیگم [illegible] تمہیں تھوڑی اہمیت دے دی ہے تو اس کا [illegible] یہ نہیں [illegible]“ کپیل دادا بگڑی طرح بھڑک [illegible] بھی پورا نہ کر پایا تو میں نے اس پر ایک [illegible]

[illegible] صاحبہ کی اس ذرہ نوازی کا تہ دل سے [illegible] ہی میرے لیے بہت... نوکری [illegible] دوستی کا ذکر کیا تھا۔ کیونکہ میں [illegible] کیا تھا۔ میرے اس طرح کہنے سے کپیل دادا کی [illegible] انا بری طرح بھڑک جاتی تھی۔ اور اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔

”ہنہ... دوستی! خوش فہمی ہے تمہاری۔“ میرے اندازے کے عین مطابق وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔ ”بیگم صاحبہ کسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتی ہیں... وہ صرف اپنے وفاداروں کی قدر کرتی ہیں اور بس...“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے طنزیہ کہا۔ ”اب تم سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور کا دھیان بار بار تمہاری طرف ہو رہا ہے۔ سڑک پر ٹریفک بہت ہے۔“

وہ تلملا کر سیدھے ہوتے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا پہنچ چکے تھے۔ بیگم صاحبہ کو میں نے اپنا منتظر پایا... مجھے دیکھتے ہی وہ بے اختیار مسکرادی تھیں۔ مجھے ان کی دلکش کشادہ آنکھوں اور خوبصورت پُربہار چہرے پہ وہی تاثرات محسوس ہوئے جو وہ شاید میرے لیے ہی مخصوص رکھتی تھیں۔ مگر مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”امید نہیں تھی کہ تمہیں دوبارہ دیکھنا نصیب ہوگا مگر اب اپنی قسمت پر نازاں ہوں۔“ ان کے لہجے کی بے اختیاری سے مجھے خجالت سی محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے اپنے

Digestpk

کارندوں کو باہر بھیج دیا تھا۔ ایک شاہانہ طرز کی نشست گاہ میں ہم دونوں اکیلے بیٹھے تھے۔ بیگم صاحبہ نے آج اپنی ڈریسنگ اور میک اپ پر خاص توجہ دے رکھی تھی، میک اپ اگرچہ انہوں نے ہلکا ہی کیا تھا، مگر کچھ خاص قسم کے "ٹچ" اس طرح دیے ہوئے تھے... جو ان کے ملکوتی حسن کو مزید پرکشش تاثر بخش رہے تھے۔

میں نے فوراً مطلب کی بات پر آتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"بیگم صاحبہ! میں عابدہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان ہوں۔ مجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟ جی میں تو آتا ہے کہ اسی وقت اس کے نیو ملتان والے ٹھکانے پہ جاکر دھاوا بول کر اس کی گردن دبوچ لوں... مگر پھر معاملے اور حالات کی نزاکت آڑے آجاتی ہے۔"

"وہ کوئی چڑیا یا بلی کا بچہ نہیں ہے کہ تم ابھی جاکر اس کی گردن دبوچ لو گے شہزی؟" بیگم صاحبہ کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔ "وہ اور اس کا باپ میرے ازلی دشمنوں میں سے ہیں۔ اور میں ان کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ وہ اپنے دشمنوں کو بے بس کرکے اس پر ایسے ہی اوچھے اور بزدلانہ ہتھکنڈے آزماتے ہیں۔"

"آپ کی ان سے کیا دشمنی ہے بیگم صاحبہ؟" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ میں [illegible] میرے اس اچانک استفسار پر وہ نہ صرف چونکیں [illegible] کے خوبرو چہرے پہ کئی رنگ سمٹ کر بکھر گئے تھے۔

"یہ لمبی کہانی ہے، پھر کبھی [illegible] کی آہ خارج کرتے ہوئے بو[illegible]۔

میں نے بھی فوراً ہی [illegible] بیگم صاحبہ! اردو روی میں میرے منہ سے [illegible] آپ کے ذاتی معاملات کو پوچھنے کا حق بہرحال نہیں ہے۔"

"نہیں... نہیں... ایسی بات نہیں ہے۔ وقت آنے پر میں بتادوں گی... بلکہ... تمہیں تو ضرور بتاؤں گی۔" ایکا یکی ان کا لہجہ اسرار بھرا ہوگیا۔

"عابدہ کے سلسلے میں آپ میری کیا مدد کرسکتی ہیں۔" میں نے اس بار ان کی پہلودار چھپی ہوئی شخصیت میں الجھنے کے بجائے فوراً موضوع بدلا۔

"ممتاز خان نے تمہیں دو دن کی مہلت دی ہے۔" وہ کچھ سوچنے کے انداز میں کہنے لگیں۔ "ان دو دنوں میں ہم اس کے چند خفیہ ٹھکانوں کی خبر لیں گے۔ ناکامی کی صورت میں ممتاز خان پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔"

"آپ مجھے ان کے متوقع خفیہ ٹھکانوں کی تفصیل بتادیں۔ میں آج ہی کمربستہ ہوجاتا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"کیونکہ جب تک عابدہ دشمنوں کی قید میں رہے گی۔ مجھ پر ایک پل ایک ایک لمحہ بھاری ہوگا۔ میں سکون کی سانس تک نہیں لے پاؤں گا۔ میں ابھی حرکت میں آنا چاہتا ہوں۔"

"بہت محبت کرتے ہو تم... عابدہ سے۔" بیگم صاحبہ نے اچانک ہی بڑے عجیب لہجے میں میری طرف بغور تکتے ہوئے پوچھا۔

"جی بیگم صاحبہ! عابدہ ہی میری سب کچھ ہے۔ پہلی سانس میں ہوں تو... دوسری سانس عابدہ ہے میرے لیے۔ اس کی م[illegible] بھی بہت چھوٹا لفظ محسوس ہوتا ہے۔ وہ سمندر [illegible] اور میں [illegible] ہوں۔ میرا مسکن اس کی سمندر [illegible] گہر[illegible] کی تہ [illegible]" میں نے گویا عابدہ کی محبت سے [illegible]ا۔

[illegible] کے دم سے خود پر سکوت ماحول میں [illegible] لینے کا گمان ہوا۔ دیکھا تو بیگم [illegible] میں کی اتری ہوئی تھی۔ ان کی نگاہیں [illegible] مرکزی نقطے پر اٹکی ہوئی تھیں۔ پھر ان [illegible] لبوں پہ تھرتھراہٹ ابھری۔ وہ جیسے ماضی کے [illegible] خوابوں میں کھوئی ہوئی سی کیفیت میں بولیں۔

"وہ بھی مجھے اسی طرح چاہتا تھا... دیوانہ وار... دیوانہ وار..."

"وو... کون... بیگم صاحبہ؟" میرے ہونٹوں سے بھی بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ ایسے میں مجھے ان کا بیضوی حسین چہرہ... کرب میں ڈوبا ہوا محسوس ہوا۔

وہ جیسے غمِ دوراں کے گرداب سے ابھر کر بولیں۔ "کک... کچھ نہیں..." کہتے ہوئے انہوں نے اپنی باریک اور رنگین اوڑھنی سے اپنی آنکھوں کے کجرارے گوشے پونچھ ڈالے۔

"میں تمہاری دلی اور ذہنی کیفیات سے واقف ہوں۔ شہزی... لیکن میں نہیں چاہتی کہ تم باہر نکلو... پولیس تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ تمہارے خلاف ڈیتھ وارنٹ نکلا ہوا ہے۔ دشمنوں کی سازش کی تکمیل اس میں ہوگی کہ... تم خدانخواستہ کسی جعلی پولیس مقابلے میں مارے جاؤ... یہ کام میرے آدمی بخوبی انجام دے ڈالیں گے۔"

"آپ نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا۔" میں نے فوراً ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مجھ سے ایک لمحہ بھی یوں

ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں جا رہا۔ آن گنت وسوسے اور اندیشناک خیالات مجھے زہریلے سنپولوں کی طرح ڈس رہے ہیں۔ میری جان دشمنوں کے قبضے میں ہے۔ اور میرا جسم ماہیِ بے آب کی طرح پھڑپھڑا رہا ہے۔''

''مگر تمہاری اپنی ذات بھی تو کسی کے لیے زندگی کا درجہ رکھتی ہوگی۔ اس پر تم غور کیوں نہیں کرتے؟'' بیگم صاحبہ نے یکدم میری طرف دیکھ کر کہا۔ اور میں نے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے لگا جیسے فوراً ہی انہوں نے بات پلٹنے کی کوشش چاہی ہو' بولیں۔ ''کیا عابدہ کے لیے تمہاری ذات اہم نہیں؟ کیا وہ تمہیں زندہ دیکھنا نہیں چاہے گی؟ تم دونوں ہی تو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو۔'' مجھے کوئی جواب نہ بن پڑا تو فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''بیگم صاحب! آپ مجھ پر بس ایک احسان کر دیں۔ مجھے ممتاز خان کے خفیہ ٹھکانوں کے سلسلے میں آگاہی دے دیں۔''

وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولیں۔ ''میں جانتی ہوں تم نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ میں کمیل دادا سمیت کچھ آدمیوں کو تمہارے ساتھ بھیجنے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

کمیل دادا کے ذکر پہ میری طبیعت بگڑنے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسے اور وہ مجھے سخت ناپسند تھ[illegible] اول خیر ہی تھا جس سے میری کار میں چھینی [illegible] خود صاحبِ فراش تھا۔ اس صورت میں مجھے [illegible] خیال آیا مگر بیگم صاحبہ سے بھی میں [illegible] اس کا ذکر کیا تو نہایت حیرت سے بولیں۔

''ارشد؟ حیرت [illegible] کمیل دا[illegible]ت کا شاید علم نہیں۔ میرے [illegible] نے دشمنوں کو پہنچائی ہے میرے کسی آ[illegible] ہوگی۔ کمیل دادا کو معمولی آدمی مت سمجھو۔ یہاں میرے بعد اس کا نمبر آتا ہے۔ وہ بہت بہادر، نڈر اور جاں نثار آدمی ہے۔ تمہیں شاید اول خیر کی عادت پڑ گئی ہے۔ مگر اس کی حالت کا تو تمہیں علم ہی ہے۔ حالانکہ کم وہ بھی نہیں ہے۔ اس نے بھی میرے لیے کمیل دادا کی طرح بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اور اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے۔ میرے پاس آدمیوں کی کوئی بڑی فوج نہیں ہے۔ مگر جتنے ہیں وہ سب میرے وفادار اور جاں نثار ہیں۔''

''جی ہاں بیگم صاحب! مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا تو وہ بولیں۔

''کمیل دادا بہت بہتر طریقے سے یہ کام انجام دے گا۔ کیونکہ میری طرح وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس سے محاذ پر ممتاز کو کس طرح شکست دی جا سکتی ہے۔ اس مہم میں کمیل دادا ہی کافی ہوگا؟''

''ٹھیک ہے بیگم صاحب۔ مجھے منظور ہے۔ ہماری روانگی کا بندوبست کریں۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''کیا میں اول خیر سے مل سکتا ہوں؟''

''ابھی نہیں، ڈاکٹروں نے اسے بے آرام کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک ہفتہ مکمل بیڈ ریسٹ کا مشورہ دیا ہے۔'' وہ صوفے سے اٹھ کر بولیں۔ ''میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ اندرونی گوشے میں کھلنے وا[illegible] کی طرف قدم بڑھا چکی تھیں۔ میں ایک گہری [illegible]انس خارج [illegible] سوچتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

رات [illegible] میں داخل ہو چکی تھی جس کار میں [illegible] میں میرے اور کمیل دادا کے علاوہ دو [illegible] تھے۔ [illegible] تو ارشد تھا جبکہ دوسرا یاور خان تھا۔ کار [illegible] تھا۔ [illegible] دادا اس کے برابر والی سیٹ پر [illegible] تھا۔ [illegible] سیٹوں پر میں اور ارشد براجمان تھے۔ [illegible] کار کے خفیہ خانوں میں اسلحہ موجود تھا، جبکہ میری [illegible] جینز کی بیلٹ میں پیچھے کی طرف اول خیر کا دیا ہوا آٹو میٹک جرمن ساختہ میگا رو تھا۔

بیگم ولا سے روانہ ہونے سے کچھ دیر پہلے میں نے بیگم صاحبہ کے ایما پر تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرنے کے بعد سے پہلے غسل وغیرہ کر کے نیا لباس زیب تن کر لیا تھا۔

ڈارک بلیو جینز کی وجہ سے میں بالکل فٹ تھا، پاؤں میں وائٹ بلیو اسپورٹس جوگر تھے۔ یہ سب زیب تن کرنے کے بعد جب میں کمرے کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے اپنے چھ فٹ سے ذرا نکلتے ہوئے چوڑے وجود پر نظر ڈالی تو خود کو اس قدر تندرست و توانا دیکھ کر خود بخود میری رگوں میں جوش کی چنگاریاں گویا توانائی کی طرح دوڑتی محسوس ہونے لگیں۔

قدرت نے مجھے بنا بنایا کاؤ بوائے ٹائپ کا آدمی بنا دیا تھا۔ آج میں نے بہت غور سے اپنے فٹ فاٹ وجود پر بھرپور نگاہ ڈالی تھی۔ میرے سر کے بال گھنے تھے اور میں سائڈ سے مانگ نکالتا تھا جس کے باعث بالوں کی ایک لٹ میری پیشانی میں داہنی آنکھ پر گری رہتی تھی۔ آدھی سے کچھ اوپر آستینوں والی شرٹ سے میرا چوڑا فراخ سینہ بازو کی

Digest.pk

ابھری ہوئی مچھلیوں کے سبب میں خاصا پر وجیہہ نظر آتا تھا۔

روانہ ہوتے وقت کمیل دادا نے میرے ساتھ موجودگی پر ناک بھوؤں چڑھائی تھی مگر بیگم صاحب کے آگے میرے خلاف کچھ بولتے یا ان کے حکم پر معترض ہونے کی اس میں جرأت نہ تھی۔

کمیل دادا چالیس کے پیٹے میں تھا۔ سر گنجا تھا۔ جسم میری طرح ہی کسرتی اور لمبا تھا۔ البتہ رنگ اس کا کالا تھا۔ ناک موٹی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بھی توانا جسم کا مالک تھا۔

ارشد کی جسمانی ساخت اول خیر جیسی تھی، یعنی قد کا ٹھگنا مگر جسم گینڈے کی طرح مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ یاور البتہ چھریرے جسم کا لمبے قد والا آدمی تھا۔ وہ کمیل دادا کا ہم عمر ہی تھا۔

کار سنسان سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی، جبکہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہم کہاں جا رہے تھے۔

کار میں دھڑکتی ہوئی خاموشی طاری تھی۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ کار کا رخ ممتاز خان کے نیو ملتان والی رہائش گاہ کی طرف تھا، مگر جب وہ چھڑا چورنگی سے دائیں جانب نواں چوک کی طرف مڑ گئی تو مجھے اندازہ ہوا کسی اور ٹھکانے پر جانے کا ان کا پروگرام ہے۔ مگر نواں چوک پر کمیل دادا نے یاور کو کار روکنے کا حکم دے ڈالا۔

اس نے ارشد اور یاور خان کو پیچھے [illegible] اگلی سیٹ پر آنے کا اشارہ کیا اور خود اس نے [illegible] سنبھال لی۔

''تم دونوں سمجھ گئے ہو نا اپنا [illegible]'' کمیل دادا نے ڈرائیونگ سیٹ کی [illegible] اور یاور خان کی طرف دیکھ کر کہا [illegible] ذرا جھک کر... اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کو [illegible] اشارہ کیا جس کا مطلب تھا وہ سمجھ چکے ہیں۔ اس کے بعد کمیل دادا نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

اب میں کمیل دادا کے ہمراہ تھا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی منصوبہ بندی کیا تھی، وہ خاموشی سے کار چلا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک سگریٹ سلگائی، اور میری جانب بھی پیکٹ بڑھایا مگر میں نے سگریٹ پینے سے انکار کر دیا۔ میں ابھی اس سے کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ اس نے کہا۔ ''مجھ سے ناراض تو نہیں ہو تم۔'' لہجہ دھیما تھا۔

''نہیں۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''میری باتوں کا برا مت منانا۔ زبان کا گرم ہوں مگر دل کا صاف ہوں۔'' اس نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے اور دھواں اگل کر کہا پھر بائیں جانب گاڑی موڑ دی۔ ''ویسے تم بہادر اور دلیر آدمی ہو۔''

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''راگی چاڑہ...'' اس نے بتایا۔

''راگی چاڑہ؟'' میں سوالیہ انداز میں زیر لب بڑبڑایا۔

''نام سنا ہے کبھی؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کیا ممتاز خان کے کسی ٹھکانے کا نام ہے؟''

''کسی حد تک۔'' وہ سامنے ونڈ اسکرین کے پار ویران جنگلی سڑک پر نظریں گاڑھے ہوئے بولا۔

''میں [illegible] الجھ گیا۔

''وہاں [illegible] نے جنگی [illegible] پر قابو پانا ہے ممتاز خان عورتیں [illegible] کرواتا ہے۔''

''اب [illegible] مطمئن ہوکر سر ہلایا۔ اور پوچھا [illegible] خان کو تم نے کیا کام سونپا ہے؟''

''وہ [illegible] ان میں واقع ممتاز خان کی رہائش [illegible] وہاں کسی بھی نوعیت کی مشکوک نقل [illegible] رکھتے رہیں گے، وہ ضرور [illegible] بھی اٹھا لیں گے۔''

''تمہیں یقین ہے کہ جنگی خان اس وقت اپنے راگی چاڑہ والے اڈے پر موجود ہوگا؟''

''یقین تو ہے۔ نہ ملا تو وہاں موجود اس کے کسی ساتھی کی گردن دبوچ کر اگلوا لیں گے۔'' اس نے کہا۔

''ہوشیار!'' کمیل دادا نے تھوڑے توقف کے بعد کہا اور فوراً ہی ایک رہائشی کالونی کی طرف جانے والی ذیلی سڑک کی جانب گاڑی موڑ لی۔ یہ سڑک قدرے خراب تھی، جابجا گڑھے بنے ہوئے تھے۔ کار کو وقفے وقفے سے جھٹکے لگ رہے تھے۔ میں تاریکی میں آنکھیں پھاڑے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

ایک جگہ کمیل دادا نے کار روک دی۔ اس نے اگنیشن سوئچ آف کر دیا۔ کار کا انجن بند ہوتے ہی گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ اطراف میں کہیں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

''کار کی ڈکی کے خفیہ خانے میں ایک ماؤزر... اے کے سینتالیس رائفل رکھی ہے۔'' ''تم کیا لو گے؟'' اس نے کار میں بیٹھے بیٹھے سرگوشی میں میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

Digest.PK

"میرے پاس میگزین ہے۔ اور فاضل راؤنڈ بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کافی ہے۔ تم جو ہتھیار رکھنا چاہو، رکھ لو۔"

میں نے بھی اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"پستول تو میرے پاس بھی ہے۔" وہ کچھ سوچ کر لہجے میں بولا۔ "کافی ہے۔ چلو اترو۔" کہتے ہوئے وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔

سامنے رہائشی مکانات کے بے ہنگم سے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاند شاید دور نہیں تھا مگر آسمان پر امڈ آنے والے ستاروں کی بہتات نے اردگرد کے ماحول کو کافی حد تک منور کر رکھا تھا۔

ہمارے عقب میں میدان تھا۔ ایک جانب کچرا کنڈی تھی جس پر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ شاید رات پڑنے پر کچرے پر ڈیزل وغیرہ چھڑک کر آگ لگا دی جاتی تھی۔ جس کے دھوئیں سے پھوٹنے والی اسمونیا جس سے میرا دم گھٹنے لگا۔

"آؤ۔" کیبل دادا نے کہا اور پھر آگے قدم بڑھا دیے۔ میں اس کے عقب میں اور پھر ساتھ ساتھ تیز قدموں چلتا ہوا ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو گیا۔ آگے بند گلی آ گئی۔ سیدھے ہاتھ والے مکان کے بالکل سامنے ایک سنگلا سا پٹ کا لکڑی چوبی چھت والا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کیبل دادا بڑے دھڑلے [illegible] دشمن کی کچھار کی طرف پیش قدمی کیے جا رہا تھا۔ [illegible] احتیاط کو بھی شاید اس نے بالائے طاق رکھا ہوا تھا۔ یا [illegible] حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار رہو [illegible] گلی ویران تھی۔ [illegible] دروازے کی طرف ہو گیا۔ [illegible] چھت کے باہر کی چھجی ہوئی تھی اور وہاں ایک [illegible] لگا ہوا تھا۔

"کیا یہی حشمت خان کا [illegible] ہے؟" میں نے سرگوشی میں کیبل دادا سے پوچھا۔

"ہاں۔"

"پر اس پر تو تالا ہے۔"

"اس پر ہمیشہ تالا ہی پڑا ہوتا ہے۔" کیبل دادا نے سرسراتی آواز میں کہا۔ پھر ...... مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود مختصر سے سنگی قدمچے طے کرتا ہوا اوپر دروازے کے قریب پہنچا اور ... اپنی جیب سے پلاس ٹائپ کا کٹر نکال کر تالے کو طریقے سے کاٹ ڈالا۔ اور دروازے کی کنڈی آہستگی سے کھول کر تھوڑا سا دروازہ وا کر کے اندر جھانکا۔

راستہ صاف پا کر اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دونوں ہی بے آواز اور دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر سرے پر پہنچے۔ وہاں ایک بھدا دروازہ تھا جس کے نیچے خلا میں سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ ایک سے زائد افراد کے قہقہوں کی آوازیں تھیں۔ ہلکی موسیقی کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کیبل دادا نے عقب میں ہاتھ گھما کر مجھے اپنے پیچھے ہی رکنے کا اشارہ کیا تو میں وہیں ٹھہر گیا اس کے بعد اس نے دروازے کی ایک جھری سے اپنی آنکھ چپکا دی۔ چند ثانیے وہ دوسری طرف دیکھتا رہا پھر اپنا چہرہ ہٹا کر مجھ سے نہایت [illegible]

اور آ[illegible] میں ایک [illegible] اور اوپر بند دروازے کے پاس [illegible] تھا۔

"جھری [illegible] کر دیکھو۔ مگر خود پر قابو رکھنا [illegible] قریب ہیں۔"

[illegible] اور عجیب سے لہجے نے جانے [illegible] کئے دل کو جیسے مٹھی میں جکڑ [illegible] نے سنسناتی نسوں کے ساتھ جھری سے اپنی آنکھ [illegible] پھر اگلے ہی لمحے میرا پورا وجود چنگاری بن کر [illegible] دہکنے لگا جو کسی بھی وقت پھٹنے کے قریب ہو۔ دوسری طرف کا منظر بالکل واضح تھا۔ کیبل دادا نے بے شک ٹھیک کہا تھا کہ منزل قریب ہے لیکن اس منزل کی مجھے ایسی توقع نہ تھی مگر اس نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ یہ منظر دیکھنے کے بعد خود پر قابو پائے رکھوں۔ اس کا اندازہ مجھے جھری سے دوسری جانب دیکھنے کے بعد ہی ہوا تھا۔ کیبل دادا نہیں جانتا تھا کہ یہ جگر پاش منظر میرے لیے واقعی ناقابل برداشت ہی ثابت ہوگا۔ جس نے میرے اکڑے ہوئے وجود کی نسوں تک میں کھولتا ہوا لاوا دوڑا دیا تھا اور میں خود پر قابو نہ پا سکا۔ جوش جنوں اور وحشت خون رنگ جذبات سے مغلوب ہو کر میں نے ذرا عقب میں ہٹ کر زوردار ٹھوکر ماری۔ رات کے اس پہر سناٹے میں دروازہ دھڑ سے کھلا تھا اور اندر جیسے رنگ میں بھنگ پڑ گیا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Digest.pk

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :5

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

میرے توانا کاندھے کی ایک ہی زوردار ضرب نے دروازے کی دوسری سمت لگی کنڈی کو اکھاڑ پھینکا تھا، دوسری طرف دو کمروں کے سامنے کھلے پختہ فرش پر بید کی کرسیاں سجائے چار پانچ افراد بُری طرح چونک گئے۔ چند ثانیوں تک تو انہیں اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ یہ اچانک کیا افتاد آن پڑی تھی۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی تپائی پر ''لوازماتِ آوارہ'' کا جو سامان پڑا تھا، وہ ان پانچوں کے ہوش میں آتے ہی یکدم کھڑے ہونے پر انہی کی ٹھوکر سے ادھر اُدھر بکھر گیا۔ ان میں چار میرے لیے اجنبی تھے۔

پانچواں میرا شناسا... بلکہ دیرینہ شناسا... میری نظروں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرین... اشرف تھا جس بات نے اسے اس سے مجھے مثلِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے پر مجبور کیا تھا وہ عابدہ تھی... جسے وہ ذرا دیر پہلے اپنے ساتھ بٹھائے زبردستی شراب پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سسکیوں کے ساتھ روئے جا رہی تھی، شاید اسے اس ملعون نے تھوڑی بہت زبردستی پلا بھی رکھی تھی۔ جس کے باعث عابدہ نڈھال حواسوں کے دوران خود کو اس کی شیطانی گرفت سے چھڑانے کی... کوشش کر رہی تھی، باقی ساتھی قہقہے لگا رہے تھے۔ اس منظر نے میرے اندر آگ سی لگا دی تھی۔ میں وحشیانہ انداز میں یکدم ہی حرکت میں آگیا۔

مجھے دیکھ کر سب ہی حیران رہ گئے تھے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ گڑبڑا کر کھڑے ہوگئے۔ اشرف نے تو مجھے دیکھتے ہی عابدہ کو خود سے دور دھکیل دیا تھا جو قریب دھری ایک کری چارپائی پر آدھی نیچے آدھی اوپر پڑی تھی جب تک یہ لوگ سنبھلتے، میں اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسے ہوئے میگارو کو ہاتھ میں لے چکا تھا اور اشرف کی پیشانی کا نشانہ لے کر ٹریگر بھی دبا دیا تھا۔

رات کے دم بخود سناٹے میں میگارو... آگ اگلنے والے ڈریگون کی طرح گرجا اشرف کی پیشانی پہ روشن دان بنا اور سر کے پچھلے حصے سے بھیجے کے خوں رنگ لوتھڑے اچھل پڑے۔ وہ تیورا کر گرا۔

''خبردار! کوئی حرکت نہ کرے۔'' مجھے کبیل دادا کی دھاڑتی آواز سنائی دی۔ اس نے بھی اپنا پستول ان چاروں پر تان لیا تھا۔

''بس...! شہزی! اتنا کافی ہے۔ عابدہ کو سنبھالو اور نکلو۔'' قدرے قریب آکر کبیل دادا نے مجھ سے کہا۔

''جنگی خان کون ہے ان میں سے؟'' میں نے کبیل دادا سے پوچھا۔

''شہزی...!'' کبیل دادا نے مجھ سے کہنا چاہا مگر میں بدستور زہریلے لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ان چاروں میں جنگی خان کون ہے... دادا...؟''

اچانک ایک موٹے شخص نے ایک کرسی کو لات ماری۔ میں اس کی حرکت کا اندازہ نہ لگا پایا۔ کرسی اچھلی اور مجھ سے ٹکرائی۔ دوسری حرکت بہ سرعت اس نے یہ کی کہ اپنے قریب کھڑے ساتھی کو اپنے کاندھے کی ٹکر رسید کی۔ وہ کبیل دادا سے ٹکرایا۔ ٹھگنے آدمی کی اس دہری حرکت کا درمیانی وقفہ صرف دو سیکنڈ پر محیط ہوگا اور تیسرے سیکنڈ میں اس نے کھلے دروازے کی طرف جست بھری۔ جب تک میں اور کبیل دادا سنبھل پاتے، وہ کسی گیند کی طرح سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اب اس میں شک و شبے کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی کہ عابدہ کو اغوا کرنے کا میرے نزدیک ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کرنے والا یہی شخص جنگی خان تھا، جس کی بعد میں کبیل دادا نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ عابدہ کو بے سدھ چھوڑ کر اس کے تعاقب میں لپک جاؤں یا نہیں کہ کبیل دادا نے میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''یہی جنگی خان ہے۔ تم عابدہ کو سنبھالو میں اس کے پیچھے جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے تعاقب میں لپکا۔ باقی تینوں مجرموں کو میں نے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جانے کا حکم دیا اور پھر عابدہ کو سنبھال کر کاندھوں پر ڈالا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ نیچے اتر کر میں نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ یہ سیڑھیوں کا نچلا دروازہ تھا۔ باہر گلی تاریک تھی۔ ہماری کار ذرا فاصلے پر ایک ویران.... گوشے میں کھڑی تھی، میں اس طرف بڑھ گیا۔ ساتھ میری متلاشی نظر تیزی سے اطراف میں گردش بھی کر رہی تھی۔ میں اندھیری گلی سے باہر آگیا اور عابدہ کو اٹھائے جلد ہی کار کے قریب جا پہنچا۔ عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر میں نے نیم بے ہوش سی عابدہ کو اندر لٹا دیا۔ کبیل دادا مجھے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ نہ جانے وہ مردود جنگی خان کے تعاقب میں کدھر چلا گیا تھا۔ اشرف کو جہنم واصل کرنے کے باوجود میرے سینے کا آتشیں ابال کم نہ ہوا تھا۔ شدید غیظ و غضب کے عالم میں جس تیزی کے ساتھ میں نے اشرف کا حشر کیا تھا بالکل یہی حالت میں ملعون جنگی خان کی بھی کرنا چاہتا تھا۔ عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابلِ معافی جرم اس نے ہی کیا تھا۔

کبیل دادا کی واپسی تک میں عابدہ کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ میری جلتی سلگتی آنکھوں میں وہ منظر گھوم رہا تھا جب وہ اوباش لوگ عابدہ کے ساتھ دست درازی کر رہے تھے۔

جلد ہی کبیل دادا ہانپتا ہوا لوٹ آیا۔

''بیٹھو گاڑی میں، جلدی...'' یہ کہتا ہوا وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آن بیٹھا۔ میں نے جنگی خان کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔'' کار اسٹارٹ کرنے کے دوران وہ جواباً بولا۔ تب تک میں بھی عقبی سیٹ پر عابدہ کا سر گود میں رکھ کر براجمان ہو چکا تھا۔

کبیل دادا کار آگے بڑھاتے ہوئے مجھ سے ناصحانہ انداز میں بولا۔

''شہزی! تم پہلے ہی پولیس کو مطلوب ہو، خون خرابے سے تمہیں اجتناب برتنا چاہیے۔''

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے اس کا مشورہ نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''بیگم ولا۔''

''نہیں۔'' میں نے انکار کیا۔ ''مجھے سرمد بابا کی کوٹھی پہنچادو۔''

''مگر...'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔ میں نے پھنکارتی آواز میں اس کی بات کاٹ دی۔

''تم وہاں نہیں پہنچا سکتے تو مجھے اتاردو۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شاید اب مجھ سے بحث میں کم ہی الجھنے لگا تھا۔ وجہ اس کی یہی رہی ہوگی کہ اس نے میرا یہ روپ پہلی بار دیکھا ہوگا۔ وہ مجھ سے اب خاصا مرعوب سا نظر آتا تھا۔

ہم جلد ہی سرمد بابا کی کوٹھی پہنچ گئے۔ بابا، عابدہ کو زندہ سلامت دیکھ کر مطمئن ہوئے مگر پھر بھی انہوں نے ایک ڈاکٹر کو بلانے کے لیے فون کردیا۔ میرا بابا کے پاس رکنا زیادہ مناسب نہ تھا۔ کیونکہ پولیس بھی میرے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ میں کبیل دادا کے ساتھ لوٹنے لگا تو سرمد بابا شفقت سے بولے۔

''میرے بچے! کدھر جارہا ہے تو؟''

''بابا! ابھی میرے سر پر بہت امتحان ہیں۔ جن پر مجھے پورا اترنا ہے۔ آپ بس میرے لیے دعا کرتے رہیں۔'' میں نے حلق میں سمٹے درد کی رقت کو دباتے ہوئے کہا۔ ''آپ عابدہ کا خیال رکھیں، خدانہ کرے کہ اس پر کوئی قیامت گزری ہو، تھوڑی دیر بعد میں فون کرکے اس کی خیریت پوچھ لوں گا مگر بابا اس کا خیال رکھیے گا۔ یوں سمجھیے، عابدہ، عابدہ نہیں... بلکہ آپ کا شہزی ہے۔''

فرطِ جذبات سے سرمد بابا نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور اسی لہجے میں بولے۔ ''میرے بچے! تم دونوں میرے لیے برابر ہو... عارفہ بیٹی نے تو عابدہ کو.. اپنی بہن بنا رکھا ہے۔'' عارفہ کے ذکر پر میں نے بابا سے اس کی بھی خیریت معلوم کرنا ضروری سمجھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔

''بیٹا! دعا کرو۔ آج کل میں اس کا ویزا آنے والا ہے۔ ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے عارفہ کے جگر کی پیوند کاری ہوجانی چاہیے۔ اس کا جگر رفتہ رفتہ کمزور ہوتا جارہا ہے۔''

''اللہ، عارفہ باجی کو شفا دے اور ان کا جلد ویزا لگ جائے۔'' میں نے دعائیہ انداز میں کہا پھر بولا۔ ''بابا! کیا عارفہ باجی کے جگر کی پیوند کاری امریکا میں ہونا ضروری ہے... کیا یہ کام یہاں نہیں ہوسکتا؟''

''ہوتو سکتا ہے بیٹا۔'' وہ بولے۔ ''لیکن امریکا میں لیور ٹرانسپلانٹیشن کی جدید ٹیکنالوجی ہے پھر عارفہ کی بھی خواہش یہی ہے... زندگی کا معاملہ ہے بیٹا! اور پھر اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس تو کیوں نہ باہر سے ہی علاج کروایا جائے؟''

''یقیناً۔'' میں نے مختصراً کہا۔ پھر انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگا تو وہ آخر میں بولے۔ ''شہزی بیٹا! ایڈووکیٹ خانم شاہ سے ضرور مل لینا۔''

''جی بہتر... بابا!'' میں نے ان سے کہا اور پھر رخصت ہوگیا۔

کبیل دادا کا ارادہ بیگم ولا چلنے کا تھا جبکہ میں نے اسے روک دیا تھا۔

''کہاں جانا چاہتے ہو تم؟'' اس نے قدرے چونک کر ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''گرائیں نگر۔'' میں نے دم بہ خود سے لہجے میں کہا۔

''گرائیں نگر...؟'' وہ چونکا۔ ''اس وقت... رات اپنے آخری پہر میں ہے مگر وہاں جاکر کیا کروگے تم؟''

''میں ممتاز خان کو بھی یہی چوٹ دینا چاہتا ہوں... جو اس نے مجھے دی... یقیناً جنگی خان نے بھی بھاگ کر وہیں پناہ لی ہو یا اس سے رابطہ کیا ہو... پھر ریحان کو بھی تو زبیر خان کی قید سے آزاد کروانا ہے۔''

میری بات سن کر کبیل دادا ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت میرے سر پر کیا سوار ہے۔ جسے میں اتار نہ پھینکتا تب تک سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

تاہم وہ بولا۔ ''مجھے بیگم صاحبہ سے رابطہ کرنا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ... کار میں بیٹھے بیٹھے سیل پر بیگم صاحبہ سے رابطہ کرنے لگا۔

''تم کچھ بھی کرتے رہو، ہمیں سب سے پہلے بیگم ولا جانا ہوگا بیگم صاحبہ بڑی بے چینی سے ہماری منتظر ہیں۔''

''وہ اس وقت سو رہی ہوں گی۔'' میں نے کہا تو اس نے اپنے سیل پر کسی سے رابطہ کیا۔ اس نے اپنے کسی ساتھی

سے پوچھا تھا۔ جس کا جواب نفی میں ملا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''تمہاری تسلی کے لیے میں نے پوچھا تھا ورنہ مجھے پورا یقین تھا کہ جب تک تم خیریت سے بیگم ولا نہیں لوٹ جاتے، وہ نہیں سوسکتیں۔'' آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے چہرے سے ہی نہیں لہجے سے بھی عجیب سا تاثر ابھرا تھا پھر اس نے مجھ سے اچانک ایک عجیب سوال کیا۔ ''شہزاد! ایک بات تو بتاؤ کیا تم عابدہ سے واقعی محبت کرتے ہو؟ میرا مطلب ہے سچی محبت... بے لوث...؟''

میں اس کے سوال پر چونک گیا۔ تاہم جواباً بولا۔ ''کیا تمہیں اب بھی اس کا اندازہ نہیں ہوسکا؟''

''ہاں ہوا تو تھا۔'' اس نے ونڈ اسکرین پر نظریں مرکوز رکھتے ہوئے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ ''عابدہ کو دشمنوں کے رحم وکرم پر دیکھ کر تمہاری جو جنونی حالت ہوئی تھی وہ بلاشبہ درانہ وار آتشِ نمرود میں کودنے کے مترادف تھی... اور اب تم... جنگی خان کے بھی خون کے پیاسے ہو رہے ہو۔''

''مجھے نیوملتان گرائیں نگر اتار کر چلے جاؤ۔'' میں نے فوراً اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اپنی بات دہرا دی۔

''میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا... ہم پہلے بیگم ولا...''

''مجھے یہیں اُتار دو۔'' میں نے فوراً اس کی بات کاٹی۔

''تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ ہر وقت اپنی مرضی کرتے ہو... بیگم صاحبہ کے حکم کا بھی پاس نہیں ہے تم کو...'' وہ پھر مجھ سے چڑنے لگا۔

''میں کسی کا غلام نہیں ہوں۔''

''تم شاید واحد شخص ہو جسے بیگم صاحبہ نے اپنی دوستی کا شرف بخشا ہے۔ تم ہی ناقدرے ہو، تمہیں اس خوش نصیبی پر فخر کرنا چاہیے۔''

''میری خوش نصیبی صرف اور صرف میری عابدہ سے وابستہ ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم مجھے اتار رہے ہو یا نہیں؟''

اچانک رات کے دم بہ خود سناٹے میں ویران سڑک پر کار کے ٹائر سمع خراش آواز میں چرچرائے اور کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔

میرا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کبیل دادا نے بریک پر دفعتاً ہی پاؤں رکھا تھا۔ میں سنبھلتے ہی تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا جبکہ کم وبیش اس کی بھی یہی حالت ہو رہی تھی۔ اب اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر نہیں بلکہ مٹھیوں کے ساتھ بھنچے ہوئے تھے اور ہونٹ بھی، جبکہ اس کی جلتی سلگتی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''شہزاد! تم مسلسل بیگم صاحبہ کی شان میں گستاخی کر رہے ہو... کاش! تمہیں بیگم صاحبہ نے دوستی کا رتبہ نہ دیا ہوتا... تو... تو...'' وہ بُری طرح مجھ پر بھنا رہا تھا۔ میرے تیور بھی چڑھ گئے۔ میں بھی تیز لہجے میں بولا۔

''میں نے کبھی بیگم صاحبہ سے ایسی دوستی کا دم نہیں بھرا ہے کہ وہ یا ان کا کوئی آدمی مجھ پر حکم چلائے اور سنو۔'' میں نے آخر میں جارحانہ لہجے میں اسے گھور کے کہا۔ ''اپنی یہ گرمی سنبھال کر رکھو کیونکہ یہ جلتی سلگتی آگ کے سامنے بھاپ بن کر اڑ جائے گی۔'' یہ کہتے ہوئے میں بھی بھنائے ہوئے انداز میں کار سے اتر آیا اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔ اس دروازے کو اندر بیٹھے کبیل دادا نے زوردار لات رسید کر کے کھولا تو وہ بڑے زور کے ساتھ مجھ سے ٹکرایا۔ چوٹ پر میرا دماغ الٹ گیا۔ تب تک کبیل دادا وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ کار کے اندر سے گویا اچھل کر برآمد ہوا۔ وہ دانت پیستا ہوا میری طرف لپکا۔ اس کے جارحانہ تیور اور بدلتے رویّے نے مجھے پہلے ہی آگ بنا دیا تھا۔ وہ مجھے دبوچنے یا بری طرح پچھاڑنے کے لیے ہی میری طرف لپکا تھا اور اگلے لمحے ہم دونوں باہم دست وگریباں تھے۔ بے شک کبیل دادا ایک تربیت یافتہ لڑاکا رہا ہوگا۔ قدوقامت میں بھی وہ چھ فٹ سے کم نہ تھا جسم بھی کسرتی تھا لیکن میں نے بھی ایک طرح سے نامساعد حالات میں ہی آنکھ کھولی تھی۔ ایسے انسان کو حالات بھی بہت کچھ سکھا کر استاد بنا دیتے ہیں۔ قدوقامت سے بھی کبیل دادا سے مار نہیں کھاتا تھا۔ میں بھی چوڑی چھاتی اور قدآور قامت کا مالک تھا مگر شاید ایک شے ایسی تھی جو مجھے کبیل دادا جیسے استاد کے مقابلے میں ممتاز کرتی تھی اور وہ تھی میرے سینے میں سلگتی آتش جنوں خیزی... جب تک میری یہ وحشت لہورنگ جنوں خیزی سینے تک محدود رہتی تو کچھ نہیں ہوتا تھا مگر جب سر پہ چڑھ جاتی تھی تو گویا نشے کی طرح میری خرد اور حواسوں پر سوار ہو جاتی تھی، پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میرے وجود کا رُواں رُواں انگارہ بن کر دہکنے لگتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ کبیل دادا نے جیسے ہی مجھ پر حملہ کیا، میں نے بھی پیچھے ہٹنے کے بجائے اسے دبوچ لیا۔ یہی نہیں دوسرے لمحے وہ میرے دھکا دینے

پر کار سے جا ٹکرایا مگر ٹکا وہ بھی نہیں۔ خوف ناک نظروں سے مجھے گھورتا ہوا دوبارہ مجھ پر پل پڑنے کے لیے دوڑا اور چابکدستی سے اپنے کاندھے کی ٹھوکر مجھے رسید کر دی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑایا۔ اس نے اس پر ہی بس نہ کیا اور دوڑ کر ایک لات میرے سینے پر رسید کر دی۔ میں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر جا پڑا۔ اس نے مجھ پر چھلانگ بھی لگا دی۔ میں نے تڑپ لگا کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ وہ بھد سے اس جگہ پر گرا۔ میں نے لیٹے لیٹے دوسری چوٹ لگائی۔ میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا ہتھوڑے کی طرح اس کی کمر پر شاید ریڑھ کی ہڈی پر لگا تھا۔ ضرب قدرے زوردار ثابت ہوئی تھی۔ اس کے حلق سے چیخ ابھری، وہ تکلیف پی گیا۔ لیٹے لیٹے کروٹ کے بل ہو کر میرے پیٹ پر لات رسید کرنے کی کوشش چاہی۔ میں پہلو کے بل۔ تھا فوراً اپنے دونوں گھٹنے پیٹ کی جانب سکیڑ لیے۔ پھر بھی اس کی زوردار لات نے میرے وجود کو ہلا دیا۔ مگر ضرب کاری سے میں خود کو بہرحال بچا گیا تھا۔ دوسرے لمحے ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کبیل دادا نے کوئی پیش قدمی نہ کی... بس کھڑا مجھے گھورتا رہا... پھر جیسے بے بسی سے دانت پیس کر اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کر غرایا۔

”مجبور ہوں... میں... بہت مجبور ہوں... میں... ورنہ تیرا برا حشر کرتا۔“ اس کی تہدیدی بھڑک پر میں نے بھی جوابی زبانی کارروائی کی۔

”یاد رکھنا کبیل دادا! میں بھی مجبور ہوں... مگر ایک حد تک... تم تو شاید رک گئے مگر دوبارہ مجھے اس حرکت پر مجبور کیا تو اچھا نہ ہوگا۔“

اس نے مارے طیش کے زمین پر پاؤں پٹخا اور پھر بولا۔ ”تم جاؤ جہنم میں۔ مجھے اب باقاعدہ تمہاری گستاخی کی شکایت بیگم صاحبہ سے کرنا پڑے گی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کار کی جانب لپکا۔

میں نے بھی لقمہ اچھال دیا۔ ”بہ صد شوق اپنی یہ خواہش ضرور پوری کر لینا۔“

وہ بکتا جھکتا ہوا کار میں جا سوار ہوا اور اگلے چند سیکنڈ... میں وہ کار کو اسٹارٹ کر کے زناٹے کے ساتھ ویران سڑک پر دوڑاتا چلا گیا۔

میں اب اندھیری سنسان سڑک پر تنہا کھڑا رہ گیا۔ مجھے کبیل دادا کی اس حرکت پر بے حد حیرت تھی... بلکہ اس جرأت پر سب سے زیادہ کہ اب وہ بیگم صاحبہ کو جا کر میرے بارے میں کیا بتانے والا تھا اور کیا واقعی وہ بیگم صاحبہ کو یہ حقیقت بتانے کی ہمت کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے ہاتھا پائی کے بعد مجھے یوں خطرے میں تن تنہا چھوڑ کر بیگم ولا لوٹ آیا تھا؟ کیا کبیل دادا کو اس بات کا تصور... نہ تھا کہ بیگم صاحبہ کا کیا ردِعمل ہوتا... کیا دادا باغی ہو گیا تھا بیگم صاحبہ سے... وہ سب جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کی نگاہوں میں میری کیا اہمیت تھی۔ بیگم صاحبہ کو مجھے غیر معمولی اہمیت دینا یقیناً کبیل دادا کو گراں گزرتا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر ان سوال طلب خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا۔

میری مہم ابھی ادھوری تھی۔ جنگی خان مفرور تھا۔ ممتاز خان کو میں عابدہ کے اغوا کرنے کے جواب میں زبردست زک پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ آسیہ کا منگیتر ریحان بھی ابھی زبیر خان کی قید میں تھا۔ ایک حساب مجھے یاسین ملک سے بھی کرنا تھا جو ممتاز خان اور زبیر خان کے ہاتھوں اپنا نجی ٹی وی چینل ہی نہیں بلکہ اپنا ضمیر بھی بیچ چکا تھا۔ اس کے باعث ہمارا سارا منصوبہ بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا تھا۔ پتا نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا تھا مگر جو لکھا تھا، وہ بھگتنا مجھے ہی تھا۔

میں نے اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ حالات کے پیشِ نظر میرا کسی گشتی پولیس پارٹی سے ٹکراؤ ممکن تھا۔ پولیس کو بھی میرے دشمنوں نے یہ انفارمیشن دے دی ہوگی کہ میں

بے عزتی

گھر گھر جا کر اشیا بیچنے والے ایک سیلزمین کی ملاقات ایک نوعمر سیلزمین سے ہوئی۔ پوچھا۔ ”کام کیسا چل رہا ہے؟“

نوعمر سیلزمین یہ سوال سن کر پھٹ پڑا۔ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بھئی یہ کام اپنے بس کا نہیں جہاں جاتا ہوں لوگ بے عزتی کرتے ہیں۔“

بوڑھا سیلزمین زیرِ لب مسکرایا اور بولا۔ ”بڑی عجیب بات ہے۔ مجھے اس پیشے میں چالیس برس ہو چکے ہیں۔ لوگوں نے میرے سامنے زور سے دروازے بند کیے جو چیزیں فروخت کرنے کے لیے نکلتا، انہیں سڑک پر پھینکا گیا۔ مجھے اس طرح ٹھوکریں ماری گئیں کہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ بعض لوگوں نے میری خوب پٹائی کی۔ لیکن بے عزتی۔ کسی نے آج تک میری بے عزتی نہیں کی۔“

ملتان میں ہی ہوں۔

میں پیدل ہی ایک طرف چل پڑا۔ میں ایک بار پھر بے یار و مددگار تھا۔ میرا خیال تھا کہ کبیل دادا میرا ساتھ دے گا۔ عابدہ تک اس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اگرچہ اس میں بیگم صاحبہ کا ہی حکم تھا۔ ایسے میں مجھے اپنا دوست اول خیر یاد آنے لگا جو اب تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ایک ویران چوراہے پر آ کر میں نے دیکھا۔ یہاں کچھ لوگوں کی آمد و رفت نظر آئی تھی۔ یہ ایک ہوٹل تھا۔ جہاں شبینہ سفر کرنے والے لوڈ ڈ ٹرک سستانے کے لیے کھڑے تھے اور شاید یہ شبینہ ہوٹل ان کے لیے ہی مخصوص تھا۔ ایک ٹیکسی بھی نظر آئی جو خالی تھی ڈرائیور یقیناً اندر کہیں چائے وغیرہ پینے گیا تھا۔ مجھے رکشے کی تلاش تھی جو مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس ہوٹل کے دوسری جانب ریلوے اسٹیشن تھا۔ میں پیدل پیدل وہاں جا نکلا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا وہاں اِکّا دُکّا ٹیکسی کے علاوہ دو تین رکشے اور کچھ تانگے کھڑے نظر آئے۔ شاید کوئی ٹرین آنے والی تھی بلکہ آ چکی تھی اور مسافر باہر نکل رہے تھے۔ میرا مقصد حل ہونے لگا۔ ظاہر ہے اب مجھے کوئی ٹیکسی یا رکشا نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اسے رات کے اس وقت ٹرین سے اترنے والے مسافروں سے بھاری اور منہ مانگا کرایہ وصول کرنے کا لالچ ہوتا۔ مسافر اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکل رہے تھے، ان کی تعداد زیادہ نہ تھی، میں نے پھر بھی قسمت آزمائی کی کوشش میں دو ایک رکشے والوں کو چلنے کا کہا مگر انہوں نے انکار میں گردنیں ہلا دیں۔

میں اب ایک رکشے والے کی منت سماجت میں لگا ہوا ہی تھا کہ اس دوران میں اسٹیشن کی بلڈنگ سے نکلنے والا ایک مسافر جس نے ہاتھ میں چھوٹا سفری بیگ تھاما ہوا تھا۔ اس طرف بڑھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باقی ٹیکسی اور رکشے اپنی اپنی سواریاں لے جا چکے تھے۔ اب یہی ایک واحد رکشا وہاں کھڑا تھا۔ میں ابھی رکشے والے سے بات کر ہی رہا تھا کہ مسافر نے بھی درمیان میں ٹانگ اڑا دی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ پھر ہم دونوں ہی کی نظریں چار ہوئیں اور بیک وقت دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک پڑے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے شناسا تھے اور مزید شناسائی کی تصدیق میں چند سیکنڈوں تک ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔ ایک عجیب بات جو ہم دونوں میں مشترک تھی، وہ چہرہ نمائی سے کتراتا تھا۔ رکشے والا ہٹپٹا کر کبھی مجھے اور کبھی اسے دیکھنے لگا۔

وہ چھتا تھا۔ اول خیر کا پرانا دوست... دبلا پتلا چھریرا اور لمبوترے گورے رنگ والا۔ یہ وہی چھتا تھا جب میں اور اول خیر اپنے ایک اہم شکار گگل خان کو لے کر گئے تھے اگرچہ بیگم صاحبہ کے حکم کے مطابق گگل خان کو ہم نے پرانی باؤلی والے ٹھکانے لے جانا تھا مگر ایک مجبوری کے باعث گگل خان کو ہم چھتے کے ٹھکانے پر لے آئے تھے، اول خیر کے مطابق چھتا اس کا احسان مند تھا۔ وہ بیگم صاحبہ کے ہی گروہ سے تعلق رکھتا تھا مگر ایک فاش غلطی کے باعث بیگم صاحبہ نے چھتے کی موت کا پروانہ جاری کر دیا تھا اور اول خیر کو یہ کڑی ذمے داری سونپی تھی کہ چھتے کو خاموشی سے ہلاک کر کے اس کی لاش ٹھکانے لگا دے مگر چھتے نے بھی ماضی میں اول خیر پر ایک احسان کیا تھا۔ لہٰذا اول خیر نے چھتے کو ساری بات بتا کے اس کی جان بخش دی تھی اور بیگم صاحبہ کو یہی بتایا تھا کہ وہ چھتے کو ختم کر چکا ہے۔ بقول اول خیر کے اس نے اپنی زندگی کا یہ سب سے بڑا رسک لیا تھا۔ اگر بیگم صاحبہ کو پتا چل جاتا تو اول خیر کو اس حکم عدولی کی پاداش میں بڑی بھیانک موت سے گزرنا پڑتا۔ چھتا اپنی بیوی پروین اور دو بچوں کے ساتھ ایک گمنام سے ٹھکانے میں رہنے لگا۔ بہت جلد اس کا ارادہ یہ شہر چھوڑ دینے کا تھا۔ گویا چھتا... اول خیر کے سر پر جھولتی .... تلوار تھا مگر ہمارے کام بھی آتا رہتا تھا۔ آج اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ یہی کیفیت اس کی بھی تھی مگر رکشے والے کے سامنے ہم زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ چھتے نے فوراً اسے رخصت کر دیا اور مجھے لے کر دوبارہ اسٹیشن کی عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔ آنے والی ٹرین وسل دے رہی تھی، پلیٹ فارم پر زیادہ لوگ نہیں تھے۔ کچھ ٹی اسٹال کھلے پڑے تھے، چھتے کا ارادہ اس طرف جانے کا تھا مگر کسی وجہ سے میں نے اسے روک دیا اور ایک نسبتاً ویران گوشے میں سیمنٹ کی بینچ پر آ کر بیٹھ گئے۔

”تم دوبارہ ملتان کیا کرنے آئے ہو؟ تمہیں اول خیر کی نصیحت یاد نہیں۔“ میں نے اسے ٹوکا تو وہ بولا۔

”گوجرانوالہ جا چکا ہوں۔ ایک آخری معاملہ تھا سو وہ نمٹانے آیا تھا۔ اور صبح تڑکے کی ٹرین پکڑ کر نکل جانا تھا مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مگر تو بتا... تو اتنی رات گئے اسٹیشن کے باہر کیا کر رہا ہے کیا تو بھی اس ٹرین سے اترا تھا؟ اول خیر کیسا ہے؟ کہاں ہے؟“

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اسے مختصراً اول خیر کے متعلق بتا دیا۔ اول خیر کے زخمی ہونے کا

سُن کر وہ بھی تشویش زدہ ہوگیا۔ تاہم اب اس کے روبہ صحت ہونے کا سن کر قدرے مطمئن بھی ہوا تھا۔ تاہم مجھ سے بولا۔ ''تیرا معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

اس کے سوال سے مجھے اندازہ ہوا اسے میرے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ بھروسے کا آدمی تھا تب میں نے اپنے حالات کے بارے میں بھی اسے آگاہ کر دیا اور کبیل دادا کی چیرہ دستی کے بارے میں بھی...

''یہ بہت ظالم اور خطرناک آدمی ہے شہزی! اس سے ہوشیار رہنا۔'' چھتے نے فوراً کہا۔ نہ جانے کیوں اس کے لہجے کو محسوس کر کے مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ اترتی محسوس ہوئی۔

''یہ وہ واحد آدمی ہے جو بیگم صاحبہ کا منہ چڑھا ہی نہیں، سر چڑھا بھی ہے اور ان کا وفادار بھی ہے۔'' وہ بولا۔ ''اور شاید تم نہیں جانتے کہ... کبیل دادا...'' چھتا اچانک کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا پھر بات بدلنے کی غرض سے ہنسا اور بولا۔ ''چل چھوڑ... یہ اور ہی معاملات ہیں، تجھے اس سے کیا لینا دینا۔''

''نہیں چھتے... مجھ سے کچھ مت چھپانا۔'' میں نے کبیل دادا سے متعلق فوراً اس کی بات پکڑ لی۔ ''تم نہیں جانتے کہ کبیل دادا آج کل مجھ سے بھی نجانے کیوں خار کھائے رہتا ہے، یہ تو بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ رویہ کچھ ایسا دوستانہ ہے کہ وہ... حد سے آگے نہیں بڑھتا۔''

''کیا... کیا کہا تم... نے؟'' چھتا یک دم چونک کر میری طرف غور سے تکتے ہوئے بولا۔ ''بیگم صاحبہ کا رویہ تمہارے ساتھ دوستانہ ہے؟ یہی کہا نا ابھی تم نے؟'' اس کے یوں مستفسر ہونے سے خود میں بھی چونک گیا۔

''ہاں، میں نے یہی کہا ہے کیوں...؟ کیا یقین نہیں آیا تمہیں میری بات پر؟'' اس کا چہرہ دم بہ خود سا ہوگیا۔ اس دوران میں پلیٹ فارم پر موجود ٹرین نے آخری وسل دی اور رینگنا شروع کر دیا۔

''یقین کرنا تو دوسری بات ہے۔ بیگم صاحبہ کے بارے میں .... کوئی ایسا دوستی کا رشتہ جوڑنے کا زعم رکھنا بھی جرم ہے مگر تم کہہ رہے ہو تو مانے لیتا ہوں۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر کبیل دادا کی تم سے ذاتی پرخاش کی وجہ بہت واضح ہے کہ اتنے عرصے بیگم صاحبہ کی غلامی کرنے کے باوجود بھی وہ اس مرتبے کو نہیں پہنچ سکا۔ کیونکہ یہ حقیقت صرف اول خیر اور میں نے ہی محسوس کی تھی کہ کبیل دادا بیگم صاحبہ کی غلامی سے زیادہ اس کی دوستی کا خواہ ہے کیوں؟ اس کے بہت سے معنی نکل سکتے ہیں مگر تمہیں میرا مشورہ ہے شہزی! جتنا ممکن ہو سکے تم خود کو ان لوگوں کے گورکھ دھندوں سے الگ کر دو۔ یہ میرا تمہیں دوستانہ مشورہ ہے اس لیے کہ تم میرے محسن اور اول خیر کے بہت قریبی دوست ہو۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو چھتے... اول خیر بھی بارہا مجھے یہی مشورہ دے چکا ہے۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

میں چھتے کو قلیل سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی سمجھتا تھا مگر وہ اپنی غیر معمولی عقل و فراست کے مطابق میرا اور بیگم صاحبہ کے گروہ کے متعلق جو تجزیہ کر رہا تھا، وہ میرے دل کو بھی لگا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چھتے! تمہارا مشورہ سچا اور مخلصانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی ان لوگوں سے دور رہنا... چاہتا ہوں مگر ممتاز خان والے معاملے کے باعث مجھے مجبوراً ان کے ساتھ نتھی ہونا پڑا۔ اس کی ایک خاص وجہ اول خیر بھی ہے مگر اول خیر بھی مجھے یہی مشورہ دیتا رہا ہے۔''

چھتے نے دوستانہ انداز میں میرے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''دیکھو دوست! میں اور اول خیر یار باش قسم کے انسان ہیں، ایک بار جو ہم سے دوستی کا دم بھر لیتا ہے تو آخر تک اس کا ساتھ نبھاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ خود بری نہیں بلکہ وہ تو بے چاری خود ایک مظلوم عورت ہے مگر کبیل دادا بہت خطرناک آدمی ہے۔ تمہیں ان لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ میں درحقیقت کبیل دادا کی وجہ سے دے رہا ہوں... اب یہ بات خود تک ہی محدود رکھنا جو میں تمہیں بتانے والا ہوں... کبیل دادا درحقیقت بیگم صاحبہ سے محبت کرتا ہے مگر خاموش محبت... وہ اب تک اس کا اظہار نہیں کر سکا ہے اور نہ ہی ایسی جرأت کر سکتا ہے... اب شاید میں بھی اور تم بھی کبیل دادا کی مخاصمت کی وجہ سمجھ سکتے ہو۔''

میرے لیے یہ ثانوی بات تھی، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر میں چھتے کی اس بات پر ضرور چونکا تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کو ایک مظلوم عورت کہہ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یار! ویسے یہ بات تو میرے لیے بھی تجسس کا باعث رہی ہے کہ آخر بیگم صاحبہ ہیں کون...؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ اور آخر وہ مجھ پر اس قدر کیوں مہربان رہتی ہیں؟''

''بس شہزی! زیادہ جان کاری بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتی...'' وہ عجیب اسرار بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے... حقیقتاً مجھے بھی بیگم صاحبہ سے متعلق زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہے تم اب بتاؤ... کرنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اسے اپنے آئندہ کے عزائم سے آگاہ کر دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا پھر پُر تفکر لہجے میں بولا۔ ''شہزی! تم واقعی ایسے حالات کی دلدل میں دھنس گئے ہو اور نکلنے کے لیے جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے ہو... اسی قدر اندر دھنس جاتے ہو۔ اس تناظر میں اگر تمہارے حالات کو دیکھا جائے تو تمہیں واقعی بیگم صاحبہ جیسی عورت کی مدد کی ضرورت ہے... مسئلہ یہ ہے کہ اول خیر بھی تمہارے ہمراہ نہیں ہے۔ تم گرائیں نگر کس مقصد کے لیے شب خون مارنا چاہتے ہو؟''

اس نے آخر میں پوچھا۔ میں نے ایک گہری ہمکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں چودھری ممتاز کو بھی وہی زک پہنچانا چاہتا ہوں جو اس نے عابدہ کو اغوا کر کے مجھے دی تھی۔ اس کا ایک ساتھی جنگی خان بھی مطلوب ہے۔''

وہ بولا۔ ''ایسے میں تم تنہا کچھ نہیں کر سکتے شہزی! تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم...''

''تم میری ایک مدد کر سکتے ہو؟'' میں نے اچانک اس کی بات کاٹی۔

وہ فوراً بولا۔ ''کیسی مدد چاہیے تمہیں؟''

''میں چودھری ممتاز خان کے کسی گھر کے فرد کو اٹھا کر کچھ روز کے لیے یرغمال بنا کر رکھنا چاہتا ہوں... یہ کام میں تنہا بھی کر لوں گا۔ مجھے بس ٹھکانا چاہیے۔ محفوظ ٹھکانا۔''

چھتا یہ سُن کر حیرت آمیز تشویش میں پڑ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''تم تن تنہا اتنا بڑا خطرناک اور رسکی کام کر لو گے؟ چودھری ممتاز کوئی معمولی آدمی نہیں ہے جبکہ گرائیں نگر کی عمارت تم نے نہیں دیکھی ہے۔ وہ پورا قلعہ ہے۔ پتا نہیں کتنے گن مین ہر وقت مستعد رہتے ہیں وہاں شکاری اور خونخوار کتوں کی بھی فوج اندر منڈلاتی رہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چھتے! مجھے یہ کام ابھی اور اسی وقت کرنا ہے اور یہ کام میں کروں گا بھی خود ہی۔ تم میرے لیے ٹھکانے کا بندوبست کر سکتے ہو؟'

''ٹھکانا بھی حاضر ہے اور میں بھی... مگر... میں تمہیں اکیلا اتنا بڑا رسک اٹھانے کے لیے گرائیں نگر جانے نہیں دوں گا... میں چلوں تمہارے ساتھ۔''

''نہیں چھتے! تم میری خاطر خود کو خطرے میں نہ ڈالو۔'' میں نے اسے منع کرتے ہوئے اس کی وجہ بھی بتائی۔ ''تم خود بھی تو ایک طرح سے خطرناک حالات سے گزر رہے ہو۔ اگر بیگم صاحبہ کے کسی آدمی کی نگاہ تم پر پڑ گئی یا انہیں ذرا بھی شبہ ہو گیا تم زندہ ہو تو میرے ساتھ اول خیر کی بھی شامت آ جائے گی۔ نہیں چھتے... ہرگز نہیں۔ تم جس کام سے قلیل مدت کے لیے یہاں آئے ہو وہ کر کے فوراً ملتان سے واپس لوٹ جاؤ بلکہ تمہیں تو بہت پہلے لوٹ جانا چاہیے تھا۔''

''میں تم لوگوں کے جانے کے بعد اپنی بیوی اور دونوں بچوں کو لے کر گوجرانوالہ نکل گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''کچھ پیسے پھنسے ہوئے تھے یہاں... وہ نکلوانے آیا ہوں۔ پر تمہارے لیے ٹھکانے کا بندوبست کیے دیتا ہوں... چلو اٹھو...'' چھتا میری بات سمجھ گیا تھا اس لیے اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔

رات اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی میں سوچ رہا تھا کہ کبیل دادا نے بیگم ولا پہنچ کر میرے بارے میں بیگم صاحبہ کو جانے کیا کیا جھوٹ سچ بتایا ہوگا مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں کبیل دادا کی باتوں کا یقین کر سکتی ہے بلکہ یہ عین ممکن تھا کہ بیگم صاحبہ نے مجھے تنہا چھوڑ کر لوٹ آنے پر الٹا کبیل دادا کو بُری طرح لتاڑا ہوگا۔ اب یا تو... ان کے آدمی مجھے تلاش کر رہے ہوں گے یا پھر... اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ میں نے سوچا اگر اب تک ایسی بات تھی تو بیگم ولا سے کسی نہ کسی کا فون آ سکتا تھا۔ مگر اب تک آیا نہیں تھا۔ میں نے فوراً سیل فون نکال کر دیکھا تو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور وہ آف ہو چکا تھا۔

چھتا اور میں ایک بار پھر اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلے۔ ایک تانگا ہمیں مل گیا۔ چھتے نے اسے کچی بستی چلنے کا کہا تو میں ٹھٹک گیا مگر بولا کچھ نہیں۔ ہم تانگے میں سوار ہو گئے۔ تانگا بان نے گھوڑے کو ہلکا چابک رسید کیا، وہ ٹپ ٹپ کرتا آگے بڑھ گیا۔ کچی بستی یہاں سے دور نہ تھی یہ وہی بستی تھی جہاں چھتا کچھ عرصے پہلے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس ٹھکانے پر میں اور اول خیر، کنگل خان کو اٹھا کر لے گئے تھے بعد میں وہ جہنم واصل بھی وہیں ہوا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ چھتا وہاں سے اپنے بیوی بچوں سمیت کوچ کرنے کے بعد بھی اس ٹھکانے سے وابستہ کیوں تھا؟''

بہرحال... تانگے والے کی موجودگی میں ہم دونوں مزید کوئی بات کرنے سے قاصر تھے۔ چھتے نے تانگے والے کو گھوڑا دوڑانے کو کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم اسی ٹھکانے پر موجود تھے۔ شہری آبادی کے کنارے اس کچی بستی میں

واقع یہ ٹھکانا مختصر سہی مگر محفوظ تھا۔ یہاں کسی کو بھی کچھ دنوں کے لیے یرغمال بنا کر رکھا جا سکتا تھا مگر چھتے نے یہاں پہنچ کر مجھے بتائے بغیر اپنے سیل فون پر اول خیر سے رابطہ کر لیا تھا۔ وہ اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لو... اپنے دوست سے بات کرو۔“ میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ بے شک چھتے نے میرے تحفظ کی خاطر ہی یہ حرکت کی تھی، بہرحال میں نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیا تو کان سے لگاتے ہی، اول خیر کی ہیلو... ہیلو... شہزی!“ کی بے چین سی آواز ابھری۔

”ہاں اول خیر... مجھے بتائے بغیر چھتے نے تم سے رابطہ کر ڈالا۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا تو دوسری طرف سے اول خیر جیسے پھٹ پڑا۔

”او خیر... کاکے... یہ تو کیا کرتا پھر رہا ہے... گبیل دادا تیرے ساتھ تھا... وہ کدھر ہے...؟“

میں نے اسے گبیل دادا سے ہونے والے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا۔ آخر میں حیرت سے بولا۔ ”کمال ہے کیا وہ ابھی تک بیگم ولا نہیں پہنچا؟... اسے تو مجھے چھوڑ کر گئے ہوئے آدھا گھنٹا ہو چکا ہے۔“

دوسری جانب یکلخت سناٹا طاری ہو گیا پھر اس کی دبی دبی آواز ابھری۔ ”ایک بات سن کاکے... تو جہاں ہے وہاں سے ایک انچ بھی نہیں ہلے گا۔ میں بیس منٹ کے اندر اندر پہنچ رہا ہوں... میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اول خیر نے مجھے بولنے نہ دیا۔

”دیکھ کاکے! یہ میرا تجھے دوستانہ حکم ہے۔ تو ایک انچ بھی وہاں سے نہیں ہلے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون چھتے کو لوٹاتے ہوئے شکایتی لہجے میں اس سے کہا۔ ”تم نے مجھے بتائے بغیر... اول خیر سے کیوں رابطہ کر لیا؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”اس لیے کہ تم صرف ایک ہی آدمی کی بات مانتے ہو اور وہ ہے اول خیر... میں تمہیں... تن تنہا کسی آگ میں جھونک کر نہیں جا سکتا۔“

بیس منٹ کے اندر اندر اول خیر ایک منی جیپ میں وہاں آن پہنچا تھا۔ اس کے ہمراہ ارشد بھی تھا۔ اول خیر کو صحت مند اور فٹ دیکھ کر میرا دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کی ہمراہی میرے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ اس کا یہ ساتھ میرا حوصلہ دگنا تگنا کر دیتا تھا۔ وہ مجھے بڑے بھائی کی طرح ہی لگتا تھا۔ سچا دوست اور ساتھی بھی... غرضیکہ مجھے اس کی شخصیت میں ایک تحفظ دلانے والا بڑا پن محسوس ہوتا تھا۔ ایک وہی تھا جو میرے اندر کے دکھ کو سمجھتا تھا اور میرا ساتھ دینے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں نے اس کی سنگت میں بہت سیکھا ہے۔ وہ آتے ہی میرے گلے سے لپٹ گیا۔ ارشد بھی مجھ سے ملا۔ اول خیر نے سب سے پہلے چھتے کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرے بارے میں اسے پہلے اطلاع دی۔

”کاکا! جب سے میں نے عابدہ بہن کے اغوا کا سنا تھا، مجھے چین نہیں مل رہا تھا مگر بیگم صاحبہ کا حکم ہے اور پھر گبیل دادا تیرے ساتھ ساتھ تھا تو مجھے کچھ تسلی تھی مگر اب... خیر... گبیل دادا اپنا منہ چھپا رہا ہوگا اس حرکت کے بعد بلکہ کوئی شبہ نہیں وہ اپنے کیے پر پشیمان بھی ہو اور تجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔ خیر... اس کی جو درگت بننے والی ہے، اس سے یہ نہیں بچ سکتا۔ پہلے مجھے عابدہ بہن کے بارے میں بتا...“ وہ بولا۔

میں نے اسے اب تک کی مہم کے بارے میں بتا دیا۔ عابدہ کی خیریت پاتے ہی اسے قدرے اطمینان ہوا، جبکہ میرے آئندہ کے عزائم وہ چھتے کی زبانی جان چکا تھا۔ اس کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ البتہ چھتے سے بولا۔

”چھتے... یوں سمجھ تو آخری بار ملتان آیا ہے۔ اب دوبارہ ادھر کا رخ مت کرنا۔ یہاں تیرے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ اپنے ساتھ تو مجھے بھی چنوائے گا یار! بھابی بچے کیسے ہیں؟“ چھتے نے اسے اطمینان دلایا اور فوراً لوٹنے کا بھی بتا دیا۔

”بس تو اپنا کام کر کے تڑکے والی گاڑی میں نکل جا، حیاتی رہی تو ملتے رہیں گے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں رب راکھا۔“

ہم باری باری چھتے سے گلے ملے۔ اول خیر کی موجودگی میں مجھے بڑا حوصلہ مل رہا تھا۔ بلاشبہ وہ یاروں کا یار تھا۔ میرے عزائم جان لینے کے باوجود اس نے ذرا بھی چون و چرا نہیں کی تھی۔

چھتے کے گھر سے نکل کر ہم گرائیں نگر روانہ ہو گئے۔ اول خیر ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ ارشد عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

”او کاکے... تیرے کول ہتھیار شتھیار ہے؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔ وہ جب مارا ماری کے فل موڈ میں ہوتا تو اپنی ٹھوس اور ٹھیٹ روایتی زبان استعمال کرتا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ”اول خیر! تیری طبیعت تو

ٹھیک ہے نا؟ میرا مطلب تھا... میں اور ارشد...''

''او خیر... کاکا۔'' وہ یک دم میری بات کاٹ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''او میں بالکل چنگا ہوں۔ بہترا آرام کرلیا۔ اب ذرا ہتھ پاؤ چلانے کو جی کرداا ے... تو فکر نہ کر...''

میں خاموش رہا۔ تاہم میں نے اپنے منصوبے سے اسے آگاہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ میں چودھری ممتاز کے گھر کی کسی عورت کو عابدہ کے اغوا کے جواب میں اٹھانا چاہتا ہوں تو وہ سنجیدگی سے بولا۔

''دیکھ کاکے! تیری مرضی لیکن عورت واپس لوٹنے کے بعد مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ بدلے اور انتقام کی آگ میں کبھی بھی ایسا قدم اٹھانا کی مت سوچا کر کاکے! جس میں بے گناہ عورت ذات کو نقصان پہنچے... یہ زنانیاں تو کچا گڑھا ہوتی ہیں اگر ممتاز خان نے ایسا منہ کالا کیا ہے تو تو کیوں ایسا کرتا ہے؟ اس کے جوان بیٹے فرخ کو اغوا کر لیتے ہیں، بات اس کو جھکانے کی اور جوابی کارروائی کی ہے نا... پر یار... عورت کو نشانہ نہ بنا... چاہے وہ دشمن کی بہن بیٹی کیوں نہ ہو۔''

اول خیر کا یہی معیارِ انسانیت اس کے اچھے آدمی ہونے کی غمازی کرتا تھا جو مجھے دل سے متاثر کرتا تھا۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ اگر ممتاز خان نے میری عابدہ کو اٹھوایا تھا تو میں بھی اس کے خاندان کی کسی عورت کو اٹھا کر اسے ذہنی اذیت سے دوچار کروں... لیکن اب اول خیر کی نصیحت نے مجھے واقعی اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کردیا اور مجھے خود بھی کافی ندامت سی محسوس ہوئی، لہٰذا بولا۔

''اول خیر! تو ٹھیک کہتا ہے یار! سچی بات کہوں میرا اپنا دل بھی اسی طرح سوچ رہا تھا۔ ٹھیک ہے ہم اس کے بیٹے فرخ کو اٹھا لیتے ہیں...''

''او خیر... کاکا! میں بھی تجھے جانتا ہوں۔ یقیناً تیرے دل میں بھی یہی بات تھی تو تو نے میری بات سے اتفاق کیا ہے۔''

''یار! یہ بتا... فرخ کو اٹھا کر کہاں لے کر جانا ہے؟ کیا چھتے کے گھر...؟''

''نہیں کالی باؤلی والے ٹھکانے پر... وہاں ارشد، یاور اس کی نگرانی کریں گے اور ہم دونوں بیگم ولا چل کر بڑے استادِ کبیل دادا کی شکایت کریں گے۔''

میں کبیل دادا کی کوئی شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا بیگم صاحبہ سے مگر سرِدست میں نے اول خیر سے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہ کی۔

جیپ پوش علاقے میں داخل ہوچکی تھی، تب تک میں اول خیر کو اپنا سارا منصوبہ بتا چکا تھا۔ میں آسیہ کے منگیتر ریحان ملک کو زبیر خان کی قید سے چھڑانا چاہتا تھا۔ ریحان کی آزادی بھی ضروری تھی کیونکہ اس کے اغوا کے باعث ہم بلیک میل ہوئے تھے اور ہمارا لائیو پروگرام نشر ہونے سے رہ گیا تھا جبکہ یاسین ملک بھی آسیہ کے خلاف کمربستہ ہوگیا تھا اور زبیر خان سے جاملا تھا۔ لہٰذا ریحان کو آزاد کروانا معمولی کام نہ تھا نہ ہی آسان۔ اس لیے براہِ راست اسے ٹکر کی چوٹ لگا کر خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنا تھی اس کے لیے ضروری تھا کہ چوٹ برابر کی ہو اس لیے میں نے چودھری ممتاز خان کی رہائش پر نقب لگانے کا حتمی ارادہ کررکھا تھا۔ اول خیر کو ان ساری باتوں اور منصوبے کی افادیت کا خوب اچھی طرح ادراک و اندازہ ہوگیا تھا۔ گرائیں نگر کی پُرشکوہ عمارت کو دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گیا... بہ قول چھتے کے... گرائیں نگر کوئی کوٹھی بنگلا نہ تھا... قلعہ تھا اور قلعے کو توڑنے کے لیے ہاتھی جیسی طاقت درکار ہوتی ہے۔

عمارت کے اردگرد بھی کوئی بنگلا یا کوٹھی کے آثار تھے تو وہ قدرے فاصلے پر تھے۔ ہم جیپ کو نسبتاً ویران جگہ پر چھوڑ کے پیدل ہی یہاں تک آئے تھے۔ ارشد کو جیپ میں ہی چھوڑ آئے تھے۔ میں اور اول خیر ایک خالی پلاٹ میں چھپے ہوئے تھے یہاں خودرو جھاڑیاں اگ آئی تھیں اور کچھ کاریں اور ایک بس کھڑی تھی ہم ان کی آڑ میں کھڑے گرائیں نگر کی اس قلعہ نما عمارت کا جائزہ لے رہے تھے۔

اول خیر نے مجھے یہ بتا کر حیران بھی کیا تھا کہ وہ ایک دو بار اس عمارت میں داخل ہوچکا تھا۔ ایک بار بیگم صاحبہ کے ساتھ آچکا تھا مگر چوروں کی طرح نہیں۔ چودھری ممتاز دراس کے باپ الف خان سے بات چیت کرنے کے لیے... دوسری بار وہ کبیل دادا کی سرکردگی میں نقب لگا کر داخل ہوا تھا۔

''دیکھ رہا ہے کاکا! کیسا مضبوط قلعہ ہے یہ...؟'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''مگر تیرے یار کے سامنے یہ ریت کا ڈھیر ثابت ہوگی۔'' میں اس کی بات پر محض سر ہلا کر رہ گیا۔

عمارت سرخ اور اسٹائلش تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ عمارت دو منزلہ تھی اور خاصے وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ عمارت کی دیواریں بلند تھیں... جن کی منڈیروں پر خم دار آہنی بریکٹ نصب تھے اور ان

بریکٹ کے ساتھ تین رو یہ خاردار فولادی تاروں نے گویا چہار دیواری کا احاطہ کر رکھا تھا۔ سیاہ رنگ کا لوہے کا گیٹ بھی فیل گزار نظر آتا تھا۔ عمارت کے اندر سے بھی ناریل اور یوکلپٹس کے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ اصل رہائشی عمارت چہار دیواری کے وسط میں تھی اور اس کی بلندی پر بیش قیمت لکڑی اور شیشے کا استعمال نظر آتا تھا۔ دیواروں پہ کسی کسی جگہ ایک سیاسی پارٹی کے بینر اور راہنماؤں کی بڑی بڑی تصویریں بھی آویزاں تھیں۔ اول خیر نے مجھے بتایا کہ اوپری منزل کے شمال اور جنوبی گوشوں میں وہ خفیہ کیبن بنے ہوئے ہیں جن پر سیاہ شیشے لگے ہوئے ہیں یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں اور ایک ایک گن مین بھی وہاں تعینات ہے۔ جبکہ گیٹ کے باہر دو گن مین اور اس سے زائد اندر بنے گیٹ سائیڈ میں ہر وقت ہتھیاروں سے لیس موجود تھے۔ اوپری منزل میں مذکورہ دو خفیہ کیبن میں نصب کیمرے چاروں طرف گردش کرتے تھے۔

''بڑے سخت انتظامات کر رکھے ہیں۔ یہ رہائش گاہ ہے یا کوئی جیل...؟'' میں نے ایک لمبی سانس بھرتے ہوئے اول خیر سے سرگوشی میں کہا۔

وہ مدھم ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''کاکا! یہ لوگ اس کو اپنی شان سمجھتے ہیں مگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ سب ان کے لیے ایک عذاب سے کم نہیں، انسان کی اصل راحت اور سکون نارمل زندگی گزارنے میں ہی ہے۔ چل... آ اس طرف...'' ہم دونوں رات کی تاریکی میں ایک طرف کو ہو لیے۔ چھپتے چھپاتے ایک لمبا چکر کاٹ کر جنوب تک آئے۔ رات کے آخری پہر میں یہ فائدہ تھا کہ ہماری یہ کارروائی نظروں میں آئے بغیر پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی تھی مگر مشتبہ بھی آسانی سے قرار دیے جاسکتے تھے۔

''ادھر ایک ٹیلی کمیونیکیشن والوں کا پول ہوا کرتا تھا مگر اب نہیں ہے۔'' مجھے اول خیر کی سرگوشی سنائی دی۔

میں نے ہولے سے استفساریہ کیا۔ ''تو اب...؟ کیا کیا جانا چاہیے؟''

''آگے آؤ۔'' کہتے ہوئے اس نے قدم بڑھائے۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ عمارت کے بالائی گوشے کی جنوبی سمت والے سیاہ شیشوں کے کیبن کی زد میں نہ آنے پائے۔

جنوبی دیوار سے ہم ایک گلی نما راستے میں آگئے، اب عمارت اور ہمارے درمیان کسی اور کوٹھی کی آڑ تھی۔ یہاں سے ایک لمبا چکر کاٹ کر عمارت کی عقبی سمت میں آگئے، عقبی سمت میں بھی ایک لگ بھگ کوئی دو کنال کا پلاٹ خالی پڑا تھا۔ یہاں مرمتی کام میں استعمال ہونے والا سامان پھیلا ہوا تھا۔

''کام بن گیا کاکا۔'' معاً اول خیر نے کہا۔ ''لیکن بڑی ہوشیاری کے ساتھ ہمیں اس حصے کی طرف پہنچنا ہوگا۔''

''اصل مرحلہ تو یہی ہے۔ اوپر کیمرے کی اندھی آنکھ سارا منظر دیکھ رہی ہے۔ کس طرح وہاں پہنچا جائے؟'' میں نے فکرمندی سے کہا۔

''سینے کے بل لیٹ کر... یہ مختصر فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔'' وہ بولا۔ ''اب یہ قسمت پر منحصر ہوگا کہ عمارت سے باہر گرد و پیش میں کوئی شبینہ گشت کرنے اور سیٹی بجانے والا چوکیدار ہمیں رینگتا ہوا نہ دیکھ سکے۔''

''مجھے تو اپنے اطراف میں کوئی نظر نہیں آرہا۔ سوائے تاریک سناٹے کے۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں زمین پر سینے کے بل لیٹ گئے، اب اس طرح ہماری مقررہ جگہ تک ہونے والی پیش قدمی اوپری منزل کے کیبن میں نصب ممکنہ و متوقع کیمرے کی خفیہ آنکھ کے دائرے میں نہیں آسکتی تھی۔ ٹانگوں سے چلنے کی بہ نسبت رینگتے ہوئے یہ مختصر سا فاصلہ بھی طویل ثابت ہوا۔ دیوار کے قریب پہنچ کر بھی ہم سیدھے کھڑے نہیں ہوئے تھے، اس کا اشارہ اول خیر مجھے کر چکا تھا۔ وہ اب عقبی دیوار کا لیٹے لیٹے ہی تھوڑی دیر تک جائزہ لیتا رہا۔ ایک سیوریج کا دیوار گیر پائپ اوپر تک جارہا تھا۔ یہ لوہے کا نہیں بلکہ ایک خاص قسم کے مسالے کا موٹا پائپ تھا جس میں سیمنٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس پر دیوار جیسا ہی رنگ کیا ہوا تھا۔ دو دو فٹ کے فاصلے پر پائپ میں فولادی پتریاں لگی ہوئی تھیں پائپ نصف سے زیادہ دیوار کے اندر دھنسا ہوا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اول خیر اور ہم اس کے ذریعے کس طرح اندر داخل ہوسکتے ہیں؟

مگر دوسرے ہی لمحے مجھے اس کی ذہانت کا اعتراف کرنا پڑا۔ اول خیر نے اپنی جیب سے ایک پلاس کی طرح کا اوزار نکالا اور مجھ سے بولا۔ ''کاکا! میں اوپر جارہا ہوں۔ جس طرح میں اس پائپ کے ذریعے اوپر دیوار تک پہنچوں گا تو بھی یہی طریقہ آزمانا۔''

میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں پائپ کی جانب بڑھا پھر جیسے اس کے ہاتھ پاؤں مشین ہوگئے۔ اوزار نما آلے کی مدد سے وہ دو دو فٹ کے فاصلے پر لگی لوہے کی پتریوں کو نصف حد تک اکھیڑتا اور اس پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اس طرح

پائپ بھی جھول کر دیوار سے قدرے باہر کو نکل آیا تھا اور اوپر چڑھنے میں مزید آسانی ہو رہی تھی، نسبتاً زیادہ آسانی مجھے ہوئی تھی۔ منڈیر پر نصب آہنی بریکٹوں اور خاردار تاروں کو پھاند کر دوسری طرف کودنا چنداں دشوار ثابت نہ ہوا۔

جہاں ہم کودے تھے، وہ رہائشی کمروں کی عقبی جگہ تھی جسے عام فہم میں گلیاری کہتے ہیں۔ گلیاری نے ایک طرح سے تقریباً سارے ہی کمروں کا احاطہ سا کر رکھا تھا۔

ہمیں اس حقیقت کی خطرناکی کا پورا احساس تھا کہ ہم نے دشمنوں کی کچھار میں قدم رکھ دیا ہے۔ ممتاز خان یا چودھری الف خان جیسی ملتان کی نمایاں بارسوخ اور بھاری بھرکم سیاسی شخصیت کی رہائش گاہ میں نقب لگانا معمولی کام نہ تھا مگر ممتاز خان نے میری عزت پر ہاتھ ڈال کر ایسا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا جس سے میرے دل و دماغ سے اس کا رعب و دبدبہ، اثر و رسوخ، طاقت سب ماند پڑ چکا تھا۔ میں اس وقت مثلِ آتش فشاں کی طرح تھا میرے سینے میں لاوا دہک رہا تھا اور میں نے تہیہ کر رکھا تھا، صورتِ حال بگڑی تو میں کم از کم گرائیں نگر نامی کے قلعے کو آگ میں جھونک دوں گا میں گویا ہر صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔

اول خیر نے سرگوشی میں کہا۔ ''کاکے! یہ گلیاری جدھر ختم ہوتی ہے وہاں ایک زینہ آئے گا وہ سیدھا اوپری منزل کو جاتا ہے خود ممتاز خان نیچے کی منزل میں ہوتا ہے۔ بیوی بچے اوپر سوتے ہیں۔ مجھے یقین تو ہے کہ فرخ ہمیں اوپر ہی ملے گا۔''

''آگے بڑھ پھر...'' میں نے بے چینی سے کہا۔ ہم گلیاری کی دیوار سے لگے مذکورہ مقام پر طلوع ہوئے، آڑ سے ابھر کر سامنے کا بیرونی حصہ ہماری تکتی ہوئی نظروں کے سامنے تھا۔ وہاں گیٹ کا اندرونی سائڈ کیبن نظر آ رہا تھا۔ دو گن مین ادھر ادھر مٹرگشت کرنے کے بعد اندر جا چکے تھے، مگر سب سے زیادہ تشویش ناک چیز وہ چار خونخوار جبڑوں اور شکاری دانتوں والے کتے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی شاید اسی لیے ابھی تک وہ ہماری بو نہیں سونگھ سکے تھے یا پھر وہ خود بھی نیند کے باعث الجھے ہوئے تھے۔

''کاکے! جلد بازی مت کرنا... زینہ میرے دائیں جانب ہے جس کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ یہ اوپر سیدھا چھت تک جاتا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ بس! یہ مرحلہ طے ہو جائے۔''

''بے فکر رہو مگر یہ کم بخت کتے۔ یار مجھے ان سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ یہ کسی وقت بھی ہماری بو سونگھ کر ہماری طرف بھونکتے ہوئے لپک سکتے ہیں۔'' میں نے سرگوشی میں کہا تو وہ بھی اسی آواز میں بولا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا ارادہ گرائیں نگر میں نقب لگانے کا ہے تو میں ان کتوں کا بھی بندوبست کر کے آتا۔ گوشت کے پارچوں میں نیند کے انجکشن اس مشکل کا حل ہو سکتے تھے۔''

اچانک دو کتے وسیع و عریض باغ کی طرف لوٹ گئے، جبکہ تیسرا کتا وہیں گارڈز کیبن کی دیوار سے لگ کر تھوتھنی اپنے اگلے پیروں میں ڈال کر لیٹ گیا جبکہ چوتھا کتا اپنے منہ سے خوں خوں کی آواز خارج کرتا ہوا بیرونی محرابی دروازے کی فینسی اور اسٹائلش قدمچوں کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنا منہ ماربل کے چکنے فرش پر ڈال دیا۔

''کم بخت کو ادھر ہی بیٹھنا تھا۔'' اول خیر کی بہت مدھم آواز ابھری۔ میں بھی اس کے عقب سے قدرے ابھر کر گلیاری کی دیواری آڑ سے مذکورہ سمت کا دیکھ رہا تھا۔ ''یہ تو واقعی پہرے دار بن کر بیٹھ گیا، اب کیسے اوپر پہنچیں گے؟''

میرے لہجے میں پریشانی در آئی، اول خیر نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سوچنے میں محو تھا۔

کتا ہمارے بہت قریب تھا۔ اس خطرے کا بھی احتمال تھا کہ ہماری بو کسی بھی سے اس کے بوگیر نتھنوں سے ٹکرا سکتی تھی۔ بہت قوی امکان تھا اس خدشے کا جسے میں نے ہی نہیں، اول خیر نے بھی محسوس کر لیا تھا اسی باعث جب اول خیر مجھے لیے کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گلیاری میں مدھم روشنی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں بری طرح ٹھٹکے۔ ہمارے عقب سے شاید دوسرے سرے سے گھوم کر نجانے کیسے ایک کتا گلیاری کے اندر آ گیا اور ہمارے پیچھے کھڑا مدھم روشنی میں ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہم ایٹم بم کے سامنے ہوں جو کسی بھی وقت پھٹنے کے قریب تھا۔

☆☆☆

ایسے نازک ترین وقت میں میرا جی چاہا تھا کہ میری رگوں میں یکلخت پارا دوڑ جائے اور میں لپک کر کتے کا خونخوار منہ دبوچ لوں تاکہ وہ بھونکنے نہ پائے۔ اگر یہ بھونکنا شروع کر دیتا تو مسلح گارڈ بھی ہماری طرف متوجہ ہو جاتے، اس کتے کے باقی تین ساتھی اپنے ساتھی کی آواز پر تیر کی طرح دوڑتے ہوئے ادھر آ جاتے۔

''کاکے! ہلنا بالکل مت... سانس بھی مت لینا۔'' مجھے اول خیر کی سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے دم بہ خود کھڑے کھڑے اپنے ڈیلوں کو نصف دائرے کی حرکت پر اول خیر کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں سامنے گھورتے اور

ہولے ہولے انداز میں غر... غر... کرتے کتے پر جمی ہوئی تھیں۔ نہ جانے اول خیر کون سا جادو کرنا چاہتا تھا کہ میں نے دیکھا کتا بھی اول خیر کی طرف تکے جا رہا تھا۔ اس کے کھلے جبڑوں سے نکیلے شکاری دانتوں کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ حلق سے ہولے ہولے غراہٹ اس کی خونخواری کا مزید بھیانک تصور پیش کر رہی تھی، غنیمت ہی تھا اب تک کہ کتے نے بھونکنا نہیں شروع کیا کہ اس میں شاید اول خیر کا کمال تھا اول خیر کے ہونٹوں نے عجیب سی ساخت بنائی... اور بہت ہلکے پچکارنے جیسی آواز پیدا کرنے لگا... کتا ہولے ہولے غرغر غر کرتا اس کے قریب آ گیا اور پھر دوسرے ہی لمحے جیسے اول خیر کی رگوں میں پارا دوڑ گیا۔ اس نے کمال پھرتی اور درانہ وار جرات سے لپک کر کتے کا شکاری تھوتھنا اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور ایک بلاخیز جھٹکا دیا کہ کتا آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، سینے میں اٹکی ہوئی سانس گویا رک رک کر جاری ہونے لگی تھی۔

''کاکا! اس کی لاش کو باہر اچھالنا پڑے گا۔ ورنہ اس کے دوسرے ساتھی بھی ادھر آ جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اول خیر نے کتے کی لاش کو اٹھایا اور پھر ہم دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اسی سمت میں آ گئے جہاں ہم کودے تھے۔ ہم دونوں نے کتے کی لاش ہاتھوں میں پکڑی، پھر ایک دو تین تک کہتے ہوئے اسے جھلایا اور اوپر اچھال دیا۔ کتے کی لاش دیوار کے اوپر پہلے آہنی بریکٹوں اور خاردار تاروں سے الجھ کر جھول گئی۔ ہماری کوشش تو یہی تھی کہ اسے اس قدر اوپر تک ضرور اچھالتے کہ وہ دوسری طرف جا گرتا مگر بدقسمتی سے وہ وہیں پھنس کر جھول گیا۔

''کام خراب ہو گیا۔'' اول خیر زیرلب بڑبڑایا۔

''ہمیں جلد اپنا کام نمٹانا ہو گا کاکے، چل آ۔'' ہم دونوں بیرونی دروازے والے حصے پر پہنچے تو پہرے دار کتا وہاں نہیں تھا ہم دونوں لپک کر زینے پر آ گئے یہاں آ کر ہم نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

ہم اوپر آ گئے۔ ایک موٹا چوبی دروازہ دھکیل کر دوسری طرف جھانکا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ کہیں چھت کے کونے میں نصب ہلکے پاور کا گلوب روشن تھا۔ ہم دونوں راہداری میں آ گئے۔ یہاں گہری خاموشی تھی۔ ہمیں دائیں جانب چار پانچ بیڈ رومز کے دروازے دکھائی دیے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ جس سے کمروں کی کشادگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ اب ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ کس کمرے میں کون ہے؟ فرخ کا بیڈ روم کون سا تھا؟ کسی ایک کمرے میں گھس کر اور اندر موجود کسی فرد کو گن پوائنٹ پر لے کر ہی فرخ کے بارے میں اگلوایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے ایک کمرا چھوڑ کر دوسرے پر اول خیر ''طبع آزمائی'' کے لیے جھک گیا۔ لاک والے دروازے بھی خاصے بھاری بھرکم اور بیش قیمت عمارتی لکڑی کے تھے۔ اول خیر نے اپنی جیب سے بظاہر ایک عام سی چابی نکالی۔ مجھے حیرت ہوئی مگر پھر چونکا بھی۔ چابی مخصوص قسم کی تھی جسے ایک سے ڈھائی انچ تک لمبا کیا جا سکتا تھا، اس تناسب سے اس کے دندانے بھی بدلے جا سکتے تھے، اول خیر کے مطابق یہ ماسٹر کی تھی۔ چابی لاک میں داخل کر کے وہ لاک کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ ساتھ ہی لٹو نما ہینڈل کو بھی گھماتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ چابی نکال کر اس نے اپنی جیب میں ڈالی اور مجھے اشارہ کرتا ہوا بہ آہستگی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

بیڈ روم بلاشبہ پُرسکون اور آرام دہ تھا۔ اے سی چل رہا تھا۔ جہازی سائز کے بیضوی بیڈ پر ایک جواں سال لڑکی سو رہی تھی۔ اس کا ریشمی لحاف نصف سرکا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک پری وش صورت لڑکی تھی۔ اس کے ریشمی گھنے سیاہ بال غلافی تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔ لمحے بھر کو یوں لگا جیسے سیاہ بدلیوں کے درمیان چاند کا رخ روشن دمک رہا ہو...

''یہ ممتاز خان کی لاڈلی بیٹی نوشابہ ہے۔ فرخ کی بڑی بہن۔'' اول خیر نے میرے کان میں دھیرے سے سرگوشی کی پھر مجھے پلٹنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے میرے پُرسوچ ذہن میں کئی سوالات تھے۔ اول خیر یہ سب کیسے جانتا تھا؟ اس نے مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا تھا کہ وہ یہاں دو بار آ چکا تھا مگر مجھے حیرت تھی کہ وہ ہر جگہ سے کس طرح واقفیت رکھتا تھا؟

بہرحال دوسرا کمرا خالی ملا، تیسرے میں فرخ موجود تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ جاگتی ہوئی حالت میں۔ وہ رات کے آخری پہر اپنا لیپ ٹاپ کھولے ہوئے تھا، کمرے کی لائٹ گل تھی ہمیں پتا نہیں چل سکا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے کہ وہ بیڈ پر ایک بڑے گاؤ تکیے سے پشت ٹکائے نیم دراز تھا، اس طرح کہ لیپ ٹاپ اس کے سینے پر کھلا ہوا تھا اور وہ خود جماہیاں لے رہا تھا۔ شکر تھا کہ اول خیر نے دروازہ بے آواز کھولا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب تک وہ سنبھلا، اول خیر چیتے کی سی لپک کے ساتھ اس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے بھی اس کے بیڈ کے قریب

آ کر اپنا خوف ناک میگارو نکال کر اس پر تان لیا۔ کمرے میں ہلکے پاور کے بلب کی روشنی کے باوجود فرخ، اول خیر کو پہچان چکا تھا۔ فرخ بہ مشکل سولہ سترہ سال کا ایک ٹین ایج لڑکا تھا۔ شکل وصورت میں خوبرو تھا۔ وہ بُری طرح خوف زدہ تھا۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں تکے جارہا تھا۔ اول خیر نے اس کا منہ اور گردن بیک وقت دبوچ رکھا تھا پھر اس نے خونخوار غراہٹ سے فرخ سے کہا۔

"اوئے کاکے! شور نہ مچاویں۔ ورنہ... ادھر میں تیری گردن دبا دوں گا... بے حرکت پڑا رہوے۔" فرخ سے مارے دہشت کے ویسے ہی نہیں بولا جارہا تھا پھر میں بھی اس پر اپنا پستول تانے..... کھڑا تھا۔ اول خیر نے سنسناتی سرگوشی میں فرخ سے کہا۔ "اوئے منڈے! تجھے خاموشی سے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا... ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم بس تجھے یرغمال بنا کر تیرے باپ کے قبضے سے اپنا ساتھی چھڑانا چاہتے ہیں۔" اس کی بات پر فرخ کی گھگی بندھ گئی۔ اول خیر نے اب اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ وہ لرزتی آواز میں بولا۔

"م... میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" اول خیر کو غصہ آگیا۔ اچانک کمرے کی دم بہ خود فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا، میں اور اول خیر اپنی جگہ سن ہو کر رہ گئے بلکہ میں تو لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے بھی ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ سے میگارو نکل چکا تھا گولی چلانے والے کا نشانہ بڑا سچا تھا۔ گولی میرے ہاتھ میں دبے میگارو کی نال سے ٹکرائی تھی اور گولی چلانے والا... بلکہ والی... دروازے پر کھڑی ہماری طرف گھور رہی تھی جبکہ میں اور اول خیر اس کی طرف یوں تکے جارہے تھے جیسے وہ دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ یہ وہی دلکش چہرے والی لڑکی تھی جسے ہم پہلے والے کمرے میں سوتا چھوڑ آئے تھے، اب نجانے وہ کس طرح بعد میں ہماری شاید واپسی کی آہٹ پر چونک کر بیدار ہو گئی تھی یا پھر پہلے سے ہی خوابیدگی کا ڈراما کر رہی تھی مگر طے شدہ امر تو یہ تھا کہ اس کی غیر متوقع مداخلت نے ہماری ساری محنت اکارت کر ڈالی تھی بلکہ بازی پلٹ کر ہمیں بھی خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ ایک سوئے ہوئے گھر کے آخری خاموش پہر میں گولی کی آواز دھماکے سے کم ثابت نہ ہوئی تھی جو مکینوں سمیت مسلح گارڈز کو بھی متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

"خبردار! کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی مت۔" دفعتاً وہ لڑکی جرأت کے ساتھ اپنی مترنم آواز کو رعب دار بناتے ہوئے بولی۔ "میرا نشانہ تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے نوشابہ نام ہے میرا... اور میں معمولی لڑکی نہیں ہوں... چودھری الف خان کی پوتی ہوں ممتاز خان کی بیٹی... شوٹنگ کلب کی ٹاپ ممبر رہ چکی ہوں میں... بس کافی ہے میرا تعارف... یا...؟"

نوشابہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اول خیر نے، بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ فرخ کے سینے پر کھلے پڑے لیپ ٹاپ پر زور کا ہاتھ مارا... مقصد نوشابہ کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پستول کی دوسری متوقع گولی کا راستہ روکنا تھا یا کچھ اور... کیونکہ جیسے ہی لیپ ٹاپ فرخ کے سینے سے اچھل کر نوشابہ کی طرف لپکا... اول خیر نے پستول کے نشانے سے ہٹنے کی کوشش کی۔ دوسری گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میرے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے۔ بیڈ پر نیم دراز جواں سال فرخ کے چہرے پر گولی پیوست ہو گئی تھی اور اس کا خوبرو چہرہ زخم ناک ہو کر بگڑ گیا۔ گولی شاید دماغ کو چاٹ گئی تھی اور وہ ڈھیر ہو گیا تھا بلاشبہ نوشابہ کا دوسری بار گولی چلانے کا عمل بے اختیاری تھا جس نے اس کے ہاتھوں اس کے بھائی کی موت کا سامان کر ڈالا تھا۔ نوشابہ سکتے میں آگئی۔ اپنے ہاتھوں اپنے بھائی کا خون ہوتے دیکھ کر اس جیسی جرأت خیز لڑکی کے حواس بھی لمحے بھر کو مختل پڑ گئے۔ اب کچھ بعید نہ تھا کہ وہ اپنے بھائی کی موت کا ہمیں ذمے دار ٹھہراتی، اور ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا، وہ ہم پر جوش غیظ وجنوں کے باعث تلے کئی فائر جھونک سکتی تھی لہٰذا میں نے اس خطرے کے پیش نظر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی میرا اور نوشابہ کا فاصلہ زیادہ نہ تھا میں سیدھا اس پر جا پڑا۔ باہر شور اور دوڑتے قدموں کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ صورتِ حال خطرناک بلکہ جان لیوا حد تک بگڑ چکی تھی۔

میں نوشابہ سے ٹکرایا۔ وہ چیخ مار کر گری۔ میں نے لپک کر اس کا پستول اٹھا لیا۔ اول خیر چیخا۔ "کاکے! بھاگ۔"

یہ کہتا ہوا وہ دروازے کی طرف لپکا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی مگر جاتے سمے اپنا میگارو اٹھانا نہیں بھولا۔ ہم دونوں راہداری کے آخری سرے تک دوڑتے چلے گئے۔ عقب میں شور اور دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب آتی جارہی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف مڑتی راہداری کے سامنے ایک دروازے والا زینہ نظر آیا۔ اول خیر آگے تھا اور میں اس کے پیچھے۔ یہ زینہ مختصر ثابت ہوا۔ دس بارہ قدمچے ہی طے کرنا پڑے تھے کہ ہم ایک ویران اندھیرے ہال میں کھڑے تھے۔

''اس طرف۔'' اول خیر نے ہانپتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہاں ایک شٹر نما دروازہ تھا جسے عام فہم میں ڈور اسپرنگ کہا جاتا ہے۔

''میرا خیال ہے ہم ابھی عمارت سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ادھر ہی کسی گوشے میں چھپ جاتے ہیں۔'' وہ میرے بچکانا سوال پر بولا۔

''نہیں کاکے یہی موقع ہے نکلنے کا۔ اس وقت افراتفری کا عالم ہے۔ سب بالائی منزل کی طرف متوجہ ہوں گے۔ صورتِ حال واضح ہوتے ہی یہی عمارت ہمارے لیے چوہےدان ثابت ہوجائے گی آؤ۔''

اس کا خیال سو فیصد درست تھا۔ وہ شٹر ڈور سے ذرا باہر جھانکنے کے بعد مجھے اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ یہ پائیں باغ کا حصہ تھا۔ اس سے آگے کار پورچ میں دو بڑی اور ایک چھوٹی گاڑی کھڑی نظر آئیں۔ باہر پو پھٹنے لگی تھی اور صبح کی سحر خیزی روشنی کی صورت میں نمودار ہونے لگی تھی۔ یہاں سے بڑا مین گیٹ نظر آتا تھا۔ اول خیر کا خیال صحیح ثابت ہوا، اس ہڑبونگ میں گارڈز گیٹ کو چھوڑ کر غائب ہو چکے تھے مگر یہ ممکن تھا کہ باہر دو مسلح محافظ موجود ہوں مگر اول خیر نے اس طرف پیش قدمی نہیں کی، وہ ایک بغلی سمت میں نظر آنے والی گیلری کی طرف دوڑا۔ ہم دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ احاطہ در ہائشی عمارت کے بیچ اس گلی میں کوئی نہ تھا۔ بلاشبہ اول خیر اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا۔

دفعتاً کسی کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آواز کا آہنگ سمجھ میں آتا تھا۔ مفہوم نہیں، تاہم لگتا تھا کوئی محافظوں کو خبردار رہنے کی تاکید کررہا تھا۔ میرا دل سائیں سائیں کرتا کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس گلیاری میں ایک سنگل پٹ والا دروازہ تھا جس کے قریب پہنچ کر اول خیر رکا۔ اس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اول خیر نے ایک لمحہ ... ضائع کیے بغیر دروازے کے تالے پر اپنے پستول سے دو فائر کیے۔ تالا ٹوٹ گیا، دروازہ کھول کر ہم باہر لپکے... اور پھر اندھادھند دوڑتے چلے گئے۔ اس دروازے کے عقب میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیں۔ ہم عمارت کی جنوبی دیوار سے باہر نکلے تھے اور اب ہمارا رخ اس طرف تھا جہاں ارشد جیپ میں ہمارا انتظار کررہا تھا۔

وہاں پہنچے تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

جیپ میں سوار ہوتے ہی ارشد نے بغیر دوسرا سانس لیے جیپ اسٹارٹ کرکے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

''کیا ہوا چھوٹے استاد؟'' بالآخر ایک موڑ کاٹتے ہی ... مین شاہراہ کی طرف تیز رفتاری سے جیپ دوڑاتے ہوئے ارشد نے اول خیر سے پوچھا۔

''معاملہ سنگین حد تک بگڑ گیا تھا۔ زندگی تھی جو بچ کر نکل آئے۔'' اول خیر نے جواب دیا مگر میری کھٹکتی نظروں نے ارشد کے چہرے سے کچھ اور بھی بھانپ لیا تھا۔ اب پتا نہیں یہ میری حد سے بڑھی ہوئی صلاحیت تھی یا حالات کی ستم ظریفی مجھے ارشد کے چہرے کا اڑا اڑا رنگ... کسی بھی طور موجودہ صورتِ حال کی خطرناکی کے باعث نہیں محسوس ہورہا تھا اور بالآخر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ اول خیر کے جواب میں وہ سرسراتے ...... لہجے میں بولا۔

''چھوٹے استاد! ایک معاملہ یہاں بھی سنگین ہو چکا ہے۔'' اس کے انکشاف کرنے والے سنسنی خیز انداز نے اول خیر سے زیادہ مجھے چونکنے پر مجبور کیا۔

''کیا بات ہے، کیا کہنا چاہ رہے ہو ارشد؟'' اول خیر نے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا جبکہ وہ خود بھی متفکر اور پریشان سا نظر آرہا تھا۔ مقصد کی ناکامی اپنی جگہ مگر چودھری ممتاز کے جواں سال بیٹے کی حادثاتی موت... یقیناً معمولی واقعہ نہ تھا اگرچہ بدنصیب فرخ اپنی ہی بہن نوشابہ کی گولی سے ہلاک ہوا تھا جو اس کے غیر معمولی جوش اور غیر ارادی حرکت کا شاخسانہ ہی تھا۔ مگر ظاہر ہے اس کی وجہ ہم ہی تھے اور یقیناً ہلاکت بھی میرے کھاتے میں ڈالی جانے والی تھی۔ اول خیر کا بدستور پُرتشویش نظر آتا چہرہ بھی اس بات کا غماز تھا مگر ارشد پوپے نے ہمیں ایک نئی فکر میں ڈال دیا تھا، وہ بولا۔

''چھوٹے استاد! تم دونوں کا اب بیگم ولا جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔'' اس نے جیسے دھماکا کیا۔

اول خیر کے چہرے پر یکلخت سناٹا طاری ہوگیا۔ وہ بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا مطلب؟'' خیریت ہے؟''

''یارو کا فون آیا تھا۔'' ارشد بولا۔ ''چھپتے والا راز... اب راز نہیں رہا چھوٹے استاد؟''

میرے دل کی دھڑکنیں جیسے یکلخت تھم گئیں۔ اول خیر کا چہرہ تو یکدم تاریک پڑتا چلا گیا... کئی ثانیے تو اس کے منہ سے کوئی آواز ہی نہ برآمد ہوسکی۔ جب وہ بولا تو مجھے اس کی آواز تک بدلی ہوئی اور گویا کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''یہ... یہ... کیا کہہ رہا ہے تو... ار... ارشد؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں چھوٹے استاد۔'' ارشد نے بیک ویو مرر پر ایک نظر ڈالی اور پھر سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پتا نہیں کس طرح ابھی ایک گھنٹا پہلے بڑے استاد کبیل دادا کی اچانک چھتے سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ اس نے اسے قابو کرنے کی کوشش کی تھی، دونوں کے درمیان زبردست مار اماری بھی ہوئی مگر چھتا بڑے استاد کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ چھوٹے استاد! تیرے مجھ پر بہت احسانات ہیں تو اب یہاں سے کہیں دور چلا جا... تجھ پر بیگم صاحبہ سے غداری کرنے کا راز افشاں ہو چکا ہے... کوئی شک نہیں، بڑا استاد (کبیل دادا) بیگم صاحبہ کے حکم پر تیری تلاش میں نکل بھی چکا ہو۔''

یہ سب سن کر اول خیر پر عجیب سا دورہ پڑ گیا۔ وہ ارشد کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ اچانک اس نے ڈیش بورڈ پر اپنا سر مارنا شروع کر دیا۔ ارشد نے گھبرا کر جیپ کو بریک لگا دیے اور مجھ سے چلا کر بولا۔ ''چھوٹے استاد کو سنبھالو... شہزی...!''

میں خود سناٹے کی کیفیت میں تھا اور عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ فوراً اٹھ کر اول خیر کو سنبھالا دینے لگا۔ ''حوصلہ کر میرے یار! تو تو بڑا دل گردے والا آدمی ہے یار۔'' میں نے کہا اور ساتھ ہی ارشد سے بولا۔

''جیپ آگے بڑھاؤ، رکو مت۔'' اس نے فوراً جیپ آگے بڑھا دی۔ اب پتا نہیں وہ کہاں جا رہا تھا۔ یہ میں نے اس کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ایک نئی پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ پریشانیوں اور مصیبتوں کے انبار میں چھتے والی پریشانی سب پر حاوی تھی۔ یہ سنگین نوعیت کا راز بھی ایسے وقت میں آشکارا ہوا تھا جبکہ میں اور اول خیر ایک ناکام مہم سے واپس لوٹ رہے تھے ہمیں فوراً بیگم صاحبہ کی پناہ درکار تھی۔

اول خیر کو میں نے بڑی مشکل سے سنبھالا تھا۔ ڈیش بورڈ سے سر ٹکرانے سے اس کی پیشانی مضروب اور سرخ نظر آرہی تھی۔ ارشد جیپ دوڑاتا ہوا ملتان کے کہیں نواح میں آ گیا تھا اور ایک نیم ویرانے کی طرف جانے والے کچے نشیبی راستے پر ہولیا تھا پھر ایک ویرانے میں نظر آنے والی کھنڈر عمارت کے پاس پہنچ کر اس نے جیپ روک دی۔

''یہ اچھا نہیں ہوا... کاکے... یہ بالکل بھی اچھا نہیں ہوا کاکے یار...'' اول خیر بار بار نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے یہی گردان کرتا جا رہا تھا۔ میں نے ارشد کو گرد و پیش پر نظر رکھے رہنے کی تاکید کی اور ایک بار پھر اول خیر کی طرف متوجہ ہوکر بولا۔

''یار اول خیر! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو تو خود جینے کا حوصلہ دینے والوں میں سے تھا۔ مشکل اور نازک ترین لمحات میں بھی... تو مسکرانے والا آدمی تھا۔ حوصلہ کر یار! ہم اس کا کچھ نہ کچھ حل سوچ لیتے ہیں۔ تو اتنی سی بات پر پریشان ہو گیا ہے۔ مجھے دیکھ... میں تو خطرناک معاملات میں بے گناہ ہی پھنستا چلا جا رہا ہوں دگرگوں حالات کی دلدل سے باہر نکلنے کی جتنی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ سینہ سپر کیے ہوئے ہوں... حالات کے سامنے ڈٹا ہوا ہوں اور پھر یار...! یہ سب میں نے تجھ سے ہی تو سیکھا ہے۔'' میرا لب و لہجہ کچھ جذباتی سا ہونے لگا تھا جس کی اثر پذیری نے اول خیر کو بھی رقت زدہ سا کر دیا ' وہ بے اختیار میرے گلے لگ کر بولا۔

''او خیر... کاکے! جیتا رہے... پر میں بھی موت سے نہیں ڈرتا۔ اور چھتے کی زندگی بچا کر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں... میرا ضمیر بھی مطمئن ہے۔ پر یار! غداری کا ٹھپہ مجھے قبول نہیں ہے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے وفاداری کا دم بھرا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ چھتے کو کالی باؤلی میں لے جا کر خاموشی سے ہلاک کر دیا جائے۔ مگر یہ میرے لیے کڑا امتحان تھا۔ ایک طرف بیگم صاحبہ کا حکم اور دوسری طرف محسن تھا میرا۔ چھتے نے ایک موقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے کیسے مار سکتا تھا۔ اسے تو پتا بھی نہ تھا کہ میں اسے کالی باؤلی کیوں لایا ہوں... نہیں... یار! کاکے! اب مجھے خود کو بیگم صاحبہ کے سامنے ایک مجرم اور غدار کی حیثیت سے پیش ہونا پڑے گا اور اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔''

میں نے پھر اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''یار! مجھے نہیں لگتا کہ بیگم صاحبہ تیرے اس جرم میں کوئی بڑی سزا دے سکتی ہیں۔ میں خود انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ تیرے اور چھتے کے درمیان احسان مندی اور محسن والا معاملہ تھا۔ یہ ایک بڑا امتحان ہوتا ہے اول خیر! اپنے محسن کو ہلاک کرنے والا تو انسان بھی کہلانے کے لائق نہیں ہوتا۔ چھتے کو بچا کر تو نے ایک لائق تحسین کام کیا تھا۔ مجھے پوری امید ہے اگر بیگم صاحبہ کو اصل حقیقت کا علم ہوگیا تو وہ تجھے معاف کردے گی۔ وہ میری بات نہیں ٹالتی۔''

میں نے دیکھا اب اس کے مُتے اور پژمردہ چہرے پر کچھ رونق اور طمانیت بھرے تاثرات ابھرے تھے۔ مگر ارشد مطمئن نظر نہیں آرہا تھا۔ ''یار شہزی! تو کہیں چھوٹے استاد کو مروا نہ دینا۔ بیگم صاحبہ کے مزاج کو تجھ سے بہتر ہم جانتے ہیں... اپنے حکم سے سرتابی کرنے والا چاہے ان کا جتنا قریبی ساتھی ہو... وہ اسے کسی صورت میں بھی معاف نہیں کرتی ہیں۔'' پھر وہ اول خیر کے پُرسوچ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا .... ''تم کیا بڑے استاد کبیل دادا کا وہ حشر بھول گئے، جب ایک ذرا سی غلطی پر بیگم صاحبہ نے انہیں دُھنک کر رکھ دیا تھا تو پھر یہ اتنی بڑی بات وہ کیسے درگزر کر سکتی ہیں۔ نہیں چھوٹے استاد... نہیں... میں تمہیں واپس بیگم ولا نہیں جانے دوں گا۔ تم ایسا کرو... یہ صوبہ ہی چھوڑ دو۔ سندھ چلے جاؤ وہ کشمور میں میرا ایک دوست ہے زندگی رہی تو ملتے رہیں گے۔''

ارشد کی اس بات پر کہ بیگم صاحبہ نے کبیل دادا جیسے گرانڈیل آدمی کو ایک ذرا سی غلطی پر دھنک کر رکھ دیا تھا، سن کر حیران ہوا تھا، یہ بات غلط بھی نہیں ہو سکتی تھی ظاہر ہے اول خیر کو یہ معلوم ہوگا مگر مجھے حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ ایک بظاہر نازک سی نرم نظر آنے والی بیگم صاحبہ... اتنی جلاد صفت فطرت کی مالک کیسے ہو سکتی تھیں؟

اول خیر نے ارشد کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جانے کو تو میں کہیں بھی چلا جاؤں گا مگر تم یاروں سے کٹ کر زندگی گزارنا بھی میرے لیے موت ہی کے برابر ہے اور پھر یہ کاکا بھی تو ہے... یہ تو بے چارہ حالات کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے۔ نہیں... یار نہیں، تو چل بیگم ولا... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

ارشد دوبارہ فکرمند ہوگیا پھر اس نے ایک الجھی ہوئی نظر میرے چہرے پر ڈالی۔ یوں لگتا تھا جیسا وہ کوئی بات کہنے سے کترا رہا ہو۔ بالآخر اس نے اول خیر سے اشارے میں جو بات کہی اس نے مجھے ایک بار پھر چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اول خیر کو مخاطب کر کے بولا۔

''چودھری ممتاز خان کا بیٹا بھی قتل ہوگیا ہے چاہے ہمارے ہاتھوں نہ سہی... مگر اس کے ذمے دار بہرحال آپ ٹھہرائے جائیں گے۔ جانتے ہو... فرخ... کا بیگم صاحبہ سے کیا رشتہ ہے؟ بیگم صاحبہ نے چودھری ممتاز کے ساتھ دشمنی میں اب تک کیوں کسی خون خرابے کی نوبت نہیں آنے دی تھی، اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں اس کا بھی ہمیں بیگم صاحبہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آخر ہم ان سے کن کن مسائل اور باتوں کی صفائیاں اور تاویلیں پیش کرتے رہیں گے؟''

''بیگم صاحبہ کا فرخ سے کیا رشتہ تھا؟'' میں نے فوراً ارشد کی بات اچک کر پوچھا۔ ارشد نے جواب دینے کے بجائے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ مگر اول خیر نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''کاکے...! شاید اب ضروری ہوگیا ہے کہ تجھے بیگم صاحبہ کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت آگاہی دے دی جائے۔''

وہ ذرا رکا۔ میں دھڑکتی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ بیگم صاحبہ سے متعلق جان کاری کا تو میں خود بھی بے چینی سے متمنی تھا۔ پھر اول خیر میری طرف دیکھ کر انکشاف کرنے کے انداز میں بولا۔

''کاکا! مقتول فرخ... بیگم صاحبہ کا بھتیجا تھا۔ بھتیجا۔''

یہ سن کر میں کئی ثانیے دم بہ خود سا رہ گیا۔ سچی بات تھی مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ اول خیر نے یہ کیسا ناقابلِ یقین انکشاف کیا تھا۔

''کک... کیا تمہارا مطلب ہے... چودھری ممتاز... بیگم صاحبہ کا بھائی ہے؟''

''ہاں کاکے۔'' اول خیر نے ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''یہ بڑی لمبی اور لرزہ خیز کہانی ہے۔ اب تو بتا... تیرا ذہن کیا کہتا ہے؟ اس بار تو یار ہم دونوں ہی بُرے پھنسے ہیں۔ لگتا ہے حالات کی تیز دھار کا یہ آخری وار ہے... آر یا پار۔''

مجھے خود چپ سی لگ گئی تھی۔ بیگم صاحبہ کی شخصیت اب تک میرے لیے اسرار بھری ہی تو تھی۔ تاہم میں نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

''فرخ کی موت کا ہمیں بھی دکھ ہے۔ وہ ایک معصوم، بے گناہ لڑکا تھا مگر تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہوتے ہیں۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پسنے والی مثالیں ایسے ہی تو نہیں رائج ہو جاتی ہیں مگر فرخ بہرحال ہمارے ہاتھوں قتل نہیں ہوا، اس کی بہن نوشابہ نے اسمارٹ بننے کی کوشش کی تھی۔ یوں بھی ہمارا ارادہ کسی کو ہلاک کرنے کا نہ تھا۔ وقت بہت ضائع ہوگیا ہے۔ ہمیں اب تک بیگم ولا پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر ہم بیگم صاحبہ سے دور رہے تو وہ بھی یہی سمجھیں گی کہ فرخ کا قتل واقعی ہمارے ہاتھوں ہوا ہے۔''

اول خیر کو میری بات سمجھ میں آ گئی مگر ارشد مطمئن نہیں تھا۔ تاہم اول خیر نے اسے بھی اپنے حتمی فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ہم نے اللہ کا نام لیا اور دھڑکتی سوچوں اور وسوسوں کے ساتھ بیگم ولا کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

ابھی ہم ملتان کے قدرے مضافات میں ہی تھے کہ ہمیں ایک ناکے پر پولیس کی خاصی تعداد نظر آ گئی۔ وہ ہر آتی جاتی گاڑیوں کو سختی کے ساتھ چیک کر رہے تھے۔ ارشد نے فوراً جیپ روکے بغیر یوٹرن لے کر واپسی کے لیے موڑ دی۔

''لگتا ہے پورے شہر کی ناکابندی کر دی گئی ہے۔ شہر میں اس طرح کی چیکنگ ہو رہی ہوگی۔'' ارشد نے کہا۔ اول خیر بولا۔

''تم ایسا کرو... کالی باؤلی والے ٹھکانے کی طرف نکل چلو... سردست وہی محفوظ جائے پناہ ہو سکتی ہے ہمارے لیے۔'' جواباً ارشد بولا۔

''کالی باؤلی جانے کے لیے سیدھے راستے پر جانا خطرناک ہوگا ہمارے لیے... ایک لمبا اور نسبتاً محفوظ راستہ اختیار کرنے پڑے گا جبکہ گاڑی میں فیول بھی ختم ہونے والا ہے۔''

''کسی روڈ سائڈ پمپ سے فیول بھروا لیتے ہیں۔ ہم دوسرا راستہ ہی اختیار کریں گے۔'' میں نے کہا۔ اول خیر نے میری بات سے اتفاق کیا تو ارشد نے جیپ کی رفتار یک دم بڑھا دی۔

بدنصیب فرخ کسی معمولی شخصیت کا بیٹا نہ تھا۔ چودھری ممتاز کی اپنے جواں سال بیٹے کی موت پر کیا حالت ہو رہی ہوگی، اس کا ہمیں بھی اندازہ تھا اور اس بات کا بھی کہ... یہ میرے سوا اور کسی کی حرکت نہیں ہو سکتی۔ وہ اس بات کو بھی خاطر میں نہیں لائے گا کہ ہم صرف عابدہ اور ریحان ملک کے اغوا کے جواب میں اس کے بیٹے کو ہرگز قتل کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اسے صرف اغوا کرنا چاہتے تھے۔ اس بات کا بھی اسے اپنی بیٹی توشابہ کے ذریعے علم ہو چکا ہوگا کہ اس کے بھائی فرخ کی موت اسی کے پستول سے چلنے والی گولی سے ہوئی ہے۔ جو غلطی سے فرخ کو لگ گئی تھی چودھری ممتاز اس کا ذمے دار بھی مجھے ہی ٹھہرائے گا۔ اس نے پورے شہر کی انتظامیہ کو میری تلاش میں چپے چپے پر چوکس کھڑا کر دیا ہوگا۔ جبکہ یہ انکشاف ہوتے ہی کہ مقتول فرخ بیگم کا بھتیجا ہے عین ممکن تھا چودھری ممتاز... اپنی بہن بیگم صاحبہ کے خلاف بھی فوری طور پر قانونی ایکشن لے، لے۔ جتھے کا مسئلہ الگ گلے کو آن اٹکا تھا۔ ادھر مجھے عابدہ کی بھی فکر لاحق تھی۔ جوشِ انتقام میں چودھری ممتاز اسے دوبارہ اپنے گھناؤنے انتقام کا نشانہ بنا سکتا تھا اور آسیہ کا منگیتر ریحان ملک کی زندگی سے بھی مجھے مایوسی ہونے لگی۔ حالات کی اس چوکھی میں کون میری اس فریاد پر کان دھرنے کے لیے تیار ہوتا کہ... اس میں سارا قصور... چودھری ممتاز خان کا ہی تھا۔ عابدہ کا اغوا اور پھر اسے اپنے اوباش غنڈوں کے حوالے کرنا... جنگ کی ابتدا اسی نے کی تھی۔

جس سڑک پر ہم رواں تھے، وہ ڈبل ہائی وے روڈ نہ تھی، گاڑی میں پیٹرول ڈلوانے کے لیے ہمیں چند کلومیٹر پر ڈبل روڈ پر آنا پڑتا مگر وہاں جانے سے ہم کترا رہے تھے، ممکن تھا پولیس ملتان کے نواح میں بھی ہماری تلاش میں نکلی ہو۔ ارشد کا خیال یہی تھا کہ اس ذیلی سڑک پر تھوڑا آگے جا کر دیکھ لینا چاہیے... اس کے مطابق بے رونق سائڈ پر کوئی پیٹرول پمپ نہیں تو کوئی ایسی آٹو مکینک کے گیراج سے بھی ایرانی ساختہ پیٹرول مل سکتا تھا۔

اس کا خیال صحیح ثابت ہوا، چند کلومیٹر کے فاصلے پر بالآخر ہمیں ایسے آٹو مکینک کا گیراج نظر آ گیا مگر وہاں پہنچتے پہنچتے ہماری جیپ کا انجن بھی کھڑکھڑا کر بند ہو گیا۔ وہاں بڑے بڑے مختلف آئل کے ڈرم رکھے ہوئے تھے۔ گیراج کا مالک پکی عمر کا آدمی تھا۔ اس سے معاملہ طے کیا گیا۔ ایک بڑے ڈرم کے سوراخ میں اس نے ہینڈ پمپ نما نلکا ڈال کر ڈرم سے ہماری جیپ کی ٹنکی میں پیٹرول منتقل کیا۔ یہ خودکار نہیں بائی مینوئل طریقہ تھا پیٹرول بھرنے کا اس لیے نصف گھنٹے سے زائد کا وقت صرف ہو گیا۔

کام ہو گیا اور ہم روانہ ہو گئے۔ آگے جا کر ہمیں یہ ذیلی سڑک بھی چھوڑ کر بنجر زمینوں اور اجاڑ ویرانوں سے راستہ بناتے ہوئے کالی باؤلی کے ٹھکانے پر جہاں پہنچے۔ یہاں میں آج پہلی بار آیا تھا۔ بظاہر یہ جگہ پولٹری فارم کی مستطیل نما عمارت سے مشابہ تھی۔ یہ پولٹری فارم تھا۔ مرغیوں کی کٹ کٹ اس ویرانے میں عجیب آہنگ پیدا کر رہی تھی۔ مرغیوں کو دی جانے والی فیڈ اور ان کے پروں کی مخصوص بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ دو آدمی بھی وہاں موجود تھے، یہ اول خیر کے ساتھی ہی تھے جو بظاہر چوکیدار نظر آتے تھے مگر اصل میں تربیت یافتہ تھے۔ اول خیر نے ان سے کچھ کہا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں

ایک گیراج نمارا ستے پر مڑنے کو کہا جس کا کوئی گیٹ نظر نہیں آتا تھا۔ تاہم یہ جگہ اندر تک گہری تھی جیپ اگر یہاں کھڑی ہوتی تو بیرونی سمت سے کسی کو نظر نہ آتی۔ جیپ کو روک کر ہم سب نیچے اتر آئے۔

ایک آدمی غائب ہو گیا جبکہ دوسرا فوراً ہماری طرف بڑھا۔ دوسرے آدمی کے اچانک چلے جانے پر اول خیر ہی نہیں ارشد کو بھی میں نے چونکتے دیکھا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''یہ ماجا کدھر غائب ہو گیا؟'' اول خیر نے موجود کارندے سے شاید اس کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ جواباً ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد بولا۔

''وہ بڑے استاد کو تمہاری آمد کی اطلاع دینے گیا ہے۔ بڑے استاد کا یہی حکم ہے۔ اس کا اندازہ تھا کہ تم لوگ ادھر کا ہی رخ کرو گے۔'' اس کی بات پر ہم تینوں یکلخت سناٹے میں آگئے۔ گویا ہمیں اپنے لوگوں سے بھی انجانا سا خطرہ محسوس ہونے لگا... کبیل دادا کی ہم سے پہلے یہاں غیر متوقع آمد خالی از علت نہ تھی۔

''تم ادھر ہی رکو اول خیر... میں پہلے جا کر کبیل دادا سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے ان دونوں کو پریشان دیکھ کر کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ دونوں کبیل دادا جیسے اکھڑ مزاج اور رعونت پرور آدمی سے ملیں۔

''او... خیر... کاکے...'' اول خیر نے میرا کاندھا تھپک کر کہا۔ ''اول خیر ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اپنے ہی لوگوں سے چھپتا پھرے... آؤ۔'' اس نے قدم بڑھا کر موجود آدمی سے پوچھا۔ ''کدھر ہے وہ...؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا مگر میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا اگر کبیل دادا نے استادی دکھانے کی کوشش چاہی تو... میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ ہمیں ایک سیلن زدہ خالی کمرے سے گزار کر... پھر ایک دوسرے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو ہم چونک پڑے۔ مختصر سے کمرے میں کبیل دادا اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ہمراہ تین اور ساتھی بھی موجود تھے۔ یقیناً وہ مسلح بھی تھے اور کبیل دادا سمیت وہ ہماری طرف گھور گھور کر تکے جا رہے تھے۔ کبیل دادا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ ہماری آمد کا سن کر وہ کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی موجود تھا جس نے اسے ہمارے بارے میں مطلع کیا تھا۔ کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ایک روشن دان تھا۔ فرنیچر کے نام پر فقط ایک چارپائی، تین کرسیاں اور چوبی بینچ تھی۔

کبیل دادا آگے بڑھا اور اپنے بدہیئت ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر ایک زوردار تھپڑ میرے ساتھ کھڑے اول خیر کے چہرے پر جڑ دیا۔ دوسرا تھپڑ مجھے رسید کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا کہ اول خیر نے فوراً سنبھلتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سناٹے دار لہجے میں بولا۔

''نہیں استاد! مجھ پر ہاتھ اٹھا لیا... یہ کافی ہے مگر کاکے پر تو ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔''

اول خیر کی اس جسارت پر کبیل دادا کے حلق سے خونخوار غراہٹ ابھری اور اس نے دانت کچکچا کر اول خیر کو دور دھکیل دیا۔ میں نے کبیل دادا کی طرف پیش قدمی کی تو اس کے تینوں ساتھیوں نے یکلخت پستول نکال لیں۔

''میں بیگم صاحبہ سے بات کرنا چاہتا ہوں... ابھی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب میں سیل فون نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو میں نے دانستہ آف رکھا تھا۔

''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا ورنہ گولی چلا دوں گا۔'' تینوں میں سے ایک ساتھی نے غرا کر کہا تو ارشد، کبیل دادا کو تنبیہ کرتے ہوئے بولا۔

''بڑے استاد! خود پر قابو رکھو۔ ہمارے خود یہاں آنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم پہلے بیگم صاحبہ سے فون پر رابطہ کر کے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ اور تمہاری یہاں پہلے سے موجودگی ہماری سچائی کا ثبوت ہے، کیونکہ تمہیں یقین تھا ہم ادھر ہی آئیں گے۔'' ارشد نے دوٹوک لہجے میں اپنی بات کی۔

''بکواس بند کرو اپنی۔'' وہ سانپ کی طرح ارشد کو گھور کر پھنکارا۔ ''بیگم صاحبہ کو سب علم ہے اور انہی کے حکم پر میں یہاں آیا ہوں۔ تم نے اس لونڈے کے کہنے پر چودھری ممتاز کے جواں سال بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ... فرخ... بیگم صاحبہ... کا...''

''ہم جانتے تھے یہ حقیقت۔'' اس بار اول خیر نے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا تو کبیل دادا نے ایک وحشیانہ جنبش سے حرکت کی اور قریب کھڑے اول خیر کی گردن اپنے آہنی ہاتھ کے شکنجے میں دبوچ لی۔

''تم غدار... آدمی... تمہیں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

میں نے سلگتی نظروں سے دیکھا اول خیر کے چہرے

پر سنسنی خیر سناٹے پھیلتے چلے گئے۔ جن کے پیچھے ایک طوفان بلاخیز امڈ پڑنے کو کروٹیں لیتا محسوس ہو رہا تھا۔ خود میری اپنی حالت اس سے مختلف نہیں تھی۔ بے شک کبیل دادا میری طرح قدآور اور گرانڈیل سہی... اور مقابلتاً اول خیر اس کی قامت سا مار کھاتا تھا مگر اول خیر کا جسم بھی کسی گینڈے کی طرح گٹھا ہوا اور مضبوط تھا مگر شاید کسی تنظیمی مصلحت اور موجودہ حالات کی حساس اور نازک گھڑیوں کا ادراک اول خیر کو کسی جوابی کارروائی سے روکے ہوئے تھا۔

''کبیل دادا! اگر یہ بات ہے تو تم نے بھی عین وقت پر میرا ساتھ چھوڑ کر بیگم صاحبہ کی حکم عدولی کی تھی۔'' میں نے کبیل دادا کی طرف جلتی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''اور دوسری حقیقت یہی ہے کہ... ہم نے فرخ کا قتل نہیں کیا... ہم صرف اسے یرغمال بنانا چاہتے تھے۔ اس کی بہن نوشابہ کی اچانک مداخلت نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اس نے اپنے پستول سے ہم پر فائر بھی کر ڈالا تھا مگر اس کی چلائی ہوئی گولی غلطی سے اس کے اپنے بھائی کو جا لگی اور وہ موقع پر ہی ختم ہو گیا۔ اس بات کا ہمیں بھی افسوس ہے۔''

اس کے ہاتھوں اول خیر کی بار بار تذلیل مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں جانتا تھا اول خیر صبر و برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہ یقیناً بیگم صاحبہ کی اور کچھ چھتے کے حوالے سے اپنی کمزوری کے باعث خاموش تھا۔ ورنہ وہ کبیل دادا سے کم نہ تھا۔ تنظیم میں کبیل دادا ''بڑا استاد'' کہلاتا تھا تو اول خیر کو ''چھوٹا استاد'' کا درجہ حاصل تھا۔

میری بات پر کبیل دادا کے چہرے پر ایک رنگ سا ابھر کے غائب ہوا۔ اس نے اول خیر کو چھوڑ دیا۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر دوسری چوٹ کی۔

''دیکھا جائے تو اس ساری صورتِ حال کے ذمے دار تم ہو۔ جب بیگم صاحبہ نے تمہیں میرے ساتھ یہ تاکید کر کے جنگی خان کے اڈے پر روانہ کیا تھا کہ مجھے کسی صورت میں بھی تنہا نہیں چھوڑنا تو تم کیوں مجھے سنسان سڑک پر اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ نہ صرف یہ بلکہ تم نے میرے ساتھ باقاعدہ ہاتھا پائی بھی کی تھی... اس لیے بہتر یہی ہے کہ یہ سارے معاملات بیگم صاحبہ کے سامنے پیش کیے جائیں... تمہاری اس حرکت سے مجھے ذاتی مخاصمت کی بو آ رہی ہے۔''

میری دھواں دھار جوابی کارروائی نے وہاں چند ثانیوں کے لیے پُرسوچ سناٹا سا طاری کر دیا۔ میں چاہتا تھا کبیل دادا کے ساتھ آئے وہ تینوں ساتھی بھی یہ حقیقت جان لیں کہ کبیل دادا، اول خیر اور بالخصوص میرے لیے اپنے دل میں کیسے مخاصمانہ جذبات رکھتا تھا۔ آخر کو وہ تینوں پہلے بیگم صاحبہ ہی کے نمک خوار اور وفادار تھے۔ کبیل دادا میری بات کو خاطر میں لائے بغیر تیز لہجے میں بولا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو۔ میں اس وقت یہاں بیگم صاحبہ کے حکم پر ہی ہوں اور میں بیگم صاحبہ کے سامنے اپنی صفائی اس سلسلے میں پیش کر چکا ہوں کہ تم میری مدد سے عابدہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے کے بعد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میری بات نہ ماننے پر تم نے اس کا نتیجہ دیکھ ہی لیا۔ لہٰذا اب تم بھی بیگم صاحبہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ مگر تمہاری باری بعد میں آئے گی، پہلے مجھے اس غدار سے جواب طلب کرنے کا حکم ملا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ غصیلی نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم مجھے بتاؤ گے کہ... چھتے کے سلسلے میں تم نے بیگم صاحبہ کے ساتھ کیوں جھوٹ بولا تھا؟ یاد رکھو تمہارے غیر تسلی بخش جواب پر مجھے بیگم صاحبہ کی طرف سے یہ اختیار مل چکا ہے کہ میں خود تمہیں اس جرم کی پاداش میں اسی وقت سزا سے دوچار کر سکتا ہوں۔'' اس کی بات نے میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ کبیل دادا کو اول خیر سے اگر کوئی ذاتی پرخاش تھی بھی تو اس کی وجہ میں ہی تھا کیونکہ سب سے

معلومات عامہ

سردار دیوان سنگھ مفتون غلطی کا اعتراف فراغدلی سے کر لیتے تھے اور ان کے بعض فقرے بہت مزیدار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ مصر براعظم ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس قسم کے معاملات میں وہ اکثر مجھ سے مشورہ کر لیتے تھے۔ میں اتفاق سے موجود نہ تھا اور کاپی پریس میں چلی گئی۔

اخبار چھپ کر آیا۔ میں نے سردار صاحب کی اس غلطی کی طرف توجہ دلائی کہ مصر براعظم ایشیا کا سب سے بڑا ملک نہیں بلکہ براعظم افریقہ کا ایک ملک ہے۔ اس پر خوب قہقہے لگائے اور بولے۔ ''کاکا، کوئی مضائقہ نہیں۔ جو بات مجھے نہ معلوم ہو وہ پبلک کو کیا معلوم ہوگی۔''

(سردار علی صابری)

ماخوذ از روزنامہ جنگ کراچی۔ مورخہ 3 فروری 75ء

پہلے اس نے مجھے بیگم صاحبہ سے متعارف کرایا تھا۔ اب اسے اول خیر سے دشمنی نکالنے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔

''اس سلسلے میں، میں صرف بیگم صاحبہ کے سامنے ہی اس کا جواب دے سکتا ہوں۔'' اول خیر نے کبیل دادا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تم سے ذاتی عناد کی بو آرہی ہے۔''

اس کی بات پر کبیل دادا نے فوراً اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا اور اس کی نال کا رخ اول خیر کی طرف کر دیا۔ یکلخت میری کنپٹیاں سائیں سائیں کرنے لگیں۔ وہ اس پر پستول تانے ہوئے زہر خند لہجے میں بولا۔

''اول خیر! مجھے جواب دو۔ چھتے کو تم نے کیوں زندہ چھوڑا تھا جبکہ بیگم صاحبہ سے تم نے یہ جھوٹ بولا تھا کہ تم ان کے حکم کے مطابق اسے ہلاک کر چکے ہو؟''

''چھتے کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا۔ وہ میرا محسن تھا۔'' اول خیر نے بالآخر صاف گوئی کے ساتھ بلا خوف جواب دیا۔

''تمہیں یہ حقیقت بیگم صاحبہ کو بتانا چاہیے تھی۔'' کبیل دادا نے اسے گھورا۔

''مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی مگر میں سمجھتا تھا محسن کشی کو بیگم صاحبہ بھی پسند نہیں کرتی ہیں اور چھتا میرا محسن تھا۔ دشمنوں کے ساتھ ایک معرکے میں اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری جان بچائی تھی، وہ میرا محسن تھا۔''

''تمہارا جواب غیر تسلی بخش ہے اور سن لو اچھی طرح سے۔'' کبیل دادا کے لہجے سے خوفناک سرسراہٹ مترشح تھی۔ اس کے چہرے سے مجھے خطرناک عزائم کی جھلک صاف نمایاں ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بولا۔

''مجھے بیگم صاحبہ نے تمہیں فوری گولی مارنے کا حکم دیا ہے اور اس حکم کی تکمیل میں کسی نے بھی آنے کی جرأت کی تو میں بے دریغ اسے بھی گولی مار دوں گا۔'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

یکلخت میری رگوں میں خون پارے کے مانند گردش کرنے لگا۔ اول خیر کو موت کے منہ میں دیکھ کر میرا رواں رواں جوش سے کانپنے لگا۔ میں اپنی جان کی پروا کیے بغیر اس کے اور اول خیر کے درمیان آگیا۔ میرا غیر معمولی فراخ سینہ اول خیر کے لیے ڈھال بن گیا اور میں کبیل دادا کے سامنے پورے قد کے ساتھ تن کر کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں کا قد کاٹھ برابر ہی تھا۔ دونوں کے درمیان آنے کے باعث میرا فاصلہ بھی کبیل دادا سے کافی حد تک قریب ہوگیا تھا۔ ہماری چوڑی پیشانیاں ہی نہیں بلکہ ناک کی پھنگیاں بھی ایک دوسرے سے ٹکرانے کے قریب ہوگئیں۔ کبیل دادا کی آنکھوں میں مجھے لہو کی جھپک صاف ابھرتی محسوس ہو رہی تھی جبکہ خود میری آنکھوں میں بھی خوفناک عزائم کی جھلک نمایاں تھی۔

''آگے سے ہٹ جاؤ... تم...'' دفعتاً کبیل دادا نے مجھے بدستور سنسناتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ گویا دانتوں تلے چبا کر کہا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے غضب کا کینہ بھرا ہوا دکھائی دیا تھا۔ میں نے بھی تن کر کہا۔

''کبیل دادا! میں خود بھی تم لوگوں کے درمیان نہیں آنا چاہتا ہوں مگر اب یہ معاملہ اور بن چکا ہے۔ مجھے بیگم صاحبہ سے بات کرنے دو۔ وہ محض تمہارے یک طرفہ بیان پر کبھی اتنا بڑا اور کڑا حکم صادر نہیں کر سکتیں۔''

''بہت زعم ہے تمہیں خود پر...'' کبیل دادا زہر خند مسکراہٹ سے بولا۔ ''خاطر جمع رکھو، بعض حساس تنظیمی معاملات میں بیگم صاحبہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی ہیں، اور تم نے تو ان کے بھتیجے کا قتل بھی کر ڈالا ہے ہٹ جاؤ... ورنہ...''

اس نے یہ کہتے ہوئے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور ادھر میں نے بہ یک جنبش حرکت کرتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ پر زوردار جھپٹا مارا، مجھ سے اچانک اور اتنی جرأت کی شاید اسے توقع نہ تھی۔ ادھر پستول اس کے ہاتھ سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے میرے ہاتھ میں میگا رو آچکا تھا جس کی نال میں نے اس کی پیشانی سے لگا دی۔

''خبردار! کوئی غلط حرکت مت کرنا دادا... میں بے دریغ گولی چلا دوں گا۔'' میرے لہجے کی زہرناک غراہٹ پر وہ دم بہ خود سا ہوگیا۔ وہ میری سفاکی کی ایک جھلک جنگی خان کے اڈے پر اشرف کے میرے ہاتھوں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اترنے کی صورت میں دیکھ چکا تھا، اسے معلوم تھا کہ میں پہلے ہی کفن بہ دوش کی راہ پر گامزن ہو چکا ہوں۔

اس کے عقب میں کھڑے تینوں ساتھی، جارحانہ نظروں سے پستولیں تانے مجھے گھورنے لگے مگر حرکت کرنے کی جرأت کسی نے نہ کی تھی۔ یہ گھڑیاں اچانک ہی نازک اور خطرناک صورت اختیار کر گئی تھیں۔ کسی بھی وقت یہاں خون خرابا ہو سکتا تھا۔ اول خیر اور ارشد کو عجیب سی چپ

لگ گئی تھی۔

تاہم محض چند ثانیوں کی دم بہ خود خاموشی کے بعد میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے اول خیر کی سپاٹ آواز ٹکرائی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھا۔

”نہیں شہزاد… !پستول ہٹا دو۔“

”یہ ہماری جان کا دشمن ہو رہا ہے اول خیر…“ میں نے عقب میں اس کی طرف دیکھے بغیر اور کبیل دادا کے جلتے سلگتے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ”ذاتی عناد نے اسے اندھا کر دیا ہے۔“

”میں کہتا ہوں پستول ہٹا دو اور ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔“ اول خیر اس بار مجھ سے عجیب تحکمانہ لہجے میں بولا۔ … میں نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے اپنا پستول والا ہاتھ گرا دیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اول خیر نے کبیل دادا کو مخاطب کر کے کہا۔

”کبیل دادا! یہ وقت ہم سب کے لیے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ پولیس کی گشتی پارٹیاں ہمیں تلاشتی پھر رہی ہیں۔ ہماری لڑائی سے وہ اس طرف متوجہ ہو سکتی ہیں اور یہ اڈا بھی ان کی نظروں میں آجائے گا۔ میرے سلسلے میں تمہارا فیصلہ کرنے کی عجلت ہم سب کو شبہے میں ڈال رہی ہے۔ بہتر ہو گا بیگم صاحبہ سے فون پر رابطہ کر لو۔“

کبیل دادا بھی ایک ہٹ دھرم انسان تھا، وہ دانت پیس کر اول خیر سے کوئی سخت جملہ کہنا چاہتا تھا مگر اچانک اس کے عقب میں کھڑے ایک ساتھی نے فوراً اپنا ایک ہاتھ کبیل دادا کے کندھے پر رکھ دیا اور ساتھ ہی مؤدبانہ جرأت سے بولا۔

”دادا! میرا خیال ہے بیگم صاحبہ سے بات کر لی جائے۔“ اپنے ساتھی کے معترض ہونے پر ہی کبیل دادا کچھ سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں خود بات کروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا… نمبر پنچ کرنے لگا۔ میرے اور اول خیر کی دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ہیلو، بیگم صاحبہ!“ رابطہ ہوتے ہی دم بہ خود سناٹے میں اس کی مؤدبانہ آواز ابھری۔ ”وہ تینوں یہاں کالی پاؤلی والے ٹھکانے میں موجود ہیں اور اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ اس نے کہا پھر دوسری طرف سے وہ کچھ سنتا رہا۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا کہ نجانے اب بیگم صاحبہ اپنے مقربِ خاص کارپرداز کبیل دادا کو کون سا حکم صادر کرنے والی تھیں؟

”اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ قتل انہوں نے نہیں کیا… ان کا مقصد صرف فرخ کو اغوا کرنا تھا مگر اس کی بہن نوشابہ کی مداخلت اور اس کی چلائی ہوئی گولی سے فرخ کی موت واقع ہوئی ہے… جی … بیگم صاحبہ… بہت بہتر… کیجیے بات…“

کبیل دادا نے فون کان سے لگائے ہوئے میری طرف ترچھی نظروں کے ساتھ گھور کر آخر میں کہا اور پھر سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون لیا اور اپنے کان سے لگا لیا۔ ”جی بیگم صاحبہ! مجھے بے حد دکھ ہے کہ…“

”شہزاد!“ دفعتاً دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی آواز نے میری بات کاٹ دی۔ ان کی آواز میں آج پہلی

حل

ہارون رشید درباریوں میں گھرا بیٹھا تھا، حاضرین کی شربت سے تواضع کی جا رہی تھی۔ شراب سے پُر جام سونے کے تھے، ایک پریشان حال درباری کی نیت میں فتور آگیا اور اس نے سونے کا جام اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین میں چھپا لیا۔ لیکن ہارون رشید کی تیز نظروں نے اس چوری کو دیکھ لیا۔

جب محفل برخاست ہونے لگی تو ساقی نے بہ آوازِ بلند حاضرینِ محفل کو مطلع کیا۔ ”صاحبان! ایک جام چوری ہو گیا ہے، کوئی درباری باہر نہ جائے۔ فرداً فرداً تلاشی لی جائے گی۔“

جس نے جام چرایا تھا، اس کی حالت بری ہونے لگی، ہارون رشید دزدیدہ نظروں سے اس کی قابلِ رحم حالت کا احساس کر رہا تھا۔ تھوڑی سی اندرونی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ہارون کھڑا ہو گیا۔ اس نے حکم دیا۔ ”سب کو تلاشی لیے بغیر جانے دیا جائے۔“

ساقی نے دبی آواز میں کہا۔ ”لیکن امیرالمومنین! وہ سونے کا جام۔“

ہارون نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں بھی جانتا ہوں کہ سونے کا ایک جام چوری ہو گیا ہے لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ جس نے چرایا ہے، وہ ماننے کا نہیں اور جس نے دیکھا ہے وہ بتانے کا نہیں اس لیے اس کا بہترین حل یہی ہے کہ اس پر پردہ پڑا رہنے دیا جائے۔“

بھکر سے دانش نواز کا ذوق

بار میں نے اپنے لیے درشتی کی لہر اور تحکمانہ پن محسوس کیا مگر مرعوب میں بھی نہیں ہوا تھا۔ تاہم ان کی آواز ابھرتے ہی میں خاموش ضرور ہو گیا تھا۔

’’یہ سب تمہاری جلد بازی اور میرے مشوروں سے انحراف کرنے کا نتیجہ ہے۔ جب تمہارا عابدہ کو چھڑانے کا مقصد پورا ہو چکا تھا تو تمہیں کبیل کا مشورہ مان لینا چاہیے تھا مگر تم خود کو تیس مار خان سمجھتے ہو ہر وقت... تم نے میرے اہم آدمی کے ساتھ ہاتھا پائی تک کر ڈالی۔‘‘

’’بیگم صاحبہ...‘‘ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ بدستور درشت لہجے میں میری بات کاٹ کر کہتی رہیں۔ ’’میں نے تمہیں کبھی اپنے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت نہیں دی بلکہ دوست کا رتبہ دیا اور تم ہو کہ اتنے منہ چڑھ گئے ہو کہ میری کسی بات کو خاطر میں ہی نہیں لاتے... آج مجھے یہ دن بھی دیکھنا پڑا... جانتے ہو فرخ کون تھا... وہ میرا پیارا بھتیجا ہے... سیدھا سادہ... میری گودوں میں کھیلا ہوا تھا وہ...‘‘ ان کا دھواں دھار لہجہ رقت کے غبار میں لپٹنے لگا۔ میں نے درمیان میں کہا۔

’’مگر یہ ہم نے نہیں کیا۔‘‘

’’اس صفائی کے لیے مجھے ثبوت چاہیے۔‘‘ وہ بولیں۔ ’’فرض کرو اگر یہ بات مان بھی لی جائے تو پھر بھی ذمے داری تم پر اور اول خیر پر ہی آتی ہے اس قتل کی... اور اول خیر... اس غدار سے تو کبیل دادا ابھی نمٹ لے گا۔ کبیل دادا کو فون دو... اس نے ابھی تک اول خیر کو زندہ کیوں چھوڑ رکھا ہے... فون دو... کبیل دادا کو...‘‘

’’بیگم صاحبہ...! پلیز ہم پہلے ہی خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ اول خیر آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کی بات تو سن لیں۔‘‘

’’میں کہتی ہوں کبیل دادا کو فون دو شہزاد... احمد خان۔‘‘ بیگم صاحبہ پر وحشیانہ جنون سا طاری تھا۔ وہ میری بھی کوئی بات... کوئی تاویل سننے کو تیار نہ تھی۔ شاید اپنے بھتیجے کے قتل کے باعث شدید غم سے ان کی یہ حالت ہو رہی تھی۔ میں فون کبیل دادا کو دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اب کی بار کبیل دادا... اول خیر کو ہرگز زندہ چھوڑنے کا موقع نہ دیتا اور بیگم صاحبہ کا حکم سنتے ہی فوراً اول خیر کو گولی مار دیتا۔ صورتِ حال بہت عجیب طرح سے ایک دائرے میں پھنس کر رہ گئی تھی مجھے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ ان نازک ترین حالات اور معاملات میں بیگم صاحبہ کی ناراضی کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہ میرے لیے نہیں تو اول خیر کے لیے ضرور جان لیوا حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ اس وقت جوش نہیں معاملہ فہمی سے کام نکالنے کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے اور بیگم صاحبہ کے اس ناقابلِ فہم اور پُراسرار تعلق کو ہوا دینے کی خاطر جس کے باعث انہوں نے مجھے ایک دوست کا درجہ دیا تھا، بروئے کار لاتے ہوئے... دل کی گہرائیوں کو اپنے لہجے میں سمو کے کہا۔

’’بیگم صاحبہ! مجھے آپ کی دوستی پر ہمیشہ فخر رہے گا... میں کبھی اس کا اظہار تو نہ کر سکا تھا مگر اس کا ایک عجیب سا احساس ضرور اپنے اندر رکھتا تھا اور اندر ہی اندر مسرور بھی رہتا تھا پلیز... پلیز... بیگم صاحبہ! آپ کی مجھ ناچیز کو عنایت کردہ اس دوستی کا واسطہ دیتا ہوں... صرف ایک بار مجھے آپ اپنا شرف دیدار بخش دیں۔ میں آپ کے سامنے اپنی اور اول خیر کی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا اور اگر نہ کر سکا تو آپ کا ہاتھ ہوگا اور میری جھکی ہوئی گردن...‘‘

یہ الفاظ میں نے بہت ملائمت آمیز لجاجت اور نرماہٹ کے ساتھ ادا کیے تھے اور ان کی اثر پذیری کا مجھے پورا یقین بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے خود کو بیگم صاحبہ کی دوستی کی خاطر نہیں بلکہ اپنے یار... او خیر... کاکا... جیسے محبت سے اپنائیت بھرے انداز میں مجھے پکارنے والے... اول خیر کی بے لوث اور بے مثال دوستی کی خاطر... اس کی جان بچانے کی خاطر... میں نے خود کو بیگم صاحبہ کے سامنے جھکایا تھا۔ دوسری سمت یکلخت خاموشی چھا گئی۔ لہجے کی گھن گرج... طوفان کا پتا دیتی آواز کی سائیں سائیں... جیسے عنقا ہوتی چلی گئی۔ کیونکہ محض چند ثانیوں کی بھیدوں بھری چپ کے بعد دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی ایک نرماہٹ میں گندھی آواز ابھری جس میں مخصوص گہری نسائیت ہی نہیں بلکہ گم گشتہ محبت کی جھلک بھی محسوس ہوتی تھی۔

’’شہزی! تم جتنے پتھر ہو اتنے ہی نرم خو بھی... تمہاری ذات کی بیک وقت سخت گیری اور نرم خوئی سے میں غیر آشنا نہیں ہوں۔ تم میں اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں... وہی ایک طرف گھن گرجتا شعلہ بار لہجہ اور پھر پل کے پل شبنم کی نرم پھوار برساتا آہنگ‘ میں نے تمہاری اور ’’اس کی ذات‘‘ میں ایک ذرا فرق بھی تو محسوس نہیں کیا اب تک... سچ بتاؤ... شہزی! کیا تم وہی ہو... کیا کیا یہ میری زورِ محبت کا شاخسانہ ہے جو تمہیں... تمہیں... دوبارہ...‘‘ پھر یکلخت ان کی آواز رقت آمیزی کے غبار سے بوجھل ہونے لگی۔ اور

مجھے ایک بار پھر بیگم صاحبہ سے متعلق اس پُراسرار گتھی نے الجھا کر رکھ دیا کہ آخر وہ کون تھا جس کے روپ میں وہ مجھے دیکھا کرتی تھیں یا دیکھنے کی کوشش کرتی تھیں؟ مگر یہ بھی ایک عجیب الجھن آمیز اتفاق ہی ہوتا کہ میں ان سے اس بارے میں کچھ مستفسر ہونے کا یارا نہ رکھ پاتا۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہوتی تھی۔ تاہم میں فقط اتنا ہی کہہ سکا۔

”بیگم صاحبہ! آپ کے سامنے پیش ہو کر اپنی کچھ صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک موقع کی عنایت چاہیے تھی آپ سے۔“

”فون کبیل دادا کو دو۔“ یکلخت دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی جیسے جھلتی ہوئی آواز ابھری۔ میں ذرا جھجکا۔ تو وہ گداز لہجے میں بولیں۔ ”شہزی! مجھ پر بھروسا رکھو... فون کبیل کو دو۔“ مجھے کچھ تسلی ہوئی، میں نے فون کبیل دادا کی طرف بڑھایا جو بدستور میری طرف پُرخار نظروں سے گھورے جا رہا تھا مگر اب اس کے چہرے کی درشتی میں الجھن کی لکیریں بھی نمایاں تھیں۔

”جی بیگم صاحبہ...!“ اس نے فوراً فون میرے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگا کر مؤدبانہ کہا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے بشرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ کچھ امید تو تھی کہ بیگم صاحبہ ... کبیل دادا کو ہمارے بارے میں اب کوئی سخت حکم نہیں دیں گی۔

”لل... لیکن... بیگم صاحبہ...؟“

تھوڑی دیر تک کان سے فون لگائے دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی بات سننے کے بعد کبیل دادا نے یک دم ان سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر شاید دوسری جانب سے اس کی بات سختی کے ساتھ کاٹ دی گئی تھی کیونکہ وہ اب اپنے ہونٹ کاٹنے لگا تھا۔ البتہ لہجہ مؤدبانہ ہی تھا، وہ کہہ رہا تھا۔

”جی... بہتر... بیگم صاحبہ! جیسا آپ کا حکم... لیجیے بات کریں...“ کہتے ہوئے کبیل دادا نے چڑے ہوئے منہ کے ساتھ مجھے دوبارہ فون تھماتے ہوئے بولا۔ ”بات کرو۔“

میں نے ایک بار پھر دھڑکتے دل کے ساتھ فون اس کے ہاتھ سے لیا اور اپنے کان سے لگا لیا۔ ”جی... بیگم صاحبہ...؟“

”شہزی! کبیل دادا تم سب کو بہ حفاظت... میرے ہاں پہنچا دے گا... لیکن اگر خطرہ محسوس ہوا تو وہ تمہیں کسی اور محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دے گا۔ بعد میں مناسب سمجھوں گی تو میں بھی ادھر پہنچ جاؤں گی۔“

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ”بیگم صاحبہ! سرِدست ہمارا ادھر ہی رہنا مناسب رہے گا کیونکہ ہم نے آپ کی طرف لوٹنے کی کوشش چاہی تھی لیکن پولیس کی سخت ناکابندی کے باعث اول خیر ہمیں یہ سوچ کر کالی باؤلی والے نسبتاً محفوظ ٹھکانے پر لے آیا کہ یہاں پہنچ کر آپ سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے صورتِ حال گوش گزار کر دی جائے گی۔ بیگم ولا کی طرف رخ کرنے کی صورت میں ممکن ہے پولیس انتظامیہ یا چودھری ممتاز کے آدمیوں کی نظروں میں آجانے کا احتمال ہو کیونکہ نوشابہ، اول خیر کو پہچان چکی تھی اور ممکن ہے آپ کی رہائش گاہ کی بھی نگرانی کی جا رہی ہو۔“

بیگم صاحبہ نے میری بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن شہزی! ایک بات مجھے سچ سچ بتانا۔“

”جی... جی... بیگم صاحبہ! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔“ میں نے یک دم کہا۔

تو وہ بولیں۔ ”کیا واقعی فرخ... نوشابہ کے پستول کی گولی سے ہی ہلاک ہوا ہے؟“

”میں قسم کھا کر کہتا ہوں بیگم صاحبہ یہ بات...“ میں نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر... میں کسی وقت خود کالی باؤلی والے ٹھکانے پر پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ حالات خراب ہو گئے ہیں، ہمیں مل بیٹھ کر کچھ سوچنا پڑے گا۔ اور اول خیر والا معاملہ بھی نمٹانا ضروری ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے فون کبیل دادا کو دینے کا کہا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر فون کبیل دادا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ فون کان سے لگائے چند ثانیوں تک دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی ہدایت لیتا رہا پھر مؤدبانہ انداز میں جی اچھا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

خرانٹ زدہ نظر اس نے اول خیر اور مجھ پر ڈالی اس کے بعد اپنے تینوں ساتھیوں سے مخاطب ہو کے تحکمانہ بولا۔ ”تم تینوں ادھر ہی موجود رہو گے۔ یہ خیال رہے، یہ تینوں یہاں سے جانے نہ پائیں۔“ اس کا اشارہ ہماری طرف تھا۔

بیگم صاحبہ سے خیر سگالی کے انداز میں گفتگو کے باوجود کبیل دادا اپنی پرانی ہٹ پر قائم تھا۔ وہ آگے بولا۔ ”میں بیگم ولا جا رہا ہوں... شاید بیگم صاحبہ کو میرے ساتھ آنا پڑے۔“

اس کے تینوں ساتھیوں نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ کبیل دادا.... نے رخصت ہوتے سے ایک بار پھر ہم پر

ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

وقت کو یاد رکھو تو گزر نہیں پاتا، بھولے رہو تو اس کے گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ مگر اس وقت کی ایک ایک گھڑی جیسے ہماری سانسوں کے ساتھ بیت رہی تھی۔ کبیل دادا کے جانے کے بعد کمرے میں چند ثانیوں تک گمبھیر سی خاموشی طاری رہی۔ سامنے کھڑے کبیل دادا کے ساتھیوں نے ایک نگاہ ہم پر ڈالنے کے بعد خاموشی سے اپنی کرسیاں سنبھال لی تھیں۔ کبیل دادا کے بعد تنظیم میں چھوٹے استاد کی حیثیت اول خیر کو حاصل تھی مگر جب سے چھتے والا راز آشکار ہوا تھا، اول خیر کی حیثیت مجرموں کی سی ہو گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اس کے وہ تینوں تنظیمی ساتھیوں کی نظروں میں اپنے چھوٹے استاد کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اول خیر اور ارشد چوبی بینچ کو ایک طرف گھسیٹ کر اس پر براجمان ہو گئے۔ ان تینوں سے ہمارا فاصلہ اتنا ضرور تھا کہ اگر ہم تینوں دھیمی آواز میں گفتگو کرتے تو وہ ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

میں نے اول خیر کو بیگم صاحبہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتا دیا تھا۔ مجھے اب اصل فکر... آسیہ کے منگیتر... ریحان ملک کی طرف سے ہو رہی تھی۔ اس کی زندگی کو خطرہ تھا۔ میرا چہرہ اس فکر میں بجھا بجھا دیکھ کر اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔

''کیا ہوا کاکے؟ تیرا چہرہ کیوں یک دم اتر گیا ہے؟''

میں نے اسے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔ وہ کچھ سوچنے کے بعد تشفی آمیز لہجے میں مجھ سے بولا۔ ''کاکے! اگر ریحان ملک... زبیر خان کا قیدی ہے تو میرا نہیں خیال کہ اس کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ چودھری ممتاز خان کے پاس یرغمال نہ ہو۔''

اچانک مجھے اپنے سیل فون کا خیال آیا۔ جواب تک آف پڑا تھا۔ بہ وجہ حالات، ہم نے اپنے سیل فونز آف کر رکھے تھے۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے سیل نکال کر آن کیا۔

سیل آن ہوتے ہی کمپنی کی طرف سے کیے گئے پیغامات موصول ہوئے، ساتھ ہی سرمد بابا، آسیہ اور ایڈووکیٹ خانم شاہ کے علاوہ ایک نامعلوم نمبر کی مس کال بھی تھی جو میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے سب سے پہلے سرمد بابا کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی ان کی پریشانی سے لبریز آواز سنائی دی۔

''شہزی بیٹا... تت... تم کہاں ہو؟ ٹھیک تو ہو نا؟ تم... تمہارا موبائل کیوں آف تھا اتنی دیر سے...؟ اور یہ میں کیا سن رہا ہوں... تت... تت تم نے چودھری ممتاز کے بیٹے کا مرڈر کیا ہے؟''

میں نے ایک سرد آہ لی اور بولا۔ ''بابا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس وقت حالات کو موافق کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہوں لیکن یہ جھوٹ ہے، میں نے کوئی قتل نہیں کیا ہے۔ کیا آپ میری اس بات کا یقین کریں گے؟ عابدہ کیسی ہے؟''

''میرے بچے... مجھ سے زیادہ تمہیں کون جانتا ہے...'' ان کی فوراً مشفق آواز ابھری مگر لہجے میں دکھ سا سمٹا ہوا تھا۔ ''مگر تم پر یہ الزام کیسے آ گیا؟ عابدہ کے سلسلے میں مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا تھی۔ وہ بھی تم سے ملنے اور بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔''

''مجھے صرف عابدہ کے بارے میں بتائیں۔'' میں نے بے چینی سے کہا۔ ''باقی باتیں وقت آنے پر آپ کو معلوم ہوتی رہیں گی۔ عابدہ سے بات ہو سکتی ہے میری اس وقت...؟''

''ہاں... مگر میں اس وقت باہر ہوں گھر سے... تم گھر کے نمبر پر اس سے بات کر لو... لیکن میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''بابا! کیا بات ہے؟ میں سن رہا ہوں۔ کہیے...؟'' میں نے کہا۔ جانے کیوں میرا دل انجانے اور اندیشناک وسوسوں سے تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ بولے۔ ''شہزای بیٹا! تم سے ایک بھیک مانگنا تھی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ جیسے رو پڑے۔

میں چونک کر پریشانی سے بولا۔ ''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بابا... آپ جانتے ہیں اچھی طرح کہ آپ میری اور عابدہ کی نظروں میں کیا حیثیت رکھتے ہیں؟''

''جانتا ہوں بیٹا...''

''پھر بھی آپ نے بھیک جیسا لفظ استعمال کر کے مجھے اس قدر شرمندہ کیا؟'' میں نے شکوہ کیا۔

''بات ہی کچھ ایسی ہے بیٹا۔'' وہ رُندھے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''عارفہ بیٹی کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہنے لگی ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اگر عارفہ کے جگر کی پیوند کاری بروقت نہ کی گئی تو اس کا جگر پھٹ جائے گا اور پھر سارا زہر اس کے جسم کو ہی نہیں، اس کی جان بھی چاٹ لے گا۔''

''تو پھر...؟'' میں نے حلق میں اٹکے ہوئے گولے کو نگلتے ہوئے پوچھا۔

''کل رات کی فلائٹ سے عارفہ کو امریکا بھیجا جارہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کے ہمراہ... عابدہ بھی..... ساتھ جائے دیکھ بھال کے لیے... صرف ایک ماہ کی بات ہے بیٹا! بعض ضروری وجوہات کے باعث میرا عارفہ بیٹی کے ساتھ جانا ممکن نہیں ہے۔ تمہارا اور عابدہ کا مجھ پر بہت بڑا احسان...''

''عابدہ سے بات کی ہے آپ نے؟'' میں نے اپنے سینے میں اٹکتی سانسوں کے درمیان بہ مشکل کہا۔

''ہاں... عارفہ نے تو عابدہ کو بہنوں کی طرح رکھا ہے۔ عابدہ کو کوئی اعتراض نہیں ہے مگر جانے سے پہلے وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔'' سرمد بابا نے بتایا اور میرے ڈولتے لہجے میں ہی نہیں میرے چہرے پر بھی سناٹا طاری ہوگیا۔ کافی دیر تک تو مجھ سے کچھ بولا بھی نہ گیا۔ دوسری جانب سے سرمد بابا کی بے چین سی آواز ابھری۔ ''کیا ہوا بیٹا! تم خاموش کیوں ہوگئے؟''

میں نے بے اختیار ایک گہری سانس کو جیسے اپنے... سینہ سوزاں سے آزاد کیا اور بولا۔ ''بابا! آپ کسی بات کی فکر نہ کریں... میں ابھی عابدہ سے بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ سے دوبارہ رابطہ کروں گا۔'' میری بات سن کر وہ مجھے دعائیں دینے لگے اور اس بات کا بھی اعتراف کرنے لگے میں اور عابدہ ہمیشہ ان کے آڑے وقتوں میں کام آتے رہے ہیں مگر حقیقت یہ تھی کہ سرمد بابا کے ہم پر احسانات تھے، انہوں نے مجھے اور عابدہ کو اپنے بچوں جیسی اہمیت دی تھی۔ یہ اب کی بات نہ تھی۔ جب وہ سرمد بابا سے سید منظور وڑائچ نہیں بنے تھے اور اطفال گھر کے اولڈ ہوم میں رہتے تھے تب سے ان کا رویہ میرے ساتھ بزرگانہ اور شفقت آمیز رہتا تھا جب میں بچہ تھا اور اپنے باپ کو یاد کر کے رویا کرتا۔ جب میں اس کی بے حسی کا گلہ کرتا تھا تو یہ بابا ہی تھے جو مجھے سہارے ہوئے تھے۔ میرے اندر جینے کی امنگ خوش رہنے اور ہر قسم کے حالات میں مسرور و مطمئن ہونے کا گر انہوں نے ہی مجھے سکھایا تھا۔

ان سے رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں نے ان کے گھر پر فون کیا۔ فون عابدہ نے ہی اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر مجھے یوں لگا جیسے صدیوں بعد میں اس کی آواز سن رہا ہوں۔ میں نے مختصراً پہلے اسے ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ رو پڑی۔ وہ زخمی لہجے میں بولی۔

''شہزی! اس سے تو اچھے ہم اطفال گھر میں تھے۔ مگر جب سے وہ اطفال گھر ایک قید خانہ بنا تو کتنی مشکل سے ہم نے اس امید کے ساتھ جان چھڑائی کہ بعد میں ہم اکٹھے ہنسی خوشی زندگی گزاریں گے مگر...'' وہ سسک پڑی۔ گلے میں اتر جانے والی رقت نے اسے جملہ بھی پورا نہیں کرنے دیا۔ اس کے ٹوٹے، مایوس اور افسردہ لہجے نے میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ میں نے اپنے لہجے کی لرزش پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے عابدہ سے کہا۔

''عابدہ! شاید زندگی اسی کا نام ہے... انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے مگر خوشی انہیں ملتی ہے جو تقدیر پر شاکر رہتے ہیں اور اسے اپنے حق میں بدلنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے ہیں۔ تم نے نہیں سنا ہے کہ دعاؤں سے تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ قدرت نے ایسے انسانوں کے سپرد کچھ کام کیے .... ہوتے ہیں جو انہوں نے انجام دینا ہوتے ہیں۔ یہ بھی ایک نیک مقصد ہے۔ سرمد بابا سے ہمارا رشتہ اٹل ہے جو بے شک خونی رشتوں کا نہیں مگر اب وہ ان سے بھی بڑھ کر ہے۔ عارفہ کا علاج بھی ضروری ہے اور تمہارا اس کے ساتھ جانا بھی مگر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ بس اتنا ضرور کہوں گا کہ اس میں بھی شاید تائیدِ ایزدی کارفرما ہو... شاید کسی دکھی انسان کی مدد کرنے کی ہماری ادا اللہ کو بھا جائے اور پھر ہمارے سارے کٹھن راستے یک دم آسان ہوتے چلے جائیں... اللہ پر بھروسا کرو، اب تم کیا کہتی ہو... میری طرف سے تو اجازت ہے۔ مجھے سرمد بابا کو جواب دینا ہے۔''

وہ بولی۔ ''شہزی! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بابا نے مجھے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا اور عارفہ تو میری باجی ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر امریکا جانے سے پہلے میں تم سے ملنا چاہتی تھی... پھر پتا نہیں کب ملاقات ہو...'' اس کے لہجے، اس کی بات پر جیسے جی جان سے لرز اٹھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو عابدہ! ہم ضرور ملیں گے۔ تم ایک نیک مقصد کی خاطر جارہی ہو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہوگا۔ ایسی... مایوس کن باتیں نہ کرو۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا تمہیں خود سے دور کرنے کو... اس لیے میں تم سے اس سلسلے میں زبردستی نہیں کرنا چاہ رہا۔ مگر ایک ماہ کی بات ہے۔ عارفہ کو نئی زندگی مل جائے گی تم ان کا خیال رکھو گی۔ اس کا اجر اللہ سے مانگنا صرف... پھر دیکھنا خوشیاں ہم سے سنبھالی نہ جائیں گی۔''

''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے اسے اپنی موجودہ پوزیشن بتائی تو وہ دہل گئی۔ میں نے کہا۔ ”تم کہو تو میں آگ کے دریا عبور کر کے تم سے ملنے آجاؤں... ایسے حالات کو میں کبھی بھی خاطر میں نہ لاؤں مگر... بات صرف میری نہیں ہے، میرے ساتھ اور لوگ بھی مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

”نہیں، نہیں... شہزی! تم سے بات اور رابطہ ہوتا رہے گا تم پھر مت آؤ... مگر مجھے تمہاری فکر ستانے لگی ہے۔“ وہ پریشان ہو کے بولی۔

”میری فکر نہ کرو... ہوسکتا ہے تمہاری اس نیکی کا صلہ اللہ مجھے اس طرح دے دے کہ یہاں سارے حالات تمہارے اور میرے حق میں موافق ہو جائیں۔ بس اللہ کا نام لے کر جاؤ، میری فکر نہ کرو، میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے بہی خواہ میرے ساتھ ہیں جو حالات کو موافق کرنے کے لیے میری طرح تگ ودو میں لگے ہوئے ہیں۔“

”بس جاتے سمے تم سے بات کروں گی۔ شاید ائرپورٹ سے... مگر پلیز... شہزی! تم اپنا فون آف مت رکھنا۔ اپنا خیال رکھنا شہزی! کیونکہ میری دنیا... میرا جینا مرنا صرف تم ہو... اور تم ہی میرا سب کچھ ہو۔“ عابدہ کے منہ سے ادا کیے یہ الفاظ گویا آبِ حیات کی مثل میرے دل شکستہ وجود کو ایک عجیب سی توانائی عطا کر گئے۔

”عابدہ! تمہارے ان سچے لفظوں کا امرت میں نے پی لیا... اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے جدا نہیں کرسکتی۔ اپنا خیال رکھنا، خدا حافظ۔“

عابدہ سے بات کرنے کے بعد میرے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ اس کے بعد سرمد بابا کو فون کر کے عابدہ کی طرف سے جانے کی تسلی دے دی۔ وہ بے چارے خوشی سے رو پڑے اور مجھے ڈھیروں دعائیں دینے لگے۔ مجھے ہر طرح کی تسلی دینے لگے۔ مثلاً عابدہ کو وہاں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ انہوں نے سارے انتظامات کر رکھے ہیں۔ مزید یہ کہ ان سے رابطے میں رہوں گا اور بات بھی ہوتی رہے گی۔

میں نے یہ ساری باتیں اپنے ساتھ بیٹھے اول خیر سے گوش گزار کردیں، وہ بولا۔ ”او خیر... کاکے... تمہاری اور عابدہ بھابی کی عظمت کو میں سلام کرتا ہوں۔ جب تم بھابی سے بات کر رہے تھے میں بھی سن رہا تھا۔ اور میں خود پر فخر کر رہا تھا کاکے! کہ ایک نیک سیرت دوست میرا یار ہے۔ شاید تیری صحبت مجھے بھی سدھار دے۔ پر یار کاکے! میں سوچ رہا تھا، اس میں ضرور اللہ کی مصلحت ہو گی کہ ان حالات میں عابدہ بھابی کو ایک ماہ کے لیے سہی... یہ ملک چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ کب کی فلائٹ ہے؟“

”آج یا کل تک چلی جائے گی۔“ میں نے بوجھل پن سے کہا پھر اچانک مجھے آسیہ کا خیال آیا۔ سیل آف تھا میرا۔ ابھی میں آسیہ کا نمبر ملانے ہی والا تھا کہ اس کی کال آگئی۔ فون کان سے لگاتے ہی آسیہ کی تڑپتی ہوئی بے چین آواز ابھری۔ نجانے کیوں مجھے ایک لمحے کو ہولا کر رکھ دیا۔

”شہزی! تت... تم... کہاں ہو... کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو نا؟ تم نے فون بند کر رکھا تھا اور مجھے طرح طرح کے وسوسے پریشان کیے ہوئے تھے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں مگر تقدیر کے الجھائے ہوئے جال سے خود کو آزاد کرانے کی تگ ودو میں مصروف ہوں۔“

”میں نے ٹی وی پر سب سن لیا اور دیکھ لیا ہے۔ تم سے چودھری ممتاز کے بیٹے کا قتل کس طرح ہو گیا؟“ وہ بولی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں اور لہجے سے صرف میرے لیے تشویش اور پریشانی ظاہر ہو رہی تھی جس پر مجھے حیرت تھی۔ میں تو اس کے منگیتر ریحان کی خیریت کے بارے میں پریشان ہو رہا تھا۔ لہٰذا میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

”ریحان کی کچھ خیر خبر...؟“

دوسری جانب سے آسیہ کی چپ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا۔ نجانے وہ کیوں ریحان کے ذکر پر یک دم خاموش ہو گئی تھی۔ کیا وہ مجھے اس سے متعلق خدانخواستہ کوئی بری خبر سنانے والی تھی۔

”یہی بات میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی شہزی۔“ معاً اس کی عجیب سی آواز ابھری۔

”ریحان دشمنوں کی قید میں تھا اور چودھری ممتاز کے بیٹے کے قتل نے مجھے ریحان کی زندگی کی طرف سے مایوس کر دیا تھا... ممتاز خان اپنے بیٹے کے قتل کا الزام تم پر ہی عائد کر رہا تھا لیکن شہزی! ایک عجیب سی انہونی ہو گئی ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ کیا تقدیر اس طرح بھی پلٹا کھا سکتی ہے مگر شاید اس الٹ پھیر کا نام ہی تقدیر ہے... اب دیکھو... ہم سب حالات موافق کرنے اور تمہارے حق میں کرنے کے لیے پوراٹیم ورک کر رہے تھے مگر اچانک سب الٹ ہو گیا۔ ہم میڈیا کے ذریعے سچائی اور صفائی کو ٹھوس شواہد ہونے کے باوجود عین وقت پر منظرِعام پر نہ لاسکے اور پھر یک دم حالات بگڑتے چلے گئے۔ اس قدر بگڑ گئے ہم مایوس ہو گئے مگر اچانک ہی مایوسیوں اور اندھیروں میں

امید کی جوت جاگ پڑی۔''

''مجھے ریحان کی خیریت سے مطلع کرو آسیہ! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش ہو رہی ہے۔ باقی باتیں بعد میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔''

وہ بولی۔ ''ریحان بالکل ٹھیک ہے اور زبیر خان نے اس شرط کے ساتھ اسے آزاد بھی کر دیا ہے کہ وہ اس معاملے کو دبا رہنے دے۔'' آسیہ کا یہ انکشاف میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ اگر یقین کر بھی لیا جائے تو کئی سوالوں کی یلغار ذہن کے حیرت کدہ میں گونجنے کا سبب بن رہی تھی آخر کیوں؟ زبیر خان، اس کے بیٹے شفقت راجا کے قتل کا الزام ہمارے سر پر تھا۔ اس نے مجھے جھکانے کے لیے ریحان کو یرغمال بنایا اور پھر بغیر کوئی گزند پہنچائے اسے آسانی سے چھوڑ بھی دیا۔ وہ بھی ان حالات میں جب دشمنی کی آگ عروج پر پہنچ چکی تھی۔

''یہ... یہ... اگر یہ... سچ ہے تو... یقین جانو آسیہ... اس سے بڑھ کر میرے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے مگر یہ سب ہوا کیسے؟'' بالآخر میں نے اٹکتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ بولی۔

''جب ریحان نے مجھ سے فون پر بات کر کے یہ خوش خبری سنائی تھی تو پہلے تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ بلاشبہ یہ میرے لیے بہت بڑی خوشی کی خبر تھی مگر اس کے ساتھ ایک اور اہم بات پر مجھے حیرت ہو رہی ہے۔''

''اہم بات؟ کیسی اہم بات؟'' میں نے سوال کیا تو وہ جواب دینے کے بجائے الٹا مجھ سے مستفسر ہوئی۔

''پہلے تم بتاؤ شہزی! کہ زبیر خان کا تمہارے پاس فون تو نہیں آیا تھا؟''

اس کا استفسار مجھے چونکا گیا۔ بے اختیار میں نے نفی میں جواب دیا۔ ''نہیں تو یا پھر ممکن ہے کیونکہ میرا سیل کافی دیر سے آف تھا۔'' میں نے سوچتے ذہن سے کہا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ ایک نامعلوم نمبر میرے سیل پر آیا ہوا تھا۔ تاہم میں نے خود ہی پوچھ لیا۔

''زبیر خان مجھے کیوں فون کرے گا؟ نہ ہی اس کے پاس میرا سیل نمبر ہے۔ تمہاری بات میں سمجھ نہیں پایا۔'' میری پیشانی پر پرسوچ شکنوں کا جال سا بن گیا۔

دوسری جانب سے مجھے آسیہ کی گہری سانس لینے کی آواز ابھری وہ بولی۔ ''زبیر خان تم سے بات کرنا چاہتا ہے کیا... یہ مجھے نہیں معلوم... ریحان نے ہی یہ بات مجھے بتائی تھی۔ ریحان سے اس نے تمہارا نمبر بھی لیا تھا۔''

انگلینڈ میں کئی سال گزارنے کے بعد جب غزالہ وطن واپس آئی تو اپنی استانی سے ملنے کے لیے بھی گئی۔ استانی نے پیار سے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''کہو بیٹی! خوش تو رہیں؟ تعلیم مکمل کر لی؟ نوکری ملی یا نہیں؟ پردیس میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ اب یہیں رہو گی یا دوبارہ واپس چلی جاؤ گی؟''

غزالہ نے کہا۔ ''آپ نے تو ایک ہی وقت میں اتنے بہت سے سوال پوچھ لیے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سوال کا جواب دوں؟''

''کوئی بات نہیں بیٹی۔'' استانی نے فوراً کہا۔ ''کوئی سے بھی دو سوالوں کے جوابات دے دو۔''

رحیم یار خان سے سلیم کا انتخاب

''کیا ریحان کو کچھ اندازہ ہے کہ زبیر خان مجھ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ریحان کو اس طرح اچانک چھوڑنے کی کیا وجہ بتائی؟''

''اس کا ریحان کو تو اندازہ نہیں ہو سکا لیکن میں تھوڑا بہت اندازہ قائم کر چکی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''شہزی! مجھے کچھ ایسا لگتا ہے یہ زبیر خان یا چودھری ممتاز کی کوئی نئی چال ہے۔ ریحان کو رہا کرنے کی صورت میں انہوں نے ایک ترپ کا پتا پھینکنے کی کوشش کی ہو گی۔ تاکہ تمہیں قابو کیا جا سکے۔''

میں آسیہ کی اس بات سے متفق نہ تھا۔ مجھے یہ کچھ اور ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ اس دوران میں آنے والی کسی کال کی ٹون وقفے وقفے سے سنائی دینے لگی' میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے بعد میں تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ ابھی ایک کال آ رہی ہے۔ بہرحال مجھے تمہارے منگیتر کی رہائی کی خبر سن کر خوشی ہوئی۔ یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ میرا سیل دوبارہ گنگنایا۔'' میں نے اپنی بھویں سکیڑ کر اسکرین پر دیکھا۔ نمبر اجنبی تھا۔ یہ وہی مذکورہ نامعلوم نمبر تھا۔ خیال تھا کہ یہ کال زبیر خان کی طرف سے ہو گی۔ میں نے کال آن کر کے دھڑکتے دل سے سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک بھاری اور

کھر کھراتی آواز اُبھری۔

''شہزاد احمد خان؟''

''آپ کون...؟'' میں نے دانستہ اثباتی جواب سے گریز کیا۔

''میں زبیر خان بات کر رہا ہوں۔ شفقت راجا میرا ہی بیٹا تھا۔ تمہیں علم تو ہوگیا ہوگا کہ میں نے ریحان کو چھوڑ دیا ہے؟'' اس کی آواز نارمل تھی۔ مجھے اس پر حیرت بھی تھی۔ تاہم میں نے بھی ہموار لہجے میں کہا۔

''اس عنایت کا میں مشکور ہوں تہ دل سے... آپ کچھ کہنا چاہتے تھے مجھ سے؟'' میں نے آخر میں کہا۔

''ہاں... ہاں۔'' وہ ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''بات اہم تھی۔ مجھ پر اگر بھروسا کر سکتے ہو تو روبرو ملاقات پر بات کرنا زیادہ مناسب ہوتا۔''

''مجھے اس بات کی بھی خوشی ہوگی اور میں خود بھی اس بات کا متمنی تھا کہ آپ سے مل کر آپ کی ساری غلط فہمی دور کر دوں۔'' میں نے کہا۔

''اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔''

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں زبیر صاحب۔'' میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا تو اس کی آواز ابھری۔

''غلط فہمی خود ہی دور ہو چکی ہے۔ جس کا ثبوت ریحان کی رہائی ہے۔''

''مجھے خوشی ہوئی یہ سن کر... مگر زیادہ بہتر ہوتا کہ میں بھی آپ کو اس روز والے افسوسناک واقعے کے بارے میں بتا سکتا بہرحال، پوچھ سکتا ہوں... یہ معاملہ کیا ہے؟'' بالآخر میں نے تھیلے سے بلی نکالنے کی سعی چاہی تو وہ بولا۔

''ہمیں اپنے ذرائع سے یہ حقیقت معلوم ہو چکی ہے کہ ہمارے بیٹے کے قاتل تم نہیں کوئی اور لوگ تھے۔'' اس نے ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ مجھے اس کے لہجے میں کہیں سے بھی کسی چال یا دروغ گوئی بر مصلحت کی بو آتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے سینے میں اٹکی ہوئی تجسس زدہ سانس خارج کی اور بولا۔

''اگر یہ سچ ہے تو مجھے بھی آپ کے تعاون کی ضرورت ہوگی... کیونکہ میں ابھی تک آپ کے لگائے گئے الزام کی وجہ سے پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔''

''ہم اس معاملے میں ہی تم سے ایک اہم ڈیل کرنا چاہتے ہیں مگر ہم تک یہ خبریں پہنچی ہیں کہ چودھری ممتاز کے بیٹے فرخ کا قتل تمہارے ہاتھوں ہوگیا ہے؟'' زبیر خان نے گمبھیر لہجے میں کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چودھری ممتاز ایک اہم شخصیت تھا جبکہ ہمارا میڈیا اتنا فاسٹ ہو چکا تھا کہ ملک کے شمالی کونے میں بھی کوئی معمولی واقعہ ظہور پذیر ہوتا تو وہ جنوبی کونے تک اس کی تشہیر سیکنڈوں میں ہو جاتی، میں نے کہا۔

''وہ قتل میرے ہاتھوں نہیں ہوا۔ میں نے مختصراً کہنا ہی مناسب جانا۔

''مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' زبیر خان بولا۔ ''دراصل ریحان کی رہائی کے معاملے پر ہماری بھی چودھری ممتاز سے کچھ ان بن ہوگئی ہے۔ بہرحال، فون پر ساری تفصیل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔''

زبیر خان کی باتوں کے تناظر میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور اس کی عداوت سے مفاہمت اور تعاون کی طرف پیش قدمی میرے حق اور مفادات میں جا سکتی تھی۔ موقع محل جانتے ہوئے میں نے بھی فوراً کہہ دیا۔

''چودھری ممتاز نے میری دشمنی میں آپ کو استعمال کرنا چاہا تھا۔ میں آپ سے تعاون کے لیے تیار ہوں مگر پولیس...''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' زبیر خان نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنی طرف سے بات ختم کر دیں گے۔ کچھ تم بھی اپنا بندوبست کرو... اور جتنی جلد ممکن ہو سکے مجھ سے بلاخوف بالمشافہ ملاقات کرنے کا موقع نکالو۔'' اس کے بعد دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا۔

اول خیر اور ارشد بہ غور میری طرف تکے جا رہے تھے پھر جب میں نے اول خیر سے یہ بات کہی تو وہ بولا۔ ''او خیر... کاکے! یہ معاملہ تو آپ ہی رپٹ گیا... پر لگتا ہے ایک نئی لمبی کھیڈ شروع ہونے والی ہے۔''

اچانک میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے ابھرا۔ شفقت راجا کے قتل کا کیس ختم کرنے کے لیے زبیر خان نے مجھے بھی یہ اشارہ دیا تھا کہ کچھ میں بھی اس سلسلے میں اپنا بندوبست کرنے کی کوشش کروں... لہٰذا آسیہ اور خانم شاہ کو اس کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے فوراً آسیہ سے رابطہ کر کے اسے ساری بات بتائی۔

اس دوران میں عمارت سے باہر تعینات چوکیدار محافظ نے ہمیں بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دی۔

تھوڑی دیر بعد میری سماعتوں سے باہر کسی گاڑی کے رکنے اور پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں

رنگت نکھرے گی تو اب نکھری ہی رہے گی!

فیئر فیس®

ٹی ٹی کی فیئر فیس گولیوں کی صورت میں کھائی جاتی ہے اور خون کو صاف کر کے جسم کے اندر سے رنگت کو نکھار دیتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے رنگت کھلتے ہوئے گورے پن میں بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی چہرے کے داغ دھبے، آنکھوں کے گرد حلقے، چہرے اور گردن کی جھریاں بھی دور ہو جاتی ہیں۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مردوں کے لئے بہت مشکل ہے کہ ابٹن اور کریمیں ملتے پھریں لیکن فیئر فیس کھانا ان کے لئے بہت آسان ہے۔

www.facebook.com/toptreatments

چھوٹے قد والے دِل چھوٹا نہ کریں!!

گروٹال®

ٹی ٹی کی گروٹال ایک ہومیو پیتھک دوا ہے جو مضر اثرات سے پاک ہے۔ اس میں شامل اجزاء انسانی جسم میں، سوماٹوٹروپن (نشوونما کا ہارمون) کی پیداوار میں اضافہ کرتے ہیں جس سے ہڈیوں اور ڈھانچے کو تقویت ملتی ہے اور ان کے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اس کے استعمال سے ہر وہ شخص جس کی عمر 30 سال سے کم ہے اپنے قد میں ممکنہ اضافہ کر سکتا ہے۔

اگر آپ کی عمر 30 سال سے کم ہے تو
گروٹال آپ کا قد بڑھا سکتی ہے!

HELPLINE ملک بھر کے ہر اچھے میڈیکل سٹور، ہومیو پیتھک سٹور اور دواخانہ پر دستیاب

TT

نہ ملنے کی صورت میں یا مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے 042-35789145 تا 6, 0334-4266255

Email: toptreatments@gmail.com, Website: www.toptreatments.net

ٹکرائیں۔ ہم سنبھل کر بیٹھ گئے۔

بس کچھ ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ ان کے ہمراہ کمیل دادا اور ایک ساتھی بھی تھا دونوں مسلح تھے۔ میں اور اول خیر وغیرہ... یک دم احتراماً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بیگم صاحبہ کو سلام بھی پیش کر دیا۔

ایک ساتھی نے فوراً کرسی اٹھا کر بیگم صاحبہ کے قریب رکھ دی اور نہایت مؤدبانہ انداز میں چند قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ بیگم صاحبہ کرسی پر نہیں بیٹھی تھیں۔ ان کی نگاہیں میرے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ میں بھی انہی کی طرف تکے جا رہا تھا۔ وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح پروقار اور دلکش نظر آ رہی تھیں۔ حالانکہ لباس سادہ سا ہی زیب تن کیا ہوا تھا۔ میک اَپ میں بھی میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے باوجود ان کی شخصیت میں عجیب سی دلکشی اور کشش رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ بلاشبہ اس میں رعب بھی تھا اور دبدبہ بھی۔

''مجھے مختصراً لفظوں میں بتا دو ہوا کیا تھا؟'' انہوں نے گہری نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکتے ہوئے بظاہر بے تاثر سے لہجے میں پوچھا۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔

''ایک بار پھر سوچ لو۔ کوئی بات بھول تو نہیں رہے کیونکہ میں نے اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینے کی کوشش کی ہے۔'' وہ بولیں۔

میں نے مضبوط اور پورے اعتماد سے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! میں نے جو بتایا ہے، اس میں ذرا بھی بھول چوک نہیں ہے۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔''

مگر بیگم صاحبہ نے اول خیر سے بات کرنا تو کجا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا جبکہ میں چاہ رہا تھا کہ وہ اگر خود بہ نفسِ نفیس یہاں آ ہی گئی تھیں تو وہ میرے سامنے اول خیر کا یہ فیصلہ صادر کر دیتیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں نے بیگم صاحبہ سے ریحان اور زبیر خان سے متعلق ہونے والی گفتگو کے بارے میں بھی انہیں فوراً آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ حسبِ توقع انہیں اس بات کا یقین ہی نہ آیا مگر ظاہر ہے اتنی بڑی اور اہم بات میں یونہی منہ سے نہیں نکال سکتا تھا مگر میں نے دیکھا... یہ سن کر بیگم صاحبہ کے چہرے پر یک دم حیران کن خوشی اور قدرے طمانیت چھا گئی اور وہ بولیں۔

''اگر یہ حقیقت ہے تو میں سمجھتی ہوں... یہ بات سو فیصد تمہارے حق میں جائے گی۔ مجھے بھی تمہارے سلسلے میں بعض قانونی پیچیدگیوں کو سلجھانے میں خاصی مدد ملے گی۔''

میں ابھی بیگم صاحبہ سے اول خیر کے سلسلے میں بھی بات چھیڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک ایک آواز پر وہاں موجود، ہم سب بُری طرح ٹھٹک گئے۔

☆☆☆

باہر ایک سے زائد گاڑیوں سخت آوازیں آئی تھیں۔ اسی اثنا میں ایک ساتھی نے بھی اندر آ کر بتایا کہ باہر پولیس آئی ہے۔

یکلخت جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ میرا اور اول خیر کا چہرہ تو جیسے دھواں دھواں ہو گیا۔ کمیل دادا کے چہرے پر بھی تشویش ابھر آئی تھی جبکہ فقط بیگم صاحبہ کا چہرہ محض ہلکے تفکر کی غمازی کر رہا تھا۔

معاً باہر میگافون پر ایک سخت... آواز ابھری۔ ''پولیس نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ خبردار! مقابلے کی صورت میں سب کو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ اس لیے حکم دیا جاتا ہے جتنے افراد بھی اندر موجود ہیں، ہاتھ کھڑے کر کے باہر آ جائیں، صرف پندرہ سیکنڈ دیے جاتے ہیں۔'' اس کے ساتھ ہی میگافون میں ہی گنتی گننے کا عمل شروع ہو گیا۔

میرا پورا وجود جل اٹھا۔ کنپٹیاں چٹخ گئیں۔ اعصاب یک دم تن گئے۔ خون کی گردش بڑھتے ہی جیسے رگیں پھٹنے لگیں۔ وہاں موجود تقریباً سب کو ہی پل کے پل یہ عام سا اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی ہو گی کہ پولیس یقیناً بیگم صاحبہ کا خفیہ تعاقب کرتے ہوئے ہی یہاں تک پہنچی تھی۔

''فکر کی ضرورت نہیں... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں جا کر بات کرتی ہوں۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پولیس کا پورا اسکواڈ موجود تھا مگر جس نے میرے وجود تک کو چٹخا کر رکھ دیا تھا وہ پولیس کی معیت میں کھڑا انسپکٹر روشن خان تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں کسی طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور بولا۔

''بیگم صاحبہ! باہر انسپکٹر روشن خان کھڑا ہے۔ مجھے اس سے کسی خیر کی توقع نہیں۔'' بیگم صاحبہ نے میری بات کا کوئی نوٹس نہ لیا مگر اول خیر فقط وہ شخص تھا جو میری یہ بات سمجھ سکتا تھا... وہ بولا۔

''یہ تشویش کی بات ہے۔ سب جانتے ہیں انسپکٹر روشن خان درپردہ کس کو تحفظ دینے کے لیے کام کرتا ہے،

اس سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔"

کسی نے بھی اس کی بات پر کان نہ دھرا۔ بیگم صاحبہ نے اول خیر کو بدستور نظر انداز کرتے ہوئے قریب کھڑے کبیل دادا سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو... پہلے میں بات کرتی ہوں باہر جا کر پولیس سے۔" کبیل دادا نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

بیگم صاحبہ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ "فکر کی ضرورت نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنی گرفتاری دے دو... میرا وعدہ ہے میں تمہیں بہت جلد چھڑا لوں گی۔"

"ہرگز نہیں بیگم صاحبہ۔" مجھ سے پہلے اول خیر نے میرے قریب آتے ہوئے یک دم اٹل آواز میں بیگم صاحبہ سے کہا اور وہ اسے تیز اور منتقمانہ نگاہوں سے گھورنے لگیں۔ وہ اول خیر سے بات کرنا گوارا نہیں کر رہی تھیں اور بیگم صاحبہ کا اول خیر سے یہ سرد اور نفرت آمیز رویہ مجھے بری طرح کھل رہا تھا مگر اول خیر بھی شاید میری طرح اس نازک موقع کی متوقع سنگینی کا احساس کر چکا تھا۔ بیگم صاحبہ نے دوبارہ مجھے ہی مخاطب کر کے کہا۔

"شہزی! تمہارا اس طرح پولیس سے بھاگتے رہنا تمہیں قانون کی نظروں میں مزید مجرم بناتا رہے گا۔ میں سب سنبھال لوں گی، تم اپنی گرفتاری دے دو۔"

اس بار میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ "مگر بیگم صاحبہ! بات صرف پولیس کی نہیں ہے۔ انسپکٹر روشن خان کی ہے جو درونِ خانہ چودھری ممتاز کے لیے کام کرتا ہے پھر میرا ڈیتھ وارنٹ نکلا ہوا ہے، وہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں کا نشانہ بنا ڈالے گا۔"

اول خیر نے بھی تقریباً چیخنے کے انداز میں یہی کہا تھا۔ "شہزی! اس خطرناک صورتِ حال میں ہرگز اپنی گرفتاری مت دینا۔" پھر وہ بیگم صاحبہ سے ملتجیانہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا۔ "بیگم صاحبہ! خدا کے لیے شہزی کو دانستہ موت کی اندھی کھائی کی نذر نہ کریں... میں اسے یہاں سے بخیر و خوبی نکال کر لے جاؤں گا۔"

اس پر کبیل دادا نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اول خیر سے کہا۔ "باہر پولیس کھڑی ہے، ہم مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تمہاری یہ حرکت ہم سمیت بیگم صاحبہ کو بھی خطرے سے دوچار کر سکتی ہے۔"

"پولیس کو یہ معلوم ہی کب ہے کہ اندر شہزی موجود ہے۔ وہ صرف تمہارا تعاقب کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہو گی۔ اس عمارت میں ایک خفیہ تہ خانے سے نکلنے والا راستہ موجود ہے۔ میں شہزی کو اسی راستے سے نکالنے کی کوشش کروں گا مگر خدا کے لیے شہزی کو انسپکٹر روشن خان جیسے قبیح اور بدطینت آدمی کے حوالے نہ کرو۔" اول خیر نے کہا۔

اس دوران میں گنتی ختم ہو چکی تھی۔ باہر میگا فون سے دوبارہ آواز ابھری۔ "گنتی ختم ہو چکی۔ آخری موقع دیتے ہیں جتنے افراد اندر موجود ہیں، باہر آ جائیں ورنہ پولیس اندر دھاوا بول دے گی۔ قانون سے ٹکرانے کا مطلب صرف موت ہو گا۔" یہ پولیس کی طرف سے واضح دھمکی تھی۔ بالآخر بیگم صاحبہ کو اول خیر کی بات سے ہی متفق ہونا پڑا۔ وقت بھی نہ رہا تھا بحث و مباحثہ کا۔

اول خیر مجھے لیے فوراً ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا جو کسی اندرونی گوشے میں کھلتا تھا۔ اب باقی سب لوگ بیگم صاحبہ کی معیت میں عمارت سے باہر نکلنے کی تیاری کرنے لگے۔ اول خیر مجھے لے ایک نسبتاً بڑے کمرے میں آ گیا۔ یہاں صرف ایک روشن دان تھا۔ کھڑکی کوئی نہ تھی۔ روشن دان سے ہی دن کی روشنی اندر آ رہی تھی جو کمرے کے حجم کو مقدور بھر حد تک ہی روشن کیے ہوئے تھی۔ یہاں مجھے دیوار کے ساتھ ساتھ نصب لوہے کی جالیوں والے پنجرے دکھائی دیے۔ یہاں بڑی عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ایسے ہی پنجرے کا دروازہ کھول کر گھٹنوں کے بل ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک کونے پر پہنچ کر اول خیر جلدی جلدی زمین صاف کرنے لگا اور پھر جلد ہی اس کے ہاتھ ایک آہنی زنگ آلود کنڈا لگ گیا۔ جسے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی طاقت صرف کر کے اوپر اٹھا دیا۔ نیچے گھپ تاریکی تھی۔ اس نے اپنی جیب سے سیل نکالا اسے سائیلنٹ پر کیا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے منہ میں دبا لیا۔ مجھے بھی اس نے اشارے سے یہی کرنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ نیچے رینگ گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ زنگ آلود سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں جو زیادہ طویل نہ تھیں۔

اب ہم اس خفیہ تہ خانے کے فرش پر کھڑے تھے یہاں بڑی سخت گھٹن تھی۔ سیل فون کی ٹارچ لائٹ میں، میں نے تہ خانے کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ یہ ایک چھوٹے کمرے کے برابر تھا۔ اول خیر نے سرگوشی میں کہا۔ اس کا لہجہ قدرے الجھا ہوا سا تھا۔

"کاکے! یہاں ایک خفیہ سرنگ بنی ہوئی ہے۔ جو باہر تقریباً نصف کلومیٹر کے بعد ایک اجاڑ ویرانے کی مختصر سی

کھوہ میں نکلتی ہے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ آج تک اسے مجھے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اب پتا نہیں وہ کھوہ جہاں یہ سرنگ نکلتی ہے، وقت کی دھول سے اَٹ کر بند ہو چکی ہے یا نہیں، یہ مجھے نہیں پتا... قسمت آزمائی کی جائے یا ادھر ہی چھپ کر پولیس کے ٹلنے کا انتظار کیا جائے؟''

اس کی بات پر میں خود الجھ سا گیا۔ ویسے میں اس کی بات کا مطلب سمجھ چکا تھا مگر مجھ سے بھی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اسے کیا جواب دوں۔ بہرحال میں نے کچھ سوچ کر اول خیر سے کہا۔

''یار! میرا تو خیال ہے یہ تہ خانہ... عارضی طور پر محفوظ پناہ گاہ ہے۔ نہ جانے اس طویل سرنگ کا اختتام کسی بند قبر پر نہ ہو ہمیں ادھر ہی رکے رہنا چاہیے۔ لیکن گاہے بہ گاہے اوپر جا کر حالات کا جائزہ بھی لینا پڑے گا۔''

''تیری بات بھی ٹھیک ہے۔'' وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ پولیس سے مذاکرات کر رہی ہوں گی۔ ممکن ہے اب تک پولیس کو ہماری یہاں موجودگی کے شبہے کی بنا پر تلاشی بھی لینی پڑ جائے۔ تم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو معاملہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔''

میں نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ ''ویسے یار! تم نے بروقت ٹھیک فیصلہ کیا تھا۔ حیرت ہے یہ خدشہ بیگم صاحبہ کے ذہن میں کیوں نہیں آیا۔ وہ تو مجھے انسپکٹر روشن کے حوالے کرنے پر تیار بھی ہو گئی تھیں۔''

''کاکے! شاید بیگم صاحبہ کو حالات کا پوری طرح اندازہ نہیں ہے لیکن شکر ہے کہ انہیں میری بات پر اعتراض نہ ہوا، میرے مشورے پر عمل پیرا ہونے کی اجازت دیتے ہی بنی تھی انہیں۔''

آپس میں حالات پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''کافی دیر ہو چکی ہے ہمیں دیکھنا چاہیے۔ پولیس ہے یا جا چکی ہے۔''

''ہاں! تو ادھر ہی ٹھہر میں اوپر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' وہ آگے سرکا۔

''میں بھی ساتھ چلوں گا۔'' وہ کچھ نہ بولا۔

ہم دونوں ابھی آہنی سیڑھیوں کی جانب بڑھے ہی تھے کہ دفعتاً ہمیں اپنے سروں کے اوپر دھمک سی سنائی دی۔ ہم جہاں کے تہاں رہ گئے اور سیل کی ٹارچ لائٹ یک دم بجھا دیں۔

''شاید اوپر پولیس سرچنگ کر رہی ہے۔'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پھر ایک ممکنہ خدشے کے پیشِ نظر دھیمی آواز میں بولا۔

''تہ خانے کا ڈھکن نما دروازہ پولیس کی نظروں میں آ سکتا ہے۔ کیا خیال ہے ہمیں سرنگ کے اندر سرک جانا چاہیے۔''

''شا... س... س... میں یہی آواز سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔ میں چپ ہو رہا۔ تہ خانے میں گھور تاریکی تھی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ میں یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ پولیس اس خفیہ تہ خانے کا سراغ نہ لگا سکے۔ ورنہ ہمیں تہ خانے کی اندھی قبر نما سرنگ میں داخل ہونا پڑ جاتا۔ تھوڑی دیر گزری۔ اوپر دھمک کی آواز دم توڑ گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر ابھی خطرہ نہیں ٹلا تھا۔ ہم مزید کچھ منٹوں تک اسی طرح تہ خانے کی کالی بھٹ تاریکی میں دم بہ خود سے کھڑے رہے۔ اس کے بعد اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تو ادھر رک' میں اوپر جا کر دیکھتا ہوں۔ پھر تجھے اشارہ کرتا ہوں لیکن ابھی لائٹ آن مت کرنا۔'' میں نے سرگوشی میں اثباتی جواب دیا۔ وہ آگے بڑھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت... پولیس گئی؟'' اول خیر نے پوچھا۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جم سی گئیں۔ وہ خاصا بدحواس سا نظر آ رہا تھا۔

''پولیس نے عمارت کو سیل کر دیا ہے اور ایک موبائل اور چند پولیس والے باہر موجود ہیں۔ باقی سب جا چکے ہیں۔'' اس کی بات پر ہم تشویش زدہ سے ہو گئے۔ اول خیر نے پوچھا۔

''بیگم صاحبہ اور دوسرے لوگ جا چکے ہیں؟''

''انسپکٹر روشن خان... بیگم صاحبہ اور بڑے استاد سمیت سارے ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لے جا چکا ہے۔''

''چل کاکے! ادھر ہی چلتے ہیں جدھر سے آئے تھے، یہاں کھڑے رہنا مناسب نہیں... کوئی پولیس والا ادھر آ سکتا ہے۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے، بولا۔ ''اول خیر میں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہتا۔ ہمیں کسی طرح بھی یہاں سے نکلنا ہو گا۔'' وہ میری بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس

91

آخری معرکہ 550/-

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-

اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 500/-

انگریز کی اسلام دشمنی، ہندو کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 300/-

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنالی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں ہندوؤں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حج

آخری چٹان 450/-

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-

بحر اوقیانوس کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-

اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر

اردو لغت

جامع ترین

ملفوظ طریقے سے تلفظ کی ادائیگی کے ساتھ اردو زبان کی جامع لغت

جہانگیر بک ڈپو

042-35757086 022-2780128

021-32765086 051-5539609 042-37220879

''کا کے! تیری بات سے تو میں بھی متفق ہوں مگر...'' وہ کہتے کہتے رکا پھر بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں پہلے باہر کا جائزہ لینے ہوگا۔ پولیس کی پوزیشن کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ آؤ ذرا۔'' کہتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

''ہمیں چھت پر جا کر دیکھنا ہوگا۔ باقی تین پولیس والے کس طرف سے پوزیشن سنبھالے ہوئے ہیں۔'' اول خیر خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ پھر ہم زینے عبور کرتے ہوئے چھت پر آگئے اور فوراً سینے کے بل لیٹ گئے اور پھر ہم دونوں ہی دو مخالف سمتوں کی طرف سینوں اور کہنیوں کے بل رینگ گئے۔ میں نے چھت کی دو فٹ اونچی منڈیر سے بڑی احتیاط کے ساتھ نیچے جھانکا اور چونک پڑا۔ دو پولیس والے یہاں بھی موجود تھے۔ میں واپس سرک گیا۔ اول خیر نے بھی رینگ کر بتایا کہ تین پولیس والے اس جانب مٹرگشت کر رہے ہیں۔ ہم دونوں نیچے آگئے۔ تہ خانے والے کمرے میں آ کر رکے۔ ہم نے اندر سے کسی بھی کمرے کو کنڈی نہیں لگائی تھی۔ ممکن تھا کہ پولیس والا اندر داخل ہو سکتا تھا اگر وہ اندر سے دروازہ بند محسوس کرتا تو ٹھٹک سکتا تھا کہ اندر کوئی موجود ہے۔

ہم دونوں دوبارہ مرغیوں کے پنجرے میں داخل ہوئے اور تہ خانے میں اُتر آئے۔

نجانے کیوں میرا دل بے چینی سی محسوس کر رہا ہے۔ باہر ٹلنے والا طوفان یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ پوری طرح ٹلا نہ ہو۔ گھات لگائے یا چھپا بیٹھا ہو۔ شاید یہ میری غیر معمولی بیدار مغز چھٹی حس تھی کہ مجھے بار بار خطرے کا احساس دلا رہی تھی اور کوئی میرے اندر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ''شہزی! بھاگ جا یہاں سے... بھاگ جا جلدی... یہاں تیری موت کا سامان کیا جا رہا ہے۔''

بے اختیار میں نے سرسراتے لہجے میں اول خیر سے کہا۔ ''یار! اول خیر جانے کیوں میرا دل بہت بے چینی محسوس کر رہا ہے لگتا ہے خطرہ ٹلا نہیں۔ کسی بھیانک عفریت کی طرح چھپا بیٹھا ہے اور موقع ملتے ہی نگلنے کو اٹھ کھڑا ہوگا۔''

''او خیر... کا کے! تیرے اندر لگتا ہے خطرہ بتانے والا کوئی الارم فٹ ہے۔'' اس عالم میں بھی جانے کیوں اسے مذاق سوجھ رہا تھا۔ مگر وہ تھا زندہ دل آدمی۔ میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''اول خیر! جس طرح ... جانوروں اور پرندوں میں وقت سے پہلے خطرہ محسوس کرنے کی حس ہوتی ہے اسی طرح انسانوں کے اندر بھی قدرتی طور پر یہ حس ہوتی ہے جسے چھٹی حس کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی میری بے کلی کا باعث ہو رہی ہے۔''

''او خیر... کا کے! میں تیرے ساتھ ہوں۔ اگر نکلنا چاہتا ہے تو آج رات ہی کوشش کر لیتے ہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں اول خیر! رات نہیں رات سے پہلے۔ شام اُترنے تک... ہمیں ہر صورت میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔'' میرے سرسراتے اور حتمی لب و لہجے نے اس بار اول خیر کو بوگیر بنا دیا۔ بولا۔

''کا کے! تیرا دل کیا محسوس کر رہا ہے؟ کوئی تو وجہ ہوگی کہ تیرا ذہن کوئی انجانا خطرہ محسوس کر رہا ہے؟''

تہ خانے کی خاموشی اور محدود فضا میں ہم دونوں کو اسرار بھری سرگوشیاں ہمیں اپنے گھٹے گھٹے سینوں پر محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے جواباً گہرے لہجے میں کہا۔

''اول خیر! انسپکٹر روشن خان کا یہاں پولیس کے آدمی چھوڑ جانا آخر کیا معنی رکھتا ہے۔ یقیناً اسے یقین کی حد تک شبہ ہوگا ہم پر... کہ میں یہاں موجود ہوں۔ کہیں خفیہ گوشے میں چھپا بیٹھا ہوں۔''

''مگر یار کا کے!'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ میں نے اپنی آواز کی سرسراہٹ جاری رکھی۔ بولا۔ ''روشن خان ایک انتہائی چالاک اور مکار انسان ہے۔ اس نے پہلے چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بیگم صاحبہ وغیرہ کا تعاقب کیا اور یہاں تک آن پہنچا۔ دیکھ اول خیر! ہر جگہ ہر حرکت جوش اور طاقت سے نہیں چلتا... جوش اور طاقت کے پیچھے اگر عقل و خرد کا انجن کارفرما ہو تو کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ ممتاز خان اچھی طرح جانتا ہے کہ بیگم صاحبہ ہی در پردہ میری سپورٹ اور پشت پناہی کر رہی ہیں۔ رات والے واقعے کے بعد سے ہی اس نے بیگم ولا کی نگرانی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ کیونکہ اسے یقین ہوگا کہ میری مدد کے لیے بیگم صاحبہ فوراً حرکت میں آئیں گی اور وہی ہوا۔ وہ جیسے ہی حرکت میں آئیں، چودھری ممتاز نے اپنے راتب خور انسپکٹر روشن خان کو حرکت میں لے آیا۔ اول خیر! بات قانونی چارہ جوئی سے اوپر تک جا چکی ہے۔ اب صرف گولیاں چلیں گی جس کا نشانہ مجھے بنایا جا سکتا ہے۔ دال میں کالا ہے... اول خیر! مجھے یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

میری اسرار بھری گفتگو پر اول خیر دم بہ خود سا رہ گیا۔ میں نے حالات کا اس کے سامنے جو تجزیہ سامنے پیش کیا ہے، اس نے اسے بھی چند... ثانیے کے لیے گومگو بنا

دیا ہے یکایک اس کے چہرے پر یہ تشویش اور اندیشناک وسوسوں کے آثار نمایاں ہو کے جم سے گئے۔ اسی لہجے میں بولا۔

''او خیر... کاکے بات تو تیری بھی پوری سولہ آنے ٹھیک لگتی ہے۔''

''ہاں اول خیر! بات ٹھیک سے بھی آگے یقیناً تک کی ہے۔'' میں نے پُرزور سے لہجے میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا فوراً سے بھی پیشتر...''

''تو اب فکر نہ کر کاکا۔ نکلنا ہے تو بس نکلنا ہے۔'' وہ یک دم جوش میں آگیا۔ ''یہ پنج ست (پانچ سات) پولیس والے ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ رات اور شام کی بات چھوڑ سہ پہر تو ہو ہی چکی ہے۔ ابھی نکلنے کی بات کر... اسلحہ تو ہمارے پاس بھی ہے۔''

''اسلحے کا استعمال ہمیں مزید خطرے میں ڈال دے گا اول خیر۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں ان پولیس والوں کی ناک بچا کے نکلنا ہوگا جیسے انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ ہم یہاں تھے بھی، لیکن ابھی نہیں ذرا شام کا گہرا پن پھیلنے دے۔ اب مجھے ایک مشورہ دے۔'' آخر میں اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ ''کہ... اپنے ان دونوں ساتھیوں کو بتا کر نکلیں یا...''

''انہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔'' اول خیر نے فوراً کہا۔ ''شام ہوتے ہی نکلنے کی کوشش کریں گے، اس سے پہلے کہ بیگم صاحبہ کی کوئی نئی ہدایت آجائے۔'' بیگم صاحبہ کے ذکر پر اچانک میرے ذہن میں وہی چھپی ہوئی کرید بھی جاگ پڑی۔ لہٰذا میں نے بھی برملا پوچھ ہی لیا۔

''یار اول خیر! آخر یہ بیگم صاحبہ کا معاملہ کیا ہے؟ جب سے مجھے یہ پتا چلا ہے کہ وہ چودھری الف خان کی بیٹی اور ممتاز خان کی بڑی بہن ہے... میرے ذہن میں ان سے متعلق عجیب وغریب خیالات پروان چڑھنے لگے ہیں۔ بھلا سگے بہن بھائی کے درمیان ایسی سنگین دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا یار۔''

میری بات پر اول خیر کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ پھر پہلو تہی اور تردد سے کام لینے والا ہے۔ فوراً آگے بولا۔ ''اول خیر! تو نے پہلے بھی مجھے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ تو بعد میں کسی اچھے وقت میں مجھے بیگم صاحبہ سے متعلق ساری تفصیل بتائے گا۔ اور یاد ہے تجھے... تو نے مجھے کھلاں والی... میں واضح طور پر یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ آخر بیگم صاحبہ کو مجھ سے ایسی کیا دلچسپی ہے کہ وہ میری ضد اور غلطیوں کو معاف بھی کر دیتی ہے اور مجھے ایک اچھے دوست کا درجہ دیتی ہے۔ میرے سلسلے میں اس کا سخت گیر اور حاکمانہ رویہ یک دم کیوں ایک نامعلوم سی ملائمت میں بدلنے لگتا ہے... رہی بات کمیل دادا کے مجھ سے خار کھانے کی' اس سے متعلق چھتے نے مجھے اشاروں کنایوں میں آگاہ تو کیا تھا مگر وہ بھی قیاس آرائیوں پر مبنی تھا مگر میں سچ اور حقیقت آج تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ بتا یار! آخر یہ بیگم صاحبہ کیا چیز ہیں؟ اور میں ان کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ دیکھ اول خیر! ایک سوال پہلے ہی کسی دو دھاری خنجر کی طرح میرے سینے میں پیوست رہتا ہے جسے میں نکال کر نہیں پھینک سکتا۔ اس کے زخم میں میرا خون اندر ہی اندر رستا ہے... پتا ہے... وہ خنجر جیسا سوال کیا ہے؟ وہ ہے میرا باپ... میں اسے تلاش کرنا چاہتا ہوں اس سے فقط اتنا سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ... اس نے مجھے خود سے کیوں دور کیا تھا؟ وہ اپنی اولاد کو... جو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی راحت ہوتی ہے۔ جب وہ مجھے بچپن میں اطفال گھر چھوڑ کے گیا تھا ناں تو وہ بھی روتا تھا... مجھ سے جدائی کا دکھ اور اپنی سنگ دلی کا احساس سے بھی ہوتا تھا مگر میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری محبت کرنے والی حقیقی ماں کے بعد وہ جسے بیاہ کر گھر لایا تھا کیا ایسا اس نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا؟ اور اب میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس عورت نے میرے باپ سے اتنا کٹھن اور جاں گسل قدم اٹھوانے کے بعد میرے باپ کو اس نے کیا دیا ہے؟''

کہتے کہتے میری آواز رُندھ گئی۔ جذبات کے سوتے آنکھوں سے بہہ نکلے... باپ جب بھی یاد آتا۔ پتا نہیں اس کی محبت میں میرے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ یا پھر اس کی سنگ دلی پر... مجھے پتا نہ چلتا۔ اول خیر نے بے اختیار مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور بھرپور لہجے میں بولا۔

''او خیر... کاکے! تیرے دکھ کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ پوچھے تو بتاؤں جب میرا باپ مرا تھا ناں... میں بہت رویا تھا۔ حالانکہ باپ کو مجھ سے بس واجبی سی محبت تھی مگر میں اپنے باپ سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا یار کاکے! یہ باپ بیٹے کے درمیان بھی ایک عجیب ہی رشتہ ہوتا ہے حالانکہ بیٹے کو ماں سے زیادہ پیار ملتا ہے مگر پتا نہیں کیوں یہ سالا بیٹا! اپنے باپ کو ہی کیوں زیادہ محسوس کرتا ہے۔ پتا نہیں بیٹا اپنے باپ کو کیا سمجھنے لگتا ہے۔ باپ کی واجبی محبت بھی بہت لگتی ہے مگر یار کاکے یہ بھی حقیقت ہی ہے باپ بھی

اپنے بیٹے سے کم محبت نہیں کرتا۔ پر پتا نہیں کیوں وہ اپنی محبت کو چھپاتا ہے مگر شفقت ظاہر کرتا ہے مجھے یاد ہے ایک بار میں بہت بیمار پڑ گیا تھا۔ میرے باپ کو غش آ گیا تھا، ماں نے ہی مجھے سنبھالا تھا۔''

ہم دونوں اپنے پھپھولے پھوڑ چکے تو اول خیر نے اپنے لہجے کی رقت پر قابو پاتے ہوئے بیگم صاحبہ والے موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''یار اب سچی بات تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کے سلسلے میں، میں نے تجھے جو اشارہ دیا ہے وہ محض میری قیاس آرائی تھی، علم مجھے بھی نہیں ہے اس بات کا کہ بیگم صاحبہ اپنے دل میں تیرے لیے کس قسم کا پراسرار نرم گوشہ رکھتی ہے رہی بات یہ کہ وہ کون ہے... کیا ہے؟ اپنے باپ اور بھائی سے اس کی دشمنی کی وجہ کیا ہے، یہ میرا وعدہ ہے میں تجھے ضرور بتاؤں گا۔ یہ بہت لمبی اور دردناک کہانی ہے۔ وعدہ وہ رہا یہاں سے نکلتے ہی میرا دوسرا کام اس داستان سے تجھے پوری طرح آگاہ کرنا ہوگا ابھی ہمیں یہاں سے نکلنے کے منصوبے پر غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔''

میں نے پھر گہرے اور پُرخیال لہجے میں اول خیر سے کہا۔ ''یار اول خیر! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے بیگم صاحبہ کے ماضی کی دردناک داستان سننے کے بعد یہ گتھی بھی آپ ہی سلجھ جائے گی کہ وہ میرے لیے اس قدر نرم گوشہ کیوں رکھتی ہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر بھی ڈر سا جاتا ہوں کہ کہیں... کہیں... کسی نہ کسی واسطے سے... میرا ابھی تو بیگم صاحبہ کے دردناک ماضی سے تعلق تو نہیں؟''

''اوخیر... کاکے!'' اول خیر یک دم بولا۔ اس کے لہجے میں تشویش مترشح تھی۔ ''رب سے خیر مانگ... ایسا سوچ بھی نہیں چل چھوڑ اب اس خشک موضوع کو... پھر کبھی سہی... یہ بتا ادھر سے نکلنے کا تیرے دل میں کیا منصوبہ آتا ہے؟''

میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کر کے خود کو اپنے شکستہ و ریختہ پڑتے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش چاہی... پھر بولا۔ ''آؤ پہلے اس قبر نما تہ خانے سے تو باہر نکلو... کمرے کی کھڑکی سے ذرا باہر جھانک کر آسمان کا نظارہ کریں کہ سہ پہر کی کس کروٹ کے پیچھے شام چھپی ہوئی ہے۔''

''اوخیر کاکے! تیرا مزاج بڑا شاعرانہ ہو گیا ہے۔'' وہ ہنسا ہم دونوں تہ خانے سے باہر کمرے میں آ گئے۔

اچانک ایک آواز پر ہماری سماعتیں ٹھٹک گئیں۔ ہم فوراً کھڑکی کی طرف لپکے۔ اور دوسرے ہی لمحے ہمیں ایک عجیب سی حیرت کا زبردست جھٹکا لگا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ عمارت کی نگرانی پر مامور... وہ پانچ سات پولیس والے اپنی موبائل گاڑی میں سوار ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔

''خیر... کاکے! اے کی کھیڈ ہے؟'' (یہ کیا چکر ہے)۔

کھڑکی کے ساتھ میری طرح چپکے ہوئے اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں بہ غور پولیس موبائل کو کچے راستے پر غائب ہوتے دیکھ... رہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر تھا۔ یہ پولیس والے کیوں واپس لوٹ رہے تھے۔ کیا انسپکٹر روشن خان کی طرف سے انہیں فقط اتنی ہی ہدایات ملی تھیں کہ وہ اس وقت واپس لوٹ جائیں... گویا میرے سارے بدترین خدشات و شبہات محض میرا واہمہ تھے... میرا ذہن بدستور سوچ میں گم رہا کہ ایسے میں دفعتاً ہی مجھے اول خیر کی خود کلامیہ اور سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''اوخیر... کاکے... وہ دیکھ...'' اس نے کھڑکی سے دوسری سمت کی طرف اشارہ کرنے کے انداز میں کہا۔ میں نے چونک کر غیر معمولی طور پر پہلے اول خیر کے چہرے کی طرف دیکھا جو دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی نظروں کی سیدھ میں دیکھا اور سرتاپا جیسے میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ پکی سڑک سے عمارت کی طرف آتے ہوئے کچے پکے راستے پر تین عدد بھاری گاڑیاں انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ آگے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ایک لینڈ کروزر تھی دو بھاری جیپیں تھیں میں اور اول خیر سکتے کی کیفیات سے دوچار تھے۔ کچھ قریب آنے پر مجھے گاڑیوں کے اندر اندر چہروں پہ موت کی خونخواری لیے آدمیوں سمیت ان کی گنوں کی جھلک بھی صاف دکھائی دینے لگی تھی۔

عمارت کے سائیں سائیں کرتے ماحول میں چیختے ہوئے آسیبی سناٹے میرے بدترین اور اندیشناک خدشات کی تصدیق کر رہے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

قسط: 6

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں

ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار لیں تو دل و دماغ ہی نہیں جسم بھی ماؤف ہونے لگتا ہے۔ میں اور اول خیر کم و بیش انہی کیفیات سے دوچار تھے مگر یہ سب چند ثانیے کے لیے ہی ہوا تھا اور پھر یکلخت میرے خالی ہاتھ میں میگارو تھرکنے لگا۔ ایسے میں اول خیر کی سرسراتی آواز ابھری۔

''نہیں کاکے...! مقابلہ نہیں... فرار... آؤ جلدی...'' یہ کہہ کر وہ پلٹا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ میرا خیال تھا، وہ تہ خانے کا رخ کرے گا اور وہاں بنی خفیہ سرنگ کے ذریعے نکلنے کی کوشش کرے گا مگر مجھے اس کی تنبیہ بھی یاد تھی کہ خفیہ سرنگ ہماری زندہ قبر بھی بن سکتی ہے کیونکہ تقریباً ایک کلومیٹر لمبی اس سرنگ کا اختتام جس کچی کھوہ میں ہوتا تھا' کیا خبر وہاں گزرتے وقت نے مٹی جھاڑ کر اسے بند کر دیا ہو۔ میری طرح وقت سے پہلے اسے بھی کچھ باتوں کا اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ خفیہ تہ خانہ... مخفی نہ رہا ہوگا۔

اول خیر نے چھت کا رخ کیا تو میں نے سکون کی سانس لی۔ ہم ناپختہ زینے طے کرتے ہوئے کھلی چھت پر آ گئے۔ تاہم میں ابھی تک اس کی حکمت عملی سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ آخر کس راستے سے فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے؟ یہ عمارت اس کی دیکھی بھالی تھی، اس لیے میں سردست اسے کوئی مشورہ دینے سے قاصر تھا۔ چھت پر بھی کاٹھ کباڑ اور ٹوٹے ہوئے آہنی تاروں اور جالیوں کے پنجرے بکھرے ہوئے تھے، ان میں فیڈ کی ادھ کھلی بوریاں بھی تھیں اور دیگر الم غلم بھی تھا۔

معاً گاڑیوں کی آوازیں قریب آ گئیں۔ جب تک مسلح دشمن عمارت میں داخل ہوتے یا اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے، عمارت کی عقبی سمت کی پانچ فٹ اونچی منڈیر سے اول خیر نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ میں نے بھی جست بھری۔ جہاں میں اول خیر کے بعد کودا تھا، وہ کبھی کسی برآمدے کی نیچی چھت تھی۔

اسی وقت میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں سے خوفناک برسٹ کا آتشیں قہقہہ ٹکرایا اور ساتھ ہی کریہہ چیخیں بھی سنائی دیں۔

''گئے وہ دونوں۔'' اول خیر نے ہانپتی آواز میں ان دونوں بدنصیب ساتھیوں کے انجام سے آگاہ کیا جو دشمنوں کی سنگ دلانہ بربریت کا شکار ہو چکے تھے۔

اول خیر نے نیچے جھانکا۔ بلندی بارہ تیرہ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ سامنے مختصر میدان اور پھر خودرو جھاڑیوں کے اختتامی سلسلے کے بعد کیکر کا جنگل سا نظر آتا تھا۔ وہ ابھی نیچے اترنے یا چھلانگ لگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں اول خیر! اس طرح ہم دشمنوں کے لیے نرم چارا ثابت ہو سکتے ہیں۔ اب مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔''

ابھی میرے منہ سے فقط اتنے ہی الفاظ برآمد ہوئے تھے کہ ایک آواز پر ہم ٹھٹکے۔ ایک چوڑے ٹائروں والی بغیر ہڈ کی جیپ گولی کی رفتار سے عمارت کی شمالی دیوار کی آڑ سے نمودار ہوئی۔ شام کے ملگجے جھٹ پٹے میں مسلح جیپ سواروں کو شاید ہمارے ہیولے دکھائی دے گئے تھے کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے جیپ سے شعلے برستے دیکھے مگر اس سے پہلے ہی ہم غیر ارادی طور پر برآمدے کی طرف سے نکلی ہوئی اس مختصر عمارت کی ''چھتی'' پر لیٹ چکے تھے، چھتی کی صرف ایک یا ڈیڑھ فٹ کی اونچی منڈیر پر گولیوں کی خوفناک بوچھاڑ نے دیوار ادھیڑ دی اور ان گنت سنگ ریزے چیخ کر برچھیوں کی طرح ہمارے چہروں سے ٹکرائے۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

اول خیر چھتی کے فرش پر سینے کے بل لیٹے لیٹے رینگ کر پلٹا اور ایک بڑے سے چوکور روشن دان کے قریب پہنچ کر ہاتھ کے ایک ہی دھکے سے اس کا چوبی تختہ توڑا اور پھر اندر غائب ہو گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور پہلے اپنی دونوں ٹانگیں اندر داخل کر کے روشن دان کے خالی چوکھٹے کو پکڑ کر نیچے کود گیا۔

ایک بار پھر ہم دونوں عمارت کے اندر تھے اور کچھ پتا نہیں تھا کہ آنے والے سنگین لمحات میں یہ عمارت ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہونے والی تھی یا پھر مقبرہ...

''کاکا! دشمن پندرہ سے بیس کی تعداد میں ہو سکتے ہیں۔'' اول خیر نے کہا

''اول خیر! ہمارے حوصلوں کے آگے ان کی تعداد کچھ نہیں... ان سب کو پولیس کی طرف سے گرین سگنل اور سرپرستی حاصل ہو چکی ہے... اب مرنا ہے یا مارنا ہے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔

''او خیر... پھر کیا پروا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص جی دارانہ لہجے میں بولا۔ دفعتاً ہمیں کمرے کے بغلی دروازے کی سمت دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ دشمن اس کمرے کی تلاش میں لپکے آ رہے تھے۔ اول خیر نے اپنا پستول ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور میگارو میرے ہاتھ میں تھا۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس فقط یہی دو ہتھیار تھے، اور کچھ

فاضل راؤنڈ قمیص کے نیچے بندھی بیلٹ میں چسپاں تھے۔ ایک دھماکے سے دروازہ کھلا مگر تب تک ہم دونوں دائیں بائیں ہوکے کاٹھ کباڑ کی آڑ میں ہو چکے تھے۔ میری آتش اگلتی نظروں نے دروازے پر چار مسلح دشمنوں کو دیکھا جو طاقت کے زعم میں درانہ وار اندر داخل ہو چکے تھے اور دوسرے ہی لمحے ان پر بیک وقت دوسمتوں سے شعلے برساتی گولیاں لپکیں۔ دھماکوں سے کمرے کی محدود فضا تھرا گئی۔ چار میں سے دوتو تیورا کر گرے، باقی دو میں سے ایک زخمی ہوکے دفاع میں پلٹا جبکہ چوتھے کو شاید اپنے تینوں بدنصیب ساتھیوں کی ڈھال میسر آ گئی تھی اور وہ دھماکوں کی آواز ابھرتے ہی کسی جنگلی بلی کی طرح لپک کر چوکھٹ کی آڑ میں ہوگیا۔ میں سب سے پہلے دشمنوں کے جدید ہتھیاروں پر [illegible] کرنا چاہتا تھا مگر بچ جانے والے ایک ساتھی نے میری اس سلسلے میں پیش قدمی کو روک دیا۔ زخمی ہو کر پلٹنے والے تیسرے دشمن کو... اول خیر کے پستول کی گولی نے چاٹ لیا، گولی اس کی کمر پر لگی... اور اذیت ناک چیخ بہت واضح سنائی دی۔

میرے اور اول خیر کے درمیان کمرے کے سائز برابر ہی فاصلہ تھا البتہ ہم دونوں کا رخ آمنے سامنے تھا۔ میں نے اپنے ایک ہاتھ کے مخصوص اشارے سے اول خیر کو... دروازے کی چوکھٹ کے پیچھے چھپے دشمن پر نظر رکھنے کو کہا اور خود پھرتی مگر محتاط روی سے دشمنوں کی دو لاشوں کی طرف بڑھنے لگا۔ میرا فاصلہ صرف چند فٹ رہ گیا تھا کہ دفعتاً اول خیر نے... بڑی عجیب اور جی دارانہ حرکت کر ڈالی۔ وہ کمرے کے دروازے کے رخ کے دائیں جانب گرا پھر لڑھکنیاں کھاتے ہوئے جیسے ہی اپنے گرنے کی جگہ تبدیل کی اس طرف چوتھے دشمن نے برسٹ مارا۔ کمرے کا فرش اس جگہ سے ادھڑ کر رہ گیا۔ میں اول خیر کی مستعد مگر خطرناک چالاکی پر بے اختیار دل ہی دل میں مسکرا اٹھا کیونکہ اگلے ہی لمحے فائر کرنے کے جوش میں آنے والے اس دشمن کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی تھی۔ وہ اول خیر کی چالاکی اور گولی، دونوں کی زد میں آگیا تھا۔

وقت کی خطرناک نزاکت اور پیش قدمی کی اہم ضرورت کو شاید میری طرح اول خیر نے بھی محسوس کرلیا تھا یہی سبب تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ میدان ''صاف'' ہوتے ہی میں ایک ہی جست میں دشمنوں کی لاش کے قریب پہنچا اور اسلحے کے نام پر جو بھی کچھ ملا، وہ اپنے قبضے میں کرلیا۔

''کاکے...! باہر نکل... اس طرف سے۔'' اے کے سینتالیس اسالٹ رائفل ہاتھ میں آتے ہی نہ صرف میرا بلکہ اس کا جوش اور حوصلہ بھی سوا ہوگیا۔

ابھی ہم نے کمرے کا دروازہ عبور کیا ہی تھا کہ درمیانے سائز کے ہال کمرے ، ایک کھلی کھڑکی سے ہم پر اندھے برسٹ نے آتشیں قہقہہ اگلا۔ زد پر اول خیر تھا مگر اس کی بیدار مغزی اور مستعدی نے شاید پہلے ہی خطرے کی بو پالی تھی، اس نے پہلے ہی پھرتی سے وہ جگہ چھوڑ دی تھی مگر بہرحال وہ جوابی فائرنگ کی پوزیشن میں نہ تھا اور جب تک اس پوزیشن پر آتا، اس پر دوسرا برسٹ بھی فائر کر دیا جاتا جبکہ مقابلتاً میں اس اندھے برسٹ کی جوابی کارروائی کی پوزیشن میں تھا۔ اے کے اسالٹ سینتالیس میرے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح دبی ہوئی تھی، فوراً اس کا رخ کھڑکی کی طرف کر کے میں نے جوابی برسٹ آتشیں قہقہے کی صورت اگلا۔ اس اثنا میں اول خیر کو سنبھلنے کا موقع ملا اور اس نے مجھے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی دائیں جانب کے کارنر والے ایک دروازے کی طرف سرکا۔ مگر میں نے کھڑکی کی سمت محتاط پیش قدمی کی تو وہاں مجھے تین مسلح افراد دکھائی دے گئے جن میں سے دو کا رخ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس طرف ہونا چاہیے تھا جہاں ہال کمرے کا دوسرا دروازہ یا اس سمت پر ایک دوسرا کمرا تھا کھڑکی کے قریب میری جھلک دیکھتے ہی تیسرے حملہ آور نے ذرا فاصلے سے ہی برسٹ مارا... یہ بھی ایک طرح سے اندھا فائر تھا کیونکہ میں اس کے نشانے پر نہ تھا، تاہم میں اس کی چالاکی بھانپ گیا۔ وہ اپنے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہونے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کی چالاکی سمجھتے ہی میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یک دم کھڑکی کے سامنے آکر اس پر اندھا دھند فائرنگ کردی۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بوکھلا کر ایک طرف دوڑا مگر کھڑکی کے راستے میری برستی.... گولیوں نے اسے جالیا۔ وہ کریہہ چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اندرونی کھڑکی پر آہنی گرلیں نہیں تھیں، میں اچھل کر کھڑکی پار کر گیا اور دوسری طرف کے گوشے کے فرش پر گرتے ہی میں نے ان دونوں مسلح حملہ آوروں کو دیکھا جو بری طرح بدکے ہوئے اس دروازے کے باہر موجود تھے جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ دروازے پر گولیاں برسائی جائیں یا پھر موت اگلتی کھڑکی کی طرف پیش قدمی

کی جائے۔ میں فرش پر لیٹا تھا اور وہ بھونچکا ۔۔صورتوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ میرے جوابی حملے نے ان کی .... عقل خبط کرڈالی تھی۔ وہ جب تک میری جانب متوجہ ہوتے، میں نے اپنی گن کا رخ ان کی جانب کرتے ہی لبلبی دبادی۔ خودکار طاقتور رائفل میرے ہاتھ میں مہیب گرج کے ساتھ تھرتھرائی اور وہ دونوں گولیوں سے چھلنی ہوکر گر پڑے۔ اول خیر نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دروازہ کھولا اور اس طرف آگیا جہاں میں مزید دو دشمن حملہ آوروں کو جہنم واصل کرچکا تھا۔

یہ دو کمرے چھوڑ کر تہ خانے والے کمرے کے رخ پر واقع تھا جس کے داہنی طرف ایک کوریڈور تھا۔ اول خیر نے اس سمت دوڑتے ہوئے مجھے بھی اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ تب تک میں پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوچکا تھا۔ کوریڈور ویران تھا۔ ہم دونوں آگے بڑھتے ہوئے تہ خانے تک آگئے۔ مگر یہ دیکھ کر میں اور اول خیر دونوں ہی حیرت زدہ رہ گئے کہ تہ خانے کا زمین دوز دروازہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ گویا تہ خانہ ان کی نظروں میں پہلے سے آچکا تھا۔

’’اول خیر! بات سمجھ میں نہیں آئی... یہ تہ خانہ...‘‘

’’او... خیر کا کا...‘‘ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ’’تیرے دل میں ابھرنے والا خطرہ غلط نہ تھا۔ جب وہ ابلیس صفت انسپکٹر روشن خان تلاشی لینے یہاں آیا تھا تو اسے شبہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں ایک خفیہ تہ خانہ بھی ہے اور یقیناً ہم دونوں بھی اندر موجود ہوں گے۔‘‘

’’مگر...‘‘ میں نے کہنا چاہا مگر وہ آگے بولتا رہا۔

’’میری بات سنتا جا کا کا! انسپکٹر روشن خان شیطانی دماغ کا آدمی ہے۔ خاص کر مجھے گرفتار کرنا اس کا مقصد نہیں تھا۔ وہ مجھے مردہ دیکھنا چاہتا ہے۔ دشمن کی طرف سے اسے یہی ایک ٹاسک ملا ہوا ہے۔ بیگم صاحبہ کی خود یہاں موجودگی ہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت تھا کہ تو ادھر ہی موجود ہے۔ انسپکٹر مکاری سے دانستہ بیگم صاحبہ کے جھانسے میں آگیا اور اپنی پولیس فورس سمیت بظاہر ناکام لوٹ گیا مگر لوٹتے ہی اس نے ممتاز خان کو فون پر سب بتادیا ہوگا کہ اب وہ خود نمٹ لے۔‘‘

اول خیر کے اس زرخیز تجزیے پر مجھے اس کی ذہانت کا معترف ہونا پڑا۔ یہ حقیقت تھی کہ کچھ اس سے ملتا جلتا تجزیہ میرے بھی دل و دماغ کے نہاں خانے میں لاشعوری طور پر موجود تھا۔ جس کے باعث میں ایک بے نام سی الجھن میں مبتلا ہوگیا مگر میری چھٹی حس تب سے ہی مسلسل خطرے کا الارم بجارہی تھی۔

اول خیر نے چوکس انداز میں ایک دروازے کو ذرا کھولا اور اندر جھانکا۔ پھر مجھے اشارہ کیا۔ یہ اسٹور تھا۔ وہاں نسبتاً کم پاور کا بلب روشن تھا یہاں بڑے بڑے مین سوئچ کے الیکٹرک بورڈ نصب تھے۔ باہر رات اترنے لگی تھی۔ اول خیر نے ایک عقل مندی کا کام یہ کیا کہ سارے مین سوئچ آف کردیے۔ یکلخت پوری عمارت تاریکی میں ڈوب گئی۔

’’کا کا! اب یہ سب اندھے ہوگئے ہیں۔ عمارت کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ آؤ میرے ساتھ۔‘‘ اس نے کہا اور اسٹور روم سے باہر آگیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا کہیں میں بھٹک نہ جاؤں۔ اس نے سیل فون کی ٹارچ بھی آن کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی کیونکہ وہ اس عمارت کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں اور اول خیر اندازے سے تاریک ماحول کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتاً میرے چہرے سے خنک ہوا کا جھونکا ٹکرایا۔ جس کا مطلب تھا ہم عمارت کے کسی بیرونی گوشے کی طرف نکل آئے تھے۔ یہ کسی مختصر صحن کا برآمدہ تھا۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا مگر حیرت کی بات تھی اس جانب کوئی دروازہ دکھائی نہ دیا تھا ہاں ایک تاریک چوکھٹ سے راستہ ضرور تھا۔ اول خیر مجھے لیے اسی سمت بڑھا۔ اندر پھر وہی گھپ تاریکی تھی اور ہوا کا دخل ندارد... اول خیر نے مجھے اندھیرے میں کھڑا کردیا اور ہلنے جلنے سے منع کیا۔ بعد میں معلوم ہوا یہ کوئی گیراج تھا اور یہاں جابجا آہنی انجر پنجر بکھرے ہوئے تھے، صرف اول خیر بغیر روشنی کے تاریکی کو ٹٹولتا ہوا چند قدم آگے بڑھا تھا اس کے بعد میں نے دیکھا جیسے تاریکی کے بطن میں ہلکی روشنی کا چیرا لگا ہو۔ اول خیر نے کوئی دروازہ کھولا اور اس کی جھری بنا کر دوسری جانب دیکھنے لگا پھر وہ نصف حد تک دروازہ وا کیے باہر نکل گیا۔ چند ثانیوں بعد اس نے ہلکی آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں بھی اندازے سے اسی سمت تاریکی میں آگے بڑھا۔ باہر تاروں کی مقدور بھر روشنی میں مجھے اول خیر پُراسرار ہیولے کے مانند کھڑا نظر آیا۔ جانے یہ عمارت کا کون سا بیرونی حصہ تھا جس کی دیوار کے ساتھ ہم دونوں دم بہ خود ہیولوں کی طرح کھڑے تھے۔

اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ پوری عمارت جیسے لرز اٹھی۔ میں خود بری طرح ہل گیا۔ ابھی ہم ایک دھماکے سے سنبھل نہیں پائے تھے کہ دوسرا شدید دھماکا ہوا۔ پھر تیسرا... یہ دھماکا تو ہمیں اس قدر اپنے قریب سنائی دیا تھا

کہ ہمیں یہ دیواریں گرتی محسوس ہوئی تھیں جس کی آڑ لیے ہم کھڑے تھے۔ نیز یہ دھماکا اس گیراج نما کمرے کی چھت پر ہوا تھا جہاں ہم تھوڑی دیر پہلے موجود تھے۔

’’دشمن نے ہینڈ گرینیڈ پھینکنا شروع کر دیئے ہیں۔‘‘ مجھے اول خیر کی سرسراتی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور چلایا۔ ’’بھاگ کاکے۔‘‘ ہم دونوں سامنے کے رخ پر دوڑ پڑے۔ ہمارے عقب میں لرزہ خیز دھماکے ہو رہے تھے۔ کوئی پانچ یا چھ کے قریب دستی بموں کے دھماکے ہوئے تھے، دشمن شاید ہماری مضبوط گھات کے سامنے بے بس ہو گیا تھا۔ اور اس لیے اس نے پوری عمارت کو ہی اڑا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اگر اول خیر بروقت عمارت سے باہر نکلنے کی منصوبہ بندی نہ کرتا تو یقیناً ہم اس جلتی سلگتی عمارت کے تنور میں بھون دیے جاتے۔ عمارت کے جس خفیہ گوشے سے اول خیر مجھے لیے باہر نکلا تھا، یہ دشمنوں کی نظر سے یا تو بچا ہوا تھا یا پھر اس طرف انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی مگر ہمارے عقب میں ذرا فاصلے پر عمارت چشم زدن میں آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی اور اس کی سلگتی ہوئی روشنی میں ہم دونوں ہی نہا گئے تھے اور یہی ہمارے لیے مصیبت بنی، آتش فشاں گولیوں کی پوری باڑ خوفناک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہم پر برسی تھی۔ ہم دونوں نے ہی دوڑتے ہوئے خود کو زمین پر گرا لیا تھا۔ گولیوں کی آتشیں ’’جھپک‘‘ مجھے اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔

’’کاکے! آگے بڑھتا رہ... رکنا مت۔‘‘ مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی۔ میں کہنیوں اور سینے کے بل جتنی تیزی سے آگے بڑھ سکتا تھا، بڑھنے لگا۔ گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ کے دوران مجھے عقب میں کئی تیز چیختی ہوئی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ یقیناً دشمن اس بات سے باخبر ہو گئے تھے کہ ہم دونوں عمارت سے صحیح و سالم باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے حق میں اچھا ثابت نہ ہوا تھا... بہ صورت دیگر... خاموشی سے فرار ہونے کا یہ اچھا موقع ہمارے ہاتھ لگا تھا کیونکہ دشمن یہی سمجھتا رہتا کہ ہم عمارت کے اندر محبوس ہو کر بے بسی سے اپنی موت کے منتظر ہیں مگر اب دوبارہ دشمن ہمارے تعاقب میں لگ چکے تھے۔ ان کی تعداد اب بھی زیادہ تھی، گاڑیاں بھی تھیں ان کے پاس جبکہ میں اور اول خیر عمارت سے باہر بے یار و مددگار تھے۔ زندگی کے تعاقب میں ایک بار پھر موت... کا فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

شمارہ اکتوبر 2014ء کی جھلکیاں

ماہنامہ سرگزشت

گل فارس
تلاش حق میں ملکوں ملکوں پھرنے والے
کا سوانح، نور کی تجلی بھری سرگزشت

لائف
تہلکہ مچا دینے والے جریدے کے عروج و زوال کی سرگزشت

کمسن فتنہ
معصوم سے بچے نے امریکا کے محکمہ خفیہ کو ہلا کر رکھ دیا تھا

آئینہ
ایک ایسی سچ بیانی جو آپ کی آنکھ بھر دے گی

اس کے علاوہ
’’فلمی الف لیلہ‘‘ جو اپنے آپ میں ایک تاریخی
دستاویز ہے ’’سراب‘‘ لہو کو گرم کر دینے والی طویل
کہانی جس کی فسوں گری آپ کو اپنا اسیر بنا لے
گی ’’الوداع‘‘ منفرد انداز کی سفر کہانی

اور
ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات،
انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں

آج ہی نزدیکی [illegible] مختص کرالیں

اس خوں ریز کشاکش کے دوران میں رات پوری طرح اتر چکی تھی۔ اس کی تاریک چادر نے اگرچہ ہمیں ڈھانپ رکھا تھا لیکن بدقسمتی سے ہم پہلے ہی دشمنوں کی نظروں میں آچکے تھے۔ وہ ہم پر مختلف سمتوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے جبکہ میں اور اول خیر خود کو زمین پر گرا چکے تھے۔ ہمیں سامنے کچھ فاصلے پر پھیلے کیکر کے جنگل میں داخل ہونا تھا۔

یکلخت فائرنگ کا سلسلہ تھم گیا اور ہمیں مزید آگے سرکنے کا موقع مل گیا۔ ہمارے عقب سے جیسے روشنی کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ دشمن اپنی گاڑیوں میں ہمارے تعاقب میں آرہے تھے، اول خیر اٹھ کر دوڑ پڑا تو میں نے بھی بے اختیار اس کی تقلید کر ڈالی۔ ہم آگے پیچھے اندھا دھند دوڑنے لگے۔ یہاں بھی میں نے اول خیر کی پیش قدمی کی حرکت کو نوٹ کیا۔ گویا وہ اس جنگل کے گمنام راستوں سے اچھی طرح واقف تھا اور شاید کسی خاص مقام پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنگل میں پھیلی قدِآدم جھاڑیوں اور موٹے تنوں والے پیڑوں نے ہمیں کسی حد تک آڑ فراہم کر رکھی تھی مگر ایسا زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہوسکتا تھا، ہمارا جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا بے حد ضروری تھا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا، جلد ہی ہم ایک مختصر سی کھنڈر نما عمارت کے اندر داخل ہوچکے تھے۔ ہماری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور ایک دوسرے سے بات کرنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''بس کاکے... اب اس سے زیادہ ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔'' اول خیر نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بمشکل کہا۔

''مگر یہ محفوظ مقام نہیں ہے ہمیں پیش قدمی جاری رکھنا ہوگی... یہاں ایک ہی دستی بم کافی ہوگا۔'' میری بات کا جواب اول خیر کے پاس نہ تھا۔ اس کی خاموشی میں شکست خوردگی اور مایوسی جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ اور تب میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا... یہ ایک جوا تھا۔ بے رحم موت ہمارے تعاقب میں تھی بلکہ بہت قریب بھی... گاڑیوں کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور کسی وقت بھی ان ہیڈلائٹس میں یہ عمارت آشکار ہوسکتی تھی۔ اس کے بعد دشمنوں کا مقصد ہرگز ہمیں پکڑنا یا پکڑ کے لے جانا نہیں تھا۔ انہیں تو ہمیں بالخصوص مجھے دیکھتے ہی موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

''اول خیر! ہمیں اس عمارت سے باہر نکلنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''او خیر کاکے!'' وہ بولا تو اس کے لہجے میں مایوسی نہ تھی۔ ایسے حالات میں بھی اس کی جی داری کم نہ ہوئی تھی۔ وہ آگے بولا۔ ''ادھر کچھ دشمنوں کو پھڑکا کر مرنا بہتر ہے۔ تیرا اور میرا زندگی کا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔''

ایسے میں مجھے سرمد بابا کے اطفال گھر میں کہے ہوئے الفاظ یاد آنے لگے۔ ''شہزی بیٹا! انسان سمجھے تو یہ ایک سادہ سا فلسفۂ زندگی ہے کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے زندگی سے کبھی مایوس مت ہونا۔ چاہے موت چند قدموں یا کچھ ساعتوں کے فاصلے پر ہی کیوں نہ کھڑی ہو جو مایوسی جیسے کفر کو جھٹلا کر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آخری حد تک نبرد آزما رہتے ہیں تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کے اٹل احکامات پر پورا بھروسا رکھتے ہیں... پس ایمان کی یہی منزل انسان کو اللہ کی پناہ میں لے آتی ہے۔ پھر چاہے یہ پناہ دنیوی ہو یا اخروی... وہ بندے کا مقدر کہلاتی ہے۔''

''اول خیر! اب جیسا میں کہوں... ویسا ہی کرنا ہے۔'' معاً میرے منہ سے تحکم آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔ میں تاریکی میں اس کے چہرے کا صحیح طرح جائزہ لینے سے تو قاصر ہی تھا مگر مجھے یقین تھا، میرے عجیب لہجے اور سرسراتی آواز پر وہ چونکا ضرور ہوگا۔

بالآخر دشمنوں کی تینوں گاڑیاں عمارت کے قریب آکر یک دم رک گئیں۔ مگر اس طرح کہ ہر گاڑی نے عمارت کا ایک حصہ گھیر رکھا تھا۔ تین مختلف سمتوں سے عمارت کا گھیراؤ ظاہر کرتا تھا کہ انہیں ہماری اندر موجودگی کا پورا یقین تھا جیسا کہ ہمیں بھی اندازہ تھا۔

عمارت کا رقبہ مختصر ہونے کے باعث ان کی تینوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ بھی زیادہ نہ تھا۔ میری تیز نظریں بڑی مشاقی سے ان کی پوزیشن کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گاڑیوں سے ہتھیار بردار دشمن نیچے اتر چکے تھے اور تب میں نے ایک نسبتاً موٹے ٹھگنے شخص کو دیکھا اور ایکا ایکی جیسے میں سر پر منڈلاتے خطرے کو فراموش کر گیا۔ یہ جنگی خان تھا۔ وہی جنگی خان جس نے عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا اور اس وقت میرے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا جب اس کے اڈے پر میں نے اشرف کو اس کی نظروں کے سامنے جہنم واصل کیا تھا۔ اس وقت وہی اپنے ساتھیوں کو ''لیڈ'' کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''دستی بم پھینکو۔'' معاً اس کی غراتی آواز رات کے سناٹے میں گاڑیوں کی گھرر گھرر کرتے شور میں ابھری۔

اس آواز میں نفرت اور جوشِ انتقام کا غضب ناک طوفان جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔

وہ سب گاڑیوں کے عقب میں پوزیشن سنبھالے ہوئے تھے اور پھر تین افراد کی ٹولیوں میں سے ایک ایک فرد نے دستی بم ہاتھ میں لے کر پن نکال کر بولنگ کرنے کے انداز میں بیک وقت تین بم عمارت کی جانب اچھال دیے۔ سماعت شکن دھماکوں سے آس پاس کا ماحول تک لرز اٹھا اور عمارت کے اندر سے شعلے اور دھوئیں کا رقصِ اجل شروع ہو گیا۔ دستی بم پھینکنے کے چند ثانیوں بعد ہی جنگی خان کی گرجتی آواز ابھری جو مجھے للکار سے مشابہ لگی۔

''آگے بڑھو۔۔۔ اور ان دونوں کو بھون کر رکھ دو۔''

اس حکم کی فوراً تعمیل کے لیے کل چھ مسلح دشمن بیک وقت عمارت کی طرف لپکے۔

دشمن کے سر پر پہنچنے سے صرف چند لمحات قبل عین آخری وقت پر میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا تھا۔ ویران جنگل میں اس عمارت کو دیکھتے ہی دشمن کا لامحالہ یہ سمجھنا کہ ہم نے پناہ کے لیے یقیناً ادھر کا ہی رخ کیا ہوگا۔ اور یوں ان کی ساری توجہ کا اس کھنڈر نما عمارت کی طرف مبذول ہونا یقینی امر تھا اور کوئی خیال یا شبہ سرِدست ان کے دل و دماغ سے کوسوں دور رہتا۔ لہٰذا میں نے اول خیر سمیت فوراً حرکت کی اور اسے مختصر ترین لفظوں میں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد ہم دونوں ہی عمارت سے نکل کر دو مخالف سمتوں میں ذرا فاصلے پر قدِآدم جھاڑیوں میں سینے اور کہنیوں کے بل جا دبکے۔

دشمنوں کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ جہاں وہ ہماری موت کا سامان کر رہے تھے، خود ان کی موت محض چند فٹ کے فاصلے پر انہیں نگلنے کو تیار ہے۔

مجھے چند فٹ کے فاصلے پر گاڑی کے موٹے ٹائر اور ان کے ساتھ کھڑے دشمنوں کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ یقیناً۔۔۔ دوسری سمت پر اول خیر کی بھی یہی پوزیشن ہوگی اور اس نے اب کیا کرنا تھا، یہ میں اسے پہلے ہی سمجھا چکا تھا۔

دشمنوں کی تعداد تقسیم ہوئی، اب جنگی خان کے ہمراہ صرف دو افراد تھے، باقی دو ٹولیوں میں محض ایک ایک آدمی تھا۔ باقی چھ افراد کھنڈر عمارت کی جانب جا چکے تھے۔ اور اس سے پہلے پولٹری فارم کی عمارت میں چھ سے آٹھ دشمن ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ میں نے سب سے پہلے حرکت کی۔ میری طرف والی ٹولی میں صرف ایک دشمن بظاہر چوکس انداز میں کھڑا تھا۔ میں نے آواز اس کے قریب سے رینگتا ہوا جیپ کے نیچے سے ہوتا ڈرائیونگ سیٹ کے رخ پر آگیا۔ میرا سو فیصد اندازہ تھا کہ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوگی اور ایسا ہی ہوا۔ جیپ بغیر ہڈ کی تھی۔ میں نے ذرا سر ابھارا اور میری آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ جیپ کے پچھلے کھلے حصے میں دو بھاری رائفلیں اور کچھ کریکر بم رکھے ہوئے تھے۔ میں گویا سانس روکے جیپ کی ڈرائیونگ کے قریب آچکا تھا اور یہاں بونٹ کے دائیں جانب مجھے حسبِ توقع صرف ایک دشمن سامنے کھڑا نظر آرہا تھا جس کا رخ کھنڈر عمارت کی طرف تھا۔ اس وقت ان سب کی توجہ اپنے ان چھ مسلح ساتھیوں پر مرکوز تھی جو دھواں اگلتی عمارت کے اندر ہماری ''متوقع'' تلاش میں بڑھ چکے تھے۔ جیپ بغیر ہڈ کے ہونے کی وجہ سے اس کا دروازہ نہ تھا۔ محض نصف درجے کا خلا تھا۔ میں اس خلا سے ذرا ابھر کر پائیدان تک آیا اور پھر اگلی دونوں سیٹوں کے درمیان سے سانپ کی طرح رینگتے ہوئے عقبی حصے میں آگیا۔ اب سب کچھ بہت تیزی کے ساتھ عمل کرنے کا متقاضی تھا۔

میں نے دو کریکر بم اٹھا لیے۔ ایک پوری قوت سے اس لینڈ کروزر کی طرف اچھال دیا جہاں جنگی خان اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ دھماکا ہوا اور مجھے ان کی چیخیں سنائی دیں۔ اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ یہ اول خیر کی طرف سے ''کارِخیر'' ہوا تھا۔ میری طرف کا دشمن بری طرح بوکھلایا۔ میں تب تک دوسرا کریکر بھی پھینک چکا تھا۔ پھر پھرتی سے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اسٹارٹ کرنے کے عمل سے لے کر اسے تیزی سے حرکت میں لانے کا دورانیہ صرف چند سیکنڈوں پر محیط تھا۔

دوسرے کریکر نے لینڈ کروزر کو نقصان پہنچایا تھا۔ عمارت کی طرف سے فائرنگ ہوئی تھی۔ اندر موجود دشمن خطرہ بھانپتے ہی پلٹے تھے مگر تب تک انہیں دیر ہو چکی تھی۔ میں نے جیپ کا اسٹیئرنگ کاٹا اور تیزی سے یوٹرن لیا۔ اس اثنا میں تاریکی سے ایک ہیولے نے میری جیپ پر جست لگائی۔ یہ اول خیر تھا۔ اس کے سوار ہوتے ہی میں جیپ کا ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ جیپ کا انجن طاقتور تھا اور ٹائر چوڑے۔ ریس پکڑتے ہی جیپ غراتی ہوئی تیزی سے دوڑنے لگی۔

''او خیر۔۔۔ کاکا! جیو۔۔۔ وے جیو۔'' اول خیر میرے برابر کی سیٹ پر سنبھل کر بیٹھتے ہی خوشی سے چیخا۔

''تم نے دوسری جیپ کے ٹائر برسٹ کر دیے تھے؟''میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں کاکا! آخری برسٹ میں نے اس کے پچھلے ٹائروں پر کیا تھا۔''وہ خوشی سے بولا۔''تو تو استادوں کا استاد نکلا رے کاکے... قسم مولا کی... مان گئے تجھے۔''

''اول خیر! گاڑی تم چلاؤ... مجھے راستوں کا علم نہیں۔'' میں نے کہا اور اس خطرے کے مقام سے کافی آگے جا کر ہم نے سیٹیں بدل ڈالیں۔ ہم گویا دشمنوں کی ناک کے نیچے سے نکل جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایک خوں ریز معرکہ سر کیا تھا ہم نے، اپنی زندگی کا گویا... یہ بڑا جُوا کھیلا تھا ہم نے۔ ہمت ہماری تھی اور مدد خدا کی تھی۔ ہم کامیاب ہوئے تھے، اب وقت کی ڈور ہمارے ہاتھ میں تھی۔ بچے کھچے دشمن ہمارا تعاقب کرنے سے قاصر تھے کیونکہ ان کی دونوں گاڑیاں ہم نے ناکارہ بنا دی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ کریکر بم پھینکنے کے بعد جنگی خان کا کیا حشر ہوا ہو گا مگر اندازہ تھا، وہ اگر مرا نہیں تو شاید زخمی ضرور ہوا ہو گا۔ میرے اعصاب شل تھے اور دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ مصیبت کی گھڑی سے نکلتے ہی اس طرح کا احساس کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ سکون کی حالت میں ذہن بھی کچھ دیر کو گم صم سا رہ جاتا ہے۔ یہ بالکل اس طرح کی کیفیات ہوتی ہیں جیسے جسم میں لگنے والی تازہ چوٹ کا بعد میں زیادہ درد محسوس ہوتا ہے۔ اگلے چند منٹوں میں ہم اس مختصر سے کیکر کے جنگل سے باہر تھے۔

سامنے پختہ سڑک تھی، مجھے نہیں پتا تھا کہ اول خیر کہاں کا رخ کرتا۔ تاہم میرے استفسار پر وہ جیپ کو تیزی سے پختہ سڑک پر لاتے ہوئے جواباً بولا۔

''کاکے! ابھی کچھ پتا نہیں... کسی جگہ ٹھہر کر بیگم صاحبہ سے بات کرتے ہیں۔''

حالات کی کشاکش نے مجھے پچھلے کئی گھنٹے سے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ میں عابدہ سے بھی بات نہیں کر سکا۔ اس کا خیال آتے ہی میرا دل بوجھل سا ہونے لگا۔ وہ عارفہ کے ساتھ امریکا روانہ ہونے والی تھی۔ جس وقت اس نے مجھ سے فون پر بات کی تھی، اس وقت فلائٹ کنفرم نہیں تھی، تاہم یہ اس نے ضرور بتایا تھا کہ آج یا کل سیٹ کنفرم ہوتے ہی وہ روانہ ہو جائے گی۔ کوئی اپنا جسم و جاں سے پیارا محض ایک شہر سے دوسرے شہر جاتا ہے تو دل و دماغ کی کیا حالت ہونے لگتی ہے۔ عابدہ تو میری رگِ جاں میں دوڑتے لہو کی گردش تھی۔ وہ دوسرے شہر نہیں بلکہ دوسرے ملک جا رہی تھی۔ کئی ہزاروں لاکھوں میل دور۔ نجانے کتنے براعظم، کتنے ٹھاٹھیں مارتے بحرِ بیکراں کے اس پار... امریکا... میرا دل کٹ رہا تھا۔

دہرا عذابِ جاں تو یہ تھا کہ میں اس کو سی آف کرنے کے لیے ائرپورٹ بھی نہیں جا سکتا تھا۔ پھر وہ خود بھی مجھ سے ایسے حالات میں جدا ہو رہی تھی کہ میرا اپنا مستقبل غیر یقینی تھا۔ دشمن اور پولیس میرے تعاقب میں تھے اور میں بے رحم موت کی لپک جھپک سے بچنے کی تگ و دو میں تھا۔ ایسے حالات میں عابدہ کا مجھ سے کوسوں دور جانا مجھ سے زیادہ اس بے چاری کے لیے جاں گسل تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے حالات میں وہ مجھے چھوڑ کر نہ جاتی۔ لیکن حالات کی مجبوری ایسی تھی کہ ہم پر کچھ صلۂ رحمی کے فرائض بھی عائد تھے۔

عارفہ، سرمد بابا کے مرحوم بیٹے کی بیوی تھی ..... یہ وہی عورت تھی جس نے اپنے شوہر کو ہی نہیں ایک بیٹے کو بھی اپنے قابو میں کر رکھا تھا اور پھر اس بیٹے (اپنے شوہر) کے ذریعے اپنے بوڑھے سسر سیٹھ منظور وڑائچ کو سرمد بابا بنا کر اولڈ ہاؤس میں لاوارثوں کی طرح پھینکوا دیا تھا مگر بعد میں وہ خود بھی مکافاتِ عمل سے نہیں بچ پائی۔ ادھر اس کا شوہر (سرمد بابا کے بیٹے) کا کار ایکسیڈنٹ میں اچانک انتقال ہوا تو دوسری طرف ڈاکٹروں نے عارفہ کی بیماری سے متعلق اذیت ناک انکشاف کیا کہ اس کا جگر تباہ ہو چکا ہے... پس... تقدیر نے پلٹا کھایا۔ سرمد بابا ایک پھر سیٹھ منظور کہلائے... عارفہ کو اپنی بیماری، اس کا علاج، دو بچے، کاروبار یہ سب اکیلے سنبھالنا ناممکن نظر آیا اور وہ اولڈ ہوم (اطفال گھر) آ کر بابا سے معافی تلافی کر کے اپنے ہمراہ لے گئی۔

سرمد بابا بھی بڑے دل کے آدمی تھے عفو و درگزر کی تفسیر بنے وہ اپنے مرحوم بیٹے کی ناگہانی موت پر آنسو بہاتے اپنی جوان بیوہ بہو کا اور دو پوتے پوتی کا سہارا بننے کے لیے چل دیے... مرد، مرد ہوتا ہے۔ بوڑھا ہو تو بھی شیر ہوتا ہے۔ سرمد بابا بوڑھے... مگر شیر تھے۔ انہوں نے سرمد بابا سے ایک بار پھر سیٹھ منظور وڑائچ بن کر سب کچھ سنبھال لیا۔ یہاں تک کہ اب وہ عارفہ کو علاج کی خاطر اسٹیٹ بھیج رہے تھے۔

''کاکا! تو کدھر کھو گیا؟'' معاً میں اول خیر کی آواز پر چونکا اور خیالات کے بھنور سے ابھرا تو اپنے گرد ویران تاریک ماحول پایا۔ اول خیر نے غالباً جیپ پختہ سڑک سے

کہیں کچے میں اتار کر ذرا محفوظ جگہ پر روک دی تھی۔ احتیاط کے پیشِ نظر اس نے ہیڈ لائٹس گل کر دی تھیں۔ انجن بھی بند کر دیا تھا۔ اوپر کھلے آسمان پر تارے چمک رہے تھے، آخر راتوں کا پھیکا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا چہار اطراف دم بہ خود سا تاریک ویرانہ تھا۔ کہیں سے گیدڑوں کے بولنے کی آواز آجاتی تھی تاروں کو ٹمٹماتی روشنی میں ہمارے اردگرد خشک بنجر ٹیلوں ٹبوں کی بہتات تھی۔

اول خیر نے اپنا سیل فون نکالا اور میں نے بھی یہی کیا۔ فی زمانہ اس سہولت نے فوری رابطہ اور کسی بھی جگہ رابطہ کا جو ذریعہ نکالا تھا، اس نے معیارِ زندگی ہی نہیں بدلا تھا بلکہ دل و دماغ اور جامد سوچوں اور خیالات کی ہر سے ایکسرسائز کا بھی باعث بنا تھا جس کا ثبوت اسکرین پر آئی ہوئی ان گنت ”مس کالز“ کو دیکھ کر میرے دل کی تیز ہوتی دھڑکنیں تھیں۔ میرے سیل فون پر عابدہ سمیت کئی لوگوں کی مس کالز چمک رہی تھیں۔ کچھ ایس ایم ایس بھی تھے۔ میں نے سب سے پہلے ایس ایم ایس چیک کیے، ان میں عابدہ کا ایس ایم ایس سب سے پہلے پڑھا اور جیسے جیسے پڑھتا گیا میرا دل بیٹھتا چلا گیا۔

عابدہ... میری کال کا... میری آواز کا... اس جدائی کی جاں گسل گھڑیوں کی دردانگیزی کے وارفتہ اظہار کا... انتظار کر کے... بالآخر حسرت و یاس اور مجبور و آس کا اپنے سینے پر بھاری پتھر رکھ کر مجھ سے کوسوں دور... امریکا جا چکی تھی۔ میری دھڑکتی سانسوں کی ڈور الجھنے لگی۔ اس نے مجھے ایس ایم ایس کیا تھا کہ وہ میرے فون کا اور مجھ سے بات کرنے کا انتظار کرتی رہی... بالآخر ناکام ہو کر وہ طیارے میں سوار ہو گئی تھی۔ اس نے میرے لیے بہت دعائیں کی تھیں، میرے حالات سنورنے کی ... میری لمبی عمر کی... اور دوبارہ ملن کی... اسے اندازہ تھا کہ میں کن حالات کا شکار ہوں اس لیے اس نے کوئی شکوہ نہ کیا تھا۔ تاہم اس نے بہت جلد مجھ سے دوبارہ ٹیلی فونک رابطہ اور سرمد بابا کے توسط سے اپنی خیریت وغیرہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کی مس کال بھی آئی ہوئی تھی۔ اب اسے کال کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے اپنے...... امڈ پڑنے والے غبار پر قابو پانے کی کوشش چاہی۔ ایک کال سرمد بابا کی تھی، بیگم صاحبہ اور آسیہ کے علاوہ... زبیر خان کی بھی مس کال درج تھی۔

اول خیر نے مجھ سے کہا۔ ”بیگم صاحب سے پہلے بات کرو۔“ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اور اپنے سیل فون سے بیگم صاحبہ سے رابطہ کیا تو دوسری جانب سے ان کی خوابیدہ سی آواز ابھری۔

”کیا ہوا... شہزاد؟ تم لوگ فون ہی ریسیو نہیں کر رہے ہو۔ خیریت سے تو ہو؟“

”لوگ“ سے ان کی مراد میں اور اول خیر ہی تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اب تک کی ساری رام کتھا سے انہیں آگاہ کر دیا تو دوسری جانب مکمل سناٹا طاری رہا۔ یقیناً یہ اطلاع ان کی توقع کے برخلاف تھی۔ پھر چند پل خاموشی کے اسی طرح گزر گئے تو ان کی دوبارہ آواز ابھری۔

”اس وقت تم دونوں کہاں ہو؟“

”اسی علاقے کے ایک تاریک ویرانے میں ہیں اور دشمنوں کی جیپ ہمارے قبضے میں ہے۔“

”یہ سب اچھا نہیں کیا ممتاز خان نے... اس رذیل پولیس انسپکٹر روشن خان سے تو میں نمٹ لوں گی... تم ایک کام کرو شہزی! کسی طرح بیگم ولا پہنچنے کی کوشش کرو۔“ مجھے بیگم صاحبہ کی اس بچکانا بات پر حیرت ہوئی۔ شاید ان حالات نے ان کا دماغ بھی ماؤف کر ڈالا تھا۔

”شاید آپ نے اب تک کے حالات کی خطرناکی کا ٹھیک طرح اندازہ نہیں لگایا بیگم صاحبہ!“ میں نے پرمتانت سے کہا۔ ”ان حالات کے تانے بانے آپ کی رہائش گاہ بیگم ولا سے ہی جڑے ہوئے تھے، آپ کی پولٹری فارم والے ٹھکانے پر آمد نے اس ٹھکانے کو خفیہ نہیں رہنے دیا اور پولیس سمیت دشمن آپ کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے۔ انسپکٹر روشن کو عمارت کی تلاشی کے دوران ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ ان کا شکار (یعنی میں) اس عمارت میں موجود ہے۔ یہی نہیں اسے خفیہ خانے کا بھی پتا چل گیا تھا مگر چونکہ اس کا ارادہ مجھے گرفتار کرنے کا سرے سے تھا ہی نہیں، لہٰذا وہ مکارانہ خاموشی اختیار کیے... بظاہر ناکام لوٹ گیا... مگر جاتے ہوئے اس نے اپنے راتب نواز چودھری ممتاز خان کو مطلع کر دیا کہ اس کا شکار عمارت کے اندر ہی موجود ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مسلح آدمی روانہ کر کے... اس قضیے کو گرفتاری کی نوبت آنے سے پہلے ہی نمٹا دے کیونکہ ممتاز خان کو میری گرفتاری نہیں میری موت مقصود تھی۔ اب یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے ایسے کسی انجانے خطرے کا بار بار احساس دلا رہی تھی۔ کیونکہ آپ کا فوراً وہاں پہنچنا شاطر انسپکٹر روشن خان کے لیے پورے وثوق کا باعث بنا تھا کہ آپ یقیناً اپنے اس خفیہ ٹھکانے پر مجھ سے ہی ملنے یا میری مدد کی خاطر ہی وہاں پہنچی تھیں۔ یہ سوچ کر مجھے

وقت سے پہلے محتاط ہونا پڑا۔ اگر ہم تہ خانے میں محبوس اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے کہ اب خطرہ ٹل گیا تو بے موت مارے جاتے۔ چنانچہ آپ لوگوں کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میں اور اول خیر تہ خانے سے نکل کر کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر... عمارت کی کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے تھے اور تب ہی ہمیں پولیس کے آدمی... وہاں سے خاموشی کے ساتھ کھسکتے ہوئے دکھائی دیے، جنہیں انسپکٹر روشن نے جاتے وقت ان چند پولیس والوں کو محض اس لیے وہاں متعین کر رکھا ہو گا کہ اس کے لوٹتے ہی کہیں ہم اس عمارت سے فرار ہونے کی کوشش نہ کر سکیں... جب تک ممتاز خان کے مسلح آدمی وہاں نہیں پہنچ جاتے، اور وہی ہوا، انہیں تھوڑی دیر بعد ہی دانستہ وہاں سے کھسک جانے کا حکم ملا... اس کے محض چند سیکنڈوں بعد ہی مسلح حملہ آوروں نے عمارت پر ہلا بول دیا۔''

بیگم صاحبہ کو مختصراً صراحت کے ساتھ یہ سب بتانا ضروری تھا۔ یہ سب سن کر وہ گنگ سی ہو گئیں پھر بولیں۔ ''شہزی! تم واقعی بہت پہنچی ہوئی شے ہو۔ تمہاری ذہنی فراست اور حالات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت بہت بلند ہے۔ میری اک ذرا سی غفلت کی وجہ سے تم بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچے ہو۔ میں پھر یہی کہوں گی کہ یہ تمہاری غیر معمولی درست قیافہ شناسی اور محتاط روی تھی کہ تمہیں وقت سے پہلے بہت سی باتوں کا اندازہ ہو گیا اور تم محتاط ہو گئے۔''

''اس کے باوجود آپ مجھے بیگم ولا بلانے پر بضد ہیں؟'' میں نے کہا۔

''لیکن پھر تم اور کدھر جاؤ گے شہزی!'' وہ پریشان ہو کے بولیں۔ ''ممتاز خان اپنے بیٹے کی اس حادثاتی موت پر پاگل ہو رہا ہے اور تمہارے خون کا پیاسا بھی۔ اپنے بیٹے کی موت کا ذمے دار وہ تمہیں ہی سمجھ رہا ہے اور اب مجھ سے بھی کوئی رعایت نہیں برتے گا۔ حالانکہ اپنے بھتیجے کی موت کا مجھے بھی ازحد دکھ ہے۔ وہ میرے ہاتھوں میں کھیلا ہوا تھا مگر...'' ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکیں۔ ایک مردم شناس، مضبوط اعصاب اور ارادوں کی مالک ٹھسے دار عورت کو میں نے پہلے بھی یوں آزردہ ہوتے دیکھا تھا۔ بے شک حالات اور وقت کی تیز دھوپ نے انہیں سخت بنا دیا تھا مگر ان کے اندر ایک نرم خو اور رقیق مزاج عورت کا دل بھی دھڑکتا تھا۔ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ دوبارہ ذرا سنبھلنے کے بعد فوراً بول پڑیں۔

''تمہیں شاید نہیں پتا شہزی! اپنے چھوٹے بھائی فرخ پر غلطی سے گولی چلانے کے بعد نوشابہ کی اپنی حالت بھی ابھی تک غیر ہے اس پر ہسٹریائی اور پاگل پن کے دورے پڑ رہے ہیں۔ بھائی، بہن کی دشمنی میں اس حد تک بڑھ جانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا.... یہ بات ممتاز خان بھی جانتا تھا لیکن اب... وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ میں نے تمہارے ذریعے فرخ کو مروانے کی انتقاماً کوشش کی تھی۔''

''انتقاماً؟'' میں استفساریہ بڑبڑایا۔

''ہاں ممتاز خان نے لئیق شاہ کو مروایا تھا۔'' وہ جیسے اپنی دھن میں اپنی رو میں کہہ گئیں۔

''لئیق شاہ؟ یہ.... یہ... کون تھا بیگم صاحبہ؟ کیا آپ کا شوہر... معافی چاہتا ہوں۔'' میں بھی رواروی میں نجانے کیا کہہ گیا تھا۔

''آہ... مت پوچھو یہ سب شہزی! ایک بڑی خوں ریز داستان ہے یہ...'' دوسری جانب سے بیگم صاحبہ کی بڑی درد انگیز اور کرب میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''تم ایسا کرو... شہزی! ملتان سے کہیں باہر نکل جاؤ بلکہ اس صوبے سے ہی نکل جاؤ... سندھ یا بلوچستان کی طرف کوچ کر جاؤ... میں تب تک یہاں کے حالات سنبھالنے اور اپنے اور تمہارے حق میں کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''بیگم صاحبہ! میں تھوڑی دیر کے لیے رابطہ منقطع کرتا ہوں۔ میں اور اول خیر آپس میں کچھ سوچ لیں پھر آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''او خیر... کاکے... بیگم صاحبہ نے تجھے آخرکار لئیق شاہ کے بارے میں بتا دیا؟'' مجھے اول خیر کی دھیمی آواز سنائی دی۔ تاریکی میں ہم دونوں کے چہرے محض ہیولوں کی صورت نظر آ رہے تھے۔ قریب ہی کوئی گیدڑ زور سے چیخ کر بھاگا۔ ایک لمحے کو سناٹا زور سے دھڑکا۔ اول خیر نے سب سن لیا تھا، میں نے اس سے پوچھا۔

''یار! یہ لئیق شاہ کون تھا؟'' اس کے جواب میں اول خیر نے مجھ سے جو کہا تھا، اس نے مجھے متحیر کر دیا۔

''وہ تم تھے... شہزی کاکے...!''

''کیا...؟ میں...؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم اول خیر؟ تم ہوش میں تو ہو... مجھے بتاؤ یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں یار کاکے! یہ واقعی بڑا پُراسرار گورکھ دھندا ہے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کر کے اسرار بھرے لہجے

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔

MEDICAM

SHAMPOO

مہینے بھر کا شیمپو

MEDICAM
SHAMPOO
Plus 3
MEDICAM
SHIKAKAI
SHAMPOO
ALD
MEDICAM
Amla
SHAMPOO
MEDICAM
MEDICAM
MEDICAM
Egg
SHAMPOO
MEDICAM
KALONJI

3 Plus SHAMPOO | SHIKAKAI | ANTI DANDRUFF | AMLA | HERBAL | ANTI-LICE | EGG | KALONJI

میں بولا۔

''سارے فساد کی جڑ یہی گورکھ دھندا ہے۔''

اول خیر سب جانتا تھا۔ بیگم صاحبہ کا ماضی کیا تھا اور حال کیا ہے لیکن جانے کیوں وہ مجھے بتانے سے ہمیشہ ہی احتراز برتتا آیا تھا۔ کبھی کہتا تھا... اسے کچھ نہیں معلوم اور جب بھی بیگم صاحبہ کے ماضی کے حوالے سے کوئی بات نکلتی تو بے اختیار اس کے منہ سے ...کبھی کچھ ایسے ہی الفاظ نکل جاتے تھے جیسے وہ بہت کچھ جانتا تھا اور جانتا بھی کیوں نہ ہو گا۔ آخر کو وہ بیگم صاحبہ کے ...۔ کار پردازوں میں نمبر دو کی حیثیت رکھتا تھا۔ کبیل دادا کے علاوہ اول خیر بھی بہت کچھ جانتا ہوگا۔ یہی نہیں وہ یہ بھی جانتا تھا کہ میرے سلسلے میں بیگم صاحبہ کا رویّہ اس قدر نرم خو کیوں ہو جایا کرتا تھا اور... اور... اب... آج کسی لئیق شاہ... نامی شخص کے ذکر پر اول خیر کا بے اختیار مجھ سے یہ کہنا کہ ''لئیق شاہ... تم تھے... شہزی کاکے۔'' مجھے بے طرح چونکنے پر مجبور کر گیا۔ میں نے اول خیر کو جھنجوڑ ڈالا۔

''یار! تم بھی مجھے اس پراسرار گورکھ دھندے میں الجھا دو گے۔ مجھے ایک بار یہ سب بتا کیوں نہیں دیتے تم... اول خیر؟''

میری بات پر اس کی ...۔ بے تاثر سی ہنسی کی ہلکی آواز سنائی دی پھر بولا۔ ''او خیر... کاکے! میں تجھے یہ سب نہ بتا کر ہی تو اس پُراسرار ...۔ گورکھ دھندے سے بچانا چاہتا ہوں۔'' وہ پھر پہلو تہی کرنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے سیل فون کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ فون ہنوز میرے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ میں نے چونک کر اسکرین پر نظر ڈالی اور یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ زبیر خان کی کال تھی۔ اس سے پہلے میں ایک بار سیل پر مختصراً گفتگو کر چکا تھا۔ ایسے کڑے وقت میں میرا اس سے بات کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر پھر جانے کیا سوچ کر میں نے اس کی کال ریسیو کر ہی ڈالی۔ کیونکہ بقول آسیہ اور خود زبیر خان کے... میرے بگڑتے حالات اور کٹھن راہوں کو ہموار کرنے میں اس کی مدد ضروری تھی۔ اگرچہ وہ مدد مشروط ہی تھی۔

''شہزاد خان! میں بہت دیر سے ٹرائی کر رہا تھا... تم ٹھیک تو ہو نا؟''...... اس نے بوجھل آواز میں پوچھا پھر فکرمندی سے بولا۔ ''تم میرے پاس کب پہنچ رہے ہو؟''

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں خود ابھی ایک مصیبت میں گرفتار ہوں اور اس سے نکلنے کی تگ و دو میں مصروف ہوں۔''

خاموشی اور ساکت ماحول کے باعث اول خیر بھی دوسری طرف کی باتیں بہ آسانی سن رہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے... تم پر چودھری الف خان کے بیٹے ممتاز خان نے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔'' وہ بولا۔

''نہ صرف یہ بلکہ اس ممتاز خان کے جواں سال بیٹے فرخ کے قتل کا الزام بھی تمہارے سر تھوپ دیا گیا ہے۔ ویسے تم اس وقت ہو کہاں؟ میرا مطلب ہے تھانے وغیرہ میں یا کسی اور جگہ...؟'' زبیر خان نے پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے سے تفکر کی پرچھائیں نمایاں طور پر محسوس ہوئی۔ میں نے جواباً کہا۔

''فی الحال تو میں اس طرح کی گرفت سے آزاد ہوں۔''

''ملتان میں ہو؟'' فوراً پوچھا گیا۔

''جی ہاں۔''

''کھلاں والی آسکتے ہو، میرے پاس... مگر یاد رکھنا... میں نے تمہاری ساتھی آسیہ کے منگیتر ریحان کو چھوڑ کر تمہاری طرف واقعی دوستی اور صلح کا ہاتھ بڑھایا ہے... کیونکہ ...... میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے اپنے ذرائع سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ...''

''جی ہاں! زبیر خان صاحب۔'' میں نے اسے تفصیل کی ''قند مکرر'' کی زحمت سے بچانے کی غرض سے فوراً کہا اور آگے بولا۔ ''میں آپ کا مشکور رہوں گا... ساتھ ہی مجھے خوشی ہوئی کہ میری طرف سے آپ کے دل میں جو غلط فہمی تھی، وہ دور ہو گئی... میں بھی کوشش کروں گا آپ کے کام آنے کی مگر بدقسمتی سے...''

''تمہاری خیریت اب ہمارا وسیع تر مفاد بن گئی ہے نوجوان۔'' میں اس کی آواز، اس کے لہجے کی گھن گرج اور بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا۔ فوراً میرے منہ سے نکلا۔

''میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں؟''

''ہاں، تم کو ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں، بڑے دوستانہ انداز میں کہ ہمیں تم سے کیا کام ہے۔'' وہ بولا۔ مجھے حیرت تھی کہ زبیر خان کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہ تھا۔ بھلا مجھ سے اسے کون سے کام کی محتاجی آن پڑی تھی۔

''دیکھو نوجوان! ہیرے کی قدر صرف جوہری ہی جانتا ہے۔ میری طرف سے تم پر کوئی قدغن کوئی زبردستی نہیں

ہے اور نہ ہی ریحان کی آزادی کو میں نے مشروط بنایا۔ حقیقت کا علم ہوتے ہی میں نے نہ صرف اسے چھوڑ دیا بلکہ تمہاری طرف سے بھی اپنا دل فوراً صاف کرلیا مگر مجھے خوب اندازہ ہے کہ میں جس سانپ پر پاؤں رکھنا چاہتا ہوں وہ بھاری پیر صرف تمہارا ہی ہوسکتا ہے، میرا نہیں۔''

''کام کی نوعیت جان سکتا ہوں؟'' میں نے گفتگو سمیٹنے کی غرض سے کہا تو وہ بولا۔

''ابھی میں کیا کہوں؟ تم خود بے شمار خطرات اور مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہو۔ پہلے تمہیں اس شکنجے سے آزاد کرانا چاہتا ہوں میں۔ اس کے بعد میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم میرے کس کام آسکتے ہو۔ وہ بھی تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا کہ تم کرتے ہو یا نہیں۔''

''آپ میری کیا مدد کرسکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''کم از کم ممتاز خان والے معاملے میں تو تمہاری مدد کر ہی سکتا ہوں۔''

''یہ مدد کھلاں والی... میں رہتے ہوئے نہیں ہو سکتی... اس وقت ملتان میں وہ میرا عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہے۔'' میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''چودھری ممتاز خان کے خلاف میرا ایک پرانا کیس بھی یہاں کی عدالت میں چل رہا ہے مگر میں اس وقت اس کے خلاف بیک وقت قانونی اور ذاتی، دونوں قسم کی جنگ میں پھنسا ہوا ہوں۔ تاہم میرے لیے زیادہ اہم قانونی جنگ ہے جس کی میں نے اپنے بہی خواہوں کے ساتھ مکمل تیاری کرلی تھی اور جیت کے امکانات بھی روشن تھے کہ اچانک آپ کی مداخلت کے باعث سارا کھیل بگڑ گیا۔ معذرت کے ساتھ... زبیر خان صاحب! پتا نہیں آپ کو اس حرکت کا کتنا فائدہ ہوا؟ میں نہیں جانتا، ہاں البتہ ممتاز خان کے حق میں آپ کی یہ مداخلت سو فیصد سودمند ثابت ہوئی۔ ورنہ صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی اور میرے بجائے اس وقت ممتاز خان پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوتا۔''

قدرے صراحت بھری گفتگو کا موقع ملا تو میں نے گلے شکوے بھی کر ڈالے۔ وہ اس کا برا منائے بغیر بولا۔

''مجھے بھی اس کا از حد قلق اور پچھتاوا ہے نوجوان!'' اس کے لہجے میں حد درجے پشیمانی اور معذرت تھی۔ میں نے بھی اپنے دل کے گویا پھپھولے پھوڑ ڈالے اور یاسین ملک کے حوالے سے بھی اس کی چیرہ دستی یاد دلائی تو وہ بولا۔

''اس لالچی اور بے ضمیر آدمی کی تم فکر مت کرو... یاسین ملک جیسے لوگوں کا ایمان صرف پیسا ہے۔''

''تو پھر آپ اسے آسیہ والی ویڈیو کلپ کے سلسلے میں مجبور کریں۔ یہ آپ کا میرے لیے ایک بہت بڑا کام ہوگا اور چودھری ممتاز خان کے خلاف قانونی پھندا بھی تنگ ہو جائے گا۔'' میں نے ایک اہم بات کی طرف اس کی توجہ دلائی تو دوسری جانب یکلخت پُرسوچ سی خاموشی چھا گئی پھر اس کی آواز ابھری۔

''اگر یہ بات ہے تو تم اس کی فکر نہ کرو شہزادا! میں ابھی یاسین ملک سے رابطہ کرتا ہوں۔''

''بس تو پھر آپ اس سے رابطہ کریں اور اسے مجبور کریں کہ وہ اپنے ٹی وی چینل کی ایک سابقہ رپورٹر مس آسیہ سے پورا پورا تعاون کرے۔ جیسا وہ کہے ویسا ہی کرے اور خاطر جمع رکھے۔ اس سے کوئی غلط کام نہیں لیا جائے گا جس سے کسی کی حق تلفی یا ناانصافی ہو۔ اس طرح آپ کی وجہ سے ہمارا جو کھیل عین وقت پر بگڑا تھا وہ شاید دوبارہ بہتری کی طرف مائل ہو جائے۔'' میں نے ''شاید'' کا لاحقہ لگانا ضروری سمجھا کیونکہ اب ممتاز خان کے بیٹے فرخ کی حادثاتی موت کے بعد اس کے خلاف صورتِ حال کچھ زیادہ ہمارے لیے ''حوصلہ افزا'' نہیں رہی تھی۔

''تم کسی بات کی فکر نہ کرو نوجوان! یاسین ملک وہی کچھ کرے گا جو تم یا آسیہ چاہے گی۔ میری اس سے بھی بات ہوچکی ہے۔'' زبیر خان نے کہا تو میں بولا۔

''بہت شکریہ آپ کا زبیر صاحب! میں بھی آپ کے کام آنے کی کوشش کروں گا مگر یاد رہے کسی کارندے یا کارپرداز کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے کام آنے والے دوست اور خیر خواہ کی حیثیت سے۔''

''بالکل... تو پھر میں تم سے امید رکھوں؟''

''امید پر دنیا قائم ہے۔ بس ذرا یہ معاملہ سنبھل جائے۔''

''فکر نہ کرو... میں یاسین ملک سے بات کرنے کے بعد مس آسیہ سے بھی بات کروں گا۔''

''میں بھی بہت جلد آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔'' یہ کہتے ہوئے رسمی والوداعی کلمات کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔

''اوخیر...'' رات کی دھڑکتی خاموشی میں مجھے ساتھ بیٹھے اول خیر کی مخصوص آواز سنائی دی۔ میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ میں نے اسی وقت آسیہ سے رابطہ کرکے اسے زبیر خان سے دوسری بار ہونے والی ''میر

حاصل'' گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ خوشی کے پُرجوش احساس تلے بولی۔

''شہزی! اب ہمارا کھیل وہیں سے شروع ہوگا جہاں سے اس کی ڈور ٹوٹی تھی۔ تم دیکھنا اب کیسے اونٹ پہاڑ تلے آتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس تازہ صورتِ حال کے باوجود بھی بہتری کی امید رکھنی چاہیے؟'' وہ میری بات کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''آف کورس... تم کیا سمجھ رہے ہو شہزی! کہ میں یہاں باجی کے گھر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں؟''

میں اس کی بات پر چونکے بِنا نہ رہ سکا۔ وہ آگے بولی۔ ''میں اور باجی خانم شاہ نے تمہاری ہدایت کے مطابق اسپیشل انوسٹی گیشن اینٹی کرائم سیل کے آپریشن انچارج... میجر ریاض باجوہ سے بالمشافہ ملاقات کی تھی اور اسے ساری صورتِ حال اور سول لائن پولیس کی جانب داری سے بھی آگاہ کیا تھا۔ تم سے آج صبح ہونے والی گفتگو سے متعلق بھی یہ بات واضح کی تھی کہ فرخ کا قتل حادثاتی طور پر اس کی اپنی بہن نوشابہ کے ہاتھوں ہوا اور تمہیں یہ اہم اطلاع بھی دیتی چلوں شہزی کہ مبینہ طور پر نوشابہ پولیس کو درست بیان دینے پر رضامند ہے کہ گولی اس کے پستول سے چلی تھی لہٰذا جب باجوہ صاحب نے اس سلسلے میں بذاتِ خود نوشابہ سے ملاقات کرنی چاہی تو اس کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر مکار... اور شاطر چودھری ممتاز نے اسے اپنی بیٹی سے ملنے ہی نہ دیا۔ وہ یقیناً اندرونِ خانہ اپنی بیٹی پر دباؤ ڈالنے کی اس مذموم کوشش میں ہے کہ یہ قتل اس کے ہاتھوں نہیں بلکہ سوچے سمجھے ارادے اور منصوبے کے تحت تم نے ہی کیا ہے۔''

آسیہ کی آواز فرطِ جوش سے لرز رہی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ خود میرا وجود بھی اسی جوش کے زیرِ اثر مرتعش ہونے لگا تھا۔ گویا میری ہر طرف سے روٹھی ہوئی تقدیر اب بھرپور طریقے سے میرا ساتھ دینے پر اتر آئی تھی۔ زبیر خان کا اچانک ایک دشمن سے میرا دوست بن جانا پھر میری خاطر خواہ طریقے سے مدد کے لیے بھی آمادہ ہو جانا اور آسیہ کے ساتھ باقاعدہ میرے حق میں چلانے والی اس کارِ خیر مہم میں شامل ہونا... یہ سب خوشی آئند باتیں نہیں تو کیا تھیں؟ اس پر اول خیر نے بڑا امید افزا اور سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا۔

''او... خیر... کاکا! اسی لیے ممتاز خان نے فوری طور پر اپنے مسلح درندہ صفت آدمیوں کے ذریعے تمہیں ہلاک کرنے کی ناپاک کوشش کی تھی۔ یقیناً اسے بھی ان ساری باتوں کا ادراک ہو چلا ہے کہ اب تم بہت جلد قانون کی گرفت سے آزاد ہونے والے ہو۔''

''ہاں، اول خیر!'' میں نے خوش آئند تصورات کے بھرپور احساس سے مغلوب ہو کے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کل کا سورج بہت اہم اور خوش گوار تبدیلیوں کے ساتھ طلوع ہو۔''

''انشاء اللہ... ایسا ہی ہوگا کاکے۔'' اول خیر نے میری کمر ٹھونکی۔ ''لیکن کاکے! اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ ممتاز خان کو اب تک اس بات کی اطلاع مل گئی ہوگی کہ ہم اس کے خونی ہرکاروں کے چنگل سے نکل بھاگے ہیں۔ اس نے مزید آدمی ہماری تلاش میں روانہ کر دیے ہوں گے۔''

اس کا خدشہ بجا تھا۔ میں نے سیل فون کی اسکرین پر وقت دیکھا، پو پھٹنے والی تھی اور صبح دم بیدار ہونے میں ایک دو گھنٹے ہی تھے۔ تازہ صورتِ حال اور ٹیلی فونک رابطوں پر زبیر خان اور آسیہ وغیرہ سے گفتگو ہونے کے بعد آب میرا آسیہ کے ہاں یعنی ایڈووکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ پر جانا ناگزیر ہو گیا تھا کیونکہ زبیر خان نے یاسین ملک کی جانب سے مثبت جواب کی توقع دلائی تھی۔ لائیو پروگرام... خانم شاہ کی رہائش گاہ سے ہی نشر ہونے کا دوبارہ بندوبست کیا جانے والا تھا۔ پہلی والی ویڈیو کلپ کی تردید وصفائی میں یہ لائیو پروگرام کرنا اشد ضروری تھا۔ اس بار صورتِ حال نسبتاً زیادہ حوصلہ افزا بھی نظر آتی تھی کیونکہ اب اس پروگرام کو کوئی اور نہیں بلکہ وہی چینل ٹیلی کاسٹ کرے گا جس سے پہلے والی ویڈیو کلپ نشر ہوئی تھی۔

''پھر ہمیں یہ جیپ چھوڑنا ہوگی، کسی مسافر لاری کا سفر اختیار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''پر کاکا! اس مختصر سفر کے دوران میں ناکے پر پولیس چیکنگ ہوسکتی ہے اور شہر کے اندر تو بڑی سخت چیکنگ ہوگی۔ چاہے جتنا اپنا ہم بہروپ بدلنے کی کوشش کریں، ممتاز خان کے خفیہ ہرکاروں کی نظروں سے ہم نہیں بچ سکتے۔ تو جانتا ہے کاکے! ممتاز خان کی انتہائی کوشش یہی ہوگی کہ وہ تجھے فوراً ٹارگٹ کرے، بعد میں وہ اسے آسانی سے پولیس مقابلہ قرار دلوا سکتا ہے۔''

اس کی بات قابلِ غور تھی۔ ملتان اس وقت میرے لیے ''ہائی رسک'' بنا ہوا تھا۔ مگر میرا خانم شاہ کی رہائش گاہ تک پہنچنا بھی ضروری تھا۔ معاً میرے ذہن میں ایک

ترکیب آئی... جو میں نے فوراً اول خیر کے گوش گزار کر دی۔ وہ کچھ مطمئن اور کچھ غیر مطمئن انداز سے بولا۔

''کاکے! کام تو یہ بھی خطرناک ہی ہوگا مگر مسافر لاری سے بہرحال کم ہی ہے۔''

''بس تو پھر بسم اللہ کرتے ہیں... کم سے کم خطرے والا راستہ اختیار کرتے ہیں۔''

''چل کاکے، پھر لے اللہ کا نام... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔'' وہ بولا اور جیپ آگے بڑھا دی۔

بنجر علاقے سے دھیمی رفتار کے ساتھ بغیر ہیڈ لائٹس آن کیے ہم مین شاہراہ کے قریب پہنچے۔ جیپ کو ایک نسبتاً بلند کچے ٹیلے کی آڑ میں روک کر ہم دونوں نیچے اتر آئے اور پیدل مین شاہراہ کی طرف ہو لیے۔ پختہ سڑک ہماری نظروں کے فاصلے پر تھی۔ وہاں چمکتی روشنیاں متحرک نظر آرہی تھیں۔ مین شاہراہ پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ قریب میں نصف قدِ آدم سوکھی جھاڑیاں تھیں۔ یہ ون وے شاہراہ ہی تھی اور جس رخ پر ہم تھے وہ ملتان کی طرف جانے والی سڑک تھی۔ میرے منصوبے کے مطابق ہمیں کسی بار بردار ٹرک پر سفر کرنا تھا جو ملتان شہر کی طرف گامزن ہوتا۔

اب ہمیں ایسے ٹرک کی تلاش تھی جو سامان سے لدا ہوتا... ٹرک کے انتظار میں ہم ایک موڑ کے قریب جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھ گئے۔ موسم کے تیور بدلنے لگے تھے، سرمائی ابتدا تھی، فضا میں ٹھنڈ اترنے لگی تھی۔ ہم دونوں نے بھاری چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ یہ ایک طرح سے ہمارے چہروں کو بھی نصف حد تک چھپانے کی تدبیر بنی ہوئی تھی۔

رات کے آخری گزرتے پہر میں سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی، عموماً ایسے وقت میں بار بردار ٹرک ہی آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ دو آئل ٹینکر، ایک ٹرک ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزرے تھے' ابھی تک ہمارے ''مطلب'' کا ٹرک ہمیں نظر نہیں آیا تھا... ہم موڑ والی جگہ پر ہی دبکے بیٹھے تھے۔ مشرق کی سمت پو پھٹنے لگی تھی، اچانک ایک چھوٹے سائز کا راکٹ ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ یہ ہمیں اپنے مطلب کا محسوس ہوا، میں نے ہولے سے اول خیر کا ہاتھ دبایا۔ وہ بھی ہوشیار ہو کے بیٹھ گیا۔ ٹرک قریب آرہا تھا اور اس موڑ پر حسبِ توقع اس کی رفتار کم سے کم ہونے لگی۔ پھر جیسے ہی اس کا رخ مڑا... ہم دونوں بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھاڑیوں سے نکلے اور ٹرک کے پیچھے دوڑتے چلے گئے اور پھر اس کے آہنی کنڈوں پر ہاتھ اور پاؤں جما کر چپک گئے۔ یہ ٹرک واقعی ہمارے مطلب کا ہے یعنی زیادہ لدا پھندا نہیں تھا۔ یہ کباڑیے کا ٹرک تھا اور اسکریپ لادے جارہا تھا یقیناً اس کا رخ ملتان کی کباڑ مارکیٹ کی طرف تھا... یہاں ہمیں تھوڑی کوشش سے اندر چھپ کر.... بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

موڑ کراس کرتے ہی ڈرائیور نے ٹرک کو ریس دی۔ گیئر بدلنے کی گھر گھراہٹ ابھری اور ٹرک نے نسبتاً تیز رفتار پکڑ لی۔ تاہم اب بھی اس کی رفتار فقط اتنی ہی تھی کہ اگر ہم اترنا بھی چاہتے تو بہ آسانی اس پر سے چھلانگ لگا کر اتر سکتے تھے۔

دل و دماغ کو کچھ تسلی ہونے لگی مگر بہرحال یہ بات بھی طے تھی کہ اب ہم بتدریج خطرات کی جانب بڑھ رہے تھے، اس ٹرک کی چیکنگ ہوسکتی تھی اگرچہ اس کا احتمال کم ہی تھا مگر لوہے اور زنگ آلود انجر پنجر سے لدے اس ٹرک کو کچھ زیادہ سخت چیکنگ کے مرحلے سے نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ اس کی مجھے امید تھی۔

''کاکا! ہوشیار... ٹول پلازا آرہا ہے۔'' خاصی دیر بعد اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی، مطلب تھا کہ ہم اپنی خفیہ جگہ پر نظرثانی کرلیں۔

ٹرک کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی۔ سویرا ہونے لگا۔ ٹرک ٹول کیبن سے گزر کر سائڈ میں رک گیا۔ انجن اسٹارٹ ہی رہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا۔ جس خطرے سے اس وقت میں دوچار تھا، اس کی اذیت سے صرف میں ہی واقف تھا... کیونکہ میرے لیے اس خطرے کا دوسرا نام موت تھا۔

کچھ آوازیں سنائیں دینے لگیں... ڈرائیور شاید پولیس والوں سے کچھ ''بھاؤ تاؤ'' کررہا تھا' معاملہ اگر وہیں تک تھا تو کچھ امید افزا تھا۔ ایک آہنی کرے کی آڑ سے میں نے ٹرک کے سرے کی طرف دیکھا جو کھلا پڑا تھا جبکہ ہم ٹرک کے درمیانی حصے میں چھپے بیٹھے تھے۔ کھلے ہوئے حصے سے مجھے ایک وردی پوش اہلکار نظر آیا۔ وہ کنڈوں اور آہنی رختوں پر پاؤں اور ہاتھ پھنسائے اسکریپ اور کباڑ پر سرسری سی نگاہ ڈال رہا تھا چند لمحوں بعد وہ اتر گیا۔ ٹرک کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کی ریس کی مخصوص آواز ابھری اور وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔ یہ اہم ناکا تھا۔ اب ٹرک شہر کے اندر داخل ہونے والا تھا۔ اندر شہر کے کسی ناکے پر بھی ٹرک کی چیکنگ ہوسکتی تھی۔

ٹرک اب شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ سوئے اتفاق یا پھر میری خوش قسمتی تھی کہ پھر دوبارہ اسے کسی نے نہیں روکا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ہمارا نجات دہندہ یہ ٹرک ایسے کسی متوقع اور امید افزا قریبی مقام سے گزرتا ہے جہاں سے خانم شاہ کی رہائش گاہ ہمیں قریب پڑتی... مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ ڈر بھی تھا کہ اگر یہ پہلے ہی اپنے کسی مطلوبہ مقام پر پہنچ گیا تو ہمارا نظر آجانا لازمی امر تھا۔ لہٰذا ہمیں کسی ایسی صورتِ حال کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی ٹرک سے اتر جانا چاہیے تھا۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہم دونوں سرک کر ٹرک کے سرے پر آگئے۔ ٹرک کھڑکھڑاتا ہوا مدھم رفتار سے چل رہا تھا۔ اب وہ ایک بازار کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اعلیٰ الصباح کے باعث بازار میں خریداروں کی تعداد کم ہی تھی البتہ متعلقہ لوگ، دکان دار، مزدور چائے وغیرہ پیتے نظر آئے۔ یہ بیک وقت سبزی منڈی اور فروٹ مارکیٹ نظر آتی تھی، ایک مقام پر ٹرک کی رفتار بہت کم ہوگئی۔ وہ شاید کسی اور گاڑی کو راستہ دے رہا تھا۔ پھر رک گیا۔ ہم نے اتر جانا ہی مناسب سمجھا۔ کسی کی نظروں میں آئے بغیر ہم ٹرک سے اترنے میں کامیاب ہوگئے۔ ہم منڈی میں داخل ہوگئے ہماری نظریں گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تو عقدہ کھلا یہاں سے ایڈووکیٹ خانم شاہ کی رہائش گاہ زیادہ دور نہ تھی بشرطیکہ ہم گلیوں، محلوں کے درمیان سے شارٹ کٹ اختیار کرتے گزرتے۔ ہم دونوں نے اس پر تبادلۂ خیال کیا اور چل پڑے۔

اب تک کی صورتِ حالات تسلی بخش نظر آتی تھی مگر جانے کیوں دل و دماغ ایک بار پھر شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں نے ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت اول خیر سے کہا۔

‘‘یار! تمہارا کیا خیال ہے پولیس یا دشمنوں نے خانم شاہ کی رہائش گاہ کی بھی خفیہ نگرانی نہیں کر رکھی ہوگی؟’’

‘‘اوخیر... کاکے!’’ وہ مسکرایا۔ ‘‘اس کا خیال تجھے اب آیا ہے۔ میرے تو بہت پہلے سے یہ خدشہ دماغ میں کلبلا رہا تھا۔’’

‘‘تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔’’ میں نے متانت سے کہا۔ ‘‘ایسے میں ہم اندر کیسے داخل ہو پائیں گے؟’’

‘‘سمجھ گیا تھا تیری بات کا مطلب کاکے... وہاں پہنچ کر صورتِ حال کا جائزہ لیں گے بلکہ تو ایک کام کر۔’’ وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

‘‘آسیہ سے رابطہ کر اور اسے بھی اس خدشے سے باخبر کر دے... ساتھ ہی اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دے۔’’

ہم باتیں کرتے ہوئے محتاط روی سے چل رہے تھے، منڈی خاصی بڑی تھی یہاں سے ایک ذیلی سڑک پار کر کے ہم اوسط درجے کے ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہ منڈی کے سامنے سڑک پار کا متوسط سا علاقہ تھا۔ زیادہ تر مزدور پیشہ افراد یہاں مقیم تھے، مٹرگشت کے انداز میں چلتے ہوئے ایک نسبتاً خالی جگہ پر رک کر میں نے جیب سے سیل نکالا اور آسیہ سے رابطہ کیا۔ وہ بے چینی سے میری منتظر تھی۔ پر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ میں ملتان میں ہی ہوں اور ان کے بہت قریب ہوں تو وہ خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے بولی۔

‘‘شہزی! بس اب جلدی پہنچ جاؤ یہاں۔ سارے معاملات ٹھیک ہوگئے ہیں، یاسین ملک کا فون آیا تھا۔ زبیر خان کے کہنے پر اور دباؤ پر وہ کمینہ ہم سے پورا تعاون کرنے پر رضامند ہوگیا ہے۔ بس تم آجاؤ... ایک بار تمہاری لائیو ویڈیو کلپ اس چینل سے تردیدی طور پر نشر ہوگئی تو سمجھو تمہارے دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑے گی... تمہاری ضمانت کے امکانات بھی روشن ہوجائیں گے۔’’

‘‘ہاں، یہ سب ٹھیک ہے آسیہ! لیکن دشمنوں کی ابھی بھی انتہائی کوشش میری شہ رگ کے قریب پہنچنا ہے...’’ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔ ‘‘میں نے تمہیں اسی لیے فون کیا تھا، آنے سے پہلے میں اس بات کی تسلی چاہتا ہوں کہیں تمہاری باجی کا گھر خفیہ نگرانی کی زد میں تو نہیں۔ میں خود بھی محتاط رہوں گا مگر تم بھی اپنے طور پر ذرا باہر کا غیر محسوس طریقے سے جائزہ لے کر مجھے بتاؤ او کے...؟’’ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور دوبارہ رابطے کا کہہ کر منقطع کر دیا۔

اول خیر میرے اس پُراندیش خیال سے متفق تھا۔ ہم دونوں اسی طرح تنگ گلیوں اور محلوں کا سہارا لیتے ہوئے بالآخر ایڈووکیٹ خانم شاہ کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ یہ قدرے پوش علاقہ تھا گلیوں کی جگہ کھلے اور چوڑے راستے تھے زیادہ تر کھلے کشادہ مکانات اور جدید اسٹائل کے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ مطلوبہ بنگلے کے راستوں کی حدود میں داخلے کے بعد ہم ازحد محتاط ہوگئے، چوتھے نمبر کا بنگلا خانم شاہ کا تھا۔ مجھے وہاں قریب میں ایک ٹھیلے والا کھڑا نظر آیا۔

کھڑا کیا تھا بلکہ اس طرف ہی وہ آدمی اپنے ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا چلا آرہا تھا جہاں ہم موجود تھے، مگر ہم نے دیکھا وہ رک گیا۔ کچھ لوگ آتے جاتے دکھائی دیے... پتا نہیں کیوں میرے چوکنے پن کی ساری حسیات ٹھیلے والے پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ وہ رک کر ہلکے فیروزی رنگ والے اس بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھ رہا تھا... پھر ذرا آگے جا کر رک گیا۔ اس دوران میں نے آسیہ کو دیکھا، وہ کسی گھریلو ملازمہ کے ہمراہ باہر ایک طرف سے چلی آرہی تھی۔ اس کی حرکات وسکنات میں مضطربانہ پن تھا۔ میں نے غور کیا تھا کہ بظاہر ٹھیلے والا بار بار گردن موڑ کر آسیہ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر جب آسیہ اور وہ ملازمہ ٹائپ عورت بنگلے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں تو میں چونکا، ٹھیلے والے نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص سے ایک سیل نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔ اسی لمحے دو افراد مجھے اس سمت سے نمودار ہوتے دکھائی دیے جدھر سے آسیہ اور وہ ملازمہ عورت ابھری تھیں۔ ٹھیلے والے نے سیل اپنے کان سے تو لگایا مگر پھر ان مذکورہ دو افراد کو دیکھتے ہی اس نے سیل اپنے کان سے فوراً ہٹا لیا۔ اس کی حرکت مجھے چونکا گئی تھی، وہ دونوں آدمی اس کی سمت بڑھے اور قریب آ کر وہ تینوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ یہ آسیہ کی کال تھی، میں نے اول خیر سے ان تینوں آدمیوں پر نظر رکھنے کا کہا اور خود ذرا سیدھا ہو کے آسیہ کی کال سننے لگا۔

''شہزی! میرا خیال ہے تمہارا خدشہ درست ہے۔ میں ماسی کے ساتھ باہر نکلی تھی بظاہر سودا سلف لیا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے پر مجھے چند لوگوں کی مشکوک نقل و حرکت محسوس ہوئیں۔'' وہ دھڑکتی آواز کے ساتھ بتا رہی تھی۔ ''دو آدمیوں کو تو باقاعدہ میں نے اپنا تعاقب کرتے ہوئے بھی پایا... ایک پولیس گاڑی بھی راستے کے سرے پر کھڑی تھی، سمجھ میں نہیں آرہا تمہارا محفوظ داخلہ کس طرح ممکن ہو؟'' اس کے لہجے سے پریشانی مترشح تھی۔ جواباً میں نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''شہزاد! تم ابھی دور ہی رہنا کہیں ان کی نظر تم پر نہ پڑ جائے۔ مجھے لگتا ہے ان لوگوں کا ذرا دور موجود پولیس گاڑی والوں سے خفیہ رابطہ ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔ میں محتاط ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دینی چاہی مگر وہ بولی۔

''لیکن شہزی! تمہارا یہاں آنا ضروری ہے جس آخری مرحلے کی ہم نے تیاری کر رکھی ہے، اسے مکمل کرنا ضروری ہے۔''

''میں کچھ سوچتا ہوں۔'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ اول خیر میری طرف متوجہ تھا۔ اس دوران اچانک میری نگاہ اول خیر کے عقب میں پڑی۔ ٹھیلے والا اپنے ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا نمودار ہوا تھا اور اب کھڑا ہو کے ہماری جانب گھورے جا رہا تھا۔ یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے اول خیر سے نچی آواز میں کہا۔

''خبردار! چونکنا مت... ٹھیلے والا تمہارے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ اسی طرف دیکھ رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر سناٹے کی کیفیت طاری ہو گئی۔

آسیہ سے باتوں کے دوران جانے کب اول خیر میری طرف متوجہ ہو گیا تھا...... اور اس دوران ٹھیلے والا آگے کو سرک آیا تھا۔ ہم دونوں... بالکل غیر محسوس طریقے سے اس کی طرف دیکھے بغیر بظاہر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوئے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئے، اس دوران میں نے کن انکھیوں سے ٹھیلے والے کی طرف دیکھا اور یکبارگی میرا دل خطرے کے پیشِ نظر زور سے دھڑک اٹھا۔ وہ اب دوبارہ سیل فون کو کان سے لگائے ہوئے تھا اور بار بار ہماری طرف گردن موڑ کر دیکھ بھی رہا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اب اس نے ٹھیلے سمیت اپنا رخ بھی ہماری طرف موڑ لیا تھا اس کے ٹھیلے پر سبزیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں اور اول خیر دو بنگلوں کے درمیان بنے ایک خالی پلاٹ کی طرف آ گئے اور پھر یہاں سے ایک دوسرے راستے پر آ گئے۔ ٹھیلے والا وہ مشکوک آدمی اتنی جلدی اس طرف نہیں گھوم سکتا تھا مگر میں نے اول خیر کو ادھر ہی رکنے کا اشارہ کیا... اور خود تیز تیز قدموں سے خالی پلاٹ کا راستہ طے کر کے دوسری طرف گھوم کر اس مشکوک ٹھیلے والے کی عقبی سمت پر آن رکا۔ وہ انہی دونوں آدمیوں کو اس جانب ہاتھ کے اشارے سے کچھ بتا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے مذکورہ وہ دونوں آدمی اس کے پاس سے ہٹ گئے تھے اور اب شاید اس کے بلانے پر دوبارہ اس سے آملے تھے۔ میں نے ان دونوں کو تیزی کے ساتھ اسی سمت کی طرف بڑھتے دیکھا جہاں ذرا... دیر پہلے میں اور اول خیر موجود تھے۔ اب شک و شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی... کہ ہم متوقع نگرانی کی زد میں آچکے تھے۔

میں بہ سرعت پلٹا اور اول خیر کو اشارہ کیا۔ ہم دونوں تیزی سے ایک بنگلے کی بیرونی دیوار کی تین فٹ آگے بنی اس جگہ پر آ کر چھپ گئے جدھر گھنے پودوں کے جھنڈ دار بیل

بوٹے اگے ہوئے تھے۔ سرِدست ہمارا اِدھر اُدھر دوڑنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دوسرے جس جگہ ہم چھپے تھے یہاں سے ہم مشکوک ٹھیلے والے کی نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو ہمارے پیچھے روانہ کرنے کے بعد وہ پھر سیل پر کسی سے رابطے میں مصروف تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ دشمن تھے یا پولیس کے مخبر۔ تاہم دونوں میں کوئی فرق نہ تھا کیونکہ دونوں کا مقصد میرے سلسلے میں ایک ہی تھا۔ یعنی مجھے دیکھتے ہی ''شوٹ'' کر دینا۔

''کاکے! ہمیں فوراً یہاں سے رفو چکر ہونا پڑے گا۔ دشمن یا پولیس کو ہماری بھنک پڑ چکی ہے۔'' اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ وہ غلط نہیں تھا ٹھیلے والے کا بار بار سیل فون پر رابطہ کرنے کا انداز یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مزید ''کمک'' بلانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایسے میں اس علاقے کی ناکا بندی ہو سکتی تھی۔

اس خطرے کو محسوس کر کے ہم عقبی سمت سے پودوں کے جھنڈ کو خیر باد کہہ کر نکلے ہی تھے کہ سناٹے میں آ گئے۔ وہ دونوں آدمی ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ پھر ایک نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش چاہی تو پستول کی جھلک دیکھتے ہی جیسے میری رگوں میں خون تحلیل پارا بن گیا۔ میں نے اس پر چیتے کی سی جست لگا دی۔ اسے مجھ سے اس قدر پھرتی کی توقع نہ تھی جبکہ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی جب تک وہ یا اس کا دوسرا ساتھی سنبھلتا، میں اسے اپنے ساتھ رگیدتا ہوا لے گیا اور زمین پر آ رہا۔ دوسرے کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے قابو کرنے کے لیے اول خیر موجود تھا۔ اپنے مدِمقابل کو زمین پر گراتے ہی میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا بھاری گھونسا پوری قوت سے اس کی ناک پر جڑ دیا۔ یہی دھما چوکڑی حسبِ توقع اول خیر کے حصے میں بھی آئی۔ اس نے تو اپنا پستول نکال کر اس کی بھرپور ضرب اپنے مدِمقابل کی کنپٹی پر رسید کر دی تھی، وہ بے حرکت و ساکت ہو گیا جبکہ میرے نیچے دبا ہوا مدِمقابل ناک پر گھونسا کھانے کے باوجود ہوش میں تھا۔ وہ تربیت یافتہ معلوم ہوتا تھا اور سخت جان بھی، اپنے دونوں ہاتھ میری گردن پر جما کر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپا اور مجھے خود سے دور اچھالنے کی کوشش چاہی مگر اس دوران میں اس کا چہرہ میری ٹانگ کی زد میں آ گیا جو اس کے لیے ''ڈبل شاک'' ثابت ہوا۔ اس کے چہرے پر پڑنے والی میری زوردار لات کی ضرب نے اس کا سر سیمنٹ کی ٹھوس دیوار سے بری طرح ٹکرا دیا تھا۔ نتیجتاً وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

جب تک میں اور اول خیر سنبھلتے، اچانک ایک سائرن بجاتی گاڑی کی آواز ابھری۔ پولیس جیپ کو اس سمت مڑتے دیکھ کر ہمارے پاس دوڑنے کا موقع نہیں رہا تھا۔ ناچار ہمیں انہی جھنڈ دار پودوں کی آڑ میں پناہ لینی پڑی جہاں تھوڑی دیر پہلے ہم موجود تھے... شکر تھا کہ پولیس کی ہم پر نگاہ نہیں پڑی تھی، دوسرے یہ کہ ایک بنگلے کی شمالی دیوار ہمیں آڑ فراہم کیے ہوئے تھی، تاہم بھاگنے یا دوڑنے کی صورت میں دیکھ لیے جانے کا زیادہ امکان تھا۔

پولیس موبائل ہماری چھٹی چھٹی ..... آنکھوں کے سامنے آ رکی تھی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر میں سناٹے میں آ گیا۔ اگرچہ اس ملعون سے ٹکراؤ کی مجھے پوری توقع تھی مگر ایسے حالات میں نہیں کہ میں بے بسی کی تصویر بنا چھپا بیٹھا تھا اور وہ میری دھڑکتی نظروں کے سامنے تھا... اور سامنے بھی کیا محض دو تین فٹ کے فاصلے پر تھا۔ ممتاز خان کا راتب خور انسپکٹر روشن کا بدہیئت چہرہ میں کیسے بھلا سکتا تھا جو ماورائے قانون ''پولیس گردی'' کا شیدائی تھا۔ یہ وہی مردود تھا جس نے اپنے نجی ٹارچل سیل میں مجھے غیر انسانی تشدد کا نشانہ بنایا تھا اور اب میری جھلک دیکھنے کو بے تاب تھا کہ دیکھتے ہی مجھے گولی مار دینے کا اس درندہ صفت کو خصوصی اختیار... حاصل تھا۔ غالباً... اول خیر نے بھی اس موذی کو دیکھ لیا تھا اور اسی سبب اس نے دھیرے سے میرا کندھا دبایا تھا۔ میں نے نظریں سکیڑ کر بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیا جو جوشِ غیظ اور آتشِ انتقام سے مسخ ہو کے گھناؤنا نظر آ رہا تھا۔ وہ یک دم اپنی طرف کا دروازہ کھول کے نیچے اترا تو دوسرے پولیس والے بھی اتر کر اس کے قریب ہی مؤدبانہ کھڑے ہو گئے۔ اس دوران میں، میں نے ٹھیلے والے کو دیکھا جو بڑے احترام سے انسپکٹر روشن خان کو صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔

''سر جی! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ان دونوں کو دیکھا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے ان میں ایک تو اپنا شکار ہی تھا، میں نے فوراً نذیر اور لالے کو مطلع کر دیا وہ انہی کے تعاقب میں گئے تھے۔''

''ان دونوں سے رابطہ کرو... ابھی۔'' انسپکٹر روشن کی آواز بھی اس کے بدہیئت چہرے اور بدخصلت فطرت کی طرح بھدی تھی۔

ٹھیلے والے نے فوراً اپنا سیل نکالا۔ اس اثنا میں انسپکٹر روشن اپنے ساتھی اہلکاروں کو چاروں طرف پھیل جانے کا

حکم دے رہا تھا۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ صورتِ حال جان لیوا حد تک خطرناک ہورہی تھی۔ اس دوران جیسے قریب ہی بم پھٹا... تھوڑے فاصلے پر بے ہوش پڑے ان دونوں ”سفید پوش“ پولیس اہلکاروں میں سے جو بلاشبہ نذیر اور لالا ہی تھے، ایک کی جیب میں موجود سیل کی بیل گنگنائی۔ میرا اور اول خیر کا رگوں میں دوڑتا خون خشک ہوگیا۔ ادھر جیسے انسپکٹر روشن کو بچھو نے ڈنک مارا۔ اس کے ساتھی اہلکار بھی بری طرح بدکے۔

”ارے سرجی! وہ دونوں تو اُدھر لیٹے پڑے ہیں۔“ ایک نے فوراً آواز کی سمت حرکت کرنے کے بعد تقریباً چلّا کر کہا۔ باقی بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بالآخر وہی ہوا۔ ہم نے جن دونوں کو اناً فناً عقیل کردیا تھا، وہی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہونے لگے۔

”یہ ضرور ان دونوں کی حرکت ہے۔ تم لوگ جاؤ سب تلاش کرو وہ ادھر ہی ہوں گے۔“ میری کھٹکی ہوئی سماعتوں میں انسپکٹر روشن کی بھیڑیے جیسی غراہٹ ٹکرائی۔ دو اہلکار انہیں ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ میں نے پودوں اور پتوں کی آڑ سے دیکھا۔ انسپکٹر غیظ و غضب کے انداز میں پلٹا اور اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ پھر بولا۔ ”چودھری صاحب! شکار تک ہم پہنچ ہی گئے ہیں۔“ پھر اس نے اب تک کی تفصیل مختصراً الفاظ میں دہرا دی۔ پھر دوسری جانب سے کچھ سنتا رہا، اس کے بعد بولا۔ ”آپ فکر نہ کرو، پولیس نے علاقے کو گھیرے میں لے لیا ہے آپ کے آدمیوں کو بھی بتادیا ہے۔ جی... جی... میرا بھی یہی خیال ہے، ہوسکتا ہے شکار بظاہر ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر خود ہی چوہے دان میں آن پھنسا ہے۔ اس نے آپ کے دونوں آدمیوں کو بے بس کرکے سیدھا... خانم شاہ کی رہائش گاہ کا ہی رخ کیا ہوگا... جی... جی چودھری صاحب... لیکن ہم اس طرح اس کی رہائش گاہ میں داخل نہیں ہوسکتے۔ کوئی اور آدمی ہوتا تو میں سب کو چھت سے الٹا لٹکا دیتا... مگر آپ تو جانتے ہی ہیں... یہ ایک خاتون وکیل کا گھر ہے۔ بات ناممکن تو نہیں ہے مگر مشکل ہے۔ میں ابھی اس کا حل سوچتا ہوں۔ ویسے ہم نے مطلوبہ بنگلے کو بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔ میں ابھی اندر جاکر دیکھتا ہوں... پھر آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں... اسے دیکھتے ہی شوٹ کردیا جائے گا۔“

اس نے بات ختم کی... وہ یقیناً اپنے راتب نواز چودھری ممتاز سے بات کررہا تھا۔ وہ قانون کا ایک ذمے دار محافظ ہوتے ہوئے قانون کی جس طرح دھجیاں بکھیر رہا تھا، وہ ماورائے قانون ہی نہیں دائرۂ انسانیت سے بھی خارج نظر آتا تھا... اصولاً اس وقت اسے یہ ساری رپورٹ اپنے محکمے کے افسر کو دینی چاہیے تھی۔

”کاکا! ہم زیادہ دیر یہاں محفوظ نہیں رہ سکتے۔“ میرے ساتھ دبکے بیٹھے اول خیر نے میرے کان میں ہلکی سی سرگوشی کی۔

”اس سے پہلے کہ پولیس کی مزید تعداد یہاں اکٹھی ہو... ہمیں نکلنا چاہیے۔“ میں نے اس کی اس بات پر غور کرنے کے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی.... پودوں کا یہ جھنڈ... زیادہ دیر ہمیں تحفظ نہیں دے سکتا تھا۔

سرکنے کی صورت میں پودوں اور پتوں میں سرسراہٹ کی آواز ایٹم بم کی طرح ابھرنے کے مترادف تھی، کیونکہ وہ دونوں اہلکار بالکل قریب ہی دوسری طرف منہ کیے کھڑے تھے۔ خوف کی وجہ سے ہم نے گویا اپنی سانسیں تک بھی روکے رکھی تھیں۔ میں نے بہت ہلکی سرگوشی میں اس خدشے کا اظہار اول خیر سے بھی کیا کہ ہماری حرکت کی صورت میں ہمیں تحفظ اور پناہ میں لیے ہوئے یہ پودے احتجاجاً چیخ کر ان دونوں پولیس اہلکاروں کو اس طرف متوجہ کرسکتے ہیں۔

اچانک ہی ایک طرف سے پانی کا ٹینکر کھڑکھڑاتا ہوا گزرنے لگا۔ اس کے شور کی آواز خاصی بلند تھی۔ اول خیر نے میرا شانہ دھیرے سے دبایا اور بائیں جانب سرک گیا۔ اس کا مطلب سمجھ کر میں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں پودوں کے جھنڈ کے اندر سے رینگتے ہوئے دونوں اہلکاروں کی نظروں سے بچتے بچاتے خالی پلاٹ والی جگہ پر آگئے اور دیوار سے چپکے چپکے آگے بڑھے۔ اسی وقت ایک تیز آواز ابھری۔

”رک جاؤ... ورنہ گولی ماردوں گا۔“ وہ ایک سفید پوش پولیس اہلکار تھا یا پھر دشمن..... اس نے گویا بم پھاڑ ڈالا تھا، ہم دونوں ــــ خالی پلاٹ کی دیوار کے سرے تک آچکے تھے اور وہ اہلکار ہمارے عقب میں اچانک نمودار ہوا تھا اور غالباً ہمیں یوں چوروں کے سے انداز میں سرکتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

”بھاگ... کاکا!“ اول خیر دھیمے سے بولا اور یک دم مجھے کھینچتا ہوا دیوار کا سرا پار کرگیا۔ عقب میں گولی چلی جو دیوار کے کارنر کو چھیدتی ہوئی گزر گئی، سنگ ریزے میرے چہرے سے ٹکرائے۔ ہم دونوں نے دیوانہ وار دوڑ لگادی۔

عقب میں شور مچ گیا۔ پولیس سائرن کی گونج ہمارے رہے سہے اوسان خطا کرنے کا باعث بننے لگی۔

پولیس شاید ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، کیونکہ جیسے ہی ہم نے ایک بلاک عبور کیا ہماری دائیں جانب دو پولیس اہلکار نمودار ہوئے، ایک کو رائفل سیدھی کر کے فائر کا موقع مل گیا۔ گولی چلی اور میں زد میں آ گیا۔ بھاری رائفل کی تین انچ لمبی گولی کے ڈیڑھ سوت دھاتی ٹکڑے نے میرے بائیں بازو کا گوشت پھاڑ ڈالا، مجھے یوں لگا جیسے میرا بازو کٹ کر الگ ہو گیا ہو۔ میں بھاگتے بھاگتے لڑکھڑایا۔ میری اذیت ناک چیخ نے اول خیر کو تشویش زدہ کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے مجھے گرنے سے سنبھالا دینے کی کوشش چاہی اور دوسرے ہاتھ کی بلاخیز پھرتی سے اس نے اپنے شلوار کے نیفے میں اڑسا ہوا پستول نکال کر یکے بعد دیگرے دو فائر داغ دیے دونوں پولیس اہلکار ہماری طرف پیش قدمی کرتے ہوئے دائیں بائیں دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔

”کاکا! ہوش کر... اس درد کو پی جا۔ وہ درندہ اِدھر ہی ہے۔ وقت نہیں ہے ہمارے پاس، بھاگ۔“

اول خیر نے جوش اور بے بسی کے درد تلے عجیب سی آواز میں مجھ سے کہا اور پھر جیسے میں نے اپنے بازو کی کھولتی ہوئی اذیت کو بھلا دیا۔ آنکھوں اور دماغ میں چھائی دھند سے جنگ کا دورانیہ محض چند سیکنڈوں تک محیط رہا اور پھر جیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ قدم تھوڑے لڑکھڑائے مگر اول خیر کے سہارا دینے پر دوبارہ جم گئے، ہم دوڑنے لگے، دوسرا بلاک پار کیا تو دفعتاً ایک سوزوکی ہمارے عین سامنے آ گئی۔ ڈرائیور اگر بروقت بریک نہیں لگاتا تو اس سے ٹکرا کر ہمارے وجود یقیناً دور جا گرتے۔ اول خیر نے مجھے سنبھالتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر میں جیسے اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔ اول خیر کو حیرت ہوئی وہ منہ کھولے میرا چہرہ تکنے لگا جبکہ میری نظریں سوزوکی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے ہم عمر شخص پر جم کر رہ گئی تھیں اور غالباً اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا اور اس کا چہرہ بھی ہکا بکا سا رہ گیا۔ پولیس کے سائرن گونج رہے تھے۔ دفعتاً ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ وہ مجھے اور میں اسے بھلا کیسے بھول سکتے تھے؟ یہ شوکت حسین عرف شوکی تھا۔ شکیلہ کا بھائی، پہلے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا مگر میں ”اطفال گھر“ کے رہنے والے اپنے اس قدر قریبی ساتھی کو کیسے بھول سکتا تھا، یہ شوکت حسین ہی تھا... شکیلہ کا بھائی، وہی شکیلہ... جسے میں اوکاڑہ کی چنی بائی اور پھر بعد میں شفقت راجا کے بھیڑیا صفت دلال کے شیطانی چنگل سے چھڑا کر لانے میں کامیاب ہوا تھا۔ بعد میں اسے میں نے سرمد بابا کی محفوظ پناہ میں دے دیا تھا۔ اس کے بعد عابدہ نے مجھے بتایا تھا کہ شکیلہ... اپنے بھائی شوکت حسین کے ساتھ چلی گئی تھی اور پھر دونوں بھائی بہن ہنسی خوشی ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ پل کے پل یہ سب باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔

”شہزی بھائی! جلدی کرو... پیچھے سوار ہو جاؤ۔“

شوکی بولا۔ وقت کی نزاکت اور صورتِ حال کا ادراک شاید اسے پہلے ہی سے تھا۔ اسی سبب اس نے بھی شناسائی کلمات میں ذرا بھی وقت ضائع نہ کیا۔ اول خیر کے لیے وہ اجنبی تھا۔ تاہم اس حد تک تو وہ بھی سمجھ ہی گیا تھا کہ ہم دونوں بہرحال ناآشنا نہ تھے۔ تاہم میرے زخمی بازو سے خون رستے دیکھ کر شوکی کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے گئے۔ میں اور اول خیر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر سوزوکی کے پچھلے حصے میں جا سوار ہوئے۔ اس میں فروٹ کی چوبی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور اوپر کینوس چڑھا ہوا تھا کچھ جگہ خالی تھی، کچھ ہم نے پھنس پھنسا کر بنا ڈالی اور سوار ہو گئے۔ شوکی نے سوزوکی آگے بڑھانے میں دیر نہیں لگائی۔ سوزوکی ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور بتدریج اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

ایسی نازک اور خطرناک گھڑی میں جب میں بے رحم موت کی سفاک نظروں کی مِں زد میں تھا، شوکی کا عین وقت پر سامنا ہونا محض اتفاقاً نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں ضرور تائیدِ ایزدی کارفرما تھی۔ مجھے خود پر نیکوکار اور پارسائی کا دعویٰ نہ تھا، نہ ہی میں دودھ کا دھلا تھا۔ میں تو خود ایک گناہ گار انسان تھا اور موقع؟ عافیت و ناعافیت میں اپنے اللہ کے حضور دانستہ و نادانستہ گناہوں کی معافی ہی مانگا کرتا تھا... مگر قدرت کے بھی کچھ مخفی اصول ہوتے ہیں جنہیں وسیع النظری اور گہری سوچ سے سمجھا جا سکتا ہے، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے جیسی مثالیں ایسے ہی نہیں تخلیق ہوئیں۔ زندگی کی پُرعافیت چھاؤں سے پل کے پل موت کے بے رحم شکنجے کی جکڑ میں پھنس جانا اور موت کے اندھیروں کے قعرِ فنا میں لڑھکتے ہوئے اچانک زندگی کی مامون پناہ میں آ جانا... یہ تائیدِ ایزدی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اپنے مضروب بازو کے زخم پر میں نے ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا جس پر تھوڑی سی کوشش سے اول خیر نے اپنی چادر کا ایک کونا پھاڑ کر لپیٹ دیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ زخم کی تکلیف دہ اذیت اور

جلن کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں نے ہونٹ اور دانت بھینچ رکھے تھے۔ اول خیر.... مجھ سے سنبھالنے کے انداز میں لپٹا ہوا تھا اور بار بار کہے جا رہا تھا۔ ''حوصلہ رکھ... کاکے... حوصلہ رکھ یار... ہم خطرے سے باہر ہیں۔ میں صرف اپنے سر کو اثبات میں ہی جنبش دے سکا تھا۔ بازو کی تکلیف معمولی نہ تھی۔ رائفل کی بے رحم گولی نے بازو ادھیڑ ڈالا تھا... مجھے فرسٹ ایڈ کی سخت ضرورت تھی۔ نجانے کتنا خون بہہ چکا تھا اور اب بھی بہہ رہا تھا۔ میں بار بار بھویں اور پپوٹے اچکا اچکا کر خود پر طاری ہونے والی غنودگی کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کب تک، آخر بے ہوشی مجھ پر حملہ آور ہونے میں کامیاب رہی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

بے ہوشی سے ہوش و خرد کے درمیان کتنا وقت بیتا، مجھے نہیں معلوم پر آنکھ کھلنے پر مجھے ایک ہی چہرہ دکھائی دیا... نرم و نازک مہربان چہرہ... کشادہ آنکھوں سے ٹپکتی شہد جیسی مٹھاس جیسے چہروں میں مجھے عابدہ کا ہی چہرہ دکھائی دینے لگتا تھا اور اس چہرے کو بھی دیکھ کر بے اختیار میرے کپکپاتے لبوں سے ''عابدہ'' نکل گیا... مجھ پر جھکے ہوئے خوابناک سے چہرے پر بیداری کی جھلک نمودار ہوئی، اور ایک نرم سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی، وہ دعائیہ کلمات تھے جو میری عابدہ کے لیے اس مہربان نرم و نازک چہرے کے دلآویز ہونٹوں سے برآمد ہوئے۔

''اللہ عابدہ کو اپنی امان میں رکھے شہزی! تمہیں ہوش آ گیا۔''

ہوش میں آتے ہی مجھے سب کچھ یاد آتا چلا گیا اور یہ بھی پہچان گیا کہ میرے سامنے کس کا چہرہ تھا... یہ شکیلہ تھی یہ ایک چھوٹا کمرا تھا مگر بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ایک سیور روشن تھا۔ میں عام سے مگر صاف ستھرے بیڈ پر دراز تھا۔ میرا اوپری بدن برہنہ تھا حسیات جاگیں تو مجھے بازو کی تکلیف کا احساس ہوا۔ جہاں اب ہلکی ہلکی ٹیسیں تو اٹھ رہی تھیں لیکن اس پر اب ایک نرم سی ٹھنڈک کا احساس بھی تھا۔ میں نے سر گھما کر دیکھا وہاں خاصی موٹی سفید رنگ کی بینڈیج بندھی ہوئی تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟'' معاً شکیلہ نے پوچھا۔ وہ میرے قریب بیڈ کی پائنتی پر ٹکی بیٹھی تھی۔ اس کے گھنے بھورے مائل بال نصف شانے پر اور نصف اس کے تیکھے اور پُرکشش چہرے پر جھول رہے تھے۔ اس نے پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کی دلکشی اور حسن و نزاکت میں اضافہ کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اب اپنے بھائی شوکت حسین کے ساتھ نسبتاً بہتر اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں ... مم... مگر میرا ساتھی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''وہ اور بھائی دوسرے کمرے میں باتیں کر رہے ہیں، تمہیں بھوک لگی ہے؟'' اس کے یاد دلانے پر مجھے بھوک کا احساس ہونے لگا مگر حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے زیادہ محسوس ہوئے، میں نے اس سے پانی مانگا۔

قریب رکھی تپائی پر شیشے کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ گلاس میں پانی انڈیل کر شکیلہ مجھے سرہانے سے سہارا دینے کے لیے ایک بار پھر مجھ پر جھک گئی، اس کے بدن کی حرارت اور خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں غٹاغٹ پورا گلاس خالی کر گیا۔

''اور دوں؟'' شکیلہ نے محبت سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں سیدھا ہو کے لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ پھر دوبارہ آنکھیں کھولیں اور قریب بیٹھی شکیلہ سے پوچھا۔ ''میرے بازو کی پٹی کس نے کی ہے؟''

''محلے کے ایک ڈاکٹر کو بلا لیا تھا، اس نے ہی ڈریسنگ کی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ میری آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرائے جنہیں بھانپ کر شکیلہ بولی۔ ''فکر نہ کرو۔ اسے کچھ نہیں بتایا گیا... ویسے بھی اس جیسے نیم حکیم ڈاکٹروں کا مقصد صرف پیسا کمانا ہوتا ہے، انہیں ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ خود کو کسی ایسے معاملے میں پھنسانا پسند کرتے ہیں۔''

''ڈریسنگ تو اس نے صحیح کی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہ اپنے کام میں خاصا تجربہ کار ہے اور کسی اچھے سرجن اور ڈاکٹر کے انڈر طویل عرصے تک کام کرتا رہا ہے، اس کی مہارت کی جھلک نے تمہارے ساتھی کو بھی متاثر کیا تھا ــ یہ ایک کیپسول اور گولی کھا لو تاکہ زخم خراب نہ ہونے پائے۔''

درمیانی دروازے پر کھٹکے کی آواز ابھری۔ میں نے اول خیر اور شوکی کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

شکیلہ سر پر دوپٹا درست کیے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ میرے بیڈ کے قریب ایک سیٹھی نما بینچ سی پڑی تھی

جس پر پرانے کشن سجے تھے۔ وہ دونوں وہاں بیٹھ گئے۔

''کیسے ہو کاکا؟'' اول خیر نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''کافی بہتر ہوں۔'' میں نے مختصراً کہا پھر اس کے ساتھ بیٹھے شوکی سے بولا۔ ''شوکی! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ تم نے خود کو خطرے میں ڈال کر... ہماری جان بچائی۔''

''اور تم نے جو میری پیاری سی بہنا شکیلہ کو مجھ سے ملا کر احسان کیا تھا، کیا وہ تم بھول گئے؟'' شوکی مسکرا کے بولا۔ یہ جملہ اس نے ایک نظر قریب کھڑی اپنی بہن شکیلہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں جھینپی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ارے یار! دوستوں میں کیسا احسان۔ یہ تو فرض ہوتا ہے۔''

''تو پھر میں نے بھی تم پر کوئی احسان نہیں کیا، یہ میرا فرض تھا۔''

''مجھے عابدہ نے تمہارے اور شکیلہ کے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''مگر تم تو سیلز مین تھے یہ سوزوکی ڈرائیور کب سے بن گئے؟''

''چھوڑو یار! لمبی کہانی ہے۔'' وہ بولا۔ میں نے محسوس کیا اس کے چہرے پر ایک لمحے کو سخت کوشی کے آثار نمودار ہوئے جیسے اس سے کوئی تلخ یاد وابستہ ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''اب کیا کرتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''کرائے کی سوزوکی لے رکھی ہے۔ منڈی سے سبزی اور فروٹ اِدھر اُدھر پہنچاتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے اچھی گزر ہو رہی ہے۔ یہ مکان کرائے کا ہے پر یار... شہزی! تمہارے بارے میں خبریں خاص طور پر دیکھتا اور پڑھتا رہا ہوں، مجھے افسوس ہے شہزی! تم ایک لمبے چوڑے گمبھیر معاملے میں پھنسا دیے گئے ہو۔ اس وقت ہم سب اگر اطفال گھر سے آزاد اور ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں تو ایسا صرف تمہاری وجہ سے ہے۔ تم نے ہم لوگوں کی خاطر اپنے اطفال گھر کے ساتھیوں کی خاطر کتنی بہادری اور جانفشانی سے اپنی جان کی بھی پروا کیے بغیر اتنی قربانیاں دی ہیں، وہ ہم کبھی نہیں بھلا سکتے... بلکہ ایک موقع پر تو میں تمہیں غدار اور دشمن بھی سمجھنے لگا تھا مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھا دوست! تم واقعی اس مثال کی زندہ تفسیر ہو کہ انسان کی زندگی کا مقصد دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے دوست۔'' وہ جذباتی ہونے لگا۔

اول خیر میری تعریف پر فخر و خوشی سے پھول کر بولا۔ ''یار! شوکی! میرا یار شہزی بڑا ہیرا بندہ ہے۔ بے شک یہ اپنے لیے نہیں... دوسروں کے لیے جیتا ہے اور جی دار بھی بڑا ہے۔''

''یار شہزی! مجھے اول خیر نے تمہارے مزید حالات سے بھی باخبر کر دیا ہے۔'' شوکی سنجیدہ ہو کر دوبارہ بولا۔ ''یقین کرو... میں خود بھی تم سے ملنا، تمہاری مدد کرنا اور تمہارے کام آنا چاہتا تھا۔ تم یقین کرو، آج تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں اور اول خیر دوسرے کمرے میں یہی تبادلہ خیال کر رہے تھے کہ...''

''میرا خیال ہے... شہزی بھائی کو آرام کرنے دیا جائے، یہ موضوع بعد کے لیے اٹھا لو... کھانا بھی تیار ہے۔'' معاً شکیلہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ دیوار پر لگے سستے سے وال کلاک پر اس وقت دو بج رہے تھے۔ شکیلہ نے بڑی نفاست سے کھانا بنایا تھا۔ میری پشت کے پیچھے بڑا سا گاؤ تکیہ لگایا گیا تھا۔ میں نے اپنے بستر پر ہی کھانا کھایا تھا جبکہ دوسرے بیڈ پر اول خیر اور شوکی نے دستر خوان بچھا کر کھایا تھا۔ شکیلہ نے مرغی کا سالن اور مٹر پلاؤ بنایا تھا۔ میٹھے میں دودھ سوئیاں تھیں۔ میری حالت اور کیفیت کافی سنبھل گئی تھی۔ بعد میں چائے کا دور چلا اور ایک بار پھر ہم محوِ گفتگو ہو گئے۔ میں آسیہ سے بات کرنا چاہتا تھا اور تب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب وہ لائیو پروگرام شوکی کے گھر سے کیا جائے۔ وہ سب میرا چہرہ تکنے لگے جبکہ میں آسیہ کے سیل کا نمبر پنچ کر کے دھڑکتے دل کے ساتھ فون اپنے کان سے لگائے ہوئے تھا۔

آسیہ سے رابطہ ہوا تو وہ کافی متوحش اور تشویش زدہ تھی۔ ظاہر ہے اس کی وجہ میں ہی تھا۔ اس نے پہلے تو میری خیریت پوچھی میں نے مختصراً اپنے بارے میں صرف اس قدر ہی بتایا کہ میں جہاں ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ اپنے زخمی ہونے کا بھی میں نے اسے ابھی نہیں بتایا تھا۔ تب اس نے بتایا کہ اس کی باجی کے بنگلے کے باہر ہونے والی ہلڑ بازی کے باعث ماحول کشیدہ ہو گیا تھا۔ پھر انسپکٹر روشن کی معیت میں پولیس نے خانم شاہ کے گھر کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا تھا مگر اسے زیادہ دخل اندازی کی جرأت نہ ہو سکی۔ تاہم اس کا انداز جارحانہ تھا... مگر زیادہ گل نہ کھلا سکا۔

''زبیر خان کی طرف سے بھی تمہارے حق میں تردیدی بیان جاری ہو چکا ہے۔'' آسیہ نے حسبِ توقع ایک نئی اطلاع دی۔

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس

آخری معرکہ 550/-

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-

اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی المناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 500/-

انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 300/-

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-

اسلام دشمنی پہ تلے ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر۔ تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-

راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور عزم عمل نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-

1965 کی جنگ کے پس منظر میں ہندوؤں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-

سیف خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-

بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-

اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

جہانگیر اردو لغت

(جامع ترین)

مفصل طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدی 199/-

- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر بک ڈپو

022-2780128 042-35757086

042-37220879 051-5539609 021-32765086

’’باجی نے اس کے بیان کو فائل کرلیا ہے۔ اب کسی طرح یہ اہم کام ہوجائے تو پھر تمہارے سلسلے میں کافی مثبت پیش رفت ہونے کی امید ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’سنو آسیہ! میرا خیال ہے اب یہ پروگرام تمہاری باجی کے ہاں ہونا تو ناممکن ہی ہے... کیا تم اس پروگرام کا بندوبست کسی اور مقام پر کرسکتی ہو؟‘‘

’’تم کہاں ہو؟‘‘ اس نے فوراً پوچھا۔

میں نے اسے شوکت حسین اور شکیلہ کے بارے میں مختصراً بتادیا، وہ بولی۔ ’’یہ ٹھیک رہے گا اور یقیناً یہ کافی حد تک محفوظ جگہ بھی ہوگی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بالکل، یہاں مجھے کوئی خطرہ تو نہیں لیکن... تمہاری طرف سے خطرے کا اندیشہ ضرور لاحق رہے گا... تم سمجھ رہی ہوناں میری بات؟‘‘

’’ہاں، میں سمجھ رہی ہوں۔‘‘ وہ میری بات پر غور کرنے کے انداز میں بولی۔ ’’میں بہت محتاط ہوکے گھر سے نکلوں گی، مجھے اپنی بھی خفیہ نگرانی کا یقین کی حد تک شبہ ہے مگر...‘‘

’’تم اپنا حلیہ بدل کر بھی نکل سکتی ہو۔‘‘ میں نے اسے راہ سُجھاتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ پولیس یا دشمن کے آدمی تمہارا تعاقب کرتے ہوئے یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔‘‘

’’ہاں، میں اس بات کا پورا خیال رکھوں گی۔ مگر تم بےفکر رہو۔ میں ان سب کو جُل دے کر نکل آؤں گی۔ تم فکر نہ کرو۔ میں ایسے کام کرنا جانتی ہوں۔‘‘ اس نے تشفی آمیز انداز میں کہا۔

مجھے یہ تسلی تھی وہ ایک عام لڑکی نہیں ہے بلکہ انویسٹی گیٹیو اور کرائم رپورٹر تھی مگر دشمن بھی کم کائیاں نہ تھے۔

’’تم کب تک نکلو گی؟‘‘ میں نے پوچھا۔

جواباً وہ بولی۔ ’’کوشش تو میری جلد از جلد ہوگی کیونکہ ہمیں اس اہم معاملے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔‘‘

’’مگر جلد بازی بھی ہمارے لیے خطرناک ثابت ہوگی۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اس سلسلے میں اس نے ایک بار پھر مجھے تسلی دی اور میرے موجودہ ٹھکانے کا پتا مانگا۔ میں نے شوکی کے گھر کا پتا اسے بتادیا۔

اس کے بعد میں نے سرمد بابا سے بھی بات کی، انہیں بھی مختصراً اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور انہیں تسلی دی کہ بہت جلد سب ٹھیک ہونے والا تھا۔ انہیں میری طرف سے بہت سخت تشویش آمیز فکر لاحق تھی۔ وہ کسی شفیق بزرگ کی طرح ہر وقت میری فکر میں مبتلا رہتے تھے۔

’’میرے بچے! میں تمہارے لیے اللہ کے حضور بہت دعا مانگتا رہتا ہوں۔‘‘ وہ روہانسا ہوکے بولے۔

میں نے کہا۔ ’’بابا! شاید آپ کی دعا کے طفیل ہی اب تک زندہ ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘ لمحہ بھر توقف کے دوران دوسری جانب سے مجھے بابا کے زیرِلب ’’آمین‘‘ کہنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے کہا۔ ’’بابا! عابدہ سے تو میری دوبارہ بات نہ ہوسکی تھی۔ کیا وہ خیریت سے امریکا پہنچ گئی ہے؟‘‘

عابدہ سے متعلق پوچھتے سے میرا دل بےقابو سا ہونے لگا تھا۔ بابا نے تسلی دی کہ ائرپورٹ پر اترتے ہی اپنے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی۔ عارفہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ عابدہ بہت مضبوط اعصاب کی لڑکی ہے۔ ابتدا میں وہ تھوڑا گھبرا رہی تھی مگر اب اس نے خود کو کافی سنبھال لیا ہے اور میرا پورا خیال بھی رکھ رہی ہے وغیرہ۔ تاہم وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے بھی بےچین ہورہی تھی، عارفہ نے کہا تھا کہ وہ ...... نئے نمبر سے کسی وقت اور بہت جلد مجھ سے رابطہ کرے گی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے اندر مچلنے والی نامعلوم سی بےچینی کو کم کرنے کی کوشش چاہی اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔

مجھے خود بھی عارفہ کے فون کا بےچینی سے انتظار تھا۔ نہ جانے کیوں جب سے عابدہ ہزاروں میل دور امریکا عازمِ سفر ہوئی تھی، مجھے ایک بےنام سی بےکلی نے گھیر رکھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک شہر سے دوسرے شہر نہیں بلکہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم کو سدھار چکی تھی۔ بےشک اس میں ایک نیک مقصد ہی کا جذبہ کارفرما تھا۔ عارفہ کی صحت یابی اور ان کے بہ خیروعافیت .... امریکا سے پاکستان لوٹ آنے کے لیے میں دعاگو بھی تھا۔ عارفہ کے علاج معالجے اور ان کی واپسی ایک ماہ کے اندر ہی متوقع تھی مگر یہ ایک ماہ کا عرصہ مجھے ایک صدی کے برابر محسوس ہونے لگا تھا۔

’’آسیہ نے کیا کہا؟‘‘ اول خیر نے مجھے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اسے آسیہ کے پروگرام سے آگاہ کردیا۔ شوکت اور شکیلہ کا بھی خیال اور مشورہ یہی تھا کہ اب آسیہ والی میڈیا کارروائی ادھر ہی نمٹانا زیادہ بہتر ہے۔

’’بس اب دعا کرو کہ آسیہ بہ خیروعافیت یہاں پہنچ جائے۔‘‘ اول خیر نے پُراندیش لہجے میں کہا۔

پھکو ادیب (مالک مکان سے): ''آج سے چند سال بعد لوگ کہا کریں گے۔ اس مکان میں ملک کا ایک نامور ادیب رہا کرتا تھا۔''

مالک مکان: ''جناب، اگر آپ نے پچھلے چھ ماہ کا کرایہ آج شام تک ادا نہ کر دیا تو لوگ یہ بات کل ہی سے کہنا شروع کر دیں گے۔''

میں نے شوکت کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کے چہرے سے کوئی ڈر و خوف کے آثار نظر نہیں آئے۔ دونوں بہن بھائی بڑے کھلے دل کے تھے۔ وہ دونوں بھی کم و بیش اسی قسم کے حالات سے گزرتے رہے تھے مگر پھر بھی مجھے ان کا احساس تھا لہٰذا میں نے شوکی کی طرف تکتے ہوئے ممنون لہجے میں کہا۔

''یار شوکی! ہماری وجہ سے تم...''

''بس... بس... آگے کچھ مت کہنا۔'' شوکی نے فوراً میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

''یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا جس سے ہمیں کسی قسم کا خطرہ ہو اور ہو بھی تو مجھے پروا نہیں بلکہ مجھے خوشی ہو گی کہ ہم بھی تمہارے کسی کام آسکیں۔'' بھائی کی بات پر شکیلہ بھی بولی۔

''ہاں شہزی بھائی! آپ نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اب تک ہمارے لیے جو کچھ کیا، اس کا تو یہ عشرِ عشیر بھی نہیں، اللہ آپ کے حالات جلد سے جلد بہتر کرے۔ آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔''

''تم دونوں کے خلوص کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''درحقیقت یہ آخری اسٹیپ ہی میری زندگی کا ایک اہم موڑ ثابت ہونے والا ہے۔ اس سے عام لوگ اصل حقائق سے آگاہ ہو جائیں گے اور میری قانونی پوزیشن بھی بہتر ہو جائے گی۔ قوی امکان ہے کہ میری بریت بھی ہو جائے۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' شکیلہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تو اول خیر اور شوکی نے بھی ہولے سے انشاء اللہ کہا۔

میں نے اول خیر کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

''میرا خیال ہے اس سلسلے میں آسیہ کو اکیلے یہ نازک مگر اہم قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔''

ابھی ہم سب اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھ ہی رہے تھے کہ اس نے خود ہی اپنی بات کی وضاحت بھی کر دی۔

''تمہارا کیا خیال ہے کاکے! آسیہ کو یہ قدم اٹھانے سے پہلے میجر باجوہ صاحب کو اعتماد میں نہیں لینا چاہیے۔ میرا مطلب ہے اگر وہ انہیں اپنے اس اقدام کے بارے میں آگاہ کر دے اور ان کی مدد سے یہاں...''

''نہیں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر اور مطلب بھی سمجھ کر... قطعیت سے کہا۔ ''اس پر میں پہلے غور کر چکا۔ یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا مگر ابھی یہ قبل از وقت ہو گا، یہ ایک طرح سے پریس ریلیز ہے۔ جس کا براہِ راست تعلق... عوام اور رائے عامہ سے ہے۔ ایسے کسی لائیو پروگرام میں ایک ذمے دار سرکاری افسر کی شمولیت کو اول تو میجر باجوہ قبول ہی نہیں کریں گے، الٹا وہ کوئی اور قانونی اور پیچیدہ راستے پر ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ جس میں خطرات بہت زیادہ ہیں۔ ابھی تو ہم انہیں یہ بھی باور نہیں کروا سکے ہیں کہ انسپکٹر روشن کا سلوک میرے ساتھ ماورائے قانون، ذاتی مخاصمت اور جانبدارانہ رہا ہے۔ انسپکٹر روشن کی ماورائے قانون ریشہ دوانیوں کے منہ زور گھوڑے کو سرِعام لگام دینے کے لیے فی الوقت یہ لائیو پروگرام نشر ہونا ضروری ہے، کسی ذمے دار اور فرض شناس قانونی اہلکار کو شامل کیے بغیر۔'' سب نے میری بات پر صاد کیا۔ سر کو جنبش دیتے ہوئے اول خیر نے مجھ سے توصیفی لہجے میں کہا۔

''او خیر کا کا... تیرا ذہن تو باریک بینی سے اور دور تک گتھیاں کھنگالتا ہے۔''

میں نے شکیلہ اور پھر شوکی کی طرف دیکھ کر خاصے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آسیہ بلاشبہ ایک خطرناک اور رسکی قدم اٹھانے جا رہی ہے۔ تم دونوں کو احساس تو ہوگا... اس میں تمہارے لیے بھی خطرہ ہو سکتا ہے... میں نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو مگر...''

''یار شہزی! یہ تم بار بار پٹری سے اترنے کیوں لگ جاتے ہو؟'' شوکی نے میری طرف دیکھ کر یک دم بات کاٹی۔ شکیلہ بھی اس کی بات پر کھلے دل سے مسکرا دی۔

''آخر کو آسیہ بھی تو ہے نا... اس نے اپنے منگیتر ریحان اور اپنی جان محض تمہاری خاطر خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ بے شک ایسا وہ اپنی ایک غلطی کے ازالے کے طور پر کر رہی ہے مگر فی زمانہ کوئی اپنا قصور، اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ اس پر مستزاد عملی طور پر اس کے ازالے

کا بھی مظاہرہ کرے۔'' شکیلہ نے آسیہ کے سلسلے میں اچھا خاصا تبصرہ کر ڈالا۔ شوکی میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔

''شہزی! اب دوبارہ ایسی بات نہ کرنا یار! تم نے ہماری خاطر بھی تو بہت کچھ کیا ہے، اب دعا کرو کہ آسیہ خیریت سے یہاں تک پہنچ جائے۔''

میرا اپنا ارادہ یہی تھا کہ یہ پروگرام ہوتے ہی میں اور اول خیر یہاں سے فوراً کوچ کر جائیں۔ ایڈووکیٹ خانم شاہ میرے کیس کے سلسلے میں تمام پیپر ورک مکمل کر چکی تھی۔ اس پروگرام کے لائیو آن ائر ہوتے ہی اس کی ویڈیو کلپ، زبیر خان کا تردیدی بیان اور نوشابہ سے متعلق حقیقت تک سارا ہوم ورک کرنے کو وہ تیار بیٹھی تھی۔

سہ پہر کے چار بج چکے تھے۔ ہم چاروں ایک کمرے میں موجود تھے۔ میرے زخمی بازو کی ٹیسیں کچھ کم ہوئی تھیں۔ شکیلہ اس درمیان میں چائے بنا لائی تھی۔ دو گھنٹوں میں چائے کا یہ دوسرا دور تھا۔ ہم سب آسیہ کے بہ خیر و عافیت یہاں پہنچنے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجی اور بند ہوگئی۔ میں ذرا چونکا۔ اسکرین پر نمبر دیکھا۔ اچانک دوبارہ بیل بجی۔ میں بیڈ پر سکڑ کر اسکرین پر ابھرنے والے نمبر کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا نمبر نامعلوم تھا مگر اس کے ڈیجیٹلو کی تعداد زیادہ تھی مجھے حیرت ہوئی، تب اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ یہ بیرون ملک سے آنے والی کال تھی یکلخت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں اور فوراً سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ میرے ہیلو کہنے کے پورے دو تین سیکنڈوں بعد عابدہ کی آواز ابھری۔ میرا پورا وجود مرتعش ہونے لگا۔

''شہزی!... میں بول رہی ہوں عابدہ۔''

''ہا... ہاں... ہاں... میں سن رہا ہوں... تم... کک... کیسی ہو... خیریت سے پہنچ گئی ہو ناں؟'' ایک دو سیکنڈ بعد عابدہ کی آواز ابھری۔

فاصلہ طویل ہونے کے باعث ایک دو سیکنڈ کا وقفہ درمیان میں آتا تھا۔

وہ بولی۔ ''ہاں ہم خیریت سے پہنچ گئے ہیں۔ یہاں نیویارک سٹی کے ایک اسپتال میں ہیں۔ عارفہ باجی کے ڈاکٹرز نے کچھ ٹیسٹ لیے ہیں۔ ان کے رزلٹ آتے ہی ان کا آپریشن کر دیا جائے گا۔'' مجھ سے ہزاروں میل دوری سے باتیں کرتے اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت اسی اسپتال کے لینڈ لائن نمبر سے بات کر رہی ہے۔

''شہزی! تم میری فکر مت کرنا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اپنی خیریت سے آگاہ کرو۔ تمہارا معاملہ کہاں تک پہنچا؟'' وہ متفکر ہونے لگی۔ میں نے اسے اپنی طرف سے بھی حوصلہ افزا اطلاع دینا ضروری سمجھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

''عارفہ باجی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ لو ان سے بات کرو۔''

عارفہ سے بات کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عابدہ ایک لمحے کے لیے بھی فون سے دور ہو مگر مجبوری تھی، تھوڑی دیر بعد ایک کمزور سی آواز ابھری۔

''کیسے ہو شہزاد؟'' میں اپنے بارے میں بھلا اسے کیا بتاتا۔ وہ خود بسترِ مرگ پر تھی لہٰذا میں نے اس کی طبیعت پوچھی۔

''آپ کیسی ہیں؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس دعا کرو • آپریشن کامیاب ہو جائے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

''شہزاد! میں دراصل تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ یہ تمہاری بہرحال بڑی قربانی ہے کہ تم نے عابدہ کو اتنی دور بھیجنے کی اجازت دی۔''

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا عارفہ صاحبہ! سرمد بابا کے مجھ پر اور عابدہ پر اس سے زیادہ بڑے احسانات ہیں اور پھر وہ ہم دونوں کو اپنے بچوں جیسا ہی سمجھتے ہیں۔ ہماری تو بس یہی دعا ہے کہ آپ جلدی اور مکمل صحت یاب ہو کے دوبارہ وطن واپس لوٹ آئیں۔''

عارفہ سے واجبی سی گفتگو کرنے کے بعد میری آخر میں عابدہ سے بات ہوئی مگر اسے مجھ سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا اور لائن کٹ گئی یا پھر شاید اسپتال کی انتظامیہ نے اتنا ہی وقت دے رکھا تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی بہرطور... عابدہ سے گفتگو کر کے میرے دل کی کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ جانے کیا بات تھی جب میں عابدہ سے بات کر لیتا تھا تو دل کو عجیب سی تسکین محسوس ہوتی تھی میرے حوصلے مزید بلند ہونے لگتے تھے، میری طوفانوں میں گھری... زندگی کو سکون ملنے لگتے تھا۔

اول خیر، شکیلہ اور شوکت حسین خاموشی سے بیٹھے میرا چہرہ تک رہے تھے۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کر

[illegible]

کے اول خیر کی طرف دیکھا اور رائے طلب لہجے میں پوچھا۔

''آسیہ سے رابطہ کیا جائے؟''

''کر کے دیکھ لو... اس کی مہم کہاں تک پہنچی ہے؟'' اس نے کہا۔ میں نے دھڑکتے دل سے آسیہ کا نمبر ملایا۔ رابطہ ہوتے ہی اس کی پُرتشویش آواز ابھری۔

''شہزی! مجھے کوئی بڑی گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہونے لگیں۔

''کیوں خیریت؟ تم ابھی نکلی نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دو تین بار کوشش کر چکی ہوں۔'' وہ جواباً فکرمندی سے بولی۔''مگر مجھے واپس لوٹنا پڑا۔ بہت سخت نگرانی ہورہی ہے۔ ایک بار تو مجھے بھی گھیرنے کی کوشش کی گئی تھی، بڑی مشکل سے واپس گھر لوٹی تھی۔ شہزاد! ممتاز خان نے سارا زور اس طرف لگا رکھا ہے، مجھے دال میں کالا لگتا ہے۔ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے ممتاز خان کو پہلے ہی سے ہماری مہم کا پتا لگ گیا ہے۔''

اس کی بات سن کر میرے ذہن رسا میں جھماکا ہوا۔ ممتاز خان کو ہماری مہم کا پتا لگنے کا اندیشہ بعید از قیاس نہیں ہو سکتا تھا۔ ان عوامل اور تازہ صورت حال پر تھوڑا غور کرنے کی ضرورت تھی۔ میں نے آسیہ سے دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر فون بند کیا اور اول خیر کی طرف متوجہ ہوا، پھر اسے آسیہ کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ ممتاز خان کو ہماری مہم سے آگاہ کرنے والا یاسین ملک بھی ہوسکتا ہے، میں نے سوچا۔ اس کی وجہ بڑی ٹھوس تھی۔ بے شک اس نے زبیر خان کے دباؤ یا روپے پیسے کے لالچ میں ہم سے تعاون کرنے پر آمادگی ظاہر کردی تھی لیکن یہ معاملہ اس کے اپنے نجی ٹی وی چینل کی ساکھ کا بھی تھا۔ بھلا کون سا ایسا ٹی وی چینل ہوسکتا تھا جو پہلے اپنے رپورٹر کی ویڈیو کلپ دکھانے کے بعد اس کی تردید میں دوبارہ ایک نئی ویڈیو کلپ لائیو دکھاتا۔ یہی بات مجھے پہلے بھی کھٹک رہی تھی۔

جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو اول خیر غصے سے دانت پیس کر بولا۔''مجھے بھی اس ضمیر فروش یاسین ملک پر پہلے سے شبہ تھا مگر دل نہیں مانتا تھا کہ وہ درونِ خانہ ممتاز خان کے ساتھ ساز باز کرلے گا۔''

''اسی میں اس کا مفاد تھا۔ یاسین ملک ہمیں ڈبل کراس کررہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آرہی ہے۔'' شوکی نے کہا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

ہم سب مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔

''فرض کرلیا جائے کہ ہمارا یاسین ملک والا اندیشہ درست بھی ہوتو... دشمنوں کو وسیع تر مفاد کے لیے آسیہ کا راستہ کھوٹا کرنے کے بجائے اس کا تعاقب کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ انہیں اپنے شکار... یعنی خدانخواستہ تم تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ انہوں نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

شوکی کی بات غور طلب تھی۔ جس سے میرا خیال باطل ثابت ہوتا تھا کہ یاسین ملک نے درمیان میں کوئی چکر چلایا تھا مگر فوراً ہی اس کی بہن شکیلہ نے توجیہہ پیش کردی۔

''اس کے باوجود ہمیں یاسین ملک والے خدشے کو صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ باتیں دونوں ہی ہوسکتی ہیں۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا صبح میں خانم شاہ کی رہائش گاہ کے قریب پولیس اور دشمنوں سے ہونے والا تازہ ٹکراؤ بھی چودھری ممتاز خان کی ساری توجہ اس طرف مرکوز کرنے کا باعث بن سکتا ہے پھر آسیہ بھی کوئی معمولی لڑکی تو نہیں تھی کہ منہ اٹھائے یہاں آنے کے لیے نکل پڑتی۔ ممکن ہے دشمنوں یا ''سفید پوش'' پولیس نے آسیہ کی خفیہ نگرانی یا تعاقب کیا، آسیہ پہلے ہی سے غیر معمولی طور پر محتاط تھی اس لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ یہاں آنے کے بجائے واپس پلٹ گئی۔''

اس پر اول خیر نے میری آسیہ سے فون پر ہونے والی گفتگو کی ایک بات پر توجہ دلاتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار بھی کرڈالا۔

''تم یہ بھی تو بتا رہے تھے کہ بقول آسیہ کہ... کچھ مشتبہ افراد نے اسے گھیرنے کی بھی کوشش چاہی تھی اگر انہیں صرف آسیہ کا تعاقب کرنا مقصود ہوتا تو پھر وہ ایسا کیوں کرتے؟ انہیں آسیہ کو نکلنے کا موقع دینا چاہیے تھا۔''

بات الجھ گئی تھی۔ میرا اپنا ذہن چکرانے لگا۔ ایک متوقع خدشے کی تائید ہوتی تو دوسرے لمحے اس کی تردید ہو جاتی، ہر بات مائنس اینڈ پلس کی کسوٹی پر برابر قرار پاتی جاتی۔ بالآخر میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے، یہ عمل صبر وتحمل اور غیر معمولی محتاط روی سے کام کرنے کا متقاضی ہے... دشمنوں کو بہرحال ہمارے اس اہم قدم اٹھانے کی بھنک پڑ چکی ہے۔''

اس دوران میں ہم نے ٹی وی آن رکھا تھا۔ شکیلہ ٹی وی کیبل پر مختلف نیوز چینلز کو آن آف کررہی تھی، آسیہ نے مجھے بتایا تھا کہ زبیر خان کا تردیدی بیان اخباروں میں بھی آچکا تھا جسے خانم شاہ فائل کرچکی تھی۔ اب....آخری مرحلہ ہی باقی بچا تھا۔ اس کے بعد وہ میری طرف سے عدالت میں صفائی پیش کرنے کا مقدمہ داخل کرتی۔ ہم سب گومگو سے بیٹھے تھے کہ اول خیر نے ایک مشورہ دیا۔

''کیا خیال ہے اس سلسلے میں زبیر خان کی مدد کیوں نہ لی جائے جبکہ وہ یہ مشورہ تمہیں دے بھی چکا ہے کہ ہم اس کی طرف کوچ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔'' میں نے زبیر خان کے اس مشورے کو قابلِ عمل نہیں سمجھا تھا مگر اب ان مخدوش حالات میں اول خیر کے یاد دلانے پر مجھے بھی غور کرنے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی مگر اس میں کئی قباحتیں تھیں۔ اس سلسلے میں شوکت اور شکیلہ نے تو کوئی دخل نہ دیا البتہ میں نے ہی کہا۔

''مگر یہ ہمارا اور زیادہ خطرناک عمل ہوگا اس کے لیے ہمیں ہی نہیں... آسیہ کو بھی... کئی گھنٹوں کا طویل سفر کرنا ہوگا کھلاں والی نزدیک نہیں ہے جبکہ آسیہ بے چاری کا تو یہاں پہنچنا ہی محال ہورہا ہے۔''

''آسیہ کے یہاں آنے اور کھلاں والی پہنچنے میں زمین آسمان کا فرق ہوگا کاکے!'' اول خیر پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ہم تینوں سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگے۔ لہٰذا اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''وہ لوگ آسیہ کے اس طویل سفر سے بھنک بھی سکتے ہیں، وہ یہی سمجھیں گے کہ آسیہ نے اپنے گھر لاہور کی راہ لی ہے۔''

''اسے اغوا بھی تو کیا جاسکتا ہے؟'' میں نے فوراً کہا۔ اس پر اول خیر کو چپ سی لگ گئی۔ اچانک میں نے سوچا اب آسیہ سے رابطہ کرلینا چاہیے کیونکہ سرِدست ہم اس مسئلے کا کوئی حل نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اب اس سے پوچھنا تھا کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، ابھی میں آسیہ سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی کال آگئی۔ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے اس کی کال وصول کی اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے بے ہنگم شور کی آواز سنائی دی۔ جس سے یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا۔ پہلا خیال میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ آسیہ اب گھر کی خاموش اور پُرسکون فضا کے بجائے کہیں باہر تھی۔ دوسرے لمحے ہی اس کی پرجوش آواز ابھری۔

''شہزی! میں کسی طرح باہر نکلنے میں کامیاب ہوچکی ہوں اور شاید... میرا خیال ہے میں نے انہیں جُل دینے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے۔''

اس خوش کن اطلاع پر میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ میں پُرمسرت لہجے میں بولا۔ ''خدا تمہاری مدد کرے۔ یہ موقع تمہیں کیسے ملا؟ اور تم ابھی کہاں ہو؟'' جواباً اس کی آواز ابھری۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں، بس ایک موقع مل گیا تھا۔ ایک گزرتے ہوئے احتجاجی جلوس کی ریلی میں داخل ہوگئی تھی، آگے جاکر میں لوگوں کے سمندر سے نکل آئی اور اب ایک رکشے میں سوار ہوں۔ تم پلیز جلدی سے مجھے ایک بار پھر اپنے دوست شوکت حسین کے گھر کا پتا سمجھا دو۔''

میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اسے دوبارہ سے پتا سمجھا دیا اور اسے مزید محتاط رہنے کی تلقین بھی کر ڈالی۔ اس کے بعد آسیہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میری گفتگو سے اول خیر وغیرہ بھی سمجھ چکے تھے، تاہم میں نے اندیشوں اور خطرات میں گھری اس خوش خبری سے انہیں بھی آگاہ کر دیا۔ آسیہ اب کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ اب نجانے کیوں میرے دل و دماغ میں بار بار یہ وسوسے اور نجانے... خدشات چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ کیا آسیہ کی صورت میں یہاں خطرات کی یلغار ہونے والی ہے۔ یقیناً اس کی لپیٹ میں شوکت حسین اور شکیلہ بھی آسکتے تھے۔ تاہم مجھے آسیہ پر مکمل بھروسا تھا کہ اس... خطرناکی کا احساس اسے بھی پورا پورا تھا۔ اسی لیے وہ..... یہاں آتے ہوئے ذرا سی بھی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرے گی۔ اب ہم چاروں آسیہ کے بہ خیر و عافیت کامیابی سے یہاں پہنچنے کی دعائیں ہی کر سکتے تھے۔

☆☆☆

ایک گھنٹا بیت گیا۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ گھر کے ایک کمرے میں ہم چاروں دم بہ خود سے بیٹھے تھے۔ کمرے میں سناٹے کی فضا تھی، یہ خاموشی دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا جیسے اس کے ساتھ ہمارے دم بہ خود وجود بھی دھڑک رہے ہوں اور ہم جیسے کسی بڑے طوفان کی متوقع آمد کے منتظر بیٹھے ہوں۔ میرے بازو کے زخم میں اب درد بھی نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا مگر ہلانے جلانے سے ہلکی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ بہ قول شوکی کے ڈاکٹر نے مجھے درد کا ٹیکا لگا دیا ہے... کچھ گولیاں، کیپسول تپائی پر ایک چھوٹے کاغذی پڑے میں لپٹے پڑے تھے جس کی ایک خوراک شکیلہ مجھے دے چکی تھی تاہم میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا تھا۔

اول خیر نے مجھے آسیہ سے رابطہ کرنے کو کہا۔ اسے تشویش ہونے لگی کہ آسیہ اب تک کیوں نہیں پہنچی تھی؟

اس دوران میں شوکت سودا سلف لینے باہر چلا گیا اور شکیلہ نے باہر صحن کا رخ کیا۔ میں اور اول خیر اب کمرے میں اکیلے موجود تھے۔ میں نے آسیہ کے سیل پر رابطہ کیا۔ اس نے مجھے تسلی بخش اطلاع دی۔

''شہزی! میں دو تین رکشے بدل چکی ہوں... وجہ تم جانتے ہو۔ اب میں سیدھی تمہاری طرف ہی آرہی ہوں... او کے بائے۔'' اس نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے اول خیر کو بتا دیا۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ آسیہ کی طرف سے تاخیر دانستہ تھی۔ وہ ایسا احتیاط کے پیشِ نظر کر رہی تھی۔

آسیہ اب کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی تھی۔ میرے دل کو نجانے کیوں ایک بار پھر نامعلوم سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔ شاید ان حالات میں یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ کمرے میں رکھا پانی کا جگ خالی تھا۔ اس کے ساتھ گلاس رکھا تھا۔ اول خیر نے میری نظریں بھانپ لیں۔

''پانی پینا ہے؟''

''ہاں یار! پیاس لگی ہے۔''

''شکیلہ بہن کو آواز دوں؟''

''نہیں، میں خود لے آتا ہوں پانی۔'' میں نے اسے شکیلہ کو آواز دینے سے منع کر دیا اور چارپائی سے کھڑا ہونے لگا تو اول خیر نے مجھے فوراً آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ مجھے چکر سا آیا مگر میں نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔

''یار کاکے! میں خود چلا جاتا مگر اچھا نہیں لگتا شکیلہ میری بہن جیسی ہے پر یار! تیری بات اور ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں یار! اس لیے تو خود جا رہا ہوں۔ تو بیٹھ، وہ بے چاری پہلے ہی ہماری بہت خدمت کر رہی ہے۔ میری تیاررداری بھی اسی نے کی۔ میں اسے بار بار بلا کر تنگ نہیں کرنا چاہ رہا۔'' میں نے اس کی بات سمجھ کر کہا اور پھر کمرے سے باہر صحن میں آگیا۔ خالی گلاس میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔

میرے سیدھے ہاتھ پر کچن تھا وہاں موجود شکیلہ پر میری نگاہ پڑ گئی۔ وہ شاید رات کے لیے کچھ تیار کر رہی تھی۔ وہ چوبی پٹڑے (چوکی) پر بیٹھی تھی۔ چوکی پر بیٹھنے کی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ اس پر خاص انداز سے بیٹھ کر ہی کام کیا جا سکتا ہے اور جس ''خاص'' انداز میں شکیلہ بیٹھی تھی، اس نے مجھے اس کی طرف سے نظریں جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کا بھرا بھرا کسا ہوا شہابی گداز بدن کمان کی طرح کھنچا ہوا تھا۔

دوپٹا، احتیاط کے پیش نظر اتار کر اس نے قریب چارپائی پر رکھ چھوڑا تھا۔ نصف آستین سے جھانکتے اس کے بھرے بھرے گورے بازو بھی نمایاں تھے۔ میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور ساتھ ہی تھوڑا سا کھنکارا بھی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ لپک کر پہلے دوپٹا اٹھانے کی کوشش کرے گی مگر میری آہٹ پاتے ہی بولی۔

''اوسوری! میں پانی کا جگ بھر کے رکھنا بھول گئی۔''

اس نے شاید میرے ہاتھ میں پکڑا خالی گلاس بھی دیکھ لیا تھا۔

''نہیں کوئی بات نہیں، میں خود پانی لے لیتا ہوں... کہاں رکھا ہے پانی؟'' میں نے اسے اٹھنے کی زحمت سے بچانے کی غرض سے کہا مگر وہ ایسے ہی رسوئی سے اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ اس نے دوپٹا ابھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ میرے بازو پر بندھی بینڈیج کو دیکھ کر بولی۔

''درد تو نہیں ہو رہا اب؟ لاؤ گلاس دو مجھے... تم اندر چلو میں پانی لاتی ہوں...'' میں نے خالی گلاس اس کی طرف بڑھا دیا۔ ناچار نظریں اٹھانا پڑیں۔ تنگ اور اونچی آستینوں کی قمیص کا گلا بھی ''ڈی'' کی صورت کشادہ تھا۔ اس کی ہوش ربائی سے بچنے کی خاطر میں نے پھر اپنی نظروں کا زاویہ اس کی طرف سے پھیر لیا اور کمرے کی جانب مڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک دوسرا پانی سے بھرا جگ اٹھا لائی۔ گلاس بھی پکڑ رکھا تھا۔ اب اس نے دوپٹا لے رکھا تھا میں اور اول خیر چارپائی پر بیٹھے تھے۔ شکیلہ نے پانی سے بھرا جگ اور گلاس رکھا پھر خالی جگ اٹھا کر مجھ سے بولی۔

''آسیہ کا کچھ پتا چلا؟''

''ہاں، وہ آرہی ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''بہت دیر کر دی اس نے پہنچنے میں۔'' شکیلہ نے کہتے ہوئے وہیں کھڑے ذرا جھک کر ایک ہاتھ سے میز پر دھرے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پھر گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے شکریہ کہہ کر گلاس اس کے ہاتھ سے لیا اور جواباً اسے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی آسیہ سے گفتگو کے بارے میں اسے بتا دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ میں نے پانی پیا۔ اول خیر کو بھی پیاس لگ گئی۔ وہ اپنے لیے دوسرے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا۔ میں نے اول خیر سے پرسوچ لہجے میں کہا۔

''یار! میں چاہ رہا تھا آسیہ کے یہاں پہنچنے تک ہم میں سے کسی ایک کو گھر سے باہر ذرا فاصلے پر کھڑے ہو کے کسی مشتبہ نقل و حرکت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیے۔''

''خیال تو برا نہیں ہے تیرا... کاکے۔'' پانی کا گلاس خالی کر کے اسے تپائی پر رکھتے ہوئے اول خیر نے میرے خیال کی تائید میں کہا۔ ''لیکن یہ کام کم از کم میں اور تو تو انجام نہیں دے سکتے۔''

''شوکت کرے گا یہ کام۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''وہ آسیہ کے یہاں بہ خیر و عافیت پہنچ جانے کے بعد تھوڑی دیر تک گردوپیش پر نظر رکھے گا کہ کہیں کوئی آسیہ کے تعاقب میں یہاں تک آنے میں کامیاب تو نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد وہ بھی اندر آجائے گا۔''

''ہاں شوکت باہر ہی گیا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے اسے فون پر بتا دو؟'' اول خیر نے کہا۔ میں نے سیل لگا کر شوکی سے رابطہ کیا۔ وہ سودا لے کر گھر ہی آرہا تھا۔ میں نے اسے ساری بات سمجھا دی۔ اور پوچھ بھی لیا کہ اس کے ہاتھوں میں زیادہ بھاری سامان تو نہیں ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ کچھ خاص سامان نہیں، وہ گھر کے پاس ذرا فاصلے پر بنے ایک سگریٹ کیبن والے کے پاس کھڑا ہو جائے گا اور یونہی گپ شپ لگاتے ہوئے گردوپیش پر نظر رکھے گا۔ ہم آسیہ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔

اپنی آخری گفتگو میں آسیہ نے بتایا تھا کہ وہ رکشا گھر سے دور ہی کھڑا کر کے اتر جائے گی اور پھر اسے فارغ کر کے پیدل آگے بڑھے گی۔

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم دونوں ٹھٹکے۔ یقینا یہ آسیہ ہی تھی۔ ہم دونوں ہی کمرے سے باہر صحن میں آگئے۔ شکیلہ بھی کچن سے نکل آئی تھی۔ بالآخر میں نے ہی آگے بڑھ کر دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا اور... دروازہ کھلتے ہی یک دم آسیہ مجھے دیکھتے ہی ''غڑاپ'' سے اندر داخل ہو گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بڑا سا ہینڈ بیگ بھی تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اس نے رکشے والے کو گھر سے کچھ زیادہ ہی فاصلے پر چھوڑ دیا تھا اور پیدل آتے ہوئے۔ یہاں تک وہ خاصی ہانپ گئی تھی۔ شکیلہ سے اس کی یہ پہلی ملاقات تھی، غائبانہ تعارف تھا... ہم اسے اندر کمرے میں لے آئے۔ وہ میرے بازو میں بندھی پٹی کو دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ میں نے مختصراً لفظوں میں اسے بتا دیا۔ اور تسلی بھی دی کہ ہڈی بچ گئی ہے بازو کی...

شکیلہ اس کے لیے پانی کا گلاس بھر لائی۔ اس نے پانی پیا اور ذرا دیر تک اپنے حواس بحال کرتی رہی۔

اول خیر کو میں نے دیکھا، وہ فوراً باہر دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اندر کمرے میں آسیہ کو شکیلہ کے ساتھ چھوڑ کر

میں بھی باہر صحن میں آ گیا...... اول خیر بڑے محتاط انداز میں بیرونی دروازے کی باریک متوازی جھری سے باہر دیکھ رہا تھا... اور چند منٹوں تک اسی طرح رہا پھر پلٹا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پوچھا۔ ''سب ٹھیک ہے؟''

''ہاں، اب تک تو ٹھیک ہے تو... شوکت سے رابطہ کر کے اپنا سیل مجھے دے۔'' اس نے کہا۔ میں نے فوراً شوکت سے رابطہ کیا اور کہا۔

''اول خیر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' پھر سیل اول خیر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شوکت سے بات کی شوکت نے اسے بتایا کہ اس نے ایک لڑکی (آسیہ) کو بڑا سا ہینڈ بیگ اٹھائے اپنے گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہے۔

''گڈ! اب ایک کام کرو شوکی بادشاہ! ذرا مٹرگشت کے انداز میں پچیس تیس قدموں تک دائیں بائیں اور سامنے چہل قدمی کرو اور گرد و پیش کا جائزہ لو... تم پندرہ بیس منٹ بعد گھر میں داخل ہو جانا۔''

شوکت عرف شوکی کو یہ ہدایت دینے کے بعد اول خیر نے مجھے سیل فون لوٹا دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ مگر وہ ویسے ہی کھڑا رہا اور تھوڑی دیر بعد خود بھی آگے بڑھ کر دروازے تک جاتا اور اس کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگتا۔

وہ یہ عمل اس وقت تک کرتا رہا جب تک کہ شوکی اپنا مقررہ وقت بہ خیر و خوبی پورا کر کے نہیں لوٹ آیا... اس کے بعد شوکت نے دروازہ اندر سے بند کر دیا

''سب ٹھیک ہے۔'' کا گرین سگنل بھی دے دیا۔ اس کے ہاتھ میں سودا سلف کے دو تین شاپنگ بیگ تھے، جنہیں اس نے باورچی خانے میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد ہم تینوں کمرے میں آ گئے۔ شکیلہ نے وہاں مزید دو کرسیاں ڈال دی تھیں۔

میں نے دیکھا آسیہ اپنے ہینڈ بیگ کو کھولے ہوئے تھی۔ اور اندر سے مائیک، تاروں کے گچھے، لیپ ٹاپ اور ایک بڑے گول لینس والا کیمرا نکالے اس کی ایڈجسٹنگ وغیرہ میں لگی ہوئی تھی۔ اس کے نازک اندام چہرے سے اس وقت عجیب طرح کا جوش مترشح تھا۔ اس وقت وہ آہنی ارادوں اور کچھ کر گزرنے کے جذبے سے معمور نظر آ رہی تھی جبکہ شکیلہ ایک طرف کھڑی بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی تھی۔ یہ سب دیکھ کر میرے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ اول خیر کے چہرے پر البتہ گہری... سنجیدگی طاری تھی۔

اخبار بین

میرے ایک دوست کو اخبارات پڑھنے کا بہت چسکا تھا جس کے نتیجے میں وہ پاگل ہو گیا ہے اور اس کے ذہن میں عجیب طرح کے خوف اور واہمے جمع ہو گئے ہیں، ایک دن وہ میرے پاس آیا تو بہت گھبرایا ہوا تھا، کہنے لگا۔ ''مجھے کچھ ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا مطلب؟'' بولا۔ کوئی ایک ہو تو بتاؤں میں جب اپنے گھر کی گھنٹی بجاتا ہوں اور اگر اندر سے چند منٹ تک جواب نہ ملے تو میرا ذہن وہ تمام کہانیاں تیار کرنے لگتا ہے جو روزانہ شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ میں تصوراتی طور پر دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے ٹی وی لاؤنج میں اپنے بچے خون میں لت پت نظر آتے ہیں، ان کی گردنیں تن سے اسی طرح جدا ہوتی ہیں جیسے اخباروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں دکھایا گیا ہوتا ہے۔ میں چیختا ہوا گھر سے باہر نکل جاتا ہوں، اہل محلہ مجھے دلاسہ دیتے ہیں پھر اگلے روز کے اخبارات کی سرخیاں مجھے یاد آتی ہیں، جب سات جنازے اکٹھے اٹھے تو کہرام مچ گیا۔ برابر برابر پڑی ہوئی سات لاشوں کی تصویر بھی چھ کالم میں چھپی ہوتی ہے۔ بین کرتی ہوئی عورتوں میں کسی خوش شکل خاتون کو آہ و زاری کرتے دکھایا جاتا ہے۔''

''دو منٹ دروازہ نہ کھلنے پر تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے، تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟''

تھوڑی دیر بعد آسیہ ساری تیاری مکمل کر چکی۔ اس کے بعد اپنا سیل فون نکال کر ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بولی۔

''تمام تیاری مکمل ہے۔ میں اب یاسین ملک کو فون کر کے بتانے لگی ہوں کہ وہ ہمیں اپنے چینل میں ''بریکنگ نیوز'' کے ساتھ آن ائر لائیو کرے۔''

آسیہ نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ اچانک باہر دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ ہم سب گویا ایک ساتھ ہی دھڑک اٹھے اور ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کے چہرے کی طرف تکنے لگے۔

''یہ کون آ گیا اس وقت؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میری نظریں شوکی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

شوکی بولا۔ ''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

اول خیر نے کہا۔ ''ٹھہرو، ایک دم دروازہ مت کھولنا، پہلے جھانک کر دیکھ لینا۔''

شوکی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ آسیہ اور شکیلہ کے چہروں پر تشویش کے آثار ابھر آئے تھے۔ میں بھی باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا شوکی دروازے کی جھری پر جھکا باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جبکہ اول خیر ہاتھ میں اپنا پستول پکڑے دروازے کے دائیں جانب چوکس کھڑا ہوگیا۔ میں نے بھی فوراً حرکت کی اور اپنے دائیں ہاتھ سے میگا رو نکال لیا اور دروازے کی دوسری سمت دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

شوکی نے سیدھے کھڑے ہو کر ایک طمانیت بھری سانس لے کر ہلکی آواز میں ہمیں بتایا۔

''باہر ڈینگی مچھر مار مہم کے تین افراد کھڑے ہیں۔ وہ یقیناً گھر میں اسپرے کرنا چاہتے ہیں۔''

میرے اور اول خیر کے بشروں پر الجھن رقص کر گئی۔ شوکی ازراہِ تشفی بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ مہم پورے شہر کی گلیوں اور محلوں میں جاری ہے۔ کل یہ لوگ ہمارے محلے کے پچھواڑے آئے تھے آج شاید اس طرف کی باری ہے۔''

اول خیر نے دھیمی آواز میں شوکت سے کہا۔ ''انہیں کل آنے کا کہہ دو۔'' ادھر آسیہ اور شکیلہ بھی حیران پریشان سی کمرے سے باہر نکل آئی تھیں ... میں انہیں آگاہ کرنے لگا۔ تاہم اول خیر کا مشورہ آسیہ نے بھی سن لیا تھا، آگے بڑھ کر بولی۔

''یہ بات مجھے کرنے دو۔'' ہم نے اسے راستہ دیا۔ شوکی بھی دروازے کے پیچھے سے ہٹ گیا۔ آسیہ نے دروازے کے قریب منہ کر کے پوچھا۔ ''کون...؟''

''وہ جی ہم ڈینگی مار مہم کے سلسلے میں تھوڑا سا اندر اسپرے کرنا چاہتے ہیں۔'' دوسری جانب سے بھی ایک عورت کی آواز ابھری۔

اس پر مجھے اور اول خیر کو حیرت ہوئی اور میں نے شوکی کو ٹہوکا دے کر پوچھا۔ ''تم تو کہہ رہے تھے باہر تین افراد ہیں' یہ عورت کہاں سے ٹپک پڑی۔'' شوکی اسی اطمینان بھری مسکراہٹ سے بولا۔

''میں نے تین افراد ہی کہا تھا۔ یہ دو مردوں اور ایک عورت کی ٹیم پر ہی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے چہروں پر ماسک چڑھائے ہوتے ہیں۔''

ادھر آسیہ انہیں ٹالنے کی غرض سے بولی۔ ''خاتون! آپ لوگ کل آجایئے گا۔ آج ذرا مہمان آئے ہوئے ہیں۔'' دوسری جانب سے اس بار ایک مرد کی آواز ابھری۔

''او بی بی! آپ کیسے عجیب لوگ ہو۔ ڈینگی مچھر نے پورے پنجاب میں تباہی مچا رکھی ہے' یہ تو گھر گھر مہم کی جا رہی ہے ہم دوبارہ نہیں آسکتے۔ یہ سرکاری حکم ہے۔ اگر آپ انکار کرتی ہیں تو ٹھیک ہے ہم لوٹ جاتے ہیں مگر ہمیں اس گھر کا نمبر اور شکایت انتظامیہ کے آفس میں درج کروانی پڑے گی اور ریفوز کی صورت میں آپ کو بھاری جرمانے کا نوٹس بھی مل جائے گا۔''

ہم سب الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہوگئے مگر شوکی نے ہمیں تسلی دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل یہ ڈینگی مار مہم ہر جگہ کی جا رہی ہے۔ پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں یہ اپنا کام کر کے چلے جائیں گے۔'' اس کی بات پر ہمیں صاد کرنا پڑا اور پھر ہمارے اشارے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اور اول خیر نے نہ صرف اپنے پستول چھپا لیے بلکہ اپنے اوپر اوڑھی ہوئی چادروں میں اپنے چہرے بھی نصف حد تک ڈھانپ لیے تھے۔ تین افراد اندر داخل ہوئے، ان کے ہاتھوں میں فوارے اور سیلنڈر تھے۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھے بغیر پروفیشنل انداز میں اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ صحن میں بنی نالیوں، غسل خانہ اور کونوں کھدروں میں اسپرے کرنے لگے۔ میری آنکھیں ان کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھیں مگر ماسک چڑھے ہونے کے باعث دکھائی نہیں دیے۔ سب نے مقدور بھر کوشش سے اپنی ناکوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ اسپرے کی جانے والی دوائی کی بو تیز اور ناگوار سی تھی۔ دفعتاً مجھے اپنا دماغ گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا...اور پھر اس دوران میں نے اول خیر اور آسیہ کو کھڑے ڈولتے دیکھا۔ ہم میں سے سب سے پہلے شکیلہ دھڑام سے بے ہوش ہو کے گری تھی، آسیہ بھی گرنے لگی۔ اب مجھے اسپرے کی دوائی سے زیادہ خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ میرے پورے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے اپنا دماغ بھی ماؤف سا ہوتا محسوس ہونے لگا۔ ایسے میں اول خیر کی ڈولتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''کک...کا کے...مم...مم...مار کھا گئے۔'' پھر ایک زوردار ''دھپ'' کی آواز سے میں نے بھاری بھرکم وجود رکھنے والے اول خیر کو بھی گرتے دیکھا، میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں کو سنبھالا دینے کی کوشش میں ہاتھ میگا رو کی طرف بڑھانا چاہا جو قمیص کے نیچے شلوار میں اڑسا ہوا تھا مگر پھر یکلخت جیسے میرے وجود کی توانائی بھی جاتی رہی، ٹانگیں کپکپانے لگیں اور جسم کا بوجھ برداشت نہ کر پائیں، غالباً آخر میں گرنے والا فرد میں ہی تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

قسط : 7

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں
ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

سب سے پہلے مجھے ہوش آیا تھا۔

ہوش میں آتے ہی مجھے سخت ٹیس کا احساس ہوا۔ اس کا مخرج میرا زخمی بازو تھا۔ درد کی یہ پُرزور لہر میرے دماغ اور حواسوں کو فوری بیدار کرنے میں معاون بھی ثابت ہوئی۔ مجھے پیش آئے حالات کا ادراک جلدی ہونے لگا۔ میں نے درد کی شدت کو محسوس کر کے بے اختیار اپنے مضروب بازو کو سہلانا چاہا تو پتا چلا کہ میرا تو پورا وجود ہی رسن بستہ تھا۔ میرے دونوں بازو ہی نہیں بلکہ دونوں پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے ...... دونوں بازو پشت کی جانب موڑ کر کسی مضبوط رسی سے کس کر باندھے گئے تھے۔ زخمی بازو مڑنے کے باعث تکلیف کی شدت میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا، اس قدر کہ بے اختیار میرے منہ سے کراہ خارج ہوگئی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ میں دشمن کی قید میں تھا۔

میری پھٹی پھٹی آنکھوں کو کچھ روشنی کا احساس ہوا۔.. ... جو نامعلوم سے روزنوں سے اندر پڑ رہی تھی، تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کسی کمرے میں نہیں تھا۔ فرش پر ہونے والی مخصوص تڑتڑاہٹ اور گھرر... رر... کی آواز سے پتا چلتا تھا کہ میں کسی بند گاڑی یا وین میں تھا۔

سرِدست میں اپنے بندھے وجود کو ہلانے جلانے سے قاصر ہی رہا۔ تاہم گردن ذرا موڑ کر دیکھنے پر بے اختیار میرے حلق سے بھنچی بھنچی سانس خارج ہوگئی۔ میرے ساتھی بھی اسی حالت میں اِدھر اُدھر بکھرے بے سدھ پڑے تھے۔ گویا دشمن نے ہماری پوری ٹیم کو ہی یرغمال بنالیا تھا۔

اول خیر بے ہوشی کی حالت میں میرے دائیں جانب پڑا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر شوکی اور بائیں جانب آسیہ تھی جبکہ شکیلہ میرے پیروں کی طرف بے حس و حرکت پڑی تھی۔ مجھے شاید اپنے زخمی بازو سے اٹھنے والی درد کی لہر نے جلدی جاگنے پر مجبور کر ڈالا تھا۔

میں نے گویا اپنے وجود کو سرتاپا سماعت بنالیا اور غور کرنے لگا۔ ہمیں کون سی گاڑی میں سوار کرایا گیا تھا۔ یہ ٹرک تھا یا وین...؟ جگہ کی تنگی سے مجھے وین کا ہی شبہ ہوا تھا۔ وین پرانی سی تھی، اس سبب اس کی دیواروں اور کونوں میں سوراخ ہونے کے باعث سورج کی کرنیں مقدور بھر اندر داخل ہو رہی تھیں اور کچھ میری آنکھیں بھی نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو— گئی تھیں۔ وین یا ٹرک کے یکساں ہچکولوں اور تیز رفتاری سے اندازہ ہوتا تھا کہ ہم کسی سپر ہائی وے جیسی شاہراہ پر گامزن تھے۔ شکر ہے کہ ہمارے چہروں یا منہ پر پٹیاں نہیں باندھی گئی تھیں۔

میں اول خیر کو آوازیں دینے لگا۔ اور ذرا کھسکتا ہوا اپنے بدن کو اس کے ساتھ مَس کر کے ہلاتے جلاتے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے مجھے کسی کی کراہ سنائی دی۔ میں نے تھوڑا سر اونچا کر کے پیروں کی جانب دیکھا۔ شکیلہ کسمسا رہی تھی۔ اسے ہوش آگیا تھا اس کے بعد اول خیر اور پھر چند منٹوں بعد ہی سارے ساتھیوں کو ہوش آچکا تھا۔ آسیہ اور شکیلہ زیادہ تشویش زدہ اور متوحش نظر آرہی تھیں۔ کم و بیش یہی حال شوکی اور اول خیر کا تھا۔ شکیلہ نے گھبرا کر کہا۔

"ہم کہاں ہیں...؟ یہ کون لوگ ہیں...؟"

خود ہمارے پاس اس کے سوال کا جواب نہ تھا مگر اندازہ تھا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے تھے۔ اول خیر بولا۔

"کاکا!... یہ بہت بُرا ہوگیا۔" میں اُسے کیا جواب دیتا۔ اچانک شوکی کی آواز اُبھری۔

"ہمیں دانتوں کے ذریعے ایک دوسرے کی رسیاں کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات واقعی قابلِ غور تھی مگر دوسرے ہی لمحے بند گاڑی کے اندر ایک بدہیت ہنسی کی آواز ابھری پھر کوئی بولا۔ "اس کا کوئی فائدہ نہیں، تمہارے دانت جھڑ جائیں گے مگر رسی پھر بھی نہیں کھلے گی۔"

اچانک ابھرنے والی اس آواز پر ہم سب دم بخود سے رہ گئے۔ آواز میرے لیے شناسا تھی، جسے پہچان کر میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ یہ جنگی خان کی آواز تھی۔ وہی ملعون جس نے عابدہ کو اغوا کرنے کا ناقابلِ معافی جرم کیا تھا اور رانگی چاڑہ کے اڈے پر میرے ہاتھوں ایک بھیانک موت مرنے سے بال بال بچ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش چاہی اور پھر مجھے اس دیوار کے اوپر چار بائی چھ انچ کا جالی دار رخنہ نظر آگیا جس کے بارے میں میرا خیال تھا اس طرف ڈرائیونگ کیبن تھا اور یقیناً ہماری باتیں بھی وہاں سنی جا رہی تھیں۔

"یہ ممتاز خان کا آدمی ہے؟" اول خیر نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔" میں نے ہولے سے تصدیق کی۔ "یہ جنگی خان ہے۔ میرا اس کے ساتھ ٹاکرا ہو چکا ہے۔" اول خیر کے چہرے کی تشویش گہری ہوگئی۔ ممتاز خان جیسے زخمی سانپ کی گرفت میں جانا گویا یقینی موت سے دوچار ہونے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

کے مترادف تھا۔ مجھے دکھ اس بات کا تھا کہ ہماری ساری محنت ساری عمل کشا کشی اپنی تمام تر احتیاط اور رازداری کے باوجود اکارت جا چکی تھی... یا تو ہم حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کے دشمن سے غافل ہونے کی فاش غلطی کر بیٹھے تھے یا پھر دشمن نے ہم سے زیادہ ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

ہم سب دم بہ خود تھے۔ اندر سے تشویش زدہ بھی۔ یہ احساس ہی ہمارے لیے سخت اذیت کا باعث تھا کہ اب جو کچھ ہونے والا تھا وہ کسی بھی صورت میں "خیر" کے زمرے میں نہیں آتا ہے۔

انجانی منزل کی جانب سفر جاری تھا۔ جنگی خان کی آواز دوبارہ نہیں ابھری تھی۔ اندیشناک وسوسوں بھرے دلوں میں "کیا ہونے والا ہے؟" کی بڑی کریہہ صورت تصویر اس اذیت ناک وسوسے کی تھی جس میں خیر کی امید صفر تھی۔ مجھے زیادہ افسوس شکیلہ اور شوکی کی طرف سے ہونے لگا۔ وہ بے چارے بہن بھائی تو خوامخواہ ہی میری وجہ سے لپیٹ میں آگئے تھے۔ دونوں اچھی بھلی پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔ کاش امیں ادھر کا رخ ہی نہ کرتا... مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

"شہزاد خان! تم نے یقیناً مجھے پہچان لیا ہوگا... کہ تم سے مخاطب، میں کون ہوں؟"

چند سیکنڈوں کے خاموش دھڑکتے وقفے میں اچانک جنگی خان کی حظ اٹھاتی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اپنے دیگر ساتھیوں کی یہاں موجودگی کے باعث میں نے اپنے ابال پر مصالحانہ ضبط کا پہرا بٹھایا اور بولا۔

"جنگی خان! تمہاری دشمنی صرف میرے ساتھ ہے۔ باقی لوگوں کو چھوڑ دو۔ میرا ان سے کوئی گہرا لگاؤ نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا یہ میرے ثانوی تعلقات کے باعث خوامخواہ ہی دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں۔"

"ہا..." جواباً جنگی خان کی استہزائیہ آواز ابھری۔ اس میں غیظِ انتقام کی کاٹ محسوس ہوتی تھی۔ "خوب جانتا ہوں تمہیں کہ ایک بار جو تمہاری دست یاری تلے آجائے... وہ شہزاد احمد خان کے لیے کس قدر اہمیت اختیار کر جاتا ہے... اب ہمارے پیاسے انتقام کی شروعات تمہارے انہی پیارے ساتھیوں سے ہی ہوگی۔" اس کے ہولناک لہجے اور جان کاری نے مجھے اندر سے لمحے بھر کو لرزا کر رکھ دیا۔ یقیناً اسے اشرف نے ہی میری اس فطرت کے بارے میں بتایا ہوگا جسے میں نے رانگی چاڑہ میں جنگی خان کی آنکھوں کے سامنے داخل جہنم کیا تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ عابدہ کے اغوا میں ملوث تھا۔

"رانگی چاڑہ میں تمہاری وحشیانہ مستعدی نے میری آنکھیں کھول دی تھیں۔ ورنہ اشرف نے مجھے تمہارے متعلق جو بتایا تھا میں نے اس پر یقین نہیں کیا تھا۔" وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ، رویہ، بولنے کا انداز بتا رہا تھا وہ کوئی انتقامی بھڑاس اپنے دل سے نکال رہا ہے۔

"بھلا ایک اطفال گھر میں پرورش پانے والا... ہم جیسے کھلے میدانوں کے شیروں سے کس طرح ٹکرا سکتا ہے...؟"

اب میں اس رذیل کی ہرزہ سرائی کا منہ توڑ جواب دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

"جنگی خان! تم نے اپنے لیے کھلے میدان کے شیر کا لفظ غلط استعمال کیا ہے جبکہ تمہاری صحیح تعریف جس سے تم خود بھی اچھی طرح واقف ہو کہ تم شیر نہیں بلکہ کرائے کے ایک بزدل ٹٹو ہو... جس نے اپنا ضمیر اپنی انسانیت گروی رکھ دی ہے۔ شیر جیسا لفظ تو تمہیں میرے لیے استعمال کرنا چاہیے بزدل ٹٹو... جو تمہیں اس وقت بھی للکار رہا ہے۔ رہی بات یہ کہ تمہیں اس بات پر حیرت ہوئی کہ مجھ جیسے ایک عام آدمی جس نے اطفال گھر میں پرورش پائی، تم جیسے "کھلے میدان کے شیر" کو رانگی چاڑہ کے اڈے سے گیدڑ کی طرح بھاگنے پر کیسے مجبور کیا۔ اس کا جواب بڑا آسان ہے کہ جب ایک صلح جو اور امن پسند انسان پر جبر اور ناانصافی مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو پھر اس کا منہ توڑ جواب دینے کے لیے ایسی جرأت مندانہ صلاحیتیں ازخود پیدا ہونے لگتی ہیں، پھر جذبۂ شجاعت اور حالات اسے بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔"

میری آواز، میرے لب و لہجے کی گھن گرج بند ٹرک کے اندر ہی نہیں یقیناً ادھر بھی گونج رہی ہوگی جہاں جنگی خان بیٹھا سن رہا تھا۔

اول خیر کی آواز بلند ہوئی۔ "او خیر... میرے کاکے شیر...!"

دوسری جانب جنگی خان کو چپ لگ گئی۔ کئی سیکنڈوں بلکہ منٹوں تک اس کی آواز نہ آئی تھی پھر جب بولا تو اس کی غراتی ہوئی آواز میں احساسِ ذلت کی بوکھلاہٹ عیاں تھی۔ "ساری اکڑفوں تمہاری ناک کے راستے نکل جائے گی... بس ایک تھوڑا انتظار..."

* * *

میں نے اپنے محبوس ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میری جوابی کاروائی نے ان کے حوصلے بلند کر دیے تھے۔ جس کا

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

ثبوت ان کے چہروں پر عود کر آنے والی پُرجوش بشاشت سے ہوتا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے ان کے چہرے متوحش اور ستے ہوئے تھے جبکہ اول خیر کے بشرے پر جی دارانہ مسکراہٹ تھی۔

گاڑی چلنے کی مخصوص یکساں گھرر... ررر... جاری تھی۔ کچھ لمحے اور بیت گئے تو ایک بار پھر غیر یقینی حالات سے تشویش دل و دماغ پر جاگزیں ہونے لگی۔ اول خیر کا چہرہ بھی اب سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ اب ہمارے خاموش چہروں سے آنے والے وقت کے انتظار کے سوا کچھ ظاہر نہ ہوتا تھا۔

محتاط اندازے کے مطابق نصف گھنٹے بعد گاڑی کی رفتار میں کمی آئی۔ اس کے بعد شاید موڑ کاٹا گیا تھا اور گاڑی نشیب کے کسی تنگ بل کھاتے کچے راستے پر اتر گئی تھی۔ رفتار نسبتاً ہلکی تھی البتہ گاڑی ہچکولے کھانے لگی تھی۔

نشیبی راستے کا یہ سفر بھی کم و بیش بیس پچیس منٹ تک جاری رہا۔ اس کے بعد ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی۔ یکلخت دھڑکتی خاموشی چھا گئی۔ انجن بند کر دیا گیا تھا۔ میرے دل نے تیزی سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا جو کچھ ہمارے بالخصوص میرے ساتھ ہونے والا تھا، وہ یقیناً اچھا نہیں ہوتا مگر مایوسی کا کفر کے زمرے میں آنا مجھے کسی ایسی سوچ سے مانع رکھے ہوئے تھا جس میں ذاتِ باری تعالیٰ کی مدد کی امید سے انحراف ہوتا ہو۔ زندگی اور موت صرف خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہے جو جسے چاہے محفوظ ٹھکانے میں موت کا ذائقہ چکھا دے اور جسے چاہے اپنی رحمانیت سے برستے شعلوں سے بچا لے۔

گاڑی کا پچھلا بھاری دروازہ خودکار انداز میں اوپر اٹھ گیا۔ لیٹے لیٹے ہم نے گردنیں اٹھا کر دیکھا۔ دھوپ کی تیز روشنی میں ہمیں کسی نواحی علاقے کا منظر نظر آیا اور تین افراد۔ ان میں ایک جنگی خان تھا باقی دو اس کے ساتھی، یقیناً یہی وہ تینوں ہوں گے جو "ڈینگی مار" ٹیم کا بہروپ بھر کر شوکت کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ ان میں عورت بھی تھی شاید اس سے کام لے کر فارغ کر دیا گیا تھا جو یقیناً ان کی ساتھی ہی ہوسکتی تھی۔

یہاں ان کے اور بھی ساتھی نمودار ہوئے جو چہروں مہروں سے چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ ان کی تعداد چھ سات سے کم نہ تھی، بظاہر غیر مسلح نظر آ رہے تھے۔ یہ اوپر چڑھ آئے، بیدردی سے گھسیٹ گھسیٹ کر ہمیں کاندھوں پر لادا اور نیچے اتر گئے۔

میں جس کے کاندھے پر تھا، وہ میری طرح ہی مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ میرا بالائی جسم اس کی پشت کی طرف جھول رہا تھا۔ اسی لیے بمشکل گردن موڑ کر اطراف میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ مجھے نیالے رنگ کی عمارت نظر آئی جو کسی فارم ہاؤس سے مشابہ تھی۔ ہمیں ایک بڑے چوبی پھاٹک سے اندر لایا گیا اور پھر ایک طویل برآمدہ نما گوشے سے گزار کر ہال کمرے کے فرش پر گویا پٹخنے کے انداز میں پھینک دیا۔ ایسے میں مجھے آسیہ اور شکیلہ کی چیخ آمیز کراہیں سنائی دیں۔ ہال کی کھڑکیاں کھلی تھیں مگر لائٹ بھی آن تھی، فرنیچر کے نام پر دو تین چارپائیاں... اتنی ہی تعداد میں سرکنڈوں کے موڑھے... دو چوبی بنچیں ایک بڑی سی میز کے علاوہ کچھ کھاد یا گندم وغیرہ کی بوریاں ایک طرف پڑی نظر آ رہی تھیں۔

آسیہ اور شکیلہ سرک کر میرے قریب ہونے لگیں۔ بے چاریاں میرے رسن بستہ ہونے کے باوجود مجھ سے جانے کون سی امید لگائے بیٹھی تھیں۔ تاہم انہیں میری قربت حوصلہ ضرور دے رہی تھی۔ وہ سب گماشتے جنگی خان سمیت ہمارے سروں پر ملک الموت بنے کھڑے گھور رہے تھے۔ پھر میں نے جنگی کو سیل فون پر بات کرتے دیکھا۔

"چودھری صاحب! مہمان حاضر ہیں۔ آگے کیا حکم ہے؟" پھر اس نے کچھ سیکنڈ دوسری طرف کی گفتگو یا ہدایت سنی پھر "جی بہتر" کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد وہاں موجود اپنے گماشتوں کو مخصوص اشارہ کیا۔ پانچ آدمی باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد جنگی خان اپنے دونوں ڈینگی ساتھیوں کے ہمراہ قریب دھری چارپائی پر جا بیٹھا۔

میں نے محسوس کیا وہ خبیث بار بار شکیلہ اور آسیہ کی طرف گھور رہا تھا۔ مگر اس کی پُرشیطنت نظریں شکیلہ کا زیادہ طواف کر رہی تھیں۔ جنگی خان کے دونوں ساتھی، آسیہ کو تاڑ رہے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ فکر ان دونوں لڑکیوں کی طرف سے ہو رہی تھی۔

وہ تینوں خبیث ہم سے کچھ فاصلے پر چارپائی پر بیٹھے ہماری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں معنی خیز کھسر پھسر میں مصروف تھے، سگریٹ بھی پی رہے تھے۔ کبھی کبھی ہلکا اوباشانہ قہقہہ بھی اگل دیتے۔

ادھر ان کی سگریٹ ختم ہوئی ادھر ایک آواز ابھری۔ یہ کسی بھاری بھرکم گاڑی کے رکنے کی آواز تھی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ کچھ سیکنڈ بعد ہال کمرے کے کھلے دروازے کے باہر بھاری قدموں کی چاپ ابھری۔

ہم فرش بوس تھے۔ ایک ساتھ اپنی گردنیں گھما کر

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

دیکھنے کی کوشش کی۔ چند مسلح کارپردازوں کی معیت میں ایک دراز قامت بھاری بھرکم خرانٹ صورت آدمی اندر داخل ہوا۔ رنگ گورا چٹا تھا۔ قد دراز۔ چہرے پر کرخت مزاجی کے تاثرات تھے... اس نے نفیس قیمتی مکلف شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ آنکھیں چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہونے کے باعث غضب کا کینہ پرور تاثر پیش کر رہی تھیں۔

یہ چودھری ممتاز خان تھا۔ اس سے پہلے میں نے صرف ایک بار اس کی دور سے جھلک دیکھی تھی۔ آج میں اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک مغرور چودھری زادہ نظر آتا تھا۔

اس نے دوسروں پر صرف سرسری نگاہ ڈالی۔ مگر پھر میرے چہرے پر تو اس کی شعلہ برساتی نظریں کسی تیز خنجر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئیں۔ اس کے ساتھی رک گئے۔ ممتاز خان آگے بڑھا۔ اس نے قریب آکر اپنا جوتا میری گردن پر رکھ دیا۔ میرا چہرہ ہال کے فرش کی گرد چھونے لگا۔

”شہزی...! کاش میں تجھے کل کا چھوکرا سمجھ کر اتنی ڈھیل نہ دیتا مگر آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تجھے غیر اہم سمجھ کر میں نے اپنی زندگی کی بڑی بھیانک غلطی کی تھی۔“

اس کی شدید غیظ تلے پھنسی پھنسی آواز ازلی عناد اور آتشِ انتقام کی پیاس کا پتا دیتی تھی۔

”سوچا تو یہی تھا کہ تیرے قابو میں آتے ہی تیرا خاتمہ کر ڈالتا... مگر تجھ سے انتقام لینے کی آرزو اس قدر شدید تھی کہ موت تیرے لیے بہت چھوٹی سزا ہوتی... مگر دیر آید درست آید کے مصداق... تجھے تیرے قریبی ساتھیوں کے ساتھ یہاں دیکھ کر میرے انتقام کی آگ میرا دماغ پھاڑے ڈال رہی ہے۔ تڑپا دینے والی اذیت ناک موت تو تیرا مقدر ہے ہی... مگر...“

باعثِ غیظ ـــ وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی مٹھی سے میرے بال جکڑ لیے اور مجھے گھسیٹ کر قریب دھرے مونڈھے تک لے گیا۔ بالوں کے شدید کھنچاؤ کے باعث میری آنکھوں سے مارے اذیت کے پانی پھوٹ پڑا۔ وہ مونڈھے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا مگر میرے بال چھوڑ دیے۔ میرا چہرہ ایک بار پھر زمین بوس تھا۔ پھر مجھے اس کی غراتی آواز سنائی دی۔

”جنگی! ادھر آ... اس کتے کا سر اٹھا کر میرے چہرے کے قریب لا... میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے بتاؤں گا... میں کون ہوں... میں اسے ایک لرزہ خیز حقیقت بھی بتانا چاہتا ہوں۔“

میرا دل دھڑکا... نہ جانے یہ کون سی لرزہ خیز حقیقت مجھے بتانا چاہتا تھا۔ بلاشبہ اس وقت اس کی حالت باؤلے کتے جیسی ہو رہی تھی۔ جنگی نے فوراً حرکت کی۔ ایک ہاتھ سے میرا اکلوتا بازو دبوچا دوسرے ہاتھ سے میرے سر کے بال جکڑ لیے۔ پھر مجھے اٹھا کر میرا چہرہ ممتاز خان کے چہرے کے قریب کر دیا۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اس کا چہرہ مجھے آتشِ غیظ سے سلگتا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

”شہزی...! میں تجھے بڑے ہولناک منظر دکھانے کے لیے زندہ رکھوں گا۔ اب ایک لرزہ خیز حقیقت سن... تو مجھے کیا سمجھتا ہے؟ صرف چودھری ممتاز... نہیں، تو نہیں جانتا میں کون ہوں؟ اور میری جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں... تو کیا سمجھتا ہے تو نے اپنی معشوق عابدہ کو امریکا بھیج کر اسے میرے عتاب سے محفوظ کر دیا ہے؟“

عابدہ کا ذکر کرنے کے بعد وہ چند ثانیوں کے لیے یوں خاموش ہو گیا جیسے میرے سامنے عابدہ کا اس خطرناک انداز میں ذکر کرنے کے بعد وہ اس کا متوقع ردِعمل، پُرتشویش تاثرات کی صورت میں میری آنکھوں اور میرے چہرے سے محسوس کر کے حظ اٹھانا چاہتا ہو... واقعی ہوا بھی ایسا ہی تھا۔ عابدہ کے اس انداز میں ذکر پر میرا چہرہ بھبک کر انگارہ سا بن گیا۔ میرے پورے وجود میں بے کلی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دیکھا غیظ کی شدت سے ممتاز خان کی باچھیں جھاگ دار ہو رہی تھیں۔

”بہت نقصان کیا ہے تو نے میرا... شہزی! تیری وجہ سے میرا اکلوتا جوان بیٹا مارا گیا۔ میرے اہم آدمیوں کو تو نے بیدردی سے ختم کر ڈالا نہیں، نہیں... شہزی... میں تجھے موت کی سزا نہیں دوں گا مگر تیری زندگی کو سزا بنا دوں گا تیرے لیے...“

وہ غیظ و غضب کے عالم میں اپنے ہونٹ، دانت اور ہاتھوں کی مٹھیاں ایک ساتھ ہی بھینچ رہا تھا۔

”چودھری صاحب... ذرا ہولے... آپ کی طبیعت...“ جنگی خان نے ممتاز کی پاگل جنونیوں جیسی ہوتی کیفیات کو دیکھتے ہوئے ہولے سے کہا تھا۔ اسی وقت ایک آدمی کانچ کے گلاس میں پانی لے آیا۔ جنگی خان نے مجھے اسی طرح دبوچے ہوئے دوبارہ فرش پر میرے ساتھیوں کے قریب ڈال دیا۔ میرا دھیان عابدہ کے حوالے [illegible] تھا۔ جس انداز میں اس نے عابدہ کا ذکر کیا، اس [illegible]

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

اتنی تشویش میں تو مبتلا کر دیا تھا مگر دل نہیں مانا کہ یہ پاگل، جنونی بیل، عابدہ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ شاید مجھے یعنی اپنے دشمن دیرینہ کو اپنے قریب دیکھ کر یہ مارے طیش میں ہذیان بکنے پر مجبور تھا۔

ممتاز خان نے ایک ہی سانس میں پانی پیا اور گلاس کسی کو تھمانے کی زحمت گوارا کیے بغیر ایک طرف اچھال دیا۔ ہال میں کانچ ٹوٹنے اور بکھرنے کی آواز ابھری تھی۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس کی زہر بھری نظریں ہنوز مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس دھکا دھکی اور اٹھا پٹخ کے باعث مجھے اپنے بازو کا زخم بھی کھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس سے اٹھنے والی درد کی ٹیسوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''اب میں اس کو بھی نہیں چھوڑوں گا... اس نے میرے دشمن کو دودھ پلا کر میرے مقابل کھڑا کیا۔ ہم نے اب تک اس کتیا کو اس کے حال پر چھوڑے رکھا تھا، مگر یہ ہماری غلطی تھی... ہمیں اس دن ہی اس مردود کتے... لئیق شاہ سمیت اسے بھی...''

اس کا غضب ناک جنون ابھی کم نہیں ہوا تھا۔ نجانے وہ کیسی بات اپنے منہ سے نکالنے والا تھا کہ جنگی خان نے اچانک جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا اور ممتاز خان بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گیا۔

وہ شاید اپنی بہن... یعنی بیگم صاحبہ سے متعلق کچھ بول رہا تھا اور لئیق شاہ کا ذکر تو میں نے بھی بیگم صاحبہ کے منہ سے محض اتفاقاً ہی ایک بار سن لیا تھا۔ جانے اس سے ماضی میں کون سا تعلق تھا ان کا... تاہم ممتاز خان اب اپنی بہن کا بھی جانی دشمن ہونے لگا تھا... یقیناً اس کی وجہ میں ہی تھا۔

وہ مونڈھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جنگی خان سے کچھ بولا تھا جس پر اس نے ہولے سے مؤدبانہ انداز میں جھکتے ہوئے جواب میں نجانے کیا ممتاز خان سے کہا تھا کہ وہ ایک بار پھر بھڑک اٹھا۔ اور ایک بار پھر میری طرف طیش بھری نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''نہیں... ابھی اسی وقت یہ سب کرنا ہو گا... جنگی...! اس کے چہرے کا اطمینان... میرا خون کھولا رہا ہے... میں اسے جلد از جلد سزا کی بھٹی میں بھسم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کاش! میں اسے زمین پر رینگنے والا کیڑا نہ سمجھتا... تو آج میں اتنے بڑے نقصانات سے دوچار نہ ہوتا۔ اب یہ حقیر کیڑا ہماری ناک میں گھس کر بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے... نہیں جنگی نہیں... ابھی اور اسی وقت... حساب دینا ہو گا اس نے... تاخیر مجھے قبول نہیں... سمجھے تم...؟'' اس نے آخر میں جنگی کو گھورا تو اس نے فوراً فدویانہ انداز میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد یہ سب لوگ ایک ایک کر کے ممتاز خان کے پیچھے ہال کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ہال کمرے میں یکلخت سناٹا طاری ہو گیا۔ ہم میں کوئی سینے کے بل اور کوئی پشت کے بل فرش پر تھا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ پہلی بار میں نے اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوتے محسوس کیا۔ یہ اس کے انتہا درجے کی تشویش میں مبتلا ہونے کی دلیل تھی۔ مجھے اپنی جانب دیکھتا پا کر بولا۔ ''کاکے... یہ تجھ پر بہت گندی خار کھائے بیٹھا ہے... پتا نہیں اب یہ تیرے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟''

اسے میری فکر ستانے لگی تھی جبکہ مجھے خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں بالخصوص آسیہ اور شکیلہ کی طرف سے تشویش ...... لاحق تھی۔ میں نے کہا۔ ''اول خیر! زندگی اور موت ہمارے رب کے ہاتھ میں ہے۔ اس جیسے باؤلے کتے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ہمیں یہاں سے فوری طور پر فرار ہونے کے بارے میں سوچنا ہو گا۔ یہ تم پر بہت بری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہے... اور سب سے پہلے اس کے غضب ناک انتقام کا ہم ہی نشانہ بنیں گے شوکی نے کہا۔ اس کی آواز میں خوف کا ارتعاش تھا۔ اسے یقیناً زیادہ فکر اپنی بہن شکیلہ کی ہو رہی تھی۔

''ان بدبختوں نے ہمیں ہلنے جلنے تک سے قاصر کر رکھا ہے۔ ہم کس طرح یہاں سے فرار کی کوشش کر سکتے ہیں؟'' آسیہ نے لب کشائی کی۔

شکیلہ نے کسی خوف یا فکر کا اظہار کیے بغیر ایک تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی سی کوشش کر کے دو دو افراد اپنی پشت ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر انگلیوں کی مدد سے ایک دوسرے کی رسیاں کھولنے کی کوشش کریں تو...''

''یہ ممکن نہیں...'' اول خیر اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''محض انگلیوں کی مدد سے اس قدر مضبوط بندھی ہوئی رسیوں کو کھولنا ناممکن ہو گا۔''

معاً میری نگاہ ہال کے کونے میں ایک چمکتی ہوئی شے پر پڑی۔ یکلخت میرا دل خوش آئند تصور سے دھڑکا۔ وہ کانچ کا ٹکڑا تھا۔

یہ یقیناً اس ٹوٹے ہوئے گلاس کا ٹکڑا تھا جو ممتاز خان

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

نے پانی پینے کے بعد غصے سے پھینکا تھا۔ میرے بازو میں درد ہونے کے باعث میں زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا۔ میں نے اول خیر کو یہ بات بتائی، اس نے ایک لمحہ بھی دیر کیے بغیر کونے میں پڑے کانچ کے ٹکڑے کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔

''یہ کیا کرنا چاہ رہا ہے؟'' شوکی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کی ہدایت کے ساتھ ہولے سے بتا بھی دیا کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ مسرت و امید کی ہلکی سی کرن اس کے چہرے پر چمکی تھی۔

''اب ہم شکیلہ والے آئیڈیے پر کچھ آسانی سے عمل کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ اس اثنا میں اول خیر نے بندھے ہونے کے باوجود غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا اور کانچ کا وہ ٹکڑا پشت کے رخ پر اپنی انگلیوں میں دبا کر دوبارہ ہمارے قریب کھسک آیا۔ اور پہلے میری رسیاں کاٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے اسے پہلے شکیلہ اور آسیہ کی رسی کاٹنے کا کہا۔ میری اولین کوشش تھی کہ پہلے آسیہ اور شکیلہ کو یہاں سے فرار کروا دیا جاتا، مگر اول خیر نے ہی نہیں شوکی نے بھی میری بات سے اختلاف کیا۔

میں چپ ہو رہا۔ اول خیر نے اپنی پشت میری پشت سے ملا دی اور نجانے کس طرح اس نے وہ کانچ کا ٹکڑا اپنی انگلیوں میں پھنسا کر اس کی تیز دھار میرے ہاتھوں کی رسی پر آزمانی شروع کر دی۔ یہ آزادی حاصل کرنے کی ایک اندھی کوشش سست رو ضرور تھی مگر اس کا نتیجہ دیر سے سہی... یقینی ہو سکتا تھا بشرطیکہ کوئی ہال میں داخل نہ ہوتا۔

یہ چور کوشش جاری تھی۔ سب اول خیر کی اس کوشش کے کامیاب ہونے کی دل ہی دل میں دعا مانگنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہماری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ہال میں ملعون جنگی خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس مکار صورت آدمی کو میں نے چونکتے دیکھا۔ اندر آتے ہی اس کم بخت نے نظریں اٹھا کے سب سے پہلے میری طرف ہی دیکھا۔ اول خیر کو مجھ سے الگ ہونے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ یہ دیکھ کر جنگی خان یوں اچھلا تھا جیسے اسے بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ وہ کسی شکرے کی طرح ہماری طرف لپکا اور جھک کر اول خیر کی بندھی ہوئی ٹانگوں کو دبوچ کر نہایت بیدردی سے ایک طرف گھسیٹ لیا... پھر اس کی نگاہ پشت پر پڑ گئی۔ میری دھڑکتی نظریں اس کی بھڑکتی ہوئی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر میں نے اسے جھکتے دیکھا۔ اب اس کے ہاتھ میں خون آلود وہ کانچ کا ٹکڑا نظر آ رہا تھا۔ اس میں لگا ہوا خون یقیناً اول خیر کا ہی تھا۔ وہ کانچ کا ایک دھاری دار ٹکڑا تھا جس کا ہر سرا کند اور تیز تھا۔ میری رسی پر رگڑنے کی کوشش میں اول خیر کی انگلیاں لہولہان ہو گئی تھیں۔

جنگی خان خون آلود کانچ کے ٹکڑے کو دیکھتا رہا پھر ایک زہرخند نظر مجھ پر اور اول خیر پر ڈالی، اپنے قریب کھڑے ایک ساتھی کو موٹی سی گالی دی اور ٹکڑا اسے تھما دیا۔ پھر ایک زوردار لات زمین بوس پڑے اول خیر کے چہرے پر رسید کر دی۔ ایک تیز کراہ ہال میں گونج گئی۔ جنگی خان کی اس حرکت پر میرا دماغ چٹخنے لگا۔

''بزدل خان!... بندھے ہوئے آدمی پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ نر کا بچہ ہے تو اس کی رسیاں کھول کر مقابلے پر آ... مگر میں جانتا ہوں تیرے جیسے ڈنگوں کے بس کی بات نہیں یہ...''

میرے حقارت آمیز للکارنے پر اس نے وحشیانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے دانستہ اس کا نام بگاڑا تھا۔

''بہت گھمنڈ ہے تم لوگوں کو... بس تھوڑا سا انتظار اور کر لو... پھر دیکھنا تم پر کیسی قیامتیں ٹوٹنے والی ہیں۔''

''ہمارا صرف ایک ہی قیامت پر ایمان ہے بزدل خان! جو اس خالقِ کائنات نے... رکھی ہے جس میں جزا و سزا کا حساب ہوگا۔ تمہارے جیسے شیطان جہنم میں دھکیلے جائیں گے۔'' اول خیر نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے اسے بزدل خان کے لقب سے نوازا۔

جنگی خان کی آنکھوں میں قہرناک طیش کی سرخی ابھری۔ دانت پیس کر اس نے اول خیر کی گردن پر اپنا جوتا رکھ دیا اور اس پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تم اگر صرف میرا شکار ہوتے تو تم جیسے بڑبولوں کا وہ حشر کرتا کہ میرا نام بگاڑنے کا مطلب تمہاری سمجھ میں آ جاتا۔''

''استاد! ہمیں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنا کام نمٹانا چاہیے۔'' اس کے ایک گماشتے نے اسے ٹوکا۔

جنگی خان پلٹ گیا پھر اپنے ساتھی سے تحکمانہ بولا۔ ''ساتھ کا کمرا تیار کرو... باقی سامان کدھر ہے؟''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ مزید دو گماشتے اندر داخل ہوئے۔ ایک کے پاس وہی ہینڈ بیگ تھا جو آسیہ کی ملکیت تھی جس کے اندر ویڈیو کیمرا، لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ وغیرہ سے متعلق سامان موجود تھا۔ جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں بڑا سا لوہے کا زنگ آلود بکس تھا جو عموماً پلمبر یا مکینک

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

وغیرہ کے پاس ہوتا ہے۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ پیٹ میں گانٹھیں سی پڑنے لگیں۔ اس سامان کا مقصد یقیناً ہم پر کوئی غیر انسانی اور انسانیت سوز حربے آزمانا تھا تو ہمارے پاس اب سوائے اللہ سے مدد مانگنے کے اور کیا چارہ باقی رہ جاتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یقیناً میری طرح اول خیر وغیرہ بھی ان چیزوں کو دیکھ کر تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے۔ بلکہ میں نے تو کسی کی ہلکی سسکاری بھی سنی تھی۔ یہ شاید آسیہ کے حلق سے خوف کے باعث برآمد ہوئی تھی۔ مگر اصل کھٹک جو مجھے اور شاید آسیہ کے دل کو بھی بے چین کر گئی تھی، وہ اس کا چرمی ہینڈ بیگ تھا۔

یہ لوگ اس سے بھلا کیا کام لینا چاہتے تھے...؟ کیا مجھ سے کوئی جھوٹا بیان... یا کچھ اور...؟

دونوں گماشتے ہماری نظروں کے سامنے سے وہ سامان جھلاتے ہوئے دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے، پھر جنگی خان نے دو مسلح افراد کو وہیں کمرے میں موجود رہنے کی تاکید کی پھر وہ اپنے دیگر ہرکاروں کے ساتھ ہال کمرے سے نکل گیا۔

پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ ہم ایک خطرناک اور جنونی دشمن کے قبضے میں تھے اور اسی کے رحم و کرم پر بھی۔ یہ احساس ہی بڑا جاں گسل تھا کہ آئندہ آنے والے لمحات ہمارے لیے بقول ممتاز خان اور جنگی خان کے کسی قیامت سے کم نہ تھے۔

انہی ہولناک ساعتوں میں کچھ وقت اور سرک گیا۔ دونوں مسلح گماشتے ایک چارپائی پر بیٹھ گئے تھے، وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں ہم آپس میں فرار سے متعلق یا اور کسی قسم کا تبادلہ خیال کرنے سے بھی قاصر تھے۔

وقت گویا کسی بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا۔ اچانک آسیہ رو پڑی۔ اول خیر نے اسے جھڑکا۔ ''اے لڑکی! کیا تجھے اللہ پر بھروسا نہیں؟ جو کچھ ہونا ہوتا ہے صرف اور صرف اس کی مرضی سے ہوتا ہے۔''

میں نے بھی آسیہ کو تسلی دینا ضروری سمجھا۔ ''آسیہ! تم تو بہت حوصلے والی تھیں پھر یہ آنسو...؟''

شکیلہ اس کے مقابلے میں مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اس کی وجہ شاید کچھ اس کی فطرت تھی اور کچھ وہ کڑے حالات تھے جن سے وہ ماضی قریب میں گزر چکی تھی۔ اس نے بھی آسیہ کو تشفی دی۔ ''آسیہ بہن! اللہ پر بھروسا رکھو۔ ہم نے کوئی جرم کوئی گناہ نہیں کیا ہے اگر کسی شیطان کے انتقام اور عتاب کا نشانہ بنانے کے لیے ہمیں یہاں لایا گیا ہے تو یہ حق و باطل کی جنگ کہلائے گی، جس میں فتح بہرحال حق کی ہی ہوتی ہے۔''

ہمارے ان الفاظ نے آسیہ کے پست حوصلوں کو کچھ ڈھارس دی۔ وہ کچھ سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''میں موت سے نہیں ڈرتی۔ وہ برحق ہے۔ لل... لیکن میں اپنے عورت ہونے سے ڈرتی ہوں۔ اس کی پامالی... ایک عورت ذات کے لیے موت سے بھی بڑھ کر سزا ہے۔''

اس کے جواب پر ہم سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ہمارے چہرے گنگ سے ہو گئے۔ پھر کوئی نہیں بولا تھا۔ چارپائی پر بیٹھے دونوں گماشتے ہماری طرف دیکھ کے خبیثانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ پھر میں نے ایک دوسرے سے دھیمی آواز میں کہتے بھی سنا۔

''لگتا ہے سالی کو وقت سے پہلے معلوم پڑ گیا ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

ایک ہولناک خیال تلے مجھے بھی اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسی طرح دن ڈھلنے لگا۔ بھوک کا احساس تو اتنا نہ تھا مگر پیاس کی شدت سے مجھے اپنا حلق سوکھتا محسوس ہوا۔ میں نے ان دونوں خبیثوں سے پانی پلانے کی بھی درخواست کی۔ جو انہوں نے سنی ان سنی کر ڈالی۔ اب میرا دھیان بار بار بیگم صاحبہ کی طرف جا رہا تھا کہ انہیں اب تک ہمارے کسی مصیبت میں گرفتار ہونے کا علم ہو چکا ہو گا۔ پھر ایڈووکیٹ خانم شاہ بھی تو تھیں۔ آسیہ کی بڑی بہن جن کی رہائش گاہ پر سب سے پہلے ہمارا لائیو پروگرام کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر بعد میں حالات ایسے ہوئے کہ ہم نے شوکت کے ہاں یہ پروگرام کرنے کا منصوبہ بنایا اور آسیہ بھی اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ وہاں آن پہنچی تھی۔ یقیناً اس کی بہن خانم شاہ نے سیل پر رابطہ کر کے خیریت وغیرہ دریافت کرنے کی کوشش کی ہوگی اور یہی کچھ بیگم صاحبہ نے بھی کیا ہو گا مگر ہمارے سیل سے جواب نہ پا کر وہ لوگ یقیناً پریشان ہو گئے ہوں گے اور اپنے تئیں ہماری تلاش کی کوشش میں مصروف بھی ہوں گے۔ خانم شاہ کے مقابلے میں مجھے بیگم صاحبہ کی طرف سے جلد مدد پہنچنے کی کچھ امید تو تھی کیونکہ ہمارے اچانک غیاب سے بیگم صاحبہ کے ذہن میں فوری خدشہ یہی پیدا ہوگا کہ ہم یقیناً ممتاز خان کی قید میں جا چکے ہوں گے اور پھر بیگم صاحبہ کہاں چین سے بیٹھی ہوں گی؟ وہ ایک طرح سے میرے دشمن ممتاز خان کے گھر کی بھیدی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

تھیں، انہیں سب معلوم ہوگا کہ ممتاز خان کے خفیہ ٹھکانے کہاں کہاں ہوسکتے تھے مگر... سوال یہ تھا کہ ان کی متوقع مدد کی امید کب تک بارآور ثابت ہوسکتی تھی؟ جبکہ ان حالات میں ممتاز خان نے بھی اپنی بہن یعنی بیگم صاحبہ کو سبق سکھانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ بھلا اس کے گمان میں یہ بات کیسے نہیں ہوسکتی تھی کہ ہماری مدد کے لیے اس کی بہن کا فوراً حرکت میں آنا یقینی امر تھا۔

اب تو سب کچھ تقدیر پر ہی منحصر تھا کہ مشیتِ ایزدی سے کیا ظہور میں آتا ہے کیا وقوع پذیر ہوتا ہے؟

☆☆☆

دن ڈھلتے ہی ہال کمرے کی کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں اور کچھ مزید لائٹس آن کر دی گئی تھیں۔ وقت گویا اب ہمارے دل کی دھڑکنوں کے مساوی دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری... دروازے کھلے اور بند ہوئے۔ اس کے چند ثانیوں بعد ہال کمرے کے کھلے ہوئے دروازے پر بھاری قدموں کی متعدد آوازیں ابھریں۔ پھر ممتاز خان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر غضب ناکی کے بجائے بشاشت دوڑ رہی تھی۔ جنگی خان بھی اس کے ہمراہ تھا۔ باقی چار پانچ مسلح کارپرداز... ایک نے پھرتی سے مونڈھا اس کے بیٹھنے کے لیے قریب سرکا دیا۔ وہ اس پر براجمان ہوگیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ سلگانے تک اس کی برماتی ہوئی نظریں مجھ پر پیوست رہیں۔ مجھے ان نظروں میں خونخواری اور آنے والے کڑے وقت کی وحشت ناکی محسوس ہوئی۔ ایک گہرا کش لے کر اس نے آسیہ کی طرف دیکھا اور کھرکھراتی ہوئی کاٹ دار آواز میں بولا۔

''مس لیڈی رپورٹر...! تمہیں بڑا شوق تھا میرے خلاف آن ایئر لائیو پروگرام چلانے کا... تمہارا یہ شوق اور یہ حسرت میں ضرور پوری کروں گا۔'' رکتے ہوئے اس نے جنگی کو اشارہ کیا۔ وہ جیسے حکم کا منتظر تھا۔ چابی بھرے کھلونے کی طرح فوراً حرکت میں آیا اور آسیہ کے قریب پہنچ کر اس کے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بند کھولے۔ میں لیٹے لیٹے سر اٹھا کر ممتاز خان سے مخاطب ہوا تو خود مجھے اپنی آواز اجنبیت کا شائبہ دیتی محسوس ہوئی۔ ''ممتاز خان! تیرے ساتھ میری کوئی پرانی دشمنی نہیں تھی اور نہ اب ہے۔ یہ سب وقت کے دھارے اور محض اپنے دفاع کا نتیجہ تھی۔ اس دشمنی کو ادھر ہی ختم کر دے، اسے میری زندگی کا اولین مقصد نہ بنا...''

''بہت خوش فہمی ہے تجھے یہاں سے زندہ بچ نکلنے کی...؟'' وہ دانت پیس کر غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''زندگی اور موت صرف اس قادرِ المطلق کے ہاتھ میں ہے ممتاز خان!'' میں نے جوش سے لرزتی آواز میں کہا۔ ''وہ جسے چاہے عین موت کے منہ سے نکال کر زندگی کی شاہراہ پر گامزن کر دے اور جسے چاہے کرسی پر آرام سے بیٹھے انسان کو موت کے اندھیروں میں دھکیل دے۔''

''تو کیا سمجھتا ہے، میں تجھے چھوڑ دوں گا؟ جانتا ہے تو فرخ کون تھا؟ میرا اکلوتا بیٹا تھا وہ...'' اپنے بیٹے کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں خون کی لالی اترنے لگی۔ ''میرے سامنے یہ گھسا پٹا جملہ مت بولنا کہ وہ تمہارے ہاتھوں قتل نہیں ہوا تھا، اگر تم میری کوٹھی میں نقب نہیں لگاتے تو یہ سب نہ ہوتا...''

''تم نے عابدہ کو اپنے کتوں کے ذریعے اغوا کرانے کا ناقابلِ تلافی جرم کیا تھا۔ اس کے جواب میں، میں تیرے بیٹے کو محض اغوا کر کے تجھے بھی اس اذیت میں مبتلا کرنا چاہتا تھا اس کے علاوہ کچھ اور مقاصد بھی تھے میرے، مگر میں کسی نہتے اور مجبور انسان کو جان سے مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

''اس کا انتقام تم میرے ایک آدمی ....کو بیدردی سے قتل کر کے لے چکے تھے۔''

''میرا شکار... یہ مردود جنگی خان تھا۔ اس کی سرکردگی میں عابدہ کو اغوا کر کے اس کے اڈے رانگی چاڑہ پہنچایا گیا تھا۔''

''اس اثنا میں جنگی خان، آسیہ کو دبوچ کر ممتاز خان کے سامنے لے آیا۔ وہ بری طرح سراسیمہ ہو رہی تھی۔ ممتاز خان کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ تھی جبکہ جنگی خان کی آنکھوں میں شیطانیت ہلکورے لے رہی تھی۔

''مس لیڈی رپورٹر... ذرا تصور کرو جب تمہاری ایک شرمناک ویڈیو کلپ انٹرنیٹ کی سوشل ویب سائٹ پر چلے گی... دکانوں پر بکے گی۔ ایسی رئیل کلپ کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔'' ممتاز خان کے ان شیطانی جملوں نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ آسیہ بے چاری کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔ میں حلق کے بل چیخ کر بولا۔

''ممتاز خان...! ایک شریف اور معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کر کے تو اللہ کے عذاب کو تو آواز دے ہی رہا ہے مگر... مگر میں دنیا کو تیرے لیے عبرت کا نمونہ بنادوں گا۔ ایسا مت کر...''

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

''بہت مزہ آرہا ہے مجھے... شہزی! تیرا اس طرح میرے سامنے بے بسی سے فریاد کرنا...'' وہ حظ اٹھاتے ہوئے انتہائی کمینگی سے مسکرا کر بولا۔

''یہ فریاد نہیں ہے... ممتاز خان! اسے چھوڑ دے۔'' میں نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اندر سامان تیار ہے؟'' ممتاز خان نے دانستہ میری طرف سے دھیان ہٹاتے ہوئے جنگی خان سے پوچھا۔

''جی ہاں جناب! سب تیار ہے۔'' جنگی خان نے جواب دیا۔ مجھے اس خبیث کتے کی آواز میں حیوانی تلذذ کی بو محسوس ہورہی تھی۔

''اوئے... خیال رہے تمہارے چہرے نہیں آنے چاہئیں سامنے... یہ ایک ''گینگ ریپ'' کلپ ہوگا، سمجھے تم... مگر اس لیڈی رپورٹر کا چہرہ واضح ہونا چاہیے... اور سب کچھ فری اسٹائل ہونا چاہیے... سمجھے تم لوگ؟''

ممتاز خان نے اسے ہدایت دی، جنگی خان کی چندی چندی آنکھوں میں بھیڑیے جیسی چمک عود کر آئی جیسے وہ شکار کو پھاڑ کھانے کے لیے بے صبرا ہوا جارہا ہو۔ اس نے محض اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ پھر ممتاز خان نے میری طرف بھویں اچکا کر خار دلانے والے انداز میں مسکرا کر دیکھا اور پھر مخصوص اشارہ کردیا۔

جنگی خان نے آسیہ کو کمرے کی طرف گھسیٹا۔ چار ساتھی اس کے پیچھے چلے۔ ان کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جدھر یہ شیطانی کھیل کھیلا جانے والا تھا۔ آسیہ چیخنے چلانے لگی، مجھے پکارنے لگی ''شم... مجھے بچالو شہزی... مجھے بچالو۔''

شدتِ غیظ وغضب سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ آنکھوں سے خون ابلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دل جیسے جلتی سلگتی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا جیسے پھٹ جائے گا۔

''ممتاز خان...!'' میری آواز پھٹ گئی۔

اول خیر نے لب کشائی کی۔ ''ممتاز خان...! ایسا مت کر... ایک شریف لڑکی کے ساتھ۔ مت بھول کر تو بھی ایک جوان بیٹی کا باپ ہے۔ ارے ظالم... جو خود بیٹیوں والے ہوتے ہیں انہیں تو ہر لڑکی اپنی بیٹی ہی کے روپ میں نظر آتی ہے۔''

''ہا... ہا... ہا... مجھے بہت لطف آرہا ہے تمہاری فریاد میں... تمہاری منت سماجتیں سن کر... بولو اور بولو۔'' ممتاز خان مکروہ لہجے میں بولا۔

جنگی خان اپنے چار شیطان ہرکاروں کے ساتھ چیختی چلاتی مدد کے لیے پکارتی بے بس آسیہ کو دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گیا۔

مجھ پر جنونیوں کی سی وحشت طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنے جسم و جان کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں پیروں کی رسیوں کو توڑنے کی سرتوڑ کوشش شروع کردی۔ اس قدر کہ مجھے اپنے ہاتھوں کی کلائیاں چھلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ ایسے میں زخمی بازو کا درد بھی پوری شدت سے جاگ اٹھا۔ مگر میرے دل و دماغ اور حواسوں پہ وحشیانہ جنون طاری تھا۔ ایک آتش فشاں تھا کھولتا ہوا، سلگتا ہوا جو پھٹنے اور لاوا اگلنے کو بے چین ہورہا تھا۔

''اول خیر...! اس مردود شیطان کو سمجھا... اسے بتا، یہ ایسا نہ کرے۔ یہ اندر اپنے شیطانوں کو اس پاک دامن معصوم عورت کے ساتھ ایسا ظلم کرنے سے روک دے۔'' میری حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔

ممتاز خان سامنے موڑھے پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا خبیثانہ انداز میں مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

''ممتاز خان! تو یقیناً ایک باپ کی اولاد نہیں ہو سکتا... ورنہ ایسی گری ہوئی غیر اخلاقی حرکت نہ کرتا جس سے انسانیت بھی لرز اٹھے۔ اب تو ذرا تصور کر... یہی سب تیری اپنی بیٹی نوشابہ کے ساتھ ہوتا... پھر تیری کیا حالت ہوتی؟ بول ممتاز خان...؟'' اول خیر کا لب ولہجہ عجیب ہو گیا۔ وہ بھی یقیناً میری طرح ذہنی ہیجان میں مبتلا تھا پھر جیسے اس پہ پاگل پن کا دورہ پڑا۔

''ممتاز خان! اندر فریاد کرتی آسیہ نہیں... تیری بیٹی نوشابہ ہے۔ تصور کر... وہ تیری بیٹیوں جیسی ہے۔ روک لے اپنے خونخوار کتوں کو۔'' وحشتِ جنوں میں اس کی آواز پھٹنے کے قریب ہوگئی۔

میرا اپنا دماغ الٹنے لگا تھا۔ میری بے چین جلتی سلگتی انگارہ نظریں بار بار اس شیطانی کمرے کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں شیر کی طرح غراتا ہوا اندر جا گھسوں اور ان شیطان بھیڑیوں کی بوٹی بوٹی دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالوں۔

آسیہ بے چاری کے تو سان وگمان میں بھی یہ نہ ہوگا کہ اسے کھلاں والی میں میری ایک ''غلط فہم'' ویڈیو کلپ بنانے کا کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ اگرچہ بعد میں اسے احساس ہوگیا تھا کہ جو منظر اس نے کلپ بند کیا ہے وہ غلط تھا۔ تب سے اس نے اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنے کا عزم کر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

رکھا تھا اور اپنے منگیتر ریحان کے منع کرنے کے باوجود سچ کو ظاہر کرنے کی خاطر اس روز سے میرے مشن میں شامل ہو گئی تھی اور اس ویڈیو کلپ کی تردید میں دوسری ویڈیو تیار کرنا چاہتی تھی جس میں ممتاز خان کا مکروہ چہرہ بے نقاب ہو جاتا مگر افسوس... آج اسی پاداش میں وہ کن قیامت خیز لمحات سے گزر رہی تھی اس کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔

کڑا وقت اپنی تمام تر اذیتوں اور شدتوں کے ساتھ حاوی رہے تو ایک ایسی کیفیت بھی آتی ہے جسے لامحالہ بے حسی کا ہی نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ بے حسی درحقیقت بے بسی اور شدتِ درد کی انتہائی اور آخری منزل ہوتی ہے، مجھ پر بھی شاید ایسی ہی بے رحمانہ بے حسی طاری ہوگئی تھی۔

میں ہولے ہولے ہانپنے لگا تھا... بالکل اس طرح جیسے شیر شکار کا تعاقب کرنے اور ناکامی کے بعد ایک طرف بیٹھ کر ہولے ہولے ہانپتا ہے اور خود کو دوبارہ تیار کرتا ہے۔ اول خیر بھی خاموش تھا۔ شکیلہ کی سسکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ شوکی گنگ پڑا تھا۔ کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔

صدیوں پر محیط ایک ایک پل کا اجتماع نصف گھنٹے تک محیط رہا۔ پھر دروازہ کھلا۔ ہماری نیم مردہ شرمسار نظریں اس بے رحم کمرے کے کھلے دروازے کی طرف اٹھ گئیں جہاں سے جنگی خان اور اس کے چاروں شیطان گماشتے برآمد ہوئے۔ وہ سب منہ لٹکائے برآمد ہوئے تھے۔ ان کی نامرادی شکلیں دیکھ کر ایک لمحے کو اطمینان سے موڑھے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھے ہوئے ممتاز خان کو بھی چونکا دینے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے بھویں سکیڑ کر ان سے پوچھا۔ ''کیا ہوا جنگی...؟''

''جناب وہ مر گئی۔'' جنگی خان نے بے رحمی سے جواب دیا۔

ہال کمرے میں شکیلہ کی ماتمی آہ ابھری۔ وہ سسک کر رونے لگی۔ اول خیر نے شدتِ کرب سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے گوشوں سے بے اختیار آنسوؤں کی لکیریں پھوٹ پڑیں۔ ایسے میں بدنصیب آسیہ ہی کے وہ الفاظ یاد آنے لگے جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہے تھے۔

''شہزی...! میں موت سے نہیں ڈرتی ہوں، وہ تو برحق ہے لیکن میں اپنے عورت ہونے سے ڈرتی ہوں۔ اس کی پامالی... ایک عورت ذات کے لیے موت سے بھی بڑھ کر سزا ہے۔'' آسیہ کے یہ الفاظ یاد کرکے میرا دل ہی نہیں پورا وجود ہی دکھ سے بھر گیا۔

میرے چشم تصور میں اس کے منگیتر ریحان کا چہرہ ابھرا... جس نے اپنے تئیں بہت کوشش چاہی تھی کہ آسیہ ان چکروں میں نہ پڑے۔ اس وجہ سے اس نے مجھے دھوکا بھی دینے کی کوشش کی تھی۔ درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا تھا اور بارہا آسیہ کو روکنے کی بھی کوشش کرچکا تھا۔ تاہم آسیہ نے جلد بازی کے جوش میں جو فاش غلطی کی تھی اس کے ازالے کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ وہ جواب میں تردیدی ویڈیو جاری کرے۔ وائے افسوس... تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

بہرحال اس اطلاع پر ممتاز خان کا چہرہ یکلخت تاریک پڑ گیا۔ وہ یک دم موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیسے مر گئی... وہ...؟''

جنگی خان سر جھکائے کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا ممتاز خان کی ساری خوشی آسیہ کی موت کی خبر سن کر غارت ہوگئی تھی۔ اس نے مارے طیش کے ہونٹ بھینچ کر ایک زوردار تھپڑ جنگی خان کے چہرے پر جڑ دیا۔

''خبیثو..... کیا پہلے کبھی عورت نہیں دیکھی؟ جو مر بھکوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ میں نے سمجھایا تھا تمہیں کہ صرف فلم بنانی ہے۔''

''ہا... ہا... شیطان خان... اس معصوم لڑکی نے اپنی جان دے کر تم سب درندوں کو مات دے ڈالی۔ اصل جیت اسے کہتے ہیں یہی بہادری ہے۔'' اول خیر نے ایک قہقہہ لگا کر کہا مگر میں نے اس کی آواز میں دکھ کی لہر بھی محسوس کی.... مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ ایک خوف ناک چپ... شوکی کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شکیلہ کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہال کمرے میں کرب انگیزی اور سوگواری کی کیفیت طاری تھی۔ ایک ٹھہراؤ کا سا احساس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آکر گزر چکا ہو۔

''لعنت ہے تم پر... جیت کا سارا مزہ ہی کرکرا کر کے رکھ دیا۔'' ممتاز خان نے اول خیر کی بات پر توجہ دیے بغیر دانت پیس کر اپنے گماشتوں کو کوسا۔ ''اب میرا منہ کھڑے کیا تک رہے ہو۔ جاؤ، اس کی لاش کو ٹھکانے لگاؤ اور اس کی ہر نشانی ختم کردو۔''

''اس نشانی کا کیا کرو گے ممتاز خان...! جو کسی زخمی سانپ کی طرح میری آنکھوں میں تمہاری مکروہ صورت کی تصویر بن کر ہمیشہ کے لیے چسپاں ہوچکی ہے۔'' میں نے ممتاز خان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن موڑ کر میری طرف غیظ آلود نظروں سے دیکھا

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

پھر بولا۔

”بہت زعم ہے تمھیں اپنے آپ پر حقیر کیڑے... تیری باری بھی آئے گی... مگر اس طرح کہ پہلے تو اپنے سارے ساتھیوں کی باریاں اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا۔“

اس اثنا میں ہماری سوگوار آنکھوں نے ایک اور اذیت ناک منظر دیکھا جو ہمیں خون کے آنسو رلا گیا۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ آسیہ جیسی نرم و نازک خوب صورت لڑکی کو ایسی حالت میں بھی دیکھیں گے۔

ممتاز خان کی ہدایت پر جنگی خان کمرے سے آسیہ کی لاش کاندھے پر اٹھائے برآمد ہوا تھا۔ آسیہ کا بے سدھ وجود ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے مردہ جسم کو کسی میلی سی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔ آسیہ کا آخری دردناک دیدار بڑا کرب ناک تھا۔ ہال کمرا ایک بار پھر آہ و فغاں سے گونجنے لگا۔

میری آنکھوں کے آنسو نہیں تھم رہے تھے۔ دماغ کی نسیں پھٹ رہی تھیں۔ رگوں میں دوڑتا لہو کھولتا لاوا گردش کررہا تھا۔ روح تک لیر لیر ہونے لگی تھی۔ مجھے ہر طرف غمناکی کے اندھیرے نظر آرہے تھے اور ان اندھیاروں میں مجھے سلگتا ہوا آتشیں گولا متحرک نظر آرہا تھا۔ کاش... کاش میں آزاد ہوتا تو اس صفتِ ابلیس ممتاز خان اور جنگی خان سمیت ان چاروں گماشتوں کا خون پی جاتا۔

ممتاز خان اٹھ کر باہر نکل گیا۔ دو آدمی چارپائی پر جا بیٹھے۔

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ وقت کو جیسے موت آگئی ہو وہ رکا ہوا محسوس ہونے لگا۔

”ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میری بہن...“ معاشو کی لرزتی آواز ابھری۔

”میں ایسا کوئی اذیت ناک منظر دیکھنے سے پہلے مر جانا بہتر سمجھوں گا۔“ وہ بے حال سا ہونے لگا۔ ہم اسے کیا جواب دیتے۔ اب تو ہر تسلی طفل تسلی ہی محسوس ہوتی تھی۔ تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ جس کی موت جس حالت میں لکھی ہوتی ہے اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔

قیامت جیسی قیامت گزر چکی تھی۔ ہم چاروں مغموم خاموشی کے زیرِ اثر تھے۔ میں خاموشی سے سوچ رہا تھا۔ آخر اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا پایا جائے؟ کچھ نہ کچھ تو سوچنا تھا اور کرنا بھی تھا۔ ممتاز خان جیسے درندہ صفت شیطان اور منہ زور حیوان کو لگام دینا ضروری تھا۔ آسیہ کی موت کا دکھ اپنی جگہ تھا مگر آگے کی سوچنا ازبس ضروری بھی تھا۔

پتا نہیں اب یہ رذیل اور صفتِ ابلیس ممتاز خان کسے تختۂ مشق بنانے والا تھا۔ میں اس کی درندہ صفت سفاکی سے نہیں اس کے غیر اخلاقی اور انسانیت سوز حربوں سے ہول زدہ ہوگیا تھا۔ یہ بہت کمینی خصلت اور بدفطرت آدمی ثابت ہوا تھا بلکہ اسے تو انسان کہنا بھی انسانیت کی توہین تھی۔

تھوڑی دیر اور گزر گئی۔ باہر شاید رات کی تاریکی اترنے لگی تھی۔ وہ دونوں مسلح حواری چارپائی پر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور آپس میں کھسر پھسر کررہے تھے۔ ان کے بشروں پر اب سنجیدگی نظر آرہی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ ممتاز خان اور اس کے گماشتے ادھر ہی کہیں موجود تھے یا جاچکے تھے۔ اگرچہ مجھے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز تو آئی تھی۔ ممکن ہے ممتاز خان اس عمارت کے کسی آرام دہ کمرے میں موجود ہو، جبکہ اس کے ساتھی، آسیہ کی لاش ٹھکانے لگانے کے لیے جاچکے ہوں اور وہ ان کی واپسی کا منتظر ہو۔ گویا آج کی ساری رات بھی ہم پر کسی قیامت کی طرح مسلط کی جانے والی تھی۔

وقت ایک بار پھر گویا بھاری سل کی طرح گزرنے لگا۔ بڑے ہولناک لمحات میں ہم سانس لے رہے تھے کہ اچانک شکیلہ نے چارپائی پر بیٹھے دونوں حواریوں کو مخاطب کرکے بہ آوازِ بلند کہا۔

”یہاں کوئی باتھ روم ہے؟“ دونوں نے بیک وقت اس کی طرف دیکھا، پھر آپس میں کھسر پھسر کی۔ پھر سر ہلا کے اس کی طرف سے لاتعلق ہوگئے۔ اب نجانے شکیلہ کو واقعی کوئی فطری حاجت ستا رہی تھی یا پھر وہ کوئی چالاکی کرنا چاہتی تھی، یہ وہی جانتی تھی۔ شکیلہ نے جب دیکھا کہ اس کی بات پر ان دونوں نے کوئی توجہ نہ دی تو چلّا کر بولی۔

”تم نے سنا نہیں، مجھے سخت پیشاب لگا ہے۔ کیا مجھ سے ڈرتے ہو... لعنت ہے تمہاری ہتھیار بند مردانگی پر... مجھ سے برداشت نہیں ہورہا اب، یہاں گندگی ہوجائے گی۔“ شکیلہ نے انہیں اکسانے کے لیے عجیب حربہ استعمال کرنا چاہا۔ میں نے دیکھا شکیلہ کی بات پر ان دونوں کے بشروں پر غصے کی سرخی ابھری۔ دونوں نے ایک دوسرے سے کھسر پھسر کی پھر ایک چارپائی سے اٹھا۔ میرا دل جانے کیوں یکبارگی زور سے دھڑکا۔ شکیلہ کا انداز واقعی بھڑکانے والا تھا اور کچھ خالی از علت بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ آدمی اس کی طرف بڑھا۔ پھر قریب آکر اس کی نازک گردن پر اپنا بھاری بھرکم پاؤں رکھ کر اپنی رائفل کی نال اس کی گردن سے چھوادی اور غرایا۔

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

"کتیا...! اپنی زبان بند رکھ... ورنہ تیرا بھی اس لیڈی رپورٹر جیسا حشر کردوں گا۔"

"ذلیل... کتے... شرم نہیں آتی تجھے... لڑکی ذات سے ایسا سلوک کرتا ہے۔ اپنا ناپاک پاؤں ہٹا دے میری بہن کی گردن سے۔"

شوکی نے طیش میں آکر اسے للکارا۔ حواری کے چہرے پر پہلے قدرے چونکنے کے اور پھر پُرطیش تاثرات ابھرے۔ وہ شکیلہ سے ہٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ اور شوکی کے وجود پر لاتوں کی بارش کردی۔ وہ کراہنے لگا۔ شکیلہ چیخنے لگی۔ میں گلا پھاڑ کر دہاڑا۔

"لعنتی نسل کے انسان... بندھے ہوؤں پر لاتیں چلا رہا ہے۔ یاد رکھنا ایک ایک سے حساب لوں گا۔ تم سب کو عبرت کا نمونہ بنا دوں گا۔"

یہ سن کر چارپائی پر بیٹھا ہوا اس کا دوسرا رائفل بردار ساتھی بھی خوفناک انداز میں غراتا ہوا میری طرف لپکا۔ راہ میں اول خیر پڑا تھا۔ اس نے بندھے ہونے کے باوجود جانے کس طرح اپنا جسم موڑا تھا کہ قریب سے گزرتا ہوا وہ حواری اس کی ٹانگوں سے الجھتا ہوا بری طرح لڑکھڑا گیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ نتیجتاً وہ منہ کے بل ہمارے درمیان آن گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ میں اور اول خیر بیک وقت جکڑ بند ہونے کے باوجود حرکت کرنے کی ایک بے بس کوشش کرتے ہوئے اس پر جا پڑے۔ مگر وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور سب سے پہلے گری ہوئی اپنی رائفل پر قبضہ جمایا۔ اس کا دوسرا ساتھی بھی شکیلہ کو چھوڑ کر ہماری طرف لپکا۔ ہماری بے مراد کوشش کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ ہم شیطان کے چیلے کی شکیلہ کی طرف سے توجہ ہٹانے میں تو ضرور کامیاب ہو گئے تھے مگر خود زیرِ عتاب آ گئے۔ ان دونوں نے مجھے اور اول خیر کو رائفلوں کے کندوں اور لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب تھک گئے تو ایک طرف کھڑے ہو کر ہانپنے لگے۔

"اب تم لوگ اپنا منہ بند رکھنا۔" یہ کہتے ہوئے دونوں چارپائی کی طرف بڑھ گئے۔ میرے اور اول خان کے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ شوکی سے ہماری یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ وہ چلا کر بولا۔ "ظالمو! ان کا خون بہہ رہا ہے... یہ مر گئے تو اپنے باپ ممتاز خان کو کیا جواب دو گے؟" ان دونوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہمارا خون بہہ بہہ کر ایک قدرتی عمل کے تحت جم کر خود ہی بہنا بند ہو گیا۔

اس دوران مجھے اول خیر کی ہلکی سرگوشی سنائی دی۔

"کاکا...! مگر یہ خون ضائع نہیں گیا۔ اس بہانے میں تیرے قریب ہو گیا ہوں، میرے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے ہیں... تو اسی طرح پڑا رہ میری طرف اپنی پشت کیے۔"

اس کی بات سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ پروانۂ آزادی کو ایک ذرا راہ کیا سجھائی دی کہ میرے اندر کا سویا درندہ بیدار ہونے لگا۔ اول خیر جانے کب سے اپنے دونوں ہاتھوں کی رسیوں پر زور آزمائی کر رہا تھا... نجانے وہ کیسے رسی کھول پایا تھا جبکہ ایک کوشش میں بھی اس طرح کی کر چکا تھا اور سوئے ہاتھوں پیروں کی کھال چھیلنے کے کچھ نہ کر سکا تھا۔

"تو ایک کام کر... کھانسنے کے بہانے اپنی پشت کو حرکت دے کر میرے ذرا اور قریب کر لے، ورنہ میرے بازوؤں کے پھیلاؤ اور بدلتی پوزیشن سے یہ دونوں مردود شک میں پڑ جائیں گے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور زور زور سے کھانسنے لگا۔ ساتھ ہی اپنی پشت اس کے مزید قریب کر لی۔ میں نے کھانسنے کی صورت میں ایک طرف گردن اٹھا کر خون بھی تھوک ڈالا۔ تاکہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے دونوں یہی سمجھیں کہ خون حلق میں پھنسنے نے مجھے کھانسنے پر مجبور کیا ہے۔

دونوں نے میری طرف دیکھا بھی تھا اور پھر دوبارہ اپنی طرف دھیان کر لیا تھا۔ ان کی چارپائی کا فاصلہ ہم سے تقریباً آٹھ نو فٹ کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ اور دروازے کے قریب تھا۔ میں نے اپنی پشت پر بندھے ہاتھ کی رسیوں پر اول خیر کے زخمی ہاتھوں کی حرکت محسوس کی اور ایک لمحے کو لرز اٹھا۔ اول خیر کے ہاتھوں کا لمس مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے گوشت کے چھلے ہوئے لوتھڑے ہوں... میرے خدا! اس نے جانے کس اذیت کے ساتھ جان توڑ کوشش سے اپنے ہاتھ رسی کی گرفت سے آزاد کیے تھے۔ بہرحال وہ کوشش میں لگا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ورنہ ہماری ساری محنت اکارت جاتی۔ ہاتھ آزاد ہونے کے باوجود ہم نے اپنے دونوں بازوؤں کی پوزیشن ویسے ہی رکھی تھی۔

میں نے ایک بار پھر کھانسنے کا عمل کیا اور اپنے جسم کو اس طرح بل دیا جیسے پسلیوں میں درد ہو رہا ہو۔ اس طرح لیٹے لیٹے میری پوزیشن بدلی۔ اب میری دونوں ٹانگیں اول

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

خیر کی پشت کی سمت ہو گئیں۔ وہ ان کی رسی کھولنے میں مشغول ہو گیا۔

یہ سب کچھ چھپ چھپاتے اور نہایت رازداری سے انجام پذیر ہوا تھا۔ اب میں آزاد تھا۔ اول خیر کی کچھ ایسی صورتِ حال تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں کی رسی نہیں کھول سکتا تھا۔ یہ فریضہ میں ہی انجام دے سکتا تھا۔ وہ دونوں گاہے بہ گاہے ہماری طرف بھی نظر ڈال لیتے تھے۔ اگر ہم بغیر کھانسے اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کرتے تو ان دونوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس بار اول خیر کھانسا اور اپنے جسم کو بل دیا۔

اسی وقت ان دونوں نے ہماری طرف دیکھا تو اول خیر ہانپنے کے انداز میں دانستہ پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

”...مم... مجھے... ایک... گلاس پانی تو پلا دو... خون میرے حلق میں اتر رہا ہے۔“

”اپنے خون سے ہی پیاس بجھا لو... ہا... ہا...“ ان میں سے ایک نے زہرخند طنز سے کہا مگر ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ اول خیر نے اپنی ٹانگیں اکڑوں انداز میں موڑ کر پشت کی طرف موڑ لی تھیں اور میرے پشت کی طرف بظاہر ”بندھے“ ہوئے ہاتھ اس کی ٹانگوں کے جکڑ بند کو چھونے لگے۔ میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اس دوران میں نے شوکی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا... شاید ہماری کارروائی کا اسے ”خوش کن“ شبہ ہو چلا تھا۔ جس وقت میں اول خیر کی رسی کھول چکا تھا ٹھیک اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ ہم بری طرح ٹھٹکے، چارپائی پر بیٹھے وہ دونوں گماشتے چونک کر اٹھے۔ اپنی رائفلیں سنبھالیں اور دروازے کی طرف بڑھے۔

”او خیر... چل کاکا اللہ کا نام لے، آگے بڑھ یہی موقع ہے۔“ ان دونوں کے باہر نکلتے ہی اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے کہا۔ اور پھر ہم دونوں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ شکیلہ تو متحیر رہ گئی۔ مسرت کے مارے اس کے حلق سے ہلکی سی سسکاری بھی برآمد ہوئی تھی۔

ان کی طرف توجہ دینے کا وقت نہ تھا۔ وہ لوگ کسی بھی وقت دوبارہ آسکتے تھے۔ ہم دونوں لپک کر ہال کمرے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا پڑا تھا۔ اس دوران میری نظریں اول خیر کے ہاتھوں پر پڑیں۔ وہ بری طرح چھلے ہوئے تھے۔ میں نے ہلکی آواز میں کہا۔

”اول خیر! تیرے ہاتھ زخمی ہیں۔“

”او خیر... کاکے... میرا تو پورا وجود ہی زخمی ہو رہا ہے... یہ زخم میرے جوش اور طاقت کو ہوا دیتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”پر میں تیری آنکھوں میں شیر جیسی چمک اور چیتے جیسا جوش دیکھ رہا ہوں، خود کو سنبھالنا، زیادہ جوش بنا بنایا کھیل بگاڑ دے گا۔“

”تو فکر نہ کر۔“ میں نے کہا اور باہر جھانکا۔

مختصر سے برآمدے کے باہر فارم کے احاطے میں رات کی سیاہی اتری ہوئی تھی۔ چھتوں کی دیواروں پر کچھ بلب نصب تھے جن کی روشنی میں مجھے سب نظر آرہے تھے۔ مگر میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ان میں نہ ممتاز خان تھا نہ ہی جنگی... البتہ وہ چاروں مردود حواری ضرور تھے جو جنگی کے ساتھ آسیہ کو اپنی بربریت کا نشانہ بنانے کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے۔ وہ شاید بدنصیب آسیہ کی لاش ٹھکانے لگا آئے تھے۔ ایک جیپ کھڑی تھی وہ چاروں اسی میں سے اترے تھے اور وہیں احاطے میں کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے اول خیر سے کہا۔

”ابھی ان کے اندر آنے میں کچھ دیر محسوس ہوتی ہے... تم جلدی سے شوکی اور شکیلہ کو آزاد کر دو۔“

اول خیر نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر میری ہدایت پر عمل کیا۔ جب تک وہ اپنے کام سے فارغ ہوا میرا دل یہ دیکھ کر یکبارگی زور سے دھڑکا کہ وہ سب ہلکی آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے اسی ہال کمرے کی طرف آرہے تھے۔ ان کی تعداد اب چھ تھی وہ سب مسلح تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ہال کمرے میں ان کی یقینی موت کا سامان کیا جا چکا تھا۔ بندھے ہوئے زخمی شیر آزاد ہو چکے تھے اور کسی کو بھی چیر پھاڑ ڈالنے کو کھلے پنجرے میں دندنا رہے تھے۔

☆☆☆

ممکنہ خون ریز مقابلے کے پیش نظر ہم نے شکیلہ اور شوکی کو اندر کمرے میں جانے کا کہا تھا مگر شوکی اپنی بہن کو کمرے میں چھوڑ کر دوبارہ ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔ میں نے اور اول خیر نے تنبیہہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سنجیدگی سے فقط اتنا بولا۔

”آئندہ مجھے مقابلے کے میدان میں خود سے الگ کرنے کا کبھی مت کہنا ورنہ شوکی تم دونوں کی دوستی کو فراموش کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہیں لگائے گا۔“

شوکی کے لہجے اور آواز میں گزرے کڑے وقت کا سوز بھی تھا اور آنے والے فیصلہ کن محاذ میں ڈٹ جانے کا جوش بھی۔ اس کی آواز میں ایسی پُرجوش تھرتھراہٹ تھی کہ

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

پھر مجھے یا اول خیر کو اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ ہم دونوں کی طرح وہ بھی ان ابلیس صفت رذیلوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اپنی بقا اور تحفظ کا جذبہ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کو بھی بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔

میں نے دیکھا۔ وہ مختصر سے برآمدے میں آ کر رک گئے تھے۔ اب ان کی باتوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ مذکورہ چاروں میں سے ایک نے دونوں پہرے دار ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’جیدی! چودھری صاحب حویلی جا چکے ہیں۔ استاد جنگی خان بھی ان کے ساتھ ہے۔ ہم ایک نظر یرغمالیوں پر ڈال لیں پھر ڈیرے کی راہ لیں گے۔ ویسے سب ٹھیک تو ہے ناں... اندر؟‘‘ جیدی نامی اس آدمی نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

’’سب ٹھیک ہے جی... فکر دی لوڑ نہیں۔ بس ذرا وہ زنانی پیشاب کرنے کے لیے شور مچا رہی تھی، ویسے ان کا اب کرنا کیا ہے؟‘‘

’’اب ان لوگوں کا فیصلہ کل صبح ہی ہوگا۔‘‘

’’ہو جائے فیصلہ تو اچھا ہے۔ اس ڈیوٹی سے جان چھوٹے۔‘‘ دوسرے نے پوچھا۔ ’’ویسے کرنا کیا ہے ان کا؟‘‘ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ پہلے شیطان نے سفاکی سے کہا۔

’’چودھری صاحب نے انسپکٹر روشن کو فون کر دیا ہے۔ وہ صبح تڑکے پولیس کی بھاری نفری لے کر یہاں پہنچے گا۔ شہزی اور اس کے ساتھی اول خیر کو تو جعلی پولیس مقابلہ دکھا کر ختم کر دیا جائے گا جبکہ ان دونوں بھائی بہنوں (شوکی اور شکیلہ) کو ڈیرے پر لے جا کر گولی ماردی جائے گی۔‘‘

ان کے عزائم سن کر میں لرز گیا۔ ہم تینوں نے ایک دوسرے کے بشروں کی طرف دیکھا..... کسی بھی وقت ہمارا خون ریز ٹاکرا ہونے والا تھا۔ دونوں مسلح پہرے دار ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلتے ہوئے..... اندر داخل ہوئے ..... اور پھر یکلخت جیسے ان پر میں اور اول خیر قیامت بن کر ٹوٹ پڑے۔

خوفناک ٹکراؤ کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وہ چاروں خونی مسلح ہرکارے بھی اپنے دونوں پہرے دار ساتھیوں کے عقب میں اندر آ رہے تھے لہٰذا یہ سب بجلی کی سی پھرتی سے کرنے کا متقاضی تھا۔ اولین کوشش ان کے ہتھیاروں پر چشم زدن میں قبضہ جمانا تھا۔ رائفلیں چھین کر انہیں واپس دروازے کی طرف دھکیلا تو وہ چاروں ابلیس بری طرح ٹھٹک گئے۔ اور اس بری طرح بدکے کہ انہوں نے اپنی گنوں کا منہ کھول دیا۔ یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی بدحواسی کا بیّن ثبوت تھا کیونکہ ان کے گمان میں کب یہ تھا کہ اندر بندھے ہوئے بے بس پڑے یرغمالی ایسا اچانک ایکشن بھی لے سکتے تھے۔ نتیجتاً ان کی بدحواسی کا نشانہ ان کے اپنے ہی وہ دونوں نہتے پہرے دار بنے۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میں ان دونوں کی کریہہ چیخیں بھی شامل تھیں۔ ان کے گرتے ہی میں اور اول خیر رائفلیں سیدھی کر کے لبلبی دبا چکے تھے۔ ہم دونوں کی گنوں نے بیک وقت آتشیں قہقہے اگلے... مگر تب تک وہ چاروں دائیں بائیں چھلانگیں مار چکے تھے۔ ہم نے بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دروازے سے باہر محتاط روی کے ساتھ جھانک کر دیکھا۔ ایک برسٹ فائر ہوا۔ میں پلٹا تو دوسرے ہی لمحے میں میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے ہال کی سیدھ والی کھڑکی کے دھندلے شیشوں کے پٹ کے پار سایہ لہراتے دیکھا۔ باہر سے رائفل کے کندہ مار کر شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھرتے ہی میں اپنی رائفل کی نال اس طرف کر چکا تھا۔ میری انگلی ٹریگر پر متحرک ہوئی، گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے پار مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے ابلیسی چیلے کو بری طرح چاٹ گئی۔ ایک اور چھناکے کی آواز ابھری۔ میں جنوں خیز انداز میں آواز کی سمت پلٹا۔ اس وقت اول خیر کی گن گرجی اور دوسرے ابلیسی چیلے کی کریہہ چیخ میرے جسم و جان کو سرشار کر گئی۔ گولیوں کی گھن گرج کے ساتھ ہی ایک دم سناٹا چھا گیا۔ بدنصیب مظلوم آسیہ کے دو مجرموں کو موت کے گھاٹ اتار کے میرے رگ و پے میں لہو کی گردش مثلِ پارا دوڑنے لگی۔ میں باقی دو ابلیسوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اپنی طرف کی مذکورہ ٹوٹی ہوئی کھڑکی کی طرف لپکا۔ یہاں سناٹا تھا۔ بیرونی احاطہ ویران تھا۔ باہر چھت کی پیشانی پر نصب بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں آتشی بگولا کی طرح پلٹا اور ہال کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ادھر اول خیر بے چارہ تجانے کس طرح اپنے زخمی ہاتھوں سے رائفل کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مگر اس دوران شوکی نے بیدار مغزی کا مظاہرہ کیا اور نہایت ہوشیاری سے اول خیر کی طرف کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے جھک کر ایک مرے ہوئے ابلیسی چیلے کی گن اٹھا کے قبضے میں کرلی۔ دروازے کی طرف لپکتے ہوئے میں نے اس کی کامیاب مستعدی پر اسے انگوٹھا دکھا کر ہمت افزائی کی اور

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

باہر آگیا۔

اول خیر اور شوکی بھی لپک کر میرے عقب میں آگئے تھے۔ باقی دونوں ابلیسی جانے کہاں غائب تھے۔

''کاکا! سامنے جیپ کھڑی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے جلدی...'' اول خیر بولا۔ شاید میری طرح اس نے بھی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ باقی ماندہ دو چیلے یقینا کہیں چھپے ممتاز خان یا جنگی خان کو تازہ صورتِ حال کی اطلاع دے رہے تھے۔

''جلد بازی نہیں کرنی اول خیر۔'' میں نے کہا۔ ''ان کے ذہن میں بھی یہی خدشہ ہوگا کہ ہم سب سے پہلے سامنے احاطے میں کھڑی جیپ کا رخ کریں گے۔ انہوں نے اسے نشانے پر رکھا ہوگا۔''

ابھی میری بات پوری ہوئی تھی کہ اول خیر چلایا۔ ''گر جاؤ۔''

میں نے فوراً خود کو زمین پر گرا دیا، برسٹ فائر ہوا، شکر تھا کہ میں تو چھلنی ہونے سے بچ گیا تھا مگر اول خیر نے بھی کمال پھرتی سے اپنے سمیت ساتھ کھڑے شوکی کو بھی دبوچ کر اندر ہال کمرے میں گھسیٹ لیا تھا۔ اگرچہ میں اب بھی حملہ آور کے رحم و کرم پر تھا مگر اس سے قبل ہی اول خیر کی گن گرجی اور ایک بھیانک چیخ مجھے اپنے سیدھے ہاتھ کی دیوار سے سنائی دی اور میں لپک کر ہال کمرے کے دروازے کی طرف آگیا۔ دوسرے ہی لمحے ہم تینوں ایک بار پھر اندر تھے۔

''باقی ایک بچا ہے۔ ہمیں ان کھڑکیوں سے باہر نکل کر اسے تلاش کر کے جہنم رسید کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ دونوں نے صاد کیا پھر ہم تینوں محتاط روی کے ساتھ کھڑکیوں کی طرف بڑھے اور باہر کود گئے۔ میری طرف کھلے احاطے کا شمالی حصہ تھا یہاں دو ابلیسی چیلوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے نفرت خیز انداز میں ان پر تھوک دیا..... تین چیلے مارے جا چکے تھے، ایک زندہ بچا تھا۔ آسیہ پر ظلم کرنے کا انہیں ہم نے بہت جلد ہی موت کا انعام دے ڈالا تھا۔ میں نے سامنے دیکھا یہاں مدھم تاریکی تھی۔ کسی دوسرے کمرے کی دیوار بھی نظر آرہی تھی۔ جس کا جنوبی گوشہ لوفٹ تک باہر کو نکلا ہوا تھا، اس کے درمیان یقینا کوئی گلی نما راہداری تھی، میں اس طرف بڑھا اور یک دم گلی میں آگیا۔ سامنے ایک اور شخص کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا اور بے اختیار ہم دونوں نے ہی ایک گہری سانس خارج کی تھی، وہ اول خیر تھا۔

''شوکی کدھر ہے...؟'' میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

''میں نے اسے واپس ہال میں بھیج دیا تھا۔ وہاں شکیلہ ہے۔ اس کی وہاں موجودگی ضروری ہے۔ ویسے بھی وہ باہر احاطے میں موجود جیپ پر بھی نظر رکھے ہوئے ہے۔ تاکہ ہمارا آخری شکار فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔'' ابھی اس کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ ہمیں ایک برسٹ کی خوفناک تڑتڑاہٹ نے بری طرح چونکا دیا۔ یہ آواز ہال کی طرف سے ابھری تھی۔ یکلخت ہم دونوں کے بشروں پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ہم دوبارہ ہال کی طرف پلٹے۔ کھڑکی سے اندر جھانکا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اندر گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ یا تو بلبوں کو دانستہ نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر مین سوئچ آف کیا گیا تھا۔ مگر کس نے؟ اور کیوں...؟'' یہ سوالیہ نشان آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹک گیا۔

''دشمن کا ایک ساتھی بچا تھا اور وہی ہمارے لیے لوہے کا چنا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس عمارت کے محل وقوع سے واقف تھا اور ہم نابلد... ہم صرف محدود حد تک حرکت پذیر ہونے کے بعد دوبارہ وہیں لوٹ آنے پر مجبور ہو جاتے۔ میں نے شوکی کو ہولے سے پکارا تو مجھے تیز تیز سانسوں کی بازگشت سنائی دی۔ پھر اچانک مدھم روشنی میں ایک چہرہ کھڑکی سے باہر جھول گیا، اسے دیکھ کر میں اور اول خیر دھک سے رہ گئے۔ وہ شکیلہ تھی۔ میں نے فوراً اسے سنبھالا اور باہر کھینچ لیا، وہ ٹھیک تھی۔

''شوکی کدھر گیا... ؟ اور یہ برسٹ کس نے فائر کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہانپنے کے انداز میں بولی۔ ''بھائی کو دشمن کی جھلک نظر آئی تھی... وہ ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا... بھائی سے رائفل نہیں چلائی جا سکی، اس نے چلا کر مجھے دوبارہ کمرے کی طرف بھاگنے کو کہا پھر اچانک لائٹ آف ہوگئی تھی ہال کی۔ برسٹ دشمن نے چلایا تھا مگر ہم بچ گئے پھر میں نے بھائی کی دوڑتے قدموں کے آواز سنی تھی، پتا نہیں وہ کدھر چلا گیا۔''

''وہ یقینا دوسری کھڑکی سے کود کر دشمن کو دبوچنے گیا ہوگا کاکے... تم ادھر ہی ٹھہرو۔'' اول خیر نے یہ سن کر فوراً کہا اور تیزی سے ایک طرف کو رینگ گیا۔ شکیلہ میرے ساتھ تھی، میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اچانک ایک للکار سے مشابہ آواز ابھری۔

''تم تینوں جہاں کہیں بھی ہو۔ سامنے احاطے کی روشنی میں اکٹھے ہو جاؤ۔ تمہارا ساتھی شوکی میرے رحم و کرم

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

پر ہے اس وقت...''

یہ آواز سن کر میں سناٹے میں آ گیا۔ یقیناً اس آخری ابلیس چیلے نے شوکی کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔ ممکن ہے اول خیر نے بھی اس کی آواز سن لی ہو۔ اب یہ اس کی صوابدید پر منحصر تھا کہ وہ اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے یا پھر... اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے۔

''میں صرف پانچ تک گنتی گنوں گا۔ اس کے بعد تمہارے ساتھی کی لاش احاطے میں گرے گی۔'' معاً اس کی غضب میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''تم تینوں بچ کر نہیں جا سکتے۔ میرے ساتھی کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والے ہیں۔ میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔''

''ایک...''

میں اس مردود کی بات پر لرز اٹھا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ جنگی خان کو مطلع کر چکا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ خونی ہرکارہ فوراً حرکت میں آ چکا ہوگا اور کسی بھی وقت اپنے ساتھیوں کے مسلح ٹولے سمیت یہاں وارد ہونے والا تھا جبکہ ادھر یہ نئی مصیبت گلے آن پڑی تھی۔

''اب کیا ہوگا شہزی...؟'' شکیلہ نے مجھے خاموش پا کر متوحش لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''حوصلہ رکھو...''

''دو۔'' اس کی گنتی جاری تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔

''تین۔''

سوچنے کے لیے اب وقت بھی نہ رہا تھا۔ وہ بے دریغ شوکی کو گولی مار سکتا تھا۔ وہ یقیناً ہال کمرے کی چھت پر کہیں چھپا کھڑا تھا۔ اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ اول خیر اس کی آواز کے تعاقب میں اس کے سر پر جا پہنچے۔ شکیلہ کی سسکی ابھری۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اسے بھی پورا ادراک تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا احاطے میں آ گیا۔ یہاں فقط ایک ہی دو سو واٹ کا بلب روشن تھا، اس کا کنکشن شاید ڈائریکٹ باہر نصب پول سے کیا گیا تھا ورنہ اندر ہال کمرے کا شاید فیوز اڑ گیا تھا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا اور سناٹے میں آ گیا۔ مجھے کھلے روشن آسمان کی مدھم روشنی میں ہال کی چھت کی منڈیر پر شوکی اپنے دونوں ہاتھ اوپر کیے کھڑا نظر آیا۔ اس کے عقب میں آخری دشمن اپنی رائفل کی نال اس کی گدی سے لگائے ہوئے تھا۔ دونوں کے ہیولے صاف نظر آتے تھے۔ اس نے شاید مجھے اور شکیلہ کو دیکھ لیا تھا۔ چلا کر بولا۔ ''رائفل پھینک دو۔ اور تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر لو۔'' میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کی پھر غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ ''تمہارا ساتھی کدھر ہے۔ اب آخری گنتی رہ گئی ہے۔''

''وہ ہمیں نہیں معلوم کدھر ہے۔'' میں نے جھوٹ بولا۔ لیکن مجھے تشویش بھی ہوئی۔ میرا جھوٹ اسے مزید غضب میں مبتلا کر سکتا تھا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اوپر سے ایک وجود لہراتے ہوئے نیچے آ رہا اور دھب سے ہمارے قریب قدموں میں گرا۔ میں بری طرح دہل گیا۔ شکیلہ کے حلق سے ہذیانی چیخ ابھری۔ دوسرے ہی لمحے شکیلہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لاش کو دیکھا تو جسم و جاں تک میں سرشاری دوڑ گئی۔ بالآخر میرے بہادر جاں نثار ساتھی اول خیر نے آخری ابلیس چیلے کو بھی نشانہ بنا ہی ڈالا تھا۔

وہ اوپر سے چیخا۔ ''کاکے...! جیپ میں سوار ہو جاؤ۔ ہم نیچے آ رہے ہیں... جلدی۔''

شکیلہ تڑپ کر مجھ سے الگ ہوئی۔ وہ اب پھٹی پھٹی آنکھوں سے اوپر دیکھ رہی تھی جہاں شوکی سلامت کھڑا تھا اور ہاتھ ہلا کر اول خیر کے ساتھ واپس پلٹ رہا تھا۔ بھائی کو سلامت پا کر وہ رونا بھول گئی تھی۔ اس کی طرح پہلے میں بھی یہی سمجھا تھا کہ کہیں بدقسمتی سے گرنے والا شوکی نہ ہو مگر اول خیر نے عین وقت پر اوپر پہنچ کر بازی پلٹ دی تھی۔

میں نے پھرتی سے رائفل اٹھائی، ہم جیپ کی طرف دوڑے... شکیلہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر سوار ہو گئی۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھال لی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً گھما دی۔ رات کے دم بخود سناٹے میں جیپ کا انجن ہلکی غراہٹ کے ساتھ بیدار ہو گیا۔ ہیڈ لائٹس جل اٹھیں اس کی روشنی اس منحوس فارم ہاؤس کے مختصر برآمدے سے ہوتی ہوئی ہال کمرے کے کھلے دروازے سے اندر پڑ رہی تھی جہاں اب آسیبی سناٹے کا سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آسیہ کو یاد کر کے ایکا ایکی میرا دل بھر آیا۔ میرا جی چاہا اس منحوس فارم ہاؤس کو آگ لگا دوں... مگر ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اول خیر اور شوکی بھی دوڑتے ہوئے آ گئے اور فوراً جیپ میں سوار ہو گئے۔ اول خیر نے میرے برابر والی سیٹ سنبھال لی۔

''نکل چل کاکے... وقت کم ہے۔'' وہ بولا اور میں نے جیپ کو گیئر ڈال کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا پھر یوٹرن لیا اور پھاٹک کے رخ پر جیپ کا رخ کرتے ہی ایکسلریٹر دبا

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

دیا۔ جیپ ہچکولے کھاتی بڑا سا چوبی پھاٹک کراس کر کے تاریک راستے پر ہولی۔ میں بتدریج رفتار بڑھاتا چلا گیا۔۔۔

☆☆☆

فارم ہاؤس سے ابھی بمشکل ہمیں نکلے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ سامنے ایک گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ یکلخت میرا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دیں تو اول خیر کی سرسراتی آواز ابھری۔ ”کوئی فائدہ نہیں، لائٹس آن کر کے دائیں جانب گاڑی موڑ دو۔ کسی کھڈ میں نہ پھنس جائے ہماری گاڑی۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ ہیڈ لائٹس دوبارہ آن کر کے فوراً اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا اور رفتار پھر بڑھا دی۔ جیپ زبردست ہچکولے کھانے لگی۔ اول خیر کی بات صحیح تھی یہاں مجھے بڑے کھڈ بھی نظر آئے تھے جیپ تاریکی کے باعث کسی گہرے کھڈ میں پھنس سکتی تھی۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی وحشیانہ تڑتڑاہٹ ابھری اور بغیر کسی وقفے کے تقریباً دس پندرہ سیکنڈ تک جاری رہی۔ اب یہ بات شک و شبے سے بالاتر ہو گئی تھی کہ جنگی خان اپنے مسلح ساتھیوں سمیت سامنے والی جیپ میں ہمارے تعاقب میں تھا۔ مرتے مرتے ابلیسی چیلوں نے ہمارے لیے یہ مشکل کھڑی کر دی تھی کہ انہوں نے ہم سے مقابلہ کرنے کے دوران جنگی خان وغیرہ کو ہمارے متعلق آگاہ کر دیا تھا۔ ہماری جیپ کے دائیں جانب موڑ کاٹتے ہی انہیں ہم پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا کہ اس جیپ میں یقیناً ان کے ساتھی نہیں ہو سکتے تھے بلکہ ان کے شکار تھے جو فرار ہو رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ہم پر انہوں نے اپنی گنوں کے دہانے کھول دیے تھے۔

ہم سب جھک گئے تھے، یہ ہمارا غیر اختیاری ردِعمل تھا مگر میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جما رکھے تھے۔ میرے زخمی بازو کا درد جانے کہاں جا سویا تھا۔ اول خیر کو دیر بعد سہی مگر اب اس علاقے کا ادراک ہو چلا تھا۔ میں اس کی ہدایت پر جیپ دوڑا رہا تھا۔ گہرے ہچکولوں میں کمی آ گئی تھی۔ اب ناپختہ مگر قدرے ہموار راستہ ہمارے سامنے تھا جس کے دائیں بائیں قدِ آدم جھاڑیاں تھیں۔ دشمنوں کی گاڑی ہمارے تعاقب میں لگ چکی تھی۔ میں تاریکی میں بل کھاتے اس کچے راستے پر جیپ آندھی طوفان کی طرح اڑائے جا رہا تھا۔ سرِدست ہم دشمنوں کی نئی کھیپ سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہمارا اسلحہ پہلی دشمن ٹیم سے مقابلہ کرنے کے بعد دوبارہ اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

معاً ایک بار پھر ہمارے عقب میں فائرنگ ہوئی۔ اس بار دشمن کی چلائی ہوئی کچھ گولیوں سے جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے کی سنسنی خیز ”ڈناڑٹ“ ابھری تھی۔ ٹائر برسٹ ہونے کا خطرہ شدید ہو گیا تو میں نے جیپ کو قدرے زگ زیگ انداز میں دوڑانا شروع کر دیا۔ اسی وقت اول خیر پھرتی سے اچھل کر جیپ کے پچھلے حصے کی طرف کود گیا۔ وہ یقیناً جوابی فائرنگ کرنا چاہتا تھا اور اب میرے خیال میں یہ ازبس ضروری بھی ہو گیا تھا۔

پوزیشن سنبھالتے ہی اول خیر نے پہلا برسٹ فائر کیا تھا اور ساتھ ہی مجھے ایک راستہ بھی سمجھا دیا تھا کہ اس راستے پر ایک خشک نالے کی پلیا پار کرتے ہی یہ راستہ تین حصوں میں منقسم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے الٹے ہاتھ والے راستے پر اسٹیئرنگ کاٹنا تھا۔ اس کے آگے راستہ نسبتاً کھلا اور سیدھا تھا جو مین روڈ سے گلے ملتا تھا۔ یہ کوئی چار پانچ کلومیٹر کا راستہ ہو سکتا تھا اور مین روڈ تک ٹاپوں ٹاپ تھا۔ یہ شبہ تھا کہ ہم شاید ممتاز خان کی آبائی جاگیر ”نئے پنڈ“ میں تھے۔

”کاکے پلیا پر چڑھتے ہوئے خیال رکھنا وہ راستہ تنگ ہوگا۔“ عقب سے دوسرا برسٹ فائر کرتے ہوئے اول خیر نے مجھے خبردار کیا۔

میری نظریں سامنے کچے راستے پر مرکوز تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں مجھے جلد ہی اس پلیا کی شکستہ منڈیریں دکھائی دے گئیں، جس کی اول خیر نے نشاندہی کر دی تھی۔ وہاں تک راستہ خاصا تنگ ہو گیا تھا۔ نسبتاً بلند بھی تھا۔ اس وقت میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔ دشمن کی تعاقب میں آتی ہوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی منعکس ہو کے میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔ میں دھک سے رہ گیا تھا۔ دشمن بتدریج قریب ہو رہے تھے۔ میں نے دانت پر دانت جما کر ایکسلریٹر پر یکدم دباؤ بڑھا دیا۔ پلیا قریب آ گئی تھی۔ اس وقت عقب سے یک بیک ایک سے زائد گنیں گرجیں، اس بار ٹائروں کا نشانہ لیا گیا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے سماعت شکن دھماکا ہوا۔ ہماری جیپ یکدم یوں بیٹھنے لگی جیسے اس کے ٹائر ہی نیچے سے نکل گئے ہوں۔ تب تک میں پلیا پر جیپ چڑھا چکا تھا۔ عین وقت پر جیپ رکنے اور ایک طرف کو جھکنے لگی۔ میں نے ہینڈ بریک لگا دیے مگر بے سود، جیپ لڑکھڑائی اور خشک نالے کی طرف پھسلتی ہوئی جا گری۔ وہ نصف حد تک جھک گئی۔

”سب باہر نکلو جلدی۔ ورنہ دشمن ہمیں بھون

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

دیں گے۔'' اول خیر چیخا۔ ہم تیزی سے جیپ سے اترے۔ میں رائفل اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ نالے کے کراڑے پر تیز روشنی چمکی۔ اس روشنی میں مجھے آٹھ دس مسلح افراد دکھائی دیے۔ یہ کوئی اولڈ ماڈل لینڈ کروزر تھی۔ جس کی چھت اڑا کر اسے بھی شکاری جیپ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ ہم تب تک پلیا کے اندر گھس گئے۔ اول خیر آگے تھا۔

''میرے پیچھے آتے رہو۔'' کہتا ہوا وہ دوڑا۔ ہم اس کے پیچھے تھے۔ رکنا بھیا نک موت کو دعوت دینا تھا۔ اس کا احساس ہمیں تھا اور ہم سے زیادہ اول خیر کو نالا تنگ تھا۔ اس کے اندر کہیں کہیں کیچڑ بھی تھا۔ خودرو جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں۔ کچھ آوارہ کتے اور گیدڑ شور مچاتے ادھر ادھر دوڑتے دیکھے۔ ان میں ایک دو کتے خونخوار اور ضدی ثابت ہوئے مگر اول خیر نے اپنی رائفل کو نال سے پکڑ کر لٹھ کی طرح گھما کر ان پر ضرب لگائی تو وہ کوں کوں کرکے ایک نالے کے کراڑے کی طرف بھاگ اٹھے۔ رات، سناٹا اور کیچڑ زدہ نالا... اس پر جھینگروں کی کراہت انگیز جھائیں جھائیں ماحول کو عجیب سا تاثر دے رہی تھیں۔ دفعتاً عقب سے گاڑی کے انجن کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔ نالے کے دائیں کراڑے پر دشمنوں کی جیپ ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔ اگر وہ ہمارے قریب پہنچ جاتے تو آسانی سے ہمیں اس نالے کے اندر ہی محدود کر کے گولیوں سے بھون دیتے۔

اول خیر ہم سے آگے تھا۔ وہ ایک جگہ رکا۔ اور بائیں کراڑے کی ڈھلان پر اگی خودرو جھاڑیوں کو پکڑ کر اس پر چڑھنے لگا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

اب مجھے اول خیر کی چالاکی کا اندازہ ہوا۔ وہ اب دشمن کو مخمصے میں ڈالے ہوئے تھا کہ آیا وہ پلیا پار کرکے کراڑے پر سے ہی ہمارا تعاقب کرتے رہیں یا بائیں طرف سے۔ اب جبکہ ان کی گاڑی کی آواز دائیں کراڑے سے ابھرتی ہوئی سنی تو اس نے لامحالہ بائیں کراڑے کا رخ کیا تھا۔ ہم سب ایک دوسرے کی مدد سے ہاتھ تھامے، دائیں کراڑے پر آگئے۔

''خبردار... کھڑے مت ہونا، لیٹ جاؤ... سینے اور کہنیوں کے بل جتنی جلدی ہوسکے، کراڑے سے نیچے اتر جاؤ۔'' اول خیر نے ہدایت دی۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے عقب میں دوسرے کراڑے پر بھی نگاہ ڈالی۔ دشمن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انہوں نے جیپ روک لی تھی اور میں نے کئی مسلح ہرکاروں کو نالے میں اترتے دیکھا۔

''وہ جیپ سے اتر کر ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔'' میں نے اول خیر کو خبردار کر دیا۔

''آگے بڑھتے رہو۔ میرے پیچھے۔'' اول خیر کی آواز سنائی دی اور گرد و پیش کی گھور تاریکی اور اوپر کھلے روشن آسمان میں ہمارے صرف متحرک ہیولے نظر آرہے تھے۔ اول خیر آگے تھا اس کے بعد شکیلہ اور شوکی تھے، میں نے خود کو دانستہ پیچھے رکھا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ پیچھے مڑ کر تعاقب میں آتے ہوئے دشمنوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دوں... مگر یہ محض میری جنونی سوچ تھی۔ اس کا خاطر خواہ فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہوسکتا تھا۔ دشمنوں کو ہماری سمت کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ اب کم از کم وہ جیپ کے ذریعے ہمارا تعاقب کرنے سے قاصر ہی تھے مگر یہ میری خام خیالی ثابت ہوئی، کیونکہ کچھ دشمن پیدل ہمارے تعاقب میں آنے کے بعد باقی جیپ میں دوبارہ پلیا کی طرف پلٹ گئے تھے۔ وہ یقیناً پل پار کرکے دوسرے کراڑے پر آنا چاہتے تھے۔ ممکن تھا اس میں صرف ڈرائیور ہی ہوتا۔

ادھر جب تک ہم کراڑے کی ریتیلی اور بھربھری مٹی والی ڈھلوان سے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے نشیب میں جا پہنچے اور یہاں سے ہم نے اٹھ کر سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں کچھ کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ان کے اختتام پر چوڑی کاریز تھی۔ (دریا سے کھیتوں کو پانی پہنچانے والا کھالا) ان پر بھی خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں۔

مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ ہم اس طرح بھاگتے ہوئے دشمنوں سے بچ نکلیں گے مگر دوسرے ہی لمحے اول خیر کی آواز ابھری۔

''اس کاریز کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چت لیٹ جاؤ۔'' اس کی یہ تدبیر مجھے کارگر لگی۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔

ماحول اچانک پرخود سا ہوگیا تھا۔ ہم کاریز کے اندر اس طرح پشت کے بل جا لیٹے تھے جیسے یہ ہماری اجتماعی کھلی قبر ہو۔ یہاں زہریلے کیڑوں، حشرات الارض اور سانپوں کا خطرہ بھی تھا مگر بہرحال یہ جان بچانے کے لیے عارضی طور پر سہی، یہ خطرہ ہمیں مول لینا تھا۔

ہر طرف اب ہُو کا عالم تھا۔ ہم جیسے چپ چاپ مگر دھڑکتے دلوں کے ساتھ گویا سانس تک روکے کاریز کے اندر لیٹے ہوئے تھے، اس کے کناروں پر اگی ہوئی لمبی

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

لمبی خودرو جھاڑیوں نے ہمیں ڈھانپ دیا تھا اور رہی سہی کسر رات کی گھور تاریکی نے پوری کر دی تھی۔ اول خیر کی اس چالاکی سے دشمن بھٹک سکتے تھے اور ہمارے اندھے تعاقب کی رو میں کافی آگے جا نکلتے۔

اچانک مجھے قریب ہی دھب دھب کرتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ دشمن دوڑتے ہوئے قریب آ رہے تھے۔ میرا دل سینے میں بے تحاشا دھڑک رہا تھا۔ اپنی رائفل کو بھی اپنے دائیں پہلو میں لٹا رکھا تھا۔ قدموں کی آوازیں قریب آ گئیں۔ میں نے گویا سانس تک روک لی۔ اب تو ان کی باتیں کرنے کے بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر عین ہمارے بالکل قریب آ کے بھاری قدموں کی دھپا دھپ تھم گئی۔ میں سن ہو کے رہ گیا۔ کیا انہیں اپنے قدموں کے قریب کاریز پر کسی قسم کا شبہ ہوا تھا؟ میرے اندر دھڑکتا شبہ بیدار ہوا۔ پھر ایسے میں ایک کریہہ شناسا آواز ابھری۔

”میں اور بشیرا ادھر ہی رکتے ہیں۔ پیچھے کھدو جیپ لا رہا ہے۔ تم لوگ آگے جاؤ۔“ یہ جنگی خان تھا۔

میرے پورے وجود میں سرشاری و غیظ جوش کی بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ میرا شکار جنگی اپنے کسی ایک ساتھی کے ساتھ ادھر رکنا چاہتا تھا۔ باقیوں نے اسے اثبات میں جواب دیا ہوگا۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے مجھے دوبارہ متعدد قدموں کی دھپا دھپ سنائی دیں جو دور ہوتے ہوتے معدوم ہو گئیں۔ یقیناً اول خیر نے بھی جنگی کی آواز سن لی تھی مگر مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں اس نئی حوصلہ افزا صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرنے سے قاصر تھے۔ مگر میں نے اپنی صوابدید پر ایک جارحانہ قدم اٹھانے کا سوچا۔ میری قوتِ فیصلہ اس وقت عروج پر تھی، میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے صرف تین سیکنڈوں کے اندر اندر فیصلہ کر لیا۔ پہلے سیکنڈ پر میں نے سوچا۔ جنگی خان یہاں صرف اپنے ایک ساتھی کے ساتھ موجود ہے۔ دوسرے سیکنڈ میں وہ اپنے زیادہ تر مسلح ساتھیوں کو ہمارے تعاقب میں آگے پیش قدمی کرنے کا حکم دے چکا تھا۔ تیسرے سیکنڈ میں... عقب میں اس کا صرف ایک کھدو نامی ساتھی جیپ لے کر کسی بھی وقت پہنچنے والا تھا۔

میں نے حرکت کی، سر اٹھا کر دیکھا۔ مجھ سے آگے سر کی طرف شکیلہ لیٹی تھی اور جنگی خان اپنے بشیرا نامی ساتھی کے ساتھ وہیں موجود تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا، جیپ کو ادھر سے ہی آنا تھا۔ میں نے کاریز سے سر تھوڑا باہر نکالا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں کہ وہ ابھی کچھ دور تھی۔ میں نے کاریز کے اندر سے کسی خونخوار مگرمچھ کی طرح حرکت کی اور جنگی کی دونوں ٹانگوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکے سے کھینچا۔ وہ منہ کے بل دھب سے گرا، اس کے ہاتھ میں پستول تھا، جو تاریکی میں کہیں گر کر غائب ہو گیا۔ اس کے ساتھی بشیرے نے حرکت کی، میں اب کھڑا ہو چکا تھا، ایک زوردار گھونسا بشیرے کی ناک پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز نکلی وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے کاریز سے ایک ہیولے کو پھرتی کے ساتھ اچھلتے دیکھا یہ اول خیر تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے والے بشیرے پر جھپٹا، میں جنگی خان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ تاریکی میں ”کرولنگ“ کے انداز میں اپنا پستول ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ کاریز کے اندر سے نجانے کون سی بلائیں نکل آئی ہیں۔ میں نے اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ اسی لمحے مجھے تاریک فضا میں لرزہ خیز کراہ سنائی دی۔ اول خیر نے شاید بشیرے کی گردن دبا دی تھی۔ ادھر جنگی میری لات کھا کر آگے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے چلا کر اول خیر سے کہا۔

”اول خیر! اس کا ایک ساتھی سامنے سے آ رہا ہے۔ جیپ لے کر، اسے قابو کر۔“ اول خیر، جنگی سے مقابلہ کرنے کے لیے میری مدد کو آنا چاہتا تھا۔ میری ہدایت پا کر وہ رائفل سنبھالے آگے بڑھا۔ اس اثنا میں شوکی اور شکیلہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں جنگی پر خونخوار درندے کی طرح جھپٹا۔ اس نے بھی فرار ہونے کی کوشش کیے بغیر مجھ پر دوبدو حملہ کیا۔ میری ٹھوڑی پر اس کا گھونسا پڑا جس کی تکلیف خبیث اور صفت ابلیس جنگی خان سے نبرد آزما ہونے کی آتش غضب میں بھسم ہو گئی۔ اس مردود سے نبرد آزمائی کے دوران بار بار آسیہ کا معصوم چہرہ میری نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا۔ اس کی چیخیں اس کی آہیں اور داد فریاد میری سلگتی سماعتوں میں گونجنے لگیں۔ گھونسا کھانے کے باوجود میں نے اپنے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچ لی اور ساتھ ہی اپنی سیدھی ٹانگ کی زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی مگر گردن پھر بھی نہیں چھوڑی، اس طرح ٹانگ کی ضرب اس کے لیے ضرب شدید ثابت ہوئی۔ اس کے حلق سے خرخراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے وہ حیرت انگیز پھرتی سے سنبھلا تھا اور میری ہاتھ کی کلائی کو پکڑنا چاہا مگر مجھ پر تو جیسے اس وقت آتشِ جنوں سوار تھا، میں نے اس کے چہرے پر قدرے اچھل کر اپنے سر کی ٹکر رسید کر دی اور اس کی گردن دباتا چلا گیا۔ وہ دہرے عذاب کا شکار تھا۔ میرے ایک ہی ہاتھ کے شکنجے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

سے وہ اب تک اپنی گردن نہیں چھڑا پا رہا تھا اور خود مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سارے وجود کی طاقت سمٹ کر میرے سیدھے ہاتھ کے پنجے میں آگئی ہو۔ میری انگلیوں کے ناخن اس کی گردن کی کھال میں اتر کر گوشت تک کو چھونے لگے تھے... اس نے ایک پرانا داؤ کھیلا اور وہ کئی قدم پیچھے ہٹا اور گرا... میں لامحالہ اس پر جھک گیا، اس نے پھرتی سے اچھل کر اپنی دونوں ٹانگیں میرے پیٹ اور سینے کے درمیان جما دیں۔ نتیجتاً میں اچھل کر اس سے دو تین فٹ پرے جا گرا۔ کھلے روشن آسمان تلے شوکی نے جب مجھے گرتا دیکھا تو خود بھی اس پر پل پڑا۔

اس وقت مجھے پٹاخہ چھوٹنے کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شوکی کی کراہ بھی۔ میں فکرمند ہو گیا۔ جنگی خان جیسا وحشی سانڈ اس کے بس کا نہ تھا۔ اس نے اپنے اوپر پڑے ہوئے شوکی کی کنپٹیوں کو اپنے دونوں ہتھوڑے جیسی ہتھیلیوں سے پیس ڈالا تھا۔ اس دیسی ساختہ داؤ میں کئی ثانیوں تک مدمقابل کا نہ صرف دماغ سن ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ سماعتیں بھی بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شوکی کا وجود اچھل کر پرے جا پڑا۔ اس میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ میں نے جنگی خان کے بدمست ہیولے کو دیکھا۔ وہ غضب ناک غراہٹ کے ساتھ میری طرف لپکا۔ اسے کھانسی کا پھندا بھی پڑا ہوا تھا، وہ بار بار کھانس رہا تھا۔ ایسا شاید اس کا گلا دبوچنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ ہم دونوں پھر گتھم گتھا ہو گئے۔ ٹھیک اسی وقت ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ہم پر پڑی۔ ہمارے ہیولے یک دم واضح ہو گئے۔ شاید اس خبیث کا ساتھی کھدو جیپ قریب لے آیا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے اب فکر نہ تھی۔ اسے سنبھالنے... بلکہ دبوچنے کے لیے اول خیر وہیں کہیں قریب ہی گھات لگائے بیٹھا تھا۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس میں مجھے جنگی خان کا چہرہ بری طرح بگڑا ہوا نظر آیا۔ اس کی بیل جیسی موٹی گردن پر میرے ہاتھ کی انگلیوں نے سرخ خراشیں ڈال دی تھیں اور چہرے پر لگنے والی میرے سر کی ٹکر نے اس کی موٹی ناک پچکا کر خون آلود کر دی تھی۔ وہ میری طرف وحشی سانڈ کی طرح لپک رہا تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن ہوتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے خون آلودہ چہرے کے تاثرات بدلتے دیکھے، میں اس کی وجہ جانتا تھا اس لیے ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اس کی طرف لپکا... مکار فطرت جنگی خان پر صورت حال کی نزاکت واضح ہو گئی تھی، دوسرے ہی لمحے اسے میدان چھوڑنا پڑا۔ وہ کسی جنگلی بلے کی طرح حرکت میں آیا اور میرے شکنجے میں آنے سے قبل ہی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اس کے پیچھے جانا بے سود تھا میں شوکی کی طرف لپکا۔ شکیلہ اسے سنبھال رہی تھی۔ اس دوران اول خیر نے ہمیں پکارا۔

”آ جاؤ... جلدی... جیپ اب ہمارے قبضے میں ہے۔“

”شوکی! تم ٹھیک تو ہو نا؟“ میں نے شوکی سے پوچھا۔ وہ بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا پھر اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم تینوں جیپ کی طرف لپکے۔ اس بار سیٹ اول خیر نے سنبھالی ہوئی تھی۔ کھدو کا بے سدھ وجود مجھے اپنے قدموں میں پڑا نظر آیا۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔

”وہ مردود... نکل بھاگا۔“ میں نے اول خیر کے برابر والی سیٹ سنبھالتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ شوکی اور شکیلہ بھی پیچھے سوار ہو گئے تھے۔

”میں نے دیکھ لیا تھا اس لیے تمہیں آواز دی تھی۔“ اول خیر نے گیئر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم اس کے تعاقب میں نہ چلے جاؤ۔“ اس نے جیپ ریورس کی۔

جیپ ریورس کر کے اس نے نشیب میں اتار دی۔ اگلے چند منٹوں بعد ہم پلیا سے آگے جانے والے مطلوبہ راستے پر گامزن تھے۔

رات کی گھور تاریکی میں جیپ اندھا دھند دوڑی جا رہی تھی۔ اول خیر کی انتہائی کوشش تھی کہ ہم جلد سے جلد ممتاز خان کی جاگیر سے نکل جائیں مگر میرے دل و دماغ پر بے چینی طاری تھی۔ میں ممتاز خان اور اس کے مقرب خاص کارپرداز... جنگی خان سے آسیہ کی المناک موت کا بھیانک انتقام لینا چاہتا تھا۔ اول خیر نے شاید میرے خاموش چہرے کے سنگین تاثرات سے میرے اندر کے کھولتے ہوئے ابال کا اندازہ لگا لیا تھا۔ ”کاکے...! کیا سوچ رہا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے گومگو سے انداز میں جواب دیا۔ میری نظریں ونڈ اسکرین سے پار ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ اول خیر نے جیپ کی رفتار بڑھا دی تھی، وہ بولا۔ ”کاکے...! ہم آسیہ بہن کا بدلہ لیں گے... ابھی ہمارا انتقام پورا نہیں ہوا۔“

اس کے چھیڑنے کی دیر تھی اور میرے پھٹ پڑنے کی۔ میں بے ساختہ بول اٹھا۔ ”اول خیر...! میری آنکھوں کے سامنے آسیہ کا چہرہ ابھی تک لہراتا ہے۔ جس

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

طرح اس غریب معصوم پر ان سفاک درندوں نے ظلم ڈھایا ہے، جی تو چاہتا ہے ممتاز خان کی حویلی سمیت پورے نئے پنڈ کو آگ کی بھٹی میں جھونک ڈالوں تب ہی میرے دل و دماغ کو چین نصیب ہوگا۔"

"کاکا... بلاشبہ آسیہ بہن جرأت مند اور بہادر عورت تھی، اس کا مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے۔" وہ بھی مغموم لہجے میں بولا۔

"اگرچہ وہ اپنی غلطی کا جلد سے جلد ازالہ کرنے کی کوشش میں تھی... مگر شاید میری طرح تو نے ایک اور حقیقت بھی نوٹ کی ہوگی کاکے... وہ آخری حد تک صدقِ دل سے تیری مدد کرنے کے لیے کوشاں تھی، اور اس کی خاطر وہ اپنے منگیتر ریحان کی دوری کو بھی برداشت کیے ہوئے تھی۔" اول خیر کی اس آخری بات نے مجھے ایک بار پھر آبدیدہ سا کر دیا اور میں نے سر جھکا دیا۔ عقب سے شوکی نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"حوصلہ کرو شہزی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم سب مل کر ان دونوں رذیل قاتلوں سے آسیہ بہن پر کیے گئے ظلم کا بدلہ لیں گے۔" شکیلہ نے بھی اس عزم کا اظہار کیا تو میں سر اٹھا کے بولا۔

"نہیں دوستوں... میں تم دونوں کو اس آگ سے دور رکھنا چاہتا ہوں... یہ صرف میری جنگ ہے۔ یہاں سے نکلنے کے بعد تم دونوں کو یہ شہر چھوڑنا ہوگا۔"

جیپ میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔ اول خیر راستوں کا شناسا تھا۔ اول خیر نے جو پہلے راستہ بتایا تھا اس کے مطابق اب تک ہمیں مین روڈ پر آجانا چاہیے تھا۔ میں نے پوچھا۔

"اول خیرا! کیا تم نے واپسی کا راستہ تبدیل کر دیا ہے؟" وہ میری بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں، یہاں سے اس منحوس جاگیر "نئے پنڈ" کی حدود جلد ختم ہوتی ہے۔ ہم موضع بھل واں پہنچنے والے ہیں وہاں سے نیم پختہ راستہ اختیار کریں گے ہمارا اب مین روڈ پر آنا مناسب نہ ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ اب تک اس مردار ممتاز خان نے اپنے راتب خور... انسپکٹر روشن خان کو خبردار کر دیا ہو۔" اول خیر کی بات معقول تھی۔ مجھے ممتاز خان کے ایک گماشتے کی بات یاد آ گئی تھی، جس کے مطابق ممتاز خان نے صبح تڑکے انسپکٹر روشن کو جعلی پولیس مقابلے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ اور اپنی جاگیر نئے پنڈ اسے سے بلایا تھا۔

اول خیر کے مطابق اب محض ایک آدھ کلومیٹر کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب ذرا دیر بعد یہ فاصلہ بھی بہ خیر و عافیت کے طے ہوا اور اول خیر کے مطابق... اب ہم موضع بھل واں کے اس مذکورہ نیم پختہ راستے پر گامزن تھے۔

میں بار بار کفِ افسوس مل رہا تھا۔ آسیہ کے ساتھ شرمناک اور انسانیت سوز ظلم کرنے والے ان چاروں ابلیسی چیلوں کو جہنم واصل کرنے کے باوجود مجھے جنگی خان کے عین وقت پر اپنے شکنجے سے بچ کر نکل جانے کا بے حد رنج تھا۔ آسیہ کی ایک لاش کے بدلے، ممتاز خان کو کئی لاشوں کا تحفہ دیا تھا مگر میرے لیے یہ سب کافی نہ تھا۔

ہمارے پاس رابطے کے لیے کوئی سیل فون نہ تھا۔ وہ سب ہم سے چھین لیے گئے تھے۔ ذہن میں ابھرنے والے ایک خیال کے تحت میں نے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اول خیر سے پوچھا۔

"بیگم ولا کا رخ کرنے سے پہلے ہمیں بیگم صاحبہ سے رابطہ کرنا چاہیے تھا... مگر..."

"اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جواباً بولا۔ "اس وقت پولیس فورس کا سارا زور نئے پنڈ میں ہنگامی آمد پر ہوگا۔ ہاں... یہ ضروری ہے کہ ہمارا بھل واں سے ایک طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس جیپ سے چھٹکارا پانا ضروری ہوگا۔"

میرا ارادہ ابھی اس جیپ کو چھوڑنے کا نہیں تھا۔ نیز میں چاہتا تھا کہ بیگم ولا کا رخ کرنے سے قبل ہم شوکی اور شکیلہ کے گھر کا رخ کرتے... وہاں سے ان کا ضروری سامان سمیٹنے میں ان کی مدد کرتا... اور پھر بیگم ولا پہنچ کر ان دونوں بہن بھائیوں کو بحفاظت ملتان سے لاہور روانہ کر دیتے مگر چودھری ممتاز خان کی بربریت اور ناپاک عزائم جاننے کے باعث میرا ارادہ تھا کہ شوکی اور شکیلہ یہ صوبہ ہی چھوڑ دیں... کراچی ان کے لیے محفوظ شہر ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنے خیال کا اظہار اول خیر کے علاوہ... شوکی اور شکیلہ سے بھی کر دیا تھا... شوکی کو یقیناً اب اپنی بہن کی فکر زیادہ تھی، مگر شکیلہ کے آثار کچھ اور ہی بتاتے تھے۔ اس کی یہ سب کرنے کی مرضی نظر نہیں آتی تھی مگر چپ تھی۔

یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوا... ہمارے دائیں کھیتوں کھلیانوں کا سلسلہ تھا جو اب موقوف ہو کے بنجر اجاڑ میدان میں بدل گیا تھا اور کہیں کہیں کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں نظر آ رہی تھیں جہاں سے روشنی پھوٹتی دکھائی دیتی تھی۔ ہمیں وقت کا احساس نہ تھا مگر مشرقی سمت سے صبح کاذب کی شفق سی پھوٹتی دیکھ کر وقت کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔

ایک طویل ذہنی اور جسمانی مشقت کے بعد جب

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

ہمارے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑے تو غنودگی سی چھانے لگی اور تھکاوٹ اور کسلمندی کا بھی زیادہ احساس ہونے لگا۔

"ہم مین روڈ پر پہنچنے والے ہیں... اس جیپ کو چھوڑنا ہوگا اب۔" اول خیر نے اعلان کیا تو میں نے اپنا ارادہ۔۔۔ گوش گزار کردیا اور بولا۔

"بیگم ولا پہنچنے کے بعد... یہ کام بیگم صاحبہ کے آدمی بھی نمٹا سکتے ہیں... اول خیر... ورنہ اگلی سواری کا انتظام کرنے میں خاصا وقت برباد ہو جائے گا۔" اول خیر نے میری بات پر صاد کیا۔

مین روڈ پر آتے ہی ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھال لی۔

اگلے ایک گھنٹے بعد جب صبح کاذب کی روشنی چہار اطراف پھیل چکی تھی، ہم شہر میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں ہمیں پولیس کا خطرہ تھا اور ممتاز خان کے ہرکاروں کا بھی... مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کی جاگیر کے مقابلے میں یہاں اس کی شہر والی رہائش گاہ "گرائیں نگر" کے آدمی زیادہ فعال ہوں گے، یوں بھی اب خطروں سے کھیلنے کے سوا ہمارے پاس منزل تک پہنچنے کا کوئی چارہ تھا بھی نہیں۔

خدا کا شکر ہوا کہ... شوکی کے گھر تک... ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ شاید ہمارا بروقت اور تیزی کے ساتھ فعال ہونا تھا۔

"جتنی جلد ہو سکے... اپنا مختصر سا سامان سمیٹ لو... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے جیپ ایک جھٹکے سے دروازے کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔

یہ متوسط طبقے کا علاقہ تھا۔ محلہ بھی مختصر سا تھا... اعلیٰ الصباح کا وقت تھا اس لیے سوائے دودھ والوں کی اِکّا دُکّا موٹر سائیکلیں ہی آتی جاتی دکھائی دی تھیں۔

مکان کا تالا توڑنا پڑا۔ دشمنوں نے ہم پر غلبہ پانے کے بعد ہمیں ہر شے سے محروم کر دیا تھا۔ گھر کی چابیاں تک نکال لی تھیں۔

بہرحال... اندر داخل ہونے کے بعد شوکی اور شکیلہ اپنا مختصر سا سامان سمیٹنے لگے۔ میں نے دیکھا شکیلہ یہ کام بے دلی سے کر رہی تھی... میں بھی مقدور بھر ان کا کام نمٹا رہا تھا... ایک تنہا موقع پر شکیلہ مجھ سے بولی۔

"شہزا...! مجھے تمہاری طرف سے تشویش رہے گی... کاش! میں تمہارے قریب رہ سکتی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ بڑا عجیب اور معنی خیز محسوس ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"شکیلہ! میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں بھی آسیہ کی طرح میرے خونی دشمنوں کی بربریت کا نشانہ بنو... یہ بات میرے لیے اپنے پیروں پر بیڑیاں ڈالنے کے مترادف ہو گی۔ پہلے ہی آسیہ کے بوجھ سے میرا دل و دماغ بھاری اور بوجھل ہو چکا ہے۔ میں مزید ایسے کسی اور بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" وہ میرا اشارہ سمجھ کر خاموش ہو گئی۔ تاہم تھوڑے توقف کے بعد بولی۔

"کیا ہمارا کراچی جانا ضروری ہے... ہم لاہور یا جنوبی پنجاب کی طرف نکل جاتے ہیں۔"

"کراچی بھی اس ملک کا حصہ ہے۔ زندگی رہی تو ہم دوبارہ اچھے دوستوں کی طرح ایک دن ضرور ملیں گے۔ شوکی پر مجھے بھروسا ہے۔ وہ کراچی میں بھی تمہارے ساتھ سکون سے گزر بسر کر سکتا ہے۔"

"ہاں... وہاں ہماے دور کے رشتے کی ایک خالہ رہتی ہیں... ہو سکتا ہے ہم وہیں کا رخ کریں۔"

"میں نے سنا ہے کراچی ایک مہربان شہر ہے۔ اس نے اپنے دامن میں نہ جانے کتنے لوگوں کو سمیٹ رکھا ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

اس سارے کام میں... نصف گھنٹا صرف ہو گیا۔ شوکی نے دو سوٹ کیس اور ایک بھاری سا بڑا بیگ تیار کر لیا تھا... ابھی دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اچانک ایک پُرشور سی آواز سن کر ٹھٹک کے رک گئے۔ یہ کسی کار کے ٹائروں کی چرچراہٹ تھی۔ ہمارے چہروں پر یکلخت سناٹا طاری ہو گیا جبکہ میرا دل سائیں... سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا... مجھے پچھتاوا ہوا کہ... میں اپنی رائفل جیپ میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے تھے۔

میں نے اشارے سے شوکی اور شکیلہ کو صحن میں ہی ٹھہرنے کا کہا اور خود پھرتی کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا... ابھی میں دروازے سے محض چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ وہ دھڑ سے کھلا... میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اول خیر کو دیکھ کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ البتہ اس کے ہمراہ ایک اور دشمن کو دیکھ کر میرے تنے ہوئے وجود میں طمانیت کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس شخص سے چاہے جتنے اختلاف سہی... مگر بہرحال اس کی حیثیت ہماے ساتھی ہی جیسی تھی... یہ بیگم صاحبہ کے گروہ کا "بڑا استاد" کہلانے والا... کمیل دادا تھا... مگر یہ شوکی اور شکیلہ کے لیے اجنبی تھا اس لیے اسے دیکھ کر دونوں بہن بھائی پریشان ہو گئے۔۔۔ کمیل دادا نے ایک نگاہ ان دونوں پر ڈالی پھر مجھ سے بولا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

''وقت کم ہے میرے پاس... آجاؤ جلدی۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا۔ اول خیر میری جانب دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا.... پھر میں نے شوکی اور شکیلہ کو کھبل دادا کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا۔ اس دوران ہم باہر آگئے۔ جیپ کے سامنے ایک کار کھڑی تھی دو آدمی باہر چوکس کھڑے تھے اگرچہ خالی ہاتھ تھے مگر میں جانتا تھا وہ اندر سے مسلح تھے۔

''تم کار میں بیٹھو۔'' کھبل نے مجھ سے کہا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے آنکھ مار کر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ میں کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر براجمان ہوگیا۔ پھر کھبل دادا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ کار اسٹارٹ تھی اس کے دونوں آدمی بھی عقبی نشستیں سنبھال چکے تھے، دوسرے ہی لمحے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

بیگم ولا پہنچنے تک... سارے راستے کھبل دادا نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی۔ میرے پاس بھی اسے بتانے کے لیے لمبی اور دکھ بھری تفصیل تھی، اچھا ہی ہوا اس نے کچھ نہیں پوچھا۔ بیگم ولا... پہنچے تو... مجھے کچھ غیر معمولی پن محسوس ہوا۔ اس شاندار اور عظیم الشان کوٹھی کے دونوں اطراف مورچے قائم کردیے گئے تھے۔ یہی نہیں، جس سمت کے راستے پر ہماری کار نے موڑ کاٹا تھا... وہاں ہرڈل راڈ نصب کی گئی تھی اور دو سیکیورٹی گارڈز چیکنگ کے بعد اس مذکورہ راستے پر آنے والی گاڑیوں کو چھوڑ رہے تھے البتہ ہماری کار اور کھبل دادا کو پہچان کر ہرڈل راڈ فوراً اوپر اٹھا دی گئی تھی۔ سامنے سفید رنگ کی عالیشان سفید کوٹھی تھی۔

بڑے سے آہنی گیٹ خودکار انداز میں دائیں بائیں .... کھل گئے اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے اندر داخل ہو گئیں۔ پھر وسیع کار پورچ میں جا رکیں۔

ہم اترے۔ اول خیر نے کھبل دادا کے قریب آکر سنجیدگی سے اپنی جیپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''یہ دشمن سے چھنی ہوئی گاڑی ہے... اسے فوراً یہاں سے ہٹانا ضروری ہے۔'' میں نے دزدیدہ نظروں سے کھبل دادا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ اسی لہجے میں وہ اول خیر سے بولا۔

''تم اپنی زبان بند رکھو۔ تم کچھ بولنے کے مجاز نہیں ہو یہاں۔''

اول خیر نے بھی ترکی بہ ترکی اسی تلخی سے جواب دیا۔ ''یہ میں احتیاط کے پیشِ نظر محض اطلاع دے رہا ہوں۔ میں نہیں چاہتا بعد میں دشمنوں کو کوئی گل کھلانے کا موقع ملے۔''

''تم نے مطلع کر دیا۔ اب اپنا منہ بند کرو۔'' کھبل دادا نخوت سے بولا۔ اس اثنا میں چار مسلح افراد اندرونی عمارت سے برآمد ہوئے۔ کھبل دادا نے انہیں وہ جیپ ٹھکانے لگانے کا حکم دیا۔ دو افراد حرکت میں آگئے۔ باقی دو سے مخاطب ہو کر کھبل دادا نے اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ کہا۔ ''اسے لے جاؤ۔''

اول خیر کے ساتھ کھبل دادا کا جارحانہ انداز دیکھ کر میرا دماغ گرم ہونے لگا۔ چھتے والے معاملے کی وجہ سے اول خیر دب رہا تھا۔ تنظیمی اصول اور قواعد و ضوابط کے مطابق وہ تنظیم اور بیگم صاحبہ کا مجرم تھا، کھبل دادا کو بھی شاید اسی لیے اپنی ذاتی عناد کی بھڑاس نکالنے کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ اسی سبب وہ گویا اول خیر کے ساتھ ''ماورائے تنظیم'' اہانت آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ وہ دونوں آدمی اول خیر کو اپنے ساتھ لے جانے لگے تو میں نے فوراً آگے بڑھ کر بہ آوازِ بلند انہیں پکارا۔

''ٹھہرو۔'' وہ رک گئے۔ میں نے کھبل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ابھی یہ میرے ساتھ ہے۔ یہ کہیں نہیں جائے گا۔ ہمیں بیگم صاحبہ سے ملنا ہے۔'' میری بات پر کھبل دادا نے تیر برساتی ہوئی نظروں سے میری طرف گھورا۔

''زیادہ سر چڑھنے کی کوشش مت کرو تم... مت بھولو کہ اس وقت تم کہاں کھڑے ہو؟'' پھر اس نے غصیلی نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ گھبرا کر آگے بڑھے۔ اول خیر نے میری طرف دیکھ کر انگلی کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ اس دوران ارشد بھی نمودار ہو گیا۔ کھبل دادا اس سے تحکمانہ بولا۔

''ان سب کو اندر روم نور میں بٹھاؤ۔'' اشارہ ہماری طرف تھا۔ ہماری چپقلش نے بے چارے شوکی اور شکیلہ گھبرا سے گئے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ پھر ہم سب ارشد کے ساتھ ایک آرام دہ کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

شکر تھا کہ ارشد ہمارے ساتھ تھا ورنہ تو یہاں سب کا رویہ ہمارے ساتھ سرد ہی تھا۔ یقیناً اس میں کھبل دادا کے حکم کا دخل ہوگا۔ اس کا شوکی کے گھر میں اچانک نازل ہونا خالی از علت نہ تھا کیونکہ میں نے بیگم صاحبہ سے ہونے والی آخری گفتگو میں ان کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ ہم لوگ کہاں اور کس مقصد کے لیے شوکی کے گھر قیام کیے ہوئے تھے پھر ہماری اچانک گمشدگی یا غیاب پر ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ نے کھبل دادا کے ذمے لگاتے یہ کام لگایا ہو کہ وہ اس گھر کی اس

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

وقت تک باقاعدہ نگرانی کرتا رہے جب تک کہ... اس کے بند دروازے کا تالا کھلا ہوا نہ دیکھ لیا جائے... بعد میں میرے اس قیاس کی تصدیق ارشد نے بھی کر دی تھی۔

یہ میرے لیے فخر کی بات تھی کہ ہمارے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے اپنے کسی عام آدمی کے بجائے کھیل دادا کو محتاط کر رکھا تھا۔ مجھ سے کھیل دادا کے خار کھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔

ارشد سے گفتگو ہوئی، سب سے پہلے تو میں نے اس سے بیگم صاحبہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہا تو وہ بولا۔

”پہلے تم بتاؤ، اچانک کدھر غائب ہو گئے تھے...؟ بیگم صاحبہ تو ہلکان ہو رہی تھیں تمہاری فکر میں؟ اور یہ دونوں کون ہیں... کچھ دیکھے بھالے لگتے ہیں مگر یاد نہیں آ رہا۔“

اوکاڑہ والی مہم میں ارشد... کی شکیلہ سے ملاقات تھی اور غائبانہ تعارف بھی تھا۔ میں نے پہلے شوکی اور شکیلہ کا تعارف کرایا تو ارشد کو یاد آ گیا۔

اس کے بعد میں نے اسے اب تک کی ساری تفصیل بتا دی۔ وہ سب سن کر دنگ رہ گیا۔ آسیہ کی موت کا اسے بھی دکھ تھا۔ پھر جب میں نے اس سے بیگم صاحبہ کے متعلق پوچھا تو وہ جواب دینے کے بجائے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر بولا۔ ”پہلے میں ذرا اس خر دماغ آدمی کھیل دادا کو یہ تفصیل بتا آؤں... اس کا یہی حکم تھا پھر آرام سے آ کر باتیں کرتا ہوں۔“

میں چونکا پھر کہا۔ ”خیریت تو ہے ناں... یہاں پر...؟“

”ابھی آ کر بتاتا ہوں۔“ وہ پھر میرے سوال سے پہلوتہی کر گیا، میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ میرے سامنے والے صوفے پر شوکی اور شکیلہ اپنے چہروں پر سوالیہ نشان لیے بیٹھے میری جانب ہی تک رہے تھے۔ ارشد جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے ہمراہ ایک بوڑھی خادمہ بھی تھی۔ جو ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ اس میں کچھ کھانے پینے کی چیزیں تھیں۔ وہ خاموشی سے ہمارے درمیان ٹرالی کھڑی کر کے چلی گئی۔ ارشد نے میری طرف دیکھا وہ میری بے چینی بھانپ کر بولا۔

”اسے اسپتال جانا تھا بیگم صاحبہ کو لینے... اسی لیے مجھے تاکید کی تھی کہ میں تم سے مختصراً احوال لے کر اسے بتا دوں۔“

میں چونکا۔ ”اسپتال...؟ کک کیا ہوا بیگم صاحبہ کو... وہ خیریت سے تو ہیں...؟“ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

”شاید تمہیں نہیں معلوم۔“ اس نے ایک اہم اطلاع دینے کے انداز میں کہا۔ ساتھ ہی ایک گہری ہنکاری بھی اپنے سینے سے خارج کی اور آگے بولا۔ ”بیگم صاحبہ کے والد... چودھری الف خان کا انتقال ہو گیا ہے۔“

اس اطلاع پر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ”کب کیسے؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے شوکی اور مجھے ٹرالی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پہلے پانی پیا... پھر چند بسکٹ کھائے... اس کے بعد چائے لے کر دوبارہ صوفے پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ شوکی اور شکیلہ بھی ٹرالی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”ابھی دو تین گھنٹے پہلے کی بات ہے، انہیں دل کا دورہ پڑا۔ انہیں آناً فاناً شہر کے ایک بڑے اسپتال میں لایا گیا مگر بدقسمتی سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اسپتال میں ہی دم توڑ دیا۔“

”اطلاع کس نے دی تھی بیگم صاحبہ کو...؟“ میں نے کسی خیال کے تحت ارشد سے پوچھا۔ وہ جواباً اپنے لیے بھی چائے کا ایک کپ بناتے ہوئے بولا۔

”انہی کے ایک محافظ نے دی تھی۔ امکان یہی ہے کہ... ایسا اس نے یقیناً وڈے چودھری (الف خان) کے کہنے پر یہ اطلاع دی تھی سیل پر...“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ گویا جس وقت ہم موضع مجلواں میں داخل ہوئے تھے، یہ اس سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ تھا یا پھر جس وقت ہم ان کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان وغیرہ سے نبرد آزما تھے شاید یہی سبب تھا کہ ہم نے پنڈ کی جاگیر سے بہ خیر و عافیت نکل آئے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر ارشد سے کہا۔

”فرخ والے واقعے کے بعد... بیگم صاحبہ کا اسپتال جانا ضروری تھا؟ میرا مطلب ہے وہاں ان کا بڑا بھائی ممتاز خان بھی...“

”میرا نہیں خیال وہ اس نازک موقع پر اپنی بہن کے ساتھ کوئی گل کھلانے کی کوشش کرے گا۔“ ارشد میری بات سمجھ کر بولا۔ ”ویسے بیگم صاحبہ کے ساتھ گارڈز ہیں۔ اب کھیل دادا بھی جا چکا ہے۔“

”بیگم صاحبہ کو ان حالات میں کھیل دادا کو ساتھ رکھنا چاہیے تھا مگر انہوں نے اسے ہماری تلاش میں معروف رکھا۔“ میں کوکو سے انداز میں بولا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد آیا۔ ”ارشد! یار ذرا اول خیر کو پوچھ لو جا کر... اس بے چارے نے بھی کچھ کھایا پیا نہیں ہے... اب بیگم صاحبہ اس کے ساتھ کیا کرنے والی ہیں؟“

میری بات پر وہ ہلکی سی معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

"بے فکر رہو، اول خیر کو تم جیسے آدمی کی سفارش حاصل ہے۔ اسے ناشتا وغیرہ پہنچا دیا گیا ہے۔"

اس کے بعد وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم لوگ آرام کرو... مجھے ذرا سیکیورٹی کے معاملات کا جائزہ لینا ہے... ممتاز خان سے کچھ بھی بعید نہیں... اور ہاں... میرا ایک مشورہ ہے جب تک بیگم صاحبہ نہیں آجاتیں، اول خیر سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ کمیل دادا کا حکم ہے میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ یہاں تمہاری کسی آدمی کے ساتھ منہ ماری ہو۔"

میں نے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہماری حالت نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ ہم تینوں نے غسل وغیرہ کر کے نئے کپڑے زیب تن کر لیے تھے۔ بیگم ولا میں ہر وقت ہر قسم کی اشیا موجود رہتی تھیں۔ ایک دو گھنٹے مزید گزر گئے۔ بیگم صاحبہ نہیں لوٹی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں تھا۔ شوکی اور شکیلہ کو الگ کمرا دیا گیا تھا آرام دہ ماحول کا اثر تھا کہ مجھے نیند آنے لگی اور میں بیڈ پر نیم دراز... سوچوں میں مستغرق رہتے رہتے جانے کب سو گیا۔

☆☆☆

کسی کے جھنجوڑنے پر میں بری طرح ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ یہ ارشد تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اٹھو... شہزی! اٹھو... نکل بھاگو..." اس نے بوکھلا کر مجھ سے کہا۔

میں بستر سے اٹھ کھڑا ہوا اور نجانے کیا افتاد اچانک آن پڑی تھی جس کے باعث میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

"کک... کیا ہوا...؟ خیر تو ہے...؟" میں نے ارشد کے بدحواس اور پرتشویش چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ "شہزی! خیریت بالکل نہیں ہے، سب درہم برہم ہو چکا ہے بس... تم نکل چلو... آؤ میرے ساتھ... وقت بالکل نہیں؟" اس نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف لپکا۔ میں اس کے پیچھے دوڑا۔

"شوکی اور شکیلہ کدھر ہیں...؟ اور اول خیر؟" میں نے اس کے پیچھے تقریباً دوڑنے کے انداز میں تیز تیز چلتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ان کو چھوڑو... اپنی خیر مناؤ، انسپکٹر روشن خان بھوکے بھیڑیے کی طرح تم پر جھپٹنے کو بے تاب ہے۔" وہ بولا۔ اور مجھے ایک بڑے ہال کمرے سے نکالتا ہوا... جیسے ہی پچھواڑے بنے وسیع لان کے ایک کھلے گوشے میں آیا تو اسی وقت کئی بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ شاید پولیس اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ایک دروازہ تھا۔ ارشد اسی طرف دوڑا۔ میں اس کے عقب میں تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹک کر رک گئے۔ چار پانچ پولیس اہلکار رائفلیں تانے چوکس کھڑے نظر آئے۔

"اب تم کہیں بھی بھاگ کر نہیں جا سکتے... شہزی...! تم قانون کے گھیرے میں آچکے ہو۔"

اچانک عقب سے ایک خونخوار بھیڑیے سے مشابہ آواز ابھری۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور سناٹے میں آگیا۔ یہ راحب محور انسپکٹر روشن خان تھا۔ اس کے ہمراہ سات آٹھ مسلح پولیس اہلکار چوکس کھڑے تھے۔ ارشد کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ انسپکٹر روشن خان کے بدہیئت ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں غضب کا کینہ چھلک رہا تھا۔

"تمہارا کھیل ختم ہو گیا شہزی!" وہ ملعون گویا اپنی فتح اور میری بے بسی پر حظ اٹھاتے ہوئے بولا۔

آدمی نیند سے بیدار ہوتے ہی حالات دگرگوں کی اس یلغار سے میرا دماغ مزید ماؤف سا ہونے لگا۔ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کب تھا۔

"اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دو۔" روشن خان نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس کے بعد مجھے اور ارشد کو ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

میری ستم کار تقدیر نے ایک بار پھر مجھے دشمنوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسا دیا تھا۔ ارشد کا چہرہ بری طرح ستا ہوا تھا۔ خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب اچانک اور کیسے ہو گیا؟ بیگم ولا جیسی مضبوط قلعہ نما حویلی میں انسپکٹر روشن خان اتنی آسانی سے کس طرح دندناتا ہوا داخل ہو گیا تھا؟ بیگم صاحبہ کہاں تھیں؟ اول خیر کہاں گیا؟

"اس کے دوسرے ساتھی اول خیر کا کچھ پتا چلا؟" ہمیں آہنی زیور پہنانے کے بعد روشن خان نے اپنے سپاہی سے دریافت کیا جس نے جواباً کہا۔

"نو سر! لگتا ہے... وہ وقت سے پہلے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... کہ وہ اپنے اس جگری یار کو خطرے میں ڈال کر بھاگ جائے۔" روشن خان وحشیانہ انداز میں غرایا۔ اس کا خیال غلط نہ تھا مگر اس بات پر مجھے بھی حیرت تھی، اول خیر کہاں گیا...؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالوں کے جوابات مجھے صرف ارشد ہی دے سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

"ایک عورت اور مرد ملے ہیں جناب... دونوں خود کو بہن بھائی کہتے ہیں۔" وہاں کھڑے ایک سپاہی نے مؤدبانہ کہا اور میری پیشانی پر امڈ آنے والی سلوٹوں میں مزید اضافہ ہوگیا۔ وہ یقیناً شوکی اور شکیلہ کی بات کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا اس بات پر رذیل صفت روشن خان کے سیاہ رو چہرے پر کمینگی کی ایک معنی خیز چمک ابھری تھی۔ اس کے مکروہ چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتی میری نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ... اسے یہاں شب خون مارنے کی ہدایت سے پہلے اچھی طرح "بریف" کیا گیا تھا۔

"لے چلو... انہیں بھی۔" روشن خان کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

میں نے انسپکٹر روشن خان کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"انسپکٹر... وہ دونوں قانون کے مجرم نہیں ہیں، انہیں چھوڑ دے۔" میرے جلتے سلگتے اور لاوا اگلتے لہجے پر روشن نے ایک جھٹکے سے اپنی موٹی گینڈے جیسی گردن موڑ کر میری طرف دیکھا پھر اسی طرح برہاتی نظروں میں مجھے لیے ہوئے چند قدم چلتا ہوا میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا اور بولا۔

"تمہارا ہر وہ ساتھی جو تمہارے ساتھ ہے، وہ قانون کا بھی مجرم ہے... لے جاؤ اس کو۔"

کئی سپاہی چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے... اور ہمیں باہر کھڑی ایک پولیس موبائل میں سوار کرا دیا گیا۔ وہاں ایک سیاہ جیپ کے علاوہ مزید ایک اور پولیس موبائل بھی کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تینوں گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہوگئیں۔

صرف مجھے پولیس ہیڈکوارٹر لے جایا گیا تھا اور وہاں ایک تنگ و تاریک اور ننگی اینٹوں والی بیرک میں ڈال دیا گیا۔

میں دل گرفتہ بیرک کے ایک کونے میں دیوار سے پشت لگائے بیٹھ گیا۔ نجانے میری تقدیر میں کیا لکھا تھا؟ سلجھنے کو جب راہ سجھائی دیتی تو عین وقت پر سب کچھ الجھ جایا کرتا تھا۔ گویا بنتے بنتے میری تقدیر اچانک بگڑ جاتی تھی، مجھے یوں لگتا جیسے میری درماندہ زندگی ایک دائرے کی قیدی بن کر رہ گئی ہے، میں جہاں سے چلتا پھر وہیں آجاتا۔

میں اب ایک بار پھر روشن خان کے رحم و کرم پر تھا اور یہ بات کم باعث تشویش نہ تھی کہ وہ میری موت کا خواہاں تھا۔ وہ چودھری ممتاز کے "ٹاسک" کے مطابق مجھے کسی بھی وقت مروا سکتا تھا۔ اس کی قید میں جانے کا مطلب موت کا قیدی بننا تھا۔

مجھے اس کی ہرگز توقع نہ تھی کہ آخر یہ سب اچانک اور اتنی تیزی کے ساتھ ہوا کیوں کر تھا؟ بیگم ولا میں تو چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھیں چہ جائیکہ... انسپکٹر روشن خان اپنی پولیس پارٹی سمیت دھڑلے کے ساتھ دندناتا ہوا نہ صرف اندر داخل ہوا بلکہ مجھے بھی گرفتار کر لایا۔ ضرور اس سلسلے میں پہلے سے اس کی راہ ہموار کی گئی ہوگی... اور راہ ہموار کرنے والا ممتاز خان کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ میں نے پیش آمدہ حالات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا تو کئی سوالوں کے جوابات مجھے بنا پوچھے ملتے چلے گئے۔ چودھری الف خان کا اچانک انتقال، بیگم صاحبہ کا اسپتال باپ کی عیادت کو جانا۔ یقیناً ممتاز خان بھی وہاں گیا ہوگا۔ اب تک کے حالات کا ممتاز خان کو تو علم تھا مگر بیگم صاحبہ کو اس کا اندازہ تھا کہ نہیں، پھر ممتاز خان سے دوبدو ٹاکرے کے دوران میرے سامنے اس کا اپنی بہن (بیگم صاحبہ) کے خلاف خطرناک عزائم کا اظہار کرنا یہ ثابت کرتا تھا کہ ممتاز خان نے باپ کی فوتگی والے موقع کو بھی نہیں بخشا اور اس مردود نے بیگم صاحبہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش چاہی ہوگی، اپنے بیٹے کی ہلاکت کے بعد وہ دشمنی میں اس قدر اندھا ہوگیا تھا کہ انتقام لینے کے لیے کسی بھی موقع کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا ہوگا۔

اس کم صفت رذیل انسان ممتاز خان کے لیے یہ اندازہ لگانا کون سی مشکل بات تھی کہ... میں اس کے صفت ابلیس حواریوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پناہ کے لیے کہاں کا رخ کرسکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے... پھر یقیناً بیگم صاحبہ کے ساتھ کوئی گل کھلایا ہوگا اس کے بعد اپنے راتب خور روشن خان کو بیگم ولا پر ریڈ کرنے کا "سنہری موقع" سے آگاہ کر دیا ہو۔

میرے پاس اب سوائے انتظار کے اب کوئی کام نہ رہا تھا جو میں کر رہا تھا۔ اس دوران عابدہ کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل و دماغ سے محو نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے دور تھی، بہت دور... کوسوں دور... اور جو اتنی دور ہوتا ہے، وہ اتنا ہی قریب ہوتا ہے... راہ محبت کی کٹھنائیوں کو سہنے والوں پر شاید ستم کار تقدیر کی یہ ایک عنایت ہوتی ہے کہ وہ محبوب کو عاشق سے دور کرکے بھی مزید قریب کر دیتی ہے کہ محبوب اپنے دیوانے کے حواسوں اور خیالات پر چھایا رہتا ہے۔

وقت کا اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا البتہ بیرک کے باہر سنسان کوریڈور میں کچھ اندھیرا سا اتر آ دیکھ کر اندازہ ہوتا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

تھا کہ سورج ڈھلنے والا ہے۔ بیرک میں میرے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔

رات ہوگئی۔ میری بیرک کے قریب اب تک کوئی پھٹکا نہیں تھا... مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر سلاخوں کی طرف آیا اور کوریڈور کی طرف منہ کر کے چلایا... میں نے پانی مانگنے کے لیے کسی کو پکارا تھا مگر کسی نے میری طرف توجہ نہ دی۔ میرا خیال تھا وہ ملعون روشن خان تو ضرور... میری "مزاج پرسی" کو آئے گا مگر مجھے حیرت تھی، وہ مجھے ڈال کر نجانے کدھر غائب ہوگیا تھا۔

وہ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ کوئی بھی نہیں آیا۔ اس طرح اونگھتے جاگتے اندیشوں بھری رات گویا آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔ صبح کہیں جا کر ایک سنتری کی صورت دیکھنا نصیب ہوئی... وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس اور چائے کا ایک بدرنگ سا کپ سلاخوں سے پار تھما کر لوٹ گیا۔

ایک گلاس پانی ناکافی تھا۔ میں غٹا غٹ چڑھا گیا پھر چائے پینے لگا جو خاصی بدمزہ تھی۔

آہنی سے نظر آنے والے کوریڈور میں اب دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی، اچانک کسی کے بھاری قدموں کی آواز ابھری۔

آنے والا شاید تنہا تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ میں ایک اخبار تھا۔ وہ کوریڈور کے سیلن زدہ فرش پر دانستہ اپنے بھاری جوتوں کی دھمک پیدا کرتا ہوا بیرک کے سلاخ دار دروازے کے بالکل قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔ یہ انسپکٹر روشن خان تھا۔ اس کے مکروہ سیاہ رو چہرے پر کمینگی اور خطرناکی کے بھرپور تاثرات مترشح تھے۔ میری جلتی سلگتی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے اخبار میری طرف بڑھا دیا۔ میری شعلہ بار آنکھوں میں پریشان کن الجھن سی تیر گئی کہ جانے اس خبیث نے اب میرے خلاف کون سا تیر آزمایا تھا۔ نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اخبار پر پڑیں۔ جو میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھا۔ اخبار آج کا ہی تھا۔ پہلے ہی صفحے پر کل سہ پہر بیگم ولا پر پڑنے والے پولیس ریڈ کی خبر جلی حروف میں چھپی تھی۔

میں دھڑکتی نظروں سے خبر پڑھتا چلا گیا۔ جس کے مطابق پولیس نے بیگم ولا پر ریڈ کرنے کے بعد میرے چند خطرناک مجرموں ارشد، شوکی اور شکیلہ کو گرفتار کر لیا ہے جبکہ اصل مجرم... یعنی میں پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

یہ خبر چونکا دینے والی تھی ساتھ ہی اس میں مجھے انسپکٹر روشن خان کے نئے رینک کا بھی علم ہوا۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا، وہ اب ترقی پا کر ڈی ایس پی کا رتبہ اختیار کر چکا تھا۔

اخبار اس نے میرے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔ مجھے جیسے ہوش آیا۔

"میری طاقت اور میرے اختیارات کا تجھے اندازہ ہو ہی گیا ہوگا... شہزی! میں ہر طرح سے تیری قبر کھودنے کی سکت رکھتا ہوں۔"

وہ بھیڑیے کے انداز میں غرایا۔ ادھر میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں... گویا میرا ایک اندیشہ تو درست ہی نکلا تھا۔ یعنی میری گرفتاری کو راز میں رکھا گیا تھا بلکہ راز میں کیا... سرے سے ہی جھوٹ پر مبنی تھا کہ میں بیگم ولا سے پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ دشمنوں کا میرے خلاف بھیانک اور خطرناک عزائم کا صاف پتا چلتا تھا۔

"اب تیرے سامنے انسپکٹر نہیں ایک ڈی ایس پی... ایک نیا پولیس افسر... روشن خان کھڑا ہے... شہزاد احمد خان عرف شہزی۔" اس کی بکواس جاری رہی۔

"اس جھوٹ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کا مقصد جان سکتا ہوں... ڈی ایس پی روشن خان؟" میں نے حتی المقدور اپنے اندر کے آتش فشاں ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ مکروہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔

"اس میں تیرا فائدہ بھی ہے... اور نقصان بھی۔"

"فائدہ...؟ اور تم..." میں زہرخند لہجے میں بولا۔

"ہاں فائدہ... اس صورت میں کہ تجھے صرف یہ قبول کرنا ہوگا کہ... چودھری ممتاز خان کے اکلوتے بیٹے فرخ کا قتل تو نے کیا تھا۔" وہ گھمائے پھرائے بغیر سیدھی بات کرتے ہوئے بولا اور میرے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی مگر اسے بھڑکانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

"اس میں میرے فائدے والی کون سی بات ہو گی؟"

"تیرے اس اقبالِ جرم کے بعد... تیرے ساتھیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور سزا کے سلسلے میں تجھ سے خاصی رعایت برتی جائے گی۔"

اس کی بات سن کر مجھے اس کی عقل پر حیرت ہوئی، کیا یہ مجھے اس قدر نادان سمجھتا تھا؟ کیا اسے ابھی تک شہزاد احمد شہزی... کے بارے میں نہیں معلوم تھا۔

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

ہم دونوں کا تو کئی بار آمنا سامنا ہو چکا تھا، کئی بار میں نے اسے زک بھی پہنچائی تھی۔ اس کے ٹارچر سیل کو بے نقاب کیا تھا۔ مجھے اپنے ٹارچر سیل میں غیر انسانی تشدد کی انتہائی منزلوں تک پہنچا کر بھی آزما کے دیکھ چکا تھا کہ شہزی کس قدر آہنی اعصاب کا مالک تھا پھر کیوں...؟ یہ مجھے ایسا سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آجاؤں گا؟ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے میری بے بسی اور شکست خوردگی پر اپنے تئیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میں اب خود کو بے آسرا اور بے سہارا سمجھوں۔ اگر یہ بات تھی تو یہ اس کی بھول تھی، ایک فاش غلطی تھی کیونکہ شہزاد احمد شہزی نے سوائے اللہ کے کسی بندے کا سہارا نہیں لیا نہ ہی آسرا کیا... اس لیے کہ میں اپنے اللہ کو ہی اپنے لیے کافی سمجھتا تھا... پردۂ غیب سے اب تک جو میری مدد آئی، وہ اس کے حکم سے آئی۔ مجھے خاموش پا کر روشن خان کو خوش فہمی ہوئی کہ شاید میں اس کی لغو بیانی پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔

وہ بھویں اچکا کر مکارانہ خباثت سے بولا۔ "سوچ لو اچھی طرح...... ایسے حالات میں جبکہ تیری مدد کو آنے والے اور پشت پناہی کرنے والے سب کے سب خود بڑی مصیبتوں کا شکار ہو چکے ہیں... تیری مدد کو کون آسکتا ہے بھلا... ویسے بھی تیرے پاس ہماری بات ماننے کے لیے ایک آپشن بچا ہے... ورنہ تو تو میری قید میں تو ہے ہی... روشن خان کی قید میں ہونا... کوئی معمولی بات نہیں... پتھر بھی لرزنے لگتے ہیں خوف سے۔"

اس فرعون صفت پولیس افسر کی گفتگو میں انتہا درجے کی کمینگی اور سفاکی رچی بسی تھی۔

میں اس کی قید میں اور اس کے رحم و کرم پر ہونے کے باوجود سلاخوں کے پیچھے سے اسے للکار سکتا تھا، اسے بتا سکتا تھا کہ راتب خوری کے حرام نوالے ٹھونسنے والے اس جیسے راشی پولیس افسر کی رگوں میں دوڑنے والا خون... ہر قسم کے جذبے سے عاری ہو جاتا ہے۔ جذبۂ شجاعت اور جاں نثاری تو درکنار... ایسے بے لہو عناصر جو بظاہر قانون کی وردی میں خود کو طاقت اور بہادری کا نمونہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اندر سے کس قدر بزدل ہوتے ہیں میں اسے اور بھی بہت کچھ جتاتا اور یاد دلانا چاہتا تھا کہ اس مردود نے مجھے کتنی ہی بار جھکانے کی کوشش کی مگر ہر بار میں اسے گزند پہنچا کر اس کی ناک کے نیچے سے نکل گیا۔ یہ فرعون صفت خارش زدہ کتے کی طرح اپنے ہی زخم چاٹتا رہ گیا لیکن میں خاموش رہا۔ میری خاموشی اسے بولنے رہنے پر مجبور کرتی اور جو باتیں میں نہیں جانتا تھا، وہ اس سے فوری طور پر آگاہ ہو رہا تھا کیونکہ وہ میرے دشمنوں سے درون خانہ ملا ہوا تھا اور دشمنوں کی کارستانی سے واقف بھی۔ وہ مجھے اس رواروی کے زعم میں سب کچھ بتا سکتا تھا۔

"کیا بیگم صاحبہ کو بھی گرفتار کیا جا چکا ہے؟" میں نے بھویں سکیڑ کر بھانپتی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جواباً وہ اپنی موٹی توند پر پتلون کی بیلٹ درست کرتے ہوئے اس کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

"اب اسے بھول جاؤ اور اپنی فکر کرو۔"

میں اس کی بات پر اندر سے لرز گیا۔ آخر ایسا کیا ہوا تھا بیگم صاحبہ کے ساتھ... جس کی وجہ سے بدبخت اسے بھول جانے کو کہہ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ بیگم صاحبہ نے میری بہت مدد کی تھی، وہ میرے لیے ایک مہربان خاتون ثابت ہوتی رہی تھیں، اول خیر جیسا جاں نثار اور وفادار ساتھی اس کا بین ثبوت تھا۔ بلاشبہ بیگم صاحبہ کے مجھ پر احسانوں کی ایک طویل فہرست تھی۔

میں اس رذیل صفت افسر کی اپنی جانب بھانپتی ہوئی نظروں سے اپنی اندرونی کیفیات چھپاتے ہوئے بظاہر لاابالی پن سے بولا۔

"آفیسر! ان حالات میں ہر انسان کو اپنی ہی فکر ہوتی ہے مگر میں جاننا تو چاہوں گا کہ آخر تم جیسا پولیس آفیسر... ایڈووکیٹ خانم شاہ کے گیٹ کا احاطہ بھی آج تک پھلانگ نہ سکا، اس نے بھلا بیگم ولا کی دیوار کیسے پھاندلی...؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی میرے اندر کا زہریلا غبار لفظوں کی صورت اگل ہی پڑا۔ میری بات پر اس کے سیاہ رو تنگ پیشانی پر سلوٹیں ابھریں۔ مگر یہ میرے کاٹ دار لفظوں کا اثر تھا کہ وہ دانت پیستے ہوئے پھٹ پڑا۔

"خانم شاہ نے اگر اب درمیان میں آنے کی کوشش کی تو اسے بہت بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا... فی الحال... وہ ہمارے راستے کی دیوار نہیں ہے۔"

"بیگم صاحبہ کے ساتھ آخر ہوا کیا ہے؟" میں اپنے اندر کی تشویش ناک بے چینی سے بالآخر مجبور پوچھ بیٹھا۔

یکلخت اس کے مکار چہرے پر شاطرانہ مسکراہٹ چپکی۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ "میں نے کہا ناں... اب اسے بھول جاؤ... آج سارے دن کی مہلت دے رہا ہوں میں اچھی طرح سوچ لے۔" وہ پلٹ کر جانے لگا مگر پھر رکا اور میری بیرک کے سلاخ دار دروازے کے قریب آکر بولا۔

"ویسے وقت کی قید نہیں کل صبح سے پہلے بھی تیرا فیصلہ اثبات

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

میں ہوتو بتا دینا... مگر کل صبح سے زیادہ تجھے مہلت نہیں دی جائے گی۔" اس کا لہجہ سنسنی خیز ہوگیا۔

میں خود کو قانون کی حراست سے زیادہ کسی وحشی دشمن کے رحم وکرم پر محسوس کرنے لگا تھا ظاہر ہے روشن خان نے سرے سے میری گرفتاری کو عوام وخواص میں ظاہر ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا مجھے دہشت زدہ کر کے اپنی مرضی کا بیان دلوانے کے بعد انہی گمنامی کی تاریکیوں میں ہلاک کرنے کا سفاکانہ فیصلہ کیا جا چکا تھا۔ جھوٹے بیان کی خاطر ہی مجھے شاید اب تک زندہ رکھا گیا تھا۔ اس میں یقیناً... ممتاز خان کی کوئی بڑی اور اہم کمزوری چھپی ہوئی تھی جس کا مجھے علم نہ تھا...

مجھے اب صحیح معنوں میں اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔

میں اس بار واقعی بہت برا پھنسا تھا شاید حالانکہ یہ میری فطرت نہیں تھی کہ میرے ساتھی بھی قید وبند میں ہوں اور میں صرف اپنی فکر میں گھلتا رہوں... مگر حالات کی نزاکت اور وقت کی نوعیت اس بار اور تھی۔ میری گرفتاری کو ظاہر نہیں کیا گیا تھا اور مفرور گردانا گیا تھا جبکہ ارشد، شوکی اور شکیلہ کا معاملہ اتنا زیادہ نازک یا خطرناک نہ تھا... نہ ہی ان کا جرم اتنا سنگین تھا پھر ان کی گرفتاری بھی ظاہر کی گئی تھی لیکن مجھے یقینی موت کا خطرہ تھا۔

فرعون صفت روشن خان اس کے لیے مجھ پر تشدد کے پہاڑ بھی توڑنے کا ارادہ کر چکا تھا... بس آج کا دن میری خیریت کا تھا کل سے یہ خیریت میرے لیے خواب بننے والی تھی۔ میں سوچتا بھی تو کیا...؟ اس قید خانے سے مفر کی اور کیا راہ ہو سکتی تھی؟ مجھے برائے نام کھانے پینے کو دیا گیا۔ دن پوری طرح چڑھ آیا تھا بیرک کے روزن نما تنگ روشن دان سے تیز دھوپ کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں پھر دھیرے دھیرے... ان کی سفیدی سنہری ہونے لگی اور پھر ملگجے اندھیرے میں بدل گئی۔

اب شام ڈھلنے والی تھی۔ گزرتے وقت کا احساس... رات پڑنے پر ہی ہوسکا اور میرے دل ودماغ کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ کل سے مجھے مشقِ ستم بنایا جانا تھا، اس کے بعد میرا کیا حشر کیا جاتا۔ میں باقاعدہ قانون کی حراست میں ہوتا بھی تو مجھے اپنے تحفظ کا احساس اور اطمینان رہتا مگر یہاں تو اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ تھا۔

وقت بھاری سل کی طرح گزرنے لگا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا، سلاخ دار دروازے کے پار کوریڈور پر مجھے عجیب سی نامعلوم منحوسیت پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔ وہاں سے مدھم روشنی آ رہی تھی۔

میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ میں خود کو سزائے موت کا قیدی تصور کرنے لگا جسے صبح تختۂ دار پر چڑھایا جانے والا تھا۔

اچانک... ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ یہ آواز کوریڈور کے سرے سے ابھری تھی۔ میں بری طرح چونک کر اٹھ کھڑا ہوا مجھے ایک دو افراد کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دیں۔ افراتفری کا یہ عالم خاموشی کے ساتھ نہایت قلیل عرصے میں تمام ہوا، پھر دوسرے ہی لمحے تین مسلح افراد کو میں نے دوڑتے ہوئے اپنی بیرک کے قریب آتا دیکھا تو میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ یہ کون تھے؟ غیبی امداد... اپنے دوست... یا پھر دشمن کی کوئی چال... کئی سوالات تھے جو اب ان کا ایک ہی تھا یعنی... میری آزادی۔

مذکورہ تینوں افراد میں سے ایک حرکت میں آیا۔ مجھے ان سے خوف بھی محسوس ہوا، کیا خبر میری جان لینے کے درپے ہوں مگر ایسا نہیں ہوا۔ آنے والے کے ایک ہاتھ میں چابیوں کا گچھا دکھائی دیا۔ اس نے فوراً آہنی چوکھٹے کے اندر ہاتھ ڈال کر چابی لگائی اور سلاخ دار دروازہ کھول دیا۔

"جلدی نکلو! وقت کم ہے آؤ..." اس نے کہا۔ وہ اجنبی تھا۔ میں الجھن آمیز پریشانی میں بیرک سے باہر آ گیا۔

ہم نے کوریڈور کو تقریباً دوڑتے ہوئے کراس کیا۔ وہاں دو کمرے کے باہر دو تین سنتری فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ ان جیسے دو مزید ساتھی ایک دوسری راہداری میں ہمارے منتظر تھے۔ ان تینوں نے مجھے ان کے حوالے کیا۔ ان سب کے چہروں پر نقاب تھے۔ وہ دونوں مجھے لیے دوسری راہداری سے جو نسبتاً مختصر تھی، اس کے سرے پر واقع ایک دروازے سے باہر آئے جہاں احاطے کی دیوار کافی قریب تھی اور ٹوٹی ہوئی بھی تھی۔ وہاں سے وہ مجھے لیے باہر آ گئے۔ جہاں مجھے ایک کار کھڑی نظر آئی۔

ایک نے مجھے کار کی طرف اشارہ کیا۔ ہم کار میں سوار ہوئے ہی تھے کہ اندر احاطے میں زبردست فائرنگ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی تیز آواز میں سائرن گونج اٹھا۔

"اپنے دونوں نجات دہندہ کو میں نے بری طرح چونکتے دیکھا۔ تاہم وہ رکے نہیں اور کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ فائرنگ کے ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکے کی بھی آواز سنائی دی۔

"خدا کرے وہ تینوں سلامت ہوں..." میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

ساتھ عقبی نشست پر بیٹھنے والے نے دعائیہ کلمات ادا کیے جو یقیناً ان تینوں افراد کے لیے تھے جو ان کے ساتھی تھے۔

کار آناً فاناً فراٹے بھرتی ہوئی پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے دور ہوتی چلی گئی۔

"کیا میں اپنے محسنوں کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے بالآخر اپنے دل کی بے تحاشا دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا تو کار ڈرائیو کرنے والے نے میرے ساتھ براجمان اپنے ساتھی کو مخاطب کر کے کہا۔

"تارڑ! اسے بتادو ہم کون ہیں؟"

تارڑ نامی ساتھی نے اپنے چہرے سے نقاب کھینچ لیا۔ یہی نہیں۔۔۔ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی یہی کیا مگر دونوں کے چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ میں مزید الجھ گیا اور جواب کا منتظر تھا۔ پھر تارڑ نامی ساتھی نے میرا شانہ تھپتھپا کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

"زبیر خان کو جانتے ہوگے۔۔۔"

"اوہ۔" میں بے اختیار چونک پڑا اور ایک گہری ہنکاری لے کر رہ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ زبیر خان کو یہ کیسے پتا چلا کہ مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر کی خفیہ بیرک میں قید کر کے رکھا گیا ہے جبکہ میری گرفتاری کو روشن خان نے راز میں رکھا تھا؟ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان تھا۔

"ناممکن۔" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ وہ دونوں چونکے پھر اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے شخص نے کہا۔

"واقعی یہ سب تمہارے لیے ناممکن ہی ہوگا۔۔۔ مگر بہت جلد یقین آجائے گا تمہیں جب تم اپنی کھلی آنکھوں سے زبیر صاحب کو دیکھو گے۔"

"کیا تم لوگ مجھے کھلاں والی لے جارہے ہو؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھ لیا۔

"نہیں۔" میرے ساتھ بیٹھے تارڑ نے کہا۔ دونوں پکی عمر کے مضبوط اور توانا مرد تھے۔ رنگت قدرے جھلسی ہوئی تھی اور چہرے مہرے سے ان کا شمار بھی شرفا میں نہیں کیا جاسکتا تھا جہاں تک میرا تجربہ تھا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوسکی تھی کیونکہ اگلے ہی لمحے اسٹیئرنگ والے نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا تھا۔

"ہاں، کیا ہوا؟ نکل گئے تم؟" پھر دوسری طرف چند سیکنڈوں کی جوابی گفتگو کے بعد بولا۔ "بس ٹھیک ہے پھر وہیں پہنچو، ہم بھی ادھر ہی کے لیے نکل پڑے ہیں۔ خیال رہے، کالے کتے پیچھے نہ لگے ہوں۔۔۔ ورنہ مشکل آجائے گی۔۔۔ اگر ایسی بات ہو بھی تو انہیں چکما دینے کے بعد ہی نیلی کوٹھی پہنچنا ہوگا، سمجھ گئے؟"

"گڈ۔"

"سب ٹھیک ہے۔ مشن سو فیصد کامیاب ہے۔"

سفر خاموشی سے جاری رہا۔ میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دل مسرور تھا اور مطمئن بھی۔ بلاشبہ زبیر خان کا یہ مجھ پر بڑا احسان تھا مگر جانے کیوں باوجود اس کے دل و دماغ ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی کہ۔۔۔ میرے لیے یہ سب بالکل اچانک ہی نہیں غیر متوقع بھی تھا۔ ویسے جب آخری بار زبیر خان سے میری ٹیلی فونک گفتگو ہوئی تھی تو اس نے پہلے ہی مجھ سے دوستانہ عزائم کا اظہار کیا تھا، وہ مجھ سے کوئی خفیہ ڈیلنگ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ڈیل کیا تھی؟ مجھے اس کا علم نہ تھا۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجھے اس سے ملنے کے لیے کھلاں والی تک کا سفر نہیں کرنے پڑے گا۔ اس کی ایک رہائش گاہ ملتان میں بھی ہے۔ وہاں کیا بات چیت ہوسکتی تھی مگر مستقل خطرے کی صورت اور طویل پناہ کے لیے میں بے دھڑک کھلاں والی اس کی جاگیر کا بھی رخ کرسکتا تھا۔

ایسے وقت میں جبکہ میرے ذاتی ہمدردوں کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔۔۔ اور میرے دشمن نہ صرف ان پر بلکہ مجھ پر بھی حاوی ہونے لگے تھے ایسے میں۔۔۔ زبیر خان کا ساتھ میرے لیے کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

میں خاموشی سے کھڑکی سے باہر تاریکی میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ کار چکنی ویران سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ شہر کے قلب سے نکل کر جنوب مغرب کی سمت دور رویہ روڈ نکلی تھی۔ اس پر پندرہ بیس منٹ کا یہ سفر مزید جاری رہا۔ یہ کوئی نئی رہائشی اسکیم تھی جس کے اشتہارات میں ٹی وی اور اخبارات میں دیکھتا اور سنتا آیا تھا۔ آبادی سے الگ تھلگ یہ علاقہ خاصا پُرفضا اور پُرسکون نظر آتا تھا۔ شہر سے پانچ چھ کلومیٹر ہی دور تھا، وہ نیلی کوٹھی اسی طرف ہی تھی یہاں پہنچ کر مجھے لگا جیسے یہ کوئی نیا چھوٹا شہر ہو۔۔۔ دس مرلے کے بنگلوں سے لے کر ایک ایک، دو دو کنال پر کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایسی ہی ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی کوٹھی کے دیوہیکل آہنی گیٹ کے سامنے کار رک گئی۔ گارڈ کیبن سے ایک باوردی محافظ نمودار ہوا اس کے بعد دونوں آہنی پٹ خودکار انداز میں دائیں بائیں کھل گئے۔ کار رینگتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ دیدہ زیب پختہ روش پر چلتی ہوئی اندر کار پورٹیکو میں جارکی۔

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

دو السیشن کتے بھی چوکس انداز میں منڈلاتے دکھائی دیے۔ نیلی کوٹھی کے نام سے منسوب یہ کوٹھی کہیں سے بھی نیلی نظر نہیں آرہی تھی جانے کیوں اس کا نام نیلی کوٹھی رکھا گیا تھا؟

بہرحال... ہم اندر ایک بڑے کمرے میں آگئے۔ نشست گاہ کی طرز کے اس کمرے میں بہت آرام و تسکین کا احساس ہوا۔

''زبیر صاحب ادھر ہی تشریف رکھتے ہیں؟'' میں نے اپنے ساتھ آنے والے دو افراد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو پچھلے دس بارہ دنوں سے ادھر ہی ہیں۔'' ایک نے صوفے پر جھکے جھکے انداز میں براجمان ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کی وجہ تم ہی ہو۔'' دوسرے نے بھی قریب کا صوفہ سنبھالتے ہوئے کہا اور کسی کو آواز دی۔ مگر اس کی آواز بلند ہونے سے قبل ہی ایک بھاری بھرکم شخصیت کا حامل آدمی اندر داخل ہوا۔ جسے دیکھتے ہی وہ دونوں یک دم اپنی جگہ سے اچھلنے کے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں نہایت مؤدبانہ انداز میں سرک کر صوفوں کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ میں بھی لامحالہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ زبیر خان تھا۔ عمر ساٹھ کے آس پاس نظر آتی تھی مگر صحت قابلِ رشک تھی۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ چہرے مہرے سے پکا کشمیری نظر آتا تھا۔ سر کے بال سفید تھے۔ میں نے اسے سلام کیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ میرے ساتھ اس نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ اور مصافحہ کیا۔ پھر وہ میرے سیدھے ہاتھ والے صوفے پر براجمان ہوگیا اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیش قیمت سلیپنگ گاؤن میں تھا۔

''میں آپ کا بہت مشکور ہوں... جناب... بلاشبہ آپ نے مجھے بڑی مصیبت سے نکالا ہے۔'' میں نے اس سے گفتگو کی ابتدا میں ہی اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھا۔

''میں نے تو تمہیں پہلے ہی یہ مشورہ دیا تھا کہ میری طرف کھلاں والی نکل آؤ، ادھر کوئی پرندہ بھی ہماری اجازت کے بغیر پر نہیں مار سکتا مگر تم... خیر... جانے دو... دیر آید درست آید۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں کی ہلکی مسکراہٹ جانے کیوں مجھے اسرار بھری محسوس ہوئی۔

''مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔'' میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ ''لیکن بدقسمتی سے میں کچھ ایسے طوفانی حالات کا شکار رہا تھا کہ کہیں نکل جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔''

''ہوں۔'' اس نے گہری ہنکاری بھری۔ اس کی آواز میں عجیب سی کھرکھراہٹ تھی۔ پھر اس نے قریب کھڑے دو میں سے ایک کو مخاطب کر کے ٹھیٹ علاقائی پنجابی میں کچھ پوچھا۔ جو ظاہر ہے میں بھی سمجھتا تھا۔ اس نے باقی ساتھیوں کے بارے میں دریافت کیا جو مجھے چھڑانے کے لیے اس مشن پر روانہ ہوئے تھے۔ تارڑ نامی شخص نے نہایت مؤدبانہ انداز میں اسے ان کی خیریت سے آگاہ کیا کہ وہ بھی پہنچ چکے ہیں... پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''نوجوان! اب تم آرام کرو... کل ناشتے کے بعد تم سے تفصیلی بات چیت ہوگی۔''

یہ کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنے مذکورہ دونوں آدمیوں کو میرے آرام وغیرہ کے سلسلے میں کچھ ہدایت دے کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کمرے میں ہی ان دونوں یعنی تارڑ وغیرہ نے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کردیا۔ اس کے بعد مجھے دوسرے کمرے میں لے آئے۔

اگلے دن غسل اور ناشتے وغیرہ کے بعد میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا اور تازہ دم محسوس کرنے لگا۔ زبیر خان نے میرے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا اور ناشتے کی میز پر اس کے علاوہ ایک حسین و جمیل جوان خاتون کو بھی وہاں موجود پاکر میرا یہ خیال غلط نکلا تھا کہ اس کوٹھی میں صرف زبیر خان ہی رہائش پذیر تھا، یہ اس کی عارضی رہائش گاہ سہی لیکن یہاں بھی بڑے ٹھاٹ نظر آرہے تھے۔

زبیر خان نے اس خاتون کا مجھ سے اپنی بیگم کے طور پر تعارف کروایا تو مجھے کچھ خاص حیرت نہ ہوئی۔ اس طرح کے بڑے زمینداروں کی ''اگلی'' بیویاں اسی طرح کی ہی ہوتی ہیں خود سے کم عمر، حسین اور طرح دار۔

اس کا نام نیلی خاتون تھا اور کوٹھی بھی یقیناً اس کی اس چہیتی بیگم کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ سو کوئی بعید نہ تھا کہ یہ کوٹھی بھی اس کے نام کردی گئی تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے ''نیلی'' کا سرسری سا جائزہ لیا۔ وہ عمر میں مجھ سے پانچ چھ سال بڑی ہوگی، البتہ زبیر خان سے آدھی عمر چھوٹی تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا... رنگ گورا، دلکش خدوخال کی مالک مجموعی طور پر وہ حسین عورت تھی۔

اس کی موجودگی میں خود کو تھوڑا نروس سا محسوس کرنے لگا۔ ناشتا پُرتکلف تھا۔ ناشتے کے بعد چائے کا دور چلا۔ ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی۔ زبیر خان ڈائننگ ٹیبل کے سرے والی کرسی پر براجمان تھا۔ جسے عرفِ عام میں گھر کے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

سربراہ والی کرسی کہا جاتا ہے۔ اس کے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر نیلی خاتون اور اس کے سامنے یعنی زبیر خان کے بائیں ہاتھ کی کرسی پر میں تھا۔ یوں نیلی خاتون اور میں آمنے سامنے تھے۔ میں نے بس ابتدا میں ایک بار ہی اس پر اور اس کے ''سراپا'' پر نظر ڈالی تھی، اس کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھنے سے احتراز ہی برتا تھا مگر مجھے احساس ہوتا رہا کہ وہ بار بار اپنی گہری آنکھوں کی گھنیری پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھتے رہنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

ناشتا ہوتا رہا۔ اس دوران ایک آدمی نے آکر زبیر خان کو جھک کر مؤدبانہ انداز میں کچھ کہا۔

''میں ابھی آیا۔'' کہہ کر وہ ٹیبل سے اٹھ کر اس آدمی کے ہمراہ ایک طرف چلا گیا۔ آدمی کے ہاتھ میں کارڈلیس تھا۔ جواب زبیر خان... کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر ایک صوفے سے ٹک کر نہایت دھیمی آواز میں گفتگو کرنے لگا۔

میں پھر نروس سا ہونے لگا اور سر جھکائے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگا۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ سامنے والی کرسی پر بیٹھی نیلی خاتون میری طرف ہی تکے جارہی ہے مگر میں نے اپنی نظریں نفیس قسم کے کپ پر ہی جمائے رکھی تھیں۔

معاً مجھے ٹیبل سے نیچے اپنے پیروں پر کسی اور کے پاؤں کا ایک ہلکے سے ''ٹھوکے'' کا احساس ہوا۔ بے اختیار میری چونکتی ہوئی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، لحہ بھر کو اس نے ترچھی نگاہیں کر کے اپنے شوہر زبیر خان کی طرف دیکھا جو کارڈلیس پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ نیلی خاتون کا اس طرح اپنے شوہر کی طرف معاً ترچھی نگاہ سے دیکھنا گویا مجھے یہ جتانا تھا کہ وہ اس سے چھپ کر یہ ''حرکت'' کر رہی ہے تب وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میرے پورے وجود میں سنسنی خیز لہریں دوڑنے لگیں۔ میں نے دوبارہ اپنی نظریں چائے کے کپ پر جھکا لیں۔ ایک بار پھر مجھے نیچے اپنے پیروں پر اس کے پاؤں کا ''ٹھوکا'' لگا۔ میں نے اپنی ٹانگیں تھوڑا پیچھے کر لیں۔ مجھے یقین تھا اس کی یہ حرکت غیر دانستہ نہ تھی، مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ میں اس ''قبیل'' کا مرد نہیں تھا کہ ان ''چہلوں'' میں دلچسپی لیتا۔ لہٰذا میں نے اپنے چہرے پر فوراً گہری سی سنجیدگی طاری کر لی۔ اس دوران میں زبیر خان... واپس ناشتے کی میز پر لوٹ آیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کے ہم دونوں قریبی صوفوں پر آکر بیٹھ گئے۔ نیلی خاتون ٹیبل پر بیٹھی تھی، اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ بہت ہولے ہولے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی اور ہر دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد ذرا گردن موڑ کر بظاہر سرسری انداز میں ہماری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس بار میں نے اس کے چہرے پر نہایت گہری سنجیدگی محسوس کی تھی۔ میں مقصد کی بات پر آنے کے لیے بے چین تھا۔ میری بے چینی بھانپ کر زبیر خان نے ایک نظر ناشتے کی میز پر بیٹھی اپنی بیگم پر ڈالی اور اس وقت تک ڈالے رکھی جب تک کہ نیلی کی اس سے نظریں چار نہ ہو گئیں، چار ہوتے ہی نیلی نے فوراً چائے کا کپ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

نیلی کے جاتے ہی میں نے خود کو پُرسکون سا محسوس کیا۔ زبیر خان نے ایک سگریٹ سلگائی۔ یہ پتلی تنکے جیسی لمبی سگریٹ تھی۔ جس کا دھواں خوشبودار تھا۔ اور گاڑھا بھی نہیں تھا ایک کش لگانے کے بعد وہ بولا۔

''شہزی! تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ تم اس بار بہت برے پھنسے تھے۔'' مجھے اس کا انداز احسان جتانے والا محسوس ہوا۔ جس نے مجھے تھوڑا پریشان بھی کر دیا۔ اس طرح احسان جتانے کا اشارہ دینے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اس کا بدلہ بھی اتارا جائے۔ خواہ وہ کسی بھی نوعیت کا ہو۔

''ممتاز خان پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ چکا ہے۔ اپنے باپ الف خان کے حوالے سے وہ بڑا اثر ورسوخ بھی رکھتا ہے ... حقیقت یہ ہے کہ ہم خود بھی اس سے دامن بچانے ہی کی کوشش کرتے ہیں مگر تمہاری خاطر ہمیں اس سے دشمنی کا خطرہ مول ہی لینا پڑا۔''

ایک بار پھر اس کے اس انداز نے مجھے فکرمند کر دیا۔ میں نے بے اختیار کہا۔ ''شاید آپ کے علم میں نہیں کہ چودھری الف خان...''

''کا انتقال ہو گیا ہے۔'' اس نے فوراً ہی میری بات درمیان سے اچک لی۔

''کیا ممتاز خان کو معلوم ہے کہ مجھے پولیس کی تحویل سے اس طرح چھڑانے کا سبب آپ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنسا پھر بولا۔ ''تم پولیس کی قید میں تھے ہی کب... شہزی؟ تمہیں تو ایک منصوبے کے تحت بڑی بھیانک پولیس گردی کا شکار بنایا جانے والا تھا۔ ویسے میرے آدمیوں نے یہ کارروائی بہت رازداری اور کامیابی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ نمٹائی ہے۔''

''میں یہی جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو اس حقیقت کا کیسے علم ہوا کہ میں روشن خان کی قید میں ہوں۔ جبکہ میری گرفتاری کو بھی اس نے کسی مذموم مقاصد کی خاطر راز میں رکھا تھا۔''

''روشن خان... ممتاز خان کا بڑا پرانا ٹاؤٹ ہے۔'' وہ بولا۔ پتلا سرمئی رنگ کا سگریٹ اس کی موٹی موٹی انگلیوں میں متحرک رہا تھا۔ ''وہ اس کی شہ پر بڑے دھڑلے کے ساتھ پولیس گردی کرتا رہا ہے... خیر، تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ اخبار میں بیگم ولا پر پولیس ریڈ کی خبر پر میں چونک پڑا تھا۔ اس میں تمہارے ساتھیوں کی گرفتاری اور تمہارے پولیس کا گھیرا توڑ کر فرار ہونے کی بھی خبر تھی۔ اس خبر نے مجھے بھی گمراہ کر دیا تھا۔ میں بھی یہی سمجھا تھا کہ تم واقعی فرار ہو گئے ہو... مجھے تمہاری فکر ستانے لگی۔ میں تو خود اتنے عرصے سے تم سے ملاقات کرنے کے انتظار میں تھا۔ پھر اس دوران ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔ اسپتال میں اپنے باپ کی عیادت اور انتقال کے بعد واپسی کے وقت اس کی بیٹی زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کر دیا۔''

وہ ذرا رکا... میرے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ میں ان کے بولنے کا بے چینی سے منتظر رہا۔ وہ آگے کہنا شروع ہوا۔

''اس کے بعد زہرہ بانو کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ کدھر غائب ہو گئی؟ کچھ پتا نہیں۔ اب تم بتاؤ تمہارے ساتھ کیا صورتِ حال ہے؟''

بیگم صاحبہ کے متعلق بات مکمل نہ پائی۔ تاہم میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے انہیں اب تک کے سارے اعصاب شکن اور آسیہ کی دردناک موت سے متعلق ساری حقیقت بیان کر دی جسے سن کر زبیر خان کی آنکھیں پھیل گئیں، چہرے پر گہری گمبھیرتا چھا گئی۔

''مجھ میں تو اتنی بھی ہمت نہیں ہو پا رہی ہے کہ اس کی دردناک موت کی خبر... اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کو دے سکوں؟ مگر سوچتا ہوں... یہ کڑوا گھونٹ مجھے ہی پینا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ آسیہ کے ذکر پر میرے لہجے میں کبیدگی اتر آئی تھی۔

''اس کی اطلاع تو تمہیں دینا ہی پڑے گی کیونکہ تمہیں اب پہلے سے زیادہ خانم شاہ کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے جبکہ اب جو رول تمہارے حق میں آسیہ ادا کرنا چاہ رہی تھی وہ اب اس کی بڑی بہن خانم شاہ کرے گی۔'' زبیر خان کی بات قابلِ غور تھی۔ آسیہ کی موت کے بعد خانم شاہ ہی میری قانونی معاملات میں مدد کر سکتی تھی۔ وہ ایک ذرا توقف کے بعد آگے بولا۔

''خانم شاہ سے تمہارے سلسلے میں میری بھی بات ہوئی تھی اگرچہ مختصر سی سہی مگر وہ پُرامید تھی اپنی چھوٹی بہن آسیہ کے مشن پر...'' میرے دل و دماغ میں کافی دیر سے ایک سوال گردش کر رہا تھا۔ زبیر خان کی اس بات پر مجھے وہ سوال پوچھنے کا موقع مل گیا۔ میں نے پُرغور نظروں سے زبیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جناب! آپ نے بھی تو میرے سلسلے میں اپنا بیان بدل ڈالا تھا اس سے کتنا فرق پڑا؟''

یکلخت اس کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی۔ نشست گاہ میں دم بہ خود سناٹا طاری ہو گیا۔ میرے اس سوال پر اس کے چہرے پر ماضی قریب کے کچھ تلخ اور درد بھرے واقعات کے حوالے سے کئی سائے لہرا گئے۔ اس نے قدرے مضطربانہ انداز میں سگریٹ کے یکے بعد دیگرے دو تین کش لگائے پھر نفیس قسم کی سنگ مرمر کی ایش ٹرے میں اسے مسل ڈالا۔

''میں تو اسی وقت تمہارے سلسلے میں اپنا بیان بدل چکا تھا کہ... میرے بیٹے شفقت راجا کے قتل میں تمہارا ہاتھ نہیں اور اب آسیہ کی دردناک موت نے بھی ثابت کر ڈالا ہے کہ واقعی یہ حقیقت تھی جو ذرہ برابر شبہ تھا تمہارے بارے میں مجھے، وہ بھی دل سے نکل چکا میرا... کیونکہ اس ویڈیو کلپ کی تردید اور تلافی کرنے کی خاطر آسیہ اور تم نے کتنے پاپڑ بیلے تھے جبکہ ممتاز خان نے یاسین ملک کو بھی خرید لیا تھا اور اسے اس ویڈیو کلپ کی اپنے نجی ٹی وی چینل پر تردید چلانے یا دکھانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا۔ آسیہ کے منگیتر ریحان کے حوالے سے بھی ممتاز خان کی میرے ساتھ ہٹ گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس وقت تک ریحان کو یرغمال بنائے رکھوں جب تک اس کا اصلی دشمن یعنی تمہارا صفایا نہیں ہو جاتا... مگر میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنے بیٹے کے اصل قاتلوں کے سلسلے میں کسی مصلحت سے کام نہیں لوں گا کیونکہ میں نے اپنے ذاتی ذرائع سے پتا لگوا لیا تھا کہ میرے بیٹے کے قتل میں بہرحال تم ملوث نہیں تھے۔'' وہ رکا۔

''اس کے بعد میری تم سے دشمنی کا جواز ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے میں نے نہ صرف ریحان کو چھوڑ دیا تھا بلکہ تمہاری مدد کرنے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا اور فوراً تمہارے سلسلے

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

میں عوام و خواص میں اس بات کا اعتراف کرلیا کہ میرے بیٹے شفقت راجا کے قتل میں شہزاد احمد خان عرف شہزی نہیں بلکہ کوئی اور لوگ ملوث ہیں۔ میں نے قانونی طور پر بھی تمہیں بے گناہ قرار دلوا دیا تھا۔ مگر یہ بات ممتاز خان کے مفادات کے خلاف جاتی تھی۔ وہ بپھر گیا مگر میں نے اس کی مطلق پروانہ کی... لہٰذا اب اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی ہے، وہ خانم شاہ پوری کردے گی۔ رہی بات ممتاز خان کے بیٹے کے قتل کی جس کا الزام تمہاری اور تمہارے قریبی ساتھی اول خیر کے سر پر تھوپا جارہا ہے... اس سلسلے میں بھی تمہیں فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اس کی بیٹی نوشابہ نے یہ حقیقت تسلیم کرلی ہے کہ اس کا بھائی فرخ کا قتل اس کی غلطی سے پستول چل جانے سے ہوا ہے۔"

"مگر اس سلسلے میں ممتاز خان کا جواز بڑا ٹھوس ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "وہ اس کی وجہ بھی مجھے ہی سمجھتا ہے مگر حقیقت یہ تھی کہ... ہم فرخ کو محض اغوا کرنا چاہتے تھے، اسے مارنا نہیں۔"

"ہاں، باوجود تمہاری تاویل کے... قانونی طور پر بھی اس کی وجہ تم ہی گردانے جاؤ گے۔ میں اس سلسلے میں ٹیلی فون پر خانم شاہ سے بھی تبادلۂ خیال کرچکا ہوں۔ اب ہم منتظر تھے کہ کب آسیہ تمہارے سلسلے میں وہ لائیو پروگرام چلاتی ہے۔ جس کے بعد بہت سی قانونی پیچیدگیاں تمہارے حق میں آسان ہوتی چلی جاتیں مگر افسوس... ایسا نہ ہوسکا۔"

میں نے کہا۔ "آسیہ کے بعد خانم شاہ ہمارے لیے اہم ہوسکتی ہے مگر اب وہ میری اس سلسلے میں کیا مدد کرسکتی ہیں؟"

"میں اس سلسلے میں بہت مختصر مگر جامع پروگرام ترتیب دے چکا ہوں۔" زبیر خان جواباً پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "میرا ایڈووکیٹ خانم شاہ کو یہاں بلانے کا ارادہ ہے۔ تم بھی فون پر ان سے بات کرلینا، تم سے بات کرکے وہ یقیناً مطمئن ہوجائیں گی۔ اور ادھر چلی آئیں گی پھر ہم سر جوڑ کر ایک لائحہ عمل طے کریں گے کہ تمہیں کس طرح اس قانونی چکروں سے آزاد کرایا جاسکتا ہے؟ مگر ابھی فون پر تم انہیں آسیہ کی موت کا کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"لیکن اسے اس کی بہن کی موت کا بتانا تو پڑے گا۔" میں نے سوالیہ نظروں سے زبیر خان کی طرف دیکھا۔

"جب وہ یہاں آئے گی تو اسے بتادیا جائے گا۔"

"مگر یہ دکھ بھری خبر اس کے لیے ذہنی شاک (صدمے) کا باعث بنے گی۔ میرا نہیں خیال اپنی بہن کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ ہم سے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرنے کے قابل ہو؟"

"تمہاری بات صحیح ہے۔" زبیر خان نے صاد کیا۔ "مگر وہ ایک قابل وکیل بھی ہے یقیناً مضبوط اعصاب کی مالک ہوگی۔ اپنی چھوٹی بہن کے اس بہیمانہ قتل کا انتقام وہ بھی ممتاز خان سے لینا چاہے گی۔ پہلی ملاقات میں نہ سہی... ایک دو روز بعد سہی... اب وہی کوئی مشورہ دے سکتی ہے۔"

بغیر وقت ضائع کیے زبیر خان نے اپنے سیل فون پر ایڈووکیٹ خانم شاہ سے رابطہ کیا پھر فون مجھے تھما دیا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہورہی تھی، دکھ بھی ہورہا تھا، پورا یقین تھا مجھے خانم شاہ چھوٹتے ہی سب سے پہلے اپنی الم نصیب بہن آسیہ کے بارے میں ہی مجھ سے پوچھے گی اور ہوا بھی وہی۔ میری آواز سنتے ہی وہ مرتعش سے لہجے میں بولی۔

"شش... شہزی...! تت... تم... ٹھیک تو ہو نا...؟ آسیہ خیریت سے ہے؟ تم لوگ سب اچانک کدھر غائب ہوگئے تھے پروگرام کا کیا بنا...؟" اس کے منہ سے سوالوں کی بوچھار جاری تھی جس کا میں نے سرِدست ایک جواب دیا۔

میں فون پر آپ کو زیادہ تفصیل نہیں بتاسکتا۔ بس اس قدر جان لیجیے کہ... اب ہمیں آپ کے مشورے اور مدد کی زیادہ ضرورت آن پڑی ہے۔ آپ نیلی کوٹھی آسکتی ہیں... زبیر صاحب کے ہاں...؟"

"ابھی آجاتی ہوں۔ فون دو انہیں۔" دوسری طرف سے اس کی مضطربانہ آواز ابھری۔ میں بھی یہی چاہتا تھا دراصل زیادہ دیر تک میری ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ انہوں نے خود ہی میری مشکل آسان کردی۔ لہٰذا میں نے فوراً سیل دوبارہ زبیر خان کی طرف بڑھا دیا۔

دونوں میں مختصر سی بات ہوئی... جس کے مطابق خانم شاہ کو اس کی رہائش گاہ سے لانے کے لیے زبیر خان اپنے آدمی روانہ کرنا چاہتا تھا مگر خانم شاہ نے اسے ایسا کرنے سے منع کردیا۔ اب وہ خود ہی تنہا اپنی کار میں یہاں نیلی کوٹھی پہنچنے والی تھی... ہم دونوں اس کی آمد کے بے کلی سے منتظر تھے۔

مجھے سرد بابا سے بھی بات کرنا تھی۔ میں ان سے... عابدہ اور ان کی بہو عارفہ کی خیریت وغیرہ معلوم کرنا چاہتا

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

تھا۔ ظاہر ہے مجھے زیادہ بے چینی عابدہ کی خیریت معلوم کرنے کی ہو رہی تھی۔ یوں بھی سرمد بابا خود بھی میرے لیے فکرمند ہوں گے۔ زبیر خان سے میں نے اس کی درخواست کی۔ اس نے فوراً کارڈلیس منگوا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ سرمد بابا کے نمبر پنچ کیے۔ ان سے بات ہوئی۔ وہ واقعی میرے لیے فکرمند تھے۔ میں نے عارفہ اور بالخصوص عابدہ کے سلسلے میں ان سے خیریت پوچھی۔ خدا کا شکر تھا وہاں امریکا میں وہ دونوں خیریت سے تھیں۔ سرمد بابا نے میری تمام مصیبتیں اور پریشانیاں ختم ہونے اور میرے جلد سے جلد گھر پہنچنے کی ڈھیروں دعا دیں۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ عابدہ کی خیریت معلوم کرنے کے بعد... میں اب خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا مگر میرا دل اس سے بات کرنے کے لیے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ البتہ سرمد بابا کا روزانہ ان سے ٹیلی فون پر رابطہ رہتا تھا۔ عارفہ کا اسٹیٹ کے جس اسپتال میں علاج ہو رہا تھا اس کا نمبر میرے پاس تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ نمبر ملایا... وہ بزی جا رہا تھا۔ عابدہ کے سیل فون پر جو اس نے وہاں جانے کے بعد حاصل کیا تھا اس نمبر کو عارفہ اور عابدہ دونوں ہی استعمال کرتی تھیں اس پر بھی ملایا دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ عابدہ سے بات کرنے، اس کی مترنم آواز سننے کے لیے میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہونے لگیں۔ بالآخر دوسری جانب سے عابدہ ہی کی آواز ابھری۔

’’ہیلو۔‘‘ اس کی آواز امرت دھارا کی طرح میری سماعتوں میں اُتری جس نے مجھے سرتاپا سرشار و بےخود سا کر دیا۔ میں اپنی دلی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے گویا دل کی عمیق گہرائیوں سے بولا۔

’’عابدہ...! میں تمہارا شہزی... تم کیسی ہو؟‘‘

’’شش... شہزی...‘‘ دوسری جانب سے عابدہ کی جذبات سے معمور لرزیدہ آواز ابھری۔ ’’تم... کہاں ہو...؟ کیسے ہو... ٹھیک تو ہو نا؟‘‘ اس کی آواز میں محبت کی سرشاری تھی اور فکر بھی۔

میں نے کہا۔ ’’ہاں، عابدہ! میں ٹھیک ہوں تم تو ٹھیک ہو نا...؟‘‘ یہ سب کہتے ہوئے جیسے میں رفتہ رفتہ اپنے گرد و پیش سے لاتعلق سا ہونے لگا۔

’’میں بھی ٹھیک ہوں شہزی مگر تمہارے بغیر بہت اُداس ہوں... میرا یہاں بالکل جی نہیں لگ رہا۔‘‘ وہ بے اختیار روہانسی سی ہونے لگی۔ میں نے اسے تسلی دی اپنے لہجے کو مضبوط بنایا۔

’’عابدہ! تمہارے بنا میرا بھی یہی حال ہے مگر عابدہ! زندگی گزارنے کے لیے انسان کو کچھ کڑوے گھونٹ بھرنے ہی پڑتے ہیں حوصلہ رکھو... باقی تھوڑے دن ہی تو رہ گئے ہیں تمہارے امریکا سے واپسی میں...‘‘ میں نے امید بندھائی۔ ’’عارفہ باجی کا علاج تو ٹھیک ہو رہا ہے ناں؟‘‘

’’ہاں شہزی! ڈاکٹر پُرامید ہیں۔ ایک ہفتے بعد ان کا آپریشن کر کے جگر تبدیل کر دیا جائے گا۔ پھر پندرہ روز کے بیڈ ریسٹ کے بعد... واپسی ہو گی... مگر...‘‘ وہ اتنی خوشی کی بات بتاتے بتاتے جانے کیوں یک دم چپ سی ہو گئی۔ جس نے مجھے بے چین کر دیا۔

’’مگر کیا عابدہ؟ آگے بولو ناں...؟ تمہیں وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے ناں...؟‘‘

’’پتا نہیں کیوں شہزی! میرا دل عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار رہنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہاں میرا دم گھٹ جائے گا۔ جی کرتا ہے میرے پر نکل آئیں اور... اور... میں اڑ کر پاکستان تمہارے پاس آ جاؤں۔‘‘ اس کے لہجے سے شدید بیتابی مترشح تھی۔ میں زیرِلب محبوبیت سے مسکرایا اور بولا۔

’’عابدہ! یہی حال میرا بھی ہے۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ تم جلد سے جلد پاکستان واپس لوٹ آؤ... میرے پاس... میرے بالکل قریب... میری آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ سرمد بابا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں بھی ان کے ہاں آؤں تو وہ مجھے اسکائپ پر تم سے بات کروائیں گے جس میں ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔‘‘

’’تمہارے مسئلے کا کیا ہوا شہزی؟ پچھلی بار تم نے مجھے بہت امید دلائی تھی کہ بہت جلد تم اپنے مسائل سے چھٹکارا پانے والے ہو؟‘‘ وہ ایک دم بولی۔

میرے دل میں ایک مجبوری ٹیس کی ابھری، جسے لفظوں کی تہ میں دباتے ہوئے بولا۔ ’’ہاں! میں کوشش کر رہا ہوں، تم بھی دعا کرو۔ اچھا سنو... میں کسی اور کے فون پر ہوں... اتنی دور لمبی گفتگو کرنا مناسب نہیں... بہت جلد میں تم سے اسکائپ پر بات کروں گا... ٹھیک ہے نا... اپنا خیال کرنا۔‘‘

پھر دوسری جانب سے عابدہ کا اثبات میں جواب سن کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

SCANNED BY PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

ایڈووکیٹ خانم شاہ ایک گھنٹے کے اندر ہی وہاں آن پہنچی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنی بہن آسیہ کے بارے میں استفسار کیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ آسیہ بھی میرے ساتھ ہوگی۔۔۔ زبیر خان بھی موجود تھا۔ میں خانم شاہ سے کچھ چھپانا جرم سمجھتا تھا۔ لہٰذا میں نے اسے دھیرے دھیرے اب تک کے سارے پیش آمدہ واقعات سمیت اس کی بہن آسیہ کے بارے میں بتا دیا۔ پہلے تو وہ یہ سن کر ایک دم سکتے میں آگئی، وہ کئی ثانیوں تک یک ٹک غیر یقینی نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ زبیر خان نے یہ عقل مندی کی تھی کہ اپنی بیوی نیلی خاتون کو بھی وہاں بلا لیا تھا اور خانم شاہ سے اس کی ملاقات بھی کروا دی تھی۔

خانم شاہ ایک تیز اور غم زدہ سی سسکاری خارج کر کے رو پڑی۔۔۔ وہاں سنبھالنے کے لیے اسے نیلی خاتون موجود تھی۔ اس نے ہی روتی ہوئی خانم شاہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا اور ہولے ہولے اس کا کاندھا تھپک کر اسے تسلیاں دینے کی کوشش کرنے لگی۔ ماحول ایک دم افسردہ اور کچھ ماتمی سا ہو چلا تھا۔ بلاشبہ خانم شاہ ایک مضبوط اعصاب کی مالک تھی مگر اپنی بہن کی اس طرح کی ظالمانہ موت نے اسے واقعی اندر سے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا آبدیدہ چہرہ۔۔۔ جوشِ غیظ کی سرخی سے بھی تپتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"کاش۔۔۔ کاش۔۔۔ میں چودھری ممتاز خان کو اس ظلم کا مزہ چکھا سکوں کاش۔۔۔" وہ رندھے ہوئے مگر جوش و غیظ کے جذبات سے لرزتے لہجے میں بولی۔ زبیر خان صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"ہم سب مل کر ممتاز خان کو اچھی طرح سبق سکھا سکتے ہیں اور آپ سے رابطہ کرنے کا بھی ہمارا یہی مقصد تھا۔"

"آسیہ کی ڈیڈ باڈی کا کیا ہوا؟" خانم شاہ اب دھیرے دھیرے اپنے آپ میں آنے لگی مگر آواز اس کی اب بھی غم کے بوجھ تلے مرتعش سی محسوس ہوتی تھی۔

"وہ انہوں نے کہیں ٹھکانے لگا دی تھی۔" میں نے جواب دیا اور آگے بولا۔ "بعد میں ان کی قید سے آزاد ہوتے ہی میں نے اور میرے ساتھی اول خیر نے ان کے ساتھ ایک خوں ریز مقابلہ کیا تھا اور جن چاروں شیطانوں نے آسیہ کے ساتھ گینگ ریپ کیا تھا، انہیں ہم نے بعد میں جہنم رسید کر دیا تھا۔ ممتاز خان کے اور بھی ساتھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے لیکن پھر حالات کچھ ایسے خطرناک رخ اختیار کرنے لگے کہ ہمیں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔"

تھوڑی دیر تک ماحول پر خاموشی طاری رہی۔ اس دوران نیلی خاتون نے خانم شاہ کو پانی پلایا اور آنسو پونچھنے کے لیے اسے ٹشو پیپر دیتی رہی۔ زبیر خان کے چہرے پر پُرسوچ خاموشی طاری تھی پھر وہ خانم شاہ سے مخاطب ہو کے بولا۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں آسیہ کی لاش بازیاب ہونے کی صورت میں ممتاز خان اور اس کے ایک اہم کارندے۔۔۔ جنگی خان کے خلاف کوئی قانونی گرفت مضبوط ہو سکتی ہے؟"

"یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں زبیر صاحب؟" خانم شاہ یک دم اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ "آسیہ کی لاش کو بازیاب کرانا ازبس ضروری ہے۔ اس کا پوسٹ مارٹم کرانا ہوگا میں خود ممتاز خان کے خلاف ایف آئی آر کٹواؤں گی اور شہزاد احمد۔۔۔ اور اس کے ساتھیوں کی حیثیت چشم دید گواہوں کی سی ہوگی۔"

"اگر یہ بات ہے تو سب سے پہلے آپ کو شہزی کے سلسلے میں قانونی طور پر کچھ آسانیاں پیدا کرنا ہوں گی۔" زبیر خان نے کہا تو میں بولا۔

"اگر آسیہ کی لاش برآمد کرنے میں ممتاز خان کے خلاف کیس مضبوط بن سکتا ہے تو یہ کام میں خود ممتاز خان کی جاگیر نئے پنڈ کا رخ کروں گا اور کسی طرح آسیہ کی لاش برآمد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"تم اب یہ سب کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو شہزی۔۔۔" خانم شاہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ اب اس کی آواز میں ذرا مضبوطی آنے لگی تھی۔ "میرے پاس ایک آسان لائحہ عمل ہے۔ لاش کی برآمدگی کے سلسلے میں پولیس خود ہی میری مدد کرے گی۔ تمہارے دو ساتھی جو چشم دید گواہوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔۔۔ یعنی شوکت حسین (شوکی) اور اس کی بہن شکیلہ۔۔۔ پہلے ہی پولیس کی حراست میں ہیں۔۔۔ لہٰذا۔۔۔" وہ اتنا کہہ کر تھوڑا سا سانس لینے کو رکی پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "شہزی! تم کو بھی پہلے اپنی رضاکارانہ گرفتاری پیش کرنا ہوگی۔"

خانم شاہ کی بات سن کر میں یک دم سناٹے میں آگیا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

قسط: 83

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مقدر کا کھیل، سیدھی کالک، رسم و
اناللہ آشرم... سب ہی اپنی اپنی
مطابق بہت ٹھیک ٹھاک نبھائی جا
جب باسیوں کے بعد نکیل بگڑنے میں
یاد آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے
پوپھال کی کالیما کی نام نہاد ابھی
گئی تو بھی اثرات میں نکالا ہے، ان کا
مقدر نظام ہی بکھرا پڑا رہا ہے... استعم
صورت گرفتاری بھی ہو، قابل نفرت ہے
بھی بات اور حالات کی ستاری نے ایک
اماں کی پناہ میں پہنچادیا تھا۔ سکون
کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا
تھا... وہ بھی علی کا پتا نہیں تھا
شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلت
اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا...
اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو تو
اور پھر اس نے سب کچھ ہی اللہ کو سونپ
راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس
کی طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب
والوں سے جوتر... بہت برتر لوٹ رہے
آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ
دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے
سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان
سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن سے

ایڈونچر اور بہت دلچسپ سلسلہ

ایڈووکیٹ خانم شاہ کی بات سے مجھے ہی نہیں زبیر خان کو بھی سخت اختلاف تھا۔ وہ مجھ سے پہلے ہی بول پڑا۔ اپنا سر اور ہاتھ بیک وقت ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن...... مگر نہیں، شہزادی کی اندھی گرفتاری ایک بے وقوفانہ عمل ہوگا۔ مجھے حیرت ہے، آپ یہ غیر دانشمندانہ مشورہ دے رہی ہیں؟" زبیر خان کی حیرت میں غصے کا عنصر بھی تھا۔ اسی اثنا میں اس نے پاس بیٹھی [illegible] کو اشارہ کر کے وہاں سے چلتا کر دیا۔

"بعض حالات و معاملات میں ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں خان صاحب۔" خانم شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بھی متانت سے بولا۔

"اور بعض حالات و معاملات میں اس طرح کی گرفتاری الٹا اپنے ہی گلے کا پھندا بن جاتی ہے۔"

خانم شاہ کے جواب میں زبیر خان خود ہی میرا دفاع کر رہا تھا۔ اس لیے سردست میں خاموشی سے دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ تاہم میں بظاہر خاموش ضرور تھا اور بھانپتی نظروں سے خانم شاہ کی گفتگو سے کچھ اندازہ بھی اخذ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے لگا تھا کہ اپنی بہن آسیہ کے اس بہیمانہ قتل پر وہ بہت رنجیدہ اور مضطرب الحال ہو رہی تھی۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسی کیفیات میں انسان کو صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے۔ حالانکہ زبیر خان سے زیادہ خانم شاہ کو بھی اس طرح اندازہ تھا کہ میرا پولیس کے ہتھے چڑھنا بالخصوص سپرنٹنڈنٹ روشن خان کے، کس قدر بھیانک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ زبیر خان اس خطرے کو ملحوظ رکھتے ہوئے خانم شاہ کے مشورے کی نفی سختی سے بھی کر رہا تھا۔

"دیکھیے خان صاحب! قانونی معاملات اور ان کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے آپ سے زیادہ میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں اور کبھی نہ کبھی یہ رسک لینا پڑتا ہے۔"

خانم شاہ کی اس بات نے یا تو مجھے بولنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے پرخلوص رویے اور اپنے کردار... مگر خود غرضانہ موقف پر ڈٹے رہنے اور اپنی وکالت کا بھرم برقرار رکھ کر رعب جھاڑ کر... قائل کرنے کی روش نے مجھے بھی تلخ بنا دیا۔ لہٰذا میں نے خانم شاہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"خانم صاحبہ! کم از کم میرے معاملے میں کوئی قانونی پیچیدگی یا باریکی سرے سے ہی نہیں نظر آتی ہے۔ میرا معاملہ تو سیدھا اور صاف ہے۔ مجھے حیرت ہے آپ کی بات پر کہ آپ کو تو ساری حقیقت کا علم ہے کہ پولیس مجھے قانون کی خاطر نہیں بلکہ اپنے راتب خواروں کی خوشنودی کی خاطر گرفتار کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ روشن خان کے جرائم سے آپ بھی واقف ہیں۔ ممتاز خان پولیس کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دوبارہ بھی پولیس مقابلے میں [illegible] کرنے کی مذموم کوشش کر چکا ہے۔"

میرے لب و لہجے میں جوش عود کر آیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب خانم شاہ کی خود غرضانہ روش مجھ پر واضح ہونے لگی تھی۔

میری دو ٹوک اور مدلل گفتگو نے شاید خانم شاہ کو باور کرا دیا تھا کہ وہ مجھے آسانی سے بے وقوف نہیں بنا سکتی۔ تجربہ بھی کہ مجھے بھی اس کی خود غرضانہ سوچ کا اندازہ ہو چکا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے انداز میں [illegible] آیا۔

"شہزادی! میری معصوم اور بے گناہ بہن آسیہ تمہاری وجہ سے ایک بھیانک موت سے ہمکنار ہوئی۔ وہ اپنا آرام و سکون [illegible] کر کے محض تمہاری مدد کی خاطر آخری دم تک مجرم رہی اور جس نے تم پر اپنی عزت، جان... بڑی جان کنی کے عالم میں قربان کر ڈالی ہے، تم اتنے خود غرض ہو گئے ہو کہ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ایک ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتے۔ مجھے تم سے اتنے گھٹیا رویے کی توقع نہ تھی۔"

کوئی چارہ کار نہ پاتے ہی خانم شاہ اب [illegible] پر اتر آئی تو مجھے مجبوراً اسے آئینہ دکھانا ہی پڑا۔ میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے متانت سے بولا۔ "محترمہ! میں اب تک دانستہ کسر نفسی سے کام لے رہا تھا۔ لیکن حقیقت ہے آپ کو بھی آپ کی بہن آسیہ میرے ساتھ بھیانک غلطی کا اظہار کرتے ہوئے آگاہ کر چکی تھی۔ وہ میری مدد نہیں کر رہی تھی بلکہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی خاطر وہ میرے ساتھ اس مہم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی ایک ویڈیو کلپ نے ہی درحقیقت میرے لیے ان گنت مسائل کھڑے کر دیے تھے۔ جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ اگرچہ میں نے پھر بھی آسیہ کی اس غلطی کو معاف کرتے ہوئے اسے خود سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ایک باضمیر اور باغیرت لڑکی تھی۔ وہ ضمیر کو قید کر کے زندگی گزارنا نہیں چاہتی تھی۔ اب رہی بات آپ کی سوچ کو گھٹیا کہنے کی تو... خانم صاحبہ! مجھے خود آپ کی گھٹیا سوچ پر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ ان [illegible] وابستہ حالات سے ناواقف نہیں ہیں۔"

میری اپنی بھی جوابی کارروائی نے ایک اسکی پروفیشنل عورت کو گنگ سا کر کے رکھ دیا تھا۔ شاید اسے اپنے آپ پر بڑا زعم تھا کہ وہ عدالتی دنیا میں اپنی دھواں دھار بحث سے سخت گیر وکیلوں کو لاجواب کر دیتی ہوگی۔ وہ میری صورت میں بظاہر ایک عام جذباتی نوجوان کو بے نام کی غیرت کا جوش دلا کر قائل کرنے لگی۔ اس کا سارا زعم خاک کے راستے بہہ نکلا تھا۔ زبیر خان مجھے اپنے موقف کے حق میں مدلل اور مسکت گفتگو کرتا پا کر دانستہ طمانیت بھرے انداز میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔

خانم شاہ فوراً اپنی اصلیت پر اتر آئی اور مارے طیش کے صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے شہزادی! اگر تم میرے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرنے کو تیار نہیں ہو تو پھر مجھ سے بھی کسی قسم کی امید مت رکھنا... اور یہ بھی تم سن لو... اپنی بہن کے قاتلوں کو تختہ دار پر چڑھانے تک میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے کوئی بھی قیمت چکانا پڑے... بائے..."

وہ جتاتے ہوئے انداز میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئی۔ میں اس کے فوراً بعد پریشانی کا شکار ہو گیا۔ مجھے اس کی بالکل پروا [illegible] بلکہ مجھ سے تعاون کے سلسلے میں [illegible] تھا۔ پریشانی [illegible] کی تھی کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد میرے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ وہ بے وقوف تھی، انتقامی روش میں وہ آسیہ کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی... بلکہ الٹا میرے خلاف [illegible] کے ہاتھ مضبوط کرنے کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ حقیقت مجھے معلوم تھی کہ نہیں آسیہ کو میری مدد کی ضرورت تھی۔ مگر جوشِ انتقام میں جلد بازی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور یہی وہی حرکت [illegible] آسیہ نے کی تھی۔

میں نے [illegible] سامنے صوفے پر بظاہر آرام سے بیٹھے ہوئے زبیر خان کی طرف دیکھا۔ یقیناً اسے بھی اندازہ ہونا چاہیے تھا کہ بپھری ہوئی خانم شاہ کا [illegible] سے اس طرح نکلنے کا مطلب... [illegible] پولیس اور [illegible] کی نظروں میں مشکوک بنانے کے مترادف تھا۔

تب میں نے دیکھا۔ زبیر خان نے [illegible] سے گمبھیر سوچ میں ڈوبا دکھائی دیا۔

"ایک باڈی گئی یہاں سے نکل رہی ہے۔ گیٹ پار کرنے سے پہلے اسے دبوچ کر اندر کمرے میں پہنچا دو۔ اس کے منہ پر پٹی بھی باندھ دو۔" یہ حکم دینے کے بعد وہ زیرِ لب انداز میں مسکرایا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

"مجھے ایسا مجبوراً کرنا پڑا۔ ورنہ اس کے یہاں جانے کے بعد یہ جگہ بھی تمہارے لیے محفوظ نہیں رہتی۔" مجھے اس کی بات درست لگی مگر مجھے یہ بھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں نے کہا۔

"میں خانم شاہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"چند گھنٹے گزر جانے کے بعد کبھی کبھی انسان کا ابال دماغ سے نیچے اترنے لگتا ہے تو تب ہی اسے بات سمجھ میں آتی ہے۔" وہ بولا۔ اسی دوران گارڈ اندر داخل ہوا اور مؤدبانہ بولا۔

"خان جی! خاتون کو اندر پہنچا دیا گیا ہے۔"

"اس کی گاڑی بھی اندر کر لی ہے؟"

"جی خان جی..."

"ٹھیک ہے۔ ہاں... وہ ذرا تیر کو بھیج دو سامان کے ساتھ۔"

"جی بہتر۔" گارڈ نے مؤدبانہ کہا اور چلا گیا۔ زبیر خان نے کسی تیر نامی آدمی کو بھجوانے کو کون سا سامان لانے کو کہا تھا۔ مگر جب ذرا سی دیر بعد ایک چھریرے جسم کا آدمی ہاتھ میں درمیانی سائز کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا تو بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔

تیر نامی اس آدمی نے جو ٹرے درمیان میں بچھی شیشے کی ٹاپ والی میز پر سجائی تھی، اس میں "[illegible] آوارہ" کا سامان سجا ہوا تھا۔

اعلیٰ برانڈ کی انگلش وسکی، دو بلوری پیک، ایک چھوٹے اور بھنی ہوئی سونگ پھلی کے دانوں کی پلیٹوں کے علاوہ آئس کیوب کا باؤل بھی تھا۔ جس کے اندر چند آدھ [illegible] ہوئے تھے۔

"کیوں نوجوان! شغل تو کرتے ہو گے...؟" زبیر خان نے معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا تو میں نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل نہیں... آپ لیجیے۔"

میں بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ ذرا تنہائی چاہتا تھا اور زبیر خان نے خود ہی یہ مسئلہ حل کر دیا۔ گلاس کو [illegible] کر لیا، پھر مجھ سے بولا۔

"تم ذرا اندر جا کر کچھ دیر آرام کر لو۔ پھر باتیں کریں گے۔" میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ گارڈ ہولے سے میرے سامنے ظاہر ہوا۔ میں... اس کے عقب میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ مجھے کمرے تک چھوڑ کے گارڈ پلٹ

گیا۔ میں آرام دہ بیڈ پر نیم دراز سا ہوکر سوچ میں مستغرق ہوگیا۔

حالات عجیب رخ اختیار کررہے تھے۔ دوست دشمن ہورہے تھے۔ جانے میری تقدیر میں آگے کیا لکھا تھا۔ میں جتنا حالات سدھارنے کی کوشش کرتا وہ اسی قدر دگرگوں ہوتے چلے جاتے۔ میرے بازو کا زخم اب قدرے بہتری کی جانب مائل تھا۔ یہاں اس کی بہتر دیکھ بھال کی گئی تھی۔

میرے کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ پھر شاید ہوا سے یا اپنے جھول میں وہ تھوڑا سا اور بھی کھل گیا۔ راہداری روشن کوریڈور مجھے صاف نظر آرہا تھا۔ میں یونہی وہاں کسی مرئی لمحے پر اپنی نظریں جمائے سوچ میں غرق تھا کہ وہاں میں نے کسی کی جھلک دیکھی۔ پھر ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور ہلکی مخصوص خوشبو سے میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ نیلی خاتون تھی۔ اسے میں نے کچھ توقف کے لیے اپنے کمرے کے سامنے رکتے دیکھا تھا اور اندر جھانکتے ہوئے بھی۔ میرے دل کو پھر بے چینی سی کھانے لگی۔ وہ آگے بڑھی، میں نے قدرے سکون کی سانس لی۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے مجھے ہلکی موسیقی کی آواز سنائی دی۔ شاید اس کا کمرا میرے کمرے کے برابر میں تھا یا پھر وہ دانستہ اس کمرے میں داخل ہوئی تھی، کوئی بڑی تھی اور وہ اس کی مالک تھی۔ اچانک ایک گانے کے بول کچھ واضح اور اونچی آواز میں سنائی دیے۔ یہ ایک انڈین مووی کا مشہور گانا تھا۔

کی گلی میں پھرتا ہے... تو کیوں بن کے بنجارہ
آ... میرے دل میں بس جا... میرے عاشق آوارہ

مجھے یہ بات اور نیلی خاتون کا یہ فلمی گیت سننا عجیب اور عامیانہ سا محسوس ہوا اور اس سے بڑھ کر اس کی یہ حرکت بھی... کہ وہ دانستہ دو تین بار ری وائنڈ کرکے گانے کے یہی بول مجھے سنانے کی کوشش کررہی تھی۔ بہرحال... مجھے ان خرافات سے کب دلچسپی تھی۔ میں نے سر جھٹکا اور اٹھ کر دروازہ بند کردیا۔ موسیقی کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر گزری۔ شاید موسیقی بھی بند کردی گئی۔ اب خاموشی طاری تھی۔

میں سوچنے کے لیے کمرے میں کچھ دیر کے لیے آیا تھا۔ نیلی خاتون کی یہ اوچھی حرکت مجھے ناگوار گزری تھی۔

میں ایک بار پھر سوچ میں گم ہوگیا۔ میں زبیر خان کے متعلق سوچنے لگا کہ وہ میری مدد کے سلسلے میں آخر کس حد تک تجھے بہت اور کس قدر کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ [illegible] ایڈووکیٹ خاتم شاہ نے بھی ایک نیا مسئلہ... بالآخر [illegible] شورش چھوڑ دیا ہے۔

مجھے اپنے کمرے میں آئے نصف گھنٹا ہوا [illegible] دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔ میں خیالات کے بھنور سے چونک کر ابھرا اور دروازے کی طرف دیکھ کر [illegible]

"کون... ؟ آجاؤ دروازہ کھلا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ زبیر خان نے "شغل" فرمانے [illegible] ہمراہ مجھے بلانے کے لیے کسی کو میرے کمرے میں بھیجا [illegible] جب دروازہ کھلا تو میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔ سامنے [illegible] خاتون کھڑی تھی۔

☆☆☆

پُرکشش اور حسین کتابی چہرہ، دراز [illegible] ریشمی بال، حسین ہونٹ اور گہری بولتی ہوئی [illegible] آنکھیں... نیلی کو دیکھ کر میں فوراً بیڈ سے اٹھ کر [illegible] بےاختیار میرے منہ سے نکلا۔

"آ... آپ... یہاں... کیسے؟"

"کیوں؟ کیا میں یہاں نہیں آسکتی؟" وہ [illegible] ہوئے بولی، دلربا مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر [illegible] طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ساتھ ہی چند قدم چلتے [illegible] اندر بھی آگئی... اور ایک ادائے دلبرانہ سے [illegible] پر براجمان... ہوگئی۔ مجھے گھبراہٹ نے آن [illegible] دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ نیلی نے مجھے چونک [illegible] گولڈن لیس والا قیمتی شلوار سوٹ پہن رکھا [illegible] باریک ریشمی چست لباس میں اس کا وجود ہر قدم پر [illegible] بھی لگ رہا تھا۔ مجھے اس اعتراف میں کوئی عار نہیں کہ [illegible] وہ نہیں بلکہ بہت دلربا اور پُرشباب جسم کی مالک بھی تھی۔ اس کے حسن و شباب کی رعنائی دیکھ کر دل [illegible] بے طرح دھڑکا تھا مگر میں خود پر قابو پاتے ہوئے [illegible]

"زبیر صاحب میرے منتظر ہوں گے مجھے ان کے پاس [illegible] چاہیے۔" مقصد اس حسین قاتلہ سے جان چھڑانا [illegible] اس کا یوں میرے کمرے میں آنا اور پھر بیٹھ بھی جانا عجیب سا لگ رہا تھا اور باعث خطر بھی۔ وہ زبیر خان کی دوسری یا تیسری بیوی تھی۔ مجھے اس سے کوئی [illegible] تھی، کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا... اس کے کسی [illegible] نظر پڑسکتی تھی جو دو کیا کہتا۔

"وہ دو تین گھنٹے سے پہلے اپنی جگہ سے [illegible] گے۔" اس نے مترنم سی آواز میں کہا۔ اس کی [illegible]

[illegible] کیں بیٹھک میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہونے لگی۔

"میں انہیں بلانے بھلا نے نہیں ان سے باتیں کرتا [illegible] ہوں۔" میں نے کہا۔

[illegible] کہتے ہوئے میں نے ایک قدم دروازے کی طرف [illegible] ہی تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں سمجھا کہ [illegible] گئی۔ ایک بار پھر اس کا دلکش حسین چہرہ [illegible] کی زد میں تھا پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"ٹھہرو، ایک بات کا جواب دو۔ کیا تم خان صاحب [illegible] دھندوں میں شامل ہوگئے ہو؟" اس کا سوال مجھے عجیب لگا۔

[illegible] حال میں نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں۔"

"وہ دوست تو کسی کو کم ہی بناتے ہیں۔ اپنا غلام [illegible] نے میں وہ کسی کو دیر نہیں لگاتے۔"

"میں کسی کا آلۂ کار یا غلام بننا پسند نہیں کرتا۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں بہت جلد یہاں سے [illegible] چاہیے۔ وہ کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا [illegible] بنانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔" اس کی بات پر [illegible] پڑا... پھر وہ مجھے اسی طرح سوچتا چھوڑ کر پلٹ [illegible] عجیب شخصیت کی اس عورت کی بھی، کبھی مجھے اس کی [illegible] سمجھ میں نہ آتی [illegible] ایک دم پُراسرار اور [illegible] عورت کبھی دوست بن کر آنے لگتی تھی۔ اس کے [illegible] نے کے بعد میں نے جو کمرے سے نکلنے کا ارادہ [illegible] بیٹھ [illegible] گیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر خاتم شاہ [illegible] دوست سعد کی [illegible] کے ذریعے میں شوکی وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ [illegible] کوشش کرتا مگر معاملہ اب الٹی آنتیں گلے پڑ چکا [illegible]

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ مجھے خاتم شاہ سے ملنا چاہیے [illegible] سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ جوش اور [illegible] سے [illegible] دل و دماغ کے ساتھ [illegible] بات مجھے اور جانے کیا کچھ [illegible] ہے... کہ اسی میں [illegible] کی کھائی تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنے بھائی اپنے [illegible] بے گناہ، جاں نثار ساتھی اور اپنی محبت کے بارے [illegible] فکرمند تھا اور اب میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ زبیر خان [illegible] حالات میں میری کیا مدد کرسکتا تھا؟ [illegible] دیکھا تو وہ اپنے "شغل" سے تقریباً فارغ [illegible] تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں [illegible] سگریٹ تھا اور [illegible] کیل فون جیسے وہ اپنے کان سے لگائے [illegible] کسی سے گفتگو کررہا تھا۔ میرے سامنے والے صوفے پر براجمان ہونے کے بعد وہ مجھ سے بولا۔

"میں نے ابھی ابھی اپنے ایک پرانے جاننے والے سینئر وکیل سے بات کی ہے۔ وہ کچھ دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔"

میں نے ہولے سے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میرا معاملہ طوالت اختیار کرسکتا ہے مگر میری کوشش ہوگی کہ پہلے... میرے ساتھیوں کو پولیس کی حراست سے چھڑانا از بس ضروری ہوگا۔ کیونکہ ان کے ذریعے مجھے بلیک میل کیا جاسکتا ہے یا کسی دباؤ کا شکار کیا جاسکتا ہے۔" میری بات سن کر زبیر خان نے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔

"خان صاحب اگر ممکن ہوسکے تو پہلے آپ پولیس کی حراست میں موجود میرے تین ساتھیوں ارشد، شوکت حسین اور شکیل کی ضمانت وغیرہ پر رہائی کا بندوبست کردیں تو مجھے زیادہ تسلی اور خوشی ہوگی۔" میری بات پر اس نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ اس دوران نہ جانے کیوں نیلی کے الفاظ میرے کانوں میں سرگوشی کے انداز میں سنائی دینے لگے۔

"تمہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے... خان صاحب کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اپنا آلۂ کار بنانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔"

میں نے سر جھٹک دیا۔ یہ اپنی جگہ ایک حقیقی امر تھا... اگر زبیر خان میرے کسی کام آرہا تھا تو پھر مجھے بھی اس کے کسی کام آنے میں عار نہیں محسوس کرنا چاہیے تھا۔ اس میں آلۂ کار بننے والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ اب جبکہ زبیر خان کا میرے ساتھ دوستانہ رویہ تھا۔ اس میں کسی حکم کا دخل نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے دل ہی دل میں نیلی خاتون کی بات رد کر ڈالی۔

"تمہیں خود سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی بڑی فکر رہتی ہے، نوجوان!" کچھ سیکنڈ کے وقفے کے بعد زبیر خان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بات ہی ایسی ہے خان صاحب! کیونکہ وہ میرے دوست ہیں۔ مصیبت کی گھڑی میں میرے کام آتے رہے ہیں اور اب میری ہی وجہ سے وہ خود مصیبت کا شکار ہیں۔ حقیقی الحال فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے مگر وہ خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

"[illegible] سردار آنے والا ہے۔ وہ سپریم کورٹ کا ایک سینئر وکیل ہے۔ میرے پرانے شناساؤں میں سے ہے۔ تمہارے سلسلے میں مشورے کے بعد میں اس سے یہ

بات بھی کر لوں گا۔"

"بہت شکریہ... خان صاحب آپ کا۔" میں نے ممنون لہجے میں کہا۔ وہ بے غور پرسوچ نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ ماحول میں بے فکر قدم پر خود سا سناٹا طاری ہو گیا۔ میں اب بے تابی سے منتظر تھا کہ زبیر خان کب اپنے مطلب کی بات مجھ سے کرتا ہے جس کا اظہار اشارتاً وہ فون پر مجھ سے کر چکا تھا۔ مزید کچھ تاخیر ہو گئی اور وقت گزرا تو میں نے ہی زبیر خان سے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو... میں خانم شاہ کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"ایسی عورتیں بڑی ہی عجیب ہوتی ہیں۔ وہ نہیں سمجھے گی تمہاری بات۔ اسے سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف ہے۔" زبیر خان نے کہا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں، ممکن ہے اب اس کا جوش کچھ کم ہو گیا ہو اور وہ میری بات سمجھ لیں۔"

"گارڈ!" زبیر خان نے بلند آواز میں پکارا۔ گارڈ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔ زبیر خان نے اسے مجھے خانم شاہ سے ملانے کا کہا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور گارڈ کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ ایک چوڑی راہداری سے گزرتے ہوئے ایک بار پھر میری نظر بھٹکتی نیلی سے ہو گئی، اس نے اپنے ریشمی گھنے بالوں میں ہیئر برش پھنسا رکھا تھا۔ میری طرف اس نے عجیب سی مسکراہٹ سے دیکھا تھا اور مسکراہٹ میں مجھے طنز کی کاٹ بھی محسوس ہوئی تھی۔

خانم شاہ کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں یرغمال بنا کے رکھا ہوا تھا۔ گارڈ دروازے پر رک گیا جبکہ میں اندر داخل ہو گیا۔

اندر روشنی تھی۔ کمرا بہتر تھا۔ ایک بیڈ اور دو کرسیاں دھری تھیں۔ واش روم بھی تھا۔ ایک کھڑکی تھی جو باہر ویرانے میں کھلتی تھی۔ اس کے اوپر گول روشندان تھا۔ خانم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر بیڈ پر بٹھا رکھا تھا۔ منہ پر اسکاچ ٹیپ تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ ذہنی اذیت کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بھی متورم نظر آئی تھیں۔ اسے اس پریشان کن حالت میں دیکھ کر مجھے دکھ بھی ہوا تھا مگر وہ بلاوجہ کا [illegible] نہ کرتی تو اس کا آج یہ حال نہ ہوتا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت آمیز درشتی کے تاثرات ابھرے تھے۔ وہ کسمسائی بھی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب آیا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے ہونٹوں پر چپکا اسکاچ ٹیپ اس طرح ہٹا دیا کہ ہونٹوں سے ہٹ گیا مگر بوقتِ ضرورت میں اسے بہ آسانی چسپاں کر سکتا تھا۔

"...تت... تم... ذلیل...! کمینے فراڈ... میرا یہ حشر کرانے... مجھے تم سے... تھی..." وہ جیسے پھٹ پڑی۔

میں برداشت سے کام لیتے ہوئے بولا۔ "ایسے گالم گلوچ والے الفاظ آپ کو زیب... محترمہ افسوس ہے مجھے کہ آپ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ایسے الفاظ بھی استعمال کرتی ہوں گی۔"

"زیادہ مہذب بننے کی ضرورت نہیں۔" وہ بپھری۔ "مجھے اس طرح یرغمال بنانے والے وحشی انسان۔"

"اس میں میرا کوئی دخل نہیں، یہ عمل..."

"زیادہ چالاک بننے کی ضرورت... اس طرح ایک خاتون کو... جانتی ہیں کہ... جرم ہوتا ہے؟"

"محترمہ... کی تشریح اتنی... سب بے گناہ ہونے کے... ایسے... ہوتے ہیں... نرم بنانا ممکن ہوتا ہے... قانون پڑھانے کی کوشش تو بالکل... معاملے کے سلسلے میں بات چیت کر... صاحب سے خصوصی اجازت لے کر... نے کہا ہو تو پھر وہ جائیں اور آپ... میں... جاؤں گا۔"

میری اس بات نے اسے کچھ سوچنے پر... تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے کا تناؤ کم... عاری جیسے تاثرات میں بدل گیا۔ اس نے... سے ایک گہری سانس خارج کی جیسے خود کو... اعصاب زدگی سے چھٹکارا پانا چاہتی ہو اور... بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

"پہلا اتنا کہ... خدارا... [illegible] کی عینک اتار کر ٹھنڈے دل و دماغ سے... سمجھنے کی کوشش کریں۔" میں نے قدرے... "آپ کیا سمجھتی ہیں کہ مجھے آپ کی موت کا... اس کے قاتل اور دشمن کوئی اور ہیں۔ ہرگز نہیں... انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کا عزم لے...

...بیزار صفت افراد کو بھی موقع پر واصلِ جہنم کر چکا... انہوں نے چوہدری ممتاز خان کے ایما پر آپ کے... بہیمانہ اور شیطانی کھیل کھیلا تھا۔" یہ کہہ کر میں... ایک بار پھر اس کے چہرے کے تاثرات کا... جس میں مثبت اشارہ پایا جاتا تھا۔

"بہن کی اچانک اور اس طرح کی سنگین موت کا ردعمل فطری تھا... لیکن خیر اب تو آپ کچھ... کریں... تو خود آپ کو اس بات کا جواب مل جائے گا... گرفتاری میرے لیے نقصان دہ اور دشمنوں کے لیے کس قدر سود مند ثابت ہوگی۔ آپ بھی اچھی طرح یہ حقیقت جانتی ہیں کہ میرے ساتھ اگر یہ سب... قانون کو ہوتا تو اس کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا لیکن یہاں الٹا ہے۔ دشمن مجھے قانون کی آڑ لے کر ہی اپنے... سے ہٹانا چاہتے تھے۔"

"شاید میں غلطی پر تھی۔" بالآخر خانم شاہ کے لرزتے ہونٹوں سے برآمد ہوا — میں نے بے اختیار ایک گہری سانس... کیا۔ خدا کا شکر ہے کہ بالآخر اسے اپنی غلطی کا... ہو گیا تھا۔ میں اسے مزید آگے بولنے کا موقع دینے... سے خاموش رہا [illegible] "تم... شاید... پھر نے مجھے اعصاب... تھا اور میں... میں دھکیلنا... دوڑی۔ یہ جانے بغیر کہ... قانون کی آڑ لے کر تمہیں راستے سے..."

"خدا کا شکر ہے آپ کو میری بات سمجھ آ گئی۔"

وہ ملامت آمیزی سے بولی۔ "شہزی! سوری، میں... تھی... کہا۔ میں اپنے نازیبا الفاظ... لیتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں... مجھے خوشی ہے کہ آپ کو... بالآخر ادراک ہو ہی گیا۔" ...مسکرا کر کہا تو وہ بولی۔

"مگر شہزی!... کیا اس طرح مجھے یرغمال بنا کر... رکھنا ایک درست عمل ہوگا؟ آخر کب تک... مطلب ہے، یہ زبیر خان مجھے اس طرح کب تک یرغمال رکھے گا۔"

"میں ان سے بات کرتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔" ...جواب میں کہا اور پھر یہی وہ لمحات تھے جب... میں خانم شاہ کی طرف سے ایک کھٹک نے سر اٹھایا تھا۔ یعنی... "مکاری۔"

کہیں یہ عورت میرے ساتھ کوئی چالاکی تو نہیں کر رہی تھی؟ پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ میں کون سا اسے ابھی یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ یہ فیصلہ تو میرے اور زبیر خان کی باہمی مشاورت سے ہی طے پا سکتا ہے۔ تاہم میں نے اس سے اداکاری کی۔

"اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔ میں اس سلسلے میں ابھی زبیر خان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے دیکھا... میری بات پر اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے الجھن سی تیر گئی تھی۔

"شاید تم بھی مجبور ہو، میں سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری۔ تمہیں زبیر خان نے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ظاہر ہے اس سے مشورہ کرنا ضروری ہوگا۔" مجھے اس کی بات اچھی لگی۔ شاید وہ اب صورتِ حالات کو سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا اس کے بارے میں ذہن میں ابھرنے والی میری تشکیک کچھ کم ہونے لگی تو میں نے مسکرا کر اسے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں زبیر خان سے بات کرتا ہوں، یہاں آپ کے ساتھ کوئی بھی نازیبا حرکت کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا کم از کم میرے یہاں ہوتے ہوئے یہ سب ناممکن ہے۔" کہتے ہوئے میں جانے کے لیے بیڈ سے اٹھا۔ میں نے اسکاچ ٹیپ اتار کر پھینک دیا۔ اس پر خانم شاہ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر بولی۔

"ذرا ایک منٹ..." میں رک کر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ "واش روم تو یہاں ہے مگر اس کا فائدہ؟" میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ اسے اب اس رسن بستہ حالت میں رکھنا مناسب نہ تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی ساری بندشیں کھول دیں۔ اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا اور واش روم کی جانب بڑھی اور بند دروازے پر زور آزمائی کرنے لگی۔ میں اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا۔ وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نے واش روم کے دروازے کو دھکا لگایا تو وہ بہ آسانی کھل گیا۔ مجھے کھٹک آمیز حیرت ہوئی۔ اسی وقت مجھے عقب سے خانم شاہ نے زوردار دھکا دیا اور پلٹ کر دوڑی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کمرے کے باہر گارڈ تاحال [illegible] بیٹھا ہوا ہے۔ ادھر میں بھی فوراً سنبھل کر پلٹا۔ تب تک خانم شاہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھلے دروازے سے باہر دوڑ لگا چکی تھی تب ہی گارڈ کی تیکھی چیخ آواز سنائی دی تھی۔ میں بھی دوڑا۔

خانم شاہ کا رخ زینے کی طرف تھا۔ وہ جوش میں دو دو، تین تین قدم پھلانگتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔ اسی وقت میں نے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے گارڈ کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھی۔ میں تشویش میں مبتلا ہو گیا مگر میں سمجھتا تھا کہ وہ گولی چلانے کی جرأت نہیں کرے گا اور اگر چلائے گا بھی تو محض خانم شاہ کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر۔

مگر جیسے ہی خانم شاہ بیرونی دروازے کی طرف دوڑی، گارڈ نے رک کر اسی کا نشانہ لیا۔ میں حلق کے بل پیچھے سے چلایا۔

"نہیں گارڈ۔"

"ٹز..." ایک دھماکا ہوا اور [illegible] خانم شاہ کی پشت سے خون کا فوارہ اچھلتے دیکھا۔ وہ ایک [illegible] چیخ سی خارج کر کے ڈھیر ہو گئی۔ میں نے گارڈ کی اس سفاکانہ حرکت پر جنونیوں کی طرح اسے جا لیا۔

"ذلیل... کتے! یہ تو نے کیا کر دیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے ایک زوردار گھونسا گارڈ کی تھوڑی پر رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اسی اثنا میں دو افراد نے مجھے دبوچ لیا۔ تھوڑی دیر میں زبیر خان بھی تشویش زدہ چہرے کے ساتھ وہاں آ گیا۔

"خان صاحب... اس نے... اس درندے نے... اس پر گولی چلائی تھی... وہ مر رہی ہے۔ اسے بچا لو۔" میں نے دونوں تنومند آدمیوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی پیشانی پر ان گنت سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔ گارڈ منہ سنبھالے میری جانب خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے مخاصمانہ چمک تھی۔ زبیر خان نے اپنے آدمیوں سے تحکمانہ کہا۔

"عورت کو اٹھا کر اندر لے جاؤ، اور اسے سنبھالو۔"

مجھے چھوڑ کر دو آدمی بے سدھ پڑی خانم شاہ کی جانب لپکے۔

"اسے فوراً اسپتال لے جانا ہوگا، خان صاحب..." میں نے زبیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر اس نے میری بات نظرانداز کرتے ہوئے غصے سے گارڈ کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"تمھیں گولی مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ ہمیں جل دے کر بھاگ رہی تھی، خان جی۔" گارڈ نے کہا۔

خانم شاہ کی حالت تشویشناک تھی۔ میں نے ایک بار پھر زبیر خان کے سامنے اپنی بات دہرائی تو وہ

"یہ سب اتنا آسان نہیں ہے شہزی؟

دو... تم ذرا خاموش رہو۔" اس کے بعد اس نے

کسی آواز میں کچھ کہا۔ اس نے فوراً اثبات میں

اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا۔

زبیر خان نے معتدل لہجا اختیار کرتے ہو

کہا۔ "دھیرج رکھو، ابھی ڈاکٹر پہنچ جاتا ہے۔"

مگر میری تسلی نہ ہوئی۔ میں اس کمرے میں

جہاں خانم شاہ نیم جان کے عالم میں ایک بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ خانم شاہ کی حالت زار دیکھ کر

لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ معاملہ اتنا نازک تھا کہ

کسی کلینک یا اسپتال نہیں لے جایا جا سکتا

مطلب یہ بھی نہ تھا کہ ایک انسان کو اپنی آنکھوں

اچھا یوں مرتے ہوئے دیکھا جائے... جیسے

جس کی اچھا تھی۔ نہ جانے کس طرح اور کتنی د

[illegible] بیٹھا رہا۔ کچھ وقت بعد

اور اس کے ساتھ ہی ایک ڈاکٹر کو لے آئے۔ ان

کو شاید زبردستی لایا گیا تھا [illegible]

کیونکہ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

مجھے کمرے میں جانے سے روک دیا [illegible]

"ڈاکٹر کو زبردستی لایا گیا ہے۔

تمھیں وہ دیکھ پائے۔ میرے ساتھی ضرور

گے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ایک لمحہ

کسی صدی کی طرح گزر رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر گارڈ کی

حرکت پر غضب ناک غصہ آ رہا تھا۔ میرا

تھا کہ اسی پستول کی ایک ایک گولی اس درندے

بھی اتار دوں۔

"اس میں خانم شاہ کی اپنی غلطی تھی۔

چاہتا ہے کہ وہ تمھیں کس طرح جل دے کر بھاگ

کر رہی تھی۔" شاید میرے چہرے سے ذہنی

کرتے ہوئے زبیر خان نے کہا۔

"گارڈ نے یہ اچھا نہیں کیا خان صاحب،

شاہ بہرحال ایک کمزور اور نہتی عورت تھی۔ اس

گارڈ کا ایک بے رحمانہ فعل تھا۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا... تم ذرا خود

کی کوشش کرو۔ میں گارڈ سے بات چیت کروں گا۔"

نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

لگ بھگ کوئی نصف گھنٹا گزرا ہوگا کہ ڈاکٹر اندر داخل

ے دیکھ کر میرے چہرے پر سخت ناگواری کے

بھرے۔ مجھے اس نے کہا۔

"خان جی! ڈاکٹر کہہ رہا ہے اسے بڑے آپریشن کی

ہے۔ گولی بہت اندر تک گھس گئی ہے۔ اس نے ایک

نقصان پہنچایا ہے۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

بات سن کر زبیر خان کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بن

مجھے خانم شاہ کی طرف سے گہری تشویش لاحق

[illegible] پہنچنے سے ظاہر تھا کہ اب زبیر خان کون

اٹھاتا ہے۔

"تم کسی بڑے ڈاکٹر کو اٹھا لاتے۔ جو ادھر ہی اس کا

آپریشن کر کے گولی نکال دیتا۔ یہ کس کو پکڑ لائے تم لوگ؟"

خان نے جھنجھلائے لہجے میں گارڈ سے کہا۔

"خان جی! ہم نے اپنی طرف سے بڑے ڈاکٹر کو ہی

تھا مگر... مجھے لگتا ہے وہ کوئی چالاکی کھیل رہا ہے۔"

اپنی صفائی میں بولا... "ابھی اس کو کنپٹی پر [illegible]

[illegible] آپریشن کرنے کے لیے تیار ہو جائے

گا۔"

"نہیں نہیں!" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

[illegible] جہاں تک اس کی الیت

ہے وہ اسی حد تک سرجری کی چلا رہا ہے۔ اس

[illegible] شک نہیں تھا۔ مگر اسپتال [illegible]

ہے... خانم شاہ کی حالت بہت نازک ہے خان صاحب!

کسی طرح بھی فوراً سے پیشتر اسپتال لے جانا ضروری

"اسے اسپتال لے جانا اتنا آسان اور معمولی بات

نہیں ہے... خان صاحب..." زبیر خان نے گویا میری

[illegible] سمجھنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم تھوڑی

خاموش رہو، اور مجھے [illegible] سوچنے دو۔"

مجھے زبیر خان کے [illegible] انداز اچھا نہیں لگا۔ گوارا

تھا مگر مجبور تھا۔ خاموش رہا۔ زبیر خان نے گارڈ کو

دیا کہ ڈاکٹر کو اسی طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر جہاں

لایا گیا تھا وہیں چھوڑ دیا جائے۔ مگر جاتے جاتے [illegible]

زبیر خان کچھ سوچ کر پلٹا، ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں

خان اس کمرے میں پہنچا جہاں زخمی خانم شاہ کو رکھا

تھا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ ڈاکٹر

فرسٹ ایڈ کے طور پر اس کی زخم کی ڈریسنگ وغیرہ کر دی

شاید کوئی انجکشن بھی لگا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سخت نقاہت طاری تھی۔ رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا... سانسیں بھی وہ اکھڑی اکھڑی سی لے رہی تھی جو سانسوں پر اس کے اوپری وجود کو ہلتا سا محسوس ہو رہا تھا۔ یکلخت مجھے یوں لگا جیسے خانم شاہ بے زبان خاموشی مجھ سے التجا و فریاد کر رہی ہو۔

"شہزی... کیا میں بھی اپنی چھوٹی بہن آسیہ کی طرح بے موت ماری جاؤں گی؟ اس کی طرح میرا بھی پرسان حال کوئی نہ ہوگا؟ کیا تم اب بھی اپنی بے بس آنکھوں سے محض تماشا دیکھتے رہ جاؤ گے؟" ان سوچوں کی یلغار سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ ایک بار پھر میرے اندر غیرت کی چنگاریاں انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگیں جو دیوانہ وار مجھے آتش نمرود میں کودنے پر اکسا رہی ہوں۔ غم و جوش سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے قریب کھڑے زبیر خان کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ "اپنے کیے کی سزا اب اسے خود ہی بھگتنی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے میں اب میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میرا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا۔ ایک انسان کی زندگی بچانے کی خاطر میں ہر خطرے کی دیوار کو پاٹنے کا عزم کر چکا تھا۔ برق جیسی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خانم شاہ کی اپنی گاڑی نیچے گیراج میں کھڑی ہوگی مگر چابیاں...؟ وہ یقیناً اس پرس میں ہوں گی جس کے اندر اس کا سیل فون بھی ہوگا مگر پرس کہاں ہے اور کیسے وہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ سردست مجھے اس کا حصول ناممکن سا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی اس کی تلاش کا وقت تھا۔ یوں بھی اول خیر جیسے ساتھی نے مجھے ہر کام میں طاق و مشاق کر دیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی سن گن لی اور پھر خانم شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر کمرے سے نکلا۔ زینے کی طرف بڑھا تو ایک آدمی سے میرا ٹکراؤ ہوا۔ وہ پہلے تو بھونچکا رہ گیا۔ پھر مجھے روکنے کی کوشش کی، اسی وقت میری ایک لات حرکت میں آئی جو اس کے پیٹ پر پڑی۔ وہ زینے سے نیچے لڑھکتا چلا گیا۔ میں بے ہوش خانم شاہ کو اٹھائے دیوانہ وار زینے اترتا مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ یہاں دو آدمیوں سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے اس حال میں دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکے۔ انھیں معلوم تھا کہ میں ان کے خان جی کا مہمان ہوں، قیدی نہیں، اس لیے انھیں تھوڑی دیر کے لیے بے وقوف بنانا آسان تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ انھوں نے ہی مجھے اسے لے جانے کا کہا ہے۔ وہ مجھے تذبذب کا شکار نظر آنے لگے پھر آگے ٹھٹک گئے۔ شاید وہ اپنے خان جی کے پاس جا کر اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہوں گے۔ میرے

درت کا انمول تحفہ
ہاشمی شہد
قدرتی اور خالص
Hashmi Honey
Pure & Natural
صحت بھی شفا بھی

لیے اتنا سوچنا کافی تھا۔ پورچ میں خانم شاہ کی سوزوکی کار کھڑی تھی۔ شکر تھا کہ دروازے لاک نہ تھے اور ہوتے بھی کیوں، بھلا خانم شاہ کو کیا پتا تھا کہ مہمان کی حیثیت سے یہاں آنے کے بعد اس بے چاری کا یہ حشر ہونا تھا۔

میں نے پھرتی کے ساتھ پچھلا دروازہ کھول کر خانم شاہ کے بے سدھ وجود کو پہلے پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور خود بہ سرعت ڈرائیونگ سنبھال لی۔ جیسے ہی کار اسٹارٹ ہوئی، مجھے کچھ چلاتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ گیٹ پر تعینات دو گن بردار گارڈز ابھی شاید یہ سمجھ نہ پائے تھے کہ میری کار گولی کی رفتار سے ان کے قریب سے نکلتا ہوا دھماکے کی آواز سے گزر کر گیٹ سے باہر نکل گئی۔ عقب میں مجھے فائرنگ کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ مگر میں اب کہاں رکنے والا تھا۔ شکر ہے کہ کسی بھی گولی نے کار کو نہیں چھوا تھا۔

سیدھی سڑک پر آ کر میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ یہ علاقہ قدرے مضافات میں ہونے کے باعث سنسان تھا۔ میرا رخ شہری آبادی کی طرف ہی تھا۔ میں نے ایسے پر خطر لمحے کو بالائے طاق رکھ چھوڑا تھا جس میں میری اپنی جان پر بھی بن آسکتی تھی۔ میرے دل و دماغ میں اس وقت صرف یہی سودا سمایا ہوا تھا کہ اللہ کے حکم سے ایک بے گناہ انسان کی زندگی ہر حالت میں بچانا تھی۔ جلد ہی میں گنجان آبادی میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے اپنے تعاقب کا کچھ زیادہ خدشہ نہ تھا۔ ایک بڑے اسپتال کے احاطے میں آ کر میں نے کار روک دی۔ پھر خانم شاہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر ایمرجنسی کی طرف دوڑ لگا دی۔ آج کل بڑی بڑی شخصیات کی ٹارگٹ کلنگ کے واقعات عام تھے۔ اس لیے اس طرح کی ایمرجنسی کو فوراً توجہ ملتی تھی۔

کاؤنٹر پر میں نے یہی بتایا کہ یہ ایک مشہور خاتون وکیل ہیں اور دو موٹر سائیکل سوار مسلح افراد نے ان کی کار پر فائرنگ کی تھی۔ میں ایک عام راہ گیر ہوں۔ محض اللہ کے واسطے اور انسانیت کے ناتے اسے یہاں لے آیا ہوں... وغیرہ۔

اسپتال کا عملہ فوراً حرکت میں آ گیا اور خانم شاہ کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ جبکہ مجھے تھانہ اور ضروری قانونی کارروائی کے لیے وہیں استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں کسی بھی قانونی کارروائی کا سرے سے متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ میں خود قانون کا ایک مفرور مجرم تھا۔ محض اس وقت تک میں وہاں رک گیا تھا کہ ڈاکٹری عملہ خانم شاہ کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ اور میرا یہ کام ہو چکا تھا لہٰذا اب یہاں سے نکلنے کے لیے پر تولنے لگا۔

جہاں ایمرجنسی کا استقبالیہ کاؤنٹر تھا، خاصی کشادہ تھی۔ یہ کسی این جی او کی سرپرستی میں بڑا اسپتال تھا اور اسے سرکاری معاونت بھی حاصل تھا۔ یہ پانچ چھ منزلہ تھا۔ لفٹ لگی ہوئی تھی۔ برابر میں تھے۔ اوپر جاتا تنگ، دراز زینے بنے ہوئے تھے دائیں جانب بھی کشادہ ایمرجنسی وارڈز بنے تھے۔ چونکہ یہ ایمرجنسی کا حصہ تھا جسے عام طور پر کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں متفرق گلے کے اور ان کے واسطے واردوں کی خاصی چہل پہل مجھے کاؤنٹر کے بائیں جانب ایک ستون کاؤنٹر پر ایک موٹی سی گوری استقبالیہ لڑکی میں رجسٹر کھولے مجھے اندراج کرنے میں منہمک پولیس کا ساتھی بھی وہاں موجود تھا جو کاؤنٹر کے ہاتھ میں مصروف تھا۔ دوسری طرف ایک لڑکی میں کچھ ایمرجنسی کے اسپتال تھانے میں تیز ادرک انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ زیادہ زیادہ نظر آتا تھا ہر کوئی رضاکارانہ شیشے کا اسٹاف کا ایک آدمی کھڑا تھا۔ کے بعد مجھے یہاں سے اپنے کھسکنے کا محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا ابھی میں اچانک میری نظروں نے جو پہلے ہی سامنے دروازے پر جمی ہوئی تھیں، ایک گھبرا دینے والا منظر

شیشے کے پار احاطے میں ایک کار دندناتی ہوئی صرف اندر داخل ہوئی بلکہ وہ سیدھی ایمرجنسی کے کے دروازے کے بالکل قریب ایک جھٹکے سے تعینات عملے کے لوگ اسے روکتے ہی رہ گئے۔ دروازے کھلے اور پھر جیسے یکدم میرا دل اچھل کر حلق آن اٹکا۔ میں نے چار پانچ مسلح افراد کو بڑی تیزی سے اترتے دیکھا۔ ان کے چہروں پر سیاہ نقاب ہوئے تھے۔ ان سب کا رخ داخلی سمت تھا۔ تعینات عملہ ان مسلح افراد کو دیکھتے ہی بھانپ گیا میری رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہوتی ساتھ ہی سائیں کرتا کنپٹیوں پر دھمکنے لگا۔ پہلی کی کے ساتھ پہلا شبہ میرے ذہن میں بھی ابھرا تھا زبیر خان کے آدمی ہو سکتے تھے جو میرے اس طرح کو گولی کی زد سے لے جانے پر اس نے میرے

روانہ کیے تھے۔ مگر زیادہ مجھے اپنے اس خدشے کو رد کرنا پڑا۔ اس کے امکانات کم تھے جھگڑا نہ ہونے کے برابر۔۔۔ کیونکہ مجھے نہیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ معاملہ اس کے لیے اتنا سنگین ہوگا۔

ہم پانچوں ہماری اسلحے کے زور پر شیشے توڑ کے اندر داخل ہوئے تو ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی اور جو لوگ جہاں تھے وہیں زیر لب ہو گئے۔ جسے جہاں چھپنے کی جگہ ملی وہ کونوں کھدروں میں دبک گئے۔ ایک نقاب پوش نے ہوائی برسٹ بھی [illegible] وجود کا وہاں مریض تھا۔ میں نیچے جھک گیا اور موٹی [illegible] ساتھ چپک گئی۔ خوف سے اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کا [illegible] کا ساتھی بھی وہیں کہیں دبک گیا تھا۔ "جو جہاں ہے وہیں [illegible] رہے۔۔۔ ورنہ گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔" نقاب پوش کی دھمکی آمیز اور خراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ مگر اس آواز نے سر سے پاؤں تک میرے سمٹے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہر دوڑا دی۔ سفاکی اور درندگی کا تاثر دیتی یہ آواز میرے لیے غیر شناسا نہ تھی۔ اس کریہہ اور شیطانی آواز کو تو میں لاکھوں افراد کے ہم ہمے (شور) میں بھی پہچان سکتا تھا۔ یہ صفت اُسی۔۔۔ چودھری ممتاز خان کے مقرب خاص بکار پہلوان جنگی خان کی آواز تھی۔۔۔ مگر میرے لیے اس وقت اہم اور تشویش ناک بات یہ تھی کہ یہ مردود ملعون یہاں کسی کو خون میں نہلانے کی غرض سے آیا تھا؟ بہت سی باتیں ذہن میں آتی تھیں۔ مگر اس وقت ان پر غور کرنے اور توجیہات تلاشنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ تاہم میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میں نے کاؤنٹر کے عقب سے ذرا سرک کر تھوڑا سر ابھارا اور اسے اپنے ساتھیوں سے کہتے سنا۔

"تم دونوں میرے ساتھ آؤ۔۔۔ دونوں اوپر دوسری منزل کے جنرل وارڈ میں ہیں۔ آؤ۔"

میں نے اسے قد کاٹھ سے پہچان لیا تھا۔ پھر میں نے اسے اپنے دو مسلح ساتھیوں کے ساتھ تیزی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھتے دیکھا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ دونوں کون تھے؟ جنہیں یہ درندہ اپنی خوف ناک بربریت کا نشانہ بنانے آیا تھا؟ میں شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ یہ لوگ میرے بھی دشمن تھے۔ یہ ممکن ہو سکتا تھا کہ ان کے دشمن میرے دوست بھی ہو سکتے تھے۔ اس خیال نے میرے اندر بے چینی اور تشویش کی لہر دوڑا دی۔ پہلے تو میرا ارادہ ادھر ہی دبکے رہنے کا تھا۔ لیکن اب نہیں۔۔۔ مجھے فوراً سے پیشتر کوئی قدم اٹھانا تھا۔ میں نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں [illegible] اور جھکے جھکے کاؤنٹر کی اوٹ سے دیکھا۔ جنگی [illegible] ساتھیوں کے ساتھ زینے طے کرتا ہوا غائب [illegible] نیچے اس کے دو نقاب پوش ساتھی موجود تھے۔ میں [illegible] عقب میں دیکھا جب۔ ایک سلوپ نما راستہ [illegible] نیچے آتا دکھائی دیا۔ یہ سلوپ نما پاٹ راہداری [illegible] خاصی چوڑی تھی اور یقیناً یہ بوقت ضرورت اس کے [illegible] کسی مریض یا معذور شخص کو اسٹریچر یا وہیل [illegible] سے اوپر یا اوپر سے نیچے لایا جاتا تھا۔ ایسے سلوپ [illegible] ساتھ ہی جو درحقیقت زینے کا ہی کام کرتے تھے [illegible] میں عام طور پر نظر آتے تھے۔

میں کسی دبکے ہوئے چوہے کی [illegible] میرے ساتھ جڑی بیٹھی موٹی لڑکی نے میری [illegible] خوف زدہ سی سرگوشی بھی کی تھی۔ شاید وہ [illegible] روکنے کا مشورہ دینا چاہتی تھی۔ اسے [illegible] میں مجبور تھا۔ ان حالات میں [illegible] نے میری [illegible] بنا دیا تھا۔

اس سلوپ [illegible] آتے ہی جیسے میرے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ [illegible] سے [illegible] دوڑتا ہوا دوسری منزل پر جا پہنچا۔ یہاں بھی خوف [illegible] ہوا تھا۔ اور میں نے ان تینوں [illegible] آدمیوں [illegible] طرف بڑھتے دیکھا۔ اس وقت راہداری [illegible] اسٹریچر نظر آیا جس پر سفید رنگ کی چادر اس طرح [illegible] تھی کہ وہ نیچے فرش تک جھولتی ہوئی تھی۔ میں [illegible] خطرناک فیصلہ کر لیا۔ اسٹریچر کو تیزی سے دھکیلا [illegible] سے اس کے پیچھے فضا میں دھکیل دیا۔ اسٹریچر [illegible] کو پیلو در پہ رینگتا ہوا ان تینوں مسلح افراد کے قریب [illegible] گزرتا چلا گیا اور سیدھا مطلوبہ وارڈ کے دروازے [illegible] ٹکرایا۔ میں اچھل کر باہر آ گیا۔ وہاں بھی بڑ بونگ [illegible] ہوئی تھی اور میں نے کھوجتی نظروں سے بستروں کی [illegible] 9 نمبر والے بیڈ کے مریض پر نظر پڑتے ہی [illegible] آ گیا۔ وہاں کبیل واڈا کو پایا۔ اس کے جسم کے [illegible] پٹیاں بندھی نظر آ رہی تھیں اور اسے ڈرپ لگی ہوئی [illegible] اس کی حالت بھی زیادہ نازک نظر نہیں آ رہی تھی [illegible] میں تھا اور اسی کے قریب والے بیڈ پر اس کا وہ [illegible] موجود تھا جسے میں ٹرین میں دیکھ چکا تھا۔ مگر مجھے [illegible] کتنی یاد آ رہا تھا۔

"کبیل واڈا۔۔۔! ہوشیار۔۔۔ دشمن آ رہا [illegible]"

[illegible] سے اسے پکار کر بتایا۔ اس نے ٹھٹک کر میری [illegible] دیکھا۔ شور و غل کی آواز پر وہ بھی بے چین نظر آ رہا [illegible] کہتے ہی پہلے تو اسے سانپ سونگھ گیا پھر فوراً ہی اس [illegible] ہاتھوں میں لگی ڈرپ کی سوئی کھینچ لی۔ وہ [illegible] ایک وقت بیڈ سے چھلانگ لگا کر اتر سے۔۔۔ اس وقت جنگی خان اپنے دونوں مسلح ساتھیوں سمیت [illegible] داخل ہوا۔ میں ان کے قریب تھا مگر وہ اس سے [illegible] تینوں کو اپنے مطلوبہ بیڈ نمبرز بھی یاد تھے۔۔۔ [illegible] انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے مطلوبہ [illegible] طرف دیکھا اور گنیں سیدھی کر لیں۔ انہوں نے بالکل [illegible] وقت میں شاید کبیل واڈا اور اس کے ساتھی کو بیڈ سے [illegible] کرتے ہوئے پناہ لینے یا چھپنے کی غرض سے نیچے ڈبکتے [illegible] ہو رہا تھا۔ اب میرے حرکت کرنے کی باری تھی۔ [illegible] ان دونوں کو بھون کر رکھ دیتے۔ میں نے عقب [illegible] سے جنگی خان کو [illegible] ٹھوکر اس طرح رسید کی [illegible] دونوں ساتھیوں سے جا ٹکرایا جب تک وہ [illegible] کر چکے تھے مگر نشانہ خطا گیا تھا۔ وارڈ [illegible] گولیوں کی [illegible] تڑتڑاہٹ نے دہشت کی فضا پیدا [illegible] خوف سے اپنی جانیں [illegible] [illegible] میں چھپنے دبکنے [illegible] [illegible] سے [illegible] کے لیے [illegible] [illegible] صورت حال سے [illegible] [illegible] تو بس اپنے شکار کو [illegible] [illegible] کی خوش قسمت نے [illegible] [illegible] سبب تھا کہ وہ [illegible] اچانک [illegible] [illegible] پانے اور اپنے قدموں پر ہی [illegible] [illegible] "[illegible]" کوشش کی جس میں [illegible] کبیل واڈا اپنے ساتھی سمیت [illegible] [illegible] مگر اب میں اپنے تو [illegible] [illegible] خطرناک نظروں [illegible] کر گئے سے ایک [illegible] ہاتھ سے گن گری [illegible] نے [illegible] کی [illegible] جاتے ہوئے میری جانب [illegible] جبکہ میری [illegible] بنے والا جنگی خان تو بالکل ہی [illegible] [illegible] کے ہاتھ کے خالی بیڈ پر جا پڑا تھا۔ جس کا مریض [illegible] کے باعث پہلے ہی نیچے جا دبکا تھا۔ اس [illegible] [illegible] رسم کوش سے تڑپ رہا تھا۔ کیونکہ میں اب [illegible] بھی موت سے ہمکنار کرنے والے سنگین [illegible] سے دو چار تھا۔ یہ اتفاق دیکھ میں نے خود کو بھڑکتی جھل آگ میں دھکیل دیا تھا۔

جب تک باقی دو سنبھلتے۔ میں نے فرش پر سے تیسرے حملہ آور کی گری ہوئی گن اٹھالی۔ اسی وقت جنگی کے دوسرے ساتھی نے اپنی گن سے مجھے وارڈ کے چکنے فرش پر ہی نشانہ بنانے کی کوشش کی مگر میں پھرتی کے ساتھ اپنی گن سمیت لڑھکنی کھاتے ہوئے اپنے بائیں کے بیڈ کی آڑ میں چلا گیا اور لڑھکنی کھانے کے دوران مجھ سے غیر ارادی حرکت بھی ہوئی کیونکہ اس حرکت کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر سنبھلتے ہوئے پہلے ساتھی کی ٹانگوں سے اپنی دونوں ٹانگیں زور سے ٹکرا بھی دی تھیں۔ جس کے نتیجے میں وہ دوبارہ لڑکھڑا کر گرنے لگا۔ برسٹ چلنے کی گن گرج کے ساتھ ہی چکنے فرش کے سنگ ریزے اڑ کر بارش کی شکل میں بکھرے۔ ہم ایک دوسرے کے نشانے پر تھے۔ مگر فوقیت میرے ہی شعلوں کو حاصل تھی۔ ٹھیک اسی وقت یکے بعد دیگرے گولیاں چلیں۔ ایک دشمن کو میں نے کریہہ چیخ کے ساتھ فرش بوس ہوتے دیکھا۔ شاید یہ کبیل والا اور اس کے ساتھی کی حرکت تھی۔ انہیں شاید اب تک سنبھلنے کا موقع مل چکا تھا۔ جنگی [illegible] میں ایک ابھی اپنی گن کی آتشی پیاس بجھانے کی سعی میں تھا کہ جنگی خان خطرہ بھانپتے ہی باہر کو دوڑا۔ جبکہ اس کے دوسرے ساتھی نے بھی پھرتی کا مظاہرہ کیا، وہ [illegible] تھا۔ میں نے بیڈ کی آڑ سے اس کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی خوف ناک آتشی باڑ نے اس کا جسم زمین میں [illegible] کیا اور اس کی ساری کراہٹ ختم کر کے رکھ دی۔

میں سیدھا ہوا۔ کبیل والا اور اس کا ساتھی دوڑ کے میری جانب لپکے۔۔۔ پستول کبیل والا کے ہاتھ میں [illegible]

[illegible] حیرت ہے تجھے، آؤ۔" وہ مجھ سے صرف اتنا ہی کہہ پایا اور باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں وارڈ سے باہر آ گئے۔ میں نے اسے بتایا نیچے ایمرجنسی کی لابی میں جنگی خان کے دو ساتھی موجود ہیں۔۔۔ لہٰذا میں نے انہیں سلوپ والے ڈھلانی راستے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے میں اوپر آیا تھا۔

ہم اس جانب بڑھے ہی تھے کہ باہر پولیس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ ہم تینوں بری طرح ٹھٹک کر [illegible] گئے۔

"[illegible]" یکدم کبیل والا کا ساتھی چیخا اور ساتھ ہی اس نے کبیل والا کو دھکا دیا۔ اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ سے وہ چھلنی ہو گیا۔ میں نے [illegible] کی آڑ لی

اور چلا۔ تقسیم والی دیوار کے زینے پر مجھے وہ مسلح آدمی دکھائی دیا جو جنگی خان کے سوا کوئی نہ تھا۔ اگرچہ اس نے نقاب چڑھایا ہوا تھا۔ میں نے فوراً برسٹ مارا۔ اس نے خود کو پیچھے گرا دیا۔ شاید اسے میری طرف سے اتنی جلدی جوابی فائرنگ کی توقع نہ تھی۔ وہ اگلا نشانہ باندھنے کے لیے پرتول رہا تھا کہ میری گن کے نشانے پر آ گیا۔ اس کے پاس پیچھے سرکنے یا چھپنے کا موقع نہ تھا بجز اس کے کہ وہ خود کو زینے کی طرف گرا دیتا۔ میں نے برسٹ اندھا دھند روز لگا دی۔ جنگی خان تب تک لوٹ کر نیچے جا چکا تھا اور پھر شاید سنبھلتے ہی اس نے نیچے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ کھیل دادا اپنے زخمی ساتھی کی طرف متوجہ ہوا پھر شاید اس کی زندگی سے مایوس ہو کر وہ میری طرف دوڑا۔ [illegible] چلے کرنے لگے۔ گراؤنڈ فلور تک زینے کے دو موڑ آتے تھے۔ دوسرے موڑ کی دیوار کی آڑ سے میں نے جھانکا تو وہاں مجھے پولیس نظر آئی اور اس دوران فائرنگ بھی ہوئی۔ مجھے نیچے لابی کے فرش پر جنگی خان کے ایک ساتھی کی خون میں لت پت لاش بھی نظر آئی۔ جس کے گرد خون کا تالاب بنا ہوا تھا۔ شاید پولیس نے اسے "ہٹ" کر دیا تھا۔ دوسرا ساتھی کہاں تھا؟ کچھ پتا نہیں چلا۔ اس دوران کھیل دادا کی مجھے ہانپتی آواز سنائی دی۔ "واپس پلٹو..... نیچے خطرہ ہے۔" یہ کہہ کر وہ واپس مڑا۔ میں بھی اپنی گن جو دشمن سے چھینی تھی، سنبھالے ہوئے پلٹا۔ ہم دوبارہ اوپر آ گئے۔ کچھ لوگ ہم سے بھی خوف زدہ نظر آنے لگے۔ وہ ہمیں بھی دہشت گرد سمجھ رہے تھے۔ کیونکہ ہمارے ہاتھوں میں بھی اسلحہ تھا۔ مختلف مقامات پر لگے کیمروں پر ہماری ویڈیو بھی بن رہی تھی۔ میرے لیے یہ زیادہ تشویش کی بات تھی۔ گویا تقدیر ایک بار پھر میری کشتی اور مصیبتوں کی زنجیر کو دراز کرنے پر آمادہ تھی۔

ہم دوسری منزل سے مزید ایک منزل اوپر آ گئے۔ پولیس کے نرغے میں ہم بھی آ سکتے تھے۔ پولیس کے ہتھے چڑھنا میرے لیے کسی مصیبت کا باعث بن سکتا تھا، یہ میں ہی جانتا تھا۔

تیسری منزل پر بھی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ یہاں بھی مریض اور عملے کے آدمی لوگ ہمیں دیکھ کر خوف سے چیخنے لگے۔ کچھ سراسیمہ ہو کر دبک گئے اور ہماری جانب سہمی ہوئی نظروں سے تکنے لگے۔

تیسری منزل پر پہنچ کر ہم محتاط تھے۔ کیا خبر نیچے پولیس کی موجودگی کے باعث جنگی خان نے بھی ادھر کا رخ کیا ہو۔

ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں فوراً [illegible] کی طرف لپکا جس کی کھڑکی سے اسپتال کے عقب [illegible] اور احاطے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ وہاں سے میں نے جھانکا تو میرے چہرے پر گہری تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ کچھ پولیس کے ساتھ رینجرز کی گاڑیاں بھی تھیں۔ میں پلٹا اور کھیل دادا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی رینجرز والوں کی موجودگی پر پریشان ہو گیا [illegible] کلامیہ انداز میں بولا۔ "پولیس سے تو مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر رینجرز..... یہ کہاں سے ٹپک پڑی ہے؟"

"ان سے مقابلہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں [illegible]" میں نے کہا۔ "مگر جنگی خان کو ان تک پہنچنے سے پہلے [illegible] چاہیے۔"

"جنگی خان؟..." وہ سوالیہ انداز میں بولا۔ [illegible] لیے کھیل دادا سے ابھی تک [illegible] تھا [illegible] ہمارے بچایا تھا۔

"جنگی خان ہی تھا جو اپنے چند مسلح [illegible] کے ہمراہ تمہیں نشانہ بنانے آیا تھا۔ میں نے اس کی [illegible] پہچان لی تھی۔" پھر میں نے [illegible] کھیل دادا کو بتا دی [illegible] صاحب اور لال خیر کے بارے [illegible] تو وہ میری بات کاٹ کر جوشِ انتقام سے بولا۔ "تو یہ جنگی خان تھا۔ اسے کسی بھی [illegible] پار رینجرز کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہیے۔"

"میں خود اس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں [illegible] افسوس وہ بچ نکلا۔"

"خبردار..... جنگی خان کو ہلاک مت کرنا [illegible] پکڑنا ہے۔" وہ بولا۔ "اس سے ہمیں بیگم صاحبہ کے [illegible] میں اگلوانا ہے۔"

میں چونکا۔ ابھی میں اس سے کچھ پوچھنے ہی [illegible] کہ نیچے برسٹ چلنے کی آواز کے ساتھ ہی چیخنے چلانے [illegible] آوازیں ابھریں۔

"یہاں سے ہٹ جاؤ اس طرف..... آؤ....." وہ ایک طرف تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے بولا [illegible] نے اس کی تقلید کی۔ ہم دونوں زینے سے ہٹ کر [illegible] میں آ گئے۔ پھر ایک خالی کمرا پا کر اس کے اندر چلے [illegible]

"پولیس اور رینجرز کے اہلکار کسی بھی وقت اوپر [illegible] ہیں....." میں نے خیال ظاہر کیا۔

یہ کوئی وی آئی پی وارڈ تھا جو خالی تھا۔ ہم

[illegible] سے بچے کمرے تھے۔ اور اوپر کھلی کھڑکی سے [illegible] پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہاں سے ہمیں [illegible] اور لفٹ نظر آ رہی تھی۔

"میرا خیال ہے جنگی خان اپنے باقی ماندہ ساتھیوں [illegible] فرار ہونے کی سرتوڑ کوشش کرے گا۔" کھیل دادا [illegible] کی طرف دیکھ کر بولا۔

"کیونکہ تمہاری بروقت مداخلت نے نہ صرف اس کا [illegible] منصوبہ چوپٹ کر ڈالا ہے بلکہ اسے مشکل میں بھی [illegible] ہے۔"

"مشکل میں تو ہم بھی پھنسے ہوئے ہیں۔" میں نے [illegible] مسکرا کر کہا۔ "میں تمہارا شکریہ ادا کرنا بھول گیا [illegible]..... تم نے عین وقت پر میری جان بچائی۔ مگر [illegible]..... مدد گل کے مرنے کا افسوس ہے۔ وہ اچھا ساتھی [illegible] بولا "جنگی خان کے کسی ساتھی کی گولیوں کی بھینٹ [illegible] چڑھ گیا تھا۔"

"آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ تم یہاں اسپتال میں کیسے [illegible] کیا ہوا؟..... وہ کہاں غائب ہیں؟ لال خیر بھی [illegible] پکڑا گیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بیگم [illegible]؟" میری بات پر کھیل دادا [illegible] ایک گہری سانس [illegible] اسی وقت زینے سے ایک [illegible] طرف جاتا دکھائی [illegible] سے دیکھ کر یکلخت میری [illegible] وہ جنگی [illegible] تھا۔ پھر میں نے دو تین پولیس [illegible] کے [illegible] میں آتے دیکھا۔ ان میں ایک رینجرز [illegible] تھا۔ "ہوشیار....." میں بولنے سے پہلے [illegible] بھی تیزی سے جھانکا۔ ٹھیک اسی وقت گولی [illegible] میں نے دو پولیس والوں کو چیختے گرتے [illegible] اور رینجرز کے اہلکار نے [illegible] کیا۔

"ہمارا فرار کی منزل کھوٹی ہو گئی ہے۔ اب کیا کریں؟" میں نے کھیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ فکر سے بولے میں [illegible] جنگی خان شاید ان کی نظروں میں آ گیا ہے [illegible] پھینک کر اور نقاب اتار کر بآسانی نکل سکتا تھا۔ [illegible]..... ذرا باہر نکلو۔"

ہم کمرے سے کوریڈور میں آ گئے۔ [illegible] فائرنگ [illegible] ایک دم سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ [illegible] کی صورت کی [illegible] اس وقت کچھ مزید پولیس [illegible] اہلکار اوپر آ گئے۔

"[illegible] ہمیں اچھی گئیں اس کمرے میں چھوڑنا ہوں گی..... لگتا ہے جنگی کیا ہاتھ سے۔ اب ہمیں باہر نکلنا ہوگا۔" کھیل دادا نے سرگوشی کی۔ میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔ پولیس اور رینجرز کی مداخلت کے دوران ہمارا جنگی خان پر ہاتھ ڈالنا ازبس مشکل تھا اور خود ہم ہی پھنس سکتے تھے۔ لہٰذا ہم نے اپنی گنیں..... اس وی آئی پی وارڈ کے اندر کہیں چھپا دیں۔ اس وقت پولیس اور رینجرز اہلکار اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کرتے دہشت پسندوں کو ٹارگٹ کیے ہوئے تھے۔ اس لیے ہمیں باہر نکلنے کا موقع مل سکتا ہے۔

ہم راہداری کے موڑ پر پہنچے تو یہاں بکھرے سہمے اور دبکے ہوئے افراد دکھائی دیے۔ ان میں اسپتال کے عملے کے بھی چند لوگ شامل تھے۔ ٹھیک اسی وقت ہمیں عقب سے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم ٹھٹک کر رکے اور پلٹ کر دیکھا۔ رینجرز کے چند مسلح اہلکار اس طرف دوڑے آ رہے تھے۔ میں یکدم سناٹے میں آ گیا۔ اسی وقت کھیل دادا نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"خبردار..... بھاگنا مت۔ یہ مجرموں کے [illegible] ہیں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ میں نے فوراً اس کی تقلید کی اور ہم بھی ان ڈرے سہمے لوگوں میں شامل ہو گئے۔ یہاں مجھے کھیل دادا کی ذہانت اور احتیاط پسندی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑا۔ کیونکہ گنوں کی ہمارے پاس عدم موجودگی نے ہمیں مصیبت سے بچا لیا تھا اور رینجرز کے اہلکار آگے دوڑتے چلے گئے۔ ہم سب پر انہوں نے سرسری نگاہ البتہ [illegible] ڈالی تھی۔

[illegible] لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔

"[illegible] ہے پولیس اور رینجرز نے دہشت گردوں کو پکڑ لیا ہے۔"

"ہاں! کچھ مارے بھی گئے ہیں....." ایک اور بولا۔

"ان کا سرغنہ باقی بچا ہے۔" عملے کے ایک وردی پوش آدمی نے کہا۔

"آخر یہ معاملہ کیا ہے.....؟"

"میرا خیال ہے رینجرز کے افسر کی بیگم اور اس کے [illegible] دہشت گرد ہلاک کرنے آئے تھے۔"

[illegible] پر میرے اور کھیل دادا کے کان کھڑے [illegible] ہے کہ ان کا تعلق ان لوگوں سے نہیں تھا جو اس وارڈ میں داخل تھے جہاں ہمارا جنگی خان اور اس کے

کیا اور مجھ سے بولا۔ ''آگے مت جاؤ۔ ریڈ زون ہے۔'' مگر میں نہیں رکا۔ وہ یکدم غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ پر گن تان کر تحکمانہ درشتی سے بولا۔ ''تم وہاں رک جاؤ، یہ میرا حکم ہے... وہاں میجر صاحب کے بیوی بچے خطرے میں ہیں۔''

میں نے سرد نظروں سے اہلکار کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ''میجر ریاض باجوہ میرے دوست ہیں اور دہشت گردوں کے اس سرغنہ کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں صرف صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔'' یہ سن کر اہلکار [illegible] نظر آنے لگا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ کمیل داد میرے پیچھے ہی تھا۔ وہ بھی میری بات پر یقین کر چکا ہوگا۔ دفعتاً میری [illegible] کی سماعتوں سے ایک غراتی ہوئی شناسا آواز ٹکرائی۔

''مجھے یہاں سے نکلنے دیا جائے... ورنہ میں لڑکے کے سر میں گولی اتار دوں گا۔''

یہ [illegible]... جنگی خان کی خوفناک آواز تھی۔

اسی راہداری کے سرے والی دیوار کی آڑ سے اپنا ذرا سا سر ابھار کر دیکھا۔ سامنے مختصر سی لابی تھی جس کے دائیں بائیں... [illegible] کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک کمرے کے سامنے مجھے جنگی خان کھڑا نظر آ گیا جس نے چودہ سولہ سال کے [illegible] لڑکے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا... قریب ایک عجیب صورت خوبصورت لڑکی روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی جو یقیناً میجر باجوہ صاحب کی بیوی تھی اور لڑکا... ان کا بیٹا تھا جس کی خوف و دہشت سے بری حالت تھی۔ وہاں میں نے چکنے فرش پر ایک رینجرز اہلکار کی لاش خون میں لت پت پڑی دیکھی۔ باقی تین چار رینجرز اہلکار [illegible] کر رہے تھے۔ بلکہ پوزیشن لیے ہوئے تھے اور اپنی گنوں سے جنگی خان کو ٹارگٹ کیے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان [illegible] میجر باجوہ کھڑے تھے۔ وہ نہتے تھے۔ [illegible] ہوئے تھے۔

''دیکھو... تم اس طرح [illegible] مصیبت میں ڈال رہے ہو۔ تمہیں بھی پولیس اور رینجرز نے چاروں طرف سے اسپتال کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔'' میجر ریاض باجوہ اس کے ساتھ [illegible] میں مصروف تھے۔ جنگی [illegible] تھا۔ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی اس کی آنکھوں میں [illegible] آمیز درشتی سے بولا۔

''نہیں میجر! [illegible] مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔ جب تک تمہارا بیٹا میرے رحم و کرم پر ہے، میرے راستے خود ہی آسان ہوتے چلے جائیں گے۔ اب تم آگے سے ہٹ جاؤ... اور مجھے نکلنے دو... یہ میرا آخری حکم ہے ورنہ میں اس لڑکے کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔''

اس اثنا میں قریب کھڑی لڑکے کی بدنصیب ماں اور میجر کی بیوی خوف سے چیخ کر گھگھیائے لہجے سے بولی۔

''نہیں... نہیں... خدا کے لیے میرے بیٹے کو مت مارنا...'' پھر وہ اپنے شوہر کی طرف پلٹی۔

''پلیز... ریاض... اسے جانے دو... ورنہ... یہ ہمارے بیٹے کو ہلاک کر دے گا۔''

میں نے میجر صاحب کے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لیا۔ فرض اور قرض کے درمیان... وہ ایک زبردست کشمکش کا شکار نظر آ رہے تھے۔ وہ پھر شاید آخری حربے کے طور پر جنگی خان کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔

''تم میرے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا... اور میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔''

ان کے اس انکشاف پر نہ صرف میں چونک گیا تھا بلکہ سیاہ نقاب سے جھانکتی ہوئی جنگی خان کی سفاک آنکھوں میں بھی مجھے الجھن تیرتی محسوس ہوئی تھی... میجر باجوہ آگے بولا۔ ''تم یقیناً پیر اقبال عرف بابر ڈکیت کے آدمی ہو... اور ضرور اسی نے تمہیں یہاں میرے بیٹے کو اغوا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔''

یہ نام میرے لیے ہی نہیں بلکہ شاید کمیل داد کے لیے بھی اجنبی ہی تھا۔ مگر مجھے افسوس ہوا کہ میجر جنگی خان کے بارے میں ایک غلط اندازہ قائم کیے ہوئے تھا۔ جو خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ معاملہ اتنا زیادہ سنگین نہ تھا جتنا کہ باجوہ صاحب سمجھ رہے تھے۔ جبکہ میرے نزدیک معاملہ فقط اس قدر تھا کہ جنگی خان کا سرے سے ایسا کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔ نہ وہ اس کے نو عمر بیٹے کو اغوا کرنا چاہتا تھا نہ ہی اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ رکھتا ہوگا۔ وہ تو بس ان کے بیٹے کو ڈھال بنا کر یہاں سے فرار چاہتا تھا۔ پھر میں نے جنگی خان کو کہتے سنا۔

''نہیں میجر... تم مجھے بالکل نہیں جانتے میں کون ہوں۔ میں یہاں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا۔ مگر افسوس وہ ناکامی سے دوچار ہوا۔ اب میں بس یہاں سے زندہ سلامت نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں تمہارے بیٹے کو چھوڑ دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ میں نے اس

ساتھیوں سے خون ریز مقابلہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ ہمیں بھی پہچان جاتے۔ لہٰذا میں نے بھی اس گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں کسی رینجرز کے افسر کی فیملی بھی موجود تھی؟'' میرا مطلب [illegible] تھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''اسی لیے رینجرز کی آمد متوقع تھی۔ البتہ... پولیس کافی قریب ہی موجود تھی۔ فائرنگ اور شور شرابے پر... متوجہ ہوئی۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک سے جس طرف رینجرز کے وہ دو تین اہلکار دوڑتے نکلے تھے ایک موٹی سی نرس اور جوان لڑکا جو وارڈ بوائے ہی لگتا تھا آ کر ہم میں شامل ہو گئے۔

''دہشت گردوں کے سرغنہ نے میجر باجوہ کی بیوی اور بچے کو یرغمال بنا رکھا ہے اور وہ یہ ڈیمانڈ کر رہا ہے کہ اسے باہر نکلنے دیا جائے۔'' موٹی نرس نے... ہانپتے ہوئے بتایا۔

''میجر باجوہ...'' اس نام پر میں بری طرح ٹھٹکا۔ کہیں یہ لوگ میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہے... جو محکمہ کسٹم کے کوسٹل انویسٹی گیشن [illegible] کا انچارج تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کہیں تم میجر ریاض باجوہ کی بات تو نہیں کر رہی ہو... سسٹر؟''

اس موٹی نرس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی۔ وہ خاصی دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ جواباً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں وہی ہیں۔ ان کے بیٹے کا [illegible] تھا۔ آنتوں میں سوراخ ہو گیا تھا... کل صبح ہی اسے داخل کیا گیا تھا ایمرجنسی میں۔ میری ہی وارڈ میں ڈیوٹی تھی۔ سرغنہ نے اسے ہی گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے۔ میں اور اسلم بڑی مشکلوں سے وہاں سے بھاگے ہیں۔'' اسلم اس کا وہ نوجوان ساتھی تھا۔

اب بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ میجر صاحب یقیناً یہاں اپنے بیمار بیٹے کو دیکھنے آئے ہوں گے اور یہاں یہ معاملہ آن پڑا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ اگر میجر ریاض باجوہ وہی تھے جو میں سمجھ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا صورتِ حال واقعی گمبھیر تھی۔ ان لوگوں کو بھلا کیا معلوم تھا کہ درحقیقت دہشت گرد یعنی جنگی خان وغیرہ یہاں علاج کی غرض سے پہلے سے داخل کمیل داد اور اس کے ساتھی کو ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ لیکن [illegible] اب تک ان لوگوں نے جس وارڈ میں ہمارا جنگی خان وغیرہ سے خون ریز ٹکراؤ ہوا تھا اصل بات بتائی ہو۔ لہٰذا ہم بھی تفتیش کی زد میں آ سکتے تھے۔

مگر ریاض باجوہ... میرے محسنوں میں سے پولیس انسپکٹر میں بھی وہ واحد فرد تھا جو اپنا [illegible] مسائل کو قریب سے جانتا اور دیکھتا آیا تھا اور مجھ سے تعاون کرنے کا بھی خواہاں تھا۔ مگر تقدیر نے اب تک اتنا موقع ہی نہ دیا تھا کہ میں اس سے کوئی خاطرخواہ [illegible] سکتا۔

میں نے اس نرس سے پوچھا۔ ''وہ وارڈ کس سمت ہے جہاں میجر صاحب کا بچہ داخل ہے؟''

''اس طرف... اس راہداری کے اختتام پر'' اس نے سامنے دائیں جانب جہاں یہ راہداری ختم [illegible] اشارہ کر کے بتایا۔

''دہشت گردوں کا سرغنہ بھی وہیں موجود [illegible]''

''ہاں۔''

میں نے فوراً اسی سمت قدم بڑھا دیے۔ تو عقب [illegible] کمیل داد نے مجھے پکارا۔

''کہاں جا رہے ہو...؟'' اس نے دانستہ [illegible] لینے سے گریز کیا تھا۔ [illegible] لڑکی بھی میری طرف عجیب نظروں سے تکنے لگی۔

''تم ادھر ٹھہرو... میں ذرا اسی صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے [illegible] مگر کمیل داد نہ رکا۔ وہ میرے پیچھے [illegible] آگے قدم بڑھاتے ہوئے میرا دل بے طرح [illegible] دھڑک رہا تھا۔

''تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو... پاگل [illegible] شہزی...؟'' پیچھے سے کمیل داد کی پھر آواز [illegible] میں آگے بڑھتا رہا۔ سرے پر پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک [illegible] وہاں گولیاں چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں فوراً [illegible] کی دیوار سے چپک گیا۔ عقب میں ذرا دور موجود [illegible] سے لوگ چیخیں مار کر آگے کو دوڑ گئے۔ میری آ[illegible] سامنے رینجرز کے دو اہلکار گر رہے تھے۔ ایک [illegible] سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہیں شاید گولیاں لگی [illegible] یقیناً جنگی خان نے ہی چلائی ہوں گی۔ میری دانست [illegible] خان بری طرح پھنس گیا ہے۔ میں آگے بڑھا۔ ایک [illegible] کے پیٹ میں گولی لگی تھی جبکہ دوسرے کے پہلو میں [illegible] تیسرا ساتھی جو انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا [illegible] ہاتھ میں پکڑے واکی ٹاکی پر کسی کو جلدی جلدی [illegible] رہا تھا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھے روک

لیے یہ سچائی بیان کرنی ضروری تھی۔ یہ کر تم کوئی مشکل پیدا کرنے اور چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بس اتنا کافی ہے۔ اب مجھے راستہ دو۔"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ کہیں میجر صاحب کسی [illegible] کا شکار ہو کر صورت حال کو سنگین نہ بنا دیں۔ مگر شکر ہوا کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ البتہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگے۔ ممکن ہے کسی [illegible] اقبال عرف بابن ڈکیت نامی آدمی سے ان کی کوئی پرانی دشمنی ہو... بہرحال جگنی خان کو نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ میں نے سرد اور نفرت بھری نظروں سے دیکھا جگنی خان [illegible] کی طرف سرک رہا تھا اور ساتھ ہی خونخوار نظروں سے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ میں اس سے دس پندرہ گز کے فاصلے پر تھا اور اس کے دائیں بازو والی سمت میں کوریڈور کی اختتامی دیوار کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

"خبردار... میرے پیچھے آنے کی کوئی جرأت نہ کرے۔" مخالف سمت کی طرف سرکتے ہوئے اس نے دہاڑ کر کہا۔

"میجر... ٹیلی فون کر کے ہدایت دے دو... ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کی [illegible] آپ کو مہنگی پڑ جائے۔"

"ٹھیرو... تم... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔" اچانک میجر صاحب کی بیوی نے جگنی خان سے کہا۔ وہ ماں تھی۔ اپنے لخت جگر کو ایک خونی شخص کی گرفت میں پا کر بے چین تھی اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر وہ خود کو بھی ایک خطرناک مجرم کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔ ماں تجھے سلام ہے... مجھے اپنی ماں کا مہربان چہرہ یاد آنے لگا... میرا دل جیسے کٹنے لگا۔ میں نے جگنی خان کی عیار آنکھوں میں بڑی تیزی سے مسکراہٹ چمکتے محسوس کی، وہ مکاری سے چہکا۔

"ہاں، اس سے زیادہ اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ مگر خبردار... اب میرے سامنے رہنے کی کوشش کرنا۔ میری نظروں سے بچنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔" اس نے آنکھیں میچیں۔

پھر وہ [illegible] ایک خطرناک [illegible] کے پیچھے [illegible] تیزی سے بڑھنے لگا۔ دیوار کی آڑ سے میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے اپنے سامنے شدید کشمکش کا شکار کھڑے میجر صاحب سے ٹیلی فون کروا دیا۔ پھر ان کی طرف سے اشارہ پاتے ہی وہ آگے بڑھا۔ میں سمجھا تھا وہ بچ جانے کے لیے لفٹ استعمال کرے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنا رخ بدل لیا۔ یہ اس کی مکاری تھی۔ کیونکہ بچے سمیت اس نے بھی میجر صاحب کو [illegible] کو ہدایت دیتے ہوئے نقدی کا تذکرہ کرتے [illegible] تھا [illegible] نے زینے کی راہداری اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

یکلخت میرے خون کی گردش تیز ہو گئی اور پھر میں تیزی کے ساتھ میجر صاحب کے سامنے آ گیا۔ پولیس کو [illegible] بھی مطلوب تھا۔ اور میجر باجوہ مجھے بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ لہٰذا مجھے اچانک سامنے دیکھ کر وہ بری طرح چونکے تھے۔ میں نے ان سے تیز لہجے میں کہا۔

"میجر صاحب! وقت کم ہے اور صورت حال خطرناک... خدا کے لیے میرے ساتھ تھوڑا تعاون کریں۔ میں اس درندہ صفت آدمی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چودھری ممتاز خان کا گماشتہ ہے اور یہ مجھے ہلاک کرنے [illegible] تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ میں اس پر قابو پا لوں گا۔ آپ ایک کام کیجیے، یہ موجود پولیس سمیت اپنے [illegible] سے کہہ دیجیے وہ ہمارا راستہ نہ روکیں... میرے ساتھ ایک ساتھی بھی ہے۔ جلدی کیجیے میجر صاحب... ہم جا رہے ہیں اس خونی کے پیچھے۔"

باجوہ صاحب کے ساتھ میری پرانی [illegible] تھی۔ جب وہ اس سے پہلے سول پولیس انسپکٹر [illegible] تھے [illegible] تھے جو میرا کیس [illegible] مدد کرنے کے خواں بھی۔ لہٰذا انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کی اور میں ان سے [illegible] جس کا ثبوت یہ تھا کہ میں اور کمیل دادا [illegible] تیزی کے ساتھ [illegible] کرتے ہوئے دوسری [illegible] آن پہنچے۔ "تم کرنا کیا چاہتے ہو آخر؟..." [illegible] کر بولا۔

"[illegible] مت کرو دادا... تم ابھی [illegible] جانتے ہو [illegible] چاہتا ہوں..." میں نے [illegible]

وہ [illegible] تحمل کیا۔ میں نے اسے اشارہ کیا [illegible] اس زینے کی دیوار کے ساتھ [illegible] لگ کر کھڑے ہو گئے جہاں سے جگنی خان [illegible] تھا۔ [illegible] میں نے [illegible] ایک [illegible] سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں [illegible] فضا نے مجھے سنہری موقع دیا تھا تو میری [illegible] بھی [illegible] لگا۔

مجھے زینے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ [illegible] سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ [illegible] دار تھے۔ جبکہ وہ موذی [illegible] جگنی خان [illegible] تھا۔ ہمیں اس پر ایک فوقیت حاصل تھی۔ ہمیں اس سے

[illegible] آ گئی تھی، جس سے جگنی خان واقف تھا اور [illegible] کی اصل ہوتا ہے جسے پہلے [illegible] مل جاتے تو وہ مقابل کی [illegible] مقدر ٹھیرتی ہے۔ سب سے پہلے میجر باجوہ [illegible] کی نگاہیں بچے سے چمٹی ہوئی، اس کی نظر مجھ پر پڑی [illegible] نے فوراً اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ [illegible] نے کوئی تاثر اپنے چہرے سے [illegible] ہونے دیا۔ اس وقت جگنی [illegible] گز کے فاصلے پر [illegible] اپنے گرد و پیش سے غافل [illegible] بات وہی تھی۔ ہم [illegible] میں [illegible] تھا کہ دوسری منزل کا [illegible] اس کی پشت لے کر [illegible] میری طرف [illegible] مگر اس کے چہرے کا رخ دوسری جانب [illegible] کمیل دادا کی طرف ہوا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں [illegible] میں نے اس کے ٹھٹکنے کا فائدہ اٹھایا اور پھر [illegible] پار [illegible] کے دو [illegible] میں نے سب [illegible] اس کی گن والے ہاتھ پر [illegible] جمایا۔ [illegible] بجلی سے جگنی خان کے ساتھ [illegible] بھی نہ کی۔ [illegible] حرکت اسے [illegible] کمیل دادا نے [illegible] کی پھرتی کے ساتھ حرکت [illegible] ہاتھ پر [illegible] کمیل کا وار [illegible] نکل... باجوہ صاحب کی بیوی [illegible] بچے کو اپنے دونوں بازوؤں سے [illegible]

جگنی خان اب تنہا ہو چکا تھا اور اپنے دشمن کو [illegible] کی حالت میں دیکھ کر میں بھوکے شیر کی طرح اس پر جھپٹا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر کے بے حال کر دیا۔ کمیل دادا نے میرا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس وقت میری نظر [illegible] دیوار کے کونے پر ٹنگے کیمرے پر پڑی۔ میں نے [illegible] خان کا نقاب چہرے سے کھینچ لیا اور اس کے سر کے بالوں [illegible] آہنی ہاتھ [illegible] کر کر وہ چہرہ [illegible] کی طرف کر کے میں چلا کر بولا۔

"لوگو! پہچان لو اچھی طرح اس درندہ صفت [illegible] جگنی خان ہے۔ چودھری ممتاز خان کے [illegible] کا [illegible] اس نے اپنے ساتھیوں سمیت اسپتال [illegible] دہشت مچائی اور میجر باجوہ صاحب کے بیٹے کو گن [illegible] میں لے کر اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میڈیا [illegible] کچھ دن پہلے معصوم لڑکی آسیہ کی اجتماعی عصمت دری [illegible] سے جان سے مار ڈالا جو اس [illegible] کے ذریعے لائیے... چودھری ممتاز خان سمیت ان سب کے بھیانک چہرے بے نقاب کرنا چاہتی تھی۔"

مجھ پر جیسے وحشیانہ جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں جانتا تھا اب تک اسپتال میں لگے ٹی وی کیمروں نے یہ سب کارروائی اپنی شیشے کی آنکھوں میں محفوظ کر لی ہوگی۔ کمیل دادا نے جگنی خان کی گن پر قبضہ جما لیا تھا۔ مجھے سنبھالا دیتے ہوئے کہنا چاہا۔

"... شہزی... کیا کر رہے ہو؟ اسے لے کر نکل چلو..."

میں اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔

"لوگو! دیکھو، اسے پہچان لو... یہ ممتاز خان کا [illegible] ہے... ایک اہم درندہ صفت جواری ہے۔ ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو بھی میں نے قتل نہیں کیا تھا۔ یہ اس کی اپنی بیٹی نوشابہ کی غلطی سے چلائی جانے والی گولی سے ہوا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں ممتاز خان کے بیٹے فرخ کو صرف اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مگر کس کا؟ ان کے بیٹے نہیں بلکہ اسے وقتی اذیت دینے کے لیے جو اذیت اس نے میری عابدہ کو اس خونی انسان جگنی خان کے ذریعے اغوا کر کے اور اس معصوم کو زبردستی شراب پلا کر بے جان کیا تھا۔ نوشابہ پولیس کو اپنا بیان دے چکی ہے جو کہ ریکارڈ پر بھی ہے... مگر ممتاز خان اسے [illegible] بے بنیاد قرار دے کر عام لوگوں اور میڈیا کے لوگوں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے۔ ممتاز خان کی کارندگی سپورٹ کرنے والی قانون کی ایک کالی بھیڑ... ماضی کا ایس ایچ او اور ڈپٹی روشن خان... اور اسے قانون مجھے ہلاک کرنے کے در پے ہے۔ ملتان کے نواح میں واقع اس کا نجی ٹارچر سیل ہے جہاں اس نے مجھے غیر قانونی طور پر حبس بے جا میں رکھا اور اس لیے مجھے وہاں انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنایا کہ میں اس کی مرضی کے ایک پہلے سے تیار شدہ بیان پر اپنا انگوٹھا لگا دوں۔ فلاں والی کے ایم این اے داراب خان کے بیٹے [illegible] شفقت کے قتل کا جھوٹا الزام بھی میرے سر لگایا گیا۔ مگر جلد ہی زبیر خان کو اپنے ذاتی ذریعے سے علم ہو گیا کہ یہ قتل اس کے بعض سیاسی دشمنوں کے ہاتھوں ہوا اور میرے حق میں ان کا بیان بھی جاری ہوا۔ ملتان کی سیشن کورٹ میں چودھری ممتاز خان کے خلاف میں ایک کیس پہلے ہی جیت چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں ملتان کے معروف ادارے "اطفال گھر" کو مجرموں اور جرائم پیشہ کا [illegible]... بنانے اور اس کے سرپرست حاجی اخلاق خان کے قتل کو حادثاتی رنگ دینے کا راز آشکارا

ہوا۔ نہ صرف یہ بلکہ انھیں ایچ ایس او روشن خان کے خلاف بھی کورٹ نے تادیبی کارروائی کا حکم جاری کیا اور اسے لائن حاضر کر کے انکوائری شروع کر دی گئی۔ نیز تفتیش کی گیرائی کی ایک ایکٹنگ اینٹی کرپشن برانچ کے افسر ریاض باجوہ کو تفتیشی افسر مقرر کیا گیا جو اب رینجرز کے میجر ریاض باجوہ ہیں۔ ان کے ریکارڈ میں یہ ساری باتیں موجود ہیں مگر افسوس کہ ایک بار پھر طاقت اور اثر و رسوخ، دولت اور اقربا پروری کے زور پر اس کیس کو دبا دیا گیا اور کھلے سچ کو ایک بھونڈے جھوٹ میں بدل دیا گیا۔ مجھے انصاف چاہیے... [illegible] سے نہیں... آپ سے... عوام سے... اہل علم و دانش اور صاحب دل لوگوں سے... لیکن اگر تم لوگوں نے بھی بے حسی کا مظاہرہ کیا اور مصلحت کوشی کی عینک چڑھا لی ہے تو ایسے مجرم تمہارے معاشرے میں ہی نہیں، تمہارے اپنے گھر میں پیدا ہوتے رہیں گے اور تمہارے لیے درد سر بنے رہیں گے۔ خدارا اب تو بے حسی کو خیرباد کہہ دو، کب تک شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا کر بیٹھے رہو گے؟ بس! مجھے یہی کہنا تھا۔"

ٹھیک اسی وقت بھاری قدموں کی آواز ابھری۔ میں جنگی خان کو دبوچے کھڑا تھا۔ وہ میری آہنی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے مچلا۔ کھیل داوا نے فوراً اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر دھکا دیا۔ ہم اسے لے کر گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ ہمارا ارادہ جنگی خان کو ساتھ لے جانے کا تھا اور مجھے پوری امید تھی کہ ہم نکل جانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں پہلے ہی میجر باجوہ کو اعتماد میں لے چکا تھا۔ مگر اب معاملہ اور تھا۔ ان کا بچہ جنگی خان کی گرفت سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس کی ماں بیٹا اسے لے کر اوپر پہنچ چکی ہوگی اور یوں ممکن تھا کہ باجوہ نے دوبارہ فون کر کے نئی ہدایت دی ہوں۔

لہٰذا وہی ہوا۔ نیچے پہنچتے ہی رینجرز اور پولیس نے ہمیں گھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد میجر باجوہ بھی پہنچ آئے۔ ہم تینوں کو ہی گرفتار کر لیا گیا۔ مگر میں نے باجوہ صاحب سے گزارش کی ہمیں وہ پولیس کی تحویل میں دینے کے بجائے اپنی تحویل میں لیں۔ ہمیں باہر لایا گیا۔ یہاں احاطے میں میڈیا اور مختلف ٹی وی چینل والوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جن کی چھتوں پر بڑے بڑے ڈش انٹینا نصب تھے۔ وہ ہماری تصویریں لے رہے تھے۔ ویڈیو بنا رہے تھے۔ ان کے سامنے بھی میں نے سچ سچ کہہ دیا جو میں ویڈیو کیمرے کے سامنے دہرا چکا تھا۔ نیز انھیں بتا بھی دیا کہ وہ دوسری منزل کی لابی کے سی سی کیمرے سے وہ فوٹیج حاصل کر سکتے ہیں جو اب تک کے ابتدا سے اس سارے مشن [illegible] تحریر ارادے کی کو سچ کر چکا تھا۔

کھیل داوا اس سارے قصے سے مطمئن اور خوش [illegible] تھا۔ مگر میں مطمئن تھا۔ مجھے میجر باجوہ صاحب سے بہت امیدیں وابستہ تھیں۔

☆☆☆

ہمیں ہیڈکوارٹر لا کر ایک بیرک میں بند کر دیا گیا [illegible] جنگی خان کو کسی اور جگہ لے جایا گیا تھا۔

ذرا تنہائی ملتے ہی کھیل داوا نے اپنی عادت کے مطابق میرے سے لڑنا شروع کر دیا۔

"تمہیں یہ جوشیلی بھری تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہارے اس تقریری مقابلے نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ہم بہ آسانی جنگی خان کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکل [illegible] تھے۔"

"میں نے وہی کیا جو ان حالات میں مجھے کرنا [illegible]" تحمل سے میں نے اسے جواب دیا تو وہ پھٹ پڑا۔

"شہری تم [illegible] خود غرض انسان ہو۔ تمہیں کیا پتا کہ بیگم صاحبہ کس حال میں ہوں گی؟ ہم جنگی خان سے ان کے بارے میں اگلوا [illegible] کہاں اور کس حال میں ہیں؟" جب میں نے قدرے چونک کر استفسارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کیا۔ جس کے مطابق بیگم صاحبہ جب ایک دوسرے اسپتال میں [illegible] بیمار باپ چودھری الف خان کی عیادت کے بعد واپس [illegible] رہی تھیں (ان کے جانے کے بعد الف خان کی موت واقع ہو گئی تھی) تو ان کی کار پر نامعلوم مسلح حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے ڈرائیور سمیت گرا ڈالے تھے۔ وہ بھی [illegible] گاڑی میں سوار تھے۔ اس وقت بیگم صاحب کے ساتھ کھیل داوا بھی نشست پر موجود تھا۔ انھوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ کھیل داوا بیگم صاحبہ کو بچا کر بھاگنا چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خود زخمی ہو کر بیہوش سا ہو گیا۔ دشمن اسے مردہ سمجھ کر بیگم صاحبہ کو اغوا کر کے لے گئے۔ کھیل داوا نے بیگم والا فون کر کے اول خیر کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو اس کے ساتھی اسے اور ایک دوسرے زخمی کو اٹھا کر اسپتال لے گئے تھے۔ لہٰذا کھیل داوا کے مطابق... ان غدار مسلح افراد کا تعلق ممتاز خان سے [illegible] اور جنگی خان ان میں شامل تھا۔ بعد میں اسے ان دونوں کے بارے میں پتا چلا کہ وہ زندہ ہیں اور ایک اسپتال [illegible]

[illegible] داخل ہیں تو وہ انھیں ختم کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا۔ مگر میری اتفاقی اور بروقت مداخلت نے جنگی خان کا منصوبہ ناکام بنا دیا اور کھیل داوا کی جان بھی بچ گئی۔

بہرحال کھیل داوا کی زبانی یہ ساری صراحت سننے کے بعد میں نے اس سے اظہار ہمدردی کیا۔

"اگر بیگم صاحبہ چودھری ممتاز خان کے قبضے میں ہے تو [illegible] رکھو... وہ بھی ایک [illegible] کے [illegible] سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔" میری بات سن کر کھیل داوا کے چہرے پر [illegible] مسکراہٹ ابھری۔

"تم کس بھول میں ہو شہری؟ اپنے جوان سال بیٹے فرخ کی موت کے بعد ممتاز خان [illegible] کے بغیر بیگم صاحبہ کی جان کا دشمن بن چکا ہے۔ روئے زمین پر اس وقت بیگم صاحبہ کا اس سے بڑا دشمن اور کوئی نہیں... اس نے بیگم صاحبہ کو کس مقصد کے لیے اغوا کیا ہوگا... یہ بھی تم نہیں جانتے... اس لیے کہ تم بیگم صاحب کے ماضی کے حوالے سے [illegible] داستان الم سے واقف ہی نہیں ہو۔ [illegible] دوست اول خیر نے بھی تمہیں اب [illegible] اور چودھری ممتاز خان کے [illegible] نہیں بتائی ہے۔"

اس انکشاف پر [illegible] سکتا تھا۔ اگرچہ مجھے اول خیر سے ہی صرف [illegible] ہو سکا تھا مگر اس [illegible] مجھے کا اب تک [illegible] مجھے ان سے [illegible] صراحت بتانے کا۔ اول خیر کو بھی اس لیے ہی [illegible] کی حیثیت حاصل تھی۔ کیا کھیل داوا کی طرح [illegible] بیگم صاحبہ کے ماضی سے واقف تھا۔

کھیل [illegible] سوچتے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے بیرک [illegible] کی حالت جام قالوں کے [illegible] تنہا کاٹ رہی تھی، ایک دیوار [illegible] میں اس پر ٹیک بیٹھا ہوا [illegible] کھیل داوا کو بیگم صاحبہ کی طرف سے [illegible] جاری تھی۔ اور مجھے بھی بیگم صاحبہ [illegible] آمیز تشویش لاحق تھی۔ کھیل داوا مجھے بار بار [illegible] جا رہا تھا۔ وہ اس کا ذمے دار مجھے ہی ٹھہرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کی بڑبڑ میرے لیے ناقابل برداشت ہو گئی تو میں نے بھی اسے سنا دی۔

"ہم دونوں ابھی پولیس رینجرز کی گرفت میں آ گئے [illegible] شکر کرو کہ رینجرز نے ہمیں اپنی کسٹڈی میں لے کیا۔"

"ایک بات بتاؤ شہزی۔" میری بات پر وہ بولا۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ میجر باجوہ تمہارا شناسا سا نظر آتا ہے۔ یقیناً تمہارے ماضی میں بھی اچھے تعلقات ہوں گے اس سے۔ اور پھر تم نے اس کے بچے کو ایک قاتل مجرم کی گرفت سے بھی بچایا۔ تم بھی اس سے اب تعاون کی درخواست کر سکتے ہو۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ شکر کرو... ہم پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے۔" میں نے تحمل آمیز انداز میں اپنی بات دہرائی۔ "باجوہ صاحب سے مجھے اچھی توقعات ہیں... وہ مجھے ملنے کا موقع دیں گے، تو میں ان سے تعاون کی درخواست کروں گا۔ بیگم صاحب اور اول خیر کی طرف سے تشویش و فکر کا شکار میں بھی ہوں۔"

میری یقین دہانی سن کر وہ چپ تو ہو گیا مگر اندر سے پھر بھی پریشان اور غیر مطمئن سا تھا۔ اس نے پھر مضطربانہ انداز میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ میں سوچنے لگا۔ پتا نہیں ایڈووکیٹ خانم شاہ کس حال میں ہوں گی؟ اس [illegible] اور مارا ماری میں نجانے ڈاکٹر ایمرجنسی آپریشن تھیٹر میں اس کا آپریشن کر بھی پائے ہوں گے کہ نہیں۔ تاہم کچھ تسلی تو تھی کہ خانم شاہ کہیں اور نہیں، بلکہ ایک اسپتال میں ہی تھیں۔ تاہم اس سلسلے میں ایک تشویش بھرا پریشان کن خیال میرے ذہن کو بے چین ضرور کر رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ خانم شاہ کو کچھ ہو جاتا ہے تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ میرے سلسلے میں پولیس کے ہاتھ ایک نیا کیس آ سکتا تھا۔ بصورت دیگر اگر اس کی جان بچ بھی جاتی ہے تو بھی وہ پولیس کو سب سے پہلے قیوم خان اور میرے خلاف بیان دے سکتی ہے۔ میں تو اس کی زندگی کے بچ جانے کی دعا ہی مانگ رہا ہوں، اور اس [illegible] کہ کاش خانم شاہ نجیب اور انتقام کی سوچ سے ہٹ کر ہوش مندی سے کام لے کر معاملے کو دبانے کی کوشش کرے تو یہ ہم سب کے لیے بہتر ہی ہوگا۔

وقت گزرتا رہا... شام ہو گئی اور پھر رات۔ کھیل داوا کی تشویش و پریشانی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تو اب باجوہ صاحب کی طرف سے بھی مایوس ہو گیا تھا کہ وہ کسی قسم کا تعاون ہم سے کریں گے۔ خود مجھے بھی حیرت تھی کہ آخر ابھی تک باجوہ صاحب نے مجھ سے ملاقات کرنے کی بھی زحمت کیوں نہیں کی۔ ایک ڈر بھی تھا دل میں کہ کہیں رینجرز کے [illegible] ہمیں پولیس کے حوالے نہ کر دیں۔ اس طرح معاملہ خطرناک اور سنگین ہونے تک جا سکتا ہے۔ مجھے یاد آیا اول

ٹیپو اور میجر صاحب کی طرف سے بھی تشویش ستا رہی تھی۔ جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ اول ٹیپو کی طرف سے تو کسی حد تک یہ تسلی تھی کہ وہ بہرحال اس وقت تک جب وہ میجر صاحب وغیرہ کی مدد کو لپکا تھا، دشمنوں کے ہتھے نہیں چڑھا تھا مگر اب کہاں اور کس حال میں تھا؟ اس کا ہمیں کوئی علم نہ تھا۔

رات کا کھانا لانے والے سے میں نے میجر صاحب کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے بس بتایا کہ وہ آج دوپہر سے ہی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آئے تھے اور پھر کہیں چلے گئے تھے۔

میں نے اور کپیل دادا نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ بھوک ہی ہماری اڑی ہوئی تھی۔ ایک گھنٹا ہی بیتا گیا تو ایک سنتری نے آ کر کہا۔ "تم دونوں میں سے شہزاد احمد کون ہے؟"

"میں..." میں نے فوراً دھڑکتے دل سے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"چلو، میجر صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔" اس نے کہا پھر بیرک کا سلاخ دار آہنی دروازہ کھولا۔ میں نے ایک نظر کپیل دادا کے چہرے پہ ڈالی اور سنتری کے ساتھ ہو لیا۔

ایک طویل اور دوسری نسبتاً چھوٹی راہداری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ خاصا کشادہ کمرا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر میجر ریاض باجوہ براجمان تھے۔ ان کے جسم پر مخصوص وردی تھی۔ سینے پر [illegible] کے علاوہ... شولڈرز پر رینکرز کے [illegible] چسپاں تھے۔ ان کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ مجھے انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور سنتری کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔

اب کمرے میں صرف میں اور میجر صاحب رہ گئے تھے۔ وہ ہولے سے کھنکھار کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولے۔

"...شہزی! تم نہیں جانتے کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے تمہاری وجہ سے کس قدر شدید دباؤ کی زد میں رہا ہوں اور تمہارے لیے ہی اب ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں۔" یہاں تک کہہ کر وہ خاموش ہوئے۔ میری دھڑکتی نظریں ان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"پولیس مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے۔" جو وہ کہہ رہے تھے اس کا مجھے خود بھی پہلے سے اندیشہ تھا۔ بہرحال میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا۔

"مگر میں جانتا ہوں اس وقت تمہارا پولیس کے [illegible] جانا شاید انصاف کے مفاد میں نہ ہو۔" وہ محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ مفاد کے حلقے میں انہوں نے [illegible] نام لینے کے بجائے "انصاف" کہا تھا۔ اس لیے کہ وہ بھی قانون کے رکھوالوں میں سے تھے۔ "مجھے تمہارا [illegible] مگر یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ تم نے اپنی جان پر کھیل کر میرے بچے کی زندگی بچائی۔ مگر شہزی! قانون بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کبھی کبھی ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ تاہم انسانی ہمدردی کے حوالے سے تمہارے اس قابل [illegible] آن دی ریکارڈ لانے کی کوشش کروں گا۔ مگر پولیس انتظامیہ اس واقعے کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ [illegible] ظاہر کر رہے ہیں کہ ایسا تم نے اپنے فرار ہونے کے [illegible] کیا... اور اس سچویشن میں بظاہر ایسا ہی نظر آ رہا [illegible] میں تمہیں مبارک باد پیش کروں گا کہ ملک کو لوٹنے [illegible] بیٹے یا ان کے [illegible] سے حق میں ہے۔ اس وقت ملک [illegible] ہو چکی ہے [illegible] اسپتال سے حاصل کردہ [illegible] سی فوٹیج نشر ہو رہی [illegible] جس کے سامنے تم [illegible] ایک جوش بھری تقریر کی [illegible] جس کے تحت اعلیٰ [illegible] سمیت صوبائی وزیر اعلیٰ نے بھی [illegible] نوٹس [illegible] اور خصوصی تحقیقاتی کمیشن بھی قائم کرنے کا حکم جاری کر [illegible] ہے۔ اپوزیشن جماعتیں بھی تمہارے حق میں [illegible] کر رہی ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے [illegible] بات پر سکون کی سانس لی تھی کہ وہ خصوصی فوٹیج میڈیا کے ہاتھ لگ چکی تھی... اور میں سمجھتا تھا کہ چنگی خان اور [illegible] خان سے میں نے بہترین انتقام لیا ہے۔

"میجر صاحب! میں بھی آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں... مگر... چنگی خان کو بھی پولیس کی تحویل میں [illegible] جانے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ آپ بھی اس سے [illegible] کر کے آپ کی [illegible] کے بارے میں اگلوا سکتے ہیں [illegible] تابوت کی آخری کیل ثابت ہو سکتی ہے۔"

"یقیناً ہم ایسا ہی کر رہے ہیں۔" میجر باجوہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس لیے چنگی خان کو الگ رکھا گیا ہے۔ اس سے اور بھی کئی حوالوں سے تفتیش جاری ہے۔ مگر..." وہ اتنا کہہ کر پھر اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ وہ اٹھ کر اپنی [illegible] کے عقب میں جا کھڑے ہوئے اور ہونٹ بھینچے پر [illegible] انداز میں چند ثانیے خاموش رہے۔ اس کے بعد بولے۔

فرق

نیو یارک کے ایک اسکول میں استانی نے ایک شاگرد سے قتل عام اور جنگ کا فرق بیان کرنے کے لیے کہا۔

لڑکے نے بلاتردد کہا۔ "جب کوئی ریڈ انڈین قبیلہ دو چار سفید فاموں کو پکڑ کر مار دیتا ہے تو اسے قتل عام کہتے ہیں اور اگر دو چار سفید فام مل کر پورے ریڈ انڈین قبیلے کو مار ڈالتے ہیں تو اسے ہم جنگ کہتے ہیں۔"

کراچی سے عبداللہ کا انکشاف

"مگر... شاید... یہ سب کچھ میں زیادہ دیر تک برقرار نہ رکھ سکوں۔" ان کے لہجے کی شکست خوردگی اور بے بسی نے مجھے پریشان کر دیا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب میجر صاحب؟"

وہ بولے۔ "...سیاسی مداخلت، یہی بے بس بنا دیتی ہے۔ ہمارے سسٹم کی خرابی کی بڑی وجہ بھی یہی ہے۔ مجھے اوپر سے احکامات موصول ہو رہے ہیں کہ یہ معاملہ [illegible] انتظامیہ یعنی پولیس کے سپرد کر دیا جائے... اور تم [illegible] چنگی خان کو بھی پولیس کے حوالے کرنا ہوگا۔"

"یہ ناانصافی اور زیادتی ہے سر...!" میں یکدم تڑپ کر بولا۔ ان کی ابتدا سے خوش امیدی کی گفتگو اب یکدم مایوسی کی جانب گامزن ہوتے دیکھ کر میں تڑپ اٹھا تھا۔ وہ مجھ سے [illegible] بولے۔

"تم فکر نہ کرو... اب معاملہ اور ہے۔ باہر کی دنیا تمہارے ساتھ ہے۔ کالی وردی والی پولیس اب تمہیں [illegible] میں نہیں رکھ سکیں گے... مجھ پر بھروسا رکھو [illegible] جب تک تحقیقاتی کمیشن قائم نہیں [illegible] کے حوالے نہیں کروں گا، ویسے بھی [illegible] انگلیاں برابر نہیں [illegible] ہر جگہ اچھی روشن خیال [illegible] لوگ نہیں ہوتے [illegible] پولیس آفیسر بھی ہوتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ مگر اندر سے بے حد پریشان اور بے چین ہو رہا تھا... اگرچہ ان کی بات بھی سچ تھی کہ اب مجھے کا [illegible] میں مار دیے جانے کا خدشہ کم ہو گیا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ آنکھیں بند کر لی جائیں [illegible] احساس ہونے لگا کہ مجھے قانون کی [illegible] دیکھا جاتا کہ... میری [illegible] خان جیسے [illegible] کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ [illegible] باہر کی دنیا میرے حق میں [illegible] رہے، اب کس کے سر [illegible] سکتی ہے۔ یہ بعد کی بات تھی۔ دریں اثنا مجھے [illegible] خانم شاہ کا خیال آیا۔ کاش [illegible] حل [illegible] صورت حال کو [illegible] اور دانش مندی سے کام لینے کی کوشش کر سکے۔

بہرحال میں نے ایک تھکی تھکی سی گہری سانس خارج کرتے ہوئے میجر باجوہ [illegible] سے پوچھا۔ "تو پھر اب [illegible] سلسلے میں آپ نے آخری فیصلہ کیا کیا ہے؟" میرے استفسار پر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گئے اور اچانک بڑے سپاٹ انداز میں بولے۔

"...میں تمہیں کبھی بھی پولیس انتظامیہ کے حوالے نہیں کروں گا۔" ان کا جواب... ان کی بات میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ جس نے مجھے خوش کن انداز سے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یکلخت میرا دل بے پایاں طمانیت اور مسرت سے دھڑکنے لگا۔ گویا ان کا میرے بارے میں اپنا یہ ذاتی اور آخری فیصلہ تھا... تاہم میں پھر بھی ان کی وضاحت چاہنے کی غرض سے کچھ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"میجر صاحب! ان ساری باتوں اور سیاسی دباؤ کے باوجود آپ کا میرے بارے میں یہ ذاتی فیصلہ میرے نزدیک قابل تحسین ہے مگر... سرا صرف آپ کے اپنے ذاتی فیصلے سے بھلا کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ میرا اپنا ذاتی فیصلہ نہیں ہے شہزی!" میجر ریاض باجوہ نے عجیب سے لہجے میں اور ایک انکشاف کیا۔

"ہر معاملے میں سیاسی دباؤ کی مداخلت اب ملک کو [illegible] کھوکھلا کر کے کرپشن کی جانب دھکیل رہی ہے... اور ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے یہ اہل اقتدار قسم کے طالع آزما... ملک و قوم کے مستقبل سے زیادہ اپنے اقتدار اور ذاتی مفادات کو عزیز رکھتے ہیں۔ ایسے تو یہ کر [illegible] یہ صاحب اقتدار یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ... یہ ملک ہے تو یہ لوگ بھی ہیں [illegible] بھی وطن عزیز کے باعث قائم ہے۔ خدانخواستہ یہ نہ رہا تو پھر یہ کہاں جائیں گے؟"

"بہر..." میں زیر لب مسکراہٹ سے بولا اور میجر ریاض باجوہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"جی ہاں سر!" میں نے کہا۔ "ایسے حالات اور [illegible] یہ لوگ کبھی تو کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں

گے۔ اس لیے تو ان لوگوں کے پاس پہلے ہی سے دو دو ملکوں کی شہریت ہوتی ہے۔ اپنا سرمایا باہر کے ممالک میں صرف کیا ہوتا ہے جس طرح کتی گندگی میں ہمیشہ اپنا ایک پیر بچا کر چلتی ہے، اسی طرح یہ لوگ بھی سیاست کے گندے جوہڑ پر اپنی ایک ٹانگ بچا کر رکھتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ملک میں صرف یہ سیاست سیاست کھیلتے ہیں۔ درحقیقت یہ لوگ جرائم پیشہ ہیں۔ انہیں عوام سے عوام کی بنیادی سہولتوں ضرورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ فضول ایشوز میں کئی کئی مہینے [illegible] ہیں۔ بسا اوقات سالوں کے سال بھی۔ مگر اپنے مفاد پر مبنی کوئی بھی ایشو ہو ایک دن میں اعلان کر کے اور پھر اسے [illegible] کا لیبل لگا کر دبا دیتے ہیں۔"

اپنی تھوڑی بہت انتہائی حد تک سیاسی سوجھ بوجھ کے مطابق میں نے تلخی سے کہا تو میجر باجوہ... بھی تلخی سے مسکرائے۔

"ہاں! تم سچ کہتے ہو۔ اب سیاست میں نیا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ جسے عام سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا آدمی بھی سمجھنے سے قاصر ہے۔"

گفتگو کہاں سے کہاں چلی گئی تھی۔ مگر میری غیر معمولی اور فطری ذہنی فراست مجھے باور کروا رہی تھی کہ ضرور میجر باجوہ مجھ سے کچھ نہ کچھ شیئرز کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کوئی خفیہ اہم نوعیت کا راز میرے سامنے آشکارا کرنے کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں۔

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بیل دے کر کسی کو اندر بلایا اور اسے چائے لانے کا کہا۔

چائے آنے تک اسی نوعیت کی گفتگو ہمارے درمیان ہوتی رہی۔ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری اس جنگ نے مجھے اب تک ہر طرح کی سوجھ بوجھ عطا کر دی تھی۔ کچھ میری اپنی فطری زود حسی کا بھی دخل تھا۔ تھوڑے سے بہت کچھ اخذ کر لیا کرتا تھا۔ اس میں میری طبیعت اور مزاج کی چالاکی، دیہاتی اور ان کی کیفیات بھی گویا میری فطرت کا حصہ تھیں۔ جس کا مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ چوہدری ممتاز خان کے ساتھ جاری یہ جنگ ابھی کوئی اہم موڑ یا رخ اختیار کرنے والی تھی۔ یا پھر اس جنگ کا "دی اینڈ" ہونے والا تھا۔

چائے آگئی۔ سادہ سے دو کپ تھے۔ جو ایک سنتری چھوٹی سی ٹرے میں اٹھائے اندر داخل ہوا تھا اور خاموشی سے ایک ایک کپ ہمارے سامنے رکھ کر لوٹ گیا تھا۔

"شہزی! کیا میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟" میجر [illegible] اچانک میری طرف دیکھ کر عجیب سے لہجے میں مخاطب ہوئے۔

میں چونکا تھا۔ ان کا انداز عجیب اور ہلکی سی مسکراہٹ [illegible] بولا۔ "سر! لگتا ہے آپ مجھے کسی بڑے اعزاز سے نوازنا چاہتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ میں آپ کے اعتماد پر پورا اترتا ہوں کہ نہیں۔" میجر باجوہ مجھے بہ غور گہری اور عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بولے۔

"شہزی! تم شاید نہیں جانتے کہ میں تم میں [illegible] ہی خصوصی دلچسپی لیے ہوئے ہوں اور جب سیشن کورٹ [illegible] جج نے مجھے تمہارے سلسلے میں تفتیشی افسر مقرر کیا تھا [illegible] سے اب تک میں تمہاری ایک ایک سرگرمی پر نظر رکھے ہوئے ہوں... میں نے اندازہ لگایا کہ تم نہ صرف [illegible] بہادر دلیر انسان ہو بلکہ ایک دردمند جذبات والی [illegible] حامل بھی ہو اور اس سے زیادہ حقیقت پسند۔ تمہارے [illegible] نہ صرف شاطر چوہدری کا بھرپور دلیرانہ مقابلہ کرنے کا جذبہ [illegible] لیتا ہے بلکہ [illegible] کے لیے یہ تمہارا عزم ہے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے۔ چائے کی چند چسکیاں لیں پھر قدرے دھیمی آواز میں بولے۔

"ملک تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ یہ تبدیلی مثبت بھی ہو سکتی ہے اور منفی رخ بھی اختیار کر سکتی ہے۔ یہ ملک کی سیاسی بساط پر بار بار ایک ہی طرح کے مہروں کی وجہ سے ہے مگر... اس میں مثبت تبدیلی کا کوئی دور دور تک نظر آتا دکھائی نہیں دے رہا ہے... اور اس ملک کے کچھ خفیہ اداروں کی ملکی مفاد کے پیش نظر انفرادی سوچ نے بہت خاموشی سے جنم لیا ہے... جسے باقاعدہ طور پر POWER کا نام دیا گیا ہے [illegible]

"پاور" ایک روبوٹ ہے... ایسا روبوٹ جس کے ممبر ایک خاص نوعیت کی پیدا گرداننگ فیڈ کر دی گئی ہے... جس کا فقط ایک ہی مقصد ہے .... یعنی وطن عزیز کی سلامتی اس کی [illegible] کسی نظریے کو پرچار کیے بغیر بہت خفیہ طریقے سے اپنی تیسری آنکھ کے ذریعے ایسے عوامل پر نظر رکھنا ہوتا ہے جو ملکی سلامتی کے مفادات سے متصادم ہیں... پاور کی اسی تیسری آنکھ نے جان لیا ہے کہ ملک کی سیاسی قوتوں نے اب تک ملک اور عوام کے مفادات کی خاطر کچھ نہیں کیا بلکہ ان باہمی رسا کشی والی روش نے ملک کو [illegible] تخریب کاری اور بے سکونی کی جانب ہی دھکیلا ہے۔" وہ ذرا سانس لینے کو رکے۔ میری نظریں ان کے چہرے پر [illegible]

[illegible] تھیں۔ وہ پھر بولے۔

"پاور کا ایک اپنا مخصوص نظریہ ہے جو عوام کے بنیادی نظریے سے ہی تشکیل کھاتا ہے۔ یعنی امن، سکون... آزادی اور خوشحالی۔ پاور اس کاز پر کام کر رہی ہے کیونکہ پاور سمیت مذکورہ عوام کو اس ملک کی اس دھرتی کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھتے تھا کہ یہ دھرتی ہے تو ہم ہیں۔ ورنہ ہم کدھر جائیں گے۔ پاور بہت خفیہ طریقے سے اپنی تیسری آنکھ سے چنتی ہے اور مجھے بھی انہوں نے ہی چنا ہے اور یہ ایک "سائیکل" ہے کیونکہ اب مجھے ایک ممبر چنا ہے اور میرا چناؤ تم ہو۔"

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ بظاہر میں کسی [illegible] سے گزر رہا تھا مگر اندر میرے دل و دماغ میں ایک [illegible] سنسنی کی کیفیات طاری تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے [illegible] زندگی ایک نیا رخ، ایک نیا موڑ اختیار کر رہی تھی۔ میں [illegible] جیسے اپنے ماضی سے بے خبر اور کٹ سا گیا اور میرے سامنے وہی کچھ تھا جو میں سن رہا تھا اور میجر صاحب کی باتوں کے پس منظر میں ایک تصوراتی ماحول دیکھ رہا تھا۔

"[illegible] تمہیں میری باتیں عجیب اور انوکھی لگ رہی ہوں [illegible] حقیقت یہی ہے کہ ہر ثبات کو بے تغیر کا سامنا ہے۔ یہ [illegible] کی لیاقت ہے نیا دور صرف سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔ [illegible] مثبت رخ [illegible] ہے یا منفی روش پر چلنا شروع [illegible] ہے۔ خیر و شر ازل سے جنم لیتے ہیں۔ نئی نئی طاقتیں [illegible] ہیں اور جنم لیتی ہیں۔ [illegible] دوسری جنگ عظیم بھی اس [illegible] تھی۔ اندر ہی اندر پنپنے والی ایک [illegible] "پاور" جو منفی سوچ کی حامل تھی۔ اس نے دنیا کو دو بڑی مہا بلی قوتوں کی طرف دھکیلا... سب پھر وہی منفی نظریہ غلبہ پانے کی طرح جنم لے رہا ہے... مگر انسان زیادہ دیر سکون سے [illegible] کسی خفیہ منفی پاور دنیا کو ایک "[illegible]" جنگ کی طرف دھکیل رہی ہے۔" وہ ذرا رک کر مجھ سے مستفسر [illegible]

"شہزی! تم [illegible] سمجھ رہے ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح سے سر!" میں نے فوراً جواب [illegible] مجھے اپنی آواز میں جوش کا ابھار سا محسوس ہونے لگا۔

"میں جس پاور کی بات کر رہا ہوں، وہ ہمارے وطن اور اس کے عظیم تر سلامتی مفادات کے لیے کام کر رہی ہے۔ [illegible] غیر محسوس [illegible] اس کے ممبران بھی نہیں جانتے کہ یہاں پیچھے ہیں؟ ان کی لیڈر شپ کس کے ہاتھ میں ہے، وغیرہ۔ بس اس کے ٹاسک اس کے کاز کو آگے بڑھانا ہے، کامیابی سے خاموشی سے۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔"

میں خاموش تھا۔ کمرے میں دھڑکتی خاموشی طاری تھی۔ ماحول اور وقت تک رکا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔ میجر صاحب کی گفتگو اور لہجے میں مجھے ایک عجیب طرح کا فسوں محسوس ہو رہا تھا جو دھیرے دھیرے میرے دل و دماغ کو کسی سحر میں جکڑ رہا تھا۔

وہ بولے۔ "شہزی! جب میری میجر کے عہدے پر ترقی ہوئی اور مجھے رینجرز فورس کا چارج سونپا گیا تو سب سے پہلا مشن مجھے اینٹی ڈکیت اینڈ ٹاسک فورس کے انچارج کی حیثیت سے سونپا گیا اور میں نے جنوبی پنجاب کے ایک بڑے ڈاکوؤں کے گروہ کا بالکل قلع قمع کر کے رکھ دیا اور اس کے سرغنہ بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کو گرفتار کر لیا... اور پھر "پاور" کے ایما پر میں نے اس کے ساتھ ایک خفیہ ڈیلنگ کر کے اسے ایک خاص مقصد کے لیے چھوڑ بھی دیا اور اس کا یہ فرار بالکل ڈرامائی اور خفیہ رکھا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔"

بدر اقبال کے نام پر میں چونکا تھا۔ بلاشبہ یہ نام میرے لیے اجنبی ہی تھا مگر... میں نے اسپتال کے سنسنی خیز ڈرامے کے دوران میجر باجوہ ... کے منہ سے اس کا تذکرہ سنا تھا جو انہوں نے جنگلی خان سے کہا تھا کہ کیا تم بدر اقبال کے آدمی ہو؟ بہرحال میں خاموشی سے میجر صاحب کی دلچسپ گفتگو سنتا رہا۔ وہ آگے بتانے لگے۔

"بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کے ساتھ ہمیں خفیہ ڈیلنگ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کی بڑی ٹھوس وجہ تھی۔ بابن ڈکیت نے اپنے سے کئی گنا بڑے اور خطرناک مجرم کو ہمارے سامنے بے نقاب کیا تھا اور اس کا نام تھا وزیر جان۔ وزیر جان بظاہر ایک معزز صنعت کار ہے۔ بابن ڈکیت نے اس کی دو کنال پر پھیلی ہوئی عالیشان کوٹھی میں نقب لگائی تھی۔ اس جیسے ڈاکو کو صرف مال و دولت کی حرص ہوتی ہے جو ڈاکے کے دوران اس کے ہاتھ بھی لگی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پرائز بانڈز اور شیئرز وغیرہ پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ وزیر جان کی خواب گاہ کے ایک خفیہ لاکر میں رکھی ہوئی فائل پر بھی اس کی نظر پڑی۔ بابن ڈکیت کچھ پڑھا لکھا انسان تو نہیں تھا مگر فائل کی مخصوص کور جلد پر چھپا ایک عجیب سے مخصوص مونوگرام نے بابن ڈکیت کے دل میں ایک تجسس سا پیدا کیا۔ وہ فائل "[illegible]"

نا تھی۔ وہ اسے ہیروں کا باکس سمجھا۔ کیونکہ ایک تو وہ کسی ہی کی شکل میں تھی دوسرے اس کے کھلنے کا کوئی سراغ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تو ہم اسے ہلانے جلانے سے اندر کوئی چیز کھڑکتی سی اسے محسوس ہوئی تھی۔ پائن ڈکیت نے اسے بھی تھیلے میں ڈال لیا تھا۔

"ڈکیتی کی یہ کامیاب واردات کرنے کے بعد وہ اپنی خفیہ کمین گاہ یعنی جنگل ڈیرے پر پہنچا تو اس عجیب فائل کے بارے میں اس کا تجسس جاگ اٹھا۔ اسے کسی طرح کھول ہی دیا مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ [illegible] اندر سے ہیرے جواہرات کے برآمد ہونے کی توقع لیے بیٹھا تھا مگر اندر کاغذوں کے پلندے کے سوا کچھ برآمد نہ ہوا۔"

"اس ڈکیتی کی خبر ہمیں موصول ہوئی تو ہم [illegible] یافتہ جاسوس کھوجی کتوں کے ذریعے پائن ڈکیت کا سراغ لگاتے ہوئے بالآخر اس کی خفیہ کمین گاہ جا پہنچے اور اس کے جنگل ڈیرے پر زبردست ریڈ کیا جو اس کے خونی گروہ کے خاتمے کے لیے بھی تابوت کی آخری کیل ثابت ہوا۔

"اس کے گروہ کے کئی ساتھی مقابلے میں مارے گئے۔ کچھ گرفتار ہوئے ان میں پائن ڈکیت بھی تھا۔ لوٹا ہوا مال و اسباب بھی ہاتھ آگیا اور وہ فائل بھی۔ یہ فائل میرے لیے اہم ثابت ہوئی۔ فائل کا تفصیلی مطالعہ اور جائزہ لینے کے بعد ہی مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ بلاشبہ پائن ڈکیت نے نادانستگی میں خود سے کئی گنا بڑے اور خطرناک سنگین مجرم کے گھر نقب لگائی تھی۔ بالا دستوں کے علم میں یہ بات آئی تو فیصلہ کیا گیا کہ وزیر جان کو ابھی گرفت میں لینے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا جبکہ دور رس نتائج اور وسیع تر مفادات کے حصول کے لیے اسے اندھیرے میں رکھ کر پس پردہ اس کی ڈوریاں ہلانے والوں کو بے نقاب کرنا زیادہ اہم تھا کیونکہ وزیر جان کی اہمیت صرف ایک مہرے کی سی تھی جس کے لیے ہم نے ایک چال چلی اور کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔ ہم انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ وزیر جان سے صرف اس مقصد کے لیے رابطہ کیا کہ وہ ہمارے تھانے سے آکر برآمد کیا ہوا مال مسروقہ لے جائے۔ ابتدا میں تو اس نے حسب توقع کوئی دلچسپی نہ دکھائی، کیونکہ وہ یقیناً شدید کشمکش کا شکار ہوگا۔ کیونکہ اسے اپنے چوری شدہ مال و دولت سے زیادہ اس خفیہ اور اہم نوعیت کی باکس فائل کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی مگر اس کے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن... والی صورت حال تھی۔ اگر وہ مذکورہ فائل کی ملکیت جتانے کی کوشش کرتا تو پھنستا تھا، نہ کرتا تو بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔

ابتدا میں اس نے کوئی دلچسپی یا تشویش ظاہر نہ کی۔ ہم بھی انتظار کا کھیل کھیلتے رہے۔ ادھر حوالات میں قیدی کی حیثیت سے موجود پائن ڈکیت کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ اس نادانستگی میں... کتنا بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ تب تک ہم نے پائن ڈکیت کی ہسٹری کھنگالنا شروع کردی اور ہمیں اس قدر ہی معلوم ہوسکا کہ وہ ملتان کے نواح میں واقع "بستی چند" کے جاگیردار چوہدری الف خان کا منشی رہ چکا تھا... پھر وہ اس کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان کا خونی ہرکارہ بن گیا، مگر پھر جانے کیا ہوا کہ وہ اس سے بھی باغی ہوگیا اور ڈاکوؤں کے ٹولے میں شامل ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گروہ کی بھی داغ بیل ڈال لی۔" [illegible] صاحب اتنا بتا کر تھوڑا خاموش ہوئے۔ میں نے چوہدری الف خان اور ممتاز خان کے ذکر پر چونکا تھا۔

پھر وہ مزید گویا ہوئے، میں دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ "ہم نے وزیر جان کے خلاف جال بچھانا شروع کردیا تھا۔ اس کے ساتھ خاموشی سے انتظار کا کھیل کھیلنا ہمارا اہم ترین خفیہ مقصد تھا۔ ہم اسے اس کشمکش و پیچ میں [illegible] چاہتے تھے کہ آیا اس کے چوری شدہ مال و دولت [illegible] کے بعد کیا وہ فائل بھی ہمارے ہاتھ لگی تھی یا اسے [illegible] پائن ڈکیت نے بیکار سمجھ کر ضائع کردیا تھا... لہٰذا جب وزیر جان نے دیکھا کہ اب تک اس کے خلاف کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی اس نے کچھ دنوں بعد خود ہی ہم سے رابطہ کیا اور مسلح آدمیوں کے ساتھ میرے پاس آن دھمکا۔ ہم جانتے تھے اگر ہم فائل کے سلسلے میں اسے گرفت میں لینے یا پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کرتے تو وہ صرف صاف مکر جاتا بلکہ ہوشیار بھی ہوجاتا جبکہ ہم ابھی اسے اندھیرے میں رکھ کر اس کی مکمل "ریکی" کرنا چاہتے تھے۔ ہم اس کے سامنے ایسے بن گئے جیسے ہم کچھ جانتے ہی نہیں۔ وہ بھی بظاہر ہمارے سامنے پُراعتماد نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے آدمی حساب و اعداد و شمار میں مصروف ہوگئے۔ ہماری نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد جب وہ مطمئن ہوکر لوٹنے لگا تو ہم نے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرکے اسے رخصت کردیا... بعد میں ایک خفیہ منصوبے کے تحت ہم نے پہلے ہی سے یہ بات ظاہر کردی تھی کہ پائن ڈکیت کی گرفتاری کے دوران اس کے چند ساتھی کچھ چوری شدہ مال و اسباب اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب بھی ہوگئے تھے یہی سبب تھا کہ ہم نے وزیر جان کو بھی اس کا چوری شدہ مکمل سامان اس کے حوالے نہیں کیا تھا... ساتھ اس پر یہ بھی باور کرایا تھا کہ پائن ڈکیت کے چند فرار ہونے والے ساتھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مقصد وزیر جان پر یہ بھی باور کرانا تھا کہ وہ سمجھے وہ فائل بھی یقیناً پائن ڈکیت کے فرار ہونے والے باقی ماندہ ساتھیوں میں سے کسی ایک کے پاس ہوگی۔

"اس کے بعد ہم نے پائن ڈکیت کو سول پولیس انتظامیہ کے سپرد کردیا تھا... مگر اس کی کڑی ریکی کرتے رہے۔ ہماری سو فیصد توقعات کے مطابق کچھ دنوں میں ہی پائن ڈکیت کو ضمانت پر رہا کرالیا گیا اور رہا کرانے والا تھا، وہی منحوس کا بیٹا وزیر جان... ہم جانتے تھے کہ اس نے یہ کام کیا تھا... مگر پائن ڈکیت کے لیے یہ بات حیران کن ہی رہی ہوگی کہ اس نے جس گھر میں نقب لگائی اس کے مالک نے اس کی ضمانت بھی کروائی۔

پائن ڈکیت جیسے خطرناک ڈاکو کو ہم نادانستہ پولیس انتظامیہ کے حوالے کرنے کا مقصد وطن عزیز کے وسیع تر مفاد میں تھا۔ کیونکہ وزیر جان جیسے خطرناک ملک دشمن عناصر [illegible] اس کے پورے ملک میں پھیلے نیٹ ورک کو بے نقاب کرنا [illegible] ہماری اولین ترجیح تھی۔ ہمارا ایک مقصد پورا ہو چکا ہے یعنی ہم وزیر جان پر [illegible] یہ حقیقت باور کرانے میں کامیاب ہو چکے [illegible] ہمارے ہاتھ سرے سے لگی ہی نہیں۔ اس نے پائن ڈکیت کی ضمانت کرانے کے بعد اپنے ساتھ لے جاکر اس سے بازپرس کی ہوگی۔ ہم دو تین دن تک اس کی ریکی پر لگے رہے [illegible] پائن ڈکیت پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اپنے مفرور ساتھیوں [illegible] اور ان سے فائل برآمد کرنے کی کوشش کرے۔ ساتھ ہی اس نے [illegible] کے ساتھ لاتعداد سودے بازی بھی کرڈالی تاکہ لالچ میں آکر پائن ڈکیت فائل کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جائے... مگر موقع پاتے ہی پائن ڈکیت اس کی گرفت سے نکل بھاگا اور [illegible] ہمارا ایک اور مقصد بھی پورا ہو گیا۔"

پھر ریاض باجوہ اچانک جھرجھری لے کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں کے درمیان [illegible] ہونے والی یہ بہت میٹنگ اہم نوعیت ہی کی تھی۔ "میرا خیال ہے اب مجھے مقصد کی بات پر آ جانا چاہیے۔" وہ آخر میں ایک گہری سانس خارج کرکے بولے۔

میں ان کی آخری بات پر یہی مطلب اخذ کر [illegible] مجھے بھی کسی "پلان" کے ایما پر ریاض باجوہ دانستہ پولیس کے حوالے کرکے اپنا کوئی اہم خفیہ مقصد تو نہیں حاصل کرنا

شمارہ دسمبر 2014ء کی جھلکیاں
ماہنامہ
سرگزشت
مرد صالح
ایک بہت بڑی شخصیت کا سبق آموز زندگی نامہ
سونے کی سڑک
وحشت پسند طبقے نے جنگل [illegible] کا راستہ بہایا
دریائے نیل
بزرگ ترین اور پُراسرار ترین بحر سے دریا کا تذکرہ
لی مان
ایک خونی ریس کی روداد جسے دیکھنے
والے موت کی گود میں سو گئے
سرویا
انسانی [illegible]
معرکۃ الآرا [illegible] طویل سرگزشت "سراب"
فلمی دنیا کے [illegible]
ہوائی کمپنی کے ملازم کی خود نوشت "الوداع"
اور
ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات
اور قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال پر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

چار رہے ہیں؟ اگر ایسا تھا تو یہ میرے لیے سر، سر کٹانے کا سودا ہوتا۔ ایک تو میں باتوں آ کیت کی طرح کوئی خطرہ تک گھر چوکنا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ پولیس میری جان کی دشمن بنی ہوئی تھی، میں نے دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر باجوہ صاحب نے مجھ سے ایسی کوئی ڈیلنگ کرنا چاہی تو میں ان کی اس بات سے شدید اختلاف کا اظہار کروں گا۔

باجوہ صاحب کہنے لگے۔ "شہزی! تم ایک بہادر اور باعزم نوجوان ہی نہیں بلکہ ایک شریف اور باضمیر انسان بھی ہو۔ ایک ایسے انسان [illegible] کے خلاف کبھی کوئی سودا کرنا پسند نہیں کرتا۔ تمہاری شرافت کے پیچھے ایک ولولہ انگیز جوش و جذبہ کارفرما رہتا ہے۔ جو کہیں معاشرے کے ناسوروں کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے کہتا رہتا ہے۔ مگر شہزی! کیا تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ جب بھی معاشرے کے ناسور جو ملک و قوم کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہوں اور اس کا اختیار کے ساتھ سودا بھی کرنے کے لیے قبول رہے ہوں تو تمہاری کیا رائے ہوگی ایسے عناصر کے خلاف؟"

میں نے فوراً جواب دیا۔ "میجر صاحب! میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ میرے بارے میں ایسے جذبات و خیالات رکھتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ ہر سچے پاکستانی محب وطن کی طرح میری رگوں میں بھی حب وطن کا جذبہ دوڑ رہا ہے... میں سمجھتا ہوں یہ ہر اس انسان کا فطری جذبہ قرار پاتا ہے جس کا خمیر ہی اس دھرتی سے اٹھا ہو جو یہاں پیدا اور پلا بڑھا ہو... میجر صاحب!... مجھے بھی اپنے وطن سے محبت ہے اور یہ وہ لاشعوری محبت ہے جو مجھے ہمیشہ ایک جنگ پر اکساتی رہتی ہے کہ میں ملک کو دہشت گرد و مفسد عناصر سے پاک کروں جنہوں نے وطن عزیز کے عام لوگوں کی زندگی اپنے اثر و رسوخ اور دولت و طاقت کے گھمنڈ میں اجیرن کر رکھی ہے اور جو اپنے مکروہ مفادات و مذموم مقاصد کے حصول کی خاطر مجبوروں اور بے کسوں کو ظلم و جبر اور ناانصافی کی چکی میں پیسنے سے گریز بھی نہیں کرتے۔"

"گڈ..." میجر باجوہ توصیفی لہجے میں بولے۔ "جیسا کہ میں نے بتایا کہ مجھ پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ تمہیں پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جائے مگر ہم ایسا نہیں چاہتے... اگرچہ ہم مجبور بھی ہیں، اس کا ہم دونوں نے ایک آسان حل تجویز کیا ہے۔ جب تم دونوں کو پولیس انتظامیہ کے حوالے کیا جا رہا ہوگا تو منصوبے کے مطابق پولیس وین پر حملہ کر دیا جائے گا۔ تم دونوں فرار ہو جاؤ گے۔"

میجر صاحب کی اس بات پر میرا دلی خوشی سے [illegible] تاہم ایک الجھن تھی۔ میں نے پوچھا۔ "میں آپ کا [illegible] ہوں میجر صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے [illegible] اہم نوعیت کی گفتگو اور "پاور" وغیرہ جیسے خفیہ راز سے مجھے آگاہ کرنا کیوں ضروری سمجھا؟" وہ جواباً مسکرا کر بولے۔

"اس لیے کہ پاور والوں کو آفتاب تم جیسے [illegible] نوجوان ہوتے ہیں۔ ان کی تیسری آنکھ بھی [illegible] تم خود کو خوش نصیب سمجھو کہ اب تم بھی پاور میں زبردست [illegible] نوعیت کی شمولیت اختیار کر چکے ہو۔ مگر یہ ساری باتیں [illegible] بتانے کا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ تم اپنے تین دشمنوں سے [illegible] ہوشیار رہو، وہ ہمارا ابھی ٹارگٹ ہیں۔ اس [illegible] سب لا ازبس ضروری تھا کیونکہ آج کل [illegible] تمہارا دشمن وزیر جان ممتاز خان کے ساتھ [illegible] اتحاد کر رہا ہے اور ہمیں پورا یقین ہے کہ وزیر جان ممتاز خان کو بھی اپنی ملک دشمن سرگرمیوں میں شامل [illegible] چاہتا ہے۔ چونکہ تم نے آج کل ممتاز خان کو بری طرح [illegible] کر رکھا ہے [illegible] وزیر جان کا حلیف [illegible] بعد وہ اس کی مدد سے [illegible] شکست سے دوچار کرنے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت حال میں تم مجھ سے کسی بھی [illegible] یا راہنمائی کے لیے رابطہ کر سکتے ہو۔"

"آخر وزیر جان کس قسم کی ملک دشمن کارروائیوں میں ملوث ہے...؟" میں نے پوچھا۔

"اس بات کو ابھی رہنے دو۔" کرنل اور باجوہ [illegible] میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

"ہمیں جنگی خان بھی چاہیے... اس سے ہمیں کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ وہ ہمارے لیے اہم ہے۔ اگر پولیس انتظامیہ کے حوالے کردیا گیا تو دوسرے دن وہ باہر ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

یہ طویل میٹنگ نما گفتگو اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ میں نے آخر میں باجوہ صاحب سے یہ درخواست بھی کی کہ وہ [illegible] میرے تین ساتھیوں، راشد، شوکی اور شکیل کے سلسلے میں بھی کچھ کرسکیں تو ان کی مہربانی ہوگی۔ انہوں نے اس بات کا وعدہ کیا تھا مجھ سے۔

مجھے واپس بیرک میں چھوڑ کر سنتری لوٹ گیا۔ شکیل داؤ [illegible] رہا تھا۔ کھڑکی کی آواز پر چونک کر بیدار ہوا تھا مجھے دیکھتے ہی دیوار گیر سنگی بنچ سے یکدم اٹھ بیٹھا۔

میں نے اسے ساری بات بتادی۔ البتہ "پاور" سے متعلق میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی وزیر جان سے متعلق کوئی بات بتائی۔ صرف اس قدر بتایا کہ باجوہ صاحب [illegible] میری بےگناہی ثابت ہو چکی ہے اور مگر موجودہ حالات سے ان [illegible] جنگی خان کی [illegible] گرفت سے آزاد کرانے [illegible] طرح سے تعاون کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

بہرحال شکیل داؤ کے لیے بھی یہ بات مسرت انگیز [illegible] یہ صرف ہمیں ہی ایک ڈرامے کے تحت آزاد کروایا جائے [illegible] بلکہ جنگی خان بھی ہمارے حوالے کر دیا جائے گا۔

چنانچہ باقی سب کچھ تیزی سے ہوا تھا۔ پولیس کی تین گاڑیاں جن میں بند وین بھی شامل تھی ہمیں لینے کے لیے رینجرز کے ہیڈکوارٹر آن پہنچیں۔ ہم تینوں کو بند وین میں سوار کرایا گیا۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں باندھی گئی تھیں۔ میں نے دیکھا جنگی خان کے مکروہ چہرے پر حسب توقع طمانیت اور بشاشت کے آثار تھے۔ وہ رینجرز سے پولیس کے قبضے میں جانے پر بظاہر خوش تھا۔

کس قدر لمبی اور دکھ کی بات تھی کہ ایک خطرناک مجرم... جسے قانون سے خوف کے بجائے "تحفظ" کا احساس ہو رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی پشت پناہی کرنے والے [illegible] اسے قانون کے شکنجے سے باآسانی چھڑا لیں گے [illegible] غیر جمہوری سیاست گری کے بل بوتے پر [illegible] "پاور" جیسی خفیہ طاقت نے جنم لیا تھا جو زہر کو زہر سے مارنے اور لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی قائل تھی۔ مجھے میجر باجوہ کی بات بالکل درست معلوم ہو رہی تھی کہ یہ دشمن اب ایک ناسور کی صورت [illegible] ملک کی جڑوں میں دیمک کی طرح گھس آئی تھی اور اسے دھیرے دھیرے چاٹ رہی تھی۔ لہٰذا کسی اور طاقت [illegible] تر جنایات اور [illegible] کے لیے ضروری تھا کہ [illegible] جڑ سے ختم کیا جائے۔"

پولیس کی تینوں گاڑیاں رینجرز کے ہیڈکوارٹر سے [illegible] اور طوفانی رفتار سے سڑک پر فراٹے بھرنے لگیں۔

میں اور شکیل [illegible] بیٹھے تھے، جبکہ ہمارے سامنے والی سیٹ پر جنگی خان [illegible] تھا۔ وہ مجھے بھی [illegible] زہریلی نظروں سے گھورنے لگا [illegible] نظروں سے [illegible] مسکراہٹ [illegible] تک بدلی ہوئی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے [illegible] اندر اٹھتا ابال کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"خوش ہولے جنگی، جو تو سمجھ رہا ہے، وہ تیری محض خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں اور جو تیرے ساتھ عنقریب ہونے والا ہے اس کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

ابھی ہمیں رینجرز ہیڈکوارٹر سے نکلے ایک اندازے کے مطابق پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک ایک دھماکے کی آواز ابھری۔

"پاور۔"

یکلخت میرے ذہن میں ابھرا۔ یقیناً میری طرح شکیل داؤ بھی یہی سمجھ گیا ہوگا۔ ہمارے بچاؤ کے لیے ہمارے بہی خواہ حرکت میں آگئے ہیں۔ اگرچہ اسے تو میں نے "پاور" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ صرف جان کاری کی غرض سے اتنا بتایا تھا کہ میجر صاحب کو میں اعتماد میں لے چکا ہوں، وہ ہماری مدد کریں گے۔ تاہم میجر صاحب نے مجھے یہ بھی بتادیا تھا کہ "پاور" بے گناہ کشت و خون کے بازار گرم نہیں کرتی جبکہ ہمیں پولیس کے قبضے سے چھڑانے کے لیے "پاور" کے تربیت یافتہ کمانڈوز [illegible] پولیس اہلکاروں کا خون بہائے ہمیں ان کے قبضے سے آزاد کرانے والے تھے۔

ایک دھماکے کے محض چند سیکنڈوں بعد دوسرا دھماکا [illegible] ہوئے۔ ہماری وین کو بھی زبردست جھٹکا لگا۔ وہ رک گئی اور اسی وقت گولیوں کی خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری۔ اور یہ بھی مسلسل چند منٹوں تک جاری رہی۔ انہی لمحوں کے دوران مجھے انسانی چیخوں کی بھی آوازیں سنائی دیں۔ ہماری وین کے ڈرائیور سمیت محافظ پولیس والے بھی جگر پاش گولیوں کے ساتھ ڈھیر ہو رہے تھے۔ کیونکہ ڈرائیونگ سیٹ کی جالی دار دیوار سے ہم انہیں تڑپتا اور ان کے جسم سے خون ابلتا دیکھ رہے تھے۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا اور چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ کیونکہ یہ سب میجر صاحب کے "پاور" اصولوں کے منافی ہو رہا تھا اور یہاں تو کشت و خون کا بازار گرم کیا جا رہا تھا۔ یکلخت ہماری وین کے عقبی دروازے پر کسی نے برسٹ مارا اور پھر ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ میری سنسناتی نظروں نے تین چار مسلح نقاب پوشوں کو دیکھا۔ انہوں نے ہم پر نظر ڈالی... پھر جنگی خان کی طرف دیکھ کر ایک نے اسے مخصوص اشارہ کیا۔ میری نظروں نے جنگی خان کے چہرے کا جائزہ لیا اور [illegible] کے لیے میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ وہ میری طرف بڑی استہزائیہ مسکراہٹ سے گھور رہا تھا۔ میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجا چکی تھی۔ معاملہ کچھ اور ہی... محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ نقاب پوش

ادھر آئے اور سب سے پہلے انہوں نے جنگی خان کو اس کی ہتھکڑیوں سے آزاد کیا جبکہ مجھے اور کمیل دادا کو گن پوائنٹ پر لے کر بازو سے دبوچتے ہوئے جیپ سے نیچے لے آئے۔

یہاں مجھے پولیس کی دو گاڑیاں تباہ شدہ دکھائی دیں اور ان کے قریب اور اندر پولیس والے خون میں نہائے مردہ حالت میں نظر آئے۔ کمیل دادا الجھن آمیز نظر سے میری طرف تکنے لگا۔ جیسے پوچھ رہا ہو۔ "یہ سب کیا ہے؟"

مجھے اب تک اندازہ ہو چکا تھا کہ بازی الٹ ہو گئی ہے... یا دور سے پہلے دشمنوں کا [illegible] منصوبہ ہوگا... اور وہ میرا "کمزراگ" [illegible] بات حقیقت تھی تو اب میری اور کمیل دادا کی [illegible] ضمانت نہ تھی۔

یہ ہمارا ادھورا قصہ پاک کر چکے تھے۔

ان کے اور بھی نقاب پوش مسلح ساتھی مجھے نظر آئے۔ ایک کار اور ایک جیپ بھی دکھائی دی جو یقیناً انہی کے زیر استعمال تھی۔ جنگی خان آزاد ہو چکا تھا جبکہ میں اور کمیل دادا ایک قید سے نکل کر دوسری بدترین قید میں جا چکے تھے۔

ہمیں رائفلوں کے کندے مار کے جیپ کی طرف دھکیلا جانے لگا... اور ہمیں اس کے اندر دھکیل دیا گیا۔

"یہ سب کیا ہے شہزی؟" کمیل دادا نے ہولے سے پوچھا۔ اس کا چہرہ ہونق سا ہو رہا تھا۔

"معاملہ الٹ ہو گیا ہے دادا!" میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔ "جن لوگوں کو آنا تھا، ان سے پہلے دشمن نے شب خون مار دیا۔ ان کا بھی منصوبہ یہی تھا شاید۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ میجر صاحب..."

"کہا تھا... معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی، اور پھر اچانک ہی جیسے میرے تاریک پڑتے دل و دماغ میں خوش آئند امید کا ایک جگنو ٹمٹمایا... وقت بھی تھا اور راستہ بھی... شاید ہم بازی پلٹ بھی سکتے تھے۔

جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی اور اس کے عقب میں کار روانہ ہو گئی۔ جنگی خان ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بڑے طنطنے کے ساتھ براجمان تھا۔ اس کے عقب والی سیٹ پر تین مسلح افراد جنہوں نے اب اپنے چہروں سے نقاب کھینچ لیے تھے۔ وہ جنگی خان کے ساتھی ہی تھے یعنی چوہدری ممتاز خان کے کارندے۔ شاید قانون کی بازی میرے حق میں پلٹتے ہوئے اس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اسی لیے اس نے یہ چال چلی تھی۔

"جی چوہدری صاحب... سب منصوبے کے مطابق ہو گیا تھا۔ دونوں شکاری ہمارے قبضے میں ہیں... [illegible] اچھا جو حکم... ابھی بات کرواتا ہوں۔"

اچانک میں نے جنگی خان کی آواز سنی۔ وہ یقیناً ممتاز خان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ گھما کر عقبی سیٹ پر بیٹھے آدمی کی طرف سیل فون بڑھایا۔ اس کا اشارہ واضح [illegible] تھا۔ اس لیے اس کے ساتھی نے سیل فون کو ایسے ہی [illegible] طرف بڑھا کر ہاتھ روک لیا۔ وہ میرے چہرے کے قریب تھا۔

چند ثانیوں بعد مجھے ممتاز خان کی تحکم بھری آواز سنائی دی۔

"ایک بار پھر خوش آمدید... [illegible] المعروف شہزی۔ حالات کا یہ پلٹا تمہیں یقیناً [illegible] ہوگا۔" ایک نئی امید اور خوش آئند وقت کے حوصلہ افزا [illegible] نے مجھے کافی حد تک سنبھالا دیا تھا۔ اس لیے [illegible] نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"ممتاز خان یہ زندگی ایک جنگ ہے۔ اس کی بازی پلٹتی رہتی ہے۔ آج تمہارے حق میں تو کل میرے حق میں۔"

"ہا... ہا... ہا... بڑی بھلی بات... مگر بھول نہیں گیا تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی کہ تم نے اپنا کوئی [illegible] ڈراما اسی میجر کے سامنے رچایا تھا، اس کا توڑ ہم نے آسانی سے کر لیا ہے، کیونکہ ایک ایسا ہی ڈراما [illegible] جواب میں ہم نے بھی رچا لیا ہے۔ کوئی نہیں جان [illegible] ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے قانون کے رکھوالوں کے ساتھ خون ریزی کے دوران چھڑانے والے میرے ساتھی تھے۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ تمہارے ساتھیوں نے ہی قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا ہے۔"

اس کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ میری سماعتوں کو چھلنی کرنے لگے۔ ایک ظالم اور بے حس انسان نے بے گناہ پولیس اہلکاروں کے خون کی ہولی کھیلی تھی، جس کا مجھے بھی شدید دکھ تھا۔ میں نے کہا۔ "تم جیسے بے حس اور [illegible] صفت انسان سے ہر قسم کی توقع رکھی جانی چاہیے ممتاز خان! مگر یاد رکھنا... تمہارے یہ جو ہتھکنڈے ہیں ایک دن تم ہی کو لے ڈوبیں گے اور وہ وقت دور نہیں رہا۔"

جواب میں سیل فون کا [illegible] اس کے کریہہ قہقہوں سے گونجنے لگا اور رابطہ منقطع ہو گیا۔

دونوں گاڑیاں ایک ذیلی سڑک سے مین روڈ کی طرف موڑ کاٹنے لگیں۔ جنگی خان [illegible] فضا میں تھے اور ایسی آوازیں ابھریں جیسے ٹائر زور سے پھٹے ہوں۔ [illegible] جیپ سے ایسی ہی آوازیں ابھریں اور اسے ایک زبردست جھٹکا لگا اور سڑک کے موڑ پر لوہے کی ریلنگ کی ایک [illegible] سے جا ٹکرائی۔ مجھے ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے اور شیشے بکھرنے کی آوازوں کے ساتھ کچھ انسانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ بالکل پچھلی سیٹوں میں درمیانی نشست کی پشت گاہ نے مجھے اور کمیل دادا کو جھٹکا لگنے پر اتنا سہارا دے دیا کہ ہمیں زیادہ چوٹ نہ آئی۔ پھر سب کچھ جیسے تیزی اور سنسنی انداز میں ہوا تھا۔ جن چند لوگوں کی جھلک مجھے نظر آئی تھی وہ اپنی وضع قطع میں ایک مخصوص ساخت کے حامل تھے۔ جسم چست لباس میں ملبوس تھے۔ آنکھوں پر ننجا (Ninja) سٹائل کے نقاب تھے، ہاتھوں میں بھی عجیب ساخت کے [illegible] والے پسٹل نظر آ رہے تھے۔ جن سے دھماکوں کے بجائے زٹ... زٹ... کی آوازیں برآمد ہو رہی تھیں۔ وہ [illegible] بے ہوش کرنے والے ڈاٹس (Dots) فائر کر رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن کا میں منتظر تھا۔ ان کے [illegible] کام کرنے کے طریقۂ کار میں مجھے ایک [illegible] ایک ساعت کی تیزی سے انہوں نے [illegible] تیزی سے اپنا کام نمٹایا تھا۔ پہلے مجھے اور کمیل دادا کو [illegible] نیچے اتارا۔ اس کے بعد [illegible] ہاتھوں کی [illegible] صرف ایک بچا تھا تب اس نے مجھ سے سوال کیا [illegible] انداز بھی مجھے کسی روبوٹ جیسا لگا تھا۔ "تمہارا شکار کدھر ہے؟"

"اگلی سیٹ پر... ڈرائیور کے برابر۔" میرے منہ سے بے اختیار [illegible] الفاظ ادا ہو گئے۔

"ہو گئے... اپنا شکار لے کر نکل جاؤ... ہم [illegible] یہاں [illegible] سنبھال لیں گے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "پولیس [illegible] سے پہلے [illegible] صورت حال [illegible] ہو گئی ہے۔ [illegible] یہاں سے نکل [illegible] ثبوت ختم کر کے وہ پلٹا۔ پھر وہ سب قریب کھڑی ایک سفید رنگ کی ہائی روف میں سوار ہو گئے۔ سڑک پر [illegible] آہنی [illegible] ہائی روف کے پچھلے حصے [illegible] کر دی گئی۔

میں اور کمیل دادا چند ثانیے [illegible]

"ہائی روف" کی گاڑی حرکت میں آئی تو [illegible] بھر گئی۔ [illegible] پولیس پر حملے کا علم ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے جیپ کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو جنگی خان کا بے سدھ وجود لڑھک کر باہر آ گیا۔

"یہ سب بے ہوش ہیں۔ [illegible] اس جگہ سے..." میں نے کمیل دادا سے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

دشمنوں کی دوسری گاڑی بھی کار ٹائر برسٹ ہونے کے باعث بے قابو ہو کر جھاڑ کے ایک خلا میں جا گھسی تھی۔ سڑک پر بچھی آہنی کیلوں نے دونوں گاڑیوں کے ٹائر برسٹ کروا لیے تھے۔

میں نے جنگی خان کو کاندھے پر ڈال لیا۔ جبکہ اس دوران کمیل دادا نے ایک بے ہوش دشمن کی جیبوں کی تلاشی لے کر سیل فون اچک لیا تھا۔ میں نے تیزی سے پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا... روڈ پر پیچھے والی ٹریفک کی آوک جاوک کچھ زیادہ نہ تھی۔ کچھ راہ گیر تھے۔ چند لوگ اس طرف متوجہ بھی ہوئے تھے کہ اس طرف کچھ ہوا ہے۔ اس لیے میں اور کمیل دادا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور نسبتاً محفوظ جگہ پر آ گئے۔ یہ سڑک سے قدرے دور جھاڑیوں کا [illegible] تھا۔ اس دوران کمیل دادا نے سیل فون پر بیگم ولا رابطہ کر کے اپنے کچھ ساتھیوں کو بابا پورہ والی روڈ پر آنے کا حکم دیا تھا۔ مجھے پہلے بیگم ولا جانے پر اعتراض ہوا مگر حالات ایسے تھے کہ اور پھر کہاں جاتے؟ بقول کمیل دادا کہ بیگم ولا اب محفوظ جگہ ہے... وہاں دوبارہ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا کیونکہ اب میجر باجوہ صاحب کی مدد بھی شامل ہو چکی تھی۔ اور اسپیشل والے [illegible] خفیہ والے کے اندر اپنی سوچ پر روشن خان کی چیرہ دستیوں کو بھی بریک لگ چکے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ بے ہوش کرنے والی ڈاٹس کا نہ جانے کب تک اثر زائل ہوتا تھا۔ جنگی خان دوبارہ ہوش میں آ کر مسئلہ کھڑا کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے ہمارے پاس ایسا کوئی بندوبست نہ تھا۔ تاہم یہ ہمارے لیے کچھ زیادہ فکر کی بات نہ تھی۔ میں اکیلا بھی جنگی کی درگت بنا سکتا تھا۔ مگر مسئلہ ظاہر ہے شور شرابے کا تھا۔ وہ اس سے فائدہ اٹھا کر بھاگ سکتا تھا۔

کچھ دیر اور بیت گئی، ایک کار میں دو آدمی ہمیں لینے کے لیے بابا پورہ کے اس روٹ پر آ گئے جہاں ہم ایک روڈ سائن کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مضبوط رسی بھی لائے تھے۔ جنگی خان کو ہوش آنے لگا تھا۔ کمیل دادا کے دونوں ساتھیوں نے مضبوطی کے ساتھ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اس کے بعد ہم سب کار میں سوار ہو کر بیگم ولا کی جانب روانہ ہو گئے۔

کچھ سکون آور لمحات میسر آئے تو کمیل دادا میری

توصیف کیے بنا نہ رہ سکا۔ ''یار شہزی! تم نے مجھے بہت حیران کیا... بے شک اول خیر کی صحبت نے تمہیں ایک استاد ٹائپ آدمی بنا دیا ہے مگر اس میں تمہاری اپنی بھی ذہانت اور خداداد صلاحیتوں اور فطری دلیری کا دخل ہے۔''

کمیل دادا جیسے کڑوے کسیلے اور ہر وقت مجھ سے خار کھاتے ہوئے انسان کے منہ سے میرے لیے ایسے الفاظ معمولی بات نہ تھی۔ میں نے کہا ''دادا! اول خیر کا تو میں احسان مند رہوں گا ہی زندگی بھر... مگر حقیقت یہی ہے کہ وقت اور حالات کی بھٹی میں [illegible] والے باعزم لوگ ہی کندن بنتے ہیں۔ بے حوصلہ [illegible] ہو جاتے ہیں۔ ویسے اس میں ہماری خوش نصیبی کا [illegible] تقدیر کی یاوری کام آتی ہے تو کہیں ذہنی صلاحیت [illegible] فوری فیصلہ... خیر... اب یہ بتاؤ بیگم ولا پہنچ کر ہم [illegible] کام اس خبیث جنگی خان کا منہ کھلوانا ہوگا۔ مجھے بیگم صاحب اور اول خیر کی طرف سے شدید فکر کھائے جا رہی ہے۔''

وہ بولا... ''فکر نہ کرو، بس ذرا بیگم ولا پہنچ لو، پھر دیکھنا یہ جنگل خان کس طرح فرفر بولتا ہے۔'' اس نے دانستہ اس کا نام بگاڑا۔ میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لو کمیل دادا! اب کیا ہمارا بیگم ولا کا رخ کرنا مناسب رہے گا؟''

میری جرح سے کمیل دادا چپ ہو جایا کرتا تھا... مگر اس بار ایسا نہ ہوا... وہ قطعیت سے واضح اور نارمل لہجے میں بولا۔

''ابھی اور کوئی ٹھکانا قابل عمل نہیں رہا۔ ہمیں بیگم ولا ہی جانا ہوگا۔ وہاں ہمارے اور ساتھی بھی موجود ہیں۔ یہ رذیل جنگی خان اتنی آسانی سے اپنا منہ بھی نہیں کھولے گا... مگر بیگم ولا کے ٹارچر سیل میں یہ ناک سے بھی بات کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا۔ کمیل دادا نے دشمن سے حاصل کیا سیل فون آف کر دیا تھا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا پہنچ گئے۔

کمیل دادا نے وہاں موجود اپنے ساتھیوں کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ اس کے ماتحت نیم مردہ اور بے ہوش جنگی خان کو لے کر ایک تہ خانہ نما کمرے میں آ گئے۔ اول خیر کی طرف سے بیگم ولا کے لینڈ لائن نمبر پر یا موجود کسی ساتھی کے سیل فون پر ابھی تک کوئی اطلاع وغیرہ نہیں آئی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں تھا، کچھ پتا نہیں تھا۔

تہ خانے کی ہیئت دیکھ کر مجھے بادی النظر میں [illegible] ہاؤس کا ہی گمان ہوا تھا۔ ایک سے ایک تشدد کرنے والے آلات اور آہنی اوزار رکھے ہوئے تھے۔ کمرا مستطیل [illegible] کا اور خوب کشادہ تھا۔ کرسیاں، ایک چوبی تختہ بھی [illegible]

کمیل دادا نے مجھے بتایا تھا کہ بیگم صاحب جب [illegible] دوسرے اسپتال سے اپنے بیمار باپ چوہدری الف خان کی عیادت کے بعد واپس لوٹ رہی تھیں تو ان کی کار پر [illegible] مسلح حملہ آوروں نے فائرنگ کر کے ٹائر برسٹ کر ڈالے تھے۔ اس وقت بیگم صاحب کے ساتھ عقبی نشست پر [illegible] موجود تھا۔ ڈرائیور کے برابر والی نشست پر بھی ہمارا ایک آدمی موجود تھا۔ ہم نے ان کا مقابلہ [illegible] چاہی تھی مگر ناکام رہے۔ میں بیگم [illegible] چاہتا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ خود زخمی [illegible] ہو گیا تھا۔ دشمن مجھے مردہ سمجھ کر بیگم صاحب کو اٹھا [illegible] نے بیگم ولا فون کر کے اول خیر کو [illegible] سے آگاہ کیا اور بے ہوش ہو گیا۔ جب آنکھ [illegible] تو مجھے [illegible] اسپتال داخل کرا چکے تھے۔ میرے ہمراہ زخمی ساتھی بھی تھا۔

جنگی خان کی [illegible] لینے کے بعد اسے وہیں چھوڑ کر ہم اوپر [illegible] کمرے میں آ گئے [illegible] اعصاب شل تھے۔ [illegible]

اسی دوران میں نے بیگم صاحب کی [illegible] ایک سوال کمیل دادا سے کیا۔ ''تمہیں کس طرح یقین ہے اس بات کا کہ یہ حملہ ممتاز خان نے ہی کروایا ہوگا؟''

''اس لیے کہ اپنے جوان سال بیٹے فرخ کی موت پر ممتاز خان کسی [illegible] کے بغیر بیگم صاحب کی جان کا دشمن بن چکا ہے اور اس وقت [illegible] پر اس کے سوا بیگم صاحب کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔'' کمیل دادا نے جواب دیا۔

''حیرت ہے... دونوں سگے بہن بھائی ہونے کے باوجود اس قدر جانی دشمن؟'' میں نے ایک تکلیف دہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سگے بہن بھائی؟''

''کیوں...؟ میں نے غلط کہا؟''

''کیا تمہیں اول خیر نے اب تک بیگم صاحب اور چوہدری ممتاز خان کے بارے میں باتوں کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا؟''

''صرف اسی قدر کہ دونوں بہن بھائی ہیں اور کچھ

[illegible] نہیں [illegible] بھی ایسی کوئی سرا [illegible] جانے کا موقع ملا [illegible] دوبارہ پوچھا۔

''اور...'' کمیل دادا کے منہ سے نکلا۔ ''[illegible] زر، زن، زمین کے معاملات میں سگے رشتے بھی دشمن ہو جاتے ہیں... مگر ممتاز خان اور بیگم صاحب... آپس میں سوتیلے بہن بھائی ہیں مگر ممتاز خان تو اسے اپنی سوتیلی بہن بھی نہیں مانتا۔ وہ سرے سے اپنی بہن ہی نہیں تسلیم کرتا۔''

اسی دوران کمیل دادا نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی آن کر دیا۔ حسب توقع مختلف ٹی وی چینلز پر بار بار مذکورہ اسپتال کے سنسنی خیز واقعے کی [illegible] دکھائی جا رہی تھیں اور شاید یہ سلسلہ کئی [illegible] سے ہی جاری [illegible] نشر و اشاعت میں کمی آ گئی تھی۔ مگر وقفے وقفے [illegible] دکھائی جا رہی تھی۔ ایک اینکر پرسن اور سینئر تجزیہ کار اس پر [illegible] مباحثہ بھی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ نیچ ان کے [illegible] جس میں جنگی خان کو میں نے ممتاز خان کے [illegible] ہرکارے کی حیثیت سے بے نقاب کیا تھا [illegible] کے ساتھ تاریخ والے تازہ ترین واقعات پر بھی [illegible] دکھائی جا رہی تھی۔

کمیل دادا نے ٹی وی کی آواز آہستہ کر دی۔ مجھے اول خیر [illegible] سے اظہار بھی کیا۔

''[illegible] جانے اول خیر کا کیا ہوا...؟ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟ ابھی تک اس سے رابطہ کرنے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہمارے پاس [illegible] وہ خود ہم سے رابطہ کر کے بتا سکے کہ...''

''وہ یہاں کے نمبر پر رابطہ کر سکتا ہے۔'' کمیل دادا میری بات کاٹ کر بولا۔ ''میرے خیال میں [illegible] سے متعلق اطلاع دینی چاہیے تھی۔''

[illegible] ''میں نے فکرمندی سے لہجے میں [illegible] تو کمیل دادا [illegible] سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''آؤ... ذرا اس [illegible] کی خبر لیتے ہیں۔ یہی ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔'' اس کا اشارہ تہ خانے میں موجود جنگی خان کی طرف تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں تازہ دم ہو کر نیچے آ گئے۔

جنگی خان کو ہوش آ چکا تھا۔ اس کے [illegible] بندھے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ زہرخندی کے ساتھ [illegible]

''مجھے اس طرح بے بس کر کے تم دونوں کسی خوش فہمی میں مت رہنا... کیونکہ جنگی خان ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جیتا ہے۔'' اس کے پرغرور لہجے کی حمایت نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی اور میں دانت پیس کر ترکی بہ ترکی اس سے بولا۔

''... تم نے بالکل ٹھیک کہا... حرام کے جنے... اس لیے کہ تم جیسے زرخرید کتے مرتے ہی رہتے ہیں سڑکوں پر... اس لیے موت بھی تمہاری خباثتوں کا علاج نہیں، لیکن تمہاری موت کو تمہارے لیے بھیک بنا دوں گا... جنگلی کتے...''

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ صاف لگتا تھا وہ میرے اندر کے کھولتے ہوئے ابال اور ایک بے نام سی بے بسی کو بھانپ کر حظ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یقیناً چوہدری ممتاز خان کا ایک تربیت یافتہ اور بہت سدھایا ہوا کتا تھا۔ کھل کر... بڑی دلیری سے بھونک رہا تھا۔ اس بار کمیل دادا نے ایک کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ہمیں بیگم صاحب کے بارے میں تم سے کچھ پوچھنا ہے... بتا دو تو ایک رعایت تمہیں مل جائے گی کہ تمہاری موت آسان کر دی جائے گی۔''

''بیگم صاحب کو تم اب بھول جاؤ کمیل دادا!'' وہ انتہائی خون رنگ لہجے میں بولا۔ ''تم سب کا سورج اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو چکا ہے۔'' میں نے طیش کے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اور اپنے بوٹ کی ٹھوکر اس کے چہرے پر مار کے غرایا۔

''خبیث کتے! سورج ازل سے غروب ہو کے طلوع ہوتا آ رہا ہے۔ صرف تم جیسے کتوں کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ جایا کرتا ہے... مجھے بھی تمہارے منہ سے بہت کچھ اگلوانا ہے۔''

میرے بھاری بوٹ کی ٹھوکر سے اس کی باچھیں پھٹ گئیں... اور وہاں سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں... مگر وہ [illegible] ہنوز دستور زہرخند انداز میں مسکرا رہا اور میرے اندر کی خوفناک آتش انتقام کو مزید بھڑکا رہا۔ ایسے میں یکلخت میرے ذہن میں بجلی کے سے ایک خیال ابھرا۔ اس خبیث کو اچھی طرح... بالخصوص میرے اندر سلگتی بھڑکتی آتش انتقام کا اندازہ ہوگا اور شاید اسی لیے یہ خبیث مجھے طیش دلا کر اکسانا چاہتا ہے کہ میں جلدی سے اسے موت کی نیند سلا دوں۔

کمیل دادا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ کمرے کی دیوار کے ساتھ پہیوں والی ایک میز رکھی تھی۔ جس کے چوبی تختے کے سرے پر لوہے کی ''ٹونگ'' نصب تھی۔ یہ آلہ [illegible] کے کام آتا ہے جو عموماً لیتھ مشینوں کے کاریگروں کے زیر استعمال ہوتی ہے۔

میں کھیل دادا کا اشارہ سمجھ گیا اور بونگ کا ایک لمحہ تیزی سے گھماتا چلا گیا۔ بونگ کے وہ آہنی سرے جو پہلے آپس میں ملے ہوئے تھے، وہ کھلنے لگے۔ ایک خاص حد تک انہیں کھول کر میں نے کھیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے جھک کر جنگی خان کو کسی بکرے کی طرح ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا۔ پھر میں نے بھی اس کی مدد کی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کا گریبان پکڑ کر نصف دھڑ تک اسے اوپر اٹھایا کہ اس کا بایاں بازو بونگ کے کھلے ہوئے دونوں سروں کے درمیان اٹک جائے۔ اس کے بعد دوسرے ہاتھ سے میں نے بسرعت لیور گھما کر جنگی خان کا بازو پھنسا دیا۔ اب وہ ایک بازو کے سہارے پر [illegible] پنجوں پر جھول رہا تھا... میں نے غور کیا۔ وہ تھوڑا [illegible]۔ تب پتا چلا کہ وہ چیخنے کی کوشش کر رہا تھا [illegible] ہذیانی قہقہہ اس کے حلق سے بلند ہوا تھا۔ وہ ہمارے بس میں تھا۔ ہمارے رحم و کرم پر تھا مگر مسلسل ہماری اس طرح کی دھجیاں اڑا رہا تھا اور ہماری سعی کو ہماری خوش فہمی قرار دے رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ زبردست قوت برداشت کا حامل بھی محسوس ہو رہا تھا۔

کھیل دادا نے لیور کو آہستہ آہستہ گھما کر اس کا بازو اچھی طرح کس دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مزید کون سا حربہ تشدد کے طور پر جنگی خان پر آزمانا چاہتا ہے؟

کھیل دادا نے مجھے دیوار پر جھولتی ایک مخصوص ساخت کی ہتھوڑی اٹھانے کو کہا۔ اس ہتھوڑی کے پچھلے سرے پر سکرو کسنے والے تین کانٹے دار کھانچے بنے ہوئے تھے۔ کھیل دادا نے اس سرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ہتھوڑی کے پچھلے سرے کو جب تم زور سے اس کے آہنی کھانچے میں جکڑے ہوئے بازو کی کہنی پر مارو گے تو پل بھر میں اس کی نہ صرف کہنی کی ہڈی چکنا چور ہو جائے گی بلکہ اس کے ناپاک وجود کو بھی سر سے پاؤں تک ایک ایسا کرنٹ دوڑا دے گی جس کی اذیت اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ اس کے بعد جب تک یہ اپنا منہ نہیں کھولے گا اس کی ہر ہڈی کے جوڑ کے ساتھ یہی عمل ہوتا رہے گا۔"

کھیل دادا کی بات درست تھی... اس کا تجربہ مجھے بھی تھا۔ بازو کی کہنی پر ذرا سی بھی چوٹ لگتی تو پورے بدن کو ایک جھٹکا لگتا تھا جیسے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ہتھوڑی تھامے میں جب جنگی خان کی طرف بڑھا تو اس پر کھیل دادا کی بات کا منطقی اثر ہوا تھا۔ وہ اپنی جانب خون خوار سی نظروں سے گھورنے اور سنسنانے لگا تھا... جس نے میرے دماغ میں آگ سی بھر دی۔ میں نے جوش میں آ کر ابھی ہتھوڑی والا اپنا ہاتھ سر سے بلند کیا تھا کہ جنگی چیخ کر بولا۔

"ٹھہر جاؤ شہزی..."

میرا ہتھوڑی والا ہاتھ سر سے بلند ہی رہ گیا۔ کھیل دادا کے چہرے پر فتح مندی کی مسکراہٹ ابھری۔ میں پہلے ہی سمجھا تھا کہ جنگی خان کی ساری اکڑ فوں نکل گئی ہے مگر دوسرے ہی لمحے اس کی غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری۔ اس میں بزدلی یا شکست خوردگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

"تم ایک باپ کی اولاد ہو تو میرے سامنے آ کر مقابلہ کرو... شہزی! تم میرے [illegible] اس طرح کی حرکت تمہیں زیب نہیں دیتی... تم نے [illegible] تو میرا وعدہ ہے جو پوچھو گے سچ سچ بتا دوں [illegible] چاہے مجھے [illegible]"

[illegible] کوئی بہتر جانتا تھا کہ وہ میری [illegible] میرے لیے [illegible] اور میری شناخت کس قدر اہمیت رکھتی تھی۔ یہ وہ ناقابلِ تلافی فقدان تھا جو آنکڑے کی طرح ازل سے میرے سینے میں اٹکا ہوا [illegible] اور میں خود کو شرمندہ اور جھوٹا محسوس کرتا آیا تھا۔ باپ [illegible] بیٹے کا مان اور باپ کا فخر و غرور... جنہوں نے مجھے آپ اپنی خود سے دھتکار دیا، خود سے جدا کر دیا... جب [illegible] "باپ" کے عنوان سے آشنا ہوا تھا۔ جنگی خان نے [illegible] کمزور رگ کو چھیڑ رہا تھا اور میں چند ثانیوں کے لیے [illegible] اپنے گرد و پیش سے ہی بے خبر ہو گیا تھا۔

جنگی میرے لیے قابل نفرین شخص تھا۔ اس کی [illegible] ناپاک شکل پر جب بھی میری نظریں پڑتیں تو آسیہ کا چہرا میرے چشم تصور میں گردش کرتا رہتا۔ عابدہ کو بھی [illegible] کرنے کا اس نے ناقابل تلافی جرم کیا تھا۔ ایسے بدترین دشمن سے دوبدو مقابلے کی تو میری بھی خواہش تھی۔ اب اس نے مجھ سے چیلنج کے انداز میں یہ بات کہی تو اس [illegible] جیسے میرے جوش جنوں میں تیزی کو دوچند تر کر دیا تھا۔ اس [illegible] گھمنڈ اس کا غرور توڑ کر خاک چٹانا اب میرا مقصد ہو گیا تھا۔

یکلخت میں نے بونگ کے لیور پر ہاتھ مارا اور اسے الٹا گھما دیا۔ جنگی خان کا بازو آزاد ہو گیا۔ اس کا [illegible] چھڑانے سے پہلے کھیل دادا اس کے دونوں ہاتھوں کی [illegible] پہلے ہی کاٹ چکا تھا۔ باقی ڈوروں کی رسی میں نے [illegible]

[illegible] جنگی خان اب ہاتھوں پیروں سے آزاد ہو چکا تھا اور [illegible] اپنی آنکھوں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے اسے [illegible] یہ توقع نہ تھی۔ کھیل دادا نے اگرچہ اس درمیان [illegible] روکنے کی سعی چاہی تھی مگر میں نے اسے خاموشی [illegible] ایک طرف کھڑے رہنے کا کہہ دیا تھا۔

"اب کیا کہتے ہو جنگی خان؟" میں نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ پاؤں پھیلا کر تن کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی جیسے یک دم لڑنے کی غرض سے پوزیشن لے [illegible] ہو گیا۔

بلاشبہ جنگی خان کا قد مجھ سے برابر رہا ہوا تھا۔ مگر اس کی جسامت کسی موٹی کھال والے گینڈے جیسی ہی تھی، جبکہ میں سرتی جسم کا مالک تھا۔ میری مونچھوں کی بناوٹ بھی [illegible] اسٹائل کی تھی اور سر کے گھنے گھنگریالے بالوں سے کانوں [illegible] قلمیں میں نے خاصی بڑھا رکھی تھیں۔ میں اس وقت چست... بلیک جینز اور لائٹ کلر کی ٹی شرٹ میں [illegible] جنگی خان کے موٹے ہونٹوں پر صرف ایک لمحے کے لیے بڑی بھیانک مسکراہٹ ابھری اور آنکھوں میں درندگی کی چمک [illegible] اس نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں اپنی جگہ سے [illegible] نہیں ہوا تھا۔ اس کا بھاری گینڈے جیسا جسم میرے [illegible] آہنی وجود سے ٹکرایا اور میں نے [illegible] اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے دبوچ کر اسی کی جھونک میں اور [illegible] اپنے وجود کی مخصوص حرکت سے کام لیتے ہوئے اسے عقب کی دیوار پر دے مارا۔ وہ وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پلٹا تو میں نے اس کی سیاہ اور پیشانی پر سرخی کا نشان ابھرتے دیکھا۔ [illegible] دیوار سے ٹکرانے کا [illegible] تھا۔ اس بار وہ [illegible] میری جانب [illegible] میں نے کھڑے کھڑے اپنی ٹانگ کو [illegible] ٹانگ اس کے پیٹ سے ذرا بلند سینے اور پیٹ کی [illegible] پر پڑی تھی۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ اوغ کی [illegible] کی صورت میں اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ اس کا سر آگے کو جھکا تو دوسری حرکت میرے ہاتھ کے گھونسے نے کی اور اس کا جبڑا ہل کر [illegible] وحشی [illegible] رنگ [illegible] کر ایک آہنی [illegible] سے مشابہ سریا اٹھا لیا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں اپنے ناپاک [illegible] دعوا ہے بڑا غرور ہے۔ اب تم نے لوہے کے اس [illegible] لیا؟" میں نے اس کے غرور پر ایک کاری طنز کا وار [illegible] جس نے اسے بلبلا کر رکھ دیا اور پھر گھورتے ہوئے وہ سریے سمیت مجھ پر پل پڑا۔ اس نے میرے سر پر ضرب لگانی چاہی تو میں نے سر بچاتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے سریے والے ہاتھ کی کلائی دبوچ لی اور دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ میں رسید کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی کلائی بھی موڑ ڈالی۔ تڑخنے کی ہلکی آواز تہ خانے کے محدود ماحول میں ابھری اور ساتھ ہی جنگی خان کی کربناک چیخ بھی۔ سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور جنگی خان بھی خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں [illegible] اپنے ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال پکڑ لیے... اس نے غراتے ہوئے اپنے سر کی ٹکر میری ناف سے ذرا نیچے رسید کر دی۔ میں اسے خاصا مضروب کر چکا تھا لہٰذا مجھے اس کی طرف سے ایسی جارحانہ حرکت کی امید کم ہی تھی۔ اس لیے میں تھوڑا مار کھا گیا... ٹکر خاصی زوردار ثابت ہوئی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ وہ غراتا ہوا اپنے قدموں پر اٹھ کر پھر میری طرف لپکا... ادھر میں ابھی اپنی ٹانگوں پر سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس نے دوسرے ہاتھ کا گھونسا میری ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ لڑکھڑانے کے دوران ٹھوڑی پر لگنے والی اس بھرپور ضرب نے میرے قدم فرش سے اکھیڑ دیے۔ میں پشت کے بل گرا۔ کلائی ٹوٹنے کے باعث جنگی خان وحشی سا بن گیا تھا۔ پھر میں نے اسے میز سے کوئی بھاری آہنی شے اٹھاتے دیکھا اور میں نے خود اس کا نشانہ بنتے ہوئے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اٹھنے کی کوشش کی تھی کہ اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک اوزار چکا تھا۔ اس نے میری طرف کھینچ مارا۔ میں اگر بروقت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے نہیں جھک جاتا تو یقیناً بھاری لوہے کا وہ ٹکڑا میرے سر یا چہرے سے ضرور ٹکراتا۔ "نشانہ چوک گیا" کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی، میں نے [illegible] ہی اسے دبوچ لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ [illegible] کی طرح بھڑ گئے۔

کھیل دادا ایک طرف کھڑا سینے پر ہاتھ باندھے، یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی دلچسپی کی چمک محسوس ہوئی تھی۔ جنگی خان کی کلائی ٹوٹنے پر اس کی انتہائی کوشش تھی کہ وہ مجھے بھی ایسا کوئی کاری وار جواب میں ضرور دے... یہی سبب تھا کہ مجھ سے لڑنے کے دوران اس کی خوف ناک نظریں بھی تیزی سے تہ خانے میں موجود ٹارچر کے لیے استعمال ہونے والے مختلف اوزاروں کو تلاش کر رہی تھیں مگر اب میں اسے ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا اس جنگ کا خاتمہ میں نے مزید چند منٹوں کے اندر اندر اسے پیٹ کے بل فرش بوس کر کے کیا۔ اس کے دونوں

ہاتھ میں نے پشت کی طرف موڑ کے رسی سے جکڑ ڈالے۔ اور پھر اسے فرش پر کمر کے بل لٹا دیا۔ پھر گھٹنے موڑ کر اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ "میں اجنگی خان... میں نے تجھے تیری اوقات دکھا دی۔ اب تو اپنا وعدہ پورا کر... ہم نے تیرے ساتھ بہت وقت ضائع کر لیا۔"

میں نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر کہا تو وہ ہذیانی قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔ "میں نے اگر بتا بھی دیا تو تم کون سا تیر مار لو گے؟"

"اپنا منہ کھولو... پہیلیاں نہ بجھاؤ۔" میں نے بوٹ کا دباؤ اس کی سوکھی سڑی گردن پر بڑھاتے ہوئے غرا کے کہا۔

"بیگم صاحب کی کہانی اب ختم ہونے والی ہے... شہزی!... اور تمہاری بھی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولا۔ میں نے غیض ناک انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ مگر مجھ سے پہلے کمیل دادا کو اس کی ہذیان گوئی پر غصہ آ گیا اور جنونی انداز میں اس نے جنگی خان کو لاتوں، گھونسوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ اس کے سر پر جیسے خونی سودا سوار ہو گیا تھا۔ وہ جنگی خان کو پیٹنے کے دوران مغلظات کی بھی بوچھاڑ کرتا رہا۔ اور اس کے گرو گھنٹال چوہدری ممتاز خان کو بھی اخلاقی سبق سکھانے کے عزم کا بھی اظہار کرتا رہا۔ کمیل دادا ہانپ گیا۔ اس سے جنگی خان کے منہ سے بیگم صاحب کے بارے میں ایسے خرافاتی الفاظ برداشت نہیں ہو سکے تھے۔ وہ مجھ سے بولا۔

"یہ ایسے منہ نہیں کھولے گا... شہزی... اسے اٹھا کر میز پر لٹاؤ۔ پھر دیکھو میں اس [illegible] کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔"

ہم دونوں نے مل کر بہ دقت جنگی کو اٹھا کر میز پر پٹخ دیا... پھر کمیل دادا نے مجھے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے جا کر کرسی پر بیٹھ گیا اور کمیل دادا کو جنگی خان پر تشدد کے گر آزماتے دیکھنے لگا۔ میرے نزدیک یہ سب معمولی نوعیت کے گر تھے۔ جس میں آہنی شکنجے اور ماؤتھ گیج کے اوزار بھی شامل تھے۔ وہ اوزار پلاس کی مدد سے اس کے ہاتھوں پیروں کے ناخنوں کو بھی کھینچ رہا تھا۔ ماؤتھ گیج اس کے منہ میں گھسیڑ کر اس کا منہ پھاڑ ڈالنے کی حد تک کھول ڈالا تھا۔ اور اس کے منہ کے اندر اوپری تالو کو آہنی برے سے چھید رہا تھا۔ غرضیکہ جنگی خان کی حالت پل بھر میں اس نے قابلِ رحم حد تک زبوں کر ڈالی۔ وہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ پانی کے چھینٹے مار کر کمیل دادا اسے دوبارہ ہوش میں لے آیا... مگر جنگی خان نے اپنا منہ نہیں کھولا۔ وہ اذیت تک کرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل بے حس کر ڈالا تھا۔ ہر درد اور اذیت ناک تکلیفوں سے وہ بے نیاز ہو چکا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اکھڑی اکھڑی چل رہی تھیں۔

ناکامی کے احساس سے کمیل دادا کا چہرہ مسخ ہو [illegible] تھا۔ اس کے نتھنوں تیز طیش میں آ کر جب اس نے ایک آہنی برما اس کی گردن میں گھونپنے کا ارادہ کیا تو عین وقت تہ خانے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے [illegible] دروازہ کھولا۔ سامنے ساتھی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فون تھا اور چہرے پر جوش کے سے آثار تھے۔ وہ [illegible] ہوا اور کمیل دادا کی طرف اپنا سیل فون بڑھاتے [illegible] سرگوشیانہ بولا۔ "استاد... چھوٹے استاد اول خیر کا فون [illegible]"

اول خیر کے ذکر پر میں بری طرح چونکا تھا [illegible] دادا نے جھپٹ کر سیل فون لے کر اپنے کان سے لگا [illegible] بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ہاں [illegible] خیر! میں کمیل دادا بول رہا ہوں۔ تم [illegible] کیسی ہیں؟" میری دھڑکتی نظریں کمیل دادا کے چہرے [illegible] تھیں۔ وہ دوسری جانب سے اس کی گفتگو [illegible] سوالات بھی کیے جس نے مجھے [illegible] کے منہ سے دہرانے کے [illegible] ادا ہوئے تھے۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ اول خیر [illegible] تھا۔ میں خود بھی اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔

"تم پھر ابھی تک کیوں [illegible]؟ کہیں [illegible] پہلے ہمیں مطلع کر دینا چاہیے تھا۔ [illegible] خطرناک کام کیسے کر سکتے تھے۔ [illegible] تم... کیا تمہیں احساس نہیں کہ اس طرح تم نے [illegible] مزید خطرے میں ڈال دیا ہے؟"

میں نے کمیل دادا کو غصے سے یہ کہتے سنا۔ [illegible] کی کسی حرکت پر بری طرح برہم ہو رہا تھا اور اس کی بات بھی اب [illegible] نہیں کر رہا تھا۔ پھر اس نے غصے [illegible] فون میرے حوالے کر دیا۔ "تم بات کرو... میں اوپر جا رہا ہوں۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

فون میرے حوالے کر کے اس نے آنے والے [illegible] ہدایت کی کہ جنگی خان کو ہلاک کر کے اس کی لاش ٹھکانے لگا دو۔ مگر میں نے سختی سے اسے یہ کام کرنے سے منع کر دیا۔

"ابھی نہیں، یہ ہماری قید میں ہی ہے۔ اس کی [illegible] کرانے کا بندوبست کرو۔ میرے ذہن میں اس کا [illegible] کھلوانے کا دوسرا طریقہ ہے۔ میں اب وہ اس پر آزمانا چاہتا ہوں۔" میری بات پر کمیل دادا نے حسبِ [illegible] اختلاف کرتے ہوئے مسکرا کر اپنے انداز میں کہا۔

"اب اس کا منہ کھلوانے کی ضرورت نہیں رہی [illegible]

[illegible] ہے ہو؟... اول خیر نے رابطہ کر کے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر دیا ہے۔"

"میں بہرا نہیں ہوں۔ تم تحمل سے بولو۔" میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "میں اس سے آسیہ کی لاش [illegible] کے بارے میں اگلوانا چاہتا ہوں۔ ویسے بھی اس مردود جنگی کا ابھی زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ اب میرا شکار ہے۔ لہٰذا [illegible] پر تم پہرے کا بندوبست کرو۔ میں تب تک اول خیر سے بات کرتا ہوں۔"

کمیل دادا ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچ کر رہ گیا۔ اس وقت اسے جلدی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ نہ الجھ سکا۔ اس نے آنے والے ساتھی کو وہی ہدایت دے ڈالی جو میں نے کی تھی۔ اس کے بعد وہ نکل گیا۔ میں ایک دوسرے کمرے میں آ گیا اور [illegible] سے بات کی۔

میری آواز سن کر وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "او [illegible]... کاکے! تیری آواز سن کر تو مجھ میں نئی جان پڑ گئی۔ کیا [illegible] ہے یہاں؟"

میں نے کہا۔ "اول خیر تم پہلے اپنی بتاؤ۔ کیسے ہو؟ [illegible] بیگم صاحب کا کوئی سراغ ملا؟"

"[illegible]" سے [illegible] ایک [illegible] "سچ" [illegible] کبھی بھی مجھ سے [illegible] "سچ" سے اس کی [illegible]

"آگے بتا... کیا صورتِ حال ہے؟" [illegible] سے پوچھا۔

"میں اس وقت کلاں والی کے ایک نواحی دیہات [illegible] میں ہوں۔ چوہدری ممتاز نے اپنے بکھو [illegible] کا کا اب کچھ لگتا ایسا ہی ہے کہ [illegible] بیگم [illegible] کا چاہتا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے [illegible] بھی نہیں اٹھایا تھا۔ بیگم صاحب اس [illegible]

"کیا بیگم صاحب کی [illegible]" میں نے پوچھا۔

"ابھی تک تو کوئی فوری خطرہ [illegible]" وہ بولا۔ "[illegible] ایک اہم اور بڑے مقصد [illegible] چاہتا ہے۔ [illegible] بیگم صاحب کو کوئی جانی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"کون سا مقصد؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"لمبی کہانی ہے۔ اس کو چھوڑو اور دیکھو کمیل دادا بھی [illegible] میں ملوث ہونے والا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم بھی اس کے ساتھ نکلنا چاہو گے مگر کمیل دادا تمہیں کبھی بھی اپنے ساتھ اس مہم پہ لے کر نہیں نکلے گا۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ بہکا کے... اندر ہی اندر تجھے آنے کی، تو جہاں ہے وہاں آرام سے بیٹھا رہ۔ یہ ہمارا اپنا ایک پرانا سیاپا (مسئلہ) ہے... ہم خود اسے حل کر لیں گے۔ بس تو دعا کرنا۔"

اس کی بات سن کر میں بے چین ہو گیا۔ ایسے حالات میں، میں اول خیر کے ساتھ ہونا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے لیے ہر وقت ایک بھائی اور سچے جاں نثار ساتھی کی طرح پریشان اور فکر مند رہتا تھا تو میں بھی اس کی طرف سے تشویش زدہ رہتا تھا کہ وہ مجھ سے دور ہو کر نہ جانے کس مصیبت کا شکار ہو بیٹھا ہے۔ ہم دونوں کے دل اور دماغ تک... یک ساتھ اور یک غم گساروں کی طرح ایک ساتھ سوچتے تھے، ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں تڑپ کر بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا میرے یار... میں کمیل دادا کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر نہیں مانا تو پھر اپنے طور پر تمہاری طرف نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مگر... کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"نا کاکے... نا... تو نے اس طرف نہیں آنا۔ میں اس وقت جہاں ہوں، ادھر ہر لمحے مجھے موت کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے... کہا نا یہ ہمارا اپنا ایک پرانا معاملہ ہے... جو شاید اب اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب تخت یا تختہ ہوگا۔ یا ہم رہیں گے یا یہ چوہدری ممتاز خان... کیونکہ اس نے بیگم صاحب کو یرغمال بنا کے اپنی قبر کھودی ہے یا پھر..."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر یکدم بولا۔ "اچھا کاکے سب رب راکھا... اپنے یار کی کامیابی کے لیے دعا کرنا... زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ میں خود تجھ سے رابطہ کروں گا... تو اس نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ یہ بھی ممکن ہے دوبارہ اس نمبر پہ میں نہ ملوں... یہ میرا نمبر نہیں ہے۔"

میں اسے پکارتا رہ گیا۔ مگر دوسری جانب سے وہ رابطہ منقطع کر چکا تھا۔ میرے اندر شدید فکر پیدا ہونے لگی۔ نہ جانے اب آگے کیا ہونے جا رہا تھا؟ چوہدری ممتاز نے واقعی ایک انتہائی قدم اٹھایا تھا... بیگم صاحب کو یرغمال بنانا معمولی بات نہ تھی۔ جیسے اول خیر نے بیگم صاحب کا سراغ اتنی جلدی جوکھم میں ڈال کر ہی لگایا ہوگا اور اس کی باتوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ نہ جانے چوہدری ممتاز اور بیگم صاحب کا آپس میں کیا معاملہ تھا؟ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ زمین یا جائیداد کا ہی کوئی جھگڑا ہوگا دونوں بہن بھائیوں کے بیچ... مگر مجھے ایک گہرا اسرار کی وجہ اور بھی محسوس ہوتی تھی اس دشمنی کی... جس کا ابھی مجھے شبہ ہی تھا کہ

شکیل شاہ کا اس میں اہم رول ہو چکا تھا شاید... جو پتا نہیں زندہ بھی تھا یا مر چکا تھا۔ اول خیر کی باتوں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ اس بار بیگم صاحبہ کے آدمیوں اور چوہدری ممتاز کے درمیان گھمسان کا اور فیصلہ کن رن پڑنے والا ہے۔ اور اس میں کئی قیمتی جانوں کے ضیاع کا بھی اندیشہ تھا۔ شاید یہی سبب تھا کہ اول خیر جیسے یار نے مجھے اس موقع اور خوف ناک جنگ سے پرے رکھنا چاہا تھا۔ یہی بات میری سمجھ میں آئی تھی کہ وہ مجھے اس میدان میں جھونکنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں میدانِ کارزار میں ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا۔ خدانخواستہ کسی [illegible] مجھے [illegible] خطرہ رہتا۔ اول خیر کی ہی نہیں بیگم صاحبہ کی جان کو بھی خطرہ تھا۔ اور اول خیر تو میرا یار تھا اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو [illegible] سے زیادہ اول خیر کو چاہ سکتا... اس نے ہی مجھے جینا سکھایا تھا۔ اس نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کس طرح دشمن کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر اس سے نبرد آزما ہوا جاتا ہے۔ اس نے ہی مجھے سکھایا تھا کہ وقت پڑنے پر کیسے ایک سچے جاں نثار دوست، ساتھی اور غمگسار کی طرح اپنی جان کی بھی پروا کیے بغیر دوسرے قابلِ قدر دوست کے کام آیا جاتا ہے۔ کئی ایسے مواقع پہ میری طرف بڑھتی یقینی موت کا رخ اس نے اپنی جانب موڑ لیا تھا اور مجھے زندگی کے راستے پہ ڈالا تھا۔ وہ سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا تھا۔ اور اب وہ خود کو بیگم صاحبہ کی وفاداری میں خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے وہاں آنے سے روک رہا تھا۔ جبکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ میرا واسطہ نوکری کی نوعیت کا ہے... مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی... یا پھر یہ بیگم صاحبہ کی دلکش شخصیت کا سحر تھا کہ اسے ممتاز خان کی قید میں پا کر مجھے بے کلی سے دوچار پا رہا تھا۔ وہ بھی تو میرے کئی ایسے آڑے وقتوں میں کام آتی رہی تھیں۔ اول خیر نے آج تک میرے ساتھ جو بھلائی کی تھی، اس میں کسی نہ کسی زاویے سے بیگم صاحبہ کی ہی پاتھ اور سپورٹ شامل تھی۔

یہ ساری باتیں گزرتے چند لمحوں میں میرے دل و دماغ میں گھوم گئی تھیں... اور مجھے اول خیر سے ایک طرح کا گلہ بھی ہونے لگا کہ اس نے میرے بارے میں اپنے تئیں اندازہ لگا لیا کہ میں اتنا خود غرض ہوں گا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے زندگی اور موت کی اس خون ریز جنگ کو تماشے کے روپ میں دیکھتا رہوں گا۔ یہ ناممکن تھا۔

مجھے افسوس تھا کہ اس نے مجھے اپنے ٹھکانے کی تفصیل نہیں بتائی تھی کہ وہ کہاں تھا... اور بیگم صاحبہ کس کے قبضے میں اور کس جگہ مقید تھیں۔ ان کا یہ فیصلہ کن [illegible] کس مقام پر ہونا متوقع تھا؟ اس نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ [illegible] کو بھی اس مہم میں شامل نہیں کرے گا، اور [illegible] لیے مجھے اس سے الجھنے کی کوئی ضرورت تھی۔ [illegible] مجھے نصیحت کی تھی، اور درست کی تھی۔ شکیل داوا [illegible] اتنی بڑی حیثیت نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ابتدا سے [illegible] صاحبہ سے متعلق ایسی مہمات سے دور رکھنے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ مگر اول خیر کی وجہ سے وہ کامیاب ہو پایا تھا مگر اب اول خیر تھا یہاں نہ بیگم صاحبہ۔ ظاہر ہے بیگم صاحبہ کے بعد شکیل داوا ہی [illegible] ساتھیوں کی کمانڈ کرتا تھا، کیونکہ تنظیم میں اسے "استاد" کی حیثیت حاصل تھی۔

ابھی میں انہی سوچوں میں [illegible] تھا کہ اچانک کمرے میں ایک ساتھی داخل ہوا [illegible] وہ مجھ سے بولا۔

"آپ کو بڑے استاد بلا رہے ہیں... جلدی..." کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں چونکا۔ شکیل داوا کا اس وقت [illegible] ایک خوش آئند امید بھری [illegible] میرا دل زور سے دھڑکا تھا اور میں ایک پل... ضائع کیے بغیر اس کے پیچھے ہو لیا۔ شکیل کے پاس پہنچا تو مجھے [illegible] لگا۔ مجھے اس قدر ان کی جلد [illegible] کی توقع نہ تھی [illegible] پھر سے [illegible] کی [illegible] اور حالات [illegible] محسوس [illegible] کے پہلے سے [illegible] کی وجہ [illegible]

شکیل داوا اپنے کمرے [illegible] ساتھ وہاں موجود تھا اور باقی دو تین [illegible] تنہیں... غالباً بیگم والا میں ہی رہتا تھا۔ ان کے پاس [illegible] کا اسلحہ تھا۔ نائن ایم ایم پستولوں سے لے کر A-K سینتالیس اور اسالٹ رائفل تک تھیں۔ باہر گاڑی میں بھی یقیناً [illegible] ایمونیشن موجود ہوگا۔ ایک [illegible] رائفل اور پستول شکیل داوا نے میری طرف بھی اچھالی۔ اس ہتھیار کی کھنک نے میرے اندر کے پُرجوش [illegible] نوجوان کو انگڑائی لے کر بیدار کر دیا۔

فولادی ہتھیار کا بوجھ محسوس کرتے ہی میرے [illegible] وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑتی چلی گئیں اور میں [illegible] میں شکیل داوا کا مشکور ہونے لگا [illegible] سب سمجھانے کے بعد تحکمانہ انداز میں مجھ سے [illegible]

"شہزی...! اس مہم میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔" اور میں نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ تیز رفتار گاڑیوں اور ایک کار میں ہمارا کارواں بیگم [illegible] سرشام روانہ ہوا تھا اور یہ سفر ملتان روڈ پر تینوں [illegible] قادر پور رانگ ساتھ [illegible] تھیں، اس کے بعد ایک طے [illegible] کے تحت تینوں گاڑیاں الگ ہو گئیں۔ دونوں [illegible] ایک ساتھ [illegible] جانب قادر پور کی طرف جانے والی [illegible] سڑک پر مڑ گئی تھیں، آگے جا کر ان دونوں نے بھی [illegible] ایک راہ پکڑ لی تھی۔ دونوں کا ٹارگٹ ایک [illegible] انہیں [illegible] پہنچنا تھا جبکہ میری اور شکیل داوا [illegible] کی [illegible] ساتھیوں [illegible] وہاں ہم نے وزیر جان نامی [illegible] آدمی [illegible] تھا۔

شکیل داوا نے مجھے ساری تفصیل دورانِ سفر کار میں [illegible] تھی۔ کار میں ہم صرف چار افراد تھے۔ ڈرائیور اس [illegible] میں ہمارا ماجد نامی ساتھی، اگلی سیٹ پہ میں اور [illegible] ساتھ بیٹھے تھے۔

اول خیر سے حاصل شدہ صراحت کے مطابق چوہدری [illegible] کے جواں سال بیٹے فرخ کی حادثاتی موت [illegible] کی [illegible] بیگم صاحبہ اور مجھ پر ڈالتے ہوئے ممتاز خان نے [illegible] اقدام پر عمل کرنے [illegible] الف خان کی اچانک طبعی موت بھی [illegible] کی گفتگو کے مطابق مجھے یہی [illegible] خان اور بیگم صاحبہ کا [illegible] زندہ تھا [illegible] نے ایک [illegible] خلاف کوئی انتہائی [illegible] نہیں کی [illegible] جب بیگم صاحبہ باپ کی [illegible] شکیل داوا کے ساتھ [illegible] ہو گیا۔ بیگم صاحبہ سے پہلے یہ اطلاع [illegible] خان [illegible] تھی۔ مگر وہ اس سے پہلے ہی اپنے مقرب خاص [illegible] خان کو [illegible] صاحبہ کے پیچھے لگا چکا تھا۔ جس نے [illegible] بیگم صاحبہ کی کار پہ کامیاب [illegible] مگر [illegible] تھا۔ ممتاز [illegible] بیگم صاحبہ کے [illegible] اغوا کر کے جانے [illegible] ایسا کیا ہوا تھا کہ اسے [illegible] طے شدہ منصوبے کے تحت [illegible] صاحبہ کو [illegible] غائب [illegible] اول خیر نے [illegible] "غائب" کا پتا لگانے [illegible] جلد اقبال عرف بابن ڈکیت کا نام سامنے [illegible] ایک مشترکہ کارندہ وزیر جان [illegible] میں آ چکا تھا۔ شکیل [illegible] کہ اس نے پھر اپنا [illegible] دی پہنانا پیش پا چکا تھا... مگر بابن ڈکیت کا وزیر جان سے طلب ابھی تک الجھن کا باعث تھا اور میرے لیے تو زیادہ حیرت، الجھن کا باعث تھا۔ کیونکہ میں پہلے ہی سے ان دونوں ناموں سے آشنا تھا۔ ریٹائرڈ فورس کے میجر ریاض باجوہ کی زبانی میں نے ان دونوں افراد کا تذکرہ سنا تھا۔ مگر انہوں نے مجھے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے بیچ ہونے والی جس [illegible] کی کہانی سنائی تھی، وہ موجودہ حالات کے تناظر میں کسی طرح بھی میرے نزدیک "فٹ" نہیں ہو رہی تھی۔ کیونکہ بقول میجر صاحب کے وزیر جان اور بابن ڈکیت کے درمیان ایک خفیہ "فصل" تھی جس کی بابن ڈکیت کے سامنے تو کوئی اہمیت نہ تھی، مگر وزیر جان کے لیے بابن ڈکیت بہت خاص حیثیت رکھتا تھا... جس کی تفصیل میجر ریاض باجوہ مجھے پچھلے لاہور میں [illegible] ملاقات میں بتا چکے تھے۔ اور وہ میرے ذہن میں محفوظ تھی۔ سب سے بڑی بات میرے ذہن میں آتی تھی کہ آخر بعد میں ایسی کیا وجہ ہوئی تھی کہ وزیر جان نے بابن ڈکیت کو بالآخر [illegible] پہ دست کر دیا تھا۔ ایک اور بات پر مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں کے اس خفیہ گٹھ جوڑ سے "پاور" والے کیوں کر ابھی تک لاعلم تھے؟ جبکہ بقول میجر صاحب کے وہ وزیر جان کی اپنی تیسری آنکھ سے مکمل ریکی کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں کئی سوالات اور بھی میرے ذہن میں آ رہے تھے... مگر سر دست شکیل داوا کی تازہ ترین جاری مہم کے حوالے سے یہ بھی کہ ایک خاص مقصد کے لیے ممتاز خان نے بھی وزیر جان سے پینگیں بڑھائی تھیں۔ ان کی معلومات کے مطابق وزیر جان، ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان مرحوم کا قریبی دوست بھی رہ چکا تھا۔ مگر بعد میں وہ دوستی پھیکی پڑنے لگی تھی۔ تاہم اب اچانک ممتاز خان نے اپنے باپ کے [illegible] مراسم بڑھانے شروع کر دیے تھے تو اس میں کوئی [illegible]... کوئی گہرا راز۔ جبکہ میری اپنی ذاتی معلومات کے مطابق جو میجر باجوہ صاحب سے حاصل کردہ تھیں یہ باتیں میں بابن ڈکیت ممتاز خان کا بھی آدمی ہو چکا تھا۔ تو گویا اول خیر کی بات بھی درست تھی کہ ممتاز خان اپنے مخصوص و مذموم مقاصد کی خاطر پرانے مہروں کو بھی [illegible] پہ لا رہا تھا۔ وہ مفادات کیا تھے؟ یہ سب ابھی اندھیرے میں تھا۔

بہر طور... قصہ یہ تھا کہ بیگم صاحبہ کی بازیابی کے لیے اول خیر نے سر توڑ کوشش کی تھی... مگر ابھی تک وہ اس بات کا پتا نہ چلا سکا تھا کہ اسے یرغمال بنا کر کس مقصد کے لیے اور کہاں پر رکھا گیا تھا۔ تاہم اول خیر نے اتنا ضرور پتا چلا لیا تھا کہ اسے چک نواں کے کسی آس پاس دیہات میں رکھا گیا

ہے۔ وہ بابن ڈکیت کی حویلی میں تھی۔ نیز وزیر جان کے آدمیوں کی، بابن ڈکیت کو مکمل سپورٹ حاصل تھی جبکہ ممتاز خان خود بھی وہیں تھا۔

جنگی خان کو ممتاز خان نے بیگم ولا کی دیگر سرگرمیوں پر نظر رکھنے پر مامور کر دیا تھا۔۔۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا کہ کمیل دادا مرا نہیں بلکہ زخمی ہوا تھا تو اس نے اپنے چند مسلح ساتھیوں کے ساتھ مذکورہ اسپتال میں دھاوا بول دیا تھا۔ مگر میری وجہ سے جنگی خان بری طرح ناکام ہو کر خاک چاٹنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

چنانچہ اب بیگم صاحبہ کے اغوا اور یرغمال بنانے والے کرتوت کا ماسٹر مائنڈ وزیر جان کو ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اول خیر کی کمیل دادا کو فراہم کردہ مستند معلومات بھی [illegible] تھیں۔ یہی سبب تھا کہ اول خیر کی معلومات کے مطابق کمیل دادا نے اپنی اس اہم ترین فیصلہ کن مہم کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا تھا۔ اپنے ساتھی اول خیر کی طرف روانہ کر دیے تھے [illegible] انہوں نے بابن ڈکیت پر حملہ کرنا تھا۔۔۔ اور دوسرے مرحلے میں ہم نے وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

ہم نے سب سے پہلے وزیر جان کی رہائش گاہ "کنال لاج" پر شب خون مار کر وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنا تھے اور بیگم صاحبہ کی باعزت بازیابی کے لیے اسے تختۂ مشق بنانا تھا۔

کمیل دادا کو ابھی میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ میں پہلے سے ہی وزیر جان اور چودھری اقبال عرف بابن ڈکیت کے ناموں اور حیثیت سے واقف ہوں۔

ہم رات سے پہلے ساہیوال پہنچ چکے تھے۔ شہر کے ایک پوش علاقے میں وزیر جان کی محل نما کوٹھی "کنال لاج" عین وسط میں واقع تھی اور جس بلاک میں تھی اس طرف جانے والے راستے پر بھی وردی پوش مگر بظاہر غیر مسلح چوکیدار نما گارڈ نظر آتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بلاک میں اعلیٰ سرکاری افسر اور ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے چیدہ چیدہ کاروباری شخصیات کی رہائش گاہیں تھیں۔ اور ذاتی پروٹیکشن کی خاطر انہوں نے اپنی سکیورٹی بھی الرٹ کر رکھی تھی۔ گویا کنال لاج میں داخلے کی تو دور کی بات تھی۔۔۔ پہلے مذکورہ بلاک میں داخل ہونے کی کوئی تدبیر کرنا تھی۔

ہم ساہیوال پہنچ کر ایک ہائی فائی ریسٹورنٹ کے فیملی ہال میں موجود تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ہم ایک چکر وہاں کا لگا چکے تھے اور جائزہ بھی لے چکے تھے۔

میں نے کمیل دادا کو تجویز دیتے ہوئے کہا۔ "دادا میرا خیال کنال لاج میں نقب لگانے کا رسک [illegible] ہم وزیر جان کو باہر سے ہی یرغمال بنانے کی کو[illegible] اپنا مقصد جلد حاصل کر سکتے ہیں۔"

"نہیں۔" اس نے میری تجویز سے [illegible] "یہ لمبا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ پورے ساہیوال [illegible] ڈنکا ہے ہمارے پیچھے پڑ جائے گی، پھر ہمارا یہاں ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ وزیر جان کو یرغمال بنا کر ہم [illegible] لے کر کہاں جائیں گے۔"

ماجد میری تجویز سے کچھ اتفاق کرتے [illegible] سے بولا۔ "استاد! ہمیں تھوڑی سی بات پر تھوڑا [illegible] ضرورت ہے۔ ہم وزیر جان کو اٹھوا کر کے [illegible] طرف نکل سکتے ہیں، کیونکہ [illegible] حویلی اس [illegible] ہے۔ چھوٹے استاد (اول خیر) نے وہاں اپنے ٹھکانے کا بندوبست تو کر رکھا تھا۔" [illegible]

[illegible] میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہارے ذہن میں کیا لائحہ عمل ہے؟"

"[illegible] رہائش گاہ میں ہی [illegible] جائے۔ [illegible] کے ذریعے اس سے [illegible] بیگم صاحبہ کے بارے میں اگلوایا جائے۔ ہمیں [illegible] وہاں گزارنا ہوں گے [illegible] اور یہاں بلانے پر مجبور کرتے [illegible] گے۔"

میں نے غور کرنے والے انداز میں [illegible] دیکھا۔ تجویز بری نہ تھی۔

بالآخر طے پایا کہ مذکورہ بلاک [illegible] ہم کار چھوڑ کر [illegible] میں اور [illegible] لاج کی طرف بڑھیں گے، جبکہ ہمارے باقی دو ساتھی ڈرائیو کار میں ہی ہماری کسی فوری ہدایت کے منتظر رہیں گے۔

پھر ایسا ہی کیا گیا۔ اس وقت گزاری [illegible] گہرے ہونے تک ہم نے کچھ کھایا پیا۔۔۔ [illegible] روانہ ہو گئے۔

مذکورہ بلاک کے جس خصوصی راستے پر [illegible] گارڈ کھڑے تھے، اس کے عقب میں [illegible] خالی پڑے تھے۔ جدھر جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا [illegible] راستہ ایک سپاٹ دیوار سے بند کیا گیا تھا۔ [illegible] اس سمت میں آئے تو ایک زیر تعمیر شدہ کوٹھی کا [illegible] دکھائی دیا۔ جو کنال لاج کی عقبی دیوار سے متصل [illegible] جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ مذکورہ کوٹھی کی کنسٹرکشن جاری تھی اور آخری مراحل پر تھی۔ یہ خالی تھی، [illegible]

[illegible] تھی کہ اس کے ایک سے زائد چوکیدار موجود ہو سکتے تھے مگر ہمیں تسلی تھی کہ وہ ایک متصل زیر کنسٹرکشن عمارت [illegible] کس قدر "چوکس" ہو سکتے تھے۔ اس کی چھت بالکل [illegible] کنال لاج [illegible] کی سامنے آسانی [illegible] نقب زنی کا مختصر ضروری سامان موجود تھا۔

[illegible] رات کے بارہ بج چکے تھے۔ آسمان روشن تھا۔ آخری [illegible] کا چاند کہیں پر سے جھکا ہوا تھا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ سے [illegible] بیابان پلاٹ پر موجود کھڑے ہوئے تھے۔ اس سے باہر سڑک کی [illegible] کھلا میدان تھا۔ وہاں سے آتی ہوئی [illegible] ہوا سائیں سائیں کی آواز پیدا کر رہی تھی۔

ہم دونوں دبے قدموں چلتے ہوئے مطلوبہ کوٹھی کی [illegible] دیوار سے آن لگے۔ یہاں سے ساتھ متصل کنال لاج [illegible] طرف ایک نظر ڈالی۔ یہاں دس فٹ سے زیادہ بلند [illegible] عمارت کھڑی تھی۔ اوپری منزل میں مدھم روشنی کی جھلک [illegible] محسوس ہو رہی تھی۔ اس طرح کی عالیشان کوٹھیوں میں عموماً [illegible] پُرسکون خاموشی پائی جاتی ہے۔ جبکہ ان کا سکیورٹی [illegible] سسٹم [illegible] ہوتا ہے جو اس قدر حساس نوعیت کا ہوتا ہے [illegible] اگر ایک پرندہ بھی کسی اندرونی چھت یا دیوار سے ٹکرا [illegible] تو [illegible] کو اس کی خبر ہو جاتی۔

[illegible] سے سیاہ لباس ہی پہن رکھا [illegible] تاکہ تاریکی [illegible] ایک آنکڑے والی اور رسی [illegible] جس پر ہر ایک گز پر موٹی گرہ باندھی گئی تھی۔ [illegible] کے سہارے [illegible] پہنچا جا سکے۔ بہت ہولے سے آنکڑا اچھال کر دیوار کے [illegible] پر نصب [illegible] آہنی ریلنگوں میں پھنسا دیا [illegible] باری باری اوپر پہنچ گئے۔

[illegible] خالی ہونے کے باعث ہماری فکر میں [illegible] مگر اس وقت یہی پُراسرار [illegible] تحفظ کی ضمانت بھی تھی۔

تب زینے کے دہانے میں، کمیل دادا کی مہارت، [illegible] اور چابک دستی کا مجھے قائل ہونا پڑا تھا۔ حالانکہ میں نے [illegible] بھی یہی کام کرتے دیکھا تھا، مگر [illegible] کمیل دادا کی [illegible] بات ہی کچھ اور تھی۔۔۔ محض اگلے چند منٹوں میں ہم کوٹھی سے [illegible] "بلند منزل" کی بالکونی پر پہنچ چکے تھے۔

[illegible] اندر کا جو نقشہ کھینچا تھا اس سلسلے میں ہماری معلومات [illegible] اول خیر سے جو ممکن ہو سکا تھا، جو ہمارے [illegible] تک پہنچائی گئی تھی۔ وہ ہی [illegible] کافی تھی۔

[illegible] یہ کوٹھی بھی ویران لگ رہی تھی، تاہم ہم ہر قدم [illegible] احتیاط کرتے ہوئے پہلے بالائی منزل کا جائزہ لیتے رہے۔ یہاں چند منٹ گزرے تھے۔ [illegible] زیادہ تھا۔۔۔ ایک بالکونی کے ساتھ، ایک گوشے کی آڑ سے ہم نے نیچے بھی نظر ڈالی تھی۔

سیاہ رنگ کے مین ڈرائنگ گیٹ کے دائیں جانب اندرونی سمت میں گارڈ کیبن نظر آتا تھا۔ درمیان میں چند روشیں تھیں۔ دائیں بائیں وسیع لان تھا، وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے آہنی پائپ نصب تھے کہ جن پر بلب روشن تھے، کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی سنائی دی تھی، پھر خاموشی چھا گئی۔ نیچے پورچ میں دو تین قیمتی بھاری گاڑیاں کھڑی دکھائی دی تھیں۔

مرکزی داخلی دروازہ ساگوان کی لکڑی کا تھا، وہ محراب کی صورت میں تھا۔ ہم نے اوپر سے بیرونی جائزہ لینے کے بعد اندر کا رخ کیا۔ مرکز میں ہال نما کمرہ تھا جہاں سے ایک چکر دار [illegible] ریلنگ والا زینہ نیچے جاتا تھا۔

وزیر جان کا [illegible] اس کی خبر تھی۔ انکا ضرور معلوم تھا کہ اس کی [illegible] ہے۔

ہال کمرے کا دروازہ کمیل دادا نے کھول لیا تھا۔ اندر ماربل کے چکنے سلوپی فرش پر بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا جو خاصا دبیز اور نرم تھا۔ دائیں بائیں کسی اسٹینڈ پر سنگ مرمر کے بڑے بڑے گلدان دھرے تھے۔ کمیل دادا نے پنسل ٹارچ روشن کر رکھی تھی۔ یہاں دو مختصر راہداریاں تھیں۔ ایک سیدھی تھی۔ دوسری درمیانی کمروں سے گزر کر عقبی سمت کی دیوار تک جا کر [illegible] تقسیم ہو کر گھوم رہی تھی۔ یہاں احتیاطاً کمیل دادا نے دو تین کمروں کو کھول کر دیکھا بھی تھا، وہ خالی اور تاریک پڑے ہوئے تھے۔ باقی [illegible] کے دروازے کے نیچے باریک خلا سے تاریکی دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ بھی خالی ہوں گے۔ [illegible] نیچے سے زیرو پاور کے بلب کی روشنی تو ضرور دکھائی دیتی۔

ہم دبے پاؤں نیچے آ گئے۔ یہ ایک اور بڑا ہال تھا۔ یہاں بھی بیش قیمت قالین فرش پر بچھا ہوا تھا۔

یہاں ایک چوڑی راہداری اور دائیں بائیں [illegible] نظر آتی تھیں۔ [illegible] پاور کے دو بلب یہاں بھی روشن تھے۔ گہری خاموشی میں بجلی کی گھرررر۔۔۔ کی آواز سنائی دے رہی تھی، یہ شاید [illegible] کے کمپریسر کی تھی۔

اچانک لائٹ آف ہو گئی۔ ہم دونوں بری طرح ٹھٹک گئے۔ کمیل دادا شاید [illegible] کا شکار ہو گیا تھا کہ آیا پنسل ٹارچ روشن کرے یا نہیں۔۔۔ اچانک لائٹ آ گئی اور

صلہ

جمال دستی

ذہانت اور خوب صورتی خدا کی ودیعت کردہ خوبیاں ہیں... جو اس دولت سے مالامال ہوتے ہیں... وہ اس پر غرور اور فخر بھی محسوس کرتے ہیں... مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ تیسری چیز جذبۂ محبت ہوتی ہے... جو کسی کو بھی اپنا بنا سکتی ہے... اور اس بے بہا دولت کا کوئی متبادل نہیں...

دو بھائیوں سے عدم مساوات پانے والی عداوت اور محبت کی عجیب کتھا...

میرا دوست اسکاٹ اکثر بعض عورتوں کی موجودگی میں بے آرامی محسوس کیا کرتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے ان کے ساتھ برا رویہ اختیار کرتے نہیں دیکھا۔ اس لیے اس عورت سے اس انداز میں بات کرتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا یہاں آنا... بے کار ہی گیا۔" وہ آتش دان کے پاس رکھی آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

جو باقی لالٹین ہی تھی، یعنی زیرو پاور کے بلب نہیں تھے، مگر بلبوں کی روشنی تھی اور ہمارے اردگرد پانچ مسلح افراد ہم پر گنیں تانے کھڑے تھے۔

"خبردار... اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کرلو... ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔"

ایک نسبتاً دراز قامت شخص نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا اور کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ دل کی دھڑکن تیز تر ہوگئی۔

میں نے [illegible] اس کے حکم کی تعمیل کی۔ دو افراد پھرتی کے ساتھ آگے بڑھے اور ہمارے ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم جس جگہ میں آن پہنچے تھے اور ہماری اندر داخلے تک کی کارروائی کسی اسکرین پر دیکھی جا رہی تھی۔

اس کے بعد دراز قامت نے اپنے ایک ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ "باس کو بتا دو جا کر... ہم انہیں ریسٹ روم لے جا رہے ہیں۔"

بڑی عجیب اصطلاح کا استعمال کیا گیا تھا ایک رہائشی جگہ کے لیے۔ ہم دونوں کو جس کشادہ کمرے میں لایا گیا تھا، وہ کسی بھی "ریسٹ" جیسے کا گمان نہیں ہو رہا تھا... بظاہر عام سا کمرا تھا اور برائے نام فرنیچر۔ ہم دونوں کو بیٹھنے نہیں دیا گیا تھا بلکہ سامنے دیوار کی جانب سیدھا کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔

"باس آرہے ہیں۔" ایک نے اندر داخل ہو کے دراز قامت شخص سے کہا۔ باس سے ان کی مراد یقیناً [illegible] خان ہی ہوسکتا تھا۔ پھر دروازہ کھلا۔ قیمتی سلیپنگ ریشمی گاؤن میں ایک شخص بڑے کروفر سے پشت پر ہاتھ رکھے اندر داخل ہوا۔ قد درمیانہ تھا، سر کے بال سفید تھے، چہرہ بھاری تھا، آنکھیں چھوٹی تھیں۔ عمر ساٹھ سے کم نہ تھی، مگر قابلِ رشک صحت نے اسے ساٹھا پاٹھا بنا رکھا تھا۔ وہ جیسے ہی کچھوے جیسے قدم اٹھاتا ہوا ہمارے ذرا قریب آیا تو اچانک جیسے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں سر سے پاؤں تک پتھرا گیا۔ اگر سکتے کی کیفیات اس کو کہتے ہیں جس میں پورا وجود سن ہو کر بے جان محسوس ہونے لگتا ہے مگر آنکھوں سے سب دیکھا اور دماغ سے سمجھا جاتا ہے تو میں بھی سکتے میں ہی آگیا تھا۔ دماغ میں شور کی سی آوازیں سناٹوں کو چٹخنی کیے دے رہی تھیں۔ پورا وجود سائیں سائیں کر رہا تھا۔ دل میں بیک وقت کئی کیفیات تھیں جن سے میں دوچار تھا۔ شناسائی کے ایک ہلکے شائبے اسے دیکھتے رہنے پر ایک مکمل آشنائی کو ظاہر کیا دبے کچلے کے متلاطم بھنور نے گویا ایک طوفانی شکل میں مجھے لپیٹ لیا اور ماضی کے سوا برس پیچھے اطفال گھر میں مجھے پھینک دیا... اور پھر جیسے میری کے سامنے پیش منظر بدل رہا۔ اب میں پس منظر سے دیکھ رہا تھا... جب میرا باپ مجھے یعنی ایک سال کے بچے کو اطفال گھر والوں کے حوالے کر کے تھا، اور میں معصومانہ حیرت اور پریشانی سے باپ دیکھ رہا تھا، اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ابا... یہ کون سی جگہ ہے... مجھے یہاں لائے ہو؟ مجھے کیوں چھوڑ کے جا رہے ہو؟"

تو باپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کر [illegible] آواز میں کہا تھا۔ "بیٹا... اب تو یہیں رہے گا... یہی جگہ بہتر ہے اور سچ بھی کہ تو اب ادھر ہی [illegible] تجھ سے ملنے آتا رہوں گا۔"

وہ افسوس بھی نظر آرہا تھا۔ رکھی بھی مگر اس [illegible] بچے بھی... [illegible] دور کردینے لگا تھا... ماں باپ کی آنکھوں [illegible] اس کے دل کا قرار ہے فکر ہوتی ہے... [illegible] میرے باپ نے ایسا قدم اٹھایا ایک سوال تھا... جس نے برسوں سے بے چین کر رکھا میرے جسم کو ہی نہیں میری روح تک کو جھنجوڑ [illegible] تھا۔ آج اس کڑے سوال کا جواب میرے سامنے [illegible]

میں جب پس منظر سے پیش منظر میں آیا تو [illegible] کیفیت نے مجھ پر غلبہ پایا۔ یہ جوشِ محبت کی یا [illegible] ہم سے صدمے کی مارکی... یا شاید کسی ازلی [illegible] رشتے کے تعلق کا احساس بھرا دباؤ کر مجھے گھیر سا آگیا [illegible] جو تیز دھار خان عرف شیری... آہنی اعصاب اور قد وقامت کا حامل چھ فٹ کا جوان تھا... ماضی کے ایک [illegible] تاک وہاں مسلسل حوالے کی تلوار کے ایک ہی وار سے [illegible] گیا۔ اور گرتے گرتے بھی بھری شہادت کے [illegible] تصدیق ہوگی... جب میں نے اپنے باپ کی آواز [illegible]

"ارے... ہائے کیا ہو گیا ہے... یہ کر رہا..."

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن
جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 9

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب ہاتھوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے... ایسے ہی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سسکتا رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Cop Web

میں بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ میرے حواس معطل ہو گئے تھے۔ جس کا سبب میرے اعصاب کا یکلخت شل ہونا تھا۔ مجھ میں اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی طاقت نہ رہی تھی، دماغ ماؤف سا ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کہ گرنے کا بھی مجھے احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس دوران میں، میں نے اپنے باپ کے یہ الفاظ سنے تھے۔

"ارے... ارے... اسے کیا ہو رہا ہے؟ یہ گر رہا ہے۔"

گویا بصری شہادت کے بعد سماعی تصدیق بھی ہو چکی تھی۔

میں فرش پر بچھے دبیز قالین پر اوندھے منہ پڑا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ ابھی ہوش و خرد کو کچھ پا رہا تھا۔ اس طرح پڑا میں خود کو اپنے یکلخت شل پڑتے اعصاب کو، اپنے منتشر ہوتے دل و دماغ کو سکون پہنچانے کی، اپنے معطل پڑتے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور کافی حد تک کامیاب بھی ہو رہا تھا کہ اب میرے وجود کی طاقت بتدریج مجتمع ہو رہی تھی اور پھر حیرت انگیز طریقے سے میں رسن بستہ ہونے کے باوجود اپنی ٹانگیں اور گھٹنے سکیڑ کر ان کے سہارے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب میں وزیر جان کے سامنے تنا کھڑا تھا جبکہ اس کی ایسی الجھی ہوئی سی نظریں ہنوز میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں، اس کے باقی ساتھی خاموش کھڑے تھے، ان کے بشروں پہ حیرت تھی۔ ہال کمرے کی دم بہ خود خاموشی میں وزیر جان کی کرخت اور چبھتی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ کیا ڈراما تھا تمہارا؟"

میں آنکھیں پھاڑے اس شخص کو تکے جا رہا تھا جو میرا باپ تھا۔ میں اسے پہچان گیا تھا مگر وہ مجھے نہیں پہچان سکا تھا۔ وجہ معقول تھی، وہ اس وقت مکمل مرد تھا جب ایک سات، آٹھ سالہ بچے کو اطفال گھر کے منتظم کے حوالے کر گیا تھا۔ جوان ہونے تک اس آٹھ سالہ بچے کی شکل وصورت کافی حد تک تبدیل ہو جاتی ہے مگر ایک مکمل جوان مرد کے پختہ العمری تک پہنچنے پہ شکل وصورت میں کچھ زیادہ فرق نہیں آتا، ماسوائے بالوں کی ہلکی سفیدی کے، اور پھر آواز تو بالکل بھی نہیں بدلتی، پھر بھلا اپنے باپ کی آواز اور شکل و صورت کو میں کس طرح بھلا سکتا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص کو، جو میرا باپ بھی تھا اور دشمن کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا، کس طرح مخاطب ہوں؟ تب... اچانک میرے اندر کے جوار بھاٹے سے رقت کا ایک طوفان سا مچلا۔ میں نے اس کے چہرے پہ نظریں جمائے ہوئے عجیب اور ڈرامائی انداز میں کہا۔

"ابا! مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟ تم تو مجھے باہر گھمانے پھرانے کے لیے لائے تھے؟"

یہ آج سے پندرہ برس پہلے کا وہ معصومانہ جملہ تھا جو میں آج تک نہیں بھولا تھا اور یقیناً میرے باپ کو بھی اپنے لختِ جگر کی یہ معصومیت بھری آواز نہ بھولی ہوگی یا بھولی ہوگی تو بھی لاشعور سے اچانک ابھر کر یادداشت کے خانے میں جائے گی ضرور... مگر نہیں، بھلا یہ بھی بھولنے والی بات کب تھی؟ ایک باپ جو اپنے لختِ جگر کو خود سے... اپنے ہاتھ کی شفقت بھری انگلی چھڑا کر کسی اور کے حوالے کرتا ہے... وہ یہ سب کیسے بھول سکتا ہے؟ یہی الفاظ تو درحقیقت ہم بچھڑے ہوئے باپ بیٹے کی دوری کے درمیان شناخت کی واحد ڈور تھی جبکہ وہ اس وقت خود بھی مجبور اور دکھی تھا۔

میں نے دوبارہ اپنی یادداشت کھنگال کر ایک جملہ اور دہرایا جو میرے باپ کا ادا کیا ہوا تھا، اسی کے لہجے میں ادا کرنے کی کوشش کی۔

"اب تم یہیں رہو گے... میں تم سے ملنے آتا رہوں گا۔"

ہم دونوں باپ، بیٹے کی نظریں ایک دوسرے کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

میں نے ماضی کے حوالے سے ایک اور جملہ دہرایا کہ اسے پوری طرح ہوش آ جائے۔

"ابا! مجھے یہاں سے لے جاؤ نا... اب میں شرارتیں نہیں کروں گا۔ نئی امی کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔ اب میں شریف بچہ بن گیا ہوں۔"

"میرے بچے! تم گندے کب تھے؟ تم تو اچھے ہو مگر ابھی تم یہ سب نہیں سمجھو گے۔"

بولتے بولتے میری آواز بھرا گئی۔ رقت آمیز جذبات نے میرے پورے وجود کو مرتعش کر ڈالا تھا۔ اسی دوران میں وزیر جان کے کسی کارندے کی "ٹھٹھا" مار کے ہنسنے کی آواز ابھری تھی۔ کسی نے ہولے سے کہا بھی تھا۔

"پاگل ہو گیا ہے شاید۔"

کھیل داوا گم صم کھڑا تھا۔ میں نے وزیر جان کے چہرے کو پڑھنا شروع کیا۔ اس کی آنکھوں کی سختی اور چہرے کی کرختگی یک دم ہوا ہو گئی۔ آنکھوں میں پہلے الجھن تیری پھر اس کی جگہ حیرت آمیز تاثرات نے لے لی۔ وہ بھویں اور آنکھیں سکیڑتا ہوا... چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر میری طرف بڑھنے لگا۔ باپ کو اس طرح اپنی جانب بڑھتے پا کر میرا دل... میرا خون جوش مارنے لگا کہ یہ شاید لہو کی کشش تھی، مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اب کسی وقت بھی بے اختیار خود سے

لپٹا کر زار و زار رو پڑے گا اور میں بھی تو خود اس کے پُرشفیق سینے میں اپنا سر اور منہ رکھ کر آنسوؤں کے آبشار گرا دینا چاہتا تھا کہ آج میں اپنی شناخت پانے والا تھا۔

وہ میرے قریب آ گیا اور بغور میرا چہرہ تکتا رہا۔ اس کی تنگ پیشانی پر سلوٹیں نمودار تھیں۔ یہ مجھے کوئی جذباتی قلبی کیفیت محسوس ہو رہی تھی کہ جس میں دو بچھڑے ہوئے کسی پرانے یادگار گیت کے بول گا کر ایک دوسرے کی پہچان بن جاتے ہیں مگر میں شاید بھول گیا تھا کہ حقیقت اور فلم میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اسے تامل میں مبتلا دیکھ کر میں نے ہی بولنے کی ابتدا کی اور پھٹ پڑا۔

"مجھے پہچان کیوں نہیں لیتے ابا؟ تم ہی تو تھے جو مجھے آج سے پندرہ برس پہلے بے رحمی سے ایک ادارے میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس ادارے کا نام اطفال گھر تھا۔ ابا... ا میں... مم... مجھے پہچانو... میں آپ کا بیٹا... شہزاد احمد ہوں۔" میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ پل کے پل جیسے ماحول کو سانپ نے ڈس لیا۔ کچھ تحیری آواز ابھری تھی۔ یقیناً کھیل داوا ہی تھی... وزیر جان کے کارپرداز بھی چونکے بنا نہ رہ سکے ہوں گے۔

یہ کہنے کے بعد میں نے ایک بار پھر تڑپتی دھڑکتی نظروں سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں شناسائی کے دیے پوری طرح سے روشن ضرور ہوئے تھے لیکن ان میں کسی قسم کی کوئی جذباتی وابستگی کی تڑپ مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

وزیر جان واپس پلٹ گیا۔ اسے یوں... بے حسی کے ساتھ پلٹتا دیکھ کر میرے پورے وجود میں جیسے چیختے ہوئے سناٹے اتر گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے آج دوسری بار میرے باپ نے مجھے "دھتکار" دیا ہو۔ کہاں تو میں یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ وہ مجھے یعنی اپنے گبرو کڑیل جوان بیٹے کو پہچاننے کے بعد ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر بڑے فخر و انبساط سے اپنے سینے سے لگا لے گا۔

وہ واپس اپنی جگہ پہ جا کے رکا اور دوسری طرف رخ کیے کھڑا ہو گیا۔

تب پھر اس اوپن ہال کمرے میں اس کی تحکمانہ آواز ابھری۔

"ان دونوں کو لے جاؤ اور گولی مار کے ختم کر ڈالو۔"

☆☆☆

مجھے اپنی سماعتوں پہ شبہ ہوا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وزیر جان کے اس بے رحمانہ حکم سے پہلے ہی مجھے ان بے رحم لفظوں کی گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیا گیا ہو۔ ایکا ایکی میری جلتی سلگتی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔ مجھے اپنے قدموں تلے کمرے کے فرش پر ایک دراڑ سی ابھرتی نظر آئی جو پھیلتے پھیلتے وزیر جان تک چلی گئی۔ پھر اس دراڑ کا گویا جال سا ہر طرف پھیل گیا اور دیواروں تک جاتا محسوس ہوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

میں اپنی لہو رنگ آنکھوں سے باپ کی شبیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ باپ جس نے آج دوسری بار مجھے دھتکار دیا تھا۔ پہلے خود سے اور اب... دنیا سے دھتکار رہا تھا۔ کیا کوئی باپ اتنا بے حس، بے رحم اور سنگ دل بھی ہو سکتا ہے؟ ایک زبردست شاک تھا جس نے میرے دل و دماغ کو اس بری طرح سے جھنجوڑ... ڈالا تھا کہ میرا تن بدن دہکتا ہوا آتش فشاں بن گیا۔ جو لاوا اگلنے کو بے چین اور پاگل ہو رہا ہو میرے پورے وجود میں لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ میں بیک وقت دکھ اور غضب کی کیفیات سے دوچار تھا۔ اپنے باس کا حکم سنتے ہی اس کے مسلح کارپرداز فوراً حرکت میں آ گئے۔ کھیل داوا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میری نظریں دوسری طرف منہ کیے کھڑے وزیر جان پر جمی ہوئی تھیں۔ دو کارپردازوں نے مجھے دبوچا تو میں حلق کے بل چیخ کر بولا۔

"وزیر جان! گولی مارنے سے پہلے... خدا کے لیے مجھے یہ تو بتا دو کہ تم مجھے پہچان چکے ہو یا نہیں؟ لیکن... یہ بدنصیب بیٹا... تمہیں اپنے باپ کی حیثیت سے ضرور پہچان چکا ہے۔"

مجھے دبوچ کر لے جانے کی کوشش کرنے والے وہ دونوں کارپرداز یک دم اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ کیونکہ مجھ سمیت انہوں نے بھی وزیر جان کے سیدھے ہاتھ کو فضا میں بلند ہوتے دیکھ لیا تھا جو اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ سردست پیش قدمی روک دی جائے... پھر وزیر جان بہت دھیرے دھیرے میری طرف اپنا رخ پھیرنے لگا۔ میری نظریں اس پہ جمی ہوئی تھیں۔ وہ پوری طرح ہماری طرف پلٹ کر کھڑا ہو گیا تو میں اس کے چہرے کو دیکھتے ہی بہت بری طرح ٹھٹکا تھا۔ وہاں مجھے بیک وقت کچھ غیظ، سرخی اور کرب کے تاثرات محسوس ہوئے، مجھے ایک زبردست دھچکا لگا۔ بلاشبہ یہ فیصلہ اس کے لیے... یعنی ایک باپ کے لیے بھی کڑا ثابت ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی بیٹے کے لیے موت کا پروانہ جاری کر چکا تھا۔ آج سے پندرہ سولہ برس پہلے بھی اس کی آنکھوں اور چہرے سے ایسا ہی کرب جھلکتا ہوا مجھے نظر آیا تھا اور... آج بھی یہی کچھ تھا۔

"یاخدا! یہ آخر کیا ماجرا ہے؟ کہیں میں پاگل ہی نہ ہو جاؤں۔" میں بے قرار ہو کر چیخ اٹھا تھا۔

"ہاں... ہاں... میں تمہیں اچھی طرح پہچان چکا ہوں، شہزاد احمد... بہت اچھی طرح پہچان چکا ہوں۔ تمہیں بس..."

دفعتاً وزیر جان چلانے کے انداز میں بولا۔ اس کا لہجہ ہذیانی محسوس ہوتا تھا۔ انداز جھلایا ہوا تھا۔ زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ ماحول ایک بار پھر دم بخود سا ہو گیا۔ میری یک ٹک اور خاموش سی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی میری طرف گھورنے کے انداز میں تکے جا رہا تھا۔ وہ آگے بولا۔

"مگر... تم اس وقت میرے بیٹے نہیں، میرے دشمن ہو... سمجھے تم؟" اس کی بات سن کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کوئی اندر سے میرا دل چھیل رہا ہو۔

"لے جاؤ... دونوں کو..." اس نے پھر حکم صادر کیا۔

باپ بیٹے کا رشتہ کیا ہوتا ہے اور اس رشتے میں شکوک و شبہات کی دراڑ کہاں سے پڑنا شروع ہوتی ہے؟ اس کا ابھی شاید مجھے ادراک نہ تھا۔

اچانک عین اس وقت، جب مجھے اور کمیل دادا کو لے جایا جانے لگا تو اس دراز قامت کارپرداز نے مؤدبانہ انداز میں وزیر جان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"باس! موت تو اب ان دونوں کا مقدر ہے ہی، تو کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ان سے پوچھ گچھ کر لی جائے۔ آخر یہ ہیں کون؟ کس کے آدمی ہیں اور کس کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہاں گھسنے کا آخر مقصد کیا تھا ان کا؟"

میرے مطابق اس کارپرداز نے اپنے باس سے بڑے پتے کی بات کہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر کہ وزیر جان میرا باپ تھا اور مجھے ہی گولی مار دینے کا سفاک حکم دے چکا تھا۔ یہ بات دوسرے لحاظ سے باعث حیرت اور الجھن تھی کہ وہ ہم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کیے بغیر ہی ہمارا صفایا کرنا چاہتا تھا؟ کیوں؟ مجھے وزیر جان کے جواب کا انتظار تھا۔ بالآخر وہ بولا۔

"میں جانتا ہوں... یہ دونوں کون ہیں اور کس کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ان کے یہاں اس طرح گھسنے کا مقصد بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا، میرے لیے شیرا اہم ہیں... فنش ناؤ۔"

وہ یہ کہہ کر دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

فیصلہ کن لمحات کی جاں گسل گھڑیاں موت بن کر میرے اعصاب پر ٹک... ٹک... ٹک کرنے لگیں۔ اپنے سنگ دل و بے حس باپ کا دوسری بار بھی یہ رویہ دیکھ کر میں یعنی ملک شہزاد احمد خان عرف شہزی... جذباتی کمزوری کی اس ہلکی رو سے نکل آیا جو انسان کے پیروں میں مجبوریوں کی بیڑیاں ڈال دیتی ہے۔ وہ شہزی... اب کسی کا بیٹا نہیں، صرف شہزی تھا۔ یاروں کا یار اور دشمنوں کا دشمن... جوش غیظ و غضب کی ایک لہر سی جو سر... سے پاؤں تک میرے اندر سرایت کرتی چلی گئی۔ میرے دونوں ہاتھ رسن بستہ تھے۔ کمیل دادا میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس میدان کا وہ بھی نیا کھلاڑی نہیں تھا۔ مگر یہ سب کچھ اچانک اور بالکل غیر متوقع ہوا تھا کہ ہم یوں آسانی کے ساتھ اس چوہے دان میں پھنس گئے تھے، ہمیں بازوؤں سے دبوچ کر کسی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

چار افراد نے ہم دونوں کو دبوچ رکھا تھا، دراز قامت ساتھی ان کی کمانڈ کر رہا تھا۔ مختلف راہداریوں سے ہمیں گزار کر وہ ایک ایسے کمرے میں لے آئے جس کے دروازے ائیر ٹائٹ محسوس ہوتے تھے گویا یہ کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اور کمیل دادا کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ ہماری پشت دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ چاروں ہم سے کچھ قدموں کے فاصلے پر گنیں تانے کھڑے ہوئے تھے جبکہ ان کا دراز قامت ساتھی، ایک طرف کھڑا ہمیں سفاکانہ مسکراہٹ سے گھورے جا رہا تھا۔

ایسے سفاکانہ منظر میں اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے مگر میں اور کمیل دادا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ شاید کمیل دادا کو اپنی موت کا اندازہ ہو چکا تھا لیکن میرے اندر عجیب سی کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ یہ خوف کی کھلبلی نہیں تھی۔ میری چھٹی حس تھی جو مجھے چیخ چیخ کر کسی انہونی کے ہو جانے کی خبر دے رہی تھی کہ میں اپنے حوصلے پست نہ ہونے دوں کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر اس نے ہماری اس طرح موت لکھی تھی تو ہم خود چل کر اپنی موت کے روبرو پیش ہوئے تھے، وقتِ اجل کبھی نہیں ٹلتا، نہ ایک پل آگے... نہ پیچھے... مگر ہماری قضا ابھی لکھی ہی نہیں گئی تھی۔

اچانک کمرے میں ایک تیز سیٹی کی آواز ابھری۔ ہم سب چونکے... یہ آواز کچھ خاص اطلاع کے موجب ہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ہم پر گنیں تانے کھڑے اور اپنے ساتھی کے اشارے کے منتظر وہ چاروں بیک وقت سر گھما کر اپنے دراز قامت ساتھی کی طرف دیکھنے لگے۔ تیز سیٹی جیسی آواز پر اس کا چہرہ یک دم متغیر ہو گیا تھا۔ چونکے ہم بھی تھے۔ شاید یہ کوئی خطرے کا اشارہ تھا جو ممکن ہے چند مخصوص کمروں تک محدود تھا یا پھر پوری کوٹھی میں پھیلا ہوا تھا کیونکہ دراز قامت کارپرداز تیزی سے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ میری اور کمیل دادا کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چاروں ساتھی بھی چونکے نظر آ رہے تھے۔

ایک موہوم سا خیال پہلے بھی میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ باہر موجود ہمارے دو ساتھی، ہمارے لیے کیا کر سکتے تھے۔ وہ تو خود ہمارے منتظر تھے۔ انہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ ہم اچانک کس مصیبت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور پھر جب تک انہیں پتا چلتا ہم اس دنیا میں ہوتے بھی کہ نہیں پھر وہ دونوں ہماری رہائی کے سلسلے میں کر بھی کیا سکتے تھے۔ بے شک وہ دونوں بھی کمیل دادا اور راول خیر کے زبردست اور تربیت یافتہ تھے مگر کنال لاج میں تو کمیل دادا اور مجھ جیسے بھی چوہے دان میں آن پھنسے تھے کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔

کمرے میں ابھرنے والی تیز سیٹی کی آواز پر خطرے کے کاشن کا گمان ہوتا... محض یہ میرے قیاس کی بات نہیں تھی۔ دراز قامت کا چہرہ اس کی غمازی کرتا نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا پہلا خیال یہی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کنال لاج کے باہر ایک گلی تاریک گوشے میں گاڑی کے اندر موجود ہمارے دونوں ساتھی، ہمارے سلسلے میں خطرے کی بو سونگھ کر کنال لاج کی طرف جارحانہ پیش قدمی تو نہیں کر چکے تھے؟

کارپرداز نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ "زٹ... زٹ" کی دو بار آواز ابھری۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ میرے اور کمیل دادا کے ٹھٹکے ہوئے بشروں پہ سناٹے اتر گئے۔ ادھر وہ چاروں گن بردار اپنے لیڈر کا یہ حشر دیکھ کر ہمیں فراموش کر کے تیزی سے حرکت میں آئے۔ مگر بے سود، دروازے کی آڑ سے دو سے زائد ہتھیار بدست افراد کی جھلک دکھائی دی اور ان کی مہیب نالوں نے اندر جھانکا۔ ان کا رخ ان چاروں گن بردار افراد کی طرف تھا۔ انہیں سنبھلنے یا جوابی فائر کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ جھانکتی نالوں نے یک بیک "زتا زٹ" کی پھنکار اگلی۔ چاروں بے چارے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ مجھے کمیل دادا کے چہرے سے گھبراہٹ آمیز تشویش کی جھلک نمودار ہوتی محسوس ہوئی، شاید وہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ اب کسی وقت ہماری باری بھی آ سکتی تھی۔

وہ چار افراد تھے۔ ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے تھے، ان کے جسموں پر مخصوص لباس دیکھ کر میں بُری طرح ٹھٹکا تھا۔

"پاور۔"

دفعتاً ہی میرے ذہن رسا میں یہ لفظ گونجا تھا کیونکہ میں ان کے ایک "کارندے" کی جھلک پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور کمیل دادا بھی... مگر کمیل دادا انہیں شاید ابھی پہچاننے سے قاصر تھا کہ یہ لوگ "پاور" کے خفیہ ایجنٹ تھے، تاہم پرانے واقعے کے حوالے سے وہ انہیں اب پہچاننے لگا تھا جب اس "دیسی ننجا اسٹائل ٹولے" نے ہمیں جنگی خان اور اس کے ہرکاروں کے قبضے سے چھڑایا تھا۔ یہ سب رینجرز فورس کے سربراہ میجر ریاض باجوہ سے ایک "خفیہ ڈیل" کے تحت طے پایا تھا جس کی بھنک تک کمیل دادا کو نہ تھی۔

بہرحال، ہم دونوں بالکل غیر متوقع طور پر ایک یقینی موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے تھے۔ "پاور" والوں کی یہ سرعت کارروائی کا عمل بڑا فعال اور مربوط تھا۔ تاہم ابھی یہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ لوگ یہاں تک پہنچے کس طرح تھے اور وہ بھی عین وقت پر کہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہم کنال لاج میں مقید ہیں۔ تب میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میجر ریاض باجوہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بابن ڈکیت والے معاملے کے بعد سے وزیر جان کی "ریکی" کر رہے تھے اور کسی وقت بھی اس پر ہاتھ ڈالنے والے تھے، ممکن ہے یہ سب اسی اتفاق کا نتیجہ ہو۔

وہ چاروں بہ سرعت ہماری طرف بڑھے، ہمیشہ کی طرح ان کا انداز میکانکی اور وقتِ مقررہ میں کام یا مشن نمٹانے جیسا تھا۔ اسی سرعت کے ساتھ ان میں سے دو نے ہمارے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھولے۔ ابھی میں ان سے مخاطب ہوا چاہتا تھا کہ اچانک باہر راہداری میں دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔ پھر ایک دو فائر ہوئے۔ میں اور کمیل دادا کچھ گھبرائے اور چونکے ہوئے تھے مگر ان چاروں "ننجا اسٹائل" ٹولے کے افراد کی حرکات و سکنات سے کسی گھبراہٹ یا چونکنے پن کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کا انداز ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ بالکل میکانکی انداز... لگ رہا تھا جیسے کوئی پروگرامنگ سافٹ ویئر... ان کے ہاتھوں میں اسٹیل کی عجیب ساخت پستول اور چھوٹی رائفلیں تھیں، وہی ڈارٹس داغنے والی جو بے ہوش یا اپاہج کر ڈالتی ہیں۔

"نمبر سکس اینڈ تھری... لیفٹس گو اینڈ اچیو دی

ٹارگٹ، پلی ہری۔'' دفعتاً ان میں سے ایک نے مشینی سے انداز میں مگر تحکمانہ کہا۔ شاید یہی انہیں ''لیڈ'' کر رہا تھا۔ وہ دونوں مذکورہ ''تھمبرز'' حرکت میں آ گئے۔ ان کے دو ساتھی بھی تھے۔ لیڈ کرنے والا مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر شہزاد! اگر تمہارا یہاں کوئی اور ساتھی قید نہیں ہے تو تم دونوں فوراً یہاں سے جا سکتے ہو۔''

میں چونکا۔ وہ مجھے جانتا تھا۔ میرے نام سے واقف تھا۔ یقیناً یہ پاور کا وہی ٹولا ہوگا جنہوں نے جنگل خان سے ہمیں آزادی دلائی تھی۔ اس کی بات پر کمیل دادا جیسے چونکتے ہی سر ہلا کے بولا۔ ''نن... نہیں ہمارا کوئی ساتھی ادھر نہیں۔''

میں نے تحمل اور ہوش مندی کا مظاہرہ کیا اور لیڈ کرنے والے سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہمارا کوئی ساتھی تو یہاں نہیں ہے... مگر... وزیر جان ہمارے لیے اہم ہے... ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' میری بات پر اس نے بلا تصدیق و تامل نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر مشینی سے لب و لہجے میں بولا۔

''وہ ہمارا ٹارگٹ ہے۔ اس کے لیے ہم نے آج پورے کنال لاج کو پچھلے کئی گھنٹوں سے ''بگڈ'' کر رکھا تھا۔ تم شاید نہیں جانتے کہ وزیر جان بہت عرصے بعد آج کنال لاج آیا تھا۔ وہ بھی ایک دن کے لیے۔''

''بگڈ'' کے ذکر پر میں چونکا تھا۔ اطفال گھر میں اردو فلموں کے علاوہ ایڈونچرز اور جاسوسی انگریزی فلمیں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ بالخصوص جیمز بونڈ کی فلمیں... ایسی ایک فلم میں، میں نے یہ ''اسپائی'' آلے کا ذکر سنا اور دیکھا تھا میں ٹھٹکا تھا، گویا انہوں نے میرے اور وزیر جان کے درمیان ہونے والی باپ بیٹے کے حوالے سے گفتگو بھی سنی ہوگی۔ تاہم میں نے کہا۔ ''مگر میجر صاحب کے مطابق تم لوگ تو ابھی وزیر جان پر کیا کوئی حملہ کرنے کے ''آرڈرز'' میں نہیں تھے، پھر یہ اچانک...؟''

''تمہاری وجہ سے۔'' اس نے جیسے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہارے سلسلے میں ہمیں پہلے سے ہی بریفنگ دے کر یہ ٹاسک دیا گیا ہے کہ ہر ایسے مشن آف ایکشن میں اپنے آدمیوں کا... بالخصوص تمہارا خیال کرنا ٹارگٹ اچیو کرنے سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔''

مجھے اس کی یہ بات عجیب لگی۔ جو ٹارگٹ سے زیادہ اپنے آدمیوں کی سلامتی کو ترجیح رکھتے تھے یا پھر انہیں خود پہ اتنا یقین کی حد تک بھروسا تھا کہ وہ جب چاہیں اپنا ٹارگٹ ''اچیو'' کر سکنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ کمیل دادا آنکھیں پٹپٹائے کبھی مجھے اور کبھی اس ''وِسکی مارکا'' ٹولے کو تکے جا رہا تھا۔ یقیناً کچھ باتیں ایسی تھیں جو میرے اور ان کے درمیان ہو رہی تھیں وہ کمیل دادا کے لیے سوالیہ طلب تھیں۔ میرا ذہن اس وقت اور حالات کے مطابق بلکہ ہر طرح کی سچوایشن میں تیزی سے کام کرتا تھا۔ میں نے اس کی ایک بات پکڑ لی اور بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں تم سے گزارش کروں گا کہ اپنا یہ ٹارگٹ میرے حوالے کر دو... میں اس سے کچھ پوچھنا بلکہ اگلوانا چاہتا ہوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''بے شک تمہاری شمولیت قابلِ قدر ہے۔ اور ہائر اتھارٹیز تک تمہاری سفارش پہنچ چکی ہے مگر ہماری ایک مخصوص اصطلاح میں تم ابھی ہماری خفیہ ایجنسی ''پاور سروس'' میں ٹیلی پرسن کی حیثیت رکھتے ہو جس کی ابھی کوئی باقاعدہ اور باضابطہ شمولیت یا انٹری نہیں ہوئی ہے جو درخواست یا اپنی کوئی گزارشات پیش کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔''

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کی۔

ٹھیک اسی وقت قدموں کی دھمک ابھری۔ پانچ چھ دیکھتے ہی اندر داخل ہوئے، میں ٹھٹکا۔ انہوں نے وزیر جان کو دبوچ رکھا تھا۔ میں بری طرح الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا کیونکہ یہ ہمارا شکار تھا جسے پھانسنے کے لیے میں اور کمیل دادا اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر یہاں آئے تھے مگر یہی حقیقت تھی کہ ہمیں عین موت کے منہ سے بچانے والے بھی یہی ''پاور'' والے تھے، اب اپنے شکار (وزیر جان) کے حصول کے لیے ان سے ٹکرانا ویسے بھی مناسب نہ تھا۔ ادھر وزیر جان کھا جانے والی نظروں سے ہماری طرف گھورے جا رہا تھا۔ یقیناً وہ پاور والوں کے ہاتھوں بری طرح پھنسا تھا جبکہ وہ ہمیں ان کا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ وہ ایک انتہائی خفیہ اور حساس ادارے ''پاور'' والوں کے قبضے میں ہے جو وطنِ عزیز کو اس جیسی اور ممتاز خان جیسی کالی بھیڑوں کا صفایا کرنے کے لیے اور ایسے ابن الوقت سیاست دانوں کی ریکی اور ان پر نظر رکھنے کے لیے جو اپنے سیاسی مفادات پر وطنِ عزیز کی سلامتی کو بھی قربان کرنے سے نہیں چوکتے تھے، ان کی بیخ کنی کرنے کے لیے کچھ اسپیشل قسم کے ''ماورائے قانون'' اختیارات تفویض کروا کے وجود میں لائی گئی تھی۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے کسی بیماری کے لیے کڑوی گولی نگل جائے۔ بقول میجر باجوہ کہ... پاور والے ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد رہتے تھے۔

کمیل دادا کو بھی ان کی حقیقت و اصلیت کا ابھی علم نہ تھا تاہم اسے اتنا اندازہ تو ضرور ہی ہوگا کہ ان کا تعلق رینجرز لوگوں کے میجر باجوہ سے تھا جو درحقیقت انٹر سروسز میں بھی رہ چکے تھے۔

کسی مجرم کے سامنے ہمیں ایسی کوئی بات کرنے سے سختی کے ساتھ ممانعت تھی جو ''پاور'' والوں کی اصلیت کو ظاہر کرتی تھی، اس لیے میں نے کمیل دادا کو پہلے ہی سرگوشی میں سمجھا دیا تھا۔ خود پاور والے ایک دوسرے کو صرف نمبروں سے مخاطب کرتے تھے۔

''تم لوگ اس کوٹھی سے زندہ نہیں نکل سکتے۔'' معاً وزیر جان کی غراہٹ سے مشابہ زہریلی آواز ابھری۔ وہ ہماری طرف پُرغیظ نظروں سے گھور رہا تھا۔ لیڈ کرنے والے نے اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا، اس نے کمال سرعت وزیر جان کی ہنسلی کی ہڈی کی طرف کی کوئی رگ حساس مسل ڈالی اور دوسرے ہی لمحے وزیر جان ان کے ہاتھوں میں لہرا گیا۔

''ہم شکار لے کر جا رہے ہیں۔ بہتر ہوگا تم بھی جلد سے جلد نکل جاؤ یہاں سے۔'' لیڈ کرنے والے نے ہم سے کہا۔ ''اور ہاں، میجر باجوہ صاحب بہت جلد تم سے رابطہ کرنے والے ہیں۔''

اس کے بعد سات آٹھ افراد کا یہ ٹولا تیزی کے ساتھ باہر کو لپکا۔ جاتے جاتے اس نے ایک اور تنبیہ کی تھی کہ بے ہوش کرنے والی ڈاٹ کا اثر ایک سے دو گھنٹے رہتا ہے لہٰذا ان کے ہوش میں آنے سے پہلے ہمیں کنال لاج سے باہر ہونا چاہیے۔

''یہ لوگ تو ہمارے کاموں میں رخنہ ڈال رہے ہیں شہزی! تمہیں ان کے ساتھ راہ و رسم نہیں بڑھانے چاہیے تھے۔'' ان کے جاتے ہی کمیل دادا نے مجھ سے تیز لہجے میں کہا جبکہ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے میں مستغرق تھا۔

''ان کا اپنا ایک طریقۂ کار ہوتا ہے۔ مت بھولو کہ ہم تھوڑی دیر پہلے یقینی موت کا شکار ہو گئے تھے اور انہی لوگوں نے ہمیں بروقت موت کے چنگل سے نجات دلائی۔''

''اونہہ، اس کا فائدہ کیا ہوا۔ شکار تو پھر بھی وہ لے اڑے ہمارا؟'' کمیل دادا ہمیشہ کی طرح اپنی ہٹ دھرمی دکھانے لگا تو میں نے اس کی طرف تیز نظروں سے تکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''کمیل دادا! تمہیں کبھی کبھی اس طرح بچکانا قسم کی باتیں کرتے دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہی نہیں ہے کہ بیگم صاحبہ کے گروہ میں تم بڑے استاد کہلاتے ہو۔ ابھی ہم نے وزیر جان پر ہاتھ ہی کب ڈالا تھا جو ہم اپنا حق جتاتے؟ الٹا ہم تو خود شکار ہو گئے تھے۔ وہ جن کا شکار تھا وہ ہم پر زندگی کا احسان کر کے اسے لے جا چکے ہیں۔''

مجھے میجر ریاض باجوہ کی بات یاد تھی کہ یہ لوگ وزیر جان کی بہت پہلے سے ریکی کر رہے تھے۔

''مگر اب کیا ہوگا؟ بیگم صاحبہ کا کس سے پتا چلائیں گے؟'' وہ جھلا کر بولا۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ ''ایک بات تو بتاؤ... یہ تمہارا وزیر جان کے ساتھ کیا معاملہ نکل آیا؟ کیا یہ تمہارا واقعی باپ...؟''

''چھوڑو... اس موضوع کو۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''بیگم صاحبہ کے بارے میں پتا چلانے کے لیے ہمارے پاس دوسرا راستہ بھی موجود ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے کمرے کے ایک کونے میں آڑے ترچھے بے ہوش پڑے، اس دراز قامت کارپرداز کو دیکھا جو ہمیں اپنے باس وزیر جان کے حکم کے مطابق اس کمرے میں موت سے ہمکنار کرنے آیا تھا اور اب وہ خود ہمارے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کمیل دادا سے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''مجھے یہ آدمی سرِدست وزیر جان کا بہترین نعم البدل لگتا ہے، وقت ضائع کیے بغیر ہمیں اسے اپنے ساتھ لے چلنا ہوگا۔'' شکر یہ تھا کہ کمیل دادا کو میری بات سمجھ آ گئی تھی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے اس کارپرداز کو جھپٹ کر اٹھا لیا۔

اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری کہ ہم دونوں بُری طرح ٹھٹک گئے۔

☆ ☆ ☆

برسٹ کی آواز تھی۔ اس کے فوراً بعد تلے اوپر فائر ہوئے۔ کمیل دادا جو وزیر جان کے اس دراز قامت مقرب خاص کارندے کو اپنے کاندھے پر ڈالنے کے لیے پر تول رہا تھا، ارادہ بدل کر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''یہ فائرنگ کیسی ہے؟'' میں کیا جواب دیتا۔ مگر میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''فائرنگ کی آواز باہر سے آ رہی ہے، کہیں ایوب اور ماجا تو نہیں... ان لوگوں سے بھڑ گئے ہیں؟''

کمیل دادا نے فوراً خیال ظاہر کیا۔ جبکہ میں ابھی تک اچنبھے کا شکار تھا۔ کیونکہ وہ دونوں پاور کے سات آٹھ

ایجنٹوں سے کیسے بھڑ سکتے تھے، اس کا جواز میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ تاہم وقت اور حالات دگرگوں کی اس لپک جھپک میرے سوچنے کے عمل کو ہمیشہ کی طرح جلا بخشتی تھی۔ میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر سب سے پہلے وہاں بے ہوش پڑے کارندوں کے ہتھیار پر قبضہ جمانے کا کھیل دادا کو اشارہ کیا اور خاص کارندے کی جامہ تلاشی کے بعد اپنے سیل فون بھی تلاش لیے پھر کھیل دادا سے بولا۔

"آؤ... باہر کا جائزہ لیتے ہیں۔ اسے بھی لے چلو۔" میرا اشارہ بے ہوش خاص کارندے کی طرف تھا۔ میں مرکزی دروازے کی طرف پہنچ کر ٹھٹک کر رکا۔ ادھر دو موٹے تازے شکاری کتے ایک معطل حالت میں پڑے نظر آ رہے تھے جبکہ تین مسلح گارڈز بھی اسی حالت میں تھے۔ یہ "مناظر" بیرونی گیٹ کے اندر کے تھے جبکہ یہاں سے مجھے سلائڈنگ ہونے والے سیاہ رنگ کے دونوں گیٹ کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اور باہر کی نقل و حرکت خاصی سنسنی خیز حد تک مشکوک دکھائی دے رہی تھی کہ میرا دل یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ گیٹ سے باہر کا وہ منظر مقدور بھر سہی... لیکن جو نظر آ رہا تھا وہ کوئی اور ہی کہانی کا منظر پیش کر رہا تھا گویا مارا ماری اور چھینا جھپٹی کا سماں تھا۔ پاور کے تین ایجنٹ مجھے خون میں لت پت نظر آئے اور چند ایسے آدمیوں کی جھلک بھی دکھائی دی جن کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں اور خاصے مستعد اور تربیت یافتہ نظر آ رہے تھے۔ گیٹ کے ستونوں پر پوری طرح سے روشن... گلوب کی روشنی میں یہ خون ریز منظر واضح تھا۔ اس وقت میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے یہی منظر بدلتے دیکھا۔ گولیوں کی سمع خراش بوچھاڑ ابھری۔ ان میں سے دو حملہ آور چھلنی ہو کر گرے۔ یقیناً یہ کارروائی پاور کے ایجنٹوں کی تھی۔ گویا ڈاٹ پھینکنے کے علاوہ بھی ان کے پاس آتشیں ہتھیار تھے، میرے عقب میں کھیل دادا، وزیر جان کے کارندے کا بے سدھ وجود اٹھائے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

"یہ کوئی اور ہی خطرناک معاملہ نکل پڑا ہے شہزی! واپس پلٹو۔" کہتے ہوئے وہ الٹے قدموں پلٹا۔ حملہ آوروں کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی تھی اور وہ شاید پاور ایجنٹوں پر حاوی ہو رہے تھے۔ یہ یقیناً وزیر جان کے آدمی ہو سکتے تھے۔ جو نجانے کہاں سے اچانک وہاں اپنے "باس" کی مدد کو ٹپک پڑے تھے۔ گویا یہ لوگ اندر کنال لاج کا رخ کر سکتے تھے اور نتیجتاً ایک بار پھر ہم دشمنوں کے نرغے میں ہوتے۔ میں نے سوچا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور میں کھیل دادا کی طرح واپس کوٹھی کے اندر پلٹنے کے بجائے آگے بڑھا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ باہر معاملہ کچھ سرد پڑتا محسوس ہوا۔ میں نے کھلے گیٹ اور دیوار کی آڑ سے جھانکا۔ میرے نتھنوں سے بارود کی بو ٹکرائی۔ میں نے دیکھا۔ ایک سیاہ رنگ کی انٹرکولر میں چار پانچ حملہ آور سوار ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور وزیر جان کا بے ہوش وجود ان کے قبضے میں تھا جبکہ پاور کے چار ایجنٹوں کی خون میں لتھڑی لاشیں بے ترتیب بکھری نظر آ رہی تھیں۔ باقی نجانے کدھر تھے۔ گویا حملہ آوروں یا وزیر جان کے ساتھیوں کو پاور ایجنٹوں پر فتح حاصل ہو گئی تھی۔ مگر ایک بات پر مجھے تعجب ہوا کہ اگر یہ وزیر جان کے ساتھی تھے تو پھر اندر کوٹھی کا رخ کرنا چاہیے تھا، یا اس کے بے سدھ وجود کو گاڑی میں ڈال کر کہاں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ دل میں آئی کہ ان سے دیوانہ وار بھڑ جاؤں... مگر اس میں رسک بہت تھا۔ وہ سب سیاہ نقاب چڑھائے ہوئے تھے چہروں پر۔ اچانک گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی... وہ لوگ فرار ہو رہے تھے۔ ٹھیک اس وقت ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن رسا میں دوڑتا چلا گیا۔ ادھر گاڑی حرکت میں آئی اور ادھر میں۔ مجھے ایک طرف پاور ایجنٹوں کی بند جیپ کھڑی نظر آ گئی۔ یہ فور وہیل ڈرائیو تھی۔ میں تیزی سے لپک کر جیپ کی طرف بڑھا۔ بسرعت ڈرائیونگ سیٹ سنبھالا۔ اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی، وہ میں نے گھما دی۔ جیپ کا انجن غرا کر بیدار ہو گیا۔ میں نے ہیڈ لائٹس روشن کر دیں اور ونڈ اسکرین کے پار تاریکی میں دیکھا۔ حملہ آوروں کی انٹرکولر کی بیک لائٹس مجھے تیزی سے دور ہوتی دکھائی دیں اور پھر دائیں جانب معدوم ہو گئیں۔ انٹرکولر نے موڑ کاٹا تھا۔ ادھر میں نے ان کے تعاقب میں جانے کے لیے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھائی ہی تھی کہ اچانک مجھے بریک لگانے پڑے۔ رات کے سناٹے میں ٹائر گھوڑے چرچرائے تھے کہ مجھے سامنے دو پاور ایجنٹ دکھائی دیے تھے۔ دونوں ہی زخمی نظر آئے تھے۔ ایک کے بازو سے خون بہہ رہا تھا، دوسرا قدرے لنگڑا رہا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ مجھے جیپ میں سوار ہوتے بھی دیکھ لیا تھا اور ہاتھ کے اشارے سے جیپ روکنے پر مجبور کیا تھا۔ پھر وہ دونوں لپک کر جیپ میں سوار ہو گئے۔ ایک میرے برابر میں براجمان ہو گیا تھا، دوسرا زخمی بازو والا عقبی سیٹ سنبھال چکا تھا۔

"تعاقب جاری رکھو۔" میرے برابر براجمان ہونے والے پاور ایجنٹ نے ہانپتی آواز میں کہا اور میں چونک پڑا۔ یہ ان کو لیڈ کرنے والا ساتھی تھا۔ کیونکہ میں اس کی آواز پہچان چکا تھا۔ بہرحال... میں نے جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی اور انٹرکولر کے تعاقب میں لگ گیا۔

میں تیزی کے ساتھ مختلف موڑ کاٹتا ہوا جیپ کو ہائی وے پر لے آیا۔

"تمہارے آدمیوں کے انجام پر مجھے بے حد افسوس ہے۔" میں نے تاسف کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔ "کیا یہ وزیر جان کے ہی آدمی تھے؟" میں نے آخر میں پوچھا۔

"انہی کے ساتھی سمجھو مگر یہ وزیر جان کے آدمیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔" اس نے جواباً کہا۔

"ہاں، میں اس کا اندازہ تھوڑی دیر پہلے لگا چکا ہوں مگر... بات سمجھ نہیں آئی۔" میں الجھن کا شکار تھا۔

وہ بولا۔ "بڑے دھیان سے تعاقب جاری رکھو۔ انہیں اپنے تعاقب کا شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ... یہ ہمیں بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" اس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ میں کانپ کر رہ گیا۔

میں اب محتاط روی کے ساتھ انٹرکولر کا تعاقب کر رہا تھا اور میرے اندر بری طرح دھکڑ پکڑ لگی ہوئی تھی۔ مجھے یہ کوئی اور ہی پُراسرار معاملہ لگ رہا تھا۔ حملہ آوروں کا یہ گروپ مجھے کسی بھی طرح وزیر جان کے ساتھی ٹولے سے تعلق رکھتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ مجھے وزیر جان کے کنال لاج میں موجود اس کے ساتھیوں سے زیادہ طاقتور اور تربیت یافتہ نظر آئے تھے۔ جنہوں نے پاور کے انتہائی ٹرینڈ اہلکاروں کو شکست دے ڈالی اور ان کے منہ کا شکار چھین کر لے اڑے تھے۔

تعاقب جاری تھا۔ رات اپنے درمیانی پہر سے گزر رہی تھی، دور تک چمکتی ویران سڑک پر چند ایک گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ انٹرکولر کی بیک لائٹس کو نظروں میں رکھے ہوئے میں ایک مناسب فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ میرے حلق سے جانے کیوں ابھی تک یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ یہ حملہ آور وزیر جان کے ساتھی ہو سکتے تھے، پھر پاور ایجنٹ کے بقول... "انہیں وزیر جان کا ساتھی ہی سمجھو" مجھے یہ بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"یس سر! نمبر زیرو اسپیکنگ۔"

معاً مجھے لیڈ کرنے والے اس ایجنٹ کی آواز سنائی دی جو میرے برابر بیٹھا تھا، وہ ایک چھوٹے ٹرانسمیٹر نما آلے کو اپنے چہرے اور منہ کے قریب کیے شاید اپنے کسی افسر کو تازہ ترین رپورٹ سے آگاہ کر رہا تھا جو میں بھی سننے میں محو ہو گیا۔ وہ نہایت مؤدبانہ انداز میں اپنے افسر کو اب تک کی ساری سچویشن کی رپورٹ دینے کے بعد آخر میں بتا رہا تھا۔

"یس سر! پہلے ہمیں صرف شبہ تھا مگر اب یقین ہو چکا ہے، یہ لوگ "اسپیکٹرم" سے تعلق رکھتے ہیں۔ جی سر! ہم انہی کے تعاقب میں ہیں مگر ابھی شکار ان سے واپس چھیننے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، جی... جی... سر! ٹھکانے کا پتا چلنے کے بعد ان کو انفارم کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہمیں "ریڈ پرسن" کی کمک درکار ہوگی، او کے سر! میں رابطے میں رہوں گا... اینڈ آل۔"

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس کی زبانی میں نے ان حملہ آوروں کے اس گروہ کا عجیب نام سنا تھا۔ یعنی "اسپیکٹرم" یقیناً عجیب اور غیر ملکی سا نام تھا۔ یہ کون تھے؟ ان کے مقاصد کیا تھے، میں نہیں جانتا تھا مگر... میں انہیں ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلے ہی چھاپ لینا چاہتا تھا۔ مجھے ہر صورت میں اپنے باپ، یعنی وزیر جان کو ان کے قبضے سے چھڑانا تھا۔ لہٰذا میں نے زیرو نمبر ایجنٹ سے کہا۔

"مسٹر زیرو! میرا خیال ہے ہم ان کے ٹھکانے تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنا شکار چھیننے کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "تم اس سلسلے میں ہمیں کسی قسم کا مشورہ نہیں دے سکتے، تمہاری حیثیت ابھی صرف انفارمیشن یا میسنجر کی ہے۔ اسالٹ اینڈ ایکشن پوزیشن کے ایجنٹ بھی اس وقت چیف کے احکامات سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔"

اس کی بات سن کر میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ظاہر ہے یہ اور حیثیت کے لوگ تھے اور ان سے بحث و مباحثہ فضول تھا۔ میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب یہ دونوں اچانک تاریکی سے نمودار ہو کر میری جیپ کے سامنے آ گئے تھے۔

"ارے... یہ گاڑی کدھر غائب ہو گئی؟" معاً عقبی سیٹ پر بیٹھے ہوئے زیرو ایجنٹ کے ساتھی کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔ ہم دونوں ٹھٹکے۔ میری بھی نظریں بدستور سامنے جمی ہوئی تھیں، میں چونک پڑا۔ انٹرکولر کی بیک لائٹس واقعی غائب تھیں۔

"یقیناً آگے موڑ ہو گا۔ انہوں نے گاڑی موڑ لی ہو گی۔" میرے برابر بیٹھے زیرو ایجنٹ نے خیال ظاہر کیا۔ میں کچھ الجھن کا شکار تھا۔ میری چھٹی حس پھڑک رہی تھی۔ میری گن پہلو کے پاس رکھی تھی۔ آگے واقعی موڑ تھا۔ مین ہائی وے ہونے کے باعث موڑ زیادہ تنگ نہیں تھا۔ لیکن

ڈگری کے اس موڑ کو اسی کی اسپیڈ سے بھی کاٹا جاسکتا تھا اور یہی میں چاہتا تھا کہ موڑ کاٹتے وقت گاڑی کی رفتار کم نہ کرنی پڑے اور میں نے ایسا ہی کیا۔ موڑ پر میں نے جیسے ہی تھوڑا اسٹیئرنگ کاٹا، اس دوران میں نے محتاط نظروں سے موڑ کے دائیں جانب بھی دیکھا تھا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ ہمیں ٹریپ کیا گیا تھا، انٹرکولر سائڈ میں کھڑی تھی اور ہمیں سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملا تھا کہ انٹرکولر کے قریب سے سمع خراش فائرنگ کے شعلے سے ہماری جانب لپکے۔ گاڑی موڑ کاٹ رہی تھی، میں غیرارادی طور پر پیچھے جھک گیا۔ مگر دونوں پاور ایجنٹوں کو یہ موقع نہ مل سکا۔ کئی گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ جیپ کی باڈی اور کھڑکی پر پڑی۔ عقبی سیٹ پر بیٹھا پاور ایجنٹ کربناک چیخ مار کے ڈھیر ہو گیا۔ جبکہ میرے جھکنے سے میری طرف لپکنے والی گولیوں کے شعلے میرے برابر میں بیٹھے دوسرے پاور ایجنٹ کا بھیجا چاٹ گئے۔ شیشے ٹوٹنے کی سمع خراش آواز ابھری اور کئی کرچیاں میرے اوپر تیز برچھیوں کی طرح برسیں۔ دفعتاً ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ جیپ ایک طرف سے بری طرح لہرائی، یقیناً کوئی گولی ٹائر کو برسٹ کرنے کا سبب بنی تھی۔ میں نے اس خطرناک صورت حال کو سنبھالنے کے لیے سیدھا ہو کے ڈولتی جیپ کی بدمستی پر قابو پانا چاہا مگر بے سود... وہ لڑھک گئی، مجھے پوری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ شکر تھا کہ سڑک کے دوسری جانب بھی ڈھلان پر کچھ جڑواں تنوں والے درخت تھے۔ جیپ فقط ایک ہی لڑھکنی کھا کے تنے کے ساتھ جا لگی۔ مجھے زوردار جھٹکا لگا۔ کاندھے اور بازو کی ہڈیاں مجھے چٹختی محسوس ہوئیں مگر یہ وقت انہیں سہلانے کا کہاں تھا۔ موت سر پر تھی، ''اپیکزم'' نامی کسی تنظیم سے تعلق رکھنے والے موت کے ہرکارے پاور ایجنٹوں کی سوچ سے بھی زیادہ مستعد اور پاورفل ثابت ہو رہے تھے، مجھے ان سے مقابلے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں تو آج تک عام نوعیت کی دیسی لڑائیاں ہی لڑتا آیا تھا۔ میں بھلا ان کے طریقۂ کار اور اصولِ جنگ سے کہاں واقف تھا مگر جنگ اور دفاع کا انداز تو بلا کے لیے ایک ہی ہوتا ہے۔ میں نے ہمت مجتمع کی، خود کو سنبھالا اور گن اٹھائی۔

جیپ اس جڑواں تنے سے ٹکنے کے باعث ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی اور سوئے اتفاق اس کا ایک دروازہ کھل چکا تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ باہر تاریکی میں کودا... ابھی تھوڑا ہی دور تھا کہ مجھے اوپر سڑک کی سمت چار پانچ قدآور مسلح ہیولے نظر آگئے۔ ابھی میرے اور ان کے درمیان جیپ کا فاصلہ تھا۔ وہ شاید جیپ پر گولیوں سے ہلا بولنے کا ارادہ رکھتے تھے، میں ایک طرف دوسرے درخت کی اوٹ سے ان ہیولوں کو دیکھ رہا تھا۔ آسمان روشن اور صاف تھا۔ پورا چاند کہیں پرے جھکا ہوا تھا۔ مگر اس کی لامحدود ضیا پاشیاں کسی حد تک اس تاریک ویرانے کو منور کیے ہوئے تھیں۔

دفعتاً میں نے ان میں سے ایک کو کرکٹ کی باؤلنگ کے انداز میں اپنا ہاتھ لہراتے دیکھا۔ جب تک میں کچھ سمجھتا جیپ ایک سماعت شکن دھماکے سے آگ کے بھڑکتے گولے میں بدل گئی۔ انہوں نے دستی بم پھینکا تھا۔

میں بھربھری مٹی والی ڈھلان پر لیٹ گیا۔ ایسا میں نے اپنے بچاؤ کے لیے کیا تھا کہ کہیں بم کی طرح پھٹتی جیپ کے کسی جلتے سلگتے ٹکڑے کی زد میں نہ آ جاؤں، مگر جیپ پر بھڑکتی آگ کی روشنی میں مجھے بھی دیکھ لیا گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے گولیوں کی بھیانک تڑتڑ ابھری اور کئی گولیاں ''زٹ... زٹ... زٹ'' میرے قریب دائیں بائیں بھربھری مٹی والی ڈھلانی زمین میں پیوست ہونے لگیں۔ گولیوں کی ان آتشیں ''جھپک'' کو میں نے اپنے چہرے اور کنپٹیوں پر صاف محسوس کیا تھا، سفاک موت کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر میں ایک لمحے کو دہل کر رہ گیا مگر پل کے پل سنبھالا لیتے ہی میں نے طوفان بلاخیز کے مانند ڈھلان پر دو تین لڑھکنیاں لگائیں اور پھر سیدھے ہو کے پوزیشن سنبھالتے ہی میں نے اوپر ڈھلان کے سرے پر ملک الموت بنے کھڑے ان ہیولوں پر اپنی گن سے ایک برسٹ داغ دیا۔ ٹھٹکے ہوئے سناٹے میں گولیوں کے آتشیں قہقہے ابھرے اور ایک سے زائد افراد کی کریہہ انگیز چیخوں نے میرے حوصلوں کے بادبان بلند کر دیے، باقی بچے پیچھے پلٹ گئے۔

میں تیزی سے اوپر کی طرف رینگنے لگا۔ مجھے ہر حالت میں ان پر فتح پانا تھی، میرا باپ... وزیر جان ان کے قبضے میں تھا۔ ان کے کچھ آدمیوں کو واصلِ جہنم کر کے میری ہمت سوا ہو گئی تھی۔ میں سڑک پر آیا تو انٹرکولر کے انجن کی غراہٹ ابھری۔

''فرار'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا۔

گویا دشمن پسپا ہونے کے بعد فرار کی کوشش میں تھا۔

انٹرکولر نے جیسے ہی سڑک پر آنے کے لیے موڑ کاٹا تو میرے ذہن میں ان کی پیش قدمی روکنے کا آسان حل یہی نظر آیا کہ میں ایک برسٹ مار کر ٹائر فلیٹ کردوں مگر پھر ڈرائیونگ سیٹ

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔
MEDICAM
SHAMPOO
مہینے بھر کا شیمپو
MEDICAM SHAMPOO
3 Plus SHAMPOO
SHIKAKAI
ANTI DANDRUFF
AMLA
HERBAL
ANTI-LICE
EGG
KALONJI

Copied From Web

پر ایک دشمن کی شبیہ مجھے صاف دکھائی دی تو میں نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے انٹرکولر کو ناکارہ کرنے کے بجائے ڈرائیور کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی۔ رات کے دم بہ خود سناٹے میں میری گن نے آتشیں قہقہہ اگلا، اور میں نے ڈرائیور کے سر کو ڈھلکتے دیکھا، انٹرکولر ڈولنے لگی۔ ابھی اس کی رفتار بہت کم تھی، وہ رک گئی، یکلخت ہر طرف سناٹا جم سا گیا۔ کیونکہ میں ڈرائیور کو ہی ان کا آخری ساتھی سمجھا تھا اس لیے دیوانہ وار آگے بڑھا تھا۔ مگر یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں عین آخری کامیابی کے لمحات میں اوور کانفیڈنس کا شکار ہو گیا تھا، یہ میرا کچا پن تھا شاید۔ اب بچنے کی امید نہ تھی، موت... یقینی موت کو اپنے سامنے بہت قریب دیکھ کر میں ایک لمحے کو سن ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ چست سیاہ لباس اور اسی رنگ کے ماسک نما نقاب میں تھا اور بڑی تسلی کے ساتھ میرا نشانہ لے کر فائر کرنے کو تیار تھا کہ اچانک میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے بازی پلٹ گئی، کورٹ کی گیند گویا اچھل کر میرے پاس آ گئی، اس کی گن شعلے اگلنے سے قاصر رہی تھی، اور وہ بری طرح بوکھلا گیا تھا پھر میں نے ڈرامائی انداز میں اپنی گن سیدھی کر دی۔ اس کا نشانہ لے کے لبلبی دبا دی، وہ اچھل کر انٹرکولر کے پچھلے حصے میں جا کودا مگر ادھر میری گن سے بھی محض کلک کی آواز ابھری۔ بازی ہم دونوں کے ہاتھ سے نکلتی چلی گئی۔ میری گن کا شکمِ آتش خالی تھا۔ میں گن پھینک کر طوفانی انداز میں انٹرکولر کی طرف دوڑا۔ میرے دشمن کو بھی پل کے پل احساس ہو گیا کہ میری حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ وہ دست بدست لڑائی پر اتر آیا۔ وہ بلا کا فائٹر ثابت ہوا۔ سب سے پہلے تو اس نے انٹرکولر کے عقبی دروازے کو لات مار کے توڑا اور اچھل کر باہر آن کودا۔ ٹھیک اسی وقت گاڑی کے کھلے دروازوں سے میں نے اپنے باپ کے بے سدھ وجود کو ایک سیٹ پر پڑے پایا۔ ادھر دشمن نے میرے اور اپنے درمیان کا مختصر فاصلہ دو "فرشی" قلابازی لگا کر طے کیا اور ایک لات میرے سینے پر رسید کر ڈالی۔ یہ سب کچھ پلک جھپکنے میں ہوا تھا کہ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا، میں لڑکھڑا کر گرا۔ مگر سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرا مقابلہ کسی عام آدمی سے نہیں بلکہ ایک تربیت یافتہ فائٹر سے تھا۔ اس کی قامت مجھ سے دبتی ہوئی تھی۔ جسم متناسب تھا مگر نہ جانے کیوں مجھے اس کی "ٹکر" میں مردانہ پنا کہیں سے بھی جھلکتا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک چست سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں لانگ بوٹ تھے، اس نے جھک کر بڑی تیزی کے ساتھ اپنے لانگ بوٹ کی کسی خفیہ میان سے ایک قرولی ٹائپ کا عجیب دستے والا چاقو نکال لیا۔ جسے ہاتھ میں پکڑنے کا انداز بھی مہارت کی چغلی کھا رہا تھا۔ میں تھوڑا پریشان ہوا۔ وہ میری جانب لپکا، میں یہی سمجھا کہ وہ دست بدست مجھ سے بھڑ جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ میرے صرف دو تین فٹ قریب آ کر اس نے نجانے کیسی مہارت اور بلاخیز پھرتی کے ساتھ چاقو میری طرف پھینکا تھا کہ میں اس کے حملے کا اندازہ ہی لگاتا رہ گیا اور چاقو سیدھا میرے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ روح تک کو چیر دینے والی درد کی کربناک لہر نے میرے پورے وجود کو مارے اذیت کے تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ بے اختیار میرے حلق سے "اوغ" کی کراہ آمیز آواز ابھری اور میں زخم پر ہاتھ رکھ کے جھکا تو اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ چاقو میرے پہلو میں پیوست نہیں ہوا تھا بلکہ چرکا لگاتا نکل گیا تھا۔ شاید دشمن سے کامیابی کے جوش میں اندازے کی عین آخری لمحات میں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ اس کا احساس اسے بھی ہوا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں نے اسے گیند کی طرح اچھلتے اور خود پر پلٹتے دیکھا، میں جو پہلے ہی درد اور زخمی ہونے کے باعث تھوڑا جھکا ہوا تھا، حواسوں پر قابو پاتے ہوئے مزید نیچے کو جھک گیا۔ وہ میرے اوپر سے گزرا اور "دھپ" کی آواز سے گرا۔ میں درد کو پی کر طوفانی بگولے کی طرح جوشِ غیظ کے ساتھ پلٹا۔ عقب میں گرے دشمن کو سنبھلتے پا کر میں اس پر طوفان بلاخیز کی طرح ٹوٹ پڑا۔ میں اسے اپنے مضبوط آہنی بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر بے بس کر دینا چاہتا تھا۔ میں ابھی اس پر زخمی شیر کی طرح جھپٹا ہی تھا کہ وہ تڑپا اور میرے شکنجے سے بچنے کی سعی چاہی مگر میں اسے دبوچ چکا تھا تب دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ مجھے وہ بدن کسی مرد کا محسوس نہیں ہوا تھا۔ تب میں نے ایک جھٹکے سے اس کا نقاب کھینچ لیا۔ لمبے گھنیرے کچھے دار بال میرے چہرے پر بکھر گئے، میں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور جھٹکا دے کر اس کے بال چہرے سے دور کیے۔ اب ہم دونوں بہت قریب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، اور ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم دونوں ہی اس بری طرح چونکے تھے کہ کئی ثانیے تک تو ایک دوسرے کو اس طرح دبوچے تکتے رہ گئے۔

☆☆☆

وقت رک گیا تھا، جیسے اسے موت آ گئی ہو۔ شناسائی کی جھلک ہم دونوں کی آنکھوں سے ہی نہیں چہروں سے بھی عیاں تھی۔ سب سے پہلے میرا سکتہ ٹوٹا اور بے اختیار منہ سے نکلا۔

"ثریا"

"شش... شہزی... تم۔" اس کے ہونٹوں سے بھی تھرائی ہوئی آواز نکلی اور پھر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، ہم دونوں ہی ورطۂ حیرت میں مبتلا تھے۔ ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

یہ وہی ثریا تھی، اطفال گھر کے زمانے کی ساتھی۔ عابدہ اور شکیلہ کی طرح میں نے اس کے ساتھ ہی اطفال گھر میں بچپن اور پھر لڑکپن بتایا تھا۔ اوکاڑہ میں چنی بائی کے چنگل سے میں جن چار بدنصیب لڑکیوں کو چھڑا کر لایا تھا اور انہیں بعد میں دارالامان کے حوالے کیا تھا ان میں شکیلہ کے ہمراہ ثریا بھی تھی۔

"او... میرے خدایا... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں، مجھے یقین نہیں آ رہا۔" وہ ہسٹریائی سے انداز میں بولی۔

میرے زخمی پہلو سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا اور مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر زخم کھلا پڑا تھا۔ اس نے مجھے سنبھالا... سہارا دے کر مجھے گاڑی کی عقبی سمت لے آئی اور پھر اس کے پچھلے حصے میں سیٹ پر لٹا دیا۔ درمیانی سیٹ پہ وزیر جان بے سدھ پڑا تھا، اور اسے ہوش آ رہا تھا۔ ثریا نے جلدی سے ڈیش بورڈ کے نچلے خانے سے ایک باکس نکالا، اور ایک سرنج بھر کے وزیر جان کی گردن میں لگا دی، لگ بھگ کوئی ون سی سی دوا انجیکٹ کر کے وہ میری طرف متوجہ ہوئی، اور میری قمیص اوپر کر کے زخم کا جائزہ لینے لگی۔

"اسے تم نے کون سا انجکشن لگایا؟" میں نے پوچھا۔

"بے ہوشی کا، ورنہ یہ تمہارے میرے تعلق پہ چونک پڑے گا۔ ہمارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔" وہ جواباً بولی۔

"کیا یہ بھی تمہارا ہی ساتھی ہے؟"

"ہاں۔"

وہ میرے زخم پہ مرہم پٹی کرنے لگی۔ "شکر ہے، آخری وقت میں میرا نشانہ جلد بازی میں چوک گیا، زخم زیادہ گہرا نہیں آیا ہے۔" وہ بولی۔

"تم ان کے ساتھ کیسے شامل ہو گئی ہو؟ یہ لوگ مجھے کچھ اور ہی طرح کے لگتے ہیں۔ ایکسٹریم..." میں نے کہا۔

وہ چونکی۔ "اوہ... تم اس تنظیم سے واقف ہو؟"

"صرف نام سے... اور وہ بھی چند گھنٹے پہلے۔" میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ میری مرہم پٹی سے فارغ ہو گئی، مجھے درد میں افاقہ ہوا، ایک انجکشن بھی اس نے مجھے لگا دیا۔

"تم تو ان لوگوں کے ساتھ رہ کر بہت خطرناک فائٹر بن گئی ہو، حیرت ہے، تم ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئیں؟" میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ مگر وہ خاصی پریشان، گھبرائی ہوئی اور فکرمند نظر آ رہی تھی، اسی لہجے میں بولی۔

"شہزی! میں سب کچھ تفصیل سے بعد میں بتا دوں گی مگر پلیز، تم ان کے راستے سے ہٹ جاؤ، یہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔" اس کے لہجے میں ازحد تشویش تھی، میں نے اسی طرح مسکرا کر کہا۔

"ان کی خطرناکی کا اندازہ مجھے تمہاری تربیت سے ہو چکا ہے۔ ویسے میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ یہ لوگ میرا شکار چھین کر بھاگے تھے۔"

"شکار؟" وہ الجھ گئی۔ میں نے درمیانی سیٹ پر بے ہوش پڑے وزیر جان کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ۔" اس کے نرم ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ میں اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک سیدھی سادی لڑکی آج مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی، شاید کڑے وقتوں اور حالات کی مار نے اسے بھی میری طرح کیا سے کیا بنا ڈالا تھا۔

"میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اشارہ وزیر جان کی طرف تھا۔ وہ مجھ سے مستفسر ہوئی۔

"تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے؟" اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر بڑی تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میں بولا۔

"میری اس شخص سے بڑی عجیب طرح کی دشمنی ہے۔ تم اس بات کو چھوڑو، میں بہرحال اس کی جان کا دشمن نہیں ہوں لیکن میں نے اس سے کچھ اہم باتیں اگلوانی تھیں۔"

"ہم زیادہ دیر ادھر نہیں کھڑے رہ سکتے۔ خفیہ ایجنسی کے اہلکار سائے کی طرح ہمارے پیچھے ہیں۔" وہ بولی۔ میں چونکا۔ سمجھ گیا کہ یہ پاور ایجنٹوں کی بات کر رہی تھی۔ میں بولا۔

"ٹھیک ہے تم چلی جاؤ، شکار میرے حوالے کر دو۔"

میری بات پر وہ الجھی پھر بولی۔ "اس طرح میں خود خطرے میں پڑ جاؤں گی۔ تنظیم کے لوگ یہ برداشت نہیں کریں گے۔ اسے وہ میری کوتاہی پر محمول کریں گے اور ایسے حالات میں جبکہ میں ان کی تنظیم میں عنقریب ایک اہم عہدے پر فائز ہونے والی ہوں کسی طرح بھی یہ میرے لیے بہتر اور مناسب نہ ہوگا۔"

"تم وزیر جان کی جان کی دشمن ہو؟" میں نے کسی خیال کے تحت دوبارہ پوچھا اور تسلی چاہی۔

"یہ کب کہا میں نے؟" وہ بولی۔ "تمہیں شاید علم نہیں اس شخص کو تنظیم میں "اسٹیشن چیف" کا عہدہ ملنے والا ہے۔"

"اسٹیشن چیف؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، اسٹیشن چیف... تنظیم کی ماسٹر اتھارٹیز جس ملک میں اپنے پنجے گاڑتی ہیں، یہ ان لوگوں کا اصول ہے کہ اسی ملک کی کسی طاقت ور بااثر شخصیت کو وسیع تر تنظیمی مفادات کے لیے اس کا کنٹرول دے دیں یہی سبب ہے کہ ان کے زیادہ تر ایجنٹ بھی لوکل سطح کے ہوتے ہیں۔"

"کیا یہ کوئی بین الاقوامی دہشت گرد تنظیم ہے؟"

"یہ ان سے بھی بڑھ کر ہے۔"

"مگر تم ان کے ساتھ کیوں شامل ہو گئی ہو؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں ثریا سے کہا۔ میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا پھر بولی۔

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔" اس نے کہا۔

اس کی بات ٹھیک تھی، وہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے لگی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ درد کی ہلکی سے ٹیس میرے زخمی پہلو سے اٹھی اور پھر سرد پڑ گئی۔ مجھے حیرت انگیز طور پر افاقہ محسوس ہو رہا تھا۔ میں بھی اس کے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

سردست مجھے یہ سفر کسی انجان اور نامعلوم منزل کی طرف گامزن محسوس ہوا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، وہاں تو نہیں جا رہے جدھر ہم پہلے وزیر جان کو پہنچانا چاہتے تھے۔ میں کسی اور جگہ کا قصد کیے ہوئے ہوں۔ اس میں اگرچہ خود مجھے بھی اپنے ہی لوگوں سے دشمنی مول لینے کا خطرہ ہے لیکن تمہاری خاطر مجھے یہ بھی قبول ہے۔ تم نے مجھے جنتی بائی جیسی ظالم نائیکا اور اس کے خطرناک لوگوں سے جو بچایا تھا۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔" اس کی بات پر میں نے ونڈ اسکرین کے پار ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ویران سڑک پر نظریں ڈالتے ہوئے روکھے پھیکے لہجے میں کہا۔

"مگر تم نے میری یہ قربانی خاک میں ملا دی۔ نہ جانے اب تم کن خطرناک اور جرائم پیشہ لوگوں کی آلۂ کار بن گئی ہو۔ یہ مجھے بہرحال پسند نہیں۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ شاید اسے افسوس ہوا تھا یا میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔ میں نے یونہی اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھا، وہ ونڈ اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے ہولے سے بولی۔

"میں نے تمہاری قربانی ضائع نہیں جانے دی تھی مگر حالات اور بعض مجبوریوں کی بنا پر میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس راستے پر چل نکلی۔ میں اب پہلے والی ثریا نہیں رہی۔" مجھے اس کے آخری الفاظ میں رقت گھلی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے تلخی سے کہا۔

"حالات نے مجھے بھی مجبور اور بے بس کیا تھا مگر میں نے اس کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور کر رہا ہوں۔ مگر کبھی بھی غلط راستے کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کے جواب میں اس نے روایتی جملہ بولا۔

"تم مرد ہو نا اور میں عورت۔"

"عابدہ کو بھول گئیں تم؟" میں نے تمثیلاً اس سے کہا۔ "وہ بھی ایک کمزور اور ناتواں عورت ہے مگر میری طرح اس نے کبھی بھی اپنے ضمیر کا سودا نہیں کیا اور عورت ہو کے مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا۔ تم کیا جانو وہ کن کن نازک لمحات اور کڑے حالات سے سرخرو ہو کے گزری ہے۔" عابدہ کے ذکر پر وہ چونکے بنا نہ رہ سکی تھی۔ ظاہر ہے اطفال گھر کی پرانی ساتھی ہونے کے ناتے اسے عابدہ نہیں بھولی تھی۔ اطفال گھر کے کچھ قریبی ساتھیوں کی طرح وہ میرے اور عابدہ کے درمیان پنپنے والے "تعلق خاطر" سے بھی بخوبی آگاہ تھی، میں نے دیکھا عابدہ کے ذکر پر اس کے ملیح چہرے پر یک دم گہری تشویش کی سلوٹیں سی پڑ گئیں۔ اس نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر ایک نظر میرے چہرے پر ڈالی پھر بولی۔

"عابدہ آج کل امریکا کے ایک اسپتال میں موجود ہے۔"

اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا جس نے یکلخت ہی میرے وجود کی ساری حسیات بیدار کر دی تھیں اور میں بے چینی اور ایک نامعلوم سی تشویش آمیز فکر سے تڑپ کر بولا۔ "تت... تمہیں کیسے معلوم ہوا...؟ بولو؟" میری پھیلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا۔ ثریا کے چہرے پر ہولناک سناٹے کسی آسیب کی طرح چمٹ گئے، وہ بولی۔

"شہزی! میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"نہیں، مجھے ابھی بتاؤ تم عابدہ کے بارے میں کیونکر واقف ہو۔ روکو گاڑی۔"

میں جیسے متوحش ہو گیا۔ مجھے ثریا ایک زہریلے دشمن کے روپ میں نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔

"شہزی! خدا کے لیے جوش میں مت آؤ، ورنہ سب کچھ بگڑ جائے گا۔ میں تم سے تعاون کی درخواست کرتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں۔ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی بلکہ... بلکہ میں تو خود تم سے مدد چاہتی تھی، مجھے سب معلوم ہے، تمہارے بارے میں، عابدہ کے بارے میں... اور چودھری ممتاز سے تمہاری دشمنی، اس کی سوتیلی بہن عماری بیگم المعروف بیگم صاحب کے بارے میں بھی۔" مجھے اس کی بات پر حیرت کا شدید جھٹکا لگا، وہ آگے بولی۔ "شہزی! لگتا ہے تم بھی عجیب ہی قسمت لے کے پیدا ہوئے ہو۔ تقدیر تمہیں ہر وقت جیسے حالتِ جنگ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اطفال گھر سے نکلے تو دوسرے دگرگوں حالات کا شکار ہو گئے اور اب ایک کے بعد دوسرے اور تیسرے نامساعد حالات کی طرف تمہیں دھکیلا جا رہا ہے اور تم اس سے ناواقف ہو۔"

میرا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔ مجھے تو بولنے تک کا ہی یارا نہیں رہا۔ اب وہی بولے جا رہی تھی اور ایک انکشاف کے بعد دوسرا انکشاف کیے جا رہی تھی۔ "شاید قدرت ہی دنیا میں کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کر چکی ہوتی ہے جن سے بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کروانا چاہتی ہے جو تمہاری طرح ثابت قدم رہتے ہیں۔ وہ سرخرو ہوتے ہیں۔ شہزی! میری اس بات کا یقین کرو، جب سے مجھے تمہارے ان حالات کا پتا چلا ہے میں خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔ میں اس وقت تمہاری ذہنی کیفیات سے واقف ہوں۔ مگر شاید یہ میری خوش قسمتی ہے یا پھر بدقسمتی کہ تم سے ملاقات تو ہوئی مگر بہت غلط وقت پر کہ میں اس وقت تمہارے ساتھ کوئی تفصیلی گفتگو کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

"تمہیں پریشانی کیا ہے اس وقت؟ اور اب تم میرے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے وزیر جان کو لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر جانا ہے جو زیرو ہاؤس کہلاتا ہے۔ آگے بات بھی ہے اسے چھوڑو مگر پہلے تمہیں وزیر جان سے جو پوچھنا اگلوانا ہے وہ کر کے مجھے فارغ کرو، اس کے لیے ابھی میں تمہیں ایک ویران عمارت میں لے جا رہی ہوں، وہ اسٹیشن فور کہلاتی ہے، جدھر ہمارے نئے اسٹیشن چیف وزیر جان کو رہنا ہوگا اور وہیں سے اسے اوپر والوں کی طرف سے ہدایات ملیں گی۔ اگرچہ یہ سب کرتے ہوئے میں اپنے لیے ایک بہت بڑا رسک بھی لے رہی ہوں۔ ویسے تمہیں اس سے پوچھنا کیا ہے؟"

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ وزیر جان سے سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر میں اس کا لگتا کیا ہوں؟ اور وہ مجھے پندرہ سولہ سال سے اب تک کیوں متواتر دھتکار رہا ہے؟ اس کے بعد میں نے بیگم صاحب کے بارے میں اگلوانا تھا لیکن ثریا کو اتنے خطرات میں گھرے دیکھ کر اور وزیر جان یعنی اپنے باپ کی مستقبل میں حیثیت و مقام دیکھ کر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا اور ذہن میں میرے روشنی کا جھماکا درحقیقت ایک فوری آنے والا خیال تھا کہ اگر ثریا میرے اور چودھری ممتاز خان سمیت بیگم صاحب کے بارے میں سب جانتی تھی تو پھر ممکن ہے اسے بیگم صاحب کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوگا کہ اسے کہاں قید یا یرغمال بنا کے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ میری معلومات کے مطابق بیگم صاحب کو چودھری ممتاز نے ہی اغوا کروایا تھا اور اس میں وزیر جان کی مدد شامل تھی جبکہ بابن ڈکیت نے ہی بیگم صاحب کو کسی خاص مقصد کے لیے اپنے کسی خفیہ یا نامعلوم اڈے میں مقید کر رکھا تھا جو چک نواں کے قریب کہیں واقع تھا۔ لہٰذا ثریا کے آخری سوال پر میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے تم مجھے وہ سب بتا سکتی ہو جو میں وزیر جان کے منہ سے اگلوانا چاہتا ہوں۔"

"ہاں، بولو۔"

پھر میں نے اپنے اور وزیر جان کے باپ بیٹے والا تعلق اور رشتے کا ذکر کیے بغیر صرف بیگم صاحب کے بارے میں پوچھا تو وہ الجھ گئی۔ مگر پھر پُرامید ہو کے بولی۔ "اگرچہ ابھی مجھے یہ سب معلوم نہیں مگر اس کا پتا میں چلا لوں گی۔ یہ تم نے ٹھیک کیا۔ اس طرح تم نے مجھے ایک بڑے خطرے سے بچا لیا اور وقت بھی۔ تم فکر نہ کرو، میں تمہیں اسٹیشن فور پہنچاتی ہوں ادھر فون ہے۔ میں ہیڈ کوارٹر پہنچتے ہی یہ معلوم کر کے تمہیں اسٹیشن فور کی عمارت میں فون کر کے بتا دوں گی، رائٹ؟"

"تم اتنی جلدی ان ساری باتوں کا کیسے پتا چلا لو گی؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ "شاید تم بھول گئے، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں نے تمہیں بتایا تھا کہ چودھری ممتاز کو وزیر جان کی فل سپورٹ حاصل ہے اور چودھری ممتاز خود بھی "اسپیکٹرم" کا کلسا ایجنٹ جو تنظیم کے بیس ٹاپ ایجنٹوں کو اپنی صوابدید پر

Copied From Web

کنٹرول کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ اب تم خوب اندازہ کرلو کہ میرے لیے یہ کام کس قدر آسان ہوگا۔" وہ مسکرائی، میں نے قدرے طمانیت بھری سانس لی۔ ٹھیک اس وقت میں نے ثریا کو چونکتے دیکھا۔ بے اختیار میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار پڑیں، شاید ثریا کو کچھ نظر آیا تھا مگر نہیں وہ بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ کو پکڑے سیدھا ہاتھ کان پر رکھ کر دھیمے لہجے میں کسی سے بات کرنے لگی۔

"یس مسٹر آرک! مشن کامیاب رہا۔ پاور ایجنٹوں کا خاتمہ کرکے ان کے قبضے سے وزیر جان کو چھڑا کر ہیڈ کوارٹر لایا جارہا ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے سارے ساتھی اس مشن کی تکمیل میں کام آچکے ہیں۔۔۔ اوور۔۔۔"

میں ٹھٹکا۔ وہ شاید اپنے کان میں لگے آویزے کی طرح جھولتے کسی خفیہ بٹن نما ٹرانسمیٹر کے ذریعے مخاطب تھی۔ پھر دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد بولی۔ "او کے مسٹر آرک! آپ بے فکر رہیں، میں بہت جلد ہیڈ کوارٹر پہنچ رہی ہوں۔۔۔ اوور اینڈ آل۔"

یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوئی تھی، میں ایک بار پھر ثریا اور وزیر جان کی طرف سے الجھن کا شکار ہوگیا۔ وزیر جان کو میں کسی بھی صورت میں ان کے حوالے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر یہ تسلی ہونے کے بعد کہ وزیر جان کی ان کی نظروں میں کیا حیثیت تھی، مجھے کچھ تسلی ہوگئی تھی اور پھر ثریا نے مجھے یہ اطمینان بھی دلایا تھا کہ میں جو کچھ وزیر جان کے منہ سے اگلوانا چاہتا تھا اس سلسلے میں بغیر کسی رکاوٹ اور مشکل کے وہ میرا مسئلہ حل کرسکتی تھی۔ ورنہ وزیر جان کب اتنی آسانی سے اپنا منہ کھولتا اور منہ کھلوانے کے لیے میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ اپنے ہی باپ پر تشدد کرتا، پھر ایسے میں ثریا کی زندگی کو بھی اپنے لوگوں سے خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ تھا جبکہ وہ مجھ سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو بھی تیار تھی اور بہت سی ایسی باتیں مدد کے حوالے سے بھی مجھ سے شیئر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی تو مجھے لمبے چوڑے کھڑاگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس پر مستزاد وقت میرے پاس بھی کم تھا۔

ہائی وے پر سفر مشکل نہیں، پچیس منٹ میں طے ہوا تھا کہ ثریا نے دائیں جانب موڑ کاٹا۔ گاڑی ایک متوسط علاقے میں داخل ہوگئی۔ یہ خاصا گنجان آباد علاقہ نظر آتا تھا اور اس وقت سنسان اور تاریک پڑا تھا۔ کہیں کہیں کسی گھر کے صحن سے ہلکی پیلی روشنی پھوٹتی نظر آتی تھی۔ ایک دو گلی نما راستے طے کرنے کے بعد گاڑی ایک خاصے کشادہ بنگلے نما گھر کے سامنے رک گئی۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ انٹرلاک تھا۔ ثریا نے چابی نکال کر گھمائی، دروازہ اندر کی طرف دھکیلا اور ہم دونوں اندر داخل ہوگئے۔ صحن میں ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ ایک طرف باغیچہ تھا۔ ہم اندر آگئے۔ یہ بنگلا نما عمارت ایک منزلہ تھی، اس وقت بنگلا ویران پڑا تھا۔

ثریا مجھے ایک آرام دہ کمرے میں لے آئی، اس کے انداز و اطوار سے اب عجلت ظاہر ہونے لگی تھی۔ شاید اسے اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچنے کی جلدی تھی۔

"میں اب چلوں گی۔" بالآخر وہ بولی۔ "تم فکر مت کرنا، تمہارا کام ہوجائے گا۔"

"مگر میں تم سے رابطے میں کیسے رہوں گا؟" میں نے سوال کیا۔ جواباً اس نے اپنے چست لباس کی شرٹ کے اندر ہاتھ ڈال کے ایک بٹن نما شے میری جانب بڑھا دی۔ اسکن کلر کا یہ بٹن کسی موٹے مسّے یا کوٹ کا ہی لگتا تھا۔

"لو، رکھو اسے۔۔۔ سنبھال کر۔"

"کیا ہے یہ؟" میں بٹن نما شے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔

"یہ ٹرانسمیٹر ہے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "اسے خفیہ رکھنے کے لیے کان کے پیچھے لگاتے ہیں باڈی اسٹکر میں یہ کم ہی کسی کو دکھائی دیتا ہے۔ غور سے دیکھنے پر کوئی یہی سمجھتا ہے کہ یہ آلۂ سماعت ہے۔"

"مگر اس کا اسپیکر، مائیک، آن اینڈ آف کا سسٹم کہاں ہے؟" میں نے الجھن آمیز حیرت سے کہا۔

"اسے فریکوئنسی پر سیٹ کیا گیا ہے جو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ جب تمہیں مجھ سے بات کرنا ہو تو اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بٹن پر رکھو گے تو پھر تمہاری یہ انگلی اسپیکر اور مائیک دونوں کا کام کرے گی، فریکوئنسی بھی تم اسی طرح بٹن پر انگلی رکھ کر ملاؤ گے۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے نہ صرف اس کا میکنزم سمجھا دیا بلکہ طریقۂ کار بھی۔ مجھے اپنے وجود میں عجیب سے سنسنی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے مجھے یہ آلہ کان سے چپکانے اور اتارنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ اب وہ میرے کان میں چسپاں تھا۔ آزمائشی طور پر دوسرے کمرے میں جاکر میں نے دو تین بار ثریا سے اس ٹرانسمیٹر سے رابطہ بھی کیا۔

"اب چلو۔۔۔ اور مجھے چک نواں کے کسی قریبی جگہ پر اتار دینا۔ اب میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔"

وہ بولی۔ "یہ کام گاڑی میں بھی کرسکتی تھی میں، لیکن

Copi om Web

تمہیں اسٹیشن فوراً ہی یہ عمارت دکھانے کا میرا ایک مقصد تھا۔ کیونکہ اب وزیر جان یعنی ہمارے نئے "اسٹیشن چیف" کو ادھر سے ہی تنظیم کی ماسٹر اتھارٹیز سے خاص ہدایات ملتی رہیں گی۔ دو تین روز میں یہ عمارت پوری طرح فعال کردی جائے گی۔ تمہارا زخم ٹھیک ہے اب؟" اس نے آخر میں پوچھا۔

"بہت بہتر ہے، تمہاری لگائی ہوئی دوا نے جادو کا کام کیا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

میں اب پوری طرح مطمئن ہوگیا تھا۔ گویا مجھے وزیر جان کے دونوں ٹھکانوں کا علم ہوچکا تھا، میرا ارادہ بیگم صاحبہ والا معاملہ نمٹانے کے بعد وزیر جان سے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا تھا۔ میں اس سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر وہ کیوں مجھے مسلسل دھتکار رہا تھا؟ اس کے دل میں میری ذرا بھی پدرانہ محبت نہ تھی حتیٰ کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر میری جان لینے پر بھی تیار تھا، کیوں؟ حقیقت یہ تھی کہ اپنے باپ کے اس سنگدلانہ، بے رحمانہ سلوک کے بعد میرے اندر کا وہ ازلی دکھ جو باپ کی بے حسی کے باعث ایک بیٹے کی دوری کا تھا وہ اب ویسا شدید نہ رہا تھا۔ تاہم سوالیہ نشان ضرور ایک آنکڑے کی طرح میرے حلق میں ابھی تک اٹکا ہوا تھا۔ اور مجھے یہ باور کرا رہا تھا کہ کیا واقعی وزیر جان میرا باپ ہی تھا؟ نہیں تو پھر کون تھا میرا باپ؟

دل تو چاہتا تھا کہ ابھی وزیر جان کو گاڑی سے گھسیٹ کر یہاں لاؤں اور جس طرح اس نے میرے ساتھ بے حسیانہ سلوک کیا تھا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں اور اس سے پوچھوں کہ اگر میں اس کا بیٹا نہیں تو پھر میں کس کا بیٹا ہوں؟ لیکن ثریا کی غیر متوقع مداخلت اور اس کی جان کے خطرے کے پیش نظر میں ابھی اس کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ پھر ثریا نے بھرپور تعاون کا بھی مجھ سے وعدہ کیا تھا یہاں تک کہ مجھے وزیر جان کی حیثیت اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں بھی آگاہ کیا تھا اور خود سے مستقل رابطے کے لیے اس نے ایک خفیہ ٹرانسمیٹر بھی دیا تھا۔

ہم دونوں باہر گاڑی میں آکر سوار ہوئے اور روانہ ہوگئے۔

پو پھٹے مجھے کھلاں والی کے قریب چک نواں اتار کے ثریا آگے روانہ ہوگئی۔

میں ایک چائے خانے میں جاکر بیٹھ گیا۔ نیند اور تھکن سے برا حال ہورہا تھا۔ یہاں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ میں اول خیر سے کہاں رابطہ کروں؟ بیگم ولا میں اس نے مجھے فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ کھلاں والی کے قریب کسی چھوٹے دیہات چک نواں میں کہیں چھپا بیٹھا ہے اور بیگم صاحبہ کی بازیابی کے لیے کوشاں ہے، جبکہ اس نے گھیل دادا کو یہی بتایا تھا کہ اس نے بابن ڈکیت کا ٹھکانا تلاش کرلیا ہے، مگر ابھی اس سے بھڑنے سے کترا رہا تھا جب تک گھیل دادا اپنے چند آدمیوں کے ساتھ وہاں نہیں پہنچ جاتا، نیز میں اول خیر سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے کی پوزیشن میں بھی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے کہا تھا وہ خود مجھ سے رابطہ کرے گا اور جس نمبر سے اس نے بیگم ولا میں ہم سے رابطہ کیا تھا وہ اس کا نمبر نہیں تھا اور نہ ہی وہ دوبارہ اس نمبر پر مل سکتا تھا۔ مجھے خود اس کے فون کا انتظار تھا۔ مگر ابھی تک اس نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

بہرحال مجھے اب ثریا سے ہی امید تھی کہ وہ اپنے تنظیم کے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر ان باتوں کا پتا چلانے کی کوشش کرے گی اور مجھے دیے ہوئے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرے گی مگر پھر بھی چک نواں پہنچنے کے بعد میرا اول اول خیر سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ دفعتاً ایک خیال میرے ذہن میں "کلک" ہوا۔ کیوں نہ اول خیر کے اس نمبر پر رابطہ کیا جائے، جس پر کل اس نے ہم سے بیگم ولا میں رابطہ کیا تھا۔ اگرچہ اس نے کہا تھا کہ وہ دوبارہ اس نمبر پر نہیں ملے گا مگر ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید اس نمبر پر اس کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوسکیں۔

ابھی میں پرانے نمبر پر اول خیر سے رابطہ کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میرے سیل پر اس کی کال آگئی۔ نمبر یہ بھی اجنبی تھا مگر دوسری جانب سے اول خیر کی آواز سنتے ہی میرے وجود میں مسرت اور جوش کی لہریں دوڑ گئیں۔

"اوخیر۔۔۔ کاکا۔۔۔ کدھر ہے تو؟ بھلا چنگا تو ہے نا؟"

اس کی مخصوص یارباش آواز ابھری تو مارے بے قراری سے الٹا میں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

"تو۔۔۔ تو کیسا ہے۔۔۔ میرے یار؟ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ ٹھیک تو ہے؟" میں جذباتی سا ہونے لگا۔ میرا اور اول خیر کا رشتہ ہی ایسا تھا بلکہ عجیب تھا۔ یہ مجھے بھائیوں سے بڑھ کر یاروں کا یار۔۔۔ لگتا تھا، ایسا بےلوث رشتہ جس میں کوئی دنیاداری غرض و غایت نہ تھی، یہ صرف محبت تھی، خلوص تھا اور ایک دوسرے پر فدا ہونے کا جاں نثار رشتہ تھا۔

"او۔۔۔ خیر۔۔۔ خیر کاکے۔۔۔ ذرا جھوٹا ہوں تیرا یار بالکل ٹھیک ہے، تو اپنی سنا۔ باقی ساتھی تو ادھر پہنچ گئے، بڑا استاد بھی پہنچنے والا ہے، تو کدھر رہ گیا ہے۔ لگتا ہے پھر کسی

لمبے مسئلے میں پڑ گیا ہے تو۔"

میں اس کی بات پر چونکا۔ باقی ساتھیوں سے اس کی مراد ہمارے وہی ساتھی تھے جو میرے اور کمیل دادا کے ساتھ بیگم ولا سے روانہ ہوئے تھے۔ پھر کمیل دادا ہی کی ہدایت کے مطابق وہ قادر پور کی طرف سے دو جیپوں میں الگ الگ دو مختلف راستوں پر آگے چک نواں کی طرف روانہ ہو گئے تھے، اس کا مطلب تھا وہ اول خیر کے پاس پہنچ چکے تھے۔

میں نے اول خیر سے کہا۔ "ساری تفصیل ملنے کے بعد ہو گی۔ میں خود اس وقت چک نواں کے ایک چائے خانے میں بیٹھا ہوں۔"

"کک... کیا؟ تو ادھر ہی ہے میرے یار؟" اسے یقین نہیں آیا۔

"ہاں۔"

"گلبہار چائے خانہ؟"

"آں... پ... پتا نہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ چائے خانے کی ایک اندرونی دیوار پر ڈیزائننگ کے انداز میں گلبہار چائے خانہ نام پڑھ کر فوراً آگے کہا۔ "ہاں یہاں اسی چائے خانے میں ہوں۔"

"وہیں پہ ٹک ہو جانا، میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا اور فون بند کر دیا۔

گلبہار چائے خانہ شاید اس چھوٹے سے قصبے میں ایک ہی تھا، کچی دیواریں تھیں، رنگ و روغن اترا ہوا تھا۔ پو پھٹنے کا وقت تھا۔ کچھ لوگ جو چوبی تختوں پہ بیٹھے پیالیاں پکڑے گرما گرم چائے پی رہے تھے۔

میرے ہاتھ میں بھی چائے کی دھواں اڑاتی پیالی تھی اور میں اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لیتے ہوئے ثریا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی کئی باتوں نے مجھے اندر سے بری طرح تشویش آمیز الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ بالخصوص عابدہ سے متعلق اور پھر "اسپیکٹرم" نامی اس بین الاقوامی تنظیم کے بارے میں اور وہاں وہ (ثریا) کیا کر رہی تھی، ان کے عزائم کیا تھے اور خود ثریا کو مجھ سے کس قسم کی مدد چاہیے تھی۔ پھر ثریا کا میرے بارے میں سب کچھ جان لینا... یہ سب مخمصے میں ڈالنے والی باتیں تھیں۔ اس نے وعدہ تو کیا تھا کہ وہ بہت جلد مجھ سے رابطہ کر کے سب کچھ تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتی تھی کب؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا اور شاید اسے بھی۔ تاہم مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ ثریا کسی معمولی تنظیم کی آلۂ کار نہ تھی جس انداز میں وہ فائٹنگ کر رہی تھی، اور اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت جلد اسپیکٹرم میں ایک اہم عہدے پر فائز ہونے والی تھی، نیز چودھری ممتاز کا بھی اسی تنظیم سے تعلق تھا۔

میں نے ابھی چائے ختم کی ہی تھی کہ ایک ویسپا موٹر سائیکل میرے قریب آن رکی۔ میں چائے خانے کے باہر وسیع احاطے پر بچھی ایک کھری چارپائی پر بیٹھا تھا۔ بائیک رکتے دیکھ کر میں اس طرف متوجہ ہوا۔ وہ اول خیر تھا۔ اسے دیکھ کر میں فوراً چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بھی بائیک سے اترا اور ہم دونوں پورے جوش کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ وہ خاصی عجلت میں تھا۔ ہم پھر وہاں رکے نہیں، بائیک پر سوار ہوئے اور اس نے ویسپا واپس موڑ لی۔

کھلاں والی کے اس دور دراز قصبے کی دھول اڑاتی کچی پگڈنڈی نما راستے پر وہ ویسپا دوڑائے جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے مجھے ایک اطلاع دی تھی کہ کمیل دادا سے اس نے رابطہ کیا تھا اور وہ بھی وہاں ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ تاہم اول خیر میری وہاں آمد پر خوش نہ تھا۔

گارے مٹی کی اور لپی تھپی کچی دیواروں والے ایک گھر کے سامنے بائیک رکی۔ ہم نیچے اترے۔ دروازے پر پرانی بوری کا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ اول خیر نے دستک دی۔ دوسری دستک پر ایک شخص نے محتاط انداز میں دروازہ کھولا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

صحن ناپختہ اور قدرے کشادہ تھا۔ وہاں دو تین آدمی گنیں لیے ایک چارپائی پر بیٹھے تھے، ہمیں دیکھ کر یک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ، ہمارے ہی آدمی تھے۔ اندر بڑا کمرا تھا۔ ہم دونوں وہاں آ گئے۔ دائیں جانب گودڑی بچھی چارپائی، اس کے سامنے نیم دائرے کی صورت میں کرسیاں اور لکڑی کی پیٹیاں دھری تھیں اور یہاں بھی ہمارے مسلح ساتھی موجود تھے۔ چارپائی پر کمیل دادا بڑے غصے کے ساتھ بیٹھا تھا اور چہرے سے خاصا برہم نظر آ رہا تھا۔ مجھ پر اور اول خیر پر تو وہ ویسے ہی ادھار کھائے رہتا تھا لہٰذا مجھے دیکھتے ہی وہ غراتے لہجے میں بولا۔

"تم مجھے کنال لاج چھوڑ کر کہاں دفع ہو گئے تھے؟"

مجھے اس کا یہ حاکمانہ لہجہ انتہائی ناگوار گزرا اور میں جواباً اس سے زیادہ سخت اور ترش لہجے میں بولا۔ "کمیل دادا! لہجہ سنبھال کر بات کیا کرو مجھ سے، میں تم لوگوں کا کارندہ یا آلۂ کار نہیں ہوں۔ رہی بات میری تو تم اندھے تو نہیں تھے، دیکھ ہی رہے تھے کہ ہم پر وزیر جان کے ساتھی ٹوٹ پڑے تھے اور وزیر جان کو خفیہ ایجنسی کے اہلکاروں سے چھڑا کر

لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے، میں ان کے تعاقب میں گیا تھا۔"

کمیل دادا کے ساتھ اس ترکی بہ ترکی لہجے میں جوابی کارروائی پر پہلے اس کے ساتھی مجھ پر مشتعل ہو جاتے تھے، مگر اب بیگم صاحبہ کا میرے ساتھ "سلوک" دیکھنے کے بعد وہ خاموش رہتے تھے۔ کمیل دادا بھی حد سے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتا تھا جبکہ میرے اور کمیل دادا کے بیچ ہونے والی نوک جھونک اور تلخ کلامی پر اول خیر بھی ایک حد تک "مجبوراً" خاموش رہتا تھا۔

"تو تم نے کون سا تیر مار لیا ان کا تعاقب کر کے؟ میں تو تمہیں خالی ہاتھ دیکھ رہا ہوں۔ ہمارا شکار وزیر جان کہاں ہے؟" وہ تیز نظروں سے میری طرف گھور کے بولا۔ جواباً میں نے استہزائیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ایک شکار تو میں نے تمہارے حوالے بھی کیا تھا، اس کا کیا کیا تم نے؟"

"وہاں پولیس آ گئی تھی، مجھے، ماجے اور ایوب کے ساتھ وہاں سے نکل بھاگنا پڑا... ویسے بھی کارندہ بے ہوش تھا، ہمارے کسی کام کا نہیں تھا۔ مجبوراً ہم نے چک نواں کا رخ کیا تو راستے میں اول خیر کی... کال آ گئی۔" کمیل دادا نے جواب دیا تو اول خیر نے اس خدشے کے پیشِ نظر کہ میرے اس کے درمیان تلخ بحث طوالت یا بدمزگی کا شکار نہ ہو جائے، فوراً مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

"اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اتنا تو پتا چلا ہی لیا ہے کہ بیگم صاحبہ کو بائن ڈکیت نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ اب ہمیں اس کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔"

"تو تم تین دنوں سے یہاں چک نواں میں جھک مار رہے ہو؟" کمیل دادا کی توپ کا رخ اس کی طرف ہو گیا۔ (شاید اول خیر چاہتا بھی یہی تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کمیل دادا کی کرخت کلامی کو وہی برداشت کر سکتا تھا، میں نہیں)

"میں نے جھک ماری، بڑے استاد" اول خیر نے گمبھیر سنجیدگی سے کہا۔ اس کے لہجے میں بہرحال "بڑے استاد" کا مودبانہ پن تھا۔ "یہ بھی میں نے ہی پتا چلایا تھا کہ بیگم صاحبہ بائن ڈکیت کے قبضے میں ہے... ورنہ ہم تو بیگم صاحبہ کی تلاش میں ابھی نیو ملتان کے گرائیں نگر میں ناک ٹوئیاں مار رہے تھے تو کبھی چودھری ممتاز کی آبائی جاگیر ستے پنڈ کی خاک چھاننے میں وقت کا زیاں کر رہے تھے۔"

"یہ بکواس اب رہنے دو، یہ بتاؤ تم نے بائن ڈکیت کے ٹھکانے کا پتا چلایا؟" کمیل دادا جھلا کے بولا۔

اچانک مجھے اپنے کان کی لو میں چبھن کا احساس ہوا، میں چونکا۔ ثریا نے بتایا تھا کہ کال آنے کی صورت میں میرے کان میں چھپا پن نما ٹرانسمیٹر گرمائش سی پیدا کرے گا۔ میں نے واش روم جانے کا بہانہ کیا اور اول خیر کے اشارے پر کمرے سے نکل آیا۔ واش روم کیا تھا کچی دیوار کی آڑ کے عقب میں گندا سا غسل خانہ ہی تھا جو بیک وقت رفعِ حاجت کے طور پر بھی مستعمل ہوتا تھا، بہرحال... مقصد چھپ کے گفتگو کرنا تھی۔ کال یقیناً ثریا ہی کی تھی۔ میں نے نلکا چلا دیا۔ شور میں میری ہلکی آواز بھی دب گئی۔

"یس، شہزی ہیئر، اوور۔" میں نے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کان کی طرف لے جاتے ہوئے ہولے سے کہا۔ دوسری طرف سے ثریا کی آواز ابھری۔

"شہزی! بیگم صاحبہ اس وقت چک نواں کے جنوب مشرق میں ہائی وے کی دوسری جانب کچے کے علاقے میں کوئی چالیس کلومیٹر دور چک جمبرہ کے لولی شاہ قبرستان کے پچھواڑے... جدھر ایک پرانی باؤلی ہے، وہاں مختصر سے ایک ڈیرے میں بنے ایک کشادہ مکان میں قید ہے، بائن ڈکیت بھی وہیں موجود ہے مگر تمہیں جلدی پہنچنا ہو گا۔ اطلاع ہے کہ چودھری ممتاز اس پر تشدد کر کے کسی اسٹامپ پیپر پر دستخط کروانا چاہتا ہے اس کے بعد اسے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، وقت کم ہے، فوراً پہنچو ورنہ چودھری کے تم سے پہلے پہنچ جانے پر صورتِ حال سے نمٹنا اتنا آسان نہ ہو گا... اوور..."

اس کی بات سن کر میرا رواں رواں تھرا اٹھا۔ میں نے کہا۔ "ہم روانہ ہونے کے لیے بالکل تیار ہیں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہاں دشمنوں کی نفری کتنی ہو گی، اوور؟"

"سوری، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ میں پھر بات کروں گی اوور اینڈ آل۔" اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔ کمرے میں پہنچا مگر ابھی مصلحتاً کوئی بات نہ چھیڑی۔ میں پہلے یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ کمیل دادا کیا منصوبہ بنائے ہوئے تھا۔ اندر پہنچا تو چونکے بنا نہ رہ سکا۔ کمیل دادا سر پکڑے بیٹھا تھا جبکہ اول خیر بھی متفکر نظر آ رہا تھا جب میں نے گمبھیر آواز میں انکشاف کیا گویا بالفاظِ دیگر دھماکا کیا۔

"تیاری پکڑو دوستو! ہمیں اسی وقت چک جمبرہ روانہ ہونا ہے۔ وہاں لولی شاہ نامی قبرستان کے پچھواڑے ایک پرانی باؤلی کے قریب کچے میں بنے ایک کشادہ مکان میں بائن ڈکیت نے بیگم صاحبہ کو یرغمال بنا رکھا ہے اور ممتاز

خان وہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ ایک اسٹامپ پیپر پر زبردستی بیگم صاحبہ کے دستخط اور انگوٹھا لگوانے کے بعد انہیں قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے ہے۔"

اس اطلاع نے جیسے سب کو ٹھرا کر رکھ دیا۔ کھیل دادا یوں چارپائی سے اچھل کر کھڑا ہوا تھا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ تحیر آمیز نظروں سے مجھے تکتے ہوئے فرطِ جوش سے بولا۔ "تت... تمہیں یہ کیسے پتا چلا؟"

"وقت ضائع مت کرو دادا! میرے اپنے بھی کچھ ذاتی ذرائع ہیں، نکلو یہاں سے۔"

میں نے کہا اور پلٹا۔ اول خیر کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں اتنا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں وہاں سے کیوں کھسک گیا تھا، موبائل کے سبب... میرے کان سے چسپاں خفیہ بٹن نما ٹرانسمٹر کے بارے میں بھلا انہیں کیا معلوم تھا۔

باہر ہماری تین گاڑیاں موجود تھیں۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی۔ میرے برابر میں کھیل دادا اور عقبی نشست پر اول خیر اور تین مسلح ساتھی سوار تھے۔ ہماری گاڑی آگے تھی، میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

وہ سب... چودھری ممتاز سمیت بائن ڈکیت کا خون چکھنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

تینوں گاڑیاں آندھی طوفان کی طرح آگے پیچھے دوڑتی ہوئی، بائی وے پر آ گئیں اور چک جمبرہ کی طرف روانہ ہو گئیں۔

میں کسی بھی صورت میں کھیل دادا کو ثریا کے متعلق کچھ بتانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ البتہ اول خیر کی تو بات اور تھی، وہ تو میرا غم خوار اور ہم رکاب و ہم راز تھا، موقع ملنے پر میں اسے سب کچھ بتانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سفر دھڑکتی خاموشی کے ساتھ جاری تھا مگر اس خامشی میں آنے والے ایک خوفناک جنگجو طوفان کی دھمک بھی محسوس ہوتی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ یہ ایک فیصلہ کن معرکہ تھا چودھری ممتاز کے خلاف... کیونکہ اس نے بیگم صاحبہ کو اغوا اور بعد میں یرغمال پھر قتل کرنے کا ناپاک ارادہ کر رکھا تھا جبکہ بیگم صاحبہ کے کارکنوں کے لیے چودھری ممتاز کا یہ جرم ہی ناقابلِ معافی تھا کہ اس نے ان کی لیڈر کو اغوا کیا تھا۔

چک جمبرہ کا طے شدہ فاصلہ پاٹنے کے بعد میں نے گاڑی دائیں جانب کچے میں اتار لی۔

دور مشرق کی سمت صبح صادق کی سپیدی نمودار ہو چکی تھی اور کسی بھی دم سورج طلوع ہونے والا تھا۔ کچے دھول اڑاتے پگڈنڈی نما راستے پر ہماری گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔

جلد ہی میری متلاشی نظروں نے لوکی شاہ قبرستان کا چوبی پھاٹک دیکھ لیا۔ اب یہاں سے یہ پگڈنڈی نما کچا راستہ دو حصوں میں منقسم ہو رہا تھا۔ ایک پھاٹک کی طرف جاتا تھا دوسرا قبرستان کی کچی باؤنڈری وال سے گھوم رہا تھا۔

قبرستان کا رقبہ خاصا وسیع نظر آتا تھا۔ میں نے اسٹیئرنگ گھما لیا اور قبرستان کے کھلے پھاٹک سے اندر داخل ہو گیا۔

اب ہم قبرستان کے بیچ سے گزر رہے تھے۔ کھیل دادا، اول خیر سمیت ہماری نظریں گردوپیش کا جائزہ لینے میں بھی محو تھیں، باقی دو گاڑیاں جن میں ہمارے مسلح ساتھی سوار تھے، ہمارے پیچھے دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ ہم قبرستان کے دوسرے پھاٹک سے باہر آئے تو میں نے جیپ روک دی۔ باقی دو گاڑیاں بھی رک گئیں، میں نے کھیل دادا سے کہا۔

"اپنے آدمیوں کو کہو کہ وہ دائیں جانب سے پرانی باؤلی کو کراس کرتے ہوئے آگے چلتے جائیں اور جہاں وہ عمارت دیکھیں، فاصلہ دے کر رک جائیں۔"

کھیل دادا نے اپنے سیل فون پر پچھلی گاڑی میں موجود ایک ساتھی سے رابطہ کر کے یہ ہدایات دیں۔ پھر میں نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا لی۔ باقی دونوں گاڑیاں دائیں طرف گھوم گئیں جبکہ میں نے اپنی جیپ بائیں جانب موڑ لی، منزل قریب ہونے کے باعث میں نے رفتار نسبتاً کم رکھی تھی۔ پرانی باؤلی سے آگے کیکر اور سرس کے درختوں کا سلسلہ تھا۔ وہاں میں نے جیپ روک دی اور اول خیر کو اپنے ساتھ آنے کا کہا، پھر نیچے اتر کر کھیل دادا سے کہا۔

"ہم پیدل آگے چلتے ہیں۔ تم ٹھیک پندرہ منٹ بعد جیپ اس راستے سے آگے بڑھا لینا جس پر ہم جا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ گن میرے ہاتھ میں تھی۔ اول خیر بھی پوری طرح مسلح تھا۔ وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔

"او خیر... کاکا تو نے تو اپنے بڑے استاد کو بھی اپنے حکم کا غلام بنا لیا۔"

"میں جانتا ہوں، کھیل دادا کبھی بھی میری بات نہیں مانتا ہے مگر یہ معاملہ اور ہے۔ اس سے کھیل دادا کی بیگم صاحبہ سے وفاداری اور نیک نیتی ظاہر ہوتی ہے، وہ جانتا ہے اس وقت بیگم صاحبہ کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ اپنی ذاتی مخاصمت اور انا پرستی کو بالائے طاق رکھے ہوئے ہے۔"

"یہ بات تو ہے کاکا۔" اول خیر کے لہجے میں اعتراف تھا۔

"بیگم صاحبہ کا اپنے قریبی ساتھیوں کے سلسلے میں انتخاب کبھی غلط نہیں ہوتا، یہ بھی حقیقت ہے کہ بیگم صاحبہ مجھ سے زیادہ بڑے استاد (کھیل دادا) پر بھروسا کرتی ہے۔"

کیکر اور سرس کا یہ ٹنڈ منڈ سا جنگل بہت مختصر ثابت ہوا تھا۔ اس کے سرے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ سامنے مجھے ڈیرے کی عمارت نظر آ گئی اور میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ڈیرے کا احاطہ اس قدر وسیع و عریض تھا کہ اس پر فٹ بال کھیلنے کے میدان کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں دو لمبی جیپیں، ایک کار اور تین بغیر ہڈ والی جیپیں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک خستہ حال بس بھی کھڑی نظر آئی جس کی کھڑکیاں اور شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور سیٹیں غائب تھیں۔

آٹھ دس مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے اور ان میں کچھ دو چارپائیوں پر بیٹھے تھے اور باقی احاطے کے پھاٹک پر باہر کھڑے ادھر ادھر چوکس نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"پہرا کڑا ہے کاکا۔" معاً اول خیر کی سرگوشی ابھری۔ میں نے فوراً سیل پر کھیل دادا سے رابطہ کر کے ہدایت جاری کیں اور موجودہ صورتِ حال گوش گزار کر دی جس کے مطابق وہ سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کو سیل فون سائلنٹ کر کے وائبریشن پر رکھنے کی تاکید کرے دوم، کھیل دادا اور دیگر ساتھیوں کو گاڑیاں وہیں چھوڑ کر عمارت کے سامنے کے رخ پر تین اطراف سے گھیرتے ہوئے پیش قدمی کرنے کا کہا اور آخر میں، میں نے کھیل دادا سے کہا کہ وہ گاڑی سے اتر کر ماجے اور ایوب کے ساتھ ہم سے آن ملے۔ تھوڑی دیر بعد میری منصوبہ بندی کے مطابق سارا کام ریڈی ہو چکا تھا اور اب صرف حملہ کرنے کی دیر تھی۔

کھیل دادا نے کہا۔ "پہلے دائیں جانب کے ساتھیوں کو فائر کھولنے کا اشارہ دینا ہو گا۔ وہ سب اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔"

"یہی کرنا ہے ہم نے۔" میں نے کہا۔ "مگر ابھی نہیں، پہلے اصل شکار پہنچنے دو۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر چپ ہو رہا۔ اول خیر میری کارروائی سے مطمئن اور خاموش تھا۔

ثریا کی رپورٹ کے مطابق چودھری ممتاز خان بھی یہاں کسی وقت پہنچنے والا تھا۔ میرا ارادہ اس سے دو دو ہاتھ کرنے کا تھا۔ مگر اس سے بڑھ کر میرا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ یہ کہ اس طرح کے حملے میں بیگم صاحبہ رسک پر ہوتیں تو چودھری ممتاز بھی حالتِ جنگ میں ہوتا، اس طرح فریقین کے درمیان ایک توازن رہتا۔ تاہم پلڑا پھر بھی دشمنوں کا ہی بھاری تھا کہ ہمارا ایک ساتھی (بیگم صاحبہ) ان کے قبضے میں تھا۔ وقت گزرتا رہا، دشمن بے خبر تھا کہ موت ایک لشکر کی صورت میں ان سے چند قدموں کے فاصلے پر گھات لگائے بیٹھی تھی۔ ٹھیک اس وقت میرے ذہنِ رسا میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کوندا اور میں نے کھیل دادا سے کہا۔

"دادا! تم ادھر ہی رکو... میں اور اول خیر یہاں پلٹ رہے ہیں۔"

"تم دونوں کدھر جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔ میں نے کہا۔

"ہم چودھری ممتاز پر راستے میں ہی ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے، اسے یرغمال بنا کے بھی ہم اپنا مقصد بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔"

اس بات پر کھیل دادا کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرا گئی۔ اسے میری بات سے پورا اتفاق تھا۔ تاہم بولا۔ "مگر یہ خطرناک کام صرف تم دونوں نہیں کر سکتے۔ کچھ ساتھی اپنے ساتھ لے جانے ہوں گے۔" میں نے اختلاف کرنا چاہا مگر اول خیر نے کھیل دادا کی بات پر صاد کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"بڑا استاد ٹھیک کہہ رہا ہے شہزی کاکے۔ ہمارے ساتھ اس وقت پندرہ ساتھی ہیں۔ ان میں سے آٹھ ہم اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔"

میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، مگر آٹھ ساتھی زیادہ ہیں چار کافی ہوں گے، یہاں دادا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ساتھی موجود ہونا ضروری ہیں کیونکہ جب ہم ممتاز خان کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً وہ موبائل فون پر یہاں ڈیرے پر موجود اپنے ساتھیوں سے ضرور رابطہ کرے گا اور پھر یہ ان کی مدد کو روانہ ہوں گے تو دادا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان سے بھڑ کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرے گا۔"

اس پر اتفاق ہونے کے بعد میں اور اول خیر چار مسلح ساتھیوں کے ساتھ جیپ میں سوار ہوئے اور واپس پلٹے۔

Cop

لوئی شاہ کے قبرستان سے ہم ایک بار پھر گزرنے لگے۔ اب کی بار یہ واپسی کا سفر تھا۔ ابھی ہماری جیپ لاش کے پھاٹک سے چند گز ہی دور تھی کہ میں ٹھٹکا۔ سامنے دھول اڑاتے کچے راستے پر مجھے گرد و غبار کے بگولے رقص کرتے دکھائی دیے۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیا۔ کچی زمین پر جیپ کے ٹائر تھوڑا چرچرائے اور ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اول خیر میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ اس نے بھی جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار یہ منظر دیکھ لیا تھا۔

"شاید ہمارا شکار آرہا ہے، اول خیر۔" میں نے ونڈ اسکرین کے پار آنکھیں سکیڑ کر دیکھتے ہوئے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"او خیر، لگتا تو یہی ہے کاکے۔"

میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ چودھری ممتاز کس راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ ڈیرے تک پہنچنے کے لیے ادھر کا راستہ نہیں اختیار کرے گا، جدھر ہم موجود تھے۔ میرا خیال درست ثابت ہوا، وہ قبرستان کی بیرونی دیوار کے پار ایک دوسرے راستے پر تھا۔ نئے ماڈل کی پجارو جیپ تھی وہ اور اس کے عقب میں کھلی چھت والی جیپ جس میں چار پانچ مسلح افراد سوار تھے۔

"اول خیر ہوشیار... ان کا راستہ کاٹنا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"او خیر۔" اس نے ہولے سے جوش سے مرتعش لہجے میں کہا۔ میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ اول خیر لپک کر گن سنبھالے عقبی حصے میں ماجا اور ایوب کے ساتھ جا ملا۔ تینوں حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ پھاٹک پار کرتے ہی میں نے پجارو اور جیپ کا تعاقب شروع کر دیا اور ایک ناہموار کچے راستے سے شارٹ کٹ کر کے پجارو کے عقب میں جانے والی جیپ کے تھوڑا قریب پہنچ گیا۔ دشمنوں کو خطرے کی بھنک ہوئی اور جب تک وہ سنبھلتے اول خیر اور اس کے دونوں ساتھیوں نے جیپ پر تابڑ توڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ ٹائر کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ جیپ میں موجود مسلح دشمنوں کو میں نے گولیاں کھا کر لڑھکتے دیکھا اور پھر جیپ کو بھی۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔ پجارو میں ممتاز خان کے ساتھ بیٹھے مسلح محافظوں کی تعداد شاید زیادہ نہ تھی۔ تین ہی افراد نظر آئے۔ انہوں نے خطرہ دیکھتے ہی اندر ہی سے فائرنگ شروع کر دی۔ میں نے یک دم اسٹیئرنگ کاٹا۔ اول خیر اور دونوں ساتھیوں نے ان پر گولیاں برسا دیں۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہمیں گھات مل چکی تھی اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم چشم زدن میں پجارو کے قریب جا پہنچے۔ دونوں گاڑیاں ایک "اینگل" کی صورت میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ فاصلہ قریب ہوتا جا رہا تھا۔ دفعتاً سماعت شکن دھماکا ہوا، میری جیپ کا اگلا حصہ آگے سے گزرتی پجارو کے پچھلے حصے سے ٹکرایا۔ ممتاز خان کی بھاری بھرکم جیپ کی طاقت منقسم ہو گئی۔ نتیجتاً ٹکر لگتے ہی وہ بری طرح ڈول گئی۔ ہماری جیپ کو بھی طوفانی جھٹکا لگا تھا۔ مگر میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوطی سے جمائے رکھی تھی۔ ادھر پجارو کا ڈرائیور بھی ماہر ثابت ہوا تھا۔ اگرچہ پجارو کو ٹکر لگنے سے وہ سائڈ کے دو پہیوں پر آکر الٹتے الٹتے بچی تھی۔ مگر ڈرائیور نے بڑی مہارت سے اس سمت اسٹیئرنگ کاٹا ہوگا جدھر سے پجارو سائڈ کے دو پہیوں پر آکر الٹتے الٹتے بچی تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ جھٹکے سے چاروں وہیل پر آگئی۔ اس طرح ایک فائدہ ہمیں ہوا تھا کہ پجارو کے عقبی حصے میں سوار دشمن بھی یقیناً اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پائے ہوں گے۔ یہی سبب تھا کہ ان کی طرف سے سردست جوابی فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہو گیا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اول خیر نے پجارو کے عقبی دروازے کی بیک اسکرین پر گولیاں برسا دیں جبکہ ماجے اور ایوب نے پجارو کے پچھلے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی جس کا نتیجہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ وجہ بڑی ٹھوس تھی، عقب سے ٹائروں کا نشانہ بنانا ناممکن حد تک مشکل تھا ایسے میں جبکہ دونوں گاڑیاں بھی خاصی تیز رفتاری سے دوڑ رہی ہوں۔ پجارو کی بیک اسکرین فائرنگ کے باعث چھناکے سے ٹوٹی تو مجھے اگلی نشستوں پر ڈرائیور دکھائی دیا۔ ممکن تھا ممتاز خان بروقت نیچے جھک کر سیٹ میں دبک گیا ہو۔ میں نے جیپ کے اسٹیئرنگ پر ایک ہاتھ جمایا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی گن اٹھالی۔ میں پجارو کے ڈرائیور کے نظر آنے والے سر کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا چاہ رہا تھا کہ اچانک میں نے سامنے دوڑتی پجارو کے عقبی حصے سے ایک اور سر ابھرتے دیکھا پھر دفعتاً ہی پجارو کا پچھلا دروازہ کھلا اور مجھے دو خون میں لت پت لاشوں کی جھلک نظر آئی۔ تیسرا زخمی حالت میں تھا مگر اس نے مجھے موقع دیے بغیر ہی برسٹ فائر کر دیا۔ میں نے اسٹیئرنگ گھما دیا اور ساتھ ہی اپنا سر بھی جھکایا۔ جیپ کی ونڈ اسکرین دھماکے سے ٹوٹی اور مجھے ایوب اور ماجے کی کربناک چیخیں سنائی دیں۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ ہماری فتح شکست میں بدلنے لگی۔ اسٹیئرنگ

کاٹنے سے جیپ پھر کچے اور ناہموار راستے پر آکے بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ میں نے فوراً بریک لگا دیے۔ وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ گرد و غبار کے بگولے نے ہمیں آن لیا۔

"گئے کاکا ہمارے دونوں یار۔" مجھے اول خیر کی کرب سے آمیز آواز سنائی دی۔

میں نے مڑ کر دیکھا، ماجا اور ایوب خون میں لت پت بے سدھ، جیپ کے فرش پر لڑھکے ہوئے تھے۔

کیکر اور سرس کا وہ مختصر سا جنگل میری نظروں کے سامنے تھا۔ جدھر ہمارے ساتھی گھیرا ڈالے ہوئے گھات لگائے بیٹھے تھے اور پجارو اس جنگل میں دوڑتی ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

اول خیر نے فوراً سیل پر کھیل دادا سے رابطہ کر کے بتایا کہ چودھری ممتاز کی جیپ جنگل کی کسی سمت سے ڈیرے کی طرف بڑھ رہی ہے کہ اسے فائرنگ کی آواز سنائی دی اور کھیل دادا نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا۔ اول خیر نے جوش سے کہا۔ "کاکے! جیپ آگے بڑھا۔ لگتا ہے وڈا ٹاکرا شروع ہو گیا ہے۔"

میں نے فوراً جیپ کا گیئر بدلا۔ وہ زور سے غرائی اور وحشی گینڈے کی طرح ایک بار پھر دوڑنے لگی۔

"ادھر سے کاکا۔" اول خیر ایک جمپ مار کے میرے برابر والی سیٹ پر آکے بولا۔ جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا، میں نے اسی سمت جیپ کا رخ موڑ دیا۔ یہ وہی سمت تھی جدھر پجارو غائب ہوئی تھی۔ ہمیں فائرنگ کی آوازیں صاف... سنائی دے رہی تھیں۔ ممکن تھا کہ وہاں پہلے سے موجود ہمارے ساتھیوں نے پجارو کو جالیا ہو لیکن وہاں پہنچے تو ہمیں جنگ کا میدان سا سلگتا ہوا نظر آیا۔ یقیناً پجارو میں موجود ڈرائیور یا ممتاز خان نے ڈیرے والی عمارت میں موجود باہن ڈکیت اور اس کے ساتھیوں کو موجودہ مخدوش صورتِ حال کے بارے میں آگاہ کر دیا ہو۔

جنگ کا میدان گرم تھا۔ میں نے جیپ روک دی اور اول خیر سمیت کدکڑا مار کے جیپ سے اتر آیا۔

ڈیرے والی عمارت سے دشمنوں نے پوزیشن سنبھالی ہوئی تھی اور جنگل کی طرف بے تحاشا فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی جانب سے ایک دو راکٹ بھی فائر ہوئے تھے۔ جن کے دھماکوں سے پورا جنگل لرزتا محسوس ہوا تھا۔

مجھے یہ دوسری جنگ بھی مات ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ نجانے کھیل دادا کدھر تھا۔ اول خیر اور میں گن سنبھالے آگے بڑھے اور موٹے موٹے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے سرے پر پہنچے تو کھیل دادا اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ ہم سے آن ٹکرایا۔

"تم دونوں کی غلط منصوبہ بندی کے باعث ہم جیتی جنگ ہارنے والے ہیں۔" وہ مارے طیش کے غرایا۔ یہ وقت بحث کا نہیں تھا۔ میں نے گن سنبھالی اور اس سمت کا رخ کیا جدھر کچھ دیر پہلے ہمارے ساتھیوں کا مسلح ٹولا گھات لگائے بیٹھا تھا مگر اب وہاں جلی ہوئی دھواں اگلتی لاشوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید دشمنوں کی طرف سے فائر کیا ہوا پہلا راکٹ ادھر ہی گرا تھا۔

میں نے ایک درخت کی آڑ سے جوابی فائرنگ کرتے ہوئے دشمنوں کی تعداد کا اندازہ لگایا جو مجھے دس بارہ سے زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس اثنا میں کھیل دادا اور اول خیر میرے قریب آگئے۔ ہمارے تین چار بچے... ساتھی ہم سے آن ملے تھے۔ میں نے کہا۔

"تم لوگ دو کی ٹولیوں میں بٹ جاؤ اور دشمن کو مصروف رکھو۔" یہ کہتے ہوئے میں پیچھے پلٹا۔ یہاں ہماری ایک کھلی چھت والی جیپ کھڑی تھی، میں اس میں سوار ہو گیا اور اسے اسٹارٹ کیا۔ اول خیر ٹک ٹک چہرے اور پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھتا رہ گیا جبکہ میں جیپ کی رفتار بتدریج بڑھاتا چلا گیا اور زن سے ان کے قریب سے گزرا۔

جیپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی اور اس کا رخ ڈیرے والی عمارت کے بڑے سے چوبی پھاٹک کی طرف تھا۔ آخری رفتار پر چھوڑ کے میں نے بسرعت اسٹیئرنگ کو "راڈ لاک" لگا دیا۔ اب جیپ کہیں نہیں مڑ سکتی تھی۔ اس کے بعد میں نے ایکسیلریٹر پر ایک بھاری ٹول رکھ دیا اور اچھل کر جیپ کے عقبی حصے میں دو سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ گیا۔ اب ایک کے بجائے دو گنیں الگ الگ میرے ہاتھوں میں تھیں۔ دشمن پہلے کئی سیکنڈوں تک تو میری اس دیوانہ وار آتش نمرود میں کود پڑنے والی جانباز حرکت کو سمجھ ہی نہ پایا تھا کہ یہ میرا کیسا پاگل پن تھا مگر پھر ان کی گولیوں کا رخ میری جیپ کی طرف ہو گیا۔

"ٹرٹ... ٹرٹ... ٹرٹ" کی سنسناتی ہوئی آوازوں سے گولیوں کی طوفانی بارش جیپ کی باڈی میں پیوست ہونے لگی اور ساتھ ہی ایک سماعت شکن دھماکا بھی سنائی دیا۔ جیپ ڈولنے لگی، رفتار میں بھی فرق آیا مگر رکی نہیں تھی۔ اگلے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ دونوں اگلے ٹائر بیک وقت ہی برسٹ ہوئے تھے،

Co e

ورنہ جیپ کے ڈس بیلنس ہو کر الٹنے کا خطرہ ہوتا۔

ایک طے شدہ مقررہ انداز سے کے مطابق میں نے اگلی دو سیٹوں کی آڑ لے کر سر ابھارا اور ساتھ ہی گنوں کا رخ بھی سامنے کر دیا اور جو دکھائی دیا اس طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دشمن آخری وقت تک میری اس دانستہ وار چال نہ سمجھ پایا تھا۔ وہ گولیوں سے چھلنی ہو کے گرنے لگے یہاں تک کہ جیپ عمارت کا پھاٹک توڑتی ہوئی اندر جا گھسی۔ اس کی رفتار خاصی حد تک کم ہو چکی تھی۔ وہ کسی دیوار سے ٹکرائی اور تب تک میں سنبھل کے جیپ سے چھلانگ مار کر فرش پر لڑھکتا چلا گیا اور فرش سے پیٹھ ٹھونک کر یک دم کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک دروازہ مجھے دائیں جانب دکھائی دیا۔ باہر فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید اول خیر وغیرہ کو بھی پیش قدمی کا موقع مل گیا تھا یا پھر وہ دشمنوں کو اپنی جانب مصروف رکھے ہوئے تھے، میری اس کوشش کے باعث یقینی طور پر دشمن کی قوت بٹ چکی تھی۔ کھلے ٹوٹے دروازے کے باہر میں نے چند دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ بیک وقت مذکورہ بند دروازے سے پیچھے کسی کے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے ایک برسٹ کھلے دروازے پر داغ دیا۔ جدھر مجھے دو تین مسلح دشمنوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔ بعد میں ان کی لرزہ خیز چیخیں بھی سنائی دیں۔ میں پھرتی کے ساتھ مذکورہ بند دروازے کی جانب بڑھا تو اس وقت دھڑ سے دروازہ کھل گیا۔ سامنے مجھے دو مسلح افراد دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ میری ایک گن خالی ہو چکی تھی، جو میں پھینک چکا تھا، دوسری گن سے میں نے ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ ایک آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا جبکہ دوسرا زخمی ہو کے گرا مگر اس نے دلیری اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر اپنے پستول سے گولی چلا دی تھی جو میری گن پر لگی، شکر تھا میرا ہاتھ زخمی نہ ہوا... مگر گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ ٹھیک اس وقت مجھے عقب سے گولیوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ گن اٹھانے کا موقع نہ تھا۔ میں ایک جست بھر کے مذکورہ دروازے سے اندر کود پڑا۔ زخمی دشمن فرش پر لیٹا آخری سانسوں پر تھا، میں نے اس کا پستول اٹھا لیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے ایک گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا۔ یہ حملہ غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجنا سا گیا۔ ضرب طاقتور تھی، لگا تھا جیسے ہتھوڑا چہرے پر پڑا ہو۔ سنبھلنے میں مجھے چند ہی پل لگے تھے اور اس دوران میں ایک لات میرے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ وہ میرے ہاتھ سے پھڑپھڑا کر اڑتے پرندے کی طرح نکل گیا... تب میں نے ایک دشمن کو دیکھا وہ تھا تو قد و قامت میں مجھ سے بٹا ہوا مگر اس پر گینڈے کا سا گمان ہوتا تھا۔ رنگت انتہائی سیاہ تھی۔ سر گنجا تھا، چہرہ گول اور مکروہ... آنکھیں بھی چھوٹی اور گول گول تھیں، بائیں کان میں سونے کا بالا لٹکا ہوا تھا۔ اس نے کھلے گھیر والی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گردن پر چربی چڑھی ہوئی تھی، وہ بڑی خونخوار نظروں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ اس کے دائیں بغلی ہولسٹر میں پستول موجود تھا، جسے اس نے نکالنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ مجھے اس پر سو فیصد بدر اقبال عرف بابن ڈکیت کا گمان ہوا، اس نے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جھپٹا مارا، اس کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے مجھے اس قدر پھرتی کی توقع نہ تھی۔ تاہم اس نے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی اور سرعت سے اپنی دائیں ٹانگ کا وار میری ناف پر کیا۔ میں دہری تکلیف کی شدت سے بری طرح کراہ کے رہ گیا۔ گردن میری ابھی تک اس نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھی تھی جس پر مجھے آہنی شکنجے کا گمان ہو رہا تھا۔ بلاشبہ اس کے موٹے تازے گینڈے وجود میں کسی خونخوار درندے جیسی ہی طاقت تھی، وہ رکا نہیں اور اپنا گھٹنا میرے دونوں جانگ کے درمیان میں رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے بھی اپنی ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کا یہ جاں کش وار روکا اور اس کی ناک پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ بیل جیسے انداز میں ڈکرایا۔ گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے محسوس کرتے ہی میں نے اس کی کلائی پکڑ کر موڑ ڈالی اور ایک دم اپنے ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوم گیا۔ ادھر اس کی گرفت سے میری گردن پھسل کر نکلی ادھر میرے دوسرے بازو کی کہنی اس کے پیٹ اور سینے کے درمیان نازک جگہ پر لگی، وہ کئی قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا۔ وہ شاید مجھ سے دو بدو لڑنا چاہتا تھا اور نہ جانے اپنے کس پر غرور جذبے کی تسکین کرنا چاہتا تھا مگر میرے دو تین جوابی وار کھا کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو شخص اس طرح دانستہ وار یہاں گھسا چلا آیا تھا وہ دو بدو لڑائی کی ابجد سے تو کم از کم واقف ہو گا ہی۔ لہٰذا میری اس جوابی ہاتھا پائی سے اسے فوراً ادراک ہو گیا کہ وہ مجھ پر محض اپنے زور بازو سے قابو نہیں پا سکتا، وہ اپنے ہولسٹر سے پستول نکالنے لگا تو میں نے اس پر چیتے جیسی جست بھری اور زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔ وہ گینڈے جیسی مضبوط جسامت ہونے کے باوجود فرش سے تقریباً دو تین انچ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرا قد چھ فٹ ایک انچ تھا اس کے مطابق میرا ڈیل ڈول خاصا کسرتی

تھا۔ یہ میں ہی تھا جو اس گینڈے جیسی گٹھی ہوئی جسامت کے بابن ڈکیت کو زمین سے چند انچ اوپر اچھال کے پیچھے دھکیلنے اور دیوار سے ٹکرانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ اس نے اپنے ہولسٹر میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جھٹکا لگنے کے باعث پستول ہولسٹر سے نکل کر فرش پر آن گرا تھا۔ جسے وہ سنبھل کے فرش سے اچکنا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر گھٹنا رسید کر دیا اور پستول کو لات سے دور کہیں سرکا دیا۔ ابھی تک اس کا کوئی ساتھی اندر نظر نہیں آیا تھا نہ ہی باہر سے کسی نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ شاید وہ سب باہر... اول خیر اور کھیل دادا وغیرہ کے ساتھ جنگ میں الجھے ہوئے تھے مگر ایک چکردار آہنی زینہ اوپر جاتا تھا۔ دوسرے دروازے کے باہر راہداری تھی، باہر دھواں دھار فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے بابن کے چہرے سے محسوس کیا کہ اسے شاید نکلنے کی عجلت ہو رہی تھی۔ معاً مجھے اپنے عقب میں دوسرے والے دروازے پر کھڑبڑ سنائی دی۔ میں تیزی سے پلٹا، ایک خون میں لت پت آدمی لڑھکتا ہوا اندر آیا، یہ بابن ڈکیت کا کوئی ساتھی تھا جو بری طرح زخمی تھا، وہ فرش پر گرتے گرتے بابن سے بولا۔

"بب... بب بدو استاد! شش... فار... لے کر... ب... باہر... پچھواڑے... پپ... پہنچو... گگ... گاڑی موجود ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بے سدھ ہو گیا۔ شاید مر گیا تھا۔ شاید دشمن کو شکست ہو رہی تھی مگر چودھری ممتاز جانے کدھر تھا۔ میں نے دیکھا بابن ڈکیت بے چین درندے کی طرح تڑپتا نظر آیا اور دوسرے ہی لمحے پہلے والے دروازے کی طرف دوڑا اور باہر راہداری میں نکل گیا۔ میں بھی اپنی جھونک میں اس کے تعاقب میں لپکا اور جیسے ہی دروازے سے باہر قدم نکالا... دھوکا کھا گیا۔ لامحالہ... بابن ڈکیت کو اندازہ تھا کہ میں بھی اس کے تعاقب میں لپکوں گا۔ وہ باہر نکلتے ہی رک گیا تھا اور جیسے ہی میں نے باہر قدم نکالے اس نے اڑنگا لگا دیا۔ میں لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ خود سے بھٹکانے کی یہ اس کی لنگڑی لولی کوشش تھی۔ میں نے گرتے سنبھلنے کی کوشش کے دوران بابن کو عمارت کے اندرونی حصے کی طرف دوڑتے ہوئے پایا۔ میں نے بھی اٹھ کر اس کے تعاقب میں دوڑنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ ایک طرف مڑا، میں بھی سرپٹ دوڑتا رہا۔ وہ ایک کمرے میں گھسا اور دروازہ بند کر دیا۔ ٹھیک اس وقت میں بابن کے کسی ساتھی کی نظر میں آ گیا جو باہر برآمدے کی دیوار کی آڑ سے سامنے احاطے کی سمت فائرنگ کرنے میں مصروف تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ میں نہتا تھا اور اس کے نشانے پر۔ مگر اسے مجھ پر گولی چلانے کی حسرت ہی رہ گئی، میرے کسی ساتھی کی گولی اس کے دماغ میں گھس گئی اور وہ تیورا کر گرا۔ میں نے جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور جھکے جھکے آگے بڑھا اور جس دروازے سے بابن ڈکیت اندر داخل ہوا تھا، اسے دو تین زوردار ٹھوکریں مار کے توڑ ڈالا۔ اندر کا منظر واضح تھا۔ بابن کو پوری امید تھی کہ اس کے لیے ملک الموت بنا میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ اس لیے اس نے پہلے ہی بیگم صاحبہ کو دبوچ رکھا تھا۔ ایک تیز پھل والا چاقو اس کے دائیں ہاتھ میں تھا جس کی تیز دھار اس نے بیگم صاحبہ کی نرم و نازک گردن کے ساتھ لگا رکھی تھی اور بائیں ہاتھ کے شکنجے سے اس نے بیگم صاحبہ کو بیدردی سے دبوچ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں خوف کے بعد حیرت اور مسرت کی چمک ابھری تھی۔

"خبردار! ادھر ہی جمے کھڑے رہو۔ ایک قدم بھی مت بڑھانا آگے... ورنہ۔" بابن ڈکیت نے خوفناک غراہٹ کے ساتھ مجھے گھورتے ہوئے دھمکی دی۔

"تم بچ کر کہیں نہیں جا سکتے رذیل انسان، میں قبر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔" میں نے خون رنگ لہجے میں اس سے کہا۔ "بیگم صاحبہ کو چھوڑ دو کتے، ورنہ تیرا برا حشر کروں گا میں۔"

"میں جانتا ہوں تم کتنے خطرناک اور دلیر آدمی ہو، جو اس طرح آگ اور شعلوں کے درمیان اپنی جان کی پروا کیے بغیر بابن ڈکیت جیسے شیر کی کچھار میں گھستا چلا آیا ہے وہ معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ بہادر دشمنوں کی قدر کرتا ہوں، مگر..."

"بکواس بند کر دو اپنی۔" میں دہاڑا۔ "تم خود کو شیر کہتے ہو اور ایک کمزور عورت کو ڈھال بنا رکھا ہے۔"

"میں حکم کا غلام ہوں... مجھے جانے دو۔"

"غلام نہیں، زر خرید کتا کہو، چودھری ممتاز خان کا کتا... خود کو شیر کہنا تمہیں زیب نہیں دے رہا۔" میں نے خوفناک غراہٹ سے کہا۔ بیگم صاحبہ یک ٹک پھیلی پھیلی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہی تھیں، اب ان کی کشادہ قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھوں میں خوف کا شائبہ تک نہ تھا مگر خوف کی جو ہلکی جھلک ان کی آنکھوں سے مترشح محسوس ہوتی تھی اس کی نوعیت مجھے اور ہی محسوس ہوتی تھی، وہ شاید میری

وجہ سے خوف کا شکار تھیں کہ میں ان کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈال چکا تھا۔ بابن ڈکیت نے بیگم صاحبہ کو دبوچے ہوئے پیچھے سرکنا شروع کر دیا۔ اس طرف ایک سنگل پٹ کا دروازہ تھا جو تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ دفعتاً بیگم صاحبہ نے چیخ ماری۔ میں ٹھٹکا۔ ان کی کشادہ اور پھیلی آنکھوں میں خوف کی چمک واضح ہو گئی، میرے عقب میں انہوں نے شاید کسی کو دیکھا تھا، میں تیزی سے عقب میں گھوما اور غیر ارادی طور پر میرے دونوں ہاتھ بچاؤ کے لیے اٹھے تھے کیونکہ ایک دشمن رائفل کو نال سے پکڑے ہوئے میرے سر پر وار کرنا چاہ رہا تھا، میں نے رائفل اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی اور نال پر گرفت جماتے ہی حملہ آور کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔ رائفل چھوڑ کر اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ میں نے رائفل اس پر سیدھی کر کے ٹریگر دبایا مگر وہ خالی تھی۔ وہ سنبھل کر پھر مجھ پر ٹوٹ پڑا، اس بار میں نے اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی ناک پر رسید کر دی، ٹکر زوردار تھی، اس کی ناک کا بانسا تک پچک گیا وہ ڈھتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت میں نے تین گن بردار آدمیوں کو ٹوٹے دروازے سے اندر کودتے دیکھا۔ وہ کھیل داد اور اول خیر تھے، تیسرا بھی ہمارا ہی ساتھی تھا۔ شاید انہوں نے باہر کا میدان مار لیا تھا۔ میں تیزی سے پلٹا اور پھر جیسے میرے اوسان خطا ہو گئے۔ رذیل بابن ڈکیت بیگم صاحبہ سمیت غائب ہو چکا تھا۔

میں گولی کی طرح سنگل پٹ والے دروازے کی طرف لپکا، عقب میں مجھے اول خیر کے پکارنے کی آواز سنائی دی تھی مگر مذکورہ دروازے سے باہر نکل چکا تھا، سامنے بنجر علاقہ تھا اور میری تکتی ہوئی نظروں نے بابن ڈکیت کو تاڑ لیا، وہ ایک بند جیپ میں بیگم صاحبہ کو سوار کرانے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے اس طرف دوڑ لگا دی، جب تک میں قریب پہنچا، وہ جیپ میں سوار ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ تب تک میں پھرتی سے جیپ کے عقبی بند دروازے پر نصب فاضل ٹائر کے ساتھ اچھل کر چپک گیا تھا۔ شاید بابن کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ جیپ میں مجھے ایک ڈرائیور کی جھلک بھی نظر آئی تھی، جیپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی، میں اس کی چھت پر آ گیا۔ شکر تھا کہ چھت سپاٹ نہیں تھی، ورنہ ہچکولے کھاتی جیپ کی چھت سے میں پھسل کر گر سکتا تھا۔ سامان رکھنے والے آہنی جنگلے کے ساتھ میں چپک گیا تھا اور آگے سرکنے لگا۔ روف ونڈو سے میں نے نیچے کا جائزہ لیا۔ گھنی مونچھوں والا ایک آدمی اس جیپ کا اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا تھا جبکہ بابن ڈکیت اس کے عقب والی سیٹ پر بیگم صاحبہ کو دبوچے بیٹھا تھا۔ وہ ڈرائیور سے پوچھ رہا تھا۔

"چودھری صاحب کدھر نکل گئے؟"

"دشمن ان کے پیچھے تھے، وہ بھی بڑی مشکلوں سے نکلے ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر لیں۔" ڈرائیور نے کہا۔ بابن کو میں نے اپنی قمیص کی سائڈ پاکٹ کھنگالتے دیکھا۔ شاید وہ سیل فون نکالنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کی نظر روف ونڈو پر پڑی۔ ایک لمحے کو غیر یقینی انداز میں اس کی آنکھیں پھیلیں۔ روف ونڈو پر آہنی جنگلا فٹ تھا۔ میں نے اس کی چلاتی ہوئی آواز سنی، وہ ڈرائیور سے مخاطب تھا۔

"جوگی... وہ چھت پر موجود ہے، جیپ کو لہراؤ۔"

جوگی نامی ڈرائیور کو یقیناً حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ وہ پہلے تو تھوڑا گڑبڑا سا گیا۔ پھر اس نے نہ صرف جیپ کی رفتار بڑھا دی بلکہ اسے زگ زیگ انداز میں لہرانے بھی لگا۔ میرا توازن بگڑنا شروع ہوا مگر میں نے روف پر لگے آہنی جنگلے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

"یہ لو بابن استاد! چھت پر فائر کرو۔" معاً میں نے جوگی ڈرائیور کی آواز سنی اور ذرا آگے سرک کر نیچے جھانکا، وہ ڈیش بورڈ کے خانے سے ایک سیاہ پستول نکال کر بابن ڈکیت کو تھما رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کو اس نے ایک ہاتھ سے دبوچ رکھا تھا۔ انہیں بظاہر اب جیپ کی چھت پر میری موجودگی کا علم ہو چکا تھا انہوں نے اپنی مزاحمت تیز کر دی تاکہ بابن ڈکیت مجھ پر فائر نہ کر سکے، یہ خطرناک صورت حال تھی، جیپ ناہموار سے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ ایسے میں جیپ کے اندر سے داغی جانے والی اندھی گولیوں سے خود کو بچانا ناممکن حد تک مشکل ہوتا۔ اس پر مستزاد میرے دائیں پہلو کا چرکا نما خوابیدہ زخم بھی جاگ سکتا تھا مگر شکر تھا خدا کا کہ ابھی تک وہ بالکل ٹھیک تھا، ثریا نے بڑی مہارت سے مرہم پٹی کی تھی اور اس کے بعد نہ جانے کون سا انجکشن لگایا تھا کہ درد تو کجا زخم کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔

دفعتاً فائر ہوا۔ گولی جیپ کی چھت میں سوراخ کرتی ہوئی، میرے چہرے کے اس قدر قریب سے نکل گئی کہ مجھے اس کی "جھپک" بالکل اپنے چہرے کے قریب محسوس ہوئی تھی، میں ایک دم پیچھے کو ہٹتا چلا گیا۔ وہ ایک کے بعد ایک فائر کرتا رہا۔ اور گولیاں چھت میں سوراخ کرتی میرے چہرے کے بالکل سامنے آر پار ہوتی گئیں۔ ادھر جیپ بھی لہرا رہی تھی، اس کے باعث میرا ایک ہاتھ لوہے کے جنگلے کی

ایک سلاخ پر گرفت نہ جما سکا اور میں دائیں جانب کو پھسل کر جیپ کی چھت سے نیچے گرنے لگا تو ایک ہاتھ نے گرفت مضبوط کر لی۔ اب میرا وجود جیپ کے دائیں جانب کھڑکی کے قریب جھولنے لگا۔ یہ اس سمت کی کھڑکی تھی جدھر بابن ڈکیت، بیگم صاحبہ کو دبوچے بیٹھا چھت پر اپنے پستول سے فائر کر رہا تھا۔ مجھے کھڑکی کی سمت جھولتے دیکھ کر اس نے پستول کا رخ میری جانب کر دیا۔ میں اس کے نشانے پر تھا۔ بیگم صاحبہ کے حلق سے تیز چیخ خارج ہوئی، جس وقت بابن ڈکیت مجھ پر فائر کرنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک بیگم صاحبہ نے ہمت سے کام لے کر اس کے پستول والے ہاتھ پر اپنے ایک ہاتھ سے جھپٹا مارا۔ عین فائر کرنے سے پہلے بابن کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گرا اور سیٹ کے نیچے کہیں لڑھک گیا۔ اس کے حلق سے خشمناک غراہٹ ابھری اور اس نے بیگم صاحبہ کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ادھر میں نے موقع غنیمت جان کر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت جنگلے کے سرے پر مضبوطی سے جمائی اور اپنا... ہوا میں جھولتا وجود سکیڑ کر اوپر اٹھایا اور دونوں ٹانگیں کھڑکی کے اندر گزار کر بابن ڈکیت کی بیل جیسی گردن پر "لیگ لاک" لگا دیا۔ اب میرا آدھا دھڑ باہر تھا اور نصف اندر... میری اور بابن ڈکیت کے درمیان زور آزمائی جاری تھی کہ اچانک ڈرائیور کی ہولناک کارروائی میری نظروں میں آ گئی۔ وہ جیپ کو سامنے تیزی سے قریب آتے ہوئے ایک موٹے تنے والے درخت کے بتدریج قریب کرنے لگا۔ مقصد جیپ کو اس کی سائڈ سے ٹکراتے گزارنا تھا۔ جس کے باعث میرا باہر کو جھولتا ہوا اوپری وجود درخت کی خوفناک رگڑ سے بری طرح مجروح ہو جاتا۔ وقت کم تھا، درخت لمحہ بہ لمحہ اور نہایت تیزی کے ساتھ قریب آ رہا تھا۔ ادھر بابن ڈکیت کی گردن سے میری زور آزمائی جاری تھی۔ جیپ اور درخت کے درمیان فاصلہ تیزی سے گھٹتا جا رہا تھا اور میرے پاس محض چند سیکنڈ تھے کہ یا تو میں بابن کی گردن چھوڑ کر دوبارہ چھت کی طرف جانے کی کوشش کرتا یا کھڑکی ہی کے راستے میں اندر داخل ہوتا جو سردست مشکل ہی نظر آ رہا تھا، ٹھیک اس وقت جب میں بابن کی گردن اپنی ٹانگوں سے آزاد کرنا چاہتا تھا اس بدبخت کو بھی عین وقت پر احساس ہو گیا کہ اس کا ساتھی ڈرائیور جوگی میرے خلاف کس قدر ہولناک داؤ کھیل چکا ہے۔ تب بابن نے فوراً اپنی گردن میری ٹانگوں سے چھڑانے کے بجائے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ میری دونوں ٹانگوں کو گرفت

نئے سال کا پہلا شمارہ اہمیت کا حامل شمارہ
ماہنامہ
سرگزشت
شکوہ سخن
اس شاعر کا زندگی نامہ جسے کالا پانی کی سزا ہوئی تھی
کیسے کیسے لوگ
انوکھی شخصیات کا مختصر مختصر سا تعارف
سمندر کے بھید
سمندر کی انوکھی دنیا کے رنگ عجیب ہیں
ہم پلہ
اس فنکار کی سرگزشت جس نے فن میں نام پیدا کیا
مایا
اندرون سندھ سے ایک انتہائی
دلچسپ و سبق آموز سچ بیانی
اس کے علاوہ
"سراب" جیسی لہو کو گرم کر دینے والی طویل کہانی
"دو فلکی الف لیلہ" جو خود میں تاریخ ہے
"الوداع" ایک لڑکی سفر کہانی جو معلومات کا خزانہ ہے
اور
ایک سے بڑھ کر ایک دلچسپ سچے واقعات
انوکھے قصے، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مختص کرالیں

میں لے لیا۔ گویا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی گردن میں ڈالنے والی میری ٹانگوں کی کوشش خود میرے گلے کا پھندا بن گئی تھی، اب میں اوپر کی جانب حرکت کرنے سے معذور تھا۔ یوں بھی اتنا وقت ہی کہاں بچا تھا میرے پاس کہ میں خود کو تیزی سے قریب آنے والے درخت کی ہولناک رگڑ نما ٹکر سے بچا پاتا۔ مجھے اپنی کربناک موت محض چند انچ کے فاصلے پر نظر آ رہی تھی اور میں بے بسی سے اسے اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

عین آخری لمحات میں بیگم صاحبہ کو بھی اس خوفناک صورتِ حال کا احساس ہوا اور پھر انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک دم اپنی جگہ سے اچھل کر ڈرائیور جوجی کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ کو بائیں جانب موڑ دیا۔ جیپ کا رخ بدلا اور موٹے درخت کا مہیب تنا میرے بالکل قریب سے گزرتا چلا گیا مگر ایک اور مصیبت گلے آن پڑی۔ اچانک اسٹیئرنگ کاٹنے کے باعث جیپ کا توازن بگڑا۔ پہلے وہ دائیں جانب لہرائی پھر شاید ڈرائیور جوجی نے اسے سنبھالنے کی کوشش چاہی تھی اور پھر وہ بائیں جانب لہرائی، پھر ایک ٹبے پر چڑھ گئی اور الٹ گئی، شکر تھا کہ دوسری جانب سے الٹی تھی ورنہ میں پس جاتا، جیپ تھوڑی دور تک گھسٹتی رہی پھر رک گئی، گرد و غبار کا طوفان سا اٹھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں مٹی سے اٹ گیا ہوں، میں نے خود کو فوراً سنبھالا اور جیپ کا دروازہ کھولا جو اب اوپر کی جانب کھل رہا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ ڈرائیور جوجی اگلی نشست میں پھنسا ہوا تھا اور بابن ڈکیت کا بھی یہی حال تھا۔ وہ درمیانی سیٹوں میں الٹا ہوا تھا اور بیگم صاحبہ اس کے اوپر تھیں، میں نے بیگم صاحبہ کا ہاتھ تھام لیا اور انہیں سہارا دے کر باہر نکال لیا۔ وہ ہوش میں تھیں مگر تھوڑا کراہ رہی تھیں۔ میں انہیں سنبھال کر ٹبے سے نیچے لے آیا اور پوچھا۔

"بیگم صاحبہ! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں، میں... میں ٹھیک... آہ..." وہ بولتے بولتے کراہ گئیں۔ تب میں نے محسوس کیا ان کے ایک پاؤں کے گھٹنے میں چوٹ لگی تھی اور ٹخنے کی ہڈی کا بھی یہی حال تھا۔ میں نے ان کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے بیگم صاحبہ کو چھوا تھا، اور اس چھونے میں مجھے عجیب طرح کی لطافت کا احساس ہوا تھا، میں نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ میں انہیں سہارا دیتا ہوا ٹبے سے اترا۔ ایسے میں ان کا بھرا بھرا اور گداز سا وجود مجھ سے مس ہو رہا۔

میں انہیں لے کر ایک نسبتاً چھوٹے ٹیلے کی آڑ میں لے آیا اور آرام سے سہارا دے کر بٹھا دیا اور گرد و پیش پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔

دور و نزدیک ٹیلوں ٹبوں کا سلسلہ پھیلا نظر آتا تھا، کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ کچھ ٹنڈ منڈ سے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کہا۔

"بیگم صاحبہ! آپ ادھر رکیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

"کک... کدھر جا رہے ہو تم... شہزی؟" ان کے لبوں سے جیسے بے اختیار نکلا۔

"جیپ میں ابھی ہمارا ایک خطرناک دشمن موجود ہے۔ وہ کوئی بھی گل کھلا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اسے زندہ نہ چھوڑنا... شہزی۔" بیگم صاحبہ کی آواز میں اچانک ہی ناگن جیسی منتقمانہ پھنکار عود کر آئی۔

"مگر اپنا خیال رکھنا۔" میں انہیں تسلی دے کر پلٹا ہی تھا کہ اچانک میں نے کسی کو خوفناک انداز میں غراتے ہوئے خود پر ٹوٹ پڑتے دیکھا۔ میں نے بچنے کی کوشش چاہی تھی مگر بے سود... حملہ آور مجھے رگیدتا رہ گیا۔ بھربھری مٹی کی گھٹن آمیز گند میرے سینے میں بھرتی محسوس ہوئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپا اور خود پر سوار ہونے کی کوشش کرنے والے کو دونوں بازوؤں سے دبوچ کر گھما کر خود سے دور لڑھکا دیا۔ وہ بدرا اقبال عرف بابن ڈکیت تھا۔ میں نے پھرتی سے اٹھ کھڑے ہونے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی، کھڑا تو وہ بھی فوراً ہو گیا تھا مگر اس نے دوبارہ مجھ پر پل پڑنے کی کوشش نہ کی اور غرا کر تہدیدی انداز میں بولا۔

"تم بچ کر نہیں جا سکتے... شہزاد خان! مجھے تمہاری اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔ چودھری صاحب اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں کسی بھی وقت پہنچنے والے ہیں۔"

میں اس کی بات پر ٹھٹکا اور اندر سے فکر آمیز تشویش کا شکار ہو گیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس خبیث نے موقع ملتے ہی ممتاز خان کو نہ صرف موجودہ حالات بلکہ ویران اور بنجر مقام کے بارے میں بھی اچھی طرح آگاہ کر دیا ہوگا جدھر اس وقت ہم موجود تھے۔ سیل فون اس کے پاس تھا اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی جیپ کے اندر اسے ممتاز خان سے سیل فون پر باتیں کرتے دیکھ اور سن چکا تھا۔ ممکن تھا ممتاز خان میرے پہلے والے حملے سے بچ کر جب اپنے ڈیرے کا رخ کرنے کے بجائے جان بچانے کے لیے کسی اور سمت اپنی

گاڑی میں فرار ہوا تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا اور آس پاس کہیں موجود تھا۔ گویا اب میرا اور بیگم صاحبہ کا یہاں رکنا خطرے سے خالی نہ تھا اور بابن ڈکیت ہر قیمت پر ہمارا راستہ روکے رکھنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس سے فیصلہ کن جنگ کرنا اور جلد اس کا قضیہ نمٹانا میرے لیے ازبس ضروری ہو گیا تھا۔ یہ تہیہ کر کے میں اس پر پل پڑا۔

اس نزاکت کو وہ بھی بھانپ چکا تھا لہٰذا پوری طرح میرے مقابل آن کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں بری طرح گتھم گتھا ہو گئے، بیگم صاحبہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہی تھیں۔ ایک موقع تاک کر بابن ڈکیت نے اپنے دائیں بازو کے گھیرے میں میری گردن لینے کی کوشش چاہی تھی کہ مجھے اپنے بائیں بازو کی کہنی کا وار اس کے پیٹ پر کرنے کا موقع مل گیا۔ ضرب زوردار تھی جس نے اسے بلبلا کر رکھ دیا۔ میں نے پلٹ کر ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ میں اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے پھرتی سے اڑنگا لگا کر گینڈے جیسی جسامت والے بابن کو نیچے گرا دیا۔ خون اس کی ناک سے بھل بھل بہتا جا رہا تھا جس کے باعث اس کا چہرہ مزید مکروہ نظر آنے لگا۔ میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگا مگر میں نے اس وقت تک اس کی گردن نہ چھوڑی تھی جب تک اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز نہ کر گئی۔ میں اٹھ کر پلٹا تو سناٹے میں آ گیا۔ بیگم صاحبہ اپنی جگہ سے غائب تھیں۔

ابھی میں اسی کیفیت میں تھا کہ معاً مجھے قریب سے ایک چیخ سنائی دی۔ میں ٹھٹکا۔ آواز کی سمت کا اندازہ لگایا تو وہ اس ٹبے کے عقب سے آتی محسوس ہوئی، پھر جیسے میرے بدن میں بجلی دوڑ گئی، میں دوڑتا ہوا ٹبے کے اوپر پہنچا تو مجھے گرتی پڑتی بیگم صاحبہ دکھائی دے گئیں۔ بابن ڈکیت کا ساتھی جوجی انہیں بیدردی سے کھینچے لیے جا رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار للکار سے مشابہ چیخ ماری تو وہ ٹھٹک کر رکا اور مڑ کر پیچھے میری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے بابن کے ساتھ گتھم گتھا ہوتا دیکھ کر پیچھے اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی اور بیگم صاحبہ کو کسی طرح بے بس کر کے خاموشی سے اپنے ساتھ لے اڑا تھا مگر موقع ملتے ہی بیگم صاحبہ کی چیخ سے میں اس طرف متوجہ ہوا۔ میں نے اس طرف دوڑ لگا دی اور ٹبے کی بھربھری مٹی والی ڈھلان سے دوڑتا پھسلتا ہوا چشم زدن میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ وہ شاید جان چکا تھا کہ میں اس کے گرو گھنٹال بابن ڈکیت کو "پچھاڑ" آیا تھا۔ اس لیے اس پر میری دہشت سوار ہو گئی، وہ بیگم صاحبہ کا ہاتھ چھوڑ کر سرپٹ ایک جانب دوڑ پڑا۔ میں نے اس کے تعاقب میں جانے کی سعی چاہی تھی مگر بیگم صاحبہ نے مجھے روک دیا اور وہ خود بے دم ہو کے گر پڑیں۔

دن پوری طرح نکل چکا تھا۔ سورج گویا سوا نیزے پر آ کے آگ برسا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر بیگم صاحبہ کو سنبھالا... مگر وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ میرا اب یہاں موجود رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نہ جانے کون سا علاقہ تھا، کس کی جاگیر تھی؟ تاہم اتنا مجھے پتا تھا کہ بھگوڑا ممتاز خان کسی وقت بھی یہاں آ سکتا تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ بیگم صاحبہ کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر میں نے اپنے کاندھے پر لاد دیا اور ایک طرف کو چل پڑا۔

مجھے دور و نزدیک کہیں بھی آبادی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مگر میں اس نیم صحرائی علاقے سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ دھوپ کی شدت کے باعث گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق میں بھی کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس پر مستزاد میں پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل حالتِ جنگ میں تھا اور مجھے ذرا بھی آرام کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔

ذہن اور جسم پر اب تھکن کے آثار غلبہ پانا شروع ہو گئے تھے مگر ایک لمحے کے لیے میں یہاں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا بیگم صاحبہ کے بے سدھ وجود کو اٹھائے چلتا رہا۔ تھوڑی دور گیا تھا کہ مجھے بیگم صاحبہ کے وجود میں حرکت سی محسوس ہوئی۔ پھر وہ کراہنے لگیں... میں رک گیا اور انہیں خود پر سے نیچے اتار کر بغور جائزہ لیا۔ وہ ہوش میں آ چکی تھیں۔ شاید انہیں میری تکلیف کا احساس اور اندازہ تھا، بولیں۔ "میں پیدل چل سکتی ہوں۔"

"شکر ہے بیگم صاحبہ! آپ کو ہوش آ گیا۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔ وہ بغور مگر عجیب سی نگاہوں کے ساتھ میری طرف تکتی رہیں پھر بولیں۔

"میں ٹھیک ہوں مگر ہم ہیں کہاں؟ اور وہ بابن ڈکیت؟"

میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا کہ میں اسے ختم کر چکا ہوں جبکہ اس کا دوسرا ساتھی جوجی فرار ہو چکا ہے۔

"بیگم صاحبہ! ہمارا اس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے دور نکل جانا بہتر ہوگا۔" انہیں بھی اس خدشے کا پوری طرح علم تھا لہٰذا بولیں۔

"چلو... میں چل سکتی ہوں۔" کہہ کر انہوں نے

آگے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بے اختیار ان کے منہ سے ایک تکلیف دہ کراہ خارج ہوئی۔ وہ گرنے لگیں تو میں نے ان کو تھام لیا اور بولا۔

"بیگم صاحبہ! ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکلنا ہوگا ورنہ اس بار خطرے میں گھر گئے تو نکلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"تم سہارا دو مجھے... میں چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ ہولے سے بولیں۔ میں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"بیگم صاحبہ! اس طرح دیر ہو جائے گی ہمیں نکلنے میں... میرا مطلب تھا اگر آپ برا نہ منائیں تو... میں آپ کو اٹھا لوں؟ اسی طرح فاصلہ جلدی طے ہو جائے گا۔ ابھی آپ بے ہوش تھیں تو میں آپ کو اسی طرح ہی اٹھا کر لایا تھا۔"

بیگم صاحبہ نے ایک عجیب سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور اپنے سر کو جنبش دی۔ میں نے دھیرے سے تھاما اور پھر کاندھے پر ڈال لیا۔

شدید گرمی اور دھوپ میں جلتے تپتے صحرائی علاقے میں بیگم صاحبہ کو اٹھائے میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی میں اپنے گرد و پیش پر بھی نظریں دوڑاتا جاتا۔ میں پیدل کافی فاصلہ طے کر چکا تو مجھے سامنے ذرا دور کھیتوں کا سلسلہ نظر آیا۔ اس سے پرے گارے مٹی کی کچی دیواروں والے بے ترتیب گھروں کی قطاریں بھی دکھائی دیں۔ ایک چھتنار سے درخت تلے میں سستانے کو ذرا رکا اور نہایت آہستگی سے بیگم صاحبہ کو اپنے کاندھوں سے نیچے اتار کر درخت تلے بٹھا دیا اور خود لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ میرا پورا جسم پسینے سے تر بتر تھا۔ چند ثانیے بیگم صاحبہ مجھے دیکھتی رہیں پھر ہولے سے بولیں۔

"شہزی! تم نے میری جان بچانے کی خاطر اپنی زندگی کی بھی پروا نہ کی اور خطروں سے کھیلتے رہے؟ کیوں؟" بیگم صاحبہ کا سوال مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ میں ان کے قریب ہی درخت کے تنے سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر مسکرا کر جواباً کہا۔

"بیگم صاحبہ! ہر ایک انسان دوسرے انسان کی خاطر کچھ نہ کچھ کرتا ضرور ہے اور پھر آپ کا تو مجھ پر احسان بھی ہے کہ..."

"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اب تک۔" وہ فوراً میری بات کاٹ کر بولیں اور اپنے میلے چیکٹ دوپٹے سے چہرہ صاف کیا۔

"اول خیر کی صورت میں آپ کا مجھ پر کوئی معمولی احسان نہیں ہے بیگم صاحبہ۔" میں نے کہا۔

"اوہ..." ہولے سے ان کے دلنشیں لبوں سے نکلا۔ "اول خیر سے تمہاری گاڑھی چھننے لگی ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔

"جی ہاں بیگم صاحبہ! اول خیر میرے لیے بھائیوں سے بڑھ کر ہے۔ وہ میرا سچا جاں نثار دوست ہے۔ جسے اچھا اور سچا دوست میسر آ جائے، دنیا میں پھر اس سے بڑھ کر خوش نصیب کوئی نہیں۔"

"ہم..." بیگم صاحبہ نے ہولے سے ہنکاری بھری پھر بولیں۔ "عابدہ کو بھی تم بہت پسند کرتے ہو اگر کبھی کوئی ایسا موقع آ جائے کہ تمہیں اپنے دوست اول خیر اور عابدہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑ جائے تو تم دونوں میں سے کس کا انتخاب کرو گے؟"

میں بیگم صاحبہ کے اس عجیب و غریب سوال پر چونکا تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم دونوں جن حالات سے دوچار تھے، وہ کم از کم اس طرح کے عجیب و غریب اور گمبھیر سوالات کرنے کے نہ تھے۔ بہرحال میں نے بے تاثر مسکراہٹ سے کہا۔ "عابدہ اور اول خیر کا میرے دل میں الگ الگ مقام ہے بیگم صاحبہ اور دونوں ہی مقام میرے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔" کہتے ہوئے میں نے یونہی گرد و پیش پر نظر ڈالی اور پر کھڑے ہو کر اپنی پیشانی پر ہاتھ کا چھجا بنا کر دور نظر آتے کھیتوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"آگے آبادی ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں وہاں پہنچنا چاہیے... آپ تیار ہیں بیگم صاحبہ؟"

"ہاں چلو۔" وہ بولیں پھر خود ہی اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش چاہی۔ میں نے انہیں سہارا دیا۔ وہ چلے سے لنگ کے ساتھ آگے بڑھیں اور کراہ کر رہ گئیں۔ میں نے انہیں دوبارہ اٹھا لیا اور آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

کھیتوں کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ مجھے کچھ لوگ کھیتوں میں کام کرتے نظر آئے تھے۔ بیگم صاحبہ کو نیچے اتار کر میں ان کی جانب ابھی بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے کھیتوں کے درمیان میں ذرا دور گرد و غبار کے مرغولے اٹھتے دکھائی دیے۔ متوقع خدشے کے پیش نظر میرا دل زور سے دھڑکا۔ پیش قدمی کا ارادہ بدل کر بغور مذکورہ سمت دیکھنے لگا۔ کھیتوں کے درمیان بل کھاتے کچے راستے پر مجھے دو تین گاڑیاں دوڑتی دکھائی دیں۔ ان کا رخ آبادی کی طرف تھا۔ پھر اچانک اگلی دو گاڑیاں آبادی کی طرف

مرحبا
قدرت کی حکمت
مرحبا شہد
میٹھی صبح بخیر
Marhaba
HONEY
Marhaba Laboratories
UAN 111-152-152
www.marhaba.com.pk

Copied From Web

گھوم گئیں جبکہ ایک کا رخ کھیتوں کی طرف ہو گیا۔ مجھے تشویش نے آن لیا۔ میں فوراً پلٹا اور اس چھتنار درخت تلے آ گیا جدھر بیگم صاحبہ موجود تھیں۔ میرے چہرے سے مترشح فکر کو بھانپتے ہوئے بولیں۔

”خیریت ہے؟“

”جلدی آئیں میرے ساتھ۔“ میں نے سہارا دے کر انہیں کھڑا کرتے ہوئے کہا۔ مجھے قریب ایک کھوہ سی دکھائی دی تھی۔ یہ ایک گڑھا سا تھا جو تازہ کھودا گیا تھا۔ شاید یہاں ٹیوب ویل یا واٹر کورس کا کام ہونے والا تھا۔ میں بیگم صاحبہ کو لے کر اس مختصر سے گڑھے نما کھوہ میں اتر گیا اور انہیں خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اچانک مجھے اپنے دائیں کان کی لو میں گرمی کا احساس ہوا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میرے کان میں نصب خفیہ ٹرانسمیٹر میں کال آ رہی تھی جو ثریا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں کھوہ سے باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے بیگم صاحبہ کے سامنے کال ریسیو کرنا پڑی۔ اپنے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کان میں نصب ٹرانسمیٹر بٹن پر رکھ لی اور بولا۔ ”میں شہزاد اسپیکنگ... اوور۔“

دوسری جانب سے ثریا کی آواز ابھری۔ ”شہزی! تم کہاں ہو؟ خیریت سے تو ہو نا؟ اوور؟“

میں نے اسے اب تک کی مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا تو اس نے مجھے بتایا... ممتاز خان نے ہیڈ کوارٹر کال کر کے اسپیکٹرم کے دس ایجنٹوں کو مدد کے لیے بلایا ہے۔

”شہزی! ممتاز خان نے بہت خطرناک اور تربیت یافتہ کارندوں سے مدد لی ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ میں بھی تمہاری کوئی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔ بس! اطلاع ہی دے سکتی ہوں اوور...“

بیگم صاحبہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے اس طرح کان پر ہاتھ رکھ کر باتیں کرتے ہوئے خاموشی سے تکے جا رہی تھیں۔

میں نے ثریا سے کہا۔ ”تمہارا شکریہ... ثریا! تم میرے لیے جتنا کر سکتیں وہ کم نہیں۔ بس خیریت کی دعا کرو، اوور...“

”شہزی! میں تمہیں ایک مقام کا پتا بتاتی ہوں۔ اگر تم کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤ تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔ تم نے اس وقت اپنی موجودگی کی جو لوکیشن بتائی ہے... وہاں سے...“

اچانک مجھے کسی گاڑی کے غراتے ہوئے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹکا اور فوراً باتوں کا سلسلہ موقوف کر کے پلٹا۔ بیگم صاحبہ کو ساتھ گھسیٹ کر ایک دم کھوہ کی دیوار کے ساتھ چپک کے دبک گیا۔ مجھے اپنے سر پر مٹی کے ذرے گرتے محسوس ہوئے اور پھر جیسے منڈیر کے بالکل قریب ہی کوئی گاڑی رکی تھی۔ اس کے بعد دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں ابھریں۔ یکلخت میرا دل گویا سائیں... سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ خطرہ... محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ہمارے سروں پہ منڈلا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ سمیت کھوہ کی دیوار سے چپکا ہوا اس سمت سرکنے لگا جدھر سیمنٹ کا تھڑا سا بنا ہوا تھا اور یہاں موٹر فٹ کرنے کے لیے تقریباً سات فٹ لمبا اور پانچ فٹ چوڑا چبوترا بنایا ہوا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے جاں گسل لمحات درکار تھے۔ دیکھ لیے جانے کا خدشہ تھا۔ مگر اس سے زیادہ خطرہ یہاں محبوس پڑے رہنے پر تھا۔ دشمن سر پر تھے۔ اگرچہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ دشمن ہی ہوں۔ مگر حالات دوراں کے پیش نظر اور ”کالوائے“ سے ایک گاڑی کا اس جانب مڑنا... اس امکان کا پکار دیتا تھا کہ یہ حرکت پذیری... ہماری تلاش ہی کا شاخسانہ لگتی تھی۔

بہت دھیرے سے محتاط روی کے ساتھ میں اوپر کھوہ کی منڈیر پر نظر ڈالتا ہوا بالآخر سیمنٹ کے مذکورہ تھڑے کے پاس پہنچ ہی گیا۔ پہلے میں نے بیگم صاحبہ کو اندر داخل کیا اور پھر جیسے ہی میں اندر کی جانب دیکھنے کے لیے لپکا... دفعتاً مجھے اوپر منڈیر پر تین چار مسلح افراد کے سر طلوع ہوتے دکھائی دیے۔ میں فوراً نیچے بیٹھ گیا۔ خیریت رہی کہ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑ سکی۔ اب میں ان لوگوں کو دیکھنے سے تو قاصر تھا مگر ان کی آپس میں ہونے والی باتوں کی آوازیں مجھ تک صاف پہنچ رہی تھیں، جس سے یقین کی حد تک اس شبہے کی بھی بالآخر تصدیق ہو گئی کہ یہ ہمارے دشمن اور چودھری ممتاز خان کے ساتھی تھے۔

”میرا خیال ہے... ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ وہ دونوں آبادی میں ہی کہیں کسی گھر میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔“ دوسرے کی آواز ابھری۔ ”ہم نے یہاں کھیتوں میں کام کرنے والے مقامی لوگوں سے بھی پوچھ لیا مگر انہوں نے کسی اجنبی یا نووارد افراد کے بارے میں لاعلمی کا ہی اظہار کیا۔“

ان کے لہجے مقامی تھے۔ تاہم اندازہ نہیں تھا کہ یہ ممتاز خان کے دیسی ساختہ کارندوں کا گروپ تھا یا اسپیکٹرم کے ایجنٹ تھے۔ کیونکہ بقول ثریا کے... اسپیکٹرم میں غیر ملکیوں کے علاوہ مقامی لوگ بھی آلۂ کار تھے جبکہ میری عقل و فہم کے مطابق اسپیکٹرم جیسی بین الاقوامی نوعیت کی حامل تنظیم صرف مخصوص عہدوں کے لیے مقامی اور با اثر شخصیات کا ہی......... انتخاب کرتی تھی۔ ان میں ملک جہان، ممتاز خان اور ثریا اہم مثالیں تھیں۔

معاً ایک تیسری آواز ابھری۔ ”واپس لوٹنے سے پہلے اس کھالا نما جگہ میں اتر کر تسلی کر لینی چاہیے ہمیں۔“

میرا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ بیگم صاحبہ یہ سب باتیں سن رہی تھیں۔ ان کا چہرہ بھی متوحش سا نظر آنے لگا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اسلحہ نام کی کوئی شے اس وقت میرے پاس نہ تھی، میں نہتا تھا۔ تھوڑا... اوپر ہو کے ان کی پوزیشن کا اندازہ کرنے لگا۔ میں نے دو آدمیوں کو کھالے نما کھوہ میں اترتے دیکھا۔ ممکن تھا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے چاروں طرف نظر ڈالنے کے بعد لوٹ جاتے مگر ایسا نہ ہوا۔ دونوں کو میں نے اس سمت بڑھتے دیکھا جدھر میں اور بیگم صاحبہ چھپے بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں جدید ساخت کے پستول نظر آ رہے تھے جبکہ اوپر موجود ان کے دو ساتھی بھی مسلح تھے گویا ہم بری طرح پھنسے تھے۔ مجھے آگے بڑھتے ہوئے ان دونوں پستول بدست کارندوں کے قدموں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب بس... جھانکنے کی دیر تھی ان کے اور ہمارے دیکھ لیے جانے کی۔ خطرہ لٹکتی تلوار کی طرح سر پر جھولنے لگا تھا۔ میں محتاط ہو گیا۔ میرے اعصاب یک دم تن گئے، دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جوشِ لہو کی گردش رگوں میں لاوا سا اچھالنے لگی کہ بس کوئی دم کو لاوا ابل پڑنے کو تیار تھا اور پھر... وہی ہوا۔

میں نے ایک سر کو اوپر سے ابھرتے اور پھر نیچے جھکتے دیکھا۔ اس نے سیمنٹ کی منڈیر کا سہارا لیا ہوا تھا اور پستول اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں پھر جیسے میرے تھکے ہوئے وجود میں ایکا ایکی بجلی دوڑ گئی۔ میں نے ایک زوردار گھونسا اس کی ناک پر جڑ دیا اور بہ سرعت دوسرے ہاتھ سے اس کا پستول جھپٹ لیا۔ پھر تلے اوپر دو فائر کر ڈالے، ایک گولی میرے قریب لہراتے ہوئے اپنی زخمی ناک سہلاتے کارندے کو چاٹ گئی، دوسری گولی نے ذرا فاصلے پہ کھڑے دوسرے کارندے کے سینے کو نشانہ بنایا۔ اوپر منڈیر پر موجود مسلح کارندوں کے ہاتھوں میں ایس جی ایم رائفلیں تھیں، وہ ایک دم مجھ پر سیدھی کر کے انہوں نے بیک وقت دو برسٹ فائر کر دیے مگر متوقع خطرے کو بھانپ کر میں پہلے ہی پھرتی کے ساتھ نیچے کو جھک گیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سیمنٹ کے کونوں کناروں پر پڑی اور کئی سنگ ریزے بکھرے۔ میں نے پھرتی سے اپنی جگہ بدلی اور مشرقی کونے کی آڑ سے اوپر سامنے منڈیر پہ کھڑے دونوں کارندوں پر تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے۔ ایک کریہہ انگیز چیخ مار کے نیچے کھالے میں آن گرا جبکہ دوسرا پیچھے کو ہٹ گیا۔ میں وہیں دبکا متلاشی نظروں سے اوپر دیکھتا رہا کہ شاید کہیں سے اچانک ابھر کر مجھ پہ فائر کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر کئی پل بیت گئے تو ایک خیال سے میرا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں وہ فون وغیرہ پر ممتاز خان سے رابطہ کر کے یہاں ہونے والی خوں ریز کارگزاری کے بارے میں نہ بتا رہا ہو۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً یہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ لہٰذا میں دیوانہ وار ہمت اور پیش قدمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سیمنٹ کے اس قبر نما کھالے سے نکلا اور جھکا جھکا محتاط روی سے چلتا ہوا کھوہ کی دیوار کے نزدیک آ گیا۔ پھر اوپر کی جانب رینگنے لگا۔ پستول میں نے منہ میں دبایا اور دونوں ہاتھوں کی مدد سے نچلا دھڑ اوپر گھسیٹا اور سر ابھار کر دیکھا تو میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ وہ کار کے قریب پوزیشن سنبھالے فون پر باتوں میں مشغول تھا اور میرا سر ابھرتا اس نے بھی دیکھ لیا۔ میں ابھی اس پر گولی چلانے کی پوزیشن میں نہ تھا مگر اس نے دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی گن سے جس کا رخ کھوہ کی طرف ہی تھا برسٹ داغ دیا۔ میں خطرہ بھانپ کر پہلے ہی نیچے کو دبک گیا۔ کھوہ کی منڈیر کے پاس زمین پر گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ پڑی اور مٹی کے ذروں کی باڑھ میرے چہرے سے ٹکرائی۔ میں نے آنکھیں موند لی تھیں پھر فوراً دوسری جانب سرک کر میں ابھرا اور اس دوران میں نے پستول بھی منہ سے نکال کر اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ اس بار ابھرتے ہی میں نے اسے فائر کرنے کا موقع دیے بغیر اپنے پستول سے تلے اوپر دو تین فائر کر ڈالے۔ ایک گولی اس کی ٹانگ پہ لگی جبکہ دو گولیاں کار کی باڈی میں کہیں پیوست ہو گئیں۔ اس نے سنبھل کر مجھ پہ ایک اور برسٹ داغ دیا۔ میں نے ایک بار پھر کھوہ کی منڈیر والے مورچے میں سر دبا دیا۔ اس بار گولیوں کی بوچھاڑ زمین پہ پڑنے کے بجائے میرے سر کے اوپر سے گزری۔ میں صحرائی چھپکلے کی طرح ایک بار پھر کھوہ کی ڈھلوانی دیوار پر تیزی سے ہاتھوں پیروں کی مدد

سے رینگتا ہوا دوسری سمت پر آیا اور سر ابھارنے سے پہلے اپنے پستول کا جائزہ لیا۔ اس کے کلپ میں فقط ایک گولی رہ گئی تھی۔ موجود دشمن کے آخری کارندے نے یقیناً اب تک فون پر "شکار" (یعنی میرے اور بیگم صاحبہ) کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لہٰذا اب اس کو جلد سے جلد پچھاڑ کر ہمیں یہاں سے بھی نکل جانے کی ضرورت تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ میرے پستول میں صرف ایک ہی گولی بچی تھی، جبکہ میرے دشمن کے پاس رائفل... میرے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ میں دوبارہ پیچھے رینگ کر دوسرے کارندے کی لاش سے پستول حاصل کرنے کی سعی کرتا۔

میں نے سر ابھار کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔ کار کے نیچے مجھے پیٹرول پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ شاید میری فائر کی ہوئی کسی گولی نے فیول ٹینک میں سوراخ کر دیا تھا اور پیٹرول موٹی دھار کی صورت میں زمین پر بہہ رہا تھا جبکہ میرا آخری دشمن شاید اس بات سے بے خبر دوسری جانب کار کے بونٹ کو مورچا بنائے کھوہ کی سمت دیکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ میں نے بڑے آرام سے کار کے نیچے جمع شدہ "آبِ استادہ" کی صورت بہتے تالاب پر گولی چلا دی۔ میرے دشمن کے فرشتوں کو بھی میری اس چال کا علم نہ ہوسکا۔ سب سے پہلے کار کے نیچے آگ کا جہنم سا دہکتا ہوا نمودار ہوا پھر سماعت شکن دھماکے سے کار کی ٹنکی پھٹی۔ گاڑھے کثیف دھوئیں کی آتشیں چھتری فضا میں بلند ہوئی اور کار دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ میں خالی پستول پھینک کر تیزی سے واپس پلٹا اور بیگم صاحبہ کی طرف آیا۔ وہ بے چاری خاصی گھبرائی ہوئی اور متوحش سی نظر آرہی تھیں حالانکہ وہ خود ایک بڑے گروہ کی سربراہ تھیں مگر اس بار شاید وہ خود براہِ راست ایسے مخدوش حالات سے دوچار تھیں کہ ان کی اپنی جان پر بنی ہوئی تھی۔ بیگم ولا کے آرام دہ اور پُرسکون ماحول میں پُرتعیش زندگی گزارنے والی بیگم صاحبہ کو نامساعد اور حالات دگرگوں نے میرے ساتھ دربدر ہونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ بہرحال... میں نے بیگم صاحبہ کو سنبھالا... اور کھوہ سے باہر نکل آیا۔ انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کار کو دھڑا دھڑ جلتے دیکھا، وہ اب چل سکتی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ایک بار پھر کھیتوں کی طرف رخ کیا۔ بیگم صاحبہ کو میں نے بتا دیا تھا کہ دشمن یہاں ہماری تلاش میں پہنچ چکا تھا۔ وہ پریشان ہوگئیں۔ ایک جگہ مڑ کر بولیں۔

"پھر ہمیں دوسری سمت جانا ہوگا۔ آبادی کا رخ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہ ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "پہلے میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی مگر پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل ڈالا کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، دشمن کسی وقت بھی ہماری تلاش میں پہنچ سکتا ہے۔ وہ اب اِدھر کھوہ کا ہی رخ کرنے والا ہے۔ آپ فکر نہ کریں بیگم صاحبہ! اب دشمن سے بھاگنا بے وقوفی ہوگی۔ اسے چل دے کر کھات لگانا زیادہ مناسب ہوگا۔ آیئے۔" وہ کچھ نہ بولیں۔ ہم دونوں آگے بڑھنے لگے۔ اس بار میرا رخ کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کی طرف نہ تھا۔ جو اب ایک جگہ جمع ہو کے کھوہ والی سمت میں موجود جلتی ہوئی کار کو دیکھنے میں محو تھے۔ ایک لمبا چکر کاٹ کر ہم جیسے ہی کھیتوں میں داخل ہوئے اچانک میرے قدم رک گئے۔ آبادی کی طرف سے مجھے دو گاڑیاں دوڑتی ہوئی نظر آگئیں۔ ان کا رخ کھوہ والی سمت کی جانب تھا جدھر کار سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ گویا آخری کارندے نے مرتے مرتے بھی ہمیں مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں اور بیگم صاحبہ یک دم نیچے بیٹھ گئے۔ فصلیں جوان تھیں اور ان کی بھڑاس سے ہمیں قیامت جیسی گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں تھوڑا سر ابھار کے مذکورہ سمت جھانکنے لگا اور چونکے بنا نہ رہ سکا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی کھوہ کی سمت بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ سب سے آگے والی گاڑی چودھری ممتاز کی وہی پجارو تھی جس پر وہ اپنے ڈیرے آیا تھا مگر راستے میں ہی ہم نے اس کا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش چاہی تھی تو یہ بغیر رکے دم دبا کے بھاگ نکلا تھا۔ اس طرح بعد میں ہمارا اس ڈکیت اور اس کے ساتھیوں سے ٹکرانا آسان ہوگیا تھا۔

بہرحال دونوں گاڑیاں کھیتوں کے سلسلے پار کر کے آگے بڑھ گئیں تو میں نے بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کون سا علاقہ تھا؟ یہ بھی نہیں کہ چودھری ممتاز خان کے یہاں کتنے ہاتھ لمبے تھے؟ یا پھر وہ یونہی ہماری تلاش میں یہاں تک آیا تھا اور یہ علاقہ اس کے لیے بھی اجنبی ہو۔ بہرطور... ابھی تو ہماری اپنی بقا کا مسئلہ تھا۔

میں اور بیگم صاحبہ آگے بڑھتے رہے۔ بیگم صاحبہ کے پاؤں کی چوٹ یا دکھن کچھ کم ہوگئی تھی اس لیے اب وہ بغیر سہارے کے چل رہی تھیں مگر انہوں نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ ابھی تک چھڑانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ایک بڑے گروہ کی سربراہ... یوں بے یار و مددگار

میرے ہمراہ تھیں، یہ دل کی بات تھی کہ مجھے خود بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ اپنے گروہ کی ایک ایسی دبنگ لیڈر تھیں کہ کوئی ادنیٰ کارندہ کیا... ان کے قریبی ساتھی بھی بیگم صاحبہ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ کھیل دادا اور اول خیر کی مثالیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ کھیل دادا تو پھر بھی گروہ میں "بڑا استاد" کہلاتا تھا... وہ تک نظریں اٹھا کر بیگم صاحبہ سے بات کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔ کہاں تو بیگم صاحبہ کے ایک اشارے پہ من و سلویٰ پیش کر دیے جاتے ہوں گے اور کہاں اب وہ پانی کے ایک قطرے کو ترسی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پہ پیاس سے پپڑیاں جم گئی تھیں۔ بھوک اور تھکن نے انہیں نڈھال کر رکھا تھا مگر انہوں نے خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کی تھی اور میرا ساتھ دے رہی تھیں۔

"کہیں سے فون کا بندوبست ہو جائے تو ہم اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا سکتے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ پھر بولیں۔ "شہزی! تمہارے کان میں کیا کوئی خفیہ ٹرانسمیٹر لگا ہوا ہے؟"

میں ان کے سوال پر تھوڑا ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مسکرایا۔

وہ اس بات کو بھولی نہیں تھیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے کھوہ میں ثریا نے مجھ سے جس خفیہ ٹرانسمیٹر پر بات کی تھی بیگم صاحبہ کے علم میں آچکی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔ "جی ہاں، بیگم صاحبہ! وہ ایک خفیہ ٹرانسمیٹر ہے جو کان میں نصب ہوتا ہے۔"

"کیا تم کسی جرائم پیشہ تنظیم کے آلۂ کار بن چکے ہو؟" ان کے لہجے میں تشکیک تھی اور شکوے کی چبھن۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "نہیں بیگم صاحبہ! میری لغت میں جرم کے جراثیم سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔"

"تو پھر... یہ سب کیا ہے؟ تم کس سے باتیں کر رہے تھے، اس خفیہ ٹرانسمیٹر پر؟"

بیگم صاحبہ لائقِ اعتبار تھیں۔ یوں بھی انہیں حقیقتِ حال بتانا ضروری تھا۔ میں نے انہیں ثریا کے متعلق بتا دیا بلکہ اس بین الاقوامی جرائم پیشہ تنظیم "اسپیکٹرم" کے بارے میں بھی بتا دیا۔

یہ سن کر بیگم صاحبہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر تشویش سے بولیں۔

"اوہ... اس کا مطلب ہے یہ مردود ممتاز خان اپنے ہاتھ پاؤں اس قدر پھیلا چکا ہے..." کہتے ہوئے انہوں نے معنی خیز انداز میں ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی، پھر رمزیہ لہجے میں بولیں۔

"سب جانتی ہوں میں اچھی طرح... وہ اپنے ہاتھ کیوں مضبوط کرنا چاہ رہا ہے۔ وہ دوسروں کو اپنا زرخرید کتا تو بناتا ہی تھا، میرے انتقام میں وہ اس قدر اندھا ہوگیا ہے کہ اپنے گلے میں بھی کسی کی غلامی کا پٹا ڈال لیا ہے۔"

ہم چلتے چلتے ایک جگہ رک گئے۔ مجھے ابھی تک بیگم صاحبہ سے تفصیل گفتگو کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ! اس بار ممتاز خان نے آپ پر بہت کاری وار کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ کھیل دادا اور اول خیر سمیت ہم سب کا یہی خیال تھا کہ چودھری ممتاز اپنے جواں سال بیٹے فرخ کا قاتل آپ کو سمجھنے لگا ہے، خدانخواستہ، آپ کو یرغمال بنانے کا مقصد اس کا یہی تھا کہ وہ آپ کی زندگی کی کہانی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ اس بات کی ہم سب کو گہری تشویش تھی۔"

"ہاں! یہ بات درست ہے۔" بیگم صاحبہ نے کہا۔ "وہ واقعی میرا کانٹا صاف کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ وہ میرے خون کا اس قدر پیاسا ہو رہا ہے کہ اس کا بس نہیں چل رہا کہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے بھون ڈالے۔"

"ایسی باتیں تو نہ کریں بیگم صاحبہ۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "اللہ آپ کو لمبی عمر دے۔ آپ نے میری عابدہ کے سلسلے میں بہت مدد کی ہے۔ چودھری ممتاز خان ہمارے ہوتے ہوئے آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا مگر ایک بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بے بس کیوں ہے؟" میری بات پر بیگم صاحبہ نے بڑے غور سے میرے چہرے کو دیکھا تھا۔ اس دوران ان کا چہرہ کئی رنگوں کے اتار چڑھاؤ کا پیش خیمہ بنا رہا پھر ایک گہری سانس خارج کی۔

"وہ مجھ سے ایک اسٹیمپ پیپر پر میرے دستخط اور انگوٹھوں کے نشان لینا چاہتا ہے۔"

"کیسا اسٹیمپ پیپر؟" میں نے الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔

"جائداد کا... ملے پنڈ کی جائداد اور ملتان کے نواح میں پھیلی ہوئی ان گنت فیکٹریوں اور فلور ملز کی حصے داری سے دستبرداری، اس کے بعد وہ مجھے جان سے مارنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اسٹیمپ پیپر پر میرے دستخط کروانے کے لیے بھی اس نے بڑا گھناؤنا طریقہ اپنانے کا فیصلہ کر رکھا تھا جس کے لیے اس بے غیرت نے مجھے بدر اقبال جیسے تھرڈ کلاس آدمی کے حوالے کر دیا۔ مقصد مجھے ذہنی اذیت پہنچانا

تھا۔ آئندہ بھی اس کے بڑے گھناؤنے منصوبے تھے کہ تم نے بروقت اپنی جان خطرے میں ڈال کر نہ صرف میری عزت و جان بچائی بلکہ بدر اقبال (بابن ڈکیت) جیسے خطرناک آدمی کو جہنم واصل بھی کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "بیگم صاحبہ! اس کارِ خیر میں، میں اکیلا نہیں تھا۔ آپ کے دونوں قریبی ساتھی، کبیل دادا اور داول خیر بھی میرے ساتھ تھے۔"

"کسرِ نفسی چھوڑو شہزی... جو حقیقت ہے وہی رہے گی۔ میری آنکھوں نے صرف تمہیں خاک و خون میں میرے دشمنوں کے ساتھ دلیرانہ وار نبرد آزما ہوتے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتے دیکھا ہے، اس وقت بھی تم ہی میرے ساتھ ہو۔"

میں کیا جواب دیتا۔ یونہی گرد و پیش پر نظریں دوڑانے لگا۔ جی میں آئی کہ بیگم صاحبہ کو ان کے ماضی کے حوالے سے بھی کریدوں نیز لئیق شاہ نامی اس شخص کے بارے میں استفسار کروں، جس کا ایک دوبار عجیب انداز میں وہ میرے سامنے ذکر بھی کر چکی تھیں مگر یہ موقع ان سے باتوں کا نہ تھا۔ ہم نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

ہم آبادی کا رخ کرنے کے بجائے اس کے قریب سے گزرنے لگے۔ یہ کوئی چھوٹا سا بستی نما گاؤں محسوس ہوتا تھا جو محض چند ہزار نفوس پر مشتمل ہوگا۔ یقیناً ہمارا یہاں دیکھ لیا جانا سو فیصد یقینی تھا۔ میں عقب میں مڑ کر کھوہ والی سمت نظریں ڈال لیتا کہ دشمن کہیں ہمارے قدموں کے نشانات پہچان کر تعاقب میں تو نہیں آ رہے، انہیں بھٹکانے کے لیے ضروری تھا کہ ہم آبادی کے قریب سے گزر کر دوسری طرف کی راہ لیں۔

دن اب ڈھلنے لگا تھا۔ دھوپ کی شدت کم ہونے لگی تھی مگر حبس بڑھنے لگا تھا۔ سردست ہمیں کوئی منزل سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کبیل دادا اور داول خیر ہماری تلاش میں کہاں تک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ تاہم میری کوشش یہی تھی کہ کسی طرح بیگم صاحبہ کو لے کر جلد سے جلد ملتان "بیگم ولا" پہنچ جاؤں۔ مگر یہاں تو صورتِ حال ہی کچھ ایسی تھی کہ ایک کے بعد ایک دشمن گلے پڑ رہا تھا اور ابھی تک ہم ممتاز خان سے پوری طرح پیچھا نہیں چھڑا پا رہے تھے۔ ثریا سے اچانک ڈرامائی بلکہ حادثاتی مگر اتفاقیہ آمیز ملاقات نے کچھ نئے سنسنی خیز انکشافات کو جنم دیا تھا۔ "اسپیکٹرم" کی بین الاقوامی تنظیم کا انکشاف معمولی بات نہ تھی جبکہ ثریا کے مطابق وہ خود بھی اس کی آلۂ کار تھی مگر اس کی تنظیم میں شمولیت کوئی اور ہی معنی رکھے ہوئے تھی جبکہ چودھری ممتاز اسپیکٹرم میں کیسا ایجنٹ کی حیثیت رکھتا تھا؟ وہ کب اور کیسے اسپیکٹرم میں شامل ہوا تھا؟ یہ اور ان سے متعلق بہت سی باتیں مجھے ثریا پوری تفصیل کے ساتھ بتانے کا وعدہ کر چکی تھی، یہی نہیں میرا باپ وزیر جان جو اب بھی اولاد اور پدرانہ شفقت کے سلسلے میں اپنی سابقہ بے حس روش پر قائم تھا، وہ اسپیکٹرم میں ایک بڑے عہدے کا حامل بن چکا تھا۔ جسے تنظیم میں اسٹیشن چیف کہا جاتا تھا۔ کوئی "ماسٹر اتھارٹی" اسپیکٹرم کا نظم و نسق چلا رہی تھی، ان کا یہاں کیا مشن تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا مگر ثریا سے یہ ساری معلومات مل سکتی تھیں لیکن سردست موجودہ صورتِ حال کی کشاکشی سے چھٹکارا پانا ضروری تھا۔ آگے ایک اونچے مقام پر چند لوگ ادھر ادھر سے لکڑیوں کو جمع کر کے گٹھیاں بنانے میں مصروف تھے، ایک کنواں بنا ہوا تھا، وہاں سے آگے چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ ہم نہر کے مختصر کراڑے میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں پانی کی وجہ سے کچھ ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہوتا تھا۔ دائیں بائیں بیر کے موٹے پتوں والے پودوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔ یہ نسبتاً الگ تھلگ جگہ تھی اور کافی حد تک محفوظ بھی۔ ہم نے منہ ہاتھ دھویا تو کچھ تازگی کا احساس ہوا۔ قریب ایک چھوٹا سا کھالا بھی تھا وہاں سے ہاتھوں کی اوک بنا کر پانی پیا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی، میں بیر کے پتوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں ڈوڈیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ بیگم صاحبہ میری نظروں کا مطلب بھانپ کر مسکرا کر بولیں۔

"یہ بیر ہے، ان کے پتوں کو مسلنے سے جو سفید گاڑھا دودھ جیسا مواد نکلتا ہے وہ چکھنے میں زہر سے بھی زیادہ کڑوا ہے مگر زخموں کے لیے انتہائی مفید ہوتا ہے۔ البتہ ان کی ڈوڈیاں میٹھی ہوتی ہیں۔ مگر ان کو بھی ایک طریقے سے توڑ کر کھانا پڑتا ہے ورنہ سارا منہ کڑوا ہو جاتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھیں۔

بیگم صاحبہ نے بیر کے پودوں سے کچھ ڈوڈیاں توڑ کر اپنی قمیص کے دامن میں بھر لیں۔ ایک دو ڈوڈیاں میں نے توڑ کر بے اختیار منہ میں ڈال لیں اور چبائیں تو فوراً تھو... تھو... کرنے لگا۔ میرا حلق کڑوا زہر ہو گیا اور فوراً کراڑے سے ذرا نیچے جا کر ہاتھوں کا "لوکو" بنا کر پانی کی کلیاں کر ڈالیں۔ ایسے میں مجھے بیگم صاحبہ کی کھنکتی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ ریتیلے کراڑے پر دامن پھیلائے بیٹھی تھیں، بولیں۔

"میں نے کہا تھا نا ان ڈوڈیوں کو کھانے کا ایک طریقہ ہے۔ آؤ... میں تمہیں چھیل کر دیتی ہوں۔"

میں ان کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ "لو دیکھو، اس طرح کھاتے ہیں۔" انہوں نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور ایک ڈوڈی اپنے گلابی لبوں میں دبا کر دانت کی مدد سے اس کا چھلکا پھر ایک طرف تھوک دیا۔ پھر چھلی ہوئی ڈوڈی کو اپنی کیلی قمیص سے صاف کر کے میری طرف بڑھا دی۔ میں نے وہ لے کر منہ میں ڈال کر چبائی۔ بہت لذیذ اور نمکین سی تھی۔ اس طرح بیگم صاحبہ نے مجھے مزید دو تین ڈوڈیاں دانت سے چھیل کر اور اپنی قمیص سے پونچھ کر دیں۔ پھر میں طریقے کے مطابق اپنے دانت سے چھیل کر ڈوڈیاں کھانے لگا۔

ہم نے خوب سیر ہو کے وہ ڈوڈیاں کھائیں... شام ہونے لگی تھی۔ بیگم صاحبہ نے مجھ سے کہا۔

"تم ثریا سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے مدد کیوں نہیں مانگ لیتے؟" میں نے جواب دیا۔

"یہ کام اگر ہوتا تو میں بہت پہلے ہی کر چکا ہوتا بیگم صاحبہ! ثریا نے جب مجھ سے رابطہ کیا تھا تو اس نے صرف میری خیریت دریافت کرنا چاہی تھی اور کچھ معلومات دی تھیں کہ چودھری ممتاز نے میرے اور آپ کی تلاش کے سلسلے میں اسپیکٹرم کے دس تربیت یافتہ ایجنٹوں سے مدد لی ہے۔ ثریا بھی ان کے ہمراہ ہے۔"

"حیرت ہے، کچھ عجیب سی ہی بات لگتی ہے، کیا چودھری ممتاز کے اپنے سارے آدمی مر چکے ہیں جو وہ اس کام کے لیے اسپیکٹرم کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔" بیگم صاحبہ نے استہزائیہ آمیز حیرت سے کہا۔

"بیگم صاحبہ! آپ نے گیدڑ کی وہ مثل نہیں سنی کہ... گیدڑ کی کم بختی آئے تو گاؤں کو بھاگا جائے... وہ اپنے سارے کارپردازوں کو آزما چکا ہے۔ اب وہ دلالی میدان میں ہمارے خلاف اتارنا چاہتا ہے۔"

"اور اس کے سارے خطرناک کارپرداز صرف تمہارے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے مسکرا کر گردن کی۔ میں نے انہیں جنگی خان کے بارے میں بتایا جسے ہم نے بیگم ولا کے تہ خانے میں قید کر رکھا تھا۔

اچانک مجھے اپنے دائیں کان کی لو میں حرارت محسوس ہوئی۔ میں چونکا۔ پھر فوراً میرا سیدھا ہاتھ حرکت میں آیا۔ ائیر پیس پر انگلی رکھ کر میں نے ثریا کی کال وصول کی۔ وہ سرگوشیانہ انداز میں بولی۔

"شہزی! تم ٹھیک ہو؟ اب کدھر ہو؟ اوور۔"

"میں ادھر ہی ہوں، جہاں پہلے تھا۔ البتہ لگتا ہے ممتاز خان اپنے گرگوں کے ساتھ میری تلاش میں یہاں بھی آن پہنچا ہے... اوور۔"

"تم جس علاقے میں ہو... وہ چک لواں کے قریب ہی کا علاقہ ہے، موضع سدھراں کہلاتا ہے۔ شکر ہے کہ تم ابھی تک ممتاز خان کے ہتھے نہیں چڑھے۔ اب میں شاید تمہاری مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ تم اس وقت جس جگہ پر چھپے بیٹھے ہو کچھ گھنٹے مزید وہیں رکو.... تو میں خود تمہاری مدد کو وہاں آن پہنچوں گی۔ جلدی جواب دو مجھے... اوور۔"

ثریا کی اس بات پر میرا دل امید کے دیے کی طرح ٹمٹمایا۔ "میں اور بیگم صاحبہ اس جگہ نسبتاً محفوظ مقام پر موجود تو ہیں مگر کچھ یقین سے اس بارے میں نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ہم کتنی دیر تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اگر بات محض ایک دو گھنٹے کی ہو تو ٹھیک ہے لیکن ثریا! میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم خود کو اتنے بڑے رسک میں مت ڈالو، اس طرح تمہاری اپنی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ممتاز خان تمہیں بھی پہچانتا ہو... اوور۔" میں نے اپنی سابقہ مہم کے حوالے سے کہا تو وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"اس کی تم فکر نہ کرو شہزی، میں پوری طرح سے محتاط ہوں۔ یوں بھی مجھے تم سے ایک تفصیلی ملاقات تو کرنا ہے۔ رہی بات ممتاز خان کے مجھے پہچان لینے کی تو یہ ناممکن ہے۔ اطفال گھر میں کنگل خان اور اس کے چند ایک کارندوں کے سوا مجھے کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ البتہ عابدہ، شکیلہ، نذیراں اور نازو وغیرہ کو ممتاز جانتا ہوگا۔ مگر یوں بھی جب سے میں "اسپیکٹرم" کی آلۂ کار بنی ہوں، میں نے اپنا رنگ ڈھنگ کافی حد تک بدل لیا ہے۔ اب کام کی بات سنو، تم اس وقت جہاں ہو، وہیں رہو، اور مجھے اس جگہ کی تفصیل بتا دو۔ میں ایک دو گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جاؤں گی... اوور۔"

میں نے اسے مختصراً موجودہ مقام کی صراحت بتا دی۔ بیگم صاحبہ کا پژمردہ چہرہ یہ سن کر یک دم کھل اٹھا تھا کہ ثریا ہماری مدد کو پہنچنے والی تھی۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق چودھری ممتاز ہنوز آبادی اور موضع سدھراں میں کہیں منڈلا رہا تھا۔ اگرچہ اس بات کا بھی پورا احتمال تھا کہ وہ یہاں بھی آ سکتا تھا لیکن میں نے یہاں نہر کے کنارے اور قدرے آس پاس کچھ گاڑیوں کے ٹائروں کے تازہ نشانات دیکھے تھے جس کا

مطلب تھا کہ وہ یہاں سے ہو کر جا چکے تھے، گویا ان کے دوبارہ یہاں آنے کا امکان کم ہی تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟"

مجھے سوچ میں مستغرق پا کر بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ مجھے ان کی آواز میں غیر معمولی ملائمت اور عجیب سی نرماہٹ کا احساس ہوا تھا۔ میں نے یونہی نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کے خوب صورت چہرے پر کچھ ایسے آثار محسوس ہوئے جو کچھ گہرائی لیے ہوئے تھے، ان کی بڑی بڑی کشادہ سیاہ آنکھوں میں بلور سے لپٹی، مزید کشش میں جو گہرائی اتری ہوئی تھی، اس کا مفہوم مجھے کچھ "پرانے حوالوں" سے سمجھ میں آتا تھا۔ تاہم پھر فوراً میں نے یونہی اپنا سر جھٹک کر ان سے کہا۔

"کچھ خاص نہیں بیگم صاحبہ! ہاں، ایک خدشہ ذہن میں آ رہا ہے کہ کھوہ والی جگہ پر اپنے کارندوں کی جلتی ہوئی کار دیکھ کر ممتاز خان کو ہماری اسی علاقے میں موجودگی کی تسلی ہو جائے گی۔ پھر وہ ہمیں تلاش کیے بغیر یہاں سے ٹلے گا نہیں اور یہ بھی ممکن ہے شاید ہمارے پیروں کے نشانات یہاں تک ان خبیثوں کی رہنمائی بھی کر ڈالیں۔" کہتے ہوئے میرے چہرے پر تشویش کی لہر سی پھیل گئی جسے بھانپ کر بیگم صاحبہ نے بہت دھیرے سے اور بڑی نرماہٹ سے اپنا مرمریں نازک ہاتھ میرے بالوں بھرے کھردرے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولیں۔

"شہزی! اللہ نے اب تک ہماری مدد کی ہے اور نہ جانے کتنے خطرات سے ہمیں اس پاک ذات نے بچایا ہے، وہ آگے بھی ہماری دست گیری فرمائے گا۔ پھر مجھے تو تم پر... تمہاری عقل و فہم اور تمہاری جواں مردی پر بھی پورا بھروسا ہے، ہم اس خطرے سے بھی بہ حفاظت نکل جائیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"شہزی۔"

"جی بیگم صاحبہ؟"

"تمہارے ذہن میں کبھی میرے بارے میں کوئی سوال نہیں ابھرتا... کہ میں کون ہوں... کیا ہوں اور میرا ماضی کیا ہے اور... اور... یہ... کہ... میں ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود تمہارا... اس قدر احترام کیوں کرتی ہوں؟ اور... اور... تمہیں پسند بھی کرتی ہوں... کیوں؟"

بیگم صاحبہ کی بات سن کر میں جیسے کسی دھماکے میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں بے ربط سی محسوس ہونے لگیں۔ بیگم صاحبہ نے جس طرف میری توجہ دلائی تھی، وہ بھی میرے لیے ایک کھوج کا درجہ رکھتی تھی۔ یہ تجسس تو میں بھی اپنے اندر رکھتا تھا کہ بیگم صاحبہ کی اصل حقیقت سے کسی روز پردہ کراؤں، کچھ باتیں وقت کے ساتھ بیگم صاحبہ کی پہلودار... اور پراسرار شخصیت کے حوالے سے ظہور پذیر ہوتی رہی تھیں۔ لیکن اب بھی کئی ایسی باتیں اہم اور تشنہ تھیں جنہیں بے نقاب کرنے کا میرے اندر ایک فطری تجسس مجھے بے چین کیے رہتا تھا۔ کئی بار اول خیر سے بھی جاننا چاہا تھا مگر پہلوتہی کر گیا، پھر کچھ حالات بھی ایسے رہے کہ اسے بھی موقع نہ مل سکا کچھ صراحت سے بتانے۔ اگرچہ موقع کل تو یہ بھی نہ بنا مگر نہ جانے کس جذبے نے بیگم صاحبہ کو اپنی حقیقت آج اور اس نازک لمحے میں "بہ قلم خود" بتانے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی ایک گہری ہنکاری خارج کر کے کہا۔

"جی بیگم صاحبہ! یہ حقیقت ہی ہے جو میں بھی اب آپ سے چھپانا نہیں چاہتا کہ... آپ کو جاننے کی... خواہش میرے دل میں بھی کروٹیں لیتی رہی ہے بالخصوص لئیق شاہ کے حوالے سے۔"

لئیق شاہ کے ذکر پر بے اختیار بیگم صاحبہ کے حلق سے ایک دریدہ سی آہ خارج ہو گئی، پھر اپنی داستان غم سنانے کو ان کے لب وا ہوئے ہی تھے کہ اچانک اوپر کراڑے کے سرے کے پاس... بالکل قریب ہی گاڑیوں کے انجنوں کی غراہٹیں ابھریں۔ پھر دروازے کھلنے کی دھمک کے ساتھ ہی مجھے ایک پرغیظ جوشیلی اور غصیلی آواز سنائی دی۔

"وہ دونوں ادھر ہی کہیں موجود ہیں۔ قدموں کے نشانات کراڑے سے نیچے نہر کی طرف جا رہے ہیں۔ آگے بڑھو... جلدی۔"

میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ خطرے کو یوں اچانک سر پر منڈلاتا محسوس کر کے مجھے اپنی سانسیں تک رکتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پورے وجود میں جیسے چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ بیگم صاحبہ کا چہرہ بھی دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور وہ حسرت و یاس کے ساتھ مجھے تکے جا رہی تھیں۔

جذباتی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرضی محبت میں پروان چڑھنے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گول مال

مختار آزاد

زمین واقعی گول ہے... شمال کی سمت ملنے والا شخص کبھی کبھی مغرب کے کسی بھی کنارے پر ٹکرا جاتا ہے... ناقابلِ گرفت مجرموں کا عجیب و غریب ٹولا... جو بڑی صفائی سے اپنی کارکردگی اور مہارت کا ثبوت دے رہا تھا... قدیم تہذیبی نوادرات کے شوقین افراد کے لیے ایک یادگار مرقع تحریر... صورتِ حال کا حیرت انگیز بیان جسے پڑھنے کا تجربہ بھی انوکھا لگے گا...

منفرد کرداروں اور سراغ رسانی کے متوالوں کے لیے ایک دلچسپ تحفہ...

پولیس افسر کائٹ کا موڈ خوشگوار ہونا چاہیے تھا۔ وہ ایک خوبصورت صبح تھی۔ آسمان بادلوں سے صاف اور موسم بھی نہایت دلکش تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس روز سنیچر تھا اور ڈیوٹی سے اس کی چھٹی تھی۔

ویسے تو پولیس والوں کو بھی ہفتے میں دو چھٹیاں ملتی ہیں لیکن کائٹ جیسے پولیس افسروں کو ایسا ہفتہ کبھی کبھار ہی ملتا ہے کہ وہ سنیچر اور اتوار، لگاتار دو ہفتہ وار چھٹیاں کر سکیں۔ اسے اکثر سنیچر کو اپنے ان ساتھیوں کی جگہ ڈیوٹی دینا پڑتی تھی

Copied From Web

قسط:10

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن۔ پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وقت کم تھا۔ میرے تھکے ہوئے وجود کا رُواں رُواں تن گیا تھا۔ دل جیسے یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ میں نے کسی شکاری درندے کی طرح خونیں نظروں سے اوپر کوارٹر کے سرے پر دیکھا وہاں شام کے جھکے جھکے سائے تلے کچھ ہیولے متحرک دکھائی دیے۔ شیر اور شکاری کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ ... خطرہ لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح مسلط تھا۔ سامنے بہتی نہر تھی۔ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی صورتِ حال تھی۔ فرار کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی تھی۔ بہت قلیل پل تھے اسی میں سوچنا اور عمل کرنا تھا۔ صرف ایک پل کے لیے تشویش سے میرا ذہن ماؤف ہوا تھا مگر پھر فوراً ہی گویا پل کے پل میرے ذہنِ رسا میں ایک خیال وارد ہوا۔ ہتر کے پودوں کے جھنڈ سے چند کھوکھلے نرکل جھانک رہے تھے۔ میں نے لپک کر انہیں اکھیڑا، اس کے دو حصے کیے پھر بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑا اور نہر کے کنارے کی طرف بڑھا اور پھر بغیر چھپاکا کیے بیگم صاحبہ کو لے کر پانی میں اُتر گیا۔ نرکل کا ایک ٹکڑا انہیں تھما دیا اور جو سمجھانا تھا... مختصر الفاظ میں سمجھا دیا۔ یوں بھی وہ پہلے ہی بہت کچھ سمجھ چکی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت میری تھکی ہوئی نظروں نے کئی مسلح اور چست بدن افراد کو نیچے اور قریب آتے دیکھا پھر اس سے پہلے کہ ہم خطرناک دشمنوں کی نظروں میں آتے، میں اور بیگم صاحبہ نرکل کے کھوکھلے ٹکڑے منہ میں ڈال کر پانی کے اندر ڈبکی لگا چکے تھے۔

ہم زیادہ گہرائی میں نہیں اُتر سکتے تھے فقط اس قدر کہ ہمارے منہ میں دبے نرکل کا دوسرا سرا پانی کی سطح سے باہر رہے اور ہماری سانسوں کا تسلسل قائم رہے۔ پانی کے اندر دم بہ خود... سا ماحول تھا۔ پانی کے پھٹتے بلبلوں کی آوازیں اور بس... بیگم صاحبہ نے میرا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔ ہم دونوں پشت کے بل تہ آب، ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔

ہمیں اس طرح پانی میں لیٹے لیٹے کئی منٹ گزر گئے۔ زیادہ دیر اس طرح پانی کے اندر محبوس رہنا ویسے بھی مناسب نہ تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر ذرا سا سر اُبھارا۔ پانی کی سطح ہلکورے لے رہی تھی، شام کی آنکھ کا کاجل گہرا ہو رہا تھا۔ گویا وہ رات میں بدلنے لگی تھی۔ ہر سو اندھیرا تھا۔

میں نے بیگم صاحبہ کو سنبھالا دینا چاہا، وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ مجھ سے آن لگیں۔ اگرچہ شام گہری تھی مگر قریب بہت قریب کا منظر خواب ناک انداز میں واضح تھا۔ ان کے لمبے گھنے ریشمی بال گیلے ہو کر ان کے گورے شہابی . . . . . . چہرے کی کشش کو سوا کر رہے تھے۔ ان کا بھرا بھرا گیلا وجود میرے توانا کسرتی جسم سے میل کھا رہا تھا۔

میں نے ہولے سے ''بیگم صاحبہ'' کہہ کر انہیں خود سے الگ کیا پھر ان کا ہاتھ پکڑ کے گرد و پیش پر نظریں ڈالتا ہوا نہر سے کراڑے میں آ گیا۔ ایک نگاہ اطراف میں اور اوپر ڈالی، ہر سو ویرانی اور دم بہ خود سناٹے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ہم دونوں نہر کے ریتیلے کنارے پر بیٹھ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگے۔ مجھے اعتراف تھا کہ بیگم صاحبہ پر اپنی نظریں جمانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ ان کی ہیئت کذائی ہی ایسی ہو رہی تھی۔ ان کا دوپٹا نہ جانے کہاں بہہ کر غائب ہو گیا تھا۔ ان کے گورے گورے شباب بکھیرتے بازو عیاں تھے۔ گریبان گیلا ہو کے مزید کشادہ ہو گیا تھا۔ میں یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں جا رہے ہو شہزی؟'' بیگم صاحبہ نے پوچھا۔

میں نے ہولے سے جواب دیا۔ ''میں ذرا اوپر جا کر ایک نظر ڈال کے آتا ہوں۔'' مقصد میرا ان سے کچھ دیر کے لیے دور ہونا تھا اور اپنے اندر کی سنسنی پر قابو پانا بھی، مگر میری بات سن کر بیگم صاحبہ نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میرے اندر ایک بار پھر اتھل پتھل ہونے لگی۔ بیگم صاحبہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولیں۔

''خطرہ ہم سے دور جا چکا ہے شہزی۔ آؤ اب بیٹھ جاؤ اور ذرا سستا لو۔'' میں ان کے قریب سیلی سیلی ریت پر بیٹھ گیا۔ اب نیند اور تھکن سے میرا بُرا حال ہونے لگا تھا۔ آس پاس کا ماحول گنگ تھا۔ چہار اطراف سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ مجھے ثریا کا انتظار تھا، نہ جانے وہ اب تک کیوں نہیں پہنچی تھی؟ مجھے اس نے رابطہ کرنے سے اگر منع نہ کیا ہوتا تو میں اس سے پوچھتا کہ وہ... کہاں رہ گئی تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو شہزی؟'' معاً سناٹے میں بیگم صاحبہ کی آواز اُبھری۔

''کچھ خاص نہیں بیگم صاحبہ! بس ذرا ثریا کے متعلق سوچ رہا تھا، وہ ابھی تک پہنچی نہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ میری بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے توصیفی لہجے میں بولی۔ ''شہزی! آج تمہاری بروقت دانش مندی نے بچا لیا ورنہ ایک بار پھر ہم ممتاز خان جیسے رذیل انسان کی قید میں ہوتے۔'' میری سوئی ثریا کی متوقع آمد پر اٹکی ہوئی تھی۔

''اگر ثریا نے یہاں پہنچنے کا نہیں کہا ہوتا تو ہم خود ہی یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے۔''

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

صورتِ حال کی گمبھیرتا کو بیگم صاحب نے بھی محسوس کرلیا تھا، وہ بولیں۔ ''ہاں، ثریا کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ تم خود اس سے رابطہ کیوں نہیں کرلیتے؟''

''میں نے سوچا تھا یہ مگر...'' میں کہتے کہتے رکا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے اب مجھے یہی کرنا چاہیے... ایک منٹ ذرا...'' کہتے ہوئے میں نے اپنے دائیں کان کو انگلی سے چھوا۔ ثریا نے ٹرانسمیٹر پر ایک ہی فریکوئنسی سیٹ کی ہوئی تھی۔ اس پر میں نے اس سے رابطہ کرنا چاہا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ مجھے تفکر آمیز تشویش نے آن لیا۔ نہ جانے کیوں وہ میری کال ریسیو نہیں کررہی تھی یا پھر...

''کیا ہوا؟'' بیگم صاحب نے مجھے سوچتا پا کر پوچھ لیا۔

میں نے جواباً ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''وہ کال اٹینڈ نہیں کررہی ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ پہنچنے والی ہو۔'' وہ بولیں۔

میں نے مبہم سے لہجے میں کہا۔ ''شاید۔'' پھر ہم خاموش ہو رہے۔ مجھے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ اوپر کراڑے میں جا کر گردوپیش کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ماحول میں عجیب سی ٹھٹکا دینے والی خاموشی طاری تھی۔ سامنے نہر کا پانی سبک روی سے بہہ رہا تھا۔

''بیگم صاحب! آپ یہاں بیٹھیں، مجھے اوپر جا کر ذرا جائزہ لینا چاہیے۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''میں بھی چلوں؟'' وہ بولیں۔

''نہیں آپ بیٹھیں ادھر ہی، میں ابھی آتا ہوں۔'' میری بات پر وہ رسان سے بولیں۔

''جلدی آجانا پلیز۔'' میں نے ہولے سے سر کو اثبات میں ہلا دیا اور آگے بڑھ گیا۔ کراڑے پر آکر میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ ہر سو ملگجی سی تاریکی کا راج تھا۔ میں مطمئن ہوکر واپس نہر کے قریب نیچے کنارے پر آگیا اور بیگم صاحب سے ذرا فاصلہ رکھ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ بیگم صاحب دھیرے دھیرے، میرے قریب سرک آئیں اور بولیں۔

''شہزی! میں تمہیں آج اپنے بارے میں بتانا چاہتی ہوں... سنو گے ناں؟'' میں نے ان کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ انہوں نے اپنی داستان سنانی شروع کردی۔

''میرا اصل نام زہرہ بانو ہے اور میری ماں کا ستارہ بیگم۔ وہ ایک مغنیہ تھیں...''

☆☆☆

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے
پریم بھٹی کا مدھوا پلا کے، متوالی کر دینی رے موسے
گوری گوری بیاں ہری ہری چوریاں، بیاں پکڑ لینی رے موسے
بل بل جاؤں میں تورے رنگ رجوا اپنی سی کر لینی رے موسے
کھسرو نجام کے بل بل جئے، موہے سہاگن کینی رے موسے نیناں ملا کے
چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملا کے
نیناں ملا کے... نیناں ملا کے

مخمل چڑھے مونڈھے پر بڑے رعب داب کے ساتھ براجمان نئے پنڈ کا بااثر جاگیردار چودھری الف خان خود پر جی جان کی محویت طاری کیے گویا سراپا سماعت بنا بیٹھا تھا۔ اس کی دم بہ خود سماعتوں میں رس گھولنے والی خوش گلو مغنیہ ستارہ بیگم اپنے حسنِ بلاخیز کے ساتھ مجسم قیامت بنی سامنے ایک گول سے قدرے اونچے چبوترا نما اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ ... پینتیس، چالیس سالہ اس جوان مرد کے دل و جگر کو ہی نہیں گویا حواسوں کو بھی لبھا رہی تھی۔ سازندوں میں طبلچی ببن میاں اپنے شاگردوں کے ساتھ نکیلی مونچھیں نکالے چند تھاپوں کے بعد اپنے طبلے کا منھا کسنے لگتا کہ کہیں سُر اور سنگیت کے امتزاج .... میں کوئی تفاوت نہ آجائے۔ بس اس محفل طرب و رنج میں فقط ایک ہی قدرداں تھا یعنی چودھری الف خان۔ اختری بائی کے بالا خانے میں صرف ایک تماشائی؟ جاننے والوں کے لیے یہ باعثِ حیرت ہوسکتا تھا مگر اس کی ایک وجہ بھی تھی کہ کھاتے دار جاگیردار چودھری کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ اس نے گویا اختری بائی کو کوٹھے سمیت خرید لیا تھا کہ وہ اس فتنہ ساز مغنیہ ستارہ بیگم کا گانا تماش بینوں کی طرح نہیں بلکہ اس کے ایک سچے قدرداں کی حیثیت سے صرف اکیلا بیٹھ کر سنے گا۔ موقع پرست اور لالچی اختری بائی اس قدردانی کی بھاری قیمت .... وصول کرتی تھی کہ اتنی اُجرت خالص اسے دیگر تماش بینوں کے مجمع سے بھی حاصل نہیں ہوتی ہوگی۔

حسین و دلکش اور خوش الحان مغنیہ ستارہ بیگم کو بھی اس قدرداں کی یہ ادا بہت پسند تھی ... وہ ہمیشہ ایک دلفریب مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتی تھی مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اس کی ظاہری مسکراہٹ میں ایک دکھ بھری حسرت کی لکیر بھی ہوتی جو الف خان کو ابتدا میں تو نہیں البتہ وقت کے ساتھ ساتھ ہی محسوس ہوتی رہی تھی۔ وہ اس کا سبب ابھی تک

Copied From Web
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ستارہ بیگم سے نہیں پوچھ پایا تھا۔ وہ ہر بار ستارہ بیگم سے اپنے دل کی بہت سی باتوں کا اظہار کرنے کا ارادہ باندھ کر آتا اور ہر بار ہی اس کے سامنے آکر اسے نامعلوم سی چپ لگ جاتی... اور وہ اس خوش گلو اپسرا کی بانہوں میں کھو کر رہ جاتا...

یہ زندہ دلانِ لاہور کا وہ دور تھا جب بالا خانے کو فن اور فنکار کی ادب نواز نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بعض شرفاء طبقۂ خاص میں ایسی محفلیں گھروں میں بھی منعقد کی جاتی تھیں اور تہذیب کا حصہ سمجھی جاتی تھیں۔ غزل کی گائیکی، شاعری کی تک بندی، مصرعہ اور ادائیگی اظہار و خوش الحانی سے ایک لطف اٹھایا جاتا۔ ہنرمند طوائفیں اور مغنیائیں تھیں جن کا اعلیٰ شعری ذوق، بلا کا حافظہ اور اشعار کا ایسا برجستہ اور برمحل استعمال کہ

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

مگر پھر گزرتے وقت کے ساتھ رنگ ڈھنگ اور اندازِ سخن بدلا تو اس کا ڈھب بھی بدل کر ڈھابا ہوگیا۔ اسے گہن لگ گیا اور یہ سب محض نفس و ہوس کا شاہکار بن کر رہ گیا۔

چوہدری الف خان بے شک فطرتاً ایک عیاش پرست اور آوارہ مزاج انسان تھا مگر جب سے اس نے ستارہ بیگم کی وجہ سے اختری بائی کے بالا خانے میں آنا جانا شروع کیا تھا اس کی عیاش طبیعت .... رومانویت میں بدلنے لگی تھی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ اور نوعمر بیٹے کا باپ بھی تھا۔ اس کی بیوی مہرالنسا بھی حسن میں کم نہ تھی مگر دل کا کیا کیا جائے کہ مانتا ہی نہیں۔ ستارہ بیگم اس کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھی اور دل و جان سے اسے چاہنے لگا تھا۔ نظروں ہی نظروں میں ستارہ بیگم کو اپنے حالِ دل کا خاموش عندیہ دینے لگتا تھا۔ ایک عورت کو بھی اللہ نے نگاہِ مرد کو پہچاننے کی غیر معمولی صلاحیت بخشی ہے۔ ستارہ بیگم بھی الف خان کی دلی کیفیات کو بھانپنے لگی تھی اور بالآخر اس نے بھی ایک روز اسی طرح کی محفل یگانہ میں چوہدری کے سامنے اپنا حالِ دل بیان کر دیا۔

اشعار نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مصلحت اندیشی کے باندھے ہوئے بند توڑ ڈالے۔ جو اندر تھا وہ باہر آگیا اور جو باہر تھا وہ رقصِ بسمل بن گیا پھر الف خان نے بھی ستارہ بیگم کے سامنے اپنا حالِ دل بیان کر دیا۔

''اب ہم سے صبر نہیں ہوتا، ہم آپ سے شادی کے خواہش مند ہیں۔ شادی کرو گی ہم سے؟''

ستارہ بیگم کو اندازہ تو تھا کہ کسی نہ کسی روز یہ جوالا مکھی پھٹے گا۔ اور کچھ ''طرح'' انہوں نے بھی دی تھی۔ کمان کھنچی نگاہیں جھکا کر ستارہ بیگم نے دھیرے سے کہا۔ ''آپ نے ایک کوٹھے والی کو بڑی عزت بخش دی سرکار۔ کیا ہم اس قابل ہیں؟''

ستارہ بیگم کے حسرت زدہ لہجے نے الف خان کو تڑپا دیا اور وہ بے اختیار اس کے دونوں مرمریں ہاتھ تھام کر مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ کس قابل ہو، یہ ہم سے نہیں ہمارے دل سے پوچھو۔ ستارہ بیگم اب آپ ہمارے دل کی ملکہ ہیں۔ ہمیں آپ کا جواب چاہیے اور بس! اس سے آگے ہم کچھ نہیں سوچنا چاہتے۔'' چودھری الف خان کی بات پر ستارہ بیگم نے اپنی کشادہ آنکھوں کے متلاطم زیروبم میں اپنے اس دیوانے فرزانے کی طرف دیکھا پھر بولی۔

''سوچنا تو آپ کو پڑے گا ہی چودھری صاحب۔''

''ہم جو سوچ چکے ہیں، اسے یقین کامل کا درجہ دیتے ہیں۔ ہمیں آپ سے عشق ہوگیا ہے۔ ہم یہ بھی بتائے دیتے ہیں اے مہ جبیں کہ ہماری سوچ کا محور و مرکز صرف آپ ہیں۔''

''اور آپ کی بیوی اور بچہ؟''

''وہ ایک روایتی سماجی رابطہ ہے جسے ہم نبھا رہے ہیں اور نبھاتے رہیں گے مگر آپ سے ایک قلبی تعلق بن گیا ہے۔ ہمیں آپ سے عشق ہے... بے طرح عشق۔''

''بڑے لوگوں کے لیے یہ عشق مشغلے بھی تو کہلاتے ہیں۔'' ستارہ بیگم نے کسی مقصد کے تحت ایک تلخ بات کہہ ڈالی۔

''آپ کی بات پر ہمیں صاد ہے اے رخِ ماہِ روشن۔'' الف خان نے برا منائے بغیر کہا۔ ''لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہمیں آپ سے پیار ہوگیا ہے، سچا پیار۔ یہ ثبوت کافی نہیں کہ ہم نے آپ کو ابھی تک مشغلہ نہیں بنایا، آپ کا سُر سنتے ہیں تو تنہا، آپ کا دیدار کرتے ہیں تو اکیلے۔ ہم آپ کو مشغلہ بنا کر آپ کے حسن و جمال کو گہن لگانا نہیں چاہتے تھے۔'' ستارہ بیگم نے ایک بار خاص نگاہوں سے الف خان کے چہرے کی طرف دیکھا پھر ہولے سے بولی۔

''میرے ساتھ تشریف لائیں۔'' کہہ کر وہ پلٹ گئی اور الف خان اس کے ساتھ ہولیا۔ اسے حیرت تھی کہ ستارہ بیگم اسے کہاں لے جا رہی تھی پھر ایک ململ کے سفید پردے کو ہٹا کر ستارہ بیگم ایک دوسرے ہال کمرے میں آگئی۔ سامنے کمرے کا دروازہ تھا۔ ستارہ بیگم نے ہولے سے الف خان کو ٹھہرنے کا کہا اور خود دروازہ دھکیل کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ ذرا دیر بعد ایک خادمہ سر جھکائے برآمد ہوئی اور خاموشی سے ایک طرف کو چلی گئی۔ الف خان کا خیال تھا

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کہ یہ خادمہ اسے اندر آنے کا کہے گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ اب الف خان کی حیرت الجھن کا شکار ہونے لگی۔ کمرے کا دروازہ آدھا بھڑا ہوا تھا۔ اچانک اندر سے ستارہ بیگم کی آواز آئی۔

"اندر تشریف لے آیئے سرکار۔" الف خان چونکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ تاہم وہ آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہوا تو بری طرح ٹھٹک کر رہ گیا۔

کمرا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ ہر شے سلیقے سے رکھی تھی۔ مسہری کے قریب ستارہ بیگم کھڑی تھی، اس کی گود میں چار پانچ سالہ بچی تھی۔ الف خان الجھن آمیز حیرت سے کبھی ستارہ بیگم کو اور کبھی اس معصوم بچی کو تکنے لگتا۔

"میں ایک ماں بھی ہوں... چودھری صاحب! یہ میری بیٹی ہے زہرہ بانو۔ اس کا باپ اب دنیا میں نہیں رہا۔ اس کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ہے۔ اب آپ کیا کہتے ہیں؟" ستارہ بیگم نے گود میں ہمکتی بچی کو ہولے سے جھلاتے ہوئے گم صم سے کھڑے چودھری الف خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو جیسے الف خان کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا آگیا۔ جیسے وہ کسی حتمی نتیجے پر پہنچ گیا ہو، پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ ستارہ بیگم کے قریب آیا اور دونوں کو تھام کر بولا۔

"ہم نے جو کہنا تھا کہہ دیا، ہمیں یہ دونوں ذمے داریاں قبول ہیں۔"

"اس بچی کو آپ نے ایک باپ جیسا پیار دینا ہوگا اور اس کی ماں کے حوالے سے اسے کسی حق سے بھی محروم مت کیجیے گا، وعدہ کریں۔" ستارہ بیگم نے کہا۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں۔" الف خان نے مستحکم لہجے میں کہا اور ستارہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

☆☆☆

اس دور کے کوٹھوں اور بالا خانوں میں غنڈے بدمعاش پالنے کا رواج نہیں تھا لیکن انسان کی فطرت وہی تھی۔ اختری بائی کی لالچی طبیعت اور مکاری اپنی جگہ پر تھی لیکن اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ نئے پنڈ کا ایک بااثر اور مہذب جاگیردار ایکدم اتنا بڑا عندیہ دے ڈالے گا۔ وہ تو اب تک اس کے شوق کو ایک پُرتعیش تفریح ہی سمجھتی آئی تھی یا پھر وقت گزارنے اور دل بہلانے کا ذریعہ... نہیں جانتی تھی کہ یہ دلداری اور شوق ایک عشقِ مجازی میں منتج ہونے والا تھا۔ یہی سبب تھا کہ جب اسی رات ستارہ بیگم نے اختری بائی کو الف خان کے پرپوزل سے آگاہ کیا تو چند ثانیوں کے لیے اختری بائی کو اس کی بات کا یقین ہی نہ آیا۔

"یہ... یہ تو کیا کہہ رہی ہے بیٹی؟" اختری بائی نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے اس کی بات سن کر دہل کے رہ گئی تھی۔

"میں صحیح کہہ رہی ہوں ماں جی۔" ستارہ نے ہولے سے کہا۔ "چودھری الف خان مجھ سے شادی کرنے کا خواہش مند ہے۔"

"تو نے کیا جواب دیا اسے؟" بالآخر اختری بائی کو یقین کرنا پڑا اور وہ تیکھے نتونوں سے ستارہ بیگم کی طرف گھورنے کے انداز میں تکتے ہوئے بولی۔

ستارہ بیگم نے بھی ماں کے لہجے کی رمزیہ تندی کو بھانپ کر ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ "کیا انہوں نے ایسا کوئی غلط کہا مجھ سے؟"

"غلط... سراسر غلط اور ناممکن ہے۔ بیٹی، تم اسے صحیح سمجھ رہی ہو؟" اختری بائی کی تیوری پر بل پڑے رہے۔

"کیوں ماں جی؟ آپ نہیں چاہتی ہو کہ آپ کی بیٹی ایک شریفانہ زندگی گزارے؟ وہ شمعِ محفل کے بجائے چراغِ خانہ بن کر ایک صاف ستھری زندگی گزارے؟" ستارہ بیگم کے لہجے میں ہلکی سی تلخی گھل آئی۔ اختری بائی ہک دک تھی۔

دوا

اسپتال میں ایک مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا۔ "یہاں دل کی تیز دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟"

مریض نے جواب دیا۔ "ہاں، بوڑھی بدصورت نرس۔"

خطرہ

اسپتال میں ایک مریض کو ایک خوب صورت نرس نے سہارا دے کر اٹھایا تو مریض بولا۔ "جی چاہتا ہے تمہارے بازوؤں میں رہ کر دم توڑ دوں۔"

نرس بولی۔ "تمہاری یہ خواہش پوری بھی ہوسکتی ہے۔ اگلے بیڈ کے پاس کھڑے ہوئے ڈاکٹر نے تمہاری بات سن لی ہے اور وہ میرے منگیتر ہیں۔"

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جا سکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety

ستارہ بیگم اس کے لیے سونے کی چڑیا تھی اور ایسی مرغی بھی جو سونے کا انڈا دیتی تھی۔ وہ اب اس کے ہاتھوں سے نکلی جارہی تھی۔ جانتی تھی آگ برابر لگی ہوئی ہے۔ ضرور اس عیاش جاگیردار کی عشقیہ باتوں نے اس کی بیٹی کا دماغ خراب کرڈالا تھا اور عشق کا بھوت سر چڑھ کر بولنے لگا تھا لہٰذا زور زبردستی سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی تھی' فوراً کیچلی بدل کر لہجے کی گرمی کو ملامت آمیزی کا ملمع چڑھا کے نرم آواز میں بولی۔

''تو نادان ہے بیٹی، سامنے کی حقیقت کو جھٹلا رہی ہے۔ کیا تو بھول گئی کہ آج سے چند سال پہلے تو ایک ایسے تلخ تجربے سے گزر چکی ہے۔ دیکھ بیٹی، میں تیری ماں ہوں۔ میں ہمیشہ تیرا بھلا ہی سوچوں گی بُرا نہیں۔ اتنا سمجھانے کے باوجود تو نے پہلے بھی اپنی ضد کی اور من مانی کی، میں برداشت کرگئی۔ کیا دیا تجھے رفاقت حسین نے؟ ایک شریفانہ زندگی گزارنے کا وعدہ اور پھر دانہ چگ کر یہ جا وہ جا؟''

ماں کی بات پر ستارہ بیگم نے بھی چڑھی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''رفاقت بھی مجھ سے سچی محبت کرتا تھا۔ بے شک غریب سہی لیکن وہ مجھے بیاہ کر ایک گھر میں لے کر گیا تھا۔ اس نے میرا ساتھ پورا نبھایا تھا مگر آپ مجھے زبردستی وہاں سے لے آئیں اور دوبارہ سے چراغِ خانہ سے شمعِ محفل بنا ڈالا۔''

''تو کیا میں تجھے اس دڑبے نما تنگ و تاریک گھر میں مرنے دیتی؟ تو ناز و نعم میں پلی تھی رفاقت نے تجھے محبت کے نام پر دیا ہی کیا تھا؟ عسرت بھری زندگی جہاں تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی ایک دن۔''

''ماں جی اس نے مجھے بیوی کا خطاب دیا تھا۔''

''ہونہہ... بیوی...!'' اختری بائی استہزائیہ انداز میں ہاتھ نچا کر بولی۔

''وہ محنت مزدوری کرتا تھا، حق حلال کی کھاتا تھا۔ وہ عیاش نہیں تھا۔''

''عیاش نہیں تھا تو یہاں کوٹھے پہ کیا کرنے آتا تھا؟''

''وہ حالات کا مارا ہوا تھا، غم غلط کرنے آتا تھا۔''

''ہاں تو پھر تجھے بیوی بنا کر اس نے کون سا تیر مار لیا تھا۔ حالات تو پھر بھی اس کے نہیں بدلے تھے بلکہ تجھ سے شادی کے بعد تو وہ روٹی کو بھی محتاج ہونے لگا تھا۔ ذرا دن گزرتے تو تجھے سستے قسم کے دھندے پر بھی لگا دیتا۔''

''ماں جی! ایسا مت بولو۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرتا۔ وہ ایک شریف انسان تھا۔'' ستارہ بیگم تڑپ اٹھی۔ ''اپنے حالات بدلنے کے لیے وہ دن رات محنت کرتا تھا مگر میری اور اپنی بچی کی جدائی نے اسے پھر مایوس کر ڈالا اور وہ نشے کا عادی بن گیا۔ بالآخر وہ تم سے اتنا بددل ہوا کہ یہ شہر ہی چھوڑ کے چلا گیا اور ایک دن خون تھوک تھوک کر مر گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا تھا مگر تمہاری ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر اس نے ایسا قدم اٹھایا تھا۔''

''اچھا بیٹی... اب وہ مر گیا ناں، قصہ ختم۔ تو اب ایک پیاری سی بیٹی کی ماں ہے۔'' اختری بائی نے فوراً پینترا بدلا۔ ''دیکھ اپنی زہرہ بانو کو... تو نے کبھی غور کیا ہے... بالکل تجھ پر گئی ہے... پھر ایک دن بڑے ہو کر یہ تیرا بھی اسی طرح سہارا بنے گی جس طرح تو میرا بنی تھی۔''

''ہرگز نہیں ماں جی۔'' ستارہ اپنی ماں کی بات پر تلملا اٹھی۔ ''میں کبھی بھی اپنی بیٹی کو اس بازار کی زینت نہیں بننے دوں گی، ہرگز نہیں۔''

''تو پھر زہرہ بانو کو اور کیا بناؤ گی؟ یہاں رہنے والیاں یہی کچھ بنتی ہیں جو تم بنیں۔ شرافت کے دعوے دار یہاں صرف دل بہلانے آتے ہیں اور پیٹھ پیچھے تھوک کر جاتے ہیں۔ رشتے مانگنے نہیں آتے یہاں۔'' اختری بائی نے اپنے تئیں ستارہ کو اوقات یاد دلانی چاہی تو ستارہ نے ماں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ماں جی ایک بات سچ سچ بتاؤ، کیا میں واقعی تمہاری بیٹی ہوں؟'' اس سوال پر اختری بائی گڑبڑا گئی مگر پھر جلدی سے بولی۔

''تیری ماں ہوں تبھی اتنے ناز و نعم سے پالا ہے تجھے۔''

''پھر تو نے میرے بارے میں کبھی ایسا کیوں نہیں سوچا جیسا میں اپنی زہرہ بانو کے بارے میں سوچتی ہوں؟'' ستارہ بیگم نے پوچھا تو جواب نہ بن پا کر مکار اختری بائی نے منہ بنا کر رونا شروع کر دیا۔

''لو... اب یہ وقت بھی دیکھنا تھا کہ ایک بیٹی اپنی ماں پر شک کرے گی... آہ...''

ستارہ بیگم خاموش ہوگئی۔ جو حقیقت اختری بائی اس کے بارے میں جانتی تھی وہ ستارہ بیگم نہیں جانتی تھی۔ اختری بائی نے آج تک ستارہ بیگم کو یہی بتایا تھا کہ وہ اس کی ماں ہے اور ان کا جدی پشتی پیشہ یہی تھا مگر یہ صرف اختری بائی کو معلوم تھا یا پھر اختری بائی کے دستِ راست نکیلی مونچھوں والے ببن میاں کو کہ ستارہ بیگم انہیں ایک ریلوے اسٹیشن کے اجاڑ پلیٹ فارم میں اس وقت روتی بلکتی ملی تھی جب اس

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کی عمر بہ مشکل دس، گیارہ سال کی تھی۔ اختری بائی نے ہی اس کا نام ستارہ رکھا تھا۔

ستارہ بیگم کو اب اپنی فکر نہ تھی۔ فکر تھی تو صرف اپنی بچی زہرہ بانو کی۔ وہ اسے اس ماحول سے نکالنا چاہتی تھی مگر اس کے لیے یہ اشد ضروری تھا کہ وہ خود یہاں سے نکلتی۔ اب اسے چودھری الف خان کی صورت میں یہ سب ہوتا نظر آرہا تھا بلکہ اس نے تو اس کی بیٹی کو بھی اس کا حق اس کا باپ بن کر دینے کی ہامی بھر لی تھی۔ وہ اب اس موقع کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

ادھر چالاک اختری بائی نے فوراً تیکھی مونچھوں والے جبن میاں سے مشورہ طلب کرلیا۔ اس نے بھی ستارہ بیگم کو اپنی سی سمجھانے کی کوشش کر کے دیکھ لی مگر ستارہ بیگم اپنے ارادے پر قائم رہی تو بالآخر جبن میاں نے بھی ہار مان لی۔ اس پر اختری بائی نے اسے لتاڑ ڈالا۔

"کچھ کرو جبن میاں! یہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی تو یہ کوٹھا ویران ہو جائے گا؟ ہم بھوکوں مرنے لگیں گے۔ اس کوٹھی کی ساری رونقیں ستارہ کے دم سے قائم ہیں۔"

جبن میاں بھی دور کی کوڑی والا دماغ اور سوچ رکھتے تھے، اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ "دیکھو اختری، غلطی تمہاری ہی تھی، تم نے اس جاگیردار کو رقم کے لالچ میں خود ہی اس قدر اہمیت دے ڈالی کہ اسے ستارہ کے قریب تر ہونے کا موقع مل گیا۔"

"اب مجھے کیا پتا تھا کہ وہ کم بخت اس سے بیاہ کرنے کا فیصلہ کر لے گا۔ اب دل کے پھپھولے مت پھوڑو جبن میاں، کوئی سبیل کوئی تدبیر کرو۔"

"یہی ہو سکتا ہے کہ ابھی جو ستارہ کر رہی ہے اسے کرنے دو۔ فی الحال دوسروں سے کام چلاؤ بعد میں اس مسئلے کو سنبھالنے کی کوشش کریں گے۔"

"اے نو... تم نے بھی خوب کہی جبن میاں۔ طبلے بجا بجا کے تمہارا دماغ بھی طبلہ ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد تو یہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی اڑن چھو ہو جائے گی پھر ہم کیا کریں گے؟"

"تو اب ہم کون سا تیر مار رہے ہیں؟ اور اگر ماریں گے بھی تو خود کو ہی آن لگے گا۔" جبن میاں کھاگ لہجے میں بولے۔ اختری بائی اپنی پیشانی مسلنے لگی تو جبن میاں ازراہِ تشفی بولے۔ "پریشان کیوں ہوتی ہو اختری بائی، دریا کو تھوڑا بہہ لینے دو، خس و خاشاک نظر آنا شروع ہو جائیں گے، بھروسا رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

جبن میاں کی بات پر اختری بائی کو کچھ زیادہ تسلی نہ ہوئی مگر چپ رہنے کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ اسے خاموش پا کر جبن میاں بولے۔ "بس! ابھی عیاش جاگیردار سے جتنے ٹکے کھرے کر سکتی ہو کر لو بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔"

جبن میاں کی بات اختری بیگم کے دل کو لگی۔ وہ دانت پیس کر خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ "ہاں جبن میاں ٹکے تو خوب کھرے کروں گی میں اس جاگیردار سے۔ اتنی آسانی سے تو میں بھی اپنی چڑیا اس کے حوالے نہیں کروں گی۔"

اس روز جب الف خان کا اس معاملے میں اختری بائی کے ساتھ سامنا ہوا تو اختری بائی نے ناک بھوں چڑھالی۔ کہاں تو وہ اس کی آمد پر اس کے آگے بچھی جاتی تھی مگر اب معاملہ دوسرا تھا تو اس نے بھی بازاری قسم کی کم ظرفی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا اور خلافِ معمول بڑے اکھڑ لہجے میں بولی۔

"چودھری صاحب! ہمیں آپ کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ آپ نے تو مہمان بن کر میزبان کے گھر میں ہی سیندھ لگا دی۔"

چودھری الف خان بھاری آواز میں گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اختری بائی! بات کرتے وقت دیکھ لیا کرو کہ تمہارے سامنے کون کھڑا ہے۔ ہم سیندھ لگانا جانتے ہی نہیں۔ صاف اور سیدھی بات کرتے ہیں۔ بولو کیا دام لو گی؟"

اختری بائی نے بھی بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا، بولی۔ "کون نہیں جانتا کہ اختری بائی کے کوٹھے کی اصل رونق کس کے دم سے ہے۔ ستارہ بیگم سے محرومی ہمارا بہت بڑا نقصان ہے۔"

"دام کی بات کرو اختری بائی۔" چودھری الف خان گمبھیر لہجے میں بولا۔ "تمہارا نقصان ہم پورا کیے دیتے ہیں۔ پہلے بھی ہم نے تمہیں مایوس نہیں کیا۔"

اختری تلخ اور طنزیہ مسکراہٹ سے بولی۔ "چودھری جی، وہ بات اور تھی، اب تو آپ سارا خزانہ ہی ہمارا لے چلے۔ اب بھلا خزانے کی ہم کیا قیمت لگا سکتے ہیں؟"

الف خان اس مکار بڑھی کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ "ہم کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتے نہ ہی ہم کسی کے ساتھ زبردستی کر رہے ہیں۔ پہلے ہم نے سوچا تھا کہ آپ کو ایک بڑی رقم کے علاوہ ہر ماہ ایک معقول رقم باقاعدگی سے دیتے رہیں گے لیکن اب ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ستارہ بیگم جب ہمارے عقد میں آجائے گی تو ایسا کرنا

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مناسب نہ ہوگا۔ ہاں ہم آپ کو پانچ لاکھ کی رقم کا چیک کاٹے دیتے ہیں۔‘‘

اس زمانے میں پانچ لاکھ معمولی رقم نہیں تھی۔ اختری بائی سمجھ تو گئی تھی کہ رقم ملے نہ ملے سونے کی چڑیا تو اب ویسے بھی پھُر ہونے والی تھی نیز اگر الف خان یہ رقم بھی نہ دیتا تو وہ اس کا کیا بگاڑ لیتی۔

معاملہ طے پا گیا اور پھر ستارہ بیگم شمعِ محفل سے چراغِ خانہ بن کے چودھری الف خان کے عقد میں آگئی۔

نئے پنڈ کا جاگیردار چودھری الف خان جب ستارہ بیگم کو بیاہ کر اپنی جاگیر پہنچا تو حویلی میں جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ الف خان کی پہلی بیوی مہرالنسا کو پہلے شوہر کی آمد کی خبر ملی تو اس نے فوراً ڈریسنگ ٹیبل سنبھال لی، بنی سنوری تو وہ ہر سمے ہی رہتی تھی مگر پھر بھی وہ آئینے کے سامنے ہلکے پھلکے میک اپ ٹچز لینے لگی تھی کہ تھوڑی بہت جو کسر تھی وہ بھی پوری ہو جائے۔ کمرے میں نو سالہ بیٹا ممتاز خان اور بارہ سالہ بیٹی نورالنسا کھیلنے میں مگن تھے۔

جب مہرالنسا کو دوسری اطلاع یہ ملی کہ سرکار تو اپنے ساتھ ایک خاتون کو بھی لائیں ہیں جو ان کی دوسری بیوی ہونے کا شرف حاصل کر چکی ہے تو مہرالنسا کا حسین چہرہ ایکدم زخمی ناگن کی طرح پھنکاریں مارتا ہوا نظر آنے لگا۔ اس کے اندر ایک چھناکا ہوا۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر بکھرنے لگی۔

عورت اور سب سے بڑھ کر ایک بیوی کے لیے اس کا شوہر ایک مان ہوتا ہے۔ ایک ایسا تفاخر آمیز غرور جس کے زعم میں بیوی شوہر کی محبت کو ملکیت کا درجہ تک دے ڈالتی ہے اور اس ملکیت کو وہ بلاشرکت غیرے اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے محفوظ سمجھتی ہے۔ اس میں شراکت داری اس کے لیے ناقابلِ قبول ہوتی ہے مگر مہرالنسا اپنے شوہر کے مزاج سے واقف تھی اور اس کی طاقت سے بھی جبکہ خود مہرالنسا کا اپنا کوئی بڑا خاندانی بیک گراؤنڈ نہ تھا۔ تاہم چھوٹی سطح کے زمیندار گھرانے سے تو وہ بھی تعلق رکھتی تھی لیکن اس کے اندر اس حصے داری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی ہمت تھی نہ جرأت، نتیجتاً وہ گھٹ کر رہ گئی۔ شوہر کی دوسری بیوی کا مطلب مہرالنسا کی نگاہ میں یہی تھا کہ پہلی پر دوسری کو ترجیح دینا۔ اپنے حق پر ڈاکا ڈالنے والی ایک سوتن کو وہ کس طرح قبول کر سکتی تھی؟ اس کا یہی احساسِ کمتری، احساسِ محرومی میں بدل کر اپنی سوکن کے خلاف ایک گھناؤنے محاذ پر اسے اکسانے لگا مگر بظاہر وہ یہ کڑوا گھونٹ پی گئی۔

ادھر ستارہ بیگم بھی زمانہ چشیدہ اور حالات کی ستائی ہوئی تھی، جانتی تھی کہ اس کی ایک سوتن بھی ہے۔ ایک ایسی سوتن جو ایک بیٹی، بیٹے کی ماں بھی تھی۔ ایسی ماں جو یہی سمجھتی ہوگی کہ آنے والی سوتن نے صرف اس کے حق پر ہی نہیں بلکہ اس کے دونوں بچوں کے حق پر بھی ڈاکا ڈالا تھا۔ پھر زہرہ بانو تو الف خان کی اولاد بھی نہیں تھی مگر آنے والی نے بڑی چالاکی سے اس کے نام بھی بہت کچھ کروا لیا تھا۔ اصل آگ سینے میں اٹھنے والی مہرالنسا کی یہی تھی جبکہ ستارہ بیگم کو پہلے سے ان سارے تلخ حقائق کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ چودھری الف خان کی نہ صرف دوسری بیوی بننا چاہتی تھی بلکہ اپنی بیٹی زہرہ بانو کا مستقبل بھی محفوظ کرنا چاہتی تھی اور یہ سب شادی سے پہلے ہی ہونا ممکن تھا اور ستارہ بیگم نے اس لیے الف خان سے ایک مشروط شادی کی تھی اور اس نے بھی ستارہ بیگم جیسی نئی دلہن کو جلد سے جلد حاصل کرنے کے نشے میں اس کی ساری شرائط مان لی تھیں اور جائداد میں بھی اس کا حق محفوظ کر دیا تھا۔

الف خان نے سرسری طور پر اپنی پہلی بیوی مہرالنسا سے کہہ دیا تھا کہ اسے دل برا کرنے کی ضرورت نہیں، اسے بھی اس حویلی میں برابر کے درجے پر رکھا جائے گا اور دونوں کے ساتھ پورا انصاف ہوگا۔

مہرالنسا کو ایسے برابری کے درجے کا انصاف ہرگز قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ تو صرف ایک بادشاہ اور ایک ملکہ کی قائل تھی... ایک بادشاہ کے ساتھ دو ملکاؤں کی نہیں مگر مہر بہ لب تھی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اس نے اپنی سوکن ستارہ بیگم کا سرسری استقبال کیا.... چہرے پر جبراً مسکراہٹ بھی سجائی تھی مگر ستارہ بیگم کو اس مسکراہٹ کی تہ میں چھپی زہر کی تلچھٹ بھی صاف محسوس ہوئی تھی۔

ستارہ بیگم بھی کوئی سیدھی سادی عورت نہ تھی۔ زمانے کے چلن اور اس کے گر جانتی تھی اور یہ بھی کہ وہ جس حویلی میں بیاہ کر آئی ہے وہاں پہلے سے اس کے شوہر کی ایک بیوی موجود ہے جو اس کا اور اس کی بیٹی کا وجود ہرگز گوارا نہیں کرے گی لہٰذا اسے یہاں صرف اپنے دیوانے شوہر الف خان پر ہی انحصار کر کے نہیں رہنا ہوگا اپنے اور اپنی بیٹی زہرہ بانو کے تحفظ کے لیے اسے بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہوں گی۔ اگرچہ اپنے اور اپنی بیٹی کا مستقبل تو وہ کسی حد تک محفوظ کر ہی چکی تھی مگر ابھی اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ستارہ بیگم نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ وقت گزرنے کے

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ساتھ ساتھ اسے مزید اور کیا کرنا ہے۔ کیونکہ ستارہ بیگم کا بہرحال کوئی آگے پیچھے نہ تھا، وہ مکمل طور پر اپنے شوہر پر انحصار کیے ہوئے تھی جبکہ اس کے مقابلے میں مہرالنسا کو اس پر ہر لحاظ سے فوقیت حاصل تھی۔ اسے چودھری الف خان کی پہلی بیوی کی حیثیت سے جو مان تھا وہ اپنی جگہ تھا پھر وہ اس کے دو بچوں کی ماں تھی، ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹے کی ماں کی حیثیت سے بھی حویلی میں مہرالنسا کی پوزیشن مضبوط تھی کہ اس نے ممتاز خان کی شکل میں چودھری الف خان کو ایک وارث دیا ہے، پھر مہرالنسا کے دو جوان اور شادی شدہ بھائی بھی تھے وہ ان کی اکلوتی بڑی بہن تھی۔ وراثت علی اور رئیس خان جو خود اپنے بہنوئی چودھری الف خان کی وجہ سے علاقے بھر میں اینڈتے پھرتے تھے۔ ایک نمبر کے نالائق، نکمے اور بدقماش تھے۔ باپ ان کا چھوٹی سطح کا زمیندار تھا، اس کے مرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے عیاشیوں اور سیر سپاٹوں میں جو زمینیں تھیں، وہ بھی کھپا دیں۔ اب وہ اس مثال کی زندہ مگر شرمناک تفسیر بنے ایک طرح سے اپنی بہن کی سفارش پر حویلی میں رہتے چلے آرہے تھے۔

لیکن ستارہ بیگم کو ان ساری چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ ہی اس نے ان کے خلاف اپنے دل و دماغ میں کسی بغض یا کینہ پروری کو جگہ دی تھی۔ وہ فطرتاً صلح جو، امن پسند اور نیک فطرت تھی مگر اپنے اور اپنی بیٹی کے تحفظ کے سلسلے میں کسی مصلحت اندیشی کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ اس بات کا اسے بھی احساس تھا بلکہ ایک قلق تھا مہرالنسا کی طرف سے کہ وہ بہرحال اس کے شوہر کی دوسری بیوی بن کر آئی ہے اور ایک طرح سے اس کے حق پہ ڈاکا ڈالنے کے مترادف تھا مگر پھر اسلامی اور دینی رو سے دیکھتی تو اسے اپنے ضمیر کی اس چبھن کا احساس ہلکا ہونے لگتا کہ چودھری الف خان بہرحال ایک مرد تھا اور اسلام میں مرد ایک سے زائد شادی کرسکتا ہے۔ در پردہ یہ سوچ کر بھی ستارہ بیگم خود کو تسلی دیتی کہ مہرالنسا کو اب بھی بہرحال حویلی میں وہی حیثیت حاصل تھی جو پہلے تھی اور وہ ایسا کچھ نہیں چاہتی تھی کہ اس میں کمی بھی ہو پھر اس نے خود تو الف خان سے شادی نہیں کی تھی بلکہ الف خان نے اس سے شادی کی تھی۔ مطلب یہ کہ وہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوا تھا اور شادی کی ضد کر بیٹھا تھا۔

لیکن ادھر مہرالنسا کے سینے پر تو جیسے ہر دم سانپ لوٹنے لگے تھے، اور اسے شہہ دینے میں اس کے دونوں

شک پرست

ولیم کی ممی شاپنگ سے واپس آئیں تو ولیم کوشش کے باوجود انہیں یہ بتانے کی جرأت نہ کرسکا کہ ان کا چہیتا کتا پیڈی کار کے نیچے آکر ہلاک ہوگیا ہے۔ کچھ دیر گھر کی صفائی ستھرائی کرنے کے بعد ممی نے اچانک پوچھا۔ ”پیڈی کہاں ہے؟“

ولیم نے بڑی ہمت سے کام لیا اور آہستہ سے بولا۔ ”پیڈی کو آج ایک کار نے کچل دیا ہے۔“

ممی نے رنج و غم کا اظہار کرنے کے بجائے کھانا لگایا۔ ماں بیٹے نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ممی پڑوس میں چلی گئیں۔ واپس آئیں تو انہیں پھر کتا یاد آیا۔

”پیڈی کہاں ہے؟“

”میں نے تو آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ پیڈی کو ایک کار نے کچل دیا ہے۔“

ممی یہ سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ ہچکیوں میں قدرے کمی آئی تو ولیم نے کہا۔ ”تعجب ہے کہ دوپہر کو جب میں نے پیڈی کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا؟“

”نہیں۔“ ممی نے ہچکی لے کر کہا۔ ”میں سمجھی تھی کہ تم نے ڈیڈی کہا ہے۔“

دلیل

ایک دوست کی دوسرے دوست سے بازار میں ملاقات ہوئی۔ اس نے اپنے دوست کو دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ”ارے سلیم! تم بیساکھی استعمال کررہے ہو، کیا ہوا؟“

سلیم نے جواب دیا۔ ”ایک کار سے ٹکر ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے کچھ دن تک مجھے بیساکھی استعمال کرائی۔ اب اس کا کہنا ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوچکا ہوں۔“

پہلے دوست نے کہا۔ ”پھر تم ابھی تک بیساکھی کیوں استعمال کررہے ہو؟“

سلیم نے کہا۔ ”ہاں ڈاکٹر تو کہتا ہے کہ میں ٹھیک ٹھاک ہوچکا ہوں مگر میرا وکیل کہتا ہے کہ مجھے ابھی کچھ دنوں اور بیساکھی استعمال کرنی چاہیے۔“

فاطمہ شاہین...... اسلام آباد

Copied From Web

بھائیوں وراثت علی اور رئیس خان کا ہاتھ تھا۔ ان کے اپنے دل کا چور انہیں بے چین کر گیا تھا کہ اب ان کے بہنوئی الف خان کی نئی بیوی ضرور ان کے خلاف کوئی گل کھلائے گی حالانکہ ستارہ بیگم کے دل میں ایسی کوئی بات تھی بھی نہیں مگر مثل ہے کہ گندی مکھی ہمیشہ گند میں ہی بیٹھتی ہے اور سارا جسم چھوڑ کر زخم پر ہی چھوتی ہے۔ اس لیے وہ ستارہ بیگم اور اس کی بیٹی زہرہ بانو کے خلاف اپنی بہن کے ساتھ مل کر کمر بستہ ہو گئے۔

☆☆☆

بلاشبہ چودھری الف خان نے اپنا وعدہ پوری طرح نبھایا۔ ستارہ بیگم نے جو کہا اس نے وہی کیا۔ نو سالہ زہرہ بانو کے نام شہر (نیو ملتان) میں کوٹھی بنوا دی جو بعد میں بیگم ولا کہلائی۔ ایک کوٹھی گرائیں نگر کے نام سے پہلے ہی موجود تھی۔ اس نے نئے پنڈ کی جاگیر میں بھی زہرہ بانو کا حصہ ڈال کر اس کا مستقبل محفوظ کر دیا۔ ستارہ بیگم خوش تھی۔ الف خان اسے والہانہ چاہنے لگا تھا۔ وہ اب بھی اپنے کمرے میں اس کے مدھر سروں میں گیت اور غزلیں سنتا تھا اور اپنا سر دھنتا تھا۔ ستارہ بیگم سے اس کی چاہت میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ شادی کے بعد تو اس کی چاہت میں اضافہ ہی ہوتا رہا اور ادھر مہر النسا تھی کہ انتظار میں بیٹھی تھی کہ ایک دن آتشِ شوق ہوا ہو اور وہ موقع تاک کر اپنی سوکن کے خلاف زہر اگلے مگر یہاں عشق تھا کہ سوا ہی ہوتا جا رہا تھا۔ تب مہر النسا کو یقین کرنا پڑا کہ ستارہ بیگم واقعی ایک جادوگرنی تھی اور اس کی اصل فسوں کاری کا راز بھی اسے پتا چل گیا تھا جو اس کی سریلی آواز میں پوشیدہ تھا۔

دو تین بار موقع ملنے پر مہر النسا نے الف خان کو ستارہ بیگم کی حیثیت جتانے کی بھی کوشش چاہی مگر الف خان نے بڑی سنسناتی اور شعلہ بار نظروں سے گھور کے اسے ایسا گھرکا کہ دوبارہ وہ . . . . . ستارہ بیگم کے خلاف اس کے سامنے کچھ بولنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی مگر اس کے سینے میں بھڑکتی رقابت کی آگ۔ اب ایک جوالا مکھی کی طرح پھٹنے کے قریب ہو گئی تھی۔ بغض و رقابت کی آگ اب آتشِ انتقام میں بدلنے لگی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ستارہ بیگم کا گلا ہی دبوچ ڈالے جہاں سے وہ اس کے شوہر کے دل و دماغ میں سحر پھونکا کرتی تھی۔

اس روز وراثت علی نے بڑی راز داری کے ساتھ اپنی بہن کو ایک، چھوٹی سی پڑیا تھمائی۔

"یہ کیا ہے وڈے ویرا؟" مہر النسا الجھن آمیز حیرت بھری نظروں سے بھائی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"یہ اس جادو کا توڑ ہے آپا جی جو اس کمینی کے گلے سے نکل کر چودھری جی کے دل و دماغ میں اتر کر سر چڑھ کے بولتا ہے۔" وراثت نے سرگوشی میں بہن سے کہا تو مہر النسا جانے کیا سمجھی اور خوف زدہ نگاہوں سے بھائی کو تکتے ہوئے بولی۔

"کک... کک... کیا یہ زہر ہے؟ نن... نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھ میں اس کی ہمت نہیں ہے وڈے ویرا۔ چودھری جی کو پتا چل گیا تو وہ مجھ پر کتے چھوڑ دے گا۔"

"او بس کر... پوری گل تے سن لیا کر آپا جی۔" وراثت علی نے عادت کے مطابق اپنا ایک ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "زہر نہیں ہے پر زہر سے بھی بڑا کام کرے گی کسی کو شک بھی نہ ہوگا۔"

"یہ ہے کیا پھر؟" مہر النسا بالآخر متعجب ہو کر مستفسر ہوئی۔

"یہ گل بوٹی ہے جسے سیندور بھی کہتے ہیں جسے ہندو زنانیاں اپنے سہاگ کی نشانی کے طور پر اپنی مانگ میں سجاتی ہیں پر اس کو غلطی سے کھا لے تو یہ گلے کو جکڑ لیتی ہے مطلب یہ کہ اس سے آواز یعنی گلا ہمیشہ کے لیے خراب ہو جاتا ہے، اب سمجھیں تم؟"

حسبِ موقع رئیس خان بھی موجود تھا۔ وہ غیر مطمئن لہجے میں بولا۔ "او وڈے ویرا، یہ زہر کی پڑیا ہوتی تو زیادہ اچھا تھا کیونکہ سنار دی ٹک ٹک سے لوہار کی ایک ہی ٹھک زیادہ چنگی ہوتی ہے۔ اس کمینی کا گلا بند کرنے سے بہتر ہے گلا ہی دبا دیا جائے ہمیشہ کے لیے۔"

"او تو چپ کر نکے۔" وراثت نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "ان حالات میں ستارہ کی چمک ہلکی کرنا زیادہ بہتر ہے نہ کہ اسے ختم کرنا۔ وہ مر گئی تو ہم تینوں پر الزام آئے گا۔"

مہر النسا بھائی کی بات سمجھ گئی پر وراثت علی نے اس سے کہا۔ "یہ تم کسی طرح۔ ہوشیاری کے ساتھ ستارہ بیگم کے کھانے میں شامل کر دینا۔ دودھ میں ڈالنے کی ہرگز غلطی نہ کرنا ورنہ دودھ کا رنگ چوکھا نکل آئے گا اور ستارہ بیگم بدک جائے گی، سمجھ گئی؟"

"بالکل سمجھ گئی وڈے ویرا۔" مہر النسا بھائی کی بات کا مطلب سمجھ کر یک دم خوش ہوتے ہوئے بولی۔

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''اِک گل ہور سن...'' وراثت آگے بولا۔ ''تو اپنا رویّہ بھی اس نال ذرا بہتر کرلے سمجھ رہی ہے ناں میری گل؟'' مہرالنسا نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

وراثت علی نے بہن کو دو روز بعد اس منصوبے پر عمل کرنے کی تاکید کی تھی۔ ان دو دنوں میں مہرو نے ستارہ بیگم کے ساتھ بالکل سہیلیوں والا برتاؤ کرنا شروع کردیا۔ چودھری الف خان کو اس پر ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی تاہم وہ خوش تھا مگر ستارہ بیگم کو اپنی سوکن کی یہ دلبری کھٹک گئی۔ اسے کسی سازش کی بو آنے لگی۔ زمانہ چشیدہ تو تھی ہے بہ ظاہر اس نے بھی اس کی سرد مہری کو ملائمت آمیزی میں بدلتے ہوئے اس کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا۔ وہ یہی سمجھتی تھی کہ شاید مہرو الف خان کے سامنے اچھا بن کر اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اس کے جواب میں لامحالہ وہ یعنی ستارہ بیگم ضرور سرد رویہ دکھائے گی تو شوہر کے سامنے خود ہی بری بنے گی لہٰذا یہ سوچ کر ستارہ بیگم نے بھی مہرالنسا کے ساتھ خوش دلی کا رویہ اپنایا وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ دونوں ایک گھاٹ میں شیر و شکر ہو کر رہیں۔

دو دن گزر گئے تیسرے روز مہرالنسا نے اپنی سازش پر عمل کر ڈالا اور سریلی آواز والی ستارہ بیگم کو کھانے میں سیندور کھلا دیا۔

وہ دن خیریت سے گزرا دوسرے دن بھی کچھ نہ ہوا مگر تیسرے روز صبح جب ستارہ بیگم نیند سے بیدار ہوئی تو اسے اپنے گلے میں ہلکی ہلکی خراش سی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اسے معمولی بات سمجھا حالانکہ وہ ٹھنڈی کھٹی چیزوں سے مکمل پرہیز کرتی تھی۔ شام تک یہ معمولی سی گلے کی خراش دکھن میں بدل گئی۔ اس نے ہلکے نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر غرارے کیے، افاقہ ہوا مگر عارضی۔ اس رات چودھری الف خان کا گیت سننے کا بھی جی چاہا تھا مگر ستارہ بیگم کی طبیعت کی خرابی کے باعث چپ ہو رہا مگر ستارہ بیگم کو تشویش سی لاحق ہوئی، اس نے دیسی قسم کا گھریلو جوشاندہ بھی بنا کر پیا۔ چوتھے روز تو ستارہ کا گلا ہی سوجھ گیا اور دکھن بڑھ گئی۔ گلے کی جلن کی سوزش کے باعث اس سے کچھ کھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔ الف خان نے فوراً علاقے کے ایک مشہور حکیم کو حویلی میں بلوایا۔ اس نے ٹارچ سے ستارہ بیگم کے حلق کا معائنہ کیا پھر اپنے مطب کی دوائیں دے دیں۔ دو روز میں ہی ستارہ بیگم کو افاقہ ہونے لگا۔ بخار اتر گیا، گلے کی سوزش میں کمی آگئی درد بھی جاتا رہا۔ ستارہ بیگم نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اس کے تیسرے روز تو ستارہ بیگم بالکل بھلی چنگی ہوگئی یوں بات آئی گئی ہوگئی۔

لیزنتر لپیٹ

چھوٹا بچہ حجام کی دکان میں داخل ہوا۔ حجام نے بچے کو دیکھتے ہی اپنے گاہک سے آہستہ سے کہا۔

''یہ لڑکا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ دیکھو ابھی تمہارے سامنے ثبوت پیش کرتا ہوں۔''

حجام نے اپنے ایک ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھا اور دوسرے ہاتھ میں، دو روپے کی ریزگاری رکھی اور بچے کو بلا کر کہا۔ ''بیٹا کون سے ہاتھ والے پیسے لوگے؟''

بچے نے دو روپے کی ریزگاری لی اور دکان سے نکل گیا۔

''دیکھا میں نے کیا کہا تھا... یہ بے وقوف کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگا اپنی زندگی میں۔'' حجام نے اپنے گاہک سے کہا۔

گاہک بال کٹوا کر باہر نکلا تو اس نے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے پایا۔ اپنی معلومات کے لیے اس نے بچے کو روک کر پوچھا۔ ''بیٹے! تم نے دس روپے کے بجائے دو روپے کی ریزگاری لی، ایسا کیوں کیا؟''

بچے نے آئسکریم کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جس دن میں نے دس روپے کا نوٹ اٹھالیا اسی دن یہ کھیل ختم ہوجائے گا۔''

(کراچی سے جاوید کاظمی کا شگفتہ پارہ)

الف خان ستارہ بیگم کی نغمہ سرائی کو ترسا ہوا تھا بالآخر اس نے اس رات ستارہ بیگم سے ایک غزل کی فرمائش کر ڈالی۔ ستارہ بیگم مداح سرا ہوئی مگر اسے اپنے گلے اور سُر پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ آواز میں کسی گہن کی طرح بھدا پن عود کر آیا تھا۔ پیہم کوشش اور بار بار کھنکھارنے کے باوجود اپنی آواز کے سریلے پن کا وہ جادو نہ چلا سکی جو اس کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ الف خاں کو بھی اس تبدیلی پر حیرت ہوئی، کہاں تو وہ ساری ساری رات گیت، غزل، ٹھمری اور وغیرہ سنتا رہتا تھا لیکن اس رات صرف ایک غزل پر اکتفا کرکے سو رہا۔ ستارہ بیگم اس کی وجہ جانتی تھی وہ بھی چپ ہو رہی۔ الف خان نے اس کا دل چھوٹا کرنا مناسب نہ سمجھا

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور تھکاوٹ کا بہانہ کر کے سو گیا۔

اگلے روز شام میں ستارہ بیگم نے تنہا ریاض کرنے کی کوشش چاہی تو اسے احساس ہو چلا کہ معاملہ واقعی خراب ہے۔ اس نے فوراً شوہر سے کہہ دیا کہ وہ اسے شہر کے کسی بڑے کان، ناک، حلق کے ماہر کے پاس لے جائے۔

بہرحال ستارہ بیگم کو ملتان کے ایک مشہور ENT سرجن کو دکھایا گیا۔ اس نے کچھ ٹیسٹ لکھ دیے، دوائیاں تجویز کیں پھر کچھ روز بعد اس نے انکشاف کیا کہ ستارہ بیگم کے آلۂ صوت میں خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ.... مسئلہ اب قابلِ علاج نہیں رہا۔ تاہم اس نے اپنے تئیں یہ تسلی ضرور دی کہ اس سے جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک قدرتی آلہ ہوتا ہے اور بہ ظاہر یہ ایک معمولی خرابی ہے فقط آواز اس نقص کی وجہ سے تھوڑی موٹی اور کھردری ہو جاتی ہے۔ اب ڈاکٹر کو کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی خرابی ستارہ بیگم کے لیے کتنی بڑی خرابی تھی۔ وہ دل ہولا کر رہ گئی۔

کہاں تو ستارہ بیگم کی سریلی آواز بغیر ساز کے بھی مدھر ہوتی اور الف خان کے کانوں میں رس انڈیلتی مگر اب تلوں میں جیسے تیل ہی نہ رہا۔ وہ بڑی بے توجہی سے یہ مشکل ایک غزل اور کبھی وہ بھی ادھوری سن کے سونے کا بہانہ کر کے لیٹ جاتا مگر ستارہ بیگم کا دل نہیں دکھاتا تھا۔ جان گیا تھا وہ کہ اب ستارہ بیگم کے گلے میں ایک لاعلاج نقص پیدا ہو چکا ہے لہٰذا اب تو اس نے ستارہ بیگم سے گانے کی فرمائش کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔

ستارہ بیگم دل مسوس کر رہ گئی۔ کئی روز تک تو وہ سمجھ ہی نہ پائی کہ ہوا کیا تھا۔ ماتھا تو اس کا اس وقت ٹھنکا جب ایک روز مہرالنسا نے اس سے پوچھا۔ ’’کیا بات ہے آج کل مجھے تمہارے کمرے سے گنگنانے کی آوازیں نہیں سنائی دیتیں؟ سچ پوچھو تو تمہاری اس سریلی اور جادو بھری آواز سن کر تو میں بھی تمہارا گیت سننے کے لیے دروازے سے گزرتے وقت کان لگائے کھڑی ہو جاتی تھی۔‘‘ اس کی بات پر ستارہ بیگم ٹھٹکی اور قدرے چونک کر گہری نگاہوں سے اپنی سوتن کے چہرے کا جائزہ لیا تو اسے اس کی آواز میں مکاری اور بظاہر میٹھی مسکراہٹ میں کمینگی چھپی صاف محسوس ہو گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا مگر وہ اندر سے کھٹک گئی۔

ستارہ بیگم نے بالآخر ایک دن شوہر سے دوبارہ اسے شہر کے ایک حکیم کو دکھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ ستارہ بیگم کا وہ عائلی حکیم تھا جسے وہ اکثر اپنی طبیعت وغیرہ دکھاتی رہتی تھی۔

چودھری الف خان اپنی چہیتی بیوی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا بہرطور اس بار خود تو نہیں گیا مگر ڈرائیور اور ایک خادمہ کے ساتھ اسے شہر جانے کی اجازت دے دی۔ ستارہ بیگم اپنے پرانے حکیم سے ملی اور اسے ساری بات بتادی کہ اس کے گلے میں اب پہلے جیسا سُریلا پن نہیں رہا۔

حکیم نے بہ غور ستارہ بیگم کے گلے کا معائنہ کیا اور بالآخر انکشاف کیا کہ ستارہ بیگم نے ضرور ایسی کوئی چیز کھائی ہے جس نے اس کے آلہ صوت کو جکڑ کر اس کی حساسیت کو متاثر کیا اور اس کے ٹشوز مردہ کر کے اس کی سریلی آواز میں ہمیشہ کا نقص پیدا کر دیا ہے۔

ستارہ بیگم کے لیے یہ جاننا کافی ثابت ہوا۔ وہ حویلی لوٹ آئی۔ وہ بہت افسردہ اور غمگین تھی۔ اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ اسے ضرور اس کی سوکن مہرالنسا نے ہی کوئی ایسی شے انجانے میں کھلا دی ہے جس سے وہ ہمیشہ کے لیے اپنی میٹھی اور سریلی آواز سے محروم ہو چکی تھی۔

غم و غصے کا ایک طوفان ستارہ بیگم کے اندر بھی اٹھا تھا۔ انتقام کی جلن اس کے سینے میں مچی تھی اور اس نے الف خان سے اس خفیہ سازش کا ذکر کرنے کا بھی ارادہ کیا تھا لیکن پھر اپنا ارادہ بدل ڈالا کیونکہ اس کے پاس ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہ تھا۔ ممکن تھا شوہر کا ہی اس کی طرف سے دل کھٹا ہو جاتا کیونکہ مہرالنسا شوہر کے سامنے تو اپنی سوکن کے ساتھ میٹھی میٹھی بنی رہتی تھی مگر اس کی غیر موجودگی میں سرد اور استہزائیہ رویہ روا رکھتی تھی۔

ستارہ بیگم، مہرو کے دونوں بھائیوں کے چہروں پر اسے دیکھ کر ابھرنے والی کمینے پن کی مسکراہٹ محسوس کرتی رہی تھی جو بہ زبانِ خاموش یہ دھمکی دیتے ہوئے محسوس ہوتے تھے کہ ’’دیکھ لیا ہم سے ٹکرانے کا انجام! خیریت چاہتی ہو تو اپنا بوریا بستر حویلی سے گول کر کے ہمیشہ کے لیے نظروں سے دور ہو جاؤ۔‘‘

’’ٹھیک ہے پھر۔‘‘ اس روز خود سے بڑبڑاتے ہوئے ستارہ بیگم نے بھی اپنی کمر کس لی۔ سمجھ تو گئی تھی کہ ان تینوں سازشی بہن بھائیوں کا ہی یہ سب کیا دھرا تھا اور اس کا مقصد بھی وہ جان چکی تھی۔ اسے خود سے زیادہ اپنی معصوم بیٹی زہرہ بانو کی فکر لاحق ہونے لگی تھی۔ بے شک دریا میں رہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر نہیں لینا چاہیے مگر ان کے درمیان رہتے ہوئے خوف سے آنکھیں بند کر کے رہنا بھی تو خطرے سے خالی نہیں ہوتا چنانچہ یہ سوچ کر وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئی۔ جانتی تھی اگر وہ اس طرح یک

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

طرفہ صلح جو اور امن پسندی کے ساتھ خاموش رہ گئی تو دنیا اور اسے اور اس کی بیٹی کو کھا جائے گی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ سر اٹھا کر جینا پڑے گا۔ اخلاص سے سر جھکانے کو دنیا اب کمزوری پر محمول کرنے لگی تھی۔

ستارہ بیگم نے سب سے پہلے یہ سوچا کہ الف خان نے اپنی جائیداد سے جو کچھ اس کے یا اس کی بیٹی زہرہ بانو کے نام کر رکھا ہے اسے قانونی تصرف میں لانا ضروری تھا۔ بے شک یہ بات اس کے شوہر کو بری لگ سکتی تھی کیونکہ ابھی وہ زندہ تھا مگر مہرالنسا اور اس کے دونوں بھائیوں کے سینے پر مونگ دلنے اور ان کے سامنے اپنی حیثیت منوانے کے لیے ستارہ بیگم نے یہ سب کرنا ضروری سمجھا تھا مگر اس طریقے سلیقے کے ساتھ کہ شوہر کو بھی برا نہ لگے۔ چنانچہ ایک روز وہ رجسٹرار آفس چلی گئی۔ چند ضروری کاغذات کی فائل اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے کچھ دے دلا کر ان کاغذات کے مختار نامے بنوائے اور انہیں باقاعدہ قانونی شکل دی جس کی وہ اور اس کی بیٹی مجاز تھیں۔

یہ سب کرنے کے بعد وہ حویلی لوٹ آئی۔ اب وہ پریشان اور افسردہ سی نہیں رہتی تھی۔ جانتی تھی اس کی پریشان اور افسردہ صورت دیکھ کر اس کے دشمنوں کو خوشی محسوس ہوتی تھی۔ لہٰذا اس نے اپنے چہرے پر اب طمانیت طاری کر لی تھی اور خوش رہتی تھی جس کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ مہرو کو اپنی سوکن کی راحت اور طمانیت بری طرح کھلنے لگی۔ پہلے وہ ستارہ بیگم کو دیکھ دیکھ کر استہزائیہ اور نفرت انگیزی سے مسکراتی تھی مگر اب وہ ایک نامعلوم سی الجھن آمیز پریشانی کا شکار نظر آنے لگی۔

ایک روز اس نے شوہر سے اجازت لی کہ وہ اور اس کی بیٹی کچھ دنوں کے لیے بیگم ولا میں رہنا چاہتی ہیں۔ الف خان کو حیرانی تو ہوئی تاہم اس نے اجازت دے دی لہٰذا ایک خادمہ کے ساتھ ستارہ بیگم اپنی بیٹی کو لے کر ملتان بیگم ولا آ گئی۔ بیگم ولا کی حالت بہت خستہ اور بکھری بکھری ہو رہی تھی۔ اس نے فوراً حویلی سے کچھ ملازم بلوا لیے جنہوں نے دو روز میں ہی بیگم ولا کی حالت سدھار دی۔ ستارہ بیگم نے اب وقتاً فوقتاً یہاں آتے رہنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس بار جب حویلی میں فصل کی کٹائی اور دیگر آمدنی کا حساب کار منشی فضل محمد ہاتھوں میں رجسٹر تھامے حویلی میں آن وارد ہوا۔ پہلے مہرالنسا آمدنی کا جائزہ لیا کرتی تھی جبکہ ستارہ بیگم نے بھی اس کی پروا نہیں کی تھی نہ ہی اسے کوئی دلچسپی تھی مگر اب چونکہ معاملہ جیسا کو تیسا والا تھا لہٰذا وہ بھی اس کمرے میں آ گئی جسے عرف عام میں بیٹھک کہا جاتا ہے۔ منشی فضل محمد کے علاوہ مہرالنسا اور اس کے دونوں بھائی بھی تھے۔

یہ سب مونڈھوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ منشی فضل محمد اپنی گود میں بڑا سا رجسٹر کھولے بیٹھا تھا۔ مہرالنسا اور اس کے دونوں بھائیوں کی نگاہ ستارہ بیگم پر پڑی تو اسے دیکھ کر ان کے چہروں پر تلخی اتر آئی جبکہ منشی فضل احتراماً رجسٹر سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہم لوگ اس وقت مصروف ہیں، تم ابھی جاؤ یہاں سے۔“ مہرالنسا نے کڑوے لہجے میں ستارہ بیگم کی طرف دیکھ کر کہا مگر ستارہ بیگم اسے اور اس کی بات کو یکسر نظر انداز کر کے منشی فضل محمد کی طرف گھورتی نظروں سے دیکھتے ہوئے تیز اور تحکمانہ لہجے میں بولی۔

”منشی... تم مجھے جانتے ہو میں کون ہوں؟“

بے چارہ منشی ستارہ بیگم کی بات پر تھوڑا گڑبڑا سا گیا پھر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ج... جی... ب... بیگم صاحب... بھلا آپ کو میں کیسے نہیں پہچانوں گا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی چھوٹی بیگم صاحب؟“

”تمہاری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کیے دیتی ہوں۔“ ستارہ بیگم نے کڑک دار اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”آئندہ ایک بات کا خیال رکھنا جب بھی چودھری صاحب کی غیر موجودگی میں کوئی حساب کتاب کرنا ہو تو ہمیں بھی آگاہ کرنا ہوگا، سمجھ گئے تم؟“

”س... سمجھ گیا چھوٹی بیگم صاحب۔ آئندہ ایسا ہی ہوگا۔“

مہرالنسا اور اس کے دونوں سازشی بھائیوں کو ستارہ بیگم کی اس بات پر آگ لگ گئی۔ مہرالنسا نے تیوری پر بل ڈال لیے اور نخوت سے بولی۔ ”ستارہ! منشی فضل محمد پرانا آدمی ہے اور چودھری صاحب نے اپنی غیر موجودگی میں ہمیں یہ اختیار دے رکھا ہے کہ ہم...“

”اب ایسا نہیں ہوگا۔“ ستارہ بیگم نے بھی بڑی نخوت سے اس کی بات کاٹ ڈالی اور قریب ایک مونڈھا کھینچ کر بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان ہو گئی۔ انداز و اطوار سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مہرو کی بات تو کیا اس کی موجودگی کو بھی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مہرالنسا کے بھائی رئیس خان جو مزاجاً گرم دماغ تھا تلخی سے ستارہ بیگم کی طرف دیکھ کر بولا۔

”خاتون! یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے، کسی باہر کی

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عورت کو اس میں دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں۔"

منشی فضل محمد کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ جان گیا تھا کہ یہاں اب جنگ چھڑ چکی ہے اور کہیں ہاتھیوں کی اس جنگ میں وہ نہ پس جائے، وہ پہلے ہی بہت لیے دیے اور رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔۔

اپنی سوکن کے بھائی کی مداخلت پر ستارہ بیگم جو پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھی تھی، جلتی سلگتی نظروں سے رئیس خان کی طرف دیکھ کر ترکی بہ ترکی بولی۔ "اس خاندان سے میں بھی تعلق رکھتی ہوں جہاں تم بہن کے گھر اپنے بیوی بچوں سمیت مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہو۔ آئندہ مجھ سے اپنی اوقات یاد رکھ کے بات کرنا ورنہ مجھے تمہارے سلسلے میں بڑی تلخ مگر سچی مثال پیش کرنا پڑے گی کہ بہن کے گھر بھائی کس پائے کی حیثیت سے رہتا ہے۔"

اس چوٹ پر رئیس خان کا چہرہ احساسِ تذلیل سے مسخ ہو کر رہ گیا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا جبکہ وراثت علی جو خاصی دیر سے خاموش مگر بھانپتی نظروں سے ستارہ بیگم کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا، اسے اپنی بہن کی سوکن کی تیوریوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ خاتون اب باقاعدہ کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکی ہے اور جس بل بوتے پر یہ سب کر رہی ہے وہ اس کی ٹھوس اور مضبوط وجہ بھی جانتا تھا۔۔ وہ چھوٹے بھائی کو کرارا جواب پڑتے ہی اور اسے احساسِ ذلت تلے سرخ ہوتے دیکھ کر ستارہ بیگم سے مخاطب ہو کر صلح جُو لہجے میں بولا۔

"محترمہ؟ میں آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں ہے لیکن بات کرنے کے کچھ اصول اور ڈھنگ ہوتے ہیں، تم شاید اس سے ناواقف ہو۔" وراثت علی کی معاملہ فہمی میں مکاری کا دخل کارفرما تھا۔

ستارہ بیگم نے اس کی طرف جلتی سلگتی نظروں سے دیکھا اور ترش لہجے میں بولی۔ "میں خوب جانتی ہوں کہ کس طرح کے لوگوں سے مجھے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ رہی بات اصول اور ڈھنگ کی تو تمہیں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کو سمجھانا چاہیے۔"

مہرالنسا جو پہلے ہی سوکن کے ہاتھوں بھائیوں کی اس تذلیل پر جلی بھنی بیٹھی تھی ایک دم آپے سے باہر ہو گئی اور پھر کراٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم۔۔۔ تم۔۔۔ ایک۔۔۔"

"خبردار! کوئی غلط بات منہ سے مت نکالنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا، سمجھیں تم۔" ستارہ بیگم نے فوراً اس کی بات کاٹتے ہوئے شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ وراثت نے اپنی بہن کا ہاتھ تھپتھپا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ستارہ بیگم نے جب منشی فضل محمد سے سارا اگلا پچھلا حساب کھلوا کر تفصیلی پوچھ تاچھ کی تو انکشاف ہوا کہ گندم اور اناج کی کئی من کی بوریاں خرد برد کی جاتی رہی ہیں نیز بہنوئی کے کام میں ہاتھ بٹانے کے نام پر رئیس خان اور وراثت علی نے کھاد اور بیجوں کے علاوہ کاشت کاری سے متعلق خریداری کے سلسلے میں اپنے بہنوئی چودھری الف خان سے دگنی تگنی رقوم بٹوری تھیں۔ یہی نہیں کئی مہنگے زرعی آلات کے لیے خطیر رقم حاصل کرنے کے باوجود ان کا کوئی ریکارڈ نہ تھا۔

ستارہ بیگم نے منشی فضل محمد کو آڑے ہاتھوں لے لیا اور اس غبن اور دھوکا دہی میں اسے برابر کا مجرم گردانتے ہوئے اس کے لتے لے ڈالے۔ منشی کا تو ایک پسینا آ رہا تھا دوسرا جا رہا تھا۔ مہرالنسا اور اس کے دونوں بھائیوں کو بھی آج پتا چلا تھا کہ انہوں نے کس "بلا" کے ساتھ ٹکر لے لی تھی جس نے ان کے آج سارے کچے چٹھے کھول کر رکھ دیے تھے۔ ان تینوں کو چپ سی لگ گئی تھی۔ ستارہ بیگم بے شک زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی مگر میٹرک تک اس نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اور اتنا شعور وہ بھی رکھتی تھی کہ اعداد و شمار کی ہیر پھیر کیا ہوتی ہے اور پھر یہ تو بالکل واضح حساب تھا۔ الف خان بے انتہا دولت و جائداد کا مالک تھا۔ ممکن ہے اپنی مصروفیات یا دیگر سرگرمیوں کے باعث اس طرف کم توجہ دیتا ہو یا پھر اپنی بیوی مہرالنسا پر زیادہ ہی بھروسا کرتا ہو۔

ستارہ بیگم نے منشی فضل محمد کو لتاڑتے ہوئے درشتی سے کہا۔ "منشی فضل! تم تو اس خاندان کے پرانے خدمت گار ہو، تمہیں اس سارے معاملے پر پردہ ڈالنے کا کتنا کمیشن ملتا تھا؟"

منشی فضل محمد کی حالت غیر ہو رہی تھی لیکن درحقیقت قصور اس کا بھی نہ تھا۔ وہ مجبور تھا، یہ بھی صحیح تھا اس نے ان سے کوئی کمیشن وصول نہیں کیا تھا۔ اس نے فوراً ستارہ بیگم کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بولا کہ اس کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس نے ہیرا پھیری میں کوئی کمیشن وصول کیا ہے، وہ بس ایک نوکر کی حیثیت سے خاندان کے لوگوں کے سامنے مجبور تھا۔

ستارہ بیگم کو اندازہ ہونے لگا کہ منشی بے قصور تھا۔ یہ نشست برخاست ہونے سے پہلے ستارہ بیگم نے منشی کو فی الفور چودھری الف خان کے سامنے پیش ہونے کا حکم دے

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیا۔

ادھر یہ تینوں سازشی بہن بھائی الگ کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

”یہ تو بڑی تیز نکلی۔ اگر یہ سب چودھری جی کو پتا چل گیا تو خیر نہیں ہماری، کچھ سوچو کیا کیا جائے؟“ وراثت علی نے پریشان ہو کر کہا تو رئیس خان بولا۔

”منشی کو میں دھمکی دے دیتا ہوں کہ وہ چودھری جی کو ایسا کچھ نہ بتائے بلکہ الٹا الزام چنڈال ستارہ بیگم پر ڈال دے۔“

”ہاں یہی بہتر رہے گا۔“ مہرو نے بھائی کی بات سے اتفاق کیا۔ موجودہ صورتِ حال سے وہ خود بھی پریشان اور فکرمند تھی کیونکہ اس کی سوکن اب اس پر بھاری پڑنے لگی تھی۔ اگر چودھری الف خان کو سارے کچے چٹھے کا پتا چل جاتا تو نہ صرف اس کا اپنے دونوں مسٹنڈے سالوں کی طرف سے دل خراب ہو جاتا بلکہ مہرالنسا سے بھی وہ بددل ہو سکتا تھا۔

”عقل سے کام لو دونوں۔“ وراثت علی نے عادتاً اپنا ایک ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”منشی کی حالت نہیں دیکھ رہے تھے پیلا پڑا جا رہا تھا۔ یہ دھمکی شمکی سے معاملہ اور خراب ہو جائے گا بلکہ اس طرح وہ چنڈال سچی ثابت ہو جائے گی۔“

”وڈے ویرا سچی تو وہ اب بھی ہے۔“ مہرو نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بے شک مگر ہمیں مکاری سے کام لینا ہوگا، ہمارے پاس ابھی وقت ہے ہم منشی کو بلا کر اس کے حساب میں گڑبڑ کروا دیتے ہیں۔“

چنانچہ منشی فضل محمد سے جب یہ سب کرنے کو کہا گیا تو اس نے فوراً اپنے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔ اس نے رجسٹر اور کھاتوں میں گڑبڑ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ستارہ بیگم نے پہلے ہی اسے تسلی دے دی تھی کہ وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا اور کرے گا تو پھنسے گا بلکہ سارا الزام اس پر ہی ڈال دیا جائے گا۔

موقع ملتے ہی ستارہ بیگم نے یہ حقیقت منشی فضل محمد سمیت الف خان تک پہنچا دی۔

چودھری الف خان بے شک دولت مند سہی لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ اپنے نقصان کو اس طرح برداشت کر لیتا اور پھر یہ تو مستقل نقصان پہنچانے والا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا پھر جب اسے یہ پتا چلا کہ مستقل نقصان میں مہرالنسا اپنے دونوں بھائیوں کی برابر شریک ہے تو وہ چراغ پا ہو گیا۔

اس نے فوراً طیش اور غیظ و غضب میں آ کر چند سخت احکامات جاری کر دیے۔ سب سے پہلا حکم نامہ یہ جاری کیا گیا کہ اس کے دونوں سالے رئیس خان اور وراثت علی فی الفور یہ حویلی چھوڑ کر اپنا الگ بندوبست کریں۔ دوسرے یہ کہ منشی فضل محمد آئندہ صرف اور صرف ستارہ بیگم کو اس کی غیر موجودگی میں حساب کتاب دیا کرے گا۔ مہرالنسا کا اس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

مہرو نے اس پر شوہر سے دبے دبے لہجے میں اعتراض کیا تو الف خان نے بڑی سخت نظروں سے اسے گھورتے ہوئے یہ تک کہہ دیا۔ ”مہرو بیگم! شکر کرو کہ تمہارے ان دونوں نکھٹو بھائیوں کے خلاف میں کوئی قانونی کارروائی نہیں کر رہا ورنہ میں ان سے اپنا نقصان بھی بھروا سکتا ہوں، جیل کی ہوا بھی انہیں کھلا سکتا ہوں، اس رعایت کو کافی سمجھو۔“ مہرالنسا کیا جواب دیتی۔

یوں ستارہ بیگم نے اپنے ساتھ کی گئی سیندر سازش کا بدلہ ان تینوں سازشی بہن بھائیوں سے لے لیا۔ مہرالنسا نے ستارہ بیگم کے لیے جو گڑھا کھودا تھا اس میں وہ خود اکیلی نہیں بلکہ اپنے دونوں بھائیوں سمیت جا گری تھی۔ اس کے دونوں بھائی تو حویلی سے ہمیشہ کے لیے بے دخل ہوئے ہی تھے۔ خود مہرالنسا کا اعتبار اپنے شوہر کے دل سے بے دخل ہو گیا تھا اور وہ اہمیت بھی جو اسے حویلی میں بڑی بیگم کی حیثیت سے حاصل تھی۔

مہرالنسا کے دل میں ستارہ بیگم کے لیے سانپ لوٹ کر رہ گئے۔ جس وقت اس کے دونوں بھائی حویلی سے اپنا بوریا بستر سمیٹ کر رخصت ہو رہے تھے تو ستارہ بیگم کے چہرے پر بھی ویسی ہی خالص فاتحانہ مسکراہٹ تھی جیسی ان تینوں بہنوں بھائیوں نے اس کے خلاف سیندر سازش کی کامیابی کے وقت اپنے مکروہ چہروں پر سجائی تھی۔

دونوں بھائیوں بڑی معاندانہ نظروں سے ستارہ بیگم کو گھور رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک تنبیہ تھی جیسے کہہ رہے ہو بہت جلد اس کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

ستارہ بیگم نے اب پوری طرح شوہر کے دل و دماغ میں اپنی عقل مندی اور وفاداری کی دھاک بٹھا دی تھی لہٰذا اس رات اس نے اس بات کا بھی شوہر سے اظہار کر ڈالا۔

”سرکار! اللہ گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی آپ کا یا اس حویلی کا بلکہ کسی کا بھی برا نہیں چاہا لیکن آج آپ کے سامنے مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ بڑی بیگم

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مہرالنسا اور اس کے دونوں بھائیوں نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا۔"

اس کے بعد اس نے اپنے شوہر کو ان کی سینہ ور سازش کے بارے میں بھی تفصیلاً آگاہ کردیا کہ یہ انکشاف اس کے ایک پرانے اور قابل حکیم نے کیا تھا کہ اس کی سریلی آواز کو خراب کرنے کے لیے اسے کوئی ایسی چیز دھوکے سے کھلادی ہے جس نے اس کے گلے کا آلۂ صوت ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔

چودھری الف خان بھی گندم کی روٹی کھاتا تھا۔ عورتوں کے چلتر اور زمانے کی چال بازیوں کا اسے بھی ادراک تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ ستارہ بیگم کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ غصے میں بپھر گیا اور چاہتا تھا کہ اسی وقت مہرالنسا کو کمرے میں بلا کر اس کی خبر لے لیکن ستارہ بیگم نے ایسا کرنے سے روک دیا۔

"بات اس طرح ختم نہیں ہوگی سرکار۔" وہ بڑے رسان سے بولی۔ "اصل خطرہ مجھے مہرو کے دونوں بھائیوں سے ہے۔ وہ نظروں نظروں میں مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر گئے ہیں۔ آپ کی وفاداری اور ایمان داری کے صلے میں خدانخواستہ مجھے اور میری معصوم بیٹی زہرہ کو یہاں کہیں بُرے دن نہ دیکھنے پڑجائیں۔"

"ہم تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہے ہیں ستارہ بیگم۔" چودھری الف خان نے بردباری سے کہا۔

اگلے دن الف خان کا حویلی میں ایک اور حکم جاری ہوچکا تھا۔ اس کے دونوں سالوں رئیس خان اور وراثت علی کی حویلی میں داخلے پر پابندی لگادی گئی تھی البتہ مہرالنسا اپنے بھائیوں سے ملنے جاسکتی تھی۔ دوسرا حکم یہ تھا کہ ستارہ بیگم کو حویلی کے جملہ انتظام و انصرام پر اختیار دے دیا گیا تھا حتیٰ کہ تجوری کی چابیاں بھی مہرالنسا کے ہاتھوں سے نکل کر اب ستارہ بیگم کے ہاتھ میں آگئیں۔

مہرالنسا کے تو اب دن و رات کیا بلکہ ہر پل جلتی ہوئی چتا بن کر رہ گئے تھے۔ وہ اب بھی باقاعدگی سے اپنے دونوں بھائیوں سے ملتی تھی اور اپنا رونا روتی رہتی تھی۔ رئیس خان اور وراثت بھی ستارہ بیگم اور اس کی معصوم بیٹی پر کم ادھار کھائے نہیں بیٹھے تھے لیکن ستارہ بیگم نے چال ہی ایسی چلی تھی کہ تینوں بُری طرح مار کھا کر اب کونے میں بیٹھے اپنے ہی زخم چاٹنے پر مجبور تھے لیکن وراثت علی کا معاملہ مختلف تھا، وہ غصے اور جوش کے بجائے دماغ استعمال کرنے کا بھی عادی تھا۔ وہ اب بہن کو ستارہ بیگم کے خلاف نئی نئی پٹیاں پڑھانے لگا۔

بہ ظاہر حالات معمول پر آگئے تھے۔ وقت ایک مناسب ڈھب سے گزرنے لگا تھا۔ موقع محل کی سب سازشیں عبث ثابت ہوئی تھیں کہ وقت نے گویا چپ چپاتے ایک لمبی زقند بھری۔

☆☆☆

ستارہ بیگم کے بالوں میں اب چاندی اُترنے لگی تھی۔ چودھری الف خان بھی وقت کے بہتے دھارے کو عمر کا خراج دیتے دیتے بوڑھا ہوچکا تھا مگر ستارہ بیگم سے اس کی محبت بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ آج بھی اسے چاہتا تھا گو چاہت کی نوعیت بدل گئی تھی، اس میں جوانی کا وہ والہانہ پن نہیں تھا مگر محبت تو محبت ہوتی ہے جسمانی تعلق سے بڑھ کر اعلیٰ و ارفع ہوچکی تھی۔

ستارہ بیگم نے یہ طویل ماہ و سال حویلی میں بڑی شان اور وقار سے گزارے تھے۔ وہ بڑی پامردی سے محلاتی سازشوں کا اب تک مقابلہ کرتی آئی تھی۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، ایک وہ وقت بھی تھا جب مہرالنسا نے حویلی میں چودھرائن کے حوالے سے ایک شاندار زندگی گزاری تھی پھر ستارہ بیگم کی آمد سے وہ ماند پڑنے لگی۔ اگرچہ ایسی بات تو نہ تھی کہ ستارہ بیگم کی ذات سے اسے کوئی نقصان پہنچا ہو لیکن مہرالنسا کی ستارہ بیگم سے رقابت اور چپقلش نے اسے اپنے ہی ہاتھوں نقصان پہنچایا تھا، نہ وہ ستارہ بیگم کے خلاف محاذ قائم کرتی اور نہ وہ حویلی میں اپنا وقار کھوتی۔ حالانکہ ستارہ بیگم کے آنے کے باوجود چودھری الف خان نے اپنی پہلی بیوی کو وہی مقام دیا تھا جو اس کا تھا مگر اس مقام کو مہرو نے خود ہی اپنی رقابت اور عداوت سے کھودیا تھا۔ یہ آگ اب بھی جوں کی توں مہرو کے سینے میں ایک بھڑکتے ہوئے الاؤ کی صورت میں موجود تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بجائے کمی آنے کے اضافہ ہی ہوا تھا۔ وقت نے ایک اور ذکی چال چلی تھی، اپنا پانسا ایک بار پھر پلٹا تھا اور بالآخر مہرالنسا کی کھوئی ہوئی ساکھ ایک بار پھر لوٹنے لگی۔ ایک بار پھر تیر و تفنگ تیکھے کیے جانے لگے وجہ یہ تھی کہ مہرالنسا آخر کار اس خاندان کے وارث کی ماں تھی۔ ایک بیٹے کی ماں، چودھری الف خان کے بیٹے ممتاز خان کی ماں۔

الف خان گو اب بوڑھا ہوچکا تھا اس میں جوانی کا وہ دم خم بھی نہیں رہا تھا مگر اب بھی ایک بوڑھے شیر کی سی دھاک جمائے بیٹھا تھا لیکن بعض جذباتی کمزوریوں کا اپنا ایک اثر تھا اور الف خان بھی اسی ایک کمزوری کے زیر اثر بہرحال

Copied From Web

آچکا تھا۔

مہرالنسا نے ستارہ بیگم سے منہ کی کھانے کے بعد زخمی ناگن کی طرح موقع کے انتظار میں کنڈلی مار لی تھی۔ اس کی اب ساری توجہ اپنے گبرو جوان...... بیٹے ممتاز خان پر مرکوز تھی۔ اس نے اسے گویا اپنا دودھ نہیں بلکہ زہر پلایا تھا اور ممتاز خان نفرت کا یہ زہر پی کر اژدھا بن گیا تھا۔ باقی رہی سہی کسر اس کے دونوں ماموں رئیس خان اور وراثت علی نے پوری کر دی تھی اور اپنی ماں اور اپنے دونوں ماموؤں کی طرح وہ بھی اپنی سوتیلی ماں اور بہن زہرہ بانو کو اپنا ازلی دشمن سمجھنے لگا۔ مہرالنسا نے بھی جوان بیٹے کو ہتھیار بنا کر استعمال کیا اور اپنی طرح اس کی سرشت میں بھی کمینگی، کینہ اور ظلم کا زہر بھر دیا۔

ممتاز خان کا قد و قامت اپنے باپ چودھری الف خان پر گیا تھا۔ مناسب قد، جسم گٹھا ہوا، آنکھوں میں ہلکورے لیتی ازلی رعونت اور چہرے پر احساسِ برتری کا غرور اور گھمنڈ، کسی کو خاطر میں نہ لانے کا اہانت آمیز رویہ جبکہ زہرہ بانو سرو قد اور اپنی ماں کی طرح حسین تھی۔ بڑی بڑی کشادہ آنکھیں اور لمبے گھنے ریشمی بال، زمانے کا چلن اور چالبازیوں کو جانچنے والا بارعب لہجہ، اندازِ تخاطب ایسا کہ مدِمقابل خود ہی رعب میں آنے لگتا۔

اپنے جوان بیٹے ممتاز خان کی مہرالنسا نے جس انداز میں تربیت کی تھی اس نے اسے ایک اوباش فطرت، بدقماش اور سرکش بنا دیا تھا۔ وہ آوارہ دوستوں اور آوارہ سرگرمیوں میں پڑ چکا تھا۔ اپنے گرد ہر وقت بدمعاش حواریوں کا ٹولا بنائے رکھتا تھا۔ اس کے دونوں ماموں بھی اس کے ہمراہ پیش پیش رہتے تھے۔

ادھر ستارہ بیگم نے اپنے اچھے اخلاق اور حسنِ سلوک کی وجہ سے حویلی کے ہی نہیں بلکہ جاگیر کے ملازموں کو بھی اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا جبکہ مہرالنسا اسے اس کی مکاری پر محمول کرتی تھی۔

ستارہ بیگم کے خیر خواہوں میں حویلی کا ایک اہم کرتا دھرتا منشی فضل محمد تو ستارہ بیگم اور اس کی بیٹی زہرہ بانو کا گویا معتمدِ خاص بن چکا تھا۔ منشی فضل محمد بھی عمر رسیدہ ہونے لگا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا کبیل خان، لمبا تڑنگا اور جوان، رنگت سانولی تھی۔ وہ بھی حویلی کے ملازموں میں شامل تھا۔

ادھر ممتاز خان کو جب اپنی ماں مہرالنسا کے ذریعے یہ پتا چلا کہ حویلی اور دیگر جاگیردارانہ معاملات ستارہ بیگم کے سپرد ہیں تو وہ غصے سے پھنک کر رہ گیا۔

اس وقت وہ غصے کے ساتھ اپنی بیٹھک لگائے بیٹھا تھا اور ایک حواری کے ذریعے اس نے منشی فضل محمد کو بلوایا۔ منشی اس وقت اپنے دو کمروں کے ناپختہ گھر میں موجود تھا۔ اتفاق سے اس کا بیٹا کبیل خان بھی تھا۔ اس نے جسم پر صرف ایک چوڑے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی اور گھر کے لمبے چوڑے صحن کے ایک کونے میں نصب چارا کترنے والی مشین جسے کٹر مشین کہا جاتا ہے بھینسوں کا چارا بنانے میں مصروف تھا۔ کبیل کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں باپ بیٹا ہی اس مکان میں رہتے تھے۔ کبیل تندہی اور جفاکشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھا کہ اس وقت ممتاز خان کا حواری وہاں آن دھمکا۔

''منشی! چھوٹے چودھری تمہیں بلا رہے ہیں اسی وقت۔''

منشی فضل اس وقت صحن میں بچھی چارپائی پر چائے کی پیالی تھامے بیٹھا تھا۔ چھوٹے چودھری یعنی ممتاز خان کے بلاوے پر وہ چونک سا گیا۔ ایک لمحے کو اس کے بوڑھے چہرے پر الجھن سی تیر گئی۔ ادھر چارا کترتے ہوئے کبیل نے حواری کی طرف ایک نظر دیکھا اور دوسری نظر اس نے اپنے باپ کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔

''جی بہت بہتر، ابھی آتا ہوں۔'' منشی فضل محمد نے حواری سے اتنا ہی کہا تھا کہ حواری کھنڈے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ابھی میرے ساتھ چلو بڈھے۔ جانتے نہیں چھوٹے چودھری جی کا غصہ۔'' یکایک چارا کترنے کی مشین کا پہیا رک گیا۔ ناپختہ صحن کی سوندھی سوندھی فضا میں مشین چلنے کی مخصوص کھچا کھچ یکدم تھم گئی۔ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ حواری کے ایسے تضحیک آمیز رویے نے اس کے اندر کڑواہٹ گھول دی، ادھر منشی نے گھبرائے ہوئے انداز میں چور سی نظروں سے اپنے جوان کڑیل بیٹے کبیل کی طرف دیکھا پھر چائے کی آدھ بھری پیالی چارپائی پر چھوڑ کر فوراً اٹھتے ہوئے بولا۔

''چلو جی چلو، ابھی چلنے میں کون سی بات ہے۔''

''نہیں بابا، بیٹھ جاؤ تم۔'' دفعتاً کبیل کی بھاری آواز گونجی پھر وہ اس اکھڑ مزاج حواری کو گھورتا ہوا چارپائی کے قریب آیا اور باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''اپنی چائے آرام سے پیو بابا۔'' اس کے بعد حواری کے سرخ

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر درشتی سے بولا۔

"اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے اس طرح مخاطب ہوتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ خبردار! آئندہ اپنی زبان کو لگام دے کر رکھنا۔ میرے بابا حویلی کے پرانے خادم ہیں، چھوٹے چودھری کیا بڑے چودھری صاحب بھی ان کی عزت کرتے ہیں، سمجھا تو؟" حواری کے دائیں بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا یوں بھی ممتاز خان کے سارے قریبی حواری اس کی ہدایت کے مطابق مسلح ہی رہتے تھے۔ کبیل کی بات پر اس کے چہرے پر غصے کی سرخی ابھر آئی اور وہ پرطیش لہجے میں بولا۔

"تم اپنی زبان کو لگام دو، حویلی کے نوکروں کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ سر چڑھ جاؤ۔"

"ہم نوکر ضرور ہیں مگر غلام نہیں۔" کبیل نے ترکی بہ ترکی اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے جواب دیا۔ "معاملہ عزت کے ساتھ چلتا رہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس نوکری پر ہم..."

"او بس کر پترے بس کر، چپ ہو جا۔" دفعتاً فضل محمد اپنے بیٹے کی بات کاٹ کر بولا۔ اپنے جواں سال کڑیل اور غیرت مند بیٹے کو جوش میں آتے دیکھ کر بوڑھا منشی خوف زدہ سا ہو گیا تھا مگر ادھر حواری بھی جیسے کبیل کی ادھوری بات کا مطلب جان گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ہولسٹر پر ہاتھ رکھ کر شعلہ بار نظروں سے لمبے چوڑے کبیل کی طرف گھورتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"میں کہتا ہوں اپنی زبان کو لگام دے کاکے ورنہ چودھری جی اور حویلی والوں کے خلاف بولنے پر تجھے پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔"

کبیل کا دماغ الٹنے لگا اس نے بڑی سنسناتی نظروں سے اسے گھورا پھر ایک استہزائیہ نظر اس کے ہولسٹر والے ہاتھ پر اور پھر چہرے پر ڈالتے ہوئے بولا۔ "ایسے بانٹے ہوئے خیراتی کھلونوں سے ڈرانا مردوں کا شیوہ نہیں۔ خاموشی سے نکل جاؤ یہاں سے ورنہ... مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" کبیل کی آواز میں نہ جانے کیسی گھن گرج تھی کہ وہ بڑی معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا پلٹ گیا۔

بے چارہ منشی فضل محمد پریشان ہو گیا اور بیٹے سے بولا۔ "اوئے پتر! تو نے کیا کر دیا؟ ناراض کر دیا اسے، تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اب مجھے سب سے پہلے چھوٹے چودھری جی سے معافی مانگنا پڑے گی۔"

میری گرل فرینڈ کے ساتھ تم ساری رقم بھی لے جا رہے ہو... وہ تو دے دو

"کس بات کی معافی بابا؟" کبیل باپ کے چہرے کی طرف دیکھ کر حیرت سے بولا۔ "ہم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے، قصور تو اس زرخرید کتے کا تھا جو اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے بے ادبی سے بات کر رہا تھا۔"

"چنگا چنگا... اب چپ کر تو۔" فضل محمد بولا۔ "تو بیٹھ کر اپنا کام کر، میں ابھی آتا ہوں۔" وہ چارپائی کے قریب پڑی جوتیوں کو پہنتے ہوئے بولا تو کبیل نے کہا۔

"بابا! میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔" بیٹے کی بات پر منشی فضل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ اپنے کڑیل جوان بیٹے کی طبیعت سے واقف تھا۔ جانتا تھا یہ اگر اس کے ساتھ چلا تو چھوٹے چودھری کے ساتھ بھی اس کی منہ ماری ہو جائے گی، لہٰذا وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بے بسی سے بولا۔

"اوئے پترا! میرے بڑھاپے کا خیال کر لے۔ تو میرا اک ہی سہارا ہے۔ اپنی جوانی پر رحم کر۔ اب حویلی کا ماحول پہلے جیسا نہیں رہا۔ میں خود معاملہ فہمی سے کام چلا رہا ہوں تو خود کو ان سے علیحدہ رکھ۔" باپ کو ہاتھ جوڑے دیکھ کر کبیل کا دل پسیج گیا اور اسے خفت محسوس ہونے لگی، اپنے باپ کے دونوں ہاتھوں کو چوم کر احترام سے بولا۔

"بابا! تجھے کتنی بار کہا ہے اس طرح ہاتھ نہ جوڑا کر، اگر تو سمجھ رہا کہ کہ حویلی کا ماحول اب بدل گیا ہے تو چودھریوں کی نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ میں جوان ہوں روٹی کما سکتا ہوں، تو اب آرام سے بیٹھ اور مجھے بھی اپنی

Copied From W

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

خدمت کا موقع دے۔''

''چنگا، چنگا... چھوڑ دوں گا نوکری، چھوڑ دوں گا۔ اب مجھے جانے دے۔ تو بیٹھ آرام سے۔'' بیٹے کو ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر باپ نے اسے دلاسا دیا اور رجسٹر سنبھالے باہر نکل گیا۔ کبیل سوچتی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

منشی فضل محمد ڈرا سہا حویلی کی بیٹھک پہنچا تو چھوٹے چودھری ممتاز خان کو پُرطیش نظروں سے اپنا منتظر پایا۔ اس کے قریب ہی دیگر چند مسلح حواریوں کے ساتھ وہ حواری بھی موجود اسے بڑی زہریلی نظروں سے گھور رہا تھا جو اسے بلانے آیا تھا اور جس کے ساتھ اس کے بیٹے کبیل کی منہ ماری ہوئی تھی۔

بہرحال منشی فضل محمد نے ڈرتے ڈرتے چودھری ممتاز خان کو سلام کیا تو اس کے کانوں سے شعلہ بار اور گرجتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ ''او بڈھے! تو اکیلا کیوں آیا ہے؟ کدھر ہے وہ تیرا پھنے خان بیٹا؟ بڑی اکڑ ہے اس کے دماغ میں؟''

منشی فوراً رجسٹر بغل میں دبا کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''چودھری صاحب! اس کی طرف سے میں معافی مانگ لیتا ہوں، جوان منڈا ہے میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔''

''اوئے، یہ بھی سمجھا دینا اسے کہ اپنی اوقات میں رہ کر آئندہ میرے بندوں سے گل بات کرے۔'' ممتاز خان نے بوڑھے فضل محمد کو خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے درشتی سے کہا تو منشی فوراً کپکپاتے لہجے میں بولا۔

''سمجھا دوں گا جی، بہت اچھی طرح سے سمجھا دوں گا۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اس نے جیسے موضوع بدلنا چاہا تو ممتاز خان جو ایک مونڈھے پر بڑی شان سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے براجمان تھا، تحکمانہ درشتی سے بولا۔

''آج سے جاگیر سے متعلق سارے معاملات میرے سامنے رکھے گا اور حساب کتاب بھی... سمجھا تو؟''

اس بات کا منشی فضل کو پہلے ہی خدشہ تھا اور اس کا جواب بھی وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ وہ مؤدبانہ بولا۔ ''ٹھیک ہے چودھری جی بھلا مجھ کمی کمین کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لل... لیکن وڈے چودھری جی کا حکم ہے کہ...''

''منشی...'' ممتاز خان دہاڑا۔ ''اب اس چھت کے نیچے میرا حکم چلے گا، سن لیا تو نے یا نہیں؟''

بے چارہ فضل محمد دہل کر رہ گیا، بولا۔ ''بالکل جی، بالکل... سن لیا۔''

''اب دفع ہو جا یہاں سے، آئندہ میں تجھے ستارہ بیگم اور زہرہ بانو کے سامنے سر جھکائے کھڑا نہیں دیکھوں۔'' ممتاز خان نے دوسرا حکم صادر کر دیا۔ منشی نے دوبارہ فدویانہ انداز میں اپنا سر ہلا دیا اور جیسے ہی پلٹنے لگا تو بری طرح ٹھٹک کر رک گیا۔

بیٹھک کے دروازے پر ایک خوبرو اور زہرہ جمال صورت دوشیزہ کھڑی تھی۔ یہ ستارہ بیگم کی بیٹی زہرہ بانو تھی۔ وہ اندر آ کر ممتاز خان سے مخاطب ہو کے بولی۔ ''یہ حکم تو بابا جانی کا ہے بھائی جان، بھلا اس بے چارے بوڑھے کو آپ کیوں ڈانٹ رہے ہو؟''

زہرہ بانو نے ہلکا پھلکا دیدہ زیب لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے ریشمی گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ کشادہ آنکھوں کی کمانیں کھنچی ہوئی تھیں اور ان میں تیز طراری دوڑ رہی تھی۔ ممتاز خان نے اپنی سوتیلی بہن کی طرف انتہائی ناگوار نظروں سے گھورا اور پھر نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''اے لڑکی! ہمیں بھائی جان کہہ کر اپنا رشتہ ہم سے جوڑنے کی کوشش مت کر... جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

زہرہ بانو نے شہر میں بھی تعلیم حاصل کی تھی اور تعلیم کے دوران کافی عرصے اپنی نیو ملتان والی کوٹھی ''بیگم ولا'' میں بھی مقیم رہی تھی۔ لہٰذا اس مناسبت سے اس کے اندر شہر اور دیہات کا عجیب امتزاج پایا جاتا تھا۔ اس نے گہری نیلے رنگ کی ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی اور سرخ قمیص، گلے میں اسکارف تھا۔ ممتاز خان کی درشتی کے جواب میں اس نے استہزائیہ مسکراہٹ سے اس کی جلتی سلگتی آنکھوں میں بے خوفی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو میرا بھائی جان کہنا اچھا نہیں لگتا تو پھر میں آپ کو ممتاز خان کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔ رہی بات رشتہ جوڑنے کی تو وہ کسی اور نے نہیں بابا جانی نے ہی جوڑا ہے اور مجھے اس پر ہمیشہ فخر رہے گا۔''

''گیٹ آؤٹ۔'' ممتاز خان آپے سے باہر ہونے لگا۔ حتیٰ کہ غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر زہرہ بانو کے دلکش ہونٹوں کی استہزائیہ مسکراہٹ میں چنداں فرق نہ آیا۔ اسی لہجے میں بولی۔ ''ممتاز خان! اپنے غصے اور دماغ کی گرمی کو قابو میں رکھو۔''

پھر وہ ایک طرف ڈرے سہمے کھڑے منشی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''منشی چاچا! آپ نے وہی کرنا ہے جو بابا جانی (چودھری الف خان) نے آپ کو حکم دے رکھا ہے۔''

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وہ بے چارہ کیا جواب دیتا۔ مگر ممتاز خان گویا جتّے سے ہی اکھڑ گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی سخت بات کہتا دروازے پر کسی کے بھاری انداز میں کھنکھارنے کی آواز ابھری اور یکلخت جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ بیٹھک میں چودھری الف، خان داخل ہو رہا تھا۔ زہرہ بانو نے فوراً باادب ہو کر سلام کیا اور اپنے سر پر اسکارف درست کرلیا۔

''کیا بات ہے دھیئے؟ یہ کیسا شور ہو رہا تھا یہاں؟''

چودھری الف خان زہرہ بانو کو بھی اپنی بیٹی ہی سمجھتا تھا، اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ممتاز خان تو جیسے پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اس نے زہرہ بانو کے خلاف باپ کے سامنے شکوے شکایت کی بھرمار کر ڈالی۔ پھر جب زہرہ بانو سے پوچھا گیا تو اس نے باپ کو وہی بتایا جو سچ تھا۔

''منشی فضل محمد کو میں نے ہی حکم دے رکھا ہے، پُتّر ممتاز! تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟'' چودھری الف خان نے اپنے جوان بیٹے ممتاز خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ بولا۔ ''بابا جانی! اس لڑکی اور اس کی ماں کا بھلا ان معاملات سے، کیا تعلق ہے؟ میں آپ کا خون ہوں سگا رشتہ ہے میرا آپ سے، کیا میں آپ کا کچھ نہیں لگتا؟''

بیٹے کی بات پر جہاندیدہ الف خان کو اگرچہ پہلے ہی ماضی کے بعض حوالوں سے کچھ تلخ حقائق اور باتوں کا ادراک تھا تاہم یہ بھی جانتا تھا کہ اب اس کا بیٹا بھی جوان ہو چکا ہے لہٰذا جوان بیٹے کے سامنے وہ کسی قسم کی گرما گرمی کرنے کے بجائے بردباری سے بولا۔

''ممتاز پُتّر! رشتے بنتے نہیں، بنائے جاتے ہیں۔ چاہے وہ خون کے ہوں یا محبت کے مگر اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ ان دونوں میں سے کون سا رشتہ وفا کرے گا لیکن وقت ثابت ضرور کر دیتا ہے۔ اس سے پہلے جاگیر اور حویلی سے متعلق ساری معاملہ داری، تمہاری ماں مہرالنسا کے ہی سپرد تھی، مگر اس نے ہمارے اعتماد کو بُری طرح سے ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس کے بعد سے ہمیں یہ سارا معاملہ مجبوراً ستارہ بیگم کے سپرد کرنا پڑا جو آج تک یہ ذمّے داری .... بخوبی انجام دیتی آئی ہے۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو آج سے یہ ذمّے داری میں تمہیں سونپتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ قریب احتراماً سر جھکائے کھڑی زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے بولا۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں بیٹی؟'' زہرہ بانو نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بالکل نہیں بابا جانی، اگر یہ ذمّے داری ممتاز بھائی جان سنبھالتے ہیں تو خوشی کی بات ہوگی اور میں سمجھتی ہوں امی جان (ستارہ بیگم) کو بھی یقیناً اس بات کی خوشی ہوگی، انہیں ویسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آپ کی شفقت اور پیار ہی ہم دونوں ماں بیٹی کے لیے کافی ہے۔''

''ہم جانتے ہیں۔'' چودھری الف خان نے مسکرا کر کہا۔ پھر اپنے بیٹے کے قریب آ کر اس کے شانے کو تھپتھپا کر سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''اوئے پتّر! تو تو میرا شیر جیسا بیٹا ہے اور شیر کو ان چھوٹے موٹے معاملات سے دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ تو شیر دا پتّر ہے... شیر بن... آگے تجھے ہی تو یہ سب کچھ سنبھالنا ہے۔ چل اب اپنی بہن کے سر پر ہاتھ پھیر... شاباش۔'' ممتاز خان کے لیے یہ بات قطعاً ناقابلِ قبول تھی کہ وہ زہرہ بانو کے سر پر دست برادری رکھتا۔ لہٰذا اسے خاموش پا کر زہرہ بانو نے خود ہی مسکرا کر الف خان کو سلام کیا اور واپس جانے کی اجازت لی۔

جس وقت زہرہ بانو بیٹھک سے نکل رہی تھی منشی فضل محمد بھی باہر نکل رہا تھا۔ وہ زہرہ بانو اور اس کی ماں ستارہ بیگم کے حسن اخلاق و سلوک سے پہلے ہی بہت متاثر تھا۔ اس کے قریب آ کر بولا۔ ''زہرہ بیٹی! تمہارا شکریہ تم اگر بروقت نہ آتیں تو یہ نکا چودھری جانے میرے ساتھ اور کتنا بُرا کرتا۔'' زہرا مسکرا کر بولی۔

''چاچا! عزت اور ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر افسوس زمینی ناخدا اس کا ٹھیکا اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور منہ کی کھاتے ہیں۔''

''ویسے زہرہ بیٹی! مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ اب حساب کتاب کے معاملات چھوٹی بیگم (ستارہ بیگم) کے بجائے نکا چودھری دیکھا کرے گا اور وڈے چودھری نے بھی اس کی اجازت دے ڈالی۔''

زہرہ بانو نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے منشی چاچا، مجھے فخر ہے کہ اتنے عرصے امی جان نے یہ حساس نوعیت کا کام سنبھالے رکھا تھا اور بابا جانی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اچھا ہی ہوا کہ امی جان بھی سو کھی (بری الذمہ) ہو گئیں۔''

اس وقت منشی فضل محمد چونکا۔ اس کا بیٹا کبیل وہاں آن پہنچا تھا۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ کبیل اور زہرہ بانو کا آج پہلی بار آمنا سامنا ہوا تھا اگرچہ غائبانہ تعارف تھا۔

''یہ میرا بیٹا ہے جی کبیل۔'' منشی نے زہرہ بانو سے کہا۔ پھر بیٹے سے بولا۔ ''یہ زہرہ بانو ہے چھوٹی بیگم صاحب

Copied From W

کی بیٹی، سلام کر... چھیتی نال۔"

کبیل جو ایک ثانیے کے لیے یہ تک بھول گیا تھا کہ وہ یہاں آیا کیوں اور کس فکر میں تھا۔ باپ کی بات پر وہ چونکا۔ درحقیقت، باپ کے گھر سے روانہ ہونے کے بعد کبیل بے چین تھا۔ ممتاز خان کے بدمزاج حواری سے تلخ کلامی کے بعد اسے خدشہ تھا کہ کہیں بیٹھک میں اس کے بوڑھے باپ کے ساتھ کسی قسم کی کوئی بدسلوکی نہ کی جائے۔ لہٰذا اس فکر سے تھوڑی دیر بعد وہ بھی چلا آیا تھا مگر یہاں پہنچ کر وہ جیسے اپنی سدھ بدھ بھی کھو گیا تھا۔ اس کی وجہ زہرہ بانو تھی۔ اس کے پُرشوخ حسن نے اسے متاثر کیا تھا اور وہ اسے دیکھتے ہی مبہوت سا ہو کر رہ گیا تھا مگر باپ کے کہنے پر... اور زہرہ بانو کا تعارف ہوتے ہی وہ فوراً ایک روایتی قسم کے احترام کے دباؤ میں آگیا اور سر جھکا کے زہرہ بانو کو سلام کیا۔ زہرہ بانو نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی... اور حویلی کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

بعد میں منشی فضل محمد نے بیٹے کو بتایا کہ زہرہ بانو کی وجہ سے بات سنبھل گئی تو وہ اس کی تعریف کرنے لگا۔

"بابا! یہ لڑکی تو ہے ہی تعریف کے لائق۔" کبیل نے دل میں کہا تھا مگر اپنی حیثیت بھی جانتا تھا اس لیے چپ ہو رہا۔

حویلی آکر زہرہ بانو نے اپنی ماں کو ساری بات بتا دی۔ وہ بھی مطمئن تھی کہ ایک اہم ذمے داری کو وہ ایک طویل عرصے تک ایمان داری سے نبھاتی آرہی تھی اور کسی کو شکایت کا موقع نہ ملا۔ آج بہ احسن خوبی وہ اس ذمے داری سے عہدہ برآ ہوچکی تھی۔

"لیکن امی جان! ہمیں اپنے حصے کی زمینوں کی دیکھ بھال اور حساب کاری خود کرنا ہوگی اور یہ کام اب آپ نہیں میں کروں گی۔" زہرہ بانو نے سنجیدگی سے کہا تو ستارہ بیگم کے چہرے پر تفکر آمیزی کے تاثرات نمودار ہوگئے۔ وہ سادہ سے میک اپ اور ہلکے میرون کلر کے نفیس لباس میں ...... ایک باوقار خاتون نظر آرہی تھی۔ بیٹی کی بات پر وہ بولی۔

"زہرہ بیٹی! بے شک جو ہمارے حق میں لکھ دیا گیا وہ ہمارا ہوگا مجھے کبھی بھی دھن دولت کا لالچ نہیں رہا لیکن یہ سب کچھ مجھے تمہاری خاطر اور تمہارے بہتر مستقبل کے لیے مجبوراً کرنا پڑا تھا، اس کی وجہ تم بھی جانتی ہو۔ مگر بیٹی اس وقت حالات اور تھے، چودھری الف خان سے شادی کے بعد میں فطری طور پر اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے کچھ تحفظات کا شکار تھی، اس لیے میں نے چودھری جی سے اپنی یہ شرط منوائی تھی مگر پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنے تحفظات، طمانیت کا احساس ہونے لگتا ہے لیکن بیٹی! آج تمہیں جوانی کی دہلیز پر اور خود کو ایک جوان بیٹی کی ماں کے روپ میں دیکھ کر مجھے شدت سے یہ احساس فکرمند کرنے لگا ہے کہ میں شاید اب بھی وہیں کھڑی ہوں۔ ایک کمزور عورت کی صورت... جہاں سے چلی تھی۔" یہ کہہ کر ستارہ بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ماں کو رنجیدۂ خاطر دیکھ کر، زہرہ بانو تڑپ اٹھی۔ فوراً ماں کے سینے سے جا لگی اور بڑے رسان مگر مضبوط لہجے میں بولی۔ "امی جان! آپ خود کو کیوں کمزور سمجھتی ہیں؟ آپ کمزور نہیں ہیں۔ عورت ہیں تو کیا ہوا؟ تاریخ بہادر عورتوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ارادوں کی مضبوطی اور حوصلوں کی بلندی یہ سب میں نے آپ ہی سے تو سیکھا ہے۔" ستارہ بیگم نے اپنے سرسراتے آنچل کے پلو سے اپنی گہری آنکھوں میں اتری نمی پونچھتے ہوئے پیار سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ہولے سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔ "ہاں بیٹی، ہم کمزور نہیں ہیں۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو میں جیسے دوبارہ جینے لگتی ہوں۔ لیکن بیٹی ہمارا یہاں حویلی میں دم خم چودھری جی (الف خان) کی وجہ سے ہے۔ زندگی موت کا کیا بھروسا، میں تو ہر وقت چودھری صاحب کی درازیِ عمر کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ بیٹی! تم ممتاز خان کے منہ نہ ہی لگو تو اچھا ہے، تم تو جانتی ہو نا... ان ماں بیٹوں کی آنکھ میں ہم کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔"

"میں سب جانتی ہوں امی جان۔" زہرہ بانو مضبوط لہجے میں بولی۔ "مگر مجھے اور بھی بہت سی باتوں کا بخوبی احساس ہے لیکن آپ کی جو بابا جانی سے کمٹمنٹ ہوئی تھی، اس کے مطابق ہمیں جو ملا... وہ ہمارا حق ہے۔ ہم اس حق سے دستبردار نہیں ہوسکتے۔ آپ مجھے پر بھروسا رکھیں اور میرے لیے دعا کیا کریں، بس۔"

"بیٹی! میں تیرے لیے تو ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں۔" ستارہ بیگم نے کہا اور زہرہ بانو محبت سے مسکرا دی۔

اس دن سے اپنے حصے کی جاگیر کے معاملات زہرہ بانو نے خود دیکھنا اور سنبھالنا شروع کردیے۔ ادھر ممتاز خان کو بھی باپ کی طرف سے گویا شہ ملتے ہی پَر لگ گئے۔ اس نے سب سے پہلے حویلی کے برسوں پرانے خادم یعنی منشی فضل محمد کو نوکری سے بے دخل کردیا اور اس کی جگہ کسی

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوسرے آدمی کو رکھ لیا۔ یہ بھی پختہ العمر آدمی تھا مگر فضل محمد کی طرح قابل اور ایمان دار نہیں تھا۔ یہ کمیشن خور تھا۔

زہرہ بانو کو جب منشی فضل محمد کی معزولی کا پتا چلا تو اسے بڑا دکھ ہوا مگر پھر کچھ سوچ کر خوش بھی ہوئی، اس نے فوراً حویلی سے ایک خادم کو فضل محمد کے گھر بھیج کر اسے بلوا لیا اور اسے اپنے حصے کی جاگیر کا منشی رکھنا چاہا تو فضل محمد تذبذب کا شکار ہو گیا۔

حقیقت۔ یہ تھی کہ منشی ایک کام آدمی تھا۔ اسے شروع سے ہی محنت اور کام کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی ۔ ایسا آدمی چاہتا ہے، کہ وہ کچھ نہ کچھ کرتا رہے خود کو مصروف رکھنے کی خاطر... لیکن اسے تذبذب درحقیقت ممتاز خان کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ مگر ستارہ بیگم کے اس پر احسانات بھی بہت تھے۔ لہٰذا وہ اس کی بیٹی کی بات کیسے رد کر سکتا تھا۔

"چاچا! مجھے آپ جیسے ایمان دار اور تجربہ کار آدمی کی ضرورت ہے اور آپ سے زیادہ اچھا انسان کون ہوگا۔ پھر میں تو آپ کو چاچا بھی کہتی ہوں۔" زہرہ بانو نے آخر میں بڑی محبت سے، کہا تو منشی فضل محمد بھی مسکرا کر اور اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر رکھتے ہوئے بولا۔

"تو بھی تو میری بیٹیوں جیسی ہے۔ میں اپنی ذمّے داری پوری طرح نبھانے کی کوشش کروں گا۔"

ادھر ممتاز خان کے ہاتھ یہ ذمّے داری کیا لگی گویا ایک مشغلہ ہاتھ آگیا۔ مہرالنسا خوش تھی، اس نے بیٹے سے کہا۔

"سُن ممتاز! جو ڈیرے کی طرف والی زمینیں اور سالونٹ پلانٹ ہے نا وہ ان دونوں (ستارہ بیگم اور زہرہ بانو) کے نام ہیں۔ اس پر بھی اپنا سب..... سے پہلے قبضہ جمائیں، اور ایک بات اور سن یہ سب اپنے کھاتے میں چڑھانے کی بلد سے جلد کوشش کرنا، تیرے دونوں ماسے، رئیس اور وراثت اس معاملے میں تیری مدد کریں گے۔ مختار کار آفس میں ان کی بڑی جان پہچان ہے، سمجھ گیا۔"

"ماں جی! اس کی فکر ہی نہ کر۔ یہ کام تو میں پہلی فرصت میں کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان دونوں ماں بیٹیوں کا ہماری جائداد، بلکہ ہماری حویلی کی ایک اینٹ پر بھی حق نہیں بنتا ہے۔ میں تو بابا جان کی وجہ سے اب تک خود کو روکے ہوئے ہوں ورنہ تو کب کا دونوں کو حویلی سے ہی نکال باہر کرتا۔"

"شاباش پُتر۔" مہرالنسا بیٹے کے عزائم جان کر خوش ہو کے بولی۔ "شہر والی کوٹھی بھی ان دونوں ماں بیٹی کے قبضے میں ہے۔ ان دونوں نے تو اس کا نام بھی بیگم ولا رکھ چھوڑا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اس کا نام بھی بدل ڈالو۔"

ماں کی بات پر ممتاز خان ..... کینہ پرور لہجے میں بولا۔ "اس کا بندوبست بھی میں نے پہلے سے ہی سوچ رکھا ہے ماں جی، میرے آدمی آہستہ آہستہ وہاں اپنا ڈیرا جما رہے ہیں۔ کل تک یہ کام بھی ہو جائے گا۔ میں خود دونوں کے لیے اس کوٹھی (بیگم ولا) میں جا کر بسر کروں گا۔"

"شادا شے پتر! یہ دونوں کام اب جلدی کر لے۔" مہرالنسا نے مکاری سے کہا اور ممتاز خان نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

زہرہ بانو کو رفتہ رفتہ اور بھی بہت سی باتوں کا احساس ہو چلا تھا۔ ممتاز خان کو اب کھل کر ان ماں بیٹیوں کے خلاف جنگ کرنے کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ اس کے اوباش حواری اس میں پیش پیش تھے۔ ان میں وسیم المعروف "چھیما" قابلِ ذکر تھا۔ وہ ایک پچیس تیس سالہ گرانڈیل آدمی تھا اور صورت سے ہی چھٹا ہوا بدمعاش نظر آتا تھا۔

وقت کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے زہرہ بانو بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہونے لگی تھی، اب تک اس کے گرد حویلی کے چند ہی معمولی قسم کے ملازم ساتھ رہتے تھے مگر اب وہ بھی بے چارے ممتاز خان کے ڈر کی وجہ سے زہرہ بانو سے کترانے لگے تھے۔

زہرہ بانو نے اپنے استعمال کے لیے ایک سفید رنگ کی سوزوکی پوٹھوہاری جیپ رکھی ہوئی تھی، اسے سالونٹ پلانٹ کے منیجر شیراز چیمہ کا ایک خفیہ پیغام موصول ہوا جس میں اس نے فقط اتنا ہی کہا تھا کہ وہ کسی دباؤ کی وجہ سے خود تو نہیں آسکتا مگر یہ زحمت اسے کرنا پڑے گی۔ زہرہ بانو کو دال میں کچھ کالا محسوس ہونے لگا۔ اس نے فوراً روانگی کا پروگرام بنایا۔ منشی فضل محمد کو ساتھ لے کر وہ روانہ ہو گئی۔ سالونٹ پلانٹ پہنچی تو ششدر رہ گئی۔ کئی سو ایکڑ پر محیط اس سالونٹ پلانٹ کی زمین پر جدید خطوط پر سسٹم سازی کر رکھی تھی۔ اس پلانٹ سے کئی اور بھوسے سے ایک خاص قسم کا تیل نکالا جاتا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے جب یہ پلانٹ چودھری الف خان نے چند زمینوں کے ٹکڑوں اور ملتان والی کوٹھی (بیگم ولا) کو اپنی دوسری محبوب بیوی ستارہ بیگم کی شرط پر ان کی بیٹی زہرہ بانو کے نام کیا تھا تو اس وقت یہ پلانٹ بعض تکنیکی وجوہ کی بنا پر بند پڑا تھا اور کافی عرصے تک بند رہا تھا لیکن ستارہ بیگم کی خصوصی توجہ اور ذمّے دار تجربہ کار آدمیوں کی بھرتی کی وجہ سے سالونٹ پلانٹ جلد منافع بخش انداز میں

Copied From Web

چل پڑا تھا۔ زہرہ بانو نے جیسے ہی رفتہ رفتہ شعور پکڑا تو ستارہ بیگم نے یہ سب۔ اسے بھی سکھا اور سمجھا دیا تھا کیونکہ آنے والے وقتوں میں زہرہ نے ہی یہ سب سنبھالنا تھا۔

زہرہ بانو جب اپنے منشی فضل محمد کے ساتھ وہاں پہنچی تو اس کے چونکنے کی وجہ وہ مسلح کارندے تھے جو پلانٹ کے وسیع وعریض احاطے کے گیٹ پر متعین تھے اور وہ سب اس کے سوتیلے بھائی ممتاز خان کے آدمی تھے۔ یہی نہیں اس کی جیپ کو بھی اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ زہرہ بانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ جیپ سے اُتری اور بارعب درشتی سے ایک کارندے سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''گیٹ کیوں نہیں کھولا جا رہا ہے؟''

''آپ کا داخلہ ممنوع کر دیا ہے چھوٹے چودھری نے۔'' کارندے نے اکھڑپن سے کہا۔

''وہ کون ہوتا ہے مجھے میری پراپرٹی میں داخل ہونے سے روکنے والا... اس پلانٹ کی مالک میں ہوں اور تم یہاں میری اجازت کے بغیر ہتھیاروں کے ساتھ کیوں موجود ہو؟ جانتے نہیں ہو میں کون ہوں؟''

وہی بدتمیز کارندہ جو وسیم عرف چھیما تھا اپنی بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر استہزائیہ مسکراہٹ سے بولا۔

''بہت اچھی طرح جانتے ہیں جی ہم آپ کو... آپ وڈے چودھری کی دوسری زنانی ستارہ بیگم کی بیٹی ہو۔'' اس نے دانستہ ایسا کہا تھا۔ اس کی زبان سے اپنی ماں کا اس طرح نام سن کر زہرہ بانو آپے سے باہر ہو گئی۔ غصے سے سرخ ہو کے بولی۔

''میری ماں کا تمیز سے نام لو سمجھے، قانونی طور پر اس پلانٹ پر میری ملکیت ہے۔ زیادہ بدمعاشی دکھاؤ گے تو میں ابھی پولیس کو بُلاؤں گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اپنے کتوں سمیت۔'' زہرہ بانو کی جوابی کارروائی نے چھیما کی ٹھیک ٹھاک ٹکور کر دی تھی مگر وہ بھی ڈھیٹ ہنسی کے ساتھ بولا۔

''او بی بی، ذرا ہولا لہجہ رکھو، مجھے اس کا جواب دینا بھی آتا ہے۔ ممتاز صاحب کو ہم صرف وڈے چودھری کا بیٹا سمجھتے ہیں اور ان کے حکم سے ہم یہاں موجود ہیں۔ تم نے جو کھیل کھیلنا ہے جا کر کھیلو۔''

اس اثنا میں منشی فضل محمد نے زہرہ بانو کے کان میں کچھ کہا تو وہ چھیما کی طرف شعلہ بار نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتی ہوں تم سب کو۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی اور جب منشی بھی پلٹنے لگا تو دفعتاً چھیما نے اپنے بھاری ہاتھ سے اس کا کاندھا دبوچ لیا۔ فضل محمد چونک کر رکا اور اس کی جانب پلٹا تو چھیما زہرآلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے تہدیدی لہجے میں بولا۔

''اوئے بڈھے! تجھے ممتاز صاحب نے حویلی سے بے دخل کر دیا تھا اب کیا اس عمر میں اس زنانی کی غلامی کرے گا تو؟'' چھیما کی بات پر منشی فضل محمد کے بوڑھے چہرے پر کچھ تفکر آمیزی کے آثار ابھرے تھے، زہرہ بانو کا دماغ بھی ایک بار پھر گرم ہونے لگا۔ تاہم منشی فضل محمد نے آہستگی سے چھیما کا ہاتھ اپنے کاندھے سے جھٹک دیا اور قریب کھڑی زہرہ بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر فقط اتنا بولا۔

''زہرہ بانو میرے لیے بیٹیوں جیسی ہے۔''

اس کے بعد اس نے زہرہ بانو کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں جیپ میں سوار ہونے لگے۔ اس دوران انہیں چھیما کی خونخوار آواز سنائی دی۔ ''اوئے بڈھے! اپنے بڑھاپے پر رحم نہیں کھاتا تو اپنے بیٹے کی جوانی پر ہی ترس کھا لے، ہماری دشمنی تجھے مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

اس کی دھمکی پر ایک لمحے کو بے چارہ منشی دہل کر رہ گیا تھا۔ تاہم زہرہ بانو کے حوصلہ دینے پر وہ خاموش ہو رہا۔ زہرہ بانو نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ منشی کو جب زہرہ بانو کے عزائم کا پتا چلا کہ وہ واقعی اس وقت متعلقہ تھانے جانے کا قصد کیے ہوئے ہے تو اس نے سمجھایا۔

''زہرہ بیٹی! ابھی تھانے کا رخ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ آپ کو پہلے اپنی امی جان سے اس کا ذکر کر لینا چاہیے۔''

''نہیں چاچا۔'' زہرہ بانو نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''میرا اس وقت تھانے جانا ضروری ہے۔''

منشی خاموش ہو گیا۔ زہرہ بانو کا چہرہ جوشِ غیظ تلے سرخ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تھانے پہنچ چکی تھی۔

تھانہ انچارج ایک سب انسپکٹر تھا۔ تھوڑے دنوں پہلے ایس ایچ او انسپکٹر غلام شبیر کا تبادلہ ہو گیا تھا تو عارضی طور پر تھانے کا چارج جہانزیب نامی ایک سب انسپکٹر کو ملا تھا۔ یہ ایک پکی عمر کا آدمی تھا اور ایماندار اور فرض شناس پولیس آفیسر تھا۔ زہرہ بانو نے اپنا تعارف کروایا تو وہ مرعوب نظر آنا لگا پھر جب اصل مسئلہ بیان کیا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ تاہم پوری بات سننے کے بعد وہ زہرہ بانو کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔

''دیکھیں بی بی! یہ جائداد وغیرہ کے تنازعات چونکہ خالصتاً خاندانی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اس میں ڈائریکٹ

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پولیس کو شامل کرنے سے معاملہ اور گمبھیر ہو سکتا ہے۔ میرا آپ کو مشورہ یہی ہے کہ پہلے آپ اپنے خاندان کے بڑوں سے مشورہ کر لیں تو یہ زیادہ بہتر رہے گا۔"

"انسپکٹر صاحب!" زہرہ نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے کاٹ دار متانت سے کہا۔

"اگر آپ بھی ممتاز خان سے خوف زدہ ہیں تو ٹھیک ہے پھر مجھے شہر جا کر پولیس انتظامیہ کے کسی اعلیٰ افسر سے ہی بات کرنی پڑے گی۔ آپ کا شکریہ۔" کہتے ہوئے زہرہ بانو کرسی سے اٹھنے لگی تو انسپکٹر جہانزیب نے اسے روک دیا اور بولا۔

"میں نے تو آپ کے فائدے کی بات کی تھی اگر آپ کچھ اور چاہتی ہیں تو یہی سہی۔ چلیں، میں خود آپ کے ساتھ چل کر معاملے کو سنبھالتا ہوں۔" کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر رکھی اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر جمائی، سیاہ رول اٹھایا۔ پانچ چھ پولیس کے آدمی لیے اور سرکاری جیپ میں سوار ہو کے زہرہ بانو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

پلانٹ پہنچنے کے بعد ان کا ٹکراؤ، ممتاز خان سے ہو گیا۔ انسپکٹر جہانزیب اسے جانتا تھا۔ دونوں کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں، ممتاز خان کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے نجانے انسپکٹر سے کیا کہا کہ وہ خاموشی سے واپس لوٹ گیا۔ زہرہ بانو کو اس پر شدید غصہ آ گیا۔ ممتاز خان نے کرخت لہجے میں زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے کہا۔

"لڑکی! میں آخری بار تم سے کہہ رہا ہوں کہ اپنی اوقات میں رہو ورنہ... تم دونوں ماں بیٹی کے لیے میں بہت بُرا ثابت ہوں گا۔" اس کھلی دھمکی پر زہرہ بانو کا پارا بھی چڑھ گیا۔ وہ بھی اس طرح ترکی بہ ترکی اور بے خوفی سے ممتاز خان کے چہرے کو گھورتے ہوئے بولی۔

"میں بھی تم سے آخری بار کہہ رہی ہوں لڑکے..."

اس بار زہرہ بانو نے بھی جواب میں حقارت ظاہر کی تھی۔ "ہم دونوں ماں بیٹی کو کمزور سمجھنے کی غلطی مت کرنا کیونکہ بھیڑیوں کی کچھار میں بھی ہم ماں بیٹی اپنا تحفظ کرنا جانتی ہیں۔ اپنی اوچھی حرکتوں سے باز آ جاؤ... ایسا نہ ہو کہ مجھے کوئی بڑا قانونی قدم اٹھانا پڑ جائے۔" یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو اسے جلتا سلگتا چھوڑ کر وہاں سے اپنی حویلی لوٹ آئی اور اپنی ماں ستارہ بیگم سے یہ ساری بات گوش گزار کر ڈالی۔ وہ بھی پریشان ہو گئی تھی، ادھر ممتاز خان نے ان دونوں ماں بیٹیوں کو نیچا کرنے کا جیسے عہد کر لیا تھا۔ اس نے پہلے اپنی ماں سے یہ ساری باتیں کیں پھر اس سلسلے میں جب خود باپ سے بات کرنا چاہی تو مہرالنسا نے اسے منع کر دیا اور مکاری سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "نہیں پُتر، ابھی تو چودھری جی کے منہ نہ لگ تو اچھا ہے۔ میں خود پہلے ان سے بات کروں گی۔"

"نہیں بے بے، اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔" ممتاز خان بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بابا جان کو اب ایک فیصلہ کرنا ہوگا، ہم یا وہ۔"

ممتاز خان نے اس دن باپ سے زہرہ بانو کی شکایت کر دی۔ چودھری الف خان کو بہرحال یہ بات پسند نہیں آئی کہ زہرہ نے تھانے کا رخ کیا تھا۔ اس نے زہرہ بانو کو طلب کر لیا۔ زہرہ بانو نے بڑے اعتماد کے ساتھ ممتاز خان کی حرکت اور اس کے مسلح حواریوں کی بدتمیزی سے آگاہ کیا۔

"کچھ بھی تھا بیٹی، تمہیں پہلے ہم سے شکایت کرنا چاہیے تھی۔" چودھری الف خان نے زہرہ بانو سے کہا۔ تو وہ اپنی غیر معمولی فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے بولی۔

"بابا جانی! میں اپنی اس غلطی پر نادم ہوں اور آپ سے معافی چاہتی ہوں لیکن مجھے بھائی ممتاز خان کا تضحیک آمیز رویہ برداشت نہیں۔ مجھے ان کی نیت میں فتور نظر آتا ہے۔ کیا آپ ان سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے سالونٹ پلانٹ میں مجھے داخل ہونے سے کیوں روکا؟"

چودھری الف خان نے بیٹے کی طرف دیکھا۔ "کیوں پُتر! یہ تمہاری کیا حرکت تھی؟"

"بابا جانی! پچھلے کچھ دنوں سے پلانٹ کا کام عدم توجہی کی بنا پر بہت گھاٹے میں جا رہا تھا۔ اس کی وجہ... نااہل اور ناتجربہ کار لوگوں کی بھرتی تھی۔ میں کچھ سودمند تبدیلیاں کرنا چاہتا تھا تاکہ پلانٹ کو چلایا جا سکے۔"

"پلانٹ کا کام رکا ہی کب تھا؟" زہرہ بانو نے ممتاز خان کے اس سفید جھوٹ پر کہا، پھر باپ سے بولی۔

"بابا جانی! یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب یہ پلانٹ امی جان کے انتظامی تصرف میں نہیں لایا گیا تھا تب تو یہ بہت زبوں حالی سے دوچار تھا مگر جیسے ہی امی جان نے اس کا انتظام سنبھالا اور نئے تجربہ کار افراد بھرتی کیے تو اس کی حالت تیزی سے سدھرنے لگی۔ اس حقیقت سے آپ بھی انکار نہیں کریں گے بابا جانی کہ آج اس سالونٹ پلانٹ سے سالانہ کروڑوں کا منافع حاصل ہو رہا ہے تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ بھائی ممتاز خان کو اس میں ایسی اچانک کیا خرابی نظر آنے لگی کہ کامیاب تجربہ کار

Copied From Web

لوگوں کو بے دخل کر کے اپنے مسلح کارندوں کا وہاں قبضہ جمانے کی فکر کر رہے ہیں؟‘‘

زہرہ بانو کی بات کو چودھری الف خان نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ وہ تیز نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر متانت سے بولا۔ ’’پتر ممتاز! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا تم ایک منافع دینے والے پلانٹ کا ستیاناس مارنا چاہتے ہو؟ یہ تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوگا۔ کل ہم خود جا کر وہاں کا جائزہ لیں گے اور سنو پتر ممتاز! تم آئندہ سے ان معاملات میں بالکل ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرو گے جو ہم ستارہ بیگم اور زہرہ بانو کے حوالے کر چکے ہیں۔‘‘

چودھری الف خان کی بات پر دونوں ماں بیٹا یعنی مہر النسا اور ممتاز خان اندر سے جل بھن گئے۔

چند دنوں بعد کی بات تھی۔ یہ چاروں سازشی ذہن کے مالک پھر سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔ ممتاز خان کے دل و دماغ میں اس کی ماں مہر النسا نے جو زہر بھر رکھا تھا وہ اب رفتہ رفتہ ایک آتش فشاں کے روپ میں ابھرنے لگا تھا۔

’’میں زہرہ بانو کو اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اسے اب مرنا ہوگا۔‘‘ وہ نفرت اور سفاک لہجے میں بولا۔ اس روز دونوں ماں بیٹا وراثت علی اور رئیس خان کے ہاں آئے ہوئے تھے اور چاروں ایک کمرے میں موجود تھے۔ بیٹے کے خطرناک عزائم کو پروان چڑھانے میں اگرچہ اس کی ماں کا ہی ہاتھ تھا مگر وہ اس طرح کے خون خرابے سے خوف زدہ تھی۔ لہٰذا۔ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

’’نہیں پتر! ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں تیرے باپ کا مزاج جانتی ہوں اور اسے پہلے ہی بہت سی باتوں کا اندازہ ہے۔ اگر ایک بار اس کا دل برا ہو گیا تو ہمارا کچھ بھی نہیں بچے گا۔‘‘

’’ہاں ممتاز!‘‘ بہن کی بات کی تائید میں وراثت علی بھی بھانجے کو سمجھاتے ہوئے بولا۔ ’’وہ دونوں ماں بیٹی ایک نمبر کی مکار عورتیں ہیں۔ تو نہیں جانتا ممتاز! مگر یہ حقیقت ہم بہت پہلے سے جانتے ہیں کہ ستارہ بیگم نے ابتدا ہی سے اپنے چال چلن سے کس طرح چودھری جی کا دل جیتا ہے اور اب بیٹی بھی وہی مکاری کر رہی ہے۔‘‘

’’ہاں، ہمیں بھی پہلے چودھری جی کے دل میں اپنی جگہ بنانی چاہیے۔ اس کے بعد آخری پتا پھینکنے کا وقت آئے گا۔‘‘

مہر النسا بولی۔ ’’دیکھ پتر ممتاز! ابھی جوش دکھانے کا وقت نہیں آیا۔ چودھری جی زندہ ہیں۔ دونوں ماں بیٹی بھی تب تک ہیں جب تک چودھری جی ہیں۔‘‘

’’ہاں ممتاز، اصل اہمیت اور حیثیت صرف تمہاری ہی ہے حویلی میں۔ تم ہی اس پوری جاگیر کے اکیلے وارث ہو۔ یہ بھلا دونوں کمزور عورتیں ہمارا کیا بگاڑ سکتی ہیں اس لیے غصے میں معاملہ خراب نہ کر۔‘‘ وراثت علی بولا۔

’’تو چودھری جی کو دایاں بازو بن کے دکھا۔ اس کا سہارا بن تاکہ وہ کئی اہم معاملات میں تجھ پر بھروسا کرنے لگے، تیرا محتاج ہونے لگے۔‘‘

’’میں تم دونوں کی باتوں سے متفق نہیں ہوں۔‘‘ رئیس خان نے کہا۔ ’’اس طرح معاملہ لمبا کرنے سے دونوں ماں بیٹیاں اپنا اثر قائم کر چکی ہوں گی، ستارہ بیگم کی میں بات نہیں کرتا مگر اس کی بیٹی زہرہ بانو دو نہیں چار ہاتھ آگے ہے۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے، دیکھتے نہیں تم دونوں کس طرح پُر پرزے نکال رہی ہے۔ فوراً قانون کا دروازہ کھٹکھٹا ڈالا، بہتر یہی ہے ممتاز سچ کہہ رہا ہے نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ سب سے پہلے زہرہ بانو کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اس کے بعد ہمیں کوئی لمبا کھیل کھیلنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔‘‘ ممتاز خان کو اپنے ماموں رئیس خان کی بات پسند آئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کافی ہم مزاج تھے جبکہ اس کی بات نے مہر النسا اور وراثت علی کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ادھر وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے زہرہ بانو نے کچھ اہم اقدامات اٹھائے تھے۔ اس نے اپنی شخصیت کو بھاری بھرکم اور رعب داب بنانے کے بارے میں سوچا۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اپنے تحفظ اور اپنے مخالفوں پر دھاک بٹھانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے پھر حالات کے حسب منشا بھی تھا یہ سب۔

زہرہ بانو نے عام گھریلو ٹائپ ملازموں کے علاوہ کارندے بھی پالنے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا تو اس کی پہلی نظرِ انتخاب منشی فضل محمد کے جوان گبرو بیٹے کبیل پر پڑی جو اس روز پہلی بار آمنا سامنا ہونے پر یک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا تھا مگر پھر زہرہ بانو کی ’’حیثیت‘‘ اور تعارف کا پتا لگتے ہی اس نے فوراً اپنی نظریں احتراماً جھکا لی تھیں۔

وہ اسے خاصا دلیر اور پُرجوش نوجوان محسوس ہوا تھا۔ زہرہ بانو نے منشی فضل محمد سے اس سلسلے میں صلاح مشورہ کیا اور ابھی اس کے بیٹے کبیل سے متعلق کوئی بات نہ کی، تاہم منشی نے بھی اس کے خیال کی حمایت کی کہ اسے بھی اپنے تحفظ کے سلسلے میں مسلح محافظ رکھنے چاہئیں۔

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

زہرہ بانو نے چُن چُن کر اپنے گرد ایسے محافظوں کا گھیرا ڈالنا شروع کر دیا۔ دو عدد باڈی گارڈز اس نے شہر سے حاصل کیے۔ تھے جبکہ تین اسے نئے پنڈ کی جاگیر سے ہی مل گئے تھے۔ انہیں لائسنس یافتہ اسلحہ بھی دلا دیا تھا۔ خود زہرہ بانو نے بھی تھوڑا بہت اسلحہ چلانا سیکھ لیا تھا۔ اپنی جاگیر کے ویران میدانوں میں جا کر وہ ہتھیار چلانے کی پریکٹس بھی کرتی تھی۔ ایک پستول اس نے بھی اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے باڈی گارڈز جاسوس بن کر اس کے حصے کی جاگیر کی نگرانی وغیرہ کیا کرتے تھے۔ ایک روز ایسے ہی ایک مخبر نے زہرہ بانو کو اطلاع پہنچائی کہ سالونٹ پلانٹ منیجر شیراز چیمہ پر ممتاز خان اپنے حواریوں کے ذریعے دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ یہ نوکری چھوڑ کے چلا جائے، ورنہ اس کی خیر نہیں۔ یہ سن کر زہرہ بانو اسی وقت اپنے دو مسلح کارندوں کے ساتھ وہاں پہنچی تو تب تک ایک اور چونکا دینے والا مگر افسوسناک منظر اس کا منتظر تھا۔

شیراز چیمہ ایک خوش لباس اور اچھی شخصیت کا مالک تھا اور ہر وقت سوٹ بوٹ میں رہتا تھا۔ اس وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی، اس کا سوٹ جگہ جگہ سے پھٹ کر لیروں کی شکل میں جھول رہا تھا۔ چہرے اور گردن پر چوٹوں اور خراشوں کے نشانات تھے۔ گریبان چاک تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک سے زائد آدمیوں نے ٹھیک ٹھاک پٹائی کر ڈالی تھی۔

زہرہ بانو کو اپنے خوش باش اور ٹک سک سے منیجر کی یہ حالت دیکھ کر انتہائی دکھ ہوا اور غصے سے وہ بری طرح کانپنے لگی۔ وہیں کسی مزدور ورکر نے اسے بتایا کہ چھیما اور اس کے دو مسلح آدمیوں نے کسی بات پر منیجر کا یہ حشر کیا تھا۔ زہرہ بانو نے پہلے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ کچھ سوچا۔ اس کے بعد منیجر شیراز سے تھوڑی دیر تک بات چیت کی پھر پلانٹ مل کے تمام ورکرز اور مزدوروں کو ایک میدان میں جمع کر کے تھوڑی دیر میں اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ جس کا لب لباب یہی تھا کہ اس پلانٹ مل کی مالک صرف وہ ہے۔ ممتاز خان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ اور نہ ہی یہاں کے لوگوں کو ان سے دبنے یا خوف کھانے کی ضرورت ہے۔ آج اگر منیجر کے ساتھ انہوں نے یہ نازیبا حرکت کی ہے تو کل... کسی اور کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا آپ اپنا تحفظ خود کریں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگ کیوں خوف زدہ ہو گئے؟ اور آرام سے اپنے ’’صاحب‘‘ کو پٹتے

مارچ 2015ء کے صفحات کی بسنت
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل...... محفل شعر و سخن اور مرزا امجد بیگ کا منفرد انداز

سفر در سفر
ویسے تو زندگی ایک سفر ہے لیکن کہیں کہیں پڑاؤ بھی آتے ہیں۔ آخری صفحات پر ایک عجیب و غریب پڑاؤ کی داستان **منظر امام** کے قلم کی روانی

درماندہ عشق
تاریخ کے اوراق سے ایک اور یادگار داستان......
الیاس سیتا پوری کا سحر انگیز انداز

سودائے جنوں
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے
ملت اسلامیہ کے مصمم ارادوں کا عبرت اثر احوال

ماروی
کبھی ہار کبھی جیت، زندگی کے رنگین سنگین لمحات پر مشتمل روداد۔ **محی الدین نواب** کا دلچسپ شاہکار

اس کے علاوہ
ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر، سلیم انور، تنویر ریاض اور سید احتشام کی دلفریب کہانیاں

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیکھتے رہے۔ یہ جگہ آپ کی روزی روٹی کی جگہ ہے۔ کمال ہے آپ اس کا تحفظ بھی نہ کر سکے اور باہر کے چند بدمعاشوں کے آگے دب گئے۔" اس دوران ایک ورکر نے زہرہ بانو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"زہرہ بی بی! آج سے پہلے ہمیں کب یہ معلوم تھا کہ اس مل کی مالک، آپ ہیں چودھری ممتاز خان نہیں۔ ہم تو اس لیے پیچھے ہٹے رہے تھے بلکہ ہمارا تو اپنا دل بھی خراب ہو گیا تھا۔ ہم نوکری چھوڑ کر جانے والے تھے، اپنے منیجر صاحب کو پٹتا ہوا ہم بھی نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ ہمیں سخت شرمندگی ہوئی، لیکن آج آپ نے حقیقت بیان کر کے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب کوئی مائی کا لعل ایسی حرکت دوبارہ نہیں کر سکتا۔"

سب نے، اس آدمی کی زبان پر ہم آواز ہو کر اتحاد کا اعلان کر دیا تو ایک اور مزدور نے انکشاف کیا۔

"زہرہ بی بی! ہمارا ایک بہادر نوجوان چند ساتھیوں کے ساتھ ان لوگوں کے تعاقب میں گیا ہے جنہوں نے یہ حرکت کی تھی۔ اسے پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی وہ ہمارا مزدور لیڈر بھی ہے۔"

اس کی بات سن کر زہرہ بانو کو ایک خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ ابھی یہ مناظرہ جاری تھا کہ ایک ٹرک تیزی سے اندر داخل ہوا۔ سب چونک کر اس طرف متوجہ ہوئے۔ منیجر شیراز بھی وہیں وسیع و عریض احاطے میں موجود تھا۔ اس کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی۔

زہرہ بانو کی متحرک نگاہ ٹرک پر جمی ہوئی تھی۔ پھر کئی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

ایک لمبا تڑنگا خوبرو جوان مرد اپنے دو تین ساتھیوں سمیت ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن سے نیچے اترا اور پھر پچھلے حصے میں یہ سب چڑھ دوڑے۔ تھوڑی دیر بعد ہی زہرہ بانو کی پھٹی پھٹی نظروں نے دیکھا۔ وہی خوبرو جوان مرد اپنے ساتھیوں کی مدد سے، تین چار نڈھال سے آدمیوں کو دبوچ کر نیچے اتار رہا تھا۔ پھر انہیں گھسیٹ کر منیجر شیراز چیمہ کے قدموں پر لا پھینکا۔ مذکورہ نوجوان خاصا جوش اور غضب ناک ہو رہا تھا۔ اس نے منیجر شیراز سے کہا۔

"ان کو پہچان لو منیجر صاحب، یہی تھے نا وہ بزدل کتے جو ہتھیاروں کے زور پر یہاں بدمعاشی کرنے آئے تھے۔ ہم نے ان کی پٹائی کر ڈالی ہے اور آپ کا حساب چکا دیا ہے۔ مزید آپ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرو۔"

زہرہ بانو نے، دیکھا وہ چاروں مضروب بُری طرح اس مذکورہ جوشیلے نوجوان پر خار کھائے ہوئے تھے۔ اس نوجوان نے شاید ان کی اچھی خاصی درگت بنا ڈالی تھی۔ انہی میں سے ایک نے اس نوجوان کی طرف گھور کے غراتے ہوئے کہا۔ "تت... تم... زندہ نہیں بچو گے... ہمارے استاد چھیما کو تم نہیں جانتے۔ وہ اس پلانٹ کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔"

"بند کر اپنی بکواس زرخرید کتے۔" وہ نوجوان شیر کی طرح دہاڑ کر بولا۔ "تمہارا استاد بھی کسی کا زرخرید کتا ہے۔ اس سے بھی میں اچھی طرح نمٹ لوں گا۔"

زہرہ بانو یک ٹک اس بہادر، جوشیلے اور دلیر نوجوان کی طرف تکے جا رہی تھی۔ اس نے عام سا ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ بال گھنے تھے، باریک مونچھیں اس کے خوبرو چہرے پر خوب جچتی تھیں۔ آنکھیں چمک دار اور روشن تھیں۔ ان میں خودداری اور غیرت مندی کے علاوہ بلند حوصلگی بھڑکتے شعلوں کی طرح ہویدا تھی۔ ابھی تک شاید اس کی نظر زہرہ بانو پر نہیں پڑی تھی اور شاید سرسری پڑی بھی ہو تو اس نے توجہ نہیں دی تھی۔ پھر فوراً ہی ایک مزدور نے اس نوجوان کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو وہ نوجوان قدرے چونک کر پہلی بار زہرہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ اب دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں۔ اپنے لہجے کی گھن گرج، جوشیلے انداز اور عمل جنگجوانہ کے باعث وہ زہرہ بانو کو پہلی ہی نگاہ میں متاثر تو کر ہی گیا تھا لیکن اپنی مردانہ وجاہت اور خوبروئی کے علاوہ چمک دار روشن روشن آنکھوں کے باعث بھی وہ زہرہ بانو کے دل میں پہلی ملاقات میں گھر کر چکا تھا۔ زہرہ بانو کو یہ جفاکش مزدور نوجوان گویا پہلی ہی نگاہ میں بھا گیا تھا۔

"آپ... زہرہ بانو ہیں؟ چودھری ممتاز خان کی بہن؟" دفعتاً ایک دل میں کھب جانے والی آواز نے زہرہ بانو کی محویت کو توڑ ڈالا۔ وہ خود کو فوراً ہی قدرے سنبھالتے ہوئے بولی۔

"میں صرف زہرہ بانو ہوں، وڈے چودھری الف خان کی دوسری بیگم ستارہ بیگم کی بیٹی۔"

شاہد زہرہ بانو نے اس کے لہجے کی استفساریہ چبھن کو محسوس کر کے دانستہ اپنا تعارف اس انداز میں کروایا تھا اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی برآمد ہوا تھا کیونکہ یہ سن کر نوجوان کی آنکھوں میں اب الجھن سی تیر گئی تھی۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس نے جس انداز سے زہرہ بانو سے اس کے بھائی ممتاز خان کے حوالے سے استفسار کرنا چاہا تھا وہ اس ضمن میں زہرہ بانو سے کوئی سخت بات کہنے والا تھا۔

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''دیکھیں بی بی! ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کا تعلق بھی حویلی والوں سے ہے۔'' نوجوان نے بالآخر زہرہ بانو کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ ''وڈے چودھری یا ممتاز خان تک آپ ہمارا پیغام پہنچا دیں کہ ہم غریب مزدور ضرور ہیں مگر محنت اور مزدوری کر کے یہاں حلال روزی کماتے ہیں لیکن کسی قسم کی کوئی بدمعاشی یا بے عزتی ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے بلکہ اس کا بھرپور جواب دیں گے اور آج سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک ممتاز خان اور اس کے کارندوں کا یہاں عمل دخل ختم نہیں ہوتا پلانٹ کا کام جام کر دیا جائے گا۔''

زہرہ بانو اب تک اندازہ لگا چکی تھی کہ یہی وہ مزدور لیڈر ہے جس کے بارے میں تھوڑی دیر پہلے ایک ورکر نے اسے بتایا تھا۔

زہرہ بانو اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔ نوجوان کو عجیب سی الجھن ہونے لگی۔ اس وقت ایک مزدور ساتھی نے جو پختہ عمر کا تھا آگے بڑھ کر اس نوجوان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''لئیق پتر... یہ پلانٹ نکے چودھری ممتاز خان کی ملکیت نہیں ہے۔ اس میں بھلا زہرہ بی بی کا کیا قصور؟ یہ تو خود ممتاز خان اور اس کے غنڈوں سے عاجز آئی ہوئی ہیں۔'' پھر ایک ورکر نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی زہرہ بانو کی تقریر کے بارے میں نوجوان کو آگاہ کر دیا۔

زہرہ بانو بولی۔ ''آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟'' اس کی مراد پورا نام تھا۔

''لئیق شاہ۔'' نوجوان نے بتایا۔

''دیکھو لئیق شاہ! تم شاید یہاں کے مزدور لیڈر ہو۔ اگر میری بات کا یقین کرو تو مجھے یہ سب دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے بہادری کے ساتھ ممتاز خان کے بدمعاش کارندوں کو بھرپور جواب دیا اور میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنی تقریر میں یہی ان سب سے کہا تھا کہ آئندہ بھی ان بدمعاشوں کو اینٹ کا جواب پتھر سے دو۔ ڈرو کسی سے بھی نہیں... یہ پلانٹ میری ملکیت ہے مگر مجھے اپنا ساتھی سمجھو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' زہرہ بانو نے دیکھا پہلی بار اس نوجوان لئیق شاہ کے خوبرو چہرے پر اثر پذیری کی چمک اُبھری تھی۔ وہ اس سے متاثر نظر آنے لگا تھا۔

''بلکہ میں خود تم لوگوں کے ہاتھ مضبوط کروں گی۔ اب یہاں ہتھیار بہ دست محافظ گیٹ پر ہر وقت موجود رہیں گے۔''

خواہش

ایک بھکاری سے اس کے ساتھی دوست نے پوچھا۔ ''اگر تمہیں لاٹری میں پہلا انعام مل جائے تو کیا کرو گے؟''

بھکاری نے جواب دیا۔ ''سب سے پہلے پارکوں کی بینچوں پر گدیاں لگواؤں گا۔''

''آپ کا شکریہ بیگم صاحبہ! بس ایک درخواست اور کرنا تھی آپ سے۔'' لئیق شاہ نے کہا۔

''ہاں بولو۔''

''ان مزدور ورکروں کو کوئی بونس نہیں ملتا حالانکہ دوسری جگہ یہ روایت قائم ہے۔''

''تم لوگوں کے جائز مطالبے منظور ہوں گے، میں سال میں ایک بونس کا اعلان کرتی ہوں۔''

احاطے میں ''بیگم صاحبہ'' زندہ باد کے نعرے لگ گئے۔ لئیق شاہ مسکراتی اور متاثر کن نظروں سے زہرہ بانو کی طرف دیکھنے لگا۔ زہرہ بانو بھی مسکراتی مگر گہری نگاہوں سے لئیق شاہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے پہلی بار اپنا دل بے طرح انداز میں دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ حالانکہ وہ بہت ریزرو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی، سمجھ دار، سلجھی ہوئی، پڑھی لکھی اور باشعور تھی، لیکن نہیں جانتی تھی کہ تقدیر میں ایک لکیر ایسی بھی ہوتی ہے جس کا نہ چاہتے ہوئے بھی انسان اسیر ہو جاتا ہے اور اس کا پتا بھی نہیں چلتا۔

بہرحال معاملہ نمٹا دیا گیا۔ بدمعاشوں کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ منیجر شیرازی کے ساتھ مار پیٹ کی رپورٹ لکھوائی گئی۔ وہ بھی اب زہرہ بانو کے اقدام سے مطمئن نظر آتا تھا۔

زہرہ بانو نے اس دن کچھ مزید مسلح گارڈز بھرتی کر کے پلانٹ کے اندر باہر تعینات کر دیے۔

ادھر منشی فضل محمد کے ذریعے کبیل کو زہرہ بانو سے متعلق سارے واقعات کا علم ہوتا رہا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ زہرہ بانو میں جذباتی قسم کی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اپنے اس جذباتی رجحان پر وہ خود کو کوستا بھی تھا کہ وہ ایک ایسے چاند کا آرزو کیے ہوئے تھا جسے دور سے دیکھا تو جا سکتا ہے مگر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ یوں جب وہ اپنا اور زہرہ بانو کا موازنہ کرتا تو بیچ زمین آسمان کا تفاوت دیکھ کر اور اپنی کم

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مانگی محسوس کر کے اپنا دل مسوس کر رہ جاتا اور اپنی کھلنڈرانہ نادانی پر پھیکی ہنسی ہنس کر رہ جاتا۔ مگر اس پھیکی ہنسی کی تہ میں دکھ کی ایسی تلچھٹ بھی ہوتی تھی جو اسے بے دم سا کیے ڈالتی۔

کبیل جانے کیوں اب تک شادی سے جی چراتا آیا تھا۔ ماں بے چاری اس کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو دل میں لیے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اس کی عمر کے کئی نوجوان نہ صرف شادی شدہ ہو چکے تھے بلکہ باپ بھی بن چکے تھے۔ ایک جگہ کبیل کی نسبت بھی طے ہوئی تھی۔ لڑکی کا نام نوری تھا۔ گاؤں کے مزارع کی بیٹی تھی۔ کبیل کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا مگر جب کبیل سے اس کی شادی ہونے والی تھی تو چند روز پہلے ہی نوری کا انتقال ہو گیا.... اسے کسی سانپ نے ڈس لیا تھا۔

پھر پتا نہیں کیوں اس روز کے بعد سے کبیل نے شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا۔ اس نے خود کو کام میں مصروف کر ڈالا تھا۔ بھینسوں کا چارا کترتا یا پھر باپ کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتا، وہ چودھری الف خان کی زمینوں پر ٹریکٹر بھی چلایا کرتا تھا۔ یاری دوستیاں بھی اس نے گانٹھ رکھی تھیں مگر رفتہ رفتہ اس نے خود کو تنہائی پسند بنا لیا تھا۔ زہرہ بانو سے متعلق تازہ ترین حالات اور یہ جان کر کہ انہیں محافظ درکار تھے تو ایک دن اس نے کچھ سوچ کر باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

باپ غسل سے فارغ ہوا تو دونوں باپ بیٹے چارپائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ وہ خاموشی سے مگر سوچتی نظروں کے ساتھ بار بار پیالی کے افق سے باپ کے چہرے کو تکتا۔

منشی فضل محمد کی کھاگ نظروں نے فوراً تاڑ لیا کہ اس کا بیٹا اسے گاہے بگاہے کچھ سوچتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بالآخر مسکرا کر بیٹے سے خود ہی بول پڑا۔

”کبیل پتر! کیا بات ہے۔ کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں تو کچھ بے چین دکھائی دیتا ہے۔ کیا گاؤں کی کوئی کڑی شڑی پسند آ گئی ہے؟“ باپ نے آخر میں ایک آنکھ میچ کر معنی خیز انداز میں کہا تو کبیل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ چور تو اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔ یہی حال کبیل کا تھا مگر پھر وہ اسے باپ کی ایک روایتی سوچ پر محمول کر کے ہنس کر بولا۔

”او نہیں پیو، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں چاہتا ہوں تو اب آرام کر۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تو ایک جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے اس عمر میں کام پر لگا ہوا ہے۔“ منشی فضل بھی ایک باپ تھا پھر جب ایک باپ بیٹے کے درمیان ”ماں“ نہ ہو تو باپ بیٹے کا یہ رشتہ ”دوستی“ میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ان دونوں میں بھی کچھ ایسی قسم کا رشتہ تھا، وہ بولا۔

”اوئے نالائق... تجھے آج اتنے دن بعد میرے بڑھاپے کا کیسے خیال آ گیا؟“

کبیل پریشان سا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ باپ کے ذہن کی کھٹک کو شک کی پٹڑی سے کس طرح اتارے؟ اس کے سوا اصل بات کرنے سے وہ ہچکچا رہا تھا۔ مصنوعی خفگی سے بولا۔

”میں تو تجھے شروع سے کہتا آ رہا ہوں بھول گیا تو؟ مجھے واقعی اب تیرا اس عمر میں کام کرنا اچھا نہیں لگتا۔“

”چنگا، تو تو مجھے ویلا بٹھا کر بیمار کرنا چاہتا ہے؟“ فضل محمد ہنس کر بولا۔ ”اوئے بے وقوف! مصروفیت انسان کو صحت مند رکھتی ہے۔ اچھا چل اصل گل بتا تو چاہتا کیا ہے؟“ بوڑھے فضل محمد کی سوئی اس کھٹک آمیز تجسس پر اٹکی ہوئی تھی جس نے کبیل کو اصل بات کرنے سے اب تک روکا ہوا تھا۔

وہ جھلا کے بولا۔ ”او پیو، مجھے بے وقوف نہ کہا کر، میں نہیں بات کرتا تجھ سے۔“ کبیل نے عورتوں کی طرح منہ پھلا لیا۔ باپ کی مسلسل شک بھری کھٹک اسے اصل بات کرنے سے مانع رکھے ہوئے تھی۔ اس بات نے اس پر جھلاہٹ طاری کر دی تھی۔ بوڑھا فضل محمد ہنستے ہوئے بولا۔

”چنگا.... چنگا پتر! ناراض نہ ہو، بتا تو سہی تو چاہتا کیا ہے؟“

کبیل مسکرا کر بولا۔ ”نہیں پیو، بھلا میں تجھ سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ بس میں ویسے ہی کہہ رہا تھا کہ وہ... میں کوئی کام کرنا چاہتا ہوں۔“

”کام کرنا چاہتا ہے؟“ فضل محمد حیرت سے بولا۔ ”تو تو ویلا کب ہے پتر ے؟ کرتا تو ہے سارا دن کام۔“

”یہ کوئی کام نہیں ہے پیو۔“ کبیل منہ بسور کر بولا۔ ”بھینسوں کو سنبھالنا، چارا کترنا، یہ تو ویسے بھی ہو جائے گا۔ میں کوئی بڑا کام کرنا چاہتا ہوں۔ ہٹکے شبکے والا... اپنی پسند کا کام۔ مردوں والا۔“

”شاواں بھئی، ذرا بتا تو... کون سا مردوں والا کام کرنا چاہتا ہے تو؟“ فضل محمد بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے بیٹے کی طرف دیکھ کر بظاہر سنجیدگی سے بولا کہ کہیں پھر وہ ناراض نہ ہو جائے۔

”پیو، میں نے سنا ہے زہرہ بی بی کو کچھ محافظوں کی ضرورت ہے... میں چاہتا ہوں... زہرہ بی بی کی نوکری کر لوں۔“

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بیٹے کی بات سن کر فضل محمد کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ اس کے بوڑھے چہرے پر ایک پریشان کن اور سوچتی ہوئی الجھن نظر آنے لگی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے جوان کڑیل بیٹے کے چہرے کو دیکھا پھر بولا۔

"پتر! مجھے کوئی اعتراض تو نہیں، کیونکہ یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ آج کل ستارہ بی بی اور زہرہ بی بی پر بُرا وقت آیا ہوا ہے۔ میں نے ان دونوں ماں بیٹیوں کا نمک کھایا ہے اور ان کے دکھوں سے بھی واقف ہوں۔ اللہ وڈے چودھری کو لمبی عمر دے۔ جب تک وہ زندہ ہے تو سب ٹھیک ہے مگر..." اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو لوہا گرم دیکھ کر کمیل نے فوراً کہا۔

"یہی بات، تو میں نے بھی محسوس کی ہے... حویلی میں ستارہ بی بی اور زہرہ بی بی کی حیثیت صرف وڈے چودھری کے دم خم سے قائم ہے۔ ممتاز خان، اس کی ماں اور اس کے دونوں بھائی کس بری طرح سے ان دونوں ماں بیٹی پر خار کھائے ہوئے ہیں۔ یہ سب میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

بیٹے کی اس صراحت بھری جان کاری پر بوڑھا باپ ششدر رہ گیا اور حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں کے ساتھ بیٹے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "پتر ے! تجھے ان ساری باتوں کا کیسے پتا ہے؟"

"اوہو...! تو خود ہی تو مجھے حویلی والوں کی ساری باتیں بتاتا ہے۔" کمیل، بات کو آئی گئی کرنے کے انداز میں بولا۔ "اور پھر میں وڈے چودھری کی زمینوں میں ٹریکٹر چلاتا ہوں۔ حویلی کے نوکروں سے میری بھی سلام دعا اور اٹھک بیٹھک رہتی ہے، ان سے بھی مجھے بہت سی باتوں کا پتا چلتا رہتا ہے۔"

بیٹے کی بات پر فضل محمد تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، تیری یہ مرضی ہے تو میں زہرہ بی بی سے بات کروں گا۔" باپ کی بات سن کر کمیل ایک دم خوش ہو گیا جبکہ فضل دین دزدیدہ اور سوچتی نظروں سے بیٹے کے چہرے کی دیدنی خوشی کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کے بیٹے کو واقعی زہرہ بی بی کی نوکری سے دلچسپی تھی یا وجہ کچھ اور تھی؟

اگلے دن اس نے زہرہ بانو سے اس کی بات کی تو وہ خوش ہو کے بولی۔ "چاچا! یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی، کیونکہ تمہارا بیٹا بھی یقیناً تمہاری طرح قابلِ اعتبار اور ایمان دار آدمی ہوگا، اسے میرے پاس بھیج دینا۔"

کمیل کو باپ نے جب زہرہ بانو کا عندیہ دیا تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سمایا۔

منشی جب بیٹے کو لے کر زہرہ بانو کے پاس پہنچا تو کمیل کے دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہونے لگی۔ اس کا منہ خشک ہو گیا اور وجود میں ایک مضطربانہ ارتعاش محسوس ہونے لگا۔

"اسے لے آیا ہوں، بی بی جی۔ اس کو آپ کی خدمت کرنے کا شوق چرا گیا ہے۔" منشی نے ہنستے ہوئے زہرہ بانو سے کہا۔ وہ مسکرا کر ایک نگاہ کمیل پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"اچھی بات ہے۔ ہم اسے اس کی خدمت کا پورا صلہ دیں گے۔"

پھر وہ براہِ راست کمیل سے مخاطب ہو کے بولی۔

"تمہارا پورا نام یہی ہے؟"

"نہیں جی، بچپن سے ہی میں یار لوگ دادا کہتے تھے جی۔ میں شرارتی ہوتا تھا نا جی بہت... پھر میرا دادا نام پڑ گیا۔ کمیل دادا۔"

"ہوں... کمیل دادا۔" زہرہ بانو نے زیرِ لب بڑبڑایا۔ "تمہارا اب یہی نام صحیح رہے گا۔ اس میں رعب اور دبدبہ ہے، کیوں ٹھیک ہے؟" زہرہ بانو نے مسکراتی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تو اس نے فوراً سر ہلا دیا۔ زہرہ بانو نے مزید کچھ سوالات کیے۔ کمیل دادا نے اسے بتا دیا کہ وہ صرف پانچ جماعتیں پڑھا تھا۔ گاڑی چلانا جانتا تھا جبکہ پستول بھی اسے چلانی آتی ہے۔

"تم کل سے میرے ساتھ رہو گے، میرے باڈی گارڈ بن کر۔ تمہاری تین ہزار تنخواہ ہوگی۔" بالآخر زہرہ بی بی نے کہا اور کمیل دادا نے دبی دبی مسرت سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ دن کمیل دادا کے لیے مسرتوں بھرا دن تھا۔ زہرہ بانو نے اسے کچھ رقم ایڈوانس دے دی تھی تاکہ وہ اپنے لیے صاف اور ڈھنگ کا مطلوبہ لباس خرید لے۔ یوں کمیل دادا بھی ایک "ٹور" میں آ گیا۔

زہرہ بانو کے تجربہ کار محافظوں نے کمیل دادا کو زہرہ بانو کی ہدایت پر کچھ دن اپنے ساتھ رکھا تھا۔ اس دوران زہرہ بانو کو پتا چلا کہ اس کی شہر والی کوٹھی "بیگم ولا" میں ممتاز خان کے کارندوں اور اس کی ملازمہ قسم کی عورتوں کا عمل دخل بڑھتا جا رہا ہے تو زہرہ بانو فوراً کمیل دادا کے ساتھ ملتان جا پہنچی۔ بیگم ولا کے گیٹ پر تعینات چوکیدار بھی اس

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے زہرہ بانو کی گاڑی دیکھ کر بھی گیٹ نہیں کھولا تھا۔ زہرہ بانو غصے سے لال پیلی ہوتے ہوئے جیپ سے اُتری اور چوکیدار سے درشت لہجے میں بولی۔

''کون ہو تم؟ اور تمہیں میری اجازت کے بغیر کس نے یہاں رکھا ہے؟''

چوکیدار ایک کسرتی جسم مگر درمیانے قد کا خرانٹ آدمی نظر آتا تھا۔ اس نے ملیشیا رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ماؤزر تھا۔ جواباً وہ زہرہ بانو کو تلخ نظروں سے گھورتے ہوئے نہایت بدتمیزی سے بولا۔ ''او مائی! تیرا دماغ خراب ہے... یہ کوٹھی چودھری...''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ زہرہ بانو کے عقب میں کھڑے کبیل دادا نے فقط ایک قدم اور ایک ہاتھ بڑھایا اور دوسرے ہی لمحے اس بداخلاق چوکیدار کی گردن کبیل دادا کے آہنی ہاتھ کے شکنجے میں آ گئی... چوکیدار نے اپنا ماؤزر سیدھا کرنے کی کوشش چاہی مگر... دوسرے ہی لمحے کبیل دادا کا ہتھوڑا نما دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور چوکیدار کو اپنے دائیں جبڑے پر قیامت ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ اس کا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔ وہ چند قدم لڑکھڑا کر بند گیٹ سے اس زور سے ٹکرایا کہ اس کے ہاتھ سے ماؤزر گر پڑا۔ ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ کبیل دادا کی دائیں ٹانگ چوکیدار کی چھاتی سے آن لگی اور وہ ہلنے جلنے سے معذور ہو گیا۔ اس لمحے کبیل دادا کا بھیانک تاثرات والا چہرہ چوکیدار کی دہشت زدہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے قریب تھا۔

''دوبارہ بیگم صاحبہ کے بارے میں ایسے نازیبا الفاظ بکنے کی جرأت بھی نہ کرنا... ورنہ تیری گردن مروڑ دوں گا۔'' کبیل دادا نے پُرغیظ لہجے میں غراتے ہوئے کہا اور پھر اپنی گن سیدھی کر لی۔

''فوراً دفع ہو جا یہاں سے۔ دوبارہ نہ دیکھوں ادھر تجھے۔'' چوکیدار کی پہلے ہی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ وہ دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ زہرہ بانو تحسین آمیز نگاہوں سے اپنے اس نئے اور بہادر باڈی گارڈ کو تکے جا رہی تھی۔ کبیل دادا نے گیٹ پورا کھول دیا اور پھر دونوں جیپ میں سوار ہو کے اندر داخل ہو گئے۔

زہرہ بانو کے ہمراہ دو مسلح محافظ اور بھی تھے۔ اندر بھی انہیں کچھ اجنبی چہرے نظر آئے، ان میں اِکا دُکا ہی شناسا چہرے تھے جو زہرہ بانو کو پہچان کر فوراً اس کی جانب لپکے۔

زہرہ بانو نے بڑے دبنگ لہجے میں ان سے پوچھا۔

''یہ کون اجنبی لوگ ہیں؟ انہیں فوراً نکال باہر کرو۔''

اس اثنا میں تین چار مسلح افراد جو یقیناً ممتاز خان کے کارندے تھے، ان میں کچھ زہرہ بانو کی شناخت رکھتے تھے، قریب آ کر ایک نے کہا۔

''ہمیں چودھری ممتاز خان نے یہاں بھیج رکھا ہے۔''

''کیوں؟ اور کس کی اجازت سے؟'' زہرہ بانو نے سلگتی نظروں سے گھور کر پوچھا۔

''مالکوں کو کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' ایک دوسرے حواری نے درشت لہجے میں کہا تو کبیل دادا نے پُرطیش نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''خبردار! بیگم صاحبہ سے تمیز سے بات کرو۔ اس کوٹھی کی مالک صرف بیگم صاحبہ ہیں اور یہاں انہی کا حکم چلے گا۔ تم لوگ اسی وقت یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔'' کبیل دادا کی بات پر تینوں حواری اسے خوفناک نظروں سے گھورنے لگے۔ اس بحث و مباحثے کے دوران اندر سے کچھ عورتیں اور مرد بھی باہر آ گئے۔ ان میں کچھ زہرہ بانو کو پہچان کر مرعوب بھی نظر آنے لگے۔ تاہم زہرہ بانو نے دونوں طرف کی بگڑتی صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے غیر متعلقہ افراد کو کوٹھی سے اپنی عورتوں سمیت نکل جانے کا حکم صادر کر دیا۔ بصورتِ دیگر اس نے پولیس کی دھمکی دے ڈالی۔ یوں بھی اب زہرہ بانو کا وہاں پلڑا بھاری نظر آ رہا تھا۔ وہاں موجود زہرہ بانو کے چند خادموں کے حوصلے بھی بڑھ گئے تھے۔

ممتاز خان کے حواریوں نے ایک گھنٹے کے اندر اندر بیگم ولا خالی کر دیا۔

زہرہ بانو نے کبیل دادا کو بیگم ولا کا منتظم بنا دیا اور اسے سختی کے ساتھ ہدایت کر دی کہ وہ یہاں کسی غیر متعلقہ فرد کو گھسنے نہیں دے گا۔ چاہے وہ ممتاز خان ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بہت مشکل اور سخت حکم تھا۔ کبیل دادا نہایت ادب سے زہرہ بانو کو مخاطب کر کے بولا۔ ''بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے چھوٹے چودھری ممتاز صاحب کے سلسلے میں یہ فیصلہ مناسب نہ ہو گا۔ بہرحال وہ آپ کے بھائی ہیں چاہے سوتیلے سہی... ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے کسی آدمی کو یہاں مستقل طور پر برداشت نہیں کریں گے، یہاں تصرف جمانے کا ارادہ ہو۔ معاملہ خاندانی بھی ہے جو بگڑ بھی سکتا ہے۔''

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

زہرہ بانو کو کبیل دادا کی بات میں وزن محسوس ہوا، اسے خوشی ہوئی کہ اس کا یہ ذاتی گارڈ صرف دیکھنے میں جنگجو نظر نہیں آتا، عقل و فہم بھی رکھتا ہے، وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے۔“

زہرہ بانو نے چند دنوں کے لیے کبیل دادا کو یہاں رکنے کا حکم دیا۔ اسے اعتراض تو نہ تھا مگر اسے اپنے بوڑھے باپ کی فکر ہونے لگی تاہم وہ مجبور تھا۔ یہ سوچ کر کہ چند دنوں کی بات تھی پھر وہ دوبارہ گاؤں چلا جائے گا۔ اس کی اپنی خواہش بھی یہی تھی کہ بیگم صاحبہ اسے خود سے دور نہ کرے، بولا۔ ”بیگم صاحبہ! آپ کا یہ حکم سر آنکھوں پر... لیکن میری خواہش تھی کہ موجودہ حالات کے پیشِ نظر میں آپ کے ساتھ ہی رہتا تو زیادہ بہتر تھا۔“

”نہیں، ابھی تمہارا یہاں موجود رہنا زیادہ ضروری ہے۔ تم منشی چاچا کی فکر نہ کرو۔ میں انہیں بتا دوں گی، چند روز بعد میں تمہیں نئے پنڈ بلوا لوں گی۔“ کبیل دادا نے فدویانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

زہرہ بانو وہاں سے نئے پنڈ لوٹ آئی تو ایک چونکا دینے والی اطلاع اس کی منتظر تھی۔ وڈے چودھری الف خان کو فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ بدقسمتی سے یہ حملہ بائیں جانب ہوا تھا اور دل کو بھی متاثر کیا تھا مگر ابھی شاید ان کی زندگی اللہ کو منظور تھی، وہ زندہ تو بچ گئے تھے مگر بستر کے ہو کر رہ گئے تھے اور اپنے جسم کو حرکت دینے حتیٰ کہ بولنے تک سے قاصر ہو گئے تھے۔ زہرہ بانو فوراً ان کے کمرے میں پہنچی اور الف خان کے سرہانے جا بیٹھی۔ ستارہ بیگم بھی مغموم چہرے کے ساتھ وہاں موجود تھی، ایک ڈاکٹر کو شہر سے بلایا گیا تھا جبکہ حکیم صاحب بھی موجود تھے۔

ممتاز خان وہاں نہیں تھا۔ البتہ اس کی ماں مہرالنسا موجود تھی۔ زہرہ بانو سے الف خان کا کوئی ایسا خونی رشتہ تو نہ تھا مگر یہ اعتراف زہرہ بانو کو ہی نہیں ستارہ بیگم کو بھی تھا کہ الف خان نے زہرہ بانو سے آج تک ایک سگے باپ جیسا ہی برتاؤ کیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ زہرہ بانو بھی الف خان کے لیے اپنے دل میں ایک بیٹی اور باپ کا درد رکھتی تھی۔ اس نے نہایت محبت سے، اس کا بے جان ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوما اور نمناک آنکھوں اور مغموم چہرے کے ساتھ باپ کا چہرہ دیکھتے ہوئے مرتعش لہجے میں بولی۔

”بابا جان! آپ جلد اچھے ہو جائیں گے۔ انشاء اللہ بابا جان! آپ... آپ...“ فرطِ جذبات سے وہ اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر پائی اور دکھ سے سسک پڑی۔ باپ کی بے جان لاشے جیسی حالت اس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ وہ صرف اپنے بوڑھے ہونٹوں کو جنبش دے سکتا تھا یا پھر آنکھوں کو دائرے کی صورت میں حرکت دیتا۔ سن بھی رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا مگر بولنے اور جسم کو حرکت دینے سے قاصر تھا۔

ستارہ بیگم بھی غم زدہ تھی، بیٹی کے کاندھے پر آہستگی سے اپنا ہاتھ رکھ کر ازراہ تشفی تھپتھپانے لگیں تو زہرہ ماں سے جا لگی اور رو پڑی۔ پھر ڈاکٹر اور حکیم صاحب سے باپ کی طبیعت وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ دونوں نے اسے دعا کی تلقین کی اور جلد صحت یابی کی تسلی بھی دی۔

ایک طرف کھڑی مہرالنسا ان دونوں ماں بیٹی کو چبھتی نگاہوں سے گھورے جا رہی تھی اور اندر ہی اندر جل بھن بھی رہی تھی، بالآخر جلن کا احساس بڑھا تو بولی۔ ”چودھری صاحب کو آرام کرنے دو... زیادہ دیر ان کے پاس بیٹھنا ان کے آرام میں خلل کا باعث بنے گا۔“ زہرہ بانو اس کی نظروں اور لہجے کی چبھن کا مطلب سمجھ گئی تھی.... مہرالنساء کو..... ان ماں بیٹیوں کی چودھری جی کے پاس موجودگی کھٹک رہی تھی، یوں بھی زہرہ منہ پھٹ تھی، سوتیلی ماں کی طرف دیکھ کر دانستہ بولی۔

”امی جی، کیا ممتاز بھائی ابھی تک نہیں پہنچے؟“ مہرالنسا کے لیے زہرہ کا یہ سوال ایک کاری وار ثابت ہوا تھا۔ اسے اس سوال پر اپنے صاحبِ فراش شوہر کے سامنے سبکی کا احساس ہوا تھا اور زہرہ نے ایسا دانستہ بھی کیا تھا۔ وہ کسی سے دبنے والی کہاں تھی؟

”ہاں، وہ... وہ... ممتاز بیٹا جاگیر کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں کہیں گیا ہوا ہے۔“ مہرالنسا بات بناتے ہوئے بولی۔ زہرہ بانو کو معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی معلوم کر چکی تھی کہ وہ کہاں سیر سپاٹے میں مصروف تھا مگر باپ کی حالت کے پیشِ نظر اسے مزید کسی غمناک دباؤ میں ڈالنے کے بجائے وہ چپ ہو رہی۔

سب کمرے سے نکل گئے مگر زہرہ بانو کافی دیر باپ کے سرہانے بیٹھی رہی۔ وہ مختلف آیاتِ کریمہ زیرلب پڑھ پڑھ کر باپ پر ہولے ہولے پھونک مارتی جاتی۔

تھوڑی دیر اور گزری تو اسے کمرے سے باہر کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ زہرہ کو غصہ آیا تاہم وہ آواز پہچان گئی تھی، یہ ممتاز خان تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اسے مہرالنسا کی آواز سنائی دی جو اپنے ”لاڈلے“ بیٹے سے سمجھانے کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"پتر ممتاز! اس وقت ذرا برداشت سے کام لے۔ وہ دونوں ناگن ماں بیٹی تیرے پیو سے سگی بن رہی ہیں۔ بڑی محبتیں جتا رہی ہیں دونوں، تیرا یوں غصے میں شور مچانا تیرے پیو کو بُرا لگے گا۔ اس ویلے اپنے نمبر بڑھانے کی کوشش کر۔"

لیکن ممتاز خان کو مہرالنسا نے جو زہر پلا رکھا تھا وہ اب سر چڑھ کے بولنے لگا تھا۔ وہ جواباً ماں سے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ "ماں جی! کچھ بھی ہو میں اس حویلی کا وارث ہوں۔ مجھے کسی کے سامنے نمبر بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ اس کتیا نے مجھے بدمعاشی دکھانی شروع کردی ہے۔ میرے آدمیوں کو پٹوایا ہے۔ آج وہ رہے گی یا میں، ہٹ جا میرے آگے سے ماں... میں اندر جا کے اس حرافہ سے نمٹتا ہوں۔"

"نہیں پتر، نہیں... صبر کر... سب ٹھیک ہونے والا ہے۔ بھول گیا اپنا منصوبہ...؟" ماں نے دھیمے لہجے میں اسے سمجھایا۔

زہرہ ٹھٹک گئی... پھر اس نے دانستہ کمرے سے نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا اور دروازے سے لگی رہی۔

"پتر! غصے سے کام بگڑ جائے گا۔ اس جوش کو نکالنے کے آگے مواقع ملتے رہیں گے مگر ابھی نہیں... جا پتر... شادشے موڈ ٹھیک کر اپنا اور اندر جا کے پہلے اپنے پیو کو اپنا چہرہ دکھا دے اور اس کمینی کے منہ نہ لگنا۔" زہرہ کو سخت طیش آ رہا تھا مگر اس نے بھی ہار نہ ماننے اور ان دونوں ماں بیٹے کے سینے پر مونگ دلنے کی قسم کھا رکھی تھی، فوراً دروازے سے ہٹ گئی اور دوبارہ آ کر خاموشی سے باپ کے سرہانے جا بیٹھی۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد ممتاز خان اندر داخل ہوا اور ایک شعلہ بار نگاہ باپ کے سرہانے بیٹھی زہرہ بانو پر ڈالتا ہوا گردن اکڑا کے آگے بڑھا اور انتہائی نخوت سے زہرہ بانو کو "ہٹ پرے" کہا۔ اس سلوک پر زہرہ بانو غصے کا کڑوا گھونٹ بھر کے رہ گئی مگر مصلحتاً کچھ نہ بولی اور خاموشی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہوگئی، تاہم اس دوران جب اس کی نگاہ باپ کے چہرے پر پڑی تو چونک پڑی۔ وہاں ناگواری کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ سمجھ گئی باپ کو بہن کے ساتھ بیٹے کا یہ ناروا رویہ بُرا لگا تھا۔

ممتاز خان باپ کے قریب کرسی پر براجمان ہوگیا۔ خانہ پری کے انداز میں چند ہمدردی کے الفاظ ادا کیے پھر اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے وقت ایک طرف خاموش کھڑی زہرہ کو پُرطیش نظروں سے گھورا پھر بولا۔

"تم ذرا باہر آؤ۔" کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

زہرہ بانو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس دوران اس کی ماں ستارہ بیگم بھی اندر آگئی۔ اس نے بھی شاید ممتاز خان کے زور زور سے بولنے کی آواز سن لی تھی اور چہرے سے متوحش سی نظر آرہی تھی۔

"امی جان! آپ بابا جانی کے پاس بیٹھیں۔" زہرہ نے ہولے سے کہا۔

"تت... تم کہاں جا رہی ہو بیٹی؟ وہ... وہ ممتاز... غصے میں نظر آرہا تھا۔ تجھ سے جھگڑا تو نہیں کرے گا؟" ستارہ بیگم پریشان ہو رہی تھی۔ زہرہ بانو نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے سے باہر آگئی۔ ایک ہال کمرے میں ممتاز خان اپنی ماں کے ساتھ کھڑا غصے سے بل کھاتا نظر آرہا تھا۔ زہرہ کو دیکھتے ہی پھٹ پڑا۔

"تم... تم... اپنی اوقات میں رہو سمجھیں... میں بہت برا آدمی ہوں۔ ذرا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔"

زہرہ بانو خائف ہوئے بغیر تن کر کھڑی رہی اور سنجیدگی سے بولی۔ "میں جانتی ہوں تم کتنے بُرے آدمی ہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ تم نے میرے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ وہ میری وجہ سے اب تک خاموش ہیں ورنہ تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

"انہوں نے بدمعاشی کی تھی۔ میرے پلانٹ کے منیجر شیرازی کو مارا پیٹا تھا۔ تمہارے بدمعاش کارندوں نے میری شہر والی کوٹھی بیگم ولا میں قبضہ جمانے کی کوشش کی تھی۔" زہرہ بانو بھی بے خوفی سے بولی۔ "تم بھی سن لو۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مجھے بھی آتا ہے۔ میں دبنے والی نہیں ہوں۔ اپنے حق کی حفاظت کرنا جانتی ہوں۔ تم غنڈے پال سکتے ہو تو میں بھی یہی سب کچھ کر سکتی ہوں۔" زہرہ بانو کے اس ترکی بہ ترکی جواب سے ممتاز خان کا پارا چڑھ گیا مگر مہرو نے اسے سنبھالا دیا اور زہرہ سے ناک بھوں چڑھا کر برہمی سے بولی۔

"اے لڑکی! تمہیں یہ سب زیب نہیں دیتا، عورت ذات ہو عورت بن کر رہو۔"

اسی دوران ستارہ بیگم بھی شوہر کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ مہرو سے بولی۔ "بہن! جہاں ظلم و زیادتی اور ناانصافی پروان چڑھے گی تو ایسے حالات بھی خود بہ خود پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تم بھی ذرا اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، وہ کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش نہ کرے... یوں بھی یہ وقت ایسی

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ اندر چودھری جی بیمار پڑے ہیں۔ ہمیں آپس میں لڑنے جھگڑنے کے بجائے ان کی جلد صحت یابی کے لیے دعائیں کرنی چاہئیں۔“

مہرالنسا نے نفرت بھری نظروں سے اپنی سوکن کو گھورا اور پھر غصے سے دانت پیس کر بولی۔ ”میں خوب سمجھتی ہوں تم دونوں میاں بیٹی کی مکاری کو۔“ پھر اپنے لاڈلے سے مخاطب ہوکر بولی۔ ”چلو بیٹا! ان کے منہ نہ لگو، یہ تو ہمیں حویلی میں نیچا دکھانے کا موقع ڈھونڈتی رہتی ہیں۔“

ستارہ بیگم کو اپنی سوکن کی اس بات پر دکھ ہوا۔ بڑی ملائمت آمیز رسانیت سے بولی۔ ”مہرو بہن! خدا گواہ ہے کہ میں نے یا میری بیٹی زہرہ نے آپ لوگوں کے خلاف کبھی بھی اپنے دل میں بغض نہیں رکھا۔ ہم تو خود محبت اور امن چاہتے ہیں۔“

”اونہہ... محبت اور امن...“ مہرو نے حقارت سے سوکن کی طرف دیکھ کر ہونٹ سکیڑ کر زہریلے لہجے میں کہا۔ ”دوسروں کے حق پہ ڈاکا ڈالنے والے بھلا امن اور محبت کیا جانیں۔ چلو بیٹا۔“ مہرو نے بیٹے کا شانہ تھپتھپایا۔ ممتاز، زہرہ کو معاندانہ نظروں سے گھورتا ہوا غصے سے پاؤں پٹخ کر چلا گیا۔

یہ اس سے اگلے دن کا ذکر تھا۔ زہرہ بانو اپنی سفید پوٹھوہار جیپ میں حویلی سے روانہ ہوئی۔ جیپ وہ خود ڈرائیو کررہی تھی۔ دو مسلح گارڈز عقبی سیٹوں پر موجود تھے۔ وہ حسب معمول اپنی زمینوں کی طرف جارہی تھی۔ منشی فضل محمد کی آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ ساتھ نہیں تھا۔ جیپ کھیتوں کے درمیان بل کھاتے کچے راستے پر دوڑی جارہی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد وہ زمینوں پر پہنچی اور معاملات کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ دیر ہوگئی۔ شام ڈھلنے تک اس نے ایک فلورمل کا دورہ کیا اور آخر میں سالونٹ پلانٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔

گاؤں، دیہات میں ویسے بھی سرِشام ہی رات کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس وقت بھی اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ زہرہ بانو تھکاوٹ سی محسوس کررہی تھی اس لیے ڈرائیونگ سیٹ اب اس کے ایک گارڈ نے سنبھال لی تھی۔ وہ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھی۔ وہ ابھی پلانٹ سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی مسافت پر تھی کہ ایک کیکر کے گھنے جھنڈ والے تنگ موڑ سے جیپ گھومی اور یکلخت فضا میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری۔ زہرہ بانو غیر ارادی طور پر فوراً نیچے جھک گئی۔ کئی گولیاں زنازٹ... جیپ کی باڈی میں پیوست ہوگئیں۔ ونڈ اسکرین دھماکے سے ٹوٹی... پھر ایک لرزہ خیز چیخ ابھری۔ یہ ڈرائیور کی چیخ تھی۔ اسی وقت ٹائر برسٹ ہونے کا بھی دھماکا ہوا۔ زہرہ بانو کے حلق سے چیخیں خارج ہوگئیں۔ موڑ کاٹتے ہوئے جیپ چونکہ ہلکی رفتار میں تھی اس لیے توازن بگڑنے کے باعث الٹنے سے بچ گئی تاہم ایک جھنڈ میں جا گھسی۔ دوسرے گارڈ نے جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے اندھا دھند فائرنگ کردی جبکہ نامعلوم حملہ آوروں کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ جاری تھی۔

”بیگم صاحبہ! آپ دروازہ کھول کر باہر نکلنے کی کوشش کریں، جلدی...“ گارڈ نے چلاّ کے کہا۔ اس وقت زہرہ بانو کا چہرہ خون سے بھر گیا۔ ایک برسٹ نے گارڈ کا بھیجا اڑا دیا تھا۔ زہرہ بانو دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ تاہم اس نے اپنے مختل پڑتے حواسوں پر مقدور بھر قابو پایا اور ایک دروازے کو لات مار کے کھولا پھر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل رینگتی ہوئی باہر تاریکی میں کود گئی۔ فائرنگ جیپ کے عقب سے اور دوسرے رخ سے ہورہی تھی۔ لہٰذا نیچے اترتے ہوئے اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا اس طرف گھنا جھنڈ تھا۔ وہ اس کے اندر جا دبکی۔ فائرنگ یکلخت بند ہوگئی۔ ایک طوفان بدتمیزی تھا جس کے تھمتے ہی چہار اطراف دھڑکتا ہوا سناٹا طاری ہوگیا تھا... زہرہ بانو کو اپنے دل کی دھڑکنیں تک سنسناتی کنپٹیوں پر سنائی دینے لگیں۔ وہ دم سادھے ادھر ہی دبکی رہی۔ مگر جانتی تھی کہ وہ یہاں زیادہ دیر تک نامعلوم حملہ آوروں کی نظروں سے نہیں بچ سکتی تھی۔ اب تک اسے اندازہ ہوچلا تھا کہ نامعلوم دشمن اس کے خون کے پیاسے ہورہے ہیں جن کے ہاتھوں اسے اپنے دونوں گارڈز کی بے گناہ اور عبرت اثر موت کا دکھ برداشت کرنا پڑا۔ سرِدست تو زہرہ بانو کو اپنی زندگی کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

”اصل شکار بچ کر بھاگ نکلا ہے استاد۔“ دفعتاً ایک غراتی ہوئی آواز دم بہ خود سناٹے میں اُبھری۔

زہرہ بانو کے دل کی دھڑکنیں جیسے یکلخت رک گئیں۔ اس نے بھانپ لیا کہ اسی کے بارے میں کہا جارہا تھا۔

”کدھر گئی وہ؟ آسمان کھا گیا۔ ڈھونڈو اسے اور نظر آتے ہی گولی ماردو۔ وہ زندہ بچ گئی تو ہمارے لیے مصیبت کھڑی کردے گی۔“ اس آواز کو پہچان کر زہرہ بانو کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ خونخوار اور غراتی ہوئی آواز ممتاز خان کے کارپرداز وسیم عرف چھیما کی تھی۔ شبہ تو زہرہ بانو کو

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پہلے ہی ہو چکا تھا کہ یہ حملہ کون کروا سکتا ہے تاہم اب اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ زہرہ بانو کے دل و دماغ میں اب خوف کے ساتھ ایک سلگتے ہوئے جوش کی ملی جلی کیفیات پیدا ہونے لگی تھیں لیکن ابھی اسے ان خونی ہرکاروں سے اپنی جان بچانا تھی اور یہی دہشت اس پر زیادہ غلبہ پائے ہوئے تھی۔ تاہم اس مشکل گھڑی میں اس نے اللہ کو یاد کیا اس سے مدد کی دعا مانگی۔ پھر وہ کچھ سوچنے سمجھنے لگی تو اسے احساس ہوا، اس کی جیپ کے گرد جو مسلح انسانی ہیولے نظر آرہے تھے ان کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں تھی اور ان سب کی توجہ ابھی جیپ کے معائنے پر ہی مرکوز تھی۔ چنانچہ ایک راستہ خالی تھا وہ بے آواز مگر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اس طرف رینگ گئی۔

اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ اپنا پستول نہیں لائی تھی۔ یوں بھی وہ کبھی کبھار ہی اسے اپنے پاس رکھتی تھی۔ پھر اسے اپنے مردہ گارڈ کی گن سنبھالنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ کیونکہ یہ سب اس کے ساتھ آج پہلی بار اور اچانک ہوا تھا۔ بہرطور، وہ جس طرف رینگ کر نکلی تھی اس کے دوسری جانب قدرے نشیبی ڈھلان تھی، جھکتی شام کی بڑھتی سیاہی اسے کسی حد تک دشمنوں کی خونی نظروں سے اب تک بچائے ہوئے تھی۔ وہ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نسبتاً کچے کے مختصر کھلے راستے پر تیزی کے ساتھ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل رینگتی ہوئی دوسری جانب نشیب میں اتر گئی۔ یہاں سے اسے ذرا دور ملگجی سی تاریکی میں سالونٹ پلانٹ کی بتیاں نظر آرہی تھیں۔ فرطِ جوش سے اس کا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اگر وہ کسی طرح یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو جان بچنے کے امکانات روشن ہو سکتے ہیں۔ مایوسی کے اندھیاروں میں اُمید کی ٹمٹماتی جوت کیا جگی کہ زہرہ بانو کو اپنے شکستہ وجود میں جیسے ایک نئی طاقت کی لہریں دوڑتی محسوس ہوئیں۔ دشمن بھی دور نہیں تھے، کسی وقت بھی ملک الموت کی طرح اس کے سر پر پہنچ سکتے تھے۔ اور وہ ان کی متوقع گرفت سے باہر بھی نہیں تھی مگر امید کی ہلکی روشنی نے زہرہ بانو کی ہمت اور حوصلے کو سوا ضرور کر دیا تھا اور پھر اللہ کا نام لے کر اس نے قدِ آدم خودرو جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ جھنڈ زیادہ طویل نہ تھا۔ آگے جا کر چٹیل اور بنجر میدان آگیا۔ زہرہ بانو کی سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کے نہیں دیکھا تھا، اس کی حتی الامکان یہی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح ان خون کے پیاسے بھیڑیوں سے بچ کر پلانٹ کی حدود میں داخل ہو جائے۔ چٹیل میدان میں کہیں کہیں ٹیلے ٹبوں کے آثار نظر آتے تھے، مگر وہ ذرا فاصلے پر تھے۔ وہ ان کی آڑ تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس نے دوڑ لگا دی۔ بھیانک اور یقینی موت اس کے تعاقب میں تھی، اور وہ اس سے بچنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروفِ کار۔۔۔ دفعتاً عقب سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آواز اُبھری اور زہرہ بانو چیخ مار کر گری۔

خوف و دہشت کی فضا میں زہرہ بانو کی اضطراری اور غیر اختیاری حرکت تھی اور شاید اس حرکت کے باعث وہ عقب سے داغے ہوئے گولیوں کے برسٹ سے بال بال بچی تھی۔ گرتے ہی وہ بھربھری مٹی والی زمین پر دور تک گھسٹتی چلی گئی مگر ہمت اس نے پھر بھی نہیں ہاری اور ایک بار پھر اٹھ کر دوڑی۔ عقب میں شاید دور کہیں موجود متعاقب خونی بھیڑیوں نے اس کا تاریکی میں متحرک ہیولا تاڑ لیا تھا۔ زہرہ بانو پر اس وقت ہر ممکن طور پر اپنی جان بچانے کا جنون سوار تھا اور اس جوش تلے وہ دوڑتی ہوئی بالآخر ایک ٹیلے کی آڑ تک جا پہنچی۔ رک کر اس نے عقب میں دیکھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس تیزی

فضول باتیں

شوہر نے اپنی بیوی کو اسپتال سے میسج کیا:

”صبح دفتر کے قریب ایک وین نے سڑک پار کرتے ہوئے مجھے زبردست ٹکر مار دی۔ داہنی پنڈلی اور ایک بازو ٹوٹ گیا۔ سر میں دس ٹانکے لگائے گئے ہیں۔۔۔ پسلیوں پر سوجن تھی۔ ایکسرے سے پتا چلا ہے کہ تین پسلیاں بھی ٹوٹی ہیں۔ چہرے پر بھی زخم آئے ہیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ مجھے کم از کم چار ہفتوں کے لیے اسپتال کے بستر پر رہنا ہوگا۔ ٹکر لگتے ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ بے چاری زویا نے بڑی مشکل سے مجھے ایک ٹیکسی میں ڈال کر اسپتال پہنچایا۔ وہ مدد نہ کرتی تو جریانِ خون سے میں مر ہی گیا ہوتا۔ وہ ابھی بھی میری دیکھ بھال کر رہی ہے۔ جلدی آؤ تاکہ وہ بے چاری جا سکے۔“

بیوی نے جواب میں میسج کیا۔ ”فضول باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ یہ کمینی زویا کون ہے جسے بے چاری کہے جا رہے ہو؟“

زاہد صادق، لاہور

Copied From Web
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے درمیانی فاصلہ گھٹتی ہوئی ٹیلوں کی طرف آرہی تھی۔ جان جانے کا خوف ایک بار پھر اسے جکڑنے لگا۔

وہ جلدی سے ایک ایسے ٹیلے کی ''ڈھلوانی آڑ'' میں جا دُبکی جہاں خودرو جھاڑیوں کے متعدد جھنڈ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ سانس تک روکے وہاں دُبکی رہی۔ مگر دھونکنی کی طرح چلتی تیز تیز سانسوں کی ڈور کو کھینچنا اس کے لیے مشکل تھا۔ زہرہ اس کے آگے نکل جانے کی دعائیں مانگنے لگی مگر دشمن بھی کائیاں تھا۔ گاڑی ایک پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی۔ وہ اس کے سامنے، جدھر وہ خودرو جھاڑیوں کی آڑ میں سینے کے بل تقریبا لیٹی ہوئی تھی، ذرا دور جا کر رک گئی۔ پھر دروازے کھلنے کی دھمک ابھری، زہرہ بانو کی دھڑکتی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ سب مسلح تھے اور نیچے اتر آئے، ان میں چھیما بھی تھا۔ دشمن کو قریب پا کر زہرہ بانو کا حلق سوکھنے لگا۔ چھیما کی تحکمانہ آواز ابھری۔ ''وہ ادھر ہی کہیں قریب چھپی ہوئی ہے، پھیل جاؤ چاروں طرف۔''

وہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ساتھ وہیں کھڑا رہا۔ باقی تین چار ساتھی، دائیں بائیں پھیل گئے۔ شکر تھا کہ عقب میں کسی نے قدم نہیں بڑھائے تھے۔ زہرہ بانو کا ذہن ایک بار پھر اس مشکل گھڑی سے نکلنے کے لیے تیزی سے کام کرنے لگا۔

دفعتاً اسے اپنا دل رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ چھیما بلند آواز میں اپنے ساتھ کھڑے حواری سے کہہ رہا تھا۔

''ادھر آؤ... ہم عقب کا جائزہ لیتے ہیں۔'' اور پھر وہ اس سمت مڑا جدھر زہرہ دبکی ہوئی تھی۔ بے رحم موت کو ایک بار پھر سامنے دیکھ کر زہرہ کا دم خشک ہونے لگا۔ اس نے پُرسوچ انداز میں اپنے سوکھے پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تب ہی ایک خیال بہ سرعت اس کے اندر ''کلک'' ہوا۔

اس نے نہایت ہوشیاری اور چابک دستی کے ساتھ ان دونوں کے قریب پہنچنے سے پہلے اپنی جگہ بدلی اور رینگتی ہوئی ٹیلے کا گویا طواف کرتی ہوئی اس سمت آن پہنچی جہاں سے محض چند قدموں کے فاصلے پر دشمنوں کی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ زہرہ کا دل ایک بار پھر پرجوش انداز میں زور سے دھڑکا، گویا تقدیر نے چند پل کے لیے اس کے ساتھ یاوری کی تھی۔ اس کا جی چاہا وہ دیوانہ وار دوڑ کے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھالے اور جیپ میں جا سوار ہو جائے کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ وہ بُری طرح دہل گئی۔ پھر جلد ہی اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کی۔ چھیما اور اس کا ساتھی، اریب قریب کی جھاڑیوں میں اندھادھند فائرنگ کر رہے تھے کہ اگر ان کا شکار ادھر کہیں چھپا بیٹھا ہو تو اس کا وہیں قصہ پاک ہو جائے، زہرہ بانو اگر بروقت اپنی جگہ نہ چھوڑتی، تو یہ اندھی فائرنگ وہیں جھاڑیوں میں اس کا کام تمام کر دیتی۔

زہرہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے تھکے ماندہ وجود میں ایک جنونانہ جوش کی طاقت مجتمع کی اور لینڈ کروزر کی طرف دوڑ لگائی، جب تک چھیما اور اس کا ساتھی اس طرف متوجہ ہوتے، وہ پھرتی کے ساتھ لینڈ کروزر کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھی۔ انجن اسٹارٹ تھا گیئر بدلنے کی دیر تھی، کامیابی کے جوش سے اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اس نے گیئر بدلا اور ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ لینڈ کروزر بپھرے ہوئے درندے کی طرح غرائی اور ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھی۔ پھر زہرہ کو کچھ نہ سوجھا۔ وہ اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ اس پر گولیوں کے پورے پورے برسٹ فائر کیے گئے اور بدقسمتی سے ایک بھولی بھٹکی گولی لینڈ کروزر کے بیک اسکرین کو چٹخاتی ہوئی زہرہ کے دائیں شولڈر اور ہنسلی کی ہڈی کے بیچ میں پیوست ہوگئی۔ زہرہ بانو کو یکلخت ایک جھٹکا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے جلتی ہوئی سلاخ گھسیڑ دی ہو۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ ابھری۔ اسٹیئرنگ پر ہاتھ بہکے۔ بدمست ہاتھی کی طرح دوڑتی پرانے ماڈل کی لینڈ کروزر ڈولنے لگی اور کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ الٹ جاتی۔ مگر زہرہ بانو اپنی ''لب بام'' فتح کو... ہاتھ سے جانے کیسے دیتی؟ اس نے فوراً درد کی اذیت کو پی لیا اور ڈولتی ہوئی لینڈ کروزر کو سنبھالا دیا۔ یوں بھی ناپختہ اور کچے ناہموار راستے پر وہ بری طرح ہچکولے بھی کھا رہی تھی۔ اگر وہ جلد اپنے حواس اور اسٹیئرنگ پر گرفت نہ جماتی تو یقیناً لینڈ کروزر الٹ چکی ہوتی۔

سالونٹ پلانٹ کی وسیع عریض باؤنڈری وال کراس کرتی ہوئی گاڑی آبادی کی طرف ہولی تھی مگر تب تک زہرہ کی اپنی حالت غیر ہونا شروع ہوگئی تھی۔ وجہ دائیں کاندھے کا زخم اور اس سے تیزی سے بہنے والا خون تھا اور جریانِ خون کے باعث زہرہ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی، وہ ایک نازک اندام اور کم عمر دوشیزہ تھی۔ پہلے کبھی وہ ایسے حالات اور تکلیف سے نہیں گزری تھی نتیجتاً غشی اور نقاہت کے باعث بار بار اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگتا اور چکر آنے کی وجہ سے کئی بار اس کا سر اسٹیئرنگ پر ڈھلک کر زور سے ٹکرایا بھی تھا۔

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آبادی پر سناٹا طاری تھا ہر سو تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچے اور گارے مٹی کے گھروں کے صحن ویران پڑے تھے۔ دروازے بند تھے، لینڈ کروزر ان کے سامنے سے دوڑتی ہوئی گزر رہی تھی، ایک موقع پر زہرہ بانو کی ہمت جواب دینے لگی اور اس نے متوقع حادثے سے بچنے کے پیش نظر فوراً بریک پر پاؤں رکھ دیے۔ وہ نڈھال سی ہو رہی تھی، گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکی تھی۔ سر اسٹیئرنگ پر عین ہارن کے اوپر آن ٹکا تھا۔ رات کی دم بخود خاموشی میں لینڈ کروزر کا ہارن مسلسل چیخنے لگا۔

☆☆☆

ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک بالکل اجنبی جگہ پر پایا۔ پہلے تو ذہن پر غنودگی سی طاری رہی۔ مگر دھیرے دھیرے حواس بحال ہوئے۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا یارا ہوا تو اس نے خود کو ایک صاف ستھرے بستر پر لیٹے پایا تھا۔ وہ کمرا بھی زیادہ بڑا نہ تھا، کچی دیواریں تھیں جن میں فریم کی ہوئی کچھ افراد کی بلیک اینڈ وائٹ تصاویر تھیں۔ آہستہ آہستہ اسے اپنے اوپر بیتے ہوئے حالات و واقعات یاد آنے لگے۔ پھر درد کی ایک ٹیس بھی اسے اپنے دائیں کاندھے پر محسوس ہوئی۔ اس نے زخم چھونے کی بے اختیار کوشش چاہی تو اس کے حلق سے ہلکی سے کراہ خارج ہوگئی۔ اس نے دیکھا اس کے زخم پر مرہم پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کمرے میں ہلکا پھلکا عام گھریلو سامان پڑا نظر آرہا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی دوسرا کمرے میں موجود نہ تھا۔ البتہ اس کے پیروں کی طرف دروازہ تھوڑا بھڑا ہوا تھا جس کی درمیانی متوازی لکیر سے باہر صحن میں ہونے والی روشنی اسے نظر آئی، ایک بار پھر اس کے دل کو انجانے خطرات اور اندیشناک وسوسوں نے گھیر لیا۔ اسے پیاس محسوس ہوئی، حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

وہ دھیرے سے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھنے کی سعی کرنے لگی مگر کامیاب نہ ہوسکی۔ کاندھے کے زخم سے دوبارہ ٹیس ابھری اور وہ پھر بے سدھ ہوکر چارپائی پر لیٹ گئی۔ قریب تپائی پر کچھ دوائیں بھی رکھی تھیں۔

”کک... کون؟ کک... کوئی ہے؟ کک کون ہے یہاں... میں کہاں ہوں؟“

وہ متوحش ہو چلائی تو باہر صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ اُبھری، پھر دروازہ پورا کھلا۔ اس نے لیٹے لیٹے اپنے پیروں کی سمت دروازے کی طرف دیکھا اور جوان خوبرو مرد کو دیکھ کر اس کا دل ایک لمحے کو جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ نوجوان کے چہرے پر میٹھی مسکراہٹ تھی۔

وہ... وہی بہادر نوجوان تھا۔ لئیق شاہ... لمبا چوڑا، مردانہ وجاہت کا حامل... جو اس کے سالوینٹ پلانٹ کا مزدور لیڈر تھا۔

”تت... تت... تم... مم... مجھے یہاں... کیسے لائے؟ میں تو... میں تو...“ حیرت و الجھن کی ملی جلی کیفیات اور کمزوری کے باعث اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی اور ہانپنے لگی۔ لئیق شاہ چند قدم چلتا ہوا اس کے قریب آیا اور ملائمت سے بولا۔

”بیگم صاحبہ! آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔ یہاں کوئی مائی کا لعل آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا... آپ پریشان نہ ہوں۔“

لئیق شاہ کے ہمدردانہ اور پُرخلوص لہجے اور الفاظ نے اسے متاثر کیا۔ بے اختیار نہ جانے کس جذبے کے تحت زہرہ بانو کے نرم لبوں پر الوہی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کی کشادہ آنکھوں کے ڈوروں میں رمزیہ گہرائی کا شائبہ بھی اُمڈ آیا۔ بولی۔ ”تمہارا شکریہ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں یہاں کیسے اور...؟ اور تم...“

”آپ کو کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں بیگم صاحبہ۔“ وہ بولا۔ ”لگتا ہے آپ کے ساتھ بہت بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ آپ کی گاڑی جس گھر کے دروازے کے سامنے رکی تھی اس کے صحن میں، میں چارپائی ڈالے لیٹا تھا کہ باہر مسلسل بجنے والے ہارن پر چونک کر باہر نکلا تو آپ کو دیکھ کر مجھے شدید حیرت اور تشویش بھی۔ آپ زخمی تھیں اور شاید خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ آپ کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا؟“

مختصراً صراحت بیان کرنے کے بعد لئیق شاہ نے آخر میں پوچھا۔ اس کی بات سُن کر زہرہ بانو بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی اور پھر چند ثانیوں بعد اس نے اپنے ساتھ پیش آمدہ حالات کے بارے میں دھیرے دھیرے اسے تفصیل سے بتا دیا جسے سن کر لئیق شاہ کے چہرے پر پہلے تو سخت تشویش کے آثار نمودار ہوئے، اس کے بعد اس کی بڑی بڑی چمک دار آنکھوں میں غیظ و غضب کے شعلے سے پھوٹنے لگے اور پھر وہ اسی جوش تلے جیسے خود کلامیہ بڑبڑایا۔

”یہ اچھا نہیں کیا... چھوٹے چودھری نے... میں اس مردار بدذات جیسے کا بُرا حشر کردوں گا۔“

ایک بار پھر اپنے لیے اس گرانڈیل خوبرو مگر دیہاتی

Copied From Web
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نظر آنے والے لئیق شاہ کو قہر بار کیفیات میں پاکر زہرہ بانو کے دل میں، ایک عجیب سے تفاخر کا احساس جاگا۔ تاہم وہ بولی۔ ''میری گاڑی باہر موجود ہوگی؟ وہ ''کھرا'' تلاش کرتے ہوئے یہاں بھی آسکتے ہیں۔ تم مجھے کسی طرح حویلی پہنچادو... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلاسکتی۔''

اس کی بات سُن کر لئیق شاہ ایک دم بے چین سا ہوگیا، بولا۔ ''بیگم صاحبہ! یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟ میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔ آپ تو ہم غریب مزدوروں کے لیے ایک مہربان اور ہمدرد مالک ثابت ہوئی ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں جہاں آپ کہیں گی، میں بہ حفاظت آپ کو وہاں اپنی جان پر بھی کھیل کر پہنچادوں گا لیکن آپ اس بات سے بے فکر ہوجائیں کہ وہ بدذات کھرا ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔''

معاً دروازے کے پاس کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز ابھری اور دو عمر رسیدہ مرد اور خاتون اندر داخل ہوئے۔ مرد نے جسم پہ صدری پہن رکھی تھی اور نیچے پرانی سی چار خانوں والی لنگی، عورت نے بھی عام سا گھریلو لباس زیب تن کررکھا تھا۔

''یہ... میرے ماں باپ ہیں۔'' لئیق شاہ نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زہرہ بانو سے کہا۔

''سلام۔'' زہرہ نے چارپائی پر لیٹے لیٹے... تکیے پر دھرے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر کہا۔

''جیتی رہے پتری... طبیعت تو ٹھیک ہے نا اب تیری؟'' لئیق شاہ کے باپ نے پُرشفقت لہجے میں کہا۔ اس کی ماں بھی زہرہ بانو کے سرہانے آن بیٹھی اور ہولے سے اپنا ایک ہاتھ زہرہ کی پیشانی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''تاپ (بخار) تو اتر گیا۔ حکیم جی نے پٹی تو ٹھیک باندھی۔''

''میں ٹھیک ہوں ماں جی اب۔'' زہرہ نے ہولے سے لئیق شاہ کی ماں کو مخاطب کرکے کہا پھر لئیق شاہ کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا تو وہ اس کا مطلب سمجھ کر بولا۔

''بیگم صاحبہ! آپ آرام کریں۔ صبح ہوتے ہی میں آپ کو حویلی چھوڑ دوں گا، آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں۔''

''میری امی جان پریشان ہورہی ہوں گی۔'' زہرہ نے ہولے سے مگر متفکر لہجے میں کہا۔ لئیق شاہ نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔ اس کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔''

لئیق شاہ نے زہرہ بانو کو گاڑی کا دروازہ کھول کے اس میں سوار کرادیا پھر خود بھی دوسری جانب سے گھوم کر اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

کچھ دیر بعد یہ لوگ حویلی پہنچ گئے۔ وہاں زہرہ بانو کی ڈھونڈ پڑی ہوئی تھی۔ ستارہ بیگم اپنی بیٹی کو دیکھ کر پُرسکون تو ہوئی مگر پھر اسے زخمی حالت میں دیکھ کر سخت متفکر اور تشویش زدہ بھی ہوگئی۔

زہرہ بانو نے انہیں ساری بات بتادی۔ مکار مہر النسا بھی ماں بیٹی کا ''حال'' جاننے کے لیے وہاں آن موجود ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی الجھن طاری تھی۔ تاہم بعد میں زہرہ بانو نے اپنے خدشات سمیت اکیلے میں ماں کو ساری حقیقت بیان کردی۔

ادھر لئیق شاہ نے واپس جانے کی اجازت چاہی تو زہرہ بانو نے ایک ملازم کو گاڑی میں اسے گھر تک چھوڑ آنے کا کہہ دیا۔ رخصت ہوتے وقت زہرہ نے لئیق شاہ کا شکریہ بھی ادا کیا۔

واپس آکے لئیق شاد چارپائی پر پڑے پڑے نیند کو مہربان کرنے کے لیے کروٹیں بدلتا رہا مگر نیند تھی کہ اس کی آنکھوں سے کوسوں دور... وہ اس مزاج کا آدمی تھا نہ اس قبیل کا کہ کسی نوجوان حسینہ پر یوں بری طرح فریفتہ ہوجاتا مگر محبت کی ایک اپنی خوشبو اور کشش ہوتی ہے بلکہ اسے ''بے اختیاری'' کہا جائے کہ لئیق شاہ کی آنکھوں کے سامنے بار بار زہرہ بانو کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کئی بار اسے خود سے ہمکلام ہونا پڑا۔ وہ کیوں بیگم صاحبہ کے بارے میں ایسا سوچ رہا تھا۔ کیا اسے ان کے اور اپنے درمیان واضح ''فرق'' نہیں نظر آرہا تھا؟ کس قدر طبقاتی تفاوت تھا دونوں کے درمیان۔ اس طرح پوری رات آنکھوں میں کٹ گئی، صبح بے دلی سے چائے پاپا کھا کے وہ جب کام پر نکلنے لگا تو ماں کی نظروں نے اس کے چہرے کی رت جگے کی تھکاوٹ بھانپ لی اور پیار سے بولی۔

''پتر لئیق! تو ساری رات کا جگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے نیند ٹوٹنے کے بعد دوبارہ نہیں سوسکا ہے، آج چھٹی کرکے آرام کرلے۔''

''نہیں ماں جی، میں چھٹی نہیں کرسکتا... چلتا ہوں۔'' ماں سے کہہ کر وہ چلا گیا۔

آج واقعی اس کا کام پر بھی دل نہیں لگ رہا تھا مگر بے دلی سے وہ کام میں مصروف رہا۔ ادھر زہرہ بانو کے ساتھ بھی کم و بیش یہی صورتِ حال تھی بلکہ کچھ سوا ہی تھی، وہ پُرجوش

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کٹیلا اور کڑیل نوجوان لئیق شاہ اس کے سنگھاسنِ دل پر تو اسی دن ہی جاگزیں ہو چکا تھا جب اس نے پہلی بار پلانٹ کے احاطے میں اسے مخاطب ہوتے دیکھا تھا پھر اب شبِ گزشتہ کی تازہ کارا اور اس قدر قربت کی حامل ''مڈبھیڑ'' نے تو زہرہ بانو کو اور بھی دلی و جذباتی طور پر اس کے قریب کر دیا تھا۔ وہ صبح ہونے تک بھی اس اہم اور خوں ریز جان لیوا واقعے کی متعلقہ تھانے میں رپورٹ کروانا بھی بھولی رہی۔ تاہم اسے جب یاد آیا تو وہ خود ہی تھانے جا پہنچی۔ وہی سب انسپکٹر جہانزیب اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ مہر النسا نے اسے ساری بات بتائی، وہ فوراً حرکت میں آیا اور جائے وقوعہ پر اس نے زہرہ کی جیپ اور اس کے بدنصیب گارڈز کی لاشیں بھی دریافت کرلیں۔ چھیما اور اس کے نامعلوم ساتھیوں کے خلاف ایف آئی آر کٹ گئی۔ زہرہ تو براہِ راست ممتاز خان کے خلاف بھی کارروائی کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت ہمراہ ستارہ بیگم اور کچھ لوگ بھی تھے۔ تاہم ستارہ بیگم نے ہی انسپکٹر جہانزیب کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد ممتاز خان کے خلاف مصلحتاً پرچہ نہیں کٹوایا۔ مشورے کے مطابق ممتاز خان پر سرِدست پرچہ کٹوانا مناسب نہ ہوتا۔ بات لمبی ہو سکتی تھی اور کیس بھی طول پکڑ جاتا اور کمزور بھی۔ چھیما، ممتاز خان کا دستِ راست تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد اس کے منہ سے یہ اگلوانا پولیس کا کام ہوتا کہ اس نے یہ سب خونی کارروائی کس کے حکم پر کی تھی۔ یوں بھی بعد میں بہت سے شواہد مل جاتے کہ وسیم عرف چھیما کس کا آدمی تھا، وغیرہ۔

چھیما کو پولیس ڈھونڈنے لگی اور بالآخر اسے اس کے چند ساتھیوں سمیت گرفتار کرلیا گیا۔ پھر جب زہرہ بانو کے سامنے ان سب کی شناختی پریڈ کروائی گئی تو اس نے چھیما سمیت ان سب کو پہچان لیا۔

زہرہ بانو مطمئن تھی۔ یہ اس سے اگلے دن کا ذکر ہے۔ زہرہ بانو اپنے علاج کی خاطر شہر آئی ہوئی تھی اور بیگم ولا میں مقیم تھی۔ البتہ چھیما اور اس کے ساتھیوں کو متوقع قرار واقعی سزا دلوانے کے لیے اس نے منشی فضل محمد اور لئیق شاہ کو سخت ہدایات دی تھیں کہ وہ روزانہ تھانے جاکر مذکورہ مجرموں کی سزا وغیرہ کے سلسلے میں بلاناغہ انسپکٹر جہانزیب سے ملتے رہیں۔ ادھر بیگم ولا میں پہلے سے محافظ گارڈز کے سربراہ کی حیثیت سے مقیم کمیل دادا کو جب زہرہ بیگم کے زخمی ہونے اور اس واقعے کا پتا چلا تو وہ سخت تشویش اور تفکر کا شکار ہو گیا۔

''بیگم صاحبہ! آپ بُرا نہ منائیں تو اب مجھے یہاں

دنیا کے کسی بھی کونے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چھوڑ کر مت جائیں۔ یہ وقت کی ضرورت ہے کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔“

زہرہ بانو نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اس کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”میری حفاظت کے لیے اللہ کافی ہے۔ جب موت آنی ہوگی تو کیا تمہارے ہوتے ہوئے نہیں آئے گی؟“ بیگم صاحب کی بات پر کبیل دادا لاجواب ہوگیا۔

وہ بولا۔ ”بیگم صاحب! اللہ تعالیٰ تو سب کا پالن ہار ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انسان آنکھیں بند کر کے آگ کے دریا میں چھلانگ لگا دے۔ اپنی حفاظت کا بھی آخر حکم اللہ نے ہی دیا ہے۔ میرا خیال ہے میں یہاں خود کو ضائع کر رہا ہوں۔“

”کیسے ضائع کر رہے ہو تم خود کو؟“ زہرہ بیگم نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”تم یہاں کسی جھونپڑی کی حفاظت پر مامور نہیں کیے گئے ہو کبیل! یہ کروڑوں کی پراپرٹی ہے جس پر میرے اپنے حریصانہ نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم ایک بہادر اور جی دار انسان ہو۔ اس لیے تو میں نے تمہاری ہمت تمہاری دلیری اور جاں نثاری کو پہلے ہی بھانپتے ہوئے تمہیں یہاں متعین کر رکھا ہے۔“

”پر بیگم صاحب! آپ کی جان اس کوٹھی سے تو زیادہ قیمتی ہے نا۔“ کہتے ہوئے کبیل دادا نے گہری نظر بیگم صاحب کے حسین چہرے پر ڈال کر جھکا لی۔

”تم اس کی فکر نہ کرو کبیل دادا۔۔۔ ایک تمہارے جیسا ہی بہادر اور وفادار ساتھی نئے پنڈ میں بھی موجود ہے اور مجھے تم دونوں پر ہمیشہ فخر رہے گا۔“ اس کی بات سن کر کبیل دادا چپ ہو رہا۔

زہرہ بانو نے آخر میں اس کی بھی تعریف کرتے ہوئے اس فخر کا اظہار کیا تھا کہ اس نے بڑی جی داری اور بہادری کے ساتھ بیگم ولا سے ممتاز خان کے حواریوں کا نہ صرف قبضہ چھڑایا تھا بلکہ انہیں مار بھگایا بھی تھا۔

بیگم صاحب کے لبوں سے اپنی تعریف سن کر کبیل دادا بالکل بچوں کی طرح خوش ہوگیا۔

زہرہ بانو تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی تیسرے دن لئیق شاہ نئے پنڈ سے سیدھا بیگم ولا پہنچا۔

وہاں متعین گارڈز کو کبیل دادا کی طرف سے سخت تاکید تھی کہ جو بھی نووارد آئے سب سے پہلے اسے اس کے پاس لایا جائے۔ لہٰذا لئیق شاہ کو سب سے پہلے کبیل دادا کے کمرے میں لایا گیا جو بیگم ولا کے وسیع و عریض احاطے کے بڑے گیٹ کے قریب ہی بنا ہوا تھا۔

لئیق شاہ ان کے لیے نووارد ہی تھا کیونکہ وہ پہلی بار بیگم ولا آیا تھا اور زہرہ بانو کو ایک اہم چونکا دینے والی اطلاع پہنچانے آیا تھا۔ وہ تنہا تھا اور مسافر لاری میں آیا تھا۔

بیگم ولا کے قوانین کے مطابق جب لئیق شاہ کو کبیل دادا کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اپنے جیسے ایک گرانڈیل اور لمبے چوڑے نوجوان کو دیکھ کر تھوڑا چونکا تھا تاہم کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”لئیق شاہ۔“

”کہاں سے آئے ہو؟ اور بیگم صاحب سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

جواباً لئیق شاہ نے سپاٹ متانت سے جواب دیا۔ ”میں نئے پنڈ سے بیگم صاحب کے لیے ایک اہم خبر لایا ہوں اور تم اب سوالوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے بیگم صاحب کو فوراً میری آمد کی اطلاع دو۔“

لئیق شاہ کا لہجہ کبیل دادا کو پسند نہیں آیا۔ نہ جانے کیوں کبیل دادا، لئیق شاہ سے ایک نامعلوم سی رقابت محسوس کرنے لگا — اب اس بے چارے کو کیا پتا تھا کہ جس شخص کو وہ سوال جواب کی کسوٹی میں پرکھنے میں مصروف ہے وہ اس کی بیگم صاحب کے دل میں کیا مقام رکھتا ہے۔

”ہولے کاکے! ذرا ہولے۔۔۔ یہ یہاں کے اصول ہیں۔ بیگم صاحب کو کب سے جانتے ہو؟“

کبیل دادا نے ہلکے سے چڑ کر کہا۔ اسے لگا تھا کہ اس کا یہ سوال قطعاً غیر متعلق تھا اور نہ جانے کس خفتہ جذبے تلے اس کے ہونٹوں پر آیا تھا۔ ادھر لئیق شاہ کا بھی پارا چڑھنے لگا۔ جوشیلا وہ بھی کم نہ تھا۔ کبیل دادا کو گھور کے بولا۔

”تم صرف بیگم صاحب سے یہ کہہ دو کہ نئے پنڈ سے لئیق شاہ آیا ہے۔ تمہیں سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔“

اس کے یوں پُراعتماد لہجے میں یہ الفاظ ادا کرنے پر نہ جانے کیوں یکلخت کبیل دادا کی پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Copied From Web
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 11

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بات ہی ایسی تھی جس نے کھیل دادا کو نامعلوم سے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نوجوان کا اعتماد اور بولنے کے انداز سے اسے ایک عجیب سے غرور کا احساس ہوا تھا اس لیے وہ اس سے کوئی اور سوال کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکا۔ ایک آدمی کے ذریعے جب اس نے اندر بیگم صاحبہ کو اس کی اطلاع پہنچائی تو زہرہ بانو نے فوراً لئیق شاہ کو بلوا لیا۔

کھیل دادا خود لئیق شاہ کو لے کر اندر پہنچا تو اس کی تیز نظروں نے بیگم صاحبہ کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات سے بہت کچھ سمجھ لیا۔ لئیق شاہ کو دیکھتے ہی زہرہ بانو کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس وقت کھیل دادا کے دل میں ایک گھونسا لگا جب بیگم صاحبہ نے کھیل دادا کو وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے لوٹ گیا۔

زہرہ بانو نے مسکراتی نگاہوں اور دلآویز مسکراہٹ سے لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہو لئیق شاہ؟ پہلی بار یہاں آئے ہو، تمہیں یہاں کا پتا ڈھونڈنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی؟''

وہ جواباً ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''نہیں بیگم صاحبہ! دقت کیسی؟ بھلا یہاں کا پتا کسے معلوم نہیں۔ آپ کی طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا جی؟'' اس نے آخر میں زہرہ بانو کے زخمی کندھے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں، اب تو کافی بہتر ہوں۔ تم بتاؤ... کیسے آنا ہوا؟ کیا صورتِ حال ہے چنڈ کی؟''

''بیگم صاحبہ! خبر اچھی نہیں ہے۔'' لئیق شاہ بولا۔ ''وہ سارے غنڈے چھوٹ گئے ہیں اور چھیما بھی اکڑتا پھر رہا ہے۔''

زہرہ بیگم کے لیے یہ اطلاع ناقابلِ یقین اور چونکا دینے والی تھی۔ غصے سے اس کا خوب صورت چہرہ سرخ ہو گیا۔

''اور جی... بیگم صاحبہ! چھیما نے تو اپنے منیجر صاحب کو بھی باقاعدہ گھر جا کے دھمکی بھی دے ڈالی ہے۔ شیراز چیمہ صاحب ڈر کے مارے جا چکے ہیں۔ انہوں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔'' لئیق شاہ آگے بتانے لگا۔ ''یہی نہیں، اس کے غنڈے دوسرے مزدوروں اور ورکروں کے بھی گھر گھر جا کے انہیں خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے ہیں کہ سالونٹ پلانٹ کی نوکری چھوڑ دو۔ ان کی دھمکیوں کے خوف سے اور اپنے گھر بار بچوں کی جانیں بچانے کے لیے کافی سے زیادہ مزدوروں اور ورکروں نے کام چھوڑ دیا ہے۔ بیگم صاحبہ! ام... مجھے افسوس سے یہ بتانا پڑ رہا ہے کہ سب سے زیادہ منافع دینے والے اس سالونٹ پلانٹ کا کام بالکل ٹھپ ہو کے رہ گیا ہے۔'' وہ بتاتا جا رہا تھا اور زہرہ بانو کو اپنا دل گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ لئیق شاہ کی نظریں زہرہ بانو کے تکلیف دہ چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کو اس قدر پریشان دیکھ کر ایک لمحے کو وہ خود بھی متفکر ہو گیا پھر ازراہِ تشفی بولا۔

''بیگم صاحبہ! آ... آپ... بالکل فکر مت کریں، ہم سب مل کر ان شاء اللہ ان سب مسائل پر قابو پا لیں گے، بس آپ ذرا حوصلہ رکھیں۔'' زہرہ بانو نے ایک نگاہ لئیق شاہ کے چہرے پر ڈالی پھر گہری سانس لے کر گوگو سے لہجے میں بولی۔

''لئیق شاہ! میں نے حوصلہ ہارنا سیکھا ہی نہیں ہے لیکن بعض خاندانی وجوہ کی بنا پر میں ہمیشہ سے ایسے کسی انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کرتی آئی ہوں جس سے حویلی والوں، بالخصوص باباجانی کی عزت پر حرف آئے۔ اب تم سے کیا چھپانا... لئیق شاہ۔'' وہ تھوڑے توقف سے بولی۔ ''امی جان، باباجان کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت رکھتی ہیں۔ ممتاز خان کی چیرہ دستیوں کا میں بھی منہ توڑ جواب دے سکتی ہوں مگر اب شاید پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ ممتاز خان اگر اپنے ساتھ چند بدمعاشوں کو اکٹھا کر کے میرے ساتھ غنڈاگردی کر رہا ہے تو پھر میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو کا دلکش حسین چہرہ اس کے اندرونی غبار اور غصے کا غماز نظر آنے لگا۔ اس کی کشادہ کالی آنکھوں سے عجیب طرح کا جوش چھلکنے لگا۔ لئیق شاہ جو بیگم صاحبہ سے نظریں جھکا کر بات کرنے کا عادی تھا مگر اب وہ یک ٹک اس کا چہرہ تکے جا رہا تھا۔ ادھر زہرہ بانو بھی جب اپنی گوگو والی کیفیت سے نکلی اور بے اختیار اس کی نگاہیں لئیق شاہ کی اپنی جانب یک ٹک تکتی نظروں سے ملیں تو جیسے دو طرفہ نظروں کی کمندیں پھنس گئیں۔ کھلی آنکھوں کے اس میل تال میں گہرے پن کا شائبہ بھی تھا اور کسی بے نام و خفتہ جذبات کا نامعلوم سا کھینچ پن بھی... چند ثانیے اس طرح گزرے تو معاً لئیق شاہ نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور ہولے سے بولا۔ ''آپ کی بات بھی ٹھیک ہی ہے بیگم صاحبہ مگر آپ کو اپنے دفاع میں بھی قدم اٹھانے کا پورا حق ہونا چاہیے۔'' زہرہ بانو نے دھیمی دھیمی آنچ جیسی نگاہوں اور ہلکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔

دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان تھے، زہرہ

بانو تو بڑے کروفر کے انداز میں صوفے کی پشت سے کمر لگائے بیٹھی تھی جبکہ اس کے سامنے والے صوفے پر لئیق شاہ اپنے لمبے چوڑے وجود کے باوجود قدرے سکڑ سمٹ کر ''جھکنے'' کے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

''ہوں...'' اس کی بات پر زہرہ بانو نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کی پھر جیسے موضوع بدلنے کی غرض سے لئیق شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

''تمہارے لیے کیا منگواؤں...؟ کھانا کھاؤ گے، پتا نہیں تم نے ناشتا بھی کیا ہے یا نہیں؟''

''ن... نہیں... جی کھانے پینے کی کوئی فکر نہ کریں میں سب کچھ کھا پی کر ہی پنڈ سے چلا تھا۔ اب واپس چلوں گا۔ بس آپ کی ہدایت کا منتظر تھا۔'' لئیق شاہ نے جلدی سے کہا اور تکے بیٹھے یوں کسمسایا جیسے رخصت ہونا چاہتا ہو۔

''نہیں، بیٹھو ابھی۔'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دھیمی سی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم پہلی بار یہاں... بیگم ولا آئے ہو، کچھ نہ کچھ تو تمہیں کھانا پینا پڑے گا ہی۔'' یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے کسی کو آواز دی۔ ایک گھریلو ملازم فوراً باادب نمودار ہوا۔ زہرہ بانو نے اسے چائے وغیرہ لانے کا حکم دیا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے بلاوجہ چائے کی زحمت کر ڈالی... اس کی کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔'' لئیق شاہ نے کہا۔

''تم مجھے بیگم صاحبہ مت کہا کرو لئیق شاہ۔'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔

اس کی بات پر لئیق شاہ تھوڑا سا گڑبڑا گیا بولا۔ ''وہ جی... دراصل سب ہی آپ کو اسی طرح مخاطب کرتے ہیں تو...''

''مگر تم مجھے آج سے صرف زہرہ بانو کہو گے۔'' زہرہ بانو نے اس کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ لئیق شاہ ایک لمحے کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔

''اچھی طرح آرام سے بیٹھو لئیق شاہ۔ تم میرے ملازموں میں سے نہیں ہو، میرے دوست اور میرے ساتھی ہو، میرے مشکل وقت کے ساتھی۔''

''آ... آپ کی ذرہ نوازی ہے... بیگم... مم... میرا مطلب ہے زہرہ صاحبہ الل... لیکن...''

''ہاں... تمہارا اس طرح مجھے پکارنا اچھا لگا۔ اب ایسے ہی رہنا، بھولنا مت۔'' زہرہ بانو مسکرائی تو بے اختیار لئیق شاہ کے خوبرو چہرے پر بھی ہلکی مسکراہٹ عود کر آئی اور وہ بھی ہنس پڑا۔ اس وقت زہرہ بانو کو وہ بہت خوب صورت لگا۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ ''تم اس طرح ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہو مجھے۔''

جس طرح دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اسی طرح بے اختیار جذبوں کو بھی راہ ملتی ہے۔ لئیق شاہ نے بھی جیسے گویا مچلتے دل سے کہہ ڈالا۔ ''آپ بھی بہت اچھی ہیں... زہرہ صاحبہ۔''

اس دوران میں ایک ملازمہ چائے وغیرہ کے لوازمات سے لدی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور جب واپس لوٹنے لگی تو زہرہ بانو نے اس سے کھبیل دادا کو اندر بھیجنے کا کہا۔

ذرا دیر میں کھبیل دادا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ سوچا سوچا سا تھا پھر جب اس نے اندر زہرہ بانو اور لئیق شاہ کو مسکراتے اور چائے وغیرہ پیتے دیکھا تو اس کا منہ مزید سوج گیا۔ تاہم اندر آ کے ایک طرف مؤدبانہ انداز میں کھڑے کے ہولے سے بولا۔

''جی بیگم صاحبہ؟''

زہرہ بانو نے ایک نگاہ پاس کھڑے کھبیل دادا پر ڈالی پھر ہاتھ کے اشارے سے اسے سامنے والے صوفے پر لئیق شاہ کے قریب بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے وہاں جا بیٹھا۔

''چائے پیو۔'' زہرہ بانو نے اس سے کہا۔ کھبیل دادا کا جی تو نہیں کیا مگر وہ بیگم صاحبہ کی ہر بات کو ایک حکم کا درجہ دیتا تھا اس لیے اس نے تھیس سے فلاسک سے ایک کپ میں چائے انڈیلی اور ذرا سیدھا ہو کے بیٹھا تو زہرہ بانو اس کے بشرے پر نظریں جمائے جمائے بولی۔

''یہ لئیق شاہ ہے۔ ہمارے ہی پنڈ کا... جانتے ہو تم اسے؟''

''اچھا جی... بڑی خوشی ہوئی ان سے مل کر... ویسے میں نے کبھی دیکھا نہیں، آج پہلی بار مل رہا ہوں۔'' کھبیل دادا نے گویا طوعاً و کرہاً جواب دیا۔

''اور لئیق شاہ! یہ کھبیل خان ہے میرا خاص آدمی... ہمارے منشی فضل محمد کا بیٹا۔'' زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کھبیل دادا کا بھی اس سے تعارف کروایا... تو لئیق شاہ بڑی خوش دلی سے کھبیل دادا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کے بولا۔

''بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر دوست...'' یہ کام بھی کھبیل دادا کو چار و ناچار کرنا پڑا۔ یعنی لئیق شاہ سے ہاتھ ملانا۔

"ویسے نام تو اس کا کمیل خان ہے مگر یہ خود کو کمیل دادا کہلوانا زیادہ پسند کرتا ہے۔" زہرہ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ تمہاری طرح یہ بھی بہت دلیر اور بہادر آدمی ہے۔"

کمیل دادا کو زہرہ بانو کا لئیق شاہ سے اس کی بہادری اور دلیری کو تشبیہ دینا اچھا نہ لگا۔ تاہم وہ چپ رہا۔

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی فراہم کردہ تازہ ترین معلومات سے کمیل دادا کو بھی آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر وہ بھی متفکر نظر آنے لگا اور تیزی سے بولا۔ "بیگم صاحبہ! پھر تو آپ کی جان کو ممتاز خان اور چھیما سے سخت خطرہ لاحق ہے۔ آپ کا اب تنہا نئے پنڈ کے معاملات سنبھالنا مناسب نہ ہو گا۔ میرا آپ کے ساتھ ہونا اشد ضروری ہو گیا ہے اب..."

"ہم نئے پنڈ میں اب تنہا نہیں ہیں دادا۔" زہرہ بانو نے ایک نگاہ اس کے ساتھ بیٹھے لئیق شاہ کی طرف گہرے انداز سے ڈالتے ہوئے کہا۔

کمیل دادا، زہرہ بانو کے منہ سے لئیق شاہ کی تعریف سن کر سہہ نہ سکا۔ بالآخر جوش رقابت میں قریب بیٹھے لئیق شاہ پر نظر ڈالتے ہوئے زہرہ بانو سے بول پڑا۔

"بیگم صاحبہ! لگتا ہے لئیق شاہ آپ کا کوئی نیا آدمی ہے اور آپ اس وقت جن حالات سے دوچار ہیں، آپ کو نئے آدمی رکھنے کے سلسلے میں بھی محتاط رہنا چاہیے۔ ممتاز خان کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ پیسوں کے زور پر ہر کام کرنا جانتا ہے۔ خنجر نما دوست بھی دشمنوں میں چھوڑ دیتا ہے جو وقت پڑنے پر..."

"کمیل دادا! یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟" دفعتاً ہی زہرہ بانو... تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "کیا تم لئیق شاہ کی وفاداری پر شبہ کر رہے ہو؟" زہرہ بانو کے اس طرح یک دم برہم ہو جانے پر کمیل دادا خود بھی گھبرا سا گیا لیکن لئیق شاہ کے چہرے پر بھی ہلکی سی تلخی نمودار ہوئی تھی۔

"جس طرح میں تم لوگوں پر اعتماد کرتی ہوں اسی طرح مجھے لئیق شاہ کی وفاداری پر بھی پورا یقین ہے۔ تم ذرا سوچ سمجھ کر کوئی بات اپنے منہ سے نکالا کرو۔ لئیق شاہ کو میں تم سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہوں۔" زہرہ بانو کا غصہ ابھی تک کم نہ ہوا تھا۔ کمیل دادا کے لئیق شاہ کے بارے میں منفی الفاظ نے اسے یک دم بپھرا دیا تھا جس پر کمیل دادا نادم ہو کے اپنی بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو گیا، اسے زہرہ بانو سے معافی مانگنا پڑی لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ "بیگم صاحبہ" کے چہرے پر ناراضگی کے آثار پھر بھی ماند نہیں پڑے تو اسے مجبوراً لئیق شاہ کو مخاطب کر کے کہنا پڑا۔

"مجھے معاف کر دینا شاہ صاحب! میری بات سے آپ کا دل دکھا ہو گا۔" اس کے معذرت خواہانہ انداز پر لئیق شاہ یک دم خوش دلی سے مسکرایا اور... دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں دادا! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ تم بیگم صاحبہ کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط رکھتے ہو، مجھے تو تمہاری یہ محتاط پسندی اچھی لگی ہے اور ویسے بھی تم نے ایسی کوئی غلط بات بھی نہیں کی۔ زہرہ صاحبہ واقعی اس وقت دوسروں سے زیادہ اپنوں سے زخم کھائے ہوئے ہیں۔"

"اب ایسی بات بھی نہیں جو بات غلط ہے... وہ غلط ہے، تم بلاوجہ کسر نفسی سے کام مت لو لئیق شاہ۔"

زہرہ بانو نے اس بار لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تاہم کمیل دادا کو لئیق شاہ کا بیگم صاحبہ کو "زہرہ صاحبہ" کہہ کر بھی مخاطب کرنا عجیب ہی لگا۔ بہرطور اس نے اب زہرہ بانو کے چہرے سے واضح طور پر برہمی کے آثار لئیق شاہ سے معافی مانگنے کے بعد کچھ کم پڑتے ضرور محسوس کیے تھے۔ زہرہ بانو نے بھی شاید ماحول کی اس کدورت کو دھونے کی غرض سے موضوع بدلا اور پھر لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

"لئیق شاہ! ہمارا منیجر شیراز تو ڈر کے مارے نوکری چھوڑ گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر ہم تمہیں اس کی جگہ اپنے سالونٹ پلانٹ کا منیجر رکھ لیں تو؟" اس کی بات پر لئیق شاہ کو حیرت کا جھٹکا لگا ہی تھا مگر کمیل دادا بھی چونکے بنا نہ رہ سکا۔ تاہم اس نے اب اپنا منہ بند ہی رکھا۔ شاید اسے اس بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اب لئیق شاہ "بیگم صاحبہ" کے لیے کوئی خاص "حیثیت" رکھتا ہے۔ تاہم ابھی وہ پوری طرح اپنے اس خیال پر صاد نہیں کر پایا تھا۔

"زہرہ صاحبہ! آپ کی کرم نوازی ہے لیکن میں خود کو شاید اتنی بڑی ذمے داری کے قابل نہیں سمجھتا۔" بالآخر لئیق شاہ کو کہنا پڑا۔ "میرا خیال ہے میں آپ کی مل کا مزدور ہی ٹھیک ہوں۔"

"کیوں؟ کیا تمہارے اندر سالونٹ پلانٹ کا نظم و نسق چلانے کی صلاحیت نہیں؟ تم ایک سمجھ دار، سلجھے ہوئے اور دیانت دار آدمی ہو اور بہادر بھی..." زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"زہرہ صاحبہ! بات صرف ذمے داری اور بہادری کی... نہیں ہے۔" لئیق شاہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کہا۔ ''اس کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونا اور شہری سوجھ بوجھ بھی ہوتی ہے اور میں اس سلسلے میں بالکل نااہل ہوں۔''

زہرہ بانو بہ غور اس نیک اور شریف نوجوان کا چہرہ تکتی رہی اور سوچنے لگی۔

کس قدر سادہ آدمی ہے اور مخلص بھی... ورنہ دیکھا جاتا تو اتنی بڑی آفر سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ کہیل دادا کے اندر کی بے چینی پھر سوا ہونے لگی۔ بیگم صاحبہ کے اس بظاہر عام سے دیہاتی نوجوان پر اس قدر التفات و عنایات کی بارش برستے دیکھ کر وہ ایک بار پھر بولنے پر مجبور ہو گیا۔ تاہم اس بار اس کا لہجہ لئیق شاہ کی طرف سے محتاط تھا۔

''میرا خیال ہے بیگم صاحبہ! ابھی فی الحال آپ ہی اس پلانٹ کے بنیادی معاملات سنبھالیں... دیگر معاملات کے لیے لئیق شاہ تو ہے پھر ہم سب بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ کیونکہ بعض اہم نوعیت کے معاملات اور ڈیلنگ وغیرہ آپ ہی کے توسط سے زیادہ بہتر رہے گی۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا۔

لئیق شاہ نے بھی فوراً کھلے دل کے ساتھ کہیل دادا کی بات کی تائید کی۔ یہی نہیں خود زہرہ بانو کو بھی کہیل دادا کا یہ مشورہ اچھا لگا اور وہ کہیل دادا کی سمجھ داری کی قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور توصیفی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

''تمہاری بات قابلِ غور ہی نہیں، مناسب بھی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہارے اور لئیق شاہ کے سلسلے میں میرا انتخاب خود میرے لیے قابلِ فخر ہے، ویلڈن کا کر۔''

زہرہ بانو کے دلنشین مسکراتے لبوں سے اپنی تعریف پر کہیل دادا کے اندر ایک مسرت سی چھلکی مگر اسے اپنی یہ مسرت جانے کیوں گہن زدہ سی محسوس ہوئی، شاید اس لیے کہ اس تعریف کا ایک ''حصے دار'' لئیق شاہ بھی تھا۔

کمرے میں چند ثانیے کے لیے خاموشی طاری رہی، اس کے بعد لئیق شاہ نے ہی رخصت ہونے کی غرض سے زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''اب آپ کا آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے؟''

''تمہیں واپس نئے پنڈ لوٹنے کی جلدی تو نہیں ہے؟'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر الٹا سوال داغ دیا۔ وہ جواباً بولا۔

''کچھ خاص جلدی تو نہیں، بس ذرا کام کی فکر ہو رہی ہے اور پھر نئے پنڈ کے حالات...''

''بس تم ٹھہرو، میں کچھ تیاری باندھ لوں۔ مجھے بھی ابھی حویلی لوٹنا ہے۔'' زہرہ بولی اور لئیق شاہ نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ پھر کہیل دادا جانے کیوں زہرہ بانو کے بیگم ولا سے نئے پنڈ جانے پر بے چین سا نظر آنے لگا، بولا۔

''بیگم صاحبہ! میرے لیے کیا حکم ہے؟ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں بھی...''

''نہیں۔'' زہرہ بانو نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ''تم اِدھر ہی رہو گے، اور یہاں کے معاملات و معمولات پر کڑی نگاہ رکھو گے، میں کسی غیر متعلقہ شخص کو خواہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو... یہاں برداشت نہیں کروں گی، بلکہ کہیل! تم ایک کام کر کے رکھو گے۔''

''جی بیگم صاحبہ! حکم کریں۔'' وہ فدویانہ انداز میں بولا۔

''تم یہاں اب شہر کی بود و باش اختیار کر چکے ہو، یہاں کے طور طریقے سے آگاہ ہو چکے ہو۔ یقیناً تمہارا اور لوگوں میں بھی اٹھنا بیٹھنا ہو گا۔ تم یہاں کے کسی بڑے اخبار میں نوکری کے لیے اشتہار جاری کر دو... منیجر کے لیے... باقی سب تمہیں پتا ہے جتنے امیدوار آئیں، تم ان میں سے اپنی فہم و ذہنی فراست اور سوجھ بوجھ کے مطابق انٹرویو کے لیے چند لوگوں کو چن کے باقی سب کو فارغ کر دو... پھر مجھ سے فون پر رابطہ کر لینا۔ حویلی اور سالونٹ پلانٹ کے کسی بھی فون نمبر پر... میں ان امیدواروں کے انٹرویوز وغیرہ کے لیے خود آ جاؤں گی۔''

''جی بہتر بیگم صاحبہ، میں کل ہی یہ کام شروع کر دوں گا۔''

''گڈ۔''

اس کے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد زہرہ بانو اپنے ایک مسلح باڈی گارڈ اور لئیق شاہ کے ہمراہ بیگم ولا سے نئے پنڈ کے لیے روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

جانے کیا بات تھی، زہرہ بانو اگر صرف چند دنوں کے لیے بھی نئے پنڈ سے شہر (بیگم ولا) میں گزارتی تو اسے یوں لگتا جیسے وہ ایک طویل عرصہ حویلی سے دور رہی ہو۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ اس نے اپنے بچپن سے جوانی تک کا ایک طویل عرصہ یہاں (نئے پنڈ میں) گزارا تھا یا پھر شاید اس لیے بھی کہ وہ بیگم ولا سے زیادہ نئے پنڈ کے معاملات میں الجھی ہوئی تھی۔ ماں کی فکر کے ساتھ اسے باپ کی بھی فکر رہتی تھی۔ اپنے مزدوروں کی، ورکروں کی، اور یہاں اپنے حصے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کی جائداد کے انتظام وانصرام کی بھی...

نئے پنڈ کی حدود میں داخل ہونے تک وہ اندر ہی اندر اپنی سوچوں میں کھوئی رہی۔ حالانکہ لئیق شاہ اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھتی تو گویا ایک اور پہاڑ جیسا امتحان ایستادہ دیکھتی... ایک اور کڑی آزمائش کی دھوپ میں اپنے وجود کو تپتا ہوا محسوس کرنے لگتی۔

اس نے سب سے پہلے لئیق شاہ کو اس کے گھر پر چھوڑا اور حویلی کا رخ کیا۔ باپ کے کمرے میں گئی۔ ان کی حالت میں ابھی کوئی بہتری نہیں آئی تھی۔ بس وہ ویسے ہی تھے جیسے ایک طویل اور یکساں بیماری کی حالت میں ایک مریض ہوتا ہے۔ نہ زندہ... نہ مردہ... بس آتی جاتی بے حس سانسوں کی بازگشت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور اپنے پیاروں کے لیے اپنے ”یہاں ہونے“ کا مستعار سی... خوش کن احساس دلاتا رہتا ہے۔

باپ کی قدم بوسی کے بعد وہ ماں سے ملی۔ حویلی کے پرانے اور قدامت پسندانہ دستور کے مطابق وہ اپنی سوتیلی ماں مہرالنسا کے کمرے میں بھی گئی جہاں اس کا ٹیڑھی نگاہ سے استقبال ہوا۔

وہ دوبارہ اپنی ماں کے پاس آگئی۔ دن ڈھلنے لگا تھا اور افق کے پار سورج غروب ہونے لگا تھا۔ بیٹی کو دیکھ کر ستارہ بیگم کی تھکی تھکی آنکھوں میں زندگی کی رمق دوڑ گئی۔ ”زہرہ بیٹی! اس بار تم نے بہت دن لگا دیے شہر میں۔“ ماں کی آنکھوں اور لہجے سے جھلکتی فکرمندی دیکھ کر زہرہ بولی۔

”امی جان! آپ اتنی فکر نہ کیا کریں، میں آپ کی بیٹی ہوں مگر بیٹا بن کر دکھاؤں گی آپ کو۔ شہر میں میرا آتے جاتے رہنا ضروری ہوتا ہے۔“

پھر تھوڑے توقف کے بعد بولی۔ ”بابا جانی کیسے ہیں اب؟ آپ کو کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہوتی؟“

”اللہ انہیں صحت و شفا دے۔ میں تو ان کے لیے دعا ہی کرتی رہتی ہوں۔“ ستارہ بیگم نے جواب دیا۔

زہرہ نے اگلے دن صبح سویرے لئیق شاہ کو حویلی آنے کی تاکید کی تھی۔ وہ آچکا تھا اور زہرہ بانو کی خاص ہدایت کے مطابق اسے حویلی کی بیٹھک کے بجائے مہمان گاہ میں بٹھایا گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زہرہ بانو، لئیق شاہ اور ایک گارڈ کے ساتھ متعلقہ تھانے پہنچی... اس وقت اس کا خوب صورت چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسے اس بات پر سخت طیش تھا کہ پولیس نے اس پر قاتلانہ حملہ کرنے والے وسیم عرف چھیما کو اس کے ساتھیوں سمیت چھوڑ دیا تھا جبکہ کم از کم زہرہ بانو کو انسپکٹر جہانزیب جیسے ایمان دار اور فرض شناس پولیس آفیسر سے ایسی ناانصافی کی توقع نہ تھی، آج وہ اس سے گویا دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی مگر تھانے پہنچ کر اس پر ایک اور کربہ انگیز حقیقت کا انکشاف بھی ہوا کہ انسپکٹر جہانزیب کا تبادلہ ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ نیا تھانے دار انسپکٹر جرار خان تعینات کیا جا چکا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں موجود تھا۔ زہرہ بانو بپھری ہوئی اس کے کمرے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود ایک موٹے سے اردلی نے زہرہ کو اندر جانے سے روک دیا۔ لئیق شاہ بھی زہرہ کے ساتھ تھا۔

”صاحب اندر ایک اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔“ وہ بولا۔ زہرہ بانو نے پُرطیش نگاہوں سے اردلی کو گھورا اور اسی لہجے میں بولی۔

”میرا اس وقت ان سے ملنا ضروری ہے راستہ چھوڑ میرا۔ تمہارے صاحب کی میٹنگ سے زیادہ ضروری میرا ان سے ملنا ہے۔“

صورت حال دیکھ کر دو وردی پوش کانسٹیبل... جو زہرہ بانو کو دیکھتے ہی اریب قریب ہی ٹھٹکنے لگے تھے فوراً اس جانب لپکے۔ اس کے قریب آکر ایک نے اکھڑ اور سرد لہجے میں زہرہ سے کہا۔ ”او بی بی! یہ کوئی دکان یا مچھلی مارکیٹ نہیں ہے جو آپ اس طرح دندناتی ہوئی اندر اپنی مرضی سے جا گھسیں گی... یہ تھانہ ہے تھانہ... بتایا تو ہے آپ کو... اندر صاحب ایک ضروری میٹنگ میں مصروف ہیں۔“ زہرہ بانو کو اس پولیس والے کی بدتمیزی پر غصہ آیا۔ لئیق شاہ تو جیسے ہتھے سے اکھڑنے لگا۔ زہرہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے اس پولیس والے کی طرف غصے سے دیکھ کر کہا۔

”بیگم صاحبہ سے تمیز سے بات کرو۔ جانتے نہیں تم یہ کس کی بیٹی ہیں؟“

”اوئے... ہمیں تمیز سکھائے گا تو...“ دوسرے پولیس والے نے لئیق شاہ کو گھورا۔ ”تمیز تو ہم تجھے سکھا دیں گے، اندر کر کے... آواز نیچی رکھ اپنی سمجھے...“

”یو شٹ اَپ۔“ زہرہ غصے سے اس پولیس والے کو گھور کے بارعب لہجے میں بولی۔ ”تم لوگ یہاں وردی کے نام پر بدمعاشی کرتے ہو یا عوام کی خدمت... اندر اطلاع کرو کہ جاگیردار چودھری الف خان کی بیٹی آئی ہے۔“

اس کی بات پر دونوں پولیس والوں کے بشروں پر خلافِ توقع استہزائیہ سی مسکراہٹ ابھری پھر ایک نے تضحیک آمیز

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لہجے میں کہا۔

''چچ... چچ... بے چارے چودھری صاحب کو اللہ شفا دے۔ وہ تو بستر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اب ان کے بیٹے... چودھری ممتاز خان کی بات کریں بی بی...''

اس کی بات پر زہرہ بانو کو ایک چونکا دینے والا جھٹکا لگا۔ ذہین اور پڑھی لکھی تھی، فوراً بھانپ گئی کہ یہاں کیا صورتِ حال پروان چڑھ چکی ہے، مصلحت اندیشی کے تحت وہ کچھ لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ''میں فالتو بحث میں نہیں پڑھنا چاہتی، مجھے یہ بتاؤ، کب تک تمہارے صاحب میٹنگ سے فارغ ہوں گے؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتے۔'' پہلے والے کانسٹیبل نے بے اعتنائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر... جب تک میٹنگ ختم ہو ہم اِدھر ہی انتظار کریں گے۔''

''آپ باہر احاطے میں بچھی بینچوں پر بیٹھ جائیں جا کر، یہاں کسی غیر متعلقہ لوگوں کو کھڑے ہونے یا بیٹھنے کی اجازت نہیں۔''

زہرہ بانو نے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ لئیق شاہ نے برہم ہو کر کچھ بولنے کی کوشش چاہی مگر زہرہ بانو نے اسے روک دیا اور دونوں پولیس والوں کی طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔ ''میں سب سمجھ رہی ہوں کہ یہاں میرے آنے سے پہلے کیا کھچڑی پکائی جا چکی ہے مگر یاد رکھنا میں بھی بہت اوپر تک جا سکتی ہوں... آؤ... لئیق شاہ...'' کہتے ہوئے زہرہ بانو غصے سے پاؤں پٹخ کر واپس پلٹی تو اسے اپنے عقب میں ایک پولیس والے کی بے ہودہ انداز میں ''کھی کھی کھی'' اور بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''اوپر نہیں... بی بی! سیدھا اوپر... آسمان کی طرف...''

لئیق شاہ سے بیگم زہرہ بانو کی تھانے میں ہوئی یہ تذلیل برداشت نہ ہو سکی۔ وہ یوں بھی مزاجاً تیز طبع اور جوشیلا نوجوان تھا، زہرہ بانو کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ یک دم رک کر پلٹا اور ''کھیں'' نکال کر بڑبڑانے والے اس بدتمیز پولیس والے کے قریب جا کر غیظ بھرے جوش سے بولا۔

''کسی کے ٹکڑوں کی خیرات پر اپنی اوقات سے زیادہ اونچا مت بولو... تم زہرہ بی بی کو نہیں جانتے... [illegible] کے حوالے سے ان کا تعارف بہت چھوٹا ہے۔ وہ اپنی حیثیت میں کیا ہیں اس کا تم سب کو جلد پتا چل جائے گا۔''

زہرہ بانو مڑ کر حیرت بھری نگاہوں سے لئیق شاہ کو ان دونوں پولیس والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ سب کہتے ہوئے سن رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ وہ دونوں پولیس والے لئیق شاہ کے ساتھ کوئی جوابی حرکت کرتے اچانک کمرے کی چق ہٹی اور ایک لمبا تڑنگا اور بھاری جسامت کا آدمی پولیس انسپکٹر کی وردی میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی کرختگی اس کی غصہ ور طبیعت کا پتا دیتی تھی جبکہ بڑی بڑی آنکھوں کے ڈیلے کسی بھینسے کی آنکھوں کی طرح ابھرے اور ابلے پڑتے دکھائی دیتے تھے۔ اس کے ہمراہ دو عام سے حلیے اور شکل و صورت کے آدمی بھی تھے، تاہم صاحبِ ثروت نظر آتے تھے۔ زہرہ بانو تو نہیں البتہ لئیق شاہ ان دونوں کو دیکھ کر چونکا ضرور تھا۔ اس کا شائبہ زہرہ بانو نے بھی لئیق شاہ کے چہرے سے محسوس تو کر لیا تھا لیکن انسپکٹر کو اندر سے برآمد ہوتے دیکھ کر وہ اس جانب خاص توجہ نہ دے سکی۔

انسپکٹر کی نظر بھی زہرہ بانو پر پڑی تھی، صرف ایک لمحے کے لیے... اس کے بعد وہ اپنے دونوں ملاقاتیوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جنہیں وہ شاید خود بہ نفسِ نفیس باہر تک رخصت کرنے آیا تھا۔ اس دوران میں زہرہ بانو کی ایک بار پھر غیر ارادی طور پر لئیق شاہ کے چہرے پر دوبارہ نگاہ پڑی جو مسلسل ان دونوں ملاقاتیوں کو تکے جا رہا تھا۔

''بس... بس جی... انسپکٹر جرار صاحب! اب ہمیں اور شرمندہ نہ کریں، ہم اب چلتے ہیں... آپ بیٹھیں۔'' دونوں ملاقاتیوں میں سے ایک نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا تو انسپکٹر جرار بھی جواباً اپنے لمبوترے اور موٹی آنکھوں والے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کھردری آواز میں بولا۔

''او جی بشیر صاحب! آپ نے تو خدمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ مانی ٹکر کھاتے... کوئی لسی پانی... صرف سوکھی چائے پی ہے آپ نے۔''

''پھر کبھی سہی... بس ہمارا کام ہو جائے، سمجھو ہم نے آپ کی شاندار دعوت اُڑا لی۔'' دوسرے ملاقاتی نے انسپکٹر سے کہا اور پھر رخصت ہو کے آگے بڑھ گئے جبکہ اس کے مخصوص اشارے پر دونوں پولیس اہلکار جو غالباً اپنے ''صاحب'' کو دیکھتے ہی یک دم ''اٹین شن'' ہو گئے تھے، اشارہ سمجھ کر فوراً مؤدبانہ انداز میں ملاقاتیوں کے رہنما بنے ان کے پیچھے ہو لیے۔ لئیق شاہ کی ہنوز سوچتی نظریں جاتے ہوئے دونوں ملاقاتیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' ملاقاتیوں کے رخصت ہوتے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہی انسپکٹر جرار خان نے ایک اچٹتی ہوئی نظر زہرہ اور لئیق شاہ کے بشروں پر ڈالی اور قریب کھڑے اپنے اردلی سے بارعب لہجے میں استفسار کیا۔

''سر جی! ان دونوں نے تو یہاں کافی دیر سے شور مچا رکھا ہے، آپ سے ملنے کے لیے۔'' اردلی نے.... سخت شکایتی لہجے میں جواب دیا۔ وہ جیسے زہرہ بانو اور لئیق شاہ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔

''میں پوچھ رہا ہوں ہیں کون یہ دونوں؟'' اس نے غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا تو زہرہ بانو خود چند قدم اس کی جانب بڑھ کر اپنا تعارف کرواتے ہوئے پُروقار لہجے میں بولی۔

''میں چودھری الف خان کی بیٹی... زہرہ بانو ہوں۔ اگر آپ کی میٹنگ ختم ہوگئی ہے تو مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

انسپکٹر جرار خان کے چہرے پر چونکنے کے آثار صرف چند ثانیے کے لیے ابھرے تھے، اس کی موٹی موٹی بدہیئت آنکھیں زہرہ بانو کے چہرے پر جیسے جم کر رہ گئیں پھر دوسرے ہی لمحے اس کے لبوترے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، اس مسکراہٹ کی تہ میں حقارت بھی چھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ اسی لہجے میں کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''او... زہرہ بانو... چودھری الف خان کی بیٹی... کیا واقعی... تم چودھری الف خان کی بیٹی ہو؟'' اتنا کہہ کر وہ ذرا متوقف ہوا پھر سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''خیر، مجھے تمہارے ذاتی اور خاندانی معاملے سے کوئی سروکار نہیں مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، اندر آجاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹا۔ زہرہ بانو کا اس کی ہرزہ سرائی پر چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی مگر بہت کچھ سمجھ بھی رہی تھی، انسپکٹر جرار اندر جاچکا تھا۔ اس کے پیچھے زہرہ بانو اور لئیق شاہ بھی آگئے۔ انسپکٹر جرار اپنی بڑی سی میز کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا اور زہرہ بانو کو بیٹھنے کے لیے محض اپنے ہاتھ کا اشارہ سامنے والی کرسی کی طرف کردیا۔ زہرہ بانو جلتی سلگتی کیفیات کے ساتھ بظاہر خاموش کرسی پر بیٹھی تو انسپکٹر نے پوچھا۔

''یہ کون ہے؟'' اس کا اشارہ لئیق شاہ کی طرف تھا۔

''یہ لئیق شاہ ہے۔ ہماری مل میں کام کرتا ہے۔'' زہرہ بانو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا پھر خود ہی قریب کھڑے لئیق شاہ سے بولی۔ ''بیٹھو... لئیق شاہ۔''

''نہیں۔'' معاً انسپکٹر اپنی کرسی پر سیدھا ہوتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔ ''یہ باہر جائے گا۔''

''یہ میرے ساتھ ہے انسپکٹر...''

''میں نے کہا نا یہ باہر جائے گا۔ میرے پاس بحث کا وقت نہیں۔'' انسپکٹر جرار خان نے کرخت لہجے میں کہا تو لئیق شاہ کا دماغ بھی بھک سے اڑ گیا اور وہ زبردستی کرسی پر آکر براجمان ہوگیا اور اپنی جانب خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے انسپکٹر سے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''انسپکٹر! تمہارے یہاں تعینات ہوتے ہی زہرہ ولی کے ساتھ یہاں جس قسم کا جان بوجھ کر سلوک روا رکھا جارہا ہے، اس کی وجہ سے ہم اچھی طرح واقف ہیں اور اب آپ سے ہمیں انصاف کی کوئی امید بھی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کس کے کہنے پر کیا جارہا ہے ہمارے ساتھ...''

''میں تمہیں اس بدتمیزی پر اسی وقت لاک اپ کرسکتا ہوں بڑبولے نوجوان۔'' انسپکٹر جرار خان خشم آلودہ نظروں سے لئیق شاہ کے جوش سے سرخ پڑتے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

''اور اگر تمہارے تھانے کی چار دیواری کے اندر تمہارے سدھائے ہوئے پولیس اہلکار کسی شریف اور معزز آدمیوں کے ساتھ بدتہذیبی کے ساتھ پیش آئیں تو پھر پہلے انہیں بھی آپ کو اندر کرنا چاہیے انسپکٹر۔'' زہرہ بانو بھی چپ نہ رہ سکی۔ انسپکٹر نے غصیلے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور بولا۔

''صرف پانچ منٹ بچے ہیں باقی۔''

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وسیم عرف چھیما اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کو کس قانون کے تحت چھوڑا گیا ہے؟'' زہرہ بانو نے سیاہ بدروح چہرے پر نگاہیں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''ان کی ضمانتیں کرالی گئی ہیں۔ قانون کے مطابق۔'' انسپکٹر نے یوں بتایا جیسے اسے پہلے ہی سے اس سوال کی توقع تھی۔

''اچھا... قانون کے مطابق؟'' زہرہ بانو کی مارے طیش کے سانس چڑھنے لگی۔ ''یا پھر بھاری رشوت لے کر؟''

''تم ایک ذمے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر پر رشوت لینے کا جھوٹا الزام لگانے کی سزا جانتی ہو؟''

''اور تم انسپکٹر؟'' زہرہ بانو بھی ترکی بہ ترکی اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلی کا اشارہ اس کی طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''اور تم انسپکٹر! وسیم عرف چھیما جیسے خونی آدمی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چھوڑنے کی سزا نہیں جانتے شاید۔"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس بات کا... بی بی؟" اچانک انسپکٹر کے بدہیت کالے ہونٹوں پر خبیثانہ مسکراہٹ ابھری۔

"اس نے اپنے ساتھی خونی ٹولے کے ساتھ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ تم سے پہلے یہاں تعینات انسپکٹر جہانزیب نے اس سلسلے میں اپنی ساری تحقیقات مکمل کر لی تھیں مگر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چالان پکا کرنے سے پہلے ہی اس ایمان دار انسپکٹر کا تبادلہ کروا دیا گیا اور میں جانتی ہوں وہ سارے تحقیقاتی ثبوت بھی بوگس کر دیے گئے ہوں گے کیونکہ اب .... ایک سازش کے تحت آپ کی اس تھانے میں راجدھانی جو قائم کر دی گئی ہے۔"

"بس... وقت ختم ہو گیا۔" انسپکٹر جرار نے اپنا ایک ہاتھ کھڑا کر کے بیزاری سے کہا۔ "تم دونوں جا سکتے ہو۔"

"ہم چلے جائیں گے انسپکٹر۔" اس بار لئیق شاہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "مگر ایک بات یاد رکھنا، ہم انصاف لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے، یہ سب جانتے ہیں ہم... تم یہ سب چودھری ممتاز خان کے ایما پر کر رہے ہو... بتا دینا اُسے ہم بھی ایسی سازشیں تیار کرنا جانتے ہیں، آئیں بیگم صاحب۔"

اس نے آخر میں زہرہ بانو کی طرف دیکھا۔ جوش سے لئیق شاہ کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ زہرہ بانو بھی تب تک اپنی کرسی چھوڑ چکی تھی۔ پھر دونوں کمرے سے باہر راہداری میں آ گئے۔ احاطے میں ان کی کار کھڑی تھی، یہ اس میں سوار ہو گئے۔

"چودھری ممتاز کے ہاتھ یہاں تک بھی پہنچ گئے ہیں زہرہ صاحب۔" زہرہ بانو کے کار اسٹارٹ کرتے ہی اس کے برابر کی نشست سنبھالتے ہوئے لئیق شاہ نے دانت پیس کر کہا۔ "اور یہ سب پہلے سے سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے۔ انسپکٹر جہانزیب کے تبادلے سے لے کر راشی انسپکٹر جرار خان کے تعینات ہونے تک ایک لمبی سازش کھیلی گئی ہے۔ گویا ممتاز خان کو آپ کے خلاف گل کھلانے کا اب قانونی طور پر بھی پورا پورا "تحفظ" حاصل ہو چکا ہے۔" لئیق شاہ نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا۔

"دونوں ماں بیٹے شروع ہی سے سازشی ذہن کے مالک ہیں۔" زہرہ بانو نے بھی اس کی تائید میں کہا۔ وہ گیئر ڈال کر کار آگے بڑھا چکی تھی۔ "مہرالنسا میری رقابت کے جوشِ انتقام میں اپنے سگے بیٹے ممتاز خان کو ایک خطرناک زہریلا سانپ بنا چکی ہے۔ اس کی رگوں میں نفرت و انتقام کا زہر بھر چکی ہے۔ وہ خود تو ہم ماں بیٹی کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی مگر اب اپنے بیٹے کے دل و دماغ میں زہر بھر کے ہم ماں بیٹیوں کے راستے کا پتھر بنانا چاہتی ہے۔"

"زہرہ صاحب! ایسی مائیں تو پھر خود اپنی اولاد کی دشمن ہوتی ہیں۔" لئیق شاہ نے مختصراً تبصرہ کیا۔

"ہاں۔" زہرہ بانو ونڈ اسکرین پر نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔ "وہ نہیں جانتی کہ انتقام میں اندھی ہو کر اپنے بیٹے کی غلط بلکہ خطرناک تربیت کر رہی ہے، اس طرح اسے ایک غلط راہ پر لگا رہی ہے۔ اسے انسان سے شیطان بنا رہی ہے۔"

"یقیناً زہرہ صاحب۔" لئیق شاہ نے ہولے سے اپنے سر کو تائیداً جنبش دی۔

"لئیق شاہ! آخر کو میری بھی ماں ہے مگر اس نے کبھی مجھے اپنی سوکن اور اس کے بیٹے کے خلاف نہیں اکسایا۔ اگر بابا جان نے ان سے اپنا عہد نبھایا تو امی جان (ستارہ بیگم) نے بھی ان کے ساتھ وفاشعاری اور خدمت گزاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آج تک۔ ان کے ساتھ کیسی کیسی گھناؤنی سازشیں حویلی میں کھیلی گئیں مگر امی جان نے کبھی بھی انتقامی روش اختیار نہیں کی۔ وہ تو بے چاری الٹا مجھے ہی منع کرتی ہیں کہ میں ان دونوں بغض کے مارے ماں بیٹے کے منہ ہی نہ لگوں... مگر وہ اپنے لیے نہیں میرے مستقبل کے لیے پریشان بھی ہوتی ہیں مگر میں نے بھی عہد کر رکھا ہے لئیق شاہ! میں ان دونوں سازشی ماں بیٹوں کے سامنے سیسہ پلائی دیوار بنوں گی۔"

"اور... مجھے آپ ہر دم اپنے ساتھ پائیں گی زہرہ صاحب۔" لئیق شاہ کے منہ سے پُرعزم ہو کے بے اختیار یہ جملہ نکلا تھا۔ زہرہ بانو کو نہ جانے کیا ہوا، اس نے اچانک گاڑی کو روک دیا۔

ان کا رخ سالونت پلانٹ جانے والے کچے راستے پر تھا، قرب و جوار میں ویرانی کا راج تھا۔ کہیں کہیں کھیت کھلیان دکھائی دیتے تھے، خودرو جھاڑیوں اور کچھ کھجوروں کے سوکھے پتلے درخت نظر آتے تھے۔

کار روک کر زہرہ بانو نے عجیب اور گہری نگاہوں سے لئیق شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس کی جانب تکے جا رہا تھا۔ زہرہ بانو کے عنابی لبوں پر انجانا دل کا امڈتا ہوا ارتعاش سا تھرک رہا تھا۔

"وعدہ کرتے ہو؟" زہرہ بانو نے جیسے کوکو سے لہجے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس کی طرف بہ دستور دیکھتے ہوئے پُرخمار لہجے میں پوچھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں زہرہ صاحبہ! آپ کو اس جنگ میں بالکل تنہا نہیں چھوڑوں گا۔'' جواباً لئیق شاہ نے بھی پُرعزم ہو کر کہا۔ دونوں کی یک ٹک نگاہیں ایک دوسرے کی خمار آلود آنکھوں پر جمی ہوئی تھیں جو کسی نئے پنپتے ہوئے تعلقِ خاطر کا... پتا دیتی تھیں، سینوں میں دھڑکتے دلوں کے شوریدہ جذبات، محبت کی اس پہلی سیڑھی سے ادغام کی راہ پا رہے تھے اور جیسے دو دیوانوں کو دشتِ الفت کی ایسی راہ سجھا رہے تھے کہ اس برابر کی لگی ہوئی آتشِ عشق میں کئی امتحاں بھی آئیں گے، اس آگ میں جل کر انہیں سونا بھی بننا ہوگا، تپ کر کندن بھی اور گلاب بھی... کیا خبر... خاکستر بھی ہونا پڑے...

بہتے اُمڈتے جذبات پر اب تک جو عارضی مصلحتوں کے بند باندھے گئے تھے، وہ نگاہوں کے پُرمعنی میل نے توڑ ڈالے۔ زہرہ بانو نے بے اختیار اپنا نرم و نازک مرمریں ہاتھ لئیق شاہ کے گھنے بالوں سے ڈھکے ہاتھ پر رکھا تو یکبارگی لئیق شاہ کے اندر بھی ایک تڑپ ابھری اور اس نے بھی پلٹ کر زہرہ کا مرمریں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، یکبارگی زہرہ بانو کو اپنے پورے وجود میں سرشاری کی کیفیات اترتی ہوئی محسوس ہونے لگی، تب ہی اچانک کیا ہوا کہ لئیق شاہ نے یک دم اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور زہرہ بانو کے خمار آلود چہرے سے اپنی نظریں ہٹا کر سامنے ونڈ اسکرین کے پار... ویران بل کھاتے کچے راستے پر جما دیں اور ایکا ایکی جیسے کہیں دور... بہت دور... کھو سا گیا۔

''کیا ہوا... لئیق شاہ؟ تم بے چین ہو گئے؟'' زہرہ بانو بے قرار سی ہو گئی۔ لئیق شاہ اس بار سامنے ہی نظریں جمائے جمائے گومگو سے لہجے میں بولا۔

''زہرہ صاحبہ! شش... شاید... ہم بہت آگے نکل رہے تھے۔''

''تم ڈرتے ہو اس بندھن سے؟'' وہ شاید اس کی جھجک کو تاڑ گئی۔

''میں اس بندھن سے نہیں اپنی اوقات سے ڈرتا ہوں۔'' اس نے جواباً کہا۔

''میرے دل سے پوچھو، تم میرے لیے کیا ہو... تمہارے سامنے میں تو کہیں بھی نہیں۔'' وہ جیسے ڈوبے لہجے میں بولی۔

''ایسا مت کہیں زہرہ صاحبہ!'' اس کی بات پر لئیق شاہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''میرا اور آپ کا بھلا کیا جوڑ؟ آپ ایک محل کی رانی ہیں اور میں... جھونپڑی میں رہنے والا گدا۔ کتنے لوگوں کے منہ کھل جائیں گے، کتنے آپ کی جان کے بیری بن جائیں گے اور پھر... اور... پھر... زہرہ صاحبہ! بات اتنی سی بھی تو نہیں۔''

''مجھے کسی بات کی پروا نہیں، مجھے صرف تمہاری محبت چاہیے... پیار چاہیے تمہارا... اس کے سامنے دنیا کا سارا عیش و آرام میرے لیے ہیچ ہوگا۔'' زہرہ بانو کی آواز سے ہی نہیں لہجے سے بھی محبت کی مدھرتا مترشح تھی۔

''زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں ایسی محبتوں کو داغ دار بنا دیتی ہیں۔ شاید اسی لیے لوگوں کا محبت سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ میں چاند کو چاند ہی رہنے دینا چاہتا ہوں... داغ دار چاند کی صورت نہیں۔''

''مگر چاند کی روشنی بھی تو طلوع ہوتے سورج کی ہی محتاج ہوتی ہے۔ جبھی وہ نگینہ بن کر چمکتا ہے۔'' زہرہ نے گمبھیر لہجے میں کہا مگر لئیق شاہ کے لہجے کا سپاٹ پن جوں کا توں رہا۔

''مگر چاند سورج کبھی آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو قیامت آجاتی ہے۔''

''میرا سب کچھ تمہارا ہی تو ہوگا۔'' زہرہ نے دوسرے طریقے سے اسے مطمئن کرنا چاہا اور یہیں اس سے غلطی ہو گئی، کیونکہ اس کی بات پر لئیق شاہ نے پہلی بار ناراض سی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور بولا۔

''آپ نے مجھے غلط سمجھ لیا۔ عورت کے مال و متاع پر کبھی بھی مرد کا حق نہیں ہوتا جبکہ عورت، مرد کے مال پر اپنا پورا حق و اختیار رکھتی ہے۔ مجھے یہ سب پسند نہیں ہوگا، بہتر یہی ہے... اس پریم کہانی کی شروعات کو ادھر ہی ختم کر دیا جائے، مجھے میری اوقات میں رہنے دیں... زہرہ صاحبہ! گاڑی آگے بڑھائیں... ہمارا زیادہ دیر یہاں رکنا ویسے بھی مناسب نہیں ہوگا۔'' وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔

''مگر ابھی تو تم نے میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا؟''

''میں اپنے وعدے پر اب بھی قائم ہوں جب تک آپ کی ملازمت میں ہوں... نمک حلال رہوں گا مگر اتنا بڑا وعدہ نہیں کر سکتا اس میں آپ ہی کی بہتری ہے۔''

''میری بہتری کس میں ہے، یہ خود میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تو ٹھیک ہے پھر... مجھے بتا دو... تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟''

زہرہ بانو کی تڑپ فزوں تر ہونے لگی۔ اسے آج لئیق شاہ کی ایک اور خوبی کا اندازہ ہو چلا تھا کہ وہ ایک خوددار

دلکش خوشبوؤں سے بسا مارچ 2015 کا پُر بہار پاکیزہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

نگہت سیما اور **رفاقت جاوید** کے دلنشیں ناول

زاھدہ پروین کا خوب صورت منی ناول...... **جنگل کا پھول**

زمر نعیم تشریف لائی ہیں متاثر کن مکمل ناول **اسیر وفا** کے ساتھ

نبیلہ ابر راجا کا نیا ناولٹ **متاع دل** صرف آپ کے لیے

شیریں حیدر کی پُرسوچ تحریر...... **آئینہ**

رضوانہ پرنس کی حاضری

فسانہ نھیں حقیقت ھے یہ کے ہمراہ

بڑے اداکارہ **سنبل اقبال** کی دلچسپ باتیں

صحرائے تھر کی کٹھنائیوں سے متعلق **سیما رضا ردا** کا پُرفکر افسانہ

اس کے ساتھ ساتھ عالمی یوم خواتین کے حوالے سے ماہر قلمکاروں کی فکر انگیز مگر دلآویز تحریریں، جن میں **سیما بنت عاصم، ام ثمامہ، روشانے عبد القیوم، فرزانہ نگہت، بشریٰ باجوہ، نظیر فاطمہ، سلمیٰ غزل، سحرش فاطمہ، نادیہ جھانگیر، فرحت احمد** اور **قراۃ العین شکیل** شامل ہیں

حسبِ معمول مختلف دلچسپ و دلکش مستقل سلسلوں کا پُر مسرت دلفریب امتزاج صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

انسان ہے۔ کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود وہ اسے کسی ڈگری یافتہ عالم کی طرح زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ الفت بھی پڑھا رہا تھا۔

زہرہ بانو کے اس آخری .... استفسار پر لئیق شاہ کو لاجواب ہونا پڑا۔ اس نے جواب دینے سے پہلوتہی کرنے کی کوشش چاہی مگر مفر کی راہ نہ پاکر بالآخر صاف گوئی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”زہرہ صاحبہ! آپ میرے لیے ایک ایسا چاند ہو... جسے میں صرف دیکھ سکتا ہوں... الو کھے لاڈلے کی طرح پانے کی آرزو کرسکتا ہوں... لل... لیکن اسے پا نہیں سکتا۔“

”آہ... مگر یہ چاند تمہارے دامن میں اترنے کے لیے خود بے چین ہے لئیق شاہ... اور تم... اسے ٹھکرا رہے ہو۔“ زہرہ بانو کے جذبۂ دل سے بے اختیار ایک آہ سی خارج ہوئی، لئیق شاہ فوراً بولا۔

”ایسا مت کہیے زہرہ صاحبہ! بھلا میری کیا اوقات کہ میں آپ کو ٹھکراؤں؟“

”تو پھر... یہ بے رخی کیسی؟“

”یہ بے رخی نہیں ہے۔“

”مجھے یقین ہے پورا... تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن تم نے اس کے بیچ ایک خودساختہ دیوار بنا ڈالی ہے۔ تفاوت کی دیوار... مگر میرے لیے یہ ریت کی دیوار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

سالونٹ پلانٹ پہنچنے پر زہرہ بانو کو سب سے پہلے وہاں پھیلی ویرانی کا سامنا کرنا پڑا اور اس کا دل جیسے مسوس کر رہ گیا۔ کہاں تو جب بھی وہ یہاں آتی تھی ہر طرف مزدوروں اور ورکروں کی چہل پہل اسے نظر آتی تھی۔ پلانٹ کی چمنیوں سے اٹھتا دھواں... ترقی کی جانب نظر آتا تھا، مشینوں کے مخصوص شور سے جیسے یہاں زندگی دوڑتی محسوس ہوتی تھی مگر آج چمنیاں بجھ گئی تھیں، ان سے ویرانی کا نادیدہ دھواں سا اٹھتا محسوس ہوتا تھا۔ کئی سال پہلے یہ پلانٹ اسی طرح ویران پڑا تھا۔ اس کے احاطے میں خودرو جھاڑیاں اُگ آئی تھیں، مشینیں زنگ آلود ہوکر ناکارہ ہوچکی تھیں، درودیوار سے کہنہ برسنے لگتا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی، جب چودھری الف خان جوان مرد تھا۔ دولت کی ریل پیل تھی، جو بلاشبہ اب بھی تھی، دیگر ذرائع سے آمدنی آتی تھی۔ اس نے بھی اس کی پروا نہ کی، لیکن ستارہ بیگم سے ایک طوفانی محبت کے نتیجے میں شادی کے بعد جب ایک وسیع عریض کارآمد پلانٹ کی حیثیت سے یہ اس کی ملکیت میں دی گئی اور جب ستارہ بیگم نے زمینوں کے معاملات اپنے ہاتھوں میں لیے تو انہوں نے سب سے پہلے اس پلانٹ پر توجہ مرکوز کی، ایک اجتماعی سوچ کو انہوں نے پروان چڑھاتے ہوئے سوچا تھا کہ اگر یہ پلانٹ نئے سرے سے دوبارہ کام کرنے لگے تو نجانے کتنے غریب لوگوں کو روزگار میسر آئے گا۔ اس کا فائدہ بھی ہوگا ایک خطیر منافع کی صورت میں... لہٰذا ستارہ بیگم نے اس مردہ پڑتے پلانٹ کو منشی فضل محمد کے ساتھ مل کر دوبارہ زندہ کیا تھا، اور ایک طرح سے اپنے خون پسینے سے اسے سینچا تھا۔ اس کے بعد زہرہ جوان ہوئی تو ستارہ بیگم تھک چکی تھی۔ اس کی بیٹی اس کا بازو بنی اور پلانٹ کو جدید خطوط پر استوار کیا مگر آج چودھری الف خان کی پہلی بیوی مہرالنسا کا... اپنے بیٹے کو پڑھائے گئے زہریلے سبق سے اور اپنے سگے بیٹے ممتاز خان نے ہی ذاتی عناد کے لیے اسی تھالی میں چھید کیا تھا جس میں اس نے کھایا تھا۔ یہ سب اسی کا توکیا دھرا تھا۔

یہ سب دیکھ اور سوچ کر بے اختیار زہرہ بانو کا دل بھر آیا اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے روتا اور دکھی دیکھ کر لئیق شاہ کو اپنا دل گھٹتا محسوس ہوا۔ اس نے بے اختیار آگے بڑھ کر زہرہ بانو کو سنبھال لیا اور بولا۔

”زہرہ صاحبہ! اس کا غم نہ کریں... حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا، آپ تو بہت ہمت والی خاتون ہیں پھر یہ آنسو...؟“

”لئیق شاہ! تم شاید نہیں جانتے... اس پلانٹ کو دوبارہ چلانے کے لیے امی جان نے بذاتِ خود کتنی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ پھر کہیں جاکر یہ دوبارہ کارآمد ہوا تھا۔ گاؤں میں نہ جانے کتنے غریب لوگوں کے بجھے چولہے جل اٹھے، کتنوں کو روزگار ملا تھا، کتنے بوڑھوں نے اپنی بیٹیاں بیاہی تھیں۔ ادھر ہی سے مزدوری کرکے کتنے ہی خالی پیٹ روٹی سے سیراب ہوئے تھے مگر... اب...“ فرطِ رقت سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کرسکی اور سسک پڑی۔ اسے رنجیدہ خاطر پاکر لئیق شاہ کا دل گھٹنے لگا، اس نے پھر زہرہ کو سنبھالا دیا اور ازراہِ تشفی بولا۔

”خدا کے لیے... زہرہ صاحبہ! خود کو سنبھالیے... کیا آپ کو میرا وعدہ یاد نہیں رہا؟ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں خود ایک بار پھر سارے مزدوروں کو ورکروں کو اکٹھا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کروں گا۔ یہاں کے لوگ اگر ڈرتے ہیں تو انہیں ڈرنے دو... میں شہر سے مزدور لاؤں گا۔ دیکھتا ہوں پھر کون مائی کا لال... ہمارے راستے کی دیوار بنتا ہے۔ پہلے تو میں آپ کی وجہ سے خاموش تھا کہ لگا چودھری ممتاز خان آپ کا بھائی ہے مگر اب مجھے خود بھی بہت سی حقیقتوں کا پتا چل گیا ہے۔ اس نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آپ کا پکا دشمن ہے اور آپ کی طرف بڑھنے والا ہاتھ میں اب کاٹ کر رکھ دوں گا۔“

اپنی جان کے تحفظ کے لیے... لئیق شاہ کو ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح دیکھ کر زہرہ بانو کو ایک فخر کا سا احساس ہوا اور بے اختیار اس نے لئیق شاہ کے بازو سے اپنا سر ٹکا دیا اور لئیق شاہ کو زہرہ بانو کے بدن کی مہک... اس کا لطافت بھرا لمس... دل و دماغ کو بے اختیار سا کرنے لگا اور پھر دفعتاً ہی جیسے وہ دونوں ایک خواب آگیں کیفیات سے جاگے۔ ایک بڑی سی لینڈ کروزر... بڑی تیزی کے ساتھ پلانٹ کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی، زہرہ بانو کے چہرے پر ایک لمحے کو خوف کی پرچھائیوں نے ڈیرا جمایا۔ لئیق شاہ بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔ گاڑی دونوں پہچان گئے تھے۔ زہرہ بانو نے جلدی سے خود کو لئیق شاہ سے الگ کر لیا مگر لینڈ کروزر میں ڈرائیور کے برابر والی نشست پر براجمان ممتاز خان کی نظروں نے دور سے ہی سب دیکھ لیا تھا۔

لینڈ کروزر ان کے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پھر دروازے کھلے، سب سے پہلے ممتاز خان اترا۔ اس نے بیش قیمت ڈبل گھوڑا بوسکی کا شلوار سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے بغل سے سیاہ رنگ کا ہولسٹر بھی جھول رہا تھا۔ جس کے اندر بھرا ہوا پستول تھا اس کی غضبناک نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔ زہرہ کو پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا پستول کار کے گلوو کمپارٹمنٹ میں کیوں چھوڑ دیا تھا۔ ممتاز خان کے گاڑی سے اترتے ہی اس کے چار مسلح حواری بھی نیچے اتر آئے تھے۔ ان میں وسیم عرف جھیما بھی تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر ممتاز خان کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔

”تو تم اب اس کمین کے ساتھ یہ گل کھلانے لگی ہو۔“ ممتاز خان نے غیظ آلود لہجے میں زہرہ بانو کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بھی قصور نہیں، آخر بیٹی کس کی ہو ایک کوٹھے والی کی۔“

”زبان سنبھال کے بات کرو... ممتاز خان۔“ زہرہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شیرنی کی طرح گرجی۔ ماں کے بارے میں نازیبا الفاظ سن کر اس نے ہر قسم کے ڈر و خوف کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

”میری ماں، صرف ایک گائیک تھی۔ ایک فنکار... وہ بری ہوتی تو... ایک باعزت اور معزز جاگیردار اسے عزت کے ساتھ بیاہ کر اپنی حویلی میں نہیں لاتا۔“

”باباجانی کا تو جوانی میں دماغ خراب ہو گیا تھا، لڑکی۔“ ممتاز خان بولا۔ ”لیکن بعد میں انہیں عقل آ گئی تھی، اور اپنی اس حقیقت کا پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا مگر تمہاری بازاری ماں نے...“

”زبان کو لگام دو ممتاز خان۔“ اپنی ماں کے بارے میں یاوہ گوئی پر زہرہ بانو ایک بار پھر چلائی۔ ”تمہیں تو اپنے سگے باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں، تم بھلا کسی اور کی عزت کا کیا پاس کرو گے ممتاز خان! تم اس طرح اپنے باپ کی شان میں بدکلامی اور بدتمیزی نہیں کر رہے ہوتے، حقیقت سنو گے تو تم گھڑوں پانی میں مارے شرم کے ڈوب مرو گے۔ تمہاری اپنی ماں نے اپنی کمزوریوں اور خطاؤں پر پردہ ڈالنے کے لیے تمہاری رگوں میں بھی اپنی رقابت کا زہر بھر دیا ہے جو اسے ابتدا ہی سے میری ماں اور مجھ سے ہو گئی تھی، کیونکہ وہ حسد کی آگ میں ہی جلتی رہی اور اب تک جل رہی ہے کیوں؟ اس لیے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی وہ بابا جانی کا دل جیتنے میں ناکام رہی ہے جبکہ بڑھاپے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد بھی بابا جانی ابھی تک میری ماں کا دم بھرتے ہیں۔ یہی اصل محبت ہے۔“

زہرہ بانو کی جوابی کارروائی نے ممتاز خان کو بری طرح زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”لڑکی! تو نے اپنی اوقات بھلا کر بڑی غلطی کی ہے... اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار ہو جا۔ آج اس کم کمین کتے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ کر ثابت کر دیا ہے تو نے کہ تیری اپنی اوقات کیا ہے۔“ اس نے آخر میں لئیق شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لئیق شاہ اب ہر قسم کی مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے چند قدم ممتاز خان کی طرف بڑھا تو اس کے ساتھ کھڑے حواری جھیما نے آگے بڑھ کر اس پر اپنی گن سیدھی کر لی۔ زہرہ بانو... لئیق شاہ کی جان کو خطرے میں دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھی مگر تب تک لئیق شاہ، ممتاز خان سے الجھ پڑا تھا اور... جنوں خیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"گنجے چودھری! کتوں کی فوج تو تُو نے پال رکھی ہے اور ہتھیاروں کے زور پر تو اتنا بھونک رہا ہے۔ میدان میں آ کے دیکھ بہادروں کی طرح پھر تجھے پتا چلے کون پلّے کی طرح چیاؤں... چیاؤں کر کے میدان چھوڑ کے بھاگتا ہے۔"

لئیق شاہ کی اس کراری جوابی کارروائی نے صورتِ حال کو یک دم جان لیوا حد تک خطرناک بنا دیا اور زہرہ بانو کو اصل خوف اس وقت لئیق شاہ کی جان جانے کا تھا کیونکہ ممتاز خان اور اس کے حواری اس وقت پوری طرح مسلح تھے اور ان پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ ایسے میں لئیق شاہ کی جوش بھری دلیرانہ حرکت انہیں مزید مشتعل کر سکتی تھی اور ہوا بھی یہی... ممتاز خان کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی غضب ناک آگ کی طرح برسنے لگی جبکہ چھیما نے تو اپنی سیدھی کی ہوئی گن کی لبلبی پر بھی انگلی رکھ دی اور اس کی گن کی نال کے نشانے پر لئیق شاہ تنا کھڑا... انہیں للکار رہا تھا۔

"دونوں کو اٹھا کر گاڑی میں ڈال کر ڈیرے پر لے چلو۔" دفعتاً ممتاز خان نے دہاڑ کر کہا۔ چاروں حواری حرکت میں آگئے اور زہرہ بانو اور لئیق شاہ کو گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹوں کی طرف بٹھا دیا گیا۔

"چودھری صاحب! اس کمین لئیق شاہ کو تو ادھر ہی مار کے قبر کھود دینی چاہیے۔" چھیما نے ممتاز خان کو مشورہ دیا۔

"نہیں، یہ منہ زور گھوڑی... اسی لگام کے سہارے ہمارے مطالبات ماننے پر مجبور ہوگی۔ ٹبی والے ڈیرے پر چلو۔" ممتاز خان غرا کر بولا اور زہرہ بانو اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکی۔ آخر اس کا سوتیلا بھائی، لئیق شاہ کو اس کی کمزوری بنا کر کون سی بات منوانا چاہتا تھا؟ وہ ایک اچنبھے کا شکار ہوگئی۔

☆☆☆

ٹبی والے ڈیرے پر یہ لوگ پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد پہنچ گئے۔ ایک حواری ان کی کار بھی وہیں لے آیا تھا۔ زہرہ بانو پریشان تھی جبکہ لئیق شاہ بھی متفکر تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی پریشان تھے۔ ٹبی والا ڈیرا کچھ زیادہ ہی خوفناک منظر پیش کرتا تھا۔ آبادی سے دور جاگیر کے آخری سرے پر بنجر ویرانوں میں جا بجا اونچے نیچے ٹیلوں ٹبوں پر مشتمل تھا۔ یہاں خودرو جھاڑیوں کے علاوہ ٹبی کے سوکھے لمبے درختوں کی بھی بہتات نظر آتی تھی اور انہی کے بیچ وہ گارے مٹی کی عمارت تھی جو کچھ زیادہ رقبے پر تو نہیں پھیلی ہوئی تھی تاہم اس کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا۔ اندر کہیں ایک جانب گھوڑے بندھے ہوئے تھے، ایک تانگا بھی نظر آ رہا تھا۔ چھکڑا سا ٹرک بھی ٹائروں کے بجائے اینٹوں پر کھڑا تھا، کچھ لکڑ... بھی بکھرے تھے۔ دو تین مسلح حواری وہاں بھی موجود تھے، ان دونوں کو گاڑی سے اتار کر سیدھا اندر لایا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی زہرہ اور لئیق کو یوں لگا جیسے یک دم بنجر صحرا سے وہ کسی آرام دہ اور پُرتعیش گھر میں آگئے ہوں۔ باہر سے بظاہر کھنڈر نظر آنے والی عمارت اندر سے برعکس تھی۔ بہرطور انہیں ایک کمرے میں لا کر دو سادہ سی کرسیوں پر بٹھا دیا گیا۔ ممتاز خان کے ساتھ چھیما بھی موجود تھا اور ایک حواری بھی... باقی کو ممتاز خان نے کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ خود وہ دونوں آرام دہ صوفے پر براجمان ہوگئے، حواری کھڑا تھا۔

"ہمیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟" زہرہ بانو نے ممتاز خان کی طرف تکتے ہوئے درشتی سے پوچھا۔ تاہم اس کے لہجے کی تہ میں کہیں چھپے ہراس کی جھلک بھی محسوس ہوتی تھی، ممتاز خان نے کوئی جواب دیے بغیر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لائٹر کی مدد سے ایک سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لے کر دھواں فضا میں اگلتے ہوئے پُرغور نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ تم دونوں کو اس جہان سے ہی رخصت کر ڈالوں مگر تمہاری ماں ستارہ بیگم کا فتنا پھر بھی باقی رہتا اور یقیناً وہ ہمارے لیے پریشانی کھڑی کر سکتی تھی، اگرچہ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ وہ تمہارے مرنے کے بعد خود بھی ادھ موئی ہو کر رہ جاتی۔ خیر..." کہتے ہوئے اس نے اپنے قریب بیٹھے چھیما کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور قریب کونے میں ... پڑی ایک چھوٹی سی میز کی دراز سے اس نے ایک ہینڈ بیگ نکالا۔ زہرہ اور لئیق کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ زہرہ بانو کچھ سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھی جبکہ لئیق شاہ کا ذہن موجودہ ماحول سے ہٹ کر اس سوچ میں مستغرق تھا کہ ان خونخوار بھیڑیوں کے چنگل سے نکلا کس طرح جائے؟ لئیق شاہ... اس قبیل کا آدمی تو نہیں تھا یعنی ہتھیار بہ دست جنگجو وغیرہ... ہاں البتہ پہلوانی ضرور کیا کرتا تھا، کسرت بھی کرتا تھا۔ لڑائی بھڑائی کے مواقع کم ہی آتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ لئیق شاہ خود ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ دوسرے کا قصور معاف کر دیا کرتا تھا۔ اپنی ذات میں سادہ فطرت تھا اب یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس کی خاصیت تھی یا خامی کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا بھی تھا۔ خاموش رہتا تو جیسے پُرسکون جھیل یا ٹھہرا سمندر... مگر جب اس پر کوئی نفرت یا انتشار کے کنکر پھینک دے تو پھر اندر سے متلاطم خیز پُرجوش طوفان کی صورت یکا یک ابل بھی پڑتا تھا۔ اس وقت گستی شاہ دھیرے دھیرے اپنی اسی خامی یا خوبی جیسی کیفیات سے دوچار تھا۔

"یہ ایک اسٹامپ پیپر ہے۔" معاً کمرے میں ممتاز خان کی آواز گونجی۔ وہ اس چرمی ہینڈ بیگ سے ایک ٹائپ شدہ پیپر نکال چکا تھا اور ایک پین بھی... جسے چھیما کو تھماتے ہوئے اس نے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس پر تم اپنے دستخط کردو... قصہ ختم... اور یہ دشمنی بھی۔" ممتاز خان نے آخر میں جیسے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"یہ کس قسم کا اسٹامپ پیپر ہے؟" زہرہ بانو نے اپنی بھویں سکیڑ کر پوچھا۔

"اس میں ان جائداد کی حصہ داری کا اندراج ہے جو میرے باپ نے جوشِ جوانی اور تمہاری ماں کے حسن کے جادو میں آکر تمہارے نام کر ڈالی تھی، جبکہ ان پر میرا حق ہے۔ میں اپنا یہ حق واپس لینا چاہتا ہوں۔"

ممتاز خان نے جیسے اپنی بات مکمل کی، زہرہ بانو اس کی بات کا مقصد سمجھتے ہی جوش سے سرخ نظر آنے لگی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وقت اور حالات کی موجودہ نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے اندر کی چالاک اور معاملہ فہم عورت بیدار ہوگئی۔ حتی الوسع اپنے لہجے کو ہر قسم کے جوشِ غیظ سے عاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہموار آواز میں بولی۔

"یہ سب میرے نام نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ امی جان ہی اس پر دستخط کرسکتی ہیں۔ اگر میں ان سے کہوں تو... مگر... پھر بھی اس بات کی ضمانت کیا ہوگی کہ ہم دونوں ماں بیٹیوں کو زندہ رہنے دیا جائے گا؟"

اس کی بات پر ممتاز خان کے چہرے پر بڑی حیبانہ مسکراہٹ ابھری۔ زہرہ بانو کی اس بات پر جانے اس کی کون سی جبلت کی تسکین ہوئی تھی کہ وہ کمینگی سے ایک آنکھ میچتے ہوئے بولا۔

"ہم بلاوجہ خون خرابے کے قائل نہیں ہیں۔ بغیر اس کے اپنا مقصد حاصل ہوجاتا ہے تو دشمن بھی ہمارے لیے بے معنی ہوکر رہ جاتے ہیں۔"

"مجھے اس سلسلے میں امی جان سے بات کرنا ہوگی... یوں بھی اس اسٹامپ پر میرے نہیں انہی کے سائن ہوں گے۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا، مجھے سب معلوم ہے۔ تمہاری مکار ماں اپنا سب کچھ تمہارے نام پہلے ہی کرچکی ہے.... اب تم ہی اس پر اپنے دستخط کرو گی۔" غصیلے لہجے میں یہ کہتے ہوئے ممتاز خان نے چھیما کو اشارہ کیا۔ وہ ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر اور پین لیے زہرہ بانو کی طرف بڑھا اور دونوں اس کی گود میں ڈال کر اپنے صوفے کی طرف پلٹ آیا۔ ممتاز خان کی خونخوار گھورتی ہوئی نظریں زہرہ بانو کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ زہرہ بانو اپنے ہاتھوں کے ارتعاش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے ایک نگاہ اسٹامپ پیپر پر ڈالتے ہوئے اس کا جائزہ لینے لگی۔

اس ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر میں ان ساری ملکیتوں کا

رنگین کتاب

ناشر نے معذرت کرتے ہوئے مصنف سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں ایسی رنگین کتاب شائع نہیں کرسکتا۔"

"جنابِ عالی! آپ کیا بات کرتے ہیں۔ میری کتاب میں تو کوئی رنگینی نہیں ہے۔" مصنف نے ترش لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں ہے؟ پہلے ہی باب میں ایک بوڑھا آدمی خوف سے پیلا پڑ جاتا ہے۔ ہیرو غصے سے سفید ہو جاتا ہے۔ ہیروئن شرم و حیا سے سرخ ہو جاتی ہے۔ ہیروئن کا باپ سردی سے نیلا پڑ جاتا ہے اور رقیب حسد سے ہرا ہو جاتا ہے۔ یہ رنگین بیانی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟" ناشر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

ایماندار چور

ایک گھر میں چور آگئے اور سب سامان اٹھا کر نکلنے لگے تھے کہ مالک مکان کی آنکھ کھل گئی۔

مالک مکان نے دیکھا کہ چور سب سامان لے جارہے ہیں اور ایک چور کے سر پر تخت پوش (جائے نماز) رکھا ہوا ہے۔ اس نے چور سے کہا۔

"ارے بھائی یہ تو چھوڑ جاؤ نماز پڑھوں گا۔"

یہ سن کر چور نے کہا۔ "کیوں، کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟"

(ساہیوال سے قیصر گل اور ملک اعجاز کا تعاون)

ذکر موجود تھا، جو زہرہ بانو کے نام تھیں۔ ان میں سے پنڈی کی کچھ زمینوں کے علاوہ سالونٹ پلانٹ اور ملتان میں واقع کوٹھی ''بیگم ولا'' کے ساتھ... ملتان ہی کے گردونواح میں موجود رائس اور فلور ملیں تھیں۔ زہرہ بانو کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھی، وہ یہ سب اتنی آسانی سے ممتاز خان جیسے شیطان صفت خونی آدمی کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ تھا مگر اس وقت ان سب باتوں سے زیادہ اہم اس کے لیے لئیق شاہ تھا، مرد کا معاملہ اور ہوتا ہے لیکن ایک عورت کے لیے اس صورت میں دولت و جائداد کوئی معنی نہیں رکھتی جب اس کے کسی چاہنے والے کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو۔ عورت زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتی ہے اور اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ لئیق شاہ اس کی چاہت تھا، اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کی زندگی بچانے کی خاطر ممتاز خان کی یہ شرط بھی مان لینے کو تیار ہو جاتی مگر جانے کیوں اس کے دل کو تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ممتاز خان اسے یا لئیق شاہ کو اپنا مقصد پورا ہو جانے کے باوجود بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔

''میں یہ سب کرنے کو تیار ہوں۔'' بالآخر اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے ممتاز خان کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ قریب بیٹھے لئیق شاہ کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اندر سے چونکے بنا نہیں رہی، بظاہر پُرسکون سمندر کی طرح نظر آنے والے لئیق شاہ کے بشرے پر زہرہ کو ایک متلاطم تیز طوفان کی آمد کے آثار اُمڈتے محسوس ہوئے، جس نے ایک لمحے کو اسے اندر سے دہلا بھی دیا۔ اسے ڈر تھا کہیں جوش میں لئیق شاہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے اور ان خونخوار خون کے پیاسے بھیڑیوں کے ہاتھوں اپنی جان سے نہ چلا جائے۔

''اب کی نا تم نے ہمارے مطلب کی بات۔'' دفعتاً ممتاز خان خوش ہو کر مکروہ لہجے میں بولا۔

''مگر میری ایک شرط ہے۔ میں اپنی زندگی کی ضمانت نہیں مانگتی... لل... لیکن لئیق شاہ کا ہمارے اس معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پہلے اسے یہاں سے جانے دیا جائے۔''

زہرہ بانو نے کہا۔ اس کی یہ شرط ممتاز خان کے لیے واقعی ایک معمولی شرط تھی لیکن اس شیطان کی نیت میں کیا تھا یہ، وہی جانتا تھا۔

''مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ تم ادھر کاغذ پر اپنے سائن کرو اُدھر تمہارے عاشق لئیق شاہ کو جانے دیا جائے گا۔''

''نہیں، پہلے اسے یہاں سے بھیجو۔'' زہرہ بانو نے کہا۔ ''یہ جب تک خیریت کے ساتھ اپنے گھر نہیں پہنچ جاتا اور اس کی عافیت کی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچ جاتی، میں مطمئن نہیں ہوں گی۔''

اس کی بات سن کر ممتاز خان سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ''لئیق شاہ کو میں چھوڑ دیتا ہوں، یہ یہاں سے چلا جائے گا۔ میرا خیال ہے یہ اطمینان تمہارے لیے کافی ہونا چاہیے۔ اب گھر پہنچ کر اس کی خیریت دینے کی اطلاع تک انتظار کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، یہ وہاں پہنچ کر کوئی گل بھی کھلا سکتا ہے۔ پولیس کو بھی بتا سکتا ہے۔''

''حیرت ہے ممتاز خان۔'' زہرہ بانو استہزائیہ حیرت سے بولی۔ ''یہاں کی پولیس کو تم پہلے ہی خرید چکے ہو اور پھر لئیق شاہ بھلا کیا گل کھلا سکتا ہے؟ اور مجھے اس کاغذ پر دستخط کرنے میں، کتنی، دیر لگے گی؟ اتنی طاقت اور اثر و رسوخ کے باوجود تم لئیق جیسے عام آدمی سے ڈر رہے ہو؟''

زہرہ بانو کی بات اپنی جگہ معقول تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ممتاز خان رضامند نظر آنے لگا مگر زہرہ بانو کو ایک بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ ابھی تک لئیق شاہ کی طرف سے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا؟ ورنہ اسے پوری توقع تھی کہ لئیق شاہ کو اس کی بات پر سخت اختلاف ہوگا۔ وہ جانے سے انکار کر دے گا مگر زہرہ بانو نے دیکھا لئیق شاہ بدستور خاموش تھا۔ کیا واقعی وہ صرف اپنی خیریت چاہتا تھا؟ اسے صرف اپنی جان بچانے کی پروا تھی؟ کیا وہ خودغرض تھا؟ آخری وقت تک زہرہ بانو کے اندر ایک نامعلوم سی حسرت سر اٹھاتی رہی کہ لئیق شاہ انکار کر دے۔ چیخ کر کہہ ڈالے۔ ''نہیں... ہرگز نہیں، مجھے یہ سب منظور نہیں، میں زہرہ صاحبہ کے بغیر اکیلا اپنی جان، اپنی عافیت کی خاطر نہیں جاؤں گا یہاں سے۔ اپنی زہرہ صاحبہ کی زندگی داؤ پر نہیں لگاؤں گا۔ انہیں، خونی دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر محض اپنی جان بچانے کی خاطر ایک قدم بھی اس عمارت سے باہر نہیں نکالوں گا تو... زہرہ بانو کا مان کتنا بڑھ جاتا۔

بالآخر زہرہ بانو اور چودھری ممتاز خان کے درمیان یہ معاہدہ حتمی طور پر طے پا گیا۔

زہرہ بانو نے کاغذ اور قلم سنبھال لیا۔ ممتاز خان نے جھیما کو اشارہ کیا۔ اس نے قریب کھڑے حواری کو...... بلایا اور تحکمانہ کہا۔ ''لئیق شاہ کو لے جاؤ یہاں سے اور

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جہاں یہ کہتا ہے اسے چھوڑ آؤ، تم اپنے ساتھ صرف شوکے کو لے جاؤ۔"

"بہت بہتر جناب۔" حواری نے مؤدبانہ انداز میں چھیما سے کہا اور پھر لئیق شاہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے قریب بیٹھی زہرہ بانو حسرت و یاس سے لئیق شاہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اسے ایک آزردہ سی حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا اور وہ اندر سے بے اختیار اپنا دل مسوس کر رہ گئی، جب اس نے اپنے محبوب اپنی پہلی اور آخری محبت... لئیق شاہ کو کرسی سے خاموشی کے ساتھ اٹھتے دیکھا۔ لئیق شاہ نے وہاں سے جاتے جاتے ہوئے بھی ایک آخری نگاہ تک زہرہ بانو پر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی اور اسی طرح سے خاموشی کے ساتھ اپنا سر جھکائے، ممتاز خان کے حواری کے ساتھ چل دیا۔ کرسی پر دم بہ خود سی بیٹھی زہرہ بانو کی مجبور سی نگاہیں لئیق شاہ کی پشت پر جمی ہوئی تھیں حتیٰ کہ وہ حواری کے ساتھ چلتا ہوا دروازے سے باہر غائب ہو گیا۔

چونکی اس وقت... جب اس نے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی اور پھر دور ہوتی چلی گئی۔ لئیق شاہ جا چکا تھا۔ آنسوؤں کے موتی تھے جو زہرہ بانو کی کجراری آنکھوں کی گھنی پلکوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے... یک دم بہہ نکلے۔

"تمہارا... عاشق تو بڑا ہی فریبی نکلا... لڑکی..."

زہرہ بانو کی جھیر جھیر سماعتوں سے ممتاز خان کی تضحیک آمیز آواز ٹکرائی۔

"چودھری صاحب! کیا عاشق ہو گا۔ جان پر بنی تو اپنی جان بچا کر رفو چکر ہو گیا۔" چھیما نے بھی زہرہ بانو کے روہانسے پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"اس نے سوچا ہو گا جان بچی سو لاکھوں پائے۔" ممتاز خان نے لقمہ دیا پھر کمرے میں دونوں کے بدہیئت قہقہے گونجنے لگے۔

زہرہ بانو گم صم بیٹھی تھی، ممتاز خان بڑی اکڑ کے ساتھ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا... شیطانی مسکراہٹ سے زہرہ بانو کو گھورے جا رہا تھا۔ وقت جیسے بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ زہرہ بانو کے اندازے کے مطابق لئیق شاہ کے خیریت سے کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانے کی اطلاع پندرہ بیس منٹ بعد آ جانی چاہیے تھی۔

کافی دیر گزر گئی، ممتاز خان اور چھیما چائے پی رہے تھے۔ اچانک باہر کسی گاڑی کے انجن کی تیز آواز ابھری، وہ... سب چونکے۔ یہی سمجھے کہ لئیق شاہ کو چھوڑ کے ان کے وہ دونوں حواری لوٹ آئے ہیں، زہرہ بانو کا دل بھی جیسے بے طرح دھڑکنے لگا گویا کڑے فیصلے کی گھڑی سر پر آن اٹکی تھی۔ گاڑی کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی اور ساتھ ہی کچھ اضافی "کھڑبڑاہٹ" کے ساتھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے باہر کوئی گڑبڑ سی ہو رہی ہو، دفعتاً کچھ چیخوں کی آواز سنائی دی پھر گولیاں چلیں اور تھوڑی دیر بعد سپاٹ سی خاموشی طاری ہو گئی۔ ممتاز خان اور چھیما بری طرح ٹھٹکے۔ زہرہ بانو کا چہرہ بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ ممتاز خان نے اپنے بغلی ہولسٹر سے پستول نکال لیا تھا جبکہ اس سے پہلے چھیما اپنے ہاتھ میں گن سنبھالے کمرے کے دروازے کی طرف لپکا تھا۔ اس نے ابھی کمرے کے دروازے سے باہر قدم نکالا ہی تھا کہ ایک زوردار لمبا بانس چھیما کے منہ پر پڑا۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اندر کو لڑکھڑا گیا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑی۔ زہرہ بانو کی پھٹی پھٹی نگاہوں نے دروازے سے لئیق شاہ کو ایک بانس نما ڈنڈا ہاتھ میں پکڑے اندر نمودار ہوتے دیکھا اور جیسے اپنی جگہ سن ہو کے رہ گئی، ممتاز خان بھی اسے غیر یقینی نظروں سے تکنے لگا مگر دوسرے ہی لمحے جیسے اسے ہوش آ گیا ہو، اس نے اپنا پستول والا ہاتھ لئیق شاہ پر تان لیا۔ اسے گولی کے نشانے پر دیکھ کر زہرہ بانو کا دل دھک سے رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے لئیق شاہ نے کسی ماہر "لٹھ باز" کی طرح اپنے گنڈاسا نما بانس کو حرکت دی تھی، ادھر ممتاز خان نے گولی چلا دی۔ زہرہ بانو کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ لئیق شاہ موٹے گنڈاسے کو پنکھے کی طرح بڑی مہارت کے ساتھ حرکت دے رہا تھا، گولی گنڈاسے کے ساتھ ٹکرائی تھی، لکڑی کے پرخچے اڑے اور دوسرے ہی لمحے بانس کی ضرب ممتاز کے پستول والے ہاتھ پر پڑی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، نہ صرف پستول ممتاز خان کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا بلکہ اس کے ہاتھ کی ہڈی بھی چٹخ گئی۔ وہ کریہہ آمیز انداز میں چیخا۔ لئیق شاہ کا خوبرو نقوش والا چہرہ اس وقت جوشِ غیظ کی تمازت سے سرخ ہو رہا تھا اور بڑی بڑی روشن آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"جلدی آیئے، زہرہ صاحب۔" وہ چیخا۔ زہرہ اپنی جگہ جامد تھی۔ لئیق شاہ کے پکارنے پر جیسے اس کے اندر بھی بجلی بھر گئی اور وہ اس کی جانب دوڑی پڑی۔ اس اثنا میں چھیما نے فرش پر گرے پڑے ہونے کے باوجود پھرتی کے ساتھ لوٹ لگائی اور اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوسرے ہی لمحے لئیق شاہ کا گنڈاسا حرکت میں آیا۔ فرش پر ایک پٹاخا چھوٹا اور دوسرا پٹاخا جھیما کے بازو کی ہڈی ٹوٹنے کا ابھرا۔ اس کے حلق سے برآمد ہونے والی چیخ بڑی کرب ناک تھی۔

لئیق شاہ نے زہرہ بانو کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے ہاتھ میں لمبا بانس تھامے دروازے کی طرف دوڑا۔ زہرہ بانو کو باہر تین چار حواریوں کے بے سدھ زخمی پڑے وجود نظر آگئے۔ دونوں اپنی کار کی جانب بڑھے۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی، زہرہ نے پھرتی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور لئیق شاہ کے سوار ہوتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھادی۔

"تم نے تو مجھے حیران کر دیا لئیق شاہ۔" احاطے کا ادھ کھلا پھاٹک توڑتی ہوئی زہرہ کی کار پکے راستے پر آگئی۔ لئیق شاہ خاموش تھا۔ "میں... میں تو سمجھی تھی کہ تم جا چکے۔" زہرہ نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

اس کی بات پر لئیق شاہ نے ایک ذرا گردن... موڑ کے زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور ایک عجیب طرح کے جوش سے بولا۔

"کیا آپ مجھے ایسا خودغرض سمجھتی تھیں زہرہ صاحبہ؟"

"ہرگز نہیں، کبھی نہیں، میرا دل ہی نہیں، دماغ بھی اس بات کو تسلیم کرنے سے آخر تک قاصر رہا۔" زہرہ نے جیسے جوشِ جذب کی سی کیفیت میں ڈوب کر کہا۔ اس وقت اس کا رواں رواں تفخر و انبساط سے لرزیدہ تھا۔ اس کا گلنار چہرہ کھل اٹھا تھا اور وہ بار بار بڑی محبت اور چاہتِ دیرینہ کے ساتھ لئیق شاہ کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔

"میں بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آپ کی جان خطرے میں ڈال کر اپنی زندگی بچانے کی کوشش کروں۔" لئیق شاہ ایک دبدبے سے بولا۔

"اس وقت وہ سب ہم پر بھاری تھے۔ ہماری ذرا سی بے پروائی یا جوش دکھانے پر مشتعل ہو سکتے تھے۔ مجھے کسی موقع کی تلاش تھی اور یہ موقع مجھے آپ ہی نے دیا تھا۔"

"تم نے یہ سب کیا کیسے؟ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"دونوں حواری مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر جیسے ہی روانہ ہوئے تو میں نے دانستہ جان بچ جانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وہ مجھے سادہ لوح سمجھے تھے، میری جانب سے جیسے ہی انہوں نے غیر محتاطی کا مظاہرہ کیا تو میں نے سب سے پہلے اپنے قریب بیٹھے حواری پر حملہ کر دیا۔ اس کی گن سے لٹھ کا کام لے کر اس کا سر پھاڑ ڈالا اور دوسرے کا بھی یہی حشر کیا۔ پھر گاڑی لے کر پلٹا اور اندھادھند احاطے میں داخل ہو گیا۔ باقی حواری گاڑی دیکھ کر اسی مغالطے میں رہے کہ اس میں ان کے اپنے ہی ساتھی ہوں گے مگر جب تک وہ مجھے پہچانتے، میں ان کے سر پر پہنچ چکا تھا اور گاڑی ان سے ٹکرا دی۔ انہوں نے ٹکر سے بچنے کی کوشش بھی کی، فائرنگ بھی کی، مگر گاڑی کی طوفانی ٹکروں سے خود کو نہ بچا پائے، مجھے ہتھیار چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا مگر جمالی چاچا کے اکھاڑے میں کسرت ضرور کیا کرتا تھا لٹھ بازی اور گنڈاسا برداری بھی میں نے انہی سے سیکھی تھی، جمالی چاچا کی زمینوں پر میں ٹریکٹر بھی چلایا کرتا تھا مجھے اور تو کچھ نہ سوجھی، قریبی احاطے میں بکھرے لکڑ... کے ڈھیر سے بانس اٹھائے اندر آگیا۔"

"واؤ... تم نے حیران کر دیا لئیق..." زہرہ ایک بار پھر یہ سب سن کر چہکی۔

"مجھے آگے کی فکر ہو رہی ہے زہرہ صاحبہ... مجھے اپنی فکر تو نہیں لیکن آپ کی جان خطرے میں ہے۔" لئیق شاہ نے پُرتفکر متانت سے کہا تو زہرہ بولی۔

"کیوں... تمہیں کیوں نہیں اپنی جان کی پروا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے بغیر میں جی سکوں گی؟"

"تو پھر آپ نے مجھ سے ایسی توقع کیسے کر لی تھی کہ میں آپ کو ان خونی درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کے چلا جاؤں گا اور اگر خدانخواستہ وہ آپ کی جان کو نقصان پہنچا دیتے تو؟"

"تو کیا؟ میں تمہاری زندگی کی خاطر اپنی موت کو خوشی سے گلے لگا لیتی۔" زہرہ بانو نے گھمبیر لہجے میں کہا تو لئیق شاہ نے جیسے تڑپ کر اپنا ایک ہاتھ زہرہ کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ اور زہرہ نے بے اختیار اپنا ایک ہاتھ اسٹیئرنگ سے ہٹا کر اس کے ہاتھ پر رکھ کر اسے چوم لیا۔ لئیق شاہ نے اپنا ہاتھ ہٹا لیا بولا۔ "پھر ایسی بات نہ کیجیے گا زہرہ صاحبہ۔"

"ایک بات بتاؤ، لئیق شاہ۔" وہ گھمبیر لہجے میں بولی۔ "مجھے ممتاز خان کے چنگل سے بچانے کے پیچھے تمہارے دل میں کون سا جذبہ کارفرما تھا؟ محض ایک جاں نثار اور وفادار ملازم کا یا پھر...؟"

"میں اس بات کا جواب نہیں دے سکتا آپ کو۔" لئیق شاہ نے ہولے سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"کیوں؟"

"میں آپ کا نمک خوار ہوں۔"

"مگر تم جانتے ہو... میں نے تمہیں اس نظر سے نہیں دیکھا۔"

"زہرہ صاحبہ! آگے کی سوچیے، ہمیں جانا کدھر ہے؟ یہاں کی پولیس سے تو ہمیں انصاف کی امید نہیں۔" لئیق شاہ نے اس موضوع سے پہلوتہی کرنے کی کوشش چاہی تو زہرہ بانو بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ سامنے نگاہیں جماتے ہوئے بولی۔

"مجھے شہر جا کے کسی اعلیٰ اور ذمے دار پولیس آفیسر سے ملنا پڑے گا۔"

"ایک مشورہ دوں زہرہ صاحبہ؟" لئیق شاہ نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔

"ہاں، بولو۔"

"آپ کا شاید اب نئے پنڈ میں رہنا مناسب نہیں ہو گا۔ وڈے چودھری (الف خان) کو سوہنا رب صحت دے ان کی بات اور تھی مگر اب..."

"تمہاری بات ٹھیک ہے لئیق شاہ۔" وہ بولی۔ "مگر شاید امی جان... بابا جان کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتیں، بابا جان کی حالت ٹھیک ہوتی تو اور بات تھی۔"

"ایک بات پوچھوں آپ سے... برا تو نہیں مانیں گی آپ؟"

"نہیں، نہیں... پوچھو۔ میں بھلا تمہاری کسی بات کا برا مان سکتی ہوں؟"

"میں نے سن رکھا ہے وڈے چودھری نے آپ کی امی جان سے محبت کی شادی کی تھی؟"

"ہاں، اور بابا جان نے امی جان سے شادی کے بعد ان کا پورا ساتھ بھی نبھایا تھا اور میں اپنی ماں کو جانتی ہوں، وہ مر جائیں گی مگر اس حالت میں وہ بابا جان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گی۔"

یہ سب بتاتے ہوئے زہرہ نے اسے اپنے اور اپنی ماں ستارہ بیگم کے بارے میں بھی بتا دیا۔

حویلی پہنچے تو شہر سے ایک ماہر ڈاکٹر چودھری الف خان کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اس نے چودھری الف خان کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ خوش خبری سنائی تھی کہ چودھری الف خان اب روبہ صحت تھے، پوری حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ستارہ بیگم کے تو خوشی کے مارے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے، ڈاکٹر نے بھی ان کی خدمات کو سراہا جنہوں نے دن رات اپنے شوہر کی تیمارداری کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ہلکی پھلکی ورزش (فزیوتھراپی) سے لے کر سہارا دے کر چہل قدمی کرانے تک... سب کچھ ستارہ بیگم نے انجام دیا تھا۔ الف خان اب باتیں بھی کرنے لگا تھا۔

زہرہ نے حویلی پہنچ کر... لئیق شاہ کو ابھی جانے نہیں دیا تھا۔ اسے مہمان خانے میں بٹھایا تھا اور اپنے کچھ آدمیوں کو وہاں اس کی حفاظت پر مامور کر دیا تھا۔

چودھری الف خان کی صحت یابی سے اس کی پہلی بیوی مہرالنسا خوش نہیں تھی۔ پھر صحت یابی کے بعد تو اس کی سوکن ستارہ بیگم کی شوہر کی نظروں میں قدر و منزلت بھی سوا ہو گئی تھی، وہ جل بھن کر رہ گئی۔ زہرہ نے ابھی ممتاز خان کی چیرہ دستیوں کے حوالے سے باپ سے بات نہیں کی تھی مگر خاموش بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ البتہ ماں سے جب اس نے اس کا ذکر کیا تو وہ یک دم پریشان اور ہراساں نظر آنے لگی۔ وہ لئیق شاہ نامی نوجوان سے بھی متاثر ہوئی تھی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ زہرہ نے ماں کو اس سے مہمان گاہ میں ملوا بھی دیا۔ لئیق شاہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ اس کی اپنی حالت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی، وہ گھبرا سا گیا اور فوراً کھڑے ہو کر ادب سے انہیں سلام کیا۔ ستارہ بیگم کو یہ سیدھا سادہ شریف سا نوجوان اچھا لگا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا، تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ ہم ماں بیٹی تو تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں اتار سکتے۔" ستارہ بیگم نے اپنے تمکین آنچل کا پلو درست کرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا تو لئیق شاہ نے نظریں اور سر جھکائے فرمانبرداری سے جواب دیا۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں۔ یہ سب سوہنے رب نے کیا۔ اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ پھر ایک نوکر کی حیثیت سے یہ میرا فرض بھی تو بنتا تھا۔"

"نہیں بیٹا! نہیں، تم نوکر نہیں ہو۔ اگر تم نوکر ہوتے تو میری بیٹی زہرہ بانو کبھی بھی مجھے تم سے نہیں ملواتی۔" ستارہ بیگم کے لہجے میں برسوں کا تجربہ بول رہا تھا۔ ان کے لفظوں کی معنی خیزی کو نہ صرف قریب کھڑی زہرہ بانو نے بلکہ خود لئیق شاہ نے بھی سمجھ لیا تھا۔ وہ بے اختیار بولا۔

"ماں جی... ! میں آپ کا اور زہرہ صاحبہ کا بھی تہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔"

لئیق شاہ کا ستارہ بیگم کو "ماں جی" کہنا زہرہ بانو کو بھلا لگا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"ارے بیٹی! لئیق پتر کو کچھ کھلایا پلایا بھی ہے، بہت تھکا تھکا نظر آرہا ہے۔" ستارہ بیگم نے بیٹی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میں نے کہہ دیا ہے۔ ابھی کھانا لگاتے ہیں۔" وہ جواباً بولی۔

"نہیں جی... اس کی ضرورت نہیں۔ میں گھر جا کر کھالوں گا۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔" لئیق شاہ بولا۔ "میری ماں اور بابا پریشان ہورہے ہوں گے۔"

"ان کی فکر نہ کرو۔ میں ایک ملازم کو وہاں بھیج کر تمہاری خیریت کی اطلاع ان تک پہنچا دوں گی۔" زہرہ بولی۔

"آپ کی مہربانی جی لیکن میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔"

"لئیق! وہ تمہارے خون کے پیاسے ہورہے ہوں گے۔" زہرہ متذبذب نظر آنے لگی تو لئیق شاہ ایک تلخ مسکراہٹ سے بولا۔

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ بزدل ہیں سامنے سے وار نہیں کریں گے۔ میں نے ان سے محتاط ہونا سیکھ لیا ہے، زہرہ صاحبہ! بس آپ اپنی فکر کیجیے گا کیونکہ آپ ان کے درمیان رہتی ہیں۔"

زہرہ نے اسے بتایا کہ چودھری الف خان اب روبہ صحت ہیں۔ اب کسی کی ہمت نہیں ہوگی ان پر ہاتھ اٹھانے کی اور وہ بہت جلد الف خان سے اس کی شکایت بھی کرنے والی تھی۔ لئیق شاہ چلا گیا۔

☆☆☆

یہ اسی رات کا ذکر تھا، ہر سو خاموشی تھی، چودھری الف خان کو حویلی کے پائیں باغ میں ٹہلانے کے بعد ستارہ بیگم انہیں اندر کمرے میں لے آئی اور انہیں سہارا دے کر آرام سے مسہری پر لٹا دیا تو الف خان نے ستارہ بیگم کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت بھری مسکراہٹ سے بولا۔

"تم بھی بیٹھو میرے ساتھ... ہمیں لگتا ہے جیسے آج ہم دوبارہ زندہ ہوئے ہیں۔"

ستارہ بیگم شرم سے گلنار ہوتے ہوئے بولی۔ "میری جان آپ پر قربان، اللہ آپ کو صحت اور لمبی عمر دے۔ آپ آرام سے لیٹ جائیں۔"

"نہیں تم بھی ہمارے ساتھ لیٹو... آج ہم لیٹ کر باتیں کریں گے، جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔" الف خان سرور میں بولا۔ ستارہ بیگم ہلکی سی شرمیلی مسکراہٹ سے بولی۔

"چودھری صاحب! اب وہ عمر کہاں رہی مگر میرے لیے وہ یادیں ایک بڑی دولت سے بڑھ کر سرمایۂ حیات ہیں۔"

"کاش! تمہارے ساتھ وہ سیندور والی سازش نہ ہوئی ہوتی تو آج ہم تم سے کوئی اچھا سا رومانی گانا سنتے... آج جانے کیوں بڑا دل کررہا ہے کوئی اچھا سا گیت سننے کو۔" شوہر کی بات پر ستارہ بیگم کا چہرہ مغموم سا ہوگیا۔ چودھری الف خان نے ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد حائل کر کے خود سے قریب کرلیا۔ محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ جذبات پر کبھی ضعف نہیں آتا، بلکہ سچی محبت کرنے والوں کی محبت کو تو وقت کی دھول ماند کرسکتی ہے نہ عمر کی طوالت... وہ بس محبت کرنا جانتے ہیں پھر سچی وفا محض جسمانی ملاپ ہی کا نام تو نہیں، یہ تو دو پیاسی روحوں کا سنجوگ ہوتا ہے۔

رات کے کسی پہر جب چودھری الف خان کی آنکھ لگ گئی تو ستارہ بیگم آہستگی سے مسہری سے اٹھی، اپنا مسکا ہوا لباس اور آنچل درست کر کے اپنے کمرے میں آئی تو چونک پڑی، اس کی مسہری کے قریب سائڈ میز پر دودھ کا بھرا گلاس رکھا تھا اور اوپر کپڑے کا نفیس کور رکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ وہ اپنا دودھ خود کچن میں جا کر نکال کر پیتی تھی، پھر کچھ سوچ کر اس کے چہرے پر ممتا بھری مسکراہٹ عود کر آئی... "زہرہ بیٹی ضرور کمرے میں آئی ہوگی اور مجھے نہ پا کر یہ دودھ بنا کے رکھ گئی ہوگی۔ کتنا خیال ہے میری بیٹی کو میرا۔" اس نے سوچا۔ وہ واقعی تھکی ہوئی تھی، آج اس کا کچن میں جا کر دودھ بنانے کا بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ویسے ہی سو جانا چاہتی تھی مگر چونکہ وہ رات کا کھانا کھانے کی عادی نہ تھی، صرف دودھ کا گلاس پیتی تھی، اسے معدے کی تکلیف تھی، اس لیے ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ وہ خالی پیٹ نہ سویا کرے۔ کم از کم دودھ کا گلاس ضرور پی کر سویا کرے۔

وہ مسہری پر آکر تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی، پھر دودھ کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اوپر سے کور ہٹایا اور گلاس منہ سے لگا لیا مگر اس سے جانے کیوں بمشکل نصف گلاس ہی پیا جاسکا۔ شاید تھکاوٹ کی وجہ تھی یا کچھ اور... اس نے باقی ادھ بھرا گلاس کور سے دوبارہ ڈھانپ کر رکھ دیا اور لائٹ آف کر کے سوگئی۔

کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور مسہری کے قریب ہی کھڑکی سے دو قاتل خونی آنکھیں اندر جھانک رہی تھیں اور پھر اگلے ہی لمحے مسہری پر دراز ستارہ بیگم کے وجود کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے گلے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سہلانے لگی اور مسہری پر پڑے پڑے جان کنی کے عالم میں تڑپنے لگی... یہاں تک کہ اس کا وجود بے حس وحرکت ہو گیا۔

کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی دو قاتل خونی آنکھوں نے یہ کربناک منظر دیکھا اور پھر جیسے تسلی کرنے کے بعد وہ غائب ہو گئیں۔ یہ اس کی سوکن مہرالنسا تھی۔

شوہر کی صحت یابی اور اس کے دوبارہ ستارہ بیگم کی طرف ملتفت ہونے پر مہرالنسا اندر تک جل بھن گئی تھی۔

"مجھے یہ کام بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔" کھڑکی سے ہٹ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بڑبڑائی۔ "مگر کیسے کرتی؟ اس وقت چودھری بڑا دم خم رکھتا تھا۔ پھر میں بھی اکیلی تھی، اس کا سیدھا شبہ مجھ پر جاتا... اب چودھری بوڑھا ہو چکا ہے اور میں خود ایک جوان بیٹے کی ماں بن چکی ہوں۔"

شیطانی سوچوں کے تلاطم میں وہ اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح پوری حویلی میں ہی نہیں بلکہ پورے نئے پنڈ میں کہرام مچ گیا۔ چھوٹی چودھرائن ستارہ بیگم انتقال کر گئی تھیں۔ زہرہ بانو تو ماں کی لاش دیکھ کر کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں آ گئی۔ چودھری الف خان جو روبہ صحت تھے، اپنی لاڈلی اور چہیتی بیگم کے اس طرح خاموشی سے روٹھ جانے کے باعث پھر ڈھے گئے۔ مہرالنسا جو خود ایک زہریلی ناگن تھی، سوتن کی لاش پر کھڑے ہو کر مگرمچھ کے آنسو بہانے لگی۔ حویلی کی اور دیگر عورتوں نے زہرہ بانو کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس کا سکتہ توڑا تو زہرہ ایک کربناک اور ہذیانی چیخ مار کر ماں کی لاش سے لپٹ کر رو پڑی... مگر کچھ دیر بعد جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کے اندر بیداری کی لہر ابھری۔ خرد نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کیا، موجودہ حالات کی تلخی نے مہمیز کیا تو... یونہی اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ اس کی نظر مسہری کی سائڈ ٹیبل پر پڑی۔ وہاں ادھ بھرا دودھ کا گلاس رکھا تھا۔ مہرالنسا بھی قریب کھڑی تھی۔ مجرم جتنا بھی چالاک ہو، کتنی ہی بے داغ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی کے لیے گڑھا کھودے... کہیں نہ کہیں اس سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ مہرالنسا کو بھی اپنی ایک فاش غلطی کا احساس ہوا، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ زہرہ بانو کا خیال دودھ کے ادھ بھرے..... گلاس کی طرف بھی جا سکتا ہے۔ اس نے فوراً ایک خادمہ کے کان میں دانت پیستے ہوئے سرگوشی کی، وہ گھبرا کر فوراً آگے بڑھی اور دودھ کا گلاس وہاں سے اچکنے لگی تو زہرہ بانو نے درشت آواز میں اسے منع کر دیا۔

"ٹھہرو، اسے ادھر ہی رکھا رہنے دو۔"

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زہرہ بانو دودھ کا گلاس اٹھا کر اسے اپنی آنکھوں کے قریب کر کے دیکھنے لگی۔ پھر کور ہٹا کر اسے سونگھا۔ اسے کچھ شبہ ہونے لگا پھر اس نے بہ آواز بلند پوچھا۔

"یہ دودھ کا گلاس کس نے رات کو یہاں رکھا تھا؟"

کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ زہرہ نے حویلی کی تمام خادماؤں سے پوچھ لیا۔ سب نے انکار میں سر ہلا دیا تو بالآخر مہرالنسا نے ہی آگے بڑھ کر مکارانہ فروتنی سے کہا۔

"ارے بیٹی... یہ تو دودھ ہے۔ ہو سکتا ہے ستارہ نے رات کو خود اپنے لیے یہ دودھ نکالا ہو اور آدھا پی کر... چھوڑ دیا ہو، لاش کو کفنانے کا انتظام ہمیں کرنا چاہیے... موسم ایسا نہیں ہے کہ لاش کو زیادہ پڑا رہنے دیا جائے۔"

زہرہ بانو کو اپنی سوتیلی ماں کے لہجے سے بے حسی کی بو محسوس ہوئی، اس نے اس کی بات کو یکسر نظرانداز کر دیا اور ایک ملازمہ سے تحکمانہ بولی۔ "ایک خالی اور صاف بوتل لے کر آؤ... میری ماں اس دودھ کو پینے کے بعد مری ہے۔ میں اس کا لیبارٹری تجزیہ کرواؤں گی۔"

اس کی بات سن کر مہرالنسا دھک سے رہ گئی اور فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔ دونوں بھائی وراثت علی اور رئیس خان بھی موجود تھے۔ زہر کی پڑیا انہوں نے ہی لا کر دی تھی اور دودھ کا گلاس مہرالنسا نے ہی اپنی سوتن کے کمرے میں رکھا تھا۔ زہر اسی نے ہی دودھ میں ملایا تھا۔

"یہ مصیبت تو گلے پڑ رہی ہے۔ جلدی کچھ کرو۔ وہ دودھ کا پتا نہیں کیا کرنے والی ہے۔" مہرو نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

ممتاز خان کا ایک ہاتھ زخمی تھا۔ اس پر بینڈیج بندھی ہوئی تھی بولا۔ "ماں جی! ہمیں دودھ کا گلاس پہلے ہی وہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ منحوس ستارہ بیگم آدھا دودھ بچا دے گی۔"

"ہمیں جلدی کچھ کرنا ہو گا۔ یہ لڑکی... ڈاڈی اوکھی ہے... سیدھا شہر کا رخ کرے گی اور ہم سب پر بہت بڑا مقدمہ کر دے گی۔" وراثت علی نے متفکر ہو کے کہا۔ ممتاز خان کو اس کی پروا نہ تھی، وہ بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''کسی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس، اپنے منہ بند رکھو۔ ایک بڑی مصیبت سے آج ہمیں چھٹکارا مل گیا ہے تو اس مصیبت (زہرہ بانو) سے جلد ہی جان چھوٹ جائے گی۔''

''مگر وہ دودھ... وہ دودھ زہریلا ہے۔'' مہرالنسا متفکر ہوکر اپنے بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بے شک ہوتا رہے۔''

''ہم سب جیل چلے جائیں گے پتر۔'' ماں ہراساں نظر آنے لگی۔ رئیس خان نے سمجھایا۔

''باجی جی! ایسی فکر نہ کرو، زہرہ کا ہم راستہ کاٹ دیں گے۔''

''ہاں، وہ شہر پہنچ پائے گی تو زہریلے دودھ کا معائنہ کروائے گی نا، ماں جی۔'' ممتاز خان کے بدہیئت ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ تھی۔ مہرالنسا بیٹے اور بھائی کی بات کا مطلب سمجھ کر تفہیمی انداز میں ہولے ہولے اپنے سر کو جنبش دینے لگی۔ تاہم پھر کچھ سوچ کر بولی۔

''ابھی ٹھہر جاؤ، ہوسکتا ہے چودھری صاحب حویلی کی عزت کی خاطر ایسا کرنے سے منع کر دیں۔ آؤ دیکھتے ہیں۔''

زہرہ بانو نے یہ بات باپ کو بتائی۔ چودھری الف خان الجھ کر رہ گیا۔ اسی وقت مہرالنسا اور ممتاز خان بھی وہاں آن موجود ہوئے، اور دونوں ماں بیٹا، زہرہ بانو کو تلخ اور زہریلی نظروں سے گھورنے لگے۔

''چودھری صاحب! آپ نے سنا... یہ لڑکی کیا گل کھلانے جارہی ہے؟''

''کیوں چودھرائن جی! آپ کو کوئی اعتراض ہے یا پھر کسی بات کا ڈر ہے؟'' اب زہرہ بانو بھی پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی، ورنہ کم از کم باپ کے سامنے وہ اپنی سوتیلی ماں سے کبھی نہیں الجھی تھی اور آج اس نے بھی اسے وڈی ماں جی کے بجائے وڈی چودھرائن کہہ کر پکارا تھا۔ اس کا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا۔ چہرہ اب بھی اشکبار تھا۔ اتنی محبت کرنے والی، جان نچھاور کرنے والی ماں... آج ظالم زمانے کی نفرتوں، کدورتوں اور محلاتی سازشوں کا شکار ہو کر اس سے ہمیشہ کے لیے چھین لی گئی تھی۔ حقیقی باپ کا سایہ تو پہلے ہی سر سے اٹھ گیا تھا۔ اب ماں بھی نہیں رہی تھی۔ سوتیلا باپ تھا۔ پتا نہیں اب ماں کے مرنے کے بعد اس کا اس کے ساتھ بھی کوئی رشتہ بنتا تھا یا نہیں، یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ البتہ زہرہ بانو کو اس تلخ اور کریہہ حقیقت کا ادراک ضرور ہونے لگا تھا کہ جو شخص (الف خان) اپنی چہیتی اور لاڈلی بیوی کے خلاف اندر ہی اندر اس حویلی میں پلنے والی سازشوں سے چشم پوشی کرتا رہا اور بالآخر اسے سازشی موت کھا گئی، وہ بھلا اب یہاں اس کا... ایک یتیم و یسر لڑکی کا کیا تحفظ کر پائے گا؟

''تم خاموش رہو مہرو، مجھے بات کرنے دو۔'' جہازی سائز مسہری پر نیم دراز چودھری الف خان نے بیوی سے تیز لہجے میں کہا۔ پھر زہرہ بانو کی طرف متوجہ ہوا۔

''بیٹی! اللہ گواہ ہے میں نے تجھے کبھی سوتیلے پن کی نظر سے نہیں دیکھا۔ تیری ماں کے ساتھ تجھے بھی اپنانے اور ایک باپ کا پیار دینے کا جو وعدہ میں نے تیری ماں ستارہ بیگم سے کیا تھا، وہ میں نے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔''

''میں جانتی ہوں... بابا جانی۔'' زہرہ بانو یک دم تڑپ کر بولی۔ ایک ایسی بے آسرا مجبور لڑکی جس کے سر پر اب نہ باپ کا سایہ تھا نہ ماں کا... وہ اپنے سوتیلے باپ کی اس بات سے جھیر جھیر ہونے لگی۔ ہمدردی کے ان بولوں نے اسے رنجیدہ خاطر کر دیا۔

چودھری الف خان نے کہا۔ ''بیٹی! مجھے ٹھیک طرح معلوم نہیں... بات کیا ہے وہ بتاؤ؟''

زہرہ بانو نے انہیں بتا دیا کہ ان کی ماں کا انتقال نہیں ہوا تھا بلکہ انہیں دودھ میں زہر دے کر قتل کیا گیا ہے اور... اس نے وہ سب بھی بتا دیا جو وہ آئندہ کا لائحہ عمل اپنے ذہن میں رکھتی تھی۔

یہ سب سن کر چودھری الف خان کے جھریوں زدہ چہرے پر شکنوں کا جال مزید گہرا ہو گیا اور آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی، وہ زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''بیٹی! تمہیں اس بات کا صرف شبہ ہے یا یقین؟''

''شبہ ہی ہے مگر یقین کی حد تک شبہ۔''

''اس کی کوئی ٹھوس وجہ تو ہو گی؟'' الف خان نے گہری متانت سے کہا۔ ''کیونکہ بسا اوقات چھوٹے موٹے خاندانی جھگڑوں میں اگر اس طرح کا کوئی قدرتی یا طبی حادثہ ہو جائے تو خوامخواہ ہی دلوں میں بڑی بڑی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا محض شبے کی بنا پر یہ معاملہ حویلی سے باہر جائے اور خوامخواہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے۔''

باپ کی بات پر زہرہ بانو نے ایک تلخ سی نگاہ سامنے ماں کے ساتھ کھڑے ممتاز خان پر ڈالی اور باپ سے بولی۔

''بابا جانی! آپ کی بات مجھے تسلیم ہے۔ مجھے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں برسوں کے تجربے کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا کہ بسا اوقات چھوٹی موٹی خاندانی تلخیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس دوران کوئی اتفاقاً حادثہ ہو جائے تو بڑی خطرناک غلط فہمی جنم لیتی ہے لیکن اگر میں اس ضمن میں آپ سے اپنے شبہے کی بنیاد پر ایک ٹھوس ثبوت پیش کرنا چاہوں تو کیا آپ اسے تسلیم کریں گے؟''

''بالکل تسلیم کروں گا زہرہ بیٹی۔ کیوں نہیں کروں گا۔ ہم تمہارے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ بولو... کیا کہنا چاہتی ہو بیٹی؟''

زہرہ بانو نے ایک گہری سانس لی اور پھر انہیں شروع سے آخر تک اس کے لاڈلے بیٹے ممتاز خان کی بدمعاشیوں اور چیرہ دستیوں کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ الف خان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ممتاز خان کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

''اب آپ ہی انصاف سے بتائیں مجھے بابا جانی کہ میرے شبہے کی وجہ چھوٹی موٹی ہے یا ٹھوس ہے؟'' زہرہ بانو نے سارن صراحت بتانے کے بعد چودھری الف خان سے کہا تو ممتاز خان غصے سے پھٹ پڑا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے بابا جانی! سفید جھوٹ۔''

''اگر یہ جھوٹ ہے تو پھر تمہارے بازو پر پلستر کیوں چڑھا ہوا ہے؟'' زہرہ بانو نے طنزیہ کہا۔

''میں اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ وہاں میرے ساتھ معمولی حادثہ پیش آگیا تھا۔''

زہرہ بانو اس سفید جھوٹ پر ششدر رہ گئی۔ مہرو بھی بیٹے کی حمایت میں بولی۔ ''لڑکی! تمہیں شرم آنی چاہیے میرے بیٹے پر ایسا گھناؤنا اور گھٹیا الزام لگاتے ہوئے۔''

''وہ مزدور اور ورکرز گواہ ہیں ان سب باتوں کے۔ وہ لئیق شاہ نامی نوجوان بھی... جو سالونٹ پلانٹ کے مزدوروں کا لیڈر ہے۔'' زہرہ نے کہا۔

''تم جن مزدوروں اور ورکروں کی بات کر رہی ہو، وہ سب تمہارے خریدے ہوئے ہیں۔ رہی بات لئیق شاہ جیسے کمین کی تو اس کے ساتھ تم اس روز سالونٹ پلانٹ کے ویران احاطے میں کیا راز و نیاز میں مصروف تھیں، وہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مجھے تو بابا جان کے سامنے ایسی بات بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔'' ممتاز خان نے موقع ملتے ہی پانسا پھینکا۔

''تو تم تسلیم کرتے ہو کہ اس روز تم وہاں آئے تھے۔'' زہرہ بانو نے اس کی بات پکڑ لی۔

مارچ 2015ء کے صفحات کی جھلک

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل
محفل شعر و سخن اور
مرزا امجد بیگ کا مدلل انداز

سفر در سفر

ویسے تو زندگی ایک سفر ہے لیکن کہیں کہیں پڑاؤ بھی آتے ہیں۔ آخری صفحات پر ایک عجیب و غریب پڑاؤ کی داستان **منظر امام** کے قلم کی روانی

درماندہ عشق

تاریخ کے اوراق سے ایک اور یادگار داستان......

الیاس سیتا پوری کا سحر انگیز انداز

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے

ملت اسلامیہ کے مسمم ارادوں کا عبرت اثر احوال

ماروی

کبھی ہار کبھی جیت، زندگی کے رنگین و سنگین لمحات پر مشتمل روداد۔ **محی الدین نواب** کا دلچسپ شاہکار

اس کے علاوہ

ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر، سلیم انور، تنویر ریاض اور ڈاکٹر ساجد امجد کی دلفریب کہانیاں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"بے شک آیا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تمہاری وجہ سے سالونٹ پلانٹ جیسا دھندا کیوں ڈھپ ہو کر رہ گیا؟" ممتاز خان نے چالاکی سے ایک اور جھوٹ بولا۔ مکار مہرالنسا نے ممتاز خان کو وہاں سے جانے کا کہا۔ وہ زہرہ کو زہریلی نظروں سے گھورتا ہوا غصے سے پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ مہرالنسا نے نفرت بھری نظروں سے زہرہ بانو سے کہا۔

"بس لڑکی! ثابت ہو چکا ہے، تم جھوٹی ہو اور درحقیقت اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے میرے معصوم بیٹے پر گھناؤنا الزام لگا رہی ہو۔ تمہیں بھلا خاندان کی عزت کی کیونکر فکر ہوگی؟ لئیق شاہ والے معاملے کی وجہ سے تو لوگ ابھی سے ہی ہمارے بارے میں باتیں کرنے لگے ہیں اور اب تم شہر جا کر ہمارے خلاف مزید گل کھلانا چاہتی ہو؟"

"یہ لئیق شاہ والا کیا معاملہ ہے زہرہ بیٹی؟" چودھری الف خان نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زہرہ بانو سازشی اور مکاریاں بیٹے کے جھوٹ در جھوٹ پر پہلے ہی اندر سے کھلی جا رہی تھی، ماں کی اچانک وفات کا اسے پہلے ہی غم کھائے جا رہا تھا۔ اب تو خود کو واقعی تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے اب سب اس کے دشمن ہونے لگے ہوں۔ انصاف ملنے کی ایک امید تھی، وہ بھی الف خان کی خاموشی سے دم توڑتی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل رقیق سا ہونے لگا۔ آنکھوں کے گوشے فرطِ رقت سے نمناک ہونے لگے، تاہم باپ کے سوال پر وہ جواباً بولی۔

"باباجانی! مجھے افسوس ہے کہ میری باتوں کو جھوٹ اور الزام سمجھا جا رہا ہے جبکہ سچ..."

"ہم نے تم سے لئیق شاہ کے بارے میں پوچھا ہے زہرہ بانو؟" اس بار چودھری الف خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا تو زہرہ بانو کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ قریب کھڑی مہرالنسا کے عیار چہرے پر مکارانہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

"باباجانی! لئیق شاہ ایک غریب ماں باپ کا شریف لڑکا ہے اور ہمارے پلانٹ کا پرانا ورکر ہے۔" بالآخر زہرہ بانو نے بتایا۔

"کیا وہ سب سچ ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے بیٹے ممتاز خان نے اس کے اور تمہارے بارے میں بتایا؟"

"کمال ہے باباجانی، آپ نے اپنے بیٹے ممتاز خان کی محض ایک بات پر بڑے کڑے انداز میں مجھ سے باز پرس شروع کر دی اور میں نے اتنی بات حقیقت بتائی اس سلسلے میں آپ نے اپنے بیٹے ممتاز خان سے ایک سوال بھی نہیں پوچھا؟"

چودھری الف خان کی جانبداری محسوس کر کے زہرہ بانو کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ دونوں باپ بیٹی کے درمیان اس طرح تلخ انداز میں ایک اہم موضوع پر بحث چھڑ گئی تھی۔

چودھری الف خان لاجواب ضرور ہوا مگر اس کی چودھراہٹ والی رگ پر لئیق شاہ کے موضوع نے شدید ضرب لگائی تھی اور یہ حساس نوعیت کی چال دونوں مکار اور سازشی ماں بیٹے نے سوچ سمجھ کر ہی کھیلی تھی۔

"زہرہ بیٹی! خاندان کی آن بان اور عزت پر ایک ذرا سی آنچ آنے سے پہلے ہم جانیں تک داؤ پر لگانے سے نہیں ہچکچاتے... تمہارا لئیق شاہ کے سلسلے میں جواب سخت ابہام کا شکار ہے۔ اگر بات واقعی وہی ہے جو ہم سمجھ رہے ہیں تو پھر اس بات کو ابھی ختم کر ڈالو۔ بصورت دیگر تمہیں یا... اس لڑکے کو... یہ گاؤں چھوڑنا پڑے گا۔"

چودھری الف خان نے خالص جاگیردارانہ لہجے میں کہا۔ زہرہ بانو کے چہرے پر تلخی گھل گئی۔ منہ پھٹ تو وہ شروع ہی سے تھی، مگر حفظِ مراتب کا پاس کرنا بھی جانتی تھی، لیکن جب بات صحیح غلط اور حق سچ کی آئی تو وہ چپ نہیں رہ سکی اور بولی۔

"باباجانی! آپ نے بھی تو امی جان سے محبت کی شادی کی تھی۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے، وہ کون تھیں کیا تھیں مگر آپ نے تو کسی کی پروا نہیں کی اور میں تو سمجھتی تھی آپ جذبۂ محبت کے بڑے قدرداں اور داعی ہیں۔ مجھے اس پر ساری عمر فخر بھی رہا ہے کہ آپ دونوں نے جس محبت کا عمر بھر ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا، وہ پورا بھی کیا تھا پھر... اب میرے سلسلے میں یہ جانب داری کیوں برتی جا رہی ہے؟"

مہرالنسا جو باپ بیٹی کے دلوں میں ایک نفاق کا بیج بو چکی تھی اور اندر ہی اندر اپنی اس کامیابی پر خوش بھی ہو رہی تھی، فوراً زہرہ بانو کو جھڑکتے ہوئے غصے سے بولی۔

"لڑکی! کیا تم اب تمیز بھی کھونے لگی ہو، اپنے باپ سے اس طرح بات کرتے ہیں؟"

"تم جاؤ مہرالنسا! میں خود اس سے بات کر رہا ہوں۔" چودھری الف خان نے بارعب لہجے میں بیوی سے کہا اور وہ زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ہوئے کمرے سے نکل گئی، مگر دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی ہوگئی، اب وہ اندر کی سن گن لے رہی تھی۔

''دیکھو بیٹی! ہماری بات اور تھی، ایک مرد کی سو خامیاں چھپ جاتی ہیں مگر ہماری نظر میں عورت کا معاملہ اور ہوتا ہے۔ پھر بات خاندان کی عورت کی ہو تو... بات اور بھی حساس ہو جاتی ہے۔ بے شک تمہارا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں مگر ہم نے ستارہ بیگم سے تمہارے تحفظ اور تربیت کے سلسلے میں جو ہو سکا، وہ کیا ہم نے... لیکن بہرحال، اب ایک حوالے سے تم بھی ہمارے خاندان سے نتھی ہو چکی ہو۔ میں تمہارے لہجے سے سرکشی کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ میں تم پر اب شاید کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتا۔ اگر تم ایسے کسی معاملے پر بضد ہو جس میں ہماری مرضی شامل نہیں... تو پھر تم اپنا راستہ الگ کر سکتی ہو جو تمہارا حق تھا، وہ ہم تمہیں دے چکے۔''

باپ کی بات پر زہرہ بانو کے وجود میں کرب کی لہر سی ابھری۔ نیلی شاہ سے وہ محبت کرتی تھی، وہ اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی مگر چودھری الف خان نے آج خود ہی اس کے اور اپنے رشتے کے بیچ گویا خط تنسیخ کھینچ دی تھی اور یہ حقیقت بھی تھی جس کا بہت پہلے سے زہرہ بانو کو بھی اندازہ تھا تو پھر اس بحث کو بڑھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''میں شاید خود بھی اب یہاں نہ رہ سکوں بابا جانی۔''

''تو تم نے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے یہاں سے؟''

''جی ہاں، بابا جانی! لیکن میں آپ کی محبت کو نہیں بھولوں گی۔''

''ہم بھی تمہیں ستارہ بیگم کے حوالے سے ہمیشہ یاد رکھیں گے، اب اس موضوع کو ادھر ہی دفن کردو، ہم تمہیں جو دے چکے وہ دے چکے اس پر اب تمہارا ہی حق ہے۔''

''اور امی جان کے خلاف سازش اور ان کے قتل نما انتقال کے بارے میں آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' زہرہ بانو نے حلق میں اترتی رقت سے پوچھا۔

''ہمیں اس بات پر قطعاً یقین نہیں ہے کہ ایسا ہوا بھی ہوگا۔'' چودھری الف خان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''آپ کو یقین آئے گا بھی کیوں بابا جانی! اس لیے کہ اس کا تعلق آپ کے خاندان سے جڑا ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی زہرہ بانو کے گھٹے گھٹے لہجے میں تلخی اتر آئی اور اس نے دانستہ لفظ ''خاندان'' کو چبا کر ادا کیا۔

''اب تم ہم پر طنز بھی کرو گی؟'' چودھری الف خان نے اس کی طرف گھورا۔

''تو کیا پھر... میں امی جان کا خون رائگاں جانے دوں؟''

''یہ تمہارے اپنے دماغ کا خلل ہے۔''

''میں دودھ کا لیبارٹری تجزیہ کرواؤں گی پھر تو آپ کو یقین آجائے گا نا... بابا جانی؟''

''اگر ایسا کرو گی تو... پھر تم ہمیں بابا جانی کے حق سے بھی محروم کردو گی۔'' الف خان نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پھر ہم بھی یہی سمجھیں گے کہ اس دودھ میں زہر ملایا گیا ہے۔ ہم پر، ہماری آن اور ہمارے خاندان کو برباد کرنے کے لیے...''

زہرہ بانو، چودھری الف خان کی بات کا مطلب سمجھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار اس احساس سے آنسو بہہ نکلے کہ شاید اب اس کی ماں کا خون بھی رائگاں چلا گیا۔

وہ روتی ہوئی پلٹ گئی۔ سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور اوندھے... منہ بستر پر گر کر تکیے میں اپنا منہ دیے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جب دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو ماں کی بڑی سی فریم کی ہوئی تصویر سے باتیں کرنے لگی۔

''امی جان! مجھے معاف کر دیجیے گا۔ شاید میں وہ سب نہ کر سکوں جو آپ کے خونِ ناحق کے بہہ جانے پر کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، اس کی وجہ بھی آپ ہی تو ہیں امی جان! میں جانتی ہوں آپ کو بھی شوہر سے کتنی محبت تھی۔ آپ بھی تو نہیں چاہیں گی نا کہ میں آپ کے محبوب شوہر کی مرضی کے خلاف کوئی ایسا قدم اٹھاؤں جو ان کے لیے دکھ اور ذہنی اذیت کا باعث بنے۔ میں بھی اس وجہ سے مجبور ہوگئی امی جان! اگر ایسا سب کچھ ہوا ہے آپ کو کسی نے موت سے ہمکنار کیا ہے تو امی جان! پھر میں یہ معاملہ اپنے اللہ کے سپرد کرتی ہوں۔ وہی سب سے بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ مگر امی جان! اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں آپ کی تصویر کو اپنے سینے سے لگائے یہاں سے چلی جاؤں گی، ہمیشہ کے لیے۔''

☆☆☆

ماں کے مرنے کے بعد زہرہ بانو کو اب اس حقیقت کا اچھی طرح احساس ہو چکا تھا کہ اب اس کی حویلی میں بلکہ نئے پنڈ میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں بچی تھی۔ چودھری الف خان نے بھی ستارہ بیگم کی وفات کے بعد ''محلاتی'' مصلحت کوشی اپنالی تھی اور اب اس کا جھکاؤ مہرالنسا اور اپنے بیٹے ممتاز خان کی طرف زیادہ ہونے لگا تھا۔ شاید وہ بھی کچھ

رہا تھا کہ ستارہ بیگم کے بعد ان کی گئے وقتوں کی اس طوفانی محبت کا بھی خاتمہ ہو چکا۔ اب ذرا خوابوں سے نکل کر حقیقت کو دنیا کی آنکھ سے دیکھنا چاہیے۔ اس پر مستزاد لئیق شاہ والے معاملے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا اور ایک طرح سے چودھری الف خان نے زہرہ بانو کو بھی اپنی زندگی سے نکال پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ زہرہ بانو کو اس بات کا قلق تھا۔ وہ چودھری الف خان کی اس بے حسی سے دل برداشتہ بھی ہوئی مگر اس کے دل میں وفا کا خمیر اس کی ماں ستارہ بیگم سے ہی تو اٹھا تھا۔ اس نے دلی طور پر الف خان سے ناتا کہیں توڑا تھا۔ وہ اسے اب بھی اپنا باپ سمجھتی تھی۔ چاہے سوتیلا سہی۔ کیونکہ بہرحال اس نے زہرہ بانو کی ایک باپ ہی کی طرح پرورش کی تھی۔ زہرہ بانو ان سے ایک بیٹی ہی کی طرح محبت کرتی تھی، انہیں باپ سمجھتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ باپ کے ساتھ ہی رہے۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی ان کی خدمت کرے، مگر سازش کی آندھیوں نے حالات کا رخ موڑ دیا تھا۔ اب تو بقول شاعر... وہی پتے ہوا دینے لگے جن پر تکیہ تھا۔ چودھری الف خان نے خود ہی ایک طرح سے زہرہ بانو کو خود سے علیحدہ کر دیا تھا۔

زہرہ بانو نے ان ساری باتوں اور کربیہ حقیقتوں کے باوجود خود کو ڈھنے نہیں دیا تھا۔ اس کے حوصلوں کے سفینے اب بھی بلند تھے۔ چودھری الف خان سمیت سبھی نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ جو کرنا چاہتی تھی، اس سے بھی روک دیا گیا تھا۔ زہرہ بانو ہمت کی پکی تھی، حوصلہ اور ہمت ہارنے والی نہیں تھی، مگر باپ نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ تاہم زہرہ نے اپنے یقین کی حد تک قائم ہونے والے شبہے کی تصدیق کرانے کا عزم صمیم ضرور کر رکھا تھا۔

اس نے حویلی (سنے پنڈ) سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنے سے پہلے کچھ دن یہاں گزارنے کا فیصلہ ضرور کیا تھا۔ اپنا سامان وغیرہ سمیٹنے کے بہانے اس نے چودھری الف خان سے گویا کچھ دن یہاں قیام برائے مستعار لے لیے تھے، مگر ایک کام فوری طور پر اس نے یہ ضرور کیا تھا کہ یہاں موجود اپنے ایک آدمی کو دودھ کی بوتل دے کر فوراً ملتان روانہ کر دیا اور کمیل دادا کو بھی ضروری ہدایات فون پر دے دیں۔

دودھ کا لیبارٹری تجزیہ کرانا ضروری تھا اور اس نے کمیل دادا کو سختی سے تاکید کی تھی یہ کام پہلی فرصت میں کروا کے اس کی رپورٹ دے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ لئیق شاہ سے بھی ایک ملاقات کے بارے میں سوچنے لگی۔

ماں کے سوگ کا تیسرا دن تھا۔ اس روز کی حتمی گفتگو کے بعد سے جیسے مہر النسا اور ممتاز خان کو کھلی چھوٹ مل گئی تھی، دونوں ماں بیٹا اب بڑے دھڑلے کے ساتھ زہرہ بانو کو تنہا اور اب "بے آسرا" جان کر سخت طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے لگے۔ ممتاز خان کو تو اس نے دانت پیس کر خونخوار انداز میں بڑبڑاتے بھی پایا تھا۔ "تم اب زندہ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ تمہیں اس حویلی اور اس پنڈ سے ہی نہیں ہر اس چیز سے دستبردار ہونا پڑے گا جو تمہاری ملکیت میں لکھ دیا گیا تھا۔"

زہرہ بانو ان گیدڑ بھبکیوں میں آنے والی نہیں تھی۔ تاہم اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ حویلی کے روزن... ایک ذرا شہ پر مخالفتوں کی تیز آندھیوں سے کشادہ ہونے لگے تھے، دشمن کے عزائم خطرناک نظر آنے لگے تھے۔ اس روز جب وہ ایک سنسان راہداری سے ہو کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی، تو یک دم ٹھٹک کر رکی۔ اسے کہیں سے ممتاز خان کی پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔

"ماں جی! اس ناگن کا اس طرح حویلی سے جانے کا ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ یہاں سے بہت سی جائداد لوٹ کر جا رہی ہے اور میں اسے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گا۔"

اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے زہرہ بانو کے قدم رک گئے۔ ساتھ ہی اس کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ سن گن لینے کی اس میں عادت نہیں تھی، لیکن موجودہ حالات کی "جنگ" سب جائز ہے کا تقاضا کرتی تھی، وہ رک گئی۔ جس کمرے کے دروازے سے آواز ابھری تھی، وہ اس کے ذرا اور قریب ہو گئی۔ وقت سہ پہر کا تھا۔ کسی کی آمد و رفت کم ہی تھی۔

"جا رہی ہے تو دفع ہونے دو، پلانٹ پر تو اب اس کا قبضہ ختم ہی سمجھو۔ اب یہاں کے بجائے شہر ہی میں نمٹنا اس ناگن سے۔"

یہ مہر النسا کی آواز تھی۔ "تم نے دیکھا نہیں، اسے ہم پر شبہ ہو چکا ہے بلکہ یقین کہو کہ ہم نے ہی اس کی ماں کو دودھ میں زہر دے کر مارا ہے۔ اب اگر اس کا بھی ادھر ہی خاتمہ کرو گے تو... تمہارے بابا جانی کا کہیں ہم سے بھی دل خراب نہ ہو جائے۔"

زہرہ بانو اس بات پر بری طرح ٹھٹکی۔ اس کا دل کرب سے بھر گیا۔ "اب بھلا کسی لیبارٹری تجزیے کی کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ضرورت باقی رہ گئی تھی؟'' یہ سنتے ہی زہرہ کو اپنا پورا وجود سلگتی آگ کی لپیٹ میں محسوس ہونے لگا۔

''بابا جانی اب کیا بگاڑ سکتے ہیں ہمارا ماں جی۔'' ممتاز خان کی خرانٹ زدہ آواز ابھری۔ ''انہوں نے جو کرنا تھا، وہ کر چکے اب باقی کا کام ہمیں ہی کرنا ہے۔ میں اس ناگن کی کمزور رگ سے واقف ہوں، ایک آخری داؤ کھیلنا چاہتا ہوں میں ماں جی، پھر دیکھنا یہ ناگن اپنا سب کچھ ہمارے نام کردے گی۔''

اسی وقت زہرہ بانو کو کہیں قریب ہی ایک کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی اس طرف آرہا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی اور جب اپنے کمرے میں پہنچی تو اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ آنکھیں اشکبار تھیں، اس کے جی میں تو آئی کہ وہ ان دونوں سازشی ماں بیٹے کے خلاف اپنی ماں کو قتل کردینے کا مقدمہ کردے۔ مگر پھر دل مسوس کررہ گئی، چودھری الف خان آڑے آجاتا، اور ماں کا چہرہ چشم تر میں لرزنے لگتا... اچانک اسے ممتاز خان کی آخری بات یاد آئی، اس نے اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے اس کی کمزور رگ کا ذکر کیا تھا اور اس کی کمزوری لئیق شاہ کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی، اس کی وجہ سے تو وہ حویلی بدر ہونے والی تھی۔

''تو کیا یہ لوگ اب... اس غریب نوجوان کو بھی اپنی کسی مکروہ اور گھناؤنی سازش کا نشانہ بنانے والے تھے؟''

اس خیال نے ہی زہرہ بانو کو سرتاپا لرزہ کررکھ دیا۔

''ممتاز خان! اگر لئیق شاہ کا تم نے ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش چاہی تو میں حقیقتاً تم دونوں ماں بیٹے کے لیے ناگن بننے میں بھی دیر نہیں لگاؤں گی، ایک زہریلی ناگن۔'' دفعتاً زہرہ بانو جوشِ غیظ سے غرائی۔

اس بات نے اسے بے چین کردیا تھا کہ اب ممتاز خان.... اس کے محبوب کے خون کا بھی پیاسا ہورہا تھا۔ وہ پھر نہیں بیٹھی، اسی وقت اپنی کار میں نکلی اور لئیق شاہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی، یوں بھی اب وہ یہاں سے جانے سے پہلے... لئیق شاہ سے ایک ملاقات ضرور کرنا چاہتی تھی۔

وہ اس کے گھر پہنچی تو بری طرح ٹھٹکی۔ وہاں شوروغل مچا ہوا تھا۔ ایک کہرام تھا جو بپا تھا۔ لئیق شاہ کے جھونپڑ نما کچی گارے مٹی کی دیواروں والے گھر کو کسی نے آگ لگادی تھی۔ وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ یہ دیکھ کر زہرہ بانو کی سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ وہ کار سے اتر کر دیوانہ وار بھڑکتے شعلوں کی طرف بڑھی، اس کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ ''لئیق شاہ... لئیق شاہ۔''

وہ اس قدر غم زدہ اور مایوسی کی گہرائی میں تھی کہ اسے اس بات کا بھی یارا نہیں رہا کہ وہ آگ کے بھڑکتے ہوئے عفریت کی جانب بڑھ رہی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر لارہے تھے اور آگ بجھانے کی اپنی سی کوشش کررہے تھے۔ دھواں بھی اٹھ رہا تھا، دور دور تک سلگتی ہوئی آگ کی تپش بھی جارہی تھی، کچھ لوگوں نے زہرہ بانو کو دیوانہ وار چلاتے ہوئے، آگ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش بھی کی مگر زہرہ بانو کے سر پہ ایک ہی جنون سوار تھا، لئیق شا... وہ نہیں رکی، دوڑتی رہی۔ حتیٰ کہ آگ کی تپش سے اس کا نازک اندام وجود جھلسنے لگا۔ وہ پسینے سے تربتر ہوگئی، اب کوئی لمحہ جاتا تھا کہ وہ خود کو بھی دیوانہ وار شعلوں کی نذر کرنے والی تھی کہ اچانک عقب سے کسی نے اسے پکڑلیا۔ اسے روک لیا بلکہ بے اختیار اپنے دو مضبوط بازوؤں کے گھیرے میں لے کر خود سے لگالیا۔ اور اس ''گھیرے'' میں نڈھال سی زہرہ بانو کو نہ جانے کیسا سکون ملا تھا کہ اس کی روح تک سرشار ہوگئی اور یہ سرشاری شاید اس کی برداشت سے باہر تھی کہ وہ غش کھاگئی۔

☆☆☆

جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اسے ماحول میں اندھیرے کی کیفیت محسوس ہوئی۔ فضا میں جلی جلی سی بو پھیلی ہوئی تھی، کچھ سیلن کا بھی احساس ہوتا تھا۔ وہ چند ثانیے تو اسی طرح پڑی جھکی جھکی سرکنڈوں کی چھت کو خالی نظروں سے گھورتی رہی۔ ذہن کی بیداری کے ساتھ اسے رفتہ رفتہ پیش آمدہ واقعے کی دھندلاہٹ چھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ پھر اسے وہ بھڑکتی آگ یاد آنے لگی جس کی لپیٹ میں لئیق شاہ کا گھر بھی تھا اور شاید وہ خود بھی یہی سمجھ کر تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اور دیوانہ وار بھڑکتی آگ میں کود پڑنے کو بھی تیار تھی مگر نہیں عین وقت پر اسے دو مضبوط بازوؤں کے حلقے میں لے لیا گیا تھا جس کی گرفت اور قربت میں شناسائی کی خوشبو آئی تھی جس کی سرشاری نے اسے بے دم کردیا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی وہ پوری طرح بیدار ہوگئی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ کسی چارپائی پر پڑی تھی جس پر پرانا سا کھیس بچھا ہوا تھا۔ ایک کھلی کھڑکی کے راستے سے باہر کی ملگجی سی روشنی اندر آرہی تھی۔

اس نے گردن موڑ کے دیکھا اور یک دم چارپائی پر اٹھ بیٹھی۔ وہ پھر بے قرار سی ہوگئی۔ کمرا کشادہ تھا۔ کچے ناہموار فرش پر بڑی سی میلی دری بچھی تھی، اور اس میں کچھ جوان اور بوڑھی عورتیں، سر تھامے بیٹھی تھیں کہ زہرہ بانو کو

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہوش میں آتے دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی سانولی عورت اٹھ کر فوراً کمرے سے باہر نکل گئی۔

''مم... میں کہاں ہوں؟ کیا ہوا تھا؟ وہ آگ... لئیق شاہ...'' زہرہ بانو کے کپکپاتے لبوں سے بے ربط الفاظ برآمد ہوئے، شاید اس کے حواس ہنوز نیم غشی کا شکار تھے، ایک موٹی سی سانولی جوان دیہاتن عورت اٹھ کر چارپائی کے قریب آگئی اور قدرے جھک کر بولی۔

''چودھرائن... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا... اب؟''

''ہاں... ہاں میں ٹھیک ہوں، مجھے بتاؤ وہ... وہ...'' الفاظ اس کے مرتعش لبوں میں ہی اٹک کر رہ گئے اور اس کی پھٹی پھٹی نگاہوں کے سامنے کشادہ کمرے کی کھلی چوکھٹ تھی، وہاں اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ لئیق شاہ کھڑا تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کی اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کسرتی بدن پر جھولتا ہوا کرتا تھا بازو ادھڑے ہوئے اور اوپر کو چڑھے ہوئے، کچھ بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے، جس میں سے بالوں بھرا وجیہہ سینہ جھانک رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ غم کی عکاسی کر رہا تھا اور آنکھوں سے غیظ اور کرب کے ملے جلے تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔

لئیق شاہ کو جیتا جی اپنے سامنے پا کر زہرہ بانو کا جیسے سارا دھڑکتا وجود یک دم پُرسکون ہوگیا۔ اپنے محبوب کو زندہ سلامت دیکھ کر اس کی جان میں جان آگئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو ادھیڑ عمر کی دیہاتی عورت اٹھ کر باہر گئی تھی شاید اس نے ہی باہر جا کر لئیق شاہ کو زہرہ کے ہوش میں آنے کی اطلاع پہنچائی تھی۔

''لئیق شاہ'' زہرہ نے بے اختیار اسے پکارا اور چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی، اسے لئیق شاہ کے اترے اترے غمناک چہرے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ اس کے پکارنے کے باوجود لئیق شاہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، وہیں کھڑے کھڑے اس سے سپاٹ لہجے میں بولا۔

''آپ کو ہوش آگیا۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو آپ یہاں سے جا سکتی ہیں۔''

زہرہ بانو کو آج لئیق شاہ کا لہجہ بدلا ہوا سا محسوس ہوا مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''یہ... یہ... آگ... تت... تمہارے گھر کو کس نے آگ لگائی تھی، یہ سب کیسے ہوا؟ تمہارے ماں پیو؟''

''کون لگا سکتا ہے یہ آگ زہرہ صاحبہ؟'' لئیق شاہ کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی اور نظریں سرد، لہجہ غم کی چغلی کھایا ہوا تھا۔ ''میں اب حویلی کو آگ لگا دوں گا، کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' یک دم جیسے لئیق شاہ گرج کر بولا۔

''لل... لیکن...'' زہرہ بانو نے کچھ کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹ کر کھردرے لہجے میں بولا۔

''زہرہ صاحبہ! میں نے باہر برادری کے لوگوں کو بڑی مشکلوں سے روکے رکھا ہے۔ وہ آپ کی بھی جان کے دشمن ہو رہے تھے، میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی حویلی والوں کی نظروں میں کیا حیثیت ہے مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ باہر آپ کی کار موجود ہے۔ بہتر یہی ہے آپ کے لیے کہ جتنی جلدی ہو سکے، آپ یہاں سے چلی جائیں۔''

سرد سپاٹ اور بے رحم لہجے میں یہ سب کہنے کے بعد لئیق شاہ واپس جانے کے لیے پلٹا تو زہرہ بانو کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ وہ اسے پکارتی ہوئی آگے بڑھی۔

''لئیق شاہ... ٹھہرو۔''

وہ رک گیا مگر اس کی طرف پلٹا نہیں، پیٹھ کیے کھڑا رہا۔

''مم... میرا اب اس حویلی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ ان ظالموں نے میری ماں کو بھی دودھ میں زہر ملا کر مار ڈالا۔'' اس کا خیال تھا یہ سن کر لئیق شاہ یک دم اس کی طرف پلٹ پڑے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہاں البتہ اس نے ایک ذرا اپنے شانے تک گردن موڑ کر پُرسوچ انداز میں کچھ غور کرنے کی کوشش ضرور چاہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں لئیق شاہ... پھر تم تو سب جانتے ہو، کیا تم اپنے لوگوں کی میری طرف سے غلط فہمی دور نہیں کر سکتے؟''

''بات اب غلط فہمی کی نہیں رہی ہے۔ یہ تم لوگوں کا اپنا معاملہ ہے۔ میرے ماں پیو آگ میں زندہ جلا دیے گئے، حویلی والوں کے ایسے ظلم نے ہم سب کو خون کے آنسو رلا دیا ہے اس لیے تو آپ یہاں، اب تک زندہ کھڑی ہو۔ یہ معاملہ اب بڑے سردار جی کے جرگے میں پیش ہونے جا رہا ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔'' انتہائی سرد مہری سے یہ سب کہتے ہوئے لئیق شاہ... صحن کی طرف چلا گیا۔ ہکا بکا رنجوری کھڑی زہرہ کو باہر کائی سارے مرد نوجوان غصے سے بھرے ہوئے آپس میں بڑبڑاتے دکھائی دیے۔ کمرے میں موجود باقی عورتیں بھی زہرہ بانو کو اب چبھتی ہوئی نظروں

سے گھورنے لگی تھیں۔ زہرہ بانو اپنے سر کا آنچل درست کیے صحن کے درمیان سے گزرنے لگی۔ اس کے آگے آگے لئیق شاہ چلا جا رہا تھا۔ وہ اسے دروازے کے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہاں اتری ہوئی شام کا کاجل بکھرا ہوا تھا۔ سامنے اس کی کار کھڑی تھی، کچھ ننگ دھڑنگ بچے کار کے گرد جمع تھے، دائیں بائیں گارے مٹی اور اپلے تھپی ہوئی دیواروں اور سرکنڈوں کے گھروں کی بے ترتیب قطار تھی۔ ایک عجیب سوگوار سا منظر تھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر جہاں لئیق شاہ کا گھر تھا وہاں اب راکھ جلا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا۔ اب بھی وہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ زہرہ بانو کو بے اختیار اپنے وجود میں کرب کی لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔ لئیق شاہ اسے آگے بڑھنے کا راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

زہرہ بانو نے ایک مجبوری نگاہ اس کے جلتے سلگتے چہرے پر ڈالی مگر وہاں اپنے لیے کوئی رمق نہ پا کر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی، اپنی کار کے قریب آئی، دروازہ کھولا۔ اندر سوار ہونے سے پہلے اس نے ایک نگاہ قریب کھڑے لئیق شاہ پر ڈالی اور ہولے سے اسے مخاطب کر کے بولی۔

"لئیق شاہ! میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے، م... میں تو... خود مظلوم ہوں، تم فقط اتنا بتا دو مجھے... کک... کیا... تم بھی مجھے... قصوروار سمجھتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے زہرہ بانو کا لہجہ ڈبڈبا گیا۔ مجبور نگاہیں چھلک پڑیں۔ اس کی بات پر لئیق شاہ نے پہلی بار تڑپ کر اس کی جانب دیکھا تو بے اختیار اس کا اپنا بھی جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر زہرہ کو اپنے سینے سے لگا لے۔ اس کی محبت میں اس نے جو اپنے اندر طبقاتی تفاوت کی ایک بے نام سی مصلحت اور کسی کی بھلائی کی خاطر جو خودساختہ بند باندھ رکھا ہے، اسے توڑ ڈالے اور کہہ ڈالے اس سے۔

"نہیں... زہرہ صاحبہ! ہرگز نہیں۔ بھلا میں آپ کو قصوروار کیوں کہوں گا؟ آپ کے ساتھ بتائے ہوئے شناسائی کے روز و شب نے مجھے آپ کے دکھ درد سے بھی آگاہ کر رکھا ہے مگر... زہرہ صاحبہ! میں مجبور ہوں۔ یہ معاملہ اب کچھ اور صورت اختیار کر گیا ہے۔" مگر وہ اس کی ہمت نہ کر سکا۔ نہ ہی وہ کوئی جواب بھی دے پایا بس وہ اس کی طرف تکتا رہ گیا تو زہرہ بانو کو جیسے خود ہی اس کا جواب بھی مل گیا۔

"خوب! تو تم اپنی برادری کے لوگوں کی وجہ سے مجبور ہو لیکن لئیق شاہ... کیا تم جانتے ہو کہ میں نے تمہاری خاطر حویلی کے عیش و آرام کو ٹھکرا دیا اور اب کچھ ہی روز میں نئے پنڈ کو بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کے جانے والی ہوں۔ تت... تت... تمہاری خاطر ہی میں نے اس شخص کی شفقت و محبت کو بھی نہیں گردانا جس نے بہرحال مجھے میرا باپ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے بیٹیوں کی طرح ہی پالا... لئیق شاہ! میں نے تو... ان چیزوں کی پروا نہیں کی اور تم نے..." اس کا لہجہ پھر چھلک پڑا۔

پھر وہ نہیں رکی۔ کار کا دروازہ کھولا۔ روتے روتے... اشکبار چہرے کے ساتھ کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ لئیق شاہ کی آنکھوں میں بھی کرب کی نمی جھلملانے لگی تھی۔

☆☆☆

کار ناہموار اور بل کھاتے راستے پر ہچکولے کھاتی دوڑی جا رہی تھی، زہرہ بانو کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ جیسے لرز رہا تھا۔ نمناک نگاہیں ونڈ اسکرین سے پار اتری ہوئی ملگجی شام کی مدھم تاریکی پر جمی ہوئی تھیں مگر اس کے دل و دماغ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ یہ تعین نہیں کر پا رہی تھی کہ آخر وہ لئیق شاہ کے اس سرد رویّے کو کیا نام دے؟ جس نے برادری کے نام پر اس کے ساتھ یوں بے اعتنائی برتی تھی۔ آخر اس نے بھی تو لئیق شاہ کی خاطر... سب سے ناتا توڑنے کا عہد کر لیا تھا۔ تو پھر... لئیق شاہ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ دونوں میں سے کون زیادہ مجبور تھا۔ وہ یا لئیق شاہ؟

تب اچانک زہرہ بانو نے حقیقت کی نگاہ سے غور کیا تو اسے لئیق شاہ بھی زیادہ قصوروار نہیں محسوس ہوا۔ عاشق و معشوق میں یہی تو ہوتا ہے۔ محبوب کی کسی خامی کو خود ہی تاویلیں اور توجیہات کے سہارے ہر قصور سے بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے۔ زہرہ بھی ایسا ہی سوچ رہی تھی۔

اگلے دن صبح... زہرہ بانو نے اپنے کچھ ذاتی اور خفیہ ذرائع سے پتا چلایا تو اسے یہی معلوم ہوا کہ اس بات سے تقریبا بہت سے قریبی لوگ واقف تھے کہ اس کی وجہ سے لئیق شاہ کی چھوٹے چودھری ممتاز خان اور اس کے حواریوں بالخصوص وسیم اور چھیما کے ساتھ دیرینہ مخاصمت چلی آ رہی تھی اور انہوں نے اس کا انتقام لئیق شاہ کے گھر کو آگ لگا کے پورا کرنے کی کوشش کی، یہی نہیں زہرہ کو اپنے بعض ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آگ لگنے کے واقعے سے محض تقریبا آدھا پونا گھنٹہ پہلے کچھ لوگوں نے چھیما اور اس کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ساتھیوں کو لئیق شاہ کو علی الاعلان یہ دھمکیاں دیتے ہوئے پایا تھا کہ ”ہم سے ٹکر لینے کا انجام تم بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔“

اس وقت لئیق شاہ ایک چھپر ہوٹل میں چائے پی رہا تھا۔ اس کے آدھا پون گھنٹے بعد ہی یہ واردات ہوئی جس میں لئیق شاہ کے بوڑھے ماں باپ بھی جل کر مر گئے۔

حویلی سے رخصتی اور نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیرآباد کرنے کی زہرہ بانو نے ساری تیاری بشمول اپنے چھوٹے موٹے ساز و سامان کی پیکنگ وغیرہ بھی مکمل کر لی تھی بس اب یہاں سے شہر روانگی کی دیر تھی مگر تازہ ترین واقعے نے زہرہ بانو کو ایک نئی شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ اس کا ارادہ بھی تھا کہ وہ لئیق شاہ کو بھی اپنے اعتماد میں لے کر اپنے ساتھ شہر لے جائے گی، اور وہاں اپنے کچھ کاروباری معاملات اس کے سپرد کرے گی مگر آتش زدگی کے واقعے اور لئیق شاہ کی طرف سے سرد مہری نے زہرہ بانو کو تشویش آمیز پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اسے زیادہ فکر لئیق شاہ کی تھی مگر وہ اب یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ممتاز خان وغیرہ لئیق شاہ سے اس کی وفاداری کے ”جرم وفا“ کی اسے جو سزا دے چکے تھے وہ اب شاید اس کے دور ہو جانے سے اس کا اعادہ نہ کریں یا لئیق شاہ سے بدلہ چکانے کے بعد ان کی دشمنی کم از کم لئیق شاہ سے ختم ہو جائے۔ مگر کیا واقعی وہ ایسا ٹھیک سوچ رہی تھی؟

زہرہ بانو کو یاد تھا۔ لئیق شاہ نے اسے بتایا تھا کہ برادری والے بہت جلد سردار سے ملاقات کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ اس سے انصاف کی بھیک مانگنے والے تھے۔ سارے ٹھوس ثبوت اور شواہد اس سلسلے میں کیا کہتے تھے یہ تو اب جرگے کے بعد ہی معلوم ہوتا۔

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے بارے میں بہت غور و خوض کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ سرِ دست لئیق شاہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مزید یہ کہ اب اس کا فی الفور یہاں سے چلے جانا زیادہ بہتر ہوگا۔ اس روز زہرہ بانو... آخری بار... چودھری الف خان سے رخصت ہو کے ہمیشہ کے لیے شہر بیگم ولا آ گئی۔

☆☆☆

کمیل دادا... زہرہ بانو کو دوبارہ یہاں بیگم ولا میں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سمایا تھا لیکن جب اسے نئے پنڈ کے حالات اور ”بیگم صاحبہ“ یعنی زہرہ بانو کے عزائم کا علم ہوا تو اس کی دلی مسرت دیدنی ہونے لگی تھی۔ مگر جانتا تھا وہ کہ بیگم صاحبہ کا اس سلسلے میں موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں اور نہ ہی وہ اس پر خوش ہیں اس لیے بمشکل ہی اس نے اپنے انداز و اطوار سے ایسی کوئی بات آشکارا نہ ہونے دی تھی کہ جس سے اسے بیگم صاحبہ کی ناراضی کا خطرہ مول لینا پڑے۔ وہ چپ چاپ حکم بجا لاتا رہا۔ البتہ رسماً اس نے لئیق شاہ سمیت دیگر معاملات پر زہرہ بانو سے افسوس کا اظہار ضرور کیا تھا۔

لئیق شاہ کا یا زہرہ بانو کا لئیق شاہ سے دور ہو جانا... کمیل دادا کی آتشِ رقابت کو سرد کرنے کا سبب تو ضرور بنا مگر کمیل دادا کو یہ بھی اچھا نہیں لگا تھا کہ گاؤں سے شہر مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی بیگم صاحبہ بجھی بجھی اور افسردہ تھی۔

اگلے دن سے زہرہ بانو نے یہاں کے کاروباری معاملات کا بذاتِ خود جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دو فلور ملز ایک رائس مل کے علاوہ نئے پنڈ کی کچھ زمینیں تھیں جس پر سالونٹ پلانٹ بھی قائم تھا۔ بے شک ابھی وہاں اس کا عملی طور پر تصرف نہ تھا مگر قانوناً وہ اس کی وارث ضرور تھی۔ اسے کسی موقع کا انتظار تھا جب وہ انہیں بھی فروخت کر دیتی... کیونکہ وہ زمینیں ایک اور بے اثر زمیندار کی زمینوں سے ملحق تھیں۔ زہرہ بانو اس سے معاملات طے کر کے اسے فروخت کرنے کا قانونی حق رکھتی تھی۔ ارادہ تو اس نے یہی کیا تھا کہ وہ عملی قدم اٹھائے مگر چوہدری الف خان کی زندگی میں اسے یہ کرنا مناسب نہ لگا۔ کیونکہ یقینی طور پر انہیں یہ بات پسند نہ آتی۔ تاہم وہ مطمئن تھی کہ قانونی طور پر وہ اس کی وارث ضرور تھی اور مختار بھی۔

دو تین روز اسے یہاں کے معاملات سنبھالنے میں صرف ہو گئے۔ تیسرے روز وہ کچھ سکون سے بیٹھی تو اسے لئیق شاہ کا خیال آیا۔ اس کا خیال تو ہر وقت اس کے دل و دماغ میں جاگزیں رہتا ہی تھا مگر وہاں اب تک کیا پیش رفت ہوئی تھی اور کیا کچھ ہو رہا تھا، اس کے بارے میں وہ بالکل لاعلم تھی اور اس کی جان کاری کے لیے اس نے کمیل دادا کے ساتھ ایک بند کمرے میں میٹنگ کی۔

”کمیل! مجھے نئے پنڈ کے معاملات کے بارے میں بھی مکمل آگاہی رکھنی چاہیے۔ اس سلسلے میں تم کیا مشورہ دو گے؟“

کمیل دادا، زہرہ بانو کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

”بیگم صاحبہ! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں یہاں سے طفیل کو نئے پنڈ روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ ایک ہی دن میں

ساری معلومات لے آئے گا۔"

"مجھے صرف ایک دن کی معلومات نہیں چاہیے، کھیل۔" زہرہ بانو نے پُرسوچ لہجے میں کہا اور کھیل دادا مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ زہرہ بانو آگے بولی۔

"کسی ایسے قابلِ اعتبار آدمی کو نئے پنڈ روانہ کرنا ہوگا جو مستقل طور پر وہاں رہتے ہوئے ہمیں ایک ایک دن سے باخبر رکھے۔" کھیل دادا شاید زہرہ بانو کی بات کا اصل مقصد نہیں سمجھا تھا۔ لہٰذا قدرے الجھ کر مستفسر ہوا۔

"بیگم صاحب! اس کی کیا ضرورت ہے؟ بھلا اب آپ کا نئے پنڈ والوں سے کیا لینا دینا۔ سی ڈی ایس اب ان کے معاملات پر..."

"نہیں کھیل دادا، میرا ابھی نئے پنڈ سے پوری طرح ناتا نہیں ٹوٹا ہے۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ کھیل دادا کی بھویں سکڑ گئیں۔ وہ آگے بولی۔ "مجھے کل تک بتادو کہ تم نے اس سلسلے میں کس آدمی کا انتخاب کیا ہے؟ مگر خیال رہے... وہ آدمی... نئے پنڈ سے تعلق نہ رکھتا ہو مگر وہ ان کے ساتھ گھل مل کر رہے اور ہمیں ایک ایک بات سے باخبر رکھے۔ اس آدمی سے مجھے کل تک ملوا دو۔ باقی میں خود اسے سمجھا دوں گی کہ اسے نئے پنڈ میں رہتے ہوئے ہمارے لیے مزید کیا کرنا ہے۔" زہرہ بانو نے تحکمانہ انداز میں اپنی بات ختم کر ڈالی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ کھیل دادا بھی احتراماً فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ تاہم اس کے چہرے پر سلوٹیں بکھر گئی تھیں۔ وہ شاید کچھ کچھ صورتِ حال کو اور بیگم صاحبہ کی باتوں کو سمجھ رہا تھا۔

اگلے دن کھیل دادا نے طفیل نامی آدمی سے زہرہ بانو کو ملوا دیا۔ طفیل شہر کا ہی رہنے والا تھا۔ وہ ایک جوان مرد تھا۔ دبلا پتلا اور سانولی رنگت تھی، ابھی حال ہی میں وہ زہرہ بانو کے گروپ میں شامل ہوا تھا۔

زہرہ بانو نے اس سے رسماً چند باتیں کیں، اس کے بعد اصل بات کی طرف آتے ہوئے اس سے کہا۔

"تمہیں بڑی ہوشیاری اور رازداری سے ایک کام کرنا ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ نئے پنڈ میں گزارنا ہوگا۔"

وہ جواباً فدویانہ انداز میں بولا۔ "بیگم صاحبہ! آپ کا حکم سر آنکھوں پر... میرے لیے یہ کام مشکل نہ ہوگا۔"

"ابھی ہم نے تمہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ تمہیں وہاں نئے پنڈ میں رہتے ہوئے کرنا کیا ہوگا۔ اصل کام وہی ہوگا کرنے کا... اس میں، میں کسی قسم کی کوتاہی برداشت نہیں کروں گی۔" زہرہ بیگم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ مگر تحکمانہ لہجے میں کہا تو اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے مؤدبانہ کہا۔

"جی بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کریں۔ میں انشاء اللہ آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"نئے پنڈ میں تمہیں عام آدمی کی طرح رہنا ہوگا۔ مخصوص لوگوں کے درمیان گھلنا ملنا بھی ہوگا۔ کچھ لوگوں کے سلسلے میں معلومات رکھنا ہوں گی۔"

"جی بہتر بیگم صاحبہ۔"

"باقی چند بنیادی باتیں تو کھیل دادا نے تمہیں سمجھا ہی دی ہوں گی مگر اصل بات ہم تمہیں سمجھائیں گے، مگر تم پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس سلسلے میں کیا ابتدائی لائحہ عمل طے کیا ہے؟" زہرہ بانو کی بات پر کھیل دادا بولا۔

"بیگم صاحبہ! طفیل وہاں ایک کھاد کی دکان کھولے گا یا کسی فارم وغیرہ میں کھیت مزدوری... وہاں قدم جمانے کے لیے میں نے اسے اسی طرح کا لائحہ عمل پہلے سے سمجھا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" زہرہ بانو نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا۔ پھر طفیل کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تمہیں وہاں کے جاگیردار الف خان، اس کے بیٹے ممتاز خان اور اس کے قریبی ساتھیوں اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک نوجوان کسی غریب مزارع کا بیٹا ہے ابھی چند روز پہلے اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ نوجوان کا نام نبیل شاہ ہے۔ وہ بچ گیا تھا۔ ماں باپ اس آتش زدگی میں جانبر نہیں ہو سکے۔ یہ آگ چودھری الف خان کے بیٹے ممتاز خان نے اپنے خاص حواری مکھیا کے ذریعے لگوائی تھی ــــ اس کے متعلق جرگے میں کیا فیصلہ ہوا اس کے بارے میں بھی مکمل آگاہی حاصل کرو گے۔" زہرہ بانو نے بات ختم کر دی۔ طفیل صرف طبعِ تفہیمی انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے جنبش دے رہا تھا۔ دودھ کی تجزیاتی رپورٹ آ گئی تھی، اور اس میں زہر کی آمیزش کی تصدیق ہو چکی تھی۔ اس رپورٹ کو دیکھ کر ایک بار پھر زہرہ بانو کے دل میں ایک غبار سا اٹھا اور اس کے جی میں آئی کہ وہ ساری مجبوریوں اور باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، اپنی سوتیلی ماں مہرالنسا اور ممتاز خان کے خلاف قانونی کارروائی کروا لے مگر پھر چودھری الف خان کا بیمار چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتا۔ یہ

ایک ایسے آدمی کا بھی چہرہ تھا جس نے باپ بن کر اس کی پرورش کی تھی۔

وقت گزرنے لگا۔ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی یاد ستانے لگی۔ ملیے کی تازہ ترین بھیجی جانے والی رپورٹ خاصی سنسنی خیز تھی۔ برادری کے لوگوں نے اپنے سردار کی بیٹھک میں فریاد ڈالی تھی مگر اس سلسلے میں ان سے معذرت کرلی گئی، وجہ یہی بتائی گئی تھی، جرگہ سسٹم پر قانونی پابندی عائد ہونے کی وجہ سے وہ ان کی مدد کرنے سے قاصر تھے، وغیرہ۔ لہٰذا اب ان لوگوں کو انصاف کے لیے قانون کا ہی دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے تھے لہٰذا اتی پیش رفت کیا تھی، ابھی یہ سب اندھیرے میں تھا۔

زہرہ بانو اس سلسلے میں لئیق شاہ کو انصاف ملنے کی دعا ہی کرسکتی تھی۔ شہر "بیگم ولا" میں زہرہ بانو کے روز و شب بظاہر پرسکون گزر رہے تھے مگر اندر سے وہ بے کلی کا شکار ہی رہتی تھی۔ اس کا دل و دماغ اور ذہن نئے پنڈ میں اٹکا ہوا تھا۔ لئیق شاہ کو تو وہ ایک لمحے کو بھی فراموش نہیں کرسکی تھی۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ نئے پنڈ کا قصد کرلے۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے جائے اور محض دیدار محبوب ہی کر کے لوٹ آئے کہ اس کے بے چین دل کو کچھ قرار تو میسر ہو۔ وہ ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی، جانے نہ جانے پر وہ ابھی غور ہی کررہی تھی کہ ایک روز طفیل خود نئے پنڈ سے بیگم ولا آن دھمکا۔ اس نے زہرہ بانو کو جو اطلاع دی اسے سن کر وہ سرتاپا لرز اٹھی۔ اس نے بتایا کہ لئیق شاہ کو نئے پنڈ سے اچانک غائب کردیا گیا تھا۔ اور شنید یہی تھا کہ اسے ممتاز خان کے خونی حواری جھیما نے اغوا کیا تھا۔

اس اطلاع پر زہرہ بانو کا سکون غارت ہوکر رہ گیا۔ اس نے اپنے ساتھ کھیل دادا کو لیا۔ دو مسلح گارڈز لے کر اسی وقت نئے پنڈ روانہ ہوگئی۔

نئے پنڈ پہنچ کر زہرہ بانو نے حویلی کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہاں سے سیدھی اس گھر پہنچی تھی جہاں زہرہ بانو، لئیق شاہ سے آخری بار رخصت ہوئی تھی۔ وہاں اریب قریب میں کچھ گھر لئیق شاہ کی برادری کے تھے۔ کچھ لوگوں سے اس نے بذات خود ملاقات کر کے لئیق شاہ کے بارے میں جاننا چاہا تھا۔ پہلے پہل تو اس کے ساتھ سرد رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ پھر چند لوگوں نے ہی اسے لئیق شاہ کے اچانک "غیاب" کے بارے میں بتایا۔

کھیل دادا وہاں سے زہرہ بانو کو اپنے گھر لے آیا۔ جو اب بھی خالی پڑا تھا۔ کیونکہ اس کے باپ منشی فضل محمد کو بھی زہرہ بانو نے شہر بلا لیا تھا۔

یہاں یہ لوگ کھلے صحن میں سر جوڑے بیٹھ گئے۔

"بیگم صاحبہ! ہمیں سب سے پہلے جھیما پر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔" کھیل دادا نے مشورہ دیا۔ "اس کمینے کے جنے نے چودھری کے حکم پر لئیق شاہ کو اغوا کیا ہوگا۔"

زہرہ بانو کا قرار لٹا ہوا تھا۔ جو اندیشناک اور زہریلے وسوسے ہر وقت اس کے دل و دماغ کو گھیرے رکھتے تھے، انجام آخر وہی ہوا تھا۔ کھیل دادا کی بات پر صاد کرتے ہوئے زہرہ بانو نے اندر ہی اندر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"ہمیں بھی اب اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی روش پر چلنا ہوگا۔ ہمارا شکار جھیما سے کم کا نہیں ہونا چاہیے، کھیل۔"

"میرے ذہن میں بھی یہی بات تھی بیگم صاحبہ۔" کھیل دادا جیسے یک دم چہک کر بولا۔ "جھیما ہمارے لیے ایک ایسا شکار ثابت ہوسکتا ہے بیگم صاحبہ کہ جس سے ہمیں بہ آسانی لئیق شاہ کا سراغ مل سکتا ہے۔ آپ ایسا کریں واپس شہر لوٹ جائیں اور یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں کھیل دادا۔" زہرہ بانو نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہ خطرناک کام تم اکیلے نہیں کرو گے۔ اس کے لیے تمہیں ساتھیوں کی ضرورت پڑے گی۔ میں بھی ابھی ادھر ہی رہوں گی۔ ساتھیوں کے آتے ہی تم اپنا کام شروع کر دینا۔"

کھیل دادا سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اسے زہرہ بانو کی بات ماننا پڑی۔ اس وقت دو گارڈز میں سے ایک کو ضروری ہدایت دے کر کار میں شہر کی طرف روانہ کردیا گیا۔ اب گھر میں زہرہ بانو کے ساتھ کھیل دادا اور گارڈ موجود تھا۔ اس گارڈ کا نام انور تھا۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ تب تک کھیل دادا نے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر دیا تھا۔ گھر عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہاں کھانے پینے کو تھا ہی کیا، لیکن کھیل دادا نے پھر بھی کچھ نہ کچھ بندوبست کر ہی لیا۔

وقت بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی طرف سے تشویش اور فکر کھائے جارہی تھی۔ ممتاز خان اور جھیما کی چیرہ دستیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ لوگ اب باقاعدہ خون خرابے پر اتر آئے تھے، پھر تازہ حالات نے بھی ان کی ہمت کو ہوا دی تھی۔ زہرہ بانو کو اس بات کا بھی شدید قلق ہورہا تھا کہ لئیق شاہ نے ..... جس برادری کی خاطر اس کے ساتھ سرد رویہ اختیار کیا، اسے چھوڑا، اب ..... ممتاز خان اور اس کے خونی ہرکاروں کے خوف

نے لئیق شاہ کو تنہا کر ڈالا تھا۔ بسا اوقات بقا کی جنگ میں اس طرح کی بے حسی دیکھنے میں آتی ہے جب ظالم طاقت ور ہو پھر انصاف ملنے کی ساری امیدیں بھی دم توڑتی جائیں اور مظلوم مزید کمزور ہوتا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

''لئیق شاہ کو اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں خود کو ساری زندگی معاف نہیں کر سکتی۔'' زہرہ بانو کے دل و دماغ میں بار بار اسی بات کی گردان ہو رہی تھی۔ کمیل دادا بھی اسے لئیق شاہ کے لیے پریشان، آزردہ اور تشویش زدہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور اپنا دل بھی مسوس رہا تھا مگر اس کا مطلب یہ بھی نہ تھا کہ وہ رقابت کی آگ میں بیگم صاحبہ سے وفاداری اور اس کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ بے شک اس کی محبت یک طرفہ اور خاموش سہی... مگر اس نے خود غرضی کا لبادہ ابھی نہیں پہنا تھا۔ اس نے آخر تک بیگم صاحبہ سے ساتھ نبھانے کا دم بھرا تھا۔ پختہ عزم کیا تھا۔

اس کے ساتھی آ گئے۔ یہ تعداد میں پانچ تھے، زہرہ بانو بھی ساتھ جانا چاہتی تھی مگر کمیل دادا نے اسے منع کر دیا اور دو آدمی وہیں اس کے پاس چھوڑ کر وہ دیگر ساتھیوں کے ساتھ کار میں روانہ ہو گیا۔

شام جھکنے لگی تھی۔ زہرہ بانو کے دل و دماغ کی بے چینی فزوں تر ہوتی جا رہی تھی، رات پڑتے ہی باہر گاڑی رکنے کی آواز ابھری۔ کمیل دادا بے نیل مرام لوٹا تھا۔ وہ نہ لئیق شاہ کا سراغ لگا پایا تھا نہ ہی جھیما پر ہاتھ ڈال سکا تھا۔ منہ لٹکائے کمیل دادا نے اپنی شکست کا اعتراف کیا تو اس کا چہرہ ناکامی اور شرمندگی کے احساس تلے چھپا ہوا تھا۔

''حیرت کی بات ہے بیگم صاحبہ! اس جھیما کا سایہ بھی نہیں ملا... گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے وہ بھی۔''

اس نے بتایا تو زہرہ بانو بولی۔ ''ہو سکتا ہے لئیق شاہ کو وہ کسی دور دراز مقام کی طرف لے گیا ہو اور جہاں اسے یرغمال بنایا گیا ہو جھیما بھی وہیں روپوش ہو۔''

''یہ ہو سکتا ہے۔'' کمیل دادا گومگو سے لہجے میں بولا۔ ''لیکن بیگم صاحبہ! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، آخر لئیق شاہ کو اغوا کرنے کا مقصد ان کا کیا ہو سکتا ہے؟ جبکہ اب تو آپ نے بھی نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا تھا اور پھر برادری والوں نے بھی لئیق شاہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ایسے تنہا اور بے قیمت آدمی کو اغوا کرنے کا آخر کے چودھری ممتاز خان کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟''

کمیل دادا کی بات پر زہرہ بانو کے دل میں ایک آہ سی اٹھی جو درد کی لہر بن کر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ وہ کمیل دادا کو کیا بتاتی کہ لئیق شاہ کس کی پاداش میں یہ ظلم بھگت رہا تھا۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ ایک سادہ لوح آدمی وفا اور وفاداری کے نام پر کس کے لیے اتنی صعوبتیں اٹھا رہا ہے۔

''لئیق شاہ بے قیمت ہوتا تو آج سکون کی زندگی بسر کر رہا ہوتا کمیل دادا! دشمنوں نے اس کے سر کی قیمت لگا رکھی ہے اور ہمیں اس کے سر کو بچانا ہے۔'' زہرہ نے کمیل کو جواب دیا۔

''میرا تو خیال ہے بیگم صاحبہ! ہمیں واپس شہر لوٹ جانا چاہیے۔ اپنا طیفہ ہے نا اسے بھیج دیں گے۔ وہ یہاں رہتے ہوئے لئیق شاہ کا کھوج لگا لے گا۔'' بالآخر کمیل دادا نے مشورہ دینے کے انداز میں زہرہ بانو سے کہا اور تب پہلی بار زہرہ بانو کے دل میں کمیل دادا کی طرف سے ایک کھٹک محسوس ہوئی۔ اسے اندازہ تھا کہ کمیل دادا کے دل میں اس کے لیے کیا تھا۔ وہ اس کی وفاداری پر شبہ نہیں کر رہی تھی، جانتی تھی وقت پڑنے پر وہ اس کی خاطر اپنی جان پر کھیل جائے گا اور اب بھی اس نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، کیونکہ ممتاز خان اور اس کے خونخوار حواریوں سے دشمنی معمولی بات نہ تھی۔ ان ساری باتوں کے باوجود... کمیل دادا کی وفاداری اپنی جگہ لیکن رقابت کا زہر بھی ایک سچ حقیقت تھی۔ کمیل دادا بھی لئیق شاہ سے اس لاشعوری رقابت کا شکار تھا۔ ممکن ہے اس نے لئیق شاہ کی تلاش میں اپنی سی پوری کوشش کی مگر وہ بات نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی ''تلاش'' میں جو غیر جانب داری کا تقاضا کرتی... لہٰذا زہرہ بانو نے دانستہ مبہم سے لہجے میں کہا۔

''کمیل! شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ کل طفیل کو یہاں بھیج دیں گے۔''

کمیل اس کی بات پر مطمئن نظر آنے لگا۔

یہ لوگ راتوں رات واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ زہرہ بانو کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ سارے راستے خاموش رہی، بیگم ولا پہنچی تو وہاں اسے گیٹ پر پولیس کی دو گاڑیاں کھڑی نظر آئیں، کار میں بیٹھے یہ سب لوگ بری طرح چونک پڑے۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 12

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کار کمیل دادا چلا رہا تھا۔ زہرہ بیگم اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھی۔ باقی دو مسلح گارڈز عقبی سیٹوں پر چوکس بیٹھے تھے، بیگم ولا کے باہر پولیس کی گاڑیاں دیکھ کر کمیل دادا کے دماغ میں جانے کیا سوجھی کہ اس نے فوراً کار کا اسٹیئرنگ دائیں جانب گھما دیا۔ وہ دوسری طرف ایک نسبتاً تنگ گلی نما راستے میں داخل ہو گئے۔

"یہ کیا حرکت ہے کمیل دادا؟" زہرہ بانو نے قدرے چونک کر پوچھا۔ لہجہ تیز اور تحکمانہ تھا۔

کمیل دادا نے راستہ کاٹنے کے بعد گاڑی ایک جگہ کسی ویران پلاٹ کے قریب روک دی اور زہرہ بیگم سے مؤدبانہ بولا۔

"بیگم صاحب! پہلے اندر کی صورت حال کا جائزہ لینا ضروری ہے، مجھے کسی سازش کی بو آرہی ہے۔"

"تم بیگم ولا میں کسی سے فون پر رابطہ کرنا چاہتے ہو؟"

"جی بیگم صاحب۔"

"مگر پولیس کی اندر موجودگی سے ایسی صورت میں..." زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے دانستہ رکی تو کمیل دادا نے کہا۔

"قریب ہی ایک پی سی او ہے۔ میں وہاں جا کر جہانگیر سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسے میں نے ہدایت کر رکھی تھی کہ کسی بھی خراب صورت حال کے پیش نظر وہ اپنی جگہ سے ہلے گا بھی نہیں۔ بالائی منزل کے جس کمرے میں وہ رہتا ہے، وہاں ایک الگ لینڈ لائن نمبر کا ٹیلی فون سیٹ رکھا ہے۔"

زہرہ بیگم، کمیل دادا کی بیدار مغزی اور محتاط روی سے متاثر ہو کے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔ "بہت اچھے! اب جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو، ہمارا اس طرح زیادہ دیر یہاں ٹھہرے رہنا مناسب نہیں ہو گا۔" زہرہ بیگم کا ستائشی لہجہ کمیل دادا کو ہمیشہ ایک دیدنی مسرت سے دوچار کر دیتا تھا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس نے گاڑی ذرا ریورس کی، ایک یوٹرن لیا اور بائیں جانب گاڑی موڑ لی۔ ذرا ہی دیر بعد وہ ایک پبلک کال آفس کے سامنے موجود تھا۔ کمیل دادا نے سوئچ آف کیا اور دروازہ کھول کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مذکورہ پی سی او میں داخل ہو گیا۔ وہاں اس نے بیگم ولا کا دوسرا نمبر ملایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ کمیل دادا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ چوتھی بیل کے بعد پانچویں بیل جانے لگی تو دوسری طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ کمیل دادا کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اس نے ہیلو کہا۔

"کون؟" دوسری جانب سے بھی مختصراً کہا گیا مگر اس شناسا آواز کو پہچان کر یکدم کمیل دادا کی آنکھوں میں چمک سی آگئی۔

"جہانگیر! میں بول رہا ہوں، کمیل دادا... خیریت تو ہے؟ یہ پولیس کیوں آئی ہے، بیگم ولا میں؟"

اپنے استاد کی آواز پہچان کر دوسری جانب جہانگیر کو جیسے چند ثانیے کے لیے سانپ سونگھ گیا پھر اس کی جوش سے لرزتی آواز ابھری۔

"آ...آ... آپ لوگ کدھر ہو اس وقت استاد؟ خیریت سے ہو نا سب؟ اور بیگم صاحب؟"

"جہانگیر۔" کمیل دادا ہولے سے غرایا۔ "ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو جلدی۔ پولیس کیوں آئی ہے؟" استاد کی ڈانٹ کھا کر جہانگیر فر فر بولنے لگا۔ "استاد! یہ پولیس یہاں کی نہیں ہے، نئے چنڈ سے آئی ہے۔ انسپکٹر اپنا نام جرار خان بتاتا ہے۔ اس کے پاس یہاں کے این سی ایم کا سرچ وارنٹ بھی ہے، وہ بیگم صاحبہ کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ کہے چودھری ممتاز خان نے بیگم صاحبہ کے خلاف رپورٹ کروائی ہے کہ بیگم صاحبہ کے ایک خاص آدمی اور... اور... نہ جانے وہ انسپکٹر کیا بک رہا تھا کہ لئیق شاہ نے چودھری ممتاز کے آدمی وسیم عرف جھیما کو قتل کر ڈالا ہے اور مفرور ہے۔"

"کیا...؟" یہ سنسنی خیز انکشافات سن کر بے اختیار کمیل دادا چیخ پڑا۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ بیگم ولا میں نہیں بلکہ ایک پرائیویٹ کال آفس میں ہے۔ اگرچہ وہ کیبن میں تھا مگر ایک اوپن کیبن تھا جس کے سامنے دکان کا بڑا سا کاؤنٹر اور کرسیاں بچھی تھیں۔ وہاں کچھ لوگ بھی موجود تھے۔ کمیل دادا کی گھرگھراتی ہوئی بھاری آواز پر وہ سب ہی اس کی جانب عجیب عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی اور دل کی سینہ توڑ دھڑکنوں اور تنے ہوئے اعصاب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولا۔

"تم خود اس وقت بیگم ولا میں کس پوزیشن میں ہو؟ میرا مطلب ہے پولیس اور وہ ذلیل جرار خان تمہیں ایک جگہ محدود کیے ہوئے ہے؟" جہانگیر اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

"میں اوپر ہی موجود ہوں۔ پولیس اور وہ انسپکٹر نیچے موجود ہے۔ ہمارے دس بارہ ساتھیوں کو ایک کمرے میں کھڑا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اوپر بھی آئے تھے، میں نے ٹیلی

فون کا والیم کم کر دیا تھا۔ کہیں فون کی گھنٹی کی آواز پر پولیس دوبارہ اوپر نہ آجائے۔ فون تو کسی کا بھی آسکتا ہے۔''

کھیل دادا تیزی کے ساتھ کام کرتے اپنے ذہن کے ساتھ دوسری طرف سے جہانگیر کی مختصراً صراحت بھری گفتگو سنتا رہا اور ساتھ ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل بھی سوچتا رہا۔

''جہانگیرے! یہ تو نے عقل مندی کا کام کیا۔ پولیس کی گاڑی دیکھ کر ہم نے بھی اپنا راستہ فوراً بدل لیا تھا۔''

''اوشاوا... استادا...! یہ تو بڑی عقل مندی کی تم نے۔ اِدھر آنا بھی نہیں۔ پولیس اور خاص کر انسپکٹر جرار کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔'' جہانگیرے کی جوش میں دبی دبی آواز ابھری۔

''سن جہانگیر! میں بیگم صاحبہ کو لے کے کہیں اور جا رہا ہوں... تو ایک کام کر... پولیس کی نظروں سے خود کو بچا کر رکھنا، اور میں اس نمبر پر دوبارہ... تجھے کال کروں گا... رب راکھا۔'' کہہ کر کھیل دادا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پیسے دے کر وہ باہر نکلا اور جیپ نما گاڑی میں سوار ہوا۔ اسٹارٹ کی اور فوراً ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان زہرہ بانو گردن موڑے اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ گاڑی چلانے کے دوران میں ہی کھیل دادا نے اسے جہانگیر سے حاصل کردہ ساری تازہ صورتِ حالت گوش گزار کر ڈالی۔ جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے زہرہ بانو کو بھی سکتہ لے ڈوبا اور پھر بے اختیار اس نے کہا۔

''کک... کیا... یہ سچ ہے؟'' کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی اور چہرے پہ رکھ دیے۔ زہرہ بیگم کو اس قدر تشویش زدہ اور افسردہ دیکھ کر کھیل دادا کے دل کو ایک گھونسا لگا۔ وہ بے چین سا ہو گیا۔ ایک ذرا ونڈ اسکرین سے نظریں ہٹا کر گردن موڑ کے مضطرب الحال زہرہ بانو کی طرف دیکھا پھر دل کی گہرائیوں سے بولا۔

''بیگم صاحبہ! حوصلہ رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ... لگتا ہے اس بار دشمن نے بڑی اوچھی چال چلی ہے... ہم بھی اس کا منہ توڑ جواب دیں گے۔''

''میرے خدا...'' زہرہ بانو کے لبوں سے پھر متوحش سے انداز میں برآمد ہوا۔ ''یہ... یہ... سب ہو کیسے سکتا ہے؟ لئیق شاہ تو خود اچانک غائب تھا پھر اس بدمعاش چیمے کا قتل وہ کیوں اور کیسے کر سکتا ہے؟''

''یہی بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں بیگم صاحبہ! اور مجھے ایک ہی بات سمجھ میں آئی ہے۔'' کھیل دادا پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''وہ کیا؟''

''بیگم صاحبہ! مجھے لگتا ہے لئیق شاہ کو جب کہیں سے بھی انصاف نہیں ملا ہو گا تو وہ مایوس ہو کر خود ہی... اپنے ماں باپ کو زندہ آگ میں جلانے والوں سے انتقام لینے کے لیے کمربستہ ہو گیا ہو گا۔ اس نے اس بات کا بھی پکا کھوج لگا لیا ہو گا کہ یہ کارستانی وسیم عرف مٹھیما نے ہی تکے چودھری ممتاز خان کے کہنے پر کی ہو گی اور پھر... اس نے...''

''نہیں کھیل دادا۔'' معاً ہی زہرہ بانو نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ وہ اب قدرے سنبھل چکی تھی اور خود کو کافی حد تک ''شاک'' کی کیفیت سے نکال چکی تھی۔ آگے بولی۔

''اگر ایسا ہوتا تو لئیق شاہ... ایک عام مہرے کے بجائے مہرہ کھسکانے والے کو سب سے پہلے انجام تک پہنچاتا اور وہ ممتاز خان ہوتا۔ مگر مجھے یہ کوئی اور سازش لگتی ہے، کوئی گہری اور دہری چال... ہوں ہم... مجھے تو لئیق شاہ کی زندگی خطرے میں نظر آ رہی ہے کھیل دادا، گاڑی روکو... اور بیگم ولا چلو واپس۔'' اچانک زہرہ بانو نے حکم صادر کر دیا۔ کھیل دادا کے لیے زہرہ بانو کا یہ حکم غیر متوقع تھا۔ تشویش آمیز حیرت سے بولا۔

''بب... بیگم صاحبہ! یہ... یہ... آپ کیا کہہ رہی...؟''

''کھیل دادا... وہی کرو جو میں کہہ رہی ہوں بس۔'' زہرہ بانو نے خاصے تیز اور درشت لہجے میں کہا۔ آواز کا اٹل پن اور لہجے کی قطعیت نے کھیل دادا کو مزید بولنے سے قاصر رکھا۔ اس نے گاڑی کی رفتار کم کر دی، اور ایک یوٹرن لیا۔ اب اس کا رخ بیگم ولا کی طرف تھا۔ مگر گاڑی کی رفتار اس نے دانستہ پہلے کی نسبت کم ہی رکھی تھی۔ وہ شاید زہرہ بیگم کو کچھ سوچنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ اس کی دانست میں زہرہ بانو نے ایسا فیصلہ جوش میں آ کر کیا تھا جب مزید کچھ دیر گزر گئی تو ناچار کھیل دادا نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ! اگر آپ بیگم ولا جانے سے پہلے کسی وکیل کا بندوبست کر لیتیں تو مناسب تھا۔ وہاں جا کر پولیس آپ کو دھر لے گی۔ خدا کے لیے اپنے فیصلے پر ایک بار غور کر لیں۔'' کھیل دادا کے لہجے میں منت کے ساتھ ایک بے بس سی لجاجت بھی اتر آئی تھی مگر زہرہ بانو کے چہرے پر جوش اور کھنڈی ہوئی انتہا سنجیدگی سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ آخری اور اٹل فیصلہ کیا تھا لہٰذا اس نے کھیل دادا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بیگم ولا تک کا راستہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا۔ صورتِ

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

حال گمبھیر تھی۔ کمیل دادا کو زہرہ بانو کی تشویش کھائے جا رہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھ میں خفیف سا لرزہ طاری ہونے لگا تھا پھر جس وقت ان کی گاڑی بیگم ولا کے گیٹ پر پہنچ کر رکی تو باہر موجود دو وردی پوش پولیس والے فوراً آگے بڑھے۔

''کمیل دادا... ہمت سے کام لو... ہو سکتا ہے کہ بعد کے حالات کا مکمل طور پر انحصار تم پر ہو۔''

بڑے ہی عجیب سے لہجے میں اس کے برابر بیٹھی زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر یہ الفاظ خاصے گہرے اور اسرار بھرے انداز میں کہے تھے۔ تب پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایکا ایکی کمیل دادا کو اپنے اندر ایک عجیب سی مضبوطی کا احساس ہونے لگا۔ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے اس کے ہاتھوں کا ارتعاش ختم ہونے لگا پھر جب وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اترا تو گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دونوں وردی پوش پولیس والوں کے سامنے اپنے پورے گرانڈیل قد کے ساتھ دیوار بن کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔

''خبردار! جو بیگم صاحب کو ہاتھ بھی لگایا ہو، یہ کوئی مفرور مجرم نہیں ہیں اور ادھر ہی موجود ہیں۔ ہٹو آگے سے۔''

کمیل دادا کے پُراعتماد اور بارعب لہجے کا ان دونوں پولیس والوں پر خاطر خواہ اثر ہوا کیونکہ وہ بھی دیکھ رہے تھے کہ ان کا رخ اندر ہی کی طرف تھا۔ اپنے ساتھ کمیل دادا کی یہ لپک دیکھ کر زہرہ بانو کے حسین و دلکش چہرے پر فخریہ سی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ کمیل دادا کی سنگت میں اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

زہرہ بانو ایک خوب صورت پختہ روش پر باوقار انداز میں چلتی ہوئی ایک بڑے کمرے میں پہنچی تو وہاں سب سے پہلے اس کی نگاہ انسپکٹر جرار خان پر پڑی، جو ایک صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ایک ٹیلی فون سیٹ اس کے سامنے رکھی گلاس ٹاپ میز پر رکھا ہوا تھا۔ وہاں ایک ٹھنڈے پانی کی بوتل اور کانچ کے دو گلاس بھی رکھے ہوئے تھے، چند مسلح پولیس اہلکار بھی وہاں اٹین شن کھڑے تھے۔ ایک نائب بھی انسپکٹر جرار کے برابر میں بیٹھا تھا جبکہ زہرہ بانو کے آٹھ دس آدمی ایک جانب قطار کی صورت میں کھڑے تھے۔

''یہ کیا تماشا لگا ہوا ہے یہاں؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہی زہرہ بیگم نے بہ آواز بلند کہا تو انسپکٹر جرار خان نے ٹیلی فون پر اپنی گفتگو کا سلسلہ فوراً ہی موقوف کر دیا اور زہرہ بانو کو گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رول تھا جو تھوڑی دیر پہلے صوفے پر ہی اس کے دائیں جانب رکھا ہوا تھا۔

زہرہ بانو کو دیکھتے ہی اس کے آدمیوں نے کورس میں اسے سلام بھی کیا تھا۔ انسپکٹر جرار کے کھڑے ہوتے ہی اس کا نائب بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک رول کیا ہوا فارم نما کاغذ بھی تھا۔ انسپکٹر جرار نے زہرہ بیگم کی طرف بہ دستور گھورتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ قریب کھڑے اپنے نائب کی طرف بڑھایا، اس نے فوراً وہ رول کیا ہوا کاغذ اسے تھما دیا۔ جسے انسپکٹر جرار نے زہرہ بیگم کے سامنے کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''یہ سرچ وارنٹ ہے... اور میں گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

''کس جرم میں؟'' زہرہ بانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔ ساتھ ہی اس نے وہ سرچ وارنٹ بھی اس کے ہاتھ سے لے کر کھول کے دیکھا۔ یہ ایف سی ایم ملتان کی طرف سے جاری کردہ تھا اور اس کی قانونی حیثیت اس حد تک تھی کہ پولیس بغیر کوئی سبب بتائے بیگم ولا میں چھاپا مار سکتی تھی۔

''تمہارے ایک خاص آدمی لئیق شاہ نے چودھری ممتاز خان کے آدمی وسیم اور چھیما کا قتل کر ڈالا ہے اور خود مفرور ہو گیا ہے۔'' انسپکٹر جرار خان نے اپنے تئیں زہرہ بانو کے سامنے ایک سنسنی خیز انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بولنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ یہ سب اسے بتاتے ہوئے اندر ہی اندر حظ اٹھا رہا ہے۔ نہیں جانتا تھا کہ یہ حقیقت پہلے ہی سے زہرہ بانو کو معلوم ہو چکی تھی، یہی سبب تھا کہ زہرہ بانو نے بھی پریشان یا تشویش زدہ ہونے کے بجائے بہ یک ترنت کہا۔

''لئیق شاہ ہمارا ملازم اور ہمارے سالونٹ پلانٹ کے مزدوروں کا لیڈر تھا۔ مگر مل کے بند ہونے کے بعد۔ دوسرے مزدوروں اور ورکرز کی طرح اس سے بھی ہمارا کوئی تعلق یا ناتا نہیں رہا تھا۔''

انسپکٹر جرار توقع لگائے بیٹھا تھا کہ زہرہ بیگم کو.... اول تو یہ انکشاف ہی .... بدحواس اور پریشان کر ڈالے گا مگر اسے یوں بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیتا پا کر اسے الجھن سی ہونے لگی، جسے وہ اپنے چہرے سے ظاہر ہونے دیے بغیر ایک اور حربہ استعمال کرتے ہوئے خبیثانہ سی مسکراہٹ سے بولا۔

''مفرور و مطلوب ملزم... لئیق شاہ سے تمہارے کس

قسم کے تعلقات ہیں، یہ پورا نیا پنڈ اچھی طرح جانتا ہے۔"

"انسپکٹر۔" زہرہ بانو گرجی۔ "تم کس طرح... بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے لئیق شاہ کو ایک مفرور اور مطلوب ملزم گردانے کی کوشش کر رہے ہو؟ جبکہ نئے پنڈ کے لوگ تو یہ حقیقت بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ... وہ پچھلے کچھ دنوں سے غائب ہے اور شنید ہے کہ اسے کسی خطرناک مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔"

انسپکٹر جرار خان کے یہاں آنے کا مقصد ایک یہ بھی تھا کہ وہ زہرہ بانو کے سامنے اس طرح کے اہم اور سنسنی خیز انکشافات کر کے اسے پریشان اور ہراساں کرنے کی کوشش کرے گا اور دباؤ ڈالے گا مگر زہرہ بانو پوری خود اعتمادی کے ساتھ اسے منہ توڑ جواب دے رہی تھی۔ جرار خان یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ زہرہ بانو کی گفتگو اس کے تعلیم یافتہ ہونے کی ہی غمازی نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ قانون کی بنیادی شقوں سے بھی اچھی طرح آگاہ تھی۔

انسپکٹر جرار خان درحقیقت چودھری ممتاز خان کی طرف سے ملے ہوئے ایک "ٹاسک" کے تحت ہی یہاں آیا تھا۔

"اور کچھ انسپکٹر؟" زہرہ بانو کی تیز اور بھانپتی نگاہوں نے اکڑے ہوئے انسپکٹر جرار کے چہرے سے اس کے غبارے کی ہوا نکلنے کا اندازہ کرتے ہی سوالیہ انداز میں کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رول کو دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے کے دوران بولا۔

"میں یہاں آ کر تمہارے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا مگر مجھے وڈے چودھری الف خان کا خیال آ جاتا ہے۔ آپ اگر ہم سے تعاون کی بات کریں تو ہمارے لیے اور آپ کے لیے بھی بہت سی آسانیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔"

انسپکٹر جرار خان کو مصالحانہ رویّہ اختیار کرتے پا کر زہرہ بانو نے بھی مصلحت اسی میں جانی کہ سردست اتنا ہی "کافی" ہے۔ لہٰذا اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بڑے کروفر کے ساتھ براجمان ہو گئی۔

"انسپکٹر صاحب! آپ کے تعاون کرنے والی بات پر مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں بھی اس سلسلے میں آپ کے تھانے میں آچکی تھی، حالانکہ وہ ہمارا قانونی حق بھی تھا مگر آپ تو ہم سے دو گھڑی باتیں کرنا تو درکنار ملاقات کا ہی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔" بیٹھتے ہی زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تو انسپکٹر جرار نے منافقانہ لہجے میں کہا۔

"تھانہ جگہ ہی ایسی ہے کہ وہاں ہر قسم کے لوگوں سے ملنا جلنا لگا ہی رہتا ہے پھر آپ کے کیس کی نوعیت بھی بہت کمزور تھی۔"

"ہمارے کیس کی نوعیت کمزور تھی؟" زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بھویں سکیڑ کر معنوی حیرت سے کہا اور اس حیرت میں طنز کی کاٹ بھی شامل تھی۔ "مجھ پر کچھ مسلح لوگوں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا اور اس وقت کے تھانہ انچارج انسپکٹر جہانزیب نے وسیم عرف چھیما کو اس کے ساتھیوں کے ساتھ گرفتار بھی کر لیا تھا بس عدالت میں چالان پیش کرنے کی دیر تھی کہ ایک سازش کے تحت اس فرض شناس انسپکٹر جہانزیب کا نہ صرف فوراً تبادلہ کروا دیا گیا بلکہ سارے مجرموں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ سازش کرنے والے شاید اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس طرح وہ حقیقت کو دبا دیں گے جبکہ انسپکٹر جہانزیب بھی زندہ ہے اور وہ ریکارڈ بھی جسے "داخلِ دفتر" کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔"

زہرہ بیگم نے انسپکٹر جرار کو ایک اور جھٹکا دیا تھا۔ زہرہ بانو کی گھاگ اور بھانپتی ہوئی نگاہیں اس راتب خور راشی انسپکٹر جرار کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کی کیفیات کو بہ خوبی سمجھ رہی تھی جسے چودھری ممتاز سے اس وقت "ڈکٹیشن" لینے کی اشد ضرورت پڑ رہی تھی۔ وہ ساری باتیں سننے کے بعد صوفے پر بیٹھے بیٹھے کسمسا کر پہلو بدلتے ہوئے بولا تو صاف ظاہر ہوتا تھا کہ حلق سے اس کی آواز پھنسی پھنسی سی برآمد ہو رہی تھی۔

"اب تو وہ چھیما بے چارہ خود ہی مقتول بن چکا ہے اور پولیس کو لئیق شاہ کی تلاش ہے۔"

"چھیما مقتول کیسے بنا؟ ہم نہیں جانتے۔" زہرہ نے فوراً کہا۔ "مگر لئیق شاہ کو بغیر ٹھوس ثبوت کے اس کا قاتل گردان کر اس کی تلاش میں شرفا کے گھر چھاپے مارنا جو خود بھی فریادی کی حیثیت رکھتے ہیں، کہاں کا انصاف ہے انسپکٹر جرار خان؟"

"میں یہاں آپ کو گرفتار کرنے کی حیثیت سے آیا تھا۔" وہ زہرہ بانو کے منہ توڑ جواب سے زچ ہو کے بولا۔ "لیکن اب میرا ارادہ بدل چکا ہے اس لیے کہ بات بڑھنے سے مزید صورتِ حال خراب ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں نے آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی۔"

"مجھ سے کس قسم کا تعاون درکار ہے آپ کو انسپکٹر؟" زہرہ بانو نے اس کی طرف اشتباہ انگیز نگاہوں سے دیکھتے

ہوئے کہا۔

انسپکٹر جرار ہولے سے کھنکھارا پھر بولا۔ ”لئیق شاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔“

”لئیق شاہ کہاں اور کدھر ہے؟ اس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔“ زہرہ بانو نے گہری متانت سے کہا۔ ”لیکن اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ بھی گیا تو سب سے پہلے اس کے دفاع میں میرا ہی قدم آگے بڑھے گا۔ ٹھوس شواہد کے ساتھ۔ اور پھر ممکن ہے ماضی سے متعلق کئی اور بھی ایسے حقائق آشکارا ہو جائیں جنہیں عارضی طور پر دبا دیا گیا ہے۔“ زہرہ بانو نے دانستہ آخر میں تہدیدی لہجہ اختیار کیا۔ جانتی تھی وہ کہ یہ راتب خور... ایک ایک بات کی رپورٹ ممتاز خان کو دے گا۔ ایک طرح سے زہرہ بانو نے بلیک میل کرنے کے انداز میں ان دونوں پر دباؤ ڈالنے اور اپنے مذموم ارادوں سے روکنے کے لیے ایک نفسیاتی حربہ استعمال کیا تھا جو خاطر خواہ ثابت ہونے کا اشارہ بھی دے رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ انسپکٹر جرار یہاں جس ارادے کے لیے آیا تھا، وہ اسے بدلنا پڑ رہا تھا۔

”آپ کی کہی ہوئی باتیں ابھی قبل از وقت ہیں۔ ہمیں پہلے لئیق شاہ کو گرفتار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد خود ہی حقائق سامنے آجائیں گے۔ آپ سے اتنا ضرور کہوں گا زہرہ صاحبہ! آپ بھی ایک معزز شہری ہونے کا ثبوت دیں اور لئیق شاہ کی گرفتاری کے سلسلے میں پولیس سے تعاون کریں، بہ صورت دیگر مجھے ذرا بھی شبہ ہوا کہ لئیق شاہ نے اس دوران آپ سے کسی قسم کا رابطہ کیا تو پھر میں وڈے چودھری (الف خان) کا بھی لحاظ نہیں کروں گا۔ چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چلا گیا۔

زہرہ بانو کی مدلل گفتگو، ان کے آئندہ کے اٹل ارادے... اور بروقت ذہانت نے بالآخر پولیس کو یہاں سے بے نیل مرام ہی جانے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ جس پر کمیل دادا کو ایک خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی اور وہ توصیفی لہجے میں زہرہ بانو سے یہ کہنے پر مجبور ہو گیا۔

”شاداجی بیگم صاحبہ! آپ کا بیگم ولا چھوڑنے کے بجائے گودے جاڑ کر واپس یہاں لوٹنے کا فیصلہ درست ثابت ہوا۔ ورنہ شاید صورت حال اور ہوتی۔“ اس کی بات سن کر زہرہ بانو نے ایک دلکش مسکراہٹ سے کہا۔

”کمیل دادا! یہی سب کچھ ممتاز خان چاہتا ہے کہ وہ ہمیں ڈرا کر قانون کی نظروں میں بھگوڑا بنا دے۔ تاکہ وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو سکے، مگر ہم نے اس کا یہ حربہ ناکام بنا دیا۔ اگر ہم ڈر کے بیگم ولا کا رخ کرنے کے بجائے کہیں اور کا رخ کرتے تو پھر چوہے بلی کا یہ کھیل ہمارے دشمنوں کے حق میں کامیاب ثابت ہوتا۔“

”بالکل صحیح فرمایا آپ نے بیگم صاحبہ۔“ کمیل دادا متاثر کن لہجے میں بولا۔

کمیل دادا نے کسی کو چائے وغیرہ کا بندوبست کرنے کا کہا پھر زہرہ بانو کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ اسے اب تشویش میں ڈوبا نظر آ رہا تھا اور وہ اس کی وجہ اچھی طرح سمجھتا تھا۔ کمیل دادا اپنے تئیں... کوشش کرتا کہ وہ زہرہ بانو کو لئیق شاہ کی طرف سے تفکیر آمیز پریشانی سے دور رکھے مگر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ احساس برچھی کی طرح چبھتا تھا کہ زہرہ بانو پوری طرح سے لئیق شاہ کے متعلق دلی و دماغی طور پر گرفت میں آچکی تھی، ایک بار اس نے زہرہ بانو کی لئیق شاہ سے توجہ ہٹانے کی بھی کوشش چاہی تھی تو اسے زہرہ بانو کے نہایت سخت رویے اور طیش کا سامنا کرنا پڑا تھا پھر اس میں دوبارہ یہ جرأت نہ ہو سکی تھی کہ وہ اس کی توجہ لئیق شاہ سے ہٹانے کی سعی کرتا لیکن رقابت کا زہر پھر بھی کم نہیں ہوا، گزرتے وقت کے ساتھ اس کا اثر سوا ہی ہوتا رہا۔ ایک بار پھر اس نے زہرہ بانو کے سامنے لئیق شاہ کے کردار سے متعلق ایک قیاس آرائی پر مبنی مفروضہ گھڑتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے کہ لئیق شاہ سے ایسا کوئی سنگین جرم ہوا ہو لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو ہم بھلا لئیق شاہ کے لیے کیا کر سکیں گے؟“ وہ یہ بات کہہ کر درحقیقت زہرہ بانو کے لئیق شاہ کے بارے میں آئندہ کے خیالات اور عزائم جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لئیق شاہ سے متعلق وہ رقابت کے چور جذبے میں آکر ایسی بات زہرہ بانو سے کہہ تو جاتا تھا مگر بعد میں اندر سے ڈرتا بھی تھا کہ کہیں پھر اس کی کوئی بات اسے بری نہ لگ جائے اور وہی ہوا بھی۔ کمیل دادا کی بات پر زہرہ بانو نے اس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ پھر اسی لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا کمیل دادا؟ کیا ہم لئیق شاہ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے؟ اپنے ایک ایسے وفادار اور جاں نثار ساتھی کو جس نے کئی خطرناک حالات اور مواقع میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر ہماری جان بچائی۔ حتیٰ کہ ہم سے وفاداری کے پاداش میں دشمنوں نے اس کے گھر کو بھی آگ لگا دی اور اس کے بوڑھے ماں باپ کو بھی زندہ جلا ڈالا اور تم کہتے ہو کہ ایسے محسن کو ہم ان

ظالموں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں؟ ہرگز نہیں، یہ خودغرضی اور بے حسی کی انتہا ہوگی، مجھے حیرت ہے کہیل دادا! تم جیسا آدمی بھی ایسی بات کرسکتا ہے؟ یا پھر تمہارے انتخاب میں ہم سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔''

زہرہ بانو کی اس آخری بات نے کہیل دادا کو سر سے پاؤں تک جھنجوڑ ڈالا۔ ''نن... نہیں بیگم صاحبہ! آ... آپ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔'' پھر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بول گیا ہے۔ بات بناتے ہوئے دوبارہ بولا۔ ''مم... میرا مطلب تھا... میرے دل میں بھی اپنے ساتھیوں کے لیے بہت قدر و قیمت ہے لیکن شاید لئیق شاہ ہمارے درمیان کبھی نہیں رہا اس لیے میرے ذہن میں یہ باتیں ابھریں جو بہرحال غلط ہیں۔''

''وہ ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ ہی رہتا ہے... کہیل دادا۔'' زہرہ بانو نے یکایک عجیب اور گہرے لہجے میں کہا۔ اس کی سوچتی ہوئی کشادہ آنکھیں... کہیل دادا کو کسی غیر مرئی نقطے پر اٹکی محسوس ہونے لگیں اور زہرہ بانو کے اس جملے نے اسے بھی آج بہت کچھ یاد کرادیا تھا کہ ''خبردار! دوبارہ بیگم صاحبہ اور لئیق شاہ کے درمیان خطِ تنسیخ کھینچنے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ خود دور کردیا جائے گا۔''

یہ سوچ کر کہیل دادا اندر سے لرز سا گیا۔ بیگم صاحبہ سے دور ہونا اس کے لیے ایسا ہی تھا جیسے اسے اس کے محور سے دور کردیا گیا ہو، بھٹکنے کے لیے... ہمیشہ کے لیے... دور خلاؤں میں... پھر وہ یک دم جیسے ایک ڈراؤنے خواب سے بیدار ہوگیا اور خفت مٹانے کی غرض سے بولا۔

''میں معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ، مجھے واقعی لئیق شاہ سے متعلق ایسا کچھ کہنا نہیں چاہیے تھا، شاید اس کی وجہ وہی ہو جو میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔ درحقیقت میں خود بھی کافی دنوں سے یہ محسوس کررہا تھا کہ آپ کی پریشانیوں اور ذہنی کرب کا زیادہ سبب لئیق شاہ ہی ہے مگر...''

''ہرگز نہیں... کہیل دادا۔'' زہرہ بانو نے مسکت لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''لئیق شاہ کبھی بھی ہمارے لیے پریشانیوں یا ذہنی کرب کا باعث نہیں بنا ہے، نہ ہی بن سکتا ہے۔ اس غریب اور سادہ انسان نے ہماری خاطر اپنی زندگی تج ڈالی ہے۔ ہم سے وفاداری کے جرم کی وہ سزا بھگت رہا ہے اور اس وقت نہ جانے کہاں دربدر ہورہا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے یکایک زہرہ بانو کی آواز بھرائی۔ قدرتی کاجل لیے کشادہ اور گہری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے، حسین بیضوی چہرے کی گوری شاداب رنگت میں نمناکی کی پرچھائیں ڈیرے ڈالنے لگی تھیں۔ پُرتعیش نشست گاہ کی فضا یک دم سوگوار ہوگئی۔ تھوڑی دیر پہلے باقی ساتھی جاچکے تھے، جہانگیر بھی تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد اٹھ کر چلا گیا تھا۔ وہاں اب صرف زہرہ بانو اور کہیل دادا موجود تھے۔ ادھیڑ عمر ملازمہ چائے کی ٹرے رکھ کے اور دونوں کے لیے ایک ایک کپ چائے کا بنا کر جاچکی تھی۔ بیگم صاحبہ کو غم زدہ دیکھ کر کہیل دادا اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ ان کا دکھ اسے اپنا دکھ محسوس ہونے لگا۔ ایک خفتہ جذبے تلے اسے احساسِ ندامت نے ادھیڑ ڈالا... کیا ضرورت تھی یہ سب کہنے کی؟ جبکہ معلوم بھی تھا بیگم صاحبہ کو لئیق شاہ سے متعلق ایسی گفتگو... اندر سے جھیروں جھیر کرڈالتی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے تمہاری کہیل دادا... کہ تم اپنے جذبۂ رقابت تلے اپنے محبوب کے دکھ اور غم کا بھی پاس نہ رکھو۔ لئیق شاہ کو دیکھو... اپنے عمل سے... اپنی حیات درماندہ سے ثابت کررہا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ دلی وابستگی اور انسیت کیا شے ہوتی ہے؟ جو بغیر کسی اظہارِ محبت کے اپنا آپ منوائی ہے اور ایک تم ہو کہ اپنے محبوب کو (بیگم صاحبہ) دکھی کر ڈالتے ہو۔ تم بیگم صاحبہ کے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہو۔ شاید کوسوں دور... کیوں؟ سوچو ذرا کہیل دادا... سوچو...''

کہیل دادا ساری رات سوچتا ہی رہا تھا اور صبح تک رت جگے نے اسے جوہرِ محبت سے آشنا کردیا تھا کہ محبت میں خودغرضی کا جذبہ سرائیت کرجائے تو اسے گھن لگ جاتا ہے جبکہ ایثار... خاموش وفا اس جذبے کو چار چاند لگادیتی ہے۔

رات کے پچھلے پہر وہ یہ سب سوچ کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہ اب خود کو پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ رقیبانہ خیالات بھی... شیطان ہی کی کارستانی ہوتے ہیں... وہ اب ان سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرے گا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی تقدیر آخر کب تک اسے محبت اور رقابت کے بیچ لٹکائے رکھے گی؟''

صبح ہوئی تو رات بھر جاگتے اور سوچتے رہنے کے باعث اس کی آنکھیں نیند سے سرخ ہورہی تھیں۔ ناشتا کرنے کو جی نہیں چاہا۔ دو کپ چائے اس نے ضرور پی تھی۔ طبیعت میں کسلمندی طاری تھی، جب بیگم صاحبہ سے اس کا آمنا سامنا ہوا تو وہ ان کا... پژمردہ سا چہرہ دیکھ کر چونک پڑا۔ صاف لگتا تھا کہ رات بھر انہوں نے بھی رت جگے میں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بتائی ہے۔ ان کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں، چال ڈھال سے تھکاوٹ کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر کبیل دادا کے دل کو پھر ایک گھونسا لگا۔ احساسِ جرم بڑھنے لگا تو دل و دماغ اس کی تلافی پر اکسانے لگا۔

''ہم کس قدر بے بس ہو گئے ہیں کبیل دادا! کہ لئیق شاہ کے لیے کچھ نہیں کر پا رہے۔''

گروہ میں زہرہ بانو کے بعد کبیل داد کی مستند حیثیت کی پاسداری میں جب ایک بار پھر دونوں رُوبرو ہوئے تو زہرہ بانو نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے تھکے تھکے اور مایوس سے لہجے میں کہا۔ کبیل دادا کو ان کی متورم سی آنکھوں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ بیگم صاحبہ نے رات بھر کس کی یادوں میں کروٹیں بدل کر گزاری تھی۔ بہرحال... وہ اپنا دردِ نہاں بھلا کر زہرہ بانو سے بولا۔

''ایسی بات نہیں ہے بیگم صاحبہ! ہم بے بس نہیں ہیں۔ میں تو نئے پنڈ سے لوٹنے سے پہلے ہی آپ کو اس بات کی تسلی دے چکا ہوں کہ آپ کے بہ خیر و عافیت یہاں بیگم ولا لوٹ آنے کے بعد میں اور طیفہ (طفیل) اگلے دن ہی دوبارہ لئیق شاہ کی تلاش میں نئے پنڈ روانہ ہو جائیں گے۔''

اس کی بات سن کر زہرہ بیگم نے قدرے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کبیل دادا پُرعزم ہو کے بولا۔ ''اور بیگم صاحبہ! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی جان کی بازی لگا کر لئیق شاہ کا نہ صرف سراغ لگا کر رہوں گا۔ بلکہ اسے اس خبیث انسپکٹر جرار کے ہتھے بھی نہیں چڑھنے دوں گا۔''

''کک... کیا واقعی... ایسا ہو جائے گا کبیل دادا؟'' زہرہ بانو نے جیسے بچوں جیسی بہلاوے والی مسرت آمیز حیرت سے کہا تو کبیل دادا نے سنجیدہ اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ایسا بالکل ہو گا بیگم صاحبہ! آپ بس میرے کامیاب لوٹنے کی دعا کیجیے گا کیونکہ میں جان چکا ہوں کہ لئیق شاہ کا سراغ کون بتا سکتا ہے؟'' اس کے مضبوط مگر ذومعنی لہجے نے زہرہ بانو کو لئیق شاہ سے متعلق تلاش کی غیر یقینی حد تک سوچ کو یقین میں بدل دیا تھا۔ کبیل دادا نے بھی پہلی بار زہرہ بانو کے پھیکی رنگت چہرے سے خوشی پھوٹتی محسوس کی تھی۔

''بیگم صاحبہ! اب آپ کا بیگم ولا میں موجود رہنا ضروری ہے۔ آپ یہاں رہتے ہوئے صرف ایک کام تیار رکھیے گا کہ کسی طرح انسپکٹر جہانزیب سے رابطہ کر کے پرانے کیس کی ریکارڈ کاپی حاصل کر لیں ساتھ ہی ایک وکیل کا بھی بندوبست کر کے رکھیں تا کہ جس وقت میں لئیق شاہ کو لے کر یہاں پہنچوں تو پولیس ہمیں تنگ نہ کر سکے۔'' وہ بولا۔

زہرہ بانو اپنے مقربِ خاص ساتھی کی بات اور اس کا لائحہ عمل سمجھ رہی تھی۔ پہلے اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ بھی لئیق شاہ کی تلاش میں اس کے شانہ بشانہ ہو گی لیکن اب حالات اور ہو گئے تھے، معاملہ صرف لئیق شاہ کو تلاش کرنے کا ہی نہیں تھا بلکہ اسے جھوٹے الزامات سے بھی بچانا تھا یہی سبب تھا کہ زہرہ بانو کی کبیل دادا کا لائحہ عمل جان کر کچھ امید ہو چلی تھی کہ وہ لئیق شاہ کی تلاش میں درست خطوط پر کام کر رہا ہے۔ پھر کبیل دادا نہیں رکا۔

نصف گھنٹے کے اندر اندر وہ اپنے دو ساتھیوں اور جہانگیر کے ساتھ نئے پنڈ روانہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کار خود کبیل دادا ڈرائیو کر رہا تھا۔ جہانگیر اس کے برابر والی نشست پر بیٹھا تھا جبکہ طیفہ عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ تینوں کے پاس بھرے ہوئے پستول اور فاضل راؤنڈ... تھے۔ دن نکلا ہوا تھا اور موسم خوش گوار تھا۔ نئے پنڈ پہنچ کر کبیل دادا نے سیدھا اپنے آبائی گھر کا رخ کیا۔ کار روک کے سب نیچے اترے، کبیل دادا نے تالا کھولا۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ان تینوں نے یونہی تھوڑا وقت وہاں گزارا اس کے بعد وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچے اور دھول اڑاتے ناہموار راستوں پر کار دوڑاتے ہوئے یہ تینوں... پنڈ کے ایسے علاقے کی طرف نکل آئے جدھر لئیق شاہ کا گھر تھا اور اس کی برادری سے تعلق رکھنے والے یہاں رہتے تھے۔ ایک جگہ کار روک کر کبیل دادا نے... کسی سے برادری کے معتبر آدمی کا اتا پتا معلوم کیا اور اس کے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

لئیق شاہ کی تلاش کے سلسلے میں کبیل دادا سمجھتا تھا کہ اسے یہاں سے کچھ نہ کچھ تو ایسے حقائق کا پتا ضرور چلے گا، جو اس کی تلاش میں بنیادی حیثیت ضرور رکھتے ہوں گے، اس کے بعد اس نے دیگر چند لوگوں سے بھی اپنے تئیں معلومات لینی تھی۔

برادری کی معتبر شخصیت سے مراد ان کا سردار نہ تھا بلکہ ایسی مقامی شخصیت تھی جس سے کسی معاملے پر سب سے پہلے ملاقات کی جاتی تھی، وہ ایک ساٹھ، پینسٹھ سالہ آدمی تھا جو چودھری اللہ وسایا کے نام سے مشہور تھا۔ لئیق شاہ جس برادری سے تعلق رکھتا تھا، وہ کوئی زیادہ بڑا زمیندار طبقہ نہیں تھا۔ لہٰذا جب وہ چودھری اللہ وسایا سے ملنے اس کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا وہ ڈیرے پر تھا اور وہیں اس کی بیٹھک تھی،

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کسی نوعمر لڑکے نے انہیں بتایا اور تینوں ڈیرے پر پہنچ گئے۔ بڑی سی گارے مٹی کی چہار دیواری تھی، چوبی دروازوں کا پھاٹک تھا جس کا ایک پٹ ٹوٹ کر بھربھری مٹی والی زمین میں دھنس چکا تھا اور اس کی مرمت کرانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اندر کہیں کہیں اناج کے ڈھیر... چبوتروں کی صورت نظر آرہے تھے، ذرا ذرا فاصلوں پر کچھ چارپائیاں اور سرکنڈوں کے موڑھے پڑے نظر آرہے تھے، کار ایک طرف روک کر یہ تینوں نیچے اتر آئے، ایک چھپر تلے انہیں تین چار بھینسیں جگالی کرتی نظر آئی تھیں۔ اس کے قریب ہی جدھر سرکنڈوں کا بڑا سا سائبان تنا ہوا تھا، اس کے تلے انہیں ایک کوٹھری نما بیٹھک کا دروازہ دکھائی دیا۔ باہر ہی .... موٹے نقشین پایوں والی نسبتاً بہتر حالت میں ایک چارپائی اور اس کے سامنے دو اونچی پشت گاہ والے مونڈھوں پر چار پانچ افراد بیٹھے دکھائی دیے۔ دو پرانی موٹر سائیکلیں بھی ایک طرف سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی تھیں۔ مذکورہ افراد کے درمیان حقہ بھی رکھا تھا۔ وہ باتوں اور گڑگڑی جمانے میں مصروف تھے۔

ان تینوں کو دیکھ کر روایتی انداز میں ان لوگوں نے پہلے تو ان کا پُرتپاک استقبال کیا، پھر لسی پانی پوچھنے کے بعد آنے کا مطلب دریافت کیا تو کھبیل دادا نے چودھری اللہ وسایا کا پوچھا۔

''جی میں ہوں، اللہ وسایا۔ خیریت تو ہے؟'' ایک سفید لنگی اور کرتہ پہنے ساٹھ پینسٹھ سالہ آدمی نے کھبیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ ایک دبلا اور خاکستری رنگ والا آدمی تھا۔ شکل وصورت سے بھلا مانس ہی معلوم ہوتا تھا۔

جب کھبیل دادا نے پہلے اپنے باپ منشی فضل دین کے بیٹے کی حیثیت سے تعارف کروایا تو اللہ وسایا کے جھریوں پڑے چہرے پر الجھن کی لکیریں بھی رل مل گئیں، جبکہ اس کے ساتھ موجود باقی آدمیوں کے بشروں پر تلخی کے آثار نمودار ہوگئے۔ چودھری الف خان کے ملازمین کی حیثیت سے ان کا تعارف بڑا تھا اور ممتاز خان اس کا بیٹا ہے، یہ حوالہ اس تلخی کا باعث تھا باوجود اس کے ان لوگوں نے ان تینوں کو بیٹھنے کے لیے کہا تھا مگر ان میں ایک نسبتاً جوان اور گھنی مونچھوں والا شخص کچھ زیادہ ہی ناگوار نظروں سے ان کی طرف گھور کے دیکھ رہا تھا۔ کھبیل دادا نے بھی ایک تیز نظر اس کے اینٹھے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی، اسے اس کی شبیہ میں بوڑھے اللہ وسایا کے چہرے کی کچھ مماثلت نظر آئی تھی، جس سے اس نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ اس کا بیٹا ہی ہوسکتا تھا۔

''جی بولیں؟ ہم آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟'' بالآخر اللہ وسایا نے کھبیل دادا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز البتہ طوعاً وکرہاً ہی محسوس ہوا تھا۔ کھبیل دادا نے بھاری اور سنجیدہ آواز میں بوڑھے سے کہا۔

''بزرگو! پہلے تو ہم آپ کو یہ بات بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارا چودھری ممتاز خان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی اس حویلی سے...''

''او باؤ! یہ کہانی ہم بہت سن چکے جی... کسی اور نوں سناؤ جا کے سن... اسی ایتھے آندے ایسی گلاں وچ...'' اس مذکورہ غصیلے نوجوان نے کھبیل دادا کی بات پر اپنا ایک ہاتھ جھٹک کر اس سے کہا تو کھبیل دادا نے اس کی طرف گھورتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''کہانیاں تو اور بھی بہت سی بنی ہیں جو یقیناً آپ سب نے بھی سن رکھی ہوں گی۔''

''کیسی کہانیاں؟'' اس غصیلے مزاج نوجوان کے برابر میں بیٹھے دوسرے آدمی نے کھبیل داد کو گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو کھبیل دادا بھی اس بار اسی لہجے میں بولا۔

''یہی کہ لئیق شاہ کو اپنی برادری کے جرگے میں انصاف دلانے کے لیے تم لوگوں نے ہی اسے اکسایا تھا اور قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے سے منع کرنے کا مشورہ دیا تھا پھر اسے نہ تم لوگ انصاف دلا سکے الٹا بے چارہ وہ خود قانون کی نظروں میں اب مجرم بن چکا ہے۔'' یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جس نے ان دونوں کے منہ پر تالے لگا دیے اور وہ بغلیں جھانکنے لگے، تب ہی چودھری اللہ وسایا کھبیل دادا سے اپنی خفت مٹانے کی غرض سے نرم لہجے میں گویا ہوا۔

''ذرا کھل کر کل بات کرو... آخر معاملہ کیا ہے؟ اب پولیس بجائے مجرموں کو پکڑنے کے لئیق شاہ کو کیوں تلاش کر رہی ہے؟''

اس کی بات پر کھبیل دادا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے بہت غور اور بھانپتی ہوئی نظروں سے اللہ وسایا کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ کیا اب تک انہیں یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ پولیس اب لئیق شاہ کو وسیم المعروف تھیما کے قتل کے الزام میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی، گویا پولیس یہاں تفتیش وتلاشی کے سلسلے میں آئی تک نہیں تھی، کیوں؟

''بزرگو! لگتا ہے تم لوگوں کو اس حقیقت کا ابھی تک نہیں پتا چلا ہے کہ پولیس لئیق شاہ کو کیوں ڈھونڈتی پھر رہی

ہے؟'' کمیل دادا نے بھی دانستہ اسرار بھرا لہجہ اختیار کیا اور باری باری ان سب کے چہروں کی طرف بھی دیکھا تھا کہ ممکن ہو انہیں معلوم ہو اور دانستہ تجاہلِ عارفانہ سے کام لینے کی کوشش کر رہے ہوں اور وہی ہوا۔ کمیل دادا کی گھاگ نظروں نے فوراً ان سب کے چہروں کے تاثرات تاڑ لیے کہ وہ یہ بات دانستہ اپنے تک ہی محدود کیے ہوئے تھے۔

''پتا ہے جی... ہمیں پتا ہے... وہ سب پتا ہے۔'' اس بار اللہ وسایا کے ایک ہم سن بوڑھے نے کمیل دادا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''پولیس کا کام یہی ہے اصل مجرموں کے بجائے... غریب بے گناہوں کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ اس میں بھی تم لوگوں کی ہی کوئی سازش ہے۔''

''ہماری نہیں کہو چاچا جی! صرف چودھری ممتاز کی سازش۔'' کمیل دادا نے اس دوسرے عمر رسیدہ آدمی کی تصحیح کرنی چاہی تو وہ بھی سر جھٹکتے ہوئے ڈھٹائی سے بولا۔

''ایک ہی بات ہے۔''

''ایک ہی بات نہیں ہے ......'' کمیل دادا نے بھی آگے سے بغیر ٹھہرے جواب دیا۔

''لئیق شاہ، زہرہ بی بی کا ایک وفادار ملازم تھا، جب لئیق شاہ کے گھر کو آگ لگوائی گئی تھی تو زہرہ بی بی ازراہِ ہمدردی خود بھی یہاں آئی تھیں، اس کے باوجود تم نہیں سمجھ رہے کہ... ہمارا اور زہرہ بی بی کا سگے چودھری ممتاز خان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں بہن بھائیوں کے بیچ سگے سوتیلے والا معاملہ ہے۔ اس لیے ان کی آپس میں کبھی نہیں بنی نہ یہ بن سکتی ہے۔''

''ہمیں چودھری الف خان کے خاندانی معاملات اور جھگڑوں سے کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی دلچسپی ہے مگر بعض مفادات میں یہ سب ایک ہو جاتے ہیں۔ یہ اونچی حویلی والوں کا عام وتیرہ ہے۔'' ایک تیسرے جوان نے اپنی علمیت بگھارنے کی کوشش چاہی تھی تو... کمیل دادا نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کی اس فضول کی ہٹ دھرمی کے باعث یہ معاملہ الجھ کر سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ تم خود تو یہاں مزے اور آرام سے بیٹھے ہو جبکہ تمہاری اپنی برادری کا آدمی (لئیق شاہ) جو بے چارہ مظلوم ہونے کے باعث نہ جانے کدھر خطروں کی گود میں پڑا ہے؟ تم لوگوں نے اب تک اس کے لیے کیا کیا ہے؟ ایک غلط مشورہ دے کر اب اسے تنہا چھوڑ کے یہاں خود مزے سے چوپال سجائے بیٹھے ہو، تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے۔ جب دوسرا اس کی مدد کے لیے آگے بڑھ رہا ہے تو تم لوگ اس پر کیڑے نکال رہے ہو۔''

کمیل دادا کو جوش آ گیا۔ وہ پھٹ پڑا تھا۔ طیبہ اور جہانگیر... بغور یہ سب سن رہے تھے۔

''اے منہ سنبھال کے بات کرو... ورنہ...'' اس بچھیل سے نوجوان کو طیش آ گیا۔ باقی سب سر جھکائے بیٹھے تھے۔

''بس... بس... کاکے! اپنا یہ جوش سنبھال کے رکھ۔'' کمیل دادا نے بیٹھے بیٹھے اس سے کہا۔ ''تو چودھری اللہ وسایا نے اس نوجوان کو ڈپٹ دیا۔

''اوئے پترا اکرم! بیٹھ جا آرام سے۔ میں بات کر رہا ہوں نا... یہ جوان بالکل صحیح کہہ رہا ہے... اگر کسی کو ہماری باتیں پسند نہیں ہیں تو میرے ڈیرے اور بیٹھک سے اٹھ کر چلا جائے... یا پھر خاموش یہاں بیٹھا رہے۔''

چودھری اللہ وسایا کو بالآخر یہ کہنا پڑا تھا اور کوئی تو نہیں اٹھا مگر اکرم نامی وہ بچھیل نوجوان، جو بلاشبہ اللہ وسایا کا بیٹا ہی تھا اور اس کا ہم عمر نوجوان دونوں وہاں سے غصے سے اٹھ کر چلے گئے۔

''میں ان دونوں کی طرف سے معافی مانگتا ہوں تم سے۔'' ان دونوں کے وہاں سے جاتے ہی بوڑھے اللہ وسایا نے کمیل دادا کی طرف دیکھ کر شرمندگی سے کہا تو کمیل دادا نے فوراً دوستانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

''او... نہیں... نہیں چودھری جی، غلط فہمیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں لیکن یہ اچھا ہوتا ہے کہ کچھ باتیں سمجھ کر اور کچھ تلخ اور سچے حقائق کو تسلیم کر کے انسان معاملہ فہمی کی راہ نکالے۔ ہم بھی اس لیے ہی آئے ہیں۔ تمہاری برادری سے تعلق رکھنے والے ایک مظلوم آدمی (لئیق شاہ) کی مدد کرنے... اور اس سلسلے میں ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔''

کمیل دادا کی بات پر اللہ وسایا نے کھلے دل سے اس بات کا اظہار کر دیا کہ وہ ان کی ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہے۔ تب کمیل دادا نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے اس سے کہنا شروع کیا۔

''ہم لئیق شاہ کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔ کچھ روز پہلے زہرہ بی بی کے ساتھ ہم یہاں آئے بھی تھے، تب ہی ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ اچانک کچھ دنوں سے غائب ہے۔ انہی باتوں کی وجہ سے تمہاری برادری کے کسی آدمی نے ہم سے کوئی خاص تعاون نہیں کیا نہ ہی لئیق شاہ کے سلسلے میں کچھ بتایا، نہ

...اپنی برادری کے جرگے سے انصاف نہ ملنے یا اسے تنہا چھوڑ دینے کے بعد لئیق شاہ اپنے دل میں کیا عزائم رکھتا تھا تاکہ ہم کچھ اندازہ قائم کر سکتے، میں پہلے آپ سے ایک سوال پوچھوں گا کہ کیا آپ لوگوں نے اب تک لئیق شاہ کی تلاش کے سلسلے میں کوئی ٹھوس قدم اٹھایا؟ اگر نہیں تو کیوں؟''

کمیل دادا کی بات پر ایک بار پھر وہ سب اپنی اپنی بغلیں جھانکنے لگے مگر اللہ وسایا جو اَب تک کی باتوں اور حقائق کو کھلے دل سے سمجھ اور تسلیم کر رہا تھا خفت بھرے لہجے میں بولا۔

''نہیں، یہ ہماری بے حسی ہے کہ ہم نے لئیق شاہ کی تلاش کے بارے میں کچھ کیا اور نہ ہی اسے انصاف دلانے کے لیے کوئی ٹھوس اقدامات کیے، بس چپ چپا کے بیٹھ گئے۔ ہمیں خود اپنے اس عمل پر شرمندگی ہے۔'' ان کی شرمندگی اور بے حسی پر ماتم کرنے کا کمیل دادا کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنے مشن کے لائحہ عمل کے مطابق چودھری اللہ وسایا سے کہا۔

''دیکھو چودھری صاحب! دشمن ایک کے بعد ایک ہمارے خلاف چالیں چل رہے ہیں، ہم ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اس کے لیے آپ سب کو بھی سرگرم ہونا پڑے گا۔ آپ اپنی پنچایت اور برادری کے وڈے سائیں لوگوں کو اکٹھا کریں، متعلقہ تھانے کا گھیراؤ کریں۔ انسپکٹر جرار خان جو درحقیقت چودھری ممتاز خان کا راتب خور اور ایک راشی افسر ہے، اس کے خلاف نعرے لگائیں۔ پرانی تاریخوں میں لئیق شاہ کی گمشدگی کے سلسلے میں چودھری ممتاز خان کے خلاف اغوا کی ایف آئی آر کٹوائیں، اپنے احتجاج کا دائرہ شہر اور کمشنر ہاؤس تک وسیع کریں۔ تب ہی تم کو انصاف ملے گا مگر اس کا اصل مقصد یہی ہوگا کہ دشمنوں کو کم از کم اس طرح دیدہ دلیری سے چیرہ دستیاں کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور جب ہم لئیق شاہ کو ڈھونڈ نکالیں گے تو اس کے لیے پہلے سے کوئی مشکلات نہیں کھڑی ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ایک دن لئیق شاہ کو ضرور ڈھونڈ لیں گے، اسی مقصد کے لیے ہی ہم نکلے ہیں۔''

کمیل دادا کی بات پر چودھری اللہ وسایا نے کھلے دل اور جوش و جذبے کے ساتھ اس کی تائید کی، بولا۔

''آپ اب بالکل فکر نہ کریں۔ میں آج سے ہی برادری کے لوگوں کو اکٹھا کر کے انہیں تیار کر دوں گا۔'' اس کی بات پر اس کے ہم عمر بوڑھے نے اس سے کہا۔

''اللہ وسایا! ان لوگوں کو یہ حقیقت تو بتا دو کہ ہماری برادری کے کچھ لوگ چودھری ممتاز خان سے دشمنی مول لینے کا خطرہ نہیں چاہتے ہیں اور وہ دوسروں کو بھی یہی نصیحت کرتے پھر رہے ہیں جب ہی تو لوگ اپنا اپنا منہ اس ڈر سے چھپائے بیٹھے ہیں۔'' اس نے ان تینوں کی طرف اشارہ کیا اور کمیل دادا اس نئے انکشاف پر چونکے بنا نہ رہ سکا، بولا۔

''اگر اس طرح کا ان لوگوں نے وتیرہ اپنا لیا تو پھر کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ تم لوگوں کو یہ بات انہیں سمجھانا ہوگی پورے جوش و جذبے کے ساتھ۔'' یہ کہتے ہوئے اچانک کمیل دادا کے ذہن میں ایک خیال جھماکے سے کلک ہوا۔ اس نے اللہ وسایا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ جو ابھی دو نوجوان غصے سے اٹھ کر گئے ہیں، یہ کون تھے؟''

''وہ جی ایک تو میرا بیٹا اکرم تھا اور دوسرا کاشف عرف کاشی تھا۔ وہ میرا بھتیجا ہے۔ میرے مرحوم بھائی محمد علی کا بیٹا۔ اور میرا ہونے والا داماد بھی۔ وٹے سٹے کی شادی ہے۔ کاشی کی بہن یعنی میری بھتیجی میرے پُتر اکرم کی منگ (منگیتر) ہے۔ ابھی چند روز میں ان کا ویاہ ہونے والا ہے۔ ہم اسی سلسلے میں یہاں چوپال ڈالے بیٹھے تھے۔''

''ہوں۔'' اس کی بات سن کر کمیل دادا نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کی پھر گوگو سے لہجے میں خودکلامیہ بڑبڑایا۔

''اس کا مطلب ہے ان دونوں کا تعلق بھی برادری میں اس گروہ سے ہے جو چودھری ممتاز سے ڈرتا ہے اور اس کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا ہے۔''

''ان کی تم فکر نہ کرو جی، میں ان دونوں منڈوں کو سمجھا دوں گا۔'' اللہ وسایا نے جلدی سے کہا مگر کمیل دادا آگے اور بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو رہا تھا۔

بہرحال... اس نے اللہ وسایا اور وہاں موجود دیگر لوگوں سے کچھ سوالات کیے اور اللہ وسایا کے ساتھ برادری کے دیگر لوگوں سے بھی ملا، ان کی قیاس آرائیاں سن کر اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرتا رہا پھر اس دوران اسے معلوم ہوا کہ لئیق شاہ کا ایک پرانا بچپن کا دوست مختیار علی بھی تھا۔ اس سے ملنا بھی ضروری خیال کرتے ہوئے وہ تینوں اس کے گھر تک جا پہنچے۔ خاصا بھرا پُرا گھر تھا۔ سب مل جل کے رہتے تھے۔ مختیار علی کو باہر بلایا گیا۔ خاندان کے دیگر بڑے بھی باہر آئے تھے، اللہ وسایا ساتھ تھا۔ اس لیے وہ کمیل دادا وغیرہ سے بھی ادب تمیز سے پیش آ رہے تھے۔ اللہ وسایا نے کمیل دادا کو بتا دیا تھا کہ یہ خاندان اس گروہ سے تعلق رکھتا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

تھا جو چودھری ممتاز خان سے ڈرتا نہیں تھا۔ بختیار علی، لئیق شاہ اور کمیل دادا کا ہم عمر ہی تھا نیز کمیل دادا کی بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے انداز و اطوار سے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے بچپن کے دوست لئیق شاہ کے سلسلے میں انہیں بہت کچھ بتانے کے لیے بے چین بھی نظر آتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ بختیار علی، کمیل دادا کو اندر ایک بیٹھک میں لے آیا۔ بیٹھک کیا تھی، اندرونی کوٹھری نما کمروں سے ملحقہ یہ بھی ایک کمرا تھا جس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ طیبہ اور جہانگیر کو کمیل دادا نے باہر کار میں ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کی تھی جبکہ چودھری اللہ وسایا واپس اپنے ڈیرے کی طرف لوٹ چکا تھا۔

گوڈری بچھی ایک چارپائی اور دو پرانے سے مونڈھے، اس کمرے کا کل فرنیچر تھا۔ دیواروں پر اسلامی طغرے آویزاں تھے۔ سادہ سی بیٹھک تھی۔ کمیل دادا نے اپنے بیٹھنے کے لیے مونڈھا سنبھال لیا۔ بختیار علی نے بھی اس کے برابر کا مونڈھا سنبھال لیا۔

"پہلے یہ بتاؤ جی کیا پیو گے؟" بختیار علی نے خوش دلی سے کمیل دادا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کمرے کا جو دوسرا دروازہ اندر کھلے صحن میں وا ہوتا تھا۔ وہاں کچھ عورتوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ساتھ ہی کسی بلورنے کی مخصوص گھرر، گھرر کی آواز بھی ان میں شامل تھی۔

کمیل دادا نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ کھانے پینے سے معذرت کرلی پھر بولا۔

"دوست! اس وقت کسی شے دی لوڑ نہیں۔ بس ایک ضروری کام ہے۔ وہ پورا ہوجائے تو فکر سے آزادی ملے، ورنہ ایسے میں کھانا پینا بھی کب اچھا لگتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے کمیل دادا نے اسے ساری بات صراحت کے ساتھ بتا دی۔ جسے سنتے ہی بختیار علی کا چہرہ پہلے تو خاصا افسردہ نظر آنے لگا پھر جواباً بولنے سے چند ثانیے پہلے اس کے چہرے پر جوش کی سی سرخی طاری ہوگئی۔

"اپنے یار لئیق شاہ سے تو میں خود بھی شرمندہ ہوں، وہ تو میرا بچپن کا دوست ہے اور میں نے اسے انصاف دلانے کے لیے بہت کوشش کی تھی، میں خود اس بات کے خلاف تھا کہ اسے جرگے سے فیصلہ لینے کے بجائے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے کیونکہ جرگے میں تو صرف وہی فیصلہ کامیاب جاتا ہے جو آپس کی برادری میں کسی تنازعے کی صورت ہو۔ غیر برادری میں بھلا جرگے کے فیصلے کی کیا اہمیت ہوسکتی تھی؟ مگر ہمارے معتبر اس بات پر بضد تھے کہ دونوں برادری کے جرگہ کمیٹی کے افراد شامل ہوں، وغیرہ... مگر ایسا نہ ہوسکا۔ لئیق شاہ بے چارہ کیا کرتا؟ برادری کے بڑوں کے فیصلے کے آگے اس نے بھی مجبوراً اپنا سر جھکالیا جب اپنوں سے بھی اسے انصاف نہ ملا تو اس وقت تک برادری دو حصوں میں بٹ چکی تھی بلکہ دو حصوں میں کیا بٹ گئی تھی، زیادہ تر لوگ ایک آدمی کی خاطر وڈے چودھری (الف خان اور ممتاز خان وغیرہ) سے دشمنی مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی، میں بات صاف کہوں گا، باؤ کمیل! ہماری برادری ایک غریب طبقے پر مشتمل ہے اور بیشتر لوگ وڈے چودھریوں کی نوکریاں کرتے ہیں۔ کھیت مزدوری کے بڑے بڑے ٹھیکے ان کو ملتے ہیں۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوکر بالآخر لئیق شاہ نے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کی کوشش چاہی تو یہی لوگ اور ان کی عورتیں جھولیاں پھیلا کر اس کے ارادوں کے سامنے آکر کھڑی ہوگئیں کہ اس جنگ میں ان کے چولہے سرد پڑجائیں گے اور یہ کہ یہ لوگ وڈے چودھریوں کی لڑائی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ میرا یار لئیق شاہ... بزدل یا کم ہمت نہیں تھا باؤ کمیل۔ وہ تو شیر جیسا دل رکھتا تھا مگر یار بڑا دل کا نرم بھی تھا اور خدا ترس بھی... تب پھر پتا ہے باؤ کمیل! میرے یار نے کیا فیصلہ کیا؟"

بختیار علی اتنا بتا کر اسرار بھرے انداز میں رکا۔ اب اس کی آواز دھیمی ہونے لگی تھی، کمیل دادا بہ غور بھویں سکیڑے اس کے چہرے کی طرف تکے جارہا تھا۔ بختیار علی نے اس بار بہت نیچی آواز میں اسے بتایا۔

"میرے یار لئیق شاہ نے جو فیصلہ کیا تھا، اس نے کسی کو خبر تک نہیں لگنے دی تھی، اور اس کے اس آخری فیصلے سے صرف میں ہی آگاہ تھا۔"

"اس نے بالآخر کیا فیصلہ کیا تھا؟" کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر بے کلی سے پوچھا۔

"اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وڈے چودھریوں سے اکیلے جنگ لڑے گا اور اپنے بوڑھے ماں باپ کے قتل کا بدلہ لے گا۔" بختیار علی نے بتایا تو کمیل دادا چونکے بنا نہ رہ سکا۔ "میں اپنے یار کو اس کے اٹل ارادوں سے روک نہیں سکتا تھا مگر میں نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ آگے بتانے لگا۔ "وہ کہتا تھا... یہ میرے اکیلے کی جنگ ہوگی وڈے چودھریوں کے ساتھ جو میں یہاں رہتے ہوئے نہیں لڑسکتا۔ اس کے لیے مجھے یہاں سے ہمیشہ کے لیے کوچ کرنا ہوگا۔ اپنا الگ ٹھکانا بنانا ہوگا۔ میں نے پھر اس کا ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دینے کی ہامی بھری تو اس نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر ایک دن وہ اچانک غائب ہوگیا۔ میں نے اسے بہت تلاش کیا اور اس کی تلاش میں جہاں جا سکتا تھا گیا بھی۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" اس کے چہرے اور لہجے سے اداسی مترشح ہونے لگی۔ کبیل دادا بڑے غور سے بختیار علی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا اپنا یہ خیال کچھ کچھ درست ثابت ہو رہا تھا کہ لئیق شاہ کے پُراسرار اور اچانک غیاب میں خود اس کا بھی ہاتھ ہے اور کوئی بعید نہیں کہ پھیما کا قتل بھی اس کے ذاتی انتقام کی ایک کڑی ہو جبکہ کبیل دادا اپنے اس خیال کا زہرہ بانو سے اظہار بھی کر چکا تھا لیکن زہرہ بانو نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا وہ لئیق شاہ کے "غیاب" کو اغوا سمجھے ہوئے تھی۔

"اور باؤ کبیل! ایک حقیقت اور بھی بتاتا چلوں۔" بختیار علی نے کچھ دیر کے توقف سے کہا پھر جانے کیا سوچ کر بولا۔ "پتا نہیں یہ حقیقت تمہیں بتانی بھی چاہیے یا نہیں... مگر بہت کم لوگ ہی یہ حقیقت جانتے ہیں ان میں، میں بھی شامل ہوں بلکہ یہ حقیقت خود لئیق شاہ نے ہی مجھے بتائی تھی۔"

"کون سی حقیقت؟ کیسی حقیقت؟ مجھے بتاؤ۔" کبیل دادا نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا مگر بختیار علی شدید تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔ جسے بھانپ کر کبیل دادا نے اسے اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"دیکھو بختیار علی! تم ایک سمجھ دار انسان ہو اور لئیق شاہ کے گہرے دوست بھی... تم یقیناً اب تک اس بات کا بھی اچھی طرح اندازہ لگا چکے ہو گے کہ ہم بھی لئیق شاہ کے دوست اور اس کے خیر خواہوں میں سے ہیں مگر یہاں کے لوگوں کو ہماری طرف سے کچھ غلط فہمیاں ہیں۔"

"آپ چھوٹی بی بی زہرہ بانو کے آدمی تو نہیں ہو؟" بختیار علی نے اچانک پوچھا تو کبیل دادا نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی، اس پر بختیار علی نے اسرار بھرے لہجے میں کہا۔ "میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا۔ زہرہ بانو کے بارے میں بھی وہ اکثر مجھ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ میں اس کی بہت سی اندر کی باتوں کا راز داں بھی ہوں اور بہت کچھ جانتا ہوں۔"

"تم لئیق شاہ سے متعلق کسی حقیقت کا ذکر کر رہے تھے؟" کبیل دادا نے اسے یاد دلایا تو وہ ایک گہری ہنکاری بھر کے بولا۔

"باؤ کبیل! میرا یار لئیق شاہ شروع سے ہی اکیلا آدمی تھا۔ بہت اکیلا اور تنہا۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ ذرا کھل کر بتاؤ۔" کبیل دادا نے الجھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک جھٹکے دار انکشاف کیا۔

"لئیق شاہ کے اندر ایک ازلی دکھ بھی پل رہا تھا۔ اسے ایک ... کی تلاش تھی۔"

"کیسا دکھ؟ کیسی تلاش؟"

"اپنے ماں باپ کی۔"

"کیا مطلب؟ وہ تو بدقسمتی سے آگ میں..."

"وہ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔" بختیار علی نے اس کی بات کاٹی تو کبیل دادا چونک پڑا۔

"مگر وہ انہیں اپنے ماں باپ کی طرح ہی سمجھتا تھا۔ شاید اس وقت وہ گیارہ، بارہ سال کا ہی تھا جب انہیں ملا تھا... پھر وہ انہی کا ہی ہو کے رہ گیا مگر پھر جیسے جیسے وہ جوان ہوتا گیا، اس کے اندر کی یہ کسک بھی بڑھتی جا رہی تھی کہ اس کے ماں باپ اب کہاں تھے؟ شاید اس کی تڑپ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اپنے ماں باپ کا چہرہ یاد تھا۔ ان کی محبت، ان کی شفقت اسے نہیں بھولی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی پھر انہیں اور بچے کی بھی خواہش تھی جو کئی برس گزر جانے کے باوجود پوری نہ ہوسکی تو وہ مزاروں پر منتیں مرادیں مانگنے بھی جایا کرتے تھے وہ بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی اللہ والے بزرگ نے انہیں نوید تو دی تھی کہ ان کے ہاں ایک اور بیٹا بھی ہوگا۔ اور یہ مراد کب بر آئی تھی، یہ معلوم نہ تھا۔ پھر انہی دنوں ایک حادثے میں وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا وہ بڑے لرزہ خیز حالات تھے جو صرف لئیق شاہ ہی جانتا ہے۔ تاہم وہ اپنے ماں باپ کو بھولا نہیں تھا، ہاں! میں نے لئیق شاہ کو اکثر بڑے فخر سے یہ کہتے ضرور سنا تھا کہ اس کا باپ... ایک بہادر سپاہی تھا۔ اس کی ڈیوٹی سرحد کی ایک چوکی پر ہوتی تھی، خود ان کا گاؤں بھی سرحدی علاقے میں تھا۔"

"ہوں... ٹھیک ہے۔" کبیل دادا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ظاہر ہے اسے لئیق شاہ کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تاہم بولا۔

"دیکھو بختیار علی! اب تو تمہیں ہماری نیک نیتی پر کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تم اپنا کوئی خیال ظاہر کر سکتے ہو کہ لئیق شاہ جب تمہارے سامنے وڈے چودھریوں سے تنہا جنگ لڑنے کے لیے اپنے عزائم کا اظہار کر چکا تھا اور پھر اچانک غائب بھی ہوگیا تھا تو وہ... کہاں اور کس کے پاس جا سکتا ہے؟ ضرور اس کے ذہن میں کوئی منصوبہ تو ہوگا؟ کسی

سے مدد لینے کا... تم آخر اس کے بچپن کے دوست تھے، کچھ نہ کچھ تو اندازہ تم نے بھی لگایا ہی ہوگا اب تک؟"

کبیل دادا کی بات پر بختیار علی کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا پھر بولا۔ "باؤ کبیل! اب آپ سے کیا چھپانا، میں خود پچھلے کئی دنوں سے خاموشی سے اس کی تلاش میں مصروف ہوں۔ دو تین جگہ جا بھی چکا ہوں۔ جہاں جہاں مجھے شبہ ہوا تھا اس کی موجودگی کا... مگر ناکامی ہوئی۔ اب ایک جگہ اور جانا تھا... مگر سوچتا ہی رہ گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جگہ بہت دور ہے لیکن امید بھی ہے کہ میرے یار کا کچھ نہ کچھ سراغ مل سکتا ہے۔"

"ہمارے پاس گاڑی ہے۔ چاہو تو ابھی نکل چلتے ہیں۔" کبیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً کہا۔ "ویسے وہ جگہ کون سی ہے؟ اور کہاں ہے؟"

بختیار علی جواباً بولا۔ "یہاں سے پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا بستی نما قصبہ آتا ہے، وہاں سے قطب پور جانے والا ایک کچا راستہ نکلتا ہے۔ قطب پور تو بہت دور ہے مگر اس راستے پر مزید پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر کمروڑ کے نام سے ایک نیم صحرائی علاقہ آتا ہے۔ وہاں لئیق شاہ کا ایک پرانا جاننے والا رہتا تھا، یا رہتی تھی۔"

"کیا مطلب؟ رہتا تھا؟ یا رہتی تھی؟" کبیل دادا نے قدرے الجھ کر درمیان میں پوچھا تو وہ ہولے سے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ہاں جی! کچھ ایسی ہی بات ہے۔ وہ شخصیت تھا اور تھی کے درمیان والی ہی ہے جی..."

"تمہارا مطلب ہے کھسرا...؟"

"ہاں جی۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی بختیار علی! لئیق شاہ جیسے آدمی کا بھلا کوئی اس قسم کا یار بھی ہوسکتا ہے؟" کبیل دادا نے کڑوا سا منہ بنا کے کہا تو وہ اس بار گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ایسی بات نہ کریں جی، آپ نے ابھی لئیق شاہ کے ماضی کی داستان نہیں سنی ہے جو بہت دردناک اور لرزہ خیز ہے۔ بجلی نام کا تو خواجہ سرا ہے... مگر میرا یار اُسے مردوں کا مرد کہتا ہے۔"

"ابھی چل سکتے ہو ہمارے ساتھ وہاں؟"

"میں تیار ہوں جی، چلو۔"

"چلو پھر... زیادہ دیر مناسب نہیں، اندھیرا پڑنے سے پہلے ہمیں لوٹنا بھی ہوگا۔"

"بس جی، آپ باہر گاڑی میں بیٹھو، میں ابھی باہر آتا ہوں۔" بختیار علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ کبیل دادا باہر آگیا۔ باہر کار میں طیفہ اور جہانگیر اس کے منتظر تھے، کبیل دادا نے انہیں ساری بات بتا دی۔

بیگم ولا سے روانہ ہوتے وقت زہرہ بانو نے کبیل دادا کو یہ ہدایت بھی کر رکھی تھی جس قدر ممکن ہوسکے، لئیق شاہ کی تلاش سے متعلق مہم سے اسے بھی آگاہ کیا جاتا رہے۔ لہٰذا کبیل دادا نے طیفے کو ساری بات سمجھا کے نئے پنڈ سے شہر (ملتان) روانہ ہونے کی ہدایت بھی کردی۔ تھوڑی دیر میں جب بختیار علی گھر سے نکلا اور یہ لوگ کار میں روانہ ہوگئے تو طیفے کو لاری اڈے پر اتار دیا گیا۔ اس کے بعد یہ لوگ مذکورہ قصبے کی طرف روانہ ہوگئے۔ کار اب کبیل دادا کے بجائے... جہانگیر چلا رہا تھا۔ کبیل دادا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا اور بختیار علی عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ باتوں کے دوران کبیل دادا نے اس سے تازہ صورت حالات کے بارے میں بھی تبادلہ خیال کیا تھا، کبیل کی طرح بختیار علی کا بھی یہی خیال تھا کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لئیق شاہ نے سب سے پہلے جھیما کا ہی شکار کیا ہوگا کیونکہ اس کے گھر کو آگ اس نے ہی ممتاز خان کے ایما پر لگائی تھی، اور مزید یہ کہ وہ اس کا خاص آدمی بھی تھا۔ اس سے بختیار علی کے اس خیال کو بھی تقویت ملی تھی کہ یہ "فریضہ" انجام دینے کے بعد لئیق شاہ پولیس وغیرہ سے بچنے کے لیے بجلی کے پاس پناہ لیے ہوئے ہوگا اور کچھ عرصے بعد وہ... ممتاز خان پر بھی ہاتھ ڈالنے کے لیے کمربستہ ہوسکتا تھا۔

گھنٹے بھر کی نان اسٹاپ اور تیز رفتار ڈرائیونگ سے یہ لوگ بجلی والے قصبے جا پہنچے۔ بجلی کا تعلق کسی اور شہر سے تھا۔ وہ بہاولپور سے یہاں آیا تھا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ شادیوں اور تقریبات میں وہ ڈانس کرتا اور طبلہ بجایا کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص اسٹائل میں ان سے ملا اور ہر بات پر تالی پیٹ پیٹ کر اس نے کم از کم کبیل دادا کا دماغ ضرور پگھلا کر رکھ دیا۔ بہ الفاظ دیگر دماغ کی دہی بنا ڈالی۔ ابتدا میں کبیل دادا کو یہاں آنا بے سود ہی معلوم ہوا کیونکہ لئیق شاہ کا یہاں بھی کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا تاہم ایک خاص بات بجلی کے توسط سے انہیں ضرور معلوم ہوئی تھی جو خاصی حوصلہ افزا تھی۔ اس نے بتایا تھا۔

"لئیق شاہ تو اپنا بچہ ہے۔ ایک وقت اس نے ہمارے ساتھ گزارا ہے۔ وہ یہاں آیا تھا... دنیا سے... اپنے لوگوں سے وہ بے چارہ غریب بڑا مایوس نظر آتا تھا۔ میرے گلے لگ کے روتا رہا۔ یہی کہتا تھا... بجلی آپا! میں اپنے

دشمنوں کو اب زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو اکیلا اور ایک غریب مزدور آدمی... وڈے چودھریوں سے کیسے مقابلہ کرے گا؟ تو وہ بولا تھا کہ مجھے اب اپنی جان کی پروا نہیں۔"

"کیا وہ تمہارے پاس اس سلسلے میں کوئی مدد لینے آیا تھا؟" کہیل دادا نے بجلی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"مدد کیسی جی...؟ وہ اس سلسلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ بڑا جی دار آدمی تھا وہ... میرے پاس تو وہ ایک ہی مقصد کے لیے آتا تھا۔" بجلی نے حسب عادت ایک عدد تالی بجا کے کہا تو کہیل دادا الجھ سا گیا، بولا۔

"وہ پھر تمہارے پاس کس قسم کی مدد کے لیے آتا تھا؟"

"اپنے ماں پی (ماں باپ) کی تلاش .... اس نے میرے سپرد یہ کام کر رکھا تھا۔ خود بھی کوشش کرتا رہتا تھا مگر میں تو اس کے ماضی سے واقف ہوں نا، جلے پاؤں کی بلی ہوں میں... گھر گھر جاتی ہوں... گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہوں۔"

"اپنے انتقام کے سلسلے میں اس نے تم سے کوئی مدد نہیں لی؟ پھر وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا؟ اور اب ہمیں وہ کہاں مل سکتا ہے؟" اس بار بختیار علی نے بجلی سے سوال کیا۔ وہ بولا۔

"چھیما کے قتل سے کچھ روز پہلے ہی وہ میرے پاس آیا تھا یہی سب کہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی تھا، بدمعاش چاہیے تو مجھے بتائے... مگر وہ نہ مانا لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی... وہ اب گیا کدھر ہے؟ چھیما کو ہلاک کرنے سے زیادہ وہ چودھری ممتاز خان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا چھیما کے ہتھے... یا چھیما اس کے ہتھے کیسے چڑھ گیا؟"

"تم سے آخری ملاقات کے بعد اس نے تمہیں بتایا تو ہوگا کہ وہ اب کہاں کا ارادہ رکھتا ہے؟" کہیل دادا نے بے چینی سے پوچھا۔

"بتایا تو تھا... مجھے۔"

"پھر...؟"

"یہی کہ... وہ نئے پنڈ میں چودھری ممتاز خان سے انتقام لے گا مگر پہلے کچھ دن غائب ہو کے یہ تاثر دینے کی کوشش کرے گا کہ وہ... بددل ہو کے نئے پنڈ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکا ہے۔"

"تت... تمہارا مطلب ہے کہ لئیق شاہ کہیں نہیں گیا؟ اور... اور... وہ نئے پنڈ میں ہی کہیں چھپا بیٹھا ہے؟" کہیل دادا کی رگوں میں یکلخت خون کی گردش تیز ہو گئی۔ جواباً بجلی نے پورے یقین کے ساتھ اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ کہیل کچھ سوچنے کے انداز میں بولا۔

"ایک بات اور سمجھ میں نہیں آئی بجلی... چھیما کیسے ہلاک ہوا؟"

"چٹاخ۔" کی زوردار آواز سے بجلی نے بتالی بجائی اور خالص زنانہ انداز میں بولا۔ "اے ہے بوا! تم تو ایسے مجھ سے ہر بات یقینی طور پر پوچھے جا رہے ہو جیسے میں کوئی نجومی ہوں۔" وہ مسکرایا۔ کہیل دادا پہلے تو کچھ گڑبڑا گیا پھر اس کی بات کا مطلب سمجھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ لئیق شاہ غائب ہونے سے پہلے تمہارے پاس آیا تھا اور اپنے عزائم کا اظہار کیا تھا۔ اس کی آخری ملاقات تم سے ہوئی تھی۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے مگر اس کے یہاں آنے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔" بجلی بولا۔

"وہ کیا؟" کہیل دادا نے اس کی طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

"یہ چھیما کا آبائی گاؤں ہے۔"

"او... اچھا۔"

"تو پھر اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سب سے پہلے چھیما پر ہی ہاتھ ڈالنے آیا تھا اور اب اس نے دوبارہ نئے پنڈ کا رخ کیا ہوگا۔"

"یقیناً۔"

"تمہارا شکریہ بجلی۔ اب ہم چلیں گے۔" کہیل دادا نے رخصت ہونے کی غرض سے کہا اور جیب سے چند بڑے نوٹ نکال لیے اور بجلی کی طرف بڑھائے تو وہ تڑخ سے بولا۔

"جی کرتا ہے ایک تالی تیرے گال پر بھی بجا دوں۔ لئیق شاہ میرا بچہ ہے۔ میری انگلی پکڑ کے چلا ہے۔ کوئی اپنے بچے کے ٹکے گھرے کرتا ہے کیا؟"

کہیل دادا کو شرمندگی کا احساس ہوا، ایسے ہی وقت بختیار علی نے اسے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ پھر رخصت ہونے کی غرض سے بجلی سے بولا۔

"ہم جانتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے... چل ناراض نہ ہو، تیری بڑی مہربانی، اب چلتے ہیں۔"

واپس لوٹتے وقت انہیں شام کے سرمئی اندھیاروں نے آلیا۔ "یار! یہ بجلی تو اتنی عمر کا نہیں لگتا تھا پھر کیسے کہہ رہا تھا

کہ اس نے لئیق شاہ کو انگلی پکڑ کے چلایا ہے؟ کیا لئیق شاہ ان کے قبیلے سے تو تعلق نہیں رکھتا؟" کافی دیر سے کمیل دادا کے دل و دماغ میں یہ پھوڑی پک رہی تھی، ایک بار پھر رقابت کا جذبہ شر بن کے اسے اکسانے لگا کہ جب بیگم صاحبہ کو یہ پتا چلے گا کہ لئیق شاہ کے بچپن یا لڑکپن کا ایک حصہ خواجہ سراؤں میں گزرا ہے تو وہ لئیق شاہ کے بارے میں کیا سوچے گی؟

"او... نہیں باؤ کمیل! پگلی ہم سے بھی دگنی عمر کا ہے۔ جسم کا دبلا پتلا اور عمر کا چور ہے۔ اس لیے ایسا نظر آتا ہے۔" مختیار نے کہا۔ کمیل اس سے مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

وہ نئے پنڈ کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ کار جہانگیر ہی چلا رہا تھا۔ مختیار عقبی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کمیل دادا کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ تازہ ترین شواہد یہی بتا رہے تھے کہ لئیق شاہ نئے پنڈ میں ہی کہیں موجود ہے۔ شاید ممتاز خان کی گھات میں... مگر کہاں؟ اور کس جگہ؟ یہ ڈھونڈنا باقی تھا۔ اس بار لئیق شاہ کی تلاش کسی مفروضے پر نہیں تھی۔ مگر نئے پنڈ میں بھی اس کے ٹھوس شواہد نہیں تھے، امکان اغلب تھا کہ وہ وہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن کمیل دادا کی سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر حمیدا واقعی لئیق شاہ کے ہاتھوں مارا گیا تھا تو یقیناً متعلقہ تھانے کی پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپے بھی مارے ہوں گے پھر لئیق شاہ کا نئے پنڈ میں چھپے رہنے کا کیا جواز بن سکتا تھا؟ ایک اور خیال بھی اس کے ذہن میں لمحے بھر کو آیا تھا کیا خبر... لئیق شاہ سرے سے کہیں روپوش ہی نہ ہو؟ ممکن ہے وہ چودھری ممتاز خان یا اس کے کارندوں کی قید میں ہو؟ اس وقت سب کچھ ممکن تھا۔

اچانک شام کے جھکے جھکے سرمئی اندھیاروں میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ پھر دوسرا اور تیسرا... پہلے دھماکے میں کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے جہانگیر کی چیخ ابھری تھی۔ اس کا ہاتھ بہکا تو گولی چلنے کے دوسرے دھماکے میں کار کا ٹائر برسٹ ہوا تھا۔ کمیل دادا اور مختیار علی یک دم نیچے جھک گئے۔ تیسری گولی کار کی باڈی میں لگی تھی۔ کمیل دادا کا دل یکلخت سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ کار ڈولنے لگی تھی اور کھیتوں میں اتر کر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی کسی جھنڈ دار درخت سے ٹکرائی۔ کمیل دادا نے جہانگیر کا جائزہ لیا۔ وہ سیٹ پر آڑھا ترچھا لڑھک کر بے سدھ ہو گیا تھا۔ اس کی گردن سے خون کی لکیر سی بہہ رہی تھی۔ گولی اس کی گردن کو چھید گئی تھی شاید... وہ کراہ رہا تھا۔ کمیل نے مختیار علی کو جہانگیر کی خبر لینے کی ہدایت کی اور خود اپنا پستول سنبھالا اور تیزی سے دروازہ کھول کر کھیتوں میں رینگ گیا۔ اس وقت ان پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکی... دونوں روشنی میں نہا گئے۔ مختیار علی سے زیادہ کمیل دادا نے بروقت اور بلاخیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے پستول سے پہلے تو گاڑی کی ہیڈ لائٹس پر تلے اوپر فائر جھونک دیے اور اپنے پستول کی شعلے اگلتی نال کا رخ تھوڑا اوپر کیا تو ایک زوردار چھناکے سے اسے نامعلوم حملہ آوروں کی گاڑی کی ونڈ اسکرین کا شیشہ دھماکے سے چٹختا سنائی دیا۔ اس میں ایک انسانی کربیہ انگیز چیخ بھی شامل تھی۔ کمیل دادا تیزی سے کھیت کی ایک نسبتاً اونچی منڈیر کی آڑ لیتا ہوا رینگ گیا۔ نامعلوم مگر متوقع حملہ آوروں کی گاڑی کی "آنکھیں" پھوڑنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک دشمن نے بے وقوفی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے کوئی بڑی سی چارجر لائٹ کی روشنی پھینکی۔ کمیل دادا نے فوراً ایک متوقع خدشے کے پیش نظر لڑھکنی لگائی، ٹھیک اسی جگہ پر دو تین فائر ہوئے۔ اس کے بعد کمیل دادا کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو شعلے لپکے... دشمن کی چیخ ابھری، لائٹ گر پڑی... وہ بجھی نہیں تھی۔ اس کا رخ بدل گیا اور اس رخ پر کمیل دادا نے دو مسلح افراد کو روشنی میں متحرک دیکھا جو اُن کی کار کی طرف لپک رہے تھے۔ کمیل دادا نے لیٹے لیٹے ان پر فائر جھونک مارے، دونوں پٹ سے گرے۔ مگر ایک لنگڑاتا ہوا تاریکی میں دوڑا۔ یک دم سناٹا طاری ہوتے ہی کمیل دادا سمجھ گیا کہ یہ تماشائے خوں رنگ جس طرح اچانک اور تیزی کے ساتھ شروع ہوا تھا اسی طرح اب اس کا ڈراپ سین ہو چکا تھا۔ لہٰذا وہ اٹھ کر لنگڑاتے ہوئے سائے کے تعاقب میں دوڑا۔ جوش کے مارے اس کا رُواں رُواں اس وقت متحرک تھا۔ اس نے تھوڑی دیر میں اس جالیا۔ نیچے گرتے ہی کمیل دادا نے اس پر قابو پالیا تھا۔

☆☆☆

سرمئی شام کے دھڑکتے ہوئے اندھیارے اب رات کے چیختے ہوئے سناٹوں میں بدلنے لگے تھے۔ بچنے والے آخری حملہ آور کو قابو کیا جا چکا تھا۔ مختیار علی نے کمیل کی ہدایت پر فوری عمل کرتے ہوئے زخمی جہانگیر کی خبر لی تھی، گولی جہانگیر کی گردن میں ہی لگی تھی مگر خوش قسمتی سے شہ رگ کو نقصان پہنچائے بغیر "پھاؤ" ہو گئی تھی۔ (گردن چھید کر پار ہو گئی تھی) مختیار علی نے خون روکنے کے لیے رومال باندھ دیا تھا۔ اگرچہ کار کی ڈگی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ جہانگیر ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ کمیل دادا کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

چہرے پر فکر و تشویش کے آثار طاری تھے، اپنے ساتھی کو بھی بچانا تھا اور ہاتھ آئے دشمن کی بھی خبر لینا تھی مگر اس کی مشکل مختیار نے یہ کہہ کر حل کر دی۔

"باؤ کمیل! کار میں فاضل ٹائر تو ہوگا۔ تم جلدی سے ٹائر بدلو۔ میرا چاچا حکیم ہے۔ گھر میں ہی اس کا مطب ہے جہانگیر کی اس سے مرہم پٹی کروا لیتے ہیں۔ وہ اس کی دوا دارو بھی کر دے گا۔" کمیل دادا نے ہونٹ بھینچ کر سوچنے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی پھر تیزی کے ساتھ اس نے کار کا ٹائر بدلا اور اس دوران ایک اور فوری لائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ یہ لوگ روانہ ہو گئے، دشمن کی مشکیں ہنوز کسی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی ان کے لیے غیر شناسا تھا مگر توقع قوی تھی اس بات کی کہ وہ کس کا آدمی ہو سکتا تھا؟ مطلب میں مختیار علی اور جہانگیر کو چھوڑ کر کمیل دادا اپنے گھر آ گیا، دشمن کو کھینچ کر کار سے اتارا اور تالا کھول کے اندر کوٹھری میں لایا پھر پستول نکال کر اس کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے غرایا۔

"مجھے تم سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کس کے آدمی ہو، تم اپنے ساتھیوں کا بھی میرے ہاتھوں حشر دیکھ چکے ہو۔ تمہارا بھی وہی حشر کروں گا، مجھے صرف تمہارے منہ سے سچ سننا ہے۔ بولو، یہ چھیما کے قتل اور لئیق شاہ کا کیا معاملہ ہے؟ وہ کدھر ہے اس وقت؟"

دشمن کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں آزاد کر دی گئی تھیں۔ اسے ایک مونڈھے پر بٹھا رکھا تھا۔ اس کی عمر تیس اکتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم دبلا پتلا قد کا لمبا تھا بلکہ کمیل دادا کا ہم قد تھا۔

"مجھے نہیں پتا تم کیا بول رہے ہو؟ پپ... پانی پلا دو مجھے ایک گلاس۔" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کمیل دادا کا پستول والا ہاتھ یک دم حرکت میں آیا۔ دشمن کے حلق سے اذیت ناک کراہ خارج ہو گئی۔ پستول کے کندے نے اس کے دائیں گال کا جبڑا ادھیڑ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے کمیل دادا خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں۔ لئیق شاہ کو تو ہم ڈھونڈ ہی لیں گے، پر تجھے میں اذیت ناک موت سے ضرور دوچار کر دوں گا، میرے سوال کا جواب دو۔"

کمیل دادا کی درندگی کی ایک جھلک وہ کچھ دیر پہلے اپنے دو تین ساتھیوں کی موت کی صورت دیکھ چکا تھا، اس وقت بھی اسے کمیل دادا کی وحشت لہو رنگ آنکھوں اور چہرے سے سفاکی جھلکتی صاف نظر آ رہی تھی کہ اس پر بری طرح خون سوار تھا۔ خون تھوکتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا تو اس کا لب و لہجہ ابھی تک کسی خوف یا دباؤ سے عاری ہی محسوس ہوتا تھا۔

"زندہ تم بھی نہیں بچو گے... اگر ہمیں پہچان ہی گئے ہو تو یہ بھی سن لو اچھی طرح کان کھول کر چودھری صاحب کے آدمی ادھر بھی کسی وقت پہنچ جائیں گے۔ ہمیں بہت پہلے سے تمہاری یہاں نئے پنڈ میں آمد کا علم ہو چکا تھا اور ہم ادھر ہی ہلا بولنے آئے تھے مگر تم لوگوں کی قسمت اچھی تھی... جو ہمیں نہیں ملے۔" اس کی ڈھٹائی آمیز گفتگو پر ایک بار پھر کمیل دادا کا دماغ الٹنے لگا۔ مگر اندر سے اسے تھوڑی تشویش بھی ہوئی کہ کم از کم یہ بات جھوٹ بول رہا تھا۔ کمیل دادا نے اپنے پستول کی نال اس کی پیشانی سے چپکا دی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میں بھی تم سے کچھ پوچھنے کے لیے اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہ کہہ کر کمیل دادا نے انگوٹھے سے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور لبلبی پر انگلی رکھ دی۔

"ٹھہ... ٹھہرو... خ... خدا کے لیے مجھے مت مارو... مم... میں تو حکم کا غلام ہوں جی..." اچانک وہ گھگیا کر بولا۔ کمیل دادا کا نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا تھا۔ تاہم پھر بھی وہ اسے سفاک نظروں سے گھورتے ہوئے پُر قطعیت سنگ دلی سے بولا۔

"تم جیسے بھاڑے کے ٹٹو میرے لیے ذرا سی بھی اہمیت نہیں رکھتے جن پر میں اپنا وقت برباد کروں... کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ تم سچ نہیں بولو گے، تمہارے ساتھیوں کی طرح یقینی موت تمہارا بھی مقدر بن چکی ہے اب..."

گرانڈیل کمیل دادا یوں تو مردانہ وجاہت کا حامل تھا مگر اس کی وجاہت میں ایک کرختگی تھی۔ چہرہ بھی کسی چھٹے ہوئے خونخوار بدمعاش سے کم نظر نہیں آتا تھا۔ حالانکہ عمر کا نوجوان ہی تھا۔ مگر چند سال بڑا ہی نظر آتا تھا۔ اچھی خاصی دھاک دشمن پر پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ یہ کہتے ہی کمیل دادا نے لبلبی دبا دی۔

"ٹرچ" کی آواز کوٹھری نما کمرے میں ابھری تھی اور دشمن کے منہ سے گھٹی گھٹی کراہ خارج ہو گئی۔

"اوہو... شاید مقابلے میں میرا پستول خالی ہو گیا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔" کمیل دادا نے ایکٹنگ کی اور جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی ہتھیلی میں چار گولیاں تھیں۔

"تیرے لیے تو ایک ہی گولی کافی ہوگی۔" کہتے ہوئے کھیل دادا نے چاروں گولیاں پستول میں بھر دیں اور دوبارہ اس کی نال دشمن کی پیشانی سے لگا دی۔

"نن... نہیں... خدا کے لیے نہیں... رب دا واسطہ... مجھے نہ مارو، میں... میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ رب دی سوں۔۔ ایک ایک لفظ سچ بولوں گا۔" وہ خوف زدہ ہو کے بولا۔ کھیل دادا کا یہ دوسرا ڈراما بھی کامیاب گیا تھا۔ یہ بات اسے بھی معلوم تھی کہ پستول خالی تھا۔ بہرحال پستول کی نال اس کی پیشانی سے ہٹائے بغیر درشتی سے بولا۔

"چل پھر بولتا جا... میرے پاس اب اپنا سوال دہرانے کا بھی وقت نہیں ہے مگر یاد رکھنا... مجھے جیسے ہی تیرا کوئی بھی لفظ جھوٹ اور دھوکا لگا، میں ٹریگر دبا دوں گا۔ تو نہیں جانتا کہ میں نئے پنڈ آ کر بہت سی باتوں سے آگاہ ہو چکا ہوں۔"

"ٹھٹ... ٹھیک ہے... پپ... پر... یہ پستول..."

"بکواس نہیں، شروع ہو جا۔" کھیل دادا نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا اور پھر وہ فر فر بولنے لگا۔

"چودھری ممتاز کے کہنے پر وسیم عرف چھیما اپنے ساتھیوں کی مدد سے گن پوائنٹ پر لئیق شاہ کو یرغمال بنا کے ڈیرے پر لے گیا تھا۔ چودھری صاحب بھی وہاں پہنچنے والے تھے۔ اس دوران لئیق شاہ اور چھیما کی آپس میں تلخ باتیں بھی ہوتی رہیں اور چھیما نے غرور میں آ کر لئیق شاہ کو یہ حقیقت بھی بتا ڈالی کہ اس کے گھر کو آگ بھی انہی لوگوں نے لگائی تھی۔ چودھری ممتاز کے کہنے پر... لئیق شاہ اندر سے زخمی تھا شاید اسے یہی بات چھیما کے منہ سے سننے کی دیر تھی کہ ایک موقع پر جب باہر چودھری ممتاز کی گاڑی کی آواز ابھری اور ہمارے کچھ ساتھی ان کے استقبال کے لیے باہر کو لپکے تو لئیق شاہ نے چھیما پر حملہ کر دیا۔ اور اس کا پستول چھین کر اسے گولی مار دی۔ ایک دو ساتھی ہمارے بھی وہاں موجود تھے جن میں، میں بھی شامل تھا۔ ہمیں اس پر قابو پانے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر وہ خود بھی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ فرار ہو گیا لیکن درحقیقت وہ وہاں سے فرار نہیں ہوا تھا، وہیں ڈیرے پر کہیں گھات لگائے بیٹھ گیا تھا۔ وہ چودھری ممتاز کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت شاید کچھ زیادہ ہی جوش میں آیا ہوا تھا۔ اسی جوش میں اس نے وہیں چودھری ممتاز پر بھی حملہ کر دیا۔ جو ناکام ثابت ہوا، اس نے راہِ فرار اختیار کی، ہمارے آدمیوں نے اس کا پیچھا کیا اور بالآخر اسے پکڑ لیا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا، کھیل دادا کا دل کسی ہولناک خیال سے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اپنی اس اچانک اندر ابھرنے والی کیفیت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"پھ... پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ لئیق شاہ کا چودھری ممتاز نے کیا کیا؟ کیا اسے مار ڈالا؟"

"نہیں۔" دشمن نے نفی میں جواب دیا اور کھیل دادا کے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہوگئی۔ بے شک لئیق شاہ اس کا رقیب تھا مگر وہ اس کے زندہ بچ جانے پر مطمئن بھی تھا شاید اس لیے کہ اس نے خود... زہرہ بانو سے وعدہ کیا تھا، بیگم ولا سے روانہ ہوتے وقت کہ وہ لئیق شاہ کو زندہ ان کے سامنے ڈھونڈ کر لائے گا۔

"تو پھر اب لئیق شاہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" کھیل دادا نے اگلا سوال کیا تو وہ ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر پانی مانگنے لگا مگر کھیل دادا نے نہایت درشتی سے انکار کر دیا اور پہلے اسے جواب دینے پر اکسایا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

"کک... کیا اس کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے نا... وعدہ کرو...؟"

"ہاں، لیکن پہلے میں تمہارے اس آخری جواب کی سچائی کا تعین کروں گا۔ اس کے بعد... لہٰذا اب آخر میں مجھ سے جھوٹ بولنے کی یا چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔"

"وعدہ کرتے ہو؟"

"وعدہ نہیں کر سکتا۔" کھیل دادا نے مسکت جواب دیا۔ تب وہ قدرے طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے تم سچے آدمی ہو اور سچ سننے کے بعد مجھے ہلاک نہیں کرو گے، ورنہ جھوٹا وعدہ کر کے مجھ سے سچ سننے کی کوشش کرتے۔"

"وقت ختم ہو گیا، جلدی بولو۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے یہ کام کرنا ہے، لئیق شاہ کی آزادی۔" کھیل دادا مرعوب ہوئے بغیر بولا۔

"لئیق شاہ اس وقت چودھری ممتاز خان کی قید میں ہی ہے اور اطمینان رکھو وہ کم از کم ابھی اسے ہلاک کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ اسے یرغمال بنا کر اپنی سوتیلی بہن زہرہ بانو کی کمزوری بنانا چاہتا ہے۔ اس سے جائداد کے اسٹیمپ پیپر سائن کروانا چاہتا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

"اس بات کا تو مجھے بھی شبہ ہے لیکن اس نے پولیس کا ڈراما کیوں رچایا ہے، لئیق شاہ کو مفرور مجرم ثابت کر کے؟"

"سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ زہرہ بانو سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد... وہ لئیق شاہ کو حمیما کے قتل کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دے گا۔" اس نے بتایا اور کمیل دادا چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے رہا پھر بولا۔

"ممتاز خان نے لئیق شاہ کو کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"وراثت علی اور رئیس خان کے پاس۔" اس نے بتایا۔

یہ نام سن کر کمیل دادا قدرے چونکا تھا۔ وہ کبھی ان دو اشخاص سے ملا نہیں تھا مگر چودھری ممتاز خان کے ان دونوں ماموؤں کے نام سن رکھے تھے جو ممتاز خان کی ماں اور چودھری الف خان کی پہلی بیوی مہرالنسا کے بھائی تھے، کمیل دادا کا باپ منشی فضل محمد ان کا پرانا خدمت گار تھا اور اس حوالے سے کمیل بھی کبھی کبھار باپ کے ایما پر ان کے کھیتوں وغیرہ میں کام کر لیا کرتا تھا۔ کئی بار اس نے چودھری الف خان کی زمینوں پر ٹریکٹر بھی چلایا تھا۔ تاہم اسے بھی وراثت علی اور رئیس خان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بھویں سکیڑ کر اس سے بولا۔

"تم کہیں ممتاز خان کے ماماؤں کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟"

"ہاں، وہی ہیں یہ دونوں... وڈی زمیندارنی (چودھرائن) کے دونوں بھائی۔" وہ اثبات میں سر ہلا کے بولا تو کمیل نے پوچھا۔

"کدھر رہتے ہیں دونوں؟ اور انہوں نے لئیق شاہ کو کہاں رکھا ہوا ہے؟ مگر ممتاز خان نے لئیق شاہ کو ان کے حوالے کیوں کیا؟"

"چودھری ممتاز خان کو زہرہ بانو سے خطرہ تھا کہ وہ یا ان کے آدمی لئیق شاہ کو ان کے چنگل سے چھڑا نہ لیں۔ کیونکہ اب تک وہ اس کے تقریباً تمام ٹھکانوں سے واقف تھے۔ پھر چودھری ممتاز نے پولیس کا بھی ڈراما رچانا تھا۔ اس لیے یہ سب کچھ اسی احتیاط کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔"

"مجھے ان دونوں کا ٹھکانا بتاؤ، میں اسی وقت وہاں جا کر تمہاری بات کی تصدیق کروں گا۔" کمیل دادا بولا۔ "مگر میرا ایک آدمی یہاں موجود رہے گا۔ اس لیے جھوٹ بولنے کا سوچنا بھی مت... نہ ہی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرنا، سمجھے تم؟"

"سب کچھ تو بتا دیا ہے تم کو... بھلا اب کیا چھپاؤں گا مگر اب سوچتا ہوں تم سے بچ گیا تو چودھری ممتاز مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔" وہ مایوس اور شکست خوردہ ہونے لگا تھا۔ کمیل دادا اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"اسے بھلا کیسے پتا چلے گا کہ یہ حقیقت تم نے آشکارا کی ہے؟"

"وہ بڈھی روح ہے جی... بڑا شیطانی ذہن کا مالک ہے چودھری ممتاز خان... اسے یہ پتا چل ہی جائے گا کہ ہمارا تم سے ٹاکرا ہوا، کیونکہ اسی نے تو ہمیں نئے پنڈ کی حدود میں مقرر کر رکھا تھا۔ جانتا تھا وہ کہ لئیق شاہ کے سلسلے میں زہرہ بانو کا کوئی نہ کوئی آدمی یہاں کا رخ کر سکتا ہے۔ ہم تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے، مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ ابھی واپسی میں ہمیں موقع ملا تو تم پر ناکام حملہ کر کے میں خود پھنس گیا۔" اس کی بات بھی صحیح تھی کمیل بولا۔

"اگر ایسی بات ہے تو پھر تم زہرہ بانو کی وفاداری کا کیوں نہیں دم بھر لیتے... آخر کو وہ بھی وڈے چودھری الف خان کی دھی ہے۔"

"ہمیں سب پتا ہے جی... زہرہ بانو کی حقیقت... مگر ان کی نگاہوں میں ایک ایسے آدمی کی بھلا کیا حیثیت ہو گی جو ایک سے غداری کر کے دوسرے سے وفاداری کا دم بھرے... غداری تو میں بھی نہیں کر رہا... پر مجبور ہوں... مرنے سے بھی نہیں ڈرتا... مگر مجھے اپنے بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آتا ہے۔ میرے بعد ان کا کیا ہو گا؟"

"بات تمہاری بھی ٹھیک ہے، پر میں تم سے سچ بتانے کے صلے میں ایک وعدہ ضرور کرتا ہوں... تمہیں ممتاز خان یا اس کے آدمیوں سے ہمیشہ کے لیے بچانے کا ایک طریقہ تمہیں ضرور بتا دوں گا۔ مگر تمہیں ایک بات بتا دوں کہ چودھری ممتاز خان جیسے بدطینت، بے رحم اور خونی آدمی کے مقابلے میں زہرہ بی بی یعنی بیگم صاحبہ بالکل مختلف انسان ہیں۔ وہ ایک نیک شریف اور ہمدرد خاتون ہیں۔ اپنے دل میں خوفِ خدا رکھتی ہیں۔ ان کی اور ان کی مرحومہ ماں ستارہ بیگم کی تو پورا پنڈ تعریفیں کرتا تھا۔"

"ہاں جی، آپ ٹھیک کہتے ہو، پر میرے لیے کیا سوچا ہے؟"

"مجھے رئیس خان اور وراثت علی کے بارے میں بتاؤ؟ انہوں نے لئیق شاہ کو کہاں یرغمال بنا کے رکھا ہے؟" کمیل دادا نے پوچھا مگر جب اسے بار بار اپنے خشک ہونٹوں پہ

زبان پھیرتے دیکھا تو بالآخر اسے بھی ترس آ گیا۔ ''ٹھہرو، میں تمہیں پانی پلاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے پستول اُڑسا اور باہر صحن میں آ گیا۔ ایک بدہیئت سی گھڑونچی پر مٹکا دھرا تھا، جست کے گلاس میں پانی انڈیلا اور دوبارہ اندر کوٹھری میں آ گیا۔ اسے پانی پلایا۔ اس نے ایک اور گلاس مانگا۔ کمیل دادا نے دوسرا گلاس بھی اسے پلا دیا۔ پھر خالی گلاس ایک طرف کھری چارپائی پر پھینکنے کے انداز میں رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ پانی سے حلق تر ہوا تو وہ بولا۔

''وراثت علی اور رئیس خان نے لئیق شاہ کو اپنے اینٹوں کے بھٹے والے کچے ڈیرے میں رکھا ہوا ہے۔ وہاں چودھری ممتاز کے دو مسلح آدمی بظاہر چوکیداری کے بھیس میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔''

''ان کا بھٹا یا کچا ڈیرا کس طرف ہے؟'' کمیل دادا نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ جواباً بولا۔

''پرانی کھوہ والا جو راستہ قبرستان سے گزر کر چاچا جمالی کی زمینوں کی طرف جاتا ہے۔ وہیں ان کا بھٹا ہے۔''

کمیل دادا خود بھی اسی علاقے کا تھا۔ اپنے ذہن میں خیالی نقشہ بناتے ہوئے اس نے فوراً محتاط اندازہ لگا لیا کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اب وہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ جہانگیر زخمی تھا۔ مختیار علی اسے اپنے چاچا حکیم کے مطب میں لے کر گیا ہوا تھا۔ موجودہ حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ جو کچھ کرنا ہے، صبح کی روشنی پھیلنے سے پہلے کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے ممتاز خان کے آدمی کو وہیں چھوڑا اور خود راتوں رات کار میں مطلوبہ جگہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

رات دھیرے دھیرے درمیانی پہر میں داخل ہو رہی تھی۔ فضا خنک ہو رہی تھی۔ چہار سو سناٹے کا راج تھا۔ آوارہ جانور بھی دور کہیں دبک گئے تھے۔ کمیل دادا سب سے پہلے مذکورہ حکیم کے مطب پہنچا۔ حکیم صاحب نے جہانگیر کی گردن کی مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ کمیل دادا مختیار علی اور جہانگیر کو لے کر روانہ ہوا اور سیدھا مختیار علی کے گھر پہنچا۔ مختیار علی نے جہانگیر کی طرف سے کمیل کو مکمل تسلی دے دی تھی کہ وہ یہاں ہر طرح سے محفوظ ہے مگر وہ اس کے ساتھ جانا چاہتا تھا لیکن کمیل دادا نے بڑی مشکل سے مختیار علی کو وہیں رکنے پر رضامند کیا اور خود روانہ ہو گیا۔

اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچنے میں کمیل دادا کو زیادہ دیر نہیں لگی۔ اس وقت ایک عجیب سے جوش تلے اس کا رُواں رُواں متحرک تھا۔ وہ خود کو کامیابی کے بس لبِ بام ہی سمجھ رہا تھا۔ جیسے ہی اسے کچے ڈیرے کے بھٹے کا چبوترا سا بنا دکھائی دیا، وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے کار کی ہیڈ لائٹس بجھا دی تھیں۔ قدرے قریب پہنچ کر اس نے کار روک دی اور نیچے اتر آیا۔ ڈبے سے اس نے کچھ فاضل راؤنڈ نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیے پھر پستول سنبھالے آگے بڑھا۔

اینٹوں کا بھٹا کسی چھوٹے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ہلکا ہلکا دھواں اگل رہا تھا۔ اندر غالباً اینٹوں کا جہنم دہک رہا تھا۔ پاس ہی ایک چھوٹی سی پھونس کی مڑھی بنی ہوئی تھی۔ وہ شاید بھٹے کے چوکیدار وغیرہ کے رہنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

کمیل دادا وہاں سے ہٹ کر پرلی طرف آیا تو اسے کچے ڈیرے کی چاردیواری دکھائی دی۔ کمیل دادا نے ایک جگہ شکاری بلے کی طرح دبک کر اندازہ لگایا۔ دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی بمشکل چار پانچ فٹ ہو گی۔ اندر وسیع و عریض میدان نما احاطہ تھا۔ وہاں کچی پکی اینٹوں کے چبوتروں کے ڈھیر سے بنے نظر آ رہے تھے۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی بھی کونے میں دکھائی دی۔ کچھ تعمیراتی سامان بھی پھیلا ہوا تھا۔ کھولی نما کوٹھریاں بنی نظر آئیں۔ وہاں سناٹا تھا۔ فقط ایک بلب ..... پھاٹک کی پیشانی پر بغیر کسی ہولڈر کے تار کے سہارے جھول رہا تھا اور اس کے گرد مچھروں کا جھرمٹ رقصاں تھا۔

کمیل جھکے جھکے انداز میں دبے پاؤں دیوار کے قریب پہنچا اور دیوار کی آڑ لیے اسی طرح جھکے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور عقبی دیوار کی طرف نکل آیا۔ تھوڑا سرا ابھار کے اس نے اندر دیکھا۔ دو چارپائیاں پڑی دکھائی دیں جو خالی تھیں۔ ایسے ہی وقت دور کہیں کسی آوارہ گیدڑ کے السائے ہوئے انداز میں چلّانے کی آواز ابھری تو کمیل دادا ٹھٹک سا گیا۔ اسے کچھ اطمینان تو تھا کہ ممتاز خان کے یہاں دو عدد پہرے پر موجود آدمیوں کے سان و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ان کا راز فاش بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ضرور وہ دونوں اندر کہیں بے فکری میں خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ یہ بات بہرحال کمیل دادا کے حق میں جاتی تھی۔

اس طرف کہیں کہیں سے دیوار ٹوٹی ہوئی تھی۔ بیشتر جگہ تو کئی آدم گزار سوراخ بھی نظر آئے۔ ایسے ہی ایک سوراخ سے اکڑوں بیٹھ کر کمیل دادا اندر داخل ہو گیا۔ چند ثانیے اپنی جگہ دبکا گرد و پیش کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے بعد محتاط روی سے آگے بڑھنے لگا۔ اچانک ہی اسے کہیں قریب سے کسی شکاری کتے کی غراہٹ سنائی دی تو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اس کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ تب اسے اس بات کا سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ ہر جگہ آتشیں ہتھیار کام نہیں آیا کرتے، اسے اپنے ساتھ کوئی سنگین یا چاقو رکھنا چاہیے تھا۔ کُتّے پر کم از کم اس وقت گولی چلا کر شور ڈالنے کا وہ متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ابھی وہ اسی اُدھیڑبن میں تھا کہ دفعتاً ہی کُتّے کی غراہٹیں کسی ذبح ہوتے جانور کی خرخراتی آوازوں میں بدل گئیں اور پھر یکلخت جیسے ہر سو آسیبی سناٹا چھا گیا۔ اس کے دائیں طرف گارے مٹی اور کہیں کہیں پکی سرخ اینٹوں کی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جو بادی النظر میں گودام کا ہی نقشہ پیش کررہی تھیں۔ ایسی ہی ایک کوٹھری کی دیوار کی آڑ لیے وہ ذرا آگے کو سرکا اور تھوڑا سر آگے نکال کر دیکھنا چاہا تو معاً ہی اسے اپنے عقب میں ایک آہٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑا اس کے بالکل پیچھے... بلکہ عین سر پر ایک بوری نما چادر سی ڈالے ایک کبڑا آدمی جس کے ایک ہاتھ میں خون آلود درانتی تھی۔ رات کے اس پہر سناٹے جیسے ماحول میں اس کریہہ صورت زرد آنکھوں والے کبڑے آدمی کو خون آلود درانتی پکڑے اپنے پیچھے کھڑے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو کمیل دادا جیسے گرانڈیل آدمی کا لہو بھی خشک ہوگیا اور ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری دوڑ گئی۔

”شی...ی...ی...“ اس آدمی نے ایک انگلی اپنے سوکھے ہونٹوں پر رکھ دی پھر سرسراتی سرگوشی میں بولا۔

”تو چور ہے؟ پہ یہاں کیا چوری کرنے آیا ہے؟“ اس نے کہا۔ اسے کم از کم انسانوں کی طرح بولتے پا کر کمیل دادا کی جان میں جان آئی، تو اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

”نن... نہیں‘ میں چور نہیں ہوں... پر تو کون ہے؟“ کمیل دادا کو وہ خود کوئی چور معلوم ہورہا تھا۔ اس کریہہ صورت کبڑے آدمی کی ایلی زرد زرد آنکھوں میں عجیب سی چمک ابھری۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی خون آلود درانتی کو لہراتے ہوئے کہا۔ ”میں... میں اس کی پیاس بجھانے آیا ہوں... پر یہ خون اس کُتّے کا ہے جو مجھ پر حملہ آور ہونے والا تھا۔“ کمیل دادا اس عجیب اور ڈراؤنی صورتِ حال پر بری طرح ٹپٹایا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسے اس عجیب الخلقت آدمی پر اب چور کا ہی گمان ہورہا تھا مگر بہرحال اس نے اس کی ایک مشکل ضرور حل کردی تھی کہ اپنی تیز دھار درانتی سے ایک خونخوار کُتّے کا خاتمہ کردیا تھا۔

”تو چور نہیں ہے تو پھر یہاں کیا کرنے آیا ہے؟“ کبڑے نے سرگوشی میں پوچھا۔ اس کی زرد آنکھوں میں شک کے سائے ابھرے۔

”اگر یہاں چوری کے لیے کچھ نہیں پڑا تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟“ جواب دینے کے بجائے کمیل دادا نے الٹا سوال داغ دیا۔ وہ دل میں اب تہیہ کر بیٹھا تھا کہ اس بدہیئت کبڑے نے اس کا ”معاملہ“ خراب کرنے کی کوشش چاہی تو وہ اسے اِدھر ہی دبوچ کر ختم کر ڈالے گا۔ اس کی بات پر کبڑا اپنی زرد آنکھوں کو خاکستری حلقوں میں تیز تیز گردش دیتے ہوئے بولا۔

”میں... میں یہاں لالاں کو مارنے آیا ہوں۔“

”لالاں...؟ یہ کون ہے؟“ کمیل دادا نے الجھ کر پوچھا۔

”میری زن (بیوی) ہے۔“ اس نے عجیب سا انکشاف کیا۔

”لیکن... وہ یہاں... کیا کررہی ہے؟“

”وہ... اِدھر ان دونوں مسٹنڈے چوکیداروں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے آئی ہوئی ہے اور میں اسے رنگے ہاتھوں ان دونوں حرام زادوں سمیت ہلاک کرنے آیا ہوں تاکہ لوگ جان لیں کہ ایک بیمار آدمی میں بھی اپنی غیرت کے لٹیروں کو ہلاک کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔“ اس کی آواز میں ایسا ارتعاش سا پیدا ہونے لگا تھا۔ تاروں بھری روشنی میں جب کمیل دادا کو .... تھوڑی دیر اس کا جائزہ لینے کا موقع ملا تو اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ شخص بیمار بھی ہے۔ اس کا لمبوترا خاکستری چہرہ متورم سا نظر آرہا تھا۔ کمیل دادا کو یہ سارا قصہ سمجھنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی۔ یہ شخص اپنی بدکردار بیوی کو اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے والے دونوں آدمیوں سمیت موت کے گھاٹ اتارنے آیا تھا۔ کمیل دادا کے لیے عجیب و غریب صورتحال پیدا ہوگئی تھی۔ بالآخر اس نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، تم ان دونوں چوکیداروں کا ابھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ان کے پاس اسلحہ ہے مگر تم میرا ساتھ دو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔“ اس کی بات پر وہ ہولے سے کھانسا پھر بولا۔

”لگتا ہے تیرا بھی کچھ ان دونوں چوکیداروں کے ساتھ ایسا ہی کچھ معاملہ ہے... چل ٹھیک ہے تو ان دونوں کے خون سے اپنی پیاس بجھانا اور میں اس درانتی کی پیاس لالاں کے خون سے بجھاؤں گا۔“

کبڑے کی بات پر کمیل دادا کا حلق کڑوا سا ہونے

لگا مگر یہ وقت لمبی چوڑی تمہیدیں باندھنے کا نہیں تھا۔ ورنہ یہ کبڑا اس کا کام خراب بھی کر سکتا تھا۔ ابھی اس کبڑے کی کہانی سننے کے بعد اس بیمار پر ہاتھ اٹھانا یوں بھی کبیل دادا کا شیوہ نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ دونوں کس کوٹھری میں موجود ہیں؟“

”ہاں، آؤ میرے ساتھ۔“ کبڑا فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پلٹ گیا۔ کبیل دادا پستول لیے اس کے عقب میں چل دیا۔ وہ کبڑا اسے لیے دو کوٹھریوں کی درمیانی مختصر گلی نما جگہ سے گزارتا ہوا ایک ایسی کوٹھری کے قریب لے آیا جہاں باہر ایک بڑے سی گودڑی نما چارپائی بچھی ہوئی تھی اور دو مونڈھے دھرے تھے۔ چارپائی کے ساتھ دو رائفلیں ٹکی ہوئی تھیں۔

”لگتا ہے وہ کمینے... اندر ایک ساتھ دونوں سے...“ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر پایا۔ یک دم جوش میں بولا۔

”میں... میں... ان تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ آپے سے باہر ہونے لگا۔ کبیل دادا پریشان ہو گیا۔ اس کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ اس نے ذرا درشت سی سرگوشی میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

”او کبڑیا! تیری مت (عقل) ماری گئی ہے اپنے نال توں سینوں بھی مروائے گا۔ ذرا سنبھال اپنے کو...“

کبیل دادا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کبڑے نے معاملہ خراب کرنے کی کوشش چاہی تو وہ اسے ایک ہلکا ہاتھ دکھا دے گا مگر اسے عقل آ گئی۔ کبیل دادا نے سب سے پہلے دونوں رائفلوں پر قبضہ جمایا اور انہیں ناکارہ بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے کبڑے کے ہاتھ سے کچھ سوچ کر درانتی اچک لی۔ ٹھیک اسی وقت کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ دونوں یک دم اپنی جگہ دبک گئے۔ کبیل دادا نے دانستہ کبڑے کو اپنے پیچھے رکھا تھا کہ کہیں وہ اپنی ”لالاں“ کو ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر برافروختہ نہ ہو جائے اور بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔

بلب کی پیلی پیلی روشنی میں کبیل دادا نے دو لحیم شحیم سے آدمیوں کو... ایک بھرپور شباب والی عورت کے ساتھ ہنستے بولتے باہر نکلتے دیکھا۔ عورت کو دیکھ کر کبیل دادا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ کچھ زیادہ حسین تو نہ تھی مگر گندمی رنگت کی صحت مند اور بھرپور عورت ضرور تھی۔ قد بھی لمبا تھا، اس نے عام سی گھریلو چست شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شلوار کا رنگ سرخ تھا اور قمیص ہلکی پھول دار تھی۔ بالوں کی موٹی سی چٹیا بنی ہوئی تھی

”واہ نی کڑیے! کیا بات ہے تیری... آج تو ہمارے ہوش ہی گم کر دیے۔“ کبیل دادا نے ایک آدمی کو تعریفی جملہ کہتے سنا۔ ادھر اس کے پیچھے کھڑے کبڑے نے بھی سن لیا کہ وہ آدمی کس کی تعریف کر رہا ہے۔ ایک بار پھر اس کے خاکستری لمبوترے سے چہرے پر اختلاج قلب کے تاثرات ابھرے جسے دیکھ کر کبیل دادا کو اس کی طرف سے پھر پریشانی لاحق ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے اس نے اسے ڈپٹ کر خود پر قابو پائے رکھنے کی ہدایت کی۔

کبیل دادا نے دیکھا عورت کے چہرے سے ایسی کسی خوشی یا مسرت آمیز تسکین کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس کی جگہ اس کا چہرہ اترا اترا اور کسی مجبوری کی غمازی کرتا نظر آ رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے اپنی جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر اسے تھمائے۔ ”یہ لے... عیش کر...“

”عیش میرے نصیب میں کہاں ہے۔ میرے شوہر کا علاج ہو جائے، میرے لیے یہی بہت ہے۔“ اس عورت نے پژمردہ سے لہجے میں کہا اور کبیل دادا کے اندر ایک چھناکا سا ہوا۔ وہ بے چاری یہاں اپنی کوئی پیاسی مسرت کشید کرنے نہیں آئی تھی، بلکہ اپنے بیمار شوہر کے علاج کے سلسلے میں اپنے جسم کا سودا کرنے آئی تھی، کبڑے نے بھی یہ سب سن لیا تھا اور اب اپنی بیوی کے یہ الفاظ سن کر اسے سکتہ ہو گیا تھا جبکہ ادھر دفعتاً ہی وہ دونوں آدمی گودڑی بچھی چارپائی کے قریب پہنچ کر بری طرح چونکے۔ اس چارپائی کے ساتھ تھوڑی دیر پہلے ٹکی ہوئی ان کی رائفلیں غائب تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب کبیل دادا بجلی بن کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ رائفل کو اس نے لٹھ کی طرح استعمال کرتے ہوئے پہلے ایک کا سر پھاڑ ڈالا۔ وہ تیورا کر گرا جبکہ دوسرے کے پیٹ پر زوردار لات رسید کر ڈالی۔ لالاں نامی وہ عورت حیران کھڑی رہ گئی۔ دوسرا آدمی لات کھاتے ہی فوراً سنبھل گیا اور بھیڑیے جیسی غراہٹ کے ساتھ کبیل دادا پر جھپٹا۔ ڈیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ہی برابر تھے۔ تاہم کبیل دادا کی رگوں میں خون اس وقت لاوے کی طرح اچھال مار رہا تھا۔ وہ تصور میں بیگم صاحبہ کا پُرمسرت چہرہ دیکھ رہا تھا، جو لئیق شاہ کے دیدار کا رہین منت ہی ہو سکتا تھا اور بیگم صاحب سے کیے گئے وعدے اور ان کے پژمردہ چہرے کی... مسرت لوٹانے کے لیے کبیل دادا نے یہ خطرناک مہم اپنی جان کی پروا کیے بغیر انجام تک پہنچائی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety

دونوں باہم دست وگریبان ہوئے تو اس نے کمیل دادا کے پیٹ پر گھٹنا رسید کر دیا۔ ضرب زوردار تھی جس نے کمیل دادا کو چند ثانیوں کے لیے بلبلا کر رکھ دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ اس جاں کش درد کو پی گیا اور سنبھلتے ہی اپنے بھاری کندھے کی ایک زبردست ٹھوکر اسے رسید کر دی۔ یہ ضرب اس کے لیے غیر متوقع اور زوردار تھی۔ وہ بری طرح اپنے قدموں لڑکھڑا کے چارپائی کے ابھرے ہوئے چوبی پائے پر پشت کے بل گرا اس کے حلق سے ابھرنے والی بھیانک کراہ سے کمیل دادا کو یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہ لگی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی تھی، وہ پٹ سے زمین پر گرا اور لاچار ہو کر پڑ گیا۔

بھرے بھرے بدن والی سرو قد لالاں آنکھیں پھاڑے کمیل دادا کو ایک طرف کھڑی تکے جا رہی تھی۔ کمیل دادا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے حیرت ہوئی وہ کبڑا جانے کدھر غائب ہو گیا تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ معاملہ ''ٹھنڈا'' پڑتے ہی کہیں وہ دل جلا کبڑا درانتی لیے اپنی بیوی لالاں پر حملہ نہ کر دے۔ ''تت... تم کون ہو؟ ان سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟'' لالاں نے پھنسی پھنسی آواز میں اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کمیل دادا نے ایک بار پھر گردوپیش پر نظر دوڑائی پھر اس کی طرف چند قدم بڑھا دیے۔ وہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔

''مجھے تجھ سے کچھ لینا دینا نہیں، صرف یہ پوچھنا ہے کہ میرا ایک آدمی یہاں ان کی قید میں تھا۔ تجھے پتا ہے وہ کس کوٹھری میں بند ہے؟'' اس کی بات پر لالاں کا خوف کچھ کم ہوا۔ تاہم اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواباً کہا۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن وہ سامنے والی کوٹھری میں ضرور کوئی ہو سکتا ہے۔'' اس نے کچی سرخ اینٹوں کے ایک ڈھیر کے قریب والی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں نے ان کو وہاں آتے جاتے دیکھا تھا۔ کچھ عجیب سی آوازیں وہاں سے آئی تھیں۔''

اس کی بات سن کر کمیل دادا کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ پہلے لالاں کا قضیہ نمٹانا چاہتا تھا کہ کہیں یہ بعد میں اس کے بارے میں کسی کو بک نہ دے۔ لہٰذا اسے بلیک میل کرنے کے انداز میں بولا۔ ''سن! تیرا نام لالاں ہے نا؟'' اس کی بات پر عورت کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔

''تت... تو مجھے کیسا جانتا ہے؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میں تجھے نہیں جانتا ہوں پر تو ہوشیار ہو جا تیرا خصم (شوہر) اِدھر ہی کہیں گی درانتی لیے موجود ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کمیل دادا نے اسے مختصراً لفظوں میں ساری بات بتا دی۔ لالاں کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔

وہ بولی۔ ''کک... کدھر گیا وہ پھر؟''

''پتا نہیں، ابھی تو اِدھر ہی تھا۔'' اس نے بتایا۔ لالاں فوراً ایک طرف کو لپکی اور کمیل دادا نے سامنے والی کوٹھری کی راہ لی۔ قریب پہنچ کر ایک زوردار لات مار کر لکڑی کا ایک پٹ والا دروازہ توڑ ڈالا۔ اندر اندھیرا تھا اس نے سوئچ ٹٹول کر آن کر دیا، کمرا بمشکل آٹھ بائی دس کا تھا اور بالکل سپاٹ مگر ایک کونے پر ..... کوئی اس جیسا کسرتی جسامت والا شخص رسن بستہ حالت میں ناہموار فرش پر بے سدھ سا پڑا تھا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا۔ نیچے صرف شلوار تھی۔ جسم پر زخموں کے نشانات دیکھ کر صاف پتا چلتا تھا کہ اسے وقتاً فوقتاً تشدد کا بھی نشانہ بنایا جاتا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ نوجوان کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی زخم خوردہ تھا۔ اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر کمیل دادا کو اس بات کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ یہ شخص تشدد کا ہی نہیں بلکہ کم خوراکی کا بھی شکار تھا۔ یہ لئیق شاہ ہی تھا۔ کمیل دادا نے جلدی جلدی اس کے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بند کھولے، وہ ہوش میں آنے لگا تھا اور ہولے سے کراہ بھی رہا تھا۔ اس نے نیم وا سی آنکھیں کھول کر گویا اپنے نجات دہندہ کی طرف دیکھا۔ ایک تیز غراتی ہوئی سی کراہ نما آواز اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ وہ زخمی اور نڈھال ہونے کے باوجود اس پر پل پڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ وہ اسے شاید دشمنوں کا ہی آدمی سمجھ رہا تھا اور یوں بھی اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں لگتا تھا۔

''اوئے... ہولا رہے... میں ہوں کمیل دادا... بیگم صاحبہ کا آدمی... کیا بھول گیا مجھے؟'' کمیل دادا نے بالآخر بتایا تو لئیق شاہ کی مزاحمت ڈھیلی پڑ گئی۔

''چل اٹھ، ہمت پکڑ... لئیق شاہ! وقت کم ہے ہمارے پاس... میں نے ان دونوں مردودوں کو بیکار کر دیا ہے۔'' کہتے ہوئے کمیل دادا نے اسے سہارا دیا۔ لئیق شاہ کی حالت واقعی ناگفتہ ہو رہی تھی، کمیل دادا نے اسے سہارا دیے کوٹھری سے باہر نکلا۔ باہر اسے لالاں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ لئیق شاہ کو لیے ابھی چند قدم آگے بڑھا تھا کہ بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ اسے کسی عورت کے رونے اور سسکنے کی آواز آ رہی تھی۔ جو بلاشبہ لالاں کے علاوہ اور کس کی ہو سکتی تھی۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کھیل دادا پھر آگے بڑھا، وہ اس راستے سے لئیق شاہ کو لیے واپس لوٹنا چاہتا تھا جہاں اس کی کار موجود تھی۔ ایک کوٹھری کی دیوار کے پاس اسے وہ درانتی بردار کبڑا دکھائی دیا تھا۔ لالاں کے رونے کی آواز بھی اُدھر ہی سے آرہی تھی، اور اس کے دل میں یہ خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں اس کے کبڑے شوہر نے اپنی بیوی پر قاتلانہ حملہ تو نہیں کر دیا۔ وہ لئیق شاہ کو سنبھالے وہاں سے گزرا تو اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ کیا دیکھتا ہے کبڑا زمین پر ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح پڑا تھا اس کی گردن پر گہرا چرکا لگا ہوا تھا جس سے خون بھل بھل بہہ کر بھربھری مٹی والی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

خون آلود درانتی کبڑے کی لاش کے پاس ہی پڑی تھی اور لالاں بکھرے بالوں کے ساتھ اس کی لاش کے پاس بیٹھی ماتم کناں تھی۔ یہ عجیب اور نئی صورتِ حال کھیل دادا کے لیے تحیّر کا باعث تھی، پھر چشم زدن میں اس نے یہی اندازہ لگایا کہ اس کے بیمار کبڑے شوہر نے بیوی پر حملہ کرنا چاہا ہوگا لیکن وہ خود سے دگنی توانا اور صحت مند بیوی کا مقابلہ نہ کرسکا ہوگا یوں موقع پاتے ہی لالاں نے اپنی جان بچانے کے دوران میں الٹا اپنے کمزور اور مدقوق شوہر کی گردن پر تیز دھار درانتی چلادی ہوگی۔

”یہ تم نے کیا کیا… پاگل عورت؟ اپنے خصم (شوہر) کو مار ڈالا؟“ کھیل دادا نے غصیلے لہجے میں کہا تو الم نصیب لالاں ماتم کناں آواز میں بولی۔

”کاش! اس سے تو اچھا تھا کہ یہ مجھے ہی مار ڈالتا مگر… میں نے اسے نہیں مارا ہے، اس نے خود ہی دل برداشتہ ہوکر میرے سامنے اپنے گلے پر درانتی پھیر ڈالی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ کھیل دادا ایک گہری اور متاسفانہ سانس خارج کر کے رہ گیا۔

”اسے تو ہونا ہی تھا دل برداشتہ… تو نے اس کے ساتھ کیسی گندی بے وفائی کی تھی۔ اکٹھے دو مردوں کے ساتھ تو اپنا منہ کالا کرنے یہاں آئی تھی۔“

”میں نے ایسا مجبوری میں کیا تھا اور وہ بھی بشیرے کی خاطر ہی تو کیا تھا تاکہ شہر کے وڈے اسپتال میں اس کا علاج کروا سکوں۔“ وہ آبدیدہ لہجے میں بولی۔ ”بس اس بات پر اس نے میرے سامنے اپنی گردن پر درانتی پھیر لی۔“

کھیل دادا کو ابھی تھوڑی دیر والا وہ عبرت اثر منظر یاد آگیا جب کبڑے کو اپنی بیوی کی اس بات پر یک دم سکتہ ہوگیا جو اس نے لالاں کو ان دونوں مسٹنڈوں سے یہ کہتے سنا تھا۔ ”عیش میرے نصیب میں کہاں۔ میرے بیمار شوہر کا علاج ہوجائے یہی کافی ہے۔“

کھیل دادا اب عجیب سے شش و پنج کا شکار ہوگیا تھا۔ ایک طرف زخمی لئیق شاہ کو سنبھالے ہوئے تھا اور دوسری طرف لالاں والا مسئلہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی غیرت گوارا نہیں کررہی تھی کہ ایک دکھی عورت کو جو بہرحال مجبور بھی تھی اور جان بوجھ کر گناہ کی طرف مائل نہیں ہوئی تھی، حالات نے اسے بے حوصلہ اور مجبور کر ڈالا تھا، ایسی حالت میں چھوڑ کر آگے بڑھ جانا اس کی مردانگی کو زیب نہیں دے رہا تھا، بولا۔

”اب رونا دھونا بند کر… جو ہوا سو ہوا… باہر میری کار موجود ہے چلتی ہے میرے ساتھ تو تجھے تیرے گھر اتارتا چلوں؟“

اس کی بات پر لالاں نے سر اٹھا کر کھیل دادا اور پھر ساتھ لگے ہوئے نڈھال سے لئیق شاہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا پھر بولی۔

”تم میری فکر نہ کرو، تم اپنے ساتھی کو لے کر چلے جاؤ‘ لگتا ہے تمہاری ڈاڈھی دشمنی ہے۔“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا

رات کا مسافر
مئی کے شمارے میں سسپنس کے آخری صفحات پر
قارئین کے محبوب قلم کار
طاہر جاوید مغل کا نیا شاہکار
جذبات کے بھنور میں الجھے ایک نوجوان کی سرکشی، جس کے پیروں میں وعدے کی ایسی زنجیر تھی جو اسے کہیں جانے ہی نہ دیتی تھی…… رنگین و سنگین پڑاؤ کی دلربا داستان

تھا کہ اچانک ایک تیز شور کی سی آواز ابھری۔ وہ سب بری طرح چونکے۔ کم از کم کھیل دادا کو بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ گاڑیوں کی آوازیں تھیں جو اس کچے ڈیرے کے پھاٹک کے باہر رکی تھیں۔ اس نے گردن گھما کے اس طرف دیکھا۔ پھاٹک کی پیشانی پر لگے بلب کی روشنی میں اسے دو گاڑیاں رکتے اور اس کے اندر سے کئی مسلح افراد اترتے دکھائی دیے۔ یکلخت اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی، پل کے پل وہ ان کی آمد کی وجہ سمجھ چکا تھا جب وہ اور جہانگیر وغیرہ خواجہ سرا انگل سے ملاقات کر کے واپس نئے پنڈ کی طرف لوٹ رہے تھے تو ممتاز خان کے آدمیوں نے جو بقول اس کے یرغمال ساتھی کے انہیں اندازہ تھا پہلے سے کہ لئیق شاہ کی تلاش میں بیگم صاحبہ یا اس کے آدمی نئے پنڈ کا رخ کریں گے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ لہٰذا یقیناً اب تک چودھری ممتاز کو اس ناکام حملے کی کسی نہ کسی طرح خبر ہو چکی ہوگی، اور لامحالہ اس کا خیال یرغمالی لئیق شاہ کی طرف گیا ہوگا کہ کہیں بیگم زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کے آدمی یہاں تک تو نہیں پہنچ گئے؟

اچانک دو تین ہوائی فائر بھی ہوئے، لالاں ہراساں نظر آنے لگی۔ جبکہ خود کھیل دادا بھی گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ لالاں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ دونوں جواں مرد اس وقت سخت مشکل میں ہیں۔ ہمت سے کام لیتے ہوئے اس نے کھیل دادا سے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے کھیل دادا بول پڑا۔ ”لالاں! تم اِدھر میرے زخمی ساتھی کو سنبھالو، میرے پاس پستول ہے میں ان دشمنوں کا مقابلہ کروں گا۔“ اس پر لالاں نے کہا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو، یہ تعداد میں زیادہ اور سب کے سب مسلح لگتے ہیں... آؤ میرے ساتھ دونوں۔“ وہ اٹھ کر آگے بڑھی، وقت کم تھا اور اس سے زیادہ سنگین تر... کھیل دادا لئیق شاہ کو سنبھالے اس کے عقب میں ہولیا۔ لئیق شاہ کو بھی کافی ہوش آ چکا تھا۔ اس نے اپنے سہارے سے چلنا شروع کر دیا تھا۔ بہت جلد کھیل داد کو اندازہ ہو گیا کہ لالاں کا مشورہ مان کر اس نے غلطی نہیں کی تھی۔ وہ یہاں کے سارے چور اور محفوظ راستوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پار کر کے وہ انہیں ایسی جگہ لے آئی جہاں خود رو گھنی جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ وہ ان کے درمیان چھپتے چھپاتے تیزی سے چلتے ہوئے قدرے کھلے راستے پر آ گئے۔ یہاں کچے پکے سے گھروں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔ لالاں کا گھر قریب ہی واقع تھا، وہ انہیں اندر لے آئی، دروازہ بند کر کے یہ لوگ اندر کمرے میں آ گئے۔ گھر کا صحن مختصر سا تھا۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا اور وہی منظر پیش کرتا تھا جو ایک غریب اور عسرت کے مارے مکینوں کا مقدر ہوتا ہے۔ اندر چارپائی بھی ایک تھی، ایک دو سالخوردہ سی کرسیاں اور مونڈھا نما نشست تھی۔ کھیل دادا نے لئیق شاہ کو چارپائی پر ڈال دیا۔ لالاں نے کمرے کی بتی جلا دی تھی، البتہ صحن کی بجھا دی تھی۔

لالاں نے ایک ٹیڑھے میڑھے جست کے جگ میں پانی بھر کے باری باری دونوں کو دیا۔ اس کے بعد ایک نگاہ لئیق شاہ پر ڈالی پھر کھیل دادا سے بولی۔

”یہ تمہارا بھائی ہے؟“

”بھائی ہی سمجھ مگر یہ میرا ساتھی ہے۔“ کھیل دادا نے جواب دیا تو لالاں باری باری عجیب سی نگاہ دونوں پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”تم دونوں ایک ہی جیسے ڈیل ڈول کے ہو خیر، تم اب باہر مت نکلنا... تمہارے دشمن ہر طرف پھیل چکے ہوں گے اب تک۔ پھر تمہارے ساتھی کی حالت بھی ٹھیک نہیں لگتی۔“

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ کسی خیال کے تحت کھیل دادا نے اس سے پوچھ لیا کیونکہ لالاں کے کہنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ انہیں محتاط رہنے کی تنبیہ کرنے کے بعد کہیں باہر جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

”میں اُدھر جا رہی ہوں کچے ڈیرے پر... اپنے شوہر کی لاش اٹھانے۔“ اس بار کھیل دادا اسے یوں تکنے لگا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ تمہارا وہاں اس وقت جانا ہمیں بھی خطرے میں ڈال دے گا تم ابھی اِدھر ہی ٹھہرو... اور مجھے کچھ سوچنے دو۔“

”میں صبح ہونے سے پہلے بشیرے کی لاش یہاں لانا چاہتی ہوں۔“ اس نے توجیہہ پیش کرتے ہوئے کھیل دادا کو سمجھانے کی کوشش چاہی۔ ”ورنہ مجھ پر اس کے قتل کا الزام لگ جائے گا۔ گاؤں والے باتیں بنائیں گے میرے خلاف۔“

”تو یہاں لا کر کیا تمہارا بشیرا زندہ ہو جائے گا؟ اس کی خودکشی اور موت تو تم یہاں بھی نہیں چھپا سکتیں؟“ کھیل دادا اسے گھورتا ہوا بولا۔

”میں بہانہ کر دوں گی، رات چور نے نقب لگائی تھی، مقابلے میں وہ مارا گیا۔“ وہ بولی۔

”ہرگز نہیں، اس کی لاش کو ابھی وہیں پڑا رہنے دو۔“

کھبیل دادا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور اسے سمجھانے کی کوشش میں مزید بولا۔

"تھوڑی دیر گزرنے دو... میں خود باہر جا کر پہلے حالات کا جائزہ لے آؤں... پتا نہیں میری کار اب وہاں موجود بھی ہوگی یا دشمنوں نے بے کار کردی ہوگی۔"

"کک... کھبیل...!" معاً چارپائی پر دراز لئیق شاہ نے اسے نحیف سی آواز میں پکارا۔ تو لالاں اور کھبیل دادا دونوں ہی اس کی طرف بیک وقت متوجہ ہوئے جبکہ کھبیل دادا اس کے قریب ہی چارپائی پر ٹک کر بیٹھ گیا اور بہ غور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو ناں؟"

"ہاں... میں ٹھیک ہی ہوں۔ ہمیں یہاں سے نکلنا چاہیے صبح ہونے سے پہلے..." لئیق شاہ نے کہا تو کھبیل دادا بولا۔

"تم فکر نہ کرو، میرا بھی یہی ارادہ ہے اس لیے میں ذرا باہر جا کے حالات کا جائزہ لینا چاہ رہا تھا۔"

"تت... تم مجھے کسی طرح کھروڑ پہنچا دو... وہاں ایک قصبہ ہے..."

"بجلی کے پاس جانا چاہتے ہو؟" کھبیل دادا نے اس کی بات کاٹ کر معنی خیز مسکراہٹ سے کہا اور اس کی بات پر لئیق شاہ بری طرح ٹھٹکا۔

"پریشان نہ ہو... ہم تمہاری تلاش میں وہاں بھی گئے تھے، مختیار علی نے بتایا تھا بجلی کے بارے میں۔" کھبیل دادا بولا اور لئیق شاہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کھبیل پھر بولا۔ "مجھے بیگم صاحبہ نے ہی تمہاری تلاش میں بھیجا تھا، وہ اس سے پہلے خود بھی آئی تھیں۔ اب ان کا یہ حکم ہے کہ میں تمہیں لے کر ملتان بیگم ولا پہنچوں... اب وہی تمہارے لیے محفوظ جگہ ہے۔" اس نے لئیق شاہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ لئیق شاہ بے چین سا نظر آنے لگا۔

"مم میرا ابھی انتقام پورا نہیں ہوا ہے جب تک میں چچ... چودھری ممتاز خان کو موت کے گھاٹ نہ اتار ڈالوں، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"چھیما کو تم نے ہی ہلاک کیا تھا؟" معاً کھبیل دادا نے بھویں سکیڑ کے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" لئیق شاہ نے بلا تامل جواب دیا۔ اس کے بعد کھبیل دادا نے بھی شروع سے اب تک کی ساری کتھا سنا ڈالی۔ یہ بھی کہ بیگم ولا میں پولیس بھی آئی تھی، وغیرہ۔

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں دادا! میرا ابھی بیگم ولا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس طرح دشمنوں کو بیگم صاحبہ کے خلاف مزید سازشیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔" لئیق شاہ نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی کوشش چاہی، جسے کھبیل دادا سراسر رد کرتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں میں نے بتا تو دی ہے ساری بات... کہ کس طرح بیگم صاحبہ نے اپنی دانش مندی سے انسپکٹر جرار خان کو منہ توڑ جواب دیا تھا۔ وہ کافی حد تک معاملہ سنبھال چکی ہیں۔ اب تک تمہارے لیے اچھے وکیل کا بندوبست اور دیگر انتظامات بھی کر چکی ہوں گی۔"

"مگر میں ممتاز خان کو زندہ..."

"او... بس کر... اب یہ رٹ..." کھبیل دادا کا دماغ گرم ہونے لگا۔ غصے سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ مگر پھر جلد ہی کچھ سوچ کر نرم لہجے میں بولا۔ "او دیکھ یار لئیق شاہ! پولیس تیرے پیچھے پڑ چکی ہے۔ تو جتنا پولیس سے بھاگے گا، اتنا ہی بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ ممتاز خان ابھی اس سرزمین پر ہی ہے۔ اسے اس طرح دشمنوں کو تمہارے اور بیگم صاحبہ کے خلاف مزید گل کھلانے کا موقع ملتا رہے گا۔" تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ "ابھی یہاں سے خیریت سے نکل جانے کی دعا کرو اور بیگم صاحبہ پر بھروسا رکھو۔ ان کی مشکلوں میں اضافہ نہ کرو... وہ تمہاری سچی ہمدرد ہیں اور ہر طرح سے تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ذرا تم خود بھی اپنے آپ کو سنبھالو۔ زیادہ جوش اچھا نہیں ہوتا۔"

لالاں ایک طرف کھڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ لئیق شاہ کے نحیف چہرے پر کبھی جوش اور کبھی بے بسی و مایوسی کے تاثرات گڈمڈ ہونے لگتے۔ اسے کھبیل دادا کی باتوں میں بھی سچائی محسوس ہوتی تو کبھی وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا کہ کہیں اس طرح وہ کسی کے ذاتی مفادات کے لیے استعمال تو نہیں کیا جا رہا؟ یوں تو اسے بیگم صاحبہ کی نیت پر شبہ نہ تھا وہ واقعی اس کے ساتھ مخلص تھیں بلکہ اسے تو بیگم صاحبہ کے بارے میں یہاں تک ادراک تھا کہ معاملہ "اخلاص و ہمدردی" سے بہت آگے کا تھا۔ بھلا ایسی عورت اسے اپنے ذاتی مفادات کے لیے کیسے استعمال کر سکتی تھی؟ اسے خاموش اور سوچ میں گم دیکھ کر کھبیل دادا اس سے پھر بولا۔

"دیکھ لئیق شاہ! اس وقت ہم دونوں ایک سنگین اور نازک وقت سے گزر رہے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں دشمن طاقتور ہیں۔ ساتھ ہم بھی تمہارا نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تم اپنی ضد سے باز آرہے ہو تو میں ذرا باہر کا چکر لگا آؤں؟" اس کی اس بات پر بے اختیار لئیق شاہ کے پژمردہ سے ہونٹوں

پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، اور اس نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ کہیل دادا نے لالاں کی طرف دیکھا۔

"کیا میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں؟"

"کس سلسلے میں؟" لالاں نے الجھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔

"یہی کہ تم اِدھر ہی رکو گی... جب تک میں باہر کی خیریت لے کر دوبارہ یہاں نہ لوٹ آؤں؟" لالاں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔ کہیل دادا مطمئن ہوکر باہر جانے لگا۔ لالاں صحن تک اس کے پیچھے آئی اور کہیل دادا کے ساتھ دروازے کے قریب پہنچتے ہی لالاں نے اسے دھیرے سے پکارا۔

"سنو۔"

"ہوں۔" کہیل دادا رک کر اس کی جانب گھوم کر مختصراً بولا۔

"اپنا خیال رکھنا... دشمن زیادہ تعداد میں ہیں۔" لالاں کی آواز میں تشویش اور تفکر پایا جاتا تھا۔ کہیل دادا چند ثانیے اسے عجیب سی نظروں سے تکتا رہا پھر کوئی جواب دیے بغیر دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

باہر گھور تاریکی کا پچھلا پہر گہرے سناٹوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ماحول خنک تھا۔ لالاں کے گھر سے نکلتے وقت اس نے اپنے پاس بھرے ہوئے پستول اور چند فاضل راؤنڈ کی موجودگی کا اطمینان کرلیا تھا۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ وہ تاریکی میں محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

لالاں کے ساتھ کچے ڈیرے سے واپسی کے وقت کہیل دادا حفظِ ماتقدم کے تحت سارا راستہ ذہن نشین کرتا آیا تھا۔ کیونکہ اس کی کار وہاں موجود تھی اور اسے کار کی طرف واپس لوٹنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں تاریکی کا حصہ بنا بل کھاتے ویران راستوں پر چلتا ہوا بالآخر کچے ڈیرے پر پہنچ گیا۔ یہاں آنے سے اس کے دل میں یہ خدشہ جاگزیں تھا کہ کسی مقام پر ممتاز خان کے ان مسلح حواریوں سے "ٹاکرا" ہوسکتا تھا۔ لیکن کہیل دادا ابھی ان نازک حالات میں دشمنوں سے ٹکرانے کا متحمل نہیں تھا اس لیے وہ سارے راستے یہی دعائیں مانگتا رہا کہ ایسا کچھ نہ ہو تو اچھا ہے۔

کچے ڈیرے پہنچ کر وہ رکا۔ تاروں بھری مدھم روشنی میں اسے ڈیرے کی دیواروں کے ہیولے نظر آرہے تھے اور کسی حد تک اندر کا منظر بھی۔ اردگرد خودرو جھاڑیاں تھیں۔ اس نے ان کی آڑ لے رکھی تھی۔ وہ اب دبے پاؤں تھوڑا اور آگے سرکا، ڈیرے کی دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ احاطے کی دیوار کا اندرونی منظر... باہر سے بھی کسی حد تک دکھائی دیتا تھا۔ وہاں اب دشمنوں کی کوئی گاڑی موجود نہ تھی۔ نہ ہی کوئی ذی نفس نظر آرہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر سوچا یقیناً یہاں کا "منظر" دیکھنے اور قیدی (لئیق شاہ) کو غائب پاکر انہیں بہت کچھ معلوم ہوگیا ہوگا، لہٰذا اب کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ اطراف کے علاقے میں بکھر کر ان کی تلاش میں مصروف ہوں۔

کہیل دادا یہاں سے پلٹا... اب اس کا رخ اس جانب تھا، جدھر اس نے اپنی کار کھڑی کی تھی، وہاں پہنچنے تک وہ دل ہی دل میں اپنی کار کی وہاں موجودگی کی دعا مانگتا رہا تھا کہ وہ دشمنوں کی نظروں میں نہ آگئی ہو یوں بھی اس نے کار کو قدِآدم اور جھنڈ دار تنوں والے چھتنار پیڑوں کی آڑ میں کھڑا کیا تھا۔ پھر رات بھی تھی، وہ وہاں پہنچا تو یک دم اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا۔ کار اپنی جگہ موجود تھی۔ فوراً آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کے دروازہ بند کرنے لگا تھا کہ اچانک وہ تیز روشنی میں نہا گیا اور ساتھ ہی بیک وقت کئی گنیں اس نے اپنی جانب اٹھتے دیکھیں۔

☆☆☆

"خبردار! حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔" ایک تیز غراہٹ سے مشابہ آواز ابھری، وہ اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ چہرے پر پڑنے والی تیز روشنی کے باعث اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ دشمن نے اس کے خلاف بڑی زبردست اور "مکمل" چال چلی تھی، کار ان کی نظروں میں آچکی تھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر دو افراد نے باہر کھینچ لیا تھا۔ وہ تعداد میں چار تھے اور چاروں مسلح بھی۔ ایک نے ہیوی ٹارچ تھامے رکھی تھی، دوسرے نے اس کی فوراً جامہ تلاشی لے کر اسے اکلوتے پستول سے محروم کردیا تھا۔

"ہمیں یقین تھا جس مائی کے لعل نے ہمارے دو آدمیوں پر ہاتھ ڈالا ہے، وہ اِدھر کا رخ ضرور کرے گا۔" وہی غراہٹ ابھری۔ پھر اس کے کسی ساتھی نے اس سے بہ عجلت کہا۔

"شاکرے! دیر مت کر... اسے فوراً لے چلو تاکہ ہمارے دوسرے ساتھیوں کو زیادہ بھٹکنا نہ پڑے۔"

"اوئے نوازا! اسے بٹھاؤ گڈی میں۔" ایک حاکمانہ آواز ابھری۔ قریب چند قدموں کے فاصلے پر ان کی گاڑی موجود تھی، دوسرا بولا۔ "بہتر یہی ہوگا کہ اسے اس کی کار میں

بٹھا کر لے چلو اور گاڑی یہ خود چلائے گا۔"

"تم اسے لے کر بیٹھو... میں اپنی گڈی اس کے آگے لگاتا ہوں۔" وہی تحکمانہ آواز ابھری۔

ناچار کمیل کو اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنی پڑی۔ ایک آدمی اس کے برابر والی سیٹ پر جبکہ دو اس کی پچھلی سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ پیچھے سے ایک نے اپنی گن کی نال اس کی گدی سے لگا رکھی تھی جبکہ ان کا چوتھا ساتھی ذرا دور کھڑی اپنی گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے بھی کار اسٹارٹ کر کے مذکورہ گاڑی کے پیچھے چلنے کا حکم ملا تھا۔ کمیل دادا نے کار اسٹارٹ کر کے اس گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ وہ سوچ رہا تھا' اسے کدھر لے جایا جا رہا تھا؟ اب تک اس سے قیدی لئیق شاہ کے بارے میں نہیں پوچھا گیا تھا؟ یا شاید کسی قریبی مقام پر لے جا کر پوچھا جاتا جہاں ان کے اور ساتھی بھی موجود ہوں۔

کمیل دادا خود کو ان کے درمیان چوہے کی طرح پھنسا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا کب تھا مگر اتنی احتیاط برتنے کے باوجود کہیں اس سے غلطی ہو چکی تھی۔ جس کا اب وہ خمیازہ بھگت رہا تھا مگر ساتھ ہی اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس مشکل سے وہ کیسے نکلے ...... جو اس کی ساری محنت اور اب تک کی کامیاب مہم کو سبوتاژ کرنے والی تھی۔ اچانک ایک فیصلے پر پہنچ کر کمیل دادا کے اعصاب تن گئے، اس نے سوچا جو کرنا ہے ابھی کرنا ہے۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ تم لوگ کون ہو اور مجھے اس طرح گن پوائنٹ پر کہاں اور کیوں لے جا رہے ہو؟"

دشمنوں کی چال کے جواب میں جو اس کے ذہن نے جوابی چال سوچی تھی، اس کے تحت وہ بولا تو عقب سے غراتی ہوئی درشت آواز ابھری۔

"زیادہ ہوشیار کاں (کوا) بننے کی ضرورت نہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں تو... کون ہے؟"

"میرا خیال ہے مجھے سچی بات بتانا ہی پڑے گی، تم شاید جسے اپنا وہ دشمن سمجھ رہے ہو جس نے میرے یہاں آنے سے پہلے بڑا خون خرابا مچایا تھا، میں خود مرتے مرتے بچا تھا۔ اگر میں تمہارے اس دشمن کی بات نہ مانتا..."

کمیل دادا نے ہمت نہ ہاری، چال کے جواب میں چال چلتا رہا۔ اسے کچھ کچھ اس بات کا اندازہ تھا کہ یہ لوگ اسے جانتے نہیں مگر حالات و واقعات کے مطابق ہی اسے اپنا مطلوبہ شکار یا دشمن سمجھ رہے تھے جو ایسا غلط بھی نہ تھا۔ وسیم عرف جھیما ہوتا تو دوسری بات تھی۔ لہٰذا اس کی بات سن کر اس بار اس کے برابر میں براجمان آدمی نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔ "کیسی سچی بات؟ کیا بتانا چاہتا ہے تو؟"

"میں، ٹھیکے دار پرویز اسلم کا منیجر ہوں۔ چودھری دلاور نام ہے میرا۔ یہاں بھٹے کے منشی اور چوکیدار کی ملی بھگت سے اینٹوں کی ڈھیریاں خرد برد کرنے آیا تھا۔ یہاں پہنچا تو پانسا ہی پلٹا ہوا تھا۔ چار پانچ مسلح افراد... جنہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے، قتل و غارت میں مصروف تھے، مجھے بھی انہوں نے چھپا لیا۔ پھر کسی لئیق شاہ نامی قیدی کو چھڑایا انہوں نے... وہ دو آدمی شاید تم لوگوں کے ساتھی ہی ہوں گے جنہوں نے ان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کے ہاتھوں مقابلے میں تمہارے دشمنوں کے آدمی بھی مرے تھے، صرف ایک ہی زندہ بچ سکا تھا... وہ میری طرح خاصا لمبا چوڑا مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ لئیق شاہ نامی قیدی بھی اس کے ہمراہ تھا... قیدی پر شاید یہاں تشدد کیا جاتا رہا تھا جس کے باعث اس کی حالت خراب تھی، لمبے قد والے نے مجھے گن پوائنٹ پر اسے سنبھالنے اور کاندھے پر لاد کر کار تک لانے پر مجبور کیا۔ پھر مجھے ان دونوں کو اپنی اس کار میں لے کر قریب ایک گھر میں چھوڑ کے آنا پڑا۔"

"مگر تمہاری کار تو کافی دیر سے یہاں موجود تھی اور ہم بھی اتنی ہی دیر سے گھات لگائے یہاں بیٹھے تھے۔ تم کیا اُڑن کھٹولے پر لے گئے تھے انہیں؟" عقب میں بیٹھے ایک شخص نے طنزیہ اور ترش لہجے میں کہا تو کمیل دادا کو پہلے سے ہی اس سوال کا اندازہ تھا، وہ اس کا بھی جواب سوچ کے بیٹھا تھا۔ فوراً بولا۔

"مجھے وقت کا کچھ اندازہ نہیں مگر مجھ سے یہی غلطی ہوئی تھی کہ مجھے ان دونوں کو قریبی ٹھکانے پر چھوڑ کے فوراً واپس لوٹ جانا چاہیے تھا مگر لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ اس خون ریز مارا ماری کے بعد اس کچے ڈیرے اور بھٹے پر میرے سوا کوئی نہ تھا۔ میں یہاں سے منشی کی کوٹھری سے فون کرنے گیا تھا اپنے ایک آدمی کو کہ وہ اپنے ساتھ ایک خالی ٹرک اور کچھ مزدور لے آئے، وہ بھی ہمارے ہی نمک خوار تھے، یہاں سے ہم نے تمام اینٹیں چوری کا منصوبہ بنایا تھا، اس سنہری موقع سے میں فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں اپنی محنت اکارت جاتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔"

"اوئے... تو کس منشی کی بات کر رہا ہے؟ وہاں کون

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سافون لگا ہوا تھا؟" ایک درشت آواز میں پوچھا گیا مگر اس کے لہجے سے اب ظاہر ہونے لگا تھا کہ وہ الجھ گیا ہے جبکہ کھیل دادا جو باتیں سوچ کر ہوا میں تیر چلا رہا تھا، اس کے مطابق... ان میں سے کچھ کو بھٹے اور کچھ ڈیرے کے محل وقوع کے بارے میں پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ ہوتا بھی تو اس کی باتوں نے انہیں بہرحال مخمصے میں ضرور ڈال دیا تھا۔ کھیل دادا نے بھی پورے جھوٹ کے بجائے آدھے سچ اور آدھے جھوٹ کا مظاہرہ کیا تھا، پورے اعتماد سے جواباً بولا۔

"لو جی، آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا تو ابھی چلو میرے ساتھ... اور سارے ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

"یہ پستول تم نے پھر کیوں اپنے پاس رکھا تھا؟" ایک اور سوال ہوا، وہ جواباً بولا۔

"کمال کرتے ہو جی! آدھی رات کو میں پستول لے کر ہی نکلوں گا۔ بھاری گنیں تو تمہارے دشمن لائے تھے اور اپنا کام کر کے چلتے بنے۔"

بڑی چالاکی سے کھیل دادا نے انہیں یہ اشارہ بھی جتا دیا تھا کہ بھلا ایک معمولی پستول کے ذریعے وہ اتنا بڑا کارنامہ وہ بھی اکیلے کیسے انجام دے سکتا تھا۔ بات الجھ گئی تھی، یہی سبب تھا کہ ان کے ذہن میں صرف اپنے شکار کو تلاش کرنے کی دھن سوار تھی، فوراً ہی ساتھ بیٹھے آدمی نے کھیل دادا کو کار روکنے کا حکم دیا۔

"کار اس طرف موڑ دو جس گھر میں ہمارے شکار موجود ہیں، خبردار! کوئی چالاکی نہ کرنا... ورنہ گولیوں سے بھون دیں گے۔"

"نا جی، نہ میری جان چھوٹ جائے... میرے لیے یہی بہت ہے۔" کھیل دادا نے دانستہ خود کو ان پر ڈرپوک ظاہر کرنے کی کوشش چاہی۔

ان کے حکم پر کھیل دادا نے فوراً اسٹیئرنگ کاٹا... اب اس کا رخ... واقعی لالاں کے گھر کی جانب تھا۔ آگے جانے والی گاڑی انہیں پلٹتا دیکھ کر... اب وہ ان کے تعاقب میں ہو گئی تھی، بہرحال اس کے قریب پہنچنے پر انہوں نے اسے ساری بات بتا دی تھی۔ وہ بھی کچھ الجھ سا گیا تھا اور یقین و غیر یقینی کی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ بہر طور ان چاروں کو یہی زعم تھا کہ ایک اکیلا اور غیر مسلح آدمی بھلا ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اس کی چال میں آ گئے۔

کھیل دادا کا ایک مقصد پورا ہو چکا تھا کہ وہ ان کے دیگر ساتھیوں کے ملنے سے پہلے ہی ان کی تعداد کو محدود کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ کار میں صرف تین افراد تھے، وہ ان پر کسی طرح قابو پانے کی سوچ رہا تھا۔

یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ انہیں لالاں کے گھر کی طرف ہی لیے جا رہا تھا۔ ذرا دیر میں یہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ کھیل دادا کا دل اب جیسے فرطِ جوش سے تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ چال اس کی اپنے لیے اور لئیق شاہ کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی کہ اگر وہ بروقت ان پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتا ہے تو یہی چال اس پر الٹ سکتی تھی اور دشمنوں کو ان کا شکار گویا تھالی میں پیش ہو جاتا۔

کھیل دادا نے کار دانستہ مذکورہ گھر سے کچھ فاصلے پر روکی تھی اور بڑے دھڑلے کے ساتھ نیچے اتر آیا تھا۔ دوسری گاڑی میں موجود ان کا چوتھا ساتھی بھی اپنی گن سنبھالے نیچے اتر آیا تھا۔ گھر کے دروازے کے قریب پہنچ کر کھیل دادا نے سرگوشی میں ان سے کہا۔ "ابھی ٹھہرو! میں دستک دوں گا پہلے... اندر ایک عورت موجود ہے۔ وہی دروازہ کھولے گی۔ اس کے بعد تمہارا کام خود ہی آسان ہو جائے گا مگر خدا کے لیے مجھے جانے دینا... میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا... ورنہ بعد میں کہیں ان کے ساتھی میری جان کے دشمن نہ بن جائیں۔"

"ہرگز نہیں۔" ایک نے درشت لہجے میں کہا۔ "تم اِدھر ہی ٹھہرو گے، پہلے ہم اپنے شکار کی تسلی کر لیں، تم دور ہی کھڑے رہو گے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک آدمی سے کہا۔ "نوازے! اس کو لے جا کر اپنے ساتھ ذرا دور کھڑا ہو جا۔ ہم تینوں اندر داخل ہوں گے، شکار ملتے ہی تجھے دور سے اشارہ کر دیں گے تو اس کو جانے دینا بلاوجہ خون خرابے سے ہم خود بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔" اس کی بات پر کھیل دادا دانستہ "معصوم" بنتے ہوئے لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔

"مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔ اندر فقط تین آدمی ہیں۔ لئیق شاہ، اس کا ساتھی، جو خود بھی زخمی ہے۔ تیسری وہ عورت... اس بے چاری کو کچھ مت کہنا... تمہارا کام ویسے بھی آسان ہو گیا ہے اب اپنے شکار کو لے جانا... بے شک اس کے ساتھی کو مار ڈالنا... پر عورت کو کچھ نہیں کہنا۔"

"لگتا ہے تیرا دل آ گیا ہے اس پر؟" ایک نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا تو کھیل دادا شرمانے کی سی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے جی۔"

وہ تینوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ خطرناک رسک لیے بغیر یہ بیل منڈھے چڑھتے کھیل دادا کو بھی نظر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں آ رہی تھی، تاہم وہ سر دست اپنے چار موجود... دشمنوں کی طاقت کو منقسم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا جو اس کی چال کی بنیاد تھی۔ اب گھر سے ذرا فاصلے پر وہ شاکر نامی مسلح آدمی کے ساتھ کار کی آڑ لیے کھڑا تھا۔ ان کی نظریں دروازے پر تھیں۔ دستک پر لالاں نے ہی دروازہ کھولا۔ تین مسلح آدمیوں کو دروازے پر دیکھ کر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ایک نے اس کا منہ دبوچ لیا۔ لالاں کو کہیل دادا نے خوف سے غش کھا کر ایک آدمی کے ہاتھوں میں جھولتے دیکھا۔ کہیل دادا کی ایک بات سچ ثابت ہوئی تھی، اس کے ساتھ موجود آدمی کا چہرہ فرطِ مسرت .... سے سرخ ہونے لگا اور یہی وقت تھا جب وہ کہیل دادا کی طرف سے لمحے بھر کو غافل ہو گیا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کھڑا آدمی اس وقت ان سے بھی زیادہ خطرناک تھا جیسے ہی وہ تینوں اندر غائب ہوئے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی۔ اپنے مضبوط بازو کی کہنی کی زبردست ٹکر دشمن کے پیٹ پر رسید کی۔ اس کے لیے یہ اچانک اور غیر متوقع تھا۔ نتیجتاً مار کھا گیا۔ سنبھلنے لکوشش کرنے تک کہیل دادا اس کی گردن کے گرد اپنے بازو کا شکنجہ کس کر جھٹکے کے ساتھ منکا توڑ چکا تھا۔

اس کی لاش زمین بوس کرنے کے بعد کہیل دادا نے اس کی گن سنبھالی اور تیزی کے ساتھ دروازے پر پہنچا۔ اندر وہ دونوں اپنی مہم میں مست تھے، دروازہ ادھ بھڑا تھا۔ پہلے اس نے اپنی ایک آنکھ موٹی جھری سے لگا کر اندر جھانکا۔ دونوں لئیق شاہ کو دبوچے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے، کہیل دادا لپک کر دائیں جانب ہو گیا۔ دونوں لئیق شاہ کو لیے باہر نکلے تو عقب سے کہیل دادا قیامت بن کر ان پر ٹوٹا۔ ایک کی کمر پر لات رسید کر ڈالی دوسرے کی گردن کے پچھلے حصے میں رائفل کا کندا بڑے زور سے رسید کیا تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں کے لیے یہ حملہ اچانک اور غیر متوقع تھا، جسے لات رسید کی تھی وہ بری طرح تڑپ کر کئی قدم دور تک لڑکھڑایا تھا اور زمین پر لڑھکنیاں کھاتا چلا گیا تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری تھی، دوسرے کی گردن رائفل کے کندے کی ضرب نے دہری کر دی تھی، اس نے البتہ سنبھلنے میں پھرتی دکھانی چاہی تھی مگر کہیل دادا نے دوسرا وار اس کے چہرے پر کیا تھا اور اس کا جبڑا چٹخا دیا تھا۔ لئیق شاہ نڈھال ہونے کے باوجود کہیل دادا کی مدد میں حرکت میں آیا اور چلا کے پہلے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیل دادا سے بولا۔

”اسے سنبھالو... وہ رائفل کی طرف بڑھ رہا ہے۔“

اس کے بعد وہ اپنے شکار کی طرف متوجہ ہوا اور زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا، کہیل دادا نے پہلے والے شکار کو دیکھا جو زمین پر لیٹے لیٹے قریب پڑی رائفل کی طرف کھسک رہا تھا، قریب پہنچ کر کہیل نے اس کے چہرے کو ٹھوکروں پر رکھ لیا پھر اس کی رائفل اٹھا کر پرے پھینک دی۔ دوسرے شکار کی طرف پلٹا جس سے لئیق شاہ نبرد آزما تھا تو چونک پڑا۔ زخمی اور نحیف ہونے کے باوجود لئیق شاہ اپنے زخمی مضروب شکار کو زمین بوس کیے اس کے سینے پر چڑھا اس کا گلا دبوچ رہا تھا جب تک کہیل دادا قریب پہنچا، وہ اسے ختم کر چکا تھا۔ مگر لئیق شاہ کا غیظ کم نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر وہ پُرغضب جوش بھرا تھا جو وہ اپنے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا۔

”یہ ختم ہو چکا؟ چل اٹھ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ ان کے اور ساتھی بھی یہاں پھیلے ہوئے ہیں۔“ کہیل دادا نے کہا تو لئیق شاہ سنبھلا۔ اچانک کہیل دادا کو لالاں کا خیال آیا۔ لئیق شاہ سے اس کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ وہ اندر نیم بے ہوش پڑی تھی۔

”اسے ہوش آ جائے گا چلو ہم نکلتے ہیں۔“ کہیل نے کہا۔

لئیق شاہ بولا۔ ”نہیں، دشمن اس عورت کو ہمارا ساتھی سمجھیں گے اب... وہ اسے نہیں چھوڑیں گے، اس کی جان خطرے میں ہے۔“

”یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ معاً ملگجی سی تاریکی میں عقب سے آواز ابھری۔ دونوں چونک کر مڑے ان کے عقب میں لالاں کھڑی تھی، بکھرے بالوں اور مسلے ہوئے کپڑوں کے ساتھ... لالاں کو جانے کب ہوش آ چکا تھا..... وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے گھر کے دروازے سے لگی کھڑی ان کی لڑائی دیکھ رہی تھی۔ ”میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی... یہاں میرا کون ہے بھلا۔ جو تھا وہ مر چکا۔ صبح ہونے والی ہے تم مجھے لاری اڈے پر اتار دو یا پھر مین روڈ پر... میں کسی بس میں بیٹھ کر لاہور نکل جاؤں گی۔ وہاں میرے کچھ قریبی عزیز رہتے ہیں۔“

”جلدی کر پھر کڑیے اس تھوڑے سے وقت کو بہت جان اور اپنا ضروری سامان سمیٹ لے۔“ کہیل دادا نے فوراً اس سے کہا پھر لئیق شاہ کو سنبھالے اپنی کار کی طرف بڑھا۔ اسے عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔ اس کے بعد اپنا پستول قبضے میں کیا جو اسے ایک شکار کی تلاشی لینے کے بعد مل گیا۔ لالاں نے روانگی کی تیاری میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی، ایک ٹین کا بکس اور کپڑے کی بڑی سی گٹھڑی اس نے سنبھال رکھی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اگلے چند منٹوں میں یہ تینوں کار میں روانہ ہو گئے۔ لالاں کو مین روڈ کے بجائے لاری اڈے پر ہی اتارنا پڑا تھا۔ ایک جوان اور بے خانماں عورت کے لیے یہی قدرے محفوظ جگہ تھی، پھر کار میں اتنی جگہ بھی نہ ہوتی کیونکہ آگے اسے اپنے زخمی ساتھی جہانگیر کو بختیار علی کے گھر سے لینا تھا۔ کبیل دادا نے چند بڑے نوٹ لالاں کو تھما دیے تھے۔ پھر کار کا رخ نئے پنڈ کی طرف موڑ دیا۔ دشمنوں سے اب بھی کسی مقام پر ٹاکرا ہونے کا خطرہ ممکن تھا۔ مگر کبیل دادا اپنے ساتھی کو یہاں دشمنوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ کے جانا چاہتا تھا۔

منہ اندھیرے ہی وہ بختیار علی کے گھر جا پہنچا۔ جہانگیر کی طبیعت کچھ بہتر تھی مگر اب بھی اسے طبی امداد کی ضرورت تھی۔ بختیار علی اپنے یار لئیق شاہ کو اس حیثت کذائی میں دیکھ کر دکھی ہو گیا تاہم اس نے کبیل دادا کی بہادری کی تعریف بھی کی، پھر یہ لوگ وہاں زیادہ دیر نہیں رکے، تاہم روانہ ہوتے وقت بختیار علی نے کبیل دادا کو نئے پنڈ سے بحفاظت نکلنے کا ایک نسبتاً محفوظ راستہ بھی سمجھا دیا جہاں دشمن سے مڈبھیڑ ہونے کا خطرہ نسبتاً کم تھا۔ کبیل دادا نے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔

دن کی روشنی پھیلنے تک بالآخر یہ لوگ بہ خیر و عافیت بیگم ولا پہنچ گئے۔

کبیل دادا چشم تصور میں... بیگم صاحبہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا کہ جب وہ لئیق شاہ کو زندہ سلامت دیکھے گی تو کس قدر مسرتیں ان کے پژمردہ چہرے پر امڈ آئیں گی اور یہی ہوا۔ جب کبیل دادا نے لئیق شاہ کو وہاں لانے کا اپنا وعدہ ایفا کیا تو لئیق شاہ کو اپنی چھت کے نیچے زندہ سلامت دیکھ کر پہلے تو زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا۔ پھر جیسے وہ لئیق شاہ کی حالتِ زار دیکھ کر ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا اور لئیق شاہ سمیت جہانگیر کی تیمارداری کا حکم جاری کر دیا۔

”کبیل دادا! تم واقعی دادا ہو... آج میں اپنے انتخاب پر کھل کر فخر کرتی ہوں۔ جب میں نے تمہارے باپ منشی فضل محمد کے ساتھ تمہیں دیکھا تھا اور تمہیں اپنے گروہ کی تشکیل دینے کی ابتدا میں ایک مضبوط، جی دار اور جاں نثار ساتھی کے روپ میں شامل کیا تھا۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتی اور مجھے طیبے نے یہ بھی بتایا تھا کہ کس طرح تم نے یہاں سے نئے پنڈ پہنچتے ہی خلوصِ نیت اور دانش مندی کے ساتھ لئیق شاہ کا کھوج لگایا تھا۔“

ایک موقع پر زہرہ بانو نے کبیل دادا کی کھلے دل سے تعریف و توصیف کر ڈالی تو کبیل دادا اپنی مسکراہٹ کی تہ میں ایک حسرت زدہ سی کسک دبائے ہوئے بولا۔

”نہیں بیگم صاحبہ! میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا اور پھر احسان کیسا، بھلا ملازم بھی مالکوں پر کوئی احسان کرتے ہیں؟“

کبیل دادا نے آخری بات نظریں جھکا کر کہی تھی اور اس میں ایک... درد چھپا ہوا تھا۔ کبیل دادا نے یہ آخری بات کچھ ایسے انداز میں کہی تھی کہ ایک محض چند ثانیوں کے لیے بیگم صاحبہ کے دل کو رمزیہ اشارہ سا کرتی محسوس ہوئی، جس کی ان کے پاس کوئی توجیہہ۔ کوئی تاویل نہ تھی... زہرہ بانو کے سینے میں دھڑکتے دل کی مخصوص ردھم لمحے بھر کو... چوکی ضرور تھی اور پھر سب نارمل ہو گیا۔

زہرہ بانو کی اس لمحے بھر کی سوچتی خاموشی نے کبیل دادا کو بھی تھوڑا اٹھکا دیا۔ جب اس نے نظر اٹھا کر زہرہ بانو کی طرف دیکھا تو یکلخت کبیل دادا کو اپنا دل مٹھی میں جکڑتا محسوس ہونے لگا۔ زہرہ بانو بڑی گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالے ہوئے تھی، یکا یک کبیل دادا کے دل و دماغ میں بجلی جیسا ایک نامعلوم سا ازلی خوف جاگا... جیسے اب اچانک سب کچھ ختم ہونے والا ہو... وہ اس کے دل کا وہ حال جاننے لگی تھی جو وہ اب تک اس خوف اور ڈر سے اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا کہ اگر وہ ”بیگم صاحبہ“ پر آشکارا ہوا تو وہ چشم زدن میں نہ صرف اسے خود سے دور کر دیں گی بلکہ تاعمر اس کا چہرہ دیکھنا بھی گوارا نہ کریں گی۔ یہ سوچ کر وہ لرز گیا۔ اور پھر جلدی سے بات بدلنے کی غرض سے بولا۔

”بیگم صاحبہ! اب لئیق شاہ کو قانون سے بچانے کی بھی ہمیں جلد ہی کوئی تدبیر کرنا ہوگی، ایسا نہ ہو دشمن دوسری چال چلنے کی کوشش کرے۔“

”ہاں۔“ زہرہ بانو نے ایک مختصر سی مگر گہری ہنکاری بھری۔ ”میں اس کا بندوبست کر چکی ہوں۔ تمہاری غیر موجودگی میں... انسپکٹر جہانزیب سے بھی رابطہ کر چکی ہوں۔ اس نے نہ صرف بھرپور تعاون کا وعدہ کیا ہے بلکہ وہ مجھے یہ بات بھی بتا چکا ہے کہ وہ سینٹرل پولیس میں ممتاز خان کے مجھ پر قاتلانہ حملے اور اس کی گرفتاری بعد میں ممتاز خان کی ضمانت پر رہائی کی رپورٹ ریکارڈ کے طور پر بہت پہلے جمع کرا چکا ہے۔ اب میرا وکیل ریکارڈ کیپر سے وہ کاپی حاصل کر لے گا۔“

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے بیگم صاحبہ۔“ کبیل دادا بولا۔ ”اس طرح تو ممتاز خان خود ایک مقدمے کا شکار بھی ہو سکتا ہے اسے پھر یقیناً لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“

"ہاں، لیکن اگر ایسا ہوا تو میں شاید ممتاز خان کے کیس کو زیادہ نہ کھینچ سکوں... البتہ یہ ہوگا کہ لئیق شاہ کی جان چھوٹ جائے گی پولیس سے۔" زہرہ بانو کی بات پر کہیل دادا نے چونک کر پوچھا۔

"کیوں بیگم صاحب! آپ ایسا کیوں کریں گی؟" پھر جیسے وہ اپنے تئیں زہرہ بانو کی بات کا مطلب سمجھ گیا اور خود ہی اس کا جواب بھی دے ڈالا بولا۔ "شاید آپ ایسا اس لیے کہہ رہی ہیں کہ وہ آپ کا سوتیلا بھائی ہے؟"

"نہیں۔" زہرہ بانو نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "یہ بات نہیں۔ چودھری ممتاز تو مجھے اپنی سوتیلی بہن کا... بلکہ سرے سے بہن کا ہی درجہ نہیں دیتا ہے۔" یہ بتاتے ہوئے زہرہ بانو کے چہرے پر تلخی کے آثار ابھرے تھے۔ کہیل دادا نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تو پھر کیا وجہ ہے اس کی بیگم صاحب... کہ آپ..." اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو زہرہ بانو نے کہا۔

"چودھری الف خان، میں انھیں بہرحال اب بھی باپ کا درجہ دیتی ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے بھی مجھے آج تک اپنی اولاد ہی سمجھا... مگر کب تک؟ یہ سب تب تک ہی رہا جب امی جان (ستارہ بیگم) زندہ رہیں... اس کے بعد سب پھیکا پڑ گیا۔"

"تو اس کا مطلب ہے آپ وڈے چودھری کی وجہ سے ممتاز خان کے خلاف لمبا مقدمہ نہیں کھینچ سکتیں؟"

"ہاں، کہیل دادا! تم ٹھیک سمجھے۔"

"لیکن بیگم صاحب! آپ یہ بھی تو دیکھیں، وہ لا چودھری ممتاز آپ کا اس وقت جانی دشمن بنا ہوا ہے۔" کہیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر تشویش سے کہا۔ "وہ آپ کو خدانخواستہ جانی نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ..."

"میں اپنے حصے کی زمین و جائداد اس کے نام لکھ دوں۔" زہرہ بانو نے کہیل کی جیسے بات مکمل کر ڈالی۔ "میں یہ سب کچھ کر بھی لیتی لیکن اب نہیں کروں گی۔ مجھے ایسی جائداد اور دولت سے تو اس دن ہی نفرت ہو گئی تھی، کہیل دادا... جب اس کی وجہ سے پہلے میری امی جان "سینہ دور سازش" کا نشانہ بنی تھیں اور بالآخر ان کی موت کا سبب بھی بنی، انھیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ میں مہر النسا اور ممتاز خان کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی حاصل کر چکی تھی، مگر پھر اپنے باپ الف خان کی وجہ سے میں نے اپنی ماں کا خون ضائع جانے دیا۔ اسی سبب میرا اب نئے پنڈ سے بھی دل خراب ہو گیا ہے۔" کہیل دادا اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وقت، حالات کی گردش اور زہرہ بانو کی سنگت میں گزرے ہوئے دنوں کی سنگین و خوں ریز وارداتوں نے اسے بھی کچھ ایسی سوجھ بوجھ عطا کر ڈالی تھی۔ زہرہ بانو کی ایک بات پر ذرا الجھ سا گیا تھا۔ وہ اب اس سلسلے میں اندر ہی اندر غور کر رہا تھا۔

"کیا سوچنے لگے کہیل دادا؟" معاً ہی زہرہ بانو کو بھی اس کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات نے یک دم چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ نہ جانے اس بات کا اندازہ بیگم صاحب کو تھا بھی کہ نہیں اور اگر نہیں تھا تو اسے انہیں احساس دلانا چاہیے تھا۔

"بیگم صاحب! ایک بات آپ کی میرے لیے کچھ الجھن کا باعث بن رہی ہے۔" بالآخر اس نے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"کہیل دادا... مت بھولو کہ تم اب میرے دائیں بازو کی حیثیت اختیار کر چکے ہو، گروہ میں میرے بعد تمہاری ہی حیثیت ہے اور تمہارا ہی حکم چلتا ہے۔ اس لیے اگر مجھ سے بھی تمہارے دل میں کسی بات پہ اختلاف ہوتا ہے تو بلا جھجک اس کا اظہار کر دیا کرو خواہ وہ بات مجھ سے متعلق ہو یا لئیق شاہ سے..."

زہرہ بانو کی اس بات نے کہیل دادا کا سیروں خون بڑھا دیا۔ سارے اختیارات ایک طرف تھے، مگر لئیق شاہ پہ بیگم صاحب کا کہیل دادا کو اختیار دینا ایک طرف تھا۔ زہرہ بانو کی اس بات نے کہیل دادا کو ایک ایسا مان دیا تھا کہ اس کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اور یہ مان اسے ایسے ہی نہیں ملا تھا مگر وہ کسر نفسی سے بولا۔

"بیگم صاحب! آپ... آ... آپ نے تو مجھے بڑا مان دے دیا۔ میری اوقات سے بھی شاید بڑھ کر..."

"کہیل دادا! تمہاری کیا حیثیت ہے یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم سچے، وفادار اور جاں نثار ساتھیوں کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ ایسے ساتھی جو اپنے ذاتی مفادات سے ہٹ کر دوسرے کے لیے سوچتے اور کرتے ہیں... کیا کہنا چاہتے تھے تم؟" زہرہ بانو نے آخر میں اس کی طرف دیکھا۔

"بیگم صاحب! آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ اگر آپ لئیق شاہ کا کیس جیت جاتی ہیں انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا بھی... پھر چودھری ممتاز خان کو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے یعنی ان کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ لیکن آپ شاید وڈے چودھری (الف خان) کی وجہ سے ممتاز خان

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے خلاف مقدمے کو طول نہ دیں اور محض لئیق شاہ کی قانونی بریت تک اپنی لڑائی محدود رکھیں۔ تو کیا اس طرح لئیق شاہ کا آپ سے دل خراب نہیں ہو جائے گا؟ کیونکہ ممتاز خان بہرحال... اس کے بوڑھے ماں باپ کا قاتل ہے اور وہ کسی صورت یہ نہیں چاہے گا کہ ممتاز خان کو معاف کر دیا جائے۔"

کبیل دادا نے اپنی بات ختم کر کے بہ غور زہرہ بانو کے چہرے کو دیکھا جو اس کی بات پر لمحہ بھر کو تاریک سا پڑ گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولی۔

"ہاں، ہمارے ذہن میں بھی یہ خدشہ آیا تھا۔ لئیق شاہ ہماری طرف سے کسی ایسی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے اور ایک بار پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ لیکن وقت اور حالات نے اسے بعد میں خود ہی بہت سی تلخ حقیقتوں کو زہر کا پیالہ سمجھ کر پینا سکھلا دیا تھا شاید اس بار بھی ایسا ہی ہو۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر اسے بتانے کی ضرورت ہی کیا بیگم صاحبہ؟" کبیل دادا نے ایک مشورہ دینا چاہا۔

"کیا مطلب؟" زہرہ بانو نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم لئیق شاہ کے لیے اتنا کچھ کر چکیں گے کہ اس کے لیے یہی کافی ہو گا۔ پھر وسیم عرف جھیما کو بھی وہ ہلاک کر چکا ہے۔ ممتاز خان کی طاقت سے وہ بھی اچھی طرح واقف ہے بقول آپ کے جب ممتاز خان پر کیس بھاری پڑنے لگے گا تو اپنا ہاتھ خود ہی ہولا کر دیں گے، وہ اپنے اثر و رسوخ اور دولت کے بل پر خود کو چھڑا لے گا۔ تو یہ ایک منطقی بات ہو گی، اس طرح آپ سے اس کا دل بھی خراب نہ ہو گا۔ مقصد یہ کہ اسے بتانے کی ضرورت ہی نہ ہو گی کہ آپ نے وڈے چودھری کی وجہ سے ممتاز خان کو معاف..."

"ہرگز نہیں۔" معاً زہرہ بانو اس کی بات کا مطلب سمجھ کر یک دم بولی۔ "اس طرح ہم لئیق شاہ سے حقیقت چھپائیں گے تو ہماری طرف سے اس کے دل میں غلط فہمی مزید بڑھ جائے گی۔ بلکہ کوئی بعید نہیں کہ وہ ہم سے متنفر بھی ہو جائے۔" ذرا توقف سے وہ پھر گویا ہوئی۔

"لئیق شاہ کو بھی ہماری طرح یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا۔ آخر کو ہم نے بھی تو اپنی ماں کا خون ممتاز خان اور اس کی ماں مہرالنسا کو معاف کر رکھا ہے... وہ اپنے شوہر کی وفادار ہی تھیں ساری عمر... اپنی ذات پر ہر بھاری پتھر انہوں نے برداشت کیا تھا مگر شوہر کی عزت و آن پہ آنچ تک نہیں آنے دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بابا جانی نے بھی امی جان کے ساتھ ہر وعدہ نبھایا تھا۔ وہ آخری وقت تک امی جان کی محبت کا دم بھرتے رہے تھے۔"

کبیل دادا چند ثانیے خاموش رہا پھر آخر میں بولا۔

"میں تو یہی دعا کرتا ہوں کہ آگے کے معاملات بہ خیر و خوبی طے پا جائیں، ایک حقیقت میں آپ کو اور بتاتا چلوں بیگم صاحبہ کہ وہ بدنصیب اور غریب بوڑھے میاں بیوی... لئیق شاہ کے حقیقی ماں باپ نہیں تھے۔" اس کے بعد کبیل دادا نے بختیار علی سے حاصل کردہ لئیق شاہ کے ماضی سے متعلق ایک حد تک معلومات زہرہ بیگم سے گوش گزار کر دیں۔ یہ انکشاف بلاشبہ زہرہ بانو کے لیے بھی چونکا دینے والا ہی تھا۔

بہرحال... تھوڑی دیر مزید اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد زہرہ بانو اٹھ کر لئیق شاہ کے کمرے میں آ گئی۔

زہرہ بانو کا اپنا کمرا بالائی منزل پر تھا۔

لئیق شاہ اور جہانگیر کی طبی امداد کے سلسلے میں ایک پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر کو اعتماد میں لے کر علاج معالجے کا بندوبست پہلے ہی کیا جا چکا تھا جس کے تحت لئیق شاہ کافی بہتر نظر آ رہا تھا۔ باقی طبیعت وقت کے ساتھ ساتھ ہی بہتر ہونا تھی، اس کی امید بھی مذکورہ ڈاکٹر نے زہرہ بانو کو دی تھی۔

لئیق شاہ اس وقت آرام دہ کشادہ بیڈ پر دراز تھا اور زہرہ بانو دروازے پر کھڑی یک ٹک اسے تکے جا رہی تھی۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں درد کے سائے ابھرے اور خدشات کی آندھی اسے اندر سے کھدیڑنے لگی۔ "لئیق شاہ! میں نے بڑی مشکلوں سے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ اب ڈرتی ہوں حالات اور وقت نے تمہیں مجھ سے دور کر دیا تھا مگر تقدیر پھر تمہیں میرے پاس لے آئی ہے کہیں ایسا تو نہ ہو گا ایک ذرا غلط فہمی کی آندھی پھر تمہیں مجھ سے جدا نہ کر دے۔ اگر ایسا ہوا لئیق شاہ! تم مجھ سے پھر دور ہو گئے تو میں بھی خود سے دور ہو جاؤں گی اور شاید زندگی سے بھی... اس لیے کہ عورت زندگی میں صرف ایک بار ہی کسی کو اپنا دل دیتی ہے اور جس کو اپنے خانۂ دل کے سنگھاسن پر بٹھاتی ہے پھر اس کی جگہ دوسرا کوئی نہیں لیتا۔ کاش! تم وقت سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھ سکو... کاش!" یہ سوچتے ہوئے زہرہ بانو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

مذکورہ ڈاکٹر نے اسے آرام کا مشورہ دیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ خاموشی سے واپس لوٹ آئی۔

☆☆☆

ایڈووکیٹ نسیم پراچہ سے صلاح مشورے کے بعد اس نے لئیق شاہ کی سب سے پہلے قبل از گرفتاری ضمانت کروالی۔ انسپکٹر جہانزیب اور پرانے داخل دفتر ریکارڈ کی خاطر خواہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

اور تھرو پراپر چینل کے ذریعے ری اوپننگ کے بعد ممتاز خان کے خلاف کیس مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ عدالت نے چودھری ممتاز کی گرفتاری کے احکامات تک جاری کر دیے۔ یہ ایام بڑی دوڑ دھوپ اور زبردست کشاکشی میں گزر رہے تھے اور جلد سے جلد کرنے کے متقاضی بھی تھے کیونکہ لئیق شاہ... اس وقت بیگم ولا میں تھا اور ممتاز خان کسی بھی وقت کوئی نیا گل کھلا سکتا تھا۔

پھر وہ نازک مرحلہ بھی آیا جب زہرہ بانو... اپنے قابل وکیل نسیم پراچہ کے ذریعے ممتاز خان اور اس کی ماں مہرالنسا کے خلاف مزید کیس کھول کر دونوں ماں بیٹے کو قانون کی چکی میں پیس کر رکھ دیتی مگر ایسے میں پھر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنی مرحومہ ماں ستارہ بیگم کا چہرہ رقصاں ہونے لگا۔ “زہرہ بیٹی! الف خان نے میرے ساتھ ہر وعدہ نبھایا تھا، اس نے مجھے کوٹھے سے ایک گھر کے چراغ کی زینت بنایا تھا۔ میرے ساتھ ایک باعزت رشتہ استوار کیا تھا۔ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی حویلی لا کر ایک مقام دیا تھا۔ اپنے خاندان کے ساتھ ہمارا رشتہ جوڑا تھا۔ اور رشتے کو آخر تک برقرار بھی رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اپنے شوہر کے خاندان کی عزت اس کی آن کو اپنی شان سمجھنے لگی تھی۔ اپنی ذات پر سب کچھ سہہ لیا مگر اپنے وفادار شوہر کی آن بان پر آنچ تک نہ آنے دی۔ تو اب کیا تم میری خان جی کے ساتھ کی وفاداریوں کو گہنا دو گی؟ وہ کیا سوچیں گے؟ نہیں زہرہ بیٹی... نہیں، انھیں ایسا درد نہ دینا۔ وہ پہلے ہی میری دائمی جدائی کا درد لیے ہوئے ہیں۔”

یہ سب سوچتے ہوئے زہر بانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے وکیل کے ذریعے ہی معافی نامہ لکھ کر عدالت میں پیش کر دیا۔ اس صلح نامے بالفاظ دیگر راضی نامے کے سبب عدالت نے ممتاز خان کو باعزت بری کر دیا تھا۔

دوسرے دن بیگم ولا میں ایک بھونچال سا آ گیا۔ جب زہرہ بانو وغیرہ کو خادموں نے بوکھلاتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ تتے پنڈ سے وڈے چودھری (الف خان) تشریف لائے ہیں۔ زہرہ بانو تڑپ اٹھی۔ وہ اس کا باپ نہیں تھا مگر سگے باپ کی طرح ہی الف خان نے اسے پیار دیا تھا۔ روبہ صحت ہونے کے بعد وہ شاید آج پہلی بار ہی حویلی سے نکلے تھے۔ ان کی آمد پر... زہرہ بانو کو کچھ خوف کا احساس بھی ہوا تھا۔ یہ خوف ایک احترام کے پیشِ نظر تھا مگر حقیقت مختلف تھی جب چودھری الف خان نے زہرہ بانو کو دیکھتے ہی آبدیدہ آنکھوں سے اسے اپنے ساتھ لگا کے محبت و شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگے اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

“بیٹی! تو نے خود اپنی طرف سے معافی نامہ اور صلح نامہ داخل کر کے میری عزت بچالی۔ میں تیرے دکھوں سے واقف ہوں مگر اپنی بدنصیبی اور بے بسی پر روتا بھی ہوں۔ سب جانتا ہوں میں، یہ سب تیری ماں کے ساتھ بھی ہوا کرتا تھا۔ مگر آفرین ہے اس عظیم عورت پر اس نے کبھی مجھے کسی دکھ یا پریشانی میں مبتلا نہیں کیا۔ سب کچھ اپنی ذات پر سہتی رہی وہ... اور آج... آج... اس کی بیٹی بھی ایک ایسے آدمی کے لیے وہی کچھ کر رہی ہے جو اس کی اولاد بھی نہیں... مگر اللہ گواہ ہے بیٹی! میں نے تمہاری ماں ستارہ سے وعدے کے مطابق اس دن تمہیں اپنی بیٹی کا درجہ دے ڈالا تھا جب وہ میری دلہن بن کر حویلی میں آئی تھی اور تم اس کی گود میں تھیں۔”

زہرہ بانو تڑپ گئی، اپنا آنسوؤں بھرا چہرہ چودھری الف خان کے پُرشفیق سینے پر رگڑتے ہوئے دردانگیز لہجے میں بولی۔

“بابا جانی! میں جانتی ہوں آپ نے کبھی مجھے سوتیلے پن کا احساس نہیں ہونے دیا۔ امی جان کی وفات کے بعد میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ ایک بیٹی کی طرح آپ کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر بعض مصلحتوں کی وجہ سے مجھے حویلی چھوڑنا پڑی۔ اس لیے کہ میری وجہ سے آپ کے گھر آپ کے خاندان کی فضا مزید تلخ نہ ہو۔”

“مگر بیٹی! تم نے دور رہتے ہوئے بھی ہمارا خیال رکھا۔ کبھی کبھی ہمیں احساس ہوتا ہے جیسے میں تمہاری ماں کا ہی نہیں تمہارا بھی مجرم ہوں۔ ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔” چودھری الف خان نے کہا۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ گیا۔

زہرہ بانو کو یوں لگا جیسے اس کے سر سے... اس کے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا ہو مگر چودھری الف خان کے جاتے ہی... زہرہ بانو کو ایک پہاڑ جیسے بار نے جکڑ لیا۔ جب اس نے لئیق شاہ کو اپنے رُوبرو دیکھا۔ وہ اس کی طرف گم صم نظروں سے تکے جا رہا تھا۔ یکلخت زہرہ بانو کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے ایک بار پھر تقدیر اسے بڑے امتحان میں ڈالنے والی ہے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن
جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 13

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وقت کو جیسے موت آ گئی تھی اور سانسوں کی بازگشت کی طرح گھڑیاں بھی گویا تھم گئی تھیں۔ کمرے کی فضا دم بخود سی تھی۔ چار نگاہیں ایک دوسرے پر ٹکی تھیں اور ان میں شکایت بھی تھی اور حکایت بھی، گلے بھی تھے، شکوے بھی، تاویلیں بھی اور توجیہات بھی۔ کمرے کی ساکت فضا میں البتہ دو مجبور دلوں کی متوحش سی "دھک... دھک" ساعتوں میں ضرور گونجتی محسوس ہو رہی تھی... لگتا یوں تھا کوئی بڑا طوفان آنے والا ہو اور وقت جیسے بُری گھڑی کی طرح ان کے سروں پہ مسلط ہو گیا تھا۔

لئیق شاہ کی سناٹے دار نظریں سامنے سراپا فریاد بنی...... زہرہ بانو پر جمی ہوئی تھیں اور خود زہرہ بانو کی نگاہیں لئیق شاہ پر اس طرح ٹھہری گئی تھیں جیسے وہ زہرہ کو اپنے کسی "کڑوے" فیصلے سے آگاہ کرنے والا ہو اور پھر یکلخت کمرے کی تھمی تھمی فضا میں ایک "آہ" سے مشابہ ہمکاری اُبھری تھی۔ اس کے بعد لئیق شاہ نے نظریں جھکا لیں اور بہت ہولے سے بولا۔

"بیگم صاحب! کیا مجھے یہاں سے جانے کی اجازت ہے؟"

لئیق شاہ کے فقط ایک اس جملے میں زہرہ بانو کو ننگی تلواروں کی جھنکار سنائی دی تھی... اس کے اجنبی سے لہجے پر وہ جی جان سے تڑپ گئی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تیرتی نمی یک دم اُبھر آئی۔ خود پر قابو پاتے ہوئے زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم یہاں سے جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"میں شاید اب آپ کا ملازم نہیں رہا ہوں۔"

"تم میرے ملازم تھے ہی کب؟"

"کاش میں آپ کا ملازم ہی ہوتا... پھر شاید مجھے اتنا دکھ نہیں ہوتا... مگر بیگم صاحب! آپ نے تو مجھے اپنا بنا کر میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے، میں اس دھوکے کو کیا نام دوں، یہ مجھے نہیں پتا مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ آج میری آنکھیں آپ کو اور اپنے دشمن چوہدری ممتاز خان کو ایک ہی قطار میں دیکھ رہی ہیں۔"

سیسے جیسے جلتے سُلگتے جملے زہرہ بانو کی زخمی ساعتوں میں اُترنے لگے۔

"...اور ہاں بیگم صاحب! میں آپ کا مشکور تو رہوں گا ہی کہ آپ نے مجھے کمیل دادا کے ذریعے دشمنوں سے رہائی دلوائی... اگرچہ اس میں بھی آپ کا کوئی ذاتی مفاد ہی ہو سکتا ہے... لیکن... بہر حال... آپ کا شکریہ۔"

لئیق شاہ یہ کہہ کر وہاں سے چلا گیا... زہرہ بانو جیسے اپنی جگہ بت بنی رہ گئی، شدتِ غم سے اس میں تو بولنے کا بھی یارا نہ تھا، بولنا تو کجا اسے اپنے آپ کا بھی ہوش نہ رہا۔

زہرہ بانو کو یکا یک چکر سا آنے لگا اور پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اسی وقت جب لئیق شاہ کمرے سے تیزی سے نکل کر باہر جا رہا تھا تو اس کا کمیل دادا سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا... وہ ایک لمحے کو رکا، پھر کچھ سوچتے ہوئے اندر لپکا تو بری طرح ٹھٹکا۔ زہرہ بانو اپنا سر تھامے کسی قریبی صوفے پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور ایسے میں کوئی لمحہ جاتا کہ وہ فرش پر جا گرتی، کمیل دادا نے بہ سرعت "بیگم صاحب" کہتے ہوئے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

بیگم صاحب کے بے سدھ پڑتے نرم و نازک وجود کو تھام کے کمیل دادا کو یوں لگا جیسے کوئی شاخ گل اس کے ہاتھوں میں آ گئی ہو، زہرہ بانو کے پھول جیسے بدن کے نرم و لطیف لمس نے ایک لمحے کو کمیل دادا کے حواسوں کو جکڑا تھا، مگر صرف ایک پل، اس کے بعد ہوش و خرد کا یارا ہوا اور اس نے زہرہ بانو کو آہستگی کے ساتھ صوفے پر بٹھا دیا... پھر جلدی سے پانی کا گلاس اس کے لرزتے لبوں سے لگا دیا۔ چند گھونٹ پانی کی برودت کے، سوکھے پڑتے حلق کو تر کر گئے تو زہرہ بانو کو کچھ بولنے کا یارا ہوا اور گویا لب ترساں نے حسرت زدہ الفاظ اُگلے۔

"گک... کمیل! وہ... وہ... لل... لئیق شاہ... چلا گیا۔"

"تو کیا ہوا بیگم صاحب؟ آ جائے گا دوبارہ۔" کمیل دادا نے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو زہرہ بانو لرزتی آواز میں بولی۔

"وہ... ناراض ہو کے گیا ہے مجھ سے... شش... شاید ہمیشہ کے لیے... آہ... وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔" کہتے ہوئے زہرہ بانو کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ کمیل دادا یک دک سا رہ گیا اور دیوانوں کی طرح زہرہ بانو کو پکارنے لگا۔

"بب... بیگم صاحب... بیگم صاحب... ہوش میں آئیں۔" اس کے چہرے پر تشویش کے سائے یکدم گہرے ہوتے چلے گئے۔ اس نے دیکھا زہرہ بانو کا حسین چہرہ ایکا ایکی پیلا زرد پڑ گیا اور جسم برف کی طرح ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اس نے چلا چلا کر دیگر لوگوں کو بلا لیا اور خود جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔ ایک خادمہ زہرہ بانو کے ہاتھوں پیروں کی مالش کرنے لگی۔ ذرا دیر بعد ڈاکٹر بھی آ گیا، اس نے تفصیلی معائنے کے بعد بتایا کہ زہرہ بانو کو کسی بات پر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شدید "شاک" پہنچا ہے، لہٰذا انہیں فوراً اسپتال منتقل کرنا ہوگا۔

یہ سننا تھا کہ پورے "بیگم وِلا" میں کھلبلی مچ گئی۔

زہرہ بانو کو کمیل دادا نے فوراً ایک قریبی اچھے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کروا دیا۔ چند ساتھی اور دو عدد ملازمائیں کمیل دادا نے وہاں تعینات کر دیے... پھر جب زہرہ بانو کی حالت قدرے خطرے سے باہر ہوئی تو کمیل دادا غصے میں لئیق شاہ کو تلاش کرنے نکل پڑا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، صاف نظر آتا تھا کہ وہ لئیق شاہ سے بھڑنے کے لیے جا رہا تھا۔

آندھی طوفان کی طرح کار دوڑاتا ہوا وہ نئے چند پہنچا اور سیدھا لئیق شاہ کے ڈیرے کا رخ کیا۔ لئیق شاہ ابھی تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ لئیق شاہ کو بیگم ولا سے نکلے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور لئیق شاہ کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا، تب پھر اچانک اس کے ذہن میں ایک نام اُبھرا... "بختیار علی" جو اس کا گہرا دوست تھا، ممکن ہے لئیق نے وہیں کا رخ کیا ہو؟ اس نے سوچا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا، وہاں پہنچا تو اسے دور سے ہی بختیار علی کے گھر کے باہر ایک بڑی سی مری کی چارپائی پر لئیق شاہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا دکھائی دیا۔

لئیق شاہ کو یوں بڑے آرام سے... اپنے دوستوں سے باتیں کرتے دیکھ کر کمیل دادا کے جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی...... وہ تیزی کے ساتھ ان کی طرف بڑھا اور چارپائی کے بالکل قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے کار کو بریک لگا دیے... گرد و غبار سا اُٹھا اور کمیل دادا بپھرا ہوا کار سے برآمد ہوا اور کسی طوفانی بگولے کی طرح لئیق شاہ کی طرف لپکا۔ بختیار علی... کمیل دادا کی یہ حرکت نہ سمجھ سکا، جبکہ لئیق شاہ کے بشرے پر بھی ایک ذرا سناٹے کی کیفیت طاری ہوئی تھی... پھر جب تک وہ کچھ سمجھنے یا سنبھلنے کی کوشش کرتا، کمیل دادا، لئیق شاہ پر بجلی بن کر ٹوٹا۔ اسے گریبان سے دبوچ کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور جوشِ غیظ میں کمیل خود بھی اپنا توازن کھو بیٹھا اور اس سمیت بھربھری مٹی والی زمین پر جا پڑا۔ بختیار سے ذرا کے ایک عدد ساتھی پلٹ کر چارپائی سے چھلانگ لگا کر پرے ہٹ گئے، جبکہ بختیار علی بیچ بچاؤ کے لیے آگے بڑھا۔ بجلی کی طرح اسے بھی حیرت تھی کہ آخر یہ کمیل دادا کو ہوا کیا ہے؟ یہ دونوں تو دوست تھے جبکہ کچھ دن پہلے ہی کمیل دادا اپنی جان پر کھیل کر اسے دشمنوں سے بچانے نکلا تھا اور کامیاب بھی رہا تھا، پھر اب یہ اس کی جان کا بیری کیوں بن گیا تھا؟

زمین پر گرتے ہی کمیل دادا لئیق کے سینے پر سوار ہو گیا اور اپنے آہنی ہاتھوں سے لئیق کی گردن دبوچنے لگا۔ ڈیل ڈول کے لحاظ سے دونوں ہی ایک دوسرے سے کم نہیں تھے مگر اس وقت بہ ظاہر کمیل دادا، لئیق شاہ پر حاوی ہوتا نظر آ رہا تھا۔ بختیار علی نے عقب سے کمیل دادا کو پکارتے ہوئے اس عمل سے باز رکھنے کی بھی کوشش کی تھی مگر کمیل دادا پر اس وقت خون سوار تھا۔ پھر اس نے اسی طرح لئیق شاہ کی گردن دبوچے ہوئے کھڑا کر دیا اور ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا... لئیق شاہ چند قدم پیچھے لڑکھڑایا، کمیل دادا نے آگے بڑھ کر غصے سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر دوسرا گھونسا لئیق شاہ کے چہرے پر رسید کیا، وہ پھر یہ وار بھی سہتے ہوئے چند قدم عقب میں لڑکھڑا گیا... کمیل دادا پھر آگے بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ لیا، اب بختیار کو بھی غصہ آ گیا، وہ کمیل کو دبوچنے کی غرض سے اس کی طرف بڑھا تو لئیق شاہ نے اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کر بختیار کو روک دیا۔

کمیل دادا، لئیق شاہ سے زہریلے لہجے میں بولا...

"تم، احسان فراموش انسان! تم نے بیگم صاحبہ کے احسانوں کا یہ بدلہ دیا کہ آج وہ تمہاری بےحسی اور خودغرضی کی وجہ سے اسپتال میں داخل ہو چکی ہیں... بولو... تم نے ان کے ساتھ ایسی کیا دل دکھانے والی باتیں کی تھیں؟"

لئیق شاہ کے خراش زدہ چہرے پر چند ثانیے کے لیے تفکر کی پرچھائیں نمودار ہوئیں.... پھر جب کمیل دادا نے ایک بار پھر گھونسا مارنا چاہا تو اس بار لئیق شاہ نے اس کی کلائی پکڑ لی... اور اسے ایک جھٹکے سے مروڑ کے کمیل دادا کو خود سے پرے دھکیل دیا اور چلّا کر بولا۔

"اب بس کمیل دادا! میں اب تک اس لیے نہ کہتا رہا کہ تمہارا مجھ پر احسان ہے... لیکن... اب میرا ہاتھ بھی اُٹھ جائے گا۔"

کمیل دادا کا غیظ و غضب کم نہیں ہوا تھا، اس نے وہیں سے ہی لئیق شاہ پر چھلانگ لگا دی اور اس کے چوڑے سینے سے ٹکرایا۔ بھاری بھرکم کمیل دادا کی ٹکر نے لئیق شاہ کے قدم تو زمین سے نہیں اُکھیڑے تھے مگر وہ اس طوفانی ٹکر کے باعث کئی قدم پیچھے کی جانب ضرور لڑکھڑا گیا تھا۔

"کمیل دادا! میں کہہ رہا ہوں اب بس کر دے۔"

لئیق شاہ اس کی طرف دیکھ کر گونج دار آواز میں بولا... مگر کمیل دادا کہاں بس کرنے والا تھا... اس کی طرف خون خوار نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں تجھے اسی طرح ٹھوکروں میں رکھ کر بیگم صاحبہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے قدموں میں لے جا کر پٹخوں گا، تاکہ انہیں بھی اچھی طرح تیری دو ٹکے کی اوقات کا اندازہ ہو جائے اور تو دوبارہ ان کی شان میں گستاخی کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔" وہ پھر جارحانہ انداز میں اس کی جانب لپکا، جبکہ کبیل دادا کی اس لفاظی پر اب لئیق شاہ کا دماغ بھی اُلٹ گیا تھا... چنانچہ جیسے ہی اس بار کبیل دادا غصے و نفرت سے دانت پیستا ہوا اس کی جانب لپکا... لئیق شاہ نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کر کے کبیل دادا کی پیش قدمی کو روک دیا اور اسی کوشش میں دونوں کے ہاتھوں کے پنجے ایک دوسرے میں اُلجھ گئے۔

دونوں کسی مضبوط چٹان کی طرح ایک دوسرے کے مدِمقابل تھے، دونوں کے سرخ پڑتے چہرے ایک دوسرے کی نظروں کے سامنے تھے اور آنکھوں میں...... خونخواری کی چمک جیسے لاوا اُگلتی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں کے پنجوں کو مروڑنے کی کوشش میں تھے۔ کبھی کبیل دادا، لئیق شاہ کو دھکیل کر چند قدم پیچھے کھدیڑ ڈالتا تو کبھی لئیق شاہ اسے دھکیل دیتا... مگر ایک دوسرے کے آہنی پنجوں سے گرفت کسی کی بھی کمزور نہیں پڑ رہی تھی... زمین پر دونوں کے بھاری بھرکم وجود کے "دھپا دھپ" گرنے کی آواز اُبھری... اور ایک بار پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ان کے حلق سے وحشیانہ غراہٹیں... برآمد ہو رہی تھیں کہ ٹھیک اسی وقت ایک آواز پر دونوں چونک پڑے، وہ کسی گاڑی کی آواز تھی... اور پھر ان دونوں کی سماعتوں سے بختیار کی چلاتی ہوئی آواز بھی ٹکرائی تھی۔

"ہوشیار... دشمن۔"

کبیل دادا اور لئیق شاہ یک دم بدک کر اُٹھے..... تب ہی انہوں نے دیکھا کہ ایک بغیر چھت والی جیپ ان سے ذرا فاصلے پر رکی تھی۔ اس کے اندر چار مسلح ڈھاٹا پوش افراد سوار تھے جبکہ پانچواں ڈرائیور تھا۔

"اندر بھاگو... میرے گھر کی طرف... جلدی۔"

بختیار پھر چیخا... لیکن شاید اب ان دونوں کے پاس وقت نہیں بچا تھا۔ جیپ کے اندر ہی سے ان چاروں افراد نے ان کی طرف فائر کھول دیے۔ بختیار کے خبردار کرنے پر کبیل اور لئیق خطرہ بھانپتے ہی اپنی لڑائی بھول کر خود کو بچانے کی تگ و دو میں لگے۔ لئیق شاہ نے بختیار کے گھر کے دروازے کی جانب چھلانگ لگائی تھی جبکہ کبیل دادا قریب کھڑی اپنی کار کی آڑ لینے کے لیے لپکا تھا۔ بگل بہت پہلے کہیں غائب ہو چکا تھا جبکہ بختیار احمد بھی اپنے گھر کا دروازہ پار کر چکا تھا... اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری تھی۔ دشمنوں نے یک بیک دونوں طرف گولیاں داغی تھیں... کچھ گولیاں دروازے میں پیوست ہو گئیں اور کچھ نے کبیل دادا کا تعاقب کیا تھا اور اس کے اپنی کار کی آڑ میں ہوتے ہی، گولیاں "تڑاتڑ" کی آوازوں سے کار کی باڈی میں پیوست ہو گئیں۔

وار خالی جاتے دیکھ کر دشمن جیپ سے اُتر آئے تھے۔ انہوں نے کبیل دادا کو نشانے پر رکھ لیا... اور پھر اس کی کار پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں، کبیل دادا کے لیے یہ نہایت ہی مخدوش صورت حال تھی۔ کیونکہ ایک تواتر سے کار پر گولیوں کا برسنا کسی وقت بھی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا... مگر اس کے پاس اور کوئی جائے پناہ بھی نہیں بچی تھی... جبکہ اس کا پستول کار کے گلوکمپارٹمنٹ میں پڑا تھا، اسے اُٹھانے کا کوئی موقع اس کے پاس تھا ہی نہیں... اِدھر گولیوں کی بارش سے کار کی باڈی جیسے مکھیوں کے چھتے کا نقشہ پیش کرنے لگی تھی۔

قرب و جوار میں شدید خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈرے سہمے لوگ اندر محبوس ہو گئے تھے۔ کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے لوگوں نے گھروں کے دروازے بھی بند کر لیے تھے۔

کبیل دادا نے اسی وقت زمین پر لوٹ لگائی اور کار سے دور ہوتا چلا گیا مگر اب وہ کسی وقت بھی گولیوں کی زد میں آ سکتا تھا... کیونکہ کار سے ہٹتے ہی اب دشمنوں کی گرجتی ہوئی گنز کا رخ اسی جانب ہو گیا تھا۔ کبیل دادا کو اپنی موت صاف نظر آنے لگی تھی اور اس کے چہرے پر سناٹے اُتر آئے تھے کہ دفعتاً ہی فضا میں ایک گڑگڑاہٹ سے مشابہ آواز اُبھری... جانے کہاں سے ایک ٹریکٹر جس کے آگے ایک بڑا سا بلیڈ لگا ہوا تھا... کبیل دادا اور دشمنوں کے بیچ میں آ گیا... اس کے ڈرائیونگ کیبن میں کبیل دادا کو لئیق شاہ بیٹھا نظر آ گیا جو اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے ہوشیار کر رہا تھا۔ پہلے تو کبیل دادا اس کا اشارہ سمجھنے سے قاصر ہی رہا... لیکن جب ٹریکٹر رک کر فوراً ریورس ہوا تو کبیل دادا ان سنگین ترلمحات میں لئیق شاہ کا اشارہ سمجھ گیا اور پھر اسی کی آڑ لیتا ہوا ٹریکٹر کے ساتھ ساتھ وہ بھی پیچھے ہٹنے لگا... جبکہ دشمنوں نے اب اپنی گنز کا رخ ٹریکٹر میں سوار لئیق شاہ کی طرف کر دیا تھا... مگر لئیق شاہ اب وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جانے کس وقت وہ کیبن چھوڑ کر اب ٹریکٹر کے دیوہیکل ٹائر کے ساتھ پیچھے ہوتا ہوا کبیل دادا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کی مدد میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا، اسی وقت کہیں سے جوابی فائرنگ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا... یہ بختیار علی تھا اور اپنی چھت سے دشمنوں پر گولیاں برسا رہا تھا مگر اس کی گن کے مقابلے میں دشمنوں کے ہتھیار جدید اور نسبتاً خطرناک تھے... تاہم اتنا ضرور ہوا تھا کہ کبیل اور لئیق کو نکل بھاگنے کا موقع ضرور مل گیا۔

پھر دائیں بائیں گھروں کی چھتوں سے بھی فائرنگ شروع ہوگئی تو دشمنوں کو بھاگتے ہی بنی۔

شکر تھا کہ کوئی جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ فائرنگ رک گئی تھی۔ دشمن ناکام ہو کے فرار ہونے پر مجبور ہوگیا تھا۔ ایک طوفان تھا جو اب تھم چکا تھا۔ فضا سازگار ہوتے ہی لوگ گھروں سے نکل آئے تھے، یہ سب لئیق شاہ کی برادری کے ہی لوگ تھے۔

''تو ٹھیک تو ہے نا کبیل؟'' لئیق شاہ نے آگے بڑھ کر زمین سے کبیل دادا کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے ایک نظر لئیق پر ڈالنے کے بعد بغیر جواب دیے اپنی کار کی طرف دیکھنے لگا جو اب کار سے زیادہ کباڑ دکھائی دے رہی تھی۔

لئیق شاہ نے کبیل دادا کے جواب نہ دینے کا بالکل بُرا نہیں منایا۔ دوبارہ مسکرا کے بولا۔ ''چل! غصہ چھوڑ اب... شکر کر جان بچ گئی ورنہ تو آج ہم دونوں ہی گئے تھے جان سے۔''

''جان بچانے کا شکریہ۔'' کبیل دادا کو بالآخر کہنا پڑا تو لئیق دوبارہ دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''جان بچانے والی ذات صرف میرے سوہنے رب کی ہے۔''

''پھر بھی تو نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے...''

''تو نے بھی تو اس روز اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے دشمنوں کی قید سے چھڑایا تھا۔''

لئیق شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا تو کبیل دادا نے بھی صاف گوئی سے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ میں نے بیگم صاحب کے حکم سے کیا تھا۔''

''اچھی لگی تمہاری صاف گوئی۔'' لئیق شاہ نے بھی کھلے دل سے کہا۔ ''ویسے تجھے یہاں نئے پنڈ آتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا، نکا چوہدری (ممتاز خان) اس وقت زخمی سانپ بنا ہوا ہے۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ صلح صفائی کے بعد اتنی جلدی وہ دوبارہ اپنی اوقات پر اُتر آئے گا۔''

میں کیا کروں اس نے پہل کی تھی

کبیل دادا نے گومگو سے لہجے میں کہا تو لئیق شاہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ''اونہہ...! صلح صفائی... یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ بیگم صاحب نے غیر جانب داری دکھاتے ہوئے اپنے بھائی کو عین اس وقت معاف کردیا جب اسے کورٹ سے سزا ہونے والی تھی۔''

اس کی بات کبیل دادا کو ناگوار لگی تھی پھر اس سے پہلے کہ ان دونوں کے بیچ اس حساس موضوع پر بحث آگے بڑھتی، اسی وقت بختیار اور بجلی ان کی طرف بڑھے، وہاں لوگوں کا شور سا مچ گیا تھا اور لوگ ان کے گرد جمع ہو کے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے تھے۔

بختیار اور بجلی نے ان دونوں کی خیریت پوچھی۔ تھوڑی دیر بعد یہ طوفان تھم گیا تو بختیار نے اپنی بیٹھک کھول دی اور یہ لوگ وہیں جا کر آرام سے بیٹھ گئے۔

کبیل دادا کا موڈ بگڑا ہوا تھا، اسے واپسی کی فکر ہونے لگی تھی۔ ایسے میں بختیار نے ایک نگاہ کبیل دادا پر ڈالنے کے بعد لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''ان کا تعلق یقیناً نکے چودھری سے ہی ہوسکتا ہے، ویسے باؤ لئیق! میں نے کوبے کھوجی کو بلوایا ہے، وہ ''پیر'' دیکھنے کا ماہر ہے۔''

''اس کا کیا فائدہ بختیار ے!'' لئیق شاہ کا لہجہ پھر تلخ ہونے لگا۔ ''اس سرزمین پر ہمارا نکے چوہدری کے سوا اور بھلا کون دشمن ہوسکتا ہے؟ پر رنج تو یار اس بات کا ہے کہ اپنے بھی دھوکا کرنے لگ گئے ہیں۔''

''میں تو تجھے پہلے ہی کہتا تھا باؤ لئیق کہ یہ نکے سوتیلے کا توڑ راما ہے بس، دیکھ لیا ناں! جہاں بات حویلی اور خونی رشتوں کی آگئی... چھوٹی بی بی (زہرہ بانو) نے فوراً عدالت میں صلح نامے کا پانسا پھینک دیا۔ ان سارے اُونچے لوگوں کا نزلہ صرف ہم غریبوں پر ہی گرتا ہے۔''

بختیار علی کی بات سن کر کبیل دادا کا دماغ پھر سے گرم ہونے لگا مگر بختیار علی اس وقت میزبان کے روپ میں بیٹھا تھا اور پھر تھوڑی دیر پہلے کے حالات بھی۔ کبیل دادا کو اپنے اندرونی اُبال پر بمشکل قابو پانا پڑا، مگر جب لئیق شاہ نے رنجیدہ نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھتے ہوئے، بختیار علی سے یہ کہا کہ "او بختیارے! کیا فائدہ ان باتوں کا اب، کہیں پھر یہ ناراض نہ ہو جائے" ظاہر ہے اس کا اشارہ کبیل دادا کی طرف تھا تو کبیل دادا خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔

"یہ تم سب لوگوں کی غلط فہمی ہے، جو تم اپنی پکا ہمدرد، بیگم صاحبہ کو ایسا سمجھ رہے ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔" وہ اتنا کہہ کر رکا اور پھر لئیق شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کم از کم تم کو تو بیگم صاحبہ سے اس قدر دل برا نہیں کرنا چاہیے تھا لئیق شاہ! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ بیگم صاحبہ کس قدر اکیلی اور مجبور عورت ہیں۔۔۔ خود ان کی ماں ستارہ بیگم بھی حویلی والوں کی اندرونی سازشوں کا شکار ہو کے جان سے چلی گئیں، اور وہ کیس بھی حل ہوا چاہتا تھا مگر عین وقت پر وڈے چوہدری (الف خان) کی وجہ سے بیگم صاحبہ کو مجبوراً اس کیس سے ہاتھ اُٹھانا پڑا، تبھی اُن کا حویلی والوں سے اتنا دل خراب ہو گیا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے پنڈ کو خیر آباد کہہ دیا۔ تم خود سوچو لئیق شاہ! یہ تو تم ہو، بیگم صاحبہ نے تو اپنی ماں کا خون انہیں معاف کر دیا۔"

"اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ انہوں نے یہ غلط کیا۔" لئیق شاہ نے بلاتوقف کہا۔ "انہیں کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی ماں کا خون معاف کرتیں؟ اور پھر۔۔۔ اپنا یہی اُصول مجھ پر بھی لاگو کر دیا۔۔۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ بیگم صاحبہ نے اپنی ماں کی خاطر ہی یہ سب کیا تھا۔" کبیل دادا، لئیق شاہ کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے بولا، تو لئیق شاہ قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"لئیق شاہ! شاید تمہیں ابھی بھی بہت سی باتوں کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ چوہدری الف خان نے بیگم صاحبہ کی ماں، ستارہ بیگم کے ساتھ محبت کی شادی کی تھی، اس وقت بیگم صاحبہ اپنی ماں ستارہ بیگم کی گود میں تھیں۔۔۔ جو خود اندر سے ایک بہت دُکھی خاتون تھیں، مگر الف خان سے شادی کے بعد جیسے انہیں دنیا کی ہر خوشی مل گئی۔ الف خان نے بھی ان دونوں ماں بیٹی کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق پورا پورا اور آخری عمر تک انصاف کیا۔۔۔ انہیں ان کے کسی بھی حق سے محروم نہیں کیا۔ ان کی محبت پر ثابت قدم رہنے پر ستارہ بیگم نے بھی نہ صرف اپنے وفادار شوہر کے لیے بلکہ ان کے خاندان کی شان اور عزت کی خاطر خود کو جیسے وقف کر دیا اور اپنی بیٹی زہرہ بانو، یعنی بیگم صاحبہ کو بھی آخر تک اسی بات کی تلقین کرتی رہتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الف خان نے ستارہ بیگم سے شادی کر کے ان کی دُکھی زندگی میں خوشیوں کی شمع روشن کر دی تھی۔ آج بیگم صاحبہ کی یہی مجبوری ہے کہ وہ ایسا جو کچھ کرتی ہیں تو صرف اپنی مرحومہ ماں کی خاطر ہی۔۔۔ اور ان کی وصیت نما نصیحت کی وجہ سے ہی کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ بہت مجبور اور دُکھی خاتون ہیں لئیق شاہ مگر بہت محبت کرنے والی بھی تم۔۔۔ تم۔۔۔ تو خوش نصیب ہو لئیق شاہ! کہ۔۔۔ تت۔۔۔ تمہیں۔۔۔ بیگم صاحبہ جیسی خاتون کا پیار ملا۔"

یہ کہتے ہوئے کبیل دادا کا اپنا لہجہ بھی جانے کس اندرونی خفتہ جذبے سے مرتعش سا ہونے لگا تھا۔۔۔ وہ آگے بولا۔ "لئیق شاہ! اتنے بے رحم نہ ہو۔۔۔ بیگم صاحبہ کی مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔۔۔ تمہاری بے رُخی کی وجہ سے ہی وہ آج اس حال کو پہنچی ہیں کہ اسپتال داخل ہوئی ہیں، مگر ایک بات تم بھی یاد رکھنا لئیق شاہ کہ بیگم صاحبہ اب تک اگر کسی مجبوری کے باعث خاموش ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ممتاز خان کو معاف کر چکی ہیں یا وہ ان سے ڈرتی ہیں، ہرگز نہیں۔ وہ آج بھی ممتاز خان کو منہ توڑ جواب دے سکتی ہیں مگر۔۔۔ اپنے باپ الف خان کی وجہ سے خاموش ہیں، اگر سمجھو تو اس کی بڑی ٹھوس وجہ ہے کہ آج بیگم صاحبہ کے پاس جو کچھ ہے وہ الف خان کی وجہ سے ہی ہے، اس لیے ان کا ضمیر یہ گوارا ہی نہیں کرتا کہ وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھائیں۔ بس وہ موقع کی منتظر ہیں۔"

کبیل دادا یہ بتا کر خاموش ہو گیا۔۔۔ بیٹھک میں خاموشی سی طاری ہو گئی۔ اب تک خاموش بیٹھے ٹکلی اور بختیار علی نے بھی کبیل دادا کی باتوں کو غور اور پوری توجہ سے سنا تھا، بلکہ انہیں یہ باتیں غلط بھی نہیں لگی تھیں لہٰذا انہوں نے بھی اپنے طور پر لئیق شاہ کو سمجھایا۔ مگر وہ تو بہت پہلے ہی کبیل دادا کی باتوں سے اندر ہی اندر اثر پذیری کے عمل سے گزرنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ لئیق شاہ کو بھی پہلی بار اپنے دل میں ایک کسک سی اُبھرتی محسوس ہونے لگی۔۔۔ ایک ٹیس سی اس کے دل میں اٹھی تھی۔۔۔ اندر اس کے ایک پچھتاوا سا ہوا تھا۔ اس کے چشم تصور میں اب زہرہ بانو کا اُداس اور حسرت زدہ چہرہ رقص کرنے لگا، ایک مجبور اور بے بس سا چہرہ مگر بے انتہا محبت کرنے والا۔۔۔ اور پھر خود لئیق شاہ کو بھی کب اس بات سے انکار تھا کہ وہ خود بھی تو زہرہ بانو کو چاہتا تھا۔ اس کے دل و

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دماغ میں ایک ہلچل سی مچ گئی، ایک طوفان سا جاگا تھا۔ یہاں تک کہ وہ یک دم بے چین سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر کمیل دادا سے بولا۔

"کمیل! میں اسی وقت بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

کمیل دادا بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے میں مختیار علی نے بھی اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی کہ تم لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوگئیں لیکن اس وقت تم دونوں کا نئے پنڈ سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا، دشمن نجانے کب سے تمہاری گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔"

"نہیں مختیارے! مجھے اسی وقت جانا ہے... تو کسی سواری کا بندوبست کر دے۔" لئیق شاہ کی بے چینی پہلے سے فزوں تر ہوگئی تھی، ایسے میں کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سواری کی فکر نہ کر... میں ابھی بیگم والا فون کر کے گاڑی منگوا لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے بیگم والا فون کیا اور اپنے کسی ساتھی کو فوراً گاڑی لے کر نئے پنڈ پہنچنے کا حکم دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں، وغیرہ۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی یاسر نامی ایک بندہ گاڑی لے کر وہاں آن پہنچا... اگلے چند منٹوں بعد یہ لوگ شہر کی طرف گامزن تھے۔ شہر تک کا سفر بہ خیر و عافیت گزرا۔ انہوں نے سیدھا اسپتال کا رخ کیا جہاں زہرہ بانو داخل تھی۔

لئیق شاہ کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا... اس کے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی... گاڑی سے اتر کے دونوں نے کمرے کا رخ کیا جہاں زہرہ بانو کو رکھا ہوا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی انہیں زہرہ بانو بیڈ پہ دراز نظر آگئی۔ وہ ہوش میں تھی اور جاگ رہی تھی۔ تاہم اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ پر اس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں... اور پھر لئیق شاہ کو دیکھتے ہی اس کے اترے ہوئے پژمردہ چہرے پہ جیسے یکایک رونق سی آگئی... اور پھیکے پھیکے گالوں کی زردی بھی ہولی گلاب سرخی خوش رنگ شگوفوں کے مانند دمکنے لگی۔ آنکھوں میں چھائی ہوئی مردنی یکایک زندگی کی چمک میں بدل گئی تھی۔ لئیق شاہ اس کے ذرا قریب جا کر اپنا سر جھکائے کھڑا ہوگیا تھا جبکہ کمیل دادا کی نظریں زہرہ بانو کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اور پھر اسی نے زہرہ بانو کو ہولے سے سلام کیا۔ مگر زہرہ بانو تو اس وقت "من و تو" کی سی حالت میں تھی۔ کمیل دادا کے دل مجبور میں ایک چبھن سی ابھری مگر دوسرے ہی لمحے زہرہ بانو کے چہرے پر اپنی مسرت کو پا کر اسے بھی ایک خوشی کا احساس ہوا تھا کہ وہ خوش ہوگئی تھی۔

پھر جب وہ یہ سوچ کر کہ اس سے پہلے کہ ہمیشہ کی طرح لئیق شاہ کی موجودگی میں بیگم صاحبہ اسے وہاں سے جانے کا کہے... وہ خود ہی خاموشی کے ساتھ اپنا سر جھکائے کمرے سے باہر جانے لگا تو اچانک اس کی سماعتوں سے زہرہ بانو کی آواز ٹکرائی۔

"ٹھہر جاؤ کمیل۔" پہلے تو کمیل دادا کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہ آیا، تاہم وہ رک گیا اور زہرہ بانو کی طرف گھوم گیا۔

"جی بیگم صاحبہ!" اس نے ہولے سے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" زہرہ بانو نے اس سے پوچھا۔

"میرا باہر کھڑا ہونا مناسب رہے گا۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔" زہرہ بانو نے ہولے سے کہا اور کمیل کمرے سے نکل گیا۔

کمرے میں ایک عجیب سے ٹھہراؤ کی سی فضا طاری ہوگئی تھی، کمرے میں صرف وہ دونوں رہ گئے تھے اور ان کی بے طرح دھڑکنیں تھیں کہ زہرہ بانو کی آواز نے اس مہیب سکوت کو توڑا۔

"کیسے ہو لئیق؟"

"آپ کیسی ہیں، بیگم صاحبہ؟" بے اختیار لئیق شاہ کے منہ سے بھی نکلا۔

"بیگم صاحبہ!" زہرہ بانو بدستور اس کے پُر وجیہہ چہرے کی طرف تکتے ہوئے بولی۔ لہجہ شکوہ کناں تھا۔

"میرا مطلب تھا کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، زہرہ بانو صاحبہ!" لئیق شاہ کو انداز تخاطب بدلنا پڑا۔

"صاحبہ کا تکلف لگانا ضروری تھا؟" زہرہ بانو کے دلکش لبوں پہ الوہی سی مسکراہٹ بکھری۔ پھر جیسے دل کی عمیق گہرائیوں سے بولی۔

"تمہارے آنے سے پہلے مجھے اپنی زندگی سے بیزاری سی ہو رہی تھی... مگر اب... ایسا نہیں ہے۔"

"کمیل دادا نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ میری وجہ سے آپ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی... مجھے اس کا واقعی بہت رنج ہوا۔" لئیق شاہ نے بتایا اور زہرہ بانو کو حیرت کا جھٹکا سا محسوس ہوا۔

"کیا تم کمیل دادا کے ساتھ آئے ہو؟ میرا مطلب ہے نئے پنڈ سے یہاں تمہیں وہی لایا ہے؟"

"جی ہاں۔" لئیق شاہ نے جواب دیا اور پھر اسے ساری تفصیل بہ شمول نامعلوم حملہ آوروں کے اسے بتا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دی۔ اس مختصر سی صراحت کو سن کر زہرہ بانو کا چہرہ چند ثانیوں کے لیے گم صم سا ہو گیا، اپنے دل میں کمیل دادا کے لیے ایک مقام، ایک احترام سا بنتا محسوس ہوا... لئیق شاہ نے زہرہ بانو کو یہ بھی بتایا کہ ابتدا میں ان دونوں کے درمیان ہاتھا پائی بھی ہوئی تھی مگر پھر بعد میں کمیل دادا نے اسے ساری بات سمجھا بھی دی تھی، اور وہ اب نادم تھا۔

یہ سب سن کر زہرہ بانو نے ایک گہری سانس خارج کی۔ پھر ہولے سے بولی۔ ''لئیق! کمیل دادا نے تمہیں میرے بارے میں جو بتایا وہ غلط نہیں ہے۔ چوہدری الف خان نے باپ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک حقیقی باپ جیسی محبت اور شفقت دی اور میرے اور میری ماں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔''

''میں آپ سے نادم ہوں، غصے اور اصل حقیقت سے ناآشنائی کے باعث میں آپ سے بدتمیزی کر گیا۔'' لئیق شاہ نے ایک نظر زہرہ بانو کے چہرے پہ ڈالتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کے بولی۔

''نہیں، تم نے تو میرے ساتھ کوئی بھی بدتمیزی نہیں کی۔''

''آپ کا دل دکھایا میں نے۔''

''ایسے دکھ مجھے ہزار جان سے قبول ہیں لئیق شاہ! جو بعد میں تمہیں کچے دھاگے سے باندھ کر دوبارہ ادھر ہی... میرے پاس... میرے قریب ہی لوٹاتے رہیں۔''

یہ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہیں لئیق شاہ کے چہرے سے نہیں ہٹائی تھیں۔ اب وہ بھی اس کی طرف یک ٹک تکے جا رہا تھا... یوں تو دل کو دل سے بہت پرانی راہ تھی اور اس راہ میں بھٹکانے والے کئی سنگِ میل بھی آئے تھے لیکن شکر ہے کہ تقدیر ان کی بہترین راہ نما ثابت ہوئی تھی۔

زہرہ بانو نے بیڈ پر اسی طرح نیم دراز اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا تو لئیق شاہ نے آگے بڑھ کر زہرہ بانو کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور تب ایکا ایکی اسے یوں لگا جیسے اس کے زخمی سے وجود میں ایک نظافت سی دوڑ گئی ہو۔ کیسی نرماہٹ، کیسی لذت تھی اس لمس میں، اس نے ایک پل کے لیے سوچا تھا، ادھر زہرہ بانو کے ہاتھ میں لئیق شاہ کی گرفت اسے سرتاپا سرشار کر گئی۔ ایسے ہی وقت میں محبت بھرے دل سے یہ دعا ضرور نکلتی ہے کہ یہ ساتھ نہ ٹوٹے، یہ ہاتھ نہ چھوٹے، اور پھر بے اختیار ہی زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے ہاتھ کو اپنی جانب کھینچا اور بولی۔

''میرے پاس بیٹھ جاؤ ناں، میرے سرہانے، میرے قریب... کہیں پھر مجھ سے ناراض ہو کے نہ چلے جاؤ... مجھے تمہاری قربت میں، تمہاری سنگت میں بہت سکون ملتا ہے، لئیق شاہ!'' اس کی آواز شدتِ جذبات سے لرز رہی تھی... لئیق شاہ اس کے سرہانے بیٹھ گیا تو بے اختیار زہرہ بانو نے اس کا ہاتھ اپنے مرمریں گال کے ساتھ لگا لیا، لئیق شاہ کو اپنا گرانڈیل وجود... یکلخت ہلکا محسوس ہوا، پھر یہیں پر ہی بس نہ ہوا، زہرہ بانو، اس کا کھردرا ہاتھ اپنے نرم نرم گال سے لگائے لگائے اپنے ہونٹوں تک لے آئی تو لئیق شاہ خود کو جذبات کے تند و تیز بہاؤ کی زد میں محسوس کرنے لگا... پھر فوراً ہی اس نے جیسے ایک گہری سانس کے ذریعے اپنے اندر کا جوار بھاٹا باہر نکالا اور... ہولے سے مسکرا کے بولا۔

''زہرہ صاحبہ! ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے؟ وہ آپ کو کب یہاں سے چھٹی دیں گے؟'' کہتے ہوئے بہت دھیرے سے لئیق شاہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''اب میں ٹھیک ہوں، تم جو آ گئے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔

اسی وقت ایک نرس نے آ کر بتایا کہ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آ رہے ہیں۔ دونوں ذرا سنبھل کے بیٹھ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے راؤنڈ کے بعد زہرہ بانو کی طبیعت تسلی بخش قرار دی اور پھر اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔

واپسی میں گاڑی یاسر ہی چلا رہا تھا۔ زہرہ بانو دانستہ کار کی عقبی سیٹ پر براجمان تھی جبکہ لئیق شاہ اس کے برابر میں بیٹھا تھا، اور آگے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر کمیل دادا تھا۔ اس کے بشرے پہ اتھاہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کار کا رخ بیگم ولا کی طرف تھا۔

بیگم ولا میں زہرہ بانو کی آمد پر ساتھیوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد دشمنوں کی طرف سے تازہ کیے گئے حملے سے متعلق ان کے بیچ تبادلۂ خیال ہوا تو کمیل دادا نے برملا زہرہ بانو سے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! اب ہمیں کمینے چوہدری کو زیادہ ڈھیل نہیں دینی چاہیے... وہ ہمارے لیے بہت خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کورٹ میں صلح صفائی اور معافی نامے کے باوجود وہ باز نہیں آیا ہے بلکہ الٹا اس کی ہمت اور بڑھ گئی ہے۔''

اس کی تائید میں لئیق شاہ بھی زہرہ سے بولا۔ ''کمیل ٹھیک کہہ رہا ہے، ہمیں چوہدری ممتاز کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا ہی پڑے گا، آخر کب تک آپ اپنی خاندانی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مصلحتوں کی وجہ سے خاموش رہیں گی؟" کمیل دادا کو لئیق شاہ کی اپنے لیے تائید ایک آنکھ نہیں بھائی، اس کی طرف کڑوی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بیگم صاحبہ کی مجبوری بھی اپنی جگہ صحیح ہے، ممتاز خان آخر کو وڈے چودھری کا سگا بیٹا ہے، اسے ہماری وجہ سے کچھ ہو گیا تو اس کا دکھ الف خان کو تو ہو گا ہی، اپنی بیگم صاحبہ بھی اس کا بہت دکھ کریں گی اسی لیے ہمیں کوئی درمیانی راستہ ہی سوچنا چاہیے۔"

"تمہارے خیال میں درمیانی راستہ اور کیا ہو سکتا ہے، کمیل دادا؟" لئیق شاہ نے بھی اس کے چہرے پہ نظریں گاڑتے ہوئے پوچھ لیا تو کمیل دادا اس کے اس اچانک سوال پہ ایک لمحے کو گڑبڑا سا گیا... پھر بولا۔

"درمیانی راستہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو خود بیگم صاحبہ ہی صحیح بتا سکتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے سامنے صوفے پر براجمان زہرہ بانو کی طرف دیکھا... تو وہ جیسے کسی عمیق خیالات کے بھنور سے اُبھر کے بولی۔

"میں خود بھی اسی درمیانی راستے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اول یہ کہ ہمیں ہروقت اسلحے سے لیس ہو کر محتاط رہنا چاہیے، دوم یہ کہ لڑائی کے جواب میں لڑائی ہی کرنی ہوگی، یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے رہیں، لئیق شاہ نے ممتاز خان کے اہم آدمی وسیم عرف چھیپا کو کیفر کردار تک پہنچا کے اسے خاصا بڑا جھٹکا دیا ہے۔ اس کے تازہ ناکام حملے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اُن میں اب زیادہ دم خم نہیں رہا، افسوس اگر اس وقت اس کا کوئی آدمی بھی مارا جاتا تو یہ زیادہ اچھا ہوتا، خیر... اب ہمیں اس کے ہر حملے کا منہ توڑ جواب دینا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ خود ہی بیزار ہو کر چپ ہو کر بیٹھ رہے۔"

"بیگم صاحبہ یہ تو آپ کی خام خیالی ہوگی، اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ ممتاز خان چپکا بیٹھا رہے گا۔" کمیل دادا نے اس کی بات سے اختلاف کیا۔ "ملکیت اور جائداد کے معاملات بڑے اُلجھے ہوتے ہیں۔ نسلی دشمنی کی طرح یہ کبھی ختم نہیں ہوتے۔"

"ان ساری باتوں کا ایک ہی حل ہے، ممتاز خان کو ہر حال پہ منہ توڑ جواب۔" لئیق شاہ نے کہا۔

"میں نے بھی اب فیصلہ کر لیا ہے کہ اب کی بار ممتاز خان کو معاف نہیں کروں گی۔" بالآخر زہرہ بانو نے حتمی لہجے میں کہا تو لئیق شاہ بولا۔

"زہرہ صاحبہ! معاف تو میں بھی اسے نہیں کروں گا، اس نے میرے غریب ماں باپ کا خون کروایا ہے اور جس نے یہ سب کیا تھا اس سے تو میں پہلے ہی انتقام لے چکا ہوں لیکن ممتاز خان کو میں بھی نہیں بھولا ہوں۔"

"مجھے تمہارے دوست بختیار علی نے بتایا تھا کہ وہ تمہارے اصلی ماں باپ نہیں تھے؟"

کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھ کر اچانک کہا تو لئیق شاہ نے ایک چونکتی ہوئی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی، پھر زہرہ بانو کی طرف ایک دزدیدہ سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "یہ حقیقت ہے کہ وہ میرے حقیقی ماں باپ نہیں تھے، لیکن انہوں نے مجھے سگے ماں باپ کی طرح پالا تھا۔"

"اور یہ... خواجہ سرا بجلی کا کیا معاملہ ہے؟ بختیار نے مجھے اس کے متعلق بھی بتایا تھا کہ وہ تمہیں بچپن سے جانتا ہے۔" کمیل دادا نے اس کے ماضی سے متعلق ایک اور سوال داغا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ دانستہ زہرہ بانو کے سامنے لئیق شاہ سے یہ سب پوچھ رہا تھا جبکہ لئیق شاہ بغیر جھجک کے اس کے سوالوں کے جواب دیے جا رہا تھا۔ مگر... بجلی والے ذکر پر اسے کچھ پل کے لیے چپ سی لگ گئی، زہرہ بانو کی نگاہیں اسی کے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ اس نے واضح طور پر لئیق شاہ کے ماتھے پر کرب کی ایک سلوٹ سی بنتی ابھرتی دیکھی، وہ خود تجسس کا شکار ہوئی مگر دوسرے ہی لمحے لئیق شاہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"ہاں! بجلی سے میرا تعلق واقعی بہت پرانا ہے... وہ میرا محسن ہے۔"

"ایک ہیجڑا... اور تمہارا محسن؟" کمیل دادا اپنے لہجے میں استہزائیہ انداز کی حیرت سموتے ہوئے بولا تو لئیق شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر تیز لہجے میں کہا۔

"کیوں کمیل دادا، کیا ایک ہیجڑا کسی انسان پر احسان نہیں کر سکتا؟ تم کیا صرف جسمانی طاقت کو ہی بہادری کا معیار سمجھتے ہو، اگر ایسا ہے تو پھر مجھے تمہاری عقل پر حیرت ہی نہیں افسوس بھی ہے۔"

گفتگو کا موضوع دوسرا رُخ اختیار کرنے لگا تو زہرہ نے مداخلت کرتے ہوئے کمیل دادا سے کہا۔ "کمیل دادا! یہ لئیق شاہ کا ذاتی معاملہ ہے۔ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"نن... نہیں... بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ؟" کمیل دادا کچھ گڑبڑا سا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ زہرہ بانو، لئیق شاہ کے ایک ہیجڑے کے ساتھ "تعلق" پر ضرور چونکیں گی اور اسی وقت بجلی کے بارے میں لئیق شاہ سے کوئی چبھتا ہوا سوال ضرور کریں گی لیکن یہ دیکھ کر وہ خود

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اپنا سا منہ لے کر رہ گیا کہ بیگم صاحبہ نے تو اُلٹا اسے ہی بُری طرح سے ٹوک دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کبیل دادا کسی بہانے وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا تو زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

"کبیل دادا کی باتوں کا برا مت منانا، یہ منہ کا تیز ہے مگر دل کا صاف آدمی ہے۔"

"میں جانتا ہوں زہرہ صاحبہ! اسی لیے میرے دل میں بھی اس کے لیے احترام اور عزت ہے۔" لئیق شاہ تفہیمی انداز میں بولا۔

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد زہرہ بانو نے لئیق شاہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا تمہارے حقیقی ماں باپ اس دنیا میں نہیں ہیں؟" زہرہ بانو کی بات نے لئیق شاہ کے اندر ایک ہُوک سی جگادی۔

"یہی تو اصل دُکھ ہے میرا، زہرہ صاحبہ کہ مرنے والے پیاروں پر رو دھو کر صبر آ ہی جاتا ہے لیکن... جو جیتے جاگتے بچھڑ جاتے ہیں... وہ ساری عمر دُکھ کے مارے بے چین رکھتے ہیں، آج مجھے اپنے ماں باپ سے بچھڑے پندرہ برس بیت چکے ہیں... لیکن، میں آج بھی خود کو میلے کی بھیڑ میں گم ہوجانے والا خوف زدہ اور روتا ہوا ایک معصوم بچہ ہی سمجھتا ہوں، جو آج بھی لوگوں کی بھیڑ میں ہراساں اور پریشان، اپنے کھوئے ہوئے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا ہے۔" یہ بتاتے ہوئے لئیق شاہ کا لہجہ غم زدہ سا ہوگیا۔ زہرہ بانو اسے اس قدر دُکھی پا کر خود بھی بے چین سی ہوگئی، اس کی طرف دیکھ کر ملائمت سے بولی۔

"تو پھر تم نے انہیں اب تک تلاش کرنے کی کوشش تو کی ہوگی؟"

"میرا تو ہر پل، ہر لمحہ ان کی تلاش میں ہی گزرتا ہے زہرہ صاحبہ!" وہ ایک رنجیدہ سی سانس خارج کر کے بولا۔ "لیکن ابھی تک مجھے کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے... میں آج بھی اپنے ماں باپ کو یاد کر کے تنہائیوں میں روتا ہوں... مجھے ان کی محبت، ان کا پیار ابھی تک یاد ہے۔ وہ دونوں مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے، میں گویا ان کی آنکھوں کا تارا تھا، اکلوتا تھا، اس وقت میں شاید گیارہ، بارہ سال کا تھا کہ میں گھر میں ایک اور خوشی کی خبر سننے لگا... شاید میرا کوئی بھائی یا بہن بھی دنیا میں آنے والا تھا... لیکن انہی دنوں بدقسمتی سے..."

اچانک یہ سب بتاتے ہوئے لئیق شاہ کا دل بھر آیا۔ اپنے دُکھ بھرے ماضی اور اپنے بے انتہا محبت کرنے والے ماں باپ کو یاد کر کے وہ غم زدہ ہوگیا... اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ شاید اپنی آنکھوں کی نمی کو زہرہ بانو سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

لئیق شاہ کو اس قدر دُکھی اور غم زدہ دیکھ کر زہرہ بانو تڑپ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے قریب آبیٹھی اور دلاسا دینے والے انداز میں لئیق شاہ کے شانے پہ اپنا ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا اور بولی۔

"حوصلہ کرو لئیق! ایک انسان کے ساتھ ہی یہ سب کچھ ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے ہی یہ سب آزمائشیں آتی ہیں جس کے در پر وہی سُرخرو ہوتے ہیں جو اس کی آزمائش پر صبر و استقامت اختیار کرتے ہیں اور اس سے بہتری کے لیے دعا گو رہتے ہیں... انشاء اللہ ایک دن تم اپنی تلاش میں ضرور کامیاب رہو گے۔ پھر میں بھی تو تمہارے ساتھ ہوں۔"

لئیق شاہ خود کو سنبھال چکا تھا، اسی طرح سر جھکائے رنجیدگی سے بولا۔ "ہاں زہرہ صاحبہ! ایک اسی سوہنے رب کا ہی تو آسرا ہے کہ میں ناامید نہیں ہوا ہوں۔"

پھر چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے کہا۔ "دیکھو لئیق! اپنا غم کہہ دینے سے آدھا رہ جاتا ہے، اور پھر اب تم مجھے بھی آج سے اپنی اس تلاش میں شامل سمجھو، میری خواہش ہے کہ تم مجھے اپنی یہ دُکھ بھری بپتا سنا دو، ایک سے دو بھلے کے مصداق، ممکن ہے تمہاری یہ داستان سن کر میرے ذہن میں کوئی ایسی بات آجائے جو تمہارے لیے معاون ثابت ہو؟" زہرہ بانو کی بات سن کر لئیق شاہ نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا... پھر کچھ سوچنے لگا... اس کے چہرے پہ اس وقت ایک جوار بھاٹے کی سی کیفیت تھی... ایک اُبال تھا یا کوئی نامعلوم سی کشمکش... صاف نظر آتا تھا کہ وہ اندر سے کسی شدید دباؤ کا شکار ہو رہا ہے... وہ ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

"شاید مجھے اب اپنے بارے میں آپ کو حقیقت بتا دینی چاہیے میں خود بھی کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ کم از کم آپ سے یہ سب نہ چھپاؤں لیکن مجھے ایسا کوئی موقع ہی نہیں ملا مگر آج میری غم رسیدہ تقدیر نے خود ہی یہ موقع فراہم کر دیا۔ ہاں... اب میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا... سب بتا دوں گا کہ میری اصل حقیقت کیا ہے اور میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟"

زہرہ بانو کی نگاہیں لئیق شاہ کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں اور دل اندر سے پتے کی طرح لرز رہا تھا، جانے کیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

زہرہ بانو کے دل میں ہزاروسوسے جنم لینے لگے اور وہ اس کی بپتا سننے کے لیے بےقراری ہوگئی... لئیق شاہ کا چہرہ الاؤ کے مانند دہکنے لگا تھا۔

وہ شاید اسے اپنی داستان دل سوز سنانے کے لیے مناسب الفاظ ہی نہیں بلکہ حوصلہ بھی ڈھونڈ رہا تھا۔

☆☆☆

"بستی پر دسمبر کی سرد اندھیری رات اتری ہوئی تھی۔ ہر سو گہرا سناٹا طاری تھا۔ رات کے جانے کون سے پہر میری اچانک آنکھ کھلی تھی، اس روز تیز بارش بھی ہو رہی تھی۔ موسم بہت سرد تھا۔ میں اپنے کوٹھری نما کمرے میں ایک چارپائی پہ لیٹا ہوا تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی، لالٹین کی ہلکی روشنی بھی دیواروں پر لرز رہی تھی۔ میں نے لیٹے لیٹے اس چھوٹی سی کھڑکی کی طرف دیکھا جو میرے سر کے قریب ہی تھی، مختصر سے نیم پختہ صحن میں مجھے دو سائے آمنے سامنے کھڑے دکھائی دیے۔

"تاج دین! اس وقت تمہارا کیسے بلاوا آگیا؟ یہ رات اور یہ موسم دیکھ رہے ہو؟"

یہ میری ماں کی آواز تھی۔ وہ میرے باپ سے مخاطب تھی۔ پھر میں نے اپنے باپ کی آواز سنی، وہ میری ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"او... جھلیے! ایسا مت بولا کر... یہ بلاوا میرے افسروں کا بلاوا نہیں ہے۔ یہ تو میرے محبوب وطن کی پکار ہے... وہ مجھے بلاتا ہے... کہ آ... اے میری سرحدوں کے سپاہی... دشمنوں نے میری طرف میلی نظروں سے دیکھا ہے... اور... پھر بھلا مجھے کون روک سکتا ہے نویدہ؟ سچ کہوں تو تو بھی نہیں۔"

"نہیں تاجے! میں بھلا کیسے یہ دغا بازی کر سکتی ہوں... کہ تجھے نہ جانے دوں... میں تو بس... ویسے ہی۔" میری ماں کا جی بھر آیا تھا... پھر میرا باپ چلا گیا۔

یہ سب میرے لیے نیا کب تھا؟ میں اکثر یہ دلگیر منظر اسی طرح پرجوش مکالموں کے ساتھ دیکھا کرتا... انہی مکالموں میں کچھ ایسے معنی خیز جملے بھی ہوتے، جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ ہمارے گھر کوئی ننھا منا مہمان بھی آنے والا تھا۔ مجھے کچھ اتنی سمجھ نہیں تھی کہ یہ کون "مہمان" تھا؟ مگر ایک دن میں نے اس سلسلے میں اپنے ماں باپ کو گفتگو کرتے ہوئے سنا۔

"نویدہ! دعا کر رب سوہنا مجھے ایک اور بیٹا دے... پھر میرے دو بازو ہوں گے... پھر میں اپنے دونوں بیٹوں کو اس پاک وطن کا سپاہی بناؤں گا۔"

"تاجے! سچ پوچھے تو مجھے بیٹی کی خواہش ہے... پر... میں پھر بھی تیری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوہنے رب سے ایک اور بیٹے کی دعا کروں گی۔"

میرا باپ یہ بات سن کر خوش ہوگیا۔

اس وقت میری عمر گیارہ بارہ برس تھی، میں معصوم بچہ ہی تھا، دھندلا دھندلا سا مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ سیالکوٹ کے کسی سرحدی گاؤں میں رہتا تھا، گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔

میں نے اپنے باپ کو ہمیشہ ایک مخصوص وردی میں ہی دیکھا تھا، بس عید اور جمعے کی نماز میں ہی وہ وردی میں نہیں ہوتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اسے سرحد کا سپاہی کہتے تھے، اور میرا باپ تھا بھی ایک بہادر اور دیانت دار سپاہی۔ پاس کے ایک سرحدی کیمپ میں اس کی ڈیوٹی ہوتی تھی، وہاں وہ بارڈر سیکیورٹی فورسز کی تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ میں انچارج واچ مین تھا۔ میرے باپ کا پورا نام تاج دین شاہ تھا۔

بلاشبہ میرا باپ ایک بہادر اور وطن سے بے حد پیار کرنے والا ایک سچا جیالا سپاہی تھا۔ میں نے گاؤں کے اکثر لوگوں کو اپنے باپ کے بعض کارناموں کی تعریفیں کرتے ہوئے بھی سنا تھا۔ گھر میں بھی وہ میری ماں کو سرحد پر ہونے والی کشمکش کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔ اس نے کئی خطرناک اسمگلروں کا خود تعاقب کر کے انہیں گرفتار کروایا تھا۔ اکثر وبیشتر سرحد پار سے چوری چھپے داخل ہونے والے پڑوسی ملک بھارت کے جاسوسوں کو بھی پکڑنے میں اپنے افسروں کی مدد کی تھی۔ وہ مجھے بھی مستقبل میں اپنی طرح ایک وطن پرست اور بہادر سپاہی کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

کئی گمنام سرفروش سپاہیوں کی طرح میرا باپ بھی اپنے وطن کی سرحدوں کی حفاظت اور ملک دشمن عناصر کے خلاف جنگ کرتے ہوئے ایک دن نجانے کہاں چلا گیا... یا شاید گمنامی کی موت شہید ہوگیا۔ ان دنوں وطن عزیز پڑوسی ملک بھارت کے ساتھ تازہ رنجشوں سے گزر رہا تھا اور سرحدوں کی سختی کے ساتھ حفاظت اور کڑی نگرانی کی جارہی تھی۔

اکثر بھارتی فوجیوں کی طرف سے بلا اشتعال فائرنگ کے واقعات بھی سننے میں آتے رہتے تھے اور لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کا بھی پاکستانی افواج منہ توڑ جواب دیتی تھی۔ یہ بھی انہی دنوں کا ایک واقعہ تھا جب میرا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

باپ ڈیوٹی پر گیا تو پھر کبھی نہیں لوٹا۔

اُن کے افسروں کی زبانی سننے میں یہی آیا کہ وہ کسی دشمن جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر گیا تھا۔ شنید تھی کہ وہ دشمن جاسوس ایک اہم ملکی راز لے اُڑا تھا۔ پھر اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں...

میری ماں غم سے نڈھال رہتی تھی، میں بھی باپ کو یاد کر کے اُداس ہو جاتا... انہی دنوں گاؤں میں میلہ لگا... ماں مجھے بھی لے گئی... ذرا دیر کو ہم ماں، بیٹا اپنا غم بھول گئے۔

وہیں میلے میں مجھے ایک عجیب سی شکل و صورت کا آدمی ملا... وہ میری طرف دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا، میں بچہ ہی تھا، اس کے ساتھ ہیل گیا اور پھر نجانے کب میری ماں کا دھیان مجھ سے ہٹ گیا اور وہ عجیب صورت آدمی مجھے کھلونوں کے ایک اسٹال پر لے گیا، وہاں ایک لکڑی کا گھوڑا مجھے پسند تھا اور میلے میں آتے ہی میں نے ماں سے وہ دلانے کی فرمائش کی تھی مگر مہنگا ہونے کے باعث ماں نے مجھے ٹال دیا تھا اور میں اپنا دل مسوس کے رہ گیا تھا۔ وہ آدمی تب سے ہی مجھے جانچے ہوئے تھا اور ہمارے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

اس نے مجھے لکڑی کا گھوڑا دلا دیا اور میں خوش ہو گیا مگر ڈر بھی لگا، اس آدمی سے نہیں بلکہ اپنی ماں سے، اگر اس نے میرے پاس یہ قیمتی گھوڑا دیکھ لیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا؟ یہی کہ یہ مجھے کسی اجنبی نے لے کر دیا ہے، وہ یقیناً مجھ پر غصہ ہوتی... مگر مجھ بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ میں یہ منحوس کھلونا پانے کے بعد اپنی ماں کو ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔

میں نے اس آدمی سے اپنی ماں کے پاس جانے کو کہا تو اس نے مجھے کوئی چیز کھانے کو دی اور بولا۔ ”یہ کھا لو، پھر تمہاری ماں کے پاس لے چلتا ہوں تمہیں۔“

وہ کوئی میٹھی گولی تھی، جسے کھانے کے بعد میں بے ہوش ہو گیا، اور جب ہوش آیا تو میری آنکھ بڑی ہی عجیب جگہ پہ کھلی، میں دنگ رہ گیا، بڑا عجیب اور گھٹا گھٹا ماحول تھا یہاں کا بلکہ یہ لوگ عجیب ہی نظر آ رہے تھے، ان کی وضع قطع... مختلف ہی تھی۔ نہ یہ مرد دکھائی دیتے تھے نہ عورت... مجھے یاد آیا کہ میں نے گاؤں میں یا پھر شہر میں کہیں ان جیسے لوگ دیکھے ضرور تھے... انہیں ہیجڑا کہا جاتا تھا۔ اس وقت تو مجھے ہیجڑے کا مطلب بھی نہیں آتا تھا۔

میں پریشان بھی ہوا اور رونے بھی لگا... اور ”ماں... ماں“ پکارنے لگا۔ میرے منہ پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ میں رو رو کر ہلکان ہو گیا... اور پھر شاید بے ہوش ہو گیا۔

پھر جب مجھے ہوش آیا تو مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا، میں کسی ایک جگہ پر، ایک مقام پر نہیں تھا... بلکہ چلتی ہوئی حالت میں تھا... ہاں، مجھے کسی سواری پر بٹھایا گیا تھا... جو آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی... اور میں ایک کجاوے نما کاٹھی کے اندر تھا، جس پر کپڑا چڑھا ہوا تھا، جیسے ڈولی ہوتی ہے۔ میں نے اپنے جسم کو حرکت دی مگر قاصر رہا، چلانا چاہا تو ناکامی ہوئی۔ میں رسن بستہ حالت میں تھا اور منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ معصوم بچہ ہی تھا میں اور وہ بھی اپنی ماں سے بچھڑا ہوا۔ ایسی ماں سے جس کا میں بہت پیارا اور لاڈلا تھا۔

ماں کو یاد کر کے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور میں گھٹی گھٹی آواز میں رونے اور سسکنے لگا، نجانے یہ کیسا سفر تھا اور کہاں کا سفر تھا جو بہت دھیرے دھیرے جاری تھا۔

وقت کون سا تھا؟ کچھ اندازہ نہیں ہو پایا، کجاوے کی جگہ بہت تنگ اور محدود تھی... جس کے اندر اندھیرا زیادہ تھا اور روشنی کم۔

کافی دیر گزر گئی... میں روتے سسکتے پھر سو گیا... شاید اس میٹھی گولی کا اثر اب تک مجھ پر طاری تھا کہ طبیعت سست اور نڈھال سی ہو رہی تھی۔ ایک نشے کی سی حالت ہو رہی تھی میری۔ میں پھر سو گیا یا شاید میں دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ شاید بہت دیر بعد میری آنکھ کھلی تھی... میں نے خود کو ایک کوٹھری نما کمرے میں پایا، جس کی زمین ناہموار تھی، اس پر میلی سی دری بچھی ہوئی تھی۔ اب میں کہہ سکتا تھا کہ یہ وقت رات کا تھا۔ کیونکہ کمرے میں ایک بلب روشن تھا۔ بڑا گھٹا گھٹا سا ماحول محسوس ہو رہا تھا یہاں کا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے، منہ سے بھی کپڑا ہٹا دیا گیا تھا۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف لپکا... دروازہ باہر سے بند تھا۔

”دروازہ کھولو... مم... مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے... دروازہ کھولو۔“ میں رونے اور چیخنے چلانے لگا... اسی وقت دروازہ کھل گیا، میں نے باہر بھاگنے کی کوشش چاہی لیکن مجھے کسی نے دبوچ لیا... اور ایک تھپڑ بھی میرے جڑ دیا... میں دہشت زدہ ہو گیا۔ اس نے مجھے دبوچ کر اسی جگہ دوبارہ دھکا دے دیا جہاں کچھ دیر پہلے میں پڑا تھا۔

”او لونڈے! اب اگر تو نے آواز نکالی تو گلے پر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تیرے پہ چھری پھیر دوں گا... سمجھا تو؟"

مجھے دبوچنے والے نے بڑے خونخوار لہجے میں مجھے دھمکایا، میں ڈر گیا، اس کی طرف دیکھا اور چونک پڑا، یہ وہی عجیب صورت آدمی تھا جس نے مجھے میری پیار کرنے والی ماں سے جدا کیا تھا... پہلی بار میرے دل میں اس گھٹے وٹے آدمی کے خلاف نفرت کی شدید لہر اٹھی تھی۔

میں نے اس کی منت کی۔ "مم... مجھے... مم... میری ماں کے پاس چھوڑ آؤ ناں؟ وہ میرے لیے بہت پریشان ہو رہی ہوگی... دیکھو... تم... تم نے مجھے کاٹھ کا گھوڑا ابھی تو لے کر دیا تھا ناں؟ تم اچھے ہو ناں۔" میرے معصومانہ جملوں پر اس سنگ دل اور بے رحم انسان پر کوئی اثر نہ ہوا... بلکہ اُلٹا اس نے مجھے مارے طیش کے بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ میں تکلیف کے مارے چلانے لگا، اسی وقت ایک اور آدمی اندر آیا، یہ بھی اسی کی طرح کا تھا، نہ مرد نہ عورت... یعنی ہیجڑا۔ مگر مقابلتاً اس سے ذرا صحت مند تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھی سے چھڑاتے ہوئے بولا۔

"سکھ دیو! کیا مار ڈالے گا اس کو؟ پرے ہٹ، چھوڑ اسے۔"

مجھے پیٹنے والا سکھ دیو تھا۔ میں اس نام پر چونکے بنا نہ رہ سکا، کیونکہ یہ نام میرے لیے اجنبی سا تھا، اگرچہ گاؤں میں اس نام کے کچھ لوگ رہتے تھے۔

اس مہربان آدمی کی مداخلت نے مجھے اس جلاد صفت آدمی کی مزید مار پیٹ سے بچا لیا، میں سسکیاں لے کر رونے لگا۔ وہ مجھے پیار سے پچکارنے لگا... سکھ دیو کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک میری طرف پرطیش نظروں سے گھور رہا تھا... پھر اپنے ساتھی سے بولا۔

"ریکھا! اچھی طرح سمجھا لے اس لونڈے کو، اگر دوبارہ اس نے رونا دھونا ڈالا تو میں اس کی کھال کھینچ لوں گا۔"

"ہاں! تو جا یہاں سے، میں اسے سمجھا دیتی ہوں۔"

ریکھا نامی اس مہربان عورت نے اس سے کہا۔ اب میں اسے ریکھا نام کے حوالے سے عورت ہی کہوں گا، بچے سے جو بھی پیار کی زبان میں بات کرے، بچہ اس کی جانب کھنچا ضرور ہے... مجھے بھی یہ ریکھا اچھی لگی۔ تھی یا اچھا لگا تھا... وہ بھی انہی کے قبیل کی تھی مگر بہرحال اس نے مجھے اس سنگدل آدمی کی مار سے بچایا تھا۔

ریکھا مجھے پیار سے پچکارنے لگی... پھر جیسے مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "دیکھو بنٹو...!

"میرا نام... تنتی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"اب تجھے یہ نام بھلانا پڑے گا... تیرا نام اب بنٹو ہے۔" اس نے کہا تو میں بچوں جیسی روایتی ضد پہ آ گیا، برا مان کے بولا۔

"نہیں مجھے اپنا نام ہی اچھا لگتا ہے۔"

ریکھا اس بار سنجیدگی سے بولی۔ "اگر تو اسی طرح ضد کرتا رہے گا تو پھر میں تجھے دوبارہ اسی سکھ دیو کے حوالے کر دوں گی۔" میں اس کی دھمکی سے ڈر گیا اور پھر اس کی منت سماجت کرتے ہوئے معصومیت سے بولا۔

"نہیں... نہیں... مجھے اس کے حوالے مت کرنا، وہ بڑا ظالم انسان ہے، پہلے اس نے مجھے میٹھی گولی دے کر بہلایا پھر مجھے میری ماں سے دور کیا اور اب چالاکی سے یہاں لا کے مجھے مارتا بھی ہے... تم... تم... اچھی ہو ناں، اللہ کے واسطے مجھے میری ماں کے پاس چھوڑ آؤ ناں۔"

"پھر وہی باتیں شروع کر دیں تم نے؟" ریکھا نے پھر مجھے ٹوکا۔ میں اس کا چہرہ تکنے لگا، وہ مجھے سمجھاتے ہوئے آگے بولی۔

"دیکھ بنٹو! پہلی بات تو یہ سن لے تو... کہ اب یہی تیرا ٹھکانا ہے، اور مجھے اور سکھ دیو کو ہی اب تو اپنے ماں باپ سمجھے گا۔ یہاں ہر آنے والے کا شروع میں یہی نام ہوتا ہے... بعد میں بدل دیا جاتا ہے۔ تمہیں اب اپنی ماں اور اپنے گھر بار کو بھلانا ہوگا... اب یہی تمہارا گھر ہے، اور ہم تمہارے اپنے، ورنہ اگر تم نے پھر وہی پرانی رٹ شروع کر دی تو میں تمہیں سکھ دیو کے حوالے کر دوں گی... سمجھ گئے؟"

اس کا لہجہ بھی ایک دم بدل گیا تھا... میں چپ ہو گیا۔ اب یہ بھی مجھے بری لگنے لگی تھی۔ یہ سب ایک ہی تھے۔ اگلی بار وہ مجھ سے تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"اب میری ایک بات غور سے سنو بنٹو! اور یاد بھی رکھو، کل تمہیں ہمارے سردار کے سامنے پیش کیا جائے گا... اور وہاں تمہیں کوئی شور شرابہ نہیں کرنا، ٹھیک ہے؟"

"کیوں؟ کیا سردار مجھے مارے گا؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"وہ سکھ دیو سے زیادہ غصے والا آدمی ہے، وہ تمہیں جان سے بھی مار سکتا ہے۔ بس تم خاموش رہنا۔ اور وہ تم سے جو سوالات کرے اس کا ہاں میں ہی جواب دینا" ریکھا بولی... میں اس کی بات سن کر اندر سے خوف زدہ ہو گیا۔ پتا نہیں ان کا سردار کون تھا، کیا تھا؟ مجھے یہی سمجھ میں آیا کہ وہ ضرور ان ہیجڑوں کا سردار ہی ہوگا۔

اس رات مجھے اسی کوٹھری میں ہی رکھا گیا تھا۔ پتا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں مجھے کیا کھانے کو دیا گیا تھا جسے ہاتھ لگانے کو بھی میرا جی نہیں چاہا تھا۔ پانی تک نہیں پیا تھا میں نے۔ وہ رات میں نے بھوکا پیاسا سو کر گزار دی۔

اگلے دن میں سو کر جاگا بلکہ مجھے جگایا گیا تھا۔ یہ کوئی تیسرا فرد تھا اور جوان لڑکا سا تھا۔ رنگت کالی کلوٹی تھی، یہ بھی مجھے ہیجڑا ہی لگ رہا تھا، چھوٹا ہیجڑا... مگر اس کے چہرے کے نقش اچھے تھے... اس نے عورتوں والا ہی روایتی سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا پھر میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا، میں نے اس سے مصافحہ کیا تو وہ دوستانہ لہجے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے بولا۔

"میرا نام... راجی ہے، آج سے تم اور میں دوست ہیں... ٹھیک ہے؟" اس کی آواز عجیب آہنگ لیے ہوئے تھی۔ مجھے تو یہ بھی برا لگا تھا، مگر چونکہ عمر میں یہ مجھ سے چند سال ہی بڑا تھا اس لیے مجبوراً میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"کیا تم بھی انہی جیسے ہو...؟ میرا مطلب ہے... آدھا مرد اور آدھی عورت؟"

وہ میری بات پر ہنسا پھر ایک تالی پیٹ کر زنانہ نما مردانہ آواز میں بولا۔ "اس بستی میں تمہیں سب ہی ایسے لوگ ملیں گے۔"

"بستی؟ یہ کون سی بستی ہے؟ میں نے تو اپنے گاؤں میں کہیں بھی ہیجڑوں کی ایسی کوئی بستی نہیں دیکھی؟"

"یہ تمہارا گاؤں نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"یہ میرا گاؤں نہیں ہے؟ تو پھر یہ کون سی جگہ ہے؟"

"تم اپنے گاؤں سے بہت دور، سرحد پار کی ایک بستی میں ہو۔" اس نے جیسے میرے سامنے ایک بھیانک انکشاف کیا... میں پریشان ہو گیا اور اسی لہجے میں بولا۔

"لل... لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ میرا تمہاری بستی میں بھلا کیا کام ہے؟ میں تو... میں تو... تم لوگوں جیسا نہیں ہوں۔"

"ہم جیسے نہیں ہو تو کیا ہوا پھر... بہت جلد تم بھی ہمارے جیسے بنا دیے جاؤ گے... یعنی پاگڑو۔"

"پاگڑو؟" میں استفہامیہ انداز میں زیرلب بڑبڑایا۔

اس وقت میں اس کی اس ہولناک بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا لہٰذا قدرے الجھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں بھلا تم جیسا کس طرح بن سکتا ہوں؟ میں تو میں تو..." مجھ سے آگے بولا ہی نہیں گیا، وہ معنی خیز انداز میں ہنسا... وہ شاید میری ناسمجھی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ میری نقل اتارتے ہوئے بولا۔

"میں تو... میں تو... کیا؟" پھر وہ اچانک خاموش ہو گیا اور بغور میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لینے لگا، اس دوران اس کی آنکھوں میں عجیب سی بھوکی چمک ہلکورے لے رہی تھی، جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکا... تاہم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بولا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟ کیا میں کوئی لڑکی ہوں...؟" میں اس پر تھوڑا خفا ہوا۔

"تم بہت خوبصورت ہو... مجھے پورا یقین ہے کہ جب تم ہمارے جیسے بنا دیے جاؤ گے تو اور زیادہ حسین لگو گے اور سردار پھمو کو بھی خوب دولت کما کر دو گے۔"

میرے چھوٹے سے ذہن میں اس کی یہ بیہودہ بات کچھ سمجھ آئی کچھ نہ آسکی، تاہم میرے اندر ایک کھٹک سی ابھری تو میں اس کی طرف ناگوار سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ میں... عورتوں والے کپڑے پہن لوں گا تو تم لوگوں جیسا ہو جاؤں گا؟"

"صرف کپڑے پہننے سے یہ سب نہیں ہوتا... اس کے لیے تمہیں سب سے پہلے باقاعدہ ایک گدھی کے عمل سے گزارا جائے گا... اس کے بعد..."

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت ریکھا نامی ہیجڑا اندر داخل ہوا تھا اور ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد وہ لڑکے سے بولا۔ "رمو! تم یہاں کیا اس کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہے ہو؟ لے کر کیوں نہیں گئے اسے تم ابھی تک؟"

رمو نام کا وہ لڑکا گھبرا سا گیا۔ بولا۔ "ابھی لیے جاتا ہوں ریکھا دیوی! چھما کر دو، میں اسے ذرا سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"بس... بس... زیادہ دودی چلتر نہ کر میرے ساتھ... لے آ اسے ابھی۔" ریکھا نے ہاتھ نچا کر رمو کی طرف دیکھتے ہوئے درشتی سے کہا اور واپس لوٹ گیا۔

"چل اوئے بتو... خالی پیلی میں ڈانٹ پڑوا دی۔ اب کیا سردار جی سے میری مار پڑوا دے گا" رمو نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"نہیں پہلے مجھے بتاؤ تم مجھے سردار کے پاس کیوں لے جا رہے ہو؟ اور... اور... یہ گدھی کیا ہوتا ہے؟ تم... تم... میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں خوف زدہ سا ہونے لگا... وہ دانت پیس کر میری جانب بڑھا اور غصے سے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"زیادہ چیوٹ نہ بن، ورنہ ایسی درگت بنے گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا... چل۔"

میں رونے لگا۔ اور اس کے ہمراہ چل پڑا۔

میں اس لڑکے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا... مگر کمبخت ریکھا کی اچانک مداخلت کے باعث نہ پوچھ سکا۔

بہرحال، رمو مجھے اس کمرے سے لے کر نکلا تو ہم ایک نسبتاً بڑے کمرے سے گزرنے لگے، یہاں بھی کئی ایسے لوگ مجھے نظر آرہے تھے جنہوں نے رنگ برنگ کپڑے، جو زیادہ تر چنی کوٹ، بلاؤز اور ساڑیوں پر مشتمل تھے، پہنے ہوئے تھے، وہ سب عجیب اور بھدی آوازوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتوں اور چہلوں میں مصروف تھے، اور سگریٹ، بیڑیاں پی رہے تھے، گاڑھے گاڑھے دھوئیں سے ماحول کثیف اور وحشت ناک سا ہو رہا تھا، کئی میری جانب بھی متوجہ ہوئے اور میری طرف دیکھ دیکھ کر فحش اشارے کر رہے تھے، دو چار نے تو کورس میں تالیاں پیٹ کر میری طرف معنی خیز جملے بھی اچھال دیے۔

"ہائے ہائے... ذرا ادھر بھی ایک نظر ہو جاوے ہے، بالکا تو بڑا چیوٹ دکھائی پڑتا ہے۔"

"کیسا چیوٹ اور کہاں کا چیوٹ ری مجو! اب تو سب دھرا رہ جاوے ہے۔"

"ارے رمو! اب تو ہی اسے تالی پیٹنا سکھلا دے یا ہمرے پاس چھوڑ دے... سب کچھ ایک ہی رات میں سکھلا دیں گے۔"

ہال میں بے ہنگم قہقہے گونجنے لگے... مجھے اس گندے ماحول سے ہی وحشت ہونے لگی، میں ایک ناقابل بیان سی گھٹن محسوس کر رہا تھا۔ میرا جی چاہا میں اسی وقت رمو کا ہاتھ جھٹک کر یہاں سے بھاگ کھڑا ہوں۔ اور ایک موقع پر مجھے ایک ایسا دروازہ بھی نظر آگیا... جو شاید باہر کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے رمو سے ہاتھ چھڑا کے بھاگنے کی کوشش چاہی تو میں اپنا ہاتھ رمو کی مضبوط گرفت سے نہ چھڑا سکا۔ میں نے اس کے ساتھ کھینچا تانی شروع کردی مگر بے سود... وہ مجھے اسی طرح بڑے مطمئن انداز میں کھینچتا ہوا ایک دوسرے کمرے میں لے آیا، جہاں میں نے چند اور گیم گیم اور مسٹنڈے سے ہیجڑوں کو دیکھا... ان میں سکھ دیو اور ریکھا بھی شامل تھے۔

یہ کمرا تو نسبتاً بہتر تھا مگر ماحول وہی تھا۔ سگریٹ اور عجیب سے تمباکو کی بو پھیلی ہوئی تھی، کمرے کی دیواریں پختہ تھیں اور فرش پر قدرے صاف سی دری بچھی ہوئی تھی۔ سامنے کچھ عام سی کرسیاں دھری تھیں، ایک گینڈے جیسے جثے اور کالی رنگت کا موٹی موٹی اُبلی ہوئی آنکھوں والا شخص ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں بڑے بڑے گول بالے لٹک رہے تھے، ہاتھ کی مٹھی میں موٹی سی بیڑی دبی ہوئی تھی، سر اس کا بالکل گنجا تھا، اور ناک موٹی تھی۔ اس نے جسم پر فقط ایک میلی سی صدری پہن رکھی تھی اور دھوتی باندھی ہوئی تھی۔

مجھے اس کے سامنے رمو نے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

وہ ہیجڑوں کا سردار پھو ہی تھا... یہ میرا اندازہ تھا جو بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ وہ مجھے پہلے تو خاموشی سے گھورتا رہا اس کے بعد کرسی سے اٹھ کر میری جانب آیا اور مجھے بہت قریب سے گویا تولتی نظروں سے دیکھنے لگا، کئی ایک جگہ اس نے جیسے مجھے ٹھوک بجا کر بھی دیکھا... مجھے اس سے خوف سا آنے لگا۔ میں بھی سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگتا تو کبھی اس سے نظریں چرا لیتا۔

"ہوں..." اس کی حلق سے ایک ہنکاری سی آواز ابھری، اس کے بعد وہ بڑے عجیب سے لہجے میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔

"بالکا تو جاندار دکھائی پڑتا ہے... درد بھی سہہ جائے گا، اور ہمارے بہت کام آوے گا۔" یہ ادا کرنے کے بعد وہ بدہیئت سا مکروہ شخص دوبارہ اپنی کرسی کی طرف لوٹ گیا اور اس پر براجمان ہوتے ہی اس نے اپنی بھاری اور کھرکھراتی آواز میں قریب موجود سکھ دیو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج رات اس کی خدمتی کی تیاری کرو۔"

"بہت بہتر مہاراج!" سکھ دیو نے فوراً مودبانہ انداز میں ایک مدھم تالی پیٹ کر کہا۔

"اس کا اشنان ہم خود اپنے ہاتھوں سے کریں گے۔" ہیجڑوں کے سردار پھو نے کھرکھراتی آواز میں کہا... اور سب نے یک آواز "بدھائی ہو... مہاراج کی بدھائی ہو" کہنا شروع کر دیا... اس کے بعد سکھ دیو نے ریکھا کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ آگے بڑھی اور مجھے اپنے ساتھ ایک دوسرے کمرے میں لے آئی۔

یہ رہائشی کمرا تھا۔ یہاں ایک بستر کی چارپائی بچھی تھی اور دو کرسیوں کے علاوہ کپڑوں وغیرہ کی چھوٹی سی الماری بھی تھی۔

مجھے ریکھا نے چارپائی پر بٹھا دیا اور پوچھا۔ "تو نے کچھ کھایا پیا کیوں نہیں ہے ابھی تک؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"مجھے بھوک نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہوگا تیرے لیے۔" وہ بولی یا بولا۔

"تم لوگ آخر میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ یہ... یہ... شہد کی کیا بلا ہے؟ آج رات میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟" میں تنگ آئے ہوئے لہجے میں بولا، اس میں ڈر بھی تھا اور ایک نامعلوم ہراس بھی۔ ریکھا بولی۔

"اوئے بابے! تیری عیاشیوں اور خوشیوں کے دن آنے والے ہیں، سردار نے تجھے پسند کرلیا ہے، اور جانتا ہے، ایک بار سردار پھمو کسی پہ مہربان ہوجائے تو اس کے سمجھو پوبارہ ہوگئے۔"

میرا جی چاہا اسی وقت اس کے سردار کو ایک موٹی سی گالی دے ڈالوں مگر ظاہر ہے میں ایسا نہیں کرسکتا تھا... کیونکہ میں تو خود ان کے رحم و کرم پہ تھا... مگر پھر بھی نجانے کیوں ایک نامعلوم سا ہولناک خیال مجھے بار بار پریشان سا کررہا تھا... ریکھا نے کہا۔

"میں تیرے لیے بھوجن لاتی ہوں، بھوکا رہنا صحیح نہیں ہوگا آج تیرا مہورت ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنسی تھی... پھر چلی گئی۔

اس کے کمرے سے جانے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا... اسے تھوڑا دھکیلا تو یک بارگی میرا دل خوشی کے مارے زور سے دھڑکا، وہ کھلا ہوا تھا۔ ریکھا کمرے سے باہر جاتے ہوئے یقیناً دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ میں نے پہلے دروازہ تھوڑا کھول کے باہر جھانکا اسی کمرے سے متصل وہ ہال کمرا تھا جہاں اور بھی لوگ (ہیجڑے) موجود تھے، مجھ میں باہر نکلنے کی ہمت نہ ہوسکی... یہ مجھے بھاگتے ہوئے پکڑ سکتے تھے۔ میں وہیں دروازے سے لگا اس کی باریک متوازی جھری سے باہر دیکھتا رہا... اور پھر میرے اندر ایک جوار بھاٹا سا بیدار ہوا، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، یکدم دروازہ کھول کے باہر نکلا اور ایک دوسرے دروازے کی طرف دوڑ لگادی۔ ہال میں یکدم شور مچ گیا۔ یہ شور کسی کو خبردار کرنے یا "پکڑو... جانے نہ پائے" جیسا نہیں تھا بلکہ استہزائیہ قہقہوں کا تھا... پھر جیسے ہال میں بلی چوہے کا کھیل شروع ہوگیا۔

کبھی کوئی میرے آگے آتا اور مجھے پکڑ کے دوسرے کی طرف دھکیل دیتا تو کبھی کوئی مجھے قہقہہ مار کے دبوچتا اور اپنے ساتھی کی طرف اچھال دیتا۔ کچھ ہیجڑوں نے میرے ساتھ نازیبا حرکت بھی کی تو مجھے مارے شرم کے واپس اسی کمرے میں پناہ کے لیے لوٹنا پڑا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ریکھا ایک چھوٹے سے تھال نمارے میں میرے لیے کھانے وغیرہ کا سامان لے آئی... مگر اس کے چہرے پہ برہمی کے آثار تھے۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اپنا منہ بسورے چپ بیٹھا رہا۔

"تو نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں" میں نے بلاخوف کہا۔ مجھے غصہ آرہا تھا۔ "تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟ میرا تم لوگوں سے بھلا کیا تعلق ہے؟ میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

ریکھا چند ثانیے غصے سے اپنے ہونٹ بھینچے مجھے تکتی رہی پھر تھال ایک تپائی پر رکھنے کے بعد مجھ سے تیز لہجے میں بولی۔

"اگر تمہاری اس حرکت کا سکھ دیو کو پتا چل گیا تو وہ تمہیں مار مار کے ادھ موا کرڈالے گا۔ کان کھول کر ایک بات سن لو... بچو! اب تمہارا یہی ٹھکانا ہے اور یہی گھر ہے... اب ہم ہی تمہارے ماں باپ، بہن اور بھائی ہیں۔ یہاں سے تم کہیں بھی بھاگ کر نہیں جاسکتے... اور چلے بھی گئے تو کدھر جاؤ گے؟ تم اس وقت اپنے ملک کی سرزمین سے کوسوں دور ہو... بھاگو گے تو تمہیں یہاں کی پولیس دھر لے گی... پاکستان کا جاسوس سمجھ کر ساری عمر کے لیے جیل میں ڈال دے گی... اس سے بہتر یہی نہیں ہے کہ ادھر ہی ہمارے پاس رہو۔" وہ یہ کہنے کے بعد ذرا تھمی پھر قریب تپائی پہ رکھے کھانے کے تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"کھانا رکھا ہوا ہے۔ کھالو اور ادھر ہی آرام سے سوجانا... میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی... میں سسک پڑا اور اپنی ماں کو یاد کرنے لگا۔

میں بھی کیسا بدنصیب انسان تھا، پہلے باپ کا ساتھ چھوٹا اور اب ماں بھی بچھڑ گئی تھی۔ مجھے تو رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آرہا تھا... میری اس طرح اچانک گمشدگی سے اس غریب پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس بے چاری کا تو غم کے مارے برا حال ہورہا ہوگا... وہ تو بالکل ہی اکیلی ہوگئی ہوگی۔

مجھے اس رذیل آدمی... سکھ دیو پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔ یہی کمینہ شخص مجھے میری ماں سے جدا کرکے اتنی دور یہاں اس گندی جگہ پر لایا تھا۔ اور اب پتا نہیں آج رات میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ مجھے تو اس کا نامعلوم تصور بھی بھیانک سا معلوم ہونے لگا تھا... اور اس مردود ہیجڑوں کے سردار پھمو بھارتی سے بھی مجھے خوف آنے لگا تھا۔

مجھے بھوک اور پیاس کا اب احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے قریب تپائی پر رکھے تھال کی طرف دیکھا، ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چھوٹی سی کٹوری میں کوئی ترکاری تھی۔۔۔ دو پھلکے تھے، پانی کا ایک بڑا سا گلاس تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھانے کا جائزہ لیا۔۔۔ گلاس اٹھا کے پانی پیا۔۔۔ پھر کھانا زہر مار کرنے لگا اور باقی بچا کھچا پانی بھی پی لیا۔۔۔ اس کے بعد کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے دروازے پر آہٹ کا احساس ہوا۔ میں یہی سمجھا کہ وہی منحوس ریکھا ہوگی۔۔۔ مگر میں ایک اجنبی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ذرا چونکا۔۔۔ وہ بھی ایک جوان منچلا ہی تھا۔ دبلا پتلا سا۔۔۔ رنگت خاکستری تھی، چہرہ لمبوترا تھا۔ اس کے ایک کان میں بالا جھول رہا تھا۔۔۔ کپڑے رنگ برنگے سے پہن رکھے تھے۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کھانے کا تھال اٹھا لیا، وہ شاید وہی لینے آیا تھا۔ جاتے جاتے اس نے میری طرف دیکھ کر نیچی آواز میں پوچھا۔

”کیا تم ہی وہ لڑکے ہو، جسے سکھدیو سرحد پار سے اغوا کرکے لایا تھا؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے مختصراً کہا۔ پھر وہ خاموشی سے چلا گیا اور میں اسی طرح چپ بیٹھا رہا۔

اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ریکھا آگئی۔ وہ خاصی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ ”بنو! تو بڑا اچھا گوان ہے رے۔۔۔ تیری خدمت کے سارے انتظام خود سردار کررہا ہے، سب یہی کہہ رہے ہیں کہ تو سردار کو بے حد پسند آگیا ہے۔“

اس کی بات پر ایک بار پھر میرے اندر کا نامعلوم خوف بیدار ہونے لگا۔ آخر ایسا میرے ساتھ کیا کیا جانے والا تھا؟ میں نے دل ہی دل میں اس پر اور اس کے سردار بچھو پر لعنت بھیجی اور اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”آخر آج رات میرے ساتھ تم لوگ کیا کرنے والے ہو؟“ میرے اس سوال کو اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تو اب ذرا آرام کرلے۔۔۔ شاید رات بھر تجھے آج جاگنا پڑے۔۔۔ چل شاباش بنو!“

یہ کہہ کر وہ خود بھی چارپائی پر لیٹ گئی اور وہیں اپنے قریب میرے لیٹنے کی جگہ بنا کر مجھے اشارے سے بلایا تو میں نے فوراً انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”مجھے نیند نہیں آرہی۔“

”ارے آجا! میرے تو ایک اشارے پر نجانے کتنے لوگ سونے کے لیے چلے آتے ہیں۔۔۔ آجا شاباش! میں تیرے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیروں گی تو گھڑی میں تجھے نیند آجائے گی۔“ وہ اپنی ایک آنکھ کو معنی خیز انداز میں میچ کر بولی۔

میرا تو اس کے ساتھ سونے کے تصور سے جی متلانے لگا تھا۔ میں نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ مجھے ذرا دیر تک شاکی نظروں سے دیکھتی رہی اس کے بعد دوسری طرف کروٹ بدل کے سوگئی، اور تھوڑی دیر بعد ہی کمرے میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔ مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ میرا تو اب ایک پل کے لیے بھی یہاں رکنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا، میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میرے پر نکل آئیں اور میں پھر سے اڑکر اپنی پیاری ماں کی گود میں جا گروں۔

پتا نہیں آج رات مجھے کس تکلیف اور کس اذیت سے گزارا جانے والا تھا؟ ایسا کیا میرے ساتھ ہونے والا تھا۔۔۔؟ اس کا نامعلوم تصور ہی مجھے ہولائے دے رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزرا تو مجھے نیند سی آنے لگی۔۔۔ مگر میں یہاں سے بھاگنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن مفر کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ایک نظر سامنے چارپائی پر بے سدھ سوئی ہوئی ریکھا کی طرف دیکھا۔۔۔ اور پھر اٹھ کر دوبارہ دروازے کی طرف آیا۔۔۔ ریکھا نے سونے سے پہلے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی تھی جو میں نے بے آواز کھول لی۔۔۔ اور دروازے کی موٹی جھری بنا کر باہر جھانکا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔۔۔ وہ ہال کمرا اب بالکل خالی تھا۔ میں نے اسے فرار ہونے کا موقع جانا اور کمرے سے نکل گیا۔۔۔ پھر دبے پاؤں ہال کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر پتا چلا کہ وہ باہر سے بند۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔

میں ادھر ادھر نظریں گھما کے دیکھنے لگا، اس ہال کمرے کے ساتھ اور بھی کئی کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے، جس کا مطلب تھا کہ اس ہال سے اور بھی کئی کمرے متصل تھے۔

اس وقت شاید سہ پہر کا وقت تھا، کھڑکیوں اور روشن دانوں سے ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اندر پڑ رہی تھیں، میں نے ان کا بھی جائزہ لیا مگر ان سب پر لوہے کی مضبوط سلاخیں نصب تھیں۔

اسی دوران مجھے کونے کی طرف ایک راستہ سا دکھائی دیا، میں اس طرف دبے پاؤں بڑھا۔۔۔ وہاں ہلکا اندھیرا تھا۔ میں اندر گھس گیا۔۔۔ مگر فوراً ہی الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا، وہاں انتہائی ناگوار بدبو تھی، جس سے میرا جی الٹنے لگا تھا۔۔۔ ناچارمیں واپس کمرے میں آگیا۔

ریکھا سو کے جاگ اٹھی تھی اور بیڑی سلگا رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھی... مجھے دیکھ کر طنزیہ بولی۔

"کیوں بنو! بھاگنے کا راستہ نہیں ملا کیا؟"

اس سمے مجھے وہ زہر لگی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

بیڑی کا دھواں کمرے میں چکرانے لگا اور میرا سر بھی۔ وہ اُٹھ کر چلی گئی... تھوڑی دیر اور گزری تو اچانک مجھے شور کی آواز سنائی دی۔ پتا چلا کہ ہال میں بے ہنگم سا ڈانس اور گانوں کی محفل سج گئی تھی... اس شور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔

اسی وقت دروازہ دھڑ سے کھلا اور تین چار ہیجڑے بدمستیاں کرتے شور مچاتے، تالیاں بجاتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور مجھے دبوچ کر ہال میں لے آئے۔ میں اس اچانک اُفتاد پر بری طرح گھبرا گیا۔ ہال میں روشنی کردی گئی تھی، ریکھا بھی ان میں موجود تھی اور سکھ دیو بھی... اسے دیکھ کر میرا دل نفرت سے بھر گیا۔ ہیجڑوں نے بڑے بڑے تھال پکڑ رکھے تھے اور ان میں چراغ اور موم بتیاں جل رہی تھیں۔ مختلف رنگوں کی کٹوریاں بھی تھیں... اور نجانے کیا کچھ تھا۔ وہ رنگ میرے چہرے پر بھی مل رہے تھے، مجھے سخت کوفت ہورہی تھی، ڈھول پیٹے جارہے تھے، اور گانے گارہے تھے، ساز بھی تھے ان کے پاس، گویا ایک طوفانِ بدتمیزی تھا جو وہاں بپا تھا۔ کبھی کوئی مجھے کاندھے پہ بٹھاتا تو کبھی دوسرا اسے چھین کر مجھے اپنی گود میں اُٹھا لیتا، حالانکہ میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا... مسیں تو میری بھیگ ہی چکی تھیں۔

اسی دوران اچانک میری نگاہ ایک ہیجڑے پر پڑی جو اس بدرنگ سی محفل سے الگ دکھائی دے رہا تھا اور بہ غور میری طرف تکے جارہا تھا۔ میں اسے پہچان رہا تھا، یہ وہی تھا جو ریکھا کے کمرے میں کھانے کے خالی برتن لینے آیا تھا اور اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا تو یہ مجھے ان لوگوں سے کچھ مختلف اور سنجیدہ مزاج کا لگا تھا... مگر اس وقت مجھے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ میں آرہا تھا۔

بالآخر کافی دیر بعد یہ شور غوغا تھما، ساز اور باجے گاجے تھمے تو دماغ میرا بھی کچھ ٹھکانے پر آیا، پھر مجھے ریکھا نے تھام لیا اور اس کے ہمراہ سکھ دیو تھا، پیچھے باقی ہیجڑے، یہ لوگ مجھے سردار پھو بھارتی کے کمرے میں لے آئے۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے اپنی کالی موٹی بیل جیسی گردن سے ایک گیروے رنگ کا دھاگا سا اُتار کے میرے گلے میں پہنا دیا... اور پھر گمبھیر آواز میں بولا۔

"اسے اوپر لے چلو۔"

وہیں ایک کونے میں سیڑھی نظر آرہی تھی، مجھے اس سے اُوپر لے جایا گیا۔ یہ بالکل سپاٹ کمرا ہی نظر آتا تھا، اور خاصا بڑا بھی تھا، جہاں تھوڑا بہت ٹوٹا پھوٹا فرنیچر نظر آتا تھا، درمیان میں دری بچھی ہوئی تھی، اسی وقت دو ہیجڑے ایک ٹرے نما تھال اُٹھائے آئے، ایک کے ہاتھ میں بڑا سا پانی کا لوٹا بھی تھا، پھر مجھے سکھ دیو اور ریکھا کے حوالے کردیا گیا، یہ دونوں خبیث مجھے لیے کمرے کے وسط میں بچھی دری پر لے آئے، اور اس دوران سردار پھو بھی قریب آگئی، ادھر خوف کے مارے میرا برا حال ہورہا تھا۔ پتا نہیں یہ شیطانی ٹولا میرے ساتھ کیا کھلواڑ کرنے والا تھا؟ میری اپنی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ ایک دو بار میں نے کمزوری آواز میں صدائے احتجاج بلند کی تھی مگر نقار خانے بلکہ اس کنجر خانے میں کون طوطی کی آواز سنتا؟

مجھے پہلے وہاں دری میں بٹھا دیا گیا تھا، اسی دوران ان دونوں ہیجڑوں نے پیتل کی تھالی نما ٹرے دری پر رکھ دی اور پانی کا لوٹا بھی۔ میں نے سہمی سہمی نظروں سے اس طرف دیکھا... تھال میں دو تین چھوٹی کٹوریاں رکھی تھیں۔ ایک میں گھی تھا اور دوسری کٹوری میں تیل اور اس کے اندر سوئی دھاگا... تیسری کٹوری میں لیپ کی طرح کی کوئی دوا تھی... میں ان چیزوں کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا مگر جب دوسرے تھال پر میری نگاہ پڑی تو میں پورے جی جان سے لرز گیا۔

دوسرے تھال میں ایک تیز دھار استرا رکھا ہوا تھا... اور روئی کے پھاہے سے بنا کے رکھے تھے۔ اس کے بعد مجھے سکھ دیو نے دبوچ کر دری پر پشت کے بل چت لٹا دیا... ریکھا نے میری ٹانگیں پکڑ لیں... سردار پھو بھارتی نے تھال پر سے استرا اُٹھا لیا... جبکہ ایک اور ہیجڑے نے سوئی دھاگا... یہ سب لوگ میرے بالکل قریب ہوگئے تھے۔

"ک... ک... یہ کیا ہو رہا ہے... م... م... میں... میرے ساتھ...؟" میں نے خوف سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

وہ سب مجھ پر جھک آئے تھے، ایسے میں ان سب کے چہرے مجھے انتہائی مکروہ نظر آرہے تھے، ان پر شیطانیت اور وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں دہشت زدہ ہوگیا، حلق سوکھ کے کانٹا ہورہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ خبیث لوگ میرا آپریشن کررہے ہوں۔ اب مجھے ان کی اس حرکت کا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مطلب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ یہ جان کر کہ اب یہ رذیل صفت لوگ مجھے زبردستی اپنے جیسا بنانے پر تلے ہوئے تھے... مگر کیوں... یہ تو پیدائشی ہوتے ہیں... جبکہ میں تو اچھا بھلا تھا۔ پھر یہ ظلم میرے ساتھ کیوں کیا جا رہا تھا؟

ریکھا میری شلوار کے آزار بند کی طرف ہاتھ بڑھانے لگی... جبکہ سردار بچھو ہاتھ میں استرا لے کر میری ٹانگوں کے قریب آ گیا۔ میں بری طرح چیخنے لگا۔

ٹھیک اسی وقت ہر سو اندھیرا پھیل گیا... شاید بجلی چلی گئی تھی... میں اور دہشت زدہ ہو گیا، کیونکہ یہ اندھیرا بھی میں ان کے شیطانی کھیل کا ایک حصہ ہی سمجھ رہا تھا، مگر ایسا نہیں تھا، شاید کسی خرابی کے باعث واقعی بجلی چلی گئی تھی، کیونکہ اسی وقت سردار بچھو کی جھلاہٹ بھری آواز ابھری۔

"یہ کیا ہوا؟ اس کم بخت بجلی کو بھی ابھی جانا تھا... فوراً بتی لے کر آؤ... ہم اب اس عمل کو بیچ میں ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔"

ذرا ہی دیر بعد دو تین آئل لیمپ کا بندوبست کر دیا گیا۔ لیمپ کی روشنی میں مجھے یہ شیطانی عمل اور بھی زیادہ بھیانک محسوس ہونے لگا۔ میں چیخنے چلانے لگا... اسی وقت پھر جیسے کوئی معجزہ ہو گیا... اچانک... "آگ... آگ" کا شور مچ گیا... سارے تتر بتر ہونے لگے، عارضی طور پر اس عمل کو روکنا پڑ گیا۔ پیچھے کہیں آگ لگ گئی تھی اور سب لوگ آگ بجھانے میں لگ گئے... جنہوں نے لیمپ تھامے ہوئے تھے، ان کے ادھر ادھر ہونے سے وہاں پھر سے تاریکی چھا گئی تھی۔ مجھے ابھی تک سکھودیو نے جکڑ رکھا تھا... اور پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑی، اس نے ریکھا کو آواز دے کر مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ ریکھا مجھے نظر نہیں آ رہی تھی... مگر کوئی تھا جو مجھے اپنے ساتھ کھینچے لے جا رہا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا جا رہا تھا... اور ساتھ ہی دل ہی دل میں خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ یہ بلا میرے سر سے ٹل گئی تھی۔ مگر کب تک؟ اس کا ابھی مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

ریکھا مجھے اپنے ساتھ تیز تیز قدموں سے لے جا رہی تھی، یوں لگتا تھا وہ خاصی عجلت میں ہو... اس پر مجھے الجھن آمیز حیرت بھی ہوئی... تاہم میں خاموش رہا۔ ہر طرف شور سا مچا ہوا تھا، میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھلا ریکھا اب مجھے کہاں لے جا رہی تھی؟ پیچھے تو آگ لگی ہوئی تھی؟ شاید اسے مجھے کسی اور جگہ لے جانے کا حکم ملا ہو؟

تھوڑی دیر بعد ہی مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے ریکھا مجھے باہر لے آئی۔ باہر کی کھلی فضا میں سانس لینا مجھے بے حد خوش گوار لگا۔ بند ذہن میں تراوٹ سی اترنے لگی اور میں بے حد سکون محسوس کرنے لگا... مگر میں سوچ رہا تھا کہ اب ریکھا مجھے کہاں لے جا کر بند کرنے والی تھی؟ پھر جلد ہی مجھ پر ایک خوشگوار انکشاف ہوا، اندھیرے کے باعث جسے ریکھا سمجھ رہا تھا وہ کوئی اور تھا... بلکہ کوئی اور بھی کون... یہ تو وہی تھا جو مجھے ان ہیجڑوں میں ذرا مختلف نظر آتا تھا... اور میرے بارے میں اس نے مجھ سے اس طرح استفسار بھی کیا تھا، جیسے میرے بارے میں پورا یقین کر لینا چاہتا ہو۔

"دیکھو بھئی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ خاصی عجلت اور دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں اس رذیل شیطانی ٹولے کے چنگل سے چھڑانا چاہتا ہوں۔" پھر ایک نکڑ والی گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے بولا۔ "وہ سامنے والی گلی دیکھ رہے ہو... اس کے بائیں جانب مڑ جانا۔ چار گھر چھوڑ کر ایک ٹاٹ جھولتے ہوئے دروازے والا گھر نظر آئے گا، اس کے دروازے پر دستک دینا، وہاں ایک عورت ہوگی، اس سے صرف اسی قدر کہنا کہ تمہیں بجلی نے بھیجا ہے، جاؤ اب ورنہ تمہیں یہ موقع پھر نہیں ملے گا۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں... میں فوراً بھاگ کھڑا ہوا۔ جلد ہی مجھے گھر نظر آ گیا جہاں ٹاٹ جھول رہا تھا۔ میرا تو جی چاہا کہ یہاں بھی نہ رکوں... کیونکہ یہ جگہ بھی اس منحوس مقام سے زیادہ دور نہیں تھی، کیا خبر کہ پھر دھر لیا جاؤں؟ لیکن میرا دل نہیں مانا... اپنا ملک اپنا شہر ہوتا تو اور بات ہوتی۔

میں نے آگے بڑھ کر مذکورہ دروازے پر دستک دی، دروازہ کسی عورت نے ہی کھولا تھا، وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ جو مجھے ان جیسی محسوس نہیں ہوئی تھی، میں نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بجلی نے بھیجا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں سردار بچھو کا کوئی آدمی ادھر آن دھمکے۔

"او... تم وہی ہو۔" وہ چونک کر بولی۔ اسے شاید پہلے سے بہت کچھ پتا تھا، کم از کم اس کے خود کلامیہ بڑبڑانے سے تو مجھے یہی لگا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی فوراً اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اندر آ جاؤ، جلدی۔" وہ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد خاصی .... عجلت میں بولی۔

اندر داخل ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے یہ سکون آمیز احساس ہوا کہ میں ایک مسلمان کے گھر میں تھا۔ یہ ایک کمرے اور چھوٹے سے صحن والا گھر تھا۔ وہ مجھے کمرے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں لے آئی۔ میں نے دیواروں پر آویزاں چند ایسے اسلامی طغرے دیکھے جو آیاتِ کریمہ پر مشتمل تھے... اور ایک طرف مجھے جانماز اور تسبیح بھی رکھی نظر آئی تھی، اسی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ میں ایک مسلم گھرانے میں تھا۔

وہ مہربان عورت مجھے کمرے میں چارپائی پر بیٹھنے کا کہہ کر خود کمرے سے نکل گئی۔ کمرا صاف ستھرا تھا جہاں ایک ہی چارپائی تھی جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ ایک طرف کونے میں ایک کرسی تھی، پانی کا ایک مٹکا تھا... اور کچھ تھوڑا بہت سامان وغیرہ۔ مجھے یہاں قدرے سکون ملا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ رہ رہ کر مجھے وہ ڈراؤنا منظر یاد آرہا تھا، جب وہ شیطانی لڑکے میرے ساتھ "شدھی" کے نام پر بھیانک ظلم کرنے والے تھے... مگر عین وقت پر میں بال بال ان کے ذلیل عمل سے بچا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ عورت آگئی اور مجھے ابھی تک کھڑا... پا کر بولی۔ "ارے! تم ابھی تک کھڑے ہو؟ بیٹھ جاؤ بیٹا!" اس نے پیار سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو مجھے اس مہربان عورت میں اپنی ماں کا پیار محسوس ہوا اور بے اختیار مجھے اپنی ماں یاد آگئی، میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس عورت نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا... اور تب میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ ممتا بھرے لہجے میں میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"بس کر، میرے بچے! چپ ہوجا، مت رو، میں جانتی ہوں تجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔"

میں اس کی بات پر حیران رہ گیا اور اپنا رونا دھونا بھی بھلا بیٹھا۔ وہ میرے بارے میں جانتی تھی، کیسے؟ پھر مجھے دوبارہ اس شریف لڑکے... بجلی کا خیال آیا... ضرور اسی نے یہ سب بتایا ہوگا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ بجلی بھی انہی کا ساتھی تھا تو پھر میری اس طرح مدد کیوں کر رہا تھا...؟

وہ مہربان عورت مجھے پیار کرتے ہوئے شیطانی ٹولے کو کوسنے لگی۔ "اللہ غارت کرے ان بدبختوں کو جو اتنے پیارے اور معصوم کے ساتھ یہ ظلم کرنے لگے تھے۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر نرمی سے بولی۔ "بیٹا! تمہارا نام کیا ہے؟"

"لل... لئیق... لئیق شاہ۔"

"ماشاء اللہ... بہت پیارا نام ہے۔ بالکل تمہاری طرح۔" وہ محبت بھرے لہجے میں بولی پھر اس نے مجھ سے کھانے کا پوچھا، مجھے بھوک نہیں تھی، مگر پھر بھی اس مہربان خاتون نے مجھے ایک گلاس میں گرم گرم دودھ لا کر دیا... ساتھ میں کچھ بسکٹ تھے۔ میں نے درمیان میں اس مہربان عورت سے اُمید بھرے لہجے میں کہا۔

"آ... آ... آپ میری مدد کریں گی؟ مم... مجھے کسی طرح میری ماں کے پاس پہنچا دیں... وہ میرے بنا غم سے نڈھال ہو رہی ہوں گی؟" وہ پیار سے مسکرا کے بولی۔

"ہاں... ہاں... کیوں نہیں لئیق بیٹا! ضرور، میں اور بجلی ضرور تمہاری مدد کریں گے... اور تمہیں تمہاری بدنصیب ماں کے پاس پہنچا کر دم لیں گے۔" میں اس کی بات سن کر بے حد خوش ہوا، وہ مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

وہ مجھے تسلی دے کر کمرے سے باہر چلی گئی... تھوڑی دیر بعد لوٹی تو وہ کچھ فکرمند نظر آرہی تھی۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھ لیا۔

"آپ... کچھ پریشان نظر آرہی ہیں؟ کیا مجھے یہاں بھی کوئی خطرہ ہے؟" میرے لہجے میں ہلکا سا خوف بھی عود کر آیا تھا۔ وہ از راہِ تشفی مجھ سے بولی۔

"تم فکر نہ کرو بیٹا! اللہ آگے بھی خیر کرے گا... بس ذرا یہ گھر اس کنجر خانے کے قریب ہے نا... اسی لیے تھوڑی فکر ستا رہی تھی کہ کہیں وہ شیطانی ٹولا تمہاری تلاش میں اِدھر ہی نہ نکل آئے۔" میں اس کی یہ بات سن کر دوبارہ پریشان ہو گیا اور اس سے معصومانہ لہجے میں بولا۔

"اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی یہاں سے کہیں دور چلا جاتا ہوں... آپ مجھے جانے دیں، آپ کا بہت شکریہ۔" میری بات سن کر اس مہربان عورت نے بے اختیار مجھے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔

"میرے بچے! تو اس وقت رات میں کہاں اور کس کے پاس جائے گا؟ بھلا یہاں سرحد پار تیرا ہمارے سوا اور کون ہمدرد ہوگا؟ اور پھر وہ لوگ باہر تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے وہ لوگ اِدھر نہ آجائیں... وہ بہت ظالم ہیں، اگر میں دوبارہ ان کے ہتھے چڑھ گیا تو اس بار وہ شاید مجھے زندہ ہی نہ چھوڑیں۔" میری آواز میں خوف کا ارتعاش تھا۔

"فکر نہ کر، اللہ بہت بڑا ہے وہ تجھے ان ظالموں سے بچائے گا... اگر خدانخواستہ وہ یہاں تیری تلاش میں آئے بھی تو میں تجھے کہیں چھپا دوں گی... ویسے مجھے نہیں لگتا کہ وہ یہاں آئیں گے، کیونکہ انہیں معلوم ہی ہے کہ یہ ان کی ساتھی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بجلی کی بہن کا گھر ہے۔"

"تت... کیا تم بھی ان کی ساتھی ہو؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا تو وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"خدا نہ کرے کہ میں ان رذیلوں کی ساتھی بنوں... میں بجلی کی بات کررہی تھی۔ وہ بھی ان کا ساتھی ضرور ہے لیکن... وہ مسلمان ہے... نجانے کیسے وہ ان کے ساتھ آن ملا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بجلی بے چارہ بھی پیدائشی طور پر انہی جیسا ہے... مگر ان کی طرح برا نہیں ہے، مجھے اس نے منہ بولی بہن بنایا ہوا ہے۔ اس نے آج ہی مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا کہ نامراد سکھ دیو... تمہیں سرحد پار سے اغوا کرکے یہاں لایا تھا، اور تمہیں بھی زبردستی..." اس نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں!... میرے ساتھ یہ لوگ گندا سلوک کرنے والے تھے... مگر میں بچ گیا۔"

"بے شک اللہ نے ہی تمہیں ان کے شر سے بچایا ہے، بیٹا!" وہ پیار سے ایک بار پھر میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "ویسے بیٹا تمہیں اللہ کے شکر کے ساتھ بجلی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے، اسی نے عین وقت پر کوئی ایسی چال چلی ہوگی جس کے باعث تم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے۔" مجھے اس نیک دل خاتون کی بات پر حیرت کا جھٹکا لگا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آ... آپ کا مطلب ہے... کہ یہ سب بجلی نے کیا تھا؟"

"ہاں میرے بچے! یہ تیلی اسی نے لگائی ہوگی... کیونکہ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کبھی بھی اس نامراد پھمو اور سکھ دیو... کو ان کے گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گا۔"

"اوں... لیکن میں اب ان خطرناک لوگوں سے دور چلے جانا چاہتا ہوں... مم... میں اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا ہوں... نجانے میری جدائی کے غم میں اس بے چاری کا کیا حال ہورہا ہوگا؟"

"تم فکر نہیں کرو بیٹا!" وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "اللہ نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے وہ آگے بھی خیر کرے گا۔ میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہوسکے تم یہاں سے نکل جاؤ مگر بیٹا! ابھی یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔ تم سرحد پار ملک بھارت میں ہو؟"

"انڈیا میں؟" میں نے معصومیت سے استفسار کیا، کیونکہ اکثر میں اپنے باپ کے منہ سے اس ملک کا نام سنتا رہتا تھا۔

"ہاں بیٹے!" وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "اب آگے کیا کرنا ہے، یہ تو بجلی ہی بتائے گا، مجھے اسی کا انتظار ہے۔"

"وہ کب آئے گا؟"

"کچھ پتا نہیں بیٹا! میرا خیال ہے کہ وہ موقع دیکھ کر ہی نکلے گا وہاں سے... اور شاید اب وہ صبح ہی آئے، تم ایسا کرو آرام کرلو... اور اب بالکل بے فکر ہوجاؤ۔"

میں واقعی تھکن محسوس کررہا تھا اور مجھے نیند بھی آرہی تھی۔ میں وہیں چارپائی پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی مجھے نیند آگئی۔

پھر رات کے نجانے کس پہر اچانک میری آنکھ کھلی، کسی شدید قسم کی ہونے والی گڑبڑ کے باعث ہی میری آنکھ کھلی تھی، اور جاگنے پر میں نے اپنی کھلی آنکھوں کے سامنے جو منظر دیکھا اس نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزہ دیا۔

میں نے تین مکروہ چہرے اپنے اوپر جھکے ہوئے دیکھے، یہ سردار پھمو، سکھ دیو اور ریکھا کے تھے، جبکہ باقی دو اور ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے جنہوں نے میری ہمدرد خاتون کو بری طرح دبوچ رکھا تھا بلکہ ایک نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ بھی رکھا ہوا تھا کہ وہ شور نہ مچا سکے۔ وہ بے چاری بری طرح دہشت زدہ دکھائی دے رہی تھی، ادھر سکھ دیو نے مجھے گریبان سے پکڑ کے چارپائی سے کھڑا کردیا، میں نے چیخنے کی کوشش چاہی تو اس نے میری گردن دبوچ لی اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "آواز بند رکھ اپنی ہوں! ورنہ ادھر ہی تیرا کریا کرم کرڈالوں گا۔"

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کے چپ ہورہا اور مارے خوف کے بری طرح لرزنے لگا۔ وہ مجھے دبوچے کھڑا رہا جبکہ سردار پھمو نے اپنی دھوتی کی ڈب سے ایک تیز دھار چاقو نکال لیا۔ میں دہشت زدہ رہ گیا اور یہی سمجھا کہ یہ مجھے ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہوئے ہیں لیکن میں نے سردار پھمو کو اس مہربان عورت کی طرف متوجہ ہوتے دیکھا۔

"بول! کدھر ہے تیرا یار بجلی؟" سردار پھمو نے چاقو اس عورت کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا تو وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"ہم... مجھے تو... نہیں معلوم۔"

"اچھا! تجھے نہیں معلوم...!" سردار بچھو ہولناک لہجے میں بولا۔ "تم دونوں نے چھپ چھپ کے بہت راستہ کھوٹا کیا ہے ہمرا۔ ہم بھی ہریان (حیران) تھے کہ آخر کون ہے وہ جیوٹ جو اس طرح ہمارے شکار بھگاتا رہا، آج معلوم ہوہی گیا... پر تو ہم اس سسرے بجلی کو ڈھونڈ لیں گے... مگر تیری اب چھٹی۔" یہ کہتے ہی اس بے رحم انسان نے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اس بے چاری کے پیٹ میں گھونپ دیا... مارے دہشت کے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ اس بدنصیب عورت کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ خون کا ایک فوارہ سردار بچھو کے چہرے اور سینے پر پڑا، جس کے باعث اس کا مکروہ چہرہ مزید بھیانک نظر آنے لگا۔

وہ عورت ابھی مری نہیں تھی، جان کنی کے عالم میں اس کے ساتھی کی گرفت میں تڑپ رہی تھی اور بھنچی بھنچی آواز میں چلانے کی کوشش کررہی تھی۔

"ابے سالے! اپنی ماں کے منہ پہ ہاتھ دھر۔" سردار بچھو نے اپنے ساتھی سے غرا کے کہا، جو عورت کو دبوچے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی، سردار بچھو نے دوسرا وار کرکے اس عورت کو ہلاک کرکے چھوڑا، پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ اس سنگدل آدمی کی آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی، وہ ایسے میں مجھے ایک قسائی کے روپ میں ہی نظر آرہا تھا... اسے اپنی طرف متوجہ پاکر میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں کہ اب میری بھی خیر نہیں۔

"کیوں بھوئے! دیکھ لیا اس سسری کا حشر، جی تو کرتا ہے کہ تیرا بھی یہی حشر کرڈالوں، پر کیا کریں، تو سالا اپنا اپنے من کو بھایا ہے کہ... پر یاد رکھ بربار ایسا نہ ہووے ہے... ورنہ اس سے بھی جیادہ برا حشر کروں گا... لے چلو اسے۔"

سردار بچھو نے آخر میں تحکمانہ کہا پھر اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ اس بدنصیب عورت کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے ساتھ... یہاں کی "صفائی" بھی کرڈالے۔

☆☆☆

میں ایک بار پھر ان شیطانی ٹھگوں کی قید میں آچکا تھا۔ مجھے اس مہربان اور ہمدرد عورت کے دردناک انجام پر بے حد دکھ تھا۔ میرے دل و دماغ پر ان لوگوں کی اب پوری طرح سے دہشت بیٹھ چکی تھی... جان گیا تھا کہ یہ بہت بے رحم اور خطرناک لوگ تھے، کسی کو بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالنے سے نہیں چوکتے تھے۔

پتا نہیں کیسے ان مردودوں کو بجلی اور اس عورت پر شبہ ہوگیا تھا کہ سب کچھ آن واحد میں پلٹ گیا تھا۔ میں اب یہاں دوہرے خوف کا شکار تھا۔ ایک ٹھگی کا اور دوسرا ان خطرناک قاتل لوگوں کا بلکہ مجھے پہلا خوف زیادہ پریشان کیے ہوئے تھا۔ بہ قول اس عورت کے مجھے بجلی نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان کے چنگل سے چھڑایا تھا۔ تو وہ اب کہاں تھا؟ اگرچہ اب اس کا بھی بھانڈا پھوٹ ہی چکا تھا اور وہ یقیناً اپنی جان کے خوف سے کہیں روپوش ہوگیا تھا۔ میرے ذہن میں اب بھی یہ مایوسانہ سوال اُبھرا تھا کہ کیا اب بھی وہ میری مدد کرسکتا تھا؟ جبکہ وہ یہاں تھا بھی نہیں، اور کہاں تھا یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ اب کون آتا میری مدد کو؟ مجھے مایوسی گھیرنے لگی۔ اور میں خوف کے مارے اندر ہی اندر ہلکان ہونے لگا۔

اس بار مجھے کسی قید خانے جیسے کمرے میں ہی رکھا گیا تھا۔ کچی اینٹوں والا فرش، سیلن زدہ دیواریں اور کمرے کا سائز بھی تنگ تھا، کھڑکی کوئی نہیں تھی، فقط روشندان تھا وہ بھی چھوٹا جس میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں، روشن دان سے ہلکی روشنی آرہی تھی۔ اب پتا نہیں یہ صبح ہوتے سویرے کی تھی یا پھر اس قید خانے سے متصل کسی دوسرے روشن کمرے سے آرہی تھی۔ شکر ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے اور انہیں ہلا جلا کر اپنے ٹوٹتے جسم کی اینٹھن دور کرنے کے قابل تو تھا۔

کافی وقت اسی طرح خاموشی سے سرکتا ہوا بیت گیا... اور روشندان سے آنے والی کرنیں دھوپ کی شکل اختیار کرنے لگیں تو میں نے اندازہ لگایا کہ صبح ہوچکی تھی اور شاید دن بھی اچھی طرح نکل آیا تھا۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی، میں مردنی نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا... اسی لمحے دروازہ کھلا اور ریکھا اندر داخل ہوئی۔ اب اس کے چہرے پر جھوٹی ہمدردی یا محبت کے تاثرات بھی نہیں تھے، اس کے برعکس وہ خاصی غصے میں نظر آتی تھی۔ میں دیوار سے پشت لگائے بیٹھی ہوئی تھی، اس نے چند قدم میرے قریب آکے مجھے بغور دیکھا اور بولی۔

"میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا آسان نہیں ہے مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب تم نے سردار بچھو کو بھی ناراض کردیا ہے۔ اب تو تمہیں پتا چل ہی گیا ہوگا کہ وہ کس قدر خطرناک ہے۔ مگر وہ تم پر مہربان ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے اس کی بکواس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی پھر دوبارہ بولی۔ ''اب تمہیں سردار سے معافی مانگنا ہوگی... تم نے بجلی کے ساتھ مل کر یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا اور سب سے بڑا پاپ یہ بھی کر ڈالا کہ شدھی کا پاٹ خراب کیا، تم جانتے ہو اس کی کتنی بڑی سزا ہے، جو تمہیں ابھی ملنے والی ہے؟'' میں اس کی اس بات پر لرزنے لگا۔

''میں نے تو ایسا کوئی جرم نہیں کیا... اور بجلی کو تو میں جانتا تک نہیں ہوں... پتا نہیں اس نے کیسے اور کیوں یہ سب کیا اور مجھے بھی مصیبت میں ڈال دیا۔'' میں نے پہلی بار چالاکی سے کام لینے کی کوشش کی۔ تاکہ اپنے اوپر نازل ہونے والی کسی نئی سزا سے بچ سکوں۔

''جھوٹ مت بولو'' ریکھا برہمی سے بولی۔ ''بجلی نے تمہیں اپنے ساتھ ملا لیا ہوگا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں، ایسا کچھ نہیں تھا میرے اور اس کے درمیان'' میں پُرزور لہجے میں بولا۔

''اگر تم یہ بتا دو کہ اب بجلی کہاں ہے تو میں تمہاری سزا ٹالنے کی کوشش کروں گی۔ تمہیں پتا ہے، تمہیں سزا ابھی سکھ دیو دے گا، سردار کے حکم سے''... اس نے شاید مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ اور واقعی میں سکھ دیو کے نام سے ہی کانپ گیا تھا... لہٰذا میں نے ریکھا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میری بات کا یقین کرو ریکھا! میں واقعی بجلی کو نہیں جانتا اور نہ ہی ہمارے بیچ پہلے سے کچھ ایسا طے تھا۔''

''وہ گیا کہاں ہے اب؟''

''مجھے نہیں پتا۔''

''جھوٹ بول رہے ہو تم'' ریکھا نے مجھے پُرتشکیک نظروں سے دیکھا۔ میں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے الجھن آمیز سوچ نظروں سے دیکھتی رہی اس کے بعد واپس چلی گئی۔

ریکھا کے جانے کے بعد میں سوچتا رہ گیا۔ یہ یہاں کس مقصد کے لیے آئی تھی؟ کیا صرف بجلی کے بارے میں جاننے کے لیے؟ یعنی بجلی اس وقت ان کا اہم شکار تھا۔

میرے چھوٹے سے ذہن میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ بجلی مجھے ان لٹیروں کے خطرناک چنگل سے چھڑانے کے لیے، ایک بڑی بھیانک اور فاش غلطی کر بیٹھا تھا، جس کا کم از کم مجھے اس وقت احساس ہو گیا تھا جب اس مہربان عورت کے گھر میں اس کی پناہ میں تھا۔ مجھے اس وقت بھی یہی خوف کھائے جا رہا تھا کہ میں اس تجز خانے سے فرار ہونے کے باوجود محفوظ نہیں ہوں... کیونکہ وہ جگہ یعنی اس عورت کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ سردار چھو وغیرہ کو کیسے بجلی پر شبہ ہوا؟ مزید یہ کہ انہوں نے اس عورت کے گھر رات کے آخری پہر چھاپا بھی بڑا کامیاب مارا تھا، اور وہ بے چاری میری ہمدرد عورت ان سفاک خونی درندوں کے ہاتھوں ماری گئی تھی... اور بجلی خود لاپتا تھا جبکہ میں دوبارہ قیدی بنا لیا گیا تھا۔ اب آگے کیا ہونے والا تھا میرے ساتھ یہ اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

ریکھا کے جانے کے تھوڑی دیر بعد سکھ دیو آ گیا۔ وہ خاصا طیش میں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں عجیب ساخت کا ہنٹر دبا ہوا تھا... جس پر کانٹے دار باریک کیلیں نصب تھیں۔ مارے خوف کے میری روح فنا ہو گئی اور میں سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے شعلہ برساتی نظروں سے میری طرف گھورا اور پھر کمرے کی محدود فضا میں ایک زنّاٹے دار آواز ابھری۔ جس میں میری دلدوز چیخ بھی شامل تھی۔ کانٹے دار ہنٹر کی ایک ہی اذیت ناک ضرب نے جیسے میری جان نکال دی تھی۔

میری پشت پر سرخ خونی لکیر ابھر آئی تھی۔ جب اس نے ہنٹر واپس کھینچا تو میری قمیص بھی ایک جگہ سے پھٹ کر چیتھڑے کی صورت اس کے ہنٹر میں پھنس گئی... اس خبیث نے اسی پر بس نہ کیا اور ایک اور ضرب لگائی۔ اس بار بھی میں مارے اذیت کے حلق کے بل چیخا تھا... اس نے اسی طرح ''شڑاپ شڑاپ'' چار پانچ ہنٹر میرے جسم کے مختلف حصوں پر برسائے، یہاں تک کہ میں تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گیا۔

پتا نہیں کب اور کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا تھا مگر ہوش آنے کے بعد، ایک بار پھر مجھے اپنے زخموں سے ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ میری قمیص تار تار تھی اور چیتھڑوں کی صورت ہی نظر آ رہی تھی۔ اس درندہ صفت سکھ دیو نے میرے جسم کے ہر حصے کو تختۂ مشق بنایا تھا۔ کمر، ٹانگیں، سینہ اور پیٹ، ہر جگہ سرخ لکیروں کا جال سا بن گیا تھا اور اب زخم سرد ہونے کے بعد، ان میں تکلیف اور جلن کا بھی احساس مزید بڑھنے لگا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں درد اور جلن کے مارے کراہنے لگا۔ میں اپنے شکستہ زخمی وجود کو ہلانے جلانے سے بھی قاصر تھا... کہ ایک ذرا سی جنبش بھی مجھے اذیت ناک لگتی تھی۔ میں ادھ موا سا، اسی طرح منہ کے بل ننگی اینٹوں والے فرش پر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پڑا تھا۔ اور شاید تھوڑی دیر بعد پھر ہوش وحواس سے بیگانہ سا ہو گیا تھا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو یکلخت مجھے یوں لگا کہ میں بینائی سے ہی محروم ہو گیا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے گھور تاریکی تھی۔ میں گھبرا کے بار بار اپنی آنکھیں جھپکنے لگا۔ پھر جب تھوڑی دیر بعد کچھ تاریکی سے دید کو یارا ہوا تو احساس ہوا کہ رات ہو چکی تھی۔۔۔ کیونکہ کسی روزن سے ہلکی سی روشنی کی کرنیں اندر پڑ رہی تھیں۔ مجھے اندھیروں سے بھی وحشت ہونے لگی۔ میرا حلق پیاس کی شدت سے سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ میں نے پانی مانگنے کے لیے آواز نکالنا چاہی مگر ایک درد انگیز سی کراہ خارج ہو کے رہ گئی۔ میں اسی طرح منہ اور سینے کے بل پڑا اور لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ میری آنکھوں میں اب آنسو بھی آ گئے تھے۔

انسان اپنی آنکھوں کا آخری منظر نہیں بھولتا اور مجھے بھی وہ یاد تھا جب میں اپنے گاؤں کے میلے میں۔۔۔ اپنی پیاری ماں کے ساتھ خوشی خوشی گھوم رہا تھا۔ اور پھر اچانک میں اس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں سے دور ہو گیا اور یہاں اس جہنم کدے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا۔۔۔ روشنی کی ایک موٹی سی لکیر پھیلتی چلی گئی۔۔۔ اور قید خانہ روشن ہو گیا۔ آنے والا کون تھا؟ یہ ابھی میں ٹھیک طرح سے نہیں دیکھ پایا تھا مگر دل میں اب بھی یہی خوف جاگزیں تھا کہ کیا مجھے ایک بار پھر تختۂ مشق بنایا جانے والا تھا؟ کیا مجھ پر اب بھی ستم توڑنے کے لیے کچھ باقی رہ گیا تھا؟

ہلکی چٹ کی آواز کمرے میں اُبھری اور دوسرے ہی لمحے کمرا پوری طرح روشن ہو گیا۔ وہ دو افراد تھے۔ میں نے نیم باز آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا، ان میں ایک تو ریکھا تھی دوسرا اس کا کوئی ساتھی تھا، جس نے اپنے ہاتھوں میں کچھ تھامے رکھا تھا۔۔۔ وہی میرے قریب آیا جبکہ ریکھا اپنی جگہ کھڑی رہی، قریب آنے والا اپنے ساتھ مرہم پٹی کا سامان لایا تھا، وہ کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح پہلے میرے زخموں کا جائزہ لیتا رہا اس کے بعد اس نے اپنا ''کام'' شروع کر دیا۔

پہلے میری قمیص اُتار کر میرا اوپری جسم برہنہ کر دیا، اس کے بعد وہ میرے زخموں پہ کسی خاص دوا کا لیپ کرنے لگا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے ٹھنڈک اور سکون کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ساری دوا میرے زخموں پر مل دی، اس کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی پیالی میں مجھے کوئی تیز ذائقے والی دوا بھی پلا دی۔ اپنا کام ختم کر کے وہ کمرے سے چلا گیا، اب صرف ریکھا وہاں رہ گئی، کچھ دیر میری طرف تکتی رہی، پھر چند قدم میری جانب بڑھی اور بولی۔

''دیکھ لیا نا یہاں سے بھاگنے کا انجام۔۔۔ اب دوبارہ ایسی حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔''

''تمہیں خدا کا واسطہ ہے مجھے جانے دو۔۔۔ تم لوگ میرے ساتھ کیوں ایسا سلوک کر رہے ہو؟ میں نے آخر تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے؟'' میں نے روتے، سسکتے ہوئے اس کی منت کی تو وہ اسی طرح بے حسی سے بولی۔

''پھر وہی فضول بکواس۔ بھول جاؤ اپنا ماضی۔۔۔ اپنی ماں اپنا گاؤں۔۔۔ اب ہم ہی تمہارے سب کچھ ہیں۔۔۔ اور یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔۔۔ سمجھے تم؟ اگر تم اس مردود بجلی کے ساتھ مل کے ایسی حرکت نہ کرتے اور تمہاری خدمی ہو جاتی تو آج تم عیش کر رہے ہوتے۔''

''آخر تم لوگ کیوں میرے ساتھ یہ ظلم کرنے پر تلے ہوئے ہو؟ کیوں مجھے اپنے جیسا بنانا چاہتے ہو؟ میں۔۔۔ میں۔۔۔ ایسے ہی ٹھیک تو ہوں۔''

میرے معصومیت بھرے سوال کو ریکھا نے ایک شیطانی قہقہے میں اُڑا دیا۔۔۔ اور پھر میرے اوپر قدرے جھکتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ''ارے بتوا! ہم جیسا بننے میں آخر کیا برائی ہے؟ بہت دولت کمائے گا۔۔۔ لکشمی مہربان ہو جاوے گی تجھ پر، پھر تو ہمرا احسان مانے گا۔''

مجھے اس کی بات بری لگی تھی اس لیے میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بولا۔ ''مم۔۔۔ مجھے پیاس لگی ہے۔''

''ابھی جا کے بھیجتی ہوں اپنے بتوا کے لیے۔'' وہ مسکرا کے بولی اور لہراتی بل کھاتی کمرے سے نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد میرے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ بھیجا گیا۔ مرہم پٹی اور دوا پینے کے بعد میری طبیعت کافی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو ایک بار پھر اندیشناک خیالات نے آن گھیرا۔۔۔ کل یہ خبیث لوگ میرے ساتھ پھر وہی مکروہ فعل کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔ اور اس بار مجھے بچانے والا کون تھا؟ جبکہ بجلی خود مفرور تھا۔ میں ایک بار پھر پریشان کن خیالات کا شکار ہونے لگا۔ وقت بیتا جا رہا تھا، کمرے کی بتی بجھا دی گئی تھی، اندھیرے سے مجھے اور بھی وحشت ہو رہی تھی، میں نے اُٹھنے کی کوشش کی، اور تھوڑا کمرے میں چلا پھرا بھی، دروازے کی طرف بھی گیا۔ میرا اوپری جسم برہنہ تھا۔۔۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے بتی جلانے کی کوشش کی... مگر وہ نہیں جلی، شاید باہر سے ہی دانستہ اس کا کنکشن آف کر دیا گیا تھا۔ دروازے کو میں نے باہر سے بند پایا۔ میں مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔

رات زیادہ ہو گئی تھی... میں قید خانے کی سیلن زدہ دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ مجھ پر سستی طاری ہونے لگی۔ مگر یہ نیند نہیں تھی، ایک بار پھر وہی ڈر اور خوف دل و دماغ کی آماجگاہ بننے لگا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازہ توڑتا ہوا اس جہنم سے نکل جاؤں۔ بے بسی اور مایوسی انتہا کو چھونے لگی تو میں رونا شروع کر دیتا۔

وہ شاید آدھی رات کا پہر تھا جب اچانک میں نیم غنودگی کے عالم میں چونکا۔ میں شاید کسی کھٹکے کی آواز پر چونکا تھا اور وہ آواز دروازے کی طرف سے ہی آئی تھی... میں اسی طرح فرش پر لیٹے لیٹے دم بخود نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا... اور پھر میں نے دیکھا بہت آہستگی سے دروازہ کھلا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، کوئی اندر داخل ہوا تھا۔ میں ڈر گیا... پتا نہیں یہ کون تھا؟

اندھیرے میں مجھے وہ کسی پُراسرار سائے کے مانند ہی دکھائی دیا تھا جو دبے پاؤں میری جانب بڑھ رہا تھا، اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ میں بھی خاموشی سے اس کی طرف تکتا رہا... یہاں تک کہ جب وہ میرے بالکل قریب آ گیا تو میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

"تت... کون...؟"

"شش... شش۔" جواب میں اس پُراسرار سائے نے یہ اشارہ کیا۔ پھر میرے خاصے قریب آ کے نہایت دھیمی آواز میں بولا۔ "شو! یہ میں ہوں... بگلی۔"

"ب... بگلی... بگلی بھائی" بے اختیار میرے منہ سے مسرت بھرے انداز میں نکلا۔

"شش... آہستہ۔" اس نے پھر مجھے تنبیہ کی۔ میرا خوشی کے مارے بُرا حال تھا۔

"خاموشی سے اُٹھ کر میرے ساتھ آؤ... خبردار! کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرنا ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی جان سے جاؤں گا۔" وہ بولا۔

اس کے بعد وہ آگے تھا اور میں اس کے پیچھے... ہم دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں بگلی عادت کے مطابق تالی نہ بجا دے... ورنہ مصیبت آ جاتی۔

بہرحال شکر رہا... ہم خیریت سے باہر آ گئے۔ وہ مجھے باہر تاریکی میں لیے آگے بڑھتا رہا۔ اس مہربان عورت کے گھر کے سامنے سے بھی ہم گزرے تھے... جسے دیکھ کر مجھے وہ نیک دل اور ہمدرد خاتون یاد آ گئی تھی۔

بگلی مجھے لیے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا... یہاں تک کہ ہم اس منحوس جگہ سے اچھی خاصی دور نکل آئے۔

یہ کوئی نیم صحرائی علاقہ تھا۔ یہاں چہار سُو تاریک سناٹے کا راج تھا۔ قریب قریب میں کچھ کچے گھروں کی بے ترتیب قطاریں، آڑے ترچھے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آسمان صاف تھا، آخری راتوں کا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔

ایسے میں ایک جگہ پہ میں تھک کر رک گیا تو بگلی بھی رُک گیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گیا تھا کہ میں چلتے چلتے تھک گیا ہوں اس لیے رک گیا اور بولا۔ "شو! ہمارا زیادہ دیر یہاں رُکنا ٹھیک نہیں ہوگا تھوڑا سستا لو تو آگے بڑھتے ہیں۔"

"میرا نام شو نہیں، شفیق ہے... شفیق شاہ۔" میں نے کہا۔ وہ شاید اندھیرے میں مسکرایا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

"سرحد پار۔"

"ہیں...!" میں خوشی سے بولا۔ "مگر کیا پیدل اتنا لمبا سفر کر لیں گے ہم؟"

"نہیں، یہاں سے تھوڑی دور ہمیں پیدل ہی چلنا پڑے گا۔" وہ بتانے لگا۔ "آگے بنجاروں کا ایک قافلہ ملے گا... یہ راجستھانی، میگھواڑ اور کولہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے بنجارے ہیں... جو اپنے ایک مذہبی تہوار کے سلسلے میں راجستھان سے چولستان کے راستے پاکستان کی سرحد عبور کریں گے... ہم بھی ان میں شامل ہو جائیں گے۔"

مجھے اس کی بات سے تسلی ہوئی، پھر کچھ سوچ کے اس سے پوچھا۔

"بگلی بھائی! تم اس رات مجھے اس نیک دل عورت کے پاس چھوڑ کے کہاں چلے گئے تھے؟" اور پھر میں نے اسے اس لرزہ خیز رات کے بارے میں بتایا، مگر اسے یہ سب پہلے ہی معلوم تھا، قدرے دُکھی لہجے میں بولا۔

"ہاں! مجھے پتا چل گیا تھا۔ بے چاری کوثر ان ظالموں کے ہاتھوں ماری گئی تھی اسی لیے میں بھی بھاگ گیا تھا، میں اس رات تمہیں فرار کروانے کے بعد وہاں سے غائب ہوتا تو مجھ پر شک کیا جاتا... کیونکہ اس وقت تمہاری ڈھونڈیا پڑی ہوئی تھی... مگر باوجود اس کے مجھ پر شبہ ہو ہی گیا... میرے پاس وقت ہی نہ تھا کہ میں پھر کچھ کر سکتا...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس لیے بھاگ کھڑا ہوا۔"

میں چپ ہو رہا... تھوڑی دیر بعد ہم پھر چل پڑے... اس کے بعد ہم مذکورہ قافلے سے جا ملے۔ بگلی ایک چلتا پرزہ تھا... پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا کہ ہم اس بنجاروں کے قافلے میں شامل ہو کر کامیابی سے سرحد پار کر کے چولستان اور پھر وہاں سے بہاولپور آ گئے۔ وہاں بگلی کے ساتھ مل کر میں نے اپنی ماں کی تلاش شروع کی۔ بگلی بے چارہ میری مدد کر رہا تھا مگر اچانک ایک موقع پر اس کا میرا ساتھ چھوٹ گیا... کسی بات پر اسے پولیس نے دھر لیا اور مجھے اسے چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ مگر بھاگتے وقت اس نے مجھے تاکید کی تھی، کہ میں سیدھا ملتان کے ایک نواحی علاقے نئے پنڈ کا رُخ کروں... وہاں اس کا کوئی جاننے والا رہتا تھا۔ بالآخر میں ملتان آ گیا اور نئے پنڈ کا رُخ کیا، لیکن بدقسمتی سے یہاں مجھے بگلی کا وہ جاننے والا نہ مل سکا مگر وہیں ایک بے اولاد جوڑے نے مجھے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں ان کے پاس رہنے لگا۔ کئی سالوں بعد کسی طرح بگلی بھی مجھ سے آن ملا۔ وہ اب بھی میری ماں کی تلاش میں پُرجوش تھا... مگر ہمیں ابھی تک کوئی کامیابی نہ ہو سکی تھی۔

یوں میرے ماہ و سال گزرتے رہے۔ اور وہیں میں پل بڑھ کر جوان ہوا۔

☆☆☆

لئیق شاہ اپنی عبرت اثر داستان سنانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ کمرے میں ایک رنجیدہ اور اُداس سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ لئیق شاہ کی آنکھوں میں نمی سی جھلک رہی تھی، اور زہرہ بانو کا چہرہ بھی دُکھ کی غمازی کر رہا تھا۔ پھر وہ دکھی لہجے میں بولی۔

"بہت دُکھ ہوا، لئیق! تمہاری داستان سن کر، میں نہیں جانتی تھی کہ تمہارے دل میں اپنوں سے بچھڑنے کا کس قدر گہرا دُکھ ایک زخم کی طرح چھپا ہوا ہے، اچھا ہوا تم نے آج اپنے دُکھ کا اظہار کر دیا... اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اپنا درد بیان کر دینے سے وہ آدھا رہ جاتا ہے۔"

"آپ سچ کہہ رہی ہیں زہرہ صاحبہ... مگر بعض دُکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی، وقت کے ساتھ کسک بڑھتی ہی جاتی ہے۔ میں آج بھی اپنی ماں کو یاد کر کے تنہائیوں میں روتا ہوں... نجانے وہ اب کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ اور پتا نہیں وہ بے چاری زندہ بھی ہو گی یا نہیں۔" لئیق شاہ نے یہ الفاظ دُکھ کے انتہائی احساس تلے ادا کیے تھے، لگتا تھا شاید وہ بھی اب تھک چکا تھا۔ زہرہ اسے ایک بار پھر آزردہ خاطر دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"لئیق! تم نے بتایا تھا کہ تمہارا کوئی بھائی بھی انہی دنوں دنیا میں آنے والا تھا، جب تم اپنی ماں سے بچھڑے تھے؟"

"ہاں۔" لئیق شاہ نے مختصراً مگر دل گیر لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہارے دل میں اپنے چھوٹے بھائی کو دیکھنے اسے تلاش کرنے کی خواہش نہیں اُٹھتی؟"

"ہاں زہرہ صاحبہ! مجھے صرف اپنی ماں کا چہرہ دیکھنے کی تمنا نہیں ہے، اپنے بھائی کو دیکھنے کی بھی شدید آرزو ہے۔ اور اپنے باپ کو بھی نہیں بھولا میں اب تک... لیکن، پتا نہیں تقدیر کو کیا منظور تھا کہ ایک پل جیسے کوئی کالی آندھی سی چلی تھی کہ ہم سب کسی تیز ہوا میں ٹوٹ کر بکھرنے والے ایک گھونسلے کی طرح... ان بے رحم ہواؤں کی زد میں آ کر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔"

یہ بتاتے ہوئے لئیق شاہ ایک بار پھر آزردہ ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں اُترنے والی نمی بھی سوا ہونے لگی تھی۔

زہرہ بانو جانتی تھی کہ لئیق شاہ کس قدر مضبوط اعصاب کا مالک تھا مگر اس وقت وہ اسے کسی چھوٹے معصوم بچے کی طرح روتا ہوا محسوس ہو رہا تھا؛ اپنوں کے بچھڑنے کا غم ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بالکل ٹوٹ کے رہ جاتا ہے اور وہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔ زہرہ بانو کو اس وقت یوں لگا جیسے لئیق شاہ ابھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا... ایسے میں اس نے لئیق شاہ کو تھام لیا... اپنا ایک بازو بڑی چاہت سے اس کے چوڑے شانے کے گرد یوں پھیلا دیا جیسے وہ اسے جو اندر ہی اندر غم کے ایک الاؤ تلے سُلگ رہا تھا، اپنے شبنمی وجود کی ریشمی چھاؤں میں سمو لینا چاہتی ہو، اس کے سارے درد کا مداوا بن کے، وہ اس کے لیے ایک ایسی بارش بننا چاہتی ہو جو اس کے محبوب کے سارے غموں کو خاروخس کی طرح بہا کے لے جائے... یہاں تک کہ زہرہ بانو نے ہولے سے اپنے جیسے مرمریں بازو سے اسے سہارتے ہوئے اپنے قدرے قریب بھی کر لیا۔ ایسے میں لئیق شاہ، جس نے ایک مصلحت کی بنا پر اب تک اپنے اور زہرہ بانو کے بیچ ایک فاصلہ قائم کیے رکھا تھا، آج جیسے وہ فاصلہ بھی اسے ختم ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ آج خود اس کے تفتہ وجود کو بھی جیسے ایک ایسے ہی سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، جو ہر مصلحت، ہر پس وپیش سے مبرا ہو، اس نے بھی جیسے اب تک ایک جلتے بلکتے صحرا میں آبلہ پائی کا عذاب سہا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھا تو آج وہ بھی ایک سکون کا متلاشی تھا۔ اپنوں سے دوری کے اس بحرِ غم میں اگر کوئی پرایا۔۔۔ جذبۂ دل کے پتواروں سے اپنے پن کی ناؤ لیے۔۔۔ اس سے ایک نئے رشتے کی، ایک تعلقِ خاطر کی آس میں ساحل کی آرزو کیے ہوئے تھا تو اسے اس کشتی کا سوار بن جانا چاہیے تھا۔

لئیق شاہ نے بھی بے اختیار اپنا چہرہ زہرہ بانو کی گھنیری زُلفوں کی چھاؤں میں چھپا لیا۔

☆☆☆

زہرہ بانو نے لئیق شاہ کے سامنے پورے خلوص کے ساتھ اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ وہ آج سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ماں باپ کی تلاش میں اپنے ساتھ سمجھے۔

پھر اسی روز بیگم ولا میں زہرہ بانو نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کی ایک اہم میٹنگ کال کروا لی۔ جبکہ کمیل دادا کو ابھی اس میٹنگ کا اصل مقصد نہیں پتا تھا، وہ یہی سمجھا تھا کہ زہرہ بانو شاید اب کی بار چوہدری ممتاز سے آخری معرکے کی تیاری کرنا چاہتی تھیں۔

یہ اہم میٹنگ بیگم ولا کے کانفرنس روم میں منعقد کی گئی تھی، جو اوپری منزل میں تھی۔

شرکا میں زہرہ بانو اور لئیق شاہ کے علاوہ کمیل دادا، یاسر، جہانگیرا اور دو اور ساتھی شامل تھے۔

جب زہرہ بانو نے میٹنگ کے اصل ایجنڈے کے بارے میں بتایا تو کمیل دادا کا منہ بن گیا، اور وہ اُکھڑا اُکھڑا اور لاتعلق سا نظر آنے لگا، مگر چونکہ یہ ان کا حکم تھا، اسی لیے وہ طوعاً و کرہاً دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔

زیادہ تر زہرہ بانو اور یاسر، جہانگیرا نے ہی اس موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، جبکہ کمیل دادا اس میٹنگ کی کم و بیش ایک گھنٹے کی کارروائی میں خاموشی ہی اختیار کیے ہوئے تھا۔

زہرہ بانو سے اپنے اس مقرب خاص کارپرداز ساتھی کی عدم دلچسپی چھپی نہ رہ سکی، اس کی طرف ترچھی نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔ ”کمیل! تم نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا اب تک کہ لئیق شاہ کے اپنوں کی تلاش کے سلسلے میں ہمیں کیا اقدامات اُٹھانے چاہییں؟“

کمیل دادا نے کچھ چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے پہلے تو ایک نظر قریب بیٹھے لئیق شاہ کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بیگم صاحبہ! ہم اس وقت ایک خطرناک صورت حال کا شکار ہیں، دشمن ہر لمحہ ہماری گھات میں رہتے ہیں ایسے میں ایک بہت ہی پرانے معاملے میں اپنی ٹانگ پھنسانا نہ صرف غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا بلکہ خطرناک بھی، دشمن ہماری اس غفلت سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔“

کمیل دادا کی بات قابلِ غور تھی لیکن یہاں معاملہ لئیق شاہ کا تھا، زہرہ بانو نے کمیل دادا کا لئیق شاہ کے معاملے کو پرانا کہنا اچھا نہیں لگا مگر وہ اپنی خفگی کے اظہار کی جرأت نہ کر سکی۔۔۔ تاہم ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”کمیل دادا! یہ معاملہ جتنا پرانا سہی اُتنا ہی ہمارے لیے اہم بھی ہے۔“

”یقیناً بیگم صاحبہ! ہونا بھی چاہیے۔“ کمیل دادا نے بظاہر مؤدبانہ کہا تھا مگر اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو لئیق شاہ اور زہرہ بانو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

زہرہ بانو نے دزدیدہ سی نگاہ لئیق شاہ کے چہرے پہ ڈالی۔ وہ آج لئیق شاہ والے اس اہم موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتی تھی اور ایک مربوط لائحہ عمل بھی ترتیب دینے کے موڈ میں تھی۔۔۔ لیکن وہ اپنے ایک اہم ترین اور گروہ میں اپنے نائب کی حیثیت رکھنے والے ساتھی کمیل دادا کی لئیق شاہ کے ”معاملے“ سے غیر دلچسپی کو بھی محسوس کر رہی تھی، اسی لیے اس نے سرِدست میٹنگ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی برخاست کر دی۔ لیکن اس کے تھوڑی دیر بعد ہی اس نے تنہائی میں کمیل دادا کو ایک کمرے میں بلا لیا۔

”بیٹھو کمیل۔“ زہرہ بانو اس کے چہرے کی طرف پہ غور تکتے ہوئے بولی۔ وہ خاموشی سے اس کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگیا۔ ”کمیل دادا! میں تم سے ایک درخواست کرنا چاہوں گی؟“

اس کے صوفے پر براجمان ہونے کے بعد زہرہ بانو نے بدستور اس کی طرف گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا تو کمیل دادا کو ایک جھٹکا سا لگا، اور وہ قدرے حیرت اور شرمندگی کے ساتھ زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ بیگم صاحبہ؟ مجھے شرمندہ تو نہ کریں، آپ مالک ہیں ہماری، حکم کریں۔“

”نہیں کمیل! تم پچھلے کئی دنوں سے میرے اور بالخصوص لئیق شاہ سے متعلق، جس طرح اپنی جان پہ کھیل کر ہمارے کام آتے رہے ہو، اس نے میری نگاہوں میں تمہاری۔۔۔ قدر و قیمت اور بھی بڑھا دی ہے۔ میں کسی معاملے میں تمہاری رائے سے اختلاف کر کے تمہارا دل خود سے خراب نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا ہے تو میں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سمجھوں گی کہ میں اپنے ایک اہم اور سچے جاں نثار اور وفادار ساتھی کو کھو رہی ہوں، جو میں کبھی نہیں چاہوں گی۔''

زہرہ بانو یہ کہہ کر ذرا تھمی تو کپیل دادا کو اپنے سینے میں دھڑکتا دل رُکتا محسوس ہونے لگا۔

اپنے لیے بیگم صاحبہ کے یہ الفاظ اسے حیات بخش محسوس ہوتے تھے، وہ اندر سے فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھتا تھا۔ اگرچہ اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا لیکن... نجانے کیوں اس بار اسے بیگم صاحبہ کا ''درخواست گزار'' لہجہ کچھ چبھتا ہوا بھی محسوس ہوا تھا، جیسے وہ اس کی کسی بات سے عاجز سی آگئی ہو... تاہم سنبھل کے بولا۔

''بیگم صاحبہ! میرے بارے میں آپ کے ایسے خیالات، بلاشبہ میرے لیے باعثِ فخر ہیں لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ میں آپ کے حکم کا غلام ہوں، میں مشورہ تو دے سکتا ہوں، لیکن اسے ماننے یا نہ ماننے کا اول و آخر اختیار آپ کا ہی ہوتا ہے۔''

''میں تم سے بالخصوص لئیق شاہ کے معاملے میں دو ٹوک بات کرنا چاہتی ہوں۔'' زہرہ بانو نے جیسے گفتگو کو نپٹنے کی غرض سے کہا۔

''جی بیگم صاحبہ! میں سن رہا ہوں۔'' وہ مؤدبانہ ہو کے بولا، مگر ساتھ اس کے دل و دماغ میں عجیب طرح کے خیالات بھی گردش کرنے لگے... ان میں یہ وسوسہ بھی جاگزیں تھا کہ کہیں بیگم صاحبہ کو لئیق شاہ کے سلسلے میں اس کی طرف سے کوئی شکایت یا سرد مہری تو نہیں محسوس ہوئی؟

زہرہ بانو نے ایک نگاہ کپیل دادا کے چہرے پہ ڈالی اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی، کپیل دادا بھی اس کے احترام میں فوراً کھڑا ہونے لگا تھا، لیکن زہرہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کو کہا... کپیل دادا، اُلجھے اُلجھے چہرے کے ساتھ اب اپنی جگہ جیسے ٹک سا گیا، اور یک ٹک زہرہ بانو کے چہرے کی طرف تکنے لگا، جیسے وہ آج اس کے سامنے کوئی بڑا انکشاف کرنے جا رہی ہو۔

زہرہ بانو دھیرے دھیرے دیوار کی طرف آئی، جہاں ایک بڑی سی پینٹنگ آویزاں تھی۔ وہ اس پینٹنگ کو چند ثانیے سوچتی نگاہوں سے تکتی رہی، جس میں مصور نے سوہنی ماہیوال کی مشہور لوک داستان کو رنگوں اور پینٹ کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں سوہنی کو دریا کی منہ زور لہروں کی زد میں دکھایا گیا تھا اور اس کا کچا گھڑا ٹوٹ چکا تھا... کیپشن میں یہ لکھا تھا۔

''محبت کبھی نہیں مرتی۔''

بس... چند لمحوں کے لیے زہرہ بانو نے اس تصویر کو دیکھا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے اپنا رخ کپیل دادا کی طرف پھیرا اور صوفے پر جیسے بیٹھا کپیل دادا ہنوز اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

''کپیل دادا! تم سب میرے جاں نثار اور وفادار ساتھی ہو اور میں تم لوگوں کی باس ہوں، لیکن میں آج تمہیں یہ کہنے کا حق دیتی ہوں کہ کیا میں صرف باس ہوں؟ کیا ایک جیتی جاگتی عورت نہیں ہوں؟''

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کپیل دادا کی مردانہ اَنا نے اسے ایک زبردست دھچکا دیا... وہ جان گیا کہ باوجود کوشش اور دھیان کے اس سے کہیں پھر کوئی غلطی ہوگئی تھی، جس کے باعث آج بیگم صاحبہ کو اس قدر ٹوٹتے ہوئے مجبور لہجے میں اس سے یہ کہنا پڑا تھا... گویا انہیں اس کی کسی بات پر یا اس کے کسی رویے پر دُکھ پہنچا تھا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کپیل؟'' اسے اتھاہ خاموشی میں ڈوبے پا کر زہرہ بانو نے دوبارہ اپنا سوال دُہرایا تو وہ یکدم تلملا سے لہجے میں بولا۔

''بیگم صاحبہ! اس میں کیا شک ہے؟ آپ کے دونوں روپ ہم سب کے لیے قابلِ احترام ہیں اور اس میں بھی کوئی شبہے کی گنجائش نہیں کہ آپ نے ہمارا بھی بڑا خیال رکھا ہے، ہمیں کبھی یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ہم آپ کے زرخرید ہیں... آپ نے یہاں بیگم والا میں ہم سب کے ساتھ ایک عزت اور وقار کے ساتھ جو معیار اور ماحول قائم کر رکھا ہے وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا بڑے اپنے چھوٹوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔''

یہ کہتے کہتے کپیل دادا کو اپنی آواز، اپنا لہجہ کیا پورا وجود فرطِ جذبات سے لرزتا محسوس ہونے لگا۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ بری طرح ٹھٹک گیا... یہ دیکھ کر کہ بیگم صاحبہ کی کشادہ آنکھوں میں نمی سی اتر آئی تھی۔ کپیل دادا کے ضمیر کو جیسے ایک تازیانہ لگا... وہ صوفے سے اُٹھا اور دل گیر سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے ''مجھے معاف کر دینا بیگم صاحبہ'' آگے بڑھ کر زہرہ بانو کے قدموں میں گرنے لگا تھا کہ فوراً زہرہ نے اسے دونوں شانوں سے تھام کر روک دیا اور بولی۔

''نہیں کپیل! مجھے اپنے ساتھیوں کا پورا احترام ہے، میں ان کی عزتِ نفس کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیتی... تم اسی طرح میرے سامنے کھڑے ہو کر بات کرو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کمیل دادا اپنے لمبے چوڑے وجود کے ساتھ سر جھکائے زہرہ بانو کے سامنے کھڑا ہوگیا، پھر بولا۔ ''بیگم صاحب! شاید مجھ سے لئیق شاہ کے معاملے میں پھر کوئی غلطی ہوگئی ہے، جس نے آپ کو آج اس قدر رنجیدۂ خاطر کردیا کہ مجھ جیسے کمین ملازم کے سامنے آپ کو... اپنے تحکمانہ لہجے سے جھک کر یہ سب کہنا پڑ رہا ہے۔''

کمیل دادا کی یہی زود فہمی، یہی فراست اور یہی ادا زہرہ بانو کو بہت پسند تھی... وہ اپنے دلنشیں لبوں پہ ایک حسین سی مسکراہٹ سجا کے اس کے چہرے کو تکتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''بیگم صاحب! مجھے اب اور شرمندہ نہ کریں... م... میں آپ کی بات کا مطلب سمجھ چکا ہوں۔'' کمیل دادا نے اتنا ہی کہا تھا کہ زہرہ بانو بولی۔

''کمیل! میں لئیق شاہ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

کمیل دادا کے اندر ایک زور کا چھناکا ہوا... لیکن پھر فوراً ہی سنبھل بھی گیا، بولا۔ ''اس سے بڑھ کر ہمارے لیے خوشی کی اور کیا بات ہوسکتی ہے بیگم صاحب...؟ ہم خود اس کا اہتمام کریں گے، آپ کا یہ فیصلہ یقیناً غلط نہیں ہوسکتا، آپ کی خوشی اس میں ہے تو ہم بھی خوش ہیں، خوب دھوم دھام سے ہم آپ کا اور لئیق شاہ کا بیاہ کریں گے بیگم صاحب!''

زہرہ بانو سے یہ سب کہتے ہوئے کمیل دادا اندر ہی اندر نجانے کتنے امتحانوں سے گزر گیا۔

''تم اس رشتے پر خوش ہو ناں کمیل؟'' زہرہ بانو نے اس کی طرف دیکھا۔

''میری کیا مجال ہے بیگم صاحب! آپ پھر مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔'' وہ گومگو سے لہجے میں بولا... اس وقت اس نے نجانے کس طرح اپنے دردِ نہاں کو چھپائے رکھا تھا... اور اب وہ زہرہ بانو سے بھی نظریں چرانے کی کوشش کررہا تھا۔

''لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ تم لئیق شاہ سے کچھ مطمئن نہیں نظر آتے ہو... کیا بات ہے ایسی... مجھے بتاؤ گے نہیں؟''

اس کی بات پر کمیل دادا اندر سے ڈر سا گیا... وہ یک لخت بولا۔ ''ن... نہیں بیگم صاحب! ایسا تو کچھ نہیں ہے۔''

زہرہ بانو نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اس سے بولی۔ ''کمیل! لئیق شاہ اندر سے بہت دکھی ہے، کل اس نے مجھے اپنی ساری دکھ بھری داستان سنائی تھی... اسے اپنے پیاروں کی تلاش ہے، اور میں نہیں چاہتی کہ مجھ سے شادی کرتے وقت اس کے دل میں کوئی بوجھ ہو۔ کوئی دکھ ہو اسی لیے پہلے میں چاہتی ہوں کہ ہم سب مل کر اس کے پیاروں کا کھوج لگانے کی کوشش کریں... میری آج کی میٹنگ بلانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن تمہاری اس سلسلے میں لاتعلقی اور سرد مہری نے مجھے اندر سے ملول اور مایوس سا کردیا تھا۔''

''ن... نہیں بیگم صاحب! ایسی بات نہیں تھی۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ آپ کی ہی نہیں بلکہ اس وقت خود لئیق شاہ کی زندگی کو بھی خطرہ ہے... ہمیں کسی انجانی مہم میں سوچ سمجھ کر ہی پڑنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے کمیل دادا کو یوں لگا جیسے وہ منافقت سے کام لے رہا ہو... جھوٹ بول رہا ہو لیکن یہ ''جھوٹ'' کسی ایسے سچ سے بہتر تھا جس سے کسی کو آزار پہنچتا ہو... یہ نظریۂ ضرورت کے تحت بولنے والا وہ جھوٹ تھا جس میں ایک مصلحت پوشیدہ تھی۔

''ہم۔'' اس کی بات پر زہرہ بانو نے ایک گہری اور پرسوچ ہنکاری خارج کی... پھر بولی۔ ''تو کیا پھر جب تک ممتاز خان کا معاملہ حل نہ ہو... تو ہماری شادی بھی رکی رہے گی؟ میرا مطلب تھا... میں لئیق شاہ کو یہاں (بیگم ولا) سے جانے نہیں دینا چاہتی... کہیں کسی جوش میں آکر وہ اس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔''

''ایسے تو بیگم صاحب! بات پھر بھی وہی ہوجائے گی۔'' کمیل دادا بولا۔ ''لئیق شاہ کے ماں باپ اور بھائی کی تلاش میں بھی جانے کتنا عرصہ لگ جائے؟ اور پھر پتا نہیں وہ زندہ بھی ہوں یا نہیں... ہمیں بہرحال تصویر کے دونوں رخ دیکھنے چاہئیں بیگم صاحب!''

''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے۔'' زہرہ بانو سوچ میں پڑ گئی... پھر اس سے مستفسر ہوئی۔ ''تو پھر تمہارا اس بارے میں کیا مشورہ ہے؟''

کمیل دادا کو اچانک یوں لگا جیسے بیگم صاحب نے اسے کسی بڑے امتحان میں ڈال دیا ہو... اپنی غلطی کا بھی ازالہ کرنا مقصود تھا اور بیگم صاحب کا دل بھی صاف کرنا تھا، لہٰذا اپنے دل پر بہت جبر کرکے اس نے زہرہ بانو کو یہی مشورہ دیا کہ اسے اور لئیق شاہ کو پہلے شادی کے بندھن میں بندھ جانا چاہیے۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بیگم ولا میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ زہرہ بانو اور لئیق شاہ کی شادی کی زور و شور سے تیاریاں کی جانے لگیں۔ ابھی شادی میں کچھ دن باقی تھے مگر ابھی سے ہی بیگم ولا کی عمارت کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا... باجے گاجے شروع کردیے گئے تھے۔ سب کے چہروں پہ خوشی تھی۔

کمیل دادا شاید وہ واحد فرد تھا جو بظاہر تو سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کررہا تھا مگر اندر سے وہ کتنا ''خوش'' تھا، یہ وہی جانتا تھا۔ اگرچہ زہرہ بانو اور لئیق شاہ کی شادی کے انتظامات میں وہی سب سے آگے تھا مگر اس کے اندر کے دکھ سے کوئی واقف نہ تھا (ماسوائے اس کے باپ منشی فضل دین کے، جو وہیں رہتا تھا اور شہر میں واقع زہرہ بانو کی ایک فلور مل سنبھالتا تھا)... ہنستے مسکراتے چہروں کے بیچ اپنا غم نہاں چھپا کے مسکرانا، بڑے دل و جگر ے کا کام ہوتا ہے اور کمیل دادا یہی کررہا تھا۔

خوشی کے اس موقع پر لئیق شاہ نے گاؤں سے اپنے دو پرانے دوستوں بگل اور بختیار علی کو بھی چند روز پہلے ہی بلالیا تھا...

موقع کی مناسبت سے زہرہ بانو بھی اپنی مخصوص سج دھج کے ساتھ رہنے لگی تھی اور خاصی حسین لگ رہی تھی... لئیق شاہ بھی بہترین شلوار سوٹ میں ملبوس رہتا اور خاصا خوبرو دکھائی دے رہا تھا... بلکہ یہ دونوں کیا، بیگم ولا کا ہر ملازم مرد یا عورت، رنگ برنگ پوشاکیں پہنے ہوئے تھا... جی کڑا کرکے کمیل دادا نے بھی اسی مناسبت سے لباس زیب تن کررکھا تھا۔

بیشتر ساتھیوں کا خیال تھا کہ شادی کی یہ عظیم تقریب شہر کے کسی بڑے میرج ہال میں ہونی چاہیے اور خوب دھوم دھام سے ہونی چاہیے، لیکن کمیل دادا نے سکیورٹی رسک کے حوالے سے ایسا کروانے سے انکار کردیا تھا... چونکہ زہرہ بانو نے اس تقریب کے سارے انتظامات کا مکمل اختیار کمیل دادا کے سپرد کررکھا تھا، اور اسی کی مرضی پر سب چھوڑا ہوا تھا، لہٰذا کمیل دادا کا ارادہ بیگم ولا میں ہی شامیانے اور قناتیں لگوا کر اس تقریب کو منانے کا تھا۔ ساتھیوں نے پہلے تو کمیل دادا کی منتیں سماجتیں کیں، مگر وہ نہیں مانا تو انھوں نے زہرہ بانو سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرڈالا، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ خود زہرہ بانو کی بھی یہی خواہش تھی... مگر اس سلسلے میں وہ بھی خاموش رہی۔ مگر من چلے ساتھی بھی بڑے کائیاں تھے، انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اس وقت بیگم ولا کی گویا ''ہائر اتھارٹی'' یعنی لئیق شاہ کے پاس سفارش کے لیے جا پہنچے۔ جبکہ حقیقت یہی تھی کہ خود لئیق شاہ باقاعدہ طور پر ایک برات کی صورت میں نکاح یا شادی والے دن اپنے گاؤں نئے پنڈ سے یہاں آنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں اس کے اور کمیل دادا کے درمیان چند روز پہلے خاصی بحث بھی ہوچکی تھی۔

لئیق شاہ شادی کے دن یہاں گاؤں سے برات لے کر آنا چاہتا تھا، جبکہ کمیل دادا اس سلسلے میں نئے پنڈ کو ''ریڈ زون'' قرار دے چکا تھا۔ وہ نئے پنڈ کو دشمنوں کا علاقہ کہتا تھا۔ اور اس میں خود لئیق شاہ کی جان کو زیادہ خطرہ تھا... بڑی مشکلوں سے لئیق شاہ اس بات پر راضی ہوا تھا کہ وہ نئے پنڈ جانے کے بجائے ادھر ہی یعنی بیگم ولا میں رہے گا۔

لہٰذا جب ساتھیوں نے اس سے بڑی پُرزور فرمائش کی تو اس نے ان کی درخواست زہرہ بانو تک پہنچا دی۔ اسے تامل تھا... اس وقت کمیل دادا بھی وہاں موجود تھا۔

اس نے یہاں بھی جب وہی بات دُہرائی تو لئیق شاہ نے کہا۔ ''نئے پنڈ کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن کیا اب ہم یہاں شہر میں بھی دشمنوں سے ڈرتے پھریں گے؟ اور باہر نکلنا چھوڑ دیں گے؟''

زہرہ بانو کی حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ کمیل دادا اور لئیق شاہ کے بیچ بحث و مباحثے والی صورتِ حال پیدا نہ ہونے پائے۔

لئیق شاہ کی بات پر کمیل دادا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''شاہ صاحب! ہم دشمنوں سے ڈرتے نہیں ہیں، لیکن بات موقع کی ہے، یہ ایک خوشی کا موقع ہے، یہ جتنا خیر و عافیت کے ساتھ بیت جائے، اُتنا ہی اچھا ہے۔''

لئیق شاہ کو اب ''بیگم صاحبہ'' کا شوہر ہونے کا درجہ ملنے والا تھا، اسی لیے اب کمیل دادا، اسے ''شاہ صاحب'' کہہ کر ہی مخاطب کرنے پر مجبور تھا۔

بہرحال زہرہ بانو کو ہی مداخلت کرنا پڑی اور اس نے اپنے ہونے والے شوہر لئیق شاہ کی بات مانی۔ کمیل دادا خاموش ہوگیا۔

میرج ہال بھی کمیل دادا نے ہی بک کرادیا... مگر اسے اس پر تشویش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ بیگم صاحبہ اس کا مشورہ ٹھکرا کے غلطی کررہی ہیں جبکہ لئیق شاہ کی ضد بھی یہی تھی۔

کمیل دادا کو اب سکیورٹی کے معاملات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑا۔ اس نے مسلح گارڈ تو پہلے ہی تشکیل

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دے دیے تھے جو بیگم ولا کے گرد و پیش میں کیے جانے والے تھے، لیکن اب اسے میرج ہال سے یہاں تک کی سکیورٹی کے انتظامات بھی کرنا تھے۔

مجبوراً اسے ایک اور نیا پلان ترتیب دینا پڑا، اور نئی حکمت عملی بنانی پڑی جس کے مطابق اس نے مسلح افراد کا ایک اور اضافی دستہ مقرر کیا جو بہ ظاہر غیر مسلح ہی نظر آتے۔ جبکہ مسلح دستہ شادی والے روز ہوائی فائرنگ کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، اگرچہ انہیں بھی کمیل دادا نے سختی کے ساتھ یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ برائے نام ہی فائرنگ کریں گے، اور تیز زیادہ شور شرابے سے گریز ہی کیا جائے۔

پولیس سے مدد لینا فضول تھا... کمیل دادا پر بڑا پریشر تھا۔ ہال بک کروانے کے بعد ہی اس نے اپنے چند ساتھی خفیہ نگرانی کے لیے ہال کے گرد چھوڑ رکھے تھے، جو وہاں بہ ظاہر عام آدمیوں کی طرح گشت کرتے رہتے... اور رخصتی والے دن تک وہ وہاں کسی بھی مشکوک فرد کو دیکھتے ہی اسے گرفت میں لے کر بیگم ولا پہنچانے کی ہدایت پر عمل پیرا رہتے۔

کمیل دادا نے پوری تندہی کے ساتھ سکیورٹی سے لے کر شادی کے تمام انتظام و انصرام تک انجام دیے تھے، لئیق شاہ سے رقابت کے باوجود کمیل دادا نے ان سارے معاملات میں ذرا بھی کمی نہیں آنے دی۔ یہاں تک کہ اس نے اس بات کا بھی دھیان رکھا تھا کہ اس کے کسی بھی رویے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہ ہونے پائے، جس سے بالخصوص بیگم صاحبہ کو اس کے کاموں میں کوئی کمی بیشی کی شکایت محسوس ہو۔

جس روز زہرہ بانو اور لئیق شاہ کا نکاح تھا، اس سے ایک دن پہلے کمیل دادا کے ساتھ نجانے کیا ہوا کہ... اس کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، آخر وہ بھی انسان تھا، ایک دھڑکتا ہوا ارمانوں بھرا دل وہ بھی رکھتا تھا۔

اس نے اپنے کمرے میں خود کو قید کرلیا... اس روز اس کا باپ منشی فضل دین بھی بیگم ولا میں ہی تھا اور چپ چپ نظروں سے اپنے بیٹے کو یہ سب کرتے اور اندر ہی اندر کڑھتے دیکھ رہا تھا۔

کمیل دادا اس روز اپنے باپ کے پاس بھی نہیں بیٹھا تھا۔ ساتھیوں سے اس نے بہانہ کرلیا تھا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور ذرا آرام کرنا چاہتا ہے۔

وہ اپنے کمرے میں آگیا مگر آرام کرنے نہیں بلکہ اپنا غم غلط کرنے... بیگم ولا میں شراب پر سختی سے پابندی تھی۔ مگر کمیل دادا نے کہیں سے ایک بوتل کا بندوبست کر لیا تھا۔ اس نے آج تک شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ گاؤں میں دوستوں یاروں کو پیتے پلاتے دیکھتا رہا تھا، اور ان کے اصرار پر اس نے بھی تھوڑی بہت چکھ رکھی تھی، اس نے سن رکھا تھا کہ اسے پینے کے بعد انسان تھوڑی دیر کے لیے غم دنیا سے نجات حاصل کرلیتا ہے... اندر کا چھپا ہوا کرب کم ہوکے دب جاتا ہے۔

پہلے تو وہ بستر پہ نیم دراز سا سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا... اس کے بعد وہ اٹھا اور میز کی جانب بڑھا، وہیں بوتل اور گلاس پڑا تھا۔ اس نے فریج سے برف کی ٹکڑیاں نکالیں... اور کرسی پہ آکر بیٹھ گیا، بے دلی سے اس نے آئس کیوب کا باؤل میز پر رکھا، اور کرسی پہ بیٹھا بیٹھا سامنے میز کی وسط میں رکھی شراب کی بوتل کو تکتا رہا۔ کئی ثانیے اسی طرح شراب کی بوتل کو گھورتے ہوئے بیت گئے... اس کے اندر ایک طوفانی سی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی... دماغ جل رہا تھا، کرب کی ایک چنگاری تھی جو شعلے سے آگ بننے کو بے تاب تھی... اس کے بعد اس نے... آگے جھک کر بوتل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں کمیل...!" اچانک ایک آواز اس کی سماعتوں میں گونجی... اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا... "اس اُم الخبائث کو ہاتھ لگانے سے پہلے اتنا سوچ لینا کمیل کہ پھر تم کہیں کے نہیں رہو گے... اس میں ایک بار ڈوبنے والا کبھی نہیں اُبھرتا، اس گندے جوہڑ میں آغشتہ ہونے کے بعد تم اپنی محبت کو ہی نہیں بلکہ بیگم صاحبہ کے ساتھ اب تک جو تمہارا معیاری تعلق ہے، وہ پراگندگی کا بھی شکار ہوسکتا ہے۔ اسی راستے سے واپس لوٹ جا کمیل!"

ضمیر کی اس آواز پر اس نے بوتل کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیا... پھر وہ کرسی سے اُٹھا، بوتل اُٹھائی اور اسے کھول کے سنک میں بہادی۔

☆☆☆

زہرہ بانو کو دلہن بنایا جاچکا تھا۔ بیگم ولا میں جیسے چودھویں کا چاند نکل آیا تھا... جس کی ضوفشانی سے بیگم ولا بقعۂ نور بن گیا تھا۔ ڈھولک کی تھاپ میں گانے گائے جارہے تھے، ایک خوشی کا سماں تھا۔ بیگم ولا کی عمارت کو بھی سجایا گیا تھا۔

شہر میں کاروباری حوالے سے زہرہ بانو کے جو جان پہچان کے لوگ تھے، انہیں دعوت نامے تقسیم کیے جاچکے تھے۔

کمیل دادا نے بڑی سمجھداری اور ہوشیاری سے سکیورٹی کا ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ مہمانوں پر کسی قسم کا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کوئی منفی اثر بھی نہ پڑنے پائے۔

نکاح ظہر کی نماز کے وقت پڑھوایا گیا... شام... ... چھ بجے بیوٹیشن آ گئی... وہ برائیڈل میک اپ کی ایکسپرٹ تھی۔ سات بجے اس نے زہرہ بانو کا میک اپ شروع کر دیا جو کم و بیش دو گھنٹے تک جاری رہا۔

زہرہ بانو اُوپری منزل پہ تھی، نچلی منزل پہ لئیق شاہ کو بھی اس کے ساتھی دولھا بنانے میں مصروف تھے۔

سہیل دادا بھی نیچے تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دھیان بار بار اوپر جا رہا تھا۔ لئیق شاہ کو اس نے دولھے کے روپ میں دیکھا، جو خاصا خوبرو نظر آ رہا تھا... اس نے سُرخ کام والی بلیک شیروانی پہن رکھی تھی، اور سر پہ ریڈ کلر کا کلاہ تھا، پیروں میں کھسّے تھے۔ یہ لباس اس کے دراز قد پہ خوب جچ رہا تھا۔

وہاں سبھی نے موقع کی مناسبت سے اپنی اپنی تیاری کر رکھی تھی، فقط ایک سہیل دادا تھا... جس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا... حالانکہ زہرہ بانو نے اسے بھی اچھی خاصی شاپنگ کروائی تھی، اور بہترین سوٹ لیا تھا اس کے لیے، مگر جانے کیا بات تھی کہ اس نے وہ لباس زیب تن کرنے کے بجائے عام سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی... وہ بھی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کے باعث بری طرح مسکی ہوئی تھی۔

اس کے باپ منشی فضل دین نے جو اپنے لختِ جگر کو اس حالت میں دیکھا تو اسے دُکھ ہوا... بوڑھا باپ تھا، اپنے بیٹے کے دُکھ سے اچھی طرح واقف تھا، مگر وہ اس موضوع پر اپنے بیٹے سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا، جانتا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا، تاہم بولا۔

"پتر سہیل! تو بھی کچھ چنگی سی پوشاک پہن لیتا... ایس لباس میں تو تو بوندلایا لگ رہا ہے۔" باپ کی بات پہ سہیل دادا پھیکے سے انداز میں مسکرایا پھر بات بناتے ہوئے مختصراً بولا۔

"کیا فائدہ اباجی! کام کی بھاگ دوڑ میں سارا لباس خراب ہو جائے گا۔"

منشی فضل کو قطعاً یہ گوارا نہ تھا کہ بیگم ولا کے سب لوگوں نے نئے قیمتی لباس پہن رکھے تھے لیکن اس کا بیٹا، جسے بیگم ولا میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی وہ یوں... عام سے لباس میں نظر آئے، اگرچہ اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ نے اسے بھی موقع کی مناسبت سے نہایت قیمتی لباس خرید کر دیا تھا۔ وہ چند ثانیے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد اس نے کسی ملازمہ کے ذریعے زہرہ بانو تک یہ خبر پہنچا دی کہ سہیل دادا ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔

اس وقت سہیل دادا نیچے ہی تھا، اُوپری منزل میں زہرہ بانو دلہن بنی بیٹھی تھی اور اوپر جانے کی کسی مرد کو سختی کے ساتھ ممانعت تھی۔ لئیق شاہ کو بھی نہیں، فقط سہیل دادا پر یہ پابندی نہیں تھی۔ زہرہ بانو نے تمام مشرقی اقدار کا خیال بھی رکھا تھا۔

"دادا! آپ کو اُوپر بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔"

نیچے آ کر ملازمہ نے سہیل دادا سے کہا تو یکبارگی سہیل دادا کا دل زور سے دھڑکا، تاہم فوراً ہی اس ملازمہ سے سنجیدگی سے بولا۔

"کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟ کوئی پریشانی تو نہیں بیگم صاحبہ کو؟"

ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا اور واپس لوٹ گئی۔

سہیل دادا سوچتا بن گیا، حالانکہ اس پر اوپر جانے کی زہرہ بیگم نے پابندی نہیں لگائی تھی، لیکن وہ خود بھی اوپر جانے سے کترا رہا تھا... ایک شرم بھی آڑے آ رہی تھی اور... جھجک بھی۔ وہ شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اس میں ابھی بیگم صاحبہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ واقعی اس وقت بوکھلایا ہوا تھا۔

اُوپری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اُوپری پورشن مکمل طور پر خواتین کے لیے مخصوص تھا، جو ملازمائیں تھیں وہ سہیل دادا کو دیکھ کر سلام کر رہی تھیں۔ خود سہیل دادا کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

بیگم صاحبہ کے کمرے تک ایک ملازمہ نے ہی رہنمائی کی تھی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سہیل دادا دستک کے بعد اندر داخل ہوا۔ پہلے زہرہ بانو تک اس کی آمد کی اطلاع پہنچائی گئی، پھر جب وہ اندر داخل ہوا تو جیسے یکلخت اس کی سانسیں تھم گئیں، دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے لیے نظروں کو سنبھالنا بھی ایک کارِ دشوار ہونے لگا۔ زہرہ بانو سامنے ہی ایک بڑے سے صوفے پر دلہن بنی بیٹھی تھی، اس نے سُرخ گلاب رنگ کا گولڈن کڑھائی والا شرارہ پہن رکھا تھا، اسی رنگ کی آتشی قمیص تھی اور دوپٹہ... جو اس وقت تھوڑا سرکا ہوا تھا۔ پیروں پہ گولڈن سینڈل تھے اور قریب اسی کے ایسا ہی میچنگ پرس رکھا تھا۔ دلہن بنی زہرہ بانو کا حسن کسی ہیرے کی طرح ہی دمک رہا تھا۔

کمرے میں ایک سحر انگیز سا اور خوشبو بھرا طلسماتی ماحول بنا ہوا تھا، جس کی ہوش ربائی میں بیگم صاحبہ کی شان اور

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

سج دھج کو چار چاند لگ گئے تھے، اس کے دلکش اور حسین چہرے سے ایک وقار بھی جھلک رہا تھا۔

لاکھ احتیاط اور مرتبے کے پاس کے باوجود کمیل دادا جیسے اپنا آپ گم کر بیٹھا تھا۔ وہ تو اپنی پلکیں جھپکانا ہی بھلا بیٹھا تھا۔ تب پھر اسے زہرہ بانو کی مترنم آواز نے ہی چونکنے پر مجبور کیا۔

"کیسی لگ رہی ہوں میں... کمیل دادا؟"

کمیل دادا کیا جواب دیتا؟ اسے تو خود کسی کے ہوش دلانے کی اس وقت ضرورت پیش آرہی تھی، مگر اس آواز نے اس کی محویت توڑی تو وہ از حد شرمندہ شرمندہ سا ہوا، اپنے دل کی حسرت آمیز کسک کو دباتے ہوئے فوراً بات بنائی۔

"ماشاء اللہ، بیگم صاحب! چشم بددور... آپ بہت حسین لگ رہی ہیں، بہت خوبصورت... میری دل سے دعا ہے بیگم صاحب کہ آپ اور شاہ صاحب، زندگی کے اس نئے سفر پر ہر لمحہ خوشیاں سمیٹتے رہیں۔" کمیل دادا نے زہرہ بانو کو یہ دعا واقعی دل سے دی تھی۔ جس پر زہرہ نے بھی دھیرے سے زیر لب آمین کہا تھا۔

"یہ بتاؤ کمیل! لئیق شاہ کو تم نے دیکھا ہے؟ وہ کیسا لگ رہا ہے دولھا کے لباس میں؟" زہرہ بانو نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تو وہ کھلے دل اور صاف گوئی سے بولا۔

"ماشاء اللہ، بیگم صاحب! وہ بھی بہت پیارا اور خوبرو لگ رہا ہے، بالکل شہزادہ۔ آپ کی اور شاہ صاحب کی جوڑی بہت پیاری لگے گی۔" کمیل دادا نے کہا۔

اچانک زہرہ بانو نے خود سے ہٹ کر جب کمیل دادا پر توجہ دی تو بولی۔ "یہ کیا کمیل! تم نے کوئی تیاری نہیں کی؟ وہی پرانا لباس پہنے ہوئے ہو؟"

کمیل دادا تھوڑا گھبرایا پھر بولا۔ "ٹھ... ٹھیک ہی تو ہے یہ لباس بیگم صاحب! اچھا بھلا تو ہے" اس کے الفاظ بے ربط سے تھے۔

"ہرگز نہیں، ابھی جاؤ اور اسی وقت وہ پینٹ کوٹ پہن کر آؤ، جلدی، یہ میرا حکم ہے۔" زہرہ بانو نے تحکمانہ کہا اور کمیل دادا ایک گہری سانس خارج کر کے واپس لوٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور تیاری میں مصروف ہو گیا، ایک گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر خود کو قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا دیکھ رہا تھا۔

زہرہ بانو کے خصوصی طور پر خرید کر دیے ہوئے، ہلکے اسکائی کلر کے بیش قیمت لارنس پول پینٹ کوٹ میں وہ خاصا وجیہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بنے تھے اور پیشانی سے تھوڑے اُڑے اُڑے ہوئے سے تھے، رنگ سانولا تھا، قد دراز تھا، گھنی مونچھیں تھیں، چہرے پر مردانہ پن تھا۔ اس میں دوبارہ بیگم صاحب کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہو سکی تھی اور کسی کام کے بہانے وہ اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔

بالآخر میرج ہال میں لئیق شاہ اور زہرہ بانو کو ساتھ بٹھا دیا گیا۔ تقریب کا آغاز ہو چکا تھا۔ پروفیشنل فوٹوگرافرز اس میرج سرمنی کی تصویریں اور ویڈیو البم بنانے میں مصروف تھے۔

کمیل دادا نے خود کو ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی چوکس کر رکھا تھا اور وہ خود بھی گاہے بگاہے اپنی خفیہ سیکیورٹی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔

لئیق شاہ کے ساتھ دلہن بنی بیٹھی زہرہ بانو کا دل مسرت بھری چٹکیاں لے رہا تھا۔ آج اس کا ایک خوابِ دیرینہ جیسے شرمندۂ تعبیر ہونے کو تھا، آج اس کا محبوب لئیق شاہ اس کے قریب... بہت قریب تھا، لیکن ابھی ارمانوں بھرے دلوں کی پیاس کو ایک ذرا وصلِ شبِ زفاف کی رات کا انتظار تھا۔ ایسی رات، جو مسرت کی ان گھڑیوں کو شادمانیوں سے لبریز کر دیتی ہے، ایک جانب اگر زہرہ بانو اپنی قسمت پر نازاں تھی تو دوسری طرف لئیق شاہ کے دل کی بھی یہی کیفیت تھی، اسے یہ سب ایک حسین خواب ہی کی صورت لگ رہا تھا، زہرہ بانو ایک حسین اپسرا کی صورت اس کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، اور وہ اس کی قربت میں سرشار تھا۔

تقریب کا اختتام ہوا، پھولوں پتیوں کی برسات میں دولھا دلہن کی رخصتی ہونے لگی، کمیل دادا حرکت میں آگیا، وہ سائے کی طرح اس جوڑے کے ساتھ اور کبھی آگے پیچھے ہو رہا تھا، اس کے کوٹ کی اندرونی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا... اور وہ بار بار میرج ہال کے باہر اور آس پاس متعین اپنے مسلح محافظ ساتھیوں سے کلیئرنس کی رپورٹ بھی لے جا رہا تھا۔

ہال کے باہر نئے ماڈل کی ٹیوٹا کرولا، دولھا اور دلہن کو بیگم ولا لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اسے بھی خوب سجایا گیا تھا۔

نو بیاہتا جوڑے کے ہال سے نکلنے سے پہلے کمیل دادا باہر نکلا اور ایک گہری نظر اطراف میں ڈالی یاسر اور جہانگیر کو اس نے کار کے قریب چوکس کھڑے رہنے کا حکم دے رکھا تھا۔ آنے والے مہمانوں کی گاڑیاں سامنے قطار کی صورت کھڑی تھیں۔ کچھ لوٹ رہے تھے، بیشتر کھڑے دلچسپی سے دولھا دلہن کی رخصتی کا یہ آخری منظر دیکھنے میں محو تھے۔

زہرہ بانو اور لئیق شاہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوئے۔ میرج ہال کے گیٹ سے باہر نکلے، ایسے میں کمیل دادا ان کے قریب ہو گیا۔۔۔ بہ ظاہر سب ٹھیک معلوم ہو رہا تھا، لیکن کمیل دادا بھول گیا تھا کہ سامنے قطار کی صورت کھڑی کاریں صرف آنے والے مہمانوں کی ہی نہیں ہو سکتیں۔ اور اس غلطی کا احساس کمیل دادا کو دیر سے ہوا۔

دولھا دلہن کو بیگم ولا لے جانے والی چمکتی دمکتی کار گیٹ کے مختصر قد مچوں کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پر مہمانوں کی کھڑی کاروں میں شامل، نیلے رنگ کی ہنڈا اکارڈ جو قدرے قریب کھڑی تھی اور اس کے اندر تھوڑی دیر پہلے تک کوئی بیٹھا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔۔۔ اب اچانک اس کے اندر چار سر دکھائی دیے۔ یہ سب ڈھاٹا پوش تھے، ایک نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور باقی تینوں نے کھڑکی سے گنز نکال لیں، اسی وقت کمیل دادا کی نظر پڑی، ان کی طرف یاسر اور جہانگیرا کی پیٹھ تھی، انہیں خبردار کرنے کا وقت نہ رہا تھا، نہ ہی کمیل دادا کے پاس اپنا پستول نکالنے کا، جو کرنا تھا، پل کے پل میں کرنا تھا اور وہ کمیل دادا نے کر ڈالا۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا، اور دولھا دلہن کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کی کہ وہ فوری طور پر نشانے کی زد سے نکل جائیں، اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا، دھکا لگنے سے زہرہ بانو ہلکی چیخ کے ساتھ نیچے قد مچوں کی طرف لڑکھڑا گئی، اور گرتے ہی اپنی کار کی باڈی سے جا ٹکرائی، اسے اپنی کار کی آڑ میسر آ گئی، مگر لئیق شاہ کو لڑکھڑانے میں دیر ہوئی، اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری، اور کمیل دادا کی وحشت بھری نظروں نے لئیق شاہ کو گولیوں سے چھلنی ہو کر گرتے دیکھا۔

دشمنوں کا نشانہ دولھا دلہن دونوں تھے مگر وہ صرف ایک کو ہی اپنی درندگی کا نشانہ بنا سکے، ان کی پوزیشن ایسی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک سفاکی اور بربریت کا یہ کھیل نہیں کھیل سکتے تھے۔۔۔ لہٰذا انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی، یاسر اور جہانگیر بھی حرکت میں آ چکے تھے۔ اور انہوں نے اس کار پر فائرنگ کی، جبکہ دشمن اپنے دفاع میں فائرنگ کرتے، راہِ فرار اختیار کرنے کی جستجو میں تھے، مگر یاسر اور جہانگیر نے ان پر جوابی فائرنگ کی اور دو دشمنوں کی کربہ انگیز چیخیں بھی سنائی دیں۔۔۔ مگر بدقسمتی سے وہ دونوں بھی گولیوں کی زد میں آ کر گرے، جبکہ کمیل دادا اپنا پستول نکالے پاگلوں کی طرح فائر کرتا۔۔۔ دشمنوں کی کار کے پیچھے لپکا۔

وہاں بڑبونگ مچ گئی۔ مہمان عورتوں بچوں کی چیخیں گونجنے لگیں۔۔۔

زہرہ بانو کا عروسی جوڑا مسک چکا تھا۔ وہ اپنی کار کی باڈی کے ساتھ جا لگی تھی اور ایسے میں اس کا محبوب لئیق شاہ گولیوں سے چھلنی ہو کر میرج ہال کے گیٹ سے لڑکھڑاتا ہوا سیدھا اس کے قریب، کچھ اس طرح گرا کہ اس کا سر زہرہ بانو کی گود میں تھا۔ اپنے محبوب کو اس طرح خون میں نہایا ہوا دیکھ کر زہرہ بانو کو جیسے سکتہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھوں کی مہندی کے رنگ میں اس کے محبوب، لئیق شاہ کا خون بھی شامل ہو گیا تھا اور رنگِ حنا جیسے رنگِ لہو میں بدل گیا تھا۔ زہرہ بانو کو یوں لگا جیسے قیامت آ گئی ہو، زمین پھٹ گئی ہو، آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔

اس کے وجود کے ہی نہیں اس کی روح تک کے ٹکڑے کر دیے گئے ہوں، یہ شدید دُکھ اور کرب انگیزی کی آخری حد ہی تھی کہ باوجود کوشش کے زہرہ بانو کے سینے سے اُٹھنے والی چیخ تھرتھرا کر وہیں اٹکی رہ گئی، اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں، پورا وجود روح سمیت دہل گیا تھا۔ ایک کپکپی اس پر طاری تھی۔

لئیق شاہ اس کی گود میں اپنا سر دیے کراہ رہا تھا، صاف نظر آتا تھا کہ وہ آخری سانسوں پہ تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر زہرہ بانو کی آنکھیں ہی جیسے لہو رنگ ہو گئیں۔۔۔ ایسے میں لئیق شاہ نے اپنا لرزتا ہوا ایک ہاتھ۔۔۔ اُوپر اُٹھانے کی ناکام کوشش کی، مگر زہرہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس کے ہونٹ کپکپائے۔۔۔ اور وہ بھنچی بھنچی آواز میں زہرہ سے بس اتنا ہی کہہ پایا۔ "ز۔۔۔ ز۔۔۔ ز۔۔۔ زہرہ! ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ ہمارا بس۔۔۔ بس۔۔۔ اتنا ہی ساتھ تھا۔۔۔ تت۔۔۔ تقدیر کو یہ۔۔۔ جو۔۔۔ مم۔۔۔ منظور۔۔۔ تت۔۔۔ تم۔۔۔ دُکھ مت۔۔۔ کک۔۔۔ کرنا۔"

لئیق شاہ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اور زہرہ بانو کا اندر جیسے لہولہان ہو گیا اور تب ہی اس کا غم آگیں سکتہ ٹوٹا، اس کے سینے کے پنجرے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی چیخ اس قدر زور سے آزاد ہوئی تھی کہ آس پاس کا ماحول بھی بری طرح تھرا اُٹھا تھا۔ اس کے بعد آہیں تھیں، سسکیاں تھیں اور نہ ختم ہونے والا ایک دُکھ تھا اور۔۔۔ زہرہ بانو تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 14

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Scanned By Amir

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

زہرہ بانو (بیگم صاحب)... اپنی یہ خوف ناک داستان...... سنانے کے بعد خاموش ہو گئیں، ان کی آواز بھرا گئی، دلکش آنکھوں میں نمی چمکنے لگی اور پل کے پل چہرہ اشکبار ہو گیا جیسے بھادوں مینہ برس پڑا ہو۔

کسی کا محبوب اپنے چاہنے والے سے اس قدر بھیانک انجام کے بعد بچھڑ جائے تو اس کے دل و دماغ کی کیا کیفیات ہوتی ہیں یہ وہی جانتا ہے جس پر بیتی ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ میں بیگم صاحب کے اس جانکاہ اور دل سوز دکھ کو سمجھ ہی نہیں رہا تھا بلکہ دل کی گہرائیوں سے محسوس بھی کر رہا تھا کیونکہ محبت میں نے بھی تو کی تھی، میں بھی تو اسی دشتِ الفت کا راہی تھا۔ عابدہ کو بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا۔ ایک طرح سے وہ بھی مجھ سے جدا ہی تھی، سات سمندر پار... میری یادوں کی بھٹی میں سلگ رہی تھی، تڑپ رہی تھی، ہم دونوں ہی مرد بابا کے احسانات کا بھرم رکھے ہوئے تھے۔

بیگم صاحب اپنے ہاتھوں کی پشت سے اپنی بھیگی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ وہ ہولے ہولے سسک بھی رہی تھیں، آج شاید ان کے دردناک ماضی کا دکھ ہرا ہو گیا تھا۔ ایسے میں مجھے ان پر بے حد ترس آیا اور ان سے بے اختیار ایک ہمدردانہ سی انسیت محسوس ہونے لگی۔ وہ روئے جا رہی تھیں۔ مجھے بھی دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے ان کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا۔ ان کا چہرہ اور ان کی آنکھیں ہنوز بھیگی بھیگی سی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اشک رواں کی یہ نہر آنکھوں سے نہیں خونِ دل سے بہہ نکلی ہو۔ میں جب ان سے مخاطب ہوا تو خود میری آواز بھی مرتعش سی محسوس ہوئی تھی۔

''بیگم صاحب! مجھے تو آج پتا چلا کہ آپ اندر سے کس قدر دکھی ہیں، غمِ الفت انسان کو ادھ موا کر ڈالتا ہے۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں بیگم صاحب... کہ میں نے اپنے تجسس کی خاطر آپ کے غم کو ہرا کر دیا۔''

میری بات سن کر بیگم صاحب کے دلنشین لبوں پر بڑی کرب آمیز مسکراہٹ ابھری پھر انہوں نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا جو ہنوز ان کے شانے پر تھا۔ وہ اسے ہولے سے تھپک کر بولیں۔

''میرا یہ غم... کبھی پرانا نہیں ہو سکتا شہزی! نہ ہی گزرتے وقت کی دھول اسے دبا سکتی ہے۔''

میں نے بہت دھیرے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا کیونکہ میں محسوس کر رہا تھا کہ ان کے شانے پر از راہِ ہمدردی رکھے ہوئے میرے ہاتھ پر ان کا مرمریں ہاتھ ہولے ہولے مسلا جا رہا تھا اور مجھے اپنے وجود میں ایک بار پھر سنسنی کا سا احساس ہونے لگا تھا۔ ہاتھوں کی یہ رگڑ مجھے چقماق پتھر کی سی لگی تھی جسے آپس میں رگڑا جائے تو یکدم آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ''چقماق'' دلوں میں آگ بھڑکاتی میں نے ہاتھ پرے ہٹا لیا۔

وہ پھر عجیب سے لہجے میں بولیں۔ ''شہزی! تم تیتی شاہ کو دیکھنا چاہو گے؟'' میں ان کی اس انہونی سی بات پر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئیں پھر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا، ان کی صراحی دار گوری گردن کے گرد ایک سونے کی چین تھی، جس کا لاکٹ ان کے گریبان کے اندر کہیں ''اٹھکیلی'' کر رہا تھا۔ لاکٹ نکال کر انہوں نے اسے کھولا پھر ایک سرے کو اپنے ہاتھ کی مٹھی سے ڈھانپ کر لاکٹ کے دوسرے اندرونی سرے کو میری آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا گول سادہ آئینہ تھا۔ اس میں میری اپنی صورت متحرک تھی۔ میں مسکرا کر بولا۔

''بیگم صاحب! یہ... یہ... تو محض آئینہ ہے۔ اس میں تو میری صورت نظر آ رہی ہے؟''

میری بات سن کر ان کے لبوں پر اسرار بھری مسکراہٹ ابھری۔ پھر وہ لاکٹ کا دوسرا حصہ میری جانب کرتے ہوئے اسی لہجے میں بولیں۔

''لو شہزی! اب... یہ آئینہ دیکھو ذرا...''

میں دنگ رہ گیا۔ وہ آئینہ تو نہ تھا مگر اس میں کسی کی تصویر تھی، بلکہ کسی کی کہاں وہ تو میری اپنی تصویر تھی۔

''یہ... یہ... یہ تو میری تصویر ہے بیگم صاحب...''

''نہیں شہزی! یہ تیتی شاہ کی تصویر ہے۔ وہ تمہارا ہم شکل ہے۔ تم بھول گئے جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو تمہیں دیکھ کر یکلخت میری حالت غیر ہو گئی تھی اور مجھ پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی؟''

میں ورطۂ حیرت میں مبتلا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں پہلی بار اول خیر کے ساتھ بیگم ولا آیا تھا اور بیگم صاحب سے پہلی بار میرا سامنا ہوا تھا تو ان کی حالت مجھے دیکھتے ہی اچانک غیر ہونے لگی تھی اور اس بات نے مجھے آج تک ایک عجیب قسم کے تجسس میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آج اس راز سے بھی پردہ اٹھ گیا تھا۔

القصہ مختصر... زہرہ بانو نے آج بڑے کھلے کھلے انداز میں اپنی کتھا سنائی تھی، اس میں اول خیر اور ارشد کا ذکر کہیں

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں تھا۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ یہ دونوں بہت بعد میں ان کے گروہ میں شامل ہوئے تھے، نیز... اپنی داستان کے آخری حصے میں بیگم صاحبہ نے یہ بھی بتایا کہ شفیق شاہ کے ہلاک ہو جانے کے بعد اسے اس کے گاؤں کے قبرستان میں ہی دفنا دیا گیا تھا جبکہ کھیل دادا نے چار قاتلوں میں سے دو کو ہلاک کر ڈالا تھا اور باقی دو کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان کے چہروں سے ڈھاٹے ہٹانے کے بعد اس بات کی بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ شفیق شاہ کا قتل چودھری ممتاز نے ہی کروایا تھا بلکہ وہ تو دونوں کو مروا دینا چاہتا تھا مگر خوش قسمتی سے زہرہ بانو اس سفاک اور خونی حملے میں بال بال بچ گئی تھیں۔

کھیل دادا ان دونوں قاتلوں کو ممتاز خان کے آدمیوں کی حیثیت سے پہچان گیا تھا اور انہیں پولیس کے حوالے کر کے اقبالِ جرم بھی کروا لیا تھا لیکن پھر اچانک ایک روز ان دونوں قاتلوں کو جیل میں زہر دے کر مروا دیا گیا اور بیشتر کیسوں کی طرح یہ کیس بھی فائلوں کے انبار میں دب کر داخلِ دفتر کر دیا گیا پھر اس روز سے باقاعدہ بیگم صاحبہ اور ممتاز خان کے درمیان جنگ کا آغاز ہو گیا۔

بیگم صاحبہ کی اس داستان میں مجھے ایک بات پر حیرت ہوئی تھی جس کا میں نے اظہار بھی کر دیا۔

”بیگم صاحبہ! ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی کہ آپ کے علم میں پہلے سے یہ بات تھی کہ کھیل دادا آپ کو پسند کرتا ہے؟“

یہ سوال میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ وہ عجیب سی مسکراہٹ سے بولیں۔ ”ہاں، میں جانتی تھی، لیکن دانستہ لاتعلق رہتی تھی اس حقیقت سے... نہیں چاہتی تھی کہ اس حساس موضوع کو چھیڑوں کیونکہ عورت ایک ہی بار کسی سے محبت کرتی ہے جو مجھے صرف شفیق شاہ سے تھی اور یہ حقیقت کھیل دادا بھی جانتا تھا مگر آفرین ہے اس آدمی پر اس نے آج تک میرے سامنے اپنے اظہارِ دل کی جرأت نہیں کی، سمجھدار تھا۔ حقیقت جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا مگر باوصف اس کے اس نے عمل میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہونے دی۔ حتیٰ کہ شفیق شاہ کے معاملے میں اس سے چھپی ہوئی رقابت کے باوجود کئی مواقع پر اس نے اپنی جان پر کھیل کر اس کی زندگی بچائی تھی اور میرے حوالے سے وہ اس کی عزت بھی کرنے لگا تھا۔“

”بے شک آفرین ہے کھیل دادا پر اس کی اعلیٰ ظرفی پر۔“ میں نے بھی کھیل دادا کے اس قابلِ لحاظ عمل پر متاثر ہو کے کہا۔

باتوں باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ رات کب سر پر آئی اور کب رات کے آخری پہر میں ڈھل بھی گئی۔

ہم دونوں گم صم اور دم بخود ہیولوں کی طرح ریتیلے کراڑے پر بیٹھے تھے کہ اچانک مجھے اپنے کان کی لو میں ہلکی سی تپش محسوس ہوئی۔ میں بری طرح چونکا اور جھٹ سے اپنی ایک انگلی کان کی طرف لے گیا اور دھیرے سے... ”شہزی اسپیکنگ“ کہا۔

لامحالہ دوسری جانب سے میں ثریا ہی کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا مگر خلافِ توقع ایک اجنبی مردانہ آواز سن کر میں بری طرح چونک پڑا۔

”یس! کامران از ہیئر، کیا تم شہزاد احمد خان ہی بول رہے ہو، اوور۔“ اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ کئی اندیشناک خدشات سے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ جان ہی نہیں پا رہا تھا کہ کیا بات کروں؟ میں تو ثریا کے بولنے کی توقع کیے بیٹھا تھا۔ تاہم اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”ہاں، میں شہزاد احمد ہی بول رہا ہوں مگر تم کون ہو؟ اور ثریا کدھر ہے... اوور۔“

دوسری جانب سے وہی اجنبی آواز ابھری۔ ”میں ثریا ہی کا ساتھی ہوں۔ وہ ایک نرغے کا شکار ہو گئی۔ تمہیں لینے کے لیے اسے آنا تھا مگر تنظیم کے ایک ضروری مشن پر اسے جانا پڑ گیا۔ اب میں تمہیں پک کروں گا کدھر ہو تم؟ اوور۔“

مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں نہیں بلکہ میرے دماغ میں ان گنت چیونٹیاں گھس گئی ہوں۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا میرے لیے... مجھ سے کئی پل تک کوئی جواب ہی نہ بن پڑا کہ اسے کیا جواب دوں؟ ایک خیال ذہن میں آتا تھا کہ ممکن ہے کامران نامی یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہو، وہ سچ ہو۔ ثریا کو اچانک کوئی اہم مشن آن پڑا ہو مگر ثریا کو مجھے بتانا چاہیے تھا یا شاید اسے اس کا موقع نہ مل سکا ہو۔ کئی الجھن آمیز لاتحل سوالات ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے۔ کیونکہ ثریا خود مجھ سے ایک مدد کے سلسلے میں ملنا چاہتی تھی، نہ صرف یہ بلکہ وہ تنہا نہ تھی اس کے ”ہم خیال“ ساتھی بھی ”اسپیکٹرم“ میں اس کے ساتھ شامل تھے، وہ ان کے خفیہ اغراض و مقاصد سے مجھے آگاہ کرنے والی تھی، ایک ہولناک خیال یہ بھی آتا تھا کہ کہیں بدقسمتی سے ثریا کا راز فاش تو نہیں ہو گیا تھا۔ کہیں وہ بے چاری کسی مصیبت کا شکار تو نہیں ہو گئی تھی۔ ایسے ہی وقت میں گویا پل کے پل میرے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آیا اور پھر میں پورے اعتماد سے بات کرنے لگا۔ اسے میں نے اپنی نہر کنارے موجودگی کے بارے میں بھی بتا دیا اور چند دوسری نشانیاں اسے بتا دیں۔

”کیا ہوا؟ کون تھا؟ ثریا نہیں تھی؟“ رابطہ منقطع ہوتے ہی بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری لی۔ اس کے بعد بیگم صاحبہ کو ساری بات بتا دی۔ ان کے چہرے پر بھی اُلجھن آمیز تشویش کے آثار نمودار ہو گئے پھر وہ جیسے خودکلامیہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔ ”مجھے تو دال میں کالا لگتا ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے گومگو انداز میں کہا۔

”شہزی! تمہارے ذہن میں کیا الجھن ہے؟ مجھے تو کوئی خطرناک گڑبڑ لگ رہی ہے لیکن تم نے تو انہیں میرا مطلب ہے کامران کو اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں بھی بتا دیا ہے؟“

میرے ذہن میں جو الجھن تھی وہ ابھی بیگم صاحبہ کو بتانے کا وقت نہ تھا۔ تاہم بولا۔ ”ہمیں یہ جگہ فوراً چھوڑنا ہو گی اور کسی اور جگہ گھات لگانا پڑے گی، آیئے بیگم صاحبہ۔“ کہتے ہوئے میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ بیگم صاحبہ نے بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہم دونوں تاریکی میں آگے بڑھنے لگے اور کراڑے کے سرے پر پہنچ کر دوسری طرف نیچے ڈھلان میں اترنے لگے۔ سامنے ٹیلے جیسے عجیب ہیولوں کی طرح نظر آ رہے تھے، یوں لگتا تھا جیسے کئی پُراسرار بلائیں کوہان نکالے دم بخود بیٹھی ہوں۔ ایسے ہی ایک ٹیلے کے قریب آ کر ہم بیٹھ گئے۔ میرا ذہن عجیب مخمصے کا شکار تھا۔ شکوک و شبہات اپنی جگہ مگر کامران کی بات معقول بھی لگتی تھی، ورنہ کامران کو بھلا ثریا کے منصوبے اور میرے بارے میں کیا پتا تھا؟ کیا خبر وہ واقعی ہماری مدد کے لیے ہی پہنچ رہا ہو۔ بہرطور، دونوں ہی باتیں تھیں۔ تاہم میں نے اس الجھی ہوئی اور متوقع مخدوش صورتِ حال کو بے نقاب کرنے کے لیے اپنے تئیں جو سوچ رکھا تھا، اس پر عمل کرنے کا میں فیصلہ تو کر ہی چکا تھا۔

اندیشناک لمحات کے متوقع خدشات تلے وقت دھیرے دھیرے دل کو دھڑکاتا گزرتا رہا۔ میں بھی ارد گرد کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ ایسے ہی عمل کے دوران جب میں آخری بار ایک نسبتاً اونچے ٹیلے پر چڑھ کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا تو اچانک میری نظر سیدھے ہاتھ کی سمت پر ٹھہری گئی۔ یہ وہ سمت تھی جہاں سے ہم چلے تھے اور یہاں پہنچے تھے وہاں ایک روشنی سی دکھائی دی۔ روشنی متحرک تھی۔ یقیناً یہ کسی گاڑی کی ہو سکتی تھی۔ تو کیا کامران مجھے لینے کے لیے، ہماری مدد کے لیے یہاں پہنچ رہا تھا؟ کیونکہ متوقع گاڑی کا رخ نہر کی طرف ہی تھا پھر ٹھیک اس وقت جب میں کچھ سوچ کر ٹیلے سے نیچے اترنے کا ارادہ کر رہا تھا دفعتاً ہی میری نظر بائیں جانب پڑی۔ یہ آبادی کی طرف والا علاقہ تھا جس کے بارے میں میرا محتاط اندازہ تھا کہ دشمن ہماری تلاش میں بھٹک کر ادھر جا نکلے تھے۔ اب اسی سمت سے مجھے ایک سے زائد روشنیاں متحرک دکھائی دیں اور پھر جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ یقیناً کوئی گہری سازش چلی گئی تھی... آبادی کی سمت سے ممتاز خان اور اس کے کارندے ہی ہو سکتے تھے جبکہ دوسری طرف کامران بھی ہمدرد کی صورت میں دشمن ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس نے ہماری تلاش میں سرگرداں ممتاز خان کو بھی ہمارے حلیے میں آگاہ کر دیا ہو یا تو پھر یہ کچھ نہ تھا؟ مگر نہیں... بہت کچھ تھا۔ آتکل مجھے ماروائی بات ہو گئی تھی، وقت کم تھا، میں تیزی سے نیچے اترا، بیگم صاحبہ کا ہاتھ پکڑا اور سمت بدل کر ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں آ گیا۔ بیگم صاحبہ بھی اس نئی صورتِ حال سے پریشان سی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا۔

”بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے ہم پہلے سے بھی زیادہ خطرے میں گھر چکے ہیں مگر اللہ مالک ہے، اس نے اب تک مدد کی ہے آگے بھی وہی ہماری دست گیری کرے گا۔ آپ یہاں رکیں میں ذرا حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“

”نن، نہیں... تم کہیں مت جاؤ، ہم یہیں سے ہی بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ بیگم صاحبہ میرا ہاتھ تھام کر تشویش زدہ لہجے میں بولیں تو میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ! ہم اس وقت چومکھی جنگ کا شکار ہیں۔ یہ موقع فرار کا نہیں ہے۔ مجھ پر بھروسا کریں میں آپ کو انشاء اللہ بحفاظت لے جاؤں گا۔“ میں نے مستحکم اور پُرعزم لہجے میں کہا اور ہولے سے تسلی آمیز انداز میں ان کا ہاتھ تھپتھپا کر آگے بڑھ گیا۔

ایک ایسی جگہ پہنچ کر جہاں مجھے یقین تھا کہ مخالف سمتوں سے آنے والے دشمنوں کا وہ مقام اتصال ہو گا، وہاں گھات لگا کر ان کی متوقع نقل و حرکت دیکھنے کے لیے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دبک کر بیٹھ گیا۔

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ گھمسان کا رن پڑنے اور آگ اور بارود کی بو آتی مجھے محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ میری ٹھٹکی ہوئی نظروں کے سامنے تاریکی میں مذکورہ مقام پر دشمنوں کے دونوں گروپ آپس میں مل گئے تھے، اب ان کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں، میرا اور ان کا فاصلہ بمشکل تیس چالیس گز ہی تھا۔ میں نے کار سے ایک نوجوان کو دو مسلح آدمیوں کی معیت میں اترتے دیکھا تھا جس کے بارے میں قوی امکان تھا کہ یہی کامران تھا جس نے ثریا کے حوالے سے مجھے بلف کرنے کی سعی چاہی تھی جبکہ ممتاز خان اپنی اسی پجارو جیپ سے اترا تھا، جس پر ہم نے اس پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے عقب میں ایک بغیر ہڈ والی جیپ بھی تھی اور ایک کار۔

کل ملا کر ان کی تعداد بارہ تیرہ سے کم نہ تھی، ان میں کچھ مسلح تھے، کچھ نہیں۔ یقیناً ان کے ہتھیار زیرِ ستر ہوں گے۔ میں نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں بغور دیکھا۔ ممتاز خان اس نوجوان سے خاصی برہمی سے مخاطب تھا۔

”یہاں ہم دو بار جھک مار کے جا چکے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔ اس نے تمہیں بےوقوف بنایا ہے۔“

”للل... لیکن باس...“ نوجوان نے کچھ کہنا چاہا مگر ممتاز نے غصیلے انداز میں اس کی بات کاٹ دی۔

”تم گدھے ہو، لگتے ہی نہیں کہ تم اسپیکٹرم کے ایک ٹاپ ایجنٹ ہو۔ تمہیں چاہیے تھا، شہزی سے براہِ راست بات کرنے کے بجائے اس ذلیل عورت سے ہی رابطہ کرواتے، شہزی تمہاری سوچ سے بھی زیادہ مکار اور چالاک ہے۔ تمہاری آواز سنتے ہی وہ بدک گیا ہوگا۔“

اس پر اس نوجوان نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

”ہمارا ارادہ یہی تھا مگر...“

ممتاز خان اس کی بات سننے کو تیار ہی نہ تھا، بولا۔

”ثریا کی غداری کے بارے میں کسے علم ہوا تھا؟“

ممتاز خان کے اس سوال پر میری سماعتیں دھڑک اٹھیں... جس مذکورہ نوجوان کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کامران تھا جوابا سودبانہ لہجے میں بولا۔ ”چیف کو ثریا پر سب سے پہلے شبہ ہوا تھا۔“

”چیف... کون چیف؟ مسٹر ڈارک کی بات تو نہیں کر رہے ہو تم؟“

”حیرت ہے باس۔ آپ کے علم میں نہیں کہ ماسٹر اتھارٹیز نے وزیر جان کو اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف مقرر کر دیا ہے اور اس کا آفس اسٹیشن فور میں قائم کر دیا ہے۔“ کامران نے شاید ممتاز کے طنز کا جواب دیا تھا۔ وہ ایک ٹاپ ایجنٹ تھا جبکہ ممتاز خان کی اسپیکٹرم میں حیثیت کیٹسا KATSA کی تھی جو یقیناً ٹاپ ایجنٹس اس کے انڈر میں نہیں تھے۔ (ثریا سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق)

میں نے دیکھا کامران کے اس انکشاف پر ممتاز خان کا چہرہ ہی نہیں آواز بھی بجھ گئی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خود ”اسٹیشن چیف“ کے عہدے کا متمنی تھا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی تو کامران بولا۔

”میں ایک بار پھر شہزی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے کان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میرے کان میں ہلکی حرارت محسوس ہوئی، میری سمجھ میں نہ آسکا کہ میں اس سے کیا بات کروں؟ اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا بات کرنے کا... یہ عقدہ کھل چکا تھا کہ ثریا کا راز فاش ہو چکا ہے اور اس کا سبب وزیر جان ہی تھا۔ نہ جانے اسے کس طرح ثریا پر شبہ ہو گیا تھا۔ اس پر غداری کا الزام بھی ثابت ہو گیا تھا۔ مجھے ثریا کے بارے میں تشویش ہونے لگی۔ ثریا سے مجھے بہت کچھ پوچھنا تھا نہ صرف یہ بلکہ اسے بھی مجھے بہت کچھ بتانا تھا کہ اسپیکٹرم نامی اس بین الاقوامی خفیہ تنظیم کے مقاصد کیا تھے؟ وغیرہ۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے مدد بھی چاہتی تھی مگر افسوس اس کا اسے علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ پاور سیکرٹ سروس کا ایک بے قاعدہ ایجنٹ ہی سہی مگر رینجرز فورس کے سربراہ میجر ریاض باجوہ کی باتیں میرے ذہن میں گردش کر رہی تھیں جن کے مطابق وطن عزیز کو کچھ اندرونی و بیرونی سازشوں کا سامنا تھا اور ایک پر خفیہ طور پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا میرا ثریا سے مل کر اسپیکٹرم کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا ازبس ضروری تھا۔

میرے کان میں حرارت بڑھی ہوئی تھی اور......

میں نے بالآخر کامران کی کال اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر میں موصول کر لی۔

”یس! ہوز دیئر؟“ میں نے دانستہ انجان بن کر پوچھا اور اوور کہا۔

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوسری جانب سے اس نوجوان کی آواز ابھری۔

”یس مسٹر شہزی! تم کہاں ہو اس وقت؟ ہم تمہاری تلاش میں نہر والی جگہ پر پہنچ چکے ہیں مگر تم یہاں نہیں ہو، اوور۔“

اس کی بات سن کر میں مسکرایا۔ پھر اس کی مکاری کے جواب میں بولا۔ ”میں کچھ دیر پہلے ادھر ہی تھا لیکن وہاں دشمن مجھے تلاش کرتے ہوئے آن پہنچے تھے۔ اب میں اس جگہ نہیں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہیں کال کر کے بتاتا ہوں۔ اس وقت میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ جب تک وہ ٹل نہیں جاتا میں اپنی کمین گاہ سے نہیں نکل سکتا۔ تم ایک کام کرو، اپنے کیشا ایجنٹ ممتاز خان کو کسی طرح یہاں سے بھگانے کی کوشش کرو، اوور۔“

”اس کی تم فکر مت کرو شہزی، تم مجھے اپنی ویئر اباؤٹ کے بارے میں بتاؤ، میں ابھی وہاں تمہیں لینے پہنچ جاتا ہوں۔ وقت ضائع نہ کرو، ورنہ تمہاری وجہ سے میں بھی اپنے لوگوں کی نظروں میں آجاؤں گا، اوور۔“

اس کی بات سن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ ”کامران! ٹھیک ہے پھر میں تمہیں بتائے دیتا ہوں مگر میں تمہیں پہچانوں گا کیسے؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اگر گاڑی میں ہو اور تمہارے ساتھ اور ساتھی بھی ہوں تو گاڑی ذرا دور چھوڑ کے تم تنہا اصل مقام کی طرف بڑھنا، اس طرح میں تمہیں اکیلا دیکھ کر دور سے ہی پہچان لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے ایک آبادی کی سمت کا ایک غلط پتا بتا دیا اس کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ واپس اسی ٹیلے کے قریب آگیا جہاں سے میں نہ صرف انہیں دیکھ سکتا تھا بلکہ ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو بھی سن سکتا تھا۔ میں نے دیکھا کامران، ممتاز خان سے کہہ رہا تھا۔

”اس نے اپنی ویئر اباؤٹ کے بارے میں مجھے آگاہ کر دیا ہے۔ وہ بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تم موت کا ہرکارہ بنے اسے ڈھونڈ رہے ہو۔“ باقی اس نے وہی کچھ کہا جو میں اس سے کہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا ممتاز خان فوراً حرکت میں آتے ہوئے بولا۔

”ہم ابھی اسے وہاں جا کر چھاپنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”نہیں باس، وہ بدک جائے گا اور بھاگ کر کہیں چھپ جائے گا۔“ کامران نے اختلاف کیا۔ ”میں اس وقت ماسٹر چیف مسٹر آرک کے آرڈرز کو فالو کر رہا ہوں۔ انہوں نے ”شہزی ٹریپ“ کا یہ مشن مکمل طور پر میری صوابدید پر چھوڑا ہے۔“

”تو کیا اب تم مجھ پر حکم چلاؤ گے؟“ ممتاز خان اپنی روایتی اکڑفوں دکھانے لگا مگر فوراً حالات کی نزاکت اور شاید ماسٹر چیف مسٹر آرک کے ذکر پر ڈھیلا پڑتے ہوئے بولا۔ ”اونہہ اوکے! کیا پلان ہے تمہارا۔“

ٹاپ ایجنٹ کامران پُرمتانت لہجے میں بولا۔ ”شہزی کو بلف کرنے کی خاطر پہلے میں وہی کروں گا جو اس نے کہا ہے۔ یہاں سے روانہ ہونے کے بیس منٹ بعد آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ میرے پیچھے آنا۔ ٹریپ کامیاب ہوتے ہی میں واچ ٹرانسمیٹر پر خفیہ کاشن دوں گا اس کے بعد آپ لوگ شکار کے گرد گھیرا ڈال دینا۔ اول میں خود ہی اسے قابو کرلوں گا۔“ اس نے مجھے قابو کرنے کے لیے جس غرور اور اطمینان کا اظہار کیا تھا اس نے میرے پورے وجود میں جوش بھر دیا تھا اور پھر میں زیرلب یہ بڑبڑاتے ہوئے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ پلٹا۔

”یہ وقت بتائے گا کامران کہ تم مجھے قابو کرتے ہو یا میں۔“

بیگم صاحبہ کے پاس پہنچ کر میں نے انہیں ساتھ لیا اور تاریکی میں تیز تیز چلتے ہوئے موجودہ صورت حال سے آگاہ کرتا گیا۔ وہ فکرآمیز لہجے میں بولیں۔ ”شہزی! تم خطرے سے کھیلنے لگے ہو، وہ سب معمولی لوگ نہیں ہیں۔ تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”بیگم صاحبہ! خطرے سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر خیر کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں اور میری کامیابی کی دعا کریں۔“

چند منٹوں بعد ہی میں اس راستے پر آن پہنچا جہاں متوقع طور پر کامران کو رکنا تھا۔ اس کے بعد کار سے اتر کر اکیلا آگے بڑھنا تھا۔۔۔ یہ نہر سے تقریباً پچاس گز دور کا علاقہ تھا اور یہاں سے آبادی کی طرف داخلے کا کچا بل کھاتا راستہ جاتا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا وہ فوری کرنے اور نمٹانے کا متقاضی تھا۔ بصورتِ دیگر ممتاز خان بھی اگر طے شدہ پروگرام کے مطابق وہاں اپنے مسلح آدمیوں سمیت پہنچتا تو صورتِ حال گمبھیر ہو جاتی۔

میں نے کار کے مقابلتاً طویل راستے کے بجائے درمیانی اور شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا اور بیگم صاحبہ کو بھی اپنے ساتھ تقریباً دوڑاتا ہوا وہاں تک پہنچا۔

بیگم صاحبہ کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر وہ بہت ہمت و حوصلے سے کام لے رہی تھیں۔ مقررہ مقام پر پہنچ کر ہم رک

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گئے۔ یہاں کیکر کے درخت اور جھنڈ دار خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، میرے ذہن میں کامران کو ٹریپ کرنے کا جو منصوبہ تھا، میں اس کے مطابق ٹھیک وقت پر ٹھیک جگہ قدم بڑھا رہا تھا۔

”شہزی!! اپنا خیال رکھنا۔“ بیگم صاحبہ کو ایک تاریک جھنڈ کے قریب چھوڑ کر جانے لگا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولیں۔ ”ایسے میں مجھے ان کے لہجے میں گہری حسرت و یاس ٹپکتی محسوس ہوئی۔ ”تم خالی ہاتھ ہو، تمہارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہیں۔ تم کس طرح...“

”بیگم صاحبہ۔“ میں نے ان کی بات کاٹ کر سرسراتی آواز میں کہا۔ ”میرا حوصلہ اور میرا عزم ہی میرے ہتھیار ہیں پھر اللہ میرے ساتھ ہے اور وہی میرے لیے کافی ہے۔ آپ چوکس رہیں... چلتا ہوں۔“

کہتے ہوئے میں تیزی سے عقب میں بڑھ گیا۔ وقت اور حالات کا تقاضا تھا جو کچھ کرنا ہے فوری کرنا ہے۔ جلد ہی مجھے سامنے روشنی نظر آ گئی۔ دل دھڑکا اور میں یکلخت مزید جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا۔ میری نظریں سامنے متحرک روشنی پر جمی ہوئی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ کار میں کامران اپنے دو تربیت یافتہ ایجنٹ ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ میں جانتا تھا میرا مقابلہ دیسی ساخت یا عام قسم کے دشمنوں سے نہیں ہے لیکن جوش، جذبہ اور شر کے خلاف خیر کی جنگ لڑنے کا عزم صمیم بھلا کب طاقت کے تفاوت کو خاطر میں لاتا ہے۔

کار قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے شکار پر جھپٹنے کے لیے جیسے اپنی سانس تک روک لی۔ میں نے جھنڈ کے تاریک گوشے سے دیکھا۔ کار کا انجن بند کر دیا گیا تھا پھر دروازے کھلے۔ ہیڈ لائٹس روشن تھیں، کار سے کامران اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ برآمد ہوا۔ میرا ان سے درمیانی فاصلہ فقط اتنا ہی تھا جتنا ایک چیتے کا اپنے شکار سے دوری پر ہوتا ہے۔

ظاہراً ان کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔

کامران نے دھیمے لہجے میں چند سیکنڈ ان سے کچھ کہا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ دونوں ساتھی اس کی کار کے قریب ہی کھڑے رہ گئے۔ کامران تاریکی میں آگے بڑھ گیا جیسے ہی وہ تاریکی میں اوجھل ہوا میں چیتے کی طرح جھاڑیوں سے نکلا۔ دونوں کا رخ اس جانب تھا جہاں کامران گیا تھا۔ عقب میں ابھر کے میں نے ایک زوردار لات ایک کی کمر کے اس حصے پر رسید کر دی جو ریڑھ کی ہڈی کا آخری اور نسبتاً کمزور حصہ کہلاتا ہے۔ ضرب زوردار تھی، لگتے ہی میرے شکار کا جسم ایک زوردار جھٹکے سے کمان کی صورت عقب میں خم ہوا اور وہ کار سے ٹکرا کر لڑھک گیا۔ دوسرا بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما تو میرے آہنی ہاتھ کا دایاں گھونسا ہتھوڑے کی طرح اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ اس وقت بقا کا جذبہ کسی جنون کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔ گھونسا کھا کر دوسرا کار کے بونٹ پر جا پڑا۔ پہلے والے کی نچلی ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ سرکنے کے باعث وہ حرکت کرنے سے قاصر تھا مگر میں مرحلہ وار لڑائی میں باری باری دونوں کی طرف متوجہ تھا اور گویا ایک بجلی کی لہر تھی جو میرے پورے وجود کو مثل پارہ بنائے ہوئے تھی۔ پہلے مضروب نے کار سے ٹکرا کے نیچے لڑھکنے کے بعد پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا مگر قبل اس کے فائر کرتا میں نے اس کے پستول والے ہاتھ پر لات مار دی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر کار کی باڈی سے ٹکرایا اور اچھلا تو میں نے فضا میں ہی اسے جھپٹ لیا۔ پہلے والے کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوسرے کی طرف لپکا اس کا منہ خون سے بھرا ہوا تھا اور سنبھل کے وہ بھی ہتھیار نکالنے کی ٹوہ میں تھا کہ میں نے اس کے چہرے کی طرف پستول کر کے ٹریگر دبا دیا۔ رات کے پُرہول اور دم بخود سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور دوسرے کا چہرہ خوں ناک چیتھڑی میں بکھر گیا۔ پہلے والا کار کے عقب میں سرکنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کا بھی میں نے کام تمام کر دیا۔ پھر تیزی سے جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا آگے لپکا۔

میری توقع کے عین مطابق کامران ہاتھ میں پستول لیے واپس دوڑتا ہوا نظر آیا۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک کارروائی مجھے اپنے سے طاقت ور دشمنوں پر غلبہ عطا کر رہی تھی۔ میری اگلی کارروائی نسبتاً سہل ثابت ہوئی۔ میں گھات میں تھا اور میرا دشمن مات میں... کامران کی بدحواسی بتا رہی تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ اردگرد سے غافل ہو کے پستول ہاتھ میں لیے واپس اپنے ساتھیوں کی جانب لوٹ رہا تھا اور راہ میں عقب سے میں نے اس پر جست لگا دی۔ وہ گرا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تاریک جھاڑیوں میں کہیں سرک گیا۔ میں نے خوف ناک غراہٹ کے ساتھ اس پر پستول تان لیا۔ کار کی مقدور بھر ہیڈ لائٹس کی روشنی وہاں تک پڑ رہی تھی، وہ مجھے دیکھ کر جیسے یک دم سکتے میں

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آ گیا۔ میرے پاس وقت کم تھا اور ممتاز خان کسی بھی وقت اپنے مسلح ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچ سکتا تھا۔ کامران نے مجھے ٹریپ کرنے کی جو چال چلی تھی، اس میں وہ خود پھنس گیا تھا۔

"میرے سر پر اس وقت خون سوار ہے اور میں تمہارے دونوں ساتھیوں کو خون میں نہلا چکا ہوں۔" میں نے وحشیانہ غراہٹ سے کہا۔ "وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں، کار کی طرف بڑھو۔"

"دیکھو... تم..." اس نے کچھ کہنا چاہا۔ اور اس وقت میرے پستول کی نال سے شعلہ چمکا۔ گولی کامران کے دائیں بازو میں پیوست ہو گئی۔ میں نے دہشت ناک لہجے میں کہا۔ "بس! اب آخری موقع ہے وقت ضائع کرنے کی کوئی چالاکی نہیں کرو گے تم... کار کی طرف بڑھو۔"

وہ میرے لہجے کی گھن گرج سے میرے خونی عزائم کا ادراک کر کے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھے کار کی جانب بڑھا تو اسی وقت مجھے قریب کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا۔ ایک لمحے میری توجہ اس جانب مبذول ہوئی اور بے اختیار میرے حلق سے گہری سانس خارج ہو گئی، وہ بیگم صاحبہ تھیں۔ انہوں نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ دھماکوں کی آوازیں سن کر وہ یقیناً میری مدد اور صورتِ حال جاننے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں۔

"بچو شہزی۔" وہ ایک دم چلا کر بولیں۔ میں کامران کی طرف پلٹا۔ وہ بجلی کی سی پھرتی سے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر دوسرے پاؤں کی پنڈلی میں بندھی میان سے ایک خنجر نکال کر مجھ پر پھینک چکا تھا، میں نے بروقت تیزی سے جھکائی دی تھی۔ "شائیں" کی سنسناتی آواز سے خنجر میرے چہرے کے قریب سے گزرا تھا کہ مجھے اس کی خوف ناک "جھپک" اپنے چہرے پر صاف محسوس ہوئی تھی۔ یہ وہی ٹرک تھی جو ثریا مجھ پر آزما چکی تھی، گویا یہ ان کا خاص ہتھیار تھا، میں نے طیش میں آ کر ایک گولی اس کے زمین پر ٹکے گھٹنے پر داغ دی۔ وہ بری طرح تڑپ گیا۔ کامران کے حلق سے بڑی کربناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ اپنا زخمی گھٹنا پکڑ کر وہیں لڑھک گیا۔ میں دانت بھینچ کر اس کی طرف بڑھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"اب بس... چلو اٹھو۔" میں اسے گھسیٹ کر کار کی طرف لایا۔ بیگم صاحبہ کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا۔ میں عقبی سیٹ پر کامران کو دبوچ کر سوار ہو گیا۔ اس وقت میں نے عقب میں دیکھا، تیز روشنیاں چمکتی دکھائی دیں۔

"بیگم صاحبہ! گاڑی بھگاؤ، دشمن آ رہا ہے۔"

بیگم صاحبہ کو ساری صورتِ حالات کا ادراک تھا۔ انہوں نے فوراً کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

"بائی وے کی طرف موڑیں گاڑی۔" میں نے کہا۔

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ کار جھاڑیوں والی زمین پر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ اس دوران میں نے بیک اسکرین سے عقب میں دیکھا۔ روشنیاں دور رہ گئی تھیں۔ انہیں جب تک حالات کا ادراک ہوتا، ہم ان کی پہنچ سے دور جا چکے تھے۔ بیگم صاحبہ بڑے ماہرانہ انداز میں کار ڈرائیو کر رہی تھیں۔ میں نے کامران کو دبوچ رکھا تھا۔ پستول میں نے اپنی جیب میں اڑس لیا تھا۔ کامران زخمی تھا۔ مجھے اب اس سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا، وہ کراہ رہا تھا اس نے کراہتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"م... میرے زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔ میں مر جاؤں گا۔"

"بے شک مر جاؤ، ہمیں پروا نہیں۔" میں نے دانستہ بے نیازی سے کہا۔

"ت... تم... مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"جہنم میں۔"

"د... دیکھو... کار کی ڈکی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ کم از کم میری مرہم پٹی تو کر دو۔"

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ہم کار کھڑی کر کے تمہاری مرہم پٹی کریں اور تمہارے کتے ہم تک پہنچ جائیں۔"

"وہ اب دور نکل گئے ہیں، تم انہیں جل دینے میں کامیاب ہو چکے ہو۔"

"شہزی! اگر تم نے اس کے منہ سے کچھ اگلوانا ہے تو اس کی جان بچانا ضروری ہے، اس کی مرہم پٹی کیے دیتے ہیں۔"

معاً بیگم صاحبہ نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ بیگم صاحبہ کو شاید اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ کامران ایک بین الاقوامی تنظیم کا ٹاپ ایجنٹ تھا۔ اتنی آسانی سے منہ کھولنے والا نہیں تھا۔ ثریا نے اگر مجھے اسکینڈم کے بارے میں نہ بتایا ہوتا تو میں بھی مارا جاتا۔ کبھی بے خبری فائدہ دیتی ہے تو کبھی باخبری سودمند ثابت ہوتی ہے۔ یقیناً بیگم صاحبہ کے یوں کہنے سے کامران کے کان ضرور کھڑے ہوئے ہوں گے۔

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تاہم میں نے بدستور انجان بنے رہنے کی اداکاری کرتے ہوئے اسی بے پروائی سے کہا۔

''ہم نے اس کا اچار نہیں ڈالنا محترمہ۔'' (میں نے دانستہ بیگم صاحبہ نہیں کہا تھا)

''ہاں، مسٹر کامران! مجھے سب سے پہلے ثریا کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ زندہ بھی ہے یا نہیں؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو تمہاری مدد... آہ...'' وہ کرب انگیزی سے کراہا... کیونکہ میں نے اس کے سفید جھوٹ پر اس کے زخمی بازو میں اپنے ہاتھ کا پنجہ گاڑ دیا تھا۔ میری انگلیاں اس کے خون سے تر ہوگئیں، اس اثنا میں سڑک آگئی۔ بیگم صاحبہ کو میں نے ملتان کی جانب ہی روانہ ہونے کا کہا۔ ہائی وے پر آتے ہی کار فراٹے بھرنے لگی۔

''میں جھوٹ سننا بالکل پسند نہیں کرتا مسٹر کامران! ٹاپ ایجنٹ فرام اسپیکٹرم۔'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''تمہارے اسٹیشن چیف وزیر جان کو کیسے اس بات کا پتا چلا تھا کہ ثریا غداری کر رہی ہے؟ اور اب وہ کہاں ہے؟''

میری ان معلومات پر وہ نہ صرف مرعوب نظر آنے لگا بلکہ تشویش زدہ سی نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔

''اب کی بار میں تمہارا زخمی گھٹنا توڑ دوں گا۔ میرے سوال کا جواب دو۔ ثریا زندہ ہے یا مردہ مگر جھوٹ نہیں سنوں گا میں، کنفرم کرنے کے میرے پاس اور بہت ذرائع ہیں تمہارے جھوٹ سچ کو...''

''وہ زندہ ہے۔''

''کہاں ہے؟''

''ہماری قید میں ہے۔''

''ہیڈ کوارٹر کے زیرِ زمین میں؟'' میں نے کہا۔

اسے جھٹکا لگا۔ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ''تو اس کتیا نے یہاں تک تمہیں بتا دیا ہے۔''

میں نے طیش میں آ کر ہونٹ سکیڑے اور اس کے زخمی گھٹنے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ کار کے دم بخود ماحول میں اس کی لرزہ خیز چیخ ابھری۔

''کہا نا میں نے... فضول بکواس نہیں سنوں گا میں۔'' میں غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''جہنم میں جاؤ... میں تمہیں کچھ نہیں بتانے والا۔ بے شک مر جانے دو مجھے۔'' تکلیف، اذیت اور بے بسی نے اسے شاید پاگل کر دیا تھا۔ میرا ذہن ایسے مواقع پر تیزی سے کام کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے غیر معمولی ذہن سے نوازا تھا۔ عقلِ سلیم یعنی کامن سینس... کسی میں کم کسی میں زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ کم زیادہ بھی نہیں ہوتی۔ بات اسے صحیح وقت پر استعمال کرنے کی ہوتی ہے۔ اگرچہ ثریا نے مجھے اسپیکٹرم کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا مگر جتنا بتایا تھا اس سے میں بہت نتائج اخذ کر چکا تھا۔ یہ یقیناً دشمن ولایتی کتوں کی کوئی بین الاقوامی تنظیم تھی۔ کوئی بڑا گینگ یا انٹرنیشنل لیول کا گروپ... کامران جیسے لوگوں کی کیا کمزوری ہوتی ہے۔ ان جیسوں کے منہ کیسے کھلوائے جاتے ہیں۔ مجھے اس کا بخوبی ادراک تھا۔ لہٰذا بڑی تسلی سے ساتھ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بولا۔

''ٹھیک ہے، تم کچھ نہ بولو... پی ایس ایس والے خود ہی تم سے اچھی طرح نمٹ لیں گے۔'' کہتے ہوئے میں نے ونڈ اسکرین پر لگے بیک ویو پر نظریں جمائیں۔ وہاں کامران کا چہرہ فوکس تھا۔ میں نے اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوتے دیکھا۔

''پپ... پی ایس ایس...؟ یہ کون ہیں؟''

میرے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا خوف زدہ لہجہ خود ہی اس امر کی چغلی کھا رہا تھا کہ وہ جانتا ہے مگر دانستہ انجان بن رہا ہے۔ میں نے لمبی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں جھوٹ بولنے کا، کیونکہ ایسا ممکن ہی نہیں کہ تم پاور سیکرٹ سروس والوں سے بے خبر ہو جبکہ تمہاری اس ولایتی تنظیم اسپیکٹرم کے ایجنٹ ان سے میرے سامنے بھڑ بھی چکے ہیں۔ انہوں نے پی ایس ایس کے چنگل سے اپنے متوقع اسٹیشن چیف وزیر جان کو چھڑایا تھا۔''

''اوہ... تو تم پاور کے لیے کام کرتے ہو۔''

''نہیں، فری لانسر ہوں۔ اپنے ذاتی مفادات اور غرض و غایت کے لیے میں کسی کے لیے بھی کام کر سکتا ہوں۔ ثریا سے میری یہی ڈیلنگ تھی، مگر تم نے اسے غدار سمجھ لیا۔''

میں نے مکاری سے کام لے کر اسے بلف کیا تو بے اختیار وہ اپنی گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر آنکھ مار دی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں حیرت آمیز الجھن کے تاثرات گڈمڈ ہوتے دیکھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں نے دانستہ اس پر نفسیاتی حربہ استعمال کرتے ہوئے بیگم صاحبہ سے مخاطب ہو کے ٹھنڈے سے لہجے میں کہا۔

''محترمہ! اپنے آدمی سے بات کر لو، شکار کہاں پہنچایا

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جائے مگر اس سے پہلے رقم کی بات کر لو۔ اسپیکر مرکا ٹاپ ایجنٹ کامران... پچیس لاکھ سے ایک روپیا کم نہیں۔"

"مم... میں تمہیں پچاس لاکھ دوں گا... مجھے چھوڑ دو۔"

"ویری گریٹ، یہ تو اچھی ڈیلنگ ہے۔" میں چٹخارے مار کے بظاہر خوشی سے بولا۔ کار ڈرائیو کرتی ہوئی بیگم صاحبہ نے شاید میری چالاکی بھانپ لی تھی، انہوں نے بیک ویو مرر سے مسکرائی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے انہیں آنکھ ماری۔ وہ میرا اشارہ بھانپ گئیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھ سے چڑے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"مگر یہ وعدے کی خلاف ورزی ہوئی۔ پھر کون ہم پر اعتماد کرے گا۔ ہم خود کو اتنا بکاؤ نہیں بنا سکتے۔"

"تم خاموش رہو محترمہ! مجھے ڈیل کرنے دو۔" میں نے بیگم صاحبہ کو مصنوعی انداز میں ڈپٹا پھر کامران کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں مسٹر کامران! تم پچاس لاکھ کی بات کر رہے تھے؟"

"پہلے میری مرہم پٹی تو کر دو۔ مجھ پر نقاہت طاری ہو رہی ہے، آہ..." وہ کراہا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو روڈ کے کنارے کار کھڑی کرنے کا کہا پھر نیچے اتر کر ڈکی کھولی اور اندر سے ایک چھوٹا باکس نکال لیا۔ پستول میں بیگم صاحبہ کو تھما آیا تھا۔ بیگم صاحبہ کار سے اتر کر اس پر پستول تانے کھڑی تھیں۔

میں نے اس کی مرہم پٹی کر دی۔ گولی بازو میں پیوست تھی۔ وہ میں نہیں نکال سکتا تھا جبکہ دوسری گولی گھٹنے کو بری طرح ترخ کر "چھو" ہو گئی تھی یعنی نکل گئی تھی۔

بہرحال سردست یہی کافی تھا کہ جریانِ خون بند ہو گیا تھا۔ کچھ گولیاں کامران نے خود ہی اس میں سے نکال کر پھانک لی تھیں۔ پانی کی دو بوتلیں تھیں، میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں، سڑک دور تک ویران تھی، کوئی اکا دکا گاڑی زناٹے سے گزر جاتی۔ میں نے کامران کی کنڈیشن کا جائزہ لیا، اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس کی سانسیں بھی تیز چل رہی تھیں۔ میں نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا تاکہ اسے کچھ ہوا لگے۔ اس کے منہ سے بوتل لگا کر میں نے اسے پانی بھی پلایا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی، اس اثنا میں بیگم صاحبہ نے ہولے سے کہا۔

"شہزی! اس کی تلاشی تو لو، مجھے سیل فون کی اشد ضرورت ہے۔" میں نے ان کی معقول بات پر اپنی بھویں اچکائیں۔ تلاشی لینے پر کئی چیزیں برآمد ہوئیں۔ اس کی گھڑی بھی اتار لی جس پر مجھے واچ ٹرانسمٹر کا گمان تھا۔ اس کے کان سے چپکا ہوا خفیہ ٹرانسمٹر بھی اچک لیا۔ کچھ چابیاں بھی، پرس اور سیل فون برآمد ہوا۔

سیل فون دیکھ کر بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں چمک لہرا گئی۔ وہ انہوں نے فوراً میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور ایک نمبر پنچ کرنے لگیں۔

"ہیلو، نبیل! میں بول رہی ہوں۔ تم لوگ کہاں ہو؟ خیریت سے ہو؟ او... شکر ہے خدا کا۔ میں بھی خیریت سے ہوں۔ شہزی نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے، تم سب بے فکر رہو، میں بالکل ٹھیک ہوں اور شہزی کے ساتھ ملتان روڈ سے واپس پہنچ رہی ہوں۔ شاید ساہیوال سے آگے ہیں ہم... نہیں، تم لوگوں کو ادھر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ بھی ملتان پہنچو... ہرگز نہیں... کہیں بھی میرا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا حکم ہے... کون؟ اول خیر! اچھا... ہاں... دو اسے فون۔"

اول خیر کے ذکر پر میں چونکا۔ بیگم صاحبہ نے اس سے رسمی باتیں کیں پھر میری جانب فون بڑھا دیا۔ میں نے بے قراری سے فون لیا اور ہیلو کہا۔

"او... خیر کا کا! بڑا اپ ٹو ڈیٹ (؟) مارا ہے تو نے یار، کیسا ہے تو؟ ٹھیک تا ہے؟" دوسری جانب سے اس کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں ٹھیک ہوں اول خیر... باقی تفصیلی باتیں ملتان پہنچ کر کرتے ہیں۔ ہاں ٹھیک ہے میں بتا دیتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ میرے یار۔"

اس کے بعد میں نے سیل اپنی جیب میں رکھ لیا اور بیگم صاحبہ کو بتا دیا۔ ملتان پہنچ کر ہمارا گزر نواں چوک سے ہوگا۔ وہاں نبیل دادا وغیرہ ہمارے منتظر ہوں گے پھر ہم سب ان کی معیت میں حکم واہ پہنچے۔

میں کامران کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ہنوز نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ میں نے دو تین بار اسے پکارا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ ایک روڈ سائڈ پٹرول پمپ اسٹیشن سے ہم نے فیول ڈلوایا۔ اس کے بعد روانہ ہو گئے۔

میرا ارادہ اب بدل گیا تھا۔ میں ملتان پہنچ کر ریاض باجوہ سے ملنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کامران کو ان کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بہت سوچنے کی کوشش کی تو تھی مگر اس میں لمبا چوڑا گھنٹر اگ تھا۔ تاہم میں ایک تجربہ

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ضرور کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ثریا کی فکر تھی۔ فیول ڈلوانے کے بعد ہم پھر روانہ ہوگئے۔

”تم ڈیلنگ کی بات کر رہے تھے۔“ تھوڑی دور جانے کے بعد کامران کی نقاہت بھری آواز ابھری۔ میں ذرا چونکا۔ بیگم صاحب کی توجہ کار ڈرائیو کرنے پر مرکوز تھی۔

”میں ثریا کے بغیر ڈیلنگ نہیں کروں گا۔“ میں نے بالآخر مسکت جواب دیا۔

”ثریا کو بھول جاؤ۔“ وہ حتمی لہجے میں بولا تو میں نے بھی سرد مہری سے کہا۔ ”تمہارے پاس آدھا پون گھنٹا ہے فیصلہ کرلو، ورنہ میں تمہیں پی ایس ایس والوں کے سپرد کر دوں گا۔“ میرا جواب خاصا کاری ثابت ہوا وہ جھلا کر بولا۔

”آخر تمہیں ثریا سے کیا لینا دینا ہے، اب تم براہِ راست میرے ساتھ معاملات طے کر سکتے ہو۔“ اس کی مکاری پر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”میرے کچھ اصول ہیں۔ میں ان کے مطابق چلتا ہوں۔ ثریا سے میرے کئی معاملات ادھورے ہیں۔ پہلے مجھے اس کے بارے میں پتا چلنا چاہیے۔ بصورتِ دیگر اگر تم نہیں مانتے تو مجھے اس کی پروا نہیں۔ پاور والے خود ہی تم سے ثریا کے بارے میں اگلوائیں گے۔“

”تم پاور سیکرٹ سروس والوں کے متعلق جانتے بھی ہو، وہ ہیں کون؟“ اس نے پینترا بدلا۔

”مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے اپنے مال سے مطلب ہے۔“ میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔ وہ کار کی سیٹ سے سر ٹکائے میری جانب ذرا گردن موڑ کر بولا۔

”پاور والے اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ وہ کسی زرخرید کو اپنے حکم کا غلام بنائیں۔ تم ان کے باقاعدہ ایجنٹ ہو اور تمہاری اب تک کی کارکردگی سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تم پی ایس ایس کے سپر ایجنٹ ہو یا پھر ڈیلٹا ایجنٹ۔“

”ڈیلٹا ایجنٹ؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بغور بھانپتی ہوئی نظروں سے میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔

”یا تو تم دانستہ انجان بن کر مکاری کر رہے ہو یا پھر میرا شبہ درست ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“ میں نے مختصراً تلخ لہجے میں کہا اور دانستہ بیزار نظر آنے لگا۔

”اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ پی ایس ایس در حقیقت انٹر سروسز والوں ہی کی ایک ذیلی خفیہ سروس ہے۔ جسے جدید خطوط پر استوار کیا گیا ہے۔ یہ عام لوگوں میں گھل مل کر ان کی سائیکی جانچتے ہیں اور پھر اپنی کسوٹی پر کسی کو پرکھ کر ان سے کام لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کا غیر متعلقہ ایجنٹ ہوتا ہے جنہیں اپنی اصطلاح کے مطابق یہ ڈیلٹا ایجنٹ کہتے ہیں۔“

میں اس کی انفارمیشن پر چونکا۔ لامحالہ میرا خیال اپنی طرف اور میجر ریاض کی طرف چلا گیا۔ گویا پاور والوں نے مجھے ڈیلٹا ایجنٹ بنایا ہوا تھا۔ میں نے پھر بظاہر بیزار کن لہجے میں کہا۔ ”مجھے ان چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔“

”میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔“ کامران بولا۔

”پاور والے بسا اوقات اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر کرمنل لوگوں سے بھی کام لینا اچھی طرح جانتے ہیں۔“ اس کی بات پر میں چونکا۔ گویا میرا پھینکا ہوا ترپ کا پتا صحیح پڑا تھا۔ وہ مجھے کوئی کرمنل ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے دانستہ معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

”اب جب تم مجھے سمجھ ہی گئے ہو تو پھر معاملے کی بات کیوں نہیں کر لیتے۔“

”میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔“ وہ بولا۔ ”تم نے سلور اسٹالون کی فلمز فرسٹ بلڈ اور جون ریمبو نہیں دیکھیں۔ اس میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ امریکی ملٹری انٹیلی جنس، جان ریمبو کی بہادری، دلیری اور شجاعت سے معمور جذبے کو دیکھتے ہوئے اسے اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہے۔ حالانکہ وہ ان کا ایک خطرناک قیدی ہوتا ہے۔ مشن مکمل کرنے کے بعد وہ اسے دوبارہ جیل میں ڈال دیتے ہیں بلکہ ایک دوبار تو اسے بدنامی سے بچنے کے لیے ہلاک کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں کیونکہ عالمی پلیٹ فارم پر امریکی خفیہ فورسز کی بدنامی ہو رہی تھی اور ان کا یہ راز فاش ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے مفادات کے لیے اپنی جیلوں میں قید خطرناک جرائم پیشہ قیدیوں کو قربانی کا بکرا بنا کر پُرتشدد اور غیر انسانی مہم پر روانہ کرتے ہیں۔“

وہ اتنا بھونکنے کے بعد خاموش ہوگیا۔ ظاہر ہے میں اس کی لغو بیانی کو بھونکنا ہی کہوں گا۔ بے شک امریکا میں یہ ہوتا ہو لیکن یہاں یقیناً ایسا کچھ نہیں تھا۔ میں بھی عام لوگوں کی نظروں میں کرمنل تھا مگر جاننے والے میری حیثیت جانتے تھے کہ میں ایک امن پسند، صلح جو اور محب وطن پاکستانی تھا۔ پاور والوں نے ایسے ہی میرا انتخاب نہیں کیا تھا اور اس کی بھی ایک ٹھوس وجہ تھی، جس کے مطابق انہیں چودھری ممتاز کے بارے میں علم ہو چکا ہوگا نیز یہ بھی کہ میری

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس سے کس نوعیت کی ذاتی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ تاہم کامران میرے بارے میں جیسا سوچ رہا تھا وہ میرے مفاد میں ہی تھا۔ میں اس کی باتوں کی نفی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میرے بارے میں اس کا یہ مغالطہ میرے حق میں تھا۔ لہٰذا اپنا پرانا سوال دہرایا۔ ''معاملے کی بات کرو اور ثریا کو میرے حوالے کرو۔''

''وہ مر چکی ہے۔'' اس نے سفاکی سے کہا۔ میرے دماغ میں دھواں بھرنے لگا۔ ایک ہوک سی اٹھی مگر میرا دل اس کی بات پر یقین کرنے کو نہیں چاہا۔ لہٰذا اسی بے پروائی سے بولا۔

''ٹھیک ہے پھر تم جانو اور پاور والے...'' یہ کہتے ہوئے میں نے بیگم صاحبہ سے کہا ''ہم کتنی دیر میں اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ جائیں گے؟''

بیگم صاحبہ بظاہر خاموشی سے کار ڈرائیو کررہی تھیں مگر میں جانتا تھا وہ بڑے غور و خوض سے ہماری باتیں سن رہی ہوں گی اور میری چینتر بازی پر دل ہی دل میں مسکرا بھی رہی ہوں گی۔ جواباً مختصراً بولیں۔ ''پہنچنے ہی والے ہیں۔''

''ہوں، گڈ۔'' میں نے ایک لمبی ہنکاری لے کر دوبارہ... مطمئن انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا مگر ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے کامران کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے الجھن آمیز پریشانی کے علاوہ جھلاہٹ کے آثار بھی محسوس ہوئے۔

''میرا خیال ہے مجھے پاور والوں کو مطلع کر دینا چاہیے۔'' یہ بڑبڑاتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے کامران کا سیل فون نکال لیا اور یونہی نمبر پنچ کرنے لگا۔ ''مجھے ہاٹ لائن نمبر یاد ہے۔ تمہارا سیل فون خوب کام آرہا ہے۔'' میں نے دانستہ کامران کی بے بسی اور جھلاہٹ کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھہرو... ٹھہرو... ایک منٹ۔'' وہ یک دم بولا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ چمکی۔

''ثریا زندہ ہے۔ میں تم سے تعاون کرنے پر تیار ہوں۔'' بالآخر وہ بولا۔

''اب میں تم پر بھروسا نہیں کرسکتا۔ تم کہہ رہے تھے کہ ثریا مر گئی ہے اور اب تم بتا رہے ہو کہ وہ زندہ ہے۔ میں تمہاری کون سی بات کا اعتبار کروں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''میں سچ بول رہا ہوں ثریا زندہ ہے۔'' مجھے اس کا لہجہ جھوٹ کی چغلی کھاتا محسوس نہیں ہوا۔ ثریا کے زندہ ہونے کی خبر پر میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

''اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟''

''پہلے معاملے کی بات کرو۔''

''معاملے ہی کی بات کررہا ہوں۔ ثریا کے بغیر ہمارے درمیان کوئی معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

''میں ثریا کو تمہارے سامنے پلیٹ میں ڈال کر پیش نہیں کرسکتا۔ وہ قید میں ہے اور سخت پہرے میں ہے۔''

''میں خود اسے چھڑا لوں گا تم صرف مجھے سچ سچ بتاؤ گے کہ اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟ مگر یاد رکھنا ثریا کو حاصل کرنے تک تم میری قید میں رہو گے اور اگر تمہاری بات جھوٹ ثابت ہوئی اور ثریا مجھے مطلوبہ جگہ نہ ملی تو یاد رکھنا پاور والے بعد میں تمہارا جو حشر کریں گے سو کریں گے، میں تمہیں ایسی بھیانک اذیتوں سے دوچار کروں گا کہ...'' میں نے اسے آخر میں تہدید کرنا چاہی تھی مگر وہ میری بات کاٹ کر زہریلے لہجے میں بولا۔

''اتنا او سیا مت اتراؤ شہزی، ممتاز خان پر چھوٹی موٹی فتوحات حاصل کر کے یہ مت سمجھ لینا کہ تم نے بڑا پالا مار لیا ہے کیونکہ تم نہیں جانتے وہ تمہاری کس طرح درونِ خانہ جڑیں کھوکھلی کررہا ہے۔ وہ اپیکرم میں اپنی اچھی خاصی حیثیت قائم کرچکا ہے۔ وہ تمہاری اہم کمزوری سے بھی واقف ہے۔ بہت جلد تم اس کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

اس کی بات پر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ دماغ میں دھواں بھرنے لگا۔ میری ایک ہی کمزوری تھی اور وہ تھی عابدہ۔ اگرچہ ثریا نے بھی اس سلسلے میں مجھے کچھ اشارہ دیا تھا اب کامران کی اس بات سے وہ اشارہ مجھے مماثلت زدہ محسوس ہوا تو میں اندر سے بے قرار اور متوحش سا ہوگیا مگر مجھے تسلی بھی تھی کہ یہ محض گیدڑ بھبکی تھی۔ عابدہ امریکا کے اسپتال میں فاخرہ کے علاج کے دوران بالکل محفوظ تھی اور سرمد بابا اس کی پل پل کی خبر لے رہے تھے۔ یکبارگی میرے ذہن میں کامران کے سیل فون پر عابدہ سے بات کرنے کا خیال آیا۔ حالات ہی کچھ ایسے تیکھے اوپر تلے پیش آتے رہے تھے کہ مجھے عابدہ یا سرمد بابا سے دوبارہ بات چیت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا مگر ابھی میں نے عابدہ سے بات کرنے کے اپنے اس ارادے سے خود کو باز ہی رکھا۔

''تم کیا بکواس کررہے ہو، میں نہیں جانتا... مجھے ثریا کا پتا بتاؤ۔''

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"تم اگر مجھ سے تعاون کرو تو میں تمہیں اسپیکٹرم میں شمولیت دلوا سکتا ہوں۔" وہ بولا۔ "یہی نہیں تمہاری ممتاز خان سے بھی صلح صفائی کروادی جائے گی۔"

"مجھے ثریا کا پتا... بتاتے ہو یا نہیں؟" میں نے اپنے اندر کی جلتی سلگتی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

"ٹھیک ہے، تم مجھے پاور والوں کے حوالے کردو۔" وہ پورے سکون سے بولا۔ "مگر یاد رکھنا... اسپیکٹرم کی ابتدا امریکا ہی کی سرزمین سے پھوٹی ہے اور ممتاز خان اسپیکٹرم کا کیٹسا ایجنٹ ہے۔ یہ بھی مت بھولو کہ اس وقت تمہاری معشوقہ دیبا بھی امریکا ہی کے ایک اسپتال میں موجود ہے۔"

"گاڑی روکو..." میں حلق کے بل دہاڑا۔ بیگم صاحبہ نے فوراً کار کو سڑک کے کنارے کرکے بریک لگا دیا۔ کامران وحشت زدہ نظر آنے لگا۔ میرے دل و دماغ میں آتشیں جنوں خیزی کی لہریں ابلتے لاوا کی طرح بھر گئیں۔

کار رکتے ہی میں نے کامران کی طرف والے دروازے پر زوردار لات رسید کردی۔ دروازہ کھلا تو دوسری لات میں نے کامران کو بھی جڑ دی۔ وہ چیخ مار کر کار سے باہر تاریکی میں لڑھک گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے جمپ لیا اور باہر کودا۔ پھر خاک چاٹتے ہوئے کامران کو دبوچ لیا اور اس پر جنونیوں کے سے انداز میں تابڑ توڑ گھونسے، ٹھوکریں اور لاتیں برسانا شروع کردیں۔ وہ اذیت ناک انداز میں چیخنے چلانے لگا۔ بیگم صاحبہ نے کار سے اتر کر میرے بپھرے ہوئے وجود کو سنبھالا دینے کی کوشش میں تھام لیا۔ "ہوش کرو شہزی! پلیز اس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ ماردو گے اسے تو کچھ حاصل نہ ہوگا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ میرا غیظ قدرے کم ہونے لگا تو میں نے دھیرے سے بیگم صاحبہ کو ہٹا کر نڈھال اور ہانپتے کراہتے کامران کو دبوچ کر دوبارہ کار کے اندر پھینکا اور اپنا غیظ چہرہ اس کے قریب لے جاکر خوفناک لہجے میں بولا۔ "میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔ بتاؤ مجھے... تم لوگ عابدہ کے خلاف کون سی سازش تیار کررہے ہو؟ کامران! تمہیں اب بتانا پڑے گا... ورنہ..."

"م... میرا وعدہ میں تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادوں گا۔" وہ کراہ کر بمشکل بولا۔ "ل... لیکن مجھے پاور والوں کے حوالے مت کرنا۔"

اس دوران بیگم صاحبہ دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بولیں۔ "ہمیں نکلنا چاہیے شہزی! دیر ہمارے لیے مناسب نہ ہوگی۔"

میں نے ان کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلادیا۔ کار کا انجن اسٹارٹ تھا۔ انہوں نے گیئر ڈال کر ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

اول خیر وغیرہ نے نواں چوک کو مقام اتصال بتایا تھا مگر وہ ہمیں قادر پور کے قریب مل گئے، وہ اور ان کے باقی ماندہ ساتھی ایک کار اور جیپ میں سوار تھے۔ بیگم صاحبہ کو زندہ سلامت میرے ساتھ پاکر ان کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا تھا۔ اول خیر بڑے پرتپاک انداز میں مجھ سے ملا تھا جبکہ کھیل دادا محض سرسری انداز میں... وہ مجھ سے ناخوش نظر آرہا تھا۔ ملتان کی جانب ہمارا سفر شروع ہوچکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ملتان پہنچ گئے، اور پو پھٹنے تک ہم بخیریت بیگم ولا پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

اول خیر اور بیگم صاحبہ سمیت سارے ساتھی میری بہادری کی تعریفیں کررہے تھے اور مجھ سے بہت خوش تھے مگر کھیل دادا ایک واحد آدمی تھا جو میری اس کامیاب مہم کو "بازیگری" قرار دینے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کا خیال تھا میں نے جنگل ڈیرے میں جذباتی ہوکر جو دیوانہ وار قدم اٹھایا تھا وہ بیگم صاحبہ کی جان کے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا، وغیرہ۔

اول خیر نے دانستہ خاموشی اختیار کررکھی۔ ورنہ وہ میرے حق میں بولتا ضرور تھا۔

ہم کھانا کھا کر کافی دیر تک آرام کرچکے تھے۔ کامران کو تہ خانے میں جنگی خان کے ساتھ قید کردیا گیا تھا۔

بیگم صاحبہ نے میری حمایت میں کھیل دادا سے کہا۔ "شہزی نے جو کچھ کیا وہ حالات کے بالکل متقاضی تھا۔"

"مگر بیگم صاحبہ! ہم سب وہاں موجود تھے اور دشمنوں پر حاوی ہونے والے تھے، ایسے میں شہزی کو سوچ سمجھ کر مجھ سے مشورہ لے کر قدم اٹھانا چاہیے تھا۔" کھیل دادا بولا تو میں خاموش نہ رہ سکا۔

"جھوٹ مت بولو کھیل دادا! وقت سے پہلے ہی جنگل ڈیرے میں بابن ڈکیت کے کارندوں کو ہماری آمد کا پتا چل چکا تھا۔ انہوں نے ہم پر حملہ کردیا تھا۔ ہم پسپا ہونے لگے تھے۔ خود تم دشمن کی کچھار میں پیش قدمی کی ہمت نہیں کر پارہے تھے۔ ایسے میں مجھے بیگم صاحبہ کو چھڑانے کے لیے اپنی جان پر کھیلنا پڑا۔"

"اس میں بھی تمہاری ہی غلطی تھی۔" کھیل دادا برہمی

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے بولا۔ ”بابن ڈکیت پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے تم نے ایک نئی پسوڑی ڈال دی تھی، تمہیں کیا ضرورت تھی ممتاز خان کی گاڑی کو ٹریپ کرنے کی، تم اور اول خیر اس مشن میں ناکام ہو گئے اور ممتاز خان بچ نکلا۔ یوں بابن ڈکیت اور اس کے مسلح ساتھی ہوشیار ہو گئے۔“

اب اول خیر خاموش نہ رہ سکا، بولا۔ ”بڑے استاد! شہزی کی یہ پلاننگ درست تھی کیونکہ ہمارے علم میں یہ بات آچکی تھی کہ ممتاز خان بھی وہاں پہنچنے والا ہے اور اپنے گھناؤنے مقاصد کے لیے وہ بیگم صاحبہ پر تشدد کا راستہ اختیار کرنے والا ہے۔ ہم ممتاز خان کو یرغمال بنا کر بیگم صاحبہ کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہتے تھے، بے شک ہمیں اس سلسلے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن جلد ہی اس کا ازالہ شہزی نے اپنی جان پر کھیل کر کیا کیونکہ اس وقت حالات ہی خطرناک رخ اختیار کر چکے تھے۔“

لاجواب ہوتے ہی کھیل دادا نے اپنی جھینپ مٹانے کی خاطر بے چارے اول خیر کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تم تو خاموش ہی رہو اول خیر، تم پر سے ابھی غداری کا لیبل نہیں اترا۔ پہلے اپنا داغ دھونے کی فکر کرو پھر تم شہزی کی وکالت کرنا۔“ ایسے میں اول خیر چپ ہو جاتا تھا تاہم اس بار وہ فقط اتنا ضرور بولا۔

”میں بیگم صاحبہ سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ اول خیر تو بے چارہ ایسے میں اتنا ہی کہہ پاتا تھا مگر میں کھیل دادا کے سامنے ہمیشہ خم ٹھونک کر جوابی کارروائی کرتا تھا۔ مجھے صاف محسوس ہونے لگا کہ وہ اندر سے سخت حسد اور جلاپے کا شکار ہو رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کے سلسلے میں اسے شروع ہی سے مجھ سے ذاتی عناد اور بغض ہونے لگا تھا۔ میں نے کھیل دادا کی طرف دیکھ کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

”کھیل دادا! تمہارے اس کینہ پرور کردار اور سلوک نے تمہیں خود اپنے آدمیوں کی نظروں میں چھوٹا کر دیا ہے۔ کیا یہ موقع ایسی باتوں کا ہے؟ اول خیر نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر تن تنہا... بیگم صاحبہ کی تلاش کا بیڑا اٹھایا تھا اور چک نواں پہنچ کر ہمیں یہ اطلاع دینے والا بھی اول خیر ہے تھا کہ بیگم صاحبہ کو اس وقت بدر اقبال عرف بابن ڈکیت نے یرغمال بنا رکھا ہے۔“

”اس بحث کو اب ختم کرو۔“ معاً بیگم صاحبہ نے اپنا ایک ہاتھ قدرے بلند کر کے گمبھیر اور تحکمانہ لہجے میں کہا تو سب کو چپ لگ گئی گویا ہم اس مہم کی کامیابی و ناکامی کس کے سر ہونے کا فیصلہ سننے کے منتظر ہو گئے۔

”تم لوگ لاحاصل بحث کر رہے ہو جبکہ ہم اب تک حالت جنگ میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے اور شہزی کے ساتھی پولیس کی قید میں ہیں۔ اس راشی خور پولیس افسر روشن خان نے نہ جانے ان کا کیا حشر کر رکھا ہو۔ ہمیں ان کے بارے میں کچھ کرنا چاہیے۔“ بیگم صاحبہ کی بات اپنی جگہ درست سہی مگر مجھے تھوڑی حیرت سی ہوئی کہ انہوں نے ایسا کوئی اعتراف کرنے کی جسارت کیوں نہ کی جس سے یہ تو ظاہر ہوتا کہ بیگم صاحبہ کو دشمنوں کے چنگل سے چھڑانے والی یہ خطرناک مہم کس کے سر تھی؟ مجھے اپنی واہ واہ کی کوئی پروا نہ تھی مگر میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ کم از کم بیگم صاحبہ اول خیر کے سلسلے میں کچھ حوصلہ افزا کلمات تو ضرور ادا کرتیں۔ اول خیر مجھ سے دوستی یاری کی پاداش میں مسلسل کھیل دادا جیسے بغضی آدمی کے زیر عتاب آتا رہا تھا۔ مجھے بیگم صاحبہ کے اس دوغلے پن پر دکھ ہوا تھا۔ تاہم میں نے سردست خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

ارشد، شوکت حسین اور شکیلہ کے سلسلے میں مجھے تشویش آمیز فکر تھی۔ یوں تو ریاض باجوہ صاحب نے مجھے نہ صرف ان کے بلکہ میرے سلسلے میں بھی تسلی دی تھی کہ وہ ہائی کمان سے اپنے تفویض شدہ خصوصی اختیارات کے ذریعے اس سلسلے میں کچھ کرنے والے تھے، میجر صاحب کا خیال آتے ہی میں نے ذہن میں فوری ابھرنے والے ایک خیال کے تحت فیصلہ کیا کہ کامران کو اسپیکٹرم کے ایک ٹاپ ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے حوالے کر دوں۔ اب وہی کامران کے منہ سے بہت سی باتیں اگلوانے کی جسارت کر سکتے تھے۔ یوں بھی یہ ان کا شکار تھا۔ اس طرح مجھے پی ایس ایس کی خصوصی سپورٹ حاصل رہتی۔ کیونکہ میں گزرتے وقتوں کے ساتھ محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے اردگرد بھانت بھانت کے خطرناک دشمنوں کا گھیرا وسیع تر ہوتا جا رہا تھا مگر کامران کا وعدہ یاد آتے ہی کہ وہ مجھے سب کچھ بتانے پر راضی تھا بشرطیکہ میں اسے پاروالوں کے حوالے نہ کرتا۔ یہ سوچ کر میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اول خیر کو مخاطب کر کے بولا۔ ”آؤ ذرا میرے ساتھ... میں کامران سے کچھ اگلوانا چاہتا ہوں۔“

”بیٹھ جاؤ شہزی! ابھی بیگم صاحبہ کا حکم نہیں ہوا۔“ مجھے کھڑا ہوتے دیکھ کر کھیل دادا ناگواری سے بولا تو میں نے اسے گھورتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

”بیگم صاحبہ کا احترام مجھ پر لازم ہے مگر یہ بات میں

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پہلے ہی واضح کر چکا ہوں کہ میں یہاں کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوں اور تم اپنی ہرزہ سرائیوں کو بھی لگام دو کھیل دادا! آؤ... اول خیر۔"

"اول خیر اپنی جگہ سے ہٹے گا بھی نہیں۔" کھیل دادا طیش میں آکر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھیک ہے میں تہ خانے میں چلا جاتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے قدم آگے بڑھایا تو بیگم صاحب نے گمبھیر آواز میں مجھے رکنے کو کہا۔

"ٹھہرو شہزی۔" میں رک گیا اور پُرمتانت نظروں سے بیگم صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اول خیر سے تحکمانہ کہا۔ "اول خیر! تم جاؤ... شہزی کے ساتھ۔" اس حکم پر اول خیر فوراً اٹھ کر میرے ساتھ چل دیا۔

"شکریہ بیگم صاحب۔" میں نے ہولے سے کہا اور جاتے ہوئے کھیل دادا پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈالی۔ اس کا چہرہ بغض و کینہ کے باعث مسخ ہو رہا تھا۔

میں اور اول خیر تہ خانے میں آگئے۔ جنگی خان کی حالت ابتر تھی۔ اسے رسن بستہ حالت میں ایک طرف ڈالا ہوا تھا، وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑا تھا۔ دوسری جانب کامران پڑا تھا۔ میں ایک کرسی پر جا کر براجمان ہو گیا اور پاؤں کی ٹھوکر مار کر کامران کو جگایا۔

"وقت ضائع کیے بغیر مجھے بتاتے چلو کیا کہنا چاہتے ہو تم..."

"پہلے مجھے ضمانت دو کہ تم مجھے چھوڑ دو گے۔" وہ غرانٹ لہجے میں بولا۔ اس کی بار بار قلابازیاں کھاتی باتوں سے میرا دماغ مارے طیش کے پھر بھنکنے لگا تھا۔ دانت پیس کر بولا۔

"اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا اور یاد رکھو اب میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔" پھر اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے کے لیے میں نے اپنی جیب سے اس کا سیل فون نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور آخر میں اسے تہدید بھی کر ڈالی۔ "اگر اب تم نے اپنی زبان نہ کھولی تو بی ایس ایس والوں کو فون کر دوں گا، وہ تمہیں لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں الجھن سی تیر گئی پھر بولا۔

"یہ... کون سی جگہ ہے؟"

"غیر متعلقہ اور فضول سوال نہیں سنوں گا میں، صرف میری باتوں کا جواب دو گے تم۔" میں نے کہا۔

وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر بولا۔ "پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"تم نے عابدہ کے متعلق جو بکواس کی تھی اس میں کتنی حقیقت ہے؟"

وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "ممتاز خان تمہیں زیر کرنے کے لیے عابدہ کو ہٹ کرنا چاہتا ہے۔"

"کس طرح؟ وہ تو پاکستان میں نہیں ہے؟" میں نے بغور اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

"اسپیکٹرم کے ذریعے۔"

"وہ کس طرح؟"

"اسپیکٹرم کے ایجنٹ ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔"

"تم نے کہا تھا کہ اسپیکٹرم کی شروعات امریکا سے ہوئی تھی؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں، یہ وہاں کی ایک انڈر گراؤنڈ انٹرنیشنل سینڈیکیٹ ہے۔"

میں اس کی بات سمجھ گیا، بولا۔ "یہ اسپیکٹرم ہے کیا بلا؟ اور یہ یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" اس نے کہا۔ پھر تلخی لہجے میں اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "خدا کے لیے مجھے پانی تو پلا دو۔"

"نہیں، پہلے سوالوں کے جواب دو۔" میں نے فیصلے لہجے میں کہا۔ "تم پھر چالاک بن رہے ہو، تمہیں اسپیکٹرم کی حقیقت کے بارے میں نہیں پتا؟ جبکہ تم اس کے ایک ٹاپ ایجنٹ ہو۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے فقط یہی پتا ہے۔"

اس بار اول خیر نے اس سے پوچھا۔ "اسپیکٹرم... یہاں... ہمارے ملک میں کیا کر رہی ہے۔ یہاں اس کے کیا مقاصد ہیں؟ یہ تو تم ضرور جانتے ہو گے کیونکہ وہ تم جیسے کتوں کے گلے میں بلاوجہ پٹا نہیں ڈالے ہوئے ہے؟"

اول خیر کے اس سوال نے اسے کچھ بوکھلا دیا تاہم بولا۔ "ہمیں یہاں کی حکومتی اور غیر حکومتی سیاسی اکابرین پر کڑی نظر رکھنے کا مشن سونپا ہوا ہے۔"

"کیوں؟"

وہ اول خیر کے اس "کیوں" کا جواب دینے کے بجائے بڑی مکاری سے پینترا بدل کر مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ "شہزی! میں تمہیں ثریا کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔"

میں اس کی چالاکی بھانپ کر غصے سے دانت بھینچ کر بولا۔ "پہلے اول خیر کی بات کا جواب دو۔"

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"وہ... وہ... مجھے ہلاک کر ڈالیں گے۔" وہ گھگھیانے لگا۔

"زندہ تو ہم بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔" اول خیر نے اس کی طرف گھورا۔ تاہم میں نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کامران کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا۔

"اگر تم ہم سے تعاون کرو گے تو ہم تمہیں بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں بلکہ میں خود ایک ڈیلٹا ایجنٹ کی حیثیت سے اوپر والوں سے تمہاری اس شرط پر سفارش بھی کروں گا کہ تمہارے مکمل تعاون کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ تمہارے تحفظ کو بھی یقینی بنا لیں گے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھے اثر پذیری سے کھلتا محسوس ہوا پھر دوسرے ہی لمحے وہ بڑے متاسفانہ لہجے میں بولا۔

"کاش! میں نے ثریا کی بات مان لی ہوتی... کاش! میں اسے ان کے حوالے نہ کرتا۔"

"کون سی بات؟" میں نے اس کے چہرے پر اپنی بھانپتی ہوئی نظریں مرکوز کیے ہوئے سکیڑ کر پوچھا۔

"اس نے میرا ضمیر جگانے کی کوشش کی تھی مگر مجھ پر عیش پرستی اور پرتعیش زندگی کا خواب رنگیں سوار تھا۔"

"تو اب تمہارا ضمیر کیا کہتا ہے؟" اول خیر نے اس سے پوچھا تو وہ پُرتاسف لہجے میں بولا۔

"اب ضمیر جاگنے کا کیا فائدہ۔ مگر اس وقت میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ ثریا جو کچھ کہہ رہی تھی وہ کسی کمزور چیز کی حیثیت سے بڑھ کر نہ تھا۔ میں اسے بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ وہ چیونٹی بن کر ہاتھی کی سونڈ میں گھسنے کی بے وقوفانہ کوشش کر رہی ہے۔ وہ محض خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔"

"بات کمزور اور طاقت ور کی نہیں ہوتی کامران، حوصلے اور ہمت کی ہوتی ہے جو تمہارے اندر نہیں۔" میں نے اسے اکسایا اور اس کا خوابیدہ ضمیر جھنجھوڑنے کی غرض سے بولا۔ "دیکھو اب بھی کچھ نہیں بگڑا... ہم سے تعاون کرو... مجھے لگتا ہے اسپیکٹرم والے اپنے کسی ناپاک اور گھناؤنے مقاصد کے لیے ہمارے وطن کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے یہاں وارد ہوئے ہیں۔"

"اسپیکٹرم والوں کی حیثیت بھی کٹھ پتلیوں سے کم نہیں... ان کے پیچھے بھی کسی کا بہت بڑا ہاتھ ہے ایک خفیہ ہاتھ..." کامران نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا تو میں اور اول خیر قدرے چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

"مجھے پانی پلا دو... میں اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا... سب بتا دوں گا۔" وہ بولا۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ اٹھ کر تہ خانے سے باہر نکل گیا۔ کامران اپنی رو میں کہتا جا رہا تھا۔

"یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ میں خود بھی اسپیکٹرم کا ٹاپ ایجنٹ ہونے کے باوجود ان کی اصل حقیقت سے ناواقف تھا بلکہ میں کیا میرے جیسے دیگر ایسے مقامی آلۂ کار بھی ناواقف تھے ماسوائے چند بڑے تنظیمی عہدے داروں کے، جن میں ممتاز خان اور اسٹیشن چیف وزیر جان بھی شامل ہیں کہ ان کے اصل اغراض و مقاصد ہیں کیا... نیز اسپیکٹرم کن کے لیے کام کر رہی ہے مگر یہ سب ثریا نے پتا چلا لیا تھا۔ جب ثریا کا پول کھلا تو اس نے مجھے ان کی اصل حقیقت بتائی بھی تھی مگر جانے کیوں میں نے اس کی باتوں کو اہمیت نہ دی، افسوس..." وہ رکا پھر میری طرف تکتے ہوئے مستحکم لہجے میں بولا۔ "شہزی! تم ایک کام کرو۔ میں... میں... یہاں غیر محفوظ ہوں۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا جو کچھ مجھے ثریا نے بتایا، اس کا دل بھی انہی باتوں کی وجہ سے اسپیکٹرم سے کھٹا ہو گیا تھا، وہ باضمیر تھی۔ تم... مجھے پی ایس ایس والوں کی تحویل میں دے دو... پلیز... جلدی کرو۔" اس کے چہرے پر اچانک انجانا سا خوف سمٹ آیا تھا۔ اس کے بارے میں میرا شبہ یکلخت تحلیل ہونے لگا۔ اس کا چہرہ، اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے بالآخر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ نیز اسے اس بات کا پچھتاوا بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس نے ثریا کے سلسلے میں جو کچھ کیا تھا وہ اسے نہیں کرنا چاہیے تھا اور یقیناً ثریا بھی پہلے اسپیکٹرم کی کامران کی طرح ایک فعال رکن تھی مگر جیسے ہی اسے اپنی ذاتی کوششوں کے ذرائع سے اسپیکٹرم کی اصلیت معلوم ہوئی تو وہ ان سے متنفر ہو گئی اور پھر بعد میں اس نے ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر بدقسمتی سے اس کا راز کھل جانے کے باعث کامران سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے کامران کو بھی اس کی اصلیت بتا کر اس کا ضمیر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہو گی۔ ثریا نے جو کچھ کامران کو بتا کر اس سے مدد کی درخواست کی ہو گی، آج کامران کو اس پر پشیمانی ہو رہی تھی۔

اول خیر پانی لے آیا تھا مگر آتے ہی اس نے بتایا کہ اوپر بیگم صاحبہ مجھے بلا رہی ہیں۔ ممتاز خان کا فون آیا تھا اور وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

میں اس اطلاع پر چونکا اور سیدھا اوپر آ گیا۔ بیگم

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

صاحب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کی وجہ ممتاز خان کا فون تھا اور صاف لگتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے ان دونوں کے بیچ ٹیلی فون پر گرما گرم گفتگو ہوتی رہی ہے۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور ہیلو کہا۔ دوسری جانب سے ممتاز خان کی بھنائی ہوئی آواز ابھری۔

"شہزی! تم نے جتنی اونچی اڑان بھرنی تھی سو بھر لی۔ اب تمہیں زمین پر ہی آنا پڑے گا۔"

میں اس کی بات پر زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں زمین پر ہی تھا ممتاز خان مگر تم آسمان پر اڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو بکواس کرنی ہے کرو... میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کامران کو تم نے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"میں تمہیں بتانے کا پابند نہیں ہوں۔"

"میرا مطلب ہے اگر وہ ابھی تک تمہارے حوالے ہے تو اسے چھوڑ دو۔ بات یہیں ختم ہو جائے گی۔"

میں اس کی بات پر چونکا۔ وہ مکاری سے جتانا چاہتا تھا کہ اگر کامران ہمارے قبضے میں ہے تو اسے یقیناً بیگم والا میں ہی رکھا ہوگا اور وہ یہاں اپنے وحشی پالتو کتوں کے ساتھ یہاں بلا بولنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "مجھے اس بات کے ختم ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پروا نہیں ہے، رہی بات کامران کی تو جس کا وہ تھا، میں اسے اس کے حوالے کر چکا ہوں۔"

"وہ... تم اسی... جس کی بات کر رہے ہو؟"

"یقیناً۔"

"تم بہت پچھتاؤ گے شہزاد احمد خان! تم نہیں جانتے۔ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔"

"تم دھمکی ہی دیتے رہو گے یا پھر میں فون بند کر دوں..."

"چوبیس گھنٹے تمہیں دے رہا ہوں۔ کامران کو ہمارے پاس ہونا چاہیے... ورنہ تم عابدہ سے متعلق بہت بری خبر سنو گے۔ یاد رکھو شہزی! مت بھولنا کہ تم اسے امریکا بھیج کر محفوظ سمجھ رہے ہو۔"

عابدہ کے ذکر پر میرا دماغ الٹنے لگا۔ میں نے بھی غصے بھرے لہجے میں کہا۔ "میں نے عابدہ کو امریکا... اس کے تحفظ کے لیے نہیں، اس کی بیماری کی بھلائی کے لیے روانہ کیا تھا اور اس کی حفاظت کرنے والی ذات اوپر موجود ہے جس کے قبضے میں سب کی جان ہے۔ میں تو تمہیں پہلے صرف ایک بھونکنے والا کتا سمجھتا تھا اب پتا چلا ہے کہ تم خود بھی کسی کے زرخرید کتے بن چکے ہو مگر یاد رکھنا ممتاز خان! اگر عابدہ کا تم نے ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش کی تو تمہارا وہ حشر کروں گا کہ تم مجھ سے موت کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

"صرف چوبیس گھنٹے... یاد رکھنا۔" دوسری جانب سے ممتاز خان نے میری دھمکی سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سرمد بابا کا نمبر ڈائل کر دیا۔ دوسری جانب سے "ہیلو" کی شناسا آواز ابھرتے ہی میں نے ایک گہری سانس لے کر سلام کیا تو وہ میری آواز پہچانتے ہی فکر آمیز بے چینی سے بولے۔

"ش... شش... شہزی بیٹا! تم لوگ کیسے ہو؟ تم کہاں ہو؟ ٹھیک تو ہو نا تم؟ تم نے مجھے خوش خبری بھی نہیں دی۔"

خوش خبری کی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔ میری زندگی اب تک اتنے آلام و مصائب میں گھری ہوئی تھی کہ اب تو میرے لیے "خوش خبری" کا لفظ بھی اجنبی بن کر رہ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے اس پر توجہ دیے بغیر کہا۔ "بابا! میں بالکل ٹھیک ہوں اور خیریت سے ہوں۔ مجھے آپ پہلے عابدہ کے بارے میں بتائیں وہ کیسی ہے؟ کب پاکستان لوٹ رہی ہے؟ عارفہ کا تو آپریشن ہو چکا ہے؟"

"بیٹا! وہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ عارفہ کا کامیاب آپریشن ہو چکا ہے مگر ڈاکٹروں نے اسے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے۔ عنقریب دونوں واپس وطن لوٹنے والی ہیں۔"

سرمد بابا کی بات سن کر میرے دل و دماغ میں سکون کی لہر سی سرایت کر گئی۔ ایک تو عابدہ کی طرف سے خیریت کی اطلاع مل گئی، دوسرے وہ جلد پاکستان لوٹنے والی تھی۔ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ "بابا! آخری بار آپ کی عابدہ سے کب بات ہوئی تھی؟"

"شہزی بیٹا! میں تو روزانہ ہی بات کرتا ہوں دونوں سے۔ اکثر تو دن میں دو بار بھی۔ کیا تمہاری بات نہیں ہوئی؟"

"ایک بار ہوئی تھی بابا۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "بڑی مشکلوں سے رابطہ ہوتا ہے، اسپتال کی مینجمنٹ کے کچھ قوانین وہاں سخت ہونے کے باعث مجھے ٹائم کے سلسلے میں کنفیوژن ہو جاتی ہے۔ بہت مختصر بات ہوئی تھی۔ اب کرتا ہوں۔"

"تم ہو کہاں پر بیٹا؟" انہوں نے پوچھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ میں ملتان میں ہی ہوں اور بیگم والا سے بول رہا ہوں۔ تب انہوں نے مجھے خوش خبری والی بات بتائی کہ

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میرے اوپر جتنے بھی کیس تھے وہ ختم کردیے گئے تھے۔ ایک بڑے پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں جنگی خان سے خون ریز ٹاکرے کے بعد میں نے جن اغوا کاروں سے میجر باجوہ صاحب کے بیٹے کو چھڑایا تھا، نیز مذکورہ اسپتال میں نصب خفیہ سی سی کیمروں کے سامنے میں نے جس طرح جنگی خان اور اس کے مسلح کارندوں کی دہشت گرد کارروائی کو آشکار کرتے ہوئے اسے چودھری ممتاز خان کا مقرب خاص کار پرداز ظاہر کیا تھا وہ میڈیا کے سامنے آچکا تھا۔ لہٰذا اب حکومتی مشینری پر زور دیا جارہا تھا کہ جنگی خان جیسے خطرناک مجرم کو پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے رینجرز کے حوالے کردیا جائے، وغیرہ۔

سرمد بابا نے مجھے ایک اور چونکا دینے والی اطلاع بھی دی تھی کہ ایڈووکیٹ خانم شاہ بھی صحت یاب ہوچکی ہیں اور انہیں اس حقیقت کا علم ہوتے ہی کہ نیلم کوٹھی میں زبیر خان کے آدمی تارڑ کی گولی کا نشانہ بننے کے بعد میں ہی اسے اپنی جان پر کھیل کر اسپتال پہنچایا تھا اور اس کی جان بچ گئی تھی، اس نے میرے حق میں نہ صرف گواہی دی تھی بلکہ پیروی بھی کی تھی۔ یوں ان کی اور میجر باجوہ صاحب کی مشترکہ کاوشوں سے میری خصوصی طور پر پیرول ہوگئی تھی۔

گویا اب جنگی خان اور کامران کو میجر باجوہ صاحب کے حوالے کرنا ازبس ضروری ہوگیا تھا۔ بہرحال میں نے سرمد بابا سے جلد ملنے کا وعدہ کرکے رابطہ منقطع کردیا اور عابدہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر نہ ہوسکی۔ اس کے بعد میں نے بیگم صاحب سے ساری حقیقت گوش گزار کردی۔ وہ میرے آئندہ کے لائحہ عمل سے مطمئن اور متفق نظر آرہی تھیں پھر وہ اپنے کاروباری و دیگر معاملات میں مصروف ہوگئیں جبکہ میں اولی خیر کے ساتھ جنگی خان اور کامران کو ایک کار میں ڈال کر سیدھا رینجرز کے ہیڈکوارٹر پہنچا۔

باجوہ صاحب بڑے پرتپاک انداز میں ہم سے ملے، پھر میں نے انہیں کامران سے متعلق ساری تفصیلات گوش گزار کیں تو وہ غور و فکر کا شکار ہوگئے۔ میں نے انہیں ثریا کے متعلق بھی بتایا کہ اسے اسپیکٹرم والوں کی قید سے چھڑانا لازمی ہوگا، مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقعات انہوں نے کامران سے پوچھ گچھ کے بعد مجھے دلائی تھیں۔ وہ خاصے پرجوش نظر آرہے تھے اور میری فتوحات سے مسرور بھی تھے۔ مجھ سے انہوں نے الگ کمرے میں ایک مختصر ون ٹو ون ملاقات بھی کی اور مجھے ایک کارڈ بھی جاری کیا جس میں میری تصویر چسپاں تھی، یہ خصوصی اختیارات کا کارڈ تھا، یہ کارڈ حاصل کرکے مجھے پہلی بار ایک مکمل تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ نیز انہوں نے مجھے مختصراً ٹریننگ کرانے کے لیے وقت بھی مانگا تھا۔ میری یہ ٹریننگ پی ایس ایس کے خفیہ تربیتی کیمپ میں ہونا تھی جس میں جدید ہتھیاروں اور اسپائی آلات اور ڈیوائسز سے لے کے بھاری مشینری کا کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم بھی شامل تھا۔ نیز اس ٹریننگ کے بعد میری باقاعدہ رہائش گاہ اور تنخواہ بھی مقرر کرنا تھی، میں ایک والنٹیئر کی حیثیت سے ''اعزازی'' طور پر پی ایس ایس میں بھرتی کردیا گیا تھا۔ اس کے اغراض و مقاصد کا کچھ اشارتی حوالوں سے مجھے پہلے ہی میجر صاحب بتا چکے تھے۔ نیز باقی معلومات مجھے پی ایس ایس کے خفیہ تربیتی کیمپ کے لیکچر سیشن میں بتانا تھیں۔ وہاں میجر سہیل عاطف سے ملاقات کرنا تھی۔ باجوہ صاحب نے مجھے کارڈ کے ایک کونے میں بنے مخصوص ''چپ'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یہ درحقیقت ایک ''سیفر چپ'' ہے جس کے اندر میرا مکمل بائیو ڈیٹا مع میرے کارناموں کے محفوظ ہے۔ یہ کارڈ مجھے...... میجر سہیل عاطف کو دینا ہوگا۔

میرے لیے یہ سب کچھ خاصا سنسنی خیز تھا۔ مجھے لگتا تھا میری بھاگتی دوڑتی بے مقصد زندگی کو جیسے اب ایک نئی سمت ملنے والی تھی مگر بردست میں مذکورہ تربیتی کیمپ کو جوائن کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ کیونکہ ابھی مجھے... کچھ ذاتی...... سلسلے میں وزیر جان سے ملنا تھا اور اس کے منہ سے بہت کچھ اگلوانا تھا۔ آخر پتا تو چلتا میں کون ہوں؟ میرا باپ کون ہے؟ میری ماں کہاں ہے؟ ان سارے سوالوں کے جواب مجھے وزیر جان کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا لیکن بات پھر وہی آجاتی تھی کہ گویا ابھی میری جنگ ممتاز خان سے ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ اس کے ساتھ تو اصل جنگ اب شروع ہونا تھی، ایسے میں جبکہ ممتاز خان اور وزیر جان خود ہی ایک بڑی مجرم تنظیم کی پشت پناہی میں آکر خود کو زیادہ بااثر اور طاقتور سمجھنے لگے تھے، پھر عابدہ سے متعلق اس کی دھمکی بھی خالی از علت نہیں ہوسکتی تھی۔ وزیر جان کا معاملہ دوسرا سہی مگر وہ بھی مجھے ممتاز خان والے معاملے سے زیادہ گمبھیر محسوس ہونے لگا تھا۔ اس میں اب زبیر خان کہاں فٹ ہونے والا تھا، یہ آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ ایڈووکیٹ خانم شاہ سے ملنا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ ان سارے معاملات دگرگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں بھی اب اپنے سلسلے میں آگے کچھ...... کرتا اور خدا نے ازخود ہی اس سلسلے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں میجر باجوہ صاحب کی صورت یہ مسئلہ حل کر دیا تھا۔ لہٰذا اب قلابازیاں کھاتے ہوئے میرے ذہن رسا میں یہی ارادہ پختہ ہونے لگا کہ مجھے اس والنٹئر "شمولیت" کو ویلکم کہنا چاہیے اور کچھ دنوں کی ٹریننگ پر چلے جانا چاہیے۔

لہٰذا میں نے باجوہ صاحب سے سنجیدگی کے ساتھ اس سلسلے میں گفتگو کی تو انہوں نے مجھے بتایا کہ پی ایس ایس والوں کا وہ خفیہ تربیتی مرکز عام ٹریننگ کیمپوں سے قطعی مختلف ہے، وہاں ایمرجنسی اور جنگی بنیادوں پر ٹریننگ دی جاتی ہے۔ بہرحال میں نے اس کی ہامی بھر لی۔ انہوں نے مجھے کل الصباح ہیڈکوارٹرز آنے کا کہہ دیا جہاں ایک بند وین میں مجھے مذکورہ تربیتی کیمپ لے جایا جانے والا تھا۔ اس کے بعد مجھے ڈیلٹا ایجنٹ سے کمانڈو کا درجہ دے دیا جاتا۔ باجوہ صاحب سے یہ تفصیلی معاملات طے کرنے کے بعد میں نے ان سے اپنے ساتھیوں ارشد، شوکی اور شکیلہ کی رہائی کے سلسلے میں درخواست کی تو انہوں نے اسی وقت آئی جی صاحب رحمان تیموری صاحب سے ہاٹ لائن پر رابطہ کیا اور مجھ سے حاصل کردہ مختصراً تفصیل ان سے متعلق انہیں گوش گزار کر دی۔ رابطہ منقطع کرنے کے بعد باجوہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی ان تینوں کے بارے میں پتا کر کے بتائیں گے۔"

میں نے مطمئن ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اول خیر کو گیسٹ روم میں بٹھایا گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ بے چارہ وہاں اکیلا بیٹھا بور ہو رہا ہوگا۔

تھوڑی دیر گزری... تیموری صاحب کا فون آ گیا۔ انہوں نے باجوہ صاحب کو ایک چونکا دینے والی اطلاع دی کہ ارشد وغیرہ سرے سے پولیس کے قبضے میں تھے ہی نہیں۔ یہ سن کر مجھے سخت تشویش ہوئی، میں سمجھ گیا اس میں چودھری ممتاز اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ روشن خان کی ضرور کوئی ملی بھگت ہوگی۔ مجھے شوکی اور بالخصوص شکیلہ سے متعلق ایک نئی پریشانی نے آ گھیرا اور میں سخت مضطرب نظر آنے لگا۔

تیموری صاحب سے بات کر کے باجوہ صاحب نے مجھ سے کنفرم کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"آر یو شیور... مسٹر شہزی کہ تمہارے ان تینوں ساتھیوں کو پولیس نے واقعی گرفتار کیا تھا؟"

میں نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ "باجوہ صاحب!... میں دشمنوں کی سازش سمجھ رہا ہوں کہ وہ کیا مغالطہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے تینوں ساتھیوں کو ڈپٹی روشن خان نے ہی گرفتار کیا تھا اور مجھے اس کا پہلے ہی شبہ تھا کہ وہ اپنے خفیہ اور مذموم مقاصد کے لیے ان کی گرفتاری کو شو آف نہیں کرے گا۔"

"ہوں... خیر شہزی! تم فکر نہ کرو۔ ان کا جلد پتا چل جائے گا۔"

"میں اب چلوں گا باجوہ صاحب!" میں نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے ایک نئی اور پریشان کن بے چینی نے آن لیا تھا۔

میں اول خیر کے ساتھ نکلا تو وہ میرے چہرے کی تفکر آمیز پریشانی بھانپ گیا کار میں بیٹھتے ہی توصیفی لہجے میں بولا۔

"او خیر... کاکے، تو نے وڈی ٹور شور بنائی ہے۔ بڑے فوجی افسر تیرے دوست بن گئے ہیں۔ پر تو خاصا پریشان بھی نظر آ رہا ہے، آخر کیا بات ہے؟"

میں نے اسے اپنی پی ایس ایس میں شمولیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا نہ ہی ٹریننگ کے متعلق... تاہم میں نے اسے ارشد وغیرہ کے تھانہ لاک اپ سے پُراسرار غیاب کے بارے میں آگاہ کیا تو وہ چھوٹتے ہی بولا۔

"میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا وہ راتب خور کمینہ روشن خان یہی حرکت کرے گا۔ شکر ہے اس روز تم اس کے ہتھے نہیں چڑھے تھے، ورنہ..." وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔

"اول خیر... اب اس ڈپٹی روشن خان سے بھی فیصلہ کن دو دو ہاتھ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا اور چونکا اس وقت جب میں پولیس ہیڈکوارٹر کے اندر اپنی جیپ لے جا کر کھڑی کر چکا تھا۔ اول خیر کو مجھ سے اس قدر تیزی کی توقع نہ تھی، وہ فطری طور پر ذرا بوکھلا سا گیا مگر پھر بولے سے "او خیر..." کہہ کر چپ ہو رہا۔

مجھے کار سے اترتے دیکھ کر چند وردی پوش پولیس اہلکار میری طرف بڑھے مگر کسی نے بھی مجھ سے "اڑنے" کی جرأت نہ کی۔ ان کے بولنے سے پہلے ہی میں نے سنجیدگی سے ایک کو مخاطب کر کے کہا۔ "مجھے ڈپٹی روشن خان سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو تم صاحب سے؟" مخاطب نے بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یہ میں ان کو ہی بتاؤں گا۔" میں نے بھی اسی لہجے میں کہا تو وہ ہمیں عمارت کے اندر آفیسرز بلاک میں لے آیا اور برآمدے میں بچھی ایک لکڑی کی بنچ نما کرسی پر ہمیں چھوڑ کر ڈپٹی روشن خان کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بعد وہ اہلکار لوٹا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ کو کس سلسلے میں ان سے ملنا ہے؟"

"تم نے انہیں بتایا نہیں کہ..."

"ظاہر ہے۔۔۔ میں بتا چکا ہوں۔" وہ میری بات کاٹ کر سرد لہجے میں بولا۔ "وہ یہی کہہ رہے ہیں کہ ملاقات کی وجہ جاننے کے بعد وہ یہ فیصلہ کریں گے کہ تمہیں ملاقات کا وقت دیں یا نہیں۔" اس کی بات سن کر میرا دماغ ایک لمحے کو بھنا کر رہ گیا۔ جی میں تو آئی کہ اس ٹٹو اہلکار کو پرے دھکیل کر دھڑ سے اس راشی اور رشوت خور روشن خان کے کمرے میں جا گھسوں اور اس کا گریبان دبوچ کر اس کے غرور کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے اس کی اوقات..... یاد دلا دوں اور شاید میں ایسا کر بھی ڈالتا، اگر اول خیر... ٹٹو اہلکار کی بات پر میرے چہرے کے بگڑتے تاثرات بھانپ کر مجھ سے سرگوشی میں یہ نہ کہتا۔

"کاکا! ذرا ہولا رہ۔ تیری فتح اور رہائی نے اسے اس بوگس قسم کے غرور میں مبتلا کر رکھا ہے، وہ اب ایسے سستے قسم کے ہتھکنڈوں سے اپنی لنگڑی لولی برتری ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہے گا۔"

اول خیر کے ان دوررس جملوں نے جیسے میرے سینے میں کھولتے لاوے پر ژالہ باری کا کام دیا تھا اگرچہ یہ سرگوشی اول خیر نے میرے کان کے قریب کی تھی مگر ٹٹو اہلکار نے یہ سن لی تھی۔ ناک بھوں چڑھا کر اول خیر سے بولا۔

"یہاں صاحب کے خلاف کوئی غلط بات نہیں چلے گی۔ اپنے آنے کا مقصد بتاؤ ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

اس کی بدتمیزی پر میں دانستہ اسے تاؤ دلانے والے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔

"اپنے صاحب سے جا کر کہہ کہ... ہم ان تینوں قیدیوں سے ملنا چاہتے ہیں جنہیں اس نے اپنی روایتی پولیس گردی دکھاتے ہوئے بیگم ولا سے غیر قانونی داخلے کے بعد گرفتار کیا تھا۔"

"شٹ اپ... بکواس بند کرو اپنی..." ٹٹو اہلکار نے میری طرف گھورتے ہوئے زہرخند لہجے میں کہا تو جواب میں، میں نے بھی اسی لہجے میں چڑھتی ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کے کہا۔

"زیادہ بدتمیزی کی جرأت اب مت کرنا... تمہارے اور تمہارے صاحب کے کالے کرتوت میڈیا میں آ چکے ہیں اور اس وقت بھی میڈیا کی خفیہ آنکھ تمہیں کہیں سے گھور رہی ہے... جن کی نگاہ میں قانونی حیثیت معتبر ہی نہیں مستند بھی ہو چکی ہے، جاؤ... جو کہا ہے وہ کرو۔"

ٹٹو اہلکار کی اکڑفوں رخصت ہونے لگی۔ بھلا اس پرائیویٹ میڈیکل سینٹر والے خونریز معرکے اور میری خصوصی ضمانت، میڈیا کی حمایت اب کہاں ڈھکی چھپی رہی تھی۔ وہ فوراً پلٹا اور کمرے میں غائب ہو گیا۔

"او خیر... کاکا، تو نے تو اس کی پتلون ہی گیلی کر دی مگر پھر بھی ذرا ہتھ ہولا رکھ... یہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہے۔" اول خیر نے پھر سرگوشی کے سے انداز میں مجھ سے کہا تو میں نے اپنی روشن خان کے کمرے کی طرف نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔

"اول خیر... ان لوگوں نے بہت پولیس گردی کر لی اب میری باری ہے۔"

"او خیر..." وہ ہولے سے بولا پھر شاید خودکلامیہ بڑبڑایا۔ "لگتا ہے آج پھر کوئی نیا رونا پڑنے والا ہے۔" وہ ٹٹو اہلکار دوبارہ واپس آتا دکھائی دیا۔ میری بھانپتی نظروں نے دور سے ہی اس کے چہرے کو تاڑ لیا۔ وہ اب خاصا بگڑا ہوا نظر آ رہا تھا اور تھوڑی دیر پہلے میں نے اس کی "اکڑ" کے غبارے سے جو ہوا نکالی تھی، لگتا تھا شاید روشن خان نے دوبارہ اس کے اندر بھر دی تھی۔ لہٰذا قریب آ کے گردن اکڑا کے بولا۔

"صاحب کو ایسے کسی قیدیوں کا علم نہیں ہے اور انہوں نے آپ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ دونوں جا سکتے ہو۔"

میں نے مارے طیش کے دانت پیس لیے اور روشن خان کے کمرے کی طرف قدم بڑھانا چاہا تھا کہ اول خیر نے مجھے روک دیا۔ "چل اوئے کاکے... کوئی نئی پسوڑی نہ ڈال دینا... ابھی چھوڑ بعد میں دیکھتے ہیں، آ..."

وہ مجھے بازو سے تھامے برآمدے سے باہر احاطے میں لے آیا جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔

"یہ کھلی پولیس گردی ہے۔ قانون کی آڑ میں یہ دشمنی کی واردات کو تحفظ دے رہے ہیں... ہمارے تینوں ساتھی یرغمال بنا لیے گئے ہیں اور ہمیں یہ بھی نہیں پتا کہ وہ خدانخواستہ زندہ بھی ہیں یا... نہیں۔"

میں کار کے قریب آتے ہوئے بپھرے ہوئے لہجے میں بولا تو اول خیر نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والا دروازہ کھول کر مجھے اندر سوار کرا دیا اور خود جلدی سے اسٹیئرنگ سیٹ پر براجمان ہونے کے بعد کار اسٹارٹ کر

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے آگے بڑھادی۔ ہیڈکوارٹر کے وسیع وعریض احاطے سے نکلتے ہی اول خیر نے کہا۔

"کاکے! پریشان نہ ہو۔ اگر زہر کو زہر ہی کاٹتا ہے تو یہی سہی۔ ہم بھی اس رذیل صفت راتب خور روشن خان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوں گے۔"

میں اس کی بات سن کر چونکا۔ "کیا تم بھی وہی سوچ رہے ہو اول خیر، جو میں سوچ رہا ہوں؟"

"او خیر، اب تیرے ساتھ رہتے ہوئے ذہنی ہم آہنگی تو آئے گی نا..." وہ مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"روشن خان جس طرح تاریکی میں پولیس گردی دکھاتا ہے تو ہم بھی راتوں میں قانون کے ایسے جعلی رکھوالوں کے لیے بہت اعلیٰ درجے کے بدمعاش ثابت ہوں گے، ذرا رات ہونے دے اس کے گھر پر چڑھائی کریں گے، ایسے تو ایسے ہی سہی۔"

"واہ... اول خیر، جیو میرے یار۔ تم نے میری نس نس میں جوش دوڑا دیا۔" میں نے لمبی ہنکاری بھر کے کہا پھر اچانک مجھے باجوہ صاحب کا خیال آیا۔ عقل نے ترغیب دی کہ اس سلسلے میں باجوہ صاحب سے ضرور بات کرنی چاہیے کہ ڈپٹی روشن خان کس دھڑلے سے اپنی وردی کا غلط استعمال کررہا تھا، ممکن ہے روشن خان کے خلاف ان کے ذہن میں کوئی کلیو ہو اور وہ اسے بروئے کار لاتے ہوئے اسے ایسا سبق سکھائیں جو اس کی تنزلی پر منتج ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اسی وقت سیل فون سے باجوہ صاحب کی ہاٹ لائن پر ان سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورتِ حال گوش گزار کردی۔ وہ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد بولے۔

"شہزی! بے شک یہ ڈپٹی روشن خان کی ایک غیر قانونی حرکت ہے اور میں بھی یہ سمجھ رہا ہوں کہ اس نے ارشد، شوکی اور شکیلہ کو کس مقصد کے لیے اور کس کے کہنے پر یرغمال بنا رکھا ہوگا مگر اس بات کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دیکھو، ہمارے کام کا ایک مخصوص طریقۂ کار ہوتا ہے۔ ورنہ اس طرح سول اتھارٹیز میں مداخلت کرنے سے عام عوامی حلقوں میں ہمیں بدنام کیا جائے گا۔ تمہارے کیس کے سلسلے میں بھی میڈیا، اتھارٹیز اور چند دیگر ایسی اہم کلیدی شخصیات کو استعمال کرنا پڑا تھا جن سے ہماری خاصی گہری اور دیرینہ شناسائی ہے۔ ہمارا ہر قدم ملک اور قوم کے مفاد میں ہی اٹھتا ہے۔ چاہے وہ تاریکی کے پردے میں ہی کیوں نہ اٹھایا جائے مگر اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ممتاز خان کے معاملے میں پی ایس ایس کو مجبوراً ظاہر ہونا پڑا اور اس کی وجہ "اسپیکٹرم" ہے مگر میں جانتا ہوں ممتاز خان کم از کم اس معاملے میں ہرزہ سرائی کرنے یا بھونکنے کے بجائے مقابلے کو ترجیح دے گا۔ بہرحال تم یہ معاملہ اپنے طور پر حل کرنے کی کوشش کرو کیونکہ اب تم آزاد ہو اور تمہاری حیثیت و شخصیت معاشرے میں مثبت انداز میں ڈیکلیئر ہوچکی ہے۔ اوکے۔"

"تھینک یو سر! آپ نے یہ کہہ کر میری بھی ایک طرح سے مشکل حل کردی۔" میں نے کہا۔ باجوہ صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے تھے اس کے بعد رابطہ منقطع کردیا۔ میں نے مطمئن انداز میں کار کی سیٹ سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

بیگم ولا پہنچ کر ہم نے بیگم صاحبہ کو یہ بتایا تو انہیں تینوں ساتھیوں کی طرف سے شدید تشویش ہوئی۔ نیز ڈپٹی روشن خان کی اس کھلی بددیانتی پر طیش بھی آیا۔ وہ روشن خان پر ماورائے قانون اور اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے کا مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں جس سے میں نے اختلاف کرتے ہوئے کہا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بیگم صاحبہ، کیونکہ یہ تاریکی کے پردے کے پیچھے ہونے والی جنگ ہے اور اس جنگ میں جو جیتا... وہی سکندر ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں اپنے طریقۂ کار سے بھی آگاہ کردیا۔

کھیل دادا بھی وہاں موجود تھا۔ وہ حسبِ عادت میری اس نئی مہم جوئی پر "مین میخ" نکالتے ہوئے بولا۔ "یہ بھڑوں کے چھتے میں دانستہ ہاتھ ڈالنے والی بات ہوگی، ابھی تو بڑی مشکلوں سے ہم نے پولیس سے جان چھڑائی ہے۔ اب پھر آ بیل مجھے مار والی حرکت ہمیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"کس نے تم سے یہ کہہ دیا کہ پولیس نے ہماری جان چھوڑ دی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے تین اہم ساتھیوں کو وہ مردود ڈپٹی روشن خان ماورائے قانون غائب کرچکا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ پولیس نے ہماری جان چھوڑ دی ہے۔"

"شہزی ٹھیک کہہ رہا ہے۔" بیگم صاحبہ نے باوقار لہجے میں کہا۔ "ایک محاذ پر دشمنوں کو شکستِ فاش دینے کے بعد اب وہ ہم سے تاریکی کے پردے میں جنگ مسلط کرنا

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چاہتے ہیں تو ہمیں اینٹ کا جواب پتھر سے ہی دینا چاہیے۔ ممتاز خان نے اس بار بڑی خطرناک اور گہری چال چلی تھی، ایک طرف مجھے یرغمال بنالیا دوسری طرف اپنے راتب خور روشن خان کے ذریعے بیگم ولا میں بغیر کسی سرچ وارنٹ کے ریڈ دلوا دی جس کے نتیجے میں وہ شہزی سمیت ہمارے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گیا جس کا پولیس میں دور دور تک کوئی ریکارڈ نہیں۔"

کمیل دادا نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔ "بیگم صاحب! ڈپٹی روشن خان، چودھری ممتاز کا زرخرید اور ٹاؤٹ ہے۔ اسی طرح چودھری ممتاز نے اس جیسے جانے کتنے لوگوں کو اپنا کتا بنا رکھا ہوگا۔ ہم کس کس سے لڑتے رہیں گے جبکہ وہ خود سات پردوں کے پیچھے چھپا ہوا ڈوریاں ہلاتا رہتا ہے۔ لہٰذا ہمیں روشن خان پر حملہ کرنے کے بجائے چودھری ممتاز کو ٹارگٹ کرنا چاہیے۔"

"تمہاری بات بھی کسی حد تک قابلِ غور ہے۔" بیگم صاحب نے اس کی حمایت میں کہا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔ "لیکن ممتاز خان نے اب دیسی ہی نہیں ولایتی کتے بھی پال لیے ہیں اس نے خود کو کافی حد تک نظر انداز کر رکھا ہے جبکہ ہمارے تینوں ساتھیوں کی بازیابی فوری ایکشن لینے کی متقاضی ہے اور اس سلسلے میں جو شکار ہمارے سب سے زیادہ قریب ہے وہ ممتاز خان نہیں بلکہ ڈپٹی روشن خان ہے۔"

بیگم صاحب نے بڑی مضبوط دلیل دے کر کمیل دادا کا منہ بند کر دیا مگر پھر بھی وہ اپنے دل کا بغض نکالے بنا نہ رہ سکا، بولا۔ "ٹھیک ہے پھر... اس مہم جوئی کی کمانڈ میرے سپرد ہوگی۔"

"میرے ہوتے ہوئے تم فیصلہ صادر کرنے والے کون ہوتے ہو کمیل دادا؟" بیگم صاحب نے تلخی سے کہا تو وہ بُری طرح گڑبڑا گیا۔ فوراً خفیف ہو کے بولا۔

"م... میرا یہ مطلب نہیں تھا بیگم صاحب۔"

"میں اس کی مکمل طور پر کمانڈ شہزی کے سپرد کرتی ہوں۔ کیا کہتے ہو تم شہزی؟" بیگم صاحب نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔

"میں آپ کے اس اعتماد کا مشکور ہوں بیگم صاحب! میں اول خیر کو ساتھ رکھنا چاہوں گا، اس مہم میں جتنے کم لوگ ہوں اتنا ہی مفید ہوگا۔ ہم دونوں کافی ہوں گے۔"

"بیگم صاحب! اول خیر کی حیثیت اب واضح کرنا ہوگی آپ کو... یہ غدار ہے ہمارا... یا ساتھی؟" زک اٹھانے کے باوجود کمیل دادا آخری حربے مسلسل آزمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھتے والے معاملے کو وہ نہیں بھولا تھا۔ اور اس کو ایک سنجیدہ ایشو بنا کر وہ اول خیر کو پچھاڑنے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ بیگم صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے کہا۔

"بیگم صاحب! میں آپ سے پہلے ہی اول خیر کے سلسلے میں سفارش کر چکا ہوں۔ یہ ایک سچا اور وفادار انسان ہے۔ اس کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر اسے معاف کر دینے کی آپ سے عاجزانہ گزارش بھی کرتا ہوں۔"

"یہ صرف تمہارا وفادار ہوگا، ہمارا نہیں۔" کمیل دادا نے اپنے دل کی میل اگلی۔ "اس کی فطرت سے ہم بھی اب تک آگاہ ہو چکے ہیں کہ یہ گروہ سے باہر کے لوگوں سے ہی دوستی نبھاتا اور وفاداری کرتا ہے اور یہ بیگم صاحب کی حکم عدولی کے ناقابلِ معافی جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ اگر اس کی سزا تجویز نہ کی گئی تو تنظیم میں ایک غلط روایت پڑ جائے گی۔"

کمیل دادا نے کسی گھاگ اور مکار پراسیکیوٹر کی طرح اول خیر کو بیگم صاحب کی عدالت میں مجرم ظاہر کرنے کی سعی چاہی...... اس کا یہ کہنا کہ اول خیر "باہر والوں" سے وفاداری یا دوستی نبھاتا ہے تو اس کا اشارہ بلاشک وشبہ میرے اور چھتے کی طرف ہی تھا۔

میں نے کہا۔ "اول خیر کی وفاداری کسی بھی شک و شبہے سے بالاتر ہے۔ میں اس کی ضمانت دیتا ہوں۔ اپنے حوالے سے نہیں... بیگم صاحب کے جاں نثار ساتھیوں کے حوالے سے... اور میں اس بات کی بھی ضمانت دینے کو تیار ہوں کہ اگر خدانخواستہ بیگم صاحب پر کوئی برا وقت آیا تو اول خیر مجھے چھوڑ کر بیگم صاحب کو ہی ترجیح دے گا۔"

"جذباتی باتیں کر کے تم اپنے جگری یار کی وکالت نہیں کر سکتے شہزی! یہ کڑے اصولوں کی بات ہے۔"

کمیل دادا زہریلے لہجے میں بولا تو میں نے بالآخر بیگم صاحب کی طرف دیکھا۔ مجھے ان کا چہرہ گم صم سا نظر آنے لگا۔ اس پر کمیل دادا نے دوبارہ زہر کی پھنکار ماری۔

"اول خیر کو مزید آزمانا... دوسرے سوراخ سے سانپ ڈسوانے کے مترادف ہوگا۔ اگر یہ سچا ہے تو اسے چھتے کو ہلاک کر دینا چاہیے۔" شاطر کمیل دادا کی اس بات پر مجھے بے انتہا طیش آ گیا۔

"تم خود بیگم صاحب کے احکامات کی کتنی پاسداری کرتے ہو۔ یہ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں کمیل دادا! تم تو مجھے اس رات کو چڑا بازار کے ویران چوراہے پر کار سے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اتار کر واپس چلے گئے تھے جب پولیس میرے پیچھے تھی، حالانکہ بیگم صاحبہ نے تمہیں کسی بھی صورت مجھے اکیلا نہ چھوڑنے کا سختی سے حکم دے رکھا تھا۔"

"تم ہرزہ سرائی کر رہے تھے۔" کبیل دادا نے لنگڑی لولی تاویل دی اور پھر اس سے پہلے کہ ہم دونوں مزید الجھتے... بیگم صاحبہ کی تحکمانہ آواز ابھری۔

"اول خیر کے سلسلے میں بہت پہلے فیصلہ کر چکی ہوں۔ مگر مجھے اسے ظاہر کرنے کا موقع نہ مل سکا۔"

بیگم صاحبہ کی اس بات پر جیسے وہاں موجود ہم سب کے چہروں پر سناٹے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بالخصوص اول خیر کا خاموش اور نادم نادم سا چہرہ مجھے کچھ زیادہ ہی پریشان لگا۔

"میرا فیصلہ بہت مختصر اور حتمی ہے۔" بالآخر بیگم صاحبہ نے کہنا شروع کیا اور دم بخود سا ماحول جیسے سماعت بن گیا۔ "ویسے تو میں نے اول خیر کے لیے بہت کڑی سزا سوچی تھی مگر شہزی سے اس کی گہری یاری کو دیکھتے ہوئے میں اسے صرف اس قدر سزا دیتی ہوں کہ... اسے اپنے حلقۂ وفاداری اور اپنی ہم رکابی سے الگ کرتی ہوں۔ آج کے بعد سے اول خیر کا نہ ہم سے تعلق رہے گا نہ ہمارے معاملات و دیگر امور سے، اور نہ ہی ہمارے گروہ کے کسی ادنیٰ ترین ساتھی سے... شہزی چونکہ ہمارے گروہ سے تعلق نہیں رکھتا اس لیے ہم اس پر شہزی سے تعلق توڑنے کا حکم دینے کا حق نہیں رکھتے۔"

میں نے سکون اور اطمینان کی سانس لی کیونکہ میرے نزدیک اول خیر کی یہ سزا بہت معمولی تھی لیکن جب میں نے اول خیر کی طرف دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ بیگم صاحبہ کا فیصلہ صادر ہوتے ہی اس کا چہرہ جیسے دھواں دھواں سا ہو کے رہ گیا۔ اس کی یک ٹک بیگم صاحبہ کی طرف تکتی آنکھوں سے انتہائی کرب ناکی جھلکنے لگی۔

"بیگم صاحبہ! مم... مجھے آپ کی کڑی سزا قبول ہوتی مگر ایسی سزا تو نہ دیں... آپ بھی جانتی ہیں کہ یہ سزا میرے لیے ہرگز ہرگز معمولی نہیں۔" بالآخر اول خیر کی غم انگیز کپکپاتی آواز ابھری۔ میں نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ میری فطری آبزرویشن والی صلاحیت مجھ پر یہ باور کروا رہی تھی کہ بیگم صاحبہ خود بھی جانتی تھیں کہ اول خیر کے لیے کون سی سزا کڑی سے کڑی ہو سکتی ہے اور انہوں نے گویا وہی کڑی سزا دی تھی مگر وہ میری سمجھ میں نہ آسکی تھی اور میں خوش تھا جبکہ بیگم صاحبہ نے "دوغلی" ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف تو مجھے خوش کر دیا تھا اور دوسری طرف انہوں نے اول خیر کو درحقیقت کڑی ہی سزا دی تھی۔

بیگم صاحبہ نے اول خیر کی داد فریاد سننا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ میں نے بیگم صاحبہ سے کچھ کہنا چاہا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھ سے پُرمتانت لہجے میں بولیں۔

"شہزی! میں تمہاری کامیابی کی دعا کرتی ہوں۔ میرے کسی ساتھی کی تمہیں ضرورت پڑے تو کسی کو بھی ساتھ لے جا سکتے ہو ماسوائے کبیل دادا کے۔" کبیل دادا سمیت اس کے ساتھی بھی احتراماً کھڑے ہو چکے تھے۔

میں نے بھی کھڑے ہو کر بیگم صاحبہ سے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "میرے لیے آپ کا ساتھی اول خیر ہی کافی ہے۔"

"خبردار شہزی! آئندہ اول خیر کو ہمارا ساتھی کہنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔" وہ فوراً تیز اور برہم لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں اور کمرے سے نکلتی چلی گئیں۔ کبیل دادا ایک فاتحانہ نگاہ ہم پر ڈالتے ہوئے بیگم صاحبہ کا دُم چھلا بنا ان کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ باقی ساتھی بھی ادھر ادھر ہو گئے۔ صرف میں اور اول خیر وہاں رہ گئے۔ میں اپنے چہرے پر تشویش و تفکر کے آثار لیے اس کی طرف بڑھا اور اسے دونوں بازوؤں سے تھام کر بولا۔

"ایسا کیا ہوا میرے یار! تو نے تو اتنی سی بات اپنے دل کو لگا لی؟" میرا انداز اسے تسلی اور حوصلہ دینے کا سا تھا مگر وہ تو جیسے پشیمانی اور کرب جیسی حالت سے دوچار نظر آرہا تھا۔ وہ کرب آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے شہزی! میرے لیے یہ بہت بڑی سزا ہے، یہ تم نہیں سمجھو گے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں اول خیر... یہ بات تیرے لیے بڑے صدمے کا باعث بنی ہے مگر میں واقعی اسے چھوٹی سزا سمجھا تھا لیکن تیری کیفیت اور تیری غمگساری کچھ اور کہانی کہہ رہی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ اسی ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بولا۔

"ہاں کاکا، یہ واقعی ایک کہانی ہے۔ ایک بڑی کہانی۔" اس کے گہرے اور عجیب اسرار بھرے انداز نے مجھے الجھن میں مبتلا کر دیا۔ وہ کس کہانی کی بات کر رہا تھا، کیسی کہانی؟ کیا اول خیر کی بھی اپنی کوئی کہانی تھی؟ جس کی ابتدا بیگم صاحبہ سے ہوئی تھی یا پھر کوئی اور معاملہ تھا؟ سچی بات تو یہ تھی کہ میں تو ابھی ابھی تک اول خیر کے ماضی سے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ناواقف تھا، دل تو چاہا تھا میرا کہ اس سے آج پوچھ ہی لوں مگر اول خیر کی موجودہ ہیئت کذائی نے مجھے اس کے بارے میں کچھ پوچھنے سے مانع ہی رکھا۔ مجھے کیپٹل دادا پر بھی شدید طیش آنے لگا کہ اس بدبخت نے اچھے بھلے موضوع کا رخ بدل کر بیگم صاحب کی توجہ اس کی جانب مبذول کرا دی تھی۔ اول خیر کو دل جوئی کی ضرورت تھی۔ میں نے جبراً مسکرا کے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور بولا۔ "چل یار اٹھ، نکل یہاں سے، جب تک تو ادھر رہے گا تیری یہی کیفیات رہیں گی۔"

"شہزی کاکا! میں اب یہاں سے کہاں جاؤں گا؟ میرا اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔ "شہزی! تو نہیں جانتا بیگم صاحب میرے لیے کیا حیثیت رکھتی تھیں۔ میں نے انہیں ہر اس روپ میں دیکھا ہے جو پاکیزہ جذبے اور مقدس احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ میری سرپرست تھیں۔ میں نے انہیں مہربان اور شفیق ماں کے روپ میں بھی دیکھا۔ بہن کے روپ میں بھی اور... اور ایک سخت گیر باس کی صورت میں بھی مگر ان کی سخت گیری میں بھی ماں، باپ جیسی شفقت ہوتی تھی۔ آج انہوں نے مجھے اس سے محروم کر دیا، اپنے سائے سے دور کر دیا۔"

"چل اٹھ، یہاں سے نکل۔" میں نے اسے بازو سے تھام لیا اور پھر ہم بیگم ولا سے نکل آئے۔ اگرچہ مجھے بیگم صاحب کی طرف سے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ میں ان کی گاڑی بھی استعمال کر سکتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ پتا نہیں کیوں اول خیر کی یہ حالت دیکھ کر خود میرا دل بھی اب یہاں سے کھٹا ہونے لگا تھا۔

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھے مرشد بابا کے گھر آ گئے۔ وہاں ماسی شریفاں موجود تھی۔ ایک بوڑھا ملازم بھی تھا۔ دونوں بے اولاد میاں بیوی تھے، اور عرصے سے وہاں ملازم تھے۔ مرشد بابا دفتر میں تھے۔ تاہم میں نے انہیں اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ بھی پہنچنے ہی والے تھے جبکہ خرم اور نعیمہ گھر پر ہی تھے۔ خرم کا پورا نام خرم دانش تھا۔ اسے پیار سے دانی کہتے تھے اور نعیمہ کو نکی۔ دونوں نے ہمیں ادب سے سلام کیا پھر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں اور اول خیر نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ ماسی ہمارے لیے چائے لے آئی تھی۔

"کاکا! میں سمجھتا ہوں بیگم صاحب نے بہت غلط وقت پر مجھے خود سے الگ کر دیا۔ مجھے اپنی فکر نہیں مگر جب تک ممتاز خان زندہ ہے وہ خطرات میں گھری ہوئی ہیں۔" اول خیر کے لہجے میں تفکر تھا۔ میں نے اس سے ازراہ تشفی کہا۔

"یار تو فکر نہ کر... میں بیگم صاحب سے بعد میں معافی تلافی کی بات کروں گا۔ مجھے یقین ہے وہ میری بات رد نہیں کریں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا، مقصد اس کا غم دور کرنا تھا تاکہ اس کی دلی کدورت کچھ کم ہو سکے مگر وہ اسی طرح پھیکی پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔

"نہیں کاکا! اب تیرا یہ وار بھی شاید کام نہ کر سکے۔ یہ الگ معاملہ ہے۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ بیگم صاحب مجھے اپنے ماضی اور اپنے محبوب مرحوم لئیق شاہ کے بارے میں سب بتا چکی ہیں۔ اس نے سن کر ہولے سے سر کو محض ایک جنبش دی تھی۔

میں نے ایک بار پھر عابدہ سے بات کرنے کی کوشش چاہی تو معلوم ہوا سیل فون کی سم بلاک کر دی گئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی حرکت ہو سکتی تھی۔ اگرچہ کامران ہماری ہی کسٹڈی میں تھا وہ ویسے بھی یہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی وہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو گیا تھا۔ یقیناً اس کے سیل فون کی سم اس کے کسی تنظیمی ساتھی کے نام سے ہو گی جو اس کے سرکردہ نے بند کروا دی ہو گی۔ اچانک مجھے لینڈ لائن کا خیال آیا۔ میں نے لینڈ لائن پر دھڑکتے دل سے فون ملایا تو فوراً ہی مذکورہ اسپتال کی ایڈمنسٹریشن سے رابطہ ہو گیا۔ میں نے مخاطب کو روم نمبر اور مریضہ عارفہ کا بتاتے ہوئے اس کی ساتھی عابدہ سے بات کرنے کا کہا، تو ذرا دیر تک ہلکے میوزک کی آواز آتی رہی اور پھر عابدہ کی آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

یہ آواز روح بن کر میرے وجود میں عین دل کے مقام پر دھڑکی تھی اور میرے پورے وجود کو ایک سرشاری میں بھگو دیتی تھی۔ میں نے تڑپ کر عابدہ کو یوں پکارا جیسے وہ مجھ سے محض چند قدموں کی دوری پر کھڑی ہو اور میں بے تابانہ اسے آواز دے کر اپنے قریب آنے کے لیے پکار رہا ہوں۔

"عابدہ... کک... کیسی ہو تم؟ میں شہزی بات کر رہا ہوں۔"

میری آواز سن کر دوسری جانب شاید عابدہ بھی ایک لمحے کو گنگ رہ گئی تھی پھر جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے بولی۔ "شش... شہزی! تت... تم... کہاں ہو؟ اب تک مجھ سے بات کیوں نہیں کر سکے؟ تم ٹھیک تو ہو نا... اللہ تمہیں سلامت رکھے... کئی صدیاں بیت جاتی ہیں جب اور اندیشناک وسوسوں تلے تم سے بات نہیں ہوتی، کبھی کبھی تو

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سرمد بابا کو بھی تمہاری خیریت کے بارے میں علم نہیں ہوتا، ایسے میں تو میں بالکل ادھ موئی ہو جاتی ہوں۔ تم سن رہے ہو ناں... شہزی؟" وہ کہے جا رہی تھی گویا جذبات... میں بہے جا رہی تھی۔

"عابدہ! تمہارے ہوتے ہوئے بھلا تمہارے شہزی کو کیا ہو سکتا ہے، جس کی دعائیں واقعی اثر پذیر ہوتی ہیں کہ چاہے حالات جس قدر بھی کٹھن ہوں ہم ایک دوسرے کی آواز تو سن لیتے ہیں نا... میں بالکل ٹھیک ہوں عابدہ اور اس وقت سرمد بابا کے گھر سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔ یہ خوش خبری سنانے کے لیے کہ میں اب قانونی طور پر باعزت رہا ہو چکا ہوں۔"

ایسا میں نے میلوں دور فاصلوں کا کرب جھیلتی عابدہ کی پریشانی اور تشویش کو کم کرنے کے لیے محض طفل تسلی کے لیے کہا تھا ورنہ حقیقت کچھ اور تھی جسے شاید عابدہ بھی محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"خدا کا شکر ہے مگر شہزی! کیا تمہارے دشمن بھی قانون کی گرفت میں آ چکے ہیں؟"

"ابھی ایسا نہیں ہوا۔" میں نے ہولے سے کہا۔ اسے اندھیرے میں، میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ تاہم امید افزا لہجے میں بولا۔ "مگر ایک دن وہ بھی ضرور قانون کی گرفت میں نہیں تو خدا کی پکڑ میں ضرور آنے والے ہیں۔ تم سناؤ، ٹھیک تو ہو نا تم؟ عارفہ کیسی ہیں؟ سرمد بابا بتا رہے تھے ان کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ بیڈ ریسٹ بھی ختم ہونے کو ہے پھر تمہارے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والی ہے اور عنقریب عارفہ کو اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا ہے۔"

"ہاں، یہ صحیح ہے ہفتے دس دن میں عارفہ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا اور انہی دنوں ہماری واپسی کی تیاری ہوگی۔ سرمد بابا کہہ رہے تھے کہ وہ ہمیں لینے کے لیے خود بھی امریکا آئیں گے۔"

"اچھا۔ یہ تو اور اچھی بات ہوگی۔"

"شہزی! تم اپنا خیال رکھتے ہو نا؟" عابدہ نے اچانک بڑی نرمی بڑی محبت سے پوچھا۔ میں جی جان سے مسکرا کے محبت پاش لہجے میں بولا۔

"ہاں عابدہ، کیوں نہیں، مجھے معلوم ہے کہ مجھے اپنا خیال رکھنا ہے اپنے لیے نہیں تمہارے لیے۔"

"اپنے لیے کیوں نہیں؟" وہ مسکراتے لہجے اور مہکتی شوخی سے بولی۔

"ارے بابا! اپنے لیے بھی رکھتا ہوں اور تم..."

"ظاہر ہے میں بھی رکھتی ہوں اپنا خیال۔"

"کس کے لیے؟ اپنے لیے یا میرے لیے؟" میں ایک نشے کی سی کیفیت میں بولا۔ اس کی نوخیز کلی جیسی چٹختی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی، امرت بن کر میری نس نس میں سما رہی تھی، میرے اندر کو سرشاری میں بھگو رہی تھی۔

"ہمارے بیچ اپنا تمہارا کب رہا ہے شہزی! میرا تو اپنا بھی تم ہو۔ صرف تم۔" وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولی پھر جیسے اچانک اس کی چونکتی ہوئی آواز ابھری۔

"شہزی!..."

"ہاں... ہاں کہو؟"

"تمہیں کبھی اخبارات پڑھنے کا موقع ملتا ہے؟... ٹی وی کی خبریں وغیرہ سنتے ہو؟"

"اخبار پڑھنے کا موقع تو خال خال ہی ملتا ہے۔ البتہ ٹی وی دیکھنے کا کبھی کبھار موقع مل جاتا ہے، کیوں خیریت؟"

وہ چند ثانیوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد بولی۔

"امریکا میں ورلڈ ٹریڈ ٹاور سینٹر میں دھماکوں کے بعد یہاں مقیم مسلم کمیونٹی بالخصوص پاکستانیوں کو بہت شک و شبے کی نظروں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کی عام عوام بھی چبھتی نظروں سے ہمیں گھورتی ہے۔ دعا کرو میں اور عارفہ بخیر جلد وطن واپس لوٹ آئیں۔"

عابدہ کی اس بات پر نہ جانے کیوں مجھے پورے وجود میں ان جانے اور متوقع خدشات کی تشویش بھری لہر سی سرائیت کرتی محسوس ہونے لگی۔ ورلڈ ٹریڈ ٹاور سینٹر کی تباہی سے متعلق خبریں تو جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا ہی میں پھیلی ہوئی تھیں جسے نائن الیون کے طور پر یاد کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں امریکا درون و برون اپنی تحقیقات میں بھی مصروف تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

"ارے بھئی تو اس میں تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم کون سا ہمیشہ کے لیے امریکا رہنے گئی ہو۔ بہ غرض علاج گئی ہو اور اب خیر سے لوٹنے والی ہو۔ پھر تمہارا امریکا میں داخلہ بھی بین الاقوامی قوانین کے تحت ہوا ہے۔ خوامخواہ اس سلسلے میں تمہیں پریشان یا تشویش زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دینی چاہی تو وہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے شہزی، مگر یہاں کی بعض خفیہ ایجنسیوں کے لوگ... غیر ملکیوں سے خوامخواہ ہی پوچھ گچھ

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرتے رہتے ہیں۔ کئی ایک کو تو غائب بھی کر چکے ہیں۔ باسکل ہولارڈ نامی ایک خفیہ ادارے کا افسر سادہ وردی میں مجھ سے بھی مل چکا ہے۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے، وہ اپنی عمومی اور ضابطے کی کارروائیوں کو نمٹا رہے ہوں گے۔ تم نے انہیں مطمئن تو کر دیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "میں اسے دو تین بار مطمئن کرنے کی کوشش کر چکی ہوں۔ نیز اپنے سفری کاغذات، عارفہ بہن سے متعلق... وہ سب کچھ اسے بتا اور دکھا چکی ہوں لیکن چلو چھوڑو تم پریشان ہو جاؤ گے۔ یہ واقعی ضابطے کی کارروائی ہی نمٹا رہے ہوں گے۔" عابدہ نے کسی خاص بات کا انکشاف کرتے کرتے یک دم اپنی بات بدلی تو مجھے تشویش ہوئی، فوراً بولا۔

"نہیں عابدہ! مجھ سے کچھ مت چھپاؤ... لیکن کیا؟ تم کیا بتانا چاہ رہی تھیں، مجھے بتاؤ... پلیز۔" میرے تشویش بھری اصرار پر بالآخر وہ بولی۔

"شہزی! سردبابا نے مجھے اس قسم کی گفتگو فون پر کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔ ان کے خیال میں امریکا کے حالات کے پیشِ نظر کچھ مخصوص کالز ریکارڈ یا ٹریس کی جا رہی ہوں۔ اگر ہمارے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو... وہ کسی شبہے کے پیرائے میں یہاں کی ایجنسیوں کے لیے کھٹک کا باعث نہ بن جائے... میں تو یہاں رہتے ہوئے روزانہ ہی اخبار پڑھتی اور ٹی وی دیکھتی ہوں۔ مجھے حالات کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ میرا خیال ہے بس تم دعا کرو ہم خیریت سے وطن واپس پہنچ جائیں۔"

اس کی بات درست تھی۔ میں نے بھی اصرار نہ کیا مگر مجھے عابدہ کی باتوں نے نہ معلوم سی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ پتا نہیں وہ باسکل ہولارڈ نامی اس شخص کے بارے میں کیا انکشاف کرنا چاہ رہی تھی، تاہم میں یہ سوچ کر کچھ مطمئن بھی تھا کہ ہمارا ایسا کسی سے کوئی تعلق نہ تھا جو کسی تشویش یا مصیبت کا باعث بنتا۔ میں نے تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اس دوران سردبابا بھی آ گئے۔ مجھ سے مل کر وہ بہت مسرور اور مطمئن ہوئے۔ اول خیر کو بھی وہ میرے دوست کی حیثیت سے پہچانتے تھے۔

کافی دنوں بعد سردبابا کے ساتھ آج تفصیلی نشست جمی تھی۔ وہ بہت خوش تھے اور بار بار عابدہ کے حوالے سے میرا شکریہ بھی ادا کرتے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے ان کی بہو عارفہ کی طبیعت کا پوچھا۔ وہ بولے۔ "شہزی بیٹا! اللہ کا شکر ہے اس نے بڑا کرم کیا میری بیٹی پر... ڈاکٹر نے بہن کے جگر کی کامیاب پیوند کاری کر لی ہے اور کسی متوقع کمپلیکشن کے باعث اسے کچھ دن آبزرویشن اور بیڈ ریسٹ پر رکھا تھا۔ اب اسے اوکے قرار دے دیا ہے بس چند دنوں کی بات ہے، دونوں خیر سے لوٹنے والی ہیں۔"

"میری بھی عابدہ سے بات ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "وہ بتا رہی تھی کہ آپ خود ان دونوں کو لینے جائیں گے؟"

"ہاں، ارادہ تو میرا یہی ہے بلکہ میرا ایک طرح سے بزنس ٹرپ بھی پینڈنگ میں چلا آ رہا تھا۔ وہاں کے حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ التوا کا شکار ہوتا رہا۔ اب سوچا اسی بہانے ہی چلا جاؤں۔"

"آپ کب جا رہے ہیں پھر؟" میں نے پوچھا۔

"دو چار روز میں چلا جاؤں گا۔ اچھا ہوا تم آ گئے اب

انتقام

ایک امریکی دورانِ سفر ایک بار پر رکا۔ اندر اکا دکا گاہک ہی موجود تھے۔

اس نے بیئر کا ایک گلاس لیا۔ بارمین نے دو سینٹ کاٹ کے اسے ریزگاری لوٹائی تو وہ حیران رہ گیا۔

"اتنی سستی بیئر تو میں نے اپنی زندگی میں نہیں پی۔" مسافر نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "اور یہ سینڈوچ کتنے کا ہے؟"

"پانچ سینٹ۔" بارمین نے سنجیدگی سے کہا۔

مسافر کا سر چکرا گیا۔ ایسی برائے نام قیمتوں پر کوئی بار چل ہی نہیں سکتا تھا، اس نے پوچھا۔ "تم اس بار کے مالک ہو؟"

"نہیں، ملازم ہوں۔" جواب آیا۔

"مالک کہاں ہے؟"

"اوپر... میں اوپر بنے ہوئے ایک کمرے میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"وہ اوپر تمہاری بیوی کے ساتھ کیوں ہے؟"

"مجبوری ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ "میں ڈیوٹی ٹائم پر نیچے آتا ہوں تو وہ آرام کرنے کے بہانے اوپر چلا جاتا ہے۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے جواب میں، میں اس کا کاروبار تباہ کر رہا ہوں۔"

سوات سے محمود عباسی کی جوابی کارروائی

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شاید واقعی جلد نکل جاؤں۔"

"یہاں آپ کے کاروبار کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"جمال الدین میرا بہت پرانا اور قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ وہ بیک وقت میرا جی ایم بھی ہے اور پی اے بھی... بلکہ مشیر بھی۔ تم شاید جمال سے نہیں ملے ہو۔ دانی اور بچی تو اسے انکل کہتے ہیں۔ دونوں مانوس ہیں اس سے۔"

"جی، ملا تو نہیں ہوں جمال صاحب سے لیکن غائبانہ تعارف ہے میرا ان سے۔"

"شہزی بیٹا! اب یہ بھاگم دوڑی چھوڑو اور آرام سے میرے پاس رہو۔ عارفہ اور عابدہ بھی خیر سے جلد لوٹنے والی ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے تھمے پھر ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔

"شہزی بیٹا! میری بڑی خواہش ہے کہ میں خود تمہاری اور عابدہ کی بڑی دھوم دھام سے شادی کروں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے کئی سال پہلے بڑی محبت اور ..... چاہ سے اپنے اکلوتے بیٹے محمود کی کی تھی۔" اپنے مرحوم بیٹے کو یاد کر کے ان کا لہجہ ڈبڈبا گیا۔ بوڑھی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ سرمد بابا ایک ہمدرد اور عظیم انسان تھے۔ میری تو ان سے اطفال گھر میں بہت پرانی شناسائی تھی، اس وقت جب میں خود ایک بچہ تھا۔ آفرین ہے اس بوڑھے شخص پر جس نے اپنی اولاد کی خاطر سب کچھ کیا مگر ان کے سگے بیٹے محمود نے ان کے ساتھ کیسا سفاکانہ برتاؤ کیا تھا۔ انہیں گھر سے ہی بے دخل کر دیا اور سب کچھ بڑی چالاکی سے اپنے نام بھی کروا لیا۔ یقیناً اس میں محمود کی بیوی عارفہ کی بھی سکھائی پڑھائی کا دخل رہا ہوگا۔ مجھے یاد تھا۔ اطفال گھر میں جب پہلی بار سرمد بابا سے میرا سامنا ہوا تھا اور انہوں نے مجھے اپنے بیٹے اور بہو (محمود اور عارفہ) کی بے حسی کے بارے میں بتایا تھا تو مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔

بہرحال سرمد بابا کی شادی والی بات پر میں نے بھی ان کی دل جوئی میں کہا۔ "ہاں بابا! میں بھی آپ کے مرحوم بیٹے محمود کی طرح ہی ہوں۔ عابدہ بھی آپ کی بیٹیوں جیسی ہے۔ ہماری شادی آپ ہی اپنے دستِ مبارک سے کریں گے۔"

میری بات پر سرمد بابا کے بوڑھے چہرے پر مسرت و خوشی کے تاثرات امڈ آئے پھر بولے۔ "شہزی بیٹا! یقین کرو گے میری بات کا... میں اس وقت جس پر سب سے زیادہ اعتماد اور بھروسا کرتا ہوں... وہ صرف اور صرف تم اور عابدہ ہی ہو۔ تمہارے علاوہ میں عابدہ کا بھی دل سے مشکور ہوں۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "بابا! آپ ہمیں اپنی اولاد کی طرح بھی سمجھتے ہیں اور پھر شکریہ جیسے الفاظ کہہ کر مجھے شرمندہ بھی کر رہے ہیں۔"

میری بات پر سرمد بابا بے اختیار ہنس پڑے۔ "تم بھی ہر بات پکڑ لیتے ہو۔ ارے بھئی شکریہ ادا کرنا تو ہمارا فرض بنتا ہے۔" اس کے بعد ہم سب نے مل کر کھانا کھایا پھر میں اول خیر کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے اب ایسا لگتا تھا جیسے اول خیر کا ہی نہیں بلکہ میرا بھی آج سے بیگم ولا اور بیگم صاحبہ سے تعلق ختم ہو گیا تھا۔ اول خیر کے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے جو فرمان جاری کیا تھا، وہ نامناسب تھا۔ میرے خیال میں اس وقت بیگم صاحبہ سمیت ہم سب ہی حالتِ جنگ میں تھے۔ ان حالات میں بیگم صاحبہ کا اول خیر کو اپنے گروہ اور اپنے ٹھکانے سے بے دخل کرنا نامناسب تھا۔ یوں تو چودھری ممتاز صرف بیگم صاحبہ کا ہی نہیں ہمارا بھی دشمن تھا اور ہم اس جنگ سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے لیکن باوجود اس کے بیگم صاحبہ کے اس فیصلے سے میں بھی اب خوش نہ تھا۔

اول خیر نے مجھے سوچتا پا کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو کاکا؟"

"مجھے بیگم صاحبہ کا فیصلہ سخت ناگوار گزرا ہے۔ انہوں نے یقیناً کمیل دادا کے کہنے اور دباؤ پر ایسا کیا ہے۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"او خیر... نہیں کاکا! بیگم صاحبہ کے اپنے کچھ اصول ہیں۔ وہ خود بھی ان سے انحراف نہیں کرتیں مگر مجھے سب سے زیادہ فکر تمہاری ہے اور..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ میں نے قدرے چونکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر بولا۔

"اور کیا؟"

"مجھے تمہاری زیادہ فکر ہے کاکے۔" اس نے جیسے یک دم بات بنانے کی کوشش چاہی تو میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھ کے بولا۔

"میری فکر کرنے کی بھلا تمہیں کیا ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ ہو۔"

"او خیر... کاکا! میری جان تجھ پر قربان۔" وہ مخصوص لہجے میں یارباش انداز سے بولا۔ "مگر شہزی کاکا! تو بیگم صاحبہ سے تعلق مت توڑنا... تجھے ابھی شاید ان کی ضرورت پڑتی رہے گی۔"

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''بہت بڑی بات کردی تو نے اپنے شہزی کاکے سے اول خیر۔'' میں نے یک دم تلخ سی سنجیدگی سے کہا تو وہ بے چارہ میرے بدلے ہوئے لہجے پر پریشان سا ہو گیا۔ میرا چہرہ تکتے ہوئے بولا۔

''کیا ہوا کاکے؟ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے تجھ سے؟''

''تم اتنا عرصہ میرے ساتھ رہے ہو اول خیر، کیا اب بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکے؟ کیا تم مجھے اتنا ہی کمزور اور بے بس سمجھتے ہو کہ میں سہاروں کی تلاش میں رہتا ہوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ ابتدا میں چند وقتی اور مشترکہ مجبوریوں کے باعث مجھے بیگم صاحبہ اور اس کے آدمیوں سے اتفاق کرنا پڑا۔ مگر کیا تم نے دیکھا نہیں کہ...'' میں کچھ سوچ کر رکا پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''اب میں اور کیا کہوں؟ یہ پھر احسان جتانے والی بات نہ ہو جائے۔''

''اوخیر... کاکا! میں سب سمجھ رہا ہوں اور دیکھتا بھی آ رہا ہوں۔'' اول خیر بے جگر مسکراہٹ سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ کو بھی اس حقیقت کا بخوبی علم ہوگا کہ اس کے مقابلے میں تمہارے ان پر احسانات زیادہ ہیں۔ تم نے اپنے بل بوتے اور اپنے زورِ بازو پر بیگم صاحبہ کے لیے سب جو کچھ کیا ہے وہ کچھ ہم بھی... میرا مطلب ہے اس کے ساتھی بھی ان کے لیے نہیں کر سکے تم نے تن تنہا اپنی جان پر کھیل کر بیگم صاحبہ کو چودھری ممتاز خان اور اس کے خطرناک گرگے... بابن ڈکیت کے چنگل سے نہ صرف چھڑایا بلکہ اسے واصلِ جہنم بھی کر ڈالا لیکن کاکے! میرے کہنے کا مقصد کچھ اور تھا، یہ زندگی ہے اور زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں گزرتی، یہ ہمیشہ الٹ پلٹ کا شکار رہتی ہے، ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت انسان کو پڑتی رہتی ہے۔''

میں نے اس کی بات پر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اول خیر! میرے لیے تمہاری یاری ہی کافی ہے۔ پھر اللہ بھی تو میرے ساتھ ہے۔''

''بے شک۔'' وہ بولا۔ ''تیرے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے میرے سوہنے شہزی کاکا... پر یار! میں پھر بھی تجھ سے یہی کہوں گا کہ تو بیگم صاحبہ سے تعلق مت توڑ ابھی۔'' اس کی بات پر میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اول خیر! سچی بات ہے کہ مجھے تیرے سلسلے میں بیگم صاحبہ کے اس فیصلے سے سخت اختلاف ہے۔ اب میرا دل خراب ہونے لگا ہے ان سے۔ اب اس موضوع کو ادھر ہی دفن کر دے... مجھے تجھ سے ایک اور ضروری بات کرنی تھی۔''

''ہاں، بول کیا بات ہے؟'' وہ پورے دھیان سے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا تو میں نے اسے وزیر جان اور اسپیکرزم سے متعلق مزید تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اول خیر یہ سن کر سنانے میں آ گیا کہ میں نے اپنے باپ کا پتا لگا لیا تھا لیکن... اس کی میرے ساتھ بے حسی اور بے رخی اپنی جگہ نہ صرف برقرار تھی بلکہ وہ تو میری جان کا بھی دشمن بن بیٹھا تھا۔

''پھر وہ تیرا باپ نہیں ہو سکتا شہزی کاکے! یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔''

اول خیر نے فوراً تبصرہ کیا تو میں نے پُرسوچ لہجے میں اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے اس کی تائید میں کہا۔ ''ہاں اول خیر! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ وہ میرا باپ نہیں ہو سکتا مگر یار! میں تو اسے اپنے بچپن سے ہی دیکھتا آیا ہوں۔ مجھے تو اپنی سگی ماں کا بھی نہیں معلوم... میں نے تو سب کچھ اسے ہی اپنا سمجھا تھا۔ یار... پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وزیر جان میرا باپ نہیں ہو؟ اگر وہ میرا باپ نہیں تھا تو پھر وہ جب سے اطفال گھر چھوڑ کے گیا تھا تو غمگین کیوں ہوتا تھا؟ اپنے لختِ جگر کی جدائی میں پھر کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے؟ اگر وہ میرا باپ نہیں ہے تو پھر کون ہے میرا باپ؟ یہ آخر کیا راز ہے؟ میرا اصل باپ کہاں ہے؟'' میرا لہجہ رقیق اور جذباتی ہونے لگا۔ اول خیر مجھے غم زدہ پا کر اپنے بیڈ سے اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اپنا ایک ہاتھ میرے کاندھوں پر پھیلا کے بولا۔

''اوخیر... کاکے! تو تو ایک دم جذباتی ہو جاتا ہے، میرے یار۔''

''یہ محض جذباتیت نہیں ہے اول خیر۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ میری پہچان اور میری شناخت کا معاملہ بھی ہے۔ میں اپنی ذات کے تشخص کو اس وقت تک نامکمل ہی سمجھوں گا جب تک اس راز سے پردہ نہیں اٹھ جاتا کہ اگر وزیر جان میرا باپ نہیں تھا تو پھر وہ سب کیا تھا؟ اور کیوں تھا؟ ماں کا تو مجھے پتا ہی تھا کہ وہ سوتیلی تھی میری... تو کیا... تو کیا... اول خیر... میرا باپ بھی سوتیلا... مگر کیسے؟ یہ سب کیا ہے... کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں... اول خیر۔'' میں نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اول خیر کو میری اس اعصاب زدہ کیفیات پر یک دم تشویش ہونے لگی۔ وہ مجھے سنبھالا دینے کی کوشش کرنے لگا اور بولا۔

''شہزی کاکے خود کو سنبھال یار، ارے تو تو بڑے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مضبوط دل گردے کا آدمی ہے۔ میں ہوں تیرے ساتھ۔۔۔ اور وزیر جان بھی مرا نہیں ہے۔ تو نے اس کا ٹھکانا دیکھ ہی رکھا ہے ناں۔۔۔ جس وقت کہے گا جا کے اس کی گردن دبوچ کے ساری اگلی پچھلی حقیقت اگلوالیں گے اس کے منہ سے۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اپنی ذات کے تشخص اور شناخت کے معاملے میں میرے جیسا مضبوط اور آہنی اعصاب کا نوجوان۔۔۔ یہ سب باتیں سوچ کر ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا تھا مگر اول خیر کی دل جوئی سے بھی مجھے بڑی ڈھارس ملتی تھی۔ اس نے وہی کچھ کہا تھا جو کل سے میرے ذہن میں "پلان" تھا بلکہ میں نے تو ثریا سے ملاقات کے بعد ہی سے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ اب مجھے وزیر جان سے بھی دو دو ہاتھ کرنا پڑے تو میں پیچھے ہرگز نہیں ہٹوں گا۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے اول خیر سے کہا۔ "میرا دل بھی وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا ہے اول خیرا! پر مجھے اس کا ابھی تک موقع نہ مل سکا اور میں بدقسمتی سے یکے بعد دیگرے اور ہی حالات سے دوچار رہا۔"

"اب تو بے فکر ہو جا کاکے! ٹھکانا تو تو نے دیکھ ہی رکھا ہے۔ صبح تڑکے ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔ ساہیوال کی طرف۔۔۔" وہ بولا۔

"کرنا تو اب یہی پڑے گا مگر یار! اس معاملے میں کچھ ٹیڑھ ہے۔"

"کیسی ٹیڑھ؟" اس نے الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"وہ دنیا کے دکھاوے کے لیے بظاہر ایک صنعت کار ہے لیکن درحقیقت وہ کسی "اسپیکٹرم" نامی بین الاقوامی گروہ کا ایک اہم عہدے دار بھی ہے جسے ان کی اصطلاح میں "اسٹیشن چیف" کہا جاتا ہے۔ ثریا کے مطابق یہ اسپیکٹرم میں مقامی سطح کا ایک بڑا عہدہ گردانا جاتا ہے۔ پاور والوں کو بھی اس کی بھنک پڑ چکی ہے۔ وہ بھی اسے میرے ذریعے شکار کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہے۔ مگر پہلے میں وزیر جان کو شکار کرنا چاہوں گا۔ اس مقصد کے پیچھے میں نے ابھی میجر باجوہ صاحب کو بھی اس سلسلے میں زیادہ تفصیل نہیں بتائی تھی۔"

"یہ تو نے بالکل ٹھیک کیا شہزی کاکے!" اول خیر یک دم پرجوش ہوتے ہوئے بولا۔ "تو فکر نہ کر۔۔۔ نیند پوری کر لے۔۔۔ کل صبح ساہیوال کی طرف نکل جائیں گے۔" اس کی بات پر میں نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح نیند پوری کر کے ہم بیدار ہوئے۔ ناشتا ہم سب نے اکٹھے کیا۔ اس دوران سرمد بابا نے مجھے امریکا روانگی کے پروگرام سے بھی آگاہ کر دیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے گزارش کی تھی کہ ان کی اور عابدہ وغیرہ کی امریکا سے واپسی تک میں ان کی کوٹھی میں ہی مقیم رہوں۔ ناشتے سے فراغت کے بعد دونوں بچے اسکول روانہ ہو گئے جبکہ سرمد بابا دفتر جانے کی تیاری کرنے لگے کہ اچانک امریکا سے ان کی لینڈ لائن پر ایک کال موصول ہوئی۔ میں چونک سا گیا۔ وہ فون پر باتیں کرنے لگے۔ میں نے اندازہ لگایا وہ کسی سے بڑی سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کر رہے تھے۔ ان سے کچھ پوچھا جا رہا تھا۔ یہ گفتگو لگ بھگ نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ یہ ساری گفتگو انگریزی میں ہوتی رہی تھی جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ دوسری طرف سے کوئی غیر شناسا ہی سرمد بابا سے مخاطب تھا۔ ورنہ عابدہ یا عارفہ سے وہ اردو میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

گفتگو کے دوران میں نے سرمد بابا کی زبان سے باسکل ہولارا۔۔۔ کا بھی ذکر سنا تو مجھے ایکا ایکی ایک نامعلوم سی تشویش نے آن لیا۔ کیونکہ یہ نام میں عابدہ سے گفتگو کے دوران بھی سن چکا تھا جو امریکا کے کسی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتا تھا۔

رابطہ منقطع ہونے کے بعد سرمد بابا کے چہرے پر بھی مجھے کچھ الجھن آمیز تفکر کے آثار نمودار ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے بابا؟ کون تھا؟ آپ خاصے پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟" میں نے پوچھا تو وہ اپنی پریشانی کو زبردستی کی مسکراہٹ میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"کوئی خاص بات نہیں شہزی بیٹا! بس وہ ذرا امریکا میں آج کل کچھ حالات ایسے ہیں، نائن الیون کے واقعے کے بعد سے وہاں بعض غیر ملکیوں کے سلسلے میں کوئی نگرانی اور پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ تو ایک معمول کی کنفرمیشن عارفہ بیٹی اور عابدہ بیٹی سے متعلق مجھ سے کی گئی تھی۔ میں نے انہیں مطمئن تو کرنے کی کوشش کی ہے کہ عارفہ بغرض علاج وہاں مقیم ہے اور عابدہ اس کی دیکھ بھال کے سلسلے میں اس کے ساتھ ہے۔ باقی آپ لوگ بے شک ان کے کاغذات کی

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جانچ پڑتال کرسکتے ہیں، وغیرہ۔"

"مجھے عابدہ نے بالکل ہولارڈ نامی ایک امریکی انٹیلی جنس افسر کے بارے میں بتایا تھا۔" میں نے کہا اور پھر عابدہ سے اس سلسلے میں کی ہوئی گفتگو کے بارے میں انہیں بتادیا تو وہ ہنستے ہوئے بولے۔

"شہزی بیٹا! یہ امریکی تو اپنے باپ پر بھی شک کر سکتے ہیں ہم کیا شے ہیں۔ او کے انجوائے یور سیلف... میں چلتا ہوں۔" کہتے ہوئے سردبابا چلے گئے۔

اب میں اور اول خیر کوٹھی میں تنہا رہ گئے۔ ہمارا ارادہ پہلے روشن خان والی مہم کے لیے روانہ ہونے کا تھا مگر میں اس سے پہلے میجر باجوہ صاحب سے ایک ملاقات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنی ٹریننگ کو سردست موخر کرنے کے سلسلے کے علاوہ ان سے یہ پوچھنا تھا کہ کامران نے انہیں اب تک ایپکزم اور بالخصوص ثریا کے بارے میں کیا بتایا جبکہ اول خیر کا ارادہ تھا کہ ابھی میجر صاحب سے ملاقات کو موخر رہنے دیا جائے یہ بعد میں بھی ہو سکتی تھی، پہلے روشن خان اور وزیر جان کا معاملہ نمٹا دینا چاہیے۔

"نہیں اول خیر۔" میں نے اس کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے گہری متانت سے کہا۔ "مجھے ثریا کے سلسلے میں کنفرمیشن درکار ہے۔"

"وہ تو ہم وزیر جان کی گردن دبوچ کر بھی اگلوا سکتے ہیں۔"

"نہیں اول خیر، میجر صاحب سے ملاقات ضروری ہے، آؤ۔" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"او خیر کا کے، اتنی جلدی نہ دکھا۔ ذرا ہولا رہ۔ دشمن باہر ہماری گھات میں ہو سکتے ہیں۔ ذرا تھوڑے سے بدل کر ہی باہر نکلیں گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سردیوں کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ اوپر گرم چادریں ڈال لیتے ہیں۔ فی الحال یہی دیسی طریقہ اپنانا پڑے گا۔"

"یار کا کے! تو ادھر ہی فون پر باجوہ صاحب سے بات کیوں نہیں کر لیتا۔"

"نہیں اول خیر، ایسی باتیں فون پر نہیں کی جا سکتیں۔"

"او چل پھر آ کے لگ۔" وہ بولا۔

ہم نے گرم چادریں اوڑھ لیں اور پوری احتیاط کے ساتھ کوٹھی سے باہر نکل آئے۔ اگرچہ کوٹھی کے پورچ میں ایک گاڑی کھڑی تھی مگر میں دانستہ سردبابا کی کوئی گاڑی اس مقصد کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہم بڑی محتاط روی کے ساتھ کوٹھی سے نکلے اور فوراً ہی ایک ٹیکسی کر کے رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم دانستہ کوٹھی سے خاصی دیر سے روانہ ہوئے تھے اور لنچ کے کافی دیر بعد نکلے تھے۔

وہاں پہنچے تو میجر ریاض باجوہ کو اپنا ہی بے چینی سے منتظر پایا۔ اول خیر ان کے لیے اجنبی تو نہ تھا مگر وہ اس کے سامنے کوئی اہم بات کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہے تھے، وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔

یہ سادہ سا کمرا تھا جہاں سادہ سا ہی مختصر فرنیچر تھا۔ یہ وہی روم تھا جہاں کل ہم نے بیٹھ کر ون ٹو ون ملاقات کی تھی۔ درمیان میں گول لکڑی کی بغیر پوش کی میز تھی اور تین کرسیاں۔ ہم آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ باجوہ صاحب بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"شہزی! میں سمجھتا ہوں ملک اور قوم کو تمہارے جیسے دلیر اور پُرعزم نوجوان پر فخر ہونا چاہیے۔ تم شاید نہیں جانتے کہ چودھری ممتاز سے اپنی ذاتی جنگ کے دوران نادانستہ طور پر ایک بڑی اور نیک جنگ کے میدان کے شہسوار بن چکے ہو جس پہ پوری قوم، ملک اور امت مسلمہ کی بقا کا دارومدار ہے۔"

وہ ذرا تھمے۔ میں پورے دھیان اور غور سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ میں ابھی ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔

"شہزی! تم آج تک ممتاز خان کے ساتھ اس جنگ میں پوری دلیری کے ساتھ اور مستقل مزاجی سے ثابت قدم رہے ہو جو تمہاری اس کے ساتھ ذاتی جنگ ہے۔ مجھے بتاؤ تمہارا اپنا دل ملک و قوم کے لیے کتنا دھڑکتا ہے۔ تمہارا دل وطنِ عزیز، پاکستان کی سلامتی اور امتِ مسلمہ کے لیے کس قدر دھڑکتا ہے؟"

میجر باجوہ صاحب کے اس سوال پر میرے چہرے پر بڑی پُراعتماد اور پُرعزم مسکراہٹ ابھری تھی اور پھر میں نے اسی لہجے میں کہا۔ "میجر صاحب! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میرا بچپن اور پھر کسی حد تک لڑکپن ایک فلاحی ادارے میں گزرا ہے۔ ایک ایسا بچہ یا لڑکا جو ابتدا ہی اس طرح کے کڑے حالات سے دوچار رہے تو اس کے اندر فطری اور نفسیاتی طور پر کچھ صلاحیتیں وقت سے پہلے ہی بیدار ہونے لگتی ہیں۔ ان میں کچھ تو فطرت کا بھی حصہ ہوتی ہیں اور کچھ قدرتی طور پر ودیعت ہوتی ہیں پھر گزرتے وقت کے ساتھ

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ساتھ یہ سب دوآتشہ بن کر ابھرتی ہیں۔

"اطفال گھر میں جب تک اس کے اصل روح رواں ملک حاجی اسحاق صاحب زندہ تھے تو ہماری تربیت اچھے اور واضح خطوط پر کی جاتی تھی، اپنی تربیت پر میں زیادہ توجہ دیتا تھا۔ کافی حد تک اپنی پڑھائی مکمل کی۔ اخبارات کا بھی مطالعہ کرتا رہا۔ مختلف ٹی وی چینلز کے سنجیدہ تجزیاتی پروگرام وغیرہ بھی غور سے دیکھتا تھا۔ ملکی اور اسلامی تاریخی واقعات تو میری گھٹی میں رچے بسے ہوئے ہیں میجر صاحب! اور اگر میں ممتاز خان یا اس طرح کے دیگر سماجی درندوں سے برسرپیکار ہوں تو اس میں ایک جذبہ میرا یہ بھی تو بنیادی طور پر شامل رہتا ہے کہ میرے وطن کی سرزمین ایسے بدطینت اور جرائم پیشہ افراد سے پاک ہوجائے۔ رہی بات وطن عزیز کی تو میں نہیں سمجھتا کہ ہماری سرزمین پاکستان کا بوڑھا، جوان، مرد، عورت حتیٰ کہ بچہ تک اس کی محبت میں سرشار نہ ہو۔ وطن کی محبت تو ہمارے خمیر میں گندھی ہوئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلم امہ کا دکھ درد اور اتحاد ہماری گھٹی میں پڑا ہونا چاہیے اور ایسا ہے بھی۔ معاف کیجیے گا میجر صاحب! آپ نے شاید شہزاد احمد خان عرف شہزی سے ایک بہت ہی بچکانہ سوال کر ڈالا ہے۔" یہ سب باتیں کرتے ہوئے میری سانسیں تیز چلنے لگی تھیں، چہرہ جوش سے مرتعش ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے چمک سی مترشح ہونے لگی تھی۔ میجر صاحب نے اپنی کرسی سے اٹھ کر والہانہ جوش سے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا اور میرا کاندھا تھپک کر بولے۔

"ویل جنٹلمین! ہمارے اسی جوش... اسی نیک جذبات سے ہمارے دیدہ و نادیدہ دشمن آج بھی خوف زدہ رہتے ہیں کہ بے شک یہ قوم کچھ خارجی اور بیرونی سازشوں تلے وقتی طور پر خوابیدہ ضرور ہو جاتی ہے لیکن وقت پڑنے پر پورے تن من دھن کے ساتھ پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ایک قوم کی صورت بیدار ہونے میں دیر بھی نہیں لگاتی ہے۔"

میں دانت پر دانت جمائے خاموش رہا۔ ایسے میں میرے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میجر باجوہ صاحب مجھ سے کچھ خاص بات کہنے والے تھے۔ دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہونے کے بعد وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"شہزاد! ہمیں پوری امید تھی کہ کامران کے ذریعے ہمیں "اسپیکٹرم" سے متعلق بہت سی باتوں بالخصوص اس کے خفیہ مقاصد اور اس کی اصلیت کے بارے میں جان کاری حاصل ہوجائے گی لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا۔"

"کیا مطلب میجر صاحب؟" میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ "کیا کامران نے کچھ بتانے سے انکار کردیا ہے؟"

"نہیں۔" میجر باجوہ نے نفی میں سر ہلایا۔ "کامران جیسے دیسی ٹاؤٹ یا ایجنٹوں کو اسپیکٹرم محض ایک ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرتی ہے۔ انہیں کچھ زیادہ جان کاری نہیں ہوتی۔ وہ بس روپے پیسوں اور پرعیش مراعات کے لیے ان کے آگے سر جھکانے والے محض حکم کے غلام ہوتے ہیں اور وہ بس اسی میں ہی خوش اور مسرور رہتے ہیں لیکن کامران کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ اس کے اندر بہرحال یہ تجسس کلبلاتا رہتا تھا کہ آخر اس بات کا پتا تو چلنا چاہیے کہ آخر "اسپیکٹرم" ہے کیا بلا؟ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ جو بظاہر ایک بین الاقوامی مجرم تنظیم کا "شو آؤٹ" کرتی ہے لیکن وطن عزیز میں آخر اس کے وہ کون سے خفیہ مقاصد ہیں؟ بقول کامران کے اس نے اپنی سی محدود کوشش سے اور جو کام اسے تنظیم کے ذریعے سونپا جاتا تھا اس سے کامران کو ایک حد تک یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ اسپیکٹرم عالمی سطح کے ایسے معاملات میں ملوث رہتی ہے جس سے کسی ایک ملک کو نقصان اور دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں اسپیکٹرم کے اپنے کالے دھندے بھی چلتے رہتے ہیں مگر کامران نے ایک آخری بات بتا کر ہمیں چونکانے کے ساتھ تشویش میں مبتلا ضرور کردیا ہے وہ ہے۔ "بلیو تکسی..."

میجر باجوہ اتنا بتا کر خاموش ہوئے۔ میں اس عجیب نام پر ایک بار پھر الجھ کر رہ گیا۔ وہ آگے بولے۔ "اس کے بارے میں بھی کامران کچھ زیادہ جان کاری نہیں کرسکا تھا۔ بس یہی بتایا کہ بلیو تکسی نامی کسی خفیہ تنظیم کے افراد اسپیکٹرم کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ کرنا چاہتے ہیں بلکہ کوئی بعید نہیں کہ بلیو تکسی نے اسپیکٹرم کی خدمات لینے کے لیے اسے خاص اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے وطن عزیز میں ہائر کیا۔ ہم اس نام پر چونک گئے تھے۔ کچھ عرصے پہلے را نے پاکستان میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے "بلیک کیٹس" کو خفیہ کارروائی پر میدان میں اتارا تھا، جسے بری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا مگر افسوس "بلیک کیٹ" کے اصل مقاصد کیا تھے؟ یہ ہنوز جان کاری نہ ہوسکی تھی۔ اب اپنے طور پر ہمیں یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بلیو تکسی ہی درحقیقت

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"بلیک کیٹس" کا دوسرا نام ہے۔ اس بار یہ ایک نئے پینترے کے ساتھ میدان میں کودی ہے اور اپنے کسی خفیہ اور دیرینہ ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے دوبارہ وطنِ عزیز کی جڑوں میں نئے کیل کانٹوں کے ساتھ گھسنے کی کوشش میں مصروفِ کار ہے۔ ناکام بلیک کیٹس کا دوسرا اور نیا روپ دھارنے والی را کی یہ ناجائز "پہلوٹھی" یعنی بلیو تمسی آخر ایسے کیا مقاصد رکھتی ہے کہ اسے فوری طور پر پہلی ناکامی کے بعد نام بدل کر دوبارہ میدان میں اترنا پڑا؟ ہم نے بھی تہیہ کررکھا ہے کہ اس بار بلیک کیٹس یعنی بلیو تمسی کے مذموم خفیہ مقاصد کو بے نقاب کر کے ہی رہیں گے لیکن اسپیکٹرم مانع آتی ہے۔"

"وہ کس طرح میجر صاحب؟" میں نے فوراً کہا۔

"اسپیکٹرم پر ہاتھ ڈالنا اب کون سا مشکل کام ہے؟"

میری بات پر وہ ہولے سے مسکرائے پھر بولے۔ "اسپیکٹرم نے خود کو بین الاقوامی سطح پر ایک "معتبر ادارے" کی صورت میں ڈیکلیئر کررکھا ہے۔ بظاہر جس کا مقصد اپنے طور پر دنیا بھر کے تاریخی نوادرات کی حفاظت، نیز ایسے نوادرات بھی جو کسی ملک یا قوم کا تاریخی ورثہ ہوتے ہیں، گمشدگی یا برآمدگی کی صورت میں انہیں ان کے صحیح اور حق بجانب مقام پر رہنے دیا جائے، ان کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ اب تک یہ تنظیم یعنی اسپیکٹرم بے شمار چوری شدہ نوادرات برآمد کر کے انہیں ان کے اصل ورثا تک پہنچا چکی ہے۔ اس تنظیم کو دنیا کے بیشتر ممالک کی مالی اعانت بھی حاصل ہے اور اس کے ممبر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس پر خفیہ طور پر ہی ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہے ورنہ عالمی سطح پر وطنِ عزیز کی بدنامی کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک "معزز ادارے" کے خلاف کارروائی کرنے کی بنا پر ہمیں غیر مہذب کا ٹھپا لگا کر عالمی سطح پر بدنام کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "میجر صاحب! میرا خیال ہے کہ چودھری ممتاز خان اور وزیر جان "اسپیکٹرم" کے مقامی سطح پر کلیدی اور اہم عہدے دار معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین پورا یقین ہے کہ کم از کم یہ دونوں تو ضرور اسپیکٹرم اور اس کے بلیو تمسی کے ساتھ گٹھ جوڑ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہی ہوں گے۔ لہٰذا اگر ان دونوں اشخاص پر ہاتھ ڈالا جائے تو اسپیکٹرم جیسے بظاہر معزز ادارے کی قلعی کھولی جا سکتی ہے۔"

"تمہارا پوائنٹ قابلِ غور ہے ینگ مین۔" میجر باجوہ میری طرف دیکھ کر مخصوص مسکراہٹ سے بولے۔ "ہم بھی اسی نقطے اور لائحہ عمل پر غور کر رہے ہیں مگر کھلے بندوں کارروائی کے مقابلے میں خفیہ کارروائی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس میں دامن بھی بچانا پڑتا ہے۔ ورنہ اس کے نتائج برعکس بھی نکلتے ہیں۔ ایسی ہی ایک کارروائی کے دوران ہم بال بال الٹے نتائج کی زد میں آنے سے بچے تھے۔ مگر اس طرح ہمیں یہ فائدہ ہوا تھا کہ "اسپیکٹرم" کے بارے میں خاصی حد تک معلومات حاصل ہوگئی تھیں مگر بات وہی آتی ہے کہ کھلے عام کارروائی کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

"میں جاننا چاہوں گا میجر صاحب کہ اسپیکٹرم کے خلاف آپ کی پہلی خفیہ کارروائی میں آپ کو کیا معلومات حاصل ہوگئی تھیں؟" میں نے ان کی طرف دیکھ کر گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ میری لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی دلچسپی پر وہ بولے۔

"بشام جھنگڑی نامی ان کا ایک بہت فعال نمائندہ تھا۔ وہ ایک آرکیالوجسٹ تھا۔ اس کا تعلق اندرونِ سندھ کے علاقے لاڑکانہ سے تھا۔ بہت فرض شناس اور ذہین نوجوان تھا۔ اس نے اپنے شعبے کے حوالے سے کئی اچھے کام اور خدمات انجام دے کر اسپیکٹرم کی شہرت اور نیک نامی میں اضافہ بھی کیا تھا مگر جیسے ہی اسے اسپیکٹرم کے اصل اور درپردہ کالے کرتوتوں کی بھنک پڑی، وہ خاموشی کے ساتھ الگ ہوگیا۔ ہم اس کے آبائی شہر لاڑکانہ گئے تھے اس سے ملنے۔ اس نے ہی ہمیں اسپیکٹرم کی کسی قدر حقیقت اور اصلیت کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی۔ جس قدر وہ جانتا تھا اس نے ہمیں بتا دیا۔ نیز آئندہ بھی اس نوجوان نے ہماری مدد کرنے کے عزم کا کھلے دل سے اظہار بھی کیا تھا۔ یوں سمجھو تمہاری طرح وہ بھی ہمارا ایک اب گمنام ساتھی ہے جو درپردہ رہتے ہوئے مگر عام لوگوں میں گھل مل کر ہمارے لیے کام کر رہا ہے مگر بدقسمتی سے پچھلے کچھ عرصے سے وہ لاپتا ہو چکا ہے یا پھر دانستہ روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ تاہم اس سے جتنی معلومات ہوسکی تھیں اس کے مطابق اسپیکٹرم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے اور اس تنظیم کے ممبروں کو ضرورت کے وقت ایک ملک سے دوسرے ملک بھی بھیجا جاتا ہے۔"

"لیکن میجر صاحب! انہوں نے میرا مطلب ہے بلیو تمسی والوں نے اس ادارے پر اتنا تسلط کیسے قائم کیا ہوا ہے؟ مجھے تو یہ لوگ جرائم پیشہ اور انتہائی تربیت یافتہ لگتے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہیں۔ آپ کا اور میرا ان سے ٹاکرا بھی ہو چکا ہے۔" میں نے مداخلت کی۔

"سب بتا رہا ہوں تمہیں۔" وہ مسکرائے۔ "اس کے لیے مجھے سب سے پہلے تمہاری مثال دینا ہوگی۔"

"میری مثال؟" میں نے الجھی ہوئی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں شہزی! تمہاری مثال۔" ان کے ہونٹوں پر اسرار بھری مسکراہٹ بکھری۔ "تم اطفال گھر میں رہتے تھے اور جب تک ملک حاجی اسحاق صاحب مرحوم اس ادارے کے روحِ رواں تھے تو یہ ادارہ واقعی ایک فلاحی ادارے کے طور پر کام کرتا رہا لیکن جیسے ہی چوہدری ممتاز اور اس کے ایک پرانے گماشتے گلگل خان نے اپنے مذموم کاروبار اور گھناؤنے مقاصد کے لیے اس ادارے کو "یرغمال" بنالیا تو پھر سب کچھ بدل کر رہ گیا۔ پھر اطفال گھر ایک فلاحی ادارہ نہیں بلکہ جرم کا گڑھ بن گیا۔ بس اسی طرح جیوئش والوں نے اس عالمی ادارے اسپیکٹرم کو اپنے گھناؤنے مقاصد اور مذموم سازشوں کے لیے use کر لیا اور اسے 'ہائی جیک' کر ڈالا۔"

میں باجوہ صاحب کی بات پر ششدر سا رہ گیا۔ وہ بولتے رہے۔ "اسپیکٹرم بھی کوئی "دودھ کا دھلا" ادارہ نہیں تھا۔ اس کے اپنے بھی بعض ذاتی خفیہ مقاصد ہوتے تھے جو وہ منشیات و نوادرات کی آڑ میں ملک ملک کی خدمت کا بیڑا اٹھا کر در پردہ حاصل کرتا رہتا تھا یہ ایک ملک کے راز، دفاعی امور سے متعلق خفیہ باتیں اور ایسے دیگر اہم راز وہ دوسرے ملک کو مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔ اسی سلسلے میں اس ادارے پر امریکا ہی میں دوبار پابندی بھی لگی۔ اسے انڈر گراؤنڈ بھی ہونا پڑا مگر وہ عارضی ثابت ہوا۔ کیونکہ بڑی بڑی مضبوط عالمی حیثیت کی ملکی و غیر ملکی شخصیات اسے سپورٹ کرتی تھیں۔ اس تنظیم کا بانی بھی ایک امریکی ہی تھا جس کے انتقال کے بعد ایک دوسرے امریکی لولووشی نے اس کی باگ ڈور سنبھال لی۔ وہ خود امریکا کی انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیم کا ایک بڑا 'ڈان' رہ چکا ہے۔ اسے اسپیکٹرم کا سربراہ بنانے میں بھی ہیکل اسٹار اور جیوئش کا ہاتھ ہے۔ لولووشی اب خود ایک بڑی مضبوط اور پاورفل شخصیت بن چکا ہے۔ اپنے کالے کرتوت ڈھانپنے کے لیے اس نے کاروبار میں بھی ہاتھ ڈال رکھا ہے۔ وہ صیہونی سوداگروں کی ایک تنظیم "جیوش بزنس میوٹی" کی صدارتی کمیٹی کا ممبر بھی ہے۔ جیوئش کی مالی اور دیگر سپورٹ کے نتیجے میں لولووشی نے اسپیکٹرم کو نئے سرے سے اور جدید خطوط پر منظم کیا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر لولووشی جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ ہے اس لیے وہ بڑی بڑی مالیت کے سودے کرتا ہے جن میں ملک ملک کے کلیدی اور خفیہ عہدوں پر فائز عالمی شخصیات شامل رہتی ہیں۔ تاہم لولووشی نے اسپیکٹرم کو اب ایک خودمختیار ادارہ بنادیا ہے۔"

باجوہ صاحب یہ ساری تفصیل بتا کر خاموش ہو گئے تو میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"باجوہ صاحب! یہ ساری باتیں آپ کو یقیناً کامران سے ہی پتا چلی ہوں گی؟"

"ظاہر ہے۔" وہ بولے۔ "لیکن شہزی! حقیقت یہ ہے کہ کامران کو بھی ان باتوں کا علم نہ تھا۔ کیونکہ اسپیکٹرم کا کوئی بھی مقامی ایجنٹ سوائے دو مقامی عہدے داروں وزیر جان اور چوہدری ممتاز کے اسپیکٹرم سے متعلق اتنی حقیقت کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ ثریا بھی نہیں اور ثریا نے ہی کامران کا ضمیر جگانے کی خاطر اسے یہ سب بتایا تھا جبکہ ثریا نے خود اپنے توسط سے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اسپیکٹرم کے یہ اہم راز جانے تھے۔ پتا نہیں اب وہ بے چاری کس حال میں ہوگی مگر میں سمجھتا ہوں ثریا نے ملک و قوم کی خاطر بڑا کام کیا ہے اور قربانی دی ہے۔ شہزی! کیا تم ثریا کی اتنی بڑی قربانی کو ضائع جانے دو گے؟"

"ہرگز نہیں، باجوہ صاحب ہرگز نہیں۔" میں نے یک ترنت پُرعزم لہجے میں کہا۔ "ثریا بے چاری تو خود مجھے یہ ساری باتیں بتانا چاہتی تھی، میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ثریا ہی نہیں بلکہ اس کے چند اور بھی ہم خیال ساتھی ہیں، اب وہ کون کون ہیں یہ مجھے بھی معلوم نہیں لیکن میجر صاحب! خدا کرے ثریا ان کی قید میں ابھی تک زندہ ہو تو میں ضرور اسے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔"

"وٹس اے پوائنٹ۔" میجر باجوہ صاحب پورے جوش سے بولے۔ "ہم بھی یہی چاہتے ہیں کسی طرح ثریا کو ان کے چنگل سے آزاد کرا لیا جائے تو نہ صرف مزید سنسنی خیز انکشافات سامنے آسکتے ہیں بلکہ ثریا کے ذریعے اس کے ان ہم خیال ساتھیوں کا بھی پتا چل سکتا ہے جو ابھی تک اسپیکٹرم کے قابلِ اعتماد ایجنٹ سمجھے جاتے ہیں۔"

میں نے اپنے ذہن میں فوری طور پر ابھرنے والے ایک خیال کے تحت باجوہ صاحب سے کہا۔ "میرا خیال ہے ثریا زندہ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے زیرِ تشدد ہوگی کیونکہ وہ اس کے ذریعے اس کے ہم خیال ساتھیوں کا بھی

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نام اگلوانے کی کوشش کر رہے ہوں گے اور مجھے یقین ہے کہ ثریا اس سلسلے میں کبھی بھی اپنی زبان نہیں کھولے گی چاہے اس کی جان ہی چلی جائے۔" یہ کہتے ہوئے میں خود بے چین سا ہو گیا۔ جی میں تو آئی کہ باجوہ صاحب کو اپنے آئندہ کے اہم مشن کے بارے میں بتادوں لیکن میں نے سردست ابھی اس کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وزیر جان پر اب میرا ہاتھ ڈالنا اور بھی اہم ہو گیا تھا چنانچہ میں نے باجوہ صاحب سے اجازت چاہی اور وعدہ کیا کہ میں ثریا کو اسمگلرز کی قید سے چھڑانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاؤں گا، آپ میرے لیے دعا کرنا۔

باجوہ صاحب نے مجھے ٹریننگ پر جانے کا بھی زور دیا تھا۔ ظاہر ہے ابھی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ تاہم میں نے پُرعزم مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوتے ہوئے باجوہ صاحب سے کہا۔

"میجر صاحب! آپ بس میری کامیابی کی دعا کریں۔ اللہ نے مجھے اتنی صلاحیت دے رکھی ہے کہ میں بغیر کسی تربیتی عمل سے گزر کے اپنا نیک مقصد حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ کیونکہ میرا عزم میرا حوصلہ اور میرے حالات ہی میری تربیت گاہ اور میرا ہتھیار ہیں۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور سیکھ رہا ہوں۔"

"گڈ! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔" میجر ریاض باجوہ نے یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے بعد میں اول خیر کے ساتھ رینجرز ہیڈکوارٹر سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

باجوہ صاحب سے میری ملاقات خاصی سیر حاصل رہی تھی۔ جو باتیں انہوں نے مجھے بتائی تھیں، اس کا ذکر میں نے اول خیر سے نہیں کیا تھا اور نہ ہی ابھی کرنا چاہتا تھا۔ اسے میں نے صرف ممتاز خان سے جنگ کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ باجوہ صاحب سے میری ملاقات کیسی رہی تھی۔ اس کا میں نے اسے گول مول سا جواب دے دیا تھا۔

اب جلد از جلد وزیر جان کی گردن ناپنا ازبس ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے مجھے بہت سے سوالوں کے جوابات حاصل ہو سکتے تھے، وہ میرا اہم ترین شکار بن چکا تھا۔ مجھے ہر حالت میں اسے چھاپنا تھا اسے اپنے قابو میں کرنا تھا۔ اگرچہ جانتا تھا میں بھی کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے اور بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہوگا مگر وہ شہزی کیا جو خطروں سے پنگا لیے بنا چپکا بیٹھا رہے۔

لیکن وزیر جان والی مہم سے پہلے مجھے ڈپٹی روشن خان سے دو دو ہاتھ کرنا تھے، وہ بہت منہ چڑھنے لگا تھا یوں بھی مجھے اس سے بہت سے پرانے حسابات چکتے کرنا تھے۔ وہ میرے ساتھ "پولیس گردی" میں بہت آگے جا چکا تھا اور مجھے اس کی پولیس گردی کو آوارہ گردی سے نمٹنا تھا۔

جب ہم رینجرز کے ہیڈکوارٹر سے نکلے تو شام گہری ہونے لگی تھی۔ ڈپٹی روشن خان اپنی سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے جب وہ پولیس میں ایک معمولی افسر ہوتا تھا تو اپنی ذاتی رہائش گاہ میں رہتا تھا۔ ڈپٹی بن جانے کے بعد اسے خاصا بڑا سرکاری بنگلا الاٹ ہوا تھا۔ اگرچہ میں بعض قانونی پیچیدگیوں سے اپنے بہی خواہوں کی مدد سے جان چھڑا چکا تھا اور آزاد تھا اور اب میری یہ حرکت مجھے دوبارہ کسی نہ ختم ہونے والے خطرناک قانونی کٹھن چکر میں پھنسانے کا باعث بن سکتی تھی لیکن روشن خان نے مجھے جس راستے پر چلنے پر مجبور کیا تھا اس راتب خور سے اس انداز میں نمٹنا میرے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ وہ دنیا والوں کی نظر میں قانون کا رکھوالا بنتا تھا مگر اس نے اپنی حرکتوں سے بڑے بڑے مجرموں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ پولیس ہیڈکوارٹر کی عمارت کے عقبی بیرونی احاطے میں اس کا بنگلا تھا۔ وہاں باقاعدہ پولیس کی چوکیاں قائم تھیں جدھر ہر وقت آٹھ آٹھ گھنٹے کا پہرا رہتا تھا۔

رات مزید گہری ہونے کا انتظار کرنے کے بعد ہم اس طرف روانہ ہو گئے۔ سردی زوروں پر تھی۔ وقت سے پہلے اندھیرا چھا چکا تھا اور کہرآلود سخت سردی نے لوگوں کو گھروں کے اندر رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ سڑکوں پر سناٹا طاری تھا۔ میں اور اول خیر ایک رکشے میں سوار ہو کے پولیس ہیڈکوارٹر کے کسی نزدیکی مقام پر پہنچے۔ اس کے بعد رکشے والے کو فارغ کر کے آگے بڑھ گئے۔

ہماری یہ مہم بہت خطرناک اور رنگی تھی مگر رسک لیے بغیر ہمیں اپنے تین ساتھیوں کا کیسے پتا چل سکتا تھا۔ میں ڈپٹی روشن خان کو بتادینا چاہتا تھا کہ وہ اگر پولیس کی وردی میں ماورائے قانون اور اپنے اختیارات سے تجاوز ہو کر بڑے دھڑلے سے میرے خلاف ہر قدم اٹھا سکتا تھا تو میں بھی اسے اسی انداز میں جواب دینا چاہتا تھا۔

اول خیر اور میں نے سردی سے بچنے کے لیے بھاری شالیں لے رکھی تھیں۔ ایک مقصد چہرہ چھپانا بھی تھا۔ ہم مٹرگشت کے انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ مطلوبہ رہائش گاہ سے پہلے پولیس چوکی ہمیں دور سے ہی نظر آ گئی۔ اس راستے

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے ہٹ کر ہم ایک چوڑی گلی میں آگئے۔ یہاں گلی کے سرے پر ایک چھپر نما چائے خانہ تھا۔ جدھر مزدور طبقہ آ کر چائے پیتا تھا۔ ایک ٹیکسی اور دو تین رکشے بھی یہاں کھڑے دکھائی دیے۔ گلی سے نکلے تو ہم چوکی کراس کر چکے تھے اور یہاں سے تقریباً پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ہمیں روشن خان کی رہائش گاہ دکھائی دی مگر اس کے گیٹ پر نظر پڑتے ہی ہم بری طرح ٹھٹکے۔ گیٹ کھل رہا تھا اور اندر سے ایک کار برآمد ہورہی تھی۔ ہم دائیں جانب کے مکانوں کی دیوار کی آڑ سے تیز تیز قدموں سے ذرا آگے بڑھے تو ہمیں کار میں ڈرائیور اور اس کے برابر والی سیٹ پر ڈپٹی روشن خان عام شلوار سوٹ میں ملبوس بیٹھا نظر آیا جبکہ دو سادہ لباس میں پولیس والے بھی تھے جو پچھلی سیٹ پر براجمان تھے۔ کار نئے ماڈل کی چمچماتی ہوئی تھی، رنگ سیاہ تھا۔ یہ ہنڈا اکارڈ تھی۔

"اوخیر کا کا یہ کدھر چلا ہے؟"

"ہم آج ہی اس سے ارشد وغیرہ کے سلسلے میں ملے ہیں، مجھے لگتا ہے یہ ان تینوں کا کوئی بندوبست کرنے نکلا ہے۔" میں نے اندازہ قائم کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر کاکا! ہمارے پاس تو گاڑی نہیں۔ اس کا تعاقب کیسے کریں گے؟" اول خیر کو پریشانی سی لاحق ہونے لگی۔ کار دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی گیٹ سے باہر آ کر ذرا دیر کو رکی تھی اور گیٹ کا مسلح چوکیدار بڑی مستعدی کے ساتھ روشن خان کی کھڑکی کے قریب جھکا اس کی کوئی ہدایت وغیرہ سن رہا تھا۔

"آؤ اول خیر، جلدی۔" میں نے سرسراتے اور جوش بھرے لہجے میں کہا اور پلٹا۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔ ہم نے ایک رکشا لیا اور کسی فرضی جگہ کا نام بتا کر اس میں سوار ہو گئے۔ ہم نے رکشے والے کے ساتھ کیا کرنا تھا یہ میں اول خیر کے ساتھ طے کر چکا تھا۔ اپنے چہرے ہم نے نصف حد تک چھپا رکھے تھے۔ اس پر رکشے والا ذرا چونکا تھا مگر ہمارے رکشے میں سوار ہوتے ہی بھاؤ تاؤ کی دردسری سے بچنے کی خوشی میں اس نے فوراً رکشا اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دیا۔

سامنے مین روڈ آ گئی رکشا ذرا رکا۔ ٹھیک اسی وقت عقب سے وہی سیاہ کار گزری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کار کا ڈرائیور مستعد تھا۔ مجھے تسلی تھی، کار کے مقابلے میں ایک رکشا والے پر تعاقب کا شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مین روڈ پر آ کر کار فراٹے بھرنے لگی۔ رکشا اس کے پیچھے تھا۔ اول خیر نے پستول نکال کر اس کی نال رکشے والے کی گدی سے لگا دی اور غرایا۔ "یہ جو سامنے سیاہ کار گزری ہے، تجھے اس کا تعاقب کرنا ہے رفتار بڑھا۔"

رکشے والا بُری طرح بدک گیا۔ میں نے بھی اس کی گردن پر اپنے ہاتھ کا شکنجہ سہلانے کے انداز میں رکھتے ہوئے دھمکی دی۔ "سوچنے میں وقت برباد مت کرو ورنہ تجھے ادھر ہی ہلاک کر کے تیرا رکشا لے اڑیں گے۔"

"او جی میرا رکشا بھلا اس کار کا مقابلہ کیسے کرے گا؟" وہ خوف سے گھگیانے کے انداز میں بولا۔" تو اول خیر غرایا۔

"اوئے چالاکی نہ کر زیادہ... کوئی کار اور رکشے کی ریس کا مقابلہ نہیں ہو رہا ہے سمجھا تو۔"

"میرا خیال ہے یہ ایسے نہیں مانے گا اس کے سر میں گولی اتار کر رکشا لے اڑو۔" میں نے دانستہ رکشے والے پر خوف کا نفسیاتی دباؤ ڈالتے ہوئے اول خیر سے کہا تو میرا یہ حربہ کامیاب رہا۔ اس نے فوراً رکشے کی رفتار بڑھا دی تاہم پھر بھی گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔ "او جی! میں غریب آدمی ہوں کی لمبے رولے شولے میں نہ ڈال دینا۔"

"چلتے چلو اور جیسے کہوں ویسے ہی کرتے رہو تو کوئی رولا، سیاپا نہیں ہوگا۔" اول خیر نے کہا مگر باز وہ بھی نہ آیا، منمناتے ہوئے بولا۔

"پر تم اس کار کا پیچھا کیوں کر رہے ہو؟ کیا اسے ہلاک کرنا چاہتے ہو؟"

"اب اپنی رکشے جیسے آواز والی چونچ بند رکھ، ہم کسی کو قتل نہیں کرنا چاہتے، بس ان کا خفیہ ٹھکانا دیکھنا چاہتے ہیں۔" اول خیر دانت بھینچ کر بولا۔

مین روڈ پر رکشا دیگر رواں ٹریفک کے درمیان دوڑتا رہا۔ ہماری نظریں ڈپٹی روشن خان کی کار پر جمی ہوئی تھیں۔ دو تین سگنلز بھی آئے۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کار کسی کھلی سڑک یا مضافات کی طرف نہ نکل جائے ورنہ ایک رکشے میں تیز رفتار کار کا تعاقب مشکل ہو جاتا۔ شکر تھا کہ ایسا نہیں ہوا۔ کار بیس پچیس منٹ بعد مختلف موڑ کاٹتی ہوئی ایک نوتعمیراتی پروجیکٹ والے علاقے میں داخل ہوگئی۔ یہاں نوتعمیر شدہ بنگلے اور کوٹھیاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں کچھ آباد کچھ غیر آباد تھیں۔

کار جس سفید رنگ کے بنگلے کے گیٹ کے باہر رکی تھی وہ نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھا اور آس پاس بیشتر پلاٹ خالی پڑے تھے۔ چند ایک کوٹھی بنگلے نظر آتے تھے۔ ان میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یقیناً وہ بے مکین تھے۔ البتہ چوکیدار باہر چارپائی ڈالے ضرور نظر آرہے تھے۔

Scanned By Amir
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

رکشے والے کو ذرا دور روک کر ہم اتر گئے۔ اور اسے کرایہ مع کچھ دھمکیاں دے کر وہاں سے رخصت کر دیا۔ اسے کرائے سے زیادہ اپنی جان کی پڑی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ فوراً وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ میں اور اول خیر آگے بڑھنے لگے۔ ہم دونوں سیاہ شالوں میں ملفوف ہونے کی وجہ سے تاریکی کا ہی حصہ نظر آ رہے تھے۔

غیر آباد اور کچھ ادھوری رہائشی عمارتوں کے ڈھانچوں کی آڑ لیتے ہوئے میں اور اول خیر جب تک مطلوبہ بنگلے کے قریب پہنچے تب تک کار سوار اتر کر اندر داخل ہو چکے تھے۔ گیٹ ہنوز بند ہی تھا۔ صرف بغلی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک چوکیدار نما آدمی ہاتھ میں بڑا سا موٹا ڈنڈا سنبھالے اندر سے نکل کر باہر کار کے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔

”کاکا! کام آسان ہی نظر آتا ہے۔ چل پہلے اس ڈنڈے بردار سے نمٹتے ہیں۔“

اول خیر نے سرگوشی کی۔ میں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ڈپٹی روشن خان کو اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا، ویسے بھی اسے کیا معلوم تھا کہ کوئی اس طرح اس کی کار کا تعاقب کر کے یہاں پہنچ سکتا ہے۔

ہم دونوں چیتے کی طرح خاموشی سے رینگتے اور جھکے جھکے انداز میں ڈنڈا بردار چوکیدار کے دائیں بائیں بیک وقت گویا بجلی کی طرح کڑکے۔ میں نے اس کی گردن کے گرد اپنے آہنی بازوؤں کا شکنجہ کسا جبکہ اول خیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا فولادی دستہ اس کی کنپٹی پر جڑ دیا۔ وہ میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ میں اسی طرح اسے گھسیٹتا ہوا بنگلے کی شمالی دیوار کے پیچھے لے گیا اور وہاں ایک کونے میں اس کے بے سدھ وجود کو ڈالنے کے بعد اول خیر کے پاس پہنچا تو اس نے چوکیدار کا ڈنڈا تھام رکھا تھا۔ وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کاکا! یہ تو سنبھال لے۔ کام آئے گا۔“ میں نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے ڈنڈا لے لیا۔ بغلی گیٹ آدھ کھلا تھا۔ میں نے اندر جھانکنا چاہا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ مجھے ایک ہلکی چیخ سنائی دی تھی۔ بالکل بھنچی بھنچی سی چیخ تھی وہ.... کیونکہ اس کے فوراً بعد وہ چیخ گھٹ کر رہ گئی تھی البتہ کسی کی غراہٹ سے مشابہ بولنے کی آواز ابھری تھی، یوں جیسے کوئی دھمکا رہا ہو۔ یکلخت میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ آواز ڈپٹی روشن خان کی تھی۔ تب پھر بنگلے کا مرکزی دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ کے ساتھ کچھ لوگ نمودار ہوئے۔ مرکزی دروازے اور گیٹ تک بیس تیس گز کا احاطہ تھا جہاں پھلواری نظر آتی تھی، وہاں ایک دو الیکٹرک پول نصب تھے جن پر گلوب روشن تھے۔ ان کی روشنی میں ایک جیپ بھی کھڑی نظر آئی۔ مذکورہ دروازے سے کچھ افراد برآمد ہوئے اور میں انہیں دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے عقب میں موجود اول خیر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

نمودار ہونے والے افراد میں ڈپٹی روشن خان، اس کے دو سپاہی، باقی دو سادہ وردی میں اس کے کارندے تھے جبکہ باقی دو ہمارے ساتھی، شوکت حسین عرف شوکی اور اس کی بہن شکیلہ تھے۔ ارشد دکھائی نہیں دیا، مجھے تشویش ہوئی۔

”تت... تت... تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟ ہمیں مارنا چاہتے ہو؟“

میں نے شوکی کو خوف سے ہکلاتے کہتے سنا۔ مجھے اس کی حالت خاصی پتلی دکھائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ یہاں رہتے ہوئے بھیانک مناظر دیکھنے کے تجربات سے گزرا ہو۔ شکیلہ بھی خوف زدہ نظر آ رہی تھی، شوکی زیادہ مچل رہا تھا۔ دونوں کو سختی کے ساتھ دبوچ رکھا تھا، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ ڈپٹی روشن نے اچانک اپنی قمیص کے اندر چھپے ہولسٹر سے ایک پستول نکال لیا۔ میں اس کی لمبی نال دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ اس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ وہ شوکی کے چہرے کی طرف کر کے سفاکانہ غراہٹ سے بولا۔ ”اگر تم نے واویلا کرنا بند نہ کیا تو...“

اس کی آواز درمیان میں رہ گئی۔ شوکی کو شاید وقت سے پہلے اس سفاک حقیقت کا اندازہ ہو چلا تھا۔ انہیں ملک عدم روانہ کرنے کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ وہ آخری بار زور سے چلا... اور اپنا ایک بازو چھڑاتے ہی اس نے ڈپٹی کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ ڈپٹی روشن کو اس حرکت کی توقع نہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے شوکی کے ہاتھ میں اس کا سائلنسر لگا پستول آ گیا۔ مگر اسے فائر کرنے کا موقع نہ مل سکا، اس سے قبل روشن خان کے ایک کارندے نے اپنے پستول سے اس پر فائر کر دیا جو اسے دبوچے ہوئے تھا۔ نہ جانے کس وقت اس نے خطرہ بھانپتے ہی پستول نکال لیا تھا۔ بہت قریب سے گولی چلی تھی اور شوکی کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی کربناک تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Scanned By Amir
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

قسط نمبر: 15

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سیناگاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

دوسری چیخ شکیلہ کے حلق سے برآمد ہوئی تھی، اس چیخ میں دہشت، درد اور کرب تھا پھر وہ ہذیانی انداز میں بھائی کو پکارنے لگی۔ ''شش...... شوکی...... آہ...... تت...... تم ظالمو! ...... تم نے مم...... میرے بھائی کو...... آہ......'' فرطِ غم سے شکیلہ ڈھے گئی۔ میں یہ سب دیکھتا اور سنتا ہی رہ گیا حالانکہ یہ میری فطرت کے خلاف تھا۔ ایسے کسی بھی نازک موقع پر میرے جسم کا رُواں رُواں پھڑک اٹھتا تھا مگر یہ سب خلافِ توقع اور بہت تیزی سے ہوا تھا۔ شکیلہ صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی، میں سرتا پا خونِ جنوں میں لتھڑ گیا، قانون کے رکھوالوں نے جس طرح اپنی وردی کے طاقت کے نشے میں نہتے مظلوموں پر سفاکی و بربریت کا جو بھیانک کھیل کھیلا تھا، اس کے سامنے تو مجھے بڑے بڑے مجرم پانی بھرتے محسوس ہوئے، پل کے پل میرے دل و دماغ کی عدالت میں مجھے ارشد اور شوکی سفید کفن پہنے کھڑے دکھائی دینے لگے۔ تب میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا۔

''آج تیرا آخری وقت ہے ڈپٹی۔'' میں دانت بھینچ کر بڑبڑایا۔

''کاکے...... اندر کیا ہو رہا ہے؟'' معاً مجھے عقب سے اول خیر کی سرسراتی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے ہولے سے کہا۔ ''تیرے ڈپٹی نے آج اپنی موت پر دستخط کردیے ہیں اول خیر۔''

''او خیر......'' وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں گہری تشویش تھی۔ دفعتاً مجھے ڈپٹی روشن خان کے ایک آدمی کی آواز سنائی دی۔

''سر! یہ تو سب ختم ہوگئے، اب لڑکی کو کہاں لے کر جائیں گے۔ اندر ہی گلا دبا کر ارشد کی طرح اس کی لاش بھی کہیں دبا دیں گے۔''

دوسرے نے بھی اپنے ''صاحب'' کو یہی مشورہ دیا۔ ''پرویز ٹھیک کہہ رہا ہے سر! ایک عورت کو ٹھکانے لگانا کون سا مشکل ہے۔''

''کیا یہ مرگیا ہے۔ اس کو دیکھو تو سہی۔'' ڈپٹی کی مکروہ آواز ابھری۔ چند ثانیے کی اس دھڑکتی خاموشی میں مجھے ہر طرف خون اچھلتا دکھائی دینے لگا۔ آواز پھر ابھری۔ ''مرگیا ہے۔ میری گولی اس کے سینے کے پار ہوگئی۔'' یہ پرویز تھا۔ مختم ناگ کی طرح جیسے میری آنکھوں کی پتلیوں میں ڈپٹی کے بعد پرویز کی شبیہ ثبت ہوگئی تھی۔

''ٹھیک ہے اندر چلو، اس کی بہن کو بھی اس کے پاس پہنچا کر دونوں کی لاشیں دور ویرانے میں گاڑ دینا۔'' ڈپٹی روشن کی سفاک آواز ابھری اور میرے جیسا مضبوط اعصاب کا انسان بھی اس کھلی بربریت پر ایک لمحے کو تھرا اٹھا۔ شکیلہ صدمے اور خوف کے مارے بے ہوش ہوچکی تھی اور یہ لوگ اب اسے اندر لے جاکر بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتے تھے، اس بربریت پر میرے دل و دماغ کی کیفیت بپھرے ہوئے آتش فشاں جیسی ہونے لگی تھی۔ میرا دل خون کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے اپنے ہاتھوں پیروں سے شرارے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ جس بے رحمی اور سفاکی سے انہوں نے ہمارے دو ساتھیوں کو اپنی بربریت کی بھینٹ چڑھایا تھا، میں بھی انہیں ایسا ہی جواب دینے کے لیے بری طرح بے چین ہو کے تڑپنے لگا۔ بہ مشکل اپنی کھولتی ابلتی کیفیات پر قابو پائے ہوئے تھا۔

سن گن لینے کے بعد وہ لوگ واپس اندر کی جانب پلٹ گئے تھے، میں نے اول خیر کو قلیل ترین الفاظ میں سارے حالات سے آگاہ کیا اور اپنے خطرناک عزائم سے بھی پھر اندر قدم رکھ دیا۔ چوکیدار سے چھینا ہوا ڈنڈا میرے ہاتھ میں تھا، اگرچہ اول خیر کا دیا ہوا پستول بھی میرے پاس تھا۔ اول خیر نے میرے خطرناک جنوں خیز عزائم جاننے کے بعد کچھ کہنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ مجھے کسی مصلحت کوشی اور دور اندیشی کے فلسفوں میں الجھانا چاہتا تھا۔

''اول خیر! تم کو لوٹنا ہے تو لوٹ جاؤ۔ میرے کاندھوں پر قرض کا پہاڑ آن پڑا ہے۔ میں تمہاری کسی مصلحت کو آج نہیں سمجھ پاؤں گا۔'' میں نے غراتی ہوئی سرگوشی میں کہا، مجھے ہی نہیں اول خیر کو بھی میری جلتی بلکتی آواز بدلی ہوئی محسوس ہوئی تھی، وہ بولا۔

''خیر کا کا میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔ تُو تو ایک دم یاری باشی کا ناتا توڑنے پر تل بیٹھتا ہے۔ میرا کوئی بھی ایسا مشورہ میرے اپنے اور تیری بھلائی کے لیے ہوتا ہے۔''

''بس اول خیر! وقت کم ہے۔'' وہ میرا اشارہ بھانپ کر بولا۔ ''چل پھر کاکے میرے نال آ۔'' (تیرے ساتھ ہوں)

ہم نیم تاریک احاطے میں آگئے۔ ہر سُو گہری رات کا سناٹا طاری تھا۔ کسی کمرے کی کھڑکی سے روشنی پھوٹ رہی تھی، ہم دونوں تیزی کے ساتھ مرکزی دروازے کی طرف آگئے۔ خلافِ توقع دروازہ اندر سے بند نہ تھا۔ شاید باہر موجود چوکیدار پہ انہیں کچھ زیادہ ہی بھروسا تھا پھر داخلی آہنی گیٹ کو بھی بند ہی سمجھے تھے، اسی لیے اندر کا دروازہ بند

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو کرنا تھا وہ فوراً اور تیزی کے ساتھ کرنے کا متقاضی تھا۔ میں نے دھیرے سے دروازے کو دھکیل کر جھری بنا کے اندر جھانکا۔ یہ نشست گاہ ٹائپ کا بڑا سا کمرا تھا۔ اندر مجھے ڈپٹی روشن خان اپنے چاروں وحشی کارندوں کی معیّت میں دکھائی دیا۔ بے ہوش شکیلہ کو ایک صوفے پر ڈال دیا گیا تھا۔ دو افراد کو ڈپٹی نے حکم دیا کہ وہ جب تک شوکی کی لاش کو باہر موجود کار کی ڈکی میں ڈالیں۔ حکم سن کر وہ پلٹے، میں اور اول خیر فوراً پیچھے ہٹ کر ایک تاریک خلا میں سرک کے جا دبکے تھے۔ وہ دونوں نکلے، وہ شوکی کی لاش کو اٹھا کر گیٹ کی طرف بڑھے۔ وہاں ایک جیپ کھڑی تھی، وہ اس کا عقبی دروازہ کھول کر شوکی کی لاش کو اندر رکھنے لگے تھے کہ انہیں احساس ہی نہ ہو سکا میں کب ان کے عقب میں ابھر کر بجلی بن کر ٹوٹا، اول خیر میرے ساتھ پیش قدم تھا، میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کا زوردار وار ایک کے سر پر پڑا، اس کی کھوپڑی چٹخ گئی۔ اس کا ساتھی بری طرح ٹھٹک کر سنبھلا اور بس یہی موقع اسے مل سکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اول خیر کی زوردار لات اس کے سینے پر پڑی، وہ اچھل کر جیپ کے کھلے دروازے سے نصف اندر اور نصف باہر جا پڑا، میرا ڈنڈے والا ہاتھ دوبارہ حرکت میں آیا اور اس کی پیشانی پر پڑا۔ اس بار کچھ آواز پیدا ہوئی تھی۔ تسلی تھی ہمیں کہ اندر موجود کسی نے نہیں سنی ہوگی اور اگر سنی بھی ہوگی تو اسے معمول کی کھٹر پٹر سے تشبیہ دی ہوگی۔

یہ کام نمٹانے کے بعد ہم تیزی سے مذکورہ دروازے کی طرف بڑھے۔ اندر جھانکا، ڈپٹی نظر نہ آیا۔ وہ شاید کسی اندرونی کمرے میں چلا گیا تھا جبکہ اس کے دونوں کارندے صوفے پر بے سدھ پڑی شکیلہ کو گھورنے میں مصروف تھے، پھر میں نے ان میں سے ایک کو دوسرے ساتھی سے کہتے سنا۔

”چل یار! صاحب اندر آرام کر رہا ہے۔ اپنا کام نمٹا جلدی سے۔ اس کا بے ہوشی کی حالت میں ہی گلا دبا دے۔“

”یار! یہ زنانی تو بڑی مست مست ہے۔ کاش صاحب اِدھر نہ ہوتا، تو پہلے...... اس کے اُمڈتے شباب سے اپنی پیاس بجھاتے۔“

ان دونوں کی بوالہوسی نے میرے دماغ میں سرخ آندھیاں چلا دیں۔ اول خیر کو بھی اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ جب میں کسی ایسی وحشتِ جنوں خیز کیفیات سے دوچار ہونے لگوں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت شہزادہ احمد خان عرف شہزی کو دیوانہ وار آگ میں بھی کود پڑنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ پھر میں نے ڈنڈا پھینک کر پستول ہاتھ میں لے لیا اور دروازے کو دھڑ سے کھول کے اندر جا پڑا۔ وہ دونوں بری طرح ٹھٹکے۔ ایک لمحے کو تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آسکا، یہ ہوا کیا ہے۔ پھر جب تک انہیں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے سامنے یقینی موت کو کھڑا دیکھ چکے ہیں، میرے پستول کی نال نے آتشیں قہقہہ اگلا اور دوسری گولی اول خیر کے پستول سے شعلے کی طرح لپکی، دو دھماکے تلے اوپر گونجے اور اس میں ان دونوں شیطانی چیلوں کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ ایک سینہ پکڑے اور دوسرا کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا تھا۔ پھر میں ایک دروازے کی طرف لپکا جبکہ دوسرے دروازے کی طرف اول خیر نے اچھل کر دروازے پر ضرب لگائی اور گویا کسی طوفانی بگولے کی طرح اندر جا پڑا مگر میری وحشت خوں رنگ نظروں کی بے قراری کو قرار نہ ملا۔ مجھے وہ صفت ابلیس ڈپٹی روشن کہیں نظر نہ آیا۔ یہ کمرا کچھ چھوٹا بھی تھا اور بیڈ روم نظر آتا تھا۔ بہت سادہ فرنیچر تھا یہاں...... میں جس تیزی سے گھسا تھا، اسی تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ کمرے سے نکلا۔ دوسرے کمرے کی طرف لپکا جہاں اول خیر نے پیش قدمی کی تھی، وہاں پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ اول خیر کو میں نے ایک دوسرے دروازے پر زور آزمائی کرتے پایا۔ یہ شاید کچن کا دروازہ تھا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا تھا۔ بیڈ کے علاوہ صوفہ بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک میز کرسی بھی تھی، ٹھیک اسی وقت کمرے میں عجیب سی بو پھیلنے لگی۔ یہ گیس کی بو تھی، جو عام طور پر چولھے جلانے کی ہوتی ہے۔ میں ابھی تک نہ سمجھ پایا تھا کہ یہ معاملہ کیا تھا۔ اول خیر دور ہٹ گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، مجھے ڈپٹی کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خبردار! گولی چلانے کی بھیانک غلطی مت کرنا۔ ورنہ سب راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے۔“ اس کی آواز کچن کے اندر سے آتی محسوس ہوئی تھی، میں نے بھویں سکیڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے ہانپتی ہوئی پُرجوش آواز میں کہا۔

”یہ خبیث خطرہ بھانپتے ہی اندر کچن میں چھپ گیا تھا اور چولھے کا برنر کھول چکا ہے گولی مت چلانا کاکے...... اس حرام زادے سے نمٹ لیتے ہیں۔“

میں نے دیکھا کچن کے دروازے پر چوکھٹ سے ڈپٹی روشن خان کا مکروہ چہرہ جھانک رہا تھا۔ اس نے پستول کی نال ہمیں دکھاتے ہوئے اس بار براہِ راست مجھ سے

مخاطب ہو کے کہا۔ ''شہزی! مجھے اندازہ ہے تمہارے سر پر خون سوار ہے اس لیے میں اکیلا کیوں مروں؟ تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔''

''ڈپٹی! خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ تجھے یہ بچوں جیسی حرکت زیب نہیں دیتی۔'' میں غرایا۔

''کسی بھول یا جوش میں مت رہنا..... شہزی! بہت نقصان اٹھاؤ گے۔'' وہ مکروہ آواز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''تم سؤر...... تو تو خود کو بڑا بااختیار سمجھتا تھا، اب اس طرح چوہے کی طرح کچن میں جا گھسا ہے۔ تو نے بہت پولیس گردی دکھا دی ڈپٹی، بڑے بدمعاشوں سے تیرا پالا پڑتا رہا ہوگا مگر تو شاید یہ بھول گیا تھا کہ ایک شریف آدمی جب بدمعاشی پر اترتا ہے تو...... پھر اس سے بڑھ کر کوئی بڑا بدمعاش نہیں ہوتا، آج تیرا پالا ایسے ہی ایک شریف بدمعاش سے ہے، باہر نکل۔ ورنہ میری ایک ہی ٹھوکر کچن کا یہ معمولی دروازہ توڑ ڈالے گی۔''

''وقت ضائع مت کر شہزی! ورنہ اذیت ناک موت ہم سب کا مقدر بنے گی۔'' وہ بولا۔ اس کی آواز گھٹ رہی تھی، وہ آگے بولا۔ ''میرا دم گھٹ رہا ہے۔ گیس کچن سے نکل کر پورے کمرے میں پھیل رہی ہے۔ مرتے مرتے میری چلائی ہوئی اندھی گولی ہم سب کو بھسم کر ڈالے گی۔ وہ کھانسنے لگا۔ مجھے پہلی بار تشویش کا جھٹکا لگا۔ گیس واقعی کچن کے دروازے کے رخنوں سے کمرے میں بھرنے لگی تھی، اور ہمیں بھی گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی اول خیر بول پڑا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں فون کر چکا ہوں کسی وقت بھی میرے ساتھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تم سب دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اول خیر کے چہرے پر تشویش جھلکنے لگی۔

''چل کاکے! نکل' اس بدبخت نے مارو اور مر جاؤ والی خطرناک چال چلی ہے۔'' میں متذبذب تھا۔ دشمن دیرینہ اور صفت ابلیس دشمن کو اس قدر قریب اور قبضے میں پا کر چھوڑ دینے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر......

''چل کاکا! شکیلہ کو اٹھا، نکل...... وہ بدبخت گر گیا ہے۔'' اول خیر چیخا۔ ہم پلٹے۔ صوفے پر لیٹی شکیلہ کو ہوش آنے لگا تھا۔ پھیلنے والی گیس نے گھٹن کے باعث اسے بھی ہوش دلا دیا تھا۔ پھر بھی وہ عالم نقاہت میں تھی، میں نے اس کے نرم و نازک وجود کو اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا اور باہر کو لپکے...... ہمیں یقین تھا ہمارے کمرے سے نکلتے ہی روشن خان بھی فوراً کچن سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور گرتا پڑتا کسی مکان کے کسی نسبتاً کھلے گوشے کا رخ کرے گا۔ اس مردود نے ڈبل چال چلی تھی۔ ایک طرف ہمیں نکلنے پر مجبور کیا تھا دوسرے اس نے اپنے ساتھیوں کو فون کر کے فوراً وہاں پہنچنے کا کہہ دیا تھا کہ کہیں اس کے کچن سے نکلنے کے بعد کہیں قریب میں گھات لگا کر نہ بیٹھے ہوں مگر میرے تیزی سے کام کرتے ذہن رسا میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال کوندا، باہر آ کر میں نے شکیلہ کو اول خیر کے حوالے کیا تو وہ تشویش ناک حیرت سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

''تو کدھر چلا کاکے؟''

''میں اس خبیث کی چال اسی پر الٹنا چاہتا ہوں۔'' میں دانت پیس کر بولا۔ وہ مجھے روکتا رہ گیا مگر میں طوفانی بگولے کی طرح چلا اور جیسے ہی آہنی گیٹ کے اندر قدم رکھا، گولی چلنے کا دھماکا ہوا، پتا نہیں کس انداز میں گولی چلائی گئی تھی مجھ پر یہ میری قسمت ہے کہ گولی خطا گئی، میں جھک گیا اور زمین پر رینگتے ہوئے مرکزی دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت مجھے اس ملعون کی آواز سنائی دی۔

''خبردار شہزی! کوئی مہم جوئی دکھانے کی کوشش مت کرنا، میں تمہاری ایک ایک حرکت دیکھ رہا ہوں۔''

اس نے یقیناً کسی کھلے اور ایسے گوشے سے گولی چلائی تھی جہاں گیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ مکان کی اوپری منزل کی طرف چلا گیا ہو۔ اگر اس نے گیس بند نہیں کی تھی تو بھی یہ خطرہ اپنی جگہ موجود تھا کہ وہ دھیرے دھیرے پورے مکان میں زہر کی طرح پھیل جائے گی۔ اسی وقت مجھے اول خیر کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ گولی کی آواز نے اسے پریشان کر دیا تھا، میں نے چلا کر اسے گیٹ سے باہر رہنے کا کہا اور خود سینے اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف آ گیا اور کھلے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ نچلے پورشن میں گیس بھر چکی تھی، سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ میں نے گویا آتشِ جنوں میں ایک خوابیدہ جہنم کی جانب پیش قدمی کر ڈالی تھی، میں اٹھ کر زینے کی طرف لپکا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے باہر سے اول خیر کی دوبارہ آواز سنائی دی۔

''اوئے شہزی! واپس پلٹ آ...... وہ لوگ آ رہے ہیں۔'' اس کی بات پر میں ٹھٹکا۔ اس کی مراد یقیناً روشن کے ساتھی اہلکاروں سے تھی جنہیں وہ بدبخت فون کر کے بلا چکا تھا مگر میں اب کہاں پلٹنے والا تھا۔ اوپر کی جانب گھومتے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

زینے کی ایک دیوار کے موکھے سے میں نے نیچے کھڑے اول خیر سے کہا۔ ''اول خیر! اندر مت آنا، تم شکیلہ کو لے کر عمارت سے دور چلے جاؤ، مجھے اپنا کام کرنے دو۔''

''اوئے نہیں کاکا، تیری جان کو شدید خطرہ ہے۔'' وہ دل دوز لہجے میں بولا۔

''اول خیر! میرا کام مت خراب کرو۔ ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ شکیلہ کو لے کر مکان سے دور ہو جاؤ۔''

جواباً میں بھی چیخا۔ ٹھیک اس وقت اوپر سے مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ زینے میں بلب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک مجھے دیوار پر پستول بہ دست سایہ نظر آیا یقیناً یہ روشن خان تھا۔ وہ اوپر تھا، میں نیچے تھا۔ وہ موقع ملتے ہی مجھے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اسے میری جنوں خیز پیش قدمی کا اندازہ ہو چکا تھا۔ اور وہ مجھے کسی طرح نیچے دھکیلنا چاہتا تھا۔ گیس پھیلی ہونے کی وجہ سے ہم دونوں ایک دوسرے پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ میں نے اوپر اندھا فائر کر ڈالا۔ وہ شیطانی عفریت کی طرح واپس پلٹ گیا۔ میں تیزی سے زینے چڑھتا ہوا اوپر جا پہنچا۔ میرے تن وجود کا رُواں رُواں جوشِ غیظ کے مارے بری طرح پھڑک رہا تھا۔ اوپر نسبتاً کھلا گوشہ تھا۔ سامنے صرف دو کمرے نظر آتے تھے۔ ایک بالکونی تھی جو نیچے مکان کے اندرونی گوشے کی طرف بنی ہوئی تھی۔ وہاں ریلنگ تھی، میری لپکتی جھپکتی متلاشی نظریں تلاشِ غنیم میں تیزی سے حرکت پذیر تھیں۔ دفعتاً مجھے اپنے دائیں جانب جدھر الا بلا بکھرا ہوا تھا، ایک سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔ پھر گولی چلی، شکر تھا کہ میں پہلے ہی محتاط تھا۔ تاریکی میں چمکتے شعلے کی آتشیں جھپک محسوس کرتے ہی میں نے خود کو چھت کے فرش پر گرا دیا۔ ابھی میں زینے کے سرے پر ہی تھا۔ میں نے اس کباڑ پر تلے اوپر دو گولیاں داغ دیں۔ پھر نہ جانے اس نے مجھ پر کون سی بھاری شے دھکیل دی۔ وہ خالی ڈرم تھا جو مجھ سے ٹکرایا۔ نتیجے میں میرے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔ میں نے حواس مجتمع رکھے اور چھت کے فرش پر لیٹے لیٹے ڈرم کو لات رسید کر دی، ڈرم جس رفتار سے میری طرف آیا تھا، اسی رفتار سے دور جانے لگا تو میں بھی اس کی آڑ لیتا ہوا نہایت پھرتی کے ساتھ خود کو ڈرم کی طرح فرش پر لڑھکاتا چلا گیا اور جیسے ہی مجھے اس ملعون کا سایہ حرکت میں دکھائی دیا، میں نے اس پر ایک اندھی لات چلا دی۔ سب سے پہلے اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر لڑھک گیا اور پھر وہ خود...... میں نے زخمی شیر کی طرح خونخوار غراہٹ سے اس پر جھپٹا مارا۔ وہ موٹے بھاری بھینسے جیسا تھا۔ میں زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ میں نے اسے دبوچ لیا مگر وہ ایک ٹرینڈ پولیس آفیسر بھی رہ چکا تھا مگر ترقی نے اسے سہل بنا دیا تھا، میں نے اس کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز خارج ہوئی، اچانک اس نے اپنے پاؤں کا بھاری گھٹنا چلا دیا جو میری ناف پر پڑا۔ ضرب زوردار تھی مگر میرے سر پر سوار خوں ریزی کی آگ میں یہ تکلیف خاکستر ہو گئی، اس نے یک دم لڑھکنی کھائی اور مجھے خود پر سے نیچے گرا دیا پھر اٹھ کر دوڑا۔ وہ اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا، میں نے لیٹے لیٹے لات چلا دی۔ وہ الجھ کر گرا اور زینے کے سرے پر جا پڑا۔ میں نے بہ سرعت حرکت کی اور پستول چھت کے فرش سے اٹھا لیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر زینے کی طرف دوڑا۔ میں اسے بہ آسانی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''روشن خان! تو نے تو جیتے جی جہنم کا رخ کر لیا۔''

میں آگے بڑھا...... زینے سے نیچے پے در پے گولیاں برسا دیں۔ نیچے گیس پھیلی ہوئی تھی۔ ایک ہولناک آتشیں جھپک نے جیسے پل کے پل نچلے پورشن کو جہنم زار بنا ڈالا۔ مجھے روشن خان کے ہولناک انداز میں چیخنے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

''خس کم جہاں پاک۔'' کہتے ہوئے میں تیزی سے پلٹا۔ چھت کی عقبی سمت ایک سیوریج کے پائپ کا سہارا لیتا ہوا نیچے اترا، یہاں تاریکی اور جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ بنگلا نما مکان کی کھڑکیوں سے آگ کی زبانیں کسی ڈریکولا کی طرح لپلپا رہی تھیں۔ مجھے اول خیر کی فکر ہوئی، کہیں وہ آگ بھڑکتے دیکھ کر میری تلاش میں اندر نہ کود پڑے۔ لہٰذا میں اسے بلند آواز میں پکارتا ہوا گیٹ کی طرف دوڑا۔ وہ اندر داخل ہونے کے لیے ہی پر تول رہا تھا۔ شکیلہ پورے ہوش میں آ چکی تھی اور وہ اسے روکنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ میری آواز پر دونوں ہی چونک کر میری طرف پلٹے۔ اسی وقت مجھے دور سامنے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ اول خیر مجھے زندہ دیکھ کر میرے ساتھ لپٹ گیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ''او خیر، کاکے...... خدا کے لیے اس طرح ہاتھ سے مت نکل جایا کر۔''

''اپنی فطرت ہی کچھ ایسی ہے اول خیر! نکل چل اب...... وہ مردود جیتے جی واصلِ جہنم ہو چکا شاید اس کے ساتھی آ رہے ہیں۔ میں نے کہا پھر ہم تینوں نے مکان کی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عقبی سمت پھیلے ویرانے کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆ ☆ ☆

ہم مسلسل کئی پل تک دوڑتے خاصے دور نکل آئے۔ ہمارے عقب میں دور آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم اپنی بے ترتیب پھولی ہوئی سانسیں بحال کرتے رہے۔ پھر کچھ باتیں کرنے کا یارا ہوا تو میں نے اور اول خیر نے غم زدہ شکیلہ کو تسلیاں دیں۔ اس کے بھائی شوکی کی موت کا ہمیں بھی افسوس تھا۔ تاہم شکیلہ کو اس بات کی خوشی بھی تھی کہ میں نے اس کے قاتلوں سے بھی بڑا بھیانک انتقام لیا تھا۔ میں جانتا تھا شکیلہ کے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ قدرے سرد ہوئی ہوگی مگر بھائی کی موت کا دکھ اپنی جگہ تھا۔ اس بدنصیب نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے بھائی کو مرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا جگر پاش منظر تھا اس کے لیے جو یقیناً بھلائے نہیں بھول پاتا...... اس منحوس بنگلا نما مکان میں یقیناً سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ ہمارے خلاف وہاں کسی ثبوت کی باقیات کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ روشن خان جیسے راتب خور قانون کے رکھوالے جس طرح جرائم پیشہ افراد کے زرخرید بن کے...... راتوں کی تاریکیوں میں بے گناہوں کے ساتھ جعلی مقابلے اور ظلم و بربریت کا کھیل کھیلتے رہے تھے، آج وہ بھی اپنی ہی پولیس گردی کا شکار ہو کے گمنامی کی حرام موت مارے گئے تھے۔

ہم تینوں تاریک اور جھاڑ جھنکاڑ ویرانوں میں گرتے پڑتے بالآخر نیشنل ہائی وے پر آ گئے، یہاں سردست دور نزدیک تک کسی رکشے یا ٹیکسی کے امکانات نظر نہیں آتے تھے۔ البتہ لوکل مسافر بسوں کی آوک جاوک کے کچھ آثار نظر آتے تھے۔ ایک ایسی ہی مسافر بس میں سوار ہو کے ہم شہر پہنچے اور وہاں سے ایک ٹیکسی میں سرمد بابا کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ ملازم مجھے بخوبی جانتے تھے۔ اس وقت سرمد بابا اور ان کے دونوں پوتے پوتی دانی اور پنکی اپنے کمروں میں سو رہے تھے۔ میں نے ان کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور شریفاں کو انہیں جگانے سے منع کر دیا۔ البتہ شکیلہ کے لیے اسے ایک کمرے کے لیے کہہ دیا جبکہ میں اور اول خیر اپنے کمرے میں آ گئے۔ تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا تھا شکیلہ ہمارے ہی پاس بعد میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ایک کرب ناک دکھ سے دوچار تھی مگر بلاشبہ وہ مضبوط اعصاب اور حوصلے کی مالک بھی تھی، میری طرح حالات نے اسے بھی کم نہیں رگڑا تھا۔ بہت کچھ جاننے پہچاننے وہ بھی لگی تھی۔ نیند لینا ضروری تھا کیونکہ اگلے دن ہمیں وزیر خان اور ثریا کے سلسلے میں ایک اہم ترین مہم کا آغاز کرنا تھا۔ شکیلہ نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور اس نے کل کی ہمارے ساتھ جانے والی مہم پر شمولیت کا اظہار بھی کیا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں اور اول خیر اپنے بستروں پر جا لیٹے۔

اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر سرمد بابا سے ملاقات ہوئی۔ دانی اور پنکی اپنا ناشتا جلدی نمٹا کر ہمیں خدا حافظ کہہ کر اسکول چلے گئے۔ وسیع ڈائننگ لاؤنج میں ایل سی ڈی بھی نصب تھی، وہاں میری دھڑکتی نظریں جمی ہوئی تھیں۔ بریکنگ نیوز نشر ہو رہی تھی اور ملتان کے قدرے نواح میں واقع اس بنگلے نما مکان میں آتشزدگی، ڈپٹی روشن خان سمیت کچھ لوگوں کے جل مرنے کی خبریں اور فوٹیج وغیرہ دکھائے جا رہے تھے۔ سرمد بابا بھی چونکے۔ ہم ناشتا کر چکے تھے اور چائے پی رہے تھے، شکیلہ بھی موجود تھی۔

”ارے یہ وہی پولیس آفیسر روشن خان تو نہیں...... اوہو...... یہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟“ معاً سرمد بابا بولے۔ میں اور اول خیر خاموش تھے۔ میں اس کی حقیقت کے بارے میں سرمد بابا سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تاہم میں نے اس بات پر معنی خیز مسکراہٹ اول خیر کے چہرے پر ڈالی تھی۔ میری اس مسکراہٹ میں ایک متوقع فتح کی طمانیت تھی، یعنی ہمارا کہیں نام نہیں تھا۔ ایک اینکر پرسن البتہ جائے وقوع کی فوٹیج پر چلا چلا کر اسے روشن خان کی ذاتی دشمنی کا شاخسانہ قرار دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہی یہ کلپس چلا تھا۔ اس کے بعد اس کی جگہ دوسری بریکنگ نیوز نے لے لی تھی۔ جو کم از کم ہمارے لیے غیر اہم ہی تھی۔

شکیلہ پہلے بھی یہاں رہ چکی تھی۔ جب میں اسے چنی بائی اور جمعہ خان وغیرہ کے چنگل سے چھڑا کر لایا تھا اور سرمد بابا کی پناہ میں لا کے رکھا تھا۔ شکیلہ سے متعلق میں نے سرمد بابا کو بھی بتایا تھا کہ اس کے بھائی شوکی کا ایک جانکاہ حادثے میں انتقال ہو گیا اور اب یہ بے چاری اکیلی تھی۔ میرے حوالے سے سرمد بابا نے میری کبھی کسی بات پر اعتراض نہ کیا تھا بلکہ شکیلہ سے اب بھی شفقت سے ہی پیش آتے تھے، بلکہ شکیلہ اور سرمد بابا سمیت ہم اطفال گھر کے ہی تو سب ساتھی تھے۔ بقول آپا جی کے بوڑھے بھی بچے ہی ہوتے ہیں۔

ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی پھر ہم ناشتے کی میز سے اٹھ کر صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ زیادہ تر اپنی امریکا روانگی اور کاروبار کی ان کی غیر موجودگی میں دیکھ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بحال کی باتیں کرتے رہے۔ عارفہ اور عابدہ سے متعلق بھی بات ہوئی، شاید ہماری یہاں آمد کی وجہ سے سرمد بابا کو آج دفتر جانے کی جلدی نہ تھی معاً ان کے سیل فون کی گھنٹی گنگنائی۔

”ارے...... یہ اس وقت جمال الدین کیوں فون کررہا ہے۔“ وہ اپنے بیش قیمت سیل فون کے ڈسپلے پر نظر ڈالتے ہوئے خودکلامیہ بڑبڑائے پھر فون کان سے لگا لیا۔

”ہاں! بولو جمال! خیریت......؟“

جمال الدین کے بارے میں سرمد بابا مجھے بتا چکے تھے۔ یہ وہی آدمی تھا جو ان کا قابلِ اعتماد اور جی ایم، پی اے، بیک وقت سبھی کچھ تھا اور گھر میں انکل جمال کے نام سے معروف تھا۔ عارفہ کو بھی اس پر بہت اعتماد تھا۔

”کیوں......؟ وہ کیوں بضد ہے مجھ سے ملنے کے لیے؟...... میں اس خبیث کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔“

معاً سرمد بابا نے ناگوار لہجے میں کہا۔ میں قدرے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ریموٹ اٹھا کر ایل سی ڈی کا والیم صفر پر کردیا۔ خاموشی کے باعث سرمد بابا کے سیل سے ان کے جی ایم انکل جمال کی آواز آرہی تھی، تاہم گفتگو زیادہ نہیں سنی جاسکتی تھی۔ ہم خاموش تھے، بابا اس سے باتوں میں مصروف تھے۔

”تو ٹھیک ہے پھر...... آفس میں آگیا ہے تو بیٹھا رہنے دو اُسے میرے انتظار میں...... خود ہی دفعان ہوجائے گا۔“ وہ بدستور ناگواری سے بولے جارہے تھے۔ لگتا تھا جیسے انکل جمال انہیں کسی ایسے شخص سے ملانے کے لیے بضد تھا جن کو سرمد بابا سخت ناپسند کرتے تھے۔ بالآخر بولے۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر...... میں تو آج دیر سے ہی دفتر پہنچوں گا۔ ایک ضروری کام سے جانا ہے مجھے...... تم ایسا کرو اس سے کہو وہ اِدھر ہی آجائے پھر......“ بادلِ ناخواستہ یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کردیا اور ہولے سے بڑبڑائے۔

”بدبخت انا نجار۔“

”کون؟ انکل جمال؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے سرمد بابا کی طرف دیکھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”ارے نہیں، شہزی بیٹے! بے چارہ جمال تو میرا لائق اور بڑا فرماں بردار آدمی ہے، میں اس منحوس سیٹھ نوید سانچے والا کی بات کررہا تھا، مجھے یہ آدمی سخت ناپسند ہے مگر چند کاروباری مصلحتوں اور مجبوری کے باعث اسے کبھی کبھار نہ چاہتے ہوئے بھی بھگتنا پڑتا ہے۔“

”یہ ہے کون ویسے؟“ میں نے یونہی برسبیل تذکرہ پوچھ لیا۔ سرمد بابا بولے۔ ”ہے کوئی نو دولتیا قسم کا سیٹھ...... خود کو میرے بیٹے محمود (مرحوم) کا بڑا پرانا اور گہرا دوست کہتا ہے...... مجھ سے کئی بار میرے بیٹے کے حوالے سے کاروباری ڈیلنگ کا کہتا رہا ہے مگر میں جانتا ہوں ہر دو نمبر کام اس کی اٹھائی گیری کے لیے وقف ہوچکا ہے۔“

”تو پھر اس کے ساتھ کاروباری روابط رکھنے میں کیا مصلحت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کسی زمانے میں اس نے کسی اڑیسہ نامی کمپنی میں دس فیصد حصہ داری کی تھی، میرے بیٹے محمود کو بھی اس کی حصہ داری پر اکسایا۔ اس نے بھی شروع میں دس فیصد کے شیئرز خرید لیے۔ اس کے بعد جانے محمود کے سر پر کیا شوق چڑھایا کہ اب جانے اپنی ذاتی دلچسپی یا پھر کسی کے اکسانے پر ایک دم چالیس فیصد کے شیئرز لے لیے۔ معلوم نہیں اب کہ...... یہ کمپنی خسارے میں جارہی تھی یا پھر اس نے ایک دم عروج حاصل کرلیا تھا، تاہم ہمارا ابھی اس کمپنی میں اپنی ٹانگ پھنسانا ضروری قرار پایا۔ جس کے لیے ہمیں اس نابکار سیٹھ نوید سانچے والا کی ناقابلِ قبول شکل اور شخصیت کو گوارا کرنا پڑتا ہے۔“

سرمد بابا کی باتوں سے میرے دوررس وجدانی ادراک رکھنے والے ذہن میں ایک سوالیہ نشان ابھرا کہ اب بھی سرمد بابا کی اس سیٹھ نوید سانچے والا...... کے ساتھ اس قدر نفرت اور ناگواری کی وجہ اور ہی تھی۔ میری متجسس فطرت نے سرمد بابا سے استفسار پر اکسایا تو میں دانستہ ہلکی اور معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

”میرا خیال ہے بابا ایسی کوئی خاص وجہ تو نہیں...... اس سے آپ کی اس قدر خفگی اور نفرت کی، باقی وہ جو دو نمبر کام کرتا ہے وہ اس کا اپنا فعل ہے جس کا وہ خود ذمے دار ہے۔“

”تم بھی بڑے کائیاں ہو شہزی! میں تو تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔“ وہ بھی یک دم ہلکی ہنسی کے ساتھ بولے۔

”اطفال گھر کے تم سب سے زیادہ ذہین بچے تھے، خیر، تم نے بھی کچھ ایسا غلط اندازہ نہیں لگایا۔ سیٹھ نوید سانچے والا سے میری ناپسندیدگی کی اصل وجہ کچھ اور ہی ہے۔ اب تم سے کیا چھپانا۔“ کہتے ہوئے انہوں نے میرے ساتھ بیٹھے اول خیر کی طرف دیکھا۔ میں ترنت ان کی نظروں کا مطلب بھانپ گیا اور بولا۔ ”بابا! اول خیر کو بھی آپ ایک ہی 100 فیصد سمجھ سکتے ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔“

"جانتا ہوں میں۔" وہ ہولے سے مسکرا کر بولے۔ "پھر چند ثانیوں کی سوچتی ہوئی سی خاموشی کے بعد مختصراً بولے۔

"اس ناہنجار خبیث سیٹھ نوید نے عارفہ کے بیوہ ہوتے ہی اس کا رشتہ مانگا تھا۔"

یہ بتاتے ہوئے سرمد بابا کے چہرے پر ایسے تاثرات امڈ آئے جیسے انہوں نے کوئی کڑوی گولی نگل لی ہو۔

"اوہو......" اس بات پر بنا اختیار میرے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔ پتا نہیں سیٹھ نوید سانچے والا...... کے اس پروپوزل میں کوئی برائی تھی یا نہیں۔ مجھے اس کا کوئی خاص اندازہ نہیں ہو پایا تھا لیکن اس کی شخصیت بہرحال، بقول سرمد بابا کے دو نمبر تھی۔

میں نے سرمد بابا کی تائید میں کہا۔ "یہ تو واقعی سیٹھ نوید کی نامعقول سی ہی بات ہے جبکہ وہ دیکھ بھی رہا ہے کہ عارفہ آپ کی بہو کی حیثیت سے ہی رہ رہی ہے۔ بہرحال...... آپ اسے زیادہ گھاس ڈالنے کی کوشش نہ کریں جہاں تک کاروباری مجبوری کا تعلق ہے تو اس حد تک اسے بھگتایا جاسکتا ہے"

"ہاں بیٹے! بس اسی مجبوری کے باعث یہ کڑوی گولی نگلنی پڑتی ہے۔" سرمد بابا تلخ لہجے میں بولے۔

"بلکہ کاروباری مجبوری بھی کیا ہے بس اڑیسہ کمپنی والا معاملہ صاف ہوجائے تو میں اس سے ملنا تو درکنار، بات کرنا بھی پسند نہیں کروں گا۔" میں نے ان کی بات پر تائیداً سر ہلا دیا۔ دل میں یہ سوال پوچھنے کی خواہش ابھری تھی جو اچانک اس دوران میرے ذہن میں ایک تشویش کی لہر کے ساتھ ابھرا تھا۔ میں سرمد بابا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ کاروبار، جائداد تو ان کی اپنی ملکیت تھی تو کیا اب بھی ایسا ہی تھا؟ ایسا تو نہیں عارفہ جب امریکا سے صحت یاب ہوکر لوٹے گی تو ایک بار پھر...... اپنے نیک نفس سسر کو سیٹھ منظور وڑائچ سے سرمد بابا بنا دے گی؟

اس دوران باہر گیٹ پر متعین چوکیدار نے انٹرکام پر سرمد بابا کو سیٹھ نوید سانچے والا کی آمد کی اطلاع دی۔ انہوں نے اسے اندر لانے کا کہہ دیا اور ریسیور رکھ کے بڑبڑائے۔ "آ گیا وہ منحوس۔"

تھوڑی دیر بعد چوکیدار کے ساتھ جو شخص نمودار ہوا تھا، وہ مجھے کہیں سے بھی سیٹھ نہیں نظر آتا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا، ایک کالے موٹے اور گوندیل عمر رسیدہ آدمی کا تھا مگر میں متوقع سیٹھ نوید سانچے والا کو دیکھ کر چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ عمر تو خیر اس کی چالیس پینتالیس سال سے کسی بھی طرح کم نہیں دکھائی دیتی تھی، مگر بہرحال اس کی پرسنالٹی پُر وجیہہ تھی۔ دراز قد، چوڑے کاندھے، گورا رنگ مگر شکل و صورت اس کی وجیہہ شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ لمبوترا تھا، ناک آگے سے مڑی ہوئی تھی اور آنکھیں بالکل ہی چندی چندی سی تھیں، جن میں مکاری کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ بال کریو کٹ تھے اور کنپٹیوں کی طرف سے سفیدی جھلکتی تھی۔ بھویں بھی غیر معمولی طور پر اونچی تھیں اور صاف لگتا تھا کہ وہ بھویں اچکا اچکا کر باتیں کرنے کا عادی تھا۔ اس وقت بھی وہ ہمیں اور بالخصوص سرمد بابا کو دیکھ کر یہی کام کر رہا تھا۔ وہ بہترین تراش کے کوٹ سوٹ میں ملبوس تھا۔

بادل ناخواستہ سرمد بابا اس سے ملنے کے لیے صوفے سے اٹھنے لگے تو اس نے مکارانہ فروتنی سے انہیں بیٹھے رہنے کا کہا اور بابا نے یہی کیا بھی۔ پھر ہم سے ہاتھ ملایا۔ شکیلہ کو ہولے سے آداب کہا۔ پھر سرمد بابا کے اشارے پر وہ سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا۔ چند پل اس نے کچھ عجیب سی مسکراتی نظروں سے ہم تینوں کا جائزہ لیا پھر جیسے ہی سرمد بابا کی طرف دیکھا، انہوں نے گویا جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں، کیسے آنا ہوا؟" ان کے لہجے میں چھپی تلخی کم از کم مجھے تو صاف محسوس ہوئی تھی، سیٹھ نوید اسی مسکراہٹ سے بولا۔

"کچھ کاروباری معاملے کی بات کرنا تھی جو اہم بھی ہے اور رازداری کی متقاضی بھی۔" کہتے ہوئے اس نے دانستہ اشارۃً ہم پر بھی نظر ڈالی تھی۔ اس پر سرمد بابا نے اپنے ہاتھ کا خفیف سا اشارہ ہماری جانب کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ میرے اپنے ہی ہیں۔ تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔" اس پر وہ بولا۔ "ان حضرات کا تعارف؟"

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تم بات کرو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ تمہیں جمال نے بتایا ہوگا کہ مجھے کہیں ضروری کام سے پہنچنا ہے۔" سرمد بابا نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بہ غور سیٹھ نوید سانچے والا کے لومڑی جیسے لمبوترے اور چندی چندی آنکھوں والے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرمد بابا کے بہ دستور روکھے لہجے اور سرد رویے نے اسے بھی یک دم ایک تلخ سی متانت میں مبتلا کر دیا تھا پھر وہ ایک گہری سانس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

خارج کرتے ہوئے پہلے تو...... ان کے مرحوم بیٹے محمود کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا رہا پھر آخر میں کہا۔ ''کیا آپ کو اپنے بیٹے کے کاروباری معاملات کے بارے میں پورا علم ہے وڑائچ صاحب؟ یا پھر میرا مطلب تھا...... اگر عارفہ صاحبہ بھی موجود ہوتیں تو...... زیادہ مناسب ہوتا۔ چونکہ میں جانتا ہوں وہ بہ غرض علاج امریکا میں مقیم ہیں اس لیے میں نے سوچا سرِدست آپ سے بات کرلی جائے۔''

''میں سن رہا ہوں، کہتے رہو۔'' سرمد بابا بولے۔

''مجھے بیٹے کے تمام کاروباری معاملات کا اچھی طرح علم ہے جبکہ اس کی ابتدا بھی میں نے ہی کی تھی۔'' سرمد بابا کی بات پر میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ نوید سانچے والا کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''معاف کیجیے وڑائچ صاحب! میرے علم میں تو یہ بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود نے آپ کا سارا کچھ اپنے نام کروانے کے بعد آپ کو اوئنڈ ہوم......''

''یہ ہمارا ذاتی گھریلو معاملہ ہے۔ تمھیں اس میں دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم کام کی بات کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔'' سرمد بابا نے کسی قدر تلخی سے یہ کہتے ہوئے اس کی بات کاٹی تو جیسے سیٹھ نوید بھی بہ یک ترنت ادھار کھائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرے پوچھنے کا مقصد یہی تھا کہ یہ بات میرے علم میں بھی ہے کہ آپ کے بیٹے محمود کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ یعنی آپ کی بہو عارفہ بیگم ہی کے نام اب سب منتقل ہو چکا ہے۔ بے شک سنبھال اب بھی آپ ہی رہے ہیں مگر قانونی طور پر تو اب بھی وہی سب کی مالک ہیں۔'' اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا تو گویا میرا شبہ ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کا اب بھی سب کچھ ان کی بہو کے نام تھا۔ مجھے دوسرا جھٹکا اس بات کا محسوس ہوا تھا کہ سیٹھ نوید سانچے والا یہ سب جانتا تھا مگر اب وہ کہنا کیا چاہتا تھا۔

میں خاموش رہا۔ تاہم میں نے سرمد بابا کے چہرے سے غیر محسوس انداز میں دکھ کی ہلکی سی رمق ضرور اُمڈتے دیکھی تھی۔ وہ خاموش رہے۔ میں نے دیکھا۔ سیٹھ نوید مکاری سے مسکرایا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے دانستہ سرمد بابا کو ایک تلخ حقیقت کا احساس دلانا چاہا تھا اور جواب میں انہیں ایک نامعلوم سی دکھ بھری خاموشی میں پاکر گویا ایک اور چرکا لگاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے ویسے عارفہ نے بتایا تھا کہ......''

''دیکھو مسٹر سانچے والا! عارفہ ابھی تک میری بہو اور میرے بیٹے کی بیوہ کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے اس کی یہی حیثیت منظور ہے۔ لہٰذا مائنڈ یور لینگویج ...... اسے عارفہ کے بجائے مسز محمود کہہ سکتے ہو تم ...... سمجھ گئے۔'' سرمد بابا جیسے یک دم پھٹ پڑے۔ انہیں شاید سیٹھ نوید کا بار بار عارفہ کہنا برا لگا تھا۔ مجھے کچھ بدمزگی کا احساس ہونے لگا۔ خود مجھے بھی اس مکار آدمی سانچے والا پر اب غصہ آنے لگا تھا۔ وہ آخر اصل بات کرنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی بے پر کی کیوں ہانک رہا تھا۔ یقیناً اس میں کچھ مقصد پوشیدہ تھا۔

بہرحال سیٹھ نوید ہولے سے کھنکھار کر بولا۔ ''وڑائچ صاحب! دراصل یہ سب باتیں کرنے کا میرا ایک مقصد تھا۔ میں جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ کے علم میں کیا کچھ ہے؟ کیونکہ آپ کی بہو عارفہ...... سوری...... مسز محمود کے امریکا روانگی سے پہلے اس سلسلے میں ان سے میں ایک میٹنگ بھی کر چکا ہوں۔ سرِدست انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ البتہ میرے استفسار پر انہوں نے مجھے اپنے شوہر کے متعلق اتنا ضرور بتایا تھا کہ ان کی اچانک ناگہانی موت سے کچھ دن پہلے وہ خاموش اور پریشان رہنے لگے تھے، تو میرے دل میں ایک تشویش آمیز کھٹک سی پیدا ہوئی تھی، پھر مجھے ان سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہ مل سکا تو مجبوراً مجھے دباؤ کے باعث آپ سے بات کرنا پڑی۔'' وہ ذرا رکا تو سرمد بابا نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''دباؤ......؟ کیسا دباؤ؟''

میں نے محسوس کیا تھا کہ بار بار اپنے جواں مرگ بیٹے محمود کے تذکرے نے ان کی بوڑھی آنکھوں کے گوشے نمناک کروا ڈالے تھے۔

''میں اسی طرف ہی آرہا ہوں۔'' سیٹھ نوید سانچے والا نے کہا اور بولا۔ ''میں چاہتا ہوں...... بلکہ وہ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں کہ یہ معاملات ہمارے درمیان بہ خیرو اسلوبی طے پا جائیں۔ دراصل، اڑیسہ کمپنی کے کچھ شیئرز تھے آپ کے بیٹے کے پاس...... آپ کو معلوم ہے کہ وہ انہوں نے کہاں رکھے ہوں گے...... میرا مطلب ہے کسی بینک کے کسی لاکر میں؟''

''اس کا علم نہیں۔'' سرمد بابا نے سپاٹ لہجے میں کہا جبکہ میں اندر سے چونک گیا۔

''آخر یہ اڑیسہ کمپنی...... ہے کس بلا کا نام؟''

''یہ ایک تجارتی جہاز راں کمپنی ہے...... اس کا ہیڈ آفس برما کے دارالحکومت رنگون میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ خسارے میں جا رہی تھی۔ بورڈ مالکان نے اس کے شیئرز

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

فروخت کرنا شروع کر دیے تھے۔ یہاں مقیم مذکورہ کمپنی کے ایک نمائندے سے آپ کے بیٹے محمود اور میں نے بھی کچھ شیئرز خرید لیے تھے۔ دس، دس فیصد..... مگر بعد میں شاید آپ کے بیٹے کو کسی طرح اس بات کا اندازہ یا علم ہونے لگا کہ یہ کمپنی نہ صرف دھیرے دھیرے سنبھلنے لگی ہے بلکہ منافع بخش بھی ہو جائے گی لہٰذا اس نے چالیس فیصد کے شیئرز مزید خریدے۔ یوں اب آپ کے بیٹے کے پاس پچاس فیصد شیئرز موجود ہیں۔ اب ان کو موت کے بعد دیگر حصے دار کمپنی کے مختار بننے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام شراکت داروں کے پاس ان کے اصل کاغذات حصے دار موجود ہوں..... کیونکہ ان کاغذات کی عدم موجودگی میں وہ مختار نہیں بن سکتے۔" سیٹھ نوید سانچے والا اتنی تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔

"کاغذات والی بات سمجھ میں نہیں آئی؟" سرمد بابا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ سیٹھ نوید بولا۔

"مذکورہ کمپنی کی طے شدہ شرائط کے مطابق جو بھی کمپنی کا پچاس فیصد شیئرز ہولڈر ہو گا، کمپنی کے نصف مالکانہ حقوق کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔"

"اگر وہ کاغذات ہمارے پاس ہیں بھی تو پھر وہ ہم ان کے حوالے کیوں کریں؟" سرمد بابا نے سوال داغا۔ میں بغور یہ ساری گفتگو نہ صرف سن رہا تھا بلکہ سمجھنے کی بھی کوشش کر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں چھپی کسی گہری سازش کو بھی بھانپنے کی سعی کر رہا تھا۔ سرمد بابا کے سوال کے جواب میں سیٹھ نوید سانچے والا نے کہا۔

"پچاس فیصد مالکانہ حقوق کے ان اہم کاغذات والی شرط کے ساتھ یہ بھی شرط تھی کہ شیئرز ہولڈر کی موت کے بعد انہیں کمپنی کو واپس فروخت کر دیا جائے گا۔ اس وقت مذکورہ کمپنی شدید خسارے سے دوچار تھی، ہم محمود صاحب کے مشکور ہیں کہ درحقیقت انہوں نے اس گرتی ہوئی کمپنی کو سہارا دیا تھا۔"

"تو اب میرے بیٹے کے احسان کے بدلے میں اس کے شیئرز ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ یہ کہاں کا قانون ہے اور کون سا انصاف ہے؟"

سرمد بابا بولے تو ان کا چہرہ دھیرے دھیرے کسی اندرونی جوش اور دباؤ تلے سرخ ہو رہا تھا۔ اس میں تو خیر کوئی شک بھی نہ تھا کہ وہ ایک خالصتاً کاروباری شخص بھی تھے۔ شاید انہیں اب اس بات کی دل ہی دل میں خوشی بھی ہو رہی تھی کہ ان کے بیٹے نے دوراندیشی اور ٹھیٹ کاروباری سوجھ بوجھ کے مطابق درست وقت پر درست فیصلہ کیا تھا کہ ایسی کمپنی کے شیئرز خرید لیے تھے جس کے دس فیصد شیئرز خریدنے کے لیے بھی لوگ ہچکچا رہے تھے، مگر اب نہ جانے کس طرح یک دم از یہ کمپنی ترقی کی جانب گامزن ہو گئی تھی تو کچھ مکار اور ابن الوقت لوگ اس کے بیٹے کی موت سے فائدہ اٹھانا چاہ رہے تھے۔

"وہ لوگ ہیں کون؟ میری ان سے میٹنگ کرواؤ۔" بالآخر سرمد بابا نے سیٹھ نوید سے کہا۔

"ابھی وہ حصے دار خود کو گمنام رکھنا چاہتے ہیں۔" وہ بولا۔

"انہوں نے تمہیں اپنا نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے؟" سرمد بابا نے آنکھیں سکیڑیں۔

"ایسا ہی سمجھ لیں۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے ان کا قانونی مشیر بھی سمجھ سکتے ہیں۔"

"اونہہ..... قانونی مشیر....." سرمد بابا نے استہزائیہ کہا۔ پھر سوال کیا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ جنہوں نے تمہیں نمائندہ بنا کر میرے پاس بھیجا ہے اور وہ جو مطالبہ کر رہے ہیں، وہ اس پر حق بہ جانب ہیں۔" سرمد بابا کے اس سوال پر سیٹھ نوید بوکھلا سا گیا۔ مجھے اس کی تنگ سی پیشانی پر جھوٹ اور دغابازی کی جھلک صاف محسوس ہوئی. ..... وہ جلدی سے گویا بات بناتے ہوئے بولا۔ "بات یہ ہے کہ کمپنی اور اس کا جوائنٹ اکاؤنٹ ابھی تک آپ کے مرحوم بیٹے محمود کے نام ہے۔ وہ قانونی طور پر اب اس کمپنی کے واحد حصے دار ہیں..... میرا مطلب یہ ہے..... اور....."

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آپ بھی تو دس فیصد کے حصے دار تھے؟" سرمد بابا نے درمیان میں کہا۔

"ہاں، مگر میں نے اپنی زندگی کی بڑی غلطی کی تھی اور آپ کے بیٹے نے ایک عظیم عقل مندی، میں اپنا دس فیصد شیئر محمود کو فروخت کر چکا تھا۔ یہی نہیں، جن لوگوں نے بھی دس فیصد کے شیئرز لیے تھے، وہ سب آپ کے بیٹے نے خرید لیے تھے جبکہ دوسری طرف بھی یہی صورت حال رہی۔"

سیٹھ نوید سانچے والا سانس لینے کے لیے رکا پھر آگے بولا۔ "باقی کے پچاس فیصد شیئرز..... رنگون کے دو مسلم تاجروں نے اور ایک امریکی نے خریدے، اس امریکی نے آپ کے بیٹے کی طرح دوراندیشی سے کام لیا اور ان دونوں رنگونی مسلم تاجروں سے ان کے حصے کے شیئرز مہنگے داموں خرید لیے، اب پچاس فیصد شیئرز امریکی سوداگر کے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety

اور پچاس آپ کے بیٹے کے۔ وہ امریکی سوداگر بھاری آفر کے ساتھ آپ کے بیٹے کے نام کے بقیہ پچاس فیصد شیئرز خریدنا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ جوائنٹ اکاؤنٹ اور پارٹنرشپ کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب میں نے آپ کو مکمل کر ساری بات بتادی ہے تاکہ آپ کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔"

"مگر تم ابتدا میں دھونس جمانے والے انداز میں باتیں کررہے تھے کہ ہر صورت میرے بیٹے کے نام کے شیئرز اور کاغذات تمہارے مؤکلوں کے حوالے کردوں؟" سرمد بابا نے چبھتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مکارانہ فروتنی سے بولا۔

"وڑائچ صاحب! آپ ضعیف انسان ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اتنی بڑی کمپنی کا بار آپ اپنے بوڑھے کاندھوں پر اٹھا پائیں گے۔ میں راستہ سہل کرنا چاہ رہا تھا۔"

"میں اگر اتنا بوڑھا ہوگیا ہوتا تو سرمد بابا سے آج دوبارہ سیٹھ منظور وڑائچ کی صورت میں تمہیں یہاں بیٹھا نظر نہیں آرہا ہوتا۔" سرمد بابا نے اس کی چندی چندی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "بہرحال میں اپنے سیکریٹری سے بریفنگ لوں گا لیکن میں پچاس فیصد شیئرز سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔" پھر ذرا رک کر پوچھا۔

"کیا تم بزنس پارٹنر...... یعنی امریکی سوداگر کا نام بتا سکتے ہو اور وہ ہوتا کہاں ہے؟"

"میں اس سلسلے میں مسز محمود (عارفہ) سے بھی بات کرچکا ہوں۔ مگر ان کی ناسازیٔ طبیعت کے باعث تفصیل سے نہ کرپایا تھا۔ پھر اس وقت حالات بھی اور تھے۔" سیٹھ نوید نے سرمد بابا کے سوال کو شاید دانستہ صرفِ نظر کردیا تھا۔

"میں نے تم سے اپنے بزنس پارٹنر کا نام پوچھا تھا؟" سرمد بابا نے دوبارہ اپنے سوال کی طرف اشارہ دیا۔ وہ بھی چھوڑنے والے کہاں تھے۔

سیٹھ نوید ہولے سے کھنکھار کر بولا۔ "وہ نیویارک میں مقیم ہے، مگر آج کل رنگون آیا ہوا ہے۔ معاملہ طے ہوجانے کے بعد وہ رنگون والا ہیڈ آفس نیویارک شفٹ کرنا چاہتا ہے یا پھر ممکن ہے وہ وہاں اپنا کوئی آدمی تعینات کردے۔ اس کا نام لولوش ہے۔" اس نے بالآخر نام بتادیا۔

"لولوش..." مجھے یہ نام سن کر ایک زبردست جھٹکا لگا۔ اس کے لیے مجھے اپنی یادداشت کے خانے کو کھنگالنے کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ نام میرا شناسا تھا۔ مجھے اپنی حال ہی میں میجر ریاض باجوہ کے ساتھ ملاقات یاد آگئی جس میں انہوں نے "اسپیکٹرم" کے حوالے سے مذکورہ امریکی لولووش کا نام لیا تھا جو درحقیقت جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ اور ایک "ڈون" تھا۔ اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے اور مخصوص سربرآوردہ شخصیات سے حاصل کردہ اثرورسوخ کے علاوہ اپنی کارگزاریوں کو "شرافت" کے پردے میں چھپانے کے لیے اس نے امریکا کی ایک معروف صیہونی سوداگروں کی ایک تنظیم JBC (جیوش بزنس کمیونٹی) میں بھی بطور اہم کاروباری شخصیت ایک بزنس مین کی حیثیت سے بھی متعارف کروا رکھا تھا اور مختلف کاروباری دھندوں میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا۔ بقول میجر باجوہ صاحب کے وہ اسپیکٹرم کا سربراہ اور اس ادارے کو ہائی جیک کرنے والا واحد شخص لولووش ہی تھا۔ جس نے اپنے ذاتی مفادات اور اپنے کالے دھندوں اور سیاہ کرتوتوں کو وسیع کرنے کی خاطر درونِ خانہ بلیوتھسی والوں سے بھی گٹھ جوڑ کر رکھا تھا بلکہ ان کے وسیع تر خفیہ مفادات کے لیے مذکورہ دونوں انٹیلی جنس نے اسے سپورٹ کر رکھا تھا۔

میری نگاہ میں لولووش ایک خطرناک ترین بین الاقوامی مجرم...... ایک "ڈون" تھا۔ جبکہ سرمد بابا کے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہ تھا کہ وہ کس سے ٹکر لے رہے ہیں۔ اگر تو لولووش وہی تھا۔ مجھے اس کی تصدیق کرنا چاہیے تھی۔ مگر محتاط انداز میں یا پھر موقع محل کا انتظار کر کے مگر مجھے لگ رہا تھا کہ سرمد بابا ایک ٹھیٹھ کاروباری شخصیت ہونے کے باعث اس جہاز راں کمپنی میں پوری طرح دلچسپی رکھتے تھے، اور پچاس فیصد تو کیا کسی بھی صورت میں ایک فیصد شیئر بھی لوٹانے کے موڈ میں نظر نہیں آرہے تھے۔ اس سے متعلق آج اگرچہ سیٹھ نوید سانچے والا نے انہیں "اپ ڈیٹ" کیا تھا جبکہ باقی کی بریفنگ وہ اپنے سیکریٹری (انکل جمال) اور اپنی بیوہ بہو عارفہ سے حاصل کرنے کا پورا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

سرمد بابا نے اپنی طرف سے سردست بات ختم کردی۔ حالانکہ جس قسم کی گفتگو ان دونوں کے درمیان ہورہی تھی، اس کے مطابق سرمد بابا، عارفہ سے متعلق کئی ایک باتیں مستفسرانہ طور پر اس سے پوچھ سکتے تھے مگر وہ دانستہ اپنی بہو کا ذکر سیٹھ نوید کے سامنے کرنا پسند نہیں کررہے تھے۔ وہ روادار، قدامت پرست انسان تھے اور سیٹھ نوید کو تو وہ ویسے ہی پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا وہ اپنی بات کرچکے تھے، مگر سیٹھ نوید جیسے بات کو کسی نتیجے تک پہنچانے کی کوشش میں تھا لہٰذا رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ "سوچ لیجیے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گاڈرائج صاحب! ممکن ہو، ساری حقیقت جان لینے کے بعد آپ کے دل میں یہ شوق جاگ اٹھا ہو کہ مذکورہ کمپنی کے اب آپ مالک ہوں گے تو میرا آپ کو دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ ہوگا کہ اس خوش فہمی کو ذہن سے اپنے نکال پھینکیے گا کیونکہ لولوش جیسے انسان کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ بزنس کی دنیا کا وہ بہت بڑا ٹائیکون ہے۔ آج وہ ایک ملک میں ہوتا ہے تو کل دوسرے ملک میں۔"

"مجھے ہی نہیں، سرمد بابا کو بھی اس کے لہجے میں چھپی تہدید صاف محسوس ہوئی تھی، شاید میرے بھڑک جانے کے ڈر سے یا کسی اور وجہ سے سرمد بابا نے ضبط سے کام لیا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے فقط اتنا کہا۔ "تم اب یہاں سے جا سکتے ہو۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔" جواباً سیٹھ نوید سانچے والا اپنی چندی چندی آنکھوں سے سرمد بابا کو عجیب سی نظروں سے گھورتا ہوا خاموشی سے لوٹ گیا۔

"ذلیل...... کمینہ...... فریبی...... مجھے دھمکی دینے آیا تھا۔" اس کے جاتے ہی سرمد بابا نے خودکلامیہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"یہ آپ کو چکر دینے کی کوشش کررہا تھا شاید۔" میں نے ہولے سے مسکراتے ہوئے بابا کی طرف دیکھا۔ مجھے کاروبار کی کوئی سوجھ بوجھ تو نہ تھی تاہم پڑھا لکھا انسان میں بھی تھا۔ عقل سلیم جسے کامن سینس کہتے ہیں، وہ میری غیر معمولی حد تک تیز تھی پھر اطفال گھر جیسے ادارے میں جو کسی بھی یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، پھر اس کے روح رواں بھی حاجی اسحاق ملک مرحوم جیسے نیک اور اصول پرست انسان تھے، وہ جب تک زندہ رہے...... اطفال گھر پر یتیم خانے کی چھاپ نہیں لگنے دی اور جدید خطوط پر اسے چلاتے رہے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے وہاں رہتے ہوئے، پرائیویٹ طور پر بی اے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ نیز انگریزی بھی سیکھتا رہا تھا۔ پھر وہاں ٹی وی کے پروگراموں میں مجھے ڈراموں سے زیادہ خبروں، حالات حاضرہ اور ڈاکومینٹری کے پروگراموں میں دلچسپی محسوس ہوتی تھی۔ کچھ اپنی غیر معمولی فطری صلاحیتیں...... جو ہر انسان کو کسی نہ کسی شکل میں ودیعت ہوتی ہیں اور ان سے زیادہ حالات نے میرے شعور کو بڑی جلا بخشی تھی۔

"یہ مجھے کیا چکر دے گا" مجھے حیرت اس بات پر ہورہی ہے کہ عارفہ بیٹی نے مجھے ابھی تک اس کی تفصیل کیوں نہ بتائی؟"

وہ میری بات پر گومگو سے لہجے میں بولے۔ میں نے کہا۔ "ہوسکتا ہے ان کی نالج میں بھی آپ جتنی ہی آگاہی ہو، یہ تو اب آپ کو عارفہ بہن سے ہی پوچھنا پڑے گا۔"

"ہوں۔" میری بات پر انہوں نے ایک ہنکاری بھری۔ "امریکا تو میں دو چار روز میں روانہ ہو ہی جاؤں گا۔ کسی مناسب موقع پر عارفہ بیٹی سے بات کروں گا لیکن پہلے میں اپنے طور پر کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے شفقت بھرے لہجے میں بولے۔

"شہزی بیٹا! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ میں ذرا ایک ضروری کام سے نکلوں گا پھر باتیں ہوں گی۔"

میں نے شکریے کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اب ہم تینوں وہاں بیٹھے رہ گئے۔

"اوخیر۔" اول خیر نے ہولے سے کہا۔ "شہزی کاکے! یہ تمہارے بابا جی تو پکے بوڑھے شیر ہیں۔ نئے کاروبار کی سرمایہ کاری سن کے ان کی بوڑھی مگر شیر جیسی آنکھوں میں بڑی شکارانہ چمک ابھر آئی ہے۔ پر مجھے تو اس میں خطرہ ہی لگتا ہے۔ اسے وڈے چینڈے والا کام لگتا ہے۔" میں اس کی بات پر ہولے سے بے تاثر انداز میں مسکرایا۔ یہ حقیقت تھی اور خطرہ بھی کوئی معمولی نوعیت کا نہ تھا۔ اس کی خطرناکی کو صرف میں ہی جانتا اور سمجھتا تھا۔ اگر تو یہ وہی انٹرنیشنل گینگسٹر تھا تو لولوش ہشت پاؤدن کی حیثیت حاصل کرچکا تھا۔ اسے بیک وقت کئی لوگوں کی نہیں بلکہ کئی اہم خفیہ اداروں کی بھی سپورٹ حاصل تھی۔ جو اپنے اپنے مفادات کے لیے اسے استعمال کررہے تھے۔ مگر کاٹھ کا الو لولوش بھی نہ تھا۔ یہ مشترکہ مفادات کا کھیل تھا۔ لولوش اپنی سپورٹ چار دانگ براعظم پھیلا رہا تھا۔ سرمد بابا اسے یقیناً معمولی آدمی سمجھ رہے تھے یا صرف ایک امریکی بزنس مین...... مجھے اب سرمد بابا کی طرف سے سخت تشویش ہونے لگی۔ میں سردست خاموش رہنا چاہتا تھا۔ پہلے دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟

مگر میرے نزدیک توجہ طلب دو باتیں ہیں۔ اس سارے گھن چکر میں...... سیٹھ نوید سانچے والا کہاں فٹ ہوتا تھا؟ جو لولوش کا بظاہر نمائندہ بن کر آیا تھا اور پھر عارفہ یہاں کس خانے میں فٹ ہوتی تھی۔ تجسس آمیز کئی سوالات میرے دل و دماغ میں گردش کررہے تھے۔ بہرطور...... ہمیں ابھی اہم ترین مہم پہ نکلنا تھا۔ شکیلہ کو ابھی ہم نے کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نہیں بتایا تھا اور اسے وہیں رہنے کا کہہ کر میں اور اول خیر دیسی طریقے سے اپنا تھوڑا بہت حلیہ بدل کے سرمد بابا کی کوٹھی سے روانہ ہوگئے۔

اس بار ہم سرمد بابا کی رہائش گاہ سے ایک کار میں سوار ہوکر نکلے تھے۔ مجبوراً ہمیں اس بار ذاتی سواری کی ضرورت پڑی تھی۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ ملتان سے ساہیوال 84 کلومیٹر تھا۔ نان اسٹاپ تیز رفتار ڈرائیونگ سے یہ کم وبیش گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔

وزیر جان کی عالی شان ذاتی رہائش "کنال لاج" مین سٹی میں تھی اور وہ شہر کا خاصا امیر ترین اور پوش علاقہ کہلاتا تھا۔ وہاں سے ہائی وے سے نواح میں تقریباً پندرہ بیس کلومیٹر کے فاصلے پر اسپیکٹرم کے اسٹیشن چیف یعنی وزیر خان کا خفیہ ٹھکانا اسٹیشن فور تھا۔ وزیر جان کے ان دونوں ٹھکانوں پر میں قدم رکھ چکا تھا۔ کنال لاج میں کھیل دادا کے ساتھ اور اسٹیشن فور میں ثریا کے ساتھ۔ زیرو ہاؤس...... جو اسپیکٹرم کا بیس کوارٹر کہلاتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کی میرے دل میں تمنا شدت سے موجود تھی۔

اس وقت مجھے بیک وقت کئی مشن درپیش تھے۔ وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا اور اپنے بارے میں پوری صراحت کے ساتھ ماضی سے متعلق تفاصیل جاننا...... اس کے بعد ثریا کا سراغ لگانا۔ سیٹھ نوید سانچے والا...... نے بھی ایک نیا مسئلہ کھڑا کردیا تھا جس کی بھیانک خطرناکی سے بہرحال سرمد بابا آگاہ نہ تھے اور مجھے لگ رہا تھا، اب سرمد بابا کا گھرانہ بھی کسی لمبے ہولناک چکر میں پھنسنے والا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی ہو رہی تھی، جس نے مجھے خاصا پریشان کر ڈالا تھا۔ اب تک میں نے حتی الوسع یہی کوشش کی تھی کہ ان سارے چکروں سے سرمد بابا کو دور ہی رکھوں مگر میرے دیدہ و نادیدہ دشمن ہشت پا کی طرح میرے بہی خواہوں تک بھی پھیلتے جارہے تھے۔ مجھے خاموش اور پریشان دیکھ کر اول خیر مخصوص لہجے میں بولا۔

"اوخیر...... کاکا! کیا بات ہے، تجھے ایک عجیب سی چپ لگ گئی ہے؟"

کار بھی وہی ڈرائیور کر رہا تھا۔ میں اس کی برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں نے ایک گہری اور پُرسوچ ہنکاری خارج کر کے کہا۔ "ہاں یار! اول خیر...... بات کچھ ایسی ہی ہے نہ جانے کیا بات ہے میرے گرد مسائل اور مشکلات کے دائرے بنتے ہی چلے جارہے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ایک بھنور ہے جس کے اندر میں دھنستا ہی چلا جارہا ہوں۔ جیسے نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ لامتناہی ہے۔"

"اوخیر...... کاکا۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں جی دارانہ حوصلہ افزائی سے بولا۔ "یاد رکھنا کاکا! جو جتنے بڑے میدان کا شہسوار ہوتا اس پر آزمائشیں بھی اتنی ہی آن پڑتی ہیں۔ یہ قدرت کا اصول ہے لیکن قدرت کے اصول کی ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ انسان کو نوازتا تو اس کی اوقات سے بڑھ کر ہے مگر تکلیفیں اس کی سکت سے کم دیتا ہے۔ پریشان نہ ہو میرے یار! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ لینے دے تقدیر کو ہم سے کام...... کب تک لے گی۔ ہمت ہارنا تو نہ تو نے سیکھا ہے نہ میں نے۔"

اول خیر کی بات پر بے اختیار میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رقص کر گئی۔ اس کی باتوں میں، اس کے لہجے میں اور سب سے بڑی بات اس کی سنگت یاری میں جانے کیسا سحر تھا کہ آپوں آپ میرا دل بڑا ہونے لگتا تھا۔ حوصلوں کے بادبان بلند ہونے لگتے تھے۔ میں نے اسے سرمد بابا سے متعلق اپنی اصل فکر اور تشویش کی بات بتادی۔ جسے سن کر ایک لمحے کو اول خیر جیسا نڈر اور باحوصلہ انسان بھی دم بخود سا رہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

"اوخیر...... کاکا! اگر یہ بات ہے تو پھر واقعی میں ایک لما پواڑا (بڑا مسئلہ) پڑتے دیکھ رہا ہوں۔" مگر پھر دوسرے ہی لمحے مشورے دینے کے انداز میں بولا۔ "اگر یہ لولوش والی بلا وہی ثابت ہوئی تو تجھے سرمد بابا کو سمجھانا ہوگا کہ وہ اس معاملے یعنی اس سودے سے اپنا ہاتھ کھینچ لے۔ مجھے یقین ہے لولوش کی حقیقت جان لینے کے بعد بابا تیری بات رد نہیں کریں گے۔"

"ہاں۔" میں نے دھیرے سے سر کو اثباتی جنبش دی اور آگے بولا۔ "مگر ایک بات اور بھی ہے اول خیر۔"

"وہ کون سی؟" اس نے ایک لمحے کے لیے اپنی نظریں کار کی ونڈ اسکرین سے ہٹا کر میرے چہرے پر ڈالی تھیں۔

ہم ملتان روڈ پر سفر کر رہے تھے اور کافی آگے نکل آئے تھے، میں نے اول خیر سے کہا۔ "یار! سچی بات بتاؤں، مجھے تو سرمد بابا کی بہو...... عارفہ کی بھی شخصیت مشکوک محسوس ہونے لگی ہے۔" میری بات پر یقیناً اول خیر کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا تھا۔ اس کے کہنے کا انداز اس بات کا غماز تھا وہ بولا۔ "اوخیر...... کیا مطلب کاکے؟ کیا پھر کوئی نوا پواڑا......؟" اس کے انداز پر بے اختیار میں ہنس دیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے کھنڈی ہوئی متانت سے بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ عارفہ، سرمد بابا کی سادہ مزاجی اور محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے اور بابا کی جذباتی کمزوری بن کر اپنا مطلب نکال رہی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں کاکا؟" اول خیر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اول خیر! سرمد بابا دنیا کے سامنے سیٹھ منظور وڑائچ ہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ درحقیقت وہ اب بھی سرمد بابا ہیں لیکن بدقسمتی سے سرمد بابا کو اس تلخ حقیقت کا اندازہ نہیں۔"

"او خیر...... کاکے! تو کیا کہنا چاہتا ہے؟" اول خیر اب بھی نہیں سمجھا تھا۔ حالانکہ سرمد بابا اور سیٹھ نوید سانچے والا کی گفتگو وہ بھی سن رہا تھا۔ ممکن تھا اس کی توجہ نہ ہو۔

"اول خیر! اب بھی سب کچھ عارفہ نے اپنے ہی نام رکھا ہوا ہے۔ کاروبار... سے متعلق معاملات، کوٹھی، جائداد اور بینک بیلنس...... حالانکہ یہ سب ابتدا سے ہی سرمد بابا کا ہی تھا۔" میں نے اول خیر کو ایک بار پھر سرمد بابا کے ماضی سے متعلق اپ ڈیٹ بھی کر دیا۔

"ان سب باتوں کا اندازہ مجھے سیٹھ نوید سانچے والا کی باتیں سن کر ہوا تھا۔ اب مجھے ڈر لگتا ہے، مطلب نکل جانے یعنی عارفہ کی صحت یاب واپسی کے بعد کہیں بے چارے سرمد بابا ایک بار پھر عضوِ معطل کی طرح کسی کونے میں نہ پھینک دیے جائیں، میں نے بھی اس وقت تہیہ کر لیا کہ اگر دوبارہ ایسا ہوا تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ کیونکہ سرمد بابا نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے۔" اول خیر نے میری بات پر تائیداً اپنا سر ہلایا تھا۔

باقی سفر خاموشی سے تمام ہوا۔ ساہیوال پہنچ کر میں نے اپنی کار کا رخ اس پوش علاقے کی طرف کر دیا تھا جدھر کنال لاج نامی کوٹھی واقع تھی۔ وہاں مجھے سناٹے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ کار تھوڑی دور کھڑی کرنے کے بعد میں نے اول خیر کو کار میں محدود رہنے کا کہہ کر خود مٹرگشت کے انداز میں چلتا ہوا کنال لاج کے قریب آ کر اس کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے تھوڑا بہت اپنا حلیہ بدل رکھا تھا کہ فوری طور پر پہچان نہ لیا جاؤں۔ مجھے یہاں وزیر جان کی موجودگی کا کچھ زیادہ وثوق نہیں تھا۔ کیونکہ بقول ثریا کے وزیر جان کے اسٹیشن چیف بن جانے کے بعد اس کا زیادہ تر وقت اب اسٹیشن فور والے بنگلے میں گزرتا تھا جو درحقیقت اسپیکٹرم کا ذیلی ٹھکانا بھی تھا۔ وزیر جان کے علم میں یقیناً یہ بات تھی کہ میں اس کی یہ کنال لاج والی کوٹھی دیکھ چکا ہوں۔ ممکن ہے اس کے ذہن میں اب بھی یہی مغالطہ ہو کہ مجھے اس کے اسٹیشن فور والے ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ تاہم وثوق سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

بادی النظر میں کوٹھی میں "آبادی" کے وہ آثار محسوس نہیں ہوئے جس کی محتاط توقع لے کر میں یہاں آیا تھا۔ میں واپس پلٹا اور کار میں آن بیٹھا۔ اس بار کار کا اسٹیئرنگ اول خیر نے سنبھال لیا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے کار آگے بڑھا دی۔ ہائی وے پر آتے ہی کار ایک بار پھر فراٹے بھرنے لگی۔ اسٹیشن فور والے بنگلے کا محل وقوع اور وہاں تک جانے والا راستہ مجھے ازبر تھا۔ پندرہ بیس کلومیٹر بعد میں نے اول خیر کو کار سڑک کے دائیں جانب موڑنے کا اشارہ کیا۔ ساہیوال کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔ یہ بھی گنجان آباد علاقہ نظر آتا تھا جبکہ اسٹیشن فور کی عمارت یہاں سے قدرے مضافات میں نسبتاً الگ تھلگ مقام پر تھی، اگرچہ وہاں بھی پختہ و نیم پختہ مکانات اور گھر نظر آ رہے تھے، اسٹیشن فور سے پہلے ہم نے کار دانستہ طور پر ایک قریبی آٹو کار مکینک کی گیراج میں لے جا کر روک دی اور مستری کو اس کی معمول کی ٹیوننگ وغیرہ میں مصروف کر دیا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔ دن کا ایک بج چکا تھا۔

اب مذکورہ عمارت ہم سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ میں دوسری بار یہاں آیا تھا۔ اب مجھے یہاں ایک بورڈ لگا نظر آیا، دو چھوٹے بڑے سائز کی گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دیں۔ ایک دو آدمی بھی دکھائی دیے، یہاں سڑک نما پختہ راستہ تھا۔ کنارے عمارت کے گیٹ کے باہر...... دو آہنی اینگل نصب کر کے وہ سفید اور سبز رنگ کا بورڈ لگا نظر آ رہا تھا جس پر گول دائرے کی صورت میں مونوگرام بھی نظر آ رہا تھا۔ بادی النظر میں اب اس عمارت پر کسی ادارے یا سرکاری عمارت کے دفتر کا ہی گمان ہوتا تھا۔ گویا ان چند دنوں میں اسپیکٹرم کی اس عمارت "اسٹیشن فور" کو مختلف ناموں سے تحفظات دے دیے تھے۔ کسی مشہور بین الاقوامی این جی او کا نام استعمال کیا گیا تھا۔ جسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی اور نہ جانے کتنے ترقی یافتہ ممالک کے نام بھی درج تھے جو انسانی خدمت کی بھلائی کے نام پر اسے سپورٹ کر رہے تھے۔ یونہی عام راہ گیروں کی طرح قریب سے گزرتے ہوئے میں نے یہ سب غور سے "ملاحظہ" کیا تھا اور اندر ہی اندر غصے سے دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ وزیر جان کا نام بھی.... سپورٹ آفیسر کے طور پر

درج تھا۔ جس فلاحی تنظیم کا نام مونوگرام کی صورت درج تھا، اسے پڑھ کر میں یکلخت مبہوت ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ نام ''اطفال گھر'' تھا۔

میں اس نام کو دیکھ کر ادھر ہی جامد ہو کے رہ گیا۔ یہ تو اول خیر تھا جس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آگے بڑھا دیا۔

''او خیر، کاکے! ادھر رکنا نہیں ہے۔ آگے چل۔'' ہم کافی آگے چلے گئے اور پھر رک گئے۔

میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ اطفال گھر اب بھی ان مردودوں کے حوالے تھا اور یہ اس ادارے کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے یا عین ممکن ہے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالے ہوئے تھے۔ اطفال گھر میرے بچپن اور میرے ماضی کی پہچان تھی اور میں کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ چودھری ممتاز خان یا زبیر جان جیسے سماجی درندوں اور ملک دشمن عناصر اس کے روحِ رواں بنیں۔

مجھے ساری کہانی سمجھ میں آ رہی تھی، رفتہ رفتہ سہی......

لیکن اس دوران اول خیر نے مجھے ٹوکا۔

''شہزی کاکے! کدھر کھو گیا تو؟''

''اول خیر! مجھے یہ لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔ اطفال گھر پر ان لوگوں نے پوری طرح اپنا قبضہ جما لیا ہے۔''

''یہ تو ہے کاکے! وزیر جان بھی لوگوں کی نظروں میں ایک مشہور صنعت کار اور انسانی فلاح و بہبود کے کاموں میں خود کو ایک سماجی کارکن کے طور پر ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''کچھ بھی ہو اول خیر! میں اطفال گھر جیسے ادارے میں ان خبیث شیطانوں کا تسلط ہوتا کبھی نہیں دیکھ سکتا۔'' میں نے غیظ و جوش سے بھرے ہوئے لہجے میں کہا تو اول خیر آہستگی سے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''او خیر، کاکے! ذرا ہولا رہ۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آہستہ آہستہ نہیں اول خیر، یہ کام فوراً ہونے کا متقاضی ہے۔'' میں مضبوط اور جمے ہوئے لہجے میں بولا۔

''نہ جانے وہاں یہ معصوم بچوں کے ساتھ کون سا نیا گل کھلا رہے ہوں، پتا نہیں۔ وہاں ممتاز خان جیسے درندوں کے کسی گگل خان جیسے کارپرداز سے کوئی دوسرا شہزی نبرد آزما ہو، نہیں اول خیر نہیں۔ مجھے اطفال گھر کو دیکھنا ہے۔ وہاں کے حالات کی آگاہی حاصل کرنا مجھ پر اب ویسے بھی فرض سے بڑھ کر ایک قرض ہے۔''

''او خیر، کاکے! لگتا ہے کہ ایک نئی پسوڑی پڑنے والی ہے۔''

''یہ پسوڑی نہیں ہے اول خیر! اطفال گھر میرا اپنا گھر ہے۔ یہ میرا اپنا خاندان ہے۔ میں بہت بے چین ہو گیا ہوں اول خیر! میں ہر صورت میں ان لوگوں کا وہاں سے قبضہ ختم کروں گا۔ ورنہ مجھے ساری زندگی چین نصیب نہیں ہو گا۔''

میں جوشِ غیظ تلے بولے جا رہا تھا اور میرے سینے میں ایک دھواں سا بھر رہا تھا۔ میں تو اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ گگل خان کے خاتمے اور چودھری ممتاز خان کو ایک بڑی زک پہنچانے کے بعد ان لوگوں کا اطفال گھر سے قبضہ ختم ہو چکا ہو گا۔ مگر آج یہ میری خام خیالی ہی ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یاد تھا اس سلسلے میں سرمد بابا نے بھی مجھے تسلی تو دی تھی کہ وہ بذاتِ خود اطفال گھر کا نظام سنبھالنے والے تھے، پھر بدقسمتی سے نہ مجھے ان سے اس بارے میں کچھ پوچھنے کا موقع مل سکا، نہ ہی وہ مجھے اب تک کچھ بتا پائے تھے، کیونکہ انہی دنوں ایک طرف میں پولیس وغیرہ کے چکروں میں الجھا ہوا تھا تو دوسری طرف عارفہ اپنی بیماری کے سلسلے میں امریکا روانگی کی تیاریوں میں تھی اور سرمد بابا عارفہ اور عابدہ کی روانگی وغیرہ کے سلسلے میں مصروفِ کار رہے تھے۔

ہم تھوڑا آگے جا کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں کچھ نئے اور زیرِ تعمیر رہائشی پروجیکٹ کے ''ڈھانچے'' ایستادہ تھے۔ میں نے اول خیر سے کہا۔ ''یہ وزیر جان تو یہاں اس عمارت میں باقاعدہ ایک دفتر بنا کر فروکش ہو گیا ہے تو کیا اس سے پہلے عام آدمی کے طور پر ملاقات کی جائے یا پھر دوسرا طریقہ اختیار کیا جائے؟'' میری بات پر وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''او خیر، کاکے! آج پہلی بار تو مجھ سے مشورہ مانگ رہا ہے ورنہ تو تو ہر پھڈے میں خود ہی ٹانگ اڑا لیتا ہے اور پھر میں بھی تیرے ساتھ چل سو چل۔'' اس کے شرارت بھرے انداز پر میں بے اختیار ہنس دیا پھر سنجیدہ ہو کے بولا۔

''نہیں یار! ایسی بات نہیں۔ کیونکہ مجھے تم پر بھروسا بھی ہے، تم کبھی مجھے کوئی غلط مشورہ نہیں دو گے۔''

''او خیر، کاکے! تو تو جذباتی ہو گیا۔ میں نے تو تیرے ساتھ ٹول (مذاق) کیا تھا۔ خیر، اب سن میری بات۔ تو نہ صرف ان لوگوں کی نظروں میں آ چکا ہے بلکہ انہیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ تو ان کی اصلیت سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کیونکہ ثریا پر سب سے پہلے وزیر جان کو ہی شبہ ہوا تھا۔ بقول تیرے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر جان بہت شاطر آدمی ہے۔ وہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرے گا ہمیں دیکھتے ہی۔ میرا خیال ہے یہ باہر جو بورڈ وغیرہ نظر آرہا ہے یہ بھی لوگوں کو دھوکے میں رکھنے کے لیے ہوگا۔ اندر کوئی دفتر وغیرہ نہ ہوگا یوں بھی آج کل بنگلوں میں دفتر لگانے کا عام رواج ہے۔ ہمیں نقب لگا کر اندر داخل ہونا چاہیے۔"

"ہوں، میں تیار ہوں پھر۔" میں نے ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر پلٹے۔

دفتر یعنی اسٹیشن فور کی عمارت کے باہر ذرا بھی کسی قسم کی آوک جاوک...... یعنی آمدورفت نظر نہیں آتی تھی۔ گویا یہاں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ یا تو انتہائی رازداری کے ساتھ یا پردے کے پیچھے ہو رہا تھا۔

اس بار ہم نے عقبی راستہ اختیار کیا تھا۔ ابھی ہم اس راستے پر ہی تھے کہ اچانک ٹھٹک کر رکے۔ ایک گاڑی کی آواز عقب سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ہم دونوں ہی بیک وقت [illegible] کر پلٹے، وہ ایک مزدا ٹرک تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ٹرک تھا جو عام گھریلو سامان وغیرہ اٹھانے میں مستعمل ہوتا تھا۔ ہم ایک طرف کو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ہمارے قریب سے گزر گیا۔ اس کے اوپر فرنیچر لدا ہوا تھا۔ یہ عام دفتری فرنیچر تھا۔ جو آفس ٹیبلز اور چیئرز پر مشتمل تھا۔ ٹرک نے موڑ کاٹا اور عمارت کے داخلی گیٹ کی طرف گھوم گیا۔ میرا سو فیصد خیال تھا کہ اس ٹرک کا فرنیچر اس عمارت کے لیے ہی لایا گیا ہوگا۔ کچھ سوچ کر ہم نے ارادہ بدلا اور اس طرف مڑ گئے۔ دیکھا تو وہ ٹرک گیٹ کے سامنے رکا ہوا تھا۔ اور اس میں سے کرسیاں، میزیں اتاری جا رہی تھیں۔ میرے ذہن نے قلابازی کھائی اور میں نے اول خیر سے کہا۔ "آؤ، ادھر ہی سے اندر چلتے ہیں۔"

"او خیر...... سمجھ گیا۔" اول خیر ہولے سے بڑبڑایا۔

عمارت کے اندر سے ایک موٹا آدمی برآمد ہوا اور اس کے ساتھ ایک جوان شخص بھی تھا، موٹا پختہ العمر تھا۔ یہ فرنیچر کا سرسری جائزہ لے رہے تھے، ہم دونوں قریب آگئے، دونوں نے ہم پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی، میں نے گیٹ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ دونوں ٹرک کے کسی منشی ٹائپ آدمی سے باتیں کرنے میں محو تھے، میں اور اول خیر عام ملاقاتیوں کے انداز میں عمارت کے اندر داخل ہو گئے۔ مجھے یقین تھا، اسٹیشن فور میں وزیر جان نے جس طرح کا بہروپ بدلا ہوا تھا، وہ یہاں کسی قسم کی گرما گرمی کے موڈ

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ ادارے کی شکل میں یہاں کسی قسم کی ہنگامہ آرائی اور دھماچوکڑی اسے یہاں عام مقامی لوگوں کی نگاہ میں مشکوک بنا سکتی تھی۔

بہروپ بازی میں جہاں بہت سے فائدے ہوتے ہیں وہاں ایک اس کمزوری کو مصلحتاً برداشت کرنا پڑتا ہے اور میرے ذہن رسا میں اسی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا خیال ابھرا تھا۔ یوں میں اور اول خیر دیسی ساختہ بھیس بدلے ہوئے تھے بادیُ النظر میں ہمیں کوئی نہیں پہچان سکتا تھا جب تک قریب بیٹھ کر کسی سے محوِ کلام نہ ہوتے۔

اندر داخلی دروازے پر بھی ایک چپراسی ٹائپ شخص ایک اسٹول پر بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ ”وزیر صاحب سے ملنا ہے۔“

”اندر آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم صاحب سے مل لو پہلے۔“ چپراسی نے کہا اور آگے بڑھ کر جالی دار شٹر کھول دیا۔ میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ بلاشبہ ہم نے ایک خطرناک جگہ پر قدم رکھ دیا تھا مگر ہم اپنے گردوپیش سے محتاط بھی تھے، مجھے لگتا ایسا ہی تھا کہ یہاں موجود ”اسٹاف“ کے لوگوں میں زیادہ تر عام لوگ ہی ہوسکتے تھے۔ ان میں دو چار ”خاص“ لوگوں کی موجودگی بھی ممکن ہوسکتی تھی، ہال کمرے میں سات آٹھ افراد اپنی میزوں پر جھکے کام میں مصروف نظر آئے۔ پورا دفتری ماحول پیدا کیا گیا تھا۔ یہاں میزوں پر کمپیوٹر، پرنٹرز وغیرہ بھی موجود تھے۔ کچھ آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ اپنی میز اور کرسی کے غیر معمولی سائز اور الگ تھلگ جگہ پر موجود آفس سپرنٹنڈنٹ اسلم کو پہچاننے میں مجھے چنداں دیر نہ لگی۔ ہم نے اسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اس کے برابر میں ایک بڑے سے کمرے کا دروازہ نظر آرہا تھا، جس کی پیشانی پر وزیر جان بریکٹ میں ”سپورٹ آفیسر“ کا نام مجھے نظر آیا تھا۔ اسلم ایک پختہ العمر شخص تھا۔ رنگ گورا تھا۔ پیشانی کی طرف سے بال چٹ تھے، جو باقی تھے وہ بہت پیچھے جا کر کچھ کرلی ہوگئے تھے۔ ہماری طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ میں نے وزیر جان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک مذکورہ آفس روم کا دروازہ کھلا اور دو افراد برآمد ہوئے۔ دونوں میرے لیے اجنبی تھے۔ اسلم نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہم سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

”آپ کس سلسلے میں صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”اطفال گھر میں موجود ایک بچے کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔“ اس بار اول خیر نے کہا۔ میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسلم نے ہمیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود کمرے میں چلا گیا۔

”شکار اندر موجود ہے کاکے۔“ اول خیر نے میرے کان کے قریب سرسراتی سرگوشی کی۔ خود جوش اور عجیب و غریب احساسات و کیفیات کے مارے میری حالت دگرگوں سی ہورہی تھی، وزیر جان نے یا یوں کہا جائے کہ اسپیکٹرم نے بڑا شاندار بہروپ بدلا تھا۔ یہاں موجود سب بظاہر عام سے ملازم ٹائپ لوگ ہی نظر آرہے تھے۔ ممکن تھا ان میں ان کا کوئی گھاگ تربیت یافتہ ایجنٹ بھی موجود ہو جو آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد اسلم برآمد ہوا اور ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی اندر ہی تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سب سے پہلے میں نے اندر قدم رکھا تھا۔ آفس بلاشبہ بڑے شاہانہ طرز کا تھا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی سیاہ کرسی پر وزیر جان براجمان تھا۔ اول خیر بھی اندر آگیا پھر میں نے وزیر جان کو گمبھیر آواز میں کہتے سنا۔

”اسلم صاحب! آپ باہر جاؤ۔“ وہ باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوگیا۔ اندر کا ماحول مجھے دھڑکتا محسوس ہونے لگا۔ کچھ خبر نہ تھی، وزیر جان مجھے پہچانا بھی تھا یا نہیں...... مگر دوسرے ہی لمحے جیسے میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں سنسنی گونج گئی جب وزیر جان نے عجیب سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ شہزی اور اپنے ساتھی کو بھی بٹھا دو۔“

اول خیر کو بھی یقیناً اس بات پر جھٹکا لگا تھا کہ وزیر جان ہمیں بہرحال پہچان چکا تھا۔ وزیر جان نے بیش قیمت سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بہت مطمئن اور پُرسکون نظر آرہا تھا مگر اس کے عمر رسیدہ سے چہرے پر جیسے بڑی خطرناکی تھی جو میری بھانپتی نظروں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ میں نے کچھ زیادہ چونکنے کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اس کی بات پر کیونکہ میں اس کی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا کہ وہ کیا ”شے“ ہے۔

”اوہ...... تو تم مجھے پہچان گئے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔ اول خیر بھی میرے برابر والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ یہ آرم چیئر تھی۔ جس کی ہتھی پر بازو رکھتے ہی یکلخت ایک کلک کی آواز ابھری اور دوسرے ہی لمحے میرے پورے وجود میں سنسنی

کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اور اول خیر...... بڑے آرام سے کسی چوہے دان میں پھنس گئے ہوں کیونکہ کرسیوں کی دونوں ہتھیوں میں لگے دو خفیہ آہنی کلپس نے ہماری دونوں کلائیوں کو رسن بستہ کر دیا تھا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے خونخوار نظروں سے وزیر جان کو گھورا۔ اس نے بڑے آرام سے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کسی کو اندر آنے سے منع کرنے کی ہدایت جاری کی۔ اس کے بعد اس کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ سارے سسٹم کے بٹن اس کی چیئر یا میز کے نیچے چھپے کسی خفیہ پینل سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دفعتاً ایک جھماکا ہوا اور وزیر جان کی عقبی دیوار جس پر بڑی سی کوئی پینٹنگ نصب تھی، ہلکی سرسراہٹ کے ساتھ ایک طرف کو سرک گئی اور اب وہاں ایک بڑی سی اسکرین روشن ہوگئی۔ میری اور اول خیر کی نظریں وزیر جان کے چہرے سے ہٹ کر اس کے عقب میں اٹھ گئیں اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اسکرین پر میری اور اول خیر کی مانیٹرنگ کا منظر دکھایا جا رہا تھا۔ جب ہم دونوں تھوڑی دیر پہلے اسٹیشن فور کی عمارت کے سامنے سے گزرے تھے، پھر دوبارہ عقب میں جا کر لوٹتے ہوئے دکھایا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ منظر Still ہوگیا۔ ہم دونوں کے چہرے فوکس ہوئے، چھ خانوں کا ایک مربع گراف ہمارے چہروں پر فوکس ہوا، اور اس نے ہمارے اصل چہرے واضح کر دیے۔ وزیر جان کی نظریں ہم دونوں کے چہروں پر جمی رہیں۔ اسکرین آف ہو گئی، پھر اس پر دوبارہ پہلی والی دیوار سرک آئی جس پر عام سی پینٹنگ آویزاں تھی۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے اپنی طاقت اور ہوشیاری کا ایک ٹیکنیکل مظاہرہ کیا تھا۔ گویا وہ آرام سے اسٹیشن فور کی عمارت کے اندر بیٹھا عمارت کے اطراف کی مانیٹرنگ کرتا رہتا تھا۔

''ہاں، اب کہو...... یہاں کیا لینے آئے تھے؟'' اس نے گمبھیر مگر سرسراتے لہجے میں کہا۔ میں نے اپنے غیظ و غضب پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

''اس ماحول میں کیسے گفتگو کی جا سکتی ہے؟'' میرا اشارہ اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کے جکڑ بندوں کی طرف تھا۔ میری بات سن کر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔ اس وقت مجھے اس کا بھاری جربیلا چہرہ بہت مکروہ محسوس ہوا۔ وہ کسی طور بھی ساٹھ سے کم کا نہ تھا مگر عمر رسیدگی میں بھی اس نے اپنی صحت سنبھالے رکھی تھی۔ اس میں یقیناً خوش حال زندگی کی آرام طلبی کا بھی دخل رہا ہوگا جبکہ میں نے اپنے بچپن میں اسے ایک جوان مرد کی شکل میں ہی دیکھا تھا۔ ایک تنگ و تاریک اور عسرت زدہ ماحول میں...... مگر اس کا چہرہ میں بھلا نہیں پایا تھا آج تک اور بھلا تا بھی کیونکر......

''وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو تو زیادہ بہتر ہے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں اس پر نظریں تنے ہوئے بولا...... ''تم سے اپنی زندگی کا اہم ترین سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ...... تم کون ہو؟ اور میرے کیا لگتے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' اس نے فوراً سرد مہری سے کہا۔

''اس کا مجھے اندازہ اسی دن ہو چکا ہے جب ہماری پہلی ملاقات ''کنال لاج'' میں ہوئی تھی۔'' میں نے اپنے سینے کے اٹھتے غبار پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''جب تم نے میری موت کا پروانہ جاری کیا تھا۔''

''وہ تو میں اب بھی کروں گا۔'' اس نے بڑی سفاکی سے کہا اور مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں مگر میرے سینے سے اٹھتا ازلی دکھ کا غبار میرے دل و دماغ میں ہی نہیں میرے رگ و پے میں بھی رفتہ رفتہ سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ یہ گھڑیاں یہ لمحات میری زندگی کی اہم ساعتوں میں شمار ہو رہے تھیں۔ میری شناخت کے حوالے سے یہ لمحات میری ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کے لیے شکست و ریخت کا باعث بھی تھے اور میرے تفاخر کا بھی...... یقیناً اس سے وزیر جان بھی بخوبی واقف تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی سفاکانہ دھمکی کو صرف نظر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''یہ وقت بتائے گا، اسے چھوڑو۔ پہلے مجھے یہ بتاؤ اگر میں تمہارا کچھ نہیں لگتا تھا تو پھر وہ سب کیا تھا؟ وہ عورت کون تھی؟ جو میری سوتیلی ماں اور تمہاری محبوب بیوی کہلاتی تھی اور تم میرے باپ...... تم یقیناً اسی کے کہنے پر ہی مجھے اطفال گھر جیسے ادارے میں میری انگلی پکڑ کر لائے تھے۔ مجھے یہ بہلاوا دے کر کہ تم مجھے باہر سیر کرانے لے جا رہے ہو۔ پر وہاں مجھے چھوڑ کر تمہارا موٹے موٹے آنسوؤں کے ساتھ رونا...... وہ سب کیا ڈراما تھا۔ اگر تم میرے لیے کچھ حیثیت نہیں رکھتے تو پھر میرے اصل ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟'' یہ سب کہتے ہوئے میرے لہجے میں رقت اترنے لگی۔ لفظوں میں تھرتھراہٹ لرزنے لگی۔ مگر میں اپنی اعصابی قوت کی بھرپور کوشش سے خود کو سنبھالے ہوئے رکھنے کی بھی سعی کر رہا تھا۔ میری بات پر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وزیر جان نے اونچی پشت گاہ والی دبیز چیئر سے اپنی پشت لگا دی اور بڑے غور سے میرا چہرہ تکتا رہا پھر بولا۔ ''لڑکے! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اپنی ذات کے بارے میں اس قدر حساس نکلو گے اور نہ ہی مجھے تمہارے سینے کی اس تڑپ کا پتا تھا کہ تم اپنی شناخت کے معاملے میں کتنے ''کچے'' ہو۔

''ہر خوددار اور باغیرت انسان یہ ضرور جاننا چاہتا ہوگا کہ وہ کس باپ کی اولاد ہے۔ وہ کس نسل سے ہے۔ پھر میرا معاملہ تو ویسے بھی اس سے بڑھ کر ہے کیونکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ میرے ماں باپ اس دنیا میں بھی ہیں کہ نہیں۔''

میں نے کہا۔ وزیر جان اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے گردن موڑ کر اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی مجھ سے نظریں چار کیں اور پھر جیسے اس کی نظروں نے میرے چہرے اور میری آنکھوں سے جھلکتی غم و اندوہ اور کرب آمیز جوش جھلاہٹ بھانپ لی۔ اسے ادراک ہوا تھا فوراً کہ میں اس وقت کس قیامت خیز ذہنی ہیجان اور نفسیاتی وجدان کی ملی جلی اور متضاد کیفیات سے گزر رہا ہوں۔

''حوصلہ رکھو کاکا۔'' مجھے اس کی ہولے سے مخصوص آواز سنائی دی اور اسی وقت میں وزیر جان کی آواز پر متوجہ ہو گیا۔

''لڑکے! اس بات کا تو اطمینان رکھ کہ تو میرا بیٹا نہیں ہے اور نہ ہی میرا تجھ سے ایسا کوئی نسبی یا خونی رشتہ ہے۔''

''یہ بات میرے لیے بھی باعثِ طمانیت ہے کہ میں تیرے جیسے انسان کا بیٹا نہیں..... وزیر جان۔'' ایک خوش کن احساس تلے جیسے میرے اندر کا غبار اور لہجے کی رقت پل کے پل صاف ہونے لگی تھی اور میں نے بڑے مستحکم لہجے میں فوراً وزیر جان سے یہ کہا تھا۔ اسے یہ بات بری لگی ہوگی یا نہیں۔ تاہم وہ میری طرف گھوما تو اس کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ اسی لہجے میں بولا۔

''مجھے تمہاری دلی و ذہنی کیفیات اور کرب کا اچھی طرح اندازہ ہے..... لڑکے اور سب سے اہم بات یہ کہ کئی سال پہلے میں بھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ تم میری اولاد ہو..... جب تم چھوٹے تھے، بہت چھوٹے اور میں نے تمہیں اطفال گھر لے جا کر پھینک دیا تھا، بعد میں اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ تم میری اولاد نہیں ہو اور پھر میں نے اطفال گھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا۔''

میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ میں نے بھی پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس سے ظاہر ہوا کہ تم ایک عورت کی خاطر اپنی سگی اولاد کو بھی خود سے دور کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔'' میرے جواب نے اس پر کاری ضرب لگائی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا زہریلا چہرہ جیسے یک دم تڑخ سا گیا۔ ایک تلخ سا رنگ اس کے چہرے اور آنکھوں میں لہرا گیا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے وہ عجیب پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ میرے ذہن نے تیزی سے موجودہ صورت حال پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے دونوں ہاتھ کلائیوں کی طرف سے رسن بستہ تھے۔ میں نے بارہا اپنے ہاتھوں کی کلائیوں کو جنبش دے کر آہنی کلپس کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش بھی کی تھی مگر جکڑ بند بہت مضبوط تھے۔

وہ دوبارہ اپنی بھاری بھرکم ریوالونگ چیئر پر براجمان ہو گیا پھر میری طرف برمائی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''تم کون ہو، کیا ہو، کس کے بیٹے ہو، تمہارا باپ کون ہے اور اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا اسڑ رہا ہے۔ تمہاری ماں کہاں ہے۔ یہ سب جو تمہارے لیے ایک ازلی کرب کا باعث بنے ہوئے ہیں، وہ سب میں اچھی طرح .... بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔''

مجھے اس کی باتوں پر چونکنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے تو پہلے ہی یقین کی حد تک اندازہ تھا کہ یہی وہ واحد شخص ہے جو میرے سینے میں سلگتی چنگاریوں جیسے بھڑکتے سوالوں کے جواب رکھتا ہے مگر اس کی آخری بات پر میں چونکنے پر ضرور مجبور ہوا تھا کہ میرا باپ اس وقت گمنامی کے اندھیروں میں کہاں پڑا اسڑ رہا تھا اور ماں کے متعلق بھی اس نے اسی طرح کا اشارہ دیا تھا کہ وہ کہاں ہے؟

''تو کیا میرے ماں باپ..... دونوں زندہ تھے؟'' ایک اور سوالیہ آنکڑا میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا اور میرے کانوں میں آندھیوں کی شائیں شائیں سی گونجنے لگیں۔ اس کی باتیں سن کر... ایک بار پھر میرا دل و دماغ ازلی کرب تلے گھٹنے لگا تھا۔ تڑپ کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود تفتہ میں سرائیت کر گئی اور پھر جیسے میں ڈھے جانے کی کیفیات سے گزرنے لگا۔

''اگر تم یہ سب جانتے ہو تو مجھ سے چھپانے کا کیا فائدہ؟ میرے ماں باپ اگر زندہ ہیں تو کہاں ہیں؟''

''کیا یہ تمہاری آخری خواہش ہے؟'' وہ استہزائیہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور پُرغرور انداز میں مسکرا کر بولا۔ میں ایسے نازک موقع پر اسے خار دلانا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا ہموار لہجے میں بولا۔

”ایسا ہی سمجھ لو۔“

”نہیں۔“ اس نے یک دم ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ ”نہیں .... ابھی تمہاری آخری خواہش کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ ابھی ہمیں تم سے بہت کام لینے ہیں۔“ میں اس کی بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔

”کیسا کام لینا چاہتے ہو تم مجھ سے؟“

”یہ باتیں یہاں نہیں ہو سکتیں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ تمہیں ہلاک کرنے کی ابھی میری تمنا تعطل کا ہی شکار رہے گی۔“ اس نے یہ الفاظ آخر میں قدرے دانت پیسنے کے انداز میں کہے تھے۔

”کیا یہ سپیریئر اتھارٹی کا فیصلہ ہے یا ماسٹر اتھارٹیز کا؟“ میں نے طنزیہ کہا۔

”اوہ .... بہت کچھ جانتے ہو تم ہمارے بارے میں۔“ وہ ہونٹ سکیڑ کر بولا۔ ”یہ سب اس کتیا کا کام ہے۔“

میں چونکا۔ اس نے ”کتیا“ کس کو کہا تھا؟ میں سوچنے لگا اور پھر میرے ذہن کی اسکرین پر ثریا کا نام ابھرا۔

ٹھیک اسی وقت مجھے یوں لگا جیسے میں آن کی آن میں فضا میں معلق ہو گیا ہوں۔ زمین شق ہوئی تھی اور میں اور اول خیر کرسیوں سمیت یک دم جیسے پاتال میں اتر گئے۔ کسی خودکار میکنزم کے تحت پوشیدہ جن تک پہلے ہی سے وزیر جان کی رسائی تھی، اس نے اس کا استعمال کیا تھا۔ چند منٹ کی گھٹاٹوپ گہرائی میں اترنے کے بعد ہلکی سی کلک کی آواز سے میری کلائیاں آزاد ہوئیں تب اس کے دوسرے ہی لمحے کرسی نے مجھے الٹ دیا۔ میں منہ کے بل فرش پر آ رہا تھا۔ شکر تھا، فرش پر دبیز قالین بچھا تھا۔ بچ گیا مگر اوندھے منہ گرا۔ ہلکی سرسراہٹ ابھری۔ شاید کرسیوں کو دوبارہ اوپر کھینچ لیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والا آفس روم کا فرش اب گویا چھت بن گیا تھا اور کرسیاں دوبارہ ایک خودکار میکنزم کے تحت چھت کے شق زدہ روشن ٹکڑے میں غائب ہو گئیں۔ چھت برابر ہو گئی۔

اب ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دینے والا معاملہ تھا۔ میرے گرد گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کے باعث میری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

”اول خیر!“ میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

”او خیر.... کاکے، میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔“ اس کی مخصوص آواز ابھری۔ ان حالات میں بھی اس کی جی داری فزوں تھی۔ مجھے تسلی ہو گئی پھر اچانک ہی روشنی ہو گئی۔ اندھیرے سے یک دم روشنی ہونے پر ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ جب تک صورتِ گردوپیش سمجھ میں آئی، بیک وقت کئی گنیں ہم پر اٹھتی چلی گئیں.... پانچ گن بردار چوکس کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے درشت لہجے میں ہمیں اٹھنے کا حکم دیا۔ یہ تہ خانہ نما آٹھ بائی دس کا کمرا تھا۔ فرنیچر نام کی ہر شے سے عاری۔ میں اور اول خیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے بظاہر سرسری نگاہ سے ان کا جائزہ لیا تھا۔ ان کے انداز و اطوار سے انتہائی مہارت ٹپکتی تھی۔ چوکس ہونے کا انداز بھی ان کی اس قسم کی تربیت کی غمازی کرتا تھا۔ میں اور اول خیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

ہمیں گن پوائنٹ پر وہاں سے ایک دوسرے نسبتاً بڑے ہال کمرے میں لایا گیا۔ یہ آراستہ کمرا تھا۔ فرنیچر بھی پڑا نظر آ رہا تھا۔ دو افراد نے ہمارے ہاتھ پشت کی سمت موڑ کر باندھ دیے۔ انہیں ہمارے سلسلے میں جو حکم ملا تھا وہ یہ پورا کر چکے تھے۔ یہی سبب تھا کہ ان میں سے تین گن بردار ایک دوسرے دروازے سے نکلتے چلے گئے۔ جس نے تحکمانہ درشتی میں ہمیں آگے بڑھنے کا کہا تھا وہ اب اپنے دائیں کان پر ہاتھ لے جا کر مؤدبانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”باس! دونوں روم تھری میں پہنچا دیے گئے ہیں۔“

میں آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ اپنے کان میں چھپاں وہی چپ نما خفیہ ٹرانسمیٹر استعمال کر رہا تھا جو ثریا نے مجھے بھی دیا تھا جو اَب میرے پاس نہیں تھا۔ وہ یقیناً اپنے باس یعنی اسٹیشن چیف وزیر جان سے ہی مخاطب تھا۔ میرے ذہن میں دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ وزیر جان سے مجھے کم از کم اتنا تو معلوم ہو ہی گیا تھا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے۔ کہاں تھے، یہ وہی جانتا تھا۔ تاہم میرے دل و دماغ کو اس احساس نے جہاں سکون و مسرت بخشی تھی، وہاں یہ خیال مجھے ادھ موا کیے دینے کی حد تک بے چین کیے ہوئے تھا کہ مجھے اپنے ماں باپ کو ہر قیمت پر تلاش کرنا تھا۔ میرا افتخار لوٹنے لگا تھا۔ میری کرچی کرچی شناخت اب دوبارہ مستحکم ہو رہی تھی، دل و دماغ میں شدید تڑپ جاگ پڑی تھی کہ میں اپنے ماں باپ کو تلاش کروں، وہ کہاں تھے، کس حال میں تھے، میں ان کا لختِ جگر تھا۔ یقیناً وہ بھی میری طویل جدائی میں تڑپ رہے ہوں گے۔ میرے اندر جوش و جذبات کے طوفان اٹھنے لگے تھے۔ میں اپنے باپ کے سینے سے لگنا چاہتا تھا پھر اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بوڑھی آنکھوں میں اترتے ایک باپ کے فخر کو دیکھ کر مسرت آگیں گھڑیوں کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ماں کی گود میں سر رکھنا چاہتا، اس کی میٹھی ممتا کی چھاؤں میں وہ سکون حاصل کرنا چاہتا تھا جس سے میں آج تک محروم تھا۔ ایک پیاس تھی میرے اندر جو اب شدید تر ہوتی جارہی تھی۔ کئی سوالات میرے اندر کلبلانے لگے تھے، میں اپنے ماں باپ سے کیسے جدا ہوا تھا۔ میری ماں اس مردود شخص وزیر جان کے عقد میں کیسے آئی تھی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا جب میں چھوٹا تھا تو اپنی سوتیلی ماں کو اپنے باپ (اب نہیں) وزیر جان سے غصے میں یہ کہتے بھی سنا تھا کہ ''شیدے! اسے بتا کیوں نہیں دیتے کہ اس کی ماں مرگئی ہے۔'' وہ سب کیا تھا؟ اور اب .... پھر یہ سب کیا ہے، وزیر جان جو ایک معمولی آدمی تھا۔ شیدے سے وزیر جان کیسے بن گیا۔ ایک معروف صنعت کار دولت مند آسودہ حال آدمی اور اب اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف.... ایک ڈان .... یہ کیا بھید تھا؟ میرے ماضی اور اب حال کے اسرار کی تاریکی میں اور کیا کیا پوشیدہ تھا؟ یہ مجھے جاننا تھا مگر افسوس .... اس نازک موقع پر وزیر جان مجھ پر قابو پانے میں کامیاب ہوچکا تھا اور اب نہ جانے وہ میری اس جذباتی کمزوری کو کس طرح ایک خفیہ اور نامعلوم ڈیل کے نام پر ''کیش'' کرانا چاہتا تھا۔ یہ ابھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ ہمیں اس کمرے میں ایک صوفے پر ساتھ ساتھ بٹھا دیا۔ وہ دونوں گن بردار اب بھی چوکس انداز میں کھڑے تھے، وہ مقامی ہی معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی دیر گزری۔ وزیر جان ایک دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ اکیلا تھا۔ اس بار اس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ وہ ہمارے سامنے کے صوفے پر براجمان ہوگیا۔ اس کے انداز و اطوار سے غرور جھلکتا تھا۔ ضمیر فروشی سے حاصل کردہ اس طاقت کا اسے بڑا گھمنڈ تھا۔

''تم نہیں جانتے لڑکے کہ تم نے چودھری ممتاز خان کی دشمنی میں کن خطرناک لوگوں سے ٹکر لے لی ہے جو تمہیں بہت مہنگی پڑنے والی ہے۔'' اس نے موٹے کتھئی رنگ کے سگار کا ایک کش لے کر کھرکھراتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''مجھے تم لڑکے کے بجائے، شہزی کہہ کر مخاطب کرسکتے ہو۔'' میں نے اس کے لہجے اور بات کی خطرناکی کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے نڈر لہجے میں کہا تو وہ خار کھانے والے انداز میں مجھے گھور کے رہ گیا پھر اسی لہجے میں بولا۔

''بہت گھمنڈ ہے خود پہ۔ نہیں جانتے تم کہ تمہاری جڑیں تک ہمارے قابو میں ہیں جس کی ڈوریاں ہلا کر ہم تمہیں محض ایک کاٹھ کی پتلی بنا سکتے ہیں جو صرف ہمارے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوگی۔''

''یہ وقت بتائے گا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترکی بہ ترکی کہا اور آخر میں اسے یاد دلایا۔

''تم کسی ڈیل شیل کی بات کر رہے تھے؟''

''یہ ڈیل تم سے سپیریئر اتھارٹی کرے گی۔''

''تو تم صرف ایک مہرے ہو؟''

''یہی سمجھ لو۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ اس بار اس نے اپنے طیش پر حیرت انگیز انداز میں قابو پایا تھا۔

''ڈیل سے پہلے میں اپنے ساتھی اول خیر اور اپنی زندگی کی ضمانت ضرور چاہوں گا۔''

''دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے پروانہ انداز میں کہا پھر اپنے صوفے کے عقب میں دائیں بائیں کھڑے حواریوں میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ اس کے سامنے آکر مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔ وزیر جان اس سے تحکمانہ بولا۔ ''ان دونوں کو روم سیون میں پہنچا دو۔ کڑی نگرانی کرنا، میں زیرو ہاؤس کو مطلع کرچکا ہوں۔ مسٹر آرک خود یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے حوالے کردینا۔''

''یس سر۔'' اس نے مؤدبانہ کہا۔

میں زیرو ہاؤس کے نام پر چونکا۔ یہ نام میرے لیے غیر شناسا نہ تھا۔ ثریا کے ذریعے ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ ''زیرو ہاؤس'' درحقیقت ''اسپیکٹرم'' کا ''ہیڈکوارٹر'' کہلاتا تھا۔ سپیریئر اتھارٹیز اس زیرو ہاؤس میں براجمان تھیں۔ مسٹر آرک کے نام سے بھی مجھے شناسائی تھی۔ ثریا نے مجھ سے مختصر سی ملاقات یا مڈبھیڑ کہہ لیں پر مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا اور میں نے خود بھی اسے مسٹر آرک سے مخاطب ہوتے سنا بھی تھا۔

بہرطور ہمیں وہاں سے ایک تیسرے کمرے میں لایا گیا۔ یہ مختصر ترین اور کسی جیل کی بیرک نما سا کمرا تھا جو میرے اور اول خیر کے سوا ہر شے سے عاری تھا۔

اندر دھکیلنے اور آہنی دروازہ باہر سے لاک کرنے کے بعد.... وہ دونوں گن بردار چلے گئے۔

''او خیر، کاکے! یہاں آکر تو.... ایک قصے کا پتا چلا ہے۔'' تنہائی میسر آتے ہی اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اوئے کاکے! سچ پوچھ تو مجھے بھی یہ جان کر بہت خوشی ہورہی ہے کہ تیرے ماں باپ زندہ ہیں..... کاکے! یقین کر تیرے ماں باپ کا سن کر تو خود میرے اندر بھی عجیب سی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تڑپ جاگ اٹھی ہے۔ شہزی کاکے! ذرا تصور کر جب ہم ان سے ملیں گے اور تو انہیں میرے بارے میں یہ بتائے گا کہ میں تیرا بھائیوں جیسا یار ہوں تو۔۔۔ تو مجھے یقین ہے ماں میرے سر پر بھی ممتا بھرا ہی ہاتھ پھیرے گی اور تیرا باپ.... مجھے بھی اس طرح ہی محبت اور شفقت سے اپنی چھاتی سے لگا لے گا جس طرح تجھے لگائے گا۔ سچی کہتا ہوں کاکے! تیرے ماں پی کا سن کے تو مجھے اپنے ماں پی یاد آگئے۔" وہ جذبات کی رو میں بولے جارہا تھا اور میں حیرت سے اس کا چہرہ تک رہا تھا۔ وہ اس قدر میرے دل کے میرے دماغ کے حتیٰ کہ میری ذات و شخص کے اتنے قریب ہو چکا تھا، اس کا مجھے اب اندازہ ہو رہا تھا۔ خود میری آنکھیں بھی وفورِ جذبات سے آبدیدہ سی ہوگئی تھیں اور میں ہونٹ پہ ہونٹ دبائے اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میرا اور اول خیر کا چہرہ جذبات کی رو سے لرزاں تھا اور پھر اس انداز میں ہی میرے ہونٹوں سے مرتعش سے الفاظ برآمد ہوئے۔

"اول خیر۔۔۔۔ یار، یار تو ٹھیک ہی کہتا مجھ سے کہ او خیر، شہزی کاکے! تیرا میرا واسطہ اور تعلق کچھ وکھرے قسم کا ہو چلا ہے۔ آج مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

ہم اگر دونوں رسن بستہ حالت میں نہیں ہوتے تو یقینا ایک دوسرے کے گلے لگ کر رو ہی پڑتے۔

"ہاں شہزی کاکے! اللہ کی قسم ہے مجھے.... تیرے ماں باپ کے زندہ ہونے کا سن کے مجھے بھی پتا نہیں کیوں وہی خوشی ہو رہی ہے جو تیرے سینے میں مچل رہی ہے اس خواہش کے ساتھ کہ ہم ان کا جلد از جلد پتا لگاتے مگر بدقسمتی سے یہ خوشی ملی بھی تو ایسے وقت میں کہ ہم خود دشمن کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔"

"حیرت ہے اول خیر، تو کیا مایوس ہوگیا اتنی جلدی؟" میں نے کہا۔ "اللہ پر بھروسا رکھ۔"

وہ ہنسا پھر بولا۔ "میں جانتا ہوں اچھی طرح... مگر دشمن نہیں جانتے کہ انہوں نے شہزی کو اپنی کچھار میں بلا کر درحقیقت اپنی شامت کو خود آواز دی ہے اور اب وہ سالا گورا کیا نام تھا اس کا شارک.... شارک مچھلی..... یا کیا....؟"

"آرک.... مسٹر آرک...." میں نے دبی دبی ہنسی کے ساتھ تصحیح کی۔

"ہاں وہی آرک شاک.... اب وہ خود ہمیں اپنے ہیڈ کوارٹر یعنی زیرو ہاؤس لے جانے کے لیے یہاں آرہا ہے۔"

"ہاں، آنے دو اسے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سسرے.... تم سے کس قسم کی خفیہ ڈیلنگ کرنا چاہتے ہیں؟" وہ بولا۔ میں کیا کہہ سکتا تھا یہ تو ان کے آنے اور بتانے پر منحصر تھا۔ لہٰذا میں محض سر ہلا کر رہ گیا وقت گزرتا گیا، گزرتا رہا۔ اور انہی سوچوں، قیاس آرائیوں میں نہ جانے کتنا وقت مزید بیت گیا۔

ہم دونوں مبہوت سے اس تنگ و تاریک کمرے میں دیوار سے پشت لگائے پاؤں پھیلائے بیٹھے رہے۔ اس طرح کچھ مزید اور وقت گزرا تو اچانک دروازے پر کھڑبڑ کی آواز ابھری۔ وہی دونوں گن بردار نمودار ہوئے اور دروازے پر کھڑے کھڑے ہی تحکمانہ درشتی کے ساتھ باہر آنے کا کہا۔ میں اور اول خیر دیوار سے پشت لگائے اسی طرح سہارا لیتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے آگے چل دیے۔ ہمیں دوبارہ اسی کشادہ کمرے میں لایا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے وزیر جان نے ہم سے باتیں کی تھیں۔ وہ بھی موجود تھا مگر اب اس کے ساتھ والے صوفے پر ایک چھریرا جسم کا سرخ چہرے والا غیر ملکی بھی براجمان تھا۔ اس نے بہترین تراش کا سفید بے داغ سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لیتا ہوا اول خیر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ غالباً یہی مسٹر آرک تھا جو اسپیکٹرم میں ہینڈلر ایجنٹ(Handler Agent) کی حیثیت رکھتا تھا۔ کم و بیش اسٹیشن چیف کے مساوی عہدہ تھا یہ۔ (ثریا کی دی ہوئی معلومات کے مطابق) مجھے اس کی ٹانگیں لمبی اور جسم سینے کی طرف سے چھوٹا محسوس ہوا۔ چہرہ لمبوترا تھا۔ بال کریو کٹ تھے، آنکھیں خلائی مخلوق کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ باچھیں پھیلی ہوئی سی اور ہونٹ پتلے اور بھنچے ہوئے تھے۔ مگر شکل و صورت اور آنکھوں سے تیز طراری اور شاطر خیزی ٹپک رہی تھی، اس کے ہمراہ دو اور افراد بھی تھے، ایک مقامی اور ایک غیر ملکی تھا۔ وہ بہ غور اپنی کھنچی کھنچی بھویں سکیڑ کر باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ ہمیں وزیر جان نے میری طرف دیکھ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا آرک نے ہولے سے انگریزی میں وزیر جان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ "ان میں شہزی کون ہے؟" اور وزیر جان نے میری جانب اشارہ کر کے اسے بتایا تو آرک اب میری طرف بہ غور ہی نہیں بلکہ برماتی ہوئی نظروں سے گھور گھور کے تکنے لگا تھا پھر وزیر جان نے اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اول خیر کے بارے میں بتایا صرف اسی قدر کے وہ میرا جاں نثار ساتھی تھا وغیرہ۔

”ہم صرف.... شہزی کو ساتھ لے کر جائیں گے۔“ آرک نے گمبھیر لہجے میں وزیر جان سے کہا۔ اس کی بھاری اور کھردری آواز اس کی دبلی پتلی شخصیت سے کسی طور بھی ہم آہنگ نہیں تھی۔ میں نے دانت چبا چبا کر براہِ راست آرک کو انگریزی میں مخاطب کر کے کہا۔

”مسٹر آرک! اول خیر کے بغیر میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔ یہ بات تم اچھی طرح اپنے دھیان میں رکھ لو۔“

اطفال گھر جیسے جدید خطوط پر استوار ادارے کی سکھائی ہوئی تعلیم یہاں میرے کام آرہی تھی۔ میں نے دیکھا۔ میری بات پر آرک کی کھنچی ہوئی بھوؤں تلے آنکھوں میں ایک لمحے کو سانپ کی سی زہریلی چمک ابھری تھی پھر وہ اسی لہجے میں گویا پھنکارتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”مسٹر شہزی! اپنی اوقات میں رہو۔ مت بھولو کہ تم محکوم ہو ہمارے.... اور تمہاری زندگی موت ہمارے ہاتھ میں ہے۔“

”سفید سؤر کی اولاد! کتے کے پلے! کان کھول کے سن.... میرا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے اور میں مسلمان ہوں جو اس ازلی اور حتمی حقیقت پر یقین کامل رکھتا ہے کہ زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے تو بھی ایک ایک سانس کے لیے اسی قادرالمطلق کا محتاج ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے اور ان جہانوں کا بھی جو ہم گناہ گاروں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں.... سمجھا تو۔“

پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا اس خبیث ملعون گورے آرک کی اس پُرغرور بات نے مجھے ایک دم ہی ہتھے سے اکھاڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرے گرج دار لہجے نے ماحول پر پل کے پل سکتہ سا طاری کر دیا۔ خود آرک کو یکلخت سانپ سونگھ گیا تھا۔ وزیر جان البتہ تھوڑا پریشان ہوتا نظر آیا تھا۔ وہ ضمیر فروش اس وقت آرک کا میزبان تھا اور اس کی چھت کے نیچے رسن بستہ حالت میں ایک قیدی کا یہ سلوک اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر رہا تھا۔

”او خیر.... جیو کاکے۔“ اول خیر نے ہولے سے کہا۔ میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں اور آنکھوں کے سامنے جیسے خون کی بارش ہونے لگی تھی، پتا نہیں میں کس جواں مرد کی اولاد تھا۔ جانے کون دلیر سپاہی تھا جس کا خون.... جس کی خو.... اور جس کا جلال میری رگ رگ میں.... میرے خون کے قطرے قطرے میں.... میری سرشت میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا کہ میں موت کو سامنے دیکھنے کے باوجود.... رسن بستہ اور قیدی ہونے کے باوصف.... خود پر غالب مدمقابل کو پچھاڑ کھانے والے انداز میں للکارنے سے کبھی باز نہیں آتا تھا۔

آرک کے دم بہ خود چہرے پہ چند ثانیوں بعد زہریلے پن کی سرخی کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھوں سے نفرت و غیظ کی چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ اس گورے سؤر سے بالکل خوف زدہ نہیں تھا کیونکہ اس نے بکواس ہی ایسی کی تھی، کتنے پرغرور لہجے میں اس نے مجھے جتانے کی کوشش چاہی تھی کہ.... میری زندگی اور موت کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا اور میں نے بلاخوف اس کی آنکھوں میں ڈال کر اسے اس کا خاطر خواہ جواب دے دیا تھا۔ آرک کو قہر و غضب میں جلتا بلکتا دیکھ کر وزیر جان نے فوراً مداخلت کی اور آرک سے مخاطب ہو کے بولا۔ ”مسٹر آرک.... تم اس گیدڑ بھبکیوں کی پروا نہ کرو جیسا تم بہتر سمجھو.... وہ کرو.... میں اسے جانتا ہوں، یہ دیوانہ اور پاگل ہے۔“ وزیر جان کے بولنے پر آرک کے چہرے کا خارش زدہ خروش کچھ کم ہوا اور وہ وزیر جان سے مخاطب ہو کے گمبھیر آواز میں بولا۔

”دیوانے اور پاگل ہی ہمارے لیے سب سے بڑا خطرہ بنتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ اپنے ساتھی کی موجودگی کے بغیر ہماری کوئی بات سننے کا بھی نہیں۔ ڈیل میں ہمیں بھی مجبوراً تھوڑی لچک کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔ ان دونوں کو میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے آرک میری طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورتا ہوا صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ تاہم مجھے ان کی خفیہ ڈیل سے متعلق اس کی اہمیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ معاملہ یقیناً مجھ سے زیادہ ان کے لیے اہم تھا مگر مجھے اس بات کا بھی ادراک تھا کہ ان کی کوئی بھی ڈیل میرے لیے ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی تاہم میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ اس ڈیل کے پس منظر میں انہیں کس طرح ”ڈاج“ دینے کی کوشش کر سکتا ہوں؟

باہر ایک لمبی سی کار کھڑی تھی۔ ہمیں عقبی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تھا اور اول خیر کی طرف آرک کا ایک ساتھی براجمان ہو گیا جبکہ دوسرے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ آرک اس کے برابر والی سیٹ پر تھا۔ کار روانہ ہو گئی اور تھوڑی دور ہائی وے پر آنے کے بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ کار اب فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے ذہن

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رسا نے تیزی کے ساتھ ان اندھے راستوں کی ''کیلکولیشن'' شروع کر دی۔ کار ہائی وے پر آ کر دائیں جانب گھومی تھی۔ گویا ملتان روڈ پر ساہیوال سے آگے کی طرف گامزن تھی۔ میں بظاہر خاموش بیٹھا تھا لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی تیز رفتاری کے بعد میرے محتاط اندازے کے مطابق انہوں نے کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا سفر طے کیا ہوگا اس کے بعد کار کی رفتار دھیمی ہو گئی تھی، میں نے اپنے جسم کو دانستہ ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ کار نے جب ایک موڑ کاٹا تو میرا جسم دائیں جانب جھکا تھا جس کا مطلب تھا کار نے بائیں جانب موڑ کاٹا تھا۔ اب کار ہچکولے کھانے لگی تھی۔ یہاں بھی دو موڑ بائیں جانب اور آخری تیسرا موڑ دائیں جانب کاٹا اس کے کوئی پانچ منٹ بعد کار رک گئی۔ میرے ذہن نے اسٹیشن فور سے یہاں تک راستوں کی ساری ''کتر بیونت'' کر ڈالی تھی اور ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوا ہوگا کہ میں کافی حد تک ان کے ''بیس کوارٹر'' تک کے راستے کا ایک محتاط ''اندازہ'' قائم کر چکا تھا۔ کار سے اترنے تک بھی ہماری آنکھوں سے پٹیاں نہیں اتاری گئی تھیں۔ البتہ کسی بڑے گیٹ کے کھلنے اور ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز مجھے ضرور سنائی دی تھی، گویا ہم اس وقت اسپیکٹرم کے بیس کوارٹر میں موجود تھے، باہر کا کل وقوع کیا تھا، مجھے اس کا بالکل علم نہ ہو سکا تھا نہ ہی اندازہ۔ اندر مختلف راہداریوں سے گزرنے کے بعد ہمیں ایک کمرے میں آرم چیئر پر بٹھا دیا گیا اور پھر ہماری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے آنکھوں کے سامنے کالے دھبے ناچتے رہے۔ اس کے بعد جب میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو، میرے سامنے جو منظر تھا، اسے دیکھتے ہی میرے جیسا مضبوط اعصاب کا مالک۔۔۔۔ بھی سر سے پاؤں تک کئی ثانیے تک تھرا اٹھا تھا۔ نام کو تو یہ کمرا تھا مگر اس پر ''سلاٹر روم'' کا گمان ہوتا تھا۔ یادانستہ اس کمرے کا ماحول ایسا بنایا گیا تھا کہ جس کی دیواروں سے رنگ و روغن تو کیا پلستر بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا، مخصوص سی سیلن چپکی ہوئی تھی، ایک دہشت زدہ کرنے والا ماحول تھا چھت پر لمبی تار کے ساتھ گلوب نما بلب روشن تھا۔ مگر مجھے اس کے ماحول نے لرزنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ بات کچھ اور تھی، اس سے بھی زیادہ ہولناک اور عبرت انگیز ۔۔۔۔۔

☆☆☆

کمرے کے زنگ آلودہ آہنی کنڈے سے ایک چرخی کے ذریعے رسی کے ساتھ ایک مادر زاد برہنہ جوان لڑکی کو الٹا لٹکایا ہوا تھا اور جانے کب سے اس حرماں نصیب کو اس حالت میں ۔۔۔۔ اس طرح الٹا لٹکایا گیا ہوگا مگر اس کے ننگے جسم پر جا بجا انسانیت سوز تشدد کے نشانات کالے اور سرخ دھبوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے، چہرے کی حالت اس سے زیادہ ہولناک تھی۔ ایک آنکھ کی جگہ خلا تھا اور وہاں سے خون تو قطرہ قطرہ ٹپک ہی رہا تھا مگر کسی باریک خون آلود نس کے سہارے آنکھ کا ڈیلا ابھی تک نیچے جھول رہا تھا۔ نچلا ہونٹ کٹا ہوا تھا۔ ایک کان کی بھی یہی حالت تھی، غرضیکہ اس پر ظلم و بربریت کی جتنی انتہا کی جا سکتی تھی۔ وہ ایک لرزہ خیز قیامت کی صورت اس بدنصیب جوان عورت پر توڑی جا چکی تھی، اس کے داغ دار اور جگہ جگہ سے جلے ہوئے سینے کے زیر و بم سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس جان کنی میں جتنی سانسیں لے رہی تھی؛ وہ مستعار ہی تھیں۔

ایک ہولناک اور تھرا دینے والا کرب انگیز خیال میرے ذہن میں ثریا کے حوالے سے ابھرا تھا اور اس پر ٹھہر گیا تھا کیونکہ سر دست میں اس بدنصیب لڑکی کے چہرے کو پہچاننے کی کوشش ہی کر رہا تھا۔

سلاٹر روم میں صرف تین افراد موجود تھے، دو گن بردار اور تیسرا آرک ۔۔۔۔ جو میری طرف ۔۔۔۔ اس طرح مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ میری کیفیات سے حظ اٹھاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا ۔۔۔۔ کہ وہ یہ منظر دکھا کر مجھ پر اپنا خوف طاری کرنا چاہتا ہو۔

''اللہ کی لعنت ہو ان پر۔'' میں نے اول خیر کو ہولے سے یہ کہتے سنا۔

''پہچان سکتے ہو اسے مسٹر شہزی! کون ہے یہ؟'' معاً سلاٹر روم کے دم بہ خود ماحول میں مفت ابلیس آرک کی آواز ابھری۔

''شاید نہیں ۔۔۔۔ کون ہے یہ؟'' میں نے حتی الامکان اپنی آواز اور لہجے کو کسی کرب انگیز بوجھل پن سے بچانے کی کوشش کی تھی۔

''یہ ثریا ہے۔'' آرک کی مکروہ آواز ابھری۔ میں ذہنی طور پر اس بری خبر پر خود کو تیار کر چکا تھا، تاہم تصدیق ہو جانے پر میری روح تک کو غشا کی کا ایک زبردست جھٹکا لگا تھا مگر میں اسے ایسا کوئی تاثر دینا نہیں چاہتا تھا کہ میرا ثریا کے ساتھ ایسا کوئی تعلق نمایاں ہو جس کی بنا پر ثریا پر مزید عرصۂ اذیت و حیات تنگ کیا جاتا اور آرک جیسے مکار آدمی کا مجھے یہ اچانک سے ہولناک منظر دکھانے کا بھی یقیناً یہی مقصد ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے جب مجھے یہ بتایا کہ ''یہ ثریا ہے'' تو اس نے فوراً بھانپتی ہوئی نظروں سے میری

طرف دیکھا تھا۔ وہ مکار سؤر…… یقیناً میرے تاثرات و میری اندرونی کیفیات سے ثریا کے لیے دکھ و کرب کے آثار کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔ یہاں میری غیر معمولی ودیعت کی گئی عقلِ سلیم یعنی کامن سینس کام آگئی تھی اور یہ ادراک ہوتے ہی میں نے اپنی کیفیات پر بمشکل قابو پاتے ہوئے اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل ہی رکھنے کی کوشش کی تھی۔

''کون ثریا؟'' میں انجان بن گیا۔

''تم میری سوچ سے بھی زیادہ فطین اور عیار ہو مسٹر شہزی۔'' آرک سرسراتے ہوئے مکروہ لہجے میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں تمہاری بات کا مطلب؟'' میں نے بدستور سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اور نہ ہی میری یہ سمجھ میں آرہا ہے کہ آخر یہ سب مجھے دکھانے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟ تم تو مجھے یہاں کسی ڈیل کے سلسلے میں لائے تھے؟''

میری بات پر اس نے بڑی بے رحمانہ نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ایک سگار سلگا لیا۔ دو تین کش لیے اس کے بعد چند قدم چلتا ہوا الٹا جھولتی ہوئی ثریا کے قریب آکے رکا۔ سگار کا سلگتا ہوا سرا اس نے ثریا کے گال پر رکھ دیا۔ اس کے بے سدھ جسم نے ہولے سے جھٹکا لیا۔ سلاٹر روم میں ہلکی سی گوشت جلنے کی چراندسی اٹھی۔

''چچ…… چچ…… بے چاری پر اس قدر تشدد ہوا ہے کہ اب تو اس کی اذیت ناک تکلیف بتانے والی حسیات ہی مردہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ ورنہ یہ بُری طرح تڑپ رہی ہوتی۔'' آرک بڑی بے رحمی سے یہ کہتا ہوا دوبارہ سگار کو اپنے بدہیئت ہونٹوں میں دبائے میری طرف بڑھا پھر میرے ذرا قریب آکر رک کے بولا۔

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے، ڈیل قیدیوں سے نہیں کی جاتی، قیدیوں اور غلاموں سے حکم دے کر کام کروایا جاتا ہے۔ ہمارا اصول بھی یہی ہے کہ جو غداری کرتا ہے ہم اس کے ہاتھ میں پستول تھما دیتے ہیں جس کے چیمبر میں صرف ایک گولی ہوتی ہے جو وہ یعنی غدار اپنی کنپٹی میں اتار لیتا ہے۔'' اس کا لہجہ تھرا دینے والا تھا پھر وہ ذرا اور میرے قریب آیا۔ بغیر آرم کی اسٹول نما کرسی پر مجھے اور اول خیر کو ساتھ ساتھ بٹھایا ہوا تھا۔ آرک میرے بالکل نزدیک پہنچ کر مجھ پر جھک گیا۔ اس قدر کہ اس کی ناک کی پھنگ میری ناک کے بالکل قریب ہوگئی۔ ایسے میں مجھے اس کا چہرہ بہت مکروہ محسوس ہونے لگا۔ اس رذیل صفت اور سفاک آدمی کے بھیانک چہرے کو اپنی جلتی سلگتی آنکھوں کے قریب پاکر مجھے اپنے اندر کی آتشِ خوں رنگ کیفیات پر قابو پانا دوبھر محسوس ہونے لگا۔ جی چاہا میرا اس کا دانتوں تلے چہرہ بگاڑ ڈالوں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ جانے کے ڈر سے میں نے اپنے دانت اور ہونٹ دونوں ہی بھینچ رکھے تھے۔

''مسٹر شہزاد احمد خان المعروف شہزی! تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں اور نہ صرف تمہارے بارے میں بلکہ تمہارے قریبی ساتھیوں اور بہی خواہوں کے علاوہ تمہاری ایک اور کمزوری سے بھی میں اچھی طرح واقف ہوں جو ایک مجبوری کے تحت تم سے ہزاروں میل دور سہی لیکن ہم جانتے ہیں وہ تمہارے دل کے کس قدر قریب ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر سیدھا ہو کے کھڑا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ عابدہ کے حوالے سے اس طرح کے اشارے مجھے پہلے بھی چند لوگوں سے ملتے رہے تھے اور اب اس نسل خنزیر…… آرک کے منہ سے بھی یہ سن کر میری رگوں میں دوڑتے خون کی گردش مثلِ لاوا کے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے غیظ و غضب پر قابو پا رکھا تھا۔ آرک سیدھا ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا پھر پلٹ کر ایک ساتھی سے تحکمانہ بولا۔ ''اس لڑکی کو ہوش میں لاؤ۔''

اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں ربڑ کا پائپ تھا۔ جس کا ایک سرا دیوار میں نصب شاید کسی پانی کے کنکشن سے منسلک ہوگا۔ دوسرا سرا جس پر پلاسٹک کی نوزل تھی، تھام کر وہ ثریا کے قریب آیا اور وال کھول دیا۔ پانی کی تیز دھار ثریا کے چہرے پر پڑنے لگی اور اس وقت تک پڑتی رہی جب تک کہ اس نے غوطے لگنے کے انداز میں کھانسنا شروع کردیا۔ وہ ہوش میں آنے لگی تھی اور اب اس کے حلق سے آہوں اور سسکیوں کی آوازیں برآمد ہورہی تھیں۔ اس کے بعد چرخی کی مدد سے ثریا کے الٹے جھولتے وجود کو فرش پر چھوڑ دیا گیا۔ تاہم رسی اب تک اس کے دونوں پیروں میں بندھی رہنے دی تھی۔ تاہم اس کو اوپر سے اتنا جھول دے کر ڈھیلا چھوڑ دیا گیا تھا کہ ثریا اگر چاہتی تو اٹھ کر بیٹھ بھی سکتی تھی اور چند قدم چل بھی لیتی اگرچہ اس بے چاری کے اندر اتنی سکت نہ تھی۔

ثریا کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے کچھ عرصہ پہلے آسیہ کا اس سے ملتا جلتا ہولناک منظر یاد آنے لگا جس کا درد ابھی تک میرے دل و دماغ میں تازہ تھا۔ آسیہ کے ساتھ تو اس سے بھی زیادہ شرمناک اور سفاکانہ سلوک کیا گیا تھا۔ جس کے تلے اس بے چاری نے بڑی جان کنی کے عالم میں بالآخر دم توڑا تھا۔ اور میں اس کے لیے کچھ نہ کرسکا تھا۔ مگر پھر میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نے آسیہ پر ستم توڑنے والے چودھری ممتاز خان کے زرخرید کتوں کو بھی بھیانک عبرت ناک انجام سے دوچار کیا تھا جبکہ آسیہ کا ابھی انتقام میرے سینے میں باقی تھا۔ وہ میں ممتاز خان کو جہنم واصل کرکے پورا کرنا چاہتا تھا۔

کم و بیش یہی کچھ اس وقت ثریا کے ساتھ کیا جارہا تھا۔ اگرچہ ثریا کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ کیونکہ وہ ان کی آلۂ کار رہ چکی تھی۔ اسے بھی اس کے ضمیر نے جھنجوڑا یا پھر بقول ثریا کے ہی اسپیکٹرم والوں کی اصلیت ان کے مذموم مقاصد جان لینے کے بعد وہ ان کے خلاف ہوگئی تھی مگر ان کی آلۂ کار اور ”رازداں“ کی حیثیت سے رہتے ہوئے وہ ان کی جڑوں کو کاٹنا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں ثریا سے میری اچانک اور حادثاتی ملاقات میں اس نے مجھے آگاہ کیا تھا مگر اسے پوری حقیقت مجھے بتانے کا موقع اور وقت نہ مل سکا تھا اگرچہ اس نے اس بات کا بھی اظہار کیا تھا کہ وہ خود بھی اس گمبھیر اور خطرناک معاملے میں مجھ سے مدد لینے کی خواہش مند تھی وغیرہ۔ ایک جھماکا میرے ذہن میں یہ رہا تھا کہ ثریا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اسپیکٹرم میں اس کے ہم خیال ساتھی اور بھی تھے، اگرچہ ان کی تعداد بہ آسانی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر وہ کہاں تھے؟ یا ان لوگوں نے ثریا کے منہ سے ان کے بارے میں بھی اگلوالیا تھا اور انہیں اذیت ناک موت سے دوچار کردیا تھا؟

کچھ ذرا ہوش میں آتے ہی ثریا کے برہنہ جسم اور چہرے کی حالتِ زار زخموں سے درد کی ٹیسیں پھوٹ پڑیں اور وہ مارے درد و کرب سے گھٹی گھٹی چیخیں مارنے لگی۔ بے چاری کے اندر تو درد کی اذیت ناک کیفیات کو دبانے کے لیے چیخنے اور سسکنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ آرک نے دوسرے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے ایک دیوار کے کونے میں رکھی میز کی دراز سے ایک اسپرے نما بوتل نکالی اور آگے بڑھ کر وہ ثریا کے رستے زخموں پر اسپرے کرنے لگا۔ اس اسپرے سے ثریا کے زخموں پر شاید ٹھنڈک اتر آئی تھی عارضی طور پر کہ وہ اب ہولے ہولے سسکنے لگی۔ آہیں بھرنے لگی۔ اس کے بعد آرک نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ کی ایک مٹھی میں ثریا کے کھچڑی زدہ جٹاؤں بالوں کو جکڑ کر اٹھا کے بٹھا دیا اور اسی طرح ہی اس کے بال مٹھی میں جکڑے۔ اس نے ثریا کا چہرہ میری جانب اٹھا دیا اور زہر آلود لہجے میں بولا۔

”ہور بچ...... (Whore Bitch) دیکھو اپنے ساتھی کی طرف...... یہ شہزی ہے جس کے ساتھ مل کر تم نے ہمارے خلاف جانے کیا کیا منصوبے بنارکھے تھے، پہچانو اسے اچھی طرح... اور ہماری طاقت کو بھی...“

اس کے منہ سے ثریا کے لیے Whore Bitch کے الفاظ نے میرے اندر آگ سی لگادی تھی۔ ثریا اپنے مسخ زدہ یک چشم چہرے سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کا ہولناک چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کی اکلوتی آنکھ سے مردنی ٹپک رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس قدر زخمی ہوکے وحشیانہ ہورہا تھا کہ میں اس کے چہرے کے تاثرات بھی جاننے سے قاصر تھا کہ آیا وہ مجھے پہچان بھی سکی تھی یا نہیں۔ تاہم اس کے حلق سے سسکاری ضرور برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہسٹریائی انداز میں آرک سے گھٹی گھٹی التجا کی۔ ”م...... مجھے مار ڈالو...... خ خدا کے لیے مجھے اس عذاب سے نجات دلادو...... مسٹر آرک...... پلیز۔“

ثریا سے ٹھیک طرح بولا بھی نہیں جارہا تھا۔ یہ سارے الفاظ اس نے ٹوٹے پھوٹے لب و لہجے اور آواز میں بمشکل ہی ادا کیے تھے۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ آرک غیظ آلودہ لہجے میں اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے غرایا۔ ”مجھے بتاؤ تم اس شخص کو پہچانتی ہو یا نہیں؟“

”ہاں، میں اسے اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ ذلیل، کتے! یہی انسان .... تیری موت ہے۔ تو بھی پہچان لے اس کو...... اپنی موت کو...... مردود آدمی...... آہ۔“ پتا نہیں کس طرح اپنے زخموں سے چور وجود کی طاقت سمیٹ کر ثریا نے یہ الفاظ آرک سے کہہ ڈالے تھے۔ جسے سن کر آرک کا چہرہ مسخ ہوکے رہ گیا۔ اس نے اسی طرح اس کے بالوں کو مٹھی سے پکڑے پکڑے ایک طرف گھسیٹا مگر چھوڑا نہیں۔ پھر ایک ہاتھ اپنے سفید کوٹ کے اندر ڈالا، نکالا تو اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک پستول تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پستول کی نال ثریا کے زخم خوردہ منہ کے اندر گھسیڑ دی اور ٹریگر دبادیا۔ سلاٹر روم کے سیلن زدہ وحشت ناک ماحول میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ ثریا کے چہرے پر خون کی سرخ لکیروں کا جال سا بن گیا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے سے بھیجے کے لوتھڑوں کو اگلتی ہوئی پار ہوگئی۔

ظلم و بربریت کے اس قہرناک شیطانی کھیل نے ماحول تک کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

میرے دل و دماغ کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی، ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا جو قہر و غضب کا لاوا اگلنے کو بے چین تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوئی میرے ہاتھوں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے جگر بند کھول ڈالے اور میں اس سفاک وسنگدل انسان جو انسان کہلانے کا مستحق نہ تھا بلکہ جانور کہنا بھی اسے جانور کی توہین ہوتی۔ یہ تو سراپا شیطان تھا ابنِ شیطان تھا۔

"لے جاؤ اس کتیا کی لاش...... میرے لیے یہ جاننا ہی کافی تھا کہ کتیا نے مسٹر شہزی کو پہچان لیا۔" آرک نے تحکمانہ کہا اور مجھے ایک جھٹکا لگا۔ ثریا نے کیا دانستہ ایسا کیا تھا یا جوش میں آکر آرک کو میری طرف سے تہدید کی تھی؟ اپنی موت آسان کرنے کے لیے؟ اس اذیت ناک تشدد سے بچنے کے لیے؟ کہ میں آرک کی موت تھا۔

بدنصیب ثریا کی لاش اٹھالی گئی۔ اول خیر کا چہرہ بھی اس کھلی بربریت پر سکتہ زدہ سارہ گیا تھا۔

"مسٹر شہزی! اب تو تمہارے پاس جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں باقی بچی ہوگی کہ ثریا تمہارے ساتھ مل کر ہماری جڑیں کاٹنا چاہتی تھی کیونکہ وہ آخری وقت میں تمہیں پہچان چکی تھی۔" آرک نے مکارانہ سفاکی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، اس کے گورے مکروہ چہرے پر بڑی حیباتہ مسکراہٹ تھی۔

"یہ صرف میری بچپن کی دوست تھی جس ادارے میں......"

"بس، ہمیں سب پتا ہے۔ چھوڑو اس بات کو اب۔" آرک نے ہاتھ اٹھا کر میری بات درمیان سے کاٹ دی۔ میں اندر ہی اندر کھول کر رہ گیا۔ وہ آگے بولا۔ "اس کے ساتھ تین غدار اور بھی تھے، دو ہم نے مار ڈالے...... مگر بدقسمتی سے ایک بچ کر بھاگ نکلا۔ اسے جلد تلاش کر لیا جائے گا۔"

میں جواباً خاموش رہا۔ آرک چند ثانیے کھڑا میرے چہرے سے میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا۔ "مسٹر شہزی! اب تم کیا کہتے ہو؟ ہمارے حکم پر عمل کرو گے یا اپنے ساتھی سمیت اس سلاٹر روم کو اپنی اذیت ناک چیخوں سے رونق بخشو گے؟"

میں نے اندر ہی اندر اس خبیث پر لعنت بھیجی پھر بظاہر بے پروانہ لہجے میں بولا۔

"میں نے تو ابھی تک تمہاری بات سنی ہی نہیں۔"

"تمہیں ہمارا ایک معمولی سا کام کرنا ہوگا۔"

"کام معمولی ہے تو مجھ سے کروانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تمہیں؟ اپنے آدمیوں کی تمہارے پاس کوئی کمی تو نہیں؟" میں اس کی بربریت اور چنگیزیت کے نظارے دیکھنے اور دھمکیوں سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے ساتھ ترکی بہ ترکی لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔

"تمہارے لیے معمولی کام ہے وہ...... ہمارے لیے نہیں۔" اس نے سپاٹ سنجیدگی سے کہا۔

"کام کیا ہے؟" میں نے برماتی نظروں سے اس کی طرف گھورا۔

"تمہیں کچھ عرصے ہمارے لیے کام کرنا ہوگا...... ایک مشن پر...... پی ایس ایس کا خاتمہ اور میجر ریاض باجوہ کا قتل۔" اس نے کہا اور میرے پورے وجود میں جیسے لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس مردود و ملعون کے خطرناک عزائم جان کر میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے حتی الامکان خود کو پھر نارمل رکھتے ہوئے بلا تصدیق و تامل پوچھا۔ "اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"ہمیں معلوم ہے تمہارے میجر ریاض باجوہ سے بڑے گہرے تعلقات ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پاور سیکرٹ سروس کو کن مقاصد کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ ہم تمہیں آزاد چھوڑ دیں گے مگر ہماری تیسری آنکھ تم پر مرکوز رہے گی، جہاں تم نے ہمیں ڈاج دینے یا کوئی چالاکی چلنے کی کوشش کی تو...... سب سے پہلے تمہیں اپنے اس ساتھی کی اذیت ناک موت کا تخیلی تصور کر لینا ہوگا۔ اس کے بعد تمہاری معشوقہ عابدہ کی باری آئے گی جو امریکا کے ایک اسپتال میں مقیم ہے۔ سمجھ گئے تم۔"

آرک کی بات نے مجھے اندر سے سرتاپا جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اول خیر اور عابدہ کا میں بال بیکا بھی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ عابدہ کے بارے میں آرک کو یقیناً اس رذیل ممتاز خان نے ہی کا ئنڈلائن دی ہوگی کیونکہ میرے ازلی دشمنوں میں ایک وہی تھا جو میری بعض جذباتی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں نے بظاہر آرک کی اس تہدید کو کوئی اہمیت نہ دی اور بولا۔

"دیکھو مسٹر آرک! یہ پی ایس ایس کیا بلا ہے مجھے اس کا علم نہیں۔ ہاں یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ میجر ریاض باجوہ سے میرے صرف دوستانہ مراسم ہیں اور اس کی وجہ محض اتنی ہے کہ اتفاق سے ایک پرائیویٹ میڈیکل سینٹر میں میرا اپنے پرانے دشمنوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا اور سوئے اتفاق میجر ریاض باجوہ کی بیگم اور بچہ وہاں ایڈمٹ تھے، دشمنوں نے بھاگ نکلنے کے لیے ان کے بچے کو یرغمال بنا کر ڈھال بنا لیا تھا۔ عین وقت پر میں نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا اور میجر صاحب کے بچے کی بھی جان بچ گئی تھی، کتا

یہی حقیقت ہے میری ان سے تعلق داری کی، اس کی تفصیلی خبر مختلف ٹی وی چینلز پر بھی آچکی ہیں۔"

آرک نے پہلی بار میری بات بظاہر بڑے غور اور دھیان سے سنی تھی۔ وہ بحث و مباحثہ کرنا نہیں جانتا تھا اور دوٹوک لہجے میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا بڑی مکاری سے بولا۔

"اوکے...... اوکے...... اٹس اوکے...... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں مگر تمہیں کرنا وہی ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں تم سے۔" وہ ذرا رکا پھر چند قدم اٹھاتا ہوا دوبارہ میرے قریب آکر مزید بولا۔ "تمہیں مرحلہ وار ہمارا یہ مشن انجام دینا ہوگا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں پاور والوں کے ہیڈکوارٹر اور ان کے خفیہ تربیتی مرکز کا پتا چلانا ہوگا اور ہمیں اپ ڈیٹ کرنا ہوگا، تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہوگی اس کام کے لیے۔ چوتھے روز تمہیں میجر باجوہ کے سر میں گولی اتارنی ہوگی، سمجھ گئے تم؟ مجھے یقین ہے تمہارے لیے یہ کام کچھ زیادہ مشکل نہیں۔"

"یہ کام اتنا آسان بھی نہیں ہے مسٹر آرک۔" میں نے کہا۔ "میجر باجوہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ وہ رینجرز فورس کا سربراہ ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس سے بھی تعلق رکھتا ہے جبکہ میں ایک عام اور غیر اہم سا سویلین...... میں ان سے کیسے یہ سب اگلوا سکتا ہوں؟ انہیں مجھ پر شبہ ہو جائے گا۔"

"شبہ تو ہمیں بھی تم پر اس بات کا ہوگا کہ تم یہاں سے جانے کے بعد...... میجر باجوہ سے پہلی فرصت میں یہ ساری حقیقت بیان کر ڈالو گے اور ان سے خفیہ گٹھ جوڑ بلکہ مدد بھی لینے کی کوشش کرو گے۔" یہ کہتے ہوئے آرک نے قدرے جھک کر ایک بار پھر اپنا مکروہ چہرہ میرے چہرے کے بالکل سامنے کر دیا اور بات جاری رکھی۔ "مگر یاد رکھو شہزی! تم لوگ ہماری گرد بھی نہیں پا سکو گے، کیونکہ ہمارے ساتھ چودھری ممتاز خان اور وزیر جیسے آدمی موجود ہیں جو عوامی حلقوں میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں کی میڈیا کو بھی ہم نے خرید رکھا ہے۔ ہم ان اداروں کو انہی کے ملک میں بدنام کر کے رکھ دیں گے مگر افسوس ہمارے پاس سردست ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ یہ ہم تم سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے دل و دماغ سے ہر قسم کی چالاکی اور عیاری نکال پھینکو...... بولو اب کیا کہتے ہو؟"

میں اس سفید گورے سور کی بات پر بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھر کے رہ گیا پھر بولا۔ "میں تنہا یہ کام نہیں کر سکتا.... میرے ساتھ اول خیر کو بھی میرے ساتھ کرنا ہوگا۔"

"شٹ اپ۔" آرک کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری کوئی فضول بکواس نہیں سنوں گا نہ ہی تم مجھے اس حقیقت سے بھٹکا سکتے ہو کہ تمہارا پاور سے کوئی تعلق نہیں...... ہمارے آدمیوں سے دوبار پی ایس ایس کا ٹکراؤ ہو چکا ہے اور تم بھی ان میں شامل رہ چکے ہو، سمجھے تم...... اب ایسی کوئی فضول بکواس نہیں چلے گی۔" وہ بپھر گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہاں آرک کے بلیک اسپیکٹرم کے ہاتھ مضبوط کرنے والے دو ہی افراد تھے۔ ایک چودھری ممتاز خان اور دوسرا وزیر جان...... یہ دونوں ہی میرے ماضی اور حال سے ہی نہیں بلکہ میری بعض جذباتی کمزوریوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ میرے ذہن میں تو یہی منصوبہ پل رہا تھا کہ میں ایک بار ان کے چنگل سے نکل کر آزاد ہو جاؤں اور بعد میں انہیں "بلف" کرنے اور "ٹریپ" کرنے کی کوشش کروں مگر کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟ مگر اور کوئی صورت بھی نہ تھی، سردست تو میرے لیے یہی غنیمت تھا کہ میں صرف ایک بار یہاں سے آزاد ہو جاؤں پھر دیکھا جائے گا۔ ممکن ہے میری یارآور تقدیر مجھے یہ موقع دے رہی ہو۔

میں نے کہا۔ "میں اپنی زندگی اور ساتھی کی زندگی کی ضمانت چاہوں گا کیونکہ یہ بات تم بھی جانتے ہو گے کہ میری دشمنی صرف ممتاز خان سے ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ اس گھن چکر میں تو میں خوامخواہ ہی پھنس گیا ہوں۔" خود سے طاقت ور دشمن اور کبھی جوش کی جگہ ہوش سے کام لینے کا گر میں نے سردبابا سے ہی سیکھا تھا اور بہت کچھ حالات سے...... لہٰذا میں نے مکارانہ چال چلنے کی روش اختیار کر لی تھی۔

"شاید تمہاری یہ بات ٹھیک ہو۔" آرک اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔ "لیکن مجھے پتا ہے کہ تم ہمارے بارے میں بھی اب تک بہت کچھ جان چکے ہو۔ اس میں ثریا نے بھی ہم سے غداری کر کے نمایاں کردار ادا کیا۔ افسوس یہاں چند لوگوں کے انتخاب میں ہم سے کچھ فاش غلطیاں ہو گئی تھیں۔ بہرحال رہی بات تمہاری اور تمہارے ساتھی اول خیر کی اس سلسلے میں تم بے فکر رہو۔ یہ ادھر ہی رہے گا۔ ایک اہم قیدی کی حیثیت سے اور اس کی زندگی کی ضمانت تمہارے کام سے مشروط ہوگی اور تمہاری بھی جبکہ تمہاری اور ممتاز خان کی ذاتی دشمنی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اسی سبب ہم نے اسے تمہارے معاملے سے دور رکھا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وہ بھی میرے ساتھ چالاکی چل رہا تھا۔ گویا میرے اور آرک کے درمیان ایک بساط بچھ چکی تھی، اس کے پاس مہروں کی کمی نہ تھی جبکہ میرے پاس تو ایک چلا ہوا کارتوس تک نہ تھا۔ یہ دماغی کھیل تھا جس کی چال کامیاب ہوتی، جیت اس کا مقدر بنتی۔ میں نے حامی بھرلی تو آرک نے کسی مسرت کا اظہار نہ کیا اور بولا۔

''او کے، سب ٹھیک ہے۔ ہمارے مشن پر روانہ ہونے سے پہلے تمہیں ایک مائنر آپریشن سے گزرنا ہوگا۔''

''آپریشن؟ کیسا آپریشن؟'' میں بُری طرح چونکا۔ اس کے بدہیئت ہونٹوں پر بڑی مکروہ اور سنگدلانہ مسکراہٹ تھی۔

وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''ہم اپنے تحفظات کے سلسلے میں مکمل طور پر تسلی چاہتے ہیں۔ یہ ایک معمولی سا سرجیکل آپریشن ہوگا۔ تمہیں جنرل اینستھیسیا کے ذریعے تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش کیا جائے گا پھر تمہارے جسم کے کسی مقام پر خفیہ طور پر ایک ڈیوائس چپ لگادی جائے گی، جو تمہاری مکمل کارکردگی کی رپورٹ ہمیں یہاں بیٹھے ہائی ٹیک سپر کمپیوٹر پر منتقل کرتی رہے گی، اس میں تمہاری کسی چالاکی، کسی عیاری کے شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی نہ ہی تمہیں ہم سے رابطہ کر کے کسی قسم کی رپورٹ دینے کی زحمت گوارا کرنا پڑے گی۔ تمہارے جسم میں موجود مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس خودبخود تمہاری ایک ایک حرکات وسکنات کی ہمیں آگاہی دیتی رہے گی۔'' اس خبیث کی بات سن کر میرے دماغ کی کیا پورے وجود کی نسیں پھول گئیں۔ نہ جانے یہ مردود میرا ایسا کون سا سرجیکل آپریشن کرنے والے تھے، جو مجھے قطعاً قابلِ قبول نہ تھا بلکہ سچی بات تو یہ تھی مجھے اس آپریشن کے نام سے ہی ہول آنے لگا تھا۔ سب سے اہم بات میرے نزدیک یہ تھی کہ اس ملعون خبیث آرک کے بقول اس میں کسی شبہے یا چالاکی کرنے کی بال برابر بھی گنجائش نہ تھی، تو پھر یہ آپریشن ویسے بھی میرے لیے خطرناک تھا۔

''یہ مائیکرو الیکٹرک ڈیوائس تمہیں ہمارا بے دام غلام بنا کے رکھے گی۔'' آرک نے آخری تیر چلایا جو سیدھا میرے دل میں کھبا تھا۔

''اوئے کاکے! یہ چٹا سور...... انگریزی میں تیرے ساتھ کیا گٹ پٹ کیے جارہا ہے۔ تیری تو حالت ہی غیر ہورہی ہے۔''

اول خیر نے ہولے سے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ اول خیر اتنا پڑھا لکھا نہ تھا مگر آرک کی مکارانہ اور سنگدلانہ تاثرات، گفتگو اور میرے ردعمل نے اسے کچھ ایسا سمجھ دیا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، میرے لیے وہ بالکل قابل قبول نہ تھا۔ میں نے اول خیر کی بات کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے دل ودماغ میں پہلی بار تشویش کی لہر پوری شدت کے ساتھ بیدار ہوئی تھی، میں اگر اول خیر کو اس ''چٹے سور'' کے خطرناک عزائم کے بارے میں آگاہ کردیتا تو یقیناً اول خیر آپے سے باہر ہو جاتا۔

ہم قیدی تھے یہاں...... مجبور اور بے بس بھی۔ میرے ذہن نے عیاری کی جو بساط آرک کے آگے بچھانے کی کوشش چاہی تھی، اسے پہلی ہی چال میں ''شہ مات'' ہوگئی تھی اور مجھے یہ بساط سمیٹتے ہی بنی تھی۔

میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کررہا تھا۔ سرِدست مفر کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں۔ اب اللہ کا ہی آسرا تھا کہ جتنا بڑا نام اتنا بڑا آسرا۔

آرک نے ہولے سے اپنے آدمی سے کچھ کہا تھا۔ مجھے بازوؤں سے پکڑ کر وہاں سے لے جایا جانے لگا۔ اول خیر بھی اٹھ کر کھڑا ہوا مگر اسے دبوچ کے سلاٹر روم میں ہی مقید کردیا گیا، وہ چیخنے چلانے لگا۔ میں خود بھی اب آپے سے باہر ہوگیا تھا اور آرک کو گالیوں سے بُری طرح لتاڑنے لگا۔ وہ آگے جاچکا تھا۔ میری آنکھوں میں دوبارہ پٹی چڑھادی گئی تھی، یہ بہت محتاط تھے۔ مجھے اپنے جیں کوارٹر یعنی زیرو ہاؤس کے اندرونی محل وقوع سے بھی آشنا نہیں ہونے دے رہے تھے۔ سرجیکل آپریشن کے نام سے ہی میرے اندر ہولناکیاں جنم لے رہی تھیں کیونکہ اس آپریشن کا مطلب تھا کہ میں ان کا بے دام غلام بن جاتا۔ میری چھٹی حس چیخ چیخ کر مجھے خبردار کررہی تھی۔ ''شہزی! یہ شیطانی آپریشن نہیں ہونا چاہیے۔ ہرگز نہیں۔'' میں نے اپنی حالت پر قابو پانا شروع کردیا تھا۔ میرے ذہن میں اچانک یہ خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں میرے اس طرح واویلا کرنے سے یہ مجھے وقت سے پہلے ہی بے ہوش نہ کرڈالیں مگر ہوش میں رہتے ہوئے بھی میں کیا کرسکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور میں ان کے شیطانی گڑھ میں موجود تھا۔ جہاں نہ جانے ان کے اور کتنے ساتھی جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے اور میں مکمل طور پر بے بس اور ان کے رحم وکرم پر تھا۔ پھر مجھے مختلف راہداریوں سے گزار کر جس کمرے میں لایا گیا وہاں میرے نتھنوں سے کچھ ایسی بوٹکرائی تھی جس نے میرے اندر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کے ہولناک خدشات کو مزید سوا کر ڈالا تھا۔ یہ ایسی ہی... مخصوص دوائیوں کی بو تھی جیسی کسی اسپتال کے آپریشن روم میں ہوتی ہے۔ دفعتاً مجھے اپنی گردن پہ چبھن کا احساس ہوا۔ یکلخت میری آنکھیں پھیل گئیں اور میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ ہی میں نے دل میں اللہ کی مدد کو ضرور پکارا تھا۔

☆☆☆

مجھے جب ہوش آیا تو یکلخت میرا دل اچھل کر حلق میں آن ٹکا۔ کیونکہ آنکھ کھلنے پر میں نے خود کو ایک آپریشن ٹیبل پر پڑے پایا تھا۔ میرے اوپر بڑا سا کنٹوپ تھا جس پر کئی گلوب روشن تھے، میرے دائیں جانب ایک بڑی سی ٹرالی رکھی ہوئی تھی جس پر اسٹین لیس اسٹیل کے سرجیکل انسٹرومنٹ رکھے تھے۔ بائیں جانب قدرے عقب میں ایک مشین سی تھی، جس پر دو چھوٹے مانیٹر اور ایک آکسیجن پمپ نظر آتا تھا۔ مانیٹر میں دل کی دھڑکنیں اور نبض کی رفتار کے گراف متحرک رہے تھے۔

میں آپریشن ٹیبل پر چت لیٹا ہوا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں پر چرمی بیلٹ بندھے ہوئے تھے۔ یہی حالت دونوں پیروں کی تھی۔ سفید کوٹ (ایپرن) میں وہاں چار افراد موجود تھے، پانچواں آرک تھا۔ دو جوان سے مرد تھے، مجھے ان کی حیثیت ہیلپر جیسی معلوم ہوئی تھی، ایک بوڑھا سا شخص تھا۔ سر کے بال سفید، چہرہ بھاری اور ٹماٹر کی طرح سرخ تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول...... مجھے اس کے چہرے سے نامعلوم سی منحوسیت ٹپکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایسی ہی مسکراہٹ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر ثبت سی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے ساٹھ سے اوپر ہی لگایا تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا ایک پختہ العمر آدمی تھا۔ یہ مقامی لگتا تھا، چہرے پہ داڑھی مونچھیں تھیں۔

آرک نے پہلے بڈھے گورے کا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ’’یہ ڈاکٹر گھسٹ ہیں۔ معروف سرجن...... اپنے کام کے ماہر۔ ہمارے پرانے خیر خواہ......‘‘ پھر آرک نے قریب کھڑے مذکورہ پختہ العمر مقامی شخص کا کاندھا تھپتھپا کر بولا۔ ’’یہ حامد ہیں کمپیوٹر ماسٹر...... مجھے یقین ہے مسٹر شہزی!‘‘ وہ مردود آخر میں مجھ سے مخاطب ہو کے زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ ’’ان دونوں ماہرین کی موجودگی میں تمہیں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔‘‘

اس کے بعد آرک آپریشن تھیٹر نما اس منحوس کمرے سے چلا گیا۔ گھسٹ نے چہرے پر سفید ماسک چڑھا لیا۔ ٹرالی کے قریب ایک ہیلپر کھڑا ہوا۔ دوسرا مشین کے پاس کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک انجکشن بھرنے لگا۔ میں اسٹریچر نما ٹیبل پر لیٹا یہ سب بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ یہ سب مجھے انسان کم اور قصائی زیادہ معلوم ہونے لگے۔ ڈاکٹر گھسٹ کا چہرہ اب سپاٹ نظر آ رہا تھا اور وہ میرے جسم کا جگہ جگہ سے ہاتھ پھیر کر کچھ جائزہ اور معائنہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ شاید بے ہوشی کے عالم میں میرا لباس بھی تبدیل کر دیا گیا تھا اور آپریشن کرانے والے مریضوں کا سا ’’چولا‘‘ ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ ایک ڈرپ کی سوئی میری نس میں اس ہیلپر نے گھونپ دی تھی اور انجکشن بھر کے پہلے ڈرپ کے اندر دوا انجیکٹ کی پھر دوسرا وائل اٹھا کے اس سے سرنج بھری اور ڈرپ ٹیوب میں جس کی سوئی میرے بازو کی نس میں پیوست تھی، کے اندر بہت دھیرے دھیرے انجیکٹ کرنے لگا۔ آج میں پہلی بار زندگی میں خود کو اس قدر بے بس، مجبور اور لاچار محسوس کر رہا تھا۔

شیطان صفت سرجن ڈاکٹر گھسٹ...... نے سرجیکل ٹرالی کے قریب کھڑے دوسرے ہیلپر سے کچھ کہا۔ وہ آگے بڑھا تو اس کی ہلکی سی ٹھوکر سے ٹرالی سرک کے میرے آپریشن ٹیبل کے ساتھ آن لگی اور پھر دفعتاً ہی میرے دائیں جانب بندھے ہاتھ کی انگلی سے کوئی آہنی شے ٹکرائی، میری انگلیاں بہرحال آزاد تھیں۔ میں نے وہ شے محض انگلیوں کی مدد سے دبوچ لی اور پھر وہ جیسے اس شے کو انگلیوں کے لمس سے محسوس کرتے ہی میرے ذہن کے اندھیروں میں یکلخت امید کی جوت جاگ پڑی۔ وہ سرجیکل نائف تھا۔ ادھر وہ خبیث ہیلپر مجھے جانے کون سا انجکشن لگا چکا تھا۔ اس سے میرا ذہن رفتہ رفتہ نیم غنودہ ہو رہا تھا۔ ایک چیخ تھی جو میرے سینہ سوزاں سے برآمد ہونے کو بے چین تھی کہ کاش بے ہوشی کے یہ لمحات کچھ طویل ہو جائیں اور میں اس سے پہلے اپنا کام انجام دے ڈالوں...... کاش ایک حسرت زدہ آہ تھی، جس نے مجھے پاگل ہونے کی حد تک بے چین کر ڈالا تھا۔ میں نائف سے غیر محسوس انداز میں اپنی کلائی کی بیلٹ کاٹنے لگا۔ شکر تھا کہ پہلے والا ہیلپر دوبارہ اپنی جگہ پر نہیں لوٹا تھا ابھی تک...... ورنہ وہ اپنی ’’غفلت‘‘ اور میری مخفی حرکت دیکھ لیتا۔ دوسرا منحوس ہیلپر ڈرپ ٹیوب میں مجھے انجکشن دے چکا تھا پھر مودبانہ اور ہولے سے ڈاکٹر گھسٹ سے بولا۔ ’’سر! میں نے سنگل ڈوز دے دی۔ آخری ڈوز کے لیے اس کے چہرے پر ماؤتھ گیگ...... دینا پڑے گا۔‘‘ ڈاکٹر گھسٹ اس وقت میرا پیٹ برہنہ کیے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کچھ جائزے میں مصروف تھا اور ساتھ ہی کمپیوٹر ماسٹر حامد کو کچھ بتا رہا تھا۔ دوسرے ہیلپر کی بات پر سیدھا ہو کے بولا۔

''یس! ماؤتھ کیپ لگا کر آخری ڈوز دے دو۔ ہم نے مارک کرلیا ہے۔''

میں چونکا گویا ابھی سنگل ڈوز دی گئی تھی، آخری ڈوز دینے کا مطلب تھا میں مکمل طور پر بے ہوش ہو کے ان کے رحم و کرم پر ہو جاتا مگر سنگل ڈوز سے ہی میری حالت نیم غنودہ سی ہوتی جا رہی تھی لیکن میں اپنی قوتِ ارادی اور مضبوط اعصاب کے سہارے اپنے ''کام'' میں مگن تھا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں اللہ سے اپنی کامیابی کی دعائیں بھی مانگتا جا رہا تھا کہ بے ہوشی کی آخری ڈوز سے پہلے میرا کم ازکم ایک ہاتھ تو آزاد ہو جائے۔

پہلے والے ہیلپر کو ڈاکٹر گمٹ نے کسی کیبنٹ کی جانب مصروف کر دیا تھا۔ وہاں وہ کچھ تلاش کر رہا تھا۔

دوسرا منحوس ہیلپر میرے چہرے کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا دیکھنا چاہ رہا تھا لہٰذا میں نے نیم غنودہ ہونے کی ایکٹنگ شروع کر دی۔ تاکہ اس شیطانی ٹولے کو مجھ پر یا میری مخفی حرکت پر کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت میرا دایاں ہاتھ آزاد ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ کے آزاد ہوتے ہی جیسے میری رگ رگ سے قہر و غضب کا کالا طوفان امڈ پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے حلق سے شیر جیسی غرغراہٹ برآمد ہوئی اور دوسرے ہی لمحے میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا جس میں وہی نشتر دبا ہوا تھا۔ پہلا نشانہ میرا یہ شیطان ڈاکٹر گمٹ بنا تھا۔ میں نے اس کی موٹی سفید چربیلی گردن چیر ڈالی۔ اس کی شہ رگ کٹ گئی تھی شاید کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کی گردن سے خون کا فوارہ ابل کر اس کے ساتھ کھڑے حامد کے چہرے پر پڑا اور سرخ ہو گیا۔ دوسرا وار بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میں نے حامد کے پیٹ پر کیا۔ سرجیکل نشتر بہت تیز دھار تھا اور صرف گویا اشارے کا منتظر تھا۔ حامد کے پیٹ پر چرکا لگنے کی دیر تھی کہ اس کا پیٹ کھل گیا۔ اور انتڑیوں کا الجھا تا ہوا ڈھیر باہر کو آن پڑا جسے حامد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی انتڑیوں کے گچھے کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور پھر ڈاکٹر گمٹ کے ساتھ وہ بھی کربناک خرخراتی چیخیں مارتا ہوا زمین پر آرہا۔ مجھ پر تو جیسے آتشِ جنوں خیزی طاری ہو چکی تھی۔ دوا دینے والا ہیلپر تو پہلے ایک لمحے کو خوف زدہ ہوا پھر وحشت زدہ ہو کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس کی خوف زدہ کیفیات سے فائدہ اٹھایا اور جلدی جلدی اپنے دوسرے بازو کی بیلٹ کاٹ ڈالی تب دونوں ہیلپروں کے ہوش ٹھکانے آئے اور وہ جارحانہ انداز میں مجھے قابو کرنے کی غرض سے میری طرف لپکے۔ یہی تو میں چاہتا تھا، پہلے والے ہیلپر نے کچھ زیادہ ہی بہادری کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر آپریشن ٹیبل کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا پاؤں آپریشن تھیٹر کے چکنے فرش پر پھیلے ہوئے خون و دیگر آلائش میں پڑ کر پھسلا اور منہ کے بل وہ میری طرف آرہا۔ میں نے اس کے چہرے پر بائیں ہاتھ کا گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز خارج کر کے زمین پر آرہا۔ دوسرے ہیلپر کو میں نے نشتر سے نشانہ بنانا چاہا مگر نشتر کا وار اس کے سینے یا پیٹ پر پڑنے کے بجائے اس کے بازو پر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ وہ اب اولی سے باہر بھاگنے کے چکروں میں تھا کہ میں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے دونوں پیروں کے بیلٹ بھی کاٹ ڈالے۔ آزاد ہوتے ہی پھر تو میں جیسے بپھرا ہوا ایک زخمی شیر بن گیا تھا۔ ڈاکٹر گمٹ اور کمپیوٹر ماسٹر حامد تڑپ تڑپ کر ختم ہو چکے تھے۔ ان کے خون اور آلائشوں کے باعث چکنے فرش پر کافی خطرناک حد تک پھسلن پیدا ہو گئی تھی، مجھے خود کو باربار سنبھالنا پڑ رہا تھا۔ انجکشن کی فرسٹ ڈوز بھی اپنا غلبہ میرے دماغ میں جما رہی تھی اور خود کو میں نیم غنودہ سی حالت میں محسوس کر رہا تھا۔ یہ تو میرے اندر کی آتش جنوں خیزی تھی کہ غیظ جوش تلے میں اپنے مضبوط اعصاب اور خوداعتمادی کو بروئے کار لا رہا تھا۔ گھونسا کھا کے اور پھسل کر گرنے والے ہیلپر نے بدحواسی میں اٹھ کر بھاگنے کی کوشش چاہی تھی کہ پھر گر پڑا۔ اس کا سفید کوٹ بھی فرش پر خون کے تالاب میں لتھڑ کر سرخ ہو رہا تھا۔ دوسرا ہیلپر جو دروازے کی طرف دوڑا تھا، وہ بھی پھسل کر گرا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے خود میں بھی پھسلتے پھسلتے بچا تھا۔ دونوں نے بے بسی اور خوف کے عالم میں چیخنا چلانا اور ''ہیلپ...... ہیلپ'' پکارنا شروع کر دیا تھا میں ابھی تک خطرے میں ہی گھرا ہوا تھا۔ اس لیے جوش کے ساتھ ہوش سے کام لینا بھی ضروری تھا۔ میں ان کی طرف سے توجہ ہٹا کر دروازے کی طرف بڑھا، مجھے کچھ اندازہ تھا کہ آپریشن تھیٹر ساؤنڈ پروف ہوتا ہے۔ میں نے دروازے سے باہر راہداری میں جھانکا...... جہاں روشنی تھی۔ دو افراد چست لباس میں ملبوس آپس میں باتیں کرتے گزرتے نظر آئے۔ وہ ایک دوسرے کاریڈور سے اس طرف گھومے تھے اور اب سامنے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کی میری جانب پشت

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھی۔ مجھے ان کی بیلٹوں میں پستولیں اڑسے ہوئے دکھائی دیے۔ بے شک یہ اسپیکٹرم کے تربیت یافتہ ایجنٹ ہو سکتے تھے اور خود میں کیا تھا۔ اس پر مستزاد مجھ پر نیم غنودگی کا بھی غلبہ سوار تھا مگر بقا کے لیے مجھے کچھ نہ کچھ تو ہاتھ پاؤں ہلانے ہی تھے، ورنہ تو میرے ساتھ...... اول خیر کی بھی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی، سردست تو میرے لیے یہی بہت تھا کہ میں اس منحوس سرجیکل آپریشن سے بچ گیا تھا۔ اور ان دونوں شیطانوں...... ڈاکٹر گلمٹ اور حامد کو ختم کر چکا تھا یقیناً یہ میرا اسپیکٹرم جیسی تنظیم کو پہنچایا ہوا خاصا بڑا نقصان تھا نہ جانے اس ہشت پا تنظیم کے کتنے شعبے یہاں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل میں مصروف کار تھے؟

بہت دھیرے سے دروازہ کھول کے میں باہر نکلا۔ پھر چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ میں پشت کی جانب سے ان دونوں پر پل پڑا۔ میری حتی الامکان کوشش یہی تھی کہ انہیں خود سے دوبدو مارا ماری کا موقع نہ دوں اور کم سے کم وقت میں ان پر قابو پانے کی کوشش کروں کیونکہ جانتا تھا میں کہ میں اس وقت خونی بھیڑیوں کی کچھار میں تھا جبکہ اول خیر بھی ان کے قبضے میں تھا، ابھی تھوڑی دیر میں آرک تک خبر پہنچنے والی تھی کہ میں اس کے بیس کوارٹر میں کیا گل کھلا چکا ہوں۔ اس کے غرور اور طاقت کے گھمنڈ کی دھجیاں بکھرنے والی تھیں۔ یہ اطلاع پہنچتے ہی بیس کوارٹر کے در و دیوار تک مجھ پر اور اول خیر پر تنگ کر دیے جائیں گے۔

وہ دونوں گویا ”اپنے ہی گھر“ میں اس اچانک حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھے، سو مار کھا گئے، دونوں ہی کوریڈور کے فرش پر گرے تھے اور میں نے ان میں سے ایک کو اپنا ہدف بناتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے نشتر سے اس کی گردن چیر ڈالی اور اس کے پستول پر ہاتھ مارا، یہ امریکن ساختہ جدید آٹومیٹک ”لوگر“ تھا۔ دوسرے نے گرتے ہی اور صورتِ حال کی خطرناکی کو پل کے پل بھانپتے ہی بڑی بلاخیز پھرتی کے ساتھ اپنا پستول نکال کر لیٹے لیٹے ہی اس کی خوفناک نال کا رخ میری طرف کر دیا۔ گولی چلانے کا دھماکا ہوا اور اس کی پستول کی نال سے گولی نکلنے کی حسرت ہی رہ گئی گوکہ اس سے پہلے ہی میرے لوگر نے آتشی قہقہہ اگل دیا تھا۔ گولی اس کی پیشانی پھاڑتی ہوئی بھیجے میں اتر گئی تھی۔

میں نے اس کا لوگر بھی اٹھا لیا اور دونوں ہاتھوں میں جدید ساختہ ہتھیار رہتے ہی میری ہمت سوا ہو گئی۔ میں اٹھ کر اندازے سے ایک طرف کو دوڑا تو اچانک مجھے چکر سا آ گیا اور میری آنکھوں میں تاریکی چھانے لگی، میرے قدم لڑکھڑا گئے اور میں شاید کوریڈور کی دیوار سے ٹکرایا تھا۔ ایک لوگر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور پھر میں بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور چکنے فرش پر گرا۔ میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں جانے کدھر سے مجھے دوڑتے ہوئے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی، یہ میرے لیے انتہائی جاں گسل اور خطرناک لمحات تھے۔

”نہیں، شہزی نہیں، اب گرا تو کبھی نہیں اٹھ پائے گا۔ اٹھ، سنبھال خود کو۔“ میرے اندر جیسے کوئی دہاڑ مار کر چیخا۔ میں نے فرش پر لیٹے لیٹے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ کچھ ہوش و خرد کا یارا ہوا، ایک لوگر ہنوز میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ دوسرا مجھ سے تھوڑے فاصلے سے فرش پہ پڑا تھا۔ میں نے بمشکل آگے کی جانب خود کو گھسیٹا اور دوسرے لوگر کو بائیں ہاتھ میں دبوچتے ہی دوڑتے قدموں کی دھمک کی آوازوں کا اندازہ کرتے ہی میں پشت کے بل لیٹے لیٹے اپنے سر کو تھوڑا سا اٹھایا اور میرے لوگر والے دونوں ہاتھ بھی بلند ہوئے، مجھے اپنی ٹانگوں کے رخ پر سامنے سے تین چار مسلح افراد اپنی طرف دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے اور پھر یہی وہ لمحہ تھا شاید جب مجھے ان سے پہلے ان پر فائر کا موقع ملا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں کے لوگر کے ٹریگر پر میری انگلیاں جیسے بجلی کی طرح تھرتھراتی چلی گئیں اور لوگرز کی نالیں شعلے اگلنے لگیں۔ پے در پے کئی کریہہ انگیز چیخیں لوگر کے دھماکوں کی آتشیں غرمستیوں میں ابھریں اور وہ سب ایک دوسرے کے اوپر گولیوں سے چھلنی ہو کر گرنے لگے۔ میری آنکھوں میں چھانے والی دھندلاہٹ ابھی پوری طرح سے چھٹی نہیں تھی۔ تاہم میں نے ایک پھر مضبوط قوتِ ارادی اور چٹخے اعصاب کی بے قاعدگی پر مکمل دسترس قائم رکھتے ہوئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا اب جو بھی کرنا تھا، وہ فوری اور جلد کرنے کا متقاضی تھا۔ پل کے پل میں نے اندازہ لگایا کہ وہ منحوس سلاٹر روم کدھر ہو سکتا تھا مگر عبث مجھے علم نہ ہو سکا۔ کیونکہ درمیان میں مجھے گردن پر سرنج کی سوئی چبھو کر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ اول خیر کی طرف سے تشویش کی ابھرتی لہر نے مجھے بولا کر رکھ دیا۔ میں کچھ دیر پہلے آرک کی ثریا کے ساتھ درندگی اور چنگیزیت کا مظاہرہ ہوتے دیکھ چکا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ آرک، اول خیر کو گن پوائنٹ پر رکھ کر مجھے بہ آسانی قابو میں آنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

میں ایک اندازے سے اللہ کا نام لے کر آگے دوڑتا چلا گیا۔ دائیں جانب مجھے ایک کمرے کا دروازہ تھوڑا کھلا نظر آیا۔ پھر آگے پیچھے متعدد دوڑتے قدموں کی آہٹ ابھری

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جب تک کوئی اس طویل کوریڈور میں نمودار ہوتا، میں غڑاپ سے مذکورہ کھلے دروازے والے کمرے میں گھس گیا۔ کمرا روشن تھا مگر خالی۔ ٹھیک اسی وقت مجھے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

کان دھرنے پر پتا چلا کہ یہ مردود چنگیز نسل...... آرک تھا جو غیظ و غضب کے مارے تقریباً پاگل ہو رہا تھا۔ وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو میرے بارے میں احکامات صادر کر رہا تھا۔ یہ آواز مجھے ایک کونے کے قریب سے زیادہ محسوس ہوئی۔ میں نے اس جانب دیکھا وہاں مجھے درز نظر آئی۔ قریب آیا تو عقدہ کھلا وہ ایک فکسڈ دروازہ تھا۔ میں نے اس کی جھری سے آنکھ چپکا دی۔ آرک کا منحوس چہرہ اور ناپاک وجود نظر آ گیا۔ مارے طیش اور جوش غیظ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ وہاں قریب آٹھ دس مسلح ساتھی موجود تھے۔

”کہاں غلطی ہوئی ہے ہم سے...... کس جگہ ہم نے چوٹ کھائی؟ اور کیسے؟ میں نے تو آخری وقت تک اسے بالکل بے بس اور بندھا ہوا آپریشن ٹیبل پر پڑے پایا تھا۔ کیا وہ جن تھا، وچ تھا، یا چھلاوا؟“

”باس! وہ واقعی چھلاوا تھا۔ اس نے پتا نہیں کیسے خود کو عین اس وقت چھڑا لیا تھا جب اسے بے ہوش کیا جا رہا تھا۔“ ایک ساتھی ایجنٹ نے آرک کو بتایا تو وہ اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ کرتے ہوئے دہاڑا۔

”جاؤ اب میرا منہ کیا تک رہے ہو۔ اسے ڈھونڈو...... وہ کسی خوفناک عفریت کی طرح ادھر ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔“ وہ سب الٹے پیروں لوٹ گئے۔ میں نے آرک کو دیکھتے دروازے کو ہولے سے اندر کی طرف تھوڑا دھکیلنا چاہا مگر ندارد۔ وہ بند تھا۔ ایک ساتھی کو اس نے اپنے پاس موجود رہنے دیا تھا۔ اس سے پوچھا۔

”کیا ڈاکٹر کمست اور حامد دونوں ختم ہو چکے ہیں؟“

”یس باس، دونوں پر شہزی نے بہت کاری وار کیا تھا۔“

”شٹ...... شٹ...... اس بدبخت شہزی نے میرا کتنا بڑا نقصان کر ڈالا۔ م...... میں...... میں ماسٹر لولوش کو کیا جواب دوں گا۔ ایک ایک عام سا لڑکا...... زیرو ہاؤس میں ہمارے ہیڈ کوارٹر میں اتنے تربیت یافتہ لوگوں کی موجودگی میں... اتنی بڑی تباہی پھیلا کر کسی پُراسرار مخلوق کی طرح غائب ہو گیا۔ نو...... نو...... نیور...... ماسٹر لولوش...... میری کھال ادھیڑ دے گا اور تم سب کی بھی......“ آرک کی حالت دیدنی حد تک بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اسے یوں اپنی ہی غیظ و غضب کی آگ میں جلتا سلگتا دیکھ کر میرے انتقامی جذبے کی بھی تسکین ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اس وقت اس کے ہرکارے نے کہا۔ ”باس! اس کا ساتھی ہمارے قبضے میں ہے۔ ہم اسے گن پوائنٹ میں لے کر شہزی کو قابو کر سکتے ہیں۔“ اس کی بات پر یکلخت میرے کان کھڑے ہو گئے، آرک نے کہا۔ ”میں آخر میں یہی کروں گا مگر ابھی نہیں، اسے ڈھونڈو، تم بھی دفع ہو جاؤ میری نظروں سے......“ اس کی غصیلی دہاڑ پر وہ بھی الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔

میں نے اس مختصر کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ خالی کمرا تھا مگر اچانک مجھے اس کے دوسرے کونے والی سمت پر ایک چبوترا نما تھڑا سا ابھرا ہوا دکھائی دیا۔ یہ باکس نما تھڑا کم و بیش پانچ فٹ کا تھا اور فرش سے ایک ڈیڑھ فٹ اوپر بھی تھا۔ میں لپک کر اس کی جانب بڑھا تو عقدہ کھلا یہ ایک مختصر سا زمین دوز زینہ تھا۔ میں لپک کر جیسے ہی اس کے اندر داخل ہوا مجھے اس کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلتا سنائی دیا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو صورتِ حال سنگین تر ہو سکتی تھی، میں تیزی کے ساتھ مگر بے آواز قدموں سے نیچے اترتا چلا گیا۔ پھر ایک مقام پر رک گیا۔ ابھی میں زینے میں تھا۔ نہ جانے اور نیچے کتنی گہرائی تک یہ تہ خانہ جاتا ہوگا مگر چند ثانیوں تک وہیں دبکا رہا اور اوپر دیکھنے لگا۔ دفعتاً میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ کئی چہرے مجھے اوپر سے نیچے تاریک خلا میں جھکے دکھائی دیے۔ یقیناً وہ مجھے دیکھنے سے عاری ہوں گے مگر دفعتاً ان میں سے ایک آواز سن کر میں پریشان ہو گیا۔

”نیچے روشنی پھینکو...... ممکن ہے...... وہ یہ سمت میں اُتر گیا ہو۔“

ان شیطانی ہرکاروں کو اگر میری ایک ذرا بھی جھلک نظر آ جاتی تو وہ ادھر ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے جبکہ میں نیچے مزید نہیں اترنا چاہتا تھا۔ میری پہلی کوشش اول خیر کو مردود چنگیز صفت آرک کے چنگل سے چھڑانا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد ابھی تک ثریا کی اس کے ہاتھوں عبرت ناک اور تھرا دینے والی موت کا منظر تازہ تھا۔ آرک جیسے خبیث اور جلاد آدمی سے کچھ بھی متوقع تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں آرک کو دیکھتے ہی اس پر قابو پانے کی سوچ رہا تھا کہ اس

کمرے کی اچانک ریکی ہوگئی، بہرطور میں روشنی پھینکنے والی بات سن کر تیزی کے ساتھ نیچے اترنے لگا تو اسی وقت اوپر سے کسی ٹارچ کی مدد سے نیچے روشنی پھینکی گئی، اب میرا مزید حرکت پذیر رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ نیچے نہ جانے اور کتنا طویل زینہ تھا یا فرش کہاں تک تھا' مجھے اس کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ البتہ روشنی پڑتے ہی میں نے خود کو پشت کے ذریعے زینے کی دیوار سے چپکالیا۔

"ہمیں نیچے اترنا پڑے گا۔ وہ یقیناً ادھر ہی گیا ہوگا۔" دوسرے نے کہا۔ مجھے پھر پریشانی نے آگھیرا۔ کیونکہ میں کم ازکم یہاں ان سے مقابلہ کرنے کے موڈ میں نہ تھا، یہ تہ خانہ میرے لیے چوہے دان بن سکتا تھا۔ آرک نے گویا میرے سلسلے میں ایک طرح سے "ڈیتھ وارنٹ" جاری کردیا تھا۔ یہاں مقابلہ کرنے کا مطلب تھا، اپنی قبر آپ کھودنا کیونکہ سب کا پھر ادھر ہی رخ ہو جاتا۔ ابھی تو ان کی "افرادی قوت" میری تلاش میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ جابر اور رابرٹ...... دوسرے زینے سے کم ازکم دس پندرہ ساتھیوں کے ساتھ نیچے اتر چکے ہیں۔ ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں جعفر کو فالو کرنا ہوگا۔ اس طرف اب تک کوئی نہیں گیا۔ وہ وہاں اکیلا ہے۔"

ایک دوسری آواز نے گویا میرے اندر تسکین کی بے پایاں لہر دوڑا دی۔ ورنہ تو میں ان کی زبانی یہ سن کر مزید حوحش سا ہوگیا تھا کہ نیچے بھی مسلح دشمنوں کا جتھا موجود تھا۔ گویا یہاں دیکھ لیے جانے کی صورت میں دونوں طرف سے سینڈوچ بن کر رہ جاتا اور یہ تہ خانہ ہی میری قبر بنتا۔

وہ سارے پلٹ گئے۔ میں نے حرکت کی، اوپر آیا۔ ذرا جھانک کر دیکھا۔ وہ جا چکے تھے۔ کمرا خالی تھا۔ میرا مزید اس کمرے میں رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دونوں جدید ساختہ لوگرز میرے دونوں ہاتھوں میں کھلونوں کی طرح دبکے ہوئے تھے، دروازے کی جھری سے میں نے جھانکا تو جیسے یکلخت میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ برابر والا کمرا وہی تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں آرک اور اس کے مسلح ساتھیوں کو دیکھ چکا تھا۔ میرے چونکنے کی وجہ وہ دو افراد تھے جو اول خیر کو رسن بستہ حالت میں اسی کمرے کی طرف لارہے تھے، میرے جھنکے ہوئے ذہن نے پل کے پل فیصلہ کرڈالا۔ "اب نہیں تو کبھی نہیں" ایک دھڑاکے سے میں نے دروازہ کھولا۔ میرے دونوں ہاتھ سامنے کی جانب بلند ہوئے اول خیر مجھے فائرنگ پوزیشن میں دیکھ کر بروقت عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً نیچے کو تھوڑا جھکا۔ اسے دائیں بائیں بازو سے دبوچے ہوئے ہرکاروں کو سنبھلنے کا موقع تو دور کی بات تھی، انہیں ایک ذرا جنبش کا بھی موقع دیے بغیر میں نے یک بیک اپنے دونوں پستولوں کے ٹریگر دبا دیے۔ دونوں کو جھٹکا لگا اور زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ آگے بڑھ کر میں نے انتہائی پھرتی کے ساتھ اول خیر کے دونوں ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر رونقیں اور زندگی کی مسرتیں دوڑ گئی تھیں۔ ایک لوگر اسے تھماتے ہی میں نے دروازے کو لات رسید کردی۔ دروازہ دھڑ سے کھلا اور اندر کوئی اس سے ٹکرا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ وہ آرک تھا جو فائر کی آواز سنتے ہی پستول ہاتھ میں لیے، دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ باہر کی سچویشن کا اسے کچھ اندازہ نہیں ہو پایا تھا اس نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی۔ میرے لوگر نے شعلہ اگلا، گولی اس کے پستول والے ہاتھ کی پوری ہتھیلی ہی اڑا چکی تھی، وہ کریہہ انداز میں چیخا، پھر میں نے کسی زخمی شیر کی طرح اس پر جھپٹا مارا اور گردن سے دبوچ لیا پھر خوفناک لہجے میں غرایا۔

"بس! اب تمہارا کھیل ختم ہوگیا کتے۔"

"تم...... تم...... یہاں سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔" وہ کراہتے ہوئے غیظ آلود لہجے میں بولا۔ اس کا دایاں ہاتھ کلائی سے اڑ جانے کے بعد خون اگل رہا تھا۔ میں نے زہرخند غراہٹ سے اور گویا اس کی حالتِ زار سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہمارا دردِ سر ہے۔"

"ماسٹر لولوش سے دشمنی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔ نہیں جانتے تم اس کو، وہ سیکڑوں میل دور بیٹھے بھی تمہیں کسی چڑیا کی طرح بے بس کرسکتا ہے۔" آرک دھمکیاں دینے سے باز نہیں آرہا تھا۔

"تمہارے ماسٹر لولوش سے میں بھی دو دو ہاتھ کرنے کو بے چین ہوں۔ اس سے بھی نمٹ لوں گا میں، تم اپنی جہنم میں خیر مناتا اب۔"

"میں ماسٹر کا خاص آدمی ہوں۔ وہ میری موت کبھی برداشت نہیں کرے گا۔"

"اسے برداشت کرنا پڑے گا...... بہت کچھ برداشت کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا اور اسے آگے دھکیلا۔

"اول خیر! محتاط رہنا اس سؤر کی اولاد کو ہم گن پوائنٹ پر ڈھال بناتے ہوئے یہاں سے نکلیں گے۔"

"او خیر...... کاکا، میں تیار ہوں۔ شکر ہے تجھے صحیح

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سلامت دیکھ لیا۔ ورنہ تو میری جان ہی سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔" وہ بولا۔

ہم دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے آرک کی گردن کے گرد اپنا بازو کا شکنجہ جکڑ رکھا تھا اور لوگر کی نال اس کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی ٹھیک اسی وقت کھلے دروازے پر کئی مسلح افراد اُمڈ پڑے مگر آرک کی ہیئت کذائی دیکھ کر ٹھٹک گئے۔

میں نے انہیں خبردار کر دیا اور آرک کو جان سے مارنے کی دھمکی دی۔ اول خیر میرے ساتھ تھا۔ وہ سب تذبذب میں مبتلا تھے۔ میں نے پھر آرک کی کنپٹی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھا کر کہا۔ "اپنے کتوں سے بولو، ہمارا راستہ صاف کریں ورنہ ہم نے اپنے سر پر کفن تو باندھ ہی رکھا ہے۔"

آرک کو اب تک میری خوں ناکی کا بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا مگر شاطرانہ لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد میری زندگی کی ضمانت کیا ہوگی؟"

"کچھ نہیں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کو حیرت آمیز الجھن چمکی۔ میں نے اس سمیت قدم بڑھائے۔ اول خیر بھی میری طرح اپنے "چوطرفہ" سے پوری طرح محتاط تھا کہ آرک کا کوئی ساتھی کسی جگہ سے اچانک ہم پر وار کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ ہم بہرحال دشمن پر کامل سبقت نہیں رکھے ہوئے تھے۔ کوئی بھی چالاکی چل سکتا تھا، آرک نے پھر میرے ساتھ تہدیدی کارروائی کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شہزی! اب بھی وقت ہے تم دونوں خود کو ہمارے حوالے کر دو، میں ڈاکٹر ٹھمٹ اور حامد کی موت کو فراموش کر دوں گا اور تمہارے ساتھ اس بار دوستانہ ڈیل کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ خبیث بڑی زبردست مکاری چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ تھا، عیار اور خنزیر صفت آرک کو میں نے جو کاری زخم لگایا تھا اس کے باعث وہ اندر سے کس قدر بپھرا ہوا تھا۔ وہ ایک مکار، سنگ دل اور بے رحم آدمی تھا جس طرح اس نے ثریا کا حال کیا تھا، وہ تھرا دینے والا منظر میری آنکھوں سے نہیں ہٹ پا رہا تھا۔

"ہو سکتا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے بھی مکاری دکھائی۔ "مگر اس وقت...... تم نہیں میں تم سے ڈیل کروں گا۔ اپنے ساتھیوں سے کہو ہتھیار زمین پر رکھ کر الٹے پاؤں دوڑ جائیں۔"

"یہ نہیں جائیں گے۔" جواباً آرک غرایا۔ میں نے دانت بھینچ کر اپنے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد مزید تنگ کر ڈالا۔ اس کے حلق سے مارے اذیت کے کراہ خارج ہوگئی۔ "میں تیری گردن توڑ ڈالوں گا خبیث کتے، اور تیری لاش کو بھی ڈھال بنا کر ان پر گولیوں کی بارش کر کے نکل...... جاؤں گا۔ بول ان کو یہ دفع ہو جائیں۔" میری خوں ناک لہجے کے اٹل پن پر ایک لمحے کو آرک کی کھنچی ہوئی بھوؤں والی آنکھوں میں خوف کی چمک لہرائی، دشمن خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو مگر موت یقینی موت کو سامنے پا کر اس کے اوسان خطا ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہی حال آرک کا تھا۔ گردن پر میرے بازو کا شکنجہ تنگ پڑتے ہی اس نے محض ہاتھ کے اشارے سے اپنے مسلح ساتھیوں کو تحکمانہ اشارہ دیا۔ اپنے باس کا اشارہ اور اس کی ہیئت کذائی بھانپ کر انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ اپنے ہتھیار کوریڈور کے فرش پر رکھ کر وہ سب پلٹ گئے۔ میری عقابی نظروں نے ہتھیاروں کا جائزہ لیا۔ وہ جدید ساختہ سب مشین گنیں تھیں۔ میں نے اول خیر کو اشارہ کیا وہ فوراً آگے بڑھا اور دو گنیں اٹھالیں جبکہ لوگر اس نے اپنے نیفے میں اڑس لیا۔

"آرک! اب میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر تو نے اب بلا چون و چرا میرے احکامات پر عمل نہ کیا۔" میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اس سے کہا۔ "نکاسی کا راستہ بتاؤ۔"

"اس طرف......" اس نے آنکھوں کے ڈیلے گھما کر اور ایک ہاتھ کے اشارے سے سامنے دائیں جانب مڑتی راہداری کی طرف رہنمائی کی' ہم وہاں پہنچے...... بائیں جانب بھی ایک راہداری تھی۔ میں دانستہ آرک کی ہدایت کے بجائے دائیں مڑنے کے بائیں جانب مڑ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیوں میں فرطِ جوش سے سائیں سائیں ہو رہی تھی۔

"ادھر نہیں...... ادھر......" آرک پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ میں نے اس پر توجہ نہ دی۔ نہ ہی میں اس پر بھروسا کر سکتا تھا۔ میں جانتا تھا وہ کسی وقت بھی مجھے پھانس سکتا تھا۔ اس طرف...... مجھے ایک دروازہ دکھائی دیا اور میں نے اول خیر کو مخصوص اشارہ کیا۔ جسے بھانپتے ہی اس نے دروازے پر جدید ساختہ سب مشین گن سے برسٹ مارا۔ دروازہ تو اکھڑ گیا۔ مگر ساتھ ہی کئی کریہہ انگیز انسانی چیخیں بھی سنائی دیں۔ معلوم ہوا وہاں بھی اس کے ساتھی گھات لگائے بیٹھے تھے، گولیوں کی آتشیں بوچھاڑ نے انہیں بری طرح رگید ڈالا تھا مگر کچھ مسلح ساتھی بچ کر دائیں بائیں گھات

لگانے کی کوشش میں مصروفِ کار ہوئے تو اسی وقت آرک کو چالاکی چلنے کا موقع مل گیا کچھ وجہ میری لمحہ بھر کو اس کی طرف سے توجہ ہٹنے کی بھی تھی کیونکہ اس کے مسلح ساتھیوں کا دوسرا ٹولہ اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ آرک نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ پر رسید کر دی۔ میں اس حملے کے لیے تیار نہ تھا۔ نتیجتاً میرے بازو کی گرفت کمزور پڑی جبکہ میرے منہ سے تکلیف کے مارے برآمد ہونے والی ہلکی آواز نے اول خیر کو میری طرف متوجہ کیا تھا۔ آرک بلاشبہ ایک تربیت یافتہ ہی باس تھا اور کسی ایسے ہی موقع کی تاک میں رہا تھا۔ اس کی ٹانگ نے بھی حرکت دکھائی جو اول خیر کے سینے پر پڑی اس کے لیے بھی یہ اچانک حملہ تھا۔ لات کھا کر وہ پیچھے کو لڑکھڑایا اور کوریڈور کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ ادھر مجھے بھی سنبھلنے میں دیر لگی مگر آرک اس مختصر سے دورانیے میں ہی کافی کامیابی حاصل کرنے لگا تھا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور ساتھ ہی میرے گن والے ہاتھ پر جھپٹا مارنا چاہا کسی حد تک وہ کامیاب بھی ہوا کیونکہ میرے ہاتھ میں تھما ہوا لوگر ہاتھ سے گرا۔ اور اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے پہلو میں کہیں اڑسا ہوا پستول نکالنے کی کوشش چاہی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس پر قابو پانے کے بعد مجھے اس کی جامہ تلاشی لینی چاہیے تھی مگر اب یہ سب سوچنے کا وقت نہ رہا تھا۔ میں نے ایک عقل مندی کی کہ بجائے اپنا لوگر اچکنے پر وقت ضائع کرنے کے میں نے لات چلا دی۔ پستول آرک کے ہاتھ میں آچکا تھا مگر میری بروقت حاضر...... دماغی اور لات رسید کرنے پر آرک چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا مگر میری یہ کوشش بھی زیادہ دیر خاطر خواہ کامیاب نہ ہو سکی تھی کیونکہ لات کھا کر چند قدم پیچھے لڑکھڑانے کے باوجود بھی آرک نے حیرت انگیز طریقے سے اپنے حواسوں پر قابو پائے رکھا تھا اور سنبھلتے ہی اس خبیث نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا رخ میری جانب کیے ہی رکھا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنی یقینی موت...... خود سے محض چند قدموں کے فاصلے پر محسوس ہوئی تھی اور ایسے نازک ترین لمحات میں اچھے اچھوں کے حواس لمحہ بھر کو شل ہو جاتے ہیں۔ آرک پہلے ہی مجھ پر زخم... کھائے ہوئے تھا۔ ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور آرک کا پورا چہرہ ہی چھلنی ہو گیا۔ اول خیر نے سنبھلتے ہی بروقت اس پر اپنی سب مشین گن سے فائر کر ڈالا تھا۔

"کاکے! ادھر پلٹ آ...... جلدی۔" وہ چلایا۔ آرک کو بڑے بھیانک طریقے سے جہنم واصل کرنے کے بعد اول خیر نے مجھے پکارا۔ شاید میری طرح اسے بھی اندازہ تھا کہ آرک کے ختم ہوتے ہی اس کے مسلح ساتھی ہم پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنا لوگر اٹھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اول خیر کی ہدایت پر عمل کیا تھا اور اس کے عقب میں دوڑتا ہوا پلٹا۔ ہم جیسے ہی مڑے تھے اور ہمارے عقب میں بیک وقت کئی گنز گرج اٹھیں...... میں نہتا تھا اس لیے اول خیر نے اپنا لوگر میرے حوالے کر دیا تھا۔

زیرو ہاؤس کی اس عمارت میں نہ جانے کتنی منحوس بھول بھلیاں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ نہ ہی ہمیں اس کے محلِ وقوع کا کچھ اندازہ تھا مگر ہمیں جہاں راستہ سوجھ رہا تھا ہم اندازے سے اسی طرف کا رخ کر لیتے مگر جانتے تھے کہ زیادہ دیر تک ہم اس "چھپن چھپائی" کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے ہماری ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ ہم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔

ایک زینے کے دائیں جانب ہمیں بغیر دروازے کا ہال کمرا سا دکھائی دیا۔ ہم دونوں اس کے اندر جا گھسے۔ یہاں الابلا اشیا کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ ہم دوڑ پڑنے کی روش پر گامزن ہال سے گزرنے لگے۔ ہال کے دوسری طرف دو کھلے پٹ والے دروازے ملتے دکھائی دیے۔ ہم اسے ٹھوکر رسید کرتے ہوئے آگے بڑھے تو اچانک ٹھٹک کر رک گئے اور دوسرے ہی لمحے ہمارے بشروں پر بیک وقت مسرت چمکی۔ سامنے ایک طویل و عریض میدان تھا وہاں شام کے سائے اترے ہوئے تھے اور آسمان دو رنگی نظر آ رہا تھا۔ سرخی اور تاریکی کے امتزاج میں عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ کہیں کہیں چھوٹے الیکٹرک پول پر بلب روشن تھے۔ باہر آئے تو دنگ رہ گئے۔ میدان کے تین اطراف تقریباً آٹھ نو فٹ اونچی دیواریں تھیں جن کے اوپر تین رویہ خاردار آہنی باڑیں تین تین فٹ کے فاصلے پر نصب خم دار فولادی بریکٹوں کے ساتھ جال کی صورت میں منسلک تھیں۔ اور یہ سلسلہ تین اطراف تک چلا جاتا تھا۔ سامنے بڑا سا دیوہیکل آہنی گیٹ تھا جبکہ دائیں بائیں طویل القامت آہنی ڈھانچے نصب تھے جن پر بڑے بڑے لوہے کے ڈرم اور بوائلر نصب تھے۔ ان میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چوتھی سمت اس عمارت کا رقبہ تھا۔

"اوخیر...... کاکے، ان خبیثوں نے اپنے زیرو ہاؤس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کو ایک ''مل'' کی آڑ میں چھپا رکھا ہے۔'' اول خیر پُرتحیر لہجے میں بولا۔ ''مجھے سالوئنٹ پلانٹ دکھائی دیتا ہے۔''

اس کی یہ بات درست تھی کیونکہ عقب میں مڑ کر میں نے عمارت کی پیشانی پر ''سن ریز سالوئنٹ پلانٹ'' پڑھا تھا۔ کچھ گاڑیاں اور باربردار ٹرک کھڑے تھے، ایک جانب ہلکی گڑگڑاہٹ سی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ پاور پلانٹ تھا گویا عمارت کو بجلی پہنچانے کا الگ سے اسٹینڈ بائی بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ ایک جارحانہ خیال ابھرا۔ میں نے فوراً اول خیر کے ہاتھوں سے سب مشین گن جھپٹ لی اور اس کا رخ اس سینٹرل پاور پلانٹ کی طرف کرکے برسٹ کھینچ مارا، دھماکوں کی گونج سے آنکھوں کو خیرہ کردینے والی چقماق سی روشنیاں ابھریں اور پوری عمارت کی بجلی چلی گئی جبکہ پاور پلانٹ روم میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

''اوتیرہ......'' اول خیر کے حلق سے ہولے سے برآمد ہوا۔ میں نے دیوہیکل آہنی گیٹ کی طرف دوڑ لگاتے ہوئے چیخ کر اول خیر کو پکارا۔ اس نے بھی فوراً میری تقلید کی۔

ہم چشم زدن میں گیٹ کے قریب پہنچ چکے تھے، بغلی دروازہ تلاشنے میں مجھے مطلق دیر نہ لگی۔ اسے کھول کر ہم باہر آگئے۔ سامنے کیکر اور سرس کا جنگل سا پھیلا ہوا تھا۔ دفعتاً ہمارے عقب میں گولیوں کی بوچھاڑ ابھری۔ ٹن...... ٹن...... زٹ زائیں کی سمع خراش آوازیں ہماری عقبی ہوئی ساعتوں سے ٹکرائی تھیں مگر ہم باہر نکل چکے تھے اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہم نے جو گل کھلانا تھا، وہ کھلا چکے تھے۔ ہماری مہم اگرچہ ایک طرف ناکام بھی ثابت ہوئی تھی تو دوسری طرف کامیاب بھی تھی۔ ثریا ہمیں کچھ بتانے کی حسرت لیے دنیا سے چلی گئی تھی مگر ہم نے آرک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ تیز ڈاکٹر گلسٹ اور کمپیوٹر ماسٹر حامد کو بھی جہنم واصل کرکے بنیادی طور پر اسپیکٹرم کو کاری ضرب لگائی تھی۔ اسپیکٹرم کے تین عہدیداروں میں سے ایک آرک، اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا تھا جو لولووش کا خاص الخاص آدمی کہلاتا تھا۔ وزیر جان اور چودھری ممتاز ابھی زندہ تھے۔ اسپیکٹرم کے کیا مذموم مقاصد تھے، ان میں سے کچھ ظاہر ہو چکے تھے باقی تاریکی کے پردے میں تھے۔ وزیر جان میرا اگلا ٹارگٹ تھا۔

ہم زیرو ہاؤس میں تباہی مچا کر نکل بھاگے تھے، آرک کے باقی ماندہ ساتھی ہمارے تعاقب میں آسکتے تھے یا پھر وہ زیرو ہاؤس کے پاور پلانٹ کی آتش زدگی پر قابو

سرگزشت جولائی 2015ء کی جھلکیاں

ماہنامہ
سرگزشت

بلند اقبال
عظیم شاعر کا زندگی نامہ

لباس
لباس کے ارتقا کی داستان

سلطنت انکا
ایک ترقی یافتہ تہذیب' جو دنیا سے ختم ہوگئی

عہد بہ عہد
تاریخ عالم قبل از تاریخ

اس کے علاوہ

خون کی روانی تیز کردینے والی طویل کہانی ''سراب''، فلمی دنیا کی بھولی بسری ہیروئن روزینہ کا احوالِ زیست، سفرنامہ، شکار کتھا اور بھی بہت سے سچے قصے، سچ بیانیاں، دلچسپ واقعات

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر پرچہ مختص کرالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پانے میں مصروفِ کار تھے، تاہم میں اور اول خیر بغیر رکے تاریک جنگل میں دوڑتے رہے۔ جنگل مختصر ثابت ہوا تھا کیونکہ اس کے بعد ایک ہائی وے کی طرف سے روشنیاں سی متحرک نظر آنے لگی تھیں۔ ہم نے وہیں پہنچ کر دم لیا تھا اور ایک جگہ تاریکی میں ٹھہر کر اپنی بے ترتیب اور پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے رہے۔

"اب کیا ارادے ہیں شہزی کاکے؟" اول خیر نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ جب تک میں بھی اپنی سانسیں درست کر چکا تھا، بولا۔ "پہلے والے نامکمل رہ جانے والے مشن کو مکمل کرنا ہے۔"

"تمہارا مطلب...... اسٹیشن فور پر چڑھائی؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہو گیا ہے اول خیر! مگر اسے دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے...... مجھے بہت کچھ بتانا ہوگا۔ ابھی اس کی زندگی میرے لیے بہت اہم ہے۔ ورنہ اس کی بے وقت موت مجھے زندہ درگور کر ڈالے گی۔"

"او خیر...... کاکے، میں سمجھ رہا ہوں تیری بات۔" وہ بولا۔ "اس پر بھی ہم قابو پالیں گے، آرک جیسے شاطر گورے کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا، یہ کم بات نہیں۔ پتا نہیں یہ رذیل شیطان کیسے کیسے بھیانک مقاصد لے کر یہاں آن وارد ہوا تھا۔ مجھے تو اس وقت تیری طرف سے تشویش ہی نے مار ڈالا تھا جب یہ خبیث گورا تجھے نہ جانے کدھر لے گیا تھا۔"

میں اس کی بات پر مسکرایا۔ پھر جب اسے اصل حقیقت کا پتا چلا تو اول خیر خوف زدہ سا ہو گیا اس کے لیے یہ سب نیا تھا جو ڈاکٹر گلکرسٹ اور حامد میرے ساتھ آرک کے حکم پر اس منحوس آپریشن تھیٹر میں کرنے والے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ہمیں اپنے عقب میں روشنیاں دکھائی دیں۔

"او خیر...... کاکے، لگتا ہے دشمن تعاقب میں آرہا ہے۔" میرے چہرے پر بھی تشویش کے آثار اُمڈ پڑے۔ ہتھیار ابھی ہم نے پھینکے نہیں تھے۔ ہائی وے دور تک ویران اور چمکتی نظر آرہی تھی۔ شام گہری ہو کے تاریکی میں بدل چکی تھی۔

☆☆☆

دشمنوں کی "باقیات" ہمارے لیے اس وقت بھی کئی مشکلات کھڑی کرسکتی تھیں۔ کوئی بعید نہ تھا کہ آرک وغیرہ کی موت اور زیرو ہاؤس میں ہونے والی خون ریزی کی خبروں نے دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچادی ہوگی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔

"سڑک کے پار دوڑ چلو، کاکا۔" دفعتاً اول خیر نے سرسراتی آواز میں کہا۔ "ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں آئے ہیں۔"

میں نے اس کی بات پر صاد کیا اور بہ سرعت...... سڑک پار کر کے دوسری جانب کے کچے میں آگئے اور پھر تیزی کے ساتھ قدرے نشیبی ڈھلان میں اترتے چلے گئے۔ یہاں بھربھری مٹی کی سوندھی سوندھی بو خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جسے محسوس کر کے اول خیر نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ ساہیوال کا انڈسٹریل ایریا معلوم ہوتا ہے یہاں جابجا کاٹن، فلور مل اور سالوینٹ پلانٹ قائم تھے۔ ایکسٹرم نے اپنے وسیع تر مفادات کے لیے اس علاقے کو اپنا بیس کوارٹر بنایا تھا تو کچھ سوچ کر ہی بنایا تھا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ مجھے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی دشمن ہمارے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں گے۔ ورنہ تو ابھی تک انہیں اپنے زخم چاٹتے رہنا چاہیے تھا۔ ممکن تھا آرک کی موت کے بعد سیکنڈ کمانڈ ممتاز خان یا وزیر جان کے سپرد ہو چکی ہو اور انہوں نے فون پر ہدایات جاری کر دی ہوں۔ کیونکہ ظاہر ہے اب تک زیرو ہاؤس کی ہنگامی یا تباہی وغیرہ کی صورتِ حال اسٹیشن چیف اور کیمبا ایجنٹ تک پہنچا دی گئی ہو۔ بہرطور، میں اور اول خیر رکے نہیں اور تاریکی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ہائی وے کے بعد یقیناً دشمن بھٹک سکتے تھے۔ مجھے امید تھی آرک کے واصلِ جہنم ہو جانے کے بعد ان کے حوصلے اور امیدیں پست ہو چکی ہوں گی اور وہ محض تلاشی مہم میں ایک فارمیلٹی پوری کرنے ہی نکلے ہوں۔

کافی آگے جاکر ہم نے عقب میں دیکھا بھی تھا، ہمیں کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ صاف ظاہر تھا، وہ بھٹک گئے تھے۔ میں اللہ کے حضور صد شکرگزار تھا کہ اس نے مجھے ایک منحوس اور قاتل گھڑی سے بال بال بچایا تھا۔ ورنہ تو میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ اب بس اس بھیانک گھڑی کا تصور کرتے ہوئے بے اختیار مجھے سرتاپا جھرجھری سی آجاتی تھی کہ اگر وہ مردود آرک اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب ہو جاتا اور اس سرجیکل آپریشن میں وہ مائیکرو الیکٹرانک ڈیوائس میرے جسم کے کسی حصے میں نصب کر دی جاتی تو میں بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔

خودرو جھاڑیوں اور ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ ختم ہوا تو کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بھی آبادی کے آثار اور کچھ کھیتوں کے سلسلے دکھائی دیے۔ جدھر سے آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم ایک جگہ رک گئے۔

''اوخیر، کاکا! بڑا بالا مارا ہے۔'' اول خیر بولا۔ اس کے لہجے سے تشویش ہویدا تھی۔ کامیابی کا جوش بھی تھا۔ ''پر شہزی کاکا! لگتا ہے اب کچھ ایسا ہی ہے اس گورے سؤر...... آرک کی ہلاکت کے بعد ہم نے کچھ ولایتی قسم کے دکھرے ہی لوگوں سے دشمنی مول لے لی ہے۔''

''یہ دشمنی مجھ پر زبردستی جبر کی صورت مسلط کی گئی ہے، اول خیر۔'' میں نے کہا۔

''چودھری ممتاز نے اپنے کہاں تک ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ یہ تو اب ہمیں معلوم ہوا ہے۔ پر یار! پتا نہیں میرے دل کو ایک عجیب اور نامعلوم سی بے چینی اور تشویش سی محسوس ہونے لگی ہے۔''

''اوخیر، کاکے! اب کیسی بے چینی...... کیوں پریشان ہوتا ہے تو؟ ٹھیک ہے جو راہ میں آئے گا اسے منہ توڑ جواب دیں گے اور پھر شہزی کاکے! تیری تو اپنی پہنچ بھی بہت اونچی ہوگئی ہے۔ میجر ریاض باجوہ صاحب سے تیری اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی ہے۔ ہمیں یہ ساری کارروائی ان کے علم میں بھی لانی چاہیے اور انہیں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے کہ اسپیکٹرم والے اس کی ٹارگٹ کلنگ کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔''

اول خیر! اب بھی میری اصل تشویش کی وجہ نہیں جان سکا تھا۔ میں درحقیقت عابدہ کی طرف سے نامعلوم سی تشویش آمیز بے چینی کا شکار تھا کیونکہ اب تک میرا جن بڑے دشمنوں سے (بشمول آرک) سامنا ہوا تھا انہوں نے مجھے اشارۃً عابدہ کی طرف سے بھی مجھے وقتاً فوقتاً دھمکایا تھا۔ پہلے میں ان کی بکواس کو گیدڑ بھبکی سمجھتا تھا مگر اب اسپیکٹرم سے ٹکراؤ ہونے کی صورت میں مجھے کچھ لگتا تھا کہ یہ دھمکیاں ایک بڑے خطرے کی طرف اشارہ کرتی تھیں اور دشمن مجھ پر باور کراتے آرہے تھے کہ وہ عابدہ کی صورت میں ایک ترپ کا پتا ان کے ہاتھ میں تھا جو اسے کسی بھی وقت ایک ٹرمپ کارڈ کی صورت میں میرے خلاف آزما سکتے تھے، عابدہ کو امریکا بھیج کر میں اب تک مطمئن تھا کہ وہ سردست دشمنوں کی پہنچ سے دور تھی مگر اب اسپیکٹرم اور لولوش جیسے بین الاقوامی بااثر گینگسٹرز کی شمولیت سے مجھے خود بھی اب یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ عابدہ مجھ سے سیکڑوں میل دوری پر...... ایک ان دیکھے خطرے میں تو نہیں گھری ہوئی، جبکہ خود عابدہ نے بھی فون پر بارہا مجھ سے کسی انجانے خطرات کا اظہار بھی کیا تھا۔

''اوئے کاکے، کیا بات ہے، تو بہت پریشان ہوگیا ہے؟'' مجھے خاموش اور سوچتا پاکر اول خیر نے مجھے ہولے سے ٹہوکا دیا تو میں چونک کر خیالات کے بھنور سے اُبھر کے بولا۔

''کچھ نہیں یار...... بس اب یہاں سے نکلنے کی کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہمیں آبادی کی طرف رخ کرنے کے بجائے دوبارہ سڑک کی طرف رخ کرنا چاہیے دشمن جا چکے ہیں۔''

اول خیر نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ہم دوبارہ پلٹے اور ہائی وے پر آگئے، یہاں ہمیں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا غالباً دشمن یہ تسلی کرنے لگے ہوں گے کہ ہم دونوں زیرو ہاؤس کے گرد و جوار سے نکل چکے تھے یا ابھی مزید کہیں چھپ کر دوبارہ شب خون مارنے کو گھات لگائے بیٹھے تھے۔

''میرا ارادہ اس علاقے کی طرف روانگی کا تھا جدھر اسٹیشن فور تھا۔ وہیں ہماری کار بھی ایک آٹو مکینک گیراج میں ٹیوننگ وغیرہ کے لیے موجود تھی۔ یقیناً گیراج والا بھی حیران ہوگا کہ ہم کار چھوڑ کر اچانک کدھر غائب ہوگئے تھے۔ اب ظاہر ہے رات کافی ہوگئی تھی، گیراج بند ہی ہوگا۔ تاہم شہر پہنچ کر ہمارا ارادہ کسی چھوٹے موٹے اقامتی ہوٹل میں رات گزارنے کا تھا۔

جلد ہی شہر کی طرف جاتی ہوئی ایک مسافر نائٹ کوچ مل گئی اور ہم دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

شہر پہنچ کر ہم اترے۔ رات ایک ہوٹل میں گزاری۔ اگلے دن سویرے جاگے اور ہوٹل چھوڑ دیا۔ سب سے پہلے ہم نے ٹیکسی کر کے مذکورہ گیراج پہنچ کر اپنی کار حاصل کی اس کے بعد دوبارہ اسٹیشن فور کی جانب روانہ ہوئے جس کی عمارت وہاں سے محض چند فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔

شب بسری کے بعد ہم دوبارہ تازہ دم ہوگئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی اور اول خیر میرے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں کار کو درمیانی رفتار سے دوڑاتا ہوا اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچا تو میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہونے لگی۔ وزیر جان نے میرے گمشدہ ماں باپ کے بارے میں جو تذکرہ کیا تھا اس کے بعد میں وزیر جان کی گردن ناپنے کے لیے سخت بے چین تھا۔ زیرو ہاؤس سے حاصل کردہ ایک سب مشین گن اور دو لوگرز ابھی تک ہمارے قبضے میں تھے، اول خیر نے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میرے چہرے کے پُرجوش تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے ایک بات کی طرف اشارہ دیتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ اسٹیشن فور کی عمارت ایک ادارے کے زیرِدست ہے لہٰذا یہاں میری ایسی کوئی دیدانہ وار حرکت ہمیں قانون کی نظروں میں مجرم بنا سکتی تھی، اس پر مستزاد ہمارے پاس غیرقانونی ہتھیار بھی تھے، مجھے نہ جانے کیوں کبھی کبھی اول خیر کی ایسی باتوں سے سخت اختلاف ہوتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ سب مشین گن ہم نے کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دی جبکہ لوگر ہمارے قمیضوں کے اندر اڑسے ہوئے تھے مگر اسٹیشن فور کی عمارت کے گیٹ پر بڑا سا تالا دیکھ کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔“ اول خیر نے گویا ایک پُرسکون ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

”وزیر جان کو اب تک تیری کامیاب مہم جوئی کا پتا چل چکا ہوگا اور اس بات کا اندازہ بھی اسے ہو گیا ہوگا کہ ہم کسی بھی وقت دوبارہ یہاں کا رخ کر سکتے ہیں۔“

”یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی......“ میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ اندر ہی ہو۔“

”اگر وہ اندر ہوگا بھی تو دوبارہ ہمارے لیے پھندا تیار کیے بیٹھا ہوگا شہزی کاکا! مگر میرا نہیں خیال کہ ان حالات میں وہ یہاں موجود ہو۔“ اول خیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا تاہم بولا۔

”لیکن یار! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔“

”میں تیری بے چینی سمجھتا ہوں کاکا، مگر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پھر...... ہمیں اس کی شہر والی کوٹھی کنال لاج کا رخ کرنا چاہیے۔“ اس نے کہا اور میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات درست تھی۔ اسٹیشن فور پر سناٹا طاری دیکھ کر مجھے بھی مایوسی ہوئی تھی۔ وزیر جان یا اس کے ”بڑے“ اب زیرو ہاؤس کے کریش ہونے کے بعد یقیناً کوئی اور لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتے ہوں گے شاید اس لیے انہوں نے یہاں سے فی الحال اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہوگا۔

اگلے چند منٹوں میں ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہر پہنچ کر ہم نے سیدھا کنال لاج کا رخ کیا تھا۔ دن کافی نکل چکا تھا۔ لوگوں کی چہل پہل دیکھنے میں آ رہی تھی۔ اول خیر کو زیادہ تشویش ہمارے پاس موجود ان غیرقانونی ہتھیاروں کی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ہم بہت جلد ان سے چھٹکارا پا لیں گے۔

کنال لاج پر بھی بظاہر سناٹا طاری محسوس ہوا۔ البتہ چوکیدار موجود تھا۔ دفعتاً گیٹ کھلا اور اندر سے ایک لمبی سی چمچماتی کار نمودار ہوئی، میں چونکا اور بہ غور بھویں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ کار کے اندر فقط ایک ماڈرن ٹائپ کی خاتون براجمان تھی، اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی، گیٹ سے نکلتے ہی اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور ہماری کار کے بالکل قریب سے زنانے کے ساتھ گزر گئی۔ مگر میرے چونکنے سے پہلے ہی عقابی نظریں عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے مجھے اس عورت پر شناسائی کا شائبہ ابھرا تھا اور میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس عورت کو پہچان چکا تھا اگرچہ کئی ماہ و سال بیت چکے تھے۔ مگر اس عورت کو اس چہرے کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ بے شک گزرتے وقت کی گرد پرانے نقوش اپنی تہ میں دبا ضرور لیتی ہے مگر کچھ ایسے نقوش واضح ضرور تھے جو کسی دوسرے کے لاشعور میں نقش ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ میری سوتیلی ماں ہی تھی اب پتا نہیں تھی بھی یا نہیں مگر بہرحال عورت یہ وہی تھی جو وزیر جان کی چہیتی بیوی کہلاتی تھی۔ اس حیرت سے قطع نظر کہ ان دونوں غریب میاں بیوی کی معاشی کایا پلٹ کسی کی رہینِ منت ہوگی، مجھے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس بظاہر جاہل اور مرد مار عورت نے بھی خود کو نئے اور ماڈرن ماحول میں ڈھال لیا تھا۔

میں نے فوراً کار اس کی کار کے تعاقب میں لگا دی۔

”او خیر...... کاکا! کیا تو اس زنانی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔“ مجھے اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے پا کر اول خیر نے کہا تو میں اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

”ہاں اول خیر، کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 16

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد مکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

''او خیر...''

میری بات پر اول خیر کے حلق سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں ہونٹ پر ہونٹ دبائے اس کار کے تعاقب میں تھا جو بلاشبہ نئے ماڈل کی ٹویوٹا پلاٹز تھی۔ رنگ اس کا سلور کلر تھا۔ مجھے اس عورت کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ باپ کو اسے اپنے بچپن میں، میں نے ''جانو'' یا ''جان'' کہتے ہی مخاطب کرتے سنا اور دیکھا تھا۔ وزیر جان کا بھی اپنا نام پتا نہیں اس وقت کیا تھا۔ ماں کو اسے میں نے شیدا ہی پکارتے سنا تھا۔ اصل نام تو میں نے اطفال گھر میں اپنے بچپن میں بھی جاننے کی کوشش نہ کی تھی، شاید اس وقت میرا شعور نام اور شناخت وغیرہ کے حوالے سے اتنا پختہ نہیں ہوا تھا۔ البتہ ماں باپ کے حوالے سے متعلق جذبات کو محسوس ضرور کر سکتا تھا۔

''شہزی کاکے! اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تو اس عورت پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا لیکن تو چاہتا کیا ہے اس عورت سے؟ اور یہ ہے کون؟ لگتی تو مجھے وزیر جان کی بیوی ہی ہے۔'' چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد اول خیر نے کہا۔

جواباً میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ سی پھیل گئی۔

''یہ وزیر جان کی بیوی ہی ہے اور میں اسے اپنی سوتیلی ماں سمجھتا تھا۔''

''مگر کاکے! موجودہ صورت حال میں تو اب وزیر جان سے بھی تیرا کوئی رشتہ نہیں رہا پھر...''

''رشتہ میرا سوتیلی ماں سے بھی نہیں رہا مگر وزیر جان بہرحال میرا سوتیلا باپ ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''او خیر۔'' اول خیر ہولے سے بڑبڑایا پھر بولا۔ ''کاکے! اس زنانی کے سلسلے میں اپنا ہاتھ ذرا ہولا رکھنا ابھی تو بڑی مشکل سے پولیس سے جان چھوٹی ہے۔ کہیں یہ وزیر جان ہم پر اغوا یا اور کسی گھٹیا قسم کا مقدمہ قائم نہ کر دے۔''

میں بظاہر جوش میں آ کر فوری طور پر جو قدم اٹھاتا تھا، اول خیر اس سلسلے میں فوراً اس کے مابعد متوقع نتائج ...... سے آگاہ کرنا اپنا فرض ضروری سمجھتا تھا لیکن بہرحال اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ میرے کسی بھی طرح کے اٹھائے ہوئے اقدام سے خائف یا پہلوتہی برتنے کی کوشش کرتا ہو، مگر اس بار مجھے بھی صورت حال کچھ گمبھیر سی معلوم ہوتی تھی۔ یہ حقیقت ہی تھی کہ میرا ارادہ اس عورت پر قابو پانا اور اس سے ''سچ'' اگلوانا تھا۔ یقیناً اس عورت نے ایک طویل عرصہ اپنے شوہر وزیر جان کے ساتھ گزارا تھا۔ کافی سے زیادہ حقائق کا میرے بارے میں اسے بھی علم تو ہوگا ہی اور نہیں تو... یہ مجھے وزیر جان کی موجودگی کا بتا سکتی تھی کہ وہ اس وقت کہاں ہو سکتا تھا، وغیرہ۔ مگر بات پھر گھوم پھر کر وہیں آن اٹکی تھی کہ اس عورت سے ضروری پوچھ گچھ کے لیے اسے پہلے کسی ایسی جگہ لے جانا ضروری تھا جو نسبتاً محفوظ بھی ہوتی اور خفیہ بھی... اس سے پہلے میں ایسے کسی ''شکار'' کو بیگم صاحب کے کسی اڈے کی طرف لے جایا کرتا تھا مگر اب اول خیر والے ''معاملے'' کے باعث وہاں کا رخ میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے بیگم صاحب نے اول خیر کو خود سے اور اپنے گروہ سے بے دخلی کا حکم جاری کر دیا تھا تو میں نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب بیگم صاحب سے یا اس کے کسی ساتھی سے کسی قسم کا کوئی تعلق قائم نہیں رکھوں گا۔ یوں بھی موجودہ اور تازہ تر صورت حال کا تعلق خالصتاً میری ''ذات'' سے تھا۔

ایک آخری ایسی جگہ سرمد بابا کی کوٹھی بچی تھی۔ وہاں کے بارے میں کچھ سوچا جا سکتا تھا۔

''کاکے! لگتا ہے اس بار تیرا دماغ بھی نہیں چل رہا۔'' اول خیر معنی خیز لہجے میں ہولے سے مسکرا کر بولا۔

''میرا دماغ کام کر رہا ہے اول خیر۔'' دفعتاً میں نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی اور تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن کے ساتھ کہا۔ ''تو اب تماشا دیکھتا چل، میں یہ سب کیسے کرتا ہوں۔''

''او خیر۔'' اول خیر ہولے سے بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔

کار خاصی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی تھی اور میں بڑی محتاط روی کے ساتھ بدستور اس کے تعاقب میں تھا۔ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں اچانک ہی اس صورت حال سے نمٹنے کا طریقہ آیا تھا گو اس میں بھی رسک تھا مگر اتنا نہیں جتنا کہ اسے اغوا یا یرغمال بنا کے سرمد بابا کی کوٹھی لے جایا جاتا۔

وہ سلور کار شہر کے معروف گنجان علاقے میں داخل ہو چکی تھی اور پھر ایک متوسط سے پختہ اینٹوں کے بنے مکان کے سامنے رک گئی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں سامنے نظریں جمائے ہوئے اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ وزیر جان جیسے آدمی کی بیوی کا ایک متوسط علاقے کے اس گھر کے سامنے رکنا میرے لیے باعثِ حیرت تھا مگر مجھے اپنی ''راہ'' ہموار ہونے کی پوری طرح امید ہو چلی تھی۔ کیونکہ میرا ارادہ بھی تھا کہ یہ عورت جہاں کا رخ کرے گی اسے وہیں دبوچنے کی کوشش کروں گا۔

اب وہ گاڑی ایک متوسط سے مکان کے سامنے رکی

تھی۔ وہاں مجھے ایک اور کار کھڑی نظر آئی تھی۔ یہ بسکٹ کلر کی لیانا تھی۔ میں نے فوراً شبہے کے پیشِ نظر اپنی کار دائیں جانب کی قدرے تنگ سی گلی میں کار روک دی اور اول خیر کو وہیں بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

میں نے حتی الامکان کوشش کی تھی کہ میرے انداز و اطوار سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس پہ وہاں آنے جانے والوں کو مجھ پر کسی قسم کے چونکنے کا موقع ملے۔ ظاہر ہے دن کا وقت تھا اور وہاں بہت سے لوگوں کی ''آوک جاوک'' دیکھنے میں آتی تھی۔ میں گلی سے ابھرا تو عورت کو مذکورہ گھر کے دروازے پر کھڑے پایا۔ وہ غالباً دستک دے چکی تھی یا وہ غیر معمولی طور پر محتاط روی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ گویا معاملہ رازداری کا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گئی۔ میں پلٹا۔ اول خیر کار کے اندر سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں گلی کی دیوار کی آڑ میں تھا۔ دوبارہ اندر کار میں جا بیٹھا اور بولا۔ ''وہ عورت گھر کے اندر جا چکی ہے۔ کچھ ایسا لگتا ہے کسی سے رازداری کے ساتھ ملنے آئی ہے۔ ایک سوزوکی لیانا بھی باہر موجود ہے۔''

''کون ہو سکتا ہے؟ معاملہ کچھ پُراسرار سا ہے۔'' اول خیر نے تبصرہ کیا۔ میں نے کہا۔

''تم اِدھر ہی رہو، میں اندر جاتا ہوں۔''

''او خیر، پھر ذرا خیال سے کاکا! یہ متوسط علاقہ ہے، لوگ شور شرابا ڈالنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔ ''لیکن میرا خیال ہے معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے گا کیونکہ ''اندر والے'' بھی رازداری رکھے ہوئے ہیں۔'' میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت کہا۔ پھر دوبارہ کار سے اتر گیا۔

گن ہم پھینک چکے تھے۔ ہمارے پاس صرف میگارو تھے۔ اس کے اندر بھی چند ہی گولیاں بچی تھیں۔ سرِدست کافی ہی تھیں۔ گھر کے دروازے کے قریب آ کے میں نے دستک دے ڈالی۔ اپنا چہرہ سرِدست ترچھا کیا ہوا تھا۔

''کون؟'' اندر سے کسی عورت کی آواز ابھری۔ آہنگ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی عمر رسیدہ خاتون تھیں۔ میں نے اپنے لہجے کو مخصوص بناتے ہوئے کہا۔

''او بی بی! باہر گاڑیاں کس کی کھڑی ہیں۔ ایک طرف تو کر لو ہمارا ٹرک پھنسا ہوا ہے۔'' بڑھیا بھی کوئی خرانٹ عورت تھی۔ چند لمحوں بعد میں نے کنڈی کھولے جانے کی آواز سنی اور گرد و پیش سے مطمئن ہو کے یک دم دروازے کو دھکا دیا۔ عمر رسیدہ عورت ہلکی چیخ کے ساتھ لڑکھڑا کے چند قدم پیچھے کو ہٹی۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ عقب میں دروازے کو کنڈی چڑھا کے پستول نکال لیا۔ عورت کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہو گئے۔ پل کے پل میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ مختصر سا نیم پختہ صحن تھا۔ ایک کھری چارپائی کونے میں رکھی تھی۔ دو کرسیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹا سا برآمدہ، اس کے دائیں جانب کچن، دو کمرے، دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ایک خالی تھا دوسرے میں دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ کھڑبڑاہٹ پر وہ برآمدے میں آئیں تو مجھے دوسری عورت کو دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔

ایک عورت وہی تھی جس کے تعاقب میں، میں یہاں آیا تھا جبکہ دوسری عورت جو نسبتاً جوان اور شوخ سی تھی اسے دیکھ کر مجھے جس طرح شناسائی کا جھٹکا لگا تھا، اس نے میرے سوچتے ذہن کو تیزی کے ساتھ برمایا تھا اور مہمیز کیا تھا کہ میں نے آخر اس نوجوان سی لڑکی کو کہاں دیکھا تھا؟

☆☆☆

یہ نوجوان لڑکی، نیلی کوٹھی کی نیلی خاتون تھی اور واقعی نیلی تھی، یعنی اس کی خوب صورت کشادہ آنکھیں جو ہر سے رمزیہ مسکراہٹ لیے ہوتی تھیں، نیلے رنگ کی تھیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ ان ''وکھری'' قسم کی خصوصیات کی بنا پہ یہ خاتون مجھے یاد رہ گئی تھی۔

یہ نیلی خاتون... زبیر خان کی ''اگلی'' یعنی (پتا نہیں) دوسری یا تیسری بیوی تھی اور اس کی آدھی عمر سے بھی کم عمر نیلی خاتون کی تھی جبکہ نیلی کوٹھی وہی تھی جہاں کچھ عرصہ پہلے ایک عجیب سے ماحول میں میری زبیر خان کے ساتھ ملاقات اور نیلی کے ساتھ معنی خیز مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ خانم شاہ کی وہاں ایک پرانے مسئلے کے لیے رضاکارانہ انٹری ہوئی تھی اور پھر زبیر خان کے مقربِ خاص کارپرداز... تارڑ کے باعث کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مجھے زخمی خانم شاہ کو کندھے پر ڈال کر اسپتال پہنچانا پڑا تھا اس کے بعد میرا زبیر خان سے دوبارہ سامنا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ بے چارہ ایک بدنصیب باپ تھا اور اپنے بیٹے شفقت راجہ کے قاتلوں سے بدلہ لینے کے لیے میری مدد کا خواہاں تھا۔

مگر اب... نیلی کو وزیر جان کی بیوی کے ساتھ یہاں دیکھ کر مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تھا اور نیلی کو بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جو یقینا مجھے ان مذکورہ ایام کے حوالے سے اچھی طرح پہچان رہی تھی لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ دونوں اس متوسط علاقے کے ایک عام اور عسرت زدہ گھر میں کیا کررہی تھیں؟

نیلی خاتون کے دلکش چہرے پر تو شناسائی کے باعث حیرت کے آثار منجمد تھے جبکہ عورت کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔ خوفناک میگا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ عمر رسیدہ عورت کی اب گھگی بندھی ہوئی تھی۔

"تت... تم... کک... کون..." وزیر جان کی بیوی نے خوف سے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"خبردار... کوئی بھی اونچی آواز میں نہیں بولے گا۔ نہ ہی کسی قسم کی کوئی چالاکی دکھانے کی غلطی کرنا۔ سب اندر چلو جلدی..." میں نے درشت آواز میں کہا اور عمر رسیدہ خاتون کو بھی سامنے والے کمرے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

"تم شہزاد احمد خان عرف شہزی ہونا؟" نیلی خاتون جو اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی، بے اختیار بولی۔ اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ وہ عورت بوکھلا کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اب حیرت و خوف کے ملے جلے تاثرات سے پھٹی چلی گئیں۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ ضرور... وزیر جان نے مجھ سے پہلے "ٹاکرے" کے بعد سے اسے... یعنی اپنی چہیتی بیوی کو غائبانہ "اپ ڈیٹ" کررکھا تھا اور مجھے بلکہ اس معصوم سے آٹھ نو سالہ بچے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ جسے اس کے اصل ماں باپ سے دور کرکے "اطفال گھر" جیسے لاوارث بچوں کے ادارے میں داخل کردیا گیا تھا۔

"ہاں، میں وہی ہوں... چلو اب اندر... ورنہ تم سب جان سے جاؤ گی۔" میں نے ان کی طرف گھور کر کہا۔

اس بار تینوں خواتین نے بلا چون و چرا میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہم اندر کمرے میں آگئے۔ کمرے کی حالت نسبتاً بہتر تھی۔ وہ تینوں کرسیوں پر براجمان ہوگئیں۔ میں نے بھی ایک کرسی گھسیٹ لی۔ نیلی خاتون کے چہرے پر خوف کا سرے سے کوئی شائبہ تک نہ تھا جبکہ اس کی جگہ اب ایک عجیب سی طمانیت اور پُرسکون سوچ کے آثار غالب تھے جبکہ عورت بدستور میری طرف خوف و حیرت سے تکے جارہی تھی۔ وہ مجھے اب پہچاننے کی کوشش کررہی تھی۔ چودہ، پندرہ سال کے بیتے ہوئے عرصے نے اس کی صحت یا عمر کو کچھ خاص متاثر نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ان کی معاشی و مالی حالت کے یک دم کایا پلٹ جانے کی رہین منت تھی۔ باقی اس نے اعلیٰ درجے کا میک اپ اور بیش قیمت لباس سے چھپا رکھا تھا۔

"کیا چاہتے ہو تم ہم سے؟" بالآخر وزیر جان کی بیوی نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ خاصی حد تک سنبھل چکی تھی جبکہ نیلی خاتون کو سنبھلنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ وہ پہلے ہی "سنبھلی" ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف اور پھر نیلی خاتون کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں مجھے اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے کہ یہاں زبیر خان کی بیوی اور تم کیا کھچڑی پکانے آئی ہو۔ حالانکہ نیلی خاتون کو بھی اس حقیقت کا اچھی طرح علم ہے کہ میرے زبیر خان کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ مجھے اس سے کوئی سروکار تو نہیں لیکن اگر تم نے میرے ساتھ خاطر خواہ تعاون نہ کیا تو میں زبیر خان سے تم لوگوں کی اس خفیہ میٹنگ کا ذکر کرسکتا ہوں۔" میں نے دانستہ ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا ضروری سمجھا۔

"تمہیں کیا معلوم کہ ہم یہاں کیوں اکٹھی ہوئی ہیں؟ اور زبیر خان کو اس میں بتانے والی ایسی کیا خاص بات ہوسکتی ہے؟" اس بار نیلی خاتون نے لب کشائی کی۔ وہ اپنے کھلنڈرے اور طمانیت بھرے لاابالی سے مزاج کے عین مطابق بولی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔

"اعلیٰ ہائی اسٹینڈرڈ اور ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی دو بیگمات کے اس نچلے درجے کے ایک عسرت زدہ گھر میں ملاقات کو میں اور کیا معنی دوں؟"

"خاصے مکار اور ذہین ہو۔" نیلی خاتون دلنشین مسکراہٹ سے بولی جبکہ وزیر جان کی بیوی دوبارہ پریشان اور تشویش زدہ سی نظر آرہی تھی، اسے نیلی خاتون کی گفتگو پسند نہیں آئی تھی، یہی سبب تھا کہ اس نے کڑی نگاہوں سے اپنے قریب والی کرسی پر بیٹھی نیسی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تم اسے کیسے اور کب سے جانتی ہو؟" جواباً نیلی خاتون بدستور میری طرف دلچسپ اور گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک بار نیلی کوٹھی آیا تھا میرے شوہر سے ملنے۔ بڑا دھانسو قسم کا نوجوان ہے۔ جس دھڑلے سے آیا تھا اسی دھڑلے سے خون خرابا کرکے واپس لوٹ گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ ماری تھی، اب پتا نہیں یہ اس نے "ماری" تھی یا مجھے کسی خاص قسم کا اشارہ دیا تھا کیونکہ اس

کے جھوٹ میں قدرے سچ بھی شامل تھا۔

"مگر یہ تو کہہ رہا ہے کہ اس کے تمہارے شوہر سے اچھے تعلقات ہیں؟" عورت نے چبھتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اچھے تھے کبھی مگر اب نہیں رہے۔" نیلی خاتون نے پھر جھوٹ بولا۔ اب مجھے اس کا چہرہ ایک دم سنجیدہ دکھائی دینے لگا۔ "بتایا ہے نا میں نے، اس روز اس نے نیلی کوٹھی میں خون خرابا کیا تھا۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور زبیر خان کو بھی ہلاک کرنا چاہا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر مجھے آنکھ کا مخصوص اشارہ کیا۔ اس بار میں بھی اندر سے چونکا۔ معاملہ مجھے ایکا ایکی پُراسرار سا محسوس ہونے لگا۔ ابھی تو میری کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ تاہم میں نے دونوں کو خاموش اور آپس میں الجھنے سے روکتے ہوئے روئے سخن وزیر جان کی بیوی کی طرف کیا اور بولا۔

"تم مجھے پہچان چکی ہو اور میں تو خیر تمہیں پہچان ہی چکا ہوں۔ لہٰذا اب نہ اپنا وقت ضائع کرو نہ میرا... باہر میرا ساتھی میرا منتظر ہے۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ میرے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟"

"تمہارا ہم لوگوں کے ساتھ واسطہ تھا نہ ہے...' ' وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھے اس کے لہجے اور بات پر طیش تو آیا تاہم ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"یہ والی بکواس میں تمہارے زن مرید شوہر وزیر جان سے بھی سن چکا ہوں اور اس پر مجھے دلی مسرت بھی ہوئی تھی مگر یہ میرے سوال کا جواب نہیں جو تم نے مجھے دیا ہے۔ کیا میں اپنا سوال دہراؤں؟" میں نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا۔ نیلی خاتون کی دیکھا دیکھی وہ بھی مائل بہ جرأت ہوگئی تھی، تنک کر بولی۔

"ہمیں نہیں معلوم کہ تمہارے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟"

"دیکھو خاتون! میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کو اچھا نہیں سمجھتا..." میں نے تہدیدی انداز میں اس سے کہا۔ "لیکن بات جب اپنی ذات اور اپنی شناخت کے حوالے سے ہو تو پھر میں کسی کے ساتھ کوئی بھی رعایت برتنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے جھوٹ مت بولو، تمہارا زن مرید شوہر سب جانتا ہے۔"

"تو پھر اسی سے جاکر کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" مجھے اس کی بات پر سخت طیش آگیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگا ریوالور اس کی طرف کردیا۔

"اگر اب بھی تم نے سچ نہیں بولا تو میں تمہارے سر میں گولی اتار دوں گا۔"

دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ خلاف توقع وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے بڑی دلیری سے بولی۔ "یہ کھلونا نیچے کرلو... شہزی! کہیں یہ گولی چل گئی تو تمہیں بڑی قیمت نہ چکانی پڑ جائے اس کی..."

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں اس کی دلیری کی وجہ سمجھنے لگا تھا۔ اسے زعم تھا اپنے شوہر وزیر جان پر جو اپنے تئیں بے شک بڑی طرم خان قسم کی شے بن چکا تھا لیکن اب بھی مجھے اس بے باکی کی وجہ کچھ اور ہی محسوس ہورہی تھی جس سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وزیر جان نے اسے میرے سلسلے میں پہلے سے بریف کررکھا تھا۔

میں غصے یا طیش میں آکر اپنی کسی اندرونی مجبوری یا بے بسی کو اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسی اطمینان سے بولا۔ "ہوں... تو تمہیں بھی اپنے شوہر کی طرح خود پر اس بات کا گھمنڈ ہے کہ میں تم دونوں میاں بیوی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر یہ تمہاری خوش فہمی اس وقت دور ہوجائے گی جب ہم تمہیں اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جائیں گے اور تم پر چوہے چھوڑ دیں گے۔" میری دھمکی پر ایک لمحے کو اس کی مکار آنکھوں میں دوبارہ خوف کی پرچھائیں تھی۔ میں اپنی بات پر مزید اثر پذیری قائم کرنے کی غرض سے آگے بولا۔

"دیکھو، تمہیں شاید احساس نہیں ہے کہ میرے لیے یہ کس قدر اہم بات ہے۔ میں اپنی ذات اپنی شناخت کی جستجو کی خاطر ہر حد سے گزر سکتا ہوں یا سمجھ لو... اس دیرینہ مقصد کے حصول کی خواہش ایک آگ کی طرح میرے سینے میں بچپن سے لگی ہوئی ہے کیونکہ میں اپنے بچپن سے ہی غیر معمولی طور پر حساس اور مزاجاً جوشیلا واقع ہوا ہوں اور اب جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ میرے ماں باپ دونوں ہی زندہ ہیں تو یہ خواہش اب ایک جنون کی شکل اختیار کرچکی ہے۔ اب مجھے بتاؤ تم مجھ سے تعاون کرنا چاہتی ہو یا میں اپنے ساتھی کو ادھر بلالوں؟" یہ کہتے ہوئے میرے لہجے، میری آواز سے پُرتپش جوش کے شعلے سے پھوٹنے لگے۔

"اس نے ایک نگاہ قریب بیٹھی نیلی پر ڈالی تو اس نے بے اختیار اسے مخاطب کرکے کہا۔ "سعیدہ! یہ بہت خطرناک اور جوشیلا نوجوان ہے۔ تمہیں اس کی بات مان لینی چاہیے۔ تم نہیں مانو گی تو اس میں تمہارے ساتھ مجھے بھی خطرہ ہے۔ ابھی تو مجھے بھی اس کی منت کرنی ہے کہ یہ ہمارے ملنے میں کوئی ایسی بات میرے شوہر زبیر خان سے نہ کرے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے دیکھا نیلی کی بات پر سعیدہ نامی اس عورت کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر ٹھہر گیا جبکہ مجھے پل کے پل یوں محسوس ہوا کہ نیلی نے دانستہ بظاہر یہ غیر متعلقہ موضوع چھیڑ دیا ہو۔

"اس کی کیا ضمانت ہے کہ یہ سب جاننے کے بعد... یہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ یعنی ہماری اس خفیہ ملاقات کا ذکر زبیر خان سے نہیں کرے گا؟" سعیدہ نے بظاہر میری طرف تکتے ہوئے نیلی سے کہا۔ امید دیرینہ کو بر آتے دیکھ کر میرا دل اندر سے فرطِ مسرت کے ساتھ یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ گویا یہ طے تھا کہ صرف وزیر جان ہی نہیں بلکہ اس کی چہیتی بیوی سعیدہ بھی میرے ماں باپ کے سلسلے میں جانتی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھے؟

بہرحال نیلی کے جواب دینے سے پہلے ہی میں نے سعیدہ کی طمانیت کی خاطر کہا۔ "مجھے تمہاری اس خفیہ میٹنگ اور ان مقاصد سے چنداں دلچسپی نہیں، جو تم دونوں یہاں آپس میں تبادلۂ خیال کرنے کی غرض سے بیٹھی تھیں۔ مجھے اپنے کام اور مطلب سے غرض ہے بلکہ یہ بات تو تمہیں نیلی بھی بتا کر مطمئن کر سکتی ہے کہ میں خود دوبارہ زبیر خان سے راہ و رسم بڑھانے کے موڈ میں سرے سے ہوں ہی نہیں۔"

"آف کورس۔" نیلی نے گویا میری تائید میں بے اختیار کہا۔ "شہزی ٹھیک کہہ رہا ہے سعیدہ! نیلی کوٹھی والے واقعے کے بعد تو یہ خود بھی زبیر خان کا سامنا کرنے سے کترانے کی کوشش کر رہا ہے اس کی ایک وجہ میں بھی ہوں کہ میں اسے زبیر خان کے عزائم کے سلسلے میں خبردار بھی کر چکی ہوں۔"

سعیدہ پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ جیسے "ہاں" اور "ناں" کے درمیان جھول کے رہ گئی تھی، بالآخر بولی۔ "ٹھیک ہے میں پہلے اس سلسلے میں وزیر جان سے مشورہ..." کہتے ہوئے اس نے اپنے پرس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ شاید سیل فون نکالنا چاہتی تھی مگر میں نے درشتی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"خبردار! ایسی کوئی چالاکی چلنے کی کوشش بھی مت کرنا محترمہ! اِدھر اور اسی وقت تمہیں میرے ساتھ معاملہ صاف کرنا ہوگا۔ اب میرے پاس وقت نہیں بچا ہے لہٰذا میں اب صرف تمہارے منہ سے اپنے ماں باپ کے بارے میں سننا چاہوں گا مگر سچ... بہ صورت دیگر مجھے تمہارے بیان پر ذرا سا بھی شبہ ہوا تو... مجھے تصدیق کرنے کی خاطر تمہیں اپنے ساتھ اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جانا ہوگا۔" میرے پُرقطعیت مگر تحکمانہ لہجے نے اسے بے اختیار بولنے پر مجبور کر دیا۔

"نن... نہیں... میں تمہیں بتا دوں گی، سب سچ سچ بتا دوں گی۔ کیونکہ اس میں مجھے اپنا کوئی فائدہ یا نقصان محسوس نہیں ہوتا، باقی رہی بات میرے شوہر سے تمہاری دشمنی یا جنگ کی وہ تم جانو اور وہ۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دل و دماغ کی عجیب سی جذباتی و ہیجانی کیفیات ہونے لگیں۔

اس نے بتانے کے لیے اپنے لب وا کیے۔ میں جیسے سرتاپا سراپا سماعت بن گیا تھا۔ وہ بولنے اور بتانے پر پوری طرح آمادہ ہو چکی تھی اور میرے دل کی دھڑکنیں تک جیسے ساکت و جامد ہو چکی تھیں کہ میری زندگی کے ایک اہم ترین موڑ کی حقیقت آج کھلنے والی تھی کہ اچانک ایک آواز پر ہم سب ہی بیک وقت ٹھٹک گئے۔

☆☆☆

وہ آواز بڑی واضح اور کسی اچانک اُمڈتے طوفان کا پتا دیتی محسوس ہوئی تھی۔ باہر گھر کے دروازے کے بہت قریب... کسی گاڑی کے تیزی کے ساتھ رکنے اور فوراً ہی دھڑا دھڑ کی آواز سے بیک وقت کئی دروازے کھلنے اور بند ہونے کی دھمک گونجی تھی۔ میں فوراً اپنے ہاتھ میں میگارو سنبھالتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تینوں عورتوں کے چہروں پر تشویش کے سائے لہرائے۔ میں ابھی پلٹ کر صحن کی طرف رخ کرنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکے سے مجھے باہر دروازہ دھڑ سے ٹوٹ کر کھلنے کی سمع خراش آواز سنائی دی۔ اِدھر میں نے بھی میگارو والا ہاتھ سیدھا کر لیا اور کمرے کے دروازے کو ایک لات رسید کر کے وا کر دیا۔ سامنے صحن میں چار مسلح افراد انتہائی جارحانہ موڈ میں نظر آئے مگر ان میں ایک کو دیکھ کر مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہ میرا غیر شناسا آدمی نہیں تھا، وہ تارڑ تھا۔ زبیر خان کا خاص آدمی... اس کے لیے بھی میری یہاں موجودگی خلافِ توقع تھی اور میری طرح اسے بھی حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے نشانے پر تھے، تاہم اسے مجھ پر تین مسلح ساتھیوں کی فوقیت حاصل تھی۔

نیلی کی خوف سے جھرجھرائی ہوئی چیخ سی سنائی دی۔ وہ اپنے شوہر کے آدمی تارڑ کو دیکھ کر اسے پہچان کے ہی بے اختیار چیخی تھی۔

"تم... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" تارڑ نے میری طرف گھورتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا۔ اب اس کے چہرے سے حیرت عنقا تھی۔ میرا دھیان باہر موجود اول خیر کی طرف جا رہا تھا۔ یقیناً اس نے بھی انہیں یوں درانہ وار اور اچانک اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا اور وہی ہوا۔ ان کے عقب سے اول خیر ہاتھ میں پستول لیے پورے جوش و خروش کے ساتھ نمودار ہوا اور گرجدار آواز میں بولا۔

"خبردار! کوئی غلط حرکت نہیں چلے گی۔ ورنہ پیچھے سے سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔"

ان سب کے رخ چونکہ میری طرف تھے پھر انہیں پتا بھی نہ تھا کہ اول خیر باہر موجود ہے یا میرا کوئی ساتھی۔ اب وہ یہی سمجھے کہ ان کے عقب میں دہاڑتا گرجتا میرا ساتھی آیا... اپنے ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا یا بھاری مشین گن۔

"بغیر پیچھے مڑے... اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اول خیر دوبارہ گرجا۔ وہ سب ساکت و جامد ہو گئے۔

"یہ کیا حرکت ہے... شہزی...؟ کیا یہ خفیہ میٹنگ تمہاری سرکردگی میں ہو رہی تھی؟" تارڑ نے مجھے بدستور گھورتے ہوئے غصیلی آواز میں کہا۔ "خان جی کے تم پر احسانات ہیں۔ وہ تمہیں اب بھی اپنا دوست سمجھتے ہیں اور تم نے انہی کے گھر میں سیندھ لگائی اور ان کی پشت پر خنجر گھونپ دیا۔"

وہ یقینی طور پر میرے اور نیلی کے سلسلے میں شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو رہا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "خان جی کا میں اب بھی دل سے احترام کرتا ہوں اور میں ان کے کیا کسی کے گھر میں بھی ایسی سیندھ لگانے کی قبیح حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ میرا ایسا مکروہ مزاج نہیں۔ یہ بات خود خان جی بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں یہاں اپنے ساتھی کے ساتھ کسی اور سلسلے میں آیا تھا اور بالکل اسی طرح آیا تھا جس طرح تم... غالباً خان جی کے حکم پر ہی نیلی خاتون کی ریکی کرتے ہوئے یہاں آئے ہو جبکہ میں اندر موجود ایک اور خاتون کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں آیا ہوں۔ کوئی کسی کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ ہتھیار پھینک کر آرام سے بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں یا پھر اپنے خان جی سے میری بات کرا دو۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا یہ خوبی کہ تارڑ... ممکنہ طور پر زبیر خان... المعروف خان جی کی ہدایت پر ہی نیلی کی ریکی کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔

تارڑ اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار نہیں پھینکے تھے کیونکہ صورتِ حال کی خطرناکی بالکل واضح تھی۔ میں ان چاروں کے نشانے پر تھا جبکہ میرے ہاتھ میں صرف ایک پستول تھا وہ جدید گنز سے مسلح تھے، فقط میرا ایک ساتھی ان کے عقب میں تھا، اگرچہ انہیں بھی معلوم نہ تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھی میری ہی طرح فقط ایک پستول ہی تھا۔

"ہم ہتھیار نہیں پھینکیں گے، جو بات کرنی ہے سامنے آکر کرو۔" تارڑ نے واضح کر دیا۔ میں تارڑ کی سفاک فطرت کی جھلک دیکھ چکا تھا جب اس نے نیلی کوٹھی میں میرے منع کرنے کے باوجود ایڈووکیٹ خانم شاہ پر گولی چلا دی تھی، اگرچہ بعد میں خان جی نے اسے بری طرح لتاڑا تھا۔

"ہتھیاروں کی چھاؤں میں دوستانہ ماحول نہیں پیدا ہو سکتا تارڑ۔" میں نے کہا۔

ٹھیک اسی وقت میرے عقب سے نیلی کی ہسٹریائی آواز ابھری۔ "نن... نہیں ایسا مت کرو۔"

"ٹھائیں" کی آواز سے گولی چلی۔ میں بدکا۔ گولی کا آتشیں شعلہ... شوں کی جھپک کے ساتھ میری گردن کے بالکل قریب سے گزرتا محسوس ہوا اور تارڑ کا ایک بازو زخمی ہو گیا۔ شاید یہ حرکت سعیدہ کی تھی۔ یقیناً اس کے پرس میں پستول موجود تھا۔ اس گولی نے بلکہ سعیدہ کی ایک خطرناک بے وقوفی نے سب کو گویا پل کے پل خطرے میں ڈال دیا۔ مجھے یہی بہتر لگا جو میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کیا، یعنی فوراً نیچے جھک گیا مگر میری خود کو بچانے کی یہ حرکت... ان تینوں خواتین کو مہنگی پڑ گئی۔ کیونکہ میرے نیچے جھکتے ہی سعیدہ سمیت وہ تینوں خواتین تارڑ اور اس کے سفاک ساتھیوں کی زد پر آگئیں، تارڑ گولی کا وار اپنے بازو پر سہہ گیا تب ہی میری جلتی سلگتی نظروں نے بیک وقت دو بھیانک سچویشنز کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا۔ تارڑ اور اس کے برابر میں کھڑے ایک ساتھی کی گنز سے برسٹ فائر ہوئے، خواتین کے حلق سے کربناک چیخوں کی لرزہ خیز گونج ابھری۔ اس کے باقی دو ساتھی، اول خیر کی سمت پلٹے تھے مگر اول خیر نے تلے اوپر اپنے میگارو کے ٹریگر پر انگلی سے دو تین بار حرکت دی۔ وہ دونوں چکرا کر گرے۔ اول خیر کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ میں نے جھکے جھکے پہلے تارڑ کے ساتھ کھڑے ساتھی پر گولی چلا دی۔ اور دوسری... تارڑ پر... جو اپنی گن کا رخ میری جانب کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ گولی دونوں کے پیٹ کے مقام پر ناف کے نیچے لگی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وہ کربناک چیخ مار کر گرے۔

اول خیر میری جانب لپکا۔ میں اٹھ کر پلٹا۔ سعیدہ اور عمر رسیدہ خاتون کی لاشوں کو میں نے خون کی ''چھپڑی'' میں پڑے پایا۔ جبکہ نیلی زخمی ہو کر کراہ رہی تھی۔

''کاکے! تو ٹھیک ہے نا...؟'' اول خیر حواس باختہ سا ہو رہا تھا۔ میں لپک کر سعیدہ کی طرف بڑھا۔ وہ ختم ہو چکی تھی۔ ایک پستول اس کی لاش کے قریب گرا پڑا تھا۔ نہ جانے خوف یا بدحواسی یا پھر حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی سعیدہ کو لے ڈوبی تھی۔ ایک وجہ اور بھی تھی، تارڑ کی غیر متوقع دخل اندازی اور اس کے خطرناک جان لیوا عزائم کا سعیدہ کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب کسی بھی وقت وہ اس کے ہاتھوں بھیانک موت سے دوچار ہو سکتی تھی۔

''چل کاکے! نکل چل... جلدی۔'' اول خیر چلایا۔

''آہ... شش... شہزی...'' مجھے نیلی کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے اسے سنبھالا دینے کی کوشش چاہی۔ وہ زندہ تھی، میں اسے اٹھا کر باہر کو دوڑا۔ باہر لوگ جمع ہونے لگے تھے۔ میں نے اور اول خیر نے چہروں پر رومال کا نقاب بنا کر چڑھا لیا تھا۔ ہمیں ہتھیار بہ دست دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ کون آج کے دور میں پرائی آگ میں کودتا ہے۔ نیلی میں کچھ سانسیں باقی تھیں، وہ بچ سکتی تھی میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ اسے اس حالت میں چھوڑ کے بھاگ جاتا۔ ہم دونوں اپنی کار کی طرف بڑھے۔ اول خیر کو میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا اور خود زخمی نیلی کو اٹھائے، پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کے نیلی کے زخمی وجود سمیت اندر جا سوار ہوا۔ دوسرے ہی لمحے اول خیر نے کار ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

یہ سارا کشاکشی نہایت قلیل عرصے میں ظہور پذیر اور اختتام پذیر بھی ہو گئی تھی۔ کار پل کے پل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اول خیر پریشان نظر آ رہا تھا خود میرے اپنے حواس عجیب سی بوکھلاہٹ کا شکار تھے۔ نیلی کا زخمی وجود... سیٹ پر نیم دراز حالت میں تھا جبکہ اس کا سر میری گود میں رکھا تھا۔ وہ بار بار کراہتے ہوئے مجھے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک حسین و جمیل اور نوخیز کلی کے مانند کھِلی چہکتی جواں سال نیلی کی قابلِ رحم اور جان کنی کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ تاہم میں نے اس کے زخموں کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی۔ اسے ایک گولی بازو میں لگی تھی اور دوسری پیٹ کے کسی مقام پر... شاید پہلو میں کہیں لگی تھی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''شش... شہزی... مم... مجھے کوٹ سلطان... لل... لے چلو... وہ دور نہیں... جلدی... پلیز۔ میں تم... تت... تمہارا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔''

''تمہیں اسپتال پہنچانا ہوگا۔'' میں نے بمشکل گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

''نہیں... میں دو... دوبارہ خان جی کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتی۔ کک... کوٹ سلطان... محفوظ جگہ ہے۔ تم فکر نہ کرو... وہاں جاں ورکھنا سب کچھ سنبھال لے گا۔''

''جاں ورکھنا...'' میں یہ عجیب اور وکھرے ٹائپ کا نام سن کر بے اختیار ہولے سے بڑبڑایا۔

''کوٹ سلطان... کی حد شروع ہو چکی ہے کاکا۔'' اول خیر بولا۔ غالباً اس نے بھی نیلی کی کراہتی ہوئی آواز سن لی تھی اور علاقہ بھی اس کا دیکھا بھالا تھا۔ ''اس سے پوچھو... وہاں کدھر جانا ہے؟''

میں نے اول خیر کے یہی الفاظ دہرا دیے۔ نیلی نے بتایا۔ ''یہ بھی کہ... جاں ورکھنا نامی شخص ہماری بھرپور مدد کرے گا۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ ایک دیسی ساختہ دیہاتی... ''جراح'' اور حکیم بھی ہے۔ اب پتا نہیں نیلی کا اس مذکورہ آدمی کے ساتھ کیا سمبندھ تھا۔ بات ماننا پڑی کیونکہ موجودہ صورتِ حال کی نزاکت میں ایک یہی شارٹ کٹ راستہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ پھر نیلی مجھے بمشکل جو پتا اور نشانیاں بتاتی گئی، وہ میں اول خیر کے آگے دہراتا گیا۔ لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی مزید تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد ہم کچے کے راستے پر اتر گئے۔ یہاں دونوں طرف دور دور تک بنجر ویرانہ نظر آتا تھا۔ آبادی کے آثار تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ نیلی پر نیم بے ہوشی سی غالب آتی جا رہی تھی۔ خون اس کے زخموں سے رس رس کر کار کی سیٹ کو تر بہ تر کر رہا تھا۔ کار کچے دھول اڑاتے مگر قدرے کشادہ راستے پر ہچکولے کھاتی دوڑی چلی جا رہی تھی۔ کوئی بیس پچیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کھیتوں کھلیانوں کے ساتھ کچھ کچی آبادی کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے، تاہم نیلی کے بتائے ہوئے نشان زدہ پتے پر اول خیر بڑی مہارت اور دلجمعی کے ساتھ کار بڑھائے چلا جا رہا تھا۔

کوٹ سلطان نامی یہ علاقہ خاصا دور افتادہ گاؤں محسوس ہوتا تھا۔ آبادی سے ہٹ کر ایک نہر کی پلیا پار کی اور نیلی کے کہنے کے مطابق ایک سفید رنگ کی مسجد دکھائی دی۔ اس سے ذرا آگے پیلے رنگ کی مختصر سی عمارت تھی، بقول نیلی کے یہ چاچا کمالے کی آٹے کی چکی تھی۔ اس سے تھوڑا ہی آگے کھجوروں کے جھنڈ کے قریب دائیں جانب ایک برساتی نالا تھا۔ ایک گارے مٹی کی کچی دیواروں کا کشادہ گھر بنا دکھائی دیا۔ اس کے دروازے کے ساتھ ہی مطب تھا جس کی پیشانی پر کوئلے سے بے ڈھنگے انداز میں ''خوشی محمد کا مطب'' لکھا تھا۔ وہاں باہر اب دو تین بیل گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ کچھ مقامی دیہاتی لوگ اندر مطب میں بیٹھے نظر آئے، ایک جوان مرد... جو تقریباً میرا ہم عمر ہی تھا، اسے مریضوں میں مصروف پایا۔ کار مطب کے سامنے اول خیر نے روک دی تھی اور مجھے اندر ہی بیٹھے رہنے کا کہہ کر خود کار سے اتر کر مطب کے کھلے دروازے سے اندر جا گھسا۔

تھوڑی ہی دیر میں، میں نے اول خیر کے ساتھ ہی اس مذکورہ نوجوان کو حواس باختہ عالم میں اندر سے نکلتے پایا اور سیدھا کار کی جانب بڑھا۔ تب تک میں نے دروازہ کھول دیا تھا اور نوجوان کا بہ غور جائزہ لیا۔ اس کا حلیہ ٹھیٹھ دیہاتی طرز کا تھا، جسم پر کرتہ تھا اور نیچے لنگی باندھی ہوئی تھی۔ بال گھنگریالے اور تیل سے چپڑے ہوئے تھے۔ رنگ سانولا تھا۔ نقوش موٹے تھے۔ مجھے کہیں سے بھی یہ ''خوشی محمد'' ٹائپ کا آدمی نہیں لگا تو میں نے پوچھ لیا۔ ''تم ہی حکیم خوشی محمد ہو؟''

وہ کار کے اندر جھک کر نیلی کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا اور چیخ پڑا۔ ''نیلو... نیلو... یہ... یہ تیری کس نے حالت بنائی ہے۔'' مجھے اس کے چیخنے کے انداز میں نسوانیت محسوس ہوئی۔

''اسے اندر لے چلو... چلو...'' وہ بولا۔ اس کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا۔ نیلی کے بے ہوش زخمی وجود کو اٹھا کر ہم اندر مطب میں لے آئے۔ ''ایمرجنسی'' صورتِ حال کو محسوس کر کے دیگر مریض اِدھر اُدھر ہو گئے۔ مطب کے اندر دیوار کے پیچھے ایک اور گوشہ تھا جدھر آلاتِ جراحی سے متعلق سامان رکھا تھا اور بڑے بڑے شیشے کے مرتبانوں میں پتا نہیں کیا کیا محلول اور خمیرے وغیرہ بھرے ہوئے تھے، ایک تختہ نما بیڈ پر نیلی کو لٹا دیا گیا۔

ابھی تک واضح نہیں ہو سکا تھا کہ خوشی محمد کہاں ہے اور جاں ورکھنا صاحب کیا یہی نوجوان تھا، جس کا نیلی بار بار ذکر کر رہی تھی۔

نوجوان نے فوراً اپنا کام شروع کر دیا اور مجھ سمیت اول خیر بھی اس نوجوان کا ''کام'' دیکھ کر ایک لمحے کو ششدر رہ گئے۔ آلات ایک گرم ابلتے ہوئے پانی کے پتیلے میں بھگو کر نکالے گئے جس کے اندر کسی اینٹی سیپٹک دوائی کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی پھر نوجوان کے ہاتھ اور انگلیاں ماہرانہ انداز میں نشتروں اور نیلی کے زخموں سے کھیلنے لگے۔ بازو والی گولی گوشت پھاڑتی ہوئی نکل چکی تھی جبکہ پہلو والی گولی نوجوان نے نکال لی جو خون سے تر بتر تھی، زخموں میں اس نے زرد رنگ کا مرہم بھرا۔ پھر مرہم پٹی کرنے لگا۔ اس کے بعد نیلی کا منہ کھول کر چھوٹی سی کٹوری کے ذریعے دوائی چار و ناچار اس کے حلق میں ٹپکائی...

پہلی بار مجھے احساس ہوا، دور افتادہ اس دیہات میں یہ مطب... بلاشبہ مقامی لوگوں کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا مگر۔ بات اتنی ہی نہ تھی، یہ نوجوان اپنے کام میں بہت ماہر بھی معلوم ہوتا تھا۔ یہ اس کا جدی پشتی خاندانی پیشہ معلوم ہوتا تھا جس میں وہ بہرحال طاق و مشاق تھا۔ ورنہ تو میں اسے نیم حکیم خطرہ جان ہی سمجھا تھا۔

نیلی کی حالت قدرے بہتر ہونے لگی تھی۔

''یہ اب ٹھیک ہے۔ آپ اندر چلو... میں ابھی تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر آتا ہوں۔'' نوجوان نے ہم سے کہا۔ وہ اب خاصا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ میں اور اول خیر ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''خوشی محمد صاحب! آپ کی مہربانی، ہم رک نہیں سکتے۔ نیلی بی بی نے ہی ہم سے کہا تھا کہ آپ...''

''میں خوشی محمد نہیں...'' نوجوان مسکرا کر بولا۔ ''او میرا چاچا سی۔ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ یہ فن میں نے اسی سے سیکھا ہے۔ میرا نام جاں ورکھنا ہے۔ آپ اندر ارمان (آرام) سے بیٹھو... آپ لوگوں نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔''

اس کا نام سن کر ہم مطمئن ہو گئے۔ نیلی کی خواہش کے عین مطابق ہم اسے اسی نوجوان کے پاس کوٹ سلطان لے آئے تھے۔

''اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یہ تو آپ کو بتانا پڑے گا۔'' اس نے آخر میں کہا۔ اول خیر نے مجھے اشارہ کیا۔ پھر خود جاں ورکھنا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ہم ٹھہر جاتے ہیں مگر ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں، تمہیں جلدی فارغ ہونا پڑے گا۔ ہم اِدھر ہی ٹھیک ہیں۔''

وہاں دو لکڑی کی اسٹول نما کرسیاں تھیں۔ میں اور اول خیر اس پر بیٹھ گئے۔ جاں ورکھنا تھوڑی دیر بعد فارغ ہو کے اندرونی گوشے میں آگیا۔ جس کا ایک دروازہ گھر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی نئی پیشکش
پر شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan
Facebook fb.com/paksociety

اندر بھی کھلتا تھا۔

اس نے ہمیں دو سلور کے گلاسوں میں خوش ذائقہ شربت پینے کو دیا جس کی اجزائے ترکیبی پر ہمیں مطب کے مرکبات کی شمولیت کا احساس ہوا تھا۔ حیرت انگیز طور پر شربت پی کر مجھے اپنے دکھے اور تھکے ہوئے وجود میں توانائی بھرتی محسوس ہوئی اور میں خود کو تازہ دم سا محسوس کرنے لگا۔ اول خیر کی بھی یہی حالت تھی بلکہ اس نے تو میرے کان میں سرگوشی بھی کر ڈالی تھی۔

''اوخیر... کاکے، لگتا ہے آبِ حیات پی لیا۔''

نیلی کی حالت قدرے بہتر تھی، چھت پر پنکھا تھا۔ دیواریں کچی اور گارے مٹی کی ہونے کے باعث ماحول خنک سا محسوس ہوتا تھا۔ جاں ورکھنا ہم سے اب کھل کر گفتگو پر آمادہ تھا۔ اس کی زبان پر بار بار یہی رٹ لگی ہوئی تھی کہ اس کی ''نیلو'' کی حالت ایسی کس نے بنائی تھی، اول خیر نے کوئی جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے سوال کر ڈالا۔

''کھنا جی! پہلے آپ بتاؤ، آپ کا اس سے کیا رشتہ ہے؟''

جاں ورکھنا نے ایک گہری سانس لی پھر ایک نظرِ الم سی تختہ نما بستر پر دراز نیلی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اے میری منگ سی... (یہ میری منگیتر تھی) پر جی نیلو کا مزاج بھی دکھرا ہی تھا۔ چاچا خوشی محمد دی اک ہی دھی سی... پیو دے پیار نے سر تے چاڑ دیا۔ اوچہ خواباں ویکھدی سی۔ میں چاچا خوشی محمد کا شاگرد تھا۔ پتا نہیں نیلو مجھے پسند کرتی تھی یا نہیں، پر مجھ سے ہنس ہنس کر بات ضرور کرتی تھی، چاچا نے زبانی کلامی اپڑیں کڑی میرے ناں کر دی... پر جی... نیلو اس زندگی سے مطمئن نہیں تھی، اسے چودھرائن بن دا شوق سی... حسین بھی تو اتنی ہی تھی، بنی بنائی چودھرائن ہی لگتی تھی۔ یہ علاقہ کوٹ سلطان کھلاں والی دے چودھری زبیر خان عرف خان جی کا ووٹ بینک سی... ایک دن جلسہ کرنے آیا۔ پتا نہیں مرن جوگی نیلو نے کوئی چکر چلایا یا... خان جی نے... کہ نیلو نے اپنے باپ کی عمر والے آدمی خان جی سے شادی کر لی... بس اتنی کہانی ہے۔ چاچا خوشی محمد دکھ سے مر گیا۔ اب میں ہی لوکاں دی خدمت کرن واسطے رہ گیا ساں... کلاں رھیندا اں سی... گھر وچ میرے علاوہ ہور کوئی نہیں۔ ہن تسی دسو، اے سارا کی معاملہ ہے؟''

وہ اپنی اور نیلو یا نیلی کی داستانِ الم بیان کر کے چپ ہو رہا۔ تو اول خیر نے ہی مختصراً لفظوں میں ۔۔۔ غیر ضروری ''کاٹ چھانٹ'' سے پوری بات اسے بتا دی۔ جسے سن کر جاں ورکھنا کا چہرہ تاریک پڑ گیا اور وہ عورتوں کی طرح اپنی پیشانی ہتھیلی پر مار کر بولا۔

ہائے... نیلو! کن چکروں میں پڑ گئی۔ خان جی تو اب اس کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ پر سمجھ میں نہیں آتا... یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا نیلو... خان جی کے خلاف درپردہ کوئی چکر چلا رہی تھی؟''

''یہ تو اب ہوش میں آنے کے بعد نیلی خود ہی بتائے گی۔'' اس بار میں نے ایک گہری سانس اور قدرے بیزار کن ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

مجھے ان کی یا نیلی کی کہانی سے یا ایسے کسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مجھے وزیر جان کی بیوی سعیدہ کے عین اس وقت مر جانے پر شدید قلق محسوس ہو رہا تھا جب وہ مجھے میرے ماضی سے متعلق ایک اہم ترین راز سے آگاہ کرنے والی تھی۔

اول خیر کے چہرے پر ایکا ایکی تشویش کے آثار طاری ہو گئے تھے جس پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اس وقت مطب کی طرف سے ''حکیم جی'' کہہ کر کسی نے جاں ور کو پکارا تو وہ اٹھ کر مطب میں چلا گیا۔ تب اول خیر نے اپنے اندر اچانک ابھرنے والی تشویش سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی... کاکے! بقول اس نوجوان کھنا کے یہ سارا علاقہ خان جی کا ووٹ بینک کہلاتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کسی نے نیلی کو اس کی بیوی کی حیثیت سے پہچان لیا ہو اور ایک بار پھر اتنے سارے دشمنوں میں خان جی کا نام بھی شامل ہو جائے۔''

''میرا نہیں خیال کسی نے پہچانا ہوگا.....'' میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اتنا ضرور ہے کہ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد... کوئی پہچان لے۔ اگر نیلی نے یہاں اپنے پرانے عاشقِ نامراد کھنا کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔''

''خطرے کی تلوار تو پھر بھی ہمارے سروں پر لٹکی ہی رہے گی، شہزی کاکے۔''

''میرا خیال ہے نیلی کے ہوش میں آنے اور اس کا آئندہ کا پروگرام جاننے کے بعد ہمیں فوراً یہاں سے کوچ کر

جانا چاہیے۔" میں نے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ... کسی مریض کو نمٹا کے دوبارہ اس حصے میں آ گیا۔ مطلب میں علاج معالجے کے علاوہ چھوٹا موٹا جراحی کا کام بھی کیا جاتا تھا۔ ایسے جراح شہر میں بھی موجود تھے۔ نہ جانے ان کا کیا طریقہ کار تھا مگر یہ بہرحال ایک باقاعدہ ڈگری یافتہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر فزیشن اینڈ سرجن کے معیار کو نہیں پہنچ سکتے تھے، جن کا طریقہ ہمیشہ پردے پر ہوتا ہے۔

بہرحال گھنا نے ایک بار پھر نیلی کا بغور معائنہ کیا پھر تسلی بخش انداز میں سر ہلایا اور ہمارے قریب آن بیٹھا۔

"کیا تم اکیلے رہتے ہو یہاں؟ میرا مطلب ہے تمہارے ماں باپ، بہن بھائی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا اس دنیا میں چاچا خوشی محمد کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی زندگی میں، اِدھر ہی مطلب میں رہتا تھا اور سوتا بھی تھا۔" اس نے بتایا۔

"تو اس کا مطلب ہے، یہ سارا کچھ چاچا خوشی محمد کا تھا، جو ایک طرح سے تمہارا ہونے یا نہ ہونے والا سسر بھی تھا؟" اس بار اول خیر نے پوچھا۔ میں نے اس کے سوال پر مشکل سے اپنی ہنسی روکی تھی۔

"ہاں جی، ظاہر ہے ان کا دنیا میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مجھے انہوں نے اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔" گھنا نے جواب دیا۔

"کیوں؟ اس کی بیٹی نیلی جو تھی؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ بڑے مغموم سے لہجے میں بولا۔

"وہ جی... چاچا خوشی محمد نے تو اس وقت ہی اپنی بیٹی سے تعلق توڑ لیا تھا جب اس نے اپنی مرضی سے اپنے باپ کی عمر کے آدمی سے شادی کر لی تھی۔"

"ہوں۔" اول خیر نے ایک گہری سانس لی پھر نیلی کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ "یہ کب تک ہوش میں آئے گی؟ اب ٹھیک تو ہے ناں یہ؟"

"ہاں جی، بالکل ٹھیک ہے، بس ہوش میں آنے والی ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔" کہتے ہوئے جاں ورگھنا اٹھا اور نیلی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ اسے ہوش آنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نیلی اپنے مکمل حواسوں میں آ چکی تھی مگر وہ ابھی اٹھ کر بیٹھنے سے قاصر تھی، اس نے جاں ورگھنا سے کچھ پوچھا تھا پھر سر ذرا گھما کے ہماری طرف دیکھا، اس کے نقاہت زدہ چہرے پر ہمیں دیکھ کر کچھ طمانیت سی نمودار ہوئی۔ جاں ورگھنا اسے میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور اسے تشفی وغیرہ دے رہا تھا پھر شاید نیلی نے اسے تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے جانے کا کہا جس پر جاں ورگھنا نے بلاچون و چرا عمل کیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد... نیلی نے میری طرف دیکھا۔ میں اس کے قریب آ گیا۔ وہ کمزور سی ہلکی آواز میں مجھ سے بولی۔

"شہزی! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی... تم نے میری جان بچائی۔"

میں نے متانت سے کہا۔ "میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ انسانیت کے ناتے... میرا ضمیر یہ گوارا ہی نہیں کرتا کہ کسی مجبور اور بے بس انسان کی مدد سے نظریں چرا جاؤں... رہی بات جان بچانے کی تو، زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوتی ہے اور اس کے ہی حکم سے ہم محض اتنا ذریعہ ضرور بنے تھے کہ تمہیں یہاں لے آئے۔"

"میں تمہیں بہت سی باتیں بتانا چاہتی ہوں۔" وہ اس قدر بول سکی۔

میں نے کہا۔ "ہاں! بہت سے سوالات میرے ذہن میں بھی ابھرتے ہیں۔ آخر یہ سب کیا معاملہ تھا؟"

"مجھے تمہاری ایک چھوٹی سی مدد کی ضرورت ہے، شہزی۔" اس نے تفصیل بتانے کے بجائے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں نے سنجیدگی سے اور دوٹوک لہجے میں کہا۔

"دیکھیے محترمہ! میں خود اس وقت ایسے حالات سے دوچار ہوں کہ مجھے اپنی مدد کی ضرورت زیادہ ہے۔ میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں اور اب یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔ ہم نے تمہاری خواہش کے مطابق تمہاری مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیا۔" میری صاف گوئی پر نیلی نے برا نہیں منایا۔ تاہم اس نے پہلے سعیدہ وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا اور میں نے بتا دیا کہ وہ نہیں بچ سکی۔ اس کے بعد وہ بولی۔

"شہزی! مجھے تمہاری سعیدہ وغیرہ سے کی ہوئی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ وزیر جان سے تمہاری کیا ٹسل ہے۔ کیا تم نہیں چاہو گے کہ میں تمہیں وزیر جان کے آئندہ کے عزائم کے بارے میں آگاہ کروں؟ میں سمجھتی ہوں کم از کم اس معاملے میں تو ہم دونوں تقریباً ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔"

نیلی نے بڑی ذہانت آمیز چالاکی سے میری دکھتی رگ کو محسوس کر کے اس پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مجھے کہنا پڑا۔

"ہاں، شاید... مگر تم وزیر جان کے بارے میں مجھے

کیا بتانا چاہتی ہو؟"

یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں وہ بات بھی بار بار کھٹکنے لگی کہ سعیدہ سے باتیں کرنے کے دوران میں نیلی مجھے آنکھوں سے خفیہ اشارے بھی کرتی رہی تھی۔

"شہزی! میرے قریب آ کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔ پہلے میں تمہیں مختصراً لفظوں میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" ناچار میں نے ساتھ کھڑے اول خیر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی اشارے سے اس کی بات سن لینے کے لیے کہا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر لکڑی کی اسٹول نما کرسیاں کھینچ کر اس کے قریب آن بیٹھے۔ نیلی نے بتانا شروع کیا۔

"شہزی! شاید تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ... جب میں نے تمہیں اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر وہاں دیکھا تو مجھے حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی تھی، درحقیقت میں اپنے لالچ کی وجہ سے ایک بڑے چکر میں پھنس گئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ میں تمہیں باتوں کے دوران میں آنکھ کے ہلکے ہلکے مخصوص اشارے بھی کیے جا رہی تھی کہ تم کہیں میری جھوٹ سچ باتوں کی سعیدہ کے سامنے نفی نہ کرنے لگو۔ میں درحقیقت اسے ایک ڈاج دے کر تمہارے ساتھ نکلنا چاہتی تھی اور بعد میں تمہیں اصل حقیقت بتانا چاہتی تھی۔ تمہاری سعیدہ سے گفتگو کے دوران میں مجھے بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ تم اس کا تعاقب کرتے ہوئے... ماسی رحمتے کے گھر تک پہنچے تھے، ماسی رحمتے، میری دور کی رشتے دار تھیں۔ غریب تھیں، اکیلی تھیں۔ میں خفیہ طور پر اس کی مالی مدد کرتی رہتی تھی۔ سعیدہ سے رازدارانہ قسم کی میٹنگز اکثر وہیں پر ہوا کرتی تھیں۔" وہ ذرا سانس لے کر دوبارہ کہنا شروع ہوئی۔

"یہ حقیقت ہے کہ میں نے دولت اور عیش و آرام کی خاطر ہی اپنے سے دگنی... عمر کے آدمی... یعنی زبیر خان سے شادی کی تھی اور بہت حد تک میری یہ خواہش پوری بھی ہو چکی تھی مگر جلد ہی مجھے تلخ حقیقت کا احساس ہونے لگا کہ میں ایک سونے کے پنجرے میں قید کر دی گئی ہوں اور میں اب خان جی (زبیر خان) سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ یہ تو میری عقل مندی تھی کہ میں نے اس سے شادی کرنے سے پہلے ایک شرط رکھی تھی جو اس بڈھے گدھے نے فوراً مان بھی لی تھی۔ اپنے تحفظ کی خاطر میں نے خان جی کی کھلاں والی جاگیر... کا نصف حصہ اپنے نام لکھوا لیا تھا۔

"خان کی پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اس سے کوئی اولاد نہ تھی، دوسری سے صرف شفقت راجا تھا اب وہ مجھ سے اولاد کا متمنی تھا۔ شفقت راجا کی موت کے بعد... اب اس کی دوسری بیوی قمر النسا... جس کے بطن سے شفقت راجا نے جنم لیا تھا۔ اس نے میرے خلاف محاذ رکھا تھا اور بالآخر مجھے دو کھلاں والی حویلی سے دور کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ خان جی نے مجھے ملتان ہی کے مضافات میں ایک کوٹھی بنا دی۔ وہ بھی میرے نام ہے لیکن میں، قمرو سوکن کی سازش سے اچھی طرح واقف تھی کیونکہ اسے بھی اس حقیقت کا علم تھا کہ کھلاں والی جاگیر کا نصف حصہ میرے نام بھی ہے۔ میں تو اکیلی تھی، میرا آگا پیچھا کون تھا؟ مگر قمرو... ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھی، ماں باپ تو خیر اس کے بھی مر چکے تھے مگر اس کے دو جوان شادی شدہ بھائی تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں محسوس کر رہی تھی کہ خان جی قمرو اور اس کے دونوں بھائیوں کے دباؤ میں آنے لگے ہیں۔ مجھے اپنا تحفظ خطرے میں نظر آنے لگا۔

"جوان اور اکلوتے بیٹے کی ہلاکت کے بعد خان جی کی طبیعت گری گری رہنے لگی مگر جلد ہی انہوں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش بھی کی تھی، وہ اپنے بیٹے کے قاتلوں سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے خاص ذرائع سے پتا چلا لیا تھا کہ اس کے بیٹے شفقت راجا کے بہیمانہ قتل میں وزیر جان اینڈ کمپنی کا ہاتھ ہے۔ جو ممتاز خان کے باپ چودھری الف خان کا دیرینہ حلیف بھی رہ چکا تھا۔ اس سلسلے میں خان جی کی تمہاری طرف سے غلط فہمی دور ہو گئی اور انہوں نے تم سے مدد لینے کی ٹھانی، مگر پھر نیلی کوٹھی میں اچانک اور غیر متوقع قسم کے کچھ ایسے حالات ظہور پذیر ہوئے تھے کہ انہیں تم سے اس گمبھیر سلسلے میں تفصیلی بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انہی دنوں ایک ہائی سوسائٹی پارٹی کلب میں میری میڈم فرح نامی خاتون سے ملاقات ہوئی۔ عورتوں کی... آپس میں کچھ ذاتیات سے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح میڈم فرح سے دوستی ہو گئی۔ وہ ایک طرح سے میری رازداں بھی بن گئی۔ اس نے ایک دن میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ مجھ سے بولی کہ جب تک یہ بڈھا (خان جی) زندہ ہے، تو مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا مگر کب تک...؟ تم جوان ہو، ابھی تم نے دنیا میں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ کل کلاں کو... یہ بڈھا مر گیا تو کون ہے اس کے بعد تمہارا؟ جبکہ تمہارے مقابلے میں تمہاری سوکن قمر النسا کی خاندان میں حیثیت مضبوط ہے۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے ذریعے تمہیں دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکے گی۔ لہٰذا ابھی سے اپنے بارے میں سوچ لو، اور جو تمہارے نام ہے،

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وہ مکمل طور پر اپنے تصرف میں کرلو۔ اس پر اس نے مجھے بڑی رازداری کا وعدہ کرتے ہوئے وزیر جان کی بیوی سعیدہ سے ملوا دیا۔ میڈم فرح نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے نام کی ہوئی، کھلاں والی کی نصف جاگیر سعیدہ کے ہاتھ فروخت کردوں۔ جب میں نے اسے یہ کہا کہ... خان جی کی زندگی میں بھلا یہ میں کیسے کرسکتی ہوں، تو سعیدہ نے مجھے ایک دن اپنی کوٹھی میں بلایا اور اپنے شوہر وزیر جان سے ملاقات کروائی، دونوں میاں بیوی نے میرے سامنے ایک بھیانک منصوبہ رکھا کہ اگر میں پچاس کروڑ میں کھلاں والی کی نصف جاگیر اسے فروخت کردوں تو، وہ اگلے دن ہی... خان جی کو مروا ڈالیں گے۔

"وزیر جان اور سعیدہ کو میڈم فرح کے ذریعے میری خواہشات اور اس سے متعلق تحفظات کا پہلے ہی علم تھا۔ لہٰذا سعیدہ اور وزیر جان نے میری اس دکھتی رگ کو چھیڑتے ہوئے، مجھے یہ ترغیب دی تھی، کیونکہ خود میں نے بھی ظاہر ہے، لالچ کی خاطر ہی ایک بڈھے سے شادی کی تھی اور اب خود بھی میں ایک بڑا ہاتھ مار کر نکل جانا چاہتی تھی اور یہ سنہری موقع مجھے یہ دونوں میاں بیوی دے رہے تھے۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت تو کیا مگر میں نے ہامی بھرلی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ نصف جاگیر خریدنے میں ان کا بھلا کیا فائدہ ہوگا اس پر وزیر جان نے بڑی اسرار بھری مسکراہٹ سے کہا تھا کہ مجھے صرف ایک بار کھلاں والی میں پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے اس کے بعد سب کچھ میرا ہوگا۔ مجھے وہ ایک بڑے گینگسٹر کے روپ میں نظر آرہا تھا۔ مجھے دولت کے لالچ نے اندھا کر رکھا تھا۔ میں نے ہامی بھرلی۔ کیونکہ خان جی کو میں اب ہر معاملے میں ہی نہیں بلکہ اپنی سوکن قمرو اور اس کے بھائیوں کے سامنے بے بس محسوس کرنے لگی تھی جس کے پیشِ نظر خان جی نے مجھے بھی ایک قیدی ہی بنا ڈالا تھا۔ ابھی یہ سازباز چل رہی تھی، کہ ان دونوں میاں بیوی میں (سعیدہ اور وزیر جان) نے میرے آگے ایک اور پتا پھینکا۔ انہوں نے مجھے خان جی کو سلو پوائزنگ کرنے کی ترغیب دے ڈالی، اس ضمن میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ خان جی کو مقتول بنا کر مجھے کسی بڑے قانونی چکر میں پھنسنے سے بچانا چاہتے تھے۔ مجھے بھی ان کی یہ بات اچھی لگی کہ یہ لوگ میرا ابھی خیال رکھ رہے تھے اور منظم طریقے سے اس خطرناک مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن بالکل اتفاقاً مجھ پر ایک دن اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ ایک طرف میرے ذریعے خان جی کو بظاہر "طبعی موت" سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے تو دوسری طرف میری موت کا پروانہ بھی جاری کیے ہوئے تھے۔ اس روز میں نے میڈم فرح کے یہاں ہی سوئے اتفاق سعیدہ اور میڈم فرح کی گفتگو سن لی تھی، جو میڈم فرح کو مجھ سے ملانے اور سازباز کرنے کے انعام کے طور پر بھاری رقم کا چیک دے رہی تھی، سعیدہ نے ہی میڈم فرح کو بتایا تھا کہ اس کا شوہر وزیر جان بظاہر قانونی طور پر خان جی کے مرنے کے بعد میرے ذریعے سے کھلاں والی کی جاگیر پر قابض ہو جائے گا اور پھر وہاں اپنے دیگر مخالفوں کو راستے سے ہٹانے کے بعد مجھے بھی خاموشی سے موت کی نیند سلا دے گا۔

"میں نے تب تک خان جی کو سعیدہ کی دی ہوئی زہر کی تھوڑی تھوڑی مقدار دودھ میں ملا کر دینی شروع کردی تھی، اب انہیں آخری خوراک دینا تھی جس سے انہیں دل کا ایک آخری اور خطرناک دورہ پڑتا مگر اب سعیدہ اور وزیر جان کی گھناؤنی سازش اور ان کے اصل عزائم جاننے کے بعد کہ یہ تو مجھے بھی ہلاک کرنے کے درپے تھے، میں اس دن سے پریشان رہنے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ کبھی دل میں خیال آتا کہ اپنے شوہر خان جی کے قدموں میں گر کر ان سے معافی مانگ لوں اور ساری حقیقت بتا دوں، مگر اس کی مجھ میں ہمت نہ پڑسکی، اس سلسلے میں آج میری سعیدہ سے خاص میٹنگ تھی کہ تم آگئے۔ میں تمہاری اور سعیدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اندر ہی اندر خوشی سے نہال ہوگئی کہ تم ہی میرے نجات دہندہ ثابت ہوسکتے ہو اور اس مشکل سے مجھے نکال سکتے ہو لیکن پھر تارڑ اور اس کے مسلح ساتھیوں کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر سب کچھ درہم برہم ہوگیا۔ خود میں بھی خوف زدہ ہوگئی اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ یقیناً خان جی کو میری بعض مشکوک حرکات سے کسی قسم کا شبہ ہوا ہوگا اور اپنے آدمی تارڑ کو میرے پیچھے لگا رکھا ہوگا مگر اب تو جیسے سب کچھ ختم ہوتا ہی نظر آرہا ہے مجھے..."

نیلی کی یہ ساری رام کتھا میں نے اور اول خیر نے بڑی یکسوئی اور غور سے سنی تھی اور حیران سے رہ گئے تھے، میرے جی میں تو آئی کہ نیلی پر لعنت بھیج کر اول خیر کو لے کر یہاں سے اسی وقت کوچ کر جاؤں مگر وزیر جان کے معاملے نے مجھے وہاں رکے رہنے پر مجبور رکھا۔ تاہم میں نے مزید اس بارے میں کچھ پوچھنے سے پہلے نیلی کو ناصحانہ انداز میں اتنا ضرور کہا۔

"تمہیں کم از کم ایک انسان ہونے کے ناتے اور

بیوی کے مرتبے پر ہوتے ہوئے، بہرحال اپنے شوہر کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے شک خان جی کی اور تمہاری عمروں میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن بہرحال تم سے شادی کرنے کے سلسلے میں خان جی نے کسی قسم کی کوئی زبردستی نہیں کی تھی بلکہ تم نے خود راضی خوشی ان کی بیوی بنتا پسند کیا تھا کیونکہ تمہارے پیشِ نظر صرف لالچ تھا۔ تم مجھے یہ بتا سکتی ہو کہ آخر وزیر جان کو کھلاں والی جاگیر پر قابض ہونے کی ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا تھا کہ خان جی ایک عام جاگیردار نہیں بلکہ سیاسی شخصیت بھی ہے۔ مقامی لوگ اس کی جگہ وزیر جان کو کیسے پسند کرتے؟"

نیلی نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے کہ خان جی کی اپنی ذاتی اور سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچانے میں ان کے اپنے ہی جوان اکلوتے بیٹے شفقت راجا کا ہی دخل تھا۔ اس نے وہاں ظلم و جبر کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ کوئی اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ لوگ اس کی شکایت بھی خان جی سے کرتے ہوئے ڈرتے تھے، تاہم پھر خان جی کے کانوں تک اس کے بیٹے کے سیاہ کرتوتوں کی داستانیں پہنچتی رہتی تھیں۔ وہ بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے مگر بیٹا لاڈلا اور سرکش تھا۔ باپ کے کسی حکم کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ یوں رفتہ رفتہ لوگوں کا دل خراب ہونے لگا۔ کئی لوگ تو وہاں سے کوچ کر کے جا بھی چکے تھے۔ بہرحال، بیٹے کے قتل کے بعد... خان جی کا بھی سیاسی کیریئر ختم ہو کر رہ گیا۔ خود ان کی دلچسپی بھی جاتی رہی۔ وہ اب صرف جاگیردار تھے... ایک بیمار جاگیردار..."

نیلی کی اس بات سے میں سو فیصد ہی متفق تھا کیونکہ خود مجھے بھی معلوم تھا کہ شفقت راجا کس قماش کا آدمی تھا۔ نیلی نے میرے سوال کے جواب میں آگے بتایا۔

"کھلاں والی کی جاگیر پر اپنا مکمل تصرف حاصل کرنے کے بعد... وزیر جان سیاسی سپورٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاید وہ سیاست کے میدان میں اترنے والا تھا مگر اس سے پہلے وہ کھلاں والی کے لوگوں کے دل جیتنا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ کھلاں والی کو جدید خطوط پر ترقی سے ہمکنار کرے گا وغیرہ۔"

میں اس کی بات پر اندر سے کھٹک گیا۔ یقیناً وزیر جان ایک علاقے میں اپنا خاص قسم کا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا جس کے پیچھے بلاشبہ "اسپیکٹرم" کی ماسٹر اتھارٹی کی "ڈکٹیشن" کا دخل رہا ہوگا اور وہ یہ سب انہی کے ایما پر انہی کے وسیع تر مفادات کی خاطر کرنا چاہتا تھا۔

"اسپیکٹرم" کے اسٹیشن چیف وزیر جان کا ایک اور گھناؤنا منصوبہ میرے علم میں آیا تو میری رگوں میں دوڑتے خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ نیلی کو اب بھی وزیر جان کی حقیقت اور خفیہ عزائم کے بارے میں کچھ علم نہ تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ لہٰذا اب میں اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا تھا کہ میرا خود بھی زبیر خان المعروف خان جی سے ملنا ازبس ضروری ہے۔ میں وزیر جان کی سازش اور گھناؤنے منصوبے کو روکنا اپنے لیے ہی نہیں بلکہ ملکی مفادات میں بھی اشد ضروری اور اپنا فرض سمجھتا تھا۔ میں نے نیلی سے یونہی دریافت کرنا چاہا جبکہ اسی تناظر میں میرے ذہن نے پہلے ہی اپنے تئیں ایک لائحہ عمل کی جزئیات پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

"اب تک جو ہوا سو ہوا، اب تمہارا آئندہ کا کیا لائحہ عمل ہے؟"

نیلی نے لیٹے لیٹے میری طرف دیکھا پھر بمشکل ایک گہری سانس حلق سے خارج کر کے بولی۔ "شہزی! میں سمجھتی ہوں کہ شاید میں خود ایک بھنور میں پھنس چکی ہوں۔ کبھی سوچتی ہوں، اسی وقت خان جی کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں اور وہ جو میری سزا مقرر کریں اُف تک نہ کروں یا پھر خاموشی سے کہیں چلی جاؤں اور گمنامی کی زندگی بسر کروں۔"

"میں تمہاری پہلی بات سے اتفاق کروں گا جبکہ تمہاری دوسری بات سے مجھے اختلاف ہے۔" میں نے بلاتامل کہا۔ "کیونکہ تم بہرحال ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہو۔ گمنامی کی زندگی تمہیں گمراہی کی طرف لے جاسکتی ہے جبکہ اگر تم اپنے شوہر سے معافی کی درخواست کرو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

میری مدد والی بات پر بے اختیار نیلی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور وہ رندھے لہجے میں بولی۔

"شہزی! تم ایک عظیم انسان ہو، کسی انسان کو مشکل میں دیکھ کر تمہارا دل بے اختیار اس کی مدد کرنے کو تڑپ اٹھتا ہے لیکن شہزی! کیا خان جی یہ ساری حقیقت جان لینے کے بعد مجھے معاف کردیں گے؟"

میں نے جواب میں کہا۔ "ابھی تو مجھے بھی اس امر کا اندازہ نہیں مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ اگر وہ تمہیں معاف نہ بھی کریں تو کم از کم تمہیں جان سے نہیں ماریں گے، البتہ اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیں۔ یعنی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تمہیں طلاق دے دیں۔ خالی ہاتھ تمہیں وہ بھی نہیں کریں گے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی جس کا مجھے کچھ کچھ یقین ہے تو پھر تم کیا کرو گی؟''

نیلی سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو میں نے اسے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ ''تو پھر تمہیں... ایک باعزت زندگی گزارنے کے لیے جاں در کھنا جیسے انسان ہی کو اپنا جیون ساتھی بنانا ہوگا، وہ تم سے محبت بھی کرتا ہے بلکہ تم تو اس کی منگیتر بھی رہ چکی ہو، بے شک یہ رشتہ تمہارے مرحوم باپ خوشی محمد نے ہی اپنے ہونہار فرماں بردار شاگرد... جاں در کھنا کے ساتھ جوڑا تھا۔ میرا خیال ہے یہی بہتر بھی رہے گا اور تمہارے ناراض باپ کی روح بھی خوش ہو جائے گی۔''

''مجھے قبول ہے... یہ سب... مجھے قبول ہے...''

نیلی فرطِ جذبات تلے بے اختیار سسک کر بول پڑی۔ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ وہ ہولے سے مخصوص لہجے میں بولا۔

''اوخیر، کاکے! مارا ماری کے ساتھ تو راہ سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو بھی سدھارتا ہے۔ مجھے تو شروع ہی سے تیری اسی ادا نے گرویدہ بنا رکھا ہے۔''

میں ہنس پڑا اور بولا۔ ''یار! میں تو خود گناہ گار ہوں... بھلا کسی کو کیا سیدھی راہ دکھاؤں گا، بس میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ اگر کوئی نیکی نہ کروں تو یار! مجھ سے گناہ بھی نہ ہونے پائے۔ پتا نہیں... اللہ تبارک و تعالیٰ کو بندے کی کون سی ادا کب بھا جائے۔''

''اوخیر، جیو کاکا... جیو۔'' وہ بولا۔ ''اب جلدی سے آگے کی سوچ... کرنا کیا ہے؟''

میرا اپنا ذاتی مشن تو سردست ناکام ہی رہا تھا۔ جسے پورا کرنے کی میں سرتوڑ کوشش میں لگا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔ تاہم یہ کام بھی کسی حد تک میرے مشن سے ہی تعلق رکھتا تھا اس لیے چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد اول خیر سے مشورہ طلب انداز میں بولا۔

''یار! اس خون خرابے کا... خان جی کو کیا بتائیں گے؟ ان کے آدمی تارڑ ہی نہیں تین مزید آدمی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔'' اول خیر کے جواب دینے سے پہلے ہی نیلی بولی۔ وہ اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔

''کسی کو بھی تم پر شبہ نہ ہوگا۔ نہ خان جی کو، نہ ہی وزیر جان کو۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟'' میں نے غور کرنے والے انداز میں فوراً نیلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اس لیے کہ وہاں ہمارے سوا اور کوئی زندہ نہیں بچا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''البتہ یہ ممکن ہے کہ وہاں موجود لاشوں سے، بعد میں خبر خان جی اور وزیر جان تک پہنچے گی تو وزیر جان یہی سمجھے گا کہ یہ سب خان جی کے ساتھیوں کی جارحانہ مداخلت سے ہوا ہوگا جبکہ خان جی سمجھیں گے وزیر جان کے ساتھیوں کا شاخسانہ ہو سکتا ہے۔''

مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ ''لیکن بعد کی پولیس تفتیش بہت کچھ ثابت کر سکتی ہے کہ یہ کسی تیسرے مسلح گروہ کی حرکت تھی۔''

''بے شک۔'' نیلی کا لہجہ اب بھی پُراعتماد تھا۔ ''تیسرا گروہ کون ہے؟ یا کون تھا؟ کسے معلوم؟ یہ سب گمنامی کے اندھیروں میں ہوا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ خان جی کو بھی نہ بتانا۔''

میں نے اول خیر کی طرف دیکھا جو بڑے غور سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میری مستفسرانہ نظروں کا مطلب سمجھ کر پُرخیال انداز میں ہولے ہولے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''کسی حد تک نیلی کی بات ٹھیک بھی لگتی ہے لیکن شہزی کاکا! تم جو خان جی سے ملاقات کا ارادہ کیے بیٹھے ہو اسے کس طرح اس سارے معاملے کا چکر دو گے؟''

''یہ بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔'' میرے بجائے نیلی بول پڑی۔ ہم دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تم بتا دینا کہ مجھ سے تمہاری اتفاقیہ مڈبھیڑ ہو گئی تھی۔ کچھ ہتھیار بند لوگ یہ خون خرابا کر کے مجھے اس حالت میں چھوڑ کے فرار ہوئے جبکہ تم نے مجھے خان جی کی بیوی کی حیثیت سے پہچان لیا کیونکہ نیلی کوٹھی میں تم مجھے دیکھ ہی چکے تھے۔''

اس کی بات پر ہم دونوں نے صاد کیا۔ نیلی نے بھی غضب کا ذہن پایا تھا۔ کیونکہ نیلی سے اس سلسلے میں گفتگو کے دوران میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن رسا میں بھی کم و بیش یہی کچھ پلان طے پا رہا تھا اور ابھی میں اندر ہی اندر اس لائحہ عمل کی جزئیات سمیٹ ہی رہا تھا کہ نیلی نے ہم سے یہ کہہ ڈالا۔

''مگر اب کیا کیا جائے؟ تمہاری ایسی حالت تو نہیں کہ تمہیں اسی وقت خان جی کے پاس لے جایا جائے اور پھر پتا نہیں وہ اپنی ملتان والی رہائش گاہ نیلی کوٹھی میں ہو یا کھلاں والی حویلی میں؟'' میں نے الجھی نظروں سے نیلی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''تم لوگ مجھے کار میں ڈال کر شدید زخمی حالت میں بھی تو یہاں لائے تھے؟ اب تو میری حالت پہلے سے کافی بہتر ہے۔ مجھے اسی طرح کار میں دوبارہ ڈال کر خان جی کے پاس لے چلو... رہی بات ان کی موجودگی، غیر موجودگی کی، تو ہم سیل فون پر خان جی سے رابطہ کر کے پوچھ سکتے ہیں۔''

''ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں، یہ سیل فون زیادہ دیر ہمارے پاس نہیں ٹکتے... سیل فون آئے گا کہاں سے؟''

اول خیر نے کہا تو نیلی بولی۔ ''یہ کوئی مسئلہ نہیں، جاں در کھنا اس کا بندوبست کر سکتا ہے۔ سیل فون تو آج کل اس قدر عام ہو گیا ہے کہ قریہ قریہ گاؤں گاؤں پہنچ گیا ہے لیکن جب میں نیلی کوٹھی سے نکلی تھی تو خان جی کھلاں والی گئے ہوئے تھے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا تو اول خیر مجھ سے پُراندیشہ لہجے میں بولا۔

''سوچ لے کاکے! مسئلہ یہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے والا ہے۔ یوں سمجھو... اپنے ہاتھ سے ہاتھی کو ہندوستان دکھانے والی بات ہوگی۔''

''یہ تو کرنا پڑے گا ہی نہیں اول خیر، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔'' میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

''اس طرح ہم شبے کی نظر میں پڑ سکتے ہیں۔'' وہ بولا۔ وہ کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیلی بھی خاموش تھی۔ میں بھی سوچ میں پڑ گیا تاہم بولا۔

''میری زبیر خان سے اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ کیا تم بھول گئے اول خیر؟ خان جی خود مجھ سے اپنے بیٹے شفقت راجا کے سلسلے میں مدد کا خواہاں تھا اب اسے حقیقت کا علم ہوگا کہ وزیر جان ہم دونوں کا ہی مشترکہ دشمن ہے، تو وہ پوری طرح ہم سے نہ صرف تعاون پر آمادہ بھی ہو جائے گا بلکہ خوش بھی ہوگا کہ ہم نے اسے بروقت اس کے اکلوتے جوان بیٹے کے قاتل کے گھناؤنے منصوبے سے بھی خبردار کر دیا پھر ہم اس سے رازداری کی بھی درخواست کر سکتے ہیں جو اس کے مفاد میں بھی ہوگی۔ اس طرح وزیر جان ساری عمر ٹامک ٹوئیاں ہی مارتا رہے گا کہ آخر یہ سب ہوا کیا تھا اور کس نے کیا تھا؟''

''بات تو تیری بھی ٹھیک ہی لگتی ہے کاکے۔'' اول خیر کچھ کچھ مطمئن ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن پھر بھی میرا مشورہ یہ ہوگا کہ خان جی سے اس کی جاگیر کھلاں والی میں ملاقات

ستمبر 2015ء کے شمارے کی ایک جھلک

رشتے کا زہر
سیانے کہتے ہیں کہ جو وقت گزر گیا سو گزر گیا... مگر جو وقت گزر کر بھی ساتھ نہ چھوڑے اس کے احساس سے پیچھا چھڑانا ممکن کیسے ہو سکتا ہے... آخری صفحات پر **شہاب جمال** کا تحفہ

خدنگ عثمانی
تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش انداز
الیاس سیتا پوری کے قلم کا سحر

شیش محل
اسما قادری کے قلم کا جادو... صفر سے زندگی کا آغاز کرنے والے دلیر اور دلبر لوگوں کی سرکشی اور دلکشی کا نیا طویل سلسلہ

ماروی
دوست سے دشمن اور دشمن سے دلبر بنانے والی بساط کی چالوں کا احوال **محی الدین نواب** کے خیالات کی روانی

ڈاکٹر شیر شاہ سید، کاشف زبیر، منظر امام، سلیم انور، تنویر ریاض اور فاروق انجم کی دلچسپ کہانیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرنے کے بجائے ملتان والی نیلی کوٹھی میں ملاقات کی جائے۔"

"ہاں، یہ تمہارا مشورہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ نیلی بھی متفق تھی پھر تھوڑی دیر بعد ہم نے... کھنا کو آواز دی۔ وہ اس دوران مطب والے گوشے میں بیٹھا مریض بھگتا رہا تھا، ہماری آواز پر فوراً دوڑا چلا آیا۔

"تمہارے پاس سیل فون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی بالکل ہے جی۔" وہ بولا اور فوراً اپنے جھولتے ہوئے لمبے کرتے کی سائڈ جیب سے ایک سستا والا سیٹ نکال لیا۔

"بیلنس تو ہے ناں اس میں؟"

"آہو جی۔"

"ہمیں ایک ضروری کال کرنی ہے۔ بات لمبی بھی ہو سکتی ہے۔"

"کوئی گل نہیں جی۔ بے فکر ہو کے کرو... اس میں پیکیج ہے۔"

"ٹھیک ہے، شکریہ۔ اب تم جاؤ پھر تمہیں آواز دیتے ہیں۔" میں نے کہا۔ اس نے نیلی کی طرف کچھ محبت بھری اور کچھ حسرت زدہ نظروں سے دیکھا پھر مجھ سے بولا۔

"سب خیر تو ہے ناجی؟"

"ہاں، ہاں... سب خیر ہے، ہم آگے کی بھی خیر منانے والے ہیں۔ بس ایک بات کرنی ہے کسی سے بہت ضروری۔"

"اچھا، اچھا... اللہ سب خیر کرے۔" وہ یہ کہتا اور سر دھنتا ہوا چلا گیا۔ مجھے اس بے چارے پر ترس بھی آرہا تھا۔ میں خود راہِ وفا کا راہی تھا، جس کی منزل قریب ہوتے ہوئے بھی دور تھی اور کم و بیش یہی حال اس غریب اور سادہ لوح جاں ورکھنا کا بھی تھا۔ نیلی کی خاطر وہ ہمارا ہر حکم مانے جارہا تھا اور درحقیقت اس میں اس کا فائدہ بھی تھا۔ میں خود بھی درحقیقت یہی چاہ رہا تھا کہ نیلی، خان جی کی طرف سے آزاد ہو جائے اور اس کو اپنالے۔ اس میں دونوں کے لیے راحت وخوشی تھی۔

میں نے سیل ہاتھ میں لے کر ایک نظر اول خیر کے چہرے پر ڈالی۔ اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ اس کے بعد میں دھڑکتے دل سے خان جی کے سیل کا نمبر پنچ کرنے لگا، کچھ ضروری نمبرز مجھے ازبر تھے۔

رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے کھرکھراتی آواز ابھری۔ "ہیلو۔"

آواز پہچان کر میں نے پہلے سلام کیا پھر بولا۔ "خان صاحب! میں شہزاد احمد خان بول رہا ہوں۔"

یکلخت دوسری سمت جیسے سناٹا طاری ہو گیا پھر زیر خان کی بھاری آواز ابھری۔ "شہزاد... تم؟ یہ... یہ تم ہی بات کر رہے ہو ناں... شہزی؟" ان کے لہجے میں غیر یقینی عیاں ہو رہی تھی، میں نے کہا۔

"جی خان صاحب! میں ہی مخاطب ہوں آپ سے... شہزی! آپ اس وقت کہاں تشریف رکھتے ہیں؟"

"میں اپنی جاگیر والی حویلی میں ہوں تم بتاؤ تم کدھر ہو؟ اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اب تمہیں کیا خطرہ ہے قانون نے تمہیں تو آزاد کر دیا ہے پھر... یہ دوری کیوں؟" وہ جیسے چھوٹتے ہی بولے چلا گیا۔ میں نے کہا۔

"قانون نے تو میرا پیچھا چھوڑ ہی دیا ہے مگر دشمن بھی تو کم نہیں میرے... وہ تو ہر وقت سائے کی طرح میرے تعاقب میں لگے رہتے ہیں۔ آپ سنائیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں... آپ سے ایک معذرت کرنا تھی... اس روز والے واقعے کی۔" میں نے دانستہ ایسا کہا۔ ابھی تک شاید اسے کوئی اطلاع نہیں پہنچی تھی جبکہ اس روز والے واقعے سے میری مراد اس روز میرا ایڈووکیٹ خانم کو زخمی حالت میں لے کر نیلی کوٹھی سے نکلنا اور اسپتال پہنچانا تھا اور اس دوران میری خان جی سے بھی تھوڑی بہت تلخ کلامی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بولا۔

"تم نے اس وقت جو کیا تھا وہ ٹھیک ہی تھا اور ایک طرح سے تمہارے حق میں بھی بہتر ہوا۔ اب تم کہاں ہو، میں تو تمہارا بے چینی سے منتظر ہوں۔"

"خان جی! پہلے آپ دل سے کہیں، آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا کوئی ناراضگی تو نہیں مجھ سے۔"

میری بات پر دوسری جانب سے خان جی نے پہلے ایک دوستانہ انداز کا قہقہہ بلند کیا، اس کے بعد بولا۔ "تم اگر اس وقت میرے سامنے ہوتے تو میں تمہارے کان تو ضرور کھینچتا... نالائق کہیں کے... ابھی تک تم مجھے نہیں پہچان سکے ہو، فوراً میرے پاس پہنچو یا پھر مجھے بتاؤ کہاں سے بات کر رہے ہو؟ میں گاڑی اور اپنے مسلح محافظ بھجوا دیتا ہوں۔"

"آپ کی بڑی مہربانی خان جی۔" اس کا خلوص دیکھ کر میرا اپنا دل رقیق سا ہونے لگا۔ یہی تو شہزاد احمد خان عرف شہزی کی فطرت کا خاصہ تھا' پیار سے قتل بھی کر دو تو اُف نہیں کروں گا لیکن نفرت اور مخاصمت سے مجھے کوئی زیر نہیں کر سکتا...۔ "آپ کی محبت اور شفقت ہے خان جی! معاملہ تھوڑا گھمبیر ہے خان جی... مکمل رازداری کا متقاضی بھی... چاہتا ہوں گھر کی بات گھر میں ہی رہے۔ آپ کو تھوڑی زحمت دوں گا، اگر آپ نیلی کوٹھی آسکتے ہیں تو پھر میں بھی اُدھر آجاتا ہوں۔ کھلاں والی تو میں بالکل نہیں آسکتا۔"

"میں ابھی تمہارا فون آنے سے پہلے خود نیلی کوٹھی کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ٹھیک ہے اگر ایسا ہے تو وہیں آجاؤ، مجھے وہاں پہنچنے میں بمشکل ایک گھنٹا لگے گا۔"

"بہت بہتر خان جی... میں بھی وہاں پہنچتا ہوں۔"

"خیریت تو ہے ناں؟"

"جی ہاں، وہیں آکر آپ سے بات ہو گی، خدا حافظ۔"

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں نے سرمد بابا کا نمبر ملانا چاہا تو کال ڈراپ ہونے لگی۔ دیکھا تو سگنل نہیں آرہے تھے، میں نے اول خیر اور نیلی کو اپنی اور خان جی کی گفتگو کے بارے میں مختصراً بتا دیا۔ سن تو وہ رہے تھے، اس کے بعد میں نے کہا۔

"اب کیا پروگرام ہے؟"

اول خیر نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا، پھر بولا۔ "ہم بھی نکلتے ہیں۔ کم و بیش ہمیں بھی اتنا وقت تو لگ ہی جائے گا۔ گاڑی میں فیول بھی بھروانا ہوگا اور نیلی کی حالت کے پیش نظر ہمیں گاڑی بھی نارمل رفتار سے چلانا ہوگی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا پھر جاں ورکھنا کو آواز دی۔ وہ بوتل کے جن کی طرح دوبارہ حاضر ہو گیا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اسے اس کا موبائل تھمایا پھر بولا۔ "دیکھو کھنا صاحب! ایک بات غور سے سنو، ہم اسی وقت نکلیں گے، نیلی بھی ہمارے ساتھ جائے گی، ہم خان جی کے پاس جارہے ہیں، معاملہ رفع دفع کرنا چاہتے ہیں۔"

"لل... لیکن جی..." وہ کچھ کہتے کہتے رہ گیا تو نیلی نے کہا۔ "سمجھے! یہ ضروری ہے۔ شہزی بھائی، مجھے ایک مصیبت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ کے لیے یہاں تمہارے پاس آجاؤں۔" نیلی کی بات پر اس کے چہرے پر کھلتے رنگ طلوع ہونے کی جھلک سی ابھری... اس کے بعد اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم نے کھنا سے کہا کہ وہ اپنے مطب کے مریضوں کو فارغ کر دے، کیونکہ ہم یہاں سے رازداری کے ساتھ نکلنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا کہ مطب میں اس وقت کوئی مریض نہیں۔

اگلے چند منٹوں بعد ہم کار میں روانہ ہو رہے تھے۔ جاں ورکھنا نے روٹی وغیرہ کا پوچھا بھی تھا مگر اب کھانے پینے کا کسے ہوش تھا۔ بہرحال اس کا ایک بار پھر شکریہ ادا کر کے ہم روانہ ہو گئے۔

ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ نیلی کار کی عقبی سیٹ پر دراز تھی، کھنا نے روانہ ہوتے وقت کچھ دوائیں نیلی کے ساتھ کر دی تھیں۔ کار اول خیر چلا رہا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر موجود تھا۔ ایک روڈ سائڈ گیس اسٹیشن سے ہم نے فیول ڈلوایا اور پھر روانہ ہو گئے۔ معاملہ پولیس کیس کا بھی تھا اس لیے ہماری کوشش تھی کہ راستے میں کسی پولیس چیکنگ پارٹی سے ہمارے مڈبھیڑ نہ ہونے پائے۔ ملتان روڈ مین ہائی وے تھی اور جگہ جگہ چیک پوسٹیں قائم تھیں، کہیں کہیں تو ہمیں بچ کے ہو کے گزرنا پڑا تھا۔

بالآخر سرِشام ہم نیلی کوٹھی پر بخیروعافیت پہنچ گئے۔ براؤن رنگ کی اسٹرکولا کو کھڑے دیکھ کر میں سمجھ گیا... خان جی کب سے پہنچ چکے تھے۔ ایک بات کا میں نے دھیان رکھا تھا کہ جاں ورکھنا کے سیل نمبر پر خان جی دوبارہ رابطہ کر سکتے تھے اس لیے میں نے روانہ ہوتے وقت جاں ورکھنا کو اس کے وسیع تر مفادات کے تحفظات کا کہہ کر اسے مجبور کر دیا تھا کہ اگر خان جی یا اور کسی کا فون اس کے سیل پر آئے اور وہ ہمارے بارے میں پوچھیں تو وہ یہی کہے گا... وہ ہمیں نہیں جانتا... نیز جاں ورکھنا اپنا اصل نام بھی نہیں بتائے گا بلکہ خود کو کوئی پی سی او والا ہی ظاہر کرے گا۔ گاؤں کے بارے میں نہیں بتائے گا، وغیرہ۔

نیلی کوٹھی میں خان جی موجود تھے۔ اپنی جواں سال بیوی نیلی کو اس حالت میں دیکھ کر... وہ بری طرح چونک گئے اور سرتاپا سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔

خان جی سے ہم نے وہی کہا جس کی منصوبہ بندی ہم کر چکے تھے۔ یعنی نیلی کا ہم سے زخمی حالت میں سامنا ہوا تھا اور نیلی نے بھی یہی بتایا کہ وزیر جان کے آدمی تھے وغیرہ... اس کے بعد نیلی زخمی ہونے کے باوجود خان جی کے قدموں میں جا گری اور رو پڑی۔ اس کی کیفیت کچھ ایسی تھی، اٹھ بیٹھ نہیں سکتی تھی مگر شدید جذبات کی رو اور ضمیر کی کسک نے نہ جانے اس کے زخمی وجود میں کیسے اتنی ہمت بھر دی تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ جاں ورکھنا نے اس کی مرہم پٹی اچھی کی تھی پھر بھی ہلنے جلنے کے باعث نیلی کے زخموں کا منہ کھلنے لگا تھا۔

ساری کتھا سننے کے بعد تو جیسے خان جی کی کئی ثانیوں تک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گم صم ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے اپنے قدموں میں پڑی روتی بلکتی زخمی نیلی کو چھونے تک کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کی گھنی بھووں سے ڈھکی آنکھوں میں نفرت و غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں... پسومارے طیش کے سرخ ہونے لگا، ان کی جلتی سلگتی حالت کو محسوس کر کے میں نے اور اول خیر نے نیلی کو سہارا دے کر صوفے پر نیم دراز کر دیا اور پھر میں خان جی کے قریب بیٹھ کر بولا۔

"خان جی! بے شک نیلی نے جو کچھ اب تک کیا وہ بہت برا کیا مگر خدا کا شکر ہے کہ اتنی بڑی سازش بے نقاب تو ہو گئی اور آپ کی جان بھی بچ گئی۔ میں آپ سے گزارش کروں گا نیلی کو معاف کر دیں۔"

جواباً خان جی بولے۔ "اگر یہ بدذات، حرافہ تمہارے ساتھ نہ ہوتی تو میں اسی وقت اسے گولی مار دیتا لیکن اب میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا... میں اسے اس کی اصل اوقات میں پہنچا دوں گا۔ یہ اس شان اور مرتبے کے لائق ہی نہ تھی، کمی کمین کو میں نے فرش سے عرش پر لا بٹھایا تھا۔ اب میں اسے دوبارہ فرش پر بٹھا دوں گا۔"

"میرا خیال ہے خان جی! ابھی اس کے لیے سزا کافی ہو گی۔" میں نے ہولے سے کہا تو خان جی نے اسی وقت نیلی کو تین بار طلاق دے ڈالی۔ اور اس کے نام جو کچھ بھی کر رکھا تھا وہ سارا واپس چھین لیا۔ نیلی اب... ایک بار پھر چودھرائن سے ایک غریب مزارع خوشی محمد کی بیٹی کے روپ میں آ گئی۔ خان جی نے یہ نیلی کوٹھی بھی اسی کے لیے بنوائی تھی۔ اسے بھی وہ اب فوراً فروخت کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ آخر میں انہوں نے میرا شکریہ بھی ادا کیا کہ میری وجہ سے یہ ساری گھناؤنی سازش بے نقاب ہوئی اور ان کی جان بھی بچ گئی۔

سارے معاملات تیزی سے نمٹانے کے متقاضی تھے۔ میں نے اسی وقت کھنا کو فون کر دیا کہ وہ آ کر نیلی کو ملک... "نیلو" کو اپنے ساتھ لے جائے۔ نیلی نے بھی میرے مشورے کو رد نہ کیا تھا۔ لیکن خان جی اب نیلی کو ایک لمحے کے لیے بھی وہاں برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور ان کے خطرناک چڑھے ہوئے تیوروں سے یہی لگتا تھا کہ وہ نیلی کو کہیں گولی ہی نہ مار دیں اس لیے انہوں نے خود ہی جاں ورکھنا کا کام آسان کر دیا کہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ایک گاڑی میں نیلی کو روانہ کر دیا۔

یہ گمبھیر معاملہ بالکل ویسے ہی نمٹا تھا جس کی مجھے پہلے سے توقع تھی۔ اول خیر میری ذہانت کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا تھا۔ ورنہ تو وہ بے چارہ گھبرایا ہوا تھا، بہرحال وہ خان جی کو نہیں جانتا تھا جبکہ مجھے خان جی سے مزاج آشنائی تھی۔ اس لیے یہ معاملہ خوش اسلوبی سے اور میری توقع کے عین مطابق طے پا چکا تھا۔ اس دوران اول خیر نے ہولے سے میرے کان میں کہا۔

"اوخیر کا کے! اب تک تو میں یہی سمجھتا تھا کہ تیرے صرف ہاتھ پیر چلتے ہیں، پر یار کا کے! تیرا تو دماغ بھی خوب چلتا ہے۔ نیلی والا معاملہ تو "جتھاں دی کھوتی اوتے آن کھلوتی" والا ثابت ہوا۔"

"ہاں، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" میں نے بھی مسکرا کر محاوراتی زبان کا سہارا لیا۔

اس دوران خان جی کے سیل فون پر کسی کی کال موصول ہوئی، ان سارے چکروں میں ہمیں ابھی آئندہ کا لائحہ عمل بنانے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا کہ ایک پولیس افسر کی کال خان جی کو آ چکی تھی۔ میرا دل انجانے اندیشوں سے دھڑکنے لگا۔

"ہاں جی... بات کر رہا ہوں انسپکٹر صاحب! کیا؟ اچھا۔ مجھے تو نہیں معلوم... اور نہ ہی تارڑ اور اس کے تین مقتول ساتھیوں سے ہمارا کوئی تعلق بھی ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں۔" کہتے ہوئے خان جی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میرے سینے سے بے اختیار طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔ خان جی نے بروقت اور بالکل ٹھیک فیصلہ کیا تھا اپنے آدمیوں سے لاتعلقی کا... پھر انہوں نے اسی وقت اپنے کسی اعلیٰ پولیس افسر سے بات کی اور یہ معاملہ رفع دفع کرنے کو کہا۔

"خان جی! کیا یہ سب کچھ اتنا آسان ہو گا؟" ان کے فارغ ہونے کے بعد میں نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر معنی خیز اسرار بھری مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی لہجے میں بولے۔ "پیسے کے آگے سب کچھ آسان ہو جاتا ہے۔ اب تم مجھ سے وعدہ کرو کہ ہم سے کسی قسم کا تعلق نہیں توڑو گے۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں خان جی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے کب آپ سے تعلق توڑا ہے اگر ایسا ہوتا تو آج میں آپ کے خلاف ہونے والی اتنی بڑی اور گھناؤنی سازش کو بے نقاب کرنے کے لیے اِدھر کیوں آتا؟"

"ہاں، یہ بھی تم نے ٹھیک کہا۔" پھر بولے۔ "کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ اب تم اِدھر رہو۔ کھانے کے بعد مزید تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔" کھانا اکٹھے کھایا گیا جو بڑا پُرتکلف تھا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور گفتگو کی ایک نشست جمی جس کا لب لباب وزیر جان ہی رہا۔ اب خان جی کی وزیر جان کے ساتھ اچھی طرح ٹھن چکی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اب میرے اور خان جی کے مفادات مشترکہ نوعیت اختیار کر چکے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ خان جی کو ابھی تک اپنے ازلی دشمن وزیر جان کی اصل حقیقت کا علم ہی نہ ہو سکا تھا۔ وہ ابھی تک اسے ایک کاروباری آدمی اور صنعت کار سمجھے ہوئے تھے، انہیں کیا پتا تھا کہ وزیر جان کتنی "اونچی چیز" بن چکا تھا۔ ایک بین الاقوامی سطح کا گینگسٹر... ایک "ڈون" تھا وہ۔

خان جی کو جب میں نے وزیر جان کی اصل حقیقت کے بارے میں بتایا تو ایک لمحے کو نہیں بلکہ کئی ثانیوں تک کے لیے وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئے۔

"یہ... یہ... سب تم بالکل یقین سے کہہ رہے ہو شہزی؟"

"جی ہاں... پورے سولہ آنے یقین سے۔" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم غلط نہیں کہہ سکتے شہزی! مجھے تمہاری بات تسلیم کرنا پڑے گی مگر یہ اور چودھری ممتاز خان آخر یہاں کس کے ایما پر اور کیا گل کھلانا چاہتے ہیں؟"

"اسی بات کا تو ہمیں کھوج لگانا ہے خان جی!" میں نے پُرجوش ہو کر کہا۔ "یہ ایک لمبی چین ہے جس کے سرے کسی دور دراز غیر ملک میں جا کر ملتے ہیں۔ یہود و ہنود کی گھٹی سازشیں ہیں امتِ مسلمہ اور بالخصوص پاکستان کے خلاف جس کا ماسٹر مائنڈ کوئی تو ہو گا جبکہ مجھے بھی یہ لولوش ایک کٹھ پتلی ہی لگتا ہے اس کی پشت پناہی کر رکھی ہے جو بظاہر انٹرنیشنل کروک کا خود کو ایک بڑا بزنس ٹائیکون کہتا ہے۔ مگر در پردہ وہ خود ایک انڈر ورلڈ کا بڑا ڈون ہے۔ اس کے اپنے بھی کچھ ذاتی مفادات ہیں۔ اب تک کی میری ایک ادارے سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق لولوش ایک برازیلین نژاد آدمی ہے اور ایک جزیرے میں اس کا بڑا عالیشان محل ہے... جہاں وہ رہتا ہے۔ امریکا کی ایک بڑی بزنس کمیونٹی "جیوش بزنس کمیونٹی" یعنی جے بی سی جو خالصتاً یہودیوں کی ہے، اس کے صدارتی بورڈ کا ممبر بھی ہے۔ را کی ذیلی شاخ "بلیو ٹکسی" کی بھی لولوش کو سپورٹ حاصل ہے اور اب وہ... "اسپیکٹرم" کی صورت میں ایک ادارے کو اپنے مخفی گھناؤنے مقاصد میں استعمال کر رہا ہے۔ جس کا بظاہر سلوگن یہی ہے کہ وہ گمشدہ نوادرات کو تلاش کر کے ان کے حقیقی مالک یعنی ممالک کو فراہم کرتا ہے۔ بات لمبی ہو جائے گی۔ خان جی! آپ چکرا کر رہ جائیں گے لیکن آپ کو حد سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وزیر جان یا بالفاظ دیگر "اسپیکٹرم" اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے آپ کے علاقے کی زمین استعمال کرنا چاہتے ہیں اور اپنے ایک مہرے... وزیر جان کو اسٹیشن چیف بنا کر آگے سرکایا ہوا ہے۔ اس بساط پر چودھری ممتاز بھی نوالہ ہے۔"

"میں واقعی یہ سب سن کر چکرا گیا ہوں... شہزی!" خان جی پریشان اور متحیر سے لہجے میں بولے۔ ایک انجانی سی جھلاہٹ... ان کے لب و لہجے پہ غالب تھی۔

"اسی لیے میں آپ کو بار بار... محتاط رہنے کی تلقین بھی کر رہا ہوں اور آپ نے یہ بھی اچھا قدم اٹھایا کہ سردست نیلی کو خود سے دور کر دیا مگر حضرت کے ساتھ کہوں گا خان جی! کہ خدارا آپ اپنے گھر پر بھی نظر رکھیں۔ دشمن مہرے کے طور پر اگر آپ کی بیوی نیلی کو استعمال کر سکتے ہیں تو وہ کسی اور کو بھی اپنا سکتے ہیں۔"

خان جی میری بات کا اشارہ سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر کی پُرغور خاموشی کے بعد بولے۔ "شہزی! اس کا مطلب ہے صورتِ حال بہت گمبھیر ہے۔"

"بالکل خان جی۔" میں نے یک دم کہا۔ "ہماری اور آپ کی سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر اور خطرناک..."

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی... اتنا کچھ ہو رہا ہے اور ہمارے خفیہ اداروں کو اس کی بھنک بھی نہیں پڑی اب تک...؟"

"بھنک پڑی ہے تو اتنا کچھ معلوم ہوا ہے ناں خان جی!" میں نے کہا اور انہیں ایک خفیہ عسکری ادارے کی ذیلی خفیہ سروس "پاور سیکرٹ سروس" کے بارے میں بتانے کے بجائے اشارتاً بتاتے ہوئے کہا۔

"یہود و ہنود بہت صبر، استقامت مگر نہایت مکاری، عیاری اور دغابازی کے ساتھ اپنے خفیہ مذموم مقاصد کو پوری منظم پلاننگ کے ساتھ آگے بڑھاتے ہیں۔" میں نے میجر ریاض باجوہ کی باتوں کی روشنی میں کہا۔

"یہ پہلے خود کو مقامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور بظاہر سماج سدھار اور خدمتِ انسانیت کے پرچار کا روپ ڈھالتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بعض ادارے ان پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اگر ایسا کرتے ہیں تو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

عوامی حلقوں میں انہیں بدنام کیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ انٹر سروسز نے بھی لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے ایسا ہی عمل اختیار کیا ہے۔ اگرچہ انہیں ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن وہ ناامید بھی نہیں ہیں۔ اصل مشکل اپنے بعض سربرآوردہ اور مقتدر شخصیات کی طرف سے ہے جو اپنے بعض ذاتی مفادات کی خاطر ان کے اشاروں پر چل رہے ہیں... ان میں وزیر جان اور ممتاز خان کے نام قابلِ ذکر ہیں اور بھی کئی کالے چہرے ہوں گے، جنہیں تلاشا ہوگا۔" میں اتنا بتا کر چپ ہوا تو خان جی میری گفتگو اور میری سیر حاصل معلومات سے متاثر ہو کر بولے۔

"شہزی! آج میں تمہیں پہلی بار ایک گمنام سپاہی کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ وطنِ عزیز کے ایسے گمنام سپاہی جو خاموشی سے ملک کی خدمت میں لگے ہوتے ہیں اور خاموشی سے مر جاتے ہیں۔ اللہ تمہاری عمر دراز کرے... اور تم اپنے اعلیٰ وارفع اور نیک مقاصد میں کامیاب ہوتے رہو، میں جیتا پراسی... لیکن شہزی! اس بات کی تم بھی گواہی دو گے، میں کبھی ملک کے خلاف ایسی قبیح حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں تو سیاست کو صرف سیاست تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ اسے اپنی ذاتی انا نہیں بنایا کبھی، مگر ایسا ہوا ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھانا پڑی اور مجھے شرمندگی بھی ہوئی، یہی سبب ہے کہ میں نے اب سیاست سے ہی کنارہ کشی اختیار کرلی ہے۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے، ان کی باتوں کے تناظر میں مجھے میجر ریاض باجوہ کی وہ بات یاد آنے لگی۔

"نوجوان! رازداری سے ملک کی خدمت کرو اور رازداری سے مر جاؤ۔ اب ہمارے ملک میں کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ ہم کس پر بھروسا کریں اور کس پر نہیں۔"

میں نے خان جی کو اس سلسلے میں محتاط تو کر ہی دیا تھا لہٰذا اب ان سے جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے ہمیں اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا اور بولے۔ "رات بہت ہوگئی ہے، صبح نکل جانا... آج رک جاؤ ادھر ہی۔"

"ضرور رکتا خان جی! مگر میرا جانا ضروری ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں کے معاملات سے بھی میں ہر پل باخبر رہنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ بولے۔

"تم ملتان میں کہاں اور کس کے پاس رہتے ہو؟"

"سیٹھ منظور وڑائچ کے ہاں۔"

"او ٹھیک ہے... لیکن تم نے آج مجھ سے جو باتیں کی ہیں ان پر پوری طرح متوجہ رہنا چاہتا ہوں لیکن یار شہزی! میں اب خود کو بہت اکیلا اکیلا بھی محسوس کرنے لگا ہوں۔ بہت بوڑھا ہوگیا ہوں میں۔ مجھے ڈر ہے کہیں میری اس کمزوری کا فائدہ میرا ازلی دشمن وزیر جان فائدہ نہ اٹھا لے۔ دنیا میں میرا اپنا ایسا کوئی نہیں جس پر میں بھروسا کرسکوں۔ لیکن تمہارے نیک عزائم، تمہارے سچے جذبات اور تمہاری جوانمردی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور تم ہی وہ واحد انسان ہو جس پر میں بھروسا کرسکتا ہوں... دراصل میں چاہتا تھا اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہمیشہ کے لیے میرے پاس کھلاں والی آجاؤ... میں جانتا ہوں تم ایک خوددار نوجوان ہو...... میں تمہیں اپنی زمینوں اور جاگیر سے متعلق بہت سی اہم ذمے داریاں سونپنا چاہتا ہوں۔ تمہیں رہنے کو اچھی رہائش گاہ کا بندوبست بھی ہو جائے گا، نوکر چاکر آرام... جو تم چاہو گے تمہیں حاصل ہوگا۔"

"میں اس اعتماد کے لیے آپ کا تہِ دل سے مشکور ہوں خان جی۔" میں نے ہولے سے کہا۔ "لیکن میری فطرت میں کسی کا آدمی یا غلام بن کے رہنا نہیں، میں آزاد پیدا ہوا ہوں، آزاد رہنا پسند کرتا ہوں، جسے شرفا کی زبان میں "آوارہ گرد" کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے کاندھوں پر کچھ ذمے داریاں ہیں، کچھ میری اپنی ذات سے متعلق فرائض جنہیں پورا کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے تمہیں غلامی کا کب کہا ہے نوجوان شہزی!" خان جی مسکرا کر بولے۔ "میں تو تمہارے باعزت روزگار کی بات کر رہا ہوں۔ آخر کب تک تم یہ بھاگ دوڑ والی زندگی میں غرق رہو گے، کب تک؟"

"جب تک میں اپنی منزل نہ پالوں خان جی! مگر مجھے یقین ہے کہ میری یہ بھاگ دوڑ رائگاں نہیں جائے گی۔" کہتے ہوئے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اول خیر بھی کھڑا ہو گیا۔ ہم نے خان جی سے جانے کی اجازت چاہی، انہوں نے چاروناچار ہمیں جانے کی اجازت دے ہی دی۔

نیلی کوٹھی سے روانگی سے قبل میری درخواست پر اس کے نوکروں نے کار کی اچھی طرح سے صفائی ستھرائی، بالفاظ دیگر "سروس" کر ڈالی تھی کیونکہ اس کی اندرونی سیٹ پر خون وغیرہ جما ہوا تھا۔

ملتان روڈ پر آنے سے قبل ہم نے اپنے میگا رو بھی اچھی طرح پونچھ کر کسی اندھی کھائی میں پھینک دیے تھے۔ ہماری انگلیوں کے نشان صاف ہو چکے تھے۔ اب ہم مطمئن ہو کر ملتان روڈ پر گامزن تھے۔

☆☆☆

رات بہت زیادہ بیت چکی تھی۔

وزیر جان پر ابھی ہاتھ ڈالنے کا موقع نہیں رہا تھا۔ نیلی والا معاملہ بہ خیر و خوبی نمٹا کر میں سمجھتا تھا ہم نے کارِ خیر ہی انجام دیا تھا...... اس مہم میں سعیدہ یعنی وزیر جان کی بیوی، تارڑ کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ میں سمجھتا تھا، وزیر جان کو اس پر شبہ نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا، اگرچہ اس میں میرا واقعی کوئی قصور نہ تھا۔

ہم رات گئے ملتان پہنچ گئے تھے۔ کوٹھی میں سیٹھ منظور وڑائچ... یعنی سردبابا ہمارے ہی منتظر تھے، اور خاصے پُرجوش نظر آرہے تھے، ہم نے انہیں زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ نہ ہی انہوں نے ہمیں زیادہ کریدنے کی کوشش کی، شکیلہ بھی وہاں تھی، سردبابا نے بتایا۔

"شہزی بیٹا! میں نے امریکا فون کیا تھا۔" ان کی بات پر میرا دل یکلخت عابدہ کے تصور سے دھڑکنے لگا۔

"عارفہ اور عابدہ بیٹی سے بات ہوئی ہے، وہ دونوں خیریت سے ہیں۔" ان کی بات پر میں نے سکون کا سانس لیا مگر نہ جانے کیوں عابدہ کے حوالے سے میرے دل و دماغ میں انجانے اندیشاک وسوسے کھٹکتے ہی رہتے تھے، میرے اندر عابدہ کی طرف سے ایک نامعلوم سی بےچینی سرائیت کرنے لگی تھی۔

"عارفہ بیٹی سے میں نے سیٹھ نوید احمد سانچے والا کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی تھی۔" وہ بتانے لگے۔

"اچھا۔" میں نے بے دلی سے کہا، مجھے عابدہ سے بات کرنے کی بےچینی ہورہی تھی۔ اس سے فون پر باتیں کرنے کا ادھر ہی زیادہ موقع ملتا تھا حالانکہ سردبابا نے مجھے ان کی خیریت کی اطلاع دی تھی مگر میں خود بھی فون پر عابدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ بابا آگے بتانے لگے۔ "عارفہ کو یہ سب علم تھا... مذکورہ کمپنی کے اصل کاغذات اسی کے پاس ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سیٹھ نوید سانچے والا سے خود آکر بات کرے گی اس سلسلے میں بلکہ وہ یہاں پاکستان آکر ایک لیگل ایڈوائزر کی بھی خدمات لے گی۔ وہ اڑیسہ کمپنی کی نصف ملکیت ملنے پر بےحد خوش ہے اور شہزی بیٹا! شاید مجھے اس سلسلے میں بہت جلد رنگون (برما) جانا پڑے۔" میں نے متفکر ہو کے کہا۔

"عارفہ اور عابدہ امریکا سے کب واپس آرہی ہیں پھر؟ اور آپ کی روانگی کا کیا بنا؟"

"میں نے اسلام آباد بات کی تھی۔ دو ایک روز میں میرا ویزا آجائے گا۔ یہ پندرہ دنوں کا خالصتاً وزٹ ویزا ہو گا۔ ویزا آتے ہی میں امریکا روانہ ہو جاؤں گا مگر سوچ رہا ہوں پہلے رنگون کا ایک چکر لگا لوں اور وہاں سے امریکا نکل جاؤں۔"

"میرا تو خیال ہے بابا! آپ پہلے اللہ کا نام لے کر امریکا ہی روانہ ہو جائیں پھر خیریت سے پاکستان لوٹنے کے بعد آپ اطمینان سے رنگون کا سفر کیجیے گا۔" میں نے مشورہ دیتے ہوئے کہا تو وہ میری جانب معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھ کر بولے۔

"میں تمہاری بےچینی سمجھ رہا ہوں، شہزی بیٹا! تم بالکل فکر نہ کرو۔ عارفہ اب بالکل صحت یاب ہو چکی ہے۔ وہ خود وہاں سے روانہ ہونے کے لیے بےقرار بیٹھی ہے۔ اس کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے، ابھی وہ انڈر میڈیکل آبزرویشن میں ہے۔ عابدہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔" وہ شاید عابدہ سے متعلق میری بےچینی سمجھ رہے تھے۔

"میں عابدہ سے بات کرسکتا ہوں؟" بالآخر میں نے کہا اور سردبابا نے فوراً اپنے بیش قیمت فون پر نمبر ملا کر میرے حوالے کر دیا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ عابدہ سے بات کی۔ وہ میری اور میں اس کی آواز سن کر ایک یک گونہ مسرت سے نہال ہو اٹھے تھے مگر بدقسمتی سے بات تفصیل سے نہ ہوسکی۔ بہرحال جتنی بھی بات ہوسکی، میری تسلی کے لیے کافی تھی کہ عابدہ خیریت سے تھی۔

ہم ٹی وی دیکھتے رہے۔ بیک وقت کئی اہم واقعات ہماری وجہ سے رونما ہو چکے تھے، اس میں ڈپٹی روشن کی موت، ہمارے ساتھی ارشد اور شکیلہ کے بھائی شوکت حسین عرف شوکی کی موت، اس کے بعد آرک کو ہم نے جہنم واصل کیا اور زیرو ہاؤس میں اسٹیکرم کے آرک سمیت دو بہترین ٹیکنیکل مجرمانہ دماغ رکھنے والے ڈاکٹر گلفت اور کمپیوٹر ایکسپرٹ اینڈ ڈیوائس ماسٹر حامد کو بھی نیست و نابود کر دیا اور اب تازہ ترین حادثاتی خونریز واقعے میں وزیر جان کی چہیتی بیوی (جسے میں اپنی سوتیلی ماں سمجھتا تھا) سعیدہ کا تارڑ کے ہاتھوں قتل اور تارڑ کا اپنا میرے ہاتھوں قتل، جس میں اس کے تین ساتھی بھی شامل تھے۔ اس کے بعد نیلی والا قضیہ بھی نمٹایا گیا۔

ٹی وی پر ان سب کی خبریں وقتاً فوقتاً آتی رہی تھیں اور پھر جس طرح بہت سی ایسی خبریں دیگر آنے والی تازہ خبروں کے ڈھیر میں گم ہو جاتی ہیں یہ خبریں بھی اس قبر میں دفن ہوگئی تھیں۔ میں نے یا اول خیر نے ایسا کوئی سراغ نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چھوڑا تھا کہ ہم کسی قسم کی قانونی پکڑ میں آتے۔

دیگر امور سے متعلق باتوں کے دوران سرمد بابا نے مجھے میجر ریاض کے بارے میں بھی بتایا کہ میری عدم موجودگی میں ان کا دو بار فون آچکا تھا۔ میں ٹی وی لاؤنج میں اول خیر، شکیلہ اور سرمد بابا کو چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرائنگ روم میں آگیا۔ جہاں ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میں نے باجوہ صاحب سے ڈائریکٹ ان کے ہاٹ لائن نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے انہوں نے ہی فون اٹھایا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ بُردبار... انداز میں بولے۔ ''شہزی! میں تم سے نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں تھے اور تمہارے چند روز غیاب کے کہاں بیتے؟ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وقت اور حالات نے تمہیں ایسی روش پر دانستہ نادانستہ طور پر ڈال دیا ہے کہ اس میں تمہیں اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ مگر اتنا مجھے بھی یقین ہے کہ تمہارے روز و شب یقیناً ایک نیک مقصد تلے بیت رہے ہوں گے، بہرحال مجھے تمہاری خیریت وغیرہ سے متعلق فکر رہتی ہے۔ اب بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا؟''

''میں اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک اور خیریت سے ہی ہوں، باجوہ صاحب۔'' میں نے فوراً کہا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' دوسری جانب سے ان کی پُرطمانیت آواز ابھری۔ ''میرے پاس آجاتے تو اچھا تھا لیکن نہیں شاید مجھے ہی تمہارے پاس آنا پڑے۔ کچھ اہم اور ضروری باتیں کرنا ہیں تم سے۔ تم جہاں سے بات کر رہے ہو وہاں تمہاری کیا پوزیشن ہے؟'' ان کے محتاط انداز و لہجے کی گفتگو سن کر میں نے کہا۔ ''جی جناب... جیسے آپ چاہیں، میں یہاں مستحکم پوزیشن میں ہوں۔ آپ اور میں یہاں پوری رازداری کے ساتھ گفتگو کرسکتے ہیں۔''

''گڈ۔'' وہ یک دم بولے۔ ''میں صرف اکیلا آرہا ہوں۔ اس بات کا خیال رہے کہ میں تم سے صرف ون ٹو ون ملاقات کا متمنی ہوں۔''

''جی... جی سر! آپ بے فکر رہیں۔ آپ جہاں تشریف لا رہے ہیں، وہ مکمل طور پر محفوظ اور مناسب جگہ ہے۔ ہم رازداری کے ساتھ یہاں گفتگو کرسکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد میجر ریاض باجوہ نے مطمئن ہو کر دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا۔

مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ باجوہ صاحب بہ نفس نفیس خود میرے پاس چل کر تشریف لا رہے تھے۔ یقیناً جو بھی معاملہ تھا وہ غیر اہم نہیں ہوسکتا تھا۔ بے شک میرے باجوہ صاحب سے دوستانہ تعلقات تھے بلکہ وہ تو مجھے اپنا محسن بھی سمجھتے تھے لیکن آج تک ایسا ہوا نہ تھا کہ وہ اس طرح مجھ سے ون ٹو ون ملاقات کے سلسلے میں ملنے آرہے ہوں۔ مجھے وہیں کھڑے کھڑے گہری اور گمبھیر تا سوچ سی لگ گئی۔

بہرحال میں نے سرمد بابا وغیرہ کو باجوہ صاحب کی آمد کے بارے میں بتادیا۔ رات کافی گزر چکی تھی، اس لیے میں نے سب کو سونے کا کہہ دیا تھا۔ سرمد بابا تو اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے جبکہ شکیلہ اور اول خیر میرے ساتھ اپنے کمرے میں آگئے، یہاں سرمد بابا کی کوٹھی میں میرا اور اول خیر کا کمرا ایک ہی تھا جبکہ شکیلہ کا الگ کمرا تھا مگر اس وقت ہم شکیلہ کے ہی کمرے میں موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد باجوہ صاحب آگئے۔ چوکیدار کے ساتھ باہر جاکر میں نے ان سے ملاقات کی، میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ ایک تو عام سول ڈریس میں تھے جبکہ گاڑی بھی ان کی ذاتی تھی، یعنی سرکاری گاڑی نہیں تھی، وہ تھے بھی اکیلے۔

میں انہیں اندر لے آیا۔ ایک الگ تھلگ سی نشست گاہ کا پہلے ہی سے انتخاب کرچکا تھا۔

میں نے چائے وغیرہ کا پوچھا باجوہ صاحب سے لیکن انہوں نے منع کردیا۔ نیز وہ خاصے عجلت میں نظر آرہے تھے اور ان کے چہرے پر گہری تشویش کے تاثرات تھے۔ جانے کیوں میرے دل و دماغ کو بار بار دھچکا سا لگ رہا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے صوفوں پر براجمان ہوگئے۔ وہ جیسے چھوٹتے ہی مجھ سے مخاطب ہوکے بولے۔

''شہزی! کیا ہم یہاں مکمل رازداری کے ساتھ گفتگو کرسکتے ہیں؟''

''شیور، سر!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''یہاں ہماری گفتگو کوئی نہیں سنے گا۔ بے شک دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں مگر باوصف اس کے ہماری گفتگو کی کوئی بھی بات لیک آؤٹ ہوئی بھی تو یوں سمجھیے یہاں ایک شہزی نہیں کئی شہزی ہیں جو ملک و قوم کی خاطر ایسی کوئی حرکت کرنے کا تصور بھی نہیں کریں گے جو ہمارے وسیع تر مفادات کے خلاف ہو۔''

میری بات پر وہ مطمئن ہونے کے بعد تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع ہوئے۔

''شہزی بیٹا! ہمیں دشمنوں کی مار کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا اپنوں کی کج روی ہمیں، ہمارے مشن کو اور ہمارے کاز کو متاثر کرتی ہے۔ ہمارا ایک اصول ہے، اور اس پر سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ یعنی رازداری سے ملک و قوم کی خدمت کرو اور رازداری سے مرجاؤ، ہماری کوشش تھی کہ ہم.... موجودہ ملکی حالات اور کچھ ابن الوقت قسم کے سیاست دانوں کی وطن دشمن خفیہ سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں ان کی بیخ کنی کے لیے ہمیں ملکی وسیع تر مفادات کے لیے پی ایس ایس کا خفیہ قیام عمل میں لانا پڑا تھا تاہم پی ایس ایس یعنی پاور سیکرٹ سروس کے قیام کا مقصد صرف اتنا بھی نہیں تھا اس کے قیام کی اصل وجہ وطن عزیز میں خفیہ طور پر سرگرم ''تیسری قوت'' پر بھی نگاہ رکھنا تھا۔ جو یہاں موجود چند کالی بھیڑوں کے ساتھ ان کے ذاتی مفادات کا ان کے ضمیر سمیت سودا کرکے انہیں اپنا آلۂ کار بنالیتی ہیں۔ میں تمہیں پہلے اشارۃً اور بعد میں واضح لفظوں میں بتا چکا ہوں کہ...''

میجر ریاض باجوہ لحہ بھر کو رک کے پھر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔

''بلیو ٹکسی کو انہی لوگوں نے جدید خطوط پر استوار کیا ہے... وطن عزیز پاکستان میں یہ خاطر خواہ طریقے سے اپنے اہداف کے وہ نتائج ہنوز حاصل نہ کرسکے ہیں جو ان کی ازلی مذموم سازشوں کا شروع ہی سے جزو لاینفک رہی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ موساد اور را کی توپوں کا رخ کسی نہ کسی طریقے یا حوالے سے ہماری طرف ہی رہا ہے۔

''اس بار بلیو ٹکسی نے پہلے سے زیادہ مضبوط گٹھ جوڑ اور منظم طریقے سے اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا آغاز کیا اور خود کو سات پردوں میں رکھتے ہوئے کٹھ پتلیوں کو میدان میں اتارا ہے اور خود ان کی ڈوریاں سنبھال لی ہیں۔ ''اسپیکٹرم'' اس کی واضح مثال ہے۔ اور اس کا سربراہ... لولووش ان کی وہ کٹھ پتلی ہے جسے خصوصی طور پر یہ مشن سونپا ہوا ہے کہ وہ مقامی سطح پر اپنے جیسی مزید کٹھ پتلیوں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرے، جو یہاں اس کا ایک خاص کارندہ... مسٹر آرک لوچن کر رہا ہے۔''

باجوہ صاحب کے منہ سے آرک کا نام سن کر میں چونکا۔ شاید ابھی انہیں اس بات کا علم نہ تھا کہ میں اسے پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں مگر ابھی میں بغور ان کی پوری بات سن لینا چاہتا تھا۔ وہ آگے بتا رہے تھے۔ ''وزیر جان اور چودھری ممتاز ان کی واضح مثال ہیں۔ ایسے ہی اور لوگ بھی جو ابھی ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ ان سب کو ان کے ذاتی مفادات کی تکمیل کا لالچ دے کر ان کے ضمیروں کا سودا کرچکے ہیں۔ مذکورہ شخصیات کسی نہ کسی حوالے سے بعض عوامی حلقوں میں اپنی مقبولیت بہرحال

اوہ گاڈ! میرے یہ ایکسرے کتنے حسین ہیں۔ ڈاکٹر! اس کے دس پرنٹ بنوادو۔ میں اپنی سہیلیوں کو بھجواؤں گی

رکھتے تھے اور رکھے ہوئے بھی ہیں۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں بھی لوہے کو لوہے سے اور زہر کو زہر سے کاٹنے کے لیے پاور سیکرٹ سروس کو خفیہ طور پر میدان میں لانا پڑا۔ اس کی بنیاد تو ان پروفیشنل رضاکاروں کو ساتھ ملانے پر رکھی جن کی کمانڈ بہرحال پروفیشنل افراد کے ہاتھ میں رکھی گئی۔ بہت سے ملے بھی، ان میں سرفہرست تم بھی تھے، اس کی بڑی وجہ تمہاری چودھری ممتاز اور بعد وزیر جان کے ساتھ پرانی نسل تھی اور تم بھی نادانستہ سہی... ایک طرح سے پی ایس ایس کے کاز میں شامل کرلیے گئے۔ مگر ہماری اس سروس کو چند عاقبت نااندیش غیر فعال کرنے کی مذموم کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

''نوجوان شہزی! تم نے بعض نامساعد حالات کی بھٹی میں خود کو بغیر استاد کی شاگردی میں رکھتے ہوئے جو کچھ سیکھا ہے، اب تک تم اسے ہی بروئے کار لائے ہوئے ہو، یہ تمہاری غیر معمولی یا ودیعت کی ہوئی ذہنی فراست اور خود اعتمادی سے پُر صلاحیتیں ہی ہیں جن کے بل بوتے پر تم اب تک بڑی کامیابی سے چومکھی لڑ رہے ہو، لیکن نوجوان! ہو سکتا ہے تمہیں اس بات کا احساس نہ ہوا ہو کہ تمہاری یہ جنگ اب تمہارے ذاتی مفادات سے ہٹ کر ملک و قوم کے وسیع تر مفادات تک پہنچ ہوتی نظر آرہی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پیچھے ہٹنے والے تم بھی نہیں ہو مگر شہزی! بے شک تم نے اب تک حالات سے جو سیکھا، اسے ہی بروئے کار لاتے رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور کچھ اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باعث... پر اب تمہیں خود کو تیار کرنا ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں کو جدید تقاضوں میں ڈھالنا ہوگا۔ اس لیے کہ ہم اپنی تیسری آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ عنقریب بین الاقوامی سطح کے پروفیشنل مجرموں کے ساتھ تمہارا ٹاکرا ہونے والا ہے۔ میں تمہارا عندیہ لینے آیا ہوں۔ اس کے بعد تمہاری پروفیشنل تربیت کا باقاعدہ آغاز کیا جاسکے۔'' وہ شاید میرے بار بار ٹریننگ سے کترانے پر آج دن ٹو دن ملاقات پر مجبور ہوئے تھے۔

میجر ریاض باجوہ اس قدر تفصیل بتانے کے بعد خاموش ہوگئے۔ نشست گاہ کا ماحول دھڑکتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ میں نے پورے دھیان اور غور سے ان کی گفتگو سنی تھی۔ بڑی توجہ سے ان کی بات کا ایک ایک لفظ سنا اور سمجھا تھا اور اس ضرورت کو میں خود بھی محسوس کرتا آرہا تھا کہ میرے دشمنوں کا جال اور گھیراؤ وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ ذاتی مقاصد کے علاوہ اور نیک مقاصد بھی میرے آگے پیچھے جارہے ہیں۔ اب تک میں اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے باعث ان کا مقابلہ بھی کرتا آیا تھا۔ اس میں اول خیر کا بھی کردار شامل تھا جس نے میری ہمت، کوشش اور تربیت بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے خود بھی اب وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق ڈھلنا ہوگا جس کی طرف باجوہ صاحب اشارہ کررہے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سر! میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ اس ضمن میں، میں بھی آپ کو کچھ بتانا چاہوں گا لیکن مجھے بہرحال یہ سن کر دھچکا پہنچا ہے کہ پی ایس ایس کو اپنے ہی بعض عاقبت نااندیش اور کالی بھیڑوں کی وجہ سے غیر فعال کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن خوشی بھی ہے کہ بہرحال اس کے مقاصد کو کوئی دھچکا نہیں پہنچا مگر مصلحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی قسم کا انتشار نہ پھیلے۔''

''تم کچھ بتانا چاہ رہے تھے مجھے نوجوان؟'' باجوہ صاحب نے ہولے سے کھنکھار کر مجھے یاد دلایا تو میں نے اسٹیشن فور سے لے کر اسپیکٹرم کے ہیڈکوارٹر زیرو ہاؤس سے لے کر آرک کی ہلاکت تک سب انہیں آگاہ کردیا جسے سن کے ان کے چہرے پر جوش و مسرت کے ملے جلے تاثرات عیاں ہوئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔

''شہزی! یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے مگر اب تمہیں حد سے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اب بین الاقوامی مجرموں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف ہو جائے گا۔''

''میں پوری طرح سے محتاط رہنے کی کوشش کروں گا سر۔'' میں نے پختہ لہجے میں کہا تو وہ آخر میں بولے۔

''میرا خیال ہے تمہاری ٹریننگ ناگزیر ہو چکی ہے تمہیں رضاکار سپاہی کی حیثیت سے اپنے خفیہ تربیتی کیمپ میں ٹریننگ لینا ہوگی شہزی۔''

''کتنے دنوں تک ہوگی یہ ٹریننگ؟'' میں نے بالآخر پوچھ لیا تو وہ ایک گہری سانس خارج کرکے بولے۔

''اس کے لیے کم از کم سال سے چھ ماہ درکار تھے لیکن شاید تم اتنا عرصہ اس کے متحمل نہیں ہوسکو گے لیکن اگر تم اپنی پوری اور بھرپور توجہ سے صرف ایک مہینہ بھی ٹریننگ کیمپ کو وقت دے دو، تو تمہیں بنیادی اکائیوں میں مہارت دی جاسکتی ہے۔ چونکہ ایسے تجربات سے تو تم یوں بھی گزر رہے ہو۔ یہ تجربات تمہاری مختصر عرصے کی تربیت کو جلا بخش دیں گے اور تم جلد ہی مہارت بھی حاصل کرلو گے۔''

میں ان کی بات پر کچھ سوچتا ہوا سا بن گیا۔ میرے آگے وزیر جان سے کچھ اگلوانے کا مشن درکار تھا۔ جسے مجھے سردست موخر کرنا پڑ رہا تھا لہٰذا بولا۔ ''مجھے منظور ہے۔ کیا کل سے مناسب رہے گا؟''

''آف کورس۔'' وہ خوش ہوکر بولے۔ ''مگر اب یہ ٹریننگ خود میں تمہیں دوں گا۔ اپنے وسائل سے اور اپنی ذاتی دلچسپی سے۔ وقتاً فوقتاً پی ایس ایس کے ہیڈکوارٹر میں بھی ٹریننگ ہوگی۔ کل صبح تم میرے پاس آجاؤ۔''

''لگاتار تو حالات اس بات کی اجازت نہ دیں مگر میں کوشش کروں گا۔ مجھے کچھ ویسے بھی فوری طور پر مشن درپیش ہیں، ان میں اسپیکٹرم کے اسٹیشن چیف وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ازبس ضروری ہے۔''

''وہ سب ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ تم ایسا کرو کل میری رہائش گاہ پر آجاؤ۔'' اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے وہ بولے۔ اب ان کا مقصد رخصت ہونا تھا۔ ''اب وہ بات تو نہیں ہوگی مگر جو اس سے پہلے ہمارے خاص ٹریننگ سینٹر میں ہوتی، مگر میں اپنی ذاتی دلچسپی اور توجہ تو تمہیں دے سکتا ہوں۔'' کہتے ہوئے انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے اپنی شرٹ کی جیب سے نکال کر تھمادیا۔

''سوری سر! میں آپ کو کچھ کھانے پینے کا ہی نہیں کہہ سکا۔'' وہ مسکرا کر میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

''اس کی ضرورت نہیں۔ تم سے کام کی باتیں ہوگئیں یہی بہت ہے۔ چلتا ہوں اور ہاں کل میں تمہارا انتظار کروں

گا اور میں تمہیں اپنے ایک انسٹرکٹر سے بھی ملواؤں گا۔ تمہیں اس کے سپرد کرنا ہے، بائی۔''

وہ چلے گئے۔ میں نے کمرے میں آکر اول خیر اور شکیلہ کو میجر باجوہ صاحب سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ کچھ حیران بھی ہوئے مگر اول خیر کی حیرانی وقتی ثابت ہوئی کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس کے بشرے پر تفکر آمیز پریشانی کے تاثرات آگئے، بولا۔ ''کاکے! باجوہ صاحب تجھے کس راہ کا راہی بنا رہے ہیں؟ یہ کیا گھن چکر ہے؟''

میں اس کی بات پر ہنس پڑا۔ ''یہ تو پرانا معاملہ ہے۔ تجھے پتا ہی ہے مگر اب ذرا گمبھیر ہوگیا ہے لیکن باجوہ صاحب تو میری راہنمائی کرنا چاہ رہے ہیں کیونکہ انہیں اندازہ ہورہا ہے کہ میرے دشمنوں کی نوعیت اور تعداد بدلتی اور پھیلتی جارہی ہے۔ وہ سب تربیت یافتہ ہیں۔ میں ان سے مار بھی کھاسکتا ہوں۔''

''نہ نہ کاکے... نہ نہ... تجھے اپنی دشمنی صرف چودھری ممتاز تک ہی محدود رکھنی چاہیے بلکہ اس معاملے کو بھی تک مکا کر دے۔ وزیر جان سے ایک دوستانہ معاہدہ کرتے ہیں اور چاچا چاچی کے بارے میں پوچھ تاچھ کرنے کے بعد خیر سے عابدہ بھابی امریکا سے لوٹ آئے، اور بس۔''

اول خیر کی بات سن کر میرے چہرے پر ایکا ایکی سنجیدگی طاری ہوگئی۔ چاہتا تو میں بھی سب کچھ یہی تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے میری تقدیر مجھے خود ہی حالات کے ایسے دھارے پر ڈال دیتی ہے کہ پھر میری فطرت میرا مزاج اس بات سے یارا نہیں کھاتا کہ میں ان سے چشم پوشی کروں۔ میجر باجوہ کی باتیں ہنوز میرے دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔ میں نے کہا۔ ''اول خیر! یہ تو اب مقدر پر جانے کہ آئندہ میری اور عابدہ کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟ مگر میں سمجھتا ہوں کہ حالات، رفتہ رفتہ مجھے کسی ایسے بامقصد دھارے پر خود ہی ڈال رہے ہیں کہ میں ان سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ خیر، باجوہ صاحب کی بات بھی صحیح ہے۔ مجھے کل صبح ان کے ہاں جانا چاہیے۔ پھر دیکھتے ہیں آگے۔'' اول خیر میری بات پر ہولے سے مسکرا کر بولا۔

''اوخیر... کاکے، کیا میرے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود تجھے کسی ٹریننگ کی ضرورت ہے؟ تو تو بنا بنایا فائٹر ہے۔ میں نے جواباً سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں اول خیر، تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ بلاشبہ تم سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے اور ابھی تک سیکھ ہی رہا ہوں لیکن یار! باجوہ صاحب کا مشورہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ مجھے کچھ خاص اور سائنٹیفک قسم کی تربیت کی ضرورت ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ اسپیکٹرم کے جب بھی کسی خاص آدمی سے میرا پالا پڑا، مجھے اس نے بہ آسانی زیر کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب یہ میری تقدیر تھی کہ مجھے کچھ ایسے سہل مواقع بھی محض اتفاقاً ہی حاصل ہوئے تھے کہ میں نے اپنے دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیے، مگر اول خیر! اب ہر بار تو ایسا نہیں ہوسکتا نا؟ تقدیر ہر بار تو مہربان نہیں ہوسکتی نا مجھ پر... اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل باجوہ صاحب کے ہاں ضرور جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے کاکے! جیسی تیری مرضی، میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو تیرے ساتھ ہی ہوں۔''

''یہی میرے لیے بڑی بات ہے میرے یار کہ تو میرے ساتھ ہے۔''

شکیلہ قریب بیٹھی ہم دونوں کی باتیں بہت غور اور دھیان سے سن رہی تھی۔ پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے کہ میجر صاحب کی بات ٹھیک ہی ہے۔ شہزی! تم واقعی ممتاز خان وغیرہ کی دشمنی میں بہت آگے نکل چکے ہو اور یہ اتفاق ہے یا پھر خدا کی مرضی کہ تم اپنے ذاتی مقاصد کے علاوہ ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کے لیے بھی چن لیے گئے ہو تو تمہیں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ پتا نہیں آگے اور کیا تمہاری زندگی میں لکھا ہے؟ اور کتنے ہنگامے مقصود ہیں تمہاری قسمت میں... تمہیں میجر صاحب کا ہمنوا بن کر ان کی مدد کرنی چاہیے لیکن میرا نہیں خیال کہ یہ جنگ طول پکڑے۔ کیونکہ تم نے بہرحال آرک کو ختم کر دیا... اسپیکٹرم کو کافی دھچکا پہنچایا ہے۔''

شکیلہ نے اب تک مجھ پر بیتے ہوئے حالات سے زبانی کلامی اور کچھ تجرباتی طور پر آگاہی حاصل کرنے کے بعد بالکل صحیح بات کہی تھی۔

اگلے دن علی الصبح میں میجر باجوہ صاحب کی رہائش گاہ پر جا پہنچا۔ وہ میرا ہی انتظار کررہے تھے۔ میں نے وہاں ان کے ساتھ صرف ایک کپ چائے پی تھی، اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک خاص گھریلو ملازم سے ملوایا اس کا نام قدیر تھا۔ وہ اچھا خاصا لمبا چوڑا اور گورے رنگ و روپ کا حامل شخص تھا اور سرحدی علاقے کا نظر آتا تھا۔ یہی وہ انسٹرکٹر تھا جس کا ذکر کل رات کو باجوہ صاحب نے کیا تھا۔ ان کی رہائش گاہ پر ہم زیادہ دیر نہیں رکے اور تینوں ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جیپ میں روانہ ہوگئے۔

باجوہ صاحب راستے میں مجھے بریف کرتے رہے کہ انہوں نے رینجرز کے ایک خاص ٹریننگ سینٹر میں بھی میری وقتاً فوقتاً حاضری کا بندوبست کیا ہے اور مجھے کچھ سائنٹیفک قسم کی چیزیں، حربے اور معلومات وہیں سے ہی زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوسکتی ہیں۔

سینٹر میں کچھ اہلکار آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سفید اور نیلے رنگ کی عمارت تھی، جس کے آگے وسیع و عریض احاطہ تھا اور بیک یارڈ میں خاصا بڑا میدان تھا۔ کچھ مٹی کے تودے نما چبوترے، مورچے، خندقیں نظر آرہی تھیں۔ جسمانی ورزشوں اور مخصوص سیلف ڈیفنس میں استعمال ہونے والے سامان اور چوبی چوکھٹے نصب تھے۔

ہم ایک ہال میں آگئے۔ وہاں ایک دراز قامت افسر نائپ آدمی سے باجوہ صاحب نے مجھے ملوایا۔ وہ بڑے پُرتپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ ان کا نام کیپٹن افتخار خان جنجوعہ تھا۔ ہم نے وہاں کھلے دوستانہ ماحول میں چند رسمی باتیں کیں۔ اس کے بعد اصل موضوع پر آئے، جس کا لب لباب، اسپیکٹرم ہی تھا۔ کیپٹن افتخار جنجوعہ بھی اسپیکٹرم کے سلسلے میں خاصے "اپ ڈیٹ" دکھائی دیتے تھے، آرک کی میرے ہاتھوں ہلاکت پر انہوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ نیز انہوں نے آرک لوچن سے متعلق یہ بھی ایک اہم انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ درحقیقت اسپیکٹرم کا زونل چیف، ایک ہینڈلر ایجنٹ کی بھی حیثیت رکھتا تھا۔ "آرک لوچن کے مرنے کی وجہ سے یہاں پاکستان میں اسپیکٹرم کے مذموم خفیہ مقاصد کو زبردست دھچکا پہنچا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا ہمیں کہ اب اسپیکٹرم کا اصل سربراہ… یعنی ماسٹر اتھارٹیز بگ باس لولوش شاید اب خود میدان میں اترے گا۔" کیپٹن جنجوعہ کی بات پر مجھے اپنے اندر ایک سنسنی خیز قسم کے جوش کا احساس ہونے لگا۔

"لولوش… ہمارا اہم ٹارگٹ ہے۔" کیپٹن جنجوعہ آگے بولے۔ "مگر وہ بہت مکار اور عیار آدمی ہے۔ بہت اثر و رسوخ کا مالک آدمی… انٹرپول کو بھی کسی زمانے میں وہ مطلوب تھا مگر اب نہیں رہا۔ اس کی پشت پر کئی سپر پاورز کی مقتدر سیاسی و غیر سیاسی شخصیات کا ہاتھ ہے۔ سب سے بڑا ہاتھ تو جیوش بزنس کمیونٹی (جے بی سی) کا ہے۔ اور پھر موساد کا۔"

"نوجوان اب تم ہی ہماری امیدوں کا مرکز ہو۔" میجر باجوہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "ہم جس پی ایس ایس پر پوری توجہ دے کر اسے خفیہ طور پر فعال کر رہے تھے اب بھی ہم تمہارے ساتھ کریں گے، تم مکمل طور پر ایک "پاور ایجنٹ" کہلاؤ گے، ایک گمنام سرفروش، گمنام سپاہی کی حیثیت سے بظاہر ہمارے مشن کو آگے بڑھاؤ گے، اور تمہیں تھری اسٹارز پاور حاصل ہوں گے۔ میں نے تمہیں ایک کارڈ دے رکھا ہے۔ اس کی "چپ" میں سارا تمہارا بائیوڈیٹا درج ہے۔ تمہیں ملکی اور قومی مفادات میں دوقتل کرنے کے بھی اختیارات حاصل ہیں۔ کوئی تم سے پوچھ تاچھ نہیں کرسکتا۔ سویلین قانونی ادارے، بھی تم سے کسی قسم کی پوچھ گچھ کا اختیار نہیں رکھ سکتے لیکن بات وہی ہے کہ تمہیں یہ سب خفیہ رکھنا ہوگا جبکہ در پردہ ہماری مدد تمہارے ساتھ شامل رہے گی۔"

"میرا خیال ہے اب پروجیکشن روم میں چلنا چاہیے۔" کیپٹن جنجوعہ نے ہماری طرف دیکھا۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ چند منٹوں بعد ہم ایک ہال کمرے میں تھے۔ یہاں سادہ فرنیچر تھا۔ ہم صوفوں پر براجمان ہوگئے۔ سامنے بڑی سی اسکرین تھی۔ کیپٹن جنجوعہ نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے ہال کمرے کی لائٹ گل کردی۔ اس کے بعد اسکرین روشن ہوگئی۔ اب ان کے ہاتھ میں ریڈ ڈاٹ لائٹ تھی جس سے وہ اسکرین پر موجود ایک نقشے پر نشاندہی کرتے ہوئے متعلقہ معلومات سے اپ ڈیٹ کرتے رہے۔ لولوش کی بھی تصویر دکھائی گئی۔ اسپیکٹرم کے نیویارک والے ہیڈ آفس کے علاوہ برما میں اس کے ذیلی آفس کا بھی محل وقوع دکھایا جانے لگا۔ بلیو کسی کے مخصوص مونوگرام اور ان سے متعلق معلومات بھی جنجوعہ صاحب مجھے دیتے رہے۔

نصف گھنٹے بعد لائٹ آن کردی گئی اور چائے کا دور چلا۔ گفتگو کے دوران، میری مخصوص ٹریننگ کے سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میجر باجوہ صاحب مجھے اور قدیر کو وہاں چھوڑ کر چلے گئے۔

☆☆☆

تھوڑا وقت مزید بیت گیا۔ اس عرصے میں، سرمد بابا کا ویزا آچکا تھا مگر انہوں نے میری مرضی کے خلاف اپنے بزنس ٹرپ پلان کو ہی زیادہ اہمیت دی تھی۔ یعنی پہلے وہ برما کا قصد کرنا چاہتے تھے، اس کے کاغذات کے لیے بھی انہوں نے اپلائی کر رکھا تھا پھر سارے سفری کاغذات مکمل ہوتے ہی وہ برما روانہ ہوگئے۔ ینگون اڈیسہ کمپنی آفس میں ان کی کیا باتیں اور کیا میٹنگز ہوئیں، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ برما سے امریکا پہنچ جائیں اور عارفہ اور عابدہ کو خیریت کے ساتھ واپس پاکستان لے آئیں۔

شکر تھا کہ سرمد بابا تیسرے روز امریکا روانہ ہوگئے اور اب میں عابدہ کی واپسی کا بے چینی سے منتظر تھا۔

ادھر ٹریننگ سینٹر میں مجھے دس، پندرہ روز بیت چکے تھے۔ وہاں کیپٹن جنجوعہ اور قدیر میری کمانڈو سطح کی تربیت میں بڑی تندہی کے ساتھ مصروف تھے۔ میری تربیت کا پہلا مرحلہ عمومی طور پر سیلف ڈیفنس تک محدود تھا۔ دوسرے مرحلے میں مجھے "ایکشن اینڈ اسالٹ" کی تربیت دی گئی جبکہ تیسرا مرحلہ ابھی جاری تھا، اس میں شوٹنگ پاور اور مختلف ایمونیشن وغیرہ سے آگاہی کے علاوہ بنیادی سطح کی کمانڈو ٹریننگ شامل تھی، تربیت کے اس آخری مرحلے میں میرا جوش زیادہ نمایاں رہا تھا۔

اس دوران میں نے وزیر جان کو ٹریپ کرنے کی کوشش بھی کی تھی جبکہ آرک لوچن وغیرہ کی موت کے بعد اسپیکٹرم مکمل طور پر انڈر گراؤنڈ ہوچکی تھی۔ اسٹیشن فور والی عمارت میں مستقل تالا پڑ چکا تھا جبکہ ان کے ہیں کوارٹر، زیرو ہاؤس میں مقامی مزدور لگا کر دنیا دکھاوے کے لیے وہاں سالونٹ پلانٹ کا کام باقاعدہ شروع کیا جاچکا تھا اور یہ کام چودھری ممتاز کے سپرد کر رکھا تھا۔

اسپیکٹرم والوں کی چالاکی اور مستعدی پر میں خود بھی دانت پیس کر رہ گیا۔ اصل چہرے گویا سات پردوں میں چھپ چکے تھے۔ مقامی مزدور ٹائپ لوگوں کو سامنے کردیا گیا تھا۔ یقیناً ان میں اسپیکٹرم کے آدمی بھی شامل ہوں گے۔

زبیر خان المعروف خان جی سے بھی میرا ٹیلی فونک رابطہ ہوتا رہا تھا۔

میری ٹریننگ آخری مراحل میں تھی جب مجھے سرمد بابا کی امریکا سے کال موصول ہوئی جو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ وصول کی۔

"شہزی بیٹا! یہاں ایک مسئلہ ہوگیا ہے۔" انہوں نے کہا تو میرے چشم تصور میں عابدہ کا چہرہ رقصاں ہوگیا۔ مجھے تشویش ہوئی، میں نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا ہے بابا؟ عابدہ اور عارفہ تو ٹھیک ہیں نا؟ آپ لوگ کب تک لوٹ رہے ہو؟"

"عابدہ تو ٹھیک ہے شہزی بیٹا۔" سرمد بابا نے بتایا تو میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ "لیکن… عارفہ بیٹی کے ساتھ عین آخری لمحات میں پیچیدگی ہوگئی ہے۔"

"کیسی پیچیدگی؟" میں پھر پریشان سا ہوگیا، وہ بولے۔

"عارفہ یوں تو بالکل ٹھیک تھی جگر کی پیوندکاری کا آپریشن بھی کامیاب ہوگیا تھا اور وہ ابھی انڈر آبزرویشن تھی کہ عین آخری دنوں میں جب اسے اسپتال سے ڈسچارج کیا جانے والا تھا تو اسے اچانک High grade Fever نے آن لیا۔ اس کے علاوہ آپریشن والی جگہ پر بھی پیچیدگی پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ اسے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ اب اس کی طبیعت اللہ کا شکر ہے کہ کافی بہتر ہوگئی ہے مگر اسے اب مزید کچھ دن انڈر آبزرویشن رکھا گیا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے ویزے کی مدت ختم ہونے والی ہے اگرچہ میں نے ایکسٹینشن کی درخواست بھی دی ہوئی ہے مگر تا حال کوئی جواب نہیں آیا۔"

میں سرمد بابا کی یہ بات سن کر پریشان ہوگیا۔ فوری طور پر تو میری سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ میں کیا کہوں؟ تاہم کچھ سوچ کر بولا۔ "اللہ عارفہ بہن کو مکمل شفا عطا فرمائے بابا، ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ ویزے کی مدت میں اضافے کا آپ کے پاس ٹھوس جواز ہے۔ آپ کوشش کریں کہ عارفہ بہن کی مکمل صحت یابی تک وہیں ان کے پاس رکے رہیں۔ اور دونوں کو اپنے ساتھ ہی لے کر پاکستان خیریت کے ساتھ لوٹ آئیں۔" میری بات پر دوسری جانب سے سرمد بابا کی گہری ہنکاری بھرنے کی آواز ابھری، پھر بولے۔

"شہزی بیٹا! خود میں بھی یہی چاہتا تھا مگر اب ایسا ہوتا نظر نہیں آرہا۔ بہرحال دو تین روز میں صورت حال واضح ہوجائے گی۔ تم دعا کرنا، پھر تفصیل سے بات ہوگی۔"

اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں ہونٹ بھینچ کر سوچوں میں گم ہوگیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب ہوگا کیا؟ سرمد بابا کی باتوں سے یہی لگ رہا تھا کہ وہ خود بھی جلد پاکستان لوٹنے کی فکر میں تھے۔ اب پتا نہیں اس میں ان کے ویزے کی مدت کے خاتمے کی وجہ تھی یا پھر یہاں ان کی کوئی کاروباری مجبوری…

☆☆☆

میجر باجوہ صاحب کی خصوصی دلچسپی اور ذاتی کوششوں سے میں اب تک جس قدر ٹریننگ حاصل کرسکتا تھا، وہ کر رہا تھا۔ کچھ حالات نے مجھے سکھایا تھا۔ اول خیر جیسے جی دار جنگجو آدمی کی سنگت بھی مجھے میسر تھی اور اب ٹیکنیکل

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

طرز کی ٹریننگ نے مجھے دو آتشہ بنا دیا تھا لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ میرے نزدیک یہ سب ثانوی باتیں تھیں۔ پیش نظر میرے اصل بات تھی جذبے اور جنون کی... میرے نزدیک یہی دو ہتھیار محبوب تھے، اور اب تک میں انہی کو ہی بروئے کار لاتا رہا تھا۔

مجھے وزیر جان کو ٹریپ کرنا تھا۔ یہ میری زندگی کا گویا ایک اہم مشن تھا۔ وزیر جان نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے میرے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی تھی جس نے میرے اندر دھواں بھر رکھا تھا اور دھوئیں سے بھی یکلخت چنگاری بھڑک اٹھتی تھی تو کبھی شعلہ فشانی ہونے لگتی۔

یہ اسی روز کی شام کا ذکر تھا۔ ہم تینوں ایک کمرے میں بیٹھے اپنے تازہ اور متوقع مشن کی جزئیات پر غور اور تبادلۂ خیال کر رہے تھے کہ شریفاں کے شوہر ملوک نے آ کے مجھے کارڈلیس تھما دیا۔

''کوئی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے کہا، میں چونکا۔ وہ چلا گیا۔ میں نے کارڈلیس اپنے کان سے لگا لیا اور ہیلو کہا تو دوسری جانب سے ایک شناسا آواز پر میرے وجود کی تمام حسیات پورے غیظ جوش کے سات یکدم بیدار ہو گئیں۔

''شہزادا! اتنا اونچا مت اڑو کہ تمہیں نیچے گرنے کے لیے زمین بھی نہ ملے۔''

''اونچا وہی لوگ اڑتے ہیں جنہیں اڑنا آتا ہے اور زمین پر اترنا بھی... وزیر جان!'' اس کی آواز پہچان کر میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا تو دوسری جانب سے وزیر جان کی پھنکارتی ہوئی آواز ابھری۔

''زمین پر تو تمہیں ہم اتاریں گے، مگر ایک زندہ لاش کی صورت۔''

''کیا یہی گیدڑ بھبکیاں سنانے کے لیے تم نے اپنا اور میرا قیمتی وقت برباد کیا ہے؟'' میں نے اسے تاؤ دلانے والے انداز میں کہا مگر میرے اندر ایک پریشان کن سی کھٹک پیدا ہونے لگی تھی کہ اس رذیل انسان نے ضرور کوئی اہم انکشاف کرنے کے لیے رابطہ کیا ہے۔ ایک کھٹک اس کی بیوی کے حوالے سے بھی تھی کہ کہیں وہ مجھے ہی اپنی بیوی سعیدہ کا قاتل تو نہیں سمجھے ہوئے یا وہ سب جو ہوا، اس کی ذمے داری مجھ پر ڈالنے کی بھی کوشش کرے۔

''وقت تو اب آنے والا تمہارے لیے جو بربادیاں لائے گا شہزی۔'' اس کی دوبارہ پُرغیظ سی آواز ابھری۔ ''جب تمہیں پتا چلے گا کہ یہاں سے ہزاروں میل دور تمہاری معشوقہ عابدہ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ضعیف ماں باپ کا میں کیا حشر کرنے والا ہوں مگر میری یہ بڑی دیرینہ خواہش بن چکی ہے کہ جب وہ دونوں بڈھے میرے قبضے میں ہوں اور تم میرے آگے ان کی زندگی کے لیے ہاتھ جوڑتے، میرے پیروں پر گرتے نظر آؤ۔''

عابدہ اور اپنے ماں باپ کے ذکر پر میرے اندر کا جوار بھاٹا رفتہ رفتہ آتش فشانی لاوے کی شکل باہر آنے کو بے تاب ہونے لگا۔ میں نے اسی لہجے میں کہا۔

''وزیر جان! پھر تم بھی یاد رکھنا۔ میں تمہیں موت سے بھی بدتر سزا دوں گا۔''

''یہ وقت بتائے گا اور بتانے والا ہے شہزی۔'' وہ زہریلی آواز میں بولا۔

''تمہارا باپ تو خیر جہاں ہے اسے وہیں اپنے دردناک انجام سے دوچار کیا جانے والا ہے جس کی ویڈیو کلپ میں خود تمہیں اپنے پاس بلا کر دکھاؤں گا۔ مگر ابھی تو تم اپنی ماں... کی خیر منالو۔ وہ اس وقت میرے رحم و کرم پر ہے۔''

میری توقعات کے عین مطابق اس نے ایک ایسا انکشاف کیا تھا جس نے واقعی مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے اندر کے طوفان پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے ایسی بزدلی کی توقع پہلے ہی سے رکھے ہوئے تھا۔ وزیر جان! مگر یاد رکھو یہ حقیقت تم بھی جانتے ہو کہ میری زندگی کا مقصد اور تلاش کا محور میرے ماں باپ ہی ہیں۔ اگر تم نے ان کا ذرا بھی بال بیکا کرنے کی کوشش چاہی تو یاد رکھنا وزیر جان پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''ختم تو اب تمہارا سب کچھ ہونے ہی والا ہے۔ شہزی!'' وزیر جان نے دانت پیسنے والے انداز میں اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''تم نے ہم سے ٹکر لے کر خود اپنے ساتھ بہت برا کیا ہے۔''

''میں نے تم سے کوئی ٹکر نہیں لی ہے۔ نہ ہی تم سے میری کوئی دشمنی تھی، میں تو خود تم سے اپنے ماں باپ کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا اور بس...'' میں نے مصلحتاً مفاہمانہ لہجے میں عیاری سے کہا تو وہ بولا۔

''یہ پینترے بازیاں اب بہت ہو چکیں شہزی! کام کی بات کرو... اب...''

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں:۔

✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رزیوم ایبل لنک
✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety

''تم یقیناً اپنی ماں سے ملنا چاہو گے؟'' اس کے لہجے میں میری بے بسی سے حظ اٹھانے والے انداز کی بو آ رہی تھی۔ وہ ایک بزدلانہ قدم اٹھانے کے بعد اپنی طاقت کے گھمنڈ میں مسرت محسوس کر رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے بے بس کرنے والا ہے۔

''کون ایسا بیٹا ہوگا جو اپنے بچھڑے ہوئے ماں باپ سے نہیں ملنا چاہتا ہوگا؟'' میں نے اپنے حلق میں اترتی رقت پر بمشکل قابو پایا۔

''ہاہاہا... یہ تو بات تم نے بھی ٹھیک ہی کہی شہزی... مگر اپنے ماں باپ سے ملنے کے لیے تمہیں ایک قیمت چکانا ہوگی۔ خود کو ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔ بالکل بے دست و پا حالت میں۔'' اس نے ہذیانی اور فتح کے زعم میں قہقہہ بلند کیا۔

''میں جانتا ہوں... تم جیسے گیدڑ ایک شیر کو پنجرے میں ہی دیکھنا پسند کریں گے۔'' میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کھولتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ ہنسا۔

''ایک پاگل جنونی شیر کو پنجرے میں ہی رکھا جاتا ہے یا گولی مار کے ختم کر دیا جاتا ہے۔''

''میرا باپ بھی تمہارے قبضے میں ہے؟'' میں نے اس کی ہرزہ سرائی پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر پوچھا۔

''اس وقت صرف تمہاری ماں ہی میرے قبضے میں ہے۔'' وہ بولا۔ ''فکر نہ کرو تمہارا باپ بھی ہماری پہنچ سے دور نہیں۔ پہلے اپنی ماں سے تو مل لو۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے بے چین ہے بے چاری۔''

اس رذیل آدمی کی بات پر میرا جگر تک اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ میں نے اپنے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''میرا باپ کدھر ہے... کہاں ہے؟''

''وہ بہت دور ہے... اس ملک کی سرحدوں سے بھی دور۔ ایک اندھیری کوٹھری میں اپنی بچی کچی زندگی کے دن کاٹ رہا ہے۔'' اس نے میرے سامنے ایک اور اعصاب چٹخا دینے والا تکلیف دہ انکشاف کیا اور میرے دریدہ وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے اپنے اندر کی درد انگیزی پر قابو پانا مشکل ہونے لگا۔

''وہ ہے کہاں؟ اور کس جرم میں... کیوں اور کہاں قید ہے؟''

''سب کچھ فون پر ہی پوچھ لو گے؟ مجھ سے ملو گے نہیں؟'' وہ میری دلی و ذہنی ہیجانی اور کرب ناک کیفیات کو گویا اپنے چشم تصور میں دیکھ کر اندازہ لگاتے ہوئے مکارانہ انداز میں بولا تو میں نے فوراً کہا۔

''میں تیار ہوں۔ کہاں ملو گے؟'' اسے کیا معلوم تھا کہ میں تو خود اس کی تلاش میں سرگرداں ہوں، وہ بولا۔

''میں نہیں... تم ملو گے... کہاں؟ یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تم اسی نمبر پر کب تک موجود ملو گے؟'' اس نے آخر میں دریافت کیا۔ میری متوحش سی بے چینی پھر فزوں تر ہونے لگی۔ میں اس سے جلد از جلد ملنا چاہتا تھا، بولا۔ ''میرا کچھ پتا نہیں ہوتا... تم ابھی بتا دو مجھے کہ تم سے کہاں ملنا ہے؟''

''ویری رچ... شہزی! اتنی جلدی نہ کرو۔ میں جانتا ہوں تم اس بڈھے بزنس مین سیٹھ منکور وڑائچ کے پاس ہی رہتے ہو اور تمہارا مستقل ٹھکانا بھی وہی ہے۔ میں چاہوں تو کسی وقت بھی اس کی کوٹھی کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں مگر غیر متعلقہ باتوں میں خود کو الجھانے کا قائل نہیں اس لیے ابھی تم اُدھر ہی آرام سے بیٹھو... بہت جلد میں تمہیں دوبارہ کال کروں گا۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں گنگ ہو کے صوفے پر بیٹھا رہ گیا۔ کارڈلیس والا ہاتھ اس طرح میرا گرا تھا جیسے میرے پہاڑ سے وجود کی ساری طاقت یکلخت ہی ختم ہو گئی ہو۔ سامنے والے صوفے پر اول خیر اور شکیلہ غور سے میری فون پر وزیر جان کے ساتھ گفتگو سن رہے تھے۔ میرا کارڈلیس والا ہاتھ نیچے گرتے ہی اول خیر یکدم تشویش زدہ انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب صوفے پر آن بیٹھا۔ شکیلہ کی کشادہ سیاہ آنکھوں میں بھی میرے لیے تشویش و تفکر کے سائے ہلکورے لینے لگے تھے۔

''خیر ہے کاکے! کیا کہہ رہا تھا یہ بدبخت؟'' اول خیر نے میرے شانے کو ہولے سے سہلا کے کہا تو میں نے اسے وزیر جان کی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ جسے سن کر اول خیر اور شکیلہ دونوں ہی ایک لمحے کے لیے ہک دک رہ گئے۔

میں یکدم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا چہرہ جوش سے سرخ اور وجود مرتعش ہو رہا تھا۔

''میں وزیر جان کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں پُرغیظ لہجے میں دانت بھینچ کر بڑبڑایا۔

''شہزی کاکے! وہ ویسے بھی ہمارے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔'' اول خیر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پر دیکھ! معاملہ نازک ہی نہیں سنگین بھی ہے۔ ماں جی اس کے قبضے میں ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ بزدل دشمن خطرناک بھی ہوتا ہے۔''

''اول خیر، ماں جی اس حرام زادے کے قبضے میں ہے۔ میرے باپ کے بارے میں بھی وہ جانتا ہے۔ بہت کچھ اگلوانا ہوگا اس کے منہ سے۔'' میں نے کہا۔

شکیلہ نے اس بار لب کشائی کی۔ ''شہزی! یہ سب تبھی ممکن ہوگا جب وزیر جان ہمارے جوتے تلے ہو۔ ہمیں اس کی کال کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ خود ہی اپنی موت کو دعوت دے گا۔''

اول خیر نے کہا۔ ''ہمیں نمبر چیک کرنا چاہیے پہلے۔''

تھوڑی دیر بعد سیٹ کی اسکرین پر نمبر چیک کیا گیا۔ وہ نمبر جس سے وزیر جان نے مجھے کال کی تھی، کسی لینڈ لائن کا نہیں تھا۔ وہ سیل نمبر تھا۔

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم وزیر جان کی دوسری کال کا انتظار کرتے۔ اس نے مجھے اس نمبر پر موجود رہنے کی خاص تلقین اور تنبیہ کی تھی۔ گویا وہ مجھے دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی کال اٹینڈ کرنے کے بعد میں اِدھر ہی محدود رہ کر اس کی اگلی کال کا انتظار کرتا ہوں یا پھر اس کی ''بیخ کنی'' کے لیے فوراً نکلنے کی کوشش کروں گا۔ اگر اس کی دوسری کال کا ہمیں مجبوراً انتظار کرنا نہیں پڑتا تو میں اور اول خیر اسی وقت اس کی رہائش گاہ کا رخ کرتے۔

وزیر جان کی دوسری کال کا مجھ سے انتظار نہیں ہو پا رہا تھا، یہ انتظار میرے اعصاب چٹخانے کا باعث بن رہا تھا۔ میں وزیر جان سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔

میں تھکے تھکے اور خاصے جھلائے ہوئے انداز میں دوبارہ صوفے پر گر گیا۔ اول خیر اور شکیلہ میری کیفیات کو محسوس کر رہے تھے کہ میں کس قدر بے چین اور کربناک گھڑیوں سے گزر رہا تھا۔

''مزید سنا کاکے! وزیر جان نے تجھ سے اپنی بیوی سعیدہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی؟'' چند ثانیوں کی پُرسوچ اور اعصاب شکن خاموشی کے بعد اول خیر نے مجھ سے سوال کیا۔ وہ بھی میرے قریب صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

میں نے جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے تو ابھی اس نے ایسی کوئی بات نہیں پوچھی۔''

''ہوں۔'' اول خیر نے پُرخیال ہنکاری لی۔ ''ابھی اسے ہم پر ایسا کوئی شبہ نہیں ہوا ہے یا پھر ممکن ہے اس نے یہی سمجھا ہو کہ یہ سب زبیر خان کی وجہ سے ہوا ہے۔ کیونکہ یقیناً پولیس کو وقوعے والی جگہ پر اس کے آدمیوں کی لاشیں ملی ہوں گی۔''

''ہاں، خیال تو میرا بھی یہی ہے لیکن ایسے میں اگر پولیس نے زبیر خان یعنی خان جی سے تفتیش وغیرہ کی تو... یہ معاملہ دوسرا رخ اختیار کر لے گا یعنی پرانی دشمنی کہ خان جی نے اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ لیا یا... نیلی کو ورغلانے کے جرم میں یہ سب ہنگامہ ہوا۔'' میں نے کہا تو شکیلہ بولی۔

''اس خونریز واقعے میں نیلی کا کردار وزیر جان سے چھپا نہیں رہے گا کیونکہ اس کے دماغ میں یہ خیال ضرور ابھرے گا کہ آخر نیلی کدھر گئی؟''

میں شکیلہ کے اس سوال کے جواب کا بہت پہلے تجزیہ کر چکا تھا لہٰذا بولا۔ ''وزیر جان کبھی خیال و خواب میں بھی ہمارے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ کیونکہ وہ خود اپنی بیوی کے ذریعے خان جی کی بیوی کے ساتھ ایک خفیہ گیم کھیل رہا تھا۔ خان جی کے آدمیوں کی لاشیں ملنے کی صورت میں لامحالہ وزیر جان کے ذہن میں بعینہٖ وہی خیال ابھرے گا جس کا اندیشہ اس کے ذہن میں بھی متوقع ہوگا کہ نیلی پر کسی قسم کا خان جی کو شبہ ہو گیا اور اس نے اپنے آدمی اس کی ریکی پر لگا دیے۔ اگرچہ ہوا بھی ایسا ہی ہے... یہ سارے اندازے اندیشوں کی صورت پہلے ہی وزیر جان کے دل و دماغ میں کلبلاتے رہے ہوں گے۔ رہی بات نیلی کی یا وقوعے والی جگہ اس کے غیاب کی تو یہ عام سمجھ میں آنے والی بات ہوگی کہ نیلی خوش قسمتی سے بچ گئی ہوگی اور فرار ہو کے روپوش ہو گئی۔''

''لیکن پھر بھی شہزی کاکے! نیلی کی صورت میں ہمارے سروں پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی۔ وزیر جان اس بات پر کھٹک ضرور جائے گا کہ آخر نیلی کدھر گئی؟ شوہر سے غداری پر خان جی نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ وہ اپنے تئیں ان ساری باتوں کا کھوج تو لگانے کی کوشش کرے گا ضرور۔'' اول خیر نے خیال آرائی کی تو میں نے کہا۔

''میرا نہیں خیال کہ نیلی اب وزیر جان کے لیے اتنی اہمیت کی حامل ہوگی۔ سازش ناکام ہونے کے بعد نیلی اب اس کے مفاد میں نہیں رہی ہوگی، یوں بھی ساری صورت حال و حالات... واضح ہیں۔''

''ایک خیال اور میرے ذہن میں آ رہا ہے۔'' معاً شکیلہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو میں اور اول خیر مستفسرانہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔ میں شکیلہ کے بارے میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ ایک ذہین اور بہادر لڑکی تھی۔ اب تک اس نے بھی حالات کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ وہ بھی ایک مضبوط اعصاب کی مالک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھی، وہ بولی۔ ''پولیس کی تفتیش یا وزیر جان سے کسی قسم کی مزید جنگ سے بچنے کی خاطر ممکن ہے خان جی (زبیر خان) سرے سے اس بات سے ہی مکر جائے کہ تارڑ وغیرہ اس کے ساتھی ہیں۔''

شکیلہ نے بلاشبہ ایک اہم نکتے کی طرف ہماری توجہ دلائی تھی جس پر میں نے اور اول خیر نے ابھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

''ہاں، تمہاری بات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔'' میں نے کہا۔

''چلو اب اس معاملے پر مٹی پاؤ۔'' اول خیر اپنے مخصوص لب و لہجے میں بولا۔

ہمارے سامنے ٹی وی آن تھا اور مختلف نجی چینلز کی چوبیس گھنٹے نشریات جاری تھیں۔ صرف چند علاقائی چینلز پر اس واقعے کی لائیو رپورٹنگ آرہی تھی۔ کچھ بریکنگ نیوز کے طور پر بھی نشر ہورہی تھیں۔

اس دن کال نہیں آئی، اگلے روز شام کے لگ بھگ پانچ بجے وزیر جان نے کال کی۔ نمبر دیکھا تو یہ پہلے والا نمبر نہیں تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کال وصول کی اور ہیلو کہا۔

''خود کو ہمارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوجاؤ شہزی۔'' دوسری جانب سے وزیر جان کی سرسراتی آواز ابھری۔ ''مگر یاد رکھنا کسی قسم کی چالاکی کی گنجائش نہیں ہوگی۔ دوسری صورت میں بھیانک نتائج کے ذمے دار تم خود ہی ہوگے۔''

''میں صرف اپنی ماں کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں... وزیر جان۔ اور اس سلسلے میں تمہاری طرف سے کسی قسم کی دغابازی یا دھوکے کو برداشت نہیں کروں گا۔''

''خاطر جمع رکھو... ایسا کچھ نہیں ہوگا اور یہ سب کان کھول کے سن لو۔ تم صرف تنہا آؤ گے، یاد رکھنا تم جیسے ہی باہر نکلو گے مجھ تک یہ اطلاع پہلے ہی پہنچادی جائے گی کہ تم تنہا ہو یا نہیں۔ میرے پاس پہنچنے تک تمہاری مکمل ریکی ہوتی رہے گی۔''

''مجھے تمہاری اس بات سے اختلاف ہے۔'' میں نے اس کی بات کی نفی کردی۔ ''میں تم تک پہنچنے سے پہلے... اپنی ماں کو کسی کے ساتھ محفوظ مقام پر دیکھنا چاہوں گا اور اس کے لیے ضروری ہوگا کہ میرے ساتھ میرا کوئی ساتھی بھی ہو۔''

''میں اس کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں دوں گا۔'' وزیر جان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم جیسے ہی میرے پاس پہنچو گے، تمہیں تمہاری ماں سے ملوانے کے بعد.... تم جہاں کہو گے، میرے آدمی اسے وہاں پہنچادیں گے۔''

''مجھے تمہارے لہجے سے منافقت اور دغابازی کی بُو آرہی ہے وزیر جان۔'' میں پُرطیش لہجے میں دانت پیس کر بولا تو دوسری جانب سے وزیر جان کی غراتی ہوئی آواز ابھری۔

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں شہزی! تمہیں وہی کچھ کرنا ہوگا جو میں چاہوں گا مت بھولو کہ اس وقت بال میرے کورٹ میں ہے۔''

اس کی بات پر میرا دماغ گرم ہونے لگا، کچھ سیکنڈوں کی خاموشی کے بعد میں سرد لہجے میں بولا۔ ''مجھے کہاں آنا ہوگا؟''

''بیگم ولا۔'' دوسری طرف سے وزیر جان نے جیسے ایک دھماکا کرڈالا۔

''بیگم ولا؟'' بے اختیار میرے منہ سے سوالیہ نکلا۔

''ہاں... کیوں... دھری رہ گئیں تمہاری ساری سوچی ہوئی چالاکیاں؟'' وزیر جان نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''لل... لیکن... بیگم ولا... وہ تو...'' مجھ سے آگے بولا نہیں گیا۔ میرے دل و دماغ میں بری طرح سائیں سائیں ہونے لگی۔ پتا نہیں یہ وزیر جان میرے ساتھ کون سا گیم کھیل رہا تھا۔

''بیگم ولا سے تمہارا بھلا کیا تعلق بنتا ہے؟'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ میں خود اس کی بات پر چکرا کر رہ گیا تھا۔ دوسری جانب سے وزیر جان کا شیطانی قہقہہ برآمد ہوا۔ پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

''کیوں شہزی؟ بڑی حیرت ہوئی تمہیں؟''

مجھے حیرت ہی نہیں بلکہ ذہنی جھٹکا بھی لگا تھا، تاہم بولا۔ ''کچھ خاص نہیں، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بیگم ولا میں میری تم سے ملاقات... کیا معنی رکھتی ہے؟''

''تم وہاں مجھ سے نہیں، زہرہ بانو... المعروف مختاری بیگم سے ملو گے اور اسے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرو گے، باہر کسی مقام پر خود ہی میرے آدمی تم سے ٹکرائیں گے اور تم دونوں بلا چون و چرا ان کا حکم مانو گے، وہ تم دونوں کو گاڑی میں بٹھا کر میرے پاس پہنچادیں گے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔'' میں نے پُرقطعیت لہجے میں کہا۔ میری کنپٹیاں سنسنانے لگی تھیں۔

''سب کچھ ممکن ہے تمہارے آگے... شہزاد احمد خان۔'' وزیر جان نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مت بھولو کہ ہمیں تمہارے بارے میں سب علم ہے۔ زہرہ بانو تمہارے ساتھ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئے گی۔''

''مگر اس سلسلے میں تمہاری معلومات بالکل صفر ہیں وزیر جان! کیونکہ میرا زہرہ بانو سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہوگا بھی کیوں؟ میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔'' میں اب دھیرے دھیرے اپنے آپے میں آنے لگا تھا کیونکہ معاملہ شاید میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہورہا تھا۔ وزیر جان عام آدمی نہ تھا، ایک بین الاقوامی سطح کی مجرم زمانہ تنظیم اسپیکٹرم کا اسٹیشن چیف تھا پھر میرا اور بیگم صاحب کا مشترکہ دشمن چودھری ممتاز خان تھا جو KATSA ایجنٹ کہلاتا تھا۔ بقول ثریا کے... اسپیکٹرم میں اس عہدے کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ ممتاز خان نے ہی میرے سلسلے میں ساری معلومات ایک بریفنگ کی صورت میں وزیر جان کو دی ہوں گی۔

تاہم میں نے وزیر جان کو جُل دینے کی کوشش کی تھی، وہ بولا۔

''شہزاد خان! فضول باتیں کرکے وقت ضائع ہی کروگے تم... مت بھولو کہ ہمارے پاس اور بھی آپشنز ہیں مگر ہم معاملے کو زیادہ الجھانا نہیں چاہتے۔''

''دیکھو وزیر جان! جہاں تک میری ذات سے تعلق ہے، اس سلسلے میں تمہارے ساتھ تعاون کرسکتا ہوں مگر دوسرے کے بارے میں، میں مجبور ہوں۔'' میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ وہ بولا۔

''میں نے تم سے جو کہا، وہ تم نے یقیناً اچھی طرح سن اور سمجھ لیا۔ میں فون بند کررہا ہوں۔ اب تم سے میرے ساتھی ملاقات کریں گے جن کے بارے میں تمہیں میں نے بتادیا ہے۔ یہ آج اور ابھی کرنا ہوگا۔ اگر تمہیں اپنے سوالوں کے جوابات چاہئیں تو یہ سب کرنا ہوگا بصورت دیگر جہاں تمہارا باپ اندھیری کوٹھری میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے، تمہاری ماں کو بھی وہاں پہنچادیا جائے گا۔ آخری بات غور سے سن لو۔ تمہاری کسی قسم کی مہم جوئی کی بھنک پڑتے ہی یہ معاملہ ختم ہوجائے گا۔ لہٰذا اس ڈیل کو غنیمت سمجھتے ہو تو آج میں اپنے ٹھکانے پر تمہارا اور زہرہ بانو کا منتظر ہوں۔''

''تم کہاں ہو اس وقت؟'' میرے منہ سے بے اختیار بے وقوفانہ سوال نکلا۔

''فضول سوال ہے یہ۔'' کہتے ہوئے وزیر جان نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا۔

شکیلہ اور اول خیر کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چہرے ہک دک تھے۔ اس لیے کہ میں نے اس بار وزیر جان کی کال آتے ہی فون کا اسپیکر وائیڈ کردیا تھا اور وزیر جان کی طرف سے ہونے والی گفتگو انہوں نے بھی سن لی تھی۔

''او خیر کاکے! اسے تو لمبی کھیڈ پے گئی ہے۔'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

''یہ ناممکن ہے... میں ایسا نہیں کرسکتا۔ میں خود اس رذیل کو تلاش کرکے رہوں گا۔'' میں بپھرے ہوئے لہجے میں بولا تو اول خیر نے کہا۔

''شہزی کاکے! اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ وزیر جان نے گھات لگائی ہے۔ تم نے اس کی بات پر غور نہیں کیا کہ اس کے آدمی تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں جو اسے تمہارے ایک ایک پل سے آگاہ کریں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم وزیر جان کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں ادھر وہ کہیں ماں جی کو کوئی نقصان نہ پہنچادے۔''

''تو پھر کیا کروں میں؟ بیگم صاحب کو خود اپنے ہاتھوں سے اغوا کرکے اس خبیث کے حوالے کردوں؟'' میں نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''او خیر... کاکے! میں نے یہ تو نہیں کہا۔'' اول خیر خفیف سا ہوکے بولا۔ میں نے بے اختیار ایک سرد سی آہ بھری۔

''پتا نہیں میری تقدیر میں کیا لکھا ہے۔ اپنی جس پیاری اور عزیز ہستی کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، وہ اتنا ہی دور ہونے لگتی ہے۔ اتنے عرصے بعد ماں جی اور باپ کا پتا چلا تو ان سے ملنا میرے لیے مشکل بنایا جارہا ہے۔'' میری آواز بھرانے لگی۔ اول خیر نے میرا شانہ تھپتھپایا، بولا۔

''او خیر... کاکے! تو ابھی سے دل چھوٹا کرنے لگ گیا۔ میں تیرے ساتھ ہوں۔ حوصلہ کر میرے یار۔'' مجھے مغموم اور آزردہ خاطر دیکھ کر شکیلہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آن بیٹھی اور اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے بازو پر دھیرے سے رکھتے ہوئے ملائمت آمیزی سے بولی۔

''شہزی! کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ تم تو بڑے حوصلے والے تھے، یہ ایک دم کبھی کبھی تمہیں کیا جاتا ہے؟ کبھی عزم و حوصلے کی چٹان نظر آتے ہو تو کبھی یکدم ریت کی دیوار۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"میرے یار شہزی کاکے کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے شکیلہ بہن۔" اول خیر نے ہلکی مسکراہٹ سے مجھے ..... دیکھا۔ "جب یہ جوش غیظ سے بھرا ہوتا ہے تو میں خود کان دبا کر سائڈ میں ہو جاتا ہوں... اور پھر یہ دشمنوں پر اس تیزی سے غلبہ پاتا چلا جاتا ہے کہ ایک لمحے کے لیے تو میں خود ہکا بکا رہ جاتا ہوں۔ خود میری اپنی زندگی بھی دشمنوں کے ساتھ مارا ماری میں گزری ہے۔ پر میں نے شہزی کاکے جیسا جوان مرد پہلی بار دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں یہ مایوسی کا غلبہ عارضی اور فطری ہوتا ہے اس کا... کیوں کاکے؟ ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟" وہ آخر میں مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے بولا تو بےاختیار میں ہنس پڑا۔

"او جیو میرے یار، زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہیں' ان کو دل پر نہیں لینا چاہیے، ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ ہم بیچ کا راستہ سوچ لیتے ہیں۔" مجھے اول خیر کی باتوں سے کچھ حوصلہ ملا' کچھ طمانیت بھی ہوئی، تاہم میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"تم کچھ بھی سوچو . مگر میں بیگم صاحبہ والی بات قطعی طور پر نہیں مان سکتا... نہ ہی میں ان سے ایسی کوئی بھیک مانگ سکتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میرے چشم تصور میں کمیل دادا کا کینہ پرور چہرہ ابھر آیا اور اس کی تیر جیسی چبھتی ہوئی باتیں میری سماعتوں میں گونجنے لگیں۔

اول خیر نے مجھے پُرسکون رہنے کا مشورہ دیا اور شکیلہ سے چائے کا کہا۔ جب وہ چلی گئی تو اول خیر بھی اٹھا اور ذرا دیر میں لوٹنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ میں سمجھ گیا دونوں مجھے تنہائی کا موقع دے کر پھر مجھے پُرسکون کرنا چاہتے تھے مگر تنہائی میں تو ایک بار پھر میرے دل و دماغ میں پریشان کن سوچوں نے حملہ کر دیا تھا۔

کچھ دیر مزید اسی طرح گزری۔ پھر اول خیر آیا اور شکیلہ بھی چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئی۔ ہم تینوں چائے پینے لگے کہ فون کی بیل گنگنائی، کارڈلیس قریب ہی رکھا تھا میں نے ہی اٹھایا اور جب کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک شناسا نسوانی آواز ابھری تھی جسے سن کر میں ساکت ہو کے رہ گیا تھا۔

"شہزی! بڑے بےمروت نکلے تم... ایسے گئے کہ دوبارہ ہماری خبر بھی نہ لی تم نے؟"

یہ بیگم صاحبہ تھیں۔ میرا پورا وجود سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جب مجھے بیگم صاحبہ کی مدد کی ضرورت تھی مگر میں ان سے کترا رہا تھا۔ خود ان کا ہی فون آ گیا... میں بری طرح الجھ کر رہ گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

"ایسی بات نہیں بیگم صاحبہ! بس کچھ حالات ایسے تھے کہ آپ سے بات کرنے کا بھی یارا نہ رہا۔" پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد ان کی خیریت پوچھی۔ "آپ کیسی ہیں بیگم صاحبہ؟"

"ویسی ہی ہوں جیسی چھوڑ کر گئے تھے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔ ان کے لہجے کی زیراہٹ میں شکوہ تھا۔

"میں نے آپ کو کب چھوڑا تھا بیگم صاحبہ؟ آپ ہی نے ہمیں بےدخل کر دیا تھا۔" میں نے بھی شکوہ کر ڈالا۔

"میں نے صرف اول خیر کے بارے میں ایسا فیصلہ کیا تھا۔ تمہارے بارے میں تو ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔"

"اول خیر کا مطلب میں ہی تھا بیگم صاحبہ! یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں۔ اول خیر تمہارے لیے ہم سے زیادہ حیثیت اختیار کر گیا ہے مگر ہم بھی مجبور تھے، بعض نکتی معاملات میں ہمیں اس سے بھی زیادہ تلخ فیصلے کرنے پڑ جاتے ہیں۔ یہ تو صرف دوری کا معاملہ تھا اور تم نے دل پر لے لیا۔"

"آپ نے کیسے فون کیا، خیریت؟" میں نے اس خشک موضوع سے درگزر کرتے ہوئے پوچھا تو دوسری جانب سے مجھے بیگم صاحبہ کی ایک آہ سے مشابہ گہری سانس بھرنے کی آواز سنائی دی پھر بولیں۔

"شہزی! تم ابھی میرے پاس آ سکتے ہو؟" میں ان کے سوال پر چونک گیا۔ یہ کیا بھید تھا؟ کیا تقدیر مجھے پھر ایسی راہ پر ڈالنے والی تھی جس سے منہ موڑ چکا تھا؟ اور ایک ایسی راہ جو میرے ذاتی مفاد سے تعلق رکھتی تھی کہ ایسے میں خود مجھے ان کے پاس جانے کی ضرورت تھی۔

"کوئی خاص وجہ بیگم صاحبہ؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔" وہ دھیرے سے بولیں — ان کی بات سن کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا اور میرے اندر اتھل پتھل سی ہونے لگی۔ تاہم میں نے ذرا محتاط لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"میں شاید آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں بیگم صاحبہ کہ آپ کو مجھ سے ایسی کون سی مدد کی ضرورت پیش آ گئی جبکہ خود آپ کے پاس آدمیوں کی کمی نہیں، پھر کمیل دادا جیسا آدمی آپ کا جاں نثار اور وفادار دستِ راست ہے۔"

"طنز کر رہے ہو مجھ پر؟" بیگم صاحبہ نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں نے فوراً نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیگم صاحبہ! میں طنز نہیں کر رہا... قطعاً نہیں، کیا میری بات غلط ہے؟"

"غلط نہیں ہے لیکن شاید قسمت ہماری کچھ ایسی ہے کہ جس نے ہر بار ہم دونوں کو مشترکہ دشمنوں کے سامنے کھڑا کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کیا چودھری ممتاز خان نے پھر کوئی نیا گل کھلایا ہے؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا تو چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد مختصراً بولیں۔

"ہاں۔"

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ "ایسا کیا کر دیا اس خبیث نے دوبارہ؟"

"ہمارا ایک اہم ترین آدمی یرغمال بنا لیا ہے اس نے... ہم نے اپنے ذرائع سے پتا چلا لیا ہے کہ ہمارا آدمی وزیر جان نامی ایک بڑے آدمی کے ٹھکانے پر موجود ہے۔ مگر بدقسمتی سے لاکھ کوشش کے باوجود ہم وزیر جان نامی اس آدمی کے خفیہ ٹھکانے کا پتا نہیں چلا سکے ہیں جہاں ہمارے آدمی کو یرغمال بنا کے رکھا گیا ہے۔"

میرے ذہن میں لاتعداد الجھاکے ہونے لگے۔ یہ کیا اتفاق تھا کہ ایک بار پھر تقدیر میری یاوری اس طرح کر رہی تھی کہ میرے سوال کرنے سے پہلے بیگم صاحبہ نے مجھ سے وہ سوال کر ڈالا تھا جس کے آڑے میری خودداری مانع ہو رہی تھی۔ میرے اندر کوئی بولا۔ "اس کو تقدیر کا طرفہ تماشا کہتے ہیں شہزی کہ تمہاری مشکل خود ہی آسان ہو رہی ہے۔ یہ سنہری موقع خود ہی تمہارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے تم بیگم صاحبہ کی مدد کرو اور وہ تمہاری... مگر باوجود اس کے جانے کیا بات تھی کہ تقدیر کے اس اتفاق سے میرا دل "مطمئن" نہیں ہو رہا تھا۔ ایک کھٹک سی ہو رہی تھی مگر کیا؟

"شہزی! میں تم سے مدد کی درخواست کرتی ہوں۔ ایسے نازک وقت میں ہمیشہ تم ہی میرے کام آتے رہے ہو، کمیل دادا اور میرے کچھ خاص آدمی اس شہر میں نہیں ہیں۔ وہ میرے ہی ایک ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر ہیں۔ انہیں اس کا علم ہی نہیں۔ اب تم ہی ایک میرے ایسے خیر خواہ ہو جو مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔ تم جانتے ہو اچھی طرح شہزی کہ میں اپنے آدمیوں کے معاملے میں کس قدر حساس اور ذمے دار ہوں۔ انہوں نے مجھ سے وفاداری کا دم بھرا ہے اور عملی طور پر اس کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اب میرے ایک آدمی کی جان پر بنی ہوئی ہے تو میں چپکی کیسے بیٹھی ہوں، پلیز... شہزی! انکار مت کرنا۔" بیگم صاحبہ کا لہجہ ملتجی ہو رہا تھا۔ میرے دل میں... آئی کہ میں اپنا مسئلہ بھی بیان کر دوں اور یہ ضروری بھی تھا تاہم کچھ سوچ کر میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! میں آ رہا ہوں۔ آپ بیگم ولا میں ہی ہیں ناں اس وقت؟"

"ہاں، میں وہیں ہوں اور تمہارا بےچینی سے انتظار کر رہی ہوں' آ رہے ہو ناں تم؟" وہ بڑے امید بھرے لہجے میں بولیں تو میں نے اثبات میں جواب دے کر فون بند کر دیا۔

شکیلہ اور اول خیر بھی اس اتفاق پر خوش نظر آنے لگے مگر جانے کیوں مجھے خوشی سے زیادہ ایک بےنام سی بےچینی ہونے لگی۔ پتا نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔ چودھری ممتاز اور وزیر جان میرے ساتھ کون سی نئی چال چل رہے تھے یا پھر بیگم صاحبہ کی باتوں میں کوئی گہرا راز تھا؟ بہرحال جو کچھ بھی ہو رہا تھا میری چھٹی حس کسی قسم کی طمانیت کا اظہار کرنے سے قاصر تھی۔ معاملہ پُراسرار اور گمبھیر تھا۔

میں اسی وقت کار میں سوار ہو کر کوٹھی سے روانہ ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ کوٹھی میں ہی تھے۔ یہ وزیر جان کی شرط تھی کہ میں اکیلا ہی سرمد بابا کی کوٹھی سے نکلوں اور اس کے آدمی لمحہ بہ لمحہ مجھے ٹریس کرتے رہیں گے۔ شکیلہ اور اول خیر نے مجھے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔

میرے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہ تھی۔ کوٹھی سے نکلتے ہی میں مین ہائی وے پر آیا تو میری عقابی نظروں نے تیزی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ متوقع تعاقب کا علم مجھے پہلے سے تھا جو کہ بقول وزیر جان کے اس کا ایک طے شدہ عمل تھا۔ یہی سبب تھا کہ مجھے جلد اپنے تعاقب میں آتی ہوئی ایک گاڑی دکھائی دے گئی، تصدیق کی خاطر میں نے اپنی کار بےمقصد دو تین جگہوں پر موڑی بھی تھی، وہ ایک نئے ماڈل کی بڑی بھاری بھرکم کار تھی اور اس کے اندر تین چار آدمیوں کی جھلک مجھے صاف نظر آئی تھی۔

گویا ان لوگوں نے وزیر جان کو، بقول اس کے اسے یہ رپورٹ بھی دے دی ہوگی کہ میں اس کے مطالبے کے عین مطابق کوٹھی سے نکل پڑا ہوں اور اب بیگم ولا کا رخ کیے ہوئے ہوں۔

بیگم ولا پہنچا تو وہاں مجھے پہچانتے ہی محافظ نے بڑا سا گیٹ کھول دیا۔ شاید اسے پہلے سے ہی میرے بارے میں ہدایات مل چکی ہوں گی۔ یہی سبب تھا کہ ولا کے کارپورچ میں رکتے ہی مجھے فوراً دو مسلح آدمیوں نے نہایت احترام کے ساتھ اندر ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ نشست گاہ کا کمرا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بہو سال نہ تو۔ جہاں اکثر ہم سب بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے بلکہ یہ کوئی اور کمرا تھا جو اوپری منزل پر نسبتاً الگ تھلگ گوشے میں بنا ہوا تھا۔ یہاں فرنیچر مختصر مگر نفیس تھا۔ کمرا بھی سادہ مگر دیدہ زیب دکھائی دیتا تھا۔ میں ایک صوفے پر براجمان ہو گیا۔ کمرے کا ماحول ہی نہیں بلکہ پورے ولا کی فضا پر عجیب سی خاموشی گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

تھوڑی دیر گزری۔ پردہ ہٹا اور ایک دوسرے اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے سے بیگم صاحبہ اندر داخل ہوئیں۔ نہ جانے کیوں اتنے روز بعد انہیں دیکھ کر میرا دل عجیب طرح دھڑکنے لگا۔ مگر ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر میں چونکے بنا بھی نہ رہ سکا۔

ان چند دنوں کی میری بیگم صاحبہ سے دوری نے انہیں بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصی کمزور نظر آرہی تھیں۔ کشادہ اور قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھوں کے گرد بھی سیاہ ہلکے پڑ گئے تھے۔ ان کی شہابی رنگت جو ہر سے مجھے اجلی اجلی سی نظر آتی تھی، اب اس میں زردی سی گھلی نظر آنے لگی تھی۔ انہوں نے ہلکے گلابی رنگ کا لباس زیب تن کر رکھا تھا اور دوپٹے کو بڑی نفاست سے آگے ڈالا ہوا تھا۔۔۔۔ میں احترام میں اٹھ کھڑا ہوا اور ہولے سے انہیں سلام کیا۔ وہ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے اور گہری نگاہوں سے میرے چہرے اور سراپا کو تکتے ہوئے میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گئیں، ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کیسے ہو شہزی؟" انہوں نے مترنم سی آواز میں بدستور میری طرف تکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے ان کی آواز میں بھی ہلکا سا... بہت عجیب سا ارتعاش محسوس ہوا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں مگر آپ پہلے سے کچھ کمزور نظر آرہی ہیں۔"

"ہاں، پچھلے دنوں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہی تھی مگر اب قدرے بہتر ہوں۔ تم تو ماشاء اللہ بالکل فٹ فاٹ نظر آرہے ہو؟" وہ ہولے سے آخر میں یہ کہتے ہوئے مسکرائیں، ان کی ہلکی مسکراہٹ میں بھی لگاوٹ، محبت اور انسیت کی دیرینہ چمک نظر آئی۔ میں نے فوراً مطلب کی بات چھیڑ ڈالی۔

"بیگم صاحبہ! آپ نے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیا ہے؟"

ان کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں چھوٹی ٹرے تھی۔ اس میں جوس کے دو گلاس رکھے تھے، وہ خاموشی سے قریب رکھی ہوئی پورٹیبل پر ٹرے رکھ کے خاموشی سے پلٹ گئی۔ میری مستفسرانہ نظریں بیگم صاحبہ کے گہری سوچ میں مستغرق چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"ابھی تو میرے ذہن میں ایسا کوئی لائحہ عمل نہیں، تمہاری مشکور ہوں کہ تم آج بھی میری کسی بھی مدد کرنے کی خاطر تیار رہتے ہو۔ میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ تم آؤ گے تو کوئی لائحہ عمل سوچیں گے۔"

بیگم صاحبہ کی بات پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ خود ایک بڑے گینگ کی سربراہ تھیں۔ بے شک اس وقت کمیل دادا سمیت اس کے کچھ خاص آدمی بقول ان کے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ان کی ہدایت کے مطابق دوسرے شہر میں تھے، مگر پھر بھی بیگم صاحبہ نے ابھی تک اپنے کسی خاص آدمی کو ممتاز خان یا وزیر جان کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کوئی پکی منصوبہ بندی ہی نہیں کی تھی؟

اب میں اپنے بارے میں سوچنے لگا کہ کیا مجھے اپنا وہ مشترکہ لائحہ عمل بیگم صاحبہ کے گوش گزار کر دینا چاہیے جو سرمد بابا کی کوٹھی سے روانہ ہوتے وقت میرے اور اول خیر کے بیچ طے پا چکا تھا؟ کیونکہ اول خیر نے مجھے بیگم ولا روانہ ہوتے وقت اس بات کی خصوصی تاکید کی تھی کہ میں بیگم صاحبہ سے تازہ صورتِ حال کے سلسلے میں کچھ نہ چھپاؤں اور انہیں آگاہ کر دوں، یوں بھی خود میری اپنی بھی یہی مرضی تھی کہ بیگم صاحبہ کو کسی دھوکے میں نہ رکھوں لہٰذا پھر میں نے انہیں بھی اپنے تازہ ترین مسئلے اور وزیر جان کی گفتگو اور مطالبے کے متعلق سب بتا ڈالا۔

میرے ماں باپ کا سن کر بیگم صاحبہ نے بھی خوشی کا اظہار کیا تھا تاہم ان کے چہرے سے فکر و تشویش بھی جھلکنے لگی تھی۔ میں نے کہا۔

"بیگم صاحبہ! آپ اس بات سے اپنا دل برا نہ کیجیے گا کہ میں اپنے مفاد کی خاطر آپ کو کسی مشکل میں ڈالوں گا۔ یقین کریں جب اس خبیث وزیر جان نے میرے سامنے یہ مطالبہ رکھا کہ میں آپ خود نہیں بلکہ آپ کو بھی لے کر۔۔۔ ماں جی کے بدلے آپ کو ان کے حوالے کر دوں تو نہ صرف ماں جی کو چھوڑ دے گا بلکہ مجھے میرے باپ کے متعلق بھی سب بتا دے گا تو یقین جانیے بیگم صاحبہ! میں نے اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا تھا۔ کیونکہ میرا ضمیر یہ کبھی گوارا نہ کرتا کہ میں آپ کو اپنی ذاتی غرض کی خاطر قربانی کا بکرا بناؤں۔"

"میں خود بھی جانتی ہوں شہزی کہ تم ایسا میرے ساتھ

تو کیا کسی غیر کے ساتھ بھی نہیں کرو گے۔" میری بات کے اختتام پر بیگم صاحبہ نے فوراً کہا۔ "تمہاری فطرت اور خودداری سے میں اچھی طرح واقف ہوں لیکن شاید یہ ہونا بھی ضروری تھا۔ اب دیکھو یہ اتفاق ہی تو ہے کہ عین اس وقت... مجھے بھی تمہاری مدد کی ضرورت پیش آگئی اور اپنے ایک آدمی کے سلسلے میں میرا ٹکراؤ بھی وزیر جان سے لازمی ٹھہرا ہے۔ میرا خیال ہے قسمت نے ہم دونوں کو یہ ایک موقع دیا ہے کہ ہم آپس کی منصوبہ بندی طے کر کے مشترکہ طور پر دشمن کو زیر کریں۔ پھر میں یہی کہوں گی کہ تم ابھی بظاہر ویسا ہی کرو جیسا تمہیں وزیر جان نے کہا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد... اس سے نمٹ لیں گے۔"

"مگر بیگم صاحبہ! اس میں آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تمہاری جان کو بھی خطرہ ہوگا؟ اور ماں جی کی بھی..." بیگم صاحبہ معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ "دیکھو شہزی! زندگی میں انسان کو بسا اوقات اپنی بقا کے لیے بڑے بڑے رسک اور خطرات مول لینے پڑتے ہیں۔ پھر ہم دونوں کی زندگی بھی کچھ ایسے ہی مخدوش اور نامساعد حالات سے گزری ہے، ویسے وزیر جان یا ممتاز خان کے لیے ہم اتنے تر نوالہ بھی ثابت نہیں ہوں گے کبھی کبھی دشمن کی چال میں آ کر بھی اس کی چال اس پر ہی الٹ کر مات دینا پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں سے نکلتے ہی میرے آدمی خفیہ طور پر ہماری نگرانی کرتے رہیں گے اور اس کار کا تعاقب کریں گے جس میں ہم دونوں کو وزیر جان کے ٹھکانے پر لے جایا جائے گا۔"

"وزیر جان اتنا بے وقوف نہیں کہ اس کے ذہن میں یہ سب باتیں شبہات کی صورت میں پیدا نہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "وہ پہلے ہی ان عوامل سے واقف ہوگا اور اس کا تدارک بھی سوچ چکا ہوگا اس صورت میں اسے ذرا بھی ایسا کوئی شبہ ہوا تو صورتِ حال سنگین تر ہو جائے گی۔"

"تم نے پھر اس معاملے کو کس طرح سے حل کرنے کا سوچا ہے؟" بیگم صاحبہ نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے تو یہی سوچا تھا بیگم صاحبہ کہ آپ کو اس خطرناک مشن میں شامل ہی نہ کروں لیکن آپ کے ساتھی کو بھی اس کی قید سے چھڑانے کا مسئلہ درپیش ہے کم و بیش میرا بھی یہی معاملہ ہے۔ ایسے میں وزیر جان نے مطالبہ بھی ایسا کر ڈالا کہ آپ کو لانے کی شرط میرے آگے ڈال دی۔ جو

انصاف

حضرت عمر فاروقؓ کے پاس ایک شخص نے آ کر شکایت کی کہ فلاں شخص نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ پست قد تھا۔ امیر المومنینؓ نے ازراہ تفنن فرمایا کہ رسول خدا کا فرمان ہے کہ چھوٹے قد کے لوگ کسی سے دھوکا نہیں کھاتے ہیں اس لیے تو جھوٹ بول رہا ہے۔

"نبی کریمؐ کا فرمان برحق یا امیر المومنین! لیکن جس شخص نے مجھے دھوکا دیا ہے، اس کا قد مجھ سے بھی چھوٹا ہے۔" اس شخص نے کہا۔

امیر المومنینؓ بے اختیار مسکرا دیے اور مدعا علیہ کو بلوا بھیجا۔

ایک سرمایہ دار اپنی سیکریٹری کو اس وعدے پر اپنے ساتھ اپنی بیوی کی حیثیت سے کاروباری دورے پر لے گیا کہ وہ واپس آ کر اسے زیورات کا سیٹ خرید دے گا۔

واپسی پر جب کئی روز تک سرمایہ دار نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو سیکریٹری نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔

"مجھے افسوس ہے ریشم بانو، میں کسی حسین ہمسفر کے بغیر کوئی کاروباری دورہ نہیں کر سکتا مگر میرے ساتھ مصیبت یہ ہے..." اس نے اپنا ایک ہاتھ سینے پر رکھا اور دوسرا سر پر اور بولا۔ "جب میرا دل نرم پڑتا ہے تو دماغ سختی پر اتر آتا ہے اور جب دماغ نرم ہوتا ہے تو دل کسی پتھر کی طرح سخت پڑ جاتا ہے۔"

سنگ دل خان کی سنگ دلی سنا خیل سے

☆☆☆

کلاس ٹیچر نے پوچھا۔ "بچو کیا تم بتا سکتے ہو کہ سانتا کلاز کہاں کا باشندہ ہے؟"

ایک آئرش طالب علم نے کھڑے ہو کر کہا۔ "میرے خیال میں سانتا کلاز جرمنی کا رہنے والا ہے کیونکہ وہ کرسمس پر جتنے بھی کھلونے میرے لیے لے کر آتا ہے، ان سب پر "میڈ اِن ہانگ کانگ" لکھا ہوتا ہے۔"

جارج کیج کی خامہ فرسائی کمرات سے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اگرچہ مجھے ہرگز قبول نہ تھی۔ مگر اس دوران آپ کے اچانک فون نے مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا کہ اب وزیر جان کے ساتھ ایسی کوئی ''ٹرک'' کھیلنی چاہیے کہ بظاہر تو اسے سب کچھ ویسا ہی ہوتا نظر آئے مگر موقع ملتے ہی میں اسے جل دینے کی کوشش کروں۔''

''میں تمہارے اس لائحہ عمل سے سو فیصد متفق ہوں شہزی۔'' بیگم صاحبہ یک دم پورے جوش سے بولیں۔ ''تقدیر نے شاید ہمیں ایک سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک مشترکہ مفاد کے حصول کی خاطر پھر یکجا کردیا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اب دیر نہیں کرو، مجھے اللہ پر بھروسا ہے اور تمہارے زورِ بازو پر بھی... سر پر تو ہم پہلے ہی اپنے کفن باندھے ہوئے ہیں پھر ڈرنا کیسا؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک عجیب سے جوش تلے میرا رُواں رُواں مرتعش تھا۔

بیگم صاحبہ نے مجھے مزید کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دیا اور ایک قیمتی سی شال نما چادر اوڑھ کر میرے ساتھ کار میں سوار ہوکر ولا سے نکل پڑیں۔

اب اصل اور خطرناک کھیل شروع ہونے والا ہے۔ آر یا پار... ہم ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اس بھاری بھرکم نئے ماڈل کی کار نے ہماری کار کا راستہ روک لیا۔ یہ ڈبل روڈ ہائی وے کی نسبتاً ویران سی جگہ تھی۔ کار میں سے تین افراد بڑی سرعت کے ساتھ اترے۔ بظاہر اُن کے ہاتھ خالی تھے مگر اندر سے یقیناً مسلح تھے، معاملہ چونکہ طے شدہ ''حوالگی'' کا تھا اس لیے انہوں نے سرِدست ہتھیاروں کی نمائش کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایک کھردرے چہرے والے نے تحکمانہ درشتی کے ساتھ ہمیں کار سے اترنے کا کہا۔ میں اور بیگم صاحبہ خاموشی کے ساتھ کار سے نیچے اتر گئے۔ ایک نے بیگم صاحبہ کے بازو کو بیدردی سے دبوچنے کی کوشش چاہی تو میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''خبردار! کوئی زبردستی یا بدتمیزی نہیں ہوگی، کیونکہ یہ سب رضاکارانہ طور پر ہورہا ہے۔''

اس کے ساتھی نے پہلے والے سے کہا۔ ''ٹیک اِٹ ایزی، کوئی زبردستی نہ کرو۔''

اس کے بعد اس نے بیگم صاحبہ کا بازو چھوڑ دیا پھر ہمیں عقبی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ میرے ساتھ ایک کارندہ بیٹھا تھا۔ دو ڈرائیور سمیت اگلی نشستوں پر تھے۔ چوتھے نے میری کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کے بعد دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوگئیں۔

☆☆☆

زندگی کیا ہوتی ہے، کس ڈھب پر چلاتی ہے، اس کا فیصلہ آنے والے وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ نہ زیردست کو اس کا اندازہ ہوتا ہے، نہ ہی زبردست اپنی طاقت کے زعم میں اس کا ادراک کرپاتا ہے مگر پیش آئندہ... حالات اور وقت کا ایک اصول اپنی جگہ اٹل رہتا ہے۔ یعنی وقت کی کوکھ میں جلاد بھی پرورش پاتا ہے اور نجات دہندہ بھی... اب یہ حالات زدگان پر منحصر ہے کہ وہ کب اور کس وقت اپنی تیسری آنکھ سے اس کی پہچان کرتے ہیں۔

مجھے خود پر زعم نہ تھا اور بے شک گوناگوں حالات کی ہلچل نے ایک استاد کی حیثیت سے مجھے اپنی شاگردی میں قبول کیا بھی تھا مگر باوصف اس کے کسی نہ کسی انسان کے اندر قدرت کی طرف سے کچھ غیر معمولی صلاحیت ودیعت بھی کی ہوتی ہیں، وہ کیا ہوتی ہیں؟ اسے پہچاننا اسے بروئے کار لانا ایک لازمی شرط ہے۔ میرا تیزی سے سوچتا، کام کرتا ذہن تیسری آنکھ سے ہی اس امرِ فہم کو تلاش رہا تھا جو بی ایس ایس کے سابقہ ٹریننگ سینٹر کے آئی کیو لیول کا حصہ تھی کہ کب دشمن کی گرفت کو جانچ کر راہِ مفر پایا جاسکتا ہے؟ اور کب پزل کے بکھرے ہوئے ٹکڑے کو درست مقام پر رکھتا ہے۔

میری کار میں ایک دشمن موجود تھا اور اکیلا ڈرائیو کررہا تھا۔ جس گاڑی میں مجھے اور بیگم صاحبہ کو سوار کرایا گیا تھا، اس میں ڈرائیور سمیت تین دشمن براجمان تھے جو یقیناً جدید ہتھیاروں سے لیس بھی تھے۔

سفر دھڑکتی پُراندیش خاموشی میں کٹ رہا تھا۔

گاڑیاں شہر کی حدود میں ہی تھیں۔ تاہم قدرے مضافات میں ایک مقام پر رک گئیں۔ میں نے کھڑکی سے گرد و پیش کا طائرانہ جائزہ لیا۔ سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ کیوں رکے تھے۔

''اب ان دونوں کے ہاتھ پشت کی سمت باندھ دو اور آنکھوں پر پٹی چڑھا دو۔'' دفعتاً اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ براجمان ایک دشمن نے اپنے ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ غالباً وہ اپنے تینوں ساتھیوں کو کمانڈ کررہا تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ ''ہم قیدی کی حیثیت سے وزیر جان کے پاس نہیں لے جائے جارہے ہیں، ہمارے بیچ ایک باضابطہ معاملہ طے ہوا ہے۔'' میرا لہجہ یکا یک بپھر گیا۔ میں کسی صورت میں رسن بستہ اور ''اندھا'' ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میری بات پر

یکلخت اس آدمی نے پھرتی کے ساتھ ایک لمبی نال والا پستول نکال کر پیچھے ہاتھ اور گردن گھماتے ہوئے رخ میری پیشانی کی طرف کردیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''فضول بکواس نہیں چلے گی، ورنہ مجھے تمہیں ادھر ہی گولی ماردینے کا حکم ملا ہوا ہے۔'' اس کی حرکت اور جارحانہ عزائم رکھنے والی گفتگو نے میرا دماغ الٹ دیا اور پھر جیسے سب پتہ الٹ گیا۔ زانو پر رکھا پہلے میرا دایاں ہاتھ برق کی طرح گھونسے کی صورت میں اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ یقیناً اسے میری جانب سے ایسی جوابی کارروائی کی توقع نہ تھی۔ نتیجتاً لمبی نال والا سائلنسر لگا پستول اس کے ہاتھ سے نکلا اور کار کی چھت سے ٹکرا کر میرے پیروں میں ہیں گرا۔ دائیں گھونسے کی حرکت کے گویا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں میرے بائیں بازو کی کہنی بھی حرکت میں آئی تھی اور اپنے ساتھ براجمان کسمساتے دشمن کی ٹھوڑی پر اس کی بھرپور ضرب لگاتے ہوئے میں نے دو باتوں کا خیال رکھا تھا۔ نمبر ایک ضرب زوردار ہو۔ نمبر دو ضرب ایسی ہو کہ نہ صرف اس کی ٹھوڑی پر پڑے بلکہ اس کی گردن کو بھی جھٹکا لگے اور ایسا ہوا بھی۔ وہ اوغ کی آواز کے ساتھ ڈھیلا پڑ گیا جبکہ ڈرائیور نے بھی مچلنے کی کوشش چاہی۔ میں تب تک قدرے جھک کر پائیدان سے پستول اٹھا چکا تھا۔

پستول ہاتھ میں آتے ہی میں نے سب سے پہلے لیڈ کرنے والے کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔ خاموش پستول کی دھڑکتی گولی نے اس کی کھوپڑی وحشیانہ حد تک چٹخا کر رکھ دی۔ ڈرائیور اپنا پستول نکال چکا تھا مگر اسے مڑ کر مجھ پر فائر کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میرے پستول کی خون ریز خاموشی ایک بار پھر ''زٹ'' کی آواز سے دھڑکی اور ڈرائیور کا دل آخری بار دھڑک کر بے حرکت ہوگیا۔ گولی نے اس کی گردن میں سوراخ کردیا تھا۔ میرے برابر میں بیٹھا دشمن پہلے ہی میری کہنی کی تباہ کن اور ''دوگلی'' ضرب سے تقریباً ڈھے چکا تھا۔ میں نے بڑے آرام سے اس کے پہلو سے نال لگا کر اسے بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا۔

بیگم صاحبہ کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے عقب میں مڑ کر بیک اسکرین کے پار دیکھا۔ چوتھا دشمن جسے اگلی گاڑی کے اندر ہونے والی ہلچل کی شاید ہلکی جھلک کا احساس ہوگیا تھا۔ پستول سنبھالے دروازہ کھولے میری کار سے اتر کر اسی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے شوٹنگ پاور کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے بیک اسکرین سے ہی نشانہ تاک کر لبلبی دبا دی۔ میرا خیال تھا چونکہ گولی ہدف پر پہنچنے سے پہلے کار کی بیک اسکرین کے شیشے سے ٹکرائے گی تو اس میں تھرتھراہٹ پیدا ہونے کے باعث اس کے نشانے پر فرق پڑے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ گولی ٹھیک نشانے پر ہی لگی تھی۔ میں نے اس کے پستول والے ہاتھ کو ہی نشانہ لیا تھا جو اس کے ہاتھ کو زخمی کرتے نکل چکا تھا پھر میں نہیں رکا اور بہ سرعت دروازہ کھول کر اس کی طرف لپکا۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ کو دبوچے کراہ رہا تھا۔ مجھے اپنی طرف دوڑتے پاکر اس نے گرے ہوئے پستول کو تلاش کرنا چاہا مگر تب تک میں اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔

بیگم صاحبہ بھی دشمنوں کی گاڑی سے اتر آئی تھیں۔ میں نے آخری دشمن کی گردن دبوچ لی۔ وہ ڈیل ڈول میں مجھ سے کم ہی تھا۔ میرے غلبہ پانے پر وہ ذرا خوف آمیز تشویش کا شکار بھی ہوگیا تھا۔

''تم لوگوں کا کھیل ختم ہوچکا۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں بتایا۔ ''تمہارے تینوں ساتھیوں کی خون آلود لاشیں گاڑی میں موجود ہیں۔ اب تم کیا کہتے ہو؟'' میں نے خوفناک غراہٹ سے کہا۔

''تت... تم نقصان اٹھاؤ گے۔ ہم چیف کے رابطے میں ہیں۔'' اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں مجھے دھمکانا چاہا۔

''غلطی تمہارے ساتھیوں کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ معاہدے کی خلاف ورزی کررہے تھے۔ ہم تو اب بھی تمہارے ساتھ جانا چاہتے ہیں مگر تمہارے ساتھی ہمیں اناشفیل کرنے کے چکر میں تھے۔'' میری چالاکی بروقت تھی جس نے اسے الجھا کے رکھ دیا۔

''آؤ، ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ جہاں تم ہمیں لے جانا چاہ رہے تھے۔'' میں نے پستول اپنی شرٹ کے اندر پینٹ کی بیلٹ میں اڑستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔ میں نے اسے کار کی جانب بڑھنے کا کہا۔

''میں پہلے چیف سے بات کروں گا تازہ صورتِ حال کی رپورٹ دینا لازمی ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے بے پروا انداز میں کاندھے اچکا کر کہا۔

''بے شک دو رپورٹ... میں تمہیں نہیں روکتا لیکن تمہیں کہنا وہی ہوگا اس سے جس کا میں تمہیں حکم دوں گا۔'' میں نے آخر میں سرسراتے لہجے میں کہا۔

''کک... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلایا۔ ''پہلے کار میں بیٹھو اور نکلو یہاں سے۔'' میں نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ناچار وہ کار کی طرف بڑھا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی جامہ تلاشی کے دوران میں نے اس کی جیب

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے برآمد ہونے والے رومال سے اس کے ہاتھ کا زخم باندھ دیا تاکہ کم ازکم خون کا اخراج کسی حد تک کم ہو۔

بیگم صاحبہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی جبکہ میں دشمن ہرکارے کے ساتھ عقبی سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

بیگم صاحبہ نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو میں نے دشمن ہرکارے سے کہا۔ ''اب چیف کو فون کر کے بتاؤ کہ کسی نامعلوم افراد نے ہم پر فائرنگ کردی تھی جس کے نتیجے میں تمہارے تینوں ساتھی ختم ہوگئے اور اب تم ہمیں رسن بستہ حالت میں لے کر روانہ ہوگئے ہو۔''

''میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔'' ہرکارے نے انکار کردیا۔ ''چیف کو شبہ ہوجائے گا پھر میری خیر نہیں ہوگی۔''

''خیر تو اب بھی تمہاری نہیں ہے۔ میں تمہاری موت تک کو مشکل بنادوں گا اور اس ویرانے میں اذیتیں دے کر تمہیں جہنم واصل کر ڈالوں گا، سمجھے تم۔'' میں نے خونخوار غراہٹ سے مشابہ آواز میں اسے تہدید کی۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر چیف اس کے علاوہ اپنے کسی ساتھی سے رابطہ کرے اور جواب نہ ملنے کی وجہ سے وہ کسی شبہے میں مبتلا ہوکر قبل از وقت اپنے کسی سفاکانہ عزائم پر عمل نہ کر بیٹھے، لہٰذا اس کے اپنے ہی ایک ساتھی کے ذریعے یہ جھوٹ بلوانا لازمی تھا۔

''ہونہہ... ٹھیک ہے مگر تم... وہاں پہنچ کر کیا خود کو چیف کے حوالے کردو گے؟'' اس نے کہا۔

''ہاں، کیونکہ ہمارے درمیان خونریزی کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ صرف اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہے۔ چلو اب وہی کرو جیسا میں نے کہا ہے۔'' میں نے چالاکی سے کام لیا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کو چہرے کے قریب کر کے اپنے چیف وزیر جان سے رابطہ کیا۔ اس کی رسٹ واچ میں ٹرانسمیٹر تھا۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے وزیر جان سے وہی کچھ کہہ ڈالا جس کا میں نے اسے حکم دیا تھا۔ میں دوسری طرف سے وزیر جان کی آواز کو نہیں سن پارہا تھا لیکن ہرکارے کے بتانے اور جواب دینے کے انداز سے ظاہر ہورہا تھا کہ وزیر جان سخت طیش میں آگیا تھا۔ میرا دل ایک بار پھر کسی اندیشناک وسوسوں تلے دھڑکنے لگا۔ یہاں صورتِ حال نازک بھی ہوسکتی تھی۔ وہ خبیث صفت ابلیس... ماں جی کو نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ تاہم اتنا مجھے یقین تھا کہ اس بات کی اسے تسلی ہوگی کہ اس کے دونوں شکار یعنی میں اور بیگم صاحبہ اب بھی اس کے ایک ہرکارے کے قبضے میں ہیں۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی ہرکارے نے کہا۔ ''وہی ہوا۔ چیف بھی سمجھ رہا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ تم نے مجھ پر قابو پا کے مجھے اس کے ساتھ خفیہ ٹھکانے پر چلنے کے لیے مجبور کیا ہوا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں غصے اور بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا پھر بولا۔ ''دیکھا جائے گا۔ تم مطلوبہ راستے کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتے چلو ہم اُدھر ہی جانا چاہتے ہیں۔'' پھر بیگم صاحبہ کو کار کی رفتار بڑھانے کا بھی کہہ ڈالا۔

ہرکارہ میرے حکم پر بلاچون وچرا عمل کررہا تھا۔ شاید اس کے لیے یہی بہت تھا کہ ہماری منزل اب بھی وہی تھی جو اس کی تھی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہرکارے کو دوبارہ چیف کی کال موصول ہوئی۔ دوسری طرف سے شاید وزیر جان نے اپنے ہرکارے سے مختصراً کچھ کہا تھا اور فوراً رابطہ منقطع بھی کردیا تھا۔ میں چونکا۔ ہرکارے کے چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی، بولا۔ ''چیف سمجھ چکا ہے کہ تم کون سی چال چل رہے ہو انہوں نے تمہارے لیے ایک چھوٹا سا پیغام دیا ہے۔''

''کیسا پیغام؟'' بے اختیار میرے منہ سے دھڑکتے الفاظ برآمد ہوئے۔

''تمہاری کار میں ریڈیو ہے؟''

''ہاں۔''

''اسے آن کرو... ایک بڑی اہم خبر نشر ہورہی ہے۔'' ہرکارے نے کہا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ چہرہ تشویش سے سیاہ پڑ گیا۔ بیگ صاحبہ نے بھی اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے فوراً ڈیش بورڈ میں نصب ریڈیو آن کردیا۔

ملک بھر میں ایک چیختی چلاتی خبر دھواں دھار انداز میں نشر ہورہی تھی۔ یہ خبر ایسی تھی کہ بے اختیار بیگم صاحبہ نے کار کے بریک لگادیے تھے۔ اور کار کے ٹائر سخ خراش آواز سے چرچرائے تھے۔ پھر کار ایک جھٹکے سے رک گئی تھی مگر مجھے کہاں ہوش تھا۔ خبریں جاری تھیں۔ مختلف تبصرے تجزیے بھی ہورہے تھے۔ اس اہم ترین خبر سے :نیائے میڈیا میں بڑی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے وجود سے جان ہی نہیں روح تک نکل جاری ہو۔ دشمنوں نے تڑپ کا آخری پتا بالآخر پھینک دیا تھا۔ بالکل اسی طرح... جیسے ایٹم بم پھینک دیا ہو۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

بے خطا

آصف ملک

ادھورے کاموں کی تکمیل از حد ضروری ہوتی ہے... خصوصاً ان لوگوں کے نزدیک جو وقت اور کام کی اہمیت کو سمجھتے ہیں... وہ ماہرِ فن تھا... کام کی نوعیت اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے پہلی ترجیح دیتا تھا... لیکن اس بار اس کے ساتھ وہ کچھ ہورہا تھا... جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا...

کام ادھورا نہ چھوڑنے والے تجربہ کار ہنرمند کی کارگزاری...

الارم کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ اگرچہ اس کا سر گھوم رہا تھا اور زبان کا ذائقہ بے حد خراب تھا کیونکہ وہ رات دو بجے تک ایک بار میں تھا اور چار بجے تک ایک کال گرل کے ساتھ اس کے فلیٹ میں رہا۔ فلیٹ میں وہ وسکی کی بوتل سے شغل کرتا رہا جو وہ اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ پانچ بجے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں آکر بستر پر گرا تو آٹھ بجے الارم نے اسے اٹھادیا۔ اس کا دل چاہا کہ پھر لیٹ جائے مگر وہ عادت سے مجبور تھا اس لیے ڈولتے سر کے ساتھ وہ واش

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 17

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی، اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

READING
Section

کار میں نصب ریڈیو سے وہ چیختی چلاتی خبر نہیں، گویا لفظوں کے کھولتے لاوے اُگلے جا رہے تھے جو میرے وجود کیا روح تک کو بھسم کیے دے رہے تھے۔

میری حالت غیر ہونے لگی۔ سر تا پا جیسے ایک جنونِ ناگہاں کی سی کیفیت طاری ہونے لگی، جی چاہتا تھا ایک ہی ہلے میں سب کچھ ختم کر ڈالوں اور خود کو بھی۔

یہ سب کیا تھا؟ خود مجھے بھی یقین کرنے میں تامل ہو رہا تھا۔ ایک دُھواں سا میرے اندر اُٹھا تھا کہ جس نے میرے پورے وجود کو بے دم سا کر کے رکھ دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جس نے مجھے ایک خوفناک ہراس میں مبتلا کیا تھا۔

”شش... شہزی! کک... کیا... واقعی ایسا ہوا ہے؟“

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان بیگم صاحبہ کی لڑکھڑاتی آواز اُبھری تھی۔ میری طرح شاید انہیں بھی اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

”یہ ریڈیو ہے... اور بین الاقوامی نشریات پر ایسی اہم خبر جھوٹ نہیں ہو سکتی۔“ میرے ساتھ بیٹھے زخمی ہرکارے نے گویا ہماری کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ وہ اب تک اندازہ لگا چکا تھا کہ ان خبروں سے ہمارا ہی تعلق ہو سکتا تھا۔

جان ایف کینیڈی ائرپورٹ پر ایف بی آئی کے اہلکاروں نے سرمد بابا، عابدہ اور عارفہ کو عین اس وقت اپنی تحویل میں لے لیا تھا جب وہ تینوں امریکا سے واپس پاکستان لوٹ رہے تھے۔ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے چیکنگ اور ”اسکیننگ“ کے دوران یہ چونکا دینے والا انکشاف ہوا تھا کہ عارفہ کے جسم کے اندر وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والا ایک بم فٹ کیا گیا تھا۔ مبینہ طور پر اسے امریکن طیارہ پین ایم اُڑانے کی ایک بھیانک سازش قرار دیا گیا تھا۔ یہ ایک ریموٹ کنٹرول ڈیوائس بم تھا۔ جبکہ انہی دنوں ورلڈ ٹریڈ سینٹر، نائن الیون کا واقعہ جسے امریکی سانحے سے تعبیر کیا جاتا ہے، تازہ تازہ رونما ہو چکا تھا۔

ریڈیو سی این این کے مطابق مذکورہ تینوں افراد کو ”عالمی دہشت گردوں“ کا ساتھی سمجھا جا رہا تھا۔ جبکہ اس سلسلے میں سرمد بابا نے ائرپورٹ پہ چلا چلا کر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی بھی کوشش چاہی تھی کہ انہیں عالمی دہشت گردوں نے نہیں بلکہ ان کے اپنے ہی (امریکی) لوگوں نے ایک سوچی سمجھی سازش میں پھانسنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ اس ضمن میں ثبوت کے طور پر انہوں نے وہاں کے میڈیا کو واضح بتایا کہ یہ بات آن دی ریکارڈ ہے کہ میری بیوہ بہو عارفہ ایک بیمار خاتون تھی اور پچھلے کئی روز سے وہ یہاں کے ایک بڑے اسپتال میں جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں ایڈمٹ تھی۔ نیز ثبوت کے طور پر اس کی پوری میڈیکل ہسٹری کا ریکارڈ مذکورہ مقامی اسپتال میں اب بھی موجود ہے۔ جہاں عارفہ کے جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں ڈاکٹرز نے دوبارہ آپریشن کیا کہ پہلے آپریشن میں پیچیدگی کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے اور یہ سوچی سمجھی سازش یقیناً اس دوسری بار کیے گئے آپریشن کے دوران ہی تیار کی گئی ہوگی۔

اس دوران ایک امریکی نژاد مسلم لیڈی رپورٹر آنسہ خالدہ نے بھی سرمد بابا وغیرہ کے کیس کی حمایت کرتے ہوئے اعلیٰ امریکی حکام سے درخواست کی تھی کہ انہیں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لوئر (وکیل) فراہم کیا جائے۔

مجھے آج عابدہ کے سارے انجانے وسوسے اور خدشات یاد آنے لگے، جن کا اظہار وہ اکثر و بیشتر ٹیلی فون پر مجھ سے کرتی رہتی تھی، بالخصوص پاسکل ہو لارڈ کے حوالے سے وہ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ سی رہتی تھی جبکہ میں اس بیچاری کو تسلیاں ہی دیتا رہ گیا تھا کہ یہ محض اس کا وہم تھا۔

میرے ہونٹ سوکھنے لگے تھے اور حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھ سے شدید صدمے کے باعث بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اگلی سیٹ پر براجمان بیگم صاحبہ نے بیک ویو مرر پر میری کیفیات بھانپتے ہوئے مجھے تسلی دینا چاہی تھی مگر وہ خود بھی پریشان تھیں۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے، کون سا قدم پہلے اٹھایا جائے؟ دل و دماغ بالکل ماؤف ہو رہے تھے۔

ایسے میں بیگم صاحبہ نے تشفی آمیز اور حوصلہ دیتے لفظوں میں کہا۔ ”شہزی! خود کو سنبھالو، ہم اس وقت خود ایک اہم مشن میں مصروف ہیں جو ایک خطرناک نہج پر ہے، ہماری ذرا سی غفلت اور عدم توجہی خدانخواستہ ماں کی جان کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ میں اب گاڑی آگے بڑھا رہی ہوں۔“ کہتے ہوئے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

ان کی بات بھی سچ تھی۔ ہم خود اس وقت ایک خطرناک اور جان لیوا سچویشن کا شکار تھے۔ وزیر جان کے تین ہرکارے میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکے تھے۔ چوتھا

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہمارے قبضے میں تھا۔ یرغمال ہرکارے کے ذریعے ہماری وزیر جان کو بھی باور کرانے کی سعی تھی کہ اب تک سب کچھ اس کی مرضی اور حسبِ منشا ہو رہا ہے۔ لیکن بقول اس کے ہرکارے کے، چیف (وزیر جان) کو اب تک شبہ ہو چکا ہوگا۔ یوں بھی یہ زیادہ دیر تک چھپنے والی بات نہیں تھی۔

ابھی میں اسی ذہنی اُکھاڑ پچھاڑ اور ژولیدگی کا شکار تھا کہ وزیر جان کی دوبارہ کال موصول ہوئی۔ تب تک میرے دل و دماغ نے بیگم صاحبہ کی نصیحت کا اثر قبول کر لیا تھا اور اب میں موجودہ مخدوش سچویشن کے بارے میں غور بھی کرنے لگا تھا۔

ہرکارے نے فوراً وزیر جان سے میری بات کرا دی۔ ''ہوں۔ تو تم نے آخر وہی کچھ کیا، جس کی میں نے تمہیں سختی سے ممانعت کی تھی۔ ایسا کیوں کیا تم نے شہزی؟ کیا تم نہیں جانتے تھے کہ تمہاری ماں اس وقت ہمارے قبضے میں ہے... اور... اور... میرے تین ساتھیوں کو بھی تم نے ہلاک کر ڈالا... کیوں؟''

اس کے تہدیدی اندازِ تخاطب نے مجھے ایک لمحے کو دہلا دیا تھا۔ تاہم میں نے پورے اعتماد اور متانت سے کہا۔ ''اپنے ساتھی سے پوچھ لو حقیقت کیا ہے۔ میں اَب تک مِن و عن تمہاری نصیحت پر ہی عمل کر رہا تھا۔ جس کا ثبوت میرا بیگم ولا جانا اور وہاں سے بیگم صاحبہ کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ وہ اس وقت بھی میرے ساتھ موجود ہیں مگر تمہارے ساتھیوں نے خود ہی معاہدے کی خلاف ورزی کی کوشش چاہی تھی، جس میں یقیناً تمہاری ہی ہدایت شامل رہی ہوگی، جو کچھ ہمارے بیچ پہلے سے طے تھا اُسے اچانک بعد میں کیوں بدلا گیا؟ جس کے نتیجے میں مجھے حرکت میں آنا پڑا۔'' میں نے بڑی چالاکی سے بات کی ذمے داری اسی پر ڈال دی۔

''اچھا!'' دوسری جانب سے اس کی استہزائیہ آواز اُبھری۔ ''اور... تم میرے اتنے ہی فرماں بردار نکلے کہ تم نے اب تک بالکل ویسا ہی کیا جیسا کہ میں نے تمہیں ہدایت کی تھی اور مزید یہ کہ بیگم صاحبہ تمہارے ساتھ اتنی آسانی سے گویا کچے دھاگے سے بندھی چلی آئیں؟''

''وزیر جان! مجھے تمہارے لہجے سے منافقت اور دوغلے پن کی بو آ رہی ہے اور تم اپنے تئیں اس طرح کے لغو اور بے محل اندازے قائم کر کے مزید کیا گل کھلانا چاہتے ہو؟ صاف اور سیدھی بات ہے، تمہیں ہم سے غرض ہے اور ہم تمہاری طرف ہی آ رہے ہیں۔ بدلے میں میری ماں کو اور بیگم صاحبہ کے آدمی کو تمہیں ہمارے حوالے کرنا ہوگا۔''

اس بار گفتگو واکی ٹاکی ٹرانسمیٹر کے بجائے سیل فون پر ہو رہی تھی۔ اور یہ اس کے ہرکارے کا ہی سیل فون تھا۔

''واٹ؟'' دوسری جانب سے اس کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری، جس نے مجھے بھی ایک لمحے کو ٹھٹکا سا دیا تھا۔ ''کون سا آدمی؟ کیسا آدمی؟''

''وہی آدمی جسے تم نے یرغمال بنا رکھا ہے۔'' میں نے اُسے یاد دلایا۔ کہتے ہوئے میری نظر ونڈ اسکرین کے اُوپر لگے بیک ویو مرر پر پڑی، جہاں مجھے گاہے بہ گاہے اپنی جانب تکتا ہوا بیگم صاحبہ کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں مجھے کچھ پریشان کن بے چینی کے آثار نمودار ہوتے محسوس ہوئے۔ اسی لمحے وزیر جان کی آواز اُبھری۔

''میں نہیں جانتا کہ تم کس آدمی کی بات کر رہے ہو؟ یقیناً اس عورت نے تمہیں دھوکا دینے کی کوشش کی ہے۔ مگر اتنا یاد رکھنا شہزی! میرے ساتھ کسی قسم کے دھوکے اور چال بازی کا سوچنا بھی نہیں، اور یہ بھی مت بھولنا کہ تمہاری ماں اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ میں بہرحال تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اور میں اُلجھن آمیز حیرت کا شکار ہو کر بیک ویو مرر میں بیگم صاحبہ کا چہرہ تکنے لگا۔ میری گھورتی ہوئی تیز اور سوالیہ نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے بیگم صاحبہ نے اٹکتے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''شش... شہزی! ابھی اس بات کو چھوڑو، پلیز۔''

''لیکن بیگم صاحبہ! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ وزیر جان نے آپ کے کسی اہم ساتھی کو یرغمال...''

''پلیز! فار گاڈ سیک شہزی، ابھی ان باتوں کا وقت نہیں۔'' وہ اس بار قدرے جھلائی ہوئی آواز میں بولیں۔

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر چپ ہو رہا۔

ایک دورویہ موڑ کے قریب پہنچ کر بیگم صاحبہ نے کار کی رفتار دھیمی کر لی اور اُکھڑی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''گاڑی کس طرف موڑنی ہے؟''

''دائیں جانب موڑ کاٹ لو۔'' ہرکارے نے فوراً بتایا۔ میرے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ کیا پُراسرار معاملہ ہے؟ بیگم صاحبہ میرے ساتھ کیا کرنا چاہ رہی ہیں؟ انہوں نے مجھ سے آخر جھوٹ کیوں بولا تھا کہ وہ اس لیے میرے ساتھ جانے پر رضامند تھیں کہ وہ وزیر جان کے قبضے سے اپنا کوئی اہم آدمی چھڑانے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ کیا اس طرح مجھ سے جھوٹ بول کر وہ میری کوئی مشکل آسان کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں یا میری مدد کرنا چاہتی تھیں؟ مگر سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہیں کیسے میری مشکل کا علم ہوا؟ میں نے تو انہیں اس سلسلے میں ابھی کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ جبکہ بیگم صاحبہ نے خود مجھ سے فون پر عین آخری وقت پر رابطہ کیا تھا۔

انہوں نے مجھ سے مدد چاہی تھی، تو کیا وہ درحقیقت میری مدد کرنا چاہتی تھیں؟ مگر کیوں اور کیسے؟

''گاڑی روکیے بیگم صاحبہ!'' دفعتاً ہی میں چلا اُٹھا اور بیگم صاحبہ نے فوراً بریک لگا دیے۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ بیگم صاحبہ نے میری جانب گردن موڑ کر کچھ عجیب سی نگاہوں سے دیکھا تو میں نے بھی ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ کو مجھے حقیقت بتانا ہوگی۔ یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ کو پہلے ہی سے میری اس مشکل کا علم تھا؟ مگر کیسے؟''

''شہزی! ماں جی کی جان خطرے میں ہے۔ میں پھر کہہ رہی ہوں یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔'' وہ بڑے رسان سے بولیں۔

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے بیگم صاحبہ! مگر میں اپنی ذاتی غرض کی خاطر کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ کی جان کو بھی خطرے میں ڈالوں۔ آپ نے یہ اچھا نہیں کیا لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ آخر آپ کو میری پریشانی کا علم کیسے ہوا؟''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ یکلخت میرے ذہن رسا میں ایک خیال کلک ہوا۔ اور پھر جیسے خود ہی ساری بات میری سمجھ میں آتی چلی گئی۔ میرا چہرہ جوش سے یک دم سرخ ہوگیا۔ اور پھر میں نے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھ کر سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

''کک... کہیں... اول خیر یا شکیلہ نے میرے علم میں لائے بغیر آپ سے اس سلسلے میں کوئی رابطہ تو نہیں کیا تھا؟'' میں نے دیکھا، میری بات پر ان کا شہابی رنگت چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔

''شہزی! کبھی کبھی تم بہت اذیت پسند ہونے لگتے ہو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولیں۔ ''جو بات مخفی ہے اُسے چھپا کیوں نہیں رہنے دیتے۔ کیوں اس طرح بال کی کھال نکالنے پر تلے رہتے ہو؟''

''بیگم صاحبہ! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''آپ کو بتانا پڑے گا کہ کیا اول خیر نے آپ سے فون پر کوئی رابطہ کیا تھا؟''

''نہیں۔''

''جھوٹ مت بولیں۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مگر اول خیر کے ایما پر شکیلہ نے مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا تھا اور تمہاری پریشانی سے متعلق آگاہ کیا تھا۔ بعد میں اول خیر نے بھی مجھ سے بات کی تھی۔ تب میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم اس طرح ہرگز نہیں مانو گے اس لیے تم سے یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ تمہاری مشکل میری مشکل ہے۔''

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ سب اول خیر کا ہی کیا دھرا تھا۔ جب وزیر جان نے بیگم صاحبہ کو لانے کی شرط رکھی تھی تو میں بڑی پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

ظاہر ہے میں وزیر جان کی یہ شرط کبھی نہیں مان سکتا تھا، اور یہ بات اول خیر بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ مگر اُسے اُمید تھی کہ اگر وہ بیگم صاحبہ کے سامنے یہ نازک مسئلہ رکھے تو وہ کچھ مدد کر سکتی تھیں۔ اول خیر جانتا تھا کہ میں اسے ایسا کرنے سے منع کروں گا۔ اس لیے مجھے بتائے بغیر ہی یہ قدم اُٹھایا تھا مگر اب حقیقت آشکارا ہوتے ہی میں ایک اُلجھن آمیز پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

''پہنچنے میں تاخیر مت کرو مسٹر شہزاد! چیف ہر بات کی ایک حد تک پروا کرتا ہے، اس کے بعد وہی کرتا ہے جس کا وہ ارادہ کیے ہوئے ہو۔''

ہمیں آپس میں اُلجھا ہوا پا کر ہرکارے نے مداخلت کر ڈالی۔ شاید اُسے بھی ڈر تھا کہ تاخیر کے باعث وزیر خان خدانخواستہ کوئی ایسا ویسا قدم نہ اُٹھا لے اور نتیجے میں وہ، یعنی ہرکارہ، ہمارے جوابی انتقام کے زیرِ عتاب نہ آ جائے۔

بیگم صاحبہ نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔ اَب میرے پاس بھی شاید اس سلسلے میں کوئی دوسرا قدم اُٹھانے کا وقت نہ رہا تھا۔ ہم کافی دور نکل آئے تھے۔ اسی دوران ہرکارے کو وزیر جان کی ہدایت نما کال موصول ہوئی۔ اس بار یہ کال واچ ٹرانسمیٹر پر وصول ہوئی۔ جس کے مطابق ہمیں ایک ویران اور نیم جنگلاتی مقام پر رُکنے کا کہا گیا تھا۔ وہاں سے ہمیں وزیر جان کے ساتھی اس کے خفیہ ٹھکانے کی طرف لے جاتے۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر بیگم صاحبہ نے کار روک دی۔ تب تک میں اپنے تئیں ایک خوفناک فیصلے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ چکا تھا۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یہ ایک خطرناک چال تھی۔ جو چال کم اور جوا زیادہ تھی، مگر اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا جبکہ اب بیگم صاحبہ کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔

کار رک گئی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا اور پُرہیبت سی خاموشی کا راج۔ ہر سو تاریکی پھیلنے لگی تھی۔

مجھے کرنا وہی تھا جو میرے دل میں تھا۔ میں گرد و پیش پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم اس وقت کہاں ہو سکتے تھے۔

مجھے یہ ساہیوال کے کسی قریبی دیہاتی علاقے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم ساہیوال سے کتنی دوری پر تھے؟ تاہم کچھ تو اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہ قریبی مقام ہو سکتا ہے جہاں ''اسپیکٹرم'' کی اسٹیشن فورنامی عمارت واقع تھی، جسے بعد میں کسی بین الاقوامی این جی او کا دفتر ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

اس اندازے پر میرا ماتھا ٹھنکنا لازمی تھا۔ تو گویا وزیر جان کی موجودہ ''کچھار'' اب بھی اسٹیشن فور کی وہی خفیہ عمارت ہی ہو سکتی تھی، جہاں تھوڑے دنوں پہلے میری اس سے مڈبھیڑ ہو چکی تھی؟ اس کا مطلب تھا زیرو ہاؤس کی میرے ہاتھوں تباہی اور اسپیکٹرم کے ''ہینڈلر'' ایجنٹ آرک لوچن کے جہنم واصل ہونے کے بعد میں نے ان کے اسٹیشن چیف وزیر جان کو بھی اپنے پرانے ٹھکانوں تک ہی محدود رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اچانک تاریکی میں جہاں کیکر اور سرس کے مشترکہ جھنڈ تھے، کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دی۔ میں ٹھٹک گیا۔ اپنے مطلوبہ منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا وقت آچکا تھا۔ وزیر جان کے ساتھی پہنچ رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی دیکھ کر مغلوب ہرکارہ بھی کافی مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس کی طمانیت اس وقت کافور ہو گئی جب میں نے اپنی جیب سے پستول نکال کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری اس حرکت کو گھورتے ہوئے ہرکارے کی کنپٹی پہ اس کا دستہ زور سے ''دھا'' دیا۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز خارج کر کے ڈھے گیا۔

''یہ کیا... کیا تم نے شہزی؟ اس کے ساتھی آرہے ہیں۔'' بیگم صاحبہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ایسے وقت میں میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیگم صاحبہ! جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ آپ گاڑی کی تمام لائٹس گل کر دیں۔ جلدی۔'' انھوں نے فوراً ہی کیا۔ اب قرب و جوار میں گہری تاریکی کا راج تھا۔

میں دروازہ کھول کر کار سے اُتر گیا۔ میری نظریں ہنوز قریب آتی روشنی پر مرکوز تھیں، پھر میں نے بیگم صاحبہ کو بھی نیچے اُترنے کا کہا اور برق سرعت کے ساتھ قریبی جھاڑیوں کی سمت بڑھ گیا، میرے خفیف اشارے پر بیگم صاحبہ نے بھی میری تقلید کی تھی۔

میری نظریں سامنے مرکوز تھیں۔ وہ کار تھی جو ہماری کار کے قریب آن رکی تھی۔ اس میں سے دو افراد برآمد ہوئے۔ مجھے ان کی کار کی ہیڈ لائٹس میں ان پستولوں کی چمک صاف دکھائی دے گئی جو اُن کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔

دونوں چوکس انداز میں کار کی طرف بڑھے۔ میں نے دھیمی سرگوشی میں بیگم صاحبہ کو اپنی جگہ دُبکے رہنے کا کہا اور خود تیزی کے ساتھ تاریکی میں ایک طرف رینگ گیا۔ ساتھ ہی میری نظریں بدستور ان دونوں پر بھی مرکوز تھیں۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ دونوں وزیر جان کے ہی بھیجے ہوئے آدمی تھے مگر اس وقت وہ کار میں ہمارے ''غیاب'' پر اور اپنے زخمی ساتھی کو بے ہوش پڑے دیکھ کر اپنے گرد و پیش سے بہت زیادہ محتاط نظر آرہے تھے۔ پھر ایک کو میں نے اپنی کلائی منہ کے قریب کرتے اور دوسرے کو جیب سے ایک ٹارچ نکال کر روشن کرتے دیکھا۔ وہ چھوٹی مگر روشنی کا وسیع دائرہ رکھنے والی ایک طاقت ور ٹارچ تھی۔ جس کی روشنی وہ گرد و پیش میں پھینک رہا تھا، اور پھر دفعتاً ہی میں نے اُسے چونک کر اپنے ساتھی سے کہتے سنا جو اپنی واچ ٹرانسمٹر پر غالباً اپنے چیف وزیر جان کو موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے میں مصروف تھا۔

''وہاں کوئی ہے۔''

اس کی بات پر خود میں بُری طرح ٹھٹک گیا، ضرور اسے قریبی جھنڈ میں دبکی ہوئی بیگم صاحبہ کی جھلک نظر آگئی تھی۔ تب میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا نہایت ہوشیاری کے ساتھ رینگ کر ان کی کار کے عقب میں آگیا۔

ٹرانسمٹر والے نے اپنے ٹارچ والے ساتھی سے کہا۔ ''تم جا کر دیکھو، کون ہے وہاں۔ میں تمھیں کور کرتا ہوں۔ خطرہ محسوس کرتے ہی بے شک گولی چلا دینا۔''

ٹارچ والا اپنے دوسرے ہاتھ میں پستول تھامے مذکورہ جھنڈ کی طرف بڑھ گیا۔

بیگم صاحبہ خطرے میں تھیں۔ یقیناً انھوں نے بھی خطرہ محسوس کر لیا ہوگا۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ بھی

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر جانے کی اہلیت رکھتی تھیں لیکن ادھر میرے بھی حرکت میں آنے کا وقت آن پہنچا تھا اور پھر میں نہیں رکا۔

کسی چیتے کی طرح میں نے ٹرانسمیٹر والے پر جست لگادی۔ حالات کا تقاضا تھا کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر زیر کرلیا جائے اور میں نے یہی کیا۔ اس پر جست لگاتے ہی میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کا دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے پر رسید کردیا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس وحرکت ہوگیا۔ اِدھر آگے بڑھتے ہوئے اس کے ساتھی کو پیچھے گڑبڑ کا احساس ہوا اور وہ یکدم پلٹا۔ تب تک میں بہ سرعت ایک بار پھر کار کے عقب میں رینگ گیا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر اپنے ساتھی کی خبر چار لینے کے لیے پستول تانے تقریباً دوڑتا ہوا پلٹا تو میں جھکا جھکا کار کی دوسری طرف کی آڑ لیے اچانک ہی اس کے عقب میں نمودار ہوا، وہ عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس پاکر یکدم پلٹا تھا کہ میں نے بلاتاخیر اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلادی۔

فاصلہ قریب ہونے کے باعث میرا نشانہ نہیں چوکا تھا۔ نتیجتاً اس کا پستول والا ہاتھ بری طرح چج گیا۔ اُس کے پستول سے محروم ہوتے ہی میں نے اُسے جالیا۔ اس نے مجھے بھٹکانے کے لیے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر ڈالی۔ چند ثانیے کے لیے تو میری آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ لیکن باوجود اس کے میں نے اسے دبوچ لیا۔ مگر اس نے بھی موقع پاتے ہی زخمی ہونے کے باوجود میرے پیٹ پر ایک گھٹنا رسید کردیا۔ درد کی ایک جاں کش لہر نے مجھے تڑپا کر رکھ دیا۔

بلاشبہ وہ اسپیکٹرم کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھا، اس نے مجھے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اپنے بائیں ہاتھ کی کہنی میری ٹھوڑی پہ جڑ دی مگر یہ ضرب کچھ زیادہ کاری ثابت نہیں ہوئی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اپنے سر کی ایک بھرپور ٹکر اس کے سینے پر رسید کردی۔ جس سے وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا اور پھر مجھے اس پر پستول تاننے کا موقع مل گیا، مگر میں اسے ابھی واصلِ جہنم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میں اسے اب تک گولی کا نشانہ بنا چکا ہوتا۔

''خبردار! اب اگر تم نے کوئی غلط حرکت کی تو بھیجا اُڑا دوں گا تمہارا۔'' میں نے وحشت ناک لہجے میں کہا تو وہ بلا خوف ایک وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔

''بہت بُرا پچھتاؤ گے تم۔ چیف پہلے ہی تم پر بُری طرح بگڑا ہوا ہے۔ تم نے ہمارے تین ساتھی جان سے مار ڈالے اور...''

اسی وقت میرے پستول کی نال سے ایک شعلہ چمکا۔ گولی اس کے بازو پر لگی۔ وہ چیخا۔ میری نال نے دوسرا شعلہ اُگلا۔ اس کا دایاں گھٹنا چج گیا۔ تیسرے شعلے کے دھما..... نے اس کی دوسری ٹانگ کی ران کو چھید ڈالا۔

''بب... بب... بس کرو، خ... خدا کے لیے... بب... بس کردو اب...'' وہ دھڑام سے گر کر فریاد کرنے لگا۔ طاقت اور برتری کے گھمنڈ میں مبتلا اس ہرکارے کی ساری اکڑفوں ہوا ہونے لگی تھی۔

اس دوران بیگم صاحبہ بھی اپنی پناہ گاہ سے نکل آئی تھیں۔ پستول اب ان کے ہاتھ میں بھی چمک رہا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس میں وہ شاید یہ سارا تماشائے خوں رنگ دیکھ رہی تھیں، پھر مجھے غالب پاکر وہ قریب آگئیں۔

میں ہونٹ بھینچتا ہوا زمین بوس زخمی ہرکارے کی طرف بڑھا اور اکڑوں بیٹھ کر اپنا ایک گھٹنا اس کے سینے پر ٹکا دیا جبکہ پستول کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''جب میں خود ہی تمہارے.... چیف کا شکارنے کر اسٹیشن فور آرہا تھا تو پھر وزیر جان نے میرے ساتھ کیوں بددیانتی کی... بولو؟''

میری اس ساری رسک بھری کاوش کا نتیجہ خیز نچوڑ اس جملے میں پوشیدہ تھا، جو میں نے اس پر نفسیاتی داؤ کھیلتے ہوئے ادا کیا تھا۔

میری بات پر وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گیا اور بالآخر غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے بوکھلاہٹ میں وہی کچھ... برآمد ہوا جو میں اُگلوانا چاہتا تھا۔

''تت... تت... تمہیں کیسے پتا چلا کہ چیف اس وقت اسٹیشن فور...'' پھر دفعتاً ہی جیسے اسے میری چال کا احساس ہوا اور وہ بولتے بولتے رُکا تو میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میری کار کے اندر موجود تمہارے ساتھی نے مجھے سب بتادیا تھا اور چیف نے بھی اُسے یہی ہدایت دی تھی کہ وہ ہمیں اسٹیشن فور کی عمارت لے کر پہنچے۔''

''تت... تو پھر یہ سارا کھڑاگ پیدا کرنے کی تمہیں کیا ضرورت تھی... آہ...'' وہ آخر میں کراہ کے رہ گیا۔ اس کے زخموں سے اب بھل بھل خون بہنے لگا تھا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری ہونے لگی تھی۔ میرا مقصد پورا ہوچکا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو اشارہ کیا اور اپنی کار کی طرف لپکا۔ عقبی دروازہ کھولا اور پہلے والے ہرکارے کو، جو ہنوز

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بے سدھ تھا، گھسیٹ کر باہر پھینکا اور بیگم صاحبہ کو کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ اسی وقت اور فوراً واپس بیگم ولا لوٹ جائیں۔ میرا میدان اب صاف ہے۔''

''ل... لیکن... تم؟'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میں ان کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

''خدا کے لیے بیگم صاحبہ! میری محنت پر پانی نہ پھیریں۔ میں نے آپ کی جان بچانے اور اپنا میدان صاف کرنے کے لیے جو جوا کھیلا ہے، اس کی متوقع جیت اب زیادہ دور نہیں ہے۔ آپ جلدی سے واپس اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جائیں۔ میرے پاس وقت کم ہے اور... یہ سارا کھیل ہی بروقت حرکت کرنے کا ہے، ورنہ... ورنہ میں ہار جاؤں گا۔''

اُنہیں میری بات سمجھ آگئی۔ ان کی کشادہ آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں پھر نہیں رُکا۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ دُشمن کی کار سنبھالی۔ حسب توقع اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ انجن بھی اسٹارٹ تھا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں کار فراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

میں اپنی غیر معمولی ذہنی فراست اور بروقت قوتِ فیصلہ کے بل بوتے پر ایک پنتھ دو کاج نمٹانے میں کسی حد تک کامیاب رہا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو کسی خطرے میں گھرنے سے بچا کے اُنہیں واپس اپنے محفوظ ٹھکانے کی طرف لوٹا دیا تھا، دوسرے میں وزیر جان کی ''متوقع دستیابی''... کا ٹھکانا بھی معلوم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جانے پہچانے گردوپیش کے مقامات سے بہت جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں ٹھیک سمت پر گامزن تھا اور اسٹیشن فور کی عمارت اب زیادہ دوری پر نہیں رہی تھی۔

اگلے چند منٹوں کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں بالآخر اسٹیشن فور کی عمارت سے ذرا فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ کار کا انجن بند کیا اور باہر نکل آیا۔ پستول میری جیب میں تھا۔ میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ چونکہ یہ مین شاہراہ سے الگ تھلگ اور دیہاتی مضافاتی علاقہ تھا، رقبہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس لیے ہر طرف گہرے سناٹے کا راج تھا۔ دور کہیں آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اسٹیشن فور کی عمارت میں باہر اور اطراف کی لوکیشن دیکھنے کے لیے اندر خفیہ کیمرے نصب تھے۔ اسی لیے میں زیادہ محتاط روی اختیار کیے ہوئے تھا۔ لہٰذا تاریکی اور اریب قریب بنے پختہ و نیم پختہ مکانوں کی دیواروں کی آڑ لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ پر مجھے رُکنا پڑا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے میرا گزرنا لازمی تھا۔ اور کوئی متبادل راستہ بھی نہیں تھا۔ مگر اسی راستے سے میں خفیہ کیمروں کی زد میں آسکتا تھا۔ ابھی میں ہونٹ بھینچے کسی تدبیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک ایک آواز پر میں چونکا۔

اسی راستے پر ایک بیل گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس کے چوبی تختے کے نیچے لالٹین جھول رہی تھی۔ فوراً ہی میرے ذہن میں ایک تدبیر سمائی۔ میں اپنی جگہ ہوشیاری سے دبک گیا۔ بیل گاڑی قریب آرہی تھی۔ جس کے جوئے میں دو بیل جتے ہوئے تھے اور اس پر ایک بڑا سا ڈھیر پرال (پیال) کا دھرا پڑا تھا، جو ایک پہاڑ کی صورت ہی نظر آتا تھا، بیرونی جگہ پر ایک چوبی پھٹے پر ایک بوڑھا دیہاتی پتلی شاخ نما چابک ہاتھ میں تھامے ہوئے بیلوں کو مخصوص آواز میں ''ٹکار'' رہا تھا۔

بیل گاڑی کے قریب آتے ہی میں نے اپنی جگہ چھوڑی اور گاڑی بان کی نظروں میں آئے بغیر میں جھکا جھکا اس کی آڑ لیتا ہوا۔ یہ مشکل راستہ پاٹنے لگا۔ مجھے چونکہ بیل گاڑی کی بلکہ اس پر ایک پہاڑ کی صورت لدے ہوئے پیال کی ڈھال میسر تھی اس لیے میں سمجھتا تھا کہ خفیہ کیمرے کی زد میں نہیں آسکتا تھا۔

بوڑھے گاڑی بان کو مجھ پر شبہ نہیں ہو سکا تھا۔ یوں بھی ہر طرف تاریکی کا ہی راج تھا۔ کہیں کسی گھر کے صحن میں لگے بلب کی مقدور بھر روشنی ٹمٹماتی نظر آجاتی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔

میں بیل گاڑی کی آڑ لیے مطلوبہ عمارت کے نزدیک پہنچا یکدم اس کے احاطے میں قدم رکھ دیا۔ فوراً ہی اس کی بغلی دیوار کی آڑ لیتا ہوا سیدھے ہاتھ کی طرف کھسکتا ہوا بالآخر ایک ایسے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا جسے ''چور دروازہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ وہ ایک سنگل پٹ کا دروازہ تھا۔ جو ظاہر ہے اندر سے بند تھا۔ اُسے کھولنے کی سر دست مجھے کوئی تدبیر سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

اچانک ایک آہٹ پر میں چونک پڑا، جو بیرونی دروازے سے اُبھری تھی۔ میں اُلٹے پاؤں گربہ قدمی سے سرکا اور دیوار کی آڑ سے ذرا سر اُبھار کر دیکھا۔

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دروازے سے خاصی عجلت میں چار پانچ افراد نمودار ہو رہے تھے۔ وہاں فقط ایک جیپ کھڑی تھی۔ وہ سب اس میں سوار ہو رہے تھے۔ مجھے ایک ذرا موقع ملا تو میں بیرونی دیوار میں بنی کیاریوں اور پھلواریوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بیرونی دروازے تک پہنچا تو یکلخت میرے اندر مسرت چمکی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی وجہ بھی میری سمجھ میں آگئی۔ جیپ کے قریب ایک ایسا آدمی کھڑا نظر آرہا تھا، جو اپنے جیپ سوار ساتھیوں کو کچھ ہدایات دینے میں مصروف تھا، یقیناً یہی اس دروازے سے نمودار ہوا ہوگا اور اس نے چونکہ اسی وقت واپس لوٹنا تھا اسی لیے اس نے دروازہ بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یقیناً اس نے ذرا ہی دیر بعد واپس لوٹنا تھا۔

اسٹیشن فور کی عمارت کو بظاہر عام ہی رکھا گیا تھا۔ مطلب باہر کوئی پہرا نہیں تھا۔ لیکن اندر خفیہ کیمرے ضرور نصب تھے۔ اندر بیٹھے مسلح افراد گرد و جوار کی مانیٹرنگ ضرور کر رہے ہوں گے۔ عمارت کو عام مقامی لوگوں کی نظروں میں غیر اہم دکھانے کے لیے ہی ایسا کیا ہوگا کہ اس کی بیرونی ساخت عام انداز ہی کی رہنے دی گئی تھی، جو بادی النظر میں کسی دفتر یا سرکاری اقامت گاہ کا منظر پیش کرتی تھی۔

بہرحال قسمت میرا ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ شخص کسی بھی وقت مذکورہ کھلے دروازے کی طرف پلٹنے والا تھا، مجھے خوش قسمتی سے پودوں اور گملوں کی آڑ ملی ہوئی تھی۔ ورنہ ان لوگوں کی مجھ پر نظر پڑ سکتی تھی۔ پھر بھی میں نے بے احتیاطی یا غیر ضروری عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ان پر ایک محتاط سی نگاہ رکھتے ہوئے میں بیرونی دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ قریب پہنچا تو مجھے چوکھٹ خالی نظر آئی۔ البتہ روشنی تھی اور دروازہ اَدھ کھلا تھا۔ میں لپک کر اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک مختصر سی راہداری تھی۔ اندر کسی گوشے میں کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کہیں روشنی تھی کہیں تاریکی۔ میں نسبتاً تاریکی والے گوشے میں جا چھپا، کیونکہ اسی وقت مجھے دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی تھی۔ وہ آدمی اندر داخل ہو رہا تھا، اور پھر دروازہ بند کرنے کے دوران ہی میں نے اُسے ٹھٹکتے ہوئے محسوس کیا۔ میرا دل یک لخت کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ وہ اب فرش پر جھک کر کچھ جانچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے میری دھڑکتی نظروں نے دیکھا کہ اس کی گردن کا زاویہ بدلا اور اس طرف گھورنے لگا جہاں میں ایک نیم تاریک گوشے میں چھپا کھڑا تھا۔ میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس کے چونکنے کی وجہ بڑی معقول تھی۔

چکنے اور شفاف فرش پر میرے جوتوں کے خاک زدہ نشان اُس کے نہ صرف چونکنے کا باعث بنے تھے بلکہ اس کی میری طرف توجہ اور راہنمائی کا بھی سبب بنے تھے، اور پھر یوں لگا جیسے میری اَب تک کی ساری محنت اَکارت چلی گئی۔ لیکن مایوس ہونا اور حالات سے ہار مان لینا تو میں نے بھی کب سیکھا تھا؟

بچپن سے لے کر اب تک اِنہی نامساعد اور حالات دگرگوں کی گود میں تقدیر نے مجھے اُچھال اُچھال کر سکھایا تھا۔ جب میں بالکل بچہ تھا۔

وہ میری طرف پستول تھامے لپکا۔ مجھے چونکہ اندھیرے کی آڑ میسر تھی، اِسی لیے میں نے بھی موقع سے پورا فائدہ اُٹھایا اور وہ جیسے ہی اپنی جھونک میں میری پہنچ میں آیا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ تربیت یافتہ وہ بھی تھا، مگر گھات میرے حصے میں تھی اسی لیے مات اس کے حصے میں آئی۔

میں نے سب سے پہلے اس کے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا مارا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ سے، رینجرز ٹریننگ سینٹر سے سیکھا ہوا ایک ''اسپائی'' داؤ کھیلا یعنی اس کی گردن کی رگِ حساس مسل ڈالی۔

یہ ایک گوریلا طرز کی ٹرک تھی۔ جو میں نے اپنی تازہ ترین مگر مختصر ٹریننگ کے دوران سیکھی تھی۔ تکنیکی اعتبار سے اس ٹرک کا پس منظر چینی میڈیکل سائنس ''آکوپنکچر'' سے ملتا تھا جو مریض کے جسم میں سوئیاں چبھو کر کیا کرتے تھے۔ اس میں رگوں اور نسوں حتیٰ کہ دھاگے جیسی شریانوں اور کیپلریز کے علم میں ماہر ہونا ضروری ہوتا ہے کہ کس جگہ کون سی رگ کو ایک مخصوص انداز میں چھیڑیں گے تو جسم کے کون سے حصے پر اس کا کیا اثر ہوگا۔

اپنے شکار کو اشاعتفیل کرنے کے بعد میں نے بڑی احتیاط سے اس کے گرتے بے سُدھ وجود کو تھام لیا کہ اس کے گرنے کی ''دھمک'' نہ گونجنے پائے۔ پھر بڑے آرام سے اُسے ایک طرف تاریکی میں ڈال کر میں نے اُبھی اندرونی سمت ایک کوریڈور کی جانب قدم بڑھایا ہی تھا کہ اَچانک مجھے ایک تیز چیخ کی آواز سنائی دی۔

چیخ کی یہ آواز بڑی ہولناک اور لرزہ دینے والی تھی۔ خود میں بھی ایک لمحے کو تھرا سا گیا۔ یہ کسی عورت کی چیخ تھی۔ میرا وجود سرتاپا جیسے سماعت بن گیا۔ اس چیخ کے فوراً ہی بعد

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اب اس کے سسکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں آواز کی سمت بڑھ گیا۔ ایک دو راہداریاں عبور کرکے میں ایک کمرے کے دروازے کی جھلک دیکھ کر رک گیا۔ رکنے کی وجہ تھی، کیوں کہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

باہر راہداری میں روشنی تھی۔ وہ کمرا راہداری سے ہٹ کر نسبتاً الگ تھلگ مقام پر بنا ہوا تھا۔ اندر مجھے ایک سے زائد افراد کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اَندر سے اَب بھی کسی بدنصیب عورت کے رونے اور سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں، آہنگ اور الفاظ اب اس عورت کے واضح طور مجھے بھی سنائی دے رہے تھے۔

”شدَے! لے لے میری جان۔ مارڈال مجھ بدنصیب بوڑھی کو۔ پپ... پر... خ... خدا کا واسطہ ہے تجھے... میرے بچھڑے لعل کی جان مت... لے، اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ مجھے ایک بار اپنے لختِ جگر سے مل لینے دے۔“ اس عورت کے داد و فریاد کرنے کی آواز اُبھری۔

”تیری جان کا کیا کروں گا میں؟ یہ تو نہ اس وقت میرے کام کی تھی جب تُو میرے نکاح میں آئی تھی اور نہ اب ہے۔“ وزیر جان کی بے رحم اور بے حس آواز اُبھری۔ وہ اسی لہجے میں آگے بولا۔

”ہاں! ایک فاش غلطی مجھ سے ضرور ہوئی تھی کہ تیرے سنپولیے بیٹے کو میں دودھ پلاتا رہا۔ کیا معلوم تھا مجھے کہ وہ ایک دن مجھے ہی ڈسنے کے لیے میری راہ تلے کانٹے بچھائے گا۔ کاش... میں اُسے اطفال گھر پھینکنے کے بجائے اس کا گلا ہی دبا دیتا مگر تو نے مجھے بھی دھوکے میں رکھا تو یدہ بیگم! تُو نے... اَب انتظار کر... بہت جلد میرے آدمی تیرے بچھڑے لعل کی لاش کاندھوں پہ اُٹھائے یہاں آرہے ہوں گے۔“

”تیرے منہ میں خاک... شدے! میرا شہزی ایک بہادر اور غیور باپ کا بیٹا ہے۔ اس باپ کا بیٹا جو وطن پرست تھا۔ تیری طرح وطن فروش نہیں۔ آہ... تُو نے دھوکے اور میری مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر مجھ سے شادی کی... اور... پھر...“

”بکواس بند کر اپنی!“ مجھے وزیر جان کی دہاڑ سنائی دی۔ اور میں یعنی شہزاد احمد خان المعروف شہزی کاکا! جس نے حالات دگرگوں کی گود میں راندۂ درگاں ہوکر پرورش پائی اور اپنی شناخت میں آج تک محو گرداں تھا، ایک دم سُن اور بے کل ہوکے رہ گیا۔

آج تک میں خود کو بڑا آہنی اَعصاب والا انسان سمجھتا تھا، مگر جانے کیا بات تھی کہ اپنے ماضی اور اپنے بچھڑے والدین کے حوالے سے کوئی بات کوئی واقعہ رونما ہوتا دیکھتا یا محسوس کرتا تھا تو جیسے میں ڈھنے لگتا تھا۔ جذبات کی ایسی یلغار سی اَعصاب اور حواس پر چھاتی چلی جاتی تھی کہ پھر میرا اپنے آپے میں رہنا محال ہوجاتا تھا۔

سماعتوں کو چھلنی کر دینے والی ان باتوں سے مجھے خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ اندر میری اپنی سگی ماں مغلوب و مصلوب ہونے کے باوجود اپنے شوہر کو للکار رہی تھی اور اس سے میری زندگی کی بھیک بھی مانگ رہی تھی۔

میرے دل و دماغ میں دھواں سا بھرنے لگا۔ جی چاہا ابھی دہاڑتا چنگھاڑتا ہوا اندر کمرے میں جا گھسوں اور رزیل صفت وزیر جان کی گردن دبوچ کر اپنی بچھڑی ماں کے قدموں تلے رگڑ ڈالوں۔ مگر مصلحت اندیشی سے حالات کی نزاکت کچھ اور تقاضا کرتی تھی، میں اس وقت اپنے ایک بڑے دُشمن کی کچھار میں تھا۔ اور دُشمن بھی ایسا جس نے رشتوں کی پاکیزگی کو اپنی ذاتی غرض کا گہن لگا رکھا تھا۔

دیکھا جاتا تو بڑا ہی عجیب رشتہ تھا میرا اور وزیر جان کا۔ پتا نہیں وہ میرا کیا لگتا تھا؟ باپ تھا یا سوتیلا؟ کیا تھا وہ میرا؟ مگر اب میری سگی ماں کے ملنے پر مجھے اسی کا ایک آخری سہارا اور اُمید تھی کہ وہی میرے اصل باپ کے بارے میں بتا سکتی تھی، ابھی کچھ دیر پہلے ماں نے اسے للکارتے ہوئے کہا تھا کہ میرا باپ اس کی طرح وطن فروش نہیں بلکہ وطن کا وفادار تھا۔ تو گویا میری ماں ہی جانتی تھی کہ میرا اصل باپ کون تھا؟ اور کہاں تھا جبکہ باپ کے حوالے سے مجھے میرے دُشمن اور وزیر جان بھی جذباتی طور پر ٹھیس لگا چکے تھے۔ ابھی میری زندگی کے کئی گوشے مخفی تھے مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اب ان کے آشکارا ہونے کا وقت بھی شاید آن پہنچا تھا۔

میں نے سرِدست ان اُلجھنوں کو اپنے دل و دماغ سے جھٹکا۔ میں نے پستول ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ساتھ ہی احتیاط کے پیشِ نظر میں نے بے ہوش ہرکارے کا پستول بھی اُچک لیا تھا۔

میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا بہت دھیرے دھیرے کھلے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ اپنی ماں کو دیکھنے، ان سے ملنے کی آرزو میں عجیب کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔

اب پتا نہیں میں اسے اپنی بدقسمتی کہوں یا خوش نصیبی کہ کن حالات میں میرا اپنی ماں سے سامنا ہونے والا تھا۔

میں اسی طرح کھسکتا ہوا دروازے کے بالکل نزدیک آ کے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رکا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اندر جھانکا۔

یہ ایک بلند چھت والا بڑا کمرا تھا۔ ابھی میں اس کا نصف گوشہ ہی دیکھ سکا تھا، اور جتنا مجھے نظر آیا تھا اس میں مجھے وزیر جان کی پشت اور اس کے دو آدمی دکھائی دیے تھے۔ اپنی ماں کو میں ابھی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ شاید اس کی طرف وزیر جان کی پشت کی آڑ تھی۔ اور تب اچانک ہی اس کے ایک ساتھی کی نظر دروازے کی طرف اُٹھی تھی۔

وہ چونک کر حلق کے بل زور سے چلّایا۔ ''کون ہے وہاں؟''

یکلخت جیسے بم پھٹا۔ اب میرا پیچھے ہٹنا عبث تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور پستول لہراتا ہوا درانہ وار اندر داخل ہو گیا.... جب تک وزیر جان کے آدمی حرکت میں آتے، میں وزیر جان کو گن پوائنٹ پر لے چکا تھا۔

''خبردار! میں گولی چلا دوں گا اگر کسی نے ذرا بھی اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش کی تو...''

میری دھاڑتی آواز ہال کمرے میں گونجی۔ اندر چار افراد موجود تھے۔ اُنہیں اسلحہ نکالنے کا بھی موقع نہیں مل سکا، اور پھر وزیر جان دھیرے دھیرے میری جانب پلٹنے لگا۔

یہ بڑی عجیب سچویشن تھی اور سنگین بھی۔ ایک طرف میرے سینے میں لاوا بھرا ہوا تھا تو دوسری طرف میں ایک رقت آمیز جذباتی کیفیات سے بھی دوچار تھا۔ کیونکہ میری ترسی ہوئی متلاشی، بے چین اور ممتا کی ماری نظریں اپنی مغلوب و مصلوب ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں، کیونکہ جیسے جیسے وزیر جان، بالکل میکانیکی انداز میں میری جانب گھوم رہا تھا مجھے اس کی دوسری طرف فرش رسیدہ ایک عورت کی جھلک بھی نظر آنے لگی تھی۔

وزیر جان میری جانب پورا گھوم چکا تھا۔ مگر اس طرح کہ اس کی آنکھیں شعلہ بار اور چہرہ قہر آلود نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے عقب میں اپنی ماں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا اور شاید انہی جذباتی کیفیات کی وجہ سے میں اپنے عقب سے بے خبر ہو گیا تھا اور اسی وقت کسی نے میری پشت پر زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔ یہی وہ وقت تھا جب وزیر جان بھی پھرتی سے ایک طرف ہٹ گیا اور میں لڑکھڑاتا ہوا سیدھا اس عورت کے پاس جا پڑا جو فرش پر مجبور اور دل گرفتہ سی بیٹھی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ میں سیدھا اس بدنصیب عورت کے پاس جا گرا تھا اور میرا سر اس کی گود میں تھا۔

پھر دو مہربان، محبت بھرے ہاتھوں کی آغوش نے کسی ٹھنڈی چھاؤں کی طرح مجھے جیسے اپنے اندر سمو لیا۔ پھر یوں ہوا جیسے میں کئی ثانیوں کے لیے دُنیا و مافیہا سے بے خبر سا ہو گیا۔ میری بے چھایا، دھوپ بھری، تپتی بلکتی اور دوڑتی بھاگتی بے قرار و بے سکون زندگی کو جیسے ایک ٹھنڈی میٹھی، محبت بھری و سکون آور ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میسر آ گئی ہو۔ میں جیسے دنیاوی غم و آلام سے بے فکر ہو گیا۔ چھ فٹ قد کا ٹھوکا شہزادہ احمد خان شہزی جیسے اس گود میں آ کے ایک معصوم بچہ بن کر رہ گیا۔ روح کیا ہوتی ہے اور روحانی سکون کسے کہتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ قدرت نے ماں کی گود کو کیسی الوہیت عطا کی تھی، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ اپنے یارِ بے بدل۔ اوّل خیر کو میں نے اکثر کہتے سنا تھا کہ ''شہزی کاکے! اے ماواں ٹھنڈیاں چھاواں ہوندیاں نیں۔''

آج اس کی بات مجھے کتنی سچی لگ رہی تھی۔

''پپ... پُتر... شش... شہزی!'' ایک یاس زدہ، تڑپتی اور درد سے کپکپاتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی جس نے مجھے بھی تڑپا کر رکھ دیا۔ اس نرم میٹھی آواز نے تو خود ہی ثابت کر دیا کہ میں اس وقت سب سے زیادہ اور اس دنیا میں بے غرض محبت کرنے والی جس ہستی کی گود میں ہوں، وہ میری ماں ہی تھی۔ ظاہر ہے یہ خون ہی کی کشش تھی کہ وہ مجھے اور میں اُسے پہچان رہا تھا۔ تاہم وزیر جان کی زبانی تو میری ماں کو پتا ہی تھا کہ میں یہاں لایا جا رہا تھا (یرغمال بنا کر)

''ہا... ہا... ہا... کیسا فلمی سین ہے یہ... مزہ آیا۔'' اسی لمحے مجھے وزیر جان کے طنز سے بھرپور ایک شیطانی قہقہے کی گونج سنائی دی۔

''سالوں سے بچھڑے ماں بیٹے... آج ملے بھی تو کہاں۔ جب موت ان سے محض چند قدموں کے فاصلے پر ان کی منتظر ہے۔''

اس ابلیس صفت کی پُرغرور یاوہ گوئی نے ماں کو سسکا کر رکھ دیا۔ ماں کی اس سسکاری میں مجھے ایک غم آگیں اور بے بسی و حسرت زدہ سی آہ محسوس ہوئی۔ اور تب میں نے بہت دھیرے سے ماں کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر چوما، پھر اُسے بھی آہستگی سے تھام کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اُس شخص پر ایک نظر ڈالی تھی جس نے میری پشت پر وار کیا تھا۔ اس کے چہرے پہ عیارانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ اچانک ہی کسی اندرونی گوشے سے نمودار ہوا تھا۔

ماں اَب میرے سہارے کھڑی تھی۔ ابھی تو مجھے اُس

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کا پُرنور چہرہ اچھی طرح سے دیکھنے کا بھی وقت نہ ملا تھا۔

اب میری شعلہ بار نظریں، گھمنڈ سے گردن اکڑائے کھڑے وزیر جان پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کی طرف بدستور گھورتے ہوئے کہا۔ ''وزیر جان! میں آگیا ہوں۔ اب میری ماں کو یہاں سے جانے دے۔''

''اچھا!'' وہ رذیل بھویں اُچکا کر طنزیہ بولا۔ ''اُونٹ تو اب پہاڑ تلے آیا ہے۔ تمہاری کون کون سی دُکھتی رگ بتاؤں جو اس وقت میرے قبضے میں ہے۔ تمہاری ماں۔ تمہاری محبوبہ عابدہ۔ اور عنقریب تمہارا باپ۔ تم... تیسرے درجے کے گینگسٹرز کے آلۂ کار بن کر خود کو کیا سمجھنے لگے تھے؟ ہمیں زیر کر ڈالو گے۔ ہاں؟ تم نے ہمارا ٹھکانا زیرو ہاؤس اُڑا دیا۔ آرک ...... جیسے ہمارے اہم آدمی کو بھی بے دردی سے ہلاک کیا۔ اور... میری بیوی سعیدہ... اُس کے قتل میں بھی یقیناً تمہارا ہی ہاتھ ہوگا۔''

وہ بپھرے ہوئے لب و لہجے میں بولے جا رہا تھا۔ مارے جوشِ غیظ کے وہ ہانپ بھی رہا تھا۔

''تمہاری ماں کو میں کیسے جانے دوں... شہزی؟ جبکہ تم نے اس معاہدے کی بھی خلاف ورزی کی ہے کہ تمہیں یہاں زہرہ بانو کو بھی ساتھ لانا تھا۔ یہی نہیں تم نے میرے ساتھیوں...''

''معاہدے کی خلاف ورزی کی شروعات تمہاری طرف سے ہوئی تھی وزیر جان!'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''مجھے پتا تھا کہ تم اپنی فطرت کے عین مطابق کہیں نہ کہیں بلف ضرور کرو گے۔'' وہ عیاری سے بولا تو میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زہریلے لہجے میں کہا۔

''خود تمہاری اس لنگڑی لولی دلیل سے فریب کی بو آرہی ہے، وزیر جان! رہی بات زہرہ بانو کی تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں اس کا آلۂ کار ہوں، ایسا میری سرشت میں ہی نہیں ہے کہ میں کسی کا زرخرید بن کر زندگی گزاروں۔ ہاں! تم اسے دوستی کہہ سکتے ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ جب اُسے تمہاری اس بزدلانہ شرط کا پتا چلا تو وہ اسی دوستی کی خاطر مجھے بھی ایک دوستانہ ''دھوکے'' میں رکھ کر میرے ساتھ چلی آئی تھی، لیکن راہ میں تمہارے بھیجے ہوئے زرخرید کتوں کی مداخلت نے سارا معاملہ ہی اُلٹا دیا۔''

''اپنی فضول بکواس اب بند کرو۔'' وہ چیخا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ زچ ہو رہا تھا مگر طاقت کے نشے میں اس وقت وہ فرعون بنا ہوا تھا۔ ''میں اب تم سے ذرا بھی رعایت نہیں برتوں گا اور بہت جلد تمہارے ساتھیوں کا انجام بھی اب دور نہیں۔''

''میری ماں کو چھوڑ دو وزیر جان۔'' میں نے اس کی یاوہ گوئی پر دھیان دیے بغیر بظاہر سپاٹ لہجے میں کہا، تو وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''بس! ابھی سے منت سماجتوں پہ اُتر آئے؟ ابھی تو میں نے یہاں تمہارے سارے پیاروں کا جمگھٹا لگانا ہے شہزی۔''

''تم بے شک اپنا یہ شوق پورا کر کے دیکھ لینا۔ لیکن ابھی میری ماں کو چھوڑ دو۔'' میں نے بدستور اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا تو اس بار ماں کی درد بھری آواز اُبھری۔

''شدے! تُو نے مجھے بہت دُکھ دیے ہیں، میں کون کون سے گنواؤں؟ مگر تیرے ایک ہی دُکھ نے آج تک میری کمر توڑے رکھی ہے، ایک ناسور کی طرح وہ دُکھ میرے وجود میں زہر بن کر اُتر رہا ہے۔ قرض تو میرا ابھی تجھ پر بہت ہے، میں تجھے معاف کر دوں گی، تو میرے بچے کو چھوڑ دے، میں نے اپنوں کی بہت جدائیاں سہی ہیں، اب مجھ میں مزید اس کی تاب نہیں رہی۔''

میری ماں کے ان جگر پاش الفاظ نے مجھے رُلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ وزیر جان کے سامنے میری زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی اور اپنی زندگی کی اُسے پروا نہیں تھی، یہی حال میرا تھا۔ مگر میں زندہ رہنا چاہتا تھا، ابھی تو میں نے بہت سی باتوں سے، بہت سے رازوں سے پردہ ہٹانا تھا۔ بس ایک بار، صرف ایک بار مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ آخر میرا اور وزیر جان کا رشتہ کیا تھا؟

میری ماں کی فریاد پر وہ ایک پُرغرور قہقہہ لگا کر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''تو نے بھی تو مجھے اب تک دھوکے میں رکھا... بلکہ نہیں... تو نے تو مجھے ایک دھوکے سے بھی بڑے عذاب میں مبتلا کیے رکھا۔ کبھی اس سنپولیے کو میرا بیٹا کہتی رہی، پھر مکر گئی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ خونی رشتوں کے سلسلے میں اس طرح کا تذبذب کس قدر جاں گسل عذاب میں مبتلا رکھتا ہے؟''

''مگر دھوکے کی ابتدا تیری طرف سے ہوئی تھی۔ میرا تجھ سے دل کھٹا ہو چکا تھا۔'' ماں نے اس سے کہا۔

میں دانستہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو کو خاموشی سے سن رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کے ماضی کا ایک

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کردار میں بھی تھا۔ اور میرا اس میں کیا ''رول ماڈل'' تھا، وہ مجھے جاننا تھا۔

''بس! اب ان باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں تجھے اپنی زندگی سے نکال چکا ہوں۔ تیرے اور میرے بیچ جو رشتہ تھا، اُسے میں بہت پہلے ختم کر چکا ہوں۔ اب میں تیری صورت تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا مگر شہزی والے معاملے کی وجہ سے مجھے یہ کرنا پڑا۔''

وہ بات ختم کر کے مڑا اور اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور ماں کو مجھ سے الگ کر کے لے جانے لگا تو میں پھٹ پڑا اور حلق کے بل چیخا۔

''وزیر جان! میری ماں کو میرے ساتھ رہنے دو۔ تمہیں کیا ڈر ہے، ہم ابھی تمہاری قید میں ہیں۔''

ماں کو لے جانے والا آدمی رُکا نہیں تھا۔ البتہ وزیر جان میری جانب زہرخند نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تو میں یہاں تمہارے پیاروں کا جمگھٹا لگاؤں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھا ... وہ اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر میری جانب بڑھے۔ یہ تین تھے، ان کے ہاتھوں میں گنز تھیں۔ ایک نے اپنی گن کی نال سے مجھے ہلکا ٹہوکا دیا اور میں خونیں نظروں سے وزیر جان کو گھورتا ہوا ان کے ساتھ ہولیا۔

میں چاہتا تو گڑبڑ پیدا کرسکتا تھا مگر میری ماں اس رذیل کے قبضے...... میں تھی۔ میری جارحانہ کارروائی، مشتعل وزیر جان کو کسی بزدلانہ حرکت پر اُکسا سکتی تھی۔

بہتر وقت اور موقع محل کی آس میں، میں ابھی اس کا ہر حکم بجالانے پر مجبور تھا اس لیے ان تینوں ہرکاروں کے ساتھ ہولیا۔

یہ تینوں میرے پیچھے چوکس انداز میں چلتے رہے اور ایک دو مختصر سی راہداریوں سے گزرنے کے بعد اس دروازے کی طرف بڑھے جو آخری سرے پر واقع تھا اور کھلا پڑا تھا۔

بلند چھت کا یہ کمرا دس بائی بارہ کا تھا، کھڑکی کے نام پر فقط ایک چھت تھی۔ دروازہ اب بند کردیا گیا تھا۔ باقی میرے علاوہ کمرا ہر شے سے عاری تھا اور صاف ستھرا بھی۔ میں ایک کونے میں جا کر دیوار سے پشت ٹکائے بیٹھ گیا۔

بات حقیقت تھی کہ اس وقت میرا دل و دماغ ماؤف سا تھا، ذہن بھانت بھانت کی سوچوں کے باعث شدید اُلجھاؤ کا شکار تھا۔

میری ماں کا دیدار مجھے نصیب ہو چکا تھا، وزیر جان میرے حقیقی باپ کے زندہ ہونے کی اُمید (چاہے دھمکی دینے کے زُمرے میں سہی) دلا چکا تھا مگر وہ کہاں تھا اور کس حال میں تھا؟ یہ ابھی مجھے نہیں معلوم تھا مگر کیا یہ کم تھا کہ ماں میرے سامنے تھی اور باپ کے زندہ ہونے کی نوید تھی، وزیر جان اور ماں کے درمیان ہونے والی گفتگو کی بازگشت ابھی تک میری سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

اگرچہ ابھی میرے ماضی کے چند اہم گوشے اس گفتگو میں وا نہیں ہوئے تھے کہ جس کا مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے دیدار نصیب ہوا تھا، میری اصل ماں تھی مگر وزیر جان کا ماضی میں اس سے کس نوعیت کا تعلق تھا، وہ بلاشبہ میاں بیوی کا ہی تھا، لیکن پھر ایسا کیا ہوا تھا کہ ان دونوں کے بیچ کوئی دراڑ پڑ گئی؟ نیز پھر میرا حقیقی باپ یہاں کہاں فٹ ہوتا تھا؟ جبکہ بقول وزیر جان کے وہ زندہ بھی تھا، اور پھر وہ دھوکے والی بات کیا تھی جس نے ماں کا دل وزیر جان سے کھٹا کردیا تھا؟

ایسے کئی لاینحل قسم کے سوالات اور بعض خود ساختہ جواب میرے اُلجھے ذہن میں گڈمڈ ہو کر مجھے ایک شکست و ریخت کے عمل سے دوچار کررہے تھے۔ ماں سے مجھے بہت سی باتوں کا پتا چل سکتا تھا۔ وہ سب جانتی تھی۔ مگر میرا باپ اس وقت کہاں اور کس حال میں تھا، یہ صرف وزیر جان جانتا تھا۔ دل و دماغ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا۔ یہ خوشی اپنی جگہ تھی کہ میں یتیم نہ تھا۔ میری ماں بھی تھی اور باپ بھی دنیا میں موجود تھا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اسے اپنی بدقسمتی کہوں یا پھر خوش نصیبی کہ یہ ساری جان کاری ایسے نامساعد حالات میں ہورہی تھی۔

عابدہ کی طرف سے مجھے جس نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔ اس نے تو مجھے جیسے اندر سے توڑ کر ہی رکھ دیا تھا۔ پرائے دیس میں وہ معصوم نجانے کون سی سازش کا شکار ہو چکی تھی۔

کیا یہ واقعی میرے دُشمنوں کی ہی کارستانی تھی؟ کیا وہ اتنے اثرورسوخ والے تھے کہ یہاں بیٹھے انہوں نے جیسے ایک بٹن دبا دیا اور عابدہ دیارِغیر میں کسی نادیدہ جال میں پھنس گئی؟ شاید ایسا ہی تھا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی ممتاز خان اور وزیر جان کی طرف سے مجھے اس طرح کی دھمکیاں ملتی رہی تھیں۔ جس میں وہ بڑے گھمنڈ کے ساتھ عابدہ کی طرف سے تہدید کیا کرتے رہتے تھے کہ وہ بہت جلد میرے پیاروں پر بھی اپنا شکنجہ تنگ کرنے والے ہیں اور ان کا پہلا شکار میری دُکھتی رگ یعنی عابدہ ہوگی۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں پہلے ان کی دھمکیوں کو گیدڑ بھبکیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ لیکن آج ریڈیو پر چلنے والی بی بی سی اور سی این این کی خبروں نے میرے تو جیسے ہوش ہی اُڑا دیے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ میری جب بھی عابدہ سے ٹیلی فون پر بات ہوتی تھی تو وہ بھی اشاروں کنایوں میں انہی خدشات کا ذکر مجھ سے کرتی رہتی تھی مگر میں اسے معمول اور وہاں کے تازہ کار حالات (نائن الیون کے واقع سے پیدا ہونے والے حالات) پر محمول کرتا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس سازش کے تانے بانے میرے دُشمن کہاں سے کہاں ملا دیں گے۔

بلاشبہ مجھے اس سے اب اپنے دُشمنوں کے اثر ورسوخ اور طاقت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ بے شک اس وقت میں جن حالاتِ دگرگوں سے گزر رہا تھا، وہ ایک اچھے بھلے انسان کے حوصلے ڈھا دینے کے لیے کافی تھے مگر میں نے بھی ہمت ہارنا نہیں سیکھا تھا۔ اگر میرے دُشمن اور میری تقدیر مجھے اتنی دور تک لے جانے پر تلی بیٹھی تھی تو پھر میرے حوصلوں کے بادبان بھی بلند تھے۔

اسی کمرے میں اور انہی سوچوں میں کچھ وقت بیتا تو میرے ساتھ ایک عجیب اور حیرت انگیز واقعہ رونما ہوا۔ جس سے ایک بہتری کی اُمید پیدا ہوئی تھی لیکن میں ایک اُلجھن آمیز پریشانی کا شکار ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں قسمت کو کیا منظور تھا؟ بس ایک حالاتِ دگرگوں کا دھارا تھا جو مجھے بہائے ..... چلا جارہا تھا۔ یہاں سے وہاں اور اب جانے کہاں کہاں۔

مجھے جو تین افراد کمرے میں چھوڑ کر گئے تھے، تو ان کا تیسرا ساتھی سب سے آخر میں کمرے سے نکلا تھا۔ مجھے جانے کیوں اس کی یہ حرکت ''دانستہ'' سی محسوس ہوئی تھی یا پھر شاید یہ میرا واہمہ تھا۔ مگر جب وہ کمرے سے نکلنے لگا تو اس نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے دوران ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی تھی۔

شاید یہ اس کی طرف سے کوئی اشارہ تھا میرے لیے۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ دوبارہ وا ہوا تھا۔ میں چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے اسی مذکورہ آدمی کی باہر سے ایک ذرا جھلک نظر آئی تھی اور ابھی میں دروازے سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھا کہ اچانک وہ غائب ہوگیا مگر جانے سے پہلے وہ کوئی شے اندر پھینک گیا۔

دروازہ لاک کرنے کی آواز اُبھری تو میں نے پُرسوچ انداز میں وہ شے اُٹھالی جو کاغذ کا مڑا تڑا ٹکڑا تھا۔ میں اُسے کھول کے پڑھنے لگا۔

''مجھے اپنا گمنام ہمدرد سمجھو۔ پیغام پڑھ کر اسے پھاڑ کے ٹکڑے جیب میں رکھ لینا۔ آج رات تمہیں یہ گمنام ہمدرد لینے آئے گا۔ یاد رکھنا، صرف آج ہی کی رات یہ موقع ہے۔''

میرے چہرے پر شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ یہ کون میرا گمنام ہمدرد یہاں پیدا ہوگیا تھا؟

ذہن پر بہت زور دیا۔ مگر سمجھ نہ سکا نہ ہی کسی قسم کا اندازہ قائم کرسکا۔ یہ کون تھا، جو مجھے وزیر جان کی قید سے چھڑا لے جانا چاہتا تھا؟ مگر صرف میں کیوں؟ میری ماں بھی تھی۔ میں اس کے بغیر بھلا کیسے یہاں سے نکل سکتا تھا؟

مجھے وقت کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہورہا تھا، تاہم لگتا تھا کہ دن کا ہی وقت اب ہو چلا تھا۔ میرے گمنام ہمدرد نے رات میں آنے کا مجھے اشارہ دیا تھا۔ لیکن وہ خلافِ توقع ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہی آگیا۔

دروازے پر اچانک ہلکی کھٹر بڑ کی آواز اُبھری۔ میں پہلے یہی سمجھا کہ کوئی ہرکارہ ہوگا مگر یہ وہی تھا، میرا گمنام ہمدرد، مجھے اس کے وقت سے پہلے آنے پر حیرت ہوئی تھی، اگر یہ سچ تھا کہ یہ مجھے یہاں سے نکالنا چاہتا تھا تو پھر یہ اپنی جان پر کھیل کر ایک خطرناک رسک لے رہا تھا۔ مگر یہ تھا کون؟ ساتھی تو یہ وزیر جان کا تھا، تب پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔ کہیں یہ ثریا کے اس گنے چنے ٹولے سے تو تعلق نہیں رکھتا تھا، جنہوں نے ''اسپیکٹرم'' میں رہتے ہوئے اس کی بیخ کنی کی ٹھان رکھی تھی اور کسی موقع کے منتظر تھے؟ کیونکہ ثریا نے مجھے اپنی موت سے قبل اتنا ضرور بتایا تھا کہ مذکورہ تنظیم کی اصلیت اور اس کے خفیہ مکروہ عزائم جاننے کے بعد اس کے چند اور قریبی ساتھی اسپیکٹرم سے متنفر ہوچکے تھے۔ مگر خوف زدہ بھی تھے اور خود کو ایک نادیدہ تارِ عنکبوت میں پھنسا ہوا محسوس کرنے لگے تھے۔ ممکن ہے میرا یہ ''گمنام ہمدرد'' انہی میں سے ایک ہو؟

وہ اندر آگیا، اس کا انداز چوروں کا سا تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ سرگوشی میں بول پڑا۔ ''زیادہ باتیں مناسب نہیں ہوں گی ہمارے لیے۔ تم تیار ہو ناں؟''

''میں تیار ہوں۔ مگر اپنی ماں کے بغیر میں یہاں سے کیسے نکل سکتا ہوں؟'' میں نے بہ غور اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا تو وہ بھنچی بھنچی آواز

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں بولا۔

''ابھی اپنی تو فکر کرو پہلے۔ تم یہاں سے نکلو گے تو تمہاری رہی ماں بھی نکال لی جائے گی یہاں سے۔'' مجھے اس کی بات سے سخت اختلاف تھا۔

''نہیں، میں ماں کے بغیر یہاں سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالوں گا۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں خود یہاں سے نہیں نکل سکتا؟ میں تو ماں کی وجہ سے مجبور ہو کے چپ ہوں، مگر موقع کے انتظار میں ہوں۔''

''لیکن تم یہ موقع خود ضائع کر رہے ہو۔''

''تم ہو کون؟'' میں نے بالآخر اس سے پوچھ لیا۔

''تمہارا ایک ہمدرد۔'' وہ مختصراً بولا۔

''یہاں ایک بھیڑیے کی کچھار میں میرا ایسا کون ہمدرد آگیا؟'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم وقت ضائع کر رہے ہو۔''

''میں ماں کے بغیر یہاں سے نہیں نکلوں گا۔ اگر تم میرے اتنے ہی خیر خواہ ہو تو میرے ساتھ میری ماں کو بھی یہاں سے...''

''مجھے بات کرنا پڑے گی۔'' وہ میری بات کاٹ کر بولا اور پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ چلا گیا۔

پل کے پل مجھے کسی گہری سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے خبردار کرنے لگی۔ ''شہزی کا کے! تیرے ساتھ ڈبل گیم کھیلنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہوشیار اور چوکنے رہنا۔''

اس سرزمین پر فی الوقت میرے دو اہم دشمن تھے۔ ایک چوہدری ممتاز خان اور دوسرا وزیر جان۔ اور سچی بات تھی کہ مجھے ممتاز خان سے زیادہ وزیر جان سے چوکنا رہنا پڑتا تھا، اس کی وجہ یہ بھی کہ یہ میرا مکار اور شاطر ترین دشمن تھا۔ بقول میرے یار اول خیر کے۔

''شہزی کا کے! مکار اور عیار دشمن زبردست نہ ہوتے ... ہوئے بھی اس دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو زبردست ہو۔''

سچ بھی یہی تھا کہ چوہدری ممتاز کی کیٹیگری الگ تھی اور وزیر جان دوسری طرح کا آدمی تھا۔

میرا وہ گمنام ہمدرد شاید میرے سلسلے میں کسی سے ''ڈکٹیشن'' لینے گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اب شام ہو چلی تھی۔ دروازے میں پھر کھڑ بڑ ہوئی۔ میں یہی سمجھا کہ میرا وہ گمنام ہمدرد ''ڈکٹیشن'' لے کر آچکا ہے۔ مگر اندر آنے والے کسی اور ہرکارے کو دیکھ کر میں تھوڑا چونکا تھا۔ اس کے ہمراہ وہ خبیث بھی تھا، جس نے میری پشت پر لات مار کر گویا میری ساری مہم جوئی پر لات مار دی تھی۔ اس وقت بھی اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ اس کا فتح سے مسکراتا چہرہ دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اُس بدبخت کو اپنی کامیاب ''کارگزاری'' پر وزیر جان کی طرف تگڑا انعام ملا ہے، نہیں تو شاباشی تو ضرور ہی ملی ہوگی۔

اس کے ہاتھ میں گن تھی، جو اس نے مجھ پر تانی ہوئی تھی، جبکہ اس کے دوسرے ساتھی کے ہاتھ میں کھانے پینے کا کوئی برتن تھا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ گن بردار تو مجھ پر نال سیدھی کیے وہیں دروازے پر ہی چوکس کھڑا رہ گیا جبکہ اس کا غیر مسلح ساتھی میرے بالکل قریب آگیا تھا اور کھانے کے برتن میری طرف بڑھا رہے۔

یہی وہ وقت تھا جب میری اس سے نظریں چار ہوئیں اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینا چاہ رہا ہو۔ میں اندر سے متحیر تو ہوا تھا مگر ظاہر نہ ہونے دیا کیونکہ میری مہم جوئی کو ''سبوتاژ'' کرنے والا مجھے اپنی تیکھی اور غصیلی نظروں میں لیے ہوئے تھا، میں چاہتا تو اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا تھا مگر کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

ٹھیک اسی وقت جب وہ مجھے کھانے کے برتن تھما رہا تھا تو اس نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سیدھی کی، مقصد مجھے کچھ دکھانا تھا۔

''آج رات جاگتے رہنا۔ میں آؤں گا، ثریا۔''

میں دنگ رہ گیا۔ وہ واپس لوٹ گئے اور میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ مجھے تو یہ ساری گنگا ہی اُلٹی بہتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یہ کوئی اور تھا۔ یہ بھی ہمدرد قسم کا ہی لگا تھا۔

مگر اس نے ثریا کا نام استعمال کیا تھا۔ کیا یہ میری تسلی کے لیے ایک اشارہ تھا کہ میں اس پر بھروسا کروں؟ ذہن پر تھوڑا زور دینے کے بعد مجھے یہی لگا تھا کہ یقیناً اس کا تعلق آنجہانی ثریا کے اُن گنے چنے افراد پر مشتمل منتشر گروپ سے تھا، جس کی خاطر ثریا نے اپنی جان، اسپیکٹرم کے درندوں کے سفاک ہاتھوں میں بڑی جان کنی کے عالم میں گنوا دی تھی۔ اور اس بے چاری کو مجھے بھی بتانے کا کچھ موقع نہ مل سکا تھا۔

حالانکہ وہ خود بھی مجھ سے مدد کی خواہاں تھی اور اب اس کے ساتھی بھیڑیوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ ذرا سے شبہے پر اسپیکٹرم کے

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سفاک درندے اُن کا بھی ثریا جیسا بھیانک حشر کر ڈالتے۔

وہ شاید ثریا کے حوالے سے میری مدد کے منتظر تھے اور اگر ایسا تھا تو ممتاز خان سمیت وزیر جان کی بھی جڑیں ہلا کر رکھ دیتا۔ لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ یہ تو ثریا کے گروپ کا تھا تو پھر میرا وہ ''گمنام ہمدرد'' کس خانے میں فٹ ہوتا تھا؟ کیا وہ بھی اسی کا ساتھی تھا؟ اس میں مجھے جانے کیوں ابہام محسوس ہوتا تھا۔ یہ دونوں ہی میرے ہمدرد تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس میں میرا اصل اور سچا ''ہمدرد'' کون تھا؟

سوچ سوچ کر میرا دماغ پاگل ہونے لگا۔ گویا آج کی رات بڑی پُراسرار اور بھیدوں بھری تھی۔ میں کس ہمدرد کی اُنگلی پکڑوں؟ میرا آخری فیصلہ ثریا کا حوالہ دینے والے ہمدرد کے حق میں ہی ہوا۔

کھانے کو میرا جی نہیں چاہا تھا۔ میں نے کھانے کے برتن ایک طرف کر دیے اور آنے والے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جسے سر پہ آنے سے قبل ہی میں ایک خطرہ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ یعنی اگر میرے یہ دونوں ہمدرد الگ الگ ہوئے تو معاملہ سنسنی خیز ہی نہیں بلکہ گمبھیر بھی ہو سکتا تھا۔ اور مجھے نہیں لگتا تھا کہ ان دونوں ہمدردوں کے بیچ کوئی ایسا تعلق ہوگا۔ صورت حال پریشان کن ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے اگلا قدم کون سا اُٹھانا چاہیے؟

وقت انہی پریشان کن سوچوں میں گزرتا رہا۔ حتیٰ کہ شام سرک آئی۔ اس وقت تو جیسے میری نظریں بھی سماعت ہی بنی ہوئی تھیں کہ دروازے پر ہلکی سی آہٹ اُبھری۔ میرے دل کی دھڑکن، شاید کسی انجانے خطرے کو محسوس کر کے یکلخت تیز ہو گئیں۔ دروازہ آہستگی سے کھلا۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور یک ٹک دروازے کی طرف دیکھنے لگا کہ آخر میرا کون سا ہمدرد پہلے نمودار ہوتا ہے؟

پہلے وہی آیا تھا، جس کے لیے میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ میرا سچا ہمدرد ہے۔ یہ وہی تھا، جس نے ثریا کا حوالہ استعمال کیا تھا۔

''جلدی نکل چلو۔'' اس نے آتے ہی سرگوشی میں کہا۔ میں اپنے اعصابی ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے اسی کی طرح دھیمی آواز میں بولا۔

''تمہیں اپنی شناخت کروانا ہوگی پہلے۔'' میری بات سُن کر اس کے چہرے پہ حیرت کے آثار نمودار ہوئے، وہ شاید یہ سمجھے ہوئے تھا کہ میں اس موقع سے فائدہ اُٹھاؤں گا اور خوشی خوشی اس کی اُنگلی تھامے اس کے ساتھ چل پڑوں گا۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ میں کس قدر خطرناک رسک لیے تمہیں اور تمہاری ماں کو یہاں سے نکالنے کا بندوبست کیے ہوئے ہوں اور تم... کیا ثریا کا حوالہ کافی نہیں تھا؟''

اس کی ''ماں'' والی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ یہی سچا ہمدرد تھا میرا۔ میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا مجھ پر احسان عظیم ہوگا، لیکن پہلے ذرا غور اور سکون سے میری بات سنو... اور صرف میرے ایک سوال کا جواب دے دو۔'' میں نے اس سے پہلے والے ہمدرد کے بارے میں ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا وہ بھی تمہارا ساتھی ہے؟ تو اسے میری بات پر نہ صرف حیرت کا جھٹکا لگا بلکہ اُس کے چہرے پہ گہری تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ جس سے خود مجھے بھی خطرے کی بو آنے لگی اور تھوڑی دیر پہلے میں جس سنسنی خیز معرکے کی توقع کیے بیٹھا تھا، لگا کہ وہ اب تب میں ہونے ہی والا تھا۔ کیونکہ جس سے اب ہم دونوں کو ہی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ وہ بھی کسی وقت یہاں پہنچنے والا تھا۔ اور پھر ٹھیک اسی وقت دروازہ ہولے سے چرچرایا۔ ہم دونوں نے بیک وقت دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ وہی تھا۔ ہم دونوں کے لیے خطرناک مگر اس وقت وہ خود بھی خطرے سے دوچار تھا اس لیے مجھے نہیں لگتا تھا کہ ہم سے کسی قسم کا ''پنگا'' لینے کی کوشش کرتا۔ ممکن ہے کہ وہ ہمارا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش کرتا، گویا اس وقت صورت حال، نازک، پیچیدہ ہو گئی تھی۔

تاہم میرے ساتھ اسے دیکھ کر وہ بھی چونکا تھا۔ لامحالہ وہ میرے اصل اور سچے ہمدرد کو دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ یہ کوئی ہرکارہ ہی ہے۔

''تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میرے متوقع طور پر ''ڈمی'' ہمدرد نے قدرے تحکمانہ... ڈرشتی کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں دیر نہ لگی کہ میرے ڈمی ہمدرد کو میرے سچے ہمدرد پر یقیناً ''منصبی'' فوقیت حاصل تھی، اس نے اپنی جیب سے پستول بھی نکال لیا تھا۔ اور اس کا رُخ بھی اُسی کی طرف تھا۔ پستول کی نال پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ کسی ممکنہ خوں ریزی کے تصور سے ہی رگوں میں میرے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

میں نے جارحانہ حرکت کا سوچا اور اسی وقت میرے اصل ہمدرد نے ایک ایسی دانشمندانہ چال چلی کہ میں خود اس کی ذہانت پر حیران رہ گیا، یہ تو شکر ہوا کہ میں اسے اس کے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بارے میں بتا چکا تھا۔ ورنہ صورتِ حال مختلف ہوتی۔ اس نے خود کو ظاہر کیے بغیر مؤدبانہ کہا۔

''سر! میں باس کے حکم سے ہی یہاں آیا تھا۔''

''ایسا باس کا کیا حکم تھا کہ تمہیں اس طرح نہتے ایک خطرناک قیدی کے پاس آنا پڑا!؟''

''یہ میں آپ کو اس کے سامنے تو نہیں بتا سکتا سر! مگر کیا آپ بھی باس کے کسی ایسے ہی حکم...'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسی وقت کمرے کے دم بہ خود ماحول میں ہلکی ''چِز'' کی آواز اُبھری اور میرا اصل ہمدرد، یعنی ثریا کا ساتھی بغیر کوئی آواز نکالے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ میرے ظالم، ڈمی ہمدرد نے اس بے چارے کی پیشانی پر روشندان بنا دیا تھا۔ اس ہلاکت سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ ان دونوں کا آپس میں ایسا کوئی تعلق نہ تھا سوائے تنظیمی حوالے کے۔

مجھے اس پر صد افسوس ہوا۔ مگر اب اصل کھیل شروع ہونے والا تھا۔ آتشی اسلحے کا نہیں بلکہ دماغ کا۔

''یہ کیا کہنے آیا تھا تم سے؟'' میرے ڈمی ہمدرد نے تشکیک بھرے لہجے میں پوچھا۔

اس عجیب مگر حساس صورتِ حال پر وہ بھی مجھے خاصا اُلجھا ہوا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ بہرحال ان سنگین اور مخدوش لمحات میں مجھے بھی اس سفاک انسان سے ڈر محسوس ہوا کہ یہ کسی بھی وقت مجھے بھی اپنے ''خاموش'' پستول کی گولی... کا نشانہ بنا سکتا ہے۔ لہٰذا مجھے بھی وہی چال چلنا پڑی۔ جواباً بولا۔

''یہ مجھ سے کوئی خفیہ ڈیل کرنے آیا تھا۔''

''کیسی ڈیل؟'' وہ بہ دستور میری طرف اشتباہ انگیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ میں نے پُرسکون اور بظاہر بے پروا نظر آتے ہوئے کاندھے اُچکا کر کہا۔

''بس! یہی کہہ رہا تھا کہ اگر میں باس کی بات مان لوں تو فائدے میں رہوں گا۔''

''کون سی بات؟''

''وہ بتانے لگا تھا، مگر تم آگئے، اور...'' میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

''ٹھیک ہے، چلو اب، میں تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

مجھے اس پر بُری طرح طیش آ رہا تھا۔ یہ میرے کسی دشمن کا ٹاؤٹ ہی لگتا تھا اور کسی خفیہ ٹاسک پر عمل پیرا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ یہ میرے (ثریا والے) ہمدرد کا معاملہ سمجھ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل....؟

جرم، افسر شاہی اور
جاگیرداری کے پس منظر
میں لکھی گئی ایک
ایڈونچرس داستان

اسماء قادری

گرداب

خوبصورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت

مکمل سیٹ 6 جلدوں میں

قیمت -/2400 روپے

القریش پبلی کیشنز

سرکلر روڈ، چوک اُردو بازار لاہور

فون: 042-37668958—37652546

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چکا ہو۔ اس لیے اس نے اس سلسلے میں زیادہ پوچھ تاچھ سے کام نہیں لیا تھا۔

میں نے پل کے پل سوچا۔ اگر یہ میرے دُشمنوں کا آدمی ہے تو ایسا ہی سہی۔ مجھے محتاط رہتے ہوئے اس موقع سے فائدہ اُٹھا لینا چاہیے۔ پتا تو چلے یہ کیا کرتا ہے اور کہاں تک جاتا ہے؟

''میں تمہارے ساتھ جانے پر تیار ہوں۔''

''گڈ! اب کی نا عقلمندوں والی بات۔ آجاؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔

مجھے اس سے یہ بھی خدشہ تھا کہ مجھے یہ گن پوائنٹ پر بھی لے جا سکتا تھا۔ تاہم اس میں رسک ہوتا اس کے لیے۔

میں اس کے عقب میں چلتا ہوا کمرے سے نکلا۔ اس دوران میرے اندر دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ میں اس کے عقب میں چلتا بہ غور اس کی حرکات و سکنات کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ وہ اس طرح چلا جا رہا تھا جیسے اُسے کسی قسم کا کوئی ڈر یا خوف تھا ہی نہیں۔

میرے اندر جو کھٹک پیدا ہوئی تھی وہ اب پہلے سے زیادہ قوی ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے سب کچھ سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا جا رہا ہو یا پھر یہ میرا وہم تھا، کیونکہ اس عمارت کا محل وقوع اس کا دیکھا بھالا تھا۔

''ایسے تو ایسے ہی سہی۔'' میں نے اندر ہی اندر ایک جارحانہ فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا کسی خفیہ دروازے سے باہر آ گیا۔

باہر رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ روشنی بھی تھی۔ سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ باہر آ کر میں اپنے گرد و پیش سے مزید چوکنا ہو گیا۔ میری یہی محتاطی میرے کام آ گئی۔ کیونکہ اسی وقت دائیں جانب مجھے ہلکی سرسراہٹ کا احساس ہوا اور عقب میں بھی مجھے کسی کی آہٹ سنائی دی۔ تب ہی دو... سایوں کو میں نے خود پر جھپٹتے ہوئے دیکھا، میں نے بھی پھرتی کے ساتھ بروقت جھکائی دی تھی۔ دونوں نے کسی کند آہنی شے سے مجھ پر وار کرنے کی کوشش چاہی تھی اور دار ایک دوسرے پر کر ڈالا۔ ان کی کراہ آمیز چیخ اُبھری تھی۔ ڈمی ہمدرد پھرتی سے پلٹا تھا۔ میں نے ان دونوں کو کاندھے کی ٹکریں رسید کر کے پرے دھکیلا ہی تھا کہ میرے ڈمی ہمدرد نے مجھ پر وہی سائیلنسر لگا پستول تان لیا اور غراہٹ سے مُشابہ آواز میں بولا۔

''اب کوئی حرکت مت کرنا۔ شور پڑ گیا تو ہم سمیت تمہارا معاملہ بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔''

''معاملہ تو میرا اب بھی خطرے میں ہے۔ تم میرے ہمدرد نہیں ہو سکتے۔ کون ہو تم؟''

میں بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواباً بولا۔ اس اثنا میں اس کے دونوں ناکام گھات لگائے ساتھیوں نے بھی پستول نکال لیے تھے۔ ان کی چالاکی مجھے کچھ کچھ سمجھ آ رہی تھی کہ یہ لوگ مجھے کسی مقصد کے تحت اثنا غفیل کر کے ہی یہاں سے لے جانا چاہتے تھے۔

''ہم تمہارے ہمدرد ہی ہیں۔ مگر تم غلط فہمی میں پڑ گئے ہو۔ اب چلو۔ اس سے پہلے کہ وزیر جان کے کسی آدمی کی ہم پر نظر پڑ جائے۔''

''ہمدرد اس طرح تاریکی میں اپنے ساتھیوں کو چھپا کر حملہ نہیں کیا کرتے۔'' میں نے بلاخوف کہا۔ ''اگر تم میرے اتنے ہی ہمدرد ہو تو میری ماں کو بھی یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرو۔''

میری بات پر وہ جیسے زچ ہو کر اپنے دانت پیسنے لگا۔ بالآخر اس نے اپنے پستول کا سیفٹی کیچ ہٹا لیا۔ میرا دل یکبارگی.... زور سے دھڑکا۔

''اب ہاں یا ناں میں جواب دینا ہو گا تمہیں شہزی! ہم خود پر زیادہ رسک نہیں لے سکتے۔ ہمارے ساتھ چلتے ہو یا پھر میں تمہیں ادھر ہی گولی مار کے چلتا بنوں؟''

میں نے پل کے پل کچھ سوچا۔ مجھے گولی مارنے کا مقصد تو بہرحال ان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم خطرے میں ان سے کچھ بعید بھی نہ تھا۔

''چلو، میں چلتا ہوں۔'' میں نے کہا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ میں دانستہ ڈمی ہمدرد کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی میرے دائیں بائیں چل رہے تھے، میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اسی سرعت کے ساتھ میرا ذہن بھی کام کر رہا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر جیسے ہی اس کے ایک ساتھی نے کار کا دروازہ کھولا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسے ایک لات رسید کی اور اس کے دوسرے ساتھی کے پیٹ میں کہنی رسید کر دی۔ اس کے حلق سے کراہ سے مُشابہ آواز اُبھری تھی۔

مجھے ڈمی ہمدرد کی غصیلی غراہٹ سنائی دی، وہ شاید مجھ پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا، تب تک میں نے تکلیف سے دہرے ہوتے اس کے ساتھی کو دبوچ کر اس کی طرف زور سے دھکیل دیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑا سائلنسر لگا

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پستول تولا ہی رہ گیا۔ ہم دونوں کی ہی کمزوری یہ تھی کہ رات کی خاموشی میں بغیر شور شرابے کے "کام" چلالیا جائے۔

شاید اسی سبب مجھے ان کے مقابلے میں زیادہ مواقع مل رہے تھے کیونکہ تب سے اب تک یہ بات طے ہو چکی تھی کہ ان کا مقصد مجھے ہلاک کرنا بہرحال نہ تھا۔ میں بھی ایک کے بعد ایک ان مواقع سے فائدہ اُٹھاتا چلا گیا۔

کار کا دروازہ کھولنے والا ساتھی جب تک سنبھلا، میری داہنی لات حرکت میں آچکی تھی جو اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کار کے کھلے دروازے سے اندر جا گرا۔

وہ اسی جانب لپکا کہ اپنا پستول اُٹھا سکے، میری رگوں میں اس وقت جیسے پارا دوڑ رہا تھا۔ ڈمی ہمدرد اپنے اوپر پڑے ساتھی کو سنبھال کر اپنے خاموش پستول سے مجھے نشانہ بنانے لگا۔ مجھے اس سے زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ "چز" کی ہلکی آواز اُبھری اور یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں بازو میں کسی نے گرم تپتی ہوئی سلاخ گھونپ دی ہو۔ میں بازو کی تکلیف کو دانتوں تلے بھینچ کر اپنی دائیں ٹانگ کی ایڑی پر پھرکی کی طرح گھوم گیا اور میری بائیں ٹانگ ڈمی کی ٹھوڑی پر لگی، اس کا جبڑا بری طرح مضروب ہوگیا۔ یہ "انٹر سرکل کک" تھی۔ تنگ جگہ پر بھی اس کا استعمال سودمند رہتا ہے۔ رینجرز ٹریننگ سینٹر میں مجھے اس میں خاصا ماہر کر دیا گیا تھا۔

ڈمی ہمدرد کا پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ میں اُسے اُٹھانے کو لپکا، عقب سے اس کے دونوں ساتھی مجھ پر پل پڑے۔ اور مجھ سمیت ہی احاطے کی گھاس پر رگید گئے۔ ایک نے تو میرے مضروب بازو کے زخم کو چھیل کر رکھ دیا۔ اذیت کی شدت سے میرے منہ سے پہلی بار ایک تیز کراہ خارج ہوئی۔ یہ لوگ بھی لڑائی بھڑائی میں کم نہیں تھے لیکن ابھی تک میں یہ اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ یہ تھے کون لوگ؟ وزیر جان کے ہاں ان کی دوستانہ انداز کی موجودگی سے فقط یہی پتا لگتا تھا کہ ان کا کسی نہ کسی حوالے سے یہاں حق بنتا تھا۔

میں ایک بار پھر زخم کی تکلیف پی گیا اور ایک فل پنچ مدِمقابل کی ناک پر رسید کر دیا۔ وار بھرپور تھا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہوگیا۔

میرے زخم کی دہری تکلیف نے مجھے ایک جنونی طیش میں مبتلا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں بپھر گیا تھا، ایک کو انٹا غفیل کرنے کے بعد میں نے دوسرے کے پیٹ اور سینے کے بیچ کی نازک جگہ پر اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دُہرا تہرا ہوکر گیند بن گیا، میں نے اُسے ٹھوکر مار کے پرے کر دیا۔ میں ڈمی کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا چہرہ ونی لفٹ کک پڑنے کے باعث خون سے تھڑا ہوا نظر آنے لگا تھا اور وہ جلد سے جلد اپنا پستول اٹھانا چاہتا تھا، جو اسے مل نہیں رہا تھا۔ مجھے "فارغ" دیکھ کر وہ کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بھاگا۔

گویا میرے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر وہ خوف زدہ ہوگیا تھا۔ میں بھی جوشِ غیظ سے غراتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔ وہ دروازہ کھولنے والا تھا کہ میں نے اُسے چھاپ لیا۔

مجھ پر جوشِ جنوں طاری تھا، میں نے اُسے گردن سے دبوچ کر کار کے اندر ہی گھسیڑ دیا اور زخمی ہونے کے باوجود اسے ساتھ والی سیٹ پر دھکیلا۔ اگنیشن میں چابی تھی۔ میں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ ڈمی نے بچنے کی کوشش چاہی۔ میں نے اس کا سر بالوں سے پکڑ کر زور سے ڈیش بورڈ پر دے مارا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی، وہ تڑپا، میں نے اس کے بال نہیں چھوڑے اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے اس کا سر ڈیش بورڈ پر مارا، اس کا چہرہ لہولہان ہوگیا، جب اس نے اپنے ہاتھ پیر چھوڑ دیے تو میں نے کار آگے بڑھا دی۔ عمارت سے چند فرلانگ آگے جا کر کار ایک جگہ روک دی اور اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر وحشت انگیز لہجے میں بولا۔

"تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔ میری ماں کی زندگی داؤ پہ لگی ہوئی ہے اور میں یہاں سے زیادہ دور نہیں جا سکتا۔ میں صرف سچ سنوں گا۔ کون ہو تم؟ اور کس کے ایما پہ مجھے یوں یرغمال بنا کر لے جا رہے تھے۔"

وہ جواب دینے کے بجائے اپنے حلق سے غوں غاں کی آواز نکالنے لگا۔ میں سمجھ گیا وہ شدید زخمی ہونے کی مکاری کر رہا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کا لہولہان چہرہ ڈیش بورڈ پر رسید کر دیا اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

"بس اب میں آزاد ہو چکا۔ یہی میرے لیے کافی ہے، یہ تو تم بھی جانتے ہوگے کہ یہ اتنا موقع بھی میرے لیے بہت ہے۔ نہ ہی میرے پاس وقت ہے کہ تم پر ضائع کروں۔ زندہ بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں سچ بولو گے تو تمہیں ہلاک نہیں کروں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔ آخری موقع دیتا ہوں۔ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو؟"

"مم... ممم... ممتاز خان کا۔" بالآخر اس نے

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بتایا۔

”جھوٹ۔ سچ بتاؤ۔“

”مم... میں... سچ بتا رہا ہوں۔“

”ممتاز خان اور وزیر جان میں کیا فرق ہے۔ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ میں تو پہلے ہی ان کے قبضے میں تھا۔ اُسے یہ حرکت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟“

”تھی ضرورت۔“ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”بب... بے شک وزیر جان اور ممتاز خان ساتھی ہیں لیکن... تمہارے... معاملے میں ان دونوں کے درمیان واضح اختلاف ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے پُرسوچ انداز میں بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم ان دونوں کا ہی شکار ہو لیکن... اس کی نوعیت مختلف ہے۔ ممتاز خان تمہیں یرغمال بنا کے زہرہ بیگم (بیگم صاحبہ) کو جھکانا چاہتا ہے۔ وہ اس کی ساری جائیداد اپنے نام لکھوانا چاہتا ہے۔“

”وہ یہ کام وزیر جان کے پاس بھی بہ آسانی انجام دے سکتا تھا۔ بھلا اُسے یہ فریب کھیلنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہیلیوں کے بجائے پوری تفصیل بتاؤ مجھے؟“

”اسپیکٹرم میں ان دونوں کے درمیان ایک عرصے سے اسٹیشن چیف کے عہدے پر ایک سرد جنگ جاری ہے۔ مگر وزیر جان کو یہ اہم عہدہ سونپا گیا جبکہ چوہدری ممتاز خان کو ”کیڈسا“ ایجنٹ بنا دیا گیا۔ جس کے انڈر تنظیم کے دس ٹاپ... ایجنٹ کام کرتے ہیں۔ کم بڑا عہدہ تو یہ بھی نہیں ہے مگر اسٹیشن چیف کی بات اور ہے۔ اسی لیے کئی اہم معاملات میں وزیر جان کا ہی حکم چلتا ہے۔ زہرہ بیگم کو ساتھ لانے کی شرط اسی نے رکھوائی تھی۔ مگر وہ ناکام گئی۔ وزیر جان نے اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہ لی تو چوہدری ممتاز نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ہی ساتھی عہدے دار وزیر جان کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی تاکہ... آگے تو تم خود ہی سمجھ گئے ہو گے۔ آہ... میرا خون بہا جا رہا ہے۔“ وہ کراہ کے بولا۔ ”گاڑی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود ہے۔ مم میری مرہم پٹی... آہ...“

مارے تکلیف اور نقاہت کے وہ پھر نڈھال ہونے لگا۔ خود میرے اپنے زخمی بازو سے خون رس رہا تھا۔ شکر ہے کہ گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ”چھاؤ“ ہو کر گوشت پھاڑتی نکل گئی تھی۔ میں نے اس پر رومال باندھ دیا تھا۔

اس نے جو کچھ بتایا۔ قرائن بھی انہی عوامل کے غماض محسوس ہوتے تھے۔

میں نے کار کی ڈگی سے فرسٹ ایڈ کا سامان نکالا۔ اپنی اور اس کی مرہم پٹی کی۔ پھر ڈگی کے اندر سے ہی مجھے ایک نائیلون کی رسی مل گئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھ کر کار کی عقبی نشست پہ لٹا دیا۔ میں بعد میں اسے پی ایس ایس کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے چوں چراں کی مگر میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرے، اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد میں نے اس کا سیل فون اُچک لیا۔

دل میں خیال آیا کہ اول خیر سے رابطہ کر لوں، جانے وہ بے چارہ کہاں میری تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوگا، مجھے اندازہ تھا کہ نچلا وہ بھی نہیں بیٹھا ہوگا، لیکن وزیر جان کی شرط کے آگے وہ بھی میری طرح شاید کسی خطرناک رسک لینے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ لیکن باوجود اس کے وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہیں بیٹھا ہوگا، اس کی پریشانی دور کرنے کے لیے اور کچھ سوچ کر میں نے اس سے رابطہ کر ہی لیا۔

”او خیر۔ کاکے! تیری آواز سن کر تو میرے اندر جان آ گئی، تو ٹھیک تو ہے ناں؟ ماں جی کیسی ہیں؟“ رابطہ ہونے پر وہ تڑپ کر بولا۔ میں نے اُسے مختصراً صراحت میں اب تک کے بارے میں آگاہی دی، تو وہ تُرنت بولا۔

”تو نے مجھ سے رابطہ کر کے بہت اچھا کیا کاکے! دیکھ میرا انتظار کر... تو نے جو لوکیشن بتائی ہے، وہاں سے میں زیادہ دور نہیں ہوں۔ ایک کام اور کر... بیگم صاحبہ کو بھی خبر کر دے۔ معاملہ حساس اور سنگین ہے، ماں جی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔“

اول خیر کے اس مشورے پر میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی، میں نے کہا۔ ”نہیں، اُنہیں بتانے کی ضرورت نہیں، تمہیں بھی میں نے صرف اس لیے ہی آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ مجھے یقین تھا کہ تم میرے لیے نہ صرف پریشان ہو گے، بلکہ میری تلاش میں بھٹک بھی رہے ہو گے۔ خیر، میرے پاس وقت کم ہے۔ یہ نمبر میرا نہیں ہے۔ میں اندر جا رہا ہوں، سیل سائلنٹ پر لگا دوں گا۔“

”نہیں کاکا! مجھے آ لینے دے۔ میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“ وہ بے چینی سے بولا۔

”آ جاؤ، میدان صاف ہے مگر میں تب تک آدھی مہم نمٹا دوں گا، کیونکہ ابھی تک عمارت کے اندر میری ڈھنڈیا نہیں پڑی۔ رب راکھا۔“ کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر دیا۔

وقت کم تھا۔ سیل فون کو وائبریشن پر لگا کر میں آگے بڑھا اور پیدل عمارت کی طرف چل دیا۔ جہاں میرا اور ڈی اور اس کے ساتھیوں سے خوں ریز معرکہ ہوا تھا، وہاں سے میں نے ڈی کا سائلنسر لگا پستول اُٹھالیا اور اس کے ایک ساتھی کا اضافی پستول بھی لے لیا۔

جس راستے سے مجھے ڈی باہر لایا تھا، میں اسی راستے سے عمارت میں دوبارہ داخل ہو گیا۔ اندر ہنوز خاموشی کا راج تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ گویا میرے پاس ابھی بہت کچھ کرنے کے لیے سنہری موقع تھا۔ وقت کی کمی اپنی جگہ مگر موقع سہل تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی کمرے کا رُخ کیا، جہاں مجھے قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا ابھی تک وہاں کا کسی نے رُخ کیا تھا یا نہیں؟ وہاں پہنچا تو کچھ ایسا اشارہ مجھے نہیں ملا جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہاں میری غیر موجودہ میں وزیر جان کا کوئی ساتھی آیا گیا ہو۔ کیونکہ دروازہ ایسے بھڑا ہوا ملا تھا، جیسا چھوڑ کر میں ڈی کے ساتھ نکلا تھا۔ یہ خوش آئند بات تھی۔ گویا مجھے قید کر کے وہ سب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔

میں پلٹا اور... اور اریب قریب کے جتنے بھی کمرے تھے میں ان کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا، مجھے یقین تھا کہ ماں کو بھی ادھر ہی کہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔

ساتھ والی مختصر راہداری کے سرے میں ہی مجھے ایک کمرے کی مُن گُن لینے کے دوران اندر سے کسی کی سسکیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میرا دل بے طرح دھڑ دھڑانے لگا۔ یہ میری ماں کی آواز تھی۔ میں نے تصور میں اس الم نصیب کو گھٹنوں میں سر دیے روتے دیکھا اور پھر میرے اندر جوالا مکھی بھڑک اُٹھا۔

دروازے کے نیچے سے روشنی کی باریک لکیر نظر آرہی تھی۔ میں نے ایک نگاہ اپنے گردوپیش پر ڈالنے کے بعد دروازے پر زور آزمائی شروع کر دی۔ دروازہ بند تھا، مگر تالا عام سا تھا۔

میں نے اپنی جیب سے ایک باریک کالنگ کارڈ نکالا اور اُسے دروازے کی درز کے اندر ڈال کر ہلکا جھٹکا دیا تو لاک کھل گیا۔ میں آہستگی سے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

سامنے میری ماں واقعی دیوار سے اپنی پشت لگائے، گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔

''ماں۔'' میں نے اُسے ہولے سے پکارا۔ میری آواز پر بے اختیار اس نے اپنا سر اُٹھا لیا اور اُس کے جھریوں بھرے چہرے پہ ایکا ایکی جیسے خوشی و مسرت پھوٹ پڑی، اندر ہلکی روشنی تھی، میں آگے بڑھا۔ وہ ضعیف و نزار ہونے کے باوجود۔ ''شہزی پتر'' کہتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں رقیق دل کے ساتھ ماں کی طرف بڑھا۔ اور جیسے اس کے قدموں میں جھک گیا۔ اس کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میں آ گیا۔ آہ! اللہ نے بھی ماں جیسی کیا ہستی پیدا کی ہے۔ ایسے ہی تو نہیں اللہ نے ماں کے قدموں میں جنت رکھی ہے کہ انسان سارے دکھوں اور غموں سے خود کو یک لخت آزاد محسوس کرتا ہے اور ایک روحانی سکون سا دل و دماغ میں جاگزیں ہونے لگتا ہے۔

میں اپنا سر جھکا کے اپنی ماں سے لپٹ گیا تھا، اس کا وجود ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔

''شہزی پتر! تت... تو نکل جا... چ... چلا جا یہاں سے... یہ... یہ شیدا بڑا خطرناک آدمی ہے۔ کک... کہیں یہ تجھے مار نہ ڈالے۔ مم... میں نے بہت دُکھ سہے ہیں پُتر! اب مجھ میں تاب نہیں۔''

میں درد سے پھٹ پڑا۔ اُسے اپنی نہیں میری فکر ہو رہی تھی۔ میں نے ماں کے سر کی چادر دُرست کی اور بولا۔

''ماں۔ تُو کیوں فکر کرتی ہے؟ اپنے پُتر پہ بھروسا رکھ۔ اب دنیا کی کوئی طاقت ہم ماں بیٹے کو جدا نہیں کر سکتی۔ وقت کم ہے ماں! آ جا میرے ساتھ۔''

وہ بے چاری حیران و پریشان سی ہو کر کبھی میرا چہرہ تکنے لگتی اور کبھی میرے ہاتھ میں پکڑے سائلنسر لگے پستول کو۔ تب ہی اُس کی نگاہ میرے زخمی بازو پر پڑی اور وہ پریشان سی ہو گئی۔

''تت... تیرے بازو کو کیا ہوا پُتر! تُو زخمی ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں ماں! یہ معمولی سا زخم ہے۔''

وہ معصومانہ حیرانی سے بولی۔

''تت تُو پستول چلا لیتا ہے؟'' ماں کی بات پر میں اندر ہی اندر مسکرا دیا۔ اب بھلا میں اُسے کیا بتاتا کہ مجھے اور کیا کیا کچھ آتا ہے۔ مجھے خاموش پا کر وہ اس بار کچھ گومگو سے لہجے میں بولی۔

''تُو پورا اپنے باپ پر گیا ہے۔ وہی ناک نقشہ ویسا ہی اُونچا لمبا اور نڈر دلیر۔ پتا نہیں وہ بے چارہ خود کہاں ہو گا۔ اور... اور... تیرا وڈا بھرا۔ آہ تقدیر نے بڑے ستم ڈھائے ہیں مجھ حرماں نصیب پہ۔''

میں ماں کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا مگر یہ ساری

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

باتیں کسی اور وقت کے لیے اٹھا کر میں ماں کو تھامے دروازے کی طرف بڑھا۔

ماں میرے ساتھ تھی اور مجھے یہاں سے ہر صورت نکلنا تھا۔ ماں کو صحیح سلامت یہاں سے نکال لے جانے کی مجھے اب زیادہ فکر ہونے لگی تھی۔

میں نے ابھی وزیر جان پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میں ماں کو لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری ہنوز سنسان پڑی تھی۔ مدھم روشنی میں، ماں کو لیے آگے بڑھتے ہوئے میں اپنے گرد و پیش سے بھی حد درجہ محتاط تھا۔ لیکن ابھی میں نے مذکورہ کمرے کے سامنے والی راہداری عبور کی تھی کہ اچانک مجھے جیب میں رکھے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔

میں نے راہداری کے سرے والی دیوار کی آڑ لی اور سیل نکال لیا۔ کال اول خیر کی تھی۔ وہ آ چکا تھا۔ میں نے اُسے باہر ہی ٹھہرے رہنے کا کہا اور آگے بڑھا۔ ایسے ہی وقت میں مجھے اپنے سیدھے ہاتھ والے لاؤنج میں کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں اِدھر ہی رُک گیا۔ مگر یہی وہ وقت تھا جب ان دونوں کی نظریں بھی مجھ پر پڑیں۔ ایک چلّایا۔

''رُک جاؤ ورنہ۔۔۔'' آواز اس کے حلق میں دبی رہ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پستول کا رُخ اُسے دیکھتے ہی گھما دیا تھا۔ پستول کی لمبی نال سے ہلکی زناٹے دار ''سرگوشی'' اُبھری جس میں دُشمن ہرکارے کی کراہ سے مُشابہ چیخ بھی شامل تھی۔

دوسرا کسی دیوار کی آڑ لینے کو حرکت میں آیا۔ میں نے اس پر بھی گولی چلا دی۔ اس کی چیخ سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اُسے زیادہ مہلک نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ کہیں چھپ گیا تھا اور ہمارے لیے مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔ میں ماں کے آگے ڈھال بنا اُسے لیے نکاسی کی راہ پہ ہولیا۔۔۔ اور ساتھ ہی میری عقابی نظریں اُسی سمت۔۔۔۔ جمی ہوئی تھیں جہاں میری گولی سے زخمی ہونے والا ہرکارہ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ موقع تاک کر مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ لیکن اس کی طرف سے خاموشی پا کر یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ یقیناً کسی خفیہ ڈیوائس پر اپنے ساتھیوں کو اطلاع کر رہا ہوگا۔

میں نے اپنی سی کوشش تیز کر دی، اس سے پہلے کہ دُشمن ہرکاروں کا یہاں جمگھٹا جمع ہو جاتا۔

اول خیر باہر میرا منتظر تھا۔ میں ماں کو لیے نکاسی والے راستے پہ ہولیا تھا۔۔۔ اسی وقت جب میں ماں کے ساتھ ایک بیرونی کمرے کی دیوار سے اُبھر رہا تھا اور حفظِ ماتقدم کے تحت میں نے اسی سمت آخری نگاہ ڈالی تو وہاں دبی دبی روشنی میں مجھے اُسی ہرکارے کا ڈولتا لڑکھڑاتا ہوا ہیولا دکھائی دے گیا، گویا اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے اور ان کے بروقت پہنچنے سے پہلے وہ آخر تک نمک حلالی کا حق ادا کرنے کی تگ و دو میں تھا کہ میں نے اس پر ایک اور ''خاموش'' فائر کر دیا۔

میں نے اُسے اُچھلتے اور پھر چیخ مار کر گرتے دیکھا۔ پھر میں نہیں رُکا اور ماں کو تھامے جتنا تیز چل سکتا تھا، چلتا ہوا عمارت کے اُسی خفیہ دروازے سے باہر آ گیا، مگر اسی لمحے جیسے پوری عمارت جاگ پڑی۔ ایک دو گولیاں بھی چلائی گئیں۔ ایک برسٹ بھی عین اسی جگہ داغا گیا تھا، جہاں ہم نے پیش قدمی کرنا چاہی تھی۔ ہم بال بال بچے۔ عمارت سے آگے جانے کا مطلب پیش قدمی توڑنے والے اندھے برسٹ کی زد میں آنا تھا۔

میں ماں کو لیے اسی سرعت کے ساتھ واپس پلٹا جیسے وہ خفیہ دروازہ ہمیں پکار رہا ہو۔ یہی ایک پناہ فوری طور پہ میری دانست میں آئی تھی، بے شک یہ درِ دُشمن سہی۔ میں ماں کو لیے اسی دروازے سے اندر آ گیا۔ اگرچہ یہاں بھی دُشمن ہرکاروں کی آمد غیر متوقع نہیں تھی، تاہم باہر اندھے فائر کرنے والوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہماری بلکہ ابھی بھی اس خفیہ ''گزرگاہ'' سے واقفیت رکھے ہوئے تھے۔

میرا خاموش پستول واقعی خاموش ہو گیا تھا، یعنی خالی ہو گیا تھا، شکر ہے کہ میں نے حفظِ ماتقدم کے تحت دوسرا ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کا سائلنسر بدلنے کے بجائے میں نے کلپ بدل لیا۔

مجھے اول خیر کی بھی فکر ہوئی، وہ باہر ہی کہیں عمارت کے آس پاس موجود تھا اور یقیناً اس نئی صورتِ حال پر تشویش کا شکار بھی ہوگا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ بھی بے خطر اس آتشِ نمرود میں نہ کود پڑے، میں نے اسے کال کرنے کی غرض سے اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسی وقت مجھے اس کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی، میں یہی سمجھا کہ مجھ سے پہلے اس نے رابطہ کر لیا ہے، خیر بات تو ایک ہی تھی، مگر ڈسپلے پر نمبر اول خیر کا نہ پا کر میں چونکا تھا، یہ بیگم صاحبہ کا بھی نمبر نہ تھا۔ ایک سنسنی خیز خیال یہ اُبھرا کہ کسی دُشمن کی کال تھی جس نے ڈمی سے ہی رابطہ کیا ہوگا، کیونکہ بہرحال یہ سیٹ اسی کا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کی تو دوسری

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

طرف سے اپنے غنیم دیرینہ کی آواز میرے لیے متوقع تھی۔

"جابر! کیا ہوا؟ اتنی دیر کیوں لگا دی تم نے؟"

گویا میرے ڈمی کا نام جابر تھا۔ میں نے حلق کے "شو سے" کو ٹیڑھا میڑھا کر کے آواز بدلنے کی کوشش کی اور ذرا کراہتی آواز میں بولا۔

"چوہدری جی! میں کامیاب تو ہو گیا تھا، مگر...." میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو دوسری طرف سے اس کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری۔

"چوہدری جی؟ کون ہو تم؟"

ایک ہی لفظ نے میرا بھانڈا پھوڑ ڈالا تھا، میرا ڈمی یا جابر شاید چوہدری ممتاز کو کسی اور "عنوان" سے مخاطب کرتا ہوگا۔ پھر بھی میں نے بات بنانے کی کوشش چاہی۔

"وہ چوہدری جی...." میری آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ دوسری طرف سے فوراً رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ اُس شاطر آدمی کو کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔

میں نے بھی اس پر لعنت بھیج دی۔ اسی وقت اول خیر کی کال آ رہی تھی۔ میں نے اس سے بات کی۔ گڑبڑ کا اُسے بھی احساس ہو چکا تھا۔

"کاکے! تُو اندر ہی رہ۔ باہر مت نکلنا، چالاک دُشمن نے سب سے پہلے عمارت کی بیرونی طرف کی ناکا بندی کر دی ہے۔"

"ہاں! میں اندر ہی ہوں اور فی الحال محفوظ بھی مگر ایسا تا دیر نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔ ماں ایک بار پھر بُری طرح ہراساں نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اُسے تسلی دی اور پھر کچھ اور اندر کی جانب کھسکا تو مجھے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑ دھڑا رہا تھا اور نظریں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ اور پھر دفعتاً ہی مجھے اپنے ذرا عقب میں بائیں جانب ایک تنگ سا زینہ اُوپر کی جانب جاتا دکھائی دیا۔ میں ماں کو لیے اسی جانب بڑھ گیا۔ اور ٹھیک اسی وقت ہم پر پورا برسٹ فائر ہوا، ماں کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، میں دہل کر رہ گیا مگر شکر ہے کہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تھی۔

دُشمن ہرکاروں کی ہم پر نگاہ پڑ چکی تھی۔ میں ماں کو تھامے.... جتنی تیزی کے ساتھ زینے طے کر سکتا تھا وہ طے کرتا چلا گیا۔ ماں کو بھی خطرے کا پوری طرح احساس تھا۔ یہی وجہ تھی وہ بے چاری بھی حوصلے سے کام لے رہی تھی۔

جیسے ہی میں نے زینے طے کیے، نیچے سے مجھے کسی ہرکارے کے غصیلے انداز میں چلانے کی آواز سنائی دی۔ میں پروا کیے بغیر اسی سمت کو بڑھا جو اُوپری منزل کی بالکونی ہی کہلاتی تھی۔

یہاں مجھے کچھ سناٹے کا احساس ہوا۔ کمرے یہاں بھی بنے ہوئے تھے۔ میں ماں کو لے کر آگے بڑھا اور ایک کمرے کی عقبی گیلری میں آ گیا۔

یہاں کسی کمرے کا دروازہ مجھے ادھ بھڑا دکھائی دیا تو میں اس میں داخل ہو گیا۔ کمرا آرام دہ اور کشادہ تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھا، اسی وقت باہر سے مجھے دوڑتے قدموں اور کسی کے اُونچے اور غصیلے لہجے میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

میں اس آواز کو پہچان گیا تھا۔ یہ وزیر جان تھا۔ میں تو اس وقت خود شکار ہونے کی پوزیشن میں تھا مگر وزیر جان بھی مجھے اپنا شکار ہی نظر آ رہا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا اور ابھی میں کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے میں کھڑبڑ کی آواز اُبھری۔ میں ماں کو لے کر فوراً ہی ایک قریب دھرے بڑے سے خوب صورت ڈیوائیڈر کے پیچھے جا چھپا۔ پھر ذرا سر اُبھار کر کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تو یک لخت میرے ٹھٹکے ہوئے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں، اندر داخل ہونے والا شخص وزیر جان ہی تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا اس کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا، یہ شاید اس کا کوئی قریبی ساتھی تھا، جسے وہ مختلف ہدایتیں دے رہا تھا۔

"وہ دونوں یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ شہزی بہت خطرناک ہو چکا ہے ہمارے لیے۔ اس کی وجہ سے ہمیں بار بار اپنے ٹھکانے بدلنے پڑتے ہیں۔ تم سب نکمے اور بے کار ہو چکے ہو میرے لیے۔ تم سے ایک لڑکا نہیں سنبھل پایا ہے، تُف ہے تم سب پر۔"

وہ اپنے ساتھی پر گرم ہو رہا تھا۔ ساتھی دبے دبے خوف سے مؤدبانہ بولا۔

"ایسی بات نہیں باس! ہم سب محتاط تھے۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا باس کہ ہمارے درمیان کوئی غدار موجود تھا۔ اسی نے شہزی کو فرار کروایا ہے۔"

"غدار؟" وزیر جان کی چونکتی ہوئی آواز اُبھری۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم ہوش میں تو ہو؟"

"باس! شہزی اگر خود فرار ہوا ہوتا تو اس کے کمرے کا دروازہ ٹوٹا ہوا یا کم از کم تالا تو ٹوٹا ہوتا۔ مگر میں نے خود

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جائزہ لیا تھا دونوں کمروں کا۔ شہزی کے کمرے کا دروازہ بالکل صحیح سلامت تھا، لاک بھی ٹھیک تھا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کمرے کا دروازہ کسی اپنے آدمی نے ہی باہر سے چابی لگا کر کھولا ہے۔" اس کی بات پر وزیر جان سوچ میں پڑ گیا۔ دفعتاً اس کے ساتھی کے سیل فون پر کسی کی کال آئی، اس نے وہ سنی اور اس بار پُرجوش لہجے میں بولا۔

"میری بات ٹھیک نکلی باس! ان غداروں کا پتا چل گیا ہے۔ عمارت سے باہر چند قدموں کے فاصلے پر ہمارے غدار ساتھی زخمی حالت میں پڑے مل گئے ہیں۔ لگتا ہے شہزادو انہیں چکما دے کر نکل گیا ہے۔"

"مائی فٹ۔" وزیر جان غیظ و غضب کے مارے اپنے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مار کے غرایا۔ پھر اپنے ساتھی کو تحکمانہ ہدایت دیتے ہوئے بولا۔ "سنو جمی! شہزادو یہاں سے فرار ہوتے ہی سب سے پہلے پاور والوں کو یہاں کی خبر دے گا، میں اسی وقت کنال لاج کی طرف نکل رہا ہوں اور اسٹیشن فور کو سنبھالنے کی ذمے داری تمہیں سونپتا ہوں، اسے عارضی طور پر بند کر ڈالو۔ اور تینوں غداروں کی مرہم پٹی کر کے انہیں گرین ہیلس پہنچا دو۔"

"یس باس! سب ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔" مؤدبانہ انداز میں کہتا ہوا اس کا ساتھی کمرے سے نکل گیا۔ میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا۔ میں نے ابھی وزیر جان پر ہاتھ ڈالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ یہ لوگ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ میں فرار ہو چکا ہوں۔

وزیر جان اپنی کچھ ضروری تیاریوں میں مصروف رہا اس کے تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکل گیا۔ میں نے فوراً اول خیر سے رابطہ کرنا چاہا تو بُری ٹھٹکا۔ سیل کام نہیں کر رہا تھا۔ بے اختیار میں ایک گہری ہنکاری خارج کر کے رہ گیا۔ یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی کہ ممتاز خان کو اس بات پر شبہ ہوتے ہی کہ اس کے ساتھی کا سیل فون کسی اور کے قبضے میں چلا گیا تھا، اس نے فوراً ہی سم بلاک کرا دی تھی۔ وہ بہت چالاک ..... اور شاطر انسان تھا، کسی ایسے ہی مواقعوں کے لیے اس نے اپنے کچھ مخصوص ساتھیوں کی سموں کا "کنٹرول" اپنے ہاتھ --- میں ہی رکھا ہوگا، تاکہ بہ وقتِ ضرورت اسے بلاک کروا سکے۔

میں دراصل فون کر کے اول خیر کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ جہاں ہے وہیں رہتے ہوئے میرے یہاں سے نکلنے کا منتظر رہے۔ ورنہ وہ نظروں میں آ گیا تو دشمنوں کا یہ گمان فرو ہو جائے گا کہ میں یہاں سے فرار ہو چکا ہوں۔

میں اسی کمرے کے عقبی دروازے سے دوبارہ بالکونی ... میں آ گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اول خیر عمارت کے باہر تھا یا چوری چھپے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

زینے طے کرتا ہوا میں محتاط روی کے ساتھ نیچے آیا تو میں نے وزیر جان کو دو آدمیوں کے ساتھ تیزی سے باہر نکلتے دیکھا۔ باقی اس کے ساتھی اِدھر اُدھر مصروف ہو گئے۔

ہر سو خاموشی چھا گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں بھی موقع تاک کر اسی خفیہ دروازے سے باہر نکلا تو سامنے احاطے کا منظر دیکھ کر بُری طرح ٹھٹک گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

اول خیر، وزیر جان پر پستول تانے کھڑا تھا، جبکہ وزیر جان کے دونوں ساتھی بے چین سے دکھائی دے رہے تھے۔ اول خیر کی یہ حرکت خود اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ایک ڈیلٹا کمانڈو ایجنٹ کی حیثیت سے میں اس کی خطرناکی سمجھ سکتا تھا کہ اول خیر کو اسٹیشن فور کی عمارت سے وزیر جان کا کوئی ساتھی اسے گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ اب میرا چھپے رہنا بے سود تھا۔

میں ماں کو لیے اس کی طرف بڑھا اور اسی وقت میری محتاط نظروں نے اسٹیشن فور کی عمارت کی ایک کھڑکی سے مہیب نال کی جھلک دیکھ لی، میں نے تلے اُوپر اس طرف دو تین فائر جھونک مارے۔

صورتِ حال ایک دم بگڑ کر خطرناک ہونے لگی تھی۔ کھڑکی چٹخنے اور کسی کے کریہہ انداز میں چیخنے کی آواز پر دھیان دیے بغیر میں پھرتی کے ساتھ آگے بڑھا۔ اول خیر کی مجھ پر نظر پڑی، اور یہی اس کی غلطی ثابت ہوئی۔ بے شک اس کا یہ ردِعمل فطری تھا۔ تاہم کچا کھلاڑی وہ بھی نہ تھا لیکن اس طرح مجھے ماں سمیت اچانک اپنی جانب آتے دیکھنا بہرحال اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ جیسے ہی اس نے میری جانب دیکھا، وزیر جان کے قریب کھڑے اس کے دونوں ساتھی حرکت میں آئے، ایک نے اول خیر کے پستول والے ہاتھ پر لات رسید کر دی۔ دوسرا اُسے دبوچنے کے لیے جھپٹا، میں نے راہ میں ہی دوڑتے ہوئے لات مارنے والے پر گولی چلا دی، وہ چیخ کر گرا۔ اول خیر نے خود پر جھپٹنے والے کو اپنے بھاری کاندھے کی ٹکر رسید کر دی، اثنائے راہ وزیر جان اپنی کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔ عمارت کے اندر سے بھی چار پانچ مسلح افراد نکل آئے۔ اول خیر نہتا تھا۔ اب اُسے وزیر جان کی ڈھال میسر نہ تھی، دشمن کسی بھی وقت

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اُسے گولیوں سے چھلنی کر سکتے تھے، ماں میرے ساتھ تھی۔ میں بھی تب تک کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے کار کے قریب والے ہرکارے کی پروا نہ کی کیونکہ اُس کے ساتھ اول خیر بھڑا ہوا تھا۔ مجھے ان مسلح ہرکاروں کی طرف سے تشویش ہوئی تھی جو اپنے باس کی جان کو خطرے میں دیکھ کر عمارت سے باہر نکل آئے تھے۔

ان میں سے دو نے مجھے اور ماں کو اپنے پستولوں کی زد میں لینے کا ارادہ کیا۔ میں نے ان پر پہلے ہی یکے بعد دیگرے دو فائر جھونک مارے، وہ لڑکھڑا کر گرے۔ باقی تین اول خیر کی طرف متوجہ رہے۔ وہ ابھی اول خیر پر کم ازکم ...اندھا دھند گولیاں داغنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ مگر اپنے دو ساتھیوں کی چیخ اور فائرنگ پر وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ تب تک میں احاطے کی ایک بغلی دیوار کی آڑ میں آچکا تھا، مگر اول خیر کی طرف سے مجھے تشویش تھی۔ وہ ان کی زد میں تھا۔

ماں کو اس دیوار کی آڑ میں چھوڑ کر میں پھر ان تینوں ہرکاروں کی طرف متوجہ ہوا، ادھر اول خیر نے بھی اس تیزی سے بدلنے والی صورتِ حال کی خطرناکی کو بھانپتے ہوئے نہ صرف اپنے مدِمقابل کے ساتھ زور آزمائی کرتے ہوئے اُسے اپنی ڈھال بنائے رکھا تھا بلکہ وہ کھسک کر وزیر جان کی کار کے آگے بھی آگیا تھا۔ مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

وزیر جان کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس نے تیزی سے کار ریورس کی تھی۔ اس اثنا میں، میں نے اس کے تینوں ساتھیوں پر گولیاں داغیں۔ مگر کوئی زخمی نہیں ہوا، وہ بھی میری طرف سے خطرناکی کو بھانپ کر فوراً احاطے میں ایک جانب کھڑی ڈبل کیبن جیپ کی آڑ میں جا چکے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ میں اپنے ساتھی اول خیر کو کسی بھی قیمت پر ان تینوں کی بھینٹ چڑھنے نہیں دینا چاہتا تھا اسی لیے میں نے بھی اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ پل کے پل ایک خیال میرے ذہن میں اُبھرا... اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو نیچے گرا لیا اور جس بھاری بھرکم جیپ کی آڑ لیے وہ تینوں ہرکارے چھپے ہوئے تھے، اس کے فیول ٹینک کا نشانہ لے کر میں نے گولی چلادی۔

فیول ٹینک نے کم ازکم اس وقت تو کسی بلاسٹنگ بم کا ہی کام دیا تھا اور ایک دھماکے سے پھٹا، جیپ کئی فٹ اُوپر اُچھلی اور ساتھ ہی انسانی چیخیں بھی اُبھریں۔ ادھر میں نے راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے وزیر جان کی کار کے ٹائر کا نشانہ لیا۔ ایک ہی گولی چلی تھی، وہ بھی خالی گئی۔ وہ تیزی سے کار بھگا لے گیا۔ میں اول خیر کی طرف متوجہ ہوا، وہ ابھی تک اپنے مدِمقابل پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ تاہم اس کے لیے وہ بھی ناک کا چنا ہی ثابت ہو رہا تھا۔ وقت کم تھا، عمارت کے اندر سے نجانے کب کون برآمد ہو جاتا، عمارت کے اندر چند ایک ہی ہو سکتے تھے، جن کے لیے اب شاید یہ سب بے سود ہی تھا اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد یہ جنگ نمٹے تو وہ پولیس کے آنے سے قبل یہاں سے نکل جائیں۔

باہر موجود آخری ہرکارے نے بھی میرے ہاتھوں اپنے دیگر ساتھیوں کا انجام دیکھ لیا تھا، لہٰذا وہ بھی نہ رُکا اور ایک طرف کو دوڑ پڑا۔

میں پلٹا اور ماں کو لیے احاطے کی دیوار پھلانگ کر سڑک پر آگیا۔ اول خیر میرے ساتھ تھا، میرے دائیں بازو پر بندھی پٹی کو دیکھ کر وہ بھی فکرمند سا ہوگیا۔

ہماری کار وہیں موجود تھی، جہاں میں نے چھوڑی تھی۔ اور پھر بلاتاخیر ہم اس میں سوار ہو کر روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

کار اول خیر چلا رہا تھا۔ میں، ماں کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھا تھا۔ ہمارا رُخ سرید بابا کی کوٹھی کی طرف تھا۔ رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ مین روڈ پر آتے ہی اول خیر نے ماں کو سلام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ میری طرح وہ بھی ماں جی کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش کا شکار رہا تھا۔

سکون کے لمحات میسر آتے ہی میں نے ماں سے مسکرا کر پوچھا۔ ”ماں جی! آپ ٹھیک ہو ناں؟“

”ہاں میرے لعل! میں بالکل ٹھیک ہوں، پر تو بہت زخمی ہے، تیرا بازو بھی۔“ ماں نے ممتا بھرے لہجے میں فکر مندی سے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

”آپ فکر نہ کریں ماں جی! یہ معمولی زخم ہے، ابھی گھر جا کے خود ہی مرہم پٹی کرلوں گا۔“

میں نے اول خیر کے بارے میں ماں جی کو بتایا، ماں جی اُسے دعائیں دینے لگیں تو اول خیر نے ایک حسرت زدہ سی آہ خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”او خیر، ماں جی! بہت عرصے بعد اس سسرے اول خیر کو بھی کسی ماں نے دعا دی ہے۔ اوئے کاکے! یقین کر دل، کلیجا سب ٹھنڈا ٹھار ہوگیا۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو میں اور ماں جی بے اختیار مسکرا دیے۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"تُو فکر نہ کر میرے یار! اب یہ دعائیں ماں جی سے ہم دونوں کو ہر روز اور مفت ملا کریں گی۔"

"ہاں کا کے! ماں کی دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تو بہت خوش قسمت ہے کہ تجھے ماں کی چھاؤں مل گئی۔"

"خیرے پتر! تُو بڑا دُکھی معلوم ہوتا ہے۔ ماں کی نگاہ ہر بیٹے کے لیے ایک ہی ہوتی ہے۔ تو بھی میرے پتروں جیسا ہی تو ہے۔" یہ کہتے ہوئے ماں کا لہجہ رُندھ گیا۔ پتا نہیں اُسے کیا یاد آ گیا تھا؟ ماں جی کا اول خیر کو "خیرے پتر" کہنا مجھے بہت اچھا لگا تھا، لیکن ان کی بات پر چونکا میں بھی تھا، انہوں نے پتر کے بجائے "میرے پتروں جیسا" لفظ استعمال کیا تھا۔ میں اس وقت اس پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ نہ ہی اپنی ماں کے اچانک غم ناک ہوتے لہجے کی وجہ سمجھ پایا تھا۔

اول خیر نے بڑے جذبات انگیز لہجے میں ماں جی سے کہا۔ "او جیئو ماں جی! تُو تو واقعی میری ماں ہی ہے۔" میرے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ مگر دل و دماغ میرا ایک عجیب سی بے چینی کا شکار تھا۔ ماں میرے ساتھ تھی باپ میرا دور تھا، مگر بقول وزیر جان کے وہ بھی زندہ تھا، مگر کہاں تھا؟ یہ نہ میں جانتا تھا نہ ہی ماں۔ مگر ماں کا وزیر جان سے ماضی کے حوالے سے تعلق اور دھوکا۔ یہ سب اور بہت سی باتیں میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔

میں ابھی تک ان اُلجھنوں میں پھنسا ہوا تھا، تاہم کچھ اُمید تو ہو چلی تھی کہ ماں کی زبانی اب بہت سی حقیقتیں بھی آشکارا ہونے والی تھیں۔ ابھی بہت سی کہی ان کہی باتیں تھیں، جو سوالات کی شکل میں میرے ہی نہیں ماں جی کے دل میں بھی موجود تھیں۔

مجھے اس خوں ریز معرکے میں وزیر جان کا بچ نکلنا بے چین کر گیا تھا، حالانکہ ایک موقع بھی ہاتھ آیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ ہاتھوں نکل گیا۔ تاہم مجھے تسلی تھی کہ وہ بھلا اب کہاں بچ کر جا سکتا تھا؟ تھا تو اسی علاقے اور اسی شہر میں، پھر میں اس کی جی سے ہونے والی باتیں بھی سن چکا تھا کہ اس نے اسٹیشن فور سے سیدھا اپنی ساہیوال والی رہائش گاہ "کنال لاج" کا رُخ کیا ہوگا۔

ہم سرمد بابا کی کوٹھی پہنچ گئے۔

شکیلہ بے چینی سے ہماری منتظر تھی، ہمیں دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ اُس بے چاری کا بھی اللہ اور ہمارے سوا کون تھا۔ ایک بھائی تھا، وہ بھی اس دنیا میں اب نہیں رہا تھا۔ دُکھی وہ بھی بہت تھی۔ ہمارے ساتھ ماں جی کو دیکھ کر اُسے پہلے تو حیرت ہوئی اور پھر حقیقت جاننے کے بعد وہ مسرت سے کھل اُٹھی۔ ہمارا دُکھی لوگوں کا، اپنوں سے بچھڑے ہوؤں کا ایک ٹولا تھا، جہاں کہیں کسی کا کوئی ماضی کا گم گشتہ کردار مل جاتا، سب کی خوشیاں پھر سانجھی ہو جاتیں، یہی حال اول خیر اور شکیلہ کا بھی تھا۔ ماں جی کو بھی وہ اپنی ماں کے تصور میں ہی دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا ابھی تو عابدہ کو بھی یہ خوش خبری سنانا تھی، وہ بھی بہت خوش ہوگی۔ آخر کو وہ ماں جی کی ہونے والی بہو تھی۔ خوشی کے اس موقع پر میں سرمد بابا کو کیسے بھول سکتا تھا۔ یقیناً وہ بھی اتنے ہی خوش ہوں گے جتنے کہ ہم سب تھے۔

ماں جی بڑی حیرت سے سرمد بابا کی عالیشان کوٹھی کو دیکھ رہی تھیں۔

"شہزی پتر! یہ گھر تیرا ہے؟" میں ماں جی کی بات پر بڑی محبت سے مسکرا دیا اور بولا۔

"سب معلوم ہو جائے گا اور مجھے بھی تو آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ آپ اب آرام کریں۔"

شکیلہ میرے بازو کا زخم دیکھ کر پریشان سی ہو گئی۔ اس نے میری مرہم پٹی شروع کر دی۔ ماں اُسے مرہم پٹی کرتے ہوئے بہ غور دیکھ رہی تھیں۔ یقیناً ان کے دل میں شکیلہ سے متعلق بھی سوال اُبھرا ہوگا۔ مگر وہ خاموش رہیں۔ شکیلہ نے ماں جی کے لیے کھانے پینے کا بندوبست کیا انہیں ان کے کمرے تک چھوڑ آئی۔

ہم بھی تھکے ہوئے تھے۔ اول خیر نے مجھے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اور باہر گیٹ پر متعین گارڈز کو کچھ ضروری ہدایات بھی دیں۔ میں اُسے بتا چکا تھا کہ کس طرح پہلے ایک ڈمی ہمدرد نے میرا نجات دہندہ بننے کی کوشش کر کے مجھے یرغمال بنانا چاہا تھا اور اسی دوران ثریا (مرحوم) کے ایک ساتھی نے مجھے وہاں سے نکالنے کی سعی بھی چاہی تھی مگر بدقسمتی سے وہ بے چارہ میرے ڈمی ہمدرد کے ہاتھوں مارا گیا تھا، جو درحقیقت، چوہدری ممتاز خان کا آدمی تھا۔

"او خیر کا کے! لگتا ہے۔ ممتاز خان اور وزیر جان کے درمیان بھی کوئی کھیڈ پڑنے والی ہے۔" ساری بات سننے کے بعد وہ بولا۔

"ہاں! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن یار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں کی سرد جنگ سے ہم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں؟"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ شکیلہ اُٹھی اور کارڈلیس

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجھے لاکر تھماتے ہوئے بولی۔ ''بیگم صاحبہ کا فون لگتا ہے۔''

میں چونکا اور ایک نظر سامنے بیٹھے اول خیر پہ ڈالنے کے بعد ریسیور اپنے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

''شہزی! تت... تم... آگئے؟ کیسے ہو؟ تم نے مجھے اپنی خیریت سے مطلع کرنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ ماں جی کا کیا بنا؟'' وہ حسبِ توقع شکوہ کرتے ہوئے بولیں تو میں نے کہا۔

''ہم بالکل ابھی پہنچے ہیں۔ ماں جی بھی ساتھ ہیں ہمارے، وہ بھی ٹھیک ہیں۔''

''کک... کیا... مم... ماں جی ساتھ ہیں۔ تت... تم اُنہیں بہ خیریت...'' ان کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ میں نے درمیان کہا۔

''ہاں! میں اور اول خیر اُنہیں بہ حفاظت وزیر جان کے چنگل سے چھڑا لائے ہیں۔''

''میں ابھی پہنچتی ہوں۔'' وہ بے چینی سے بولیں تو میں نے منع کر دیا۔

''نہیں زہرہ صاحبہ! اس وقت آپ کا نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔ صبح ہونے پر میں خود آپ سے رابطہ کرلوں گا۔ اور آپ بھی ذرا ممتاز خان سے محتاط رہیں۔ وہ آپ کی جائداد ہتھیانے کے لیے اب ہر حد سے گزرنے کو تیار بیٹھا ہے، یہاں تک کے اپنے لوگوں سے بھی دشمنی مول لینے میں عار محسوس نہیں کررہا ہے۔''

''میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں شہزاد!'' وہ بے نیازی سے بولیں۔ ''ممتاز خان لالچی فطرت انسان ہی نہیں بلکہ ضدی اور کینہ پرور بھی ہے۔ اس نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ جائداد کی میری نظروں میں کوئی حیثیت نہیں، لیکن اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ پھر مجھے بھی اس سے ضد ہوگئی ہے، وہ میری ماں کا قاتل بھی ہے۔ میں بھی اس کے سینے پر مونگ دلتی رہوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ، کل ماں جی کو لے کر میرے پاس آؤ گے؟'' انہوں نے آخر میں بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا تو میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ابھی آپ کی طرف آنے کا تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ کوشش کروں گا۔ حالات دوسرا رخ اختیار کررہے ہیں اور ہمیں ابھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر میں کل کسی وقت آجاؤں گی۔'' وہ بولیں اور تھوڑے توقف کے بعد ہولے سے پوچھا۔ ''عابدہ بچی کی کوئی خیر خبر؟ کب تک لوٹ رہی ہے وہ؟''

ان کے اس اچانک اور بے محل سوال پر میں ذرا چونکا۔ پھر ایک گہری ہمکاری خارج کرکے بولا۔ ''وہ ٹھیک ہے۔ عارفہ کا آپریشن کامیاب ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ دونوں سرمد بابا کے ساتھ بہت جلد پاکستان لوٹنے والی ہیں۔''

میں نے دانستہ ان سے جھوٹ بولا اور رات والی تشویش ناک خبر سے متعلق کچھ نہیں بتایا۔

اول خیر والے معاملے کے بعد میں خود اب زہرہ بانو سے کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ یہ بات انہوں نے بھی محسوس کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا جب بھی فون آتا، وہ پہلے مجھ سے بے مروتی کا شکوہ کرتیں اور پھر اصل گفتگو کی طرف آتیں۔ میں بھی دانستہ طرح دے جاتا۔

اول خیر سے میں نے اس بات کا شکوہ کیا تھا کہ اس نے مجھے لاعلم رکھتے ہوئے بیگم صاحبہ کو میرے ساتھ کیوں روانہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا؟

وہ بے چارہ شرمندہ تو ہوا مگر کوئی جواب نہیں دے سکا۔

''دیکھو اول خیر! جب تک تمہاری حیثیت بیگم صاحبہ کی نظروں میں پہلے جیسی نہیں ہو جاتی، میں نہ ان کا کوئی احسان لینا چاہتا ہوں اور نہ ہی ان کے ساتھ کسی قسم کے رابطوں کو طول دینا پسند کروں گا۔'' وہ چپ رہا۔

میں نے عابدہ والی اہم خبر سے اُسے آگاہ کیا تو پہلے تو اُسے بھی میری طرح اس بات پر یقین نہ آیا مگر میرے چہرے سے مترشح ہونے والی افسردگی اور گہری تشویش نے اُسے باور کرادیا کہ یہ خبر جھوٹی یا محض افواہ نہیں تھی۔

اس دوران ٹی وی بھی آن تھا۔ مگر ابھی تک جان ایف کینیڈی ائرپورٹ والے اس ناخوشگوار واقعے کی کوئی رپورٹ نہیں آرہی تھی۔ لیکن جب اول خیر نے مختلف چینلز باری باری آن کرکے دیکھے تو ایک پر اس اہم خبر سے متعلق باقاعدہ ایک پروگرام نشر ہورہا تھا۔ وہ ہم غور سے دیکھنے لگے۔

سب کچھ وہی تھا، جو میں کار کے ریڈیو میں سن چکا تھا۔ ابھی کوئی نئی خبر نہیں آئی تھی۔ لیکن مبصرین، تجزیہ نگاروں اور اینکر پرسن سمیت سب کا خیال تھا کہ نئے انکشافات منظر عام پر آنے کی توقع تھی۔

ایک سینئر صحافی اور تجزیہ نگار نے اس خدشے کا بھی اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''چونکہ ان تینوں افراد (عابدہ، عارفہ اور سیٹھ منظور وڑائچ) کا تعلق پاکستان سے ہے۔ تو عین ممکن ہے امریکا پاکستان کی وزارت خارجہ سے رابطہ کر کے ان تینوں مذکورہ افراد کے پاکستان میں مقیم خاندانوں کو

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بھی دائرۂ تفتیش میں لانے کا کہہ سکتا ہے۔"

"کاکے! تجھے بہت جلد اس سلسلے میں میجر باجوہ صاحب کو آگاہ کرنا پڑے گا۔ یہ معاملہ مجھے گمبھیر لگتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔"

مجھے اول خیر ہی پُرتشویش آواز نے محویت سے چونکا دیا۔ اس کی بات پر میں نے اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

اس کے بعد ہم بھی آرام کرنے کے لیے ذرا دیر کو لیٹ گئے مگر خاصی دیر تک اسی سلسلے میں تبادلۂ خیال بھی کرتے رہے۔ پھر جانے کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

شکیلہ صبح سویرے جاگ گئی تھی۔ ماں جی کی وہ بڑی تندہی کے ساتھ خدمت کر رہی تھی۔

ماں جی کے نہانے اور کپڑوں کا انتظام۔ پھر ناشتا اسی نے کروایا تھا۔ روایتی ماؤں کی طرح ماں جی نے بھی اُسے جانے میرے حوالے سے کیا سمجھ لیا تھا۔ ابھی ماں جی کو عابدہ کی حقیقت کا علم نہ تھا۔ ناشتا خاموشی سے ہوتا رہا۔ اس دوران شکیلہ نے مجھے بے چین کر دینے والی اطلاع دی کہ آج صبح بیگم صاحبہ کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں کہ جب سب بیدار ہو جائیں تو فون کر کے انہیں بتا دیا جائے۔ لہٰذا اب شکیلہ مجھ سے اجازت لینا چاہتی تھی کہ وہ فون کر کے بیگم صاحبہ کو بتا دے؟

میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ کوئی بہانہ مجھے اس وقت نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں ابھی کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ناشتے کے بعد مجھے... ماں سے بھی بہت ساری باتیں کرنا تھیں۔ میں نے شکیلہ کو کوئی جواب نہ دیا اور ناشتے میں مصروف رہا۔

ابھی ہم نے ناشتا ختم کیا ہی تھا کہ گیٹ پر موجود ایک گارڈ نے انٹرکام پر بیگم صاحبہ کی آمد کی اطلاع دے ڈالی۔ میں اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا اور اول خیر کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ یوں بھی اب وہ یہاں آ ہی چکی تھیں تو انہیں ملے بغیر یہاں سے لوٹانا نامناسب ہی ہوتا۔ لہٰذا میں نے گارڈ سے کہہ دیا کہ انہیں اندر آنے دیا جائے اور ملازم سے کہا کہ زہرہ بیگم کو ڈرائنگ روم میں ہی بٹھائے۔

میں ان سے ابھی اکیلے ہی ملنا چاہتا تھا۔

بیگم صاحبہ کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے چند منٹوں بعد میں وہاں پہنچا تو زہرہ بانو کے ساتھ کبیل دادا کو دیکھ کر جانے کیوں میرے حلق میں کڑواہٹ گھلنے لگی۔ طوعاً و کرہاً مجھے کبیل دادا سے بھی ملنا پڑا۔ جب سے اس نے اول خیر والا معاملہ خراب کیا تھا، مجھے یہ بھی ناپسند لگا تھا۔

"بہت بے مروت ہوتے جا رہے ہو تم شہزی!" حسبِ عادت زہرہ بانو مجھ سے شکایت کرتے ہوئے بولیں۔ "دیکھ لو، ہم بھی بغیر بتائے آ گئے یہاں۔ یہ تمہارا بازو؟" ان کی نگاہ اچانک ہی میرے پٹی بندھے زخمی بازو پر پڑی۔

"ہاں معمولی زخم آ گیا تھا۔ اب قدرے بہتر ہے۔" میں نے کہا۔

"ماں جی کیسی ہیں؟ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے شہزادا! پلیز مجھے بھی ملواؤ ناں ماں جی سے؟"

میں نے کہا۔ "وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں۔" میں نے ہلکا سا جھوٹ بولنا مناسب سمجھا تھا۔

"کیا بات ہے شہزی؟ تم کچھ رُوکھے رُوکھے سے ہو رہے ہو؟"

"اس کی وجہ آپ جانتی ہیں زہرہ صاحبہ!" میں نے بھی صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

"جانتی ہوں اس کی وجہ اول خیر ہے۔" وہ بھی بے یک گُرنت بولیں۔ کبیل دادا، جو بظاہر خاموش مگر بہ دستور میرے چہرے کی طرف گھورنے کے انداز میں تکے جا رہا تھا۔ زہرہ بانو سے میرا اس طرح کا رویہ اُسے کھلتا تھا۔ وہ چپ نہ رہ سکا اور بول پڑا۔

"کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ اول خیر اس وقت تمہارے ساتھ موجود ہے؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں نے بھی گرم ہوتی نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"بیگم صاحبہ اس کے بارے میں کوئی سخت حکم بھی دے سکتی تھیں۔" وہ بولا۔

"مثلاً؟" میں نے زہریلے طنز سے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

"تمہیں بیگم صاحبہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے کوئی ایسا حکم جاری نہیں کیا کہ اول خیر اس علاقے بلکہ اس شہر میں ہی دوبارہ نظر نہ آئے نہ ہی تمہارے ساتھ بھی۔"

مجھے اس کی بات پر طیش آ گیا۔

"میں بھی کسی ایسے حکم کو اپنے یار پر مسلط ہوتے کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا اور مجھ پر تو تم ازکم بالکل بھی نہیں۔"

"شہزادا! اپنی اوقات میں رہو سمجھے تم۔" میری جوابی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کارروائی پر کبیل دادا عادتاً جتھے سے اُکھڑنے لگا وہ چلا کر بولا تو بیگم صاحبہ نے یکدم مداخلت کرتے ہوئے کبیل دادا سے کہا۔

"دادا! تم خاموش رہو۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم شہزی سے نہیں اُلجھو گے۔" وہ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے میری طرف شعلہ بار نظروں سے تکنے لگا۔ پھر اپنا سر جھکا لیا۔

زہرہ بانو کی اس تنبیہ کے بعد اُسے مزید کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ میں نے بھی اس گرما گرمی کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بہرحال ہمارے مہمان کی حیثیت سے آئے تھے۔

اسی دوران شریفاں کھانے پینے کی نفیس سی ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔ پھر چائے کا ایک کپ اس نے زہرہ بانو کو تھمایا اور دوسرا کبیل دادا کو تھمانے لگی تو اس نے زہرہ بانو کو دیکھتے ہوئے طوعاً و کرہاً چائے کا کپ تھام تو لیا مگر اُسے اپنے سامنے دھری پڑی تپائی پر رکھ دیا۔ میں بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا چکا تھا۔ زہرہ بانو البتہ چائے کے گھونٹ بھرنے کے دوران میری طرف تکنے لگیں۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ درمیان میں آنے سے کمرے کی فضا مکدر سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے ایک کھنچاؤ سا طاری ہوگیا تھا۔ ایسے میں، میں نے اول خیر کا موضوع بدلنے کی غرض سے زہرہ بانو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"حالات کا تقاضا ہے کہ آپ بھی اب حد سے زیادہ محتاط رہیں زہرہ صاحبہ!"

"ہم حالات سے بے خبر نہیں رہتے۔ بابا جانی (الف خان) جب تک زندہ رہے ہمیں کئی باتوں کا لحاظ رہتا تھا لیکن لئیق شاہ کے قتل اور قانون کی طرف سے انصاف نہ ملنے کی صورت بھی اب تمام ہوتی نظر آرہی ہے ہمیں۔ اب ممتاز خان کو بہت جلد ہمارا شکار بننا پڑے گا۔"

میں نے آج پہلی بار زہرہ بانو کے لہجے سے چوہدری ممتاز کے لیے آتشِ انتقام کے شعلے لپکتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ ان کی کشادہ آنکھوں سے ایک ایسی نفرت مترشح ہوتی دیکھی جاسکتی تھی، جس کی تہ میں غم کی راکھ بھی دبی ہوئی تھی جو اب کسی بھی لمحے بھڑکتی ہوئی آگ کی صورت اختیار کرنے والی ہو۔ وہ شاید اب ممتاز خان کا کوئی لحاظ کیے بغیر اُسے کیفرِ کردار تک پہنچا کر جیسے جلد سے جلد اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرنا چاہتی تھیں، جس نے انہیں اب بے سکون کرنا شروع کر دیا تھا۔

"میں آج تک اس خوش فہمی میں تھی کہ میں ممتاز خان کے ساتھ قانونی جنگ کر رہی ہوں اور ایک دن فتح میری ہوگی۔ مگر وہ اپنے اوچھے ہتھکنڈوں سے باز نہ آیا اور بدستور مجرمانہ روش اختیار کیے رہا ہمارے ساتھ۔ شاید وہ نہیں جانتا ہے کہ جب کوئی امن پسند اور شریف، بدمعاش بنتا ہے تو اُس سے بڑھ کر پھر اور کوئی بدمعاش نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے دل کا غبار نکالتی رہیں میں خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئیں تو میں نے منہ پھلائے بیٹھے کبیل دادا کو مخاطب کر کے کہا۔ "کبیل! اپنی چائے تو پی لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" اس نے کوئی رُخ نہیں دیا مجھے۔ میں نے بھی محض آدابِ میزبانی کو ہی ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ رُخصت ہونے لگیں تو انہوں نے کبیل دادا کو کوئی اشارہ کیا، جسے سمجھ کر اس نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد زہرہ بانو میری طرف بڑی گہری نگاہوں سے تکتے ہوئے بولیں۔ "شہزی! تم خود کو ہم سے کبھی الگ مت سمجھنا۔ تم اپنے دروازے شاید زہرہ بانو کے لیے بند کر رہے ہو۔ لیکن بیگم ولا اور زہرہ بانو کے دروازے تمہارے لیے کبھی بند نہیں ہوسکتے، مرتے دم تک نہیں۔ تم جس طرح میری طرف سے تشویش میں رہتے ہو۔ عین اسی طرح میں بھی اسی فکر میں مبتلا رہتی ہوں کہ خدارا چوہدری ممتاز خان کو آسان چارامت سمجھنا اور اس سے محتاط رہنے کی کوشش کرنا۔ کیونکہ تم سے اس کی دُشمنی کی وجہ بھی میں ہی ہوں۔ اگر تمہیں اس کے ہاتھوں خدانخواستہ کوئی نقصان پہنچا تو میں یہ برداشت نہ کرسکوں گی۔" کہتے کہتے ان کی آواز ڈبڈبانے لگی تھی۔ ممکن ہے اُنہیں ایسے میں لئیق شاہ کی یاد آگئی ہو جو ممتاز خان کی بربریت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا جب وہ لمحہ بھر کے توقف کے بعد آگے بولنا شروع ہوگئیں۔

"لئیق شاہ والا واقعہ میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی۔ وہ دردناک منظر میری آنکھوں سے آج تک محو نہیں ہوسکا ہے شہزی!" وہ پھر اسی طرح رُندھے ہوئے اور دل گیر لہجے میں بولیں۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

پھر وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سوگوار چہرے کے سامنے لاتے ہوئے آبدیدہ پڑتی آنکھوں سے اُنہیں دیکھنے لگیں۔ "ان ہاتھوں کی حنا بھی ماند نہیں پڑی تھی کہ انہیں اپنے محبوب شوہر لئیق شاہ کی لاش کو تھامنا پڑ گیا۔ میں بھلا وہ

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

منظر فراموش کرسکتی ہوں شہزی؟ ہرگز نہیں۔"

وہ سسک کر واپس جانے لگیں تو میں نے یک دم آگے بڑھ کر ان کا راستہ روک لیا۔ وہ سر اُٹھا کر اور قدرے چونکنے کے انداز میں اشکبار چہرے سے مجھے تکنے لگیں۔ میں نے ہولے سے مُسکرا کر کہا۔

"زہرہ صاحبہ! آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میرے لیے آپ کے دروازے بند ہو گئے؟ ہرگز نہیں۔ بس ذرا ممکن ہو سکے تو اول خیر کے بارے میں ایک بار سوچ لیجیے گا۔ وہ اب بھی آپ کا بہت اچھا، سچا اور جاں نثار ساتھی ہے، اُسے اس بات کا ابھی تک بے حد قلق ہے کہ اُسے آپ نے خود سے، بیگم ولا سے بے دخل کر دیا ہے۔"

زہرہ بانو کچھ سیکنڈ میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئیں پھر کوئی جواب دیے بغیر چلی گئیں۔

میں نے واپس آ کر اول خیر کو اس ملاقات کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی کچھ افسردہ سا نظر آنے لگا۔ پھر بولا۔

"تم نے بیگم صاحبہ کو عابدہ کے بارے میں کچھ بتایا؟" پتا نہیں اس نے کیا سوچ کر مجھ سے یہ سوال پوچھا تھا۔ میں نے جواباً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، انہیں بھلا میں کیا بتاتا اور کیوں؟"

"کاکے! ایک سے دو بھلے۔ کسی سے مشورہ کر لینا اچھا ہی ہوتا ہے۔ عابدہ جس صورت حال میں پھنس گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ مسئلہ معمولی نوعیت کا نہیں ہے۔"

"وہ بھلا مجھے اس گمبھیر مسئلے میں کیا اچھا مشورہ دے سکتی ہیں، میں صرف میجر باجوہ صاحب سے ہی اس سلسلے میں بات کرنا بہتر اور ضروری سمجھتا ہوں۔" میں نے گہری متانت .... سے کہا تو اُس نے خاموشی اختیار کرلی۔

ماں جی سے مجھے بہت تفصیلی اور طویل گفتگو کرنا تھی مگر اس سے پہلے میں میجر صاحب سے ایک ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اکیلا رینجرز ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔

"شہزاد احمد خان کیسے ہو؟" مجھے دیکھتے ہی انہوں نے اپنے مخصوص اور مضبوط لہجے میں کہا اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں ان سے مصافحہ کرکے ان کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا اور چند رسمی کلمات کے بعد میں نے انہیں گزشتہ شب کی معرکہ آرائی کی رپورٹ دے دی۔ نیز ماں جی کے بارے میں بھی انہیں بتا دیا اور یہ بھی کہ بقول وزیر جان کے میرا باپ بھی زندہ ہے۔

یہ سن کر باجوہ صاحب نے سب سے پہلے تو مجھے ماں جی کے ملنے کی مبارکباد دی۔ ابھی میں نے اُن سے دانستہ عابدہ والی بات نہیں چھیڑی تھی۔ کیونکہ وہ ایک بہت طویل اور اہم موضوع تھا۔ پہلے میں ان کے ساتھ عمومی نوعیت کے معاملات پر گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

وہ چند ثانیے کے لیے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گئے۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولے۔

"جینٹلمین! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری اتنی معرکہ آرائی کے باوجود بدقسمتی سے اس کے خلاف اب تک کوئی ٹھوس ثبوت ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ ہم سے بدک چکا ہے اور تمہاری اصلیت بھی جان گیا ہے۔ اسے خوب اندازہ ہے کہ وہ پاور والوں کی نظروں میں آچکا ہے اور ہم سے حد درجہ محتاط رہنے لگا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ اب سیاسی حلقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے لگا ہے۔ تاکہ اُسے عوامی شیلٹر حاصل ہو سکے۔ خیر، مجھے تمہاری اس کے ساتھ جاری جنگ میں کچھ ایسا لگتا ضرور ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی ہماری گرفت میں آئے گا۔"

باجوہ صاحب کی اس بات سے مجھے بھی پورا اتفاق تھا۔

"جی ہاں باجوہ صاحب! کیونکہ ماں جی کے ملنے کے بعد مجھے اپنا اور وزیر جان کا یہ معاملہ بہت دور تک جاتا دکھائی دیتا ہے۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، میں بہت جلد اس کی جڑیں کاٹنے والا ہوں۔ بلکہ لوہے کو لوہے سے کاٹنے والا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اُنہیں ممتاز خان کے بارے میں بھی بتا دیا۔ جو اپنے ذاتی عناد کی خاطر اپنے ہی ساتھی وزیر جان کے منہ سے اس کا شکار چھیننے کے لیے کوشاں تھا مگر میں نے اس کی یہ چال ناکام بنادی تھی۔

میری اس بات پر وہ معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "جینٹلمین! ہم نے اسی لیے تمہیں اسپیکٹرم کے ان دونوں مقامی عہدے داروں کے سلسلے میں فری ہینڈ دے رکھا ہے۔ جیسے ہی تمہارے ہاتھ میں ان دونوں کی جڑیں آجائیں گی تمہاری طرف سے گرین سگنل ملتے ہی ہم حرکت میں آجائیں گے اور بین الاقوامی شہرت کے حامل اس نام نہاد ادارے کا پول کھول کر رکھ دیں گے۔ کیونکہ کچھ سیاسی اور ملکی مصلحتوں کے باعث ابھی ہم ان پر ہاتھ ڈالنے سے اجتناب برتے ہوئے ہیں۔" میں نے ان کی بات پر اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔ پھر اس دوران ثریا اور اسپیکٹرم میں موجود اس کے اُن چند گنے چنے ساتھیوں کے بارے میں بھی بتایا جو درونِ خانہ ہی ثریا مرحوم کے مشن کو آگے بڑھائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

حالات میں انہیں بھی بے حد محتاط رہتے ہوئے یہ کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ کبھار کے اندر ہی محبوس ہو کے رہ گئے ہیں۔ ثریا کا راز آشکارا ہونے اور اسے عبرت ناک سزا دینے کے بعد سے وہ بھی محتاط ہو گئے ہیں۔ ایک نے مجھ سے نجانے کیسے رابطہ کر لیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ میرے ڈی ہمدرد جو ممتاز خان کا ساتھی تھا، اس کے ہاتھوں مارا گیا جس کا مجھے ابھی تک قلق ہے۔ اس سے ہمیں کافی مفید معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔''

''یقیناً وہ ہمارے لیے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ لیکن اب کیا معلوم کہ ثریا کے ایسے اور ہم خیال ساتھی وہاں کتنے رہ گئے ہیں؟'' وہ میری طرف اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے تو میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

''میں ان میں سے کسی ایک کو رابطے میں لانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' اس کے بعد میں ذرا توقف سے اصل بات کی طرف آیا۔

''میں دراصل آپ کے پاس ایک اور گمبھیر مسئلے کے بارے میں ڈسکشن کرنے آیا تھا منیجر صاحب!''

''ہاں، ہاں بولو۔ میں سن رہا ہوں۔''

''شاید آپ کے علم میں گزشتہ شب ٹی وی اور ریڈیو پر چلنے والی ایک بین الاقوامی خبر رساں ادارے کی وہ خبر نہیں آئی جس کے مطابق...'' اور پھر میں نے انہیں عابدہ اور عارفہ سے متعلق وہ اہم بات بھی گوش گزار کر ڈالی۔

انہوں نے اعتراف کیا کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہ اتنی اہم خبر سے محروم رہ گئے تھے حالانکہ انہیں عابدہ اور عارفہ کے کیس کا اچھی طرح علم تھا۔

باجوہ صاحب یہ سن کر واقعی کچھ فکرمند اور پریشان سے نظر آنے لگے اور کئی ثانیوں تک کسی گہری سوچ میں مستغرق بھی رہے۔ بالآخر ایک لمبی سانس خارج کر کے بولے۔

''اس کا مطلب ہے ان لوگوں نے تمہیں جو دھمکی دی تھی، وہ محض دھمکی نہ تھی۔ اس سے ایک بات تو طے ہوئی کہ ان کے روابط واقعی بین الاقوامی سطح تک رسائی رکھتے ہیں اور ہماری معلومات کے مطابق، جو میں گزشتہ دنوں تمہارے علم میں بھی لا چکا ہوں کہ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش ہی یہ سب کر سکتا ہے اور اس کی سپاری دینے والے ہیں یہ دونوں خاص مہرے یعنی ممتاز خان اور وزیر جان۔''

میں بہ غور ان کی بات سن رہا تھا، بولا۔ ''سر! اب مجھے ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ لوگ اس کی آڑ لے کر یہاں مجھے بھی خطرناک جرائم پیشہ مجرموں کا ساتھی گردان کر، کسی قانونی گرفت میں لانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''ابھی یہ سب اتنی جلدی ممکن نہیں ہو شاید۔ مگر یہ سب وہاں کی غیر جانبدارانہ اور شفاف تفتیش پر ہی منحصر ہے۔ کیونکہ عارفہ کا میڈیکل پرابلم ایک جینوئن حقیقت ہے، یہ انہیں جھٹلا نہیں سکتے۔''

''اس سلسلے میں پُرامید تو میں بھی ہوں سر! کیونکہ مرید بابا بھی ساتھ ہیں اور وہ اپنا پورا پورا دفاع کرنے کی کوشش کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں! لیکن تم اس سلسلے میں ابھی کوئی فکر نہ کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ تم اپنی توجہ صرف ممتاز خان اور بالخصوص وزیر جان پر مرکوز رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

''انشاءاللہ!'' میں نے زیرِلب دعائیہ کہا۔

باجوہ صاحب سے اس گمبھیر معاملے پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد مجھے کچھ تسلی تو ہو گئی تھی۔ مگر ان سے رُخصت ہونے کے بعد میں واپسی کے سفر تک یہی سوچتا رہا کہ یہ معاملہ اتنا آسان بھی نہیں ہے اور مجھے اس کے حل کے لیے نئے کیل کانٹوں اور مربوط منصوبہ بندی سے لیس ہونا پڑے گا۔

میں بری طرح اُلجھ گیا تھا۔ پتا نہیں میری تقدیر کو کیا منظور تھا۔ ابھی نجانے اور کتنے امتحان مقصود تھے میرے؟ مجھے تو اپنے سارے ہی معاملات اُلجھے اور بکھرے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔

میرا حقیقی اور سگا باپ زندہ تھا۔ مگر کہاں اور کس حال میں تھا، یہ مجھے نہیں پتا تھا۔ ماں جی میرے پاس تھیں۔ ابھی ان سے بھی بہت سی باتوں کا انکشاف ہونا باقی تھا۔ عابدہ امریکا میں اکیلی جنس کے ہاتھوں پھنس چکی تھی۔ ادھر وزیر جان اور ممتاز خان میرے لیے کڑا امتحان بنے ہوئے تھے۔

میں انہی اُلجھی ہوئی سوچوں کے درمیان مرید بابا کی کوٹھی پہنچا تو وہاں ایک چونکا دینے والی خبر میری منتظر تھی۔ خبر ٹیلی فون کے ذریعے ملی تھی جبکہ فون شکیلہ نے اٹینڈ کیا تھا۔ اور اطلاع امریکا سے ہی آئی تھی۔

میری اُلجھنوں میں جیسے ایک اور اُلجھن کا اضافہ ہونے لگا تھا۔ لیکن مجھے اس نئی اُلجھن کے پیچھے بھی ایک مکروہ سازش کا گماں ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 18

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد تشکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے۔

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

READIN
Section

شکیلہ نے مجھے اس چونکا دینے والی اطلاع کے متعلق بتایا کہ امریکا سے سرمد بابا کا فون آیا ہے، وہ آج شام کی فلائٹ سے پاکستان لوٹ رہے تھے۔

''کیا عابدہ اور عارفہ بھی ساتھ ہیں؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ مجھے عابدہ کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی۔ حالانکہ سرمد بابا کی واپسی کی خبر سے مجھے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن شکیلہ کا گھٹا گھٹا چہرہ دیکھ کر نجانے کیوں میں اندر سے ایکا ایکی بے نام وسوسوں کا شکار ہونے لگا تھا۔

میری سوالیہ نظریں شکیلہ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہاں مجھے ایک ہولناک خاموشی کے سوا کچھ نہیں ملا تو میں نے تقریباً چلّا کر اور تیز لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں شکیلہ؟ کیا عابدہ بھی ان کے ساتھ لوٹ رہی ہے؟''

''نن... نہیں۔'' بالآخر شکیلہ کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی اور میں نے دوسرے ہی لمحے شکیلہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر اور صاف بولو۔'' شکیلہ کا چہرہ مجھے اترا اترا سا دکھائی دیا۔ جیسے وہ میرے سامنے ابھی کوئی بھیانک انکشاف کرنے والی ہو۔

وہ میرے جھنجوڑنے کی پروا کیے بغیر بولی۔ ''سرمد بابا کے ساتھ صرف عارفہ لوٹ رہی ہیں۔''

''کک... کیا؟'' میں پورے جی جان سے چلّا کر رہ گیا۔ میرا سر چکرا گیا تھا، مجھے ایسا لگا جیسے در و دیوار دہل رہے ہوں اور زمین پیروں تلے سے کھسک رہی ہو۔

''ی... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ عا... عابدہ ان کے ساتھ کیوں نہیں آرہی ہے؟'' میری حالت غیر ہو رہی تھی اور میں شکیلہ سے اس طرح بات کر رہا تھا جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔ حالانکہ اس بے چاری کا کیا دوش تھا؟ وہ تو صرف وہی کچھ بتا رہی تھی جو اس نے فون پر سنا تھا۔

ایسے ہی وقت میں اول خیر میری طرف بڑھا اور میرا دایاں شانہ ہولے سے تھپتھپایا اور مجھے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔

''کاکے! ذرا سنبھال خود کو۔''

''کیسے سنبھالوں یار میں خود کو؟'' میں جیسے اس پر چڑھ دوڑا اور مارے طیش و غضب کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور حلق کے بل چلّا کر بولا۔

''مجھے فون ملا کر دو شکیلہ! میں خود سرمد بابا سے بات کروں گا۔ میں انہیں ایسی حرکت بھی نہیں کرنے دوں گا۔''

اول خیر میری بپھری ہوئی حالت دیکھ کر پریشان ہو گیا اور شکیلہ کا چہرہ متوحش نظر آنے لگا۔

''کاکے! تو بات تو سن۔''

''میں کسی کی کوئی بات نہیں سنوں گا اول خیر!''

میں نے پُرغیظ انداز میں قریب دھری تپائی کو لات رسید کر دی۔ ''اور اگر کسی نے میرے آڑے آنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔ یہ صریحاً دھوکا ہے، عابدہ کے ساتھ، میرے ساتھ۔ عابدہ اپنے کسی کام سے امریکا نہیں گئی تھی، وہ سرمد بابا کی بیمار بہو کے ساتھ گئی تھی۔ اور اب یہ دونوں اس بے چاری کو وہاں دیارِ غیر میں بالکل اکیلا چھوڑ کر خود واپس لوٹ رہے ہیں۔ ہرگز نہیں۔''

اول خیر پھر میری طرف بڑھا تو میں نے اسے بھی دھکا دے کر خود سے پرے کر دیا اور پُرطیش نظروں سے قریب کھڑی لرزتی کانپتی شکیلہ سے بولا۔ ''تم نے سنا نہیں۔ کیا کہا ہے میں نے۔ مجھے اسی وقت فون ملا کر دو۔''

میری دہاڑ سے پوری کوٹھی گونج رہی تھی۔ اماں جو دوسرے کمرے میں تھیں، فوراً وہاں آن پہنچیں اور مجھے غصے سے پھنکتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں اور وہاں موجود سب کی طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگیں۔

شکیلہ نے فوراً فون ملایا۔ مگر کسی وجہ سے رابطہ نہ ہو سکا، تاہم وہ کوشش میں لگی رہی۔ میری حالت ابتر ہو رہی تھی۔ میں کمرے میں زخمی شیر کی طرح ٹہلنے لگا، اول خیر کو دوبارہ میرے قریب آنے کی جرأت نہیں ہو سکی تھی۔

میرے اندر ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی، جس کی حدت سے میرے جسم کا رُواں رُواں بری طرح تپ رہا تھا۔ ایک جوالہ مکھی تھا جو مجھے بہت تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ دماغ اس تپش سے شل ہو رہا تھا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سرمد بابا جیسا آدمی، جو یہ حقیقت اچھی طرح جانتا تھا کہ عابدہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی تھی۔ وہ میرے لیے کیا تھی اور میں اس کے لیے کیا تھا۔ وہ سب کچھ بھی سرمد بابا کے علم میں اچھی طرح تھا کہ عابدہ کو اس کی بیمار بہو کے ساتھ روانہ کر کے میں اور عابدہ کس بڑے اور کٹھن امتحان سے گزر رہے تھے، چہ جائیکہ اب وہ اسے وہیں سمندر پار چھوڑ کر اور وہ بھی ایسے حالات میں، صرف اپنی بہو کو لے کر واپس وطن لوٹ رہے تھے۔ جیسے عابدہ کسی دوسرے شہر میں ہو۔

رہ رہ کر میری آنکھوں کے سامنے عابدہ کا ڈرا سہما چہرہ، اس کی مخدوش باتیں، وہ سب یاد آنے لگیں جو اس

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے وہاں رہتے ہوئے محسوس کی تھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے بارے میں مجھ سے فون پر ذکر بھی کرتی رہی تھی۔

''شش... شہزی! لو... رابطہ ہو گیا۔''

معاً مجھے شکیلہ کی آواز نے چونکا دیا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے سیل لیا اور اپنے کان سے لگا لیا۔ ابھی میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دوسری طرف سے سرمد بابا کی آواز ابھری۔

''میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا۔ کچھ مجبوری ہے۔ جلدی کہو، کیا کہنا ہے؟ کون ہے؟''

سرمد بابا کی یہ بات سن کر میرا اندر انگار ہو گیا۔ میں بہ مشکل خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''سیٹھ منظور وڑائچ! یہ میں بات کر رہا ہوں، شہزاد احمد خان۔ اور آپ کو میری پوری بات سننا ہو گی۔'' میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور دانستہ انہیں سرمد بابا کے بجائے ''سیٹھ منظور وڑائچ کے نام سے مخاطب کیا تھا، تو دوسری طرف چند لمحوں کے لیے چپ سی چھا گئی۔ پھر ان کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔

''بیٹا! میں پاکستان ہی آ رہا ہوں اور مزید تفصیل...''

''سیٹھ منظور وڑائچ! مجھے کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، مجھے صرف یہ بتائیں کہ عابدہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ آ رہی ہے؟'' میں نے ان کی بات کاٹ کر سرد اور سخت لہجے میں کہا تو دوسری طرف سے سرمد بابا نہایت شفیق لہجے میں بولے۔

''شہزی بیٹا! میں تمہاری پریشانی کی وجہ سمجھ رہا ہوں اور میں خود بھی پریشان ہوں۔ یہاں کے حالات ایک دم بھیانک صورت اختیار کر گئے تھے اور ہم تینوں کے لیے یہاں سے نکلنا ممکن نہیں رہا تھا۔ یہ تو شکر ہوا کہ...''

اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔ میں جیسے پاگل ہو گیا اور ہیلو، ہیلو کرتا رہ گیا۔ مگر دوسری جانب سے اب سوں سوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیا۔ شکیلہ، جو میرے قریب ہی کھڑی تھی، مجھ سے فون لے کر دوبارہ ملانے لگی۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا۔

''کیا ہو گیا شہزی پتر؟ خیریت تو ہے نا؟'' ماں نے چند قدم میری طرف بڑھاتے ہوئے فکرمندی سے کہا تو میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

میں ماں کو کیا بتاتا؟ بات لمبی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنی ابلتی کھولتی حالت پر قدرے قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ماں جی! بس تھوڑی سی پریشانی ہو گئی ہے۔ میں بعد میں آپ کو بتا دوں گا، آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں بیٹا۔'' یہ کہہ کر میں قریب دھرے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ ایسے میں اول خیر نے شکیلہ کو اشارہ کیا اور ماں جی سے کچھ کہا۔ شکیلہ ماں کو لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھ گئی اور پھر اول خیر میرے قریب آ کر بیٹھ گیا پھر بہت دھیرے سے اور بہت محبت کے ساتھ میرے کاندھے پر اپنا ایک بازو رکھتے ہوئے بولا۔

''اوئے کاکے! بھلا مجھ سے زیادہ کون تیرا درد سمجھتا ہو گا۔ تو بھی جھلا جاتا ہے۔ ایسے یار کو تو خود سے پرے دھکا دیتا ہے جس نے تیرے دکھوں کو اور تجھے بھی اپنا سمجھ رکھا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ میرے دھکا دینے سے اس بے چارے کو یقیناً دلی تکلیف ہوئی تھی اور مجھے بھی بعد میں اس کا احساس ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے اسی طرح اپنا سر جھکائے جھکائے کہا۔

''یار...! مجھے معاف کر دینا۔''

''اوخیر کاکے! معافی بھلا کس بات کی؟'' اس کا مخصوص انداز لوٹ آیا۔ ''اوئے یارا! محبت کی ایک یہی خرابی تو ہوتی ہے کہ بندہ لاڈ میں آ جاتا ہے، اپنے پیارے دوست کی ایک تھوڑی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ فوراً دل پہ لے لیتا ہے۔ چل چھوڑ، خود کو سنبھال ذرا۔ سرمد بابا کو آ لینے دے پھر...''

''اول خیر! تو سمجھتا کیوں نہیں ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹی۔ ''سرمد بابا آخر عابدہ کو وہاں کیوں اور کس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آ رہا ہے؟ کیا وہ نہیں جانتا کہ میں اس کے بغیر...'' میں باعث رقت کے اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔

اسی بازو کے گھیرے میں، جو اس نے میرے شانے پر بڑی محبت سے پھیلا رکھا تھا، مجھے بے اختیار خود سے لگا لیا۔

''اوخیر کاکے! میں سب جانتا ہوں اور تیرے اندر اس وقت کیا پک رہا ہے وہ بھی۔ تو ذرا سرمد بابا کو آ لینے دے۔ اور ابھی ان کے ساتھ بدتمیزی نہ کر۔ کیا خبر حقیقت کیا ہو؟ وہ کتنے مجبور ہوں یا انہوں نے عابدہ کے لیے کیا بھلائی سوچ رکھی ہو۔ اور پھر وہ ایک بڑے آدمی ہیں۔ یہاں تک انہوں نے اپنا کام آسان کر لیا ہے تو آگے بھی وہ بہت کچھ کر لیں گے۔ انہیں بھی آخر ایک ایک بات کا احساس ہو گا ہی۔''

میں نے اپنے حلق میں اترنے والی رقت کو نگلتے ہوئے کہا۔ ''یار اول خیر! سرمد بابا کو کم از کم اس سلسلے میں کوئی تفصیل تو بتانا چاہیے تھی کہ آخر صرف عابدہ کے ساتھ ہی ایسا کیا ہوا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لا سکے؟ جبکہ سنگین الزام تو ان کی بیوہ بہو عارفہ پر تھا، عابدہ بے چاری کو کس الزام کے تحت وہاں امریکا میں روک لیا گیا ہے؟ اب وہ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کہاں ہے؟ کس حال میں اور کس کے پاس ہے؟ میں تو یہ ساری باتیں سوچ سوچ کر ہی پاگل ہوا جا رہا ہوں یار!''

''میں سمجھ رہا ہوں تیری دلی کیفیات کو شہزی کاکے!'' اول خیر بولا۔ ''ہم اب اللہ سے دعا ہی کر سکتے ہیں بہتری کی۔ اور سرمد بابا کا انتظار۔ وہ آج رات آ رہے ہیں۔ تب ہی حقیقت سے پردہ اٹھ سکتا ہے۔ یار ماں جی کا ہی خیال کر لے، وہ تجھے اس قدر پریشان دیکھ کر خود بھی تشویش زدہ ہو رہی ہیں۔''

میں نے اس کی بات پر چپ سادھ لی۔ مگر اندر سے میں اس قدر بےکل ہو کر رہ گیا تھا کہ مجھ سے ایک لمحہ تک نہیں بتایا جا رہا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے اول خیر سے کہا۔

''یار اول خیر، ایک کام تو ہو سکتا ہے ناں۔ ہم اس اسپتال والوں سے فون کر کے ہی پوچھ لیں کہ آخر یہ معاملہ کیا ہوا تھا؟ اور عابدہ...''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک شکیلہ نمودار ہوئی۔ وہ ماں کو ان کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ سیل فون لیے وہ میرے قریب آئی تو میں بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا کہ شاید امریکا سے ہی کوئی فون کال آئی ہو؟

''شہزی! امریکا سے کسی خاتون کا فون ہے تمہارے لیے۔'' کہتے ہوئے شکیلہ نے فون مجھے تھما دیا۔ میں حیران ہوا کہ بھلا امریکا میں یہ میری کون جاننے والی نکل آئی تھی؟ پھر میرا دھیان عارفہ کی طرف بھی گیا، مگر اس کی طرف سے امید کم ہی تھی، وہ لوگ تو جہاز میں سوار بھی ہو چکے ہوں گے۔

میں نے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے ایک اجنبی خاتون کی آواز ابھری۔ لب و لہجہ امریکن انگلش تھا۔ اور یو ایس اے انگریزی میں ہی اس نے مجھ سے بات کی۔

''ہیلو! کیا میں شہزاد احمد خان سے بات کر رہی ہوں؟'' دوسری جانب سے اس نے استفساریہ کہا، لہجہ اور انداز تخاطب شائستہ تھا۔ میں نے بھی انگریزی میں جواب دیا۔

''جی ہاں! میں شہزاد احمد خان بات کر رہا ہوں.... معاف کیجیے گا میں آپ کو پہچانا نہیں۔''

''مسٹر شہزاد! بہت خوشی ہوئی آپ سے بات کر کے۔ آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جاننے لگی ہوں۔ آپ کی گرل فرینڈ عابدہ کے توسط سے۔''

عابدہ کے ذکر پر جیسے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی اور بے چینی فزوں تر۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

''آپ کون؟ عابدہ کو آپ کیسے جانتی ہیں؟ اور وہ کہاں ہے اور کیسی ہے؟ پلیز، آپ مجھے اس کے بارے میں کچھ بتائیں پلیز۔''

''it,s my pleasure مسٹر شہزاد کہ میری آپ سے بات ہو گئی۔'' پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے بولی۔ ''میرا نام آنسہ خالدہ ہے اور میں امریکن نژاد مسلم ہوں۔ یہاں ایک امریکن براڈ کاسٹ ادارے میں ڈسٹرکٹ فیکٹ رپورٹر ہوں اور ڈس کوری چینل میں فیلڈ اینڈ ریسرچ آفیسر بھی۔ میرا تعارف لمبا ہو جائے گا۔ آپ بس اتنا جان لیں کہ آج کل امریکا میں ہونے والے ایک عالمی نوعیت کے دل فگار واقعے نائن الیون کے سلسلے میں پس پردہ حقائق کے لیے کوشاں ہوں اور ساتھ ہی یہاں مقیم مسلم کمیونٹی پر اس واقعے کی وجہ سے پڑنے والے منفی اثرات کی پروٹیکشن کے لیے بھی کام کر رہی ہوں۔ عارفہ کے سلسلے میں جو کچھ یہاں ہوا یا کیا گیا، اس کی چھان بین اور تحقیق بھی میں کر رہی ہوں۔''

اس کی بات پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ اور اُس روز کار میں ریڈیو سے نشر ہونے والی وہ رپورٹ، جس میں مسلم امریکی نژاد خاتون آنسہ خالدہ کا نام لیا گیا تھا، یکدم میرے ذہن میں تازہ ہو گئی۔

''جی، جی، مجھے یاد آ گیا۔ میں نے اس سلسلے میں آپ کے نام کا ذکر سنا تھا۔'' میں نے فوراً کہا تو وہ بولی۔

''ضرور سنا ہوگا۔ مگر اس وقت آپ کو فون کرنے کا میرا مقصد آپ کو حالات سے آگاہی دینا اور اسی سلسلے میں آپ سے کچھ تعاون درکار تھا۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری ایک بڑی پریشانی کو شیئر کیا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، آنسہ خالدہ کو میں اپنے لیے ایک امداد غیبی ہی تصور کر رہا تھا۔

''درحقیقت میں اس وقت عابدہ کی وجہ سے ہی پریشان تھا۔ کیونکہ ان کے دور کے ریلیٹیوز مسٹر منظور وڑائچ اور ان کی بہو کو چھوڑ دیا گیا ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ امریکی حکام نے عابدہ کو کس جرم میں روک لیا ہے۔ پلیز، آپ میری عابدہ سے بات کروا دیں۔''

میں ایک ہی سانس میں یہ سب کہہ گیا تو دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز ابھری۔

''ایگزیکٹلی! میں بھی اسی نقطے پر اپنی تحقیقات کو آگے

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بڑھا رہی ہوں۔ کیونکہ یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے کہ جس کے پیٹ میں تباہ کن ڈیوائس بم چھپایا گیا، اسے تو معمول کی تحقیقات کے بعد چھوڑ دیا گیا جبکہ ایک معمولی نظر آنے والی لڑکی کو کیوں روک لیا گیا۔ میں تمہاری گرل فرینڈ سے امریکی سی آئی اے سینٹر میں ایک ملاقات کر چکی ہوں۔ بڑی مشکل سے اور بالکل قلیل وقت دیا گیا تھا مجھے اس سے ملاقات کا۔ وہ مجھے ایک خوف زدہ چڑیا کے مانند ہی محسوس ہوئی تھی بالکل بے ضرر سی۔“

اس کی بات سن کر میرا دل گھٹنے لگا اور سانسیں سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ وہ عابدہ سے متعلق ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ وہ ایک نازک سی چڑیا تھی۔

”میں نے اس کی حمایت میں سی آئی اے کے چیف ڈائریکٹر مسٹر کمبلیٹ ڈک سے بات کی تھی کہ اس بھولی بھالی سی ڈری سہمی لڑکی میں آپ کو ایسا کون سا خطرناک مجرم چھپا نظر آ رہا ہے، جسے یہاں لا کر رکھا ہوا ہے؟“ وہ بتا رہی تھی اور میں جیسے سناٹے کی سی کیفیات میں تھا۔

”اس پر انہوں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا کہ ہماری جیلوں، کوکوران (cocoran)، گوانتا نامو (guantanamo) اور بگرام (bagram) کا اگر تم ایک وزٹ کر لو تو وہاں تمہیں اس سے زیادہ معصوم، بے ضرر اور بھولی بھالی صورت والے دنیا کے خطرناک ترین مجرم نظر آ جائیں گے جن کا ریکارڈ دیکھ کر ہی تم دنگ رہ جاؤ گی۔“

آنسہ خالدہ کی زبان سے امریکا کی ان خطرناک ترین جیلوں کا نام سن کر میں اندر سے لرز اٹھا تھا۔ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”تت... تو پھر... آپ عابدہ کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں؟“

”میں تمہیں خوف زدہ کرنا نہیں چاہ رہی ہوں مسٹر شہزاد!“ وہ قدرے ملائمت آمیزی سے بولی۔ ”بلکہ میں تمہاری اور عابدہ کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور یہ میرا نہ صرف مشن ہے بلکہ ایک عزم بھی ہے۔ مجھے عابدہ نے ہی کہا تھا کہ میں کسی طرح تم سے رابطہ کر کے اس کے موجودہ حالات سے آگاہ کر دوں اور تسلی بھی دے دوں۔“

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ عابدہ، جو خود وہاں خطرناک حالات کا شکار تھی اور اسے میری خیریت کی فکر ہو رہی تھی۔ مجھے اس فرشتہ صفت مسلم امریکی خاتون کے نیک خیالات نے بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے اپنے اندر کے غم کو پیتے ہوئے آنسہ خالدہ سے کہا۔

”میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا، اگر آپ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کر سکیں۔ بلکہ آپ کا یہ احسان تو میں اور عابدہ ساری زندگی نہیں بھلا سکتے۔“

”میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی ہوں مسٹر شہزاد!“ وہ بولی۔ ”یہ میرا مشن اور میرے پیشے کا حصہ ہے کہ اصل حقائق کو دنیا کے سامنے لاؤں اور درپردہ عناصر کو بے نقاب کروں۔ میں فون پر تو زیادہ باتیں اس طرح کی نہیں کر سکتی اگر زندگی رہی تو تم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کیا میں سمجھوں کہ میرے فون کرنے کا مقصد پورا ہوا؟“

میں نے جواباً کہا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں آنسہ خالدہ صاحبہ کہ آپ کے فون سے میرے بے چین دل کو کچھ تسلی ہوئی لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آخر عابدہ کو کس جرم کے تحت سی آئی اے سینٹر میں رکھا گیا ہے؟ اور وہ کب تک اسے اس طرح رکھیں گے؟... وہاں اس کا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں، وہ وہاں تنہا ہے، کون اس کی وکالت کرے گا؟ کون اس کا کیس لڑے گا؟ بس! یہی سوچ سوچ کر میں پریشان ہو رہا ہوں۔“

”میں نے عارفہ اور مسٹر منظور وڑائچ سے بھی ملاقات کی تھی۔ انہیں مجھ پر شاید ابھی بھروسا... نہیں ہو سکا ہے۔ مگر تم تسلی رکھو، مجھ سے ایک مسلم بہن کے لیے جو ہو سکا وہ کروں گی۔ میرا نمبر نوٹ کر لو اور اور اپنا نمبر مجھے دے دو، میں وقتاً فوقتاً عابدہ کی خیریت وغیرہ کے سلسلے میں آگاہ کرتی رہوں گی۔“

میں نے اسے اپنا نمبر دے دیا اور اس کا نمبر نوٹ کر لیا۔ آنسہ خالدہ کے فون سے میرے دل کو کافی ڈھارس ہوئی تھی۔

اول خیر انگریزی نہیں سمجھتا تھا، البتہ شکیلہ تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھی، وہ ہماری ٹیلی فونک گفتگو کافی حد تک سمجھ چکی تھی۔ اول خیر کو مجھے ہی اس گفتگو کے بارے میں بتانا پڑا۔ وہ بھی ششدر سا رہ گیا اور قدرے خوش ہو کر بولا۔

”او خیر کا کے! بڑا خوش ہوا دل یہ سن کر کہ اللہ پاک نے عابدہ بہن کی مدد کے لیے آنسہ خالدہ جیسی ایک فرشتہ صفت اور بہادر خاتون کو وہاں پہلے ہی سے بھیج رکھا ہے۔“

”ہاں اول خیر بھائی! اللہ عابدہ بہن اور شہزی بھائی کی مدد فرمائے۔ آنسہ خالدہ کی صورت میں عابدہ کی امدادِ غیبی وہاں پہنچ چکی ہے، ہمیں اب دعا کرنی چاہیے۔“ شکیلہ نے کہا۔

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دونوں یہ گفتگو یقیناً میرا ذہنی دباؤ کم کرنے کے لیے کر رہے تھے، مگر مجھے قرار تب ہی ملتا جب میں عابدہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا۔

میں نے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر سرمد بابا نے یہ کیا کھیل کھیلا ہے؟ دل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ ان جیسا انسان ایسی خودغرضی بھی دکھا سکتا ہے؟''

''او، نہیں کاکے! یہ تیری غلط فہمی ہے، تو ان کی طرف سے بدگمان نہ ہو۔ یقیناً انہوں نے عابدہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ سوچ رکھا ہوگا۔'' اول خیر نے کہا تو شکیلہ بھی اس کی تائید میں بولی۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ سرمد بابا کے پاس اس کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہو؟ اور ان کے لوٹ آنے میں ہی خیریت ہو۔ بعد میں انہوں نے کوئی منصوبہ بنا رکھا ہو۔''

میں نے ان دونوں کے چہروں کی طرف باری باری تکتے ہوئے کہا۔ ''سیدھی بات تھی، سرمد بابا عابدہ کے بغیر لوٹ آنے سے انکار کر دیتے۔ اور وہاں رہتے ہوئے اس کا کیس لڑتے، ان کے پاس بہت آپشن تھے۔ وہ عارف اور عابدہ کو ایک قانون کے تحت امریکا لے کر گئے تھے، جس کے ٹھوس ثبوت ان کے پاس موجود تھے۔ یہاں آ کر وہ اب بھلا کیا کر سکتے ہیں؟''

میری بات کا ان دونوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ لمحے بھر کے لیے خاموشی چھائی رہی، پھر میں نے شکیلہ سے کہا۔

''شکیلہ! تم پلیز ذرا ماں جی کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔ وہ پریشان ہو رہی ہوں گی''۔ شکیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور چلی گئی۔

مجھے ماں جی سے بھی بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ باجوہ صاحب سے ملاقات کے بعد میں نے ماں جی سے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرنا تھیں۔ مگر یہاں آتے ہی مجھے ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

اس نئی صورتِ حال کے بعد سے میرا دھیان عابدہ کی طرف سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹا تھا۔ شریفاں نے میرے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا تھا۔ مگر میرا دل بالکل بھی کچھ کھانے یا پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ دل کر رہا تھا کہ بس کسی طرح سرمد بابا یہاں جلد سے جلد پہنچ جائیں اور میں ان سے بازپرس کر سکوں کہ آخر انہیں ایسی کیا مجبوری آن پڑی کہ وہ عابدہ کو وہیں سات سمندر پار دیارِ غیر میں چھوڑ آئے تھے۔ اور کس کے رحم و کرم پر؟

میں بار بار چشمِ تصور میں عابدہ کا پریشان حال اور غم زدہ چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پتا نہیں تقدیر کو بھی کیا منظور تھا کہ وہ ہم دونوں کو ایک کے بعد ایک امتحان میں ڈال رہی تھی۔ آگے اور خدا کو کیا منظور تھا۔ یہ کسے معلوم تھا۔

کہاں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا اور کہاں اب یہ حال تھا کہ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ میرے دل کی بےچینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی، کسی طور مجھے قرار نہیں آ رہا تھا۔ عابدہ مجھ سے اتنی دور گویا دارالکفر میں بے یار و مددگار بیٹھی تھی۔ اور میں یہاں بیٹھا بےبسی سے ہاتھ ملنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ تب مجھے ماں جی کا خیال آیا کہ اس پریشان حال گھڑی میں ایک ماں کا سہارا ہی دل کو سکون دے سکتا ہے، سو میں ان کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

شکیلہ ان کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ ماں جی بھی مجھ سے باتیں کرنے کے لیے بےچین تھیں، مگر بےچاری مجھے پریشان حال پا کر خاموش تھیں البتہ ان کے چہرے پر کئی سوالیہ نشان تھے جو میں دیکھ سکتا تھا۔ شاید شکیلہ نے انہیں بھی حقیقتِ حال سے تھوڑا بہت آگاہ کر ہی دیا تھا، کیونکہ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر بےاختیار ان کے لبوں سے دعائیہ کلمات برآمد ہوئے تھے۔

''میرا رب سوہنا میرے پُتر شہزی کی پریشانی دور... کرے۔ تو اتنا خود کو ہلکان نہ کر پُتر! رب سوہنا خیر کرے گا۔ عابدہ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''ماں! بس تو دعا کر ماں دعا۔'' ماں کے ممتا بھرے پیارے لہجے پر میں از حد دکھی ہو کر آبدیدہ سا ہو گیا اور بےاختیار ان کی طرف بڑھا۔ وہ مسہری پر بیٹھی تھیں اور شکیلہ ان کے قریب ایک کرسی پر براجمان تھی۔

میں ماں جی کے پاس جا کر ان کے قریب جا بیٹھا اور اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ ایک سکون آور ٹھنڈک تھی جس نے ایکا ایکی مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایک چھایا تھی، جس نے مجھ جیسے آبلہ پا صحرا گرد کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ پیار سے اور بہت دھیرے دھیرے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتی جا رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت میں شکیلہ وہاں سے خاموشی سے جا چکی تھی۔

ماں نے آہستگی کے ساتھ میرا سر اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ذرا اوپر اٹھایا اور بہ غور اپنی بوڑھی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جیسے آپوں آپ

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

بولیں۔

''بالکل اپڑیں ہیوتے ہے تو۔ وہی چہرہ۔ وہی آنکھیں اور اسی کی طرح اوچا لما (اونچا لمبا)۔ نجانے میرا دوسرا لختِ جگر کہاں ہوگا۔ ہوتا تو وہ بھی تیرے جیسا ہی ہوتا۔ آہ! میں بھی کیسی نصیبوں جلی ہوں۔ پہلے میرے سر کا تاج بچھڑا اور پھر میرا لختِ جگر لئیق۔''

ماں کے یہ الفاظ جیسے بم بن کر میری سماعتوں میں پھٹے تھے۔ میرے دربانده و دریدہ وجود میں جیسے ان گنت زنجیروں کی جھنکار گونجی تھی۔ اور اس جھنکار میں کوئی رقصِ بسمل کی طرح تڑپ اٹھا تھا۔

''دوسرا لختِ جگر... لئیق؟'' یہ دو الفاظ جیسے میری دم بخود سماعتوں میں منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

''ماں جی! تت... تم نے ابھی کیا کہا۔ کس کا نام لیا تھا۔'' خود میری آواز جیسے بہت دور سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''کک... کیا میرا کوئی اور بھائی بھی تھا؟''

''ہاؤ پتر! لئیق شاہ نام تھا اس کا۔ تیرا وڈا بھرا سی او۔'' (تیرا بڑا بھائی تھا وہ) ماں جی نے گلوگیر سے لہجے میں بتایا اور میں سن ہو کر رہ گیا۔

''لئیق شاہ... لئیق شاہ۔ بیگم صاحب۔ زہرہ بانو۔ بجلی۔ میرا ہم شکل۔ راجستھان کے ہیجڑوں کے ٹولے میں پھنسنے والا، وہ لڑکا جس کا باپ سرحدوں کا محافظ اور ایک بہادر سپاہی تھا۔ جس کی داستانِ دلستاں زہرہ بانو سنا چکی تھی۔ آہ! یہ کیا غضب تھا؟ یہ کون سا وار تھا تقدیر کا مجھ تفتہ داماں پر۔ یہ اب کیا کیا ہونے لگا تھا میرے ساتھ؟

کئی ثانیے تو میں ساکت و صامت رہ گیا۔ ماں جی ایسے میں کہتی چلی گئیں۔

''وہ بالکل تیرے جیسا ہی تھا۔ شاید بارہ تیرا سال کا ہوگا اس وقت وہ، آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، جب بدقسمتی سے مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ تو بھی اس وقت دنیا میں آنے والا تھا۔ تیرا باپ مجھ سے کہتا تھا۔ ''نویدہ! دعا کر رب سوہنا مجھے اک ہور (ایک اور بیٹا) دے۔ پھر میرے دو بازو ہوں گے۔ میں اپنے دونوں بیٹوں کو اس پاک وطن کا سپاہی بناؤں گا۔''

میں اس سے کہتی۔

''تاجے! سچ پوچھے تو مجھے بیٹی کی خواہش ہے۔ پر میں پھر بھی تیری خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوہنے رب سے ایک بیٹے کی ہی دعا کروں گی۔''

ماں کہے جارہی تھی اور میرے سینے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ زہرہ بانو کی داستانِ دل فگار کا ایک ایک لفظ میرے دماغ میں گونج رہا تھا۔ میں یک ٹک ماں کی سنے جارہا تھا۔ مجھے گرد و پیش کا بھی ہوش نہ رہا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے ماضی سے پردہ اٹھائے جارہی تھی۔

''آج میں تجھے بتاتی ہوں بیٹا کہ تو اس بدبخت، مکار اور دھوکے باز وزیر جان کا بیٹا نہیں ہے۔ ہاں یہ تیرا سوتیلا باپ ضرور ہے۔ تو میرے پہلے شوہر تاج دین شاہ کا بیٹا ہے اور اپنے بچھڑے ہوئے بھائی لئیق شاہ کا چھوٹا بھائی۔ تیرا باپ تاج دین شاہ تو وطن کا ایک سچا سپاہی تھا۔ وہ خود کو سرحدوں کا محافظ کہتا تھا۔ وہ بہت جوشیلا، نڈر اور دلیر تھا۔ پنڈ میں سب لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ وہ ہر وقت وردی میں رہتا تھا۔ چاہے بارش ہو، طوفان ہو، جب بھی بلاوا آتا وہ ہر دم جانے کے لیے تیار رہتا۔ کہنے کو تو وہ وہاں سرحدی چوکی میں بارڈر سکیورٹی فورسز میں رینجرز کا ایک معمولی سپاہی تھا۔ اور تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ میں انچارج وائج مین کے بھی فرائض انجام دیتا تھا، مگر اس نے اپنی جان پر کھیل کر وطن کے لیے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے تھے۔

کئی خطرناک اسمگلروں کو اس نے پکڑوایا تھا اور بھارتی جاسوسوں کا تعاقب کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ایک دن ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں گیا تو پھر نہیں لوٹا۔ سب مجھے یہی کہتے تھے کہ تاجا شہید ہو گیا ہے۔ اب اس کا انتظار چھوڑ دے۔ اگر ایسا ہوا بھی تھا، تو بھی شہزی بیٹا! میں ایک شہید کی بیوہ کہلانے میں زیادہ فخر کرتی۔ مگر...''

ماں رکی تو میں نے ایک تکلیف دہ بے قراری سے کہا۔

''ماں تجھے تو فخر ہونا چاہیے تھا کہ تو ایک جیالے جاں باز کی بیوی تھی۔ پھر... پھر تو نے اس رذیل وزیر جان سے کیوں شادی کر لی؟''

میرے اس چبھتے ہوئے سوال پر ماں نے ایک گھٹی گھٹی سی آہ بھری، پھر بولی۔ ''بیٹا! یہ انسان کی فطرت ہے۔ جب وہ حالات زدگی کا شکار ہوتا ہے ناں تو بدقسمتی اور کم عقلی بھی اس کے جلو میں چلتی ہے۔'' ماں نے ایک لمحہ توقف کیا پھر بتانے لگی۔

''تیرے باپ اور بھائی کے بچھڑنے کے بعد میں بہت ٹوٹ چکی تھی، پھر تو اس وقت میرے پیٹ میں تھا۔ سرکاری طور پر برائے نام میری مالی مدد تو کی گئی مگر کب تک۔ میری آخری امید اب بس ایک تو ہی تھا۔ ورنہ مجھے تو اپنی زندگی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وزیر جان ان دنوں جیل سے رہا ہوا تھا۔ گاؤں میں اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سب اس سے ڈرتے تھے۔ وہ شیدے پہلوان کے نام سے جانا جاتا تھا۔ سنا تھا کہ اس نے کشتی میں اپنے حریف کو جان بوجھ کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ اس سے اس کی ذاتی دشمنی تھی۔

بہرحال اسے زیادہ سزا نہیں ہوئی تھی، جسے وہ بہ آسانی کاٹ کر باہر آ گیا تھا۔ میں تب تک تجھے جنم دے چکی تھی۔ ان دنوں میں ایک عمر رسیدہ زمیندارنی کے ہاں کام کرتی تھی۔ دنیا میں وہ بھی میری طرح اکیلی تھی۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی، جو شادی شدہ تھی اور پاس پنڈ میں ہی بیاہی ہوئی تھی، وہ بے اولاد تھی۔ جبکہ اس زمیندارنی کا شوہر مر چکا تھا، اسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔ بے چاری زمیندارنی ایک ٹانگ سے معذور تھی، اور وہ بیمار رہتی تھی، مجھے اس نے صرف اپنی خدمت کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کا شوہر ایک چھوٹی سطح کا زمیندار تھا۔

ان دنوں جس کے پاس زمین کا چھوٹا ٹکڑا ہوتا وہ زمیندار ہی کہلاتا تھا۔ اس کے پاس بھی یہی کچھ تھا، وہاں سے آمدنی ہو جاتی تھی۔ یوں بھی اکیلی عورت کا بھلا کیا خرچہ تھا؟ ایک اور بھی ملازمہ اس نے رکھی ہوئی تھی، گھر کے کام کاج وہی نمٹاتی تھی، جبکہ مجھے اس نے صرف اپنے لیے مقرر کر رکھا تھا، کیونکہ وہ تنہائی کا شکار تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کرتا رہے، اس کی سنتا رہے، اور میں یہی کرتی تھی، مجھے بھی سہارا ہو گیا تھا۔

تجھے میں نے اس کے پاس ہی جنم دیا تھا، ہم پنجاب کے ایک دورافتادہ سرحدی گاؤں میں رہتے تھے، وہاں ڈاکٹروں یا لیڈی ڈاکٹروں کا کوئی تصور نہ تھا، ایسے موقع پر دائی اماں کو بلا لیا جاتا تھا۔ زمیندارنی نے تیری پرورش اپنے ذمے لے لی تھی۔

جبکہ مجھ سے وہ اکثر کہتی رہتی تھی کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ اس نے تجھے اپنی بے اولاد بیٹی کی گود میں ڈال دیا تھا کہ وہاں تیری بہتر پرورش ہو گی، میرے پاس بھلا کیا رہ گیا تھا؟

انہی دنوں شیدے پہلوان (وزیر جان) سے میرا سامنا ہونے لگا تھا، وہ مجھے شادی کے لیے بہلانے پھسلانے لگا، مگر میں صاف انکار کرتی رہی، وہ یہی کہتا کہ میرا شوہر شہید ہو چکا ہے، اگر زندہ ہوتا تو اب تک واپس آ چکا ہوتا۔

اس سے پہلے بھی گاؤں میں ایک دو واقعات اس طرح کے ہو چکے تھے، جن عورتوں کے شوہر سرحدی چوکی سے، اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران دشمن ملک کی سرحد میں غائب ہو جاتے تو ان کی عورتیں کچھ انتظار کرنے کے بعد دوسری شادی کر لیتی تھیں، ایسا وہی عورتیں کرتی تھیں جو میری طرح مجبور، جوان اور اکیلی ہوتی تھیں، تاہم میں نے پھر بھی اس کی بات نہیں مانی۔ آخر اس نے مجھے شادی پر رضامند کرنے کے لیے ایک دھوکا کیا اور ایسی چال چلی کہ میں دکھوں کی ماری حرماں نصیب اس کے فریب میں آ گئی۔

اس نے ایک دن مجھے میرے شوہر کے کپڑے لا کر دکھائے اور کچھ ایسی نشانیاں بھی... جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا شوہر شہید ہو چکا ہے۔ بدقسمتی سے انہی دنوں زمیندارنی کا انتقال ہو گیا۔ میں پھر اکیلی رہ گئی، تو اس کی بیٹی کی گود میں تھا، اور چند دنوں کا تھا جبکہ شیدا اس حقیقت سے واقف نہیں تھا کہ میرا کوئی بچہ بھی ہے، نہ ہی میں نے اسے بتایا تھا۔

میں نے ناچار وزیر جان سے شادی کر لی، وہ مجھے شہر لے آیا۔ مجھے تو بھی یاد آتا تھا اور میں ایک دو بار شیدے سے بہانہ بنا کر گاؤں کا چکر لگاتی تو اپنے بیٹے کو بھی دیکھ لیتی، زمیندارنی کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی اپنے شوہر سمیت اب اسی گاؤں اور گھر میں رہنے لگی تھی۔

انہی دنوں مجھے اس حقیقت کا بھی علم ہو گیا کہ شیدے نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی تھی، اس نے کسی طرح میرے شوہر کے کپڑے اور کچھ نشانیاں حاصل کر لی تھیں، جو میرے ہی گھر سے اس نے چوری کی تھیں، میں نے شیدے سے سخت جھگڑا کیا، وہ معافیاں مانگنے لگا، مگر میرا دل اس سے کھٹا ہو گیا تھا، مگر اب ہو بھی کیا سکتا تھا؟ پھر شیدے کا کسی سے جھگڑا ہو گیا اور اسے چند سالوں کی سزا ہو گئی، اور تقدیر نے بھی ایک اور پلٹا کھایا۔

زمیندارنی کی بیٹی اور اس کے شوہر کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہو گیا۔ میں اپنے بچے کو لے کر گھر آ گئی۔ شیدے سے بھی ملنے جیل جایا کرتی تھی، آخر کو وہ میرا شوہر تھا۔

تاہم میں پریشان تھی کہ اسے بچے سے متعلق کیا بتاؤں گی؟ مگر اس کا بھی آسان حل میرے پاس تھا، اگر اس نے مجھے دھوکا دیا تھا تو میں نے بھی اسے دھوکے میں رکھا اور اس سے یہی کہا کہ یہ بچہ اسی کا ہے، جسے میں نے اس کے جیل جانے کے بعد جنم دیا تھا۔

بچہ ابھی دودھ پیتا ہی تھا، اور پھر شیدے کو بھی لمبی سزا ملی تھی۔ میرا دھوکا چل گیا جب وہ سزا پوری کر کے آیا تو بچے سے بہت پیار کرنے لگا، وہ اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا تھا۔

اپنی بدقماشی کی وجہ سے وہ کہیں نوکری نہ کر سکا۔ اور ایک بار پھر مجھے غربت کے دن دیکھنے پڑ گئے، شیدا بھی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پریشان رہنے لگا، تب اس نے جانے کیا چکر چلایا کہ ایک دولت مند بیوہ عورت کو اپنی چکنی چپڑی باتوں میں پھنسالیا اور اس سے دوسری شادی رچالی۔

مجھے بہت دکھ ہوا اور مجھے اس سے نفرت ہوگئی، وہ بھی میرے ساتھ ظلم پر اتر آیا۔ میری سوتن کا اپنا گھر تھا، شیدا وہاں رہنے لگا اور مجھے بھی لے جانا چاہا، میں بھلا اپنی سوتن کے گھر میں کیسے رہ سکتی تھی؟ انکار کرنے پر اس نے بچے کو مجھ سے چھین لیا اور چلا گیا، میں نے چیخ چیخ کر اس سے کہا کہ یہ بچہ اس کا نہیں ہے، اور اسے ثبوت کے طور پر کئی ایک ایسی باتیں بھی بتائیں، مگر وہ سمجھا کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ تاہم اس کے دل میں شک ضرور پیدا ہوگیا تھا۔ بچہ تو وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مگر اسی مخمصے میں رہا کہ یہ بچہ اس کا ہے بھی یا نہیں۔ یہ معاملہ جتنا نازک ہوتا ہے اتنا ہی حساس بھی۔

ضد میں وہ بچہ تو لے گیا، اور مجھے بھی طلاق دے ڈالی۔ مجھے اس کا کوئی دکھ نہ تھا مگر بچے کی وجہ سے میں پاگل ہوگئی غم کے مارے۔ وہ اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ نجانے کہاں رہنے لگا تھا؟ میں اسے ڈھونڈتی رہی، کئی سال بیت چلے، میں نے دارالامان میں پناہ لے رکھی تھی۔ تھانے جا کر بھی فریاد کی تھی مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ شہزی بیٹا! تم ذرا اس الم نصیب عورت کے غموں اور کٹھنائیوں کا تصور کرو، جس کا آشیانہ ہی بکھر گیا ہو۔ میں نیم پاگل سی دارالامان میں ایک زندہ لاش کی طرح پڑی رہی۔ نجانے کتنا عرصہ بیت گیا۔ آخر ایک دن خود ہی اس بدبخت نے مجھے تلاش کرلیا اور اپنے ہاں لے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تم زندہ ہو۔ اور آخری بار اس نے مجھ سے پوچھا، قسمیں دے کر، تب میں نے تیرے سر کی قسم کھا کر اسے بتادیا کہ میں نے تم سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے بلکہ میرے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔ اس کا ایک بھائی بھی تھا، جو بچھڑ چکا ہے، تب اسے میری بات کا یقین آیا تھا، کیونکہ وہ خود بھی اس سلسلے میں الجھن اور مخمصے کا شکار رہنے لگا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کوئی بھی ماں اپنے لختِ جگر کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتی۔ پھر اس نے مجھے اپنی قید میں رکھ لیا تھا۔"

ماں اپنی داستانِ غم ناک سنانے کے بعد سسکیاں بھر بھر کے خاموش ہوگئی اور میں اپنی جگہ منجمد ہوکر ماں کی زبانی یہ ساری اَلم کتھا سنتا رہا اور اختتام کے بعد بھی کئی لمحوں تک میں گم صم سا بیٹھا رہا۔

آج میرے ماضی کے حوالوں سے وہ سب کچھ آشکارا ہوچکا تھا، جسے جاننے کے لیے اور، جس پر سے پردہ اٹھانے کے لیے میں آج تک بے چین و بے قرار رہتا تھا۔ آج مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور دکھ بھی۔ بڑی عجیب کیفیات اور ذہنی کرب سے میں دوچار ہو رہا تھا۔ یہ کیسا اور کیا اتفاق تھا، یا پھر تقدیر کا مذاق۔ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، بڑا بھائی، جو اب دنیا میں نہیں رہا تھا، اور اس کا قاتل تھا چوہدری ممتاز خان۔ جبکہ باپ میرا لاپتا تھا، لیکن نہیں، وزیر جان نے تو اس کا بھی پتا لگا لیا تھا، میرے انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا اور مجھے زیر کرنے کے لیے وہ جذباتی سہارے تلاش رہا تھا۔

لئیق شاہ کی شادی بیگم صاحبہ یعنی زہرہ بانو سے ہوچکی تھی، گویا اب وہ میری بھابی تھی۔ بے شک بیوہ سہی۔ اور پھر وہ تو اس سے محبت بھی کرلی تھی، بہت شدت سے چاہت رکھتی تھی اس سے۔

اب میں ماں کو اپنے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں کیا بتاتا، اور کیسے بتاتا، اور کہاں سے میں اتنا حوصلہ لاتا کہ ماں کو اس کے لختِ جگر کے بارے میں کہہ سکتا کہ وہ جس گمشدہ بیٹے کی راہ تک رہی ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔

"پتر شہزی! لگتا ہے، میرے رب سوہنے کو مجھ پر رحم آ ہی گیا ہے، وہ تو بڑا رحیم و کریم ہے۔ آج اس نے مجھے تجھ سے ملایا ہے کل وہ ضرور مجھے میرے دوسرے لختِ جگر سے بھی ملائے گا۔ ہے ناں شہزی بیٹا!"

ماں نے میری جانب پُرامید نگاہوں سے دیکھا تو مجھے بے اختیار اپنی بوڑھی اور دکھوں کی ماری ماں کے ان معصومانہ اور جگر پاش لفظوں پر رونا آگیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں، مجھ میں بالکل بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں ماں کو اپنے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں بتاتا۔

"ارے تو رو رہا ہے میرے لعل؟ کیوں؟" میری آنکھوں میں نمی دیکھ کر ماں ایک دم پریشان سی ہوکر بولی تو میں نے ماں کا جھریوں بھرا ہاتھ محبت اور عقیدت سے تھام کر چوم لیا اور بولا۔

"ہاں ماں! بھائی یاد آگیا تھا۔ پر میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں ماں کہ باپ کو بھی ... ایک دن تلاش کر کے ہی رہوں گا۔"

"میرے لعل! تجھ سے مجھے بڑی امیدیں ہیں۔ مجھے اللہ کے ساتھ تجھ پر بھی پورا بھروسا ہے مگر بیٹا اب میں تھک گئی ہوں، اب میرے اندر مزید غموں کو سہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ بس تو کسی طرح میرے لئیق شاہ کو ڈھونڈ کر لا دے۔ میں اس کی یاد میں بہت تڑپی ہوں۔ پتا نہیں وہ بے چارہ کس حال میں اور کہاں ہوگا۔"

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ماں کہے جا رہی تھی اور میری آنکھوں سے جیسے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی، کبھی جی کرتا ماں کو بتا دوں کہ لئیق شاہ میرا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ مگر ماں کیا یہ دکھ سہہ لیتی؟ مجھ میں تو کم از کم یہ ہمت نہیں ہو رہی تھی، مگر ماں کو بتانا بھی ضروری تھا، ورنہ وہ اپنی بوڑھی آنکھوں میں اپنے دوسرے بیٹے کا غم لیے اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی۔ اس طرح اسے کچھ سکون تو مل جاتا، ایک بار کا دکھ تھا ناں۔ مگر اس طرح تو وہ روزانہ ایک عذاب سے گزرتی تھی۔ مگر میں وہ ہمت کہاں سے لاؤں؟

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ وہ ایک نام تھا جو کسی نیون سائن کی طرح میرے دماغ میں روشن ہوا تھا۔

”بیگم صاحبہ۔“

یہ نام اب میرے لیے ایک بھابی کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔ اپنے مرحوم بھائی کی بیوہ کی حیثیت سے زہرہ بانو کو دیکھ کر میں اب اپنے دل میں ان کے لیے بھی ایک احترام، عقیدت اور محبت سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور شہزی کا کا تو تھا ہی سراپا محبت۔ سب سے محبت کرنے والا۔ کسی کا دل نہ دکھانے والا۔

میں نے یہ معاملہ جلد سے جلد نمٹانے کے لیے زہرہ بانو کو فون کر دیا۔

وہ حیران ہوئیں، کیونکہ ابھی تو وہ مجھ سے مل کر گئی تھیں۔ میں نے سر دست انہیں فون پر کچھ نہیں بتایا۔ تاہم اتنا ضرور کہا کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے یہاں آجائیں۔

میں اب چشمِ تصور سے زہرہ بھابی (اب میں انہیں بھابی ہی کہوں گا) کو ایک عجیب کیفیات سے دوچار ہوتا دیکھ رہا تھا، جب انہیں اس بات کا پتا چلتا کہ وہ میری کیا لگتی ہیں اور لئیق شاہ جس سے انہوں نے بے اندازہ محبت کی تھی، اس سے میرا کیا رشتہ ہے۔

میں نے اول خیر اور شکیلہ کو بھی ساری حقیقت بتا دی۔ دونوں ششدر رہ گئے۔ کئی لمحوں تک تو وہ منہ کھولے میرا چہرہ ہی تکتے رہ گئے۔ شکیلہ سے تو سر دست کچھ بولا ہی نہیں گیا، البتہ اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”او خیر کا کے! یہ تو سچ کہہ رہا ہے؟“

”ہاں اول خیر! یہ سچ ہے۔ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، بڑا بھائی۔“ میں نے گہرے رنج و کرب سے کہا اور اول خیر ایک گہری دکھ بھری سی ہنکاری خارج کر کے رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد زہرہ بانو حیران و پریشان سی وہاں پہنچیں۔ میں، اول خیر اور شکیلہ انہیں لے کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ حسبِ معمول کھیل دادا بھی ایک باڈی گارڈ کی حیثیت سے ان کے ساتھ تھا۔

میں نے بڑے پُرسکون ماحول میں نہایت دھیرے دھیرے بھابی زہرہ بانو... کو ماں سے مل کر ساری حقیقت بتا دی اور وہ جیسے یک دم بت بن گئیں۔ کھیل دادا بھی مارے حیرت کے ہونقوں کی طرح میرا منہ تکنے لگا۔

”شش شہزی! کک... ک... کیا یہ سچ ہے؟“ زہرہ بانو کے کپکپاتے لبوں سے برآمد ہوا تھا، انہیں یقین کرنے میں ہنوز تامل ہو رہا تھا۔

”ہاں! زہرہ بھابی! یہ سچ ہے۔ بالکل ایسا ہی ایک پُریقین سچ جیسے آپ میرے سامنے بیٹھی ہیں۔“ میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا اور شاید میرے منہ سے بے اختیار بھابی کا لفظ سن کر ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ان کا حسین دلکش چہرہ ایک ارتعاش کا شکار نظر آنے لگا تھا جو اُن کی اندرونی کیفیات کی بڑی واضح غمازی کر رہا تھا۔ میرے بھابی کہنے پر شاید ان کا ایک غمِ نہاں ہرا ہو گیا تھا۔

کئی لمحات اسی طرح سکتے کی سی حالت میں بیت گئے۔ پھر وہ بولیں۔ ”شہزی! کیا ماں جی کو تم نے بتا دیا ہے کہ...“

”ابھی نہیں بتایا۔ میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا، مجھ میں ماں جی سے اتنی بڑی بات کہنے کا حوصلہ نہیں ہو پا رہا۔“ میں نے بڑے کرب سے کہا تو وہ بھی سسک پڑیں۔

میں نے کہا۔ ”بھابی! میرا خیال ہے کہ اب آپ ہی ماں جی کو یہ حقیقت بتا سکتی ہیں کہ ان کا گم شدہ بیٹا لئیق شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔“

میری بات پر بے اختیار ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ ٹشو پیپر سے انہیں پونچھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

”شہزی! میری اپنی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی ہے، دل تو چاہتا ہے کہ ابھی اٹھوں اور ماں جی کے قدموں میں جا کر اپنا سر رکھ کے رو دوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ کیا وہ اتنا بڑا صدمہ سہہ پائیں گی؟“

”بھابی! اب آپ ہی اتنی بڑی بات ماں جی کو بتا سکتی ہیں۔ مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو فوراً بلا لیا تھا۔ میں خود بھی آ سکتا تھا مگر مجھے ایک نئی مصیبت نے آن گھیرا ہے اور میں اسی سلسلے میں پریشان تھا۔“ میں نے کہا تو وہ قدرے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

”خیریت ہے شہزی؟ ایسا آخر کیا ہوا ہے۔ مجھے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

حسین اور پُراثر تحریروں کا مجموعہ اکتوبر 2015 کا دل پذیر پاکیزہ

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگہت سیما، قیصرہ حیات کے ناولوں کی نئی اقساط کے ہمراہ

پڑھیے **دُرِّ ثمن بلال** کے دلچسپ ناول کی دوسری بھرپور قسط

زندگی خاک نہ تھی..... **شیریں حیدر** کی جاندار تحریر منی ناول کی صورت

متاع دل..... **نبیلہ ابر راجا** کا خوب صورت ناولٹ اختتام کی طرف گامزن

دلہن میں لے کے جاؤں گا..... **اقبال بانو** کی کھلکھلاتی تحریر

قارئین کے پُرزور اصرار پر..... **ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی**

کے قلم سے ایک پُرعقیدت سلسلہ **یادوں کی مالا**.....

حقیقت..... **سحر ساجد** کے قلم کا شاہکار مکمل ناول

گلوکارہ **سارہ رضا خان** سے گنگناتی ملاقات

دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی پُرلطف کاوشیں جن میں **شمیم فضل خالق**، **اُمّ ایمان قاضی**، **رفاقت جاوید**، **صدف آصف**، **عنیقہ محمد بیگ** و دیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ صحت، معلومات، تفریح، ماہرین کے پُرمغز اور مستقل سلسلے ہر رنگ آپ کی خوش ذوقی کی نذر

READING
Section

بتاؤ؟''

میں نے انہیں عابدہ وغیرہ سے متعلق ساری بات بتا دی اور یہ بھی کہ اب سرمد بابا اور عارفہ ہی پاکستان لوٹ رہے تھے، جبکہ عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں نے اپنی کسٹڈی میں رکھا ہوا تھا۔ نیز، زہرہ بانو کو آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی بتادیا۔

یہ سب سن کے وہ بھی پریشان اور تشویش زدہ سی نظر آنے لگیں۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں۔

''شہزی! اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ عابدہ بہن کے سلسلے میں بہتر کرے گا۔ میرا خیال ہے یہ معاملہ خاصا گمبھیر ہے، تمہاری بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ سرمد بابا کو اس طرح عابدہ کو وہاں دیارِ غیر میں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن ممکن ہے ان کے پاس بھی اس کے... سوا دوسرا آپشن نہ ہو۔ ہاں یہ انہوں نے ضرور سوچ رکھا ہوگا کہ وہ عابدہ کے سلسلے میں اب آگے کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کے آنے کا انتظار کرلینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے وہ عابدہ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔''

زہرہ بانو نے بھی وہی بات کی تھی جو تھوڑی دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ مجھے تسلی دینے کے دوران کہہ چکے تھے۔

میں نے کہا۔ ''میں بھی اسی لیے خاموش ہوں اور بے چینی سے سرمد بابا کی آمد کا منتظر ہوں۔ ورنہ تو میں بے حد غصے میں آگیا تھا یہ سن کر کہ وہ عابدہ کو وہیں چھوڑ کر صرف عارفہ کو لے کر لوٹ رہے ہیں۔''

''ویسے ایک بات سوچ طلب ہے۔'' وہ اچانک بولیں۔ اور میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔ ''اسکیننگ کے ذریعے تباہی پھیلانے والا مواد تو عارفہ کے جسم سے برآمد ہوا تھا۔ حراست میں تو اسے ہونا چاہیے تھا، مگر سی آئی اے والوں نے آخر بے چاری عابدہ کو کیوں دھرلیا؟''

''میں نے بھی انہی خطوط پر بہت غور و خوض کیا تھا۔ یہ بات خود میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔'' میں نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

وہ چند ثانیے خاموشی کے ساتھ کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔ ''میرا خیال ہے، ابھی ماں جی سے کوئی بات نہیں کرتے ہیں۔ پہلے سرمد بابا کو آجانے دو، دیکھتے ہیں انہوں نے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اس کے بعد ماں جی کو بھی ان کے بیٹے سے متعلق وہ حقیقت...''

''نہیں زہرہ بھابی!'' میں نے ان کی بات درمیان میں ٹوک دی۔ ''یہ سب جاننے کے بعد اب مجھ سے ماں جی کا اپنے بیٹے کے انتظار میں اس طرح بے چین رہنا، دیکھا نہیں جارہا۔ پلیز، آپ ابھی ماں جی سے جا کر یہ سب کہہ دیں۔''

''ماں جی کہاں ہیں اس وقت؟'' بالآخر زہرہ بانو نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ وہ کچھ سوچتی رہیں پھر بولیں۔

''تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ ہم دونوں ماں جی کے پاس چلتے ہیں۔'' میں نے ان کی بات پر ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔ تاہم کچھ سوچ کر شکیلہ کو بھی آنے کا اشارہ کر دیا۔

ہم تینوں ماں جی کے کمرے میں پہنچے۔ ماں جی، میرے ساتھ ایک اجنبی خاتون کو دیکھ کر ذرا حیرت زدہ سی ہوگئیں، پھر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگیں۔ میں چپ تھا۔ شکیلہ آگے بڑھ کر ماں جی کے قریب جا بیٹھی تھی، جبکہ زہرہ بانو ایک ذرا لمحے کو رکیں، پھر ماں جی کو سلام کیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنا سر بڑی محبت سے ماں جی کی گود میں رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیں، خود میں بھی رقت زدہ سا ہونے لگا تھا۔ ماں جی حیران پریشان یہ سارا ماجرا دیکھتی رہیں پھر بے اختیار ان کا ہاتھ زہرہ بانو کے بالوں کو چھونے لگا، وہ بڑے پیار سے ان کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''بیٹی! تو کون ہے؟ اس طرح کیوں رو رہی ہے؟'' ماں جی نے بڑے پیار اور ملائمت آمیزی سے پوچھا اور پھر میری جانب دیکھنے لگیں۔

''پتر شہزی! تو بتاتا کیوں نہیں۔ یہ کون ہے بے چاری۔ اسس قدر دکھ کے ساتھ رو رہی ہے یہ کہ جیسے اس کا اور میرا دکھ سانجھا ہو۔''

''ہاں ماں! تو نے ٹھیک کہا۔ اس کا اور تیرا دکھ ایک ہی ہے۔ تو جس بیٹے کی جدائی میں تڑپ رہی ہے، یہ بدنصیب بھی اسی کی جدائی کا شکار ہے۔'' میں نے ڈبڈبائے لہجے میں کہا اور مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ میں اتنی ہمت کیسے آگئی تھی؟

''کیا مطلب بیٹا! میں سمجھی نہیں؟'' ماں پھر الجھ گئیں۔

''ماں! یہ تیری بدنصیب بہو ہے، زہرہ بانو۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''کک... کیا؟''

''ہاں ماں! یہ بھائی لئیق شاہ کی...'' مجھ میں آگے بتانے کی ہمت نہ ہوسکی، تب زہرہ بانو نے اپنا سر اٹھا کر ماں جی کی طرف دیکھا اور زار و قطار روتے ہوئے بولیں۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"ماں جی! میں تیرے بیٹے لئیق شاہ کی بیوی ہوں تیری بہو۔"

میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔ زہرہ بانو کی بات پر ماں کے جھریوں بھرے چہرے پر ایک مسرت بھرا ارتعاش ابھرا، بوڑھی آنکھوں میں خوش آئند دنوں کی نوید ایک امید بن کر چمکی۔ انہوں نے ایک نگاہ حیرت وانبساط کی مجھ پر اور پھر زہرہ بانو کے جھکے ہوئے چہرے پہ ڈالی، اس کے بعد جیسے پیاسی ممتا چیخ اٹھی۔

"تت... تو تم... میرے لعل لئیق کی بیوی ہے؟ سچ بتا بیٹی!"

ماں جی نے کہتے ہوئے یک دم زہرہ بانو کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا۔ اور پیار سے پیشانی چوم لی..... زہرہ بانو ایک غمِ نہاں تلے مسلسل روئے جارہی تھی۔

"ہاں ماں جی! یہ سچ ہے۔ بھلا اتنی بڑی بات میں جھوٹ کیسے کہہ سکتی ہوں۔"

زہرہ بانو نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف ذرا گردن موڑ کے دیکھا تو میں نے بھی مغموم لہجے میں ماں جی سے تائید میں کہا۔

"ہاں ماں! یہ سچ کہہ رہی ہے، اس لیے کہ تو نے مجھے جو بتایا تھا، وہی کچھ یہ مجھے بتا چکی تھی۔ اس کا نام زہرہ بانو ہے۔"

نہ مجھ میں اصل بات کی طرف آنے کی ہمت ہو پا رہی تھی نہ ہی زہرہ بانو میں کہ ماں کو اب لئیق شاہ کے بارے میں کیا اور کیسے بتاتے؟ آخر ماں نے ہی ہماری یہ مشکل آسان کردی۔ پوچھا۔

"میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ میری بیٹی جھوٹ بول رہی ہے، پر میرا بچھڑا لعل، لئیق شاہ کدھر ہے؟ وہ اس کے ساتھ کیوں نہیں آیا؟ وہ کہاں گیا؟ جب سے وہ بچھڑا ہے، میری آنکھیں اسے دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔ تم دونوں بتاتے کیوں نہیں۔ میرا لعل لئیق شاہ کدھر ہے؟ میں نے تو ابھی تک اس کے بچپن کے کپڑے بھی سنبھال کے رکھے ہیں، انہیں ہی دیکھ دیکھ کر میں اپنا دل بہلاتی اور آنسو بہاتی رہتی ہوں۔ تم دونوں خاموش کیوں ہو؟"

ماں کے الفاظ جگر چھلنی کیے دے رہے تھے، ایک ناقابلِ بیاں کرب اور غم کی کیفیات طاری تھی مجھ پر اور زہرہ بانو پر بھی۔

"ماں جی! لئیق شاہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔" بالآخر زہرہ بانو کے لبوں سے یہ دل فگار الفاظ برآمد ہو گئے، اور ماں کو جیسے یک دم سکتہ ہو گیا۔ ان کا پورا وجود جیسے پتھرا گیا۔ آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اور پھر جیسے پانی، کبھی کبھی پتھر توڑ کے نکل آتا ہے، بہ عین اسی طرح ماں کی پتھورا آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے آبشار پھوٹ پڑے۔ وہ دکھی لہجے میں بولیں۔

"کک... کیا میرا لئیق اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے اور میں بدنصیب اس کی راہ تک رہی ہوں۔ کب ہوا یہ؟ کیسے ہوا شہزی پتر! تو بتا، کیا یہ سچ ہے؟"

مارے غم کے ماں کو غش آنے لگے۔ زہرہ بانو اپنا دکھ بھول کر ماں کو سنبھالنے لگی، شکیلہ ان کے لیے پانی لینے دوڑی، میں آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔

"ماں! غم نہ کر ابھی تیرا یہ بیٹا تو زندہ ہے ناں۔ تجھے پتا ہے بھائی لئیق شاہ بھی بالکل میری جیسی شکل وصورت کا تھا۔"

"ہاں ماں جی! وہ بالکل تیرے اس گبرو بیٹے شہزی کی طرح تھا۔" زہرہ بانو بھی بولی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے ماں جی کو لئیق شاہ کے متعلق مختصراً بتانے لگی۔

☆☆☆

غم چاہے کتنا ہی بڑا ہو اسے سہنا پڑتا ہے۔ پھر سہہ کے بھلانا بھی پڑتا ہے۔ یہی زندگی ہے۔ بھولنے کا عمل نہ ہو تو زندگی ہی رک جائے۔ وقت ٹھہر جائے اور انسان اَدھ موا ہو جائے۔ مجھے بھی بھائی کا غم سہنا تھا اور ماں کو اپنے جوان بیٹے کی موت کا۔

وہ دن بڑا افسردگی سے گزرا تھا، زہرہ بانو خاصی دیر ماں جی کے پاس بیٹھی رہیں، پھر جانے لگیں تو ماں نے انہیں نہ جانے دیا۔ بولیں۔

"زہرہ بیٹی! نہ جا تو اِدھر ہی رہ، میرے پاس، تیرے پاس سے میرے لعل لئیق کی خوشبو آتی ہے۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گی کہیں بھی۔" ماں کی بات پر زہرہ بانو نے میری طرف دیکھا۔ پھر اٹھ کر میرے قریب آئیں اور ہولے سے بولیں۔

"شہزی! کیا میں ماں کو کچھ روز کے لیے اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں؟"

میں سوچ میں پڑ گیا تو شکیلہ اور اول خیر نے میرے قریب آکر زہرہ بانو کی تائید میں کہا کہ ماں کو کچھ روز کے لیے زہرہ بانو کے پاس بھیج دیا جائے، ان کا دل بہل جائے گا۔

لہٰذا پھر ایسا ہی کیا گیا اور ماں، زہرہ بانو کے ہمراہ بیگم

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

والا چلی گئیں۔

سرمد بابا کی فلائٹ لیٹ ہو گئی تھی۔

شکیلہ اونگھتے اونگھتے سو گئی تھی، اول خیر کا بھی یہی حال تھا، صرف میں ہی جاگ رہا تھا، نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے کہ مصداق میری بھی ذرا دیر کو آنکھ لگ گئی۔

خواب میں، میں نے عابدہ کو دیکھا۔ وہ مجھ سے شکوہ کناں تھی۔ ”شہزی! میں تم سے ہر بار فون پر کہتی تھی ناں کہ میں یہاں خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ ایک انجانا خطرہ۔ جیسے کوئی نادیدہ جال ہو، جسے میرے گرد دھیرے دھیرے لپیٹا جا رہا ہو۔ مگر... تم مجھے تسلیاں ہی دیتے رہے۔ آخر تک مجھے بس بہلاتے ہی رہے کہ یہ میرا وہم ہے، بھلا میرا وہاں کون دشمن ہے؟ اب دیکھ لیا ناں تم نے خود۔ شہزی! میں تمہارے لیے، تمہاری جدائی میں تڑپ رہی ہوں، آجاؤ ناں اب میرے پاس تم۔ دیکھو... میں تم سے کتنی دور ہونے لگی ہوں۔ جلدی آجاؤ میرے شہزی! ورنہ میں بہت دور چلی جاؤں گی۔ لو میرا ہاتھ تھام لو۔ کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔ آجاؤ۔ تم تو کہتے تھے کہ محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ لو تھام لو اب میرا ہاتھ یا کرو میرا انتظار۔“ اس نے یہ کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھا دیے۔ میں چلّایا۔

”نہیں، نہیں عابدہ! میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں اسے تھامنے کے لیے آگے بڑھا۔ مگر وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی، جیسے اسے کوئی کھینچ رہا ہو۔ مجھ سے دور لے جانا چاہتا ہو۔ میں دیوانہ وار اس کی طرف دوڑتا، وہ اتنی تیزی کے ساتھ مجھ سے دور۔ اور دور، بہت دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں دیوانہ وار اسے پکارنے لگا تو کسی نے جھنجوڑ کو مجھے جگا دیا۔ یہ اول خیر تھا، جو ڈرائنگ روم میں ہی میری طرح ایک قریب کے صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ شاید میرے چیخنے سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

میں جاگ کر زور زور سے ہانپنے لگا، جیسے نجانے کتنی میلوں کی مسافتیں طے کی ہوں۔

”اوئے شہزی کاکا حوصلہ کر میرے یار! وہ مجھے دلاسا دینے لگا۔ میرے سینے میں ایک الاؤ سا دہکنے لگا تھا۔ پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تب ہی گیٹ پر متعین گارڈ نے انٹرکام پر میری ہدایت کے مطابق مجھے مطلع کیا کہ سرمد بابا آگئے ہیں۔ میں اور اول خیر سنبھل کر بیٹھ گئے۔

میری کیفیات ایک بار پھر جوالا مکھی جیسی ہونے لگی تھی، صاف نظر آتا تھا کہ میں سرمد بابا کو دیکھتے ہی پھٹ پڑوں گا۔ شاید میری اس دروں و بروں کیفیات کا قریب بیٹھے اول خیر کو بھی اندازہ ہو گیا تھا، مجھ سے بولا۔

”شہزی کاکے! ابھی سرمد بابا سے ایسا کچھ مت کہنا۔ پہلے ان کی بات غور سے سن لینا۔ دیکھتے ہیں انہوں نے عابدہ بہن کے بارے میں کیا لائحہ عمل طے کیا ہے۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس وقت سرمد بابا کے ساتھ عارفہ کے علاوہ عابدہ بھی ہوتی۔

اول خیر نے شکیلہ کو جگا دیا تھا، شریفاں اور اس کا شوہر فضل محمد بھی جاگے ہوئے تھے۔ یہ دونوں دوڑ کر باہر کو لپکے تھے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ عجیب کیفیت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، دونوں ہی آتش فشاں کی شکل بھڑکے ہوئے تھے۔ مجھے خود پہ قابو پانا دوبھر ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا ہی لگتا تھا کہ آج میرے اور بابا سرمد کے درمیان بڑی گرما گرمی ہو جائے گی۔ میرے اندرونی ابال کی کیفیات میرے مرتعش وجود سے ہویدا ہو رہی تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے اول خیر مجھے بار بار صبر و برداشت کی تلقین کیے جا رہا تھا۔

ایسے ہی وقت میں سرمد بابا اور عارفہ اندر داخل ہوئے تھے۔ ہم تینوں ان کا استقبال کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

عارفہ وہیل چیئر پہ تھی وہ کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ البتہ ایک معمول کے مطابق اور دوسری بار ایمرجنسی آپریشن سے گزرنے کے بعد وہ کافی کمزور دکھائی دے رہی تھی جبکہ سرمد بابا نارمل ہی دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پہ ہمیشہ کی طرح ایک پرشفیق سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ جبکہ ان کی بہو عارفہ نے بس ایک ہلکی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی، البتہ وہ اول خیر اور شکیلہ کو کچھ چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

مجھے اس کا یوں ان دونوں کو دیکھنا سخت برا لگا تھا۔ اپنا مطلب اس عورت نے نکلوا لیا تھا مجھ سے اور اب مجھے اس کے تیور بدلے ہوئے ہی نظر آنے لگے تھے، ایسے میں سیٹھ نوید سانچے والا کی باتیں بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگی تھیں۔

ابھی سلام دعا اور رسمی کلمات کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ عارفہ نے شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یہ دونوں کون ہیں؟“ اس نے مجھے مخاطب کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

”یہ میرے دوست ہیں۔“ میں نے بھی جواباً قدرے روکھے پن سے کہا اور پھر فوراً ہی عارفہ کی طرف سے توجہ ہٹا

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر میں نے سرمد بابا سے عابدہ سے متعلق پوچھا تو وہ بولے۔

''شہزی بیٹا! میں جانتا ہوں اس وقت تمہاری دلی کیفیات کو، لیکن بہتر ہوگا کہ اس موضوع پر کل صبح بات کی جائے۔ بات لمبی اور گمبھیر بھی ہے اور۔۔۔''

''کمال کر دیا سیٹھ منظور صاحب آپ نے بھی۔'' میں نے فوراً ان کی بات کاٹ کر تلخ اور تیز لہجے میں کہا۔ ''ایک طرف آپ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ اس وقت میرے دل پہ کیا بیت رہی ہے اور دوسری جانب آپ فرما رہے ہیں کہ اس موضوع پر کل بات کریں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کی امریکا سے واپسی کا کس بے چینی اور کرب و قیامت سے گزر کر انتظار کیا ہے، صرف یہ جاننے کے لیے کہ عابدہ کے ساتھ آخر ایسا کیا ہوا ہے۔ اور آپ دونوں اسے دیارِ غیر میں اکیلا کیسے چھوڑ آئے ہیں؟ آپ کو وہاں رہتے ہوئے اس کا دفاع کرنا چاہیے تھا، تا کہ اس طرح اسے ہزاروں میل دور ایک اجنبی دیس میں تنہا چھوڑ آئے، میرا سکھ چین حرام ہو گیا ہے مجھ پر جب تک میں عابدہ کو صحیح سلامت اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں۔ حیرت ہے ایسے میں آپ آرام کی باتیں کیسے کر رہے ہیں؟''

میری بات سن کر سرمد بابا کے چہرے پہ خجالت کے آثار ابھرے تھے، ندامت کی ایک رمق بھی میں نے ان کی پیشانی پر نمودار ہوتے محسوس کی تھی، مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی جواب دیتے، عارفہ میری طرف دیکھ کر قدرے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

''شہزاد! میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا، پہلے اس کا جواب دو۔ یہ دونوں کون ہیں اور میرے گھر میں کیوں ہیں؟''

عارفہ کی اس بات نے تو جیسے میرا دماغ بھک سے اُڑا دیا۔ میں بڑی تیزی کے ساتھ اور درشت انداز میں بولا۔

''محترمہ! آپ کے سوال سے کہیں زیادہ اہم ترین سوال میرا ہے۔ مجھے پہلے اس کا جواب درکار ہے۔ عابدہ آپ لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں آئی؟ جبکہ وہ اپنے کسی ذاتی کام سے نہیں بلکہ آپ کی بیماری، آپ کی تیمارداری، اور دل جوئی کی خاطر گئی تھی۔''

میری جوابی کارروائی نے ایک لمحے کے لیے عارفہ کا چہرہ سرخ کر دیا، اور اس کے چہرے سے پھوٹتی تندی سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ بھی جواب میں مجھ سے کوئی سخت بات کہنے والی تھی مگر پھر شاید صورتِ حال کی نزاکت کا بھی اسے احساس ہوا اور پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اس کے بعد قدرے ہموار لہجے میں بولی۔

''دیکھو شہزی! ہم تمہارا اور عابدہ کا یہ احسان مانتے ہیں لیکن اب یہ تو ہمیں نہیں پتا تھا نا کہ آگے کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اگر پتا ہوتا تو ہم امریکا جاتے ہی کیوں؟''

''میں نے کوئی احسان کیا ہے نا عابدہ نے۔ ہم نے جو کیا سرمد بابا کی شفقت اور محبت میں اور ایک انسانی ہمدردی کے طور پر کیا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''پیش آئند حالات کا کسی کو بھی پیشگی علم نہیں ہوتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اپنے کسی ہمدرد کو اکیلا چھوڑ دو۔ تم لوگوں کو اول تو عابدہ کے بغیر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بے چاری سیدھی سادی لڑکی ہے۔ کبھی بھی ایسے حالات سے نہیں گزری ہے۔''

''بیٹا! ہم تمہیں یہی بات تو سمجھانا چاہ رہے ہیں کہ ہم نے عابدہ بیٹی کو اکیلا نہیں چھوڑا ہے۔'' سرمد بابا نے کہا تو میں ان کی طرف دیکھ کر بولا۔

''میں بھی آپ سے یہی پوچھ رہا ہوں کہ مجھے بتایا تو جائے کہ آخر آپ لوگوں نے اس کے دفاع سے متعلق کیا سوچ رکھا ہے؟ مگر آپ کو آرام کرنے کی سوجھ رہی ہے۔''

''شہزی! تمہیں بابا جی سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ تم چھوٹے بڑے کا احترام ہی بھول گئے ہو؟''

عارفہ نے میری طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا تو سرمد بابا نے فوراً مداخلت کی، پہلے اپنی بہو کو خاموش رہنے کو کہا پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور بدستور مجھ سے خلیقانہ لہجے میں بولے۔

''شہزی بیٹا! تمہاری پریشانی بجا ہے۔ اچھا ٹھیک ہے بیٹھو۔ ہم اِدھر ہی بات کر لیتے ہیں۔'' پھر انہوں نے شریفاں کو کہا کہ عارفہ کو ان کے کمرے میں چھوڑ آئے۔ وہ اس کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

ہم چاروں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اول خیر اور شکیلہ سے وہ واقف ہی تھے۔ چند ثانیے تک نشست گاہ کی محدود فضا میں دھڑکتی ہوئی خاموشی طاری رہی اس کے بعد سرمد بابا نے مختصراً مجھے وہی کچھ بتایا جو اَب تک کی اطلاعات کے مطابق میں بھی جانتا تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ عابدہ کو وہاں انہوں نے کس قانون کے تحت روکے رکھا ہے؟ اور افسوس آپ نے عابدہ کے دفاع کے لیے کچھ بھی نہیں کیا؟ جبکہ سازش کا نشانہ عارفہ ہی تھی۔ اصولاً تو اسے امریکیوں کے دائرہ تفتیش میں آنا چاہیے تھا۔''

READING
Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میری مدلل گفتگو سن کر ایک لمحے کو سرمد بابا بھی لاجواب ہوتے نظر آنے لگے، تاہم بولے۔ ''شہزی بیٹا! تمہاری ساری باتیں اپنی جگہ درست اور حق بہ جانب ہیں، کاش میں تمہاری غلط فہمی دور کرسکوں، یہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کرچکا تھا، خود ہم پریشان ہوگئے تھے کہ آخر یہ اتنا بڑا واقعہ کیسے اور کیوں کر رونما ہوا؟ ہمیں تو اس پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہم اس خطرناک سازش کا شکار کیسے اور کیوں ہوئے۔ دیکھو بیٹا! جیسے عارفہ میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہے اسی طرح عابدہ بھی، بلکہ عابدہ اور تمہاری تو بات ہی اور ہے۔''

وہ اتنا کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکے پھر بولے۔

''شہزی بیٹا! وہاں ہم بدقسمتی سے جن حالات کا شکار ہوئے، ہمیں خود سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کیا جائے؟ تاہم اپنے دفاع کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ شکر ہوا کہ ہمیں ایک مقامی لائر فراہم کردیا گیا، جس نے ہمارا کیس لڑا اور عارفہ کی بیماری سے متعلق سارے ثبوت پیش کیے گئے، اور اس اسپتال کی بھی نشاندہی کی گئی جہاں عارفہ بیٹی کا علاج ہوتا رہا تھا۔ لہٰذا ہمارا موقف یہی تھا کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا، وہ اسی اسپتال میں ہی کیا گیا تھا۔

''بیٹا! کیس تو ہم جیت گئے تھے۔ مگر عابدہ بیٹی کے پاس سے بدقسمتی سے کچھ ایسی اشیا برآمد ہوئی تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سازش میں شریک رہی ہے، اب اسے بدقسمتی کہہ لو بیٹا! یا عارفہ کی غلطی کہ سی آئی اے سینٹر میں موجود ایک اسپیشل ایجنٹ پاسکل ہولارڈ کو عارفہ نے جب دورانِ تفتیش عابدہ کے متعلق یہ بتایا کہ اس سے ہماری کوئی رشتہ داری یا خاندانی رشتہ نہیں ہے اور وہ محض ہماری ایک ہیلپر ہے تو بس ادھر ہی عابدہ بے چاری کا معاملہ بگڑ گیا۔''

سرمد بابا کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ میں آنکھیں سکیڑے بڑے غور سے ان کی بات سن رہا تھا۔

''پاسکل ہولارڈ'' کا نام میں نے بارہا فون پر عابدہ سے گفتگو کے دوران بھی سن رکھا تھا۔ وہ سب سے زیادہ اسی شخص سے خوف زدہ رہتی تھی، جو اکثر اسپتال میں آکر ان سے ''تفتیشی'' ملاقات کے دوران عابدہ کو زیادہ مشق ستم بناتا تھا۔

نیز میں اس نقطے پر بھی غور کرنے پر مجبور ہوا کہ آیا عارفہ نے اپنی جان چھڑانے کے لیے دانستہ عابدہ کے سلسلے میں غلطی کی تھی یا پھر یہ واقعی اس کی ''نادانستہ'' غلطی تھی؟

سرمد بابا آخر میں حلق سے ایک گہری اور آزردہ سی ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولے۔ ''شہزی بیٹا! یقین کرو مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہوا کہ انہوں نے ہمیں تو جانے دیا مگر عابدہ کے سلسلے میں انہوں نے عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اس بے چاری کو مزید تفتیش کے نام پر روک لیا۔ ہم مجبور تھے بیٹا! لائر نے بھی ہمیں یہی مشورہ دیا تھا کہ آپ ابھی عارفہ کو لے کر لوٹ جاؤ، میں باقی کی صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ اپنی بات ختم کرکے خاموش ہوئے تو میں نے طنز آمیز تلخی سے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے سرمد بابا کہ یہ مشورہ آپ کو لائر نے نہیں بلکہ عارفہ نے دیا ہوگا، کیونکہ اس کا وہاں اپنا مقصد پورا جو ہوچکا تھا۔ لیکن بابا! عارفہ کی خودغرضی اپنی جگہ... مجھے کم از کم آپ سے ایسی توقع نہ تھی۔''

میری بات پر وہ فوراً تڑپ کر بولے۔ ''نہیں بیٹا! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ عارفہ بیٹی تو...''

''رہنے دیں بابا!'' میں نے زہریلی تلخی سے ان کی بات درمیان میں کاٹی۔ ''آپ خود بھی اپنی بہو سے اور اس کی پست ذہنیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پہلے اس نے آپ کے اکلوتے بیٹے کو مٹھی میں کیا اور آپ کو بوڑھا مریض بنا کر اطفال گھر کے دارالضعیف میں پھنکوا دیا، اور وہاں آپ سیٹھ منظور وڑائچ سے سرمد بابا بنا دیے گئے اور سارا کچھ بیٹے نے آپ سے لے کر اپنے قبضے میں کرلیا، مگر خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی اور آپ نے دیکھا پھر کیا ہوا، آپ کے بیٹے محمود کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہوگیا اور آپ کی اسی بہو کو دوبارہ آپ کی ضرورت پڑ گئی، اور وہ آپ کو چکنی چپڑی باتوں سے بہلا پھسلا کر اطفال گھر سے لے گئی۔

''میں حالانکہ اس وقت ایک معصوم بچہ ہی تھا، مگر حالات کی تلخی اور استادی نے مجھے وقت سے پہلے اس خودغرض زمانے کا چلن اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ عارفہ آپ کو اپنی ذاتی غرض کے لیے اپنے ساتھ لے گئی اور آپ یہی سمجھتے رہے کہ آپ کی بہو کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے اور آپ ایک بار پھر خود کو سیٹھ منظور سمجھنے لگے، مگر میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا جب وہ سیٹھ نوید احمد سانچے والا آپ سے ملنے آیا تھا، میں تو یہی سمجھتا آرہا تھا کہ آپ آج بھی اس اونچی اور عالیشان کوٹھی کے مالک اور اپنے وسیع کاروبار کے کرتا دھرتا سرمد بابا نہیں، بلکہ سیٹھ منظور وڑائچ ہیں۔ مگر یہ میری بھول تھی۔ آپ آج بھی سرمد بابا ہیں اور مجھے تو اب یہ ڈر ہے کہ آپ ایک بار پھر یہاں سے نکال دیے نہ جائیں، کیونکہ اب عارفہ بالکل بھلی چنگی ہوگئی ہے۔ وہ اب بھی جوان ہے، خوب صورت

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے، ایک مرد کے سہارے کی اسے پھر ضرورت پڑ سکتی ہے بس۔ اب فرق یہ ہوگا کہ پہلے آپ کو اپنے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر گھر سے نکالا تھا، اب عارفہ کا شوہر آپ کو۔"

"شہزاد احمد خان! اپنی زبان کو لگام دے دے۔" سرمد بابا یک دم چیخ پڑے۔ وہ غصے سے سرخ ہو گئے تھے، میں نے بھی تشنیع جاری رکھتے ہوئے زہریلے طنز سے کہا۔

"کیوں بابا جی! اب آپ کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تو چلا اٹھے۔ میرے دل سے پوچھو بابا جی!" میں بھی طیش میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور چیخ کر ایک مُکا اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر ٹھونکتے ہوئے بولا۔

"یہاں کیا بیت رہی ہے۔ عارفہ آپ کی اپنی تھی نا۔ مرحوم بیٹے کی بیوہ اور آپ کے پوتے پوتی کی ماں۔ آپ کی نسل کی تربیت اور پرداخت کرنے والی، اسے پروان چڑھانے والی۔ اس لیے آپ نے صرف اسی کے لیے سوچا، جبکہ عابدہ آپ کی بھلا کیا لگتی تھی؟ اس بے چاری کو تو آپ لوگوں نے ایک ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے وہیں پھینک دیا۔ مگر نہیں بابا جی! میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ بتا دیں اس کو، اپنی بہو کو، میرا نام بھی شہزاد احمد خان ہے، زمانے کو بھگتا ہوا ہوں میں، ایک دنیا کو میں نے تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ صرف کل تک کی مہلت ہے آپ دونوں کے پاس۔ عابدہ کے سلسلے میں آپ اور عارفہ کو امریکا کا دوبارہ سفر کرنا پڑے تو کرنا ہوگا۔ اور میری عابدہ کو یہاں لانا ہوگا۔"

میرا رُواں رُواں بپھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اول خیر بھی میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

میں نے ان لوگوں کو اسی وقت یہاں سے کوچ کرنے کا حکم دیا اور ماں جی کو بھی ساتھ لینے کا کہا۔ سرمد بابا یک دم ٹھنڈے پڑ گئے۔ مجھے "پاور" والوں کی طرف سے کوارٹر ملا ہوا تھا، جس کے بارے میں مجھے رینجرز فورس کے میجر باجوہ بتا چکے تھے، اور میں وہیں جانا چاہتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ بعض تلخ حقیقتوں کو انہوں نے بھی جانتے سمجھتے ہوئے قبول کر رکھا تھا۔

ابھی تک سرمد بابا کو ماں جی کے بارے میں معلوم نہیں تھا۔

"تم کہیں نہیں جا رہے ہو، شہزی!" معاً سرمد بابا کی آواز ابھری۔ اور وہ میرا راستہ روکے آن کھڑے ہوئے۔ وہ بڑے غور سے میرے چہرے کو تکے جا رہے تھے اور میں بھی ان کی آنکھوں میں گھور رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے شہزی بیٹا کہ تم نے جن حالات کی گود میں پرورش پائی ہے ایک اچھے بھلے سیدھے اور شریف انسان کو کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں، تمہیں یاد تو ہوگا کہ جب پہلی بار اطفال گھر میں تمہارا اور میرا سامنا ہوا تھا تو تمہیں دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ تم ایک غیر معمولی طور پر ذہین اور ایک حیرت انگیز قوتِ ارادی کے مالک ہو۔ اور اطفال گھر میں رہنے اور پرورش پانے والے سب بچوں سے بالکل مختلف۔ تم جتنے مزاج کے تیز ہو اتنے ہی محبت کرنے والے مخلص اور سچے انسان بھی ہو، یہ تمہاری شخصیت کا ایک خاصہ ہے۔

"میں آج بھی اپنی اس بات پر قائم ہوں کہ اپنے بیٹے... کی طرح تمہیں سمجھنے لگا ہوں اور اس حوالے سے بھلا میں عابدہ بیٹی کو بھی اپنی بیٹی، بلکہ اپنی ہونے والی بہو کیسے نہیں سمجھوں گا۔ لیکن بیٹے! تم نے بھی شاید ٹھیک ہی کہا ہے۔ میں ابھی تک سرمد بابا ہوں، سیٹھ منظور وڑائچ نہیں۔ مجھ سے شاید واقعی تمہارے اور عابدہ کے سلسلے میں کہیں کوئی غلطی ضرور ہو گئی ہے۔

"اس وقت مجھے جو مناسب لگا وہی میں نے کیا۔ لیکن بیٹا! مجھ پر بھروسا کرو اور تھوڑا صبر کرو۔ میں یہاں پاکستان صرف عارفہ بیٹی کو چھوڑنے آیا ہوں۔ ایک دو روز بعد میں دوبارہ امریکا جاؤں گا... اور عابدہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ کیا تم اس بڈھے کو معاف نہیں کر سکتے؟ مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ شہزی بیٹا! میں تمہیں واقعی اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں اور اپنا بازو بھی۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے بیٹا! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے ایک بار پھر میرے ساتھ وہی پرانی کہانی دہرائی جانے والی ہے۔ لیکن مجھے اس کی نہ پہلے پروا تھی نہ اب ہے پروا ہے تو بس اپنے پوتے پوتی کی۔ ایک ماں کی طرح مجھے ان معصوموں کی فکر رہتی ہے، شاید اس تلخ حقیقت نے میری بھی آنکھیں کھول دی ہیں کہ ایک جوان اور بیوہ عورت کسی کے بھی بہکانے میں آسکتی ہے، شاید تم میری باتیں سمجھ رہے ہو تو خدا کے لیے بیٹا! مجھے معاف کر دو اور میرا ساتھ نہ چھوڑو۔"

وہ اتنا کہنے کے بعد رو پڑے۔ مجھے ان پر بے اختیار ترس آنے لگا۔ میرے اندر ابال سرد پڑنے لگا۔

دیکھا جائے تو اس میں سرمد بابا کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ یا اتنا نہیں تھا جتنا کہ میں نے سمجھ لیا تھا، البتہ عارفہ کے حوالے سے میرے اندر ایک کھٹک پڑ چکی تھی۔ وہ کوئی نیا گل کھلانے کے چکروں میں نظر آرہی تھی اور اس کے لیے وہ چاہتی یہی تھی کہ میں یہاں نہ رہوں۔ مجھے اب یہاں بھی ایک سازش کی بو آنے لگی تھی۔ جس کا تعلق عارفہ سے ہی تھا۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے بھی سرمد بابا سے اپنے سخت لب و لہجے کی معافی مانگ لی اور انہیں بتادیا کہ آپ کا میرا ساتھ ایک منہ بولے بیٹے جیسا ہی رہے گا۔ لیکن میرا یہاں رہنا اب بنتا نہیں ہے۔ پھر میں نے انہیں اپنی ماں جی کے بارے میں بھی مختصر بتادیا۔ وہ حیرت آمیز خوشی کا اظہار کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

صبح تک گفتگو ہوتی رہی۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں بھی سوچ وبچار ہوتی رہی۔ طے پایا گیا کہ ہمیں یہاں بھی کسی بڑے اور قابل وکیل کو ہائر کرلینا چاہیے نیز میں نے میجر باجوہ سے بھی اس سلسلے میں صلح ومشورہ کرنے کا سوچ رکھا تھا۔

القصہ کوتاہ میں اپنی مختصر ٹیم، اپنے ضروری ساز و سامان کے ساتھ ماں سمیت اپنے کوارٹر آگیا۔ اور میجر صاحب کو بھی اس کی اطلاع دے دی۔ وہ میرے اس فیصلے پر بے حد خوش ہوئے تھے۔

کہنے کو تو یہ کوارٹر ہی تھا مگر کسی کشادہ مکان سے کم نہ تھا۔ شکیلہ اور اول خیر خوش تھے، ماں بھی آرام سے تھیں، جبکہ مجھے بھی ذرا تسلی ہوگئی تھی کہ زندگی کسی ٹھکانے تو لگی تھی۔ اور اب میں آرام سے اپنے مقصد میں مصروف رہ سکتا تھا۔ یہاں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ سیکیورٹی کا کوئی بڑا اندیشہ نہ تھا۔ ہمارے استعمال کے لیے ایک ہزار سی سی کی گاڑی بھی دے دی گئی تھی۔

ہم نے کوارٹر میں آرام کیا، کیونکہ میری وجہ سے شکیلہ اور اول خیر بھی نہیں سوئے تھے، وہ بھی رات والے ناخوشگوار واقعے کے باعث بے آرام تھے۔ تازہ دم ہونے کے بعد میں نے ہیڈ کوارٹر جاکر میجر باجوہ صاحب سے ملنے کا قصد کیا اور جانے سے پہلے انہیں فون کیا تو انہوں نے کہا کہ وہ خود ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے یہاں پہنچ رہے تھے۔

شکیلہ نے کچن سنبھال لیا تھا۔ اول خیر چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹالیا کرتا تھا۔ دونوں بہت پہلے سے ہی کافی گھل مل گئے تھے۔

میجر باجوہ کو ہم نے لنچ پر ہی بلا لیا تھا کیونکہ اب کھانے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ ان کی آمد ہوئی تو وہ مجھے یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر کھانے کے بعد بہت سی اہم باتوں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا، عابدہ کی سی آئی اے اور ایف بی آئی کی حوالگی سے متعلق گفتگو ہوئی۔ دیگر موضوعات پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔

⁂

وہ چلے گئے اور جاتے ہوئے مجھ سے کہہ گئے کہ وہ کچھ مزید ضروری ''اسٹف'' یہاں بھیجنے والے تھے، جن میں لیپ ٹاپ، کمپیوٹر، اور اسی سے متعلق چند دیگر اشیا شامل تھیں۔ مجھے خود بھی ان چیزوں کی ضرورت پڑنے والی تھی۔ ضرورت کی حد تک مجھے یہ ساری چیزیں استعمال کرنا آتی تھیں۔

میجر باجوہ کے جانے کے بعد ہم تینوں بھی مختلف امور پر گفتگو کرنے لگے۔

''مجھے تو عابدہ کی گرفتاری میں اپنے ہی دشمنوں کی کارستانی نظر آتی ہے۔'' شکیلہ نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''یہ بہت اچھا خیال آیا ہے شکیلہ کے ذہن میں۔ کیونکہ وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان میرے سامنے بارہا اپنی ان دھمکیوں کا اعادہ کرچکے ہیں کہ وہ امریکا میں موجود عابدہ کے لیے مشکل کھڑی کرسکتے ہیں۔ ایسے میں شکیلہ کے ذہن نے صحیح خطوط پر سوچا ہے۔''

اول خیر نے کہا۔ ''بے شک وہ ایسا کرسکتے ہیں، کیونکہ دونوں ہی ''اسپیکٹرم'' جیسی ایک عالمی مجرمانہ سرگرمی کی حامل تنظیم کے بڑے عہدے دار نما ایجنٹ ہیں۔ لیکن باسکل ہولارڈ ایک الگ شخصیت ہے۔ وہ امریکا کی ذمے دار خفیہ ایجنسی کا کوئی افسر ہے۔ اور لامحالہ اپنی ڈیوٹی نبھا رہا ہے اور بس۔''

''میں تمہاری اس بات سے بالکل بھی متفق نہیں ہوں میرے یار!'' میں نے اول خیر کی طرف دیکھ کر نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''تم امریکی خفیہ ایجنسی کو کیا دودھ کا دھلا سمجھ رہے ہو؟ جس کی کارستانیاں پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ اور اپنے مفادات کی خاطر یہ رائج بین الاقوامی قوانین کی بھی بڑی ڈھٹائی سے دھجیاں بکھیرتی رہتی ہیں، یہی نہیں اپنے حریف ممالک کی جاسوسی بھی کرتے ہوئے اسے کئی بار طشت ازبام کیا جاتا رہا ہے۔ اور اپنے کیے پر صاف مکرتی بھی رہی ہیں۔ ان میں سی آئی اے پیش پیش اور بدنام زمانہ ہے۔''

''لیکن اس سے یہ ظاہر کب ہوتا ہے کہ وہ ایک مجرم تنظیموں سے بھی لنک رکھتی ہے؟'' اول خیر نے سنجیدگی سے کہا۔

''بالکل الوالور ہی ہے سی آئی اے۔ میں نے کہا تاں کہ اپنے وسیع تر مفادات کے لیے یہ ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر یہ عالمی سطح کے گینگسٹرز سے بھی خفیہ رابطہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ بلکہ ان کے ادارے میں خود

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بڑے بڑے نامی گرامی گینگسٹرز موجود ہیں۔ اور شاید تم بھول رہے ہو اول خیر! عابدہ مجھے فون پر اکثر باسکل ہولارڈ کے بارے میں بتایا کرتی تھی کہ نائن الیون کے واقعے کے بعد امریکا میں مقیم سمیت آنے جانے والوں پر امریکی خفیہ ایجنسیاں کڑی نظر رکھتی تھی اور جن پر انہیں ذرا بھی شبہ ہوتا، وہ انہیں تفتیش کے لیے لے جاتی۔ پاکستانیوں پر تو زیادہ کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جب تک عابدہ اور عارفہ اسپتال میں مقیم رہیں، ایف بی آئی سے لے کر سی آئی اے اور جانے کتنے خفیہ اداروں کے لوگ وہاں ان کے پاس مختلف انداز میں پوچھ گچھ کے لیے آتے رہتے تھے۔ انہی میں ایک باسکل ہولارڈ بھی شامل تھا۔

میں عابدہ بے چاری کو یہ تسلی دے دیا کرتا تھا کہ یہ وہاں کے تازہ ترین ناخوشگوار حالات کے پیش نگاہ ہو رہا ہے، اور یہ معمول کی کارروائی ہے، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تو جواب میں عابدہ مجھے بالخصوص باسکل ہولارڈ کے بارے میں بتاتی تھی کہ وہ اسے زیادہ نظروں میں لیے رہتا تھا اور اسی سے زیادہ پوچھ گچھ کرتا تھا۔ بے چین تو میں بھی تھا لیکن بہرحال...'' میں رکا اور شکیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم نے ایک اچھے نقطے کی طرف توجہ دلائی، اب تم ہمارے لیے ایک اچھی سی چائے بنا کر لے آؤ، میں تب تک آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور دوسرے کمرے میں آگیا۔ اول خیر بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

میں اپنی اسکائپ اور ای میل آئی ڈی بنا چکا تھا، جو میں نے آنسہ خالدہ کو اس کے سیل فون پر ایس ایم ایس کردی تھی۔ فوراً ہی اس کا ریپلائی آگیا اور اس کے بعد میں نے اس کے سیل فون پر رابطہ کیا۔

مختصراً رسمی کلمات کے بعد میں نے اس سے عابدہ کے متعلق پوچھا، ابھی کوئی تازہ خبر نہ تھی، وہی سب کچھ تھا جو وہ مجھے بتا چکی تھی، تاہم میں نے اسے سرمد بابا کے بارے میں بتایا کہ وہ آج یا کل کی فلائٹ سے امریکا پہنچنے والے تھے، لہٰذا میں نے آنسہ خالدہ سے عاجزانہ درخواست کی کہ اس سے جو ہو سکے وہ سرمد بابا کی ممکنہ مدد کرے۔ جس کا آنسہ خالدہ نے پورے تہ دل سے وعدہ کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر کسی طرح ممکن ہو سکے تو وہ باسکل ہولارڈ کے بارے میں مجھے تفصیلی بائیو ڈیٹا فراہم کردے۔ میری اس بات پر وہ قدرے چونک کر بولی۔

''باسکل ہولارڈ کے سلسلے میں تمہاری اس دلچسپی کی وجہ جان سکتی ہوں مسٹر شہزاد؟''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسے میں اپنے حالات کی لمبی چوڑی تفاصیل کیا بتاتا، لہٰذا سرِ دست بات بناتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے ابھی بہت سی باتیں مجھے مکمل صراحت ... سے آپ کے ساتھ شیئر کرنا ہوں گی۔ تب ہی میں آپ کے اس سوال کا جواب دے پاؤں گا، آپ پلیز، میرا یہ کام کردیں۔''

''نو پرابلم میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات، میں آج یا کل تمہیں اس کا جواب دے دوں گی، ٹیک کیئر بائی۔''

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میں کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ اس دوران شکیلہ چائے لے آئی تھی۔ چائے پینے کے بعد میرا ارادہ سرمد بابا سے ملنے کا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور اول خیر سرمد بابا کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔

ابھی شام ہونے میں تھوڑی دیر باقی تھی، ہم سرمد بابا کی کوٹھی کے گیٹ سے تھوڑی ہی دور تھے کہ میں چونک پڑا۔ ایک کار کھلے گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چونکنے کی وجہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود سیٹھ نوید احمد سانچے والا تھا۔ وہ یقیناً عارفہ سے ہی ملنے، اس کی مزاج پرسی کے لیے آیا ہوگا۔ میں نے کچھ سوچ کر کار وہیں روک دی اور اول خیر سے بولا۔

''تم اِدھر ہی کار میں رکو' میں ذرا ایک ایڈونچر کر کے آتا ہوں۔''

''او خیر۔'' وہ مسکرایا۔ اور میں کار کا دروازہ کھول کے نیچے اتر گیا.... تب تک وہ کار اندر جا کر غائب ہو چکی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میں بھی گیٹ پر پہنچ گیا۔

گارڈ مجھے جانتا تھا، میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ قدرے حیرت سے بولا۔ ''خیریت ہے صاحب؟ آپ کی کار؟''

''ہاں یار! وہ ابھی آتے ہوئے راستے میں خراب ہو گئی تھی، کام زیادہ تھا، ادھر مکینک کے پاس ہی چھوڑ آیا ہوں۔ سیٹھ صاحب تو اندر موجود ہیں ناں؟''

''جی ہاں سر! تشریف لائیں۔'' وہ خوش اخلاقی سے بولا تو میں اندر داخل ہو گیا۔

اب میری کوشش تھی کہ اور کسی کی نظر مجھ پر نہ پڑے۔ گارڈ میری طرف سے اپنی توجہ ہٹا چکا تھا۔ میں نے کار پورٹیکو میں ایک نگاہ ڈالی۔ وہاں حسب توقع سیٹھ نوید سانچے والا کی کار کھڑی تھی۔ میں لپک کر ایک بالکونی کے

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ذریعے اندر داخل ہوگیا۔

میں اس کوٹھی کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔ اسی لیے میں نے جو سوچ رکھا تھا اس کے ٹھیک عین مطابق میں ایک ایسے کمرے میں رازداری کے ساتھ جا پہنچا تھا، جس سے ملحقہ وہ نشست گاہ تھی، جدھر میرے محتاط اندازے کے... مطابق سیٹھ نوید، عارفہ یا سرمد بابا کے ساتھ "بیٹھک" جمائے ہوئے ہوگا۔

میں نے ایک کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا کے اندر دیکھا۔ اندر صرف عارفہ اور سیٹھ نوید آمنے سامنے کے صوفوں پر براجمان تھے۔ عارفہ نے شاید اب وہیل چیئر چھوڑ دی تھی۔ یوں بھی اس کی طبیعت اب کافی سے زیادہ بہتر تھی۔ تاہم خالی وہیل چیئر ایک طرف پڑی نظر آرہی تھی۔

میں نے پردے کے پیچھے سے بہ غور ان دونوں کا جائزہ لیا۔ سیٹھ نوید نے اپنی تیاری میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ اس کے دراز قامت... جسم پہ بہترین تراش کا بیش قیمت سفاری سوٹ تھا۔ عارفہ نے بھی اپنی سج دھج اور ڈریسنگ پر خاصی توجہ دے رکھی تھی۔ وہ دونوں آپس میں مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان میں اشیائے... خورونوش کی نفیس ٹرالی نظر آرہی تھی۔

میری ابھی چند دن پہلے ہی سیٹھ نوید احمد سانچے والا سے ایک خاموش سی ملاقات ہو چکی تھی۔ میں اسے... "خاموش" ملاقات ہی کہوں گا، کیونکہ اس روز صرف ان کے اور سرمد بابا کے درمیان ہی گفتگو ہوتی رہی تھی، اور مجھے یاد تھا، انہوں نے سیٹھ نوید کا بڑی سرد مہری سے استقبال کیا تھا، وہ اسے سخت ناپسند کرتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ نوید، عارفہ سے شادی کا خواہشمند تھا، جبکہ سرمد بابا، اپنی بہو کو ابھی تک اپنے بیٹے کی بیوہ ہی سمجھے ہوئے تھے، اور یہی وہ دن تھا جب مجھے اس تلخ حقیقت کا اندازہ بھی ہوا تھا کہ سرمد بابا، ابھی تک سرمد بابا ہی تھے، سیٹھ منظور نہیں۔

ان دونوں کے درمیان کچھ دیر رسمی گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ نوید بار بار عارفہ کی مکمل صحت یابی پر اسے ڈھیروں مبارک باد سے نواز رہا تھا۔ اور عارفہ مسکرا مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیے جارہی تھی۔

ان کے درمیان ابھی کاروباری نوعیت کی گفتگو شروع نہیں ہوئی تھی، جس کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ وہ ابھی اسے امریکا میں ہونے والی اپنے ساتھ اس ٹریجڈی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ایک موقع پر سیٹھ نوید نے اپنی چندی چندی مکار آنکھوں سے عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت کمینے پن سے کہا۔

"ویسے میڈم جی! آپ کی ذہنی فراست کی داد دینا پڑے گی، جس طرح آپ نے اس خطرناک صورت حال کو ہینڈل کیا تھا، ورنہ تو وہ بڈھا اپنے ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبنے لگا تھا۔" اس کی اس بات پر یک لخت میرے کان کھڑے ہوگئے۔

عارفہ بھی بڑے کمینے انداز میں مسکرا کر ذرا نیچی آواز میں بولی۔ "آہستہ بولو سیٹھ صاحب! اندر وہ بڈھا موجود ہے، کہیں سن نہ لے۔"

"ویسے میڈم! آپ کے ذہن نے کیسے اچانک یہ ترکیب نکالی تھی؟"

"بس! حالات کے مطابق میرے اندر اچانک ہی ایک خیال در آیا تھا اور میں نے سارا ملبا عابدہ پر الٹ دیا تھا۔" وہ بولی تو میرا دل جیسے سلگتی ہوئی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔

"امریکی اہلکاروں کی تفتیش کے دوران ہی میں نے بھانپ لیا تھا کہ ایک امریکی افسر عابدہ کو سب سے زیادہ شبہے کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا، تب میں نے بھی انہیں اشاروں کنایوں میں یہی بتایا کہ عابدہ سے ہمارا کوئی بھی فیملی تعلق نہیں ہے، اور مزید کہ اس نے ہمارے ساتھ آنے پر خود ہی اصرار کیا تھا۔ مجبوراً ہمیں اسے ہیلپر کے طور پر ساتھ لانا پڑا تھا۔ پھر مجھ سے باسکل ہولا رڈ نامی اسی افسر نے علیحدگی میں بھی سوالات کیے، جو عابدہ پر شبہ کیے ہوئے تھا، تو میں نے اسے عابدہ کے متعلق مزید جھوٹ سچ بیان دے ڈالا کھل کر۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس کا ایک ساتھی بھی وہاں پاکستان میں ہے، شہزاد احمد۔ وہ ایک بڑا کرمنل ہے اور اس لڑکی (عابدہ) سے اکثر ملنے آتا رہتا تھا۔ مجھ سے متعلق تو شواہد مضبوط تھے کہ میں اپنے علاج کے سلسلے میں آئی تھی اور منظور وڑائچ میرے فادر ان لا اور میرے گارجین تھے۔ بس ان سے ہی میرا تعلق ہے۔"

"گریٹ! آپ تو واقعی جینئس ہیں میڈم جی۔" سیٹھ نوید اس کی مکروہ ذہانت کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اس بڈھے سے بھی وہیں جان چھڑا لیتیں جو ہماری راہ کا سب سے بڑا کانٹا بنا ہوا ہے اب تک۔"

"نہیں، اس طرح میرا بھی لوٹنا مشکل ہوجاتا۔ ویسے اس بڈھے کی تم فکر نہ کرو، جب تک میں بیمار تھی، میں نے ایک ناگن کی طرح اپنی کینچلی بدل رکھی تھی، اب میں پھر سے

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بھلی چنگی ہوگئی ہوں تو کیا ڈر ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر میں اس بڈھے سے ایک ملاقات کر چکا ہوں۔ وہ اب بھی آپ کو اپنے مرحوم بیٹے محمود کی بیوہ سمجھے ہوئے ہے۔ اور لگتا ہے آپ کو ایسے ہی بوڑھی کر دے گا' اپنی طرح۔''

''اونہہ، مائی فٹ! یہ کون ہوتا ہے مجھے اپنے بیٹے کے ساتھ ستی کر دینے والا۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ میں نے دیکھا ہی کیا ہے۔''

''بالکل میڈم جی! آپ تو ابھی تک جوان اور حسین ہیں۔ ایسے ہی تو نہیں ہم آپ کے دیوانے ہیں۔ اور آپ کی یادوں میں آہیں بھرتے رہتے ہیں۔'' سیٹھ نوید سانچے والا نے اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر نہایت بھونڈے عاشق کے سے انداز میں کہا اور عارفہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

اس کے بعد مختصر وقفے میں کچھ کھانے پینے کا دور چلا۔ میں پردے کے پیچھے چھپا یہ سب سن رہا تھا اور آتش فشاں کے مانند میرا پورا وجود دہک رہا تھا۔ دماغ میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں، اور سانسیں، میرے اندر کے ابال کی طرح چڑھنے لگی تھیں، جی چاہتا تھا اسی وقت اندر داخل ہو جاؤں اور سب سے پہلے اس حرافہ، عارفہ کا گلا دبوچ ڈالوں۔ اس نے عابدہ کے ساتھ بے حسی اور خود غرضی کے علاوہ اس بے چاری معصوم کے ساتھ بڑا ظلم بھی کیا تھا۔

بہت مشکل سے میں نے اپنے اندر کے اشتعال پر قابو پائے رکھا تھا، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جبکہ ان کے آئندہ کے زہریلے عزائم جاننا میرے لیے زیادہ ضروری تھا۔ بہت ضروری۔

''چلیں، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اَب کچھ کاروبار کی بھی باتیں ہو جائیں، تم کچھ اُڑیسہ کمپنی کے بارے میں بتا رہے تھے۔ کیا بنا اس کا؟''

عارفہ نے گفتگو کا رخ موڑنا چاہا، مگر شاید سیٹھ نوید پر اس وقت ریشہ خطمی کا دورہ پڑا ہوا تھا، عشق کا بھوت اس پر سوار ہوگیا تھا یا پھر وہ ایک دولت مند بیوہ کو ''ہاتھ'' دکھانا چاہ رہا تھا کہ اس کی طرف مخمور سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''چھوڑیں جی کاروبار کو۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں ہوں ناں میڈم جی! آپ کی یہ ساری دردسری لینے کے لیے۔ آج خوشی کا موقع ہے، آپ کو میں خوش اور صحت مند دیکھ رہا ہوں۔ اور آپ کی سنگت میں یہ حسین و لطیف لمحات۔۔۔بس جی شاعری کرنے کو چاہتا ہے۔''

وہ عارفہ پر بری طرح فریفتہ ہوتا دکھائی دے رہا تھا اور عارفہ جیسے اس کی لچھے دار باتوں سے مسرور ہوئی جا رہی تھی۔

یہ دونوں خبیث کسی اور کی خوشیوں کو تاراج کر کے اس کے مقبرے پر خوشیاں منا رہے تھے اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا، میں نے بھی اسی وقت یہ عہد کرلیا تھا کہ خوش، میں بھی انہیں نہیں رہنے دوں گا۔

کسی طرح گفتگو کاروباری نہج پر آ ہی گئی تھی ....

سیٹھ نوید سانچے والا اب عارفہ کو اڑیسہ کمپنی اور اس کے شیئرز سے متعلق آگاہ کر رہا تھا۔ نیز اس نے اس سلسلے میں تھوڑے دن پہلے ہی، سرمد بابا سے ہونے والی تلخ گفتگو کے بارے میں بھی اسے بتایا۔ تو میں نے دیکھا، عارفہ کے چہرے پہ پُر سوچ تاثرات پھیل گئے۔

''تمہارا کیا مشورہ ہے نوید! اگر ہم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سرے سے فروخت ہی نہ کریں بلکہ اس امریکی سوداگر۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟''

''لولووش۔''

''ہاں، لولووش! اگر ہم اسے بھاری قیمت دے کر وہ پچاس فیصد شیئرز خرید لیں تو کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا رہے گا۔ یہی تو میں بھی چاہتا ہوں میڈم جی!'' سیٹھ نوید سانچے والا نے فوراً اس کی طرف دیکھ کر کہا اور مجھے اس کی بات پر ایک حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیونکہ ابھی تھوڑے دن پہلے ہی اس کے اور سرمد بابا کے درمیان ہونے والی گفتگو میں خود سیٹھ نوید اس بات پر بضد تھا اور سرمد بابا پر زور دے رہا تھا کہ شیئرز فروخت کر دیے جائیں۔ مگر اب وہ عارفہ کے سامنے اس کے بالکل الٹ کہہ رہا تھا۔ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا اس وقت سیٹھ نوید کے مفادات اور تھے؟ یا پھر کوئی اور معاملہ تھا یہ؟

''نوید صاحب! اگر یہ کام ہو جاتا ہے تو سمجھو میں اس ملک کی ہی نہیں بلکہ ایشیا کی امیر ترین خاتون کہلاؤں گی۔'' عارفہ نے ایک خواب کی سی کیفیت میں کہا۔ اس کا حسین چہرہ اس وقت لالچ و طمع کے باعث عجیب سا تاثر پیش کر رہا تھا۔

'ایکسکیوزمی میڈم جی! کیا آپ مجھے صرف نوید کہنا پسند کریں گی؟'' سیٹھ نوید شوخ سے لہجے میں بولا تو عارفہ بے اختیار ہنس پڑی بولی۔

''تو پھر تم بھی مجھے میڈم جی نہ کہا کرو، صرف عارفہ کافی ہے۔''

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''نہیں، مجھے آپ کو میڈم جی کہنا اچھا لگتا ہے، اس میں مجھے ایک محبت سی محسوس ہوتی ہے''۔ وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ دونوں کے درمیان خاصی سے زیادہ بے تکلفی تھی۔ تاہم وہ فوراً ہی سنجیدگی سے بولا۔

''میڈم جی! یہ اسی صورت میں ہی ممکن ہو سکے گا کہ آپ اس بڈھے سے شیئرز اور کاغذات کی فائل اپنے نام کروالیں۔ نہ صرف یہ بلکہ شیئرز ہولڈر اکاؤنٹ میں بھی اپنا نام درج کروالیں۔''

''یہ میرے لیے کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' عارفہ نے غرور سے کہا تو وہ بولا۔

''یہ بڈھا اتنا تر نوالہ نہیں ہے میڈم جی! جتنا آپ اسے سمجھ رہی ہو، میں اس سلسلے میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ مجھے تو حیرت ہے، آپ نے اپنے مرحوم شوہر کا سب کچھ جب اپنے نام کروالیا تھا تو یہ اتنا اہم کام کیسے بھول گئیں؟ بلکہ بھولنا تو کیا، آپ نے تو اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی، اَب دیکھ لو۔ آپ کی ساری امارت کا دارومدار ہی انہی شیئرز پر ہے۔''

''مجھے واقعی اس کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اس میں دلچسپی لی تھی، نہ محمود نے بھی کبھی اس کا تذکرہ مجھ سے کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اب تم نے مجھے یہ نئی کہانی سنا کر ایک عجیب مسرت والی پریشانی سے دوچار کر دیا ہے۔''

''ہاں، شیئرز کے کاروبار میں یہی کچھ ہوتا تو رہتا ہے، بالخصوص ایسے شیئرز میں جب کمپنی شدید مالی خسارے سے دوچار بھی ہو اور پھر ایک دم پو بارہ ہوجاتے ہیں۔ خیر اب زیادہ حیرانی اور پریشانی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس بڈھے سے وہ سب بھی ہتھیانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ میرا اب دوبارہ یہاں آنا مناسب نہیں ہوگا، وہ بڈھا شک میں پڑ گیا تو پھر ہمارے لیے مشکلات پیدا کر دے گا، اسے تو میری صورت سے بھی نفرت ہے، جب سے میں نے تمہارے ایما پر اس سے رشتے کی بات کی تھی۔''

''ہاں! میں بھی یہی مناسب سمجھتی ہوں، ابھی میں خود بھی اس کی نظروں میں بری نہیں بننا چاہتی، وہ اب بھی مجھے ایک بہو اور اپنے مرحوم بیٹے کے روپ میں ہی دیکھ رہا ہے، اسی لیے کبھی اس نے مجھ سے جائداد یا کاروبار وغیرہ اپنے نام کروانے کی بات نہیں کی۔ کام نکلنے کے بعد میں اسے پھر دودھ کے بال کی طرح نکال باہر پھینکوں گی۔''

عارفہ کی بات پر میرا دماغ ایک بار پھر گرم ہونے لگا۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ وہ شریفاں تھی جو شاید کسی کام کے سلسلے میں کمرے کے اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر میں اس کی آہٹ پاتے ہی قریب ہی دیوار پہ ایستادہ بڑے سے ڈیوائیڈر کے پیچھے ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ چلی گئی تو میں دوبارہ کھڑکی کی طرف آیا مگر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کمرے میں اب کوئی نہیں تھا۔

میں اسی خاموشی سے دوبارہ کمرے سے باہر آگیا اور دوسری طرف سے گھوم کر اندر داخل ہوا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ ادھر سے ہی واپس لوٹ جاؤں، لیکن یہ میں نے مناسب نہیں سمجھا کیونکہ گارڈ کو معلوم تھا کہ میں اندر آیا تھا، وہ کسی کو میرے بارے میں بتا سکتا تھا کہ میں اندر آیا تھا۔ اور میں کسی کو اپنے بارے میں کسی شک میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا، کم از کم عارفہ کو تو نہیں۔

اسی لیے میں نے اندر داخل ہو کر سرمد بابا سے ملاقات کی، میں ان سے مختصراً بات کر کے یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا۔ عارفہ نے بھی چاروناچار ہمارے ساتھ نشست جمائی تھی۔ اس دوران اس نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا کہ سرمد بابا کا ابھی اس طرح اور اتنی جلدی دوبارہ امریکا جانا مناسب نہ تھا اور ناممکن بھی۔ تاہم سرمد بابا کا جلد سے جلد امریکا جانے کا مصمم ارادہ تھا۔

سرمد بابا کا جانا ضروری تھا۔ تاہم میں نے سرمد بابا سے اپنے لیے بھی امریکا روانہ ہونے کے لیے کہا تو وہ بولے۔

''شہزی بیٹا! تمہارا امریکا جانا اول تو اتنا آسان نہیں ہے اور پھر ان حالات میں بالکل بھی نہیں ہوسکتا ہے امریکی تمہیں بھی گرفتار کرلیں۔ ابھی میں جا کر عابدہ کا دفاع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور جب تک کوئی حتمی صورت نظر نہیں آتی میں وہیں رہوں گا۔''

میں نے سرمد بابا کو آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی بتانے کا سوچا، مگر پھر عارفہ کی موجودگی میں اس کے بارے میں ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ عارفہ کی موجودگی میں، میں اپنے اندر کی کیفیات پر بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے تھا۔

''میرا تو خیال ہے ابھی آپ کا اتنی جلدی امریکا جانا ویسے بھی مناسب نہ ہوگا۔'' عارفہ نے زہر اگلا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی۔

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''امریکی ابھی اتنی آسانی سے عابدہ کو نہیں چھوڑیں گے کہ آپ وہاں جائیں اور وہ عابدہ کا ہاتھ آپ کو تھما دیں۔ وہاں ہم نے عابدہ کے لیے ایک لائر کا بندوبست کر رکھا ہے۔ وہ یہ معاملہ دیکھ رہا ہے، جب وہ کہے گا، تب ہی آپ کا امریکا جانا بہتر ہوگا۔''

میں نے عارفہ کی طرف ایک ثانیے کے لیے بڑی خوفناک نظروں سے دیکھا تھا، اس قدر کہ ایک لمحے کو میرے چہرے کے خوفناک تاثرات محسوس کر کے اس کے چہرے پر بھی ذرا دیر کو ایک خوف کا تاثر ابھر آیا تھا۔

میرا جی تو چاہا کہ ابھی پھٹ پڑوں، اور اس کے اور اس خبیث سیٹھ نوید سانچے والا کے کریہہ منصوبے کو سرمد بابا کے سامنے آشکار کر دوں۔ مگر اس کا ابھی کوئی فائدہ نہ تھا۔

میں نے خود کو جلدی نارمل کر لیا اور اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''لائر کو کیس سے زیادہ اپنی فیس سے دلچسپی ہوتی ہے۔ جبکہ اس کے ساتھ مستقل طور پر ہم میں سے کسی ایک کو وہاں موجود رہنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے، پھر اپنا کوئی وہاں ہوگا تو عابدہ کو بھی ڈھارس بندھی رہے گی۔''

''تمہاری بات سے میں متفق ہوں بیٹا! اسی لیے یہ بحث کرنا ہی فضول ہے کہ ہم میں سے امریکا کسی کو جانا چاہیے یا نہیں۔'' سرمد بابا نے یہ کہہ کر عارفہ کا منہ ہی بند کر دیا۔

''میں تم سے وعدہ کر چکا ہوں شہزی بیٹا کہ عابدہ کو لیے بغیر میں واپس پاکستان نہیں لوٹوں گا۔''

میں نے وزدیدہ نظروں سے عارفہ کی طرف دیکھا، وہ خاصی پریشان دکھنے لگی تھی، اور میں اس کی وجہ جانتا تھا۔

میں تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ میں سرمد بابا سے ایک اور ملاقات کرنا چاہتا تھا مگر تنہائی میں۔ جب عارفہ موجود نہ ہو۔

میں کوٹھی سے باہر آ گیا اور تیز تیز چلتا ہوا ذرا دور کھڑی اپنی کار کے قریب پہنچا اور پھر دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔ میرا چہرہ اس وقت جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

''اوخیر۔'' اول خیر نے ایک بھانپتی ہوئی نگاہ میرے چہرے پہ ڈالی تھی اور یک دم کار آگے بڑھا دی۔

''لگتا ہے کوئی خاص بات ہوئی ہے آج۔ کوئی لڑائی شڑائی تو نہیں ہوئی اس زنانی سے کاکے؟'' اول خیر نے کار کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ اسے میرے چہرے کے پُرغیظ تاثرات نے فکرمند کر دیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اور اول خیر کو عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔

''اوخیر کاکے! یہ زنانی عارفہ تو واقعی ایک حرافہ ہے، اور احسان فراموش بھی۔''

''ہاں اول خیر! احسان فراموش بھی اور محسن کش بھی، یہ عورت نہیں ایک زہریلی ناگن ہے۔''

''زہریلی ناگن کا علاج اس کا سر کچلنے میں ہی ہے کاکے!'' اول خیر خرانٹ لہجے میں بولا۔ ''اس کمینی عورت نے عابدہ بہن کو امریکی انٹیلی جنس کے ہاتھوں پھنسایا ہے اور دوسری طرف یہاں وہ اس خبیث سیٹھ کے ساتھ خوش آئند خواب بن رہی ہے۔ کاکے! زنانیوں پر ہاتھ اٹھانا ایک مرد کی شان تو نہیں ہوتی، لیکن یہ عورت ایک ناگن ہے۔ جسے دودھ پلاؤ تو یہ اسی کو ڈستی ہے۔ اس کا بندوبست کرنا ضروری ہے۔''

یہ تلخ حقیقت جاننے کے بعد اول خیر کے دل میں بھی عارفہ کے خلاف نفرت کی آگ دوچند ہونے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، اول خیر! اب ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ پہلے ذرا عابدہ کا معاملہ واضح ہو جائے، ورنہ یہ حرافہ اس کا معاملہ خراب کر سکتی ہے۔ کیونکہ مجھے اس کے ساتھ اس سیٹھ نوید سانچے والا کی ساجھے داری کسی خطرناک ڈرامے کی ابتدا ہی معلوم ہوتی ہے۔''

''تیرا کیا مطلب ہے کاکے! کیا سیٹھ نوید کھانچے والا۔''

''سانچے والا۔'' میں نے تصحیح کی۔

''ہاں! وہی، کیا اس بدبخت کے تعلقات اسپیکٹرم کے سپریم چیف لولووش کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں؟''

''یہ ممکن ہے، ہو سکتا ہے یہ اس کا ایک کاروباری طاؤٹ ہو۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ سیٹھ نوید سانچے والا لولووش کے ملکی و غیر ملکی کاروباری معاملات کے تحفظات کے لیے کام کرتا ہے۔'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اب سانچے والے پر بھی نگاہ رکھنا پڑے گی۔ میں اس کا حدود اربع جاننا چاہتا ہوں جو مجھے سرمد بابا ہی بتا سکتے ہیں۔''

تب اچانک میرے ذہن میں انکل جمال سے ملنے کا خیال آیا۔ وہی مجھے ایک مخلص اور ایمان دار آدمی نظر آتا تھا۔ اول خیر نے میرے اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔

ہمارے گھر پہنچتے ہی امریکا سے آنسہ خالدہ کا فون آ گیا۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

"مسٹر شہزاد! میں نے باسکل ہولارڈ سے متعلق کچھ مفصل اسٹف تمہیں ای میل کر دیا ہے۔ باسکل ہولارڈ سے متعلق یہ مواد عمومی نوعیت کا نہیں ہے۔ اس میں اس کے بارے میں اتنی زیادہ گہری تفاصیل نہیں ہیں، یہ مواد جو میں نے تمہیں بھیجا ہے، وہ میں نے اپنی ذاتی کاوشوں اور بعض خفیہ ذرائع سے حاصل کیا ہے، اس میں میرے لیے بھی بعض چونکا دینے والے انکشافات ہیں، خیر، پہلے تم انہیں غور سے دیکھ لو اور آج پاکستانی وقت کے مطابق مجھ سے اسکائپ پر ایک فیس ٹو فیس ملاقات بھی کر لو۔"

میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور پھر جلدی سے اپنے کمرے میں آ کر کمپیوٹر پر بیٹھ گیا۔

اپنا ای میل چیک کیا تو وہاں آنسہ خالدہ کا برقی پیغام موجود پایا۔ میں نے اس کا بھیجا ہوا اسٹف نکالا اور اسے اوپن کر کے بہ غور دیکھنا شروع کر دیا۔

سب سے پہلے باسکل ہولارڈ کی تصویر میں نے دیکھی۔ وہ ایک چالیس، پینتالیس سالہ خاصا بھاری بھرکم شخص تھا۔ کاندھے چوڑے تھے اور قد کا درمیانہ تھا۔ چہرہ قدرے لمبوترا اور آنکھیں چھوٹی مگر اندر کو دھنسی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ایسی آنکھوں میں غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ رنگ گورا ہی تھا، بال سولجر کٹ تھے، یعنی بہت چھوٹے۔ صورت سے ہی وہ ایک خطرناک ٹاپ ایجنٹ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن جب میں نے اس کی بائیو ڈیٹا پر ایک نظر ڈالی تو اندر سے دہل سا گیا۔

باسکل ہولارڈ نسلاً ایک یہودی تھا اور ایک طویل عرصے سے امریکا میں رہائش پذیر تھا۔ اس کے باپ کا تعلق اسرائیل سے تھا اور وہ یہودی تھا، جبکہ ماں اس کی امریکی کیتھولک کرسچن تھی۔ دونوں نے پسند کی شادی کی تھی، جو زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔

دونوں کے بیچ اس کی پیدائش کے بعد ہی علیحدگی ہو گئی اور باپ اپنے بیٹے کو لے کر واپس اسرائیل چلا گیا۔ وہیں اس کی ابتدائی تربیت ہوئی۔ اس کا باپ ایک کٹر اسلام دشمن اور یہودی تھا۔ اپنے بیٹے باسکل ہولارڈ کی بھی اس نے اسی انداز میں تربیت کی تھی۔ باسکل کو پولیس کا محکمہ اچھا لگتا تھا، وہ فطرتاً جارحانہ مزاج، مطلق العنان اور انتقامی خو رکھنے والا لڑکا تھا اور چاہتا تھا کہ رعب داب والی زندگی گزارے، اس کے لیے اس نے اپنے ملک اسرائیل کے بجائے امریکا کا انتخاب کیا اور پھر وہ امریکا آ گیا۔ باقی کی تعلیم اس نے ادھر ہی حاصل کی اور پولیس میں بھرتی ہو گیا۔

اسی دوران Salvadoran Civil War میں اسے "ٹائیگر ٹیک فورس" کا کمانڈو انچارج بنا کر بھیجا گیا جہاں اس نے بے گناہ اور معصوم لوگوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے اور امریکا نے اس کے اس "کارنامے" پر اسے زبردست خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے بعد اسے ایف بی آئی میں بھرتی کر لیا گیا۔ ان دنوں امریکا بری طرح نسل پرستی شکار تھا۔ یہاں بھی اس نے اپنی ٹائیگر ٹیک فورس (جو اب اس کی ذاتی قوت کا درجہ اختیار کر چکی تھی) کے ذریعے ان پر بے تحاشا ظلم ڈھائے۔

اس کے کچھ عرصے بعد جب ایف بی آئی میں اس کی ترقی ۔۔۔ ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر ہونا متوقع تھی وہ سی آئی اے میں چلا گیا۔ اور اب وہاں اس کا شمار ایک ٹاپ ڈبل ایجنٹ میں ہونے لگا تھا۔ اور وہ سی آئی اے کا ایک بااختیار افسر کہلاتا تھا۔

اپنے محکمے میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے یہ خفیہ طور پر غیر قانونی ہتھکنڈے بروئے کار لانے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا، اس کے لیے وہ اپنی ذاتی فورس "ٹائیگر ٹیک فورس" کو استعمال کرتا تھا، جس کے کئی زیرِ زمین بدنامِ زمانہ اور مافیائی "ڈون" سے روابط تھے۔

اس نے حال ہی میں اپنی بیٹی انجیلا ہولارڈ کی شادی ایک عالمی مافیائی ڈون "لولوش" سے کی تھی۔ جو بظاہر ایک معزز اور عالمی کروک کا ایک بڑا بزنس ٹائیکون کہلاتا تھا۔

باسکل ہولارڈ کی یہ ایک ہی بیٹی تھی۔ بیوی مر چکی تھی۔ سفاکی، انتشار پسندی، کمزوروں پہ جبر اور کینہ پروری باسکل ہولارڈ کی نسلی فطرت کا حصہ تھی، یہی سبب تھا کہ جب امریکا میں نائن الیون کا واقعہ وقوع پذیر ہوا تو اس نے اس کا سارا ملبا سب سے پہلے تو امریکا میں مقیم مسلم کمیونٹی پر ڈال دیا۔ تفتیش وغیرہ کے بہانے ان کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی۔ نیز ایک خفیہ مہم کے ذریعے اس نے ان کے خلاف ۔ امریکی عوام کے دلوں میں مختلف پروپیگنڈوں سے نفرت ابھارنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔

مسلم دشمنی اسے اپنے باپ سے ملی تھی۔ وہ ..... اب بھرپور طریقے سے اس کا استعمال کر رہا تھا۔ لہٰذا اب نائن الیون کے واقعے کے بعد سے اسے امریکی مسلمانوں کے خلاف ..... ایک نیا گل کھلانے کا موقع مل گیا۔ بڑے پیمانے پر ان کی پکڑ دھکڑ شروع کی اور کئی بے گناہ معصوم لوگوں کو اس

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

بدبخت نے امریکا کی غلیظ اور خطرناک جیلوں میں سڑنے کے لیے بھیج دیا۔

باسکل ہولارڈ کی اصل رہائش گاہ لاس اینجلس کے مضافاتی علاقے، ویسٹ روڈ کی ڈلشائر بولیوارڈ پر واقع فیڈرل بلڈنگ میں تھی۔

باسکل ہولارڈ کے بارے میں یہ سب جاننے کے بعد میرے اندر ہول سے اٹھنے لگے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ میں کئی لمحوں تک اپنی جگہ سن ہو کے رہ گیا تھا، مجھے اس بات کی قطعاً امید نہ تھی میری یہ جنگ دیکھتے ہی دیکھتے اتنے وسیع پیمانے پر پھیل جائے گی۔ کسی نے سچ ہی تو کہا ہے کہ کیچڑ میں گرنے سے آدمی سارا ہی لتھڑ جاتا ہے۔ تب پھر میں نے بھی یہ عزم صمیم کرلیا تھا کہ اگر ایسا تھا تو پھر میں بھی اپنے دشمنوں کے لیے ''کیچ'' کی جونک بن جاؤں گا۔

شکیلہ اور اول خیر بھی اس وقت میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے اور میں کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ میرے چہرے پر یکلخت پھیلنے والے سناٹوں کی تہ میں چھپی ہوئی تشویش آمیز ہولناک خاموشی کو وہ دونوں بھی فوراً بھانپ گئے تھے۔

''اوخیر کاکے! تجھے تو ایک خوفناک سی چپ کھا گئی، خیریت تو ہے؟'' اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''آخر آنسہ خالدہ نے ایسا کیا بھیج دیا ہے تجھے، ہمیں بھی بتا۔''

میں نے جواباً اپنے حلق سے ایک گہری ہنکاری... خارج کر کے کہا۔ ''اول خیر! ایسا لگتا ہے کہ ہماری جنگ بہت دور تک پھیل گئی ہے۔''

وہ کچھ سمجھے بغیر ہنس کر بولا۔ ''تو کیا خیال ہے کاکے! اپنے گوڈوں، گٹوں پر تیل کی مالش کرلیں؟''

ان تشویش ناک حالات میں بھی اول خیر کی اس بات پر بے اختیار میں ہولے سے ہنس دیا۔ البتہ شکیلہ نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اول خیر کو ٹوکا۔

''تمہیں ہر وقت مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی کام کی بات بھی منہ سے نکال لیا کرو۔''

''جاؤ پھر ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ، میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کام کی بات اور نہیں ہوسکتی۔'' اول خیر نے کہا تو وہ منہ بنا کر بولی۔

''میں نوکرانی نہیں لگی ہوئی ہوں تمہاری۔ جاؤ خود ہی بنالو جاکر۔''

''ارے یار! کیوں تنگ کرتے ہو تم اس کو...... ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بے چاری۔ پہلے ہی یہ بہت کام کرتی ہے۔'' میں نے شکیلہ کی طرف داری کی تو وہ بولی۔

''شہزی! میں آپ کے لیے نہیں کہہ رہی تھی۔ آپ کے لیے بنالاؤں؟''

''چائے کا موڈ تو واقعی ہو رہا ہے، بہ شرطیکہ تم تھکی ہوئی نہ ہو۔''

''نہیں، نہیں، میں تھکی ہوئی نہیں ہوں۔ ابھی بنالاتی ہوں۔'' وہ بے چاری جلدی سے بولی، تو اول خیر نے کہا۔

''اوکاکی! بیٹھ جا تو، میں ہی بنالاتا ہوں۔''

''تمہارا شکریہ۔'' شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر گھورا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد اول خیر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''کاکے! مجھے بھی بتا یار! آخر ایسا کیا ہے اس میں۔ یہ کس کی تصویر ہے؟''

اس نے سامنے مانیٹر کی اسکرین پر باسکل ہولارڈ کی تصویر کی طرف اشارہ کیا تو میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ جسے سن کر اس کا منہ بھی کھلا رہ گیا۔ اور وہ ''اوخیر'' کہنا بھی بھول گیا۔ مگر چند پل بیتنے کے بعد اس کے حلق سے یہ جملہ بالآخر برآمد ہو ہی گیا۔

''اوخیر کاکے! یہ تو واقعی میں لمبا معاملہ لگ رہا ہے۔''

''ہاں اول خیر! کچھ ایسا ہی ہے۔ لیکن ہم بھی... ''تر نوالہ''... ثابت نہیں ہوں گے دشمنوں کے لیے۔'' میں نے بھی ہولے سے مگر پُرعزم ہو کے کہا۔

نامساعد حالات ایک زنجیر کی طرح کڑی درکڑی مجھے اپنے گھیرے میں لیتے ہوئے محسوس ہونے لگے تھے۔ گویا جہاں سر اٹھا کے دیکھتا، مجھے اپنا ایک سے بڑھ کر ایک طاقت ور دشمن کھڑا نظر آتا تھا۔

باسکل ہولارڈ کی ہسٹری جاننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں اب معاملہ نہ صرف کھٹائی میں پڑنے والا تھا بلکہ بہت دور تک جانے والا تھا۔ اور اس کے لیے مجھے کچھ خصوصی نوعیت کے ''ایفرٹس'' لینے چاہیے تھے۔

سرمد بابا اس سلسلے میں بے شک ایک مبہم امید تھے، مگر ان کے علاوہ بھی مجھے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی بندوبست کرنا تھا۔ عابدہ یقیناً اسی بات کی منتظر ہوگی کہ اس اندوہناک واقعے کے بعد میں بھی خاموش نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اسی امید پر میری بھی راہ تک رہی ہوگی۔

آنسہ خالدہ کی اگر بات کی جاتی تو وہ اس سلسلے میں قوی امید تھی میری، میں نے سوچا کہ سرمد بابا کو بھی آنسہ

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

خالدہ کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا، مگر ابھی ان کی امریکا روانگی کا پروگرام حتمی نہیں ہوا تھا۔ ایک تیسری امید بھی تھی۔

میجر ریاض باجوہ یا پی ایس ایس (پاور سیکریٹ سروس والے) جبکہ میں باجوہ صاحب سے اس موضوع پر بات کر چکا تھا اور انہوں نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا کہ پہلے سرمد بابا اور آنسہ خالدہ کی کاوشوں کو دیکھ لیتے ہیں، وہ کہاں تک بارآور ثابت ہوتی ہیں، جب تمام امیدیں ختم ہو جائیں، تب ہی ہم اپنے تئیں کچھ کرنے کا سوچ سکتے ہیں۔ مجھے باجوہ صاحب کا یہ مشورہ اچھا لگا تھا، اور میں ان کے اس مشورے سے پُرامید بھی تھا۔ مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ سرمد بابا اور آنسہ کی کاوشیں کہاں تک کامیاب ہوتی ہیں۔ جبکہ سرمد بابا نے امریکا میں ایک لائر بھی ہائر کر رکھا تھا۔

اپنی مہم جوئی کے سلسلے میں باجوہ صاحب نے پہلا اشارہ یہی دیا تھا کہ ملکی سطح پر امریکا پر سفارتی دباؤ ڈالنے پر بھی غور ہو سکتا تھا، ناکامی کی صورت میں ہمارے پاس آخری آپشن یہی تھا کہ عابدہ کی رہائی کے لیے خود میدانِ عمل میں کودنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ مگر یہ مشن نہ صرف خفیہ ہوگا بلکہ اس میں صرف مجھ سمیت پی ایس ایس کے چند انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز ہی شامل ہو سکتے ہیں۔ جن کی کوئی شناخت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ہیں کون؟ وغیرہ۔

مجھے اسی آخری آپشن میں زیادہ دلچسپی تھی۔ مگر مجھے ابھی اس کے کوئی امکانات ہوتے نظر نہیں آتے تھے۔

میں نے ابھی پچھلے دنوں ہی اسپیکٹرم کو کاری ضرب لگائی تھی، اور آرک سمیت اس شیطان ڈاکٹر گمسٹ کو جہنم واصل کیا تھا بلکہ ان کی اہم عمارت زیرو ہاؤس بھی تباہ کر ڈالی تھی، پھر اسی دوران میرا وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کے ساتھیوں سے بھی ٹکراؤ ہوا اور انہیں اپنے زخم چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن وزیر جان کی دھمکی مجھے یاد تھی، جو اس نے مجھے، آرک اور ڈاکٹر گمسٹ کی ہلاکت کے بعد دی تھی کہ میری اس تازہ مہم کی وجہ سے اب لولوش خود براہِ راست میدان میں اترنے والا تھا۔ کیونکہ آرک اور گمسٹ اس کے بے حد قریبی اور اہم ساتھیوں میں شمار کیے جاتے تھے۔

میں خود لولوش سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ عابدہ کی سی آئی اے سینٹر میں حوالگی کے بعد وہ مجھے زیر کرنے یا جھکانے کے لیے پھر کوئی بزدلانہ حرکت کر سکتے تھے۔

لہٰذا ابھی میں صرف عابدہ کی رہائی کے لیے ہی اپنی توجہ مرکوز کرنا چاہتا تھا، جبکہ اپنے باپ کی تلاش بھی میرے اہم منصوبوں میں شامل تھی۔

ماں جی سے اپنے ماضی کے بارے میں جان کاری کے بعد کہ لئیق شاہ اور میں ایک ہی باپ کی اولاد تھے اور میرے اصل باپ کا نام تاج دین شاہ تھا، جس نے رینجرز کا ایک عام سپاہی ہوتے ہوئے بھی کسی گمنام مجاہد کی طرح ملک دشمن عناصر کی سازشوں کو ملیامیٹ کیا تھا اور آخر میں وہ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر گیا تو پھر اس کا کچھ پتا نہ چلا تھا۔

میں اب بھی شاید اس معاملے میں زیادہ دلچسپی نہ لیتا۔ اگر وزیر جان مجھے یہ نہ بتاتا کہ میرا باپ زندہ ہے اور وہ بھارتی جیل میں ایک گمنام جنگی قیدی کی حیثیت سے نجانے کس حال میں تھا۔ بات چند سالوں کی نہیں بلکہ کئی سال پرانی تھی۔ مگر مجھے اس کی تلاش کرنا تھی اور میں نے میجر باجوہ سے تازہ ملاقات میں تاج دین شاہ کا ریکارڈ تلاشنے اور اس سلسلے میں تفصیل حاصل کرنے کی درخواست کی تھی۔

انہیں بہرحال یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ میں ایک سرحد کے بہادر سپاہی کا بیٹا تھا۔ اور وہ اس حیرت انگیز اتفاق پر حیران بھی تھے کہ بہ عین میں بھی اسی راہ پہ دانستہ و نادانستہ چل پڑا تھا۔

اگلے دن ہی میجر صاحب کا فون آ گیا اور انہوں نے مجھے دفتر بلا لیا۔ انہیں ریکارڈ روم سے بابا (میرے باپ) ...کی وہ پرانی فائل مل گئی تھی، جس میں ان کے بارے میں ساری ... تفاصیل درج تھی۔

میں ایک جوش کی سی کیفیت میں وہاں پہنچا۔ فائل اور یجبل حالت میں تھی اور خاصی پرانی بھی۔ میں وہیں ایک کمرے میں فائل کا بہ غور مطالعہ کرنے لگا اور جیسے جیسے پڑھتا جا رہا تھا، میرے رگ و پے میں ایک جوش کی سی کیفیات سرایت کرتی جا رہی تھی۔

فائل میں میرے بابا کی تصویر بھی چسپاں تھی، یہ ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ گمشدگی سے پہلے اور بعد کی بھی مفصل تحقیقاتی رپورٹ موجود تھی۔ جس کے مطابق تاج دین شاہ ایک محبِ وطن اور بہادر سپاہی تھا اور اپنے فرض سے کبھی غفلت نہیں برتتا تھا۔

اس کی ایک سرحدی کیمپ میں ڈیوٹی ہوتی تھی، وہاں وہ بارڈر سیکیورٹی فورسز کی تھرڈ رجمنٹ کمپنی کی سرچنگ ونگ

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کا انچارج وا ئج مین تھا۔

تحقیقاتی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ ایک بھارتی جاسوس، جو جانے کس طرح سرحد پار کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوگیا تھا بلکہ اپنا کوئی خفیہ مشن نمٹانے کے بعد اب وہ واپس بھارت کا قصد کیے ہوئے تھا۔

ایسے ملک دشمن جاسوسوں کو، جو سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے اور واپس لوٹنے کی کوشش کرتے تھے انہیں، اپنی اصطلاح میں ''ریڈ پرسن'' کہا جاتا تھا، اور یہ سب سے زیادہ خطرناک جاسوس سمجھے جاتے تھے کیونکہ یہ وطنِ عزیز میں اپنا ملک دشمن خفیہ منصوبہ نمٹا کر واپس جا رہے ہوتے تھے اور ان کے پاس اہم ملکی راز ہوتے تھے۔ ایسے ریڈ پرسن جاسوس کو چھاپنا زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ ایسے خطرناک جاسوس کو اپنی جان پر بھی کھیل کر دھرنا پڑتا تھا یا ہلاک کرنا لازمی ہوتا تھا۔

تاج دین شاہ نے ایک سرد اور اندھیری رات میں ایک ایسے ہی ریڈ پرسن جاسوس کو فرار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایسے جاسوسوں کی خطرناکی سے واقف تھا۔ اپنا ایک مختصر پیغام ... چھوڑ کر وہ اس جاسوس کو دھرنے یا جہنم واصل کرنے کے لیے اس کے تعاقب میں لپکا۔ یہاں تک کہ دشمن کی سرحد پار کر گیا۔

اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ تاہم اس کے چھوڑے ہوئے پیغام کے مطابق اعلیٰ حکام کو اندازہ تو ہو چکا تھا کہ وہ کسی ریڈ پرسن جاسوس کی تلاش میں ہی گیا ہے۔ جب کئی دنوں تک اس کی واپسی نہ ہوئی اور نہ ہی اس کی کوئی خیریت کی اطلاع آئی تو پتا چلایا گیا کہ آخر دشمن ملک کا وہ جاسوس یہاں کس مشن کے تحت آیا تھا اور آیا وہ کوئی اہم ملکی راز بھی چوری کر گیا تھا یا نہیں؟

اس سلسلے میں بڑی ہنگامی بنیادوں پر تحقیق اور کھوجنا کی گئی تو پتا چلا وہ بھارتی جاسوس اپنے ایک دیرینہ ''چانکیہ پلان'' کے تحت یہاں آیا تھا اور ایک اہم ملکی دفاعی راز چوری کرنے میں کامیاب ہوکر بھاگا تھا۔ تاج دین اسی کے تعاقب میں گیا تھا۔

وہ راز اس قدر اہم تھا کہ اگر وہ بھارت کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ خدانخواستہ اپنے مذموم جنگی ارادوں میں کامیاب ہوجاتا۔

اس تحقیق کے بعد ایک کھلبلی اور تشویش آمیز بے چینی سی پھیل گئی۔ دشمن کی طرف سے ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا۔ [illegible] کئی دن بیت چکے تھے، جس کا ایک ہی واضح مطلب تھا کہ سپاہی تاج دین نے اس ریڈ پرسن بھارتی جاسوس کو اس کے ہی ملک میں دھر لیا تھا اور وہ اہم راز اس نے ضائع کر دیا تھا، پھر خود بھی شہید ہوگیا تھا۔

تاج دین کی غیر موجودگی میں اسے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اس کی بیوی یا بیوہ کو تلاش کیا گیا۔ مگر وہ تو بے چاری خود اپنے لاپتا بچے (لئیق شاہ) کی تلاش میں نجانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ بہت تلاش کیا گیا اسے مگر وہ نہ ملی۔

یہ رپورٹ پڑھنے کے بعد بے اختیار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میرے ماضی کا شیرازہ کس دھوم سے بکھرا تھا کہ اس کی دادرسی بھی نہ ہو سکی تھی۔ میرے ماں باپ کا محبت اور جاں فشانی سے بنایا ہوا وہ آشیانہ جو یقیناً انہوں نے اپنے خون سے سینچا ہوگا، کس طرح تنکا تنکا ہوگیا تھا، اس عورت کے دکھوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، جس کا شوہر اپنا فرض نبھانے نامعلوم منزل کی طرف نکل گیا اور اس کا ایک بیٹا گاؤں کے میلے میں بچھڑا تو دوسرے کو وہ حرماں نصیب اپنی کوکھ میں لیے ڈھوتی رہی اور جب وہ دنیا میں آیا تو حالات اور اس ظالم زمانے نے اسے مکروفریب سے اس قدر خوف زدہ کر دیا کہ وہ ایک مرد کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئی، اور اسی ''تحفظ'' دینے والے مرد نے اس کے ساتھ بھی دھوکا کیا، اور اس کا دوسرا بچہ بھی چھین لیا گیا۔

اب اسی الم نصیب ماں کو اپنے ایک جوان بیٹے کی ہلاکت کا صدمہ جھیلنا پڑا تو دوسرا میری صورت میں اسے پہلے ہی نامساعد حالات کی گود میں پڑا ہوا ملا۔ آہ! زندگی آخر اتنے امتحان کیوں لیتی ہے؟ اور یہ سارے امتحان کمزور اور نادار انسانوں کے حصے میں ہی کیوں آتے ہیں؟ کیا وہ زیادہ اللہ کو محبوب ہوتے ہیں جنہیں وہ آزماتا ہے؟

میں کافی دیر تک اسی طرح آزردہ اور بدحواسی کی حالت میں وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے بعد ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا واپس اپنے کوارٹر میں آگیا۔

میرے لیے اب وزیر جان کو چھاپنا ضروری ہوگیا تھا۔ کیونکہ بہ قول اس کے، وہی اس حقیقت کو جانتا تھا کہ میرا باپ اب کہاں اور کس حال میں تھا؟ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹیکسی کے ساتھ اس کے روابط پر ہی اس نے یہ جان کاری لی تھی۔ اور پاور والوں کی رپورٹ کے مطابق اسپیکٹرم ایک ''بگ ڈیل'' کے تحت بلیو ٹیکسی کے بعض خفیہ مفادات کے لیے کام کر رہی تھی۔ یہ اور بہت سی باتوں کا ''امین'' اسپیکٹرم کا یہ اسٹیشن چیف وزیر جان ہی بتا سکتا تھا۔ جبکہ وزیر جان

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے ڈبھیڑ ہونے کی صورت میں، مجھے چوہدری ممتاز خان کے بارے میں بھی اسے بتانا تھا کہ اس نے اپنی تنظیم (اسپیکٹرم) کے مفادات پر اپنے مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے مجھے اس کی قید سے رہائی دلوائی تھی۔ اور ظاہر ہے ایسے میں آنجہانی ثریا کے اسپیکٹرم میں چھپے باغی گروپ کے اس ہمدرد کے بارے میں نہیں بتا سکتا تھا، جو بے چارہ میرے ڈمی ہمدرد، یعنی ممتاز خان کے آدمیوں کے ہاتھوں نادانستگی میں ہی مارا گیا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اسپیکٹرم میں، یہ ممتاز خان کا ایک ناقابلِ معافی جرم مانا جاتا۔ بشرطیکہ وزیر جان اس پر کوئی ایکشن لیتا۔

اسپیکٹرم کی مقامی قیادت میں آرک کے واصلِ جہنم ہونے کے بعد اب ''ہینڈلر ایجنٹ'' کا عہدہ خالی ہو گیا تھا۔

میں ان ساری باتوں پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے کال موصول ہوئی۔ یہ عارفہ کی کال تھی۔ میری بھویں سکڑ گئیں۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے عارفہ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

''شش... شہزی! پلیز، تم اس وقت آ سکتے ہو۔''

''آ جاتا ہوں، ویسے خیریت تو ہے؟ آپ کچھ پریشان اور گھبرائی ہوئی سی ہیں؟'' میں نے پوچھا، میری پیشانی پر سلوٹ ابھری۔

''خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ... وہ بابا جی پتا نہیں کدھر چلے گئے ہیں؟ آج صبح سے غائب ہیں، ان کا سیل فون بھی بند جا رہا ہے۔'' اس نے بتایا اور میں پریشان سا ہو گیا۔

''صبح کہاں کے لیے نکلے تھے وہ؟'' میں نے پوچھا۔

''دفتر ہی گئے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی، مگر انہوں نے مجھے ابھی کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا، اور خود اپنی کار میں نکل گئے۔'' وہ بتانے لگی۔

''کافی دیر گزر گئی تو دفتر سے ان کے پی اے جمال کا فون آیا کہ سیٹھ صاحب نے آج دفتر آنے کا کہا تھا اور ایک میٹنگ بھی انہوں کرنا تھی۔ جب میں نے کہا کہ وہ تو کافی دیر ہوئی دفتر کے لیے نکل چکے ہیں تو جمال کے ساتھ مجھے بھی پریشانی ہوئی، میں نے ان کے سیل پر بھی فون کیا مگر وہ بند ملا۔ میں سخت پریشان ہوں شہزی! پلیز تم کچھ کرو۔ دانی اور پنکی بھی رو رہے ہیں، اپنے دادو سے اتنے قریب جو ہیں۔'' وہ روہانسی ہونے لگی۔ مجھے اس کی گلوگیر آواز، مگرمچھ کے آنسو بہاتی محسوس ہونے لگی۔

''آپ اللہ سے خیریت کی دعا کریں، ایک کام کریں، مجھے سسر بابا کے پی اے انکل جمال کا نمبر دے دیں۔ میں ذرا ان سے بھی بات کر لوں۔''

اس نے نمبر دے دیا اور میں نے رابطہ منقطع کر کے فوراً انکل جمال کے سیل پر ان سے رابطہ کیا۔

میں نے ان سے صرف اتنا کہا کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، تو انہوں نے مجھے دفتر بلا لیا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر میں دفتر میں تھا۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا روبار تھا، اور یہ دفتر ملتان کینٹ کمرشل ایریا میں واقع تھا، میں تھانہ روڈ بازار سے سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گیا تھا۔ انکل جمال نے مجھے اس کا تفصیلی پتا بتایا تھا۔

انکل جمال خاصے پریشان اور گھبرائے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ مجھے لے کر سیدھا اپنے آفس روم میں پہنچے تھے۔ پریشانی اور تشویش کیا ہوتی ہے، وہ ان کی آنکھوں اور چہرے سے صاف عیاں تھی۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا، وہ اچانک کہاں چلے گئے، کیا تم سے کوئی بات ہوئی تھی سیٹھ صاحب کی؟ کیونکہ تم ان کے زیادہ قریب تھے۔''

''نہیں، میں خود یہ خبر سن کر پریشان ہوں۔'' میں نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا اور ان کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''آپ کی ان سے کوئی بات ہوئی؟''

''بس، رات ہی مجھ سے بات ہوئی تھی ان کی، اور وہ پتا نہیں کس نوعیت کی میٹنگ بھی کرنا چاہتے تھے آج صبح، ہم ان کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ بالآخر مجھے ہی فون کرنا پڑا تھا میڈم عارفہ کو۔''

''انہوں نے فون پہ کیا جواب دیا تھا آپ کو؟''

''یہی کہ وہ بھی یہی سمجھی ہوئی تھیں کہ سیٹھ صاحب دفتر میں ہی ہیں۔''

''ہم!'' میں نے ایک پُرغور ہنکاری بھری اور بولا۔

''آپ نے پولیس کو اطلاع دی؟''

''میری تو خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، اچھا ہوا تم آ گئے، کیونکہ میں نے میڈم سے اس سلسلے میں بات کی تھی کہ وہ پولیس کو فوراً مطلع کر دیں، مجھے حیرت ہے کہ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

انہوں نے مجھے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ پولیس بلاوجہ سب کو پریشان کرے گی، تھوڑا اور انتظار کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے سیل فون کی بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہو، اور وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔" انکل جمال کی اس بات نے میرے اندر کی کھٹک کو فزوں تر کر دیا۔

"میرا تو خیال ہے ہمیں پولیس میں اطلاع کر دینی چاہیے۔ اللہ خیر ہی کرے۔ اتنے گھنٹے تو بیت چکے ہیں۔" مجھے سوچتا پا کر وہ بولے۔

"فوراً سے پیشتر اور اسی وقت پولیس کو مطلع کریں انکل جمال!"

"میں یہی کرنے لگا ہوں، مگر میڈم صاحبہ سے بھی ڈر رہا تھا۔ اب آپ نے بھی کہہ دیا ہے تو۔۔۔" وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ٹیبل پر پڑے فون کو اپنی جانب کھسکانے لگے۔ ذرا دیر بعد متعلقہ تھانے فون کر کے تھانہ انچارج کی موجودگی کا پتا کیا اور اپنے آنے کا بھی کہہ کر فون بند کر دیا۔

"آپ چل رہے ہیں میرے ساتھ شہزاد صاحب؟" وہ کھڑے ہو کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے تو میں نے کہا۔

"آپ ہی چلے جائیں اور پولیس کو ضابطے کی کارروائی میں پورا تعاون دینے کی کوشش کریں۔ آپ سے صرف ایک بات پوچھنی تھی مجھے۔"

"جی جی، پوچھیں؟" وہ جلدی سے بولے تو میں بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"آپ سیٹھ نوید سانچے والا کو تو جانتے ہی ہوں گے؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں اس نو دولتیے اور موقع پرست شخص کو۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولے۔ پھر میں سیٹھ نوید کی رہائش گاہ اور دفتر سمیت سارا آتا پتا معلوم کر کے انکل جمال سے رخصت ہو گیا۔ آخر میں وہ بھی کچھ الجھ سے گئے تھے، پھر اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ استفسار کرتے، میں نکل آیا تھا۔

انکل جمال سے میں نے سیٹھ نوید کا سیل اور لینڈ لائن نمبر بھی لے لیا تھا۔ ابھی انہیں تھانے جانے کی جلدی تھی اسی لیے میں نے ان سے سیٹھ نوید سانچے والا کے بارے میں تفصیلی معلومات لینے کے لیے کوئی اور وقت اٹھا رکھا تھا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، سہ پہر کے تین بج رہے تھے، یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ سیٹھ نوید اس وقت اپنے دفتر میں ہی ہوگا، روانہ ہو گیا۔

جلیل آباد ہاؤسنگ ایریا کے قریب ہی کہیں اس کا۔۔ خاصا بڑا بنگلا نما مکان تھا اور اس سے صرف ایک ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ریلوے روڈ کے پاس ہی اس کا دفتر تھا۔

دفتر کی عمارت اگرچہ خالصتاً کاروباری نظر نہیں آتی تھی، لیکن دو ہزار گز پر واقع یہ دو منزلہ عمارت بھی بادیٔ النظر میں ایک وسیع و عریض کوٹھی کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ جس کی پیشانی پر براس شیلڈ میں "کوگو انٹرپرائزز" کا نام کندہ تھا۔

میں نے اپنی گاڑی اس کے دفتر کے باہر روک دی۔ احاطے میں اور بھی کئی چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں، میری عقابی نگاہوں نے وہاں، نسبتاً ایک الگ تھلگ کونے میں کھڑی سیٹھ نوید سانچے والا کی سفید کرولا کار دیکھ لی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اندر موجود تھا۔

گیٹ پر دو گن مین موجود تھے۔ ان کے جسموں پر سکیورٹی گارڈز کی نیلی وردیاں تھیں۔ ایک نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے صرف اپنا نام بتایا اور یہی کہا کہ میں سیٹھ نوید سے ملنا چاہتا ہوں۔

"صاحب سے آپ کی اپائنٹمنٹ ہے؟" دوسرے نے میری طرف دیکھ کر سپاٹ لہجے میں پوچھا تو مجھے اس کے سوال پر حیرت ہوئی، کیونکہ مجھے امید نہ تھی کہ اتنی جلدی اور باہر گیٹ پر ہی مجھ پر ایسا سوال داغا جائے گا۔

بہرحال میں نے جواب دیا۔ "نہیں، میری ایسی کوئی اپائنٹمنٹ تو نہیں تھی لیکن وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ان سے جا کر فقط اتنا کہہ دیں کہ مجھے سیٹھ منظور وڑائچ نے بھیجا ہے۔"

"سیٹھ منظور وڑائچ۔" پہلا والا گن مین اس نام پر یوں چونکا تھا، جیسے وہ اس نام سے اچھی طرح واقف ہو۔ بھویں سکیڑ کر میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

"تم سیٹھ منظور کے کیا لگتے ہو؟"

"میں بیٹا ہوں اُن کا۔"

"ان کا تو ایک ہی بیٹا تھا، جو۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے، محمود نام تھا مرحوم کا۔ میں سیٹھ منظور کا منہ بولا بیٹا ہوں۔ اور اب مجھے اندر جانے دیا جائے۔" میں آخر میں دانستہ بھڑکنے والے انداز میں بولا۔ پھر میری کسی الیکٹرک فائینڈر ٹائپ آلے سے مختصراً چیکنگ کی گئی اور اندر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں ابھی گراؤنڈ فلور پر ہی تھا اور اپنے قدم میں نے دانستہ آہستہ کر رکھے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ یہاں صرف نئے آنے والوں کو ہی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ایسے روکا جاتا تھا جیسے مجھے روکا گیا تھا۔

گراؤنڈ فلور پر شاید گودام وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ دو تین آلیشان کیوبیکل بھی نظر آئے، جو شیشے کے بنے ہوئے تھے، ان کے اندر چند افراد بیٹھے دکھائی دیے، میں بہ ظاہر سرسری نگاہ ان پر ڈالتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا اور فرسٹ فلور پر ہی مجھے سینٹرل اے سی اسپلٹ پلانٹ کی ٹھنڈک محسوس ہوئی اور شیشے کے مختلف آفس کیبن نظر آئے، زینے کے اختتام کے بالکل سامنے مجھے استقبالیہ ٹائپ کا ایک بڑا سا کاؤنٹر دکھائی دیا۔ یہاں بھی دو مخصوص وردی پوش گن مین چاق چوبند انداز میں کھڑے تھے۔ وہ میری طرف سرد نظروں سے دیکھنے لگے۔ جبکہ سامنے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود دو جوان مردوں اور ایک الٹرا فیشن ایبل لڑکی بھی مجھ پر اپنی سوالیہ نظریں جما چکے تھے، جس کا صاف مطلب تھا کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان سے مخاطب ہوا جائے، ورنہ پیچھے سے آواز دے کر بلا لیا جائے گا۔

سو، میں بھی سیدھا انہی کی طرف بڑھا، کم و بیش یہاں بھی یہی کچھ ہوا جو میں نیچے داخلے کے وقت گیٹ پر بھگت چکا تھا۔ البتہ مجھے یہاں روک کر باس کے پی اے سے رابطہ کر کے پہلے اسے میرے بارے میں بتایا گیا۔ اس نے حکم صادر کیا کہ وہ ملاقاتی یعنی مجھے ادھر ہی روکے رکھیں، وہ باس سے کنفرم کر کے دوبارہ انٹرکام پر بتائے گا۔

لہٰذا، مجھے ایک طرف بچھے گہرے سبز رنگ کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا اور میں خاموشی سے وہیں براجمان ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ مجھے ان تینوں میں سے ایک نے اشارے سے بلایا۔ میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو اس نے کہا کہ باس آپ کو نہیں پہچان رہے ہیں، مگر آپ نے جن صاحب کا ریفرنس دیا ہے، انہیں فون کر کے پہلے مطلع کریں، اور وہ باس کو آپ سے ملاقات کے لیے فون کریں گے۔ تب...''

''وہ صاحب آج صبح سے لاپتا ہیں۔ اور میں اسی سلسلے میں سیٹھ نوید سانچے والا سے ملنے آیا ہوں۔ بتاؤ اپنے باس کو یہ بات۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر ایک ایک لفظ چبا کر اور اتنی بلند آواز میں کہا کہ وہاں دائیں بائیں کام کرنے والے سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے، جبکہ وہ دونوں گارڈز بھی تیزی سے میری طرف بڑھے تھے، مگر انہیں مجھے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ میرے چہرے اور لہجے سے ایسا اعتماد جھلکنے لگا تھا جیسے میں ان کا کوئی بڑا افسر ہوں، اپنی پرسنالٹی کو بارعب بنانے کے لیے میں اپنے لباس پر بھی خصوصی توجہ دیا کرتا تھا۔ جبکہ میرے بال بھی سولجر کٹ تھے۔

مجھے دراصل اس سازشی سانچے والے نو دولتیے سیٹھ پر ایک دم ہی غصہ آ گیا تھا، جو مجھے سرمد بابا کے حوالے سے جان لینے کے باوصف، کم ظرف دولتیوں والے نخرے کر رہا تھا اور ملنے سے بھی انکاری تھا۔ اس میں مجھے اپنی ہتک محسوس ہوئی تھی، جس سے میں کھول کر رہ گیا تھا۔

''سر! آپ یہاں آجائیں۔ پلیز۔''

ایک گارڈ نے مجھ سے طوعاً و کرہاً شائستہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، اس کے چہرے پر بھی جارحانہ تناؤ دیکھ کر میں نے اپنی جیب سے رینجرز فورس کا مخصوص نشان والا کارڈ اسے دکھا دیا۔ وہ اسے ایک نگاہ دیکھتے ہی گویا اپنی جگہ منجمد ہو گیا، میں دوبارہ کاؤنٹر بوائے کی طرف متوجہ ہوا اور بارعب لہجے میں بولا۔

''سیٹھ نوید سانچے والا کو بولو' مجھ سے ملو گے یا میں دوبارہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ آؤں اور اس ادارے کو بھی سیل کر جاؤں؟''

اَب تو تینوں کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ مجھے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ٹائپ کی کوئی شے سمجھنے لگے اور اسی نے دوبارہ سانچے والا کے پی اے سے انٹرکام پر رابطہ کیا۔ اب اس کے چہرے سے بھی بوکھلاہٹ نمایاں تھی، جبکہ وہ دونوں گارڈز مجھ سے کئی قدم پرے ہو کر کھڑے ہو گئے تھے کہ مبادا، میں ان کی کسی اخلاقی حرکت کو بھی غلط حرکت پر محمول کر کے، ان کے لیے مشکل نہ کھڑی کر دوں۔

مجھے فوراً گویا شرفِ باریابی بخش دیا گیا۔ اور کاؤنٹر کا ہی ایک آدمی نہایت ''احترام'' سے میرے ساتھ ہو لیا۔

میں عموماً اپنی اس طرح کی شناخت ہر ایری غیری جگہ پہ شو آف کرنا پسند نہیں کرتا تھا، جب تک کہ اس کی کہیں اَشد ضرورت نہ پڑ جاتی۔

اوپر فلور کافی نیچی چھت والے تھے، اسی لیے اوپر نیچے جانے والے زینوں کے ''قدمچے'' مختصر اور چھوٹے تھے، مطلب انہیں طے کرنے میں زیادہ وقت یا تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

دوسرے فلور پر ہی ایک بھاری بھرکم اور درمیانے قد و قامت کے سوٹڈ بوٹڈ شخص نے میرا بڑا پُرتپاک استقبال کیا۔ ساتھ ہی وہ مجھے غور غور سے تکے بھی جا رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا ایک شاہانہ آفس روم کا دروازہ کھول کر اندر ہی

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لے گیا۔

سامنے ہی ایک بڑی سی ٹیک کی ٹیبل پر، بھاری بھرکم اور اونچی پشت گاہ والی چیئر سنبھالے سیٹھ نوید سانچے والا براجمان تھا۔ اس کی سکڑی ہوئی بھویں اور تنگ پڑتی پیشانی بتا رہی تھی کہ وہ میری طرف سے شدید الجھن آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا تھا اور میرے ہی بارے میں سوچے جا رہا تھا کہ آخر میں تھا کیا؟

"بہت افسوس ہوا مجھے آپ سے مل کر سیٹھ نوید سانچے والا صاحب!"

میں نے اس کی طرف ناگوار نظروں سے گھورتے ہوئے، قدرے تلخ لہجے میں کہا تو وہ بھی ایک کائیاں تھا، میرے کڑوے اندازِ تخاطب کی وجہ جان کر اپنے چہرے پہ جبراً مسکراہٹ کا توبڑا سجاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

اتنی "ڈوز" اس کے لیے کافی تھی، لہٰذا میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے فوراً اس آدمی کو، شاید اس کا پی اے تھا، باہر جانے کا کہہ دیا۔ پھر اپنے لہجے میں خجالت سمونے کی کوشش کرتا ہوا مجھ سے بولا۔

"بیٹھو بیٹھو شہزاد صاحب! دراصل میں صرف بائی نیم ہی آپ کو جانتا تھا، کبھی آپ کے نام..."

"سفید جھوٹ۔" میں اس کے سامنے والی کرسی سنبھالتے ہوئے اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ پر سخت خار کھائے ہوئے تھا۔ مگر میری "شناخت" اس کی رعونت اور غرور کے آڑے آ رہی تھی۔

"حالانکہ آپ... شاید سیٹھ منظور وڑائچ کے منہ سے تو نہیں، البتہ، میڈم جی کے لبوں سے تو میرا ذکر سن ہی چکے تھے، اس کے باوجود آپ مجھے نہیں پہچان سکے؟ اینی وے چھوڑیں اس بات کو۔ تشریف رکھیں آپ بھی۔"

میں نے دانستہ اسی کے لہجے میں، جس سے وہ عارفہ کو "میڈم جی" کہہ کر پکارتا تھا، ایسا کہا تھا اور یقیناً اسے اندر سے ایک زبردست شاک پہنچا تھا کہ میں اس کی "خلوت" کی اس بھونڈی ادا سے کس طرح واقف ہوا تھا؟

اس کا چہرہ میں نے ایک لمحے کے لیے دھواں دھواں پڑتے دیکھا تھا۔ تاہم وہ میری طرف تکتے ہوئے... اپنی کرسی پر دوبارہ براجمان ہو گیا تھا۔

"خیریت ہے، کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ سیٹھ منظور وڑائچ کو آج صبح چند نامعلوم افراد نے اغوا کر لیا ہے؟"

میں نے اس پر ایک اندھیرے میں نفسیاتی تیر چلایا... جس کا لامحالہ نتیجہ خاطر خواہ ہی برآمد ہوا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"تت... تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہیں چند نامعلوم افراد نے اغوا کیا ہے؟"

اصولاً اسے یہ کہنا چاہیے تھا کہ "مجھے نہیں معلوم" مگر میرے نفسیاتی حربے نے اسے بے اختیار مجھ سے وضاحتی سوال کرنے پر مجبور کر دیا تھا، جو اسے میری نظروں میں مشکوک بنا گیا تھا۔ مجھے جس بات کا شبہ تھا وہ سچ ثابت ہوا تھا کہ سرمد بابا کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اغوا ہی کیا گیا تھا، اور وہ بھی رازداری سے۔

نوید سانچے والا کو پھر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس کی حالت دیدنی ہونے لگی، سنبھلنے کی کوشش میں دوبارہ بولا۔

"مم میرا مطلب تھا کہ کیا واقعی وہ اغوا ہوئے ہیں؟"

"قرائن سے تو یہی نظر آتا ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ اب اس کا اعتماد بحال تو ہونے لگا تھا لیکن اس کا چہرہ مخمصے کا اب بھی شکار نظر آ رہا تھا۔ اس کے بعد میز کی دراز سے اپنا لمبا چوڑا اسمارٹ فون نکال کر بولا۔

"میں ابھی عارفہ سے ذرا خیر خبر لے لوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے انہیں معلوم ہے اور انہوں نے ہی تو مجھے سیٹھ صاحب کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں پھر بھی انہیں کم از کم فون کر کے پوچھ تو لوں کہ..."

"سیٹھ سانچے والا فون رکھ دو۔ تمہارے اور میڈم جی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔"

میں نے یک دم گمبھیر آواز میں کہا اور اس کے ہاتھ سے اسمارٹ فون چھوٹ کر اس کی گود میں گر گیا۔

وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر در آنے والے ایک فرد کو دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر:19

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی، اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسائے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

Downloaded From

Downloaded From paksociety.com

وہ عارفہ تھی۔ خوب سج دھج کر آئی تھی وہ۔ میک اَپ کی چمک دمک، میچنگ جیولری، بیش قیمت ساڑی، بالوں کو نفاست سے گھونسلا ٹائپ کا جوڑا بنا کر اُسے سلیقے سے ایک سیاہ مہین جالی میں لپیٹ رکھا تھا۔ ڈھلتی عمر کی ''یلغاری'' نشانیوں کو اِن لوازمات سے کسی قدر شکست دینے کی اپنی سی سعی ضرور کر رکھی تھی اُس نے۔

اسے اچانک سیٹھ نوید احمد سانچے والا کے شاہانہ آفس روم میں داخل ہوتے اور مع اس کی ''تیاریوں'' کے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ سارا ''سامان'' اس نو دولتیے سیٹھ کو لبھانے کے لیے ہی کیا گیا تھا، نیز یہ کسی رمزیہ جشنِ کامیابی کو منانے کا اشارہ بھی تو ہوسکتا تھا؟

مگر بُرا ہو اس گھڑی کا جو ان دونوں کے لیے منحوس ثابت ہوئی تھی کہ تقدیر کے لکھے نے ان دونوں شیطانوں کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا میری وہاں موجودگی، عارفہ کے سان گمان سے بھی بالاتر تھی...... مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چمکتے گورے چہرے کا رنگ یوں ایک دم بجھ کر رہ گیا جیسے کسی اسٹوڈیو کی تیز فلش لائٹ ایک دم تاریک پڑ جائے۔

''تت... تت... تم...'' اس کے ساکت لبوں سے پھنسے پھنسے الفاظ برآمد ہوئے تھے۔ پھر وہ میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سیٹھ نوید کو پھیلی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ جیسے میں وہاں اُسی کی دعوت پر آیا تھا، جبکہ خود سیٹھ کی حالت اس وقت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور رومال سے بار بار اپنی عرق آلودہ پیشانی کو پونچھنے لگا۔

میں بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہک دک سی کھڑی عارفہ کے سراپا... پر ایک استہزائیہ سی نظر ڈالتے ہوئے میں بولا۔

''ہاں میں، شہزاد احمد خان شہزی۔ آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہوگا محترمہ!''

وہ بت بنی کھڑی تھی۔ اُس کے منہ کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ اپنی منکوبہ نظر کی یہ ہیئت کذائی سیٹھ نوید کو ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے پہلی بار اس نازک سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش چاہی۔ لیکن جب وہ ساکت کھڑی عارفہ سے مخاطب ہوا تو لہجہ اس کا بھی بوکھلایا ہوا تھا، اور اس بوکھلاہٹ میں، وہ مجھ سے اپنے خلوت کی ''آپ سے تو کا عنواں ہوگئے'' بھی نہ چھپا رہ سکا۔

''تت... تم بیٹھو پلیز۔''

عارفہ نے ایک گہری سانس لی۔ گویا اس نے بھانپ لیا تھا کہ اب خود کو سنبھالنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ آگے بڑھی اور سیٹھ نوید کے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ میرے ساتھ والی کرسی بھی خالی تھی۔ میں سیٹھ نوید کے سامنے والی کرسی پر تھا۔ سیٹھ نوید نے انٹرکام پر کسی کو پانی لانے کو کہا تھا۔

میری ایکسرے جیسی نظریں ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں محو تھیں جہاں مجھے ایک مجرمانہ سی بدحواسی کا شائبہ صاف محسوس ہوا تھا۔ وجہ اس کی صاف تھی کہ میں بلاکم و کاست اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ سرمد بابا کو غائب یا اغوا کروانے میں ان دونوں کا ہاتھ تھا، اور یہ میرے پُراعتماد لہجے اور اچانک یہاں آمد نے سیٹھ نوید پر اچھی طرح باور کرا دیا تھا۔ اس پر طُرہ یہ کہ عین اسی وقت اس کی توقع کے برخلاف عارفہ بھی کچھ ایسے انداز میں یہاں آن وارد ہوئی تھی کہ یقین کی حد تک کیے گئے شبہے میں کوئی گنجائش باقی... نہ رہی تھی؟

جس بیوہ خاتون کا باپ جیسا سسر غائب کر دیا گیا تھا، وہ بجائے تشویش زدہ ہونے کے یوں سج دھج کر یہاں آ پہنچی تھی۔ یہی نہیں، یہ بنی سنوری عارفہ، اُس عارفہ سے یکسر مختلف تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے فون کر کے سرمد بابا کی گمشدگی کے بارے میں روتے بلکتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت اس کی جیسے غم کے بارے جان نکلی جا رہی تھی اور اب میں اسے یہاں، ایک بالکل الگ روپ میں دیکھ رہا تھا، جو ایک خوش باش حسینہ جیسی نظر آ رہی تھی، جیسے اس کے لیے کوئی غم کوئی سانحہ ہوا ہی نہ ہو۔ اس بات نے بھی مجھے شک میں مبتلا کیا تھا، اور ساتھ ہی مجھے اس حرافہ کے اداکارانہ جوہر کا بھی معترف ہونا پڑا تھا۔

''میں ابھی ذرا دیر پہلے آپ ہی کو فون کرنے والا تھا، اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تشریف لے آئیں میڈم!''

سیٹھ نوید نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کا لہجہ محتاط ہوگیا تھا اور عارفہ سے تنہائیوں کی بے تکلفانہ گفتگو کو فوراً ہی اَدب و آداب کا روپ دینے کی کوشش کرنے لگا۔

میں عارفہ کو مسلسل گھورتے ہوئے دانستہ زہریلے طنز سے بولا۔ ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ یہاں، سیٹھ صاحب کو سرمد بابا کی گمشدگی کی خبر دینے آئی ہیں یا کسی تقریب میں جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟''

میرے طنز پر اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ یقینی طور پر اس

Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کا حلق خشک ہو رہا تھا اور وہ اُسے تر کرنے کی سعی میں اپنے ہونٹ آہستگی سے بھینچتے ہوئے بولی تو اس کی آواز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔

"ن... نہیں... آں... ہاں، میں تمہیں مطلع کرنے کے بعد سیٹھ صاحب سے مدد لینے آئی تھی۔"

"مدد لینے یا کسی خفیہ منصوبے کی کامیابی کا جشن منانے؟" میرا لہجہ ہنوز زہر میں بجھے تیر کی طرح تند ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہی ہے محترمہ کہ آپ کو سرمد بابا کی گمشدگی کی اطلاع کے لیے یہاں آنے کے بجائے فوراً متعلقہ تھانے ...کا رُخ کرنا چاہیے تھا۔"

"ہم... میں نے جمال سے کہہ دیا تھا کہ فوراً تھانے میں رپورٹ درج کروادے۔"

"اچھا!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر آپ نے تو اُسے سرے سے ہی اس بات سے منع کردیا تھا کہ وہ اس اہم واقعے کی رپورٹ پولیس کو نہ دے، کیونکہ بہ قول آپ کے، پولیس بلاوجہ سب کو پریشان کرے گی، تھوڑا اور انتظار کرلیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے سیل فون کی بیٹری... ڈاؤن ہوگئی ہو، اور وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔" میں نے من وعن اس کے وہی الفاظ دہرا دیے جو اس نے جمال کو کہے تھے۔

"جبکہ مجھے فون کرتے وقت تو آپ کی فکر و تشویش سے حالت ہی غیر ہو رہی تھی اور آپ کو خدشہ تھا کہ باباجی کو اغوا نہ کرلیا گیا ہو؟ آپ کے اس دوغلے پن نے مجھے ایک تلخ سے شبہے میں مبتلا کردیا ہے میڈم عارفہ جی!" میں نے آخر میں دانستہ نوید... کا خلوت والا انداز اپنایا تھا۔

اُسے نہیں پتا تھا کہ میں انکل جمال سے پہلے ہی بات کرچکا ہوں۔ یہی سبب تھا کہ میری بات پر اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ وہ اس میدان کی کچی کھلاڑی تھی اور بہت سی ایسی توجہ طلب باتوں اور باریکیوں پر توجہ نہ دے پائی تھی۔ مگر کائیاں بھی تھی، جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔

"ن... نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں اس وقت بہت پریشان تھی اور بدحواس بھی اسی لیے جمال سے میں نے ایسا کہا تھا، مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ مجھے کرنا کیا چاہیے؟"

وہ بھونڈے انداز میں بات بنا تو گئی تھی لیکن میرا شبہ یقین میں بدل چکا تھا کہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہے۔ میں کوئی پولیس والا نہیں تھا، نہ ہی سول انتظامیہ میں کسی بڑی قانونی پوسٹ پر فائز تھا۔ ہاں ایک سیکریٹ "پاور ایجنٹ" ضرور تھا۔ جو بہ ظاہر کھلے بندوں کسی بھی جگہ مداخلت نہیں کرتا، مگر پاور سیکریٹ سروس کا جو کاز اور ایم تھا، یعنی اپنے تئیں جو "تیسری آنکھ" دیکھ رہی ہے، اُسے پرکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر ایک لائحہ عمل تیار کرکے خفیہ کارروائی کرنا، اس پر میں ضرور عمل پیرا ہوسکتا تھا اور اب میں ان دونوں کے متعلق کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا مگر مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی کہ میں نے اپنا خصوصی اختیارات والا کارڈ شو کردیا تھا۔

"تم رینجرز میں کس پوسٹ پر کام کرتے ہو؟"

اچانک سیٹھ نوید نے میری جانب دیکھ کر وہ سوال کرڈالا جس کا میرا تیزی سے سوچتا ہوا ذہن کوئی جواز تلاش کرنے میں محو تھا، لہٰذا مسکرا کر بولا۔

"بعض چھوٹے موٹے راستوں کی عمومی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے میرے پاس ایسے بے شمار جعلی کارڈ موجود رہتے ہیں، جن میں انکم ٹیکس آفیسرز سے لے کر خود کو کسی بڑے اخبار کا صحافی ظاہر کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو، ایسے کئی کارڈ ہر وقت میری جیب میں رہتے ہیں"۔

"تو یہ جعلی کام بھی تم کرتے ہو۔" سیٹھ نوید نے میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے کہا، صاف عیاں تھا وہ میری کسی کمزوری کو پکڑ کر اُسے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ نے اپنی آنکھوں سے میرے پاس ایسا کوئی کارڈ دیکھا ہے؟ نہیں ناں! یہ میں نے جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں استعمال کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں، جیسے تمہارا وہ سیکورٹی آفیسر۔ جسے صرف وردی پہننا اور گن اُٹھانا آتی ہے۔ کسی کارڈ کی باریکی یا اس کی تحریر پڑھنا نہیں۔ اب اس فضول بحث کو چھوڑو اور تم دونوں مجھے بتاؤ کہ سرمد بابا کو تم لوگوں نے اغوا کرکے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم مسٹر!" میری دوٹوک بات پر وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا اور اپنی کرسی سے بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ میرا رینجرز سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ایک دم اپنی اکڑ میں آگیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس کی پتلون ضرور گیلی ہونے کے قریب ہوگئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی عارفہ نے بھی گویا خربوزے کی طرح رنگ پکڑا

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اور بپھرے ہوئے لہجے میں مجھ سے بولی۔

''تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی، ہم پہ اتنا بڑا الزام عائد کرنے کی، ہاں؟'' پھر وہ اپنے ''منظورِ نواز'' کی طرف دیکھتے ہوئے میرے بارے میں بولی۔

''میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی بعد میں تفصیل سے۔ یہ واقعی دو نمبر کا آدمی ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کے بارے میں سب پتا ہے، یہ تو باباجی نے اسے اتنا سر پہ چڑھا رکھا تھا، ورنہ تو یہ مجھے شروع ہی سے سخت ناپسند تھا، پتا نہیں باباجی نے اس کرمنل کو کیوں گھر میں گھسا رکھا تھا۔'' عارفہ کو بھی میرے بارے میں زہر اُگلنے کا موقع مل گیا۔

''اچھا!'' میں نے ایک طویل ہنکارا بھرتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں میری طرف گھورنے لگے۔ میں پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عارفہ کی کرسی کے قریب آیا اور پھر اس کے میک اَپ زدہ چہرے پر قدرے جھک کر بولا۔

''میڈم عارفہ! آج تو آپ نے اپنی رہی سہی اوقات بھی دکھا کر اس پر مہر ثبت کر ڈالی ہے کہ آپ ایک انتہائی درجے کی کم ظرف، مفاد پرست اور محسن کش عورت ہو، آپ مجھے کیا جانیں گی؟ جانتا تو میں آپ کو ہوں اچھی طرح کہ پہلے کس طرح آپ نے اپنے نیک اور شریف سسر کا سارا کچھ اپنے شوہر کے نام کروایا اور پھر انہیں گھر سے بے دخل کروا کے لاوارثوں کی طرح ایک خیراتی ادارے میں پھنکوا دیا، پھر جب آپ کے زن مرید شوہر محمود کا ایک حادثے میں اچانک انتقال ہوا تو آپ کو اپنے سسر کی کمی کا احساس ہوا اور آپ اُس سادہ لوح دُکھی آدمی کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے آئیں، کیونکہ اُس وقت آپ خود بھی جگر کی ایک خطرناک بیماری کی لپیٹ میں آچکی تھیں، آپ کو سرمد بابا جیسے ایک ذمے دار آدمی ہی کی ضرورت پیش آئی۔ آپ جانتی تھیں کہ ریاکاری اور پُرفریب دنیا میں ایک وہی ایسے آدمی ہیں، جو سب کچھ بھلا کر اس نازک وقت میں بالکل صدقِ نیت سے آپ کی مدد کریں گے۔ اور ایسا انہوں نے کیا بھی، مگر اُن کے اس حسنِ سلوک کے باوصف آپ کے دل میں اُن کے لیے کالک کم نہ ہوئی، یہاں تک کہ آپ نے تو ایک معصوم اور دُکھیاری لڑکی کے ساتھ بھی احسان فروشی کرنے کی انتہا کر دی، جس نے آپ کی خاطر خود کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا، کیا لگتی تھی وہ آپ کی؟ مگر وہ انسانی ہمدردی کی خاطر اور سرمد بابا کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہی ایما پر آپ کی دادرسی اور تیمارداری کے لیے اپنے دل پہ پہاڑ جیسا پتھر رکھ کر آپ کے ساتھ سات سمندر پار چلی گئی۔ جانتی ہیں ناں آپ اچھی طرح کہ میرا اور عابدہ کا ایک دوسرے سے کیا رشتہ ہے؟ اتنا کہنا کافی سمجھیں آپ کہ محبت کرتا ہوں میں اُس سے۔ آپ نے اُس معصوم کے ساتھ کیا کیا! جب دیکھا اب وہ آپ کے کام کی نہیں رہی تو اُس بے قصور کو امریکی خفیہ اداروں کو اس کے خلاف شبہے میں ڈال کر اور اپنی گردن بچاتے... ہوئے اُس معصوم کو وہیں پھنسا کے آپ خود آرام سے پاکستان لوٹ آئیں، کیا سمجھ لیا تھا آپ نے عابدہ کو، ہاں؟ ایک ٹشو پیپر ہے وہ۔ لاوارث تھی وہ؟ جسے آپ نے جب چاہا استعمال کیا اور کہیں بھی پھینک دیا؟ کیا سمجھتی تھیں آپ خود کو کہ آپ اُس غریب سادہ لوح کو پھنسا کے اور اپنی گردن بچا کے آرام سے یہاں لوٹ آئیں گی اور بس۔ کہانی ...ختم؟ ہاہ۔ بڑی خوش فہمی تھی آپ کو۔ آپ یہ کیوں بھول گئیں کہ آپ کو میرے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اور یہ کہ جب تک عابدہ امریکا میں پھنسی رہے گی، میں آپ کی زندگی اجیرن کیے رکھوں گا۔ میڈم عارفہ جی! اتنی آسانی سے آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ بس یہ دعا کریں کہ عابدہ کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ ورنہ آپ جان جائیے کہ اگر خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو بہت بُرا ہو جائے گا۔''

یہ کہتے کہتے میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ جوشِ غیظ اور ایک کرب ناک دُکھ تلے میرے جسم کا رُواں رُواں مرتعش ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے چنگاریاں بھر آئی تھیں، اور عارفہ کے لیے میرا یہ روپ شاید نیا ہی تھا۔ تاہم اُس نے میرے جلتے سُلگتے لہجے سے اُمڈتی شوریدہ سری اور عزائم کا اچھی طرح اندازہ ضرور کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایکا ایکی ایک خوف سا مترشح ہونے لگا تھا۔

میں سیدھا ہو کے دوبارہ سیٹھ نوید کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''میں تم دونوں کی فیوچر پلاننگ سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں۔ اس لیے تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ معاملہ راز داری سے اور اِدھر ہی نمٹا دو تو اچھا رہے گا۔ ورنہ قانون میں بھی جانتا ہوں۔ سارے شواہد تم دونوں کے خلاف جاتے ہیں، اور یہی نہیں، بلکہ میں یہ بھی... جانتا ہوں کہ سرمد بابا کو کیوں اور کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ وہ کبھی بھی آڑیسہ کمپنی کے شیئرز تمہارے یا عارفہ کے حوالے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

....نہیں کریں گے۔ انہوں نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے اور میں وہ حق نبھانا جانتا ہوں، پیچھے میں بھی نہیں ہٹوں گا۔ کیونکہ تمہیں یاد ہوگا اچھی طرح سے کہ جب تم اُس روز وڑائچ صاحب سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے کے لیے جس طرح دباؤ ڈال رہے تھے اور ڈھکی چھپی دھمکیوں سے بھی کام لے رہے تھے، میں سمجھ گیا تھا کہ دال میں ضرور کالا ہوگا آگے چل کر۔ کیا کہتے ہو اب؟"

سیٹھ نوید اور عارفہ نے اپنے تئیں جس کھیل کو آسان سمجھا تھا، وہ اب ان کے گلے کی ہڈی ثابت ہونے لگا تھا، ایسے چھچھوندر کی طرح، جو نہ نگلنے کا، نہ اُگلنے کا تھا۔ ان دونوں کے لیے بھی بلاشبہ یہ نازک صورتِ حال تھی۔

عارفہ اب میرے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا کر اس کا چہرہ تکنے لگی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں سے بے بسی سی جھلکتی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ خود سیٹھ نوید کا چہرہ کسی اور ہی سانچے میں ڈھلا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔

اس نے ایک بٹن دبایا۔ ایک ہلکی سی بیپ کی آواز کمرے میں گونجی، میں کچھ سمجھ نہ سکا مگر جب دروازے کے اُوپر لگے ایک سُرخ بلب کو جلتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ باہر والوں کے لیے ایک کاشن تھا کہ اندر اہم میٹنگ شروع ہو چکی تھی، لہٰذا ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس کے بعد مجھ سے بولا۔

"شہزی! بیٹھو ذرا، میں تفصیل سے ساری بات بتانا چاہتا ہوں"۔

بلی شاید تھیلے سے برآمد ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنی کرسی سنبھال لی...... وہ کھنکھار کے بولنا شروع ہوا۔

"دیکھو شہزی! میں اُس روز وڑائچ صاحب سے ملاقات کے دوران ہی تمہاری اُن کی نظروں میں حیثیت جان چکا تھا، جب میں اُن سے رازداری اور تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے تمہاری موجودگی میں ہی بات شروع کرنے کا کہہ ڈالا تھا، اس لیے تم بھی جانتے ہو کہ یہ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا معاملہ کیا ہے اور کتنا نازک ہے۔"

وہ اتنا کہنے کے بعد ذرا رکا اور پھر گویا ہوا۔

"میں نے اُسی روز وڑائچ صاحب کو خبردار کر دیا تھا کہ جو اس کمپنی کے شیئرز ہولڈر ہیں وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، ان سے دشمنی مہنگی پڑے گی، مگر وہ نہ مانے۔ آپ کے سامنے کی تو بات ہے شہزاد صاحب!" وہ مکاری سی میری طرف دیکھ کر بولا۔

میں جانتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہی جواب دے گا، یوں بھی مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ وہ میرے سامنے سچ ہی اُگلتا۔ اگرچہ اس حد تک بات اس کی کچھ حقیقت بھی تھی، تاہم یہ ممکن تھا کہ "کام" آسان کرنے کے لیے انہوں نے اس کا ٹاسک اسے ہی دے رکھا ہو اور در پردہ سپورٹ انہی کی ہو۔ اسی لیے میں نے بھی کیچلی بدلی اور دوسرا وار کرنے تک محتاط پالیسی بدلتے ہوئے کہا۔

"ہاں! مجھے یہ بات معلوم ہے۔ مگر تم بھی تو ان کے ساتھی ہو سکتے ہو؟" میں نے اُسے بلف کرنا چاہا، مقصد اُسے یہی باور کرانا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آرہا ہوں۔

"ہاں! میں ان کا ساتھی ہوں لیکن کاروبار کی حد تک۔ اسی لیے اُن کو اچھی طرح جانتا بھی ہوں کہ وہ اپنے مفادات کے آگے انسانی جان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

اُس نے عیارانہ لہجے میں اعتراف کیا تو میں بولا۔

"تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وڑائچ صاحب کو انہی لوگوں نے ہی اغوا کیا ہوگا؟"

"اور بھلا کون ہو سکتے ہیں؟ مگر تم سمجھو تب ناں۔ تم تو اُلٹا ہم پر ہی شک کیے بیٹھے ہو۔"

"لیکن میرے شک کی وجہ بھی ٹھوس ہے، آخر کو یہ لوگ تمہارے ہی جانے پہچانے ہیں" میں نے ابھی لولو وش کا نام لینا دانستہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس پر بدک سکتا تھا۔

"بے شک میرے جانے پہچانے ہیں مگر وہ کرمنل لوگ بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، مجھے تمہاری بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔" میں نے چالاکی سے مصالحانہ رویہ اپناتے ہوئے کہا۔ "تم ان سے بات کرو کہ وہ وڑائچ صاحب کو چھوڑ دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری بات رد نہیں کریں گے، یوں بھی اب ان کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے، اس قسم کے مشکل کاروبار کرنے کی نہیں، جبکہ یہ معاملہ بھی خطرناک ہے۔"

"یہ تم نے بڑی عقل مندی کی بات کی شہزاد صاحب!" سیٹھ نوید یکدم خوش ہو کر بولا۔ "لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ہم سے اپنا تعاون برقرار رکھو۔"

"میں یہی کر سکتا ہوں، جو میں نے کہا، تم کب اُن لوگوں سے بات کرو گے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، تو جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"آپ نے میری تعاون والی بات پر غور کیا؟"

"کیا مطلب؟"

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

''آپ ابھی پولیس تک یہ بات نہیں پہنچنے دیں گے۔''

''لیکن گمشدگی کی تو پولیس میں رپورٹ اب تک درج ہوچکی ہوگی؟''

''بے شک، وہ الگ معاملہ ہے، رپورٹ تو درج ہونا ہی چاہیے۔ لیکن تم پولیس کو ہماری راہ پر نہیں لگاؤ گے، مطلب کہ انہیں یہ بتانے کی غلطی کبھی نہ کرنا کہ اغوا کنندگان سے میرا کوئی تعلق بھی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، بات معاہدے کی ہورہی ہے ہمارے بیچ، تو اسے یہیں تک محدود رکھنے میں ہم سب کا فائدہ ہے، آگے تمہاری مرضی ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' میں نے سپے تلے لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر تم کب مجھے اس ڈیل سے آگاہ کرو گے؟''

''ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا وڈاچج صاحب کو یرغمال بنانے والے وہی لوگ ہیں یا کوئی اور۔ میں اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر مجھے ایسا کوئی اشارہ ملا تو تم سے رابطہ ہوجائے گا میرا۔'' یہ کہتے ہوئے اُس رذیل شخص نے مصافحے کے لیے میری جانب اپنا ہاتھ بڑھادیا۔

ہاں! میں اُسے رذیل ہی کہوں گا، جو اب مجھے بے وقوف سمجھ کر ڈاج دینے کی کوشش کررہا تھا، میں بہ ظاہر اس کی چالاکی میں آتے ہوئے ایک پُرامیدی مسکراہٹ اپنے چہرے پہ سجا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مصافحہ کرکے نکل آیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ سیٹھ نوید انہی لوگوں کا ٹاؤٹ تھا، اور انہی کے کاز پر کام کررہا تھا اور سرمد بابا کے اغوا میں بھی اسی کا ہاتھ تھا لیکن مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ آیا اس میں عارفہ کا مفاد کہاں فٹ ہوتا تھا؟ کیا وہ واقعی شیئرز فروخت کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی یا اس جہاز رانی کمپنی کی حصے داری کو جاری رکھنا چاہتی تھی؟

اپنے دوسرے خیال کو میں نے رد کردیا۔ کیونکہ عارفہ کا اس سلسلے میں کچھ خاص کاروباری مائنڈ نہ تھا، جو سرمد بابا کا تھا، صرف سرمد بابا یہی چاہتے تھے کہ وہ اس شپنگ کمپنی کی حصے داری کو جاری رکھیں، جبکہ عارفہ کو پہلے ہی سیٹھ نوید نے برین واش کردیا ہوگا کہ وہ اس خطرناک معاملے میں پڑے بغیر بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق ساٹھ فیصد کے شیئرز کی ادائیگی پکڑے اور الگ ہوجائے۔ جبکہ اس سے پہلے کی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے مطابق عارفہ کا خیال یہی تھا کہ وہ باقی کے پچاس فیصد شیئرز لولووش سے خریدنے کی کوشش کریں گے۔

مگر میں نہیں جانتا تھا کہ سیٹھ نوید کس حد تک عارفہ سے مخلص تھا؟ اور لولووش کا کتنا نمک خوار؟ دیکھا جائے تو عارفہ اور سیٹھ نوید کے بیچ یہ معاملہ صاف تھا۔ یعنی دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ باقی کے شیئرز لولووش کو فروخت کردیے جائیں، اس سے بہت سارا روپیہ پکڑیں اور نئی زندگی کی راہ لیں۔ یعنی قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں مستقبل قریب میں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، اور ان کے بیچ سب سے بڑی اور ''دومنہ'' والی رکاوٹ ...سرمد بابا تھے۔ یعنی وہ نہ شیئرز زبردستی فروخت کرنے پر تیار تھے نہ ہی عارفہ کی سیٹھ نوید جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند۔

میرے نزدیک جہاں تک شیئرز والی بات تھی، اس پر تو سرمد بابا کا زور اور حکم چل سکتا تھا، لیکن عارفہ کی شادی والا معاملہ اس کا ذاتی فعل تھا... اس میں بلاشبہ قانونی اور شرعی طور پر وہ آزاد و خودمختار بھی تھی۔ یقیناً یہ حقیقت سرمد بابا بھی جانتے ہی ہوں گے، لیکن وہ سیٹھ نوید کو بہرحال اچھا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کے اس خیال سے میں بھی اتفاق کرتا تھا۔

یہ بات ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہوسکی تھی کہ سرمد بابا کی ''مراجعت'' کے بعد انہوں نے اپنا کتنا کچھ اپنے ہاتھ میں کررکھا تھا کہ وہ اپنی بیوہ بہو کو برے بھلے کی تمیز بتاتے ہوئے خاندان کے ایک جہاندیدہ بزرگ کی طرح اُسے سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کرتے؟

جبکہ مجھے آثار ایسے ہی نظر آرہے تھے کہ عارفہ ایک بار پھر سرمد بابا کو ہری جھنڈی دکھا کر دودھ سے مکھی کی طرح نکالنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اور اس ''کارِخیر'' میں اس کے ساتھ سیٹھ نوید بھی بہ نفسِ نفیس پیش پیش تھا۔

اگرچہ میں سرمد بابا سے بھی ناراض تھا مگر میری وہ ناراضی عارضی تھی۔ عابدہ کے سلسلے میں ان کا اتنا قصور نہ تھا، جتنا اس حرافہ عارفہ کا تھا۔ بلکہ وہ تو عابدہ کے سلسلے میں اب بھی پُرعزم تھے.... میں ایسے نازک موقع پر سرمد بابا کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ نوید کے دفتر سے نکلنے کے بعد میں اپنی کار میں آبیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے کمرے سے نکلتے ہی سیٹھ نوید اپنے گارڈز کو اُس وقت تک مجھ پر کڑی نظریں مرکوز

Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

رکھنے کی ہدایت دے چکا ہوگا، جب تک میں دور دور تک ان کی حدِ نگاہ سے اُوجھل نہ ہو جاؤں۔ میں نے بھی یہی کیا اور کار میں سوار ہو کر کچھ دور نکل گیا۔

سیٹھ نوید کا بنگلا بھی اس کے دفتر سے قریب ہی تھا، میں ایک چکر وہاں کا پہلے ہی لگا چکا تھا۔ یہ ایک نئی رہائشی اسکیم تھی، اگرچہ بیشتر بنگلے کوٹھیاں ایستادہ ہو چکی تھیں، اور کچھ تعمیر کے مرحلے میں تھیں، جس سبب بنگلے اور دفتر کے گرد و پیش کچھ زیرِ تعمیر عمارتی ڈھانچے کھڑے تھے اور وہاں سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔

ایسے ہی ایک سنگی ڈھانچے کے پاس کار.... روکی اور اس کا انجن بند کر دیا۔

یہاں سے میں بیک وقت دو جگہوں پہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دفتر اور اس کے بنگلے کی طرف جانے والا وہ راستہ جو آٹھ دس فرلانگ کے بعد بائیں جانب کو گھوم رہا تھا۔

جہاں میں کار سمیت موجود تھا، یہاں جا بجا ریتی بجری کا ڈھیر اور دیگر ریختہ پھیلا ہوا تھا اور کچھ ادھ بھرے بلر ایستادہ تھے، اسی لیے مطمئن تھا کہ یہاں سے مجھ پر فوری طور پہ کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا میں اندر اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بیٹھا رہا تھا۔

سہ پہر ہلکی شام میں ڈھلنے لگی تھی، آسمان صاف اور فضا جامد تھی، تاہم موسم کچھ خوشگوار ہی تھا، ڈھلتی ہوئی سنہری دھوپ میں ایک عجیب سی خاموش اُداسی کا عنصر محسوس ہوتا تھا۔

ایک جانب وسیع میدان تھا اور وہاں کچھ لڑکے کرکٹ اور فٹ بال کھیل رہے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ عین میرے خیال کے مطابق، ''کوکو انٹرپرائزز'' کے مین گیٹ سے میں نے عارفہ کو اکیلے نمودار ہوتے نہیں دیکھا تھا، اُس کے ہمراہ سیٹھ نوید بھی تھا۔ گاڑیاں دونوں کے پاس تھیں لیکن وہ عارفہ کے ساتھ اُسی کی کار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنی کار کے اگنیشن سوئچ میں لگی چابی گھما دی۔ ہلکی سی غراہٹ سے انجن بیدار ہو گیا۔

ونڈ اسکرین کے پار میری نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ عارفہ کی کار میں سوار ہونے تک سیٹھ نوید اپنی گردن گھما گھما کر اطراف کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ وہ عارفہ کی ڈرائیونگ والی سیٹ کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ کار آگے بڑھی، مگر میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، آس پاس کا زیرِ تعمیر علاقہ زیادہ تر غیر آباد ہونے کی وجہ سے میدانی ہی نظر آتا تھا۔

جب کار مین روڈ والے راستے کے بجائے دوسرے راستے پر ہو لی تو میں نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ مذکورہ راستہ جو بلاشبہ سیٹھ نوید کے بنگلے تک ہی جاتا تھا، اُس پر کار آتے ہی دوڑ پڑی، مجھے اندازہ ہوا کہ عارفہ خاصی ''رف'' ڈرائیونگ کرنے کی عادی تھی۔

مجھے ان کی متوقع منزل کا بخوبی اندازہ تھا اسی لیے میں نے براہِ راست ان کے تعاقب کا خطرہ مول لیے بغیر۔ ایک دوسرے نسبتاً کچے راستے پر اپنی کار کا رخ کر دیا۔ سنسان اور قدرے کھلا میدانی علاقہ ہونے کے باعث انہیں تعاقب میں آتی میری کار کا اندازہ ہو سکتا تھا اسی لیے میں نے متبادل راستہ اختیار کیا تھا۔

بمشکل دس منٹ لگے تھے، مقررہ جگہ پر پہنچنے میں اور میں نے دیکھا کہ وہاں ان کی کار بھی پہنچ چکی تھی اور اب وہ دونوں نیچے اُتر رہے تھے۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے، ونڈ اسکرین کے پار ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیٹھ نوید، عارفہ کو اپنے بنگلے پر کیوں لایا تھا؟ کیا باقی کی کوئی منصوبہ بندی کرنے کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے؟ جبکہ عارفہ کے ہار سنگھار سے کچھ اور بات بھی سمجھ میں آتی تھی۔

''تو کیا یہ نودولتیا سیٹھ۔ اتنے بڑے گھر میں بالکل اکیلا رہتا ہے؟ آخر اس کا حدود اربع کیا ہے؟'' میں سوچنے لگا۔ مجھے ابھی تک اس سے متعلق کچھ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے جمال ہی بتا سکتا تھا، اور اس سے مجھے ابھی تفصیلی بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

وہ دونوں اندر جا چکے تھے اور میں کار سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اطراف میں گھلنے والی شام کی ملگجی سی تاریکی مجھے تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ میں اسی کی آڑ لیتا ہوا محتاط روی سے چلا، بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ نیا رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے اطراف میں ویرانی کا راج تھا، البتہ روشنی کا خاطر خواہ بندوبست کیا ہوا تھا، اور سیکیورٹی بس اسی حد تک تھی کہ ہر بنگلے کے گیٹ پر کوئی نہ کوئی گن مین یا چوکیدار موجود نظر آتا تھا۔ سیٹھ نوید کے بنگلے پر بھی دو چوکیدار تھے۔ ایک ڈنڈا بردار اور دوسرا بندوق بہ دست۔

بنگلے کے اطراف میں بھی تعمیر شدہ اور زیرِ تعمیر گھر تھے، ان میں کچھ ویران تھے، مگر اِکا دُکا مزدور ٹائپ افراد

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چار پائی پر بیٹھے بیڑی پیتے دکھائی دیے۔

میں ایک بڑا چکر کاٹ کر بنگلے کے پچھواڑے آیا تو یہاں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ دفعتاً مجھے ایک جگہ لوڈر کھڑا دکھائی دیا، جس سے پلر کھڑے کیے جاتے تھے اور ریتی بجری کی مکسنگ کی بھی اس کے ساتھ مشین اٹیچ تھی، یہ بنگلے کے قدرے قریب ہی کھڑا تھا، میں چار پائیوں پر بیٹھے افراد کی نگاہ سے بچتا بچاتا اسی طرف بڑھا اور پھر میرا کام آسان ہوتا چلا گیا۔

لوڈر پر چڑھتے ہی، میں نے اس کے ایک لمبے اور آگے کو نکلے ہوئے آہنی راڈ پر جھولتے ہوئے، بنگلے کی ایک دیوار تک ہاتھ بڑھا کر رسائی حاصل کی اور پھر بے آواز دوسری طرف کود گیا۔

سُن گُن لینے تک میں چند ثانیے وہیں دبکا رہا پھر آگے قدم بڑھائے، کہیں کسی کُتے کے ہلکے سے بھونکنے کی آواز آئی تھی، میں بنگلے کی عقبی راہداری میں اُترا تھا، اور وہاں سے میں نے دائیں جانب پیش قدمی کی اور ایک بالکونی ... ٹاپ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

بنگلے میں خاموشی کا راج تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ سیٹھ نوید کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں رہتا ہوگا۔ کم از کم اس وقت تو نہیں تھا ان دونوں کے علاوہ۔

میں ایک کمرے سے ہوتا ہوا، اندازے سے نشست گاہ کی طرف آیا تو وہاں مجھے، ہنستی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹکا۔

کمروں کی بیشتر لائٹس بجھی ہوئی تھیں اور کسی میں ہلکے پاور کے بلب روشن تھے۔ ایک کھڑکی سے میں نے اندر جھانکا اور فوراً ہی لاحول پڑھ کے وہاں سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ دونوں اندر ''اٹھکیلیوں'' میں مصروف تھے۔ اور سیٹھ نوید، عارفہ پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اب کھڑکی کے پردے کو سرکا کے وہاں آنکھوں کی جگہ اپنے کان لگا دیے۔

''جان! آج کی رات ٹھہر جاؤ نا... کتنا انتظار کیا ہے میں نے تمہارا۔ پلیز۔''

یہ سیٹھ نوید کی آواز تھی۔ دوسری کھنکتی آواز عارفہ کی اُبھری۔

''ارادہ میرا بھی یہی تھا، لیکن آج تمہارے آفس میں اُس لوفر کی اچانک اور غیر متوقع آمد نے مجھے بہت پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے میرا اب یہاں رات گزارنا ممکن نہیں رہا۔''

''اس کی کیوں فکر کرتی ہو جانم! وہ واقعی ایک لوفر ہے، ایک تیسرے درجے کا لوفر۔ اُس سے تو پولیس ہی نمٹ لے گی۔'' سیٹھ نوید نے اسے تسلی دی تو عارفہ کی متوحش سی آواز اُبھری۔

''مگر میں ایسے لوفروں سے ڈرتی ہوں، تم نے دیکھا نہیں کس طرح مجھے دھمکیاں دے رہا تھا، مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک جنون کی سی کیفیت مترشح ہوتی نظر آئی تھی۔ خون اُترا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں۔ پتا نہیں اُسے کیسے اس بات کا پتا چل گیا کہ میں نے ہی امریکی خفیہ اداروں سے اپنی جان چھڑانے کے لیے عابدہ کو دھوکے سے پھنسوا دیا تھا۔''

''میں کہہ رہا ہوں ناں جان! اس کی فکر نہ کرو تم۔ میں جو موجود ہوں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' سیٹھ نوید بولا۔

''تم، پلیز! یہ باباجی والا معاملہ نمٹا دو، کہیں ہم دونوں ہی نہ پھنس جائیں، شہزی کو ہم پر سو فیصد شبہ ہو چکا ہے۔''

عارفہ کی اس بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ اور سرمد بابا کے ذکر پر تو میں سرتاپا گوش برآواز بن چکا تھا۔ پھر میں نے اس تیس مار خاں سیٹھ نوید کی آواز سُنی۔

''وہ بہت ہٹیلا بڈھا ہے۔ سہیل بتا رہا تھا کہ مان کے نہیں دے رہا ہے وہ۔ مر جائے گا مگر وہ شیئرز ہمارے ہاتھ میں نہیں دے گا۔ تم سے ایک غلطی ہو گئی جان! اگر تم وہ شیئرز بھی اس بڈھے سے لے کر اپنے نام کروا لیتیں تو بہت آسانی ہو جاتی۔''

''اُس بڈھے نے تمہیں پہچان تو نہیں لیا ہے؟''

''نہیں، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ خود کو اس کی نظروں میں لاؤں، میں نے اس پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُسے یرغمال بنانے والے لوگ وہی ہیں، جو اس سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ہر قیمت پر حاصل چاہتے ہیں۔'' سیٹھ نوید نے جواب دیا۔

''چلو، یہ تو تم نے عقل مندی کا کام کیا لیکن اب کیا کیا جائے؟ شہزاد ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا چلتا پُرزہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ اس بڈھے کا سُراغ نہ لگا لے؟ اب کیسے نمٹاؤ گے یہ معاملہ؟'' عارفہ کو فکر کھائے جا رہی تھی۔

''کہا ناں جان! آج سہیل آخری کوشش کرے گا اُس بڈھے کو منانے کی۔ مگر سوال وہی پیدا ہوتا ہے، وہ مر جائے گا، مگر ہماری بات نہیں مانے گا، مجھ سے ایک غلطی

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوگئی، مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ اگر تم ساتھ دو تو؟''

''میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں، بولو، کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اس بڈھے کی کمزوری سے میں واقف ہوں، اگر تم ذرا اپنا دل بڑا کرو تو ایک اور حل بھی ہے میرے دماغ میں۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو تم؟''

''ایک اور اغوا۔''

''کس کا؟''

تمہارے دونوں بچوں، پنکی اور دانی کا۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''ہاں یہ بکواس ہی ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''یہ محض ایک ڈراما ہوگا۔ دونوں بچوں کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ انہیں اس بڈھے کی نظروں کے سامنے لا کر دوسرے انداز سے دھمکانا ہوگا۔ بچے اس کی کمزوری ہیں اور پھر وہ تو اس کے پوتے ہیں۔ اس طرح وہ مجبور ہوجائے گا ہماری بات ماننے پر۔''

''نن... نہیں، میں اپنے بچوں کی زندگیاں اس طرح داؤ پہ ہرگز نہیں لگانے دوں گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ اپنا دل بڑا کرو... ارے بابا! یہ محض ایک ڈراما ہوگا، اس بڈھے کو جھکانے کے لیے۔ بچوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ وہ میرے آدمیوں کے پاس بالکل آرام سے ہوں گے۔''

ایک طویل پُرسوچ وقفہ گزرا۔ عارفہ کو ہامی بھرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ ماں تھی دونوں بچوں کی، لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود اس کا دل اس ڈرامے کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ اُسے کافی دیر تک خاموش اور سوچتا پا کر عیار سیٹھ نے اُسے محبت سے سمجھانے کی کوشش چاہی۔

''دیکھو جان! کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ ہم مستقبل میں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے کا عہد کر چکے ہیں۔ پھر پنکی اور دانی کو تو میں بھی ایک باپ کا ہی پیار دوں گا، بھلا میں یہ کیسے چاہوں گا کہ انہیں ذرا سی بھی تکلیف ہو۔ وہ دونوں بچے میرے آدمیوں کی حفاظت اور پناہ میں ہوں گے۔ بس! ایک ڈراما کرنا ہے، اور مجھے اس ڈرامے کی کامیابی پر سو فیصد اُمید ہے، اس کے بعد سارے مسئلے سمجھو چٹکی بجاتے ہی حل ہوجائیں گے۔ اب ایک گوٹ ہماری پھنس گئی ہے تو کیا کیا جائے؟ یہی ایک حل ہے۔''

خاموشی کے ایک وقفے کے دوران سیٹھ نوید کی دوبارہ آواز اُبھری۔ وہ مکارانہ اُسے لبھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''دیکھو ڈارلنگ! آئندہ کی خوشگوار اور مسرتوں بھری زندگی کے لیے انسان کو کچھ خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں اور پھر اس میں کیا خطرہ ہے؟ یہ کون سا سچ ہونے جا رہا ہے؟ اس کے بعد ہماری پُرمسرت اور شادمانیوں سے بھرپور زندگی منتظر ہوگی، جہاں صرف تم اور میں ہوں گے، میں نے تو سوچ بھی لیا ہے کہ شادی کے بعد ہم سوئٹزرلینڈ جائیں گے۔ وہ ایک الگ ہی خوابوں کی دنیا ہے۔ بس! اب یہی ایک حل ہے ان ساری خوشیوں کو پل بھر میں اپنا لینے کا۔''

''تت... تمہیں یقین ہے کہ اس ڈرامے میں تم بغیر کسی نقصان کے کامیاب ہوجاؤ گے؟'' بالآخر عارفہ کی مرتعش سی آواز اُبھری جس میں نیم رضامندی کی جھلک بدرجۂ اُتم موجود تھی۔

''شیور ڈارلنگ! وائے ناٹ۔ منصوبہ بے داغ اور سو فیصد کامیابی کی ضمانت ہے، کیونکہ وہ میرا منصوبہ ہے، اور میرا کوئی بھی منصوبہ آج تک ناکام نہیں ہوا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''میرے بچے خوف زدہ ہوجائیں گے، کیونکہ وہ کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرے۔''

''میں جانتا ہوں، مگر یہ سب بہت قلیل مدت کے لیے ہوگا، اب ہمیشہ کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے ہمیں یہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی ہوگا، تم فکر نہ کرو جان! پنکی اور دانی کو میں اپنے بچے ہی سمجھتا ہوں۔ میں اُن پہ ایک ذرا آنچ تک نہ آنے دوں گا۔ اِٹس مائی پرومس۔''

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کمینے اور عیار شخص نے سرمد بابا کو جھکانے کے لیے بڑا جامع اور بے داغ منصوبہ بنایا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے دونوں پوتوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی خاطر وہ شیئرز تو کیا اپنی جان بھی دشمن کے قدموں میں رکھنے کے لیے تیار ہوجاتے۔ کیونکہ ایک باپ سے زیادہ ایک دادا کو اپنے پوتوں سے محبت ہوتی ہے۔ اور سرمد بابا پنکی اور دانی سے ایسی ہی محبت کرتے تھے۔

یوں تو میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ سرمد بابا کو سرے سے ہی اس خطرناک معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے تھا، جو وہ کر رہے تھے وہی کرتے رہتے آرام سے اور اللہ اللہ کرتے، اب ان کی عمر کاروبار کے اتنے بکھیڑے پالنے کی بھی نہ رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ ساٹھ فیصد شیئرز کی قیمت انہیں مل رہی تھی، وہ نہیں جانتے تھے لولوڈش کو کہ وہ کس قدر خطرناک آدمی ہے، اور اُس کے کتنے روپ ہیں۔ نیز کتنا بڑا ''ڈون'' ہے وہ۔ تاہم بوڑھے آدمی تھے اسی لیے ضد اور انا کے پکے تھے۔

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میرا شُبہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کا غیاب سیٹھ نوید اور عارفہ کا مُشترکہ منصوبہ تھا۔

''کب تک اس منصوبے پر تمہارا عمل کرنے کا ارادہ ہے؟''

مجھے عارفہ کی آواز سنائی دی۔ میں اب کھڑکی کے پردے سے کان ہٹا کر اپنی آنکھیں چپکا کر دیکھنے لگا۔ اب وہ دونوں تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔

''کل بچے اسکول جائیں گے؟''

''ہاں۔''

''بس! تو کل ہی میں سہیل کو سمجھا دوں گا اور بتا بھی دوں گا کہ دونوں بچوں پر ہلکی سی بھی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ انہیں وہ ان کے اسکول سے اغوا کرلے۔'' سیٹھ نوید نے کہا۔

''میں اب چلوں گی۔'' عارفہ اُٹھ کھڑی ہوئی، نوید بھی اس کے ساتھ اُٹھتے ہوئے بولا۔

''اتنی جلدی۔ ابھی تو ہم نے...''

''نہیں، میرا موڈ ذرا آف ہوگیا ہے۔'' عارفہ بولی۔ ''تم جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دو اور بچوں کو ایک دن سے زیادہ میں خود سے دور نہیں رکھ سکتی۔''

سیٹھ نوید نے سچویشن کو سمجھتے ہوئے مکاری سے کہا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، مجھے تمہارا اطمینان اور سکون زیادہ عزیز ہے، تم گھر جاؤ اور ریلیکس ہونے کی کوشش کرو، میں کل ہی یہ کام نمٹا دوں گا۔ بچوں کے بارے میں اگر تم سے کوئی... پوچھے تو کوئی بھی بہانہ کردینا۔''

''کیا بہانہ کروں؟ نوکروں اور ملازموں سے کیا کہوں گی بچوں کے بارے میں؟ کچھ تو بتانا پڑے گا ہی انہیں۔ اور پھر گھر آنے کے بعد پنکی اور دانی کے ذہنوں میں بھی یہ خیال ضرور اُبھرے گا کہ آخر اُن کے ساتھ یہ سب ہوا کیا تھا؟''

''تو پھر ایک کام کرنا۔'' سیٹھ نوید کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک پریشان اور خوف زدہ ماں کی ایکٹنگ کرتے ہوئے، انہیں یہی بتانا کہ بچے اغوا کیے جاچکے ہیں اور اغوا کرنے والوں نے یہ دھمکی دی ہے کہ کسی کو اس کی خبر نہ کی جائے اور خاموشی سے تاوان مقررہ جگہ پر پہنچا دیا جائے، دیٹس آل۔''

عارفہ نے اثبات میں سرہلا دیا۔

میں نے دل ہی دل میں اس فاحشہ، دغا باز اور مطلب پرست عورت پر ایک لعنت بھیجی کہ اسے اپنی خوشیوں اور بوالہوسیوں سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہ تھی۔ وہ جس کھیل کو محض ڈراما سمجھ رہی تھی، وہ حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا تھا۔ چلو، یہ بھی اتنے ڈر کی بات نہ تھی، اس عورت نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ محض ڈراما سہی، مگر اس طرح اس کے دونوں معصوم بچوں کے ذہنوں پر کس قدر منفی اثر پڑ سکتا تھا۔ مگر عارفہ کو سیٹھ نوید نے خوش آئند مستقبل کے جو سبز باغ دکھلائے تھے، اُس نے اس عورت کو اندھا کردیا تھا۔ اگرچہ ایک ماں کے دل نے اس کے اندر کچوکا تو لگایا تھا، مگر جلد ہی سیٹھ نوید نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اُسے رام کر ہی لیا تھا۔

آخر میں ان کے درمیان اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سے متعلق بھی گفتگو ہوئی تھی اور عارفہ نے پوچھا تھا کہ اس کی امریکی سوداگر لولووش سے بات ہوئی؟ تو سیٹھ نوید نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اُس سے یہی کہا کہ وہ پہلے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس سے باقی کے پچاس شیئرز کی خریداری کے سلسلے میں بات کرے گا، نہ مانا تو اس سے اُلجھنا خطرناک ہوگا، پھر ہمیں ہی باقی کے اپنے پچاس فیصد شیئرز اُسے فروخت کرنا ہوں گے۔ مگر یہ سب تب ہی ممکن ہوگا جب وہ شیئرز ہمارے ہاتھ میں ہوں گے۔ وغیرہ۔

عارفہ اس کی بات سن کر کچھ مطمئن ہوئی کچھ نہیں، تاہم تھوڑی دیر بعد وہ اس سے رُخصت ہوکر چلی گئی۔ سیٹھ نوید وہیں کھڑا چند ثانیے کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے سیل پر کسی کا نمبر ملایا۔ میں دھڑکتے دل سے اس پر آنکھیں لگائے ہوئے سرتاپا سماعت بنا، کھڑکی کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ہاں سہیل! کیا صورتِ حال ہے؟ منہ کھولا اس بڈھے نے؟ نہیں۔ مائی فٹ! خیر، میں نے اس کا ایک حل ڈھونڈ لیا ہے۔ تم ایسا کرو اسی وقت میرے پاس پہنچو۔ او کے۔ بائے۔''

اس نے سیل ایک طرف صوفے پر اُچھال دیا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سہیل نامی اپنے آدمی سے بات کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ سرمد بابا اس وقت کس کے قبضے.... میں تھے، اور وہ خود بھی ادھر ہی کسی وقت پہنچنے والا تھا۔ ورنہ تو میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ عارفہ کے جاتے ہی میں سیٹھ نوید کو زدوکوب کرکے سرمد بابا کے بارے میں اُگلوانے کی کوشش کروں۔ مگر اب ایک طرح سے براہ راست خود ہی کام آسان ہو رہا تھا، تو مجھے کسی لمبے چکر میں ہاتھ ڈالنے کی کیا

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دلکش کہانیوں ودیگر دلچسپیوں کا حسین مرقع نومبر 2015ء کا دل خوش کن پاکیزہ

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

نگہت سیما اور **قیصرہ حیات** کے خوبصورت قسط وار ناول

در ثمن بلال کے حسین ناول کی اگلی جاندار قسط

شیریں حیدر نے پردہ اٹھایا کچھ دلدوز حقائق سے اپنی بھرپور تحریر..... **زندگی خاک نہ تھی**..... میں

نبیلہ ابر راجا کے تجسس سے بھرے ناولٹ **متاع دل** کی آخری قسط

بشریٰ گوندل ایک بھرپور مکمل ناول کے ہمراہ

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پرروح سفر کی عقیدت بھری داستان

انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی
ہماری مایہ ناز مصنفہ **رفاقت جاوید**
سے خوب صورت ملاقات

علاوہ ازیں.....

سیما سراج، قانتہ رابعہ، فرحین اظفر،
نزہت جبیں ضیاء، نگہت اعظمی ودیگر رائٹرز کی پرحیرت کاوشیں

اس کے ساتھ ساتھ مثبت تفریحی معلومات سے مزین مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ضرورت تھی۔

تاہم سہیل کے آنے تک میرے پاس کچھ وقت تھا۔ نوید بھی شاید فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ بہت سی باتیں میرے علم میں آچکی تھیں، اسی لیے میں کافی مطمئن تھا، ایسے میں عموماً متوقع کامیابی کے جوش میں انسان سے جلد بازی میں غلطی بھی ہو جایا کرتی ہے۔ میں سوچ سمجھ کر اگلا قدم اُٹھانا چاہتا تھا، تاکہ ہاتھ آئی بازی نکل نہ جائے، میری کوشش یہی تھی کہ عارفہ اور سیٹھ نوید کے اگلے پلان پر عمل ہونے سے پہلے ہی میں سرمد بابا کو بازیاب کروالوں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک تیس پینتیس سالہ شخص وہاں آن پہنچا، سیٹھ نوید اب عام سے لباس میں تھا، دونوں کی گفتگو سے مجھے تسلی ہوگئی کہ نو وارد سہیل ہی تھا، نیز ان کی گفتگو کا لب لباب بھی عمومی نوعیت کا تھا اس لیے میں نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا اور جس راستے اور جس طریقے سے آیا تھا اسی سے واپس بنگلے سے باہر آگیا اور سیدھا اپنی کار کا رُخ کیا۔

رات ہو چلی تھی۔ میں اپنی کار میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار بنگلے کے گیٹ پر نظریں جمائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا، وہاں مجھے ایک ٹویوٹا جیپ کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ منٹوں بعد ہی میں نے سہیل کو گیٹ سے نمودار ہوتے دیکھا اور میرے اعصاب تن گئے۔ وہ اپنی جیپ میں سوار ہوا اور ایک طرف روانہ ہوگیا، جیپ حرکت میں آتے ہی میں نے بھی اپنی کار اس کے تعاقب میں لگا دی۔

علاقہ قدرے سنسان ہونے کے باعث تعاقب کا شبہ ہوسکتا تھا اسی لیے میں نے ہیڈ لائٹس گل کر رکھی تھیں، تاہم اتنا بھی اندھیرا نہ تھا کہ مجھے راستہ سجھائی نہ دیتا، جبکہ سہیل کی جیپ کی بیک لائٹس میری راہنمائی کر رہی تھیں۔

مین روڈ پر آتے ہی جیپ نے رفتار پکڑ لی اور میں نے بھی اپنی کار کی بتیاں جلا دیں، اور محتاط روی کے ساتھ اس کے تعاقب میں رواں دواں ایک ایسے علاقے تک جا پہنچا، جو بہ مشکل دو تین کلومیٹر ہی کے فاصلے پر تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی، یہ علاقہ سرمد بابا کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہ تھا اور متوسط علاقہ ہی کہلاتا تھا، جو ڈیرا لبستی جانے والی سڑک کے کنارے پر تھا۔ ایک مختصر سے چوراہے پر جیپ دائیں جانب کو مڑ گئی، میں نے بھی ذرا فاصلہ رکھ کر اسی طرف اپنی کار موڑ دی۔ علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنی کار لائٹس آف کر دیں اور جیپ کی بیک لائٹس کے سہارے تعاقب جاری رکھا۔

ایک موقع پر میں کھٹک گیا۔ جیپ ایک دوسرے راستے سے دوبارہ کھلی سڑک پر آگئی۔ یہ وہی مین روڈ تھی جس پر کچھ دیر پہلے ہم محوِ سفر تھے۔

''ہُوں۔ تو اسے شبہ ہو گیا ہے۔'' میرے ذہن میں اُبھرا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی کار کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ اسی وقت جیپ نے بھی رفتار پکڑی، سہیل راہِ فرار اختیار کرنے لگا تھا۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھا، تاہم میں جیپ کا پیچھا کرتا رہا، آگے ایک موڑ پر جیپ کی رفتار کچھ ہلکی ہوئی، لیکن میں نے اپنی کار کی اسپیڈ کم کرنے کے بجائے مہارت کے ساتھ کنارے میں... آماری اور تیزی سے موڑ کاٹا، چونکہ میں اپنی کار کو بغیر کسی خطرے کے موڑ کاٹنے کا زاویہ بنا چکا تھا اسی لیے میں چشم زدن میں سہیل کے سر پہ جا پہنچا اور کار ریکدم اُس کی جیپ کے آگے، راستہ روک کر کھڑی کر دی۔

عقب سے آنے والی چند گاڑیوں نے ہارن پہ ہارن دینا شروع کر دیے، اسی وقت سہیل نے اپنی جیپ ریوس کرنا چاہی تھی جو اس کے پیچھے کھڑی ایک بلیک کرولا سے جا ٹکرائی، اور پھنس گئی۔ مفر کی راہ نہ پاتے ہوئے، اس نے پستول نکالا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا، وہ مجھے گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر میں اسے اب کہاں نظر آتا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ میں چھوڑ چکا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کھڑکی سے اپنا سر اور پستول والا ہاتھ نکالے میری خالی کار کو تکے جا رہا تھا اور اُسے پتا بھی نہ چلا کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ پھرتی سے کھولتے ہی میں نے اس پر اپنا پستول تان لیا اور غراتے ہوئے بولا۔

''حرکت مت کرنا، اور خبردار! پستول پھینک کر ہی کھڑکی سے ہاتھ اندر کرنا۔''

وہ پریشان سا ہو گیا۔ عقب میں رُکنے والی گاڑیوں نے جیسے ہی خطرے کی بو سونگھی، پھر تو جسے جہاں موقع ملا وہ اُدھر ہی مڑ کے آگے یا پیچھے ہولیا۔

میری نظریں سہیل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا، پستول پھینک کر اس نے میری طرف دیکھا، میری نال کا رُخ اس کے چہرے کی طرف تھا۔

''نکلو باہر۔ جلدی۔'' میں نے دُرشتی سے دوسرا حکم دیا، اور پستول کی نال کا رُخ اسی کی جانب کیے رکھا۔ وہ باہر اُتر آیا، میں نے ذرا فاصلہ رکھا اور اُسے اپنی کار کی جانب

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بڑھنے کا اشارہ کیا، وہ پلٹا اور پلٹتے ہی میرے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا۔

اس کے اس اچانک مگر متوقع وار سے میں نے اپنے پستول والے ہاتھ کو جُھکائی دے کر بچایا اور خود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، وار خالی جانے کے باعث وہ میری طرف کافی آگے تک جھک آیا تھا، تبھی میرے دوسرے ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز سے پیچھے کو اُلٹ گیا۔

میں نے اپنا پستول پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا اور آگے بڑھ کر اُسے گردن سے دبوچ لیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا خاصا تنومند آدمی تھا۔ رنگت سانولی تھی اور چہرے سے ہی بدقماش دکھائی دیتا تھا، مگر ٹھوڑی پہ پڑنے والے میرے ایک ہی زوردار گھونسے نے اس کی طبیعت صاف کردی تھی۔

اپنی کار کے پاس گھسیٹنے تک اس کے حلق سے جانے کیا کیا اول فول اُبلتا رہا، مگر میں اُسے اپنی کار تک کھینچ لے آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا جسے میں نے لات کے بند کیا اور اسے دبوچے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیلا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار اسٹارٹ کی اور غراتے ہوئے خار کھائے لہجے میں کہا۔ ”مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے سیٹھ نوید سانچے والا کے کہنے پر منظور وڑائچ صاحب کو کہاں یرغمال بنا رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ تمہارا نام سہیل ہے۔ یہ کار اسی سمت موڑ لو ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

”تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کسی... آہ...“ اس کے جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کردیا، اس کی داڑھ کی طرف کے دانت ہل گئے اور ایک دو ٹوٹ بھی گئے تھے کیونکہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔

”میرے ساتھ جمناسٹک مت کرو، سمجھے، ورنہ تمہارے ہر جھوٹ پر میں ایسے ہی تم پر گھونسے برساتا رہوں گا۔“ میں نے وحشیانہ غراہٹ سے کہا اور... اُسے وہیں چلنے کو کہا۔

اس کے چہرے سے اب بے بسی جھلکنے لگی تھی اور اذیت کے آثار رسوا تھے۔ بالآخر اس نے کھڑکی سے باہر خون تھوکا اور کار آگے بڑھا دی۔

تھوڑی دیر بعد کار اسی علاقے میں داخل ہوگئی۔ اب یہاں پہنچ مجھے ایک شش وپنج نے گھیر لیا کہ کیا ضروری تھا یہ کمبخت مجھے اُسی جگہ لے جاتا، جہاں سرمد بابا کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا؟ وہ مجھے چالاکی سے پھنسا بھی سکتا تھا، اُس کے ساتھی بھی وہاں موجود ہو سکتے تھے، جن سے مجھے بھڑنا بھی پڑتا۔

”کار اپنے ٹھکانے سے چند قدموں کے فاصلے پر روکنا۔ سمجھے؟“ میں نے تحکمانہ دُرشتی سے کہا اور اس نے ایک گلی پار کرنے کے بعد بائیں جانب کار موڑ کر روک لی۔ پہلے میں نیچے اُترا اور پستول نکال لیا۔ پھر اُسے نیچے اُترنے کا کہا۔

”کون سا ٹھکانا ہے؟“ میں نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ وہ میرے گن پوائنٹ پر تھا۔

”وہ سامنے ایک گلی ہے، اس کے اندر۔“ اس نے چاروناچار جواب دیا۔ اس کے منہ سے ابھی تک خون نکل رہا تھا، شاید اس کی داڑھ اندر گہرائی تک ٹوٹ گئی تھی اور خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھا ہوا تھا۔

”دیکھو، میں آخری بار کہہ رہا ہوں، مجھ سے کسی قسم کا دھوکا تمہیں مہنگا پڑے گا۔ جس کی ایک جھلک تم دیکھ ہی رہے ہو۔“ میں نے فیصلہ کن پیش قدمی کرنے سے پہلے اسے تہدید کرنا ضروری سمجھا۔

”اب بتاؤ مجھے، وہاں تمہارے کتنے آدمی موجود ہیں؟ مجھے یرغمالی بھی وہیں ملنا چاہیے، کلیئر؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”میں زخمی ہوں، میرا خون بہہ رہا ہے۔ مم...“

میں نے ہونٹ بھینچ کر ایک اور گھونسا اس کے دوسرے جبڑے پہ رسید کردیا۔ اس کے حلق سے ذبح ہوتے بکرے کی سی آواز نکلی اور وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ ”تت... تم قسائی! مم... میں تمہیں۔“ وہ بلبلا کر بھونکنے پر آمادہ ہوا تو میں نے اس کا گریبان پکڑ کر دوبارہ اس کے پیروں پہ کھڑا کردیا، ایک نگاہ اطراف پہ ڈالی، دور پرے کچھ سائے متحرک دکھائی دیے تھے، اریب قریب میں کوئی نہیں تھا۔

”دیکھو! نہ تم مجھے جانتے ہو، نہ وہ نودولتیا سیٹھ نوید کھانچے یا سانچے والا، اگر جانتے ہوتے تو مجھ سے ٹکر نہیں لیتے، بلاوجہ میرے ہاتھوں سے خرچ ہونے کے بجائے، تعاون کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے، بغیر کسی جھوٹ، دھوکے اور ڈرامابازی کے، مجھے سچ بتاؤ، اور میری بات مت کاٹو۔ سمجھ گئے؟“

میں نے پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”وہاں صرف دو ساتھی موجود ہیں، یرغمالی بھی وہیں ہے۔“

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''ہوں... چلو اب آگے چلو۔ رومال ہے تمہاری جیب میں؟''

میں نے اس کی تلاشی لی اور رومال نکال کر اس کے حوالے کر دیا، وہ اس نے اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اس کی حالت میں نے خاصی خستہ کر دی تھی، وہ اب کسی چوں و چرا کے بغیر میرا ہر حکم بجالانے کے لیے تیار تھا۔ ہم چلتے ہوئے مذکورہ گلی میں داخل ہوئے اور سرے پر ہی وہ مکان تھا جس کی سہیل نے نشاندہی کی تھی۔

مگر یہ دیکھ کر میں چونک گیا کہ دروازے پر تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے خوف ناک نظروں سے سہیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے؟'' وہ بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

''مم... مجھے تو نہیں معلوم۔ ہوسکتا ہے وہ دونوں کسی کام سے باہر نکلے ہوں؟''

اس کی بات صحیح لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس اس مکان کی چابی تو ہوگی؟''

دونوں مضروب جبڑوں کی وجہ سے اُسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی بات پر بھروسا نہیں کیا اور اس کی تلاشی لی۔ مجھے اس کی جیب سے چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ملا، میں نے وہ نکال کر اس کے خون آلود چہرے کی طرف لہرایا۔ ''اس میں ہے وہ چابی؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا، مگر میں نے پھر بھی ایک ایک چابی اس تالے پر آزما ڈالی۔

ایک چابی لگ گئی۔ کامیابی کی منزل قریب تھی اس لیے میں نے اس جھوٹ کی سزا کو موخر کر دیا اور دروازہ کھول کو اُسے اندر دھکیلا۔ عقب میں دروازہ بند کیا تو وہ یکدم صحن کے ایک طرف بنی، چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

میں نے پستول نکال کر اس کا رُخ اسی کی جانب کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، ٹز، کی آواز کے ساتھ ہی اس کی چیخ اُبھری، وہ سرے پر پہنچ کر پیچھے کو اُلٹا اور نیچے لڑھکتا چلا آیا۔ میں نے اُس کی طرف سے نگاہ ہٹا کے اپنی آنکھوں کو تیزی سے گردش دی۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، سامنے دو ہی کمروں کے دروازے نظر آئے، ایک تو کھلا پڑا تھا دوسرا بند تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دروازے کو لات رسید کردی، وہ دھڑ سے کھلا۔ ایک پٹ ٹوٹ کر بھی گر پڑا، اندر اندھیرا تھا، میں لائٹ آن کرنے کے لیے ابھی سوئچ ٹٹول ہی رہا تھا کہ ایک کمزور سی لرزتی آواز اُبھری۔

''کک... کون؟''

...... اس آواز پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ یہ سرمد بابا کی آواز تھی۔ اسی دوران میری اُنگلیوں نے سوئچ بورڈ کو چھوا اور لائٹ آن کر دی، سامنے ہی مجھے فرش پر دیوار سے لگے سرمد بابا اس حال میں بیٹھے دکھائی دیے کہ میرے اندر کرب کی لہر سی دوڑ گئی۔ انہیں شاید زیادہ تر اندھیرے میں رکھا گیا تھا، کمرے میں روشنی ہونے سے ان کی بوڑھی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں، یہی وجہ تھی وہ اب اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ کا چھجا سا بنا کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ پہچانتے ہی لرزیدہ آواز میں بولے۔

''شش... شہزی! تم...!''

وہ رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے، اور ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ان پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ میں فوراً آگے بڑھا اور رسیوں سے .... انہیں آزاد کرنے لگا، مجھے سہیل کے دو ساتھیوں کے لوٹ آنے کا خدشہ تھا، اسی لیے میں جلدی جلدی اپنا کام نمٹانے لگا، بابا بھی خاموش رہے، میں نے انہیں سنبھالا اور صحن میں آ گیا۔ ایک طرف سہیل زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا اور اسی وقت مجھے ایک موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ میں نے سرمد بابا کو اپنے پیچھے کر لیا اور پستول ہاتھ میں لیے باہر جھانکا۔ آنے والے دو تھے، بائیک انہوں نے عین دروازے کے سامنے ہی روکی تھی۔ مجھے یہی سہیل کے ساتھی لگے۔ کیونکہ وہ بھی اسی قبیل کے دِکھتے تھے۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی وہ ایک ثانیے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ سمجھ تو گئے تھے کہ میں ان کا شکار چھین کر لے جا رہا تھا اور میرے پیچھے سرمد بابا کی بھی جھلک انہوں نے دیکھ لی تھی۔ سہیل کی طرح یہ بھی مجھے تیسرے درجے کے کھلاڑی لگے تھے، مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بے ضرر تھے۔ میرا تجربہ تھا کہ کبھی کبھی تیسرے درجے کا مجرم بھی ایک بڑی مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔ سو میں محتاط ہی تھا اور ابھی انہیں کسی قسم کی تہدید دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بائیک پر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی ''نازیبا'' حرکت کرنے کی ٹھانی، مگر میرے پستول کی گولی نے اُسے چیخ مار کے بائیک سے ہی نیچے گرنے پر مجبور کر دیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی تھی۔ دوسرے پر میری خاطر خواہ دہشت بیٹھی تو اس نے ہلنے کی بھی جرأت نہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کی مگر یہ میری خام خیالی تھی راستہ صاف جان کر سرمد بابا کو لیے میں نے جیسے ہی دروازے کی چوکھٹ پار کی، اس نے یکدم اپنی بائیک کا ایکسلیٹر گھما دیا۔ بائیک کا اگلا حصہ بلند ہوا اور یہی اس کی وہ چال تھی جس نے مجھے لمحے بھر کو بوکھلا دیا۔ وہ ون وہیلر کا ماہر معلوم ہوتا تھا، بائیک کی زد میں ہم دونوں ہی آ گئے، میں نے سرمد بابا کو سنبھالا اور انہیں ایک طرف دھکا دیا، بائیک کا اگلا وہیل کسی بدمست اُچھلنے والے گھوڑے کی طرح مجھ پر آ رہا، مجھے زوردار دھکا لگا اور میں نیچے گر گیا، پستول ہاتھ سے چھوٹا تو بائیک سوار نے دوسری چال یہ چلی کہ بجائے راہِ فرار اختیار کرنے کے، بائیک سے چھلانگ لگا دی۔ بائیک گھوں گھوں کرتی ہوئی اُلٹ پلٹ گئی، اور میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کے دوران زمین پر گرے پستول کی طرف پیش قدمی کی، مگر اس سے پہلے ہی مدِمقابل نے اپنا پسٹل نکال لیا اور میری طرف اس کا رُخ کر کے گولی چلا دی، میں صاف نشانے پر تھا، اور اتنے قریب سے فائر ہونے والی گولی سے مجھے کوئی معجزہ ہی اب بچا سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا ایک کرب ناک چیخ سے۔۔ گونج اُٹھی۔

☆☆☆

وہ سرمد بابا کی چیخ تھی۔

جانے کب، کیسے اور کس وقت وہ مجھے خطرے میں پا کر اچانک میرے سامنے لڑھکتے چلے آئے تھے اور فائر کی ہوئی گولی انہیں چاٹ گئی تھی، وہ ''دھپ'' کی آواز سے میرے بالکل قریب گرے تھے، اس وقت میں زمین سے اپنا پستول اُٹھانے کے لیے جست لگا چکا تھا، اور وہ میرے ہاتھ میں تھا، دوسرا فائر ہوا، اس بار نشانہ میں ہی تھا، لیکن تب تک میں اپنا پستول ہاتھ میں لیتے ہی بہ سرعت لُڑھکنی لگا چکا تھا اور اسی دوران میں نے مدِمقابل کا نشانہ لے کر گولی داغی، وہ چیخ مار کر گرا، اس کا دوسرا ساتھی جو میری گولی کھا کر زمین بوس تھا، وہ ہنوز بے حس و حرکت تھا۔

علاقے میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ لوگ خوف و ہراس میں تھے۔ جسے جہاں جگہ ملی، دبک کر چھپ گیا۔ میں نے میدان صاف دیکھا اور زخمی سرمد بابا کو اُٹھا کر اپنی کار کی طرف دوڑا، مجھے تو اب ان کے کراہنے کی بھی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، جس سے میری تشویش میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ وہ خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور میں اُن کے خون سے۔

سرمد بابا کو اس حال میں دیکھ کر میں ہول سا رہا تھا۔ ان ظالموں کی قید میں رہتے ہوئے ان کی حالت پہلے ہی نہایت خستہ ہو رہی تھی، نجانے کس طرح، اور وہ کون سا ایسا جذبہ تھا، جس نے یک دم سرمد بابا کو میری جان بچانے پر اُکسایا اور وہ عین وقت پر میری ڈھال بن گئے۔ ہاں! سمجھ آیا۔ وہ مجھے اپنے مرحوم بیٹے محمود کے روپ میں جو دیکھتے تھے۔ آہ سرمد بابا!

میرا اندر اندر جھیر جھیر ہونے لگا تھا۔ جب دل ڈول رہا ہو تو انسان کے اعصاب بھی جواب دینے لگتے ہیں۔ یہی میری کیفیت ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے تیسے سرمد بابا کے بے سُدھ وجود کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور قریبی اسپتال کا رُخ کیا۔ اب پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی یہ قانون پاس ہو چکا تھا کہ M.L.O. کیس کے چکروں میں پڑے بغیر پہلے مریض کی جان بچائی جائے، یعنی زخمی کو طبی امداد فراہم کی جانی چاہیے۔ یہی کچھ مذکورہ اسپتال کا عملہ کرنے میں مصروف تھا، میں نے انکل جمال کو فون کر کے صرف اسی قدر ہی مطلع کیا کہ وہ فوراً اسپتال پہنچیں، اور عارفہ کو ضرور مطلع کر دیں (عارفہ کو مطلع کرنے کا میں نے مصلحتاً کہا تھا) اس کے بعد میں نے اول خیر سے رابطہ کیا اور اُس سے کہا کہ وہ اسی وقت سرمد بابا کی کوٹھی کے اطراف میں جا کھڑا ہو، اور کسی بھی قسم کی غیر معمولی یا مشکوک نقل و حرکت پر نظر رکھے اور کچھ ایسا محسوس کرے تو مجھے بتا دے۔

اس کے بعد میں نے میجر ریاض باجوہ صاحب سے ان کے پرسنل نمبر پر بات کر کے انہیں ساری بات بتا دی کہ وہ کسی طرح مقامی پولیس انتظامیہ کے افسر سے رابطہ کر کے اُن تینوں مجرموں کے خلاف فوری ایکشن لیں، جنہوں نے سرمد بابا کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ساتھ ہی میں نے ان کو اس علاقے اور مکان کا پتا بھی بتا دیا۔

ڈاکٹرز، سرمد بابا کی جان بچانے کے لیے کوشاں تھے اور میں E.O.T ایمرجنسی آپریشن تھیٹر کے سامنے والے کوریڈور میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا، اور اللہ سے سرمد بابا کی زندگی اور شفایابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے اندر آنے جانے والے ہر فرد سے میں بے چینی کے ساتھ ان کے بارے میں پوچھتا اور ہر بار مجھے یہی جواب ملتا کہ ''دعا کریں'' اور میں دعائیں کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جمال انکل بھی آ گئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ حواس باختہ سے نظر آ رہے تھے۔ آتے ہی

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجھ سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولے۔ "اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟ ہوا کیا تھا آخر؟"

جمال انکل میرے ہی نہیں، سرمد بابا کے بھی ایک پُرانے اور قابل اعتماد آدمی تھے۔ میں انہیں ایک طرف کونے میں لے گیا اور انہیں مختصراً الفاظ میں ساری بات بتا دی۔ ان کا چہرہ بھی یہ سب سن کر غصے کے مارے سُرخ ہو گیا۔

"مجھے تو پہلے ہی اس مردود سیٹھ پر شبہ تھا، وڑائچ صاحب کو تو یہ شخص سخت ناپسند تھا، مگر میڈم عارفہ کو کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا تو دماغ ہی گھوم گیا ہے یہ لرزہ خیز حقیقت جان کر۔ یقین نہیں آتا کہ میڈم بھی ایسی گری ہوئی حرکت کرسکتی ہیں؟"

"ہاں! مجھے بھی یقین کرنا پڑا تھا جب میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا تھا۔" میں نے ہولے سے کہا تو وہ... دانت پیس کر بولے۔

"میڈم نے تو گھر کے بھیدی والا کام کیا ہے، جو اپنی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ مگر اس مردود سیٹھ کو تو ضرور پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کے خلاف فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرانا ہوگی، لیکن بات پھر وہی ہوجاتی ہے کہ بجلی اپنے گھر پہ ہی گرے گی اور جب لوگوں کو یہ پتا چلے گا کہ اس ساری سازش کے پیچھے اپنے ہی آدمی کا کام ہے تو...."

"کچھ بھی ہو جمال انکل! اصل مجرموں کو تو کٹہرے میں لانا ہی ہوگا۔ اور پھر سرمد بابا بھی اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔" میں نے کہا۔

"اللہ اپنے پیارے حبیبؐ کے صدقے وڑائچ صاحب کو شفا و زندگی دے دے۔" جمال انکل آخر میں دعائیہ لہجے میں بولے، پھر مجھ سے پوچھا۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ کچھ اُمید تو دلائی ہوگی انہوں نے؟"

میں نے ایک طویل سانس کھینچ کر کہا۔ "ابھی تک تو کوئی بات نہیں کی ہے انہوں نے۔ دیکھیں، کیا ہوتا ہے۔ آپ دعا کریں۔ ہاں جمال انکل، ایک بات کا خیال رہے۔ عارفہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی ہے۔ ابھی اس کے سامنے ایسے بن جانا جیسے مجھے اور آپ کو کچھ پتا ہی نہیں ہے، باقی میں دیکھتا ہوں۔"

وہ بھی ایک جہاندیدہ انسان تھے، میرا اشارہ بھانپ کر انہوں نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی عارفہ بھی "روتی پیٹتی" وہاں آپہنچی، اس کے ہمراہ پنکی اور دانی بھی تھے۔ اُن کے چہرے بھی اُترے ہوئے تھے۔ عارفہ کے چہرے پر تصنع کا صاف گماں ہوتا تھا، یہی نہیں، اس کی آنکھوں سے کسی اندرونی بے چینی کا تاثر بھی ملتا تھا اور ایک خوف بھی۔ اور اس کی وجہ صرف میں ہی جانتا تھا۔

"کک... کیا ہوا بابا کو؟ کس نے کیا یہ سب؟ آہ! ہم تو ان کے بغیر دنیا میں اکیلے رہ جائیں گے۔" اس نے میرے قریب آتے ہی چلتر بازی شروع کردی۔

میں گمبھیر نظروں سے اس مکار عورت کا چہرہ تکنے لگا، جہاں ریاکاری اور فریب کو معصومیت کی تہ میں اس نے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ صرف میں ہی یہ جانتا تھا کہ اس کے گورے چہرے کے پس پردہ ایک کالے دل کی کیا سیاہ کاری کارفرما تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے اندر بار بار ایک سوال گردش کررہا ہوگا۔ "آخر یہ ہو کیا گیا تھا؟ کہیں، سیٹھ نوید سے جلد بازی میں کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی تھی؟ سرمد بابا زندہ بچ گئے تو کیا ہوگا؟ وغیرہ۔

اور مجھے پورا یقین تھا کہ عارفہ نے سرمد بابا کے شدید زخمی ہونے اور ان کی اسپتال میں موجودگی کی اطلاع ملتے ہی یقیناً سیٹھ نوید سے سب سے پہلے رابطہ کرکے یہی دریافت کیا ہوگا کہ "وہ بڈھا تو تمہارے آدمیوں کے پاس یرغمال تھا۔ اس کا زخمی ہونا تو گیا بھاڑ میں، وہ شہزی کے ساتھ اسپتال کیسے پہنچ گیا؟"

اور مجھے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ تھا کہ اس کا جواب سیٹھ نوید کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، البتہ یہ خبر سنتے ہی وہ خود بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا ہوگا۔

اب آئندہ کی سنسنی خیز اور فیصلہ کن گھڑیوں میں دیکھنا یہ تھا کہ آیا پولیس اس مکان اور اس کے تینوں آدمیوں تک پہلے پہنچتی ہے یا سیٹھ نوید کے آدمی، جو یقیناً، اس کے ایما پر وہاں پولیس سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے، وہاں کی تمام نشانیاں مٹاتے ہوئے، اپنے زخمی ساتھیوں کا بارلاد کے وقت سے پہلے رفوچکر ہونے کی کوشش کریں گے؟

یہی وجہ تھی کہ اس مہم کی ابتدا سے ہی میری کوشش تھی کہ اس کے ان تینوں ساتھیوں میں سے سہیل سمیت کوئی جان سے نہ جائے، کوئی ایک آدھ مرچکا ہوتو میں نہیں کہہ سکتا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ سیٹھ نوید کے آدمیوں کی رسائی سے پہلے پولیس وہاں پہنچ جائے گی، تبھی میں نے میجر باجوہ صاحب سے یہ کام ٹرنت کروانے کی چال چلی تھی۔ اس طریقے سے پولیس کا فوراً سے پیشتر حرکت میں آنا یقینی امر تھا۔

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے عارفہ کو ایک لمحے کے لیے بڑی خوف ناک نظروں سے گھورا اور پھر اُس سے تسلی و تشفی کا ایک جملہ بھی کہے بغیر چنکی اور دانی کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھو بچو! اللہ سب بہتر کرے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناں پیارے اللہ میاں بچوں کی دعائیں جلد سُن لیتے ہیں، تو شاباش! رونے اور رنجیدہ ہونے کے بجائے ابھی سے دعا مانگنا شروع کر دو کہ وہ ہمارے بابا کو زندگی اور شفا دے۔''

دونوں بچے ذہین اور سمجھدار بھی تھے اور بڑے بھی، میری بات سن کر وہ دونوں خاموشی سے ایک طرف بنی لوہے کی بینچ پر بیٹھ گئے۔

''شش... شہزی! تت... تمہیں بابا جی کہاں سے اور کس حالت میں ملے تھے؟''

معاً عارفہ نے قدرے اٹکتے ہوئے پوچھا تو میں نے اس کے بہ ظاہر معصوم چہرے کو سُلگتی نظروں سے گھورا۔ جواب تو اُسے میں ایسا دینا چاہتا تھا کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے، لیکن ابھی یہ موقع میرے پاس محفوظ تھا، البتہ میں نے اُسے ''شاک'' دینا ضروری سمجھا۔

''میں انہیں وہیں سے لایا ہوں، جہاں اغوا کاروں نے انہیں یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا۔'' حسبِ توقع میری بات پر اس کے چہرے پہ ایک تشویش زدہ سا خوف کا تاثر چمکا اور وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

''تت... تمہارا مطلب ہے تم... خ... خود، بابا جی کو۔ تمہیں اغوا کاروں کے ٹھکانے کا کیسے پتا چلا؟'' وہ مجھ سے اپنے مطلب کی کوئی ایسی بات اُگلوانے کوشش میں تھی، جس سے وہ سیٹھ نوید کو آگاہی بہ الفاظ دیگر راہنمائی دے سکے، مگر اس کا لکنت زدہ لہجہ اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔

''ہاں! میں خود ان مجرموں کے ٹھکانے تک پہنچا تھا۔''

''یہی تو تمہاری غلطی تھی۔''

اس حرافہ نے میری غلطی پکڑی اور اب پل کے پل اس کے لہجے میں اعتماد اور ایک نیا فتنہ جنم لینے لگا تھا۔

''کاش! تم یہ مہم جوئی نہ کرتے تو آج بابا جی کی یہ حالت... نہ ہوتی، اگر تم نے اغوا کنندگان کا ٹھکانا دیکھ ہی لیا تھا تو پھر خود تیس مار خاں بننے کی کیا ضرورت تھی؟ تم پولیس کو انفارم کر دیتے۔''

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے والی لڑ رہوک اور مجرم زدہ عارفہ تو کہیں سے بھی نہیں لگی۔ اس دوران جمالی انکل بھی قریب آ گئے تھے، عارفہ کو جیسے ایک گل کھلانے کا موقع مل گیا، اگلے ہی لمحے مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس پر ایکا ایکی ہسٹریائی دورہ پڑ گیا۔ اس نے ڈھیروں ڈھیر آنسو بہاتے ہوئے میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے زور زور سے جھنجوڑتے ہوئے چلّا کر بولی۔

''تت... تمہاری ہی وجہ سے میرے بابا جی اس حالت کو پہنچے ہیں، صرف تمہاری وجہ سے۔ تم بھی اس جرم میں شریک ہو۔ تمہیں اس نازک وقت میں پولیس کی مدد لینی چاہیے تھی۔ اور... اور...''

اسی وقت عملے کے چند لوگ دوڑتے ہوئے ہماری طرف بڑھے اور ڈانٹنے کے انداز میں ہمیں متنبہ کیا کہ یہاں شور نہ مچایا جائے۔

میں نے ان سے معذرت چاہی اور نازک موقع محل دیکھتے ہوئے عارفہ کی اس دھواں دھار اداکاری و صداکاری کو فوراً ''بریک'' لگانے کی غرض سے پہلے تو ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑوایا، اور پھر قہر بار لہجے میں ایک ایک لفظ گویا چبا کر بولا۔

''محترمہ اپنی زبان اور اپنے اس ڈرامے کو لگام دیں۔ ورنہ ہوگا یہ کہ جو راز بعد میں باہم بیٹھ کر کھلے گا وہ یوں سرِ عام اور سرِ بازار کھل جائے گا۔ بات ہے رُسوائی کی، لیکن کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اگر تم یہی چاہتی ہو تو یہی سہی، سنو پھر۔

پولیس اس سلسلے میں میری مدد کم کرتی اور مخبری زیادہ، مجھے اس کا اچھی طرح تجربہ ہے، اور اگر میں بروقت حرکت میں نہ آتا تو کل صبح آپ کے یہ دونوں بچے ڈرامائی انداز میں اغوا ہو کر اُنہی کے پاس پہنچا دیے جاتے جنہوں نے سرمد بابا کو یرغمال بنا رکھا تھا اور اغوا کار، جو ابھی تک بابا جی کا اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں منہ کھلوانے میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے، چنکی اور دانی کو ان کی جذباتی کمزوری بنا کر اپنا دیرینہ مقصد حاصل کر لیتے۔ اس سے آگے کی کہانی بھی سننا چاہتی ہیں آپ؟''

اتنا کہہ کر میں رکا۔ ادھر عارفہ کے اندر کا خوف اور تشویش آمیز پریشانی، جو اس نے مگر مچھ کے آنسوؤں اور رونی شکل بنا کر چھپانے کی سعی کی تھی، میری بات سننے کے بعد جیسے پوری طرح ہویدا ہونے لگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے مصنوعی ہسٹریائی دورے کی بھی کیفیات یوں اُڑن چھو ہو گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑنا شاید اسی کو کہتے ہیں، جس کی واضح تفسیر میں اس وقت اپنے سامنے

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کمزی عارفہ کی مکروہ صورت سے مترشح ہوتے دیکھ رہا تھا۔

وہ یوں آنکھیں پھیلائے مجھے تکنے لگی جیسے کسی اور دنیا کا باسی ہوں یا کوئی ایسی خلائی مخلوق جو زمین میں بسنے والی مخلوق سے زیادہ ذہین ہو اور مافوق الفطرت بھی۔

”چلیں، اس ڈرامے کا کلائمکس بھی بتائے دیتا ہوں جس کی پروڈیوسر تم اور ڈائریکٹر سیٹھ نوید سانجھے تھا، یعنی یہ تم دونوں کی مشترکہ پیشکش تھی۔ اب باقی کی کسر سرمد بابا ان مجرموں کو پہچان کر پوری کر دیں گے، جنہوں نے انہیں اغوا کرنے کا بھیانک جرم کیا تھا اور وہ یقینی طور پر تمہارے منظورِ نواز سیٹھ نوید کے ہی آدمی تھے۔ اور کچھ؟“

”تت... تم... آخر ہو کیا شے؟“ عارفہ کے حلق سے جیسے بے اختیار پھسلا تھا، جو اس کی تسلیم شدہ شکست کا نہ صرف ثبوت تھا بلکہ اس کے ”کچے پن“ کو بھی ظاہر کرتا تھا کہ اس کی عقل صرف عام گھریلو عورتوں کی طرح سازشیں کرنے تک محدود تھی، یہ خطرناک چکر اس کے بس میں کہاں تھے۔

عارفہ کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ ہوائیاں اُڑتے چہرے اور سوکھے پڑتے حلق سے بہ مشکل یہ ٹوٹے اور بے ربط سے جملے اس سے ادا ہو پائے تھے۔

مجھے اس کی ہیئت کذائی سے لطف اندوز ہونے کا کوئی شوق نہ تھا۔ میں تو اس کا چیختا چلاتا منہ بند کرنا چاہتا تھا، اور یہ حقیقت بھی کہ وہ اب سیٹھ نوید جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت انسان کے پیچھے نہ لگے جو اسے تباہ کرنے اور اپنا دامن بچانے میں ذرا دیر نہیں لگائے گا۔ بہ صورتِ دیگر انہوں نے کسی کی قبر پر اپنے سہانے سپنوں کا جو تاج محل سجانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے وہ آشکار تو ہو ہی چکا ہے اسی لیے اب زیادہ پاؤں نہ پھیلائے۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے وہ سلاخوں کے پیچھے ہو گی۔

مجھے سرمد بابا سے ابتدا ہی سے ایک ذہنی اور قلبی قُربت ہو گئی تھی۔ میں ان کا خاندان، ان کا گھر بچانا چاہتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ موقع ملنے پر میں عارفہ کو بھی سمجھانے اور اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔

میرے منہ سے یہ حقیقت جمال انکل نے بھی سُن لی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ قریب بیٹھے عارفہ کے دونوں بچوں، چنکی اور دانی نے بھی سن لی ہو۔ البتہ جمال انکل اب عارفہ کو ایک تکلیف دہ حیرت بھری نظروں سے تکے جا رہے تھے۔

اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ہم سب ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوئے۔ ایک ڈاکٹر گہرے سبز لباس میں برآمد ہوا تھا، جس کے چہرے پہ ابھی تک ماسک لگا ہوا تھا۔ میں بلا تاخیر اس کی طرف بڑھا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! کیسے ہیں وہ؟“

ڈاکٹر نے اپنے منہ سے کپڑے کا ماسک ہٹایا اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”تم کیا لگتے ہو ان کے؟“

”میں ان کا کچھ لگتا تو نہیں ہوں لیکن، منہ بولا بیٹا ضرور ہوں ان کا۔“ میں نے جواب دیا اور بے چینی سے دوبارہ پوچھا۔ ”بتایئے ناں ڈاکٹر صاحب! وہ خیریت سے تو ہیں ناں؟“ میں بے چین اور دھڑکتی نظروں سے ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگا، وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آ رہے تھے۔ پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

”آئم سوری! اللہ کو یہی منظور تھا۔“

وہ ہولے سے میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔ میرے اندر ایک چھناکا ہوا، مجھے ایسا لگا جیسے میرا کوئی اپنا ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہو۔ دُکھ کی ایک کرب ناک لہر تھی، جو میرے وجود میں کسی خنجر کی طرح اُترتی چلی گئی۔ سرمد بابا بچھڑ گئے؟ ہمیشہ کے لیے۔ وہ بوڑھا شخص جو اطفال گھر کے ایک گوشے میں، برآمدے کے باہر، سب سے الگ تھلگ، چپ سا بیٹھا رہتا تھا، وہ بوڑھا، جس نے مجھے زندگی جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا، جس کی زندہ دل باتیں سن کر میرے اندر کی مایوسیاں چھٹنے لگی تھیں۔ وہ شفقت کرنے والا بابا آج یوں اچانک مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ کیا اس طرح بھی لوگ پل بھر میں ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں؟ کیا رشتہ تھا میرا ان سے؟ کیا لگتا تھا میں ان کا؟ کیوں مجھے ان کے اس طرح بچھڑنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنا سگا بچھڑ گیا ہو۔ آج پتا چلا کہ بعض لوگ کیسے دوسرے کو اپنا بنا لیتے ہیں کہ وہ اپنوں سے بھی زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ ہاں! یہ محض خونی رشتے کی کہانی تو نہیں ہے۔ یہ تو محبت، خلوص اور ہمدردی کے رشتوں سے بنی ہوئی ایک ایسے تعلق کی زنجیر تھی جس نے مجھے سرمد بابا سے اور انہیں مجھ سے اب تک ایسے ہی جوڑے رکھا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے اپنوں سے بھی بڑھ کر ہوں۔ آہ! مجھے اطفال گھر کا وہ معصوم سا بوڑھا کیسے بھول سکتا تھا، جو برآمدے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا، خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہتا تھا۔

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں اس وقت بچہ تھا۔ ہم دونوں کی پتا نہیں کون سی قدر مشترک تھی، جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کردیا تھا۔ بڑی عجیب دوستی ہوگئی تھی، ایک بچے اور ایک بوڑھے کی، اس قدر عجیب کہ پھر دونوں ایک دوسرے کو اپنے اندر کے دکھوں سے آگاہ کرکے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا کرتے۔ سرمد بابا بھی اندر سے اتنے ہی دکھی تھے جتنا کہ میں تھا۔

"شہزی بھیا! دادو فوت ہوگئے؟"

معاً ہی میں گمبھیر گمبھیر خیالات سے چونکا تھا۔ پنکی میرے قریب آکے غم زدہ لہجے میں بولی۔ دانی بھی اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب آچکا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے یہی بتایا ہے ناں شہزی بھیا کہ اب دادو ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے ہیں؟"

ان معصوموں کی باتوں نے مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیا۔ میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ میں نے آہستگی سے ان دونوں کے سروں پہ ہاتھ رکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولا۔

"ہاں، اللہ کو جو منظور تھا۔ اب تم اپنے دادو جانی کے لیے اللہ سے دعا کرنا، وہ انھیں جنت میں جگہ دے۔"

جمال انکل بھی بالکل بچوں کی طرح رو پڑے تھے۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ قریب کھڑی عارفہ کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے پہ پریشانی، تشویش اور دکھ کے مصنوعی تاثرات، جو تھوڑی دیر پہلے تک مجھے نظر آرہے تھے، وہ پل کے پل مفقود ہو چکے تھے۔ وہاں اب ایک سکون سا دکھائی دیتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ایسا کیوں تھا۔

☆☆☆

سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا، ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دفن ہوگئے اور مجھے ایک چپ سی کھا گئی۔ ایک کسک تھی جو میرے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ سرمد بابا کی موت کا ذمے دار میں خود کو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار خود کو یہ تسلی دینے کی ناکام کوشش کی تھی کہ میں سرمد بابا کو نہ صرف اس طرح بچانا چاہتا تھا بلکہ کچھ تلخ حقائق کو بھی بے نقاب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو آئندہ کے لیے سودمند ثابت ہوسکتے تھے۔ پولیس کے چکروں میں پڑ جاتا تو نہ صرف حقائق مسخ کردیے جاتے بلکہ سرمد بابا کی بازیابی کا معاملہ بھی کسی خطرناک انجام سے دوچار کردیا جاتا۔

اب اتنا ضرور تھا کہ کم از کم حقائق مسخ نہیں ہوسکتے تھے۔ [illegible] مجرم سہیل سمیت پولیس نے گرفتار کرلیے تھے۔ اگرچہ وہ زخمی حالت میں تھے تاہم ان کا علاج معالجہ کیا جارہا تھا۔

عابدہ کی طرف سے میری فکر و تشویش ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوئی تھی، لیکن سرمد بابا اور اس مردود سیٹھ نوید والے معاملے نے مجھے اُلجھا دیا تھا، دیکھا جاتا تو سرمد بابا کی بازیابی سے عابدہ کا مسئلہ بھی ایک طرح سے نتھی تھا۔ جبکہ امریکی نژاد مسلم خاتون لیڈی رپورٹر آنسہ خالدہ کو سرمد بابا کی موت کی اطلاع کرنا ضروری تھا، یوں بھی میں نے اس سے رابطہ کرکے عابدہ کے بارے میں خیریت وغیرہ دریافت کرنا تھی۔ اب ایک یہی میری ہمدرد خاتون تھی، جو وہاں میری اور عابدہ کی دادرسی کررہی تھی۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ اللہ نے اس نیک دل اور ہمدرد خاتون کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کے بھیجا تھا، ورنہ عابدہ کا امریکا میں اللہ کے سوا اور کون تھا جو وہاں اس کی دادرسی کرتا۔

پاکستانی معیاری وقت کے مطابق یہاں رات تھی اور وہاں امریکا میں اس وقت صبح تھی۔ میں آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

تھوڑی دیر میں میرا اس سے ٹیلی فونک رابطہ ہوگیا۔ صاحب سلامت کے مختصر وقفے کے دوران ہی خالدہ نے خاصی عجلت میں مجھ سے کہا۔

"مسٹر شہزاد! میں نے تمہیں ایک میل کی ہے اسے چیک کرو، پھر تم سے بات ہوتی ہے بلکہ ایک گھنٹے بعد ہم اب اسکائپ پر ملتے ہیں، تم تب تک میرا وہ برقی پیغام پڑھ لو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں تمہیں بھیج چکی ہوں۔"

"لل... لیکن مجھے عابدہ کے بارے میں تو بتا دو پلیز۔ وہ کیسی ہے؟ کہاں؟" میں بے چینی سے بولا۔

"سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ میں آگے کی بہتری کے لیے کوشش کررہی ہوں۔" دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔ "بس مجھے ایک گھنٹا دے دو۔ پھر اسکائپ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ اوکے؟"

"ٹھیک ہے، لیکن — مجھے تمہیں ایک اہم خبر سے آگاہ کرنا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"پلیز، ذرا جلدی۔" وہ خاصی عجلت میں لگتی تھی اور میں نے اسے سرمد بابا کے متعلق بتا دیا۔

"او مائی گاڈ! یہ کیسے ہوا؟" وہ چونکی۔ میں نے اشارتاً اُسے بتا دیا۔

"اب کیس میں تبدیلی لانا پڑے گی اور اس لائر سے بھی مجھے ملنا پڑے گا، جسے مسٹر منظور وڑائچ نے ہائر کیا ہوا

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھا۔ خیر تم فوری طور پر ایک کام کرو۔ مجھے کسی بھی طرح مسٹر منظور کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھیج دو۔ او کے بائے۔ گھنٹے بعد اسکائپ پر ملتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے اسی وقت اپنا میل چیک کیا۔ وہاں میرے لیے آنسہ خالدہ کی طرف سے صرف چند لفظی پیغام تھا۔

''اس نام کی میل اوپن کرو۔
''sweet lady@

مجھے اس مختصر ترین برقی پیغام پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ رینجرز کی خصوصی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور متعدد ''اسپائی'' آئی کیو ٹیسٹ سے گزرنے کے بعد اس طرح کے اشارے میری سمجھ سے بالاتر نہیں تھے۔

یقیناً آنسہ خالدہ مجھ سے کچھ اہم نوعیت کی معلومات شیئر کرنا چاہ رہی ہوگی۔ اور اُسے خدشہ ہوگا کہ کہیں اس کی میل امریکی خفیہ ادارے ٹریس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے اس نے اپنی ہی ایک سویٹ لیڈی کے نام سے میل آئی ڈی بھی بنا رکھی تھی۔

میں نے فوراً اس نام کی میل کلک کر کے اوپن کی تو سب سے پہلے ایک نیم عریاں عورت کی ڈانس کرتی تصویر دکھائی دی، اور ایک فحش ویب کیم سائٹ کا چمکتا دمکتا اشتہار ''بلنک'' کرنے لگا۔

عموماً ایسے جنک میل وہ ہوتے تھے جن میں کمپیوٹر وائرس کا خطرہ ہوتا تھا۔ اور یہ عام طور پر جانے انجانے لوگوں کو آتے ہی رہتے تھے۔ اور پڑھے یا کلک کیے بغیر انہیں ڈیلیٹ کر دیا جاتا تھا، لیکن میں نے اسے اوپن والے آپشن میں جا کے کلک کر دیا تو جیسے ایکاایکی سب کچھ غائب ہو گیا۔ اور اب وہاں۔ کچھ تصاویر اور ایک پیغام مجھے نظر آیا۔ جو آنسہ خالدہ کی ہی طرف سے تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھنے لگا۔ خالدہ نے لکھا تھا۔

''مسٹر شہزاد! میں اب تمہیں اسی میل ایڈریس سے پیغام وغیرہ بھیجوں گی، کیونکہ نائن الیون کی خفیہ اور غیر جانبدار تحقیقات پر یہاں کے کچھ ادارے میری کالیں اور ای میل تک ٹریس کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور بالخصوص عابدہ کے سلسلے میں جو کچھ بھی میں کر رہی ہوں، اس پر بھی میری ریکی ہو رہی ہے۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا، تاہم جتنا بھی ہوتا ہے میں تم سے رابطہ کرنے اور عابدہ سے متعلق بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مسٹر شہزاد! میں تمہیں نہیں جانتی، تم کون ہو، کیا ہو، کیا کرتے ہو؟ لیکن تمہارے دشمنوں کا اندازہ کر کے مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔

نائن الیون کے واقعے کے بعد یہاں زیادہ تر مقامی سطح پر مسلم کمیونٹی کے لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ یہ سانحہ انتہاپسندی کا نام دے کر مسلمانوں کے سر تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اصل حقائق پر پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ اور اس مذموم کوششوں میں جے بی سی پوری طرح خفیہ طور پر ملوث ہے، جس کا ٹاسک باسکل ہولارڈ نامی ایک امریکی نژاد یہودی کو دیا گیا ہے، جس کی تفاصیل گزشتہ میل میں تمہیں بھیج چکی ہوں تصاویر سمیت۔

باتیں بہت سی ہیں، موقع ملا تو مل بیٹھ کر تفصیل سے اس پر بات ہوگی، یہ باتیں تمہاری راہنمائی کے لیے تھیں۔ اب میں اصل بات کی طرف آتی ہوں۔

یہاں ہمارا موضوع عابدہ ہے۔ مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ عابدہ کو پھنسانے میں تمہاری ہی ایک ریلیٹو عارفہ کا دخل ہے۔ سی آئی اے کے ایک ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے آفیشل ایجنٹ باسکل ہولارڈ نے ہی عارفہ کو اشاروں کنایوں میں ڈرا دھمکا کر عابدہ کے خلاف بیان دینے پر اُکسایا تھا، اور عارفہ نے اپنی گردن بچانے کی خاطر... تمہاری گرل فرینڈ کو پھنسا دیا۔

یاد رہے ٹائیگر ٹیگ درحقیقت باسکل ہولارڈ ہی کی اپنی بعض جدید خطوط پر بنائی ہوئی ذاتی فورس ہے جسے وہ امریکی خفیہ ادارے میں ضم کر کے مشترکہ مفادات میں استعمال کرتا رہتا ہے۔ یہاں مسلم کمیونٹی میں یہی ونگ زیادہ فعال ہے، جس کی وجہ سے یہاں اس کی کافی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔

باسکل ہولارڈ بڑے اثر ورسوخ کا مالک ہے، جس کی پشت پر انہی لوگوں کا ہاتھ ہے جو امریکا مشنری پر اثرانداز رہتے ہیں، یعنی یہودی لابی، جو وہاں بہ ظاہر سوداگروں کی ایک انجمن جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کا لبادہ اُوڑھے ہوئے ہے۔ باسکل ہولارڈ درون خانہ ان کا نمائندہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ باسکل ہولارڈ فطرتاً مجرم ذہنیت کا آدمی ہے، اور محکمانہ اختیارات سے ہٹ کر بھی اس کے بعض ذاتی تعلقات ہیں جو بڑے خطرناک نوعیت کے ہیں۔ ان میں ایک لولوش کا نام سرفہرست ہے، جو اب اس کا داماد بھی بن چکا ہے۔ لولوش کے بارے میں بھی تمہیں بتا چکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے تمہارے عابدہ والے معاملے میں، میں

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

خود بھی یہاں خطرناک لوگوں کی نظروں میں آنے لگی ہوں، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں یہاں مقیم مسلم کمیونٹی کی پروٹیکشن کے سلسلے میں ہر دم اور بلا خوف فعال رہتی ہوں۔ اور صرف اللہ سے ڈرتی ہوں۔

اب آخری اور اہم بات سن لو۔ ابھی تھوڑے دن پہلے اپنی جان پہ کھیل کر باسکل ہولارڈ اور اس کے داماد لولووش کی باہم خفیہ گفتگو میرے علم میں آئی ہے۔ سی آئی اے نے پاکستان میں تمہیں ٹارگٹ کرنے یا اغوا کرنے کے لیے ایک خفیہ آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سی آئی اے کے دو ٹاپ ایجنٹ، جو یقینی طور پر ٹائیگر فیگ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، عنقریب ان دونوں کو پاکستان تمہاری تلاش اور اغوا کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔ خدا کے لیے اسے معمولی بات مت سمجھنا۔ کیونکہ پوری سی آئی اے ایک طرف اور ان کا یہ ایک ونگ (ٹائیگر فیگ) ایک طرف ہے۔ اتنا اشارہ کافی ہے۔ بات ختم کرتی ہوں، فوراً اسکائپ پر ملو۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔''

آنسہ خالدہ کا یہ برقی پیغام پڑھنے کے بعد میں کئی ثانیوں تک سناٹے کی سی کیفیات میں رہا۔ مجھے اس کا کوئی خوف نہ تھا کہ ٹائیگر فیگ کے دو ٹاپ ایجنٹ مجھے خفیہ طور پر امریکا لے جانے کے لیے اغوا کرنے کی نیت سے کسی بھی وقت وارد ہونے والے تھے۔ امریکا تو میں خود بھی جانا چاہتا تھا، یہ میرا ایک جوش ہی تھا، مگر معاملہ شاید اتنا ہی نہ تھا، جیسا کہ خالدہ نے ذکر کیا تھا۔ وہ امریکی مجھے عالمی سطح پر ایک بڑا دہشت گرد قرار دینا چاہتے تھے یا معاملہ اس سے بھی آگے کا تھا، یہ واضح ہونا ابھی باقی تھا۔

میل پڑھنے کے بعد میں نے فوراً اپنی اسکائپ آئی ڈی اوپن کی۔ تو چونک پڑا، وہاں خالدہ پہلے سے آن لائن تھی۔ میں نے اُسے جیسے ہی ''hi'' کا میسج کیا اس کی ویڈیو کالنگ آگئی۔ میں اپنا ویب کیم سیٹ کر چکا تھا۔ اب ہیڈفون کان پر چڑھا لیا، اس میں مائیک بھی نصب تھا۔

میں نے اس کی ویڈیو کالنگ کا جواب دیا اور اگلے ہی لمحے اس کی تصویر آگئی۔ ابتدا میں تصویر ذرا الجھن کرتی رہی اس کے بعد صحیح ہوگئی۔ وہ ایک ملائم اور چمکدار سی جلد والی ہلکی سانولی رنگت کی خاتون تھی اور خاصی اسمارٹ اور پرکشش لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تیز سی چمک تھی اور چہرہ قدرے بیضوی تھا، بال بوائے کٹ تھے، اس کی شخصیت میں مجھے خاصا رعب داب محسوس ہوا تھا، وہ مجھے دیکھ کر بڑے دل نشیں انداز میں مسکرائی اور ''ہیلو'' کہتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی ہلا دیا۔ میں نے بھی یہی کچھ کیا۔

''ہم! خاصے ہینڈسم اور اسمارٹ ہو۔ تم تو صورت سے ہی بالی وڈ کی اسپائی فلموں کے ہیرو نظر آرہے ہو۔'' اُس نے کہا۔ اس کی آواز میں بیک وقت مٹھاس اور رعب کا تاثر ملتا تھا۔ میں ہولے سے مسکرا دیا اور مقصد کی بات کی طرف آنے کی غرض سے بولا۔

''شکریہ! آپ کیسی ہیں؟ میں نے آپ کا ای میل پڑھ لیا، اور ممنون بھی ہوں آپ کا، لیکن مجھے زیادہ فکر عابدہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔''

میری بات سن کر وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''مسٹر شہزاد! عابدہ کے معاملے سے میں ایک لمحے کے لیے بھی... غافل نہیں ہوئی ہوں۔ یہ میرا ٹاسک بھی ہے کہ اُس معصوم کو باسکل ہولارڈ جیسے خبیث انسان کے پنجوں سے آزادی دلواؤں ... بلکہ اس کا مکروہ چہرہ بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کروں ... لیکن میں تمہیں کسی خوش فہمی میں نہیں رکھنا چاہتی۔

عابدہ کا معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، میں اس کی پروٹیکشن میں ہوں۔ مگر میرے لیے اصل پریشانی اور تشویش کی بات ٹائیگر ٹیگ کے وہ دو ایجنٹ ہیں جنہیں تمہیں اغوا کرنے کا ٹاسک دیا جانے والا ہے، اب بار بار تمہارے سامنے اس بات کا اظہار کرتا مجھے آکورڈ ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ اور ایسی بہت سی خفیہ انفارمیشن میں نے کیسے حاصل کی ہیں۔ اس سے پہلے امریکی ملکی اور سفارتی سطح پر حکومت پاکستان سے تمہاری حوالگی کے سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور مجھے یقین بھی تھا کہ تمہارا ملک تمہیں امریکا کا مجرم سمجھتے ہوئے .... پلیٹ میں سجا کر ان کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اس کڑوی حقیقت کا بھی اندازہ ہے کہ امریکا کا اگر ایک کتا بھی پاکستان میں کسی مجرمانہ کارروائی میں ملوث پایا جائے تو اُسے کوئی سزا دینے کے بجائے، نہلا دھلا کر باعزت طریقے سے، سات سلامیاں دے کر جہاز میں سوار کروا کے امریکا روانہ کر دیں گے۔

تمہیں شاید میری بات بُری لگی ہو، مگر حقیقت یہی ہے۔ اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں ہے، جب میں اپنے مسلم بھائیوں اور بہنوں سے محبت کرتی ہوں تو مجھے بھلا مسلم ممالک سے کیوں نہ محبت ہوگی؟ بس کچھ تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے، ان میں بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بحث طویل ہو جائے گی۔ میرا تم سے رابطہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں بالخصوص فوری خطرات

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے آگاہ کروں۔ جیسے ہی وہ دو ایجنٹ فائنل ہوں گے میں تمہیں ان کی تصاویر اور آمد سے مطلع کردوں گی۔ اس کے بعد تم کو... کیا کرنا ہے ان کے ساتھ یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "مس خالدہ! میں آپ کے عزم کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے بروقت ایک اہم خطرے سے آگاہ کیا، میں اب اس بڑھتے ہوئے خطرے کو پوری سنجیدگی سے مدِ نگاہ رکھوں گا اور آپ کی آئندہ اور وقتاً فوقتاً انفارمیشن کی راہنمائی میں بھی قدم اُٹھانے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا، لیکن اس وقت میری ساری توجہ عابدہ پر مرکوز ہے، آپ اس سلسلے میں اپنی کاوشوں کو آگے بڑھاتی رہیں تو مجھے تسلی کے ساتھ خوشی بھی ہو گی۔"

"آف کورس! میں یہی تو کر رہی ہوں، تم تسلی رکھو۔" وہ مسکرائی۔ پھر معنی خیز لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے تم اپنی گرل فرینڈ سے بہت محبت کرتے ہو، اور خود سے زیادہ تمہیں اس کی فکر ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں مس خالدہ! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔"

"او کے! تم سے بات کرکے، تمہیں دیکھ کے خوشی ہوئی، میری باتوں کو دھیان میں رکھنا۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔ فی امان اللہ۔" اس نے رُخصت ہوتے وقت پہلی بار اسلامی انداز میں مجھے خدا حافظ کہا اور میں نے بھی اسی انداز میں اسے سلام کیا تھا۔

اسکرین تاریک ہوتے ہی میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ شکیلہ اور اول خیر کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے، گفتگو ختم ہوتے ہی دونوں میری طرف آ گئے تھے۔ شکیلہ نے تو بہت کچھ سمجھ لیا تھا، جبکہ اول خیر اُسے بار بار ٹہوکے مار رہا تھا کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔

جب بات واضح ہوئی تو اول خیر کے چہرے پر بھی شکیلہ کی طرح کے پریشان کن تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"او خیر کا کا! اے تے لمبی پسوڑی پے رہی ہے۔ وہ امریکی اب کیا تیرے بھی سر ہو رہے ہیں؟ ٹھیک ہے پھر آ لینے دو ان خبیثوں کو۔ نمٹ لیں گے ان سے بھی۔"

"اول خیر! مجھے خود سے زیادہ عابدہ کی فکر ستا رہی ہے۔ میں تو ان حالات کو فیس کر ہی لوں گا، مگر وہ بے چاری ایک بڑے عالمی گھن چکر میں پھنس گئی ہے۔ اور میں ادھر بے بسی سے اپنے ہاتھ مل رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کاکے! پر ہم عابدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے ہیں، اور پھر وہاں اپنی مسلم بہنا آنسہ خالدہ بھی کوشش کر رہی ہے، پر یہ جو سی آئی اے اپنے جو دو ایجنٹ تیرے چکر میں بھیج رہے ہیں، وہ...؟"

"آ لینے دو انہیں بھی، یہ میرا کام آسان کرنے آ رہے ہیں اول خیر!" میں نے اس کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک... کیا مطلب کاکے؟" اول خیر شاید کچھ کچھ سمجھتے ہوئے تشویش زدہ آواز میں بولا۔

"ہاں میرے یار! میں خود بھی ان کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ آ لینے دو انہیں۔ یہ میرا کام آسان کرنے ہی آ رہے ہیں۔"

"شہزی! کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ تم خود بھی یہی چاہ رہے ہو کہ وہ تمہیں واقعی اغوا کر کے امریکا پہنچا دیں؟" شکیلہ میرا اشارہ پوری طرح بھانپ چکی تھی۔

"ہاں شکیلہ! تم ٹھیک سمجھی ہو، لیکن وہ مجھے نہیں بلکہ اپنی موت کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"او... خیر کاکے! یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔ ایسا نہیں کرنے دیں گے ہم تجھے۔" اول خیر پریشانی سے بولا۔ "یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، اور نہ ہی ملتان سے ساہیوال تک کا معاملہ ہے یہ ساتھ سمندر پار اور امریکا جیسے سُپر پاور ملک کا معاملہ ہے۔ نجانے کیسے کیسے خطرناک لوگ ہوں گے وہاں۔ نہ نہ۔ کاکے۔ ناں! سوچ سمجھ کے بولا کر ذرا۔"

"یہ صحیح ہے شہزی! خدا کے لیے اس معاملے کو اتنا معمولی مت سمجھو کہ..." شکیلہ بولی۔

"میں صرف اللہ کی طاقت کو سُپر پاور تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی اس موضوع کو چھوڑ دو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں اس وقت ہر قیمت پر وزیر جان کو ٹارگٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو چل چل کاکے! میں ساتھ ہوں تیرے۔ ڈھونڈ نکالتے ہیں اسے بھی۔" اول خیر یک دم بولا۔

"ہوں۔ اس کے فلاحی ادارے والے دفتر کا پہلے رُخ کریں گے، پھر اس کی ساہیوال والی رہائش گاہ کا۔" میں خود کلامیہ انداز میں بولا۔ اور اول خیر نے اپنے سر کو اثباتی... جنبش دی تھی۔

☆☆☆

ماں جی آج کل زہرہ بھابی کے بہ صد اصرار پر ان کے ہاں "بیگم ولا" میں مقیم تھیں اور وہ دونوں ساس بہو،

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ایک دوسرے سے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں ہی باتیں کرتی رہتی تھیں، ماں جی کو جب سے یہ پتا چلا تھا کہ زہرہ بانو ان کی بہو تھیں، انہیں زہرہ بانو سے ایک خاص قسم کی اُنسیت ہوگئی تھی۔

زہرہ بانو نے جتنا عرصہ بھی لئیق شاہ کی ''سنگت'' میں گزارا تھا وہ سب ماں جی سے شیئر کرتی تھی۔

میں نے بھی یہی سوچ کر ماں جی کو زہرہ بانو کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کہ اس طرح ماں جی کا بھی کچھ موڈ چینج ہوجائے گا۔

میجر ریاض باجوہ کی مداخلت کے باعث تینوں مجرموں کو اسپیشل انوسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ کے سپرد کردیا گیا تھا اور ان کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ گرفتاری بھی جاری کیے جا چکے تھے۔ عدالت کی طرف سے پولیس کو دی گئی ریمانڈ کی مدت کے دوران ہی تینوں نے اقبالِ جرم قبول لیا تھا۔ ان کے بیانات کی روشنی میں پولیس نے سیٹھ نوید سانچے والے کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک قابل اور شہر کے بڑے وکیل کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ اپنے جرم سے انکاری تھا، مگر اس کے خلاف کیس بہت مضبوط اور شواہد و ثبوت ناقابلِ تردید تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ساتھ عارفہ کو بھی پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ مگر ابھی تک ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آرہی تھی، نظر یہی آتا تھا کہ عارفہ اور اس کا گٹھ جوڑ بہت مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔

سرمد بابا کے آنجہانی ہونے اور سیٹھ نوید کی گرفتاری کے بعد آڑیسہ کمپنی کے اشتہار کی کیا اہمیت و وقعت رہ گئی تھی، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

میں نے ریاض باجوہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی میٹنگ میں انہیں عابدہ کے حالات اور آنسہ خالدہ سے ہونے والی گفتگو اور روابط وغیرہ سے اچھی طرح ''اَپ ڈیٹ'' کردیا تھا۔

سی آئی اے کے کمانڈو ونگ ''ٹائیگر ٹیک'' کے اُن دو ایجنٹوں کی پاکستان میں متوقع اور خفیہ آمد کے سلسلے میں بھی میجر ریاض باجوہ نے گہری تشویش کا اظہار کیا تھا، تاہم میری طرح وہ بھی ان سے آڑے ہاتھوں نمٹنے کے لیے پوری طرح پرعزم تھے۔ ان دو متوقع ایجنٹوں کو ٹریس کرنے کے لیے انہوں نے اپنی خفیہ فورس ''پاور'' کو متحرک کردیا تھا، ساتھ ہی مجھے بھی محتاط رہنے کی ہدایت کردی تھی۔

اس سلسلے میں میجر ریاض کا کہنا تھا کہ۔ ان دونوں سی آئی اے کے ایجنٹوں سے خفیہ ذریعے سے ہی نمٹنا ہوگا، کیونکہ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ ان ایجنٹوں کے اپنے مشن میں ناکامی اور ظاہر ہونے کے بعد سیاسی حکومتی قیادت انہیں ''باعزت'' طور پر اور کوئی الزام ... عائد کیے بغیر واپس امریکا روانہ کردے گی۔

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ دونوں ایجنٹ یہاں آکر اپنی موت آپ ہی مرجائیں، تاکہ پھر کسی غیر ملکی ایجنٹ کو وطنِ عزیز میں اس طرح کی ''مہم جوئی'' کی جراَت نہ ہوسکے۔

مجھے چند روز بعد جمال انکل نے فون کرکے بتایا کہ سرمد بابا مرحوم کے وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا۔

میں اس وقت اول خیر کے ساتھ وزیر جان کو قابو کرنے کی مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔

میں ایک اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا، آخر ایسی کیا بات تھی کہ سرمد بابا کے وکیل کو میری ضرورت پیش آگئی تھی؟ مجھے یہاں کسی اور ہی معاملے کی ابتدا ہوتی محسوس ہونے لگی تو اس پر سے پردہ ہٹانے کے لیے میں جمال انکل کو فون کرکے دفتر جا پہنچا، اول خیر میرے ساتھ تھا۔

مجھے اس بات پر کچھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ وکیل صاحب سے آخر میری ملاقات سرمد بابا کے دفتر میں ہی کیوں کروائی جارہی تھی؟ اگر انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی اہم یا خفیہ نوعیت کی بات کرنا تھی تو وہ مجھے اپنے دفتر میں بھی بلا سکتے تھے؟ بعد میں پتا چلا کہ اس کی ایک اہم وجہ تھی، وہ عارفہ اور اس کے دونوں بچوں، پنکی اور وانی کو بھی اس میٹنگ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال میں اول خیر کے ہمراہ دفتر پہنچا۔ وہاں ایک الگ اور بند کمرے میں اس ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اول خیر کو اس ''چھوٹی'' میٹنگ میں شرکت کرنے سے روکا گیا، اور روکنے والی تھی عارفہ، مگر میں اڑ گیا اور اس میٹنگ میں مشروط شرکت کی ضد کر ڈالی، کیونکہ مجھے اب تک اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ میٹنگ کے شرکا میں میری اہمیت مسلّمہ تھی، ناچار عارفہ کو ہی جھکنا پڑا۔ اول خیر شامل کیا گیا اور میٹنگ کے آغاز میں ہی مجھے پتا چلا کہ یہ میٹنگ درحقیقت سرمد بابا مرحوم کی وصیت سنانے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ جس کا اظہار ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے ابتدا میں کردیا تھا، اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ بھلا سرمد بابا کی خاندانی وصیت سے میرا کیا تعلق ہوسکتا تھا؟

میں نے کن انکھیوں سے عارفہ کی طرف بھی دیکھا تھا،

Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اس کے چہرے پہ ناگواری اور نفرت کے ملے جلے تاثرات سمیت ایک عجیب سی بے چینی بھی کروٹیں لے رہی تھی۔

صاف لگتا تھا کہ اُسے میری شمولیت ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اور اب مجھے ایک کڑوی گولی کی طرح نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جس قدر مجھ سے پیچھا چھڑانے کی تگ ودو میں رہتی، میں کسی نہ کسی بہانے پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا اور یہ حقیقت ہی تھی کہ جب تک عابدہ کا معاملہ بہ خیر وخوبی طے نہیں پا جاتا، میں اس کا پیچھا یوں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے اب اصل بات کا آغاز کر دینا چاہیے۔''

چند ضروری ابتدائی کلمات اور سرمد بابا کی رحلت سے متعلق متاسفانہ اظہار کے بعد ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے کہا۔ پھر اپنے ہمراہ لائے گرے کلر کے بریف کیس کو کھولنے لگے۔ پھر اندر سے ایک فائل نکالنے کے دوران بولے۔

''سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا کی وصیت کے سلسلے میں عارفہ اور شہزاد احمد خان عرف شہزی کو آگاہ کرنا، میرے ذمے ایک قانونی فریضہ تھا جسے آج میں پورا کر رہا ہوں۔'' وہ خاموش ہوئے۔ فائل ان کے سامنے کھل چکی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد انہوں نے باری باری میری اور عارفہ کی طرف دیکھا، پھر ہولے سے کھنکھار کر دوبارہ گمبھیر لہجے میں گویا ہوئے۔

''سیٹھ منظور وڑائچ صاحب، اگرچہ بہت پہلے اپنی وصیت تیار کروا چکے تھے، مگر بعد میں نجانے کیا ہوا کہ انہوں نے خود ہی اپنی وصیت کو کالعدم قرار دے کر ختم کر دیا تھا، پھر ایک طویل عرصے تک انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔ اگرچہ میں ان کا عائلی وکیل رہ چکا تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر رُکے اور ایک نگاہ اپنے دائیں جانب کی چیئر پہ براجمان عارفہ پر ڈالی پھر آگے بولے۔

''پھر کچھ ہی عرصہ پہلے اچانک انہوں نے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا، مگر افسوس کہ اُس وقت وہ سیٹھ منظور وڑائچ نہیں بلکہ سرمد بابا تھے، آپ شاید میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں، یعنی اُن کا سب کچھ ان کے بیٹے محمود کے نام ہو چکا تھا، یا کیا جا چکا تھا۔''

میں نے محسوس کیا کہ ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے دانستہ اس جملے کو وضاحت کے ساتھ ادا کیا تھا، اور ایک بار پھر عارفہ پر نگاہ ڈالی تھی، جس کے چہرے پہ اب پریشانی اور بے چینی سمیت اب خجالت کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔

وکیل صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے محتاط لہجے میں مزید بولے۔ ''میرا ان کی ذاتیات سے تو کوئی تعلق نہ تھا، لیکن بہرحال میں ان کا تنخواہ دار وکیل تو تھا اور میرا یہ فرض تھا کہ میں انہیں نیک اور اچھے مشورے بھی دیتا رہوں، انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے بیٹے محمود کا ایک جانکاہ حادثے میں انتقال ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے بیٹے کے نام تھا وہ لامحالہ اس کی بیوہ عارفہ کے نام منتقل ہو چکا ہے۔ وہ قانون نہیں جانتے تھے، مگر میں نے انہیں قانون کی ایک شق سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ آپ کے مرحوم بیٹے محمود نے براہِ راست آپ سے ہی آپ کا سب کچھ اپنے نام کروایا تھا، چاہے وہ جس طریقے سے بھی کروایا ہو۔ لیکن اب ان کے انتقال کے بعد قانون کی رو سے یہ دوبارہ آپ کا ہو جائے گا، مگر آفرین ہے ان پر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنا سب کچھ اپنی بیوہ بہو مس عارفہ محمود کے نام ہی رہنے دیا۔''

اسی وقت میں نے دیکھا کہ عارفہ کے چہرے پہ، جہاں تھوڑی دیر قبل پریشانی اور بے چینی کے آثار تھے، وہ یکدم ایک مسرت آمیز طمانیت میں بدل گئے۔

''ہاں! انہوں نے صرف اس قدر ضرور کیا کہ پاور آف اٹارنی اپنے پاس رکھی تھی، اور بعض معاملات میں وہ مجاز بھی تھے کہ اپنا دیا ہوا، وہ کس کے حوالے کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ لیکن اب ان کا پیسا، بینک بیلنس، پراپرٹیز اور کاروبار، سب کچھ ان کی بیوہ بہو عارفہ کے نام ہو چکا ہے۔ ماسوائے اڑیسہ کمپنی کے وہ پچاس فیصد شیئرز کے۔''

''کک... کیا مطلب؟ وہ کس کے نام ہیں پھر؟'' عارفہ ایک دم چلا اُٹھی۔ وہ شیئرز خالصتاً میرے مرحوم شوہر محمود ہی کی ملکیت تھے۔'' ان سے سیٹھ منظور وڑائچ کا کوئی تعلق تھا، نہ ہی ان کا حق تھا ان پر۔''

''مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دیں عارفہ صاحبہ! وصیت سن لینے کے بعد آپ کے تمام اعتراضات اور تحفظات سننے کے لیے میں ابھی ادھر ہی موجود رہوں گا، اسی لیے میں نے میٹنگ کے لیے آپ ہی کے دفتر کا انتخاب کیا ہے۔'' ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے گہری متانت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

عارفہ کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنا کچھ حاصل ہونے کے باوجود اس حریص عورت کے حواسوں پر لالچ و طمع اس قدر سوار تھا کہ شیئرز سے محرومی کا سن کر وہ باؤلی ہو گئی تھی۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سلیم ہیرانی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ایسا فوراً ہی نہیں ہوا تھا، بے شک وہ شیئرز سیٹھ منظور وڑائچ کے بیٹے محمود ہی کی ملکیت میں شمار ہوتے تھے، لیکن چونکہ قانون کی رو سے سب کچھ منظور وڑائچ ہی کے توسط سے ان کے بیٹے کے نام تھا، اسی لیے قانون کی رو سے وہ بھی ان میں ردوبدل کرنے کے مجاز تھے۔ بلکہ وہ تو اپنا سب کچھ اپنے ہی نام دوبارہ کرنے کا بھی قانونی حق رکھتے تھے مگر جانے کیا بات تھی کہ بعد میں انہوں نے وہ سب کچھ اپنے دونوں پوتے پوتی، نعیمہ عرف پنکی اور خرم دانش عرف دانی کے نام کر دیا جبکہ اس کی پاور آف اٹارنی ان کی ماں عارفہ کو سونپ دی، اور یہ شرط رکھی کہ اگر عارفہ سیٹھ نوید احمد کے نکاح میں جاتی ہے تو یہ پاور بھی اس کے پاس نہیں رہے گی۔ ہاں البتہ کسی اور نیک شریف آدمی کے نکاح میں اپنی مرضی سے جائے تو یہ پاور اسی کے پاس محفوظ رہے گی اور یہ سب میری وفات کے بعد ناقابلِ تنسیخ سمجھا جائے۔ تاہم کاروبار میں پچیس فیصد حصہ غیر مشروط طور پر میری بہو عارفہ اپنا بھی حق رکھے گی۔ اب رہی بات اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کی جو انہوں نے خالصتاً اپنے نام کروا رکھے تھے۔ اگرچہ یہ بھی پہلے ان کے بیٹے محمود کے ہی نام تھے تاہم بعد میں منظور صاحب مرحوم نے اپنی وصیت میں اس سلسلے میں بھی ردوبدل کروائی تھی۔

اب رہی بات یہ کہ اڑیسہ کمپنی کے وہ پچاس فیصد شیئرز اب کس کی ملکیت کہلائیں گے تو اس سلسلے میں وصیت کا آخری باب پڑھ کے بتائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ کاپیاں آپ دونوں کو دے دوں گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بہ آوازِ بلند وصیت کا آخری باب پڑھا۔

''زندگی اور موت کا مالک صرف اللہ ہے۔ یہ کب اور کیسے آنی ہوتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا، تاہم کچھ تحفظات کے پیشِ نظر میں اپنے مرنے کے بعد، خواہ وہ ناگہانی ہو، میں اڑیسہ کمپنی کے پچاس فیصد شیئرز کی مکمل پاور آف اٹارنی اپنے منہ بولے بیٹے شہزاد احمد خان عرف شہزی کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اسے جیسے چاہے استعمال کرنے کا قانونی مجاز ہوگا۔ اور اس سے حاصل کردہ منافع کا نصف مختار بھی ہوگا، چاہے اب وہ اسے فروخت کرے یا اس سے کاروبار کو آگے بڑھائے۔ باقی پچاس فیصد میرے دونوں پوتے پوتی کے نام ہوگا۔

بقلم خود سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا۔''

''مائی فٹ!'' عارفہ ایک بار پھر ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ''میں نہیں مانتی اس لغو وصیت کو۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔ یہ اسی کی سازش ہے۔'' اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ ''میں اس وصیت کو کورٹ میں چیلنج کروں گی۔''

''شیور! آپ اس کا حق رکھتی ہیں۔ تو پھر آپ مجھے بتا دیجیے گا کہ کب آپ اس نیک کام کا ارادہ رکھتی ہیں؟'' ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے بپھری ہوئی عارفہ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا اور آگے بولے۔

''تاکہ میں مزید کچھ کاغذات تیار کر لوں۔ کیونکہ سرمد بابا نے اپنی وصیت میں یہ شق بھی رکھی ہے۔ اس صورت میں، انہوں نے کچھ ثبوت کے ساتھ جو باتیں مجھ سے پرسنلی شیئرز کی ہیں وہ مجھے مجبوراً کورٹ میں طشت ازبام کرنا پڑ جائیں گی، اور پھر آپ کو بعد میں ہر قسم کے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی بعید نہیں آپ کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی کی اس بات پر عارفہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا مگر وہ بری طرح تلملا بھی رہی تھی۔

میرے چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ میں تو سب جانتا تھا کہ سرمد بابا کن حالات سے گزر رہے تھے، ایسے میں انہوں نے جو کیا تھا بالکل ٹھیک ہی کیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے اپنے آخری ایام میں میری طرح اپنی بہو عارفہ اور سیٹھ نوید کے خفیہ گٹھ جوڑ سے آگاہی حاصل کر لی ہو اور ان کا دل خراب ہو گیا ہو۔ تاہم انہوں نے بعد میں سوچا ہو کہ عارفہ ایک اکیلی عورت ہے، زیادہ عمر بھی نہیں ہوئی، اگر دوسری شادی کرتی بھی ہے تو پتا نہیں سوتیلے باپ کا ان کے ان کے پوتے پوتی کے ساتھ کیسا سلوک ہو؟ کہیں وہ عارفہ کو بے وقوف بنا کر اس کا سارا کچھ ہڑپ ہی نہ کر لے۔

سرمد بابا صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا بھی تھے، اور ایسے حالات میں ایسے بوڑھوں کی دور اندیشی سے انکار ممکن نہیں۔

میٹنگ کے بعد بھی متعلقہ نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے مجھ سے اپنے دفتر آنے کا وقت مانگا، میں نے انہیں یہ بات بعد میں فون پہ بتانے کا کہا، وہ میرا اشارہ سمجھ گئے، اس کے بعد عارفہ سے بھی یہی بات پوچھی، اس نے فوراً اگلے دن ہی پہنچنے کا کہہ دیا، مگر اب اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، وصیت کو عدالت میں چیلنج کرنے کا جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کے اندر جوش تھا وہ ہیرانی صاحب کی تنبیہ کے بعد ماند پڑ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگی تو پنکی اور دانی میری طرف بڑھے، اور میرا ایک ہاتھ چھو کر پنکی نے بڑی رسانیت

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے کہا۔

''بھائی جان! آپ آیئے ناں ہمارے گھر؟ آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

اس کی دیکھا دیکھی دانی بھی بولا۔ ''ہاں بھائی جان! دادو جان کے بعد ہم خود کو بالکل اکیلے ہی سمجھنے لگے ہیں، آپ سے کچھ سہارا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اب کبھی بھی ہمارے گھر نہیں آئیں گے؟''

مجھے ان دونوں پر بے اختیار پیار آ گیا۔ یہ سرمد بابا کی ان کے ساتھ محبت اور میرا ان سے بے لوث برتاؤ تھا کہ یہ دونوں مجھے بھی اپنے ہی گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

''تم سے کس نے یہ کہہ دیا کہ میں اب تمہارے گھر نہیں آیا کروں گا؟ تمہارے دادو جان نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا کہہ کر تم سے میرا جو رشتہ ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اور پھر اب اس وصیت کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ میں ضرور آیا کروں گا۔'' اس کے بعد میں نے ذرا جھک کر ان دونوں کی پیشانیوں کو چوما۔

دونوں کے چہروں پہ میں نے طمانیت اور خوشی کے آثار محسوس کیے تھے۔ جس کا اظہار ان دونوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کے دبا کر کیا تھا۔ میں بھی ہولے سے مسکرا دیا تھا اور ترچھی نظروں سے قریب کھڑی عارفہ کی طرف دیکھا تھا، اس کا چہرہ بھرپور نفرت کی عکاسی کر رہا تھا۔ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔

''او خیر کاکے! یہ اپنے سرمد بابا تو تم کو بھی جاتے جاتے سیٹھ بنا گئے۔ کروڑوں کی مالیت کے شیئرز میں سے نصف حصہ تمہارے نام کر گئے!''

کار میں روانہ ہوتے وقت اول خیر نے بڑی عجیب کہہ دی۔ مجھے اس کی بات بری لگی۔ مگر میں جانتا تھا کہ ایسا اس نے رواروی اور مذاق میں کہا تھا، ورنہ وہ مجھے یہ خوبی ... جانتا تھا کہ میں ایسی کسی شے کو لینا ہی پسند نہیں کرتا، جو میری نہ ہو۔ لہٰذا بولا۔

''سرمد بابا ایک طرح سے مجھے ایک بڑی ذمے داری سونپ گئے ہیں۔ ان شیئرز پر میں اپنا حق نہیں سمجھتا۔ ان کی وصیت اپنی جگہ نیک نیتی پر مبنی ہے، اور ایک طرح سے انہوں نے مجھے منہ بولا بیٹا ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے ساتھ کس قدر مخلص تھا، وہ اس کا بارہا میرے سامنے اظہار بھی کر چکے تھے کہ اگر ان کا بیٹا محمود بھی زندہ ہوتا تو وہ تب بھی اس سے زیادہ مجھ پر بھروسا کرتے۔ اللہ انہیں جنت بخشے عجیب فقیر منش انسان تھے وہ۔''

''آمین!'' اول خیر زیر لب بولا۔ ''لیکن کاکے وہ نیک نیتی ہی کے ساتھ تمہیں ان پچاس فیصد شیئرز کے منافع کا مختار و مالک بنا گئے ہیں اور تم اس کا حق بھی رکھتے ہو۔ جبکہ تم یہ بھی سمجھ رہے ہو کہ وہ ایک طرح سے تمہیں ایک بڑی ذمے داری بھی سونپ گئے ہیں۔ سرمد بابا تمہیں اپنی خوشی سے دے گئے ہیں۔ تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔''

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے اول خیر؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو مذاق کر رہا ہے میرے ساتھ؟'' مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں کاکے! میں تیرے ساتھ کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھا رہا ہوں تجھے۔ یہ ایک جنگ ہے، اور اس میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا ہے، اسے ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔ اور پھر یہ تو اس دنیا سے رخصت ہونے والے ایک ایسے شخص کا اپنی خوشی سے دیا ہوا وہ تحفہ ہے جس کا اس نے تجھے حقدار سمجھا ہے۔ تو بتا مجھے، تو نے اور عابدہ بہن نے سرمد بابا کی خاطر کیا نہیں کیا؟ اور اب تک کر رہا ہے بلکہ وہ تیرا اچھے خاندان سے جو رشتہ جوڑ چکے ہیں، وہ ایک طے شدہ امر ہے کہ تو ان کے بعد بھی ان کے خاندان کی دیکھ بھال میں شامل رہے گا، سرمد بابا نے تجھے ایسے ہی نہیں زبانی کلامی اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ بلکہ وہ تجھے ایسا سمجھتے بھی تھے، اور تو نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔ کاکے! تیری جنگ بہت پھیل چکی ہے۔ جب تک یہ زندگی ساتھ دے گی اول خیر کو تو بغیر کسی غرض کے اپنے ساتھ پائے گا، لیکن کاکے! پیسوں کی تجھے ضرورت رہے گی۔ اس رضاکارانہ نوکری میں بے شک تجھے تھوڑا بہت جو مل رہا ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جس حساب سے تیرے ملکی و غیر ملکی دشمنوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی اس اہم ضرورت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لولوش جیسے عالمی مجرم اور باسکل ہولارڈ جیسے خبیث سی آئی اے افسر سے نمٹنے کا تو میرے ذہن میں ایک آسان اور شاندار منصوبہ بھی آ چکا ہے۔ مگر تو میری بات کب مانتا ہے؟''۔

وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا تو میں نے اپنی سوچتی نظریں اس کے چہرے پہ جما دیں۔ منصوبے والی ..... بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

وہ میری بے چینی اور نیم رضامندی بھانپ کر مسکرا سے بولا۔ ''گھر پہنچ کر میں تجھے بتاتا ہوں کہ ہم نے کیا

Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرنا ہے۔"

☆☆☆

لولووش اور پاسکل ہولارڈ جیسے طاقت ور دُشمن سے نمٹنے اور عابدہ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا جو منصوبہ اول خیر نے مجھے بتایا تھا، وہ اگرچہ بادی النظر میں بالکل سادہ سا ہی محسوس ہوتا تھا لیکن شاندار اور مؤثر بھی معلوم ہوتا تھا، رہی بات خطرات کی تو وہ اپنی جگہ موجود تھے۔ ان سے نمٹنا تو ہمارا کب کا شیوہ بن چکا تھا۔

آڑیسہ کمپنی کے وہ شیئرز اب مکمل طور پر میرے تصرف میں تھے، جس میں لولووش کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ میں اب خود اس سلسلے میں لولووش سے ایک کاروباری ڈیلنگ کرتا اور یوں میری اور اس کی ملاقات متوقع ہوتی۔ یہی وہ وقت ہوتا جس سے میں فائدہ اُٹھاتے ہوئے لولووش پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں آجاتا اور اس طرح اس کی بیوی انجیلا، جو پاسکل ہولارڈ کی لاڈلی اکلوتی بیٹی تھی، اسے اغوا کرکے پاسکل ہولارڈ کے چنگل سے عابدہ کو چھڑوانے کی کوشش کرتا۔

پاسکل ہولارڈ یقیناً اپنی بیٹی اور چہیتے داماد لولووش کی رہائی کی خاطر عابدہ کو ہمارے حوالے کرنے پر مجبور ہوسکتا تھا۔ کام مشکل تھا مگر منصوبہ بے داغ تھا۔ اور یہی چیز میری ہمت اور جوش کو مہمیز کررہی تھی۔

"اول خیر! تیرا منصوبہ تو زبردست ہے لیکن لولووش سے اس سلسلے میں بات کیسے اور کہاں ہو؟"

"سیٹھ نوید کا لنک مجھے لولووش سے لگتا ہے، وہی ہماری اس سے بات کرواسکتا ہے۔" اول خیر بولا۔

"مگر وہ تو پولیس کے حوالے ہے؟"

"وہ وہاں زیادہ عرصہ نہیں رہے گا، بہت جلد ضمانت پر چھوٹ جائے گا۔"

"مگر وہ سرمد بابا کا مجرم اور قاتل ہے۔ اُسے تو میں ہر قیمت پر سزا دلوا کر رہوں گا۔"

"وہ کہیں بھاگا نہیں جارہا، اس سے بھی نمٹ لیں گے، عارفہ کے ذریعے اس سے بات ہوسکتی ہے، وہ ضرور اس سے ملاقات کرنے جاتی ہوگی بلکہ مجھے یقین ہے اس نے اب تک لاک اَپ میں ہی اس سے ملاقات کرکے اسے تازہ صورتِ حال کے بارے میں بتا بھی دیا ہوگا کہ اب اڑیسہ کمپنی کے شیئرز تمہاری ملکیت میں ہیں۔"

"میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آتا ہے۔"

"کیسا خیال؟"

"عارفہ بھی تو "تھرڈ پرسن" کا رول ادا کرکے ہماری بات لولووش سے کرواسکتی ہے؟"

"ہاں! یہ بھی ممکن ہے۔" اول خیر نے میرے خیال کی تائید کی۔ تاہم لحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "ابھی فوراً اس سلسلے میں عارفہ سے رابطہ نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ فی الحال انتظار کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ممکن ہے عارفہ یا سیٹھ نوید خود ہی ہم سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوجائیں، کیونکہ اب اس وصیت کے بعد سے عارفہ کی بھی نیندیں حرام ہوچکی ہوں گی۔ وہ بہت جلد تم سے رابطہ کرے گی۔"

"میرا خیال ہے تب تک وزیر جان کا قضیہ نمٹا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "میں اس پر اب باقاعدہ ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں، پاور والوں کی طرف سے مجھے ریڈ سگنل کا انتظار تھا جو مجھے مل چکا ہے، میری کل ہی میجر صاحب سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی، انہوں نے کیپٹن جنجوعہ صاحب سے بھی حتمی مشورہ کیا تھا۔"

"بس تو ٹھیک ہے آج رات ہی نکلتے ہیں اس مہم پر۔ اب وزیر جان کا معاملہ ختم ہوجانا چاہیے۔" اول خیر بولا۔

"ہاں اول خیر۔ جب سے مجھے اس خبیث نے بتایا ہے اور میں نے ریکارڈ روم میں اپنے باپ سے متعلق جو کچھ پڑھا ہے کہ میرا اجری سپاہی باپ زندہ ہے، مجھے بے چینی سی لگی ہوئی ہے۔ وزیر جان میرے باپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ اب اس کا منہ کھلوانا ضروری ہوگیا ہے۔ میں اب تک اسے اسی وجہ سے چھوڑتا آیا تھا کہ مجھے اس سے متعلق حقیقت کا کچھ علم نہ تھا، لیکن اب ماں جی کی زبانی مجھے حقیقت کا علم ہوچکا ہے، یہ دھوکے باز شخص نہ صرف ملک دُشمن ہے بلکہ میری ماں کا مجرم بھی، بہت ظلم ڈھایا اس نے میری مجبور ماں پر۔" میرے اندر کا اُبال خون بن کر آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔

شکیلہ نے ہمیں اس مہم پر حتمی اور فیصلہ کن طور پر مائل پایا تو مشورہ دیتے ہوئے بولی۔ "اس خطرناک مہم پر صرف تم دونوں کا جانا کافی نہ ہوگا، تمہیں پاور کے ایجنٹوں کو شامل کرنا چاہیے۔"

"وزیر جان صرف میرا شکار ہے شکیلہ!" میں نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔ "میں خود اُسے ٹھکانے لگاؤں گا تب ہی میرے اندر کی آتشِ انتقام ٹھنڈی ہوگی۔"

شکیلہ نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اول خیر نے اُسے اشارے سے خاموش کرادیا۔

☆☆☆

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

میں اور اول خیر اس مہم پر ساہیوال کی طرف روانہ ہونے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ اچانک مجھے زہرہ بانو کی کال موصول ہوئی۔ فون اٹینڈ کرتے ہی میں نے سب سے پہلے ماں جی کی خیریت دریافت کی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور میرے پاس خوش بھی، تم بتاؤ، کہاں ہو اس وقت؟'' وہ بولیں۔

''میں اپنی رہائش گاہ پر۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ اور اسی وقت میرے سیل پر کسی اور کال کی بپ کی آواز اُبھرنے لگی۔

''شہزی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے کسی کی کال موصول ہوئی تھی، وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''کون تھا وہ؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''پتا نہیں، لیکن اپنا نام بتانے سے گریزاں تھا، پوچھ رہا تھا کہ شہزاد احمد خان سے بات ہوسکتی ہے۔''

''پھر، آپ نے کیا جواب دیا اُسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ یہاں نہیں ہوتے۔'' وہ جواباً بولیں۔

''آپ نے یہاں کا تو نہیں بتایا اُسے؟'' کسی خیال کے تحت میں نے کہا۔

''نہیں، لیکن وہ تمہارا نمبر مانگ رہا تھا کہ ایک تو اس کے پاس وقت بہت کم ہے، تم سے کوئی اہم بات کرنی ہے، دوسرے وہ تم سے ملاقات بھی کرنا چاہتا ہے۔''

''حیرت ہے۔ اس کے پاس وقت بھی کم ہے اور وہ مجھ سے ملاقات کا بھی متمنی ہے؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہوگئی تھیں۔ ''آپ نے نمبر دیا اسے میرا؟''

''ہاں! دینا ہی پڑا، اس نے بات ہی ایسی کہی تھی۔'' زہرہ نے کہا۔

''کیا بات کہی تھی اس نے؟'' میں نے استفسار کیا۔ اس دوران دوسری کال کی بپ مسلسل بج رہی تھی، اور میں نے زہرہ بانو کا جواب سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

''میرا خیال ہے میرے سیل پر جس کال کی بپ بج رہی ہے، وہ اسی کی کال نہ ہو۔ میں اٹینڈ کرکے آپ سے پھر بات کرتا ہوں۔ آپ صرف مجھے یہ بتا دیں کہ اس کی کال آپ کے سیل فون پر آئی تھی یا لینڈ لائن پر؟''

''لینڈ لائن پر۔'' انہوں نے جواب دیا اور پھر میں نے رابطہ منقطع کرکے دوسری کال ریسیو کی۔

''ہیلو، شش... شہزاد خان؟'' دوسری جانب سے استفساریہ کہا گیا۔ بولنے والا مجھے خاصا عجلت میں اور کچھ اعصاب زدہ بھی لگا۔

''ہاں! بات کر رہا ہوں، مگر تم کون ہو؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شہزاد! میرے پاس وقت کم ہے اور میں زیادہ دیر تم سے رابطے میں نہیں رہ سکتا، بس یوں سمجھ لو کہ میں اس وقت اپنی جان پہ کھیلا ہوا ہوں۔ میں ثریا کا ساتھی ہوں۔ ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ جب تم وزیر جان کی قید میں تھے تو میرا ایک ساتھی تمہارا گمنام ہمدرد بن کے تمہیں اور تمہاری ماں کو اس کی قید سے چھڑانے کے لیے اپنی زندگی ہار بیٹھا تھا، لیکن اس کی قربانی ضائع نہیں گئی تھی۔ کافی ہے اتنا؟ آگے بات کروں؟''

اس نے کہا تو میرے وجود میں خون کی گردش یک لخت تیز ہوگئی۔ ''میں جان گیا ہوں، صرف ایک بات، کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ہی... بیگم ولا...؟''

''ہاں! میں نے ہی وہاں فون کیا تھا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''کیونکہ ثریا نے جو ہمیں نمبر دے رکھا تھا تمہارا، وہ بیگم ولا کا ہی تھا۔''

''بولو جلدی کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے فوراً کہا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ملے بغیر بات نہیں بن سکتی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بات صرف ملاقات ہی کی نہیں ہے، ہمیں عملی طور پر کچھ کرنا بھی ہوگا، بس اتنا سمجھ لو، اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو نیست و نابود کرنے کا تمہیں ایک سنہری موقع ملنے والا ہے۔ اب صرف ملنے کی بات کرو۔''

''میں تیار ہوں۔ کہاں ملنا ہے؟''

''آج رات شارپلی 9 بجے لاہور ائرپورٹ کے قریب واقع ایک ہوٹل کے کمرا نمبر 19 میں۔ ڈن؟'' اس نے آخر میں استفساریہ کہا اور میرے اثباتی جواب کے بات اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے چہرے پہ گمبھیرتا سی چھا گئی۔ اول خیر اور شکیلہ میرے قریب ہی موجود تھے۔

''خیریت کاکے؟ کون تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟'' اول خیر قدرے بے چینی سے مستفسر ہوا۔ میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور اسے ساری بات بتا دی۔

''تو کیا تو نے لاہور جانے کا فیصلہ کرلیا ہے شہزی؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اور حقیقت یہی ہے جو ثریا کے حوالے سے میری

READING Section

معلومات میں موجود ہے، وہ اس نے مرنے سے پہلے مجھے دی تھیں۔ جس کے مطابق ثریا حالات سے مجبور ہو کر نادانستگی میں وزیر جان کے ٹولے میں شامل ہو گئی تھی۔ مگر جیسے ہی اُسے اور چند دیگر لوگوں کو معلوم ہوا کہ وزیر جان درحقیقت ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو وہ اس سے متنفر ہونے لگے۔ پھر ثریا اور اس کے ہم خیال لوگوں پر مشتمل ٹولے نے اندر ہی رہتے ہوئے اس کی بیخ کنی کرنے کی ٹھانی۔

اسی دوران حادثاتی طور پر ثریا کا مجھ سے ٹکراؤ ہو گیا اور اس نے مجھے ساری حقیقت بتا دی، اور مجھ سے بھی اس سلسلے میں مدد چاہی، اسی نے بعد میں اپنے گنے چنے ساتھیوں کو میرے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا مگر بدقسمتی سے ثریا اور اس کے کچھ ساتھی اس خفیہ ”مہم جوئی“ میں مارے گئے۔ اب پتا نہیں باقی ماندہ کتنے بچے تھے۔ لیکن وہ اب بھی کسی ایسے موقع کے منتظر تھے کہ اسپیکٹرم کو بڑی زک پہنچا سکیں، ہوسکتا ہے وہ موقع انہیں اب ملا ہو۔ اسی لیے میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“ اور میں لاہور ضرور جاؤں گا۔“ میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

حفظِ ماتقدم کے تحت ہم نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ میں اس گمنام ہمدرد سے بہ ظاہر اکیلا ہی ملاقات کروں گا، جبکہ اول خیر مجھ پر نگاہ رکھے گا اور ”فالو“ کرتا رہے گا۔

مختصر مگر ضروری تیاری کے بعد میں اور اول خیر لاہور روانگی کے لیے تیار تھے۔ اس دوران زہرہ بانو کا فون آ گیا۔ وہ بھی دریافت کرنا چاہ رہی تھیں کہ کال کرنے والا کون تھا اور کیا چاہتا تھا؟ وغیرہ۔

میں نے انہیں سب بتا دیا، انہیں میرے اس اقدام پر تشویش ہوئی تھی، تاہم میں نے ان کی تشفی کر دی تھی۔

”ماں جی! تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہ رہی تھیں۔“

”کون سی بات؟ دینا انہیں فون، میں ابھی کر لیتا ہوں۔“ میں نے قدرے چونک کر کہا تو زہرہ بانو عجیب سے لہجے میں بولیں۔

”وہ فون پہ نہیں، تم سے روبرو بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم آ سکتے ہو تو آ جاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔“

میں اُلجھ سا گیا اور سوچنے لگا، پتا نہیں ماں جی ایسی کیا بات مجھ سے کرنا چاہتی تھیں جو فون پہ نہیں ہو سکتی تھی۔ جبکہ ابھی چند دن پہلے تو وہ میرے پاس ہی تھیں، پھر اب اچانک بیگم ولا پہنچ کر ایسی کیا بات مجھ سے کرنا یاد آ گئی تھی؟ اور وہ بھی ایسی بات جو فون پر نہیں ہو سکتی تھی۔

”کیا آپ کو علم ہے ماں جی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟“ میں نے زہرہ بانو سے پوچھا۔

”مجھے نہیں پتا، ویسے میں نے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی ماں جی سے۔ بڑا عجیب جواب دیا تھا ماں جی نے کہ وہ ہم دونوں کے سامنے ہی وہ بات کرنا چاہتی ہیں۔ پلیز آ جاؤ ناں شہزی! مجھے تو خوامخواہ کا تجسس ہو رہا ہے۔“ وہ بڑے دُلار سے بولیں۔

”کہیں وہ پریشان تو نہیں ہیں؟“

”بالکل نہیں، بھلا میرے پاس انہیں کیا پریشانی ہو گی۔ شہزی! وہ بے حد خوش ہیں۔“

”اچھا ٹھیک ہے، میں آتا ہوں ابھی۔“ میں نے کہہ کر بات ختم کی۔

میں نے اول خیر کو ساتھ لیا اور کار میں روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بیگم ولا پہنچ چکے تھے۔

مجھے آج یہاں معمول سے زیادہ سخت سیکیورٹی کا احساس ہوا، میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ میں ان کے لیے اجنبی تو نہیں تھا مگر کچھ نئے لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے، انہی میں مجھے کھیل دادا دکھائی دے گیا۔ میں اس کی یہاں موجودی کی وجہ جان گیا۔ اُسے زہرہ بانو نے ہی باہر گیٹ پر ہمیں لینے کے لیے بھیجا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پہ مجھے دیکھتے ہی ایک کھنڈی ہوئی سنجیدگی کے تاثرات اُمڈ آئے تھے۔ پھر وہ جیسے طوعاً وکرہاً ہی ہماری کار کی جانب بڑھا تھا۔ لیکن اول خیر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بگڑ سے گئے۔

میں کار سے نیچے اُتر آیا اور ساتھ ہی اول خیر کو بھی اُترنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

”اسے کیوں لائے ہو اپنے ساتھ۔“ وہ ایک نفرت انگیز سی نگاہ اول خیر پر ڈالنے کے بعد مجھ سے قدرے دُرشت لہجے میں بولا تو میں نے بھی اسی طرح تند انداز میں کہا۔

”یہ میرا ساتھی ہے اور میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتا ہوں ہٹو آگے سے۔“ پھر میں نے متذبذب کھڑے اول خیر سے کہا۔ ”اول خیر! آؤ میرے ساتھ۔“

میرا جارحانہ انداز دیکھ کر وہ فوراً ایک طرف کو ہو گیا۔ جب سے اُسے اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ لئیق شاہ کے حوالے سے میرا زہرہ بانو کے ساتھ کیا رشتہ قائم ہو چکا ہے وہ اب میرے آڑے آنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ تاہم روش اس کی اب تک میرے ساتھ وہی پرانی تھی، یعنی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

رقیبوں والی۔

گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کبیل دادا نے مجھے سنانے کی غرض سے اپنے کسی ساتھی سے بہ آواز بلند کہا۔ ''اسے مہمان گاہ میں بٹھاؤ۔'' اشارہ اول خیر کی طرف تھا۔ کبیل دادا کے حکم پر وہ آدمی فوراً اول خیر کی طرف بڑھا تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک دیا اور کبیل دادا کی طرف گھوم گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھاری آواز میں کہا۔ ''اول خیر میرے ساتھ ہی اندر جائے گا۔''

''اسے تو یہاں دروازے کے پاس بھی آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر خیر۔ لیکن یہ مہمان گاہ میں رکے گا۔ جب تک تم اندر سے واپس نہیں آجاتے۔'' کبیل دادا نے بھی گمبھیر لہجے میں کہا۔

اس کی اڑی بازی پر مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر میں اب اس کے معاملے میں ضبط سے ہی کام لینے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے کہ میرے دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے احترام بھی تھا، اور اس کی اپنے ساتھ رقابت کو بے بنیاد اور فضول ہی سمجھتا تھا۔ لہٰذا خود کو ذرا پُرسکون رکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو کبیل! بے شک اس کا تعلق اب یہاں سے نہیں رہا ہے، لیکن یہ اب میرا آدمی ہے اور اسی حیثیت سے یہ یہاں آیا ہے۔''

''میں اسے اندر نہیں جانے دوں گا۔ بس!'' کبیل دادا نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہاں موجود جو پرانے ساتھی تھے، وہ میری اور کبیل دادا کی پرانی چپقلش سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے وہ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے لیکن کچھ نئے لوگ، میری اور اول خیر کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے، ان کے خیال میں شاید یہ معاملہ دشمن داری کا تھا۔ ایک دو نے جارحانہ انداز میں ہماری جانب قدم بھی بڑھایا تھا مگر کبیل دادا نے انہیں غصے اور جھنجلاہٹ کے مارے چلا کر وہیں رُکنے کا کہہ ڈالا۔ پھر کسی پرانے آدمی نے اس نئے والے آدمی کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

''او خیرا'' کہتے ہوئے اول خیر نے کبیل دادا کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تو چلا جا کاکے! ماں جی سے مل آ۔ میں اِدھر ہی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ خیر ہے۔''

''ہرگز نہیں، تم بھی میرے ساتھ اندر چلو گے۔'' میں نے گرم سے لہجے میں کہا اور کبیل دادا کی اکڑ پر اسی وقت زہرہ بانو کا سیل نمبر ملایا، اور ان سے کہا کہ میں اول خیر کے بغیر اندر نہیں آؤں گا۔ مزید یہ کہ ماں جی بھی اول خیر کو میرا وفادار ساتھی، دوست، غمخوار اور بھائی کی حیثیت سے جاننے لگی ہیں۔

میں نے دانستہ ماں جی کا تذکرہ کیا تھا، تاکہ زہرہ بانو کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہاں اول خیر کے سلسلے میں کیسا نازک معاملہ تھا۔

دوسری طرف پل بھر کو خاموشی چھا گئی پھر زہرہ بانو نے مجھ سے کہا کہ کبیل دادا کو فون دو، میں نے فون کبیل دادا کی طرف بڑھا دیا۔

کبیل دادا نے بہ دستور کڑوی کسیلی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے فون میرے ہاتھ سے لیا، تھوڑی دیر دوسری طرف کی گفتگو سنتا رہا، پھر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے بیگم صاحب! جیسا آپ کا حکم۔''

اس نے سیل فون دوبارہ میری جانب بڑھا دیا اور اول خیر کو بھی میرے ساتھ آگے جانے کی اجازت مل گئی۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے ماں جی کے کمرے میں حاضری دی۔ ماں کے قریب آتے ہی مجھے ہمیشہ ایک روحانی سکون ملتا تھا۔ ذہن و دل پہ طاری ایک بوجھ کی سی کیفیات گویا پل کے پل عنقا ہونے لگتیں اور میں خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ میرے لیے دعائیں مانگنے والی میری ماں زندہ تھی۔

زہرہ بانو بھی وہیں موجود تھیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ میں سلام کر کے ماں جی کے بالکل قریب بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ ماں جی میرے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں، اول خیر نے بھی ماں جی کو سلام کر کے اپنا سر احترام سے ان کے سامنے جھکا دیا، ماں جی نے اس کے سر پہ بھی پیار سے اپنا ہاتھ پھیرا اور جیتے رہنے کی دعا دی۔ پھر اس نے قریبی کرسی پر تمکنت کے ساتھ براجمان زہرہ بانو کو بھی سلام کیا۔ پھر اول خیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس کے دوست پہلے سے موجود تھے، وہ وہاں مصروف ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی، ماں جی کو دیکھ کر وہ یہاں ایسے ہی خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی جیسے یہ اس کے بیٹے کا گھر ہو۔

''ماں! لگتا ہے، تیری نوں تیری بہت خدمت کرتی ہے، اسی لیے یہاں بہت خوش نظر آ رہی ہو۔'' کہتے ہوئے میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں پتر! کیوں نہیں، یہ میری بہت خدمت کرتی ہے۔'' ماں جی نے نرم اور میٹھے لہجے میں کہا۔ ''میں تو اسے

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اب بھی اپنی نوں ہی سمجھتی ہوں۔ جب سے اس نے مجھے یہ بتایا ہے کہ میرا لئیق بھی یہاں، اس گھر میں رہ چکا ہے، مجھے تو اس کے درودیواروں سے اس کی خوشبو آنے لگی ہے۔ شہزی پتر! مجھے اب بھی ایسا ہی لگتا ہے جیسے میرا لئیق ادھر ہی کہیں موجود ہے۔ ابھی ماں جی کہہ کر مجھ سے آن لپٹے گا۔"

ماں یہ کہتے کہتے روہانسی ہونے لگیں۔ ماں کو بڑے بیٹے کی دائمی جدائی کے دکھ میں اس قدر رنجور اور افسردہ دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ مجھے ہولے سے ایک سسکی کی بھی آواز سنائی دی، یہ زہرہ بانو تھیں، وہ بھی اپنے مرحوم شوہر کی یاد تازہ ہونے پر آب دیدہ سی ہوگئی تھیں۔ میں بھی بڑے بھائی کی یاد میں غم زدہ سا خاموش اپنا سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"شہزی پتر! لئیق کی صورت میں ابھی تک نہیں بھولی ہوں، آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے، میلے کا وہ دن، جب وہ میری اُنگلی پکڑے، بہت خوش نظر آرہا تھا، جانے کون سی پھر وہ منحوس گھڑی آگئی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ پر اب مجھے زہرہ بیٹی نے پتر لئیق کی تصویر دکھائی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ وہ تو بالکل تیرا ہم شکل تھا۔ لیکن پتر! پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے پھر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے تو لئیق کی وہی صورت یاد رہ گئی، جب وہ گیارہ --- بارہ سال کا ایک معصوم سا بچہ تھا۔" ماں جی نے اس بار غم کی رقت کو پیتے ہوئے کہا۔

لیکن ماں جی کی اس بات کو سن کر جانے کیوں ایسا لگا، جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں پکڑ کے دبوچ لیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے ماں جی کو اپنے بڑے بیٹے لئیق شاہ سے ہی زیادہ پیار تھا۔ اور جو بیٹا زندہ اور اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، جو خود بھی ماں باپ اور بھائی کی جدائی کا زہر پیے ہوئے تھا، اس کے درد کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ بس صرف ایک پل کے لیے ہی میرے اندر یہ احساس جاگا تھا، جسے میں نے فوراً ہی لغو جان کر اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اور ساتھ ہی خود کو بھی کوسا کہ میں نے ماں جیسی ہستی کے بارے میں ایسا خیال سوچا بھی کیوں، شیطان کا ورغلانا اسی کو--- تو کہتے ہیں کہ وہ اچانک ہی وار کرتا ہے۔ وہ ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ مگر ایمان کی طرح ہمارے دل و دماغ پر قابض نہیں ہوسکتا۔ اور مجھے اسی دل و دماغ نے ایسا شیطانی اور لغو خیال فوراً جھٹکنے پر مائل کیا تھا۔

"شہزی پتر!" ماں جی نے اچانک مجھے پکارا تو میں خیالات سے چونکا، بے اختیار ماں کی طرف دیکھا اور بے تابانہ بولا۔

"ہاں ماں! بول، تو مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی تھی؟" بالآخر میں نے ماں کو یاد دلایا تو انہوں نے ایک نگاہ پاس ہی کرسی پر بیٹھی زہرہ بانو کی طرف دیکھا، پھر اُسے بڑی محبت سے پکارا۔

"زہرہ! ادھر آنا ذرا۔"

زہرہ بانو اپنی کرسی سے اُٹھ کر ماں جی کے بیڈ کے بالکل قریب آکر کھڑی ہوگئیں۔

"ادھر بیٹھ، میرے قریب۔" ماں نے ہولے سے کہا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

اب میں ماں کے سیدھے ہاتھ کی طرف تھا اور زہرہ بانو ماں کے بائیں جانب۔ ماں جی نے پہلے اپنا بایاں ہاتھ زہرہ بانو کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھا اور سیدھے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما۔ مجھے ان کے ہاتھ میں واضح طور پر ہلکی لرزش سی محسوس ہوئی تھی، نہیں جان سکا تھا میں کہ یہ ارتعاش ماں جی کی کسی اندرونی جذباتی کیفیت کا رہینِ منت تھا یا ان کی عمر کا تقاضا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ماں جی اب کیا کہنے والی تھی۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے ایک ایسے بیٹے کو کس جاں کش اور مہیب آزمائش میں ڈالنے والی تھی، جو پہلے ہی حیاتِ درماندہ کے سُلگتے صحرا میں راندۂ درگاہ تھا۔

پھر جیسے وہ ہم دونوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ "مجھ بدنصیب نے دنیا میں بہت دُکھ دیکھے ہیں۔ اپنی خوشیاں بھی مجھ سے ناراض سکھیوں کی طرح رُوٹھ گئیں۔ مگر میں نے کبھی اپنے سوہنے رب سے کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں کیا اور اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کیا۔ اس آس و اُمید پر کہ کبھی تو مجھے اس کا صلہ ملے گا۔ مجھے --- تم دونوں سے بڑی اُمید ہے کہ تم دونوں کو میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ورنہ۔ شاید ایک دُکھیاری ماں کا دل ٹوٹ جائے گا، میں بے سکون ہی رہوں گی۔ اور اگر ایسا ہوا تم دونوں خوش رہو گے تو یقیناً لئیق شاہ کی روح کو بھی تسکین ملتی رہے گی اور گھر کی عزت بھی گھر میں ہی رہے گی۔ کیونکہ وہ زہرہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ بھلا اسے کیسے دُکھی اور تنہا دیکھ سکتا ہے وہ۔ لہٰذا! میری دلی خواہش ہے کہ تم دونوں شادی کرلو۔"

یہ کہہ کر ماں جی نے زہرہ بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر:20

مندر کلیسا [illegible] کا [illegible]، دھرم [illegible] والے [illegible]... سب ہی اپنے اپنے
عقیدے کے مطابق نیک نیتی سے [illegible] ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد
نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ
پال نے کلیسا کے نام [illegible] کر جیسے [illegible] جماعت میں نکالا ہے، ان
کا ذکر بھی شرمناک [illegible] یہ [illegible] ہے... اس [illegible] صورت کوئی بھی
ہو قابل نفرت ہے... ا[illegible] اور حالات کی [illegible] فلاحی ادارے
کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن [illegible] ہونے لگا جو نہیں
ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا [illegible] کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی
چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات [illegible] کا ان کو نہ دکھاتا رہا... یہ سلسلہ اس وقت
تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے... پھر اس نے سب کچھ [illegible] کر رکھ
دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک [illegible] اس نے بتا دیا کہ طاقت کے [illegible] میں
راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... طاقت [illegible] ہے جو بے اس [illegible] والے
والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... [illegible] بدلتی، نئی [illegible]
سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں [illegible] دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Downloaded From

ماں جی کی بات نے جیسے وقت کی نبض تھام لی تھی۔ ایسی نبض کہ جس کی حرکت دل کی ہموار "ردھم" کا پتا دیتی ہے کہ زندگی ابھی رواں دواں ہے، لیکن صرف دھڑکتے دل کا نام ہی تو زندگی نہیں... بعض زندہ لوگ تو مُردوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں۔ ماں جی کی بات بھی شاید میرے لیے کچھ ایسا ہی پیغام لائی تھی۔ جس نے مجھے گردوپیش سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔

کمرے... کی فضا اچانک ہی دم بہ خود سی ہو گئی تھی۔ ہر سُو ایک سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ ہاں! شور... زدہ سناٹا۔ بھلا سناٹا بھی شور زدہ ہوتا ہے؟ لیکن بعض سناٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو بہ ظاہر خاموش ہوں مگر اندر اپنے ایک طوفان چھپائے ہوتے ہیں۔

میں ماں کے دائیں جانب اور زہرہ بانو اُن کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔

میں ابھی تک جیسے ایک شاک کی سی کیفیات سے دوچار تھا۔ میرا ہاتھ ابھی تک زہرہ بانو کے نرم و نازک ہاتھ پر تھا، ان کے ہاتھ میں واضح طور پر لرزش محسوس کی جا سکتی تھی۔

چند نہیں بلکہ کئی ثانیے اسی طرح گم صم سی گھڑیوں کی نذر ہو گئے، اور جب حواسوں کو عقل و خرد کا یارا ہوا تو میں نے ماں جی کے دائیں جانب بیٹھی زہرہ بانو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی کشادہ آنکھیں... مزید پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نگاہیں میرے چہرے پہ جم سی گئی تھیں۔ لگتا تو یہی تھا کہ میری طرح وہ بھی ایک شاک سے گزر رہی ہو۔

آخر کیا سوچ کے ماں جی نے اتنی بڑی بات اور اتنی آسانی سے کہہ دی تھی؟ کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میرا اور عابدہ کا تعلق، احساسات و جذبات کی غیر مرئی ڈور میں بندھ چکا ہے؟ عابدہ کی وجہ سے میں کس قدر پریشان اور تشویش زدہ تھا، کیا ماں جی کو پھر بھی اس بات کا احساس نہ ہو سکا تھا کہ عابدہ میرے لیے میری سانسوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ماں جی کو زہرہ بانو اور میری عمر کے تفاوت کی بھی پروا نہ تھی؟ یا... ان کا دل صرف اپنے بڑے بیٹے لئیق شاہ کے لیے دھڑکتا تھا؟ اور جو بیٹا، یعنی میں... ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ماں جی کو اس کے جذبات و احساسات کی کوئی فکر نہ تھی؟ آخر کیا سوچ کر ماں جی نے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی؟ مجھے اپنے اس خیال پر فوراً شرمندگی کا احساس بھی ہوا تھا کہ میں... ماں کے ممتا بھرے اور بے لوث پیار پر "شبہ" کر رہا تھا۔ ماں باپ کے لیے تو سب اولاد سانجھی ہوتی ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے "لاڈلا" کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ماں جی کی ممتا بھری محبت کو میں نے آج دوسری بار شک کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اور خود ہی مجھے اپنی اس غلط فہمی پر ندامت اور شرمساری بھی محسوس ہونے لگتی تھی۔

ایک خیال اور بھی اچانک ہی کسی برچھی کی طرح میرے سینے میں کھب کے رہ گیا۔

"کہیں اس سارے چکر میں زہرہ بانو کا تو ہاتھ نہیں تھا؟ ماں جی کو اپنے ساتھ بہ صد اصرار بیگم ولا لے جانا، ان کی تندہی کے ساتھ خدمت کرنا۔ اور ماں جی کو اپنا بنا لینا کہ ماں جی کا دل ہی بیگم ولا میں زہرہ بانو کے ساتھ لگ کر رہ گیا تھا۔ کک... کہیں غیر محسوس طور پر زہرہ بانو نے ہی تو نہیں میری اور عابدہ کی محبت پر شب خوں مارا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے بڑی تیز اور آتش فشاں... نظروں سے زہرہ بانو کے سکتہ زدہ چہرے کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا کہ کہیں یہ ساری "شرارت" اور "شر انگیزی" اسی کی تو نہیں پھیلائی ہوئی۔ مگر خود اس کے چہرے پر بھی تو ایسے ہی تاثرات، ڈوبتی ناؤ کی طرح ہلکورے لے رہے تھے کہ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

میری آنکھوں سے یکلخت پھوٹتے شراروں کی تپش کو شاید زہرہ بانو نے بھی پل کے پل بھانپ لیا تھا اور یہی سبب تھا کہ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں خوف، آنسوؤں کی طرح بہہ کر اس کے پورے چہرے پر پھیل گیا۔

"تت... تم دونوں خاموش کیوں ہو گئے؟ جواب نہیں دیا میری بات کا۔"

دفعتاً ہی ماں جی کی آواز نے جیسے پُرسکوت گھڑیوں کو تھپک کر رقصاں کیا۔ تب ہی میں نے زہرہ بانو کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا، یوں، جیسے میں نے کسی ناگن کے پھن پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ماں جی نے میری اس حرکت کو خاص طور پر نوٹ کرتے ہوئے مجھے شاکی... نظروں سے گھور کے دیکھا۔

"مم... ماں جی! ای ی ی... یہ آ... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

میری آواز میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی گویا میرا پورا جسم

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
f PAKSOCIETY

ہی ڈگمگا رہا ہو۔ یکدم ہی میں ماں جی کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شہزی پُتر!''

ماں جی نے مجھے پکارا۔ ان کی ٹھہری ہوئی اور سپاٹ آواز محسوس کر کے میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی ان کی طرف گھوما تو ایک منظر دیکھ کر میں زہرہ بانو کی شر انگیزی اور چالاکی کی جھلک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ ابھی تک ماں جی کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان کے پاس سے اٹھی بھی نہیں تھی۔

یہی وہ وقت تھا، جب پہلی بار میرے پورے وجود میں اس کے لیے نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جبکہ ماں جی مجھے آواز دینے کے بعد اب میرا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔ اپنی آواز پر متوجہ پا کر وہ دوبارہ بولیں۔

''تجھے پسند نہیں آئی میری بات شہزی پُتر؟''

میں ابھی ماں جی کو ایسا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا جس سے ان کا دل دکھتا۔ لہٰذا میں نے پل کے پل اس گمبھیر اور لاینحل سی صورتِ حال کو ماں کی بغیر کسی ناراضگی کے ہینڈل کرنے کا سوچ کر، مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے، ماں جی کے قریب آ کر کہا۔

''ماں جی! میرے لیے آپ کا یہ فیصلہ بہت اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع ہے۔ جس کا ابھی میں اتنی جلدی بھلا کیا جواب دے سکوں گا؟''

یہ کہہ کر میں تھما اور پھر جیسے ان عذاب ناک گھڑیوں کا کچھ بوجھ زہرہ بانو کی گود میں ڈالنے کی غرض سے دوبارہ ماں جی سے بولا۔

''بلکہ یہ سب کچھ تو زہرہ بھابی کے لیے بھی غیر متوقع اور اچانک ہی ہوگا۔ اب بھلا وہ یا میں اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟''

دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔ یہ احساس مجھے ماں جی کے چہرے پر خوش امیدی کے ابھرتے تاثر کو بھانپ کر ہوا۔ وہ میری اس بات سے شاید مجھے نیم رضامند سمجھ رہی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے ممتا بھری رسانیت سے بولیں۔

''ہاں، ہاں... شہزی پُتر! تم دونوں سوچ لو پھر فیصلہ کر لینا۔ ایک دوسرے سے تو تم پہلے سے واقف ہو ہی۔ ویسے ایک بات میں تم دونوں سے ہی کہوں گی کہ یہ سارے تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ کس کا کہاں اور کس کے ساتھ لکھا ہے، یہ کاتبِ تقدیر پہلے ہی لکھ چکا ہوتا ہے اور میں تم دونوں کا ایک لکھا دیکھ رہی ہوں۔ کاش! میرا یہ سوہنا خواب پورا ہو جائے۔''

ماں جی کی بات سن کر میں دہل کر رہ گیا۔ ''کیا واقعی کاتبِ تقدیر نے ایسا کچھ میرے نصیب میں لکھ ڈالا تھا کہ...'' اس سے آگے کا تصور میرے لیے محال تھا۔

میں نے ایک سلگتی ہوئی نظر زہرہ بانو کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ اس بار اس نے اپنا چہرہ جھکایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز سراسر فدویانہ لگا۔ جیسے اسے ماں جی کی بات پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ اس میں بھی مجھے اس کی چلتر کاری کا شبہ ہوا تھا کہ وہ خاموش کیوں تھی؟ اسے بھی انکار میں بولنا چاہیے تھا ماں جی سے، تاکہ ماں جی اپنے اس خیال پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور بالآخر ایک گہری سانس کھینچ کر ماں جی سے کہا۔

''ماں جی! مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں آج شام اول خیر کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ابھی تیاری بھی کرنی ہے۔ آپ کو اور کوئی بات تو نہیں کرنا تھی؟''

میری بات پر ماں جی نے ایک سوچتی ہوئی سی نظر میرے چہرے پر ڈال کر ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، پھر بولیں۔

''شہزی پُتر! اپنا خیال رکھنا۔ کب تک لوٹنے کا خیر ہے؟''

''ارادہ تو جلد لوٹنے کا ہے، اگر کام بڑھ گیا تو مزید کتنے دن رکنا پڑے اس کا نہیں معلوم مجھے۔''

''چنگا۔ پر میری بات پر تو غور تو کرے گا ناں شہزی پُتر؟''

ماں جی نے مجھے جس بات پر غور کرنے کے لیے کہا تھا، وہ میرے لیے قابلِ غور تو کیا، اس کا تصور کرنا بھی میرے لیے ناممکنات میں سے تھا لیکن ماں جی کو میں کیا جواب دیتا؟

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بہت ہولے سے فقط اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ جبکہ ماں جی نے وقتِ رخصت میری خیریت اور سلامتی کی اتنی بہت سی دعائیں دیں کہ بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ ماں کی انہی دعاؤں کا تو میں پیاسا تھا، جو وہ مجھے ہر وقت دیتی رہتی تھیں۔ میں ان کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر جب ماں جی کو سلام کر کے اور دانستہ زہرہ بانو کو نظر انداز کرتے ہوئے، کمرے سے نکلنے لگا تو وہ ایک دم ماں جی

READING Section

کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے بڑی نرم آواز میں بولی۔

''شہزی کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر ہم ماں جی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔''

مجھے صاف لگا تھا کہ اس نے ''ہم'' کا صیغہ جان بوجھ کر لگایا تھا اور ''ماں جی'' کا لفظ الگ سے استعمال کیا تھا بلکہ اس نے اس حساس موضوع کے چھڑنے پر، دانستہ ہی تھوڑی دیر مزید روکنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس کی طرف ایک بار پھر برہم سی نگاہ ڈالی اور خاصی رکھائی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ذرا جلدی ہے، ویسے بھی ابھی مجھے بھوک نہیں پھر سہی۔'' کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک کچھ سوچ کر میں مڑا، زہرہ بانو کی نگاہیں ابھی تک میرے تعاقب میں جمی ہوئی تھیں، مجھے اس طرح یکدم اپنی جانب پلٹتا دیکھ کر وہ بھی تھوڑا اچونکی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ ذرا..... میرے ساتھ آئیں گی؟'' میرا لہجہ یکسر اجنبی تھا۔

''ابھی آتی ہوں۔'' میں دروازے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ گیا۔

یہ کمرا، ماں جی کے کمرے سے ذرا الگ اور فاصلے پر تھا..... اور خالی بھی۔

یہاں آ کر میں بیٹھا نہیں، کھڑا رہا اور اپنے اندر کے ابال پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ اتنے میں وہ بھی آ گئی۔

میں اس کی طرف پلٹا۔ ہم دونوں آمنے سامنے تھے اور نگاہیں چار تھیں۔

''کیا آپ ماں جی کے ساتھ اسی لیے اتنی محبت جتا رہی تھیں کہ وہ ایک دن آپ کی خدمت گزاری کے نتیجے میں آج میرے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ ڈالیں جو میری سوچ میں تو کیا تصور میں بھی کبھی نہیں ہو سکتی۔ جواب دیں مجھے؟''

میں نے ایک ایک لفظ چبا کر سخت لہجے میں کہا تو اس کے شاداب چہرے پہ بیک وقت کئی رنگ چھلک گئے۔ ان میں برہمی کا رنگ بھی تھا اور ایک نامعلوم اداسی کا شائبہ بھی، کہیں ناگواری کی کروٹ تھی تو کسی رخ پر کم گشتہ دکھ بھی اٹا ہوا تھا، کشادہ آنکھوں کی گہرائیوں میں حسرت و یاس کی تاثراتی چمک بھی ابھری تھی، لیکن سب سے آخر میں اس کے چہرے پہ جو کیفیت گویا ٹھہر کے رہ گئی تھی، اسے محسوس کر کے ایک لمحے کو تو میں بھی قدرے چونکنے پر مجبور ہو گیا۔

زہرہ بانو کے چہرے کی اس آخری اور مجسم ٹھہر جانے والی کیفیت میں ایکا ایکی ایک سرکشی نمودار ہونے لگی۔ وہ جواباً آتش فشاں لہجے میں گویا ہوئی۔

''شہزاد احمد صاحب! تم نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام مجھ پر تھوپ دیا؟ ماں جی سے میری محبت، میرا خلوص تمہیں ڈھونگ لگا؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟''

''ہاں!'' میں اندر سے بھڑکا ہوا تھا اس لیے دوٹوک انداز میں کہہ ڈالا۔

''کیوں؟''

''کیوں؟'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''کمال ہے۔ آپ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہیں؟ آخر ماں جی نے اتنی بڑی بات کیسے اور کیا سوچ کر کہہ ڈالی ہم دونوں سے؟ ضرور اس میں آپ کے ڈھونگی رویے کا بھی دخل ہو گا کہ ماں جی مجھ سے ایسا کہنے پر بالآخر مجبور ہو جائیں۔ سچ کہا نا میں نے زہرہ بیگم!''

زہرہ بانو کے چہرے پر اب شدید اتار چڑھاؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ضبط اور تحمل سے کام لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

''مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی شہزی! کہ تم میرے بارے میں ایسی گری ہوئی اور گھٹیا سوچ رکھو گے۔ مجھے ماں جی سے واقعی سچی محبت ہے۔ ان سے میری محبت کا صرف یہی حوالہ کافی ہے کہ وہ میرے مرحوم شوہر لئیق شاہ کی ماں ہیں اور میں ان کی بہو۔''

''تو پھر یہ سب آپ کیوں خاموشی اور فرماں برداری سے سنتی رہیں، جو ماں جی نے ہم دونوں سے کہا تھا۔'' میں نے تلخی سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسی وقت ان کے پاس سے اٹھ جاتیں اور ایک دم انکار کر ڈالتیں مگر آپ تو ایسے فدویانہ انداز میں ان سے لگی بیٹھی رہیں جیسے آپ کو ماں جی کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ میں بھی تو تھا ناں۔ ماں جی کی بات سنتے ہی ایک دم ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ مقصد اشارتاً ان پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میرے لیے ان کا یہ فیصلہ قابلِ قبول نہیں۔''

''تو پھر کہہ ڈالتے یہ بات ماں جی سے ... کیوں خاموش رہے تھے؟'' وہ بھی تنک کر بولی۔ ''اس طرح تو تم نے بھی دوغلے پن سے کام لیا۔ اور اسی بات پر ہی ماں جی کو احساس ہوا تھا کہ ان کی بات تمہارے لیے قابلِ قبول ہے۔''

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

زہرہ بانو کی اس بات نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ کیونکہ اپنی اس غلطی کا مجھے بھی احساس ان کے چہرے پہ ایک طرح کی خوش امیدی کا تاثر ابھرتے وقت ہوا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

”میں ابھی صاف بات کہہ کر ماں جی کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا لیکن اب یہ ذمّے داری صرف آپ کی بنتی ہے زہرہ صاحبہ کہ آپ ماں جی کو اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کریں، انہیں میرے اور عابدہ سے متعلق اصل حقیقت بتادیں کہ میں اس کے لیے کیا ہوں اور وہ میرے لیے کیا ہے۔“

”لیکن تم نے جو مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔

”اس کی وہی حیثیت ہے جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں اور جو آپ اچھی طرح سن چکی ہیں۔“

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“ اچانک وہ بدلے لہجے میں بولی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کسی محاذ پر خم ٹھونک کر آ گئی ہو۔

”تم نے مجھ پر ایک غلط اور گھٹیا الزام لگایا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تم اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہو۔“

”تو پھر آپ کو اپنے الزام کی خود ہی نفی کرنا ہوگی۔“ میں نے بھی اٹل لہجے میں کہا۔ ”جس طرح آپ نے اپنے سلوک سے ماں جی کو یہ باور کروانا چاہا کہ آپ ان کو ابھی تک اپنی ساس سمجھتی ہیں، بالکل اسی طرح انہیں آپ نے یہ احساس دلانا ہے کہ ان کی بات، ان کا خیال، میرے لیے ہی نہیں بلکہ آپ کے لیے بھی نا قابل عمل ہے۔“

”پہلے تمہیں اپنے الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“

”میں نے جو دیکھا، جو محسوس کیا وہ کہہ دیا۔ اس کی نفی آپ کو خود کرنا ہوگی، اپنے عمل سے۔“

یہ کہہ کر میں انہیں سوچتا ہوا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ اول خیر دوسرے کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے بلوا لیا اور پھر ہم بیگم ولا سے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس بار بھی کار اول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ منتظر تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طول پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”او خیر ہو کاکا! ماں جی سے ملنے کے بعد تو تیرے چہرے پہ بارہ بج گئے ہیں، خیریت ہے؟“

میری سوچتی نظریں کار کی ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اسی انداز میں بولا۔ ”پتا نہیں کیوں یار اول خیر! آج میرا دل بڑا خراب سا ہو رہا ہے۔“

”او خیر! کیا بات ہوگئی ایسی کاکے؟ ماں جی نے تجھے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ کہیں تیری خرابیِ دل کا تعلق اسی بات سے تو نہیں؟“

کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑتا، مگر اس وقت میں اندر سے تلخ ہو رہا تھا۔ ایک کڑواہٹ سی تھی جو کسی زہر کی طرح میرے پورے وجود میں گھل رہی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے اول خیر کو ساری بات بتادی، یہ بھی کہ آخر میں آتے ہوئے میری زہرہ بانو سے بھی تلخی ہوگئی تھی۔

اول خیر یہ سن کر سنجیدہ رہا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے ایک عجیب بات کہہ کر مجھے چونکنے پہ مجبور کر دیا۔

”شہزی کاکے! پتا نہیں تو کیا سمجھے، لیکن بات سچ ہے۔ چاہتا تو میں یہی تھا کہ تجھے پہلے ہی سے بتا دیتا، لیکن یہ موضوع ہی حساس نوعیت کا تھا کہ میں چپ رہا۔ درحقیقت مجھے انہی دنوں یہ شبہ ہونے لگا تھا، جب ماں جی کا بیگم ولا میں دل لگ گیا تھا۔ اور پھر جب ماں جی کی زبانی ہی یہ پتا چلا کہ ان کا وہاں دل لگنے لگا ہے تو میں کچھ کچھ کھٹک گیا تھا لیکن...“ وہ کہتے کہتے تھما تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”لیکن کیا؟“

”میرا خیال ہے تجھے بیگم صاحبہ سے ابھی اتنی بڑی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں ان کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ اپنی شخصیت پر کوئی الزام بھی برداشت نہیں کرتی ہیں۔ اگر ایسا کچھ ہو بھی جائے تو وہ اس کی تردید کرنے کے بجائے، ضد میں آکر الٹا وہی کرتی ہیں، جیسا انہیں سمجھا جا رہا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں نے ان پر غلط الزام لگایا تھا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”غلط تو نہیں کہا تھا کاکے! پر تجھے یہ بات ابھی نہیں کہنی چاہیے تھی۔ جبکہ ماں جی کو تو نے صحیح جواب دیا تھا۔ یعنی، نا انکار نا اقرار۔“ وہ بولا۔

”مگر مجھے اب بھی یقین ہے کہ زہرہ بانو نے میرے اور عابدہ کے بیچ سیندھ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ہی

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

میری طرف ملتفت رہتی تھی۔ اشاروں کنایوں میں اکثر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ مجھے عابدہ سے کتنی محبت ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اسے جب خود ہی احساس ہو گیا کہ عابدہ میرے لیے کیا حیثیت اختیار کر چکی ہے تو...''

''او کاکے! تو واقعی کاکا ہی ہے۔'' اول خیر نے اچانک میری بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ ایسی باتوں بلکہ حقیقتوں سے انسان کو خود ہی مصلحتاً چشم پوشی کرنی چاہیے جس کا تعلق انسانی فطرت اور نفسیات سے ہو۔ دیکھ کاکے! میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں، مگر ایسا تجربہ ضرور رکھتا ہوں، جو کسی یونیورسٹی یا کتابوں میں کم ہی ملتا ہے۔ تجھے تو اسی دن ہی یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی جب پہلی بار بیگم صاحبہ کا تجھ سے سامنا ہوا تھا اور وہ تجھے دیکھ کر کیوں بے ہوش ہو گئی تھیں۔'' وہ ذرا تھما، پھر ایک موڑ کاٹنے کے بعد گرد و پیش پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ سامنے نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اور وہ بھی ایسی محبت جو دائمی جدائی کا جاں گسل احساس بھی رکھتی ہو۔ یہی شے انسان کو ہمیشہ ایک ایسے احساسِ محرومی سے دوچار رکھتی ہے کہ... لاشعوری طور پر اپنے محبوب جیسی جھلک سے متعلق کوئی بھی نشانی کے لیے اس کا دل تڑپتا رہے۔ اور پھر کاکے! تو تو پورا ہی لئیق شاہ ہے۔ اس لیے یہ بات سمجھنے کی کوشش کر۔ دل نرم رکھا کر کہ کچھ حقیقتوں کے آگے ایک کمزور انسان بے بس ہوتا ہے۔ یہی حال اس بے چاری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔

''کاکے! تو نہ صرف اس کی دید کے لیے سکون کا... باعث ہے بلکہ ان کے غمِ دل کے لیے ایک عذابِ مسلسل بھی ہے۔ وہ تیری صورت میں رسائی و نارسائی کے کرب سے بھی دوچار رہتی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ ماں جی کی بات نے شعوری و لاشعوری طور پر ان کی ازلی احساسِ محرومی کو اندر سے تڑپا کر رکھ دیا ہو۔ ان کی خاموشی بھی اسی بات کا مظہر ہو..... تمہیں بیگم صاحبہ کی یہ خاموشی ''نیم رضامند'' سی محسوس ہوئی ہو۔ لیکن تم نے ان کے آگے اس کا درانہ وار اظہار کر کے بلکہ الزام لگا کے ان کی اس احساسِ محرومی کو ضد اور سرکشی میں بدل ڈالا ہے۔

بس! اب آگے اللہ خیر ہی کرے۔ لیکن تو تسلی رکھ... کاکے! ایسا کچھ ہوگا نہیں۔ بیگم صاحبہ کبھی بھی تیرے اور عابدہ کے حق میں ڈاکا نہیں ڈالیں گی۔ پر تو نے ان کا دل توڑ کر اچھا نہیں کیا۔''

اول خیر کی باتوں نے مجھے حیران سا کر دیا۔ زہرہ بانو کے بارے میں اس کے خیالات ایک طرف ان سے ہمدردی کے غماز نظر آتے تھے تو دوسری طرف ان کی حمایت میں مجھے بھی غلط ثابت کر رہے تھے۔

میں اس کی بات سن کر خاموش رہا۔ پتا نہیں کیوں میرا اس موضوع پر زیادہ بات کرنے کو جی نہیں چاہا۔ مجھے خاموش دیکھ کے اس نے بھی اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی۔

☆☆☆

لاہور روانگی کے سلسلے میں، کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے پروگرام کچھ تبدیل کر دیا تھا۔

ثریا کے جس ساتھی نے مجھے فون کر کے لاہور کے ایک ہوٹل کے کمرا نمبر 19 میں آج رات نو بجے شارپلی پہنچنے کا کہا تھا، اس پر کلی طور پر بھروسا کرنا غیر دانشمندانہ قدم تھا، اگرچہ اس نے اپنی سچائی کے کچھ ثبوت میرے ساتھ ''شیئرز'' کیے تھے، اس کے باوجود احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ضروری تھا۔

چنانچہ اول خیر اور میرا یہی پلان فائنل ہوا تھا کہ ہم لاہور کم از کم دو گھنٹے قبل پہنچ کر پہلے خود سے اس سارے معاملے کی ریکی کر کے تسلی کر لیں۔ ہمارے ساتھ شکیلہ نے بھی جانے کی ہامی بھر لی تھی۔

پی ایس ایس (پاور سیکریٹ سروس) والوں کے ہیڈ کوارٹر میں ہمارے مستقل قیام پذیری کے دوران میں اول خیر اور شکیلہ بھی کمانڈو ٹریننگ لیتے رہے تھے بلکہ میں خود بھی اس میں شامل تھا، میجر ریاض باجوہ نے میری ہی سفارش پر ان دونوں کی رضاکارانہ بھرتی کا خیر مقدم کرتے ہوئے، میرے ہیلپرز کی حیثیت سے اجازت دے دی تھی۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ وطنِ عزیز میں موجود کالی بھیڑوں کا خفیہ طور پر قلع قمع کرنے کے لیے، جو مختلف لبادوں میں وطنِ عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور لوٹ مار، کرپشن کے ذریعے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف تھے، رینجرز کے ہی ایک ایسے ونگ کو عمل میں لایا گیا تھا جو کلی طور پر خود کو وطن کا گمنام مگر سچا سپاہی سمجھتے ہوئے اس میں رضاکارانہ طور پر بھرتی کیے گئے تھے۔ جو خود بھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسے لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے، مگر خاطر خواہ سورسز نہ ہونے کی بنا پر وہ بے بس تھے یا پھر مقدور بھر اپنی سی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے ایک میں بھی تھا۔ میری چوہدری ممتاز اور وزیر جان کے ساتھ ہونے والی چومکھی جنگ میں ان دونوں دشمنوں کے خلاف چونکا دینے والے انکشافات کے بعد سے میجر ریاض باجوہ میرا انتخاب ایک ”پاور ایجنٹ“ کے طور پر کر چکے تھے۔

بہرحال اول خیر اور شکیلہ اس اہم مہم میں خاصے پُراعتماد نظر آرہے تھے۔ ماں جی گھر پر نہیں تھیں، ورنہ شکیلہ کو میں ساتھ نہیں لے جاتا۔

البتہ آنسہ خالدہ سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے لیے میرے پاس اسمارٹ فون تھا اور اس میں تیز رفتار نیٹ کی سہولت موجود تھی۔

ہم لاہور کے لیے ملتان سے اپنی کار میں تقریباً تین بجے سہ پہر نکل پڑے۔ بائی روڈ سفر تھا اور کار بھی اچھی کنڈیشن کی تھی۔ درمیانی رفتار سے ملتان سے لاہور لگ بھگ چار سے ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا، میں نے اول خیر کو اسی رفتار سے کار چلانے کا کہا تھا۔

چونکہ یہ ایک اہم مشن تھا اور ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اسی لیے ہم نے ”اسلحہ خیز“ تیاری پوری کر رکھی تھی۔ کار اول خیر چلا رہا تھا اور اس کے برابر میں شکیلہ بیٹھی تھی، جبکہ میں دانستہ عقبی سیٹ پر براجمان تھا اور میری گود میں ایک ہلکی ساخت کی مشین گن تیار حالت میں تھی۔

اوکاڑہ پہنچ کر ہم ..... ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں بہ مشکل بیس منٹ رکے اور کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور چائے کا ایک ایک کپ اپنے معدے میں اتارنے کے بعد دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اب کار میں چلا رہا تھا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر شکیلہ تھی جبکہ اول خیر عقبی سیٹ پر محتاط بیٹھا تھا۔

موسم گرم اور خشک تھا۔ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ پنجاب کی گرمیاں یوں بھی بڑی خشک ہوتی ہیں۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں ہمارے پاس موجود تھیں، تاکہ بلاوجہ راستے میں رکنا نہ پڑے اور سفر جاری رہے۔

لاہور کے لیے روانہ ہوتے وقت ـــــ شبہ تھا کہ ممکن ہے ہمارا تعاقب کیا جائے۔ مگر ابھی تک ایسی کوئی بات ظہور پذیر ہونے کے امکانات دور نزدیک نظر نہیں آرہے تھے۔

خلاف توقع اول خیر اور شکیلہ کی ابھی تک راستے میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی تھی۔ وجہ مجھے یہی سمجھ میں آئی تھی کہ [illegible] ہم دوغلی رنگی حالات سے دوچار تھے، کسی بحث میں پڑتے تو دشمن ہم پر وار کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ انہوں نے ہی یہ جال بچھایا ہوتا، یہی سبب تھا کہ ہم غیر معمولی طور پر احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ البتہ گاہے بہ گاہے... موجودہ سچویشن پر تبادلۂ خیال ضرور کر رہے تھے۔

”اگر تو واقعی یہ سچ ثابت ہوا تو ہمیں ثریا کی روح کو سلام پیش کرنا چاہیے کہ وہ ..... اپنی جان کی پروا کیے بغیر ان درندوں کے بیچ میں رہتے ہوئے، اپنے چند مٹھی بھر ساتھیوں کا ایک ایسا ٹولا بنانے میں کامیاب رہی جو اس کی موت کے بعد بھی اپنے اس خطرناک مشن میں مصروف کار ہیں۔ جو بھیڑیوں کی کچھار میں رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کرنے کو کوئی موقع ـــ جانے نہیں دیتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہی گنتی کے چند بھیدی ایکسٹرم کی لنکا

تلاش

سردار دلیپ سنگھ لندن گئے۔ ایک روز ہائیڈ پارک کی وسعتوں کو ناپتے ناپتے تھک گئے تو ایک بینچ پر لیٹ کر سستانے لگے۔ چند منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر خاتون ادھر سے گزری۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آر یو ریلک سنگ (ARE YOU RELAXING)۔“

انہوں نے جھٹ کہا۔ ”نو... آئی ایم دلیپ سنگھ!“

پھر ایک چلبلی دوشیزہ نے جاتے ہوئے وہی کہا۔ سردار جی نے پرانا جواب دہرا دیا۔ جب چار پانچ لوگوں کے ساتھ یہی قصہ ہوا تو سردار جی بینچ سے اٹھ گئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اتنے لوگ ریلک سنگھ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تو یہ ہم ان کو سرکر لینی چاہیے۔ وہ ایک طرف چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے کئی لوگوں سے سوال کیا۔ ہر ایک ہنس کر عجیب نظروں سے ان کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں ایک عمر رسیدہ شخص بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔ سردار جی نے اپنا سوال دہرایا۔ ”آر یو ریلک سنگھ؟“ اس نے غنودہ آواز میں کہا۔ ”یس۔“

سردار جی تیزی سے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولے۔ ”تم یہاں پڑے موج کر رہے ہو... ادھر سارے لوگ تم کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

امرتسر سے سردار خشونت سنگھ کا تجربہ

ڈھا سکتے تھے۔ مگر تنہا یہ لوگ بہرحال کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، جب تک کہ انہیں کوئی بیرونی سپورٹ نہیں مل جاتی۔ ثریا جب زندہ تھی تو وہ بھی انہی بنیادوں پہ اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھی اور اسی سلسلے میں اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔

ہم ساڑھے سات بجے تک بہ خیریت لاہور پہنچ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نصف گھنٹا لیٹ ہوئے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب واقع مذکورہ ہوٹل کا رخ کیا۔ ملکی حالات کے پیش نظر راستے میں چند جگہوں پر ہونے والی چیکنگ کی وجہ سے ہم ریڈی میڈ میک اپ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کیونکہ چیکنگ کے دوران شناختی کارڈ دکھانے کا سب سے پہلے تقاضا کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں ہمارے اصل فوٹو چسپاں تھے، چہرہ بدلنے کی صورت میں مشکل پڑ جاتی۔ جبکہ اسلحہ بھی ہم نے کار کے خفیہ خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں آخری ہتھیار میرا ''پاور ایجنٹ'' کا وہ کارڈ رہ جاتا تھا جس کے سلسلے میں، میں احتیاط ہی کرتا تھا کہ اسے باربار شو نہ کرنا پڑے تو بہتر ہے۔

جیسے ہی ہم شہر میں داخل ہوئے تو مذکورہ ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے ہم نے کسی الگ تھلگ مقام پر کار کے اندر ہی یہ ''کام'' نمٹا دیا۔ اس میں مزید بیس سے پچیس منٹ صرف ہوگئے۔

ہمارے پاس اب ثریا کے ساتھی کی ''ریکی'' کرنے کے لیے کم وبیش ایک گھنٹا ہی بچا تھا۔

معاملہ حساس تھا اسی لیے میں اپنے منصوبے کو بے داغ رکھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے ہم نے ایک نسبتاً عام سے قریبی ہوٹل میں ایک کمرا لیا۔ وہاں کچھ مزید ضروری تیاریاں کیں، جس میں ریڈی میڈ میک اپ بھی شامل تھا اور اسلحے کی ترتیب بھی۔

اس کے بعد ہم تینوں اس ہوٹل سے روانہ ہوئے اور ائرپورٹ والے ہوٹل کا رخ کیا۔

میں نے اب اپنی کار کو استعمال کرنے سے اجتناب برتا، اور وہی پرانا طریقہ اختیار کیا جو ایسے مواقع میں اکثر کرتا تھا۔ یعنی کار کسی گیراج میں روک کر اس کی ٹیوننگ اور آئل چینج کرنے کے لیے چھوڑ دی اور وہاں سے ہم تینوں ایک ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔

کسی اہم اور حساس نوعیت کے مشن کا ٹارگٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے لائحہ عمل کو زگ زیگ انداز میں ترتیب دے کر آگے بڑھانا میری تربیت کا حصہ تھا۔

مذکورہ ہوٹل پہنچ کر جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ ہم تینوں میک اپ میں تھے اور ہمارے پہچان لیے جانے کا احتمال کم ہی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اسپیکٹرم کے گھاگ اور انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ بھی غضب کی نظر رکھتے تھے۔ ایک تجربہ اس کا مجھے ہوچکا تھا۔ وہ ''متوقع'' صورت حال میں بدلے ہوئے چہروں کے پیچھے اصل چہرہ تاڑنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہوٹل ائرپورٹ کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں اندر باہر سخت سیکورٹی کا انتظام تھا۔ اس کے لیے میں نے اول خیر اور شکیلہ کو باہر ہی کہیں محتاط ہو کے کھڑے رہنے اور انہیں کانوں کی ''لو'' پہ اسپائی ائرفون چپکائے رکھنے کی ہدایت کردی تھی۔ تاکہ میرا ان سے رابطہ بحال رہے۔

میری ہدایت کے مطابق یہ دونوں کسی عام سے فرد کو بھی شک میں مبتلا کیے بغیر اپنا کام بہ خوبی سرانجام دینا جانتے تھے۔ یعنی انہیں ایک ہی جگہ مسلسل کھڑے نہیں رہنا تھا۔

میں اب تنہا تھا اور ہوٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گیٹ پر ہی مجھے روک لیا گیا۔ ایک وردی پوش سیکیورٹی گارڈ نے ''میٹل فائینڈر'' میرے پورے جسم پہ پھیرا، اس کے بعد مجھے ایک فل باڈی اسکیننگ (میٹل ڈیٹکٹر) ڈور کے اندر سے گزارا گیا اور پھر وہاں سے میں نے فرش پر بچھے دبیز کارپٹ پر قدم رکھتا، پُراعتماد چال چلتا ہوا دانستہ استقبالیہ پر جانے کے بجائے لابی کا رخ کیا۔ جہاں کہیں کہیں ہوٹل کے عملے کے افراد ڈبل پیس سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے، ان میں گوری چٹی اسمارٹ لڑکیاں بھی تھیں۔

اس طرح کے اسٹارز ہوٹلز میں عام سے لباس والے کسٹمر کو یہ لوگ خوامخواہ ہی چبھتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہ ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا حصہ تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ایسا ہلکا کسٹمر ان کے مالی فائدے کے لائق نہیں ہوتا تھا۔ تاہم میں نے اپنی ڈریسنگ کا خاص خیال رکھا تھا تاکہ کسی معمولی آدمی کو بھی مجھ پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔

میں نے بیش قیمت گرے کلر کا بہترین تراش کا سگنیچر کلاس ڈبل بٹن سوٹ زیب تن کر رکھا تھا، جو میرے دراز قد

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر مُتعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety

اور کسرتی جسم پر بہت عمدہ نظر آتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ لابی کی طرف جاتے ہوئے قریب کھڑے عملے کے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص نے میری پُر وجیہہ شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے مجھ سے کچھ استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ اس کے برعکس اس نے نہایت ادب سے قدرے جھک کر ہاتھ کے اشارے سے لاؤنج کی طرف میری راہنمائی کر ڈالی۔

اپنے چہرے پہ بُردبارانہ تاثرات لیے میں نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے اسی مذکورہ شخص کی طرف دیکھا وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا، مگر پھر مجھ پر نظر پڑی تو میں نے ہلکے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی، اشارہ بھانپتے ہی وہ تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔

''سر؟'' میرے صوفے کے قریب آ کر وہ نہایت احترام سے بولا۔

''میری کراچی کی فلائٹ کینسل ہو گئی ہے، دوسری فلائٹ میں ابھی چند گھنٹے باقی ہیں، کوئی روم مل سکتا ہے؟''

مجھے معلوم تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا اسی لیے میں نے ساتھ ہی...... معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے یہ بھی کہہ ڈالا ''میں بہت تھکا ہوا ہوں، استقبالیہ پہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ بس! جلدی سے میرے لیے ایک کمرے کا بندوبست کر دو جو گراؤنڈ پر ہی ہو۔ پندرہ اور بیس کی رو میں ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس طرف ذرا میں ماحولیاتی سکون محسوس کرتا ہوں۔''

مجھے موٹی اسامی سمجھ کر اس نے چند سیکنڈوں میں میرا کام نمٹا دیا۔

میں نے دانستہ اسی کمرے کا انتخاب کیا تھا جو کمرا نمبر انیس کے قریب ہی ہو، تاہم ساتھ ہی میں نے اپنی قریب ترین چوائس بھی بتا ڈالی تھی۔

مجھے کمرا نمبر اکیس ملا تھا۔ میں نے تگڑی ٹپ کے ساتھ پے منٹ کی اور اسی آدمی کے ہمراہ مذکورہ کمرے میں آ گیا۔

ثریا کے ساتھی نے چونکہ پہلے ہی سے مجھے کمرا نمبر انیس کا کہہ رکھا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ یا تو وہ وہاں موجود تھا یا آنے والا تھا، گویا کمرا ایک تھا۔

یہاں آتے ہی میں نے اپنے لیے کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو منگوایا اور کھانا سرو ہونے کے بعد میں نے اسی شخص سے ''یہ کمرا نمبر انیس میں میرے ایک عزیز کو بھی آنا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا... ہاں، یاد آیا، زبیر، بتا سکتے ہو، وہ آ گیا ہے؟''

وہ جواباً مودبانہ بولا۔ ''یس سر! وہ تو ابھی دو تین گھنٹے قبل ہی آئے تھے مگر میرا خیال ہے سر کہ وہ آپ کے مطلوبہ عزیز نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ دو افراد ہیں، اور ایک ان میں مس سوزی نامی خاتون ہیں اور مرد کا نام شاید عبید تھا۔''

''اوکے! مجھے شاید مغالطہ ہوا ہوگا۔ تم جا سکتے ہو، ضرورت پڑی تو میں کال کر لوں گا تمہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اسپائی ٹرانسمیٹر پر ادل خیر سے رابطہ کر کے اپنا کمرا نمبر بتا دیا۔

دو افراد میں ہمارا مطلوبہ آدمی عبید ہی ہو سکتا تھا، کیونکہ میرے سیل پر رابطہ کرنے والا مرد ہی تھا۔ جبکہ سوزی نامی عورت پر مجھے کچھ الجھن سی ہوئی تھی۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آیا یہ دونوں دشمن تھے یا خیر خواہ۔ یعنی آنجہانی ثریا کے ساتھی۔

عبید نے (اگر تو یہ وہی تھا) مجھے فون کرنے سے منع ... کر رکھا تھا۔ البتہ خود وہ کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کر سکتا تھا۔

اگلے دس منٹوں بعد میں روم سے نکلا، گرد و پیش پہ طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور میری نظریں کمرا نمبر انیس پر ٹھہر گئیں۔ پھر میں اسی طرف بڑھ گیا۔

عملے کی ایک سوٹ پوش حسینہ مسکراتی ہوئی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی، جواباً میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ آگے بڑھ گئی تو میں مطلوبہ دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے دروازہ تھوڑا دھکیلا، وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، مجھے ایک ایسی آڑ کی تلاش تھی جہاں رک کر میں اس کمرے پر نگاہ رکھ سکوں۔ جلد ہی مجھے اوپر جاتے زینے کا ایک خلا دکھائی دے گیا، وہاں سے میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر دروازے پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

اس طرف ایک نصف قد آدم کھڑکی بھی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ میں ادھر ہی جا کھڑا ہوا اور یونہی باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

ہوٹل چونکہ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا اس لیے کھڑکیاں ائرٹائٹ تھیں۔

کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے رسٹ واچ

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

میں وقت دیکھا۔ اسی وقت مجھے اپنے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے دانستہ سیل کو ''خاموش'' حالت میں رکھا ہوا تھا۔

ڈسپلے پر اسی کا نمبر آرہا تھا۔ میرا دل یکبارگی ایک جوش کے احساس تلے دھڑکا اور کال اٹینڈ کر ڈالی۔

''ہیلو، کہاں ہو تم؟'' دوسری جانب سے عجلت آمیز آواز ابھری۔

''راستے میں ہوں لیکن فکر نہ کرو میں ٹھیک نو بجے۔۔۔''

''او کے، رائٹ۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''میں نے یہی تسلی کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ سنو، میں اس وقت اپنی جان داؤ پہ لگائے ہوئے ہوں، ممکن ہے تھوڑی دیر ہو جائے۔'' وہ آگے بولا۔

''میرے ساتھ ایک ساتھی لڑکی بھی ہے۔ وہ تنظیم کی وفادار ہے۔ میں اسے چالاکی سے ڈاج دے کر روم نمبر انیس میں آکر تم سے ملاقات کروں گا اور ایک اہم بات شیئر کر کے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل بھی طے کریں گے۔''

''کیا تمہاری ساتھی لڑکی کو کمرا نمبر انیس کا علم ہے؟'' میں نے اس کا ایک جھوٹ پکڑنے کی غرض سے پوچھا۔

''ہاں! او کے بائے۔'' اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میری تسلی تو ہو گئی تھی لیکن ایک بات پر الجھ گیا تھا میں۔ اگر وہ کمرا انیس میں مجھ سے کوئی خفیہ بات کرنا چاہتا تھا تو پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی یعنی تنظیم کی وفادار کو اس کمرے کے بارے میں کیوں بتایا تھا؟ یا پھر ہو سکتا ہے اس کی کوئی مجبوری ہو؟ وہ خود بھی کسی تنظیمی اہم مشن پر وہاں پہنچنے والے ہوں یا پھر پہنچ چکے ہوں؟

اس ضمن میں بہت سی باتیں ذہن میں آرہی تھیں جس کے چند اہم نکات پر میں غور کر چکا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر پُرغور انداز میں اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ پہلے میرے دل میں خیال آیا کہ دروازے پر ناک کر کے اندر گن پوائنٹ پر گھسنے کی کوشش کروں لیکن اس طرح معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اگر وہ سچا تھا تو اس کا بھی سارا منصوبہ غارت ہو جاتا اور زندگی اس کی الگ اپنے لوگوں کے ہاتھوں داؤ پہ لگ جاتی۔ اسی لیے اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میرا اب وہاں کھڑے رہنا بے کار ہی تھا۔ لہٰذا میں واپس اپنے کمرے میں آگیا اور ایک بار پھر اول خیر سے رابطہ کیا۔ اسے مزید چند ضروری ہدایات دیں۔

پورے نو بجے تو نہیں، البتہ نو بج کر بیس منٹ پر اس نے مجھے کال کی اور پوچھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہوں؟''

''مجھے پندرہ، بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن اس سے زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں استقبالیہ پر کیا کہوں کہ کس سے ملنا ہے مجھے۔ ایسے ہوٹلوں میں سیکیورٹی سخت ہوتی ہے۔ تم کس نام سے مقیم ہو؟''

''عبید۔'' اس نے جواب دیا اور میرا اثباتی جواب سننے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے مزید پندرہ منٹ اپنے کمرے میں گزارے، پھر اول خیر سے رابطہ کر کے اسے موجودہ سچویشن کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے کمرا نمبر انیس کے دروازے پر آکر دستک دی اور ایک ہاتھ اپنا کوٹ کی جیب کے اندر ڈال لیا۔

''کون؟'' اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

''میں شہزی، جسے تم نے فون کیا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے ایک درمیانی عمر اور مناسب قد و قامت کا حامل شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے فوراً اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راستہ دیا۔

میں محتاط روی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اور ایک ہی نگاہ ڈال کے سمجھ گیا کہ وہ کمرے میں تنہا تھا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ جب تک وہ پلٹتا میں باتھ روم اور واش روم چیک کر چکا تھا کہ وہاں اس کا کوئی ساتھی تو نہیں چھپا ہوا۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ ثریا کا حوالہ دینے کے بعد تمہارے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی؟'' وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ تاکہ بھی قفل کی دوسری چابی سے اس کا کوئی ساتھی اندر نہ در آئے۔

''اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہو تو ہم آرام سے بیٹھ کر گفتگو کر لیں؟''

وہ کچھ کچھ بیزار سا نظر آنے لگا۔

''لو، یہ بھی میں میز پر ڈالے دیتا ہوں۔۔۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر قریب دھری میز کی سطح پر رکھ دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY Section

''تم شاید میک اپ میں ہو؟'' میں اس کی بات پر چونکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ثریا کے کتنے ساتھی میری صورت سے آشنا تھے؟

''تمہیں کیسے شک ہوا؟ کیا تم نے میری صورت دیکھی ہے؟''

''بچکانا سوال۔'' وہ بولا۔ ''تم اسپیکٹرم کے انتہائی مطلوب دشمنوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری تصاویر تک پوری دنیا میں، جہاں جہاں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، پہنچا دی گئی ہیں۔ اب ذرا کام کی بات ہوجائے؟''

''شیور۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ میں اب اس کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔

اب ہم دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے کان کی لو پر ہاتھ رکھ کر اول خیر سے مختصراً بات کی اور اس سے بولا۔

''ہاں! اب کہو۔ کیا بات ہے؟'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''آرک لوچن کی تمہارے ہاتھوں ہلاکت کے بعد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو زبردست دھچکا لگا ہے۔ کیونکہ وہ تنظیم کا ایک مقامی ہینڈلر ایجنٹ تھا۔ جس کے زیرِ اثر اسٹیشن چیف اور کیٹسا ایجنٹ ہوتے ہیں۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا، اس کے بعد دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے آگے کہنا شروع کیا۔

''شاید تمہارے علم میں ہو کہ اسپیکٹرم بڑے بڑے عالمی گروہوں اور ممالک سمیت بھاری معاوضے پر ان کے مفادات کے لیے پوری رازداری کے ساتھ کام کرتی ہے بلکہ بسا اوقات تو انہیں بھی ساتھ ملا لیتی ہے جہاں ان کے مشترکہ مفادات ہوں' ان میں 'بلیو ٹکسی' کا نام قابلِ ذکر ہے۔ بلیو ٹکسی کے بارے میں تمہیں کچھ بریفنگ ہے؟'' وہ رکا۔

''ہاں!'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

''یہی کہ یہ بھارتی بدنامِ زمانہ خفیہ ایجنسی ''را'' کی ایک ذیلی شکل ہے جسے خصوصی طور پر بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے جدید بنیادوں پر تشکیل دیا ہے۔'' میں نے میجر ریاض باجوہ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کہا تو عبید مسکرا کے عجیب سے لہجے میں بولا۔

''بس؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن آمیز سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

''بھارت شروع ہی سے پاکستان کے خلاف دوغلی پالیسی چلا رہا ہے۔ بہ ظاہر وہ وطنِ عزیز کے خلاف جو ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، اس کے در پردہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ را کے وطنِ عزیز میں ملک دشمن سرگرمیوں کے ٹھوس شواہد ملنے اور یو این او میں پاکستان کے خاطر خواہ احتجاج کے بعد سے معاملہ بہ ظاہر ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور لگتا یوں ہے کہ اب سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد را کا اصل ونگ ''بلیو ٹکسی'' اپنی کارستانیاں آگے بڑھاتا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ را کا ایک ونگ، بہت پہلے سے ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر تھما اور ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالنے کے بعد آگے بولا۔ ''اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ آج بارہ بجے کی فلائٹ سے ایک عام مسافر کے بھیس میں بلیو ٹکسی کا ایک اسپیشل سپر ایجنٹ جس کا اصل نام سندر داس ہے، نخیل کے نام سے یہاں پہنچنے والا ہے، جو درحقیقت اسپیکٹرم کے ساتھ کیے گئے ایک معاہدے کے تحت اس کی لوکل کمانڈ کو سنبھالا دے گا، اور اسے اسپیکٹرم کا ہینڈلر ایجنٹ کا عہدہ تفویض کیا جائے گا۔ یوں سمجھ لو اسپیکٹرم نے یہاں اپنے ذوتل ونگ کو سپورٹ دینے کے لیے بلیو ٹکسی سے ایک مدد لی ہے۔ اور اب وہ دونوں مشترکہ طور پر اپنے مذموم مقاصد کو یہاں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔'' وہ رکا۔

اس کی بات شاید اب بھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ تاہم میں خاموش اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ آگے بولا۔

''پہلے میں خود سندر داس کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں غور کرنے پر میں نے سوچا کہ اس سے بھلا کیا فرق پڑتا؟ بلیو ٹکسی اپنا ایک اور ایجنٹ بھیج دیتی۔ یہ مسئلے کا خاطر خواہ حل نہ ہوتا۔ لہٰذا بعد میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں .... اس نتیجے پر پہنچا کہ تم سے مدد لینی چاہیے، جو پلان میں نے سوچ رکھا ہے، اس کے مطابق ہمیں اسپیکٹرم کے خلاف دوررس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔''

''کیا پلان ہے تمہارا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔

وہ میرے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں سندر داس کی جگہ لینا ہوگی۔''

''واٹ؟'' میں بری طرح چونکا۔ ''یہ.... یہ.... کیسے ممکن ہے، بھلا؟ اسپیکٹرم کی پوری عالمی قیادت کی نظروں

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں، میں اب اجنبی نہیں رہا، وہ میرے سامنے آئے بغیر میری ایک ایک ہسٹری اور تصویر تک سے واقف ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں میک اپ۔۔ کرلوں تو بھی یہ ناممکن ہے، باوجود اس کے بہت سی قباحتیں ہیں۔ سندر داس کا بھی پورا ریکارڈ، مع کوڈز وغیرہ کے سب ان کے پاس محفوظ ہوگا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو شہزی۔۔۔! ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ ہم نے ان ساری باتوں پہ غور نہیں کیا ہوگا؟" عبید میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

میں اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ اس بار وضاحت آمیز اور صراحت سے اپنے پلان کی تفصیل بتانے لگا۔

"سنو شہزی! جب ہم نے ان ساری باتوں پہ غور کیا تو ہمیں بھی یہ ناممکن سا لگا تھا، لیکن اس میں سارا کھیل چونکہ ٹائمنگ کا ہے اس لیے یہ منصوبہ ہمارے لیے قابل غور ہے۔"

"ٹائمنگ سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

"ہمارا پلان اس پر زیادہ دیر متحرک نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ دنوں یا ہفتوں پر محیط نہیں ہوسکتا، یہ صرف چند منٹوں کا کھیل ہوگا۔"

"چند منٹوں کا کھیل؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ "ایک مقررہ اور مختصر وقت تک اس منصوبے پر عمل پیرا رہتے ہوئے دشمن پر ایسی کاری ضرب پڑے گی کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔"

"تو پھر یہ کارنامہ تم یا تمہارا کوئی ساتھی بھی بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے تم لوگوں نے میرا ہی کیوں انتخاب کیا؟" میرے اس روایتی سوال پر وہ بولا۔

"مجھے پتا تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے، شاید ثریا نے تمہیں اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں دی کہ۔۔۔ اسپیکٹرم کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد اپنی جان پر کھیل کر اس نے خود سمیت، اسپیکٹرم کے جال میں پھنسنے کے بعد کتنے لوگوں کے ضمیر کو جگایا تھا، یہ محض گنتی کے تھے، یوں سمجھ لو آٹھ، دس، ان میں ثریا سمیت تو بہت سے مارے گئے، اب صرف میں اور میرے دو ساتھی کریم اور سجاد نامی ساتھی بچے ہیں، وہ دونوں وزیر جان کی اسپیشل کمانڈ کے زیر اثر ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں، رہا میں تو، مجھے تم دیکھ ہی رہے ہو، میں خود اس وقت تنظیم کی ایک وفادار سوزی کے ساتھ، سندر داس کو پروٹوکول دینے کے لیے آیا ہوا ہوں۔

"بات اگر تمہاری سمجھ میں آگئی ہے تو میں آخری بات کہہ ڈالوں، کیونکہ اب وقت کم بچا ہے، اور ہمیں بلکہ تمہیں بہت سا کام نمٹانا ہے۔ اگر دل نہیں مان رہا تمہارا تو تم واپس جاسکتے ہو۔"

"آخری بات بھی کہہ ڈالو، میں سب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آگے بڑھنے کے لیے ہی قدم اٹھاتا ہوں، پیچھے نہیں۔"

"گڈ" وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ "دیکھو، سندر داس کو ائرپورٹ ریسیو کرنے کے لیے میں اور سوزی جائیں گے، یہاں اسی ہوٹل میں کمرا نمبر اکیاون میں اسے کچھ دیر رکنا ہے، اس کے بعد ایک گاڑی ہمیں لینے کے لیے آئے گی۔

"اس میں ہمارے ساتھی یعنی تنظیمی وفادار ہوں گے، وہ ہمیں سندر داس سمیت ساہیوال لے جائیں گے۔ یہ سارے معاملات چک تواں میں واقع اسپیکٹرم کے فلاحی آفس اسٹیشن فور میں طے پائیں گے۔

"معاہدے کی اس بلیک کوبرا فائل پر سندر داس سمیت، وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد وزیر جان سندر داس کو اپنی ذاتی گاڑی میں اپنی رہائش گاہ "کیتال لاج" لے جائے گا، سندر داس وہیں رہے گا، جب تک وزیر جان اسے کھلاں والی میں زیر تعمیر ایک نئے "زیرو ہاؤس" میں منتقل نہیں کر دیتا۔"

"کھلاں والی۔" میں اس نام پر بری طرح چونکا تو عبید کو بھی میرے اس طرح بدکنے پر حیرت ہوئی، وہ اسی لہجے میں بولا۔

"کیا ہوا؟ تم کھلاں والی کے ذکر پر اتنا چونک کیوں گئے ایک دم؟"

میں اگر اسے زبیر خان عرف خان جی کے بارے میں بتاتا تو بات لمبی ہوجاتی اسی لیے اس سے سر دست پہلو تہی کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی خاص بات نہیں، یہ نام ذرا سنا ہوا لگا تھا، تم آگے کہو۔"

"معاہدے کی اس فائل کو "بلیک کوبرا" کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں اسپیکٹرم سمیت بلیو ٹکسی کا گٹھ جوڑ، اور وزیر جان اور ممتاز خان کا سارا کچا چٹھا درج ہے۔ اگر ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہوجاتا ہے تو یوں سمجھو ان دونوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے ہیں، بہ صورت دیگر یہ بلیک کوبرا معاہدہ۔۔۔ اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ایک نئی زندگی دے

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ڈالے گا۔ جو ظاہر ہے ہمارے ملک کے لیے خیر کا باعث نہیں بن سکتا۔ لہٰذا تمہیں سندر داس کی جگہ لینا ہوگی اور فائل پر دستخط ہوتے ہی تمہیں، سجاد اور کریم فرار کروا دیں گے۔ تم وہ فائل لے کر نکل جانا اور اسے پاور والوں کے سپرد کر دینا۔ یہ منصوبہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ ڈن۔"

"ڈن!" میں نے بھی مستحکم لہجے میں کہا پھر سوچتے ہوئے بولا۔ "مگر سندر داس کو یہاں سوزی کے ہوتے ہوئے ٹھکانے لگانا اور اس کی جگہ لینا، کیا اتنا ہی آسان ہوگا؟"

"تم نے ہامی بھر لی، شہزاد صاحب! بس یہی کافی ہے۔ باقی کا کام میں سرانجام دے ڈالوں گا۔"

"لیکن سندر داس کی شکل و صورت جیسا میک اپ اور یقینی طور پر اس کے بائیو ڈیٹا کا مفصل ریکارڈ، یہ سب اس قلیل مدت میں کرنا کیسے ممکن ہوگا؟"

"فون پر تم سے بات اور ہامی بھرتے ہی میں اور سجاد اس کا پہلے ہی سے بندوبست کر چکے ہیں۔ اس طرح ہماری جانیں بھی داؤ پہ لگی ہوئی ہیں۔ اب ہماری زندگی کا دار و مدار اس منصوبے کی کامیابی پر منحصر ہے۔ سندر داس کا بائیو ڈیٹا کریم اور سجاد نے گول کر کے دوسرا بنا ڈالا ہے، حتیٰ کہ سندر داس کی تصویر بھی تبدیل کر دی گئی ہے، اور اس کی جو تصویر سجاد اور کریم نے وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی ہے وہ اصل سندر داس کی نہیں ہوگی بلکہ یہ وہ ہوگی جو میں تمہارا ریڈی میڈ میک اپ کرنے کے بعد ظاہر کردوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے وہ تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے بھویں سکیڑ کر اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ تو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ جس شخص کی تصویر تھی وہ عام سی اور میک اپ کی رُو سے بہت آسان سی تصویر تھی، یعنی اس شخص کا میک اپ بہ آسانی میرے چہرے پہ کیا جا سکتا تھا۔ یہی تصویر وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی گئی تھی۔ جبکہ بائیو ڈیٹا تبدیل کرنے کی یوں بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اس کے علاوہ عبید نے احتیاط کے پیش نظر سندر داس کے اصل چہرے کی بھی تصویر مجھے دکھا دی، جو کہ ظاہر ہے اسے اس کے ساتھی کریم یا سجاد نے اسے دی ہوگی، جو انہیں را کی طرف سے برقی رابطے کے ذریعے ہی موصول ہوئی ہو گی، تا کہ یہ لوگ (اسپیکٹرم) ان کے ساتھی کو پہچان لیں، جبکہ منصوبے کے مطابق اصل تصویر کو وزیر جان وغیرہ سے چھپایا ہی گیا ہوگا۔ بہرحال میں نے اصل سندر داس کی تصویر بھی دیکھ کر اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

مگر پھر یکایک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں نے اس سے پوچھا۔

"تم نے جو نقلی سندر داس کی تصویر انہیں دکھائی ہے، اسے سوزی نے بھی تو دیکھا ہوگا، جبکہ وہ تمہارے ساتھ ائرپورٹ پر اصل سندر داس کو ریسیو کرنے جا رہی ہے، وہ اس بدلی ہوئی صورت والے اصل سندر داس کو دیکھ کر..."

"میں سرے سے ایسا ہوتے ہی نہیں دوں گا۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر درمیان میں بولا۔ "اول تو میری یہی کوشش ہوگی کہ صرف میں ہی سندر داس کو لے کر ہوٹل پہنچوں اور سوزی کو روم نمبر اکیاون میں ہی ٹکے رہنے کا مشورہ دوں گا، اس کے بعد اپنے شکار کو میں روم نمبر ایس میں لا کر اس کا تخفیل کرنے کے بعد تمہیں بلا لوں گا اور پھر تم سندر داس بن کر ہمارے ساتھ اسٹیشن فور کی طرف روانہ ہو جاؤ گے۔"

"سوچ لو دوست! اگر سوزی نے بھی تمہارے ساتھ لاؤنج تک جانے کا ارادہ کر لیا تو پھر کیا کرو گے؟ کیونکہ وہ آخرکار اپنے "بڑوں" کی ہی ہدایت پر عمل کرے گی، تم پر ہرگز نہیں۔" میں نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

"اس کا حل بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے کہ سوزی انکار کر سکتی ہے، جبکہ میرے ساتھ جانے میں وہ اصل سندر داس کو دیکھ کر چونک جائے گی۔ تب میں اسے ائرپورٹ پر ہی کسی طرح ڈاج یا جُل دینے کی کوشش کروں گا، بلکہ ممکن ہوا تو میں اسے بہانے سے وہیں کہیں پبلک ٹوائلٹ میں ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"پھر اپنے بڑوں کو کیا جواب دو گے سوزی کے بارے میں۔"

"آسان سی بات ہے، کہہ دوں گا میں کہ نامعلوم دشمنوں نے ہم پر حملہ کر ڈالا تھا اور میں بڑی مشکل سے تمہیں، یعنی سندر داس کو لے کر پہنچا ہوں۔" وہ بولا۔

یہاں مجھے اس کے منصوبے میں کئی سقم محسوس ہوئے تھے، جو بہ ظاہر تیر بہ ہدف بھی نظر آتے تھے، لیکن ذرا غور کرنے پر ہی مجھے اس امر کا بھی اندازہ ہو چلا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ منصوبہ جہاں سو فیصدی کامیابی کا ضامن نظر آتا تھا وہیں، خطرناک بھی محسوس ہوتا تھا۔

لہٰذا اب مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ منصوبہ کس وجہ سے اتنا قلیل اور مختصر مدت میں انجام دینے کا متقاضی تھا؟ ظاہر ہے اسے طول نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس میں بھانڈا پھوٹنے

READ Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

..... کا سو فیصد خطرہ تھا۔ اس کی بات پر مجھے بالآخر بتانا پڑا۔

"اگر منصوبے کو جلد اور زیادہ آسانی سے نمٹانا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں بلکہ میرے دو ساتھی بھی ہوٹل کے باہر موجود ہیں۔"

میری بات پر وہ چونکا اور جانے کیوں اس کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہو گئیں پھر وہ اسی انداز میں بولا۔

"ہرگز نہیں۔ ہمارے منصوبے میں مزید کسی اور کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے، رہے تم تو تم ہمارے ساتھ ہو ہی۔ لیکن فی الحال تم بھی نہیں۔ میں سیل پر تم سے رابطے میں رہوں گا۔ یہ بتاؤ، تم نے یہاں کمرا لے رکھا ہے؟"

"ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میرے زیادہ دیر یہاں رہنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا۔"

"گڈ! اب تم ذرا تیار ہو جاؤ میں تمہارا سندر داس جیسا میک اپ کیے دیتا ہوں، باقی کپڑوں کا بندوبست تو اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ہو ہی جائے گا۔"

اس نے آخر میں کہا اور میں نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔

وہ اپنے کام میں خاصا ماہر ثابت ہوا بلکہ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے محسوس ہوا تھا، میں اگر ایسا میک اپ کرتا تو مجھے کم از کم آدھے سے پونا گھنٹا تو لگ ہی جاتا۔ حالانکہ سندر داس جیسی صورت اختیار کر کے میک اپ کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اس نے یہ کام بہ مشکل پندرہ، بیس منٹ میں نمٹا دیا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس منصوبے کا کلی طور پر انحصار مجھ پر تھا اسی لیے میں اس میں ترمیم کرنے کا حق رکھتا تھا۔ میں اسی پر ہی غور کر رہا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اول خیر سے رابطہ کرنا تھا، ورنہ رابطے میں دیر ہونے کی صورت میں وہ مجھے کسی خطرے میں پھنسا سمجھ کر اندر گھسا چلا آتا۔

اول خیر کو میں نے ابھی صرف عبید کے ساتھ ہونے والی "تسلی بخش" ملاقات کے بارے میں ہی بتایا تھا، اور اپنی تسلی کروا کے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ منصوبے کی کامیابی کی صورت میں وزیر جان اور ممتاز خان پاور والوں کی گرفت میں آ جاتے اور پھر قید خانہ ہمیشہ کا ان دونوں کا مقدر ہوتا۔ جبکہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا بھی قلع قمع ہو جاتا۔ پھر کیا ہوتا؟ کیا لولووش اس زخم کو بھلا پاتا؟ جبکہ اس صورت میں عابدہ کی زندگی داؤ پہ لگی ہوئی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ لولووش، سی آئی اے کے باسکل ہولارڈ کا چہیتا داماد تھا۔ جس کی ٹائیگر فیک فورس کے ایجنٹ پاکستان میں میری گرفتاری کے لیے عنقریب ایک خفیہ آپریشن کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ تو کیا میں عابدہ کی خاطر اپنے وطن کو ملک دشمن عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟ کیا میرا قومی آدرش اور ملی حمیت اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ میں اپنے وطن پر اپنی محبت کو ترجیح دیتا؟ جبکہ مجھ پر تو سرحد کے ایک گمنام اور بہادر سپاہی کا بیٹا ہونے کی حیثیت کا بھی اطلاق ہوتا تھا۔

"کاتبِ تقدیر نے آخر یہ سارے امتحان میرے اور عابدہ کے نصیب میں ہی کیوں لکھے تھے؟" میں نے کڑھتے دل کے ساتھ سوچا۔

پہلے عابدہ مجھ سے دور ہوئی اور اتنی دور ہوئی کہ سات سمندر پار چلی گئی۔ پھر جدائی کی اس طول پڑتی عذاب ناک گھڑیوں میں وہاں اس کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک نیک مقصد اور کارِ خیر ادا کرنے کی اسے اتنی بڑی اور بھیانک سزا سے دوچار ہونا پڑا کہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو "عالمی دہشت گردوں" اور امریکی دشمنوں کا آلۂ کار قرار دے دیا گیا۔ اب اسے امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے ایک میں بھیجنے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے تھے۔ کاش! میں عابدہ کو امریکا بھیجتا ہی نہیں تو آج اس کے ساتھ یہ سب نہ ہوا ہوتا۔

اچانک ہی میرے دل و دماغ پر مایوسی اور بددلی کا غلبہ سا طاری ہونے لگا۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے غم خوار اور بے جگر... یار اول خیر کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ایسے مایوسی کے لمحات میں ایک وہ ہی میری ہمت بڑھاتا تھا۔ مگر نہیں، وہ جب میرے قریب نہ بھی ہوتا تھا تو اس کی بے لوث باتیں اور نصیحتیں تو میرے ساتھ رہتی ہی تھیں۔ ایسے موقع پر وہ اپنی پوری زندگی کے تجربے کا نچوڑ، میری سوچ اور میرے حوصلے کے خشک پڑتے سوتوں پر نچھاور کر دیتا تھا۔ ایسے میں اسی کی ایک کہی ہوئی بات مجھے بے اختیار یاد آ گئی۔

"او خیر، کاکے! تو بہت جلدی اپنا دل چھوٹا کر لیتا ہے، پر دیکھ، انسان فطری طور پر کمزور واقع ہوا ہے۔ زیادہ خوشی ملتی ہے تو وہ اسے "خوشی کے آنسو" کہہ کر اپنی اس فطری ... کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ دکھ کی گھڑی میں وہ اپنے آنسوؤں کے ذریعے اسے "تقدیر کا لکھا" کے الزام میں دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایسا تب ہی ہوتا ہے جب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے جو کچھ بھی

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کررہا ہے، وہ صرف اور صرف اپنے بل بوتے اور اپنے زوربازو پر کررہا ہے۔ درحقیقت وہ اس طرح اللہ کی اس مدد کو بھولنے لگتا ہے جو حق کی جنگ میں ایک کمزور سے کمزور تر انسان کے ساتھ بھی درپردہ شامل رہتی ہے۔ ''پس! مایوس نہ ہونا'' یہ اس مولائے کریم کی شرط ہے۔''

اول خیر کے کہے ہوئے یہ جملے یاد آتے ہی ایکا ایکی مجھے اپنے اندر ایک حیرت انگیز سی تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ شاید یہ سچ تھا کہ میں ایسا سوچنے لگا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ ہمت مرداں، مدد خدا، یہ خیال آتے ہی میں اپنے اندر ایک نئی طاقت اور نیا جوش اور ولولہ سرایت کرتا محسوس کرنے لگا۔ اور صدق دل کے ساتھ اللہ سے معافی بھی مانگی کہ میں کیوں بھول گیا تھا یہ کہ میں جس جنگ میں مصروف ہوں، وہ صرف میری ہی جنگ نہیں ہے، یہ ایک حق کی باطل کے خلاف جنگ ہے اور اللہ کی مدد تو اس میں لازماً شامل ہے ہی، تو پھر کیوں اس زعم میں مبتلا ہوگیا تھا کہ یہ سب کچھ میں اپنے زوربازو کے بل بوتے پر کررہا ہوں۔

میں نے سر جھٹک کر خیالات کی بڑھتی ہوئی کثافت کو ذہن دل سے نکال پھینکا اور عبید کا انتظار کرنے لگا۔

سندرداس جیسے تربیت یافتہ بلیوٹکسی ایجنٹ کو قابو کرنا اور پھر اس سلسلے میں اسپیکٹرم ایجنٹ سوزی کو ڈاج دینا، یہ دونوں ایسے مختلف اور ''رسک فل'' کام تھے، جسے عبید تن تنہا انجام دینے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ مجھے وہ ''اوور کانفیڈنس'' کا شکار محسوس ہوتا دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے میں نے بھی اسے اپنے ساتھیوں اور اپنی مدد کی پیش کش بھی کرڈالی تھی۔ اگرچہ پچویشن کچھ ایسی ہی تھی جو سوزی اور سندرداس کے لیے طمانیت کا باعث بنتی تھی کہ عبید ان کا ہی ''ساتھی'' تھا اور عبید کے لیے ظاہر ہے کہ ''ساتھی'' بن کر یہ کام نمٹانا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا، لیکن پھر بھی اسے اکیلے یہ کام سرانجام نہیں دینا چاہیے تھا۔

میں نے وقت گزاری کے لیے سوچا کہ کیوں نہ اب اول خیر سے بھی ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کرکے ساری بات بتادی جائے، یہ سوچ کر ابھی میں اس سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے سیل پر عبید کی کال آگئی۔ اور پھر جب میں نے اس کی دوسری طرف سے ذرا بوکھلائی ہوئی آواز سنی تو میں خود بھی پریشان ہوگیا۔

''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟''

''یہ کم بخت سوزی ڈاج میں نہیں آسکی ہے، زیادہ کوشش کی تو وہ میری طرف سے فوراً شک میں پڑجائے گی اور کوئی بعید نہیں وہ مجھ پر بھی قابو پالے، کیونکہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ ہے، اور اس وقت مجھے خود بھی اسی کی کمانڈ میں دیا گیا ہے۔'' وہ بولا۔ میں نے فکرمندانہ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر ذرا ایک لمحہ کے توقف سے مستفسر ہوا۔

''ویسے سوزی کا تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں اسے تھوڑی دیر کے لیے خود سے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے منصوبے کو رازداری سے عملی جامہ پہنا سکوں، تم کوئی مدد کرسکو تو...''

''مجھے سوچنے دو۔'' میں نے کہا۔

''ذرا جلدی۔ وقت کم ہے۔ ورنہ یہ سارا زرخیز منصوبہ پل بھر میں مٹی ہوجائے گا۔'' وہ بولا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ پھر اس سے پوچھا۔

''تم ہو کہاں اس وقت؟''

''ائرپورٹ سے ہوٹل کی طرف آرہا ہوں، کمرا نمبر اکیاون میں آنا ہے ہمیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مگر دیکھو... تم اس کے سامنے مت آنا، ہوسکتا ہے وہ تمہیں پہچان لے۔ میں خود اس وقت تمہیں ائرپورٹ کے لاؤنج کے پبلک ٹوائلٹ سے فون...''

اچانک دوسری طرف سے عبید کی کراہ آمیز گھٹی گھٹی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے رابطہ منقطع ہوگیا۔ میرے پورے وجود میں جیسے سرد لہر سی دوڑ گئی بلکہ پل کے پل میں نے اپنی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی ننھی بوندیں بھی محسوس کی تھیں۔

صاف لگتا تھا کہ عبید پر بات کرتے ہوئے کسی نے حملہ کردیا تھا۔ شاید اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ بنا بنایا زرخیز منصوبہ ناکام ہوچلا تھا، کیونکہ عین ممکن تھا کہ سوزی کو اس پر کسی بات کا شبہ ہوگیا ہو۔ اور وہ اس کی ریکی کرتے ہوئے اس تک پہنچ کر گفتگو کا کافی حصہ سن چکی ہو۔ ابھی یہ میرا صرف قیاس تھا۔

میں تیر کی طرح اپنے کمرے سے نکلا اور چکنے فرش والے کوریڈور پر اندھا دھند دوڑتا چلا گیا، ساتھ ہی اول خیر سے رابطہ کرکے ہانپتی آواز میں بولا۔

''اول خیر! تم دونوں جلدی سے ائرپورٹ کے لاؤنج تک پہنچو، میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔ جلدی۔'' میں نے فوراً رابطہ منقطع کردیا اور دوڑتا ہوا ہوٹل کی لابی سے سیدھا گیٹ

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پر پہنچا، عملے کے اور دیگر لوگ مجھے اس طرح بے تحاشا دوڑتا پاکر چونکے مگر مجھے اب ان کی پروا نہیں تھی۔

ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے ہی میں نے ائرپورٹ کا رخ کیا۔ اور اس طرف جانے والی سڑک پر آکر اپنی رفتار بڑھا دی۔ ڈبل چیس سوٹ کے ساتھ میں دوڑتا ہوا کسی گھاگ جاسوس کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ جو فرار ہوتے ہوئے کسی خطرناک مجرم کا تعاقب کرتا ہے۔

چند منٹوں میں ہی ائرپورٹ کے گیٹ پر میں پہنچ چکا تھا، یہاں چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے پاس وقت ضائع کرنے کا کوئی چانس نہ تھا اسی لیے میں نے فوراً سے پیشتر ہی اپنی جیب سے اپنا اسپیشل سروس والا کارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سیکیورٹی اہلکاروں کو وہ دکھا کر میں اندر داخل ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ مجھے ایک طرف کھڑے، منتظر دکھائی دیے تھے، میں نے انہیں ادھر ہی رکنے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ میں انہیں بھی اپنے ”ریفرنس“ سے اندر لے جا سکتا تھا، مگر کچھ سوچ کر میں نے ایسا نہیں کیا۔

مجھے عبید کی جان بچانا تھی اور سوزی پر بروقت قابو پانا تھا۔ بہ صورت دیگر وہ اپنے لوگوں کو عبید کی ”غداری“ کے علاوہ۔۔۔ کسی منصوبے کی بھنک کی اطلاع بھی کر سکتی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ عبید پر قابو پا کر یہ اطلاع دے بھی چکی ہو، اس صورت میں سارا منصوبہ ہی فیل ہو جاتا۔

اندر ارائیول لاؤنج میں آتے ہی میں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے، عقابی نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اور آنے والے ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھنے لگا۔

مجھے زیادہ تر۔۔۔۔ سندر داس اور اس کے ساتھ موجود سوزی نامی لڑکی ۔۔۔ کی ایک ساتھ نظر آنے کی امید تھی، اگر عبید، سوزی کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو سوزی نے بھلا اس بے چارے کو کہاں زندہ چھوڑا ہوگا۔ جلد ہی مجھے ایک نہیں بلکہ دو مطلوبہ چہرے دکھائی دے گئے اور میں بری طرح ٹھٹک گیا، خوشی اور طمانیت کی ایک لہر سی میرے وجود میں دوڑ گئی، ان میں ایک تو سندر داس تھا (جس کی اصل تصویر عبید مجھے کسی احتیاط کے پیش نظر ہوٹل میں ہی دکھا چکا تھا) جبکہ دوسرا چہرہ عبید کا تھا۔

عبید کو دیکھ کر بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ میں تو یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ سوزی نے اس پہ قابو پا لیا ہوگا، یا بے بس کر دیا ہوگا، لیکن ہو سکتا ہے کہ خوش قسمتی سے وہ سوزی کے قابو میں آنے کے بجائے، وہ اس کے نرغے میں آ گئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو بلاشبہ عبید نے بڑی ہمت اور جواں مردی سے کام لیا تھا، یہی تو وہ حوصلہ ہوتا ہے جو خود سے زیادہ طاقت ور دشمن پر حاوی کرتا ہے، لیکن مجھے تو فون کر کے عبید کو آگاہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ جب متوقع طور پر مجھ سے بات کرتے ہوئے سوزی نے ہی اس پر حملہ کیا تھا تو عبید کی فون پر مجھ سے بات ادھوری رہ گئی تھی۔

لیکن میں اب عبید کو زندہ دیکھ کر خوش تھا کہ منصوبہ اپنی جگہ جوں کا توں تھا لیکن پھر بھی عبید ہی مجھے کچھ بتا سکتا تھا۔

میں ان کے پیچھے ہولیا اور ہوٹل تک جا پہنچا۔ راستے میں اول خیر کو بھی۔۔۔۔ دوبارہ اسی پوزیشن میں کھڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی، وہ بھی اس گھن چکر پر کچھ الجھ سا گیا تھا۔

ہوٹل آتے ہی میں نے سیدھا اپنے روم کا رخ کیا اور عبید کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کو سندر داس کو ٹھکانے لگا کر ہی آنا تھا۔ لہٰذا میں یہ دعا مانگنے لگا کہ سندر داس کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور تیزی سے میں نے دروازے کا رخ کیا۔

”کون؟“ میں نے دروازے سے لگ کر ہولے سے پوچھا۔

”میں ہوں عبید، جلدی کھولو دروازہ۔“ دوسری جانب سے عبید کی آواز ابھری اور میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ تھکا تھکا ہانپتا سا ایک قریب رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔

”اف! آج تو میں بھی جان سے گیا تھا اور منصوبہ بھی سارا خاک میں ملنے والا تھا شکر ہے۔ سب ٹھیک رہا۔“

میں تب تک دروازہ بند کر کے اس کی جانب پلٹا تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تھکا تھکا سا تھا مگر وہاں کامیابی کا جوش بھی ایک دبی دبی سرخی کی صورت میں نظر آتا تھا۔

”جب تم سے فون پر میری بات ادھوری رہ گئی تھی تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم سوزی کے نرغے میں آ چکے ہو، کیونکہ فون پر بات کرتے ہوئے میں نے تمہاری کراہ کی آواز سنی تھی۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”ہاں! اس کم بخت کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا“ وہ بولا۔ ”یہ اسپیکٹرم کے ایجنٹ بہت زیرک اور گھاگ ہوتے ہیں، ذرا

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ذرا سی بات پر کھٹک جاتے ہیں، خیر، میں نے سوزی کو وہیں پبلک ٹوائلٹ میں ہی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تھوڑی گڑبڑ تو ہو گئی ہے، اس کے لیے مجھے چیف (وزیر جان) کو مطمئن کرنا پڑے گا، وہ میں کرلوں گا۔ اب سندرداس کو بھی اسی کمرے میں...''

''کیا تم نے اسے بھی ہلاک کردیا ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال تو میں نے دھوکے سے اسے بے ہوش کر دیا ہے، اب اسے بہ آسانی جہنم واصل کیا جاسکتا ہے۔''

''نہیں، اسے ابھی زندہ رہنے دو۔''

''کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟'' وہ جیسے یکدم مجھے گھور کے بولا۔ وہ میری حیثیت نہیں جانتا تھا اسی لیے بے اختیار اس کے منہ سے یہ نکلا تھا۔ جبکہ میں سندرداس کو پاور والوں (میجر ریاض باجوہ) کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

''میں اسے خفیہ فورسز والوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہرحال دشمن ملک کا جاسوس ہے اور وطن دشمن کارروائیوں کے لیے یہاں آیا تھا، اس کے منہ سے بہت کچھ اگلوایا جاسکتا ہے۔''

''ہمارے پاس اس سارے کھڑاگ میں پڑنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ لوگ ہمیں لینے کے لیے یہاں ہوٹل پہنچنے والے ہیں۔'' وہ بولا۔

''کسی کھڑاگ کی ضرورت نہیں ہوگی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''باہر موجود میرے ساتھی یہ کام بہ خوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اس سے پوچھا۔

''تم نے اب تک کی کیا رپورٹ دی انہیں؟''

''یہی کہ نامعلوم دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی ہلاک ہوگئی اور میں سندرداس کو بچا کے ہوٹل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہوں، لیکن یہاں بھی مجھے خطرہ ہے۔ اسی لیے میں نے دانستہ ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں اور سندرداس خود ہی آجائیں، لیکن انہوں نے منع کرتے ہوئے یہ حکم صادر کردیا ہے کہ وہ خود ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اس گڑبڑ کے بعد ان لوگوں کو تم پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہوگیا؟''

میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو وہ اطمینان سے...... بولا... ''نہیں، ہم نے ویسے بھی اپنے منصوبے میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ رہی بات موجودہ گڑبڑ کی تو یہ وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ خفیہ فورسز کے ادارے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، ممکن ہے یہ انہی کی حرکت ہو۔''

باقی کے کام ہم نے ترنت نمٹائے، بے ہوش سندرداس کو انتہائی رازداری کے ساتھ کمرے کی کھڑکی سے اول خیر اور شکیلہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کو رسن بستہ کر دیا گیا تھا، تاکہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو۔

بے ہوش اور رسن بستہ سندرداس کو اول خیر اور شکیلہ کے حوالے کرتے وقت میں نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں ایک ''ڈکٹیشن'' بھی دے ڈالی تھی۔ میں چونکہ اس منصوبے کی مدد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کے تابوت میں آخری ٹھونکنے کا پختہ ارادہ کرچکا تھا، اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کسی بھی صورت میں ہونے والی متوقع گڑبڑ میں ''پاور'' والوں کی مدد بھی میرے ساتھ شامل ہو۔

اگرچہ اس سے پہلے انہیں اس مشن میں شامل نہ کرنے کا میرا ایک مقصد تھا، جس کی تکمیل کے لیے... میں اب تک درحقیقت میجر باجوہ صاحب کے مشوروں پر ہی عمل کر رہا تھا، کیونکہ بہ قول ان کے پاور والوں کا ابھی براہ راست اسپیکٹرم پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا، اس کے لیے پہلے کسی گوریلا کارروائی کے ذریعے ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرلیا جاتا۔ اس کے بعد پاور سیکریٹ سروس اپنا ایکشن پلان ترتیب دیتے۔ پاور سیکریٹ سروس جیسا ادارہ ہو خواہ انٹر سروسز یا آئی ایس آئی، ان کا ایک اپنا طریقہ کار ہوتا ہے، وہ خاموشی سے پہلے اپنے ''گوریلوں'' کے ذریعے ٹھوس ثبوت و شواہد اکٹھے کرتے ہیں اس کے بعد ہی ایکشن لیتے ہیں، بہ صورت دیگر ایسے اداروں کو بعض شرپسند عناصر بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

''اسپیکٹرم'' کے سلسلے میں بھی یہی قباحتیں تھیں، اس نے خود کو ایک بین الاقوامی فلاحی ادارے کی حیثیت سے ظاہر کر رکھا تھا۔ اور ملکی سطح پر کچھ کارنامے بھی انجام دیے تھے، جس کی بنا پر انہیں (اسپیکٹرم کو) بعض سیاسی اور عوامی حلقوں میں خاطرخواہ پذیرائی بھی ملی تھی۔

لیکن اب صورت حال اور تھی۔ عبید کے منصوبے کے مطابق اس بار کی کارروائی اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیتی، بلکہ عالمی سطح پر بھی اسے ایک بدنام زمانہ مجرم تنظیم کے طور پر... ڈکلیئر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا جب ان کے خلاف ٹھوس ثبوت ہاتھ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آجاتے، اور اب اس کے حصول کا یہ سنہری موقع تھا۔ اسی لیے میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی صرف اپنے بل بوتے پر اس اہم مشن کو پورا کرنے کا رسک لے سکتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں، میں نے اول خیرا اور شکیلہ کو اچھی طرح بریف کر دیا تھا کہ وہ دونوں بلیوتکسی کے ایجنٹ سندرداس کو میجر ریاض باجوہ صاحب کے حوالے کرتے وقت انہیں ساری صورتِ حالات بتادیں۔ تا کہ وہ کسی بھی وقت گڑبڑ کی صورت میں اسٹیشن فور پر اپنی خفیہ فورس ''پاور'' سمیت کامیاب چڑھائی کر سکیں۔ عبید کو میں نے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اور اس نے میری اس حکمتِ عملی پر اطمینان کا بھی اظہار کیا تھا۔

اس کے بعد ہم موجودہ منصوبے کی لائن آف ایکشن ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔

بہ قول عبید کے، میرے لیے صرف سندرداس کا بھیس بھرنا ہی کافی نہ تھا، اس سے متعلق دیگر اہم نوعیت کی باتوں اور معاملات سے میرا ''اَپ ڈیٹ'' ہونا لازمی تھا، جو اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد ہمیں سوچنا تھا۔

سندرداس کے پاس ایک بریف کیس تھا۔ اس کے اندر کچھ ضروری کاغذات تھے، انہی میں ایک فائل ہمیں نظر آئی تھی جس کا رنگ سیاہ تھا، جس پر بلیوتکسی کے ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے سندرداس اور اس کے متعلقہ عہدے دار کے دستخط پہلے سے موجود تھے، یہ آرڈنری دستخط تھے، تاہم ثبوت کے لیے یہی کافی تھا جو اسپیکٹرم کے، را کے ایک ذیلی ونگ ''بلیوتکسی'' سے گٹھ جوڑ ظاہر کرتے تھے۔ مگر عبید نے فائل کا جائزہ لینے کے بعد مجھے بتایا کہ اسی طرح کی ایک فائل وزیر جان کے پاس بھی تھی۔ اور یہ دونوں فائلیں ''کمپائل'' ہونے کے بعد ہی ایک مکمل ''بلیک کوبرا'' فائل کہلاتی، اور اس میں جو حصہ ان کے پاس تھا، وزیر جان اور ممتاز خان دستخط ہونا تھے۔ تاہم عبید نے حفظِ ماتقدم کے تحت مجھے سندرداس کے دستخط دکھا دیے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ مجھے بھی وہاں دوبارہ دستخط کرنا پڑ جاتے۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ میں وہاں سندرداس کے دستخط کی پریکٹس کرتا، تاہم ایک سادے سے کاغذ پر میں نے دو تین بار سندرداس کے دستخط کر کے کچھ ہاتھ ''صاف'' کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ فرق ہوسکتا تھا مگر دیگر شواہد اس قدر مضبوط تھے کہ وزیر جان کا اس طرف دھیان کم ہی جاتا۔ یوں بھی فائل میں اصل دستخطوں کی اہمیت وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کی تھی۔

سندرداس کی جامہ تلاشی کے دوران میں اس کا سیل، والٹ اور دیگر ضروری اشیا ہم نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہ ہوئی تھی۔ تاہم اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، اس سے جس قدر اپ ڈیٹ ہونا لازمی تھا میرا، وہ میں ہو چکا تھا۔ لیکن ایک خطرہ تھا کہ اگر سندرداس سے اس کے اپنے کسی باس یا ساتھی کا رابطہ ہوتا تو میں اسے کیا جواب دیتا؟ اور کیسے دیتا؟ میں نے جب اسی خطرے کا اظہار عبید سے کیا تو وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''شہزی! اس لیے ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے کیونکہ ..... لیٹ ہونے کی صورت میں سارا منصوبہ ہی خاک میں مل جائے گا اور ہماری جان کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔

چنانچہ ہماری کوشش یہ تھی کہ یہ معاملہ یا معاہدہ راتوں رات ہی نمٹ جائے۔

یہ سارے امور نمٹانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسپیکٹرم کے چار ایجنٹ ہمیں لینے کے لیے وہاں آن پہنچے۔

اب اصل خطرناک کام کی ابتدا ہونے لگی تھی۔ پیش آئندہ حالات غیر یقینی تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ آگے ہمارے ساتھ یا میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ تخت یا تختہ۔

بہت سے خطرات اندیشناک خیالات، وسوسہ بن کر دل ودماغ میں کلبلا رہے تھے۔

میں نے بغور اسپیکٹرم کے ان چاروں ایجنٹوں کی حرکت و سکنات سے جائزہ لینے کی سعی چاہی تھی، مجھے بہ ظاہر ان کی حرکات وسکنات میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جس سے پتا چلتا ہو کہ انہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شبہ ہوا ہو۔

روم اکیاون میں آکر انہوں نے مجھ سے مسکرا کر خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ملایا۔ میں نے عبید کی ہدایت کے مطابق اپنے چہرے کو سنجیدہ اور رعب دار بنا رکھا تھا، تاہم اس میں ہلکی سی پریشانی اور تشویش کا ''تڑکا'' بھی لگا دیا تھا، تاکہ وہ سب حقیقی محسوس ہو، جو تھوڑی دیر قبل ائرپورٹ کے پبلک لاؤنج میں ہمارے ساتھ ہو چکا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی کو جہنم واصل کرنا پڑا۔

ان چار ایجنٹوں میں دو تو مناسب قد و قامت کے تھے اور وہ مقامی ہی نظر آتے تھے، جبکہ ایک متناسب الاعضاء جسامت کی خاتون تھی، بادی النظر میں وہ مقامی ہی لگتی تھی لیکن میری عقابی نگاہوں نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں اور جلد کی رنگت میں غیر مقامی پن کو تاڑ لیا تھا۔ جبکہ چوتھا دراز

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

قامت تھا، اس نے اپنی اصلیت چھپانے کی ذرا بھی سعی نہیں کی تھی، وہ غیر ملکی ہی نظر آتا تھا۔ اسی نے ہی سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہو کر چند مخصوص کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا۔ جو ظاہر ہے عبید مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اس کا لہجہ بھی غیر مقامی ہونے کی چغلی کھاتا تھا۔ وہ انگریزی میں ہی مخاطب تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا بارعب اور تحکم مزاج نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ مجھے اس خطرناک ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اس سے گفتگو کر کے یہ جتانا تھا کہ میں ان کا محکوم نہیں، بلکہ مستقبل میں ان کا چیف کی سطح کا "ہینڈلر ایجنٹ" ہوں۔ جسے اسپیکٹرم کی سپریم اتھارٹی کی حمایت حاصل ہونے والی تھی۔ لہٰذا میں بھی اپنے لہجے کو پُراعتماد اور بارعب بناتے ہوئے اس سے انگلش میں ہی بولا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرے سلسلے میں بڑی رازداری برتی گئی ہوگی، لیکن یہاں آ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنی رازداری سے کام لیا گیا ہے۔"

اس سے مخاطب ہوتے وقت میں نے اپنے لب و لہجے کا بھی خیال رکھا تھا کہ کہیں وہ میری اصلیت سے واقف نہ ہو جائے۔

بہرحال میری بات اور شکایت میں وزن تھا، اس پر مستزاد میرے بارعب لہجے اور طنز کا اس دراز قامت پر خاطر خواہ اثر بھی ہوا، لہٰذا اسے اس حقیقت کا بھی فوراً اندازہ ہو چلا تھا کہ میں خود بھی اپنی آئندہ کی (معاہدے کے بعد کی) حیثیت کا بہ خوبی ادراک رکھتا ہوں۔ یہی سبب تھا کہ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پہ خجالت کے آثار نمودار ہو گئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"ہم نے پوری رازداری ہی برتی تھی لیکن بدقسمتی سے یہاں ہمارے کچھ مخالف گروپس بھی ہماری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ انہی میں سے ہی کسی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیشہ انہیں منہ کی ہی کھانی پڑتی ہے، جس کا ثبوت آپ کا ہمارے سامنے صحیح سلامت موجود ہونا ہے۔"

میں نے اب اس کی بات پر حوصلہ افزا انداز میں مسکرانا ضروری سمجھا۔

وہ ایک بڑی سی انٹرکولر گاڑی میں آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب ساہیوال کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔ وہ خاتون، جس پر مجھے غیر مقامی ہونے کا شبہ تھا، اپنے چیف (اسٹیشن چیف) وزیر جان کو مودبانہ انداز میں مطلع کر رہی تھی کہ ہم سب لاہور سے بخیریت ساہیوال کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔

اول خیر کو میری (عبید کے) اس منصوبے میں..... شمولیت پر تشویش لاحق تھی بلکہ اسے تو یہ سارا منصوبہ ہی ایک پل صراط پر چلنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ یہ خونی بھیڑیوں کی کچھار میں گھس کر ان کے خوفناک جبڑوں سے شکار کھینچ کر لانے والی بات تھی۔

لیکن میں سمجھتا تھا، جس قدر اس میں خطرات تھے، اس کی کامیابی کی صورت میں اتنے ہی اس کے دوررس نتائج برآمد ہونے کے قوی امکانات بھی موجود تھے۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ وہ دراز قامت ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا، میں اس خاتون کے ساتھ درمیانی سیٹ پر تھا، جبکہ ان کا چوتھا ساتھی عبید کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

انٹرکولر ایک طاقت ور انجن کی لگژری گاڑی تھی، یہی سبب تھا کہ خاصی تیز رفتاری کے باوصف، جھٹکوں کا بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں یہ نان اسٹاپ سفر لگ بھگ تین گھنٹوں پر محیط رہا اور پھر منزل پر پہنچ کر ہم سب نیچے اتر آئے۔

فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ میرے سامنے اسٹیشن نور کی وہی عمارت تھی جہاں میں اس سے پہلے بھی دو تین بار آ چکا تھا اور بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی تھیں۔ اب مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے اس بار میں اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والا ہوں۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ بہ ظاہر میرا چہرہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ اگرچہ اندر میرے دل میں ایک دھکڑ پکڑ کی سی کیفیات طاری تھی، لیکن میں نے اپنی چال ڈھال اور شخصیت کو مستحکم بنائے رکھا۔

ایک ہال نما کمرے میں، جہاں خاصا قیمتی اور آرام دہ فرنیچر بچھا ہوا تھا۔ وہاں مجھے بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کسی نے آ کر مجھے مطلع کیا کہ ابھی کچھ دیر میں "چیفس" (اسٹیشن چیف اور کیشا ایجنٹ) تشریف لانے والے تھے۔

میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنی کنپٹیوں پہ سنسناہٹ محسوس ہوئی، وجہ میرے ان دونوں ازلی دشمنوں کی اس ہال

READING
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کمرے میں آدھمکی۔

''ویلکم اویلکم۔'' سب سے پہلے وزیر جان مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو۔۔۔ پھیلاتا ہوا، میری طرف بڑھا، اور میں بھی اپنے ہونٹوں پہ دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سموئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد چوہدری ممتاز میرے ساتھ پُرتپاک انداز میں بغل گیر ہوا۔ اس مردود کو طوعاً و کرہاً ہی سہی، اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، مجھے اپنے بڑے بھائی شفیق شاہ کے خون کی بو آتی محسوس ہوئی، یہ خونی میرے بھائی کا قاتل تھا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے وقت میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے رکھا تھا، ورنہ جی تو میرا یہی چاہتا تھا کہ اس خونی کا گلا دبوچ لوں۔

ان دونوں کے علاوہ ان کے چار ساتھی بھی تھے جو بہ ظاہر تو غیر مسلح ہی نظر آرہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے چست لباس کے پیچھے جدید طرز کے ہتھیار چھپا رکھے ہوں گے۔ ان میں عبید بھی شامل تھا۔

اس کے بعد ہم آمنے سامنے دونوں صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ کچھ کھانے پینے کا دور چلا، پینے کے لیے جو کچھ وہاں میرے سامنے سرو کیا گیا تھا اس میں وہسکی بھی تھی اور مشروب بھی۔ میٹھا چیوڑا، تکس اور بھنے ہوئے تیتروں کے سالم پھور بھی دھرے تھے۔

شراب کو تو میں نے آج تک چھوا بھی نہیں تھا اور یہاں یہی مشکل آن پڑی تھی کہ اگر میں پینے سے انکار کرتا تو وہ دونوں گھاگ ''چیفس'' میرے بارے میں کھٹک سکتے تھے۔

بہت جبر و کراہ کے بعد میں نے بالآخر وہسکی کا پیگ تھام ہی لیا اور ان دونوں سے ''چیئرز'' کرنے کے بعد دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتے ہوئے پیگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، ایک ہلکی چسکی لی تو شراب کی تلخی نے میرے دماغ کی نسوں تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اور جب اس کا آبِ ارغواں کا وہ گھونٹ میرے حلق سے اترنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے گلے سے لے کر سینے تک یہ تلخ گھونٹ مجھے چیرے ڈال رہا ہو۔ ایک جلن کا احساس ہوا تھا۔ مگر جلد ہی میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔

''ہم کرنل سی جی بجوانی کے دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ ہماری لوکل کمانڈ کی سپورٹ کے لیے اپنا ایک اہم آدمی ہمیں سونپ دیا۔''

وزیر جان نے آبِ تلخ کا گھونٹ بھرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

چونکہ عبید نے موقع کی مناسبت سے اس بارے میں مجھے اچھا خاصا بریف کر دیا تھا کہ مجھے کیسی اور کس نوعیت کی گفتگو کرنی ہے۔ نیز وزیر جان کے منہ سے کسی کرنل سی جی بجوانی کا نام سن کر میں نے اندازہ قائم کیا کہ یہ سندرداس کا ہی کوئی چیف ٹائپ کا شخص ہوگا۔ اب مجھے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں وہ اسی وقت سی جی نامی اس شخص سے رابطہ نہ کر بیٹھے، یا خود اس کی کوئی کال نہ آجائے، اگرچہ عبید نے اس سلسلے میں پہلے ہی میری تشفی کر دی تھی کہ اسٹیشن فور کے کنٹرول اینڈ پاور روم میں اس کے دونوں ساتھیوں سجاد اور کریم کا ہی کنٹرول ہے، لہٰذا وہ ایسا کچھ ہونے نہیں دیں گے، یا اس طرح کی کوئی کال ہی ڈراپ کر دیں گے' یا انہیں کسی طرح مطمئن کر دیں گے وغیرہ، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ باتیں مختصر کرتے ہوئے، میں ان دونوں پر یہی زور دوں کہ معاہدہ بلیک کوبرا کو جلد از جلد فائنل کر دیا جائے۔

لہٰذا وزیر جان کے بعد اس کے تقریباً ہم رتبہ چوہدری ممتاز خان نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''اس کے ساتھ ہم یہ امید بھی کرتے ہیں کہ ہمارا اور آپ کا یہ ساتھ بلیک کوبرا معاہدے کی صورت میں کافی عرصے تک رہے گا اور مددگار بھی ثابت ہوگا۔''

''کیوں نہیں بلکہ مجھے پورا وشواش ہے کہ اس معاہدے کے بعد تو بلیو تکسی اور اسپیکٹرم کا یہ مثالی اتحاد ثابت ہوگا۔ سی جی صاحب خود اس کا ایک شاندار جشن منانے کے لیے یہاں ہوں گے۔'' میں نے بھی ان کا من پسند جواب دیا۔

''زبردست، پھر تو بگ باس لولوڈش کو بھی ہم یہاں مدعو کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ یقیناً اس جشن میں شرکت کے موقع کو نظر انداز نہیں کریں گے۔'' وزیر جان بولا۔

لولوڈش کے ذکر پر میرا حلق بغیر پیے کڑوا ہونے لگا۔ یہی بدبخت اور ملعون تو میرا اصل شکار تھا۔ تاہم میں اس کے ذکر پہ کچھ چونکا ضرور تھا۔

جی تو میرا کر رہا تھا کہ میں باتوں باتوں میں ان سے اور بھی کچھ اگلوا لوں، لیکن اب اس کا موقع تھا نہ کوئی فائدہ، کیونکہ اس منصوبے کی کامیابی کے بعد یہ دونوں پاور والوں کی گرفت میں ہوں گے۔

وہ دو دو پیگ چڑھا چکے تھے، جبکہ میرا پہلا ہی نہیں ختم ہوا تھا۔ البتہ نصف ہو چکا تھا، اور اسی نے ہی میرا دماغ گھما کر

READERS Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

رکھ دیا تھا۔ کیونکہ پیتا تو ایک طرف میں نے اس اُم خبیث کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے یہ ہال کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر معاملہ یہاں بہت حساس اور اہم تھا اسی لیے میں نے [illegible] تحمل [illegible] تے اعصاب پر قابو رکھا تھا۔

اسی دوران [illegible] باتوں [illegible] باتوں میں چالاکی سے میں ان دونوں جغادریوں [illegible] مقصد کی طرف لے آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ معاہدے [illegible] پر دستخط کرنے والے معاملے کو طول نہ دے ڈالیں اور [illegible] وقت ذرا سی دیر کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ عبید کی [illegible] ساتھ یہی ہدایت [illegible]

بجا [illegible] وقت بھی پھو [illegible] معاملے کی بات [illegible] دونوں نے فوراً [illegible] بھر لی۔

میں نے [illegible] وقت [illegible] سندر داس کا [illegible] کیس [illegible] سامنے رکھ دیا اور بلیک [illegible] کی فائل سے متعلق کاغذات کے صفحات ان [illegible] دیے، تب [illegible] ...... وہاں موجود [illegible] ایک [illegible] کو مخصوص اشارہ [illegible] جو ذرا سی دیر میں ایک [illegible] فائل ہاتھ میں [illegible] اس کے رُوبرو پیش ہو چکا [illegible]

یہی اصل کوبرا فائل [illegible] ٹاپ [illegible] فائل کے دونوں حصوں کا [illegible] ایک [illegible] جان نے اس پر اپنے دستخط کیے اس کے بعد [illegible] ممتاز خان اپنے دستخط کرنے کے لیے فائل پر جھکا۔

دونوں مہاشیطانوں کو اس فائل پر دستخط [illegible] میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات [illegible] جی کر رہا تھا کہ اسی وقت میرے پر نکل آئیں اور [illegible] سے اُڑ کر اپنے ٹھکانے جا پہنچوں اور پھر ان دونوں [illegible] ...... کے عبرت ناک انجام کا تماشا دیکھوں۔

مجھے یہ دونوں خبیث گویا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرتے محسوس ہو رہے تھے اور ظاہر ہے حقیقت بھی یہی تھی۔

اس فائل اور اس وقت کے لیے میں نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ اس منصوبے کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے پر میرے آئندہ کے کئی کامیاب منصوبوں کا انحصار تھا۔ میں اب تک بہت غور و فکر کے ساتھ بہت کچھ سوچ چکا تھا۔

ممتاز خان بھی بلیک کوبرا فائل پر دستخط کر کے سیدھا ہو گیا تو میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہ ظاہر بے پروا سا نظر آنے لگا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فائل میرے ہی حوالے کی جائے گی، جبکہ ایک کاپی اس کی ان کے پاس موجود تھی۔ اس پر میرے دستخط ہونا تھے۔ وہ فائل میری جانب سرکا دی گئی تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وجہ یہی تھی سندر داس کے دستخط کی مجھے کچھ زیادہ پریکٹس نہیں تھی، تاہم اپنی غیر معمولی زود فہمی اور سمجھداری کے بل بوتے پر میں نے اللہ کا نام لے کر پورے اعتماد کے ساتھ فائل اپنی جانب کھسکائی اور قلم سنبھالے فائل پر جھک گیا۔ ساتھ ہی لمحے بھر کو ان دونوں خبیثوں کی طرف بھی دیکھا۔ وزیر جان اپنے لیے ایک اور پیگ بنانے میں مصروف تھا جبکہ چوہدری ممتاز خان ٹرے میں رکھے بھنے ہوئے تیتروں میں سے ایک سالم پٹھور کو اٹھا کے بھنبھوڑنے میں مصروف تھا۔

میں نے فائل پر سندر داس سے ملتے جلتے دستخط کر دیے اور پھر فائل دانستہ بند کر کے تھوڑا آگے کھسکا دی اور اپنی فائل خود سنبھالتے ہی میں نے ان کا دھیان بٹاتے ہوئے فوراً تہنیتی لہجے میں کہا۔

''بدھائی ہو آپ سب کو۔ آج سے ہم سب ایک ہو گئے۔ [illegible] ہو گئے۔''

''[illegible] بدھائی۔'' وہ دونوں بھی بھونڈے انداز میں [illegible] پیگ والے ہاتھ بلند کرتے ہوئے غرور کے نشے تلے [illegible] لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے وزیر جان نے [illegible] کر دیا۔ وہ اپنا سیل فون نکال کر بولا۔ ''[illegible] خوشی کے موقع کی اطلاع چیف باس لولووس [illegible] یہاں کی لوکل کمانڈ کے مستقبل کے لیے بہت [illegible] تسلی ہو جائے گی۔''

میں اپنی [illegible] اور غیر ارادی طور پر فائل [illegible] کی گرفت [illegible] ابس نہیں چل رہا تھا کہ [illegible] اسی وقت یہاں [illegible] ہوں، لیکن یہ بچوں کا [illegible] گیند چھین [illegible] اس وقت اسٹیشن [illegible] کے اندرونی [illegible] اور [illegible] کرم کے گھاگ [illegible] تھا۔

[illegible] نے اس کی [illegible] ہاں میں ہاں ملا [illegible] اور ہنستے ہوئے [illegible] شیطان والے تاثر [illegible] بلیو تلسی انجیل [illegible] کر دے کی [illegible] جی صاحب کا [illegible] دے دینا۔''

وہ دونوں میری بات [illegible] ہوئے اپنا سر [illegible] میرا پیگ نصف [illegible] یا تھا، جو میں میز پر ہی رکھ چکا تھا اور دانستہ میں نے پلیٹ میں سے تھوڑا میٹھا چیوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
Download from paksociety.com

''اونہہ، رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ لگتا ہے چیف باس کہیں بزی ہیں۔ خیر بعد میں بات کرلیں گے۔''

معاً وزیر جان کی اس آواز نے میرے اندر دور تک خوشی کی لہریں دوڑا دیں، اچھا ہی ہوا تھا کہ لولوش سے اس کا رابطہ نہیں ہو پایا، ورنہ بات لمبی بھی ہوسکتی تھی اور خطرناک بھی۔

''مسٹر سندر داس! کیا تم اس بڑے معاہدے کی خوش خبری اپنے سی جی صاحب کو نہیں دو گے؟''

اچانک چوہدری ممتاز خان نے مجھ سے کہا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ لولوش سے رابطہ کرنے یا بات کرنے سے زیادہ برا کرنل سی جی بجوانی سے میرا رابطہ کرنا تھا، کیونکہ اس سے براہ راست مجھے ہی بات کرنا تھی۔

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر ایک متانت آمیز سی ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

''میں کرنل صاحب کے اوقات کار سے واقف ہوں، وہ اس وقت آرام...''

یہی وہ وقت تھا جب اچانک وزیر جان کے سیل فون کی بیل گنگنائی اور میری بات ادھوری رہ گئی۔

''اوہ، چیف باس کی کال ہے، جسٹ اے منٹ۔''

وزیر جان نے اپنے سیل فون کی بڑی سی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے سیل اپنے کان سے لگا کر انتہائی مودبانہ لہجے میں پہلے اسے ہائے ہیلو کہا اور پھر بولا۔

''یس چیف! میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ کو بلیک کوبرا معاہدہ طے پانے کی خوش خبری سنا دوں۔''

یہ کہہ کر وہ رکا اور شاید دوسری طرف سے لولوش کی بات خاموشی سے سننے لگا۔ ادھر میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں، میں جانتا تھا کہ عبید اور اس کے دونوں ساتھی سجاد اور کریم کی جان بھی میری طرح گویا حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اگر لولوش امریکا میں تھا تو وہاں اس وقت شام کے چار یا پانچ ہی بجے ہوں گے، کیونکہ امریکا اور پاکستان کے اسٹینڈرڈ ٹائمنگ میں کم از کم چوبیس گھنٹے کا فرق تھا۔

''یس چیف! شیور۔ وہ اس وقت ہمارے سامنے ہی موجود ہے۔ سوری... او... سمجھ گیا۔ آواز ذرا ہلکی تھی، اسی لیے آپ کی بات نہیں سمجھ پایا، ہاں تو آپ اس وقت رنگون میں ہیں؟ سو نائس، یہ تو اور بھی اچھا ہو جائے گا کہ اس اہم معاہدے کے بعد آپ دونوں کی ملاقاتیں بھی ہو جائیں۔ بھارت سے برما کون سا دور ہے۔ اس عظیم معاہدے کے بعد اگر آپ کی اور کرنل سی جی بجوانی کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ یس، یس چیف! بٹ، ہم چاہ رہے تھے کہ آپ پاکستان کا بھی ایک چکر...'' وہ رکا۔ سیل فون اپنے کان سے لگائے میری طرف دیکھتے ہوئے فون پر بولا۔

''یس چیف! مسٹر سندر داس اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لیجیے بات کریں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے فون میری طرف بڑھا دیا اور ایک پرجوش سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''یہ لو مسٹر سندر داس! چیف باس لولوش آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے اپنے سوکھے حلق کو تر کرنے کے لیے کچھ نگلنے کی سعی چاہی اور چہرے پہ مسکراہٹ لیے، دھڑکتے دل کے ساتھ وزیر جان سے سیل فون تھام لیا۔

میں اس وقت عالمی حیثیت کے حامل ایک انٹرنیشنل ڈان ''اسپیکٹرم'' جیسی دہشت پا اور بین الاقوامی گینگ کا چیف باس، برموڈس کے کسی گمنام دور افتادہ، پراسرار جزیرے میں پیدا ہونے والا، اور وہیں کا رہائشی اور بودوباش اختیار کرنے والے، خوف و دہشت کی علامت، سفاکی اور بربریت میں تاتاری فطرت کے مالک برازیلین نژاد لولوش سے مخاطب ہونے والا تھا۔

لولوش سے متعلق اب تک مجھے مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی رہی تھیں، اس کی تعریف میں، میں نے اب تک یہی کچھ سنا تھا، اور اس وقت اس سے بات کرنے والا تھا میں، جو میری زندگی کا پہلا موقع تھا۔

''ہیلو... چیف... مسٹر لولوش! میں سندر داس آپ سے شرف کلامی حاصل کرنے پر آپ کا اور کے دونوں ساتھیوں، مسٹر وزیر جان اور ممتاز خان کا مشکور ہوں۔''

میں نے اس کے رتبے اور گٹھ جوڑ کے حوالے سے نہایت مودبانہ انداز تخاطب اپناتے ہوئے اس سے کہا تو دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے خاموشی سی طاری رہی۔ جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے بری طرح کھل رہی تھی کہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پھر جب بدستور اسی خاموشی کا دورانیہ کچھ طویل ہوا تو میں سمجھا شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔ میں نے دوبارہ 'ہیلو' کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتاً ہی دوسری جانب سے ایک

READ Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کھرکھراتی، بھاری اور کھردری سی آواز ابھری۔

"ہائے۔ ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی تم سے بات کر کے اور اس سے زیادہ مسرت ہمیں اس معاہدے کے طے پا جانے پر ہوئی ہے۔ مسٹر سندر داس سکسینہ!"

اس نے میرا، یعنی سندر داس کا پورا نام لیا تھا۔ اس کے لہجے میں جانے کیوں مجھے ایک خوفناک سی سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا، جسے محسوس کر کے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں ان گنت چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کا کھردرا اور سپاٹ لہجہ اس کی دوستانہ گفتگو کی نفی کرتا لگا تھا یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ میرا منہ خشک سا ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کم بخت کی آواز اور لہجے میں ایسا کیا تھا کہ مجھے اپنا اعتماد متزلزل سا ہوتا محسوس ہوا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ کہتا، اس نے فوراً کھنچی کھنچی آواز میں کہا۔

"فون وزیر جان کو دو۔"

میں نے ایسا ہی کیا اور فون وزیر جان کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے فوراً اپنے کان سے لگا کر مودبانہ انداز میں ہیلو بھی کہہ دیا۔

میری دھڑکتی نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے اطراف میں گردش کر رہی تھیں، تب ہی اچانک کیا ہوا کہ اس کا کھلا کھلا چہرہ، دھواں دھواں سا ہونے لگا، یوں، جیسے بالکل ست کے رہ گیا ہو۔ اور اس کی اِدھر اُدھر گردش کرتی نظریں یک بیک میرے چہرے پر مرکوز ہو کے رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں سے میرے لیے جو تھوڑی دیر قبل دوستانہ جذبات مترشح ہو رہے تھے، وہ ایکا ایکی ایک عجیب سے سناٹوں میں بدل گئے۔ میرا دل یکبارگی ـــ زور سے دھڑکا۔ اور پورے وجود میں ایک سنسنی ـــ سی دوڑ گئی۔

"او کے چیف! آئی گیٹ اِٹ۔"

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میرے چہرے سے یک دم نظریں ہٹا کر اپنے قریب بیٹھے ممتاز خان سے کچھ کہا۔

میں ٹھٹک گیا۔ یہ مخصوص کوڈ ورڈز تھے۔ جس میں "ڈی" اور "ایس" کا استعمال بار بار آتا تھا۔ اپنی ٹریننگ کے دوران مجھے "ڈی کوڈنگ" کی جو تربیت دی گئی تھی، اس کے مطابق کوڈ ورڈز کی گفتگو میں بار بار ڈی اور ایس کا صاف مطلب (suspicious+dummy) کا لیا جاتا تھا۔ یعنی "مشتبہ۔"

میری بھانپتی ہوئی نظریں پہلے ہی ان دونوں کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں تب ہی میں نے دیکھا کہ چوہدری ممتاز خان کا چہرہ بھی یک دم بھونچکا سا رہ گیا۔

ٹھیک اسی وقت میرے اندر کوئی زور سے چیخا۔۔۔۔

"شہزی! تمہارا پول کھل چکا ہے۔ ہوشیار باشد!"

ظاہر ہے میری موجودگی میں بھلا وزیر جان کو ممتاز خان سے کوڈ ورڈز میں کیوں گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ دال میں یقینی طور پر کالا تھا۔

لیکن میں بہ ظاہر اپنے چہرے پہ طمانیت کے آثار طاری کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔ بے شک اگر لولوش کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ یقینی پھر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے ہزاروں میل دور تھا اور محض فون پر وہ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اصل میں، میں کون تھا؟ جبکہ کوڈ ورڈ کی گفتگو سے مجھے تھوڑا بہت اس امر کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ ابھی یہ دونوں میرے سلسلے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ لیکن مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ خوش فہمی بھی نہیں تھی۔ ہاں البتہ لولوش کا میرا یعنی سندر داس کا پورا نام لینا مجھے چونکا ضرور گیا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یا تو سندر داس سے رابطے میں رہ چکا تھا یا اس کے بارے میں اسے پوری جان کاری تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں ان کے بارے میں اندازے قائم کرتا رہ گیا اور انہوں جو کرنا تھا وہ کر ڈالا۔ وزیر جان کے ایک ذرا مخصوص اشارے پر ان چاروں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور اپنے لباس سے پستولیں نکال کر مجھ پر تان لیں، ان میں عبید کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا، وہ ابھی مجبور تھا، اور ان کا محکم بھی۔ میں چونکہ ذہنی طور پر چند سیکنڈ قبل ہی خود کو اس ناخوش گوار واقعے کے لیے تیار کر چکا تھا اس لیے بہ ظاہر آرام سے اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

اس دوران میں ان دونوں نے بھی اپنی پستولیں نکال کر اس کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر قدرے درشتی سے کہا تو وزیر جان نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں آپ کی اصلیت سے متعلق کچھ شبہ ہوا ہے کہ آپ ہمارے مطلوبہ آدمی نہیں ہو۔"

اس کا محتاط لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ابھی وہ

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

خود بھی اس سلسلے میں ابہام کا شکار تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ان کا شک غلط نکلا تو کہیں میں ان سے ناراض ہی نہ ہو جاؤں، یہی وہ نکتہ تھا، جسے میں نے فوراً بھانپتے ہوئے وزیر جان سے تلخ لہجے میں کہا۔

”حیرت ہے، آپ کو اپنے لوگوں پہ بھی بھروسا نہیں رہا یا پھر یہ سب اس قدر نکمے ہیں کہ تمہارے کسی بھی دشمن کی چال میں آرام سے پھنس سکتے ہیں۔“

”ابھی پتا چل جاتا ہے۔“ اس بار ممتاز خان نے کہا اور اپنے ایک پستول بہ دست ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا جبکہ دوسرا ساتھی میری جانب بڑھا۔

”یہ فائل ہمارے حوالے کر دو۔“ ممتاز خان نے اپنے پستول کا رخ میری جانب کر دیا۔ عین لب بام شکست پر میں اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا اور اس گھڑی کو کوسنے لگا جب اس مردود لولووش سے میری فون پر گفتگو ہوئی تھی، جو مختصر سہی مگر اس گرگ باراں دیدہ شخص کو نجانے کیسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے کارپرداز کو اس کی بھنک دے دی تھی۔

وہ اہم فائل میری گود میں پڑی تھی، ناچار وہ میں نے اس کے ساتھی کی طرف بڑھا دی، جو اپنا پستول تانے میرے سامنے آچکا تھا، اس کا انداز خاصا محتاط تھا اور اس نے بالکل میرے آگے آنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ ایک سائڈ سے میری جانب بڑھا تھا۔ اور تب ہی اچانک میری سماعتوں نے ایک چلاتی ہوئی آواز سنی تھی، جس نے مجھے ہی نہیں وہاں موجود سبھی کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ چیف کے سر میں روشن دان بنا دوں گا۔“

یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ عبید تھا۔ اپنے منصوبے کی اب تک کامیاب آبیاری کرتے ہوئے عین آخری لمحات میں اس کی ناکامی اسے بھی راس نہ آسکی تھی اور وہ جوش جنوں میں مجھ سمیت اپنی جان بھی داؤ پہ لگا گیا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے صوفے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے، عقب سے اپنے اسٹیشن چیف وزیر جان کی کنپٹی پر اپنے پستول کی نال رکھ دی تھی۔

”سب اپنے ہتھیار پھینک دو، وزیر جان تم بھی ورنہ گولی چلا دوں گا میں۔“ وہ پھر جنونی انداز میں چیخا۔

وزیر جان اور ممتاز خان کے چہرے مسخ ہو گئے۔ ان کے باقی ساتھی بہ ظاہر سپاٹ انداز میں کھڑے رہ گئے، جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ عبید کے لہجے اور درانہ وار انداز نے جلد ہی وزیر جان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جب اپنا کوئی ساتھی باغی ہوتا ہے تو اس نے سر سے اپنے کفن ہی باندھے ہوتا ہے، وہ صرف مرنے اور مارنے کے لیے ہی اپنے کسی پر ہتھیار اٹھاتا ہے۔

اس نے نہ صرف فوراً اپنا پستول پھینک دیا بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی ہتھیار پھینک دینے کا کہا۔

”شہزی! فائل لے کر بھاگ جاؤ۔ میں زیادہ دیر...“ عبید نے چلا کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ عبید کو میں نے بغیر آواز نکالے گرتے دیکھا۔

نامعلوم سمت سے آنے والی جو گولی اسے چاٹ گئی تھی، وہ یقیناً انہی کے کسی ساتھی نے داغی ہو گی، یہ کوئی کھلی کچہری نہیں تھی، مجرموں کا اپنا ٹھکانا تھا، کہاں کب کون سا ان کا ساتھی یہاں دھیان لگائے بیٹھا تھا، کون جانتا تھا؟

یقیناً عبید کو بھی اس خطرے کا اندازہ تھا لیکن باوجود اس کے اس نے مجھے ایک قلیل سا موقع دینے کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، ساتھ ہی ”بھری محفل“ میں میرا نام بھی پکار چکا تھا، جو یقیناً وزیر جان اور ممتاز خان پر بم ہی بن کر گرا ہو گا۔

گولی کا دھماکا اور عبید کی چیخ کے فوراً ہی بعد میرے حرکت کرنے کی باری آ گئی تھی، وہ ایک پل ایسا تھا کہ جس نے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں گویا پارا دوڑا دیا۔

میں نے فائل دبوچ لی۔ صوفے پر بیٹھے سب سے پہلے اس آدمی کو ایک لات رسید کی جو گولی کی آواز اور اپنے ”غدار“ ساتھی کی چیخ پر اپنا پستول اٹھانے کی فوری کوشش میں آگے کو جھکا تھا۔ لات اسے میں نے اس زاویے سے ماری تھی کہ وہ ”قائمہ“ بن گیا تھا، یعنی لڑکھڑا کر اور ذرا ترچھا ہو کے تیزی سے وہ اپنے دونوں گرو گھنٹال، وزیر جان اور ممتاز خان پر جا گرا تھا۔ باقی دونوں ساتھی ایجنٹ اپنے پستول اٹھا چکے تھے، جبکہ مجھے پہلے ہی ان کی اس متوقع حرکت کا ادراک تھا جس کے تدارک میں .... پہلے والے کو لات رسید کرتے ہی اس کے پستول پر قبضہ جما چکا تھا، لیکن میرے پاس دوبارہ سنبھل کے اٹھنے کی مہلت نہیں تھی، لہذا میں نے ایک ہاتھ میں بلیک کوبرا فائل سنبھالی اور دوسرے میں پستول تولتے ہوئے، تلے اوپر دو فائر ٹھونک دیے، میرے پستول کی ایک گولی کارگر ثابت ہوئی، دشمن کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا تھا جبکہ دوسرا...... اپنے دائیں شانے پر گولی کا داغ سہتے ہوئے لڑکھڑایا ضرور تھا مگر خود کو

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ڈھنے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے، مجھ پر ایک فائر جھونک دیا۔ عین اسی وقت میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسی طرف جست لگادی تھی، جدھر دروازہ تھا، چھلانگ کارآمد تو ثابت ہوئی تھی مگر ہال کمرے کے چکنے فرش پر میں گھسیٹتا ہوا اس کی چوکھٹ سے اپنے سر کو ٹکرانے سے نہ بچا سکا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ سی خارج ہوگئی تھی، اور مجھے اپنا پورا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے گرد تاریکی سی سمٹ آئی۔ فائل پر میری گرفت ڈھیلی پڑی اور وہ چھوٹ کر دروازے کی چوکھٹ سے باہر، کوریڈور کی طرف سرکتی چلی گئی۔

بلیک کوبرا فائل سے محرومی کے احساس نے مجھے جیسے ایک دم ہوش دلادیا، اور بکھرے حواسوں کو پل کے پل سمیٹتے ہی میری متلاشی نظریں اس پر جم گئیں، عقب میں گولی کا دھماکا گونجا، مگر جب تک میں بہ سرعت رینگ کر چوکھٹ چھوڑ چکا تھا۔ گولی کسی چوبی حصے سے ٹکرائی تھی اور لکڑی کے چھلتر، مع براد وں کے میرے چہرے پر لگے۔ مجھے کچھ خراشوں کا احساس ہوا۔ اس کی پروا کیے بغیر میں نے نظر آجانے والی کوبرا فائل پر جھپٹا مارا اور اٹھ کر دوڑ لگادی۔ اپنے عقب میں مجھے وزیر جان اور ممتاز خان کے تحکمانہ انداز میں پاگلوں کی طرح چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ دوڑتے قدموں کی گونج عمارت میں ہڑبونگ کا پتا دیتی تھی۔

میری کوشش یہاں سے باہر نکلنے کی تھی، جبکہ اس کے بہت سے گوشوں سے میں اتنا واقف بھی نہ تھا۔ اچانک میرے سامنے تین چست لباس میں ملبوس افراد کسی کمرے سے طلوع ہو کر ملک الموت کی طرح میرے سامنے آن کھڑے ہوئے، ان کے ہاتھوں میں طاقت ور گنز تھیں۔

”ہالٹ۔“ ان میں سے ایک حلق کے بل چیخا۔ میں ایک گہری سانس خارج کرکے وہیں جم کر کھڑا ہوگیا۔ میرا اور ان کا فاصلہ بہ مشکل چند قدموں کا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ میرا کھیل ختم ہوگیا تھا مگر ایسے ہی وقت میں ایک چونکا دینے والا واقعہ رونما ہوا، انہی میں سے ان کے ایک ساتھی نے عجیب حرکت کی، اس نے مجھ پر تانی ہوئی گن کو حرکت دی اور اس کا کندا، اس کے ساتھ کھڑے ساتھی کے جبڑے پر لگا۔ ظاہر ہے یہ حملہ اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ اپنے حلق سے ”اوغ“ کی آواز خارج کرتا ہوا اپنے تیسرے ساتھی سے جاٹکرایا، دونوں ہی لڑکھڑائے تو اس نے پوزیشن بنا کر ان پر برسٹ فائر کردیا۔

میں ابھی حیرت زدہ نظروں سے یہ ”معجزانہ“ منظر دیکھ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ دسمبر 2015ء کی جھلکیاں

جہد برق

ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق، اردو کے نامور قلم کار کا زندگی نامہ

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال کے شرربار قلم کا شہکار، سیر پاکستان

بگ تھری

مریم کے خان کا کرکٹ کے دیوانوں کی خاطر چونکا دینے والی تحریر

اپنے حصے کی شمع

سلمٰی اعوان کی وہ تحریر جسے عرصہ تک آپ بھلا نہ پائیں گے

درست غلط فیصلہ

رومانہ شعیب کی بستر مرگ سے ارسال کردہ سچ بیانی

اس کے علاوہ

اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی واقعات، سچے قصے، یادرہ جانے والی تحریریں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ...... ہر شمارہ، خاص شمارہ

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں۔ جبکہ میرے اس دشمن نما ہمدرد نے اپنے ہی دونوں ساتھیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد یکدم مجھ پر بھی گن تان لی۔ میرا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل چلا کر مجھ سے بولا۔

”نیچے گر جاؤ۔“ اس نے ہاتھ کا اشارہ بھی کیا تھا۔ میں فوراً نیچے گر گیا۔ اس نے برسٹ کھول دیا، گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ مجھے اپنے عین سر پہ سنائی دیتی محسوس ہوئی تھی اور عقب میں متعدد انسانی چیخیں، لیکن چند ہی سیکنڈوں بعد میں نے اپنے اس ہمدرد کو بھی گولیوں سے چھلنی ہو کے گرتے دیکھا۔ جس کے بارے میں اب تک میں یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وہ عبید کے انہی آخری دو ساتھیوں، سجاد اور کریم میں سے ہی کوئی ہو سکتا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے پیچھے اپنی گردن گھما کر دیکھا تو میں اس کی قربانی کو دل ہی دل میں سلام پیش کیے بنا نہ رہ سکا، میرے تعاقب میں آنے والے مسلح دشمنوں کو وہ مرتے مرتے بھی جہنم واصل کر چکا تھا۔ جو کم و بیش تین چار کی تعداد میں تو تھے ہی۔ ایک دو کراہ رہے تھے۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ میں نے اس کی گن اٹھائی اور پستول بیلٹ میں اڑس لیا، جبکہ فائل کو میں اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کھول کر اس میں رکھ چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ نکاسی کے سارے راستے بند کیے جا چکے ہوں گے یا انہیں پہلے ہی سے ٹریپ کر دیا ہو گا۔ اس لیے میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مجھے بس چند لمحوں کے لیے ٹھہرنے کی مہلت درکار تھی کہ میں میجر باجوہ صاحب کو ”گرین سگنل“ دے دوں۔

جس طرف سے میرے ہمدرد سمیت وہ تین مسلح دشمن اچانک طلوع ہوئے تھے، میں نے اسی طرف کا ہی رخ کیا تھا۔ میں سمجھا تھا کہ شاید وہ کوئی کمرا ہو گا لیکن موڑ کاٹنے پر معلوم ہوا وہ ایک زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا، پہلے میں نے زینے چڑھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر میں فوراً اس کے خلا میں جا چھپا۔ اور وہاں سے میں نے ذرا ٹھہر کر اپنا سیل فون نکالا اور باجوہ صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔

میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا جس میں ایک جوش کی سی کیفیت تھی۔ ایک اہم مشن کامیابی کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس بار اسپیکٹرم کو آخری چوٹ لگنے والی تھی، اس کا شیرازہ بکھرنے کو تھا۔ بلیک کوبرا فائل کی صورت میں اس کی تباہی میری شرٹ کے اندر سینے میں ایک ”بٹن“ کی طرح چسپاں تھی، جسے دبانے کی دیر تھی۔ یہ اسپیکٹرم کے لیے ایک ایسا ٹائم بم تھا جس کی ”کاؤنٹ ڈاؤن“ شروع ہو چکی تھی، اور یہ پھٹنے کو تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس اہم فائل کے حصول کے لیے عبید سمیت اس کے ساتھیوں (سجاد یا کریم) نے بھی اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ ان کا ایک ساتھی ابھی زندہ تھا، اور اسپیکٹرم میں ابھی وہی بچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کی قربانی زائل جانے کیسے دے سکتا تھا؟

باجوہ صاحب سے رابطہ ہوا تو میرے اندر گہری طمانیت... سی پھیل گئی۔ وہ اپنی پاور سیکریٹ سروس سمیت پہلے ہی سے اسٹیشن فور کی عمارت کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، اور میری طرف سے گرین سگنل کے منتظر تھے۔

جیسے ہی انہیں اس بات کی تشفی ہو گئی کہ بلیک کوبرا فائل میرے پاس محفوظ تھی، انہوں نے ایکشن لے لیا۔

لیکن میرا کام اب چھپ کر تماشا دیکھنا ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اسٹیشن فور کے اندر اچھی خاصی کھلبلی مچا دی تھی۔ میری سماعتوں میں ابھی تک وزیر جان اور ممتاز خان کی بوکھلائی ہوئی ہسٹریائی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

آج کا دن اسپیکٹرم کا آخری دن ثابت ہونے والا تھا۔ میرے گرین سگنل دینے کے بعد ”پاور“ والے اب تک حرکت میں آ گئے ہوں گے۔ کچھ لمحات مزید بیت گئے، کوئی ہلچل محسوس نہ کر کے مجھے ذرا حیرت سی ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ موجودہ آپریشن میں انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا تھا، تاہم میرے اندر بے چینی نے دستک دی تو مجھ سے وہاں دبکا بیٹھا نہیں گیا اور گن سنبھالے زینے سے نکلنے کے ارادے سے تھوڑا سرکا ہی تھا کہ اچانک مجھے پہلے سے زیادہ کھلبلی کا شور سنائی دیا۔ اسی وقت مجھے عمارت کے اندر متعدد انسانوں کے در آنے کا احساس ہوا۔ میں اپنی جگہ ایک بار پھر جم گیا، اسی وقت پہلے وقفے وقفے سے برسٹ فائر ہوئے، اس کے فوراً بعد ہی تواتر کے ساتھ گولیاں چلنے کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا مگر بھگدڑ بہ دستور مچی ہوئی تھی۔ اس میں انسانی آوازوں کے زور زور سے بولنے کا شور بھی تھا۔ انہی آوازوں میں مجھے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

”اس طرف اوپر... اوپر۔“

یہ میجر ریاض باجوہ کی آواز تھی۔ میں فوراً اوٹ سے نکل آیا۔ ان کے ہمراہ پاور سیکریٹ سروس کے چار ایجنٹ تھے۔ سب جدید اسلحے سے مسلح تھے۔ باقی پھیلے ہوئے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب چونک پڑے۔

تاہم میجر باجوہ نے اپنے تین ساتھیوں سے ہدایتاً کہا۔

''اوپر کوئی بھی ہو پہلی کوشش یہی کرنا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، ورنہ بھون دینا گولیوں سے۔''

وہ تینوں بجلی کی سی پھرتی سے اوپر کو چلے گئے۔ ان کے ساتھ اب میں اور ایک ساتھی رہ گیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

''شہزی! تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''کوئی نہیں سر! لیکن ایک احتیاط کیجیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اسپیکٹرم کے ایجنٹوں کے درمیان میں ایک ہمارا آدمی بھی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں عبید کے دونوں ساتھیوں کریم اور سجاد کے بارے میں بتادیا۔ یہ بھی کہ عبید اور اس کا ایک ساتھی مشن پر قربان ہوچکے تھے۔ اب پتا نہیں کریم بچا تھا یا سجاد۔

''بے فکر رہو۔ پاور ایجنٹ اندھا دھند حرکت نہیں کرتے۔'' وہ بارعب اور مستحکم لہجے میں بولے۔ ''میں پھر بھی کیپٹن افتخار جنجوعہ کو ہدایت کیے دیتا ہوں۔''

کیپٹن افتخار جنجوعہ سے میں بھی بہ خوبی واقف تھا۔ یہ تقریباً میری ہی عمر کا وہی نوجوان تھا جس کے ساتھ میں نے پی ایس ایس کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت حاصل کی تھی۔

میجر باجوہ نے ایک مختصر ڈیوائس پر کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کرکے اس کے بارے میں بتادیا پھر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

''شہزی! وہ فائل کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے سر!'' میں نے فرطِ جوش سے کہا اور ابھی میں نے اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک..... میرے دائیں جانب کوریڈور میں ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ ہم یکدم زینے کے خلا میں آگئے، لیکن اسی وقت میری مختل ہوتی سماعتوں نے کسی ٹھوس شے گرنے..... کی آواز سنی۔ جسے صرف میں ہی نہیں میجر ریاض اور ان کے ساتھی نے بھی بھانپ لیا تھا، اور پھر ہم تینوں نے ہی بیک وقت بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لمبی جست بھری، جس وقت ہم تینوں اپنے بائیں ہاتھ والی مختصر راہداری کے فرش پر آرہے تھے، ٹھیک اسی وقت دوسرا سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس بار دشمنوں نے ہینڈ گرینیڈ بہت قریب پھینکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کچھ فلیل آتشی ذروں کے مانند..... میرے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکرائے۔ یہ جلتے ہوئے ٹکڑے تھے۔ مارے تکلیف سے میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔

''شہزی! آر یو اوکے؟'' دفعتاً میں نے دھوئیں کے کثیف بادلوں میں میجر ریاض کی تفکر بھری آواز سنی، اور مجھے احساس ہوا کہ دوسرے ہینڈ گرینیڈ سے صرف مجھے ہی خراشیں آئی تھیں۔

''یس سر! آئم اوکے۔ آر' یو؟''

''فرار..... دشمن فرار ہونے کے لیے یہ آخری ہتھکنڈا آزما رہا ہے۔''

میجر ریاض باجوہ کی اس بات نے مجھے فکرمند سا کر دیا۔ اچانک ان کے وائرلیس ڈیوائس میں سے مخصوص بیپ کی آواز ابھری۔

''یس۔'' انہوں نے فوراً کال ریسیو کی۔ کچھ سیکنڈ دوسری جانب سے اپنے کسی ماتحت وغیرہ کی بات سنتے رہے پھر بارعب اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔

''نکاسی کے ہر راستے پر چار چار جوانوں کی ٹولی مقرر کردو۔ اور تمام گاڑیاں ٹاپ آف رکھو۔ کوئی دشمن بھاگنے نہ پائے۔ کلیئر۔''

اس کے بعد انہوں نے کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کیا۔

''دشمن ہلکی ساخت کے بم استعمال کررہا ہے۔ مقصد فرار ہونا ہے۔ بی کیئرفل۔ اپنے اصل ٹارگٹ پر خود کو فوکس رکھو۔ وہ دونوں بچ کے جانے نہ پائیں اور نہ ہی ان کی ہلاکت ہو۔ کلیئر۔''

وہ بات سے فارغ ہوئے تو اسی وقت اوپر سے فائرنگ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کوئی چلّایا۔ ''ہتھیار پھینک دو ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

یہ ہمارے ساتھی تھے، انہوں نے شاید اوپر موجود دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے تلے اوپر دو برسٹ فائر ہوئے، انسانی چیخ کی آواز بھی ابھری۔ میجر ریاض متفکر سے ہوگئے۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑے، میں اور ان کا ساتھی گن لے کر ان کے پیچھے لپکے۔ اوپر فائرنگ جاری تھی۔ پتا چلا پاور اور اسپیکٹرم کے ایجنٹ ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ اوپری منزل میں بھی چھوٹے بڑے کمرے اور طویل راہداریاں تھیں۔ ہم سب پوزیشنیں سنبھالے ہوئے وہاں پہنچے۔ میجر ریاض نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ دو ساتھیوں نے ہمیں دیکھ کر اپنے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا۔

اسی وقت وہاں سے دو چست لباس میں مسلح افراد،

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اگر ہم سامنے ہوتے تو وہ بے دریغ ہم تینوں کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتے تھے۔ میں دل ہی دل میں اپنے ان دونوں ساتھیوں کے چوکنے پن کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ وہ ان دونوں دشمنوں کی پوزیشنیں پہلے ہی تاڑ چکے تھے۔ جیسے ہی وہ فائرنگ کرتے ہوئے ایک تنگ راہداری سے نمودار ہوئے تو ہمارے دونوں ساتھیوں نے ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کر گرے مگر دوسرے نے زخمی ہونے اور گرنے کے باوجود لیٹے لیٹے اپنی گن کا رخ ہمارے دونوں ساتھیوں کی طرف موڑ دیا۔ انہیں اس حملے کی توقع نہ تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میجر باجوہ نے اپنے پستول سے اس پر تلے اوپر دو فائر جھونک دیے۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت ان کے دونوں ساتھیوں نے اپنے افسر کی طرف دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کھڑے کر کے مخصوص اشارہ کیا اور پھر ہم تینوں بھی ان میں شامل ہو گئے۔

''باقی ساتھی کہاں ہیں؟'' میجر باجوہ نے پوچھا۔

''سر! وہ اندر دشمنوں کے پیچھے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں رکنے کو کہا گیا ہے تاکہ کوئی اِدھر سے فرار نہ ہونے پائے۔'' ایک نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

''اصل شکار کدھر ہیں؟'' میجر باجوہ نے پوچھا۔

''ابھی ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں لیکن یہاں وہ نہیں ہیں۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے واپس پلٹے۔

نیچے آتے ہی ہم نے آگے کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی تھی۔ وزیر جان اور ممتاز خان کے ابھی تک ہتھے چڑھنے کی خبر نہیں آئی تھی۔ اگرچہ پاور والوں کی اسٹیشن فور پر خاطر خواہ انداز میں چڑھائی ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے سو فیصدی نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔

اچانک میں نے اپنی سمت بدلی اور ان سے الگ ہو کر اپنی گن تھامے ایک طرف کھسک گیا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی اس خفیہ تہ خانے کا خیال ابھرا تھا، جہاں ایک دن وزیر جان نے دھوکے سے مجھے اور راول خیر کو قید کر دیا تھا۔ میں اسی طرف بڑھا تھا۔

میں اکیلا تھا۔ میں نے اسی کمرے کا رخ کیا جس کے فرش پر اس تہ خانے کا راستہ جاتا تھا۔ بہ ظاہر وہ... اسپیکٹرم کا ایک آفیشل روم تھا۔ میں اسی طرف جانے والی راہداری میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ فائرنگ اب وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ بارود کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ پاور والوں نے یہاں بڑی مؤثر کارروائی کر کے دشمنوں پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اصل شکار کے سلسلے میں انہیں ابھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

یہاں مجھے کچھ لاشیں بھی زمین پر پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک میں ایک جگہ ٹھٹک کے رکا۔ سامنے ایک کشادہ جگہ پر مجھے کیپٹن افتخار اور اس کے تین ساتھی پوزیشنیں سنبھالے ہوئے نظر آئے۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر ہلّا بولنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ یہاں بھی مجھے تین چار لاشیں فرش پر پڑی نظر آئیں، ان میں ایک لاش کی وردی سے میں پہچانا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی کی تھی، مجھے اس پر دکھ ہوا تھا۔ میں انہیں اپنے مشن میں مصروف چھوڑ کے آگے بڑھنے لگا تھا کہ اچانک کیپٹن باجوہ کی آواز پر میں بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ وہ اپنے ساتھی سے چلّا کر تحکمانہ کہہ رہے تھے۔

''اصل شکار اس کمرے میں ہیں۔ دروازہ اُڑا دو، جلدی۔''

ان کے ایک ساتھی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ کمرے کے دروازے پر ہلکی ساخت کا دستی بم پھینکا۔ ایک دھماکا ہوا اور دروازے کے پرخچے اُڑ گئے۔ مجھے ایک دیوار کی آڑ تھی، لیکن وہ تینوں کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے تھے۔ دروازے پرخچے اُڑتے ہی ایک اور بم اندر پھینکا گیا تھا۔ اور پھر کیپٹن باجوہ نے اپنے تینوں ساتھیوں سمیت پھرتی کے ساتھ اندر کی سمت پیش قدمی کی۔ میں بھی دیوار کی آڑ سے نکلا۔ ہیوی گن میرے ہاتھ میں تھی جو عبید کے آنجہانی ساتھی کی لاش پر سے اٹھا لی تھی۔ اگرچہ ایک پسٹل بھی میری بیلٹ میں اُڑسا ہوا تھا۔

کیپٹن جنجوعہ کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا کہ اندر اصل شکار موجود تھا۔ یقیناً ان کے کسی ساتھی نے بتایا ہوگا۔

یہ چاروں کمرے کی طرف لپکے اور لامحالہ میں نے بھی سر دست تہ خانے والے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ بدل دیا اور اسی مذکورہ کمرے کی جانب کیپٹن باجوہ کی ٹیم کے پیچھے لپکا تھا کہ اچانک اندر سے کسی نے طاقت ور گن کا منہ کھول دیا۔ لمحے بھر کے لیے تو میرے اپنے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے، ہوش اس وقت آیا جب میں نے اپنے ساتھیوں کی کرب ناک آوازیں سنیں۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہی کی وجہ سے میں دشمنوں کی فائرنگ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
READING Section

محفوظ رہا تھا، کیونکہ وہ پہلے ہی میرے آگے تھے۔ اگرچہ انہوں نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی فرش پر گر کے خود کو گولیوں کی زد سے بچانے کی سعی چاہی تھی، مگر سیدھی فائرنگ نے انہیں شاید چاٹ لیا تھا۔ میں جوشِ جنوں کی کیفیت میں آ گیا، گن میری سیدھی تھی، میں نے لبلبی پر انگلی رکھ دی اور پھر نہیں ہٹائی۔ نشانہ اندر دھواں بھرے کمرے کا خلا تھا۔ جواب میں مجھے اندر سے ایک سے زائد دشمنوں کی چیخ سنائی دی۔ اور اسی طرح فائرنگ کرتے ہوئے میں نے جب کمرے کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر کی جانب پیش قدمی کرنی چاہی تو اچانک مجھے اپنے قریب قدموں میں پڑے کیپٹن افتخار جنجوعہ اور ان کے ایک ساتھی کی کراہ نما آواز سنائی دی۔ میں اس طرف متوجہ ہو گیا۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ کیپٹن افتخار اور ان کا ایک ساتھی زندہ تھے، میں انہیں ابھی سنبھالنے کے لیے جھکا ہوا تھا کہ اچانک کوئی کمرے سے نکل کر بھاگا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور اپنے ازلی دشمن، اپنے بھائی لئیق شاہ کے قاتل کو اس طرح راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف دوڑا۔۔۔ اور اپنے حلق سے ایک جوشِ جنوں کی سی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میں نے اسے ایک ہی جست میں جا لیا۔ اپنے بھاری بھرکم جثے کے باعث وہ زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ میرے اوپر پڑتے ہی وہ نیچے آ رہا اور میں اسے فرش پر رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔

پھر سنبھلتے ہی میں اس کے سینے پر جا سوار ہوا میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک ایک کر کے وہ سارے خوں ناک مناظر میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ کئی چہرے ان میں میرا بھائی لئیق شاہ پھر آسیہ کی لاش میری نگاہِ تصور میں آن کھڑی ہوئی، پھر معصوم آسیہ کا چہرہ، اور وہ سارے درد انگیز اور ظلم ناک مناظر جو اس سفاک شیطان کے رہینِ منت تھے، باری باری میری وحشت خوں رنگ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔

"بس ممتاز خان! آج تیری بربریت اور چنگیزی کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اب تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔" میں نے لہو رنگ لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں میری منتیں کرتے ہوئے بولا۔

"شش... شہزی! م مجھے... م... معاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔ میں تمہیں بہت سی دولت..."

مگر میں جوشِ جنوں تلے اس کا گلا دباتا چلا گیا، اور اس کے حلق سے اب محض خرخراہٹ کی آوازیں برآمد ہونے لگیں، میری آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اور پھر اس سے پیشتر کہ اس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی اچانک مجھے اپنی سماعتوں میں میجر باجوہ کی آواز سنائی دی۔

"نہیں شہزی! چھوڑ دو اسے۔"

میجر صاحب کی آواز سن کر میرا جنون کچھ کم ہوا اور پھر ان کے دو ساتھیوں نے مجھے شانوں سے تھام کر آہستگی کے ساتھ زمین بوس ممتاز خان کے اوپر سے اٹھایا۔

ممتاز خان کو فوراً گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ جبکہ زخمی کیپٹن افتخار اور ان کے ایک ساتھی کو فوراً ان کے ساتھیوں نے ابتدائی طبی امداد دینی شروع کر دی تھی۔ میجر صاحب کا آپریشن کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ اسٹیشن فور پر باور والوں کا قبضہ ہو چکا تھا، نیز اسپیکٹرم کے کئی کارندے بھی گرفت میں آ چکے تھے، کچھ مارے بھی گئے تھے۔ لیکن ابھی ایک دشمن وزیر جان باقی تھا۔

میں نے اپنے حواسوں کو قابو میں کیا۔۔۔ اور تیزی سے اسی سمت کو دوڑا۔ جدھر تھوڑی دیر پہلے میں پیش قدمی کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

میں جلد ہی اس مطلوبہ کمرے میں جا پہنچا۔ یہاں بھی سب کچھ ابتری کی حالت میں ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے تہ خانے کا راستہ تلاشنے کی بے حد کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں نے فرش سے وہ دبیز غالیچہ بھی اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے نیچے تہ خانہ تھا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں میز کی طرف بڑھا اور وہاں چھیڑ چھاڑ کرنے پر مجھے ایک دراز کھولتے ہی ایک پینل نظر آ گیا۔ پینل کے ہر بٹن پر انگریزی کے الفابیٹ درج تھے۔ اندازے سے میں نے ایک ایسے ہی۔۔۔ G والے بٹن کو پش کیا تو اچانک کمرے میں ایک گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ میں پینل چھوڑ کر اسی سمت کو لپکا۔ جہاں غالیچہ بچھا ہوا تھا وہاں ایک آٹھ مربع فٹ کا چوکور تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنے سیل فون کی ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی اندر پھینکی۔ تہ خانے کی زمین زیادہ گہری نہ تھی، میں چھلانگ لگا کر اندر اتر گیا۔ اور چاروں طرف روشنی ڈالنے لگا تو اچانک میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف تہ خانے کی دیوار پر ایک چار فٹ کا چوکور خلا دکھائی دیا۔ میرے چہرے پہ سلوٹیں نمودار ہو گئیں اور فرطِ جوش تلے میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس میں کیا شک تھا کہ میرا اصل شکار (وزیر جان) اسی راستے سے فرار ہوا ہوگا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اس خلا میں اتر گیا جس کی چھت کافی جھکی ہوئی تھی۔ یہ

Section

ایک سرنگ نما خلا تھا۔ میں نے اس میں جھکے جھکے دوڑتے ہوئے میجر باجوہ سے رابطہ کر کے انہیں اس تہ خانے کے بارے میں آگاہ کیا اور سرنگ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ سرنگ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی... محسوس ہو رہی تھی۔ سرنگ گہری ہونے کے باعث مجھے رفتہ رفتہ اس میں آکسیجن کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک خدشہ یہ بھی پریشان کرنے لگا تھا کہ کہیں آگے جا کر اپنے اختتام پر یہ سرنگ بند نہ کر دی گئی ہو۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ... وزیر جان کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ سرنگ کا سرا بند کرنے کی تگ و دو کرتا۔ جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ بائیں جانب مڑتے ہی مجھے ذرا دور ہی روشنی کی مدور سی جھلک دکھائی دی۔ میری رفتار تیز ہو گئی۔ میری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ آکسیجن کی کمی اور ڈی ہائیڈریشن کے باعث میں اپنے اندر ناطاقتی بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ایک عزم اور حوصلے نے مجھے چٹان بنا رکھا تھا۔ اور میری قوتِ ارادی کو اس پُرغیظ ولولے نے مہمیز کر رکھا تھا کہ میں نے اپنے ان دونوں ازلی دشمن کو کسی صورت میں بھی بچ کر نہیں جانے دینا ہے۔ ایک میرے بھائی کا قاتل تھا، جو میری بروقت پھرتی کے باعث، پاور والوں کی گرفت میں آچکا تھا تو دوسرے نے میری ماں کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اسے بے یارومددگار چھوڑا تھا۔ وہ ابھی مفرور تھا۔

یہی وہ آتشِ غیظ تھی جس نے مجھے ڈھنے سے روکے رکھا تھا۔

میں جلد ہی ہانپتا ہوا اس روشن سرے کی طرف آ گیا اور یہاں سے تازہ ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا تو حواس بھی کچھ معمول پہ آنے لگے۔ میں نے رائفل پھینک دی، پستول میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ میں نے اس تنگ سرے میں اپنے دونوں ہاتھ پھنسائے اور باہر آزاد فضا میں ابھر آیا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اطراف کا جائزہ لینے پر مجھے حدِ نگاہ بنجر زمین اور ٹیلوں ٹبوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ زمین پر بھربھری مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا۔ اگر وزیر جان یہاں سے فرار ہوا بھی ہوگا تو وہ ابھی زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے زمین کا جائزہ لینے پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشان نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ قدموں کے نشانوں نے مجھے ضرور چونکا دیا، جس کا مطلب تھا کہ میں بالکل صحیح سمت پر جا رہا تھا۔ میں انہی قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھ گیا اور تقریباً دوڑ لگا دی۔

اس سلسلے میں، میں نے فون پر میجر ریاض باجوہ کو ''لیڈ'' کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح میرے وہاں سے اچانک نکل جانے کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ بہرطور انہیں اس جگہ کے محلِ وقوع سے آگاہ کرنے کے بعد میں قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھتا رہا۔ بلیک کوبرا فائل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور میں بدستور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک مقام پر مجھے قدموں کے نشانات بائیں جانب کو مڑتے محسوس ہوئے، یہاں میں رکا اور جھک کر بہ غور کھوجیوں کی طرح قدموں کے نشانات کی ''ہیئت'' بھانپنے لگا۔

یہاں قدموں کے نشانات کچھ گڈمڈ سے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے یہاں پہنچ کر کوئی تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا اور پھر اس نے یک دم اپنا راستہ بدل لیا تھا لیکن چند قدموں کے بعد پھر وہ رک کر ذرا ٹھہرا اور پھر پلٹ کر دوسری سمت چل پڑا تھا۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ فراری اگر تو وزیر جان ہی تھا تو اسے راستے کا تعین کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہوگی، وہ بس اپنی جان بچانے کے لیے جس طرح بے سروسامانی کی حالت میں نکلا تھا تو جہاں اس کا منہ ہوا، وہ اس طرف نکل گیا تھا۔ ایسے شکار کو بھانپنا، کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر ابھی میں نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ مجھے اپنے عقب سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ یہ مخصوص، موٹے اور چوڑے ٹائروں والی جیپ تھی، اس میں میجر باجوہ اور چار ساتھی بھی براجمان تھے، ان میں دو اول خیر اور شکیلہ تھے۔ جنہیں عمارت سے باہر تعینات کیا گیا تھا۔ جبکہ زخمیوں کو اسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔

مجھے وہاں دیکھ کر وہ سب نیچے اتر آئے اور میرے ایما پر وہ بھی قدموں کے نشانات کا تعین کرنے میں مصروف ہو گئے۔

اس کے بعد ہم سب جیپ میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ ہم پُرامید تھے کہ ہمارا آخری شکار وزیر جان زیادہ دور نہیں گیا تھا اور کسی بھی لمحے وہ ہمارے نرغے میں آنے والا تھا۔ بشرطیکہ وہ وہی تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میرے چہرے کے پُرجوش تاثرات بھانپتے ہوئے مجھے ایک بات کی طرف اشارہ دیتے ہوئے اتنا ضرور کہا کہ اسٹیشن فور کی عمارت ایک ادارے کے زیرِدست ہے لہٰذا یہاں میری ایسی کوئی درانہ وار حرکت ہمیں قانون کی نظروں میں مجرم بنا سکتی تھی، اس پر مستزاد ہمارے پاس غیر قانونی ہتھیار بھی تھے، مجھے نہ جانے کیوں کبھی کبھی اول خیر کی ایسی باتوں سے سخت اختلاف ہوتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا۔ اسٹیشن فور کی عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے کار روک دی۔ سب مشین گن ہم نے کار کی سیٹ کے نیچے چھپا دی جبکہ لوگر ہمارے قمیضوں کے اندر اڑسے ہوئے تھے مگر اسٹیشن فور کی عمارت کے گیٹ پر بڑا سا تالا دیکھ کر میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

''مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ یہاں ہمیں کوئی نہیں ملے گا۔'' اول خیر نے گویا ایک پُرسکون ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔

''وزیر جان کو اب تک تیری کامیاب مہم جوئی کا پتا چل چکا ہوگا اور اس بات کا اندازہ بھی اسے ہو گیا ہوگا کہ ہم کسی بھی وقت دوبارہ یہاں کا رخ کر سکتے ہیں۔''

''یہ کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ اس کی......'' میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہ اندر ہی ہو۔''

''اگر وہ اندر ہوگا بھی تو دوبارہ ہمارے لیے پھندا تیار کیے بیٹھا ہوگا شہزی کاکا! مگر میرا نہیں خیال کہ ان حالات میں وہ یہاں موجود ہو۔'' اول خیر نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا تاہم بولا۔

''لیکن یار! وزیر جان پر ہاتھ ڈالنا ضروری ہے۔''

''میں تیری بے چینی سمجھتا ہوں کاکا، مگر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ میرا خیال ہے پھر...... ہمیں اس کی شہر والی کوٹھی کنال لاج کا رخ کرنا چاہیے۔'' اس نے کہا اور میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کی بات درست تھی۔ اسٹیشن فور پر سناٹا طاری دیکھ کر مجھے بھی مایوسی ہوئی تھی۔ وزیر جان یا اس کے ''بڑے'' اب زیرو ہاؤس کے کریش ہونے کے بعد یقیناً کوئی اور لائحہ عمل مرتب کرنا چاہتے ہوں گے شاید اس لیے انہوں نے یہاں سے فی الحال اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا ہوگا۔

اگلے چند منٹوں میں ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

☆☆☆

شہر پہنچ کر ہم نے سیدھا کنال لاج کا رخ کیا تھا۔ دن کافی نکل چکا تھا۔ لوگوں کی چہل پہل دیکھنے میں آ رہی تھی۔ اول خیر کو زیادہ تشویش ہمارے پاس موجود ان غیر قانونی ہتھیاروں کی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی تھی کہ ہم بہت جلد ان سے چھٹکارا پالیں گے۔

کنال لاج پر بھی بظاہر سناٹا طاری محسوس ہوا۔ البتہ چوکیدار موجود تھا۔ دفعتاً گیٹ کھلا اور اندر سے ایک لمبی سی چمچماتی کار نمودار ہوئی، میں چونکا اور بہ غور بھویں سکیڑ کر دیکھنے لگا۔ کار کے اندر فقط ایک ماڈرن ٹائپ کی خاتون براجمان تھی، اور خود ہی کار ڈرائیو کر رہی تھی، گیٹ سے نکلتے ہی اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور ہماری کار کے بالکل قریب سے زنانے کے ساتھ گزر گئی۔ مگر میرے چونکنے سے پہلے ہی عقابی نظریں عورت کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اسی لیے مجھے اس عورت پر شناسائی کا شائبہ ابھرا تھا اور میرے ذہن میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میں اس عورت کو پہچان چکا تھا اگرچہ کئی ماہ و سال بیت چکے تھے۔ مگر اس عورت کو اس چہرے کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔ بے شک گزرتے وقت کی گرد پرانے نقوش اپنی تہ میں دبا ضرور لیتی ہے مگر کچھ ایسے نقوش واضح ضرور تھے جو کسی دوسرے کے لاشعور میں نقش ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ میری سوتیلی ماں ہی تھی اب پتا نہیں تھی بھی یا نہیں مگر بہرحال عورت یہ وہی تھی جو وزیر جان کی چہیتی بیوی کہلاتی تھی۔ اس حیرت سے قطع نظر کہ ان دونوں غریب میاں بیوی کی معاشی کایا پلٹ کسی کی رہینِ منت ہوگی، مجھے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ اس بظاہر جاہل اور مرد مار عورت نے بھی خود کو نئے اور ماڈرن ماحول میں ڈھال لیا تھا۔

میں نے فوراً کار اس کی کار کے تعاقب میں لگا دی۔

''او خیر...... کاکا! کیا تو اس زنانی پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔'' مجھے اس کے تعاقب میں روانہ ہوتے پا کر اول خیر نے کہا تو میں اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت اور نظریں سامنے ونڈ اسکرین پر مرکوز رکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ہاں اول خیر، کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دوسرا حصہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ترتیب:

ایم۔ طلحہ عامر

Downloaded From

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 21

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Downloaded From

READING
Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تلاشِ مُہم جاری تھی۔

باوجود اس کے کہ مجھے اطمینان تھا کہ وزیر جان کو بس ہم تھوڑی ہی دیر میں چھاپنے والے تھے، لیکن پتا نہیں کیوں اس کی تلاش میں میری بے چینی اور جوش آسمان کو چھو رہا تھا۔ حالانکہ میں اپنے اصل مشن میں کامیاب ہو چکا تھا، جس کا ثبوت وہ بلیک کوبرا فائل تھی جو میرے سینے سے چپکی ہوئی تھی، مگر وزیر جان کو جلد از جلد تلاش کرنے کا ایک جنون میرے سر پہ سوار تھا۔ میری اس کیفیت کو اول خیر بخش سمجھ رہا تھا، تاہم وہ اور شکیلہ خاموش تھے، جبکہ میں اور میجر باجوہ آپس میں وزیر جان کے متعلق ہی گفتگو کر رہے تھے۔

صبح کاذب کی روشنی چہار سو پھیلنے لگی تھی۔ مفرور وزیر جان کی تلاش میں ابھی ہمیں چند ہی سیکنڈ گزرے ہوں گے کہ اچانک اس کے قدموں کے نشان ایک مقام پر گڈمڈ سے ہو گئے۔ جیپ رک گئی، ہم سب نیچے اُتر آئے اور بہ غور زمین پر کچھ دیکھنے لگے۔

”گاڑی کے ٹائروں کے نشانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مقام پر اس کا کوئی ساتھی اسے لینے آ پہنچا تھا، گو... گو۔“ میجر ریاض باجوہ نے جلدی سے کہا اور ہم سب دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔

میری بے چینی اور جوش ایک مرتبہ پھر سوا ہونے لگا۔ وزیر جان کا کسی گاڑی میں فرار ہونے کے انکشاف نے میری اُمیدیں ماند کر دی تھیں۔ میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن میجر صاحب! سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کے ساتھی کو اتنا موقع کیسے ملا کہ وہ پاور کے ایجنٹوں کے حملے کے دوران ایک عدد گاڑی لے کر خاموشی سے فرار ہو گیا؟ اس پر مستزاد وہ وزیر جان کو لینے ٹھیک اسی مقام پر بھی پہنچ گیا؟“

میری بات پر وہ بہ دستور جیپ کی ونڈ اسکرین کے پار اپنی نظریں جمائے ہوئے بولے۔ ”یہ کوئی ناممکن سی بات نہیں ہے۔ اسٹیشن فور میں یقیناً اسی طرح کا کوئی دوسرا خفیہ راستہ بھی ہوگا، موقع ملتے ہی اس کا ساتھی نکل بھاگا۔ ٹرانسمیٹر یا اسی طرح کے کسی رابطے پر ہی ان دونوں کا اتصال ممکن ہوا ہوگا۔“

”حیرت ہے، پھر چوہدری ممتاز نے ایسے کسی موقع سے کیوں فائدہ نہیں اُٹھایا تھا؟“

میرے منہ سے فوراً نکلا تو میجر صاحب زہریلی مسکراہٹ سے بولے۔ ”اس کا آسان سا جواب ہے کہ اُسے موقع ہی نہ ملا اور پھر ہم نے بھی تو اُسے ایسے کسی موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کہاں چھوڑا تھا۔ وہ جلد ہی ہمارے نرغے میں آ گیا تھا۔“

ابھی ہم نے بہ مشکل تین چار کلومیٹر کا ہی راستہ طے کیا ہوگا کہ ہمیں دور ہی سے کسی آبادی کے آثار نظر آنے لگے۔ جس کے قریب سے ایک ایسی ذیلی سڑک گزرتی تھی جو سیدھا ملتان روڈ سے ملتی تھی۔ ہم اس سڑک پر پہنچے تو میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا حکم دیا۔ ایک بار پھر جیپ سے اُتر کر ہم مذکورہ گاڑی کے ٹائروں کے نشانات کا تعین کرنے لگے۔ تب اس کی سمت کا اندازہ ہوا۔

وزیر جان جس گاڑی میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ فرار ہوا تھا وہ ملتان روڈ کے رُخ پر مڑ گئی تھی۔

پختہ سڑک پر آتے ہی میجر باجوہ نے ڈرائیور کو جیپ دوڑانے کی ہدایت کر دی۔ ساتھ ہی وہ اپنے وائرلیس سیٹ پر کسی ساتھی کو کچھ ہدایات بھی دینے لگے۔

یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ آنے جانے والی گاڑیاں ہمیں بہت قریب سے کراس کر رہی تھیں۔ مگر ڈرائیور بڑی مہارت سے جیپ کو طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا... اگر میجر باجوہ درست سمت پر سوچ رہے تھے تو شکار ہم سے اب بھی زیادہ دور نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔

ملتان روڈ کا الحاق ابھی چند کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ صبح کاذب کا وقت ہونے کے باعث اس روڈ پر ٹریفک کی آوک جاوک بھی نہ ہونے کے برابر تھی، ہم سے آگے جانے والی گاڑیوں میں ایک تو مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس تھی جو یقیناً کسی قریبی بستی سے صبح تڑکے روانہ ہوئی ہوگی، جبکہ باقی دو چار گاڑیوں میں سے ایک بھوسے سے لدا پھندا ٹرک تھا اور دوسرا ٹریکٹر۔

لیکن انہیں کراس کرتے ہی ہمیں ایک کار ضرور دکھائی دے گئی جس کی رفتار خاصی حد تک ”مشکوک“ تھی۔

اس کار کو دیکھ کر میجر باجوہ نے فوراً ڈرائیور کو بھی جیپ کی رفتار بڑھانے کا کہہ دیا۔

مشکوک کار کا تعاقب شروع ہو گیا تھا اور درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ میجر باجوہ نے ڈرائیور کو دو تین بار ہارن دینے کا بھی کہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ اگر وہ مطلوبہ کار نہ تھی تو اپنے پیچھے آنے والی رینجرز والوں کی مخصوص جیپ دیکھ کر اپنی کار روک دے، مگر ایسا نہیں ہوا۔ آگے والی کار کے ڈرائیور نے رفتار مزید بڑھا دی۔ ہمیں ایک دھچکا لگا۔ کار میں صرف ایک ہی فرد تھا، اور وہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہوئے تھا۔ جبکہ مطلوبہ شخص یہی لگتا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے بار بار ہارن دینے پر بھی نہیں رک رہا تھا۔ ورنہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ اپنے پیچھے آنے والی پولیس یا رینجرز کی گاڑی کو دیکھتے ہی فوراً گاڑی روک دیتا۔

لیکن اس نے کار کی رفتار بجائے کم کرنے کے اور بڑھالی تھی۔ اب صورتِ حال بڑی عجیب سی ہوگئی تھی۔ مشکوک کار بھی یہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن ہماری توقع کے خلاف اس میں ایک ہی آدمی سوار تھا اور وہ بھی صرف ڈرائیور۔ اس کے ساتھ وزیر جان کو بھی ہونا چاہیے تھا۔

''سمجھ میں نہیں آرہا، اگر یہ ہماری مطلوبہ گاڑی نہیں ہے تو پھر یہ اپنی کار روک کیوں نہیں رہا ہے؟'' میجر باجوہ نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے اپنے ہونٹ پُرسوچ انداز میں بھینچ لیے۔

''ہوسکتا ہے یہ ہمارا مطلوبہ شخص نہ ہو کوئی اور ہو۔ اور کسی خوف کے باعث کار نہیں روک رہا ہو۔'' میں نے خیال ظاہر کیا تو اس بار اول خیر بھی بولا۔

''رینجرز کی گاڑی اپنے تعاقب میں آتے دیکھ کر ہوسکتا ہے کہ وزیر جان سیٹوں کے درمیان کہیں سکڑسمٹ کر بیٹھ گیا ہو؟'' اس کا نقطہ بھی قابلِ غور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میجر نے اپنے ایک ساتھی کو آگے جانے والی کار کا ایک ٹائر فلیٹ کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور ایک ہی گولی نے کام کر دکھایا۔ ایک دھماکے سے کار کا ٹائر برسٹ ہوا اور وہ دائیں بائیں ڈولنے لگی۔ ہمیں بھی اپنی جیپ کی رفتار کم کرنا پڑی جبکہ کار ڈولتی ہوئی تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ ہماری جیپ قریب پہنچ کر رک گئی اور ہم سب گنیں تانے نیچے اُتر آئے۔ میجر باجوہ کے دو ساتھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کار کی سمت بڑھے اور ڈرائیور کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔ سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی گئی، اس کی جیب سے کچھ ایسی چیزیں برآمد ہوئیں جن سے ثابت ہوگیا تھا کہ وہ اسپیکٹرم کا ہی کارندہ ہے۔ ایک کارڈ سے یہ بات واضح ہوئی تھی جو اسپیکٹرم کے مخصوص مونوگرام کا تھا۔ ایک پستول بھی برآمد ہوا تھا۔

میں نے اور اول خیر نے کار کی بھی تلاشی لی۔ سیٹوں سے لے کر کار کی ڈگی بھی دیکھ ڈالی مگر وزیر جان کا پتا نہیں تھا۔ اس عجیب صورت حال نے ہمیں اُلجھا سا دیا تھا۔ شواہد بھی بتا رہے تھے کہ وزیر جان کو اپنے اس کار والے ساتھی کے ساتھ موجود ہونا تھا، مگر وہ یہاں سے بھی گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھا۔

پاور کے دونوں اہلکاروں نے کارندے کو دبوچ رکھا تھا پھر اسی طرح میجر باجوہ کے سامنے پیش کر دیا۔ میں بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

''وزیر جان کو کہاں اور کس مقام پر تم نے اُتارا ہے؟'' انہوں نے بارعب اور کڑک دار آواز میں اس سے دریافت کیا تو وہ بولا۔

''مجھے باس کے بارے میں نہیں معلوم۔ میں تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تھا۔''

''تم لوگ ختم ہو چکے ہو۔ اور تمہارا باس وزیر جان بھی نہیں بچ سکتا اب۔ اسی لیے سچ بتا دو ورنہ میں تمہارے منہ سے سچ اُگلوانے کے لیے کسی بھی طریقے سے گریز نہیں کروں گا۔'' میجر ریاض باجوہ نے اُسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ بجائے ان کی بات کا جواب دینے کے ڈھٹائی سے بولا۔

''آپ لوگوں کی یہ ماورائے قانون کارروائی کسی بھی طرح ایک آزاد ریاست کے زمرے میں نہیں آتی۔ جہاں ہر کسی کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔''

مجھے اس کی چالاکی پر غصہ آنے لگا، اس کی گفتگو سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ یہ وزیر جان کا کوئی قریبی ساتھی ہی تھا۔ میجر باجوہ نے اسی طرح بارعب انداز میں کہا۔

''اب تم لوگوں کا یہ حربہ نہیں چل سکتا۔ اس لیے کہ تم لوگ نوادرات کی آڑ میں یہاں کیا گل کھلا رہے ہو، اس کا ثبوت وہ بلیک کوبرا فائل کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اب تم اپنا اور ہمارا وقت ضائع کیے بغیر سچ بتا دو۔''

میری بہ غور تکتی نظروں نے تاڑ لیا کہ وہ غیر معمولی اعتماد کا مظاہرہ کر رہا تھا، بولا۔ ''اُس بلیک کوبرا فائل کو بنیاد بنا کر اگر اس بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارے کے خلاف کارروائی کی گئی ہے تو یہ تمہاری ایک خطرناک بھول کے سوا کچھ نہیں۔''

''سر! یہ جان بوجھ کر ہمارا وقت ضائع کر رہا ہے۔ اسے میرے حوالے کریں، میں ابھی اس کے منہ سے اُگلوا لیتا ہوں۔'' میں نے اس چالاک کارندے کو پُرطیش نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو میجر صاحب نے مجھے مخصوص اشارہ کر دیا۔

میں جیسے پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ گرفت خاصی مضبوط تھی، جس سے اس کی آنکھیں حلقوم سے باہر اُبل پڑنے کے قریب ہوگئیں۔

''تم لوگوں کا یہ ڈراما ختم ہو چکا ہے۔ تمہارا وہ بھارتی اہلکار سندر داس بھی ہماری گرفت میں ہے، اور کیٹسا ایجنٹ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ممتاز خان بھی۔ اب بس ہمیں اپنے جواب کا انتظار ہے، بولو، کہاں چھوڑ کر آئے ہو اپنے اسٹیشن چیف کو؟ خبردار! اب کوئی غیر متعلقہ جملہ منہ سے ہرگز مت نکالنا۔"

میری بات پر اس نے ایک بار پھر اپنی وہی بکواس کرنا چاہی تو میں نے اس کے جبڑے پر گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اپنے حلق سے کراہ خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ مگر میں نے فوراً آگے بڑھ کر اسے پھر دبوچ لیا۔ میرے ایک ہی گھونسے نے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں پھر غرا کے بولا۔

"جواب دو گے یا تمہیں اسی طرح تختۂ مشق بناتا رہوں۔"

"تم... تم میرے ساتھ غیر قانونی حرکت کر رہے ہو۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

میں نے اس بار ایک مُکا اس کی ناک پہ بھی جڑ دیا۔ وہ بری طرح چیخ مار کے گرا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ڈرامے کر رہا تھا، ورنہ اسپیکٹرم کے کارندے اتنے نازک جاں نہیں تھے کہ تھرڈ ڈگری کی اس مار پر درد اور تکلیف کے مارے چیخنے چلّانے لگتے۔ اس نے اپنے مضروب چہرے پہ ہاتھ رکھ کر خود کو زمین پر گرا دیا۔ میں دانت پیس کر اس پر جھکا مگر اس نے بجلی کی سی پھرتی سے مٹی اپنی مٹھیوں میں دبا کر میرے چہرے پر اُچھال دی۔ جو میری آنکھوں سمیت تھوڑی بہت منہ اور ناک میں گھس گئی۔ میں عارضی طور پر دیکھنے سے قاصر ہو گیا اور کھانسنے لگا۔ اسی وقت مجھے اس کارندے کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دیں، شاید کسی ساتھی نے اس پاداش میں اسے گُدّی لگا دی تھی جبکہ مجھے اول خیر نے سنبھالا اور شکیلہ جلدی سے جیپ کے اندر موجود پانی کی بوتل لے آئی اور میرے منہ پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا، مگر میری آنکھوں میں جلن اور نتھنوں میں خارش سی ہو رہی تھی۔ مجھے چھینکیں بھی آگئیں۔ کچھ حالت سنبھلی تو دیکھا میجر باجوہ کے دونوں ساتھیوں نے کارندے کو دبوچ رکھا تھا۔

بالآخر طے پایا کہ اسے ہیڈکوارٹر لے جا کر ہی منہ کھلوایا جائے۔ میں اس ناکامی پر بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ وزیر جان کے اس طرح ہاتھ آتے آتے چکنی مچھلی کی طرح نکل جانے پر مجھے تلملاہٹ سی ہو رہی تھی۔ مگر اسپیکٹرم کے کارندے پر اس طرح سرِعام تشدد کرنا پاور والوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ لہٰذا کوئی چارہ نہ پا کر مجھے بھی خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ البتہ روانہ ہوتے وقت میں نے باجوہ صاحب سے کہا۔

"سر! اس طرح تو یہ بدبخت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ وقت ضائع ہونے کی صورت میں وزیر جان بہت دور نکل چکا ہوگا۔"

"بے فکر رہو شہزی! وہ اب ویسے بھی نہیں بچ سکتا۔" میجر باجوہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ "وہ اب بے خانماں و برباد ہو چکا ہے۔ میں اس کی ذاتی رہائش گاہ کینال لاج کو بھی سیل کرانے کے احکامات جاری کیے دیتا ہوں۔ چلو اب۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ خدا نے ہمیں آج اسپیکٹرم کے خلاف ایک بڑی کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔ چوہدری ممتاز کا اس طرح گرفت میں آنا اور سب سے اہم بات کہ وہ اہم فائل ہمارے قبضے میں آچکی تھی جو اسپیکٹرم کی پوری لوکل کمانڈ سمیت، چوہدری ممتاز خان اور وزیر جان کے گلے کا پھندا بننے والی تھی، یہی نہیں بلیو ٹکلسی کا ایک اہم اور ٹاپ ایجنٹ سندر داس بھی ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ اب صرف وزیر جان ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس کے کئی کارندے بھی پاور والوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے، کچھ مارے گئے تھے۔

بہرحال ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اسپیکٹرم کے کارندے کو بھی رسن بستہ کر دیا گیا تھا۔

ہیڈکوارٹر پہنچنے کے بعد میں نے میجر باجوہ سے ان عوامل پر تبادلۂ خیال کرنا ضروری سمجھا کہ اس کامیاب آپریشن کے بعد اس کے منفی یا مثبت اثرات عابدہ اور میرے گمشدہ باپ پر کس حد تک مرتب ہو سکتے تھے؟

اس پر وہ مجھے سرِدست کوئی خاطرخواہ جواب نہیں دے سکے اور کہا کہ جب تک ان کا ایک اہم مہرہ وزیر جان قابو میں نہیں آجاتا، کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

ابھی تک قرائن اور مختلف شواہد سے یہی نظر آتا تھا کہ اسپیکٹرم کی لوکل قیادت میں بے شک ممتاز خان کی بھی حیثیت اپنی جگہ اہم جانی جاتی تھی، لیکن کلیدی حیثیت ہمیشہ وزیر جان کو ہی حاصل رہی تھی، لوکل کمانڈ کی حد تک ہی نہیں بلکہ اسپیکٹرم کی عالمی قیادت تک یہ باتیں محض قیاس پر ہی مبنی نہیں تھیں، گرفتار شدہ افراد نے بھی یہی کچھ اُگلا تھا۔ بلکہ کئی ایک نے تو یہاں تک بھی بتایا کہ اسپیکٹرم میں لولوش کے بعد وزیر جان کو "ماسٹر" تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس خدشے کا بھی احتمال تھا کہ ممکن ہے وزیر جان بیرونِ ملک فرار ہونے کی بھی کوشش کر سکتا تھا۔ یا پھر کوئی دوسرا قدم اُٹھانے کی کوشش کرتا۔

ہم تینوں واپس اپنے کوارٹر میں آگئے۔ میں بہت

Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

تھکن محسوس کر رہا تھا۔ شکیلہ ناشتا بنانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے نہا دھو کر عام کپڑے پہنے اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ مجھے شدید تھکا ہوا پا کر اول خیر نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔

میں نے اپنا سیل اور ای میل وغیرہ چیک کیا، پھر آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنا چاہا، مگر نہ اس کی کوئی ای میل آئی تھی نہ ہی اور کوئی میسج۔ اُس سے رابطہ بھی نہ ہو سکا۔ عابدہ کے بارے میں وہی مجھے پل پل کی خبر سے آگاہ کرتی تھی، نیز سرمد بابا اب اس دنیا میں نہیں رہے تھے، لہٰذا اب عابدہ کے سلسلے میں آنسہ خالدہ ہی میری آخری اُمید تھی۔ میں اُسے سرمد بابا کی موت کی اطلاع دے چکا تھا۔

عابدہ کے متعلق سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ جاگا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ مجھے جاگتا پا کر شکیلہ چہرے پہ مسکراہٹ لیے کمرے میں آ گئی۔

''اچھا کیا تم نے آرام کر لیا۔ بہت تھکے ہوئے تھے تم اسی لیے میں نے ناشتے پر جگایا نہیں خیر، کھانا تیار ہے۔''

''ہاں یار! لگا دو کھانا۔'' میں نے کہا پھر اول خیر کا پوچھا۔

''وہ پہلے ہی کھانے کی میز پر براجمان ہو چکا ہے۔'' شکیلہ نے کہا۔

میں کچن سے ملحقہ بڑے سے لاؤنج میں آ گیا جہاں ایک طرف ڈائننگ ٹیبل بچھی ہوئی تھی۔ اول خیر انہماک سے اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

''خیریت ہے، ایسی کیا خاص خبر ہے بھئی۔''

''یہ اپنے خان صاحب کے متعلق خبر تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے زبیر خان سے متعلق؟'' میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لو کاکے! تم بھی پڑھ لو۔ زبیر خان پر پچھلے دنوں فالج کا حملہ ہوا تھا، اب اسپتال سے گھر آ گیا ہے۔ اپنی کھلاں والی حویلی میں۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔ کھلاں والی سے مجھے کچھ اور بھی یاد آ گیا تھا۔ ایک بہت اہم بات، جو ہوٹل میں عبید سے ملاقات پر میں نے اس کے منہ سے سنی تھی۔ جب اس نے مجھے سندر واس کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ وزیر جان، لولووش کی طرف سے اُسے اسپیکٹرم کا ''ہینڈلر ایجنٹ'' کا عہدہ تفویض کرنے کے بعد، کھلاں والی میں زیرِ تعمیر ایک نئے زیرو ہاؤس میں منتقل کر دے گا۔ میں اس پر چونکے بنا نہ رہا تھا، مگر اس وقت حالات ایسے تھے کہ میں اس سے مزید کچھ نہیں پوچھ سکا تھا۔ اور جلدی بھی کیا تھی، مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ عبید کی اتنی ہی لکھی ہوئی تھی۔ تاہم اب زبیر خان سے متعلق خبر پر اس کی آبائی حویلی کا خیال ...آیا تو مجھے یاد آ گیا۔

میں نے اخبار اس کے ہاتھ سے لیا اور خبر تفصیل سے پڑھی، جس کے مطابق زبیر خان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ایمرجنسی میں اُسے لاہور کے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں وہ دس بارہ دن داخل رہا تھا اور اب واپس اپنے آبائی گاؤں ''کھلاں والی'' آ گیا تھا۔ انسان کی زندگی میں تو یہ سب چیزیں چلتی رہتی ہیں، کبھی خوشی کبھی غم۔ مگر میری سوئی اسپیکٹرم کے اس نئے زیرو ہاؤس پر اٹک کر رہ گئی تھی کہ آخر یہ کیا معاملہ تھا؟ کس نے کھلاں والی کی زمین وزیر جان کو بیچی تھی؟ اور کس کی اجازت سے؟

نیلی اور جاں در کھتا والے معاملے کے بعد سے میری دوبارہ زبیر خان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی فون پر کوئی بات ہوئی تھی۔ جبکہ میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ نیلم والے معاملے کے دوران ہی یہ بھانڈا پھوٹا تھا کہ وزیر جان کھلاں والی کی جاگیر یا اس کی زمین کا ٹکڑا خریدنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بلکہ وہ ہر قیمت پر ایسا کرنا چاہتا تھا۔ اور مجھے یہ اس کے کسی اور مخفی منصوبے کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جس کے نتیجے میں وزیر جان نے اپنی چہیتی بیوی سعیدہ کو نیلم کے ساتھ خفیہ ساز باز میں لگا رکھا تھا۔

''او خیر کا کے! تو اس خبر کو سن کے کہاں کھو گیا۔ خیریت تو ہے؟'' معاً اول خیر نے مجھے ٹہوکا دیا۔ میرے اندر ایک تلملی سی چل رہی تھی۔ میں ذرا چونکا اور سر جھٹک کر بولا۔

''کچھ نہیں یار! زبیر خان کے ذکر پر ایسے ہی کچھ یاد آ گیا تھا۔ پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

اس اثنا میں شکیلہ کھانا ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ کھانے کے دوران میں نے وہ بات ان دونوں سے بھی شیئر کر دی۔

''اب کیا فائدہ اس کے بارے میں سوچنے کا۔'' اول خیر بولا۔ ''اسپیکٹرم کا سیاپا ہی مک گیا۔ اب یہ وزیر جان بچا ہے، وہ بھی کب تک بچے گا، بلیک کوبرا فائل کی صورت میں اس کے خلاف پاور والوں کے ہاتھ ٹھوس ثبوت لگ چکے ہیں۔''

''پھر بھی یار آخر پتا تو چلے کہ کھلاں والی میں کون سی جگہ ان لوگوں نے اپنے نئے زیرو ہاؤس کی داغ بیل ڈالی تھی اور کس کے بل بوتے پر؟'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا تو اول خیر کے بجائے شکیلہ سنجیدگی سے بولی۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''ہم کھلاں والی زبیر خان کی خیریت پوچھنے کے بہانے بھی جا سکتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر ہمیں خود بھی ماحول کا اندازہ ہو جائے گا۔''

''مشورہ تو اچھا ہے شکیلہ کا، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زبیر خان کسی کو پہچاننے کے قابل ہوگا بھی یا نہیں؟ میرا مطلب ہے وہ ہمیں پہچان پائے گا؟'' اول خیر نے کہا۔

''ہم ایک فارمیلٹی کے طور پر جائیں گے وہاں۔ زبیر خان سے ہاتھ ملانے نہیں جا رہے ہیں ہم۔'' شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''زبیر خان کو وہاں جا کر سہرا ڈالنے کا میں بھی نہیں کہہ رہا ہوں۔'' اول خیر نے جلبلا کر کہا۔

''شہزی کا وہاں جانے کا جو مقصد ہے وہ میں سمجھ چکا ہوں، تمہیں یہ بات سمجھنے میں ابھی تھوڑی دیر لگے گی۔'' دونوں میں بحث شروع ہو چکی تھی۔

میرا دھیان عابدہ کی طرف لگا ہوا تھا۔ آنسہ خالدہ سے بات ہو جاتی تو کچھ تسلی ہو جاتی۔ مجھے بہ دستور سنجیدہ اور خاموش پا کر دونوں خاموش ہو گئے پھر شکیلہ نے میری اس خاموشی کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''شہزی! آنسہ خالدہ نے دوبارہ کوئی رابطہ نہیں کیا۔ ہمیں عابدہ کے بارے میں بھی کوئی سنجیدہ اسٹیپ اُٹھانا ہوگا۔ کیونکہ سرمد بابا کے انتقال کے بعد معاملہ اور ہو چکا ہے۔''

''میں نے دو ایک بار کوشش کی تھی آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی، میں خود بھی اس سے سرمد بابا کی موت کے بعد تبادلۂ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مگر رابطہ نہ ہو سکا تھا۔'' میں نے کہا تو شکیلہ نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''تم اُسے اس سلسلے میں ایک ای میل یا میسج ہی کر دو۔''

بے دلی سے کھانا ختم کر کے میں ٹیبل سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ آنسہ خالدہ کی کال آ گئی، میں نے فوراً جھپٹ کر اپنا سیل لیا اور کان سے لگا لیا۔

''ہائے مسٹر شہزاد! کیسے ہو۔ تم شاید مجھے کال کر رہے تھے؟'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔ میں نے فوراً کہا۔

''جی ہاں! مگر آنسرنگ مشین میں تمہارا ریکارڈ شدہ میسج سنائی دیا تھا کہ تم اس وقت بزی تھیں۔'' میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ نجانے اب عابدہ سے متعلق کون سا نیا سانحہ میرے علم میں آنے والا تھا؟

''مسٹر شہزاد! سیٹھ منظور وڑائچ کے انتقال کی خبر سے مجھے بھی شاک پہنچا ہے۔'' وہ بولی۔ ''عابدہ کا کیس عدالت میں پیش ہونے والا ہے۔ اور اس میں سیٹھ منظور وڑائچ کا پیش ہونا لازمی تھا۔'' اس نے وہی کہا جس کا مجھے اندازہ تھا۔

''آپ نے لائر سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ تو لیا ہوگا۔ میں نے اسی لیے آپ کو سب سے پہلے اس افسوس ناک خبر سے مطلع کیا تھا۔''

''اُس سے بات کرنے کے بعد ہی میں نے تمہیں فون کیا ہے۔'' وہ بولی۔ میں دھڑکتے دل سے اس کی بات سننے لگا۔ ''لائر کی کچھ مصروفیات اور عدم دستیابی کے باعث میرا اس سے دیر سے رابطہ ہوا تھا، بہرحال اس نے یہی مشورہ دیا ہے کہ سرمد بابا کی ہلاکت سے عابدہ کا کیس کمزور پڑ سکتا ہے، کیونکہ یہاں کورٹ کے ریکارڈ میں ہمارے لائر نے کیس کے متعلق جواب ڈیٹ دے رکھی ہے اس کے مطابق منظور وڑائچ ہی عابدہ کے سرپرست تھے، اور وہ اُنہی کے ایما پر ہی ان کی ڈاٹر اِن لاء کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ لیکن تم فکر نہ کرو اور جلد سے جلد کسی تیز رفتار کوریئر سروس سے منظور وڑائچ کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی ایک کاپی میرے ایڈریس پر بھیج دو۔ بلکہ آج ہی بھیج دو۔''

آنسہ کی بات نے میری تشویش بڑھا دی۔ ''میں آج ہی یہ کام کر لوں گا مس خالدہ! لیکن اب کیس سے متعلق نئی صورتِ حال کیا ہوگی؟ لائر کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟ آئی مین کوئی اُمید؟''

''مسٹر شہزاد! سب سے بڑی اُمید تو یہ ہے کہ ہماری کوششوں، بہ شمول مسٹر منظور وڑائچ، ہم نے یہ کیس سی آئی اے کی اسپیشل کورٹ میں نہیں جانے دیا، اور اسے نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوپن سوسائٹیز کی عدالت میں دائر کروانے میں کامیاب ہوئے۔ جبکہ باسکل ہولارڈ اب بھی عابدہ کے کیس کو سی آئی اے کی انٹی ٹیرر کورٹ میں گھسیٹنے کی کوشش میں مصروف ہے، اس سے اس کے عابدہ سے متعلق خطرناک عزائم کا اندازہ . . . ہوتا ہے، کیونکہ مذکورہ عدالت میں کیس چلانے کا مطلب امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے کسی ایک جیل کی ہوا کھانا۔''

میں آنسہ کی بات پر لرز کر رہ گیا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ الفاظ میرا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ نجانے کتنے پل اسی طرح دم بہ خودی خاموشی میں بیت گئے۔ پھر اُس کی دوبارہ آواز اُبھری۔

''اسی لیے میں اس خدشے کا اظہار کر رہی تھی کہ کیس

READING Section

کمزور ہونے کی صورت میں کہیں عابدہ کا کیس اینٹی ٹیرر کورٹ میں نہ منتقل کردیا جائے۔ ڈو یو ہیئر می مسٹر شہزاد؟" اس نے لمحہ بھر توقف کے بعد آخر میں پوچھا۔

شاید اُس نے میری طویل اور یک ٹک خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے کہ کہیں کال ڈراپ تو نہیں ہوگئی، سوالیہ کہا۔ میں اس سے باتیں کرتے ہوئے نشست گاہ میں آگیا تھا، اول خیر اور شکیلہ بھی ذرا دیر بعد وہاں آگئے تھے۔

چونکہ میرے سیل فون کا وائیڈ اسپیکر آن تھا، اسی لیے شکیلہ اور اول خیر بھی میری اور آنسہ کے درمیان ہونے والی دوطرفہ گفتگو کو بہ آسانی سن رہے تھے اور میری کیفیات کو بھی محسوس کررہے تھے۔ ایسے ہی میں اول خیر نے حوصلہ دینے کے انداز میں میرا کاندھا ہولے سے تھپتھپایا تب میں نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جج... جی میں سن رہا ہوں۔ میں اسی لیے آپ سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا کہ اب ایسی صورت حال میں کیا کیا جاسکتا ہے؟ لائر نے کوئی مشورہ تو دیا ہوگا آپ کو؟"

"میں اسی طرف آرہی ہوں۔" وہ بولی۔ "میں پہلے بھی تم سے کہہ چکی ہوں مسٹر شہزاد کہ میں اسٹیٹ فارورڈ لڑکی ہوں اور ٹو دی پوائنٹ بات کرتی ہوں۔ تمہیں کسی جھوٹی تسلی میں رکھنا چاہتی ہوں نہ ہی بلند بانگ دعوے کرکے تمہیں کسی مغالطے میں رکھنا میرا مقصد ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میری ساری توجہ تمہاری گرل فرینڈ عابدہ کو سی آئی اے، بالخصوص باسکل ہولارڈ کے چنگل سے چھڑانے میں مرکوز ہے۔ اور میں تم پر کوئی احسان نہیں کررہی، وہی کچھ کررہی ہوں جو میرا "ایم" ہے۔ مقصد کی بات کی طرف آتے ہیں تو اب یہی ایک حل ہے کہ مسٹر منظور وڑائچ کی ڈاٹر ان لاء (بہو) کو ہی امریکا آنا پڑے گا۔"

میں اس کی بات پر سن ہو کے رہ گیا تھا۔ عارفہ میرے یا عابدہ کے ساتھ کتنی "مخلص" تھی، یہ میرے سوا کون جانتا تھا۔ کیونکہ اس حرافہ اور ذلیل عورت نے ہی اپنی گردن ... بچانے کے لیے بے چاری عابدہ کو وہاں پھنسوا دیا تھا۔ اب عارفہ سے عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کسی مدد کی اُمید رکھنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے بھیڑوں کی رکھوالی کے لیے بھیڑیوں کو چھوڑ دیا جائے۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ کبھی بھی اپنے وکیل اور ڈاکٹر سے بھی کوئی بات مت چھپاؤ، آنسہ خالدہ کوئی وکیل یا ڈاکٹر تو نہیں تھی، مگر ایک سچی ہمدرد ضرور تھی۔ اسی لیے میں نے بھی اس سے کچھ چھپانا مناسب نہ سمجھا اور عارفہ کے متعلق سب کچھ بتادیا۔ جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے اُسے بھی ایک چپ سی لگ گئی۔ پھر میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔

"اب آپ خود ہی اندازہ کرلیں مس خالدہ! ایسی صورت میں کیا کیا جاسکتا ہے۔"

"پھر تو یہ واقعی ایک گمبھیر مسئلہ بن سکتا ہے مسٹر شہزاد! کیونکہ مسٹر منظور وڑائچ کے بعد اب ایک آخری اُمید عارفہ ہی بچی تھی اور اسی کی گواہی اس لبرل اوورسیز سوسائٹیز کی کورٹ میں عابدہ کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔" آنسہ خالدہ کے لہجے میں پُرمتانت سی تفکیر کو محسوس کرکے میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کوئی دوسری راہ یا کوئی ایسی صورت جس میں عارفہ کی گواہی کی ضرورت ہی نہ پڑے؟"

"ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے مسٹر شہزاد؟" وہ بولی۔ "شاید پریشانیوں نے تمہارے اعصاب اور ذہن پر خاصا منفی اثر ڈالا ہے۔"

میں اس کی بات پر چپ سا ہوگیا۔ وہ ایسا کچھ غلط بھی تو نہیں کہہ رہی تھی۔ عابدہ کی پریشانی نے تو میرا دماغ ہی ماؤف کردیا تھا۔ مجھے خاموش پاکر آنسہ خالدہ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "آئم ٹیریبلی سوری۔ تم نے میرے اس ریمارکس کا برا تو نہیں منایا مسٹر شہزاد؟"

"قطعاً نہیں مس خالدہ! آپ نے میرے بارے میں بالکل ٹھیک ہی تو ریمارکس پاس کیے ہیں۔ عابدہ کی پریشانی نے واقعی مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا ہے۔ سوچتا ہوں اللہ کے سوا آپ کا سہارا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ آپ جیسی میلوں دور بیٹھی ہمدرد کو میں کیا نام دوں، ماسوائے اس کے کہ آپ کو اپنے اور عابدہ کے لیے ایک فرشتہ ہی کہوں۔"

"پلیز شہزاد! سوری ٹو سے۔ میرا مقصد تمہیں ایموشنل یا دکھی کرنا نہیں تھا۔" آنسہ بولی۔ "مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ تم اور عابدہ کس کرب سے گزر رہے ہو۔ اینی وے میں ایک مشورہ دوں گی۔ اگر تمہارے اور عارفہ کے درمیان ایسا کوئی بات ایشو نہیں ہے تو تم اُسے کسی طرح اپنے لیے کنوینس کرنے کی کوشش تو کرو۔ ممکن ہے بات بن جائے۔ مگر جو بھی کرو ذرا جلدی کرنا۔ اور مجھے بتادینا تاکہ ہمارا لائر کیس کو نئے انداز سے تیار کرکے کورٹ سے پیشی کی تاریخ لینے کی کوشش کرے۔ اور ہاں! سیٹھ منظور وڑائچ کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پہلی فرصت میں بھیج دو۔"

عابدہ کی پریشانی میں مجھے اپنے متعلق اس سے کوئی بات پوچھنے کا یارا تک نہ رہا تھا، مگر اول خیر نے جب محسوس کیا کہ میرے اور آنسہ کے درمیان گفتگو اختتام پذیر ہونے والی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ے تو اس نے فوراً نیچی آواز میں مجھ سے کچھ کہا۔ یہ وہ استفسار یہ جملے تھے، جس میں مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، لیکن میرے ان دونوں ساتھیوں کو اس کی پوری فکر و تشویش تھی، ناچار میں نے اختتامی کلمات کے دوران ہی اس کا بھی مختصراً ذکر کیا تو اس نے اس سلسلے میں مجھے صرف ای میل کے ذریعے ہی معلومات کا تبادلہ کروانے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح کی حساس گفتگو اور معلومات کی ترسیل بہم پہنچانے کے لیے آنسہ خالدہ نے اپنی ایک دوسری فیک (fake) میل آئی ڈی sweet@_laday کے نام سے بنا رکھی تھی۔ جو بہ ظاہر ایک فحش ویب کیم سائٹ کی تھی۔ تاکہ اس کی ای میل وغیرہ وہاں امریکی خفیہ اداروں میں ٹریس نہ کی جا رہی ہو۔ جبکہ اپنے اصل نام کی رئیل آئی ڈی جوں کی توں تھی۔

میں نے اثبات میں جواب دے دیا اور ”بیسٹ وشز“ کے ساتھ آنسہ خالدہ نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اول خیر نے مجھے جو چند جملے لکھ کر دکھائے تھے، وہ آنسہ خالدہ سے دریافت کرنا تھا کہ میرے سلسلے میں سی آئی اے کا ایک خصوصی اسالٹ ونگ جس کی باگیں ٹائیگر فیک کے نام سے باسکل ہولارڈ کے ہاتھوں میں تھیں، اپنے خفیہ آپریشن کے لیے وہ کسی بھی وقت پاکستان وارد ہونے والے تھے، اس سلسلے میں تازہ رپورٹس کیا تھیں؟ وغیرہ۔ اگرچہ اول خیر کے ان لفظوں کو میں نے اشاروں کنایوں میں ہی بدل کر آنسہ خالدہ سے پوچھا تھا اور اس نے بھی مجھے اسی انداز میں مختصر ترین جواب دے دیا تھا۔

میں نے فون بے دلی سے ایک طرف صوفے پر پھینک کر، تھکے تھکے سے انداز میں اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر ذرا دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ چند سیکنڈ اسی طرح گزرے تو اچانک مجھے اپنی شل سماعتوں میں اول خیر کی مخصوص آواز سنائی دی۔

”اوخیر کا کے! تو پھر قنوطی ہو رہا ہے؟“ میں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھیکی سی مسکراہٹ سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”نہیں یار! بھلا تمہارے اور شکیلہ جیسے غم خوار اور جاں نثار ساتھیوں کے ہوتے ہوئے میں مایوس کیسے ہو سکتا ہوں۔ بس ذرا اس نئی صورت حال نے پریشان سا کر ڈالا ہے۔ بہی خواہوں سے مدد لینا کسی حد تک آسان ہوتا ہے مگر بات جب دشمنوں سے مدد لینے کی ہو۔ اور وہ بھی ایسے مارِ آستین دشمنوں سے جو بغل میں چھری چھپائے ہوئے ہوں تو بات اور ہو جاتی ہے۔“

”حیرت ہے، آنسہ خالدہ کو تم نے عارفہ کے سلسلے میں اچھا خاصا بریف بھی کر دیا تھا، باوجود اس کے، وہ مصر ہے کہ ہمیں عارفہ کو اپنے حق میں کنوینس کرنا ہوگا۔ اسے کوئی دوسرا حل بھی تو بتانا چاہیے تھا؟“ شکیلہ نے کہا۔

”عابدہ بہن والے کیس میں سردار بابا مرحوم کے بعد وہ حرافہ عارفہ ہی ایک اہم شخصیت باقی بچی ہے، جو مزار پڑتے اس کیس میں جان ڈال سکتی ہے۔“ اول خیر نے کہا۔

”تم بتاؤ شکیلہ! اس سلسلے میں کیا واقعی ہمیں عارفہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے ہوں گے؟“ میں نے ان کی بحث سے بچنے کے لیے فوراً مداخلت کر ڈالی۔ ورنہ تو عارفہ جیسی حرافہ اور مارِ آستین ناگن کو کون سی بین رام کر سکتی تھی؟ اس پر میں خود بھی غور کر رہا تھا۔

”اس ناگن کو دودھ بھی پلا دو گے، تب بھی اس سے بدلے میں زہر ہی ملے گا۔ ہمیں آنسہ خالدہ سے ہی اس سلسلے میں مدد لینا ہوگی۔“ شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا تو اول خیر متانت سے بولا۔

”آنسہ خالدہ ہزاروں میل دور بیٹھی عابدہ بہن اور ہمارے لیے جو کچھ کر رہی ہے، وہ بلاشبہ اس کا ایک اچھا عمل ہے، اور وہ کم نہیں کر رہی۔ لیکن جو ہمارے کرنے کا کام ہے وہ ہمیں ہی کرنا ہوگا۔ اس پر یہ اضافی بوجھ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے مجبور کرنے پر کوئی قدم اُٹھا بھی لے گی تو وہ کمزور بھی ثابت ہو سکتا ہے، اور اس کا فائدہ باسکل ہولارڈ کو ہوگا، جو پہلے ہی عابدہ بہن پر دانت نکوسے ہوئے ہے اور اُسے عالمی دہشت گردوں کی ساتھی قرار دینے پر تلا بیٹھا ہے، نجانے وہ مردود اس طرح کی ناپاک حرکت کر کے اپنے کون سے مذموم مقصد کی تکمیل چاہتا ہے، تاہم لگتا یہی ہے کہ یہ معاملہ صرف لولووش یا اسپیکٹرم کی دشمنی کا ہی نہیں ہے، اس سے آگے کا بھی ہے۔“

اول خیر کی اس بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ”تم کیا کہنا چاہتے ہو اول خیر؟ ذرا کھل کر بولو۔“

”میرا ایک اندازہ ہے، جو میں نے باسکل ہولارڈ کی ان تفصیلات کی روشنی میں قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جو آنسہ خالدہ نے تمہیں اپنی فیک میل ایڈریس سے بھیجی تھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ”نائن الیون“ کے سانحے کے پیچھے امریکی یا یہودی لابی کے جو ناپاک مقاصد رہے ہوں گے، اس کی راہ ہموار کرنے کے لیے سی آئی اے کا یہ مذکورہ ونگ ٹائیگر فیک، باسکل ہولارڈ کی سرکردگی میں مصروفِ کار ہے، جو ایک خفیہ ٹاسک کے تحت نائن الیون کا سارا ملبا دنیائے مسلم پر ڈالنا...

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چاہتے ہیں، اس کے لیے وہ ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انہیں دہشت گرد بھی قرار دیے جانے کی پوری کوشش کی جارہی ہے۔ آج کے حالات اس کی بہ عین عکاس ہیں۔" مجھے اول خیر کی ان باتوں نے ششدر کردیا تھا۔ بے شک یہ باتیں میرے علم میں بھی تھیں جو میں نے ملکی اور غیر ملکی غیر جانبدار مبصرین کے تجزیوں اور نچوڑ سے حاصل کی تھیں۔ لیکن اب تک اول خیر کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ اس کا ذہن دیسی مار کا تھا اور سوچ بھی اس کی یہیں تک محدود ہوگی، لیکن جس طرح اس نے ان سب باتوں کا احاطہ کیا تھا، وہ قابلِ دید تھیں۔

"تم تو اتنے یقین سے یہ سب کہہ رہے ہو جیسے تمہیں الہام ہوگیا ہو۔" شکیلہ نے شاید اس کی عالمی بصیرت سے جل کر کہا تو اول خیر بولا۔

"بی بی! اگر تم ٹی وی پر صرف معاشرے کی عکاسی کے نام پر چلائے جانے والے برگر فیملیز سے اَٹے پڑے، نت نئے ڈیزائن والے ملبوسات اور جدید فیشن کی نمائش کرتے ڈرامے دیکھنے کے بجائے سنجیدگی سے عالمی اخبارات، رسائل اور ڈاکومنٹری کا مطالعہ کرو تو تم بھی بہ آسانی ان سب باتوں کا تجزیہ کرسکتی ہو۔"

میرے حساب سے اول خیر نے اس بار شکیلہ کو زوردار چوٹ دی تھی، میں نے کچھ دیر تک دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی کہ دیکھوں شکیلہ اسے کیا جواب دیتی ہے؟ درحقیقت میرے نزدیک ان دونوں کے درمیان اس طرح کی بحث ذہنی جمناسٹک کے مترادف تھی۔ بشرطیکہ پٹری سے نہ اُترتی۔ میرا خیال تھا شکیلہ زچ ہوجائے گی۔ لیکن میں نے دیکھا وہ بڑے اعتماد سے مُسکراتے ہوئے بولی۔

"خوشی ہوئی مجھے تمہاری اس بصیرت کے متعلق جان کر۔ ورنہ تو میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ تم دماغ کم اور اسلحہ کا زیادہ استعمال کرتے ہو۔ باقی تمہاری اطلاع کے لیے بتادوں کہ جس طرح کی تم بصیرت رکھتے ہو، وہ اب پرانی ہوچکی ہے، نائن الیون کے درپردہ امریکا یا اس کے اندر گھسی بیٹھی مستحکم دشمن لابی کے اصل مقاصد کیا تھے، اس سے اب ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی آگاہی ہوچکی ہے۔ اگرچہ یہ پوری ڈکلیئر نہیں ہوگی، ہاں اب ایک سرد جنگ ضرور چھڑ چکی ہے، ان دو گروہوں کے درمیان، جو اپنے اپنے طور پر اس عالمی واقعے کو سچ یا جھوٹ قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، اور اس کی دلالت میں اپنے اپنے طور پر ثبوت پیش کرنے کے لیے کوشاں بھی رہتے ہیں، ایک وہ گروہ جو اس واقعے کو ایک گھناؤنی سازش اور خود ساختہ قرار دینے کی جدوجہد میں ہے، اس کی نمائندہ تم آنسہ خالدہ کو بھی کہہ سکتے ہو، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو اسے واقعی ایک ناپاک سازش کے تحت مسلم دنیا پر تھوپنا چاہتا ہے، اس کا نمائندہ تمہیں امریکی نژاد یہودی باسکل ہولارڈ کی شکل میں بہ آسانی نظر آسکتا ہے۔ بلکہ اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو درحقیقت یہی لابی اس واقعے میں زیادہ ملوث محسوس ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ باسکل ہولارڈ کا گروہ اسے سچ ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے اُوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا اسی سبب تمہارے ذہن میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بے اختیار یہ خیال آیا تھا کہ عابدہ کا معاملہ لولووش اور اسپیکٹرم سے آگے کا ہے۔"

میں بے اختیار فخریہ انداز میں مسکرایا۔ میرے دونوں ساتھی ذہنی فراست میں کم نہیں تھے۔ میں نے تالی بجا کر دونوں کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھا اور اور سنجیدگی سے موجودہ مسئلے کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"تم دونوں کی باتوں کی روشنی میں آخری فیصلہ یہی طے پاتا ہے کہ عارفہ والا معاملہ ہمیں ہی دیکھنا ہوگا اور اس میں تاخیر کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے لیے مجھے خود عارفہ سے ایک ملاقات کرنا ہوگی۔"

میں ان دونوں کی سنتا ضرور تھا، مگر آخری اور حتمی فیصلہ میرا ہی ہوتا تھا۔ جو عموماً انہی کے مشوروں کی روشنی میں ہی ہوتا تھا۔ ان دونوں نے اگرچہ میرے فیصلے پر اثباتی انداز کی خاموشی تو اختیار کرلی تھی لیکن ان کے چہرے پر جھلکنے والے اضطراب کا خود میں بھی شکار تھا۔ آخر اس اہم، حساس اور نازک ترین معاملے میں عارفہ جیسی ناگن کو کیسے رام کیا جاسکتا تھا؟ یہ کوئی ایسا معاملہ بھی نہ تھا کہ عارفہ کی کنپٹی پر گن رکھ کر زور زبردستی سے کروالیا جاتا۔ اس میں مکمل طور پر عارفہ کی دیانتداری اور خلوص کی ضرورت تھی، اور اس جیسی ناگن سے ایسی توقع رکھنے کو میں دنیا کا احمقانہ ترین کام سمجھتا، جسے مجھے بہرحال کرنا تھا۔

اُصولی طور پر اگر دیکھا جاتا تو اخلاقی طور پر عارفہ کو خود ہی اپنی محسنہ عابدہ کی مدد کے سلسلے میں پہل کرنی چاہیے تھی، مگر وہ کبھی ایسا نہیں کرتی، اس ناگن کو جھکانے کے لیے میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا تھا۔ "ڈیل۔"

"لیکن ہم عارفہ کو کس طرح اس پر راضی کریں گے؟ وہ ہم پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔" حتمی فیصلہ کرنے کے بعد شکیلہ نے اس کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کہا۔

''ڈیل ...؟'' میں گمبھیر لہجے میں مختصراً بولا۔

''ڈیل۔''

''ہاں! مجھے عارفہ سے ایک ڈیل کرنا ہوگی، ایک سودا۔'' میں نے پُرغور سے انداز میں کہا۔ ''وہ زہریلی ناگن ایک کاروباری ذہن بھی رکھتی ہے اور اس کی کمزوری اس کی لالچی فطرت ہے۔ میں اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا۔''

''او خیر کا کے! کہیں تم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز تو اس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے؟''

میری توقع کے عین مطابق اول خیر نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں اس سے متعلق بہ خوبی آگاہ تھے۔ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تو شکیلہ نے فوراً ایک تکلیف دہ حیرت سے کہا۔ ''شہزی! تت... تو کیا تم اڑیسہ کمپنی کے شیئرز اس کے حوالے کردو گے؟''

''ہاں! عابدہ کی رہائی کی خاطر اور اسے مصیبت کی اس گھڑی سے نکالنے کے لیے میں اس جیسے لاکھوں مالیت کے شیئرز بھی اس ناگن کے حوالے کرسکتا ہوں۔'' میں نے مضبوط اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ''یوں بھی اُصولی طور پر میں نے کبھی بھی خود کو ان شیئرز کا مالک نہیں سمجھا، آج سوچتا ہوں تو مجھے خدا کی اس مصلحت پر حیرت محسوس ہوتی ہے کہ شاید اسی دن کے لیے سردہ بابا ان شیئرز کی پاور آف اٹارنی اور خودمختاری میرے سُپرد کر گئے تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شہزی کہ عابدہ بہن کے سامنے ان شیئرز کی کوئی حیثیت نہیں ہوسکتی، بلکہ دنیا کی ساری دولت ہی ہیچ ہے، مگر اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ اس ڈیل کے نتیجے میں عارفہ وہی کرے گی جو ہم چاہیں گے؟ وہ ہمیں دھوکا بھی دے سکتی ہے اور اس کا نتیجہ عابدہ کے لیے خدا نہ خواستہ بہت خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔''

شکیلہ نے کہا تو اس کے اس خدشے کی توثیق اول خیر نے بھی کر ڈالی، وہ پُرتشویش لہجے میں بولا۔ ''کوئی بعید نہیں کہ وہ وہاں جا کر ہمارے دُشمنوں سے ہم سے زیادہ منفعت والی ڈیل کرلے اور عابدہ بہن... نن... نہیں... نہیں شہزی کا کے! ہمیں اس سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کو کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ کہیں یہ ڈیل یا یہ سودا ہمارے لیے آ بیل مجھے مار والا نہ ثابت ہوجائے۔ اگر ہم یہ مقدمہ ہار گئے تو ہمیں اس کے بہت ہی خطرناک نتائج بھگتنا پڑ جائیں گے۔''

اول خیر خاصا متوحش سا نظر آنے لگا تھا اور اس سے زیادہ میں خود بھی انہی اندیشناک وسوسوں اور خدشات کا شکار تھا۔ لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''دوستو! انسان کی زندگی تو خود ایک رسک سے عبارت ہے، اس کا کیا بھروسا، مگر ایک اُمید کے سہارے ہم اس زندگی کو گزارتے ہیں۔ ہمیں یہ رسک بہرحال اُٹھانا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، ہاں یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اس ڈیل کے تحفظات کیا ہونے چاہئیں، وہ ہم عارفہ سے ڈسکس کرکے اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے کا کے! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا...'' اول خیر نے فوراً کہا۔ شکیلہ نے ایک اور بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کروائی۔

''یہ ڈیل تو ہوتی رہے گی۔ پہلے ہمیں سردہ بابا کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ آنسہ خالدہ کو امریکا روانہ کرنا ہوگا۔ وہ کہاں ہے ہمارے پاس؟'' شکیلہ کی بات پر میں نے کہا۔

''اس سلسلے میں پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ متعلقہ اسپتال سے نکلوا لیں گے مگر وہ شاید ڈپلی کیٹ ہوتا، جبکہ اوریجنل سرٹیفکیٹ عارفہ کے پاس ہی تھا، کیونکہ اسپتال سے سردہ بابا کی ڈیڈ باڈی اسی نے وصول کی تھی، اس سلسلے میں بھی اس سے بات کرلیں گے۔''

''ویسے کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ تمہارے قانونی طور پر شیئرز کے مالک بننے کے بعد عارفہ اس قدر آرام سے بیٹھی رہی، اس کی نیندیں حرام ہوجانی چاہئیں، مگر اس نے اس سلسلے میں اب تک تم سے کوئی رابطہ بھی نہیں کیا؟''

شکیلہ نے اپنے تئیں ایک اہم بات کی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ شاید اپنی اس شکست پر حد سے زیادہ مایوسی کا شکار ہوگئی ہے، کیونکہ مجھ سے تو اُسے قطعاً یہ اُمید نہ ہوگی کہ میں بڑے آرام سے اُسے پلیٹ میں سجا کر شیئرز پیش کردوں گا۔''

بہرحال چائے کا ایک ایک کپ پی کر میں اور اول خیر کوارٹر سے روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگے، اس دوران میں نے عارفہ کو ایک عدد فون کھڑکانا ضروری سمجھا، رابطہ ہوتے ہی اس نے میری آواز پہچان کر تحیّر آمیز لہجے میں کہا جس میں طنز کا ایک مکارانہ تیر بھی پوشیدہ تھا۔

''مجھے یقین نہیں آرہا کہ سارے شیئرز چالاکی سے ہتھیانے کے بعد تمہیں مجھ کو فون کرنے کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔''

''ہاں! اُصولاً تو بات کی ابتدا آپ کو کرنی چاہیے تھی،

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور میں تو آپ کے فون کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔" میں نے بھی کمالِ مکاری سے دانستہ گیند اس کی کورٹ میں اُچھال دی، تو وہ اس بار واقعی حیرت سے بولی۔

"اچھا! تمہیں واقعی میرے فون کا انتظار تھا؟ مگر کیوں؟" وہ ایک تجسس آمیز اُلجھن کا شکار ہوگئی۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ شیئرز واپس لینے کے لیے مجھے کسی بھاری ڈیل کی آفر کریں گی۔" میں نے لہجے کو معنی خیز بناتے ہوئے کہا تو چند ثانیے کے لیے اُسے ایک چپ سی لگ گئی، شاید اسے مجھ سے ایسی کسی "معنی خیز" بات کی توقع نہ تھی۔ گویا میرے خلوص اور نیک نیتی سے میرے دُشمن بھی اچھی طرح واقف تھے اس کا مجھے آج پتا چلا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس کی طویل پڑتی خاموشی پر میں نے اُسے مختصر الفاظ کا ٹہوکا دیا۔

"کک... کچھ نہیں، وہ دراصل میں تمہاری طرف سے مایوس ہوگئی تھی، اُمید نہیں تھی مجھے کہ تم کبھی مجھ سے کسی قسم کا رابطہ کر سکتے ہو۔"

"غلط" میں نے کہا۔ "جب تک عابدہ خیریت سے واپس نہیں آجاتی، میرا آپ سے ویسے بھی رابطہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کمال ہے یہ خوش فہمی آپ کو کب اور کیسے ہوگئی؟" وہ چنڈال میرے دُکھی لہجے میں پوشیدہ ایک خاص قسم کی تہدید کو بھانپ کر بولی۔

"دھمکی مت دو مجھے، میں شیئرز اور ڈیل کے حوالے سے بات کر رہی تھی۔"

میں نے بھی کم از کم اس وقت اس بات کو طول دینا مناسب خیال نہیں کیا اور اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "شیئرز واپس حاصل کرنے کے لیے آپ مجھ سے کیا ڈیل کرنا پسند کریں گی؟"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" اس پر جیسے شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ "تم... تم اگر واقعی مجھ سے شیئرز کے بدلے میں کوئی ڈیل کرنا چاہتے ہو تو... اسی وقت ساری باتیں بھلا کر میرے پاس آجاؤ۔ مجھے یقین ہے، اگر بات اس نہج پر آہی گئی ہے تو ہمارے درمیان بھی بغیر کسی ڈیڈلاک کے کوئی نہ کوئی ڈیل کامیاب ہو ہی جائے گی۔"

اُس کا چلتر کسی جادو کی طرح سر چڑھ کے بولنے لگا۔ اس کے لب و لہجے سے مترشح لالچ، دولت اور حرص و طمع کی بے پناہ بھوک نے میرے اندر کے مضطرب اندھیاروں میں امید کی ٹمٹماتی لو کو فزوں تر کر دیا تھا۔ اور مجھے اس سے کسی کامیاب ڈیل کی توقع ہونے لگی تھی۔

"ڈیٹس گڈ، آئی ول بی دیئر۔" یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اور اول خیر عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف محوِ سفر تھے۔ کار کے اس مختصر سے سفر کے دوران میں ہم نے اس منصوبے پر بھی تبادلۂ خیال کیا تھا جو خالصتاً اول خیر کے زرخیز ذہن کی پیداوار تھا، جس کے مطابق ہم نے عارفہ یا سیٹھ نوید احمد سانچے والا کو "تھرڈ پرسن" بنا کے ان میں سے کسی ایک یا دونوں کے ساتھ رنگون جا کر اڑیسہ کمپنی کے سلسلے میں سودے بازی کرنا تھی اور کسی طرح لولووش کی بیوی انجیلا کو اغوا کر کے، باسکل ہولارڈ پر عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں دباؤ ڈالنا تھا۔ مگر قدرت نے یہاں ہمارا کام قدرے آسان کر دیا تھا، اور کسی لمبے چوڑے بکھیڑے میں پڑنے سے بھی بچا لیا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس منصوبے کو "پلان بی" کا نام دے کر سرِدست پسِ پشت ڈال دیا تھا کہ پہلے یہ قانونی طریقہ اختیار کر کے دیکھ لیا جائے، جو نسبتاً سہل اور اُمید افزا بھی تھا۔

عارفہ کی رہائش گاہ سے ابھی ہم ایک آدھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہی تھے کہ میرا سیل فون گنگنایا۔ سیل فون پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میری پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہوگئیں۔ اسکرین پر ابھرنے والے نمبرز کے ابتدائی ڈیجیٹ سے اندازہ ہوا کہ کال بیرونِ ملک سے تھی، پہلا خیال میرا آنسہ خالدہ کی طرف ہی گیا تھا، وہ کسی بھی نمبر سے مجھے کال کر سکتی تھی، اگرچہ اس کا نام بھی ڈسپلے میں نمایاں ہوتا تھا، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا، کال باہر کی ہوتی مگر نمبر لوکل بھی شو ہوتا تھا۔ میں نے دھڑکتے دل سے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری جانب ایک بھاری مردانہ آواز سن کر میں چونکا۔ یہ آواز میرے لیے سراسر اجنبی تھی۔ لہجہ ہندی اردو تھا۔

"شہزاد احمد خان؟" مجھ سے استفساریہ کہا گیا تو میں نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے پوچھ لیا۔

"یس! آپ کون۔" میرے استفسار پر دوسری جانب خاموشی طاری رہی، اس کے بعد وہی گمبھیر سی بھاری آواز ٹکرائی۔

"مسٹر شہزاد... ولد... تاج دین شاہ فرنٹیئر پوسٹ واچ مین! یہی ولدیت ہے ناں تمہاری؟" میں جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ بھلا میں اس نام اور اس کے اس عظیم حوالے کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ یہی تو میری اور میرے خاندان کی شناخت تھی۔ باپ کے ذکر نے میرے اندر ایک کھلبلی سی مچا دی تھی، اول خیر نے میری کیفیت اور کال کی "نوعیت" بھانپ کر کار کی رفتار

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

حد درجہ آہستہ کر دی تھی۔

کال کرنے والے اس اجنبی نے مجھے میری ولدیت سمیت مخاطب کیا تھا۔ وہ یقیناً مجھ سے میرے کھوئے ہوئے باپ سے متعلق ہی گفتگو کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اثبات میں جواب دیا۔

"ہاں... ہاں... یہی میری ولدیت ہے، تاج دین شاہ میرا باپ تھا۔ تت... تم کون ہو؟ کیا تم میرے باپ کے بارے میں جانتے ہو؟"

"اُسے تو ہم نجانے کتنے عرصے سے جانتے آرہے ہیں۔ اور وہ ہمارا ہی مہمان ہے۔" دوسری جانب عجیب سے لہجے میں کہا گیا تو یکا یک میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اور میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اول خیر کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے اپنے سیل کا وائیڈ اسپیکر آن کر دیا، تاکہ اول خیر بھی گفتگو سن سکے۔ اس نے میرا اشارہ بھانپتے ہی کار سڑک کے کنارے روک دی تھی۔

"تم آخر ہو کون؟ دوست یا دُشمن؟" میں نے بالآخر اپنی دگرگوں سی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے گہری متانت سے پوچھا۔

"ہم نہ دوست تھے نہ دُشمن، لیکن ہماری دُشمنی سے ہمارے دوست بھی پناہ مانگتے ہیں۔ تم نے ہمارے ساتھ دُشمنی کر کے سراسر گھاٹے کا ہی سودا کیا ہے۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا اور میں نے اس کی آواز پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے، دل ہی دل میں یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کی کہ آخر یہ کون میرا نیا دُشمن پیدا ہو گیا تھا؟ تاہم میں اس کے مزید بولنے کا منتظر رہا، اور وہ تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

"بس! کچھ لو اور کچھ دو کے تحت بات ختم ہو جائے تو یہ ہمارے بیچ ایک بہترین معاہدہ قرار پا سکتا ہے۔" اس کے ٹھہرے اور دبے دبے سے لہجے میں مجھے مکاری کی جھلک نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے جواباً اسی انداز میں مختصراً کہا۔

"میں سن رہا ہوں۔"

"ہمارے آدمی کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ خیر! جب معاہدے کی ہی بات ہو رہی ہے تو ہم بھی دوستانہ طریقہ ہی اپنائیں گے۔"

"تمہارا آدمی؟ کون؟" میں نے اُلجھ کر سوالیہ کہا۔

"سندر داس سکسینہ۔" اس نے بالآخر بتایا اور میری سماعت کے قریب جیسے بم پھٹ گیا ہو۔ سب سے پہلا خیال اس شخص کے متعلق میرے ذہن میں کلک ہوا تھا، وہ بلیو ٹلسی کے چیف کرنل سی جی بھگوانی کا تھا۔ میں نے اب تک خود کو کافی سنبھال لیا تھا اور تیزی سے کام کرتے ذہن میں جو پہلا خیال اُبھرا، اس کے تحت میں نے انجان بن کر کہا۔

"سندر داس سکسینہ؟ کون ہے یہ؟ اور میرا بھلا اس سے کیا تعلق؟ اور تم نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا۔" یہ کہتے ہوئے میں اب تک اس بات کا اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وزیر جان نے گویا چھوٹتے ہی بلیو ٹلسی کے چیف کرنل سی جی بھگوانی سے رابطہ کر کے اُسے بڑی صراحت کے ساتھ میرے اور میری تازہ کار "مہم جوئی" کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا، بعد ازاں ان دونوں کے درمیان مزید کچھ طے بھی پا گیا ہوگا کہ مجھے کیسے جھکایا جائے، اور میرا نمبر بھی اسی نے ہی دیا ہوگا، یوں بھی میرے نمبر کا حصول میرے دُشمن کے لیے ناممکن کب رہا تھا؟

"اگر تم نے میرے ساتھ یہی بھونڈا مذاق کرنا ہے تو پھر تم سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم اپنے ساتھی سندر داس کی رہائی کا دوسرا طریقہ بھی آزمانے کا آپشن رکھتے ہیں، مگر تمہارا باپ..." اس خبیث نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں یہی سمجھا شاید وہ بددل ہو کے رابطہ منقطع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، میں فوراً مستفسر ہوا۔

"تم بلیو ٹلسی کے کرنل سی جی بھگوانی بات کر رہے ہو؟"

"مجھے پوری اُمید تھی کہ تم پٹری پہ آجاؤ گے اور بغیر وقت ضائع کیے معاملے کی بات کرنے پر آمادہ ہو جاؤ گے۔" وہ فوراً مکارانہ لہجے میں بولا، اس کا لہجہ فتح کا تاثر لیے ہوئے تھا۔ وہ کم بخت میری ازلی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے واقعی اپنے اصل ٹریک پہ لے آیا تھا۔

"اب تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیا تمہارے بارے میں میرا اندازہ درست نہیں؟"

"سو فیصد درست اندازہ لگایا ہے تم نے۔ مجھے کرنل سی جی بھگوانی کہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اگر معاملے کی بات پہ آتے ہیں تو ہم آپس میں کچھ لو اور کچھ دو کے تحت معاملہ داری طے کر سکتے ہیں۔"

"منظور ہے مجھے، آگے بولو۔" میں نے فوراً کہا۔ یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ اس وقت بلیو ٹلسی کا کرنل سی جی بھگوانی مجھ سے مخاطب تھا، میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے جلد از جلد میرے باپ کے متعلق بتائے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”دیکھو، مسٹر شہزاد! ہم جانتے ہیں کہ تمہارا پاکستان کے کسی قانونی یا خفیہ ادارے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے، تم حادثاتی طور پر یا پھر اپنی کسی غرض اور مدد لینے کے لیے رضاکارانہ بھرتی کر لیے گئے ہو۔ پاکستانی خفیہ اداروں کا ہمیشہ سے یہی وتیرہ رہا ہے، وہ اپنے خفیہ مقاصد کی برآری کے لیے ایسے سویلین کو بھی نیڈی ایجنٹ بنا کر اپنے ساتھ شامل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، جو ان کے لیے ڈیلی ویجز پر مخبری کر سکیں، انہیں صرف اپنے مفادات عزیز... ہوتے ہیں، جو پورے ہو جانے کے بعد اپنے ایسے ڈیلی ویجز مخبروں کو خاموشی اور رازداری کے ساتھ غائب کر ڈالتے ہیں۔ لہٰذا میرا تمہارے لیے سب سے پہلا مشورہ تو یہی ہے ہوگا کہ تم اگر یہی کام کسی دوسرے ملک کے لیے کرو تو تمہیں نہ صرف پورا تحفظ حاصل ہوگا بلکہ عیش و آرام اور دولت بھی ملے گی۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم ایک معمولی کوارٹر میں رہتے ہو، ایک معمولی تنخواہ پر گزارا کرتے ہو۔ خیر! یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ اب بولو تو کام کی بات پر آ جائیں؟“ اس نے آخر میں کہا۔

میں اس کی بکواس کو بہ ظاہر خاموشی سے سنتا رہا۔ را کا یہی طریقۂ کار تھا، وہ اسی طرح برین واش کرتے تھے۔ ورنہ اس نے پاکستانی خفیہ اداروں کے متعلق جو بکواس کی تھی وہ صریحاً گمراہ کن اور غلط تھی۔ میں کوئی نیڈی ایجنٹ تھا، اور نہ ہی اپنی کسی ذاتی ضرورت کے تحت پاور میں ہیلپر یا الیکٹرلی بھرتی ہوا تھا۔ بلکہ یہ ایک جذبہ تھا میرا اپنے وطن کی خدمت کا اور اس کی جڑوں کو کھوکھلی کرنے والے ملک دشمن عناصر کے خلاف کمربستہ ہونے کا۔ جس کی مثال میرا باپ تھا۔ جس نے آج سے کئی برس پہلے دشمن ملک کے جاسوس کا اپنی جان پر کھیل کر تعاقب کیا اور اس کا منصوبہ خاک میں ملا دیا تھا۔ مگر خود گرفتار ہو کر ابھی تک وطن کے ایک گمنام سپاہی کی طرح دشمن ملک میں ایک قیدی کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں اپنے وطن کے لیے قربانی دی تھی، خود کو ہی نہیں اپنے گھر بار کو بھی قربان کر ڈالا تھا، ان سے ایک طویل جدائی برداشت کی تھی، بلکہ ابھی تک کر رہا تھا۔ باقی رہی کرنل سی جی کی بکواس، اور مجھے برین واش کرنا، یہ تو ان کے چانکیہ پلان کا ایک حصہ ہی تھا۔ یہ ہمیشہ ضمیر فروشوں اور وطن فروشوں کو اپنے چانکیہ پلان کے تحت نشانہ بناتے تھے، میں نے بھی کسی جوش و جذبے کا مظاہرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ یہ میری ماسٹر ٹریننگ کا حصہ تھا کہ دشمن کو کیسے بلف کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ابھی مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ بلیو ٹلسی کے کھاگ چیف کرنل سی جی بجوانی کو بے وقوف بنا سکتا ہوں۔ لہٰذا وہ مجھے اپنے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اس کی اسی ”سمجھ“ کو مزید پختہ کرنے کے لیے وہ کچھ کہنا مناسب سمجھا، جیسا کہ وہ میرے بارے میں اندازہ قائم کیے ہوئے تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ میرے بارے اس طرح کی تفصیل اسے وزیر جان سے ہی حاصل ہوئی ہوگی۔ لہٰذا میں نے اس کی بکواس سننے کے بعد دانستہ تھوڑی دیر کے لیے پُرسوچ خاموشی اختیار کی تھی، جیسے میں اس کے ٹرانس میں آ رہا ہوں۔ تاہم پھر بولا۔

”یہ حقیقت ہے کہ میری یہاں کچھ لوگوں سے ذاتی نوعیت کی جنگ پہلے ہی سے جاری تھی، چوہدری ممتاز خان اور وزیر جان میرے دو ازلی دشمن تھے، مگر وہ مجھ سے اثر و رسوخ اور طاقت میں کہیں زیادہ تھے، میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، لیکن اسی جنگ کے دوران میں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ وزیر جان کے پیچھے یہاں کے خفیہ ادارے بھی پڑے ہوئے تھے، بس اسی وجہ سے مجھے اپنی طاقت بڑھانے اور ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ کیونکہ ابھی ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کیے بنا یہ لوگ وزیر جان وغیرہ پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، اسی لیے میری پشت پناہی کرتے ہوئے، انہوں نے مجھے ہی آگے رکھا تھا۔“

وہ مجھے جیسا سمجھ رہا تھا، میں نے بھی اسے وہی بتا دیا اپنے بارے میں۔ اس پر اس نے میری توقع کے عین مطابق ایک فاتحانہ قہقہہ بلند کیا تھا۔ اور پھر اسی غرور تلے بولا۔

”ہماری انفارمیشن کبھی غلط نہیں ہوتی ہیں۔“

میں نے دل ہی دل میں اس پر بے شمار لعنتیں رسید کیں پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ”تم میرے باپ کے متعلق مجھے بتا رہے تھے۔“

”تمہارا باپ زندہ ہے، اور ہماری قید میں ہے۔ وہ بہت ضعیف ہو چکا ہے، اب تو وہ کسی کو شاید پہچاننے کے قابل بھی نہیں رہا اور نہ ہی اسے اپنا ماضی یاد ہے اچھی طرح، اس لیے وہ اب ویسے بھی ہمارے کام کا نہیں رہا۔“

اس انکشاف پر میرے پورے وجود میں کرب کی ایک لہر سی دوڑ گئی، اپنے باپ سے متعلق دکھ بھری اطلاع نے مجھے رنجور سا کر دیا تھا۔ حلق میں رقت سی اترنے لگی تھی، اس خبیث کرنل سی جی بجوانی کے خلاف میرے دل و دماغ میں نفرت و غیظ کی ایک آگ سی سلگ اٹھی تھی، جی میں تو میرے آئی کہ اسی وقت اس کی بکواس اور اس لغو بیانی کا

Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جواب دے ڈالوں جو اس نے پاکستان کے خفیہ اداروں کے بارے میں کی تھی۔

"کہ اے خبیث انسان! تیری اس بکواس کا جواب میرا باپ ہے، جس نے اپنے وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر ڈالا۔ اور تم اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے، وہ تو ایک گمنام سپاہی کی طرح اپنے وطن کی خدمت کرتا رہا، بغیر کسی صلے کے لالچ میں وہ دُشمن ملک میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے اور سُرخرو ہے۔ اے ذلیل انسان! یہ صرف میرے ایک باپ کی مثال نہیں ہے۔ میرے وطن کا ہر خاص و عام پاکستانی جس کا دل وطن کے لیے دھڑکتا ہے، وہ بھی اپنے ملک کی خاطر اس سے بھی بڑی قربانی جھیلنے کے لیے خوشی خوشی اور ہر دم تیار رہتا ہے۔"

بہرطور میں اپنے سینے کے مچلتے طوفانوں کی اچھل پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر پُرسکون لہجے میں مستفسر ہوا۔

"اُسے تم نے کس جُرم کے تحت اتنے طویل عرصے سے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے؟"

"بس! باقی باتیں تم خود اس سے پوچھ لینا۔" اس نے مکاری سے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا، اتنا بھی اُس خبیث نے میرے باپ کے بارے میں بتایا تھا تو اس میں بھی اس کی مجبوری ہوگی، پھر مجھے تسلی تھی کہ اس وقت معاہدے کی زیادہ ضرورت اسے محسوس ہو رہی تھی، اور اس کی اسی "ضرورت" کو ہوا دے کر ہی اس کے منہ سے مزید تھوڑا بہت اُگلوایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی چالاکی سے کہا۔

"لیکن جب تک میری تسلی نہیں ہوگی تو یہ معاہدہ کیسے طے پا سکتا ہے؟ جبکہ میں اپنے باپ سے متعلق وزیر جان کی زبانی بہت کچھ جان اور سن چکا ہوں کہ وہ ابھی تک تم لوگوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔"

"تم کیسی تسلی چاہتے ہو؟" بالآخر اسے یہ کہنا ہی پڑا، جس کا میں متمنی تھا، لہٰذا اپنے لہجے میں بہ ظاہر بے اعتنائی سموتے ہوئے بولا۔

"تم نے ابھی مجھ سے کہا کہ میرا باپ اب تم لوگوں کے کام کا نہیں رہا اور تم مجھ سے ایک معاہدے کے تحت اُسے میرے حوالے کرنے پر رضامند بھی ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ میرے باپ کو تم لوگ کبھی بھی نہیں چھوڑو گے۔ ایک طویل عرصے سے وہ تم لوگوں کی قید میں ہے، تو یقیناً تمہارے لیے اہم ہی ہوگا۔"

"وہ اب واقعی ہمارے لیے اہم نہیں رہا، میری بات کا وشواش کرو۔"

"جب تک مجھے اس کے جرم، جو تمہاری نظروں میں ہو سکتا ہے، کے متعلق آگاہی نہیں ہوگی میں کیسے یہ اندازہ لگا پاؤں گا کہ وہ تم لوگوں کے لیے اب بھی اہمیت رکھتا ہے یا نہیں؟"

"ٹھیک ہے، پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" بالآخر وہ شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔ میں نے پہلا سوال یہ کیا کہ ان کی نظر میں میرے باپ کا جرم کیا تھا تو وہ بولا۔

"جرم تو اس کا غیر معمولی نہیں تھا۔ اس نے ہمارے ایک نہایت اہم جاسوس کو عین اس وقت جان سے مار ڈالا تھا، جب وہ اپنا مشن کامیابی سے پورا کر کے اٹاری کے مقام پر پہنچا تھا۔ خیر! اب کیا فائدہ ان باتوں کا۔"

اس نے ایک بار پھر پہلوتہی کرنی چاہی مگر میرے اندر اس برسوں پرانے راز پر سے پوری طرح جان کاری حاصل کرنے کا ازلی تجسس کم نہ ہوا، میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے باپ نے جو قربانی دی تھی، اس کا حاصل کیا ہوا تھا؟ کیونکہ رینجرز کے ہیڈ کوارٹر کے ریکارڈ روم میں مجھے میرے باپ تاج دین شاہ کی جو فائل ملی تھی، اس میں بھی کچھ معلومات ابہام کا شکار تھی کہ میرا باپ ایک دُشمن ملک کے خطرناک جاسوس کے تعاقب میں گیا تھا جو ایک خطرناک ملکی راز اُڑا لے جانے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد اس راز سے متعلق آج تک ایسا کوئی نقصان وطنِ عزیز کو نہیں جھیلنا پڑا تھا، جس کا مطلب لامحالہ یہی لیا گیا تھا کہ فرنٹیئر واچ مین تاج دین شاہ نے اس دُشمن جاسوس کا کامیاب تعاقب کر کے اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا، مگر خود بھی نہیں لوٹا تھا۔ لہٰذا میں نے اس سلسلے میں اس کا منہ کھولنے کے لیے کہا۔

"مجھے حیرت تو اس بات پر ہے کہ اگر تمہارا وہ جاسوس بہ قول تم لوگوں کے اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن میرے باپ کے ہاتھوں قتل بھی ہو گیا تھا تو پھر تم نے ابھی تک میرے باپ کو زندہ کیوں رکھا ہوا تھا؟ اس پر قتل کا مقدمہ بنا کے..." آگے مجھ سے نہ بولا گیا، دُکھ کا ایک غبار سا میرے سینے میں اُٹھنے لگا تھا، تب وہ خود ہی بول پڑا۔

"اگر تمہارا باپ ہمارے اس جاسوس کو ہلاک نہیں کرتا تو بہت پہلے جب تمہارا ملک ہماری سازشوں سے دولخت ہوا تھا، تو اس مشن کی کامیابی کے بعد اس کا سہ لخت ہو جانا بھی لازمی تھا۔ مگر افسوس تمہارے باپ نے نہ صرف ہمارے جاسوس کو ہلاک کر دیا بلکہ اس کے قبضے سے وہ راز بھی اُڑا کر زائل کر دیا تھا، جو ہمارے لیے اہم حیثیت رکھتا

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھا۔ بعد میں ہم نے ہر طرح سے کوشش کی لیکن تمہارے باپ نے کچھ بھی اُگل کے نہیں دیا۔“

اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے۔ ایسے میں اول خیر بھی آب دیدہ ہوگیا تھا۔ اس نے مجھے خاموش انداز میں حوصلہ دینے کے لیے، دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اس بات کا خیال رکھتے ہوئے کہ میری آواز مارے رقت کے لرزتی محسوس نہ ہو، اس سے کہا۔

”تو تم اس سے وہ راز اُگلوانے کے لیے اس پر اتنے عرصے تک تشدد کرتے رہے۔“ میرا غم ایکا ایکی آتش فشاں کا روپ دھارنے لگا تھا۔ جسے میں نے ہونٹ بھینچ کر جیسے بڑی مشکلوں سے قابو کیے رکھا تھا۔

”یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر تمہارا باپ بھی سخت مٹی کا بنا ہوا تھا، کچھ بھی اُگل کر نہیں دیا۔ میں اُن دنوں انڈین بی ایس ایف میں تھا، پھر انڈین آرمی سے ریٹائر ہوا اور کافی عرصہ ”را“ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز رہا، اس کے بعد اب تاحیات بلیو ٹلسی کا چیف بنا دیا گیا اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ وہ اب ہمارے کسی کام کا تو نہیں رہا البتہ تمہارے کام کا ضرور ہوگا۔“ یہ کہتے ہوئے اس خبیث نے ایک ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا، میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش اُبھری تھی کہ کاش! یہ خبیث اس وقت میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی گردن دبوچ لیتا، اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک اس مردود کی آنکھیں اور زبان باہر کو نہیں آجاتیں۔ وہ بڑے آرام سے اپنی بربریت کی داستان سنا رہا تھا مجھے، بلکہ ایک بیٹے کو، جس کے باپ کا اس خبیث نے کیا حشر کیا تھا۔

”اگر تمہاری تسلی ہوگئی ہو تو اب معاہدے کی بات کر لی جائے؟“ دوسری جانب سے اس نے پوچھا، مجھے یہ تسلی ہو گئی تھی کہ میرے باپ نے وطنِ عزیز کے لیے جو قربانی دی تھی وہ ضائع نہیں گئی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی اپنے دُکھ اور غضب ناک کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اسے اثبات میں جواب دے ڈالا تو وہ بولا۔

”معاہدہ سیدھا سادہ سا ہے، ہم تمہارے باپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں اور تم ہمارا آدمی سندر داس ہمارے حوالے کردو۔“ اس مکار بھارتی مہادیر چکر کی بات سن کر میں نے ایک بار پھر دانستہ چند ثانیوں کی خاموشی اختیار کرتے ہوئے یہی تاثر دینا چاہا کہ جیسے میں اس کی اس ”آفر“ پر ایک معمولی سی ردوقدح کے بعد غور کرسکتا ہوں، اپنے لہجے کو گومگو سا بناتے ہوئے اس خبیث سے بولا۔

”سندر داس جن لوگوں کے حوالے کیا جاچکا ہے، وہاں سے اسے اگر میں نکال بھی لوں تو طرفین کی حوالگی کی ٹرم اینڈ کنڈیشن کیا ہوگی؟ علاوہ ازیں اس کا کیا ثبوت ہوگا کہ یہ معاہدہ طے پا جانے کے بعد تم یا تمہارا کوئی حواری مجھے پھنسانے کے لیے اس راز کو آشکارا نہیں کرے گا، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو میرے لیے مصیبت کھڑی ہوسکتی ہے، میرا کورٹ مارشل بھی ہوسکتا ہے۔“

میں نے آخر میں دانستہ ایسا کہا تھا، تاکہ اُس کی ”بُدھی“ میں یہ بات اچھی طرح سما جائے کہ میں سنجیدگی سے اس کی باتوں میں آرہا تھا یا میں خود بھی ذاتی طور پر اس معاہدے کی کامیاب تکمیل چاہتا تھا۔

”گڈ! یہ ہوئی ناں بات۔“ وہ یک دم خوش ہو کر بولا۔ ”اس کی تمہیں بالکل بھی چنتا نہیں کرنی چاہیے، ہمارا کام ہو جائے، یہی کافی ہوتا ہے ہمارے لیے، یہ ہمارے اُصولوں کے ہی خلاف ہے کہ ہم کام نکل جانے کے بعد مخالف پارٹی کے بارے میں ایسا کوئی فضول قدم بھی اُٹھائیں، کیونکہ اگر ہم ایسا کرنے لگ جائیں تو پھر کون ہماری باتوں کا آئندہ یقین کرے گا؟ ممکن ہے ہمیں پھر دوبارہ بھی تم سے کوئی کام پڑسکتا ہے، اسی نوعیت کا۔“

”سمجھ گیا میں، اب اس کی ٹرم اینڈ کنڈیشن کی بات کرو۔“ میں نے لہجے میں جوش سا سموتے ہوئے کہا تو بولا۔

”سب سے پہلے تمہیں سندر داس کو نکالنا ہوگا، اور اُسے کسی محفوظ مقام پر لے کر پہنچو گے، پھر ہمارے فون کا انتظار کرو گے، اس نمبر پر تمہیں میں اب دوبارہ نہیں ملوں گا نہ ہی بات کروں گا۔ میرا ایک آدمی تم سے اب رابطے میں رہے گا، لیکن ضرورت پڑی تو میں بھی بات کرسکتا ہوں، اس کے بعد ہمارا ایک آدمی اپنی تسلی کرنے کے لیے تم سے ملے گا، اور وہی ہمیں ”آل اوکے“ کا سگنل دے گا جس کے بعد ہمارے حرکت میں آنے کی باری ہوگی یعنی تمہارے باپ تاج دین شاہ کو ہم ساتھ لے کر اٹاری کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچیں گے۔ اور وہیں تم یا تمہارا کوئی آدمی اس کی تصدیق کرکے تمہیں ”اوکے“ کا سگنل دے گا۔ اس طرح دوطرفہ تسلی ہوجانے کے بعد اٹاری ہی کے ایک سرحدی مقام پر دونوں آدمیوں کی ”میچوکل ری پلیسمنٹ“ عمل میں لائی جائے گی، ڈن؟“

اُس نے مختصر ترین الفاظ میں اس معاہدے کی عملی تصویر پیش کردی۔ میں نے فوراً رضامندی کے بجائے یونہی چند متعلقہ سوالات کرنا ضروری سمجھا، اور معاہدے سے متعلق

Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پھر روایتی قسم کے تحفظات کا اظہار کیا، جس کی تشفی ہوتے ہی میں نے بھی اس کے ساتھ یہ معاہدہ ڈن کر دیا۔ تاہم ایک اہم سوال جو واقعی میرے نزدیک اہم تھا، اس سے ضرور، رواروی کے انداز میں پوچھ لیا۔

”تمہارا وہ آدمی جو سندر داس کے سلسلے میں تشفی کرنے آئے گا، کیا وہ سرحد پار سے آئے گا یا اِدھر ہی کہیں وہ رہتا ہے۔“

اس سوال کو پوچھنے کا مقصد میرا یہی تھا کہ میں جاننا چاہتا تھا کہ بلیو ٹکلسی کے اور کتنے خطرناک ایجنٹ یہاں پہلے سے گھسے بیٹھے تھے؟

”مسٹر شہزاد!“ اس کی گمبھیر آواز اُبھری۔ ”یہ ایک غیر متعلقہ سوال ہے اور ہمیں ان میں اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرنا چاہیے تو پھر میں معاہدے کو حتمی سمجھوں؟“

میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اثبات میں جواب دے دیا۔ دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

”او خیر!“ گفتگو اختتام پذیر ہوتے ہی میرے برابر میں اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھے اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ سیل فون کے وائیڈ اسپیکر سسٹم سے وہ بھی میرے اور کرنل سی جی بجوانی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے اُسے کار آگے بڑھانے کا اشارہ کر دیا، اس نے ایک نظر میرے سوچ میں پڑے چہرے پر ڈالی اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھالی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں اس موضوع پر پھر بات کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، ابھی ہمیں عارفہ سے ملنا تھا، جس کی رہائش گاہ سے اب ہم زیادہ دور بھی نہیں تھے۔

وہاں پہنچے تو اُسے اپنا ہی منتظر پایا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ چنکی اور روانی اسکول سے آ کر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اپنے کمروں میں سو رہے تھے یا پھر سُلا دیے گئے تھے۔ ایک دو نئے ملازم نظر آئے، پرانے ملازمین میں شریفاں اور اس کا شوہر دکھائی نہیں دیے تھے، جن کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ تھا کہ وہ سرمد بابا کے مرحوم ہونے کے بعد نہیں رہیں گے۔ تاہم دونوں بچوں سے انہیں بھی محبت تھی۔

معلوم ہوا، وہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ وہ نہ بھی جاتے تو عارفہ اپنے ناروا رویّے سے انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیتی اور مجھے یقین تھا کہ ہوا بھی یہی ہوگا۔ وہ اتنی ہی کینہ پرور اور کم ظرف عورت تھی۔ صرف اپنی عمل داری کی قائل تھی، مجھے یقین تھا کہ اس نے جمال انکل کو بھی اپنی کمپنی سے نکال باہر کیا ہوگا۔ وہ اپنے شوہر یا سسر کی کوئی بھی نشانی یا باقیات پالنے کی عادی نہیں تھی۔

یہ اس کے صد درجہ جلاپے اور حسد کی نشانی تھی۔ محسن کش تو اپنی جگہ تھی ہی، احساسِ کمتری اور احساسِ محرومی کی بھی ماری ہوئی لگتی تھی اور بلا کی خود غرض بھی۔ عابدہ کے ساتھ اس نے جو کیا تھا، یہ تعریفیں اس پر پوری اُترتی تھیں۔

ہم ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ شیئرز سے متعلق میری نرمی پر اس ناگن نے بھی فوراً اپنی کینچلی بدل ڈالی تھی ورنہ کہاں تو یہ میری صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی، وہ میرے ساتھ بہت دوستانہ رویے اور خوش دلی کا اظہار کر رہی تھی، لیکن میرے چہرے پہ ویسی ہی گمبھیرتا طاری رہی۔ اُس نے چائے وغیرہ بھی منگوانی چاہی تھی، لیکن میں نے منع کر دیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ معاملات کی بات ہو جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”میرے لیے وہ شیئرز کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اور نہ ہی ان پر میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔“ اُسے اپنی جانب سنجیدگی سے متوجہ پا کر میں نے کہا۔ ”لیکن بسا اوقات کنٹراڈکشن جیسی صورتِ حال میں جب یہی بات ایک ضد اختیار کر لیتی ہے تو بات اور ہو جاتی ہے۔ مختصراً یہ کہ میرا آپ سے بھی کوئی اور کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے، جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ سرمد بابا کے حوالے سے ہی تھا، اب وہ ہی نہیں رہے تو میرا خیال ہے ہمیں بھی کھلے دل و دماغ سے کام لیتے ہوئے ایک دوسرے پر عائد جو بھی واجبات بنتے ہیں، انہیں باہم رضامندی سے طے کر کے اپنے اپنے راستے پر ہو لیا جائے۔“ میری بات پر اس مکار عورت کی آنکھوں میں خوش فہمی کی ایک چمک سی نمودار ہوئی تھی۔ فوراً چالاکی سے مسکرا کر بولی۔

”تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی ہے شہزی! یقین کرو میں خود کو بے حد مطمئن محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن تمہاری واجبات والی بات میری سمجھ میں نہ آ سکی، اگر اس کی تھوڑی تشریح کر دیتے تو...“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے اس کی طرف پُرمتانت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ سرمد بابا اپنی وصیت کے مطابق مجھے ایک بڑی ذمّے داری سونپ گئے ہیں جبکہ ایسے میں، خود میرے اپنے کاندھوں پہ ان گنت ذمّے داریوں کا بوجھ لدا ہوا ہے، اس بوجھ کو میں اضافی بوجھ ہی سمجھتا ہوں، آپ چنکی اور روانی کی ماں ہیں، میں نہیں سمجھتا کہ ایک ماں سے بڑھ کر بھلا کون اپنے بچوں کا بھلا سوچے گی۔ لہٰذا اس کی تفصیل کی ضرورت اسی لیے مجھے پیش آئی تھی کہ آپ اچھی طرح میری بات سمجھ لیں، اور آپ کے دل میں

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کسی قسم کا کوئی شبہ باقی نہ رہے۔"

"میں واقعی تمہاری باتوں کا مطلب سمجھ رہی ہوں شہزاد! لیکن یہ واجبات والی بات۔"

"میں اسی طرف آرہا ہوں۔" میں نے ہولے سے کھنکھار کے کہا۔ "واجبات والی بات سے میری مراد پیسوں وغیرہ کا لین دین نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کے لیے ایک پرغور نظر ڈالی۔ حسبِ توقع وہاں مجھے اطمینان کے آثار کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔

"واجبات سے میری مراد صرف وہ فرائض ہیں جو ہمیں نیک نیتی سے پورے کرنا ہوں گے۔"

"کیسے فرائض؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ عابدہ آپ کی محسن تھی، اور ہے۔ لیکن آپ نے اپنی گردن بچانے کے لیے اُس بے چاری کو پھنسوا دیا اور سرمد بابا نے بھی اس سلسلے میں جانبداری برتتے ہوئے عابدہ کے بجائے اپنے بیٹے کی بیوہ یعنی آپ کو ہی ترجیح دی، اس سلسلے میں میری ان سے بھی تلخ کلامی ہوئی تھی، لیکن میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب آپ پر اخلاقی ہی نہیں بلکہ قانونی طور پر بھی یہی فرض عائد ہوتا ہے کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں آپ میری مدد کریں۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

میں نے دانستہ سرمد بابا کا اس انداز میں ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا، تاکہ وہ یہی سمجھے کہ میرا سرمد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے اور اسی لیے میں ان کی سونپی ہوئی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں، اگرچہ اس ذمے داری میں مجھے بھی مالی منفعت حاصل تھی۔ لیکن حقیقت یہی تھی سرمد بابا نے درمیانی راہ اختیار کی تھی، اور عابدہ کے لیے اُنہوں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا، مگر افسوس کہ زندگی نے اُنہیں موقع ہی نہ دیا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ عابدہ نے میرے لیے قربانی دی ہے، یہ اس کا احسان ہے مجھ پر، مگر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ سرمد بابا نے بھی تم دونوں پر بہت سے احسانات کیے تھے۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ میرے لیے تم نے جو کچھ کیا وہ سرمد بابا کی خاطر ہی کیا تھا۔" اس نے بڑی مکاری سے جتایا تو میں نے بھی کہہ ڈالا۔

"میری اور عابدہ کی قربانیاں سرمد بابا کے احسانات کے سامنے ہیچ ہیں، مگر عابدہ کی اب جان پر بن آئی ہے۔ لیکن ہم اگر اس طرح کی بحث میں اُلجھ گئے تو آپس میں ہماری معاملے داری رہ جائے گی۔"

"آف کورس! میں بھی یہی چاہ رہی ہوں کہ معاملے کی بات شروع کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔"

"سرمد بابا کی اچانک رحلت کے بعد امریکا کی عدالت میں عابدہ کا کیس کھٹائی میں پڑنے لگا ہے، میں نے اس کے لائر سے فون پر بات کی تھی، اس پر اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب ایک ہی صورت ہے کہ اس مقدمے کے دوسرے فریق، یعنی آپ کو عدالت میں پیش ہو کر عابدہ کے حق میں یہ گواہی دینا ہوگی جو ظاہر ہے سچ ہے کہ وہ آپ کے ساتھ لک آفٹر کے لیے امریکا گئی تھی اور وہاں ایک سازش کے تحت اُسے پھنسوا دیا گیا، لہٰذا اصل معاملے کی چھان بین یا غیر جانبدارانہ تحقیق کے بجائے عابدہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جو صریحاً ناانصافی ہے، باقی آپ کو لائر سمجھا دے گا۔"

"او آئی سی تو یہ بات ہے، تبھی میں کہوں کہ یہ اونٹ پہاڑ تلے کیسے آیا ہے۔"

ساری بات سمجھنے کے بعد وہ بڑی مکاری سے بولی۔ اس کے لہجے میں ایکا ایکی جیسے سنکھیا گھل گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ "اونٹ" کسے کہہ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے جو اس کے چہرے سے مکارانہ فروتنی مترشح تھی وہ اب ہوا ہو کے ایکا ایکی "آکڑ" میں بدل گئی تھی۔ گویا وہ سمجھ رہی تھی کہ میری دُکھتی رگ اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے بھی بڑے مستحکم اور بہ ظاہر پُرسکون لہجے میں کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے سامنے اس وقت ہاتھ جوڑے بیٹھا ہوں؟ اور تم سے عابدہ کی مدد کے سلسلے میں بھیک مانگ رہا ہوں؟ ہرگز نہیں، اس خوش فہمی کو تم اپنے دل سے ہی نکال دو۔ کیونکہ میرے پاس اس سے بہتر آپشن موجود ہے، جو نسبتاً آسان بھی ہے۔"

"اچھا!" وہ طنزیہ کاٹ سے بولی۔ "تو پھر حیرت ہے مجھے کہ تم اتنے آسان آپشن کو رد کرکے پھر میرے پاس کیا لینے آئے ہو۔" اس کی گفتگو لمحہ بہ لمحہ زہریلی ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے ایک ایک لفظ چباتے ہوئے کہا۔

"محترمہ عارفہ بیگم! میں اس لیے یہاں آیا ہوں تاکہ تم عابدہ کے سلسلے میں اپنا اُصولی کردار ادا کرکے میرے دُشمنوں کی ہٹ لسٹ سے خارج ہو جاؤ، کیونکہ یہ امر ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ عابدہ تمہارے غلط بیان دینے کی وجہ

READING Section

سے پھنسی ہے۔ اور اگر اُسے خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو سب سے پہلے تمہیں اس کا حساب چکانا ہوگا اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں اپنے دشمنوں کو بالکل معاف نہیں کیا کرتا اور عابدہ کے دشمن کو تو بالکل بھی نہیں۔"

میری بات پر عارفہ کے چہرے پہ ایک پھیکا سا رنگ آ کے گزر گیا، یقینی طور پر یہ اس کے اندر کا دبا دبا خوف تھا جو شاید اس حوالے سے پہلے ہی اس کے اندر کی بے چینی بنا ہوا تھا۔

"دھمکی دے رہے ہو مجھے؟" اس نے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"دھمکی وہ لوگ دیتے ہیں جو کچھ کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ میری اب تک کی زندگی تمہارے سامنے ہے، میں نے جو کہا وہ کر دکھایا۔"

"تمہارے پاس دوسرا آپشن کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"لولوش۔"

"لولوش؟" اسے ایک جھٹکا لگا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں نے شاید اس کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"تت... تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"بچکانا سوال ہے۔" میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ "اب معاملے کی بات کریں تو بہتر ہوگا۔" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولی۔

"تم یہ چاہتے ہو کہ میں عابدہ کے حق میں گواہی دینے امریکا جاؤں اور پھر تم وہ سارے شیئرز میرے حوالے کر دو گے؟"

"ہاں!" میں نے مختصراً کہا تو وہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ سے بولی۔

"اور تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے اس جھانسے میں آ جاؤں گی۔"

اس کی بات پر میرا طیش آسمان کو چھونے لگا، یہ عورت نہ ہوتی تو میں اسی وقت اس کی گردن دبوچ کر اسے کہتا "اے خبیث انسان! تم نے جو عابدہ کے ساتھ کیا ہے، اس سلسلے میں مجھے تم سے کسی ڈیلنگ یا معاہدے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ تم پر واجب ہے کہ تم اپنی محسنہ کے لیے یہ سب کرو۔ ورنہ میں تمہاری زندگی کو جہنم بنا دوں گا۔"

لیکن میں عارفہ سے اس طرح نہیں کہہ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیوں جب بھی میرے دل و دماغ میں عارفہ کے لیے ایسا کوئی جارحانہ خیال آتا تھا تو میری نظروں کے سامنے سرمد بابا کا چہرہ گھوم جاتا تھا۔ تاہم میں نے اپنے اندر کے اُبال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"جھانسا نہیں دے رہا ہوں، حقیقت بیان کر رہا ہوں، اور ویسے بھی کیا تم پر یہ واجب نہیں ہوتا کہ تم بغیر کسی معاہدے یا معاملے کے اپنی محسنہ عابدہ کی مدد کرو، جو تم پر اُصولی طور پر واجب بھی ہے؟" میری اس بات نے اُسے شپٹا دیا، مگر ڈھٹائی سے بولی۔

"میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟"

"ٹھیک ہے پھر میں دوسرے آپشن پر غور کر لیتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا تو اس نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور میرے مقابل کھڑے ہو کر بولی۔

"ٹھہرو! اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تم ان شیئرز کے حقدار ہو تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے، میں نے سرمد بابا کی وصیت کو کورٹ میں چیلنج کر دیا ہے، بہت جلد فیصلہ میرے حق میں ہونے والا ہے۔"

"خوش فہمی تمہیں ہے، مجھے نہیں۔" میں نے کہا، پھر ایک سناٹے دار مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چند پل کے توقف سے بولا۔ "بائی دی وے، جسے تم نے اپنے مستقبل کا جیون ساتھی بنا رکھا ہے، یعنی سیٹھ نوید سانچے والا۔ وہ بہت جلد پولیس کے سامنے یہ سچ اُگلنے والا ہے کہ سرمد بابا کے اغوا اور قتل میں تم بھی اس کے ساتھ شامل تھیں۔ کسی وقت بھی پولیس تمہاری گرفتاری کے لیے یہاں چھاپا مارنے والی ہے۔"

"کون سیٹھ نوید سانچے والا؟ میں اسے جانتی بھی نہیں۔" وہ مکاری سے مسکرا کر بولی۔

"اچھی ٹرک ہے، شاید چل بھی جائے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں دوسرے آپشن پر عمل پیرا ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں ہی نہیں تم بھی جانتی ہو اچھی طرح کہ لولوش کی ان شیئرز میں جان اٹکی ہوئی ہے اور شاید تمہارے علم میں نہیں ہے کہ جس سی آئی اے افسر ہاسکل ہولارڈ نے عابدہ کو حراست میں لیا ہوا ہے لولوش اس کا چہیتا داماد ہے، وہ بڑے آرام سے اور بغیر کسی لمبے چوڑے چکروں میں پڑے، عابدہ کو امریکا سے یہاں پاکستان پہنچا دے گا۔"

"اس کے لیے ایک طویل پروسس کی ضرورت پڑے گی تمہیں اور اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ لولوش جیسا عالمی گینگسٹر تمہیں دھوکا نہیں دے گا۔" اس نے کہا۔

وہ بلا کی عیار اور شاطر تھی۔ میری ہر بات کو ایک

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مضبوط دلیل سے باطل قرار دیے جارہی تھی، اور میں شاید اس خوش فہمی میں تھا کہ میں اسے مختلف چکروں میں ڈال کر خوف زدہ کر کے اپنا کام نکلوالوں گا۔ حقیقت یہی تھی کہ میں خود بھی عارفہ کے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہتا تھا جس سے چنکی اور دانی دنیا میں اکیلے رہ جاتے، کیونکہ سرمد بابا کے بعد اب بھلا ان دونوں معصوم بچوں کا دنیا میں اپنی ماں (عارفہ) کے سوا اور کون تھا؟ میں نے اپنی اسی جذباتی کمزوری کو عارفہ سے چھپانے کے لیے شروع میں ہی یہ ظاہر کردیا تھا کہ میرا سرمد بابا سے دل خراب ہو چکا ہے۔ رہی بات سیٹھ نوید سانچے والا پر سرمد بابا کو اغوا اور بعد ان کے حادثاتی قتل والے کیس کی تو یہ کام پبلک پراسیکیوٹر کے سپرد تھا۔

”یہ میرا دردِ سر ہے کہ میں اس سے کیسے اپنی بات منواتا ہوں۔ تم میرے ساتھ معاملے کی بات کرو۔ ہاں یا نہیں؟ میرا بہت وقت ضائع ہوگیا۔ سب سے پہلے مجھے سرمد بابا کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے۔ وہ میں لائر کو امریکا فوراً ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد لائر پیشی کی تاریخ لے گا اور تم امریکا روانگی کا پروگرام بناؤ گی، ممکن ہے اس میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی کرنا پڑے۔“

”اور شیئرز میرے حوالے کب کرو گے؟“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

”عابدہ کی رہائی اور اس کی یہاں بہ خیریت واپسی کے بعد۔“

”اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بعد میں اس معاہدے سے ہی مکر جاؤ۔“

”اتنا تم بھی مجھے جانتی ہو کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ عابدہ مجھے مل جائے، میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں ہوگی۔“

”مگر میں اس سلسلے میں تحفظات اور ابہام کا شکار رہوں گی۔ بہرحال میں کسی سے مشورہ کر کے تمہیں کوئی حتمی جواب دوں گی۔“ وہ کچھ نیم رضامندی سے بولی۔

”سیٹھ نوید سانچے والا سے مشورہ کرو گی؟“

”ہاں۔“ اس نے صاف گوئی سے کہا، جیسے مجھ سے اس کا کیا پوشیدہ تھا بھلا۔

”کیا اس نے اپنی ضمانت کروالی ہے یا پھر جیل میں اس سے ملو گی؟“

”اس کی ضمانت جلد ہونے والی ہے، ویسے میں اس سے ملتی رہتی ہوں۔ کل ہی اس سے مل کر میں تمہیں آگاہ بھی کروں گی۔“ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ وہ سیٹھ نوید سے ملتی رہتی تھی۔ اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے اس کی ضمانت کے ساتھ ساتھ اپنے لیے بھی ایک وکیل ہائر کرلیا ہو۔ میں نے طنزیہ کہا۔

”ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ تم سیٹھ نوید کو جانتی بھی نہیں۔“

”اب چھوڑو ان باتوں کو۔“ اس نے گفتگو ختم کرنے کے ارادے سے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ اب آپ ڈیتھ سرٹیفکیٹ میرے حوالے کردیں تو میں وہ امریکا لائر کو بائی پوسٹ کردوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ ابھی میں تمہیں نہیں دے سکتی۔ پہلے نوید سے بات کروں گی۔ اس کے بعد۔“ وہ بولی۔ ”ویسے تم یہ متعلقہ اسپتال سے بھی نکلوا سکتے ہو۔ اس میں بھلا کیا پریشانی ہے؟“

”وہ ڈپلی کیٹ کہلائے گا۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا ہوا پھر؟ تم اسے کسی کلاس ون آفیسر سے اٹیسٹ کروالو۔ وہ سرٹیفکیٹ خود میرے لیے بھی ضروری ہوگا، وہ تو میں تمہیں کسی صورت میں بھی نہیں دے سکتی۔“

”میں عابدہ کے کیس کے سلسلے میں تھوڑا سا بھی ابہام چھوڑنا نہیں چاہتا۔ ویسے میں اس سلسلے میں لائر سے مشورہ لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”ڈپلی کیٹ سرٹیفکیٹ تو تم بھی نکلوا سکتی ہو، اس میں کیا قباحت ہے؟“

”تم پہلے اپنے لائر سے بات کرلو، میں تب تک نوید سے بات کرتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ میں اور اول خیر واپس لوٹ آئے۔

میری اور عارفہ کی اس ملاقات سے اول خیر اور شکیلہ زیادہ پُراُمید نہ تھے کہ وہ اس سلسلے میں ہماری کوئی مدد کرنے پر رضامند ہوگی، اور اس کی باتوں سے مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا۔

بہرحال میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے سلسلے میں آنسہ خالدہ سے مشورہ لینے کا ارادہ کیا، لیکن امریکا کے وقت کے حساب سے وہاں آدھی رات تھی، اسی لیے میں نے اُسے میسج کردیا۔ اور تب تک میں نے متعلقہ اسپتال سے ایک اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھی نکلوالیا، تاکہ آنسہ خالدہ کا جواب اثبات میں آئے تو میں فوراً اُسے ارسال کردوں۔

اپنے کوارٹر پہنچے تو شکیلہ نے مجھے بتایا کہ میجر ریاض باجوہ کا فون آیا تھا۔ میں چونکا۔

”کیا کہہ رہے تھے وہ؟“ میں نے شکیلہ کی طرف

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور تو کوئی خاص بات نہیں کی، بس تمہارا ہی پوچھ رہے تھے کہ آ جائے تو میرے پاس بھیج دینا۔''

شکیلہ کی بات سن کر میں اکیلا ہی میجر صاحب سے ملنے ان کے آفس روم کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

ایک بند کمرے میں، میری ون ٹو ون ملاقات میجر ریاض باجوہ سے ہوئی۔

رسمی کلمات کے بعد میں نے ان کے چہرے سے ایک تفکر سا جھلکتا محسوس کیا۔ تاہم میں نے اصل بات کی طرف آنے سے پہلے پوچھا۔

''سر! وزیر جان کا کچھ پتا چلا؟''

''ابھی تک تو نہیں، لیکن اس کی تلاش جاری ہے۔'' اُنہوں نے مختصراً جواب دیا۔

''اور سندر داس یا چوہدری ممتاز خان نے کچھ اُگل کے دیا؟''

''اصل مسئلہ ان کے منہ سے کچھ اُگلوانا نہیں بلکہ تسلیم کروانا ہے، کیونکہ وہ کون ہیں، کیا ہیں یہ سب ہمیں معلوم ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ ان کے عجیب سے لہجے نے مجھے چونکا سا دیا۔ پتا نہیں کیوں وہ آج مجھے کچھ بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک بد دلی کی سی کیفیات ان کے سنجیدہ چہرے سے مترشح ہوتی نظر آ رہی تھی۔ خاموشی کا یہ وقفہ طول پکڑنے لگا تو میں نے پوچھ لیا۔

''کیا بات ہے سر! آپ آج کچھ اُلجھی اُلجھی سی باتیں کر رہے ہیں؟''

اُنہوں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور اپنی کرسی سے اُٹھ کر اپنے سیدھے ہاتھ والی اس دیوار کی طرف جا کھڑے ہوئے جہاں ایک کھڑکی باہر ہیڈ کوارٹر کے اس میدان میں کھلتی تھی، جدھر ڈرل وغیرہ ہوتی تھی۔ میری نظریں ہنوز ان کے تعاقب میں تھیں۔ وہ چند ثانیے کھڑے باہر میدان کی طرف تکتے رہے، پھر میز کی طرف آئے اور جھک کر اس کی دراز کھولی اور اس کے اندر سے ایک پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔

''اسے پہچانتے ہو؟''

میں نے حیران حیران سی نظروں سے تصویر پر ایک نظر ڈالی، صورت دیکھی بھالی تھی اور ذرا سا ذہن کھنگالنے پر میں اسے پہچان بھی گیا اور مجھے حیرت بھی ہوئی کہ یہ تصویر بھلا یہاں کیسے آ گئی اور کیوں؟''

''جی سر! میں اس تصویر کو پہچان گیا ہوں، مگر یہ آپ کے پاس؟''

''کیا واقعی تم اس تصویر والی کو پہچان گئے ہو یا پھر...''

''میں پہچان گیا ہوں سر! یہ چوہدری ممتاز خان کی جواں سال بیٹی نوشابہ ہے۔'' میں نے فوراً بتایا۔

''ہاں! اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ فرخ نام تھا اس کا۔'' وہ بولے۔ ''جس کے قتل کا الزام تم پر اور تمہارے ساتھی اول خیر پر لگا تھا۔''

''ج... جی ہاں سر!'' میری آواز جانے کیوں حلق میں اٹکنے لگی تھی۔ میجر صاحب کا بدلا بدلا لہجہ، ممتاز خان کی بیٹی نوشابہ کی تصویر، اور اب میجر صاحب کے منہ سے نوشابہ کے چھوٹے مقتول بھائی فرخ کا ذکر۔ یہ سب کیا تھا؟ کون سا نیا محاذ اب کھلنے والا تھا؟ اس نازک وقت کی بساط پر دشمن پھر کون سی نئی چال چلنے والے تھے میرے ساتھ؟ میرے اندر کوئی جیسے حلق پھاڑ کر چلّایا۔

''شہزاد احمد خان! تمہارے دُشمنوں کے ترکش میں ابھی بہت تیر باقی ہیں، تم کب تک اور ان کے کون کون سے تیر و تفنگ کا مقابلہ کرو گے۔''

میرے اندر ایک زبردست سی ہلچل مچ گئی تھی۔ میں بے چین تھا یہ جاننے کے لیے کہ آخر یہ کون سا نیا گورکھ دھندا شروع ہونے والا تھا؟

میجر ریاض باجوہ تھکے تھکے سے انداز سے میرے سامنے اپنی چیئر پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔ پھر بولے۔

''شہزاد! نوشابہ نے اپنے بھائی فرخ کا مرڈر کیس ری اوپن کرا دیا ہے۔ تمہارے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر کٹوا دی ہے۔ پولیس تمہیں کسی بھی وقت گرفتار کرنے والی ہے۔'' میجر ریاض باجوہ نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا۔ میں اس وقت جن نازک اور حساس ترین حالات سے گزر رہا تھا، اس میں ایسے کسی نئے محاذ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ قطعاً نہیں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنیں کنپٹیوں پہ سنائی دیتی محسوس ہونے لگی تھیں، میں غیر یقینی نظروں سے میجر باجوہ صاحب کا چہرہ تکے جا رہا تھا اور جب بولا تو مجھے اپنی آواز حلق سے بہ مشکل نکلتی محسوس ہوئی۔

''یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟ وہ کیس داخل ہی نہیں ہوا تھا کبھی میرے خلاف، ری اوپن کیسے ہو گیا؟ حتیٰ کہ میرے اور اول خیر کے خلاف ایف آئی آر بھی کٹ گئی؟ پہلے کیا نوشابہ سوئی ہوئی تھی؟''

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"لگتا ہے اس کی پشت پر کسی کا ہاتھ ہے۔ ایک ہی آدمی ہوسکتا ہے، جس نے اُسے سارے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے، اُسے اُکسایا ہے۔ اور وہ وزیر جان ہی ہوسکتا ہے۔"

"وزیر جان؟ مگر وہ تو روپوش ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ وہ روپوش ہے اور اپنی کسی خفیہ کمین گاہ میں بیٹھا یہ سب کررہا ہے، ہاتھ آجاتا ہمارے تو اور حالات ہوتے شاید۔"

"آپ کا خیال ہے کہ اُسی نے نوشابہ کو۔۔۔"

"ہاں! میں اپنے طور پر کنفرم کروا چکا ہوں۔ نوشابہ اپنے باپ چوہدری ممتاز کی رہائی کے سلسلے میں بھی سرگرم ہوگئی ہے اور اپنے باپ کی سیاسی پارٹی سے وابستگی کو ظاہر کرتے ہوئے خود بھی شامل ہوگئی ہے۔ بعض ابن الوقت قسم کے سیاست دان جنہیں سیاہ ست دان کہنا زیادہ بہتر ہوگا، وہ بھی اس کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف بیان بازی کرنے لگے ہیں اور بالخصوص تمہارے ایشو کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرکے ہمارے حوالے سے اُچھالا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری توقع کے خلاف اور قبل از وقت ہوگیا ہے۔ وزیر جان بہت ہی شاطر دماغ کا آدمی نکلا۔ جانتا ہے اچھی طرح کہ کب اور کس وقت کون سے مہرے کو سرکاتا ہے۔"

"حیرت ہے سر! وزیر جان نے اتنی جلدی کس طرح نوشابہ کا مائنڈ سیٹ اَپ بدل کر رکھ دیا۔" میں گومگو سے انداز میں بولا۔

"ایسی بات نہیں ہے، نوشابہ کا تیر اس نے بہت پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہوگا۔ نوشابہ کا اب اپنے باپ ممتاز خان کے علاوہ رہ بھی کون گیا ہے؟ وہ باپ کے بغیر خود کو تنہا تصور کرنے لگی ہوگی اور اسی ایشو کو وزیر جان نے استعمال کرتے ہوئے اس کا مائنڈ سیٹ اَپ چینج کرنے کی کوشش کی ہوگی، بہرحال وہ ایک عورت ہے، تنہائی اُسے عدم تحفظ کا احساس دلاتی ہوگی۔"

"تو پھر اب ایسی صورت حال میں کیا کرنا ہوگا ہمیں؟" میں نے دھڑکتے دل سے میجر صاحب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ابھی تو مجھے ان سے کرنل سی جی بھوانی کے سلسلے میں بھی بات کرنا تھی۔

"اس سلسلے میں آج رات ڈی آئی جی جنرل رینجرز سے ہماری خصوصی میٹنگ ہے۔ ہوسکتا ہے ہمیں "پاور" کو ہنگامی بنیادوں پر ڈراپ کرنا پڑے۔" وہ بولے، اور مجھے ایک اور جھٹکا لگا۔

پاور کے خاتمے کا مطلب تھا، میں، شکیلہ اور اول خیر بے سروساماں ہوجاتے۔ جبکہ پولیس بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ پریشانیوں اور تفکرات کی یلغار سے میرا حلق سوکھنے لگا تھا۔ ہماری حیثیت ہی کیا تھی؟ ایک رضا کار، اور ڈیلی ویجز کی۔

"تم فکر نہ کرو شہزاد! اگر ایسا کوئی فیصلہ ہوا بھی تو میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔" اُنہوں نے شاید میرے چہرے سے پریشانی کے آثار بھانپتے ہوئے کہا۔

"سر! میری پریشانی اپنی جگہ لیکن آپ سے ایک اور اہم معاملے پر بھی ڈسکشن کرنا تھی، سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں؟"

"ہاں، تم بولو، میں سن رہا ہوں، تم کون سے معاملے کی بات کرنا چاہتے ہو؟" وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے، تو میں نے اُنہیں بلیو ٹیکسی کے سی جی بھوانی سے فونک گفتگو کے بارے میں پوری صراحت سے آگاہ کردیا اور اس سلسلے میں مجھے کون سا قدم اُٹھانا چاہیے تھا، اس کے بارے میں بھی بتادیا۔ یہ سب باتیں سننے کے بعد ان کے چہرے کی سنجیدگی بڑھ گئی، شکنوں کا ایک جال سا اُن کے ماتھے پر پھیل گیا۔

کچھ ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولے۔ "یہ معاملہ بھی بہت حساس نوعیت کا ہے، ایسے میں جبکہ ہمارے خصوصی ونگ پاور کے سلسلے میں آخری فیصلہ کیا جانے والا ہے، ہم ایسی مہم جوئی کا رسک نہیں لے سکتے۔ یہ بہت رسکی مشن ہوگا، اگر سندر داس فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تو بہت مشکل کھڑی ہوجائے گی، جبکہ ایسے میں ہم پہلے ہی گمبھیر حالات سے دوچار ہوچکے ہیں، اور بلیو ٹیکسی کے کھاگ ایجنٹ اتنے سہل نہیں ہیں کہ ہم اُنہیں اس طرح آسانی سے جُل دے سکیں۔" مجھے میجر باجوہ صاحب کی بات پر حیرانی سی ہوئی۔

"لیکن سر! میرا منصوبہ بے داغ ہے۔ اس کے لیے پاور کے چار ایجنٹ کافی ہوں گے میرے ساتھ۔"

میری بات پر وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔ "جنٹلمین! تمہیں اپنا یہ رسکی منصوبہ اسی لیے بے سقم لگ رہا ہے کہ تم اپنے باپ کو بھارتی خفیہ ایجنسی کی قید سے چھڑوانا چاہتے ہو۔"

میجر ریاض باجوہ کی اس بات سے مجھے ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی، آج پہلی بار میں نے ان کی بات سے شدید اختلاف کیا تھا۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''تو کیا سر! میرے باپ کی رہائی کی ذمے داری آپ لوگوں پر عائد نہیں ہوتی؟ کیا وہ اپنے کسی ذاتی کام سے سرحد پار گیا تھا؟ اس نے اپنا گھر بار وطن کی خاطر قربان کر ڈالا، اور اپنی جان کی بازی لگا کر دشمن ملک کے ایسے خطرناک جاسوس کو اسی کے ملک میں جہنم واصل بھی کیا، جو ایک خطرناک ملکی راز چرالے جانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کیا اس کا یہ حق نہیں بنتا کہ اس کی رہائی اور وطن واپسی کے لیے ہم کچھ کریں۔ اور پھر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ یہ میرا محض ایک ذاتی مسئلہ ہے؟ بہت افسوس ہوا سر مجھے آپ کی بات پر۔''

''تم خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو جنٹلمین!'' میجر ریاض باجوہ نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اس کا کیا ثبوت ہے کہ کرنل سی جی بجوانی تمہاری ایک جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر تمہیں بلف نہیں کر رہا؟ کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ جس تاج دین شاہ کی بات کر رہا ہے، وہ زندہ بھی ہے۔'' مجھے میجر باجوہ کا لہجہ بے رحمی کا عکاس محسوس ہوا۔ میں ان کا احترام کرتا تھا اس لیے کوئی سخت جواب دینے سے گریزاں ہی رہا، لیکن وہ فوراً نرمی سے بولے۔

''دیکھو! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلیو ٹکسی والے تم سے گیم کھیل رہے ہیں۔''

''اگر یہ کنفرم ہو جائے کہ میرا باپ زندہ ہے تب آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟'' میں نے اپنے تئیں باجوہ صاحب سے رائے چاہی تو وہ بولے۔

''باوجود اس کے سندرداس جیسے اہم اور خطرناک مہرے کو ہم اپنے قبضہ گرفت سے نہیں نکال سکتے۔''

''سر! میری آپ سے ریکویسٹ ہے، اس موقع سے ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیے، اس طرح نہ صرف ہم یہاں گھسے بیٹھے ''را'' سمیت بلیو ٹکسی کے ایجنٹوں کا سراغ لگالیں گے بلکہ اس طرح میرے باپ کو بھی رہائی مل جائے گی۔ میرا باپ ایک غازی ہے سر، وطن کا غازی۔ کرنل سی جی بجوانی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی کہ میرا باپ اب واقعی ان کے لیے ... کارآمد نہیں رہا ہے، اور اسی لیے انہوں نے اس آپشن کو استعمال کرنے کا سوچا ہوگا کہ میری اس جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر وہ اپنے اہم آدمی کو حاصل کرلیں۔ ان کی اس اُمید اور ڈیل کی وجہ بڑی ٹھوس اور سمجھ میں آنے والی ہے! پلیز سر! مجھ پر بھروسا کریں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے ملتجی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، مجھے ان کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستغرق محسوس ہوا تو مجھے اُمید سی ہوئی اور میں پہلے سے بھی زیادہ مستحکم لہجے میں بولا۔

''سر! پاور رہتی ہے یا نہیں، بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وطنِ عزیز کا ہر محبِ وطن ایک ''پاور'' ہے۔ اور یہ پاور درحقیقت اللہ کی پاور ہے۔ میں اور میرے دونوں ساتھی (شکیلہ اور راول خیر) بے شک یہاں سے بے دخل بھی کر دیے جائیں تو کوئی پروا نہیں، میرا آپ سے وعدہ ہے سر! ہم آپ سے ملاقات سے پہلے بھی پاور تھے اور اب بھی ہیں اور انشاء اللہ رہیں گے، بھلا آپ کو ہم سے آج تک کبھی کوئی شکایت ہوئی ہے؟ ہم نے آپ سے ٹریننگ لی ہے سر! میرے دونوں ساتھیوں کو بھی کیپٹن افتخار جنجوعہ صاحب نے کافی حد تک ٹرینڈ کیا ہے، لیکن ہمارا اصل ہتھیار ہمارا نیک جذبہ ہے۔ ہم تو فتح کے قریب ہیں، لیکن محض اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ ختم کرنا بڑی بات نہیں، یہ ایک ایسے آکٹوپس کی طرح پھیلی ہوئی ہے جس کا اگر ایک ٹینٹیکل (Tentacle) کاٹ دو تو چند دنوں بعد دوسرا نکل آتا ہے، جبکہ ہمیں اس کا سر کچلنا چاہیے، آپ کے بھی علم میں یہ ہوگا کہ ہمارے بیرونی دشمنوں نے اسے ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ہائر کرلیا ہے، لہٰذا اس حقیقت سے آپ کو بھی انکار نہیں ہوگا سر! کہ ملک اس وقت بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس طرح کی سازشیں ماضی میں بھی ہوتی رہیں ہیں، وطنِ عزیز اس وقت بیرونی سازشوں کے نرغے میں بھی ہے، ہمارے دشمن آپس میں گٹھ جوڑ کر چکے ہیں، ٹھیک ہے ملک کے بعض وسیع تر... مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، کچھ سخت فیصلے بھی ہمیں جھیلنے پڑتے ہیں، اور بعض ملک دشمن عناصر سیاست کی آڑ میں بھی اپنے ذاتی مفادات کے حصول سے نہیں چوکتے، اور جہاں ان کی گردن پھنستی ہے وہ بلبلا کر ''عوامی کارڈ'' کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں، اور کیا آپ بھول گئے سر؟ پاور سیکریٹ سروس بھی تو اسی کا توڑ کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی تاکہ زہر کو زہر سے اور لوہے کو لوہے سے کاٹا جائے، ناک کو ہاتھ گھما کر پکڑیں یا سامنے سے، بات تو ایک ہی ہے سر، یہ ٹھیک ہے کہ پاور طشت ازبام ہوگئی، اور اب اسے ختم کیا جا رہا ہے، لیکن کیا اس سے پاور کا مقصد ختم ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں سر! اس سے کیا فرق پڑے گا؟ رہی بات میری اور میرے ساتھیوں کی متوقع گرفتاری کی، تو آپ بے فکر رہیں، مجھے ایسے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا تجربہ ہے، وہ میں دیکھ لوں گا، مگر اس وقت جو کام ضروری ہے وہ نمٹانا ہوگا۔ پلیز سر آئی ہمبلی ریکویسٹ یو، آخر میں یہی کہوں گا کہ وطن کے جس جاں

Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نثار سپاہی کی آزادی کے لیے جو شخص کوشاں ہے، وہ بھی اسی بہادر اور محبِ وطن سپاہی کا بیٹا ہے۔ میرا وعدہ ہے سر، میں سندر داس کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔"

میجر ریاض باجوہ سے یہ سب کہتے ہوئے میری آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ ایک عجیب سے جوش تلے میرے وجود کا رُواں رُواں مرتعش سا ہو رہا تھا۔ میری لرزتی نظروں کے سامنے میجر باجوہ کا چہرہ ان کے اندرونی جذبات کا عکاس نظر آنے لگا۔ میری پُرجوش باتوں کی اثر پزیری ان کے بُشرے سے عیاں تھی۔

پھر وہ اپنی چیئر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور "ویل ڈن جنٹلمین!" کہتے ہوئے اپنے دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھے، میں نے بھی اپنی کُرسی چھوڑ دی اور فرطِ جوش سے ان کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ وہ میرا کاندھا تھپتھپا کر بولے۔

"شہزاد احمد خان! مجھے تم پر اور تمہاری صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے دوبارہ اپنی چیئر سنبھال لی، اور ساتھ ہی مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میرے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولے۔

"شہزاد! ہم کسی بھی صورت میں اپنے مشن کو اُدھورا نہیں چھوڑتے، ہاں، مصلحتاً یا موقع محل کے تحت اس میں تعطل آ سکتا ہے یا کچھ تبدیلیاں لانی پڑتی ہیں، تم نے پاور سے متعلق اور مابعد جو باتیں کی ہیں، ان کی مماثلت کی وجہ سے ہی میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں یہ چانس دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"تھینک یو سو مچ سر!" خوشی کے باعث یہ اظہارِ مسرت میرے لبوں پہ آ گیا۔ "سر! میں انشاء اللہ ہمیشہ کی طرح آپ کی اُمیدوں پہ پورا اُترنے کی کوشش کروں گا۔"

"میری بھی تم سے ہمیشہ یہی توقعات رہی ہیں۔" وہ مسکرا کر بولے۔ "لیکن ایک بات یاد رکھنا شہزاد کہ یہ سب کچھ میں خالصتاً اپنی صوابدید پر کروں گا۔ اگر خدانخواستہ تمہارا یہ مشن ناکامی سے دوچار ہوا یا سندر داس نکل بھاگا تو میں محکمہ جاتی کارروائی کے زیرِ عتاب آ جاؤں گا، میرا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے ہوئے ان کے بشرے پہ یکا یک ایک گمبھیر سنجیدگی عود کر آئی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔

"آئی نو سر! مجھے بھی اس خدشے کا احساس ہے، لیکن میں جان لڑا دوں گا اس اہم مشن کی تکمیل کے لیے لیکن سندر داس کو نکلنے نہیں دوں گا۔ اور مجھے اُمید ہے انشاء اللہ میں [illegible] رہوں گا، کیونکہ میرا دل کہتا ہے جس غفور و رحیم نے مجھے میری ماں سے ملوایا ہے، یہ ذریعہ بھی اُسی کا ہی عطا کردہ ہے، ہمتِ مرداں مددِ خدا۔ یہ اُس ربِ کریم کا وعدہ ہے سر!"

میری بات پر ریاض باجوہ نے ایک بار پھر بڑی گرمجوشی سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور... میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں جنٹلمین!" پھر ذرا توقف سے بولے۔ "یہ تو شکر ہے کہ سندر داس ابھی تک میری ہی کسٹڈی میں ہے۔ لیکن میں زیادہ دیر اُسے اپنی کسٹڈی میں نہیں رکھ سکتا۔ جی ایچ کیو کے احکامات کے مطابق مجھے جلد ہی اُسے ان کے سُپرد کرنا ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر! میں انشاء اللہ بہت جلد یہ مشن نمٹانے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا پھر پوچھا۔ "کیا چوہدری ممتاز خان کو جی ایچ کیو کے حوالے کر دیا گیا ہے؟"

"ہاں!" اُنہوں نے مختصر جواب دیا۔

"ہمارے لیے کیا حکم ہے سر! آئی مین، کیا ہم یہاں سے کہیں اور شفٹ ہونے کی تیاری کریں؟"

"ابھی نہیں، پہلے اپنا یہ مشن نمٹاؤ، دیکھتے ہیں پھر، ابھی میٹنگ کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو گا، تاہم تم تینوں خود کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار رکھو۔" میں نے ان کی بات پر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور رخصت ہوتے وقت میجر صاحب نے میری اس جانب بھی توجہ دلوا دی تھی کہ نوشابہ والے کیس کے سلسلے میں کوئی اچھا سا وکیل بھی ہائر کر لوں، وغیرہ۔

☆☆☆

میں اپنے کوارٹر پہنچا تو شکیلہ اور راول خیر کو اپنا منتظر پایا، مگر میں ان کے چہرے دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ دونوں ہی مجھے خاصے متفکر اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔

"تم دونوں کو کیا ہوا؟ تم دونوں خاصے پریشان دکھائی دے رہے ہو؟"

"شہزی! کیا میجر صاحب سے تمہیں کچھ پتا نہیں چلا؟" شکیلہ نے مجھ سے مخاطب ہونے میں پہل کی تو مجھے ان کے چہروں سے چھلکتی پریشانی اور تشویش کا کچھ اندازہ ہوا۔

"ہاں! نوشابہ کی بات تو نہیں کر رہے ہو تم؟"

"ہاں کاکے! ابھی ابھی ایک نجی ٹی وی چینل میں ہم نے اُسے ایک پریس کانفرنس کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔ میرا دل ایسا بے چین ہوا کہ جی چاہا اسی وقت تمہارے پیچھے جاؤں اور تمہیں مطلع کر دوں۔"

"چل رہی ہے پریس کانفرنس یا ختم ہو گئی۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا تو اس بار شکیلہ نے جواب دیا۔

READING Section

"ختم ہوگئی ہے، مگر شہزی! اس لڑکی نے تمہارے خلاف بڑی بکواس کی ہے اور... اس نے تو تمہیں اشاروں کنایوں میں اسٹیبلیشمنٹ کا اور نجانے کن کن لوگوں کا ٹاؤٹ بھی قرار دے ڈالا ہے۔ بہت زہر اُگل رہی تھی وہ تمہارے خلاف۔"

"تم بتاؤ شہزی! میجر صاحب نے تم سے کیا کہا۔" اول خیر نے پُرفکر نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہم تینوں تب تک نشست گاہ میں آ بیٹھے تھے، جہاں ٹی وی آن تھا۔

میں نے انہیں اپنے اور میجر صاحب کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ اور یہ بھی بتایا کہ میں اپنے نئے مشن کے سلسلے میں اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ ساتھ ہی ان دونوں کو بھی تسلی دی کہ انہیں اس نئی صورت حال سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن شکیلہ کے مقابلے میں اول خیر کے چہرے پر عدم طمانیت کے آثار جوں کے توں موجود رہے اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا، پھر میں نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

"کیا بات ہے اول خیر! تم کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آرہے ہو؟"

"پریشانی کی بات تو ہے کاکے!" وہ پُرتفکیر آواز میں بولا۔ "میرا خیال تھا پہلے تو شابہ والے معاملے سے نمٹ لیتے، اس کے بعد اس مشن میں ہاتھ ڈالتے، پھر عارفہ سے بھی ہم نے عابدہ کے سلسلے میں معاملہ داری کی بات شروع کر رکھی ہے۔ یار کاکے! تُو کیا شے ہے؟ تُو نے بیک وقت اتنے سارے معاملات میں ٹانگ پھنسا دی ہے۔ کس معاملے کو پہلے دیکھتا ہے اس کا کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔" وہ بے چارہ آخر میں اُلجھ سا گیا تھا۔

"شہزی جو کر رہا ہے وہ ٹھیک ہی کر رہا ہے۔" شکیلہ نے کہا۔ "حالات کی یلغار ہی ایسی ہے ہم پر کہ یہ سارے معاملات جو تمہاری ناقص عقل میں اُلجھن کا باعث بن رہے ہیں، درحقیقت ان سب کے تانے بانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک چین ہے جسے کڑی در کڑی سُلجھانا ہے۔"

شکیلہ نے اپنی فہم و فراست کے مطابق "حالاتِ دوراں" کا بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا، ان سارے مذکورہ معاملات کا "لنک" کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے آپس میں ملتا ضرور تھا، اور حالات کا دھارا بھی ایک ہی تھا کہ اس پر اسی طرح بہا جائے۔

اگرچہ مجھے شکیلہ کی اس بات میں وزن محسوس ہوا تھا لیکن میں نے دانستہ اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنے چہرے پہ پُرسوچ خاموشی طاری رکھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اول خیر اس کے جواب میں کیا کہتا ہے؟ لہٰذا وہ مجھے خاموش پاکر اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"میں تم سے زیادہ شہزی کے قریب رہا ہوں، اور شروع سے لے کر اب تک کے سارے حالات کا بھی گہرا مُشاہدہ رکھتا ہوں بلکہ ان کا مجھے تجربہ بھی رہا ہے۔ شطرنج کی اس چار دانگ پھیلی بازی میں کب اور کہاں مہرہ کھسکانا چاہیے، اس کا بھی مجھے بہ خوبی ادراک ہے۔ میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ بیک وقت اتنے سارے معاملات کو ہاتھ میں لینے کی وجہ سے کسی ایک معاملے پر گرفت کمزور ہونے لگتی ہے، اور انسان صحیح طور پر انصاف نہیں کر پاتا، جبکہ یہاں ہر معاملہ اپنی جگہ نازک اور حساس نوعیت کا ہے، کوئی ایک معاملہ بگڑا تو سب درہم برہم بھی ہوسکتا ہے۔"

"لو! تم نے تو خود ہی میری بات کی تصدیق کر ڈالی۔" شکیلہ نے پورے اعتماد سے مسکرا کر کہا۔ اور اول خیر بھوچکی سی صورت بنا کر اس کا چہرہ تکنے لگا، ان نازک گھڑیوں میں بھی میرے اندر ہنسی کا شگوفہ پھوٹا تھا، مگر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ہونٹوں پر "پہنچنے" سے روکے رکھا۔ وہ اسی اعتماد سے آگے بولی۔

"تمہاری آخری بات سے یہ وضاحت ہوگئی کہ یہ سارے معاملات ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور ایک کو چھوڑیں تو دوسرا سر اُٹھا کر آڑے آجائے گا۔ اور بدقسمتی سے یہ سب ایک ساتھ ہی سر پہ آن پڑے ہیں۔ کسے حل کیا جائے اور کسے چھوڑا جائے۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ سب معاملات ساتھ ساتھ ہی فیس کرنے کے متقاضی ہیں۔"

میں اب منتظر تھا کہ اول خیر کیا جواب دیتا ہے؟ لیکن میرا مقصد یہ دیکھنا نہیں تھا کہ دونوں میں سے کون زیادہ ذہین تھا اور کون کم۔ بلکہ میرے دل میں ان دونوں کے متعلق ایسی کوئی سوچ تھی ہی نہیں۔ شکیلہ کی عقل و فراست کی کسوٹی کچھ اور تھی، جبکہ اول خیر کی فہم و فطانت اور تھی۔ اور دونوں ہی فی زمانہ ضروری بھی تھیں۔ شکیلہ کی سوچ کا تھوڑا "پچ" مجھ سے میل کھاتا تھا، جبکہ اول خیر اس کے اُلٹ تھا۔ شکیلہ کی سوچ "ابھی" سے متعلق تھی تو اول خیر کی "کبھی" سے وابستہ۔ وہ دور اندیشی کو ملحوظ رکھنے کا عادی تھا اور شکیلہ کو کل پر بھروسا نہیں تھا۔ اُسے کل پر تشویش ہوتی تھی، نجانے کیا ہو؟ اور جو ہو وہ ابھی نمٹا دیا جائے، اول خیر دور بین تھا تو شکیلہ خورد بین۔ اور

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں ان دونوں کی باتوں کی روشنی میں اپنی عقل کی مشترکہ کسوٹی پر کوئی ایک فیصلہ صادر کر ڈالتا تھا۔ میں اسی کا منتظر تھا، جب اول خیر نے جواب میں کہا۔

"باوجود اس کے ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ کون سا معاملہ اپنی ترتیب اور اہمیت کے لحاظ سے پہلے آتا ہے۔"

"ایگزیکٹلی! میں بھی تو یہی کہنا چاہ رہی تھی۔" وہ بولی۔ تب میں نے بھی گفتگو کو حتمی شکل دیتے ہوئے درمیان میں کہا۔ "عارفہ کے جواب کا ہمیں انتظار ہے، یہاں ہیڈ کوارٹر میں اب ہمارا کیا مستقبل ہوگا، یہ میجر باجوہ صاحب ہمیں کل صبح تک بتا دیں گے، کرنل سی جی کے ساتھی نے ہم سے خود رابطہ کرنا تھا، کب؟ یہ بھی اندھیرے میں ہے۔"

وزیر جان کا کھوج اور نوشابہ والا معاملہ ایسا ہے جس کے لیے ہمیں پہلے سوچنا ہوگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ ضروری نوشابہ کے معاملے کو دیکھنا ہے، جس نے میرے اور اول خیر کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر بھی کٹوا دی ہے۔"

شکیلہ نے میری بات پر اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی تھی۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھا، وہ ہنوز کسی نامعلوم سی اُلجھن کا شکار دکھائی دے رہا تھا، اس کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا جیسے وہ کوئی بات کہنا چاہتا ہو، مگر کہنے کی شاید ہمت نہیں پا رہا تھا۔

اسی وقت میرے سیل کی بیل گنگنائی، ایسے میں سیل کی بیل بھی اچانک دل دھڑکا دیتی تھی۔ میں نے سیل پر نمبر دیکھا تو ایک نئی سوچ نے میرے اعصاب پر یلغار کر دی۔ کال زہرہ بانو کی تھی، میری جب سے ان کے ساتھ تلخ کلامی ہوئی تھی تب سے مجھے کم ہی اُمید تھی کہ وہ مجھ سے دوبارہ رابطہ کریں گی۔ ماں جی وہیں تھیں، ممکن ہے ان سے متعلق انہوں نے مجھ سے کوئی بات کہنا ہو، میں نے سیل کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

میرے اور زہرہ بانو کے درمیان چونکہ کچھ ذاتی معاملات بھی تھے، اسی لیے میں نے اس کا اسپیکر وائیڈ نہیں کیا تھا اور دوسرے کمرے میں آ گیا تھا۔

"شہزی! کیسے ہو؟" دوسری طرف سے اُن کی وہی لچکدار، اپنائیت اور ملائمت آمیزی میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔ جس کی تہ میں مجھے ہمیشہ ایک حسرت کا دردناک لوچ سا بھی محسوس ہوا کرتا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں زہرہ! تم کیسی ہو؟"

"بہرحال تمہارے لہجے کا یہ بے تکلفانہ پن اور تمہارا مجھے زہرہ کہنا اچھا لگا، ورنہ تو تم بھابی کہتے تھے مجھے۔" ان کے لہجے کی معنی خیزی نے مجھے ذرا گڑبڑا سا دیا، ایسا واقعی میرے ہونٹوں سے روا روی اور بے اختیاری میں نکل گیا تھا۔ میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ بول پڑیں۔

"تم نے جانے کے بعد مجھ سے پھر کوئی رابطہ ہی نہیں کیا، مگر مجھے تمہاری ہر وقت فکر رہتی ہے۔ سوچا تھا کہ اس روز کی الزام تراشی کے بعد تم سے کوئی بات نہ کروں گی لیکن یہ بھلا میرے لیے کب اور کہاں ممکن ہوسکتا ہے؟ مگر تم تو رہے ہمیشہ کے بے مروت، ماں جی کے بہانے ہی فون کر لیتے کہ ہمارے بجھے ہوئے دل کو ایک خوش فہمی کا سہارا ہی ہو جاتا۔ ہمیں دیکھو بچوں کی طرح تمہارے ساتھ لڑتے ہیں اور دل میں کوئی بُغض رکھے بغیر بچوں ہی کی طرح سب کچھ بھول بھال کر خود ہی من بھی جاتے ہیں۔ کیا تم اس روز کی ناراضی ابھی تک اپنے دل میں رکھے ہوئے ہو شہزی؟" اُنہوں نے آخر میں پوچھا۔

ان کے گداز لب و لہجے میں بہت درد تھا، بہت سوز تھا، ان کی آواز اور ان کے لہجے میں دور کہیں کسی حسرت زدہ و نارسا تمنا کی کسک بھی تھی، جس کا اظہار بھی شاید ان کے لیے عذاب ناک تھا۔ یہی وہ سب کچھ آشکارا کرتا تھا کہ وہ شکست خوردگی کا کتنا بڑا گھاؤ کھائے ہوئے تھیں۔ لیکن مجھے آج یہ سب کیوں محسوس ہوا تھا؟ خود سے سوال کیا تو میرے اندر سے بھی ایک آہ سی نکل گئی۔ میری آنکھیں بھی تو کسی کی منتظر تھیں؟ میں بھی تو عابدہ سے جدائی کا زخم کھائے ہوئے تھا۔ موسم ہجراں کے اس بے برگ و بار چمن کی زمین پر گرے ہوئے خزاں رسیدہ پتوں میں خود میں بھی تو شامل تھا جو حسرت بھری نظروں سے اس درخت کو تکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جن پر کبھی وہ جھول کر موسم بہار کے گیت گایا کرتے تھے، مگر وہ اب نوحاں کناں تھے۔ تو کیا... میرا اور زہرہ بانو کا دُکھ سانجھا ہو گیا تھا؟ تو کیا... اَب میں اور زہرہ بانو راہِ اُلفت کے دو ایسے ہم رکاب بن چکے تھے، جن کی بے نشاں منزلیں بغیر کسی سنگِ میل کے طے ہو رہی تھیں، آہ... شاید آج مجھے صحیح معنوں میں زہرہ بانو کے دُکھ کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ ہاں آج... میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ آج مجھے اول خیر کی وہ بات یاد آ رہی تھی جو اس نے زہرہ بانو کے ساتھ ہونے والی میری تلخی کے نتیجے میں ان کی حمایت میں مجھ سے کہی تھی۔

"انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اور وہ بھی ایسی محبت جو دائمی جدائی کا جاں گسل احساس بھی رکھتی ہو۔ یہی شے انسان کو ہمیشہ ایک ایسی احساسِ محرومی سے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دو چار رکھتی ہے کہ لاشعوری طور پر اپنے محبوب جیسی جھلک یا مستعار لی گئی اس سے متعلق کوئی نشانی کے لیے اس کا دل تڑپتا رہتا ہے۔ اور پھر کا کے! تو تو پورا ہی لئیق شاہ ہے۔ اس لیے تھوڑا یہ بات سمجھنے کی کوشش کیا کر اور اتنی وسعت اپنے دل میں رکھا کر کہ کچھ حقیقتوں کے آگے ایک کمزور انسان بے بس ہوتا ہی ہے۔ یہی حال اس بے چاری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔"

اول خیر کے یہ الفاظ یاد کر کے آج مجھے لگا جیسے میرا بھی زہرہ بانو جیسا حال ہونے لگا ہے۔ عابدہ کی جدائی نے مجھے بھی تو ایک ایسی ہی احساسِ محرومی سے دو چار کر دیا تھا، جس میں لاشعوری طور پر وہ کسی ایسے انسان میں اپنے بچھڑے محبوب کی جھلک دیکھتا ہے، جو اس کے قریب رہتا ہو۔ جس سے ایک عرصے سے تعلق داری رہی ہو۔ اگر زہرہ بانو مجھ میں لئیق شاہ کی مماثلت کے حوالے سے اپنی کسی لاشعوری اپنائیت میں مبتلا تھی، تو کیا میں بھی ان کی نرمی، ملاحت آمیزی اور ان کے لہجے سے مترشح وارفتانہ انداز کا پیاسا ہو رہا تھا، کیا میں بھی لاشعوری طور پر اپنی کسی احساسِ محرومی کو دور کرنے کے لیے کسی مستعار گھڑیوں کا متلاشی تھا؟ یا پھر یہ آج زہرہ بانو کے لب و لہجے اور اندازِ تخاطب کا شاخسانہ تھا؟

"کیا سوچنے لگے شہزی!" دوسری جانب سے دوبارہ ان کی لوچ دار آواز اُبھری، جس نے مجھے خیالات کے بھنور سے اُبھارا۔ نجانے کیوں ان کی آواز آج میرے دل کی تڑپ بڑھا رہی تھی۔ پریشانیوں کی یلغار میں کسی کا میٹھا اور اپنائیت بھرے لہجے کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے۔ اور یہی اثر پذیری مجھ پر حاوی ہونے لگی تھی۔ اس قدر کے بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہو گیا۔

"زہرہ! ام... میں بہت پریشان ہوں... آج ایسا لگتا ہے جیسے مسائل کا پورا ملبا میرے سر پہ آن گرا ہے۔"

"چلے آؤ پھر میرے پاس۔" وہ بے اختیار جیسے وارفتانہ انداز میں بولیں۔ "ایسے وقتوں میں انسان کسی اپنے کا ہی سہارا ڈھونڈتا ہے۔ آجاؤ" میں تمہاری منتظر ہوں۔"

انہیں شاید تازہ حالات کا علم نہ تھا اور ایسے میں مجھے انہی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

"گاڑی بھجوا دوں میں؟ کپیل دادا اور میرے آدمی تمہیں لینے آجائیں گے۔"

"نہیں، میں خود ہی آجاتا ہوں۔ آپ سے اور بھی... موضوعات پر گفتگو کرنی ہے مجھے۔"

"میں منتظر ہوں۔ بلا تاخیر چلے آؤ شہزی!"

"آپ ناراض تو نہیں ہیں مجھ سے۔ اس روز کی تلخ کلامی پر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ شاید میں واقعی آپ کی طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔"

"او... کم آن شہزی! لیو اِٹ پلیز! آ رہے ہو ناں پھر؟"

"میں آ رہا ہوں۔"

رابطہ منقطع ہوتے ہی میں نے دوبارہ نشست گاہ کا رخ کیا تھا۔ شکیلہ اور اول خیر قدرے چونک کر میری طرف تکنے لگے۔ اول خیر کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی جیسے اُسے اندازہ ہو چکا تھا کہ فون کس کا تھا۔

"بیگم صاحبہ کا فون تھا۔" میں نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ شکیلہ نے تو نہیں، البتہ اول خیر ضرور مجھے بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"او خیر... کیا کہہ رہی تھیں؟ خیریت سے تو ہیں؟ اور ماں جی؟"

"سب خیریت تھی، یوں ہی انہوں نے میری خیریت کے لیے فون کیا تھا۔" میں نے کہا اور خاموش سا کھڑا رہا۔ میری نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ مجھے پتا بھی نہ چلا کہ اول خیر نے شکیلہ کو کمرے سے جانے کا مخصوص اشارہ کر دیا اور میرے بالکل قریب آ کر میرے کاندھے پر ہولے سے اپنا ایک ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"او خیر... کا کے! تو نے بیگم صاحبہ سے دوبارہ تو اپنی کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا؟"

"نہیں یار! بلکہ میں نے تو اُن سے اپنے اُس دن والے رویّے پر معذرت بھی کر لی تھی۔"

"تو پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"انہوں نے میری معذرت والی بات تو جیسے سرے سے سُنی ہی نہیں، بس اتنا کہا۔ "آجاؤ میرے پاس۔" میں جیسے عملِ تنویم کے زیرِ اثر بولا۔

"وہ ایسی ہی مہربان خاتون ہیں۔ بہت محبت کرنے والی، صاف اور سچے دل کی مالک۔" اول خیر نے بھی ایک گہری سانس بھر کے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

"شہزی! برا مت منانا میرے یار! سچی کہوں گا تجھ سے، اس وقت تجھے بیگم صاحبہ جیسی مہربان خاتون کے سہارے کی ضرورت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جس وقت تو بہت پریشان نظر آ رہا تھا ناں، اور کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا تو پتا ہے میرے دل میں سب سے پہلے بیگم صاحبہ کا ہی خیال آ رہا تھا، لیکن میں تجھ سے ان کا ذکر کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ دیکھ لے کا کے! تو نے ان پر ایک بڑا الزام لگایا تھا، لیکن

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

انہوں نے وہ سب بھلا دیا اور تجھ سے بات کیے بنا نہ رہ سکیں وہ۔ یہ تُو نے اور بھی اچھا کیا کہ ان سے اپنے اس دن والے رویے پر دلی معذرت بھی کرلی۔ چل کاکے! جا۔ اب بغیر کسی غلط فہمی کے پہنچ جا ان کے پاس۔ اور اپنی ساری پریشانی بتا دے انہیں۔ اب تو ہمارا یہاں سے بھی بوریا بستر سمجھو گول ہونے والا ہے۔ کوئی پروا نہیں اللہ مالک ہے، اور مجھے یقین ہے کہ میجر صاحب ہمیں اس طرح تنہا تو نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ انہوں نے تجھ سے وعدہ کیا ہے۔ لیکن پتا نہیں بعد کے حالات کیا ہوں۔ بیگم صاحبہ کی اور بات ہے، وہ ایک دردمند دل رکھنے والی خاتون ہیں۔ ادارہ چلانے والے یا ملکی معاملات چلانے والے لوگوں کے ہاتھ کہیں نہ کہیں بندھے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن بیگم صاحبہ اوران کا گروہ ہی ایک ایسا ادارہ سمجھو جو صحیح معنوں میں لوہے کو لوہے سا کاٹتا ہے۔ ان کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہوتے۔ چل کاکے! بیگم ولا۔ آج بیگم صاحبہ کو اپنی ساری پریشانی بتادے، کچھ مت چھپانا اُن سے۔"

"تُو بھی میرے ساتھ چلے گا۔" میں نے گمبیر لہجے میں کہا۔

"میں تیار ہوں۔" اس نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہمیں پولیس کا بھی ڈر تھا۔ مگر میجر باجوہ صاحب نے اس سلسلے میں مجھے اتنی تسلی تو دے رکھی تھی کہ جب تک میں یہاں ہوں، وہ مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگم ولا پہنچ چکے تھے تو شام جھکنے لگی تھی۔ میں بے دھڑک اول خیر کو لے کر اندر داخل ہوا۔ شاید میرے آنے کی اطلاع گیٹ پر موجود مسلح محافظوں کو کردی گئی تھی۔ میں جہاں سے گزرتا، میرے لیے دروازے واہ ہوتے چلے جاتے۔ اول خیر البتہ مصلحتاً اپنے یاروں دوستوں کے ساتھ مصروف گفتگو ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ تبدیلی کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ کبیل دادا مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ پھر کسی سے پوچھنے پر پتا چلا کہ بیگم صاحبہ نے ہی اُسے باہر کہیں کسی کام سے بھیجا تھا۔

خوب صورت مرکزی محرابی دروازے کی چوکھٹ پار کرکے جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا تو چونک پڑا۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دیں۔ اگرچہ اس میں کوئی چونکنے والی بات نہیں تھی کہ وہ ہمیشہ میرا یہاں آنے پر عموماً اسی طرح ہی خود آکر استقبال کرتی تھیں، لیکن آج کی بات اور تھی، آج کی ملاقات اور تھی، آج لگتا تھا جیسے کچھ خاص ہو۔ اور وہ اسی "نسائیت" سے ہی تیار ہوکر میرے سامنے کھڑی تھیں۔ پوری تیاری کے ساتھ، تیاری بھی کیسی۔ جیسے آج ان کی شادی کا دن ہو۔ ان کے عنابی ہونٹوں کی سرخی اور اس پر کھلتی دل آویز مسکراہٹ۔ ایسا کیوں تھا؟ میں یہی سمجھا تھا کہ ناراضی ڈھلنے کی خوشی میں ایسی دُلہنوں جیسی سج دھج اس کا التزام قرار پایا ہو؟ ہلکا آسمانی مہین لباس، جو دیکھنے میں بالکل سادہ مگر پرُکار تھا، ایسا کہ ان کے بھرے بھرے جسم پر بالکل فٹ تھا۔ میں ایک ٹک پہلے تو انہیں دیکھتا ہی رہ گیا، وہ اپنے دلنشیں ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے میری طرف سج سج قدم اُٹھاتی ہوئی بڑھیں اور میں جیسے ان کے ٹرانس میں ان کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے اپنا نازک اندام سا ہاتھ میری جانب بڑھا دیا اور میں نے بھی بے اختیار ان کا مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے یہاں آکر ایک سُکھ ایک سکون کا احساس ہونے لگا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لیے کسی اندرونی گوشے کی طرف بڑھنے لگیں۔ ان کے بدن کی عطر بیز نکہت میرے حواسوں پہ چھا رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے دل، دماغ کا سارا بوجھ کہیں باہر چھوڑ آیا ہوں۔ اسی وقت مجھے ماں جی کا خیال آگیا۔ میں نے ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھ لیا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آرام کررہی ہیں۔ آؤ ہم کچھ دیر تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ اپنے اپنے اندر کا بوجھ اُتارتے ہیں۔"

وہ مجھے . . ولا کے کسی گوشۂ تنہائی میں بنے کمرے میں لے آئی۔ کمرے کی فضا بھی معطر تھی، روم فریشر میں گلاب کی خوشبو مہک رہی تھی، کمرے کی روشنی فقط اتنی ہی تھی کہ کچھ قریب سے سجھائی دے سکے، سامنے مسہری تھی، سرخ گاؤ تکیے فینسی اسٹائل کے سرہانے کے پاس دھرے، جیسے کمن کے ہنڈولوں کے منتظر تھے۔

"بیٹھ جاؤ یہاں۔" اس نے مجھے مسہری پر بٹھادیا اور خود چلتی ہوئی، ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے ہوئے موتیے کے گجرے اُٹھا لائی اور بالکل میرے پاس میرے قریب بیٹھ گئی۔ گجروں کی دل آویز خوشبو زہرہ بانو کے بدن کی مہک میں رل مل کر حواسوں پر ایک عجیب سا نشہ طاری کررہی تھی۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا، مگر جتنا مختصر تھا اُتنا ہی قُربت کا احساس جگا رہا تھا، بڑھا رہا تھا۔ ایسے میں زہرہ بانو نے موتیے کا وہ گجرا میری طرف بڑھا دیا اور بہت دھیرے سے بولی۔

"یہ میرے یہاں سجا دو۔" اس نے اشارے سے

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بتایا۔ میں نے گجرا اس کے ہاتھ سے لیا اور تھوڑا آگے جھک کر اس کے ایک کان کے پاس اٹکا دیا، میرے ہاتھ کھینچنے سے قبل ہی اس نے میرا ہاتھ وہیں تھام کر روک دیا اور اپنا مرمریں نازک مگر جلتا تپتا گال میرے کھردرے بالوں بھرے ہاتھ سے لگا دیا۔ ایک تپش، ایک تڑپ سی میرے اندر اٹھی تھی۔ ایسے میں میرا اور اس کا چہرہ قریب، قریب تر ہو گیا۔ اس قدر کہ سانسوں کی بازگشت بھی ایک دوسرے کو صاف سنائی دینے لگی تھی۔

''شہزی! لگتا ہے آج تم زندگی کی ایک طویل سڑک پر دوڑتے دوڑتے تھک گئے ہو۔ اور... اور آج میرے کاندھے پر اپنا سر رکھنے چلے آئے ہو۔ ہے ناں؟''

''ہاں زہرہ، میں واقعی بہت تھک سا گیا ہوں اور شاید ٹوٹ بھی رہا ہوں۔ شاید مجھے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں میں کچھ وقت آرام اور سکون سے سو کے گزار دوں۔''

''شہزی! میرا بھی یہی حال ہے، میں بھی شاید آج ٹوٹ رہی ہوں، بکھر رہی ہوں، آؤ کہ ہم ایک دوسرے کو بچا لیں، نہ میں تمہیں ٹوٹنے دوں نہ تم مجھے بکھرنے دو۔'' کہتے ہوئے وہ میرے قریب آ گئی، بہت قریب۔ اس کی آواز میں جادو تھا ایک سحر تھا، جو مجھے ٹرانس میں لے رہا تھا۔ وہ سرگوشی

میں بولی ''لئیق!''

''عابدہ۔''

ایک فسوں کی وادی تھی جہاں وہ میرا ہاتھ پکڑے مجھے وہاں اُتار رہی تھی اور میں بھی اُترے جا رہا تھا۔

پتا نہیں کب اور کس وقت میری آنکھ کھلی تھی اور میں جیسے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا تھا۔ ہوش و خرد کا یارا ہوا تو سب یاد آنے لگا۔ وہ سب کچھ میرے لیے قطعاً ناقابلِ عمل ہی نہیں بلکہ ناقابلِ تصور بھی تھا۔ میں نے شکر کیا کہ یہ سب ایک خواب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نہ میں لئیق شاہ کی جگہ لے سکتا تھا، نہ زہرہ بانو، عابدہ کی۔ تو پھر یہ کیا تھا اور کیسا خواب تھا؟

میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش میں دیکھا اور ہل کر رہ گیا۔ وہی ماحول تھا، وہی کمرا تھا اور وہی مسہری تھی جہاں میں عابدہ سے بے وفائی کا مرتکب ہوا تھا۔ مگر وہ کہاں تھی؟ زہرہ بانو۔ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مجھے چکر سا آ گیا۔ دماغ گھومنے لگا۔ خود کو یقین دلانے لگا۔ شہزاد احمد خان اتنا کمزور کب سے ہو گیا۔ وہ اگر ہر میدان کا شہسوار تھا اور اب تک بہادری سے اپنے حالات اور دشمنوں سے نمٹتا چلا آ رہا تھا تو پھر یہاں کیوں بزدلی پر آمادہ ہو گیا؟ کیسے؟ کیوں؟ کیا میرے ساتھ اس بار اس نے سازش کھیلی تھی، جسے اپنا سمجھتا آیا تھا؟

اسی وقت کمرے کی دم بہ خود فضا میں تالی بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اُٹھا کے دیکھا اور میری آنکھیں یہ غیر یقینی منظر دیکھنے کے لیے پھیل سی گئیں۔

وہ عابدہ تھی۔ ستا ہوا مرجھایا ہوا چہرہ لیے، آنکھوں میں شکوہ و شکایت کے دیپ جلائے، ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ سجائے کھڑی تھی۔

''واہ شہزی! میں تو تمہیں مردِ آہن سمجھتی تھی۔ مگر تم نے تو اپنی مردانگی یہاں پر ایک غیر عورت کے ساتھ خوب دکھا دی۔ کیا تم اسے مردانگی کہو گے، ہاں؟ نہیں شہزی۔ کم از کم ایسی مردانگی تو تمہیں بالکل شیوا نہیں دیتی تھی، تم نے بس میرا فقط یہی انتظار کیا؟ میری محبت کا یہی پاس تھا تمہاری نگاہوں میں، جسے تم نے آج ہوس کی سولی پر چڑھا دیا۔ یہ کیسا تمہارا جذبۂ محبت تھا شہزی! جس نے تمہیں اس قدر کمزور بنا دیا کہ تم نے پناہ کے لیے میری بانہوں کے بجائے کسی اور کی زُلفوں کو سہارا بنا لیا۔ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی شہزی، کبھی بھی نہیں اور شاید تم بھی خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤ گے۔ تم نے آج میرا مان توڑا ہے۔ میرا دل، میرا اندر توڑ دیا ہے۔ تو کیا میں بھی خود کو بکھرنے سے بچانے کے لیے کسی غیر مرد...''

''عابدہ...!'' میں چلّا اٹھا اور مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

اسی وقت کمرے میں روشنی ہو گئی۔ سامنے زہرہ بانو کھڑی تھی جو اس وقت مجھے ایک زہریلی ناگن کی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ میں مجھے ایک فاتحانہ سی چمک محسوس ہوئی تھی جو میری اس خوش فہمی کو پل کے پل ہوا کیے دے رہی تھی۔ جو میرے اندر ایک موہوم سی اُمید جگائے ہوئے تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ مگر زہرہ بانو کی مسکراہٹ نے مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا اندر سے۔

ایک سوالیہ نشان آنکڑے کی طرح جیسے میرے حلق میں آن اٹکا تھا کہ کیا واقعی یہ ''سب کچھ'' ہو چکا تھا؟

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Downloaded From

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 22

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

READING
Section

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Downloaded From

ایک پھانس سی تھی جو میرے گلے میں اٹک کر رہ گئی تھی، اس سوئے دار پر لٹکے مجرم کی طرح جس کے پیروں تلے سے جلاد نے تختہ کھینچ لیا ہو مگر جان تھی کہ نکل ہی نہ رہی ہو اور یہی اذیت مجھے بھی ادھ موا کیے دے رہی تھی۔

میری اس جاں کش تکلیف کو فزوں تر کرتی وہ مسکراہٹ تھی جو میں اس وقت زہرہ بانو کے لبوں پر مچلتی ہوئی دیکھ رہا تھا۔

''کیا واقعی یہ سب کچھ ہو چکا تھا؟ جو نہیں ہونا چاہیے تھا؟''

مجھے اپنا حلق خشک محسوس ہو رہا تھا، اس قدر کہ منہ سے کوئی الفاظ ہی نہیں نکل رہے تھے۔ بس! اک یک ٹک نگاہ تھی جو زہرہ بانو کے چہرے پہ جم کے رہ گئی تھی۔ جیسے ہی وہ چند قدم اُٹھاتی مسہری کے قریب آئی، میں مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے میں مجھے ہلکا سا چکر بھی آ گیا، یہ شاید نیند سے بیداری کے فوراً بعد اُٹھ کھڑے ہونے کی وجہ سے ہوا تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔

''کک... کیا، کیا ہے تم نے میرے ساتھ؟ کیوں کیا ایسا میرے ساتھ؟'' میرا لہجہ اور الفاظ کا بکھراپن صاف عیاں تھا۔ میں نے دیکھا زہرہ بانو کے چہرے کی مسکراہٹ یک دم حیرت میں بدل گئی... اور وہ بہ دستور میری طرف سوالیہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔

''کیا ہوا؟ میں نے ایسا کیا کر دیا تمہارے ساتھ؟ میں کچھ سمجھی نہیں؟''

اس کے ان الفاظ نے جیسے میرے اندر تک سکون آور لہریں سی دوڑا دیں۔ میں نے بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے خود کو پُرسکون کیا اور دوبارہ مسہری پر بیٹھ گیا۔

''شش... شاید، میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔'' کہتے ہوئے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ شکر ہے کہ بات بن گئی، زہرہ بانو کچھ نہیں سمجھی تھی۔ وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھی، اور پھر بہت دھیرے سے اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے کاندھے پر رکھ دیا۔

''ہاں! تم نے یقیناً کوئی خواب ہی دیکھا ہوگا۔ اس میں تمہارا نہیں، تمہارے حالات، تمہاری پریشانیوں کا ہی دخل ہے۔''

مجھے زہرہ بانو کی بات سے ہی نہیں لہجے سے بھی صاف لگتا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔ میں ایک بار پہلے بھی زہرہ بانو کی ذات پر شبہ کر چکا تھا، جب ماں جی نے شادی والی بات کہی تھی اور اول خیر کے سمجھانے پر مجھے اس کا قلق بھی ہوا تھا، اگرچہ زہرہ بانو نے بھی جواب میں سرکشی کا مظاہرہ کیا تھا جو شاید اس کے فطری ردعمل کا غماز تھا، لیکن بعد میں وہ اس بات کو ایسے فراموش کر گئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا، بلاشبہ یہ اس کا بڑا پن تھا، اور مجھے بھی اسی رویے کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

میں واقعی اس کے سامنے شرمساری سی محسوس کرنے لگا اور دل میں خیال آیا کہ یہی وقت ہے، ایک اُلجھن کو پوری طرح رفع کرنے اور معذرت کرنے کا۔ غلطی تسلیم کرنا بہ ذات خود ایک بڑا پن ہے، لہٰذا میں نے زہرہ بانو کا اپنے شانے پر رکھا ہوا مرمریں ہاتھ آہستگی سے تھام لیا۔ وہ میرے قریب ہی مسہری پر بیٹھ گئی اور میرے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ میں بھی اسی طرح بہ غور اس کا چہرہ تکتا رہا۔ پھر ہولے سے بولا۔

''زہرہ! تم جانتی ہو کہ میں تم سے کوئی بھی بات نہیں چھپاتا ہوں۔ اپنے دُکھ درد، اپنی تکلیفیں، سب تم سے شیئر کرتا ہوں۔ ایسے میں شاید نادانستہ طور پر میرے منہ سے کبھی تمہارے لیے کچھ ایسا نکل جاتا ہے جس سے تمہیں دکھ بھی ہوتا ہو۔ میں اُس روز ماں جی والی بات پر جذباتی ہو گیا تھا اور تمہیں غلط سمجھ بیٹھا تھا، میں اس کی تم سے معافی چاہتا ہوں۔'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس بار بات کو اپنائیت کا رنگ دیتے ہوئے آپ کا صیغہ استعمال نہیں کیا تھا۔

''بس! کہہ چکے؟'' زہرہ نے مسکراتے ہوئے نہایت ملائمت آمیزی سے کہا تو میں دوبارہ بولا۔

''نہیں۔ اور بھی کہنا ہے مجھے۔'' یہ کہتے ہوئے بے اختیار میرے ہونٹوں پہ بھی دھیمی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ اس کی نگاہیں بڑی محبت سے میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ ہمیشہ کی طرح مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہیں دور لے چلی ہو۔

''زہرہ! آج پھر مجھ پر وہی جذباتی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔ آج پھر میں تمہیں ایک الزام دینے لگا تھا۔ میں... سمجھا تھا کہ شش... شاید... کل رات...'' میری آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ مجھ سے جملہ پورا نہیں ہو پایا تھا کہ زہرہ نے نرم آواز میں کہا۔

''میں جان گئی تھی کہ تم کیا سمجھنے لگے تھے۔ اور تم مجھے جیسا سمجھتے ہو اس میں تمہارا بھی تو کوئی قصور نہیں ہوتا۔ اسی لیے... میں بھی اپنا غصہ اپنی ناراضی بھول جاتی ہوں۔ مگر

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شہزی! آج ایک بات تم بھی سن لو۔ زہرہ بانو صرف ایک عورت کا نام نہیں ہے۔ آگاہ ہو ناں تم اچھی طرح میری زندگی سے، میرے ماضی سے۔ میں کیا ہوں، کون ہوں۔ میں خود اپنی ذات میں ایک چٹان ہوں، پختہ ارادوں اور پُرعزم و حوصلے کی مالک عورت ہوں میں۔ کبھی بھی ایسی کوئی حرکت کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی جو میری شخصیت اور میرے کردار کے حوالے سے خود میرے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔ رہے تم، تو میں تمہیں جانتی ہوں، اور عابدہ کو بھی، میں نے کبھی بھی اس بات کو سوچا تو کیا تصور بھی نہیں کیا کہ کبھی میں اس کی جگہ لے لوں۔ ہرگز نہیں۔ میں یہ تمہید بھی کبھی نہیں باندھتی نہ ہی میں نے اس کی ضرورت محسوس کی کیونکہ میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں۔ لیکن آج تمہاری معذرت ..... نے مجھے یہ سب کہنے پر مجبور کر دیا۔" وہ پورے اعتماد، پورے وقار سے یہ سب کہہ کر خاموش ہوگئی۔

لیکن میں نے اس کے صبیح چہرے کی ملاحت میں گھلی ہوئی ایک غم آگیں کسک کو بھی واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کشادہ گوشے، کناروں تک یادِ رفتگاں کے پُرآزار لمحوں کے بوجھ تلے بھیگنے لگے تھے۔

اُس نے بڑے پُروقار انداز میں اپنی صفائی پیش کردی تھی۔ اگرچہ میرا دل پہلے ہی اس کی طرف سے صاف ہوگیا تھا۔ لیکن آج خود اس کی زبانی یہ سب سن لینے کے بعد میری تمام غلط فہمی دور ہوگئی تھی۔

دل کی کدورتیں اس طرح دُھل جانے کے بعد ہم دونوں چند ثانیے ایک دوسرے کو گہری نظروں اور وسعتِ دل کے ساتھ دیکھ کر ہولے ہولے مسکرانے لگے، ایسے میں زہرہ نے میری ناک کی پھنگی کو ہولے سے چھوتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"تم مجھے کبھی کبھی کسی شریر بچے کی طرح ستاتے بھی ہو اور سن بھی جاتے ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا اچھی لگی۔ لیکن شہزی! مجھے مت ستایا کرو۔ جانتے ہو نا، میں اندر سے کس قدر دُکھوں اور غموں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہوں؟" اس کا لہجہ پھر رقتی ہونے لگا۔ میں نے دھیرے سے اور کچھ اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی نرماہٹ سے کھیلتے ہوئے بولا۔

"بھلا میں آپ کا غم نہیں جانوں گا تو کون جانے گا؟ لیکن اس سچ کو تو آپ بھی جھٹلا نہ پائیں گی کہ آپ کا غم وقت کی گرد میں ایک دفن شدہ غم ہے۔ جس کی قبر ہمیشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔ لیکن میں اپنے دُکھ کو کیا نام دوں زہرہ؟ جو نہ مدفن ہے نہ ہی اس کی کوئی قبر ہے کہ جس پر میں آنسو بہا کر اپنے دُکھ کا بوجھ ہلکا کرسکوں۔ بلکہ میرا غم تو میرے لیے اک عذابِ مسلسل ہے۔ ایک غم ناتمام ہے۔ جس کا کوئی انت ہی نہیں۔

یہ ایک کربیہ حقیقت صحیح، لیکن دستورِ دنیا یہی ہے کہ مرنے والے پر صبر آ ہی جاتا ہے۔ لیکن... میں کیا کروں۔ کہاں اپنا سر پٹخوں۔ کدھر جاؤں میں۔ کہاں روؤں میں کہ میری عابدہ تو میری آنکھوں کے سامنے دور کردی گئی۔ بہت دور... اتنی دور کہ سمندروں پار چلی گئی۔ ایک ایسے دیسِ اغیار میں جہاں وہ معصوم بھوکے کرگسوں کے غول میں جا پھنسی ہے، جہاں اس کے پاس سوائے خدا کے کوئی نہیں۔ اور میں یہاں بے بسی سے ہاتھ مل رہا ہوں۔ یوں جیسے اس غریب کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔"

یہ کہتے کہتے میرا اپنا لہجہ بھی رُندھ گیا۔ ایک غبار سا تھا جس سے میرا سینہ بھر گیا تھا۔ مجھے گھٹن سی ہونے لگی۔ اور میں جیسے ہچکیاں لینے کے انداز میں لمبے لمبے سانس لینے لگا تو بے اختیار زہرہ بانو نے میری جھکی ہوئی گردن کے گرد اپنے مرمریں اور مہربان بازوؤں کا حصار بنا کر خود سے لگا لیا۔

"ماں جی کی طبیعت کیسی ہے؟ میں تو ابھی تک ان سے مل بھی نہیں سکا۔" میں نے دھیرے سے خود کو اس سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ ٹھیک ہی ہیں۔ ابھی میں نے انہیں تمہارے بارے میں نہیں بتایا ہے کہ تم آئے ہوئے ہو۔"

"کیا وقت ہو رہا ہے؟"

"رات کے بارہ بج چکے ہیں۔" اس نے جواب دیا اور بے اختیار میں ہڑبڑا سا گیا۔ مجھے اول خیر کا خیال آیا، وہ بھی میرے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس وقت شام ڈھلنے لگی تھی۔ اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا۔ مجھے اس طرح لیٹے ہوئے شاید پانچ چھ گھنٹے بیت ہی چکے تھے۔

"وہ... اول خیر بھی میرے ساتھ تھا۔"

"وہ بھی ادھر ہی ہے۔ جاگ رہا ہے۔" زہرہ بانو نے جواب دیا۔ "تم منہ ہاتھ دھو کر ذرا فریش ہو جاؤ۔ پھر اکٹھے کھانا کھاتے ہیں۔"

"ماں جی جاگ رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سوگئی ہیں۔"

"اول خیر نے کھانا کھالیا؟"

"میں نے پوچھا تھا۔ کہہ رہا تھا، تمہارے ساتھ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کھاؤں گا۔"

"مجھے کھانے کی کوئی خاص طلب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں پہلے ہی سو کر بہت سا وقت ضائع کر چکا ہوں۔۔۔۔ ابھی مجھے۔۔۔ کئی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنا تھا، مگر میں تو یہاں آ کر کہیں اور ہی کھو گیا۔ بے چارہ اول خیر بھی اکیلا بور ہو رہا ہوگا۔"

"لگتا ہے پریشانی کے باعث کافی دنوں سے تم نیند نہیں کر سکے شاید اسی لیے تھوڑا آرام ملتے ہی بے سدھ ہو کر سو گئے۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ہاں! یہی بات ہے۔" میں نے کہا اور مسہری سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمیں کسی ایسے کمرے میں بیٹھنا چاہیے جہاں میں اول خیر کو بھی اپنے ساتھ بٹھا سکوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم واش روم سے ہو آؤ۔ پھر نشست گاہ میں آ جانا۔ کنبیل دادا بھی وہیں آئے گا۔" یہ کہہ کر وہ مسہری سے اُٹھی اور دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو میں نے آواز دی۔

"زہرہ!" میری آواز پر اس کے بڑھتے ہوئے قدم یک دم تھم گئے، وہ پلٹی اور مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

"ہوں۔۔۔ کہو۔" اس کے عنابی لبوں سے مجھے شگفتگی سی ٹپکتی محسوس ہوئی۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ اور اس کے بالکل قریب پہنچ کر رک گیا اور بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بھی منہ سے کچھ نہ بولی، جیسے وہ دانستہ ان لمحات کو طول دینا چاہ رہی ہو، جیسے وہ چاہ رہی ہو کہ میں اُسے اسی طرح گہری نظروں سے دیکھتا رہوں اور وہ میری طرف۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم نے ماں جی سے بات کی تھی؟"

"کون سی بات؟" وہ سوالیہ نگاہوں سے تکتے ہوئے بولی۔ جانے کیوں مجھے لگا جیسے وہ دانستہ انجان بننے کی کوشش کر رہی ہو۔

"وہی، ماں جی کو قائل کرنے والی بات۔" بالآخر میں نے یاد دلایا تو اس کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ کچھ دیر پہلے میرے بہ غور اس طرح تکتے رہنے پر اس کے چہرے اور آنکھوں سے جو لطافت انگیز کشش سی مترشح تھی وہ ہوا ہونے لگی تھی۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے۔۔۔۔ دھیرے سے بولی۔

"ہاں! لیکن ابھی میں پوری طرح ان سے بات نہیں کر سکی ہوں۔"

"وجہ؟" میں نے مختصراً پوچھا۔ لمحے بھر کو اس نے میری طرف قدرے گہری نگاہ سے دیکھا تھا، پھر اپنا چہرہ داہنی جانب موڑ کر پھیکے پھیکے سے لہجے میں بولی۔

"یہ ایسی بات نہیں ہے کہ ایک دم اور ایک ہی وقت میں ماں جی سے کہہ ڈالوں، اس طرح وہ یہ بات اپنے دل میں بھی لے سکتی ہیں، موزوں وقت پر اُنھیں سمجھا دوں گی، تم اس کی فکر نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ نہیں رکی اور دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا، دروازے کی خالی چوکھٹ کو تکتا رہ گیا۔ ایک بار پھر میرا ذہن شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگا تھا۔ کیا ایسا وہ دانستہ کر رہی تھی یا پھر واقعی اُس کی بات ٹھیک تھی۔

میرے پاس یہ سب سوچنے کا وقت نہ تھا لیکن میں اب ماں جی کے سامنے جانے سے بھی کترانے لگا تھا کہ وہ مجھ سے میرا "جواب" پوچھ سکتی تھیں۔ جس کے لیے میں نے اُنھیں اب تک مصلحتاً ٹالا ہوا تھا، تاکہ تب تک زہرہ بانو اُنھیں اپنے طور پر قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

کچھ دیر گزری۔ میں اور اول خیر نشست گاہ میں موجود تھے۔ اول خیر میرے چہرے کی طرف بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولا۔

"خیر ہے کاکے، تو سو گیا تھا؟" اس نے شاید میری آنکھوں اور چہرے کی اُلساہٹ سے یہ اندازہ قائم کیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"ہاں! پتا نہیں کیوں یہاں آتے ہی مجھے گہری نیند سی آ گئی تھی۔"

"او خیر۔" بہت ہولے سے اس کے منہ سے یہ برآمد ہوا تھا۔ جانے کیوں میں بھی اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مجھ سے شاکی ہو رہا ہو۔

"کیا مطلب؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپی سی مسکراہٹ سے بولا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ تو اندر بیٹھا بیگم صاحبہ سے مسئلے مسائل پر تفصیلی گفتگو کر رہا ہوگا۔ مگر تو تو ایسا اندر گیا کہ سوتا ہی رہ گیا۔" اس نے ابھی اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ زہرہ بانو اندر داخل ہوئی، اس کے ہمراہ کنبیل دادا بھی تھا۔

زہرہ بانو کو دیکھ کر اول خیر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا، پھر ان کے بیٹھتے ہی وہ بھی بیٹھ گیا۔ اگرچہ اب اس کا بیگم صاحب کے گروپ سے کوئی تعلق نہ رہا تھا، مگر وہ آج بھی اس کا

READING Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

احترام اسی طرح کرتا تھا، جیسے پہلے کیا کرتا تھا۔

کبیل دادا نے ایک نگاہ میرے قریب بیٹھے اول خیر پر ڈالی تھی، پھر میرے چہرے پر نظریں جما دیں۔ کمرے میں ہم چاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور میں نے اول خیر کے مشورے کے مطابق زہرہ بانو کو سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کے خفیہ گٹھ جوڑ سے لے کر اس کی گواہی کی ضرورت سے لے کر ممتاز خان کی گرفتاری اور اس کی بیٹی نوشابہ کے میرے خلاف میدان میں اُترنے تک اور بلیو ٹیکسی کے کرنل سی جی بجوانی سے متعلق میرے باپ کی مشروط حوالگی۔ سب کچھ اس کے گوش گزار کر دیا۔

اگرچہ ان میں سے کچھ باتیں اس کے علم میں بھی تھیں، مگر یہ ساری باتیں پوری صراحت سے سننے کے بعد اس کا چہرہ بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا، قریب بیٹھے کبیل دادا نے بھی یہ سب غور سے سنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک شاید زہرہ بانو کے بولنے کا انتظار کرتا رہا، پھر اسے پُرسوچ خاموشی میں پا کر مجھ سے بولا۔

”تم نے اپنی غلط منصوبہ بندی اور ہم سے دور رہنے کی وجہ سے خود کو ان گنت مسئلوں میں پھنسا لیا ہے۔ جس کے باعث خود ہمیں بھی سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ ہمیں پہلے کون سا قدم اُٹھانا چاہیے؟“

نجانے یہ بات کبیل دادا نے کیا جتانے کے لیے مجھ سے کہی تھی۔ اس طرح کی ”کراس ٹاکنگ“ میں وہ زہرہ بانو کو بھی مجھ سے اختلاف کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں نے اس کی طرف سرد نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے آج تک اپنے کسی فیصلے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہوا ہے۔ ہاں! کہیں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہوگی، تو میں بعد میں اس کی تلافی یا درستگی کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔“

”اس میں شہزی کا کوئی قصور نہیں کبیل دادا!“ بالآخر زہرہ بانو نے اس سے مخاطب ہو کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”جو شخص ایسے گوناگوں حالات کا شکار رہا ہو، اس میں اچھے بھلے آدمی سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب ایسی گفتگو پر بحث کرنا وقت کے زیاں کے سوا کچھ نہیں، بہتر یہی ہوگا کہ ان مسائل کے حل کی طرف توجہ دینا چاہیے ہمیں۔“ زہرہ بانو کے ٹوکنے پر کبیل دادا نے چپ سادھ لی تھی۔

”شہزی! بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مسائل آپس میں الجھ کر گڈمڈ ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان کے سرے بھی آپس میں کہیں نہ کہیں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اب میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ ان میں کسی ایک مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہاتھ ڈالا جائے تو باقی کا حل بھی ازخود سامنے آ جائے گا۔ اس لیے پہلے مرحلہ وار اسی مسئلے پر ہاتھ ڈالا جائے جو پہلے حل کرنے کا متقاضی ہے، ورنہ تو مسائل سارے ہی اہم ہیں۔“

زہرہ بانو نے بھی وہی بات کہی تھی جس کا اظہار شکیلہ ہم سے کر چکی تھی۔ زہرہ نے سامنے لگے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر خود کلامیہ انداز میں بولی۔

”میرا خیال ہے اب تو رات ہو گئی ہے۔ ورنہ میں ابھی اپنے وکیل سے بات کر کے مشورہ کر لیتی، خیر، میں کل صبح خود اس سے ملنے نکل جاؤں گی اور سب سے پہلے تمہارے خلاف کٹی ایف آئی آر کو کالعدم قرار دلوانے کی کوشش کروں گی۔ مجھے اُمید ہے پوری کہ فاروقی کوئی نہ کوئی ایسی قانونی شق ڈھونڈ لے گا۔ ساتھ ہی تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری بھی کروانا ہوگی۔ رہی بات بابا جان کی رہائی کی تو میں سمجھتی ہوں، انہیں کرنل سی جی کے چنگل سے چھڑانے کا یہ اچھا موقع تمہارے ہاتھ لگا ہے۔ اور اس سلسلے میں تم میجر صاحب کو بھی اپنے اعتماد میں لے چکے ہو مگر یہ کام تم صرف اپنے بل بوتے پر کرنے کا رسک مت لو۔“

”اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھے پاور والوں یا کسی بھی ایسے ادارے سے مدد لینی چاہیے تو یہ ناممکن ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور اسے پی ایس ایف (پاور سیکریٹ سروس) کے ڈراپ آف کیے جانے کی بات دہرا دی تو وہ فوراً نفی میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”ایسی غلطی کرنا بھی نہیں شہزی! یہ کام تمہیں خالصتاً اپنے بل بوتے پر کرنا ہوگا، جس کی کوئی پلاننگ یا لائحہ عمل یقیناً پہلے سے ہی تمہارے ذہن میں ہوگا۔“

میں نے اس کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بات صحیح ہے۔ ورنہ میجر ریاض باجوہ بھی بہت پہلے مجھے یہ مشورہ دے چکے ہوتے۔“

”تم کب تک اس مشن کو کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”کرنل سی جی یا اس کا کوئی آدمی مجھ سے رابطہ کرنے والا ہے...۔ اس ڈیل کے سلسلے میں مجھے خود ہامی بھرنا ہوگی۔“

”جب تم نے حتمی فیصلہ کر لیا ہے تو تم خود ہی کرنل سی جی سے رابطہ کر کے اُنہیں بتا کیوں نہیں دیتے؟“

”سی جی نے خود مجھ سے کہا تھا کہ وہ مجھے دوبارہ اس

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نمبر پر نہیں ملے گا البتہ بہت جلد وہ یا اس کا کوئی آدمی خود ہی مجھ سے رابطہ کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہارے ساتھ اس مشن میں کون کون ہوگا؟" کسی خیال کے تحت اس نے پوچھا۔

"میں، اول خیر اور شکیلہ ہوں گے۔"

"کبیل دادا بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔" زہرہ نے فوراً کہا۔ میں نے بے اختیار زہرہ بانو کے قریب بیٹھے کبیل دادا کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ آفرین ہے اس شخص پر کہ مجھ سے لاکھ جذبۂ رقابت رکھنے کے باوجود وہ "بیگم صاحبہ" کے کسی بھی حکم پر ناک بھوں نہیں چڑھاتا تھا۔ اس نے فوراً ان کے حکم کی تکمیل میں اپنا سر دھیرے سے خم کیا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے اول خیر کی طرف دیکھا تھا۔ زہرہ بانو کے حکم اور کبیل دادا کا اس حکم کے سامنے فوراً تعمیل پر اس کے چہرے پر بھی گہری طمانیت کے آثار پھیل گئے تھے۔

"میں کبیل دادا کو تمہاری تحویل میں دیتی ہوں۔ اس خطرناک مگر اہم اور رسک فل مہم میں اس کا بھی ہونا ضروری ہے۔" زہرہ نے آخر میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا تو میں نے بھی ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔ مجھے خود بھی اس مہم کی حساسیت اور اہمیت کا ادراک تھا اور مجھ سے زیادہ شاید اول خیر کو کیونکہ یہ اسی کا مشورہ تھا کہ ہمارے ان گنت مسائل میں بیگم صاحبہ کے گروہ کا ساتھ ضروری تھا، اور پاور کے متوقع طور پر ڈراپ ہونے کے بعد تو یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح زہرہ بانو اپنے کسی ساتھی کے ہمراہ فاروقی نامی وکیل سے ملنے چلی گئی جبکہ ہم بیگم ولا میں ہی موجود رہے۔ مجھے کرنل سی جی یا اس کے کسی آدمی کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔

میجر ریاض باجوہ کے وعدے کے بعد میں جلد سے جلد اس مشن کو پورا کرنا چاہتا تھا، نجانے بعد میں کیا اور کیسے حالات ہوتے، کسے پتا تھا۔ میجر صاحب کا ہامی بھرنا مشکل ضرور مگر ناممکن نہ تھا۔ یہ بھی اُنہوں نے بلاشبہ ایک بہت بڑا رسک مول لے کر ہی کیا تھا۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ مہم اپنی تکمیل کو پہنچ جائے۔

اول خیر نے میرے کہنے پر شکیلہ کو فون کر کے اب تک کے حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ کبیل دادا ہمارے ساتھ کافی دیر بیٹھا، مجھ سے اس نئے مشن کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کرتا رہا، وہ اول خیر سے بالکل بھی مخاطب نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ اُس غریب کو یوں نظر انداز کیے ہوئے تھا جیسے وہ اُسے جانتا ہی نہ ہو۔

مجھ سے زیادہ اول خیر کا کبیل دادا سے ساتھ رہا تھا۔ دونوں میں "بڑے اُستاد" اور "چھوٹے اُستاد" کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلق تو ضرور ہی رہا تھا۔ اب ماضی کے ایک پرانے ساتھی کے ایسے بے تعلق رویے کو دیکھ کر اول خیر کا اندر سے دُکھی ہونا فطری تھا۔

میرے جی میں آئی کہ میں اسی وقت اِن دونوں کے بیچ صلاح کروانے کی کوشش کروں، اور کبیل دادا کو سمجھاؤں، مگر پھر مجھے یاد آیا کہ میں اس سلسلے میں زہرہ بانو سے بہت پہلے بات کر کے یہ کوشش کر چکا تھا، مگر مجھے ناکامی ہوئی تھی، حالانکہ مجھے اس بات کا زعم بھی تھا کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی، لیکن اس نے بھی مجھے اپنی تنظیم کے کچھ اُصولوں کے حوالے سے خاموش ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے کبیل دادا کو بتایا کہ میرے ذہن میں کیا لائحہ عمل تھا نیز اس مشن کی ابتدا اٹاری کے کسی قریبی علاقے میں ہونا تھی۔ میری طرح اس نے بھی یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ کرنل سی جی ہمارے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کر سکتا تھا۔ لیکن ہم نے مہم کی ابتدا میں کون سے ضروری اقدامات اُٹھانے تھے، اس پر ہم کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔

ایک موقع پر میں کبیل دادا سے تھوڑی دیر کے لیے معذرت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا اور ماں جی کے کمرے کا رخ کیا۔

ہم نے ابھی ماں جی کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی، کیونکہ یوں بھی ابھی ماں جی کو یہ سب بتانا قبل از وقت ہی ہوتا۔ جس دُکھ کو وہ عرصہ دراز سے وقت کی گرد میں دبائے ہوئے تھیں، میں ابھی اُسے دبا ہی رہنے دینا چاہتا تھا، جب تک میں اپنے باپ اور ایک دُکھیاری ماں کے سر کا تاج ان کی آنکھوں کے روبرو نہ پیش کرتا، اس سے ابھی ماں جی کو آگاہ کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ اس اہم مشن کی کامیابی کے لیے ماں جی کی دعائیں ضرور لوں۔

میں ان کے کمرے میں گیا اور مجھے دیکھتے ہی اُنہوں نے وفورِ جذبات سے اپنی بوڑھی بانہیں پھیلا دیں اور کپکپاتے لہجے میں بولیں۔

"شہزی پتر، تو۔" میں آگے بڑھ کر ان کے ممتا بھرے دامن میں سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی محبت اور

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شفقت سے میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دعائیہ لہجے میں بولیں۔ ''اللہ تجھے سلامت رکھے پتر! کیسا ہے تُو؟''

''میں ٹھیک ہوں ماں! تُو بتا، یہاں تجھے کوئی تکلیف تو نہیں۔'' میں نے یونہی پوچھا تھا، ورنہ میں جانتا تھا، بھلا ماں جی کو یہاں کیا تکلیف ہوسکتی تھی۔ وہ بولیں۔

''بالکل نہیں پتر! یہ میری اپنی دھی کا گھر ہے۔ بھلا یہاں مجھے کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ زہرہ بے چاری تو سگی بیٹیوں کی طرح میری خدمت کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے پتر! مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔ دیکھا جائے تو اَب کیا لگتی ہے وہ ہماری؟ کہنے کو تو بہو ہے، مگر ایک بہو کا بھی ساتھ تب ہی جانا جاتا ہے جب تک اس کے سر کا تاج سلامت رہے۔ لیکن وہ تو بیوہ ہونے کے بعد بھی ہمارے ساتھ خون سے بھی بڑھ کر رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ یہ اس کی ہمارے ساتھ محبت ہے، اور پھر بیوگی کا داغ بھی تو دیکھو۔ عین رخصتی کے وقت۔ وہ کنواری بیوہ ہوگئی۔ یہ محبت اور عقیدت کی انتہا ہے پتر! اس سے بڑھ کر کسی کے خلوص کی اور کیا مثال ہوسکتی ہے بھلا۔ اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ...''

ماں جی فرطِ جذب تلے سسک پڑیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ وہ اپنا جملہ بھی پورا نہیں کرسکی تھیں، ان کے ضعیف لب کپکپا رہے تھے۔ آج ماں جی نے جس طرح زہرہ بانو کے کردار اور اوصاف کا میرے سامنے نقشہ کھینچا تھا، اس نے مجھے بھی یہ ادراک بخشا تھا کہ زہرہ بانو واقعی ایک بلند کردار اور اعلیٰ ظرف کی حامل خاتون تھی۔ ماں جی کی بات غلط نہ تھی۔ زہرہ بانو ہماری کیا لگتی تھی؟ بس! اپنے محبوب اور مرحوم شوہر کی محبت کی نشانی کے طور پر ہی وہ ماں جی سے، مجھ سے اپنا ایک ایسا رشتہ قائم کیے ہوئے تھی، جس کی مثال تو خون کے رشتوں میں بھی ملنا مشکل ہوگی۔

''آفرین ہے پتر! اس کڑی زہرہ بانو پر جس نے محض پتر لئیق شاہ کے حوالے سے ہمارے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط بنا رکھا ہے۔'' ایک ذرا توقف کے بعد ماں جی نے اپنی چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ماں جی! تُو ٹھیک ہی کہتی ہے۔ بھابی زہرہ واقعی بھائی لئیق شاہ کے ساتھ اپنی محبت کو نہیں بھولی ہیں۔ ہمارے ساتھ ان کا پُرخلوص اور محبت بھرا رویہ اس کی زندہ مثال ہے۔''

''لیکن... شہزی پتر! سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ وہ تو اپنی محبت نبھا رہی ہے ہمارے ساتھ۔ مگر ہم اس کے لیے کیا کررہے ہیں؟ کیا یہ خودغرضی نہیں ہماری کہ ہم اس کا دُکھ درد جانتے ہوئے بھی انجان بنے بیٹھے ہیں؟''

ماں جی کی اس بات پر میں محتاط سا ہونے لگا۔ گفتگو اسی نہج پر آرہی تھی شاید، جس سے میں کترائے ہوئے تھا۔ میں چپ رہا۔ کمرے میں چند ثانیے کے لیے دم بہ خود سی خاموشی چھائی رہی، پھر اس سکوت کو ماں جی کی مرتعش آواز نے ہی توڑا۔

''پتر! ہم اس غریب کا دُکھ تو بانٹ سکتے ہیں ناں۔ جو ہمارے اختیار میں ہے وہ تو ہم کرسکتے ہیں ناں اس کے لیے۔ اس کا میں نے تجھے راستہ بھی دکھایا مگر تُو نے ابھی تک مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔ دیکھ پتر! زہرہ کے لیے تُو بھی لئیق شاہ بن سکتا ہے۔ میں ایک عورت ہوں ناں۔ اسی لیے مجھے پتا ہے وہ تجھے لئیق شاہ کے ہی روپ میں دیکھ رہی ہے۔''

ماں جی کی اس بات نے ایک بار پھر میرے اندر وہی دھکڑ پکڑ سی مچا دی۔ میرا دماغ ایک بار پھر گرم ہونے لگا۔ لیکن میں ماں جی سے سخت لہجے میں بات کرتا تو کجا ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں خود اُلجھا ہوا تھا کہ آخر ابھی تک زہرہ بانو نے کیوں نہیں ماں جی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ جو ماں جی سوچ رہی تھیں وہ میرے لیے ناممکن تھا۔

بہرحال میں نے پہلے کی طرح نہایت تحمل اور میانہ روی اختیار کرتے ہوئے اس بار خود ہی ماں جی کو دوسرے طریقے سے سمجھانے کی کوشش چاہی کہ انہیں دُکھ بھی نہ پہنچے۔ لہٰذا اشاروں کنائیوں سے کام لیتے ہوئے بولا۔

''ماں جی! آپ کا حکم سر آنکھوں پہ۔ لیکن آپ جیسا سوچ رہی ہوں، کیا خبر ویسا نہ ہو۔ میں تو اس روز بھی ڈر گیا تھا جب آپ نے زہرہ بھابی کے سامنے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی۔ کہیں انہیں دُکھ نہ پہنچا ہو آپ کی بات سے۔ حالانکہ آپ کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ بھی ہوگیا ہے کہ وہ بھائی لئیق شاہ سے کتنی شدید محبت کرتی تھیں بلکہ کرتی ہیں۔ پھر بھلا وہ اس کی جگہ کسی اور کو کیسے دے سکتی ہیں؟''

میں نے اپنے تئیں بہت نپے تلے انداز میں ماں جی کو ایک منطقی پوائنٹ آف ویو سے سمجھانے اور اُنہیں ان کی ضد سے ہٹانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس کے برعکس ماں جی پورے اطمینان اور قدرے اسرار بھرے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولیں۔

''شہزی پتر! مائیں حکم نہیں دیا کرتیں، ان کی بات ہی سعادت مند اولاد کے لیے حکم کا درجہ ہوتی ہے، میں تیری ماں کے علاوہ ایک عورت بھی ہوں۔ اور ایک عورت دوسری عورت کی نگاہوں اور اس کے انداز و اطوار سے بہت کچھ جان اور سمجھ لیتی ہے، مجھے زہرہ بیٹی کی آنکھوں میں لئیق شاہ

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کی تصویر تو ضرور دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے عکس میں درپردہ مجھے تیری شبیہ بھی نظر آتی ہے۔ اُس روز میں نے بہت سوچ سمجھ کے اپنے منہ سے یہ بات نکالی تھی، اور میری نگاہوں نے زہرہ بیٹی کے چہرے سے تو نہیں البتہ تیری صورت سے جھلکتا صاف انکار بھانپ لیا تھا۔ تو مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کر۔ میں سب سمجھتی ہوں، تجھے یہ بات نہیں پسند تو نہ سہی۔ مگر اس طرح میں زہرہ بیٹی کے سامنے خود کو چھوٹا ہی محسوس کرتی رہوں گی۔ خیر! تیری مرضی پتر!"

ماں جی کا لہجہ دُکھی ہونے لگا۔ میں اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ ماں جی کی بات نے مجھے شرمندہ بھی کیا تھا۔ ایک طرح سے میں ان کا دھیان بٹانا چاہ رہا تھا، مگر انہوں نے تو مجھے چکرا کر رکھ دیا، جھوٹ میں بھی ماں سے نہیں بول سکتا تھا۔

ایسے میں زہرہ بانو کی وہ گفتگو میری سماعت میں گونجنے لگی۔ جو ابھی تھوڑی دیر قبل اس نے مجھ سے اپنے متعلق کہی تھی۔ اس کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا، یہ بات اب میرے سامنے طے شدہ تھی۔ بات صرف ماں جی کے محسوسات کی تھی اور میری رضامندی کی۔ وہ ماں جی بھی سمجھ چکی تھیں، اب میں مزید ان سے پہلوتہی نہیں کرسکتا تھا۔ جس کڑے امتحان پر میں پورا اُترنے کے لیے انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا تھا وہ اب جیسے لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح میرے سر پہ معلق ہوگیا تھا۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور میں خاموش ہوگیا تھا۔ اچانک میں نے ماں جی کے ممتا بھرے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ وہ بڑی محبت سے میرے سر پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگیں، میں نے نگاہ اُٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ قدرے چونک کر بولیں۔

"تو رو رہا ہے۔ میرا پتر؟ میرا لعل!" میری بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر ماں جی نے تڑپ کر کہا۔ "لگتا ہے میری بات سے تیرا دل دُکھا ہے۔ تو شش شاید کسی اور کو پسند کرتا ہے۔ تو اس میں اتنا دُکھی ہونے کی کیا بات ہے میرے لعل! ہاں۔ یاد تو آرہا ہے مجھے، تیرے ساتھ میں نے ایک لڑکی کا نام تو سنا تھا۔ شش شکیلہ نہیں... عا... عابدہ۔"

"ہاں ماں جی! عابدہ ہی نام ہے اس لڑکی کا۔ جسے میں بہت چاہتا ہوں۔ اور وہ مجھے۔"

"وہ کہاں ہے؟ میں نے تو کبھی دیکھا ہی نہیں اُسے۔" ماں جی نے پوچھا تو میں بے اختیار ایک دُکھ بھری ہنکاری خارج کرکے رہ گیا بولا۔

"وہ بے چاری ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوگئی ہے ماں جی!"

"کیسی مصیبت؟"

☆ عورت اور روپے کے سامنے کبھی کبھی قانون اور انصاف بھی بے بس ہوجاتے ہیں۔

☆ بہت سی عورتیں اپنے جسم سے زیادہ اپنے غموں کا میک اپ کرتی ہیں۔

☆ ہر لڑکی اسٹین گن ہے۔ غلط باتوں میں۔

☆ مور میں ایک بڑی خوبی ہے۔ وہ عورتوں کی طرح کسی دوسرے کی دم پر رشک نہیں کرتا۔

☆ ہر خرگوش کیلی یا گنگ پر بہترین تقریر کرسکتا ہے۔

"یہ لمبی کہانی ہے ماں جی! پھر کبھی .... سنادوں گا۔ تم اُس بے چاری کے لیے دعا کرسکتی ہو تو کرلینا۔ اس نے میری خاطر بڑی قربانی دی ہے۔" عابدہ کے بارے میں بتاتے ہوئے میرا لہجہ میرا آپ اندر سے گمبھیر ہونے لگا تھا اور ماں جی بڑے غور سے میری بات، میرے چہرے اور میری کیفیات کا بھی جائزہ لیتی جارہی تھیں۔ بولیں۔

"تو پھر تو نے اس بے چاری کو کلا (اکیلا) چھوڑ دیا؟ اس کی اب تک مدد کیوں نہیں کرسکا؟"

"اسی غم نے تو مجھے ادھ موا کررکھا ہے ماں جی! میں کتنا بے بس اور مجبور ہوں نہ اب تک اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔" میں نے کہا تو ماں جی خاموش ہوگئیں۔

میں نے دیکھا ان کا چہرہ کچھ بجھا بجھا سا ہوگیا تھا۔ میں جانتا تھا ان کو زہرہ بانو کا غم تھا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھیں اور ایک ماں کی طرح وہ اس کی فکر بھی کیے ہوئے تھیں۔ وہ ابھی تک اُسے اپنی بہو کے درجے پر رکھے ہوئے تھیں، نہ صرف یہ بلکہ ایک ماں کی طرح اس کے لیے پریشان بھی رہتی تھیں۔

ماں جی پریشانی میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ اس کا حل مجھے ہی تلاش کرنا تھا اور ایک اور بات بھی اچانک میرے ذہن میں اُبھری تھی، جس کا مجھے خود بھی افسوس تھا کہ میرا پہلے کیوں نہیں اس طرف دھیان گیا تھا۔ وہ یہ کہ ماں جی نے جس طرح آج زہرہ بانو کے دردناک دکھوں کی تصویر کھینچی تھی اس نے میرے اندر بھی اس کے لیے ایک ہمدردی کا جذبہ بھر دیا تھا، کیا غلط کہا تھا ماں نے کہ زہرہ واقعی کیا لگتی تھی ہماری؟ مگر ماں جی کی خدمت وہ بالکل اسی طرح ہی کرتی تھی جیسے وہ ان کی بیٹی ہو۔ کیا ایسے بھی دنیا میں بے لوث اور پرخلوص رشتے ہوتے ہیں۔ جو بلا کسی غرض کے یا کسی خاندانی نسبت کے اس قدر محبت بھرے ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں۔ زہرہ بانو کے علاوہ بھی اول خیر اس کی مثال تھا۔ وہ بھائیوں سے بڑھ کر مجھے چاہتا تھا اور میں

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اُسے۔

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ہی زہرہ بانو کی تنہائیوں اور اندر کی آباد ویران دنیا کی گھٹی گھٹی آہوں کو میں نے صحیح معنوں میں محسوس کیا تھا اور اس کا درد میرے دل میں بھی جاگا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا ایک حل ایکاایکی ہی عود کر آیا تھا۔ بس! تھوڑی کوشش کی دیر تھی، اس سے زہرہ بانو کی تنہائیوں کا بھی کسی حد تک ازالہ ہوجاتا اور ماں جی بھی اُسے خوش اور ”آباد“ دیکھ مطمئن و مسرور ہوجاتیں۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کرکے ماں جی سے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

”ماں جی! میرے ذہن میں اس کا ایک حل ہے۔ آپ زہرہ بانو کو خوش دیکھنا چاہتی ہیں ناں۔ بس یہ کام اب آپ مجھ پر چھوڑ دیں اور تھوڑا انتظار کرلیں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں زہرہ بانو کے دُکھوں کا مداوا کرکے رہوں گا۔“

”تُو نے ایسا کیا سوچا ہے پتر؟“ ماں کے چہرے پر بھی خوش اُمیدی کے تاثرات لرزنے لگے تھے۔ میں نے اُنہیں بڑی محبت کے ساتھ دونوں بازوؤں میں سنبھالا اور مسکرا کر بولا۔

”یہ آپ کو جلد ان کے چہرے سے معلوم ہوجائے گا۔ بس دعا کیجیے گا کہ میں اس نیک کوشش میں کامیاب رہوں۔ ابھی میں کچھ اپنی پریشانی میں ہوں جو انشاء اللہ جلد دور ہوجائے گی اور میرے لیے بھی دعا کیجیے گا بلکہ عابدہ کے لیے بھی کہ وہ جس مصیبت کا شکار ہے بہت جلد اس سے نجات پالے۔“

”انشاء اللہ میرے پُتر انشاء اللہ۔ میرا رب سوہنا ضرور عابدہ بیٹی کی مصیبت بھی دور کرے گا اور تیری بھی۔“

”آمین ماں جی آمین، اللہ تعالیٰ آپ کی زبان مبارک کرے۔ آپ نے دعا دے دی مجھے تسلی ہوگئی۔“ میں اطمینان بھرے لہجے میں بولا اور پھر ماں جی کی پیشانی چومی۔ اُنہوں نے ممتا بھرے انداز میں میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور زیرِلب کوئی دعا پڑھ کر مجھ پر پھونک ماری۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

نشست گاہ میں پہنچا تو میرا رواں رواں مسرور اور مطمئن تھا۔

ماں جی کی دعاؤں نے میرے اندر حوصلے اور عزم کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

میں نے زہرہ بانو کے لیے جو کچھ سوچ رکھا تھا، میں اس پر غور کرتا رہا اور مجھے یقین تھا کہ اگر وہ میری بات مان جاتی ہے تو یقیناً یہ اس کے لیے بھی اچھا ہی ہوگا۔

البتہ میں نے زہرہ بانو سے اس بات کا ذکر کرنے سے پہلے اول خیر اور شکیلہ سے بھی مشورہ کرنا ضروری سمجھا تھا۔

کافی دیر بعد زہرہ بانو کی واپسی ہوئی تو اس نے خوش خبری سنائی کہ نوشابہ میرے خلاف ایف آئی آر نہیں بلکہ ”این سی“ کٹوا سکی تھی۔ اگرچہ اس نے ایف آئی آر کٹوانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن چونکہ ایک تو اس کے بھائی فرخ کے قتل کو کئی سال بیت چکے تھے اور پھر یہ مقدمہ بھی کسی کے خلاف قائم نہیں کیا جاسکا تھا۔ اگرچہ پولیس اس سلسلے میں اپنے بیانات بھی مکمل کرچکی تھی اور بعد کی تفتیش سے یہ کیس ثابت ہوگیا تھا کہ نوشابہ کے پستول سے ہی گولی چلی تھی جو اس کے بھائی فرخ کو چاٹ گئی تھی۔ وقوعے کے بعد سے نوشابہ اپنے حواس کھو بیٹھی تھی یا پھر اسے اس کے باپ چوہدری ممتاز نے ہی کیس کو دبانے کے لیے ایسا کہا تھا کہ وہ خود براہ راست اپنے بیٹے کا مجھے اور زہرہ بانو کو قاتل سمجھے ہوئے تھا اور ہم سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

جیسا کہ پھر بعد میں میجر باجوہ ...... نے مجھ سے حقیقت گوش وگزار کی تھی کہ اب باپ کی گرفتاری کے بعد اس کی انتقامی ”گدی“ اس کی بیٹی نوشابہ نے سنبھال لی تھی اور وزیر جان اس کی بھرپور سپورٹ کررہا تھا۔

بہرطور اس کا کیس کمزور ہی ثابت ہوا تھا اور پولیس، جو ”فرخ مرڈر کیس“ کو داخلِ دفتر کرچکی تھی، ری اوپن کرنے کے موڈ میں نہیں تھی نہ ہی اس کیس کی اب کوئی قانونی پوزیشن ... رہی تھی۔ بلکہ اسے ری اوپن کرنے کی صورت میں اُلٹا یہ کیس نوشابہ کے ہی گلے میں فٹ ہونے لگا تھا۔ مگر پھر بھی پولیس انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے پر وہ صرف این سی ہی کٹوا سکی تھی۔ اسی لیے فاروقی صاحب نے اطمینان دلایا تھا کہ اس کیس کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اگر ہم چاہیں تو اُلٹا نوشابہ پر ہتکِ عزت کا دعویٰ کرکے اس کے گلے میں یہ کیس ڈال سکتے تھے۔

البتہ فاروقی صاحب میری قبل از گرفتاری ضمانت کا بندوبست کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ اور میرا ہر طرح سے قانونی تحفظ کا پورا انتظام رکھے ہوئے تھے۔

دیکھا جاتا تو زہرہ بانو نے مجھے ایک فالتو کی پڑنے والی مصیبت سے بچا لیا تھا۔

ابھی ہم نوشابہ اور وزیر جان وغیرہ کے گٹھ جوڑ سے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

متعلق گفتگو کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرے سیل کی بیل گنگنا اُٹھی۔ میں یہی سمجھا کہ شکیلہ کی کال ہوگی، لیکن اسکرین پر ایک اجنبی نمبر دیکھ کر میں چونکا اور دھڑکتے دل سے فون کان سے لگا کر ’ہیلو‘ کہا تو دوسری طرف سے شناسا آواز اُبھری۔

‘‘کیا فیصلہ ہوا؟’’ دوسری جانب سے گمبھیر لہجے میں پوچھا گیا، انداز نخوت بھرا اور رعونت آمیز تھا۔ یہ بلیو ٹیکسی کا چیف کرنل سی جی بھوانی تھا۔ اس خبیث کی آواز سن کر یکدم میرے اعصاب تن گئے۔ اس نے خود ہی فون کر دیا تھا۔

مجھے... اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے اُسے لیا جواب دینا تھا وہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا، اسی لیے بلا تاخیر اور اپنے لہجے میں ذرا جھول لاتے ہوئے بولا۔

‘‘میں تمہارے ہی فون کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سنو، غور سے سنو میں... میں نے بڑی مشکلوں سے اور اپنے آپ پر بڑا خطرناک رسک لے کر ہاٹ کسٹڈی سے نکال کر اپنے قبضے میں کر رکھا ہے، اور میں زیادہ دیر اُسے اپنی ذاتی کسٹڈی میں نہیں رکھ سکتا۔ ڈیل مکمل کرو اور اپنا آدمی لے جاؤ۔’’ میں نے دانستہ اپنے لہجے کو حواس باختہ سا بنانے کی کوشش کی تھی۔

‘‘گڈ! ہمیں تم سے یہی آشا تھی۔’’ دوسری جانب سے کرنل سی جی بھوانی کی کھرکھراتی آواز اُبھری۔ ‘‘رسک تو تمہیں لینا ہی تھا۔ آخر کو تمہارے باپ کی رہائی کا معاملہ ہے۔ تمہارا نروس ہونا ایک فطری عمل ہے، خیر! اب کام کی بات ہو جائے۔’’ وہ رکا تو میں بول پڑا۔

‘‘دیکھو، تم جس مقام پہ یہ ڈیل کرنا چاہتے ہو، میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ سب پاکستانی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہو جاتا۔ تم جانتے ہو اس میں ہم دونوں کو ہی دو طرفہ بی ایس فورسز والوں سے خطرہ ہوگا۔ جبکہ میرے ساتھ ایک خطرناک قیدی بھی ہوگا، ملتان سے لاہور تک ہی اُسے لے کر پہنچنا میرے لیے خطرے سے کم نہ ہوگا، اور اگر میں اپنے ہی پی ایس ایف والوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تو مجھ پر غداری کا مقدمہ...’’

‘‘دھیرج، دھیرج۔ ذرا شانت ہو کے بات کرو۔ اور پہلے غور سے میری بات پوری سن لو۔’’ دوسری طرف سے سی جی نے میری بات کاٹتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ‘‘تمہیں قیدی کو لے کر ملتان سے لاہور تک کا سفر تو کرنا ہی پڑے گا۔ جس طرح تمہارے کچھ خدشات ہیں اسی طرح ہم بھی اسی طرح کے تحفظات رکھتے ہیں۔ تمہیں تو صرف اپنے ہی ملک میں ملتان سے لاہور تک کے ایک سرحدی علاقے تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ جبکہ ہمیں تو سرحد پار کرنا پڑے گی۔ معاملہ ایک قیدی کا نہ ہوتا تو ہم اُسے قانونی طرح سے بھارت لے جاتے، مگر اب تمہیں ہی نہیں بلکہ ہمیں بھی چور راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ اور یہی ضروری ہے۔’’

‘‘لل... لیکن سرحد پار۔’’ میں کہتے کہتے دانستہ رکا تو میری توقع کے عین مطابق وہ بولا۔

‘‘تمہیں سرحد پار نہیں کرنا پڑے گی۔ کسی طرح تم پہلے لاہور پہنچو اور جی ٹی روڈ پر آ جاؤ۔’’

‘‘اس روڈ پر میں ایک خطرناک قیدی کو لے کر سفر نہیں کر سکتا۔ یہاں چیکنگ سخت ہے اور جگہ جگہ چیک پوسٹ ہیں۔’’ میں نے کہا۔

‘‘تو پھر تم سی بی (کینال بینک) روڈ پر آ جانا۔ یہ روڈ قدرے مضافاتی ہے۔ وہاں سے پنڈ کرباٹ سنگھ جانے والی ایک ذیلی سڑک پر آ کر کہیں رک جانا اور ہماری بعد کی ہدایات کا انتظار کرنا۔ پھر ہم بتائیں گے کہ تمہیں آگے کہاں نکلنا ہے، ڈن؟’’ اس نے اپنی بات ختم کی اور میں نے سوچنے کا ایک قلیل وقفہ اختیار کرتے ہوئے بالآخر ہامی بھرلی تاہم آخر میں پوچھ لیا۔

‘‘کیا مجھے اسی نمبر پر تم سے رابطہ کرنا پڑے گا؟’’

‘‘نہیں، یہ نمبر اب تمہیں ڈیڈ ملے گا۔ میں کسی اور نمبر سے تم سے وقفے وقفے سے خود ہی رابطہ کر کے پوچھتا رہوں گا۔’’ اس نے کہا اور میں اس کی چالاکی پر اندر ہی اندر کھول گیا۔ وہ شاطر ہر بار ایک نئے نمبر سے مجھ سے رابطہ کرتا تھا اور سابقہ نمبر اس کا مجھے بند ہی ملتا تھا۔ میرا اثبات میں جواب ملتے ہی وہ آخر میں سرسراتے لہجے میں بولا۔

‘‘ایک بات کا دھیان رہے۔ کسی بھی قسم کی چالاکی تمہارے لیے نقصان کا باعث بنے گی، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ تمہارے علاوہ ہمارے پاس اور بھی کئی آپشن ہیں، اسی لیے بہتر ہوگا کہ تم اس سے فائدہ اُٹھاؤ تاکہ ہمارے درمیان ہونے والی ڈیل کامیاب رہے۔ قیدی تمہارے ساتھ ہونا چاہیے، ڈمی کی صورت میں ہمیں اپنے خفیہ ذرائع سے ترنت معلوم ہو جائے گا کہ تمہارے ساتھ کون ہے۔ سمجھ گئے؟ اور ہاں! ایک بات کا اور خاص خیال رہے۔ تمہارے ہمراہ صرف ایک آدمی ہونا چاہیے، تیسرا ہمارا آدمی ہوگا۔ یعنی قیدی سندرداس۔’’

‘‘اور تمہارے ساتھ بھی اتنے ہی آدمی ہونے

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

چاہئیں۔ یہ ایک ڈیل ہے اسی لیے معاملہ برابری کی بنیاد پر طے ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ تم تو یہاں اپنے کسی جاسوس کے ذریعے ہماری ریکی کروالو گے کہ ہمارے ساتھ تمہارا مطلوبہ آدمی موجود ہے یا نہیں لیکن مجھے کیسے پتا چلے کہ...“

”اس کے لیے تم بھی وہی طریقہ اختیار کر سکتے ہو۔“ وہ میری بات کاٹ کر شاطرانہ لہجے میں بولا اور میں اندر ہی اندر اس کی مکاری پر کھول اُٹھا۔

میرا اثبات میں جواب پاتے ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں اس کی آخری تہدیدی گفتگو پر چونکے بنا نہ رہا تھا...میری پاور آف آبزرویشن صرف نظروں سے دیکھنے تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ میں مدِ مقابل کی گفتگو سے بھی بہت سی باتوں کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بلیو ٹکسی کے اس گھاگ سربراہ اور شیوسینا کے سابقہ لیڈر کرنل سی جی بھوانی کی آخری بات سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ان کا ایک آدمی یا جاسوس آل ریڈی یہاں یا ہمارے آس پاس کہیں موجود تھا۔

مجھے اس بات پر حیرت ہوئی تھی بلکہ میں کچھ اُلجھ سا بھی گیا تھا کہ کرنل سی جی نے اپنے جاسوس کے بارے میں مطلع کرنا مجھے کیوں ضروری سمجھا تھا؟ بے شک اس کے نزدیک یقیناً یہی وجہ رہی ہوگی کہ وہ مجھ پر اس طرح اپنا ”پُراثر“ دباؤ ڈالنا چاہتا تھا، تاکہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کا بلف یا ٹریپ ٹریکنگ کرنے کی کوشش نہ کروں اور بالکل سیدھے سبھاؤ یہ معاملہ یا ڈیل طے پا جائے۔ مگر شاید اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ اسی بات نے خود مجھے نہ صرف محتاط کر دیا تھا بلکہ اپنے زرخیز منصوبے کو خاطر خواہ حد تک مؤثر اور کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ضروری ترمیم کرنے کا بھی موقع مل گیا تھا۔ ابھی میں نے اپنا منصوبہ کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مجھے کرنل سی جی یا اس کے آدمی کے فون کا انتظار تھا۔ تاکہ حتمی طور پر یہ معلوم ہو جاتا کہ اب کرنا کیا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

میں نے سی جی سے اپنے جن متوقع خدشات کا اظہار کیا تھا وہ اپنی جگہ درست بھی تھے۔ اور مجھے اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ بھی کرنا تھا۔ بہ صورتِ دیگر میں ہی نہیں میرے ساتھ میجر باجوہ بھی پھنس سکتے تھے۔ اب مجھے میجر باجوہ ...... سے، سندر داس کو میرے حوالے کرنے کے سلسلے میں فائنل بات کرنا تھی۔ اور یہ بات فون پر نہیں ہو سکتی تھی۔

اس ”ہاٹ ناٹ ایڈونچر“ کے سلسلے میں میرے ذہن میں جو پہلے سے منصوبہ پرورش پا رہا تھا، کرنل سی جی سے تازہ ترین گفتگو کرنے کے بعد میں اس مہم کو زیادہ سے زیادہ محفوظ کرنے کے لیے تھوڑی ترمیم کرنا چاہتا تھا۔ میں اس جاسوس کو ٹریپ کرنا چاہتا تھا۔

کرنل سی جی کے سلسلے میں میرے ذہن میں دو باتیں آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھ سے کسی قسم کا دھوکا کرنا چاہتا تھا۔ یعنی دغا بازی کے ذریعے وہ اپنا آدمی تو لے اُڑتا مگر ہمارا آدمی ہمارے حوالے پھر بھی نہیں کرتا، جیسا کہ میں اس کے ساتھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ دوسری بات یہ میرے ذہن میں آتی تھی کہ بہ قول اس کے اب میرا باپ (تاج دین) ان کے کسی ”کام“ کا نہیں رہا تھا اور وہ اس کے بدلے میں مجھے کوئی چارہ ڈالے بغیر اپنا آدمی (سندر داس) لے کر میرے باپ کو میرے حوالے کر دیتا۔

بالآخر تھوڑی دیر بعد ہی میں نے اول خیر، کبیل دادا اور زہرہ بانو کے ساتھ اپنا منصوبہ شیئر کر دیا۔ چونکہ یہ ایک پورا ٹیم ورک تھا، بے شک اس کی ”پری پلاننگ“ میرے ہاتھ میں تھی۔ لیکن میرا یہ شیوہ نہیں تھا کہ کسی سے تبادلۂ خیال اور مشورے کیے بغیر منصوبے پر عمل کر ڈالوں۔ میرے نزدیک ایسا کرنا ناکامی کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

تھوڑی سی رد و قد کے بعد بھی ساتھیوں نے میرے اس منصوبے کی توثیق کر ڈالی۔ البتہ کبیل دادا تھوڑا اڑا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں سرے سے ہی سندر داس کو ساتھ رکھنے کا رسک لینا ہی نہیں چاہیے۔ اس کی جگہ ڈمی کو استعمال کرنا زیادہ بہتر تھا، دوسرا یہ کہ ہمیں بلیو ٹکسی کے جاسوس کو اپنی گرفت میں لے کر اسے اپنی مرضی کے احکامات پر عمل کرنے پر مجبور کرتے رہیں، کیونکہ اُس کے علم میں یہ ساری رام کتھا پہلے سے ہی ہوگی کہ ہمارا مطلوبہ آدمی کہاں اور اس وقت کس کے قبضۂ گرفت میں ہے۔ وغیرہ۔

مجھے اس سلسلے میں کبیل دادا کو قائل کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی، کیونکہ زہرہ بانو میری بات سمجھ چکی تھی اور اسی نے کبیل دادا کو سمجھا بھی دیا تھا۔ اس نے خاموشی تو اختیار کر لی تھی لیکن مجھے وہ کوئی خاص مطمئن نظر نہیں آ رہا تھا۔

بہر کیف مجھے اول خیر اور زہرہ بانو کی تائید حاصل ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کی ابتدا کر دی۔

READING
Section

میرے اور کرنل بی جی کے درمیان ہونے والی گفتگو میں اس معاملے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا وقت رات کا مقرر کیا گیا تھا۔

اس دوران میں نے امریکا فون کر کے آنسہ خالدہ سے بھی رابطہ کیا اور اُسے اپنی اور عارفہ سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ گومگو سے لہجے میں بولی۔

''مسٹر شہزی! عارفہ کو تم کس طرح مناتے ہو، یہ مجھ سے زیادہ تم ہی بہتر جانتے ہو گے۔ لیکن اس میں دیر نہیں ہونی... چاہیے۔ عابدہ کے لائر کے مطابق عارفہ کی گواہی عابدہ کے لیے انتہائی ضروری اور مفید ثابت ہو سکتی ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے تقدیر کی اس بوالعجبی پر تاسف انگیز اور دُکھ بھری سی حیرت ہوئی کہ ایک اہم مسئلے کے سلسلے میں جس شخص کی گواہی کی ضرورت پڑی بھی تھی تو وہ کسی دوست کی نہیں بلکہ اسی دُشمن کی تھی جس کی وجہ سے عابدہ آج اس حال کو پہنچی تھی۔ میں نے اپنے حلق میں اُترنے والی اس دُکھ آمیز رقت کو نگلا اور بولا۔

''میں عارفہ کو منا لوں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔'' آنسہ خالدہ سے یہ کہتے ہوئے خود مجھے اپنے لہجے کا کھوکھلا پن محسوس ہوا تھا اور آواز جیسے میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''آر یو شیور؟'' دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز اُبھری۔

''یس مس خالدہ! آئم شیور۔ یہاں کا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔ آپ بس عابدہ کے کیس کو مضبوط بنانے کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں۔''

''آف کورس۔ اینڈ ڈونٹ وری۔ مسٹر شہزاد! اور ہاں، ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا کیا بنا؟'' اس نے آخر میں اچانک پوچھا تو میں نے فوراً جواب میں کہا۔

''میں نے یہی پوچھنے کے لیے آپ کو فون کیا تھا۔ کچھ مجبوری کی بنا پر اصل ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں ابھی حاصل نہیں کر پایا ہوں۔ لیکن متعلقہ ہاسپٹل سے میں نے ایک ڈپلی کیٹ ڈیتھ سرٹیفکیٹ نکلوالیا ہے۔ کہیں تو...''

''چلے گا۔ وہی بھجوا دو۔ ایک ہی بات ہے۔'' وہ بولی۔

''آپ ذرا لائر سے اس سلسلے میں مشورہ کر لیتیں تو زیادہ بہتر ہوتا۔''

''فکر نہیں کرو شہزی! اصل ڈپلی کیٹ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور یہ تو ایک فارملٹی ہے۔ تم وہی سرٹیفکیٹ مجھے جلد ہی کسی تیز رفتار کوریئر سروس سے روانہ کردو۔''

''اوکے۔ میں آج ہی یہ کام کرتا ہوں۔''

''اوکے بائے۔''

''بائے۔''

☆☆☆

اُس روز کا سارا دن مختلف نوعیت کی اہم مصروفیات میں گزرا۔ سب سے پہلے تو میں نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ ایک تیز رفتار کوریئر سروس کے ذریعے ''رش ڈلیوری'' کروا کے آنسہ خالدہ کو امریکا روانہ کر دیا۔ پھر میجر باجوہ صاحب سے خفیہ اور اہم نوعیت کی ملاقات سے لے کر سندر داس کو اپنی تحویل میں لینے کے سلسلے میں کچھ ضروری اقدام کے اُمور پر گفتگو میں وہ دن بیتا چلا گیا۔ اور رات کو دس بجے کے قریب سندر داس کو ہمارے حوالے کیا گیا۔

اس وقت میجر باجوہ ...... کا چہرہ اور ان کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ میری خاطر ہی نہیں بلکہ وطن کے ایک گمنام سپاہی کی رہائی کے لیے بلاشبہ اپنے اُوپر ایک بہت بڑا رسک لینے کو تیار ہو گئے تھے۔ صرف میرے بھروسے اور اس وعدے پر کہ میں ان کا شکار بہ خیریت اور مقررہ وقت کے اندر اندر واپس ان کی تحویل میں دے دوں گا۔ انشاء اللہ!

اس وقت میرا اپنا چہرہ بھی جوش و جذبات سے تمتما رہا تھا۔ میں خود بھی ایک بہت بڑی اور حساس نوعیت کی ذمے داری اپنے سر لے رہا تھا۔ خدانہ خواستہ ناکامی کی صورت میں ایک بھونچال آسکتا تھا۔ سندر داس معمولی آدمی نہ تھا۔ بلیو ٹیکسی کا ایک کلیدی مہرہ تھا اور اس کے گرفت سے نکل جانے کے نتائج بہت بھیانک بھی نکل سکتے تھے، اور اس کا سارا ملبا میجر باجوہ ...... پر ہی گرتا۔ ان کا کورٹ مارشل بھی ہو سکتا تھا اور غدار ی کا مقدمہ بھی ان کے خلاف قائم ہو سکتا تھا۔

میرا جو حال ہوتا وہ تو بعد کی بات تھی۔ مجھے جو بھی کرنا تھا خالصتاً اپنی اور اپنے ساتھیوں کی صوابدید پر کرنا تھا، یعنی اس مہم میں ہم رینجرز یا کسی پاور ایجنٹ کو شامل کرنے کے یوں بھی مجاز نہ تھے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ جب سندر داس کو انتہائی رازداری کے ساتھ اور رسن بستہ حالت میں میرے حوالے کیا گیا تو خود میری اپنی کیفیات عجیب سی ہونے لگی تھیں۔ اور جب میں اُسے اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے ہمراہ کسی قیدی یا انسان کو نہیں بلکہ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ایک ایٹم بم کو لے جارہا ہوں۔ اور ایٹم بم بھی ایسا کہ جس کی ''کاؤنٹ ڈاؤن'' شروع ہو چکی تھی اور وہ اب پھٹا کہ تب پھٹا والی حالت میں ہو۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور روانہ ہو گیا۔ روانگی سے قبل موسم کے بدلتے تیور کو مدِ نگاہ رکھتے ہوئے ہم نے اسی مناسبت سے تیاری کر رکھی تھی۔ ممکن تھا ہمیں اس معرکہ خیز ایڈونچر میں بی آر بی نہر میں بھی اُترنا پڑتا، اس لیے احتیاط کے پیشِ نظر واٹر پروف بیگز کے علاوہ پیراکی کے لباس بھی اپنے سامان میں شامل کر لیے گئے تھے۔

ڈیل کے مطابق مجھ سمیت ''قیدی'' کے علاوہ صرف ایک ساتھی ہمراہ رہنے کا پابند تھا۔ میرا ارادہ اول خیر کو ساتھ رکھنے کا تھا، مگر اول خیر نے اسے رد کرتے ہوئے کبیل دادا کو ساتھ رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ یوں اب کبیل دادا کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا، جبکہ میں عقبی سیٹ پر نہایت محتاط ہو کر سندر داس کے برابر بیٹھا تھا۔

ہمارے روانہ ہونے سے ایک گھنٹا پہلے ہی اول خیر اور شکیلہ ایک دوسری کار میں روانہ کر دیے گئے تھے۔

کوئی بعید نہ تھا کہ ہم اب تک بلیو ٹِکسی کے کسی جاسوس یا ایجنٹ کی نظروں میں بھی آ چکے ہوں۔ اور خود میں بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ مجھے قیدی اور کبیل دادا سمیت روانہ ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیں جانتا تھا کہ اس وقت ان کی ساری توجہ صرف مجھ پر ہی مرکوز ہو سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اپنے پیچھے یا تعاقب میں چلے آنے کے بجائے اُنہیں ایک گھنٹے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ بیگم ولا سے میرے اور کبیل دادا کے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے شکیلہ کو فون کر کے کوارٹر سے سیدھا نواں چوک پر پہنچنے کا کہا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے میں نے اُسے کسی بس یا رکشا میں پہنچنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے کوارٹر سے نکلتے ہی میں نے بیگم ولا سے اول خیر کو بھی اسی طرح نواں چوک پہنچ کر شکیلہ کو ٹریس کرنے کی ہدایت کی۔ مگر ان دونوں کو آپس میں ملنے یا بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہیں پبلک پلیس کے کسی واش روم میں باری باری گھس کر اپنا اصلی چہرہ چھپانے اور اس پر ریڈی میڈ میک اَپ چڑھانے کی ہدایت دی تھی۔ تاکہ اگر کوئی ان کے پیچھے تھا بھی تو وہ دونوں پبلک پلیس کے واش روم میں دیگر لوگوں کے ساتھ رل مل کر اپنا بہروپ بدل کر باہر نکلیں۔ یہ احتیاط کے پیشِ نظر تھا۔ ممکن تھا کہ بلیو ٹِکسی کا کوئی ایجنٹ ان کی بھی کوارٹر یا بیگم ولا سے ریکی کر رہا ہو۔ وہاں سے اسی طرح الگ الگ ایک مسافر کوچ کے ذریعے ان دونوں کو خانیوال پہنچنا تھا اور وہاں سے چند کلومیٹر چک چراسی کے ایک روڈ سائڈ ہوٹل ماہی کے اسٹاپ پر اُتر کر ساتھ مل جانا تھا۔ شکیلہ نے ایک مرد کا بھیس بھرا تھا۔ اسی ہوٹل میں پہنچنے کے بعد اول خیر نے بیگم ولا فون کر کے زہرہ بانو کو اپنے پہنچنے کی اطلاع دینا تھی جہاں ان کے آدمی کا ایک ساتھی وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس نے انہیں ایک کار کا بندوبست کر کے دینا تھا۔ ادھر تب تک ہم بھی اسی علاقے سے گزرنے والے ہوں گے مگر ہمارے اس مذکورہ علاقے کو کراس کرنے سے ٹھیک گھنٹا پہلے اول خیر اور شکیلہ کو روانہ ہونا تھا اور پھر مسلسل ہمارے رابطے میں رہتے ہوئے اسی مدت کے فاصلے سے ہم سے آگے ہی رہتے ہوئے آگے کا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس دوران میں اور کبیل دادا اپنے متوقع تعاقب کو ٹریس کرنے کی بھی کوشش کے ساتھ ساتھ اول خیر کو بھی اس سے آگاہ کرتے رہتے اور یوں ان متوقع مشکوک افراد کے تعاقب میں اول خیر اور شکیلہ کہیں رک کر ان کے تعاقب میں لگ جاتے۔ یوں یہ سلسلہ مقررہ مقام تک جاری رہتا، جب تک متعاقبین سے ہمیں کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

ملتان روڈ پر آتے ہی کبیل دادا نے کار کی رفتار بڑھا دی تھی۔ قیدی کے کانوں میں، میں نے دو عدد ڈائس کھسیڑ دیے تھے، تاکہ وہ ہماری کسی قسم کی کوئی گفتگو سننے سے معذور ہی رہے۔

ابھی ہم نے چند ہی کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کرنل سی جی کی کال آ گئی۔ یہ ایک تیسرا نمبر تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور بار بار کرنل سی جی کے خود ہی رابطہ کرنے پر مجھے بھی سندر داس کی اہمیت کا صحیح طرح اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ ان کا کس قدر خاص الخاص مہرہ تھا، حالانکہ پہلی ہونے والی گفتگو میں کرنل سی جی نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ اب اس کے بجائے اس کا کوئی آدمی مسلسل میرے ساتھ رابطے میں رہے گا۔

میں نے کال اٹینڈ کی اور وہ خبیث خوش ہو کر بولا۔ ''بہت اچھے جا رہے ہو۔ ذرا میری بات کروا دو سندر داس سے۔'' میں اس شاطر آدمی کی بات پر چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ اس کا اس قدر یقین سے یہ کہنا کہ ''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' خالی از علت نہ تھا۔ گویا اُسے ایک ایک بات کی درست ''رپورٹنگ'' مل رہی تھی۔ حالانکہ میں نے روانہ... ہوتے ہی محتاط نظریں بھی دوڑانی شروع کر دی تھیں، لیکن مجھے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ایسا کوئی مشکوک شخص یا گاڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ جبکہ میں اپنے ساتھ بیٹھے قیدی سندرداس پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وہ ایک ٹاپ کلاس اور انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ تھا۔ کوئی بھی ٹرک یا بائی مینوئل سائینٹیفک طریقہ استعمال کر کے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک سکتا تھا۔ جس کا میں بھی تجربہ رکھتا تھا۔ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں آیا تھا۔ کہیں یہ شاطر آدمی مجھ پر اپنی خفتہ رسائی کا رعب جھاڑ کر نفسیاتی دباؤ تو نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”جب تمہاری خفیہ ذرائع سے تسلی ہو ہی گئی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے بات کرنے کی؟“

”دھیرج، دھیرج، شانت رہو مسٹر نیڈی ایجنٹ!“ اس کے استہزائیہ لہجے پر میں اندر سے کھول اٹھا تھا۔ مگر اس وقت اس کے کھانچے میں میری گوٹ پھنسی ہوئی تھی اس لیے اپنے طیش کو پی گیا اور خاموش رہا۔ وہ آگے بولا۔

”مجھے بات کر لینے دو۔ یہ ڈیل کا حصہ ہے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر۔ پہلے میری بات کراؤ میرے باپ سے۔“ یہ کہتے ہوئے میرے گلے میں رقت سی اترنے لگی۔ وہ سنگدلانہ بے حسی سے بولا۔

”ایک زندہ مردہ کے مثل شخص، بھلا تم سے کیا اور کیسے بات کر سکتا ہے؟ کہا ناں میں نے کہ وہ تو بولنے سے بھی قاصر ہے، سنتا بھی اتنا ہی ہے کہ جب کوئی اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر بولے۔ اور وہ بھی چلا کر۔“

یہی وہ وقت تھا جب میرے اعصاب بس سے باہر ہونے لگے اور جی چاہا کہ اس مردود کو بتا دوں کہ اگر تیرا میرے ساتھ سامنا ہو گیا تو میں تجھ سے اپنے باپ پر کیے جانے والے ایک ایک ظلم کا بدلہ لوں گا۔ مگر میرا حلق اس مردود کی اپنے باپ سے متعلق گفتگو پر رقت زدہ ہونے لگا تھا۔ میں چپ رہا تو اس نے اپنا مطالبہ دہرا دیا۔

میں نے دانت پیس کر سندرداس کے ایک کان سے ڈاٹ نکالا اور سیل اس کے کان کے قریب کر دیا۔ بات بہت مختصراً ہوئی تھی اور صرف اسی حد تک کہ چند کوڈز سندرداس نے دہرائے اور دوسری جانب سے اس نے اپنے چیف کی ہدایات سنیں اور پھر بس۔

میں نے سیل اپنی بلیو جینز کی جیکٹ کی جیب میں رکھا اور دوبارہ سندرداس کے کان میں ڈاٹ ٹھونس دیا۔ میری نگاہ ونڈ اسکرین کے اوپر لگے مرر پر پڑی۔ اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے کبیل دادا کی نظریں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے بھی ٹائیٹ جینز اور آدھی بازوؤں والی شرٹ پر سیاہ رنگ کی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے اپنی نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین پر رکھتے ہوئے مجھ سے مختصراً پوچھا۔

”کیا باتیں ہو رہی تھیں؟“

میں نے اسے بتا دیا۔ پھر اس سے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے اتنی دور بیٹھے کس طرح اس کی خبر ہو رہی ہے کہ ہم اس وقت ہم کہاں کہاں سے گزر رہے ہیں اور مزید یہ کہ اسے بڑی تسلی تھی کہ ان کا مطلوبہ آدمی ہمارے ساتھ ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے بیک ویو مرر میں اس کے چہرے کو دیکھا تو ٹھٹکا۔ کھبیل دادا کے موٹے موٹے سیاہ رو ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ بولا۔

”قیدی کے کان بند کر دیے؟“

”ہاں! بات ختم ہوتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا۔“ میں نے جواب دیا تو وہ بولا۔

”تم نے اب تک اپنے ارد گرد کیا محسوس کیا؟ کوئی مشکوک نقل و حرکت؟“

”نہیں۔ ماسوائے ٹریفک کی آوک جاوک کے۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر تو تم کار میں بیٹھے صرف جھک مار رہے ہو۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ اس بے وقت .... کی رقابت بھری عداوت نے مجھے اندر سے سلگا کر رکھ دیا تھا، جسے میں تحمل سے پی گیا .... تاہم دانت پیس کر بولا۔

”میری اس وقت ساری اٹینشن اس مردود کی طرف ہے، کہیں یہ یہاں بیٹھے بیٹھے کوئی گل نہ کھلا دے۔“

”یہ چہل پہل چھوڑو اور اب غیر محسوس طریقے سے جس ہاتھ پر تمہارے قیدی بیٹھا ہے، اسی رخ پر سڑک کے کنارے عقب میں دیکھو۔ کار کا رنگ تو لائٹ گرے ہے، مگر اس وقت تمہیں اس کی صرف ہیڈ لائٹس ہی دکھائی دیں گی۔ یہ پرانے ماڈل کی سوک سیڈان ہے۔ جو اس وقت سے ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی ہے جب میں نے معصوم شاہ روڈ سے خانیوال جانے والی سڑک کی طرف کٹ مارا تھا تو یہ اس وقت سے ہی ہمارے پیچھے لگ گئی تھی... بلکہ جس گیس اسٹیشن پر ہم نے ٹنکی فل کروائی تھی اس کار پر میری

READING Section

اچانک نگاہ پڑی تھی۔ یہ اس وقت گیس اسٹیشن کے واش روم ایریا کی طرف کھڑی تھی اور اس کے اندر دو افراد سوار تھے۔ میں نے اس کار کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا۔“

کمیل داد نے بڑے آرام سے بتایا اور میں نے اسی سمت کو گردن موڑنے کے بہانے عقبی اسکرین سے دیکھا تو رات کے اندھیاروں میں آتی جاتی ٹریفک کی لائٹس میں اس ہیڈ لائٹ کو تاڑ گیا تھا جو یکساں رفتار کے ساتھ سڑک کا درمیان چھوڑے کنارے کنارے ہمارے تعاقب میں چلی آرہی تھی اور ان کا انداز ایسا ہی تھا کہ خبر ہونے سے پہلے یہ بھانپنا مشکل تھا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں بھی ہو سکتی ہے۔

مجھے خوشی ہوئی کہ وہ اپنا ”کام“ بہ احسن طریق و خوبی نبھا رہا تھا، اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنا، بخل کرنے کے مترادف ہوتا، لہٰذا میں بے اختیار توصیفی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب یار کمیل! تم نے تو واقعی کمال کردیا۔ حالانکہ میں خود بھی سارے راستے محتاط رہا ہوں، لیکن میں بھی چوک گیا۔“

اس سے اس طرح دوستانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے اچانک ہی نجانے کیوں میرا دھیان ماں جی والے ”مسئلے“ کی طرف چلا گیا اور جو کچھ اس مسئلے کے ”حل“ کے لیے میرے ذہن میں موجود تھا وہ تازہ ہونے لگا۔ تاہم مجھے مناسب وقت کا انتظار تھا۔

”اب ایسی بات بھی نہیں ہے، تمہارا اس وقت سارا دھیان اس قیدی اور اس کے پس منظر میں ہونے والی ڈیل پر مرکوز ہے، جبکہ میری پوری توجہ متوقع تعاقب پر مرکوز رہی تھی۔ خیر...“ پھر موضوع پلٹتے ہوئے اس بار گہری متانت سے بولا۔ ”اول خیر اور شکیلہ کو اس کار کے بارے میں خبردار کردو، اور کار کا نمبر بھی بتادو تاکہ اسے تلاشنے میں اُنہیں زیادہ وقت کا سامنا نہ کرنا پڑے وہ آگے کہیں رک جائیں اور منصوبے کے مطابق ہمارے اور متعاقب کار کے کراس کرجانے کے بعد وہ ان کے تعاقب میں لگ جائیں“۔

کمیل دادا نے اس بات کا بڑے کھلے دل سے اعتراف کیا تھا جو میرے ذہن میں بھی تھا۔ مگر میں نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے اس کا کچھ خاص اظہار نہیں کیا تھا۔ کمیل دادا کی یہی اعلیٰ ظرفی اس کے بلند کردار کی نشانی تھی۔ مگر اس کی میرے ساتھ بلاوجہ کی رقابت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ حالانکہ جانتا بھی تھا کہ میں کس سے پیار کرتا تھا۔ بس کبھی کبھی اچھے بھلے آدمی کی کوئی کل ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہے، یہی حال کمیل دادا کا تھا۔ یوں بھی جب سے اُسے اس حقیقت کا پتا چلا تھا کہ لئیق شاہ میرا بھائی تھا، اور زہر بانو اس کی بیوہ ہونے کے ناتے میری اب کیا لگتی تھی، تب سے میرے ساتھ اس کے اکھڑ اور روکھے پھیکے رویے میں کچھ تبدیلی تو ہوئی تھی مگر رقابت کی آگ ویسی ہی تھی۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

میں نے اسی وقت فون کرکے اول خیر کو اس لائٹ گرے کلر کی متعاقب کار کے بارے میں مطلع کردیا اور نمبر بھی بتادیا اور تاکید کی کہ اس وقت چونکہ متعاقبین کو خود اپنے تعاقب کا دھیان بھی نہیں ہوگا اسی لیے محتاط رہ کر تعاقب کیا جائے، کیونکہ کسی بھی ممکنہ خطرے کی صورت میں اول خیر اور شکیلہ ہی کے ہاتھ میں یہ ساری ”گیم“ جاسکتی تھی۔

موقع کی مناسبت سے اس نے بھی کوئی فاضل گفتگو کرنے سے احتراض ہی برتا تھا۔ تاہم اس سے بات کرنے کے دوران مجھے پس منظر میں شکیلہ کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز آئی تھی، شاید دونوں کے بیچ کسی بات پر بحث چھڑی ہوئی تھی یا اول خیر اُسے ستانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے جلد رابطہ منقطع کردیا۔

رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ سفر جاری تھا۔ اول خیر نے مجھے بتایا تھا کہ وہ دونوں خانیوال کراس کرچکے تھے۔

میں نے اول خیر کو یہ بھی ہدایت کردی تھی کہ وہ جیسے ہی اپنی نئی پوزیشن میں آئے، مجھے فوراً مطلع کردے۔ کمالیہ جانے والی سڑک سے تھوڑا آگے اور ساہیوال کے ذرا نزدیک پہنچے تو اول خیر نے مجھے فون پر مطلع کردیا کہ وہ اپنی ہدایت کردہ پوزیشن میں آچکا تھا۔

میں نے کمیل داد کو بھی آگاہ کردیا۔ وہ چند ثانیے پر سوچ خاموشی کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔ ”کیا یہ سب ایسے ہی چلتا رہے گا یا۔ انہیں ٹریپ کرنا ہے؟“

”میرا تو خیال یہی ہے کہ ابھی ان پر صرف نظر رکھنی چاہیے۔ لیکن ان سے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتے ہی ان پر اٹیک کرنا لازمی ہوجائے گا۔“ میں نے جواب دیا تاہم اس سے بھی رائے لینے کے انداز میں پوچھ لیا۔ ”تم کیا کہتے ہو کمیل؟“

”سر دست تو مجھے بھی یہی بہتر لگتا ہے۔ لیکن لاہور پہنچ کر کرنل سی جی کو ہمیں زیادہ دیر اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اُسے بتانا ہوگا کہ ہمیں کہاں اور کس مقام پر پہنچنا

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے؟"

"ہاں! لاہور پہنچنے کے بعد ہی اس نے کہا تھا کہ بتا دوں گا۔"

"صحیح۔ لیکن ابھی جو ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں، ان سے بھی ہمیں ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" وہ پُرغور متانت سے بولا۔ "کیونکہ ان کا آدمی ہمارے ساتھ ہے اور ان کی نظروں میں بھی ہے۔ جبکہ ہمارے مطلوبہ آدمی (میرے باپ) کی ہمیں جھلک بھی نہیں دکھائی گئی ہے۔ یہ ہم سے کسی مطلوبہ مقام تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنے گرو گھنٹال سی جی بھجوانی کے اشارے پر ہم سے شکار چھیننے کی کوشش کرسکتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے اس خدشے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ کرنل سی جی جیسے فریبی اور شاطر آدمی نے یہی کچھ سوچ رکھا ہو۔ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"دادا! تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن بہ قول تمہارے تعاقب میں آنے والے صرف دو افراد ہیں۔ کیا صرف یہ دو افراد ہم سے اتنا اہم شکار چھیننے کے لیے روانہ کیے گئے ہیں؟"

"تو ہم پھر کتنے ہیں؟" کیپل دادا بولا۔

"ہم چار ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"غلط۔" وہ بولا۔ "ہم دو ہیں۔ ان کی نظر میں۔ انہیں کیا پتا کہ ہمارے دو اور ساتھی ان کے بھی تعاقب میں ہیں۔"

"ہاں! اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ہی میں نے اس طرح کی منصوبہ بندی کی ہے۔" میں نے کہا۔

مجھے اپنی وہ سابقہ مہم یاد تھی جب میں اسی طرح وزیر جان کے قبضے سے اپنی ماں کو چھڑانے نکلا تھا اور وزیر جان نے راستے میں ایسی ہی چال چلتے ہوئے مجھ سے اپنا شکار چھیننے کی کوشش کی تھی۔

"تمہاری پلاننگ تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ غلط ہے کہ ہم دشمن کو کوئی چال چلنے کا موقع فراہم کریں۔ اور منتظر بیٹھے رہیں کہ وہ ہم پر حملہ آور ہوں۔ جبکہ ہمارے ساتھ انتہائی مطلوب اور خطرناک دشمن قیدی بھی ہو جو بذاتِ خود بھی ایک چھلاوا ہو۔"

"تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو پھر؟" میں نے اس سے پوچھ ہی لیا تو بیک ویو مرر پر مجھے اس کے چہرے پہ ایک معنی خیز مسکراہٹ سی دکھائی دی۔ وہ بولا۔

پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی... پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی فروری کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہاکر سے بک کروالیں

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''بلی کو تھیلے سے برآمد کرنے کے لیے میں ایک چال چلنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی چال؟'' میں نے سوالیہ کہا۔

''ہمیں ایک ذرا دیر کے لیے رکنا ہوگا۔ اس دوران متعاقبین کیا گل کھلاتے ہیں وہ وقت سے پہلے ظاہر ہوجائے گا۔ وہ یقیناً کرنل سی جی سے رابطہ کرکے اس کے بارے میں بتائیں گے۔ یا تو وہ انہیں ایکشن کی ہدایت دے گا یا پھر اسی طرح انتظار کا کھیل کھیلنے کا کہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہم سے بھی رابطہ کرلے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو کے آگے روانہ ہوجائیں گے۔''

میں نے تھوڑی دیر اس کی بات پر غور کیا اور وقت دیکھا، رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی، میں نے سوچا کہ اگر متعاقبین نے کوئی گل کھلانا بھی چاہا تو وہ یوں دورانِ سفر بھی کھلا سکتے ہیں، جس سے نمٹنے کا میں اول خیر اور شکیلہ کو ان کے تعاقب میں لگا کر بندوبست کرچکا تھا۔ اس لیے کہیں بھی ذرا دیر کے لیے رُکنا، خود خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا، وقت کا بھی زیاں ہوتا۔ لہٰذا میں نے کھبیل دادا کو سفر جاری رکھنے کا کہا۔ وہ خاموش رہا۔

شاید معاملے کی حساسیت کو دیکھتے ہوئے وہ خود بھی مجھ سے کسی بات پر اختلاف نہیں کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی ساری ذمّے داری میرے ہی کاندھوں پر رہے اور یہ ٹھیک بھی تھا، کیونکہ کئی ایسی باتیں تھیں جن کا ادراک صرف مجھے ہی تھا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حیرت انگیز طور پر میری بات درست ثابت ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب ہم ساہیوال اور اوکاڑہ کراس کرکے پھول نگر کے قریب ہی پہنچنے والے تھے کہ مجھے اچانک اول خیر کی کال موصول ہوئی۔

''او خیر کا کے! جس کار کے ہم تعاقب میں لگے ہوئے ہیں، اس کے ساتھ ایک لمبی سی گاڑی اور ایک کار ساتھ آن ملی ہیں۔ لگتا ایسا ہی ہے کہ یہ انہی کے ساتھی ہیں اور کسی بھی وقت تمہاری گاڑی پر ہلا بولا جاسکتا ہے۔''

اس کی بات پر یک بیک میرے اعصاب تن گئے اور میں نے فوراً کہا۔ ''اول خیر! یقیناً ایسا ہوسکتا ہے۔ معمولی سے شبے کو بھی تمہیں نظر انداز نہیں کرنا ہوگا، اس وقت خطرے کی ہر گھڑی میں تمہارا اور شکیلہ کا کردار اہم ہوسکتا ہے۔ مگر تم بھی محتاط رہو۔ اور ہمارے عقب میں جو بھی خطرہ محسوس کرو، مجھے پل کے پل آگاہ کرتے رہنا۔'' اس کے بعد میں نے سیل اپنے ہاتھ میں ہی تھامے ہوئے ایک نظر عقب میں ڈالی۔ مجھے تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آگے پیچھے ہوتی دکھائی دیں۔

اول خیر کی کار ابھی مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت خونی معرکہ آرائی ہونے والی تھی۔

''کیا ہوا؟'' کھبیل دادا نے گمبھیر لہجے میں پوچھا تو میں نے اُسے اول خیر کی کال اور تازہ خطرے سے آگاہ کر دیا اور بولا۔

''تم کار کی رفتار تھوڑی بڑھا دو۔''

''نہیں'' اس نے اختلاف کیا۔ ''یہی رفتار ٹھیک ہے۔ اس طرح انہیں اس بات کا شک ہوجائے گا کہ ہمیں ان پر شبہ ہوگیا ہے۔ جو ہونا ہے وہ تو اب ہو کے ہی رہے گا۔ اس صورتِ حال کے لیے ہمیں اپنی تیاری کرنا ہوگی۔''

''ہم۔'' میں نے پُرسوچ ہنکاری خارج کی۔ اور اپنی جیکٹ کے اندر سے تلے اُوپر نال والا فل آٹو اسنیک سلینسر پسٹل نکال کر گود میں رکھ لیا یہ روسی ساختہ لوگر بانڈ آرم کی نئی شکل تھی جسے امریکا نے بھی بنایا تھا۔ مگر اس جدید شکل کے لوگر کو ہینڈل کرنا آسان نہ تھا، اسے کوئی ہتھیار باز ہی چلا سکتا تھا، اور وہ بھی جس کا نشانہ طاق و مشاق ہو، اس کی نائن ایم ایم کی گولی انسان کی کھوپڑی کے پرخچے اُڑا دیتی تھی، اس ہتھیار کی اتنی دہشت تھی کہ اسے سنبھالنے والا خود بھی ایک لمحے کے لیے بھوت سا ہوجاتا تھا، مگر یہ اس وقت میرے ہاتھ میں کھلونے کی طرح تھرک رہا تھا، اور اسی وقت کھبیل داد نے بھی اپنی لیدر کی سیاہ جیکٹ میں ہاتھ ڈالا تھا، اب اس کے برابر والی سیٹ پر ایک لمبی نال والا نیلگوں مائل رنگ کا سیاہ جرمن ساختہ میگا رور رکھا نظر آنے لگا تھا۔

اسی وقت سندر داس کچھ بے چین سا دکھائی دینے لگا۔ اس کے صرف کان بند تھے، مگر آنکھیں تو کھلی تھیں، اچانک سے یہ ساری ''تیاری'' دیکھ کر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور بولا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ سُن نہیں سکتا تھا اسی لیے میں نے اس کی طرف کرخت نظروں سے گھورتے ہوئے اپنے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تاکید کی۔

اس کے دونوں ہاتھ پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے اور پیروں میں بھی ایسی ہی آہنی کڑی ڈالی گئی تھی۔ میں نے اپنا دھیان پیچھے لگایا ہوا تھا، کھبیل دادا سے کہا۔ ''کھبیل!

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تم ذرا سائڈ مرر سے ان پر نگاہ رکھو اور بتاؤ کہ کیا متعاقبین کا فاصلہ کم ہو رہا ہے یا...''

''میں یہی کر رہا ہوں۔'' کمیل دادا سپاٹ اور خشک لہجے میں بولا۔

میں جانتا تھا وہ صرف زہرہ بانو کی وجہ سے میری ہدایات پر بلا چون و چرا عمل کر رہا ہے، ورنہ یہ سب اس کی طبیعت اور مزاج کا حصہ نہ تھا۔ کم از کم میرے سلسلے میں تو بالکل بھی نہیں۔ کیونکہ وہ خود اپنی جگہ ایک اُستاد تھا۔ زہرہ بانو کے گروہ میں اس کی حیثیت دوسرے نمبر پر تھی بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی کچھ آگے کی تھی۔ ''بیگم ولا'' کا کرتا دھرتا وہی تھا اور زہرہ بانو کے ماضی کا سچا اور جاں نثار غم گسار ساتھی ہونے کا بھی اعزاز رکھتا تھا وہ۔ زہرہ بانو کو اس پر اندھا اعتماد تھا اور خود کمیل اس کے صرف ایک اشارۂ ابرو پر ہر دم کٹ مرنے کو بھی تیار رہتا تھا۔

''تو پھر کیا پتا چلا؟ وہ حملے کے موڈ میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ تینوں گاڑیاں یکساں پوزیشن میں ہیں۔ فقط دھیان بٹانے کے لیے ایک دوسرے سے آگے پیچھے ہو رہی ہیں۔''

''ہمم'' میرے منہ سے نکلا۔ پھر بولا۔ ''لیکن ہمیں پہلے سے زیادہ محتاط...'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کمیل دادا کے منہ سے چونکنے کے انداز میں ''اَرے'' خارج ہوا۔ میں بھی ٹھٹک گیا۔

''ہوشیار! ان میں سے ایک گاڑی نے اچانک رفتار پکڑ لی ہے۔'' اس نے اپنا جملہ مکمل کیا اور یکدم میرے اعصاب تن گئے۔ میں یک دم اَلرٹ ہو گیا اور عقبی منظر پیش کرنے والے مرر میں دیکھا تو واقعی ایک گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس مجھے تیزی کے ساتھ اپنی کار کے قریب آتی دکھائی دیں۔ کسی ممکنہ خطرے سے میرا پورا وجود سنسنانے لگا تھا۔ اسی وقت میں نے کمیل سے کہا کہ وہ کار کی رفتار مقابلتاً ہرگز نہ بڑھائے۔

جواب میں اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ میں نے اپنا مہیبا سٹیک سلیٹر دائیں ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور بائیں ہاتھ میں سیل تھا کہ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال کے پیش نظر اول خیر سے بھی فوری طور پر رابطہ کرسکوں۔

وہ گاڑی، ٹویوٹا پروبوکس تھی، جو ایک تیز رفتار زناٹے سے ہماری کار سے آگے نکلتی چلی گئی۔ اس وقت میری ساری اٹینشن اسی طرف تھی۔ سندر داس کی طرف سے میری توجہ ہٹی تھی، یوں بھی وہ رسن بستہ حالت میں تھا گاڑی سفید رنگ کی تھی جس کی کھڑکیوں کے شیشے ٹنٹڈ تھے اور میں دیکھ نہیں پایا کہ اندر کتنے افراد موجود ہو سکتے تھے؟

پروبوکس ہماری کار سے چند گز آگے نکل گئی تھی اور ٹھیک اسی وقت وہ ہماری کار کے سامنے آگئی اور بتدریج اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ایک دم بریک لگا کر ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کریں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

وہ ہماری کار کی رفتار کے برابر آ کر اب یکساں اسپیڈ سے سڑک پر رواں دواں تھی۔ میں اُلجھ گیا اور کچھ سمجھ نہ پایا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ دُشمن کیا کرنا چاہ رہا ہے اور آیا ان کا تعلق دُشمنوں سے ہے بھی یا ہمیں کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایسے میں مجھے کمیل دادا کی خود کلامیہ بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''یہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

''یہی میں بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے

پاگل

''وہ سامنے گم صم بیٹھا ہوا شخص پاگل معلوم ہوتا ہے!''

''یہ کیسے کہہ دیا تم نے... ہوسکتا ہے کہ وہ بیوی کا ستایا ہوا کوئی مظلوم شوہر ہو!''

قصۂ جدید وقدیم

لڑکے نے اپنی دوست کو فون کیا۔ روایتی باتوں کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم واٹس ایپ پر ہو؟''

''نہیں... میں تو گھر پر ہوں۔''

''میرا مطلب تھا کہ تم واٹس ایپ استعمال کرتی ہو؟''

''نہیں... میرے ماموں نے امریکا سے گورا کرنے کی کریم بھیجی تھی... میں تو وہی استعمال کرتی ہوں۔''

''ارے بھئی...!'' لڑکا زچ ہو کر بولا۔ ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں واٹس ایپ چلانا آتا ہے؟''

''نہیں... میں نے تو ڈرائیونگ ہی نہیں سیکھی۔ تم چلا لینا، میں پیچھے بیٹھ جاؤں گی۔''

حسن ابدال سے نور العین کی معصومیت

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کہا۔ اسی وقت میں نے محسوس کیا کہ کبیل دادا نے کار کی رفتار مقابلتاً کم کر دی تھی۔ میری طرح وہ بھی محتاط نظروں سے سامنے اور عقب میں گاہے بہ گاہے نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ باقی دو گاڑیاں بھی عقب میں اپنی یکساں رفتار پر تھیں۔

''کیا کرنا چاہ رہے ہیں یہ لوگ آخر۔'' بالآخر کبیل دادا کی جھنجلائی ہوئی آواز اُبھری۔ ''پروبوکس کی رفتار بہت غیر محسوس طریقے سے کم ہو رہی ہے۔''

''تم کار آگے نکال لے جاؤ۔'' میں نے اس سے کہا۔

''یہی کرنے لگا ہوں میں۔'' اس نے جواب دیا اور کار کو ڈبل ٹاپ گیئر ڈالا اور جیسے ہی وہ وین کو کراس کر کے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا پروبوکس آگے آ گئی، کبیل دادا کو فوراً بریک پر پاؤں رکھنا پڑا۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے پُرغیظ سی غراہٹ برآمد ہوئی تھی، اس نے کار کو سنبھالا، رفتار آہستہ ہوئی، اسی دوران کار سڑک کے کنارے، کچے میں اُترتے اُترتے بچی، اور پھر وہی ہوا جس کا ہمارے گمان میں بھی نہ تھا۔

سیٹ پر بہ ظاہر خاموش بیٹھے سندرداس نے نجانے کیا کارروائی کر ڈالی تھی یا پھر میرے دھیان کا بٹنا اس کی خفیہ مگر قلیل کارروائی کو نہ بھانپ سکا تھا کہ اس نے اس کشاکشی کے دوران اپنے دونوں رسن بستہ ہاتھوں کو اس انداز میں بروئے کار لاتے ہوئے کار کا دروازہ کھول ڈالا کہ مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ چلتی کار سے باہر کود چکا تھا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ایک لمحے کو میں سناٹے میں آ گیا کہ یہ ہو کیا گیا تھا۔

کار کا دروازہ کھلا پڑا میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ میں حلق کے بل چیخا۔ ''کار روکو۔ کار روکو۔''

تب تک کبیل دادا کو بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ اس نے یک دم بریک لگائے، تاریک سڑک پر کار کے ٹائر زور سے چرچرائے، مجھے ایک جھٹکا لگا، مگر فوراً ہی خود کو سنبھالا دیا۔ کار بیچ سڑک پر گھومتے گھومتے رکی، مگر اس سے پہلے ہی میں نے بھی کھلے دروازے سے باہر جست لگا دی، پسٹل میں اس دوران جیکٹ میں ٹھونس چکا تھا۔ انہی لمحات میں مجھے یک بیک ایک سے زائد گاڑیوں کے ٹائروں کی سمع خراش چرچراہٹ سنائی دی تھی۔ میرا وجود زمین سے رگڑا، چکرایا، اور دوسرے ہی لمحے میں نے ہاتھوں پیروں کو ماہرانہ انداز میں حرکت دی اور پختہ سڑک پر رگڑ کھانے سے خود کو بچاتے ہوئے اپنے ہاتھ پاؤں سکیڑ کر جسم گول کر دیا اور اسی طرح لڑھکتا ہوا، کسی سنگی شے سے ٹکرایا، جو سنگ میل کا زمین پر گڑا تھا۔

چند... دیگر گاڑیوں کے رکنے سے ان کی ہیڈ لائٹس نے سڑک اور اطراف کا کافی دور تک کا علاقہ روشن کر دیا تھا اور میں نے سنبھلتے ہی اسی روشنی میں تلاشِ غنیم میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنی متلاشی نظروں کو گردش دی تھی۔ اور تب ہی میں نے ایک سنسناتا ہوا منظر دیکھا، میرے جبڑوں سے گرا ہوا شکار کوئی اور شکاری اُچکنے لگا تھا۔

یہ پہلی والی متعاقب گاڑی تھی، جو زمین پہ گٹھڑی سے بنے سندرداس کے بالکل قریب آ رکی تھی، اور اسی وقت مجھے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دی تھی، یہ پروبوکس سے کی گئی تھی جس نے ہماری کار کا راستہ روکا تھا اور سڑک کے درمیان ترچھی کھڑی تھی، ان کا نشانہ ہماری کار تھی، جس میں اب صرف کبیل دادا سوار تھا جو شاید خود بھی خطرے کو بھانپ گیا تھا، میری چمکتی نظروں کے لمحاتی منظر نے کبیل دادا کی کار کی باڈی میں سیکڑوں سوراخ بنتے دیکھے... ٹھیک اسی وقت میں نے کبیل دادا کو کار کے دوسری طراف کے دروازے سے باہر سڑک پر رینگتے ہوئے نکلتے دیکھا اور میں اپنے شکار کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جسے مذکورہ کار سے دو افراد اُتر کر سنبھالا دیے، اپنی کار کی طرف لے جانے کی سعی میں مصروف تھے، مجھے بیک وقت دو کام ترنت نمٹانے تھے، اپنا شکار چھیننا اور کبیل دادا کی مدد کرنا۔

میں نے پل کے پل پوزیشن سنبھالی اور اپنا اسنیک سلیئر سیدھا کر کے تلے اُوپر دو فائر داغ ڈالے، میرا پسٹل آگ اُگلنے والے ڈریگون کی طرح گرجا تھا، میں نے گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس میں شکار چھیننے والے اُن دونوں کے کاندھوں پر کھوپڑیوں کے بجائے خون اور چیتھڑے اُچھلتے دیکھے۔ لمحہ بھر میں ہی ان کی گردنیں کسی ٹوٹے ہوئے پائپ کی طرح دکھائی دینے لگی تھیں۔

میرے ہتھیار کی خطرناکی اور مہیب کاری کو بھانپ کر کار میں بیٹھے نظر آنے والے فقط ایک آدمی پر اپنے ساتھیوں کے حشرناک انجام کی ایسی دہشت بیٹھی کہ اُسے اپنی کار سے باہر آنے کی جرات نہ ہو سکی لیکن دوسری کار جو پہلے سے ہمارے تعاقب میں تھی اس میں دو افراد سوار تھے۔ وہ اسی کار کے عقب میں کھڑی تھی۔ مجھے اول خیر اور شکیلہ کی کار کی جھلک بھی نظر آ گئی تھی۔ میں نے اسی وقت اول الذکر کار کی ونڈ اسکرین کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا، اُوپری نال سے شعلہ

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

چھوٹا اور کار کی اسکرین کے پرخچے اُڑ گئے اور ساتھ ہی خون سے رنگین بھی نظر آنے لگی۔ میں نے اپنے شکار کی راہ مسدود کر دی تھی، وہ رسن بستہ حالت میں بے یار و مددگار اب ٹانگ ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا یا پھر کسی مدد کا منتظر رہتا۔ میں نے اسی وقت اول خیر کو فون کر کے چند ہدایت دیں اور پلٹا۔

مجھے یقین تھا کہ اول خیر اور شکیلہ اب باقی ماندہ صورت حال کو ہینڈل کر لیں گے، میرے لیے اب اصل خطرہ ان وین سواروں کا تھا۔ وہ خاصی تعداد میں ہو سکتے تھے اور دوسرے یہ کہ کمیل دادا ان کے نشانے پانے میں تھا، میں تیزی سے پلٹا اور وین والے دشمنوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے اپنے اسنیک سلیٹر کو ڈبل شاٹ پر ایڈجسٹ کر دیا۔ میں نے دیکھا پروبوکس کے دروازے کھلے تھے اور اس کے اندر سے تقریباً چار افراد چست سیاہ لباس میں... ...کمیل دادا پر تابڑتوڑ گولیاں برسا رہے تھے۔ جبکہ کمیل دادا بھی تنہا ہونے کے باوجود اپنی سی مقدور بھر کوشش میں ان پر جوابی کارروائی کے دوران خود کو اپنی ''چھلنی شدہ'' کار سے دور کرنے کی تگ و دو میں تھا، مگر اُسے خاطر خواہ موقع نہیں مل پا رہا تھا۔

دشمنوں کی طرف سے متوقع خدشے اور کسی چال میں آنے کے حصار کو میری بروقت اور خاطر خواہ کارروائی کو پروبوکس سوار دشمنوں نے بھی تاڑ لیا تھا، یہی نہیں اُنہوں نے ایک چوتھی کار جس میں اول خیر اور شکیلہ سوار تھے اور اپنی کارروائی بہ احسنِ خوبی سرانجام دے رہے تھے، کو بھی تاڑ گئے تھے، اسی وقت میں پروبوکس حرکت میں آئی، غالباً ڈرائیور نے اپنی سیٹ نہیں چھوڑی تھی، پروبوکس کا رخ پہلے کمیل دادا کی کار کی جانب ہوا اور اس سے پہلے وہ چاروں مسلح چست لباس والے کدکڑے مار کے نیچے اُتر چکے تھے، میں نے اپنے اسنیک سلیٹر سے ان پر ڈبل شاٹ کھیلا۔ تلے اُوپر نال والی میرے پسٹل کی دونوں نالیں بھیانک انداز میں بیک وقت گرجی تھیں۔ اس طرح کی نال والے پسٹل سے اگر ڈبل شاٹ کھیلا جائے اور دور رس نتائج متوقع ہوں تو فائر کرتے وقت اسے مخصوص انداز میں ہولے سے ''جرک'' دیا جاتا ہے، میں نے ایسا ہی کیا تھا، یہی سبب تھا کہ اُن چار میں سے دو دشمن پٹ سے گرے تھے، باقی... دونوں کو فوراً اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ میری ہتھیلی میں دیا ہوا ہتھیار ہاتھی کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اُن کو کمیل دادا یا مجھ پر جوابی فائر کرنے کے بجائے اپنی پڑ گئی، تب ہی کمیل دادا کو ان پر اپنا جرمن ساختہ میگارو آزمانے کا موقع ملا، اس نے فائر داغا، ایک دشمن چیخ مار کر گرا، میں نے دوسرے کو کمیل دادا کے رحم و کرم پر چھوڑا اور ٹرن کرتی پروبوکس کے ٹائروں کا نشانہ لیا۔ اس کا رخ کمیل دادا کی پیچھوا اپنی کار کی جانب تھا، لیکن تب تک چونکہ میں کمیل داد کو نکلنے کا موقع دے چکا تھا، وہ ایک شکار... گرانے کے بعد وہاں سے چیتے جیسی سرعت کے ساتھ کھسک گیا۔

ادھر میرے سنگل شاٹ نے پروبوکس کا عقبی ٹائر فلیٹ کر دیا، وین کا بیلنس بگڑا، ڈرائیور کو اُسے سنبھالنے کی پڑ گئی، میرے عقب میں اول خیر اور شکیلہ اپنے اکلوتے دشمن کو ڈھیر کرنے کی سرتوڑ کوشش میں لگے ہوئے تھے، میرا دھیان اس طرف بھی تھا۔ میں نے شکیلہ کو شکار پر پستول تانے اُسے اپنی جگہ ساکت رکھنے پر مجبور کیے ہوئے دیکھا اور اسی جانب لپکا۔

میں نے اول خیر کو اس کار پر بے تحاشا فائرنگ کرتے دیکھا جو اپنے آخری ایک سوار کو لیے واپس بیک کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ میں نے اول خیر کو آواز دی۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے شکیلہ کو شکار سمیت دشمنوں کی دوسری کار سنبھالنے کا کہا اور اول خیر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ... کیا، میں اس طرف متوجہ ہوا تو دیکھا کمیل داد کا شکار پروبوکس کا ٹائر برسٹ ہونے کے بعد ڈرائیور سمیت کہیں تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ سڑک پر ٹریفک جام ہونے لگا تھا، ہم نے شکار سمیت نکلنے کی ٹھان لی اور دشمن کی کار میں آگے نکل گئے۔

کار اب اول خیر ڈرائیو کر رہا تھا، میں اس کے برابر میں بیٹھا تھا، عقبی سیٹ پر سندر داس شکیلہ اور کمیل دادا کے بیچ ٹھنسا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے، ہم نے دشمن کی چال بری طرح ناکام بنا دی تھی۔

''مبارک ہو شہزی! تمہاری پلاننگ کامیاب گئی، ورنہ آج شکار ہاتھ سے گیا تھا۔''

کمیل دادا نے کھلے دل سے میری تعریف کی۔ میں نے مختصراً شکریہ کہا۔ میں اس وقت غصے سے بھرا بیٹھا تھا، کرنل سی جی نے حسب توقع میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ میں نے اس سے باری باری ان نمبروں پر رابطہ کرنے کی کوشش چاہی، جن سے وہ اب تک میرے ساتھ رابطہ کر چکا تھا، مگر سب بند ملے۔

میری اس حرکت کو دیکھتے ہوئے میرے برابر میں

READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے اول خیر نے کہا۔ “فکر نہ کر کاکے! اس مردود دھوکے باز کرنل کی کال خود ہی آجائے گی، جب اس کے حواری اپنی ناکامی کی اسے اطلاع دیں گے۔”

“میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ کرنل سی جی کی نیت ٹھیک نہیں، اس نے شہزی کی جذباتی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی تھی۔ اور اپنا شہزی بھی بے چارہ اپنے باپ کو اس کے چنگل سے چھڑانے کے لیے، اتنا بڑا رسک لے بیٹھا۔”

عقبی سیٹ پر بیٹھے کبیل دادا نے تبصرہ کیا۔ میں اندازہ نہ کرسکا کہ یہ بات اس نے طنز میں کہی تھی یا یونہی۔ تاہم اول خیر چپ نہ رہ سکا، بولا۔

“دادا! ماں پیو کی خاطر شہزی کیا کوئی بھی بڑے سے بڑا آدمی اپنی جان تک کا بھی رسک اُٹھا لینے میں دیر نہیں کرے گا۔ یہ تو پھر سندر داس تھا۔” اول خیر کی بات صحیح تھی۔ اس نے پہلی بار آج کبیل دادا کو “استاد” یا “بڑا استاد” کہہ کر مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ کبیل دادا کی اس بے چارے کے ساتھ مستقل رُکھائی کا انداز تھا۔ میں چپ رہا کہ کہیں اول خیر کی حمایت میں بولنے پر کبیل دادا اسے میری جانبداری پر محمول نہ کرے، کیونکہ اس وقت وہ بھی بہرحال ہمارا ساتھی تھا اور ہمارے کاز میں شامل بھی۔

“میں نے تم سے بات نہیں کی ہے۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔” کبیل دادا نے اُسے جھڑک دیا۔ ٹھیک اسی وقت اول خیر نے کار کے بریک لگا دیے۔

رات کے پچھر سناٹے میں کار کے ٹائر زور سے چرچرائے... اور وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہم سب اول خیر کی اس حرکت پر چونک گئے۔ اس نے اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر کبیل دادا کو سخت نظروں سے گھورا اور بولا۔

“بس دادا! اب تک میں نے تمہاری جتنی عزت کرنی تھی کرلی۔ تمہیں اگر مجھ سے بات کرنا پسند نہیں ہے تو شہزی کاکے کے کاموں میں کیڑے بھی مت نکالو۔ شہزی کاکے کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ یہ جذباتی فطرت کا آدمی ضرور ہے لیکن اپنے بچاؤ کی سُدھ بُدھ بھی رکھتا ہے۔ اس کا ثبوت ہم سب کے سامنے ہے۔”

کار کے محدود ماحول کو یک بیک گمبھیر تا سی چپ کھا گئی۔ خود میں بھی اول خیر کا کبیل دادا کو آج پہلی بار اس طرح کے انداز میں مخاطب ہوتے دیکھ کر دم بہ خود سا رہ گیا تھا۔

ظاہر ہے آدمی کب تک اپنی بے عزتی برداشت کرسکتا ہے۔ اول خیر نے بھی ایک حد تک صرف پرانے تعلقات کی وجہ سے برداشت کیا تھا۔ مگر اب وہ میرا ساتھی تھا۔ “بیگم ولا” اور “بیگم صاحبہ” کے گروہ سے راندۂ درگاہ ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں کبیل دادا کے لیے عزت تھی مگر...

“تم اپنی اوقات میں رہ کر بات کیا کرو اول خیر! ورنہ...” کبیل دادا نے ایک بار پھر اُسے لتاڑا اور دھمکی دی تو اول خیر نے اس کی طرف بڑی خوں ریز نظروں سے گھورا اور اسی لہجے میں اس کا جملہ لوٹایا۔

“میری اوقات سننا چاہتے ہو ناں تو سن لو آج تم بھی دادا! حقیقت یہی ہے کہ اس سے پہلے میں خود کو ایک غلام ہی تصور کرتا تھا، مگر شہزی کاکے کی یاری میں آنے کے بعد مجھے اپنی اصل حیثیت اور حقیقت کا اندازہ ہوا ہے۔ جہاں جذبات اور دوستی کے رشتوں کی قدر کی جاتی ہے۔ کیا قصور تھا میرا جو میری اتنی قربانیوں کو بیگم ولا میں نظرانداز کر دیا گیا۔ بیگم صاحبہ کی ایک حکم عدولی ہی کی تھی ناں میں نے۔ وہ بھی اپنے کسی ذاتی مقصد کے لیے نہیں۔ اپنے ہی گروہ کے ساتھی چھنے کی خاطر۔ کیا کرتا میں؟ وہ دو چھوٹے معصوم بچوں کا باپ اور ایک بیوی کا شوہر تھا، کنبے کا واحد کفیل۔ محض ایک ذرا سی غلطی پر میں اُسے گولی کیسے مار سکتا تھا؟ اُسے معاف کیا جاسکتا تھا...” یہ کہتے ہوئے اول خیر کا لہجہ رقت زدہ سا ہونے لگا۔

“اگر یہ بات تھی تو تمہیں بیگم صاحبہ کو بتانا چاہیے تھا۔” کبیل دادا اس سے درشت لہجے میں بولا۔

“مجھے ڈر تھا کہ وہ یہ کام کسی اور کے ذمے لگا دیتیں۔ چھنے نے کئی مواقع پر میری جان بچائی تھی۔ میں اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔”

“کچھ بھی تھا۔ یہ بات چھپا کر اور غلط بیانی کرکے کہ تم نے چھنے کو بیگم صاحبہ کے حکم پر گولی ماردی ہے، یہ جھوٹ اس سے بڑا جرم بن گیا تھا تمہارا۔ بیگم صاحبہ اتنی ظالم ہوتیں تو بعد میں بھی چھنے کو مروا سکتی تھیں، لیکن اُنہوں نے ایسا نہیں کیا۔” کبیل بولا تو اسی وقت شکیلہ نے بیزاری سے کہا۔

“یہ تم لوگ ایسے نازک وقت میں کس غیر متعلقہ بحث میں لگ گئے ہو؟ دشمن سر پہ سوار ہے۔ آگے کی سوچو۔”

“گاڑی چلاؤ، یار تم!” میں نے بھی بیزار سا ہو کے اول خیر سے کہا اور اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پھر بولا۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اب آگے بڑھنے کا کیا فائدہ ہے شہزی کاکے! اس مردود بھارتی کرنل کی نیت کا فتور تو آشکارا ہو چکا ہے۔ وہ اس ڈیل سے مخلص نہیں ہے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ حسبِ معمول کرنل سی جی کی نئے نمبر سے کال موصول ہو گئی۔ میں نے دانت پیس کر ہیلو کہا تھا تو دوسری طرف سے اس بدبخت کی آواز اُبھری۔

''کہاں تک پہنچے؟'' اس کے لہجے کا تاثر ایسا ہی تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ... وہ ایک دم انجان بن گیا تھا۔ پل کے پل میرے ذہن میں ایک خیال اُبھرا۔ جھوٹے کو گھر تک پہنچانا چاہیے، کوئی شکوہ کیے بغیر میں بھی اسی لہجے میں بولا۔

''بس! پہنچنے ہی والے ہیں۔ اب آگے کی صورتِ حال بتا دو۔'' دوسری جانب یک دم خاموشی سی چھا گئی۔ یقیناً میرے بھی اس طرح انجان بن جانے پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ تاہم اس بار جب بولا تو اس کی آواز میں پہلے جیسا اعتماد نہیں رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ لاہور پہنچ کر تم مقررہ مقام پر پہنچو، اس کے بعد اسی نمبر پر مجھ سے رابطہ کرنا۔ وہاں پہنچ کر ہماری آخری بات ہو گی اور ڈیل بھی۔ اس کے بعد تم اپنا راستہ لینا اور ہم اپنا اور یاد رکھنا۔ صرف تم ہو گے اور تمہارا ایک ساتھی ہمارے آدمی کے ساتھ۔ چوتھا نہ ہو۔''

''ایسا ہی ہو گا۔ مجھے یاد ہے۔ بار بار یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔'' میں نے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا تو اس خبیث نے گڈ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے چال چل رہے تھے، کامیابی کسے ملنے والی تھی؟ یہ سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے مایوسی سی ہونے لگی تھی۔

کرنل سی جی اپنی ڈیل سے مخلص نظر نہیں آرہا تھا ورنہ یہ چال کیوں چلتا؟ ایک خیال یہ بھی میرے سوچتے ہوئے ذہن میں اُبھرا تھا کہ کیا خبر یہ کسی اور لوگوں کا حملہ ہو، مگر جلد ہی میں نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ اگر یہ چال کرنل سی جی نے نہیں چلی تھی تو پھر اُسے اب تک کی ہمارے بارے میں ''کرنٹ'' رپورٹنگ کون کر رہا تھا؟ حالانکہ اس وقت تو میرے ساتھ اور بھی ساتھی کار میں موجود تھے۔ اس کا اسے کیوں نہیں پتا لگ سکا تھا؟ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ اب اس کے بیشتر متعاقب حواریوں کو ہم نے واصلِ جہنم جو کر ڈالا تھا۔ اب کوئی ہمارے تعاقب میں نہ تھا۔ لیکن یہ بات کرنل ہم سے نہیں پوچھ سکتا تھا، ورنہ اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی اسی کی ''انجان'' بننے کی ایکٹنگ جاری رکھی تھی۔ اندازہ تو اب اُسے بھی اچھی طرح ہو گیا ہو گا کہ میں اتنی آسانی سے قیدی سندر داس کو اس کے حوالے نہیں کرنے والا۔ اس لیے اُسے اب یہ ڈیل حقیقی بنیادوں پر کرنا پڑے گی۔

سکون

بیوی روٹھ کر میکے گئی اور اپنی ماں کے گھر بیٹھ گئی۔ شوہر نے پہلے روز فون کیا تو ساس نے نرمی سے بات کی۔ پھر یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔ وہ روز فون کرتا اور اپنی شکایات دہراتا، ساس ہی فون اٹھاتی۔ زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد والا معاملہ دیکھ کر اس نے بھی تلخی اختیار کر لی اور داماد کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

چالیسویں دن داماد نے فون کیا تو وہ بپھر کر بولی۔ ''میں تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ اب وہ تمہارے لیے مر چکی ہے... تم بار بار فون کر کے تنگ کیوں کرتے ہو؟''

''مر چکی ہے!'' داماد کی آسودہ آواز آئی۔ ''یہ سُن کر کتنا سکون ملتا ہے... یہی سننے کے لیے تو روز فون کرتا ہوں!''

کوہاٹ سے ارجمند خان کی سرگوشی

یہ سوچ کر مجھے کچھ اُمید ہوئی کہ اب کرنل سی جی بھوانی کی باری تھی کہ وہ میری چال میں آتا۔

''حیرت ہے، تم نے کرنل سی جی کو تاڑا نہیں؟'' کمیل دادا نے کہا۔

''اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی کہ یہ ظاہر ہوتا کہ یہ حرکت اسی ملعون کی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس منحوس کے علاوہ اور بھلا کس کی یہ حرکت ہو سکتی ہے۔ اب بھلا وہ یہ بات اپنے منہ سے کہہ سکتا تھا؟''

''اسی لیے تو میں نے بھی کچھ نہیں کہا۔ جس طرح اس نے مجھ پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اسی طرح میں نے بھی اس سے انجان بنے رہنے کا کھیل کھیلا۔''

''لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ محض تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے، وہ اپنا شکار ہم سے چھین لینا چاہتا ہے اور ہمیں ہمارا مطلوبہ آدمی دینے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔''

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''اب نکل پڑے ہیں تو دیکھنا ہی پڑے گا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ اتنا تو اُسے بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم اتنی آسانی سے اس کے نرغے میں آنے والے نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے اس نے یہ حرکت ایک جوئے کے طور پر کھیلی ہو۔ اب شکست کے بعد وہ اصل سودے پر مجبور ہو جائے۔'' میں نے کہا تو کبیل دادو چپ ہو رہا۔ وہ شاید اب میری بات سمجھا تھا۔

اول خیر نے ہولے سے ''اوخیر۔'' کہا تھا۔ ہمارا سفر ایک مختصری جنگ ریز ہلچل کے بعد دوبارہ شروع ہو گیا تھا۔

کبیل دادا مجھے بے دلی کا شکار نظر آ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ کرنل سی جی میرے ساتھ ایک ''ایموشنل گیم'' کھیل کر اپنا مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے اور میں اس کے ہاتھوں جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہا تھا۔ میں کبیل دادا کی اس سطحی سوچ کو اس کی کج روی پر ہی محمول کر سکتا تھا۔ بات تو ویسے اس کی بھی ٹھیک ہی تھی، اور ہو بھی سب کچھ ویسے ہی رہا تھا، جیسا کہ وہ سمجھے ہوئے تھا۔

کیمبر کینٹ کراس کرتے ہوئے ہم اوکاڑہ پہنچے۔ اس وقت دور مشرقی اُفق کسی نئی نویلی دُلہن کے رُخساروں کے مانند دہکنے لگا تھا۔ ہمارا سفر اب لاہور روڈ پر جاری تھا۔ آگے سڑک کے کنارے ایک پیٹرول پمپ نظر آیا۔ اول خیر نے کار اسی طرف موڑ لی۔

کار میں پیٹرول ڈلوانے کے بعد ہم آگے روانہ ہونے لگے تو کبیل دادو گمبھیر آواز میں بولا۔ ''شہزی! کرنل بجوانی سے رابطہ کر کے اُسے۔ بتا دو کہ ہم اس کے مقررہ مقام تک پہنچ چکے ہیں۔''

اگرچہ ابھی ہم مطلوبہ مقام سے کافی دور تھے، تاہم مجھے اس کا مشورہ معقول لگا۔ چونکہ مجھے اس بار کرنل بجوانی نے خود ہی مذکورہ نمبر پر رابطہ کرنے کا کہا تھا اسی لیے میں نے وہی نمبر کھڑکا دیا۔

''ہم مطلوبہ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔'' رابطہ ہوتے ہی میں نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ چند ثانیے کی پُرسوچ خاموشی کے بعد بولا۔

''تمہارا مطلب ہے تم کرباٹ سنگھ پہنچ چکے ہو؟''

''میں نے فارسی نہیں بولی، کیا اُردو اور ہندی میں کوئی فرق ہے؟'' میرا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا۔

''اپنا لہجہ درست کرو۔ جانتے نہیں میں کون ہوں۔ تم اس وقت فوجی رینک کے ایک بڑے اور افسرِ اعلیٰ سے بات کر رہے ہو۔ سمجھے تم؟'' وہ پُرغرور لہجے میں بولا۔

''افسرِ اعلیٰ ......! میں یہی پوچھ رہا ہوں۔ آگے کی کیا ہدایت ہے؟'' میں نے زہریلے طنز سے کہا۔

''مت بھولنا یہ کہ میں کسی وقت بھی تمہارے آپشن کو اگنور کر سکتا ہوں۔'' اس کی بھی غراتی ہوئی آواز اُبھری۔ ''اسی لیے آئندہ اپنا لہجہ درست رکھنا۔''

اس کا خار کھایا ہوا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے اب تک آنے والی کا بھاؤ معلوم ہو چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے شکست خوردہ ایجنٹ نے اُسے اب تک اپنی ناکام ''مہم جوئی'' کے بارے میں آگاہ کر دیا ہوگا کہ وہ جسے تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے وہ گلے کا چھچھوندر ثابت ہوا تھا۔ وہ بھی ایسا کہ تقریباً سب کے گلے چیر ڈالے تھے۔ وہ نفسیاتی طور پر میرے دباؤ میں تھا۔ جس نے اسے جھلاہٹ آمیز غصے اور غرور میں مبتلا کر دیا تھا۔

یہ بات وہ مجھے شاید کوئی دوسری یا تیسری بار جتا چکا تھا کہ اس کے پاس مجھ سے ڈیل کے علاوہ بھی اور بہت سے آپشن تھے اور میں اس کی یہ بکواس کسی مصلحت کے تحت سنتا اور برداشت کرتا آ رہا تھا۔ لیکن اس بار نہ کر پایا اور ترنت بول اٹھا۔

''مسٹر افسرِ اعلیٰ ......! اگر تمہارے پاس اور بھی آپشنز ہیں تو وہ تمہیں مبارک ہوں، آپشنز تو میں بھی بہت سے رکھتا ہوں، بس، بات آسانی کی ہے، جہاں طے ہو جائے، اسی لیے مجھے اب تم بار بار یہ جتانے کی کوشش نہ کرو، اور وقت ضائع کرنے کے بجائے صرف کام کی باتیں کی جائیں تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔''

اس بار وہ کسی فالتو بکواس کرنے کے بجائے کام کی بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''ہم بھی یہی چاہتے ہیں، مجھے اب یہ بتاؤ کہ پنڈ کرباٹ سنگھ میں تم کون سے مقام پر موجود ہو اس وقت؟''

''ہم پنڈ کرباٹ سنگھ کی نیو کالونی والی جگہ پر کہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔'' میں نے ایک اور جھوٹ بولا۔

''کہاں؟ کس کے پاس اور کون ہے تمہارے ساتھ؟'' اس نے بڑی بے چینی سے استفسار کیا تو بے اختیار میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی اور میں تیز لہجے میں بولا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو کرنل بجوانی! اور اب اس ہاتھ دو اور اس ہاتھ لو والی بات ہوگی۔'' میں جانتا تھا وہ ہماری لوکیشن ٹریس کر کے ایک بار پھر اپنے مسلح

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

گرگوں کے ذریعے ہم پر ہلا بولنے کی کوشش کرسکتا تھا۔

”تمہاری نیت میں مجھے فتور محسوس ہو رہا ہے مسٹر شہزی! ایسے غیر یقینی ماحول اور بد اعتمادی کی فضا میں ہمارے درمیان اتنی اہم ڈیل کس طرح ممکن ہوسکتی ہے؟“

وہ شاطرانہ لہجے میں بولا اور مجھے اس کی مکاری پر بے تحاشا غصہ آنے لگا - میں نے سوچا کہ یہی وقت ہے اس مردود اور دھوکے باز انسان کو آئینہ دکھا دیا جائے، لہٰذا بولا۔

”خاطر جمع رکھو بجوانی! نہ تم اتنے بے خبر ہو اور نہ ہی ہم اتنے نادان، تم ہم پر ایک حملہ کروا چکے ہو اور اب تک اس کے انجام سے بھی... واقف ہو چکے ہو گے۔ اگر اب تم دوبارہ یہی بے وقوفی دہرانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو تو اس سے نہ صرف ڈیل متاثر ہوگی بلکہ بار بار یہ جنگ ہم دونوں کے لیے بھی نقصان کا سبب بن سکتی ہے، اور کم از کم یہاں تو... بالکل بھی نہیں کہ سرحدی علاقہ قریب ہے۔ اور ہماری آپس کی جنگ میں بی ایس ایف یا ایسا ہی کوئی حساس ادارہ کود پڑا تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس ڈیل کو شفاف رکھو۔ ورنہ ہم ادھر سے ہی واپس لوٹ جاتے ہیں۔“

اس بار میں نے بھی اس سے دوٹوک لہجے میں بات کرلی، جس پر وہ بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کیونکہ دوسری جانب کچھ لمحات کے لیے خاموشی سی طاری ہوگئی تھی، پھر اس کی آواز اُبھری۔

”پتا نہیں تم کس حملے کی بات کر رہے ہو؟ او کے۔ تم لوگ بی آر بی پار کرکے دوسرے کنارے پہ آجاؤ۔ ہم وہاں ایک مڑھی میں تمہارے منتظر ہیں۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے لوکیشن مجھے بتا دی۔ اور کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر ڈالا۔

میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

”او خیر کا کے! اب تم نے اس دغا باز آدمی کو صحیح جواب دیا۔ ورنہ تو یہ مردود ہمیں اب تک اپنے آگے لگائے ہوئے تھا۔“ اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا تو کہبیل دادا نے مجھ سے مخاطب ہو کر سنجیدگی سے کہا۔

”اب بھی ہم اس کے کہنے پر ہی تو لگ رہے ہیں۔ جو یہ کہہ رہا ہے وہ ہم بلا چون و چرا کیے جا رہے ہیں۔ بی آر بی پار کرنا آسان نہیں، اور اس سے زیادہ مشکل اُس مقام پر پہنچنا ہے، جو انڈیا کے بارڈر کے قریب ہے، گویا وہ ہم سے اپنا شکار چھین کر بہ آسانی پلٹنے کا ارادہ اور راستہ بھی محفوظ دیکھے ہوئے ہے۔“

”میرا خیال ہے شہزی! کہبیل دادا کی بات غلط نہیں ہے۔“ شکیلہ نے پہلی بار کہبیل دادا کی کسی بات کی تائید کی تھی۔ میں نے بھی اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں ایک ذرا اپنی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

”تو کیا ہمیں بجوانی کو اس بات پر مجبور کرنا چاہیے کہ وہ خود بی آر بی پار کرکے ہمارے طے کردہ مقام پر ملے؟“

”بالکل۔“ کہبیل دادا نے فوراً اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

”وہ نہیں مانے گا۔“

”تم اس سے ذرا یہ بات کہہ کر تو دیکھو کہ وہ جواب کیا دیتا ہے؟ پھر اس کا بھی حل سوچ لیتے ہیں۔“ اول خیر نے کہا۔ وہ بھی مجھے کہبیل دادا کے مشورے سے متفق نظر آیا، اگرچہ بات غلط بھی نہیں تھی، مگر میں اپنے بدنصیب باپ کو ہر قیمت پر اس سفاک اور ظالم ہندو کرنل کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا۔ چاہے مجھے اس کے لیے سرحد پار ہی کیوں نہ جانا پڑتا.... لیکن میں نے ساتھیوں کی بات پر سر دست اتفاق کرتے ہوئے اسی وقت کرنل بجوانی سے رابطہ کرلیا اور اپنی بات اس کے سامنے رکھی مگر وہ خبیث نہیں مانا اور رابطہ منقطع کردیا۔ اس رذیل کی ہٹ دھرمی پر میں .... بری طرح کھول اُٹھا تھا۔ بالآخر میں نے کوچ کا حکم دے دیا۔

لاہور کی سمت جاتی ہوئی اس روڈ پر خاصی ٹریفک نظر آتی تھی۔ بہرحال ہم بھائی پھیرو، سرائے چھیما اور رینا ناتھ کراس کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں سندر اڈا پہنچ گئے۔ آگے ٹھوکر نیاز بیگ پہنچنے میں ہمیں بہ مشکل پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے۔

ٹھوکر نیاز بیگ کینال بینک روڈ پر نہر کے کنارے کنارے کار دوڑاتے ہوئے ہم پینتیس، چالیس منٹ بعد بھٹہ چوک پہنچے تو ہمیں ناشتے وغیرہ کی طلب ہوئی۔ ایک روڈ سائڈ ہوٹل کے وسیع احاطے میں اول خیر نے کار روک دی۔

یہاں رُکنے سے پہلے ہم نے اس بات کی اچھی طرح سے تسلی کرلی تھی کہ کوئی پولیس چوکی یا حساس ادارے کے اہلکار سے ہماری مڈبھیڑ نہ ہونے پائے، اگرچہ میرے پاس رینجرز فورس کا کارڈ تھا، لیکن حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ میں وہ کارڈ شو کرتا۔ چہ جائیکہ اس کی اشد ضرورت نہ پڑتی۔

ہم سب کار سے نیچے اُتر آئے۔ آسمان پر بادل چھانے لگے تھے، ٹھنڈ کی لہر بڑھنے لگی تھی، موسم کے تیور بوندا باندی کا پتا دے رہے تھے۔ سڑک پر ٹریفک کی شائیں

READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

شائیں جاری تھی۔ اول خیر ناشتے کا آرڈر دینے کے لیے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا جبکہ ہم نے سندر داس کو باہر نکالنے کے بجائے عقبی سیٹ پر لٹا دیا اور شکیلہ کار کی اگلی سیٹ پر موجود رہی۔ میں اور کمبیل دادا سڑک کے کنارے احاطے میں بچھے ہوئے بان کے پلنگ پر بیٹھ گئے۔ اسی وقت ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ ہم نے اپنا پلنگ ایک بڑے سے بانس کے چھپر..... تلے کھسکا لیا۔

ہمیں آگے روانگی کی عجلت تھی اسی لیے اول خیر خود ہی ناشتے کی ٹرے اُٹھا لایا تھا۔ پہلے اس نے کار میں بیٹھی شکیلہ کو ناشتا پہنچایا اس نے خود بھی ناشتا کیا اور تھوڑا بہت سندر داس کے منہ میں بھی ٹھونسا۔ ہم تینوں بان والے پلنگ پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگے۔ پراٹھے گرما گرم، مزیدار اور خستہ تھے، آملیٹ کے ساتھ اول خیر ایک باؤل دہی سے بھر کے بھی لے آیا تھا، وہ ناشتے میں دہی کھانے کا عادی تھا۔ اس پر کمبیل دادا نے اس سے کہا۔

''دہی ذرا کم ہی کھانا۔ صبح دہی کھانے سے واہی تباہی ہونے لگتی ہے، ٹھنڈ اور بارش الگ پڑ رہی ہے اور تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے ہو۔'' اس کی بات پر میں ہولے سے مسکرایا تھا اور ترچھی نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھا تھا۔ مجھے کمبیل دادا کا اول خیر سے پہلی بار اس طرح مخاطب ہونا اچھا لگا تھا۔ یہ اس کا ایک طرح سے دوستانہ انداز تھا جبکہ رہی سہی کسر اول خیر نے بھی پوری کر دی، وہ اس کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''او خیر وڈے اُستاد جی! جو اس شے کا عادی ہو اُسے کچھ نہیں ہوتا، پہلی دفعہ کھانے والے کو ضرور سستی اور آلکسی دیتا ہے دہی۔''

اول خیر کا کمبیل دادا کو پرانے لقب ''بڑے اُستاد جی'' کہنا بھی مجھے اچھا لگا۔ ان دونوں کے بیچ دوستانہ ماحول دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہوئی تھی۔ درحقیقت میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان صلح ہو جائے اور جانتا تھا میں کہ کمبیل دادا سے اول خیر کی صلح ہونے کا مطلب ''بیگم صاحبہ'' سے صلح ہونا تھا۔ اس بات کا تو مجھے بھی اعتراف تھا کہ کمبیل دادا اور اول خیر دونوں ایک دوسرے کے پرانے ساتھی اور یار بیلی تھے۔

بہرحال ہمارے بیچ اس دوران مزید کوئی خاص بات چیت نہ ہو سکی۔ شکر تھا کہ کمبیل دادا نے اس مہم میں دوبارہ کوئی مین میخ نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی، شاید اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اس وقت کرنل بجوانی کی باتیں ماننے پر مجبور تھا۔ اور کیا کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، اس کا بھی وہ ادراک رکھتا تھا۔

''جمع خرچ'' کے ساتھ ہمیں کوئی بیس سے پچیس منٹ لگے ہوں گے اس کے بعد ہم آگے روانہ ہوگئے۔ ہم اپنے متوقع تعاقب پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ جس کے ابھی ہم میں سے کسی کو بھی ایسے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ شاید کرنل بجوانی کے پاس اب افرادی ایجنٹوں کی قلت ہوگئی تھی، یا پھر ان کا ایک گروپ نہر پار اس مڑھی کے پاس موجود تھا، جہاں، ہمیں پہنچنا تھا اور اس ڈیل کو آخری صورت دینا تھی۔

ہلکی بارش شاید کڑکڑاتی سردی کا پتا دینے کے بعد معدوم ہوگئی تھی۔ مگر موسم کھل گیا تھا۔ سردی جوں کی توں تھی۔

دس پندرہ منٹ بعد ہم روہی والا پُل پر آگئے۔ یہاں سے ہم نے بڑی سڑک چھوڑ دی اور نالے کے دائیں کنارے پہ ہم آگے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اردگرد کھیت کھلیان، صبح کی عطر بیز فضا میں لہلاتے نظر آرہے تھے، انہی کے بیچ کہیں کہیں بھٹوں کی چمنیاں دھواں اُگل رہی تھیں، نالے کے کنارے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ آگے نیو کالونی کی دیوار نظر آرہی تھی۔ جو تقریبا پانچ منٹ دس منٹ کے سفر کے بعد اختتام پذیر ہوئی۔ اور ہم چنڈ کر باٹ سنگھ میں تھے۔

ایک نسبتاً ویران مقام پر پہنچ کر اول خیر نے کار روک دی۔ یہاں آس پاس خاصے اُونچے ٹیلے ٹبے نظر آرہے تھے۔ اب مسئلہ نہر پار کرنے کا تھا۔ نہر کے دونوں طرف کے کراڑے بہت اُونچے تھے۔ جبکہ نہر کا چوڑا پاٹ خاصی گہرائی میں بہہ رہا تھا۔

پُل کی طرف سے چوکیوں کی بتیاں صبح کاذب کی روشنی میں بھی چمکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اسی وقت کرنل بجوانی کی کال آگئی، وہ چھوٹتے ہی بولا۔

''تم لوگ ابھی تک نہیں پہنچے؟ کدھر رہ گئے ہو؟''

''پہنچ تو ہم کب کے گئے ہیں، مگر نہر پار کرنے کے لیے ہمیں کچھ اسپیشل ایفرٹس لینا پڑ رہے ہیں۔'' میں نے جواز گھڑا۔

''پُل سے ہم لوگ نہیں آسکتے کہ وہاں سخت پہرا ہے اور چوکیاں بنی ہوئی ہیں، نہر پار کرکے آنا پڑے گا۔ اور ہم ایسی کسی تیاری سے نہیں آئے ہیں، تم پہلے بتا دیتے کہ نہر بھی

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پار کرنی ہے تو ہم اپنے ساتھ پیراکی کا لباس لے آتے۔" میں نے دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

"تو اب کیا سوچا ہے؟ کچھ بندوبست کیا تم نے نہر پار کرنے کا؟" وہ بولا۔

بسا اوقات انسان کا ذہن وقت اور حالات کے مطابق بالکل ٹھیک کام کر جاتا ہے، ایسے ہی وقت میں میرے ذہن میں بھی ایک خیال کلک ہوا۔ میں نے کہا۔

"نہر پار کرنا مشکل ہی نظر آرہا ہے۔ اگر ہم ڈھیٹ بن کر اپنی سی کوشش کر بھی لیتے ہیں تو تمہارے آدمی کے ڈوب مرنے کا خطرہ ہوگا، کیونکہ اُس کے ہاتھ پیر ہم نے باندھے ہوئے ہیں اور تیرنا صرف مجھے آتا ہے، میرے ساتھی کو نہیں، جبکہ میں اکیلا تمہارے آدمی کو سنبھالے ہوئے دوسرے کنارے نہیں آسکتا۔"

لمحے بھر کی خاموشی کے بعد کرنل بھوانی بولا۔ "ہمارے ساتھی سندر داس کو تیرنا آتا ہے۔ تم اس کی مشکیں کھول دو۔"

"یہ میرے لیے ممکن نہ ہوگا کرنل!" میں نے مسکت جواب دے ڈالا۔ "اس سے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ میں واپس ہی لوٹ جاؤں۔"

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔ اپنے باپ کو لیے بغیر تم کیسے خالی ہاتھ..."

"میں واقعی ایسا نہیں کرتا۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن ایک تو میں تمہاری طرف سے اب بددلی کا شکار ہونے لگا ہوں۔ دوسرے یہ کہ مجھے نہر پار کرنے کی کوئی سبیل بھی نظر نہیں آرہی۔ اب ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ تم ہماری طرف پیش قدمی کرو۔"

"یہ نہیں ہوسکتا۔ نہر تمہیں ہی پار کرنا ہوگی۔"

وہ حتمی لہجے میں بولا تو میں نے بھی بلاتامل کہا۔ "تمہاری مرضی پھر، میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر واپس لوٹ جاؤں گا، یوں بھی مجھے تمہاری نیت پر کامل شبہ ہونے لگا ہے۔ ہم بھی تو آخر ملتان سے اتنا طویل سفر کرکے یہاں تک پہنچے ہیں، کیا تم نہر بھی نہیں پار کرسکتے؟"

مجھے اس بار سخت رویہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نہیں جانتا تھا کہ نہر کے پار اور سرحد کے قریب اس کے کتنے آدمی ہمارے منتظر ہوسکتے تھے؟ اور کتنے گھات لگائے بیٹھے ہم پر دوسرا حملہ کرنے کو تیار تھے؟

چند سیکنڈوں کی خاموشی کے بعد کرنل بھوانی بولا۔ "میری کال کا انتظار کرو۔" کہہ کر وہ رابطہ منقطع کرنے لگا تو میں نے بلا تاخیر کہا۔ "کال جلدی کرنا، ہم یہاں ایک خطرناک قیدی کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔"

اس نے اثبات میں جواب دیا اور میں نے اپنے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کی تو کمیل دادا بولا۔ "اب تم نے اس دغاباز کرنل کو ٹھیک جواب دیا۔ کوشش یہی کرو کہ کرنل تمہاری بات مان لے، کیونکہ نہر پار کرنے میں بہت رسک ہے، نجانے دوسری طرف اس مردود کے کتنے آدمی ہماری تاک میں بیٹھے ہوں گے؟"

"تو کیا ان لوگوں نے اتنی آسانی سے سرحد پار کرلی ہوگی اور سب ایک جگہ جمع ہوگئے؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" شکیلہ نے قدرے حیرت سے کہا تو اول خیر نے جواب دیا۔

"ہم اس وقت جس جگہ پر کھڑے ہیں وہ سرحد کا ایک دور اُفتادہ علاقہ ہے، ممکن ہے ان کے چند ایجنٹوں نے کسی بھیس میں سرحد پار کرلی ہو۔"

"یہ ضروری نہیں کہ اُن لوگوں کو سرحد پار کرنا پڑے، بلیو ٹلسی کے ایجنٹ پہلے ہی سے یہاں موجود ہوں۔" میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے پُرغور لہجے میں کہا۔ "کرنل سی جی بھوانی کی باتوں اور دیگر عوامل سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ بلیو ٹلسی کے ایجنٹ اپنے گرو گھنٹال کی ایک ایک ہدایت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ایک گروپ کو تو ہم نے راستے میں ہی ڈھیر کردیا تھا، دوسرا گروپ ہماری گھات میں نہر کے کنارے موجود ہوسکتا ہے۔" اسی وقت کمیل دادا نے ٹکڑا دیا۔

"اور کوئی بعید نہیں کہ اُن کا کوئی ایجنٹ ہمارے کہیں اریب قریب بھی موجود ہو۔" کمیل دادا کے اس خدشے نے میرے پورے وجود میں سنسنی کی لہر سی دوڑادی۔ اس کا خیال غلط نہیں ہوسکتا تھا، یہ ممکن تھا۔ میں نے غیرارادی طور پر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔

ہم کار سے اُتر کر باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔ ہمارے اطراف میں دور و نزدیک ویرانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ کسی آبادی کے آثار اور نہ ہی کوئی روئیدگی تھی۔ ماسوائے ٹیلوں ٹبوں کے۔ بہرطور ہم اپنے گردوپیش سے محتاط تو تھے ہی۔ اول خیر نے کہا۔ "پتھر اپنی جگہ بھاری ہوتا ہے۔ ہم نے جتنی پیش قدمی کرنا تھی کرلی، اب کرنل بھوانی کی باری ہے۔ وہ ہماری طرف بڑھے۔ مزید رسک لینا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔" اس کی بات صحیح تھی۔ سندر داس جیسا ایٹم بم ہمارے ساتھ تھا، وہ اگر ہاتھ سے نکل جاتا تو اس کے بعد کے اثرات کسی قیامت سے کیا کم ہوتے۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"سوال وہی پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان لوگوں کے ساتھی پہلے ہی سے یہاں موجود ہیں تو پھر ہمارا مطلوبہ آدمی کہاں اور کس کے قبضے میں ہوسکتا ہے؟" شکیلہ نے خیال ظاہر کیا۔

"صحیح۔" کمیل دادا نے شکیلہ کی تائید میں مختصرا کہا تو وہ آگے بولی۔

"اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سی جی اس ڈیل کے ساتھ مخلص ہے تو اس نے اپنے کسی آدمی کے ساتھ بہت پہلے ہی ہمارا مطلوبہ آدمی یہاں پہنچا دیا ہوگا۔ یا پھر وہ ہماری طرح ہمیں بلف کرنے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی چت بھی ہماری اور پٹ بھی ہماری۔ اپنا شکار بھی لے اُڑے اور ہمیں ہمارے مطلوبہ آدمی کی گرد تک بھی نہ پہنچنے دے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ کرنل بجوانی کی یہ چال اسی کے اُوپر اُلٹ دی جائے۔" کمیل دادا ایک دم پُرسوچ لہجے میں بولا تو ہم سب بیک وقت چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"تمہارے ذہن میں کیا ترکیب آرہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے کرنل کا جواب آجائے۔ پھر بتاتا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اسی وقت میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ خیال یہی تھا کہ کال کرنل بجوانی کی ہوگی، مگر ڈسپلے پر میں نے نگاہ ڈالی تو بری طرح چونک پڑا۔

وہ کال امریکا سے آنسہ خالدہ کی تھی۔ میرا دل یکدم دھک دھک کرنے لگا۔ میں اپنے ساتھیوں سے ذرا چند قدموں کے فاصلے پر چلا گیا۔

"ہیلو مس خالدہ! خیریت ہے؟ عا... عابدہ تو ٹھیک ہے ناں؟" میں نے بے چینی سے کہا تو دوسری جانب سے اس کی آواز اُبھری۔

"خیریت یہی ہے کہ پاسکل ہولارڈ کو ہمارے خلاف ایک محاذ پر فتح حاصل ہوگئی ہے۔" اس نے بتایا اور میرا دھک دھک کرتا دل جیسے رک گیا۔ میرے منہ سے پھنسی پھنسی آواز بہ مشکل ہی برآمد ہوئی تھی۔

"کیا... مم... میں سمجھا نہیں؟"

"تم یقیناً سب سمجھ رہے ہو۔" وہ بولی۔ "میری کوششوں کے باوجود پاسکل ہولارڈ، عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے کی اینٹی ٹیریر کورٹ بینچ میں لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔"

اس نے ایک بھیانک اور لرزہ دینے والا انکشاف کیا۔ میرا حلق سوکھنے لگا اور آواز ہی برآمد نہ ہو پائی۔ اس کی بات سن کر میرے وجود کا رواں رواں تھرانے لگا۔ بہ مشکل ہی الفاظ میرے منہ سے برآمد ہوئے تھے۔

"تت... تو... پھر... اب کیا ہوگا؟ کیا یہ خطرناک ہوگا۔ عا... عابدہ کے لیے؟"

"تم شاید کہیں باہر ہو۔ شائیں شائیں کی آوازیں آرہی ہیں۔ آواز کٹ رہی ہے۔" وہ اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ جبکہ مجھے اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں بے چین سا ہوگیا تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ میں آؤٹ آف باؤنڈری وال ہوں۔ لل... لیکن..."

"تم ایسا کرو گھر پہنچ جاؤ۔ پھر میں کال کرتی ہوں۔"

میں نے تشویش آمیز بے قراری سے کہا۔ "نن... نہیں۔ مجھے گھر لوٹتے ہوئے دیر ہوجائے گی۔ میں کسی جگہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں پھنسا ہوا ہوں۔ پلیز، بات جاری رکھو۔ میں سن رہا ہوں۔ پلیز۔" میں نے ملتجی لہجے میں کہا تو وہ ملائمت آمیزی سے بولی۔

"اوکے، اوکے۔ ٹیک اٹ ایزی۔ کیا تم نے سن لی میری بات؟"

"جج... جی ہاں۔ مجھے آپ کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا یہ بات عابدہ کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتی ہے؟"

"ابھی تو کچھ کہنا قبل از وقت ہی ہوگا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پاسکل ہولارڈ کیس کی مخالفت میں کامیابی کے ساتھ ایک اسٹیپ آگے اُٹھا چکا ہے۔ جیسا کہ وہ چاہتا تھا۔"

وہ بتانے لگی۔ "کیونکہ نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے اس کیس کا سی آئی اے کی اینٹی ٹیریر کورٹ میں ٹرانسفر ہونا بہرحال عابدہ کے حق میں اچھا تو نہیں ہے لیکن ہمیں اس کیس کا جم کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لحاظ سے اب کم از کم عارفہ کی گواہی اشد ضروری ہوگئی ہے۔ خیر، تم نے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کا کیا کیا؟" آنسہ خالدہ نے آخر میں پوچھا۔ مجھے اس کی باتوں سے ہول آرہا تھا۔

میں نے کہا۔ "وہ میں آپ کو بھیج چکا ہوں۔"

"گڈ۔ اور عارفہ کو راضی کیا تم نے؟ وہ کب تک آرہی ہے؟ کیونکہ کیس اَب خصوصی عدالت میں ٹرانسفر کردیا گیا ہے۔ اور وہاں تاخیر اسے مزید کمزور کرنے کا باعث بن

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سکتی ہے اور نہ ہی زیادہ مہلت ملنے کی اُمید ہے۔'' اس کی بات نے مجھے پریشان کردیا۔ بولا۔

''میں نے اُسے تقریباً رضامند کرلیا ہے۔ بس دو ایک دن میں اس کی طرف سے حتمی جواب مجھے مل جائے گا تو میں آپ کو بتادوں گا۔''

''ایک بات ذہن میں ضرور رکھنا مسٹر شہزادا کہ اب ان خاتون کی گواہی بہت ضروری ہوگئی ہے۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ اوکے؟''

''جی میں سمجھ گیا۔ آئی نو۔ بٹ آپ عابدہ سے ملتی رہتی ہیں ناں؟ وہ کیسی ہے؟ ٹھیک تو ہے ناں؟ میرے بارے میں آپ اُسے پلیز بتاتی رہیے گا کہ میں مسلسل آپ سے رابطے میں ہوں اور اسے تسلی بھی...''

میں اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔ عابدہ وہاں کس حال میں ہوسکتی تھی۔ یہ بھلا مجھ سے بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ میرا جی بھر آیا تھا۔ گلے میں رقت اُترنے کے باعث میری آواز لڑکھڑا گئی تھی اور میں آگے نہ بول سکا تھا۔ دوسری جانب بھی لحہ بھر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ پھر آنسہ خالدہ کی تشفی آمیز آواز سنائی دی۔

''شہزادا! پلیز، مضبوط بنو اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ مجھ سے عابدہ اور تمہارے لیے جو ہوسکا وہ میں ضرور کروں گی۔ لیکن جہاں تک تمہارے کرنے کا کام ہے وہ تمہیں ضرور انجام دینا ہوگا۔''

''کیا میری عابدہ سے بات ہوسکتی ہے؟''

''نہیں۔ اب تو مجھے بھی ملنے نہیں دیا جاتا۔ مگر میں کوئی نہ کوئی سورس استعمال کرکے مل ہی لیتی ہوں۔ لیکن اب تو یہ بھی ممکن ہوتا نہیں نظر آرہا۔ ہاں ایک بات پوچھنا تھی تم سے؟'' وہ آخر میں اچانک بولی میں نے فوراً اثباتی جواب دیا تو اس نے پُرسوچ لہجے اور مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''شہزادا! عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں مجھے ایک راہ اور بھی سجھائی دیتی ہے۔ لیکن پھر تمہارے ملک کے حالات اور مسخ شدہ سیاسی فضا دیکھتی ہوں تو چپ ہوجاتی ہوں''۔ وہ رُکی تو میں نے تیزی سے کہا۔

''جی جی بولیں۔ میں سن رہا ہوں۔''

''شہزادا! ان حالات میں جبکہ عابدہ کا کیس خصوصی عدالت میں ٹرانسفر کردیا گیا ہے تو میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں کچھ مزید اسپیشل قسم کے ایفرٹس بھی لینا چاہئیں۔''

''یقیناً'' میں نے فوراً کہا۔

''یہ کہ تم عابدہ کا معاملہ ہاٹ ایشو پر اپنے ملک کے معتبر حلقوں میں ہائی لائٹ کرو۔ تاکہ اُسے سیاسی اور ریاستی سپورٹ حاصل ہو۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی وہاں کارفرما ہوں گی۔ ملکی سطح پر اس ایشو کو اُٹھانے سے ہوسکتا ہے دباؤ بڑھے اور عابدہ کے سلسلے میں کچھ نرمی کی جائے۔'' آنسہ خالدہ نے کہا تو اس کی بات سن کر میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کرکے رہ گیا اور پھیکے لہجے میں بولا۔

''آنسہ خالدہ! آپ کا مشورہ اپنی جگہ۔ لیکن جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ملک کے داخلی حالات اور یہاں کی مسخ شدہ سیاسی فضا کا ذکر کیا تو وہ اتنا کچھ غلط بھی نہیں، ظاہر ہے آپ ایک بین الاقوامی سطح کی رپورٹر اور سیاسی مبصر بھی ہیں اور دنیائے عالم کے بعض سیاسی اور سماجی حالات و واقعات پر آپ گہری نظر رکھتی ہوں گی، کہنے کا مطلب یہ کہ جس آپشن کا اب ذکر کررہی ہیں اس پر میں اور میرے ساتھی بہت پہلے سے غور کرچکے ہیں بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی مختصراً ابھی اس پر تبادلۂ خیال ہوچکا ہے، لیکن میں کہتا چلوں کہ یہ خوامخواہ خود کو پرومینٹ کرنے والی بات ہوگی، اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ ہاں، عابدہ کی رہائی کی آڑ میں بعض ابن الوقت قسم کے لوگ اپنی سیاسی دُکان ضرور چمکائیں گے، کچھ معتبر حلقے اور سماجی تنظیمیں اس سلسلے میں واویلا مچاکر اور خود کو ریٹنگ کی بھیڑ چال میں کچھ آگے لے آئیں گی۔ لیکن پھر وہی خاموشی چھا جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عابدہ کو درپردہ اپنے خفیہ اور مذموم مقاصد میں استعمال کرنے والی استعماری اور طاغوتی قوتیں مزید مستحکم اور طاقت پکڑ لیں گی۔ اس لیے میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ سے کیا ہوسکتا ہے۔ اس کے بعد میں خود حرکت میں آؤں گا اور پھر خالصتاً اپنی صوابدید پر اس کام کا بیڑا اُٹھاؤں گا۔''

آنسہ خالدہ سے یہ سب کہتے ہوئے میری آواز میں جوش کی سی کیفیات عود کر آنے لگی تھیں۔ ایک پختہ عزم کی جھلک میرے لفظ لفظ سے عیاں ہوتی محسوس کرکے آنسہ خالدہ نے بڑے حوصلہ افزا اور توصیفی انداز میں مجھ سے کہا۔

''شہزادا! تمہارے اس عزم کو میں بھی سلام پیش کرتی ہوں۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر تم ابھی سے خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔ اور نہ کبھی خود کو اکیلا نہ سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر اس آپشن کو محفوظ سمجھو۔ گڈ لک۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کردیا اور میں ایک لمبی ہنکاری خارج کرکے دوبارہ اپنے ساتھیوں سے آن ملا۔ میرے چہرے

READING
Section
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پر شدید مدوجزر کی سی کیفیات تھیں۔ وہ سب میری طرف ہی تکے جا رہے تھے۔

ایسے نازک وقت میں آنسہ خالدہ کی کال نے مجھے ایک طرح سے دہری پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آنسہ خالدہ کو میں نے عارفہ کے سلسلے میں جو تسلی دی تھی وہ کھوکھلی تھی۔ کیونکہ ابھی تک اس حرافہ نے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ حالانکہ میں نے اس کی دُکھتی رگ کو بھی چھیڑنے کی کوشش کی تھی۔ یعنی اڈیسہ کمپنی کے شیئرز، عابدہ کے حق میں گواہی دینے کے بدلے میں اس کے حوالے کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

”او خیر کا کے! کس کی کال تھی؟“ اول خیر میرے چہرے کو بہ غور تکتا ہوا بولا۔ میں نے اس موقع پر آنسہ خالدہ کی کال کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا اور ٹال گیا۔ اول خیر بھی کچھ بھانپ کر چپ ہو رہا۔

ہم آئندہ کی صورتِ حالات پر تبادلۂ خیال کر چکے تھے۔ اب ہمیں کرنل بجوانی کے فون کا انتظار تھا۔ جب تھوڑی دیر مزید بیتی تو میں نے خود ہی اس خبیث سے رابطہ کر لیا۔

”کیا تم ہمیں بیچ منجدھار میں پھنسا کر بھول گئے ہو یا اپنا ارادہ بدل کر کسی دوسرے آپشن پر غور کرنے لگے ہو؟“ میں نے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔ مجھ پر بیزار کن سی چڑچڑاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ وہ بولا۔

”دھیرج، مہاشے جی! میں تمہارا کام آسان کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ تم لوگوں کو نہر پار کرنے کی زحمت سے بچانے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ معاملہ نہر کے دونوں کناروں پر ہی بھگتا دیا جائے۔“

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔ ذرا کھل کر بات کرو۔“ میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

”تم اور ہم نہر کے دونوں کناروں پر آ کھڑے ہوں گے۔ اس طرح تم اپنا آدمی دیکھ لینا اور ہم اپنا آدمی دیکھ لیں گے۔ اس کے بعد تمہارا دوسرا آدمی وہیں کنارے پر کھڑا رہے گا اور چونکہ تمہیں تیرنا آتا ہے۔ اس لیے تم ہمارے آدمی کو اپنے ساتھ لے کر نہر میں اُتر جاؤ گے۔ اُدھر بہ عین ہمارا بھی آدمی اسی طرح تمہارے آدمی کو نہر میں لے کر اُتر جائے گا۔ پھر جب دونوں طرف کا یہ تبادلہ اپنے اختتام کو پہنچے گا تو پھر ادھر سے تم لوٹ جاؤ گے اور اُدھر سے ہمارا آدمی، کلیئر؟“

میں نے پل کے پل اس مردود اور مکار آدمی کی بات پر غور کیا تو ایک جھماکا میرے ذہن میں ہوا۔ اس نے ملتان روڈ پر ہمارے ساتھ ایک ناکام جوا کھیلنے کے بعد شاید اب اپنی حکمتِ عملی بدل لی تھی، ممکن ہے کہ اس کی اس بات میں حقیقت رہی ہو کہ میرا باپ اب ان کے کام کا نہیں رہا تھا۔ (بلکہ بہ قول اسی بے رحم آدمی کے، وہ کسی کے بھی کام کا نہیں رہا تھا۔ لیکن یہ تو میرا دل ہی جانتا تھا کہ میرا باپ میرے لیے کیا اہمیت رکھتا تھا۔) اسی لیے وہ اب سنجیدہ بھی ہو رہا ہو کہ چلو ایک ”بے کار“ (اس کی نظر میں) کے بدلے میں اپنا ”کارآمد“ سپر ایجنٹ سندرداس کمینہ کو حاصل کر لے۔ لیکن بات اتنی بھی نہیں تھی، یہ بھی عین ممکن تھا کہ کرنل بجوانی کے آدمی مجھے بھی کنارے پر پہنچتے ہی سندرداس سمیت دبوچ لیتے۔ اور اپنے کسی ”غیر اہم“ آدمی کو میرے بدلے میں چارے کے طور پر استعمال کر کے مجھے اپنے ساتھ سرحد پار لے جاتے۔ آگے سوچنے کے لیے اور بھی بہت کچھ تھا۔

”کیا سوچنے لگے مہاشے! فیصلہ کرو جلدی۔ تمہاری طرح ہم بھی اپنے آدمیوں کو داؤ پہ لگائے ہوئے ہیں۔“ میری طرف سے پُرسوچ خاموشی کا طویل وقفہ ہوتے محسوس کر کے دوسری جانب سے اس مردود و ملعون کی کھرکھراتی ہوئی آواز اُبھری تھی۔

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، مجھے قبول ہے۔ کب تک کرنا ہے یہ سب؟“

”میرے خیال میں یہ خفیہ ری پلیس منٹ شام کی ہلکی تاریکی میں ہی مناسب رہے گی۔ کچھ وقت ہمیں ادھر ہی کہیں چھپ کے بِتانا ہوگا۔“

اس شاطر انسان کی بات پر میرے سوچتے ذہن میں ایک پُرخیال روشنی کا جھماکا ہوا اور میں نے بھی فوراً سے پیشتر اس کی تائید میں ہامی بھر لی۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سیل فون کا وائیڈ اسپیکر آن ہونے کی وجہ سے وہاں موجود میرے تینوں ساتھیوں (اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا) نے بھی یہ دو طرفہ گفتگو پوری صراحت کے ساتھ سن لی تھی۔

”او خیر کا کے! یہ دغاباز آدمی ایک پنتھ دو کاج کے مصداق، تمہیں بھی ٹریپ کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اس جھانسے میں مت آنا!“ اول خیر نے چھوٹتے ہی مجھ سے کہا تو شکیلہ نے بھی میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو تائیدی انداز میں جنبش دی، البتہ کبیل دادا نے خلافِ توقع اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے اس کی

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

طرف دیکھا تو مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ کا غماز نظر آیا۔ میں لمحے بھر کو دانستہ خاموشی اختیار کیے اس کے بولنے کا منتظر رہا تھا اور وہی ہوا۔

''میرا تجربہ ہے کہ دشمن چالاک ہونے کے ساتھ اگر بلا کا دغا باز بھی ہو تو اپنی اسی فطرت کے باعث وہ کہیں نہ کہیں دھوکا ضرور کھا جاتا ہے۔ عرفِ عام میں اسے سیانا کوا کہتے ہیں جو بیٹ کو دانہ سمجھ کر اس پر آن بیٹھتا ہے۔ اب کرنل سی جی بجوانی بھی ہم سے ایک ہاتھ کھانے والا ہے۔ پہلے اس نے ہم پر ہلا بول کر ایک جوا کھیلا تھا اس بار ہم اس پر شب خون مار کے یہ بازی سود کے ساتھ جیتنے کی کوشش کریں گے۔''

کمیل دادا کی اسرار بھری گفتگو پر اول خیر اور شکیلہ ہونقوں کے انداز میں اس کا منہ تکنے لگے تھے۔ جبکہ میری باریک مونچھوں تلے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ جو خیال کرنل سی جی کی گفتگو کے فوراً بعد میرے ذہن طباع میں کلک ہوا تھا، یہ عین وہی کمیل دادا کے بھی ذہن رسا میں اُبھرا تھا تو اس کا مطلب تھا وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جب شکیلہ اور اول خیر کوئی تبصرہ کیے بغیر اسی طرح کمیل دادا کے مزید بولنے کے منتظر رہے تو میں نے بھی اسی طرح معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔

''دادا! میں شاید تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔'' میں دانستہ مبہم لہجے میں بولا تھا، جس پر اس نے میری طرف بے تاثر نظروں سے دیکھا تھا۔ میں نے توثیق چاہی اور بولا۔ ''اس نے ہمارے ساتھ ایک نیا جوا کھیلنے کی غرض سے جو مہلت لی ہے ہم بھی اسی مہلت سے فائدہ اُٹھانے --کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیں۔''

''تم ٹھیک سمجھے۔'' وہ بولا۔ ''یہ تو اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جو گیم ہم اس کے ساتھ کھیلنا چاہ رہے ہیں وہی وہ بھی ہمارے ساتھ کھیل رہا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اُسے ہم سے پہلے اس پر عمل کرنے کا موقع ملا، مگر اس کی بدقسمتی اور ہماری خوش قسمتی کہ وہ ناکام رہا، اب وہ آخری وار اور آخری چال آزمانے کے لیے پَر تولے ہوئے ہے۔ جبکہ ہمیں ابھی موقع ملا ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اب وقت کس کا ساتھ دیتا ہے؟''

''یہ تم دونوں آخر آپس میں کیا پہیلیاں بُھجوا رہے ہو۔ ہمیں بھی بتاؤ گے کچھ یا نہیں؟'' شکیلہ، جو کافی دیر سے خاموش کھڑی میرے اور کمیل دادا کے درمیان ہونے والی ذومعنی گفتگو کو ایک ''بے چین'' سی خاموشی کے ساتھ سُنے جا رہی تھی، بالآخر بول ہی پڑی۔

شکیلہ کی بات پر کمیل دادا نے ذرا گردن موڑ کے اس کے سراپا پر ایک گہری نظر ڈالی، پھر نہر کی طرف اپنا منہ پھیر کر سپاٹ لہجے میں مختصراً بولا۔ ''اپنے آپ کو حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لو۔''

''ہم تیار ہی ہیں۔'' شکیلہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اپنے اور کمیل دادا کے متوقع پلان سے آگاہ کر دیا۔ دشمن پر آخری اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا وقت آ گیا ہے۔

ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ایک تجربے کے مطابق زیادہ وقت میں احتیاط ملحوظ رکھنے کے بھی مواقع زیادہ ہوتے ہیں اور مشن بغیر کسی بھاری نقصان کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے ایک بار پھر اس پر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کیا اور اپنی اس پیش قدمی کو بالآخر حتمی شکل دے ڈالی۔ اس کے مطابق اول خیر اور شکیلہ کو قیدی سندرداس کے پاس ہی موجود رہنا تھا۔

اول خیر اور شکیلہ کو میرے بجائے کمیل دادا نے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ میں نے دانستہ کمیل دادا کو آگے کر رکھا تھا، تاکہ اس کے اندر اس مہم سے متعلق جو بددلی پیدا ہونے لگی تھی وہ دور ہوتی رہے اور اس کے اندر اعتماد پیدا ہو۔ پھر اول خیر کے ساتھ بھی اس کی بات چیت کا تانتا جڑا رہے۔ کرنل سی جی کے اگلے فون اور اس کی بدنیتی محسوس کرتے ہی کمیل دادا بھی جوش میں آ گیا تھا۔

ہمیں اس خطرے کا بھی پوری طرح احساس تھا کہ ممکن ہے بلیو گلکسی کے ایجنٹ نہر پار کے کنارے کے علاوہ اس کنارے پر بھی کہیں موجود ہو سکتے تھے۔ اسی لیے کمیل دادا کے علاوہ میں نے بھی اول خیر اور شکیلہ کو سختی سے اس بات کی ہدایت کر دی تھی کہ بغیر آپس میں اُلجھے، اپنے گرد و پیش سے ازحد محتاط رہیں۔ بلیو گلکسی کے ایجنٹ یہاں ان کے ساتھ کوئی خفیہ کارروائی کر سکتے تھے۔ یہ مقام ایسا تھا کہ ہم یا ہمارے دشمن یک دم ایک دوسرے پر ہلا بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ یہ سرحدی علاقہ تھا اور یہاں بارود کے دھماکے بارڈر سیکیورٹی فورسز والوں کو اس طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ آخری ہدایت میری ان دونوں کے لیے یہی تھی کہ وہ جیسے ہی اپنے اردگرد کوئی خطرہ محسوس کریں، سیل فون پر ہمیں ضرور آگاہ کریں۔

چنانچہ سندرداس کو ہم نے کار کی ڈگی میں اسی طرح

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

رسن بستہ حالت میں ہی ٹھونس دیا تھا۔ البتہ اول خیر کو کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ وقفے سے ڈگی کھول کر اس کی خیریت معلوم کرتا رہے، کہیں حبس دم کا شکار نہ ہو بیٹھے۔

اس کے بعد میں اور کبیل دادا۔ نہر کے بلند کراڑے کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم نے اپنے پیراکی کے لباس بھی سنبھال لیے تھے۔

کھلی تازہ ہوا کی سبک خرامی کافی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکی بارش کے بعد فضا دھلی نکھری نظر آ رہی تھی اوپر کھلا نیلا آسمان تھا اور اس فضائے بسیط پر پھیلی نیلی چھتری تلے، سفید سفید بادلوں کے ٹکڑے راج ہنسوں کے جوڑوں کی طرح تیرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ فضا میں نہر کے پانی کی نمی میں خودرو پودوں کی باس نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی اور اس کی خوشبو بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کراڑے کی بلندی پر پہنچتے ہی ہم سینے کے بل لیٹ گئے اور گرد و پیش کے علاوہ سامنے نظریں جما دیں۔ یہ بات ایک خدشے کی صورت ہمارے ذہن میں بھی تھی کہ جو ہم کرنے جا رہے تھے، یہ عین ایسا ہی ہمارے دشمن بھی کر سکتے تھے، یہ ایک دوسرے کو اندھیرے میں رکھ کر تیر چلانے جیسی صورت حال تھی۔

ہمارے سامنے بی آر بی کی نہر کا چوڑا پاٹ سبک روی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ زندہ دلان لاہور نے یہ نہر اس وقت کھودی، جب یہ اعلان ہوا کہ اس مقام پر نہر کھودنے سے پاکستان کو بھارتی افواج کی طرف سے ممکنہ شر انگیزی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ ان کی اپیل پر شہریوں نے آٹھ کلومیٹر فاصلے پر محیط یہ نہر محض چند دنوں میں بلا معاوضہ ہی کھود ڈالی تھی۔

ہماری پیش قدمی کا رخ اسی سمت تھا جس طرف کرنل بجوانی نے ہمیں پہلے نہر عبور کر کے آنے کا کہا تھا اور بعد میں ہم نے اس کا یہ مطالبہ رد کر دیا تھا۔ لہٰذا اس سے ہم نے یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ یقیناً نہر پار اسی طرف ہی اس کے حواریوں کا کوئی ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ ایک اُمید یہ بھی بندھی تھی، جیسا کہ میں پہلے ہی کرنل بجوانی کی باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ میرے باپ کو بہت پہلے ہی سے سرحد پار پہنچا دیا گیا ہوگا اور اب وہ ان کے حوالے تھا۔ اس بات پر بھی مجھے یک گونہ مسرت کا احساس ہوا تھا۔

سندر داس جیسا آدمی بھی ان کے لیے معمولی حیثیت کا نہیں تھا۔ جسے کرنل بجوانی ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔

کراڑے کی بلندی سے گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد ہم نیچے کی طرف اُترنے لگے اور ایک دوسرے کے سہارے بلندی سے نیچے کنارے پر اُتر آئے۔ سامنے نہر کے بہتے پانیوں پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ میرا اشارہ بھانپتے ہی پیراکی کا لباس پہننے لگا، میں نے بھی چند سیکنڈ میں یہ کام نمٹا لیا، ہتھیاروں کو ہم نے واٹر پروف کر کے اپنی جیکٹوں کے اندر رکھ لیا اور اوپر زپ کر دی۔

تھوڑی دیر بعد کبیل دادا نے مجھے اشارہ کیا اور ہم نہر کے پانی میں اُتر گئے۔ اچانک اُمڈتی سردی میں نہر کے پانی کی برودت سے ایک لمحے کو جسم ٹھٹھر سا گیا۔ شکر تھا کہ ہمارا پیراکی کا لباس بھی واٹر پروف تھا اور اسی لیے کچھ زیادہ ٹھنڈ کا احساس نہیں ہوا۔ پانی میں اُترتے ہی ہم نے غوطہ لگا لیا تھا۔ اب چند سیکنڈوں کے بعد سطح آب پر اُبھرتے، اور پھر ڈبکی لگا کر غائب ہو جاتے، اسی طرح کچھ دیر بعد ہم دوسرے کنارے کے قریب ہلکے چھپاکے سے اُبھرے۔ پانی کی سطح سے ایک نظر اطراف میں ڈال کر ہم کنارے پر آ گئے۔ یہ پُل اور آبادی سے خاصا دور کا علاقہ تھا۔

کنارے پہ آتے ہی ہم نے بہ سرعت حرکت کی اور پیراکی کا لباس اُتار کر کینوس بیگ میں ٹھونس دیا اس کے بعد کراڑے پر چڑھنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ اچانک میں ٹھٹکا اور فوراً کبیل دادا کے کاندھے پر ہاتھ دھرا۔ اس نے چونک کر گردن گھما کر میری طرف دیکھا، پھر میری ایک طرف جمی دم بہ خودی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تو وہ بھی چونک گیا۔ میرے بائیں ہاتھ کی طرف اوپر کراڑے سے دو افراد تیزی سے نیچے کنارے پر آ رہے تھے اور ان کی

ایک خوب صورت بات

ایک جوکر نے لوگوں کو ایک جوک سنایا۔

لوگ بہت زیادہ ہنسے۔ اس نے وہ جوک پھر سے سنایا۔ تو کم لوگ ہنسے۔ اس نے وہی جوک تیسری دفعہ سنایا تو کوئی بھی نہ ہنسا۔ تو پھر اس جوکر نے بہت خوب صورت بات کہی کہ ”اگر تم ایک خوشی کو لے کر بار بار خوش نہیں ہو سکتے تو پھر ایک غم کو لے کر بار بار روتے کیوں ہو؟ زندگی زخموں سے بھری ہے، وقت کو مرہم بنانا سیکھو۔ اے دوست موت سے ہارنا ہی ہے۔ زندگی سے تو جینا سیکھو۔“

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی خوب صورت بات

READING Section

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وضع قطع اور نظر آتی مخصوص ''تیاری'' سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی ہماری طرح کسی ''اسپیشل مہم'' پر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرا خیال لامحالہ کرنل بھوانی کے آدمیوں کی طرف چلا گیا۔

''ہُوں! تو گویا ان لوگوں نے بھی وہی ٹرک آزما ڈالی۔ ... یعنی انتظار کے کھیل کی آڑ میں خفیہ طور پر اپنے مقصد کے حصول کے لیے گوریلا کارروائی۔'' کبیل دادا زہرخند لہجے میں بڑبڑایا تو میں بولا۔

''دادا! ان دونوں کو دوسرے کنارے تک نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''ان دونوں کو اُوپر پہنچانے سے پہلے ہمیں ان کے بارے میں تسلی کر لینی چاہیے۔ ہوسکتا ہے ان کا تعلق بی ایس ایف والوں سے ہو۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ مجھے کبیل دادا کی بات سے پورا اتفاق تھا، کیونکہ جوان دونوں مُشتبہ لوگوں کی وضع قطع تھی وہ کسی عام مقامی لوگوں جیسی نہیں نظر آتی تھی۔ چُست لباس اور پشت کے ساتھ بندھے مخصوص بیگ، صرف دو ہی قسم کے آدمیوں کی علامت کو ظاہر کرتے تھے، ایک سرحد پر تعینات افراد کی اور دوسرے ہمارے دُشمن۔ جو اس وقت یقیناً پوری تیاری کے ساتھ تھے۔

ہم دونوں تیزی کے ساتھ اسی سمت بڑھ گئے۔ کاچنی مٹی اور ریتیلے کراڑے کی ڈھلوانی سطح یہاں غیر ہموار سی تھی، اسی لیے میں اور کبیل دادا جُھکے جُھکے انداز میں ان دونوں مُشتبہ افراد کی طرف بڑھنے لگے۔ ابھی ہم نے کوئی ہتھیار نہیں نکالا تھا۔ چند سو گز کا یہ فاصلہ کچھ منٹوں میں تیزی سے پاٹنے کے بعد جب ہم ان دنوں مُشتبہ افراد کے ذرا نزدیک پہنچے تو وہ دونوں تب تک کنارے پر پہنچ کر پیراکی کا لباس پہننے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کبیل دادا کے... ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی پھر وہ سرگوشی میں بولا۔

''شہزی! صیاد خود ہی آ گیا دام میں۔ کیا اب بھی کسی شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی ہے تمہارے دل میں؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' میں نے بھی بہ یک حُرنت کہا۔

''کیونکہ سرکاری اہلکاروں کو کبھی بھی اس طرح یہ نہر پار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں بلیو ٹکسی کے ایجنٹ ہی ہیں۔''

''باوجود اس کے ہمیں ان کو زندہ چھاپنا ہے۔'' وہ بولا اور میں نے اثبات میں اپنے سر کو جُنبش دی تھی۔ اب ان کی نظروں میں آئے بغیر انہیں چھاپنا ناممکن ہی تھا، کیونکہ [illegible] آس پاس ایسی کوئی آڑ نہ تھی اور کنارہ سپاٹ تھا جہاں وہ دونوں اپنا اپنا پیراکی کا لباس تقریباً پہن ہی چکے تھے۔ میں اور کبیل دادا ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرتے ہوئے پستول تھامے، ایک دم ہی ان کی جانب لپکے، ہم پر ان کی نظر پڑی تو وہ بری طرح بدکے۔ پھر دونوں ہی نے بیک وقت اپنے لباس کے اندر ہاتھ ڈالنے کی کوشش ... کی تھی کہ کبیل دادا نے بھاری اور رعب دار آواز میں انہیں جامد رہنے کا حکم دے ڈالا۔

''خبردار! تم دونوں نشانے پر ہو۔ کوئی غلط حرکت تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔''

''تم دونوں کون ہو؟ ہم سیکیورٹی فورسز کے آدمی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا لہجہ بارعب بنانے کی کوشش کی تھی، لیکن میں اس کے لہجے اور آواز کی تہ میں چھپی پریشانی کے عنصر کو بھانپ گیا تھا۔ لہٰذا اس بار میں اپنے ڈبل نال والے اسینک سلینر کا رخ اسی کی جانب کرتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا

''سیکیورٹی فورسز والے تو ہم ہیں۔ اور جانتے ہیں اچھی طرح کہ ایسے کسی بھی موقع پر وہ اتنی جلدی اپنی شناخت اپنے منہ سے نہیں کیا کرتے۔''

میری اس جوابی لفاظی نے بولنے والے کا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھی کا بھی اعتماد یکلخت متزلزل کر کے رکھ دیا اور اب ان کے بشروں کی پریشانی اور تشویش بھی واضح ہونے لگی تھی..... کبیل دادا نے تحکمانہ دُرشتی سے کہا۔

''اب تم دونوں اپنے ہاتھ بلند کر کے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ جاؤ، جلدی۔''

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ بلند کر کے کھڑے کھڑے ریتیلی سی زمین پر جھکے۔ انداز ایسا ہی تھا کہ وہ حکم کی تعمیل کرنے لگے تھے مگر اچانک ایک نے کمال پھرتی سے اُلٹی جست بھری اور غڑاپ سے نہر کے پانی میں جا کودا۔ میں یا کبیل دادا اس پر فائر جھونک سکتے تھے۔ لیکن ہم ابھی ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے چلا کر کبیل دادا سے کہا۔

''تم اسے قابو کرو۔'' اور پھر آگے بڑھ کر میں نے بھی نہر میں چھلانگ لگا دی۔ میری یہ جارحانہ پیش قدمی خود میرے لیے بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ نہر میں کودنے والا شخص اپنی گن نکال کر مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میری حتی الامکان کوشش تھی کہ اُسے سرے سے سنبھلنے ہی نہ دوں اور جالوں۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مشاہدہ

"اجی! کیا کر رہے ہو؟" بیوی نے شوہر سے پوچھا۔

"مکھیاں مار رہا ہوں۔"

"اب تک کتنی مار لیں؟"

"تین نر اور دو مادہ۔"

بیوی کی اکتاہٹ یکا یک کافور ہو گئی۔ اس نے چونک کر سوال کیا۔ "تمھیں نر اور مادہ کا کیسے پتا چلا؟"

"آسان سی بات ہے۔ دو فون پر دیر سے بیٹھی ہوئی تھیں، تین ان کے گرد منڈلا کر بار بار شربت کی بوتل پر جا بیٹھتی تھیں۔"

(خرم اختر، یو اے ای)

جس جگہ وہ کودا تھا، وہیں میں نے بھی اپنی جگہ سے اُچھل کر غوطہ لگایا تھا۔ اور ٹھیک اُسی پر جا پڑا۔ اُس کا وجود چھوتے ہی میں نے اپنی سی پہلی کوشش اسے دبوچنے کی کی تھی۔ وہ ڈیل ڈول میں مجھ سے دبتا ہوا تھا۔ اس سے لپٹتے ہی مجھے فوراً اس کے پاس آتشی اسلحے کی موجودگی کا احساس ہوا، وہ بھی مجھ پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا...... پھر وہ جیسے ہی سانس لینے کے لیے سطحِ آب پر اُبھرا میں نے اس کے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی، لیکن اگلا وار اس نے مجھے اپنے سر کی ٹکر مار کے کیا جو میری ناک پہ لگا، ٹکر خاصی ٹرک سے اور زوردار ماری گئی تھی، اسی لیے چند لمحوں کے لیے میرا دماغ جھنجھنا گیا۔ پانی کی سطح پر بری طرح ہلچل مچ گئی۔ وہ گول ہو گیا اور اندر ڈبکی لگائی تب ہی میں نے خود کو سنبھالا دیا اور پانی کے اندر ہی اسے دوبارہ دبوچنے کی کوشش چاہی تو میرا ایک ہاتھ کسی فولادی نال سے ٹکرا گیا۔ میری تو جیسے روح فنا ہو گئی، اس کمبخت نے پانی کے اندر بھی غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں مطلق دیر نہیں لگی تھی کہ میرا مقابلہ کسی عام آدمی سے نہیں تھا، وہ مجھ پہ پانی کے اندر کسی وقت بھی گولی چلا سکتا تھا اور یہ.... تصور کرتے ہی میں پانی کے اندر جتنی تیز پھرتی کا مظاہرہ کر سکتا تھا، کرتے ہوئے اس کی نال کا رخ موڑ دیا۔ اسی وقت پانی کے اندر ایسی آواز اُبھری تھی جیسے کوئی پانی سے بھری ٹیوب پھٹی ہو۔ پانی مزید گدلا سا ہوتا محسوس ہوا، میری بروقت حاضر دماغی اور پھرتی نے مجھے گولی کے گھاؤ سے بال بال بچا لیا تھا۔ میں نے اس کی گن کی نال نہیں چھوڑی تھی اور اسی طرح اگلے ثانیے میں اس کی کلائی بھی میرے قابو میں آ گئی۔ جبس دم کی مشق کو یہاں کام میں لاتے ہوئے میں نے پوری طاقت سے اس کی کلائی موڑ ڈالی۔ پانی کے اندر "بُڑ بُڑ" کرتے بُلبلے چھوٹنے کا مطلب مدِمقابل کے حلق سے اُٹھتی چیخ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تہِ آب ہو چکی تھی۔ لیکن ممکن تھا اس کے جسم کے ساتھ کوئی اور ہتھیار بھی چپکا ہو۔ اسی لیے میں حریف کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دینا چاہتا تھا، اُسے گھائل کرنے کے بعد میں نے اپنے دائیں بازو کے حلقے میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش چاہی تو اندر پانی کے ذرا کم ہوتے گدلے پن میں، میں نے اسے دوسرے ہاتھ سے پنڈلی کی جانب لمبے پھل والا تیز چاقو نکالتے دیکھا۔ اور اسی وقت اس کی گردن میرے بازو کے حلقے میں آتے ہی میں نے اپنی توجہ اس کے چاقو والے ہاتھ سے ہٹا کر اپنے اسی مہلک داؤ پر مرکوز کر دی، کیونکہ جانتا تھا میں، اس داؤ کی کامیابی حریف کے ساتھ کیا گُل کھلاتی تھی۔

اگلے ہی لمحے پانی کی ہلچل میں سکون ٹھہرنے لگا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنے مدِمقابل کی گردن توڑ ڈالی تھی۔

پانی کے اندر اس کا مچلتا ہوا جسم ایک دم ڈھیلا پڑتے ہی میں نے اسے چھوڑ دیا اور سطحِ آب پر اُبھر کر رُکی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ میں اب کبیل دادا کی مدد کے لیے کنارے پہ جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اگر تو یہ دونوں واقعی بلیو گلکسی کے ایجنٹ تھے (جس کا کم از کم مجھے تو پورا یقین تھا) تو میرے خیال کے مطابق کبیل دادا کا اس پر جلدی قابو پانا آسان نہیں تھا، لیکن جب میں نے کنارے پر دیکھا تو چونک پڑا۔ کبیل دادا بڑے اطمینان سے کھڑا اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے میری ہی سمت دیکھ رہا تھا، جبکہ اس کا مدِمقابل اس کے قدموں کے قریب ہی ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اور پاس ہی ایک قرولی ٹائپ کا کمانڈو خنجر اور ایک پستول ریت پر پڑا نظر آیا۔ میں کنارے پہ آ گیا۔

"وہی ہوا، تم نے اسے مار ڈالا۔" میرے قریب پہنچنے پر کبیل دادا نے میرے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے بھی اپنی گردن موڑ کر نہر کی طرف دیکھا جہاں پانی کی سطح پر میرے حریف کی لاش اُبھر آئی تھی۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا لیکن وہ پے در پے مجھ پر قاتلانہ حملے کیے جا رہا تھا، ایک موقع پر اُسے مجھ پر گولی چلانے کا بھی موقع مل گیا تھا، قسمت اچھی تھی بچ گیا۔'' میں نے کہا اور پھر اس کے زمین پر بے سدھ پڑے حریف پر ایک نگاہ ڈال کر مستفسر ہوا۔

''کیا یہ بھی؟''

''نہیں، بے ہوش ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہم اپنے ہتھیار استعمال نہیں کر سکتے تھے، ویسے یہ لڑائی بھڑائی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔''

''تم واقعی داد کے مستحق ہو کہ ایک تربیت یافتہ شخص کو اتنی آسانی سے ڈھیر کر کے رکھ دیا۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ مجھے قدرے تیز سی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''تمہارا کیا مطلب ہے، میں گھاس چرا رہا ہوں؟''

''نہیں تم تو ہو ہی بڑے اُستاد۔ میں ٹیکنیکل لڑائی کی بات کر رہا تھا، جبکہ تم دیسی۔''

''لڑائی، لڑائی ہوتی ہے، ٹیکنیکل ہو یا دیسی ساختہ۔ بس! موقع ملنے کی بات ہوتی ہے۔ اس نے بھی میری کم دُھلائی نہیں کی تھی، لیکن ایک موقع پر میں نے اس کی ناک اور ٹھوڑی پر ڈبل پنچ رسید کر دیا تھا، شاید یہی ضرب کاری ثابت ہوئی تھی۔''

میں آگے بڑھا اور حریف کا معائنہ کیا۔ وہ اوندھا گا

.......زمین پر دھرا پڑا تھا۔

میں نے جھک کر اسے سیدھا کیا تو اس کا چہرہ بری طرح مسخ نظر آیا۔ بلکہ اس کا منہ بھی خون آلودہ تھا، وہاں سے ابھی تک خون بہے جا رہا تھا۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی، ایک سیل فون اور کچھ غیر اہم چھوٹی موٹی اشیا برآمد ہوئی تھیں۔ مگر کسی قسم کی کوئی ایسی شے نہیں ملی جس سے اس کی شناخت ہونا ممکن ہوتی۔

''یہ بلیو نگلسی کا ایجنٹ ہی ہے، یا ان کا کوئی ساتھی۔'' میں نے سیدھے ہو کر کبیل دادا سے کہا۔ ''اسے ہوش میں لانا پڑے گا۔ یہ ہمیں بہت کچھ بتا سکتا ہے۔''

''میں نے اسی لیے تو اسے صرف ادھ موا کیا تھا۔'' کبیل دادا نے مختصراً کہا اور ایک نگاہ اطراف میں دور تک ڈالنے کے بعد وہ آگے بڑھا اور پھر بے ہوش حریف کو ٹانگوں سے پکڑ کر نہر کی طرف لے گیا۔ کنارہ قدرے اُونچا تھا۔ کبیل دادا نے اسے اسی طرح ٹانگوں سے پکڑ کر اُلٹا کر کے پانی کی سطح پر یوں لٹکا دیا کہ اب بے ہوش حریف کا فقط سر پانی میں تھا، میں خاموشی سے اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا۔ اور تب ہی میں نے کبیل دادا کے دونوں ہاتھوں میں پکڑی ہوئی حریف کی ٹانگوں میں تھرتھلی مچتے دیکھی تو اس نے فوراً حریف کو اسی طرح اُوپر کھینچ لیا، اور واپس گیلی ریت پر پٹخ دیا۔

وہ اب بری طرح کھانسے جا رہا تھا۔ کبیل دادا اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا اور اس کا چہرہ تھپتھپانے لگا، حریف ہوش میں آ کر بری طرح کراہنے لگا تو کبیل دادا اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں بولا۔

''اب یہ ایکٹنگ چھوڑ دو اور ہمارے سوالوں کا جواب دو، ورنہ تمہارا حشر بھی تمہارے دوسرے ساتھی جیسا ہوگا۔ کیونکہ تم دونوں کی اصلیت کھل چکی ہے۔''

''پپ... پانی۔ مجھے پانی پلاؤ۔'' وہ کراہا تو کبیل دادا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کے مضروب چہرے پہ اپنے بھاری ہاتھ کا ایک گھونسا جڑ دیا۔ وہ چیخ پڑا۔

''تمہارا ساتھی تو جلدی میں آسان موت مر گیا، لیکن تمہاری تو ہم موت بھی مشکل کر دیں گے۔ بہتر یہی ہے ہمارے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دیتے جاؤ۔'' کبیل دادا نے خوں ریز غراہٹ سے کہا۔

''پپ... پوچھو۔''

''ہمارے آدمی کو تم نے یہاں کس مقام پر رکھا ہوا ہے۔''

''کک... کون سا آدمی؟'' وہ پھر باز نہ آیا تو میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر اپنا بوٹ رکھ دیا، اس کا چہرہ دوسری طرف کو مڑ گیا، اور خاک چاٹنے لگا۔

''تم بلیو نگلسی کے ایجنٹ اور بھارتی جاسوس ہو۔ بولو تو تمہاری شلوار..... اُتاریں، اور تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ ہم کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں، اب اگر تم نے ذرا بھی چالاکی یا نانک کرنے کی کوشش کی تو نہر میں غوطے دے کر تمہارا کام تمام کر ڈالیں گے اور آگے بڑھ جائیں گے، کیونکہ ہماری منزل دور نہیں۔ اب بولو، مگر صرف سچ۔''

وہ پھر بھی مان کے نہ دیا اور بدستور انجان بننے کی اداکاری کرتا رہا تو میں نے وہی کبیل دادا والی ٹیکنک آزما ڈالی، اسے ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا نہر کی طرف لے گیا اور اُلٹا جھلا دیا، ایک بار پھر اس کا سر پانی کے اندر تھا اور وہ بری طرح تڑپنے لگا۔ چند سیکنڈوں تک میں نے اس کا سر پانی کے اندر ہی رہنے دیا اس کے بعد اُوپر کھینچ لیا۔ وہ بری

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

طرح کھانسنے لگا، لیکن میں نے دو تین بار اس کے ساتھ یہ عمل کیا تو اس کی حالت بالکل ہی غیر ہونے لگی اس کے بعد میں نے اسے گیلی زمین پر پٹخ دیا اور اسے سنانے کے لیے کبیل دادا سے بولا۔

"ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اب اگر اس نے اپنا منہ نہ کھولا تو اسے بھی ختم کر کے اس کی لاش نہر میں پھینک دینا۔"

کبیل دادا آگے بڑھا اور ایک بار پھر اس کے چہرے کے قریب جھک گیا۔ "ہاں! اب کیا کہتے ہو؟ پانی کی موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ سچ بولو گے تو کم از کم اس اذیت سے بچ جاؤ گے۔ تعاون کرنے پر ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ نرمی کی جائے۔"

"کک... کیا مجھے جانے دیا جائے گا؟" اس نے پوچھا۔

"یہ بعد کی بات ہے۔ لیکن کم از کم اس طرح اذیت دے کر نہیں ماریں گے اور قانونی رویہ اختیار کریں گے تمہارے ساتھ۔" کبیل دادا نے جواب دیا، تو وہ اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہاں ہمارے تین ساتھی اور بھی موجود ہیں۔ اور تمہارا آدمی بھی۔" اتنا بتا کر وہ ہانپنے لگا اور میں اس کی بات پر مسرت سے کھل اُٹھا۔ میرا باپ وطنِ عزیز کی سرحد پر پہنچایا جا چکا تھا۔ یعنی میرا مشن ٹھیک سمت میں تھی۔

"ہمارے آدمی کا نام بتاؤ؟" کبیل دادا نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا تو وہ جوابا بولا۔

"تت... تاج دین شاہ۔"

اپنے باپ کا نام سن کر ایک بار پھر میرا دل و دماغ مسرت سے بھر گیا۔ میرا اندر عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہونے لگا۔ فرطِ جذبات اور عقیدت و احترام سے میری آنکھوں کے گوشے نمناک ہونے لگے تھے۔ میں رقت زدہ سا ہونے لگا تھا۔

"کرنل سی جی بجوانی بھی ان تینوں کے ساتھ ہے؟" کبیل نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ سرحد پار اٹاری کے ایک انٹروگیشن سیل سینٹر میں موجود ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"لیکن ہم کیسے تمہاری بات پر بھروسا کر لیں، جبکہ تمہارے کرنل بجوانی نے تو سندر داس کے بدلے میں ڈیل کرنے کے باوجود ہم سے دھوکا کیا تھا اور ہم پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے حملہ بھی کروایا تھا اور تم دونوں بھی اسی نیت سے سرحد پار کر رہے تھے کہ اپنا شکار لے اُڑو؟"

"ہاں! یہ بات سچ ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"لیکن جب کرنل نے دیکھا کہ وہ تم پر اس طرح قابو پانے میں ناکام ہو گیا ہے اور اس بات کا بھی اُسے یقین ہونے لگا کہ تم واقعی اپنے باپ کو اس کی قید سے آزاد کرانے کے لیے اتنا بڑا رسک اُٹھائے ہوئے ہو تو اس نے بھی یہ والا آپشن محفوظ رکھا تھا کہ تمہارے ساتھ سیدھے سبھاؤ ڈیلنگ کر کے تمہارے آدمی کے عوض اپنا آدمی لے کر اپنا راستہ لیا جائے۔"

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

READING
Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''لیکن پھر تم دونوں کو کیوں نہر کی دوسری طرف روانہ نہ کیا گیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''کرنل اس آخری وقت میں بھی ایک اور جوا کھیلنا چاہتا تھا۔ اس کی ناکامی کے بعد مقررہ وقت، یعنی شام تک اس ڈیل کو سیدھے انداز میں اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیتا۔''

اس نے سب کچھ وہی بتایا تھا جس کا میں وقت اور حالات کے مطابق تجزیہ کرتا رہا تھا۔

''یعنی تمہارا مطلب ہے کہ بلیو ٹکلسی کے تین ایجنٹ وہاں ہمارے مطلوبہ آدمی کے ساتھ موجود ہیں؟'' کھبیل دادا نے پوچھا تو اثبات میں جواب ملتے ہی میں نے اس سے اُس مقام کا حدود اربع دریافت کیا۔ اس پر وہ خاصا متذبذب سا نظر آنے لگا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''میں خود یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ میں اس مقام کی طرف تمہاری زبانی کلامی رہنمائی نہیں کرسکتا، بہتر ہوگا، میں بھی وہاں تک تم لوگوں کے ساتھ چلوں۔''

''کیا تمہیں غیر قانونی طور پر سرحد پار کرایا گیا ہے؟''

''نہیں، میں قانونی طور پر واہگہ بارڈر سے لایا گیا تھا۔ میرے ساتھ دو اور ساتھی بھی تھے۔''

''اور باقی وہ تین ساتھی، جو ہمارے مطلوبہ آدمی کو لے کر یہاں پہنچے ہیں۔''

''وہ غیر قانونی طور پر نکواڑ کے راستے اندر بھیجیں گئے ہیں، ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ابھی تاج دین شاہ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''چلو اُٹھو اب، ہمارے ساتھ چلو۔ اور بتاؤ کہ وہ کدھر ہیں تمہارے ساتھی۔''

بالآخر میں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے سہارا دینے کی غرض سے اُٹھایا اور اسی وقت اس نے اپنا داؤ کھیلتے ہوئے مجھے ایک زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی، میں اس کے اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھا، لڑکھڑاتا ہوا قریب کھڑے کھبیل دادا سے ٹکرا گیا، ہم دونوں تقریباً ایک ہی ڈیل ڈول کے یکم شحیم... تھے، نتیجتاً میرے ٹکرانے سے لمحے بھر کو وہ بھی اپنا توازن قائم ...نہ رکھ سکا اور چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا، مگر میری طرح وہ فوراً سنبھلا بھی تھا، لیکن اتنا ہی موقع بلیو ٹکلسی کے اس گھاگ ایجنٹ کے لیے کافی تھا۔ اس نے فوراً نہر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک زوردار چھپاکے سے وہ سطحِ آب پر گرا اور یک دم ایک غوطہ مار کے غائب ہوگیا، میں نے اس کے پیچھے نہر میں چھلانگ لگانے کا ارادہ کیا مگر کھبیل دادا نے مجھے روک دیا۔

''جانے دو اسے۔ ہمارا پہلے ہی بہت سا وقت ضائع ہو چکا ہے۔''

''مگر...'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

''اول خیر کو فون کر کے اس کے بارے میں مطلع کر دو، وہ اور شکیلا اسے بہ آسانی گرفت میں لے لیں گے۔ یہ اکیلا ان دونوں کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔''

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اس طرف چند ثانیے تکتا رہا جہاں ہمارا شکار ڈبکی لگا کر غائب ہوا تھا، اس کے بعد اپنا سیل نکال کر میں نے اول خیر کو مختصراً اس مفرور دشمن کے بارے میں خبردار کر دیا۔

اس کے بعد میں نے کھبیل دادا کی طرف اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مگر وہ زمین پر جھک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے بعد ایک گہری سانس خارج کر کے سیدھا ہوا اور ایک جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''آؤ میرے ساتھ۔ میں نے ان کا کھرا پالیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا، میں اپنا سر دھنتا ہوا اس کے پیچھے ہولیا۔

میں کھبیل دادا کی بات پر مطمئن تھا، وہ خالصتاً دیہاتی ماحول کا پروردہ تھا اور کھوجیوں والی صلاحیت کا اس میں پایا جانا عام بات تھی۔

''میرا خیال ہے یہ دونوں بھی اسی ٹھکانے سے چلے ہوں گے جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں۔'' میں نے اس کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے کہا تو وہ اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں! اسی لیے میں نے ان کا کھرا تلاشنے کی کوشش کی تھی۔ چلتے رہو تیز تیز۔''

دن چڑھنے لگا تھا۔ سردی کم ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں ٹیلوں میوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے تیز تیز مگر محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ سرحدی علاقہ شروع ہوگیا تھا، اور سامنے ہمیں کبھی کبھی کسی ٹیلے کی آڑ سے خاردار باڑ بھی نظر آجاتی تھی۔ ایک مقام پر کھبیل دادا رک گیا اور بہ ظاہر خاموش کھڑا اطراف کی سن گن لیتا رہا اس کے بعد بولا۔

''کھرا یہاں سے دائیں جانب کو مڑ رہا ہے، ہوشیار رہنا شہزی! ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔'' اسی وقت گولی چلنے کی آواز اُبھری تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

AIOURDUBOOKS.NET

قسط 23

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

AIOURDUBOOKS.NET

وہی ہوا جس کا ڈر تھا...

بی آر بی جیسے اس حساس علاقے میں گولی چلنے کا دھماکا ہم سب کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ آناً فاناً یہاں گن بردار اہلکار وارد ہوسکتے تھے۔

''یہ بُرا ہوگیا دادا...!'' میں نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

''جو ہونا تھا، ہوچکا۔ پتا چلنا چاہیے کہ گولی کیوں اور کس نے چلائی ہے؟'' وہ بولا اور اسی سمت آگے بڑھ گیا جہاں کُھرا مڑ رہا تھا، جبکہ گولی کی آواز... سامنے کے رخ سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں اسی جانب پیش قدمی کرنا چاہیے، آخر پتا تو چلتا کہ یہ گولی چلنے کا معاملہ کیا تھا؟

کبیل دادا کُھرے کی رہنمائی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے شاید میری طرح اپنے اصل ہدف تک پہنچنے کی جلدی تھی، وہ بغیر رُکے مگر محتاط روی کے ساتھ اپنی پیش قدمی جاری رکھے ہوئے تھا کہ اچانک اس نے پینترا بدلا اور پھر اس کا رخ اسی طرف ہوگیا جدھر سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی، ایک بے کی مختصر سی ڈھلوانی آڑ میں ہوکر وہ جم گیا اور مجھے بھی ساکت ہونے کا اشارہ کردیا۔

اس نے مجھے سر نہیں اُٹھانے دیا تھا مگر خود ڈھلوانی آڑ سے تھوڑا سا اُبھار کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسی وقت دوبارہ فائرنگ کی تڑتڑاہٹ اُبھری... اور غیر ارادی طور پر کبیل دادا نے اپنا سر جھکا لیا، میں دھک سے رہ گیا۔ میں یہی سمجھا شاید اسی پر کسی نے فائر کھولا ہے مگر کبیل نے دوبارہ سر اُبھار کر دیکھا اور ساتھ ہی مجھے بھی اشارہ کیا، میں بھی ذرا اُوپر کو سرکا اور دنگ رہ گیا۔

بادیُ النظر میں وہ جنگ کا ہی میدان نظر آتا تھا۔ ہم سے لگ بھگ کوئی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک بغیر ہُڈ کی بھاری سی لمبی جیپ کھڑی تھی اور اُسے مورچا بنائے چند وردی پوش اہلکار پوزیشنیں سنبھالے، اپنے سامنے کے رخ پر بنے ایک بلند ٹیلے پر فائرنگ کر رہے تھے، اس طرف سے بھی جوابی فائرنگ کی جارہی تھی اور یہ وہی والی سمت تھی جس طرف میں اور کبیل دادا تھوڑی دیر پہلے پیش قدمی... جاری رکھے ہوئے تھے۔

''جلدی آؤ اِس طرف...'' کبیل دادا گویا کسی خطرناک صورت حال کو بھانپتے ہوئے بولا۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا۔

''کیا تمہارا ابھی یہی خیال ہے کہ ہمارے دُشمن بی ایس ایف والوں کی نظروں میں آچکے ہیں؟'' میں نے اس کے ہم قدم ہوتے ہی پوچھا مگر اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے محض اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی اور بولا۔

''ہمیں عقب سے ان پر جھپٹنا ہوگا، ورنہ بی ایس ایف والے ہمارا شکار چھین لیں گے۔'' میں سمجھ گیا تھا کہ وہ ''شکار'' کسے کہہ رہا تھا، اور یہ حقیقت بھی تھی کہ ان مذکورہ تین بلوچستانی ایجنٹوں کے ساتھ میرا باپ، جو مبینہ طور پر ان کی قید میں ایک یرغمالی ہی کی حیثیت رکھتا تھا، بی ایس ایف اہلکاروں کے ساتھ اس جنگ میں وہ بھی زد میں آسکتا تھا۔ یوں میرے باپ کی زندگی بھی شدید خطرے میں تھی۔ یہی سبب تھا کہ مجھے کبیل دادا کی ایسے نازک وقت میں یہ بات درست محسوس ہوئی۔ جیسے ہی یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا، میں بھی اپنی جگہ سے بہ سرعت حرکت کی۔

فائرنگ اب وقفے وقفے سے جاری تھی۔ میں اور کبیل دادا اپنی گنز سنبھالے اسی ٹیلے کے عقبی سمت سے گھوم کر ذرا قریب پہنچے تو ایک منظر ہمارا منتظر تھا۔

وہ منظر خاصا چونکا دینے والا تھا، مگر اس منظر نے میری نگاہوں کی تڑپ کو یک بیک جوش سے تمتماتی آگ میں جلا ڈالا تھا۔ ہمارے سامنے وہ تین افراد تھے جبکہ چوتھے کی ہیئت اس کی وضع قطع سے صاف عیاں تھی کہ اُن تینوں کی نظروں میں وہ کیا حیثیت رکھتا تھا... پھر میں خود کو نہیں روک سکا، میں یہ بھی نہیں سن سکا کہ کبیل دادا نے میری اس دیوانہ وار پیش قدمی پر مجھے کیا سرزنش کرنی چاہی تھی، میں اسک سلینسر ہاتھ میں تولتا اسی سمت دیوانہ وار دوڑتا چلا گیا جہاں اُن تین افراد میں سے ایک غالباً لاش کی صورت میں بھربھری مٹی پر لہولہان پڑا تھا، جبکہ دوسرا ٹیلے کی آڑ لیے ہوئے بی ایس ایف کے اہلکاروں پر جوابی فائرنگ کرنے میں مصروف تھا، انداز اس کا ایسا ہی تھا جیسے وہ اپنے تیسرے ساتھی کو وہاں سے بھاگ جانے کے لیے موقع فراہم کررہا ہو۔ اس نے .... کسی بدحال سے نظر آنے والے آدمی کو اپنے کاندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا... میرا دل ہی نہیں بلکہ میرا یقین بھی چیخ چیخ کر یہ گواہی دے رہا تھا کہ اس تیسرے شخص کے کندھوں پر ڈھلکا ہوا وہ بدحال سا آدمی اور کوئی نہیں ہوسکتا، ماسوائے میرے باپ کے... بس! اس منظر نے میرے پورے وجود کی رگوں میں خون کی گردش کو کسی طوفان کی طرح تیز کردیا تھا۔ میں نے اس تیسرے شخص کے تعاقب میں بے تحاشا دوڑتے ہوئے ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک فضا میں ایک شے لہراتی ہوئی لپکتی نظر آئی، وہ شے کبیل دادا کو بھی نظر آگئی تھی۔ میں نے اپنے عقب میں ایک بار پھر کبیل دادا کو چلاتے ہوئے سنا۔

ہزی! رک جاؤ...'' اسی وقت وہ شے سنسناتی قریب ہی زمین پر گری اور کان پھاڑ دھماکا ہوا، دس ہوا جیسے میرے قدموں تلے زمین لرز گئی ہو، شدید تھا، میں بھربھری مٹی والی زمین پر گرا۔ ایک اور سنسناتی ہوئی آواز اُبھری اور ایک اور لن دھماکے نے مجھے اعصاب زدہ سا کر کے رکھ یکے بعد دیگرے اسی نوعیت کے دو دھماکے اور دیے تھے، جو نسبتاً بہت فاصلے پر ہوئے تھے، فرجی آبادی ٹکوڑی وغیرہ میں داغے گئے تھے، یوں تھا جیسے اس سرحدی پٹی کے قریب لائن آف کنٹرول نے اچانک شدید گولہ باری کر ڈالی ہو، سرحد پار داغے گئے تھے۔

رف بارود کی بُو اور گرد و غبار پھیل گیا تھا۔ بھارت ایسی شرانگیزی معمول کی بات تھی، شاید یہ بھی اسی تھا، میں اوندھے منہ زمین پر گرا ہوا تھا۔ جب اٹھنے کی سعی چاہی تو دو ہاتھوں نے مجھے سہارا دے میں مدد دی۔ یہ کبیل دادا تھا مگر مجھے کہاں چین تھا، اں رُواں جوشِ جذبات تلے تھرتھرا رہا تھا۔

میں نے اُٹھ کر سنبھلتے ہی دوبارہ اسی سمت کی طرف پاہا تھا مگر کبیل دادا نے اس بار مجھے اپنے دونوں کے نرغے میں لے لیا۔

''اوئے شہزی! یہ کیا پاگل پن کرنے چلا تھا؟ سنبھال یکھتا نہیں، گولہ باری ہو رہی ہے۔''

''چھوڑ دے مجھے کبیل!'' میں اس کی گرفت میں مچل لو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ''وہ... وہ میرا باپ!'' متلاشی نظریں سامنے گردش کرنے لگیں مگر وہاں اب گرد و کثافت کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اوئے نہیں... نہیں شہزی! اُدھر خطرہ ہے، ہوش میں تیرے ساتھ ہوں ذرا حالات کا جائزہ تو لینے دے'' کبیل دادا نے مجھے سمجھایا۔ تب میرے بے چین دل دماغ میں ذرا ٹھہراؤ سا آیا۔

''لگتا ہے بھارت نے لائن آف کنٹرول کی خلاف دی کرتے ہوئے گولہ باری کر ڈالی ہے مگر یہ زیادہ دیر ری نہیں رہے گی، ذرا صبر کر۔'' وہ بولا۔

اسی وقت اپنے سرحدی چوکیوں سے بھی جوابی گولے فائرنگ کی گئی۔ جنگ کے سماں جیسا یہ میدانِ کارزار جاری تھا، کبیل دادا مجھے لیے ایک طرف کسی ٹیلے کی آڑ میں آگیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، جو ایسے وقت میں کسی گہری سوچوں میں ڈوبا محسوس ہوا۔ مجھے اپنے باپ کی فکر ہوئی۔

''کبیل! کچھ کر، یا پھر مجھے جانے دے...'' میں شدید بے چینی سے بولا تو وہ پُرسوچ خیالات کے بھنور سے یکدم اُبھر کر بولا۔

''شہزی! کہا ناں! تھوڑا صبر کر، سن! مجھے لگتا ہے سرحد پار سے یہ گولہ باری کسی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا شاخسانہ ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا...؟'' میں اس کی بات پر چونکا۔

''تھوڑی دیر کے لیے سوچ ذرا شہزی! کرنل سی جی بھجوانی اس وقت بھارتی سرحدی علاقے اٹاری کے انٹروگیشن سیل میں موجود ہے، ایسے میں اُسے یقیناً یہ اطلاع مل گئی ہوگی کہ ان کا کھیل بگڑنے لگا ہے اور یوں اس نے اسی مقام پر محض افراتفری ڈالنے کے لیے اپنی بارڈر سیکیورٹی فورسز کو حکم جاری کیا ہو...''

اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا تھا، بادیُ النظر میں شاید اس کی بات پر اتفاق کرنا مشکل سہی لیکن موجودہ حالات کی ہلچل، اس کے تجزیے کی صداقت پر دلیل کرتی تھی۔ بھجوانی نے اس ''ڈیل'' کے لیے میرے باپ کو اپنے جن تین آدمیوں کے حوالے کر رکھا تھا، وہ تینوں کسی وجہ سے پاکستانی فورسز کی نظروں میں آگئے ہوں گے اور یوں ان کا کھیل بگڑنے لگا ہوگا، اور ان تینوں میں سے کسی ایک نے اس کی اطلاع یہاں سے کچھ دور سرحد پار واقع اٹاری میں مقیم بھجوانی کو دے ڈالی ہوگی اور یوں اس نے لوکیشن ٹریس کرنے کے بعد اسی طرف گولہ باری کروائی تاکہ اس کے تینوں ساتھیوں کو نکل بھاگنے کا موقع مل سکے۔ لیکن... میرے ذہن میں بجلی کے کوندے کی طرح لپکنے والے ایک خیال نے کبیل دادا کی اس بات کو رد کردیا۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''سی جی ایسا نہیں کرسکتا، کیا وہ نہیں جانتا اس میں اس کا اپنا بھی نقصان ہے۔ اس ڈیل کی ناکامی کا سب سے زیادہ اثر اسی پر پڑے گا، کیونکہ ابھی اس کا مطلوبہ آدمی ہمارے قبضے میں ہے اور ہمارا (میرا باپ) سرحد پار کر کے یہاں آچکا ہے۔''

''ممکن ہے تمہاری بات درست ہو مگر مجھے نہیں لگتا کہ سی جی جیسا مکار و عیار، فریبی شخص اس طرح کا کوئی گھاٹے کا سودا بھی کرسکتا ہے۔ کچھ ایسا مجھے لگ رہا ہے کہ وہ اس کے پیچھے بھی کوئی گہری بلکہ دہری چال کھیل رہا ہے...'' کبیل

AIOURDUBOOKS.NET

دادا ایک وقت اپنے خیال کی نفی بھی کررہا تھا اور تائید بھی۔

"تم شاید مجھ سے زیادہ اس فریبی اور رذیل کرنل کی چالیں سمجھ رہے ہو دادا...! مگر... ہم یہاں کس بات کا انتظار کررہے ہیں...؟" میں نے اس کی کشمکش کے جواب میں کہا۔

"گولہ باری رکنے کا۔" کبیل دادا نے مختصراً جواب دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جب یہ سلسلہ تھما تو ہم دونوں نے قدم آگے بڑھا دیے۔

گردوغبار کی چادر فضا میں ہنوز تنی ہوئی تھی جبکہ میں اور کبیل دادا محض اندازے سے تقریباً دوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ہمارے اندازے کی حکمتِ عملی کچھ زیادہ مشکل نہیں تھی۔ نسبتاً محفوظ جگہ کا تعین ہی اصل مرکز تھی، یہی سبب تھا کہ جلد ہی ہم دونوں دھوئیں اور مرغولوں کے بادلوں میں ڈوب گئے، جو اَب قدرے ماند پڑنے لگے تھے، حتیٰ کہ ہمیں اس کے درمیان دھول سے اٹے وہ دو افراد تیزی کے ساتھ ایک طرف بڑھتے دکھائی دیے، جن میں سے ایک کے کاندھے پر وہی مجہول سا شخص لدا ہوا تھا، پہلا اپنے "باربردار" ساتھی کو سہارا بھی دینے کی کوشش کررہا تھا۔ مگر خود اس کی اپنی حالت بھی ناگفتہ بہ ہورہی تھی، یعنی وہ خاصا زخمی نظر آرہا تھا۔

ہدف تاڑتے ہی میرا جوش سوا ہوگیا اور پھر میں نہیں رکا۔ طوفانی رفتار سے آگے دوڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ میں نے جوشِ جنوں تلے سب سے پہلے اسی شخص پر چیتے کی طرح جھپٹا مارا، جو "باربردار" تھا۔ اس وقت میں بڑی عجیب ذہنی و جذباتی کیفیات کا شکار ہورہا تھا، طیش، جوش، رقت آمیزی، یہ سب گڈمڈ ہوکر مجھے ایک عجیب انسان کا روپ دے رہے تھے۔

اپنے شکار پر جھپٹا مارتے سمے، اس امر کا دھیان رکھا جانا تھا کہ اس کے کاندھے پر لدا ہوا شخص گرنے نہ پائے۔ جیسے ہی میرا شکار لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا، اس کے کاندھوں پر لدا ہوا وہ عجیب اور اپنی ہیئت میں بدحال سا شخص میرے دونوں مضبوط بازوؤں کے حفاظتی حصار میں آچکا تھا۔

یار، بیلی، دوست، سنگت، ساتھی، حتیٰ کہ عزیز رشتے دار، سگا بہن بھائی تک... بے شک ان کی قربت کا قرار اپنی جگہ اور ان کی پہچان و شناخت کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ لیکن ماں اور باپ کے وجود کی خوشبو اور راحت آمیزی کا احساس ان سب سے جداگانہ ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ خدائے بزرگ و برتر نے ان دونوں ہستیوں میں اپنی جھلک کا ایک پرتو شامل کررکھا ہے، ہاں! ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ کی ناراضی کو خدا کی ناراضی کہا گیا ہے... باپ چاہے کتنے ہی ضعیف اور نحیف ونزار کیوں نہ ہوں لیکن کسی گھر میں ان کے دم سے جوان اور صحت مند مکینوں ایک تحفظ اور روحانی سکھ ضرور محسوس ہوتا ہے۔ تحفظ احساس صرف ایک صحت مند اور توانا بازوؤں میں ہی نہ ہوتا بلکہ اس سے زیادہ، ماں باپ کے بوڑھے ہاتھوں م بھی ہوتا ہے، جو ہر وقت اپنی اولاد کے لیے اللہ کے حضو دعا کے لیے اُٹھے رہتے ہیں۔ اس طاقت بے بہا کا کو مقابلہ کرسکتا ہے بھلا؟ یہی وہ سبب تھا جب میں نے اس بوڑھے، نحیف اور کمزور سے وجود کو اپنے توانا اور مضبو بازوؤں میں بھرا... تو پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ہی نہیں پورا وجود بھی یکلخت عقیدت واحترام سے لبریز ہو ہو، ایسے ہی وقت میرے بے قرار دل نے گویا چیخ کر گواہ دی تھی کہ، یہی تو وہ سبب ہے جو میری شناخت کا ضامن ٹھہرایا گیا تھا۔

یہی میرا باپ تھا، یہی میری شناخت تھی، وہ فخر تھا ج کے لیے میں آج تک خود کو مکمل شہزاد احمد خان... سمجھنے قاصر ہی رہا تھا اور آج یہ نام مکمل ہوگیا تھا۔

اپنے باپ کو سنبھالتے ہی میں بس چند ثانیے ا جذباتی سی کیفیات کا شکار رہا تھا۔ اس کے بعد ہوش مجھے آیا تھا جب عقب سے کبیل دادا نے اچانک اس دوس شکار کو دبوچا تھا جس کی اپنی حالت ناگفتنی تھی، کیونکہ وہ ہتھیار مجھ پر سیدھا کرنے کی کوشش میں تھا مگر فائر کرنے اُسے حسرت ہی رہ گئی، کبیل دادا نے اُسے جالیا تھا اور ا ہی مخصوص جھٹکے سے شاید اُسے ہمیشہ کے لیے بے بس کر تھا۔ جبکہ دوسرا جو میرے دھکے سے منہ کے بل گرا تھا، لیتے ہی اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ لڑھکنی کھائی تاکہ کسی اندھے حملے سے فوری طور پر بچ سکے اور حملہ کر کی پوزیشن میں آسکے، مگر کبیل دادا بھی ایک کائیاں تھا، حقیقت کا ادراک ہوجانے کے بعد کہ میرے ہاتھ گوہرِ مقصو سے لبریز ہوچکے ہیں، وہ پورا پورا میرے تحفظ میں اپنی جا لڑانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے دوسرے شکار کی ط جست لگائی تھی، مگر تب تک وہ آخری حریف نہ صرف سنبھال چکا تھا بلکہ اپنا پستول بھی نکالنے کی کوشش کے دورا ہی اُس نے اپنی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے ہو کبیل دادا پر راؤنڈ کک بھی چلا دی مگر کبیل دادا کے اپنے ایک تربیت یافتہ حریف کی طرف سے یہ حملہ ہی نہیں خصوص ٹرک بھی قطعاً غیر متوقع نہ تھی۔ یہی سبب تھا کہ وہ قت خود کو بہ سرعت جھکائی دے کر اس طوفانی کک سے صاف بچا گیا تھا، مگر حریف کے اگلے مرحلے سے میں واقف تھا اسی لیے مجھے بھی حرکت میں آنا پڑا، کیونکہ کک ناکام جاتے ہی حریف کے پستول کی نال کا رخ لامحالہ کبیل دادا کی طرف ہونا لازمی تھا، جس کا اندازہ شاید ابھی کبیل دادا کو نہیں پایا تھا۔ مگر میں اس کا ادراک کرتے ہی چند قدم اس کی طرف بڑھ آیا تھا۔ جیسے ہی اس کے پستول کی نال کا رخ کبیل دادا کی طرف ہوا، کھڑے کھڑے میری لات حرکت میں آئی اور اس کا پستول فضا میں اُڑ کر کہیں دور جا گرا۔

میں اپنا کام کرچکا تھا، یہی وجہ تھی کہ کبیل دادا نے ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ حریف پر جھپٹا مارا، لیکن حریف نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے بغیر اس کا یہ حملہ ہلکہ ہلا اپنے بازوؤں کے مخصوص اسٹائل پر روک دیا اور ساتھ ہی اس نے داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی ضرب کبیل دادا کے پیٹ پر رسید کردی۔ وہ اس جاں کش تکلیف سے دہرا ہوگیا۔

میں جان گیا تھا کہ کبیل دادا کے مقابلے میں کرنل سی جی بھوانی کا کوئی عام کارپرداز نہیں بلکہ بلیو تلسی کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہے، اس لیے کبیل کو اسے زیر کرنے میں خاصا وقت لگ سکتا ہے۔ جس کا اس نازک وقت میں کم از کم میں تو متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ کبیل کو عارضی طور پر ہی سہی، ڈھا دینے کے بعد حریف میری جانب لپکا، میں اپنی جگہ سے ہلے بغیر، پل کے پل میں اس کے انداز جارح کو بھانپ کر اپنے باپ کے بے سُدھ وجود کو بہ دستور اسی طرح تھامے ہوئے اپنے جوتے کی ایڑی پر جتنی تیزی سے گھوم سکتا تھا، گھوم گیا اور یوں میں نے لفٹ کک حریف کے چہرے پر رسید کرنی چاہی تھی، لیکن وہ بھی بروقت میرے جوابی حملے کے انداز کو تاڑ کر بہ سرعت جھکائی دے گیا تھا اور اسی دوران اس نے مجھے سوئپ کردیا، اپنے باپ کو زمین پر لٹائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ اسی اثنا میں میرا حریف رکوع کے بل جھک کر اپنی داہنی پنڈلی سے ایک مہلک اور تیز پھل والی قرولی نکال چکا تھا، میرے پاس وقت نہیں رہا تھا کہ میں اس کے مہلک وار سے خود کو بچا پاتا، وہ ایک ہاتھ میں قرولی سونتے میرے سر پر پہنچ چکا تھا، اب تب میں وہ مجھ پر وار کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اُسے ایک کریہہ سی چیخ کو کسی بیل کی ڈکراہٹ سے مشابہ آواز میں خارج کرتے پایا اور اس کا قرولی والا ہاتھ فضا میں ہی اُٹھا رہ گیا، ایک تیز شکاری چاقو دستے تک اس کے سینے میں پیوست ہوچکا تھا۔ ضرب اور نشانہ ایسا کاری تھا کہ اس کے تکلیف کے مارے کھلے منہ سے خون اُبلتا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔

یہ بروقت حرکت زمین بوس کبیل دادا کی تھی جس نے شاید اسے پنڈلی کی طرف جھکتے دیکھ کر اس کے مقصد کو تاڑ گیا تھا اور یوں اس سے زیادہ اس نے پھرتی کا مظاہرہ دکھاتے ہوئے اپنا چاقو اُستادانہ مہارت سے اس کی طرف اُچھال دیا تھا۔

"خس کم جہاں پاک..." کبیل دادا ہاتھ جھاڑتے ہوئے اُٹھا۔ "چل شہزی! نکل چل یہاں سے، ورنہ لمبی پھڈیک میں پڑ جائیں گے۔" وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ میں فوراً سنبھلا اور ایک نگاہ اپنے باپ کے چہرے پر ڈالی، دل میں رقت بھری اور خوشی وغمی جیسے ملے جلے جذبات کا ایک جوار بھاٹا سا اُٹھا، میں بڑی محبت، احترام اور پُرعقیدت سے اس کا جائزہ لینے لگا، وہ نیم بے ہوش سا تھا، یا پھر کمزوری کے باعث وہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا، اس کے بوڑھے لب سوکھ کر پپڑی ہورہے تھے، چہرے پر ان گنت جھریوں کا جال تھا، داڑھی، مونچھیں کسی مجذوب کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے گرد گھیرے حلقے اس کی شدید جسمانی کمزوری کو ظاہر کررہے تھے، بال کھچڑی سے تھے اور مٹی دھول سے اٹے پڑے تھے۔

کپڑوں کی حالت اس سے زیادہ ناگفتہ بہ ہورہی تھی بلکہ کپڑے کیا تھے، سوائے چیتھڑوں کے، جہاں سے میرے باپ کے ضعیف جسم کے کئی گوشے برہنہ نظر آرہے تھے، اور ان برہنہ گوشوں پر زخموں کے سیاہ داغ بتا رہے تھے کہ وہ کتنے پرانے ہوسکتے تھے۔ میرا دل بھر آیا۔ یہ میرا باپ ہی نہیں بلکہ وطن عزیز کا وہ بہادر اور محبِ وطن سپاہی بھی تھا جس نے اپنے ملک کی خاطر نجانے کتنی صعوبتیں اُٹھائی تھیں۔ میں نے فوراً اپنی بھاری جیکٹ اسے پہنا دی تھی۔

یہ کمزور وجود کس قدر طاقت ور تھا یہ میں ہی جانتا تھا، اس نے کیسے دُشمن کے دانت کھٹے کیے تھے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا... ان بوڑھے کپکپاتے ہاتھوں نے کبھی کس طرح آتش و آہن کے ساتھ پنجہ آزمائی کی تھی۔

"تُو پہچان رہا ہے اس باباجی کو...؟" کبیل دادا نے میرے قریب آکر پوچھا۔

"میں نے کیا، میرے لہو نے گواہی دے ڈالی ہے کہ یہی میرا باپ ہے۔" میں نے پورے یقین سے کہا تو دادا بولا۔

AIOURDUBOOKS.NET

Poora Pakistan
Raha Hai Bol
Hashmi Ispaghol
Hashmi Ispaghol
روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈشوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست
Daily Lo Fit Raho
www.hashmisurma.com
HashmiSince1794
Benchmark.pk

”چنگا! چل اُٹھ پھر، ہمیں واپس ہونا ہے۔“ میں نے فوراً اپنے باپ کے بے سُدھ سے وجود کو اُٹھا لیا اور تیزی سے واپس کراڑے کی طرف بڑھنے لگے، ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک میرا سیل گنگنایا۔ میں نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے کبیل دادا کو اپنی جیب سے سیل نکالنے اور کال اٹینڈ کرنے کا کہا۔ اس نے فوراً وہی کیا اور ایک نگاہ سیل کی اسکرین پر ڈالتے ہوئے بولا۔

”خدا خیر کرے... اول خیر کی کال ہے۔“ کہتے ہوئے اس نے فوراً سیل اپنے کان سے لگا کر کہا۔ ”ہاں! اول خیر... کیا بات ہے؟“

”ہاں... ہاں! وہ ٹھیک ہے اور میرے ساتھ ہے ہمارا مشن کامیاب ہو گیا ہے، مگر کسی وجہ سے وہ کال نہیں اٹینڈ کر پا رہا، تم بتاؤ؟ خیریت تو ہے ناں؟ یہ مجھے کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟“ وہ بولتا رہا اور میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔

”کیا...؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ مگر۔“ کبیل دادا کا چہرہ یکلخت تاریک پڑتا دیکھ کر میں نے ایک ہاتھ سے سیل اس سے جھپٹ لیا اور کان سے لگا کر بولا۔

”ہاں اول خیر! کیا ہوا...؟“ اس دوران میں کبیل دادا نے میرے باپ کو سہار لیا تھا تا کہ میں اطمینان سے بات کر سکوں۔

”کاکے! یہاں ہم پر کچھ نامعلوم حملہ آوروں نے اچانک ہلّا بول دیا ہے، تم دونوں کہاں ہو؟“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پس منظر میں مجھے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دے گئی تھیں۔ میری فراخ پیشانی پر یکلخت شکنوں کا جال سا بن گیا اور میں نے فوراً پوچھا۔

”اول خیر! وہ کتنے لوگ ہیں اور...“ میری آواز نامکمل ہی رہ گئی، کیونکہ دوسری طرف سے کال اچانک منقطع ہو گئی تھی، میں پریشان ہو گیا اور اسی انداز میں ہیلو... ہیلو، کرتا رہ گیا۔ دوسری جانب سے ٹوں... ٹوں، کی مخصوص آواز کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دی تو میں نے فوراً شکیلہ کا نمبر ایمرجنسی والے ڈیجیٹ تو پریسیٹ کیے ہوئے کو پنچ کیا، مگر شکیلہ نے بھی کال ریسیو نہیں کی تو میری تشویش فزوں تر ہونے لگی، میں نے کھڑے کھڑے کبیل دادا پر ایک نظر ڈالی، اُسے بھی وہاں کی صورت حال کا کسی حد تک اندازہ ہو چلا تھا، لہٰذا بہ یک ترنت بولا۔

”شہزی! ہمارا دوسرے کنارے تک پہنچنا ضروری ہے، وقت ضائع مت کرو۔“

یہ کہتے ہی وہ میرے باپ کو سنبھال کراڑے ک طرف دوڑا اور میں نے بھی آگے قدم بڑھا دیے۔ ہمار عقب میں کہیں ذرا فاصلے پر ایک گولہ اور پھٹا تھا مگر ہم ز نہیں اور کراڑے پر پہنچ کر ہی دم لیا۔ وہاں سے ہم ہوئے نیچے اُترے اور پھر پانی میں چھلانگنے سے پہلے میں نے اپنے باپ کو سنبھالا اور جلدی جلدی اسے اپنا کا لباس پہنایا، مقصد مقدور بھر حد تک پانی کی برودت سردی سے بچائے رکھنا تھا۔ کبیل دادا نے مجھے اپنا لباس پہنانے کے لیے دینا چاہا مگر میں نے انکار کر تاہم اس کے بعد میرے باپ کو دوبارہ اسی نے ہی سنبھ لیا تھا، اور میں نے بھی کسی قدر اسے سہارا دے رکھا تھا اسی طرح تیرتے ہوئے بالآخر دوسرے کنارے سے جا تھے، جہاں اب اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ غیر مع سناٹا دیکھ کر میرا دل اندر سے ہول اٹھا تھا کہ یہاں ایسا ہوا تھا؟ ہم اسی جانب بڑھے جہاں ہم نے اول خیر اور شک کو چھوڑا تھا اور کار کے اندر رسن بستہ حالت میں سندر موجود تھا۔

وہاں کا نقشہ بتا رہا تھا کہ یہاں دو گروپوں درمیان ٹھیک ٹھاک معرکہ آرائی ہوئی ہے۔ کار کی باڈی گولیوں کے ان گنت سوراخ تھے، ونڈ اسکرین کھڑکیوں کے شیشے چٹخے ہوئے تھے، تین ٹائر برسٹ آ رہے تھے، دو لاشیں اور خون پھیلا ہوا تھا، ایک سیل نظر آیا جو کبیل دادا نے لپک کر اُٹھا لیا۔ جبکہ مجھے مذکو دونوں لاشوں کی ذرا فاصلے سے ہی تصدیق ہو چکی تھی کہ اُن نامعلوم حملہ آوروں کے ساتھیوں کی ہوں گی جن کے ساتھ مبینہ طور پر اول خیر اور شکیلہ کے ساتھ معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اپنے ساتھیوں اور بالخصوص سندرداس جیسے خطرناک قیدی کو غائب پا کر مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا اور اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہونے لگے۔

اس دوران میں میرے باپ کو پوری طرح ہوش آنے لگا تھا اور وہ بے چینی کے اظہار میں اپنے بوڑھے ہاتھ پیروں کو بار بار حرکت دینے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی اپنے منہ سے بے ربط آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ اس کی یہ مقدور بھر سعی خود کو مجھ سے چھڑانے جیسی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اتنے برس بعد اب کن محفوظ ہاتھوں میں تھا، نہ وہ یہ جانفزا حقیقت بھی جانتا تھا کہ جس ملک کی خاطر اُس نے اتنا طویل اور پُرآلام و پُرآزار عرصہ دُشمن ملک کی سرزمین کے ٹارچر سیل اور عقوبت خانوں میں گزارا تھا، وہ اب دوبارہ اسی

AIOURDUBOOKS.NET

وطنِ عزیز کی محفوظ گود میں آچکا تھا۔ لیکن میرے پاس ابھی اسے اتنی بڑی خوش خبری سنانے کا وقت نہ تھا۔ سندرداس اور میرے دونوں ساتھیوں کے غیاب نے میری اس فتح پر اوس گرادی تھی۔

”میں نے کہا تھا نا شہزی! یہ کرنل سی جی بجوانی غضب کا مکار اور شاطر آدمی ہے۔“ کبیل دادا کی کھرکھراتی آواز میری یک ٹک سماعتوں سے ٹکرائی۔

”اس نے ہمارے خلاف شطرنج جیسی چالیں اپنے پیادوں کے ذریعے چار دانگ چھوڑ رکھی تھیں۔ جہاں کس کا وارا لگے، لگتا ہے اس کے آخری پیادے کا وارا لگ چکا ہے۔“

”کبیل دادا! میرا موڈ اس وقت سی جی بجوانی کی تعریفیں سننے کا بالکل نہیں ہو رہا ہے۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”لیکن... سمجھ میں نہیں آتا، بجوانی کا یہ آخری مہرہ کیا سندرداس سمیت اول خیر اور شکیلہ کو بھی اپنے ساتھ یرغمال بنا لے گیا ہے یا ہمارے ساتھی اس مہرے کے تعاقب میں گئے ہیں؟“

”کال کے اچانک منقطع ہو جانے سے تو یہی لگتا ہے کہ وہ دونوں بھی دشمن کے نرغے میں آچکے ہیں...“

”تم کھُرا تلاش کرلیتے ہو نا...؟“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”جلدی کرو، ہمیں اس مقام تک پہنچنا ہوگا، اسی وقت...“ جوشِ غیظ سے میری سانسیں چڑھنے لگی تھیں۔

اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں چیخ پڑا۔

”کبیل دادا! بحث نہیں چلے گی، کھُرا تلاش کرو... تم نہیں جانتے سندرداس اس وقت کیسا بم ثابت ہو سکتا ہے میرے لیے...“ میری طرف گھورتی ہوئی اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے برہمی کی چمک اُبھری تھی، جو فوراً معدوم بھی ہو گئی اور پھر اس نے وہی کیا جس کا میں نے اسے حکم دیا تھا۔

وہ چند منٹوں تک وقوعے والی جگہ (اس جگہ کو میں اب یہی کہہ سکتا تھا) کا مختلف انداز میں طواف کرتا رہا، کبھی جھک جاتا، اور کئی قدم آگے بڑھ جاتا، پھر راستہ کاٹتا اور دائیں بائیں مڑ جاتا اور واپس لوٹ آتا۔ میں سرتاپا ایک پُرتشویش بےچینی کا شکار تھا اور بڑی بےتابانہ نظروں سے ہونٹ بھینچے کبیل دادا کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

”یہاں چار افراد نے بلّا بولا ہے، جو ایک چوڑے ٹائروں والی جیپ میں آئے تھے۔“ بالآخر اس نے میرے قریب آکر بتانا شروع کیا۔

”لیکن... حیرت کی بات ہے کہ یہ کہیں باہر سے نہیں بلکہ کسی قریبی مقامی آبادی سے شب خون مارنے یہاں آئے تھے، جس کا مطلب ہے، وہ اس حملے کی پہلے سے ہی منصوبہ بندی کیے ہوئے تھے۔“ میں اس کے انکشاف پر بُری طرح چونکا۔

”تمہارا مطلب ہے موضع تکواڑیاں کے کسی مقام سے آئے ہیں؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مگر شاید، ہم پر آگے چل کر ایک اور بھی انکشاف ہونے والا ہے۔ آؤ، اس طرف سے آگے بڑھو، وہ آبادی قریب ہے جہاں سے میرے خیال کے مطابق حملہ آور آئے تھے۔“ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اُدھر سرحد کی جانب ابتری معدوم ہونے لگی تھی، مجھے خدشہ تھا کہ تین سرحدی جاسوسوں کی کھوج میں بی ایس ایف والے قریبی آبادیوں کا رخ کر سکتے تھے۔ تاہم ایک اطمینان بھی تھا کہ ایسا شاید نہ بھی ہو کیونکہ ہم ان تینوں کو وہیں جہنم واصل کر آئے تھے، اور کوئی بعید نہیں تھا کہ ان کی لاشیں بی ایس ایف والوں کی نظروں میں آچکی ہوں، تاہم اس عقدے کا پتا چلانے کے لیے کہ آخر انہیں کس نے ہلاک کیا؟ وہ کوئی پٹرولنگ یا ٹارگٹڈ کارروائی عمل میں لا سکتے تھے۔

میں کبیل دادا کی انکشاف والی بات پر چونکا تھا اور کھدبد کا شکار تھا، جان تو گیا تھا میں بھی کہ وہ... کھُرا تلاش کرنے کے دوران میں مزید انکشافات کی توقع رکھے ہوئے تھا۔

ایک خدشے نے میرے ذہن میں سر اُٹھایا تھا کہ کہیں اُس مردود کرنل سی جی کے یہ آخری چار مہرے سندرداس سمیت میرے دونوں ساتھیوں کو بھی سرحد پار لے جانے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اپنے اس خدشے کا اظہار میں نے تیز تیز قدموں سے ساتھ چلتے ہوئے کبیل دادا سے بھی کیا تھا، اس کا خیال بھی کم و بیش یہی تھا۔

اگر ایسا ہو جاتا تو سندرداس کو ہمارے لیے ڈھونڈنا گویا بھوسے میں سوئی تلاشنے والی بات ہو جاتی۔ انہی باتوں نے میرے اندر بلکہ میرے روئیں روئیں میں ہلچل اور سنسنی سی پھیلا دی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے بار بار میجر ریاض باجوہ کا چہرہ رقص کر رہا تھا اور اُن کی وہ تنبیہ بھی جو سندرداس کو میرے حوالے کرتے وقت کی تھی۔

”شہزی! تمہاری خاطر میں اپنے اُوپر ایک بہت بڑا رسک لے رہا ہوں، بےشک اس کے پیچھے بھی نیک نیتی اور ایک نیک مقصد ہی کارفرما ہے، لیکن اگر خدانخواستہ سندرداس ہاتھوں سے نکل گیا تو اس کی صفائی اور تمہید میں اعلیٰ حکام کو کوئی توجیہہ پیش نہیں کر سکوں گا، میرا کیریئر ختم ہو کر رہ جائے

ارٹ مارشل تو ہوگا ہی میرا، غداری کا مقدمہ بھی مجھ پر م کیا جا سکتا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ ایک فوجی افسر کے داری کا لیبل خودکشی سے کم نہیں ہوتا...“

یہ الفاظ یاد کرکے میرا ذہنی خلجان بڑھتا جا رہا تھا، ملکی کے مدار مجھے اپنی طرف کھینچنے لگے تھے، اور ایسے ادکو اس جاں گسل تصور سے چھٹکارا پانا ممکن نہ ہو رہا تھا۔

”شہزی...! کیا ضرورت تھی بھلا اتنا بڑا اور پُرخطر ف لینے کی...؟ تم نے محض اپنی غرض کی خاطر جہاں طرف خطرناک ملک دشمن ایجنٹ کو گنوا دیا، بلکہ اس کی اس میں ایک ذمے دار فوجی افسر کا بھی زندگی سمیت، کچھ داؤ پر لگا دیا، شہزی یہ تم نے کیا کردیا؟ یہ کیسا جُوا ملا کہ تمہاری اس حرکت پر تو تمہارا اپنا باپ بھی تمہیں تال نہیں کرے گا۔ اُس نے تو ملک کی خاطر تم سب کو رہان کردیا اور تم نے...“

”نہیں... خدا کے لیے نہیں، ایسا نہیں ہوگا... میں یسا نہیں ہونے دوں گا...“

میں جذبات کی شدت سے چیخ اُٹھا، میرے آگے آگے کھُرے پر نگاہ رکھے ہوئے کبیل دادا میری اس چیخ پر ری طرح ٹھٹک کر رُک گیا۔

میرا پورا وجود مرتعش تھا۔ کبیل دادا جو آنکھیں پھاڑے ایک وحشیانہ سی حیرت تلے میری طرف تکے جا رہا تھا، اُس سے بھی میری ہیجان خیز کیفیات چھپی نہ رہ سکی تھیں۔

باپ کا نحیف و نزار وجود میرے ہاتھوں میں تھا اور ب پھر مجھے قریب ہی چھایا دار درخت تلے ایک کٹیا سی دکھائی دی، وہ شاید کسی فقیر کی مڑھی لگتی تھی، میں اپنے باپ کو لیے اسی جانب بڑھا تو کبیل دادا نے مجھے خبردار کیا۔

”شہزی! ٹھہرو، ایک کھُرا مجھے اسی کٹیا کے اندر جاتے ہوئے ملا ہے، ہو سکتا ہے وہاں کوئی دشمن ہو، میں تمہیں یہی بتانا چاہ رہا تھا کہ تمہاری چیخ نے مجھے چونکا دیا۔“

مگر میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔ میں وہاں کیا کرنے جا رہا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا، لیکن جب میں اس مڑھی کے داخلی دروازے پر پہنچا تو مجھ سے پہلے ہی کبیل دادا لپک کر دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ دروازہ کیا تھا، بس، مختصر سے داخلی راستے پر ایک پیوند زدہ ٹاٹ جھول رہا تھا، جسے پرے ہٹا کر اور پستول ایک ہاتھ میں لیے کبیل دادا ہی پہلے اندر داخل ہوا پھر میں، اور دوسرے ہی لمحے ہم دونوں ہی بری طرح ٹھٹکے تھے۔

☆☆☆

اگرچہ اندر کی وضع قطع ہمارے لیے غیر متوقع نہ تھی۔ وہ بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ کسی غریب یا فقیر کی کٹیا ہو سکتی ہے یعنی، کونے میں ایک جگہ صراحی اور اوپر جست کا ایک ٹیڑھا میڑھا سا گلاس دھرا پڑا تھا، زمین پر پرانی سی گدڑی بچھی ہوئی تھی، لیکن جس شے نے ہمیں بری طرح چونکنے پر مجبور کیا، وہ ایک بےسدھ جسم تھا، جو زخمی بھی تھا اور اُوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔

یہ شکیلہ تھی۔ میں نے اپنے باپ کو آہستگی سے اس میلی گدڑی پر لٹا دیا اور شکیلہ کی طرف لپکا، وہ کراہ رہی تھی اور زخمی بھی تھی، اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا اور ایک بازو پر بڑا سا گھاؤ نظر آ رہا تھا۔ ٹانگ بھی گھٹنے کی طرف سے زخمی تھی، یوں لگا۔ جیسے اسے دوبدو لڑائی میں چوٹیں آئی ہوں۔ شکر تھا کہیں گولی کا نشان مجھے دکھائی نہیں دیا تھا، جس کا مطلب تھا اسے کوئی خاص جان لیوا زخم نہیں آیا تھا، لیکن بازو والے گھاؤ سے مسلسل خون بہنے کی وجہ سے اُس پر نقاہت ضرور طاری تھی اور اس کی نیم بےہوشی کی اصل وجہ بھی یہی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنا رومال نکال کر اس کے بازو والے زخم پر باندھ دیا اور کبیل دادا کو صراحی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر پانی کا گلاس بھرا اور مجھے تھما دیا۔ جو میں نے تھام کر فوراً شکیلہ کے لبوں سے لگا دیا۔ اس کے کپکپاتے لب وا ہوئے اور چند گھونٹ پانی کے حلق سے اُتارنے کے بعد اُسے کچھ ہوش و خرد کا یارا ہوا تو میں نے گلاس ہٹایا۔ وہ اب آنکھیں کھولے مجھے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی، ابھی شاید اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ پوری طرح نہیں چھٹی تھی، تاہم میرے پکارنے پر اس کے ستے ہوئے چہرے پر کچھ شناسائی اور طمانیت کے تاثرات اُبھرے۔

”شکیلہ! تم ٹھیک تو ہو ناں... لو پانی پیو اور...“

میں نے دوبارہ پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا، اس بار اس نے سارا پانی پی لیا اور پھر یوں ہانپنے لگی جیسے اس کی سانسیں ابھی صحیح طرح بحال نہ ہوئی ہوں۔ اُس نے ذرا ہمت سے کام لیا اور اپنی گردن موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

”تم بالکل ٹھیک ہو شکیلہ!“ میں نے اس سے ازراہِ تشفی کہا۔ ”ہم دشمنوں کے تعاقب میں جا رہے ہیں، کیا تم ہمیں کچھ بتا سکتی ہو کہ تم لوگوں کے ساتھ ہوا کیا تھا اور اول خیر کہاں ہے؟“

میری بات پر شکیلہ ہولے سے کراہی، وہ میری بات کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگی، میں اُسے بدستور

AIOURDUBOOKS.NET

سہارنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھنا چاہتی تھی مگر اس کے زخموں نے اسے ہلنے جلنے سے بھی باز کر رکھا تھا، ایسے میں ہمارے سر پر کھڑے کبیل دادا نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شہزی! ہمارے پاس وقت کم ہے اور گھرا زیادہ دیر نہیں چل سکتا...''

میں نے سر اُٹھا کر سوچتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور شکیلہ کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ اور ہمارے آنے تک یہاں سے ہلنا بھی مت، ہم دشمنوں کے تعاقب میں جا رہے ہیں جو شاید زیادہ دور نہیں مگر تاخیر انہیں ہم سے دور ضرور کر دے گی۔'' یہ کہنے کے بعد میں نے قریب لیٹے اپنے باپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا باپ ہے، تاج دین شاہ، اس کی بھی حالت تم سے مختلف نہیں۔ مگر یہ ابھی کسی کو نہیں پہچان پا رہا، تم کو اس کا بھی دھیان رکھنا ہے، تم سمجھ رہی ہو ناں میری باتیں؟''

شکیلہ نے ایک ذرا گردن موڑ کر اپنے دائیں جانب بے سُدھ لیٹے میرے باپ کی طرف دیکھا اور پھر ہولے سے اپنی گردن کو اثباتی جنبش دی۔ اس کے پاس سے اُٹھتے اُٹھتے ... میں نے اول خیر کے بارے میں پوچھا تو وہ فقط یہی بتا سکی کہ ان پر جن نامعلوم حملہ آوروں نے ہلّا بولا تھا، اور اپنا شکار (سندر داس) چھڑا کر لے گئے تھے، اول خیر انہی کے تعاقب میں گیا تھا مگر وہ خود بھی کم زخمی نہیں تھا، جبکہ وہ خود ایک دُشمن سے دوبدو لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی، اگرچہ مدِ مقابل بھی بری طرح گھائل ہو گیا تھا پھر اس نے اپنی جان بچانے کی کوشش میں یہاں کی راہ لی تھی۔

میں نے اپنے بوڑھے باپ کی پیشانی کو چوما، میں نے دیکھا وہ اپنی گھنی نمیالی بھوؤں سے ڈھکی بوڑھی آنکھوں سے مجھے دیکھنے یا پھر شاید پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں اور کبیل دادا تیزی کے ساتھ مڑھی سے باہر نکل آئے۔

آگے بڑھتے ہوئے میرا پورا وجود جھیروں جھیر ہونے لگا تھا۔ میں اپنے دل پر جبر و صبر کی بھاری سل رکھے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا اور جلد ہی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تو کبیل دادا ایک جگہ ٹھہر گیا۔

یہ تکواڑیاں کے قریب کا ایک اور چھوٹا سا دیہات تھا۔ کبیل نے مجھے اُسی چونکا دینے والے ایک اور انکشاف کے بارے میں بتایا کہ بی آر بی پار کرتے ہی ہم سے دُشمن کے جن دو ایجنٹوں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور ان میں سے ایک تو میرے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا جبکہ دوسرا، پوچھ کچھ کے دوران ہمارے چنگل سے بھاگ نکلا تھا اور دریا میں چھلانگ لگا دی تھی، بعد میں ہم نے حفظِ ماتقدم کے تحت اس کی اطلاع سیل پر اول خیر وغیرہ کو بھی دے دی تھی۔ اب کبیل دادا نے جو انکشاف کیا تھا، اس کے مطابق وہ مفرور دُشمن، جس کے بارے میں ہمارا قوی خیال یہی تھا کہ وہ اپنے ایک دوسرے ساتھی کی طرف رخ کرے گا جسے نہر کے دوسرے کنارے پر ہمارے خلاف ہی کسی ''مہم جوئی'' کے لیے بھیجا گیا تھا مگر ایسا اُس نے نہیں کیا تھا۔ کبیل دادا کو اسی بات کی... حیرت تھی کہ اگر وہ دُشمن تھا تو پھر اس نے اول خیر اور شکیلہ کی طرف رخ کرنے کے بجائے، کسی اور جگہ کا کیوں رخ کیا تھا...؟

اس کی قلعی اب کھلی تھی۔ منصوبے کے مطابق وہ پہلے یہاں آیا تھا جدھر اس کے اور بھی ساتھی (پانچ ساتھی، جن میں سے دو اول خیر وغیرہ کے ساتھ لڑائی میں ہلاک ہو چکے تھے) ایک خفیہ ٹھکانے پر پہلے سے موجود تھے، وہ انہیں لے کر بذریعہ جیپ اُس مقام تک پہنچا اور اول خیر وغیرہ پر ہلّا بول دیا۔

کبیل دادا نے بالکل صحیح گھرا تلاشا تھا اور اب ہم دونوں تیزی کے ساتھ اسی ٹھکانے کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔

دن ڈھلنے لگا تھا، آسمان پر سرمئی پن نمودار ہونے لگا تھا اور سردی کی کاٹ میں بھی اضافہ ہو چلا تھا مگر ہماری رگوں کی تیز گردش، میرے اور کبیل دادا کے توانا جسم کو گرمائے ہوئے تھا۔ یہ آبادی دور اُفتادہ سرحدی پورہ میں ہونے کے باعث سرِ شام ہی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہی تھی، یوں بھی سخت سردی کی اس .... شام میں کون باہر نکلتا تھا۔

کبیل دادا کے کہنے کے مطابق، دشمن مہروں نے اُسی جیپ میں واپسی اختیار کی تھی، جس میں وہ ہلّا بولنے آئے تھے۔ کبیل دادا نے مجھے پوری اُمید دلائی تھی کہ دشمن مہرے اپنے ٹھکانے پر مل سکتے تھے۔ یہ سن کر مجھے یک گونہ سکون ملا تھا۔

چند ٹیڑھی میڑھی بے ترتیب اور گارے مٹی سے اٹی پڑی کچی دیواروں والے گھروں کی مختصر مختصر گلیوں سے ہم دونوں گزرنے لگے۔ ان دیواروں پر کہیں کہیں گوبر تھپے ہوئے تھے۔

''اِدھر ٹھہرنا ذرا...'' اچانک ایک گلی کے آخری سرے پر پہنچ کر کبیل دادا نے رکتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا اور ساتھ ہی اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ بھی دیا۔

''اوئے شہزی! مبارکاں! وہ جیپ کھڑی ہے جس کا ہے، دُشمن اندر موجود ہیں۔'' کبیل دادا نے ذرا اور ر جھانکنے کے بعد جوشِ مسرت تلے کہا تو میرا دل بھی سے دھڑکنے لگا، مجھے اول خیر کی فکر بھی ستائے ہوئے وہ نجانے کہاں اور کس حال میں تھا جبکہ شکیلہ کی طرف مجھے کچھ تسلی ہو چکی تھی۔

ابھی ہم آگے بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک نے اس مکان سے کچھ افراد کو نکلتے دیکھا۔ میرے وجود بش ہوئی، میں ان پر شب خوں مارنے کے لیے بے ہو گیا، کبیل دادا نے میری کیفیت بھانپ کر اپنے ایک سے میرا شانہ دھیرے سے دبایا۔

وہ تین افراد تھے، ایک خاصا زخمی تھا مگر اس کی مرہم کی ہوئی نظر آتی تھی، جبکہ باقی دونوں افراد ایک ایک دی سنبھالے ہوئے تھے' اسے پہچان کر میری رگوں میں کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔

ان دونوں سہارے ہوئے افراد میں ایک تو اول خیر ن بستہ حالت میں تھا جبکہ دوسرا سندر داس تھا، وہ — چاق و چوبند سہی مگر اس کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا، جس اسے چلنے میں خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، شاید گولی لگی تھی اور وہ اپنے ایک ساتھی کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر چل رہا تھا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ یہاں اپنے ساتھیوں کی مرہم پٹی کے لیے رکے تھے، سب سے آخر میں جو شخص کچھ سامان اُٹھائے برآمد ہوا، اُسے دیکھ کر تو میں اور کبیل دادا بری طرح چونکے تھے، یہ وہی مہرہ تھا، جو ہمارے چنگل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے کبیل دادا کی ذہنی فراست کا بھی قائل ہونا پڑا تھا، اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا کہ یہ بھگوڑا دشمن ہماری سوچ سے بھی زیادہ چالاک ثابت ہوا تھا، کیونکہ اس نے اول خیر یا شکیلہ پر خود ہی ہلّا بولنے کے بجائے قریبی آبادی میں کسی خفیہ ٹھکانے پر موجود اپنے ساتھیوں سے رابطہ کر کے اُنہیں بروئے کار لایا تھا جو یقیناً پہلے سے سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق... وہاں موجود تھے، یوں بہ قول کبیل دادا کے کرنل سی جی نے ہمارے ساتھ آخری جُوا کھیلنے کی کوشش چاہی تھی اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی رہا تھا۔

''کبیل! یہ یہاں سے کوچ کر رہے ہیں اور اول خیر کو انہوں نے کسی مقصد کے لیے یرغمال بنا رکھا ہے۔ یہ جانے نہ پائیں یہاں سے۔''

''میں تیار ہوں، ہمیں دو مختلف سمتوں سے ان کو گھیرنا پڑے گا۔''

''ہاں! مگر دھیان رہے کبیل! سندر داس کو زندہ پکڑنا ہے۔ باقیوں کو جہنم واصل کر دینا اور اول خیر کے سلسلے میں بھی احتیاط رکھنا۔''

''میں جانتا ہوں۔''

''ایک بات اور...'' میں نے فوراً کہا۔ ''موقع ملتے ہی دُشمنوں کے ساتھ، ان کی گاڑی کے کم از کم دو عدد ٹائروں کو بھی نشانہ بنانا ہوگا۔''

''ایسا ہی ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر ایک طرف کو رینگ گیا۔ میں نے سیدھے ہاتھ کی جانب پیش قدمی کی، میرا اسنیک سلیئر ہاتھ میں دہاڑنے کے لیے بے چینی سے تھرکنے لگا۔

اسی وقت جب یہ لوگ مرحلہ وار اس ڈبل کیبن پک اپ نما جیپ میں سوار ہونے لگے اور آخر میں جس نے اول خیر کو رسن بستہ حالت میں دبوچے ہوئے تھا، اس کے سر کا نشانہ لے کر میں نے ڈبل شاٹ پر ٹریگر دبا دیا، میرے مہیب اسنیک سلیئر کی تلے اُوپر نالوں نے کسی ڈریگون کی طرح شعلے اُگلے۔ سماعت شکن دھماکا ہوا، بیک وقت ایک گولی شکار کی گردن اور دوسری اس کے سر پر لگی تو جیسے چیتھڑوں کی صورت میں اس کا سر ہی کاندھوں سے بکھر کر غائب ہو گیا۔ اول خیر کے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے تھے، پھر جیسے اس نے بھی پل کے پل صورتِ حال کو بھانپ لیا اور گاڑی کی باڈی کی اوٹ میں خود کو جھکا دیا، وہ اس طرح ہمیں دشمنوں پر کھل کر حملہ کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا اور میں اس کی بروقت حاضر دماغی پر ہولے سے زیرِ لب مسکرایا تھا۔

جیپ میں سوار ہونے والوں کے لیے ہمارا یہ حملہ یقیناً اسی طرح اچانک تھا جس طرح انہوں نے کراڑے کے قریب اول خیر اور شکیلہ پر ہلّا بولا تھا۔ گویا سیر کو سوا سیر پڑ چکے تھے۔

اسی وقت یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے، میں نے جیپ کی اسٹیئرنگ سیٹ سنبھالتے ہوئے حریف کا سر جھکتے اور بعد میں اس کا جسم لڑھکتے دیکھا۔ یہ کبیل دادا کا شاخسانہ تھا۔ جو میرے والے شکار کے ڈھتے ہی موقع پا کر مکان کی جنوبی دیوار کی آڑ میں آ گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر موجود دشمن کو مار گرانے میں کامیاب ہوا۔ دوسرے اور تیسرے نے اندر سے ہی فائر کھول دیا، ان کا نشانہ یقینی طور پر کبیل دادا ہی تھا مگر میں نے دیکھا، وہ جیپ کے اندر محبوس رہتے ہوئے

AIOURDUBOOKS.NET

گرجدار فائر کرنے والے کو بھی تلاشنے کی کوشش کر رہے تھے، جو میں ہی تھا۔ ان کے ساتھ سندرداس بھی حرکت میں آچکا تھا۔ اسی وقت دوسرے اور تیسرے فائر پر میں پھر چونکا، اس فائر کے سنگم میں مجھے جیپ کے دو ٹائر برسٹ ہونے کے دھماکے بھی سنائی دیے تھے، کبیل دادا کی ہوشیاری پر میں زیرِلب مسکرا دیا۔

اول خیر کی جان خطرے میں تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں میرے اندر اچانک ہی سر اُٹھانے والے خطرے نے دشمن کی اگلی چال کی تصدیق کر ڈالی۔

خطرناک بلیوتکسی ایجنٹ سندرداس نے جیپ کا اسی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور بغیر مجھے دکھائی دیے نیچے اُتر گیا تھا، اس کا اندازہ اُس وقت ہوا جب میں نے اُس کی گرفت میں اول خیر کو دیکھا تھا، اس نے اُسے گن پوائنٹ میں لے لیا تھا۔ اول خیر کو ایک موقع تو ملا تھا، مگر اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے وہ بروقت خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرسکا تھا اور سندرداس کے نرغے میں آگیا تھا۔

اس نے اسے ڈھال بنا لیا تھا اور اب اس سمیت دوبارہ جیپ میں سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، اس وقت تک میں اپنی جگہ سے حرکت کر چکا تھا اور شام کی گھٹتی ملگجی تاریکی کا فائدہ اُٹھائے گاڑی کی ایک سائڈ کی جانب بڑھا، مگر سندرداس کے دوسرے ساتھی کی نظروں میں آگیا جو جیپ کی کھڑکی سے وقفے وقفے سے اپنا سر اُبھارے اسی سمت دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں سے میرے اسنیک سلیئر کے گرجنے کی آواز اُبھری تھی۔

گولیوں کے دھماکوں سے لوگ یقیناً جاگ گئے ہوں گے مگر خوف سے اندر ہی دبکے رہ گئے تھے۔

میں اس کی نگاہوں میں آگیا تھا، اس نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر مجھ پر فائر جھونک مارا، متوقع خطرے پر میں بھی نظر رکھے ہوئے تھا، یہی وجہ تھی پیش قدمی کرتے وقت خود میں نے بھی نظریں بدستور اسی جانب مرکوز رکھی تھیں اور میں نے اس کے چہرے کے ساتھ ہی نال کی جھلک دیکھتے ہی لُڑھکنی لگائی تھی، گولی میرے کہیں قریب ہی بھربھری مٹی والی زمین میں پیوست ہوئی تھی اور اسی وقت دوسرا فائر ہوا، اس کی بھی مجھے پوری توقع تھی کیونکہ جانتا تھا کہ ایک بار دشمن کی متلاشی نگاہ میں آنے کے بعد وہ مجھے اتنی آسانی سے نکلنے نہیں دے گا، اسی لیے لُڑھکنی لگاتے ہی میں نے دوسرا انداز اختیار کیا اور۔۔۔ پھر صرف ایک پل کا موقع پاتے ہی میں نے گاڑی کے بونٹ تک رسائی حاصل کر لی اور اسی آڑ میں اس پر فائر کردیا۔۔۔۔۔۔ دو دھماکے ہوئے جیپ کی ونڈ اسکرین کے پرخچے اُڑ گئے، ساتھ ہی مجھ پر داغنے والا بھی۔ میرے اس بھیانک پسٹل کی زد میں والے کسی شکار کو بھی ذرا آواز نکالنے کا موقع نہیں ملتا سندرداس اپنے ساتھیوں کے اس خوفناک انجام کے خاصا نروس ہو گیا تھا اور اس نے وہی بُزدلانہ قدم اُٹھایا کی مجھے توقع تھی۔ اس کا اب ایک آخری وہی ساتھی تھا جو خاصا زخمی تھا، اس نے خود کو شاید گاڑی کی کسی سیٹ نیچے دبکا رکھا تھا۔

ادھر سندرداس، اول خیر کو ڈھال بنائے جیپ اُتر آیا، وہ میری جھلک دیکھ چکا تھا اور یہ اندازہ بھی غالباً پہلے سے ہی ہو چکا تھا کہ ان پر حملہ کرنے والے سکتے تھے۔

''خبردار شہزادا! خود کو میرے حوالے کردو۔۔۔ میں اس کے سر میں گولی اُتار دوں گا۔'' وہ ہسٹریائی میں چیخا۔ میں نے دیکھا، اس مردود نے اول خیر کی کنپٹی اپنے پستول کی نال لگا رکھی تھی۔ میں بھی اسی طرح اپنا پسٹل اس پر تانے دھیرے دھیرے اس کے سامنے ہو چکا تھا۔

میری اور سندرداس کی آنکھیں چار ہوئیں اور جیسے اپنی متوقع فتح پر اس کے بدہیئت ہونٹوں پہ مسکراہٹ رقص کر گئی۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ یہ بد شکست خوردگی کے عالم میں اور انتقاماً کہیں اول خیر کو ہی نہیں مار دے اسی لیے۔۔۔ میری عقابی نظریں بار بار کے چہرے اور اس کے پستول کی لبلبی پر ٹکی ہوئی اُنگلی ایک ذرا جنبش کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''سنا نہیں! میں کہتا ہوں، پستول پھینک دو۔۔۔''

پھر مجنونانہ انداز میں چلّایا۔ اس نے ایک لمحے کو پھٹی آنکھوں سے میرے ایک ہاتھ میں دبے ہوئے تلے اوپر نال والے اس بھیانک پسٹل کو بھی دیکھا تھا۔

''میں پستول پھینک رہا ہوں۔۔۔ تم اسے چھوڑ دو۔''

میں نے اپنے پستول کو اسی طرح اس پر تانے رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ میرا نشانہ اس کا ہی تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی اور پسٹل پھینک دو، میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں، ابھی اسی وقت پستول پھینک کر اپنے سارے ساتھیوں کو میرے سامنے۔۔۔ آنے کی ہدایت

''وہ دہاڑا۔

اس بات کا اور اپنی اہمیت کا اس مکار کو بھی پوری طرح احساس تھا کہ میں نے اور کبیل دادا نے جس طرح اس کے ساتھیوں کی لاشیں گرائی تھیں، ہم اسے کسی صورت بھی۔۔۔ ہلاک نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ یہ ہمارا قیدی تھا اور قیدی بھی ایسا کہ اپنی ذات میں بغیر ہتھیار کے بھی یہ ہمارے لیے کسی بھی وقت ایک بم بن سکتا تھا۔ ورنہ مجھے پتا تھا کہ اس کی پشت کے پیچھے ہی کبیل دادا مکان کی دیوار کے پیچھے کسی موقع کا منتظر تھا، میں نے اُسے سخت تاکید کی تھی کہ وہ اس پر کسی صورت میں بھی گولی چلانے کا مجاز نہیں ہوسکتا، یوں بھی اور کبیل دادا کو بھی اس حقیقت کا اندازہ تھا اس لیے وہ بھی کوئی ''ایسی ویسی'' حرکت کرنے سے سرِدست قاصر تھا۔ لیکن بے خبر سندرداس بھی نہیں تھا اس جگہ سے، کیونکہ اُسے اندازہ تھا، اس طرف میرا ایک ساتھی (کبیل دادا) موجود ہے۔ یوں بھی وہ ایک گھاگ ایجنٹ تھا، اب تک اُسے خود بھی اس ''تبادلۂ فائرنگ'' سے اندازہ ہو چکا ہوگا کہ میرے ساتھ صرف ایک ہی ساتھی تھا۔

''تم کیسے یہاں سے نکل سکتے ہو؟ جبکہ تمہاری گاڑی کے ٹائر فلیٹ ہو چکے ہیں؟'' میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھنے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

''گاڑی کے صرف دو ٹائر برسٹ ہوئے ہیں اور اتنے ہی فاضل ٹائر اندر موجود ہیں۔ تم میری نظروں کے سامنے رہو گے اور تمہارا ساتھی ٹائر بدلے گا۔''

اس کی بات پر میرے رگ و پے میں یکا یک مسرت کی لہر اُٹھی تھی، اس کا مطلب تھا کہ وہ ۔۔۔ فوری طور پر یہاں سے نکلنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور نہ ہی اس کے پاس ایسا کوئی متبادل راستہ تھا، ورنہ ایک اندیشہ تھا کہ شاید اس کے اور بھی ساتھی یہاں پہنچنے والے ہوں یا کرنل سی جی نے خود ہی کوئی ایسا بندوبست اس کے لیے کر رکھا ہو، مگر۔۔۔ فی الحال ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تمہاری باتیں منظور ہیں، میرے ساتھ صرف ایک ہی ساتھی ہے۔ میں اُسے ابھی آواز دے کر بلا لیتا ہوں لیکن تم میرے ساتھی کی کنپٹی سے یہ پستول ہٹادو۔۔۔''

''ہرگز نہیں۔۔۔'' وہ ایک بار پھر وحشت سے چلّایا۔ ''یاد رکھو! اس وقت میرے ہاتھ میں ترپ کے دو پتے ہیں، ایک تمہارا یہ ساتھی (اول خیر) اور دوسرا میں خود۔۔۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے پستول کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ دی۔ یک لخت میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

''میں جانتا ہوں، تمہارے اس ساتھی (اول خیر) کی طرح میں بھی تمہارے لیے اتنا ہی اہم ہوں۔۔۔ مت بھولو کہ ہم جیسوں کے پاس آخری آپشن خودکشی ہوتا ہے، اب وقت ضائع کیے بغیر جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔۔۔''

میں اس کی بات سن کر سنسنا اُٹھا، وہ میری سوچ سے زیادہ چالاک اور اس سے کہیں بڑھ کر ''خطرناک'' بھی ثابت ہو رہا تھا، وہ میری دُکھتی رگ سے واقف تھا اور مجھے اس کا بھی ادراک تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، وہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا، اُس کی اپنی زندگی تو داؤ پر لگی ہی ہوئی تھی اور یہ کہ وہ اپنی زندہ سے زیادہ ''مردہ'' اہمیت سے بھی بالکل اسی طرح واقف تھا جیسے مرا ہوا ہاتھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔

اب میرے لیے اس خبیث کا حکم ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا، قدرے جھک کر اپنا پسٹل اس کی طرف اُچھال دیا اور سیدھا ہو کے کھڑا ہوا ہی تھا کہ اچانک میں نے اسے چیتے کی طرح پلٹتے دیکھا، اور ساتھ ہی اس نے اپنے عقب میں گولی چلا دی، میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے کبیل دادا کی کرب ناک آواز سُنی اور میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

یہی وہ نازک وقت تھا جب اول خیر نے بھی اس خطرناک سچویشن کو سمجھتے ہوئے رسن بستہ ہونے کے باوجود، لمحے بھر کو سہی اس کے گن پوائنٹ سے ''آؤٹ'' ہوتے ہی اسے اپنے کاندھے کی ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی، سندرداس کا دھیان لمحے بھر کو کبیل دادا کی خفیہ پیش قدمی اور اس پر گولی داغنے کے باعث بٹا تھا، اسی لیے وہ اول خیر کی اس اچانک اور زوردار ٹھوکر پر لڑکھڑا گیا۔ پل کے پل میں اسی لمحاتی سنہری موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تیزی سے اس کی جانب لپکا، اس نے سنبھلنے کی سعی چاہتے ہوئے اپنے پستول کی نال کا رخ میری جانب کر دیا مگر تب تک اسے دیر ہو چکی تھی، میں اپنی جگہ سے لانگ جمپ لگا چکا تھا، مگر اس طرح کہ اس کے نشانے سے خود کو بچاتا ہوا اس پر جا پڑا تھا، وہ مجھ سمیت پشت کے بل گرا، گولی بھی چلی مگر وہ ہوا ہو گئی، اس کے گرتے ہی ۔۔۔۔ پستول بھی اس کی گرفت سے نکلتا چلا گیا، میں نے اس کی ٹھوڑی پر ایک ہارڈ پنچ رسید کر دیا، وہ جھنجھنا سا گیا اور کچھ وقت کے لیے بے حس و حرکت ہو گیا، میں اُٹھ کر کبیل دادا کی طرف دوڑا۔

''دد۔۔۔ دادا۔۔۔!'' میں کرب ناک آواز میں چیخا۔

وہ زمین پر گرا پڑا تھا اور کراہ رہا تھا، اسی اثنا میں اول خیر بھی

AIOURDUBOOKS.NET

قریب آگیا، اس کے دونوں ہاتھ پشت پر نائلون کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے، وہ میں نے جلدی جلدی کھول ڈالے۔ ہم دونوں کبیل پر جھکے، وہ جیسے اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا، میرے اور اول خیر کے چہرے پر کرب اور تشویش کے تاثرات نمایاں تھے۔

''گگ... کبیل... کبیل دادا!'' میں اسے سنبھالتے ہوئے پکارنے لگا اور فوراً گولی لگنے کے مقام کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ باعثِ اذیت اپنے دائیں پہلو پر رکھے ہوئے تھے، وہاں سے تیزی کے ساتھ بہتے خون نے مجھے مزید تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سندرداس کو قابو کرنے کے لیے کبیل نے اپنی جان داؤ پہ لگا دی تھی۔ اس نے اپنے تئیں اس کی جانب جارحانہ پیش قدمی چاہی تھی، مگر نجانے کیسے سندرداس کی عقابی نظروں میں آگیا تھا۔ وہ شاید محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنے سائے سے بھی محتاط تھا۔

''کاکا! جلدی سے وڈے استاد کو اندر لے چلو، وہاں مرہم پٹی کا سارا سامان موجود ہے۔'' اول خیر نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی اپنے ''بڑے اُستاذ'' کو اس حالت میں دیکھ کر فرطِ غم سے لرز رہا تھا۔

''اول خیر! تم سندرداس کو قابو کرو، یہ زیادہ دیر بے حس و حرکت نہیں رہے گا۔''

میں نے ہانپتی سی آواز میں کہا اور زمین پر پڑے کراہتے ہوئے کبیل دادا سے بولا۔

''دادا...! حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا۔ اس پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ اول خیر میری ہدایت کے مطابق سندرداس کو اسی ڈوری سے اچھی طرح کس چکا تھا، جس سے تھوڑی دیر پہلے اس کے بازوؤں کو باندھا گیا تھا۔

میں زخمی کبیل دادا کو اُٹھائے ہوئے آگے بڑھا۔ اول خیر نے میری رہنمائی کر دی تھی۔۔۔ میں زخمی کبیل دادا کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے دروازے کی طرف لپکا اور اسے لات رسید کر کے کھولا، اندر داخل ہوا، مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، عام سا یہ مکان ایسا ہی دکھتا تھا، جیسے یہاں عرصہ دراز سے کوئی نہ رہتا ہو۔ مختصر سے صحن کے بعد سامنے کے رخ پہ فقط دو ہی کمرے نظر آتے تھے، دونوں کھلے پڑے تھے۔ صحن میں مدھم روشنی تھی، کمرے تاریک تھے، اول خیر نے مجھے بتا دیا تھا کہ کون سے کمرے میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔

کمرے کی حالت دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ اس [illegible] خاصی جلدی میں تھے۔ انہیں اپنے ساتھیوں کی مرہم [illegible] کر کے نکلنے کی جلدی تھی، کیونکہ یہ سارا سامان اسی طرح بکھرا ہوا تھا۔ ایک پرانے سے پلنگ پر کبیل دادا کو [illegible] کے بعد میں نے تیزی کے ساتھ ہاتھ پیر چلائے، مرہم [illegible] سامان ایک جگہ اکٹھا کیا اور کبیل دادا کی جیکٹ اور [illegible] اُتاری۔ اسی دوران اول خیر بھی بے سدھ سندرداس کو کاندھے پر لادے اٹھا لایا۔ پھر وہ بھی میری مدد میں شامل ہو گیا۔ میں نے زخم کا معائنہ کیا۔ شکر تھا کہ گولی ''چھاؤ'' ہو کر نکل گئی، اور زخم زیادہ گہرا نہیں تھا، میں اسے کبیل دادا کی خوش قسمتی ہی تعبیر کروں گا کہ وہ اتنے قریب سے موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا، لیکن زیادہ خون کے بہہ جانے پر مجھے تشویش تھی۔

میں نے اسپرٹ اور اینٹی سیپٹک قسم کے ایک محلول سے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر کے زخم تو بھر دیا تھا اور جریان خون بھی رک گیا تھا، مگر کبیل دادا مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا تھا، مجھے فکر لاحق ہونے لگی کہ کہیں زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے وہ ''شاک'' میں نہ چلا جائے۔ اول خیر اس کے منہ میں پانی اُنڈیلنے اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرسٹ ایڈ کی پوری کٹ موجود تھی اس میں کچھ انجکشن بھی رکھے تھے، جن کا مجھے کوئی خاص تجربہ نہ تھا، تاہم مجھے ان میں ایک ''کورامائن'' ڈراپ اور امونیا اسپرٹ نظر آگیا، ڈراپ کے چند قطرے کسی طرح کبیل دادا کے منہ میں ٹپکا دیے تاکہ وہ شاک میں نہ جا سکے، جبکہ امونیا اسپرٹ کو میں نے روئی کا ایک پھایا بنا کر اس میں اُنڈیلا اور اس کے نتھنوں سے وقفے وقفے سے لگا دیا، تاکہ ماؤف پڑتے دماغ اور مختل اعصاب جاگ جائیں اور وہی ہوا، کبیل دادا کو تھوڑا ہوش آنے لگا، درد کش کی گولیاں میں نے پیس کر پانی سے اس کے حلق میں انڈیل دی تھیں۔

کبیل دادا کی طبیعت کچھ سنبھلنے لگی تو اول خیر نے مجھ سے کہا۔

''تم اِدھر رکو میں گاڑی کے ٹائر بدلنے کی کوشش کرتا ہوں، ہمیں نکل جانا چاہیے، کہیں کوئی نیا فسانہ نہ کھڑا ہو جائے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، لیکن چند سیکنڈوں بعد میں بھی اُٹھ کھڑا ہوا، ایک نگاہ قریب فرش پر دھرے پڑے رسن بستہ سندرداس پر ڈالی، وہ ہوش میں آنے لگا تھا، کچھ سوچ کر میں نے اسے گھسیٹ کر کاندھوں پر اُٹھایا اور مکان سے باہر آگیا۔

گاؤں کے کچھ لوگ ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے ل آئے تھے، ایک تو باقاعدہ ٹائر تبدیل کروانے ری مدد بھی کرنے لگا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ اول ان سے یہی کہا تھا کہ جو لاشیں وہ دیکھ رہے ہیں یہ جاسوسوں کی ہیں اور ہم سرکاری اہلکار ہیں وغیرہ... جلد ہی یہ کام نمٹا لیا گیا۔ سندرداس کو میں پیچھے ڈال ور اول خیر کو اس کی رکھوالی پر بٹھا دیا تھا، جبکہ کبیل ھی سیٹ پر آرام سے لٹا دیا گیا تھا۔ خود میں نے سنبھال لیا اور جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا [illegible] میں فرسٹ ایڈ کا بکس بھی لے آیا تھا اپنے

میں نے ادھر کا ہی رخ کیا تھا جدھر وہ مڑھی تھی... [illegible] میں ہمیں تھوڑی ہی دیر لگی تھی، اندر شکیلہ موجود تھی اجان اسی حالت میں بے سدھ لیٹے تھے، شکیلہ کی بھی کچھ سنبھلی ہوئی تھی، میں بابا جان کا جائزہ لینے لگا اول خیر شکیلہ کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا، کم و بیش پندرہ بیس منٹ لگے، اس کے بعد جب ہم سب مڑھی نکل کر جیپ میں سوار ہونے لگے تو میرے سیل فون کی بجی، میں نے اول خیر کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا ارہ کیا اور خود اس کی جگہ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ سندرداس کے اور چہرے پر میں نے کپڑے کا ایک گٹھا بنا کر لپیٹ دیا اور نتھنوں کی جگہ خالی چھوڑ دی تھی۔

کال زہرہ بانو کی تھی اور میں نے انہیں مختصراً بتا دیا تھا اب تک کیا ہوا تھا، اس دوران اول خیر جیپ آگے بڑھا ا تھا، زہرہ، کبیل دادا کے زخمی ہونے پر فکرمند تھی۔ تاہم آگے بولی۔

''تم لوگوں کے لاہور روانہ ہوتے ہی اپنے دو آدمی میں نے چند گھنٹوں بعد ایک کار میں تمہاری طرف روانہ کر دیے تھے...''

''یہ آپ نے اچھا کیا۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارا مشن کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے، کبیل دادا کی طرف سے ذرا پریشانی ہے کہ اُسے بہت جلد ہاسپٹلائز کرنا پڑے شاید۔''

''اس کی فکر نہیں کرو، منظور اور جمشید کبیل دادا کو سنبھال لیں گے۔ وہ لاہور میں ایک ٹھکانے پر موجود ہیں۔''

''لیکن کبیل دادا کو اسپتال لے جانا ضروری ہے، اس کا بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ ملتان تک میں اسے اس حالت میں نہیں لا سکتا۔ جبکہ خود میرا سندرداس کو جلد از جلد ملتان لانا ضروری ہے۔''

''میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات...'' دوسری طرف سے وہ بولی۔ ''میں ابھی جمی اور منظورے کو اس سلسلے میں ہدایت کیے دیتی ہوں اور تمہیں ان کا نمبر سینڈ کرتی ہوں، وہ تمہیں لاہور میں مل جائیں گے۔''

کچھ مزید گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع ہوا تو میں نے اول خیر کو ساری بات بتائی۔ وہ کچھ مطمئن ہوا مگر میں کچھ اور سوچ رہا تھا، میں کبیل دادا جیسے اہم آدمی کو مذکورہ ان دونوں آدمیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا، کیونکہ اب تک کے حالات کی ہلچل سے مجھ پر یہ حقیقت تو اچھی طرح واضح ہو چکی تھی کہ کرنل سی جی بجوانی اور وزیر جان کے ابھی تک آپس میں گٹھ جوڑ قائم تھے اور کوئی ''لنک'' بھی۔

میرا خیال تھا تازہ تر حالات کے بعد وہ مجھ سے ایک بھرپور دھمکیوں بھرا رابطہ کرے گا، لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا تھا، وہ شاید اپنے زخم چاٹ رہا تھا یا پھر کسی نئے جوڑ توڑ میں مصروف تھا۔ وزیر جان بے شک خود مفرور سہی لیکن بہرحال اُس کی ''بیک'' پر لولووش جیسے بین الاقوامی گینگسٹر کا ہاتھ تھا، جبکہ خود وزیر جان، بلیوتلسی کو کسی نہ کسی صورت میں سپورٹ کر رہا تھا اور وہ بھی اس کے ساتھ تھے، یہ الگ بات تھی کہ میں نے ان کا ایک بڑا منصوبہ (ھینڈلر ایجنٹ والا) بری طرح ناکام بنا دیا تھا۔ یہی نہیں ان کا ایک مشترکہ مہرہ سندرداس بھی میرے قبضے میں تھا اور اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو تہ و بالا کر ڈالا تھا۔

میں نے اول خیر کو ساری بات بتائی تو اس نے بھی یہی کہا کہ کرنل سی جی اس وقت وزیر جان کے ساتھ بدستور رابطے میں ہوگا اور وہ اپنی اس دوسری شکستِ فاش پر نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

''لیکن یار! میرا ملتان پہنچنا اور کبیل دادا کا لاہور میں علاج دونوں ہی ضروری ہیں۔'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''مجھے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر سندرداس کو باجوہ صاحب کے حوالے کرنا ہے کیونکہ وہ اسے انٹیلی جنس والوں کے سپرد کرنے والے ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، تم اور شکیلہ وغیرہ ملتان نکل جاؤ۔'' اول خیر بولا۔ ''میں جمی اور منظورے کے ساتھ کبیل دادا کے پاس رہوں گا اور انہی کے ساتھ ہی ملتان آجاؤں گا۔''

مجھے اس کی یہ تجویز معقول لگی۔ پھر میں نے اس معاملے میں تاخیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور لاہور پہنچتے ہی میں

AIOURDUBOOKS.NET

نے جمی وغیرہ سے رابطہ کیا، جن کا نمبر زہرہ بانو نے مجھے ذرا دیر بعد ہی ایس ایم ایس کر دیا تھا۔

پھر کبیل دادا کو اول خیر سمیت ان کے حوالے کر کے میں اسی گاڑی میں راتوں رات ملتان کی طرف روانہ ہو گیا۔ کبیل دادا کو زہرہ بانو کے ان دونوں مذکورہ آدمیوں اور اول خیر کے حوالے کر کے میں مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ اسے کسی بھی اسپتال میں چوبیس گھنٹے یا اس سے زیادہ ہاسپٹلائز کرنے کے بعد ملتان لوٹ آتے۔

پو پھٹنے تک میں ملتان پہنچ گیا۔ سندرداس کی حالت خارش زدہ کتے جیسی ہو رہی تھی اس لیے کہ چٹ بھی ان کی ہوئی تھی اور پٹ بھی۔ وہ اپنی لبِ بام فتح کے بعد ناکامی پر بری طرح تلملا رہا تھا اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ میں اس کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا کہاں تھا۔

میں نے سب سے پہلے سندرداس کو ایک بھرپور شکریے کے ساتھ میجر باجوہ صاحب کے حوالے کیا تو اُنہوں نے بھی سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور میری اس شاندار کامیابی پر مبارکباد دی، نیز میرے باپ کو انہوں نے بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ سیلیوٹ بھی پیش کیا تھا۔ باقی قانونی معاملات اُنہوں نے سنبھالنے کا مجھ سے وعدہ بھی کیا تھا اور میں نے ان سے کبیل دادا سے متعلق کیئر کا بھی کہہ دیا تھا جو لاہور کے ایک مقامی اسپتال میں داخل تھا۔ (اس کے بارے میں اول خیر نے مجھے تھوڑی دیر بعد راستے میں ہی بتا دیا تھا) باجوہ صاحب نے اسی وقت لاہور میں واقع اپنی ایک ریٹک کمپنی کو کبیل دادا کے لیے اسپیشل کیئر کے سلسلے میں کہہ دیا تھا۔ آخر کو اس مشن میں کبیل دادا نے اپنی جان پر کھیل کر میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔

آخر میں رخصت ہوتے وقت باجوہ صاحب نے مجھے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ میں اپنے باپ تاج دین شاہ کو کل صبح ہیڈ کوارٹر لے کر ضرور پہنچوں، کیونکہ وہ ریکارڈ روم سے میرے بابا کا سارا بائیوڈیٹا فنگر پرنٹس سمیت نکال کر ''ری ویو'' کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور قانوناً اس بات کی تصدیق ہو جانے کے بعد کہ... یہی وہ بہادر محبِ وطن مگر گمنام سپاہی تاج دین شاہ تھا تو اسے جلد ہی سرکاری سطح پر ڈیکلیئر کر دیا جائے گا، نہ صرف یہ بلکہ اس کے لیے صدرِ مملکت اور چیف منسٹر کی طرف سے کسی ملکی اعزاز سے بھی نوازے جانے کا اعلان کیا جا سکتا تھا۔

میں نے دشمنوں کی گاڑی وہیں ہیڈ کوارٹر میں چھوڑی اور میجر صاحب کی دی ہوئی ایک دوسری کار میں بابا اور شکیلہ کے ساتھ بیگم ولا پہنچا تو خود میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اتنے طویل عرصہ بیت جانے کے بعد ماں اپنے سہاگ کو اپنے سر کے تاج کو، اس حال میں دیکھ کر کیسا محسوس کرے گی۔ اپنے اُس شریکِ حیات کو جس نے اپنی زندگی، اپنا سب کچھ ایک عظیم مقصد کے لیے قربان کر دیا، آج وہ اس کی آنکھوں کے سامنے آنے والا تھا۔ خود میری اپنی حالت ابھی تک ناگفتنی سی ہو رہی تھی، فرطِ جذبات سے میرا خود پہ قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

بیگم ولا میں سب سے پہلے زہرہ بیگم نے ہمارا استقبال کیا تھا۔ بابا جان کو ساتھ دیکھ کر ایک لمحے کو وہ بھی مبہوت سی رہ گئی تھی۔ اس کے کپکپاتے لبوں سے بے اختیار یہ الفاظ برآمد ہوئے۔

''شش... شہزی! ی ی... یہ کک... کون؟'' اس کی بات پر میرے ہونٹوں پہ ایک مجبور سی مسکراہٹ اُبھری اور اسی لہجے میں بہت دھیرے سے بولا۔

''زہرہ...! یہ میرے بابا ہیں... تاج دین شاہ...''

''او... میرے خدا!'' ایک بار پھر اس کے مرتعش لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ''کک... کیا واقعی ایسا ہے؟'' اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

''ہاں زہرہ! یہی وہ میری شناخت ہے جس نے اب تک میرے تشخص کو نامکمل رکھا ہوا تھا، وہ آج تکمیل کو پہنچا۔ انہیں آرام اور مناسب علاج کی ضرورت ہے۔ ابھی آپ ماں جی سے کچھ مت کہنا، پہلے ان کی حالت ذرا سنبھل جانے دو۔''

اس نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا اور اپنے سر کو ہولے سے تفہیمی جنبش دی۔

زہرہ بانو نے اسی وقت ایک فی میل اور میل نرس کا بندوبست کرنے کی ہدایت جاری کی اور ساتھ ہی اپنے ایک مشہور فیملی فزیشن کو کال کر ڈالی۔ بابا جان اس وقت... ہوش میں تو تھے۔ مگر کمزوری اور نقاہت کے باعث ان سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا، وہ کبھی اپنی بوڑھی آنکھوں سے مجھے اور اطراف میں حیران سی نظروں کے ساتھ دیکھنے لگتے تو کبھی یک دم خالی الذہنی کی کیفیت کی حالت میں اپنے گرد و پیش سے لاتعلق سے ہو جاتے۔ اس وقت میں نے بھی ان سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں جانا تھا، انہیں ایک صاف ھرے کمرے میں لے جا کر آرام دہ بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ ارہ دونوں ملازموں کو زہرہ بانو نے کچھ خاص ہدایت د الہ کی اور پھر میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آگئی۔ لہ کو بھی آرام کی ضرورت تھی، اُسے بھی اس کے کمرے ں پہنچا دیا گیا تھا اور ایک جوان مستعد لڑکی کو اس کی ا، یسنگ وغیرہ کی ہدایت کر دی۔

میں خود بھی تھکا ہوا تھا۔ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ میں زہرہ بانو کے ساتھ زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا، اُس بھی میری پُرتکان مسافت کا اندازہ لگا لیا تھا اور مجھے بھی آرام کرنے کا مشوہ دیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی بھی دو تین بار کوشش کی مگر ابطہ نہ ہو پایا۔ نئے حالات کو فیس کرنے کے لیے میرا آرام رنا ضروری تھا لہٰذا میں بیڈ پر گرتے ہی سو گیا۔

☆☆☆

صبح میں تقریباً دن چڑھے سوتا رہا تھا اور خود ہی نیند ری ہونے کے بعد آنکھ بھی کھل گئی تھی، میرے سیل پر تین دو مس کالز آئی ہوئی تھیں۔ ایک تو آنسہ خالدہ کی تھی، دوسری میجر باجوہ اور تیسری انجان کال تھی۔ میں نے سب سے پہلے آنسہ خالدہ کا نمبر ملایا اور شکر تھا کہ اس سے رابطہ ہو گیا۔

کچھ معذرتی کلمات کے بعد اسی نے... گفتگو کی ابتدا کی۔ ''مسٹر شہزاد...! آج سے ٹھیک نو روز بعد عابدہ کو کورٹ میں پیش کیا جانے والا ہے۔ تم نے عارفہ کی گواہی کے سلسلے میں کیا کیا...؟'' عابدہ کے ذکر پر میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگی تھیں۔ اسے کورٹ میں پیش کرنے کی سن کر میری پیشانی پر پُرتشویش سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔

''میں نے اس سلسلے میں عارفہ سے ملاقات کی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ یہ کہتے ہوئے ایک گولا سا میرے حلق میں اٹکنے لگا تھا۔

''پھر کیا ہوا...؟'' آنسہ خالدہ کے لہجے میں بھی تفکر آمیز بے چینی تھی، جسے محسوس کرتے ہوئے میں نے مزید کہا۔

''عارفہ کے بارے میں تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا تھا کہ میری اس کے ساتھ کچھ کنڈیشنل قسم کی صورتِ حال ہے، اُس کی مرضی کو اپنی راہ میں ہموار... کرنے کے لیے مجھے کچھ مخصوص ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جس کی میں بہرحال کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی

چمڑی جائے پر دمڑی نا جائے

ایک یہودی بسترِ مرگ پر پڑا آخری سانس لے رہا تھا۔ بیوی اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ مرنے سے چند منٹ قبل اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں کو تھوڑا سا کھولا اور بیوی سے بولا۔ ''ڈارلنگ میرے کمرے میں اس وقت اور کون موجود ہے؟''

''سبھی موجود ہیں۔'' بیوی نے جواب دیا۔

''کیا شائل بھی یہیں ہے؟''

''ہاں شائل بھی ہے۔''

''کیا ڈیوڈ بھی ہے؟''

''ہاں ڈیوڈ بھی ہے۔''

''کیا جیکب بھی موجود ہے؟''

''ہاں جیکب بھی موجود ہے۔''

یہودی کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی۔ ''پھر دکان پر کون ہے؟'' اور اس چیخ کے ساتھ ہی اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

محمد عفان آزاد، کراچی

نظمِ راشد

ایک روز منٹو صاحب بڑی تیزی سے ریڈیو اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہو رہے تھے کہ وہاں برآمدے میں مڈگارڈوں کے بغیر ایک سائیکل دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے رک گئے اور پھر دوسرے ہی لمحے ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں مسکراہٹ کی ایک چمک دوڑ گئی اور وہ چیخ کر کہنے لگے۔

''راشد صاحب! راشد صاحب! ذرا باہر تشریف لائیے۔'' شور سن کر ن م راشد کے علاوہ کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک اور ریڈیو اسٹیشن کے دوسرے کارکن بھی ان کے گرد جمع ہو گئے۔

''راشد صاحب! آپ دیکھ رہے ہیں اسے۔'' منٹو نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ بغیر مڈگارڈوں کی سائیکل، خدا کی قسم اسائیکل نہیں بلکہ حقیقت میں آپ کی کوئی نظم ہے۔''

فاران اظہار، حیدرآباد

AIOURDUBOOKS.NET

صورت نکل آئے گی۔'' یہ کہتے ہوئے خود مجھے اپنی آواز اور لہجہ بداعتمادی کا شکار محسوس ہوا تھا۔ دوسری جانب سے آنسہ خالدہ نے فوری جواب نہیں دیا تاہم ایک لحظے کی خاموشی کے بعد ہمکاری خارج کرنے کے انداز میں وہ بولی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں اب، وہاں کی کیا صورتِ حال ہے، یہ تم ہی بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو، میں نے تمھیں انفارم کرنا تھا، جتنی جلد ہو سکے، عارفہ کو عابدہ کے عدالت میں پیش ہونے سے کم از کم تین دن قبل امریکا میں ہونا چاہیے۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا...'' میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے جواب دینے کی کوشش چاہی تو دوسری جانب سے اس کی بھی کچھ تھکی تھکی سی آواز اُبھری۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو... میں اور عابدہ کا وکیل اب بے چینی سے عارفہ کے منتظر ہیں۔ اور کوئی بات...؟''

اس نے جیسے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا تو مجھے فوراً ہی یہ تکلیف دہ سا احساس ہوا کہ آنسہ خالدہ بھی میری طرف سے کچھ مایوس سی ہو رہی تھی۔ میں اُس سے مزید کچھ کہہ سکا نہ پوچھ پایا اور رابطہ منقطع ہوگیا۔

آنسہ خالدہ کوئی معمولی خاتون نہ تھی۔ امریکی میڈیا اور خبر رساں ادارے کی بین الاقوامی رپورٹر تھی۔ محض تسلیوں اور تاویلوں سے خوش ہونے کے بجائے حقیقت پر نگاہ رکھتی تھی، کس وقت کیا اور کیسے ہونا چاہیے، اس کا اُسے بہ خوبی ادراک تھا۔ کسی بھی قسم کی تمہید و توجیہہ میں پڑے بغیر وہ صرف مقاصد پر نگاہ رکھتی تھی۔

عارفہ نے مجھ سے سوچنے (باالفاظِ دیگر سیٹھ نوید سانچے والا سے مشورہ لینے) کی مہلت مانگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے کافی مہلت دے چکا ہوں اور اب اس کا جواب مجھے حاصل کرنا چاہیے تھا۔

بابا جان کی بازیابی کے بعد میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ میرے اعتماد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ یہ کوئی معمولی کامیابی نہ تھی۔ یہ اعتماد مجھے اپنے آپ سے زیادہ اس پاک ذات ربِ کریم پر تھا جو ہر کڑے وقت میں میری دست گیری فرماتا تھا، مجھے اُمید تھی کہ وہ عابدہ کے سلسلے میں بھی میری مدد ضرور کرے گا۔ ربِ کریم پر یہی اعتماد میری ان گنت پریشانیوں کا بوجھ ہلکا کیے ہوئے تھا۔

دوسری مسڈ کال میجر باجوہ صاحب کی تھی، لہٰذا خالدہ سے بات کرنے کے بعد میں نے ان سے بھی رابطہ کرلیا اور بتایا کہ میں اُٹھا ہوا نہیں تھا۔

''کوئی بات نہیں جنٹلمین!'' وہ ہمیشہ کی طرح خوش دلی سے بولے۔ مشن کی کامیابی اور اپنا اہم ''قیدی'' واپس حاصل کرنے کے بعد ان کی خوش دلی لوٹ آئی تھی۔ وہ مزید بولے۔ ''میں سمجھ گیا تھا اسی لیے میں نے خود ہی کال ڈس مس کر ڈالی تھی، خیر! یہ بتاؤ ہمارا ہیرو کیسا اور کس حال میں ہے؟'' میں جان گیا کہ وہ ''ہیرو'' کسے کہہ رہے تھے۔ اس میں کیا شک تھا کہ بابا جان ملک و قوم کے ہیرو ہی تو تھے۔ ایک ایسے ہیرو جو غازی تھے۔

''وہ بالکل خیریت سے ہیں اور ایک ڈاکٹر جو فزیشن اور ماہرِ امراضِ ضعیفاں بھی ہیں، ان کے لیے بلائے گئے ہیں۔''

''ویل جنٹلمین! یہ بہت اچھا کیا۔'' وہ بولے۔ ''ہماری ایک میڈیکل کور کی ٹیم تاج دین شاہ کا میڈیکل چیک اَپ کرنا چاہتی ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا ناں کہ ہم ذرا اپنے طور پر کچھ تصدیق اور تجزیے کے بعد اپنے اس عظیم ہیرو کو قومی سطح پر ڈکلیئر کرنا چاہتے ہیں... برا نہ منانا جنٹلمین! یہ ایک جسٹ انفارملٹی ہوگی، ورنہ بھلا ایک باپ کو اپنا بیٹا اور ایک بیوی کو اپنا شوہر پہچاننا ہی کافی ہے مگر کچھ قانونی معاملات نمٹانے کا بھی اپنا ایک انداز ہوتا ہے۔''

''جی سر! میں سمجھ گیا۔ اس میں برا ماننے کی بات نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ بتائیں کیا آپ کی ٹیم اِدھر ہی معائنہ کرنا چاہتی ہے یا...'' میں نے کہتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ بیک یک ترنت بولے۔

''یہ معائنہ ہیڈ کوارٹر کے میڈیکل سیکشن میں کیا جائے گا جہاں ہمارے کچھ اعلیٰ افسران کے علاوہ صدرِ مملکت بھی شامل ہوں گے، کیونکہ میں نے کہا تھا ناں کہ تاج دین شاہ کے لیے اعلیٰ اعزاز کا بھی اِدھر ہی فیصلہ کیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے سر! تو میں بابا جان کو لے کر حاضر ہو جاتا ہوں۔''

''بالکل نہیں، میں اس عظیم ہیرو کو لینے کے لیے خود آؤں گا... اپنی ٹیم کے ساتھ، اور ہاں ایک اور بات...'' وہ بولے۔ ''تمھیں تو موجود ہونا ہے، لیکن تمھاری والدہ صاحبہ کی بھی اس میں شرکت لازمی ہوگی۔ اسی لیے اب تم مجھے بتاؤ گے کہ میں کب تک آ جاؤں؟'' میں ان کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ انھیں معلوم ہی تھا کہ میرا آج کل کہاں ٹھکانا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ابھی تک ماں جی کو بابا جان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ کچھ سوچ کر بولا۔

''سر! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے تو خوشی کی بات ہوگی کہ بہ حیثیت من حیث القوم کے ہم اس عظیم ہیرو کو خراجِ تحسین پیش کریں، لیکن سر! مجھے تھوڑا سا وقت درکار ہوگا، ایک تو میں ابھی تک کسی وجہ سے ماں جی کو اس حقیقت کے بارے میں نہیں بتا سکا ہوں، دوسرا یہ کہ میں خود ابھی ذرا دیر پہلے ہی سو کر اُٹھا ہوں، بس، سر! آپ مجھے صرف آدھا گھنٹا عنایت کر دیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ میں آپ سے اس سے پہلے ہی خود رابطہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔''

''رائٹ! کوئی بات نہیں ہم انتظار کر لیتے ہیں۔ بیسٹ آف لک۔'' کہنے کے بعد اُنھوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں بیڈ سے اُٹھا اور اپنے دھیان میں واش روم کی طرف بڑھنے لگا تو اچانک کچھ یاد کر کے میں رکا، اور پلٹا، سیل اُٹھا کر دیکھا، میں اس تیسری مسڈ کال کو بھولنے لگا تھا، اَن نون نمبر کی تھی، نہ جانے یہ کس کی کال تھی؟ پھر یہ سوچ کر میں نے اپنا سیل بے پروا انداز میں خالی بیڈ پر... پھینکا ہی تھا کہ میرا سیل گنگنایا۔ میں چونکا، جھک کر سیل اُٹھا کر ڈسپلے دیکھا اور یکبارگی میرا دل زور سے دھڑکا، کال اسی ''اَن نون'' نمبر سے آ رہی تھی۔

''ہیلو...'' بالآخر میں نے سیل اپنے کان سے لگاتے ہوئے کہا تو دوسری طرف سے ایک شناسا سی گمبھیر آواز اُبھری۔

''تم یقیناً اپنی شان دار کامیابی کا جشن منا رہے ہوگے... بدھائی ہو... میں نے تمھیں اس کی مبارکباد دینے کے لیے فون کیا تھا۔''

کرنل سی جی بجوانی کی آواز سن کر جانے کیوں میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے بہ ظاہر ٹھہرے ٹھہرے طنزیہ لہجے سے بھی صاف عیاں تھا کہ وہ اندر سے کس قدر خار کھائے ہوئے ہے۔

''کامیابی کا جشن تو میں اس وقت ہی مناؤں گا جب میں تمھیں خود اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کروں گا سی جی کتے!'' میں نے پُرغیظ لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے اس کی بھی بھیڑیے جیسی غراہٹ لیے آواز اُبھری۔

''بہت زعم ہے تمھیں اپنے آپ پر... نیڈی ایجنٹ! ایک لنگڑے لولے اپاہج اور بے کار آدمی کو پا کر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی خطرناک غلطی کبھی مت کرنا۔ نہیں جانتے تم کہ میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ دُشمنوں کی یہ چھوٹی موٹی فتوحات ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ رہی بات میرے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کی تو میں اس شُبھ گھڑی کا بے چینی سے منتظر رہوں گا لیکن اس سے پہلے میں تمھیں ایک تحفہ ضرور دینا چاہتا ہوں...''

اس مردود خبیث کی آخری بات پر میں اندر سے بے چین ہوگیا کہ نجانے یہ کون سا ''تحفہ'' دینے کی بات کر رہا تھا؟ اب اس کے پاس میرے لیے کیا باقی بچا تھا بھلا...؟

تاہم مجھے اس خبیث کے لہجے میں چھپی ایک گیدڑ بھبکی محسوس ہوئی تھی، جسے بھانپ کر میں نے بھی اسے ترکی بہ ترکی جواب دے ڈالا۔

''ابھی تو تم میرے اس تحفے کے چھن جانے کا جشن مناؤ سی جی بجوانی! جس کا خواب تمھارے لیے شرمندۂ تعبیر ہی نہ ہو سکا اور... جس کے حصول کے لیے تم نے نجانے کیسے کیسے اوچھے ہتھکنڈے بھی استعمال کر ڈالے تھے، لیکن چچ... چچ... افسوس!''

میں نے آخر میں استہزائیہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو دوسری طرف سے اس کی خار کھائی ہوئی غراہٹ کے سوائے کچھ سنائی نہ دیا، تاہم ایک لحظے کے بعد ہی اس کی پھنکارتی آواز اُبھری۔

''کرنل سی جی بجوانی کا دوسرا نام پکنیر ہے نیڈی! جو اپنا انتقام لینا کبھی نہیں بھولتا، خاطر جمع رکھو، بہت جلد میں سود کے ساتھ تمھیں یہ سب لوٹانے والا ہوں...''

یہ کہتے ہی دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ میں نے اپنے کان سے فون ہٹا دیا اور چند ثانیے اسی طرح اسے ہاتھ میں پکڑے، ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے سرسراتے اور زخم خوردہ لہجے میں چھپی آتشِ انتقام کی تپش کوئی گل کھلانے کا ہی پیش خیمہ لگتی تھی۔ جو وہ کسی ''تحفے'' کی صورت مجھے دینا چاہتا تھا۔ وہ تحفہ کیا تھا؟ مجھے اس کا ابھی تک کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ میں نے اس پر اور اس کے تحفے پر لعنت بھیجی اور سیل دوبارہ بیڈ پر پھینک کر واش روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

بارہ بجے تک میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو چکا تھا۔ ایک خوش کن خبر میری منتظر تھی۔ اول خیر وغیرہ بھی کبیل دادا کو لے کر بہ خیریت بیگم ولا پہنچ چکے تھے اور اس کی طبیعت اب کافی بہتر تھی۔ زہرہ اور شکیلہ جاگ چکی تھیں اور انہی سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہ لوگ سب آج گیارہ بجے تک پہنچ چکے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں کہ ''بیگم ولا''

AIOURDUBOOKS.NET

صرف ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی عظیم الشان کوٹھی ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک چھوٹی اسٹیٹ کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے رقبے میں ہی نہیں بلکہ اس میں موجود دیگر سہولیات کے علاوہ جدید خطوط پر اس کی سیکیورٹی الارمنگ سسٹم سے لے کر اسے قلعے جیسی مضبوطی کے بھی اقدامات اُٹھائے جاتے رہے تھے۔ اب یہ ایک قلعہ نما اسٹیٹ ہی کا منظر پیش کرتی تھی۔ اس میں جدید طبّی سہولیات سے لے کر ہر قسم کے ضروری اور فوری روابط کے علاوہ ایسے اہم کوٹیکٹس بھی نتھی کیے گئے تھے جو ایمرجنسی کی صورت میں مستعمل ہوتے تھے۔

میں سب سے پہلے ماں جی سے ملا، وہ اپنے کمرے میں تھیں۔ یہاں ان کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر خوشی وطمانیت کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔

”کیسا ہے تو شہزی پتر؟ کدھر غائب رہتا ہے سارا سارا دن؟“ وہ ممتا بھری شفقت سے بولیں اور میں بڑی محبت اور عقیدت سے ان کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ماں جی کتنا خوش ہوں گی جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کا سہاگ زندہ سلامت اسی چھت تلے موجود تھا، جہاں وہ خود بھی موجود تھیں بلکہ میرا باپ... وہ کتنا خوش ہوگا، جب وہ اپنے برسوں بچھڑے کنبے کو ایک چھت کے نیچے دیکھے گا... کس قدر دیدنی منظر ہوگا یہ ہم ماں بیٹے اور باپ کے لیے... نہیں ہوگا تو ایک لئیق شاہ... آہ... کاش! میرا یہ دلارا بھائی بھی آج زندہ ہوتا تو... یہ سوچ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔

”کیا ہوا میرے لعل...؟ تو... رونے لگا، کیوں...؟“ ماں کی ممتا بھری نگاہوں سے میرے آنسو بھلا کیسے چھپے رہ سکتے تھے۔ وہ مجھے اس طرح روتا دیکھ کر ایک دم پریشان ہو گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کے آنسو صاف کیے اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتے ہوئے چند قدم بڑھائے اور ماں کے پائینتی بیٹھ کر ان کے قدم چھو کر محبت بھری رقت سے بولا۔

”ماں! یہ خوشی کے آنسو ہیں... سمجھو تو آج خوشی کا دن ہے، لیکن ڈرتا بھی ہوں کہ... کہ آپ پتا نہیں اس خوشی کو کیسے برداشت کر پائیں گی؟ اس لیے کچھ کہہ نہیں پا رہا، کچھ بتا نہیں پا رہا ہوں میں...“ میری بات پر ماں کے [illegible] ایک رنگ سا آکر گزرا۔ وہ بیڈ کے گاؤ تکیے [illegible] اپنی پشت [illegible] بیٹھی تھیں، اور ایک اُلجھن آمیز حیرت کا رنگ لیے وہ پہلے تو یک ٹک میرا چہرہ تکتی رہیں پھر اسی لہجے میں بولیں۔

”پتر شہزی! تت... تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں سمجھ نہیں رہی؟“

میں نے اپنی جذباتی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کی اور مسکرا کر کہا۔ ”ماں جی! آج واقعی خوشی کا دن ہے، آپ کے لیے بھی اور میرے لیے بھی، بس! خوشی کی برکتوں کے لیے دعا کریں، میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں...“ یہ کہہ کر میں ماں کے قدموں سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے جھک کر ان کی پیشانی کو چوما اور پلٹ کر ان کے کمرے سے باہر آگیا۔

زہرہ بانو میری منتظر تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ...ڈاکٹر کے بارے میں پوچھا تو وہ ہولے سے مسکرا کر بولی۔ ”وہ آیا تھا اور بابا جانی کو دیکھ کر جا بھی چکا۔“

”کیا کہا اس نے بابا جان کے بارے میں؟ کوئی ایسی تشویش والی بات تو...“

”بالکل نہیں۔“ وہ میرا جملہ اُچک کر بولی۔ ”بابا جانی اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں، بس! ذرا کمزوری اور پیش آمدہ حالات کی وجہ سے کچھ کھوئے کھوئے اور خالی الذہنی کی کیفیات سے دوچار ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان نے تسلی دی ہے کہ ان کی یہ کیفیت عارضی ہے، اُنہوں نے کچھ ضروری ہدایات کے ساتھ دوائیں تجویز کی ہیں، جو میں نے اُسی وقت منگوا لی تھیں، جن کے باقاعدگی کے استعمال سے وہ بہت جلد بھلے چنگے ہو جائیں گے۔“

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی تھی۔ تاہم زہرہ بانو کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے استفساریہ بولا۔

”ان کی یادداشت سے متعلق ڈاکٹر سلیمان نے کوئی اُمید دلائی ہوگی...؟“

”ہاں! کیوں نہیں، اُمید تو دلائی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ سب اتنی جلدی تو ممکن نہیں مگر وقت گزرتے کے ساتھ انشاء اللہ بابا جانی کی یادداشت بحال ہو جائے گی۔“

”اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن وہ کچھ بول بھی نہیں پا رہے ہیں؟ کہیں خدانخواستہ ان کی زبان...“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ بولی۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے ان کا اچھی طرح جسمانی معائنہ بھی کیا ہے، انہوں نے اس کے بارے میں بھی وہی تسلی دی ہے کہ یادداشت کے ساتھ ساتھ ان کی قوت گویائی بھی متاثر ہوئی ہے، وہ بھی آہستہ آہستہ ہی بحال ہو جائے گی، درحقیقت ظالموں نے انہیں بہت ٹارچر کیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے بڑے سائنٹیفک طریقے استعمال کیے تھے، ان کی زبان کھولنے کے لیے طرح طرح کے انجکشن لگائے گئے تھے، مائنڈ کنٹرول ٹیکنالوجی کے حربے بھی آزمائے گئے تھے مگر یہ غیر معمولی قوتِ ارادی تھی ان کی کہ دشمنوں کو کامیابی نہ ہو سکی لیکن بے فکر رہو، ڈاکٹر سلیمان کو میں جانتی ہوں وہ کبھی بھی جھوٹی تسلی نہیں دیتے، یہ جلد ری کور ہو جائیں گے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میرے اندر دل کی گہرائیوں سے یہ آواز برآمد ہوئی تھی۔

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ زہرہ بانو بولی اور میں نے زیرِ لب آمین کہا، پھر اسے میجر باجوہ کی باتوں سے آگاہ کیا تو وہ بھی خوش ہو کر بولی۔

”یہ تو واقعی اچھی بات ہے۔ زندہ قوموں کی نشانی بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہیروکو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔“

”بے شک۔“ میں زیرِ لب مختصراً بولا اور بابا جان کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ مجھے لیے اُن کے کمرے میں آ گئی۔

وہ خاصا کشادہ اور آرام دہ کمرا تھا، ضرورت کی ہر شے سے مزیّن اور آراستہ بھی۔ کمرے میں اے سی کے علاوہ گیس ہیٹر بھی نصب تھا۔ سردی کی وجہ سے ہیٹر آن تھا اور کمرے کی فضا گرم اور سکون آور ہو رہی تھی، بابا جان جاگ رہے تھے اور ایک بڑے سے آرام دہ نرم بیڈ پر گاؤ تکیے کے ساتھ پشت لگائے بیٹھے تھے اور ایک نرس باؤل ہاتھ میں لیے ان کے قریب موجود تھی اور چمچ کے ذریعے کوئی یخنی سی قوت بخش خوراک انہیں کھلا رہی تھی۔ زہرہ بانو نے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

میری نظریں بابا جان پر جم کر رہ گئی تھیں... بلاشبہ ان کا یہاں پورا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ بابا جان کی اب سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر لگتا تھا کہ انہیں غسل وغیرہ کے ساتھ ان کے داڑھی مونچھوں کی کٹنگ بھی کرائی گئی تھی اور نئے اُجلے کپڑے بھی پہنا رکھے تھے۔ اس ”تراش خراش“ کے بعد ان کی جو صورت نکلی تھی، اُس کی شبیہ مجھ پر پڑتی تھی۔ میں انہیں دیکھ کر چند لمحوں کے لیے مبہوت رہ گیا تھا۔

”دیکھو تو ذرا شہزی!“

ایسے میں اچانک میرے قریب کھڑی زہرہ بانو جیسے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ اس کی نگاہیں بھی اپنی خالی نظروں سے ہماری طرف تکتے ہوئے بابا جان پر جمی ہوئی تھیں۔

”بالکل وہی چہرہ، وہی آنکھیں اور ایسا ہی دراز قامت، چوڑے کاندھے، فراخ پیشانی اور ویسی ہی عزم حوصلے سے سرشار روشن آنکھیں، جیسا میرا لئیق شاہ تھا... اور... اور... جیسے تم ہو... شہزاد احمد خان... عرف شہزی...

”سنو شہزی! میجر صاحب سے کہنا کہ ان کا تجزیہ کروانے کی کیا ضرورت ہے بھلا...؟ میرا دل چیر کر وہ دیکھ لیں، جو اس عظیم انسان کو دیکھ کر کہہ رہا ہے کہ یہی میرے لئیق شاہ کا اور تمہارا باپ اور وطن کا بہادر و دلیر سپاہی... تاج دین شاہ ہے۔“

یہ کہتے ہوئے فرطِ جذبات سے زہرہ بانو کی آواز لرزنے لگی۔

”بے شک زہرہ! تم ٹھیک ہی کہتی ہو۔“ میرے ہونٹوں سے بھی بے اختیار برآمد ہوا۔ ”جب میں نے انہیں پہلی بار چھوا تھا تو ان کے لمس سے مجھے بھی ایک نرم، میٹھی اور مہربان سی غیر مرئی شفقت کا احساس ہوا تھا اور میرا دل بھر آیا تھا، تب پھر اسی وقت جیسے خون کی کشش نے جوش مارا تھا اور میری رگوں میں ایک جوار بھاٹے کی سی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی، بالکل اسی طرح جیسے مدوجزر کے وقت کھلے آسمان تلے طباق چاند کو چھونے کے لیے بیکراں سمندر کی موجیں جوبن پر آنے لگتی ہیں اور پورے چاند کی کشش اُسے اپنی جانب کھینچنے کی کوشش کرتی ہیں۔“

”آؤ شہزی! قریب آؤ ان کے... شاید تمہاری طرح ان کا خون بھی اپنے لختِ جگر کو دیکھ کر جوش مارنے لگے۔“ کہتے ہوئے زہرہ بانو نے میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم دونوں ایک ساتھ قدم اُٹھاتے ہوئے بابا جان کے بیڈ کے قریب بڑھنے لگے۔

میں نے دیکھا بابا جان اسی طرح یک ٹک اور اپنی گم صم سی آنکھوں سے ہم دونوں کو دھیرے دھیرے اپنی جانب بڑھتے خاموشی سے تکے جا رہے تھے۔

قریب پہنچنے کے بعد میں اور زہرہ جدا ہوئے۔ وہ اُن کے بائیں طرف جا کر قریب آہستگی سے بیٹھ گئی اور میں... بابا جان کے دائیں بازو پر اُن کے قریب بیٹھ گیا۔

میرے ہونٹوں پر ایک عقیدت بھری مسکراہٹ تھی اور میری اس مسکراہٹ میں ایک فخر کی کیفیت بھی تھی اور اس کی تہ میں دبی دُکھ کی کسک بھی۔ زہرہ بانو نے ازراہِ احترام، ان کا بوڑھا اور کمزور ہاتھ بڑی محبت سے اپنے دونوں

AIOURDUBOOKS.NET

ہاتھوں میں تھام لیا تھا جبکہ میں نے قدرے آگے جھک کر بابا جان کی روشن پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور پھر اپنا ایک بازو آہستگی سے ان کے گلے کے گرد حائل کردیا۔

وہ کبھی حیران اور کبھی خالی خالی نظروں سے میری طرف اور کبھی زہرہ بانو کی طرف دیکھنے لگتے۔ جب مجھ پر ان کی نظریں ٹک سی گئیں تو میں نے مسکراتے ہوئے انہیں پکارا۔

”بابا!“

اُن کی دودھیاں پڑتی سفید بھوؤں میں ایک ذرا جنبش اُبھری تھی۔ ان کی بوڑھی آنکھوں میں کسی نامعلوم سے تاثر کی کھوجتی ہوئی کسک نے جاگنے کی کوشش چاہی تھی۔ ضعیف لبوں پر کسی نوائے خروش نے تھرتھراہٹ جگانے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کے بعد وہی اجنبیت اور ویرانی سی اُتر آئی۔ وہ کچھ بول نہیں پارہے تھے۔ البتہ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں میں جنبش سی اُبھرتی مگر عبث...

”زہرہ...! تم اِدھر ہی بیٹھو، میں ماں جی کو یہاں لاتا ہوں۔“ میں نے زہرہ بانو سے کہا تو اس نے میری طرف دیکھ کر دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا ماں کے کمرے میں پہنچا۔

ماں جی ابھی تک حیران و پریشانی کی سی کیفیت میں بیٹھی تھیں، وہ بے چاری شاید انتظار کرتی رہی تھیں میرا کہ میں انہیں کب آکر کون سی خوش خبری سناتا ہوں؟

”آؤ ماں جی! آپ کو ایک نظارہ کراتا ہوں...“

کہتے ہوئے میں نے انہیں سہارا دینے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے بعد ان کا ایک ہاتھ تھامے انہیں آہستہ آہستہ بابا جان کے کمرے کے قریب لے آیا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی ماں کی نگاہیں سامنے بیڈ پر بیٹھے بابا جان پر پڑیں اور پھر جیسے زمین نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ وہ ایکا ایکی سکتے میں آگئیں، بس ایک ٹک اُنہیں دیکھتی رہ گئیں۔ میں ان کا ہاتھ تھامے، ساتھ کھڑا دُزدیدہ نظروں سے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا ماں جی کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر زہرہ بانو بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کی بھی نگاہیں ماں جی پر جم کر رہ گئی تھیں۔

میں نے دیکھا ماں جی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیریں بہہ نکلیں، وہ اب کبھی گردن گھما کر میری جانب تکنے لگتیں تو کبھی بابا جان کی طرف موڑ لیتیں۔ تب ہی مجھے ان کی دم بہ خودسی لرزیدہ آواز سنائی دی۔ وہ مجھ سے مخاطب تھیں۔ لہجہ گلوگیر تھا۔

”شش... شہزی پُتر! کک... کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی...؟ مجھے بتا پتر! کک کیا یہ منظر میری نظروں کا دھوکا تو نہیں ہے...؟“

”نہیں ماں جی! آپ اپنی نظروں کے سامنے جو کچھ دیکھ رہی ہیں، وہ نظروں کا دھوکا نہیں، اسی طرح حقیقت جیسے میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں...“ میں نے جواب دیا اور تب ماں نے میرا ہاتھ چھوڑا... بے اختیار بابا جان کے بیڈ کی طرف بڑھیں... ان کے قدم ڈگمگائے... وہ گرنے کے قریب تھیں... میں انہیں سنبھالنے کو فوراً لپکا... مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بابا جان کے بیڈ کے پائینتی پہنچ کر یوں گری تھیں کہ ان کا سر آپوں آپ میرے بابا جان کے قدموں میں جا پڑا تھا۔

اور پھر اُنہوں نے وہاں سے اپنا سر نہیں اُٹھایا، پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں وہ... میں اُنہیں سنبھالنے کو جھکنا ہی چاہتا تھا کہ زہرہ بانو نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔ میں سیدھا کھڑا ہوگیا۔ میں اور زہرہ اب یہ جذباتی منظر مغموم سی خاموشی سے دیکھنے لگے۔

ایک خاتون کو اپنے قدموں پر یوں جھکے دیکھ کر بابا جان کی آنکھوں میں پہلے اُلجھن اور پھر حیرت سی اُمڈنے لگی۔ ان کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تھی۔ ماں کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو اُنہوں نے سر اُٹھا کر اشکبار آنکھوں سے اپنے سرتاج کو دیکھا... کچھ حیرانی سی ان کی آنکھوں میں چمکی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ میں نے انہیں ابھی بابا جان کی یادداشت متاثر ہونے سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔

”تت... تاج دین! مم... میرے سر کے تاج! مم... مجھ الم نصیب کو نہیں پہچان رہے؟ میں نویدہ ہوں... تمہاری شریکِ سفر... تقدیر نے ہمیں ایک طویل جدائی اور کڑی آزمائش کے بعد ملایا بھی تو کس حال میں کہ... کہ...“ ماں جی کا لہجہ رُندھ گیا۔ وہ چادر کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگیں۔ ان کی ادھوری بات کا مطلب سمجھ کر میں بھی رنجور ہوگیا۔ وہ یقیناً ایسے موقع پر اپنے بڑے بیٹے اور میرے بھائی لئیق شاہ کو یاد کر کے غمگین ہوگئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ میری جانب گردن موڑ کر بولیں۔

”شہزی پتر! یہ... یہ، مجھے پہچانتے کیوں نہیں...؟“

زہرہ بانو نے آہستگی سے اُن کے شانوں کو چھو کر کہا۔

”ماں جی! یہ ابھی کسی کو بھی نہیں پہچان پارہے ہیں، شہزی کو بھی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ماں جی کو مختصراً بتایا اور ڈاکٹر سلیمان کی تشفی آمیز اُمید دلانے کا بھی ذکر کر دیا۔

ماں جی اُٹھی نہیں، وہیں بیٹھی رہیں۔ میں نے زہرہ بانو کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے اُسے میجر ریاض باجوہ کی بات یاد دلائی تو زہرہ نے ہولے سے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور مجھے کمرے سے باہر چلنے کا خفیف سا اشارہ کیا۔

”ڈاکٹر سلیمان نے یہ بھی کہا تھا کہ بابا جان کے قریبی اور شناسا لوگ جس قدر ان کے قریب رہیں گے اُتنی ہی جلدی ری کوری اور بہتری کے امکانات ہوں گے۔“

اپنے کمرے میں آکر زہرہ بانو نے مجھ سے کہا۔ ”اس لیے ماں جی کو تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ رہنے دیا جائے، ہاں! میں کچھ دیر بعد جا کر ماں جی کو سمجھا کر لے آؤں گی۔“

میں چپ ہو رہا۔ تب تک میں نے شکیلہ اور کبیل دادا کی خبر لی۔ وہ ہوش میں آچکا تھا اور مجھ سے باتیں بھی کیں اس نے۔ میں نے اس کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا، اس کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اول خیر بھی جاگ گیا تھا۔ شکیلہ کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی گئی تھی اور ٹانگ کے زخم پر بینڈیج لگادی تھی۔

ہم سب وہیں آبیٹھے تھے، جدھر کبیل دادا کا بستر لگا ہوا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر کچھ دوائیں اور انجکشن رکھے نظر آرہے تھے۔ اتنی دیر میں زہرہ بانو بھی وہیں آگئی، اُسے دیکھ کر کبیل دادا... صاحبِ فراش ہونے کے باوجود اس کے احترام میں، ذرا کسمسا کر سر تکیے سے لگا کے اپنی پشت ٹکانے کی کوشش کرنے لگا تو زہرہ بانو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔

”آرام سے لیٹے رہو... اب کیسی طبیعت ہے تمہاری...؟“ زہرہ بانو نے بردبارانہ متانت سے پوچھا اور میرے قریب والی کرسی اول خیر نے چھوڑی تو وہ اس پر براجمان ہوگئی۔

”کافی بہتر ہوں بیگم صاحبہ!“ اس نے ہولے سے جواب دیا۔ لہجہ مؤدبانہ ہی تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے سے مخاطب ہوتے دیکھ کر، ایسے میں ایک بار پھر میرے دماغ میں وہی بات گردش کرنے لگی جس کے بارے میں، میں کچھ دن پہلے ماں جی والے ”مسئلے“ سے متعلق میں اپنے تئیں ایک حل نکالنے کے بارے میں غور کرنے لگا تھا، مگر اس سے پہلے میں اول خیر سے ایک مشورہ ضرور کرلینا چاہتا تھا...

خوش گوار اور پُرطمانیت والے ماحول میں ہمارے درمیان باتیں ہوتی رہیں، سب سے زیادہ خوشی ہمیں اپنی اہم ترین مہم کی کامیابی اور بابا جان کے زندہ سلامت یہاں لوٹ آنے کی تھی۔ اس دوران میں ممتاز خان اور وزیر جان کے بارے میں بھی بعض سنجیدہ نوعیت کی گفتگو ہوئی، ممتاز خان تو انٹیلی جنس والوں کی گرفت میں جا چکا تھا جبکہ وزیر جان مفرور تھا، اس کی تلاش جاری تھی۔

میجر باجوہ کی معلومات کے مطابق وہ چوہدری ممتاز خان کی بیٹی نوشابہ کے ساتھ درپردہ ”عوامی کارڈ“ کھیلنے کی سازش میں بھی مصروف تھا۔ اس دوران میں عابدہ کے بارے میں طویل گفتگو بھی ہوئی۔ طے یہی پایا کہ عارفہ سے ایک آخری ملاقات ضروری تھی۔ نیز اس کے ”ساجھے دار“ سیٹھ نوید احمد سانچے والا... کا ذکر بھی زیرِ بحث آتا رہا۔ اس سلسلے میں خبریں یہی تھیں کو وہ اپنی ضمانت وغیرہ کے سلسلے میں سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور پیسہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے موجود ساتھیوں کے باہمی مشورے سے میجر ریاض باجوہ سے فون پر رابطہ کر کے انہیں آگاہ کر دیا۔ اُنہوں نے دو تین دن بعد بابا جان، ماں جی اور مجھے لینے کے لیے پہنچنے کا وعدہ کیا تھا۔ کوشش تھی کہ تب تک بابا جان کی طبیعت بھی سنبھل جاتی۔ ان کا ارادہ اپنی میڈیکل ٹیم کے ذریعے پہلے بابا جان کی مکمل اور ماضی کے حالات و واقعات کی تصدیق کے بعد، اپنے اعلیٰ افسران سمیت صدرِ مملکت کو بھی آگاہ کرنے کا تھا۔ اس کے لیے انہیں کچھ ضروری نوعیت کے اُمور نمٹانے تھے۔

میجر صاحب چاہتے تھے کہ وطن کے اس گمنام اور بہادر محبِ وطن سپاہی کو پورے اعزاز کے ساتھ ملک و قوم کے سامنے متعارف کروایا جائے، جو اُن کا حق بھی تھا۔ ساتھ ہی باجوہ صاحب نے مجھے بھی یہ اُمید دلائی تھی کہ ممکن ہے مجھے بھی آرمی یا رینجرز کور میں کوئی اچھا سا عہدہ تفویض کر دیا جائے، مجھے ایسا کوئی لالچ نہیں تھا مگر میں خاموش رہا۔

اس دوران میں نے اول خیر کو اشارہ کیا اور اسے لیے اپنے کمرے میں آگیا۔

”اوخیر...! کاکے! لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔“ وہ اندر آتے ہی بولا۔ خوشی کے اس موقع پر اس کی بھی خوش دلی لوٹ آئی تھی۔ میں نے کہا۔

”اول خیر! تم سے ایک سنجیدہ معاملے پر مشورہ کرنا تھا۔“

AIOURDUBOOKS.NET

"ہاں... بول! کیا بات ہے؟ کیسا معاملہ...؟"

"دیکھ یار...! تمھیں ماں جی والی بات کا تو پتا ہی ہے ناں..."

"کون سی بات؟"

"وہی یار...! زہرہ بانو کے ساتھ میری شادی والی..." میں نے اُسے یاد دلایا تو بے اختیار اور حسبِ عادت اُس کے منہ سے نکل گیا۔

"او... خیر!"

"خیر کیسی...؟" میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ وہ تھوڑا اگڑبڑا گیا۔

"بالکل خیر نہیں ہے مگر... لگتا ہے تُو نے اس سلسلے میں کچھ سوچ لیا ہے۔" وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔ میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے مختصر الفاظ میں اس کے سامنے یہ تجویز رکھ دی جو میں نے کچھ دن پہلے سے سوچ رکھی تھی۔ اول خیر نے پہلے تو میری تجویز کو بڑے غور سے سنا، اور بعد میں اچانک اس کا پُرسوچ سا چہرہ یکدم ایک زلزلے کی کیفیات سے دوچار ہوگیا۔ ہونق سی شکل بنا کر پہلے تو وہ مجھے تکتا رہا پھر تشویش زدہ لہجے میں بولا۔

"اوخیر... کاکے! ای ی... تجھے اتنی خطرناک پٹی کس نے پڑا دی...؟ ضرور یہ اس کم عقل شکیلہ کا کام ہوگا؟"

"خبردار جو میرا تم نے نام لیا..." اس بلبلاتی آواز پر میں اور اول خیر دونوں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے جہاں شکیلہ ایک اسٹک کے سہارے کھڑی سلگتی نگاہوں سے اول خیر کی طرف گھور رہی تھی۔ مجھے اور اول خیر کو وہاں خاموشی سے اُٹھتے دیکھ کر وہ شاید بدک گئی تھی اور کب سے دروازے کے پیچھے لگی ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اول خیر کی طرح وہ بھی میری رازداں تھی، اور میرا اُس سے بھی اس نازک موضوع پر بات کرنے کا ارادہ تھا، لیکن اس کی حالت دیکھ کر میں نے سرِدست اول خیر سے ہی صلح مشورے کا سوچا۔

"یا اللہ خیر..." اسے دیکھ کر اول خیر زیرِلب بڑبڑایا تھا۔

"میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم یہاں میری غیرموجودگی میں شہزی کے ساتھ میری غیبت کرنے میں مصروف ہو گے۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولی تو میں مسکرا کے اس سے بولا۔

"آؤ... شکیلہ! ایسی کوئی بات نہیں، دراصل تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسی لیے میں نے سوچا پہلے اول سے بات کرلی جائے تو بعد میں تم سے بھی۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور معاف کرنا... تمہاری باتیں سن لی ہیں۔ میرا مشورہ بھی ہے کہ تجویز سولہ آنے ٹھیک ہے۔" بڑے دبنگ اندا کہتے ہوئے شکیلہ میرے خفیف سے اشارے پر ا میں دروازہ بند کرتے ہوئے قریب آگئی۔

"نہیں کوئی بات نہیں، تمھیں تو بتانا ہی تھا۔" میں مصالحانہ پالیسی اختیار کرنا چاہی، کیونکہ جانتا تھا ان کے درمیان مہا بھارت چھڑ گئی تو اصل بات کا "ہوا" ہوجائے گا۔

"اوخیر... نہ سوچا نہ سمجھا اور سولہ آنے بات ہونے کا عندیہ دے ڈالا۔" اول خیر نے بسورتے کہا۔ "اوبی بی! یہ گڈی گڈے کا کھیل نہیں ہے، کے بات کرو اور اگر کوئی مناسب تجویز نہیں دے سکتی بند رکھو اپنا۔"

"مجھے بھی سب معلوم ہے اچھی طرح..." وہ بولی۔ "اس میں برائی کیا ہے اگر... کبیل دادا او بانو..."

"اوئے... اوئے کاکی! آہستہ بول، مردائی گ ہمیں؟ کیوں اپنے ساتھ ہمیں بھی جوتے پڑوا یہاں... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، جیسے کو ہمار کان کتر کے یہاں اچانک آن ٹپکی ہو۔"

"میں کوئی غلط بات نہیں کہہ رہی ہوں... ایک سے کارِخیر ہے یہ..."

"ٹھیک ہی تو میں تمہیں عقل کی کھوتی کہتا ہوں اول خیر اس مرتبہ اُسے غصے سے گھور کر بولا۔ "کارِخ کرنے کے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں... اور فی زمانہ اُلٹی آنتیں گلے پڑنے کے بھی مترادف ہوتا ہے، غلط جنم لیتی ہیں اور جدائیاں ہوجایا کرتی ہیں۔"

"تو میں نے کب کہا کہ ابھی جا کر زہرہ بانو یا دادا سے .... یہ سب کہہ ڈالو۔" شکیلہ تڑخ کر بولی۔ " تو میں نے صرف شہزی کی تجویز کی صرف تائید ہی کی کوئی مشورہ تو نہیں دے ڈالا کہ ایسا ہی کرو..."

"تم دونوں اگر اسی طرح بحث میں اُلجھے ر اصل بات اپنے وسیع مقصد سمیت غارت ہوجائے گی بالآخر مجھے درمیان میں کودنا پڑا تو دونوں خاموش ہوگئے میرا خیال تھا کہ میں ماں جی کا "اصل" مسئلہ یا یو

JASOOSI DIGEST
PUBLICATIONS
Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through
63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

AIOURDUBOOKS.NET

کہا جائے کہ اُن کی زہرہ بانو سے متعلق روایتی ماؤں والی ''فکر'' کو سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ ماں سے اس سلسلے میں میری دوسری بار ہونے والی گفتگو پر مجھے بھی ماں سے اپنے دل کی بات (عابدہ سے متعلق) کہنے کا خاطر خواہ موقع ملا تھا۔ وہ بھی اب میرے اور عابدہ سے متعلق اس ''تعلقِ خاطر'' کو سمجھنے لگی تھیں، پھر اسی دوران میں اُنھوں نے زہرہ بانو سے اپنی ''فکر'' سے متعلق مجھ سے جو گفتگو کی تھی تو تب ہی اچانک میرے ذہن میں کبیل دادا سے متعلق پہلا خیال یہی آیا تھا کہ... زہرہ بانو کے لیے کبیل دادا سے اچھا، پیار کرنے والا، بے لوث اور مخلص جیون ساتھی بھلا اور کون ہوسکتا تھا؟ یوں تو کبیل دادا کی زہرہ بانو سے محبت، یک طرفہ اور خاموش سہی... لیکن وہ اُسے بھولا نہیں تھا، کسی معصوم مگر خوف زدہ سے بچے کی طرح اس نے اپنی یک تہی محبت کو زہرہ بانو سے اب تک چھپا رکھا تھا... اُسے ڈر تھا کہ اس کا اظہار کہیں اُسے اپنے محبوب سے دور نہ کردے۔ وہ اس کی صرف چھایا تلے، قریب رہنے کو ہی اب تک کافی سمجھے ہوئے تھا۔ کبیل دادا صرف ایک بہادر اور دلیر آدمی ہی نہیں وفادار بھی تھا، وہ اپنی ''بیگم صاحبہ'' کی ہر ایک جنبشِ ابرو تلے اپنا سر خم کرنے کو تیار رہتا تھا، یہ کیا کم بات تھی کہ وہ مجھے اپنا رقیب سمجھے ہوئے تھا مگر جہاں ''بیگم صاحبہ'' کے حکم کی بات آتی، وہ سب کچھ بھول کر میرے سامنے دو زانو ہو جاتا تھا، یہی حال اس کا لئیق شاہ کے ساتھ بھی رہتا تھا۔

کبیل دادا منہ کا کڑوا سہی مگر دل کا کھرا اور سچا آدمی تھا، اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اگر میں کبیل دادا یا زہرہ بانو سے اس سنجیدہ مسئلے سے متعلق کوئی بات کروں اور وہ بن جائے تو اس سے بڑھ کر خوشی کی بھلا اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ ماں جی کے دل کو بھی قرار مل جاتا اور زہرہ بانو کی کرب انگیز تنہائی کو بھی کچھ سکون مل جاتا، مگر اصل بات تو یہ تھی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون اور کیسے باندھے؟ مجھ سے یہ ہی نہیں طے ہو پا رہا تھا کہ یہ نازک اور حساس بات پہلے کس سے کی جائے؟ کبیل دادا سے یا زہرہ بانو سے...؟

''میرا خیال ہے پہلے ماں جی سے یہ بات کہی جائے، وہ بہتر سمجھیں تو پھر وہ خود ہی زہرہ بانو کو یہ مشورہ دیں۔'' بالآخر شکیلہ نے آئیڈیا دیا تو حسبِ عادت اول خیر نے اُسے زچ کرنے کی خاطر، پہلے تو اس کا مضحکہ اُڑانے والے انداز میں اپنے منہ سے باریک سی آواز خارج کی، پھر ہولے سے بولا۔

''یہ ماں جی سے بھی جوتے پڑوائے گی۔''

''تو پھر تم ہی کوئی صائب مشورہ کیوں نہیں دیتے شہزی کو...؟'' شکیلہ نے کڑوے لہجے میں اس کہا تو وہ بولا۔

''میرا تو یہی مشورہ ہے کہ اس نازک موضوع سرے سے چھیڑا ہی نہ جائے۔''

''نہیں، اول خیر! تم خود بتاؤ آخر ایسا کب گا؟'' میں نے کہا۔ ''ماں جی کو سب سے زیادہ زہرہ فکر کھائے جارہی ہے اور میں ایک طرف اُنہیں بھی ہوتا نہیں دیکھ سکتا، یوں بھی اگر زہرہ بانو اور کبیل دادا بندھن میں بندھ جاتے ہیں تو میرا خیال ہے اس سے بات اور کیا ہوسکتی ہے؟''

''میں بھی تو یہی کہہ رہی ہوں... یہ بہت اچھا گا۔ زہرہ بانو کی عمر نکلی جارہی ہے، کبیل دادا ایک طرح ان کے انتظار میں بوڑھا ہونے لگا ہے، یہ الگ بات دونوں دیکھنے میں صحت مند اور جوان ہی لگتے ہیں، ہا کتنا مزہ آئے گا، بیگم ولا میں ایک بار پھر شادیانے گے۔'' شکیلہ چہک کر بولی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میں پہلے اس سلسلے میں کبیل دادا بات کرکے دیکھتا ہوں، وہ کیا کہتا ہے۔'' بالآخر میں ایک گہری سانس خارج کرکے حتمی لہجے میں کہا اور اول میرا چہرہ تکنے لگا۔ تاہم اس نے میری اس بات کی تائید کی کہ مجھے پہلے کبیل دادا کو اس سلسلے میں اعتماد میں چاہیے۔

آج ہی رات میں نے کبیل دادا سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال اور اس کا ''عندیہ'' لینے کا فیصلہ کرلیا

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں کبیل دادا کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ مجھے دیکھ کر اس چہرے پر بے تاثر سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر کھلے دل سے مسکرایا تھا، میری نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں کہ ایکا ایکی جانے کیوں مجھے اس کے چہرے کے تاثرات میں ایک عجیب قسم کا گم صم پن سا محسوس ہوا، جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی کسی گہری اور پُرتفکر سوچ میں غلطاں رہا ہو۔ تاہم میں خاموشی سے اس کے کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ چند رسمی کلمات کے بعد میں ابھی اصل بات کی طرف آنا ہی چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بولا۔

''اچھا ہوا تم آگئے شہزی! میں تم سے ایک بات کر چاہتا تھا۔'' میں اس کی بات پر چونکا... کہ بات تو میں اس

نے آیا تھا مگر یہاں تو یہ مجھ سے پہلے ہی بات کرنے کو بیٹھا تھا۔

''ہاں... ہاں... کہو، کیا بات ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے کہا اور ہی کچھ بھانپتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

اس کا چہرہ بہ ظاہر مجھے سپاٹ نظر آرہا تھا لیکن اندر اس کے کیا کیا ہلچل مچی ہوئی تھی، مجھے اس کا شائبہ تو ہوا تھا، مگر سبب نامعلوم تھا۔ اس نے ایک ذرا اپنی موڑ کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں ایک کرب ناک سا تاثر کروٹیں لیتا دکھائی دیا۔ مجھے چپ سی لگ گئی، گویا میں بے چینی سے اس کے بولنے کا ہو رہا...

''شہزی! ایک بات آج مجھے سچ بتانا، جھوٹ مت وعدہ کرو سچ بولو گے میرے ساتھ۔'' میں اس کی عجیب حیران رہ گیا، آج سے پہلے کبھی میں نے اسے اتنا خاطر اور مغموم نہیں دیکھا تھا، جتنا آج وہ مجھے نظر آرہا

''ارے یار! کیسی بات کرتے ہو؟ میں تم سے کیا، کسی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ ہاں! کسی سے ناراضگی ہو تو منہ پہ بول دیا کرتا ہوں دل میں نہیں رکھتا کہ یہی میری فطرت ہے۔'' میں نے جواب دیا تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ بولا۔

''تو پھر مجھے سچ سچ بتاؤ کہ تم مجھے کیسا سمجھے ہو...؟''

میری سمجھ سے یہ بات قاصر تھی کہ کبیل دادا جیسا سنجیدہ اور اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی جو مجھ سے بھی بڑا لیے دبے رہتا تھا، یہ اچانک آج اسے کیا ہوا تھا؟ کیا وہ آج اپنا آپ مجھ پر کھولنے والا تھا...؟'' ایک سوالیہ نشان میرے سامنے تھا۔ لہٰذا میں بھی کھلے دل اور بھرپور دوستانہ مسکراہٹ سے بولا۔

''کبیل دادا! سچی بات کہوں گا کہ تمہاری تعریف کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ تم واقعی دادا... ہو۔ دل کے دادا، سچائی و جاں نثاری کے دادا... اور کیا کہوں تمہاری تعریف میں؟''

''سچ کہہ رہے ہو...؟''

''اللہ کی قسم میں سچ کہہ رہا ہوں... اور بولو؟''

''لل... لیکن میں نے تو... کبھی بھی تم سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ تمہیں برا بھلا ہی کہا، پھر بھی تم مجھے اچھا سمجھ رہے ہو؟ کیوں...؟ ایک بار پھر سوچ لو... شہزی! اگر تم مجھے اسی لیے اچھا کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہارے مرحوم بھائی لئیق شاہ کے ساتھ اور بعد میں تمہارے ساتھ جو اچھا کیا بھی تو یہ تمہاری بھول ہوگی، میں نے صرف بیگم صاحبہ کا حکم بجالانا ہی اولین سمجھا اور بس...''

''تو کیا تم مجھے اتنا ہی نادان سمجھ رہے ہو کہ میں اتنی سی بات نہیں سمجھ رہا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو اس کی بے تاثر سی آنکھوں میں حیرت سی جاگی اور اسی لہجے میں بولا۔

''تت... کیا، تم پھر بھی مجھے اچھا سمجھے ہوئے ہو...؟''

''یہ... آج تم کیسی عجیب باتیں کررہے ہو دادا...؟ کیا تم نے میرے رویّے سے کبھی ایسا کچھ محسوس کیا ہے جس سے تم اندازہ لگا سکو کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا، یا نفرت کرتا ہوں تم سے؟''

''نہیں۔'' اس نے بھی جواب دیا۔

''تو پھر؟ تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ دیکھو... تم اچھے انسان ہو، میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہاں! تم نے دوستی تو دوستی، دُشمنی کا بھی ایک معیار قائم کیا ہے، یہ الگ بات ہے کہ تم میرے سلسلے میں ایک چھوٹی سی غلط فہمی کا شکار ضرور رہتے ہو اور میری یہ دلی خواہش ہے کہ آج تم میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو... حیرت کی بات نہیں یہ کہ تم جانتے بھی ہو کہ...''

''شہزی! مجھے تم سے کچھ کہنا تھا...'' وہ میری بات کاٹ کر یکدم بولا۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم اپنی کہہ چکے اور میں اپنی صفائی پیش کرچکا...؟ اور کیا کہنا باقی ہے دوست! وہ بھی کہہ ڈالو، آج شہزادا احمد شہزی سے کچھ نہیں چھپاؤ، اسے آزما کر دیکھو، یہ تو دُشمنوں تک کو معاف کردینا والا آدمی ہے اور یاروں کا یار بھی ہے... بولو۔''

''شہزی! تم... بیگم صاحبہ سے شادی کرلو...''

کبیل دادا نے ایک دم جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کیا اور میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا...

☆☆☆

یہ حقیقت تھی کہ مجھے کئی ثانیے تک تو اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا کہ کبیل دادا نے مجھ سے یہ کہا کیا تھا؟ اور کیوں...؟ میں تو خود اس سے یہ سب کہنے آیا تھا اور پھر مجھے تو اس کی طرف سے اس طرح کہنے کی رتی بھر بھی اُمید نہ تھی اور ہوتی بھی بھلا کیسے...؟ کبیل دادا اور میری آپس

AIOURDUBOOKS.NET

کی رنجش ورقابت کی بنیاد ابتدا سے ہی اسی بات پر تو تھی کہ وہ زہرہ بانو سے محبت کرتا تھا۔ اس کی یہ محبت میرے آنجہانی بھائی لئیق شاہ سے بھی پہلے کی تھی۔ مگر وہ لئیق شاہ کو چاہنے لگی تھی اور کبیل دادا اپنی خاموش وفا کو اسی طرح اپنے سینے میں دبائے بیٹھا تھا، پھر لئیق شاہ کی صورت میں جب اس نے مجھے دیکھا اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ زہرہ بانو کا جھکاؤ میری طرف زیادہ ہوتا تھا تو یہ بات اسے سخت کھلا کرتی تھی، آج وہی کبیل دادا مجھے زہرہ بانو سے شادی کا مشورہ دے رہا تھا جو میرے لیے بہرحال غیر متوقع سی بات تھی۔

’’ی یہ... تم کیا کہہ رہے ہو کبیل دادا...؟ ہوش میں تو ہو تم...؟‘‘

بالآخر میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور میرے لہجے میں سختی بھی عود کر آئی۔

’’میں پوری طرح سے ہوش میں ہوں اور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں...‘‘

’’بکواس کر رہے ہو تم۔ یہ ناممکن ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ میں کسے چاہتا ہوں؟‘‘

’’جانتا ہوں، تم عابدہ کو چاہتے ہو مگر وہ...‘‘ کبیل دادا اچانک کچھ کہتے کہتے رکا، پھر اپنا سر تکیے پر سیدھا ٹکا دیا اور بڑے حزن وملال کی سی کیفیت میں بولتا چلا گیا۔

’’شہزی! تم نہیں جانتے کہ بیگم صاحبہ ہر روز کس کرب سے گزرتی ہیں۔ لئیق شاہ کے مرنے کے بعد سے اب تک وہ اُسے ایک پل کے لیے بھی نہیں بھول سکی ہیں۔ میں نے ان کا بہت دل بہلانے کی کوشش چاہی تھی مگر ناکام رہا، پھر تم سامنے آگئے، مجھے ان کا زخم ایک بار پھر ہرا ہوتا محسوس ہوا، مجھے تم سے اس بات کی چڑ نہیں تھی کہ تمہیں میں اپنا رقیب سمجھتا تھا، جسے سمجھتا تھا وہ تو چلا گیا تھا دنیا سے مگر تم سے میری رقابت کی وجہ اور تھی شہزی...‘‘ وہ اتنا کہہ کر رکا، میری یک ٹک نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اس کا فقط آدھا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا، باقی نصف تکیے کے دوسرے رخ پر تھا، اور میں اس کی ایک آنکھ سے آنسو بہتا دیکھ رہا تھا۔ آج پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ کبیل دادا جیسا خاموش طبع، لیے دیے رہنے والا، آج میرے سامنے خود کو پرت در پرت کھول رہا تھا... اور میں بھی خاموشی سے اس کی سن رہا تھا، تاکہ وہ آج پوری طرح میرے سامنے کھل جائے، اپنا بارا اپنے دل کا بوجھ اُتار پھینکے....

’’شہزی! میں تم سے صرف اسی لیے خار کھاتا تھا کہ تمہاری وجہ سے بیگم صاحبہ کا زخم ایک بار پھر ہرا ہو گیا تھا۔ تم اس کے لیے ایک طرف تو راحت کا باعث تھے تو دوسری طرف ان کے دل کا کرب بھی جگانے کا سبب تھے۔ میں اسی لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ ہو سکے تو تم بیگم صاحبہ کو اپنا لو... میں اُنہیں مزید دُکھی اور غمگین نہیں دیکھ سکتا...‘‘

میں کبیل دادا کی اس ادا پر اش اش کر اٹھا۔ کیسا سچا عاشق تھا یہ... جو اپنے محبوب کی خوشی کی خاطر اپنی محبت کو کس انوکھے طریقے سے قربان کر رہا تھا۔ آفرین ہے اس شخص پر، جس نے نجانے کتنے عرصے تک یک طرفہ محبت کی صلیب کو اپنے گلے سے لٹکائے رکھا تھا اور... وہ آج صحیح معنوں میں ایک سچے محبوب کی تصویر نظر آ رہا تھا مجھے۔

میں نے کہا۔ ’’کبیل! مجھ سے جھوٹ مت بولنا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم بیگم صاحبہ سے محبت کرتے ہو، شدید محبت۔‘‘ میری بات پر اس کے چہرے پر ہلکا سا خوف کا شائبہ نمودار ہوا، وہ مجھ سے جیسے نظریں چرانے لگا۔ بولا کچھ نہیں، شاید اندازہ اُسے بھی تھا کہ بھلا عشق ومشک کب چھپتا ہے لیکن یہاں معاملہ کبیل دادا کا یک طرفہ عشق تھا اور اُسے اسی لیے یہی زعم تھا کہ یہ راز اس کے سینے میں ہی چھپا رہے گا۔ اُس کی ’’چپ‘‘ کو ایک اعترافی خاموشی پر محمول کرتے ہوئے میں نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے دوبارہ کہا۔

’’کبیل دادا! تمہارا اپنا اس بارے میں کیا خیال ہے...؟‘‘

’’کس بارے میں؟‘‘ اس نے ایک بار پھر تکیے پر اپنا سر رکھے رکھے میری جانب گردن گھما کر دیکھا تو میں بولا۔

’’کیسی عجیب بات ہے کبیل دادا کہ جس نازک موضوع پر میں تم سے بات کرنے آیا تھا تم نے بھی آج وہی موضوع چھیڑ دیا... مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے کہ نجانے تقدیر اور کتنے گل کھلانے والی ہے...‘‘

’’تم مجھ سے کون سی بات کہنا چاہتے تھے؟‘‘ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی اور بالآخر میں نے اس سے وہی کہہ ڈالا جس کا میں ارادہ کر کے یہاں تھا۔ وہ میری بات سنتے ہی جیسے بھونچکا... سا رہ گیا، کئی لحظ تو اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا... اور پھر میں نے دیکھا کہ اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہو گئی... کبیل دادا دوبارہ اپنا سر تکیے پر سیدھا کر کے ہنسنے لگا اور ہنستا ہی چلا گیا... یوں جیسے پاگل ہو گیا ہو...

’’کیا بات ہے؟ ہنس کیوں رہے ہو تم؟‘‘ میں نے

ے متانت سے کہا تو وہ اپنی ہنسی کو ایک دم روک کر طرح لیٹے لیٹے خالی نظروں سے چھت کو گھورتے بولا۔

’’جو بات میں پچھلے کئی سالوں سے لے کر اب تک ہصاحبہ سے نہ کر سکا وہ بھلا اب کیا کروں گا؟‘‘

’’تم بزدل ہو، محبت کرنے والے شیر جیسا دل رکھتے ‘‘میں نے ازراہِ تفنن کہا۔

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا پھر مجھے بذلہ سنجی مسکراتے دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا، تاہم دوسرے ہی لمحے ہگی سے بولا۔

’’تم نے بات تو مذاق میں ہی کہی ہے لیکن میرا خیال ہ کہ حقیقت بھی یہی ہے... میں واقعی اس معاملے میں کورا بزدل ہوں۔ میں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار کسی کو کر چاہا تھا اور اتنا ہی میرے دل میں یہ خوف بھی گھر رگیا کہ کہیں میرا اظہارِ محبت مجھے اپنے محبوب سے دور ہی ردے۔‘‘

میں نے اسے بغور دیکھا۔ بیڈ پر دراز لمبے چوڑے اور میچورڈ سی شخصیت کا مالک، اس سے یہ بات کہتے ے مجھے بالکل ایک چھوٹا سا معصوم بچہ ہی نظر آنے لگا۔ میں نے کہا۔ ’’اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ اگر تم کہو تو ہم اس سلسلے میں کچھ کریں؟‘‘

’’ہم کون؟‘‘ اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے میری رف دیکھا۔ ’’اور... کون کون ہے تمہارے ساتھ؟ کک کیا اُنہیں بھی معلوم ہے کہ...‘‘ وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ میں درمیان میں بول پڑا۔

’’کون کون نہیں، سب اپنے ہی ہیں، اور تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے دل کی بات بھلا چھپی رہ سکتی ہے؟‘‘

’’جب بیگم صاحبہ سے آج تک چھپی ہوئی ہے تو... بھلا دوسرا کوئی کس طرح جان سکتا ہے...‘‘

’’یہ بھی تمہاری خوش فہمی ہے...‘‘ میں نے انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔ میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر ایکا ایکی اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیں سی نمودار ہوئی، بالکل بچوں جیسا خوف۔

’’کک... کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘

’’ہاں... یہ تمہاری بھول کہ زہرہ بانو یعنی بیگم صاحبہ کو تمہاری اس ادا کا علم نہیں ہے۔‘‘ بالآخر میں نے کہا۔

رفتہ رفتہ میرے اور کبیل دادا کے درمیان ہونے الی گفتگو نازک مرحلے میں داخل ہونے لگی تھی۔ کیونکہ اس بات کا انکشاف کبیل دادا پر کوئی معمولی بات نہ ہوتی کہ اس کے سینے میں چھپی آتشِ عشق سے زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) بےخبر ہے۔ میں درحقیقت اس کا حوصلہ بڑھانا چاہ رہا تھا۔

’’تت... تمہیں کیسے پتا؟‘‘

’’بس! ہے پتا مجھے۔‘‘

’’تمہیں پتا ہے، تم کیا کہہ رہے ہو...؟‘‘

’’چھوڑو یہ باتیں کبیل! بہت پرانا ہو چکا یہ سب... تم کہو تو میں اور ماں جی زہرہ بانو سے اس سلسلے میں بات کریں؟‘‘

’’نہیں، پہلے مجھے بتاؤ۔ اتنی بڑی بات تم کس برتے پر اتنے یقین سے کر رہے ہو؟‘‘ وہ اب تکیے سے پشت ٹکا کر ذرا اُٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور اُسے بتا دیا کہ زہرہ بانو مجھے بہت پہلے جب اپنی ماضی کی داستان سے تفصیلاً آگاہ کیا تھا تو اس بات کا بھی اُنہوں نے مسکراتے ہوئے اظہار کیا تھا کہ تم اُسے ایک ’’باس‘‘ سے زیادہ ’’چاہت‘‘ کی نظر سے دیکھتے ہو...

پہلے تو کبیل دادا کو میری اس بات پر یقین نہیں آیا لیکن جب میں نے اُسے اس کے اپنے ماضی سمیت، اپنے بھائی لئیق شاہ اور زہرہ بانو، چوہدری الف خان، ممتاز خان وغیرہ کے بارے میں مختصراً بتایا تو کبیل دادا کے بشرے پہ سناٹا چھا گیا، وہ کئی ثانیوں تک گم صم بیٹھا میرا چہرہ تکتا رہ گیا۔ اُس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور میں اس کی اس کیفیاتِ دگرگوں کو سمجھ رہا تھا۔ لہٰذا ایک گہری ہمکاری خارج کر کے اس سے بولا۔

’’اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، تم مجھے اجازت دو، تو میں اور ماں جی، زہرہ بانو سے تمہارے سلسلے میں...‘‘

’’نہیں، ہرگز نہیں۔‘‘ وہ یک دم انکار میں اپنا سر ہلاتے ہوئے بولا۔

’’آخر کیوں؟‘‘

’’مجھے اعتراف ہے کہ تمہیں ماضی سے متعلق بہت سی باتوں کا علم ہو چکا ہے، لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں شہزی! جن کا صرف علم میں ہی ہونا کافی نہیں ہوتا، ان کا ادراک کرنا زیادہ ضروری ہوتا ہے، اور تمہیں وہ نہیں ہے۔‘‘ وہ عجیب فلسفیانہ لہجے میں بولا۔

’’مثلاً؟‘‘ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

’’بیگم صاحبہ کی نگاہوں کے سامنے میری حیثیت صرف ایک ملازم کی سی ہے، دوست کی نہیں۔‘‘

AIOURDUBOOKS.NET

''تم اُن کے سب سے زیادہ قریبی اور وفادار، جاں نثار ساتھی ہو۔ وہ تم پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور یہ سب ایک ملازم کے لیے نہیں سچے دوست کی صفات میں شمار ہوتا ہے۔''

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش چاہی تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ کا برتاؤ میرے ساتھ بھی دوستانہ نہیں رہا، ماسوائے ایک باس کے حکم کے، ہاں! تم اپنی بات کر سکتے ہو، تمہارے ساتھ ان کا رویّہ دوستانہ... بلکہ اس سے کچھ آگے کا رہا ہے، چاہے کسی بھی حوالے سے سہی۔'' میں نے اس کی ذومعنی بات پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا، یہ الگ بات تھی کہ اس کی بات نے مجھے لاجواب سا ضرور کردیا تھا، بہرکیف میں اسے صرفِ نظر کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا، سنو! ہم تمہاری طرف سے بات نہیں کرتے، ماں جی سے میں کہوں گا کہ وہ خود ہی اپنی بات تجویز کے طور پر بیگم صاحبہ کے سامنے رکھیں، دیکھیں پھر وہ کیا کہتی ہیں؟''

میرا یہ داؤ چل گیا کیونکہ کبیل دادا خاموشی کے ساتھ کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید کہا۔ ''کبیل! حوصلہ کرو، آخر ایسا کب تک چلے گا، یہ ایک اچھی بات ہوگی، تمہارے لیے بھی اور خود بیگم صاحبہ کے لیے بھی، اُنہیں تمہارے جیسا محبت کرنے والا شوہر مل جائے گا اور تمہیں تمہاری ازلی محبت... اس سے بڑھ کر ہمارے لیے بھی خوشی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ ہم سب بھی تو اس بات پر متفق ہیں۔'' وہ پھر بھی کچھ نہیں بولا۔ اس کی خاموشی بدستور اسی طرح ہی قائم رہی تو میں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ذرا قریب جا کر کاندھے پر ہولے سے تھپکی دی اور جب دروازے کی طرف پلٹنے لگا تو کبیل دادا نے میرا ہاتھ تھام لیا، میں قدرے چونک کر اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ ممنون بھرے لہجے میں بولا۔

''تمہارا بہت شکریہ شہزی! اگر یہ سب تمہاری وجہ سے ممکن ہوا تو... سمجھ لینا، یہ دادا، ہمیشہ کے لیے تمہارا غلام ہوجائے گا۔'' جواباً میں مسکرا کر بولا۔

''مجھے بھی خوشی ہوگی لیکن تمہارے غلام بننے کی نہیں بلکہ دوست بننے کی...''

کبیل دادا کے کمرے سے آکر میں نے اول خیر اور شکیلہ کو ساری بات بتادی، شکیلہ تو مطمئن اور خوش تھی لیکن جانے کیوں اول خیر چپ چپ سا تھا۔ میں نے اُسے اسی کے حال پر چھوڑا اور ماں جی کے کمرے میں آگیا۔ وہ جاگ رہی تھیں۔ میں اُن کے قریب بستر پر بیٹھ گیا اور بڑی محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''ماں جی! آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ میں زہرہ بانو کے سلسلے میں کوئی راہ نکال لوں گا...''

''ہاں پتر! یاد ہے مجھے، بول کیا کہنا چاہتا ہے تُو؟'' وہ ممتا بھرے لہجے میں بولیں تو میں نے کبیل دادا سے متعلق انہیں تفصیل سے آگاہ کردیا۔ اتنا عرصہ یہاں بیگم ولا میں رہتے ہوئے ماں جی بھی کبیل دادا کو اچھی طرح جاننے لگی تھیں۔ انہیں بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ تاہم اُنہوں نے جب اس سلسلے میں مثبت ہامی بھری تو میں نے بتادیا کہ اُنہیں کس طریقے سے زہرہ بانو سے بات کرنی ہوگی، وغیرہ۔

ماں جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کوئی مناسب وقت دیکھ کر زہرہ سے ضرور بات کریں گی۔

☆☆☆

اگلے دن میرا ارادہ عارفہ کے ہاں جانے کا تھا۔ اس کے لیے میں نے اول خیر کو اپنے ساتھ جانے کے لیے تیار کیا تھا۔

بیگم ولا سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے عارفہ کو فون کرنا ضروری سمجھا تھا۔

اس کے سیل فون پر جانے والی دوسری رِنگ کے بعد ہی اس حرافہ کی مختصر سی آواز اُبھری۔

''ہیلو!'' انداز سپاٹ اور قدرے سرد مہر تھا۔ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

''میں شہزاد احمد بول رہا ہوں۔ ڈیل سے متعلق آپ نے کیا فیصلہ کیا؟'' یہ پوچھتے ہوئے میری اپنی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں۔ ایسا عموماً ہوتا ہے، اپنے کسی سب سے زیادہ قابلِ نفرت دُشمن سے ہمکلام ہوتے وقت انسان کا دل ہی نہیں دماغ بھی سُلگ رہا ہوتا ہے، اور دشمن بھی کیسا، ایک احسان فراموش دشمن۔ یہی حال اس وقت میرا ہورہا تھا۔

''میں ابھی تک سیٹھ نوید سے اس بارے میں کوئی مشورہ نہیں کرسکی ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''کیا مطلب...؟'' اس کی بات سن کر میرا دماغ بری طرح بھنا گیا۔ مجھے اس کے لہجے سے منافقت، جھوٹ اور فریب کاری کی بوآتی محسوس ہوئی۔ میں زہریلے طنز سے بولا۔

''ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ تم نے اتنے اہم ایشو پر اس سے اب تک کوئی بات ہی نہ کی ہو؟ اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم تھانے تو اس سے ملنے روز ہی جاتی ہوگی۔''

''تھانہ...؟ کیسا تھانہ؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب...؟'' اس کے جی جلانے والے استہزا پر میں میرا دماغ گرم ہونے لگا تھا۔

''اس کی ضمانت ہوچکی ہے اور وہ اس وقت اپنی رہائش گاہ پر آرام کررہا ہے۔'' اس حرافہ کا لہجہ تفاخر آمیز غرور سے لبریز ہورہا تھا اور اندازِ تخاطب بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے یہ ''خوش خبری'' سنا کر تصور ہی تصور میں میری جلتی سلگتی کیفیات سے حظ اُٹھا رہی ہو۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس خبر پر مجھے شاک پہنچا تھا۔ جس نے چند ثانیے کے لیے مجھے سناٹے میں مبتلا کردیا تھا۔

''کب کی بات ہے یہ...؟''

''اِٹ از، نان آف یور بزنس۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے نے مجھے سلگا کر رکھ دیا۔ خدشہ اس بات کا مجھے پہلے تھا کہ سیٹھ نوید پیسے اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر اپنی ضمانت کروانے کی کوشش تو ضرور کرے گا۔ لہٰذا میں اپنے ابال پر قابو پاتے ہوئے بہ ظاہر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا معاملہ خالصتاً تمہارے اور میرے بیچ ہے، کیا تم خود کو اتنا ہی بے اختیار سمجھ رہی ہو کہ تمہیں اس سلسلے میں سیٹھ نوید سے مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آرہی ہے؟ تم خود کیوں نہیں فیصلہ کرلیتیں؟'' یہ بات کہنے کا میرا ایک مقصد تھا، تاکہ میں اسے آئینہ دکھا سکوں۔

''اب جب کہ تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ نوید اور میں مستقبل کے جیون ساتھی بننے والے ہیں تو اس سے میں ہر معاملے میں مشورہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔'' وہ بولی۔ انداز بدستور اس ناگن کا مجھے جلانے والا تھا۔ میں نے بھی بھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تو وقت ہی بہتر بتائے گا کہ دوسروں کی خوشیوں کو اپنے مفادات پر تاراج کرنے والے کس طرح مسرتوں کے محل تعمیر کریں گے، لیکن اس وقت معاملے کی بات ہو جائے تو اچھا ہے، تم خود ہی فیصلہ کرلو... کیونکہ کچھ ہی دنوں بعد عابدہ کی پیشی ہے اور اس کے لائر نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں کم از کم اس سے پہلے امریکا میں ہونا چاہیے۔''

''آئی ڈونٹ کیئر... یہ میرا ہیڈ یک نہیں ہے۔'' وہ پُرغرور لہجے میں بولی۔

''کیا...؟'' اس کے جواب پر میں جیسے سرتاپا سُلگ اُٹھا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو تم؟''

''مائنڈ یور لینگویج مسٹر شہزاد احمد خان...! تمہیں عورتوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے؟'' دوسری جانب سے اس کی غصیلی آواز اُبھری۔ مجھے اسی وقت اس کے بدلے ہوئے تیور اور روکھے لب و لہجے سے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنے عاشق سیٹھ نوید سے اس بارے میں مشورہ کرچکی ہے اور اب اسی رذیل کے کہنے پر اس کا رویّہ بدل گیا تھا۔ ورنہ تو کہاں اڑیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے کے لیے اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگی تھی اور اندازِ گفتگو بھی اس کا میرے ساتھ چاپلوسانہ ہوتا تھا۔

''وہ واقعی عورتیں ہی ہوتی ہیں جن سے تمیز سے بات کی جائے اور تم عورت تو کیا انسان کہلوانے کے لائق بھی نہیں ہو... بلکہ تم ایک ناگن ہو زہریلی ناگن...'' میں بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یاد رکھو ایک بات میری... عابدہ کی مدد کرنا تم پر فرض اور واجب ہے۔ میں جانتا ہوں اچھی طرح سے کہ تمہیں کس نودولتیے سیٹھ نے یہ نئی پٹی پڑھائی ہے۔ اُس سے تو میں نمٹ ہی لوں گا اچھی طرح لیکن تم سے نمٹنے کے لیے میں ابھی پہنچ رہا ہوں...'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کردیا اور طیش میں آکر اپنا سیل فون دور اُچھال دیا۔ مارے غیظ و غضب کے میرا پورا وجود جل رہا تھا، میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ آج جس انداز میں اس حرافہ نے میرے ساتھ گفتگو کی تھی، اگر وہ ناگن میرے سامنے ہوتی تو میں اس کی گردن دبوچ لیتا۔

''ہولا رہے کاکے! یہ وقت غصے کا نہیں ہے۔'' اول خیر نے کہا اور آگے بڑھ کر میرا سیل اُٹھالیا، جو فرش پر بچھے دبیز قالین کی وجہ سے ٹوٹا تو نہیں تھا مگر کھل ضرور گیا تھا اور اس کی بیٹری نکل کر باہر آن پڑی تھی۔ اول خیر نے اسے اُٹھا کر دوبارہ جوڑ دیا۔

''مجھے سرمد بابا مرحوم اور ان کے دونوں چھوٹے معصوم پوتے پوتی (پنکی، دانی) کا خیال آجاتا ہے، اول خیر! ورنہ میں اس حرافہ کو ایسا سبق سکھاتا کہ اسے اپنی اصل اوقات یاد آجاتی۔'' میرا غیظ کم نہیں ہوا تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا، آخر یہ لالچی عورت ایک دم بدل کیسے گئی؟'' اول خیر جھلّائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کہاں تو اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا سن کر یہ ہماری بات پر فوراً آمادہ ہوگئی تھی۔ میرا خیال ہے سیٹھ نوید نے انتقاماً اسے منع کردیا ہے ہمارے ساتھ ڈیل کرنے سے؟ ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اس خبیث سیٹھ نے عارفہ کو ہم سے بدول کرنے کے لیے یہی کہا ہوگا کہ ہم اس کے ساتھ دھوکا کررہے ہیں۔''

AIOURDUBOOKS.NET

‘‘اس خبیث کی ضمانت ہوچکی ہے۔’’

‘‘اوہو....’’ اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

‘‘اسی لیے تو یہ حرافہ زیادہ اُچھل رہی ہے، ضرور اسی نوید نے اسے پٹی پڑھادی ہوگی۔ مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی، نوید کا بھی تو اس میں مفاد شامل ہے؟’’

‘‘مجھے یہ کچھ اور معاملہ لگتا ہے اول خیر...!’’ بالآخر میں نے اپنے اُبال پر قابو پاتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ ‘‘جیسا کہ مجھے شبہ ہے، سیٹھ نوید احمد سانچے والا خود بھی نہیں چاہتا ہوگا کہ یہ شیئرز عارفہ کے ہاتھ لگیں، کیونکہ وہ انہیں لولووش کی ملکیت سمجھے ہوئے ہے اور وہ یہ اُسی کے حوالے کرنا چاہتا ہوگا۔ کیونکہ اس ڈیل کے بعد ظاہر ہے میں اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے قانونی طریقے سے، عابدہ کے حق میں اس کے گواہی دینے کے بعد میں یہ شیئرز واقعی عارفہ کے نام کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔’’

‘‘ممکن ہے یہ بات بھی رہی ہو۔’’ اول خیر نے کہا۔ ‘‘لیکن اب بھی کچھ گڑبڑ ایسی لگتی ہے جس کی وجہ ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو پارہی۔’’

‘‘آخر کیا وجہ ہوسکتی ہے ایسی؟’’

‘‘پہلی تو یہی وجہ ہوگی کہ اس سیٹھ نے عارفہ کو ہم سے ڈرادیا ہوگا کہ ہم اپنا کام نکلوانے کے بعد شیئرز اُسے دینے سے مکر جائیں گے اور دوسرے یہ کہ...’’ اول خیر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

‘‘کون؟ آجاؤ۔’’ میں نے کہا تو زہرہ بانو اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی لفافہ تھا اور چہرے پر کچھ اُلجھن آمیز تاثرات تھے۔ میری نظریں اس کے ہاتھ میں تھمے ایک بڑے سے لفافے پر مرکوز تھیں جو وہ میرے قریب آنے کے بعد میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

‘‘یہ خط تمہارے نام ہے، کورٹ کا لگتا ہے، کیا معاملہ ہے یہ...؟’’ میری پیشانی پہ شکنوں کا جال سا پھیل گیا۔ میں نے خط لیا اور جب اسے کھول کر پڑھا تو میرا دماغ جل اُٹھا۔

‘‘سمجھا!’’ میں دانت پیس کر زہرخند لہجے میں بڑبڑایا۔

‘‘کیا ہے یہ شہزی! کوئی عدالتی نوٹس لگتا ہے؟’’ زہرہ بانو نے میرے چہرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور بولا۔

‘‘اُس حرافہ نے سرمد بابا کی وصیت کو کورٹ میں چیلنج کردیا ہے، اسی سلسلے میں میری تین روز بعد عدالت میں پیشی ہے۔’’

‘‘اوہ....’’ زہرہ بانو کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ اور میں نے اسے مزید تازہ صورتِ حالات سے بھی آگا کردیا۔ جسے سن کر وہ بھی واقعی متفکر سی ہوگئی اور پھر اسی میں بولی۔ ‘‘ایسی صورت میں تو بے چاری عابدہ کے لیے بھی مشکل پیدا ہوجائے گی۔’’

‘‘یہ سب ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا جا رہا ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘مجھے مقدمے میں پھنسانے کا مقصد یہی ہے دشمنوں کا تاکہ میں عابدہ کے سلسلے میں ضروری اقدامات اُٹھانے سے دور رہوں۔’’

‘‘مجھے تو لگتا ہے یہ عارفہ، سیٹھ نوید اور اُس عالمی گینگسٹر لولووش کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔’’ زہرہ بولی۔

‘‘اور یہی دونوں کسی دن اسے ٹھکانے لگانے سے گریز نہیں کریں گے۔’’ میں نے دانت پیس کر کہا۔

‘‘تم نے عارفہ کو اس انداز میں سمجھانے کی کبھی کوشش نہیں کی؟’’

‘‘اُس بے وقوف کو ہر طرح سے سمجھا چکا ہوں۔’’ میں نے تلخی سے کہا۔ میرے لہجے میں قدرے جھلاہٹ آمیز بے بسی عود کر آئی تھی۔ ‘‘مگر اس عیار دماغ سیٹھ نوید سانچے والا نے اُسے اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے اور وہ اب وہی کرتی ہے جس کا وہ اُسے کرنے کا کہتا ہے۔’’

‘‘گویا عارفہ مکمل طور پر اس کے ٹرانس میں آئی ہوئی ہے؟’’

‘‘ہاں۔’’

‘‘تم اور میں چلیں اس کے ہاں!’’ زہرہ نے کہا۔ ‘‘میں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔’’

‘‘وہ نہیں مانے گی۔’’ میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ‘‘میں عارفہ کا نفسیاتی مسئلہ سمجھ گیا ہوں، اُس نے ایک خاصا طویل عرصہ بیماری اور تنہائی میں کاٹا ہے، اس دوران یہ نودولتیا سیٹھ نوید ایک ‘‘دولت مند بیوہ’’ پر ڈورے ڈالنے کی کوشش میں لگا رہا تھا، مگر سرمد بابا کی وجہ سے... اس نامراد کی ایک نہ چل سکی تھی، کیونکہ وہ اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھے، ان کے مرنے کے بعد ہی سیٹھ نوید کو اپنی دال گلانے کا موقع ملا، تو صحت یابی اور آزادی کے بعد عارفہ نے بھی خود کو سیٹھ نوید کے سپرد کردیا۔ میں نے ان کی خلوت کی گفتگو بھی سن رکھی ہے، اس لیے اس میں کوئی مبالغہ آمیزی نہیں کہ ان دونوں کا مستقبل قریب میں کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ لیکن اس وقت وہ کمینہ عارفہ کو میرے خلاف استعمال کررہا ہے اور اس میں لولووش ہی کی ہدایات کارفرما ہے۔’’

‘‘سندرداس والی کامیاب مہم اور اسپیکٹرم کا ایک بڑ

ہ خاک میں ملانے پر لولووش نے ہمیں مکمل طور پر نانے پر رکھ لیا ہے۔’’ اول خیر نے کہا تو زہرہ بولی۔

‘‘لیکن لولووش کی ایک کمزوری اڑیسہ کمپنی کی صورت ابھی تک تمہارے ہاتھ میں ہے شہزی...!’’

‘‘اس کے لیے اس نے یہ حل جو نکالا ہے...’’ میں کورٹ کا جاری کردہ نوٹس زہرہ کے سامنے لہرایا۔

‘‘یہ ضروری تو نہیں کہ اس میں وہ کامیاب بھی ہو۔’’ اول خیر بولا۔ ‘‘ہمارا کیس مضبوط ہے، سرمد بابا کا وکیل ہماری رہنمائی کرسکتا ہے... کیا نام تھا اس کا شہزی؟’’

‘‘ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی...’’ میں نے بتایا۔

‘‘تم ایسا کرو اسے یہاں بلوالو۔’’ زہرہ فوراً مجھ سے لی۔ ‘‘یوں بھی اب سے قانونی طور پر اس نئی صورت حال سے آگاہ کرنا ضروری ہے۔’’

‘‘مجھے اس مقدمے کی کوئی فکر نہیں، نہ ہی اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سے میں کوئی دلچسپی رکھتا ہوں۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘لیکن... اس وقت مجھے سب سے زیادہ اس بات کی فکر ہو ہی ہے کہ آنسہ خالدہ کے مطابق عابدہ کو نو روز بعد کورٹ میں پیش کیا جانے والا ہے اور عابدہ کا کیس اس کے حق میں کرنے کے لیے اس عارفہ کی گواہی اشد ضروری ہے، اس کا کیا جائے...؟’’ میں نے فکرمندی سے کہا۔ کمرے میں ت خاموشی سی چھا گئی۔ خود میرا اپنا چہرہ بھی عارفہ کے انکار اور اس پر مستزاد مجھ پر کیس کرنے پر اُترا اُترا سا نظر آنے لگا تھا۔ مجھے مضطرب الحال اور آزردہ خاطر دیکھ کر اول خیر نے میرے شانے کو حوصلہ افزا انداز میں ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

‘‘ٹینشن نہ لے کاکے! اللہ بہتر کرے گا... بیگم صاحبہ اور ہم کوئی نہ کوئی صورت نکال لیں گے۔’’

‘‘یار! اب کیا صورت نکلے گی بھلا...’’ میں نے کبیدہ خاطر ہوکر کہا۔ ‘‘عابدہ کو اتنا عرصہ ہوگیا ہے، وہ دیارِ غیر میں جانے کن حالوں میں ہوگی غریب، کون ہے وہاں اس کا سوائے خدا کے... وہ میرے کہنے پر اور خداترسی کے نیک جذبے کے ساتھ کسی بیمار کو شفا دلانے کی غرض سے گئی تھی، اور خود دردِ لادوا کی تفسیر بن کر رہ گئی ہے وہاں... وہ ایک ایسے شکنجے میں جکڑ دی گئی ہے کہ شاید وہ بے چاری اپنی زندگی سے بھی مایوس ہوچکی ہو اور اِدھر میں ابھی تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، کتنا بے بس اور بے مایہ انسان ہوں یار میں کہ ابھی تک عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ بھی تو نہیں کرسکا ہوں...’’

مجھے رنجیدہ اور دکھی دیکھ کر زہرہ بانو تڑپ سی گئی اور بے اختیار چند قدم میری طرف بڑھی، غیر اختیاری طور پہ وہ میرے مزید قریب آنا چاہتی تھی لیکن پھر اول خیر کی موجودگی کے باعث وہ میرے بالکل قریب آکر رک گئی۔

‘‘شہزی! کیوں اتنے رنجیدہ ہوتے ہو؟ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم کہو تو میں اس عارفہ کو ایسا سبق سکھاؤں گی کہ وہ خود امریکا جاکر عابدہ کے حق میں گواہی دینے پر مجبور ہوجائے گی۔’’ میں اس کی بات پر بولا۔

‘‘یہی تو سب سے بڑی مجبوری ہے اس مسئلے کی کہ یہ کام زور زبردستی میں نہیں ہوسکتا، ورنہ تو میں ہی عارفہ کو سبق سکھانے کے لیے کافی تھا۔’’

‘‘ہم ایک ڈراما کرتے ہیں۔’’ وہ بولی اور میں اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ آگے بولی۔ ‘‘اس کے دونوں بچوں کو اغوا کرلیتے ہیں۔’’

زہرہ بانو کی بات پر میں نے سختی سے اپنا سر انکار میں جھٹک دیا۔ ‘‘عارفہ کو اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں ایسی کوئی حرکت نہیں کرسکتا، اور کروں گا بھی تو وہ محض ڈراما ہی ہوگا، وہ بڑی کائیاں عورت ہے، سب جانتی ہے، ورنہ سرمد بابا اپنی وصیت میں مجھے اتنی بڑی ذمّے داری کیوں سونپتے۔ یوں بھی بچوں پر اس طرح غلط اثرات مرتب ہوں گے۔’’

‘‘بہت ہی بے ضمیر اور بے حس عورت ہے یہ...’’ زہرہ بانو دانت پیس کر نفرت خیز لہجے میں بولی۔ ‘‘یہ جانتی بھی ہے کہ تم اس کے دونوں بچوں سے کس قدر مخلص ہو اس کے باوجود...’’

‘‘میرے ذہن میں ایک اور حل آتا ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘مجھے شاید اب اس سلسلے میں سیٹھ نوید سے بات کرنی چاہیے۔’’

‘‘تم کیا بات کروگے؟’’ زہرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

‘‘میں اُس سے شیئرز کے سلسلے میں یہ معاہدہ کروں گا کہ... وہ میری لولووش سے بات کرائے، میں عابدہ کے بدلے میں اُسے اڑیسہ کمپنی کے سارے شیئرز دینے کو تیار ہوں۔’’ اس پر اول خیر نے مجھے اپنی ایک پرانی تجویز یاد دلاتے ہوئے کہا۔

‘‘اوخیر... کاکے! یہ مشورہ تو میں بہت پہلے ہی تمہیں دے چکا تھا کہ...’’ اس کی بات درمیان میں رہ گئی، زہرہ

AIOURDUBOOKS.NET

نے اُلجھے ہوئے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”ایک منٹ...! لولوش سے بھلا، عابدہ کے مسئلے کا کیا تعلق بنتا ہے؟“ اس کی بات پر میں نے ایک گہری سانس لی، اسے شاید بہت سی باتوں کا ادراک نہ تھا، یا پھر وہ بھول رہی تھی۔ میں نے اُسے بتایا۔

”لولوش، سی آئی اے افسر باسکل ہولارڈ کا چہیتا داماد ہے، اس کی اکلوتی بیٹی انجیلا کا شوہر ہے وہ...“

”اوہ... شاید تم نے مجھے یہ بتایا تھا...“ وہ قدرے چونک کر بولی۔ ”حیرت ہے، سی آئی اے کا ایک ذمے دار افسر اور اتنے بڑے عالمی گینگسٹر سے اس طرح کی رشتے داری...“

”سی آئی اے کا اصل طریقہ کار یہی تو ہوتا ہے، وہ اپنے بعض وسیع تر مفادات میں ایسے لوگوں سے بھی کام لینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی۔“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”تاہم باسکل ہولارڈ کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں، وہ فطرتاً ایک کینہ پرور اور متعصب یہودی ہے۔ خود پسندی، برتری اور طاقت کا زعم رکھنے والی یہودی قوم کی بھرپور عکاسی اس کے کردار سے جھلکتی ہے، مجرمانہ اور متشدد ذہنیت کا حامل یہ شخص انسان کہلوانے کے لائق نہیں۔ کمزوروں پر ظلم کے پہاڑ توڑنا اس کی جبلّت کا خاصہ ہے۔ خود کو منوانے اور امریکا کے کلیدی اہم اداروں میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے اس خبیث انسان نے باغی امریکی ریاستوں میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خونِ ناحق بہایا۔

”مائی گاڈ!“ زہرہ بانو کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”ی ی... یہ سب تمہیں کیسے پتا چلا شہزی...؟“

”آنسہ خالدہ سے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”یہی وہ ایک فرشتہ صفت مسلم خاتون ہے جس نے عابدہ کے معاملے کو بہت ہائی لائٹ کیا ہے، ورنہ تو وہ مردود باسکل ہولارڈ، عابدہ کو تفتیش کے بہانے اب تک نجانے کہاں گم کرچکا ہوتا۔ یہ خالدہ کی کاوشوں کا ہی ثمر ہے کہ عابدہ کا کیس عدالت تک پہنچا۔ تاکہ اُسے منظر سے غائب نہ کیا جائے، مگر یہاں بھی وہی مخدوش صورتِ حال ہے کہ اگر عابدہ کے حق میں عارفہ کی گواہی نہیں گئی تو دشمن اس گھناؤنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے اور پھر نجانے وہ عابدہ کا کیا حشر کریں۔“

”میرے خدا!“ زہرہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”یقین نہیں آتا کہ بے چاری معصوم عابدہ... نادانستگی میں اتنی بڑی سازش کے جال میں پھنس چکی ہے، اللہ رحم کرے اس معصوم غریب پر...“

”پھنسی نہیں بلکہ پھنسا دی گئی ہے۔“ میں نے کرب انگیز تلخی سے کہا۔

”جے بی سی اب اپنا مکروہ چہرہ چھپانے کے لیے باسکل ہولارڈ کو آگے کھسکا چکی ہے، جو اُس وقت سے ہی عابدہ کو نشانہ بنانے کا پہلے ہی ارادہ باندھ چکا تھا جب وہ عارفہ کے ساتھ امریکا کے ایک اسپتال میں رہتی تھی۔ جب میری عابدہ سے فون پر باتیں ہوتی تھیں تو وہ اس خدشے کا اظہار بھی کرتی تھی مجھ سے... لیکن میں اسے ایک عام کارروائی خیال کر کے اس بے چاری کو خام تسلیاں ہی دیتا رہ گیا، اور وہ جال میں پھنسا دی گئی...“ میرا لہجہ غمگین ہو گیا۔ زہرہ بانو اور اول خیر مجھے تسلیاں دینے لگے اور اسی دوران اول خیر نے دوبارہ اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

”تمہاری تجویز بُری نہیں لیکن لولوش سے رابطہ کرنے کا واحد ذریعہ سیٹھ نوید سانچے والا ہی ہے۔“

”چلو پھر اسی بدبخت پر پتا پھینک کر دیکھتے ہیں۔“ اول خیر کہا۔ ”ممکن ہے وہ ہم سے عارفہ کی غیر موجودگی میں کوئی خفیہ معاملہ داری طے کرنے کی کوشش چاہے۔ وہ کون سا عارفہ کے ساتھ مخلص ہے۔“

دوپہر کا کھانا میں نے زہر مار کیا اور سیٹھ نوید سے ملنے کے لیے اول خیر کے ساتھ میں بیگم ولا سے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

باہر جاڑے کی دھوپ چمک رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک کا سیلِ رواں تھا۔ ہماری کار عیدگاہ روڈ پر آگئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اول خیر بیٹھا تھا اور میں اس کے برابر میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔

ذرا دیر بعد اول خیر نے کار کو عیدگاہ روڈ سے شاہ شمس پارک کراس کرنے کے بعد حسین آگاہی روڈ کی طرف موڑا اور رفتار بڑھا دی مگر جلد ہی اسے بریک پر پاؤں رکھنا پڑے۔ ہمارے عقب سے ایک سیاہ رنگ کی ڈبل کیبن ٹویوٹا ہائی لکس، بہت تیزی کے ساتھ ہمیں کراس کر کے نکلی تھی، اور اس کی سائڈ ہماری کار کو لگتے لگتے بچی تھی۔ اول خیر نے اسی لیے فوراً بریک پیڈل پر پاؤں رکھ دیا تھا۔

”لعنت ہے، نشے میں گاڑی چلا رہا تھا اُلّو کا پٹھا!“ اول خیر غصیلے لہجے میں ڈبل کیبن کے ڈرائیور کو کوستے ہوئے بڑبڑایا۔ میں بھی اس افتاد پر ذرا ہڑبڑا گیا تھا اور خیالات کے بھنور سے نکل کر سامنے دیکھنے لگا، تو دوسرے ہی لمحے ایک اور واقعہ ظہور پذیر ہوا۔

طاقت ور انجن والی ٹویوٹا ہائی لکس کے ٹائر سمع خراش

ان سے چرچرائے تھے۔ ہائیڈرولک ہیوی بریک اور پاورفل باڈی کے زور پر ڈبل کیبن فوراً جامد ہوگئی اگرچہ اول خیر نے بھی غیر ارادی طور پر کار کی رفتار کم کردی تھی لیکن ...... پھر سامنے والی گاڑی کو راستے پر آکر جام ہوتے دیکھتے ہی اس نے بھی بریک پاؤں رکھ دیا تھا پھر اچانک ڈبل کیبن کا انجن غرایا اور وہ کے ساتھ ریورس ہوئی، ہماری کار رکتے رکتے بھی اس حصے سے ٹکرائی، ہمیں ایک زوردار جھٹکا لگا۔ تحمل حواسوں کو قابو کرنے تک ڈبل کیبن ہماری کار کو پیچھے طرف رگیدتی لے گئی، اور رک گئی۔ ہماری کار عجیب خیز انداز میں ترچھی ہوکر رک گئی، میں اور اول خیر خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہی تھے کہ اچانک بین سے کسرتی بدن کے قدرے دراز قامت افراد وں میں پستول لیے ہماری طرف لپکے اور قریب آتے ہی نے غراہٹ آمیز آواز میں کیا۔

”ہالٹ، کوئی حرکت مت کرنا، گاڑی سے باہر نکلو...“

تخاطب کے یکسر اجنبی لب و لہجے اور برآمد ہوتے ی الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ دونوں غیر تھے۔ ایک نے دوسری جانب کی کھڑکی سے اول خیر کو پستول کی نال سے اپنی جگہ محبوس رہنے پر مجبور کر رکھا بکہ اس کے دوسرے ساتھی نے اپنے پستول کی نال کا میرے چہرے کی طرف کر رکھا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب ے تیزی سے دھڑکتے دل میں ایک ہی لفظ اُبھرا تھا...

”ٹائیگر ٹیگ...“

یہ لفظ محض غیر ارادی طور پر ہی نہیں میرے دل و دماغ میں اُبھرا تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک ٹھوس وجہ بھی تھی۔ خالدہ کے ساتھ عابدہ کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ٹیلی فونک ابطے کے دوران، اُسی نے مجھے یہ انفارمیشن دے رکھی تھی ی آئی اے (باسکل ہولارڈ) عنقریب اپنے اسالٹ ”ٹائیگر ٹیگ“ کے دو ٹاپ ایجنٹ میری خفیہ گرفتاری یا کے لیے امریکا سے پاکستان ”لانچ“ کرنے والے ۔ یہی وجہ تھی کہ ان دونوں کی اجنبی اور غیر ملکی صورتیں کر پل کے پل میرا دھیان اسی طرف چلا گیا تھا۔

”کون ہو تم لوگ...؟“ میں نے اپنی کھڑکی... پر اس غیر ملکی چہرے والے سے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اس نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ بھینچ کر ری کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی کہ ان کا تعلق انہی مذکورہ دو ایجنٹوں سے تھا، میں نے دانستہ کسی جارحانہ حرکت سے گریز ہی کیا تھا۔ عابدہ کے حوالے سے ایسا کوئی بھی قدم مجھے ازخود محتاط روی پر مجبور کر دیا کرتا تھا۔

وہ مجھے بازو سے پکڑے اپنی گاڑی کی طرف لے گیا اور عقبی کھلے دروازے سے وہ مجھے لیے اندر سوار ہوگیا۔ اس دوران میں اس کا گہری اور بھانپتی ہوئی نظروں سے جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جلد کا رنگ سپید تھا۔ برطانوی تو نہیں لگتا تھا کہ ان کی سپیدی میں سُرخی گھلی ہوتی ہے، قد دراز اور میرے برابر تھا، جسم بھی کسرتی اور مضبوط ہی دکھتا تھا، چہرہ قدرے لمبوترا اور جبڑے کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں، آنکھیں باریک اور کونے کھنچے ہوئے تھے، آنکھوں کا رنگ ہلکا براؤن مائل نیلا تھا۔ سر کے بال ”کریو کٹ“ تھے، جبکہ اس کا دوسرا ساتھی، جس نے اول خیر کو گن پوائنٹ پہ لیے، ہنوز کار کی سیٹ پر محبوس کر رکھا تھا، نسبتاً درمیانی جسامت کا مگر جسم اس کا بھی ورزشی ہی لگتا تھا، جبکہ چہرہ قدرے گول تھا، سر گنجا۔ دونوں نے سوٹ کوٹ پہن رکھے تھے۔

”میں بغیر کوئی مزاحمت کیے تم لوگوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، بشرطیکہ میرے ساتھی کو چھوڑ دیا جائے۔“ میں نے اس سے کہا۔ میرا خیال تھا مجھے اپنی گاڑی میں سوار کرانے کے بعد اول خیر کو بھی ساتھ لایا جائے گا، مگر ایسا نہ ہوا تو میں نے اس اندیشے پر کہ کہیں، یہ لوگ اول خیر کو کسی قسم کا جسمانی نقصان نہ پہنچا دیں تو وہ بولا۔

”ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ...“

اس دوران میری عقابی نظریں گاڑی کے بیک ویو مرر پر بھی اُٹھ رہی تھیں جہاں سے میں عقب میں اپنی آڑی ترچھی کھڑی کار پہ بھی نظر رکھے ہوئے تھا، اور... تب ہی میں نے دیکھا کہ اس کا دوسرا ساتھی، بہ ظاہر بڑے مطمئن انداز میں مگر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اکیلا ہی بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو، اول خیر مجھے سیٹ پر ایک طرف لڑھکا ہوا دکھائی دیا۔ میرا دماغ بھنا گیا۔

”یہ کیا حرکت کی ہے میرے ساتھی سے تمہارے آدمی نے...؟“ میرے درشت لہجے میں پریشانی اور تشویش کا عنصر بھی غالب تھا۔

”کچھ نہیں کیا اسے۔“ وہ بولا۔ ”محض دستہ مار کے بے ہوش کیا ہے، اس نے ضرور کوئی جارحانہ حرکت کرنے کی

AIOURDUBOOKS.NET

کوشش کی ہوگی، ورنہ میرا ساتھی اس جوابی کارروائی میں اپنا وقت برباد کرنے کا عادی نہیں۔'' اس کی بات سن کر میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اس کا دوسرا گنجے سر والا ساتھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ پستول اب اس کے ہاتھ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دوران میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میں پوری طرح اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ فی الوقت یہ مجھے کہاں اور کس کے پاس لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے؟

گنجے سر والے آدمی نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی، گاڑی کے شیشے ڈارک تھے اسی وقت میرے ساتھ بیٹھے کریوکٹ نے میری آنکھوں پر کپڑے کا ایک عجیب سا غلاف چڑھا دیا۔ ''عجیب سا'' اس لیے میں نے کہا کہ یہ بڑا آرام دہ اور چبھن سے عاری تھا، مگر اہم بات یہ تھی کہ... اس کے پہناتے ہی ایک عجیب سی بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی تھی، اور میرا سر گھومنے لگا تھا۔ پھر مجھے کسمسانے کا بھی موقع نہ ملا تھا کہ اگلے ہی لمحے میں دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

میں نہیں جانتا تھا کہ کب اور کہاں میری آنکھ کھلی تھی۔ لیکن جہاں بھی کھلی تھی، وہ ایک چھوٹا سا کمرا ہی تھا۔ جس کے در و دیوار مجھے لکڑی کے ہی محسوس ہوئے تھے، کیونکہ دیواروں کی سطح پر ''فارمیکا شیٹ'' کا ہی گماں ہوتا تھا۔

سر کے بھاری پن اور ماؤف پڑتے ذہن سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں کافی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔ ممکن تھا مجھے ایک مقررہ مدت کے بعد کلوروفارم کی دوسری ڈوز بھی دی گئی ہو۔

غلاف میرے چہرے سے اب ہٹا ہوا تھا۔ شاید اس کے ناک اور منہ والے حصے کو کلوروفارم میں بھگویا گیا تھا، جسے پہناتے ہی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ مجھے تسلی تھی کہ اول خیر کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ایک تشفی اور بھی میری سمجھ میں آتی تھی۔ یہ مجھے کسی قسم کا کوئی گزند پہنچانے کا ارادہ بہرحال نہیں رکھے ہوئے تھے، ورنہ وہ اول خیر کی طرح میری کنپٹی پر بھی پستول کا آہنی اور کند دستہ ''دجا'' کر مجھے انٹاغفیل کر سکتے تھے۔

بے ہوشی سے ہوش مندی کے وہ تمام مندرجات، جو مکمل حواسوں کے ضامن ہوتے ہیں، جیسے جیسے میں ان کے قریب جا رہا تھا، بہ عین مجھ پر بہت سی چونکا دینے والی باتوں کا بھی انکشاف ہونے لگا تھا۔ پہلا انکشاف تو یہ ہوا کہ میں سطحِ زمین پر نہیں تھا، مگر خلا میں بھی نہیں تھا۔ میں ہلکورے کھا رہا تھا، جیسے کسی کشتی میں سوار ہوں۔ میں پشت کے بل ایک بنک بیڈ (bunk bed) پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ فولادی ہتھک سے بندھے ہوئے تھے جس کی ایک چین بنک کی آہنی ر سے منسلک تھی گویا میں بنک بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ تو سکتا تھا ا کر کھڑا بھی ہو سکتا تھا مگر اس سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ م نے سرِدست ایسا ہی کیا اور بنک سے اُتر گیا، فرش پر پا رکھتے ہی میرے قدم لڑکھڑائے تھے، یہ ہلکورے لینے باعث ہوا تھا یا پھر سر میں چکر آنے کے سبب کہ میں نے بنک کے سہارے ہی سنبھالے رکھا اور گرد و پیش کا جا لینے لگا۔ کمرا مجھے قدرے تکون شیپ کا محسوس ہوتا تھا۔ کی چھت قدرے نیچی تھی، جس پر ایک دیوار کے تلے ا یہ دو ہی بنک بیڈ بنے ہوئے تھے۔ جس پر میں تھا اس اُوپر ایک اور بنک تھا۔ اُس پر میری نظر پڑی تو میں طرح چونک گیا۔ میرا تو یہی خیال تھا کہ میں اکیلا ہی ا کا بک نما کمرے میں قید تھا، لیکن یہاں تو ایک اور شخص تھا جسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ہی نہیں بلکہ پریشانی کا جھٹکا لگا کہ کہیں یہ میرا کوئی اپنا ساتھی تو نہیں تھا؟ اول خیر کا نا سب سے پہلے میرے ذہن میں اُبھرا تھا، تاہم اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔

کمرے میں ہلکے بلب کی روشنی ہو رہی تھی، سید ہاتھ کی دیوار پر ایک ''پورٹ ہول'' (گول کھڑکی) دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ باہر ملگجی سی تاریکی تھی جس پس منظر میں تھوڑا غور سے دیکھنے پر ہلکورے لیتی لہروں شائبہ بھی محسوس ہوتا تھا۔ کمرا بدستور اسی طرح ہلکورے محسوس ہو رہا تھا اور اب تو صاف اندازہ مجھے بھی ہو چلا تھا میں کسی لانچ میں ہوں۔

میرا دھیان پھر دوسرے بنک پر دراز آدمی کی طرف چلا گیا، وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ ہتھکڑی نما زنجیر سے بندھے ہوئے تھے جس کا ایک سرا بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے جڑا ہوا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ میرا کوئی اپنا ساتھی نہ ہو، دھڑکتے دل سے اس کا دیوار کی طرف ڈھلکا ہوا چہرہ اپنی جانب کیا تو چونک پڑا۔ وہ میرا کوئی ساتھی تو نہیں تھا مگر... میرے چونکنے کی وجہ کچھ اور تھی...

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

جواب

کاشف زبیر

انگیٹھی میں آگ دہکتی رہے تو در و دیوار حرارت سے پُر رہتے ہیں... لیکن گر دیوار میں باقی رہ جائے معمولی رخنہ بھی تو انگیٹھی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے اور سرد خیزی ہر شے کو جما دیتی ہے... اس کے دل میں بھی ایک ایسی ہی آگ دہک رہی تھی... اور وہ کسی طور اس دہکتی آگ کو سرد نہیں کرنا چاہتا تھا... تاوقتیکہ اپنا مقصد نہ پالیتا...

جان و مال کے لٹیروں میں گھر جانے والے مسافروں کی دردناک کہانی

میں بس اڈے پر تھا۔ یہاں سے بسیں دوسرے شہروں کو جاتی ہیں۔ ایک ہوٹل کے چھپر تلے رکھی میزوں اور کرسیوں پر مسافر یا آنے جانے والے لوگ بیٹھے تھے۔ میرے سامنے چائے کا کپ رکھا ہوا تھا مگر مجھے اس بدذائقہ چائے سے دلچسپی نہیں تھی، ایک گھونٹ لیتے ہی میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کش لینے لگا۔ صبح کا وقت تھا اور بیشتر لوگ دن میں سفر کرنا پسند کرتے ہیں کیونکہ سندھ کے اس حصے میں ڈاکوراج ہے۔ یہ راج کبھی ہلکا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 24

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میرے چونکنے کی وجہ بظاہر معمولی سہی لیکن ایک بات نے مجھے کھٹکا ضرور دیا تھا کہ اگر متوقع طور پر اغوا کنندگان کا تعلق ''ٹائیگر ٹیگ'' سے تھا تو پھر پاکستان میں ان کا شکار صرف میں یا میرا کوئی ساتھی ہونا چاہیے تھا (اگرچہ میرا ساتھی بھی دور کی بات تھی، کیونکہ اصل شکار تو میں ہی تھا ان کا) تو پھر یہ اُن کا دوسرا ''شکار'' کون تھا؟

میرے ذہن میں یہی سوال بار بار گردش کر رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اسے بھی لگے ہاتھوں میرے ساتھ ہی اغوا کیا گیا ہو۔ یوں اگر ہم دونوں ہی ٹائیگر ٹیگ کے متوقع اور مذکورہ ٹاپ ایجنٹوں کے چنگل میں پھنس چکے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ یہ دوسرا قیدی بھی کوئی معمولی حیثیت کا آدمی نہیں ہو سکتا تھا مگر یہ تھا کون......؟

میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جب میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا تو اسی وقت اسے ہوش آ گیا...... وہ ایک دم ہی ہڑبڑا کر بیٹھنے کی کوشش میں بنک بیڈ اور چھت کے درمیان پھنس کر رہ گیا، کیونکہ اس کا بنک بیڈ میرے بیڈ سے اوپر اور کمرے کی چھت کے قریب تھا۔ نتیجے میں اس کا سر زوردار آواز سے چھت سے ٹکرایا تھا اور بندھے ہوئے ہاتھوں میں بھی اینٹھن ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار ہولے سے کراہ کے رہ گیا تھا۔ تبھی اس کی مجھ پر نگاہ پڑی اور وہ بوکھلا کر بولا۔

''کک...... کون ہو تم؟ اور...... اور، مجھے تم نے یہاں......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی، کیونکہ اسی وقت اس کی نظر میرے دونوں ہاتھوں کے آہنی جکڑ بند پر پڑی تو وہ ہونق سا ہو کر میرا منہ تکنے لگا، ہم دونوں کے چہرے بہت قریب اور آمنے سامنے ہو گئے، فرق صرف یہ تھا کہ وہ بنک بیڈ پر تھا اور میں کھڑا تھا۔

''میرا بھی یہی حال ہے دوست!'' میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا تو وہ اپنا سر جھٹکنے لگا، یوں جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ میں اسے بہ غور تکنے لگا۔ سانولا رنگ، عمر پینتیس چالیس کے لگ بھگ، چہرے پہ ہلکی سی سیاہ داڑھی ابھری ہوئی تھی، سر کے بال گھنے اور بکھرے بکھرے تھے۔ صحت اچھی تھی، قد بھی مناسب ہی معلوم ہوتا تھا، وہ خاصا پریشان اور افسردہ نظر آ رہا تھا، جیسے ان حالات سے پہلی بار سابقہ پڑا ہو...... مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ بظاہر ایک عام سا دکھائی دینے والا یہ بندہ ٹائیگر ٹیگ والوں کو مطلوب کیسے ہو سکتا ہے......؟ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کسی غلط فہمی کے نتیجے میں ان کے چنگل میں آ پھنسا ہو......؟

''تم بھی......؟'' وہ بولا۔

''ہاں! میں بھی......!'' میں نے پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم ہنس رہے ہو......؟ تم ضرور اس کے ساتھی ہو گے۔'' وہ شک بھری نظروں سے میری طرف تکتے ہوئے بولا۔

''تمہاری عقل پر ماتم ہی کر سکتا ہوں دوست!'' میں نے اس بار متانت سے کہا۔ ''دیکھ بھی رہے ہو کہ میرا بھی تم سے کچھ مختلف حال نہیں اور پھر بھی ایسی بے وقوفانہ بات......''

میری بات سن کر وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ صورت و شکل سے وہ خاصا سنجیدہ اور سمجھدار آدمی نظر آتا تھا مگر سادہ لوح بھی لگتا تھا۔ عمر میں مجھ سے آٹھ، دس سال بڑا ہی ہوگا مگر جانے کیوں اس کی حرکات و سکنات کسی پندرہ سولہ سالہ لڑکے جیسی تھیں۔

''سوری یار...... ناراض کیوں ہوتے ہو!'' وہ جھینپ کر بولا۔ ''شاید مجھے غلط فہمی ہو گئی تھی۔''

''شاید نہیں، یقیناً کہو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تم ہو کون؟ اور انہوں نے تمہیں کس مقصد کے لیے پکڑا ہے......؟''

''پکڑا ہے......؟'' وہ چونکا۔ ''مجھے پکڑا کب ہے انہوں نے......؟ میں تو ان کے ساتھ تھا۔''

''کیا......؟'' میں جیسے زور سے چیخا۔ میرے لیے اس کا یہ انکشاف چونکا دینے والا ہی نہیں بلکہ حیران کن تھا۔

''تت...... تم ان کے ساتھ تھے؟'' اب چونکنے اور بوکھلانے کی باری میری تھی۔

''ہاں! لیکن میں اپنے بارے میں بعد میں بتاؤں گا تمہیں۔'' وہ ہنوز مجھے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیونکہ میری حقیقت تم سے زیادہ اہم اور رازداری کی متقاضی ہو گی۔'' میں اس آدمی کی عجیب سی گفتگو پر ایک الجھن آمیز حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ گویا کہاں تو میں خود کو ایک اہم قیدی تصور کیے ہوئے تھا اور اب پتا چلا تھا کہ یہاں تو مجھ سے بھی زیادہ خود کو اہم سمجھنے والا قیدی موجود ہے۔

''یہ بات مت کرو، ان لوگوں کے لیے اہم ہم دونوں ہی ہوں گے۔'' میں نے دوسری طرف گردن موڑ کر پورٹ ہول کی جانب دیکھا، شاید وہاں سے کچھ نظر آ جائے لیکن تاریک خلا کے سوا وہاں کچھ نہ تھا۔ لہٰذا دوبارہ اس کی طرف گردن موڑ کر مزید بولا۔

''ہم دونوں ہی اہم ہیں اور اہم ہی قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھے ہیں، یعنی خطرناک لوگ۔'' میں نے دانستہ ٹائیگر ٹیگ کا ذکر نہیں کیا تھا۔

میری بات نے اسے سوچوں میں گم کر دیا۔ پھر جیسے سر دھنتے ہوئے بولا۔ ''بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے! مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ......'' وہ رکا پھر چلایا۔ ''میرے خدا...! ہم کہیں کسی بحری جہاز میں تو نہیں ہیں؟ یہ کمرا ڈول رہا ہے تھوڑا تھوڑا۔''

''بہت دیر سے تمہیں پتا چلا، خیر دیر آید درست آید۔'' میں نے کہا۔ وہ اب اِدھر اُدھر دیکھنے لگا پھر چھت کو گھورنے لگا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے......'' میں نے اسے یاد دلایا۔ یہ شخص خود میرے لیے ایک معما بنا ہوا تھا، اور حد سے زیادہ پراسرار اور محتاط بھی نظر آ رہا تھا۔ میرے یاد دلانے پر وہ بولا۔

''میں جو کہنا چاہ رہا تھا وہ مجھے پتا چل گیا ہے کہ ہم کسی ٹھوس جگہ پر نہیں بلکہ پانی میں تیر رہے ہیں، او خدایا...... یہ بدبخت کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟''

''صرف تمہیں نہیں، مجھے بھی لے جا رہے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے اس کی تصحیح کرنی چاہی تو وہ اس بار جھلا کر بولا۔

''مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔ مجھے اس وقت صرف اپنی فکر ہو رہی ہے۔ میری بیوی، میرے بچے پریشان ہو رہے ہوں گے کس قدر......''

مجھے اس کی صاف گوئی اچھی لگی تھی اور مجھے اس بھولے سادے انسان پر ترس بھی آیا کہ یہ بے چارہ بال بچے دار تھا۔ تاہم میں بولا۔ ''دیکھو دوست! اس وقت ہم ایک محاورتاً نہیں بلکہ شاید حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس طرح اگر اپنا اپنا منہ موڑے دیوار کی طرف دیکھتے رہیں گے تو کچھ نہیں کر پائیں گے، تم نے وہ محاورے نہیں سنے، ایک اور ایک گیارہ...... اور ایک سے دو بھلے۔''

''میں اکیلا ہی بھلا......'' وہ بولا۔

''جہنم میں جاؤ پھر۔'' میں نے بھی زچ ہو کر کہا اور اس کی طرف سے منہ موڑ کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔

''اے مسٹر! تمیز سے بات کرو مجھ سے...... جانتے نہیں تم کہ کون ہوں میں......!'' وہ اس بار اپنی بھاری اور کھردری آواز کو رعب دار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ میں نے اس کی طرف دیکھے بنا ہی بے پروا انداز میں کہا۔ ''تم خود کو اگر تیس مار خاں سمجھ رہے ہو تو میں بھی طرم خاں ہوں، بس اب تم اپنے فائدے کی سوچو اور میں اپنے فائدے کی سوچوں گا۔'' مجھے بھی اس کی بے رخی اور رکھائی پر غصہ آ گیا تھا۔

دس، پندرہ منٹ اسی طرح خاموشی میں گزر گئے، ہم نے آپس میں پھر کوئی بات نہیں کی۔ میں اپنے طور پر اس کے اور ان دونوں نامعلوم اغوا کنندگان کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کی بات مجھے ابھی تک کھٹک رہی تھی۔ بہ قول اس کے وہ ان کے ساتھ تھا...... یعنی اس کے کہنے کا مطلب تو مجھے یہی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ انہیں جانتا تھا، یا پھر ان کے درمیان...... خاصی دیر تک بات چیت بھی ہوئی تھی۔

وہ خاصا مستقل مزاج ثابت ہو رہا تھا، مزید کئی منٹ بیت گئے مگر اس نے بات کر کے نہیں دی، جبکہ مجھے اندر سے بے چینی کھائے جا رہی تھی۔

اچانک دروازے پر کھٹر کھٹر ہوئی، میں چونکا، وہ بھی بدکا اور جب دروازہ کھلنے لگا تو وہ اپنے بنک سے نیچے میرے ساتھ ہی آن کھڑا ہوا۔ اس کا بنک ذرا اونچا ہونے کے باعث اسے اپنے دونوں ہاتھ بلند کرنے پڑے تھے۔

دروازے سے ایک موٹا تازہ سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا۔ قد اس کا ٹھگنا اور جسم خوب گٹھا ہوا تھا، سر کے بال چھوٹے اور تیل میں چپڑے ہوئے محسوس ہوتے تھے، آنکھوں میں وحشت سی ناچ رہی تھی اور موٹے کالے بھدے ہونٹوں پر سفاکی تیرتی نظر آتی تھی۔ اس نے صرف ایک صدری (بنیان ٹائپ قمیص) پہن رکھی تھی اور نیچے خاصے کھلے گھیر والی شلوار پہن رکھی تھی۔ ایک کان کی لو سے پیتل کا بالا جھول رہا تھا، پہلی ہی نظر میں مجھے وہ کسی جہاز کا خلاصی لگا تھا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ دروازے پر ہی رک کر تھوڑی دیر تک ہم دونوں کو اپنی وحشیانہ نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد ہماری جانب بڑھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا اور اپنی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکال کر دوسرے قیدی کی زنجیر نما ہتھکڑی کھولنے لگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کون سی زبان میں مخاطب کروں؟ اسی اثنا میں وہ قیدی اس سے ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

''دد...... دیکھو! ہم...... مجھے کچھ بھی نہیں معلوم، میں تو خود سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اتنے عرصے سے گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا...... میرا یقین......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا، کیونکہ اسی وقت اس موٹے خلاصی کا ہتھوڑے جیسا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

اس کے حلق سے ''اوغ'' کی کراہ آمیز آواز ابھری اور وہ بے چارہ اپنا مضروب جبڑا ابھی نہ سہلا سکا۔

''اب اپنا منہ بند رکھنا اور شرافت سے میرے ساتھ چلو۔'' خلاصی درشت لہجے میں بولا۔

ان دونوں کے درمیان انگریزی میں ہی گفتگو ہوئی تھی، قیدی کی انگریزی تو صاف اور شستہ تھی لیکن ملاح ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا تھا۔ اس کے لہجے کو میں نے خاموشی سے بھانپنے کی کوشش کی تھی جو مجھے کسی اور ہی خطے کی محسوس ہوئی۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ اگر میں نے بھی بلاضرورت اپنا منہ کھولا تو بحری قزاق نما یہ خلاصی مجھے بھی ایک تیغ جما دے گا اسی لیے میں چپ ہی رہا۔ پھر اس قیدی کو اپنے ساتھ لے جاتے وقت اس نے ایک نگاہِ غلط میرے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔

ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر دیا گیا۔ میں عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر میں کہاں ہوں؟ کہاں لے جایا جا رہا ہوں اور مجھے اغوا کرنے والے آخر کون لوگ ہیں؟ کیونکہ اب تک تو میرا یہی خیال تھا کہ میں ٹائیگر ٹیگ والوں کے ہتھے چڑھا ہوا ہوں، کا اندازہ مجھے ان کے حلیے، زبان اور لب و لہجے سے ہوا اب آنکھ کھلی تو گویا ایک اور ہی جہاں دیکھ رہا تھا۔

ایک جگہ بندھے ہوئے رہنے سے مجھے خود بھی سخت حشت ہو رہی تھی۔ میں منتظر تھا کہ میری بھی کسی کے سامنے پیشی ہو تا کہ حالات کا کچھ علم ہو سکے۔ مذکورہ قیدی سے کچھ امید بندھی تھی اور اس کی باتوں سے اندازہ بھی ہوا کہ وہ ان ''نامعلوم'' افراد یا ''گروہ'' کے بارے میں کچھ جانتا بھی تھا لیکن وہ نجانے کیوں میرے سامنے اپنی زبان کھولنے سے کترا رہے ہوئے تھا۔

میرے پاس اب انتظار کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ تاہم پریشانی سے بڑھ کر مجھے اس بات پر تشویش ضرور ہو رہی تھی کہ عابدہ کا معاملہ کھٹائی میں پڑ سکتا تھا۔ اس کی پیشی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے اور اس کے حق میں گواہی دینے کے سلسلے میں میری کوششیں اکارت جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

عابدہ کو سزا اور امریکا کی بھیانک جیل میں جانے سے بچانے کے لیے میں کچھ نہیں کر پایا تھا اب تک، اس پر مستزاد میں خود غیر یقینی حالات کا شکار ہو گیا تھا۔ میرا اپنا کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کن لوگوں کی قید میں تھا اور ان کا مقصد کیا تھا۔

مجھے عابدہ کو سزا ہونے کے تصور سے ہی ہول آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ پگھلنے لگا اور مجھے کسی طور قرار نہیں مل رہا تھا۔ کبھی دماغ میں آتش فشانی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی تو کبھی بے بسی کے مارے میرا دیواروں سے سر ٹکرانے کا جی کرتا۔ نجانے میں کن لوگوں کی قید میں تھا اور وہ مجھے کہاں اور کس اجنبی سرزمین کی طرف لے جانے کا قصد کیے ہوئے تھے؟

کمرے میں کوئی وال یا ٹیبل کلاک مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ جس سے مجھے وقت کا اندازہ ہو پاتا۔ جبکہ اس تکون کمرے کی دیوار پر بنے واحد کھڑکی نما پورٹ ہول کے پار مجھے ہنوز نیم اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا، جس سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا کہ وقت رات کا ہی ہے۔

بہرکیف...... میرے پاس انتظار کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا سو میں دوبارہ اپنے بنک بیڈ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں کی زنجیر کا جائزہ لیا، وہ ایک اندرونی قفل کے ذریعے بندھی ہوئی تھی جسے چابی سے ہی کھولا جا سکتا تھا، یعنی اس کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی کوئی گنجائش نہ تھی ماسوائے ہتھوڑی کی ضربات کے، جس کا حصول مجھے ابھی ناممکن ہی نظر آ رہا تھا۔

اس وحشی خلاصی کو قیدی سمیت گئے میرے اندازے سے بیس پچیس منٹ ہوئے تھے کہ اچانک دروازے پر آہٹ کی آواز ابھری۔ میرا دل دھڑکا کہ شاید اب ''پیشی'' میری تھی۔ مگر میں اسی طرح بیٹھا دھڑکتی نظروں سے دروازے کی طرف تکتا رہا۔ دروازہ کھلا اور وہی موٹا تازہ غصیلا خلاصی نمودار ہوا، وہ اکیلا ہی تھا۔

''نیچے اترو......'' دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی وہ میری طرف گھورتے ہوئے کرخت لہجے میں بولا۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی، یہ حکم صادر کرنے تک وہ میرے قریب آ کر ہتھکڑی نما زنجیر میں چابی ڈال کر اسے کھولنے لگا۔ میرے جی میں تو آئی کہ ہاتھ کھلتے ہی میں اس پر قابو پانے کی کوشش کروں لیکن ابھی یہ سب قبل از وقت ہی ہوتا۔ کیونکہ مجھے یہاں کے حالات اور ''تیرتے'' محل وقوع کا پوری طرح اندازہ نہ تھا۔ ایک اور بات میرے لیے اچنبھے کا باعث تھی۔ خلاصی ابھی تک مجھے غیر مسلح نظر آ رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنی ''راجدھانی'' کا کچھ زیادہ ہی زعم ہے۔

میرے دونوں ہاتھ آزاد کرتے ہی اس نے مجھے

اگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کمرے سے نکلا اور ایک اوپن ٹاپ راہداری یں آ گیا...... تب ہی ایک خوشگوار سی مگر قدرے خنک سمندری ہواؤں کے جھونکے نے میرا استقبال کیا۔ میری ازدیدہ نظریں بڑی تیزی سے اطراف کا جائزہ لینے لگیں۔ منظر ڈھلتی شام کا ہی تھا۔ میں دنگ رہ گیا...... سمجھا تو میں یہی تھا کہ میں کسی چھوٹی موٹی لانچ پر ہوں مگر...... یہاں تو یرے سامنے ایک سپر ٹاپ لگژری یوٹ (YACHT) کا منظر تھا۔ یہ ایک خاصی بڑی کشادہ اور آرام دہ سفری کشتی ھی، جسے ایڈونچرز پسند طویل سفر میں استعمال کیا کرتے یں۔ اس میں ایک پورے گھر جیسا آرام اور ضرورت کی ہر اشیا موجود ہوتی ہے۔

یک منزلہ یہ یوٹ سفید اور نیلے رنگ کی تھی۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ جلد ہی ہم راہداری سے منسلک ایک ٹین لیس اسٹیل کی نیم گردشی سیڑھیوں کے قریب پہنچے تو اس بحری قزاق نما خلاصی نے مجھے درشت آواز میں اسی کی جانب بڑھنے کا کہا۔ میں اپنا ایک ہاتھ اس کی دھاتی ریلنگ پر رکھے قدمچے طے کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد میں اوپر ایک کھلے اور کشادہ سے رشے پر تھا۔ عرشہ بھی کیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے میں کسی دور فتادہ دل فریب جزیرے کے ساحل پر بنے دیدہ زیب ہٹ کی چھت پہ آ گیا ہوں۔ یوٹ مناسب رفتار سے کھلے پانیوں میں رواں دواں تھی۔ بیکراں سمندر میں جھکتی شام کا یہ منظر دل فریب معلوم ہوتا تھا۔

یوٹ کا ڈیک بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ یہاں کچھ فینسی لائٹس بھی لگی ہوئی تھیں۔ میرے دائیں جانب یوٹ کا نیم وس کی صورت میں شیشے کا بونٹ پھیلا ہوا تھا، جس کی خوب صورت ونڈ اسکرین کے پس منظر میں مجھے لمبے چوڑے پنل کے پار ایک آرام دہ نشست گاہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں ہلکی سبز روشنی تھی، اعلیٰ درجے کا فرنیچر سجا تھا۔ اس کی چھت پر ریلنگ کے سہارے مجھے دو سانولے بدن کی طرح دار حسینائیں کھڑی دکھائی دیں۔ وہ انڈین لگ رہی تھیں مجھے۔ وہ اوپر سے نیچے اور سامنے اطراف میں پھیلے بیکراں سمندر کا نظارہ کرنے میں مصروف تھیں، ایک نے میری رف دیکھ کر ایک فضائی بوسہ بھی اچھال دیا تھا، اور پھر دونوں ی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

سامنے نیم دائرے کی صورت میں مختصر سا فولڈنگ فرنیچر بچھا ہوا تھا جو کرسیوں اور ایک میز پر مشتمل تھا۔ وہاں میں نے ایک نیکر پوش گینڈے کو بیٹھے دیکھا۔ میں اسے گینڈا ہی کہوں گا، جو اپنی جسامت میں ایسا ہی نظر آ رہا تھا۔ خوب گٹھے ہوئے مگر ٹھوس نظر آنے والے جثے کے علاوہ اس کی پیشانی پہ عین درمیان ایک بڑا سا گومڑ بھی نکلا ہوا تھا۔ میں نے ایسے لوگ دیکھ رکھے تھے، جن کی گردن کے پیچھے گدی پر یا سامنے کی طرف تھیلی نما (sac) گلہڑ جھولتا رہتا تھا۔ کسی کے چھوٹے گومڑ کی صورت میں عین پیشانی پر بنا ہوتا تھا۔ اس کی معمولی سرجری کروالی جاتی تھی مگر مستقل طور پر یہ ختم نہیں ہوتا تھا، کچھ عرصے بعد یہ دوبارہ پیشانی پر ابھر آتا تھا۔

اس کا سر گنجا تھا، رنگ قدرے سانولا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں، ناک کچھ چپٹی اور ہونٹ ذرا پتلے تھے، بادیٔ النظر میں مجھے اس کی شبیہ میں منگول نسل کی جھلک صاف محسوس ہوئی تھی۔

اس نے اپنے ٹھوس اور کسرتی جسم پر فقط نیکر اور اوپر صدری نما کوئی شے پہن رکھی تھی۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھرپور جسمانی قوت کا بھی حامل ہوگا۔ اس کے سامنے میز پر ایک بوتل اور دو پیگ رکھے ہوئے تھے۔ ایک خالی تھا، دوسرا ادھ بھرا۔ تین چار خلاصی اس کے دائیں بائیں بظاہر بے پروا انداز میں کھڑے ہوئے تھے۔ باقی چند دوسرے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ چند ایک کو میں نے آنکھوں سے دوربین لگائے دور سمندر کی وسعتوں میں جھانکتے ہوئے مصروف بھی دیکھا۔

ایک بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اسلحہ نام کی کوئی چیز تک نہیں تھی یا پھر کم از کم اس وقت مجھے تو نہیں نظر آ رہی تھی۔ یہ سب مجھے کسی اور ہی قومیت کے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری قومیت کے یہ لوگ کہیں سے بھی ''ٹائیگر ٹیگ'' کے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ جب میں ان کے (ٹائیگر ٹیگ) کے ان دو ایجنٹوں کے ہتھے چڑھا تھا تو میں نے عادت کے مطابق پہلی ہی نظر میں ان دونوں کی شکل و صورت، حتیٰ کہ لب و لہجہ تک بھی ان کی وضع قطع سمیت نوٹ کیا تھا، جو ان سے سر بہ سر مختلف تھا۔ وہ شستہ لہجے میں اور رواں انگلش بول رہے تھے اور لب و لہجے سے وہ امریکی یا برطانوی لگتے تھے لیکن یہ لوگ میرے ان سارے تجزیوں کے برعکس محسوس ہوئے تھے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ پھر یہ کون تھے......؟ اور میں ان کے ہتھے کیسے چڑھ گیا......؟ کہیں میں کسی کے منہ سے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.
SPAGHOL
SINCE 1975

چھین لیا جانے والا ''نوالہ''...... تو نہیں بن کر رہ گیا تھا؟ تاہم ابھی میں نہ جان سکا تھا اور نہ ہی یہ اندازہ قائم کر سکا تھا کہ یہ کون سے ملک کے باشندے تھے؟

مجھے وہ دوسرا ساتھی قیدی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نجانے انہوں نے اس بے چارے کا کیا کیا تھا؟ البتہ ایک لرزا دینے والا خیال ضرور دماغ میں ابھرا تھا کہ کہیں ان خبیثوں نے اس بے چارے کو زندہ ہی تو نہیں سمندر بُرد کر دیا تھا۔

بہرحال...... یہی گینڈے جیسی ساخت کا مالک شخص ہی مجھے ان کا سرغنہ دکھائی دیا تھا جس کے قریب مجھے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔

وہ پہلے تو چند ثانیے اپنی برماتی نظروں سے مجھے گھورتا رہا اس کے بعد شکستہ سی انگریزی میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ......''

اس کی آواز خاصی کھردری اور کھرکھراتی ہوئی تھی جس میں تحکمانہ عنصر صاف عیاں تھا، تاہم میں بھی اس کے چہرے پر اپنی نگاہیں جمائے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے لانے والا اب اپنے متوقع سرغنہ کے عقب میں جا کر سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ اس کی بھی گھورتی نظریں میرے چہرے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

میں دانستہ سردست اس گینڈے سرغنہ کے بولنے کا منتظر رہا، اس کی ایکسرے کرتی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ آگے کو ذرا جھکا اور بوتل سے خالی پیگ کو بھرنے لگا تو بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

''تھینکس......! میں ڈرنک نہیں کرتا......''

''ہم م م......'' اس کے حلق سے ابھرتی اس قلیل سی ہمکاری نما آواز میں بھی مجھے ایک سرسراتی ہوئی سنسنی کا احساس ہوا۔ تاہم اس نے پیگ بھر لیا تھا اور پھر وہی پیگ اٹھا کر اس نے اپنے گٹھے ہوئے وجود کو واپس کرسی کی پشت گاہ سے ٹکا دیا۔ ایک گھونٹ بھرنے کے دوران میں بھی وہ مجھے اپنی برماتی آنکھوں سے گھورتا رہا۔ میں بھی سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔ گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے مجھے میرے پورے نام سے پکارا۔

''مسٹر شہزاد احمد خان......! تم خود کو اب جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی طور بھی ہمارے درمیان سمجھو، کیونکہ اب اسی میں ہی تمہاری بہتری اور ہمارے لیے امن ہے۔''

میں نہیں جانتا تھا کہ اس کی بات کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے مگر میں اس سے جو کہنا چاہتا تھا، وہ ہولے سے کھنکھار کر بولا۔

''بہتر تو یہی تھا کہ مجھے یہ معلوم ہو کہ میں کن لوگوں کے درمیان اور کس حیثیت سے ہوں......''

میں نے اپنے تئیں بڑے نپے تلے انداز میں اس سے ٹو دی پوائنٹ بات کی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر اس کے منگولی چہرے پر ایک تندی کی لہر ابھری، اس کی تنگ گول پیشانی شکنوں سمیت سکڑ سی گئی اور آنکھوں میں کرختگی نمایاں ہونے لگی مگر میں نے بھی اس کے ان تاثرات کا کوئی نوٹس لیے بغیر اپنے چہرے سے کسی بھی قسم کا کوئی ڈر، خوف ابھرنے نہیں دیا۔

میری ایک ہی بات نے اسے جیسے ہتھے سے اکھاڑ ڈالا اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے طیش ناک انداز میں اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا پیگ میز پر پٹخنے کے انداز میں رکھا تو جام چھلک کر میز پر پھیلنے لگا جبکہ بلوریں پیگ الٹی میز کی سطح پر پڑا ہنوز اس کے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کی مٹھی میں دبا رہا اور وہ خود بھی اسی انداز میں تھوڑا جھکا رہتے ہوئے میری جانب خونخوار سی نظروں سے گھورتا رہا۔ میں نے تب بھی کسی قسم کی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ کا تاثر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا اور اسی طرح اطمینان سے جما کرسی پر بیٹھا اسے تکتا رہا۔ وہ شاید اپنی منگولوں والی فطرت پر اترنے لگا تھا۔

''آئندہ ہم سے کوئی سوال کرنے کی جرأت مت کرنا...... گریٹ ماسٹر کا ایک ہی قول ہے، جو قیدی یا مفتوح سوال کرے اس کی زبان کاٹ کر پھینک دو۔'' بھیڑیے جیسی غراہٹ تلے یہ کہتے ہوئے اس نے اسی طرح جھٹکے جیسے انداز میں اپنے نیکر کے اندر سے ایک عجیب طرح کا چاقو نکالا، عجیب اس طرح کہ چاقو کا پھل دودھاری تھا۔ ایک طرف تو تیز چمکتی دھار تھی تو دوسری کانٹے دار۔ نجانے اس نے کس کو ''گریٹ ماسٹر'' کہا تھا جس کے قول کا پاس نہ کرتے ہوئے اس نے میرے ساتھ بڑا احسان جتایا تھا۔ لمحہ بھر کو متوقف ہونے کے بعد وہ قدرے سیدھا ہوا تو اس نے جام بھی اٹھا لیا جو اس نے ابھی تک اپنی غصے سے بھنچی ہوئی مٹھی کی گرفت سے نکالا نہیں تھا۔ چھلکنے کے بعد وہ نصف رہ گیا تھا۔

''بہتر ہے۔'' میں نے مصلحتاً ہولے سے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ وہ سیدھا ٹک کر بیٹھ گیا اور اسی کرختگی کے انداز میں بولا۔

''آئندہ محتاط رہنا۔'' کہتے ہوئے اس نے دھمکی کا ایک اور گھونٹ بھرا۔ میرے اس طرح تحکمانہ انداز میں

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بولنے سے اس کی نجانے کون سی جبلت کی تسکین ہوئی تھی لیکن مجھے یہ آگاہی مل گئی تھی کہ مجھے مفتوح رہتے ہوئے اس کی کون سی کمزوریوں سے کھیلنا ہے۔ کیونکہ میں ابھی تک اندھیرے میں تھا۔ مجھے ایک ذرا بھی ان کے بارے میں اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔

"گڈ! مجھے یہی انداز پسند ہے۔" وہ بولا۔ میں بھی اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور بلی کے تھیلے سے باہر نکلنے کا بے چینی کے ساتھ منتظر رہا۔

"تم سب سے پہلے خود کو ہمارا قیدی ہی سمجھو اور اس سے زیادہ مالِ مسروقہ بھی۔ تمہاری بیک وقت یہی حیثیت ہے لیکن ساتھ ہی تمہیں ہمارا احسان مند بھی ہونا چاہیے کہ ہم نے تمہیں ایک بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بھی بچا لیا ہے، دوسرا احسان تمہیں ہمارے گریٹ ماسٹر کا یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے ہمیں تمہارے سلسلے میں خصوصی طور پر یہ ہدایات بھی دی ہیں کہ تمہیں ہماری قید میں کسی قسم کی کوئی بھی تکلیف نہ ہونے پائے مگر یہ بھی یاد رہے کہ گریٹ ماسٹر کی تمہارے سلسلے میں یہ رعایت مکمل طور سے مشروط ہے، اس وقت تک جب تک تم ہم سے تعاون کرتے رہو گے، یعنی چپ چاپ ہمارے حکم کی تعمیل اور بس......"

"اس کے لیے میں تمہارے گریٹ ماسٹر کا مشکور رہوں گا اور میری کوشش بھی یہی ہوگی کہ اس نے میرے سلسلے میں جو شرط رکھی ہے اس سے مستفید ہوتا رہوں۔"

میں نے اندر سے بڑے کڑے اور بظاہر حتمی انداز میں کہا۔ یہ کہتے ہوئے زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی عزتِ نفس کے مجروح ہونے کا بھی بڑی شدت سے احساس ہوا تھا۔ کسی کے آگے اس قدر تعمیل میں جھک جانا میرا شیوہ نہیں تھا لیکن حقیقت بھی یہی تھی کہ میں اس سے پہلے اس طرح کے غیر یقینی حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ میرے پیروں تلے اول تو زمین ہی نہیں تھی، تھی بھی تو بحرِ رواں پر، جس کی سرحدوں اور ساحلوں کا مجھے کچھ بھی اندازہ نہیں تھا۔

اپنے دیس کی سرحدوں میں ہونے کی اور بات ہوتی ہے، اور باہر اور...... اسی لیے...... پل کے پل ان سارے معاملات کا ادراک کرتے ہوئے میں نے بھی حسبِ حالات اپنے اوپر سے جنگجو شہزی کا لبادہ اتار پھینکا تھا۔ یہ انداز عارضی تھا۔ حالات اور اپنے دفاع کا جہاں اور جیسے بھی ادراک ہوتا...... میں پھر پیچھے ہٹنے اور جھکنے والا نہیں تھا۔ کیونکہ سرحد پار ہونے کا میرے نزدیک ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ...... میں جلد بہ دیر عابدہ کے قریب ہونے والا ہوں۔

"تھ...... تھ...... تھ" میری بات پر اس نے پیگ والا ہاتھ اپنے پیچھے ہاتھ لپیٹے کھڑے ساتھی کی طرف اونچا کیا، اس نے فوراً اس کے ہاتھ سے پیگ لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لیا تو گینڈے نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجائیں، پھر اس بار اپنا خالی ہاتھ اونچا کیا تو عقب میں کھڑے اسی خلاصی نے مؤدبانہ انداز میں دوبارہ اسے وہ پیگ تھما دیا۔

"مجھے...... سے جی کوہارا...... کہتے ہیں......" کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے میری جانب بڑھایا اور میں نے بھی گویا طوعاً و کرہاً اپنا ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ مجھے اعتراف تھا کہ اس کا ہاتھ گرفت میں لیتے ہی مجھے اس کے گینڈے جیسے توانا بدن میں ٹھاٹھیں مارتا، طاقت و توانائی کا ایک سمندر موجزن محسوس ہوا تھا۔ اس خنک موسم میں بھی اس کے ہاتھ کی گرفت میں ایک گرمی کا احساس اس کی رگوں میں دوڑتے لہو کی گرماہٹ کا پتا دیتی تھی، جسے لپکنے جھپکنے اور پلٹ کر جھپٹنے...... جیسے بہانوں کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

اس کا نام مجھے اس کی ہیئت کی طرح عجیب ہی محسوس ہوا تھا...... سے جی کوہارا...... یہ کس خطے کے باشندے کا نام ہوسکتا تھا؟ میں اندازہ ہی لگاتا رہ گیا مگر جانے کیوں مجھے ساتھ ہی یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ میں اس سے کسی کم خطرناک صورتِ حالات کا شکار بھی نہیں ہوں...... بہت سنبھل کر، بالفاظ دیگر پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا مجھے۔

ایک بھرپور مصافحے کے بعد ہم دونوں ہی اپنی کرسیوں کی پشت گاہوں سے ٹک کر سیدھے ہو کے بیٹھ گئے تھے۔ کسی قسم کی جلد بازی میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی، جبکہ مجھے اپنے بجائے اس کے منہ کے "کھلنے" کا انتظار بڑے صبر و استقامت سے کرنا تھا۔ دشمن اس بار نجانے کس انداز میں اور اپنی پوری قوت کے ساتھ مجھ پر حاوی ہو چلا تھا، اور مجھے اس کی "سائیکی" کو سمجھ کر آگے بڑھنا تھا، اسٹیپ بائی اسٹیپ۔

لہٰذا میں خاموش رہا اور بظاہر بے پروا انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا، مقصد اسے اب میرا یہ جتانا تھا کہ مجھے کچھ "جاننے" کی مطلق پروا نہ تھی۔

"یہ کشتی بہت خوب صورت ہے...... خاص طور پر......" آخر میں یہ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ تھوڑا سر اٹھا

ن کی چھت کی ریلنگ کے ساتھ لگی کھڑی ان دونوں نیم لڑکیوں کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ میں نے دانستہ اسے کچھ دکھانے اور اپنے آپ پر رانے کے لیے کی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ بڑی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اپنی طرف سے اس آنکھوں اور پیشانی پر الجھن آمیز سلوٹیں ابھارنے میں اب رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میرے بارے بہت سی باتوں کے سلسلے میں پہلے ہی سے بریفنگ" دے دی گئی تھی۔ میرا مزاج، فطرت اور وہ جس سے میرے دیدہ و نادیدہ دشمن کسی نہ کسی الے سے واقف تھے۔ یہی سبب تھا کہ اس کی آنکھوں نے والی الجھن اور پیشانی پر پڑنے والی سلوٹیں والی "بریفنگ" کی نفی کرتی محسوس ہوئی ہوں گی۔

"تم عورتوں میں دلچسپی لینے والے تو نہیں لگتے......" نے شاکی نظروں سے میری جانب دیکھا اور میں چونکا۔ کی بات میرے لیے خلافِ توقع تھی، یوں تو اس کا غصیلا ایسے ہی لوگوں جیسا تھا جو بات بات پر یکدم بھڑک تے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں میرا ذاتی تھا کہ وہ عاقل بھی ہوتے ہیں مگر ان کی غصہ ور طبیعت عقل کے آگے مانع رہتی ہے۔ اسی لیے مجھے توقع نہ تھی وہ بہت جلد میرے بارے میں اس طرح کی بات کر لے گا۔ میں نے بات بناتے ہوئے جھینپی جھینپی مسکراہٹ سے کہا۔

"انسان کا مزاج بدلتے ہوئے موسموں جیسا ہی ہوتا مسٹر سے جی کوہارا......! ویسے پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیسے میرے بارے میں ایسا شریفانہ اندازہ قائم کرلیا......؟"

"تم بہت دلچسپ آدمی ہو......" وہ پہلی بار مسکرا کر ستانہ انداز میں بولا۔ "بات تمہاری بھی ٹھیک ہی ہے...... یہ اندازہ میں نے یہ دیکھ کر لگایا تھا کہ تم شراب کو چھوتے نہیں اور ذوق رکھتے ہو شباب کا......"

میں اس کی بات پر لاحول ہی پڑھ سکتا تھا جو اس طرح کی خرافات کو "ذوق" کہہ رہا تھا لیکن مجھے تو اس کی ہاں میں ہاں ملانی تھی اور ساتھ ہی اپنی "حیثیت" کو بھی رکھتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم اٹھانا تھا۔

"بعض لوگ یہ دونوں ذوق رکھتے ہیں اور کچھ لوگ صرف ایک......" بادلِ ناخواستہ مجھے بھی اس طرح کی گی کی سطح میں اترنا پڑا...... ٹھیک اسی وقت ایک خلاصی نما کارپرداز اس کی طرف آیا۔ اس نے ہاتھ میں سنگل لینس ٹیلی اسکوپ تھام رکھی تھی۔ وہ مؤدبانہ انداز میں اس کے کان کی طرف تھوڑا جھکا اور نیچی آواز میں اس سے کچھ کہا۔ میں نے کان دھرنے کی سعی چاہی مگر زبان میرے لیے اجنبی تھی۔ کوہارا کو میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے نووارد کے ہاتھ سے دوربین لی اور ڈیک کی ریلنگ کی طرف چلا گیا۔ پھر اپنی ایک آنکھ سے لگا کر دور سمندر کی وسعتوں کی طرف کچھ دیکھتا رہا...... پھر اس نے اپنے اسی آدمی کی طرف بڑھ کر، جو تکون کمرے سے مجھے لایا تھا، سے تحکمانہ انداز میں کچھ کہا، اس نے جواباً مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی اور وہ آدمی فوراً کیبن کی طرف جانے والے ایک گلیارے کی طرف بڑھ گیا۔ اس اثنا میں کوہارا اپنی کرسی کی طرف آیا مگر بیٹھا نہیں۔ اس کے چہرے پر گمبھیر تا طاری تھی، اسے اپنی جانب تکتا پا کر میں بھی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہمارے کچھ دوست مہمان یہاں پہنچ رہے ہیں...... تمہیں یقیناً اُن سے مل کر کوئی خوشی تو نہیں ہوگی لیکن...... اس میں تمہارا فائدہ ہی ہوگا۔" اس نے اسی لہجے و انداز میں مجھ سے کہنا شروع کیا اور جانے کیوں مجھے اپنے وجود میں نامعلوم سی سرسراہٹ کا احساس ہونے لگا۔

"لیکن معاملہ ایک ڈیل کا ہے...... تمہارے کسی نقصان کے بغیر...... مگر شرط وہی ہے جو گریٹ ماسٹر اور اس کے دوست چاہتے ہیں، یعنی تعاون اور تعمیل...... دیٹس اِٹ۔"

"بہت بہتر......" میں نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

"گڈ......" اس نے چہک کر اپنی باچھیں پھیلا دیں۔ اس کم بخت نے دھونس دھمکی سے مجھے اپنا "معمول" بنا لیا تھا اور ظاہر ہے میں بھی اس وقت تک ہی مجبور تھا جب تک کہ مجھے حالات کا صحیح طرح ادراک نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ اس بار میں یکسر مختلف حالات سے دوچار تھا...... جو غیر یقینی اور اپنے ہی خطرناک بھی معلوم ہوتے تھے۔

"بیٹھ جاؤ......" اس نے کہا اور خود بھی اپنی کرسی سنبھال لی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کہیں سے بگل کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی لہروں کے شور کے سنگم میں کسی بھاری انجن کی گھرگھراتی آواز بھی سنائی دی تھی۔ شاید اس کے دوست مہمان پہنچ گئے تھے۔ کوہارا اسی طرح اطمینان سے بیٹھا شغل کرتا رہا، جبکہ میرا سکون غارت ہوگیا تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

بگل بجتے ہی عرشے پہ ہلچل سی مچ گئی۔ تب ہی مجھے کوہارا کے عقب میں ڈیک کی ریلنگ کے پار کسی لانچ کا۔۔ مستول اور اوپری حصہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ایک نسبتاً بلند مستول پر مجھے جس ملک کا پھریرا لہراتا نظر آیا، اسے دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا اور ساتھ ہی جسم میں سنسنی دوڑتی چلی گئی۔

وہ مخصوص پھریرا انڈین نیول آرمی کا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ میں بحرِعرب یا بحرِ ہند کے کسی سی چینل پر اور انڈیا کے ساحل کے قریب تھا۔ صورتِ حال کچھ کچھ اپنی تمام تر خطرناکی کے ساتھ مجھ پر آشکارا ہونے والی تھی، سب سے پہلے تو یہ حقیقت واضح ہوئی تھی کہ میں کہاں تھا، دوسرے یہ کہ انڈین نیول آرمی کا پرچم دیکھ کر میرے ذہن میں بلیو تلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کا تصور ابھرا تھا اور یہ دونوں ہی حقیقتیں کم از کم میرے حق میں نہیں تھیں۔

”تمہارے مہمان آگئے ہیں شاید۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں بھی چپ رہا۔ البتہ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی، اس میں کیا شک تھا کہ آنے والے یہ ”مہمان“ مجھے جانتے تھے اور میرے لیے ہی یہاں آئے تھے۔

مزید تھوڑی دیر اسی ہلچل میں گزری اور پھر میں نے دیکھا...... جس گلیارے میں کوہارا...... کا پہلے والا کارپرداز غائب ہوا تھا وہیں سے وہ دوبارہ نمودار ہوا تو اس کے ہمراہ تین افراد اور بھی تھے جو بہترین تراش کے سوٹ میں ملبوس تھے۔ سے جی انہیں دیکھ کر اطمینان بھرے انداز میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، جبکہ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی کرسی پر جما بیٹھا رہا۔ بلیو تلسی اور کرنل سی جی بھجوانی کا مکروہ تصور ذہن میں ابھرتے ہی میرے اندر کا جنگجو شہزی بیدار ہونے لگا تھا۔

یہ وہ ذلیل لوگ تھے جنہوں نے میرے باپ پر تشدد کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے، میں ان خبیثوں کو کیسے معاف کرسکتا تھا۔ اب مجھے تقدیر کے اس ”بہانے“ پر یقین آرہا تھا کہ وہ مجھے اس طرح حادثاتی طور پر ہی سہی، اپنے ملک کی سرحد سے دور کرکے کون سے کام لینا چاہتی تھی۔

کوہارا ان کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر میں نے اپنی کرسی نہیں چھوڑی تھی اور بدستور اسی طرح اپنی جگہ جما بیٹھا ان تینوں کی جانب دیکھے جارہا تھا۔ ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ ایک مرد خاصا پختہ عمر اور خاکستری رنگت، چوڑے شانوں والا درمیانہ قامت تھا، سر بیچ سے گنجا اور قلمیں بڑھی ہوئی تھیں جہاں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے سفید براق رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا، جبکہ دوسرا مرد نسبتاً قدرے دراز قامت اور جوان تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا۔ چہرے کے نقوش خوبرو تھے، صحت اچھی تھی، اور لڑکی بھی جوان اور خاصی حسین نظر آتی تھی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر سمندری ہواؤں میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ اس کا کتابی تھا۔ اس نے اپنی دلنشیں آنکھوں پر سیاہ نفیس فریم والی عینک چڑھا رکھی تھی جو اس کے صورت خوب چہرے پر جچ رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے چوبیس پچیس سال سے زیادہ کا نہیں محسوس ہوتا تھا۔

جوان مرد اور اس لڑکی نے سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ لڑکی بھی کوٹ سوٹ میں جچ رہی تھی۔ وہ قریب آئے تو تینوں ہی میری جانب بڑے غور سے دیکھنے لگے، پختہ عمر کا آدمی مجھے خاصا خرانٹ محسوس ہوا جبکہ جوان مرد اور عورت خاصے چالاک اور تیز دکھائی دے رہے تھے۔

”ہائے گائیز...... ویل کم ٹو مائی یوٹ!“ کوہارا نے ان کے استقبال کے لیے اپنے دونوں بازو پھیلاتے ہوئے دوستانہ خوشدلی سے کہا اور باری باری انہوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ خرانٹ مرد اب کی بار خاصی تیز نظروں سے مجھے گھورنے لگا تھا جبکہ جوان مرد کی چابک دست نظریں تیزی سے اب اطراف میں گردش کررہی تھیں اور لڑکی مجھے عجیب سی نگاہوں میں لیے ہوئے تھی۔

ان لوگوں کے درمیان مختصر سے رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر اسی وقت کوہارا نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تھا اس کے میری طرف دیکھنے کے انداز میں گھورنے کا عنصر محسوس کرکے ناچار میں نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا مگر میں نے ان تینوں سے ملنے کی کوشش کی نہ ہی مصافحے کے لیے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ تب ہی کوہارا نے ان سے تعارف کے طور پر فقط میرا نام بتایا اور آخر میں ان کا تعارف کراتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولا۔

”ان سے ملو مسٹر شہزاد......! یہ چندر ناتھ ہیں۔“ اس نے اسی سفید سوٹ پوش اور پکی عمر کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے ساتھ کھڑے نسبتاً جوان مرد کا بھی تعارف کرایا، جس کا نام شیام پانڈے تھا جبکہ عورت کا مس کوریلا بتایا گیا تھا۔

میں نے ان کی طرف دیکھ کر کوئی جنبش نہیں کی تھی مگر پکی عمر والے چندر ناتھ نے اپنی گول گول چندی آنکھوں سے گھورتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا، اس کی نظریں بالکل سپاٹ تھیں، ناچار مجھے بھی اس سے ہاتھ ملانا پڑا، پھر باری باری اسی طرح مجھ سے اس کے باقی دونوں ساتھیوں نے بھی ہاتھ ملایا۔

چند ثانیوں بعد کوہارا نے مجھ سمیت اپنے مہمانوں کو اندر کیبن میں چلنے کا کہا۔ جبکہ اس کا ہم زبان و ہم نسل کارپرداز، ہم سے ذرا دیر پہلے ہی واپسی کے لیے مڑ چکا تھا، اور ہم پانچوں گلیارے سے گزرتے ہوئے اندر ایک کشادہ کیبن میں آگئے۔

کیبن کی شان ہی نرالی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں کسی عالیشان کوٹھی کے پُرتعیش ڈرائنگ روم میں آگیا ہوں۔ اس کی سج دھج ہی کسی بیش قیمت محل کی آرام دہ اور کشادہ نشست گاہ سے کیا کم ہوگی۔

ضرورت کی کیا شے تھی جو وہاں موجود نہ تھی۔ اعلیٰ درجے کا فرنیچر، گول اور قدرے بیضوی چھت سے جھولتا فانوس، فینسی لائٹیں، ایک طرف بار کاؤنٹر بنا ہوا تھا، وہاں کوہارا کا ایک آدمی وہسکی اور پیگ نکالنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ کھڑکیوں کے دیدہ زیب پردے سرکے ہوئے تھے جہاں سے باہر تاریک پڑتے سمندر کا نظارہ تھا۔

ہم سب وہاں نیم دائرے کی صورت میں بچھے فرنیچر پر براجمان ہوگئے۔

اس دوران میں باری باری ان تینوں کے بشروں کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں مکاری مگر دلآویز لبوں پر معنی خیز سی مسکراہٹ رقصاں تھی، اس میں بھی میرے لیے کسی طنز کا عنصر ہی غالب نظر آیا تھا مجھے، جبکہ اس کے ساتھی جوان مرد کا چہرہ سپاٹ تھا البتہ چندر ناتھ کے چہرے پر سنجیدگی اور قدرے ناگواری کے تاثرات تھے، اور یہ ابھی اچانک ہی اس کے چہرے پہ نمودار ہوئے تھے، اس کی وجہ کا مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنے اس قیاس کی تصدیق بھی ہوگئی۔ وہ ہم سے پہلے وہاں موجود تھا۔

سے جی کوہارا کا وہ خاص اور ہم نسل کا کارپرداز جس کا نام مجھے بھومک معلوم ہوا تھا، کیونکہ اسی وقت کوہارا نے اسے اپنی زبان میں آواز دے کر بلایا تھا اور ساتھ ہی ایک مخصوص اشارہ بھی کیا تھا، وہ فوراً اس کے قریب آکر رکوع کے بل اس کی بات سننے کے لیے جھک گیا اور نجانے پھر کوہارا نے اس سے کیا کہا تھا۔ وہ مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی حرکت دیتے پلٹ کر کیبن نما اس پُرتعیش نشست گاہ سے نکلتا چلا گیا۔

”میرا خیال ہے بات کرلی جائے سی جی بھجوانی صاحب سے......؟“

دفعتاً کوہارا نے چندر ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کرنل بھجوانی کا ذکر سنتے ہی میرے اعصاب شل ہونے لگے...... دل کی دھڑکنیں جو پہلے ہی موجودہ حالات پر بے طرح بے ترتیب تھیں۔ اب کوہارا کے منہ سے اس خبیث کا نام سن کر بتدریج مجھے اپنے ان اندیشناک خیالات کی ازخود ہی تصدیق ہونے لگی تھی، جس سلسلے میں کچھ پوچھنے سے کوہارا نے مجھے سختی بلکہ درشتی سے منع کررکھا تھا۔ تاہم میں اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پائے خاموش بیٹھا رہا کہ اور مزید جانے کیا کیا کچھ پردۂ غیب سے سامنے آنے والا تھا۔

”مسٹر کوہارا......!“ چندر ناتھ نے جواباً ایک نظر غلط سی میرے چہرے پہ ڈالتے ہوئے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”پہلے ہمیں یہ تو پتا چلے کہ یہ یہاں ہے کس حیثیت سے؟“

میں نے دیکھا، اس کی بات پر کوہارا کے چہرے پہ پہلے چونکنے اور پھر قدرے بدمزگی کے تاثرات ابھرے جس پر اس نے ہلکی مسکراہٹ کی ملمع کاری سجاتے ہوئے کہا تو اس کے جملوں اور لہجے میں ایک طرح کے دبنگ اور دبدبے کا عنصر غالب تھا۔

”یہ یہاں اسی حیثیت سے ہے جو ہم اور تم چاہتے تھے۔“

”لیکن......“ چندر کچھ کہتے کہتے رہ گیا۔

”گریٹ ماسٹر کا یہی انداز ہوتا ہے مسٹر چندر ناتھ! ان کا اپنا ایک اصول ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا“ کوہارا یہ کہتے ہوئے ایک لحظے کے لیے رکا اور پھر اس بار بڑی کاٹ دار سنجیدگی سے اپنا پہلا سوال دہرا دیا۔ اس کی بات سن کر چندر ناتھ نے بے اختیار کچھ اس انداز کی ہمکاری خارج کی جیسے اسے اپنی طبیعت کے برخلاف کوئی بات برداشت کرنا پڑ رہی ہو۔ تاہم اس نے اپنے گنجے سر کو بھی خفیف سی جنبش دی تھی اور ساتھ ہی اپنی جیب سے ایک بڑا ٹیب نما سیل نکال کر کوئی نمبر ملانے لگا۔

”چیف...... ! مشن چیزڈ...... آگے کیا حکم ہے؟“

رابطہ ہوتے ہی چندر ناتھ نے انتہائی مؤدبانہ لہجے میں کہا اور پھر دوسری طرف سے اپنے ”چیف“ کی کسی بات پر ”یس“ کہتے ہوئے اس نے فوراً سیل کوہارا کی طرف بڑھا دیا اور ساتھ ہی ہولے سے بولا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

"چیف آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

کوہارا نے اس سے سیل لے کر اپنے کان سے لگایا اور گمبھیر آواز میں بولا۔ "ہیلو! مسٹر بھجوانی! آپ سے کیا گیا وعدہ پورا ہوا...... اب آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوسری جانب سے اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔

"اس کی فکر نہ کریں...... بہتر یہی ہوگا کہ آپ اپنی مہلت کے اندر اندر یہ کام جتنی جلدی ہو سکے، اسے نمٹا دیں کیونکہ ہمیں بہت جلد آگے بھی روانہ ہونا ہے۔ جی...... جی، اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں، ہماری دوستی اور ساتھ نبھانے کی بنیاد ہی اس بات پر قائم ہے کہ ہم اسی طرح ایک دوسرے سے تعاون کرتے رہیں اور کامیابیاں ہمارا مقدر بنتی رہیں...... او...... اچھا! آپ ابھی ماسٹر سے بات کر لیں، پھر میں کروں گا اور...... آپ کا آدمی عارضی طور پر آپ کے حوالے ہوگا......"

اس کے بعد اس نے سیل دوبارہ چندر ناتھ کو دے دیا۔

میں بظاہر خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھا، دھڑکتی سماعتوں سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ہی مجھے کئی باتوں کا ادراک بھی ہوتا جا رہا تھا۔ یہ عارضی طور پر میری کرنل بھجوانی کو حوالگی، میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

اس سارے کھیل میں اب میرے دماغ کے اندر کرنل سی جی بھجوانی کا نام تو پختہ ہو ہی چکا تھا، البتہ اب کوہارا کی باتوں سے "لولوش" کے نام کا بھی اضافہ ہو چلا تھا۔

ایک اور بات کا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہاں بوٹ میں کوہارا اپنے ہم نسلوں سے اپنی زبان میں (جو میرے لیے اجنبی تھی) میں باتیں کر رہا تھا لیکن اپنے "گریٹ ماسٹر" سے اس نے انگریزی ہی میں بات کی تھی جس کا مطلب تھا کہ کوہارا اگر (میرے اندازے کے مطابق) لولوش کا مقربِ خاص کارپرداز تو تھا لیکن وہ اس کی قومیت یا علاقے سے نہیں تھا۔

کوہارا نے بھومک کو اشارہ کیا، اس نے بہ یک ترنت ایک آٹو موبائل ڈیوائس اس کے سامنے لا کر ٹیبل پر رکھ دی، جس کا کوئی بٹن بھومک پش کر چکا تھا یہی وجہ تھی کہ ذرا ہی دیر بعد اس سے ہلکی بپ کی آواز ابھری اور کوہارا نے ایک آلۂ سماعت جیسی کوئی شے اپنے کان میں پھنسا دی اور صوفے سے اپنی پشت ٹکا کر آرام سے بیٹھا رہا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی سے انتہائی مودبانہ انداز میں باتیں کرنے لگا۔

"ماسٹر! تو پھر اجازت ہے؟ قیدی ان کے حوالے کر دیا جائے؟"

"جی جی...... ماسٹر! میں کہہ دوں گا ان سے کہ قیدی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ اس کے علاوہ میں اس سے بھی بات کر لوں گا۔ بھومک ساتھ جائے گا۔"

اس کے بعد اس نے چندر ناتھ کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔ اس دوران میں خلاصی ان کے سامنے ڈرنکس رکھ چکے تھے۔

کوہارا شاید لولوش سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی زبانی یہ سن کر اچنبھا بھی ہوا اور ایک طرح سے دلی طمانیت کا بھی احساس ہوا تھا کہ یہ نہ صرف مجھے سردست کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے بلکہ کسی اور کو بھی مجھے کوئی گزند پہنچانے سے مانع رکھے ہوئے تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ چندر ناتھ کا موڈ پھر آف ہونے لگا تھا، تاہم ابھی وہ کچھ بولا نہیں لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں تھا کہ میں کسی "خطرناک خوش فہمی" کا شکار ہو جاتا، کیونکہ بہرحال کرنل سی جی بھجوانی (بلیوٹلسی) اور لولوش (اسپیکٹرم) والوں کی دشمن فہرست میں میرا نام یقیناً ٹاپ آف دی لسٹ پر ہی ہو سکتا تھا، جنہیں میں... اب تک کئی محاذ پر زبردست شکست سے دوچار کرتا رہا تھا اور اپنے حالیہ اور مشترکہ منصوبے "بلیک کوبرا" کی تباہی کے بعد تو ان سے ذرا سی بھی بھلائی کی توقع رکھنا عبث اور نری بے وقوفی ہوتی۔ چنانچہ اگر یہ لوگ میرے ساتھ اپنے کسی اہم مفاد کی وجہ سے رعایت برت رہے تھے تو یہ ایسا ہی تھا کہ اپنے شکار کو "تیار" کر کے ہڑپ کیا جاتا ہے۔

بہرحال ان کی باتوں سے یہ تو پتا چلتا تھا کہ بلیوٹلسی اور اسپیکٹرم کے درمیان خاصا مضبوط گٹھ جوڑ قائم ہے۔

ساتھ ہی میں ایک حیرت آمیز الجھن کا بھی شکار تھا کہ عارضی طور پر یہ مجھے بلیوٹلسی کے حوالے کس مقصد کے لیے کرنا چاہتے تھے؟ اور کیوں؟ جبکہ میں تو دونوں کا ہی اہم شکار تھا۔ اس قلیل مہلت میں بلیوٹلسی یا کرنل بھجوانی مجھ سے ایسا کیا کام لینا چاہتا تھا کہ جسے پورا کرنے کے بعد وہ مجھے زندہ سلامت اور ذرا سی بھی گزند پہنچائے بغیر دوبارہ کوہارا کے سپرد کر دیتا اور پھر نجانے یہ مجھے کہاں لے جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟

پینے پلانے کی یہ محفل زیادہ طویل نہ چل سکی۔ چندر ناتھ اور اس کے دونوں ساتھی ایک ایک پیگ چڑھانے کے بعد رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اب ہم چلیں گے...... مسٹر کوہارا......!" چندر ناتھ نے گمبھیر آواز میں کہا اور کوہارا نے معنی خیز مسکراہٹ اس کی رف اچھال دی، ساتھ ہی وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

چندر ناتھ نے ایک بار پھر میری جانب چبھتی ہوئی راٹ نظروں سے دیکھا، وہ مجھ پر خاصا "بھرا" ہوا دکھائی ے رہا تھا، پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی کوریلا کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک اسٹین لیس اسٹیل کی ہتھکڑی نکال کر میری جانب بڑھی اور مجھے کھڑے ہونے کا کہا۔

"ہم...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ...... یہ سب کیا ہے......؟" میں کوریلا کے اشارے پر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا تھا لیکن یہ کہے بنا بھی نہ رہ سکا تھا، میرا مخاطب کوہارا ہی تھا۔

"تمہاری زبان میں کیا لگا ہے، دیکھو ذرا......"

کوہارا نے میرا سوال نظر انداز کرتے ہوئے اچانک ہی مجھ سے کہا اور آنکھیں سکیڑے میرا منہ تکنے لگا۔ غیر ارادی طور پر میں... اپنی زبان منہ سے باہر نکال کر نیچی نگاہیں کر کے اسے دیکھنے لگا تو اسی وقت ایک گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا، اور ذرا ادھ نکلی زبان میرے ہی دانتوں تلے دب کر کٹ سی گئی۔ اس اذیت نے میرے حلق سے چیخیں نکال دیں، جن کا اختتام کراہوں پر ہوتا رہا۔ میرے منہ سے خون کی موٹی لکیریں بھل بھل کرتی گرنے لگیں، آنکھوں سے باعثِ تکلیف کے آنسو بہہ نکلے تھے۔

یہ سفاکانہ حرکت کوہارا کی تھی، جو مجھے اپنی چڑھی ہوئی طیش ناک آنکھوں سے گھور رہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا...... کہ تمہیں کوئی سوال نہیں کرنا۔ آئندہ محتاط رہنا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی نیکر کی جیب سے رومال نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا چندر ناتھ میری اس درگت پر پہلی بار خبیثانہ انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ شاید مجھے تشدد کی حالت میں ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

میری آنکھوں میں یک بیک خون اتر آیا۔ دماغ میں شورش سی ہونے لگی، کاش! کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس حرام زادے کی اس ظالمانہ حرکت پر اس کا بڑا بھیانک حشر کرتا۔

"یہ تم پر میرا ادھار رہا...... کوہارا......!" میں اپنے دل میں عہد کیا، اور اپنی جلتی بلکتی کیفیات پر قابو پانے کی سعی ہانپتے ہوئے، اس کا دیا ہوا رومال اپنے منہ میں رکھ لیا۔

میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی آتش فشاں کیفیات پر قابو پایا تھا، جانتا تھا کہ اس وقت میرے قدم کسی اجنبی سرزمین پر ہیں، یہاں دو چار کو مار گرا کے جاتا بھی تو کدھر......؟ بغیر ویزا اور پاسپورٹ کے تو میں سرحد پار مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرم ہی گردانا جاتا۔

"اس کی پٹی کر دو......" اس بار کوہارا نے اپنے ہم قوم بھومک سے انگریزی میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں، ہماری لانچ میں یہ کام نمٹا لیا جائے گا......" چندر ناتھ نے کہا۔ اس خبیث کے چہرے سے ہنوز حظ اٹھانے والے تاثرات چسپاں تھے، وہ کمینہ شاید مجھے ایسی ہی مضروب حالت میں دیکھنے کا زیادہ متمنی تھا مگر کوہارا نے بلا تبصرہ اس کی بات رد کر دی اور بھومک کو گھورا۔ وہ جلدی سے حرکت میں آیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے ایک چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں لے جا کر میری کٹی ہوئی زبان کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

سردست میں بولنے سے قاصر تھا۔ مجھے اس لڑکی نے ہتھکڑی ڈال دی، اس طرح کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب تھے۔

ہم سب کیبن سے باہر آ گئے مگر اس بار ڈیک کی طرف جانے کے بجائے گلیارے میں آ کر عقب میں بڑھ گئے، جہاں چند قدموں کے فاصلے پر ایک سیڑھی ٹکی ہوئی تھی جو قریب کھڑی نسبتاً چھوٹی لانچ سے منسلک تھی، اسی سیڑھیوں کے ذریعے ہم دوسری لانچ پر اتر گئے۔

یہ سب کچھ طے شدہ نظر آتا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ میرے سلسلے میں بلیوٹلسی اور اسپیکٹرم کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ پہلے ہی سے طے تھا اور میرے لیے ابھی ان کے حکم کی تعمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔

لانچ میں آتے ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اور کسی گندی سی جگہ پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد لانچ میں حرکت پیدا ہونا شروع ہو گئی اور اس کا سویا فرش گویا گھرگھراتی آواز میں بیدار ہو گیا۔

میری زخمی زبان پر نجانے کون سا مرہم لگایا گیا تھا کہ اس کی تکلیف پوری طرح رفع تو نہیں ہوئی تھی لیکن شدت ضرور کم ہو گئی تھی، ظاہر ہے پٹی لگنے کے باعث میں ابھی کچھ بولنے سے بھی قاصر تھا۔

مجھے فرش پر ہی بٹھایا گیا تھا۔ ایک بات یاد تھی مجھے کہ ان لوگوں کو مجھے صحیح سالم دوبارہ کوہارا کے حوالے کرنا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ بلیوٹلسی اور اسپیکٹرم کے گٹھ جوڑ کے بیچ کس قدر مضبوط دوستی اور خیر خواہی کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔

زبان پر لگے مرہم کا اثر کم ہونے سے میرے زخم

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے دوبارہ ٹیسیں سی اٹھنے لگی تھیں۔ اس تکلیف سے دوبارہ مجھے اپنی آنکھوں سے پانی بہتا محسوس ہونے لگا، جو بندھی ہوئی پٹی میں جذب ہو رہا تھا۔

اس تیز رفتار لانچ کا سفر، میرے اندازے کے مطابق لگ بھگ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہا ہوگا۔ اس کے بعد وہ کہیں رک گئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنے قریب کہیں کھڑبڑ کی آوازیں سنائی دیں، لگا کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی نے کوئی بھاری دروازہ کھسکایا ہو۔ اس کے بعد قدموں کی آواز کے ساتھ ہی کوئی میرے قریب آیا تھا۔ مجھے بازو سے پکڑ کر بڑی بیدردی سے اٹھا کے کھڑا کر دیا گیا۔ اندازے اور ان کی آپس کی باتوں سے مجھے پتا چلا تھا کہ یہ دو افراد تھے اور بلیو تلسی کے شیام اور کوریلا ہی تھے۔

پھر سب کچھ کافی تیزی سے نمٹایا گیا، یعنی لانچ سے باہر اور پھر وہاں سے ایک ہیلی کاپٹر میں سوار کرانے تک، سب عجلت میں نمٹایا گیا تھا، صاف لگتا تھا کہ انہیں خاصی جلدی تھی۔

ہیلی کاپٹر کے کسی نامعلوم منزل کی جانب پرواز کرنے تک بالکل خاموشی رہی۔

ابھی میرے پاس خود کو تن بہ تقدیر کرنے کے سوا اور کوئی آپشن نہیں تھا اور یہی میں کر رہا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں بالخصوص، ماں جی اور اول خیر وغیرہ کی بھی فکر تھی کہ وہ بے چارے میرے اس طرح اچانک اور پُراسرار غیاب پر کس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے۔ زہرہ بانو اور شکیلہ بھی میرے لیے کم پریشان نہیں ہوں گی۔ بے چارہ اول خیر تو پاگلوں کی طرح میری تلاش میں سرگرداں ہوگا اور کبیل دادا بھی اب میرے لیے کم پریشان تو نہیں ہو رہا ہوگا۔ مجھے اس بات کا بھی قلق تھا کہ کبیل دادا سے زہرہ بانو کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے بعد مجھے زہرہ بانو سے اصل بات کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔

جلد ہی یہ سفر بھی تمام ہوا اور ہیلی کوپٹر کسی جگہ پر اترا، مجھے اسی طرح باہر نکال کر اتارا گیا، جیسے کسی "موسٹ وانٹڈ" مجرم کو بیدردی سے گھسیٹ کر اتارا جاتا ہے، یہاں مجھے پہلی بار اپنے سلسلے میں گہری تشویش کا احساس ہوا کہ میں اب بھی ایسے حالات کا شکار ہوں جس کے نتائج میرے حق میں انتہائی خراب بھی نکل سکتے تھے، مزید یہ کہ مجھے ایسی کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے، جیسا کہ میں کوہارا کی قید میں ہونے لگا تھا۔ بے شک وہاں میرے ساتھ قیدیوں جیسا گھٹیا سلوک تو نہیں کیا گیا تھا مگر جانتا تھا کہ وہاں بھی ایک وقت تک ایسا چلتا رہتا، ہمیشہ نہیں، کیونکہ میں بہرحال اپنے خطرناک اور بھیانک ترین دشمنوں کے نرغے میں تھا اور ان سے کسی بھی صورت میں رعایت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

ہیلی کوپٹر سے اترنے سے لے کر آگے بڑھنے تک...... میں نے اپنی دیگر حسیات کو پوری طرح بیدار کر رکھا تھا۔ ہیلی کوپٹر سے اترتے ہی میرے جوتوں نے پختہ زمین کو چھوا تھا اور آگے بڑھنے تک میں نے اپنے کانوں سے کچھ ایسی آوازیں بھی سنی تھیں، جیسے میں کسی گنجان شہر کے بجائے کہیں دور افتادہ ویرانے میں ہوں۔ اس کا اندازہ مجھے گرد و پیش کے دم بہ خود سناٹے سے ہوا تھا۔

جلد ہی میرے قدموں نے ایک ایسے فرش کو چھو لیا، جو قدرے چکنا تھا۔ اس کے فوراً بعد مجھے روک دیا گیا، اسی وقت میری سماعتوں سے کسی بھاری آہنی گیٹ کے کھلنے کی آواز ٹکرائی اور پھر مجھے آگے دھکیلا گیا، ہم تھوڑی دیر تک مختلف راہداریوں سے گزرتے رہے، کہیں چلے کہیں رکے، بالآخر ایک جگہ مجھے کسی لوہے کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ چند ثانیے تو میری آنکھوں کے گرد سیاہ دھبے سے ناچتے رہے۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، اس لیے میں اپنی آنکھوں کو مسلنے سے بھی قاصر تھا۔ یہی سبب تھا کہ آنکھوں سے پٹی کھلنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا۔ رفتہ رفتہ چھٹا تو تیزی روشنی دکھائی دی اور میں نے خود کو ایک بلند چھت اور سپاٹ در و دیوار والے کمرے میں پایا۔ جس کا فرش ہی نہیں در و دیوار بھی سیلن زدہ سے ہو رہے تھے۔

چھت کے عین وسط میں لمبی الیکٹرک وائر کے ساتھ فقط ایک ہی بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی میں مجھے وہاں دو ہی افراد کھڑے دکھائی دیے۔ یہ شیام اور کوریلا ہی تھے، چندرناتھ نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میرا حلق پیاس کی شدت سے خشک ہو رہا تھا...... زبان کی تکلیف بھی بیدار ہونے لگی تھی۔ نجانے میں کب سے بھوکا پیاسا تھا؟ معدہ خالی ہونے کے باعث وہاں آگ سی مچی ہوئی تھی۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ میں پہلے والے واقعے کے کتنی دیر تک بے ہوش پڑا رہا تھا۔ کم بخت کوہارا نے بھی مجھے کچھ کھانے پینے کو نہیں پوچھا تھا۔ سوائے مے نوشی کے، جسے، میں نے تو ہاتھ بھی لگانا گوارا نہیں کیا تھا۔

"مم...... مجھے پپ...... پانی تو پلا دو ایک گلاس......"

میرے سوکھے پڑتے حلق سے کراہ آمیز لکنت زدہ الفاظ

خارج ہوئے۔ وہ دونوں میرے دائیں بائیں اسٹیچو بنے کھڑے تھے مگر انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ زبان زخمی ہونے کی وجہ سے مجھے بولنے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ الفاظ میرے واضح نہیں تھے، بولتے ہوئے ایسا ہی لگتا تھا، جیسے کوئی گونگا بولنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس حرام زادے کوہارا نے میرے جسم کے نازک حصے میں اچانک اور دھوکے سے وار کیا تھا اور میں اس پر بری طرح خار کھائے ہوئے تھا۔

میں نے دوبارہ بولنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا، دروازہ میرے دائیں بازو پر تھا، میں نے گردن موڑ کر دیکھا، تین افراد اندر داخل ہوئے تھے۔ ان میں ایک تو وہی پکی عمر والا خرانٹ، چندرناتھ تھا، دوسرا جوان سا مرد تھا، اس کے جسم پر مخصوص لباس تھا، وہ کوئی محافظ ٹائپ کا آدمی نظر آتا تھا، جبکہ اس کے ہمراہ ایک، لمبا تڑنگا اور قوی الجثہ شخص بھی تھا، اس کے جسم پر نیلی اور خاکی وردی نما چست لباس تھا، وہ پہلی ہی نگاہ میں مجھے کوئی آفیسر قسم کا ہی آدمی لگا، رنگت خاکستری تھی، آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ان میں غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چہرے پر کرختگی کے تاثرات کھنڈے ہوئے تھے، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ سوا ہو گئے۔

اندر داخل ہوتے ہی تینوں گویا طے شدہ پوزیشن میں میرے قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔ چندرناتھ میرے بائیں طرف کوریلا کے قریب، جبکہ کرخت صورت آفیسر میرے عین سامنے، اور اس کا محافظ اس کے بائیں جانب تن کر کھڑا ہو گیا۔

اس آفیسر کے چہرے پر میں نے نظریں جما دی تھیں جو خود بھی میری طرف بڑی کٹیلی اور خار کھائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پپ...... پانی۔" میرے منہ سے نکلا اور اسی وقت کمرے میں چٹاخ کی آواز ابھری۔ اس کرخت صورت آفیسر کا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا تھا، اس نے ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کر دیا تھا۔ میں کرسی سے نیچے گرتے گرتے بچا۔ اس نے نفرت انگیزی سے اپنے سیاہ بدرو ہونٹ، دانتوں سمیت بھینچ رکھے تھے۔

"جی تو کرتا ہے، تمہیں زہر پلا دوں......" دفعتاً ہی وہ آفیسر غیظ آلودہ لہجے میں مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "لیکن......!"

اس نے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں نے کرسی پر دوبارہ سنبھل کر نیم باز سی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پاس کھڑے چندرناتھ سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

"اس کا منہ زخمی ہے، اور مجھے اس کی زبان سے کام لینا ہے۔ کیا یہ ٹھیک طرح سے بات کر سکتا ہے؟"

"یس چیف!" چندرناتھ نے فوراً تحکمانہ انداز میں جواب دیا۔ "میں نے ابھی آپ کو بتایا تھا ناں کہ لولوش کے برمی آدمی کوہارا نے......"

"او کے...... او کے!" اس کرخت رو مزاج آدمی نے اپنا ایک ہاتھ کھڑا کر کے خاصی بیزاری سے کہا اور چندرناتھ کے منہ کو گویا بریک لگا دیا۔ میں نے اس کرخت رو آفیسر کے چہرے سے صاف محسوس کیا تھا کہ وہ کوہارا کے لیے کوئی سخت جملہ اپنے منہ سے نکالنا چاہتا تھا لیکن شاید میری وہاں موجودگی کے باعث رک گیا تھا۔

"مجھے اچھی طرح دیکھ لونیڈی ایجنٹ......! میں کرنل سی جی بھجوانی ہوں......" کہتے ہوئے اس نے مجھے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ مجھے...... پہلے ہی اس کا اندازہ ہو چکا تھا، نا بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہی سبب تھا کہ میں نے اپنے چہرے سے ایسے کسی قسم کے تاثرات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ وہ خبیث اپنا تعارف کرانے کے بعد تھوڑی دیر تک اپنی اندر کو دھنسی ہوئی کینہ پرور آنکھوں کو سکیڑے میرے چہرے کا جائزہ لیتا رہا اور میری آنکھوں سے ایسا کوئی "خاطر خواہ" تاثر نہ پا کر وہ مزید بھڑکا اور اسی لہجے میں بھیڑیے جیسی آواز میں غرایا اور اپنے ایک ہاتھ سے میری گردن دبوچ لی، پھر میرے چہرے کے قریب اپنا مکروہ چہرہ کیے بولا۔

"تم...... تم نے مجھے بہت زک پہنچائی ہے، گن گن کر بدلا لوں گا اب...... تمہیں میری طاقت کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا ناں...... میلوں دور رہ کر میں نے تمہیں کس طرح ایک نامراد چوہے کی طرح دبوچ لیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی، میں پھر کرسی سے گرتے گرتے بچا تھا وجہ اس کی یہی تھی کہ میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے، اور میں بیلنس قائم نہیں کر پاتا تھا، یوں بھی کرسی چھوٹی اور بغیر "ہتھیوں" کی تھی۔ جس پر میرا جیسا لمبا چوڑا آدمی بیٹھ تو نہیں سکتا تھا، صرف ٹک سکتا تھا۔

مجھے اس کے پُرغرور لہجے کی تہ میں دبی شکست آمیز

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

خجالت اور جھنجلاہٹ صاف محسوس ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے ہاتھوں ''میچوئیل ری پلیسمنٹ'' والی کامیاب مہم جوئی کے بعد اس کے اس غرور اور گھمنڈ کی ساری دھجیاں بکھر کر رہ گئی تھیں اور اب وہ باؤلا کتا بنا ہوا تھا۔

بہرکیف میں خاموش ہی رہا۔ جانتا تھا کہ میں اس وقت ایک ایسے بھارتی فرعون آفیسر کے سامنے موجود ہوں جو میرے وطن کا دشمن ہے اور اس کا شمار بھارتی آرمی کمانڈ کی اس لابی میں ہوتا تھا جو نہ صرف میرے وطن کو دولخت کرنے کی قبیح سازش میں شامل رہے تھے، بلکہ اسے سہ لخت (خاکم بدہن) کرنے کی مذموم اور دیرینہ منصوبہ بندی میں اپنی ''باقیات'' سمیت بلیوتلسی کی صورت، ہنوز کارفرما تھے۔

یہی وہ مردود اور سفاک درندہ صفت انسان تھا جو میرے محب الوطن اور غیور رباپ کو اپنے ٹارچر سیل میں انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے اور میں اسے ادھر ہی واصلِ جہنم کر ڈالتا۔

میری خاموشی کا اس نے نجانے کیا مطلب لیا۔ تاہم بولا۔

''افسوس تو اس بات کا ہے کہ تم اب بھی پورے طور پر میرے قبضے میں نہیں ہو لیکن کسی خوش فہم مغالطے میں مت رہنا بیٹے.....! تم یہاں سے جا کر بھی ہماری ہی گرفت میں رہو گے اور جب ہم چاہیں گے تمہیں کسی مرے چوہے کی طرح دوبارہ ادھر لا پٹخیں گے۔''

کہتے ہوئے اس کی بدرو سیاہ باچھوں سے غصیلے پن کے باعث جھاگ کی لکیریں سی بہہ نکلیں۔

''تم مجھ سے اب کیا چاہتے ہو.....؟'' بالآخر میں نے کہا اور اس بار دانستہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں الفاظ اپنے حلق سے برآمد کیے تھے۔ جسے سن کر وہ سیدھا ہو کر یک دم کسی بولائے ہوئے سؤر کی طرح بدکا اور قریب کھڑے چندر ناتھ سے تیز لہجے میں بولا۔

''دی ی..... یہ کیا ہے چندر؟ مجھے اس کا رواں اور صاف لہجہ چاہیے، اس آواز میں تو وہ لوگ اسے پہچاننے سے ہی انکاری ہو جائیں گے.....؟'' اس کی بات پر چندر ناتھ کچھ گھبرا سا گیا، میں خود بھی اس خبیث کی اس بات پر اندر سے چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ آخر وہ کن لوگوں کو میری آواز سنانا چاہتا تھا؟ کیا میرے اپنوں کو.....؟ کیا بھجوانی انہیں میری آواز سنا کر انہیں کسی بات پر بلیک میل کرنا چاہتا تھا؟ مگر کیوں؟ مجھے اس بات نے ایک تفکر آمیز الجھن میں ڈال دیا۔

''چ-- چیف! آپ ذرا مجھے دو تین گھنٹوں کی مہلت دے دیں، میں اسے اس قابل.....''

''چندی.....! تم جانتے ہو ہمارے پاس وقت کم ہے۔'' وہ چیخا۔ ''اسے انہیں واپس بھی کرنا ہے۔ کیا یہ دو تین گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائے گا؟''

''یس چیف! میں اسے ابھی میڈیکل پینل لے جاتا ہوں، وہاں.....''

''نو، نو، نیور.....'' کرنل سی جی بھجوانی اپنا ایک ہاتھ بلند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں اتنا وقت نہیں افورڈ کر سکتا۔''

''چیف! میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔'' معاً میرے بائیں جانب کھڑے شیام نے بھجوانی سے کہا۔ ''ہم لولووش سے تھوڑی مزید مہلت مانگ لیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں قصور اس کے اپنے ساتھی کا ہی ہے۔ اسی نے ہی اسے زخمی کیا ہے۔''

''شیام ٹھیک کہہ رہا ہے چیف! ہمارے پاس اپنی بات کا جواز ہے۔'' ساتھ کھڑے چندر ناتھ نے فوراً اپنے ماتحت ساتھی کی تائید کر ڈالی مگر سی جی ان دونوں کی طرف غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''مہلت تو میں نے اس سے ویسے بھی لینے کا پہلے ہی سے سوچ رکھا ہے مگر میں اس مہلت کو اس نیڈی کے علاج میں نہیں کھپانا چاہتا..... تم لوگوں کی عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے.....؟'' اس کی جھڑکی پر وہ دونوں سن ہو کر رہ گئے اور تب ہی اچانک میرے قدرے دائیں جانب کھڑی سبک اندام کوریلا نے نہایت مودبانہ انداز میں کرنل سی جی سے کہا۔

''سر.....! میرے خیال میں یہ اداکاری کر رہا ہے.....'' وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن--- کرنل سی جی کو یک دم غصے سے اپنی جانب گھومتا دیکھ کر چپ ہو گئی اور وہ دانت پیس کر اس سے بولا۔

''مس کوریلا.....! میرے سامنے خیال کی نہیں یقین کی بات کرو۔''

''یس..... سر! مم..... میں..... یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ یہ اپنی زخمی زبان کا فائدہ اٹھا کر ہم سے ناٹک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے کوہارا کی لانچ میں اتنا غلط بولتے ہوئے نہیں دیکھا تھا لیکن ہماری کچھ باتیں سننے کے بعد یہ مکر کرنے لگا ہے لیکن ہمیں اس کی بھی پروا نہیں ہونی چاہیے اور اس سے ہم صرف بات ہی نہیں بلکہ اس کی ویڈیو اینڈ وائس کلپ دیکھا کر بھی اپنا اصل مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔''

''ہاں..... ذہن میں تو میرے بھی یہی بات آتی ہے۔'' کرنل سی جی نے اس کی بات پر اتفاق کیا اور پھر تحکمانہ انداز میں کوریلا سے بولا۔

''مس کوریلا.....! تم اسے کل کے لیے ذرا بریف کر دو کہ ہم کرنا کیا چاہتے ہیں..... تاکہ یہ کسی قسم کی خلل اندازی نہ کر سکے اور تم.....'' کہتے ہوئے وہ چندر ناتھ کی طرف گھوما۔

''سر.....!'' خود سے مخاطب ہوتا دیکھ کر چندر ناتھ نے اپنے سر کو خم دیتے ہوئے مودبانہ کہا۔

''کل صبح مجھے پاکستان سے چلنے والے اس لائیو پروگرام کی ویڈیو ڈسک چاہیے، ایچ ڈی میں، کلیئر.....؟''

''یس چیف! شیور۔'' چندر ناتھ نے اسی طرح مودبانہ انداز میں اپنے سر کو دھیرے سے اثبات میں حرکت دی۔ اس کے بعد کرنل سی جی نے اپنے ہونٹ بھینچ کر مجھ پر ایک پُرطیش نگاہ ڈالی اور اپنے وردی پوش ہمراہی کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے چندر ناتھ اور شیام بھی ہو لیے۔

اب صرف کمرے میں کوریلا اور میں رہ گئے، نجانے اس کو مجھ سے کیا کہنا تھا، وہ میں اس کی زبانی سننے کے لیے بری طرح بے چین تھا لیکن میرا ذہن کرنل سی جی کی اس بات پر اٹک کر رہ گیا تھا کہ آخر پاکستان میں کل کون سا ایسا اہم پروگرام نشر ہونے والا تھا، جس کی ویڈیو کلپ حاصل کرنے کے لیے اس نے چندر ناتھ کو پابند کیا تھا؟

''تم نے بلاوجہ اس بری قصاب کوہارا..... کے سامنے منہ کھول کر اپنی زبان زخمی کر ڈالی.....'' کوریلا چند قدم چل کر میری طرف گھوم گئی۔ اب نجانے اس کے لہجے میں صنفِ نازک والی ''نزاکت'' تھی یا پھر اس نے ویسے ہی مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرنا چاہا تھا، تاہم اس کے نرم رویے سے حوصلہ پا کر میں نے ہولے سے مسکرا کر کہا۔

''لیکن بہ قول آپ کے، میں ناٹک کر رہا تھا۔''

''ناٹک تو تم کر رہے تھے، اس میں کیا شک ہے۔'' اس نے کہا۔

''پلیز.....! مجھے پانی تو پلا دو۔'' یہ کہتے ہوئے میرا اپنے سوکھے ہونٹوں پہ زبان پھیرنے کو جی چاہا مگر زخمی ہونے کے باعث حرکت بھی دینے سے قاصر ہی رہا۔

''پانی مل جائے گا.....'' وہ بولی۔ ''لیکن ایک شرط پر۔''

''کیسی شرط.....؟''

''مجھ سے پورا تعاون کرو گے؟''

مگر

تین غیر حاضر دماغ پروفیسر ریلوے اسٹیشن پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ باتوں میں اتنے محو تھے کہ گاڑی آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ چند منٹ بعد سیٹی بجی تو وہ چونکے اور گھبرا کر ایک ڈبے کی طرف دوڑے۔ دو تو کسی نہ کسی طرح چڑھ گئے لیکن تیسرے صاحب نہ چڑھ سکے۔

ایک قلی نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں صاحب جی! دوسری گاڑی سے چلے جانا۔''

پروفیسر بولے۔ ''وہ تو میں چلا ہی جاؤں گا مگر ان دونوں کا کیا ہوگا جو مجھے چھوڑنے آئے تھے۔''

ثبوت

بیوی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی تم سے شادی کر کے۔ کیسے کیسے قابل اور ذہین لڑکے مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔''

''اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ قابل اور ذہین تھے۔'' شوہر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اور تم سے شادی نہ کر کے انہوں نے اپنی قابلیت کا ثبوت بھی دے دیا تھا۔''

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون سوشل ورکر وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہداری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ کانپ کر رہ گئیں۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے نیچی اور خوفزدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا۔ ''خدا کی پناہ! کیسی خوفناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟''

''کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''پھر آپ لوگ اسے کوٹھری میں بند کیوں نہیں رکھتے۔ کیا یہ آپ لوگوں کے قابو میں نہیں آتی؟'' خاتون نے تشویش سے پوچھا۔

''مجبوری ہے کہ اسے کسی کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل وہ میری بیوی ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

شاہ کوٹ سے احمد پرویز کی مجبوری

''کروں گا۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آخر پتا تو چلے کہ مجھے یہاں کیوں اور کس مقصد کے لیے لایا گیا ہے؟ اور......''

''ابھی سب معلوم ہو جاتا ہے۔'' اس نے میری بات کاٹی اور پھر اپنے کوٹ کے کالر میں منہ ڈال کر کسی سے کچھ کہا۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی ایک طرح دار حسینہ اندر داخل ہوئی، یہ نسبتاً کم عمر تھی، اور شوخ و چنچل بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک میڈیکل باکس سے مشابہ کیس تھامے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

اپنی تربیت کے دوران میں مجھے بھارتی انٹیلی جنس، بالخصوص ''را'' کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ جاسوسی وغیرہ کے سلسلے میں یہ لوگ کم عمر اور حسین لڑکیوں سے بھی کئی اہم کام لیا کرتے تھے، جو اپنے حسن و شباب کو دشمنوں کے خلاف ایک خطرناک ''ہتھیار'' کی صورت استعمال کرتے تھے لیکن یہ مکمل طور پر تربیت یافتہ بھی ہوتی تھیں۔ بلیوتلسی نے بھی یہی وتیرہ اختیار کر رکھا تھا، اس لیے میں جانتا تھا کہ بظاہر نازک اندام لڑکیاں اپنے اندر کس قدر خطرناکیاں چھپائے ہوئے ہوں گی۔

تاہم میں ایک بات یہ بھی جانتا تھا کہ آفٹر آل یہ صنفِ نازک ہی تھیں۔ میں نے میٹھی مسکراہٹ سی اپنے چہرے پہ طاری رہنے دی تھی۔ اس نے بھی اسی طرح مسکراتے ہوئے پہلے تو باکس نیچے رکھا پھر پانی کی بوتل کھول کر میرے منہ کے قریب کر دی۔ میں نے تھوڑا آگے جھک کر بوتل سے اپنا منہ لگا لیا، اس نے بوتل کو تھوڑا اونچا کیا اور میں گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا، دفعتاً مجھے ٹھسکا لگا تو لڑکی نے یک دم بوتل میرے منہ سے ہٹا دی۔

''آرام سے پانی پیو، تمہاری زبان بھی زخمی ہے۔'' اس لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ مجھے اس کا لہجہ بھی ملائمت آمیز اور میٹھا محسوس ہوا۔ میں جھینپے ہوئے انداز میں مسکرایا۔ اس نے پھر پانی کی بوتل میرے منہ سے لگا دی، بوتل خالی ہو گئی تو اس نے ہٹا دی اور بوتل نیچے رکھ دی۔ پھر اپنا میڈیکل باکس کھولنے لگی۔ وہ شاید بلیوتلسی کے میڈیکل ونگ سے تعلق رکھتی تھی اس لیے اپنا کام بڑی مشاقی سے انجام دینے لگی۔ پرانی پٹی کھول کر ایک ٹارچ جلا کر زخم کا جائزہ لیا پھر اس میں مرہم لگا کر ہلکی سی چپچی نما پلاسٹر ٹیپ لگا دی۔ مجھے کچھ سکون ملا۔ پھر اس نے دو قسم کی دوائیوں کی شیشیاں نکال کر دو دو گھونٹ پلائے۔

اس کے بعد وہ نرس نما لڑکی اپنا سامان سمیٹے خاموشی سے لوٹ گئی۔ میں نے کوریلا کا شکریہ ادا کیا۔

''اب یقیناً تم مجھ سے تعاون کرو گے، تاکہ میں اپنا کام جلد نمٹا سکوں۔'' وہ بدستور مسکراتی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی بات سے مجھے ایسا لگا جیسے یہ مجھے اپنے کسی کام کے لیے ''آسان'' بنانے کی سعی چاہ رہی ہو۔

''شکریہ! ویسے آپ یہ سب کچھ نہ بھی کرتیں، تو بھی آپ جیسی حسین اور مہربان خاتون کے ساتھ میں یوں بھی تعاون ضرور کرتا۔'' اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ایک بار پھر اپنے کوٹ کا ایک کالر اونچا کر کے، بہت دھیمی آواز میں کسی سے باتیں کرنے لگی۔ میں دانستہ اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا لیکن اس کے چہرے پہ اب نرم میٹھی مسکراہٹ عنقا ہو چکی تھی، اس کی جگہ سپاٹ سی متانت کھنڈ آئی تھی۔ وہ اسی لہجے میں مجھ سے بولی۔

''اب میری بات غور سے سنو!'' وہ رکی، میں اس کی طرف ہمہ تن گوش ہو گیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''کل صبح دس بجے پاکستان میں تمہارے باپ تاج دین شاہ کے سلسلے میں ایک بڑی اور اہم تقریب کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ وہاں اسے ملکی سطح پر زبردست خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا اور اس کی شخصیت کو ''ڈکلیئر'' کیا جائے گا کہ اس نے آج سے کئی سال پہلے ایک گمنام پاکستانی سپاہی کی حیثیت سے وطن کی خاطر کیسی قربانی دی تھی اور اپنا گھربار سب تیاگ دیا تھا، وغیرہ۔ اسے ایک بڑے ملکی آرمی اعزاز سے نوازنے کا بھی اعلان کیا جائے گا......'' وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی۔ میرا رُواں رُواں یہ سن کر جوشِ مسرت و فخر و انبساط سے جھوم اٹھا۔

اس کا مطلب تھا کہ میجر ریاض باجوہ نے اپنا فرض بڑی خوش اسلوبی سے نبھا دیا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک آدھ روز میں میرے باپ کو لینے کے لیے آئیں گے اور ان سے متعلق وہ ساری ڈاکومینٹری اور میڈیکل تصدیق وغیرہ کے بعد ان کی شخصیت کو ایک بڑے اعزاز کے ساتھ ہائی لائٹ کریں گے۔ مجھے اس بات کا افسوس بھی ہو رہا تھا کہ میں اس عظیم تقریب میں موجود نہیں تھا لیکن...... پھر اچانک ہی میرے اندر ایک اندیشناک اور لرزا دینے والا خیال بھی ابھرا کہ آخر یہ سب مجھے بتانے یا دکھانے کا ان بلیوتلسی والوں کا کیا مقصد تھا؟ یہی وہ وقت تھا جب مجھے کرنل سی جی بھجوانی کی وہ دھمکی یاد آنے لگی جو اس نے مجھے میرے ہاتھوں عبرت ناک شکست اٹھانے کے بعد

اس وقت دی تھی جب میں بیگم ولا میں موجود تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد مجھے ایک ''تحفہ'' دینے والا تھا، تو کیا وہ خبیث اس عظیم تقریب میں ایسا کچھ ''خطرناک'' کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس روح فرسا خیال نے ہی مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔

''اب تمہیں کیا کرنا ہوگا......'' وہ آگے بتانے لگی۔ میں سراپا سماعت بن گیا۔

''......اس ڈکلیئریشن اور پروگرام کے ختم ہونے کے بعد تمہیں اپنے کسی ساتھی سے فون پر بات کروائی جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ رکی۔ اس کی بات پر مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ یہ لوگ ایسا کوئی خطرناک کام کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، اس تسلی کی وجہ ایک اور بھی تھی کہ اس ملکی سطح کی اس اہم تقریب کی ظاہر ہے سیکیورٹی بھی اتنی ہی سخت ہوگی اور دوسرے یہ کہ پاکستان میں، میں نے اسپیکٹرم ہی نہیں بلکہ بلیوتلسی کا بھی خاطر خواہ حد تک قلع قمع کر ڈالا تھا۔

''مجھے اپنے ساتھی سے کب اور کیا بات کرنا ہوگی......؟'' قدرے طمانیت حاصل ہو جانے کے بعد میں نے بالآخر اس کی طرف دیکھ کر پوچھا تو وہ بولی۔

''پروگرام ختم ہونے اور دیکھ لیے جانے کے بعد تمہیں بتایا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں بھی اس کی ویڈیو کلپ دکھا دی جائے تاکہ تم ہماری بات کو صحیح طرح سے اور ہمارے مطابق ایکسپریس کر سکو......'' میں نے چپ سادھ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلی گئی، اس کے جانے کے ذرا دیر بعد ہی مجھے پینے کے لیے سوپ اور اسی طرح کی کوئی رقیق شے دی گئی۔ میری زبان زخمی ہونے کی وجہ سے میں درست کچھ کھانے سے بھی قاصر تھا۔

کوریلا کمرے سے جا چکی تھی۔ نیند سے میرا اب سر بھی چکرانے لگا تھا، تھکاوٹ بھی ہونے لگی تھی، ایک ہی رخ پر پشت کی سمت بندھے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کی وجہ سے پورے جسم میں اکڑن سی پیدا ہونے لگی تھی، شکر تھا کہ میں کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ لہٰذا میں اٹھ کر دیوار کے کونے میں جا کر، اس کے سہارے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیوار پر ہی سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ مجھے کسی نے جگا دیا۔ رقیق سی خوراک دی گئی، اور اسی نوعمر نرس نما لڑکی نے دوبارہ میری زبان کی پٹی کر دی تھی، بلکہ اس بار اس نے صرف مرہم لگا دیا تھا، ایک انجکشن بھی میرے بازو میں ٹھونک دیا تھا۔ کچھ چین کلر وغیرہ کھلائی گئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کب تک سویا رہا تھا۔ کمرے میں قدرے بلندی پر ایک چھوٹا چوکور سا سلاخ دار روشن دان تھا، جس کے پار مقدور بھر نظر آنے والا آسمان سفیدی مائل نیلا ہو رہا تھا، اندازہ ہوا کہ صبح ہو چکی تھی یا پھر دن کا کوئی وقت تھا۔

نرس اپنا کام نمٹا کر چلی گئی۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی کوریلا آگئی۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ اس نے بے تاثر سی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور سپاٹ لہجے میں مخاطب ہوئی۔

''تم تیار ہو؟'' وہ اب کی بار کسی بھی مسکراہٹ کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ اس نے اس بار بزنس کوٹ سوٹ کے بجائے وردی نما چست لباس پہن رکھا تھا۔

''کس بات کی تیاری؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مبارک باد تو میں تمہیں کسی صورت میں نہیں دے سکتی لیکن یہ بتائے دیتی ہوں کہ تمہارا باپ تاج دین شاہ ایک ملکی غازی ہیرو کے روپ میں نمایاں حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اب ہمارا کام قدرے آسان ہو جائے گا۔'' وہ رکی تو میں اندر سے بری طرح الجھ سا گیا۔ اپنے باپ کی نمایاں حیثیت اختیار کرنے کی خوشی اپنی جگہ لیکن مجھے الجھن اس بات پر ہو رہی تھی کہ یہ لوگ آخر کرنا کیا چاہتے تھے؟ میں نے اس کی طرف شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''

''اپنے آدمی سندر داس کی رہائی۔'' وہ بولی۔

''یہ اب ناممکن ہے۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تم یہ کام ممکن بناؤ گے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں سے یک بیک چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

''تو ٹھیک ہے، مجھے میرے ملک پہنچا دو، میں تمہارا آدمی چھڑانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے اس کی ناکامی سے حظ اٹھاتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا تو اس نے نفرت انگیز انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پہ رسید کر دیا۔ تھپڑ خاصا زوردار تھا جس نے ایک لمحے کو میرا دماغ ہی جھنجھنا ڈالا تھا۔ مجھے اپنے دائیں گال پر جلن کا احساس ہونے لگا۔ ایک عورت کے ہاتھ کے تھپڑ میں اتنا دم ہونا کوئی اچنبھے کی بات اس لیے نہیں تھی کہ کوریلا کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ تربیت یافتہ بلیوتلسی ایجنٹ تھی۔ اس کے ہاتھ میں ''مردانہ سختی'' یا طاقت، اس کی تربیت کا مظہر تھی۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

''اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو اور مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ سے بولا۔

''جس کی جان پر بنی ہوئی ہو، وہ بھلا کیا مذاق کرے گا بے چارہ...... تم ہی غلط سمجھی تھیں۔''

''بس! اب بکواس بند......'' وہ جھٹکے دار لہجے میں مجھے گھور کر بولی۔ ''ہم اپنا ساتھی تمہارے ذریعے ہی آزاد کروائیں گے۔''

''اوہ......'' میں نے ہنوز اسے خار دلانے والے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور استہزائیہ طنز سے بولا۔ ''یعنی قیدی کے بدلے قیدی۔''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''ہمیں اسی موقع کا انتظار تھا جب تمہارے باپ کی حیثیت اور شناخت بڑے پیمانے پر آشکارا ہو، تاکہ تمہاری اہمیت بھی اپنی جگہ تسلیم کی جاسکے اور تم عام انسان نہیں بلکہ اب ایک غازی اور محبِ وطن سپاہی کے بیٹے بھی کہلاؤ۔ یوں ایک اعلیٰ فوجی اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے کی واپسی کے لیے تمہارے ملک کی انٹیلی جنس ہمارے آدمی (سندر داس) کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔'' وہ اپنے انکشافات بیان کرنے کے بعد میری طرف فاتحانہ مسکراہٹ سے دیکھنے لگی۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے تئیں ایک بڑی مضبوط و مربوط چال چلی تھی اور اس بات میں بھی کوئی شک نہ تھا کہ میری اپنی ذاتی حیثیت اپنی جگہ مگر اب میرے باپ کے حوالے سے میری بھی جو شناخت اور اہمیت ڈکلیئر ہو چکی تھی، اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں اپنی اس شناخت پر جتنا فخر کرتا، وہ کم ہوتا، یہی تو وہ شناخت تھی جس کی تلاش میں، میں نے رات دن ایک کر ڈالے تھے اور جس کی وجہ سے میں خود کو ادھورا سمجھتا رہا تھا، اسی شناخت کے حصول نے میری زندگی کا ڈھب بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے بغیر میں نے نہ جانے کتنے ماہ و سال ایک بے چین سی تڑپ میں بتائے تھے، آج میری برسوں کی وہ دلی تمنا قبول ہو چکی تھی۔ جبکہ وزیر جان کے حوالے سے میں اللہ سے یہی دعا مانگتا رہا تھا اگر خدانخواستہ وہی میری شناخت نکلا تو اس سے بہتر تو میں یتیم ہونے کو ہی ترجیح دیتا یا پھر موت کو۔ ظاہر ہے ایک ملک دشمن اور جرائم پیشہ انسان کی اولاد کہلوانا میرے لیے ڈوب مرنے کا ہی مقام ہوتا۔

تقدیر کی بھی یہ کیسی بوالعجبی تھی کہ اتنی بڑی خوش خبری میں اپنے دشمنوں کے منہ سے سن رہا تھا۔ تاہم میں بہت مطمئن تھا اور اسی طمانیت بھری مسکراہٹ سے میں نے قریب کھڑی کوریلا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میرے چہرے کو تکے جا رہی تھی۔

''ہوں......!'' میں نے ایک ہنکارا بھرا۔ ''تو تم لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح میرے بدلے میں تمہیں اپنا آدمی مل جائے گا......؟''

''ہاں! ہمیں پورا وشواس ہے، کیونکہ تم اب معمولی حیثیت کے آدمی نہیں رہے، ایک اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے ہو اور اتنے ہی اہم بھی جتنا کہ تاج دین شاہ کی پوری فیملی کو ہونا چاہیے۔'' کوریلا نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اسے اب کیا بتاتا کہ یہ ان کی کتنی بڑی بھول تھی کہ وہ ایسا سمجھ رہے تھے۔

اول تو میں ایسا خود ہی نہیں چاہ سکتا تھا کہ میرے بدلے میں سندر داس جیسا انتہائی تربیت یافتہ بلیو ٹلسی ایجنٹ ان کے حوالے کر دیا جاتا، نہ ہی میجر ریاض باجوہ وغیرہ ایسا کوئی قدم اٹھانے کا سوچتے بھی، یہ الگ بات تھی کہ وہ دوسرے آپشنز پر غور ضرور کرتے، رہی بات عزیزوں اور بہی خواہوں کی تو وہ بے چارے اس صورتِ حال سے ضرور پریشان اور تشویش زدہ ہو سکتے تھے۔ اسی بات نے مجھے پریشان سا کر ڈالا تھا، جسے بھانپتے ہی کوریلا خوش فہمی کے احساس سے مجھ سے بولی۔

''لگتا ہے اب تمہارے ہوش ٹھکانے آگئے ہیں۔''

''میں تو پہلے ہی ہوش میں تھا اے نازنین ماہ جبیں! لیکن مجھے تم لوگوں کے ہوش میں آنے کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔'' کوریلا کا خوب رو چہرہ جو ذرا دیر پہلے میرے چہرے سے جھلکتی عارضی پریشانی کا تاثر بھانپ کر ایک خوش فہمی کے احساس سے گل رنگ ہوا جا رہا تھا، میرے کاٹ دار طنزیہ جواب نے اسے یک دم تاریک کر ڈالا۔ وہ پھر جارحانہ موڈ میں نظر آنے لگی، اس نے مارے طیش کے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے پیس رکھا تھا۔ میں اس کی طرف بے پروا نہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مزید بھڑکی اور چند قدم آگے بڑھ کر میرے چہرے پر جھکی اور اپنے ہاتھ کی مٹھی میں میرا چہرہ جکڑتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔

''ساری اکڑفوں ناک کے راستے نکل جائے گی تمہاری جب تمہارے پیاروں کو یہ پتا چلے گا کہ تم سرحد پار اور کن لوگوں کی گرفت میں ہو اور ان کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔''

''تمہارا ہاتھ بہت نرم اور گداز ہے۔'' میں نے

لہجے میں کہا۔ ''ایسے خوب صورت ہاتھ کی گرفت بھی پھولوں کے جیسی لگتی ہے...... آہ! پلیز، تھوڑی دیر اور تھامے رہو اسی طرح میرے چہرے کو......''

میری اس بات نے جیسے جلتی پر تیلی کا کام کیا، وہ پہلے سے زیادہ بھڑک اٹھی، اس کے حسین قتالہ چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا بس نہیں چل رہا کہ وہ اپنے لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ کھرونچ ڈالے، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں اس بات یا اس کے انکشاف سے پریشان ہو جاؤں گا اور اس سے کسی رعایت کی بھیک مانگوں گا، جبکہ اس کے برعکس میں نے اس کی سب باتوں کو محض استہزا آمیز مذاق میں اڑا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے ہاتھ کی ''خوب صورت'' گرفت میرے چہرے پہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی چلی گئی، حتیٰ کہ اس کے ناخن تک میری ٹھوڑی اور گال کی جلد میں دھنسنے کے قریب ہو گئے، میرا چہرہ اتنا چھوٹا نہ تھا کہ اس کے ایک ہاتھ کی گرفت میں ہی سما جاتا مگر جتنا سما سکتا تھا اتنا وہ اسے گھائل کرنے کی کوشش میں لگی رہی اور بالآخر میں نے ہنسنا شروع کر دیا...... اس نے ایک جھٹکے سے میرا چہرہ چھوڑ دیا۔

اسی وقت کمرے میں قدموں کی آہٹ ابھری، جسے سن کر وہ یک دم ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی لیکن اس کی نگاہیں بار بار دروازے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ چار افراد تھے جو دروازے سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ کرنل سی جی بھجوانی، چندر ناتھ، شیام اور چوتھا مخصوص وردی پہنے ہوئے ان کا ہی ساتھی ایجنٹ نظر آتا تھا۔ (یہ کل والا آدمی نہیں تھا)

اندر داخل ہوتے ہی کرنل سی جی نے اپنی کینہ توز نگاہیں میرے چہرے پر جما دیں۔ مجھے وہ خاصا خار کھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے کوریلا کی طرف دیکھ کر اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی، جسے سمجھ کر کوریلا نے فوراً اپنی وردی کے اندر سے ایک بڑا سا اسمارٹ فون نکالا اور پھر کوئی نمبر پنچ کرنے لگی۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے فون کان سے لگا لیا۔ میں اب اپنی آنکھیں ذرا سکیڑے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے اندر دھکڑ پکڑ جاری تھی۔ دوسری طرف سے ہلکی آواز ابھری۔ غالباً اس نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ ''ہیلو'' کی آواز پر میں نے غور کیا لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کوریلا نے کہاں کا نمبر ملایا تھا؟ خیال یہی تھا کہ بیگم ولا کا نمبر ملایا ہوگا جس کی فوراً ہی تصدیق بھی ہو گئی جب کوریلا نے دوسری طرف سے ہیلو کی آواز سنتے ہی استفساریہ کہا۔

''یہ بیگم ولا کا نمبر ہے؟''

''جی ہاں! آپ کو کس سے بات کرنی ہے اور آپ کون صاحبہ بول رہی ہیں؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ وہ شاید زہرہ بانو کا کوئی آدمی تھا۔

''مجھے کسی ذمے دار آدمی سے بات کرنی ہے، شہزاد احمد خان شہزی کے سلسلے میں۔''

کوریلا کی اس بات پر دوسری جانب چند لحظے کے لیے سناٹا چھا گیا۔ پھر ہولڈ کرنے کے لیے کہا گیا، اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک بے چین، گھبرائی ہوئی متوحش سی نسوانی آواز ابھری۔

''ہ...... ہیلو...... کک...... کون؟ شش...... شہزی......؟ کون بول رہا ہے؟''

اس آواز کو میں پہچان گیا تھا، یہ زہرہ بانو تھی۔ کوریلا نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ہیلو، اپنا تعارف کرواؤ، تم کون ہو؟''

''میں زہرہ بانو ہوں......'' دوسری جانب سے زہرہ بانو کی آواز ابھری۔ اس کی آواز میں اعتماد آنے لگا تھا، اور وہ شاید خود کو بھی کچھ سنبھالنے لگی تھی۔ اِدھر کوریلا نے ایک نگاہ اپنے چیف پر ڈالی۔ کرنل سی جی نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''شہزاد احمد خان ہمارے پاس ہے، زندہ سلامت......''

''لیکن تم کون ہو؟''

''بات مت کاٹو، اور صرف ہماری سنو۔'' کوریلا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس سے اس کا چہرہ وہ لگ ہی نہیں رہا تھا جو پہلے مسکراتا رہتا تھا، وہ پل کے پل مجھے ایک زہریلی ناگن کے روپ میں نظر آنے لگی تھی۔

''شہزاد خان اس وقت تک ہمارے پاس زندہ اور محفوظ رہے گا، جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔''

''کیا مطالبہ ہے تم لوگوں کا؟'' اسمارٹ فون کے اسپیکر پر زہرہ بانو کی آواز ابھری، لہجہ اس نے اپنا مضبوط رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تہ میں چھپی ہوئی تشویش بھی ہویدا تھی۔

''پہلے اپنے آدمی سے بات کر لو، تاکہ تمہاری تسلی ہو جائے کہ ہم جھوٹ نہیں بول رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے کوریلا نے فون میرے کانوں سے لگا دیا۔

''ہیلو...... ہیلو...... شہزی! تت...... تم ٹھیک تو ہوناں......؟ کی...... یہ کون لوگ ہیں؟ تم کہاں ہو؟'' دوسری

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جانب سے زہرہ بانو کی ہراساں سی آواز ابھری۔

''میں...... جہاں بھی ہوں، بالکل محفوظ...... ہوں اور میرے بارے میں تم لوگوں کو...... پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں...... او......!'' آخری لفظ میرے منہ میں ہی رہ گیا تھا، کیونکہ اسی وقت پاس کھڑے کرنل سی جی نے میرے لات رسید کر کے مجھے کرسی سمیت الٹ دیا تھا۔ کوریلا یک دم ایک طرف ہوگئی اور سی جی کی طرف دیکھنے لگی، اس کا سیاہ رُو چہرہ شدتِ غیظ تلے لال بھبو کا ہو رہا تھا۔ اس نے آگے ہاتھ بڑھایا اور کوریلا نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا سیل اس کی جانب بڑھا دیا۔

''سنو......! شہزاد خان کو واپس اور زندہ سلامت دیکھنا چاہتے ہو تو ہمارا آدمی تم لوگوں کو واپس کرنا پڑے گا، ورنہ ہم اس کا وہ حشر کریں گے جو اس کے باپ تاج دین شاہ کا کیا تھا، بلکہ اس سے بھی برا ہوگا اس کے ساتھ اگر تم لوگوں نے ہمارا مطالبہ تسلیم نہ کیا۔''

کرنل سی جی بھجوانی باؤلے کُتّے کی طرح بولے جا رہا تھا، اس کی حالت واقعی ایک خارش زدہ کُتّے کے جیسی ہو رہی تھی۔

میں ابھی تک رسن بستہ حالت میں سیلن زدہ، ننگے فرش پر لڑھکا پڑا ہوا تھا۔ کرسی ایک طرف کو الٹی پڑی تھی۔ کرنل سی جی بھجوانی کی غصیلی اور غراتی ہوئی آوازیں میرے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔ وہ بد بخت ہنوز زہرہ بانو سے مخاطب تھا۔

اس مردود نے اپنے بھاری بھرکم بوٹ کی لات میرے پیٹ پر رسید کی تھی، جس کے باعث مجھے اپنے پیٹ میں خاصی دیر تک اینٹھن کا احساس ہوتا رہا تھا۔

''غور سے سن لو، شہزاد اس وقت تم لوگوں کی سوچ سے بھی میلوں دور ہے، جہاں چڑیا کا بچہ بھی پر نہیں مار سکتا، اس لیے کسی فضول قسم کی مہم جوئی کا خیال بھی اپنے دل میں مت لانا، صرف معاملے کی بات ہوگی، اِس ہاتھ لو اُس ہاتھ دو......''

''دو...... دیکھو! پہلے ہمیں پتا تو چلنا چاہیے کہ شہزاد اس وقت کن لوگوں کی قید میں ہے اور......؟'' دوسری جانب سے زہرہ بانو کی پریشان کن آواز ابھری تھی، جبکہ سی جی درمیان میں ہی اس کی بات کاٹ کر بھیڑیے جیسی غراہٹ خارج کرتے ہوئے بولا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے، صرف معاملے کی بات سننا ہے تو آگے بات کی جائے، بہ صورت دیگر...... شہزاد گیا......'' اس کے لہجے سے سفاکی عیاں تھی۔

''نن...... نہیں، میں معاملے کی بات کی طرف آرہی ہوں، مجھے بتاؤ، ہمیں کیا کرنا ہوگا؟''

''رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ کے قبضے میں ہمارا ایک اہم آدمی سندر داس ہے، وہ ہمیں چاہیے۔ تمہیں، شہزاد مل جائے گا۔'' سی جی نے کہا اور ساتھ ہی اس نے قریب کھڑے شیام کو اشارہ کیا، اس نے اپنے چیف کا اشارہ بھانپ کر فوراً کرسی سیدھی کی اور مجھے بازوؤں سے سنبھال کر اس پر دوبارہ بٹھا دیا۔

پیٹ میں سی جی بھجوانی کے بھاری بوٹ والی لات نے مجھے اندر سے سخت تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا، دونوں ہاتھ میرے، پشت کی طرف بندھے ہونے کے سبب میں دہرا ہو کر پیٹ تھامنے سے قاصر تھا۔ کرسی بھی بغیر پشت گاہ والی تھی، میں ٹیک بھی نہیں لگا سکتا تھا اور مجھے اکڑ کر اس پر بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

''لیکن ہم یہ کام کیسے کر سکتے ہیں؟ ہمارا تو ان کے ساتھ ایسا کوئی ایشو نہیں ہے؟'' زہرہ بولی۔

''تم نے فقط میجر ریاض باجوہ کو اطلاع پہنچانی ہے اور ہمارے درمیان تم رابطے کا کام کرو گی، بس!'' بھجوانی زہر خند آواز میں بولا۔

''یہ مشکل ہوگا، ہمارا اُن کے ساتھ کوئی بھی قریبی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی وہ ہماری کسی بات پر بھروسا کریں گے۔''

''مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا، اب تم جانو اور تمہارا کام......'' کرنل بھجوانی بولا۔ ''جب تک ہمارا مطالبہ تسلیم نہیں کر لیا جاتا، تب تک شہزاد ہماری قید میں رہے گا اور ہمارا قید خانہ کسی ٹارچر سیل سے کم نہیں، جلدی ہمارا کام کرو اور شہزاد کو ہر روز توڑے جانے والے تشدد سے بچا لو، آخر کو وہ ملک کے ایک عظیم سپاہی کا بیٹا ہے، اس کی رہائی کے سلسلے میں بہت کچھ کر سکتے ہو تم سب...... ہاں! معاملہ رازداری کا متقاضی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے آدمی کے سلسلے میں رازداری برتی جا رہی ہے، بہ صورت دیگر...... آگے تم لوگ خود سمجھ دار ہو......'' اس نے تہدیدی انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رابطہ منقطع کرنے کے بعد کرنل بھجوانی نے فون دوبارہ کوریلا کی طرف بڑھا دیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔

''آئندہ تم یا شیام ان لوگوں سے رابطے میں رہو گے، اس کے بعد کی بریفنگ چندر ناتھ تمہیں دیتا رہے گا، دیٹس اِٹ۔''

اپنے چیف کی بات پر تینوں نے مؤدبانہ انداز میں

...کیے تھے۔ تاہم چندر ناتھ نے پوچھا۔

''چیف! کیا اسے اب واقعی کوہارا کو کب سپرد کرنا ''اس کا اشارہ میری طرف تھا اور میں اپنے پیٹ کی بل بھلا کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ کرنل بھجوانی نے ...ری طرف دیکھ کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ہمارے اسپیکٹرم اور لولوش کے ساتھ دیرینہ اور ...کہ مفادات وابستہ ہیں، ہم اسے ہرگز ناراض کرنے کا ...طرہ نہیں مول لے سکتے، ابھی ان کا ایک اہم مہرہ وزیر جان ...ستان میں موجود ہے اور پاکستان کے خلاف ہماری ...ریہ سازشوں کے سلسلے میں وہ ہمارے بھی کام آتا رہے ...۔ اس لیے یہ اسپیکٹرم کی قید میں رہے یا ہماری، اس ...ے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ ہمارا مشترکہ قیدی ہے۔''

''لیکن سر! اگر ہمارا مطالبہ مان لیا گیا تو ہمیں اس کی (بری) ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن اس وقت یہ......'' کوریلا ...تی کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔

''آئی نو دیٹ، اِٹس او کے!'' کرنل بھجوانی نے اپنے ...ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ابھی اس سے جو مقصد حاصل کرنا تھا کر لیا، پاکستانی رینجرز فورس نے اب تک سندر داس سکینہ کو انٹیلی جنس کے حوالے کر دیا ہوگا۔ جبکہ اس کے (میرے) بہی خواہ ہاتھ ...کر ان کے پیچھے پڑ جائیں گے، اس طرح سندر داس کو ...لوگ اتنی جلدی موت سے ہمکنار کرنے کا سوچیں گے بھی ...ہیں۔ مجھے آشا تو ہے کہ پاکستانی انٹیلی جنس اپنے غازی اور ...اعزاز یافتہ سپاہی کے بیٹے کو ہمارے آدمی کے بدلے میں ...حوالہ کروانے پر مجبور ہو جائیں، مگر اس کے (میرے) بہی خواہ بھی کم نہیں ہیں کسی سے، وزیر جان اور وہاں موجود ...ارے چند بچے کھچے ایجنٹوں کی انفارمیشن کے مطابق شہزاد ...ے ساتھی اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کا وہاں ایک مضبوط گروپ ہے، جو اپنا ایک اثر رکھے ہوئے ہیں۔''

''چیف! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہزاد کے ساتھی ہماری ...ت ماننے کے بجائے اپنے ساتھی کو چھڑانے کے لیے ...ارے خلاف خفیہ کمانڈو ایکشن کرنے کی کوشش کریں؟'' ...شیام نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو سی جی بھجوانی نے ایک استہزائیہ ...نگاہ میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔

''یہ پھر اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ ...کمانڈو......'' وہ یہ کہہ کر اپنے آدمیوں کے ساتھ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

یہ لوگ میرے سامنے اس قدر یقین سے یہ سب باتیں کر رہے تھے جیسے میں واقعی ہمیشہ کے لیے ان کی قید میں آچکا ہوں اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے ان کی ''مشترکہ'' قید سے نہیں چھڑا سکتی تھی۔ یہی زعم اور غرور انسان کو لے ڈوبتا ہے، کرنل بھجوانی اور لولوش اسی غرور میں مبتلا تھے۔

بے شک ان لوگوں نے مجھے ایک مربوط پلاننگ کے بعد نہ صرف بے دست و پا کر دیا تھا بلکہ سرحد پار پہنچا دیا تھا اور اب بھی نچانے میں اور کہاں کہاں کن کن لوگوں کے مفاد کے لیے پہنچایا جانے والا تھا؟ اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ تو ہو چلا تھا مگر سرحد پار میرے ساتھ کھیلے جانے والے اس ہولناک کھیل میں تنِ تنہا ان سارے حالات کا خود ہی اللہ کے بھروسے پر مقابلہ کرنا تھا، جو معمولی بات نہ تھی لیکن مجھے اصل فکر اپنی نہیں، بلکہ پاکستان میں موجود میرے ساتھیوں کی تھی جو بے چارے اس صورتِ حال سے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے، اول خیر اور شکیلہ سمیت وہ بھی میرے پیارے اور خیر خواہ...... سمجھ تو جائیں گے کہ میں کن لوگوں کی قید میں ہو سکتا ہوں۔ وہ بھی یقیناً اتنی دور بیٹھے میری رہائی کے لیے کوئی لائحہ عمل سوچ سکتے تھے مگر انہیں کیا معلوم تھا کہ میں اب کہاں کہاں دربدر کیا جانے والا تھا؟ اور وہ اپنی اس خطرناک مہم میں کہاں تک کامیاب ہو سکتے تھے؟ یہ وہ نہیں جانتے تھے مگر مجھے اس کا اندازہ تھا کہ وہ بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے مایوسی میرے نزدیک گناہ کے مترادف تھی۔ اس گناہ کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور ڈٹ کر، ایک چیلنج سمجھ کر میں نے ایسے حالات کا مقابلہ کیا تھا، جب موت کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا تھا۔

بے شک میں اب تک اپنی زندگی کے بہت خراب اور غیر یقینی حالات سے گزرتا رہا تھا، بلکہ جم کر اس کا مقابلہ بھی کیا تھا مگر یہاں معاملہ اور ہی لگتا تھا۔ سرحد پار، بے سروسامانی کے عالم میں ایک ملک سے دوسرے ملک شروع ہونے والی، براعظم، براعظم آوارہ گردی، اسے میں حالات کا دھارا کہوں یا ستم تقدیر...... لیکن اب تک میں نے جس سے استادی سیکھی تھی، وہ حالات کا یہی بہتا دھارا ہی تو تھا۔

☆☆☆

میں اپنی زندگی میں اس طرح کی پہلی بار ہی رہائی نما ''قید'' کو دیکھ رہا تھا، جب مجھے ''یوز ٹو'' کرنے کے بعد دوبارہ اسی طرح واپس وہیں پہنچایا جا رہا تھا، جہاں سے لایا

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

گیا تھا لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ کوئی بھی شے اپنی جگہ سو فیصد پرفیکٹ نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں رتی ماشہ کا کھوٹ، انیس بیس کا فرق رہ جاتا ہے، تو یہاں بھی میرے ساتھ یہی ہوا۔

جب مجھے لولوش کے دستِ راست کوہارا کی بوٹ کی طرف روانہ کیا جا رہا تھا تو میری آنکھوں پہ پٹی کو شاید عجلت میں باندھا گیا تھا، جس کے باعث میری ایک آنکھ کی اوپری طرف ایک باریک سی درز کھلی رہ گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کا میری رہائی یا فرار سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا لیکن میں وطن دشمنوں کا یہ ٹھکانا اپنی یادداشت میں محفوظ تو رکھ سکتا تھا، جہاں بیٹھ کر میرے وطن کے لیے گھناؤنی سازشیں تیار کی جاتی تھیں اور یہی وہ جہنم کدہ تھا، جہاں میرے باپ پر اس درندہ صفت انسان، کرنل سی جی بھجوانی نے طرح طرح کے ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔

یہ بھی شکر تھا کہ وقت دن کا ہی تھا، ورنہ رات کی تاریکی میں مجھے شاید گرد و پیش کے اس محلِ وقوع کا اتنا پتا نہیں چلتا۔

سب سے پہلے میں نے کمرے سے نکلتے وقت اس باریک جھری سے جائزہ لینا شروع کیا۔ میں جس سیلن زدہ اور ننگی اینٹوں والے کمرے میں تھا، وہ کمرا وہاں صرف ایک ہی نہیں تھا، ایسے اور کمرے بھی مجھے ایک راہداری سے گزرتے ہوئے دائیں بائیں دکھائی دیے تھے، ان میں بیشتر سے تو مجھے چیخنے چلّانے کی بھی آوازیں سنائی دی تھیں، یہ مجھے پورا ہی ایک ٹارچر سیل ہی کی طرح لگا تھا۔ دو تین موڑ کاٹنے کے بعد مجھے ایک سنگل پٹ والے دروازے سے باہر نکالا گیا تو مجھے یوں لگا جیسے کسی پرانی کلاسک بلیک اینڈ وائٹ فلم کا منظر یک دم بدل گیا ہو اور اس کی جگہ کسی نئی رنگین فلم کا منظر آ گیا ہو۔

ایک چکنے فرش والا وسیع و عریض ہال تھا۔ یہاں مجھے کچھ مسلح وردی پوش دکھائی دیے، نیم دائرے کی شکل میں میزیں تھیں، گول موٹے ستون تھے اور کہیں ایک دو جگہ پر پینل نصب تھے، جہاں چھوٹی بڑی اسکرینز جرک کرتی نظر آتیں، مجھے سیدھے ہاتھ لے جا کر ایک سلائڈنگ ڈور سے باہر نکالا گیا اور یہاں سے ایک قدرے طویل راہداری پر چلتے ہوئے ہم وسیع و عریض احاطے میں آ گئے، جہاں درمیان میں ایک ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک ہیلی کوپٹر پہلے سے موجود تھا، یہ شاید وہی تھا جس میں ہم سوار ہو کر گزشتہ شب یہاں پہنچے تھے۔ پٹی کی ''اتفاقیہ'' جھری سے جھانکتے ہوئے میں نے دھیان رکھا تھا کہ ''اندھے پن'' کی اداکاری جاری رکھوں اور گرد و پیش کے جائزے لینے میں احتیاط برتوں تاکہ کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہونے پائے۔

میرے ہمراہ اس بار صرف شیام اور گوریلا تھے، چندر ناتھ اس مرتبہ نہیں چلا تھا۔ یہ دونوں مجھے لیے ہیلی کوپٹر کے پچھلے حصے میں سوار ہو گئے۔ پائلٹ اندر موجود تھا۔ ہمارے سوار ہوتے ہی کوپٹر کے دیوہیکل پنکھ حرکت میں آ گئے اور اس کے ذرا دیر بعد وہ فضا میں بلند ہو گیا۔ یہاں سے بھی میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی، کافی کوشش اور وقت طلب حرکات و سکنات کے بعد مجھے آس پاس نیچے خاصا بڑا جنگل پھیلا ہوا نظر آیا تھا۔

ہیلی کوپٹر جس رخ پر تھا وہاں نیچے مجھے ایک بل کھاتی پٹی دکھائی دینے لگی، جس کے اطراف میں بھی خاصا بڑا گھنا جنگل تھا، اس کے بعد جنگل کی حدود تمام ہوتے ہی بنجر پہاڑیاں اور سنگلاخ ویرانے تھے، پار اس کے پہنچے تو مجھے ریت کے میدان نظر آنے لگے، میں ان ساری نشانیوں کو ذہن میں رکھتا گیا، ایک مینار بھی نظر آیا جس کی حالت خستہ تھی، یہ شاید ساحلی علاقہ تھا اور کبھی یہ مینار ''واچ ٹاور'' کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ اب یہاں چیلوں اور کوؤں نے گھونسلے بنا لیے تھے، وہی اس کے گرد منڈلاتے ہوئے مجھے دکھائی دیے تھے۔ کیونکہ اس کے بعد سمندر کی حدود شروع ہو گئی تھی۔

ہیلی کوپٹر اب قدرے نیچی پرواز پر تھا۔ جہاں اس کا رخ تھا وہیں مجھے ایک لانچ ساحل کنارے دکھائی دی، ہیلی کوپٹر اس کے قریب جا اترا، مجھے نیچے اتارا گیا، اس کے بعد ہم لانچ کی طرف بڑھے۔ اس میں چار مسلح افراد موجود تھے، ہم عرشے پر ہی کھڑے رہے، لانچ کا انجن، شاید ہیلی کوپٹر کو فضا میں گردش کرتے دیکھتے ہی اسٹارٹ کر دیا گیا تھا، ہمارے سوار ہوتے ہی لانچ گڑگڑاتے ہوئے کھلے سمندر کی طرف بڑھ گئی اور بتدریج اس کی رفتار تیز ہوتی چلی گئی۔

مجھے کچھ تسلی اور اطمینان ہوا کہ میں کرنل سی جی بھجوانی کی قید سے تو نکلا، ورنہ وہ خبیث درندہ صفت انسان میرا جانے کیا حشر کرنے والا تھا لیکن مجھے لولوش یا کوہارا سے بھی خیر کی کوئی امید نہ تھی۔ وہ میرے لیے اس سے بھی بڑھ کر جلاد ثابت ہو سکتے تھے۔ گویا میں ان کے بیچ کھلونا بنا دیا گیا تھا، جو چاہے لیتا اور مجھ سے کھیلنا شروع کر دیتا۔ آج مجھے لگ پتا رہا تھا کہ سرحد پار کی جنگ کیا ہوتی ہے، انسان خود کو بالکل بے دست و پا سمجھنے لگتا ہے۔ جائے تو کہاں جائے، والی صورتِ حال ہوتی ہے اس کے لیے۔

JBD

...کے شاہکار تاریخی ناول

انسان اور دیوتا 450/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

معظم علی 475/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستانِ شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیمِ برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوطِ غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلہ حجاز 599/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالمِ اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمتِ عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنھیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیرِ میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 300/-
فتحِ دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتحِ سندھ کی معرکہ آرا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

...معرکہ 550/-

...رات کے مسافر 475/-

...کی تلاش 300/-

...ری 625/-

...سلسلہ
دیدہ زیب طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)
...کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بک ڈپو
042-35757086
051-5539609
021-32765086
022-2780128
042-37220879

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

تھوڑی دیر بعد ہماری لانچ کوہارا کی عالیشان ''بوٹ'' سے جا لگی۔ ایک خودکار سیڑھیوں کے ذریعے کوریلا اور شیام مجھے لے کر بوٹ پر اترے، اور حسبِ وعدہ مجھے انہوں نے کوہارا کے حوالے کر دیا اور اس سے تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد واپس لوٹ گئے۔

سمندر پر نکلا یہ دن پوری تب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اوپر کھلے نیلے آسمان پر آبی پرندے اُڑتے پھر رہے تھے۔ موسم خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ میں عرشے پر ہی موجود تھا جہاں کوہارا اور اس کا بری نسل کا آدمی بھومک موجود تھا، چند دیگر خلاصی بھی تھے، وہ اِدھر اُدھر مصروف سے نظر آ رہے تھے۔ کوہارا وہیں عرشے پر دھری فولڈنگ چیئر پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا، اس کے سامنے میز پر ناشتے وغیرہ کا سامان رکھا ہوا تھا، دو تین ناریل بھی پڑے تھے، وہی دونوں انڈین لڑکیاں اس کے قریب بیٹھی ناریل کی ''آنکھ'' پھوڑے ان میں اسٹرا ڈالے اس کا پانی پینے میں مشغول تھیں۔

''بیٹھو! ناشتا کر لو، معاف کرنا، کل تو میں نے تمہیں کھانے کا کچھ پوچھا ہی نہیں، بھوک تو لگی ہوگی تمہیں، آجاؤ۔'' وہ میری طرف دیکھ کر کھرکھراتی آواز میں بڑے سکون پرور لہجے میں بولا۔ میں جانتا تھا کہ اس ''سکون'' کی تہ میں کس قدر اچانک اور قہر بار طوفان چھپا رہتا ہے۔ بھوک تو مجھے جانے کب سے لگی ہوئی تھی۔

میں خاموشی سے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میز پر ناشتے کے نام پر سی فوڈ ہی کی بہتات نظر آ رہی تھی، جن میں تلی ہوئی فش، کچھ شکاری پرندوں کے بھنے ہوئے سالم پھور کے علاوہ ابلے ہوئے انڈے اور جیم، بٹر اور بریڈ وغیرہ رکھے تھے۔ آبِ ارغواں کی دو بوتلیں اور تین پیگ بھی رکھے تھے۔ چائے یا کافی کا فلاسک بھی نظر آتا تھا۔

میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی سمت بندھے ہوئے تھے، اور میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ سوالات تو بہت کلبلا رہے تھے میرے ذہن میں، جنہیں نوکِ زباں پر میں نہیں لا سکتا تھا، اسی لیے خاموش بیٹھا رہا تو اس نے قریب کھڑے بھومک کو اشارہ کیا، اس نے فوراً آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھوں کے جکڑ بند کھول دیے۔

ایک ہی رخ پر اور کافی دیر تک دونوں ہاتھ بندھے رہنے سے میرے دونوں بازوؤں میں اینٹھن سی ہونے لگی تھی۔ اسی لیے آزاد ہوتے ہی میں نے پہلے اپنے دونوں اکڑے ہوئے ہاتھوں کو وارم اپ کیا، پھر کوہارا کا شکریہ ادا کر کے میں بھی ناشتے پر گویا ٹوٹ پڑا تھا۔ میں دانستہ ندیدے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ مقصد یہی تھا میرا کہ کوہارا...... نے مجھ سے متعلق اپنے اندر جو تاثر قائم کر رکھا تھا، میں اس کی نفی کرتا رہوں، ورنہ وہ صرف ''تذکرے'' کی حد تک ہی میری خطرناکیوں سے واقف تھا۔ دونوں انڈین لڑکیاں مجھے اس طرح ناشتا کرتے ہوئے دیکھ کر ہولے سے ہنسی تھیں، میں نے بھی ان کی طرف جھینپی جھینپی مسکراہٹ سے دیکھا تھا۔

ناشتے کے بعد میں ایک مگ میں کافی انڈیل کر پینے لگا۔ کسی نے صحیح تو کہا ہے کہ خالی پیٹ انسان کی عقل بھی کام نہیں کرتی ہے نہ دماغ۔ قوت بخش ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے جسم میں توانائی سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ساتھ ہی میں نے تیزی سے سوچنا شروع کر دیا تھا اور منتظر تھا کہ کوہارا اپنی زبان خود ہی کھولے، مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ پڑے، ورنہ کم بخت پھر مجھے زخمی کر سکتا تھا۔ جبکہ زبان بھی ابھی میری پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہو پائی تھی، اگرچہ پہلے کی نسبت کافی افاقہ تھا۔

''ناشتے کا شکریہ! میں تمہارا اور گریٹ ماسٹر کا مشکور ہوں کہ ایک قیدی کی حیثیت دینے کے باوجود مجھے یہاں دوستانہ ماحول دے رکھا ہے۔'' میں نے اس کا منہ کھلوانے کے لیے چالاکی سے اس کی اور لولووش کی تعریف بھی کر ڈالی اور حسبِ توقع کوہارا نے بھینچی بھینچی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر اپنے اور اپنے ''گریٹ ماسٹر'' کی شان میں قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔

''گریٹ ماسٹر کا یہی انداز ہوتا ہے ہمیشہ، حالانکہ تم اس کے دشمن نمبر ایک ہو مگر پھر بھی اس نے تمہارے سلسلے میں مجھے یہی حکم دے رکھا ہے کہ میں تم پر اس وقت تک کسی قسم کی سختی نہ برتوں جب تک کہ تم بلاضرورت اپنا منہ نہیں کھولو گے۔''

''میں اب یہی کر رہا ہوں......'' میں نے گرما گرم کافی کا ایک تلخ گھونٹ بھر کے کہا۔

''لیکن گریٹ ماسٹر کی دشمنی والی بات پر میں شرمندہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے، میں تو آج تک گریٹ ماسٹر سے ملا بھی نہیں ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ نادانستہ طور پر بلاواسطہ ہمارے بیچ کچھ ہو گیا ہو تو اس کی معذرت چاہوں گا۔'' میں چاہتا تھا کہ وہ میری اس بات پر کوئی تبصرہ کرے تاکہ بات سے بات نکلتی رہے مگر وہ اچانک بات بدل کر مجھ سے مستفسر ہوا۔

''ان لوگوں نے تم پر کسی قسم کا کوئی تشدد تو نہیں کیا تھا؟'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواباً

''نہیں، ادھار تو وہ مجھ پر بہت کھائے بیٹھے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی گریٹ ماسٹر کی مہربانی کا دخل ہے ورنہ تو کرنل بھوانی مجھے چھوڑتا تو کجا، یوں بغیر کوئی گزند پہنچائے رہ بھی نہیں سکتا تھا، جس قدر وہ مجھ پر بھرا بیٹھا تھا۔''

''ہوں ں ں......'' اس نے صرف ایک ہنکارا بھرا پھر مجھے اس وقت مایوسی ہوئی جب اس نے قریب دست کھڑے بھومک کو مخصوص اشارہ کیا اور اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی میں اسی کمرے میں تھا، جہاں پہلے میں مقید تھا، اس بار بھی مجھے میرے بنک بیڈ کی راڈ کے ساتھ ہتھکڑی لگا کر باندھ دیا گیا۔ وہاں وہی کل والا میرا ہم وطن قیدی بھی اپنے بنک بیڈ پر دراز حالت میں موجود تھا مگر اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا، وہ خاصا زخمی حالت میں تھا، پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ احساس ہو چلا تھا کہ اس بے چارے پر خاصا تشدد کیا گیا تھا۔ میری سوئی ایک بار اپنے حالات سے ہٹ کر پھر اس پر اٹک گئی۔

اس کی بے رخی کے باوجود مجھے اس پر ترس آیا، وہ بہرحال میرا ہم وطن تھا اور میری طرح غیروں کی قید میں تھا، لیکن وہ کون اور کیوں ان کی قید میں تھا؟ یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا میرے ذہن میں لیکن یہ مجھ سے کسی بھی قسم کے تعاون پر رضامند نہیں ہوا تھا، نا کچھ بتاتا بھی تھا اپنے بارے میں، حالانکہ اس بے وقوف کو میں نے پہلے اشاروں میں اور پھر واضح لفظوں میں یہ باور بھی کروانے کی کوشش چاہی تھی کہ ہم دونوں ایک سے دکھلے تھے اور محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے بھی سوار تھے مگر وہ اپنی ہٹ کا پکا نکلا تھا، اس نے میرے ساتھ ذرا بھی تعاون کر کے نہیں دیا۔

خیر، بھومک کی موجودگی میں، میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ ہولے ہولے کراہنے لگا تھا، اس کے دونوں ہاتھ بنک کے آہنی راڈ سے بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بہ غور اس کے زخموں کا جائزہ لیا، اس کے چہرے، ماتھے اور بازوؤں پر سوجن تھی اور ٹانگوں میں بھی زخم محسوس ہوا تھا، کیونکہ اس کی ٹائٹ پینٹ پر پنڈلی اور ران کی طرف خون جم کر اپنی رنگت بدلنے لگا تھا، یہی حال اس کے سینے، پشت اور پہلو کا تھا۔

''کیا ہوا دوست؟ انہوں نے تمہیں اتنا کیوں مارا ہے؟'' میں نے کہتے ہوئے اس کا گال ہولے سے تھپتھپایا اور ساتھ ہی اسے ہوش دلانے کی بھی کوشش چاہی۔

''آ آ...... آہ...... ب...... بہت مارا ہے م...... مجھے ان ظالموں نے۔'' وہ کراہا۔

''مجھے بے حد افسوس ہوا ہے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر......'' میں نے ازراہِ ترحم اس سے کہا۔ ''کاش! تم مجھ پر بھروسا کرو اور مجھے ان کا اپنی طرح ایک قیدی ہی سمجھو تو شاید ہماری زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت مشکلات آسان ہو جائیں......''

''م...... میں......'' وہ کہتے کہتے رکا، باعثِ تکلیف...۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پھر اسے ہولے سے تھپک کر حوصلہ دیا اور بولا۔

''اللہ تم پر رحم کرے دوست! یہ لوگ واقعی بے حد ظالم ہیں۔ تم کچھ حوصلہ پکڑو تو پھر بات کرتے ہیں، ویسے تمہاری زیادہ طبیعت تو خراب نہیں ہے ناں؟'' میں نے ازراہِ ہمدردی آخر میں پوچھا، تو وہ بہ مشکل اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''بس! ٹھ...... ٹھیک ہی ہوں میں......'' وہ ذرا کسمسایا، میں نے اسے سہارا دیا تو وہ میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''اتنا تو بتا دو کہ تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟ پاکستان، یا انڈیا سے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم کس ملک کے رہنے والے ہو؟'' اس نے الٹا مجھ سے پوچھ لیا، اس پر بھی میں نے شکر کیا کہ چلو مجھ سے ہی سہی، کچھ سوال تو کیا، لہٰذا میں نے جواباً کہا۔

''میں تو پاکستان کا رہنے والا ہوں......''

''میں بھی پاکستانی ہوں۔'' اس نے ایک گہرا سانس لے کر بتایا۔

''تو تم بھی واقعی ان کے قیدی ہو......؟'' اس نے شاکی سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اس کے بچکانا سوال پر پھر سے غصہ تو آیا مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ کہ مجھ میں تمہیں ایسی کیا خوبیاں دکھائی دے رہی ہیں جس سے میں تمہیں ان کا قیدی نہیں بلکہ ساتھی لگ رہا ہوں؟''

''یہ لوگ جس قدر سفاک اور درندہ صفت ہیں اتنے ہی چالاک اور ذہین بھی'' وہ بولا۔ ''ہو سکتا ہے کہ مجھ سے کچھ اگلوانے کے لیے انہوں نے تمہیں میرے ساتھ ہی قیدی بنا کر رکھا ہو، تاکہ میں تمہارے ساتھ گھل مل جاؤں۔''

''اچھا......!'' میں نے طنزیہ کہا۔ وہ شاید پاکستان کی جیلوں میں ایسا ہوتا دیکھ کر یا سن کر ایسا کہنے پر مجبور تھا۔

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

جہاں واقعی کسی عادی اور ڈھیٹ مجرم سے کوئی راز اگلوانے کے لیے یہ حربہ استعمال کیا جاتا تھا۔ میں نے کہا۔

"ہاں دوست! تمہاری بات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہی ہے، یہ ہوتا ہے مگر پاکستانی جیلوں میں، جبکہ ہم اپنے ملک سے کوسوں دور بھارت کے کسی ویران ساحل پر موجود ہیں اور کسی بڑے عالمی گینگسٹر کی قید میں بھی...... یہاں ایسی چالیں نہیں چلی جاتیں، کیونکہ یہ خود ہی براہِ راست قیدی کے منہ سے سب کچھ اگلوانے کا فن جانتے ہیں لیکن سب سے پہلی بات یہ کہ میں نے تو ابھی تک تم سے ایسی کوئی بات پوچھی بھی نہیں ہے، جس سے تم میرے سلسلے میں شک و شبے میں پڑ جاؤ۔"

"ہوں! لیکن انہوں نے کل تمہیں کہاں غائب کر دیا تھا؟" اس نے پھر سوال داغا، تو میں نے اس غرض سے کہ شاید میرے ہی سچ بولنے سے وہ مجھ پر بھروسا کر لے اور کچھ اپنے اور ان کے درمیان معاملہ داری کے بارے میں بتانے پر مجبور ہو جائے۔

لیکن میں نے اسے مزید اپنے اعتماد میں لینے کی غرض سے محتاط ہو کر اور کچھ باتوں سے پہلو تہی کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں بتانے لگا۔

"میرا معاملہ شاید تم سے زیادہ خطرناک اور نازک ہو، یوں سمجھو میں پاکستان کی ایک خفیہ انٹیلی جنس سے تعلق رکھتا ہوں، یا رکھتا تھا، اور اپنے وطن میں کچھ ایسے ملک دشمن عناصر اور ایجنٹس کا خاتمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا جو پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے، ان میں سرفہرست، اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی جیسی ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث خفیہ تنظیمیں......"

"ای...... ای...... ایک منٹ!" اس نے بری طرح چونک کر درمیان میں میری بات کاٹ دی۔ "ابھی تم نے کون سی تنظیم کا نام لیا تھا؟"

"بلیو ٹکسی؟"

"نہیں، اس سے پہلے۔"

"اسپیکٹرم!"

"ہاں...... ہاں! یہی...... ان سے تمہاری کیا دشمنی ہے؟" وہ بھونچکا ہو کر مستفسر ہوا۔

"اصل دشمنی میری انہی کے ساتھ تو ہے۔" میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"تو کیا تم واقعی خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھتے ہو؟" وہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور میں نے دیکھا اس کے بشرے سے اب قدرے اعتماد اور طمانیت کے تاثرات ہویدا ہونے لگے تھے۔

"باقاعدہ تو نہیں تھا لیکن حادثاتی طور پر شامل ہو گیا تھا۔" میں پھر بتانے لگا، وہ بڑے غور سے ہمہ تن گوش رہا، اور یک ٹک میری جانب دیکھنے لگا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا کہ ابتدا میں میری کن لوگوں سے دشمنی تھی اور پھر میں کس طرح حالات کے دھارے میں بہتا ہوا کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ وغیرہ۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکے جا رہا تھا۔ اسے اسپیکٹرم کے ذکر پر چونکتا پا کر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ستایا ہوا لگتا تھا، یہ الگ بات تھی کہ میرے ذہن میں اس کے سلسلے میں ایک اندیشناک خدشے نے بھی سر ابھارا تھا کہ کہیں یہ اسپیکٹرم کا باغی یا کوئی بھگوڑا فعال ایجنٹ نہ ہو...... جو اس تنظیم کو "ری جوائن" بھی کر سکتا تھا۔

"یہ لو دوست! میں نے اب تمہیں اپنے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔" چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تمہیں اگر اب مجھ پر بھروسا ہو چکا ہے تو اب ذرا تم بھی اپنے بارے میں مجھے اسی طرح تفصیلاً آگاہ کر دو...... تا کہ ہم دونوں مل کر آگے کی سوچ سکیں۔"

میں نے اب پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر اب بھی اس نے اپنا منہ نہیں کھولا تو اس سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لوں گا لیکن اس کی نوبت ہی نہ آ سکی، اس نے بنک پر لیٹے لیٹے میری طرف اپنا چہرہ کر کے انتہائی متاثر کن لہجے میں بولا۔

"دوست! میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں...... کاش! میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوتے تو میں تمہیں باقاعدہ سلیوٹ بھی پیش کرتا اور تم جیسے بہادر، ثابت قدم اور جری انسان کو میں اپنے گلے لگاتا۔ دوست! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟" وہ آخر میں استفساریہ بولا۔

"شہزاد احمد خان عرف شہزی۔" میں اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا۔ وہ آگے بولا۔

"ہاں! شہزاد خان! میں اب تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا، اس لیے کہ تم نے یہ صحیح کہا تھا کہ ہم دونوں واقعی ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور ایک سے دو بھلے ہو سکتے ہیں، تو دوست! مجھے تم اپنے ساتھ سمجھو لیکن تم اب بھی اسپیکٹرم کی خطرناکی اور اس کے مکروہ اور گھناؤنے عزائم سے شاید پوری طرح واقف نہیں...... تم نے ابھی اسپیکٹرم کی ہولناکی کا وہ تصور بھی نہیں کیا ہوگا جو میں جانتا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر رکا۔

یک ٹک نگاہیں اس کے بشرے پر جمی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنے اور "اسپیکٹرم" کے بارے میں کوئی بڑا انکشاف کرنے والا ہو۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے نام سے [illegible]

"میرا نام...... بشام چھلگری ہے......"

مجھے اس نام پر ایک جھٹکا سا لگا، یہ نام مجھے کچھ سنا ہوا [illegible] اس کی بات آگے بڑھنے سے پہلے ہی میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ دوست! مجھے یہ نام سنا ہوا لگتا ہے، ذرا سوچنے دو کہ میں نے یہ کب اور کہاں سنا تھا۔"

"یقیناً سنا ہوگا۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہلکے سے ہنسا۔ "تم بھی "پاور ایجنٹ" تھے۔" اس کے چہرے پر عجیب تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

میں اپنے ذہن پر زور دینے لگا، اس نام کا اگر ایک سے زیادہ بار تذکرہ ہوتا تو شاید میں اتنی جلدی نہیں بھولتا، پیہم زور دینے کے بعد اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

"اسپیکٹرم...... بشام چھلگری...... آرکیالوجسٹ...... اوہ......" یہ نام میرے سوچتے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگے اور مجھے دھیرے دھیرے یاد آنے لگا تھا یہ سب...... میجر ریاض باجوہ صاحب نے مجھے "اسپیکٹرم" کے خفیہ مقاصد کے بارے میں آگاہ کیا تھا، جس کے مطابق "اسپیکٹرم" نے خود کو ایک بین الاقوامی سطح پر ایک "ادارے" کی صورت میں متعارف کر رکھا تھا۔ بظاہر اس کا مقصد اپنے طور پر دنیا بھر کے تاریخی نوادرات کی حفاظت، نیز ایسے نوادرات بھی جو کسی ملک یا قوم کا تاریخی ورثہ ہوتے ہیں، ان کی گمشدگی یا برآمدگی کی صورت میں ان کا صحیح اور حق بجانب مقام پر رہنے دیا جائے، ان کے اہم مقاصد میں شامل ہے۔ اب تک یہ تنظیم، یعنی "اسپیکٹرم" بے شمار چوری شدہ نوادرات برآمد کر کے انہیں ان کے اصل وارثا تک پہنچا چکی تھی۔

اس تنظیم کو دنیا کے بیشتر ممالک کی مالی اعانت بھی حاصل تھی اور اس کے ممبر پوری دنیا میں پھیلے ہوئے تھے......

"تم بشام چھلگری...... ایک آرکیالوجسٹ، ذہین اور شائستہ، تعلیم یافتہ نوجوان، تمہارا تعلق صوبہ سندھ کے مشہور تاریخی شہر لاڑکانہ سے ہے، اسپیکٹرم کے سابقہ اور فیلڈ آفیسر اور فعال ممبر......! کیا غلط کہا میں نے کچھ......؟"

ساری یادداشت کھنگالنے کے بعد میں نے خاصے مسرت بھرے جوش سے کہا تو اس نے ایک حیرت آمیز سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یو آر ایبسولوٹلی رائٹ...... مسٹر شہزاد خان! میں وہی بشام چھلگری ہوں...... جو ایک عرصے سے اسپیکٹرم کو چھوڑنے کے بعد گمنامی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔" وہ یہ کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکا، میں ہمہ تن گوش اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"بلاشبہ اسپیکٹرم ابتدا میں بین الاقوامی طرز کا ایک معتبر ادارہ تھا اور عالمی سطح پر اس کی ایک ساکھ تھی اور بڑے فعال طریقے سے کام کر رہی تھی، اس تنظیم نے کئی بڑے ممالک کے چوری شدہ یا گم شدہ نوادرات لوٹانے کے کارہائے نمایاں انجام بھی دیے تھے، یہی وجہ تھی کہ کئی ترقی یافتہ ممالک میں اس کی پذیرائی ہوتی رہی، اور مختلف ممالک سے اس تنظیم کو بڑے بڑے فنڈ ملنے لگے لیکن یہ سب تب تک رہا، جب تک مسٹر ڈی کارلو...... اسے آرگنائز کرتے رہے، جن کا شمار اس تنظیم کے بانیوں میں ہوتا تھا۔ لولوش ان کے نائب کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو اصل میں جرائم کی دنیا کا ایک بڑا ڈون تھا۔ اس نے اسپیکٹرم کو ہائی جیک کر لیا اور پھر اس تنظیم کی نیک نامی اور فعل کامی کو غلط طریقے سے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ نہ صرف مختلف ممالک کی بدنامِ زمانہ خفیہ ایجنسیوں کے لیے خطیر معاوضوں پر ایک ملک کے راز دوسرے ملک کے ہاتھوں پہنچانے لگے بلکہ ان وسیع تر مفادات میں بھی ان کا پورا پورا ساتھ دینے لگے، کیونکہ اس تنظیم کی ساکھ پہلے ہی پچاس سے زائد ممالک میں قابلِ تحسین ہی نہیں بلکہ عزت و تکریم کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ لولوش نے اگرچہ بہت پہلے سے ہی اس کی جڑوں کو اپنے مطابق سینچنا شروع کر دیا تھا، مقاصد تو اب بھی اس کے وہی تھے مگر درپردہ لولوش اسے جرائم کے راستے پر ڈال چکا تھا۔ جو راضی رہے وہ اس کے لیے کام کرتے رہے، جنھوں نے انکار کیا انہیں خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ میرے جیسے لوگ کنارہ کش ہو کر روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے لیکن میں خود ایک اہم وجہ کے تحت دوبارہ ان کے نرغے میں آ گیا......"

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔ میں بڑی یکسوئی اور غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ یہ بالکل ویسا ہی سین تھا جیسا کہ میرے سلسلے میں "اطفال گھر" میں ہوا تھا، جب تک

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

حاجی محمد اسحاق اسے نیک نامی سے چلاتے رہے تو سب ٹھیک تھا مگر ان کی موت کے بعد اس ادارے کو چوہدری ممتاز خان نے ہائی جیک کر کے اپنے حواری گگل خان کو اس کا سرغنہ بنا دیا اور بچوں کو علمی و دینی تعلیم کے بجائے جرائم کا نصاب پڑھایا جانے لگا، پھر اطفال گھر جرائم کا اڈا بن گیا۔ اچانک ماضی کی باتیں میرے ذہن میں گھوم گئیں۔

''آخر وہ ایسی کیا وجہ تھی، جس نے تمہیں دوبارہ اسپیکٹرم کے نرغے میں پھنسا دیا؟'' وہ میرے سوال پر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا، پھر ایک نگاہ دروازے کی طرف ڈال کر ہولے سے بولا۔

''یہ بات انتہائی خطرناک، حساس اور رازداری کی متقاضی ہے، ابھی میں نہیں بتا سکتا، دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں لیکن میرا وعدہ ہے تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا...... بلکہ تمہیں ہی تو بتاؤں گا اور مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت پڑے گی، میں اسی وجہ کے تحت تو اب تک زندہ ہوں، اور ان درندہ صفت لوگوں کے ہاتھوں بار بار تشدد کا نشانہ بنتا رہا ہوں، ورنہ تو یہ لوگ مجھے بھی کب کا موت کے گھاٹ اتار چکے ہوتے، لہٰذا ابھی صرف ان سے چھٹکارا پانے کی سوچو......''

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے دوست! لیکن کہیں ایسا نہ ہو جائے تم اور میں جدا کر دیے جائیں، جیسا کہ کل ہوا تھا، یہ تمہیں نجانے کہاں لے گئے تھے، مجھے خود بھی تمہاری طرف سے تشویش ہو گئی تھی، اور پھر یہ اہم راز، راز ہی رہ جائے، اگر ایسا کوئی ہاٹ ایشو نہیں ہے تو مجھے بھی اس کے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر دوست اس وقت ہم دونوں ہی غیر یقینی حالات کا شکار ہیں، آگے تم جو بہتر سمجھو......''

میری بات نے اسے بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے مزید کہا۔ ''یوں بھی ہم اپنی زبان میں باتیں کر رہے ہیں، یہ لوگ کہاں یہ سمجھیں گے؟''

''ان کے پاس ایسے ٹرانسلیٹر ڈیوائسز موجود ہیں جو کسی بھی زبان کو کنورٹ کر سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ چھت کو اور پھر کمرے کی دیواروں کو تکنے لگا۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بالآخر بہت دھیمی آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ سنو غور سے...... تین سپر اور منی پاور کے ممالک دنیا کو ایڈ وولف ہٹلر کی طرح تیسری جنگِ عظیم میں جھونکنے والے ہیں۔ ان میں امریکا، روس اور بھارت شامل ہیں۔ ان تینوں ممالک کے جنگی جنونی جنرلوں نے اپنے اس خفیہ پلان کو ''ورلڈ بگ بینگ'' کا نام دیا ہے، اور اس گھناؤنے انسانیت سوز مقصد کے لیے تین ممالک کو ''یوز ٹو'' (استعمال) کیا جائے گا، اس میں ایک ایران ہے، دوسرا ہمارا ملک پاکستان اور تیسرا اچھن ہے۔ یہ ایک عالمی سازش ہے۔ دیکھو دوست انسان کی فطرت میں تغیر و تبدل کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک جگہ زیادہ دیر تک نہیں بیٹھ سکتا، اس کی فطرت میں سکون ہے نہ آرام...... وہ چاہتا ہے کچھ نہ کچھ ہوتا رہے، پہلی اور دوسری جنگِ عظیم بھی ایسے ہی جنونی جنرلوں کا شاخسانہ تھی۔ انسان کی فطرت میں ہی جنگ ہے۔

خیر...... میں تمہیں بتا رہا تھا، موئن جو دڑو لاڑکانہ میں ڈوکری کے مقام پر ایک مشہور تاریخی کھنڈرات کا حامل علاقہ ہے، جہاں آج سے کچھ سال پہلے...... سندھیالوجی کے ایک پروفیسر کریم بخش نظامانی نے کھدائی کروائی تھی، ان کی برسوں کی تحقیق کے مطابق موئن جو دڑو کے جس مقام پر کھدائی کرنا مقصود تھا، وہاں آریائی دور کا نایاب نوادر موجود ہونے کے امکانات ہیں جو گزشتہ کھدائیوں کے دوران نہیں مل سکا تھا۔ مذکورہ پروفیسر تاریخ اور آرکیالوجی میں ڈبل پی ایچ ڈی ہیں اور بہت قابل مانے جاتے ہیں۔ کھدائی کی گئی تو واقعی آریائی دور کا وہ نادر نمونہ ان کے ہاتھ لگ گیا، جس کی تحقیق و تلاش میں انہوں نے رات دن ایک کر ڈالے تھے۔ ان کی شبانہ روز تحقیق کے مطابق وہ نادر و نایاب نمونہ ایک اژدھے کی شکل کا ہے جس نے ایک بڑا سا پھن کاڑھا ہوا ہے اور اس کے منہ میں ایک چمکتا ہوا بیش قیمت ہیرا جگمگا رہا ہے، جو کوہ نور ہیرے (کوہ نور، برصغیر سے برآمد ہونے والا وہ ہیرا جو برطانیہ کے قبضے میں ہے اور ملکہ الزبتھ کے تاج کی زینت بنا ہوا ہے، جسے لوٹانے یا حاصل کرنے کے لیے محض عمومی کوششیں کی جاتی رہی ہیں، دوسری طرف بھارت بھی اس کوشش میں مصروف ہے) سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل انمول اور بیش قیمت ہے۔

''پروفیسر کریم بخش نے اس ہیرے کا نام ''طلسم نور ہیرا''...... رکھا تھا، اور یہ نام رکھنے کی وجہ وہ اپنی عرق ریزی اور نجانے کتنی اجنبی، نامانوس اور متروکہ زبان کی تحقیق کے مطابق، ایسی پُراسراریت بتاتے تھے جو اس ہیرے سے وابستہ تھیں۔ نجانے کیا بات تھی جو میں نے اس ہیرے کی بازیافت کے بعد محسوس کی تھی وہ یہ کہ پروفیسر کریم بخش نظامانی گم صم اور عجیب سے رہنے لگے تھے، ان کی بے پایہ خوشی کو جیسے ایک اسرار بھری چپ کھا گئی تھی۔

''جب میں نے طلسم نور ہیرے کو کھدائی کے بعد پہلی بار دیکھا تو اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری

ایک بڑے سے کالے اژدھے کے کھولے ہوئے ندر کی بیچ منکے کی طرح وہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت ب سے بڑے، قیمتی اور تاریخی عظمت کے حوالے اور ہیرے کی اہمیت جانی جاتی ہے۔ کوہ نور ہیرا صورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن پاکستان سے ہونے والا یہ طلسم نور ہیرا خوب صورتی اور وزن اور اس سے بھی نسبتاً بڑا تو تھا ہی، نیز تاریخی ورثے لے سے بھی اس کی عظمت کوہ نور ہیرے سے بڑھ کر ازیں علاوہ اس ہیرے میں مجھے ایک عجیب سی ریت بھی محسوس ہوئی تھی، میں اس پر باوجود کوشش دیر اپنی نظریں نہیں جما پا رہا تھا، ملٹی ڈائمنشنل (Multidimension) یعنی کئی رخی یہ ہیرا مجھے درے غیر مرئی لہریں چھوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو کھوں کے راستے میرے پورے وجود میں سرائیت تھیں، جب میں نے تھوڑی کوشش سے اس پر اپنی جمانا چاہیں تو مجھے یوں لگا جیسے میں گردوپیش سے کسی اور ہی دنیا کی طرف پرواز کرنے لگا ہوں، میری میں عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں، چیخ و پکار، پھنکاریں، تیر و تفنگ، میدانِ جنگ کا سا اور دیو ہیکل درندوں کی دہاڑیں، بے ہنگم قہقہوں کے آہیں اور سسکیاں اور نجانے کیسی کیسی دل ہولا دینے آوازیں تھیں۔ پھر مجھے اپنا وجود منتشر سا محسوس ہونے لگا، اچانک مجھے کسی نے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا، جیسے ایک خواب سے بیدار ہو گیا، میں نے دیکھا، صاحب نے مجھے سنبھالا ہوا تھا، وہ خود بھی مجھے شان اور ژولیدہ خاطر نظر آرہے تھے۔ بعد میں انہوں پُراسرار ہیرے سے متعلق انکشاف کرتے ہوئے یہ ہیرا آج ہزاروں سال پہلے آریائی اور دراوڑی کے بیچ جنگ و جدل اور خون ریزی کا باعث بنا اور اسی وجہ سے یہ لوگ تباہ و برباد ہوئے، ان میں علوم کے ماہر بھی تھے، یہ ہیرا ان کے کسی بڑے دیوتا لیکن جب میں نے پروفیسر صاحب سے اپنی اس غریب کیفیات سے متعلق پوچھا تو انہوں نے کچھ اس لاعلمی کا مظاہرہ کیا تھا کہ جس سے مجھے شک گزرا بہت کچھ جانتے تھے مگر بتانے سے بچنا چاہ رہے تھے، تو ہی بتایا کہ بعض چیزوں کا تاثر ہی ایسا ہوتا ہے قوتِ متخیلہ پر اثر پذیر ہو کر حواسوں پر اثر انداز ہوتا یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہم کسی اچھی چیز یا اچھے منظر کا مثبت تاثر لیتے ہیں، اور بُرے کا تلخ، یہ ہیرا بھی چونکہ زمانہ قدیم سے تعلق رکھتا ہے اور تم نے بھی اپنے ذہن میں ویسا ہی تاثر رکھتے ہوئے اسے دیکھا اور اس میں کھو گئے، پھر وہ آریائی اور دراوڑی قوموں کے متعلق بتانے لگے کہ آریائی سفید فام اور دراوڑ گہرے رنگ کے تھے، جبکہ آریائی، دراوڑیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور انہیں ''داس'' کہتے تھے، جس کا مطلب ''غلام'' تھا۔ ان کے بیچ بڑی زبردست طبقاتی تقسیم تھی، دراوڑی بھی خود کو کم نہیں سمجھتے تھے، یہ بالکل ایسا ہی جیسے، آج جرمن، روس یا امریکا خود کو دنیا کی عظیم قوم کہتے ہیں اور اپنے سے کم طاقت والی قوموں کو زیر کرنے کے لیے جنگ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

''تاہم ابھی اس نادر و نایاب ہیرے کی پاکستان کے حوالے سے ملکیت کے باضابطہ دعویٰ کا اعلان بھی نہیں ہوا تھا کہ بدقسمتی سے یہ چوری ہو گیا۔ کسی کو پتا بھی نہ چل سکا کہ وطنِ عزیز کو کس قدر اہمیت کی حامل اور انمول شے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ پروفیسر کریم بخش کو طلسمِ نور ہیرے کی چوری کا اس قدر ملال ہوا کہ وہ دل کے دورے کا شکار ہو کر دارِ فانی سے ہی کوچ کر گئے۔

''مرنے سے پہلے وہ اس بات پر متفکر تھے کہ اگر یہ ہیرا...... نہ ملا تو یہ...... دنیا میں تیسری جنگِ عظیم کا سبب بن سکتا ہے، کاش! یہ جلد ہمیں مل جائے، ورنہ اس کے اثرات کسی ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے کم نہیں ہوں گے۔

''میرا تعلق بھی چونکہ آثارِ قدیمہ سے تھا اور پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ مجھے بھی اس نادر و انمول ہیرے کی چوری ہونے کا سخت ملال تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوا، میں نے بے حد کوشش کی کہ کسی طرح حکومت اور مقتدر حکومتی حلقے اس ہیرے کی تلاش میں میرا ساتھ دیں مگر انہیں تو اپنی خرمستیوں سے ہی کہاں فرصت تھی۔ ان کے لیے تو یہ سب ایک دیوانے کا خواب ہی تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وطنِ عزیز کو کس قدر اہمیت کے حامل تاریخی نوادر سے محروم کر دیا گیا تھا، جو اگر پاکستان میں ہوتا تو اس کا کس قدر فائدہ ملک کو ہوتا۔ مگر افسوس کسی حکمراں جماعت نے اسے تلاشنے یا کھوجنے کا بیڑا نہ اٹھایا، بالآخر میں نے اپنے تئیں کوشش چاہی تو اسی دوران ''اسپیکٹرم'' نامی تنظیم کا میں نے ایک روز اخبار میں تذکرہ سنا، جو اپنے طور پر چوری یا گم شدہ نوادرات کو تلاش کر کے ان کا جائز مقام دلانے کے لیے خاصی شہرت رکھتی تھی، اسی اخبار

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

میں اس کے تازہ ترین کارنامے کی بھی خبر چھپی تھی، جس میں اس نے بدھا (گوتم بدھ) کے ایک ایسے مجسمے کو تلاش کیا تھا جو تھائی لینڈ کی ملکیت تھا۔

”مجھے اپنی مراد بر آتی نظر آنے لگی اور میں نے اس تنظیم کے بارے میں معلومات وغیرہ حاصل کرنے کے بعد نیویارک، مسٹر ڈی کارلو کو ایک خط لکھا، انہوں نے خود بھی مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا اور ایک ہفتے کے وزٹ ویزا پر میں امریکا روانہ ہوگیا، کیونکہ اسپیکٹرم کا ہیڈ آفس وہیں تھا اور اب بھی ہے۔ وہیں میں نے مسٹر ڈی کالو سے اس سلسلے میں تفصیل سے بات چیت کی تو وہ بھی اس ہیرے کی تلاش کے سلسلے میں کمربستہ ہوگئے، بلکہ مجھے بھی اس تنظیم میں شمولیت کی دعوت دے ڈالی جو میں نے فوراً قبول کرلی۔

”چونکہ گم شدہ نوادرات کے سلسلے میں اس تنظیم کے ممبرز اپنی سی ذاتی کوششیں کرتے تھے اسی لیے انہیں خاص تربیتی کلاسز سے گزارا جاتا تھا، مجھے بھی اس کے لیے دوبارہ انہی کے ذریعے اسپانسر شپ ملی اور یوں میں بھی وہاں دو ماہ کی تربیتی ٹریننگ حاصل کرچکا تھا، اس میں اپنے دفاع سے لے کر نوادرات کے کھوج اور ان کی برآمدگی سے لے کر اسلحہ چلانے تک کے جدید اور سائنٹیفک طریقے اور دیگر حربوں سے آشنائی کروائی گئی تھی۔

”تاہم اس میں کوئی شک نہ تھا کہ طلسم نور ہیرے کی تلاش میں میرے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اسپیکٹرم، یعنی مسٹر ڈی کارلو نے اس سلسلے میں میری مدد کی، میں نے بھی ان کی تنظیم کے لیے بہت کام کیا مگر ابھی تک میں اپنے اصل مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔ یعنی طلسم نور ہیرے کی بازیافت...... مگر میں ناامید نہیں تھا۔ میں اپنے طور پر کھوج میں لگا رہا...... بالآخر میری کوششیں رنگ لائیں اور مجھے اتنا تو پتا لگ ہی گیا کہ وہ نادر ہیرا اژدھے سمیت جس نے چوری کیا تھا یا یوں کہہ لو کروایا گیا تھا وہ وہیں کا ایک مقامی بااثر زمیندار تھا، جسے نوادر جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور اپنے اس شوقِ جنوں میں ہر وہ حد پار کر ڈالنے میں عار محسوس نہیں کرتا تھا، جب بھی اس مقام میں کھدائی ہوتی تھی وہ زمیندار اپنے ہاریوں کو مزدور کے روپ میں ان کے بیچ شامل کرکے ان کے ذریعے چوری کرواتا تھا اور یہ بھی اس کے کسی مزدور کا ہی کام تھا۔ میں چونکہ وہیں کا رہنے والا تھا اسی لیے وہاں کے ماحول کو زیادہ بہتر طریقے سے جانتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہاں کی پولیس علاقے کے ایک بااثر زمیندار کے خلاف کارروائی کیا کرے گی، بلکہ الٹا اسے ”باخبر“ کردے گی کہ اس کے خلاف کیا ہونے چلا ہے، اسی لیے میں اس کے خلاف کوئی ایکشن لینے کے سلسلے میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی اعلیٰ ذمے دار افسر سے ہی اس سلسلے میں بات کروں، بہرحال میری کوششیں رنگ تو لائیں اور سب سے پہلے اس مزدور کو گرفت میں لیا گیا، جس نے مذکورہ وڈیرے کے کہنے پر وہ اژدھے والا ہیرا چوری کیا تھا، یوں اس بااثر وڈیرے پر بھی ہاتھ ڈالا گیا۔ وہ صاف مکر گیا، اور اپنی ضمانت وغیرہ کی کوشش کرنے لگا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا، وہ رہا ہوگیا۔ میں سخت مایوس ہوا، کیسے لوگ تھے یہ، جو اپنے ہی ملک کا ایک قیمتی اثاثہ چوری کرکے بیٹھے تھے، آرام سے میں بھی نہیں بیٹھا تھا، میں چونکہ اسپیکٹرم کا ایک نمائندہ اور باقاعدہ ممبر تھا، اسی لیے میں نے ایک آفیشلی رپورٹ تیار کرکے، فوراً نیویارک، مسٹر ڈی کارلو کو ارجنٹ ارسال کی اور اس سلسلے میں انہیں اپنے عزائم سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھا کہ اب میں خود ذاتی طور پر اس کے کھوج کے لیے کوشاں ہونا چاہتا ہوں، وغیرہ...... چونکہ اسپیکٹرم کے ایجنٹ بیشتر ممالک میں پھیلے ہوئے تھے، البتہ پاکستان میں صرف میں ہی ایک تھا، یا پروفیسر کریم بخش نظامانی مرحوم...... جبکہ بھارت میں اسپیکٹرم کی ممبر سازی کی نفری خاطر خواہ تھی، وہاں اس کے ممبرز کی تعداد گیارہ کے قریب تھی۔ وہیں سے میری مدد کو سوشیلا اور وکرم کو بھیجا گیا۔ یہ دنوں تنظیم کے بڑے فعال ممبر تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں مذکورہ تنظیم سارا خرچہ پانی اور وہ تمام وسائل تفویض کرتی تھی، جس کی بنا پر ہم اپنا مشن پایہ تکمیل تک پہنچاتے تھے۔ لہٰذا اگر طلسم نور ہیرا برآمد کرلیا جاتا تو لازمی طور پر اس کا کریڈٹ اسپیکٹرم کو جاتا اور یہ اس کا حق بھی بنتا تھا۔

”بہرکیف...... میری مدد کو جو دو ممبران آئے تھے، میں نے انہیں بریف کیا اور پھر ہم نے اپنے تئیں اس بااثر زمیندار کے خلاف خفیہ کارروائی کا آغاز کردیا۔ سوشیلا اور وکرم اسپیکٹرم کے سینئر ممبر تھے اور ان کی مدد سے ہم نے وہ ہیرا بالآخر مذکورہ زمیندار کی حویلی کے خفیہ تہ خانے سے برآمد کرلیا۔

”سوشیلا اور وکرم کی رہائش وغیرہ کا بندوبست میرے پاس ہی تھا۔ میں نے ان دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ان کے روانہ ہونے سے پہلے ہی میں نے ان کے کہنے پر ایک آفیشلی لیٹر کی صورت میں رپورٹ تیار کرکے اسپیکٹرم ہیڈ آفس نیویارک روانہ کردی۔

”طلسم نور ہیرا میرے پاس تھا اور میں اسے اگلے متعلقہ محکمے کے سپرد کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ وہ سوشیلا اور وکرم میرے پاس رہے، اگلے دن وہ دونوں بذریعہ جہاز انڈیا روانہ ہوگئے۔ ہیرا میرے پاس تھا۔ اگلے میں جاگا۔ ہیرا دیکھا تو مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا، نہ وہ حیرت نہ وہ تاثر نہ وہ اثر پذیری جو اسے دیکھ کر مجھے ہوتی تھی بعد میں مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ ہیرا نقلی تھا، اصل ہیرا وکرم یا سوشیلا یا پھر وہ دونوں ہی چوری کرکے لے گئے تھے۔

”میں نے فوراً مسٹر ڈی کارلو سے رابطہ کیا تاکہ اس سلسلے میں ان سے بات کرسکوں تو مجھ پر ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ وہ ایک روز پہلے ہی ٹریفک حادثے میں ناگہانی موت کا شکار ہوچکے تھے۔ مجھے ان کی اچانک موت کا دکھ بھی ہوا اور تشویش بھی کہ اب کیا ہوگا؟ کون میری مدد کرے گا؟ وکرم یا سوشیلا میں سے کوئی ایک یا دونوں مجھے ہاتھ دکھا گئے تھے، کس کے کہنے پر؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ میں کئی دن اسی ادھیڑبن میں رہا کہ اب کیا کروں اور کیا نہ کروں، کہ مجھے لولوش کی فون کال موصول ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ اسپیکٹرم کا روحِ رواں ہے۔ چونکہ میری رپورٹ اسے مل چکی تھی کہ ہیرا میں حاصل کرچکا ہوں، تو اس نے مجھ سے ہیرے کے بدلے سودے بازی کرنا چاہی، اسے ابھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہیرا تو ایک بار پھر چوری ہوچکا تھا۔ مگر مجھے اس کی بات پر سخت طیش آیا اور مجھے ہر طرح کی دھمکیاں دینے لگا پھر رفتہ رفتہ اس کی بھی قلعی کھلتی چلی گئی کہ لولوش کس قماش کا آدمی تھا اور اس نے اسپیکٹرم جیسے معتبر ادارے کو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر غلط راستے پر ڈال دیا ہے، لہٰذا پھر میں بھی ان سے کنارہ کش ہوگیا اور اسپیکٹرم سے ہر طرح کا تعلق، رابطہ توڑ دیا، نہ صرف یہ بلکہ میں نے اپنا استعفیٰ بھی لکھ کر بھیج دیا لیکن لولوش کی مسلسل دھمکیاں مجھے ملتی رہیں، وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ ہیرا میرے پاس ہے لیکن میں اس سے یہ جھوٹ بول رہا ہوں کہ وہ چوری ہوگیا ہے۔ حالانکہ میں اسے بتا چکا تھا، اور ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ یہی سمجھے بیٹھے ہوئے تھا، میں ان کا اصلی چہرہ دیکھنے کے بعد ان سے متنفر ہوگیا ہوں، جب اس نے مجھ سے طلسم نور ہیرے کے سلسلے میں خفیہ سودے بازی کرنی چاہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ لولوش کتنا بڑا گینگسٹر بن چکا ہے، اسی لیے مجھے اس سے خوف آنے لگا، اور میں روپوشی کی زندگی گزارنے لگا۔ میں نے نوکری بھی چھوڑ دی اور دکان وغیرہ کھول کر معمولی زندگی بسر کرنے لگا۔ انہی دنوں میں نے شادی بھی کرلی، اللہ نے مجھے دو جڑواں بیٹے بیٹی کا باپ بھی بنایا، میں اپنی سادہ مگر پُرسکون زندگی سے بہت مطمئن اور خوش تھا کہ اچانک میں ان کے ہتھے چڑھ گیا اور اب یہ مجھے برما لے جارہے ہیں، لولوش کے سپرد کرنے...... اور مجھے اسی بات کا خوف ہے کہ وہ مجھے جان سے ہی ماردے گا۔ میری بیوی بھری جوانی میں بیوہ ہوجائے گی اور چھوٹے بچے یتیم ہوجائیں گے۔ کیونکہ لولوش میری کسی بات پر یقین نہیں کرتا، اس کا یہی اصرار ہے کہ وہ ہیرا اب بھی میرے قبضے میں ہے۔“

☆☆☆

وہ تمام تفصیل بتانے کے بعد خاموش ہوگیا لیکن اپنے بیوی بچوں کو یاد کرکے اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ میں نے اس کی ساری کتھا سننے کے بعد چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی اختیار کیے رکھی اور پھر اس سے بولا۔

”مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی...... تم جیسا بہادر اور محبِ وطن آدمی بھلا اس قدر ہمت ہار کے کیوں بیٹھ گیا تھا؟ کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خیال تک نہیں آیا کہ سوشیلا اور وکرم تمہیں اُلّو بنا کر وہ ہیرا چوری کرکے لے گئے اور تم نے اسے دوبارہ بازیاب کرانے کی کوشش تک نہ کی؟ جبکہ پہلی بار جب یہ ہیرا چوری ہوا تھا تو تم نے اپنی انتھک کوششوں سے بالآخر یہ ہیرا اس بااثر زمیندار کے قبضے سے برآمد کرالیا تھا، پھر تم نے ہمت کیوں ہاری......؟“

میری بات سننے کے بعد وہ ایک گہری سانس خارج کرکے بولا۔ ”اپنے ملک کا معاملہ اور تھا اور اس وقت مسٹر ڈی کارلو بھی زندہ تھے، تنظیم اپنے اصل اغراض و مقاصد میں پوری طرح فعال تھی، مجھے اس کی سپورٹ حاصل تھی لیکن ڈی کارلو کے مرنے اور تنظیم کے ہائی جیک ہونے کے بعد، میں بےحوصلہ ہوگیا اور پھر اس بار معاملہ بھی دوسرے ملک کا تھا، ہیرا چوری کرکے سرحد پار پہنچا دیا گیا تھا۔“

”تمہاری بدقسمتی یہ ہوئی کہ تم ہیرے کی برآمدگی کے سلسلے میں ایک تحریری رپورٹ نیویارک مسٹر ڈی کارلو کو لکھ کر بھیج چکے تھے، جو لولوش کے ہاتھ لگ گئی، اب وہ بھلا کیسے اس بات کا یقین کرے گا؟ وہ یہی سمجھے ہوئے ہوگا کہ تمہاری اپنی نیت میں فتور آچکا ہے اور تم خود اس ہیرے کا کسی سے سودا کرکے کھرب پتی بننے کا خواب دیکھ رہے ہو۔“

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

''بالکل یہی ہوا ہے میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔ ''اسے خطرناک غلط فہمی ہوگئی ہے، جو لگتا ہے اب میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔''

اس تکونی کمرے میں سناٹا طاری رہا۔ میرے لیے یہ خبر بڑی سنسنی خیز تھی۔ طلسم نور ہیرے جیسا بے مثال و نایاب نوادر پاکستان کی ملکیت تھا مگر وہ ملکی سطح پر ہائی لائٹ ہونے سے پہلے ہی اُڑا لیا گیا اور ان چوروں کا تعلق بھی اسی ملک (بھارت) سے تھا۔ اب یہ بدبخت لولووش اسے ہتھیانے کے چکروں میں تھا۔ اس ہیرے سے متعلق مجھے بھی تجسس ہوا اور اس تجسس کی وجہ اس کی وہ پُراسرار خاصیت تھی جو بشام نے مجھے بتائی تھی لیکن میرے دل و دماغ میں اس کی یہ بات بھی کسی کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی کہ جب اس نے اپنی کتھا کے دوران پاکستانی محقق پروفیسر کریم بخش نظامانی کے بہ قول یہ ہیرا اگر اپنے جائز مقام (پاکستان) سے ہٹا دیا گیا تو یہ تیسری عالمی جنگ کا باعث بھی بن سکتا تھا۔ بہ صورت دیگر یہ نادر و نایاب ہیرا پاکستان کی ملکیت میں رہا تو یہ اس کے لیے (پاکستان کے لیے) سودمند ثابت ہوتا رہے گا۔

تو گویا اب صورتِ حال یہ تھی کہ یہ لوگ ہم دونوں ''قیدیوں'' کو برما لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جہاں لولووش بے چینی سے ہمارا منتظر تھا۔ لولووش نے گویا ایک تیر سے دو شکار کیے تھے، ایک طرف ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بشام چھلگری کو قابو کیا تھا اور دوسری طرف اڈیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے اور گویا ''لگے ہاتھوں'' مجھے اپنے حلیف بلیو ٹکسی والوں کے ساتھ اپنے بھرپور تعاون اور دوستانہ جذبات کو فروغ دینے کے لیے ''یوز ٹو'' بھی کرنے کی کوشش کی تھی۔ گویا مجھے دہرے مفادات کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ یہ اس کی ذہانت اور سہ رخی عملی کارروائی کا کمال تھا کہ وہ اپنی حد تک کامیاب جا رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اسے اس طرح کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

''کیا سوچنے لگے دوست؟'' مجھے سوچوں کے بھنور میں غلطاں پا کر بشام نے کہا تو میں اس گرداب سے ابھر کر بولا۔

''آں...... کچھ نہیں، تمہارے لیے حالات واقعی تشویش ناک حد تک مخدوش ہیں، تمہاری بدقسمتی یہ ہے کہ لولووش کو تم سے ایک ایسی شے درکار ہے جو تمہارے پاس نہیں لیکن لولووش اس بات پر پورا یقین کیے بیٹھا ہے کہ وہ تمہارے قبضے میں ہے۔''

''ہاں! مجھے بھی اسی تشویش نے پریشان اور خوف زدہ کر رکھا ہے۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ ''سوچتا ہوں اب کہ...... کیا ضرورت تھی مجھے اس ہیرے کے پیچھے بھاگنے کی؟ جب ملک کے ذمّے داران و مقتدران نے ہی اس کی حفاظت کے سلسلے میں کسی سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا تو مجھے کیا ضرورت پڑی تھی اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کی؟ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو بعد میں میرے بیوی بچوں کا کیا بنے گا؟ کوئی انہیں نہیں پوچھے گا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ آزردہ ہونے لگا۔ ہمارے ملک کا یہی...... بڑا المیہ ہے، ملک کے سچے خدمت گاروں اور وطن پرستوں کو کیا ملتا ہے؟ ایک میڈل...... اور بس! مجھے ایک واقعہ یاد آگیا تھا، کسی شہید سپاہی کا گھرانا غربت اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہا تھا، بھوک نے ڈیرے ڈال رکھے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا، آخر میں اس میڈل یافتہ شہید کی بیوہ نے بھوک سے تنگ آکر اپنے شوہر کو ملنے والا سونے کا میڈل بیچ ڈالا تھا۔

رہی ہیرے والی بات تو اس کا مجھے بھی قلق تھا۔ میں یہ قطعی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ طلسم نور جیسا ہیرا، جس پر صرف میرے ملک کا حق تھا وہ دوسرے کے پاس چلا جائے۔ میرا فرض تھا کہ میں اسے حاصل کرنے کی جستجو کروں۔

''دیکھو بشام! ملک و قوم کی سچی خدمت کرنے والے کبھی بھی دل میں کسی صلے یا اعزاز کا لالچ نہیں رکھتے، ان کا مطمحِ نگاہ صرف اور صرف خدمت ہوتا ہے اور بس! مجھے تم پر فخر ہے کہ تم نے یہی کچھ کیا۔ مگر تم ہمت مت ہارو، میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ اور سب سے بڑا ہمارا ساتھ اللہ کا ہے۔ بس تم ایک بات واضح کر دو کہ کیا واقعی تم اب بھی یہ چاہتے ہو کہ وہ طلسم نور ہیرا، جس پر صرف ہمارے ملک کا حق ہے، اسے ہم دوبارہ حاصل کریں؟''

میری بات پر اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں جوش کی ایک لہر سی مترشح ہوتی محسوس ہوئی۔ بولا۔

''کیوں نہیں دوست! میں بھلا کیسے نہیں چاہوں گا اپنے استاد پروفیسر کریم بخش صاحب مرحوم کی دن رات کی عمر گزار محنتوں کے ثمر، طلسم نور ہیرہ حاصل کروں، جس پر ہماری دھرتی ماں کا حق ہے اور اس کا زیور بھی۔ اسی صدمے نے ہی تو پروفیسر صاحب کی جان لی تھی کہ اس بیش قیمت اور خدا کے دیے ہوئے تحفے کی ہم حفاظت نہ کر سکے۔ اسے حاصل کرنے کی دلی تمنا اور جوش اب بھی میرے سینے میں ٹھیں مارتا ہے مگر جب اپنے حالات اور وسائل کی طرف دیکھتا ہوں تو سر جھکا لیتا ہوں۔''

''بس دوست! اپنا یہی جوش اور ہمت جواں رکھنا، انشاء اللہ ہم اس زیور کو حاصل کر کے رہیں گے۔'' میں نے بھی اسی جوش سے کہا تو وہ پہلی بار میری طرف دیکھ کر مستحکم انداز میں مسکرایا اور میں نے بھی اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''ایک بات بتاؤ...... کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ طلسمِ نور ہیرا، وکرم اور سوشیلا نے ہی چرایا ہے؟''

''پورا سو فیصد یقین ہے مجھے......'' میری بات پر وہ بہ یک ترنت بولا۔ ''کیونکہ ہیرے کی برآمدگی کے فوراً ہی بعد میں نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور یہ دنوں اس رات میرے پاس ہی رہے تھے، اگلے دن وہ روانہ ہوئے تو میں چند گھنٹوں تک رپورٹس وغیرہ اور چند دیگر اہم نوعیت کے کاموں میں مصروف رہا، بعد میں جب میں اپنے ضروری امور وغیرہ سے فارغ ہوا تو یوں ہی ایک نظر میرا اس ہیرے کو دیکھنے کا جی چاہا تو مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ ہیرا چرایا جا چکا تھا، جبکہ اس کی جگہ یہ نقلی ہیرا رکھ دیا گیا تھا۔''

''حیرت ہے'' میں نے کہا۔ ''بہ قول تمہارے وکرم اور سوشیلا تو اسپیکٹرم کے سینئر اور قابلِ بھروسا ممبران تھے۔''

''نیت بدلتے کب دیر لگتی ہے دوست!'' وہ ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''یہ تو پھر اس نادر و نایاب ہیرے کی بات تھی جو انمول تھا۔''

''کیا خبر وہ ہیرا ان دونوں کے بجائے کسی ایک نے ہی چرایا ہو؟'' میں نے کہا۔ ''یعنی وکرم یا پھر...... سوشیلا نے؟''

''خیال تو مجھے بھی یہی آتا ہے لیکن بات تو وہی ہے کہ ہیرا چرایا جا چکا ہے، اب چاہے، سوشیلا نے چرایا ہو یا وکرم کی یہ حرکت ہو؟''

''اگر تو یہ صرف ان میں سے کسی ایک کی ہی حرکت ہے تو پھر یہ سب اچانک نہیں ہوا ہوگا بلکہ پہلے سے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا ہوگا۔'' میں نے پُرغور لہجے میں کہا۔

''ممکن ہے۔'' اس نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا تمہیں وکرم یا سوشیلا کے بارے میں تفصیلاً آگاہی ہے؟'' میں نے کہا اور اپنی بات کی وضاحت چاہی۔ ''میرا مطلب ہے، ان کا یہاں بھارت میں کچھ اتا پتا ہے؟ وہ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟''

''کچھ زیادہ تو نہیں......'' وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''لیکن...... اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ ممبئی ...... شہر میں رہتے ہیں۔''

''اگر تم کسی طرح ہیڈ آفس سے ان کی پوری بائیو ڈیٹا تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید ان کا کھوج لگا سکتے تھے۔''

''کون میری مدد کرتا؟'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اپنے ملک کا تو یہ حال تھا کہ پہلی بار ہیرا جس بااثر زمیندار نے چرایا، اس کا تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا اور میں نے ہی وہ اپنی کوششوں سے اس کے قبضے سے بازیاب کروایا۔ دوسری بار چوری ہوا تو معاملہ غیر ملک کا تھا، میں کیا کر سکتا تھا، بددل ہوگیا تھا میں۔''

''ہُم......'' وہ صحیح کہہ رہا تھا۔

کمرے میں چند ثانیے خاموشی طاری رہی۔

میں اب سوچنے لگا کہ لولووش کے ہم دونوں ہی انتہائی اہم اور ''قیمتی'' قیدی تھے، انتہائی مطلوبہ بھی...... وہ ہم میں سے اس وقت تک کسی کو جان سے نہیں مارنے کا اردہ نہیں رکھے ہوئے تھا، جب تک کہ اپنا مقصد حاصل نہ کر لیتا لیکن بشام کو رہائی درکار تھی اور مجھے لولووش پر قابو پانا تھا، اس کے لیے میں کل رات سے ہی اپنے ایک پلان پر اچھی طرح غور و خوض کر چکا تھا۔ اس پلان میں کرنل سی جی کو جہنم واصل کرنا بھی شامل تھا۔

''کمال ہے، ابھی تک یہ لوگ روانہ کیوں نہیں ہوئے ہیں؟'' معاً بشام نے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس بات پر تو خود مجھے بھی حیرت تھی کہ ''بوٹ'' ابھی تک روانہ کیوں نہیں ہوئی تھی۔

''ہوسکتا ہے بوٹ میں کوئی خرابی ہوگئی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''لیکن ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کر لینی چاہیے۔''

''کیسے؟ ہمیں تو یہ کم بخت لوگ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑتے۔'' وہ بولا۔ ''صرف حوائج ضروریہ کے وقت چند سیکنڈوں کے لیے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھولتے ہیں اور پھر اسی حالت میں لے آتے ہیں ہمیں۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے، بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو......'' میں نے اسرار بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''کیا اب بھی تم ایسی باتیں کرو گے دوست؟''

''جانتا ہوں!'' میں نے دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے کہا۔

''بتاؤ مجھے کیا پلان ہے تمہارا؟'' اس نے پورے اشتیاق سے پوچھا اور میں اسے نیچی آواز میں اپنے منصوبے

WWW.AIOURDUBOOKS.NET

سے دھیرے دھیرے آگاہ کرتا چلا گیا۔ پورا منصوبہ جان لینے کے بعد اس کے چہرے پر پہلی بار ایک مسرت آمیز حیرانگی کے تاثرات ابھرے تھے، جیسے اسے بھی میری طرح اس منصوبے کی کامیابی کا پورا یقین ہو۔

”تم واقعی بہت ذہین ہو دوست! تمہاری پلاننگ رسکی سہی لیکن اس میں کامیابی کے بھی پورے چانسز ہیں۔“ وہ مجھ سے توصیفی لہجے میں بولا۔ میں ہلکے سے مسکرا دیا۔

تھوڑی دیر گزری، دروازے میں کھڑ بڑ کی آواز ابھری۔ ہم یہی سمجھے کہ وہی بھومک ہوگا لیکن جب دروازہ کھلا تو وہاں بھومک کے ساتھ کوہارا بھی موجود تھا۔ دونوں کے چہروں پہ بڑی زہر خند مسکراہٹ تھی۔ میرے اندر بے چینی کی ایک لہر نے کروٹ لی اور کسی خطرناکی کا احساس ہونے لگا۔

”ہم......! اس کا مطلب ہے تم سچ بول رہے تھے۔“ کوہارا نے ایک نگاہِ غلط مجھ پر ڈالنے کے بعد بشام کی طرف دیکھ کر سرسراتے لہجے میں کہا، مجھے اس کے لہجے میں خطرناکی کی بُو آتی محسوس ہوئی۔ اس کا یوں کہنا۔ ”اس کا مطلب ہے تم سچ بول رہے تھے۔“ کسی ہولناک شاخسانے کا ہی پتا دیتا محسوس ہوا تھا مجھے...... کیا مطلب تھا اس کا......؟ کیا اس خبیث جلاد نے ہماری باتیں سن لی تھیں؟ مگر کیسے؟ ہم تو اپنی زبان میں باتیں کررہے تھے، تب پھر مجھے بشام کی بات یاد آئی، جب میں نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وہ مجھے اس راز سے آگاہ کرڈالے جس کے باعث وہ مصیبت میں گرفتار تھا اور یہ اگر سن بھی رہے ہوں تو ہماری زبان کیا سمجھیں گے تو، بشام نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے پاس وائس ٹرانسلیٹر ڈیوائسز موجود ہوتی ہیں، کیونکہ انہیں مختلف ممالک کے ممبران کے اکثر وائس میسجز بھی موصول ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ میرے ذہن میں لامحالہ یہی شبہ ابھرا تھا۔

میں نے دیکھا، کوہارا نے بھومک کو ایک مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور مجھے پرے ہونے کا درشت سا اشارہ کیا اور پھر بشام کے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھولنے لگا۔

”کک...... کہاں لے جارہے ہو مجھے......؟“ بشام نے بھومک کی طرف دیکھ کر منہ کھولا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، بھومک کے بھدے بھدے ہونٹوں پر جوابا سفاک مسکراہٹ تھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں وحشت زدہ سا ہونے لگا، مجھے شاید کسی ”ہولناکی“ کا احساس ہو چلا تھا۔

”اسے کہاں لے جارہے ہو؟“ میں نے دروازے پر کھڑے گینڈے جیسے کوہارا سے پوچھا تو اسی وقت بھومک نے میری گردن اپنے ہتھوڑے جیسے ہاتھ کی گرفت میں لے لی اور بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

تم اپنا منہ بند رکھو، ورنہ......“ اس نے تہدیدی انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور زوردار جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی۔ بشام گھگیانے لگا تھا۔ اسے شاید کسی خطرناکی کا احساس ہو چلا تھا۔

”یہ اب ہمارے کام کا نہیں رہا ہے اس لیے اس کے بوجھ سے ہم اپنی بوٹ کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ ہاہاہا......!“ کوہارا نے میری طرف دیکھ کر بڑے ہولناک لہجے میں کہا اور پھر جانے کے لیے واپس مڑا، میں اس کی بات سن کر سرتاپا لرز اٹھا۔ یہی حال بشام کا ہوا۔ وہ موٹے تازے خلاصی بھومک کی گرفت میں زور زور سے مچلنے لگا۔

”مم...... مجھے چھوڑ دو...... خ خ...... خدا کے لیے، مجھے مت مارو...... مم...... میرے چ...... چھو...... چھوٹے بچے ہیں۔“ وہ دوہائی دیے جارہا تھا مگر بھومک یا کوہارا جیسے قسائیوں پر اس کی داد و فریاد کا کوئی اثر نہیں ہوا، بھومک نے ایک خوفناک نال والا پستول نکال لیا تھا۔ میں حلق کے بل جنونیوں کی طرح چلّایا۔

”کوہارا......! فار گاڈ سیک! اس بے چارے کے ساتھ یہ ظلم مت کرو۔“

مگر کوہارا جاچکا تھا اور بھومک بھی۔

دروازہ بند کردیا گیا۔ مجھے بشام کے چلّانے اور زندگی کی بھیک مانگنے کی لرزا دینے والی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں اور میرا دل اندر سے کٹ رہا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہتھکڑی سے اپنے ہاتھ آزاد کروا کے اس منحوس کمرے کا دروازہ توڑتا ہوا، بھومک پر جھپٹ پڑوں مگر میں خود بے بس تھا۔

اچانک ”ٹھائیں“ کی آواز ابھری۔ مجھے ایک دم سکتہ ہوگیا۔ بشام کے چلّانے اور فریادیں کرنے کی آوازیں بھی گولی کی اس آواز کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں، میرے ماؤف ہوتے دماغ اور دم بہ خود ساعتوں میں جو آخری بے رحم سی آواز ابھری تھی وہ...... پانی میں کسی کے گرنے کی زوردار چھپاکے کی آواز تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے یہاں میوزیکل، رامینک اور خوب صورت کہانیوں کی خوب صورت فلمیں ہا کرتی تھیں۔ کیسے کیسے ہنرمند ہماری فلم انڈسٹری سے وابستہ ے۔ موسیقار، کہانی نویس، ہدایت کار، اداکار، صداکار اور کتنی خوب صورت فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔

پھر معاشرے کی طرح فلموں میں بھی تشدد کا دور شروع ہوگیا۔ اس کے ساتھ کہانیاں بھی بے تکی اور بے مقصدی ہونے لگیں۔ فلموں میں بدمعاشوں کا دور شروع ہو

متوالا

منظر امام

سلور اسکرین کا اپنا نشہ ہوتا ہے... اس کا سحر ہر شخص کو جکڑ لیتا ہے... ایسے ہی دل فریب طلسم کدہ سے تعلق رکھنے والے فلم ساز کی کتھا... منفرد اور یادگار کہانیوں کی تلاش اسے سرگرداں رکھتی تھی... بالآخر وہ ایک ایسے کھنڈر تک جا پہنچا جہاں ایک پُراسرار اور محبت بھری کہانی... آج بھی سانس لے رہی تھی...

[illegible]

Downloaded From

آوارہ گرد

قسط 25

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بے رحم لمحوں کی مصلوب گھڑیاں میرے یک تک وجود کا جیسے حصہ بن کر رہ گئی تھیں۔

گولی کے دھماکے کے بعد ہی ہشام کی آواز کا یک دم ڈوب جانا اور پھر پانی میں کسی کے گرنے یا گرانے کی چھپاکے کی بے رحم آواز نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا تھا کہ سفاک درندوں نے بے گناہ اور معصوم ہشام جھلگری کے ساتھ کیا کیا ہوگا...... ! یہ دل سوز تصور کرتے ہی کہ سے جی کوہارا کے قسائی صفت بری ساتھی بھومک اسی کے ایما پر ایک بے گناہ کی بڑی بے رحمی سے جان لے چکا تھا، اس نے میرے پورے وجود میں ان دونوں کے خلاف نفرت کی لہر دوڑا دی تھی۔ یہ دونوں درندہ صفت انسان کہلانے کے لائق نہیں تھے۔

دکھ سے میرا اندر بھر سا گیا تھا، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو ہشام میری آنکھوں کے سامنے موجود تھا اور اپنی بیوی اور دو چھوٹے بچوں کو یاد کر کے ان کا بار بار ذکر کر رہا تھا۔ ان درندوں نے اسے پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا اور شاید اس کی لاش کے ساتھ وہی کیا تھا جو ''سمندر گرد'' کیا کرتے ہیں، یعنی اس کی لاش کو سمندر برد کر دیا گیا تھا۔

اس ننگی فرعونیت پر مجھ جیسا مضبوط دل گردے کا آدمی بھی دہل کر رہ گیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے پشیمانی محسوس ہوئی تھی کہ میرے ہی اصرار پر اس غریب نے طلسم نور ہیرے کے سلسلے میں میرے سامنے بھی وہی کہانی دہرا دی تھی جو وہ انہیں سنا چکا تھا، جس کے باعث وہ ان کے ہتھے چڑھا تھا۔ مگر کوہارا یا اس کا بدذات گریٹ ماسٹر لولووش کو اس پر یقین نہیں آیا تھا، وہ یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ہشام ان سے جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے تنہائی میں اور میرے ساتھ دوستانہ ہم آہنگی ہونے کے بعد ہشام مجھے جھوٹی کہانی نہیں سنا سکتا تھا، اسی لیے ان مردودوں (لولووش اور کوہارا) کو تب ہی اس کی بات پر یقین آیا تھا، جب انہوں نے اس منحوس کیبن کمرے میں کسی جگہ نصب خفیہ ٹرانسمیٹر یا ''بگ'' کے ذریعے یہ سب سنا تھا اور یہی بات بدنصیب ہشام کے لیے موت کا پیغام لانے کا سبب بنی تھی۔ ظاہر ہے اب وہ ان کے لیے بے کار ہو چکا تھا۔

میں آزردہ دل سے سوچنے لگا کہ اگر ان ظالموں کو حقیقت کا پتا چل بھی چکا تھا تو پھر اس غریب ہشام کو اس بیدردی سے ہلاک کرنے کیا ضرورت تھی انہیں؟ وہ اسے زندہ چھوڑ سکتے تھے۔ لیکن تاتاری فطرت اور صورت سے قسائی دکھنے والے یہ بدمست قسم کے ظالم خلاصی نما بری درندوں نے اسے نہیں بخشا۔

میں جب بھی ایسے انسانیت سوز مناظر دیکھتا تو مجھے انسانوں سے ہی نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔ یہ بے رحم بے مہر لوگ کس آسانی سے ایک جیتے جاگتے انسان کی جان لے لیتے تھے۔ انہی مناظر نے مجھے بھی سخت دل بنا دیا تھا اور... میں بھی اپنے اندر تہیہ کر لیتا تھا کہ میں ایسا کوئی بھی موقع جانے نہ دوں جب ایسے کسی سفاک درندے کی گردن میری آہنی گرفت میں آئے۔

اب ہر سو اتھاہ خاموشی سی طاری ہو گئی تھی۔ یہ منحوس بوٹ ابھی تک اپنے گمنام آبی ٹھکانے سے ٹس سے مس تک نہیں ہوئی تھی اور تازہ کار بھیانک واقعے کے بعد مجھے نہیں لگتا تھا کہ یہ اب (رنگون) برما کی طرف اپنا ''متوقع'' سفر بھی شروع کرے گی۔ کیونکہ انہیں اب وکرم یا سوشیلا کی تلاش ہوگی، تاکہ ان کے قبضے سے وہ نایاب و نادر طلسم نور ہیرا حاصل کیا جا سکتا۔ اس تسلی کے بعد کہ وہ ہیرا ہشام کے بجائے ان دونوں بھارتیوں کے پ [illegible] لولووش کے لیے انہیں تلاشنا کیا مشکل تھا۔

ہیڈ آفس میں یقیناً سوشیلا اور وکرم کا پورا اور تفصیلی بائیو ڈیٹا موجود ہوگا کہ وہ بھارت میں ممبئی کے کس علاقے میں رہتے ہوں گے۔ تاہم یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آیا میرے ساتھ ہی یہ مہم انہیں نمٹانا تھی یا مجھے پہلے برما پہنچا کر لولووش کے پاس چھوڑنا انہیں مقصود ہوتا۔ اس کے لیے ضرور سے جی کوہارا کو لولووش کی طرف سے تازہ ہدایات کا انتظار ہوگا۔

سی جی بھجوانی کے ہاتھوں میری عارضی حوالگی بھی مجھے تفکر میں مبتلا کیے ہوئے تھی کہ میرے بہی خواہوں کو اس بدذات نے یہی کہہ کر مطلع تو کر دیا تھا کہ میں ان کے قبضے ..... میں تھا اور وہ میرے بدلے میں اپنے اہم آدمی سندرداس سکینہ کو پاکستانی انٹیلی جنس کے اداروں سے آزادی دلوانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، شاطر دماغ بھجوانی نے اپنے تئیں بڑی زرخیز چال چلی تھی۔

ملکی سطح پر میرے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوتے ہی اس نے اپنی طرف سے ترپ کا ایک پتا پھینک دیا تھا، اس نے پاکستانی خفیہ ایجنسی کے کسی ذمے دار افسر کے بجائے میرے بہی خواہوں سے رابطہ کیا تھا تاکہ وہ کوئی ایسا ہی طریقہ آزمانے کی کوشش پہ مجبور ہو جائیں، جیسا کہ میں نے میجر ریاض باجوہ کے ساتھ اندر ہی اندر معاملہ نمٹانے کے سلسلے میں کیا تھا۔ مگر میری بات اور تھی، میری میجر باجوہ صاحب کے ساتھ اچھی اور دوستانہ طرز کی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور پھر اب تو سندرداس کا معاملہ اوپر تک جا چکا تھا، زہرہ بانو یا اول خیر وغیرہ ایسی کسی مہم جوئی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، جیسا کہ میں اپنے باپ کے سلسلے میں کر چکا تھا۔ اس صورت میں میرے ساتھیوں اور پاکستانی خفیہ اداروں کے درمیان تصادم ہونے کا بھی خطرہ ہو سکتا تھا، وہ اپنی سی کوشش میں متعلقہ افسران پر میری رہائی کے سلسلے میں دباؤ ڈال سکتے تھے، آخر کو میں وطن کے ایک بہادر غازی سپاہی کا فرزند تھا۔ لیکن میں بالکل بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسا کچھ ہو۔ جبکہ مکار بھجوانی چاہتا تھا کہ میرے سلسلے میں خفیہ اداروں کے متعلقہ افسران پر میرے ساتھیوں کا دباؤ، عوامی احتجاج میں بدل جائے اور ایسا ہو بھی سکتا تھا۔ میرے ساتھی جوش میں آ کر ایسا کر سکتے تھے، کیونکہ مجھے اپنا وہ وقت بھی یاد تھا جب اپنے باپ کو بھجوانی کے قبضے سے چھڑانے کے سلسلے میں میری بھی میجر باجوہ صاحب سے بحث ہو گئی تھی۔

میری کوشش تھی کہ میں کسی طرح اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے انہیں صبر کی تلقین کروں، تاکہ وہ جلد بازی میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھا بیٹھیں جو خود ان کے لیے کسی مشکل کا باعث بن جائے۔ ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا تھا جب میں اس بوٹ پر اپنا قبضہ جما لیتا۔

کافی دیر گزر گئی۔ میں اپنے بنک بیڈ کے سہارے کھڑے کھڑے تھک گیا، میں نے اپنے بنک کے اوپر بنے خالی بنک بیڈ پر ایک افسردہ سی نظر ڈالی جہاں کچھ دیر پہلے ہشام لیٹا ہوتا تھا، مگر اب وہ خالی تھا۔ اس کے خالی پن میں مجھے ایک سوگواریت کا احساس ہوا۔

میں ایک آزردہ سی ہمکاری خارج کر کے اپنے بنک بیڈ پر لیٹ گیا۔ اسی طرح مزید تھوڑی دیر اور بیت گئی۔ بوٹ اسی طرح اپنے مقام پر لنگر انداز دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہی تھی۔ وقت کا اندازہ مجھے نہیں تھا۔ تاہم دن تو نکلا ہوا تھا۔ میں خود منتظر تھا کہ اب میرے سلسلے میں کیا احکامات ملنے والے تھے؟ لیکن اب میں نے اپنا ارادہ کچھ بدل لیا تھا، پہلے میرا ارادہ ان کے ساتھ سفر کرنے اور برما پہنچ کر لولووش کا سامنا کرنے کا تھا، لیکن ان کی بربریت سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ کب یہ لوگ مجھے بھی ہشام کی طرح اپنی درندگی کا نشانہ بنا ڈالتے۔ یوں بھی اب ہشام اور کرنل سی جی کے حوالے سے یہاں کی صورت حال مختلف ہو گئی تھی۔ اب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

معا دروازے پر کسی کے قدموں کی ہلکی چاپ اُبھری۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، مجھے یوں لگا جیسے اب میری موت کا پروانہ جاری کیا جانے والا تھا۔

دروازہ کھلا اور میں قدرے چونکا۔ وہاں کوئی اور تھا، ساتھی خلاصی کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی، بھومک ہی عموماً یہاں کا رخ کرتا تھا۔ یہ بری نہیں تھا اور کوئی مقامی انڈین ہی نظر آتا تھا، اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔

دروازہ کھول کر اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی تھی۔ پھر میرے بنک کے ذرا قریب آتے آتے اس نے میری ہتھکڑی کو بھی ایک نظر دیکھا تھا، جو بنک کے راڈ سے بندھی ہوئی تھی، تسلی ہونے کے بعد وہ میرے قریب آیا اور کھانے کی ٹرے میرے اوپر والے خالی بنک پر رکھ دی اور... تمسخرانہ سی مسکراہٹ سے... میری طرف دیکھ کر پلٹنے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

''کیا تم مجھے اس قیدی کے بارے میں بتا سکتے ہو، جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے باہر لے جایا گیا تھا؟'' میں نے اس سے انگریزی کے بجائے اردو میں ہی بات کی تھی۔

اس نے میری طرف دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو اپنی گردن پر پھیرا۔ میں اس مردود کا اشارہ سمجھ کر اندر سے کٹ کر رہ گیا اور بولا۔ ''اسے مار ڈالا ہے تو تم لوگوں نے بڑی جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے۔'' میں نے اپنی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے اس کے تار وپود کو ہلانا شروع کر دیا۔ ''وہ تم لوگوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔''

میری بات سن کر وہ اپنے شانے اچکا کر بولا۔ ''ہمیں کیا معلوم؟ یہ تو وہ دونوں جانیں۔''

''سنو! انہوں نے ایک خزانے کی تلاش کے سلسلے میں اسے بلاوجہ ہی ہلاک کیا ہے۔'' میں نے دانستہ ہیرے کے بجائے ''خزانے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس حد تک ان دونوں سفاک برمیوں کے عزائم کا پتا تھا۔

''خزانہ! کیسا خزانہ......؟'' وہ اپنی بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ یہ کمرا ''بگڈ'' ہوگا اور نجانے اس کا لاسلکی رابطہ براہ راست اسی بوٹ کے کسی خفیہ آپریٹنگ روم سے تھا یا پھر برما میں موجود لولووش تک اس کی رسائی کی گئی تھی، ... یہ میں ایک خطرناک رسکی کھیل کھیل رہا تھا، مگر میرے پاس یہ جوا کھیلنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ کب تک میں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یوں کسی موقع کی تاک میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا، جبکہ ان فرعونوں کی بربریت کے مظاہرے دیکھ کر خود مجھے بھی بے موت مارے جانے کا خدشہ دامن گیر تھا۔

اس کی لاعلمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں دانستہ اپنے لہجے میں ایک مکارانہ حیرت سموتے ہوئے بولا۔ ''حیرت ہے! تم لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یہ سارا چکر اس خزانے کے لیے چلایا جارہا ہے جو قریب ہوتے ہوئے بھی ان کی لاعلمی کی وجہ سے دور ہے۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی میں نے بھانپتی .... نظروں سے اس کے چہرے پر اثر پذیر ہونے والے تاثرات کو بھی جانچنا چاہا تھا، مجھے لگا تو تھا کہ میری اس بات نے اس کے بہ ظاہر سپاٹ چہرے پر کچھ سوچ آمیز الجھن کی سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ لوہا گرم محسوس کر کے میں نے فوراً بولا۔

''مجھے صرف دو تین آدمیوں کا ساتھ چاہیے، اس کے بعد وہ عظیم خزانہ جو کالی ماتا کا خزانہ کہلاتا ہے، وہ ہمارا ہوگا۔'' میں نے دیکھا، اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں ایک لمحے کو چمک سی ابھری تھی، وہ بولا۔

''تم ان دونوں کے ساتھ مل کر کیوں نہیں یہ کام کر لیتے ہو؟'' اس کے بے وقوفانہ سوال پر میرا جی اس کی عقل پر ماتم کرنے کو چاہا تھا لیکن اس کی یہ ''بے وقوفی'' ہی تو میرے کام آنے والی تھی۔

''تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، دیکھتے نہیں کہ میں ان کا قیدی ہوں، یہ مجھ سے خزانے کا راز اگلوانا چاہتے ہیں، لیکن میں نے اگل کے نہیں دیا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد مجھے بھی میرے ساتھی کی طرح مار ڈالیں گے۔''

''تمہارے ساتھی کو انہوں نے کیوں مارا؟'' اس نے پوچھا۔ اسے سوالاً جواباً کی سطح پر آتے دیکھ کر میں کچھ پُرامید سا ہوا اور بولا۔

''مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے، لیکن میں زیادہ دیر ان کا تشدد نہیں برداشت کروں گا مگر تم لوگ بھی سن لو، خزانہ حاصل کرنے کے بعد یہ ماسوائے اپنے ساتھیوں کے، تم سب کو مار ڈالے گا، تاکہ خزانے کا راز بھی دفن ہو جائے، ہوش کرو اور میرا ساتھ دو، میں چاہتا ہوں وہ خزانہ تم لوگوں کی مدد سے حاصل کرنے کے بعد تمہیں تمہارا حصہ دے کر نکل جاؤں گا، تم بھی خزانہ پا کر ساری عمر عیش و عشرت سے گزارو گے، بلکہ تمہاری آنے والی نسلیں تک آرام سے بیٹھ کر اس عظیم خزانے کے مزے اڑاتی رہیں گی۔ بولو! کیا کہتے ہو؟''

میری بات پر وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بیک وقت تذبذب، خوف اور لالچ کے آثار گڈمڈ ہونے لگے تھے۔ میں نے دوبارہ لوہا گرم دیکھ کر چوٹ کی۔

''تھوڑی ہمت کرنے کی ضرورت ہے، تم، میں اور تمہارے ساتھی مل کر ان دونوں وحشی اور سفاک برمیوں پر بہ آسانی قابو پا سکتے ہیں۔ ان کی لانچ قبضے میں کر کے ہم خزانے کے مقام تک پہنچیں گے اور پھر سارا خزانہ نکالنے کے بعد اس کی حصہ داری کر کے اپنی اپنی راہ ہو لیں گے۔''

''یہ بہت خطرناک لوگ ہیں اور صرف دو نہیں ہیں۔'' وہ پہلی بار دھیمے میں لہجے میں بولا۔ اسے نیم رضامند اور ''معاملہ داری'' کی طرف آتے دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا۔

''چاہے جتنے بھی ہوں، کوئی پروا نہ کرو، اگر ہم مل جائیں تو بہ آسانی ان سب پر قابو پا سکتے ہیں۔ مجھ پر بھروسا کرو۔'' ایک لمحہ توقف سے بولا۔ ''تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اپنے بھارتی ساتھی کتنے ہیں؟ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ انہوں نے تمہیں ادھر سے ہی اپنی لانچ میں نوکر رکھا ہے؟''

''ہاں! ہم بھارتی ہیں اور ادھر ہی خلیج کھمبات کے کنارے ہماری بستی ہے، ہم وہیں رہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں.....'' میں نے سوچا، تو گویا یہ علاقہ خلیج کھمبات کہلاتا تھا۔

''تم کتنے ہو؟''

''پہلے تو پانچ تھے، اب تین ہیں۔ دو چھوڑ گئے تھے نوکری۔''

''میں نے دو انڈین لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔''

''وہ طوائفیں ہیں۔''

''ان کا تعلق کس ملک سے ہے؟ بھارت یا برما سے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم، وہ دونوں ہم سے پہلے یہاں موجود تھیں۔''

''ان کے ساتھی کتنے ہیں؟ میرا مطلب ہے برمی؟''

''پانچ، چھ تو ہوں گے ہی۔''

''سے جی کوہارا اور بھومک کو ملا کر؟''

''نہیں، ان دونوں کے علاوہ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا، فرض کرو تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتے

ہو تو، کیا سمجھتے ہو، تمہارے باقی دو ساتھی ہم خیال بن جائیں گے؟ یعنی، ایسا تو نہیں کہ وہ ان برمیوں کو ہماری مخبری کر دیں؟''

میری بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ''مخبری تو نہیں کریں گے، لیکن ان سے بات کرنا پڑے گی، مگر ہم ان برمیوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، یہ بہت ظالم اور طاقت ور ہیں۔''

''تم لوگ کب سے ان کے ساتھ ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں۔'' اس جواب دیا۔

''ان لوگوں نے تمہیں کیا کہہ کر اپنے ساتھ رکھا تھا؟''

''یہی کہ انہیں خلاصیوں کی ضرورت تھی۔'' اس نے خاطر خواہ جواب دیا، کیونکہ جب میں نے پہلی بار عرشے پر ان لوگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا تو مجھے یہاں دو قسم کے ہی خلاصی (ملاح) دکھائی دیے تھے۔ ایک بھارتی اور دوسرے برمی۔ میرے ذہن میں اسی وقت یہ خیال آیا تھا کہ برمی خلاصیوں کے مقابلے میں بھارتی خلاصیوں کے گروپ کو یہاں صرف نوکر یا غلاموں کی حیثیت حاصل ہوگی، اور اگر میں کسی طرح ان کا مائنڈ سیٹ اَپ بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں تو یہ (بھارتی خلاصی) اس نوکری اور غلامی پر لعنت بھیج کر میرے ہم خیال بن سکتے تھے۔ لہٰذا ان سب باتوں کے تناظر میں، میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھی اور بولا۔

''نہیں، انہیں خلاصیوں یا نوکروں کی ضرورت نہیں تھی، انہیں تو ان لوگوں کی ضرورت تھی جنہیں یہ برمی اس خزانے کی تلاش میں جھونکنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں اور واپس اپنے ملک کی راہ لیں تاکہ یہ راز آشکارا ہی نہ ہو سکے۔''

میری بات پر اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات کی ایک جھلک سی اُبھری اور وہ فکرمندی سے بولا۔ ''تت..... تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اور پھر ان کا کیا مقصد ہے یہاں؟ مجھے اور میرے ساتھی کو کس پاداش میں انہوں نے یہاں قیدی بنا رکھا ہے؟ اس لیے کہ وہ ہم سے اس خزانے کا راز اگلوانا چاہتے تھے اور مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے ان ظالموں نے میرے ساتھی کو نہیں چھوڑا تو تم لوگوں کو کیوں بخشیں گے؟ دیکھو! میری بات کا یقین کرو، خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو بلکہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاؤ، تم غریبوں کی قسمت بدل جائے گی۔ میں ان کی بعض ایسی کمزوریوں سے واقف ہوں جس کے زور پر میں انہیں قابو کر سکتا ہوں، ہمت کرو اپنی تقدیر بدلنے کا یہ موقع ضائع مت کرو۔ میرا ساتھ دو، بولو! کیا کہتے ہو؟''

پہلی بار اس کے چہرے سے گھبراہٹ اور پھر ''سمجھداری'' کے تاثرات نمودار ہونے لگے۔ پھر میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔ ''مجھے کیا کرنا ہوگا ابھی؟''

''شاباش! یہ کی ناں عقل مندوں والی بات۔'' میرا دل اپنی کامیابی پر بلیوں اچھل پڑا۔ ''اب مجھے یہ بتاؤ، یہ دونوں یعنی کوہارا اور بھومک اس وقت کہاں ہیں؟''

''کوہارا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کہیں گیا ہوا ہے، جبکہ بھومک لانچ پر ہی موجود ہے۔ اس نے جواب دیا اور میری آنکھوں میں معنی خیز چمک ابھری۔ مجھے اس کا اندازہ تھا کہ کوہارا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ضرور وکرم اور سوشیلا کی تلاش میں نکلا ہوگا، ان دونوں کی تلاش میں کوہارا کا خود نکلنا، اس کی مہم کی اہمیت کو اجاگر کرتا تھا۔ جبکہ اس کا مقرب خاص..... بھومک لانچ میں تھا، یہ بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ اس کی لانچ میں موجودگی کوہارا نے سوچ سمجھ کر ہی کی تھی۔ وہ اس کا سچا اور وفادار دستِ راست تھا۔

''سنو! میں جانتا ہوں اچھی طرح کہ وہ کہاں گئے ہوں گے۔'' میں نے اپنی آواز میں جوش سموتے ہوئے کہا۔ ''یہی موقع ہے ان پر قابو پانے کا۔ اب تم سب سے پہلے ایک کام کرو، اس کمرے میں کہیں خفیہ ٹرانسمیٹر نصب ہے۔ تم وہ ڈھونڈنے کی کوشش کرو، اس کے ذریعے یہ ہماری خفیہ باتیں سن سکتے ہیں۔'' میری بات پر یک دم اس کے چہرے پر خوف کی ایک واضح جھلک ابھری تھی، وہ گھبرانے لگا، میں نے جلدی سے کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تم یہ کر سکتے ہو، اس کا کنکشن ضرور سے جی کوہارا کے کمرے میں.....'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک موٹا اور ٹھگنا برمی خلاصی نمودار ہوا، اس کے چہرے پر غصیلے پن کے آثار تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار کی طرح --- کا خم دار چنگیزی چھرا نظر آرہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے پہلے ایک پُرغیظ سی نگاہ مجھ پر ڈالی، پھر قریب کھڑے بھارتی خلاصی کو گھورا اور منہ سے بھی شاید اس نے کوئی غضب ناک سی غراہٹ نکالی تھی، دوسرے ہی لمحے وہ اس کی جانب دانت نکوستے ہوئے لپکا۔ بھارتی خلاصی کی

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جان پر بن آئی، کم تو اتا وہ بھی نہیں تھا، جان کسے پیاری نہیں ہوتی، اس نے فوراً اپنے دفاع کے لیے حرکت کی، برمی اپنا تلوار نما چھرا لیے جیسے ہی اس کے قریب آیا، بھارتی خلاصی نے اسے جھونک دینے کی کوشش چاہی، اس میں وہ اسی قدر ہی کامیاب ہو سکا تھا کہ برمی خلاصی کا چھرا اس کے پیٹ کے بجائے، اس کا شانہ زخمی کر گیا، بھارتی خلاصی مارے تکلیف کے تلملا اٹھا۔ چہ کا بڑا اذیت ناک ثابت ہوا تھا۔ جس نے بھارتی خلاصی کو بری طرح بلبلا کر رکھ دیا تھا، میں نے دیکھا اذیت ناکی نے اسے بھی جیسے ایک جوشِ جنوں میں مبتلا کر دیا۔ برمی دوسرے وار کے لیے ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ بھارتی نے اپنی لات چلا دی جو برمی کے پہلو پہ لگی، وہ لڑکھڑا کر میرے بنک کے قریب آیا اور تب ہی میں نے حرکت کی، میں نے بنک بیڈ کے سہارے خود کو ٹکایا، اگرچہ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، مگر ٹانگیں آزاد تھیں، وہی میں نے قینچی کی طرح بہ سرعت اس وحشی برمی قسائی کی موٹی سی گردن میں پھنسا دیں، اس نے اپنے چھرے والے ہاتھ کو حرکت دینا چاہی، جس کا مجھے ادراک تھا، مگر وہ میرے ایک خطرناک داؤ ”لیگ لاک“ میں آ چکا تھا، میں نے اپنے وجود کی پوری طاقت کو ٹانگوں میں سموتے ہوئے مخصوص انداز میں ایک زوردار ”جرک“ لیا، کمرے میں کڑاکے کی ہولناک آواز ابھری اور موٹا برمی یک دم ڈھیلا ہو کر میری دنوں ٹانگوں کے ”جکڑ بند“ میں جھول کر رہ گیا، میں نے اس کے تنِ مردہ کو چھوڑ دیا، وہ دھڑام سے گرا، چھرا اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر گر چکا تھا، میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس زخمی بھارتی خلاصی سے بولا۔

”چھرا اٹھا لو اور جلدی سے میری ہتھکڑی کاٹ ڈالو، ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔“ وہ میری خطرناکی کی ایک جھلک دیکھ چکا تھا اور میری بات کا بھی اسے یقین آ گیا تھا، یوں بھی اب اس کے پاس میری بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، مگر وہ خود بھی زخمی تھا۔ اس کے دائیں شانے سے بھل بھل خون رِسے جا رہا تھا۔ تاہم جان پر اس کی بھی بنی ہوئی تھی، اور میری بھی۔ اس نے ہمت کی اور زمین پر سے چنگیزی مار کا چھرا اٹھا لیا۔ میں نے پہلے اپنی ہتھکڑی کا جائزہ لیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ میرے ہاتھ کے قریب والی جگہ پر ضرب لگانے کے بجائے، راڈ سے بندھی ہوئی زنجیر پر لگائے، وہ بے چارہ بہ مشکل ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھا، تاہم اس نے وہی کیا، چھرا تیز تھا اس نے اس کی دو تین ضربات اس پر لگائیں تو ہتھکڑی بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے ٹوٹ گئی، باقی کام میں نے تیزی سے نمٹایا اور بھارتی ملاح کے ہاتھوں سے چھرا لے لیا۔ وہ اب نڈھال ہو رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

”تم فکر مت کرو، میرا وعدہ ہے، میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑوں گا، لانچ میں ضرور مرہم پٹی کا پورا سامان موجود ہوگا۔ بس مجھے ایک بار اس لانچ پر قبضہ جمانے دو۔“ اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں نے اسے فرش پر آرام سے لٹا دیا۔ اس کے بعد میں نے برمی خلاصی کی لاش کا جائزہ لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس کم بخت کی ڈیوٹی اسی کمرے میں ہوگی جہاں یہ بیٹھ کر اس بگڈ کمرے میں ہونے والی گفتگو سنتے ہوں گے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر اس جہنم واصل برمی خلاصی نے ہماری گفتگو سن لی تھی تو بھومک اب تک اس سے کیوں بے خبر تھا؟ اس کی ایک ہی وجہ میرے ذہن میں آتی تھی کہ کوہارا کی غیر موجودگی میں بھومک یا تو آرام میں مصروف ہوگا یا پھر لانچ میں موجود انڈین طوائفوں کے ساتھ موج مستی میں غرق ہوگا۔ اس دوران یہ برمی خود ہی اس معاملے کو نمٹانے کے لیے چھرا لیے ادھر آن پہنچا۔

بہرکیف کچھ بھی تھا، میں اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کی چولا ٹائپ قمیص پھاڑ کر زخمی خلاصی کے زخم پر پٹی باندھی تاکہ کم از کم جریانِ خون میں کمی ہو سکے پھر پوچھا۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”گگ...... گوردن۔“ اس نے کراہتے ہوئے بتایا۔

”تمہارے دو ساتھیوں کے نام؟“

”اش...... اشوک اور...... مہتا......“

”ہوں...... ٹھیک ہے، اب تم ذرا آرام کرو، میں باہر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں جانے لگا تو وہ یک دم کراہتے ہوئے بولا۔

”ٹھ ٹھ...... ٹھہرو...... میرا تمہارے ساتھ ہونا ضروری ہے، ورنہ میرے ساتھی تمہاری مدد کو نہیں آئیں گے۔“ میں نے اس کی بات پر لمحہ بھر غور کیا تو اس کی بات مجھے ٹھیک لگی۔

میں نے پوچھا۔ ”تم چل سکتے ہو؟“

”ہاں! بس، تھوڑا سہارا دے دو مجھے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش میں کسمسایا تو میں نے فوراً اسے سہارا دیا اور کھڑا کر دیا۔ اب میرے ایک ہاتھ میں تلوار نما چھرا تھا اور دوسرے

لمبے لہراتے حسین بال ہمیشہ کے لئے۔
MEDICAM
SHAMPOO
مہینے بھر کا شیمپو
MEDICAM SHAMPOO
3 Plus SHAMPOO
SHIKAKAI
ANTI DANDRUFF
AMLA
HERBAL
ANTI-LICE
EGG
KALONJI

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

ہاتھ سے میں نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے باہر کی سن گن لی پھر باہر جھانکا۔ چونکہ یہ حصہ بوٹ کے "دنبالے" کی جگہ کا تھا اسی لیے یہاں کوئی نظر نہ آیا۔ ہم باہر گلیارے میں آ گئے۔ گوردن میری راہنمائی کر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ پہلے اپنے دونوں ساتھیوں سے جا ملے اور انہیں صورت حال سے آگاہ کرے۔

کھلی راہ داری میں چلتے ہوئے ابھی ہمیں چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ اچانک ہمارے اوپر ایک بڑا سا جال آن گرا اور ساتھ ہی قدرے بلندی سے کوئی زور سے حلق کے بل چلّایا، ہم دونوں اس جال میں بُری طرح الجھ سے گئے۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا، عرشے کی وسطی ریلنگ پہ ایک برمی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جال کی رسی تھی ہوئی تھی، جسے اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے مخصوص انداز میں کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اور گوردن جال میں الجھنے کے باعث اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکے تھے اور گر پڑے، زخمی ہونے کے باعث گوردن تکلیف سے چلانے لگا، خود میں اس اچانک افتاد ناگہانی پر ایک لمحے کے لیے بوکھلا سا گیا تھا، گرنے کے باعث میرے ہاتھ سے چھرا بھی چھوٹ گیا۔ ادھر جال تیزی سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا اور ہم گول مول سے ہو گئے تھے، میرا دل تشویش ناک انداز میں تیزی سے دھڑک رہا تھا، جانتا تھا میں کہ اگر ہم ان سفاک برمیوں کے ہتھے چڑھ گئے تو بہت بھیانک انجام سے دوچار کر دیے جائیں گے۔

"جلدی سے چھرے کی مدد سے جال کاٹ ڈالو......" گوردن چلانے اور کراہنے کے انداز میں بولا۔

"چھرا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا ہے۔" میں چلّایا۔

جال میں ہم دونوں لپٹ کر گول مول ہو گئے تھے۔

تاہم میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں پر قابو پایا اور تیزی سے اردگرد نگاہ ڈالی تو راہداری کے فرش پر ایک جانب وہ چھرا پڑا دکھائی دے گیا۔ میں نے جال میں لپٹے اوندھے منہ پڑ کر اس طرف گھسٹنے کی کوشش کی اور اپنا ایک ہاتھ جال کے چوکور سوراخ سے باہر نکالا، مگر میرا ہاتھ چھرے کی پہنچ سے دور رہا، میں نے اپنے بدن کی پوری طاقت اس طرف سرکنے پر دے ڈالی، گھٹنوں کو فرش پر زور سے گھسیٹا، جس کے نتیجے میں وہ بُری طرح چھل کر رہ گئے۔ اوپر وہ بدبخت جال کو لپیٹے اوپر کھینچنے کی کوشش کیے جا رہا تھا، ساتھ ہی حلق کے بل برمی زبان میں چیخ بھی رہا تھا، وہ شاید اپنے ساتھیوں کو باخبر کر رہا تھا، اسی وقت راہداری میں دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں، میں نے جال کے اندر سے ان آوازوں کی طرف اپنا سر گھما کر دیکھا، چار، پانچ خلاصی ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے تھامے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ان میں برمی خلاصیوں کے علاوہ دو انڈین بھی تھے۔ میں نے گوردن سے کہا۔

"اپنے ساتھیوں، اشوک اور مہتا سے مدد لو۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا تاہم وہ انہیں دوڑتے ہوئے آتے دیکھتا رہا، میں نے چھرے کو حاصل کرنے کی کوشش جاری رکھی اور بالآخر اس کا پھل میری انگلیوں کو چھونے لگا، اسی دوران وہ تینوں ہمیں قابو کرنے کے لیے جیسے ہی قریب پہنچے تو میں نے دیکھا، گوردن کے تو دو انڈین خلاصی ادھر ہی رک گئے، انہوں نے شاید اپنے ساتھی کو بھی زخمی حالت میں دیکھ لیا تھا، لیکن ایک برمی نے انہیں بُری طرح جھڑکا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندی بول رہا تھا۔ ایک نے اس سے کہا۔

"تم دیکھ نہیں رہے ہو، ہمارا ساتھی بھی جال میں لپٹا ہوا ہے، ڈنڈے چلانا درست نہیں، جال کھول کر پہلے قیدی پر قابو پانا ہو گا۔" اس کی بات پر وہ برمی خلاصی زور سے غرایا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کرتے ہوئے، ڈنڈا سنبھالے آگے بڑھا اور ہم پر پل پڑا، گوردن نے چلّا کر اشوک اور مہتا سے کہا۔

"بچاؤ...... یہ برمی سسرے...... ہمرے دشمن ہیں۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ دونوں الٹا انہی برمیوں پر ڈنڈے برسانے لگے۔ مگر انڈین بے چارے ان موٹے تازے سانڈ نما برمیوں کے مقابلے میں کمزور تھے، ایک برمی نے طیش میں آ کر انڈین خلاصی کے سر پہ گھما کر ڈنڈا رسید کر دیا، اس بے چارے کا سر کھل گیا اور بھیجا باہر آ پڑا، وہ تیورا کر گرا، دوسرا انڈین خلاصی خوف زدہ ہو کر جان بچانے کی غرض سے الٹے پاؤں بھاگا تو ایک برمی اس کے پیچھے ڈنڈا لہراتا غراتا ہو، دوڑ گیا، باقی ہم پر پل پڑے، اس وقت تک میں بھی چھرے پر اپنی گرفت جما چکا تھا اور جال کے اندر سے ہی میں نے ایک برمی کے پیٹ میں وہ چھرا گھونپ دیا۔ اس کی زبان باہر آ گئی اور منہ سے خون ابل پڑا، ایک دو ڈنڈے میرے جسم پر بھی پڑے تھے اور میں اپنا سر بچانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ نجانے بے چارے گوردن کا کیا حشر ہوا تھا۔ مگر مجھے ایک دو ڈنڈوں نے بری طرح بلبلا کر رکھ دیا تھا، میں نے دوسرے برمی کو بھی بری طرح گھائل کر دیا تو تیسرا محتاط ہو کر پیچھے ہٹ گیا،

میرے جسم میں جیسے بجلی دوڑ گئی تھی۔ فرطِ جوش سے میرا رُواں رُواں پارا بنا ہوا تھا، آن واحد میں میں نے جال کو اتنا کاٹ ڈالا تھا کہ باہر نکل سکوں، میں نے دیکھا، اوپر موجود برمی غائب ہو گیا تھا، وہ یقیناً یا تو بھوبک کو اطلاع دینے گیا تھا یا پھر اسلحہ اٹھانے گیا تھا۔ جبکہ میرے پاس اسلحے کے نام پر صرف یہ چنگیزی ٹائپ کا چھرا تھا۔ یہ بھی اس نازک وقت میں غنیمت تھا۔ باقی ایک برمی بچا تھا اور وہ میرے مقابلے پر پر تولے آن کھڑا ہوا، اس کی آنکھوں سے دہشت مترشح تھی اور وہ مجھ پر بدستور اپنا ڈنڈا تولے کھڑا تھا۔ مجھے اس پر جلد قابو پانا تھا۔ اس نے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ بلند کی اور ڈنڈا ہوا میں لہرایا، میں اس کے حملے کا انداز سمجھ گیا، وہ اسے مجھ پر اچھالنا چاہتا تھا۔ میں بھی محتاط تھا، مگر اسے کوئی موقع دیے بغیر ہی میں نے خود یہ حرکت کر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھرا اس کی طرف اچھال دیا، جو سیدھا اس کے سینے میں جا کر کھب گیا، اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ وہیں اپنا گھائل سینہ پکڑے تیورا کر گرا، اسی وقت گولی چلی، میں بہ سرعت غیر ارادی طور پر جھکائی دے گیا اور راہداری کے فرش پر لیٹ گیا، گولی میرے قریب دیوار میں پیوست ہو گئی، مجھے سرے پر دو مسلح آدمیوں کی جھلک دکھائی دی تھی، میں آگے جانے کے بجائے تیزی سے عقب میں پلٹا، اسی وقت میری نگاہ جال میں پھنسے ہوئے گوردن پر پڑی، وہ شدید زخمی حالت میں پڑا مدد طلب نظروں سے میری جانب تکے جا رہا تھا مگر میں اب اس بے چارے کی کوئی مدد کرنے سے قاصر تھا اور خود مجھے ابھی بہت کچھ کرنا تھا، اسے اللہ کے بھروسے چھوڑ کر میں اٹھ کر الٹے پاؤں دوڑا، میرے عقب میں دو تین مزید گولیاں داغی گئی تھیں، مگر میں راہداری میں زگ زیگ انداز میں تیزی سے دوڑتا چلا گیا اور ایک جگہ سے راہداری بائیں جانب... گھوم رہی تھی، اسی طرف مڑ گیا۔ سامنے مجھے ایک سیڑھی اوپر عرشے کی طرف جاتی دکھائی دی، میرا ذہن اس وقت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

سیڑھی کے نیچے بنے خلا کی دیوار میں...... مجھے ایک سنگل پٹ کا دروازہ دکھائی دیا تھا، میں نے اوپر جانے کا ارادہ ترک کیا اور دروازے کو ایک زوردار لات رسید کی، وہ دھڑ سے کھلا اور میں اندر داخل ہو گیا۔

میں شاید انجن روم میں آ گیا تھا یا پھر کوئی بوائلر روم تھا۔ کیونکہ میرے دائیں بائیں مشینیں نصب تھیں اور بھاری بھرکم پسٹن تھے، جن میں دھواں اٹھ رہا تھا، شائیں شائیں کی آوازیں بھی گونج رہی تھیں۔ اسی وقت مجھے دو تین فائر سنائی دیے، ان ظالم برمیوں نے شاید بے چارے گوردن کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ میں آگے بڑھا اور تنگ اور بھل بھلیوں جیسے راستوں سے ہوتا ہوا، ایک ایسی جگہ آ کر رکا، جہاں مجھے کاٹھ کباڑ اور آبی ریختوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا، یہاں بڑی گندی بساند پھیلی ہوئی تھی، جیسے میں کسی جھینگوں اور مچھلیوں کے گودام میں آ گیا تھا۔ مجھے یہاں گھٹن کا احساس ہونے لگا اور نکاسی کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا تو یہاں آ کر پچھتانے لگا، لیکن ہمت نہیں ہاری اور ایک طرف کو بڑھ گیا، مگر ہر جگہ دوڑ دوڑ کر آہنی دیواروں سے سر ٹکرا کر میں بے دم سا ہو گیا۔ لیکن مجھے نکاسی کا راستہ نہ ملا، ناچار میں واپس پلٹا تو راستہ بھولنے لگا، گھٹن کا احساس الگ مجھے مارے ڈال رہا تھا اور اس خیال سے ہی میں لرز اٹھا تھا کہ میں شاید کسی چوہے دان میں اپنے آپ آن پھنسا ہوں۔ آکسیجن اور دیگر کاربائن ٹائپ کی بو سے مجھے سانس لینے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی اور دم پھولنے لگا تھا، دل کچا ہو رہا تھا، متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں بے دم سا ہو کر ایک فولادی پائپ کے سہارے ٹک گیا مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا اور زمین پر لڑھک گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

نجانے کب میری آنکھ کھلی تھی۔ میں پورا ٹھنڈے پانی سے شرابور تھا۔ میں کھلے عرشے پر پڑا تھا اور میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کسی مضبوط ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ یہ کسی جال کی ڈوری تھی۔ تیز شرانٹے دار ہوائیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں، ساتھ ہی ساتھ ہی عرشے کے تختے دار فرش میں گھر گھراہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں، صاف ظاہر تھا کہ بوٹ کا سفر کسی نامعلوم منزل کی جانب شروع ہو چکا تھا۔

میرا اوپری بدن برہنہ تھا، نیچے صرف جینز پینٹ تھی۔ ابھی مجھے پوری طرح ہوش بھی نہیں آیا تھا کہ ایک زوردار اور تڑپا ڈالنے والا کوڑا میرے ننگے بدن پر پڑا اور اذیت کے باعث میرے حلق سے ایک چیخ خارج ہو گئی۔ کوڑے کی یہ ضرب شاید مجھے پوری طرح ہوش میں لانے کے لیے ماری گئی تھی۔ جس نے ماؤف سے دماغ کی بندنسوں کو کھول دیا تھا۔ میں کراہنے لگا اور آنکھیں کھول کر ماحول کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میں اوندھے منہ اس عرشے پر پڑا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

صرف اپنے سر کو ذرا اٹھا کر دائیں بائیں ہی دیکھ سکتا تھا۔

ڈھلتے ہوئے دن کی خنک شام کا آغاز ہونے لگا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے مجھے کسی کے جوتے نظر آئے، دیکھا تو یہ سے جی کوہارا تھا اور کرسی پر بڑے آرام سے بیٹھا، میری طرف قہر آلودہ نظروں سے گھورے جارہا تھا، میز ایک طرف کو سرکائی ہوئی تھی، باقی دو کرسیاں خالی تھیں۔ دو بری خلاصی ہاتھ باندھے، پاؤں پھیلائے اس کے عقب میں کھڑے تھے اور اس کا دستِ راست بھومک ہاتھ میں ایک خاردار کوڑا لیے کھڑا تھا، اس کے چہرے سے بھی وحشت ناکی ٹپک رہی تھی۔ وہ جلاد صفت کوڑا تھامے یوں کھڑا تھا جیسے مجھ پر اس کی بارش کرنے کے لیے بے چین ہو۔ تب ہی کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھے سے جی کوہارا نے اسے مخصوص اشارہ کیا اور جیسے پھر بھومک کی مراد برآئی۔ اس نے مجھ پر یکے بعد دیگرے کوڑوں کی بارش کردی، میری سمع خراش چیخوں سے یوٹ گونجنے لگی۔ کوڑے میں فولادی تاروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر اس طرح لپیٹے ہوئے تھے کہ ان کے تیز نکیلے سرے ابھر آئے تھے۔ اس کی پڑنے والی ہر ضرب جاں کش تھی ... ایسا لگتا تھا جیسے کھال ادھڑی جارہی ہو۔

''خ خ...... خدا کے لیے بب...... بس کرو! بس کرو......'' میں بہ مشکل بول سکا تھا، یہ پہلا موقع تھا میری زندگی کا کہ میں کسی سے یوں بے بس اور لاچارگی کے عالم میں بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نڈھال اور نیم بے ہوش سا ہونے لگا تھا، تب ہی شاید سے جی کوہارا نے اپنے اس جلاد ساتھی کو کوئی اشارہ کیا تھا اور وہ رک گیا۔

میرا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، چھلے ہوئے جسم میں ایسی جلن مچی ہوئی تھی جیسے کسی نے میرے وجود کو آگ میں جھونک دیا ہو، مجھ سے سانس بھی ٹھیک طرح نہیں لی جارہی تھی۔ جبکہ وہ بدبخت بھومک خاردار کوڑا پکڑے ہانپ رہا تھا اور اس کی بیل جیسی ہانپتی سانسوں...... سے بھی وحشت کی بو آرہی تھی، اس نے کوڑا ایک طرف پھینکا اور کہیں چلا گیا۔ میرا منہ کھلا ہوا تھا اور بہ دقت تمام سانسیں لے رہا تھا۔ بھینچی بھینچی نظروں سے میں نے سے جی کوہارا کی طرف دیکھا اس کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ چونکہ میرا چہرہ اس کے جوتوں کے قریب تھا اسی لیے وہ تضحیک آمیز انداز میں اپنا ایک پیر میرے گال سے لگاتے ہوئے پُرغرور لہجے میں بولا۔

''چچ چچ چچ...... بہت مار لگا دی اس نے تمہیں...... لیکن میں کیا کروں؟'' اس نے حظ اٹھانے والے انداز میں میرا تمسخر اڑایا۔ ''یہ اس کم بخت بھومک کی مجبوری ہے، کوئی بھی ایسی حرکت کرے تو یہ کسی کو نہیں بخشتا مگر...... میرا خیال ہے تمہارے ساتھ اس نے پھر بھی رعایت برتی ہے، تم نے ہمارے ساتھی ہلاک کر ڈالے اور آپس میں انہیں لڑوایا بھی۔ میں نے واپس آکر سوپچرنگ روم میں تمہاری اور گوردن کے درمیان ہونے والی گفتگو کی ڈسک جب سنی تو تمہاری اس خطرناک ذہانت سے تو میں بھی خوف زدہ ہوگیا کہ تم نے کس طرح اسے کسی فرضی خزانے کا ذکر کر کے بے وقوف بنایا، لیکن افسوس...... تمہاری اس چال نے گریٹ ماسٹر کا بڑا دل دکھایا ہے اور تمہیں ان کی خاص رعایت سے اب محروم کردیا گیا ہے۔'' اس کا لہجہ لحظہ بہ لحظہ زہریلا ہوتا جارہا تھا۔ پھر وہ ایک طرف گردن موڑ کر کچھ دیکھنے کے بعد مصنوعی انداز میں چونک کر بولا۔

''ارے......! یہ کیا؟ یہ پھر آرہا ہے...... لگتا ہے اس کا دل نہیں بھرا، دیکھیں تو ذرا اب یہ تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے؟''

پتا نہیں اب مجھ پر یہ اور کون سی قیامت ڈھانے والے تھے، میں نے دھڑکتے دل سے بہ مشکل تمام لیٹے لیٹے اپنی گردن ذرا گھمائی تو کیا دیکھتا ہوں! وہ رذیل جلاد بھومک...... اپنے ہاتھ میں ایک مچھیروں جیسا کپڑے کا تھیلا اٹھائے اسی طرف سر دھنتا ہوا چلا آرہا تھا۔ میں کراہنے لگا اور دل میں ہول سے اٹھنے لگے تھے کہ اب جانے یہ رذیل بھومک میرے ساتھ کیا کرنے والا تھا؟

وہ میرے قریب آگیا۔ اس کا چہرہ مکروہ ہو رہا تھا اور آنکھوں میں جنونی قسم کی سفاکیت تیر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ تھیلے کے اندر ڈالا اور جب باہر نکالا تو نجانے اس کی مٹھی میں کیا بھر گیا تھا کہ وہ اس نے میرے ننگے مضروب اور چھلے ہوئے زخم والے جسم پر الٹ دیا، نہ صرف یہ بلکہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھ سے ملنے بھی لگا، تکلیف اور اذیت کی تیز اور جاں کش سی لہریں، کسی آسمانی بجلی کی طرح میری روح تک میں اترتی چلی گئیں۔

اس خبیث نے مچھلیوں اور جھینگوں پہ لگانے والا نمک میرے زخموں پر چھڑک دیا تھا، بلکہ اسے اچھی طرح مل بھی دیا تھا تاکہ کسی مرہم کی طرح وہ نمک میرے کھلے زخموں میں جذب ہوکر مجھے مزید قیامت خیز اذیتوں سے دوچار رکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے زخموں پر نمک نہیں کسی نے گوشت خور چیونٹیاں چھوڑ دی ہوں جو مجھے نوچ کھسوٹ کر کھال کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اندر جسم میں سرایت کررہی تھیں۔ میں بلبلا رہا تھا، تڑپ رہا تھا اور وہ دونوں شیطان، سے جی کوہارا اور بھومک بدمست قہقہے لگانے میں مصروف تھے۔ میں مارے اذیت کے تڑپ رہا تھا، ایک جان کنی کا عالم تھا مجھ پر، ظلم تو یہ تھا کہ میرے دونوں ہاتھ بھی پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے کہ میں اپنے زخموں کو سہلا کر ہی کچھ قرار پالیتا، میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا، کبھی ادھر کبھی ادھر سر پٹخ رہا تھا۔ یوٹ کا عرشہ میری چیخوں، آہوں اور کراہوں سے گونج رہا تھا اور انہی میں سے جی کوہارا اور بھومک کے وحشیانہ قہقہے بھی شامل ہورہے تھے۔ پھر ایک ایسا مقام بھی آیا کہ میں ان ناقابلِ برداشت اذیتوں کی انتہا پر جا پہنچا اور بے ہوش ہوگیا اور جانے کب تک بے ہوش رہا۔

دوبارہ میری آنکھ کسی نسبتاً کشادہ اور آرام دہ کمرے میں کھلی تھی۔ ماحول میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نیم غنودہ اور ماؤف...... ذہن کے ساتھ ادھ کھلی آنکھوں سے چھت کو تکے جارہا تھا اور چند ثانیے اسی طرح ہی پڑا رہا۔ میرا ذہن ڈوبا ڈوبا سا رہا، پھر آہستہ آہستہ مجھے یاد آتا رہا کہ میں کہاں اور کن حالوں میں تھا۔ نیز تھوڑی دیر پہلے ہی میری کیا درگت بنائی گئی تھی، مجھے اپنے اذیت ناک اور سلگتے ہوئے زخموں کا احساس ہوا، مگر وہاں اب ٹھنڈک اور آرام تھا اور ایک ذرا جائزہ لینے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہاں مرہم وغیرہ لگا دیا گیا تھا، ورنہ جاگنے سے میرا پھر وہی درد کے مارے بُرا حال ہوجاتا، لیکن میں ہلنے جلنے سے قاصر ہی رہا تھا، اگرچہ میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا۔ مجھے نقاہت اور کمزوری محسوس ہورہی تھی۔ میں فقط جانگیے میں تھا اور سارا جسم چھالا بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے کسی کاؤچ پر لٹایا گیا تھا۔

''اسی طرح پڑے رہو...... حرکت کرو گے تو زخم کھل جائیں گے۔'' معاً ایک بھاری آواز ابھری، میں نے بہ دقت تمام لیٹے لیٹے اپنی گردن آواز کی سمت گھمائی، وہاں سامنے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑے صوفے پر سے جی کوہارا ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے بیٹھا تھا جبکہ وہ جلاد صفت بھومک اس کے عقب میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر لپیٹے کھڑا میری طرف بڑی سلگا دینے والی مسکراہٹ سے تکے جارہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے پورے مضروب وجود میں اس کے خلاف غیظ و غضب کی لہر سی اٹھی تھی۔

''تمہیں گریٹ ماسٹر! کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، انہی کی سفارش پر تمہارے ساتھ یہ رعایت برتی گئی ہے۔'' وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی چھوٹی سی چپٹی بوتل تھی، جسے وہ اپنے منہ سے لگا کر وقفے وقفے سے چسکیاں بھی بھرے جارہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اور اس کا گریٹ ماسٹر لولودش میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہے تھے۔ پیٹ رہے تھے، مار رہے تھے، پھر دودھ پلا رہے تھے۔ میں خاموش رہا، ابھی میں اپنے اندر بولنے کی بھی سکت محسوس نہیں کررہا تھا۔

''لیکن ماسٹر کو اس بات کا غصہ ہے کہ تم نے ہمارے کئی آدمیوں کو ہلاک کر ڈالا ہے اور خلاصیوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش بھی کی۔ تم نہیں جانتے کہ اس کی کتنی بھیانک سزا ہے، تمہیں اس سزا سے بھی ماسٹر نے بچالیا۔'' اس نے آخر میں سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں...... تمہارے ماسٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے بہ مشکل اپنے ریختہ سے وجود کی طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ یوٹ رکی ہوئی تھی، شاید اسے کسی مقام پر لنگر انداز کردیا گیا تھا۔

میری اس بات پر سے جی کوہارا کی آنکھوں میں معنی خیز سی چمک ابھری تھی۔ ''بہت جلد تمہاری ماسٹر سے ملاقات کروادی جائے گی، ابھی ہمیں کچھ اہم کام نمٹانا ہیں۔''

مجھے کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ ان لوگوں نے ابھی یہاں کون سے ''اہم'' کام نمٹانے تھے۔ تاہم میں نے اس کے رویے میں کچھ نرمی کا عنصر محسوس کرتے ہوئے بالآخر وہی سوال کر ڈالا جو مجھے ابتدا سے بے چین کیے ہوئے تھا۔

''کیا تم میری ایک بے چینی دور کرسکتے ہو؟''

''کیسی بے چینی؟'' اس نے اپنی بھویں سکیڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔

مجھ پر انسانیت سوز تشدد کے بعد اس کی حیوانی خصلت کو قدرے تسکین حاصل ہوگئی تھی، شاید اسی لیے وہ میرے ساتھ سوالاً جواباً پر آمادہ بھی ہوگیا تھا۔ ورنہ تو اس نے مجھے بولنے تک سے بھی مانع رکھا ہوا تھا۔ میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کہا۔ ''مجھے میرے ملک سے اغوا کرنے والے وہ دو غیر ملکی کون تھے، جن سے، بہ قول تمہارے، مجھے چھڑا لیا گیا تھا؟'' میرے اس سوال پر کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی زہریلی مسکراہٹ ابھری تھی۔

''وہ امریکی سی آئی اے سے تعلق رکھتے تھے۔ تمہیں یرغمال بنا کر امریکا لے جانے کے ایک خفیہ ٹاسک پر پاکستان آئے تھے اور تم بہ آسانی ان کے ہتھے بھی چڑھ گئے تھے۔''

میں اس انکشاف پر بے اختیار ایک گہری سانس لے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر رہ گیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا، وہ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے ہی ایجنٹ تھے، جن کے بارے میں مجھے آنسہ خالدہ پہلے ہی بتا چکی تھی۔ تاہم ایک ٹیڑھ باقی تھی، بولا۔ ''کمال ہے، تم لوگوں نے کیسے اتنی آسانی سے ان کا منصوبہ ناکام بنادیا؟ کیا انہیں ماردیا تم نے؟''

''ہاں! ایک تو مارا گیا تھا، دوسرا بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔''

''لیکن تمہارا ان لوگوں کے ساتھ کس مقام پر ٹکراؤ ہوا تھا؟ کیونکہ جب انہوں نے مجھے میرے ملک میں اغوا کرنے کے بعد بے ہوش کرڈالا تھا تو میری آنکھ اس بوٹ میں کھلی تھی؟''

''اصل میں تم ہمارا شکار تھے، جبکہ گریٹ ماسٹر کو پہلے ہی سے اس کی اطلاع تھی کہ ہمارا شکار کون لوگ اچکنا چاہتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں اپنے ''گریٹ ماسٹر'' کا کچھ زیادہ ہی غرور کسی نشے کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ آگے بولا۔ ''ماسٹر تو ان کے منصوبے کی ایک ایک کڑی سے واقف تھا، لیکن تم چونکہ اصل میں گریٹ ماسٹر کا شکار تھے اسی لیے ماسٹر نے ہمارے ذریعے تمہیں ان سے اچک لیا۔''

اس دوران ایک انڈین دوشیزہ ہاتھ میں کوئی پیالہ لیے میرے قریب آئی، اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

''یہ دوائی ہے، پی لو، آرام آتا رہے گا۔'' کوہارا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے اس انڈین دوشیزہ کی طرف دیکھا، وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی کاؤچ کے قریب آگئی، وہ پیالہ تھامے میرے بالکل قریب جھک آئی اور میرے ہونٹوں سے لگا دیا، میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹا کر پیالے میں دیکھا، ایک بدرنگ سا محلول اندر ہلکورے لے رہا تھا، میرا پہلے تو دل ہی نہیں کیا اسے پینے کو مگر خطرناک دشمن کی قید میں اس ''کرم نوازی'' کو ٹھکرانا خود کو مزید کمزور کرنے کے مترادف ہوتا، میں خود چاہتا تھا کہ میں جلد صحت یاب ہوکر اپنے دفاع کے لیے کوشش جاری رکھوں، سو میں نے دوائی کا پہلے ایک گھونٹ بھرا تو اس کا ذائقہ واقعی کسی کڑوی کسیلی دوائی کا سا ہی لگا، مگر میں آنکھیں بند کیے ساری دوائی چڑھا گیا، پیالہ منہ سے ہٹانے کے بعد بھی وہ بھارتی دوشیزہ مجھ پر جھکی رہی، شاید وہ آخر میں میری نظروں کا ''ملاپ'' چاہتی تھی۔ کیونکہ دوا ختم ہونے کے بعد جب غیر ارادی طور پر میری نظر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس نے اپنی بائیں آنکھ کا خفیف اشارہ مجھے کیا اور فوراً سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میرے اندر ایک جھماکا ہوا، اپنی آنکھ کا یہ اشارہ اس نے مسکراتے چہرے کے بجائے بہت سنجیدگی سے کیا تھا اور یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس اشارے کے پس پردہ کسی پسندیدگی یا عامیانہ پن کے بجائے کچھ اور ہی مقصد کارفرما تھا۔

وہ خاموشی سے واپس پلٹ گئی۔ دوا پیتے ہی مجھے اپنے پورے بدن میں دو طرح کی تبدیلیوں کا احساس ہوا، ایک یہ کہ زخموں میں جو تھوڑا بہت جلن اور درد تھا وہ بالکل ہی جاتا رہا تھا، دوسرا یہ کہ میں اپنے اندر طاقت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ میرا جی اٹھ کر بیٹھنے کو چاہا اور میں ذرا کسمسایا۔

''نہ...نہ...! اسی طرح لیٹے رہو۔'' کوہارا نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے سے منع کردیا اور آگے بولا۔ ''ہاں! تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ ہم نے کس طرح اپنا شکار سی آئی اے کے ان دو ٹاپ ایجنٹوں سے چھینا۔ یہ دونوں تمہیں پلاننگ کے مطابق اغوا کرکے بحری جہاز کے ذریعے کراچی سے مشرق وسطیٰ کے کسی علاقے کی طرف لے جانا چاہتے تھے اور ایسا انہوں نے کیا بھی، آگے کا امریکا کا سفر انہوں نے ورجن اٹلانٹک کے طیارے سے کرنا تھا، تمہیں مریض بنا کر لے جانا تھا، اس مقصد کے لیے انہوں نے تمہیں ایک ایسا انجکشن بھی لگا دیا تھا جس سے تم اعصابی طور پر لاغر ہوجاتے، سننے اور دیکھنے کے علاوہ تم حرکت کرنے اور بولنے سے اس وقت تک معذور رہتے جب تک کہ امریکا جے ایف کینیڈی نہ اتار لیے جاتے۔ تاہم بحری جہاز میں لے جاتے ہوئے تمہیں طویل بے ہوشی کا ایک ٹیکا لگا دیا گیا تھا۔

ادھر گریٹ ماسٹر کے منصوبے کے مطابق عربیئین سی میں ہم نے اس مسافر بردار جہاز میں خفیہ کمانڈو کارروائی کی، جس کے نتیجے میں سی آئی اے کا ایک ایجنٹ ہمارے ہاتھوں مارا گیا۔ دوسرا زخمی ہوکر سمندر میں کود کر اپنی جان بچا گیا۔ ہمارا مقصد پورا ہوچکا تھا، اور ہم تمہیں اپنی بوٹ میں ڈال کر بھارت کی طرف نکل آئے۔''

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوا تو میں اس کی زبانی یہ سب سن کر حیران بھی ہوا اور متفکر بھی کہ میں سے جی کوہارا کو محض ایک ملاح یا ان کا سردار قسم کی کوئی شے سمجھ رہا تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہ تھا کہ سے جی کوہارا بھی اسپیکٹرم کا ایک چلتا پرزہ ٹائپ کارندہ تھا اور لولووش کا مقامی (برمی) دستِ راست بھی...... ورنہ تو میں اس خوش فہمی میں تھا کہ مجھے ایک ذرا موقع بھی ملتا تو میں اسے بچھاڑ سکتا تھا، مگر اب یہ اتنا آسان نہیں لگتا تھا۔ مایوس تو میں اب بھی نہیں تھا اور نہ ہی میری سرشت میں یہ تھا کہ دشمن کی طاقت کا اندازہ ہوتے ہی میں میدان چھوڑنے کی سوچتا، لیکن اب ناکوں چنے چبانے اور جوئے شیر لانے والی بات تھی۔

''کیا سوچنے لگے؟'' وہ مجھے سوچ میں غلطاں پا کر بولا۔ اس نے بڑے پُرغرور انداز میں اپنی بھویں اچکا رکھی تھیں۔ میرا تجربہ تھا کہ ایسے پُرغرور آدمی کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھایا جائے تو ناکامی کے چانسز کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا میں ظاہری طور پر توصیفی انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے، پھر تو مجھے واقعی تمہارا اور تمہارے گریٹ ماسٹر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے مجھے سی آئی اے جیسی بدنامِ زمانہ اور دنیا کی خطرناک ایجنسی کے چنگل سے بچا لیا، ورنہ وہ امریکا لے جا کر جانے میرا کیا حشر کرتے۔''

''میرا نہیں، صرف گریٹ ماسٹر لولووش کا شکریہ ادا کرو۔'' سے جی کوہارا اسی پُرغرور مسکراہٹ سے بولا۔ آج اس خرانٹ مغز برمی بدمعاش نے مجھے سوالاً جواباً کا موقع دیا ہی تھا تو میں بھی اس سے کھل کر سوالات کرنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا، تاکہ دھیرے دھیرے میں اسے اپنے سیر حاصل مقصد کی طرف لاسکوں۔ لہٰذا سب سے پہلے تو میں نے اپنے ذہن میں مچلتے اس سوال کی بے چینی کو رفع کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی میری...... جہاں تک میری معلومات ہیں، تمہارے گریٹ ماسٹر لولووش کا فادر ان لاء باسکل ہولارڈ خود سی آئی اے کے اس خطرناک اسالٹ ونگ ٹائیگر ٹیگ کی سربراہی کررہا ہے، اور وہ دو سی آئی اے ایجنٹ اسی کی ایما پر پاکستان مجھے اغوا کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے تو، پھر لولووش نے اپنے فادر ان لاء کے مفادات کے خلاف کیوں قدم اٹھایا؟ اس سے متصادم کیسے ہوگیا وہ؟ کیا اس طرح سسر اور داماد کے بیچ نفرت و عداوت کی دیوار کھڑی ہونے کا امکان مسترد کیا جاسکتا ہے؟ جبکہ میں نے سنا ہے ان دونوں کے درمیان سسر داماد کے رشتے سے بڑھ کر دوستی کا رشتہ زیادہ مضبوط ہے، اور باسکل ہولارڈ کی اکلوتی لاڈلی بیٹی انجیلا کی لولووش سے شادی بھی اسی دیرینہ دوستی کا نتیجہ ہے۔''

''بہت برمحل سوال ہے تمہارا...... اور مجھے تمہاری گریٹ ماسٹر اور باسکل ہولارڈ کے بارے میں اس قدر معلومات پر حیرت بھی ہوئی ہے۔'' سے جی کوہارا نے یہ کہتے ہوئے بھوک کو ایک اشارہ کیا اور اپنی پیٹھ صوفے کی پشت گاہ سے ٹکا دی۔ بھوک حرکت میں آیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''گریٹ ماسٹر نے صحیح کہا تھا تمہارے بارے میں...... کہ ہمیں تم پر ہاتھ ڈالنے کے بعد انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے، تم بہت خطرناک آدمی ہو اور ہوتے بھی کیوں ناں...... جس کے پیچھے دنیا کی تین بڑی بین الاقوامی سطح کی تنظیمیں بلیوٹکسی، ٹائیگر ٹیگ (سی آئی اے)، اسپیکٹرم...... ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہوں وہ کوئی عام آدمی کیسے ہوسکتا ہے بھلا۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

''میں ایک عام انسان ہی تھا، مجھے خطرناک بنانے والے یہی لوگ ہیں۔''

''اور تم نے انہیں نیست و نابود کرنے کا پکا عزم کر رکھا ہے!'' سے جی کوہارا اس بار زہرناک لہجے میں بولا تو میں یک دم محتاط سا ہوگیا اور مکاری سے بولا۔

''یہ میرا دردِ سر نہیں، میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ میرے ان لوگوں سے تمام معاملات بہ خیر و خوبی طے پا جائیں اور میں اپنے ملک میں ایک عام امن پسند شہری کی طرح زندگی بسر کروں، اسی لیے تو میں جلد از جلد گریٹ ماسٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ذہین ہونے کے ساتھ مکار بھی ہو۔'' وہ بولا۔ میں خاموش رہا۔ اثنائے راہ بھوک ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوا، اس میں وہسکی کی ایک بوتل اور دو پیگ رکھے ہوئے تھے۔ برف کی چھوٹی ڈلیوں کا ایک بھرا ہوا باؤل بھی تھا، اس کے اندر ادھ کٹے لیموں بھی تھے۔ وہ اس نے سامنے رکھی ایک درمیانے سائز کی گلاس ٹاپ میز پر رکھ دی اور واپس اپنی جگہ جا کر مؤدبانہ کھڑا ہوگیا۔ کوہارا نے ایک خالی پیگ میں برف کی ڈلیاں ہاتھ سے اٹھا کر ڈالیں، پھر ان پر وہسکی انڈیلنے لگا۔ پیگ تیار کرنے کے بعد وہ پھر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ ایک گھونٹ معدے میں منتقل کرنے کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

''ہوسکتا ہے تم بلیوٹکسی اور سی آئی اے والوں کا کچھ بگاڑ لو اور کسی حد تک اسپیکٹرم کو بھی تھوڑا بہت نقصان پہنچا دو، مگر گریٹ ماسٹر لولووش کا تم ایک ذرا بال بھی بیکا نہیں کرسکتے، اس لیے کہ تم کیا کوئی بھی نہیں جانتا، ماسٹر لولووش کی پشت پر کیسی عجیب اور پُراسرار طاقتیں کارفرما ہیں، وہ برمودا کے جزائر کا پروردہ ہے، ان جزیروں کے دیوتاؤں کی اسے بڑی طاقتیں حاصل ہیں، افریقہ کے گھنے جنگلات کے دیو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ڈاکٹرز اس کے آگے پانی بھرتے ہیں، جاننے والے اسے برمودا کا شہزادہ بھی کہتے ہیں۔ ماسٹر لولوش کسی تنظیم یا آدمیوں کا محتاج نہیں، وہ اپنی ذات میں خود ایک تنظیم ہے...... ایک ناقابلِ تسخیر تنظیم......''

اس کی یاوہ گوئی میں دلچسپی لیے بغیر میں نے اسے اپنا سوال یاد دلایا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر لولوش کا جو جی کرتا ہے وہ کر ڈالتا ہے، کسی کی ناراضی کی پروا کیے بغیر۔ وہ جب چاہے تمہیں کسی کے بھی حوالے کر دے۔ امریکا خود ماسٹر لولوش اور اسپیکٹرم کی بالادستی چاہتا ہے، چھوڑو یہ سب باتیں۔ اب میرے سوالوں کا جواب دو......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوا تو اب مجھے محتاط ہونا پڑا، ساتھ ہی دل ہی دل میں، میں اس بھاڑے کے ٹٹو پر لعنت بھی بھیجتا جا رہا تھا جو خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت سے انکاری ایک دنیاوی کیڑے لولوش کو نجانے کن کن طاغوتی طاقتوں سے تشبیہہ دینے پر تلا ہوا تھا۔ جبکہ میرا ایمان تھا کہ سچ اور حق ہر شیطانی اور باطل طاقت کو بالآخر نیست و نابود کر ڈالتا ہے۔

''تم کیا سمجھے ہوئے ہو کہ اب تم زندہ رہو گے؟''

''زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس نے میری جتنی لکھی ہوگی اتنی تو میں ضرور گزاروں گا۔''

''خطرناک، مکار ہونے کے ساتھ ساتھ تم شیخی خورے بھی ہو......'' اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ میں نے اس بحث میں پڑنے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''وکرم اور سوشیلا کا کیا بنا...... تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ان کی تلاش میں بھی گئے تھے؟''

میری بات پر اس کے چہرے پر ایک تندی لہر کا شائبہ سا ابھرا اور پھر وہ اسی لہجے میں میری طرف گھور کر بولا۔ ''اپنی زبان کو اب تالا لگا دو...... سمجھے تم۔'' میں ایک دم خاموش ہو گیا۔ سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنی اس مہم میں بری طرح ناکامی سے دوچار ہوا ہوگا۔ لیکن میں نے دیکھا میرے اس آخری سوال نے اس کا موڈ بری طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے چیخ کر بھومک سے برمی زبان میں کچھ کہا اور بھومک جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھا، میں ڈر سا گیا کہیں یہ بدبخت جلاد پھر مجھ پر تشدد کے کوہ گراں تو نہیں گرانے والا؟ مگر شکر رہا ایسا کچھ نہ ہوا۔ اس نے ایک خوفناک نال والا پستول نکال لیا تھا۔ پھر اس نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

میری حالت اب وہی تھی، یعنی کمزوری اور دکھن۔ دوائی اور مرہم وغیرہ سے اگرچہ کافی افاقہ ہو گیا تھا لیکن جلنے سے جیسے یہ قیامت خیز کیفیات دوبارہ جاگ اٹھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کاؤچ سے اٹھ کر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو میرا سارا وجود درد اور دکھن سے بُری طرح سنسنا اٹھا، میرے حلق سے بے اختیار کراہ آمیز چیخ سی خارج ہو گئی۔

''خیال رکھنا...... اب کی بار کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یہ کم بخت بھومک تمہیں دوبارہ رگید کر رکھ دے گا اور اس بار اس نے تم پر کوڑے برسا دیے تو تمہارے جسم پر ابھرے ہوئے آبلے، کوڑھ میں بدل جائیں گے، پھر تمہیں کہیں زندہ ہی سمندر میں نہ پھینک دیا جائے۔ کوڑھ کے مریض سے تو خونخوار مچھلیاں بھی دور بھاگ جاتی ہیں...... ہاہاہا......'' سے جی کوہارا نے تضحیک آمیز انداز میں یہ کہتے ہوئے ایک بدمست قہقہہ بھی لگا دیا اور میں اندر تک سلگ اٹھا۔

ابھی مجھے نجانے کتنے اور بے بسی و بے چارگی کے گھونٹ بھرنے تھے۔ سو یہ گھونٹ بھی بھر لیا اور بغیر کسی سہارے کے بہ مشکل کھڑا تو ہو گیا، مگر میرا سر چکرانے لگا تھا۔ اسی دوران میں نے اپنے جسم کا جائزہ بھی لیا تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میرا پورا جسم چھالوں اور آبلوں سے اٹا پڑا تھا، اپنی یہ حالت دیکھ کر میری وحشت جنوں خیزی کسی خوابیدہ آتش فشاں کے مانند بیدار ہونے لگی تھی اور میرا بس نہیں چلتا تھا کہ میں کسی طرح بھومک سے پستول جھپٹ لوں اور پھر ان دونوں بری شیطانوں پر گولیوں کی بارش کر دوں۔ لیکن میں خود کو ایک لاغر وجود سمجھے ہوئے تھا۔ میرے لیے تو ایک قدم بھی اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا۔ ادھر جسم کو تھوڑی سی بھی حرکت دیتا اور سارے بدن کے چھالے اور آبلے چیخ اٹھتے۔ بڑی مشکلوں سے میں لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے نکلا اور باہر آ گیا۔

کھلی فضا میں آ کر میں نے ایک کیبن کی دیوار کے سہارے لگ کر چند گہرے گہرے سانس لیے اور پھر چار و ناچار آگے بڑھنے لگا۔

بھومک مجھے اسی طرف ہی چلنے کا اشارہ کیے جا رہا تھا، جدھر وہی منحوس تنگ اور تکونی شیپ کمرا تھا۔ میں بس اپنی قوتِ ارادی کے بل پر ہی چل رہا تھا، ورنہ تو ہر قدم پر ایسا ہی لگتا تھا کہ اب گرا کہ تب گرا...... بالآخر گرتے پڑتے میں بھومک کے آگے آگے، اسی طرح چلتے ہوئے دروازے تک پہنچا جو ادھ کھلا پڑا تھا، میں اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ بھومک نے اندر آنے کی زحمت تک گوارا نہ کی اور باہر ہی سے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

میں اپنے بنک بیڈ پر جا پڑا اور یوں لمبے لمبے سانس لینے لگا جیسے میلوں کی مسافتیں طے کرتا یہاں تک پہنچا ہوں۔ ایک بار پھر میرے وجود میں زخموں کی جلن اور دکھن اٹھنے لگی جس نے مجھے ہولے ہولے کراہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس بار میرے دونوں ہاتھ آزاد تھے مگر زخموں نے مجھے ویسے ہی پورا مفلوج سا کر رکھا تھا۔ مجھے اپنی ایسی بے بسی پر خود... ہی رونا آ رہا تھا۔ ساتھ ہی مجھے اس بات پر بھی افسوس ہونے لگا کہ قسمت نے مجھے گوردن کی صورت میں جو موقع دیا تھا، وہ شاید میں جلد بازی یا غیر محتاطی کے باعث گنوا بیٹھا تھا۔ کاش! میں انجن روم کا رخ ...کرتا اور نہ ہی اس چوہے دان میں پھنستا۔

دفعتاً میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ وہ دبلی پتلی نازک اندام بھارتی دوشیزہ کا آنکھ مارنا مجھے یاد آیا تو دل و دماغ میں مایوسی کے سیاہ گھرتے بادل کچھ چھٹتے سے محسوس ہونے لگے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کے یوں آنکھ مارنے میں کوئی رمز تھا، ایسا نہیں تھا کہ اس میں کسی قسم کی پسندیدگی تھی بلکہ آنکھ کا وہ رمزیہ اشارہ کچھ اور ہی کہانی مجھے سناتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اس پر غور کرنے لگا، اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ کیا وہ مجھے کسی قسم کی تسلی دینا چاہتی تھی یا پھر کوئی مزید جارحانہ حرکت سے مجھے مانع کرنا اس کا مقصد تھا؟ کیوں؟ کیا وہ خود میرے لیے ایسا کوئی بندوبست کرنا چاہتی تھی؟ اس کا جواب اثبات میں اگر سوچا جاتا تو اس میں ایک ایسی طوائف کا کیا مفاد پوشیدہ تھا جو خود بھاڑے پر خرید کر اس بوٹ میں لائی گئی ہو؟

بہرکیف میرے لیے کسی اچھے وقت کے انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

بھومک کو گئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دروازہ کھلا، میں نے بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے بہ دقت تمام دروازے کی طرف گردن موڑ کر دیکھا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ دروازے سے وہی بھارتی دوشیزہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹرے تھی۔ پتا نہیں اس میں دوائی تھی یا کھانے پینے کا سامان، تاہم میں اسے اسی طرح پڑا دیکھتا رہا، وہ قریب آ گئی۔ میں نے اس سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ اس نے فوراً نفی میں اپنا سر ہلایا، ساتھ ہی اپنی آنکھوں کو کمرے کی خالی فضا کا جائزہ لینے کے انداز میں گردش بھی دی، جیسے مجھے ایک خاموش اشارے سے کچھ یاد دلانا چاہ رہی ہو۔ تب ہی میں فوراً اس کا اشارہ بھانپ کر محتاط ہو گیا۔

میں واقعی ذرا دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ یہ کمرا بگڈ تھا اور اب تک کی ساری خرابیوں نے کم و بیش ادھر ہی سے سر اٹھایا تھا۔ ہشام چھلگری کی بے رحمانہ موت، گوردن کے ساتھ میرے معاملے کی خرابی، جس میں، میں نے اوور کانفیڈنس اور جلد بازی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا اور اب میں پھر وہی غلطی کرنے والا تھا۔ حالانکہ میں بے حد محتاط رہ کر ہر کام سرانجام دینے کا عادی تھا، پھر پتا نہیں کیوں مجھ سے یہ فاش غلطیاں گویا سرزد ہی ہونے لگی تھیں۔

''شکر کرو کہ یہ لوگ درد دیتے ہیں تو دوا بھی کرتے ہیں۔ اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' اس نے میری طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مترنم لہجے میں کہا تو اس کے بولنے کے نپے تلے انداز اور الفاظ نے مجھے بہت کچھ باور کرا دیا، لہٰذا میں نے بھی اس کا اسی انداز میں ساتھ دینا مناسب جانا اور بہ جبر دکر ہا مسکرا کر بولا۔

''ٹھیک ہی کہتی ہو تم اے نازنین ماہ جبیں! پہلی بار ایسے مہربان دشمنوں سے پالا پڑا ہے۔''

اس نے مجھے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ ''ٹھیک جا رہے ہو۔'' پھر ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے میرے بنک پر ایک جانب رکھتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اوپر والے بنک کو فولڈ کر کے دیوار سے لگایا اور آہنی ہک میں پھنسا دیا۔ اب میں اپنے بنک بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسی دوران اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی چھنگلیہ اور انگوٹھے کو مخصوص انداز میں پھیلا کر درمیان کی تین انگلیاں موڑیں اور ریسیور سا بنا کر کان اور منہ کی طرف لے جا کر اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ میں اس کا اشارہ بھانپ گیا۔ سمجھ گیا کہ وہ مجھے بار بار کیوں اس قسم کا اشارہ کر رہی تھی کہ میں غیر ارادی طور پر بھی یہ بات نہ بھولوں کہ کمرا ''بگڈ'' تھا۔

ایسا چالاک اشارہ کرنے والی یہ بھارتی دوشیزہ کسی صورت میں بھی طوائف نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ میرے دل نے اس کے بارے میں پہلی گواہی دی تھی، تو پھر یہ کون تھی؟ میں اندر سے بدک سا گیا تھا۔ تاہم میں نے اس کی طرف دیکھ کر خاموشی سے اپنے سر کو تفہیمی انداز کی جنبش دی تھی۔

''تم جب تک یہ بھوجن کر لو، میں تھوڑی دیر میں دوبارہ آؤں گی، تمہارے چھالوں پر مرہم لگانے۔ ٹھیک؟'' اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا اور میں نے ''شکریہ'' کہہ دیا۔ وہ واپس چلی گئی۔

اب شاید اسی نے یہاں آنا جانا کرنا تھا، کو [illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بیشتر ملاح ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے تھے، ایک محتاط اندازے کے مطابق بھوک کو چھوڑ کر کوئی ایک آدھ ہی باقی بچا ہوگا، یہ میرے لیے ایک خوش آئند بات تھی اور بہتر بھی۔ مگر میں نے اس کا خمیازہ بھی تو بھگتنا تھا۔

بہرکیف میں ٹرے کی طرف متوجہ ہوا۔ پانی کی بوتل، سینڈوچز، ابلا ہوا انڈا، بھنی ہوئی مچھلی، ابلے ہوئے چاول اور ملک پیک کے علاوہ جوس پیک بھی تھا۔ کھانے کے قوت بخش لوازمات اس طرف اشارہ کرتے تھے کہ یہ لوگ مجھے بہت جلد ''بھلا چنگا'' دیکھنا چاہتے تھے اور یقینا اس میں لولووش کی ''ہدایات'' کا ہی دخل ہوسکتا تھا، ورنہ کم از کم سے جی کوہارا جیسے جلاد ابن جلاد سے ایسی ''خیر'' کی توقع نہ تھی مجھے۔ کھانے کی اشتہاانگیز خوشبو نے میری مری مری سی بھوک کو یکدم چمکا دیا تھا۔ کھانا پینا میرے لیے ضروری تھا، کھانے کے دوران میں اس دوشیزہ کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ اس کو دوبارہ آنا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوا تو میں نے ٹرے کے دوسرے گوشے کا جائزہ لیا، وہاں بھانت بھانت کی مرہم اور دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ آگئی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا، وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں اس کی طرف دیکھ کر جوابی مسکراہٹ پھینک کر رہ گیا۔ لیکن میں چونکا اس وقت جب اس نے اپنی مٹھی میں دبا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ کاغذ مڑا تڑا تھا، میں اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

''مت بھولنا کہ تم خطرناک لوگوں کے بیچ میں ہو، اس لیے ہر طرح سے محتاط رہو، جلد بازی مت کرو۔ اس کمرے کی دیواروں کے کان ہیں، سرگوشی بھی کرو گے تو سن لی جائے گی۔ اشارہ سمجھ رہے ہو تم، ساری باتیں، چاہے کسی بھی زبان میں ہوں، سوچرنگ روم کے آٹو ڈیوائس میں ٹرانسلیٹ ہو رہی ہوتی ہیں۔ اچھا ہوا ان کی نفری قوت کم ہو گئی ہے، مگر یہ کچھ زیادہ پُرامید صورت حال نہیں ہے۔ کوئی اور چال چلنا پڑے گی، میں تمہاری مدد کروں گی۔ بس تھوڑا انتظار کرو، قلم رکھنے کی ممانعت ہے، یہ کاغذ بھی میں بڑی مشکلوں سے لکھ کر لائی ہوں۔ فقط پنسل ہی لا سکی ہوں۔''

''چندر کلا۔''

اختتام پر یہ یقینا اسی کا نام تھا۔ میں نے وہ کاغذ اپنے ہاتھ میں تھامے رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے اپنے بریزر میں ہاتھ ڈالا، میں دوسری طرف تکنے لگا، اس نے ایک پنسل کی نوک ہولے سے میرے بازو میں چبھوئی، میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور پنسل لے کر اسی کاغذ کے پیچھے فقط یہ لکھ کر کہ...... ''تم کون ہو اور میری مدد کیوں کرنا چاہتی ہو؟'' کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے وہ پڑھا اور پنسل میرے ہاتھ سے لے کر جلدی سے چند جملے گھسیٹے۔

''میں ایک عام سی طوائف ہوں، مگر ان ظالم اور وحشی بردیوں نے میرے تین ہم وطن خلاصیوں کو بڑی بے دردی سے ہلاک کر ڈالا ہے، انہی میں اشوک بھی تھا، وہ بے چارہ مجھے چاہنے لگا تھا اور یہاں سے فرار کا پروگرام بنائے ہوئے تھا میرے ساتھ۔ میرے ساتھ جو دوسری طوائف ہے اس کے اور میرے ساتھ یہ لوگ بڑا بدترین سلوک کرتے ہیں، ہم دونوں تمہاری مدد سے بھاگنا چاہتے ہیں، لیکن پہلے ضروری یہ ہوگا کہ تمہارے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ ان لوگوں نے اپنی عیاشیوں کے لیے ہمیں خرید تو لیا ہے مگر ہمیں ان سے اپنی جان کو خطرہ ہونے لگا ہے، اب بس کرتی ہوں۔''

یہ سطریں مجھے پڑھانے کے بعد اس نے وہ کاغذ اور پنسل اپنے بریزر میں چھپا لیا اور اسی وقت باہر دروازے پر کھٹر بڑ کی آوازیں ابھریں۔ وہ بہ سرعت حرکت میں آئی اور مجھے مرہم لگانا شروع کر دیا۔ میرے وجود میں ٹھنڈک اترنے لگی۔

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا، چندر کلا نے دروازے کی طرف دیکھنے کی مطلق ضرورت نہ سمجھی اور اپنے کام میں لگی رہی، جبکہ میں نے ضرور قدرے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا، وہاں مجھے بھوک کا مکروہ چہرہ نظر آیا تھا، اس نے ایک کرخت سی بھانپتی ہوئی نظر ہم دونوں پر ڈالی اور پھر جیسے مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ تب ہی چندر کلا نے اپنی ذرا گردن موڑ کر اس دروازے کی طرف دیکھا تھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے چلی گئی۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ چندر کلا میری آزادی کے سلسلے میں کیا کرنے والی تھی؟ اب سے جی کوہارا کے آئندہ کے عزائم کیا تھے؟ بوٹ کا سفر ایک بار پھر کیوں روک دیا گیا تھا؟ نیز اب ہم بھارت کے کس شہر کے ساحل کے قریب تھے؟ اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اپنے بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے پورٹ ہول سے باہر دیکھنے کی سعی چاہی تھی، جہاں گھور تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں سو گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نیند سے دوبارہ جاگنے تک کا دورانیہ غالباً چند ہی گھنٹوں پر محیط رہا تھا، کیونکہ جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو پورٹ ہول کے باہر ابھی تک مقدور بھر نظر آنے والے آسمان پر دمکتے تاروں تلے مجھے رات کا اندھیرا ہی پانی کے ساتھ ہلکورے لیتا دکھائی دیا تھا۔ کمرے کی لائٹ گل تھی، جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جس وقت نیند سے میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اس وقت لائٹ آن تھی، ہو سکتا ہے بعد میں بھوک مجھے دیکھنے آیا ہو اور اسی نے لائٹ گل کر دی ہو، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں جاگا کیونکر تھا؟ تب ہی اچانک مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی بھی تھا۔ اس پُراسرار احساس کے ہوتے ہی میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

''کک...... کون؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔

''ششش...... شی......'' کسی نے بہت قریب ہی شُشکارتی ہوئی سرگوشی کی اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ معاً ہی مجھے اپنے اوپر والے بنک بیڈ پر کسی کی ہلکی سی کھنکتی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میں بھک رہ گیا۔

''میں تمہارے اوپر والے بنک پر موجود ہوں، اپنے بولنے کی آواز ہلکی رکھنا۔''

اس شناسا سی آواز پر میں بدکا۔ یہ چندر کلا تھی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ آہستگی سے بولا۔ ''تم اس وقت...... یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''اتنی آواز ٹھیک ہے، اب کوئی جاگتا نہیں، سب سو رہے ہیں، سوچرنگ روم بھی خالی پڑا ہے۔ کوئی ہماری باتیں نہیں سن سکتا۔'' وہ بولی۔

''مت بھولو کہ سوچرنگ روم میں کوئی نہ بھی ہو تب بھی یہاں کی گفتگو وہاں ریکارڈ ہوتی رہتی ہے، جس کی ڈسک نکال کر کسی بھی وقت سنی جا سکتی ہے۔''

''مجھے تمہارا یہ محتاط انداز پسند آیا۔'' وہ قدرے شوخی سے بولی۔ ''مگر اب اس کی بھی چنتا نہ کرو، میں نے ٹائمر کی مدد سے دو گھنٹوں کے لیے سسٹم آف کر دیا ہے۔''

اس کی باتیں میرے دل و دماغ میں ایک بار پھر اس کی جانب سے شکوک و شبہات پیدا کرنے لگی تھیں۔ ایسی احتیاط، ایسی جچی تلی اور گھاگ گفتگو کوئی عام لڑکی نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے فوراً خوش امیدی تلے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے پھر، یہاں سے ہمیں فرار ہو جانا چاہیے؟''

ڈرائیور

مال روڈ پر اپنا کام نمٹانے کے بعد میں واپس آیا تو اسے غائب پایا۔ میں گاڑی کے پاس کھڑا ہو گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں شدید گرمی میں آدھ گھنٹا کھڑا رہا، وہ واپس آیا تو اس کے چہرے پر پشیمانی کے کوئی آثار نہ تھے بلکہ اس نے الٹا مجھے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ ''صاحب! آپ تو اندر جا کر بیٹھ ہی گئے، میں کافی دیر آپ کا انتظار کرتا رہا، پھر میں ٹہلنے چلا گیا۔ صاحب، مال روڈ کی بہت تعریفیں سنی ہوئی تھیں دیکھی آج ہے!'' گھر واپسی کے دوران گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہو گئی اور کوشش کے باوجود اسٹارٹ نہ ہوئی، میں نے اسے کہا کہ ''بونٹ کھول کر چیک کرو کہ کیا خرابی ہے؟'' وہ بولا۔ ''صاحب، مجھے تو انجن کا کچھ پتا نہیں!''

''پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں گاڑی میں بیٹھتا ہوں، آپ دھکا لگائیں۔'' اس نے سیدھا سا حل بتایا...!

مجھے بہت غصہ آیا مگر میں نے ایک دفعہ پھر ضبط سے کام لیا، اس سے چابی پکڑی اور اسٹیئرنگ پر بیٹھ کر اسے دھکا لگانے کے لیے کہا گاڑی اسٹارٹ ہو گئی!

''تم تو کہتے تھے کہ تمہیں گاڑی اور ڈرائیونگ کا بہت تجربہ ہے مگر لگتا ہے تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''صاحب! مجھ پر الزام نہ لگائیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔ ''میں گاؤں میں بیس سال ٹریکٹر چلاتا رہا ہوں اور میں نے نمبردار کے بیٹے کی گاڑی بھی چلائی ہے۔''

اس دفعہ میں نے بہت مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا، وجہ صاف ظاہر ہے، اس کے پاس پستول کا لائسنس تھا!

حماقت

ڈاکٹر: مریض سے ''تم اب میرے پاس آئے ہو، اس سے پہلے پتا نہیں کتنے ڈاکٹروں کو دکھایا ہوگا۔''

مریض: ''جی نہیں، میں تو ایک کیمسٹ کے پاس گیا تھا۔''

ڈاکٹر: ''مکمل جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا کہ علاج کر سکے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، خیر بتاؤ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟''

مریض: ''جی اس احمق نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا ہے۔''

کراچی سے ندا صمرین کی سوغات

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''نہیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''اس کا ابھی کوئی فائدہ نہ ہوگا ہمیں۔ اس لیے کہ ہم ساحل سے دور ہیں، لیکن تم فرار کیوں ہونا چاہتے ہو؟ کیا تم ان لوگوں سے انتقام نہیں لینا چاہتے؟''

''میرا تو دل کرتا ہے اسی وقت ان سب کو جہنم واصل کر ڈالوں۔'' میں نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

''اس کا موقع میں تمہیں فراہم کرسکتی ہوں۔'' وہ ترنت بولی۔ ''مگر پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو گے۔''

''پوچھو، کیسا سوال؟''

''تمہیں ان لوگوں نے کیوں یرغمال بنا رکھا ہے؟''

''تم تو سے جی کو ہارا کی قربتوں کی ساتھی رہی ہو، کیا ابھی تک اس سے یہ معلوم نہیں کرسکی ہو؟''

''اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ تمہیں وہ اپنے باس کے حکم پر رنگون لے جانے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''یہ نہیں بتایا، کیوں؟''

''میں نے پوچھا تھا۔'' چندر کلا بولی۔ ''مگر اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔''

''ہم......'' میں نے ہولے سے آواز نکالی اور پہلی بار اسے نام سے مخاطب کر کے مستفسر ہوا۔

''ایک بات تو بتاؤ چندر کلا...... تم ہو کون؟ اور کس کے ایما پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری مدد کررہی ہو؟ جانتی بھی ہو کہ یہ لوگ کس قدر سفاک اور درندہ صفت ہیں۔''

میرے سوال پر چندر کلا کو جیسے چند ثانیوں کے لیے ایک چپ سی لگ گئی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ''تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟'' اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''ایک خوب صورت لڑکی، مگر طوائف نہیں، ہاں کسی کی آلۂ کار ضرور سمجھتا ہوں، جو طوائف کے روپ میں یہاں لائی گئی ہے۔'' جو میرے دل میں اس کے لیے تھا وہ میں نے اس سے کہہ دیا۔

''بہت ذہین ہو تم! کیونکہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ بہتر بھی یہی ہوگا ہم ایک دوسرے کے سامنے کھل جائیں، تاکہ آگے کے معاملات بھی ہمارے درمیان بہ آسانی طے پاتے رہیں۔''

میری دوٹوک گفتگو نے اسے ''کھلنے'' پر آمادہ کرلیا تھا۔ لہٰذا اس کی تائید میں بولا۔ ''بہتر بھی یہی ہوگا کہ اگر ہم ایک دوسرے کے کام آسکیں۔''

میں اب یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ میرے بارے میں کتنی جان کاری رکھتی تھی؟

''جہاں تک مجھے معلوم ہے، تمہارے اور لولووش کے بیچ معاملہ کوئی کاروباری نوعیت کا ہے۔'' بالآخر اس نے کہا۔ ''کسی جہاز راں کمپنی کے کچھ شیئرز تمہارے نام ہیں، وہ تم سے ہتھیانے کی کوشش کی جارہی ہے۔'' اس کی بات سن کر مجھے مسرت ہوئی کہ چندر کلا میرے بارے میں صرف اسی قدر ہی جانتی تھی اس سے زیادہ نہیں اور یہ بات میرے حق میں جاسکتی تھی جب تک کہ اس کی دورخی شخصیت میرے سامنے نہیں کھل جاتی۔ میں نے اس کی ''محدود'' جان کاری کی حد بندی کرتے ہوئے اس کی تائید میں کہا۔

''ہاں! یہاں معاملہ ایسا ہی کچھ ہے، وہ مجھے اپنے پاس یرغمال بنائے رکھنے کے دوران وہ شیئرز میرے ساتھیوں سے حاصل کرنے کے بعد ایک اسٹامپ پیپر پر میرے سائن کروانا چاہتا ہے، تاکہ وہ اس اڈیسہ نامی جہاز راں کمپنی کا بلا شرکت غیرے مالک بن جائے۔''

''اوہ......'' چندر کلا کے منہ سے فقط اتنا ہی نکلا تھا کہ میں نے اس کے بارے میں پوچھ لیا۔ ''اب تم اپنے بارے میں بتا دو ٹھیک ٹھیک اور یہ بھی کہ میں بدلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''میرا معاملہ تم سے زیادہ گمبھیر ہے۔'' وہ اسرار بھرے لہجے میں بولی۔ ''تم سے پہلے جو قیدی یہاں موجود تھا، بوشام......''

''بشام......'' میں نے ہولے سے تصحیح کی۔

''ہاں! وہی، وہ میرے بہت کام کا آدمی تھا اور تمہارا ہم وطن بھی تھا، اسی لیے تمہارے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی، مگر افسوس، اس نے طلسم نور ہیرے سے متعلق تم سے گفتگو کر کے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر ڈالے تھے۔''

اس کی زبان سے طلسم نور ہیرے سے متعلق سن کر مجھے اپنے وجود میں سنسنی کا احساس ہوا تھا۔ بولا۔ ''کیا تم بھی اس کے حصول میں دلچسپی رکھتی ہو؟ اگر ایسا ہے تو میرا دوستانہ مشورہ تمہیں یہی ہوگا کہ اس سے باز آجاؤ...... یہ سر پھروں کا کام ہے۔'' میں نے دانستہ آخر میں ایسا کہا تھا، تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں بھی اس ہیرے کے حصول میں دلچسپی رکھے ہوئے تھا اور کیوں نہ رکھتا، یہ نادر و نایاب ہیرا میرے وطن کی ملکیت تھا۔ اس کی خاطر بشام نے اپنی جان کی قربانی تک دے ڈالی تھی۔ لیکن میں چندر کلا کے سامنے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، جس سے وہ میری طرف سے بھی کھٹک جاتی، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے مجھ سے کیا غرض تھی؟

''یہ واقعی سر پھروں کا کام ہے۔'' وہ میری بات کی تائید میں بولی۔ ''لیکن شاید تم نہیں جانتے کہ اس پُراسرار ہیرے کے پس پردہ بعض لوگوں کے کس قدر خطرناک عزائم ہیں۔''

''مثلاً۔'' میں نے سوالیہ کہا، اندر سے کھٹک گیا تھا میں۔

''سنو گے تو تمہارے پیروں تلے زمین نکل جائے گی۔''

''میرے پاؤں یوں بھی زمین پر کب ہیں، تم اپنی بات جاری رکھو۔'' میں نے کہا۔

''مذاق اچھا کر لیتے ہو۔'' وہ کھنکتے لہجے میں بولی، میں متنفسرانہ انداز کی خاموشی اختیار کیے رہا پھر اس نے ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے مزید کہا۔

''اس ہیرے کے حصول میں دو گروہ کارفرما ہیں، ایک گروہ تو وہ ہے جس کا مطمحِ نظر دولت ہے، اور دوسرا وہ گروہ ہے جو تین ممالک کے درمیان جنگ چاہتا ہے، جوع العرض کے جنون میں مبتلا کچھ جرنیل ان تینوں ممالک کو جنگ کی آگ میں جھونک کر سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ خطے کے مالک بن جائیں گے، مگر وہ نہیں جانتے ہیں کہ اس طرح تیسری عالمی جنگ کے چھڑ جانے کا خطرہ ہے اور پوری دنیا اس کی لپیٹ میں آسکتی ہے، جو دنیا کے خاتمے کا بھی سبب بن سکتی ہے کیونکہ یہ جنگ مکمل طور پر ایٹمی جنگ میں بدل سکتی ہے اور پھر کوئی بھی نہیں بچے گا۔''

اس کی بات پر میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا مجھے اس تناظر میں بشام کی بات یاد آگئی تھی، اس نے بھی مجھے یہی کچھ بتایا تھا۔ جس کے مطابق امریکا، روس اور بھارت کے تین جرنیل خفیہ طور پر پاکستان، ایران اور چین کے درمیان ایک بڑے بھیانک مشترکہ منصوبے پر کام کررہے تھے، جسے ''ورلڈ بگ بینگ'' کا نام دیا گیا تھا۔ تاہم میں نے چندر کلا سے کہا۔

''تم ان دونوں گروہ میں سے کس سے تعلق رکھتی ہو؟ دولت کے حصول والے گروہ سے یا پھر...... دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنے والوں سے؟''

''دولت والے گروپ سے......'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''خوب! پھر تو تمہاری اور میری خوب نبھے گی۔'' میں نے بھی دانستہ خود کو لالچی اور لامحالہ طالع آزما گروہ سے نتھی کرلیا۔

''اور میرا خیال ہے ہم کم از کم اس دوسرے خطرناک جرنیلی گروہ سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔'' اس نے مسکراتے لہجے میں جواب دیا۔ ''کیونکہ ہم کسی کی جان لینے کے درپے نہیں ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہتی ہو تم۔'' میں نے تائیداً کہا، ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے یہ سوچنے میں محو تھا کہ سر دست یہ میرے سلسلے میں کیا مدد کرسکتی ہے، یقیناً یہ اس مشن میں اکیلی نہیں ہوگی اس کے اور بھی ساتھی کہیں نہ کہیں موجود اور کسی موقع کی تاک میں ہوں گے۔ اس لیے ابھی میں خود کو اسی کا ہم خیال ثابت کرنے اور اس کی ہاں میں ہاں ملانے کی پوزیشن میں رکھے ہوئے تھا۔ چندر کلا کے ذریعے میں ایک پنتھ دو کاج بلکہ سہ کاج انجام دے سکتا تھا۔ میں نے ایک ذرا توقف کے بعد کہا۔

''کیا اچھا ہوتا کہ مجھے بھی تم لوگ اپنے گروپ میں شامل کر لیتے، اس بیش قیمت ہیرے سے تو مجھے بھی دلچسپی ہے۔''

''تم شامل ہو چکے ہو۔'' وہ بولی۔ ''بس! ایک مدد چاہیے تمہاری۔''

''میری مدد؟'' میں نے دانستہ اپنے چونکتے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ ''میں بھلا تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟ میں خود تمہاری مدد کا محتاج ہوں۔''

''ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں۔'' وہ اس بار سنجیدگی سے بولی، لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ اب مطلب کی بات پر آرہی تھی۔ میں چپ رہا۔

''میں کوشش کے باوجود وہ ڈسک ممکن نہ تلاش سکی، جس میں تمہاری اور بشام کی اس ہیرے سے متعلق تفصیلی گفتگو ریکارڈ کی گئی تھی۔ لیکن میں نے کوہارا اور کسی حد تک بھومک کے منہ سے اس ہیرے کے متعلق اتنا ضرور اگلوا لیا کہ انہیں اس کا کسی حد تک کھوج مل چکا ہے، جو کسی سوشیلا نامی عورت کے قبضے میں ہے، جو انہی کی تنظیم اسپیکٹرم سے وابستہ تھی، اس نے تنظیم کی ایک فیلڈ آفیسر کی حیثیت سے وہ ہیرا تمہارے ملک پاکستان سے اڑا دیا اور اپنے تنظیمی ساتھی بشام کو چکما دے کر بھارت لوٹ آئی۔ اس کے ہمراہ دکرم نامی ایک ساتھی بھی تھا۔ لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ اس کی ساتھی نے کیا گل کھلایا ہے، بعد میں وہ ہیرے سمیت غائب ہوگئی

READ Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور کافی عرصے تک اس کی ڈھنڈیا پڑی رہی، بالآخر ان لوگوں نے اس کا کھوج لگالیا۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

یہ سب باتیں میرے علم میں پہلے ہی سے تھیں لیکن اس کی آخری بات میرے لیے چونکا دینے والی ثابت ہوئی، یہ انکشاف میرے لیے بے حد اہم اور تکلیف دہ بھی تھا کہ سوشیلا ان رذیلوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی، جس کا مطلب تھا ہیرے تک ان کی رسائی کافی حد تک ممکن ہونے والی تھی، میں بے چین سا ہوگیا مگر میں نے چندر کلا پر ایسا کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ ابھی تک میں اس کی طرف سے تشکیک کا شکار تھا۔ لیکن یہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ سوشیلا کے سلسلے میں کوہارا کی مہم جوئی کہاں تک پہنچی تھی، جس کے لیے اس قسائی نے بدقسمت ہشام کی..... بیدردی سے جان لی تھی۔ میں نے بہ ظاہر غیر دلچسپی سے کہا۔

"سوشیلا کو انہوں نے کہاں قید رکھا ہوا ہے اور کیا اب تک یہ لوگ اس کے منہ سے ہیرے سے متعلق کچھ نہیں اگلوا سکے؟"

"وہ اوپر والے کیبن میں ہے اور ان دونوں وحشی بریموں نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس کے گلے میں پٹا ڈال کر گھسیٹتے پھرتے ہیں اور پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ان سے رو رو کر موت کی بھیک مانگتی ہے۔"

"اس نے کچھ بتایا نہیں، ہیرے کے بارے میں؟" میں نے دلچسپی لیے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

"اس نے جو بتایا ہے وہ خاصا سنسنی خیز ہے۔ کوہارا اس کے بیان کی تصدیق کرنے کے بعد ہی اسے ہلاک کرے گا تاکہ وہ جھوٹ نہ بول سکے۔" اس نے جواب دیا۔

"تو اب تک کیا بتایا ہے اس نے اور کوہارا وغیرہ نے کیا قدم اٹھایا؟" میرے سوالات جاری رہے۔

"اس نے کچھ بتایا تو ہے اور کل صبح بھومک اور ایک ساتھی اس کی تصدیق کے لیے جائیں گے۔" وہ بولی۔

"ہوں ں ں....." میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری لی۔ پھر بولا۔ "بھومک اور اس کے ساتھی کے جانے کے بعد کوہارا اس بوٹ میں اکیلا رہ جائے گا۔"

"بالکل۔" اس نے فوراً درمیان میں کہا۔ "میرا منصوبہ یہی ہے، میں اس کے ساتھ سوئی ہوتی ہوں، صبح تک اسے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا دوں گی، تم اس کی مشکیں کس لینا، ہمارا کوہارا یا بھومک سے کوئی لینا دینا نہیں، ہم سوشیلا سے معاملات طے کرنے کی کوشش کریں گے اور بس!"

اس کی یہ بات سنتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ چندر کلا کیا چاہتی تھی؟ اسے صرف ہیرے کی برآمدگی سے دلچسپی تھی اور میں جانتا تھا کہ ہیرا ہاتھ آتے ہی یہ مجھے بھی "ہاتھ" دکھا جائے گی۔

لیکن ابھی چونکہ میری اپنی "گوٹ" پھنسی ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ مجھے بھی اس کی مدد سے یہاں موجود اپنے بہت سے دشمنوں سے حساب چکانا تھا، جن میں سرفہرست کرنل بی جی بھگوانی تھا۔ نیز میں نے پاکستان اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فونک رابطہ بھی کرنا تھا۔ وہ سب میری وجہ سے کس قدر پریشان اور تشویش زدہ ہو رہے ہوں گے اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "چندر کلا.....! میں ہر معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں، لیکن بس ایک بات کا خیال رہے کہ ہمارے تمہارے بیچ اعتماد کا یہ رشتہ نہ ٹوٹنے پائے، مفادات کو مشترکہ ہی رہنے دینا اور ایک دوسرے کی غرض و غایت کا بھی پاس رکھنا۔ پھر میں ہر طرح سے تمہارے ساتھ ہوں۔"

میری بات سن کر وہ بنک سے نیچے اتر آئی، اس کے جواں اور نوخیز کلی جیسے بدن کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرانے لگی۔ تاریکی کے باعث میں اسے دیکھ تو نہیں پارہا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو مجھے صاف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے اپنے چہرے پر کسی کے گرم گرم سانسوں کی مہک محسوس ہوئی، اس کے بعد کسی کی نرم و نازک انگلیوں کا لمس میرے چہرے سے ٹکرایا، اور چندر کلا کی جذبات سے بھرپور آواز آئی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں میرے پریتم! ہر معاملے میں، ہر جگہ، جہاں اور جیسے کہو، وہ مجھے قبول ہوگا۔"

اس کی اس حرکت نے مجھے بدکا کر رکھ دیا، میرا اسے پرے دھکا دینے کو جی تو چاہا تھا لیکن میں ایسا نہ کرسکا، تاہم اسے آہستگی کے ساتھ خود سے پرے کیا اور بہانے سے اپنے بنک پر سے نیچے اتر آیا۔

سریع الاثر ادویات اور مرہم وغیرہ نے میرے زخموں پر ہی نہیں بلکہ میری طبیعت پر بھی خاطر خواہ اثر کیا تھا، میں اپنے اندر کھوئی ہوئی طاقت اور بشاشت کو لوٹتا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے صبح کا سورج اس بوٹ پر ہماری حکمرانی کے ساتھ طلوع ہونے والا ہے؟" اس کا جواب چندر کلا نے یوں دیا کہ میرا ایک ہاتھ تھام کر مجھے کوئی ٹھوس فولادی شے تھما دی، جس کا میں خوب اچھی طرح لمس آشنا تھا۔ یہ کوئی ہتھیار تھا۔ بھاری پستول۔ یہ تھمانے کے بعد وہ جواباً بولی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ یہ سنبھالے رکھو۔ معاملہ بگڑتے دیکھو تو بے دریغ استعمال کرلینا۔ اگرچہ میں صبح تک کام مزید آسان کرلوں گی۔"

"میں اس سنہری موقع کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔" میں نے ہولے سے کہا۔ ہتھیار اور موقع محسوس کرتے ہی میرے اندر فطری جوش نے یک دم انگڑائی لی تھی۔

"چلتی ہوں میں، بہت جلد تم اور میں اس لانچ پر قیدیوں کی طرح نہیں، بلکہ آزاد ساتھیوں کی طرح ملیں گے۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

مجھے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اسی طرح گم صم سا کھڑا رہا۔ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے اور میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں نے پورٹ ہول کی طرف دیکھا، جہاں مقدور بھر نظر آنے والے سمندر پر کہیں دور پرے جھکے ہوئے چاند کی ضوفشانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یہ رات کا جانے کون سا پہر تھا، مجھے کچھ ٹھیک طرح اندازہ نہ تھا۔

بہرکیف پستول ہاتھ میں آتے ہی میں اپنے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ سا محسوس کرنے لگا تھا۔ میری پرانی جنگجو فطرت بیدار ہونے لگی تھی۔ غیظ و غضب کے وہ سارے طوفان جو میرے اندر کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح جوالا مکھی بن کر بھکنے کو تیار تھے، وہ اب مجھے ایکا ایکی ہی امڈنے کو بے چین سے محسوس ہونے لگے تھے۔

میں اپنے بنک بیڈ پر آکر نیم دراز سا ہوگیا۔ آزادی اور دشمنوں پر قابو پانے کی نوید و امید پاتے ہی میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور ہو چکی تھی۔ پستول میں نے بنک بیڈ کے سرہانے اس طرح چھپا کر رکھ دیا کہ ایک تو میں اسے جب چاہتا نکال سکتا اور کسی کو نظر بھی نہ آتا۔

میں صبح کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ چندر کلا کی باتیں کافی دیر تک میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہیں۔ اگر وہ میری مدد سے اس طلسم نور ہیرے کا حصول آسان بنانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی تو میں اسے اس کی ایک بڑی بھول قرار دیے ہوئے تھا۔ وہ بھی مجھے اپنی طرح کا ایک طالع آزما بنا کر اپنی کشتی میں سوار کرنا چاہتی تھی۔ میرے دل میں بھی لالچ کا بیج بو کر وہ سمجھ رہی تھی کہ میری مدد سے اپنا کام بہ آسانی نکال لے گی۔ یہ یقیناً وہی چال تھی جیسی میں گوردن سے چلنے والا تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ "خزانے کی تلاش" کی اس قدیمی اور روایتی کہانی میں میرے علاوہ اور کتنے لوگ چندر کلا کی پشت پر تھے؟ اور اگر تھے بھی تو وہ کہاں تھے؟ چندر کلا اب تک ان کی مدد لینے سے کیوں قاصر تھی؟ یہ اور ایسے کئی سوالات میرے ذہنِ رسا میں گڈمڈ ہونے لگے تھے، لیکن میں نے بھی اپنے دل میں یہ تہیہ کر رکھا تھا کہ ہیرے کے حصول کے سلسلے میں چندر کلا اور اس کے چھپے ہوئے ساتھیوں کو میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

وقت گزرتا رہا، میری آنکھیں پھر نیند سے بوجھل ہونے لگیں لیکن میں ابھی سونا نہیں چاہتا تھا، یوں بھی اس بوٹ میں ایک قیدی کی حیثیت سے میں سوتا ہی رہا تھا۔ لیکن باوجود اس کے میری آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کسی کھٹکے پر کھلی تھی۔ کوئی دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے قدرے چونک کر نیم غنودگی کے عالم میں بنک بیڈ پر لیٹے لیٹے ذرا گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

دروازے کے پار مجھے صبح کاذب کی روشنی محسوس ہوئی تھی اور اسی کے اجالے میں مجھے کسی کا بھاری بھرکم وجود بھی نظر آیا تھا۔ وہ متحرک ہوا، اور کمرے میں چٹ کی ہلکی سی آواز ابھری، کمرا روشن ہوگیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسی طرح پڑا رہا۔ آنے والا بھومک تھا، اس بدذات کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔

اگرچہ مجھے اس کے نازل ہونے کی پوری امید تھی، حالانکہ چندر کلا نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ صبح ہوتے ہی سے جی کوہارا کی ہدایت کے مطابق وہ ہیرے کی کھوج کے سلسلے میں کہیں روانہ ہونے والا تھا۔ تاہم یہ بھی ممکن تھا کہ وہ بوٹ سے روانہ ہونے سے قبل میرے کمرے کا رخ کرسکتا تھا اور وہی ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا بھومک کو اس کی موت یہاں کھینچ لائی تھی، کیونکہ چندر کلا نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اگر تو بھومک اپنے مشن پر جانے سے پہلے میرے کمرے کا رخ کرتا ہے اور اپنی تسلی اور میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر خاموشی سے پلٹ جاتا ہے تو اسے جانے دیا جائے، بہ صورت دیگر وہ مجھے دوبارہ رسن بستہ یا اسی طرح [illegible]

Section

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور حرکت، بہ شمول مجھے بے بس کرنے کی نیت رکھتا ہو تو میں بے دریغ اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ یہ تو خیر چندر کلا کی ہدایت تھی اور میں خود بھی ایسا ہی کچھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ لیکن بھومک کی آمد کا تو میں خود بھی بڑی بے چینی سے منتظر تھا۔ اب چاہے وہ مجھ سے کوئی ایسی ویسی حرکت کیے بغیر نہ بھی لوٹتا، تب مجھے اس خبیث جلاد صفت کو چھوڑنا نہیں تھا۔

بھومک کو اپنے کمرے میں در انداز ہوتے دیکھ کر ہی میری رگوں میں خون، مثلِ لاوا کی طرح کھولنے لگا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ بدبخت مجھے دوبارہ ہتھکڑی لگانے ہی آیا تھا، شاید یوٹ سے روانگی سے پہلے وہ مجھے پوری طرح محبوس رکھنے کا ارداہ کیے ہوئے تھا۔ میں نے بھی اندر ہی اندر دانت بھینچ لیے تھے۔ اس مردود کو دیکھتے ہی مجھ پر جنون طاری ہونے لگا تھا، اور میں اس کی گردن دبوچنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

وہ پہلے تو دروازے پر کھڑا بہ غور میری طرف گھور کے دیکھتا رہا، اس کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے بنک کے قریب آ کر ذرا فاصلے سے کھڑا ہو گیا، اس کے ایک ہاتھ میں زنجیر نظر آ رہی تھی اور دوسرے میں پستول۔ آج پہلی بار میں اس خبیث کے ہاتھ میں پستول دیکھ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہی رہی ہو گی کہ میں کمرے میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا، اس کا کمرے میں داخل ہونے کا انداز بھی اسی طرح محتاط رو تھا، جیسے وہ کسی شیر کے پنجرے میں داخل ہوا ہو۔

''اسی طرح لیٹے لیٹے کوئی اور حرکت کیے بغیر اپنے دونوں ہاتھ راڈ کے اندر سے گھما کر آگے بڑھا دو۔'' معاً اس کی کرخت اور تحکمانہ سی آواز ابھری۔ وہ بدبخت پھر سے میرے دونوں ہاتھوں کو بنک بیڈ کے آہنی راڈ سے باندھنا چاہتا تھا۔ جس کا مطلب پھر وہی جاں گسل بے بسی تھی، میں اپنے سینے میں اس جلاد بھومک کے لیے نفرت و غیظ کے ہزار طوفان چھپائے اس کی طرف قہربار نظروں سے گھورے جا رہا تھا، اور تب ہی اس نے شاید میری آنکھوں سے بہت کچھ محسوس کر لیا تھا، کیونکہ اسی وقت اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میرے سر کی طرف کر لیا تھا، جبکہ میں نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ راڈ سے گھما کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ اب زنجیر لگانے کے لیے اسے پستول والے ہاتھ کو بھی بروئے کار لانا پڑا۔ زنجیر کے فولادی کڑے میرے ہاتھوں سے گزارنے کے لیے، اسے بھی میرے ذرا اور قریب آنا پڑا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر ٹھاٹھیں مارتا جوش کا ایک سمندر سا اپنے مدوجزر کے ساتھ اچھلا اور میرے دونوں آگے بڑھے ہوئے آہنی ہاتھوں کے شکنجے میں بھومک کی موٹی گردن سما گئی اور ایک بپھری ہوئی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میں نے اس کا سر پوری قوت سے اسی آہنی راڈ کے ساتھ بڑے زور سے ٹکرا دیا۔ اس کی پیشانی فولادی راڈ پر لگی تھی۔

اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ خارج ہوئی، میں نے دوسری بار بھی یہی عمل دہرایا، اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر چکا تھا۔ پیشانی پھٹ گئی تھی، مگر وہ سخت جان ثابت ہوا، اس نے سنبھلتے ہی میرے چہرے پر اپنے ہتھوڑے جیسے گھونسے کا وار کیا جو میں اپنی ناک بچاتے ہوئے، دائیں گال پر سہہ گیا اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں بنک بیڈ سے اتر آیا، اتنے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہ فرش پر ایک طرف گرے پستول اٹھانے کے لیے جھکا، میں تب تک اس کے سر پہ سوار ہو چکا تھا، میری ٹانگ حرکت میں آئی جو اس کی پشت پر لگی، وہ الٹ کر دیوار سے سر کے بل جا ٹکرایا۔ ایک بار پھر اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی خارج ہوئی، وہ وحشی بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا پلٹا، اس کا مکروہ چہرہ خون میں تر تھا، اور مسخ ہو کر مزید کریہہ صورت بن چکا تھا۔ وہ زخمی بھینسے کی طرح مجھ پر جھپٹا، میں بھی پرے نہیں ہٹا اور باقاعدہ اس کے ساتھ زور آزمائی پر اتر آیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔

میری چشمِ تصور میں بار بار وہ منظر رقص کرنے لگا جب، یہ مردود مجھے خاردار کوڑے برسا رہا تھا اور میرے کھلے زخموں پر نمک پاشی کر رہا تھا، اس کے جسم میں واقعی کسی افریقی بھینسے جیسی طاقت تھی، مگر جوشِ جنوں سے میرا بھی کم برا حال نہ تھا، یہی شے میری طاقت کو سوا کیے ہوئے تھی، میں نے اسے گھما کر پشت کے بل زور سے دیوار پر مارا اور ساتھ ہی اپنی داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اس کے پیٹ پر رسید کر دی، وہ تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ مگر فوراً ہی برداشت کرتے ہوئے اس نے اپنے جھکے ہوئے سر کی ٹکر میرے پیٹ پر بھی رسید کر ڈالی، یہ ضرب میرے لیے اچانک تھی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا مگر خود کو گرنے نہیں دیا، وہ مجھے گرتا دیکھ کر بھیڑیے جیسی غراہٹ حلق سے خارج کرتا ہوا لپکا، تو میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا، وہ گھوم سا گیا، میں پھر نہیں رکا اور اس پر لاتوں مکوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی، وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں نے اسے دبوچ کر بنک بیڈ پر ڈال دیا، اس کے بعد زمین پر گری زنجیر اٹھا کر اس کے دونوں ہاتھ بنک کے فولادی راڈ کے ساتھ باندھ دیے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں چند ثانیے کھڑا ہانپتا رہا، اس کے بعد اپنا اور اس کا پستول سنبھال لیا۔ میرا اوپری بدن ابھی تک برہنہ تھا، نیچے ٹائٹ پینٹ تھی، ایسے میں، میرا کسرتی جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ ذرا دیر تک اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد میں دروازے کی طرف پلٹا ہی تھا کہ اچانک وہاں سے کسی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر ٹھٹکا۔

چندر کلا کو وہاں دیکھ کر میرے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے۔ وہ ہنوز مختصر لباس میں تھی، اور اس دلنشیں آنکھوں میں حیرت تھی، وہ اندر آ گئی تھی اور کبھی بنک بیڈ پر کراہتے ہوئے نڈھال پڑے بھومک کو دیکھتی تو کبھی میرے چہرے کو تکنے لگتی۔

''تم نے اپنا کام ختم کر لیا؟'' میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور بولی۔ ''یہ خبیث کب یہاں آیا تھا؟''

''اس خبیث کو چھوڑو اور مجھے سوئچرنگ روم کی طرف لے چلو، جلدی .... مجھے اپنے ساتھیوں سے ضروری بات کرنی ہیں۔''

''پہلے اس مردود کو ٹھکانے لگانا ہو گا، وہ اپنے کمرے میں بے سدھ پڑا ہے، جاگ گیا تو مصیبت بن جائے گا۔'' وہ بولی۔ میں نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور آگے بڑھا، وہ میرے شانہ بشانہ کمرے سے باہر آ گئی۔

باہر آ کر میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ چندر کلا میرے آگے چل رہی تھی، ہم اس تنگ سی راہداری سے ہوتے ہوئے دنبالے کی حدود سے نکل کر عرشے اور کیبن کی طرف آ گئے۔

کھلی سمندری فضا بہت صاف اور شفاف معلوم ہو رہی تھی۔ کھلے نیلے آسمان پر سفید لمبی چونچوں والے آبی پرندے اڑتے پھر رہے تھے۔ حدِ نگاہ پھیلے بیکراں سمندر کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

چندر کلا مجھے لے کر ایک کیبن میں داخل ہوئی، جس کا دروازہ پہلے ہی سے ادھ کھلا ہوا تھا۔ یہ ایک مکمل طرح سے رہائشی اور آرام دہ کیبن تھا۔ ایک بڑے سے کاؤچ پر مجھے سے جی کوہارا کا گینڈے جیسا وجود کسی ڈھیر کی طرح پڑا نظر آیا۔ وہ بے سدھ تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں، دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے، ٹانگوں کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔

''ان کا اس وقت اور کوئی ساتھی یوٹ میں موجود ہے؟'' میں نے ایک نظر میں جائزہ لینے کے بعد چندر کلا سے پوچھا۔

''ایک ساتھی تھا......'' وہ جواباً بولی۔ ''وہ شاید کوئی میکینکل فالٹ درست کرنے کے لیے نیچے انجن روم میں گیا ہوا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اس یوٹ میں تین دشمنوں کے علاوہ ہم دو ہیں اور...... چھٹا قیدی؟ ساتواں مسافر تمہاری ساتھی طوائف؟'' میں نے اس سے تصحیح چاہنے والے انداز میں کہا۔

''ہاں!'' چندر کلا نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''اور ان تینوں دشمنوں میں سے دو بڑے دشمن تقریباً زیر ہو چکے ہیں۔ رہی وہ طوائف، تو وہ میری ساتھی نہیں تھی، میں نے اسے ملکِ عدم پہنچا دیا ہے اور اب میرا خیال ہے کوہارا اور بھومک کو بھی ختم کر کے ان کی لاشیں سمندر برد کر دیتے ہیں۔''

اس کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ اس نے کس قدر سفاکی سے مجھے اپنی ساتھی طوائف کو قتل کرنے کا ذکر کیا تھا، جس نے مجھے اس کی طرف سے مزید محتاط رہنے کا احساس دلایا تھا، ساتھ ہی میرے اس خدشے کو بھی تقویت ملتی تھی کہ چندر کلا طوائف کے بھیس میں کچھ اور ہی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ اس کی پشت پر کوئی بڑا ''ریکٹ'' بھی ہوتا لیکن کوہارا اور بھومک کو ہلاک کرنے پر مجھے اس کی بات سے اختلاف تھا، میں ابھی کوہارا اور بھومک کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم کوہارا کو تو بالکل بھی نہیں، کیوں؟ یہ میں چندر کلا کو نہیں بتا سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کی بدقسمت ساتھی طوائف کے اس کے ہاتھوں مارے جانے پر دانستہ کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے کہا۔

''ان دونوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔ پہلے اس گینڈے کو قابو کر لیں، تم کوئی مضبوط سی رسی یا زنجیر کا بندوبست کرو، اس سے پہلے کہ اسے ہوش آ جائے۔'' میری بات پر چندر کلا نے اثبات میں ... سر ہلایا اور رسی وغیرہ ڈھونڈنے چلی گئی۔

میں نے چند قدم آگے بڑھ کر بے سدھ پڑے کوہارا کا جائزہ لیا اور سوچنے لگا، انسان اپنی طاقت کے غرور میں کس قدر اندھا ہو جاتا ہے۔ [illegible] ایک عورت کے ہاتھوں

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

زیر ہو کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

کوہارا کے سان وگمان میں بھی یہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنی عیاشیوں کے لیے جس طوائف کو رکھے ہوئے تھا، نہیں جانتا تھا کہ اسے ”طوائف“ سمجھنے کی اس نے بڑی فاش غلطی کی ہے، حالانکہ چندر کلا پوری طرح سے میری مدد میں شامل تھی بلکہ ایک طرح سے اس منحوس بوٹ میں میرے لیے نجات دہندہ بھی ثابت ہوئی تھی، مگر باوصف اس کے میں اس کی طرف سے بھی محتاط تھا، کیونکہ میں ابھی تک اس کی اصل حقیقت سے واقف نہیں تھا، ممکن تھا وہ مجھے استعمال کر رہی ہو، اس میں اس کا کوئی مفاد ہو، اور ایسا تھا بھی، اس خدشے کا بھی مجھے احتمال تھا کہ اپنی غرض نکل جانے کے بعد وہ مجھے بھی ”ہاتھ“ دکھا سکتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک مضبوط سی رسی لے آئی، ہم نے مل کر کوہارا کی مشکیں کس ڈالیں۔ اس سے فارغ ہو کر میں نے تیسرے بری ساتھی کی تلاش میں انجن روم کا رخ کیا اور چندر کلا کو بھی اپنے ساتھ لیا۔

میں اب اس کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا، نیز میں ضرورت پڑنے پہ اس پر حکم بھی چلا سکتا تھا۔ ہم دونوں انجن روم میں آ گئے، کوہارا کے تیسرے بری ساتھی کو میں نے اور چندر کلا نے بہت تلاش کیا، مگر وہ ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ مجھے حیرت آمیز تشویش نے آن لیا۔ وہ کدھر اچانک غائب ہو گیا تھا؟ انجن روم سے باہر بھی بوٹ کے ہر حصے میں، ہم نے اسے تلاش کیا مگر وہ نہ ملا۔

”کہیں تم نے تو اسے بھی......“ میں نے چندر کلا سے تشکیک بھری نظروں سے کہنا چاہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”اسے اگر میں ہلاک کرتی تو تم سے کیوں چھپاتی، لیکن مجھے لگتا ہے وہ خطرہ محسوس کر کے سمندر میں چھلانگ لگا کے کہیں فرار ہو چکا ہوگا۔“

اس کی بات مجھے ہضم نہیں ہوئی۔ میں نے پوچھا۔

”ساحل یہاں سے کتنی دوری پر ہے؟“

”کچھ زیادہ نہیں، چند ناٹیکل میل کے فاصلے پر ہو گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”کون سا ساحل لگتا ہے؟ میرا مطلب ہے بھارت کے کس علاقے کا؟“

”بالاسور......“

میں چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد میں اسے لیے سونچرنگ روم کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد میں نے ایک نظر اس کا تفصیلی جائزہ لیا۔ یہ بھی ایک کیبن نما کمرا تھا۔ ایک جانب دو بنک بیڈ نظر آتے تھے، دوسرے کونے میں ایک چھوٹا سا چینل نصب تھا۔ اس کے ساتھ ایک اسکرین بھی تھی، جبکہ چینل کے قریب ایک تقریباً سترہ انچ کا سی سی ٹی وی، ایل سی ڈی مانیٹر بھی رکھا تھا، یہ فور چینل اسکواڈ تھا اور اس میں اس وقت بیک وقت چار مناظر ڈسپلے ہو رہے تھے، جو اسی بوٹ کے مختلف گوشوں کا منظر دکھا رہے تھے، ہم اسی طرف ہی بڑھے تھے کہ مجھ سے پہلے ہی چندر کلا نے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

”پہلے مجھے اپنے ساتھیوں سے رابطہ کرنے دو۔“ میں نے اس سے کہا۔

”میں پہلے اس کی فریکوئنسی بدل دوں، تاکہ ان کے ساتھی لوکیشن ٹریس کرتے ہوئے ان کی مدد کو یہاں نہ پہنچ سکیں اور نہ ہی ہمیں تلاش سکیں۔“ اس نے بدستور چینل پر اس کے جلتے بجھتے بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے جواب دیا۔ میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایک گہری سانس خارج کر کے سیدھی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”یہ اب ریڈی ہے۔ یہ بیک وقت وائرلیس اینڈ ٹیلی فونک سیٹنگ پر ہے۔“

”گڈ۔“ میں نے اس کی توصیف ضروری سمجھی، مگر اندر سے اس کے بارے میں میری کھٹک مسلسل تقویت پکڑ رہی تھی کہ چندر کلا کوئی چلتا پرزہ تھی اور مجھے اس سے حد درجہ محتاط رہنے کی بھی ضرورت تھی۔

چندر کلا نے ایک ہیڈ فون مجھے تھما دیا، میں نے ”تھینکس“ کہا۔ یہ لگانے کے بعد میں دھڑکتے دل سے بیگم ولا کا نمبر ملانے لگا۔ ذرا دیر تک لاسلکی لہروں کی بچر مچر سنائی دیتی رہی، پھر ٹون کی آواز آنے لگی، کچھ لمحے بعد ہی دوسری جانب سے ایک شناسا نسوانی آواز ابھری، یہ زہرہ بانو کی آواز تھی اور شاید بلیوتھسی کے کرنل سی جی بجوانی کے رابطہ کرنے کے بعد سے ہی وہ فون کا کارڈلیس اپنے قریب ہی رکھے ہوئے تھی۔ اس کی آواز سن کر میں فوراً بولا۔

”ہیلو، زہرہ! یہ میں بول رہا ہوں، شہزی!“

میری آواز سنتے ہی وہ یک بیک لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

”ششش...... شہزی! ی ی...... یہ...... واقعی...... تت...... تم ہو؟ تت...... ٹھیک تو ہوناں......؟ کک کہاں ہو؟ کیسے ہو؟“ اس کے لہجے میں حد درجہ بے چینی اور تشویش کا عنصر غالب تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش
یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے
ہم خاص کیوں ہیں؟

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں www.paksociety.com

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan
Like us on Facebook fb.com/paksociety
twitter.com/paksociety

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''ہاں! ہاں! یہ میں ہی ہوں زہرہ! اور میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن خدا کے لیے میری بات ذرا دھیان اور پورے سکون سے سنو۔''

''میں سُن رہی ہوں۔'' وہ یکدم بولی۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ذرا پُرسکون کیا پھر بولا۔

''زہرہ! پہلے تم بتاؤ! کرنل سی جی کے رابطے کے بعد تم لوگوں نے اب تک کون سا قدم اٹھایا ہے؟''

میں اپنی طرف سے کوئی بات کرنے سے پہلے یہ تسلی کرلینا چاہتا تھا کہ وہاں کی کیا صورت حال تھی اب تک کی؟

''ابھی تک تو کچھ نہیں، ہاں میجر باجوہ صاحب سے اس سلسلے میں ضرور ملنے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، لیکن تمہارے دوستوں اول خیر اور شکیلہ کو اس پر سخت اعتراض تھا۔'' وہ بتانے لگی۔ ''وہ دونوں تمہاری رہائی یا بازیابی کے سلسلے میں اپنے طور پر کچھ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''وہ دونوں میجر باجوہ صاحب سے مدد لینے پر کیوں معترض ہیں؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تھا۔ وہ جواباً بولی۔

''ان کا خیال ہے کہ اس طرح تمہاری رہائی کا معاملہ طول پکڑ جائے گا اور کچھ گڑبڑ ہونے کا بھی امکان ہے، ہاں البتہ کبیل دادا کا اس بارے میں ہم سب سے خیال مختلف تھا اور حیرت کی بات ہے شہزی کہ کبیل دادا کی بات درست ثابت ہوئی جس کی سچائی کا ثبوت یہ ہے کہ تم آج مجھ سے باتیں کررہے ہو۔''

''اچھا!'' اس کی آخری بات پر مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔ ''اس کا کیا خیال تھا اس بارے میں؟''

''وہ کہتا تھا کہ جلد بازی کی ضرورت نہیں، شہزی کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عام آدمی ہے، وہ خود بھی ایک انتہائی تربیت یافتہ کمانڈو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کے حالات کیا ہیں، اس کا وہی اچھی طرح ادراک رکھتا ہوگا، اسی لیے فی الحال خاموشی اختیار کی جائے۔ جبکہ مجھ سمیت اول خیر اور شکیلہ کوئی بھی اس کی اس بات سے متفق نہ تھا، مگر آج......''

''کبیل دادا کا خیال بالکل درست تھا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''وہ ایک گرگ باراں دیدہ، دور اندیش اور ذہین آدمی ہے۔ منہ کا تلخ ضرور ہے مگر بات سچی اور کھری کرتا ہے۔ اب سنو میری بات غور سے۔'' میں اتنا کہہ کر ذرا تھما، دوسری جانب سے زہرہ ہمہ تن گوش بر آواز رہی تو میں نے آگے کہنا شروع کیا۔

''تم میں سے کسی کو بھی کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے ابھی...... ہاں! مجھے جس ساتھی کی بھی ضرورت پڑی تو میں خود ہی اسے بلالوں گا۔ میں سمجھتا ہوں قدرت نے مجھے آگے بڑھنے کا خود ہی موقع فراہم کردیا ہے۔ میں اس وقت آزاد ہوں، خیریت سے ہوں۔ آپ لوگ میجر باجوہ سمیت کسی بھی ذمے دار افسر سے اس وقت تک کوئی بات نہیں کریں گے جب تک میں اس کی اجازت نہ دوں......''

''لل...... لیکن، شہزی......!''

''بات مت کاٹو میری اور صرف سنتی جاؤ، مجھے اپنے دشمنوں پر کاری وار لگانے کا ایک موقع ملا ہے، اس طرح ممکن ہے میں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرسکوں۔ میری فکر مت کرو، مجھے جیسے جیسے موقع ملتا رہے گا، میں تم لوگوں سے رابطہ کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دیتا رہوں گا۔''

''پلیز، شہزی! اپنے کسی ساتھی کو تو بلالو، تم ہو کہاں اور کس ملک میں؟'' زہرہ متفکر لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

''ضرور بلاؤں گا، اس سلسلے میں بعد میں بات کرتے ہیں، ابھی تم سب کو میری خیریت کے سلسلے میں تسلی دے دو، میں جلد دوبارہ رابطہ کروں گا، اللہ حافظ!'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ میں جب ساتھ کھڑی چندر کلا کی طرف متوجہ ہوا تو چونک پڑا۔

وہ بڑے غور اور عجیب سی نگاہوں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے میں محو تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک دم ہی کسی گہری سوچ کا شکار ہوگئی ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں اپنے ہی خواہوں سے رابطے کے جوش اور روا روی میں کچھ ایسے الفاظ بھی اپنے منہ سے نکال بیٹھا تھا جو مجھے...... کم از کم چندر کلا کے سامنے ادا نہیں کرنا چاہیے تھے، لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میجر باجوہ، بلیو ٹمسی اور کرنل سی جی بھجوانی جیسے الفاظ اور چند دوسرے الفاظ چندر کلا کو میری طرف سے حیرت میں بھی مبتلا کر گئے تھے اور کھٹک کا بھی باعث بن سکتے تھے۔

''تم کیا پاکستانی جاسوس ہو؟'' بالآخر اس نے وہی سوال داغ ڈالا جس کی مجھے اس سے توقع تھی۔ بات بنانے کی کوشش میں قدرے ہنستے ہوئے میں نے کہا۔

''نہیں، میں تو ایک عام سا کاروباری آدمی ہوں، ہاں! پاکستان میں میرے تعلقات بعض اعلیٰ افسران سے بھی رہ چکے ہیں اسی لیے تو میں نے اپنے ساتھیوں کو منع کیا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں کسی ایسے افسر سے مدد نہ لیں، جس سے میرے عالمی گینگسٹر لولوش کے ساتھ تعلقات ظاہر ہوں۔''

''مگر...... لولوش تو تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''دشمن تو وہ میرا اب ہوا ہے، پہلے تو دوست تھا، کاروباری رابطوں کے درمیان ہی مجھے اس کے منشیات اور اسمگلنگ کے دھندوں کا علم ہوا تو میں اس سے کنارہ کش ہوگیا، جس کی سزا آج میں اس کی دشمنی کی صورت میں بھگت رہا ہوں۔''

''اور یہ بلیو ٹمسی اور سی جی بھجوانی کیا بلا ہیں؟''

''یہ واقعی بلا ہیں۔'' میں بغیر جھجکے اس کے سوالات کے جواب دیے جارہا تھا۔ ''یہ بھارتی خفیہ ایجنسی ہے، اور لولوش نے انہیں میرے پیچھے لگا رکھا ہے، لیکن مجھے حیرت ہے، تم ان سے کیسے لاعلم ہو؟ جبکہ تم تو کوہارا کی خلوتوں کی ساتھی رہی ہو، پھر ایک دو روز پہلے ہی مجھے ان کے حوالے بھی کیا گیا تھا اور......''

''چھوڑو اب یہ فضول باتیں۔'' اس نے بیزاری دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اوپر جا کر سوشیلا کی خبر لینی چاہیے۔''

''چلو۔'' میں نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی اور میں اس کے عقب میں چل پڑا۔

ایک مختصری اسٹیل راڈر اسٹیئر چڑھنے کے بعد ہم ایک اور چھوٹے سے کیبن میں آگئے۔ چندر کلا دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوگئی اور میں بھی اس کے عقب میں اندر داخل ہوگیا۔

سامنے ہی میں نے جو شرمناک منظر دیکھا وہ انسانیت سوز اور بربریت کا منہ بولتا ثبوت نظر آیا تھا۔ کیبن میں صرف ایک ہی بنک بیڈ تھا، باقی ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ مختصر سے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی اور اس پر آڑے ترچھے انداز میں ایک جوان عورت اس طرح بے سدھ سی پڑی تھی کہ اس کے جسم پر لباس نام کی ایک دھجی تک نہ تھی۔ بلاشبہ وہ حسن کا شاہکار رہی تھی، گورا رنگ، مناسب قد اور دری پر اس کے بکھرے ہوئے گھنے ریشمی بالوں کو دیکھ کر بادی النظر میں یوں لگتا تھا جیسے فرانس کی کسی نقاش آرٹسٹ کا نمونہ ہو۔ لیکن اس وقت وہ جیتی جاگتی تصویر کی صورت میں نمونۂ عبرت ہی نظر آرہی تھی۔

''پہلے اس کی ستر پوشی کا بندوبست کرو، پھر اس سے کچھ بات کرتے ہیں۔''

چندر کلا نے اپنے جسم پر لپٹی چادر کھول کر عورت کے اوپر ڈال دی۔ اس دوران شاید کھٹر کے وغیرہ سے سوشیلا کسمسائی اور کیبن میں کسی کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ یک دم ہسٹریائی انداز میں چلاتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''نن...... نہیں...... نہیں...... مم...... میرے قریب مت آؤ...... بھگوان کا واسطہ ہے تمہیں، مجھے مار ڈالو...... لل...... لیکن یہ ظلم مت کرو میرے ساتھ......''

''خاموش رہو......'' چندر کلا نے اسے جھڑکنے کے انداز میں کہا تو وہ ایک دم خاموش سی ہوکر باری باری متوحش نگاہوں سے ہمارے چہرے دیکھنے لگی۔

''تم سوشیلا ہو؟'' میں نے بہ غور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔ اس کی قابل رحم ہیئت گذائی بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ وہ دونوں وحشی بری سے جی کو ہارا اور بھومک کیا کرتے رہے ہوں گے۔ اس کے بدن کے نازک حصوں پر ہی نہیں بلکہ چہرے اور ہونٹوں پر بھی سرخ کٹ کے نشانات اور خراشیں نظر آرہی تھیں۔

''ہہ...... ہاں!'' اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بہ مشکل جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک خوف کی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔

''دیکھو...... ہم ان لوگوں سے زیادہ خطرناک لوگ ہیں، جنہوں نے تمہاری یہ حالت کی ہے۔ لیکن ہمارا وعدہ ہے اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو ہم تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے، بلکہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔''

میری بات پر اس کے مُتے ہوئے چہرے کا رنگ کچھ تبدیل ہوا تھا۔ آنکھوں میں امید کی لوٹمٹائی تھی اور لبوں پر فریادی سی جنبش کی جھلک ابھری تھی۔

''لیکن...... ایک بات یاد رکھنا۔'' اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ سب بھانپتے ہوئے میں نے تہدیدی انداز اختیار کیا۔ ''ہمارے ساتھ کسی قسم کا دھوکا یا فریب کے بارے میں خیال تک اپنے دل میں مت لانا، کیونکہ تم اب ہماری قید میں ہو اس وقت، جب تک تمہاری باتوں کی تصدیق نہیں ہوجاتی۔''

''تت...... تم لوگ کون ہو؟'' اس نے بالآخر سوال کیا۔ میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ ''ہم بھی انہی لوگوں کے ساتھی ہیں اور ان سے مختلف نہیں بلکہ دو ہاتھ آگے ہی ہیں۔''

اس لیے زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں...... بس! تعاون اور سچ بولنے کی بات کرو۔"

"مم...... تیار ہوں، لل...... لیکن بھگوان کے واسطے مجھے ان وحشی درندوں کے حوالے مت کرنا۔" وہ منت بھرے لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

"یہ تمہارے تعاون سے مشروط ہوگا۔ ابھی تم اپنے حواس بحال کرو اور ذرا ڈھنگ کا حلیہ اختیار کرو پھر تم سے آکر تفصیلاً گفتگو کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے چندرکلا کو اشارہ کیا اور کیبن سے باہر آگیا۔ چندرکلا نے کیبن کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ ہم دوبارہ نشست گاہ والے بڑے کیبن میں آگئے۔ ہمیں اچانک کسی کے زور زور سے بولنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ کوہارا تھا جس کی اب بوٹ پر حکمرانی کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ صورتِ حال اب بدل چکی تھی، اب وہ میرا قیدی تھا۔ میں نے چندرکلا سے کہا۔

"یہاں ہم زیادہ دیر نہیں رک سکتے، انڈین کوسٹ گارڈ کی گشتی موٹر بوٹ یہاں آسکتی ہے۔ کوہارا کی بات اور تھی مگر ہم انہیں قائل نہیں کر سکتے، میں خود غیر قانونی طور پر یہاں ہوں۔" وہ میری بات سن کر متفکر سی نظر آنے لگی۔ پھر جیسے پل کے پل کچھ سوچ کر تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

"چنتا کی کوئی ضرورت نہیں، میں انہیں قائل کرلوں گی، لیکن اس سے پہلے تمہیں یہاں کسی خفیہ گوشے میں چھپا دوں گی۔"

"یہ رسک لینے کا کیا فائدہ؟"

"تم کیا چاہتے ہو پھر؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"تمہارے ساتھ اس ہیرے کی کھوج اور لولووش کے دوست کرنل سی جی بھوانی سے ایک ملاقات۔" میں نے کہا۔

"کرنل بھوانی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"لولووش نے اسے میرے خلاف جن باتوں پر ورغلا رکھا ہے، میں اسے صاف کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ لولووش کے ساتھ ہونے والی میری ایک آخری دیرینہ کاروباری ڈیلنگ کے سلسلے میں مدد بھی کرے۔" پھر اس کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کے لیے میں نے اسے تاکید کی کہ وہ سوشیلا کو جا کر کوئی ڈھنگ کا لباس دے آئے۔ میں جب تک کوہارا سے ایک ملاقات کرتا ہوں۔ چندرکلا میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور ایک دیوار گیر کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں وہاں سے کوہارا والے کیبن میں آگیا۔

اندر داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بڑے خونخوار انداز میں غرایا۔ مارے طیش اور غیظ سے اس کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ شاید وہ اس سے پہلے اس طرح کے دھوکے اور بے بسی کا شکار نہیں ہوا تھا۔ اسے میں نے بڑی بری طرح سے رسن بستہ کر رکھا تھا، دونوں ہاتھ تو اس کے پشت کے بل باندھے ہی تھے میں نے، اس کی ٹانگوں کو بھی موڑ کر ہاتھوں کے قریب کر کے باندھ ڈالا تھا، جس سے اس کی جسمانی ہیئت مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی۔

"جانتے ہو اس جرأت کا انجام تم...... تمہارے تصور سے بھی زیادہ بھیانک ہو سکتا ہے۔" وہ غرایا۔ میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر رسی کا وہ چھوڑا ہوا سرا جھک کر اٹھایا جو ذرا لمبا کر کے میں نے دانستہ چھوڑ رکھا تھا، اور پھر اس کے گینڈے جیسے وجود کو اسی طرح کھینچتا اور گھسیٹتا ہوا باہر عرشے میں آگیا۔ وہ اپنے حلق سے بدستور مغلظات کا طوفان اگلتا رہا، میں نے اس کی رسی چھوڑی اور بڑے آرام سے چلتا ہوا دنبالے کی طرف آگیا، پھر اس تکونی کمرے میں داخل ہوا، جہاں بنک پر بھومک بھی آہنی جکڑ بند میں پڑا ہوا تھا، مجھے دیکھتے ہی وہ بھیڑیے جیسی آوازوں کے ساتھ غرانے لگا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اسے بنک پر سے کھینچ کر بوری کی طرح نیچے فرش پر مارا اور ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اسے بھی عرشے پر لا کر سے جی کوہارا کے قریب پٹخ دیا، جہاں چندرکلا بھی آچکی تھی اور اب بڑے آرام سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر فولڈنگ چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ جبکہ سے جی کوہارا اسے بھی خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے میں مصروف تھا۔

"ایک عورت کے بل پر مجھے دھوکے سے زیر کرنے والے تم مسکی چھپنے خاں اور کر بھی کیا سکتے ہو......" مجھے دیکھتے ہی اس کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔ بدھا کے اس پیروکار کے منہ سے اس طرح اگلے جانے والے زہر نے میرا اندر جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس حال میں بھی پہنچ کر اس نے اپنے غرور کا سر ایک ایسی بات کا سہارا لے کر اونچا کرنے کی کوشش چاہی تھی، جو ایسی غلط بھی نہ تھی۔ اس پر واقعتاً میں نے نہیں بلکہ چندرکلا نے ہی دھوکے سے قابو پایا تھا۔

اگرچہ اس کے دستِ راست بھومک کو میں نے اپنے زورِ بازو سے قابو کیا تھا۔ مگر موقع کی بات تھی، کوہارا کے سلسلے میں یہ موقع مجھے نہیں مل سکا تھا، لیکن اس نے

ممتا جیسی حدت لیے مئی 2016 کا دلنشیں پاکیزہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

نگہت سیما، در ثمن بلال اور **انجم انصار** کے سلسلے وار ناولوں کی نئی اقساط......

مدیحہ شاھد نے متعارف کرایا **پتھر کا دیس**......

نایاب جیلانی نے بکھیری خیالات کی کہکشاں...... **دیارِ صبح کے اجالوں میں**

ماں کا پیار...... ہماری مصنفات کا اظہار

رفاقت جاوید نے بڑی خوب صورتی سے کھوجا ایک **معما**

عقیلہ حق کی خوب صورت

اور عاقلانہ گفتگو سے سجی ہماری بزم

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور **اختر شجاعت** کے پرنور قلم سے دل پذیر مضامین

اس کے علاوہ

شیریں حیدر، ثریا انجم، سمیرا یونس ھارون، شمیم فضل خالق، فرحین اظفر، ھاجرہ ریحان، شبینہ گل و دیگر ماہر مصنفات کی پرکشش تحریریں

اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت موضوعات و حکایات لیے مستقل سلسلے آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے

Available At Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجھے ”مسکی پھنے خاں“ کا جو خطاب دیا تھا، اس کا قرض اتارنا مجھ پر واجب ہوگیا تھا۔

”چندر کلا......! تم نے اسے دھوکے سے قابو پایا تھا، اب تم ہی اسے آزاد کروگی، اٹھو......اس کی رسیاں کھول دو، میں اس کا یہ غرور بھی خاک میں ملانا چاہتا ہوں۔“

میں نے کرسی پر بیٹھی ہنستی مسکراتی چندر کلا سے جوشِ غیظ تلے یہ کہا تو یک دم اس کی ہنسی کو ہی نہیں بلکہ اس کی مسکراہٹ کو بھی بریک لگ گیا اور اس کی جگہ خوف نے لے لی۔

”ی ی...... یہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ یک دم کپکپاتی آواز میں بولی۔ میں نے دیکھا ایک لمحے کے لیے سے جی کوہارا کے چہرے پر بھی ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

”تم نے سنا نہیں چندر کلا......؟“ میں حلق کے بل چیخا۔ میرا چہرہ فرطِ جوش تلے سرخ ہوگیا تھا۔ میری دہاڑ پر چندر کلا یک دم کپکپا کر کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور لرزتی کانپتی سی رسن بستہ حالت میں پڑے سے جی کوہارا کی طرف بڑھی اور اکڑوں بیٹھ کر اس کی رسیاں کھولنے لگی۔ سے جی کوہارا جیسے قوت باز شیطان کے ہاتھ پیروں کی رسیاں کھولتے ہوئے چندر کلا کے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے، رسیاں کھولنے میں اسے وقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، مگر وہ اپنے کام میں جتی رہی، اسے تھوڑی دیر ضرور لگی مگر اس پر سے جی کوہارا جیسے شیطان کی ایسی دہشت طاری تھی کہ وہ اس کا آخری جکڑ بند کھولتے ہی ایک چیخ سی مار کے جلدی سے اٹھ کر ایک طرف کو دوڑ کے جا کھڑی ہوئی۔

جکڑ بندوں سے نجات پاتے ہی سے جی کوہارا کسی بدمست سؤر کی طرح چیخا تھا اور غضب آلودہ نظروں سے میری طرف گھورنے لگا۔ وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح باچھوں سے جھاگ خارج کرنے لگا تھا۔ اس کے گینڈے جیسے جسم میں بے پناہ طاقت بھری ہوئی محسوس ہوتی تھی، اگرچہ قد میں وہ مجھ سے ذرا دبتا ہوا تھا مگر جسم اس کا پلے ہوئے سؤر جیسا ہی نظر آتا تھا۔

اس نے ایک ہاتھ اپنے سینے پر ہتھوڑے کی طرح مار کے اپنی قمیص پھاڑ ڈالی تھی۔ اب اس کا گوشت کے پہاڑ جیسا موٹا تازہ وجود نیم برہنگی میں مزید کسی موٹے تازے بیل کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ خود میرا اوپری جسم بھی ہنوز برہنہ تھا اور چمکتے سورج کی تمازت میں میرا کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ سینے کا گوشت کسی مضبوط چٹان کی طرح تنا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو سخت حریفانہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ میری پتلون کی بیلٹ میں دو پستول اڑسے ہوئے تھے، ایک پستول تو وہ تھا جو چندر کلا نے مجھے رات میں تھمایا تھا، جبکہ دوسرا میں نے بھومک سے چھینا تھا۔ میں نے وہ دونوں نکال کر عرشے میں ایک طرف کو لڑھکا دیے۔

”ختم کر ڈالو اس مسکی کو باس! زندہ مت چھوڑنا...... یہ اب تمہارے ہاتھوں نہیں بچے گا باس......“ معاً فرش پر بندھے پڑے اس کے پالتو کتے بھومک نے زہرخند لہجے میں چلا کر سے جی کوہارا سے کہا اور یہی وہ وقت تھا جب کوہارا بھیڑیے جیسی خونخوار غراہٹ خارج کرتا ہوا مجھ پر جھپٹا، اس کا خیال تھا کہ میں اپنی جگہ چھوڑ دوں گا مگر میں وہیں اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا ایستادہ ہوگیا تھا، وہ پوری قوت سے مجھے اپنی تباہ کن ٹکر سے گرانے کے لیے مجھ پر پل پڑا تھا، قریب آتے ہی میں نے بڑے آرام سے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر بازوؤں کے سہارے اس کے بدمست جسم کو ایک مخصوص ٹرک کے ذریعے اس طرح زور مارا تھا کہ وہ اپنی جھونک میں سیدھا لڑکھڑاتا ہوا عرشے کی ریلنگ سے جا ٹکرایا تھا۔ قریب تھا کہ وہ سمندر میں الٹ پڑتا، کہ میں نے فوراً آگے بڑھ کر پیچھے سے اس کی موٹی بیل جیسی گردن کے گرد اپنے ایک بازو کا شکنجہ کس دیا اور اپنے ساتھ لگائے ہوئے چند قدم عقب میں پلٹا اور دیسی ساختہ اڑنگا لگا کر اسے عرشے پر گرا ڈالا۔ کوہارا اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ دھڑام کی خاصی زوردار آواز کے ساتھ عرشے پر گرا تھا۔

”بس! اتنا ہی دم تھا تمہارے اندر کوہارا......! جس پر تم اتنا اکڑ رہے تھے۔“

میرے اس استہزائیہ جملے نے جیسے جلتی پر تیلی کا کام کیا اور اس نے اپنے جثے کے بالکل برعکس بڑی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، لیٹے لیٹے اپنی ایک ٹانگ چلا دی تھی۔ یہ داؤ میرے لیے اچانک ہی ثابت ہوا تھا، نتیجتاً میں اپنی جگہ سے اچھل کر عرشے پر آرہا۔ میرے گرتے ہی وہ عرشے پر کسی بھاری بھرکم وہیل کی طرح تڑپا اور بلاخیز پھرتی سے اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کا ”لیگ لاک“ میری گردن کے گرد کس دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ مجھے اس کے گینڈے جیسے بھاری بھرکم جثے سے ایسی پھرتی اور داؤ بازی کی توقع نہ تھی۔ شاید یہی وجہ میرے مار کھانے کی بنی تھی۔

اس کے گینڈے جیسی موٹی ستونوں والی ٹانگوں کی قینچی میں میری گردن کا جکڑ جانا کسی ہولناک موت کا باعث بننے سے کم نہیں تھا، میری گردن اپنی ٹانگوں میں جکڑتے ہی اس نے اپنے پہاڑ جیسے وجود کی پوری طاقت کو صرف کرتے ہوئے زورآوری کا مظاہرہ شروع کر دیا اور مجھے اپنی سانسیں کیا بلکہ کسی بھی وقت گردن ٹوٹنے کا خطرہ صاف نظر آنے لگا تھا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اس ٹانگوں کی قینچی کھولنے پر پورے جسم کی طاقت کا زور لگا دیا تھا، مگر بے سود، کیونکہ اس خطرناک داؤ میں ہاتھوں کے مقابلے میں اس وقت اس کی ٹانگوں میں پورے جسم کی طاقت صرف کرنے میں نسبتاً آسانی ہو رہی تھی۔ اور یہی وہ کر رہا تھا۔ پل کے پل میری سانسیں گھٹنے لگیں اور آنکھوں تلے اندھیرا سا چھانے لگا تھا کہ اچانک میرے ڈوبتے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں نے اس کی ٹانگوں کے گرد بے سود لپٹے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو کچھ اور متحرک کیا اور جو میں چاہتا تھا وہی ہوا، یعنی میں نے اس کی ٹانگوں کے فولادی شکنجے کو کھولنے کی کوشش ترک کر کے اپنے ہاتھوں کے دونوں پنجے فرش پر جما دیے اور پورے وجود کی طاقت صرف کرتے ہوئے میں گھٹنے سکیڑے کھڑے ہونے کی تگ و دو کرنے لگا اور یوں میرے ساتھ ہی سے جی کوہارا کا جسم ساتھ اس کی ٹانگوں کی طرف سے اوپر اٹھنے لگا تو اس کی طاقت کی زورآوری میں دراڑ پڑتی مجھے صاف طور پر محسوس ہوئی۔ اس مہلک داؤ کا آخری اور فوری توڑ یہی میری سمجھ میں آیا تھا جس میں خاطرخواہ کامیابی محسوس کرتے ہی میں نے اپنے جسم کا سارا زور اسی جوابی داؤ میں صرف کر دیا، یہاں تک کہ میں اپنے گھٹنوں کے بل پر کھڑا ہونے لگا اور اسی وقت میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو مزید حرکت دیتے ہوئے کسی طرح اس کے دونوں پیروں کے انگوٹھوں کو پکڑ کر زور لگا کر مروڑنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنے جسم کو بل بھی دیتا چلا گیا، یہاں تک کہ اس کا جسم بھی بل کھا گیا اور اسی وقت اس کا لیگ لاک کافی حد تک کمزور پڑا تو میں نے ایک جھٹکے سے اس کی دونوں ٹانگیں کھول ڈالیں اور پیروں کے انگوٹھے مروڑ کر ہڈیاں توڑ ڈالیں، اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی۔ ایک خطرناک داؤ سے نکلنے اور موت کے منہ سے بال بال بچنے کے بعد مجھ پر بھی جنونانہ وحشت طاری ہوگئی تھی۔ کوہارا اپنے پیروں کا ابھی زخم ہی چاٹ رہا تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر اپنے بھاری بوٹ کا ”ٹو“ رسید کر دیا جو اس کی ناک پر لگا۔ اس کی ناک پھٹ کر بھل بھل خون چھوڑنے لگی۔ انگوٹھوں اور پھر ناک کی چوٹ نے اسے بے حال سا کر دیا تھا مگر سخت جان بھی تھا، وہ ان چوٹوں کی پروا کیے بغیر وحشیانہ غراہٹ سے کھڑے ہونے کی کوشش میں لوٹ لگا کر میرے بوٹ کی دوسری ضرب سے بچنے کے لیے پرے لڑھک گیا اور یک دم کھڑا ہوگیا، لیکن اس کے قدم ڈگمگانے لگے تھے، مگر میں اسے اب سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور چند قدم اس کی طرف بڑھ کر میں اپنے ایک پاؤں کی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوما اور دوسری ٹانگ کو قوس کی صورت میں تیزی کے ساتھ حرکت دی، میرے پاؤں کی یہ زوردار ضرب اس کے جبڑے کو بری طرح چٹخا گئی اور وہ کئی قدم عقب میں لڑکھڑا گیا، مگر میں نے پھر اسے سنبھلنے نہیں دیا اور اسی طرح کبھی ایک تو کبھی دوسری راؤنڈ کک سے اس کی تواضع کرتا چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بے حال ہوگیا اور لڑکھڑا کر گرا، مگر اسی وقت اس نے اپنی سی ایک آخری کوشش میں لڑھکنی لگائی اور جدھر میں نے پستولیں رکھی تھیں، وہ اس طرف جا پڑا، ابھی اس نے لیٹ کر ایک پستول کے دستے پر اپنا ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میں اس کی حرکت کو پہلے ہی بھانپتے ہوئے اچھل کر اس پر جا پڑا، اس طرح کہ میرا ایک پیر میرے لمبے چوڑے جسم کے بھرپور وزن سے اس کے ہاتھ کی کلائی پر اس زور سے پڑا کہ اس کی ہڈی کو ہی بری طرح چٹخا کر رکھ دیا۔ میں نے اس پر لاتوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی، وہ درد و اذیت سے حلق کے بل چلانے لگا، اسے بالکل نڈھال سا کرنے کے بعد میں اسے دوبارہ ایک ٹانگ سے گھسیٹتا ہوا اسے وہیں لا پٹخا جدھر وہ تھوڑی دیر پہلے پڑا ہوا تھا۔ وہی رسی رکھی ہوئی تھی جس سے میں نے ذرا ہی دیر میں پھر سے اس کی مشکیں کس دیں اور خود ہانپتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

چندر کلا جو تھوڑی دیر پہلے سے جی کوہارا کے آزاد ہونے پر خوف سے پیلی پڑ گئی تھی اب فرطِ حیرت سے اپنا منہ کھولے کبھی اس کی طرف اور کبھی میری طرف تکے جا رہی تھی، جبکہ قریب پڑے بھومک کا چہرہ بھی پہلی بار خوف کا شکار نظر آنے لگا تھا۔

میں نے چندر کلا سے پانی لانے کا کہا اور پھر اپنا ایک پاؤں فرش بوس سے جی کوہارا کی گردن پر رکھتے ہوئے اس پر ذرا جھک کر زہرخند لہجے میں بولا۔

”تم نے تو ابھی تک صرف اپنے زرخرید کتوں کے بل پر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیے رکھا تھا اور کمزور و بے بس کو اپنے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا تھا، لیکن اب تمہیں [illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

طرح اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس مسکی چھنے خان نے اپنے شایانِ شان، اپنے زورِ بازو پر تمہارا چیلنج قبول کر کے تمہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا، کیا کہتے ہو اب؟''

احساسِ شکست تلے کوہارا کا چہرہ بالکل ہی مسخ ہو کر رہ گیا تھا، اپنی خفت مٹانے کی ایک لغوی کوشش کرتے ہوئے وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''تم...... تم! زندہ نہیں بچو گے، تم گریٹ ماسٹر کو نہیں جانتے، نہ ہی اس کی بے پناہ طاقت سے واقف ہو۔''

''تمہارے گریٹ ماسٹر کا بھی عنقریب میں ایسا ہی حشر کروں گا پاگل کتے! اب اپنی زبان بند رکھنا۔'' میں نے اسی پاؤں سے اس کے چہرے کو ہلکی ٹھوکر رسید کی۔ اس اثنا میں چندر کلا پانی کی بوتل لے آئی اور میری طرف بڑھا دی۔ اس کا ڈھکن وہ پہلے ہی کھول چکی تھی، میں نے وہ منہ سے لگا لی اور گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا۔

☆☆☆

اگلے چند منٹوں میں، میں سے جی کوہارا اور بھومک کو بوٹ کے دنبالے والے اسی تکونی کمرے میں مقید کر چکا تھا۔ بوٹ پر اب مکمل طور پر میرا قبضہ قائم ہو چکا تھا۔

میں اور چندر کلا سوچر تک روم میں آن بیٹھے تھے۔ سوشیلا کو بھی اوپری کیبن سے نکال کر لے آئے تھے۔ میری سخت تاکید پر چندر کلا نے اب ذرا ڈھنگ کا لباس زیب تن کر لیا تھا اور سوشیلا کو بھی لباس پہنا دیا تھا۔ اس کی حالت اب قدرے بہتر نظر آ رہی تھی۔ اسے کچھ کھلا یا پلایا بھی گیا تھا۔ میں نے اور چندر کلا نے بھی تھوڑا بہت زہر مار کیا، اس کے بعد میں نے سوشیلا سے دوٹوک لہجے میں طلسم نور ہیرے کے متعلق دریافت کرتے ہوئے اس پر اپنی معلومات کا بھی رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

''بشام سے میری ملاقات ہوئی تھی اور اس نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ ہیرا تم لے اڑی تھیں، مختصراً یہ کہ اب تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ وہ ہیرا آیا ابھی تک تمہارے قبضے میں ہے یا پھر تم اسے اپنے کسی منصوبے کے مطابق کسی اور کے حوالے کر چکی ہو، جھوٹ بولنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ اس لانچ پر اب میرا قبضہ ہے اور جو ان خطرناک لوگوں پر قابو پا سکتا ہے وہ خود کتنا خطرناک ہوگا، اسی لیے تمہاری بات کی تصدیق تک تم ادھر ہی رہو گی۔ لہٰذا اب سچ بولنا شروع کر دو۔''

اس نے اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیری، اس کا خوبرو اور حسین چہرہ اس وقت بھی بُری طرح ستا ہوا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ کوہارا اور بھومک نے اسے بری طرح تختۂ مشق بنا رکھا تھا اور وہ اب اپنی زندگی سے بھی مایوس نظر آتی تھی۔ لہٰذا اس سے جھوٹ بولنے کی امید کم ہی نظر آتی تھی۔ جب وہ بولی تو اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''وہ ہیرا میں نے ہی بشام سے اڑایا تھا، مگر اس کا میرے ساتھی وکرم کو پتا نہ تھا۔ میں جنرل ایڈوانی کے لیے کام کرتی ہوں۔ وہ ہیرا میں اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی تاکہ وہ میری بہن اوشا اور اس کے بچوں کو چھوڑ دے۔'' وہ اتنا ہی بتا کر سسک پڑی۔

''کیا مطلب؟ تمہاری بہن اور اس کے بچوں کا بھلا جنرل ایڈوانی سے کیا تعلق؟'' میں نے اس کے سسکنے کی پروا کیے بغیر پوچھا تو وہ اسی طرح غم زدہ لہجے میں بولی۔

''ایڈوانی کے آدمیوں نے اسپیکٹرم کے بھارتی ممبران کو ٹریس کیا تھا اور بھارت میں صرف میں اور وکرم ہی اسپیکٹرم کے ممبر اور فیلڈ آفیسر تھے۔ وکرم کو چھوڑ کر انہوں نے مجھے نشانہ بنا لیا۔ اس کے آدمی مجھے اغوا کر کے ایڈوانی کے پاس لے گئے۔ پہلے تو وہ مجھے وطن پرستی کا درس دیتا رہا پھر میرا مائنڈ سیٹ بدلنے کی کوشش کرتا رہا کہ اس طلسم نور ہیرے پر بھارت کا حق ہے جبکہ طلسم نور ہیرے سے متعلق اسپیکٹرم کی حتمی رپورٹ کے مطابق وہ پاکستان کی ملکیت تھا۔ اس رپورٹ کو بین الاقوامی سطح پر ابھی ظاہر ہونے نہیں دیا گیا اور اسپیکٹرم کے روحِ رواں مسٹر ڈی کارلو کا ایک ناگہانی حادثے میں انتقال ہو گیا۔ لولوش نے اس تنظیم کی باگ ڈور سنبھالی تو ہمیں بھی اس حقیقت کا علم ہوا کہ اب اسپیکٹرم محض عالمی جرائم پیشہ گاڈ فادر کی ایک ریکٹ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ میں اور وکرم اس سے کنارہ کش ہونے لگے، ہیرے سے متعلق اسپیکٹرم کی حتمی رپورٹ کو بھی دبا دیا گیا تھا، صاف لگتا تھا کہ بعض عناصر اسے پاکستان کی ملکیت کے حوالے سے متنازعہ بنانا چاہتے تھے۔ یہ سب باتیں چونکہ پہلے ہی سے میرے علم میں تھیں اسی لیے مجھے ایڈوانی کی ہر بات جھوٹ کا پلندا محسوس ہوئی اور مجھے شک گزرا کہ اس کا اصل مقصد کچھ اور تھا، میں اپنے تئیں چالاکی کر کے اور اس کی مدد کرنے کا وعدہ کر کے اس وقت تو اس کے چنگل سے نکل آئی مگر یہ میری بھول تھی، میں نہیں جانتی تھی کہ ایڈوانی کے ہاتھ کتنے لمبے تھے۔ مگر دوسری بار ایڈوانی نے مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی زحمت کیے بغیر مجھے دوسرے طریقے سے اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''اوشا میری ایک ہی بہن ہے، اس کے دو بچے ہیں، اس کے پتی نریندر کمار کو ایڈوانی نے ہلاک کروا دیا اور بیوی بچوں کو یرغمال بنا لیا۔ اس کے بعد اس کے آدمی بلراج سنگھ نے مجھ سے صرف ٹیلی فونک رابطہ کیا اور مختصر لفظوں میں حکم کی تعمیل کی سختی سے تاکید کی، بہ صورتِ دیگر میری بہن اور اس کے دونوں چھوٹے معصوم بچوں کو ہلاک کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے فون بند کر دیا۔ میں مجبور ہو گئی تھی، یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ہیرے کو اسپیکٹرم کا کوئی ممبر ہی حاصل کر سکتا ہے۔

''اسی دوران مجھے اور وکرم کو نیویارک ہیڈ کوارٹر سے پیغام ملا کہ ہم دونوں فوراً پاکستان پہنچ کر بشام نامی اپنے ساتھی ممبر سے رابطہ کر کے، ہیرے سے متعلق گمشدگی اور برآمدگی کے سلسلے میں اس کی مدد کریں۔ میرے لیے اس ہیرے کو حاصل کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ بلراج سنگھ نے میرا کام مزید آسان کرنے کے لیے روانگی سے قبل مجھے ایک اور ہیرا بھی دے دیا تھا جو ہو بہو طلسم نور ہیرے کی نقل تھا۔

''میں اپنے مشن میں کامیاب رہی اور بھارت لوٹنے کے بعد ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بلراج نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے ہیرا اس کے حوالے کرنے سے پہلے اپنا یہ مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیا کہ وہ پہلے میری بہن اوشا اور اس کے دونوں بچوں کو چھوڑ دے۔ خود میں روپوش تھی اور میری کوشش یہی تھی کہ جنرل ایڈوانی یا اس کے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھ سکوں، یہ معاملہ ایسا تھا کہ میں کسی سے مدد بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اسی لیے یہ سب میں نے خود ہی کرنے کی ٹھانی تھی۔ میرے پاس کافی حد تک وسائل موجود تھے۔ بلراج سنگھ مجھے دھمکیاں دینے لگا، مگر میں نے اس کی بات نہ مانی۔ بالآخر ان لوگوں کو ہی میرا یہ مطالبہ ماننا پڑا۔ اس کے لیے ایک مقررہ مقام طے پایا گیا۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ جنرل ایڈوانی نے میری بہن اوشا اور اس کے دونوں بچوں کو چھوڑ دیا ہے تو میں نے وہ ہیرا جنرل ایڈوانی کے آدمی بلراج سنگھ کے حوالے کر دیا اور اوشا کے گھر پہنچی تو وہاں لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ پورا گھر بھڑکتے شعلوں کی زد میں تھا۔ ان ظالموں نے میری بہن اور اس کے دونوں معصوم بچوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ میں خون کے آنسو رو پڑی۔ جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے مجھے بھی مضبوط ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ بھارت ان گنت زیرِ زمین ''ڈون'' سے بھرا پڑا ہے۔ میں نے بھی ایک ایسے ہی ''ڈان'' سے رابطہ کیا اور بھاری معاوضے پر انہیں ایڈوانی کے قتل کی سپاری دینا چاہی، مگر ایڈوانی کے ساتھ ''جنرل'' کے لاحقے نے انہیں میری مدد سے معذور کر دیا۔ میں مایوس ہو گئی، پھر اسی دوران میں ان وحشی برمیوں (سے جی کوہارا اور بھومک) کے ہتھے چڑھ گئی۔ میں نے انہیں بھی وہی کچھ بتایا اور ایک طرح سے خوش بھی ہوئی کہ سیر کو سوا سیر پڑنے والے تھے، شاید یہی لوگ میرا انتقام جنرل ایڈوانی سے لے سکیں، مگر یہ لوگ تو میری کسی بات پر بھروسا ہی کرنے پر تیار نہ تھے، یہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں اور وہ ہیرا میرے ہی پاس ہے۔ لیکن جب انہوں نے مجھے اپنے ہر طرح کے وحشیانہ تشدد اور بہیمانہ سلوک کا اچھی طرح نشانہ بنا لیا تب کہیں جا کر ان وحشیوں کو میری بات کا کچھ بھروسا ہوا اور یہ لوگ ایڈوانی اور بلراج کی تلاش میں نکلے مگر انہیں ناکامی

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...
پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی مئی کا
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوئی، ایک بار پھر ان درندوں نے مجھے تختۂ مشق بنالیا، بالآخر میں نے ہاتھ جوڑ کر ان سے موت کی بھیک مانگنا شروع کر دی......"

سوشیلا اپنی لرزہ خیز کتھا بتا کر گھٹ گھٹ کے رو پڑی۔ اگر تو یہ سچی تھی تو اس کا مطلب تھا، ہیرے کی چوری میں اس کی اپنی ذاتی غرض کا دخل نہ تھا، وہ ایک مجبوری تھی۔ نیز یہ بھی کہ وہ اب تک اسپیکٹرم (جب تک یہ ایک معتبر عالمی ادارہ تھا) کے لیے دیانت داری سے کام کرتی رہی تھی۔ مگر جنرل ایڈوانی کی دھونس دھاندلی اور ہراسمنٹ نے اسے غلط راستے پر چلنے پہ مجبور کر ڈالا تھا۔ لہٰذا میرے فیصلے کی کسوٹی پر وہ بے قصور ہی نہیں قابلِ رحم بھی تھی۔ ایک اور بات پر بھی میں نے فوری طور پر غور کیا تھا، چندر کلا کے مقابلے میں سوشیلا اس طلسم نور ہیرے کی برآمدگی کے سلسلے میں میری خاطر خواہ اور بے غرض مدد کر سکتی تھی، یوں بھی وہ جنرل ایڈوانی سے اپنی بہن وغیرہ کا انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ یہ میرا بھرپور ساتھ دے سکتی تھی، جو میرے لیے کئی محاذوں پر کارآمد بھی ثابت ہو سکتا تھا، اگر چندر کلا اور سوشیلا کا موجودہ حالات میں موازنہ کیا جاتا تو سوشیلا دیارِ غیر میں میرے لیے اچھی اور خاطر خواہ "سپورٹر" بھی بن سکتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جنرل ایڈوانی نے پہلے اس کے بہنوئی کو موت کے گھاٹ اتروایا اور بعد میں ہیرا ملنے کے باوجود اس کی بیوہ بہن کو اس کے دو معصوم بچوں سمیت زندہ بھی جلا ڈالا۔ یہی سبب تھا کہ سوشیلا کے سینے میں جنرل ایڈوانی کے خلاف نفرت کا ایک جوالا مکھی دہک رہا تھا۔ وہ ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بھارت کے انڈرگراؤنڈ "ڈان" کی مدد لینے کی بھی ایک ناکام کوشش کر چکی تھی۔ میری صورت میں اسے ایک چلتا پھرتا "کمانڈو ڈان" دستیاب ہو رہا تھا تو وہ بھی یقیناً میری ہر طرح کی مدد کے لیے فرشِ راہ ہو جاتی۔ اب مجھے چندر کلا کا وجود ایک بوجھ بلکہ مسئلہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ میرے آگے کے سوچے سمجھے اہم معاملات کو بگاڑنے کا باعث بن سکتی تھی، وہ دوست نما دشمن بننے میں ذرا بھی دیر نہ لگاتی، تاہم اس سے بھی مجھے مصالحت کے ساتھ چلنا تھا۔

پل کے پل یہ سب سوچنے اور گہرے تجزیے کے بعد میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور اس بار بڑے نرم لہجے میں سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سوشیلا......! ذرا آؤ میرے ساتھ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے سہارا دینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شاید اس بوٹ میں پہلی بار ایسا نرم لہجہ سنا تھا اور وہ سر اٹھا کر میری جانب دیکھنے لگی۔

وہ کبھی اپنی پُرکشش مگر اشک بار آنکھوں سے میرے، اس کی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو تکنے لگتی تو کبھی میرے چہرے کی طرف۔ میں ہولے سے مسکرایا تو اس کے گداز لبوں پر ان کہی سی جنبش لرزی، تب اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں اسے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور قریب کھڑی چندر کلا کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

سوشیلا کو لے کر میں دنبالے کی طرف آیا جدھر تنگ اور تکونی قید خانے میں کوہارا اور بھوکمک مقید تھے۔ دروازہ کھول کر میں نے حیران پریشان سوشیلا کو سامنے کا منظر دکھا دیا۔ پہلے تو اسے کوہارا اور بھوکمک کو ایسی حالت میں دیکھ کر حیرت اور غیر یقینی کا جھٹکا لگا پھر جیسے یکایک اس کے چہرے کے تاثرات متغیر سے ہوئے اور آنکھوں سے غصے اور نفرت کی چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے ہسٹریائی چیخ بلند ہوئی اور وہ تیزی کے ساتھ ان دونوں پر کسی زخمی ناگن کی طرح جھپٹی، پھر میرے اور چندر کلا کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اپنے لانبے ناخنوں سے کوہارا اور بھوکمک کے چہروں پر کھرونچے ڈالنے شروع کر دیے اور ساتھ ہی پھنکار سے مشابہ آوازیں بھی اپنے حلق سے خارج کرتی گئی۔ کوہارا اور بھوکمک بندھے ہوئے تھے اسی لیے وہ صرف اپنی گزیدگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے اور کراہیں خارج کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے بھی سوشیلا کو دل کی بھڑاس نکالنے کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی اور خاموشی سے چندر کلا کے ساتھ دروازے پر ہی کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

ایک مظلوم اور کمزور جبر سہنے کے بعد جب ظالم کو بھی اسی حالت میں دیکھتا ہے تو اس کے طیش اور انتقام کی جس حالت کا تصور کیا جا سکتا ہے وہی اس وقت سوشیلا کی ہو رہی تھی۔ وہ ہانپ گئی تھی مگر اس کے اندر کی آتشِ انتقام سرد نہیں ہوئی تھی، اس کے تیز ناخنوں نے ان دونوں کے چہروں پر سرخ لکیروں کی صورت میں کھرونچے ڈال دیے تھے اور ان کے منہ سے میری اور سوشیلا کی شان میں مغلظات کا طوفان بپا تھا۔ میں نے چندر کلا کو مخصوص اشارہ کیا، وہ آگے بڑھی اور سوشیلا کو سنبھالتی ہوئی اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے آئی۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور پھر نشست گاہ والے کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

سوشیلا کی حالت اب قدرے سنبھل گئی تھی۔ اسے یہ

سب دکھانے کا میرا ایک مقصد تھا۔ اس سے وہ میرے بارے میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ میں کیا تھا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم نے کوہارا جیسے شیطان اور اس کے ساتھی کو یوں چوہوں کی طرح بے دست و پا کر کے رکھ ڈالا ہے۔" سوشیلا میری طرف دیکھ کر توصیف آمیز حیرت سے بولی تو چندر کلا نے اسے ساری بات بتا دی۔ میرے اور کوہارا کے درمیان دو بدو مقابلے کا بھی سن کر وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ میرے جسم پر زخموں کی خراشیں اور کوہارا کے ٹوٹے ہوئے دونوں پیروں کے انگوٹھوں سمیت بھوکمک کی پچکی ہوئی ناک ان باتوں کا بیّن ثبوت تھے۔

"سوشیلا! تمہیں یہ سب دکھانے کا میرا ایک ہی مقصد تھا کہ تم مجھ پر، میرے زورِ بازو پر بھروسا کرو اور مجھ سے بغیر کسی دھوکے کا خیال بھی لائے، تعاون کرو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیونکہ یہ میری فطرت ہے کہ دوستوں کا میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑتا اور دشمنوں کو معاف کرنا میری سرشت میں شامل نہیں۔ لہٰذا اب یہ تم پر منحصر ہے کہ میری کون سی فطرت کا انتخاب کرتی ہو۔"

"میں تمہاری دونوں سرشتوں کا ہی سچے دل سے انتخاب کروں گی۔" وہ ایک دم موہنی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ چندر کلا شاید اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ کر چونکی تھی مگر میں کسی حد تک اس کی ذو معنی بات کا اندازہ لگا چکا تھا اور اس کی طرف چونکنے کے بجائے مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا تو وہ بھی اسی انداز میں مسکرا کر وضاحت میں دوبارہ بولی۔

"تمہاری دشمنوں والی فطرت میرے دشمنوں کے لیے کام آئے گی اور دوستوں والی سرشت میرے لیے، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ مجھے صرف تمہاری دوستی والی سرشت ہی نہیں بلکہ دشمنوں والی فطرت بھی قبول ہے۔"

"میں سمجھ گیا تھا۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"تمہاری ظلم بھری داستان سن کر ہی نہیں بلکہ چندر کلا کی زبانی مجھے تمہاری مظلومیت جان کر بھی تمہارے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات پروان چڑھے تھے۔"

"کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟" اس نے میری طرف گہری گہری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔

"شہزاد احمد خان، عرفیت شہزی رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہارا نام بھی تمہاری طرح خوبرو اور پُروجیہہ ہے۔ تم واقعی ایک اچھے اور دلیر انسان ہو۔"

"میرا خیال ہے ہمیں اس ہیرے کے سلسلے میں کوئی لائحۂ عمل طے کر لینا چاہیے۔" چندر کلا نے اچانک مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے چہرے پہ نظریں جمائیں۔ وہ خاصی بیزار سی نظر آ رہی تھی۔ شاید سوشیلا کا میرا یوں تعریف کرنا اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے بھی ہولے سے کھنکھارتے ہوئے، سوشیلا سے اس کی تعریف کرنا ضروری سمجھا اور اسے بتایا کہ اس شیطانی بوٹ پر قابض ہونے میں چندر کلا کا بھی ہاتھ تھا۔ اس پر سوشیلا نے ایک دوستانہ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ بھی ڈالی اور بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں، لیکن بعد میں تم نے بھی تو سے جی کوہارا سے دوبدو مقابلہ کر کے اسے خاک چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"میرا خیال ہے اب ہم فضول قسم کی باتوں میں اپنا وقت ہی ضائع کر رہے ہیں۔" چندر کلا نے دوبارہ جیسے اپنی بیزاری کا اعلان کیا۔

"آخر تمہیں اس ہیرے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟" بالآخر سوشیلا نے اس سے کہہ ڈالا تو وہ بولی۔

"اس ہیرے سے تو ہم سب کو ہی دلچسپی ہے۔"

"کیا تم اس میں حصہ داری چاہتی ہو؟" سوشیلا نے اس سے پوچھا۔

"کیا تم یہ نہیں چاہتیں؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

اخلاقیات

دو سفری سیلزمین بہت عرصے بعد ملے۔ ایک نے حالات کا شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ "آج کا دن تو بہت ہی برا گزرا۔ کہیں ڈانٹ پھٹکار سننے کو ملی۔ کہیں گالیاں، کہیں لوگوں نے منہ بنا کر دروازہ بند کر لیا، کہیں گرجتے برسنے لگے۔ فروخت کچھ بھی نہ ہوا۔"

"کیا بیچ رہے ہو آج کل؟" دوسرے نے پوچھا۔

"اخلاق سنوارنے والی کتابیں۔" پہلے نے جواب دیا۔

ایبا کامران، سبی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

رُوح افزا
زندگی میں
اور کیا چاہیئے!
Roohafzapk

''اس لیے کہ وہ ہیرا ہماری ملکیت نہیں ہے، نہ ہی ہمارا اس پر حق ہے۔'' سوشیلا نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی تھی۔ اس کی اس بات نے ثابت کر ڈالا تھا کہ وہ اسپیکٹرم کی ایک سچی رکن تھی اور اپنے کاز اور فرض سے بھی غافل نہیں تھی۔ مگر چندر کلا کو یہ بات بُری لگی۔ بولی۔

''وہ ہیرا کسی کی بھی ملکیت نہیں ہے۔ بس! جس کے ہاتھ میں ہے وہی اس کا مالک ہے اور یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔''

''تو پھر اس کا مالک اس وقت ایڈوانی ہوا، کیونکہ وہ ہیرا اب اسی کے پاس ہے۔'' سوشیلا نے ہلکی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو میں نے ان کی گلوخلاصی کرانا ضروری سمجھا اور درمیان میں بولا۔

''اس بحث کو ابھی چھوڑو، پہلے ہیرے کو اپنے ہاتھ میں آجانے دیا جائے، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' مجھے چندر کلا کی بات بھی رکھنا تھی، اس لیے سوشیلا سے اس کی حمایت میں بولا۔ ''ویسے چندر کلا کا ہیرا حاصل کرنے کا مقصد صرف لالچ ہی نہیں ہے، اس میں عالمِ انسانیت کو ایک بڑی جنگ میں جھونکنے سے بچاؤ کا بھی نیک جذبہ کارفرما ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بالآخر ''ورلڈ بگ بینگ'' والی بات اس کے گوش گزار کر ڈالی تو سوشیلا حیرت بھری نگاہوں سے چندر کلا کا چہرہ تکنے لگی۔

''تت...... تو کیا...... تت تمہیں بھی یہ بات معلوم ہے؟''

''ہاں!'' چندر کلا نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

''کک...... کیسے معلوم ہوئی یہ بات تمہیں؟'' سوشیلا کی حیرت کم نہ ہوئی تو میں نے کچھ اندازہ لگاتے ہوئے سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں یہ جنرل ایڈوانی انہی جنگی جنونی جرنیلوں میں سے ہو جو ایک بھیانک سازش کے تحت پوری دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنا چاہتے ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے چندر کلا اور ہشام کی دی ہوئی معلومات کی مختصراً صراحت بھی اسے بتا ڈالی۔

''یقیناً...... ایڈوانی کا تعلق انہی تین ممالک کے جرنیلوں سے ہے، جو ایڈولف ہٹلر کی طرح پوری دنیا پر حکمرانی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔'' سوشیلا نے پورے وثوق سے توثیق کی تو چندر کلا نے اپنا بدلہ چکاتے ہوئے سوشیلا سے طنزاً کہا۔

''اور تم یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ جنرل ایڈوانی کتنا خطرناک آدمی ہے، تم نے محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر وہ ہیرا اس کے حوالے کر کے ان جنگی جنونیوں کے ورلڈ بگ بینگ کے بھیانک منصوبے کو شرمندۂ تعبیر ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔''

''اس لیے کہ میں سمجھتی تھی کہ یہ محض چند مٹھی بھر جنگی دیوانوں کا خواب ہے، جو کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر اب تمہیں کیسے یقین آگیا؟'' چندر کلا بدستور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں لگی ہوئی تھی۔ ہیرے سے ''حصے داری'' کے متعلق سوشیلا کا کہنا شاید چندر کلا کو ابھی تک کھل رہا تھا۔

''تمہاری زبان سے یہ سب سن کر......'' سوشیلا اس کے اندر کے جلاپے کو سمجھے بغیر بولی۔ ''اور مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارا ابھی کسی نہ کسی حوالے سے کسی ایسے جرنیل سے ضرور رابطہ رہا ہوگا۔'' سوشیلا نے وہی بات کہہ ڈالی تھی جو میرے دل میں پہلے ہی سے تھی مگر میں نے مصلحتاً چندر کلا سے نہیں کہی تھی۔ مگر اس بار میں نے بھی ان کی بات کاٹنے کی کوشش نہیں کی اور چاہتا تھا کہ ان دونوں ''خواتین'' کے درمیان یہ موضوع ذرا آگے بڑھے۔ چنانچہ میں دزدیدہ نظروں سے چندر کلا کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، تاکہ اس کے تاثرات کا ردِعمل بھانپ سکوں۔ وہی ہوا۔ اس کی بات پر چندر کلا نے قدرے گھبرا کر میری طرف دیکھا تھا، میں اس کی طرف سے فوراً اپنی نظریں چرا گیا تو وہ جیسے ہڑبڑا کر بولی۔

''نن...... نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں سمجھ گیا دال میں کچھ کالا ہے اور اس ''کالک'' کو میں سرِدست تاریکی میں ہی چھپے رہنے دینے کی غرض سے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے سوشیلا سے بول پڑا۔

''اس کی ضمانت میں تمہیں دیتا ہوں سوشیلا کہ چندر کلا کا تعلق ورلڈ بگ بینگ کے منصوبہ ساز کسی جرنیل سے نہیں ہے۔''

''کیوں......؟ تم بھلا اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ یہ کوئی معمولی راز نہیں ہے جو ہر ایرے غیرے کی زبان پہ زدِعام ہو۔'' مجھ سے یہ کہتے ہوئے جب سوشیلا نے میری طرف دیکھا تو میں نے چندر کلا سے نظر بچا کر اسے آنکھ مار دی اور جلدی سے اس بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بولا۔

''دیوانوں کی باتیں زبانِ زدِعام ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے سوشیلا! لیکن اس بات کا تمہیں بھی میری طرح

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یقین کرلینا چاہیے کہ چندر کلا کا ایسا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں! طالع آزماؤں سے تم اس کا تعلق بے شک جوڑ سکتی ہو۔ جو خزانے کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔" سوشیلا ذہین ثابت ہوئی۔ وہ فوراً سے نہ صرف میری آنکھ کا اشارہ سمجھ گئی تھی بلکہ میری ہوا میں اڑائی ہوئی بات کا مطلب بھی بھانپ گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ اس نے بھی ہنسی میں اس بات کو ہوا کرنے کی غرض سے کہہ ڈالا۔

"صحیح کہتے ہو شہزی! یہ طالع آزما بھی تو کم سر پھرے نہیں ہوتے۔ خزانوں کی تلاش میں جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے لیے نکل جاتے ہیں اور ہاتھ کچھ نہیں آتا، الٹا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں، میری بات کو مذاق میں مت اڑاؤ......" چندر کلا نے اچانک گہری سنجیدگی سے کہا تو مجھ سمیت سوشیلا بھی اس کی طرف چونک کر تکنے لگی۔

"بالاسور میں میرے تین ساتھی موجود ہیں، انہی میں سے ایک خود کو ان جرنیلوں میں سے ایک کا قریبی ملازم کہتا ہے، لیکن وہ کس ملک کے کس جرنیل سے تعلق رکھتا ہے یہ وہ نہیں بتاتا، کیونکہ یہ بتانے سے وہ اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا ہے۔"

"لیکن تم پھر یہاں کیسے آن پھنسیں؟" سوشیلا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"پھنسی نہیں تھی، میں یہاں لائی گئی تھی۔"

"کس کے کہنے پر؟ اور تمہیں کیا پتا کہ یہ لوگ، یعنی کوہارا وغیرہ طلسم نور ہیرے کی تلاش میں یہاں آئے ہیں؟" سوشیلا اس کی طرف سے موقع ملتے ہی جیسے اس کے ساتھ جرح پر اتر آئی تھی، میں بھی اب یہی چاہتا تھا کہ چندر کلا کا اصل چہرہ سامنے آجائے، لہٰذا خاموشی سے سامع بنا ان کی باتیں سنتا رہا۔

"ہمیں شبہ ہوا تھا ان پر......" چندر کلا بتانے لگی۔

"درحقیقت یہ لوگ بالاسور کی بندرگاہ میں طوائفوں کو تلاشتے پھر رہے تھے۔ میں اس پیشے سے تعلق تو نہیں رکھتی ہوں، مگر گھر میں میرے بوڑھے ماں باپ اور تین چھوٹے بھائی بہن ہیں، ان کی کفالت میرے ذمے ہے، میرے ماں باپ بہت ضعیف ہیں۔ ہم جنگل میں تیندو کے پتے چننے کا کام کرتے ہیں۔ وہ اب بیمار رہتے ہیں، میں اکیلی اتنے پتے نہیں چن سکتی، اور ٹھیکے دار مجھے اس سے زیادہ کام نہیں دیتا، ناچار میں ان لوگوں کے ساتھ آگئی۔ بعد میں مجھے ان کی گفتگو سے جب یہ پتا چلا کہ یہ تو درحقیقت اسی ہیرے کی تلاش میں آئے ہیں تو میں چونک پڑی اور اپنے ساتھیوں کو اس کی خبر پہنچانے کے لیے بے چین ہوگئی مگر بدقسمتی سے یہاں سے مجھے جانے کی اجازت نہیں دی گئی اور تب مجھ پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ یہ لوگ ہمیں صرف عیاشی کے لیے ہی نہیں لائے تھے بلکہ اپنا غلام بھی بنا کر رکھنا چاہتے تھے، سو مجھے فرار کی اور کوئی راہ نہ ملی تو میں نے شہزی کے ساتھ خفیہ سازباز کرلی۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ میں نے سوشیلا کی طرف دیکھا۔ میری طرح اسے بھی اس کی اس نئی کہانی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ تاہم میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا۔

"اس وقت ہمارے نزدیک اس سے زیادہ اہم معاملات ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ پہلے ان پر توجہ دی جائے۔ سب سے پہلے اس لانچ پر اپنے قبضے کو یقینی بنانا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب ہم میں سے کوئی اسے پائلٹ کرے۔"

"اس پر قبضے کی کیا ضرورت ہے؟" چندر کلا بولی۔ "یہاں لائف بوٹ ضرور موجود ہوگی۔ ہم اس میں سوار ہو کر بہ آسانی بالاسور کے ساحل پر اتر جاتے ہیں۔"

"میں ابھی اس بوٹ سے دست بردار نہیں ہوسکتا، ابھی میرے اس سے بہت سے مفادات وابستہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے تھوڑا بہت تجربہ تو ہے، اگر کوشش کروں اور اس کا میکینزم سمجھ میں آجائے تو کوئی مشکل نہیں ہوگی۔" سوشیلا کے خیالات مجھ سے میل کھاتے تھے، چندر کلا سے زیادہ میں اس کے لیے قابلِ بھروسا ساتھی تھا اور وہ میرے لیے۔ لہٰذا میں نے فوراً کہا۔

"اس سے زیادہ بہتر اور کیا بات ہوسکتی ہے۔ آؤ پھر پائلٹ روم میں چلتے ہیں۔"

"ٹھہرو......!" معاً چندر کلا نے تیز سی آواز میں کہا اور ہم دونوں قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ نال والا پستول نظر آرہا تھا۔ جس کا رخ ہماری طرف ہی تھا۔ میرے چہرے پہ سناٹے بکھرتے چلے گئے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

"میک، میں واقعی میں کوئی ہیلووین پارٹی نہیں کرنا چاہتی۔"

میک نے اپنی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جب تم میری مخالفت کی کوشش کرتی ہو تو اس وقت بھی واقعی بے حد کیوٹ لگتی ہو۔"

جینی کے پچاس برس سے اوپر کے گھٹنے جتنی تیزی کے ساتھ اسے اجازت دے سکتے تھے، وہ ڈائننگ روم کی کرسی پر سے اتنی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میک،

اس بے عیب منصوبے کی روداد جس میں معمولی سی دراڑ آگئی تھی...

دو متضاد طبیعتوں کے مالک میاں بیوی کامیاب زندگی گزار رہے ہیں تو کہیں طبیعتوں کا یہی تضاد انہیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہونے پر مجبور کر دیتا ہے... مغرب کے مخصوص ماحول میں گندھی تحریر جہاں ان کے تہواروں کو نہایت جوش اور منفرد انداز میں منانے کا رواج بڑھتا جارہا ہے... ایک ایسے ہی تہوار کی پُرجوش تقریب کا احوال... ہر مہمان متبادل چہرے کے ساتھ موجود تھا...

الیس انور

الٹی تدبیر

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From

آوارہ گرد

قسط 26

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی ایک معصوم بچہ جس نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک جھلک اور دھندلا خاکہ یاد تھا۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ماں تھی کہاں؟ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا، ایک نئی عورت بھی اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی مگر اس کے ساتھ اس کا رویہ درست نہ تھا۔ شہزی اپنی ماں کا خلا اپنے باپ کی موجودگی سے پُر کرنے کی کوشش کرتا مگر چند ہی دنوں بعد باپ اسے "نئی عورت" کے ایما پر اطفال گھر میں چھوڑ کر چلا گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بھی رہتے تھے، جن کے "بچوں" نے انہیں یہاں چھوڑ کر خود کو "یتیم" سمجھنے میں زیادہ عافیت محسوس کی تھی۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی، جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی "یتیم" تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی اور ایک "تعلقِ خاطر" ان دونوں کے بیچ پنپنے لگا تھا۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ "اطفال گھر" ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چل رہا تھا۔ یہاں روایتی یتیم خانوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ بچوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا۔ ان کے رہن سہن، کھانے پینے اور تربیت تک کی کڑی نگرانی ایک نظم و ضبط کے تحت کی جاتی تھی۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی، جس کی حقیقت جان کر شہزی کو ایک تکلیف دہ حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں تھا بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا مگر اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک گیا تھا۔ اس کے دو بچے تھے، جو اپنے دادا سے مانوس تھے۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس "بوڑھے دوست" کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دنیوی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھنے والا یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں شوکت حسین، اس کی بہن شکیلہ، بلال، اشرف، ثریا، عابدہ سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ناکام ہو جاتے ہیں جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف کنگل خان اور اس کے حواری، ان پر تشدد کرتے ہیں، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن جاتے ہیں۔ کنگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنا لیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ انسپکٹر روشن خان، چوہدری ممتاز خان کا ٹاؤٹ اور "راتب خور" ہے، جو ان کے خفیہ اور گھناؤنے مقاصد کے لیے کام کرتا ہے۔ وہ شہزی کا دشمن بن جاتا ہے اور اسے بے گناہ قانونی شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی کا یار اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون ظفاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں وہ "چھوٹے استاد" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ "بڑا استاد" کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو کسی ڈاکو کے چنگل سے چھڑانے کے لیے شہزی اور اول خیر ملتان سے لاہور کا قصد کرتے ہیں۔ راستے میں بڑی سیاسی شخصیت زبیر خان کے لاڈلے اور بگڑے ہوئے بیٹے شفقت راجہ کے ساتھ شہزی کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ جنی بائی کے چنگل سے چھڑا کر شہزی، ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو لاہور دارالامان پہنچا دیتا ہے۔ جھگڑے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، کمیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں۔ زہرہ بانو المعروف "بیگم صاحبہ" اول خیر کو گروہ سے بے دخل کر دیتی ہے، اس میں کمیل دادا کی کج ادائیوں کا بھی دخل ہے مگر بیگم صاحبہ شہزی کو نہیں بھولتی اور وہ اسی طرح اس کی ہر قسم کی مدد میں شامل رہتی ہے۔ بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا ہے، جب ہی یہ بھید کھلتا ہے کہ ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان نے ایک مغنیہ ستارہ بیگم سے محبت کی دوسری شادی کی تھی۔ ستارہ بیگم کی پہلے سے ایک بچی تھی، جو گود میں تھی، یہی زہرہ بانو ہوتی ہے۔ زہرہ بانو، جمیل شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی، جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹر" کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں، لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی کارڈ کی حمایت حاصل ہونے کے باعث میجر ریاض بغیر کسی ٹھوس ثبوت وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان پر ہاتھ ڈالنے سے قاصر ہے، اس لیے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو "آنریری" طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی "پاور" کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں ہوتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں "پاور" کو مصلحتاً "ڈراپ" کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ کے جگر کی پیوندکاری کے سلسلے میں امریکا روانگی کے وقت عابدہ اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جو ایک عالمی سطح کا ڈان ہے ..... لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر تھی۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ عابدہ کو امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے کسی ایک میں ڈالنے کا شدت سے خواہش مند ہے۔ باسکل ہولارڈ کی اپنی ذاتی نوعیت کی فورس "ٹائیگر فنگ" شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہے، ایک تو دولتیا سیٹھ نوید ساپنچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ بنا ہوا ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی جس کی سرحدی چوکی پر واچ مین کی ڈیوٹی تھی۔ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں سرحد پار کر جاتا ہے اور بھارتی فرعون افسروں کے چنگل میں جا پھنستا ہے، مگر وہ دشمن کی ایک گھناؤنی سازش کو بے نقاب بلکہ ناکامی سے دوچار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی کے افسران کی وہ لاابالی جو وطنِ عزیز کو "دولخت" کرنے کی مذموم سازش

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

میں شامل رہی تھی، اپنی ہی سازش کی ناکامی پر تاج دین شاہ پر تشدد کی انتہا کرا لیتی ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی پے در پے ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد دونوں کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ ہو جاتا ہے۔ پی آر پی کے کنارے شہزی اپنے دوستوں اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا وغیرہ کی مدد سے بلیو ٹکسی کے کرنل سی جی بھگوانی کا ایک منصوبہ ناکامی سے دوچار کرتا ہے اور اپنے باپ کو اس کے چنگل سے بھی چھڑا لیتا ہے۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی کے سلسلے میں نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے اینٹی ٹیریرز کورٹ میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس صورتِ حالات نے شہزی کو گہری تشویش میں مبتلا کر رکھا ہے، اگرچہ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر، تجزیہ نگار اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں "ٹائیگر ٹیک" کے دو ٹاپ ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، اور ایک بحری کنٹینر کے ذریعے اسے ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہاں شہزی، جو نیم بے ہوشی اور خالی الذہنی کی حالت میں ہے، منہ کا چھینا ہوا شکار ثابت ہوتا ہے اور ایک دشمن سے دوسرے دشمن کے منہ میں جا پہنچتا ہے۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شپرز کے سلسلے میں لولوش آج کل برما (رنگون) میں مقیم ہے۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک سپر ٹاپ لگژری بوٹ (YACHT) میں لیے بحرِ ہند میں خلیج کے کسی ساحلی علاقے کے قریب گہرے پانیوں میں موجود ہے۔ شہزی ان کی قید میں ہے اور یہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھنگڑی سے ہوتی ہے، جو لاڑکانہ کا رہائشی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آ جاتا ہے کہ یہ وہی آرکیالوجسٹ ہشام جھنگڑی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ فیلڈ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر حیثیت کی حامل تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اسے "ہائی جیک" کر کے اب خود اس کا سربراہ بن بیٹھا تھا۔ ہشام پہلے تو شہزی پر شک کرتا ہے، مگر پھر جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے تو پھر وہ اسے پاکستان میں موئن جو دڑو کے مقام سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک کے جنگی جنونی اور ہٹلر کی طرح جوع الارض کے ہوس کار جرنیل اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے "ورلڈ بگ بینگ" کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ بلیو ٹکسی کے چندرناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ بے چارہ خالی الذہن ہو کر رہ گیا اور اپنی یادداشت تک کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت "وکٹیم" ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو اب ایک بڑی تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا گیا۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، اس میں اس کی مدد چندرکلا کرتی ہے۔ سوشیلا بھی اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ بعد میں چندرکلا دھوکا دیتی ہے اور سے جی کوہارا اور بھومک کی بربریت کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے، معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چندرکلا...... کے چہرے پہ سرد مہری کھنڈی ہوئی تھی۔

"یہ کیا حرکت ہے چندرکلا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ سوشیلا بھی گنگ سی ہو گئی تھی۔

"تم دونوں کو وہی کچھ کرنا ہے جو میں چاہوں گی۔" اس نے میری طرف دیکھ کر اسی لہجے میں کہا۔ "اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لو اور خبردار...... کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔" اس نے آخر میں تحکمانہ درشتی سے کہا اور ساتھ ہی ہمیں کیبن سے باہر نکلنے کا اشارہ بھی کر دیا۔

"تم غلطی کر رہی ہو چندرکلا! اس وقت ہم......"

"شٹ اَپ!" وہ چلّا کر بولی۔ اسے اس لہجے میں بولتے پا کر مجھے کچھ خاص حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کا اندازہ میں بہت پہلے ہی سے لگا چکا تھا، جب اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی کچھ اسی طرح کے انگلش الفاظ منہ سے اُگلے تھے۔

اس کی یہ حرکت، اس بات کا بھی صاف پتا دیتی تھی کہ وہ اندر سے کیا "شے" ہو سکتی ہے۔ ناچار ہمیں اس کا حکم ماننا پڑا، مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں یہ کوہارا اور بھومک جیسے وحشی برمیوں کے سلسلے میں کوئی بھیانک غلطی نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ وہ اگر اس کی ذرا سی بھی بے وقوفی پر آزاد ہو جاتے تو صورتِ حال خود اس کے لیے بھی خطرناک ہو سکتی تھی۔

بہرکیف...... اس کا حکم ماننے کے سوا میرے پاس سر دست اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے دونوں ... ہاتھ اُوپر اٹھا لیے تو سوشیلا نے کی فوراً میری تقلید کی۔ وہ ہمیں کیپچرنگ روم سے باہر لے آئی اور پائلٹ روم کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پائلٹ روم اس پرتعیش رہائشی کیبن کے بالمقابل ہی تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سوشیلا سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔

''چلو سوشیلا! اسے پائلٹ کرو اور بالاسور کی بندرگاہ تک پہنچاؤ، لیکن خبردار اگر تم نے ذرا سی بھی چالاکی کا مظاہرہ کیا تو......''

''مجھے چھوٹی موٹی بوٹ چلانے کا تو تجربہ ہے، لیکن...... اتنی بڑی بوٹ چلانا میرے لیے مشکل ہوگا۔'' سوشیلا نے منمناتی آواز سی آواز میں کہا۔ ایک بار پھر اس کی حالت غیر سی ہونے لگی تھی، اس بے چاری کے لیے یہ صورت حال بھی آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا جیسی تھی۔ اس کی بات پر چندر کلا نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو اور آگے بڑھ کر اسے پائلٹ کرو، ورنہ گولی مار کے تمہاری لاش سمندر میں پھنکوا دوں گی۔'' اس کی دھمکی پر سوشیلا نے میری طرف بے بسی سے دیکھا تو میں نے چندر کلا کو آخری بار سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''چندر کلا......! دیکھو، ہم خوامخواہ ہی ایک دوسرے کی دشمنی مول لے رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے اگر اس دوران وہ دونوں وحشی بری موقع سے فائدہ اٹھا گئے تو یہ ہم تینوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوگا۔ بالاسور کی بندرگاہ کا رخ کرنے سے ہمارا سامنا انڈین نیوی والوں سے ہوسکتا ہے اور تم نہیں جانتی ہو کہ اگر انہوں نے سے جی کوہارا اور بھومک کو دیکھ لیا تو وہ اپنے اثر و رسوخ سے نہ صرف انڈین نیول کو رام کرلیں گے بلکہ الٹا ہم بھی دوبارہ ان وحشیوں کے نرغے میں آجائیں گے جبکہ ان کے اثر و رسوخ کا اب تک تمہیں بھی بہ خوبی اندازہ ہو ہی چکا ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی بات کی اثر پذیری بھانپنے کے لیے چندر کلا کے چہرے پہ نظریں گاڑے رکھی تھیں، جس کے خاطر خواہ نتائج، پہلی بار اس کے چہرے سے اُلجھن آمیز سوچوں کی صورت میں نظر آئے تو میں نے بھی لوہا گرم دیکھ کر اس سے مزید کہا۔

''دیکھو چندر کلا......! اس وقت ہمارے ساتھ تم بھی خطرے میں گھری ہوئی ہو۔ ہمارے دشمن مشترکہ ہیں۔ سے جی کوہارا اور بھومک کا تعلق ایک خطرناک عالمی گینگ سے ہے جو یقیناً ان سے ہر لمحہ رابطے میں رہتے ہوں گے، لیکن اب سے جی کوہارا اور بھومک کی طرف سے ان کی خاموشی انہیں بھی کھٹکا سکتی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ وہ یہاں موجود اپنے حریف انڈین خفیہ ایجنسی (بلیوٹکسی) سے مدد کے لیے نہ کہہ دیں، تم جانتی تو ہو کہ مجھے ایک دن کے لیے ان کے حوالے بھی کیا گیا تھا۔ اب رہی بات ہیرے کے حصول کی تو اس کے لیے میں پہلے ہی تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں، یہی وجہ ہے کہ میں نے تمہیں ابتدا میں ہی باہمی بھروسے کی تلقین کی تھی۔''

میں نے محض یہ بات چندر کلا کو ڈرانے کے لیے ہی نہیں کی تھی بلکہ مجھے خود بھی اس متوقع اور مخفی خطرے کا احساس تھا۔ اس میں بھلا شک بھی کیا تھا کہ رنگون میں موجود لولوش یقیناً، میرے سلسلے میں سے جی کوہارا سے رابطے میں ہوگا، اب جبکہ یہ دونوں (سے جی کوہارا اور بھومک) بے بس کردیے گئے تھے تو ضرور لولوش جیسے خطرناک شاطر شخص نے لامحالہ کسی خطرے کی بُو بھی سونگھ لی ہوگی، وہ یہاں موجود اپنے حریف کرنل بجوانی کے کان میں اس خطرے کی بھنک ڈال سکتا تھا اور اسے اپنے ان دونوں ساتھیوں کی ''خیریت'' معلوم کرنے کے لیے انہیں یہاں متوجہ کرسکتا تھا۔

''لیکن میں دیکھ رہی ہوں کہ تم اس گوری چڑیل کے ساتھ اس ہیرے کے سلسلے میں کچھ اور ہی سوچ رہے ہو۔'' کہتے ہوئے ایک کڑوی سی نگاہ اس نے سوشیلا پر ڈالتے ہوئے میری طرف شاکی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ اس بارے میں کھٹک تو میں پہلے ہی گیا تھا جب سوشیلا اور میرے درمیان طلسم نور ہیرے سے متعلق مختصر سی گفتگو ہوئی تھی، جس میں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ہیرا میرے لیے بھی کتنا اہم ہوسکتا ہے۔

لہٰذا میں نے اس شبے کو رفع کرنے کی غرض سے بات بنانی چاہی اور اس سے کہا۔

''تمہیں شاید کچھ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہوگی۔ سوشیلا کی کہانی تم نے سن لی کہ اس نے اپنی شادی شدہ بہن اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کو اس جنونی جنرل کے ایل ایڈوانی کے خونی چنگل سے بچانا چاہا تھا مگر اس بدبخت اور سفاک انسان نے ہیرا اس سے حاصل کرنے کے باوجود اس کی بدنصیب بہن کو نہیں بخشا۔ پہلے اس بے چاری کے شوہر کو مروایا اور بعد میں اوشا کو بھی اس کے دونوں معصوم چھوٹے بچوں سمیت جلوا کر خاکستر کر ڈالا اسی لیے سوشیلا کی نگاہوں میں اب اس ہیرے کی کوئی قدر و منزلت سرے سے نہیں ہے، وہ تو صرف اس ظالم اور درندہ صفت جنرل سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہے، اس کے لیے وہ مجھ سے مدد کی طلب گار ہے۔''

''اور...... تم اس کے ذریعے وہ ہیرا حاصل کرکے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اپنے ملک پاکستان کا رخ کرنا چاہتے ہو؟'' چندرکلا نے میری طرف تیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے طنزیہ کہا تو میں اس کی بات کو ہنسی میں اڑاتے ہوئے بولا۔

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ ہاتھ آئی دولت کو اس طرح صفحے میں لوٹا دوں۔'' میں نے غیر محسوس انداز میں اس کی طرف کھسکنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ''اسی لیے تو میں نے تم سے سب سے پہلے یہی سوال کیا تھا کہ تم کون سے گروپ سے تعلق رکھتی ہو؟ جرنیلی گروپ سے یا طالع آزماؤں کے گروہ سے۔''

اسی وقت گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ میں زور سے اچھلا اور اسی لمحے اپنے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے میں چندرکلا کے ساتھ وہ کچھ کر گیا، جو ''گیم'' میں اس کے ساتھ کرنا چاہتا تھا، اس نے بروقت میری حرکت نوٹ کرلی تھی اور مجھے خبردار کرنے کے اس نے میرے پیروں کے پاس فائر جھونک مارا تھا، جس سے پہلے تو میں بوکھلا کر اچھلا اور پھر اسی کو ''موقعِ واردات'' کا ایک سنہری موقع جان کر دانستہ کچھ اس طرح لڑکھڑایا جیسے کہ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا ہوں اور فرش پر اس طرح گرا کہ مجھے ٹھیک ٹھاک اس امر کا اندازہ بھی رہے کہ میری لات بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت پذیر ہونے پر وہ پستول لیے کھڑی چندرکلا کی ٹانگوں سے ٹکرائے جائے اور...... میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہوگیا، جس کا موقع ایک طرح سے چندرکلا نے ہی مجھے فراہم کیا تھا، نتیجے میں وہ فرش سے چند انچ اُچھلی اور پھر کسی چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گری تو اس کے ہاتھ سے پستول نکلتا چلا گیا۔ چندرکلا کو جب تک میری اس بروقت اور فوری چالاکی سمجھ میں آتی وہ میرے زیردست آچکی تھی، سوشیلا پستول اُٹھانے کے لیے لپکی جبکہ چندرکلا کو میں نے فرش پر اسی طرح لیٹے لیٹے ہی لوٹ لگا کر چھاپ لیا اور اس کی نرم و نازک گردن دبوچ لی تو ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے میرے مضبوط ہاتھ کے آہنی شکنجے میں کسی کمزوری چڑیا کی گردن آگئی ہو اور جسے میں نے ذرا دیر اگر زیادہ دبائے رکھا تو اس کی جان... نکل جائے گی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ بہ ظاہر کمزور نظر آنے والی یہ چڑیا کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتی تھی ایسے وقت میں......

چندرکلا کو اسی طرح دبوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور تب تک سوشیلا اپنی ہوشیاری دکھا چکی تھی، یعنی اس کا پستول وہ اپنے قبضے میں لے چکی تھی۔

''اس کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر ان دونوں کے ساتھ اندر بند کرنا پڑے گا، تم کوئی رسی وغیرہ کا بندوبست کرلو جلدی......'' میں نے سوشیلا کو ہدایت کی۔ وہ فوراً حرکت میں آئی۔

''مم...... مجھے چھما کر دو...... میرے پریتم!'' چندرکلا میرے بازو کی آہنی گرفت میں گھگیا کر بولی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مجھے کس برتے پر ''پریتم'' پکارتی تھی نہ ہی مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی تھی۔ میں جلد از جلد لولوش کے ساتھ ایک ''گیم'' کھیلنا چاہتا تھا اور چندرکلا نے درمیان میں اچانک روڑا اٹکا دیا تھا۔ بہرکیف میں نے یہ روڑا ہٹا دیا تھا میں نے...اب سوشیلا کی مدد سے، اسے بھی رسن بستہ کر کے اسی تکونی شیپ کے کابک نما کیبن میں، ان دونوں وحشی بریموں کے ساتھ مقید کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ چندرکلا کے لیے یہ مختصر قید خانہ ایسا ہی محسوس ہوتا رہے گا جیسے وہ دو خونخوار بھیڑیوں کے پنجرے میں قید کردی گئی ہو۔

جیسا کہ میں بہت پہلے ہی اس اہم امر کا ادراک کر چکا تھا کہ چندرکلا کے مقابلے میں سوشیلا، میرے زیادہ کام آسکتی تھی اور میرا حکم بھی بلاچون وچرا بجا لاسکتی تھی، کیونکہ اس کے مطمحِ نظر اب طلسم نور ہیرا نہیں رہا تھا بلکہ کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن اوشا اور اس کے بدنصیب خاندان کا انتقام لینا زیادہ بڑا مقصد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے سوشیلا سے بھی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ہیرے کے حصول اور جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے میں وہ کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ اس دوران کچھ اور اہم کام پہلے نمٹانا میرے لیے زیادہ ضروری تھے۔ حسبِ توقع سوشیلا نے نہایت خندہ پیشانی سے میرے اس فیصلے کو قبول کیا تھا۔ تاہم میں نے اسے اپنے اور اپنے مشن کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ میں تھا کون اور آئندہ کیا کرنا چاہتا تھا، وغیرہ۔

سوشیلا بہرحال ایک بھارتی عورت تھی، اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا کہ کسی وقت بھی اس کی اپنے وطن (بھارت) کے لیے رگِ حمیت پھڑک سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے اپنے بارے میں اسے چندرکلا کی طرح یہی بتایا تھا کہ ایک عالمی گینگ لولوش کے ساتھ میرے کچھ کاروباری معاملات کے سلسلے میں بڑی خطرناک ''ڈسکس'' چل رہی ہے۔ لہٰذا میں اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہوں......

بہرکیف میں اس کے ساتھ سب سے پہلے سیجر تک روم میں آگیا۔ میں سے جی کوہارا کا سیل فون پہلے ہی اپنے قبضے میں کر چکا تھا اور اس کی کونٹیکٹ لسٹ میں... لولوش کا نمبر تلاشنے کی سعی چاہی تھی، لولوش یا کسی ''گریٹ ماسٹر''

کے نام سے اس لسٹ میں مجھے ایسا کوئی نمبر "سیو" نہیں ملا تھا، مجھے حیرت تو ہوئی تاہم میں نے اس میں زیادہ سر کھپانا غیر ضروری ہی سمجھا تھا، میں نے کنٹرول پینل کا رخ کیا۔ وہاں وائرلیس سسٹم پر میں نے مختلف فریکوئنسیز چیک آؤٹ کیں، لیکن وہاں بھی مجھے ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے ایسا کوئی سسٹم نہیں نظر آسکا تھا جسے بروئے کار لاتے ہوئے میں لولووش سے کوئی رابطہ کرسکتا۔

درحقیقت میں لولووش سے رابطہ کرنا چاہتا تھا اور ذہن میں اُبھرنے والے ایک فوری منصوبے کے تحت اُسے "بلف" کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے کمپاس کا بھی جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت ہم بحرِ ہند یا خلیجِ بنگال کے کس مقام پر موجود تھے؟ پتا چلا بنگال کے وسط میں ہماری بوٹ تیر رہی تھی۔ جہاں سے میانمار (برما) کی بندرگاہ کا سی چینل جاتا تھا۔

اچانک ایک بورڈ کے کونے میں لگا ننھا سا سرخ بلب تیزی سے جلنے بجھنے لگا، ساتھ ہی سیٹی کی آواز بھی ابھرنے لگی۔ سوشیلا بھی اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"شاید کوئی ہم سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہے۔" ساتھ ہی میرے ذہن میں لولووش کا ہی خیال ابھرا تھا کہ کیا خبر وہی اپنے اہم دستِ راست سے جی کو ہارا سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہو.....؟ میں نے جب یہ کہتے ہوئے سوشیلا کے چہرے کی طرف دیکھا تو چونکا۔ اس کے چہرے پر مجھے عجیب سی گھبراہٹ کے آثار محسوس ہوئے تھے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

"یہ کسی اور رابطے کی بچر تک ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بولی۔

"یہ کسی کی کال فریکوئنسی نہیں بلکہ سگنل الارم ہے، جس کا مطلب ہے کوئی لانچ اس بوٹ کے قریب آرہی ہے۔"

"لانچ؟" میری پیشانی پر شکن نمودار ہوئی۔ "کیسی لانچ؟"

"جسٹ اے منٹ، میں دیکھتی ہوں....." وہ بولی اور فوراً آگے بڑھی۔ اب وہ پینل بورڈ پر لگی مختلف نمبروں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ اس کی لانچ والی بات نے مجھے فکر مند سا کر دیا تھا۔

"اس لانچ کی ڈگری بتا رہی ہے، یہ بالاسور کے کسی نزدیکی ساحل سے آرہی ہے۔"

اسکرین کے ریڈار سیکشن میں ایک گہرے سبز رنگ کے نقطے کو جلتا بجھتا دیکھ کر سوشیلا نے بتایا تو میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔

"اس لانچ کی شناخت ہوسکتی ہے؟ پتا تو چلے یہ کوئی اور لانچ ہے یا پھر انڈین نیول کی کوئی بوٹ ہے؟"

"وہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں....." سوشیلا نے بدستور پینل بورڈ کے مختلف بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔ چند منٹوں کی عرق ریزی کے بعد اس نے کچھ تسلی بخش اطلاع دی کہ یہ کوئی اور ہی لانچ تھی۔

"ہوسکتا ہے یہ کوئی ایڈونچر فیری ہو؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ممکن ہے لیکن اس کا رخ ہماری ہی طرف ہے، جیسے انہیں ہماری ہی کھوج ہو۔" سوشیلا نے کہا۔

"ہم م م....." میں نے ہونٹ بھینچے۔ "یہ جس زاویے سے آرہی ہے، ہمیں پہلے ہی سے محتاط ہوکر اسے واچ کرنا ہوگا۔ تم آسکتی ہو میرے ساتھ؟"

"چلو۔" وہ مڑی۔ پھر ہم دونوں بچرنگ روم سے باہر نکل آئے۔ نکلتے وقت میں نے کسی احتیاط کے پیشِ نظر وہاں موجود واکی ٹاکی اٹھا لیے تھے، ایک سوشیلا کو تھماتے وقت میں نے اسے ہدایت کی۔

"تم کیبن کریو (پائلٹ روم) کا رخ کرو..... اور مجھ سے رابطے میں رہو۔ ہوسکتا ہے ہمیں کسی قریبی ساحل کا رخ کرنا پڑے۔" اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"ایک بات اور....." میں نے کہا وہ جاتے جاتے رکی اور مستفسرانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "تم فیول وغیرہ چیک کرلینا اور جو بھی کمی بیشی تمہیں محسوس ہو مجھے بتا دینا۔ ہمیں اس بوٹ کو ساتھ رکھنا ہے۔"

"اوکے۔" اس نے اثبات میں۔ سر ہلا دیا اور میں عرشے پر آگیا۔

بوٹ میں قابض ہونے کے بعد سے میں نے اس کی پوری تلاشی لے لی تھی۔ اسلحے کے نام پر مجھے صرف چار پستول ملے تھے، جن میں سے تین خالی تھے، ان میں سے دو میں نے سمندر میں پھینک دیے۔ فاضل راؤنڈز کا صرف ایک ڈبا اور دو عدد اٹیچڈ بلٹ کلپ ملے تھے، ایک کلپ تو میں نے خالی پستول میں لگا کر سوشیلا کے حوالے کر دیا تھا، ایک بھرا ہوا کلپ میرے پاس تھا۔ بہ قول چندرکلا کے ان کا ایک ساتھی غائب تھا، اُسے پھر ایک اور بار تلاش کیا، مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا، اس بارے میں چندرکلا کا پہلے ہی سے یہی خیال تھا کہ وہ خوف زدہ ہوکر سمندر میں چھلانگ لگا کر

کہیں غائب ہوگیا ہوگا۔

بہرحال میں نے پستول شرٹ کے نیچے، بیلٹ میں اڑسا اور دوربین گلے میں لٹکائے عرشے کی ریلنگ کے کنارے آکر کھڑا ہوگیا۔ واکی ٹاکی بیلٹ میں اٹکا رکھا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت کیبن کریو میں موجود سوشیلا سے فوری رابطہ بھی کرسکوں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ آسمان پر ہلکے بادلوں کی موجودگی موسم کی کسی بھی وقت خرابی کا اعلان کرتے نظر آرہے تھے۔ سمندری ہواؤں میں بھی تیزی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے دوربین گلے سے اتار کر آنکھوں سے لگالی اور بیکراں پھیلے اطراف کے سمندر کا جائزہ لینے لگا۔ ہواؤں کے پکڑتے زور کے باعث لہریں کچھ متلاطم زدہ دکھائی دے رہی تھیں، جنوب مشرق کی جانب مجھے موجوں پر ایک ڈولتی ہوئی لانچ دکھائی دے گئی۔ میں نے دوربین گلے میں جھولتی چھوڑ کر، بھومک سے چھینی ہوئی طاقت ور سنگل لینس ٹیلی اسکوپ نکال کر اپنی ایک آنکھ سے لگالی۔ لمبی ٹیوب کی شکل کی اس دوربین کو میں نے اسی جانب فوکس کرکے ایک آنکھ چپکادی۔ وہ کوئی عام سی چھوٹی لانچ تھی... بالکل اسی طرح کی جیسی ساحل کے کنارے آباد مچھیروں کی ہوا کرتی ہیں۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ ورنہ تو میں بھی سمجھا تھا کہ یہ کسی انڈین سرکار سے تعلق رکھنے والی نیول یا کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ نہ ہو۔ تاہم احتیاط کا تقاضا یہ بھی نہ تھا کہ میں ان سے بالکل غافل ہو رہتا۔ اُدھر کریو کیبن میں موجود سوشیلا میرے کسی حکم کی منتظر تھی، اس نے تھوڑی دیر بعد مجھ سے واکی ٹاکی پر رابطہ بھی کیا تھا۔ میں نے اسے عرشے پر ہی بُلا لیا اور ٹیلی اسکوپ تھمادی اور ساتھ ہی اس لانچ کے بارے میں بتادیا۔

"ہوں ں...... مجھے بھی یہ کسی مچھیروں ہی کی لانچ لگتی ہے۔" سوشیلا نے ٹیلی اسکوپ اپنی ایک آنکھ پر لگائے رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن...... اس لانچ کا ہماری طرف رخ ہونا بلامقصد نہیں ہوسکتا۔"

"بالکل صحیح کہا تم نے، مجھے بھی یہی بات کھٹک رہی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اصل میں ہیں کون اور ہماری طرف کس مقصد کے تحت آرہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"ایک پستول میں نے تمہیں دے رکھا ہے۔" ایک لمحے کے وقفے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "تم اندر پائلٹ روم میں موجود رہو، واکی ٹاکی ہمارے پاس ہے، میں ادھر ذرا چھپ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تم بھی محتاط رہنا، ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرتے ہی میں تم سے واکی ٹاکی پر رابطہ کروں گا۔" میری بات پر اس نے فوراً اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی اور پائلٹ روم کی طرف لوٹ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا اور ایک بار پھر دوربین نکال کر آنکھ سے لگالی۔

لانچ قریب آتی جارہی تھی۔ یہ عام سی موٹر لانچ تھی۔ اب اس میں موجود ... کچھ افراد بھی صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ مزید قریب آنے پر ان کے خاکے بھی واضح ہوتے ... دکھائی دیے۔ یہ چار افراد تھے۔ عام سے کھلے ڈلے لباسوں میں تھے اور غیر مسلح بھی۔ لیکن باوجود اس کے مجھے یہ مشکوک سے محسوس ہوئے۔ یہ سب ایک ساتھ کھڑے ہماری بوٹ کی طرف ... دیکھ رہے تھے۔ معاً واکی ٹاکی پر سوشیلا نے مجھ سے رابطہ کیا۔

"مجھے یہ لوگ چندر کلا کے ساتھی لگتے ہیں۔" اس نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم بھی انہیں دیکھ رہی ہو؟" مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔

"ہاں! تمہاری والی دوربین میں اب ان کی لانچ ہی نہیں بلکہ اس میں ریلنگ کے قریب کھڑے یہ چاروں افراد مجھے بھی دکھائی دینے لگے ہیں اور اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا۔"

"تمہارا خیال درست ہوسکتا ہے سوشی!" میں نے واکی ٹاکی پر فوراً اس کی تائید کر ڈالی۔ میری بات پہ وہ آگے بولی۔

"یہ لوگ مسلح بھی ہوسکتے ہیں۔ مجھے تو چندر کلا کا تعلق انہی جنونی جرنیلی گروہ کے کسی جنرل سے لگتا ہے۔"

"تم محتاط رہو اور اسی طرف نگاہ رکھو۔" میں نے اس کے اظہارِ خیال پر تبصرہ کیے بغیر کہا۔

"میں محتاط ہوں سر!" وہ یک دم مؤدبانہ انداز میں بولی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

"ہم دونوں ایک ہی جیسے حالات کا شکار ہیں اور اپنی اپنی بقا اور غرض و غایت کے تابع بھی اسی لیے مجھے سر کہنے کی ضرورت نہیں، تومی کہہ سکتی ہو۔"

"شکریہ سر! میرا مطلب ہے تومی!" وہ کھنکتے لہجے میں بولی۔ میں نے "گڈ" کہہ کر واکی ٹاکی دوبارہ بیلٹ میں اڑس لیا۔ اسے سے جی کوہارا اور بھومک جیسے خبیث درندوں سے آزادی دلوانے اور ان کا میرے ہاتھوں حشرناک انجام دیکھنے کے بعد وہ بے چاری خود کو میرا محکوم سمجھنے لگی تھی۔ لیکن میں نے بردباری اور کسی حد تک مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اسے برابری کی حیثیت کا درجہ دے ڈالا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کیونکہ وہ آگے چل کر میرے بہت کام آسکتی تھی (شاید، جب تک اس کا مفاد میرے ساتھ وابستہ رہتا)۔

لانچ کے قریب تر آنے تک میں اسی طرح ریلنگ سے لگا کھڑا رہا۔ اب وہ چاروں مجھے صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا پورا وجود جانے کس نامعلوم اندیشناک احساس سے دھڑکنے لگا۔

وہ لانچ ہماری بوٹ کے خاصے قریب آکر ٹھہر گئی تھی اور وہ چاروں مجھے بہ غور دیکھے جارہے تھے۔ ان چاروں میں دو سانولی رنگت کے درمیانے قد و قامت کے حامل، جبکہ ایک دبلا پتلا گوری رنگت والا شخص تھا، چوتھا ان کا ساتھی خاصا قدآور اور صحت مند دکھائی دیتا تھا جبکہ دبلے اور آخرالذکر آدمی کی رنگت سرخ وسپید نظر آتی تھی۔

پتا نہیں کیا بات تھی کہ قریب سے دیکھے جانے پر مجھے ان کے بشروں سے وہ عمومی پن عنقا نظر آنے لگا تھا جو میں ذرا دیر پہلے ان کے ذرا نزدیک آنے پر دوربین سے دیکھتا رہا تھا۔ نسبتاً دراز قامت آدمی نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بہ آواز بلند مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم ہماری بات سن سکتے ہو......؟'' اس کی آواز بھاری اور گونج دار تھی۔ لہجہ غیر ملکی ہونے کی چغلی کھاتا محسوس ہوا اور زبان ٹوٹی پھوٹی ہندی اور اردو تھی۔

''ہاں! میں تمہاری آواز بہ آسانی سن رہا ہوں۔ تم لوگ کون ہو؟'' میں نے بھی جواباً اسی طرح اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر بلند آواز میں کہا۔

''ہم شاید راستہ بھول رہے ہیں۔ کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ خلیج کھمبات کا ساحل کس طرف پڑے گا؟'' اسی دراز قامت آدمی نے کہا اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو منہ سے ہٹا لیا۔ میں ابھی اُسے کوئی جواب دینے ہی والا تھا کہ یکایک میرے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ پل کے پل مجھے ان چاروں کے ہاتھوں میں رائفلوں کی جھلک دکھائی دے گئی، جو انہوں نے ایک خاص ''ٹرک'' کے ساتھ اپنے سامنے کہیں اس طرح ٹکا رکھی تھیں کہ بہ وقتِ ضرورت انہیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گرفت میں لے کر فوراً استعمال کیا جاسکے اور وہی ہوا۔ یک بیک چار مہیب گنوں کی نالوں کا رخ میری جانب ہوگیا اور اگلے ہی لمحے سمندر کی کھلی بے رحم فضا میں گولیوں کی سماعت شکن بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور میں ایک زوردار چیخ مار کر بوٹ کی ریلنگ سے نیچے گہرے اتھلے پانیوں میں زوردار چھپاکے سے جا گرا......

☆☆☆

بے شک زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے، لیکن انسان کو اسی خالقِ کائنات نے عقل بھی عطا کی ہے کہ وہ آگ اور پانی کی پہچان کر سکے اور اپنے تحفظ کی راہ کو ممکن بناتا رہے۔ یہی کچھ میں نے کیا تھا۔

یہ میری چھٹی حس کی کارستانی تھی کہ ان کے قریب آتے ہی میرا دل کسی اندیشناک احساس سے دھڑکا تھا۔ میں نے پہلے ہی کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر سوچ لیا تھا کہ ایسی کسی ''صورت'' میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔ ان کے ہاتھوں میں گنز کی جھلک دیکھتے ہی میں نے ریلنگ کے قریب آکر خود کو پیٹ کے بل پر کرلیا تھا۔ جیسے ہی فضا فائرنگ سے گونجی، خود کو ریلنگ سے دانستہ چیخ خارج کرتے ہوئے گرا لیا تھا۔ یوں میں ان نامعلوم دشمنوں کو ''کراس بلف'' کرنے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا تھا۔

پانی میں ایک زوردار چھپاکے سے گرتے ہی میں نے ایک گہری ''تار'' ماری اور تیزی سے تیرتا ہوا ان کی لانچ کی طرف چلا گیا پھر ایک محتاط اندازے سے ایسی جگہ سے ابھرا کہ میں ان کی نظروں میں نہ آسکوں، مگر میں ان کی جھلک دیکھ سکوں۔ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوتے ہی میں نے ریلنگ کی طرف سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ مجھے یہ چاروں ریلنگ سے سرے پر قدرے آگے کو جھکے ہوئے نظر آگئے۔ وہ میری بوٹ کے نیچے اتھلے پانی کی طرف اپنی گنز کا رخ کیے مجھے تلاشنے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ وہ کسی حد تک میرے دھوکے میں آچکے تھے۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ آیا میں ان کی گولیوں کی زد میں آکر پانی کے اندر کہیں غرق ہوچکا تھا یا نہیں اور میں انہیں یہ ''اندازہ'' لگانے کا موقع دے رہا تھا۔ میں چاہتا تو اپنا پستول نکال کر ایک دو کو ادھر سے ہی ڈھیر کر سکتا تھا مگر ان کے پاس ایک تو طاقت ور رائفلیں تھیں، دوسرے یہ کہ انہیں میرا پتا چل جاتا اور باقی ساتھی دشمن میرے لیے مشکل کھڑی کرسکتے تھے۔

اچانک میں نے ایک عجیب سی شے کو فضا میں اڑتے دیکھا، یہ جال نما سیڑھی تھی جس کے سرے پر یقیناً کنڈے نما دو آنکڑے لگے ہوئے تھے جو ہماری بوٹ کی ریلنگ سے اٹک گئے تھے۔ یہ لوگ بوٹ پر چڑھائی کررہے تھے اور مجھے کروکیبن میں موجود سوشیلا کی فکر ستا رہی تھی، ان معلوم دشمنوں کی اندھا دھند فائرنگ سے مجھے ان کے سفاک عزائم کا اندازہ ہو چلا تھا اور یہی میرے لیے زیادہ تشویش کی بات تھی کہ یہ درندہ صفت لوگ سوشیلا کو بھی دیکھتے ہی گولی مار

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

دیں گے۔ اگرچہ میں نے دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے سوشیلا کو بھی ایک بھرا ہوا پسٹل دے رکھا تھا اور یقیناً وہ بھی اب تک گولیوں کی تڑتڑاہٹ سن کر محتاط ہو گئی ہوگی۔ تاہم پھر بھی وہ اکیلی تھی جبکہ یہ خونی دشمن چار کی تعداد میں تھے نیز ان کے پاس ہم سے زیادہ بھاری اسلحہ تھا۔

میں نے پانی کے اندر ہاتھ ڈال کر اپنی کمر پر شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس جالی دار رسی کی سیڑھی پر دشمنوں کے اترنے کا منتظر رہا۔

سب سے پہلے دونوں سانولی رنگت والے آئے، اپنی رائفلیں انہوں نے پشت پر اسٹرپ کر رکھی تھیں، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اچانک مجھے اسی دراز قامت آدمی کی آواز سنائی دی جو تحکمانہ انداز میں شاید اپنے انہی دونوں آدمیوں سے کہہ رہا تھا۔

"چندرکلا...... کے علاوہ جو بھی نظر آئے، اُسے بے دریغ گولیوں سے بھون ڈالو۔"

اس کی بات پر میرا ماتھا ٹھنکا۔ اس کا مطلب تھا میرا اور سوشیلا کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ یہ لوگ چندرکلا کے ہی ساتھی تھے۔ لیکن میں اب شش و پنج کا شکار ہو گیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ دراز قامت گورا شخص اور اس کا ہم نسل دکھائی دینے والا ساتھی آگے بڑھنے پر آمادہ نہ تھے۔ میرا اب ان دونوں سانولی رنگت کے آدمیوں کو ادھر ہی سے "شکار" کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ لہٰذا جیسے ہی میں نے اپنا پستول والا ہاتھ ذرا بلند کر کے سیدھا کیا، اچانک اس بدبخت کے ساتھی کی نگاہ جانے کس طرح نیچے پڑ گئی۔ وہ گویا میری جھلک دیکھتے ہی حلق کے بل چلایا اور اسی جوش میں آ کر اس نے ریلنگ سے ذرا مزید آگے جھک کر مجھ پر اپنی گن تاننے کی کوشش چاہی تو میں نے پہلے اسی بدبخت کا ہی نشانہ لے کر اپنے پستول کا ٹریگر دبا دیا۔ میرے پستول کی نال سے گرجتا ہوا شعلہ لپکا اور گولی اس کی پیشانی میں سرخ روشن دان بنا گئی، وہ آواز نکالے بغیر اور مجھ پر فائر کرنے کی حسرت لیے، ریلنگ سے اُلٹ کر ایک زوردار چھپاکے سے نیچے سمندر میں جا گرا۔ اس دوران میں مزید دو فائر کر ڈالے ان دونوں پر جو جالی دار سیڑھی پر اپنی لانچ سے میری بوٹ تک کا مختصر سفر طے کرنے میں مصروفِ کار تھے، دونوں کے حلق سے کریہہ انگیز چیخیں خارج ہوئی تھیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون زندہ رہا یا دونوں ہی وفات پانے کے قریب تھے کیونکہ اسی وقت اپنی لانچ کی ریلنگ کے ساتھ کھڑے انہیں "لیڈ" کرنے والے اس دراز قامت گورے نے اپنی گن سے مجھے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی، میں تب تک اس متوقع خطرے کو بھانپ کر پانی میں ایک طویل اور گہرا غوطہ لگا چکا تھا اور ساتھ ہی اسی پھرتی سے اپنا زاویہ بھی بدل چکا تھا۔ پانی کے اندر ان گنت بلبلے پھوٹے اور میں تیر کر دوسری سمت نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں سوشیلا کو اپنے دفاع کے لیے کافی حد تک موقع فراہم کر چکا تھا۔ مجھے جب تک اس کے پاس پہنچنے کا موقع ملتا، وہ تب تک اپنے دفاع کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر پانی کی سطح سے اپنا سر ابھارا تو مجھے لانچ کی سیلن زدہ گیلی دیوار پر نصب آہنی سیڑھی دکھائی دی اور میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس پر چڑھ گیا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دشمن لانچ پر آ گیا۔ پستول ہاتھ میں تولتے ہوئے میں محتاط رہنے کے ساتھ اسی سمت بڑھا جس طرف میرا اندازہ تھا کہ وہاں اسی دراز قامت شخص کو ہونا چاہیے تھا۔ لانچ اتنی زیادہ بڑی بھی نہیں تھی، ایک ہی کیبن تھا اور کچھ مستول جھول رہے تھے۔ مجھے لانچ میں ہر طرف اشیا بکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں، ان سے بچتا بچاتا ہوا اسی طرف کو بڑھا جہاں دشمنوں نے ہماری بوٹ پر سوار ہونے کے لیے رسی کی جالی دار سیڑھیاں منسلک کر رکھی تھیں۔ اچانک میں نے اسی دراز قامت آدمی کی جھلک دیکھی۔ وہ اسی سیڑھی پر دوسری طرف ہماری بوٹ پر سوار ہونے کی کوشش میں مصروف تھا، جبکہ اس کا ایک سانولی رنگت کا ساتھی اسی لانچ کی جانب اپنی گن تھامے پشت کے بل سیڑھی پر اٹکا ہوا تھا، تاکہ کسی ممکنہ خطرے کے پیشِ نظر وہ با آسانی فائر کھول سکے۔

"تو گویا ان دونوں میں سے ایک میری فائرنگ سے زخمی ہو گیا تھا۔" میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ میں اس کی نظروں میں آئے بغیر اس کا نشانہ لینا چاہتا تھا، قبل اس کے کہ اس کی مجھ پر نگاہ پڑتی اور یہ مجھ پر گولی چلاتا، لہٰذا ابھی میں اسے نشانہ بنانے کی تگ و دو میں تھا کہ اچانک فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ابھرا۔ میں یہی سمجھا شاید میں اس کی نظروں میں آ گیا تھا اور اسی نے ہی مجھ پر گولی چلائی تھی، لیکن ایسا نہیں تھا، گولی بوٹ کی طرف داغی گئی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ یہ حرکت سوشیلا کے سوا اور کس کی ہو سکتی تھی، اسی وقت ان دونوں کی طرف سے بھی جوابی فائرنگ ہوئی، ہدف بوٹ تھی۔ میں نے ان دونوں کی "مصروفیت" سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے پستول سے اسی سانولی رنگت والے کا نشانہ لے کر گولی داغی۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ جالی دار سیڑھی سے چھوٹ کر نیچے سمندر میں جا گرا۔ سرخ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

وسپید دراز قامت گورا اب میرے اور سوشیلا کے بیچ میں سینڈوچ بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک برسٹ مجھ پر فائر کیا اور میں نے ایک آڑ میں ہو کر خود کو اس کی مہیب آتشیں زدگی سے بچایا، دوبارہ ابھر کر اس کی جانب دیکھا تو اس نے دوسرا برسٹ بوٹ کی جانب بھی داغ ڈالا اور تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ میں نے اپنے پستول سے یکے بعد دیگرے اس پر دو فائر جھونک ڈالے، ایک گولی اسے کہیں لگی تھی، کیونکہ میں نے اسے جھٹکا کھاتے دیکھا تھا، مگر وہ خاصا سخت جان ثابت ہوا۔ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر بالآخر وہ بوٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی اس کے خاصا نزدیک پہنچ چکا تھا۔ مجھے گہری تشویش نے آن لیا، میرے پستول میں گولیاں ختم ہو چکی تھیں، مگر میرے پاس پہلے ہی سے ایک عدد بھرا ہوا فاضل کلپ موجود تھا، خالی نکال کر میں نے وہ پستول میں اٹیچ کیا اور واکی ٹاکی پر سوشیلا سے رابطہ کرنا چاہا۔ میں اُسے خبردار کرنا چاہتا تھا کہ ایک دشمن بوٹ میں داخل ہو چکا ہے، مگر واکی ٹاکی میں شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ شاید پانی کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ اسی جانب بڑھا جہاں جالی دار سیڑھی ہماری بوٹ کے ساتھ منسلک تھی، جیسے ہی میں وہاں پہنچا، میرا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس بدبخت سرخ گورے نے بوٹ میں سوار ہوتے ہی وہ سیڑھی کاٹ کر نیچے پھینک دی تھی۔ میری پیشانی پر اُلجھن آمیز سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ ٹھیک اسی وقت بوٹ میں مجھے گولیاں چلنے کی آوازیں گونجتی سنائی دیں۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ سوشیلا کی طرف سے میری تشویش فزوں تر ہونے لگی تھی۔ میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ دوبارہ سمندر میں چھلانگ لگا دی اور غوطہ مار کر اپنی بوٹ کی طرف آ گیا۔ اس طرف کچھ رسوں کے ساتھ ٹائر جھول رہے تھے، میں ان کے سہارے اُوپر چڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بوٹ کے عرشے پر تھا۔

سہ پہر اب دھیرے دھیرے شام میں ڈھلنے لگی تھی۔ سمندری ہواؤں کی سبک خرامی میں تیزی آ رہی تھی۔ اُوپر بیکراں آسمان پر اب کالے بادل منڈلانے لگے تھے...... کسی بھی وقت تیز اور طوفانی بارش کا گماں ہوتا تھا۔

بوٹ پر مجھے غیر معمولی خاموشی اور سناٹے کا راج محسوس ہوا۔ پستول میرے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور اطراف کا جائزہ لینے کے دوران اچانک میری نگاہ فرش پر پڑی اور میں چونک پڑا۔ فرش پر خون کی ایک تازہ... لکیری آگے تک چلی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی کہ یہ اسی گورے کا خون تھا جو میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ میں آگے کو لپکا اور اسی وقت پائلٹ روم سے میں نے سوشیلا کو بدحواسی کے عالم میں دوڑتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اسے زندہ دیکھ کر میں نے بے اختیار طمانیت بھری سانس لی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی، میں نے اسے پستول دے رکھا تھا۔

”شش...... شہزی! جلدی آؤ......“ وہ مجھ سے یہ کہہ کر دوبارہ پائلٹ روم کی جانب کو لپکی، میں بھی حیران و پریشان سا اس کے پیچھے دوڑا۔ جب میں پائلٹ روم میں پہنچا تو تب تک سوشیلا بوٹ کو حرکت میں لا چکی تھی۔ مجھے قریب فرش پر وہی گورا بے سدھ پڑا دکھائی دیا۔ سوشیلا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل اسی کی تھی۔

”کیا یہ مر گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! بے ہوش ہے۔“ سوشیلا نے جواب دیا۔ ”لیکن ہمارا اب بالاسور کی بندرگاہ پہ پہنچنا ضروری ہو گیا ہے۔“

”خیریت تو ہے ناں؟ ایسا کیا دیکھ لیا ہے تم نے؟“

”ایک تیز رفتار موٹر بوٹ ہماری بوٹ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مجھے یہ ان دونوں بریموں کے ساتھی لگتے ہیں۔“ سوشیلا نے انکشاف کیا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ......“ معاً مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے بچکانا سوال پوچھ رہا تھا، ظاہر ہے اس نے ریڈار کے ذریعے ہی پتا چلایا ہوگا۔ لہٰذا میں نے اپنی ہی بات کا گلا گھونٹتے ہوئے اس سے کہا۔

”ہماری بوٹ اس تیز رفتار اسپیڈ بوٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہمیں ان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا، مجھے یہ ان کے انڈین حریف نما ساتھی لگتے ہیں۔“ میرا اشارہ بلیو ٹکسی کے ایجنٹوں کی طرف تھا، جس سے وہ لاعلم تھی۔

”ہمیں بالاسور کی طرف سفر جاری رکھنا ہوگا۔“

میری بات پر سوشیلا کا چہرہ جانے انجانے خوف سے سفید پڑ گیا۔ شاید اس کے سر پر ہی نہیں بلکہ اس کے اعصاب پر بھی ابھی تک سے جی کو ہارا اور بھوک کی شرمناک اور انسانیت سوز درندگی کا خوف سوار تھا۔ میری زبانی یہ سن کر اس کا متوحش ہونا یقینی امر تھا۔

بوٹ حرکت میں آ چکی تھی اور اسے جتنی تیز رفتاری سے طے شدہ آبی راہ گزر پر دوڑایا جا سکتا تھا، سوشیلا نے اسے گامزن کر دیا تھا۔

پھوار تیز بارش میں بدلنے سے پہلے ہی دم توڑ چکی تھی، جبکہ میں اس وقت تیز طوفانی بارش کی توقع کیے ہوئے تھا۔ تاہم موسم کے تیور ہنوز کچھ ایسے ہی اب بھی نظر آتے تھے کہ اب تب میں طوفان آیا کہ آیا......

میں نے واکی ٹاکی کا جائزہ لیا، خشک ہونے کے بعد یہ کام کرنے لگا تھا۔

”تم یہ رائفل مجھے دے دو اور اس گورے کی بھی مشکیں کس کر کیبن کریو سے باہر کہیں ڈال دو...... میں عرشے پر مستول گیری کرتا ہوں۔“ کہتے ہوئے میں نے فرش پر بے سدھ پڑے گورے کی جلدی سے تلاشی لی تو اس کے پاس سے کچھ شناختی کاغذات اور دیگر اشیا برآمد ہوئیں۔ ... مقصود کی شے آخر میں اس کے پیٹ پر بندھے ایک چرمی بیلٹ میں اڑسے ہوئے بلٹ کلپ کی صورت میں برآمد ہوئی۔ اس کی رائفل بھری ہوئی تھی، فاضل کلپ میں نے اپنے قبضے میں کر لیے۔ پستول اپنا بیلٹ میں اس طرح اٹکا دیا کہ بہ وقت، فوری ضرورت پر نکال سکوں...... باقی برآمد ہونے والے کاغذات کا جائزہ لینے کا ابھی میرے پاس وقت نہ تھا۔ تاہم میں نے وہ بھی اپنے پاس سنبھال لیے تھے اور تیزی کے ساتھ کیبن کریو سے باہر نکلتا چلا گیا۔

عرشے پر آ کر میں نے دن کینس دوربین سنبھالنے سے پہلے ایک نظر یوں ہی اطراف میں حدِ نگاہ پھیلے سمندر پر ڈالی تو چونک پڑا۔ لگ بھگ کوئی چند ناٹیکل میل کے فاصلے پر جنوب مشرقی سمت میں مجھے پانی کی ہلکورے لیتی سطح پر ہلچل سی مچتی دکھائی دی، وہ کوئی اسپیڈ بوٹ ہی تھی جو انتہائی تیز رفتاری سے پانی کی سطح کو چیرتی اپنے پیچھے جھاگ کی لکیر چھوڑتی ہوئی اسی طرف ... گویا اُڑی چلی آ رہی تھی۔ ایک اور متوقع خونیں معرکے کا سوچ کے میری رگوں میں خون کی گردش یک لخت تیز ہو گئی۔

دوربین کو میں نے آنکھ سے لگا کر اس اسپیڈ بوٹ کا جائزہ لینا ضروری سمجھا، تاکہ اس میں سواروں کی تعداد کا کچھ اندازہ لگا سکوں۔

تیز سمندری ہواؤں میں بتدریج اضافہ ہونے لگا تھا اور پھوار نما بارش پڑنا شروع ہو گئی تھی۔

مجھے اس میں پانچ سے زائد مسلح افراد کے خاکے دکھائی دے گئے۔ ان کی حرکات و سکنات انہیں انتہائی تربیت یافتہ باور کرتی نظر آ رہی تھی۔ میرے اندر کا تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ گویا ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔ میں نے دوربین آنکھ سے ہٹائی، ہاتھ میں دبی رائفل کی چال درست کی اور اس کی سیٹنگ کا جائزہ لیا پھر عرشے کی ایک ایسی سمت کی طرف جھکے جھکے انداز میں بڑھ گیا کہ اگر اسپیڈ بوٹ میں سے کوئی اس بوٹ کا جائزہ لینا بھی چاہ رہا ہو تو میں انہیں نظر نہ آ سکوں......

ایک آہنی آڑ میسر آتے ہی میں نے وہاں پوزیشن سنبھال لی۔ رائفل کسی بھی وقت آتشیں چنگھاڑ مارنے کے لیے میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی، میں ایسے رخ پر پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا کہ دشمن کے اس نئے گروپ کی موٹر بوٹ مجھے نظر آتی رہے کہ وہ ہماری بوٹ کے کون سے حصے کا رخ کرتی ہے۔ نیز اس کے سوار بھی مجھے نظر آتے رہیں۔

کیبن کریو میں موجود سوشیلا بوٹ کو حتی المقدور بھگائے جا رہی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ہماری بوٹ ان کی اسپیڈ بوٹ کا رخ نہیں کر سکتی۔ اسی لیے میں نے راہِ فرار کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔ اسپیڈ بوٹ تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اگر تو یہ متوقع طور پر بلیو ٹکسی ایجنٹ تھے تو ان پر میرا اندھا دھند فائر کھولنا کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا تھا بجز اس کے کہ میں انہیں مکاری سے چھاپنے کی کوشش کرتا۔

اسپیڈ بوٹ قریب آ چکی تھی اور اسی رخ پہ تھی جہاں بوٹ پر میں ایک آڑ لیے چھپا کھڑا تھا، مجھے اس میں سوار پانچ سے چھ مسلح افراد نظر آ رہے تھے۔ دو کو تو پہچان کر میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا تھا، وہ بلیو ٹکسی ایجنٹ شیام اور کودیلا تھے۔ باقی ان کے تین چار ساتھی ایجنٹ تھے۔ ان کے جسموں پہ چست لباس نظر آ رہے تھے، میں اب بھی چاہتا تو ان پر بے دریغ فائر کھول سکتا تھا۔ لیکن میں یہ بے وقوفی نہیں کر سکتا تھا، حالانکہ چندر کلا کے ساتھیوں کے ساتھ میں نے یہی طریقہ آزمایا تھا مگر ہر دشمن کی اپنی کیٹیگری ہوتی ہے۔ یہ اس پر نہیں اترتے تھے۔

بہرکیف ایک کمانڈو ایجنٹ کی حیثیت سے میں ان کے ”لائن آف ایکشن“ کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں سردست ان پر کوئی حملہ کیے بغیر آنکھیں سکیڑے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں محو تھا۔ ان کی بوٹ قریب آتے ہی اپنا رخ بدل کر بوٹ کے دنبالے کی طرف بڑھ گئی، اب میرا اپنی جگہ پر محبوس رہنا عبث تھا لہٰذا میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور دوڑتا ہوا بوٹ کے دنبالے کی طرف پہنچا، اسی وقت بوٹ پر موجود کسی کو شاید میری جھلک دکھائی دے گئی، کیونکہ اگلے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دھوکا

نعیم: "میری بیوی نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔"
خلیق: "کیا دھوکا دیا؟"
نعیم: "کہنے لگی کہ اگر تم رات کو دیر سے آئے تو میں خودکشی کرلوں گی۔"
خلیق: "اس میں کیا دھوکا ہوا؟"
نعیم: "اس نے خودکشی نہیں کی۔"

محمد منشا، جلالپور بھٹیاں

لیے گولی چلنے کا دھماکا ہوا، میں نے آواز کا آہنگ بھانپتے ہی خود کو نیچے گرالیا۔

میں گرتے ہی لڑھکنے کے انداز میں اپنی پیش قدمی کو موقوف کیے بغیر بالآخر بوٹ کے اس حصے تک پہنچ گیا جدھر میں آنا چاہتا تھا۔ ابھی میں بہ سرعت سنبھل کر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میری کھلکتی ہوئی سماعتوں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی گونجیلی آواز سنائی دی۔

"ہیلی کاپٹر......"

میرے ذہن میں ابھرا اور میری پیشانی پر اَن گنت پریشان کن سی سلوٹیں اُبھر آئیں۔ میں نے رائفل کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ذرا سر اٹھا کر کھلی فضا میں آواز کی سمت دیکھا تو وہاں مجھے ایک چوپڑ ڈگڈگاتا ہوا نظر آ گیا، میں نے اس طرف سنگل لینس آنکھ سے لگا کر دیکھا تو مجھے تین افراد دکھائی دیے، تیسرا پائلٹ تھا، باقی دو مسلح تھے، ان کے ہاتھوں میں طاقت ور رائفلیں دبی ہوئی تھیں، ایک کی رائفل مجھے تھنڈر بولٹ کلیبر کی محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس کی نال کے نیچے راکٹ فائر سسٹم کی نسبتاً بڑے میکنزم کی اضافی نال بھی دکھائی دیتی تھی۔

پل کے پل ان کی صورتیں دیکھ کر میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ایک گہری تشویش کی لہر سی اٹھی تھی کہ میرے دشمنوں نے غالباً مشترکہ طور پر میرے خلاف "ڈبل ایکٹ اسالٹ آپریشن" کر ڈالا تھا۔ کیونکہ گنجے سر کے یہ تینوں چوپڑ سوار مجھے بری دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ بھی تھا، اب تو اس خطرناک ترین صورت حال کو مجھے فیس کرنا ہی تھا۔ دشمن کے دو گروہ (اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی) میرے خلاف جدید اسلحے سمیت ہلہ بولنے کے لیے سر پر آن پہنچے تھے اور مجھے اپنے محدود اسلحے کے بل بوتے پر بیک وقت ان دونوں سے نبرد آزما ہونا تھا۔

اپنے "ہائی پروفائل" دشمنوں سے نمٹنے کے ایک عجیب جنون خیز جوش تلے میرے ہونٹ سختی کے ساتھ باہم بھنچ گئے اور میں نے مضبوطی کے ساتھ رائفل تھام کر سب سے پہلے اسپیڈ بوٹ میں سوار بلیو ٹکسی ایجنٹوں کی طرف توجہ کی اور ایک غائر سی نگاہ آسمان پر شکاری پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے چوپڑ پر ڈالی ...... وہ اب اسپیڈ بوٹ کے اوپر معلق تھا، یوں، جیسے انہیں "کور" فراہم کر رہا ہو...... صورت حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے پل کے پل ایک گوریلا طرز کی حکمت عملی ترتیب دی اور واکی ٹاکی پر سوشیلا سے رابطہ کیا۔ پہلے اسے مختصراً صورت حال کی صراحت بیان کی اور اس کے بعد کہا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس! احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ کام کرنا ہوگا تمہیں، اسی وقت تم قیدیوں کے کمرے میں جاؤ اور اندر سے دروازہ بند کرلینا، واکی ٹاکی پر میری مزید ہدایت کا انتظار کرنا......"

اسے یہ ہدایت دینے کے بعد میں نے بوٹ کی نسبتاً محفوظ دیوار سے باہر سمندر میں جھانکا تو اسپیڈ بوٹ اور اس پر "معلق" چوپڑ کو ویسے ہی پا کر مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔ میں ان کی طرف سے فوراً حملہ آور ہونے کی توقع کر رہا تھا مگر اب ان کی طرف سے یہ "خاموشی" مجھے ایک نامعلوم سی تشویش میں مبتلا کیے دے رہی تھی۔ ابھی میں اسی اُلجھن آمیز تانے بانے کے متعلق سوچ رہا تھا کہ اچانک ایک میگا فون کے ذریعے آواز سنائی دی۔ یہ چوپڑ سے آرہی تھی۔

"مسٹر شہزاد کمان (خان)! اس وقت تمہارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں، پہلا یہ کہ تم بغیر کسی جوابی کارروائی کے خود کو ہمارے حوالے کردو، کیونکہ تم ہم سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو، اگر یہ غلطی کرو گے تو سخت پچھتاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے لیے اس اجنبی دیس میں فرار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ دوسرا راستہ جو تمہارے لیے آخری راستہ ہو ...... ہم سے جنگ کرنے کا ہے اور اس میں لازماً تمہاری شکست اور عبرت ناک انجام کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ تمہیں صرف دس سیکنڈوں کی مہلت دی جاتی ہے۔ اپنے دونوں ...... ہاتھ بلند کرکے بوٹ کے عرشے پر آجاؤ، یا پھر اپنے بھیانک انجام کا سامنا کرو۔"

یہ کہتے ہی میگا فون سے گویا اسی وقت ہی کاؤنٹ ڈاؤن شروع کردی گئی......

"ون......"

میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ہی تیز تر ہو گئی۔ مجھے ایسی کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر کہ یہ لوگ مجھے

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گولیوں کا نشانہ نہیں بنا سکتے ..... ان کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے ان سے مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ میرے پاس کوئی میگا فون نہ تھا..... ورنہ میں نے ان کی دھمکی کے جواب میں یہ کہہ سکتا تھا کہ لولوش کا ایک اہم ساتھی سے جی کوہارا میری گرفت میں ہے اور حملے کی صورت میں (میں) اُسے جانی نقصان پہنچا سکتا ہوں..... اگرچہ اس پہ بھی کوئی بعید نہ تھا کہ اُنہیں اپنے ان دونوں ساتھیوں کوہارا اور بھوک کی بھی کوئی پروا ہوتی۔

میں نے پوزیشن سنبھالی۔ میگا فون پر گنتی اب پانچ پر آگئی تھی۔ پل کے پل میں نے اس ''دہری'' صورت حال کا جائزہ لیا کہ پہلے کون میرے لیے فوری خطرے کا سبب بن سکتا تھا، بوٹ سوار یا چوپڑ..... میں نے سب سے پہلے اسپیڈ بوٹ پر معلق چوپڑ کا نشانہ لیا، مگر جلد ہی مجھ پر یہ حوصلہ شکن انکشاف ہو گیا کہ میرے ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل کی فضائی رینج سے چوپڑ باہر تھا۔ اگر ہوتا..... تو بھی اس کی گولی چوپڑ کی باڈی کو خاطر خواہ نقصان نہیں پہنچا سکتی تھی، تب تک دشمن سنبھل کر مجھ پر ہلہ بول سکتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک ہی وار دشمن کے لیے کاری ثابت ہوتا کہ میں دوسری طرف متوجہ ہو سکتا۔ گنتی آٹھ پہ پہنچ چکی تھی اور میرے پاس اب سوچنے کے بجائے عمل کرنے کا قلیل ترین وقت رہ گیا تھا۔ میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ میرے انداز و اطوار سے بے بسی سی جھلکنے لگی تھی۔

☆☆☆

گنتی پوری ہوگئی۔

فضا میں یک بیک ایک عجیب سی ٹھٹکا دینے والی ہولناک سی خاموشی طاری ہوگئی۔ ماسوائے سمندری ہواؤں کے شور میں چوپڑ کی گڑگڑاہٹ..... جیسے ابھی کچھ ہونے والا تھا، آر یا پار..... میں نے دیکھا۔ بوٹ کے اُوپر معلق چوپڑ نے حرکت کی اور بوٹ کے قریب آنے لگا۔ وہ دونوں فضا سے ہی بوٹ کے اندرونی گوشوں کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئے۔ جبکہ اسپیڈ بوٹ نے بھی بیک وقت ہی حرکت کی تھی۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے، دل جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا تھا۔ دشمن حملے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ بوٹ اور چوپڑ کی آوازیں قریب تر ہوتی تھیں بلکہ چوپڑ تو اب تقریباً بوٹ پر معلق نظر آنے لگا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ اور فوری خطرہ ٹیلی اسکوپ گن سے تھا۔ مجھے ان کی حکمت عملی سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی تھی۔ چوپڑ پہلے بوٹ کے اُوپر آکے اپنے بوٹ والے ''حلیفوں'' کو کور دے رہا تھا، تاکہ بلیوٹکسی کے گھاگ ایجنٹ بوٹ میں درانداز ہو سکیں، جبکہ میں اپنی جگہ جیسے محبوس کر دیا گیا تھا لیکن ایسا زیادہ دیر چلنا، دشمنوں کے شکنجے میں آنے کے مترادف تھا۔ میں نے اُوپر فضا میں آہنی عفریت کی طرح منڈلاتے چوپڑ کو دیکھا اور اپنی جگہ سے حرکت کی، تاکہ نسبتاً محفوظ جگہ سے اس پر فائر کھول سکوں مگر میری جھلک تاک میں بیٹھے ایک اسکن ہیڈ نے دیکھ لی۔ اسی وقت گولی چلی، میری تھکی ہوئی سماعتیں، پہلے ہی اس متوقع آواز کے دھیان [illegible] گولی کی سنسناتی آواز پر میں نے ایک جست بھری، ایک کیبن کی چھت پر لڑھکتا ہوا میں پشت کے بل پر ہوا، رائفل سیدھی کی، چوپڑ میرے عین سر پہ ڈگمگا رہا تھا۔ میں نے ایک پل ضائع کیے بغیر اس پر برسٹ فائر کر دیا۔ چوپڑ کے نچلے فولادی پنجرے پر میں نے چنگاریاں سی چھٹتی دیکھیں، جو گولیاں ٹکرانے کے باعث ہی تھیں۔ چوپڑ نے خطرہ محسوس کرتے ہی، حرکت کی اور ایسی پوزیشن پر آنے لگا کہ اس پر سوار دونوں اسکن ہیڈ ''بری'' مجھ پر باآسانی گولیاں داغ سکیں، لیکن تب تک میں تیزی سے رینگ کر اپنی جگہ بدل چکا تھا، اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری، قریب ہونے کے باعث، ان دونوں گنجے شیطانوں نے شاید بھاری مشین گن کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ پوری باڑ کیبن کی اس چھت کو چھیدتی چلی گئی، جہاں تھوڑی دیر پہلے میں موجود تھا۔ میں ایک تنگ سے گلیارے میں آن گرا تھا۔ فائرنگ بند ہوگئی، ان کے حملہ کرنے کا محتاط انداز مجھے یہ باور کرانے لگا تھا کہ دشمن اس بوٹ کو کسی ایسے خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، جس سے اس کے سمندر برد ہونے کا خطرہ ہو۔ وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ انہیں پتا تھا، اس بوٹ میں ان کے (لولوش کے) دو ساتھی سے جی کوہارا اور بھوک بھی موجود تھے، اور بھی سمجھ میں آنے والی وجوہات ہوسکتی تھیں۔

تنگ گلیارے میں گرتے ہی، مجھے احساس ہوا کہ بوٹ پر بوٹ سوار دشمن بھی آدھمکے ہیں..... لیکن مجھے میرے لیے زیادہ مصیبت کا باعث وہ چوپڑ تھا جو لٹکتی ہوئی تلوار کی صورت میرے سر پہ معلق تھا۔

میں نے گن سنبھالی اور اسی سمت کو اس اوپن ٹاپ راہداری کی دیوار سے پیٹھ چپکائے محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

چوپڑ سوار، نیچے والوں کو شاید میری ''لوکیشن'' سے متعلق راہنمائی کر رہے تھے، یہی سبب تھا کہ میں نے اسی رہداری کے سرے پر، جہاں سے یہ تھوڑی بل کھا رہی تھی، وہاں

کچھ کمزوری محسوس کی...... معاً ایک فائر ہوا اور میرے حلق سے سسکاری چیخ خارج ہوگئی، مجھے یوں لگا تھا جیسے کسی نے گرم سلاخ میرے بائیں شانے میں گھونپ دی ہو۔ میں لڑکھڑا کر گرا اور گن میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی، پشت کے بل راہداری کے فرش پر گرتے ہی میری لامحالہ نظریں، کیبن کی چھت پر پڑیں، وہاں، مجھے ایک دشمن کی جھلک دکھائی دی، اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا، جو اب تاک کر ایک اور فائر کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود اپنے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا، اسی وقت اس نے مجھ پر دوسری گولی داغی، میں فرش پر لیٹے لیٹے ماہی بے آب کی طرح تڑپا، جگہ بدلی، گولی اسی خالی جگہ پر پیوست ہوگئی، اب میری باری تھی...... تاک کر میں نے نشانہ لیا، ٹریگر دباتے ہی میرے پستول نے شعلہ اگلا، گولی کیبن کی چھت پر کھڑے دشمن کی پیشانی کو رنگین کر گئی، وہ وہیں کھڑے کھڑے میکانکی انداز میں دھپ سے میرے بالکل قریب گرا، میں اپنے زخمی شانے پر ہاتھ رکھے اس کی تکلیف کو دانتوں تلے دبائے آگے کو بڑھا، اپنی رائفل میں نے اُٹھالی تھی، پستول دوبارہ بیلٹ میں پھنسا دیا تھا۔

عقب میں اچانک، گولیوں کی پوری باڑ داغی گئی، خوش قسمتی سے میں اس وقت تک راہداری کے اس حصے کی طرف آچکا تھا، جہاں سے یہ بل کھا کر گھوم رہی تھی اور گولیوں کی تڑاتڑی سنتے ہی میں خود کو چھلنی ہونے سے صاف بچا گیا، مگر پلٹ کر میں نے بھی ایک محتاط انداز سے پر آڑ سے تلے دو تین فائر جھونک مارے۔

متوقع دشمن حملہ آور کی چیخ سنتے ہی میرے بھنچے بھنچے ہونٹ، مسکرانے کے انداز میں کھنچ گئے۔ دفعتاً ہی گولیاں چلیں، میں بدکا۔ مگر اس کے آہنگ اور درمیانی وقفے سے مجھے فوری اندازہ ہوا کہ یہ کسی اور طرف داغی گئی تھیں اور رائفل کی نہیں، پسٹل فائر تھا۔ سمت وہی تھی، جہاں وہ تکونی شیپ ''قید خانہ'' تھا...... میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا، میرے ہونٹوں کی فاتحانہ مسکراہٹ ایک دم معدوم ہوگئی۔ گہری تشویش کے احساس تلے میرا چہرہ ست کے رہ گیا۔ دشمن جدید اسلحے سے لیس اور زیادہ تعداد میں تھے جبکہ میں اب تک دو دشمن گرا چکا تھا اور یہ دشمن کوئی عام حیثیت کے حامل نہیں تھے، انتہائی تربیت یافتہ بلیوتمسی سیکریٹ ایجنٹ تھے۔

قید خانے کی طرف سے گولیوں کی آنے والی آوازیں اس بھیانک حقیقت کے منکشف ہونے کی دلیل تھیں کہ دشمن وہاں تک پہنچ چکے ہیں، جہاں سوشیلا بھی ایک طرح سے محبوس تھی، جبکہ مجھے ابھی تک سوشیلا سے واکی ٹاکی پر رابطہ کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا تھا۔ یوں بے چاری سوشیلا دو ہولناک خطرات کے بیچ ''سینڈوچ'' بننے والی تھی۔

اول تو کوہارا اور بھوک آزاد ہوتے ہی اس کا حشرناک انجام کر ڈالتے، پھر وہ زخمی درندوں کی طرح پوری بوٹ میں میرے خون کی بو سونگھنا شروع کر دیتے۔

ابھی میں اس طرف پیش قدمی کے ارادے سے ایک قدم اُٹھانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک فضا میں بدستور گڑگڑاتے ہوئے چوپڑ کی آواز مجھے عین سر پر سنائی دی، میں نے فوراً سر اٹھا کر اوپر دیکھا، اور میری آنکھوں میں چھائی تشویش ناک سی مردنی، پل کے پل ایک شکارانہ چمک میں بدل گئی، مجھے چوپڑ پر فائر کرنے کا یہ دوسرا اور نسبتاً زیادہ بہتر موقع ملا تھا، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ خاصا نیچے اور کچھ ایسے زاویے پر تھا کہ مجھے کانوں سے ہیڈ فون وغیرہ چڑھائے ہوئے پائلٹ کا آدھا بدن دکھائی دے رہا تھا جبکہ اس کے کھلے دروازے سے نصف حد تک باہر نکلے ہوئے وہ دونوں مسلح اسکن ہیڈ ڈبری پیچھے راہداری میں جھک کر مجھے تاڑنے کی جستجو میں تھے، یوں کہ ان دونوں نے اپنی اپنی ایک ٹانگ چوپڑ کے ''لینڈنگ اسکڈ'' پر ٹکا رکھی تھیں۔

مجھے ان کا حملہ اور جنگی حکمت عملی طے شدہ محسوس ہو رہی تھی، یعنی بوٹ کو کوئی بڑا نقصان بھی نہ پہنچنے پائے اور اپنا مقصد بھی خاطر خواہ طریقے سے حاصل کر لیا جائے، وجہ وہی رہی ہوگی، جس کا ذکر میں پہلے کر چکا تھا۔

اس دوران مجھے قید خانے کی سمت سے بھی گولیوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں، وہاں شاید وہ سوشیلا سے نبرد آزما تھے۔ میں جانتا تھا کہ سوشیلا زیادہ دیر تک ان گھاگ ایجنٹوں کے سامنے نہیں ٹک سکتی، اس کے مارے جانے کے یقینی احساس سے میرا دل ایک بے نام سے دکھ سے بھرنے لگا تھا، سوشیلا میرے آگے چل کر بہت کام آنے والی تھی اور دیار غیر میں اس سے وہی ایسی شخصیت تھی جس پر میں مکمل بھروسا کر سکتا تھا......

اسی وقت جب میں بسرعت رائفل سے پائلٹ کا نشانہ لینا چاہتا تھا، مجھے عقب میں کسی کی لپکتی ہوئی جھلک دکھائی دی، جیسے کوئی مجھ پر فائر کرنے کی پوزیشن بنا رہا ہو اور جسے میں اچانک ہی نظر آ گیا تھا، اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس پر پہلے گولی چلاتا تو...... ایک تو چوپڑ سوار دشمنوں کو نہ صرف اپنے ''نشانے'' سے کھو دیتا بلکہ انہیں بھی خود پر ''نشانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بازی" کا پورا موقع دے ڈالتا، اگر اپنے عقب والے دشمن کو نظر انداز کرتا تو وہ مجھ پر بلا دریغ گولی چلا سکتا تھا اور...... یہی آخرالذکر دشمن میرے لیے زیادہ خطرناک تھا، کیونکہ میں اس کے نشانے پر تھا......

فوری فیصلہ اور عمل کرنے کی اس کڑی اور جاں گسل صورت حال نے میرے جوشِ جنوں میں عجیب سا اضافہ کر ڈالا اور اسی خرد و جنوں کے جذبۂ جوش تلے میں نے اپنی اٹھی ہوئی رائفل کا رخ مذکورہ دشمن کی جھلک تاڑ کر برسٹ فائر کیا، مجھے اس کی کوئی چیخ سنائی نہ دی، تاہم اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ چند لحظے کے لیے میری طرف سے بے خبر ہو گیا، اسی وقت جب میں اپنی گن کی نال کا رخ تیزی سے اوپر منڈلاتے چوپڑ کی طرف کرنے لگا تو مجھ پر یک بیک کئی گولیاں چوپڑ سے داغی گئیں، میرے دائیں بائیں پڑنے والی گولیوں کی باڑ سے مجھے اندازہ ہوا کہ ابھی میں ان کے نشانے پر تو نہیں تھا مگر زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکتا تھا، میں نے اسی قلیل موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، تاک کر برسٹ مارا...... لینڈنگ اسکڈ پر ٹکا ہوا ایک گنجا بری نیچے آرہا، جبکہ شاید پائلٹ کو بھی کوئی گولی لگی تھی، جس سبب چوپڑ ذرا لہرانے لگا اور اسی وقت اس نے ایک طرف حرکت کی، اوپر سے گرنے والا بری پہلے تو کیبن کی چھت پر آن پڑا، پھر وہاں لڑھکتا ہوا، راہداری میں میرے بالکل قریب ہی کسی بھینسے کی طرح زوردار آواز میں گرا تھا...... میں فوراً اسی طرف پلٹا، جہاں میں نے اپنے پہلے دشمن پر فائر جھونکا تھا، وہاں کوئی نظر نہ آیا تو میں اس بری کی لاش کی طرف متوجہ ہوا، اس کی گن بھی اسی کے ساتھ راہداری میں آن پڑی تھی، میں اسے اٹھانے کے لیے لپکا یہ تو شکر ہوا کہ میں اپنے "عقبی" دشمن سے اب بھی محتاط تھا اور یہی احتیاط میرے کام آگئی، کیونکہ میں اس جہنم واصل بری کی گن اٹھانے کے لیے لڑھکنی لگا کر لپکا تھا اور اسی وقت میرے عقب میں گولیاں چلی تھیں جو پسٹل سے داغی گئی تھیں، مجھے چونکہ اس خطرے کا احتمال تھا اسی لیے میں نے گن پر پڑتے ہی، اسے دبوچا اور پشت کے بل پر آکر اسی طرف اس کی نال کر دی۔ لبلبی دبانے کے دوران ہی مجھے وہ بلیو ٹکسی ایجنٹ دکھائی دے گیا تھا جو کافی سامنے آچکا تھا، اُسے شاید مجھ سے اس ڈبل ایکٹ اسالٹ کی اُمید نہ تھی، میری گن کی نال کے آہنی دہن سے ایک طویل آتشی قہقہہ اُگلا اور وہ چھلنی ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میری سماعتوں نے ایک زوردار چھپاکے کی آواز سنی...... اور اس کے ساتھ ہی فضا میں مسلسل ابھرنے والی چوپڑ کی گڑگڑاہٹ بھی یکلخت معدوم ہو گئی۔ میں اپنی اس اہم فتح پر جی جان سے سرشار ہو گیا، جس نے مجھے مزید حوصلہ عطا کیا، نسبتاً طاقتور گن ہاتھ آتے ہی میرے حوصلے کوہ شکن ہونے لگے تھے، یہی نہیں، میرے ہاتھ اس گنجے بری کی وہ گن بھی لگ چکی تھی جو ایک اسٹرپ کے ساتھ اس کی پشت پر بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی ٹیلی اسکوپک گن تھی جس کی نال کے نیچے راکٹ فائر کرنے کی تقریباً ساڑھے چار سو میلیمیٹر پوائنٹ کی ایکسٹرا نال بھی جھانک رہی تھی، میں اب اسی سمت اندھا دھند دوڑتا چلا گیا، جہاں وہ قید خانہ تھا۔ وہاں اب خاموشی سی چھا گئی تھی، جس سے میری تشویش فزوں تر ہو رہی تھی۔

میں دوڑتا ہوا راہداری کے سرے سے ابھرا اور اس طرف کو گھوما جہاں قید خانے کی مختصر سی اوپن ٹاپ گلیاری گزرتی تھی، اچانک مجھے یوں لگا جیسے مجھ پر کسی بھاری بھرکم بھینسے نے حملہ کر دیا ہو۔ وہ پانی سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے جنگلی بھینسے جیسی ہی غراہٹ سے مشابہ ڈکراہٹ سے مجھ پر اچانک ہی دھاوا بولا تھا اور نتیجے میں میرے ہاتھوں بھاری مشین گن چھوٹ کر گر پڑی، خود میں بھی حملہ آور کی زد میں آکر گرا تھا، تاہم میں نے گرتے ہی سنبھلنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی اور ایک قلیل موقع تاک کر اس کے چہرے پہ ایک زوردار گھونسا جڑ دیا مگر میں نے محسوس کیا اس کے بھاری جبڑوں اور چوڑی ہڈیوں والے چہرے پر کچھ خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ وہی چوپڑ سوار اسکن ہیڈ بری تھا، جس کے ایک ساتھی اور پائلٹ کو میں جہنم واصل کر چکا تھا اور شاید اس نے چوپڑ کے سمندر میں گرنے سے پہلے ہی چھلانگ لگا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دشمنوں کے مشترکہ گروہ میں سے ایک گروہ (اسپیکٹرم) کو خاصی زک پہنچا چکا تھا۔ اب ان میں سے یہ آخری دشمن باقی بچا تھا جبکہ بلیو ٹکسی کے بھی دو تین ایجنٹس میرے ہاتھوں مارے جا چکے تھے، اس اندازے سے بلیو ٹکسی کے صرف اب دو یا تین ہی ایجنٹ باقی بچے تھے، اور وہ شیام اور کورنیلا ہی ہو سکتے تھے، یا پھر ایک دو مزید ان کے ساتھی۔

یہ گنجا بری بری طرح بپھرا ہوا تھا، اس نے میرے بائیں شانے کے زخم پر اپنی فولاد جیسی سخت اور موٹی اُنگلیاں گاڑ دیں، درد و اذیت کی ایک جاں کش لہر میرے پیر کے انگوٹھے سے سر تک سرایت کر گئی اور میرے حلق سے چیخ خارج ہو گئی، میں بری طرح بلبلا گیا، کھلے زخم سے بھل بھل خون بہہ نکلا، مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے لگی اور آنکھوں

کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ میری فتح اگرچہ ہنوز دلی دور است...... کے مصداق سہی لیکن میں کافی حد تک اپنے مشترکہ دشمنوں کے اس ٹولے کو خاصا نقصان پہنچا چکا تھا۔ ایسے میں دشمن کے زیردست ہو جانا ملال آمیز کسک کا ہی باعث ہوتا، میں نے سر کو جھٹکے دے کر، ذہن پر طاری ہونے والی دھند کو جھٹکنے کی کوشش چاہی اور اسی دوران میں اس آخری گنجے برمی نے میرے زخمی شانے سے اپنے آہنی ہاتھ کا پنجہ، گرفت میں رکھا تھا اور میں درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا، دوسرے ہاتھ سے اس نے میری گردن دبوچ لی تھی، میں نے اپنے پورے وجود کی ہمت مجتمع کی اور جان کش اذیت کی پروا کیے بغیر جنوں خیزی کا سہارا لیا، یہی میرا وہ ہتھیار تھا جو مجھے ہر قسم کے درد اور تکلیف کے احساس سے عاری کر دیا کرتا تھا اور میں دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتا تھا۔ میری داہنی ٹانگ کا گھٹنا تیزی سے حرکت پذیر ہوا اور اس کی ضرب شدید اس گنجے برمی کے پیٹ کے نچلے نازک حصے پر پڑی، اس کے حلق سے برآمد ہونے والی اذیت ناک چیخ بھی مجھے ایک وحشیانہ غراہٹ سے ہی مشابہ معلوم ہوئی تھی۔ اس کی بیک وقت دونوں ہاتھوں کے شکنجوں کی گرفت کمزور پڑتے ہی میں مچھلی کی طرح تڑپا اور اپنے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا اور اس کی نال اس تنومند برمی کے پیٹ سے لگا کر ٹریگر دبا دیا۔ "ٹوز" کی آواز کے ساتھ ہی گنجا برمی ٹھنڈا پڑ گیا، اس کے مردہ وجود کو ایک طرف دھکیل کر میں آگے بڑھا۔ پستول سنبھالنے اور گن اٹھانے تک میں نے چند سیکنڈ لگائے تھے۔ درد کی ابھرنے والی ٹیسوں کی پروا کیے بغیر میں اس قید خانے والے کمرے کی گیلری میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے اس طرف سوشیلا کی دل دہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں...... جس نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا...... میں اس طرف کو گرتا پڑتا لپکا، خود میری اپنی حالت گری گری سی ہونے لگی تھی، مگر میں نے خود کو سنبھالے رکھا تھا، لیکن یہ بھی تھا کہ مجھے اپنے بائیں شانے کے زخم کو پٹی وغیرہ کرنا لازمی تھا، کیونکہ وہاں سے مسلسل خون بہہ رہا تھا، اگرچہ میں نے اپنی شرٹ کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر عارضی طور پر سہی، پٹی سی باندھ تو دی تھی اور اس سے کسی حد تک جریانِ خون کم بھی ہو گیا تھا مگر بہنا پھر بھی بند نہیں ہوا تھا۔

سامنے ہی مجھے ہولناک منظر دکھائی دے گیا۔ شیام اپنے ایک ساتھی کے ساتھ قید خانے کے دروازے پر موجود تھا، اس کی ساتھی ایجنٹ کوریلا اور دیگر ایک دو ساتھی غائب تھے، ان کی جگہ سے جی کوہارا اور اس کا ساتھی بھوک موجود تھے، اس طرح کہ، کوہارا نے سوشیلا کو کسی بے رحم شکرے کی طرح دبوچ رکھا تھا جبکہ بھوک اپنے ہاتھ میں ایک چنگیزی قسم کا خم دار چھرا لیے، جس پر لگا تازہ لہو ٹپک رہا تھا، اس طرح کھڑا تھا کہ اس کے قدموں میں، چندرکلا کسی ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح اپنی چِری ہوئی گردن کو پکڑے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خون بہہ بہہ کر فرش پر تالاب کی صورت بن رہا تھا اور بھوک نے نہایت سنگ دلی کے ساتھ اپنا ایک پاؤں اس کے تڑپتے وجود پر یوں رکھا ہوا تھا جیسے اس نے کوئی جانور ذبح کیا ہو۔

بھوک کے ہاتھوں چندرکلا کا یہ عبرت ناک حشر دیکھ کر مجھے اپنے اندر ایک کرب کا احساس ابھرا، بے اختیار...... اس کا مجھے پیار بھرے انداز میں "میرے پریتم" کہنا یاد آنے لگا چندرکلا کی کج روی اپنی جگہ، لیکن اس نے بہرحال کوہارا اور بھوک جیسے درندوں کے سلسلے میں میری ہی نہیں سوشیلا کی بھی مدد کی تھی، چندرکلا کی تڑپتی موت پر اس کی دائمی جدائی کی ایک نامعلوم سی کمی کا اپنے دل میں دکھ بھرا احساس مجھے ادھ موا سا کر گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں بھوک سے چندرکلا کی جاں گسل موت کا انتقام لینے کے پر تول رہا تھا کہ کوہارا کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں کمزور اور بے بس چڑیا کے مانند دبی ہوئی سوشیلا کو اس نے بھوک کی طرف دھکیل دیا اور سوشیلا، جو پہلے ہی غالباً اپنی نگاہوں کے سامنے بدنصیب چندرکلا کا روح فرسا انجام دیکھ چکی تھی، خوف و دہشت سے گنگ سی ہو کر رہ گئی، دھکیلے جانے پر تھوڑی آزادی ملتے ہی، اس نے ان درندوں کے چنگل سے بھاگنے کی ایک دیوانہ وار کوشش چاہی تھی کہ بھوک نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے اسے راستے ہی میں دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی نرم و نازک گردن پر چھری پھیرتا، میں نے اپنی گن سیدھی کر چکا تھا اور لبلبی پر میری انگلی نے ایک ذرا حرکت کی...... بھاری مشین گن زوردار آواز میں گرجی اور بھوک کے سر کے پرخچے فضا میں بکھر گئے...... خون کے چھینٹے سوشیلا پر ہی نہیں، قریب کھڑے کوہارا اور شیام پر بھی پڑے، ایک لمحے کو تو یہ سب دہل کر رہ گئے کہ یہ ہوا کیا تھا؟ کیونکہ شاید ابھی تک یہ لوگ میری طرف سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ ان کے ساتھی میرے ساتھ نبردآزما تھے اور یہاں یہ لوگ بڑے آرام سے اپنی کارروائی نمٹاتے رہیں گے، جو کسی حد تک یہ نمٹا بھی چکے تھے، جن میں جہنم واصل بھوک اور کوہارا کی رہائی کے علاوہ ان کے ہاتھوں

چندر کلا کی موت بھی تھا۔

دوسرا لمحہ ان کا تتر بتر ہونے کا تھا اور سوشیلا موقع غنیمت جان کر، بروقت عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف دوڑی۔ میں نے فوراً اسے کور کیا اور تتر بتر ہوتے دشمنوں پر ایک اور برسٹ داغا۔ شیام کا ساتھی اس کی بھینٹ چڑھا اور کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا، جبکہ کوہارا اور شیام نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دنبالے کی طرف دوڑ کر اپنی جان بچائی۔ مجھ پر وحشتِ جنوں خیزی طاری تھی، میں آگے بڑھا اور فرش پر نمونۂ عبرت بنی چندر کلا کے جسدِ خاکی کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیا۔ وہ مرغِ بسمل کی جاں گسل کیفیات سے آزاد ہو چکی تھی اور کٹی پھٹی لاش بن چکی تھی، جبکہ اسے اس حال کو پہنچانے والے درندے بھوک کی بے سر وجود کی لاش بھی قریب ہی آڑی ترچھی پڑی تھی۔

اس دوران میں سوشیلا میرے ساتھ آن لگی تھی، یوں جیسے میرے وجود کا حصہ بن جانا چاہتی ہو، اس کے نرم و نازک اور شاخِ گل جیسے وجود کا لمس مجھ میں پیوست سا ہو گیا تھا، کوئی اور لمحہ ہوتا...... کوئی اور حالات ہوتے...... یا میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً ان سرور آگیں لمحات میں کوئی گستاخانہ سی جسارت ضرور کر ڈالتا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے کٹ پھٹ گیا تھا اور حسین چہرے پر بھی خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ شاید اسے کوہارا وغیرہ نے دبوچتے ہی، ایک بار پھر انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔

"اس طرف آؤ...... جلدی۔" میں نے فوراً اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا اور اس طرف کو دوڑ پڑا، جہاں کوہارا اور شیام غائب ہوئے تھے۔ سوشیلا کو میں نے اپنے عقب میں کر رکھا تھا۔ گن میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ پستول بیلٹ سے نکال کر میں نے ایک اضافی کلپ کے ساتھ سوشیلا کو تھما دیا تھا۔ ٹیلی اسکوپک راکٹ گن، اسٹرپ کے ساتھ میری پشت پر جھول رہی تھی۔

"تت...... تم بہت زخمی نظر آ رہے ہو......" اس نے تفکر آمیز تشویش سے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھتا رہا۔

"تم نے بروقت پہنچ کر میری جان بچالی، ورنہ تو میں بھی چندر کلا کی طرح......" اس نے کچھ قدم میرے ساتھ آگے جا کر پھر ہانپتے ہوئے کہنا چاہا۔

"ابھی خاموش رہو اور اپنے گردوپیش پہ نظر رکھو......" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "دشمن بوٹ میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہماری گھات میں ہیں۔ ہم ابھی تک خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔"

اس نے فوراً چپ سادھ لی۔ اُسے غالباً ابھی تک موجودہ صورتِ حالات کی نزاکت کا اندازہ نہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوہارا جیسے درندے کی آزادی کے بعد ہم میں سے کوئی غفلت میں اس کے ہاتھوں مارا جاتا، کیونکہ کوہارا کی مثال اس وقت زخمی درندے جیسی ہو رہی تھی۔ وہ مجھے پھاڑ کھانے کو بے چین ہو رہا تھا۔ میں نے دنبالے کی طرف محتاط روی سے حرکت کی، یہاں میرے پیشِ نظر اب دو مقاصد تھے، کسی دشمن سے مڈبھیڑ ہونے پر اسے واصلِ جہنم کر ڈالتا یا پھر اس بوٹ سے راہِ فرار...... کیونکہ پسپا ہوتے دشمن پر میری فتح عارضی بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ ان کی مدد کو مزید ساتھیوں کی کمک یہاں اس سے زیادہ بھاری اسلحے اور نفری قوت کے ساتھ کسی بھی وقت پہنچ سکتی تھی۔ اس لیے میری زیادہ توجہ اس وقت بوٹ سے فرار اور کسی بھی قریبی ساحل پر پہنچنے پر مرکوز تھی۔

ایک ایسے ہی گوشے کی طرف آ کر میری آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ مجھے بوٹ کے بالکل قریب، دشمن کی وہی بوٹ ہلکورے لیتی ہوئی دکھائی دی جس میں سوار ہو کر بلیچی کے کمانگ ایجنٹ (شیام اور گوریلا وغیرہ) یہاں تک پہنچے تھے۔

ایسے ہی وقت میں بڑے زور سے بجلی کڑکی اور تیز بارش نے اچانک اپنا جوبن دکھایا، شرانٹے دار بارش کے ساتھ ہی تیز طوفانی ہواؤں نے سمندر میں جل تھل سا مچا دیا۔ شام میں رات کا گمان ہونے لگا۔ یہ میرے اور سوشیلا کے لیے فرار کا بہتر موقع بن سکتا تھا۔

میں نے تیز طوفانی ہواؤں اور شرانٹے دار بارش کے شور میں چلا کر سوشیلا سے کہا۔

"سمندر میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ...... ہمیں اس بوٹ کے نزدیک پہنچنا ہے۔ اپنا ہاتھ دو......" اس نے بلا چون و چرا اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور پھر میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بوٹ سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

اُچھالیں مارتے سمندر کی لہروں نے ہمیں بچھاڑنے کی کوشش چاہی تھی، لیکن ہم دونوں نے مضبوطی سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رکھا تھا اور اپنی سی کوشش کرتے ہوئے تیرنے کے انداز میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے بوٹ کے نزدیک جا پہنچے...... بوٹ کا ایک آہنی کنڈا ہاتھ میں آتے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہی میں نے پوری قوت صرف کر دی کہ اسے پکڑ کر میں سوشیلا سمیت بوٹ میں سوار ہو جاؤں...... لیکن میرے زخم نے بھی مجھے ادھ موا کر رکھا تھا، لیکن یہ میرے جوش اور قوتِ ارادی تھی کہ میں اپنی سی کوشش میں کچھ کامیاب رہا تھا، باقی کی کسر میری ''حالت'' دیکھتے ہوئے سوشیلا نے اس طرح پوری کرنی چاہی کہ...... میرے زور پر اُوپر اٹھتے ہی خود بھی چابک دستی کے ساتھ ایک دوسرا آہنی کنڈا پکڑ لیا اور مجھ سے پہلے نہایت پھرتی سے بوٹ میں جا سوار ہوئی، پھر مجھے اپنے جسم کا سارا زور لگا کر اُوپر کھینچنے کی کوشش کرنے لگی، ٹھیک اسی وقت طوفانی بارش کے شور میں گولیوں کی بھیانک تڑا تڑی ابھری، یہ وہی وقت تھا جب میں خود بھی زور لگا کر سوشیلا کا ہاتھ پکڑے بوٹ میں آنے کی کوشش میں تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز نے سوشیلا کو دہلا دیا اور اسی بوکھلاہٹ میں اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، میں دوبارہ اچھلتے پانیوں میں جا پڑا...... اور خاصی گہرائی تک چلا گیا۔ بھاری مشین گن میرے ہاتھوں سے چھوٹ کر زیرِ آب ہو گئی، لیکن ٹیلی اسکوپک راکٹ فائر گن، ابھی تک میری پشت پہ بندھی ہوئی تھی۔

غالباً بوٹ سے ہم پر کسی دشمن کی نظر پڑ گئی تھی اور اس نے گولیوں کی بوچھار کر ڈالی تھی، مجھے تو کوئی گولی نہیں چاٹ سکی تھی اور سوشیلا کی طرف سے بھی مجھے تسلی تھی کہ وہ بھی بچ گئی ہوگی، کیونکہ اسے کوئی گولی لگتی تو اس کی چیخ ضرور ابھرتی، تاہم اس سے گھبراہٹ میں میرا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔

میں نے اپنی سی سعی چاہتے ہوئے گہرے پانیوں میں ہاتھ پیر چلائے اور خود کو ایک بار پھر سطحِ آب پہ اُبھارا...... تو دیکھا میں بوٹ سے تھوڑا دور تھا اور بوٹ سے بوٹ پہ مسلسل گولیاں داغی جا رہی تھیں، شاید یہ خبر ہوتے ہی کہ اب میں بوٹ میں نہیں تھا، دشمنوں کی ساری ''اٹینشن'' اس طرف ہو گئی تھی۔

گولیوں کی اس متواتر بارش میں، بوٹ تک میرا پہنچنا محال تھا، کیونکہ دشمنوں کی پوری کوشش تھی کہ وہ مجھے بوٹ تک نہ پہنچنے دیں۔ اسی وقت بوٹ سے تیز سرچ لائٹیں سمندر میں پھینکی جانے لگیں۔ میں نے اسی روشنی میں بوٹ کی طرف ذرا سا سر ابھار کر دیکھا تو بوٹ پر تین چار افراد گنیں تانے ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ میں نے اسی وقت ہلکا غوطہ لیا اور اسی دوران اپنی پشت سے راکٹ گن لے کر سنبھال لی۔ اس میں راکٹ کو دیکھا اور میرے ہونٹوں پہ زہرخند مسکراہٹ کھنچ گئی۔

دوسرے ہی لمحے میں پانی سے اُبھر آیا اور تاک کے اسی ریلنگ کی طرف نشانہ لے کر راکٹ فائر کر دیا۔ ایک سنسناتی ہوئی آواز سے ہلکی سطح کا راکٹ فائر ہوا، اور تب ہی میں نے بوٹ کی ریلنگ سے کسی کے چلانے کی آواز سنی تھی۔ شاید کسی نے میری یہ خطرناک حرکت بھانپ لی تھی۔

ایک دھماکا ہوا اور میں نے بوٹ میں آگ کا گولہ سا پھٹتے دیکھا۔ اتنا موقع میرے لیے کافی تھا، میں تیزی سے بوٹ کی طرف بڑھا، جہاں سوشیلا میری ''سودمند'' کارستانی ملاحظہ کرنے کے بعد قریب آ گئی تھی اور جھک کر میرا ہاتھ تھامنے کی سعی میں مصروف ہو گئی۔ میں نے آہنی کنڈے کو پکڑا اور سوشیلا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے قدرے جھک کر مجھے اُوپر سوار ہونے میں مدد دی۔

بوٹ کے فرش پر گرتے ہی میں نڈھال سا ہو کر پڑ گیا، مگر ہانپتے ہوئے تیزی سے بولا۔

''سوشی! بوٹ بڑھاؤ، جلدی......'' وہ مجھے چھوڑ کر تھروٹل کی طرف لپکی اور اگلے چند سیکنڈوں میں بوٹ کے انجن کے غرانے کی آواز ابھری۔

بوٹ حرکت میں آتے ہی، ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔ مگر جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ اس طوفان باد و باراں اور اچھلتی لہروں میں بوٹ اس بُری طرح ڈول رہی تھی کہ کسی وقت بھی اُلٹ سکتی تھی۔

''بوٹ کی رفتار کم کرو...... ورنہ ایک بار پھر ہم سمندر میں ہوں گے۔'' میں نے حلق کے بل چلا کر کہا۔

سمندر میں گرنے کی وجہ سے میرے زخم میں بندھی ہوئی عارضی پٹی کھل کر نجانے کہاں بہہ چکی تھی اور جو تھوڑا بہت زخم بند ہو گیا تھا وہ پھر ہرا ہو کے کھل گیا تھا۔ خون ایک بار پھر بہہ چلا تھا۔ شاید اب تک یہ سب میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر ہی کیا تھا، ورنہ تو یہ کہاں ممکن ہوتا......

اسی وقت مجھ پر غنودی طاری ہونے لگی۔ سر چکرانے لگا۔ میں ہوش و خرد کی دنیا سے شاید رخصت ہونے لگا تھا اور عین اس وقت جب میری آنکھیں بند ہونے لگی تھیں، میں نے بوٹ کو کسی بپھرتی اور اُونچی طوفانی لہر کے رحم و کرم پر بری طرح اُچھلتے دیکھا، نہ صرف یہ بلکہ سوشیلا کو بھی چیختے ہوئے اپنے بالکل قریب لڑھکتے ہوئے پایا، پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

☆☆☆

کب اور کتنی دیر بعد، میرا خرد سے یارا ہوا، مجھے نہیں

معلوم مگر آنکھ کھلی تو گھٹا ٹوپ اندھیاروں اور پُرہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہیں قریب جھینگروں کی جھائیں جھائیں کرتی گونج عجیب سا تاثر پیش کرتی تھی، مگر کہیں ایک اور بھی آواز میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی، ہلکی اور دھیمی دھیمی سی، یہ موجوں کا شور تھا...... مجھے احساس ہوا کہ میرے دائیں جانب خشکی تھی اور بائیں جانب کوئی ویران اور تاریک ساحل...... مگر دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا، چند لمحے تو میرا ذہن ماؤف سا ہی رہا تھا، پھر دھیرے دھیرے پیش آنے والے جاں گسل ساعتوں کا ادراک ہوتا چلا گیا۔ میں کروٹ کے بل تھا سیدھا ہوا تو زخمی شانے پر درد کی ٹیس سی اُٹھی، بے اختیار میرے حلق سے کراہ خارج ہوگئی...... نقاہت جوں کی توں تھی، بلکہ اس میں اضافہ ہی ہو چلا تھا اب مجھ میں تو اُٹھ کر بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔ ذہن ہنوز غنودگی کا شکار تھا۔ پیٹھ کے بل ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کے بطن سے جیسے جگنو چمک اُٹھے...... یہ کھلا اُوپر کھلا آسمان تھا، جہاں اَن گنت تارے ٹمٹما رہے تھے۔ مطلع صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کی کچھ دار ٹولیاں تیرتی ہوئی نظر آجاتی تھیں۔

میں نے ذہن پر طاری دھند کو جھٹکنے کے لیے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے اور گرد و پیش کا جائزہ لیا مگر چہار سو ایک وحشت ناک تاریک سناٹوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

''سس...... سوشی......! سو...... شیلا......!'' میں نے بمشکل لرزیدہ ہونٹوں سے سوشیلا کو پکارا۔

مجھے یاد آگیا تھا کہ عین آخری لمحات میں میرے اور سوشیلا کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ ایک تیز بپھرتی ہوئی اُونچی لہر نے ہماری بوٹ کو بُری طرح اچھالا تھا اور سوشیلا اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے، ایک غیر ارادی سی چیخ کے ساتھ میرے بالکل، بوٹ کے فرش پر آن گری تھی، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ اس پر بھی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم غرقاب نہیں ہوئے تھے مگر یہ معجزہ آخر رونما کیسے ہوا تھا کہ میں ساحلِ سمندر کے بالکل قریب پڑا تھا۔

''کک...... کیا...... سوشی......؟'' ایک لرزا دینے والا اندیشناک خدشہ میرے دل میں اُبھرا تھا کہ کہیں سوشیلا، بوٹ اُلٹنے کے باعث سمندر برد تو نہیں ہوگئی تھی؟ لیکن پھر میں کیسے بچ گیا؟

میں غیر یقینی حالات سے ہی نہیں بلکہ مخدوش حالات سے بھی گزر رہا تھا۔ ایک اجنبی سرزمین جہاں دشمنوں کے مشترکہ ٹولے میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور جہاں میرا اللہ کے سوا کوئی مددگار بھی نہ تھا، سوشیلا کی صورت ایک مبہم سی اُمید ہوئی تھی کہ اس کی مدد سے ایک اجنبی سرزمین میں پاؤں جمانے کا کچھ موقع ملتا، اب وہ بھی دم توڑنے لگی تھی۔ خود میری اپنی حالت ناگفتہ بہ ہورہی تھی۔ دشمنوں کی طرف سے الگ مجھے بے چینی تھی کہ وہ کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔

سوشیلا کو کھویا تو احساس ہوا کہ وہ میرے لیے ان غیر یقینی قسم کے حالات میں کتنا بڑا آسرا تھی۔

کئی گھڑیاں اسی طرح بے سدھ ساحلی ریت پر مجھے پڑے پڑے بیت گئیں۔ طوفانِ باد و باراں کے بعد فضا اور بھی زیادہ پُرسکون اور دھلی دھلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ دور مدھم مدھم روشنی میں سمندر یوں پُرسکون دکھائی دے رہا تھا جیسے، اس پر کوئی طوفان ہی نہ گزرا ہو۔ البتہ اس کے سناٹے دار اُفق پر کبھی کبھی آسمانی بجلی کی چمک اُبھرتی تو ایک عجیب سا پُرہیبت منظر دیکھنے کو ملتا۔ خنک ہواؤں کے چلتے جھونکوں میں ٹھنڈ کی کاٹ بڑھنے لگی تھی اور مجھے سردی کا احساس ہونے لگا تھا، خون بھی شاید اسی وجہ سے قدرے جم کر رک گیا تھا۔ خون میں بھی ایک ''نیچرل پروسس'' کے تحت خود ہی جم جانے کی قدرتی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

میں نے ذرا ہمت سے کام لیا، آخر کب تک اس طرح بے یار و مددگار ویران ساحل میں پڑا رہتا؟ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش چاہی اور دائیں بازو کی کہنی ریت پر ٹکا کر کسی نہ کسی طرح بیٹھنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اب ایک بار پھر میں نے ذرا آنکھیں سکیڑ کر گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لیا مگر وہی تاریکی اور جھینگروں کی جھائیں جھائیں اور موجوں کی ''شرررر'' کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں اپنے تئیں اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے دائیں جانب جنگل تھا یا بنجر ویرانہ؟ یا پھر کوئی آبادی یا کسی آبادی کے آثار......؟ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھٹا ٹوپ تاریکی میں اسی طرف ہی دیکھے جا رہا تھا پھر میں نے گردن گھما کر سمندر کی طرف دیکھا۔ وہاں تاروں کی مدھم مدھم روشنی اور پُرہول سناٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

معاً ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ آواز میرے دائیں جانب تاریکی سے اُبھرتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ آواز کسی جانور کی آواز سے ہی مشابہ محسوس ہوئی تھی۔ آواز بس ایک بار ہی اُبھری تھی۔ مجھے ڈر لگا کہیں اس طرف کوئی گھنا جنگل ہی نہ ہو اور اب وہاں سے کوئی خونخوار جانور مجھ پر حملہ نہ کر دے جبکہ میری اپنی حالت دگرگوں تھی۔ میں نے تن اور

پڑھ رکھا تھا کہ ہندوستان میں گھنے جنگلوں کی خاصی بہتات ہے۔ یہاں شکاری اور آدم خور درندوں کی بھی کمی نہیں...... یہ سوچ کر ہی میں اندر سے دہل سا گیا کہ اگر میرا بھی کسی ایسے درندے سے یہاں سامنا ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟ جبکہ میرے پاس تو ہتھیار نام کی کوئی شے بھی ساتھ نہ تھی۔ کجا ایک چاقو تک نہ تھا۔

اچانک میں بری طرح ٹھٹکا...... اسی سمت پر جہاں بدستور میری نظریں جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک ٹمٹماتی روشنی سی دکھائی دی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا مگر گہری تاریکی میں نظر آتی وہ روشنی بالکل واضح تھی۔ معاً ایک بار پھر مجھے کسی جانور کے زوردار خراٹے لینے کی آواز سنائی دی۔ میں پہلے ہی گھبرایا ہوا سا تھا، روشنی اور وقفے وقفے سے آتی ہوئی کسی جانور کی غراہٹ سے مشابہ آواز نے میری فکرمندی کو مزید سوا کر دیا۔ مجھے ادھر اُدھر کہیں چھپنے کی بھی کوئی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناچار میں یونہی تن بہ تقدیر، اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ کچھ لمحات اور بیت چلے...... میری تکی ہوئی نظریں اسی طرف جمی ہوئی تھیں، روشنی کا مدور دائرہ بھی کچھ پھیلنے لگا تھا اور ساتھ ہی مجھے تاریکی میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں بھی دکھائی دینے لگی تھیں، جو ادھر اُدھر ڈولتی، حرکت کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ بلکہ اب تو وہ مدور نما روشنی بھی کچھ واضح ہونے لگی تھی، جو کسی لالٹین کی سی لگتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ اچانک وہ سب کچھ غائب ہو گیا۔ مجھے اچنبھا ہوا، کہ یہ کیا ماجرا تھا؟ پھر سوچا، ہو سکتا ہے اس طرف کوئی آبادی وغیرہ اور یہ جو بھی تھے، کہیں اور طرف مڑ گئے ہوں۔ یہ سوچ کر میں اپنا سر جھٹک کے سمندر کی طرف دیکھنے لگا اور کوشش میں تھا کہ ذرا اٹھ کر کھڑا ہو سکوں، مگر مجھ میں اتنی بھی سکت نہ رہی تھی، اس نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ سے جی کوبارا اور شیام وغیرہ کی طرف سے الگ پریشانی تھی کہ اگر وہ بھی اس طرف نکل آتے تو ان کی گرفت سے بچنا میرا محال ہی ہوتا۔

اچانک مجھے فضا میں ایک گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ ایک بڑا ہیلی کاپٹر ہی لگا تھا مجھے...... اور اس میں سے تیز سرچ لائٹ گردش کر رہی تھی۔ وہ ساحل کے رخ پر تھا اور ساحل پر روشنی پھینکے، وہ میری طرف ہی بڑھا چلا آ رہا تھا۔

”دشمن“ میرے ذہن میں ابھرا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ مگر مجھ میں اتنی سکت پیدا نہ ہو سکی تھی کہ میں اُٹھ کر تاریک جنگل کی طرف دوڑ کر کسی محفوظ مقام میں چھپ سکتا، ہیلی کاپٹر تیزی سے اسی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا اور میں کسی بھی وقت، ساحلی ریت پر ان کی گردشی سرچ لائٹ کے ہالے میں آ سکتا تھا۔ میں نے اپنے وجود کی ساری طاقت مجتمع کی اور جنگل کی طرف گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی وقت جانے کدھر سے میرے ریختہ و شکستہ وجود میں ....قوت پیدا ہوئی کہ میں گرتا پڑتا تقریباً اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاید جان بچانے کا جذبہ، ہر قسم کی کمزوری پر غالب آ گیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کی قریب آتی آواز مجھے انتہائی منحوس محسوس ہونے لگی۔ عین اسی وقت جب ہیلی کاپٹر اپنی تیز سرچ لائٹ سے ساحلی ریت کا جائزہ لیتا ہوا میرے بالکل قریب پہنچا، میں ایک گھنے جھنڈ میں خود کو گرا چکا تھا۔ لائٹ کا تیز روشن ہالہ میرے اوپر سے گزر گیا، شکر تھا کہ میں نے خود کو گھنی جھاڑیوں میں گرا لیا تھا۔ ہیلی کاپٹر آگے نکل گیا تھا مگر ٹلا نہیں تھا۔ وہ تھوڑا آگے جا کر پھر منڈلانے لگا۔ میں اٹھ کر جنگل کی طرف بڑھا، مگر کسی جھاڑی سے میرا پاؤں رپٹا اور میں منہ کے بل گرا۔ میرے گردوپیش تاریکی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاتی آواز مجھے منحوس لگ رہی تھی۔ وہ شاید تھوڑی دور جا کر فضا میں معلق ہو گیا تھا، میرے دل میں خدشہ ابھرا تھا کہ کہیں انہیں اس جگہ پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا تھا، جہاں میں گرا تھا؟

ذرا ہی دیر ہیلی کاپٹر کی آواز پھر قریب آتی محسوس ہونے لگی۔ میں تشویش زدہ سا ہو گیا۔

میں نے ذرا سنبھل کر جھاڑیوں کے عقب سے اسی سمت دیکھا، جہاں مجھے ہیلی کاپٹر محض ایک روشنی کی صورت ہی دکھائی دے رہا تھا، اس کے بعد میں نے اُسے ساحل پر لینڈ کرتے دیکھا۔ اندیشناک خدشات تلے میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شاید انہیں واقعی کچھ شبہ ہو گیا تھا، یا پھر یہ ویسے ہی یہاں اتر کر میری تلاش میں گردوپیش کے مقامات کا جائزہ لینا چاہتے ہوں...... یہ سوچ کر میں آگے سرکا ہی تھا کہ اچانک ایک خوفناک سی غراہٹ نے مجھے دہلا دیا۔ میں وہیں ساکت و جامد ہو گیا۔

میرے سامنے ایک خوفناک جبڑے اور شکاری دانتوں والا خاصا جسیم کتا کھڑا غرا رہا تھا۔ اس کے کھلے جبڑوں سے تیز نکیلے دانتوں کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر کے، مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کو تیار تھا۔ اس پر روشنی پڑ رہی تھی، جو اس کے ساتھ کھڑے ایک چادر پوش کے ہاتھوں میں پکڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوئی بڑی سی لالٹین سے پھوٹ رہی تھی۔ اس چادر پوش کا چہرہ، مجھے ... تاریکی میں ملفوف ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے ہولے سے کتے کو شتکارا تھا۔ یہ اسی کا ہی لگتا تھا۔ شکاری کتے کی غراہٹیں معدوم تو نہیں ہوئی تھیں، البتہ مدھم ضرور پڑ گئی تھیں۔

میں اب اس چادر پوش کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا، جس کا وجود مجھے کچھ جھکا جھکا سا ہی نظر آتا تھا۔ اس نے اپنے اُوپر کوئی چادر سی لے رکھی تھی۔ جس کا گھونگھٹ اس نے شاید دانستہ ہی اپنے چہرے کے آگے کر رکھا تھا، وہاں مجھے تاریک خلا کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ چہرہ اس کے پس منظر میں تھا۔

''تت...... تم...... کون؟'' میں نے بہ مشکل اسے دیکھ کر کہا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین سے بھی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا، اس کی روشنی، ہیلی کاپٹر سواروں کو اس طرف متوجہ کر سکتی تھی۔

''تم زخمی دکھائی دیتے ہو۔'' تاریک ہالے کے اندر سے ایک عجیب سے لہجے کی کھرکھراتی آواز برآمد ہوئی۔

''میرے دشمن...... یہاں بھی آ پہنچے ہیں، کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' میں نے مناسب الفاظ کا استعمال کیا کہ وہ خود ہی سمجھ... جائے کہ میں کیا چاہتا تھا۔

''ہیلی کاپٹر کی آواز سن رہے ہو نا تم......؟ وہ شاید میری تلاش میں یہاں تک آ پہنچے ہیں۔ مم...... مگر اس لالٹین کی روشنی......''

''آ جاؤ...... میرے پیچھے۔'' اس نے میری بات کاٹ کر کہا، لالٹین کی لو ذرا دھیمی کی اور پلٹا۔ وہ شاید میری بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ خونخوار قسم کا شکاری کتا، سب سے آگے تھا۔ لالٹین کی روشنی میں ہم تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے، شکر تھا کہ ایسے وقت میں میری ہمت کچھ سوا ہو گئی تھی، یا پھر جان بچانے کا جذبہ غالب تھا کہ میں اپنی قوت ارادی کے بل پر چلنے لگا، اگرچہ میرے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی، اور سر بھی شاید نقاہت کے باعث چکرا رہا تھا۔ میں چلتے چلتے پیچھے رہ جاتا تو چادر پوش اپنی رفتار دھیمی کر لیتا۔ یہ شاید وہی تھا جسے میں تھوڑی دیر پہلے دیکھ چکا تھا۔

ابھی میں اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ چادر پوش شخص کون تھا؟ اور اس بیابان ساحل کنارے جنگل میں کیا کرتا تھا۔

سوشیلا مجھے رہ رہ کر یاد آ رہی تھی، پتا نہیں وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی، زندہ بھی تھی کہ نہیں بے چاری......

عقب میں دور مجھے ہیلی کاپٹر کی آواز معدوم سی ہوتی محسوس ہوئی تھی، دشمن شاید میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ مجھے اس طرف سے بھی تشویش تھی، سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے اس چادر پوش کے پاس خاطر خواہ پناہ مل جائے گی، کیا میں اس کے پاس کچھ محفوظ وقت گزار پاؤں گا یا دھر لیا جاؤں گا؟

جنگل جتنا اندر تھا اتنا ہی گھنا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ جنگل کی فضا میں نباتات اور جنگلی گل بوٹوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ سردی کا احساس بتدریج بڑھ رہا تھا۔ خنک ہواؤں کے سبک خرام جھونکے، خاموش جنگل کی سناٹے دار فضا میں عجیب سا تاثر پیدا کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

ایک مقام پر میں نڈھال سا ہو کر گر پڑا۔ مجھے شاید کمزوری کے باعث چکر سا آ گیا تھا۔ سانسیں بھی سینے میں اٹکنے لگی تھیں۔ میرا ذہن ایک بار پھر تاریکیوں کی آماجگاہ بننے لگا تھا۔ ایسے ہی وقت میں، میں نے اس چادر پوش کو اپنی جانب رک کر پلٹتے اور متوجہ ہوتے پایا...... وہ اپنے ہاتھ میں لالٹین پکڑے میرے قریب آ کر گھٹنوں کے بل اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی سیاہ چادر کے گھونگھٹ میں مجھے جو چہرہ نظر آیا تھا، وہ انتہائی مکروہ اور بھیانک تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کسی خاموش ماحول میں ہی کھلی تھی۔ بس! فرق اتنا تھا کہ میں بیرونی فضا کے بجائے کسی تنگ و تاریک مڑھی جیسی جگہ کے اندر موجود تھا۔ وہ کوئی جھلنگا سی کھری چارپائی تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنی آنکھیں گرم ہوتی محسوس ہونے لگیں، تب ہی مجھے احساس ہوا کہ میں بخار کی شدت سے تپ رہا تھا۔ میرا پورا وجود تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کا تو اب یہ عالم تھا کہ میں ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا، نظر یہی آتا تھا کہ میں شاید اب اسی بے بسی اور بے کسی میں اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔ اپنے وطن سے میلوں دور، دیار غیر میں ایک دور دراز جنگل بستی میں میری قبر کھود کر یہیں مجھے دفنا دیا جائے گا۔

بخار کی شدت سے میرے حلق سے رہ رہ کر کراہیں سی خارج ہونے لگی تھیں۔

میرا اُوپری جسم برہنہ تھا۔ نیچے فقط جینز کی پینٹ تھی۔

میں نے اپنے شانے کے زخم کا جائزہ لیا۔ وہ کھلا پڑا تھا۔ بے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوش ہوتے سے مجھے اس پُراسرار چادر پوش کا چہرہ قریب سے دیکھنے کا جو قلیل سا موقع ملا تھا، اسی نے ہی مجھے دہلا دیا تھا، اُف...... کس قدر مکروہ اور کریہہ چہرہ تھا اس چادر پوش کا...... ہوش میں آنے کے باوجود وہ بھیانک چہرہ جیسے میری آنکھوں میں ثبت ہوکر رہ گیا۔ سیاہ توے جیسی رنگت، اُوپری ہونٹ کٹا ہوا، جہاں سے اس کی غلیظ اور بدنما دانتوں کی اُوپری ... قطار صاف نظر آتی تھی، بہت ہی بھیانک محسوس ہوتی تھی۔ ایک آنکھ پچکی ہوئی اور دوسری اُبلی پڑی ہوئی، جیسے ابھی اس کی اکلوتی آنکھ کا بڑا سا ڈیلا باہر کو اُبل پڑے گا...... چہرہ بھی تکونی اور چیچک زدہ تھا، ناک غائب تھی اور اس کی جگہ فقط دو سوراخ تھے۔

ایک عجیب سی ناگوار بو بھی میرے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جیسے کوئی کیچڑ پھیلا ہو کہیں۔

میں نے بمشکل تمام اپنی گردن موڑ کر کچھ اپنے اطراف کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ میں مڑھی کے صحن میں ہی، ایک مختصر سے برآمدے کی دیوار سے لگی چارپائی پر دراز تھا۔ قریب ایک بدنما سے بانس کے ساتھ ایک لالٹین جھول رہی تھی، جس کی یرقان زدہ سی روشنی میں مجھے کچھ گردوپیش میں دیکھنے کا موقع ملا۔

صحن کے کونے میں مجھے ایک مختصر سے حصے میں ''کیچ'' سی پھیلی نظر آئی۔ وہ ناگوار بو شاید اسی پھیلی ہوئی کیچ سے ہی آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس کا کیا مقصد تھا؟ پھر معاً ہی مجھے کیچ کی گدلی گدلی سطح پر کچھ رینگتا ہوا نظر آیا۔ ایک نہیں کئی ایسی عجیب سی کینچوے جیسے کیڑے...... ایک کمرہ نما گوشہ بھی اسی طرف مجھے نظر آیا تھا، جس کی چوکھٹ پر... پیوند زدہ ٹاٹ جھول رہا تھا۔ وہاں بھی اسی طرح کی لالٹین کی یرقان زدہ روشنی سی پھوٹتی نظر آئی۔ وہ چادر پوش نجانے کہاں غائب تھا، اس کا کتا بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اندازہ تو تھا مجھے کہ یہ اسی پُراسرار چادر پوش کا ٹھکانا ہوگا اور وہی مجھے بے ہوشی کی حالت میں ادھر لایا ہوگا۔

''کوئی ہے......؟'' میں نے پکارا مگر جواب ندارد۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد میں نے کسی کے ہولے سے کھانسنے کی آواز سنی، مخرج وہی مذکورہ گوشہ تھا، جہاں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ پھر میں نے وہاں سے اسی بدہیئت شخص کو نکلتے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک مٹی کی ڈولی سی پکڑ رکھی تھی، جس کے اُوپر کپڑا لپٹا ہوا تھا۔ اب اس نے کوئی بھی چادر اپنے اُوپر نہیں اوڑھ رکھی تھی۔ اسے نکلتے دیکھ کر میں یہی سمجھا تھا کہ وہ شاید میرے پکارنے پر ہی نکلا تھا مگر اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اور اسی صحن کے اسی گوشے کی طرف بڑھ گیا، جہاں ''کیچ'' پھیلی ہوئی تھی۔

پھر میں نے اسے وہاں ڈولی کو اُلٹاتے ہوئے دیکھا، ڈولی کے اندر شاید کوئی گدلا سا پانی تھا اور اس کے اندر وہی کینچوے ٹائپ کیڑے نکل کر کیچ میں گر رہے تھے، وہ کیڑے خاصے پھولے پھولے اور موٹے ہو رہے تھے، جیسے کسی کا خون چوس کر موٹے ہو رہے ہوں۔

''جونک......''

میرے ذہن میں ابھرا اور میں سرتاپا کانپ اُٹھا۔ یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ شخص ان جونکوں سے کیا کام لیتا تھا؟ مجھے کراہیت سی ہونے لگی۔ میں آنکھیں پھاڑے اسی طرف دیکھنے لگا، وہ جونکوں کو کچھ ڈالنے لگا۔ اس کے بعد وہ اندر جانے کے بجائے میری جانب بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے اس گوشے کی آڑ سے کسی کے ہولناک انداز میں چیخنے کی آواز ابھری۔ چیخ نسوانی تھی۔ میری روح تک فنا ہوگئی۔

وہ میرے قریب آگیا۔ اس کا مکروہ چہرہ ایک بار پھر میرے قریب تھا۔ مجھے کراہیت سی ہونے لگی، جی اُلٹنے لگا۔ اس کے ادھ کٹے بدہیئت ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

وہ ڈولی میرے قریب سرہانے رکھ کے پھر اسی آڑ کی طرف پلٹ گیا۔ میں اس قدر گنگ تھا کہ اسے مخاطب بھی نہ کرسکا تھا یا پھر شاید میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے اور مجھ سے دور ہی رہے، مگر اس نے جو غلیظ سی ڈولی میرے سرہانے رکھ چھوڑی تھی، اس میں سے مجھے سخت ناگوار سی بو آنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اسے دوبارہ نمودار ہوتے دیکھا۔ اندر سے اب کسی عورت کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پتا نہیں یہ کیا ماجرا تھا؟ اندر یہ کیسے جونکیں لگا رہا تھا؟

اب اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک آب خورہ نظر آرہا تھا، وہ اسے تھامے میرے قریب آگیا اور اُسے میرے لبوں سے لگانے کے لیے مجھ پر ذرا جھکا تو میں نے اپنا منہ پرے کرلیا اور اس سے بہ مشکل بولا۔

''ی...... ی...... یہ کیا ہے؟''

''دوائی ہے یہ، اسے پی لو...... منش شانت ہوجائے گا......'' وہ بولا۔ کٹے ہوئے ہونٹ کے باعث اس کے الفاظ مکمل نہیں تھے۔

''مم...... میں یہ دوائی نہیں پی سکتا۔'' میں نے انکار کیا تو وہ بولا۔

"تمہاری حالت بہت کھراب ہے۔ اس بار بے ہوش ہوئے تو سیدھا اگلے جہاں سدھار جاؤ گے۔ جونگی بابا کی بات غلط نہیں ہوتی۔ اس پوروائی (بستی) کے لوگوں کو میں زہر بھی پینے کے لیے دوں تو وہ کھوشی کھوشی (خوشی) پی لیتے ہیں، کیونکہ وہ میری ویدیا کو جانتے ہیں اچھی طرح۔ لو شاباش! پی لو دوا......"

"مائی گاڈ، جونگی بابا......" میرے اندر سرگوشی اُبھری۔ کیا یہ کوئی وید یا حکیم تھا؟ مگر یہ کیسا حکیم تھا؟ اتنا بدہیبت اور مکروہ صورت؟ بہرطور اس کی بات نے مجھے فکرمند ضرور کر دیا تھا۔ میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، بجز اس کے کہ اس کی بات مان لیتا۔ میں نے اس طرف منہ کیا، اس نے مٹی کا پیالہ نما آب خورہ میرے کپکپاتے ہونٹوں سے لگا دیا، میں نے لالٹین کی روشنی میں اس بے رنگ دوا کو دیکھنے کی بھی سعی چاہی۔ دوا نہایت کڑوی تھی۔ ایک گھونٹ بھر کے ہی میرا جی متلانے لگا۔ اس نے پھر مجھے دوا پینے پر زور دیا۔

"سانس روکے دوا کو بغیر محسوس کیے پی جاؤ...... ترنت......" وہ بولا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور واقعی میں آنکھیں بند کر کے اور سانس روکے دوا پی گیا۔

"اندر کون ہے؟" بالآخر ذرا دیر بعد میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں نے اب خود کو ذہنی طور پر ان عجیب و غریب حالات کے لیے تیار کر لیا تھا۔ دوا پینے کے بعد میں حیرت انگیز طور پر اپنے اندر ایک توانائی سی دوڑتے محسوس کر رہا تھا اور خرابیِ طبیعت میں بھی کچھ افاقہ ہوتا محسوس کرنے لگا تھا اب......

جونگی بابا...... نامی اس بدہیبت آدمی نے میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر، میرے سرہانے رکھی ڈولی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ایک نظر میرے شانے کے زخم کا جائزہ لیا پھر پُرغور لہجے میں بڑبڑایا۔

"جراثیم کا شدید حملہ......" پھر میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک بھیانک منظر دیکھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ڈولی کے اندر ڈالا اور اس کے اندر سے ایک کلبلاتی ہوئی جونک نکالی، یہ جونک کوئی چار سے پانچ انچ لمبی تھی، اور ہاتھ کے انگوٹھے کے برابر اور اسی جیسی لگتی تھی۔

"ی ی...... ی...... یہ...... کک...... کیا کر رہے ہو تم میرے ساتھ؟" میں لرزیدہ سی آواز میں بولا۔

"ششش......" اس کے منہ سے نکلا اور پھر اس نے وہ جونک میرے ایک زخم پر رکھ دی۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک لرزتی ہوئی چیخ سی خارج ہو گئی۔ ایسا میرے ساتھ پہلی بار ہو رہا تھا۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ جونک میرے زخم کے ساتھ چپک گئی اور شاید میرا خون چوسنے لگی تھی اب......

"ششش...... ششش، چیخو مت، تمہارے دشمن ادھر کو آ نکلیں گے۔" اس نے کہا اور پھر ڈولی کے اندر ہاتھ ڈال کر دوسری اور پھر تیسری جونک نکال کر میرے کھلے زخم پر لگاتا چلا گیا۔

جونکوں سے علاج کے سلسلے میں میری بھی فقط اتنی ہی معلومات تھی جتنی کہ ایک عام آدمی کی ہو سکتی تھی۔ یعنی آج کے جدید دور میں بھی کہیں کہیں جونکوں سے علاج کیا جاتا تھا۔ یہ جسم سے گندہ خون چوس لیتی تھیں۔ تھوڑی اضافی معلومات کے مطابق میں نے تو یہاں تک بھی سن رکھا تھا کہ جدید سائنس کے اس دور میں بھی بعض ترقی یافتہ ممالک میں سرجن ڈاکٹرز، سرجری کے دوران، انسانی رگوں میں جمنے والے خون (کلوٹس) کو ختم کرنے کے لیے بھی ان جونکوں کو استعمال کرنے لگے تھے۔ ویسکیولر ہارٹ سرجری میں آنے والے ایسے کلوٹس رکاوٹ بنتے تھے تو انہیں جونکوں کے ذریعے ری موو (Remove) کر دیا جاتا تھا اور پھر باآسانی سرجری کا عمل کامیابی سے آگے بڑھایا جاتا تھا۔ عجیب بات تو یہ تھی، جونک چپکانے کا عمل اپنی جگہ ایک خوفناک سا تاثر تھا، لیکن اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ جونک کے منہ سے خارج ہونے والا ایک مخصوص مواد اس کی وجہ تھی، جو اس "لوکل اینستھیسیا" کا کام کرتی تھی، یعنی اس جگہ کو ہی بے حس کر ڈالتی تھی اور مریض کو کوئی درد یا تکلیف، خون چوسنے کے دوران میں نہیں ہوتی تھی۔

مگر یہاں بات کچھ اور تھی یہ کسی ترقی یافتہ ملک کے اسپتال کا کوئی جدید آپریشن تھیٹر نہ تھا۔ یہاں یہ سب ہوتے دیکھ کر میرا تو دم ہی باہر کو آنے لگا تھا۔ وہ جونگی بابا، جو وید کا دعوے دار تھا، یہ سب کچھ بڑے آرام سے کیے جا رہا تھا۔

لگ بھگ کوئی پانچ یا چھ جونکیں میرے زخم اور جسم کے دیگر حصوں میں چپکانے کے بعد اس نے خالی ڈولی پھر میرے سرہانے کے قریب رکھ دی پھر مجھ سے بولا۔

"اسی طرح شانت پڑے رہو اور جونکوں کو اپنا کام کرنے دو۔ تمہارا زخم جراثیم زدہ ہو گیا ہے۔ اسی کارن تمہیں تیز بخار نے آن لیا ہے۔"

مجھے اب پسینہ آنے لگا تھا۔ بخار کی شدت بھی کم ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے کچھ سکون محسوس کیا تو خود کو تن

بہ تقدیر کرتے ہوئے ایک بار پھر پوچھا۔

”کیا اس طرف اندر بھی کوئی مریض ہے تمہارا......؟“

”ہاں! ایک کنیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بھی تمہاری ہی کوئی ساتھی ہے......“ جوگی بابا کی اس بات پر میں ایک دم چونک پڑا۔ میرا خیال سیدھا سوشیلا کی طرف چلا گیا۔

”تت...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میری ساتھی ہے؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”وہ بھی اسی طرح مجھے ساحل پر پڑی ملی تھی، جیسے تم ملے تھے مجھے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس سے میرے دل و دماغ میں اَن گنت سوالات ابھر رہے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”ہم سمندر میں ایک کشتی پر سوار تھے، طوفان میں گھر گئے اور ہماری کشتی الٹ گئی تھی، لیکن میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں اور میری ساتھی زندہ سلامت ساحل تک کیسے آ پہنچے؟“

”تم دونوں یقیناً ساحل کے نزدیک پہنچ چکے ہو گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور...... خوش قسمتی سے طوفانی لہروں نے تم دونوں کو الگ الگ مقام پر ساحل پہ لا کر پٹخ دیا ہوگا۔“

مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا۔ تاہم میں خوش تھا کہ سوشیلا بھی زندہ تھی، بشرطیکہ کہ اگر تو وہی تھی، لیکن وہ زخمی کب تھی؟ میں نے سوچا مگر اس جوگی نسل کے آدمی نے اُسے کیوں جونکیں لگا دی تھیں؟

”میں ایک نظر اس عورت کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ بالآخر میں نے کہا۔ ”اگر وہ میری ساتھی نکلی تو مجھے یقیناً خوشی ہوگی۔ لیکن...... وہ زخمی تو نہ تھی، پھر تم نے اُسے کیوں جونکیں لگائی ہیں؟“ میں نے دیکھا میرے اس سوال پر اس کے ادھ کٹے ہونٹ والے چہرے پہ اسرار بھری سی مسکراہٹ اُبھری۔ بولا۔

”وہ تمہاری ساتھی ہی ہوگی، مگر بہت گھبرائی ہوئی اور ڈری ہوئی ہے۔ شاید تمہیں دیکھے تو خوش ہو جائے وہ کنیا۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے اصل سوال کا جواب دانستہ گول کر گیا تھا، سرِدست میں نے بھی اپنا سوال دہرانا ضروری نہیں سمجھا، میں پہلے اس ”کنیا“ کو دیکھنا چاہتا تھا، آیا وہ سوشیلا تھی بھی یا نہیں۔ میں نے مصلحتاً اس کی تائید ہی میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے تمہاری بات ٹھیک ہی ہو۔ مجھے ایک نظر دکھا دو؟“

”دیکھ لینا کنیا کو...... وہ اب ادھر ہی ہے۔ پہلے تم ہلنے جلنے کے قابل تو ہو جاؤ۔“ وہ بولا۔ نجانے کیوں مجھے اس کے لہجے سے عیاری اور ایک اسرار بھری سی مکاری ٹپکتی محسوس ہونے لگی، یہی وہ وقت تھا جب میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا تھا۔

”آہ...... اوہ......“ اچانک وہی نسوانی چیخ ابھری۔ میں چونک پڑا اور اسی گوشے کی طرف ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ پھر اسی لمحے مجھے کچھ اٹھا پٹخ کی سی آوازیں سنائی دیں، جیسے کوئی اٹھ کر گرتا پڑتا، چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے دیکھا، جوگی بابا جلدی سے اسی طرف لپکا اور اسی وقت میں نے مذکورہ سمت سے کسی کی جھلک ابھرتے دیکھی، میرا دل دھک دھک کرنے لگا، وہ جو کوئی بھی تھی، ابھی پوری طرح منظرِ عام پر بھی نہیں آئی تھی کہ اس جوگی بابا نے اُسے پھرتی کے ساتھ وہیں دبوچ لیا۔ وہ چلائی، میں نے آہنگ پر اپنی سماعتیں مرکوز کر کے اسے پہچاننے کی سعی چاہی تھی مگر نا کام رہا۔ جوگی بابا نے شاید اُسے کچھ اس طرح سے دبوچ لیا تھا کہ وہ گھٹی گھٹی کراہ ہی خارج کر کے رہ گئی تھی۔ میں نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش کی تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا، میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ناطاقتی سی مجھے محسوس ہوئی بلکہ ناطاقتی بھی کیا، مجھے تو یوں لگا جیسے میں بالکل ایک لاش میں تبدیل ہو گیا ہوں، محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک زندہ لاش ...... اپنی اس حالت پر میں اندر سے بُری طرح دہل کر رہ گیا۔ یہ خبیث نجانے میرے ساتھ کیا کھلواڑ کرنے والا تھا یا کر رہا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا پھر میں نے اپنے جسم کے ساتھ چمٹی ہوئی ان منحوس جونکوں کو دیکھا، جو بڑی خاموشی کے ساتھ میرے وجود سے کسی آسیب کی طرح چپکی ہوئی میرا خون چوسنے میں مصروف تھیں۔ تب ہی ایک بات محسوس کر کے میرا ماتھا ٹھنکا۔ میرے جسم پر اس نامراد جوگی بابا نے پانچ چھ جونکیں چھوڑ رکھی تھیں، ان میں سے دو تو میرے زخم سے رستا ہوا گندہ چوس رہی تھیں، لیکن باقی میرے اس حصے پر چپکی ہوئی تھیں جو بالکل صحت مند تھا، یعنی وہاں کوئی زخم نہ تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ مجھے یہیں کھٹکا ہوا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے، یہ خبیث جوگی بابا، کہیں اپنی جونکوں کے ذریعے، میرا علاج کرنے کے بہانے کسی اور مکروہ چکر میں تو نہیں تھا؟ اگر تو سوشیلا بھی اس کے قبضے میں تھی۔ چونکہ وہ زخمی بھی نہیں تھی تو کیا، اُسے بھی صحت مند خون سے ان جونکوں کو ”سیراب“ کیا

جارہا تھا......؟ مگر کیوں......؟ نجانے یہ کیا پراسرار چکر تھا۔ اگرچہ میں اپنی تکلیف اور بخار وغیرہ میں کافی بہتری محسوس کررہا تھا لیکن ہلنے جلنے سے یوں قاصر ہوگیا تھا جیسے پتھر کا بن کر رہ گیا ہوں۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ اس سیال مادہ دوا پینے سے تو نہیں ہوا تھا؟ یقیناً یہی بات ہوگی، مگر اس دوا کے پینے سے مجھے افاقہ بھی تو محسوس ہوا تھا۔ ممکن ہے یہ دوا دہری تاثیر والی ہو؟

بہرحال جو کچھ بھی ہورہا تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔ میں نے جوشِ غیظ سے ایک بار پھر اپنے جسم کو حرکت دینی چاہی مگر قاصر رہا، مارے بے بسی کے میں اندر ہی اندر بری طرح تملا کر رہ گیا۔ مجھے جیسے اپنی حالتِ زار پہ خود ہی رونا سا آنے لگا تھا۔ ایک مصیبت سے چھٹکارا ملا تو دوسری گلے کو آن پڑی تھی اور وہ بھی ایسی عجیب و غریب کہ میں ابھی تک اس کی کوئی توجیہہ پیش کرنے سا قاصر ہی تھا۔

میری نظریں اسی گوشے کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری، میں نے جوگی بابا کو وہاں سے نمودار ہوتے ...... دیکھا اور چونک پڑا...... اس کے ہاتھ اور چولے دار قمیص جو خستہ حالت کی، خون سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے قریب جھولتے ہوئے ایک چیتھڑے دار کپڑا اچکا اور اس سے اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔ اسے خون میں لتھڑا ہوا پا کر مجھے یہ سوچ کر ہول سا آگیا کہ کہیں اس بدبخت نے اُس عورت (وہ جو کوئی بھی تھی) کو جان سے تو نہیں مار ڈالا؟

میں نے منہ سے آواز خارج کی، شکر تھا کہ میں بول سکتا تھا، میں نے اپنی طرف سے چلا کر کہا۔ "تت...... تم نے اس عورت کے ساتھ کیا کیا ہے؟ اور...... اور یہ میرے جسم کو کیا ہوگیا ہے؟ میں ہل جل بھی نہیں سکتا۔" آواز میرے حلق سے زور لگانے کے باوجود بس اتنی ہی خارج ہو سکی تھی کہ وہ اس تک پہنچ جاتی۔ اس مردود نے ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی تھی اس کے بعد وہ اپنے کام میں مگن ہوگیا۔

کنج کے قریب کئی ڈولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا اس کے بعد ایک ڈولی اُٹھا کر وہ میری طرف بڑھا۔ جھک کر میرے زخموں کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا، وہ جھک کر ان جونکوں کو زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا جو میرے جسم کے نسبتاً صحت مند حصے سے چمٹی خون چوس رہی تھیں۔ پھر اس نے بڑے مخصوص طریقے سے وہ جونکیں میرے جسم سے الگ کیں تو میں نے دیکھا وہ خاصی پھول کر کپا ہورہی تھیں۔ گویا میرا خون چوس چکی تھیں۔ ان جونکوں کو اس نے ڈولی میں ڈال دیا اور آڑ کی طرف بڑھ گیا۔ ذرا دیر بعد واپس لوٹا، کنج کی طرف گیا وہاں سے ایک اور ڈولی اٹھائی اور دوبارہ میری طرف بڑھا۔ اس دوران میں نے اپنے ہاتھوں پیروں اور جسم کو حرکت دینی چاہی مگر بے سود......

وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ اب اس نے میرے زخموں سے چپکی ہوئی جونکیں الگ کیں اور ڈولی میں ڈال دیں، تھوڑی دیر بعد وہ ان پر کسی مرہم کا لیپ کرنے لگا۔ میں نے اپنے طیش پر مصلحتاً قابو پا رکھا تھا۔ کیونکہ ابھی میں اس کے رحم و کرم پر ہی تھا۔ وہ ایسی حالت میں میرے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ میری کسی بات کا جواب نہیں دے رہا ہے تو میں نے بالآخر اس سے قدرے لجاجت آمیز انداز میں کہا۔

"کیا تم نے اس عورت کو مار ڈالا ہے؟"

"ششش...... یہ پاپ ایک وید کبھی نہیں کرسکتا۔" اس نے جواب سرگوشیانہ لہجے میں جواب دیا تو مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔

"تو پھر یہ خون...... تمہارے ہاتھوں اور کپڑوں میں جو نظر آرہا ہے، کس کا ہے؟"

"اُسی کنیا کا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وہ پتا نہیں کیوں مجھ سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہے، اس کے شریر سے جونکیں الگ کرنے کے دوران اس نے مچلنا شروع کردیا تھا تو ایک دو جونکیں دب کر پھٹ گئی تھیں۔ سسری نے اپنا ہی تازہ خون ضائع کردیا۔ چ...... چ......" مجھے اس کے بولنے کا یہ انداز نہایت مکروہ اور بھیانک لگا۔

"مجھے اسے دیکھنے دو...... تاکہ تسلی تو ہوجائے میری کہ وہ میری ساتھی ہے یا نہیں؟" میں نے بہ دستور اس کے بدہیئت چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو اچانک ایک تیز سی آواز ابھری۔

"جوگی بابا! اندر آسکتا ہوں؟" یہ ایک مردانہ آواز تھی جو مڑھی کے باہر سے آئی تھی۔

"ہاں...... ہاں! نندو آجاؤ اندر۔" جوگی بابا نے بھی اندر سے ہی ہانک لگائی تو اس کے کچھ ہی دیر میں ایک موٹا تازہ اور ٹھگنا سا سیاہ رو شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور گول تھیں۔ عام سی شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ وہ ہمارے قریب ہی چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کی بنی ہوئی ایک ٹوکری سی تھی۔

"اوہ...... ہو...... لگتا ہے نیا شکار ہاتھ لگا ہے۔ آج تو تازہ اور بہت سا مال لے کر ہی جاؤں گا۔ مہارانی صاحبہ تو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کھوس ہوجاویں گی۔" اس موٹے ٹھگنے آدمی کی بات نے مجھے ایکا ایکی ایک تشویش آمیز اُلجھن میں ڈال دیا۔ اس کے بولنے کا انداز اور "شکار" کا لفظ استعمال کرنا، مجھے کسی ہولناک خطرے کی غمازی کرتا محسوس ہوا تھا۔ نجانے یہ کون سی مہارانی کا چیلا تھا؟ لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی بات پر جوگی بابا کے مکروہ چہرے پر ایک دم کرختگی کے تاثرات اُبھر آئے اور پھر وہ اس سے اسی لہجے میں اپنی اکلوتی آنکھ سے گھور کر بولا۔

"اُلٹی سیدھی بکواس مت کر تندوے، ای ہمرے مہمان ہیں۔ زخمی اور بیمار ہیں بے چارے۔"

"اچھا...... اچھا، ناراض کیوں ہوتے ہو سوامی جی! چھما کر دو۔" تندو بہ یک ترنت مکارانہ فروتنی سے بولا تو جوگی بابا نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور اُسی گوشے کی طرف بڑھ گیا۔ میں حیران و پریشان انہیں جاتا دیکھتا رہا، تھوڑی دیر انہیں وہاں لگی تھی، جب یہ دونوں دوبارہ وہاں سے برآمد ہوئے تو میں نے دیکھا، تندو کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گھی کی ٹوکری خاصی پھولی ہوئی دکھائی دینے لگی تھی۔ تندو خوش خوش چلا گیا۔ جوگی بابا نے وہیں کھڑے کھڑے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد عجیب سے اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں مجھے ایک خبیثانہ قسم کا کمینہ پن محسوس ہوا۔ میں نے کہا۔

"آخر یہ سب کون سا چکر چلا رہے ہو تم؟ مجھے جانے دو یہاں سے۔ اب میری طبیعت کافی بہتر ہے۔ تمہارا شکریہ۔" میرا انداز اس سے جان چھڑانے کا سا تھا۔ وہ چند قدم میری طرف چل کر آیا، پھر بولا۔

"ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، جب ٹھیک جاؤ تو چلے جانا۔"

"سچ سچ بتاؤ، تم نے میرے ساتھ کیا کیا ہے؟" میں نے اس کی طرف گھورنے والے انداز میں کہا۔ "میں اپنے جسم کو ذرا سی بھی حرکت دینے سے قاصر ہو گیا ہوں۔ مجھے حاجت کی ضرورت ہے۔" بالآخر میں نے آخر میں چالاکی سے کہا۔ وہ بولا۔

"میں نے تمہارے ساتھ کچھ نہیں کیا، تمہارا علاج کر رہا ہوں۔ حاجت ادھر ہی کر دو۔" وہ بے پروانہ انداز میں یہ کہتا ہوا، اسی طرف بڑھ گیا۔ میرا جی چاہا اسے خوب گالیاں دوں، مگر میں اسے غصہ دلانا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی اسے ناراض کرنا میرا مقصد تھا۔ ہو سکتا تھا، جب تک مجھے کوئی موقع ملتا یہ غصے میں آ کر پہلے ہی کچھ اور برا میرے ساتھ کر ڈالتا۔ میں بے بسی کے مارے خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ چلا گیا، وقت گزرتا رہا۔ نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے، اسی مصداق مجھے بھی نیند سی آنے لگی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا یا پھر شاید آخری تھا، کیونکہ صبح کاذب کی روشنی کا ہلکا ہلکا اُجالا سا مجھے اس منحوس مڑھی کے صحن کے اندر پڑتا محسوس ہونے لگا تھا۔ لالٹین کی لو خود ہی مدھم ہو گئی تھی، شاید اس میں تیل ختم ہونے لگا تھا یا پھر کوئی اور وجہ رہی ہو۔ ابھی میں نیم غنودگی کے عالم میں ہی تھا کہ اچانک میں نے صحن میں اندھیرا ہوتے دیکھا اور خنک ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ اسی وقت کڑاکے کی آواز ابھری اور تیز بارش ہونے لگی۔ لالٹین کی لو بجھ چکی تھی۔

یہ شاید کوئی بارانی علاقہ تھا یا پھر ساحل سمندر کے قریب ہونے کے باعث یہاں ہر وقت بارش کا ہی سماں بندھا رہتا تھا۔ میری نیند ٹوٹ سی گئی، یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا، میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کو ہلانے جلانے کی کوشش جاری رکھی، تب ہی مجھے لگا کہ میں اپنے دائیں پیر کا انگوٹھا ہلانے میں کامیاب رہا ہوں، یہی حال میرے دائیں ہاتھ کی اُنگلیوں کا ہونے لگا۔ میں انہیں تھوڑا تھوڑا ہلا رہا تھا۔ بے سدھ وہ بے حرکت پڑے وجود کو تھوڑا ہلتے جلتے دیکھ کر میرے اندر ایک نئے حوصلے اور امید بھری مسرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے اپنی ہی کوشش جاری رکھی، شاید جو دوا میں نے پی تھی اس کا اثر زائل ہونے لگا تھا، اور اب میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اس دوا کو پینے سے صاف انکار کر دوں گا۔

میں نے اپنے جسم کو "وارم اَپ" کرنے کی یہ "ایکسرسائز" جاری رکھی۔ اب میرا گھٹنا بھی ذرا حرکت کرنے لگا تھا، دوسرے ہاتھ کی اُنگلیوں میں بھی حرکت پذیری جاگنے لگی تھی۔ میری یہی کوشش تھی کہ اس خبیث آدمی جوگی بابا کے نمودار ہونے سے پہلے ہی میں چلنے پھرنے کے لائق ہو جاؤں۔ بارش بدستور جاری تھی اور رہ رہ کر بادلوں کے ہولناک انداز میں گرجنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں نے اپنی کوشش جاری رکھی ہوئی تھی، میں کافی حد تک اب اپنے جسم کو ہلانے جلانے کے قابل ہونے لگا تھا، لیکن ابھی میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پا رہا تھا کہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ لہٰذا میں نے صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھا۔ کیونکہ میری کوششیں رنگ لاتی محسوس ہو رہی تھیں، کچھ دوا کا زائل ہوتا اثر اور کچھ میری اپنی کوشش تھی کہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں خاصی حد تک اپنے جسم کو حرکت دینے کے قابل ہو گیا۔

اس دوران بارش کا زور بھی ٹوٹنے لگا تھا، اگرچہ پوری طرح رکی نہیں تھی، البتہ بجلی کی چمک اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں کافی حد تک معدوم ہو چکی تھیں۔

اچانک میری تھکی ہوئی سماعتوں سے ایک عجیب سی آواز ٹکرائی۔ میں چونکا، یہ کراہتی ہوئی سی آواز تھی۔ میں نے گردن گھما کر اسی گوشے کی طرف دیکھا تو مجھے کوئی شے سی رینگتی ہوئی نظر آئی۔ میں ٹھٹکا اور یک ٹک اسی طرف دیکھنے لگا، نجانے وہ کیا شے تھی؟ اندھیرے کے باعث پورے طور پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ دوبارہ اندر کو سرک گئی۔ خدا جانے کیا شے تھی وہ؟ میں اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر دوبارہ اپنی ایکسرسائز میں مصروف ہو گیا۔

معاً مجھے یوں لگا جیسے کوئی گھسٹ گھسٹ کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے فوراً آواز کی سمت دیکھا اور دہل سا گیا۔ فرش پر، میری چارپائی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک استخوانی سا وجود، ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا میری چارپائی کے قریب آ رہا تھا۔ اس کی حالت کسی انسانی ڈھانچے جیسی ہی تھی، جسم ہڈیوں کا پنجر تھا، کھال سوکھ کر ہڈیوں کے ساتھ چپکی ہوئی نظر آتی تھی۔ بال جھڑے ہوئے تھے، سر گنجا اور آنکھیں حلقوں سے باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ رنگت سیاہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ بہ مشکل ہاتھوں پیروں کی مدد سے تقریباً گھسٹنے کے انداز میں ہی میری چارپائی کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میں یہ ہولناک سا منظر دیکھ کر لرز سا گیا۔ خدا جانے یہ کیا عجیب سی بلا تھی، لیکن جلد ہی مجھے یہ ادراک بھی ہوا کہ یہ بے چارہ تو خود کسی خون چوسنے والی بلا کے زیر اثر رہ چکا ہے شاید...... وہ میری چارپائی کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔

''ک ک... کون؟ کون ہو تم؟'' اس سے مخاطب ہوتے ہوئے میرا لہجہ بھی لڑکھڑا سا گیا۔ اسی وقت آڑ سے جوگی بابا نمودار ہوا۔ وہ خاصا غصے میں تھا۔ شاید اسی عجیب آدمی کو ڈھونڈتے ہوئے وہ اس طرف نکلا تھا۔ پھر اس پر نظر پڑی تو وہ چلایا۔

''او...... بدبخت! چل اندر......'' اس کی آواز پر وہ عجیب آدمی چونکا اور باریک سی کمزور آواز میں چیختا ہوا مڑھی کے دروازے کی طرف کو لپکا، مگر وہ بے چارہ ابھی راستے ہی میں تھا کہ جوگی بابا نے اس کا راستہ روک لیا اور اُسے بری طرح پیٹنے لگا، ساتھ ہی غصے میں بڑبڑاتا بھی جاتا۔

''اب تو میرے کام کا نہیں رہا، لگتا ہے تیری چتا بھی اب جلانا پڑے گی۔''

وہ استخوانی نما آدمی جو پہلے ہی نڈھال اور سوکھی سڑی لاش بنا ہوا تھا، بے دم سا ہو کر چت لیٹ گیا۔

''مر گیا......'' جوگی بابا ہانپنے کے انداز میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ وہ بدنصیب انسان شاید واقعی مر گیا تھا جو پہلے ہی ادھ موا ہو گیا تھا۔ اسی وقت جوگی بابا نے سر...... گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی باہر کو اُبلتی ہوئی اکلوتی آنکھ میں مجھے سفاک چمک محسوس ہوئی جس نے مجھے اندر سے لرزا سا دیا۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے چند ثانیے تکتا رہا، میں نے دانستہ اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ پھر میں نے اس کے قدموں کی چاپ سنی، میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ میری چارپائی کے قریب آ کر غور سے میرا جائزہ لینے لگا۔ اس خبیث کو اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے بھی دھیرے دھیرے اپنی گردن اس کی طرف موڑ کر دیکھا تو اس کی اکلوتی بھیانک سی آنکھ بڑے غور سے میرے جسم کو تکے جا رہی تھی، یوں، جیسے اس کا ایکسرے کر رہی ہو...... پھر وہ میرے ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا، میں نے بھی جان بوجھ کر اسے یہی تاثر دیا کہ میں واقعی ابھی تک بے حس و حرکت ہوں۔

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں اس مردود کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟ لہٰذا میں نے اس کا دھیان اپنی طرف سے ہٹانے کی خاطر اسے باتوں میں لگانے کی کوشش چاہتے ہوئے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یہ کون تھا غریب؟ اس کے تو جسم میں خون ہی نہیں تھا اور گوشت بھی برائے نام منڈھا ہوا تھا اس کی سوکھی ہڈیوں پر......؟''

''ہوں ں......'' اس نے ایک ہنکاری لی تو میں نے اس سے پھر دگرگوں آواز میں کہا۔

''میں ابھی تک کوئی حرکت نہیں کر پا رہا ہوں...... آخر ایسا کب تک ہوگا میرے ساتھ؟'' مگر وہ میری بات کا جواب دینے کے بجائے، خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور دوبارہ اسی گوشے میں غائب ہو گیا، ذرا دیر بعد لوٹا تو میں سنسنا اُٹھا اس خبیث کے ہاتھ میں وہی آب خورہ تھا، جس سے یہ مجھے علاج کے نام پر کوئی ایسی دوا پلاتا تھا، اسے پیتے ہی میرا جسم بے حس و حرکت ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے بھی اس بار پکا تہیہ کر لیا تھا کہ یہ دوا نہیں پیوں گا، میں نے ایک بار پھر اپنے جسم اور ہاتھوں پیروں کو ہلا جلا کر دیکھا تو میرے اندر ایک جوش آمیز سی مسرت جاگی، میری جسمانی طاقت زیادہ نہیں تو کسی حد تک ضرور بحال ہو گئی تھی۔ تاہم مجھے لگتا یہی

تھا کہ اس خبیث جوگی کو اس بات کا شبہ ہو چلا تھا کہ اس کی دوا کا اثر زائل ہونے لگا ہے۔ اب وہ دوبارہ ایک اور پیالہ لیے آرہا تھا۔

اس خبیث سے درانہ وار بھڑ جانے کو میں تیار تھا۔ چاہے جتنی بھی سکت مجھ میں اس سے مقابلہ کرنے کی بحال ہوئی تھی میں اُسے بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے میرے اعصاب یکلخت تن گئے پھر وہ میرے قریب آگیا اور مجھ پر ذرا جھک کر وہ آب خورہ میرے ہونٹوں کے قریب کیا تو میں بولا۔

”نہیں...... مجھے اب اس دوا کو پینے کی ضرورت نہیں ہے، میں ٹھیک ہوں۔“

”انکار مت کرو...... تمہیں یہ دوا پینا پڑے گی۔“

اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور زبردستی آب خورہ میرے ہونٹوں سے لگایا تو اب میرے پاس حرکت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا منہ پرے کر دیا اور ساتھ ہی اپنے دائیں ہاتھ کا ایک گھونسا اس کے جھکے ہوئے مکروہ چہرے پر جڑنے کی کوشش چاہی، میرا ہاتھ اُوپر اُٹھ بھی گیا تھا اور اس کے چہرے سے لگا بھی تھا، مگر اس کی ضرب میں خاطر خواہ طاقت نہیں رہی تھی۔ بس، اتنا ہوا کہ اس کا چہرہ ذرا گھوما تھا اور آب خورے والا ہاتھ ہل گیا تھا، مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور دوسرے ہاتھ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ کم از کم آب خورے سے ٹکرا جائے اور یہی ہوا بھی...... آب خورہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا، ساری دوا میرے اُوپر برہنہ بدن پر بہہ گئی، لیکن میں نے دیکھا اس دوا کے محلول کے ساتھ ننھے طفیلیے قسم کے کیڑے بھی تھے، جو میرے برہنہ بدن پر رینگنے لگے، تب مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مجھے اس دوا میں ننھی جونکیں بھی پلائی جارہی تھیں۔ اس تصور سے ہی میں لرز اُٹھا کہ کہیں، پہلے والی جو دوا مجھے اس خبیث شیطان نے پلائی تھی، کہیں اس میں بھی تو یہی ننھی جونکیں نہیں تھیں؟

جوگی بابا نے ایک غصیلی غراہٹ حلق سے خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ جس کی تکلیف کا مجھے بس! ہلکا سا ہی احساس ہوا تھا۔ لیکن مجھ پر جنون آمیز طیش سوار ہو گیا تھا، میں نے ایک ہاتھ سے لیٹے لیٹے اس کی گردن دبوچ لی اور اسی کے سہارے چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہونے کی سعی چاہی تاکہ میں اسے اپنے بھاری کڑیل بدن کے بوجھ تلے زیر کرنے کی کوشش کر سکوں...... میں اپنی سی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوا کیونکہ میں چارپائی سے نیچے گرا تو وہ بھی میرے نیچے دب گیا، میں نے اپنے مفلوج پڑتے وجود کی رہی سہی بحال شدہ ساری طاقت کو ایک ہاتھ میں مجتمع کیا اور اس کی گردن دبوچتا چلا گیا۔ اس کے حلق سے خرخراتی سی آوازیں برآمد ہونے لگیں، مگر اس خبیث نے وہی پرانا داؤ کھیلا، یعنی میرے زخمی شانے کو اپنے ناخنوں سے کھرچ ڈالا، لیکن وہ شاید یہ بھول گیا تھا کہ مجھے ہر قسم کے درد سے اسی نے ہی ”بے حس“ کیا تھا اور وہی میرے کام بھی آیا، مطلب مجھے کچھ زیادہ تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا، لیکن میں نے اس کی گردن نہیں چھوڑی۔ وہ میرے ہاتھ کے شکنجے میں پوری طرح کسی جا چکی تھی، اس نے دوسرا داؤ کھیلا اور اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا سکیڑ کر اس کی زوردار ضرب میرے زیرِ ناف رسید کر ڈالی، یہاں مجھے تکلیف کا احساس ہوا اور میں درد سے دہرا ہو گیا، ہاتھ کی گرفت کمزور پڑتے ہی وہ کم بخت چکنی مچھلی کی طرح اپنی گردن میرے کمزور پڑتے ہاتھ کے شکنجے سے چھڑا گیا اور ساتھ ہی اس نے اپنے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میرا سر پکڑ کر زور سے فرش پر دے مارا، میرے منہ سے تیز چیخ خارج ہو گئی، مگر میں نے اپنے حواسوں کو قابو رکھا اور اس تکلیف کو سہہ گیا، وہ اُٹھ کر بھاگنے لگا تو میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی وہ منہ کے بل گرا اور اس کے حلق سے کریہہ چیخ خارج ہو گئی، میں پھر لیٹے لیٹے اس پر اچھل کر جا پڑا...... اس کشاکشی میں میرے جسم کی باقی ماندہ قوت بھی لوٹ آئی تھی اور میں نے اسی کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے ساتھ کیا تھا، میں نے بھی اس کا سر بالوں سے دبوچ کر بڑے زور سے فرش پر دے مارا۔ اس کے حلق سے بڑی کریہہ انگیز چیخ خارج ہوئی تھی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کا سر بری طرح پھٹ گیا تھا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔ میں اس مردود کو اسی حال میں چھوڑ کر اٹھا تو مجھے چکر سا آگیا، میں نے سہارا لینے کے لیے مڑھی کے ایک بدنما بانس کا سہارا لیا اور ذرا دیر کھڑا ہو کے اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگا۔ شکر تھا کہ میں اب اپنے قدموں پر کھڑا تھا، مگر کمزوری اب بھی محسوس کر رہا تھا۔ نجانے کیا بات تھی کہ میرا جی متلانے لگا تھا، پیٹ میں گراہیں سی پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ میں نے ذرا دیر اسی بانس کو تھامے رکھتے ہوئے کھڑا رہا اور سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ ذہن پر طاری ہونے والی دھند

ذرا چھٹی تو میں نے ایک قدم آگے، بغیر کسی سہارے کے بڑھایا، میری ٹانگوں میں ابھی تک لڑکھڑاہٹ سی تھی، تاہم میں نے ہمت کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اسی گوشے کی طرف بڑھا۔

قریب پہنچ کر میں ذرا رکا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا اندر وہ کون عورت تھی، جو شاید میری ہی طرح اس مصیبت کا شکار رہی تھی۔ میں نے پیوندزدہ سا کپڑا ایک طرف ہٹایا اور اندر داخل ہوگیا۔ سامنے نگاہ پڑی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

☆☆☆

اندر بھی اتنا ہی بڑا گوشہ تھا، جتنا کہ باہر صحن کا تھا بلکہ یہ شاید مڑھی کا کوئی عقبی حصہ تھا۔ اُوپر چھت کی طرف روشندان کے نام پر ایک چھوٹا سوراخ تھا، جہاں سے دن کی ہلکی روشنی اندر پڑ رہی تھی، ورنہ تو یہاں بھی اندھیرا سا ہی تھا۔ شاید آسمان پر ابھی تک کالے بادلوں کا جمگھٹا تھا مگر یہاں نجانے کیا کاٹھ کباڑ اور الا بلا بکھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ، ایک طرف کونے میں اسی طرح کا ایک کیچڑ سا بھی پھیلا ہوا تھا جس کی حد بندی مٹی کی منڈیر بنا کر کی ہوئی تھی، وہاں یقیناً اس مردود جوگی بابا نے جونکیں پال رکھی تھیں۔ جونکوں کا گویا خود ساختہ ''فارم'' سا بنا رکھا تھا، کیونکہ وہاں مجھے مٹی کی ادھ کھلی بوریاں بھی رکھی نظر آئی تھیں۔ ایک طرف کونے میں مجھے چرمی تھیلیاں اور دوائیں وغیرہ گھوٹنے کا سامان نظر آیا۔ یہاں دو تین جھلنگا سی کھری چارپائیاں بھی بچھی ہوئی تھیں، دو خالی تھیں ایک پر میں نے کسی کو دراز پایا، وہ کوئی جوان عورت تھی، جس کا اُوپری بدن بالکل برہنہ تھا اور اس کے گورے جسم پر جونکیں چپکی ہوئی تھیں، میں یہ منظر دیکھ کر دہل سا گیا، تاہم آگے بڑھا۔ قریب پہنچا تو بری طرح چونکا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہوا تھا وہ عورت سوشیلا ہی تھی، وہ نیم بے ہوش سی تھی، اور ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھتے ہی فوراً اس کی طرف بڑھا اور اسے آوازیں دیں۔

''سس...... سوشی! ...... سوشیلا......!'' میری آواز پر اس کے حلق سے زور سے کراہنے کی آواز خارج ہوئی تھی اور پھر اس نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی حالت بھی میری طرح ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور اس نے کچھ بولنے کی سعی چاہی تھی کہ اچانک مجھے باہر کچھ شور زدہ سی آوازیں آتی سنائی دیں۔ یہ آوازیں بھاری گاڑیوں کی تھیں۔

''دشمن'' میرے تھکے ہوئے ذہن میں اُبھرا اور میرے خون کی گردش یکلخت تیز تر ہوگئی۔ اس دوران سوشیلا نے نحیف سی آواز میں مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی، مگر میرے پاس اب اس کی بات سننے کا کہاں وقت تھا...... میں نے ایک قریب پڑی چادر اٹھا کر اسے دی اور کہا۔ ''سوشی! دشمن یہاں آن پہنچے ہیں، ہمت کرو، میری اپنی حالت بھی ٹھیک نہیں......'' میری بات پر اسے بھی مخدوش صورتِ حالات کا اندازہ ہوا اور وہ اپنی ساری تکالیف بھلا کر اُٹھ بیٹھی۔ جونکیں ہنوز اس کے جسم سے چپکی ہوئی اس کا خون چوسنے میں مگن تھیں اور یہ اتنی آسانی سے چھوٹنے والی نہیں تھیں، بہرطور اس نے ہمت دکھائی اور میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''یہ تو کسی دیسی ساختہ وید کا جھونپڑا معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہاں کہاں آئے ہوں گے؟'' مجھے ایک کرخت سی آواز سنائی دی اور اس آواز کو پہچاننے میں مجھے چنداں دیر نہ لگی تھی، یہ ادھیڑ عمر چندر ناتھ تھا، بلیک کلسی کے کرنل سی جی بجوانی کا قریبی دستِ راست تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ پہلے والے خونی معرکے کے بعد دشمنوں کی نئی ''کھیپ'' پہنچ چکی تھی، یہ سوچ کر میرا پورا وجود سنسنا اُٹھا تھا۔

''شکار چھپنے کے لیے ایسی ہی جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمیں اندر داخل ہونا چاہیے......'' یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔ اپنے سفاک اور درندہ صفت دشمنوں کے مشترکہ ٹولے کو یہاں پا کر میرا پورا وجود سنسنا اُٹھا...... ایک بار پھر میں اور سوشیلا بدترین اور مخدوش تر صورتِ حالات کا شکار ہونے لگے تھے۔ ایسا اس مردود جوگی بابا کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس خبیث شیطان نے نجانے اپنے کون سے گھناؤنے مقصد کی خاطر نہ صرف مجھے اور سوشیلا کو ''جونک زدہ'' بنا ڈالا تھا بلکہ یہاں کل رات سے مقید کر کے ہمارا بہت سا وقت بھی برباد کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں ہمارے خطرناک دشمنوں کا مشترکہ ٹولہ ہماری تلاش میں بالآخر یہاں تک بھی آن پہنچا تھا۔ اب صورتِ حالات انتہائی کشیدہ تھی، یعنی میرے پاس تو ہتھیار نام کی کوئی شے تک نہ تھی...... جبکہ باہر دشمنوں کی خاصی تعداد بھاری اسلحے کے ساتھ موجود تھی۔ اس پر مستزاد میں اور سوشیلا خالی ہاتھ ہی نہیں، بلکہ ''حالتِ غیر'' میں بھی تھے، بے چاری سوشیلا کی حالت تو زیادہ پتلی ہو رہی تھی، اس کے جسم پر تو ابھی تک جونکیں چمٹی ہوئی تھیں، مسلسل اس کا خون پینے میں مصروف

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

تھیں۔

بہرکیف اب کوئی معجزہ ہی ہمیں ان بھیڑیا صفت دشمنوں سے بچا سکتا تھا۔ کیونکہ مفر کی تمام راہیں مسدود... دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے ان کے اندر... آنے کے قدموں کی بھاری آوازیں سنیں، اسی دوران میری عقابی نظریں تیزی سے گرد و پیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ کسی بھی وقت یہاں وارد ہوسکتے تھے۔ میں نے کیچڑ والے حصے کی طرف دیکھا اور کچھ سوچ کر سوشیلا کو لیے تیزی سے اسی طرف بڑھا۔

''سوشی! جان بچانے کا یہ آخری راستہ ہے۔ ذرا حوصلے اور ہمت سے کام لینا اور آواز چاہے جتنی بھی تکلیف کیوں نہ پڑے، منہ سے آواز مت نکالنا۔'' میں نے اس سے کہا اور پھر جتنی تیزی کے ساتھ ایک دو ادھ خالی مٹی کی بوریوں کو کھینچ کر کیچڑ تک لا سکتا تھا، لے آیا اور پھر انہیں وہاں پھیلا کر، سوشیلا کو لیے اس جونک زدہ کیچڑ میں لتھڑ گیا اور ساتھ ہی سوشیلا کو بھی اس میں ڈبو دیا...... اب ہم دونوں کیچڑ میں لتھڑ کر ایک طرح سے ''کیموفلاج'' ہو چکے تھے۔ کیچڑ گہرا تھا، جس کی گدلی سطح ناہموار تھی، یعنی کہیں سے ابھری ہوئی اور کہیں نیچی تھی۔ ایسا مٹی کے ان ڈھیروں کی وجہ سے تھا، جو یہاں جونکوں کا ''فارم'' بنانے کے لیے پھینک رکھی تھی، اب ہم دونوں نے کیچڑ سے اتنا منہ باہر کر رکھا تھا کہ سانسوں کی آمد و رفت جاری رکھ سکیں۔

ٹھیک اسی وقت، میں نے کئی مسلح افراد کو تیزی سے اندر در آتے دیکھا۔ میری ایک آنکھ کیچڑ کے اندر تھی، جسے ظاہر ہے میں نے بند کر رکھا تھا جبکہ دوسری آنکھ باہر...... میں اور سوشیلا کیچڑ سے بُری طرح لتھڑ چکے تھے۔

دشمنوں کے جانے پہچانے چہروں میں مجھے چندر ناتھ، کوریلا، شیام اور سے جی کوہارا دکھائی دیے، دو اور بھی دشمن ساتھی تھے جو میرے لیے ان جانے تھے۔ گویا ''ہائی پروفائل'' دشمنوں کی ''کریم'' میرے سر پہ موجود تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ میری ذرا سی جھلک دیکھتے ہی مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ ڈالتے...... جبکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اس سے زیادہ تعداد میں باہر بھی موجود ہوسکتے تھے۔

''یہاں تو بڑا گند پھیلا ہوا ہے...... بڑی عجیب سی ہی جگہ ہے یہ۔'' میں نے کوہارا کی آواز سنی۔

''یہاں ضرور وہی بدصورت بڈھا... رہتا ہوگا جس کی لاش ہم نے دیکھی تھی۔'' یہ کوریلا تھی۔ میں گویا دم سادھے کیچ میں لیٹا ہوا ان کی باتیں سن رہا تھا، جو میرے لیے حوصلہ افزا تھیں، ساتھ ہی میں یہ بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں سوشیلا کسی وجہ سے چیخ نہ پڑے۔ ہم دونوں جونکوں والی کیچ میں لیٹے پڑے تھے۔ میرے جسم کے ساتھ بھی لاتعداد چمٹ رہی تھیں بلکہ مجھے تو اپنے معدے میں بھی کراہیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''لیکن اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اچھی طرح تلاشی لے لینا چاہیے۔'' شیام کی آواز ابھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ایک ہی رخ پر لیٹا ہوا تھا اسی لیے مجھے محدود حد تک ہی یہ منظر دکھائی دے رہا تھا، پھر میں نے انہیں دائیں بائیں پھیلتے دیکھا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں ان کو اس کیچ پر شبہ نہ ہو جائے۔

مجھے اپنے وجود پر لاتعداد کیڑے سے رینگتے محسوس ہونے لگے، کراہیت اور بدبو کے باعث میرا بُرا حال ہو رہا تھا، مگر جان بچانے کا جذبہ ان سب پر غالب تھا۔ معاً میں نے ایک جونک کو اپنے کھلے منہ کی طرف رینگتے ہوئے آتے دیکھا۔ میری آنکھ کا ایک ڈیلا اسی کی رینگتی ہوئی حرکت دیکھ رہا تھا اور خوف سے پھیل سا گیا۔ انگوٹھے جتنی ایک جونک کیچ پر رینگتی ہوئی میرے کیچڑ زدہ گال پر آ گئی تھی اور اب منہ کی جانب دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ میں نے منہ بند کر دیا اور ناک سے سانس لینے لگا۔ جونک ہونٹ پر آ کر رک گئی اور پھر اس نے ناک کی طرف سرکنا شروع کیا تو میں نے ہولے سے اسے پھونک ماری، مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جونک کا ناک میں گھسنا خطرناک ہوسکتا تھا۔ مجھے چھینک آسکتی تھی۔ پل کے پل میں نے سوچا اور اپنا منہ کھول کر جونک کو چبا ڈالا۔ یہ میری زندگی کا ہولناک اور انتہائی کریہہ آمیز لمحہ تھا۔ جونک چباتے ہی میرا منہ ایک عجیب سے مادے سے بھر گیا تھا۔ میرا جی اُلٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے میں نے معدے کے اندر سے اٹھتی ہوئی قے کو روکے رکھا تھا۔

''واپس چلو...... ہم نے یہاں بہت وقت ضائع کرلیا۔'' چندر ناتھ کی اس آواز نے میرے اندر طمانیت کی لہر دوڑا دی۔ میں نے کچلی ہوئی جونک کو ہولے سے تھوک دیا تھا۔

عین آخری لمحات میں جب یہ لوگ باہر نکل رہے تھے، ایک تیز سسکاری کی آواز ابھری۔ یہ یقیناً سوشیلا کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ ضرور اس کے ساتھ بھی میری طرح کوئی ایسی ناقابلِ برداشت سی صورتِ حال پیش آئی ہوگی۔ میں تو برداشت کر گیا تھا مگر شاید وہ نہ کر پائی تھی۔ تاہم سسکی

کی آواز باریک سی ابھری تھی، لگا یہی تھا کہ اس بے چاری نے اسے روکے رکھنے کی پوری سی کوشش کی تھی، مگر بالآخر وہ اس کے حلق سے برآمد ہو ہی گئی تھی۔ میں سن ہو کر رہ گیا۔

”یہ کیسی آواز تھی؟“ معاً ہی میں نے سے جی کوہارا کو نکلتے نکلتے رکتے پایا۔

”کیسی آواز؟“ چندر ناتھ کا سوالیہ لہجہ تھا۔ وہ شاید باہر نکل چکا تھا اور سب سے آخر میں سے جی کوہارا تھا اور وہ چونک کر رکا تھا۔

”پتا نہیں عجیب سی ہی آواز تھی۔“

”یہاں ہم نے تلاشی لے لی ہے۔ مجھے تو یہاں سخت کراہیت ہو رہی ہے۔ آ جاؤ“

”شاید، میرا وہم ہی ہو......“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لیکن جب ذرا دیر بعد مجھے باہر ایک سے زائد گاڑیوں کے روانہ ہونے کی آوازیں دور ہوتی سنائی دیں تو میں ایک دم کیچ سے اُٹھ گیا اور ایک زوردار اور بڑی سی قے کر ڈالی۔ یہی حال سوشیلا کا ہوا۔ وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قے کرنے لگی تھی، ساتھ ہی اس کے حلق سے عجیب و غریب ہسٹریائی آوازیں بھی برآمد ہونے لگی تھیں۔

میں اپنی زندگی کی بہت ہی عجیب و غریب اور ناقابلِ تصور صورتِ حالات سے دوچار تھا۔

”شش...... شہزی! ی...... ی...... یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا ہے؟ اُف...... میرا تو اب مر جانے کو جی چاہتا ہے۔“ سوشیلا بھی میری طرح بہت سی قے کرنے کے بعد ہانپتے اور روتے ہوئے بولی۔ اس کی سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ میری اپنی حالت غیر تھی، مگر میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”سوشیلا! میں بھی انہیں حالات سے دوچار ہوں، حوصلہ کرو، ہمارے اہم مقاصد کے سامنے ایسی تکالیف کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اگر تم بالکل ہی مایوس اور بددل ہو گئی ہو تو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ تم میرا ساتھ چھوڑ سکتی ہو۔“

بالآخر مجھے یہاں تک بھی کہنا پڑ گیا تھا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے کسی کم ہمتی کا مظاہرہ کرے اور مجھے بھی اپنے ساتھ پھنسا دے، جیسا کہ ابھی ذرا دیر پہلے اس کے حلق سے سسکاری خارج ہو گئی تھی اور دشمن چونک پڑا تھا، مگر قسمت اچھی تھی کہ وہ تلاشی لینے کے بعد خود بھی یہاں سے مایوس ہو چکے تھے اور اسے اپنا واہمہ یا کچھ اور سمجھ کر چلے گئے تھے۔

”نن...... نہیں شہزی! پلیز...... سوری! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ سوشیلا میری بات کا اثر لیتے ہوئے ایک دم بولی۔

”تمہاری بات کا کچھ بھی مطلب ہو سوشیلا......!“ میں نے فوراً اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”تم دیکھ رہی ہو کہ میری اپنی بھی حالت خراب ہے اور یہ محض میں اپنی ہمت، عزم اور قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھالے ہوئے ہوں۔ بے شک تم عورت ذات ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم ان باتوں سے گھبرا کر ایسی ویسی حرکت کر ڈالو، جیسی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کر چکی تھیں، یہ تو قسمت مہربان تھی جو بچ گئے ورنہ تو تمہاری اس حرکت نے ایک جھٹکے میں سب کچھ تمام کر دینا تھا ہمارا......“

سوشیلا کو اس طرح کی تھوڑی سی ”ڈوز“ دینا ضروری تھا۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ رہتے ہوئے ایسے کسی بھی نازک موقع اور صورتِ حالات میں کم ہمتی یا مایوسی کا مظاہرہ نہ کرے۔

”میرے منہ میں اور جسم کے ایک نازک حصے پر جونک رینگنے لگی تھی۔“ وہ بولی۔

”منہ میں آنے والی جونک کو تو میں نے کسی طرح سے تھوک دیا تھا مگر...... جسم کے نازک حصے پر رینگنے والی جونک......“ وہ چپ ہو گئی۔

”اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا، وہ خبیث جوگی بابا میرے ہاتھوں ختم ہو چکا ہے۔ اس کی لاش ادھر ہی پڑی ہوئی ہے اب تک...... ایسا نہ ہو اس وجہ سے ہم ایک نئی مصیبت کا شکار ہو جائیں۔“

”لیکن تمہارا شانہ بری طرح زخمی ہے۔“ وہ میرے زخم کی طرف دیکھ کر تفکر سے بولی۔

”یہاں مرہم پٹی کا سامان موجود ہے۔ ہمیں ان منحوس جونکوں سے بھی جان چھڑانا ہے، جو ابھی تک ہمارے جسم کے ساتھ چپکی ہوئی ہیں۔“

”میں نے ان جونکوں کو نوچنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”یہ کھینچنے سے کبھی نہیں اُتریں گی۔“ اس نے کہا۔ ”گرم دیا سلائی سے ہی الگ کی جا سکتی ہیں۔“

سوشیلا کی بات غلط نہیں تھی، سن میں نے بھی یہی رکھا تھا کہ جونکیں گرم سلاخ یا دیا سلائی سے ہی الگ کرنا ممکن ہوتا ہے۔

"جو بھی ہے ہمیں جلدی یہ سب کچھ انجام دینا ہے۔ اگر کوئی ادھر آ نکلا تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ یہ جوگی بابا اس بستی کا وید کہلاتا ہے اور شاید اس کے یہاں کی کسی مہارانی کے ساتھ بھی روابط ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے تندو نامی اس موٹے ٹھگنے آدمی کے بارے میں بھی بتایا۔

"یہ کوئی گہرا چکر لگتا ہے۔ لیکن ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں، ٹھہرو میں پہلے تمہارے زخموں پہ مرہم لگا دوں۔" سوشیلا نے کہا اور پھر میں نے بھی حرکت کی۔

دوائیوں اور مرہم پٹی کا سامان وہاں موجود تھا۔ سوشیلا نے بڑی مہارت سے میرا زخم صاف کر کے اس پہ مرہم لگایا اور پٹی کر دی، اس نے پٹی کرنے کے دوران بتایا کہ وہ بڑی اچھی نرس بھی رہ چکی تھی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دو تین ماچسیں تلاش کیں اور ایک ایک دیا سلائی جلا کر پہلے میرے جسم کے مختلف حصوں سے جونکیں الگ کیں اس کے بعد میں نے اس کے ساتھ بھی عمل کیا، جبکہ اندرونی حصوں سے اس نے خود ہی یہ کام ایک الگ گوشے میں جا کر انجام دیا۔

ان پیچیدہ مسائل سے چھٹکارا پانے کے بعد کچھ سکون ملا۔ اس کے بعد ہم نے غسل وغیرہ بھی کر کے اپنی حالت کچھ سدھاری۔ شکر تھا کہ یہاں پانی کی کمی نہیں تھی۔

"میں اس مڑھی کو آگ لگانا چاہتا ہوں۔" روانہ ہوتے وقت میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو سوشیلا بھی میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔

روانہ ہوتے وقت ہم نے اس مڑھی کو آگ لگا دی اور جنگل کی طرف نکل گئے۔

☆☆☆

جنگل خاصا گھنا تھا۔ دن میں بھی یہاں اندھیرا سا محسوس ہوتا تھا۔ اگرچہ سورج کی کرنیں چھتنار درختوں اور گل بوٹوں سے لدی پھندی شاخوں کے رخنوں سے چھن کر پڑ رہی تھیں، اسی کی مدد سے ہم راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ فضا جنگلی پرندوں کی مدھریاں چہچہاہٹ سے گونج رہی تھی۔ کبھی کسی جانور کی اُلسائی ہوئی آواز بھی سنائی دے جاتی۔

میری طبیعت گری گری سی ہو رہی تھی۔ جونکیں پیٹ میں چپک کر اپنا کام شروع کر چکی تھیں، یعنی خون چوسنے لگی تھیں، شانے کے زخم میں کافی حد تک افاقہ تو تھا مگر صرف اسی قدر... کہ درد کم تھا، لیکن کیچڑ اور دیگر خرابیِ وقت کے باعث مجھے لگتا تھا کہ زخم خراب ہونے لگا ہے اور اس میں پیپ (pus) پڑنے لگی تھی۔ کیونکہ اس میں سوجن ہو رہی تھی اور درد سے زیادہ دکھن کا احساس ہو رہا تھا۔ جو کبھی کم کبھی زیادہ ہونے لگتا۔ زخم جراثیم زدہ ہونے کے باعث مجھے بخار بھی ہو گیا تھا۔ جوگی بابا کی مڑھی میں مقدور بھر کوشش، سوشیلا نے زخم وغیرہ کے سلسلے میں کی تھی، میں سمجھتا تھا وہ عارضی ہی تھی۔ زخم میں انفیکشن پھیلنے کا خطرہ ہونے لگا تھا۔ پیٹ کی جونکیں الگ پریشان اور جی متلا رہی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ سر پہ پہنچے ہوئے دشمنوں سے اللہ رب العزت نے بچا لیا تھا ورنہ دوسری بار دشمنوں کا یہ مشترکہ ٹولہ نئی "کمک" کے ساتھ حملہ آور ہوا تھا اور میں تنہا بھی تھا، حالت بھی خراب تھی میری، میں ان سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں تو بالکل بھی نہیں تھا۔ ورنہ میری بڑی خواہش تھی کہ ان سے بھڑ جاتا اور بلیو ٹکسی اور اسپیکٹرم کو ایک اور چوٹ دیتا۔ یہ اچھا موقع تھا، کیونکہ ایک طرف بلیو ٹکسی کے تین ٹاپ ایجنٹ چندر ناتھ، کورنیلا اور شیام موجود تھے تو دوسری طرف اسپیکٹرم کا سے جی کو ہارا تھا۔ ان چاروں کو جہنم رسید کرنے سے بلیو ٹکسی اور اسپیکٹرم کو اچھی خاصی چوٹ لگ سکتی تھی اور جب تک میری سرکوبی کے لیے یہ دونوں اگلے ایجنٹ بھیجنے کے لیے تیار کرتے، میں تب تک ان دونوں تنظیموں کی اعلیٰ قیادت کی ناک کے قریب ہو چکا ہوتا۔

"کسی قریبی آبادی کا رخ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ وہاں ہمارے لیے خطرات بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے سوشیلا سے کہا۔ میں دراصل دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ بلا ارادہ آگے بڑھی چلی جا رہی تھی میرے ساتھ...... یا اس نے کسی نسبتاً محفوظ مقام تک پہنچنے کے لیے پہلے سے کچھ سوچ رکھا تھا۔ اس لیے میں نے سر دست اس سے کہا تو وہ بولی۔

"تمہاری حالت مجھ سے زیادہ خراب ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے تمہارا پہلے خاطر خواہ علاج ہو جائے، اس کے بعد آگے کا سفر کرتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے آگے کون سی آبادی ہے؟ میرا مطلب ہے، جہاں میرا علاج ہو سکے؟" مجھے اس کی بات اچھی لگی تھی کہ اُسے میری فکر تھی۔ وہ جواباً بولی۔

"آگے کون سی پوروائی (بستی یا گاؤں) ہے، مجھے اس کا علم نہیں لیکن میں نراش نہیں ہوں، پوری آشا ہے کہ وہاں تمہیں کم از کم ابتدائی طبی امداد تو مل ہی جائے گی۔"

"میں اسی لیے کہہ رہا تھا کہ وہاں جوگی بابا کے مرنے اور اس کے جھونپڑی سے آگ کی خبر ملتے ہی، سب سے پہلے ہم

پر شبہ کیا جائے گا، کیونکہ اس بستی میں نو وارد ہم ہی کہلائیں گے اور پھر جوگی بابا کے کسی مہارانی کے ساتھ کچھ پُراسرار قسم کے خفیہ روابط بھی تھے۔ اس کا کوئی تندو نامی ایک آدمی جوگی بابا کے پاس بھی آیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے تندو کی جوگی بابا سے کی ہوئی عجیب اور معنی خیز گفتگو کے بارے میں بھی اس بار ذرا تفصیل سے آگاہ کر دیا تو وہ بولی۔

''میرے ذہن میں یہ بات ہے مگر ضروری نہیں کہ ہم پر ہی شبہ کیا جائے اور پھر یہ جوگی بابا کی جھونپڑی آبادی سے خاصی دور ہے۔ تب تک ہم اپنا کام کر کے نکل چکے ہوں گے۔''

''بشرطیکہ وہ سب کچھ وقت پر ہوتا چلا جائے جیسا ہم سوچ رہے ہیں۔ ہمارے دشمن بھی وہاں کا رخ کر سکتے ہیں۔''

''ہم اندھا دھند نہیں داخل ہوں گے، پہلے حالات کا جائزہ لیں گے۔'' اس نے مختصراً کہا اور میرے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ میں کچھ زیادہ پُراُمید نہ تھا، تاہم سوشیلا کو بہتر اوراک تھا۔ اسی لیے خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ ایک مقام پر جنگل چھٹنے لگا اور کچا بل کھاتا راستہ دکھائی دیا۔ ہم اس پر چل پڑے۔ ابھی ہم اس راستے پر چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک مجھے بڑے زور کی قے ہوئی اور مجھے چکر سا آ گیا، میں گر پڑا۔ سوشیلا پریشان ہو گئی۔ میری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔

''ہے بھگوان......! تمہیں تو بڑا تیز بخار ہو رہا ہے۔''

وہ اپنے ایک ہاتھ سے میری پیشانی چھوتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔ میری طبیعت واقعی بہت خراب ہونے لگی تھی۔ سردی کا احساس بڑھ رہا تھا، حالانکہ موسم سردی کا بھی نہیں تھا۔ آنکھیں غنودگی اور نیم بے ہوشی کے باعث بند سی ہونے لگی تھیں۔ خود مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب شاید میرا آخری وقت ہی آ پہنچا ہے۔ جی میرا الٹ رہا تھا اور اب خالی قے اور اُبکائیاں سی آ رہی تھیں۔

''اُف! تمہاری قے میں کتنی ساری ننھی جونکیں نکلی ہیں......'' میں [illegible] کو کہتے سنا تو اسی وقت میری بھی نیم باز سی نظریں بھربھری مٹی والی زمین پر پھیلی قے پر پڑی تو اس میں مجھے لاتعداد چھوٹی چھوٹی طفیلیے نما کیڑے حرکت کرتے نظر آئے۔

''چنتا کی ضرورت نہیں شہزی! یہ تمہارے لیے اچھا ہے کہ تم قے کرتے رہو۔ پریشان نہ ہونا میں تمہیں اس حال میں نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ بے چاری مجھے حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔ ورنہ تو میں مایوس ہی ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی میں اس طرح کے بے بسی و لاچارگی جیسے حالات سے بھی دوچار ہو سکتا ہوں۔ سوشیلا اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر اچانک شاید اس کی نگاہ کہیں پڑی اور وہ مجھے زمین پر اسی طرح نڈھال سا چھوڑ کر اسی طرف اُٹھ کر دوڑی۔ میں تب تک خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا اور اُٹھ کر بیٹھنے لگا۔

میں اب زمین پر ہی بیٹھا رہ گیا تھا۔ مجھ میں اپنی ٹانگوں پر بھی کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا شاید اس بار میری طبیعت بگڑی ہے تو اب سنبھل نہیں پائے گی اور میرے ساتھ وہی ہونے لگا تھا، کیونکہ میرا دل اب مالش کرنے لگا تھا۔ آنکھوں کے پپوٹے گرم ہو کر سوجنے لگے تھے۔ بڑی قابلِ رحم حالت میں تھا میں اس وقت...... اور ایسے ہی میں مجھے اپنے وہ سب ساتھی یاد آنے لگے جو مجھ پر جان چھڑکتے تھے، مجھ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اول خیر۔ ماں جی، زہرہ بانو اور شکیلہ...... اب تو کھیل داوا بھی میرا یار بن چکا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو خندہ پیشانی سے میرے لاڈ اُٹھایا کرتے تھے۔ زہرہ بانو اور بالخصوص اول خیر تو میری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اُٹھتے تھے۔ مجھے اول خیر کا بڑی محبت سے ''[illegible]او...... خیر کا کاکا!'' کہنا یاد آ رہا تھا۔ بڑا یار باش اور محبت آمیز [illegible]م تھا اس کا۔ بلکہ وہ تو بے چارے اب بھی میری جدائی میں ادھ موئے ہو رہے ہوں گے۔ میں نے بھی اُن سے بچھڑنے کے بعد بس ایک بار ہی رابطہ کیا تھا، جب میں نے سے جی کو ہارا کی بوٹ پر اپنا قبضہ جمایا تھا۔

ایسے میں مجھے عابدہ کی بھی یاد بھلا کیوں نہ آتی، وہ الم نصیب تو جیسے میرے لیے ایک خواب سی بن کر رہ گئی تھی۔ اب ان لوگوں کو کیا پتا تھا کہ میں کس حال میں تھا؟ عابدہ تو بے چاری خود بھی نجانے کیسے حالات کا شکار ہو گی، اس کے کیس کا بھی اب تک کیا بنا ہو گا؟ میں نے آنسہ خالدہ کی راہنمائی میں جو ''ایڈرلس'' لینے تھے وہ تک میں نہیں لے سکا تھا اور ایک نئے جنجال میں پھنس گیا تھا۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے بے بسی اور دکھ کے مارے میری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ اچانک مجھے اپنے حلق میں خراش سی محسوس ہوئی۔ مجھے کھانسی کا دورہ پڑا اور میں لگاتار کھانستا ہی چلا گیا۔ کھانستے کھانستے میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں اپنا سینہ پکڑے بے دم سا ہو کر رہ گیا۔ ایسے ہی وقت میں سوشیلا مجھے ایک بیل گاڑی کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ بیل گاڑی میں ایک بوڑھا اور ایک جوان مرد عورت سوار تھے۔ بیل گاڑی کی باگیں بوڑھے نے ہی سنبھالے ہوئی تھیں۔ چوبی طرز کی اس بیل گاڑی میں ایک ہی بیل جتا

ہوا تھا۔ سوشیلا شاید انہیں ہی دیکھ کر یک دم اٹھ کر مدد کے لیے ان کے پاس دوڑی تھی۔ مجھے زمین پر بے سدھ پڑا دیکھ کر وہ تینوں گاڑی سوار فوراً نیچے اُتر آئے اور مجھے سنبھالنے کو لپکے۔ میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، بس! نیم باز سی آنکھوں سے ان کی طرف تکے جارہا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرا آخری وقت آن پہنچا ہوا اور میں کوئی دم کا مہمان ہوں۔ ان تینوں بھلے مانس انسانوں نے مجھے جلدی سے اٹھا کر بیل گاڑی میں ڈالا پھر سوشیلا کو بھی سوار کرانے کے بعد بوڑھے نے بیل گاڑی دوڑا دی۔

چوبی پہیوں والی بیل گاڑی میں جھٹکے بھی خوب لگ رہے تھے اور میں ہولے ہولے منہ کھولے کراہے جارہا تھا۔ ابھی میں ہوش و حواس کی دنیا میں تھا اور اپنی آنکھوں سے اپنی حالتِ زار دیکھ رہا تھا۔

بیل گاڑی جلد ہی کھیتوں کے درمیان بنے کچے بل کھاتے راستے پر آگئی تھی اور اس کے تھوڑی دیر بعد کچے دیہاتی طرز کے گھروں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ایسے ہی ایک ناپختہ گھر کے سامنے بیل گاڑی روک دی گئی۔ یہ شاید انہی لوگوں کا گھر تھا مگر وہاں خاصے لوگ موجود تھے۔

اچانک میں نے اس نوجوان کو چلاتے سنا۔

”ارے یہ کیا......! یہاں کون آیا تھا؟ کس نے ہمارے گھر کا دروازہ توڑا ہے۔“

”یہاں کچھ لوگ آئے تھے راجو......!“ ایک آدمی کو میں نے کہتے سنا۔ ”فوجی لگتے تھے، یا پھر سرکار کے آدمی تو دکھائی پڑتے ہی تھے، بڑی بڑی گاڑیوں میں تھے، اُنہوں نے صرف تمہارے ہی نہیں اور بھی یہاں گھروں کی تلاشی لی تھی اور دو مرد و عورت کے بارے میں ہر ایک سے پوچھتے پھر رہے تھے، جس گھر پہ تالا تھا، اُسے توڑ کر گھر کی تلاشی لی گئی، پرنتو چمتکار چوری کچھ نہیں کیا ہے اُنہوں نے۔“

میں اس آدمی کی بات پر دھک سے رہ گیا تھا تو گویا میرے دشمن ہم سے پہلے یہاں بھی پہنچ گئے تھے۔ یقیناً یہ وہی ہوں گے۔ مجھے یہاں بھی اب خطرہ محسوس ہونے لگا، سوشیلا بھی ضرور، یہ سب سن کر پریشان ہوگئی ہوگی۔

”اچھا...... اچھا، ٹھیک ہے۔“ گاڑی بان بوڑھے نے کہا تھا، پھر اس نے اترنے سے پہلے، گاڑی میں بیٹھے بیٹھے، اس نوجوان سے کچھ کہا تھا اور وہ جلدی سے اتر کر ایک جانب کو سرپٹ دوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد بوڑھے اور سوشیلا نے مجھے سنبھالتے ہوئے نیچے اُتارا۔ وہاں موجود باقی لوگ لوگ جو مجمع سا لگائے کھڑے ایک دوسرے کے ساتھ باتیں اور تبادلۂ خیال کر رہے تھے، ہمیں عجیب عجیب سی نظروں سے تکتے رہے تھے۔

بہرکیف......اُس عورت نے جلدی سے آگے بڑھ کر گھر کا دروازہ کھولا اور مجھے لیے اندر داخل ہوگئے۔

ناپختہ سے صحن کا وہی منظر تھا جیسا کہ ایک دور اُفتادہ دیہاتوں وغیرہ میں ہوتا ہے...... مجھے اندر ایک کوٹھڑی میں لایا گیا، وہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر مجھے لٹا دیا گیا۔ عورت نے جلدی سے پانی کا ایک گلاس بھر کر سوشیلا کو تھمایا اور اس نے گلاس میرے کپکپاتے ہونٹوں سے لگا دیا۔

تازہ ٹھنڈے پانی کی برودت میرے حلق کو تر کرتی ہوئی معدے میں اُتری تو مجھے یک گونہ سکون سا ملا۔ کچھ حالت سنبھلی تو تھی مگر طبیعت ویسی ہی تھی۔ میں سارا پسینے سے شرابور ہوچکا تھا۔

”ہے بھگوان! کیسا کڑیل جیوٹ جوان ہے، اس بےچارے کو ہوا کیا ہے؟“ اس عورت نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ تخاطب سوشیلا ہی تھی، نیم وا سی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا، جو مجھے زیادہ عمر کی نہیں لگی تھی، اٹھارہ، بیس ہوگی۔ رنگت سانولی مگر پُرکشش تھی۔ جسم کسا ہوا تھا اور اس نے سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی جو خاصی پرانی تھی۔ وہ نوجوان شاید اس کا شوہر یا پھر بھائی تھا۔

”اس بےچارے کو زخم آگیا تھا اور وہی خراب ہوگیا تو اس کی حالت بھی ایسی ہوگئی۔“ سوشیلا نے جواب دیا اور آخر میں پوچھا۔ ”یہاں ایسا کوئی ڈاکٹر یا حکیم مل تو جائے گا ناں...... جو اس بےچارے کا علاج کرسکے؟“

”وید تو ایک ہی یہاں، جوگی بابا کے نام سے مشہور ہے۔“ وہ بولی۔ ”مگر اس کی جھونپڑی دور ہے، پاس دوار (قریب) میں ایک ہی ڈاکٹر ہے تو...... مگر وہ ذرا چڑچڑے مزاج کا آدمی ہے۔“

جوگی بابا کے ذکر پر بے اختیار میری اور سوشیلا کی نگاہیں آپس میں ٹکرائی تھیں، پھر سوشیلا نے اس سے پوچھا۔

”کیوں...... کیا لوگ اس سے علاج کروانا پسند نہیں کرتے؟“

”کچھ ایسی بات بھی ہے، مگر وہ ڈاکٹر خود جوگی بابا کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ اُس کے خیال میں وہ ایک مجرم ذہن کا وید ہے، جو لوگوں کا علاج کے بہانے خون چوس رہا ہے۔“ اس عورت نے جواب دیا۔ ”پوروائی کے سارے لوگ اسی پاس علاج کروانے جاتے ہیں، اس ڈاکٹر کے پاس چند ہی مریض آتے ہیں، شاید اسی لیے وہ جوگی بابا کی شہرت سے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جلتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ حویلی والوں کا تو جوگی بابا خاص وید ہے۔"

میں ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا، وہ عورت آگے بھی کچھ بتانے والی تھی کہ اسی دوران راجن نامی وہ نوجوان ایک درمیانی عمر کے آدمی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ مجھے وہ صورت وشکل سے خاصا معقول لگا تھا۔ رنگ گورا تھا، جسم درمیانہ اور آنکھوں میں نظر کا نفیس فریم کا چشمہ پہن رکھا تھا۔ اس کا بیگ راجن نے ہی اُٹھا رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے مجھے وہ سنجیدہ روہی دکھائی دیا تھا۔

اس نے پہلے میرا تفصیلی معائنہ کیا، پھر میرے زخم کا جائزہ لیا اور پھر جب اس نے سوشیلا سے کچھ دریافت کرنا چاہا تو سوشیلا نے اس کے کان میں ہولے سے کچھ کہا، جس پر ڈاکٹر نے اپنے سر کو دھیرے دے تفہیمی جنبش دی اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اسے میرے کلینک میں لانا ہوگا...... میں وہیں اس کا بہتر طور پر علاج کرسکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! جیسا آپ مناسب اور مریض کے لیے بہتر سمجھیں۔" سوشیلا نے فوراً کہا۔ "تو پھر لے چلیں ابھی مریض کو آپ کے کلینک میں؟"

سوشیلا کو بھی میری طرح اس بات کی تشویش ستانے لگی تھی کہ ہمارے دشمن یہاں بھی ہماری تلاش میں مصروف کار تھے اور کسی بھی وقت ہمارے سر پہ پہنچ سکتے تھے، یہی نہیں، یہاں کے لوگوں میں سے کوئی بھی ہمارے سلسلے میں انعام کے لالچ میں ان سے چغلی کھا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سوشیلا نے ڈاکٹر کے مشورے پر فوراً اثبات میں جواب دیا اور یوں مجھے ڈاکٹر کے کلینک میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر کے پاس اپنی ایک دیسی ساختہ پرانے ماڈل کی فیاٹ گاڑی تھی۔ مجھے اسی میں کلینک پہنچایا گیا، جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

کلینک ایک بڑے سے نیم پختہ گھر کی بیٹھک میں قائم کیا ہوا تھا، جس کا ایک دروازہ باہر اور ایک گھر کے اندر صحن میں کھلتا تھا۔

مجھے اس کلینک نما بیٹھک کی پیشانی پر ایک سالخوردہ سا بورڈ لگا نظر آیا تھا، جس پر ڈاکٹر لیکھ رام لکھا تھا۔

مجھے اسی بیٹھک نما کلینک میں ایک کاؤچ پر لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر وہاں اکیلا نہیں تھا۔ ایک نوعمر لڑکا بھی اس کا ہیلپر تھا، جو بیک وقت اس کا کمپاؤنڈر، نوکر اور چپڑاسی بھی تھا۔ وہ مقامی ہی لگتا تھا اور غریب سا نظر آتا تھا۔

جب ڈاکٹر نے دوبارہ میرے زخم کا ذرا تفصیلی معائنہ کیا تو اس نے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے اور سوشیلا سے بولا۔

"یہ زخم تو "گن شاٹ وونڈ" ہے، یہ میڈیکولیگل کیس ہے، آپ کو پہلے اس کی متعلقہ تھانے میں رپورٹ کروانا ہوگی البتہ میں ابتدائی طبی امداد دے دیتا ہوں۔"

اس کی بات پر میں پریشان سا ہو گیا، سوشیلا البتہ ڈاکٹر کی منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔

"ڈاکٹر صاحب! راستے میں ہم پر کچھ رہزنوں نے حملہ کیا تھا۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور ہم بالاسور سے کھمبات جا رہے تھے۔ راستے ہماری ان ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ ہو گئی تھی، بڑی مشکلوں سے ان سے جان چھڑا کر بھاگے اور گرتے پڑتے اس بدبخت جوگی بابا کی جھونپڑی میں پناہ کی غرض سے آئے تو اس مردود نے علاج کے بہانے ہمارا یہ حال کر دیا۔"

جوگی بابا کے ذکر پر ڈاکٹر بھی چونکا تھا، پھر بولا۔ "مگر...... یہ پولیس کیس ہے۔ میری شکایت ہوسکتی ہے۔"

"لیکن یہ کسی دشمنی کا بھی کیس نہیں ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو بھگوان کا واسطہ...... پیسوں کی آپ چنتا نہ کریں، وہ میں آپ کو دے دوں گے۔"

"جوگی بابا کا کیا بنا؟"

"اگر تم یہ بات راز میں رکھو تو ہم تم سے جھوٹ نہیں بولیں گے کہ وہ ایک مجرم ذہنیت کا آدمی تھا۔" اس بار میں نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اس مردود سے تو میں خود بھی عاجز آیا ہوا تھا، اس حرام زادے نے حویلی والوں کو بالخصوص مہارانی صاحبہ کو میرے خلاف بھی بھڑکا رکھا تھا۔"

"وہ ڈاکو ہماری تلاش میں وہاں آن پہنچے تھے۔" میں نے کہانی گھڑی۔ "کیونکہ اپنی حفاظت کے لیے میرے پاس جو پستول تھا، اس سے میں نے اپنے اور اپنی پتنی کے بچاؤ کے ان پر جوابی حملہ کیا تھا اور ان کے دو آدمی میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ اسی کا بدلہ لینے ہماری تلاش میں وہاں تک بھی آن پہنچے تھے ہم تو ان کے ہتھے نہیں چڑھے البتہ جوگی بابا کی جھونپڑی کو آگ لگا کر انہوں نے اس کی چتا بنا ڈالی۔ ہم دونوں مشکلوں سے چھپتے چھپاتے بھاگ آئے۔"

یہ ضروری نہ تھا کہ وہ . . . ڈاکٹر رام میری گھڑی ہوئی جھوٹی کہانی پر بھروسا کرتا یا نہ کرتا، لیکن اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا حریف جہنم واصل ہو چکا تھا، اس بات نے اُسے ہم سے خوش اور مطمئن کر دیا۔ بس پھر کیا تھا، اس نے

بڑی تندہی سے میرا علاج شروع کر دیا۔ اس نے مجھے پہلے ایسی دوا پلائی جس سے مجھے تھوڑی دیر بعد ہی جلاب آنے شروع ہو گئے۔ جس سے میں مزید کمزوری محسوس کرنے لگا، لیکن اس کے بعد اس نے مجھے ایک ڈیکسٹروز واٹر (سوڈیم اور گلوکوز) کی ڈرپ لگا دی۔ دوسرے ہاتھ کی نس میں بھی ڈرپ لگا دی۔ میرے شانے کا زخم اس نے اندر گہرائی تک صاف کیا تھا اور دو گولیاں نکالی تھیں۔ پھر اس کے بعد اس کے اندر انڈے کی زردی جیسے رنگ کا مرہم بھر کے اُوپر پٹی کر دی۔ کچھ انجکشن بھی لگائے، جن میں دردکش کے علاوہ سریع الاثر اینٹی بائیوٹکس اور زخم جلد ٹھیک ہونے کے بھی انجکشن شامل تھے۔ پینے کو دوا بھی دی۔ پھر شاید میں پانچ چھ گھنٹوں تک نیند یا بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو خود کو کلینک والی جگہ کے بجائے ایک کمرے میں پایا۔ وہاں میں اکیلا تھا، ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ میں اب خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ جسم میں پہلے جیسی بشاشت دوڑنے لگی تھی۔ مجھے پیاس اور بھوک کا احساس ہوا۔ لیکن میں حیران تھا کہ میری جگہ کیسے بدل گئی تھی؟ میں تو ڈاکٹر لیکھ رام کے گھر کی بیٹھک والی کلینک میں ایک کاؤچ پر تھا، یہاں کیسے آ گیا تھا اور کون مجھے یہاں لایا تھا؟ آیا یہ وہی جگہ بھی تھی یا کوئی اور گھر تھا؟ یہ سوچ کر میں کچھ پریشان بھی ہوا۔ میں چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلا، میں نے قدرے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ سوشیلا تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے پینے کی ایک ٹرے تھی، جس پر کپڑا سا ڈھکا ہوا تھا، وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، باہر شاید سہ پہر ہو رہی تھی۔ کیونکہ کمرے کے کھلے دروازے کے پار سے نظر آنے والی دھوپ سنہری دکھائی دے رہی تھی اور ادھر سے ہی مجھے اس بیٹھک کا وہ دروازہ بھی نظر آ رہا تھا، جس میں ڈاکٹر لیکھ رام نے اپنا کلینک کھول رکھا تھا۔

''اب کافی بہتر نظر آ رہے ہو؟ کیسا محسوس کر رہے ہو؟'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

''پہلے سے بہت زیادہ بہتر، لیکن میں یہاں کیسے آ گیا؟ میرا مطلب ہے اس کمرے میں؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہاں کچھ مریضوں کا رش ہونے لگا تھا، وہ تمہیں اور مجھے کچھ عجیب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہی ڈاکٹر...... سے کہا تھا کہ وہ تمہیں کسی اندرونی کمرے میں لیٹا دے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ پھر میں نے بھی اس کی مدد کی تھی۔ ہم تمہیں اندر لے آئے تھے اور یہاں لا کر آرام سے لٹا دیا تھا۔'' کہتے ہوئے اس نے کھانے کی ٹرے میرے سامنے چارپائی پر رکھ دی اور آگے بولی۔

''تمہیں یقیناً بھوک تو لگی ہو گی، بھوجن کر لو تو پھر یہاں سے نکلتے ہیں، ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہو گا۔''

''اس کا خدشہ تو مجھے بھی ہے۔'' میں نے ایک نظر کھانے کی ٹرے پر ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔ ''ویسے کیا تم نے کوئی نیا خطرہ محسوس کیا ہے یہاں؟''

''ایک خطرہ تو حویلی والوں کی طرف سے ہونے لگا ہے۔'' وہ جواباً بولی۔ ''دوسرا خطرہ دشمنوں کا ہے۔''

''حویلی والوں سے کس قسم کا خطرہ ہے؟'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ بھی اب کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس نے شاید غسل وغیرہ کر کے نئے کپڑے بھی پہن لیے تھے۔ یہ شاید اس بھلے مانس ڈاکٹر کی ''مہربانی'' کا نتیجہ تھا۔

''ڈاکٹر لیکھ رام نے ہی اس خطرے کا اظہار مجھ سے کیا تھا۔'' وہ میرے قریب چارپائی پر ٹک کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس نے سلک کی گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پیروں میں نئے سینڈل بھی تھے۔ اس لباس میں وہ خاصی پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

''تم کھانا تو شروع کرو......'' اس نے گویا مجھے ٹوکا۔ میں نے ٹرے سے رومال نما کپڑا ہٹا دیا۔ کھانے میں ترکاری، آلو کی بھجیا اور دہی تھا، تین پھلکے (چپاتی نما انڈین روٹیاں) تھیں۔

''ڈاکٹر لیکھ رام نے تو جوگی بابا اور مہاسائی کے درمیان خفیہ روابط کے بڑے سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں، جنہیں سن کر تو میرا دل ہی دہل کر رہ گیا ہے، یہی نہیں، جوگی بابا اس ڈاکٹر کی بیوی کا قاتل بھی ہے۔'' میں کھانے میں مصروف ہو گیا تھا اور سوشیلا بولے جا رہی تھی۔ نوالہ توڑتے وقت میرا ہاتھ رک گیا تھا...... ٹھیک اسی وقت کوئی دروازے پرجوش یا سخت انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

قسط 27

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ یہ پتا نہیں تھا کہ وہ ماں تھی کہاں؟ باپ اس کی نظروں سامنے تھا، ایک نئی عورت بھی اب اس کی آنکھوں کے سامنے تھی مگر اس کے ساتھ اس کا رویہ اچھا نہ تھا۔ چند ہی دنوں بعد باپ اسے نئی عورت کے ایما اطفال گھر میں چھوڑ کر چلا گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی، وہاں بوڑھے بھی رہتے تھے، جن کے بچوں نے انہیں یہاں چھوڑ کر خود کو یتیم سمجھنے میں زیا عافیت محسوس کی تھی۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی، جو ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی یتیم تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ یہاں روایتی یتیم خانوں والی کوئی بات نہیں تھی بلکہ بچوں کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی، جن کی حقیقت جان کر شہزی کو تکلیف دہ حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا مگر اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیو کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے ساتھ یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ مگر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ وہ اپنے چند ساتھیوں شوکت حسین، اس کی بہن شکیلہ، بلال، اشرف، ثریا، عابدہ سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی، مگر ناکام رہے جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ انسپکٹر روشن خان، چوہدری ممتاز خان کا کارندہ تھا۔ جو ان کے خفیہ اور گھناؤنے مقاصد کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ شہزی کا دشمن بن جاتا ہے اور اسے بے گناہ قانونی شکنجے میں جکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ، جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استا گبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ گبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو کسی نائکہ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے شہزی اور اول خیر ملتان سے لاہور کا قصد کرتے ہیں۔ راستے میں بڑی سیاسی شخصیت زبیر خان کے لاڈلے اور بگڑے ہوئے بیٹے شفقت راجا کے ساتھ شہزی کی مڈبھیڑ ہوجاتی ہے۔ چنی بائی کے چنگل سے چھڑا کر شہزی، ثریا اور شکیلہ وغیرہ کو لاہور دارالامان پہنچا دیتا ہے۔ چھتے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، گبیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں، زہرہ بانو المعروف ''بیگم صاحبہ'' اول خیر کو گروہ سے بے دخل کردیتی ہے، بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا ہے، تب ہی یہ بھید کھلتا ہے کہ ممتاز خان کے باپ چوہدری الف خان نے ایک مغنیہ ستارہ بیگم سے محبت کی دوسری شادی کی تھی۔ ستارہ بیگم کی پہلے سے ایک بیٹی تھی، جو گود میں تھی، یہی زہرہ بانو تھی۔ زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں لگے ہوتے ہیں، لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی کارڈ کی حمایت حاصل ہونے کے باعث میجر ریاض کسی ٹھوس ثبوت کے وزیر جان اور چوہدری تھے، اس لیے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو آنریری طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ کے علاج کے سلسلے میں امریکا روانگی کے وقت عابدہ اس کے ہمراہ ہوتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جو ایک عالمی سطح کا ڈان ہے لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھے ہوئے ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ ایک بھارتی جاسوس کے تعاقب میں وہ سرحد پار کرجاتا ہے اور بھارتی فرعون افسروں کے چنگل میں جا پھنستا ہے، مگر وہ دشمن کی ایک گھناؤنی سازش کو بے نقاب بلکہ ناکامی سے دوچار کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی کے افسران کی وہ لابی جو وطنِ عزیز کو دولخت کرنے کی مذموم سازش میں شامل رہی تھی، اپنی نئی سازش کی ناکامی پر تاج دین شاہ پر تشدد کی انتہا کرڈالتی ہے۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی پے درپے ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد دونوں کا آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ ہوجاتا ہے۔ بی آر بی کے کنارے شہزی اپنے دوستوں اول خیر، شکیلہ اور گبیل دادا وغیرہ کی مدد سے بلیوٹلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کا ایک منصوبہ ناکامی

وچار کرتا ہے اور اپنے باپ کو اس کے چنگل سے بھی چھڑا لیتا ہے۔ شہزی، گبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے کے نتیجے میں گبیل دادا کا شہزی کے سلسلے میں نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کا دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس نیویارک سٹی کی لبرل اینڈ اوورسیز سوسائٹیز کی عدالت سے سی آئی اے اینٹی ٹیریریز کورٹ میں منتقل کرنے کی سازش میں ب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ٹاپ ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش آج کل رنگون) میں مقیم ہے۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک سپر ٹاپ لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو لاڑکانہ کا رہائشی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آجاتا ہے کہ یہ آرکیالوجسٹ بشام چھلگری ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی رر رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا ب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے اسے ہائی جیک کرکے اب خود اس کا سربراہ بیٹھا تھا۔ بشام پہلے تو شہزی پر شک کرتا ہے مگر جب اسے اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک محبِ وطن شخص ہے تو پھر وہ اسے پاکستان میں موئن جودڑو مقام سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک کے جنگی جنونی اور ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت جی کوہارا کی یوٹ بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ں کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ ے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو بڑی تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے لے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس ں قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، اس میں اس کی مدد چندر کلا کرتی ہے۔ سوشیلا بھی اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ بعد میں رر کلا دھوکا دیتی ہے اور سے جی کوہارا اور بھوک کی بربریت کا شکار ہوکر مرجاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں ے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ب بوڑھا بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوتی ہے۔ وہ جونگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا لوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا ہے۔ شہزی کے دشمن تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا تا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے اتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جونگی بابا کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ سوشیلا ا اس جانب دیکھ کر ٹھٹکی تھی۔ سامنے ڈاکٹر لیکھ رام کھڑا تھا، س باختہ اور گھبرایا ہوا سا......

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا......؟'' مجھ سے پہلے شیلا نے بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا تو وہ یب آکر بولا۔

''وہ......وہ حویلی سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ تمہیں اور زی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔'' سوشیلا کے رے پہ خوف کی پرچھائیں سی چمکی، خود میں بھی تشویش ہ سا ہوگیا پھر سوشیلا نے ہی اس سے کہا۔

''مم......مگر کیوں؟ ہمارا ان سے بھلا کیا لینا دینا ہے؟ کیوں ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' لیکھ رام بولا۔ ''مگر تم دونوں کو ان کے ساتھ جانا تو پڑے گا ہی۔''

''یہ اچھی زبردستی ہے۔ ہم ہرگز نہیں جائیں گے ان کے ساتھ۔'' سوشیلا نے کہا تو میں لیکھ رام کی طرف دیکھ کر اس سے بھانپنے والے انداز میں مستفسر ہوا۔

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ ہمیں کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں؟ اور...... کیا یہ بلاوا کہیں اسی مہارانی کا تو نہیں ہے؟ جس کے ساتھ جونگی بابا کا کوئی پُراسرار تعلق تھا؟''

''حویلی والوں کا مطلب، مہارانی ہی ہوتا ہے۔'' ڈاکٹر لیکھ رام ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن...... مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اُن تک جونگی بابا کی ہلاکت

کی خبر پہنچ چکی ہوگی اور ظاہر ہے تم اس پوردائی میں نووارد ہو۔ اس لیے پہلا شک تم دونوں پر ہی گیا ہوگا مہارانی کا......“

”تمہارا کیا خیال ہے، ہمیں ان کے ساتھ چلے جانا چاہیے؟ زیادہ سے زیادہ اپنی صفائی ہی پیش کرنا ہوگی اور کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں! میرا بھی یہی مشورہ ہوگا کہ تم دونوں کا انکار اُنہیں مزید شبہے میں مبتلا کرسکتا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ آپ چلے ہی جائیں، ورنہ وہ آپ کے ساتھ زبردستی بھی کر سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ایسی کوئی نوبت آئے۔“

”یہ مہارانی کیا کسی راجے مہاراجے کی پتنی ہے یا......“ استفساریہ کہتے ہوئے سوشیلا نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اُس عورت کا نام ہی مہارانی ہے، ایک جوان خوب صورت بیوہ عورت ہے۔ بس ذرا زمیندارنی قسم کی خاتون ہے، اس کا پتی پوروائی کا مکھیا ہوا کرتا تھا۔ بڑی رعب داب والی عورت ہے، اگر تم اس کے ساتھ ادب احترام سے پیش آئے اور اُسے قائل کر دیا تو وہ تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہیں پیدا کرسکتی، لیکن یہ بات اپنی جگہ کم تشویش والی بھی نہیں ہے کہ جونکی بابا کو اس کا خاص التفاف حاصل تھا۔ وہ ذرا مشکل سے ہی قائل یا رام ہوسکتی ہے۔“

”چلو پھر، ہم تیار ہیں ساتھ جانے کے لیے۔“ میں نے دل ہی دل میں ایک مسکت سا فیصلہ کیا۔ سوشیلا نے میری طرف ذرا حیرت سے دیکھا تھا، میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو ایک تشفی آمیز سی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں ڈاکٹر لیکھ رام کے ساتھ اس کے کلینک نما گھر سے باہر آئے۔ سامنے دیکھا تو ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی جیپ کھڑی تھی۔ اس کے پاس چار تنومند شیم افراد کھڑے تھے، جنہوں نے کھلے گھیر والی شلوار قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ ان کی پشت سے رائفلیں جھول رہی تھیں اور سروں پہ پرانے اسٹائل کے پگڑ بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پہ بڑی بڑی گھنی مونچھیں ان کے تیوروں کو مزید کرخت بنائے ہوئے تھیں۔ وہ خاصی تیز نظروں سے ہماری طرف گھور رہے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ہمارے انکار پر ہمیں زبردستی بھی ساتھ لے جانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے۔

ہمیں انہوں نے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا، ایک نے جیپ کا عقبی دروازہ پہلے ہی کھولے رکھا تھا، ڈاکٹر لیکھ رام واپس گھر میں جانے لگا تو ایک حواری نے اُسے بھی درشت سی آواز میں پکارا۔

”ہے...... ڈاکٹر! تجھے بھی ہمارے ساتھ چلنا ہے۔“

اس کی آواز پر ڈاکٹر لیکھ رام کی پیشانی پر تفکر کی ایک ذرا سلوٹ سی ابھری، پھر وہ بھی بے چون وچرا... ہمارے ساتھ ہی جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہوگیا۔ بستی کے دیگر لوگ بھی کھڑے ہماری طرف آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے، ان کے لیے یہ سب جیسے کوئی بغیر ٹکٹ کا تماشا ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیپ روانہ ہوچکی تھی۔

☆☆☆

کچے اور بل کھاتے راستے پر جیپ ہچکولوں کے درمیان دوڑی جارہی تھی۔ آبادی اور کچے گھروں کا سلسلہ پیچھے رہ گیا تھا، دائیں بائیں کھیت کھلیان پھیلے ہوئے تھے۔ سہ پہر اب شام میں ڈھلنے لگی تھی۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں کے سلسلے عنقا ہونے لگے تو اس کی جگہ بنجر سے میدان نے لے لی۔ کچھ دور چلنے کے بعد درختوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس مختصر سے نظر آنے والے جنگل کے بیچوں بیچ ایک قدرے بلند اور مسطح قطعہ اراضی پر ایک قدیم طرز کے چبوتروں والی ٹمیالے رنگی اینٹوں کی بلند و بالا حویلی کے بڑے سے چوبی پھاٹک کے سامنے جیپ ذرا رکی تو اگلے ہی لمحے دونوں دروازے جیسے خودکار انداز میں وا ہوتے چلے گئے، جیپ اندر داخل ہوگئی۔

جیپ رینگنے کے انداز میں تھوڑا اور آگے بڑھی تو مجھے دو تین شکاری طرز کے کتے دکھائی دیے تھے۔ تاہم کچھ مخصوص لباس میں خدام ٹائپ کے افراد بھی وہاں مٹرگشت کرتے نظر آئے۔ سامنے حویلی کا محراب والا مرکزی دروازہ تھا۔ جیپ ادھر ہی رکی تھی۔ دو رائفل بردار دروازے کے دائیں بائیں تنے کھڑے تھے۔ ہمیں دو افراد جیپ سے لے کر اترے اور دروازے کی طرف بڑھے۔ میں اطراف کا جائزہ لیتا ہوا اندر داخل ہوا تو مجھے ایک خوشگوار سی خنکی کا احساس ہوا، پہلے تو مجھے اس پر ائرکنڈیشنڈ کا گماں ہوا تھا، جلد ہی مگر پتا چلا کہ یہاں اس نام کی کوئی شے سرے سے نہ تھی۔ ہاں، حویلی کی بناوٹ ہی کچھ ایسے اہرام کے طرز کی تھی کہ یہاں سے ہوا گزر کر خنک ہو جاتی تھی۔ تاہم ایک بات میں محسوس کیے بنا نہ رہ سکا تھا کہ یہ جتنی بڑی حویلی تھی اس کے مکین اتنے ہی کم تھے۔ ابھی تک

دام اور خادمائیں ہی نظر آئی تھیں، ممکن تھا اندر اور بھی چھ ظہور پذیر ہوتا۔ ہم ایک بلند چھت والے ہال میں داخل و چکے تھے۔

مجھے اور سوشیلا کو ایک بوسیدہ سے فرنیچر والے گوشے ی طرف لاکر بٹھا دیا گیا جبکہ ڈاکٹر لیکھ رام کو ہال کے تدائی گوشے میں ٹھہرے رہنے کا حکم ملا تھا۔

تھوڑی دیر گزری تو ایک خاصی دراز قامت عورت در داخل ہوئی، جو میرے تصور سے بالکل مختلف تھی اور اس مجھے کافی حیرت بھی ہوئی تھی، وہ اگرچہ اتنی کم عمر بھی نہ تھی، اہم مہارانی جیسے لقب اور پوری بستی سمیت حویلی میں اس کا رعب و دبدبہ نظر آرہا تھا، اس کے مطابق اسے کم از کم یس، پینتیس سے تو اُوپر ہی ہونا چاہیے تھا مگر وہ اس کے کس بمشکل چوبیس، پچیس کی ہی نظر آتی تھی۔ رنگ قدرے انولا مگر پُرکشش تھا۔ بال گھنے تھے اور شانوں پر سیاہ ھٹاؤں جیسے پھیلے ہوئے تھے۔ نرم گالوں سے تازگی پھوٹتی سوس ہوتی تھی اور گداز لب خاصے سیکس اپیل لگتے تھے۔ ں کی آنکھیں بھی کشادہ اور قدرتی کاجل لیے ہوئے تھیں، گران آنکھوں میں نامعلوم سی اداسی کا شائبہ سا ہلکورے لیتا سوس ہوتا تھا۔ وہ سوشیلا سے چند سال ہی چھوٹی لگتی تھی۔ ں وقت اس کا پُرکشش اور حسین چہرہ برہمی اور غصیلے پن کی جہ سے خاصا بگڑا ہوا ہی نظر آرہا تھا۔

اس نے ایک نگاہ سوشیلا اور پھر میرے چہرے پر الی۔ رفتہ رفتہ اس کے چڑھے ہوئے تیور بھی معمول پر تے محسوس ہونے لگے۔ اس کے ہمراہ وہی تندو نامی شخص ی تھا جسے میں جونکی بابا کی مڑھی میں دیکھ چکا تھا، تب مجھے ری اندازہ ہوگیا تھا کہ اسی نے اب تک کی حقیقت سے ہارانی کو آگاہ کیا ہوگا اور یوں ہمارا حویلی میں فوری طور پر وا آگیا تھا۔

”رام...... مہارانی جی!“ سوشیلا نے اس کی طرف یکھ کر احتراماً کھڑے ہوتے ہوئے کہا تو میں بھی کھڑا ہوگیا ر سوشیلا کی طرح میں نے بھی محض اپنے سر کے خفیف شارے سے اسے سلام کیا تھا۔ اندازہ مجھے ہو چلا تھا کہ یہی ہ مہارانی صاحبہ تھیں جس کی طرف سے زبردستی بلاوا آیا ا۔

”کون ہو تم دونوں؟ اور کہاں سے آئے ہو؟“ ہارانی نے خاصے درشت لہجے میں ہم دونوں کے چہروں کا ری بارمی جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”میرا نام سوشیلا ہے اور یہ میرا ساتھی شہزاد احمد ہے۔ ہم ممبئی سے ایک سفری لانچ میں احمد آباد جارہے تھے۔“ میری دانستہ خاموشی پر سوشیلا نے ہی اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”راستے میں ہماری لانچ میں خرابی پیدا ہوگئی اور ساتھ ہی ہم ایک طوفان کا شکار ہوگئے تھے۔ بالاسور کے ساحل پر ہم کسی طرح تیرتے ہوئے پہنچے اور پھر......“

”جونکی بابا کو تم نے کیوں ہلاک کیا تھا؟“ مہارانی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے درشتی سے پوچھا تو اس بار میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”مہارانی صاحبہ! آپ کو اس بارے میں شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم دونوں تو خود خاصے زخمی حالت میں بالاسور کے ایک ویران ساحل سے آن لگے تھے، کیونکہ ہماری لانچ پر بحری قزاقوں کے ایک ٹولے نے ہلا بول دیا تھا۔ ہمیں جنگل میں ایک مڑھی نظر آئی اور جان بچانے کے لیے ہم نے اسی طرف رخ کیا تھا، کیونکہ بالاسور کا یہ ساحل قریب ہونے کی وجہ سے وہ بحری قزاق ساحل تک ہمارا تعاقب کرتے ہوئے آگئے تھے۔ جونکی بابا تو ہمارا محسن تھا، اس نے میری اور میری ساتھی سوشی کی مرہم پٹی کی تھی اور اپنی جونکوں سے علاج کیا تھا ہمارا کہ اسی دوران قزاقوں کے ساتھی وہاں آن پہنچے، میں اپنی ساتھی کے ساتھ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا تھا، پھر بعد میں وہاں کیا ہوا، اس کا ہمیں علم نہیں...... لیکن مجھے خود ذاتی طور پر بھی جونکی بابا کے مرنے کا افسوس ہے۔“

میں نے پوری صفائی کے ساتھ آدھے سچ میں آدھا جھوٹ شامل کرتے ہوئے مہارانی سے پورے اعتماد بھرے لہجے میں کہا تو اس کے چہرے پر کچھ اُلجھے ہوئے سے تاثرات ابھرے تھے اور پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑے خاص حواری تندو کی طرف دیکھا۔ وہ جیسے اس کی مستفسرانہ نگاہوں کا مطلب جان کر مؤدبانہ بولا۔

”مہارانی جی! جب میں وہاں گیا تھا تو یہ واقعی وہاں جونکی بابا کی مڑھی میں ایک چارپائی پر بیمار حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ بعد کا تو مجھے بھی صحیح علم نہیں کہ پھر وہاں کیا ہوا تھا؟“ اس کے جواب پر میں نے بے اختیار دل میں طمانیت محسوس کی۔

میری نظریں مہارانی کے اُلجھے ہوئے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہ شاید اب تک ہمیں جونکی بابا کا قاتل سمجھے ہوئے تھی (اگرچہ یہ غلط بھی نہ تھا) لیکن: میرے محتاط انداز کے جواب اور تندو کی بات نے اُس کا یہ ”یقین“ متزلزل کر کے رکھ دیا تھا۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید کہا۔

’’آپ دیکھ ہی رہی ہیں مہارانی صاحبہ ہماری حالت کو...... اس سے زیادہ ہم اپنی صفائی میں اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔‘‘

’’ڈاکٹر لیکھ رام کو پیش کرو یہاں......‘‘ اچانک مہارانی نے بہ آواز بلند کہا۔

ذرا ہی دیر بعد ڈاکٹر لیکھ رام کو وہاں پیش کر دیا گیا۔ مہارانی نے اس کی طرف غضبناک نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

’’یہ دونوں تم تک کس حالت میں پہنچے تھے؟‘‘

’’مہارانی صاحبہ! ان دونوں کو جے پرکاش لایا تھا۔ اپنی بیل گاڑی میں بٹھا کر۔ تب شہزاد کی حالت بہت خراب تھی، اسے بڑا تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔‘‘

’’جھوٹ مت بولنا ہم سے...... ڈاکٹر لیکھ رام! جانتے ہو ناں ہمیں، ہم بال کی کھال نکال کر اصل مجرم کو بالآخر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ جونکی بابا کے ہمارے ساتھ کیسے تعلقات تھے اور وہ ہمارے لیے کس قدر اہم آدمی تھا، یہ تم سمیت پوری بستی کے لوگ جانتے ہیں۔ ہم اس کے قاتل کو نہیں چھوڑ سکتے، اسے تلاش کر کے ہی رہیں گے۔‘‘

’’میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں مہارانی صاحبہ! جے پرکاش دور نہیں، اس سے آپ پوچھ سکتی ہیں۔‘‘ ڈاکٹر لیکھ رام نے کہا۔ وہ مہارانی سے کچھ زیادہ خائف نظر نہیں آ رہا تھا اور ٹو دی پوائنٹ بات کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے یہاں کے حالات کا بہت کچھ علم تھا۔

’’ہوں ں ں......‘‘ مہارانی نے گہری اور پُرسوچ ہمکاری بھری، پھر ایک نگاہ سوشیلا پر ڈالنے کے بعد براہ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

’’تم دونوں ابھی کچھ روز ادھر ہی رہو گے، جب تک ہمیں تمہارے سلسلے میں پوری تسلی نہیں ہو جاتی۔‘‘ اُس نے جیسے اپنا زبردستی کا فیصلہ ہمارے سر تھوپ دیا جس پر میں پریشان سا ہو گیا اور فوراً ہی احتجاجی لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ تو آپ ہمارے ساتھ زیادتی کریں گی مہارانی صاحبہ! جبکہ میں نے تو اپنی صفائی پورے ثبوت کے ساتھ، آپ کے سامنے پیش بھی کر دی ہے۔ لہٰذا ہمیں جانے دیا جائے اب......‘‘

’’ہرگز نہیں۔‘‘ وہ مسکت لہجے میں بولی۔ ’’ہم تم دونوں کو یہاں قیدی کی صورت نہیں بلکہ مہمان کی حیثیت سے رکھیں گے۔ اسے ہماری طرف سے ایک خاص رعایت سمجھو، یہ چند روز تم ہمارے مہمان گاہ میں گزارو گے۔ بس! اس حویلی سے باہر جانے کی اجازت نہیں حاصل ہو گی تم دونوں کو...... یہی ہمارا آخری فیصلہ ہے۔‘‘

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ڈاکٹر لیکھ رام نے مجھے آنکھ کے مخصوص اشارے سے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا اور میں ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

مہارانی نے جاتے جاتے میری طرف دیکھ کر قدرے نرمی سے کہا۔ ’’تم دونوں آج رات جل بھوجن (کھانا وغیرہ) ہمارے ساتھ کرو گے۔‘‘

’’شکریہ مہارانی صاحبہ!‘‘ میں نے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ اُس نے ایک گہری گہری نگاہ مجھ پر ڈالے رکھی اور پھر پلٹ کر باوقار قدموں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ نندو کے کان میں البتہ اس نے جاتے وقت کچھ کہا تھا، یہی وجہ تھی کہ مہارانی کے جاتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا اور بولا۔

’’آیئے۔‘‘ اس کے انداز میں بھی ہمارے لیے احترام در آیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ ہو لیے۔ وہ ہمیں ایک زینے کے ذریعے بالائی منزل کے ایک قدرے کشادہ کمرے میں لے آیا۔

’’آپ یہاں آرام کریں۔ اندر الماری میں زنانہ و مردانہ کپڑے موجود ہیں۔ اپنے ناپ کے دیکھ کر پہن لیجیے گا۔ وہ سامنے ہودی (غسل خانہ وغیرہ) ہے۔‘‘ اس نے اشاروں کے ساتھ بتایا۔ اس کے بعد چلا گیا۔

’’مہمان بلائے جان تو سنا تھا، یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا، میزبان بلائے جان ہو گیا......‘‘ نندو کے جاتے ہی سوشیلا نے جل کر کہا۔ میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ کمرے میں مجھے فقط دو دریچے ہی نظر آئے تھے، ایک وسیع احاطے اور لان میں کھلتا تھا جبکہ دوسرا حویلی کی عقبی سمت۔ میں اسی طرف کو بڑھا اور چوبی کواڑوں پر لگی ’’بلّی‘‘ ہٹا کر کواڑ تھوڑا کھول کے دیکھا اور پُرسوچ انداز میں باہر دیکھنے لگا۔

میرے سامنے جنگل جلیبی اور تیندو پتے کے درختوں سے اٹا پڑا گھنا جنگل تھا جو اس وقت شام کی ملگجی سی تاریکی میں خاصا پُراسرار نظر آ رہا تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر اپنا سر دریچے سے باہر نکال کر نیچے جھانکا۔ ایک اندازے کے مطابق اُوپری منزل سے نیچے کا فاصلہ اتنا بہرحال نہیں تھا کہ کوئی یہاں سے فرار ہونے کے لیے نیچے چھلانگ لگانے کی بے وقوفی کرتا، جو ظاہر ہے سیدھے سبھاؤ خودکشی کے ہی

JBD

جہانگیر بکس

91

Since 1923

JAHANGIR BOOKS

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

خری معرکہ -/550
منات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو
ور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم
وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا
ہ سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا ”میں بت فروش
ت شکن کہلانا چاہتا ہوں“ نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

ھیری رات کے مُسافر -/475
میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی
ش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت
کی الم ناک داستان

فت کی تلاش -/300
ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر،
نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں
پ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

روکسریٰ -/625
سلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی،
تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان
کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گُمشدہ قافلے -/500
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یُوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
فرڈی ننینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/599
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

مُحمّد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/300
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہموں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/450
سیّد خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/325
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

جہانگیر
اُردو لغت
(جامع ترین)
نظمی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اُردو زبان کا پہلا لُغت

سبق آموز کُتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195
اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140
حکایاتِ رومیؒ -/180
دلچسپ و عجیب حقائق -/170
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199
دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180
بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

ھانگیر بُک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609
021-32765086

مترادف ہوتا۔

''ایک لمبی رسی میسّر آجائے تو یہاں سے فرار آسان ہوسکتا ہے۔'' سوشیلا نے ہولے سے میرے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔ میں ذرا چونکا۔ وہ نجانے کب میرے پیچھے آن کھڑی ہوئی تھی۔ زیرک دماغ تھی اسی لیے فوراً بھانپ گئی تھی کہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے۔'' میں دریچے کا کواڑ اَدھ کھلا چھوڑ کر واپس پلٹ آیا۔

''لیکن اگر ہم ناکام ہوگئے تو اس خودساختہ مہارانی صاحبہ کا پورا پورا یقین ہم پر ہو جائے گا کہ ہم ہی جونگی بابا کے......''

''شش......'' میں نے اُنگلی ہونٹوں پہ رکھ کر اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں......''

''یہ کوہارا کی یوٹ نہیں ہے، جو ہماری گفتگو ایک ڈیوائس پر دوسرے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر سن رہے ہوں۔'' وہ بولی۔

''لیکن باہر دروازے پر تو کوئی کان لگائے ہماری گفتگو سن سکتا ہے ناں بے وقوف!'' میں نے سوشیلا کو ہلکے سے جھڑکنا مناسب سمجھا تو وہ اس بار پہلے سے بھی زیادہ مدھم سی آواز میں بولی۔

''ہم کھل کر آپس میں باتیں نہیں کریں گے تو آئندہ کی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیسے کریں گے؟'' اس کی بات بھی ٹھیک تھی۔ میں نے اس بار ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں! اتنے دالیم میں باتیں کرنا ٹھیک رہے گا۔''

''ہمیں سنجیدگی سے اور جلد از جلد یہاں سے فرار ہونے کا کوئی لائحۂ عمل تیار کرنا ہوگا......'' وہ ہلکی آواز میں بولی۔ ''مت بھولو کہ ہمارے دشمنوں کا مشترکہ ٹولا یہاں آن پہنچا ہے اور اُنہیں اب تک بستی کے لوگوں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہم اسی بستی میں ہیں اور کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''مجھے اسی بات کی تو سب سے زیادہ تشویش ہو رہی ہے۔ اگر وہ ادھر آنکلے تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ زمیندارنی ٹائپ مہارانی ان کا راستہ روک سکے گی بلکہ ہمارا بھی پول کھل جائے گا۔''

''پھر تو ہمیں رات کا انتظار کرنا ہوگا، تب ہی فرار کی یہ کہانی مکمل ہوسکے گی۔'' سوشیلا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں نہا دھو کر ذرا فریش ہو جانا چاہیے، پتا نہیں کب نیچے سے مہارانی صاحبہ کا جل بھوجن کا بلاوا آجائے۔''

وہ مسکرائی، ان حالات میں سوشیلا کی زندہ دلی میرے حوصلوں کو بھی تقویت بخش رہی تھی۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا، ساتھ ہی ہولے سے کہا۔ ''پھر بھی ہمیں ہر لمحہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔''

ڈاکٹر لیکھ رام کے ہاں کسی خادم کو بھیج کر میری دوائیاں اور مرہم پٹی کا سامان منگوالیا گیا تھا، جو مجھے نندو ہی دینے آیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سوشیلا نہا دھو کر نکلی تو کمرے کی روشنیوں میں، وہ مجھے کھلتے گلاب کی طرح نظر آنے لگی۔ وہ بڑا سا باتھ ٹاوَل لپیٹے ہی باہر نکل آئی تھی۔ شاخِ گل جیسا اس کا سیم تن وجود پر بہار سا نظر آرہا تھا، سوشیلا واقعی ایک حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اس کے گیلے بال نیم برہنہ شانوں پر پھیلے ہوئے تھے، دھلے نکھرے چہرے پر ہی نہیں اس کے بدن پر بھی شبنمی قطرے، موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

میں نے اس کی طرف سے نظریں پھیر لیں، میں اپنے ناپ کے کپڑے الماری سے نکال چکا تھا۔ ایک سیاہ پینٹ اور ہلکے بلیو کلر کی شرٹ پسند کی، اس کے بعد تولیا سنبھالے میں نے باتھ روم کا رخ کیا۔ تھوڑی دیر بعد نہا کر نکلا تو سوشیلا بھی اپنے لیے کپڑے نکال چکی تھی۔

وہ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی میں ملفوف تھی، اور خاصی حسین لگ رہی تھی۔ ساڑی کس کر اور خاص انڈین کاٹھیاواڑی اسٹائل میں باندھی گئی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور میں نے اس سے پوچھا۔

''یہ، ان حالات میں تمہیں کیا سوجھی؟''

''کیا مطلب؟'' وہ اپنی گھنیری پلکیں جھپکا کر میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''میں نے کوئی مشکل بات نہیں کی۔'' میں متانت سے بولا۔ ''ہمیں کسی بھی وقت یہاں سے فرار ہونا ہے اور ایسے میں تمہیں کوئی عام سا شلوار سوٹ پہننا چاہیے تھا۔ یہاں کوئی دعوت تو نہیں ہو رہی کہ تم نے یہ بھاری بھرکم ساڑی پہن لی۔''

میری بات پر وہ خاص بھیدوں بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ''میں اس میں خود کو کافی ریلیکس فیل کر رہی ہوں۔ اسی طرح ہم پر خفیہ کڑی نگرانی کرنے والے بھی ریلیکس ہی رہیں گے، یعنی ہماری طرف سے ان کو یہ چِنتا نہیں ہوگی کہ ہم یہاں سے فرار کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں۔''

پتا نہیں اس میں واقعی اس کی چالاکی کا دخل تھا یا پھر یہ اس کی دانستہ حرکت تھی، میں نے خاموشی اختیار کرلی۔

تھوڑی دیر گزری، نیچے سے مہارانی کا بلاوا آگیا۔ ایک نوعمر لڑکی نے آکر ہمیں مطلع کیا تھا کہ مہارانی جی نیچے کھانے کی میز پر ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

میں اور سوشیلا مذکورہ خادمہ کے ساتھ نیچے پہنچے۔ وہ ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے آئی جہاں معمول کے مطابق ہر شے سادہ تھی، سادہ فرنیچر، اور عام سے در و دیوار، وہ بھی بغیر رنگ و روغن کے۔ حیرت کی بات تھی کہ مہارانی کے سوا اب تک مجھے یہاں اور کوئی حویلی کا مکین دکھائی نہیں دیا تھا۔

بہر حال ہم دونوں خاموشی سے میز کی جانب بڑھے اور ساتھ ساتھ دو کرسیوں پر بیٹھ گئے، ہمارے سامنے والی کرسی پر مہارانی براجمان تھی۔ ذرا فاصلے سے نندو بھی موجود تھا۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے مہارانی کے چہرے کی طرف دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ سوشیلا کو بڑی خاص نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ پھر میری بھانپتی ہوئی نظروں نے اس کے ملیح چہرے پر ہلکی تلخ سی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی، جس میں طنز کا عنصر غالب تھا۔ تاہم ایک خاص قسم کی چمک بھی اس کی آنکھوں سے مترشح محسوس ہوتی تھی، جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔

مہارانی کی سنگت میں رات کا کھانا قدرے خاموشی میں کھایا گیا۔ کھانا بلاشبہ پُرتکلف تھا۔ کھانے کے اختتام پر جب میں اور سوشیلا رخصت ہونے کے لیے میز سے اُٹھنے لگے تو مہارانی نے سوشیلا کو تو کمرے میں جانے کی اجازت دے ڈالی البتہ مجھے روک لیا۔ سوشیلا میری طرف قدرے اُلجھن آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تو میں نے اُسے اپنے سر کا مخصوص اثباتی اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گئی۔ میں مہارانی کی طرف مستفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگا تو وہ اپنی کرسی چھوڑتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''آؤ......میرے ساتھ'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک طرف کو چلی تو میں نے بھی اس کی تقلید کرڈالی۔ ہم نچلی منزل کی ایک تنگ سی راہداری سے گزرنے لگے، یہاں نیم تاریکی سی چھائی ہوئی تھی۔ میں مہارانی سے صرف تین چار قدموں کے فاصلے سے چل رہا تھا۔ اس نے سفید رنگ کا مہین سا سوٹ پہن رکھا تھا، جس کے آر پار اس کے ہوشربا جسمانی نشیب و فراز کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی، مگر میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی، اُلجھن تو مجھے یہ تھی کہ یہ مجھے کہاں اور کیوں لے جا رہی تھی؟ جہاں ہم پہنچے، یہ کوئی مختصر سی نشست گاہ تھی۔

ہم یہاں دو صوفہ ٹائپ کرسیوں پر آمنے سامنے براجمان ہوگئے۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی، یہاں بھی روشنی ہلکی ہی تھی یا دانستہ مدھم رکھی گئی تھی اور مہارانی جس کرسی پر براجمان تھی، وہاں روشنی کا زاویہ کچھ یوں تھا کہ اس کا چہرہ نیم تاریکی میں چھپ کر رہ گیا تھا، جبکہ میرے چہرے پر روشنی پڑ رہی تھی۔

وہ چند ثانیے شاید میری ہی طرف تکتی رہی تھی، پھر اس کی آواز اُبھری۔ ''جونگی بابا سے تمہاری ملاقات کا دورانیہ کتنا رہا تھا؟''

''کچھ زیادہ تو نہیں، میں خود زخمی تھا اور مجھے خود ہوش نہیں تھا۔'' میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا کہ نہ جانے وہ میرے منہ سے ایسا کیا اُگلوانے والی تھی جس سے اس کا یہ شُبہ یقین میں بدل جاتا۔

''جونگی بابا نے تمہیں میرے متعلق کچھ بتایا تھا؟''

''نہیں۔''

''میرے آدمی نندو کو تو تم پہچان گئے ہوگے، وہ اُس وقت جونگی بابا کے جھونپڑے میں آیا تھا، جب تم بھی وہاں تھے؟'' مجھے اس کا لہجہ دم بہ دم اسرار بھرا سا محسوس ہونے لگا۔

''ہاں! میں نے اسے وہاں دیکھا تھا۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

''پھر تم یہ بھی جانتے ہوگے کہ نندو وہاں کیوں آیا تھا؟'' یہ کہتے ہوئے مہارانی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدلا تو ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ روشنی میں آیا۔ مجھے مہارانی کا چہرہ کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دیا تھا، جیسے اس کا سانولا رنگ، جو ایک خاص کشش کا باعث تھا، ایکا ایکی بے کشش اور سیاہ پڑنے لگا ہو۔ ایسے ہی وقت مجھے اپنے وجود میں پھریری سی اُترتی محسوس ہوئی تھی تاہم میں نے جواباً کہا۔

''کچھ زیادہ تو نہیں، بس اتنا ہی اندازہ مجھے ہو پایا تھا کہ وہ شاید کچھ لینے کے لیے وہاں آیا تھا۔''

''کیا؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم......'' کہتے ہوئے میں نے دانستہ پہلو بدل کر اپنے وجود کو کچھ اس طرح جنبش دی کہ میں ذرا اس کا چہرہ دیکھ پاؤں، میں اس کا پورا چہرہ تو نہیں دیکھ پایا تھا، البتہ ناک اور ہونٹ ہی دیکھ سکا، جو نا کستری رنگت کے ہونے لگے تھے۔ یہ سوچ کر کہ کیا مہارانی کے چہرے کی رنگت یا ہیئت بدل رہی تھی، بے اختیار مجھے ایک جُھرجُھری سی

آ گئی۔ میں نے اسے اپنا واہمہ ہی قرار دیا کہ یہ شاید اس عجیب اور الگ قسم کے ماحول کا اثر ہو۔

“روپا……!” معاً اس نے کسی کو پکارا۔ ایک دبلی پتلی لڑکی اندر آئی اور اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر مؤدبانہ انداز میں مہارانی سے بولی۔

“جی مہارانی صاحبہ؟”

“انہیں ان کے کمرے تک چھوڑ آؤ……” مہارانی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس خادمہ سے کہا۔ مجھے اس بار مہارانی کی آواز بھی بدلی ہوئی سی لگی تھی۔ میں خود اس ماحول میں ایک تکدر سا محسوس کر رہا تھا، اس پر شکر کیا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

“آیئے میرے ساتھ……” روپا نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ میں نے جاتے وقت بھی مہارانی کے چہرے پر نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی مگر مہارانی نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا تھا، میں فقط اس کی گردن ہی دیکھ سکا تھا جس کی جلد مجھے بالکل کالی سیاہ دکھائی دی تھی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید ایسا کم روشنی یا نیم اندھیرے کی وجہ سے تھا، لیکن اس قدر گہری سیاہ رنگت کی میں کوئی توجیح نہ پیش کر سکا اور خاموشی سے روپا کے ساتھ چلتا ہوا، اوپری منزل پہ پہنچا۔ اس دوران مجھ پر نیند کا بھی غلبہ محسوس ہونے لگا۔ میری آنکھیں جیسے نیند سے بھاری ہونے لگی تھیں۔ مہارانی نے مجھ سے بہت تھوڑی اور مختصر باتیں کی تھیں۔

مجھے کمرے میں چھوڑنے کے بعد روپا خاموشی سے پلٹ گئی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ کمرے میں سوشیلا بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

میرے یہ سوچنے کی دو وجوہات تھیں، پہلی تو یہ کہ وہ مجھ سے پوچھنا چاہتی ہوگی کہ آخر مہارانی مجھے اپنے ساتھ کہاں لے گئی تھی اور کیا باتیں کیں؟ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم نے آج رات ہی اس منحوس حویلی سے فرار کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ سوشیلا اپنے بستر پر بے سدھ اور گہری نیند سو رہی تھی۔ یہی حال اب میرا بھی ہونے لگا تھا۔ میں سونا نہیں چاہتا تھا، بلکہ سوشیلا کو جگا کر اس سے بات کرنے کا ارادہ کیے ہوا تھا، لیکن مجھ میں تو اب جیسے اپنے پیروں پہ بھی کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، کہ گر ہی نہ پڑوں۔ میں فوراً اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا اور بستر پر گر پڑا۔ دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا تھا، مہارانی کا چند سیکنڈوں میں مجھ سے جونگی بابا کے بارے میں مختصر ترین سوالات پوچھ کر رخصت کرنا، مجھے خالی از علت نہیں لگا تھا۔ دوسرے یہ کہ میرے اور سوشیلا کے کھانے میں ضرور کوئی ایسی چیز دانستہ شامل کی گئی تھی جس سے ہم پر نیند کا غلبہ سا طاری ہونے لگا تھا۔ اسے اگرچہ بے ہوشی کی کیفیت تو نہیں کہہ سکتے تھے، کیونکہ بستر پر گرنے کے بعد بھی میں پوری طرح ہوش میں تھا۔

اچانک میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، جونگی بابا نے بھی مجھے ایسا ہی کچھ پلا کر اعصابی اور جسمانی طور پر معذور کر دیا تھا، کہیں ویسی ہی شے تو اس مہارانی نے ہمیں نہیں پلا دی تھی؟ جونگی بابا اور مہارانی کا سمبندھ بھی تو پُراسرار تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے سر کو دو تین بار زور زور سے جھٹکے دیے، تاکہ نیند کا خمار اُتر جائے، کامیابی ہوئی مگر چند سیکنڈوں کے لیے، مجھ پر بے ہوشی نما نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا اور میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں، میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شاید ایک بھرپور سی جماہی لی اور پھر گہری نیند میں ڈوب گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو میں نے کچھ شور سنا اور چند لوگوں کو اپنے قریب پایا، مجھے کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں بھی آتی سنائی دی تھیں۔ ذرا غور کیا تو پتا لگا کہ یہ مہارانی تھی۔ میری نیم غنودہ آنکھوں نے نندو کو بھی وہاں موجود پایا، خادمہ روپا بھی تھی اور دو ادھیڑ عمر کے مرد عورت بھی موجود تھے۔ وہ بھی حویلی کے ملازم ہی نظر آتے تھے۔

“کیسے بھاگ گئی وہ……؟ تم کیا سو رہے تھے سب؟” مجھے مہارانی کی پُرطیش آواز سنائی دی تھی۔

“ہمیں کیا پتا تھا مہارانی صاحبہ کہ وہ اتنی چالاک ثابت ہوگی کہ اتنی بُلندی سے چھلانگ……” ایک ملازم نے صفائی میں کچھ کہنا چاہا مگر مہارانی کی غصیلی آواز نے اُس کی بات کا گلا گھونٹ دیا۔

“بکواس بند کرو اپنی…… یہ دیکھ نہیں رہے ہو۔ رسی، یہ چارپائی کی دوائن کھول کر، اس کی رسی بنا کر وہ نیچے اُتری ہوگی، جاؤ سب اُس چنڈال کو ڈھونڈ کر آؤ ورنہ میں تم سب کو زندہ جلا دوں گی۔” مہارانی بری طرح بپھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی اور مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ آخر یہ کس “چالاک” اور “چنڈال” کے فرار کی باتیں ہو رہی تھیں؟ اور پھر اچانک جیسے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

“کہیں یہ سوشیلا کے فرار کی باتیں تو نہیں ہو رہی تھیں؟ لیکن کیوں……؟ بھلا سوشیلا میرے بغیر اور مجھے اس طرح چھوڑ کر کیوں کر خود اکیلے فرار ہوگئی تھی؟ کیا اس نے بھی مجھے اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے چندر کلا کی طرح دھوکا دیا تھا؟

میری شاید نیند پوری ہونے کے باعث خمار کم ہونے لگا تھا۔ میں نے مہارانی کی طرف دیکھا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ “م…… مہارانی صاحبہ! کیا ہوا……؟ کون فرار ہوگیا ہے یہاں سے……؟”

“تمہاری ساتھی، سوشیلا……” اس نے برہم نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

“کیا……؟” مجھے جیسے یقین نہیں آیا۔ “یہ…… یہ کیسے ہوسکتا ہے؟”

“یہ ہو چکا ہے، دیکھو یہاں آ کر ذرا……” مہارانی نے مجھ سے کہا، لہجہ خاصا طنزیہ تھا، اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا، جو تیندو پتے کے جنگل میں کھلتی تھی، میں اپنے چہرے پر غیر یقینی سے تاثرات لیے بستر سے اُٹھا، تو مجھے چکر سا آ گیا، میرے قدم ذرا لڑکھڑائے بھی تھے، میں شاید ابھی تک رات والے کھانے میں متوقع طور پر ملائی گئی نشہ آور دوائی کے زیرِ اَثر تھا، تاہم اب وہ نشہ کافی حد تک اُتر چکا تھا۔

میں مذکورہ کھڑکی کی طرف آیا تو کیا دیکھتا ہوں وہاں ایک پلنگ نما چارپائی کی نواڑ جھول رہی تھی، جسے لپیٹ کر موٹا اور دراز کیا گیا تھا، اس کا ایک سرا کھڑکی کے اندر بندھا ہوا تھا اور دوسرا کھڑکی سے باہر حویلی کی عمارت سے نیچے جھول رہا تھا۔ لگتا تو صاف یہی تھا کہ سوشیلا ہی کی یہ حرکت ہوسکتی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں میرا دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ سوشیلا اس طرح مجھے اکیلا چھوڑ کر خود ہی فرار ہو جائے گی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ پیش آمدہ حالات سے خوف زدہ ہوگئی ہو اور اس نے اکیلے ہی راہِ فرار ہونے میں عافیت جانی ہو۔ میرا ساتھ دینے کا اپنا وعدہ وہ بھول گئی ہو شاید۔

“کیا اب بھی تمہیں وشواش نہیں آ رہا ہے؟ مگر چنتا مت کرو، میرے آدمی اُسے تلاش کر کے ہی لوٹیں گے۔” مہارانی نے مجھے متذبذب سوچ میں مبتلا پا کر کہا۔ اس کے یقین بھرے لہجے سے مجھے سچائی کی بو آ رہی تھی۔ مگر میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا کہ سوشیلا ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔

“جس کی جان پر بنی ہو تو وہ اپنوں تک کو چھوڑ کر بھاگ لیتا ہے، یہ تو تم تھے، اب پتا نہیں، تم دونوں کے بیچ کیسا سمبندھ تھا کہ اس نے تمہاری بھی پروا نہ کی، لیکن اس کے فرار نے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ تم دونوں جونگی بابا کے مجرم ہو۔”

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جولائی 2016ء کی جھلکیاں

قصیدہ گو

اس شاعر کی زندگی میں خوشیوں نے کبھی جھانک کر بھی نہ دیکھا، رلا دینے والا زندگی نامہ

لازوال

فلم نگری سے اس اہم شخصیت کی داستان جس نے آخر وقت میں پاکستان چھوڑ دیا

ملکہ مارجوری

اس پاکستانی ملکہ کا تذکرہ جس کی پھوپی اس کا پیار ہتھیانے پر اتر آئی تھی

شمشال سے ٹورنٹو

سحر آفرین الفاظ سے مزین انتہائی دلچسپ سفر کہانی کا ڈرامائی موڑ

اس کے علاوہ

تاریخ عالم، جولائی کی شخصیات، دلچسپ واقعات، سچی داستانیں، سچ بیانیاں۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

بس ایک بار سرگزشت پڑھیں پھر آپ خود ہی اس کے اسیر ہو جائیں گے

مہارانی کی اس بات پر مجھے تشویش نے آلیا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ’’نہیں مہارانی صاحبہ! آپ کا اندازہ غلط ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں بھی آپ کو یہاں نہیں نظر آرہا ہوتا۔ اگر ہم نے یہاں سے فرار ہونا ہی ہوتا تو دونوں ایک ساتھ فرار ہوتے جبکہ گزشتہ رات جب میں آپ کے ساتھ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے اُوپر اپنے کمرے میں آیا تو میں نے سوشیلا کو اپنے بستر پر بے سُدھ سویا ہوا پایا تھا۔ خود میرا اپنا نیند سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ خود میں بھی بستر پر گرتے ہی سو گیا تھا۔ لیکن ہاں! مجھے ایسا ضرور لگا تھا جیسے میں نے کوئی نشہ آور چیز کھالی ہو۔ وہ نیند قدرتی نہیں بلکہ کسی دوا کے زیرِ اَثر تھی۔‘‘ بالآخر میں نے مہارانی سے یہ کہہ ڈالا۔ یکا یک ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ سب جان بوجھ کر اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ نیز مجھے سوشیلا کا فرار بھی ایک ڈراما لگا جو مہارانی نے ہی رچایا ہوگا۔

مہارانی نے میری بات پر ایک ناگوار سی نگاہ میرے چہرے پہ ڈالی اور پھر اسی لہجے میں بولی۔

’’تمہارا کیا مطلب ہے کہ ہم نے تمہارے کھانے میں بے ہوش کر دینے والی کوئی شے ڈالی تھی؟‘‘

’’کھانا کھاتے ہی مجھ پر غنودگی اور ایک نشہ سا طاری ہونے لگا تھا جو بہ ظاہر نیند کا ہی تاثر دیتا محسوس ہوا تھا، لیکن ایسی نیند تو پہلے کبھی کھانا کھاتے ہی مجھے نہیں آئی تھی، میں پھر کیا سمجھتا؟‘‘ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو اس کے حسین و دل کش چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں نے مزید کہا۔

’’میرے شبہ کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ خوامخواہ ہی سوشیلا کے نامعلوم فرار پر ہمیں مجرم ثابت کرنے پر تُلی ہوئی ہیں جبکہ میں نے اور نہ ہی میری ساتھی سوشیلا نے جونگی بابا کے ساتھ کچھ کیا ہے، میں پھر کہہ رہا ہوں، وہ ہمارا محسن تھا، اس نے میرا علاج کیا تھا اور ہمیں اس کی موت پر دکھ ہوا ہے۔‘‘

میں نے دیکھا کہ میری اس بات پر مہارانی کے چہرے کے برہم سے تاثرات پل کے پل ایک اُلجھن آمیزی میں بدلنے لگے تھے۔ مجھے کچھ ادراک ہوا کہ مہارانی بعض محتاط اندازوں سے یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ آیا ہم جب تک جونگی بابا کی مڑھی میں رہے تھے، تو کیا ہمیں (مجھے اور سوشیلا) کو جونگی بابا کی ’’اصلیت‘‘ جاننے کا موقع مل چکا تھا یا نہیں...... کیونکہ اس نے گزشتہ رات کھانے کے بعد مجھ سے سوالات کی جو مختصر سی نشست جمائی تھی، اس سے مجھے اب یہی لگ رہا تھا کہ وہ ابھی تک اسی مخمصے کا شکار تھی کہ کیا ہم واقعی جونگی بابا کی اصلیت بہ شمول اس کے (مہارانی کے) اور جونگی بابا کے درمیان پُراسرار تعلق سے واقفیت حاصل کر چکے تھے یا نہیں؟ وہ اسی لیے شاید ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی اور جونگی بابا کے قتل کی تفتیش کے بہانے وہ یہ سب اپنے طور پر بھی جاننا چاہتی تھی، اُسے یقیناً اس بات کا بھی ڈر ہوگا کہ کہیں ہم یہاں سے جا کر اس کے جرم کا پول نہ کھول ڈالیں جبکہ اسے کیا پتا تھا کہ ہم تو خود اپنے دشمنوں سے سر چھپاتے پھر رہے تھے۔

بلاشبہ یہ خود ہمارے لیے بھی ایک بلاوجہ کی ’’فٹیگ‘‘ تھی۔ اس لیے میں نے بھی اب ذرا محتاط لہجہ اختیار کر لیا تھا مگر سوشیلا کے سلسلے میں، میں مہارانی سے کسی قسم کا ’’کمپرومائز‘‘ کرنے کے ہرگز موڈ میں نہیں تھا۔

تاہم ان سب باتوں کے باوجود میں ایک فطری تجسس کا شکار ضرور ہو گیا تھا کہ آخر جونگی بابا اور مہارانی کے درمیان ایسا کیا تعلق ہو سکتا تھا، جس کی وجہ سے وہ ہماری طرف سے خدشات کا شکار تھی؟ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اس پردۂ تعلق کے پیچھے کوئی جرم چھپا ہوا تھا۔ یہ بھی تھا کہ جونگی بابا کے مرنے کے بعد اس جرم کی آبیاری بھی اختتام کو پہنچی تھی جس کے در پردہ مہارانی کا وہ مفاد بھی ختم ہو چکا ہوگا، جو جونگی بابا اور مہارانی کا مشترکہ ہی ہو سکتا تھا۔

بہرکیف......! مہارانی نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد مجھ سے کہا۔ ’’تمہیں وہم ہوا ہے۔ تمہیں کوئی بے ہوشی کی دوا نہیں دی گئی تھی نہ ہی تمہاری ساتھی سوشیلا کو...... وہ ویسے ہی تمہیں دکھانے کے لیے سوتی بن گئی ہوگی، تاکہ تم بھی سو جاؤ اور وہ بہ آسانی فرار ہو سکے۔‘‘

’’نہیں، یہ میرا وہم نہیں تھا۔‘‘ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ’’سوشیلا میری ساتھی تھی۔ وہ کافی عرصے سے میرے ساتھ تھی، میں اُسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتی بلکہ اُسے تو خود میری ضرورت تھی۔‘‘

مہارانی کا اپنی بات پہ اڑے رہنا ہی اس کے جھوٹے ہونے کی دلیل تھی، بولی۔ ’’ٹھیک ہے، سب معلوم ہو جائے گا ابھی، میں نے سوشیلا کی تلاش میں اپنے آدمی دوڑا دیے ہیں، بہت جلد وہ ہمارے سامنے پیش کر دی جائے گی۔‘‘

مہارانی نے یہ بات مجھ سے دوسری بار اور بھرپور یقین سے کہی تھی کہ خود مجھے بھی کبھی ایسا محسوس ہونے لگتا تھا جیسے وہ سچ کہہ رہی ہو۔

نواڑ نما رسی اُوپر کھینچ لی گئی تھی، وہ نندو کے ہاتھ میں تھی، میں نے اس سے لے کر اس کا بہ غور جائزہ لیا۔ پھر کچھ سوچ کر اسی پلنگ نما چارپائی کی طرف بڑھا، جہاں سے یہ نکالی گئی تھی، میں نے بہت باریک بیں نظروں سے اس نواڑ کو سوشیلا اور اپنے پلنگ کی نواڑ سے ملا کر دیکھا، پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مہارانی سمیت وہاں موجود سب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے مہارانی سے کہا۔ ’’اس رسی اور پلنگ کی رسی کے رنگ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آپ غور سے دیکھ لیں، پھر میں دوبارہ آپ کو یہ رسی دیکھنے کے لیے دوں گا۔‘‘

مہارانی نے ایک نگاہ رسی پر ڈالی، اس کے بعد میں نے نواڑ کا ایک سرا نندو کو پکڑنے کے لیے دیا اور کہا کہ وہ اسے مضبوطی سے تھامے رکھے۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مہارانی کی بھی اُلجھی ہوئی نگاہیں میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نواڑ نما اس رسی کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک دبا کر یوں رگڑا کہ میرے دونوں ہاتھ پھسلتے ہوئے اُس آخری سرے تک چلے گئے، جو نندو کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے بعد میں نے رسی کو دوبارہ پلنگ کی نواڑ سے ’’میچ‘‘ کیا۔ واضح طور پر دونوں کے رنگ میں فرق آچکا تھا۔ میں نے سیدھے کھڑے ہو کر مہارانی سے کہا۔

’’مہارانی صاحبہ! اب دوبارہ اس رسی کو غور سے دیکھیں، میرے اس پر ہاتھ گھمانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس کا رنگ بدل گیا ہے، نواڑ کا رنگ کتنا سفید تھا پہلے......‘‘

’’کیا کہنا چاہتے ہو تم کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟‘‘ مہارانی نے تیز نگاہوں سے مجھے گھورا، لیکن میں خائف ہوئے بغیر اس سے ترکی بہ ترکی بولا۔

’’آپ جھوٹ بول رہی ہیں یا نہیں، لیکن مجھے اب یقین ہو گیا ہے یہ سب میری ساتھی سوشیلا کے فرار کا محض ایک ناٹک رچایا گیا ہے۔ وہ اسی حویلی کے کسی قید خانے میں موجود ہے۔‘‘

’’اگر یہ بات ہے تو پھر تم باہر کیوں ہو اس قید خانے سے......؟‘‘ مہارانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’بقول تمہارے اگر ہم نے سوشیلا اور تمہارے کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی اور تم دونوں ہی بے سدھ ہو کر سو گئے تھے تو پھر تمہیں کیوں چھوڑا گیا؟‘‘

اپنے تئیں مہارانی نے بڑا مضبوط جواز گھڑا تھا، لیکن میں پھر بھی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا، بولا۔ ’’اس کی وجہ آپ کو معلوم ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ آپ میری ساتھی کی گمشدگی کی پولیس کو اطلاع دے دیں۔‘‘

’’یہ ہماری راجدھانی ہے، ہم ہی یہاں کی پولیس ہیں اور ہم ہی کرتا دھرتا ہیں اس پوروائی کے۔‘‘ مہارانی کا لب و لہجہ جارحانہ اور طیش ناک ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ایک لمحے کو لگا کہ وہ اب کسی بھی وقت میرے خلاف کوئی سخت فیصلہ صادر کرنے والی تھی۔ لیکن میں بھی نچلا ہونے والا نہیں تھا۔ اس بار استہزائیہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

’’پھر تو مجھے انصاف ملنے کی اُمید بالکل ہی نہیں رکھنی چاہیے۔‘‘

’’اس گستاخ کو تہ خانے میں لے جا کر ڈال دو......‘‘ دفعتاً ہی کمرے میں مہارانی کی زہریلی پھنکار سے مُشابہ آواز اُبھری اور اسی وقت نندو نے چلا کر مخصوص انداز میں کسی کو پکارا۔ آن کی آن میں وہاں پانچ چھ مسلح افراد باادب حاضر ہو گئے۔ وہ چوکنے بھی نظر آرہے تھے۔ تاہم ان کی جارحانہ نظریں میرے چہرے پہ جمی ہوئی تھیں۔

’’اس گستاخ کو تہ خانے میں لے جا کر قید کر دو۔‘‘ نندو نے ان سے تحکمانہ کہا۔ حواریوں نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے دانستہ ایک استہزائیہ سی نظر مہارانی کے پُرتیش چہرے پہ ڈالی تھی۔ مجھے وہاں کچھ ایسے آثار دکھائی دیے جیسے وہ خود اپنا یہ فیصلہ صادر کرنے پر ناخوش تھی۔ اس کے مسلح حواری مجھے لیے ابھی کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ اچانک ایک آدمی گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہم بھی رک گئے۔ وہ مہارانی سے گھبرائے لہجے میں بولا۔

’’مہارانی صاحبہ! وہ...... وہ باہر...... پپ...... پولیس آئی ہے۔‘‘ اس اطلاع پر مہارانی کا چہرہ پریشان سا دکھائی دینے لگا، خود مجھے بھی تشویش سی ہونے لگی، اگرچہ خود میں نے ذرا دیر پہلے ہی مہارانی کو پولیس کا مشورہ دیا تھا، مگر حقیقت یہی تھی کہ پولیس کے بیچ میں پڑنے سے میرا معاملہ بھی خراب ہو سکتا تھا۔ وہ میرے بارے میں بھی پوچھ تاچھ کر سکتی تھی۔ گویا پولیس کی آمد کے ذکر پر مہارانی کی طرح میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ مگر اپنے چہرے سے میں نے کسی تفکر کو ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ مسلح حواری مجھے ساتھ لے جاتے ہوئے رک کر اب سوالیہ نظروں سے مہارانی کی طرف تکے جا رہے تھے۔

’’اسے لے جاؤ......‘‘ مہارانی نے تحکمانہ انداز میں

اپنے حواریوں سے کہا۔ میرے لیے بھی سرِدست شاید یہی بہتر تھا۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے گزارتے ہوئے ایک تنگ و تاریک تہ خانے میں لے آئے۔ تہ خانے تک پہنچتے پہنچتے، یہ حواری دو بچے تھے، باقی ادھر اُدھر ہو گئے تھے۔ وہ مجھے کوئی عام سا ہی انسان سمجھے ہوئے تھے شاید۔ البتہ باقی دونوں خاصے چوکنا تھے۔ ایک نیچی چوکھٹ والے دروازے کے سامنے لاکر مجھے کھڑا کر دیا گیا۔

تہ خانے کا یہ اس قدر نیچا اور تنگ دہانہ دیکھتے ہی مجھے ہول سے آنے لگے تھے۔ مجھے وحشت سی ہونے لگی۔ دروازہ خاصا بھاری اور زنگ آلود تھا۔ ایک تو اُسے کھولنے اور دھکیلنے میں مصروف ہو گیا، جبکہ دوسرا میرے ساتھ چوکنا کھڑا تھا۔ تب ہی میرے وجود میں جیسے برق سی دوڑ گئی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے ساتھ کھڑے حواری کی رائفل پر ہاتھ مارا اور اس کی نال کا رخ بدلنے کے ساتھ ہی اس کے پیٹ پر زوردار پنچ رسید کر دیا، وہ کراہ نما سی آواز نکال کر جھکا اور رائفل میرے ہاتھ میں آگئی، تب تک تہ خانے کے دروازے سے ''مصروف کار'' دوسرا حواری اپنی رائفل سنبھال کر میری طرف پلٹا تھا کہ میں نے اس کی پشت پر بھی لات رسید کر دی، وہ تہ خانے کے اندر جا پڑا۔ تب تک پہلے والا اپنے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے حلق سے غراہٹ خارج کرتا میری طرف لپکا تو میں نے جھکائی دی اور وہ بھی اپنی جھونک میں اندر تھا۔ میں نے بہ سرعت حرکت کی اور تہ خانے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ایک لیور مجھے دکھائی دیا تھا، اُسے میں نے جلدی سے دبا دیا۔ تہ خانے کا دروازہ اب باہر سے لاک ہو گیا تھا۔

رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک لمحہ اس کا جائزہ لیا۔ وہ عام سی رائفل تھی۔ جس میں تین انچ کی سات گولیوں کا میگزین ڈلتا تھا۔ میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور چند ثانیے وہیں تہ خانے کے سامنے کھڑا رہا۔

میں یہ دیکھنا چاہ رہا تھا کہ اندر مقید حواریوں کے چیخنے چلانے یا مدد کے لیے پکارے جانے کی آوازیں باہر سنائی دیتی ہیں یا نہیں، حسبِ توقع میرا اندازہ درست ثابت ہوا، اندر سے کوئی آواز برآمد نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے اب تسلی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

مجھے اطمینان تھا کہ حویلی میں اچانک پولیس کی آمد کی وجہ سے سب کی مصروفیت ادھر ہی ہوگی، میں تب تک اپنی خفیہ کارگزاری دکھانے کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں بجائے پیچھے لوٹنے کے آگے بڑھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہاں اس تنگ و تاریک راہداری میں اور کتنے تہ خانے یا کمرے تھے۔ راہداری میری توقع کے برخلاف آگے سے مختصر ثابت ہوئی۔

چند قدموں کے بعد وہ دائیں جانب گھوم گئی تھی اور آگے سپاٹ دیوار آگئی تھی، مگر یہاں پہنچ کر میں چونکا تھا، مجھے سرے کے بائیں جانب ایک دروازہ نظر آیا، جس پر بھاری قفل لگا ہوا تھا۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس پر رائفل کا ٹھوس کندا مارنا شروع کر دیا، تالا زنگ آلود اور خستہ حال تھا، تین چار زوردار ضربات کے بعد ہی کھل گیا، میں نے جلدی سے کنڈا کھولا اور دروازہ اندر دھکیلا ایک عجیب سی ناگوار بدبو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا اور میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ تب ہی مجھے اندر سے ایک لرزتی سی نسوانی آواز سنائی دی۔

''کک...... کون؟'' اس آواز کو پہچانتے ہی میں جیسے شانت ہو گیا، یہ سوشیلا کی آواز تھی، میرے محتاط ذہن رسا میں یہاں آتے ہی، پہلا خیال یہی ابھرا تھا کہ اگر سوشیلا کو کہیں مقید رکھا ہوگا تو وہ یہیں کہیں ہو سکتی تھی۔

''سوشی......! جلدی سے باہر آجاؤ......'' میں نے اندر داخل ہونے کے بجائے باہر ہی کھڑے کھڑے اسے آواز دی، وہ بھی میری آواز پہچان گئی تھی، مگر باہر نہیں آئی، بولی۔

''شش...... شہزی......! مم...... میں...... آہ......'' وہ جملہ کراہ میں بدل کر اُدھورا رہ گیا۔ میں سمجھ گیا اندر معاملہ کچھ اور تھا۔ میں بدبو کی پروا کیے بغیر اندر داخل ہو گیا اور اندھیرے میں سوئچ ٹٹول کر لائٹ آن کی تو ایک دہشت انگیز منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

☆☆☆

جو انسانیت سوز منظر میں نے جونکی بابا کی مڑھی میں دیکھا تھا، کم و بیش اسی سے ملتا جلتا منظر مجھے یہاں بھی نظر آیا تھا۔ کمرے میں فقط ایک ہی بلب روشن تھا۔ سامنے دائیں بائیں انسانی ہڈیوں کے پنجر بکھرے پڑے نظر آئے۔ ایک طرف ویسی ہی پاؤچ نما سیلوفین تھلیاں ایک بڑے سے چوبی ریک پر پڑی دکھائی دی تھیں، جن میں سرخ اور گاڑھا خون بھرا ہوا تھا۔ کچھ زمین پر گری پڑی تھیں۔ جبکہ میری نظروں کے بالکل سامنے ایک چارپائی پر سوشیلا رسیوں سے بندھی پڑی تھی۔ وہ ہوش میں تھی اور بری طرح دہشت زدہ نظر آرہی تھی، جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا منظر دیکھ رکھا ہو۔

اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی نگاہوں میں التجا تھی۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر پہلے اسے رسیوں سے آزاد کرایا تو وہ ایک دم مجھ سے لپٹ گئی اور اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

''شش...... شہزی...... مم...... مجھے یہاں سے لے چلو، بھگوان کے لیے...... وہ...... وہ، مہارانی ایک ڈڈ...... ڈائن ہے۔'' وہ خوف زدہ اور بے ربط جملوں کے درمیان بولی اور میں اس کی ڈائن والی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے اسے پہلے حوصلہ اور تسلی دینا ضروری سمجھا، تاکہ وہ اپنے حواسوں میں آجائے، یوں بھی سے جی کو ہارا اور بھومک جیسے درندہ صفت شیطانوں کی قید میں رہی، اس سے پہلے وہ جنزل کے ایل ایڈوانی کی چپقلشوں کا بھی شکار رہی تھی، بعد میں وہ اس سفاک اور جنونی انسان کے ہاتھوں اپنی بہن اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کی ہلاکت کے غم ناک سانحے سے بھی گزری تھی، اور میرے ساتھ اس نے جنزل کے ایل ایڈوانی سے ناصرف بھرپور انتقام لینے کا عزم کر رکھا تھا بلکہ وہ ہیرا (طلسم نور) بھی اس کے قبضے سے برآمد کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ ان حالات نے اُسے اعصابی طور پر اب تک خاصا مضبوط تو بنا دیا ہوگا، نیز وہ اسپیکٹرم کی فعال رکن رہی تھی (جب تک اسپیکٹرم واقعی ایک معتبر ادارہ کہلاتا رہا) مگر شاید اس نے جو دل دہلا دینے والا منظر دیکھا ہوگا، وہ ان پیش آمدہ حالات سے مختلف ہوگا، جس نے اسے یوں دہشت زدہ اور مخبوط الحواس کر ڈالا تھا۔ جونکی بابا اور مہارانی کے حوالے سے اگرچہ خود مجھے بھی کسی گھناؤنی سی پُراسراریت کی بو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ بالخصوص اس رات کو جب میں اور مہارانی ایک نیم تاریک سے کمرے میں باتیں کر رہے تھے اور مجھے اس کے چہرے کی جھلک صاف نظر نہیں آرہی تھی، وہ بدلا بدلا سا مجھے محسوس ہوا تھا، میں کھٹک گیا تھا لیکن ابھی بہت کچھ در پردہ تھا۔

میں نے آہستگی کے ساتھ سہمی ہوئی اور خوف زدہ سی سوشیلا کو خود سے الگ کیا اور اُسے مختصراً الفاظ میں اب تک کی صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ کچھ سنبھلی اور بولی۔

''اس رات کھانے کے بعد میری بھی یہی حالت ہوئی تھی، جب تمہیں مہارانی نے روک لیا تھا اور میں اپنے کمرے میں آکر تمہاری واپسی کے انتظار میں جاگنے کی کوشش کر رہی تھی کہ تم سے پوچھوں آخر مہارانی نے تمہیں اپنے پاس روک کر کیا باتیں کیں؟ لیکن مجھے ایسی نیند آئی کہ میں جیسے بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔ اس کے بعد میری آنکھ یہاں کھلی تھی۔ کمرے میں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا، پہلے تو میں یہی سمجھی تھی کہ میں اپنے ہی کمرے میں ہوں اور لائٹ آف ہے، مگر جب میں نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش چاہی تو قاصر رہی، تب ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں رسیوں سے بندھی ہوئی ایک چارپائی پر پڑی ہوں۔ میں خوف سے چیخنے چلانے لگی تو کوئی دروازہ کھولے اندر داخل ہوا، کمرے میں روشنی ہو گئی، میں اسے پہچان گئی، وہ نندو تھا۔ اس نے مجھے دھمکایا کہ شور مچانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ حویلی کا یہ حصہ پاتال کہلاتا ہے۔ یہ...... تم جو ریک دیکھ رہے ہو ناں...... شہزی......!'' اس نے کپکپاتی آواز میں اس سالخوردہ سے ریک کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ وہی خون ہے جو نندو، جونکی بابا کی مڑھی سے لاتا تھا۔ یہ جونکوں کا چوسا ہوا خون ہے۔ جونکی بابا نے اپنی مڑھی میں جونکوں کا جو فارم بنا رکھا تھا۔ وہ خاص مہارانی کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ جونکیں جب خون پی کر موٹی اور اپنے سائز سے بھاری ہو جاتی تھیں تو جونکی بابا انہیں پھوڑ کر ان سے نکلنے والا خون ایک تھیلی میں جمع کر لیا کرتا تھا۔ اُف...... کس قدر گھناؤنے عمل کی یہ کہانی ہے۔'' وہ بے اختیار کپکپا گئی پھر بولی۔

''پلیز! پہلے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، میں بعد میں سب کچھ تمہیں تفصیل سے بتا دوں گی۔'' میں نے ہونٹ بھینچ کر پرسوچ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں اسے لیے کمرے سے باہر آگیا۔

یہ سب پتا نہیں کیا گھن چکر تھا، جس سے میرا دل و دماغ عجیب و غریب کیفیات کا شکار ہونے لگا تھا۔ یہ بالکل مختلف اور عجیب و غریب حالات تھے، جن سے میں دوچار تھا، نجانے اب پردۂ غیب سے کیا کیا کچھ ظاہر ہونے والا تھا۔ اس کی ایک ہولناک سی توقع ہی کی جا سکتی تھی۔

نیم تاریک سی راہداری سنسنان پڑی تھی۔ حواری سے چھینی ہوئی رائفل ہنوز میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ اس کی سات گولیاں پوری تھیں۔ سوشیلا کو اپنے عقب میں کیے ہوئے میں قدرے تیز مگر محتاط قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔

جن دونوں حواریوں کو میں نے تہ خانے میں بند کیا تھا، یہ عین ممکن تھا کہ ان کے ساتھی ان کی طرف سے زیادہ دیر تک غافل نہیں رہ سکتے تھے۔ اگرچہ اس وقت اُوپر سب پولیس کے ساتھ مصروف تھے اور یہ بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ اس موقع سے ہم جلد از جلد فائدہ اُٹھا کر حویلی

سے باہر بھی نکل سکتے تھے۔ میں سوشیلا کو لیے ہاتھ میں رائفل سنبھالے تنگ سی سیلن زدہ سیڑھیاں چڑھتا بالآخر اُوپر اس دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا، جدھر حویلی کا گراؤنڈ فلور تھا۔ وہ مسلح حواری مجھے اسی راستے سے اندر لائے تھے اور وہ مجھے اَزبر تھا کہ مجھے پہلے کس کمرے میں قدم رکھنا تھا جو ہمارے لیے قدرے محفوظ بھی ہوتا۔

مذکورہ کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے کانوں میں مہارانی کے پُرجلال انداز میں چلانے کی آوازیں آنے لگیں، وہ کسی تفتیشی پولیس افسر کے ساتھ خاصی برہمی سے باتیں کررہی تھی۔ ایک لمحے کو رک میں نے ان کی باتیں سننا ضروری سمجھا تا کہ معاملے کی تہ تک پہنچنے کے ساتھ ساتھ آئندہ کا لائحۂ عمل بھی تیار کرنے میں آسانی ہوتی۔ جبکہ سوشیلا کا خیال تھا کہ ہمیں اس سنہری موقع سے فائدہ اُٹھا کر پہلے فرار کی کوشش کرنی چاہیے۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا، کیونکہ میں نے مہارانی کو کہتے سنا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ کو ہمارے کسی دشمن نے ورغلایا ہوگا اور آپ بھی کسی کے ایک گمنام سے خط پر پوری پولیس پارٹی کے ساتھ بغیر تصدیق کے، یہاں دوڑے چلے آئے......؟''

''میرے پاس اس حویلی کی تلاشی کا سرچ وارنٹ ہے، مہارانی صاحبہ!'' جواباً ایک بھاری مردانہ آواز سنائی دی جو خاصی رعب دار تھی، یہ یقیناً اسی انسپکٹر کی آواز تھی جس سے مہارانی مخاطب تھی۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مہارانی سے ذرا بھی خائف یا مرعوب نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اور ہم صرف کسی گمنام فون یا خط پر بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے کوئی قدم نہیں اُٹھاتے ہیں، پہلے اس کی خفیہ طور پر مکمل تحقیقات کرتے ہیں، اس کے بعد ہی عملی طور پر آگے بڑھتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے اس بستی میں ہی نہیں بلکہ اریب قریب کے گاؤں دیہاتوں کے بھی لوگ پُراسرار طور پر غائب ہونے لگے ہیں، جن میں سے کچھ کی بگڑی ہوئی لاشیں اور ہڈیوں کی صورت میں استخوانی پنجر ملے ہیں۔ جنہیں زمین میں گاڑھا گیا تھا۔'' انسپکٹر کی بات جاری تھی، مگر میرے لیے اب یہاں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ پولیس کو مہارانی پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا اور وہ اس کے پیچھے پڑ چکی تھی۔ یوں بھی اگر مہارانی کوئی خونی کھیل کھیلنے میں مصروف تھی تو وہ اب جونگی بابا کے واصلِ جہنم ہونے کے بعد ختم ہو چکا تھا۔ مہارانی کے پریشان اور چڑچڑے مزاج کی وجہ بھی یہی رہی ہوگی۔ باقی آگے کی کیا حقیقت تھی وہ، بقول سوشیلا کے اُسے معلوم تھی، جو میں بعد میں بھی اس سے پوچھ سکتا تھا۔

''نکل چلو اب......'' سوشیلا نے مجھے ٹہوکا دیا اور میں آگے بڑھ گیا۔ نکاسی کا ہمیں ایک ہی راستہ معلوم تھا جہاں سے ہمیں لایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ کبھی اگر تھا تو اس سے ہم دونوں ہی لاعلم تھے۔ پھر بھی میں محتاط روی کے ساتھ حویلی کے ان گوشوں کا ہی انتخاب کیے ہوئے تھا، جہاں سے مجھے کوئی ایسا راستہ دکھائی دے جائے کہ ہم بہ آسانی یہاں سے نکل سکیں۔

ایک غلام گردش کے عقبی خلا میں دیوار پر مجھے خاصی بڑی کھڑکی نظر آئی۔ یہاں سے میں نے باہر جھانکا تو مجھے حویلی کا بیرونی حصہ نظر آیا جہاں میں نے پولیس کی ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی جیپ کھڑی دیکھی، وہاں کچھ انڈین پولیس ....کی وردی میں افراد خاصے چوکس کھڑے تھے۔

ابھی میں کھڑکی سے ہٹ کر آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک میری نظر حویلی کی طرف آنے والے بل کھاتے چوڑے کچے راستے پر پڑی اور میں بُری طرح چونک پڑا۔ وہاں دو تین بھاری بھرکم گاڑیاں خاصی رفتار کے ساتھ حویلی کی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے اور آنکھیں پھیل سی گئیں۔ وہ پولیس کی گاڑیاں نہیں تھیں، مگر میں جان سکتا تھا کہ اس میں کون لوگ سوار ہو سکتے تھے! میں نے کھڑکی سے ہٹنے کا ارادہ ترک کیا اور ان گاڑیوں پر نظریں گاڑ دیں۔

''یہ......گاڑیاں......؟'' معاً مجھے سوشیلا کی اٹکتی آواز سنائی دی۔ وہ بھی میرے قریب کھڑی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی کانپتی ہوئی سی آواز میں اندیشوں کی تھرتھراہٹ تھی۔

''مجھے دیکھنے دو......'' میں نے بدستور اپنی عقابی نظریں انہی گاڑیوں پر مرکوز رکھتے ہوئے مختصراً کہا۔

گاڑیاں احاطے کے بڑے سے چوبی دروازے کے قریب پہنچ کر رک چکی تھیں۔ اب ان کا زاویہ کچھ اس طرح بن گیا تھا کہ یہ تینوں گاڑیاں میری نظروں سے تقریباً اوجھل ہو چکی تھیں۔ گیٹ پر تعینات مہارانی کے مسلح گارڈز نے شاید انہیں روک لیا تھا اور ضروری پوچھ تاچھ میں مصروف تھے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان گاڑیوں میں کون لوگ ہو سکتے تھے! پھر بھی میں ان کے اندر داخل ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا، میں تب ہی انہیں دیکھ کر پہچان سکتا تھا، جب

انہیں اندر داخل ہونے کی اجازت مل جاتی۔

''شہزی......! یہ وہی لوگ ہیں، ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' سوشیلا نے سرگوشی میں کہا۔ وہ خود کو کافی سنبھال چکی تھی۔ میں نے جواباً کہا۔

''ٹھہرو...... مجھے پہلے تصدیق کرلینے دو، تب ہی کچھ کرتے ہیں۔ ہمارے لیے ان لوگوں نے دروازے وا نہیں کرر کھے ہیں کہ ہم بڑے آرام سے نکل جائیں گے۔''

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر چپ ہو رہی۔

میری یک ٹک نظریں بدستور دروازے کے اندرونی حصے پر مرکوز تھیں۔ دروازے کے باہر کیا ہو رہا تھا، مجھے اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا، یہ ضرور پتا چلتا تھا کہ انہیں روک لیا گیا تھا۔ پھر اچانک میں نے اس دیوہیکل چوبی گیٹ کا بغلی دروازہ کھلتے دیکھا۔

ایک حواری تیزی سے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کا رخ حویلی کے مرکزی دروازے کی طرف تھا۔ وہ شاید اندر مہارانی سے یہ اجازت لینے کے لیے جا رہا تھا کہ ان نووارد گاڑی سواروں کو اندر داخل ہونے دیا جائے یا نہیں۔

اس سارے عمل میں تھوڑی دیر لگ سکتی تھی۔ گزرتا ہوا ہر لمحہ چیخ چیخ کر مجھے خبردار کر رہا تھا کہ ایسے وقت میں بہت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانے کی ضرورت ہے، نہ صرف کسی قسم کی جلد بازی بلکہ بلاوجہ کی تاخیر بھی ہمارے لیے کوئی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی تھی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اسی طرف دیکھتا رہا۔ یہ فوری فیصلے کی گھڑی تھی، سوشیلا زیادہ پریشان اور تشویش زدہ نظر آنے لگی۔ پل کے پل میں نے سوچا۔ ہماری تلاش میں سرگرداں، اگر یہ ہمارے مشترکہ دشمنوں کا ٹولا ہی تھا، یعنی بلیوتکسی اور اس کے اتحادی کوہارا (اسپیکٹرم) اور یہ لوگ بلاشبہ ہماری ہی تلاش میں یہاں تک پہنچے تھے، تو کم از کم مہارانی انہیں ہمارے بارے میں کبھی نہیں بتا سکتی تھی بلکہ وہ کیا، مہارانی نے تو اس پولیس انسپکٹر کو بھی ہمارے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا ہوگا، جس کے ساتھ وہ برہمی سے پیش آرہی تھی، نہ ہی وہ بتا سکتی تھی، وجہ اس کی ظاہر ہے یہی تھی کہ وہ مجھے اپنی طرف سے تہ خانے میں مقید کروا چکی تھی اور سوشیلا تو پہلے ہی اس کی ''قید'' میں تھی۔

یہی بات ہمارے حق میں جاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر جو کسی گمنام اطلاع پر مہارانی کے کسی جرم کو بے نقاب کرنے کی غرض سے تفتیش کے لیے آیا ہوا تھا وہ حویلی کی تلاشی کے لیے بضد تھا۔ یوں، ہمارے دشمنوں کو بھی ''لگے ہاتھوں'' یہ موقع حاصل ہو سکتا تھا۔ میرے دشمنوں میں بلیوتکسی ٹولا اندر موجود پولیس کو ہی نہیں بلکہ مہارانی کو بھی کسی خفیہ ادارے کی کارروائی یا غیر ملکی جاسوس کی تلاش کے سلسلے میں اپنا تعارفی حوالہ دے کر ان سب کو بہ آسانی مرعوب کر سکتا تھا۔ کیونکہ بلیوتکسی ٹولے کو بہرحال ایک خفیہ (بھارتی) ملکی ادارے کی حیثیت اور رعب و دبدبہ حاصل تھا، اور ان کی مرضی کے سامنے مہارانی بھی مجبور ہو سکتی تھی۔

پولیس کی بات تو اور تھی لیکن بلیوتکسی اور اسپیکٹرم والے میری تلاش میں اس حویلی کا چپّا چپّا چھان سکتے تھے۔ کیونکہ اب تک ہماری تلاش میں ان لوگوں نے پوری بستی چھان ماری ہوگی اور یہ بھی انہیں پتا چلا ہوگا کہ اس بستی میں دو نووارد اجنبی افراد کو دیکھا گیا ہے۔ پھر ان کی تلاش اور تفتیش کا دائرۂ کار ڈاکٹر لیکھ رام سے لے کر بالآخر یہاں مہارانی کی حویلی تک منتج ہوا ہوگا یوں انہیں پورا یقین ہو چلا ہوگا کہ ہم انہیں اسی حویلی میں ہی مل سکتے تھے۔

مہارانی ان کے آگے نہیں ٹھہر سکتی تھی، وہ کوئی اصلی والی راجاؤں مہاراجاؤں والی مہارانی نہیں تھی، ایک عام سی زمیندارنی تھی اور تنہا تھی، نجانے اس کے باقی افرادِ خانہ کہاں تھے؟ تھے بھی یا نہیں، میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم یہاں اس کے رکھ رکھاؤ سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ دبدبے والی نہیں تھی۔

بہرکیف ذہن میں تیزی سے چلتے خیالات کی اس چین میں، میں چند سیکنڈوں کے اندر اندر ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا اور اسی وقت میں نے سوشیلا سمیت حرکت کی۔

اب میری کوشش تھی کہ میں حویلی کے اندرونی گوشوں میں چھپتا چھپاتا ہوا کوئی ایسا چور یا قدرے متبادل راستہ ڈھونڈ لوں جہاں سے میں سوشیلا سمیت بہ خیر و عافیت اس منحوس حویلی سے نکل جاؤں ورنہ یہ حویلی کسی وقت بھی ہمارے لیے چوہے دان بن سکتی تھی۔

میں نے ایک بات محسوس کی تھی، حویلی کے بیشتر گوشے دن کی روشنی میں بھی نیم تاریکی میں غرق تھے، میں اور سوشیلا اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی کی نظروں میں آئے بغیر کسی چور نکاسی کے راستے کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

حویلی کے ایک بعید ترین گوشے میں، جہاں خاصی خاموشی تھی، مجھے ایک کمرے کا دروازہ کھلا ملا۔ اندر سے روشنی آرہی تھی، مگر یہ روشنی کسی بلب کی نہیں لگتی تھی، یہ سورج کی روشنی تھی۔ میں نے سوشیلا کو ایک طرف کھڑے رہنے کا کہا اور خود گربہ قدمی سے کمرے کی دیوار سے لگے، اس کے

دروازے کی طرف بڑھا اور اندر جھانکا۔ کمرا بھائیں بھائیں کررہا تھا مگر اندر یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک سی اُبھری تھی کہ کمرے کی ایک کھڑکی چوپٹ کھلی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے سوشیلا کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور خود بھی آگے بڑھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے بڑے دھیان سے باہر جھانکا تو میرا دل کامیابی کے احساس تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔

یہ کھڑکی قدرے بلندی پر سہی مگر جنگل کی طرف واقع تھی اور وہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''آؤ سوشیلا......! ہمیں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔'' میں نے اس سے کہا۔

کھڑکی آدم گزار تھی۔ تھوڑا اسکڑ سمٹ کر باہر کودا جاسکتا تھا۔ یہ بمشکل سات، آٹھ فٹ ہی بلند تھی۔ پہلے میں باہر کودا، اس کے بعد سوشیلا اپنی ساڑی سنبھالے کھڑکی کی چوکھٹ پر اُبھری۔

اسی وقت اس کی تیز چیخ اُبھری، میں بری طرح ٹھٹکا۔ میں نے دیکھا وہ باہر نکلنے کے لیے زور آزمائی کررہی تھی، لیکن شاید کوئی اسے اندر سے پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں پریشان ہوگیا۔

''کیا ہوا......؟ کون ہے تمہارے پیچھے؟'' میں نے اوپر کھڑکی کی چوکھٹ میں پھنسی شوشیلا سے تیز آواز میں کہا۔ اسی وقت سوشیلا نے خود ہی کوئی ہمت دکھائی تھی اور عقب سے اسے دبوچنے والے پر اس نے لات چلا دی تھی، پھر ایک جھٹکے سے وہ اُچھلی اور سیدھی نیچے آرہی، میں نے آگے بڑھ کر اس کے گرتے ہوئے نرم و نازک جسم کو تھام لیا۔ وہ خاصی دہشت زدہ سی ہورہی تھی۔ تاہم میری مضبوط بانہوں کی گرفت میں آتے ہی اس نے قدرے سکون کا سانس لیا تھا۔ رائفل میں نے پشت پر ٹکا رکھی تھی، دوڑنے سے پہلے میں نے ایک نظر کھڑکی پر ڈالنا ضروری سمجھا تھا کہ کہیں وہاں سے سوشیلا کو دبوچنے والا ہم پر فائر ہی نہ کھول دے۔

کھڑکی کے چوکھٹے پر مجھے مہارانی کے ایک حواری کی صورت نظر آئی تھی۔ اس نے ''قیدیوں'' کو بھاگتے دیکھ کر اپنی رائفل سیدھی کرلی۔ مگر اس سے پہلے میں خطرہ بھانپتے ہی سوشیلا کو زمین پر ٹکا کر اپنی رائفل ہاتھ میں لے چکا تھا اور سوشیلا میرے عقب میں کھڑی تھی۔ میری رائفل نے ایک زوردار دھماکے سے گولی اُگلی تھی، جو اس حواری کے شانے پر لگی، وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف اُلٹ گرا۔

''بھاگو سوشیلا......!'' میں نے اس سے کہا اور جنگل کی طرف دوڑ لگا دی۔ سوشیلا نے فوراً میری تقلید کی تھی۔ ہم دونوں اندھا دھند جنگل کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

☆☆☆

ہم دونوں جنگل میں داخل ہونے کے باوجود اس وقت تک دوڑتے رہے، جب تک کہ حویلی سے کافی دور نہیں ہوگئے۔ سوشیلا ایک نازک اندام عورت ہونے کے باوجود اس کڑے وقت میں بھرپور ہمت اور حوصلے کا مظاہرہ کررہی تھی، یا یہ اس جذبے کی کارفرمائی تھی جو اس کے اندر ان وحشی دشمنوں کے دوبارہ ہتھے چڑھنے کے خوف کی وجہ سے پوری طرح بیدار تھا۔

جنگل خاصا گھنا تھا۔ ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکے تھے۔ ہاں، کبھی دوڑتے تو کبھی تیز تیز قدموں سے چلنے لگتے، ابھی ہم حویلی سے بہ مشکل چند ہی کوس دور تھے کہ ہمیں اپنے عقب میں گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

''دشمن......!'' یکبارگی میرے ذہن میں اُبھرا۔ میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''دوڑو سوشیلا! دشمن ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔''

بدقسمتی سے یہ وہ وقت تھا جب سوشیلا کا سانس بُری طرح پھول چکا تھا اور اس کی دوڑنے کی تو کیا، بے چاری کے چلنے کی بھی ہمت جواب دے چکی تھی۔ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''ہے بھگوان......! مجھ سے تو اب چلا بھی نہیں جارہا...... میں تو...... ذرا دیر رک کر ستانے کا سوچ رہی تھی۔'' میں اس کی بات سن کر پریشان ہوگیا۔ گاڑیوں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھیں۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ عین آخری لمحات میں ہمارے فرار کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا اور یہ سب اسی حواری کی مداخلت سے ہوا تھا جس نے سوشیلا کو کھڑکی سے باہر کودتے ہوئے جانے کیسے اچانک دیکھ لیا تھا اور بعد میں فائر بھی کر ڈالا تھا، اپنی اس بے وقوفی کا تو اسے بعد میں احساس ہوا ہوگا کہ یہ وہ وقت تھا جب مہارانی پولیس سے ہمارے سلسلے میں اپنی جان چھڑانے کی کوشش میں تھی اور اس پر مستزاد ہمارے دشمن بھی وہاں آدھمکے تھے۔ فائر کی آواز نے انہیں بھی ضرور چونکا دیا ہوگا اور پھر کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں رہا ہوگا۔

پولیس سے قطع نظر میرے دشمن فوراً سے پیشتر ہمارے تعاقب میں نکل گئے ہوں گے، کیونکہ بستی والوں کی زبانی انہیں پہلے ہی سے ہمارے سلسلے میں بھنک پڑ چکی تھی۔

''سوشی! ہمت کرو پلیز......! آگے بڑھو......دشمن سر پہ پہنچنے والے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ میرا ہاتھ چھوڑ کے بے دم ہوکر گرنے لگی، مگر میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، وہ سسک پڑی۔

''شہزی......! تم بھاگ جاؤ...... مجھے یہیں چھوڑ دو......'' اس کی سسکتی آواز میں بڑی بے چارگی آمیز بے بسی تھی۔ اس کے لہجے کی شکست خوردگی میں حسرت و یاس کی بے چارگی ایک آس بن کر ٹپکتی محسوس ہوئی تھی مجھے۔

''نہیں سوشیلا......! میں تمہیں ہرگز ان وحشی درندوں کے حوالے نہیں کروں گا۔'' میں نے نجانے کس جذبے کے تحت ایک جوش بھری آواز میں کہا اور پھر سوشیلا کے نرم و نازک وجود کو اپنی بانہوں میں اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا۔ اس کے حلق سے ایک ''آہ'' سے مُشابہ سسکی ابھری تھی اور میں نے دوڑ لگا دی۔

خود میرا اپنا بھی تھکن اور ہانپنے سے بُرا حال ہورہا تھا۔ میرے زخم اگرچہ مندمل ہونے لگے تھے، لیکن اس بھاگم دوڑی سے ان میں دوبارہ سے دُکھن ہونے لگی تھی، لیکن ڈاکٹر لیکھ رام کی ٹریٹمنٹ وغیرہ سے مجھے جادو اَثر فائدہ تو ہوا تھا۔ مگر ان حالات میں میری طبیعت دوبارہ بگڑنے کا اندیشہ تھا۔ لیکن میں نے پہلے کب ان باتوں کی پروا کی تھی۔ میں رکا نہیں تھا، سوشیلا کو کاندھے پر اُٹھائے اسی طرح دوڑتا رہا۔

آگے جنگل کچھ چھدرا چھدرا سا ہوگیا تھا۔ عقب میں گاڑیوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس طرح بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، میں بھی آخر انسان تھا اور بیماری سے اُٹھا تھا۔ کب تک ایک بوجھ کو اُٹھائے دوڑتا رہتا۔ جبکہ دشمن تیز رفتار گاڑیوں میں تھے اور جدید اسلحے سے لیس بھی، میرے پاس فقط ایک عام سی رائفل تھی۔

جلد ہی اطراف میں گردش کرتی ہوئی میری آنکھوں نے ایک موٹے اور جڑواں تنوں والے ایسے درخت کو تاڑ لیا، جس کے درمیان ... ایک کھالا سا بنا ہوا تھا۔ کھالے کے سرے پر خودرو قدِ آدم جھاڑیاں بھی اُگی ہوئی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت میرے عقب میں برسٹ فائر ہوا، غیر ارادی طور پر میرا پاؤں کسی جھاڑی سے رپٹا، میں نیچے آرہا۔ سوشیلا کے حلق سے بھی بے اختیار ایک خوف زدہ سی چیخ خارج ہوگئی۔ میں نے گرتے گرتے اسے سنبھالا اور پھر اُٹھ کر اسی موٹے اور جڑواں تنوں والے درخت کی طرف لپکا۔

مجھے اندازہ تھا کہ دشمن نے یا تو ہماری بھنک پالی تھی یا ہم یوں ہی ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے برسٹ فائر کیا تھا۔

بہرکیف میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ سوشیلا کا ہاتھ تھامے اس کھالے کے اندر گھس گیا بلکہ ''سما گیا'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے تاریک سے خلا میں ہم دونوں چھپ تو گئے تھے، مگر میں ایک مُشکل میں پھنس گیا تھا۔

کھالے کا خلا کتنا گہرا تھا، مجھے اس کا اندر گھسنے کے بعد ہی اندازہ ہوسکا تھا، چھدرے جنگل سے اگرچہ سورج کی کرنیں چھن کر زمین پر پڑ رہی تھیں، لیکن کھالا قدرے گہرا ہونے کے باعث دور سے تاریک ہی نظر آتا تھا۔

اب مشکل یہ تھی کہ دشمنوں سے بچنے کے چکر اور جلد بازی میں کھالے کے اندر ہماری پوزیشن کچھ ایسی بن گئی تھی کہ ہم اندر سکڑ سمٹ کر ایک دوسرے سے باہم پیوست سے ہوگئے تھے۔ میں کھالے کی اندرونی تہ کی دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور سوشیلا پشت کے بل میرے سینے سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی نرم و گداز اور سبک خرام پشت کو اپنے تنے ہوئے وجود پر برداشت کرنا میرے لیے خاصا ''مہلک'' ثابت ہورہا تھا۔ میں نے سوشیلا کو خود سے تھوڑا آگے دھکیلنے کی اپنی سی کوشش چاہی تھی، مگر اس طرح اس کے ظاہر ہونے کا خدشہ بڑھنے لگتا تھا۔ وہ کسمسا کر پھر اندر میرے ساتھ پیوست ہوجاتی تھی۔ میں نے کھالے کے دہانے کے سرے پر اُگی ہوئی جھاڑیوں کو مزید آگے کر کے پھیلا لیا تھا، اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ میں تو کھالے کے اندر سے باہر، سامنے کے رخ پر دیکھ سکتا تھا، مگر باہر والے اندر دیکھنے سے قاصر تھے، جب تک کہ وہ قریب آکر اندر جھانک کر نہیں دیکھ لیتے۔ لیکن ایسا ممکن ہوسکتا تھا کہ کسی کو یہاں شک ہو جاتا تو وہ یہ بھی کر کے دیکھ سکتا تھا۔ اب میں اور سوشیلا یہی دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی اس طرف متوجہ نہ ہوتا۔

میری اور سوشیلا کی دھڑکتی نظریں، آگے تنی ہوئی جھاڑیوں کے آر پار جمی ہوئی تھیں۔

دفعتاً ہی میں نے وہی تین بھاری گاڑیاں تیزی سے قریب آتے دیکھیں، جو میں حویلی کے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ چھوٹے موٹے موڑ کاٹتی، ہچکولے لیتی اسی طرف بڑھی چلی آرہی تھیں۔ میری عقابی نظریں گاڑی میں سوار افراد کو بھانپنے کی کوشش میں تھیں اور ساتھ ہی میں یہ دعا بھی مانگے جارہا تھا کہ یہ گاڑیاں اِدھر نہ رکیں اور اسی طرح آگے بڑھ جائیں۔

گاڑیاں لمحہ بہ لمحہ اسی درخت کے قریب آتی جارہی تھیں اور جیسے جیسے قریب ہورہی تھیں، ہمارے دل کی

دھڑکنوں میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ یہاں تک تینوں گاڑیاں ہمارے بالکل قریب آگئیں اور میری بدستور ان پر جمی ہوئی نظروں نے گاڑیوں میں سوار چند شناسا چہروں کو فوراً پہچان لیا، جن میں چندر ناتھ، شیام اور کوریلا سوار تھے، ان میں سے جی کوہارا اور تین اسی رنگ و نسل کے برمی بھی سوار تھے، جبکہ بلیوتلسی کا مسلح ونگ بھی موجود تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے یہ خوفناک شکاری تھے اور اپنے چھپے ہوئے شکار کو ڈھونڈنے بلکہ انہیں دیکھتے ہی ان کی تکا بوٹی کرنے کو تیار تھے۔

گاڑیاں اب ہمارے درخت کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ ہماری پھیلی پھیلی سی نظریں، جیسے ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں، یہاں تک کہ وہ ایک کے بعد دوسری اور تیسری، بھی گزرتی چلی گئیں...... اور ہم دونوں کے حلق سے بے اختیار ایک گہری طمانیت بھری سانس خارج ہوگئی، لیکن دوسرے ہی لمحے ہم بری طرح چونک پڑے۔ تینوں گاڑیوں کی جاتی ہوئی آوازوں میں یک دم فرق آیا۔

گاڑیوں کی آوازیں معدوم ہونے کے بجائے، تھمی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں۔ میرا دل یکبارگی اندیشناکی سے دھڑکا۔

''گاڑیاں رک گئی ہیں...... شہزی!'' معاً میرے ساتھ چپکی لگی کھڑی سوشیلا نے سرسراتی سرگوشی کی۔

''ہاں......! لگ تو ایسا ہی رہا ہے۔''

''مم...... مگر کیوں؟ کیا انہیں کچھ شبہ ہوا ہے؟''

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے ویسے ہی رکے ہوں۔''

''نہیں شہزی! ویسے ہی نہیں رک سکتے یہ لوگ......'' سوشیلا نے جیسے پل کے پل تجزیہ کیا۔ ''یہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں، حویلی سے لے کر اس جنگل تک انہوں نے ہمیں کسی طریقے سے واچ کیا ہوگا۔''

''تمہارا خیال ہے، قدموں کے نشانات......؟''

''ہاں!''

مجھے اس کی بات بلا مبہم لگی۔ ''تب تو یہ لوگ اس درخت کا بھی کھوج لگا سکتے ہیں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

''دعا کرو ایسا نہ ہو......'' اس کی آواز میں سراسیمگی کا شائبہ ابھرا تھا۔

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا......'' میں نے زیر لب کہا۔

''تم تھوڑا اس طرف ہو جاؤ، میں ایک نظر باہر ڈالنا چاہتا ہوں۔'' میں کسمسایا، وہ میرے ساتھ چپکی ہوئی سی ایک طرف کو سرکی، میں نے پھنس پھنسا کر حرکت کی اور کھالے کے دہانے پر تھوڑا سا ابھرا۔ سر باہر نکالا اور یک دم ہی مجھے اندر ہونا پڑا۔ تینوں گاڑیاں درخت سے کچھ ہی فاصلے پر رکی ہوئی تھیں۔ ان کے انجن اب بند کر دیے گئے تھے، البتہ ان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ وہ سب مسلح تھے اور اطراف میں تیزی سے بکھرنے لگے تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں لمبے پھلوں والے چھرے بھی تھے، جن سے وہ راہ میں آنے والے جنگلی پتوں اور جھاڑیوں کو کاٹ رہے تھے۔ سے جی کوہارا اور چندر ناتھ وغیرہ کو ملا کر ان کی تعداد دس، بارہ کے قریب لگتی تھی۔ ان میں بھارتی، برمی دونوں ہی تھے۔

''کیا ہوا......؟'' مجھے چونکتا محسوس کر کے سوشیلا نے سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ سب پھیل گئے ہیں چاروں طرف، ہم زیادہ دیر شاید اس درخت کے اندر محبوس نہیں رہ سکتے۔''

''تمہارا خیال ہے ہمیں باہر نکلنا ہوگا؟'' وہ ہراساں لہجے میں بولی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی وقت کھالے کے باہر آہٹ اُبھری اور ساتھ ہی کھچا کھچ جیسی آواز بھی آئی۔ شاید کوئی جھاڑیوں اور پتوں پر چھرا چلاتا ہوا اس طرف کو آنکلا تھا۔

یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں نے سوشیلا کو آواز نہ نکالنے کی ہدایت کی اور محتاط ہوکر کھالے کے سرے پر سرک آیا۔ رائفل میں نے اتار کے اندر ہی کہیں ٹکا دی تھی۔ یہ عام سی رائفل ابھی کسی کام کی نہیں تھی۔

میں نے دو برمیوں کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔ وہ جڑواں تنوں والے اس درخت کے خاصے قریب آگئے تھے اور میں کھالے کے دہانے پر بکھری ہوئی جھاڑیوں کے روزنوں سے انہیں گھور رہا تھا۔ وہ ان جھاڑیوں کے بھی بہت قریب آگئے تھے، میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا اور میں نے جیسے اپنی سانس تک روک لی تھی۔ دونوں برمی اگر ان جھاڑیوں پر چھرے چلاتے تو یہ یقینی امر ہوتا کہ جڑواں تنوں والے اس درخت کا یہ خلا ان کی نظروں میں آجاتا اور پھر یہ بے دریغ اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے اسے ہمارے سمیت، مکھیوں کا چھتا بنا ڈالتے۔

دونوں برمی ان جھاڑیوں کے قریب آکر یوں خاموشی سے کھڑے ہوگئے تھے، جیسے ''شکار'' کی بو سونگھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ جھاڑیوں کے چھدرے رخنوں کے پار میری دھڑکتی ہوئی نظریں ان کے بشروں پہ جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کی پشت پر رائفلوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

تب ہی ایک برمی کی چُندی چُندی سی مکار آنکھوں کو میں نے کھالے کی جھاڑیوں پر اٹکتے دیکھا۔ اس کے حلق سے آواز سی خارج ہوئی، شاید اس نے اپنے ساتھی کی بھی توجہ اس طرف مبذول کروانے کی کوشش کی تھی اور دوسرے ... ہی لمحے ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے چھروں کو حرکت دی اور کھچا کھچ کی آواز کے اُبھرنے کے ساتھ ہی تیزی سے کھالے کے سامنے سے جھاڑیاں صاف ہوتی چلی گئیں۔ میں تھوڑا پیچھے کو سرک گیا۔

میرا پورا وجود اس وقت اندیشناک خطروں کی دھمک محسوس کرتے ہوئے بُری طرح سنسنانے لگا تھا۔ برمیوں کو کھالا دکھائی دے گیا تھا۔ ان کے باقی ساتھیوں کی آوازیں بھی اطراف میں گونج رہی تھیں، ان میں گاہے بہ گاہے چندر ناتھ اور سے جی کوہارا کی تحکمانہ آوازیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔ پھر میں نے ان دونوں کو کھالے پر بہ غور نظریں جماتے ہوئے دیکھا، تب ہی ان میں سے ایک، اپنا لمبے پھل والا چھرا لیے آگے بڑھا۔ اب میرا محبوس رہنا عبث تھا۔ میں کھالے کے اندر سے ہی اس پر عقابی نظریں جمائے ہوئے آگے کو سرکا۔ وہ چند قدم مزید قریب آیا اور کھالے کے دہانے کے پاس رک گیا، اس نے اپنی بیلٹ میں اڑسی ہوئی چھوٹی ٹارچ نکالی۔ ابھی وہ اسے روشن کرنے ہی والا تھا کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔ گردن دبوچتے ہی میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی، وہ وہیں جھول کر رہ گیا۔ میں نے اسے اندر کھینچ لیا اور اس کے بے سدھ وجود کو سوشیلا کے ساتھ ٹِکا دیا۔ ساتھ ہی اس سے سرسراتی سرگوشی میں بولا۔

''اس کی گن قبضے میں کرلو...... جلدی۔''

میں نے اس کا چھرا اپنے قبضے میں کرلیا تھا، وہ اب میرے دائیں ہاتھ میں تھرک رہا تھا۔

دوسرا برمی اپنے ساتھی کو اچانک غائب پاکر ذرا متحیر سا ہوا تھا اور اس نے شاید اسے آواز بھی دی تھی، جواب میں، میں نے بھی اپنے حلق سے عجیب سی آواز خارج کی۔ برمی کا ساتھی چونکا اور اس نے یک دم اپنی گن پشت سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی، چھرا اس نے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

وہ گن تھامے کھالے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں اسے دبوچنے کے لیے چیتے کی طرح کھالے کے تاریک سے خلا میں چپکا کھڑا تھا کہ اچانک اس برمی نے کسی خطرے کی بُو سونگھ لی اور وہ وہیں رک گیا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر متلاشی نظروں سے اپنے دیگر ساتھیوں کو دیکھنا چاہا تھا، یہ بھانپتے ہی کہ وہ انہیں آواز دے کر اس طرف متوجہ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، میں نے چیتے جیسی سبک خرامی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور چھرا تولے ہوئے، کھالے کے دہانے سے کسی آفت کی طرح نازل ہوا اور اس برمی کی اپنے ساتھیوں کو آواز دینے کی حسرت سینے میں ہی دم توڑ گئی۔

میرے چھرے کے تیز دھار پھل نے اس کا پیٹ چیر ڈالا تھا، مگر شاید اس بدبخت کی اُنگلی اپنی گن کے ٹریگر پر اٹکی ہوئی تھی، جو غیر ارادی طور پر حرکت میں آئی تھی۔ ایک کریہہ انگیز اور گھٹی گھٹی سی کراہ خارج کرتے ہوئے وہ گرا تو اس کی گن کسی وحشیانہ دہاڑ کے ساتھ گرجی۔ میں نے اس کی گن پر ہاتھ مارا اور اچک لی۔ پھر سوشیلا کو آواز دی۔ وہ پہلے والے برمی کی گن ہاتھ میں لیے کھالے سے نمودار ہوئی۔

''اس طرف...... جلدی......'' میں نے اشارے سے اتنا ہی کہا اور اس طرف کی جھاڑیوں کی طرف لپکا، جو خاصی قدِ آدم تھیں بلکہ وہاں دشمنوں کی گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔

میرے ہاتھ میں دشمن کی جدید گن لگ چکی تھی۔ میں نے پل کے پل اس کا جائزہ لیتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ یہ ڈیڈ پیسٹ اسالٹ سیریل کی ایک ملٹی فنکشنل کروشیئن مشین گن تھی۔ اس کے ساتھ ہینڈ گارڈ اٹیچ تھا، جسے میں نے الگ کر کے پھینک دیا تھا۔ اسی وقت مجھے شور سنائی دیا۔

''اس طرف...... وہاں دوڑ و سب...... ہری اپ اینڈ فلش گن آن......''

یہ بلیوتلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کے نائب چندر ناتھ کی پُرغیض آواز تھی۔ وہ اس وقت غالباً سے جی کوہارا اور اس کے برمی ساتھیوں پر بھی حکم صادر کرنے کا مجاز نظر آرہا تھا۔

اسی وقت جنگل کا یہ حصہ تیز روشنیوں میں نہا گیا اور مجھے اپنے سامنے محض چند قدموں کے فاصلے پر تین مسلح افراد دکھائی دیے، جن میں دو اپنے مخصوص چست لباس اور وضع قطع سے بھارتی اور ایک برمی دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف ہی گھوم رہے تھے، جدھر میں اور سوشیلا سرک رہے تھے۔ میری گن کا رخ اسی طرف ہی تھا اور انگلی لبلبی پر، جس نے پلک جھپکتے ہی حرکت کی تھی۔ پورا برسٹ میری گن کی نال سے چلا اور وہ تینوں حلق سے کریہہ انگیز چیخیں خارج کرتے ہوئے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ تب ہی ہم پر بیک وقت

کئی گنیں گرجی تھیں۔ مجھے اس کا پہلے ہی اندازہ تھا، اسی سبب میں نے سوشیلا سمیت خود کو پاس کی گھنی جھاڑیوں میں گرالیا تھا۔ گولیوں کی سنسناتی ہوئی بوچھاڑ ہمارے سروں سے گزری تھی۔

''آگے بڑھو...... رکنا مت......'' میں نے اس سے کہا اور بہ سرعت کرولنگ کرتا، اس جیپ کی آڑ میں آگیا، جو دشمنوں کی لاشوں سے ذرا فاصلے پر ہی کھڑی تھی۔ مگر میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر، فوراً پشت کے بل ہوگیا اور سوشیلا کو بھی یہی ہدایت کرتے ہوئے اسے اپنی تقلید کرنے کا کہا۔

میری انگلی بدستور گن کی لبلبی پر ایک ذراسی جنبش لینے کو بے قرار تھی۔ اسے حرکت دی اور میری گن نے اسی طرف ہی جوابی برسٹ اُگلا تھا، جس طرف سے ہم پر گولیاں برسائی گئی تھیں۔ سوشیلا نے بھی میری تقلید کرتے ہوئے مذکورہ سمت فائر کھولا تھا، ایک سے زائد اُبھرنے والی دشمنوں کی چیخوں نے ہمارے نشانے کی تصدیق کر ڈالی تو میں نے فوراً حرکت کی اور سوشیلا کو مجھے کور دینے کا کہہ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر اس میں سوار ہونے کے لیے ذرا اُونچا ہوا ہی تھا کہ ایک برسٹ فائر ہوا، کئی گولیاں ''زٹا...... زٹ زٹ......'' کی آواز سے گاڑی کی فولادی باڈی سے ٹکرائی تھیں اور ایک آدھ ہی کھڑکی کے شیشوں سے آر پار ہوئی تھی، شکر تھا کہ میں نے بروقت جھکائی دی تھی۔ تاہم گولی سے شیشوں کے ٹوٹ کر ان سے اُچھلنے والی کرچیاں میرے چہرے پر پڑی تھیں اور خراشیں ڈال گئی تھیں۔ میں نے ہلکی کراہ خارج کی تو سوشیلا کی تشویش زدہ آواز ابھری۔

''شہزی......! یو اوکے......؟''

''گاڑی کے عقبی دروازے سے اندر سوار ہو جاؤ......'' میں نے کہا اور ذرا ابھر کر ٹوٹے ہوئے شیشوں کی کھڑکی کے آر پار سے اسی جانب ایک برسٹ فائر کر دیا۔ میرے کانوں نے ایک ہی چیخ سنی تھی۔ اس سے قریب موجود دشمن کی افرادی قوت کا ادراک کرتے ہی میں بلاخیز پھرتی کے ساتھ جیپ میں سوار ہوگیا۔ تب تک سوشیلا بھی جیپ کے پچھلے حصے کا دروازہ کھول کر اندر جا گھسی تھی۔ میں نے تلے اوپر فائرنگ کی ہدایت دیتے ہوئے جیپ کے اگنیشن سوئچ میں پہلے سے موجود چابی گھما دی اور کلچ دبا کر گاڑی کو گیئر میں ڈالتے ہی پوری ریس دیتے ہوئے کلچ کو اس طرح چھوڑا کہ جیپ کسی طوفانی بگولے کی طرح حرکت میں آتے ہی دوڑ پڑی۔ توقع کے عین مطابق عقب سے جیپ پر تابڑتوڑ فائرنگ ابھری، جیپ کو میں جتنی مہارت سے کسی بھی گولی کی زد میں آنے سے بچانے کی خاطر دوڑا سکتا تھا، دوڑاتا چلا گیا۔ اگرچہ کئی گولیاں جیپ کی باڈی میں پیوست بھی ہوئی تھیں۔ سوشیلا کو جھکے رہنے کی تاکید کے ساتھ خود بھی اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تھی کیونکہ کچھ گولیاں جیپ کی عقبی اسکرین کو توڑتی ہوئی، اندر بھی در آئی تھیں اور ونڈ اسکرین کو توڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھیں۔ شکر تھا کہ ابھی تک کسی گولی نے ٹائر فلیٹ نہیں کیا تھا اور یہی میں چاہتا بھی تھا، مگر ایسے میں جیپ اور خود کو بچاتے ہوئے اندھا دھند دوڑنا بھی کم رسکی عمل نہیں تھا۔ جنگل کے ناہموار راستوں پہ جیپ بری طرح سے ہچکولے بھی کھا رہی تھی۔ شکر تھا کہ جلد ہی جنگلاتی سلسلہ اختتام کو پہنچا اور بنجر میدانی سلسلہ شروع ہوگیا۔

''شہزی......! دشمن تعاقب میں آرہے ہیں......'' معاً عقب سے سوشیلا کی آواز ابھری۔ جس کی میں توقع کیے بیٹھا تھا اور اس کا حل بھی سوچے ہوئے تھا۔ لہٰذا جیسے ہی سوشیلا نے یہ اطلاع دی تو میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس سے بولا۔

''سوشی......! تم اپنی گن پچھلی سیٹ پر چھوڑ کر فوراً آ کے اسٹیئرنگ سنبھالو...... جلدی......''

سوشیلا نے میری ہدایات پر فوراً عمل کیا اور ذراسی کوشش اور چابک دستی سے ہم دونوں اپنی سیٹیں تبدیل کر چکے تھے۔ ابھی میں گن سنبھالے عقبی سیٹ پر آ کے ٹکا ہی تھا کہ اچانک عقب سے گولیوں کے برسٹ چلنے کی آواز ابھری، میں نے گن سنبھالتے ہی چلا کر سوشیلا سے کہا۔

''جیپ کو زگ زیگ دوڑانے کی کوشش کرو......''

میں نے عقبی سیٹ سے اپنا سر ابھار کر دیکھا تو دو جیپیں ہمارے تعاقب میں دوڑی آرہی تھیں۔ میں نے ٹوٹی ہوئی عقبی اسکرین سے گن کی نال نکالی اور ایک جیپ کو نشانے پر لے کر ٹریگر دبا دیا۔ گو یہ ایک آسان عمل نہیں تھا کیونکہ میری ہدایت کے مطابق سوشیلا بھی اپنی جیپ کو زگ زیگ انداز میں دوڑائے جارہی تھی۔ تاہم میرا نشانہ بھی شاید خطا نہیں گیا تھا۔ میری گن دہاڑی اور میں نے دشمنوں کی ایک جیپ کو بری طرح لہراتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُلٹتے اُلٹتے رہ گئی، کیونکہ اس کے ڈرائیور کو گولی چاٹ گئی تھی اور کسی اور نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اسے مزید بے قابو ہونے اور اُلٹنے سے بچا لیا تھا، اب فقط ایک جیپ ہمارے پیچھے آرہی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی اس سے فائرنگ کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

ٹھیک اسی وقت میں نے دیکھا کہ دوسری جیپ بھی دوبارہ ہمارے تعاقب میں آنے لگی۔ لیکن چونکا میں تب تھا جب میں نے اگلی جیپ کی کھڑکی سے ایک دشمن کو چھت کی طرف سوار ہوتے دیکھا۔ اس کے پاس مجھے راکٹ لانچر نظر آیا تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے...... میری گن خالی ہوچکی تھی۔ میں نے سوشیلا کی گن اُٹھالی۔

اسی وقت سوکھی جھاڑیوں والے ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ میں ابھی راکٹ لانچر والے دشمن کو نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا کہ سوشیلا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''آگے ایک سڑک آرہی ہے۔ اس پر گاڑی کو ڈال دوں یا......''

''سڑک پر ڈال دو جیپ کو......'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اپنی گن سے جیپ کی چھت پر سوار مذکورہ راکٹ لانچر سنبھالے ہوئے دشمن کا نشانہ لیا۔ برسٹ فائر ہوا۔ لیکن چونکہ دونوں ہی گاڑیاں زیگ زیگ دوڑ رہی تھیں، شاید اسی لیے میرا نشانہ بھی خطا گیا اور دشمن اپنا کام کر گیا۔ اس نے راکٹ فائر کر دیا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے کچھ بھی کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ راکٹ اپنے عقب میں دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا ہمارے تعاقب میں آیا۔

میرے پاس وقت نہیں تھا کہ میں سوشیلا کو خبردار کرتے ہوئے کوئی ہدایت دیتا۔ راکٹ ہمارے قریب آیا اور ہماری جیپ کے بالکل قریب سے ''شائیں'' کی آواز سے گزرتا چلا گیا۔ اس کی ہولناک جھلک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی سوشیلا نے بھی دیکھی اور اس کے حلق سے عجیب سی آواز اُبھری تھی۔

خوش قسمتی سے دشمن کا نشانہ خطا جاتے دیکھتے ہی میں نے اسے کوئی اور راکٹ فائر کرنے کا موقع دیے بغیر اس جیپ پر فائر کھول دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ میرے پاس آخری راؤنڈ والی یہ گن بچی تھی اور دشمن ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اور مجھے مالِ غنیمت کے طور پر جو محدود اسلحہ ہاتھ آیا تھا اسے بے حد دھیان سے استعمال کرتا تاکہ یہ ضائع نہ ہونے پائے۔ مگر بدقسمتی سے صورتِ حال ایسی تھی کہ میرے پاس اس کے سوا...... کوئی چارہ نہ تھا کہ مجھے کہیں کہیں اندھا جوا بھی کھیلنا پڑ رہا تھا۔ سو میں کھیل رہا تھا۔ دشمن پر اندھا دھند گولیاں داغنے کا میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی طرح جیپ کی چھت پر سوار وہ راکٹ لانچر بہ دست ہلاک ہوجائے، جس کا ایک ہی کامیاب نشانہ ہمیں عبرت ناک شکست سے دو چار کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ بدبخت اب دوسرا راکٹ فائر کرنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔

ہماری جیپیں ایک دوسرے کے نشانوں سے بچنے کی خاطر لہرا رہی تھیں اور زگ زیگ انداز میں دوڑ رہی تھیں۔ دشمن اس پوزیشن میں تھا کہ وہ اندھا دھند کافی دیر تک اپنا اسلحہ اندھے جوئے کے نام پر خرچ کرسکتا تھا، لیکن ہماری اس کے مقابلے میں پوزیشن نازک تھی کہ ہمارے پاس ایک ہی گن تھی وہ بھی کافی ''خرچ'' ہونے لگی تھی۔

میں نے اندھا دھند گولیاں بھی محض قسمت کے یاور ہونے کی اُمید پر برسائی تھیں مگر حتی المقدور کوشش کے تحت یہ سعی بھی چاہی تھی کہ وہ نشانے پر آتی رہیں، دشمنوں کی طرف سے بھی فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ سوشیلا شاید جیپ کو سڑک کی طرف نہیں موڑ سکی تھی، ٹھیک اسی وقت دوسرا راکٹ فائر ہوا۔ اس بار میری بھانپتی آنکھوں نے پل کے پل اپنی طرف آتے ہوئے راکٹ کے ''ٹارگٹ'' کا ادراک کیا۔ وہ نشانے پر تھا اور ٹارگٹ ہماری جیپ تھی۔ میں حلق کے بل چلّایا۔

''سوشی......! جیپ فوراً دائیں جانب موڑ لو......''

سوشیلا نے بھی شاید ایسے کسی خطرے کو بھانپ لیا تھا، اس نے ایک لمحے کی بھی دیر لگائے بغیر اسٹیئرنگ کاٹا اور جیپ گھوم گئی، راکٹ ایک اور سنسناتی ہوئی ''شائیں'' کی آواز سے ہماری جیپ کے قریب سے گزر گیا۔ ٹھیک اسی وقت قسمت نے ایک اور یاوری کی۔ میری گن کی برستی گولی، دشمن کی اگلی جیپ کا کوئی ایک ٹائر چاٹ گئی، کیونکہ میں نے ایک دھماکے سے اسے بُری طرح ڈولتے دیکھا، یہاں تک کہ وہ سنبھلتے سنبھلتے اُلٹ گئی، اس کی چھت پر سوار، ہمارے لیے مصیبت بنا لانچر بہ دست دشمن بھی نیچے آرہا۔

''جیپ سڑک کی طرف موڑنے کی کوشش کرو......''

میں نے سوشیلا کو پھر ہدایت دی۔

''میں کوشش کر رہی ہوں...... تم نے ایک جیپ الٹا دی......'' وہ جواباً بولی۔ اس کے لہجے میں مسرت چمکی تھی۔ میں نے کوئی توجہ دیے بغیر دوسری جیپ کو تاڑا...... وہ بھی بدستور ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ وہاں سے فائرنگ کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا۔ دشمن کی اصل ''کمانڈ'' (چندر ناتھ اور کوہارا وغیرہ) شاید اسی جیپ میں سوار تھے، کیونکہ وہ اپنے ساتھیوں کی جیپ اُلٹتے دیکھ کر بھی نہیں رکے تھے۔

جیپ سڑک پر آگئی۔ سڑک پر آتے ہی آگے موڑ آگیا، بائیں جانب موڑ مڑتے ہی ایک ہیوی ٹریلر ٹرک اپنے بھونپو کو بنکارتا ہوا اچانک ہی نازل ہوا، اس کے

ڈرائیور بے چارے نے ہمیں اس کی زد سے بچاتے ہوئے یا پھر بوکھلاہٹ میں اسٹیئرنگ کاٹ دیا۔ نتیجے میں وہ بدمست ہاتھی کی طرح ڈول گیا اور اس کا لمبا ٹریلر گھوم کر ہمارے تعاقب میں آنے والی دشمن کی جیپ سے ٹکرا گیا۔ اگرچہ اس کے ڈرائیور نے بھی اس کی ٹکر سے اپنی جیپ کو بچانے کی پوری کوشش چاہی تھی، لیکن وہ فقط اتنا ہی کامیاب ہوسکا کہ ٹکر کی شدت ہی کم کر پایا، مگر اتنی ٹکر بھی کافی تھی، جیپ کا توازن بگڑا اور وہ ایک طرف کو سائڈ میں ...... اُلٹ گئی۔

''جیپ کی رفتار نارمل کرلو......'' میں نے کہا اور ایک دم اُچھل کر اگلی سیٹ پر سوشیلا کے برابر آکر بیٹھ گیا۔

''بال بال بچے ہیں......'' میں جیسے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے خود کلامیہ بڑبڑایا۔ اس اعصاب شکن معرکہ آرائی کے بعد مجھے تھکن کا سا احساس ہونے لگا تھا اور حلق جیسے سوکھ کر کانٹا ہورہا تھا۔

''یہ سب تمہاری بروقت قوتِ فیصلہ اور چابک دستی کی بدولت ہوا ہے کہ ہم خطرناک دشمنوں کے نرغے سے بچ نکلے...... ورنہ تو میں نراش ہی ہو چلی تھی۔ اسلحے کے نام پر بھلا ہمارے پاس تھا ہی کیا؟'' سوشیلا نے توصیفی لہجے میں کہا۔ اس نے اب جیپ کی رفتار مناسب کرلی تھی۔

''آگے کی منزل کا تعین اب تمہارے سپرد ہے......'' میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ کے خانوں کا جائزہ لیتے ہوئے آگے کی منصوبہ بندی کی غرض سے پوچھا۔ مجھے پانی وغیرہ کی بوتل کی تلاش تھی جو نہ ملی۔

''ہم بالاسور سے بھگت گڑھ کی طرف جارہے ہیں۔'' اس نے ایک گہری مسکراتی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور پھر سامنے ٹوٹی ہوئی اسکرین سے باہر تکاتے ہوئے جواب دیا۔

''میری مراد کسی قریبی اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچنے سے تھی۔'' میں نے وضاحت کی۔

''کیا تم اب بھی دشمنوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''ہاں......!'' میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کھڑکی سے باہر نگاہ ڈال کر جواب دیا۔

''تمہارا اسٹیمنا کمال کا ہے۔ مجھے اب پورا یقین ہے کہ تم ہی جنرل کے ایل ایڈوانی کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہو۔'' وہ متاثر کن لہجے میں بولی۔ وہ اب کافی مطمئن نظر آنے لگی تھی۔ آگے بولی۔ ''مجھے اب یقین ہوگیا ہے کہ میں نے درست آدمی کا انتخاب کیا ہے۔''

''یہ سارا علاقہ خلیج کھمبات کہلاتا ہے؟'' میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر ہوکر پوچھا۔

''خلیج کھمبات اور یہاں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ... میں چونکا۔ کیونکہ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سارا ساحلی علاقہ، یعنی بالاسور وغیرہ اسی میں شامل تھا۔ چندرکلا اور اس کے بھارتی ساتھیوں سے ہی اس کا تذکرہ کرتے میں نے سنا تھا۔ درحقیقت میں بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر کی جگہ کا تعین کرنا چاہتا تھا، جب واپسی میں اُنہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھی تھی جس کا ایک کونا کسی وجہ سے میری ایک آنکھ سے سرک گیا تھا اور میں نے واپسی تک کا راستہ اور کسی حد تک بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر کا محلِ وقوع ذہن نشین کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ جاتی دفعہ بھی میں نے ذہن میں وقت کا دورانیہ یاد رکھا تھا۔ جو ایک تیز رفتار لانچ اور پھر ہیلی کاپٹر پر منتج ہوا تھا۔

''خلیج کھمبات تو ممبئی کے ساحل کے قریب بھارت کے ایک مشہور شہر ''سورت'' میں واقع ہے۔'' سوشیلا نے بتایا۔

''اوہ......'' میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور ذہن کو کھنگالا۔ اس کا مطلب تھا کہ بلیوٹلسی کا ہیڈکوارٹر سورت کے ہی گردونواح میں کہیں واقع تھا۔ چندرکلا سے حاصل شدہ معلومات کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے میں نے اندازہ لگایا۔ جس وقت میں سے جی کوہارا کی لانچ میں تھا وہ مقام برما کی بندرگاہ میانمار (myanmar) کے قریب خلیجِ بنگال (bay of bengal) تھا، جبکہ مجھے چندرناتھ وغیرہ کے حوالے کیا گیا تھا تو وہ مجھے ایک تیز رفتار بوٹ میں لیے خلیج بنگال کے کسی نامعلوم ساحل پر جو قریب تھا، وہاں سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے کھمبات پہنچایا گیا تھا۔

''کیوں......؟ تم نے کھمبات میں کیا کرنا تھا؟'' مجھے سوچتا ہوا پاکر اس نے پوچھ لیا۔

''نہیں، کچھ خاص نہیں......'' میں نے بات بنانی چاہی۔ ''میرا اندازہ تھا کہ میرے دشمنوں کا اصل ٹھکانا وہیں ہے۔'' میں اسے بلیوٹلسی والے معاملے سے ابھی بے خبر رکھنا چاہتا تھا۔ البتہ اسے بھارتی خفیہ ادارے کا نام دے کر سوشیلا کو یہی باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ یہ لوگ بھی طلسمِ نور ہیرے کے حصول کے سلسلے میں سے جی کوہارا کے ساتھ نتھی تھے۔

''لیکن اب یہ لوگ تمہاری بو سونگھتے ہوئے ابھی بالاسور کے گردونواح میں ہی منڈلاتے رہیں گے۔'' وہ بولی۔

''تمہیں اس علاقے (بالاسور) کی کس حد تک جان

کاری ہے؟''

''کچھ زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تو ہے کہ تمہارے مشن کی تکمیل تک ہم ادھر ہی کہیں کسی محفوظ ٹھکانے تک کچھ روز آرام سے گزار سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کی مشن والی بات پر میرے چشمِ تصور میں بلیوتُلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کا مکروہ چہرہ گردش کرنے لگا۔

''پھر تو اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔''

''کیا تم اپنے ان دشمنوں کے ٹھکانے سے واقف ہو؟'' سوشیلا نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

''اسی لیے تو میں ابھی اس علاقے سے باہر نہیں نکلنا چاہتا۔''

''گویا تم دریا میں رہتے ہوئے ان مگرمچھوں سے بیر لیتے رہو گے؟'' وہ ایک خاص مسکراہٹ اور مخصوص لہجے میں بولی۔ اس کی زندہ دلی میرے لیے سودمند تھی، جسے مزید ابھارتے ہوئے میں مسکرا کر بولا۔

''اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں۔''

''جنرل ایڈوانی کا کیا کرو گے؟'' اس نے یاد دلایا اور آگے بولی۔

''کیا تم بھول گئے ہو کہ تمہارے ملک کی امانت وہ نادرونایاب طلسمِ نورہیرا اس کے قبضے میں جاچکا ہے؟''

''اتنی بڑی حقیقت میں کیسے بھول سکتا ہوں بھلا۔'' وہ مجھے شاید رفتہ رفتہ اپنے ''مقصد'' کی طرف لانے کا ارادہ کیے ہوئے تھی جو ہمارا مشترکہ ہی تھا۔ وہ بہرصورت، اپنی بہن اور اس کے شوہر اور معصوم بچوں کے بیدردانہ قتل کا انتقام اس درندہ صفت جنرل کے ایل ایڈوانی سے لینے کے لیے بے چین تھی۔

''لیکن پہلے میں اپنے ان دشمنوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں جو یہاں میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے خاتمے کے بعد ہی میں اس طرف توجہ دوں گا۔'' میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ پھر بات بدلی۔

''لیکن اس وقت ہمیں کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے اس جیپ سے چھٹکارا پانا ہوگا، وہ بھی کسی ویرانے میں، تاکہ دشمن ہمارے تعاقب میں آئیں، جس کی مجھے پوری توقع ہے تو وہ اپنی اس جیپ کو موجود پاکر کسی ایسی آبادی کی نشاندہی نہ کرپائیں جہاں ہم فروکش ہوں......''

''یہی خیال میرا بھی ہے، مگر......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''مگر کیا......؟'' میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''یہاں سے مجھے کوئی سواری ملنے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔''

''آبادی کتنی دور ہے؟ جہاں ہم پہنچنا چاہتے ہیں؟''

''ایک آبادی قریب ہی پڑے گی، جبکہ دوسری آبادی اس سے بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔''

''اس آبادی کا نام؟''

''ابھی بتایا تو تھا، بھگت گڑھ۔''

''وہاں تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے ایک عجیب سی مسکراہٹ سے کہا۔

''وہاں میرا ایک بدھو عاشق رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی کہیں حیرت و مسرت سے مر ہی نا جائے......''

''تو کیا ہم اس کے گھر پہ رہیں گے؟''

''نہیں، اس کا وہاں ایک پرانی طرز کا سرائے ہے۔''

''واٹ......؟'' سرائے کے لفظ پر میں چونکے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ بھارت جیسے ملک میں مجھے کسی ہوٹل ہی کی اُمید ہوسکتی تھی، مگر......''

''کمال ہے، بھارت میں اب بھی سرائے نام کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔''

''بھارت ایک وسیع وعریض ملک ہے لیکن اس کے دور اُفتادہ علاقے اب بھی افریقہ کے کئی پسماندہ ریاستوں کی طرح خاصے بیک ورڈ ہیں۔ کیا تم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہنے کی خواہش رکھتے ہو......؟'' اس نے یہ بتاتے ہوئے آخر میں مجھ سے پوچھا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر طنز کررہی ہو۔ میں نے جھینپی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، بس ویسے ہی مجھے کچھ حیرت ہوئی تھی بلکہ میں تو خوش ہوں کہ ایسی دورافتادہ اور بیک ورڈ جگہ ہی میرے لیے سرِدست محفوظ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ میرے پاس اس ودیشی ملک میں رہنے کے لیے کوئی اجازت نامہ نہیں ہے، اور نہ ہی ایسے ضروری کاغذات کا کوئی ایک ایسا ٹکڑا بھی جو یہاں کے کسی چھوٹے سے چھوٹے اہلکار کو میری طرف سے مطمئن کرسکے۔''

''ایگزیکٹلی......! میرا بھی یہی خیال ہے کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''لیکن اپنے مشن کی تکمیل کے سلسلے میں اگر تمہیں بھارت میں زیادہ عرصہ رہنا پڑ

ئے تو تمہیں یہاں کے شناختی کاغذات بنوانے کے ے میں سوچنا پڑے۔''

اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں، میں نے ں کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ سوشیلا کی بات میرے لیے دلچسپی ا باعث تھی۔ اگر وہ یہ سب کسی مناسب وقت میں کرسکتی تھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ اپنے ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے مجھے یہاں اور مزید کتنے مشن رانجام دینے تھے، اس کا مجھے اندازہ ہوتا تھا۔ وطنِ عزیز کے خلاف بھارتی دراندازی سمیت اس کے جاسوسوں اور لہ کاروں کا جال روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ پاکستان میں پکڑے جانے والے بھارتی جاسوس سندرداس سکسینہ...... و ''را'' کے ایک تازہ کارونگ ''بلیوتلسی'' کا ٹاپ ایجنٹ ھا، اس کی مثال سامنے تھی بلکہ اگر میں سندرداس کو جو پہلے ی ''اسپیکٹرم'' کا نامزد ''ہینڈلر ایجنٹ'' بھی تھا، بروقت بے قاب نہ کرتا تو پاکستان میں رہتے ہوئے وہ بیک وقت بلیو تلسی اور اسپیکٹرم کے مشترکہ خفیہ مذموم مفادات کے لیے یک خطرناک ''ڈبل ایجنٹ'' کا رول ادا کرتے ہوئے وطنِ عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرتا رہتا (خاکم بدہن) مگر اسے گرفتار کروا کے میں نے بلیوتلسی کو ہی نہیں بلکہ ''را'' والوں کو بھی بڑی چوٹ پہنچائی تھی، لیکن میں بالکل نیک نیتی کے ساتھ اس کامیابی کا کریڈٹ مرحومہ ثریا کے ساتھی....کو دیتا ہوں۔

بہرکیف یہی سبب تھا کہ مجھے سوشیلا کی یہ بات سودمند محسوس ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھی اپنی جگہ ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ سوشیلا بھی ایک بھارتی عورت تھی۔ عین ممکن تھا کہ میرا اصل مشن جاننے کے بعد اس کی رگِ حمیت وحب الوطنی کسی وقت بھی پھڑک سکتی تھی، ابھی تو اس کی آنکھوں پر صرف جنرل ایڈوانی سے انتقام لینے کی عینک چڑھی ہوئی تھی، جس کے اُترنے کے بعد وہ میرے خلاف بھی ہوسکتی تھی، لہٰذا میں نے اسے ابھی اپنے اصل مشن سے پوری طرح آگاہ ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ماسوائے اس کے کہ یہ سارا چکر اور مارا ماری اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کی وجہ سے تھی، وغیرہ......

''کیا سوچنے لگے......؟'' مجھے پُرسوچ خاموشی میں پاکر سوشیلا نے کہا تو میں بے اختیار اس کی تائید میں بولا۔

''میں تمہاری ہی بات پر غور کررہا تھا سوشی......!'' میں نے بات بنائی۔ ''سوچ رہا تھا کہ نجانے جنرل ایڈوانی کو جہنم داصل کرنے میں کتنے روز لگیں اور اس کے لیے ظاہر ہے مجھے بھی تمہارے ساتھ بھارت کے بڑے گنجان آباد شہروں کا رخ کرنا پڑے۔ اسی لیے مجھے تمہاری با[illegible] لگی تھی، ورنہ تو میرے لیے اس میں کوئی خاص دلچسپی کا عنصر نہ تھا۔''

''ہم بالاسور کراس کرچکے ہیں، بھگت گڑھ کی حدود شروع ہوچکی ہے، یہاں سے ہمیں سواری مل جائے گی، یہ بتاؤ اس جیپ سے کہاں چھٹکارا پانا ہے؟'' اس نے موضوع بدل دیا۔ میں نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر اطراف کا جائزہ لیا۔ کچھ شہری سی آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کہیں فیکٹری اور کارخانوں کے شیڈ تھے، ان میں فارم ہاؤس اور کھیت کھلیان بھی نظر آتے تھے۔

''سڑک سے اُتار کر اس طرف موڑلو جیپ......'' میں نے کہا تو سوشیلا نے جیپ کو بائیں جانب کچے میں اُتار لیا۔ اُس طرف مجھے ایک پلیا کی منڈیر سی دکھائی دی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی چھوٹی سی نہر بھی بہتی تھی۔ اسی نہر کے کنارے پہنچ کر سوشیلا نے جیپ روک دی۔ ہم دونوں نیچے اُتر آئے۔ دونوں گنیں ہم نے جیپ میں چھوڑ دیں، یوں بھی اب وہ ہمارے کام کی نہیں رہی تھیں۔ جیپ کا رخ نہر کی طرف کرکے ہم نے اسے آگے دھکیل دیا، جیپ نہر میں جاگری۔ وہاں سے ہم دوبارہ پیدل چلتے ہوئے سڑک پر آگئے۔ گرمی اور دھوپ پڑ رہی تھی۔ دوپہر ڈھلنے لگی تھی۔

میں نے یہاں آتے وقت چند مسافر لاریوں کی آوک جاوک دیکھی تھی۔ ایسی ہی ایک لاری ہمیں بالاسور سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ قریب آنے پر سوشیلا نے ہاتھ لہرا کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور پھر ہم دونوں اس میں سوار ہوگئے۔

''کرائے کا کیا کریں گے؟ میرے پاس تو ابھی پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔'' میں نے مسافروں سے کھچاکھچ بھری لاری میں سوار ہونے کے بعد سوشیلا کے ساتھ لگے کھڑے ہوکر اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ بولی۔

''اس کی چنتا نہ کرو تم...... یہ ساڑی اور کپڑے نکالتے وقت میرے ہاتھ کچھ روپے لگے تھے، کم ہیں مگر بھگت گڑھ تک کا کرایہ ادا تو ہو ہی جائے گا۔''

میں نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔ کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ کر میں نے سوچ رکھا تھا کہ پاکستان فون کرکے سوشیلا کے اکاؤنٹ کے ذریعے اپنے ساتھیوں سے کچھ روپے منگوالوں گا۔ وہاں میرا اور اول خیر کا مشترکہ اکاؤنٹ تھا۔ نہ بھی ہوتا تو بھی کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا، وہاں میرے بہی خواہوں کی کوئی کمی نہ تھی، ماسٹر کارڈ یا ویسٹرن

یونین کے ذریعے بھی میں پاکستان سے یہاں پیسے وغیرہ منگوا سکتا تھا۔

لاری کا سفر جاری تھا۔ احتیاط کے پیشِ نظر (اگرچہ اس میں خود سوشیلا کا بھی مشورہ شامل تھا) خود کو عام لوگوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے میں اپنے چہرے کو بھی چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں نے اپنی شرٹ کے کالر دانستہ کھڑے کر رکھے تھے۔ بہ قول سوشیلا کے...... بلیو تلسی والے اپنا کوئی ''ہارپ ایجنٹ'' جو عام لوگوں میں گھلا ملا ہوتا ہے، ہماری ریکی میں لگا سکتے تھے، یا میرے سلسلے میں'' غیر ملکی جاسوس'' کا لیبل لگا کر دیوار گیر اور پبلک مقامات پر ''پوسٹر بازی'' کر سکتے تھے۔

بھارت میں بھی غضب کی گرمی پڑتی تھی، اس کا اندازہ مجھے آج ہوا تھا۔ نیز پاکستانی اور بھارتی دیہاتوں کا حال بھی ایک ہی جیسا نظر آتا تھا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور حبس و گھٹن کی کیفیت بھی طاری تھی۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سہ پہر ہونے لگی تھی۔ سوشیلا کے مطابق بھگت گڑھ پندرہ، بیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہی بس کا آخری اسٹاپ بھی تھا۔ یہی سبب تھا کہ آگے مزید کچھ سواریاں اُتریں تو ایک ڈبل سیٹ خالی ہو گئی، میں اور سوشیلا جلدی سے اس پر براجمان ہو گئے۔ سوشیلا کرایہ دے چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بس خالی ہونے لگی تو کھلی کھڑکیوں سے بھی در آتی ہوا لگی، جس سے پسینا خشک ہونے لگا اور طبیعت بہتر ہونے لگی۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا کہ کچے پکے مکانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آبادی بھی نظر آنے لگی تھی، لوگ باگ بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دینے لگے، مختصر بازار اور دیگر چھوٹے موٹے پبلک مقامات اور پارک وغیرہ بھی دکھائی دینے لگے۔

ہم شاید بھگت گڑھ پہنچ چکے تھے اور یہ مجھے خاصا بڑا نواحی علاقہ محسوس ہوا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ دشمن ہماری تلاش میں اس علاقے کو ضرور ٹارگٹ بنا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ ہماری، بالخصوص میری تصویر دکھا کر ہمیں ٹریس بھی کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ ایسے میں، میں نہیں جانتا تھا کہ سوشیلا کے سرائے والا وہ ''بدھو عاشق'' ہماری کس حد تک مدد کر سکتا تھا؟

بالآخر لاری خالی ڈبے کی طرح کھڑکھڑاتی ہوئی اپنے مستقر پر پہنچی اور ہم دونوں اُتر گئے۔ سامنے تانگے اور رکشے نظر آنے لگے، جو ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے حلق کے بل چیخ رہے تھے، سوشیلا ایک تانگے پر سوار ہو گئی جس میں ایک گھوڑا جتا ہوا تھا۔ میری سوئی پھر کرائے اور پیسے پر اٹک گئی، مگر بولا کچھ نہیں، کیونکہ جب سوشیلا بس کنڈیکٹر کو اپنی ساڑی کے پلو سے بندھے روپوں میں سے اپنا اور میرا کرایہ دینے لگی تو اُس کے پاس پھر بھی چند روپے باقی بچے تھے۔

میں اور سوشیلا تانگے پر سوار ہو کر سرائے کی طرف روانہ ہو گئے۔ سوشیلا نے اپنے اس بدھو عاشق کا نام کاشی رام بتایا تھا۔ بھگت گڑھ میں اس کا ایک ہوٹل اور ایک سرائے تھی۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی تھا۔ وہ اپنے دو چھوٹے بچوں اور بیوی کے ساتھ ایک مکان میں رہتا تھا، جو سرائے سے زیادہ دور نہ تھا۔ سرائے وہ خود سنبھالتا تھا۔ ہوٹل بھی سرائے سے ہی متصل تھا۔ سیٹھ ٹائپ آدمی تھا اور کسی زمانے میں وہ سوشیلا کا کلاس فیلو ہی نہیں بلکہ کولیگ بھی رہ چکا تھا۔ سوشیلا کے مطابق وہ بھی اسپیکٹرم میں انچارج ریکارڈ کیپر تھا، مگر جلد ہی اُس کا اس نوکری سے دل بھر گیا۔ سوشیلا نے بھی اسے کچھ خاص رخ نہیں دیا تو وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔ بالاسور (بھگت گڑھ) اس کا آبائی شہر تھا، باپ کی اکلوتی اولاد تھا، وہ ممبئی سے واپس آ گیا اور ادھر ہی باپ کا ہوٹل اور سرائے سنبھالنے لگا۔ پھر یہیں کا ہی ہو کر رہ گیا۔ وہ کامیڈین ٹائپ تھا اور درحقیقت وہ ممبئی فلم میں چانس ملنے کی خواہش سے آیا تھا، ابتدا میں چھوٹے موٹے کامیڈین رول ملے کیے مگر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکا تو بددل ہو گیا۔ اسی دوران اسے اسپیکٹرم جیسے معتبر ادارے میں نوکری مل گئی، وہ چاہتا تھا کہ وہ ممبئی کو نہ چھوڑے اور دوبارہ بھارتی فلم نگری میں قسمت آزمانے کی کوشش کرے۔ تب تک وہ پیسے بھی کماتا رہے تاکہ اُسے باپ سے نہ منگوانے پڑیں، لیکن اس کا یہاں سے بھی دل اُچاٹ ہو گیا، ایک بڑی وجہ سوشیلا کی بے رخی بھی تھی۔ جلد مایوس ہو جانا اس کی فطرت میں شامل تھا، بالآخر وہ اپنے آبائی شہر ہی پلٹ گیا۔

سوشیلا کی زبانی کاشی رام کی یہ کہانی میرے لیے اپنی جگہ دلچسپ سہی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اب سوشیلا کی بھلا کیا مدد کر سکتا تھا؟ ماسوائے اس کے کہ وہ اسے اپنے سرائے نما ہوٹل میں رہنے کے لیے چند دنوں کے لیے کوئی کمرا دے ڈالتا۔ جب میں نے اشارتاً اس کا ذکر سوشیلا سے کیا تو وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

''رازداری اور بوقتِ ضرورت یہ ہمارے لیے مددگار تو ثابت ہو سکتا ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا۔'' میں بھی جواباً بے اختیار مسکرا دیا۔ ''ہمارے لیے ان حالات میں رازداری سب سے زیادہ اہم ہے۔''

تھوڑی دیر بعد تانگہ ایک پرانی سی عمارت کے سامنے جا رکا۔

ہم نیچے اُتر گئے۔ سرائے کے اندر باہر کچھ خاص گہما گہمی دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ عام سے مسافر مرد عورت اِدھر اُدھر منڈلاتے نظر آئے۔ جو سرائے سے نکل کر اس کے ساتھ ہی نیچے متصل ایک چھپر نما ہوٹل میں کھانا اور چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ سرائے کی عمارت دو منزلہ تھا۔ سامنے احاطہ تھا۔ ایک پھاٹک اور اس کے بعد سیمنٹ کے تین یا چار فٹ اُونچے قدمچے تھے۔

پہلی ہی نظر میں مجھے یہ بھوت سرائے معلوم ہوا۔ طویل سے برآمدے میں کمرے ایک قطار کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ وہیں ایک بوڑھا آدمی، آنکھوں پر گول عدسوں والی نظر کی عینک لگائے رجسٹر اور قلم رکھے بیٹھا تھا۔ مجھے تو کہیں سے یہ کاشی رام نہیں لگا تھا۔

''چاچا...... پرنام!'' سوشیلا نے اس کے قریب جا کر اُسے سلام کیا۔ بوڑھے نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور فوراً رجسٹر اور اس پر رکھا قلم سنبھال لیا۔ وہ ہماری وضع قطع سے شاید ہمیں کوئی موٹی آسامی سمجھ بیٹھا تھا۔ جواب دینے کے بعد وہ فوراً پیشہ ورانہ انداز میں اپنی عینک درست کرتے ہوئے بولا۔

''ایک دم فرسٹ کلاس والا کمرا خالی ہے۔ آپ دونوں شاید یہاں ہنی مون منانے آئے ہیں؟'' وہ ہم دونوں کو شاید کوئی نیا شادی شدہ جوڑا سمجھ بیٹھا تھا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ سوشیلا نے دھیرے سے میرا ہاتھ دبا دیا اور اس سے بولی۔

''چاچا......! کاشی رام سے ہمیں ملنا تھا، وہ کہاں ملے گا اس وقت......؟'' اس پر وہ بوڑھا تھوڑا خاموش سا ہو کر ہماری طرف تکنے لگا پھر جواباً بولا۔

''ہاں! وہ ہے تو اِدھر ہی...... مگر تمہیں اس سے کیا کام ہے؟''

''ہمیں اسی سے ملنا ہے، آپ پلیز، ہمیں کاشی رام سے ملوا دیں۔'' سوشیلا نے کہا۔

بوڑھے نے غور سے ہمیں سرتاپا دیکھا پھر ایک طرف دھری لکڑی کی بینچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ساتھ ہی کسی کو آواز لگائی۔ ایک چھوکرا ٹائپ لڑکا وہاں نمودار ہوا۔

''ابے او...... جا جا کر اپنے بابو کاشی رام لو بنا جا اس کے کچھ مہمان آئے ہیں۔'' بوڑھے نے اس سے کہا اور رجسٹر کھولے ایک بار پھر اس پر جھک گیا۔ میں اور سوشیلا خاموشی سے پاس والی چوبی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے یہاں سے آگے کے معاملات سوشیلا پر چھوڑ رکھے تھے۔ وہی حالات کے مطابق کوئی بہتر راستہ بنائے رکھتی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میں نے اسی چھوکرے ٹائپ لڑکے کے ساتھ ایک عجیب سی شے کو لُڑھکتے ہوئے انداز میں آتے دیکھا...... میں نے سوچا اگر تو یہی کاشی رام تھا تو میں سمجھ گیا کہ سوشیلا جیسی حسین عورت نے اسے کیوں مایوس کیا تھا؟ نیز کاشی رام کا یہ فیصلہ بھی درست تھا کہ وہ بھارتی فلم انڈسٹری میں ہیرو کے بجائے کامیڈین بننے کیوں نکلا تھا، بلکہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ وہ کامیڈین حرکات و سکنات کے بغیر بھی اگر صرف خاموش ہی کھڑا رہتا تو اُسے دیکھ کر ہنسی چھوٹ جاتی تھی، یہی حال میرا ہوا تھا۔

وہ تیس، پینتیس کے پیٹے میں ہوگا۔ رنگ گہرا سانولا تھا اور آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ اتنی چھوٹی کہ چھچھوندر کی بھی بڑی لگیں۔ ناک چہرے سمیت لمبوتری تھی۔ سر کے بال چار و ناچار ہی تھے۔ یعنی واقعی دو چار ہی تھے۔ گنج زیادہ ابھری ہوئی نظر آتی تھی۔ قد بھی ایسا تھا کہ جیسے کوئی بونا چلا آ رہا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ چل رہا تھا تو چلتا کم اور جھومتا زیادہ نظر آتا تھا۔

اس کی شاید نظر بھی کمزور تھی یا پھر جتنے سائز کی اس کی آنکھیں تھیں، اس سے اتنا ہی اسے نظر آتا ہوگا۔ کیونکہ وہ ہمارے خاصے قریب آنے کے بعد مجھے تو نہیں البتہ سوشیلا کو ضرور پہچان گیا اور اسی وقت میں نے اس کے چہرے کی رنگت سانولی سے قدرے سرخ ہوتے دیکھی، مسرت کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جگنو جیسی چمک ابھرتے ہی اس کے حلق سے باریک سی آواز بھی ابھرتے میں نے سنی تھی۔

''سس...... سوشیلا...... یہ تم ہو؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر جیسے شادیِ مرگ کی سی کیفیت میں بولا۔

''آف کورس...... یہ میں ہی ہوں، تمہاری نظریں کمزور تو نہیں ہوئی ہیں نا......؟'' سوشیلا نے اس کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا تو کاشی رام کے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز برآمد ہوئی۔

''نن...... نہیں تو، مم...... میری نظریں تو بالکل ٹھیک ہیں، سکس بائی سکس...... مگر تمہیں اچانک یہاں دیکھ کر مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا ہے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ خود

مجھے اس کی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اس قدر چھوٹی اور چنی چنی آنکھوں سے دیکھتا کیسے ہوگا؟

''کیا تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مجھے یہاں دیکھ کر......؟'' سوشیلا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے اُسے اکسایا۔ سوشی کی اس ادا پر کاشی رام چاروں شانے چت ہو گیا۔ فوراً پرنام کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ارے...... سوشیلا جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، مجھے تو آپ کو یہاں اپنے غریب خانے پہ دیکھ کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بیان سے باہر ہے، دراصل یہ میرے لیے ایک ناقابلِ یقین سرپرائز ہے۔ خیر...... خیر...... پدھاریئے......''

اُس نے ہمیں اپنے ساتھ آنے کا کہا لیکن پھر اچانک اسے میرا خیال آیا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اس کی عقل شاید خوشی سے خبط ہوگئی تھی، اب اسے میرا خیال آیا تو اس نے سوشیلا سے پوچھ لیا۔

''یہ...... یہ کون ہیں سوشیلا جی؟!''

''یہ میرے پتی ہیں، شنکر راج......'' سوشیلا نے جواب دیا اور میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ یوں جیسے کسی بلب کا فیوز اُڑ جاتا ہے۔ مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ سی گھلتی محسوس ہوئی۔ لیکن پھر شاید وقت کے تقاضے اور حالات کے پیشِ نظر یہی کہا جا سکتا تھا جو سوشیلا نے بہتر محسوس کیا ہو اسی لیے میں پی گیا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ ''پتی'' کے لفظ پر کاشی رام کا چہرہ اُتر سا گیا تھا۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ سوشیلا اگر اسے بے وقوف بنائے رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی تو پھر خود کو اسے شادی شدہ ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر راج صاحب......!''

اس نے میری طرف زبردستی اور پھیکی سی مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ طبیعت مکدر ہونے کے باوجود میں نے بھی اس کی طرف جبراً مسکراہٹ سے دیکھنا ضروری سمجھا۔

وہ ہمیں ایک کمرے میں لے آیا۔ یہ شاید اسی کا کمرا تھا۔ کیونکہ وہاں، ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ ایک چھوٹا ٹی وی، بیڈ، میز کرسی اور ایک بڑا سا کاؤچ۔ فریج بھی تھا، ساتھ ہی ایئر کولر بھی رکھا تھا۔ کمرا ہوادار تھا اور اس کی فضا بھی خاصی ٹھنڈک آمیز تھی۔ یہاں آکر ہمیں کچھ سکون ملا۔

''تمہارا کمرا تو بہت اچھا اور ٹھنڈا ہے۔ اُف...... باہر کس قدر حبس اور گرمی تھی۔ ہمیں بھی ایسا ہی کمرا چاہیے رہنے کے لیے۔'' سوشیلا نے اس سے کہا تو کاشی رام اس کی بات پر قدرے چونکا اور اسی لہجے میں اس سے بولا۔

''کیا آپ واقعی یہاں رہنے کے لیے آئی ہیں، سوشیلا جی؟''

''ہاں! ہم ذرا شہر کے ہنگاموں اور شور سے بھاگ کر یہاں کچھ روز سکون اور آرام سے بِتانے کے لیے آئے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں یہاں تمہارے سرائے سے بڑھ کر رہنے کے لیے اور کوئی جگہ اچھی نہیں لگی، سو یہاں چلے آئے۔''

''سوشیلا جی......! یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔'' وہ خوشی سے بولا۔

''مگر ہمیں کمرا ذرا الگ تھلگ اور آرام دہ چاہیے۔ کرائے کی تم چِنتا مت کرنا۔''

''ارے سوشیلا جی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں اور آپ سے کرایہ لوں گا؟'' وہ ایک دم پھر اس پر ریشہ خطمی سا ہوتے ہوئے بولا تو سوشیلا، کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ کر اپنی ناک کی پھنگی کو چھو کر ہولے سے کھنکاری، تو کاشی رام کو ایک دم اس بات کا ہوش آیا کہ اس کا ''شوہر'' بھی ساتھ کھڑا ہے، اور سوشیلا نے اس پر اشارے سے بھی شاید یہی باور کرانے کی کوشش چاہی تھی، جس کا کاشی رام کو فوراً احساس ہوا اور ذرا سنبھل کر فوراً بات بناتے ہوئے بولا۔

''مم...... میرا مطلب ہے کہ...... اب دیکھیں ناں...... آپ اور ہم پرانے دفتری ساتھی رہ چکے ہیں، کچھ اچھا نہیں لگتا آپ سے کرائے کی بات کرتے ہوئے۔''

''نہیں، کرایہ تو ہم آپ کو دیں گے ہی کاشی رام صاحب! لیکن وہ کیا ہے کہ ہمارے ساتھ یہاں آتے ہی ایک ٹریجڈی ہوگئی ہے۔'' سوشیلا نے آخر میں اُترے ہوئے چہرے سے کہا تو وہ یکدم ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔

''کک...... کیسی ٹریجڈی سوشیلا جی......؟''

''یہاں آتے ہوئے کسی اُچکے نے لاری کے اندر ہی ہماری جیب کاٹ لی ہے، وقتی پریشانی تو ہوئی ہے مگر تم اس کی چنتا نہ کرو...... یہاں بینک تو ہوں گے ناں......؟ ہم جلد ہی پیسے منگوالیں گے۔ اگرچہ تھوڑی دیر لگے شاید......''

''نہیں...... نہیں، اس کی بھی کیا ضرورت ہے...... آپ مجھ سے پیسے......'' وہ پھر پٹڑی سے اُترنے لگا تو سوشیلا نے اپنی ناک کی پھنگی کو چھوا ہی تھا کہ اُسے ہوش آگیا...... ایک بار پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔

''مم...... میرا مطلب تھا کہ جب تک آپ کے پیسے یں آجاتے، میں اُدھار دے دوں گا۔'' وہ شاید اب سوشیلا ا پھنگی پکڑ کر کھنکھارنے کا اشارہ سمجھنے لگا تھا اور مجھے لگتا تھا کہ سوشیلا نے مجھے اس کے سامنے اپنا ''پتی'' ظاہر کر کے اس کے جذبات کو ''بریک'' لگانے کی ہی غرض سے ایسا کیا تھا۔ مکن تھا اور بھی کوئی وجہ رہی ہو، تاہم مجھے اپنی ہنسی روکنا شکل ہو رہا تھا۔ ان حالات میں کاشی رام جیسا ہنسوڑ سا کردار اچانک ہی ابھر آیا تھا، ورنہ میری زندگی میں ایسے کردار کہاں تھے۔ ہاں! البتہ اول خیر اور شکیلہ کی آپس میں وک جھوک سے بھی میں محظوظ ہوتا تھا۔

اپنے ساتھیوں کی یاد آتے ہی میں اُداس سا ہوگیا۔ س پر مستزاد عابدہ کی یادوں کا تو جیسے ایک مقبرہ آباد ہوگیا تھا۔ میرے سینے میں، نجانے وہ بے چاری کس حال میں تھی اور کہاں تھی؟ باسکل ہولارڈ جیسے غبی، سفاک اور متعصب یہودی درندے نے اُسے نجانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہوگا اب تک...... اس تصور سے ہی مجھے ہول آنے لگا تھا۔ خود میں ایسے حالات میں گھرا ہوا تھا کہ ابھی تک مجھے آنسہ خالدہ سے اس کے بارے میں کوئی خیر خیریت کا فون بھی نہیں کر سکا تھا۔ اب یہاں آکر مجھے اُمید ہو چلی تھی کہ شاید خالدہ سے ٹیلی فونک بات کرنے کی کوئی سبیل نکل آئے۔ وہ خود بھی یقیناً پریشان ہوگی۔ میں اچانک منظرِ عام سے کہاں غائب ہوگیا تھا، وہ بھی ایسے نازک موقع پر جبکہ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کو اینٹی ٹیریئر کورٹ میں گھسیٹنے کی مذموم سازش اور تگ و دو میں مصروف تھا۔ اُدھر پاکستان میں عارفہ اور سیٹھ نوید جیسے زہریلے سانپوں کا جوڑا میرے اس طرح اچانک ''غیاب'' پر خوشی کے جشن میں محورقص و سرور ہوگا۔

کاشی رام نے ہمیں فوراً ہی مطلوبہ کمرا فراہم کر دیا۔ یہاں ہم زیادہ عرصہ نہیں ٹک سکتے تھے۔ دشمن ہر طرف ہمارے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میں نے یہاں محض ضرورتاً ''اسٹے'' کیا تھا، تاکہ جب تک اپنے بہی خواہوں سے ٹیلی فونک رابطہ کر کے انہیں اپنی خیریت اور ان کی خیریت کے وغیرہ کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکوں۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے سوشیلا کو سب سے پہلے اسی بات کا پابند کیا تھا کہ وہ کاشی رام کے ذریعے اولین فرصت میں ٹیلی فون کے بندوبست کی بات بھی کرے، جس میں ٹرنک کال کی بھی سہولت ہونی چاہیے، اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس میں تھوڑی دیر لگی، تاہم رات تک کاشی رام نے

ہمارے کمرے میں ایک عدد ٹیلی فون سیٹ بھی رکھوا دیا تھا۔ سہ پہر اب رات میں ڈھل چکی تھی۔

کچھ وقت ملا تو میں نے سوشیلا کو یاد دلایا کہ وہ مجھے جونکی بابا اور مہارانی کے بیچ پُراسرار تعلق کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس نے بتایا......

کئی برس پہلے انڈیا میں پھیلنے والے طاعون کی وبا نے مہارانی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ان کا پورا خاندان ختم ہوگیا، صرف یہی زندہ بچی تھی۔ اسی علاقے میں ڈاکٹر لیکھ رام کو بھارت سرکار نے اپنی ٹیم کے ساتھ یہاں بھیجا تھا۔ وہ خود بھی اس وبا کا شکار ہو کر ختم ہوگئے صرف لیکھ رام ہی زندہ بچا اور پھر اس نے ادھر ہی رہتے ہوئے لوگوں کی خدمت کرنے کا فیصلہ کیا اور بعد میں اپنی پتنی کو بھی بلوا لیا۔ ان کا کوئی بچہ نہیں تھا۔

ابتدا میں ڈاکٹر لیکھ رام ہی مہارانی کا علاج کر رہا تھا مگر پھر مہارانی جونکی بابا نامی ایک آدمی سے علاج کروانے لگی جو خود کو بڑا وید کہتا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مہارانی، جونکی بابا کے علاج سے زیادہ خوش اور مطمئن نظر آنے لگی۔ وہ درحقیقت مجرم ذہنیت کا انسان تھا، زندہ انسانوں کا خون جونکوں کے ذریعے ''سک'' کروا کر وہ طاعون کے مریضوں کو پلاتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق جونکوں کے تھوک میں، چوسے ہوئے خون میں ایک مادہ جو ایک خاص پروٹین ہوتا ہے، وہ اور ینجائم نامی ایک خامرہ، اور کیمیائی مرکبات اس چوسے ہوئے خون میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس قدرتی مرکبات سے بننے والے خون میں حیرت انگیز طبی تاثیر شامل ہو جاتی ہے جو بقول جونکی بابا کے، طاعون کے علاج میں فائدہ دیتی ہے۔

''تمہیں یہ سب باتیں کس نے بتائیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی ڈاکٹر لیکھ رام نے ہی بتائی تھیں مجھے، آگے سنو اب......'' وہ بولی۔

''اس علاج پر ڈاکٹر لیکھ رام نے بھی تحقیق کی اور اسے Hirudotherpy کا نام دیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک افریقہ کے کسی قدیم کینی بال قبیلے کا طریقہ علاج ہے مگر اس سے انسان کے اندر آدم خوری پرورش پاتی ہے۔ تمہیں یاد ہے ناں جب تم نے مجھے اس تہ خانے والی جگہ کے ایک کمرے سے نکالا تھا تو میں نے خوف زدہ ہو کر تم سے یہی کہا تھا کہ یہ مہارانی ایک ڈائن ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ انسانی لہو پی کر آدم خور بن چکی ہے۔ جونکی بابا کے مرنے کے بعد اس نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ وہ اپنے خاص حواری نندو کے ذریعے بستی سے انسانوں کو پکڑ کر لاتا تھا اور رات کی تاریکی میں مہارانی اس کے ساتھ یہ شیطانی کھیل کھیلا کرتی تھی۔ اپنے تئیں اس نے حویلی میں بھی ایک ''کیچ'' بنا کر جونکوں کا فارم بنانے کی کوشش کی تھی۔ میرے سامنے اس نے ایک انسان کو ہلاک کیا تھا۔ جونکوں کے ذریعے جونکی بابا، انسانی خون نکالنے کا طریقہ اپناتا تھا وہ مہارانی کو معلوم نہ تھا، مگر انسانی خون کی اسے لت لگ گئی تھی۔ اس نے ایک قیدی کا میرے سامنے، اپنے دانتوں سے اس کی شہ رگ کاٹ خون پیا تھا، اُف......بھگوان......! کیسا ڈراؤنا منظر تھا وہ...... جب میں ایک انسان کو ایک دوسرے انسان کا اس طرح خون پیتے دیکھ رہی تھی، مجھے مہارانی کوئی ''ویمپائر'' لگ رہی تھی۔ میں تو مارے دہشت کے ہی بے ہوش ہوگئی تھی۔

''مہارانی کو انسانی خون پی پی کر خود بھی بڑی عجیب و غریب بیماریاں لگ چکی ہیں، اس کا رنگ بدلنے لگتا تھا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے حسین عورت سے ایک بدصورت ڈائن دکھائی دینے لگتی تھی۔'' سوشیلا اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔

مہارانی اور جونکی بابا سے اگر میرا سامنا نہ ہوا ہوتا تو میں سوشیلا کی اس بات کا یقین ہی نہیں کرتا۔ تاہم میں نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ بھارت کے ایک شہر میں پولیس نے تین آدم خور بھائیوں کو گرفتار کیا تھا۔ بعد میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اب شاید مہارانی کا بھی یہی حال ہونے والا تھا۔ کیونکہ پولیس کو اس پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا اور شاید اس کی بستی والوں کو بھی بھنک پڑ چکی تھی۔

بہرکیف رات کا کھانا ہم نے اپنے کمرے میں منگوا کر کھایا اور سوشیلا نے دانستہ کھانے میں کاشی رام کو بھی شامل رکھا تھا۔ اس دوران میں موقع ملتے ہی میں نے سوشیلا کو کان میں ہدایت کی کہ وہ کسی طرح کاشی رام کو کچھ دیر کے لیے باہر لے جا کر اپنے ساتھ مصروفِ گفتگو کرے تاکہ میں آرام سے اپنے ساتھیوں سے گفتگو کر سکوں......

اس نے ایسا ہی کیا۔ کھانے کے اختتام پر میں نے دانستہ جماہی لیتے ہوئے نیند کے غلبے کا ذکر کیا اور بیڈ پر جا کر سوتا بن گیا۔ ایسے میں مجھے سوشیلا کے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''انہیں فوراً ہی کھانا کھا کر نیند آ جاتی ہے۔ میرا تو ابھی بہت سی باتیں کرنے کا جی چاہ رہا تھا۔'' اس نے شاید ایک توبہ شکن انگڑائی بھی لی تھی۔ جس کی آواز میرے کانوں

ب پہنچی تھی۔

''چلو کاشی! باہر کہیں کھلی فضا میں بیٹھ کر باتیں کرتے
ں۔'' سوشیلا، اس سے کہہ رہی تھی اور میرے کانوں میں
ثی رام کی ایسی آواز ٹکرائی جیسے اُس نے ہچکی لی ہو، یہ شاید
ں جھلے آدمی کی مسرت کے اظہار کرنے کا کوئی انداز تھا۔
ڑی دیر بعد دونوں کمرے سے باہر جا چکے تھے۔ سوشیلا
رے کہنے کے مطابق اپنا ''رول'' خوب نبھا رہی تھی۔

ان کے کمرے سے نکلتے ہی میں بہ سرعت بیڈ سے
ما، دروازے کی جھری سے ذرا باہر جھانکا، پھر اپنی تسلی
رنے کے بعد میں نے دروازے کو بند کیا، مگر اندر سے
نڈی نہیں لگائی۔ اس کے بعد ٹیلی فون کی جانب بڑھا اور
ڑکتے دل کے ساتھ آنسہ خالدہ کے سیل فون کا نمبر ملایا۔
ب دو بار لائن ڈراپ ہوئی مگر تیسری بار رابطہ ہوگیا۔

''ہیلو......!'' دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز
ھری اور میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات
نے لگیں۔ کیونکہ امریکا میں مقیم، میرے لیے یہی وہ واحد
نصیت تھی جو کسی نہ کسی طرح عابدہ کے ساتھ رابطے میں تھی
اس کی خبر گیری کی آگاہی رکھے ہوئے تھی۔ اب میں نہیں
انتا تھا کہ اس کے پاس عابدہ سے متعلق کیا اچھی بری خبریں
یں؟ نیز وہ کہاں اور کس حال میں تھی؟ آنسہ خالدہ اس
ے متعلق مجھے کیا بتانے والی تھی، امر واقعہ تو یہی تھا کہ اب
نسہ خالدہ سے بات کرتے ہوئے میں اپنے اندر پہاڑ جیسا
وصلہ اور طاقت مجتمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب
دسری جانب سے آنسہ خالدہ کی آواز سننے کے بعد چند
انیوں بعد بولا تو میری اپنی آواز میں واضح طور پر
ڑکھڑاہٹ تھی۔

''ہہ......ہیلو......! آنسہ خ خالدہ صاحبہ......!''

''ارے ے ے......تم! شہزی......!'' میری آواز
چانتے ہی دوسری طرف خالدہ بھی سخت متحیر و متغیر سی ہوگئی۔

''تت......تم کہاں اور کیسے ہو شہزی......! کہاں پہنچے
و......؟ خدانخواستہ تم کہیں ٹائیگر ٹیگ...... او...... مائی گاڈ!
ں کیا کہوں......؟'' اس کے لہجے سے پریشانی کے ساتھ
شویش بھی ہویدا ہو رہی تھی۔ غالباً اس کی سمجھ میں بھی نہیں
رہا تھا کہ وہ کیا کہے!

''بس! خالدہ صاحبہ! کیا کہوں میں......خود مجھے نہیں
قین تھا کہ میں اچانک کن حالات کا شکار ہو جاؤں گا......''
میں نے پژمردہ سے لہجے میں کہا اور پھر اپنے حواسوں پر قابو
اتے ہوئے سب سے پہلے دل مضبوط کر کے عابدہ کی
خیریت پوچھی تو دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کی ایک آہ سے مُشابہ ہمکاری خارج کرنے کی آواز سنائی دی اور خاموشی سی چھا گئی اور میرا اندر ہولنے لگا۔

''شہزی......! اب میں کیا بتاؤں تمہیں...... میں نے تو اپنی طرف سے عابدہ کو بچانے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی، تمہیں بھی اس بے چاری سے متعلق خبریں پہنچاتی رہی...... مگر افسوس......'' وہ اتنا کہتے کہتے چپ ہوئی تو میں جیسے سُن ہو کر رہ گیا۔ حلق میں گویا کانٹے اُگ آئے، بولنے اور اُس سے عابدہ کے متعلق مزید کچھ استفسار کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ٹوٹا ٹوٹا اور مایوس لہجہ، عابدہ سے متعلق میرے ان سارے اندیش ناک اور ہولناک خدشات کی غمازی کرتا محسوس ہو رہا تھا، جو کوڑیالے سانپوں کی طرح اب تک مجھے ڈستے رہے تھے۔

''پھ پھ...... پھر بھی آنسہ خالدہ......! مم...... مجھے بتاؤ تو سہی کہ وہ غریب، ہے کن حالوں میں......''

''مجھے پہلے تم اپنے بارے میں......''

''نہیں خالدہ! پہلے مجھے عابدہ کے متعلق بتاؤ...... خدا کے لیے......'' میں بہ یک ترنت اس کی بات کاٹتے ہوئے غمگین لہجے میں بولا۔

''عارفہ اور اس کی اہم گواہی کی عدم موجودگی و دستیابی کے باعث ہم عابدہ کا مقدمہ نیویارک کی اوورسیز سیول سوسائٹی کی کورٹ میں ہار گئے اور باسکل ہولارڈ عابدہ کا مقدمہ واشنگٹن کی اینٹی ٹیریئر کورٹ تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا، وہاں اُس خبیث نے معصوم اور بے گناہ عابدہ کو بالآخر، اس الزام تلے کہ اس سے امریکا کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہے، امریکی ریاست کیلی فورنیا کی ایک خطرناک جیل......کورکوران (corcoran) میں قید کروا دیا ہے۔ وہاں باسکل ہولارڈ کا اثر چلتا ہے۔

''سوری ٹو سے...... مسٹر شہزی......! یہ ساری باتیں تمہیں بڑے صبر اور حوصلے سے سننا ہوں گی...... میرا مقصد تمہیں وقتاً فوقتاً اُن تلخ حقائق سے آگاہ کرتے رہنا ہے، جن سے میں نے اپنے تئیں پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ میرا پروفیشن بھی ہے اور ایک مسلم بے گناہ اور معصوم لڑکی کو ایک یہودی کی گھناؤنی سازش کے پھندے سے بچانا بھی...... کیونکہ ایسے ہی لوگ اس خبیث باسکل ہولارڈ کے نشانے پر ہوتے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ باسکل ہولارڈ یہاں بھی چپکا بیٹھنے والا نہیں ہے، وہ وہاں عابدہ پر جیل کی اذیت ناک اور انسانیت سوز سختیاں کرنے کے بعد اُسے

اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے بلیک میل کر کے استعمال کرنا چاہتا ہے اور خدا نہ کرے کہ عابدہ کو وہ مجبور کر کے کسی اندھے گڑھے میں پھینک دے، لیکن اب تک کی میری کھوج یہی ہے……“

آنسہ خالدہ بولے جا رہی تھی اور میرے وجود کا رواں رواں تڑپ رہا تھا۔

”شہزی……! آر یو ویئر……؟“ مجھے یک ٹک خاموش پا کر وہ استفساریہ بولی۔

”ج…… جی! میں سُن رہا ہوں……“ میں آنسوؤں کے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

”تم بتاؤ اب…… کہاں اور کیسے ہو؟ ویسے میری زہرہ بانو سے بھی بات ہوئی تھی۔ اُس نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ تم کہیں اچانک غائب ہو چکے ہو……“

جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ میں نے آنسہ خالدہ کو اپنے سیل فون کے علاوہ ”بیگم ولا“ کے لینڈ لائن کا بھی نمبر دے رکھا تھا۔ میں نے جواباً کہا۔

”میں بھی کچھ غیر تسلی بخش حالات سے دوچار ہوں…… اس کی تفصیل ابھی بتانا مناسب نہیں…… آپ اب کیا سمجھتی ہیں کہ عابدہ کے سلسلے میں آپ کیا کر سکتی ہیں؟“

میری بات پر، دوسری جانب سے مجھے اس کے ایک گہرے سانس لینے کی آواز سنائی دی تھی۔

”شہزی……! میں تم سے پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہوں کہ میں امریکا میں صرف عابدہ کے لیے ہی نہیں بلکہ نائن الیون کے واقعے کے بعد سے، یہاں مقیم مسلم کمیونٹی کی فزیکل اور سوشل پروٹیکشن کے لیے سرگرم ہوں، نیز اس واقعے کی وجہ سے دنیائے مسلم پر پڑنے والے منفی اثرات اور اس کے محرکات کی خفیہ طور پر کھوج اور پتا لگانے میں مصروف ہوں کہ اس عالمی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں کافی حد تک کامیاب جا رہی ہوں۔ اس کا ثبوت میرا حال ہی میں چھپنے والا وہ آرٹیکل ہے۔ جس کے مطابق سی آئی اے کا باسکل ہولارڈ اپنی ذاتی فورس ”ٹائیگر ٹیگ“ کے ذریعے، ایف بی آئی کے ساتھ مل کر…… امریکی ایف بی آئی نے یہاں مقیم مسلمانوں، خصوصاً پاکستانی نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے مقدمات میں پھنسانے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ٹائیگر ٹیگ اور ایف بی آئی کے مشترکہ ایجنٹس مسلم نوجوانوں سے ”جعلی جہادی“ بن کر دوستی کرتے ہیں اور پھر ان کو دنیا بھر میں مسلمانوں پر جاری مظالم کے خلاف جہاد اور جنگجوئیت پر راغب کرتے ہیں۔ بعد ازاں انہیں ”اسٹنگ آپریشن“ کے نام پر گرفتار کر کے جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ باسکل ہولارڈ اس عالمی سازش کے سرخیلوں کا خفیہ ٹاسک لے کر آگے بڑھ رہا ہے۔ جن کا تعلق کسی مسلم سرزمین سے نہیں بلکہ امریکا سے ہی ہے جس کے تانے بانے جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) سے جا کر ملتے ہیں۔ جس نے امریکا کی معاشیات اور اقتصادیات پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے اور شہزی……! میں ہی نہیں بلکہ تم بھی یہ بات جانتے ہو کہ عابدہ کو بھی ایسی ہی کسی سازش کا ہی نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اب میں اپنے منہ سے کیا کہوں……؟ کہ اس مہم میں میری اپنی جان کو بھی شدید خطرات رہنے لگے ہیں، کئی بار مجھ پر حملے کیے گئے۔ مگر مجھے اللہ کی ذات پر کامل بھروسا ہے۔ وہی میری اس نیک مقصد میں مدد فرماتا رہے گا۔ عابدہ کا معاملہ بے شک گمبھیر صورت اختیار کر گیا ہے مگر خاموش میں بھی نہیں بیٹھی ہوں۔ اب تم بتاؤ، تم وہاں کن حالات کا شکار ہو چکے ہو؟“

آنسہ خالدہ نے اپنی بات ختم کی تو میں نے کہا۔

”میں ابھی آپ کو اس بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا لیکن میں آپ کے ساتھ وقتاً فوقتاً رابطے میں رہوں گا۔ آپ اس کا یہ مطلب مت سمجھیے گا کہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں، یوں سمجھیے میں اپنے تئیں ان لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے لیے کوشاں ہوں جنہوں نے عابدہ کو پھنسایا ہے۔“

”کیا تم پاکستان سے باہر ہو……؟“

”جی! یہی سمجھ لیں۔“

”کس ملک کی سرزمین پر ہو تم اس وقت؟“ اس نے پوچھا۔

مگر اسی وقت کسی وجہ سے لائن کٹ گئی اور ساتھ ہی دروازے پر بھی آہٹ اُبھری۔ میں جلدی سے جا کر بیڈ پر دراز ہو کر سوتا بن گیا۔ اتنے میں سوشیلا، کاشی رام کو ”گڈ نائٹ“ کہہ کر اندر داخل ہوئی اور دروازہ بند کر دیا۔ میں فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

”مجبوراً اس باگڑ بلے کے ساتھ اتنا وقت گزارنا پڑا…… لگتا ہے یہ کڑوا گھونٹ اب مجھے بار بار پینا پڑے گا۔“ وہ ایک تھکی تھکی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”تم نے اپنے ساتھیوں سے بات کر لی؟“

”ہاں!“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ ”چیٹنگ وائف“ کا رول پلے کرتے ہوئے تم خاصی انجوائمنٹ فیل کر رہی ہو گی، مگر……“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ

”توبہ ہے، باتیں بہت کرتا ہے۔ اب میں اس کے ھ تنہا نہیں نکلوں گی۔“

”کیا اس نے تمہارے ساتھ کوئی ”معنی خیز“ رت تو نہیں کر ڈالی؟“ میں اس کا دل بہلانے کی کوشش رہا تھا۔ تاکہ اس کا موڈ ٹھیک ہو سکے۔ وہی ہوا، وہ میری ت پر بے اختیار ہنس پڑی اور شاور لینے کے لیے باتھ روم طرف بڑھ گئی۔ میں اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ے تھوڑا کھول کر باہر جھانکا۔ راہداری سنسان پڑی تھی۔ دروازہ بند کر کے اندر آ گیا اور دوبارہ ٹیلی فون کا ریسیور الیا اور پاکستان میں بیگم ولا کا نمبر ملایا۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور میرے ب سے پاکستان کا وقت آدھا گھنٹا پیچھے ہی تھا، یعنی وہاں وقت ساڑھے گیارہ بج رہے ہوں گے۔

”ہیلو……“ دوسری جانب سے شناسا آواز ابھری۔ ہرہ بانو ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ میرے ہی فون کے ظار میں تھی۔

”ہیلو…… زہرہ! یہ میں بول رہا ہوں…… ی……!“ میں نے ہولے سے کہا۔

”شہ…… شہزی…… شہزی……! تم کہاں ہو اور کیسے ……؟“ دوسری جانب سے اس کی تشویش زدہ سی بے قرار از اُبھری۔

”میں جہاں ہوں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں، ں سب خیریت ہے ناں……؟ اماں ابا جی اور…… اول وغیرہ……؟ سب کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ سب ٹھیک ہیں مگر ہم تمہاری طرف سے بہت فکر رہتے ہیں۔“ وہ جیسے چڑھی ہوئی سانسوں کے درمیان ۔ ”کبیل دادا اور اول خیر انڈیا آنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بھی بہت پریشان رہتی ہے تمہارے لیے۔“

”ابھی کسی کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گا، جیسے جیسے مجھے موقع ملتا رہے یہ بھی میں خطرہ مول لے کر فون کر لیتا ہوں، کچھ پتا کہ بلیو تلسی یا را والے میری کالز بھی ٹریس کر رہے …… اس لیے میرے پاس بہت کم وقت ہوتا ہے، یہ یں، مجھے کچھ پیسے بھجوا سکتی ہو؟“

”ہاں! ہاں کیوں نہیں؟ کتنے پیسے چاہییں تمہیں؟ مجھے بات کی تو زیادہ فکر ہو رہی تھی مگر تم واپس کیوں نہیں اتے؟“ زہرہ بانو نے فراخ دلی سے کہا تو میں بولا۔

”مجھے شاید یہ تقدیر نے ہی موقع دیا ہے۔ میں اسے ضائع نہیں کروں گا اور تم سب بے فکر رہو، مجھے یہاں بھی کچھ ایسے مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ میں اپنا مشن آسانی سے پورا کر سکوں…… میں تمہیں ایک اکاؤنٹ نمبر دے رہا ہوں، کسی طرح پیسے بھجوا دیں، میرا اور اول خیر کا پاکستان میں مشترکہ اکاؤنٹ ہے۔“

”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شہزی؟ میں تمہیں پیسے بھجوا دوں گی۔ اس کی کیوں فکر کرتے ہو؟“ وہ بڑے رسان سے بولی۔ میں نے اسے سوشیلا کا نام اور اکاؤنٹ نمبر بتا دیا۔ ساتھ ہی کہا کہ چند لاکھ روپے سے زیادہ مت بھیجیں جائیں وغیرہ…… اس کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس اثنا میں سوشیلا بھی غسل وغیرہ کر کے نکل آئی۔ نہانے کے بعد وہ خاصی نکھری نکھری نظر آ رہی تھی اور اس نے ڈھیلا ڈھلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہمارے پاس سامان بھی کچھ نہیں تھا۔ ہنی مون پہ آنے والے جوڑے کو خالی ہاتھ پا کر بھی کاشی رام کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ تاہم مجھے یاد آیا کہ سوشیلا نے اسے یہی بتایا تھا کہ ہمارا سامان راستے میں چوری ہو گیا تھا۔ اس لیے اس بھلے مانس نے کچھ ہلکے پھلکے کپڑے بھجوا دیے تھے۔

ہم سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ میں نے سوشیلا کو بتا دیا کہ کل تک اس کے ممبئی والے اکاؤنٹ میں پیسے آ جائیں گے۔

”اس کی کیا ضرورت تھی شہزی؟ پیسے تھے میرے پاس۔“ وہ بولی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے یہ بات محض مروتاً کہی تھی یا خلوصِ نیت سے، تاہم میں نے دوسرا موضوع چھیڑ دیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کل صبح تمہیں، کاشی رام سے بات کرنا ہو گی۔ وہ ہمارے رہنے کے لیے کوئی الگ بندوبست کر دے تو یہ زیادہ بہتر ہو گا۔ تب تک تم ممبئی جا کر روپے نکلوا لانا۔ ہو سکے تو چھوٹی موٹی گاڑی کا بھی بندوبست ہو جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ کاشی رام کا بھی حساب ساتھ کے ساتھ چکتا کرتے رہیں گے۔“ میری بات پر سوشیلا نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے کہا۔

”ہزاری سی کی ایک کار ہے میرے پاس، جو وہیں ممبئی میں میرے مکان کے گیراج میں کھڑی ہے۔ میری موسی پریشان ہو رہی ہو گی۔ میں اسے بھی فون کیے دیتی ہوں ذرا……“

اس نے اپنی موسی کو فون کیا اور میری ہدایت کے

مطابق اُسے نہیں بتایا کہ وہ کہاں تھی اس وقت۔ تاہم اپنے جلد گھر پہنچنے کی تسلی اُسے ضرور دے دی تھی۔

''میں جنرل کے ایل ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہوں۔ اس کے لیے میں جلد سے جلد ممبئی کا رخ کرنا چاہتی ہوں۔ وہ وہیں دیار میں رہتا ہے۔''

''تمہیں اس سے جان کا خطرہ ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت اچانک اس سے پوچھا۔

''ہاں! کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے گھناؤنے عزائم سے واقف ہوں اور وہ کوئی بھی ایسی شے نہیں چھوڑتا جو اس کے معمولی سے راز سے بھی واقف ہو۔''

''تو پھر اس کے لیے ہمیں بہت محتاط ہو کر قدم اُٹھانا ہوگا، کسی قسم کی جلد بازی جانی نقصان اور مشن کے فیل ہونے پر بھی منتج ہوسکتی ہے۔'' میں نے گہری متانت سے کہا۔

''لیکن تم یہاں اپنے دشمنوں سے بھی نبرد آزما ہو۔ ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں ہیں اور وہ شکاری کتوں کی طرح ہمارے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے وہ یہاں بھی کسی وقت پہنچ سکتے ہیں۔'' سوشیلا نے متوحش سے لہجے میں کہا تو میں بے پروانہ انداز میں بولا۔

''تم اگر اتنی ہی خوف زدہ ہو تو میری طرف سے اجازت ہے تمہیں، تم میرا ساتھ چھوڑ کر ممبئی اپنے گھر جاسکتی ہو۔ میں اپنا مشن پورا کر کے تمہارے پاس ممبئی آجاؤں گا اور پھر جنرل ایڈوانی سے نمٹ لیں گے۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو شہزی؟'' وہ روٹھے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ ''میں اتنی خود غرض نہیں ہوں کہ اپنے مطلب کی خاطر تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں، تمہیں ابھی میری ضرورت رہے گی، اس لیے کہ تمہارے پاس شناختی کاغذات نہیں ہیں اور تم کسی بھی انڈین اہلکار کی نظروں میں آسکتے ہو۔ میں ساتھ رہوں گی تمہارے تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر ہوا بھی تو میں اس کمی کو کور کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔''

اس کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ میں چپ رہا، وہ آگے بولی۔

''مجھے تو بس اس بات کی پریشانی ہو رہی ہے کہ تم اپنے اتنے خطرناک اور طاقت ور دشمنوں سے تن تنہا بغیر کسی ہتھیار کے کیسے مقابلہ کرو گے؟''

''میرا عزم اور حوصلہ ہی ہمیشہ سے میرے ہتھیار رہے ہیں سوشی!'' میں نے مستحکم لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے خالی ہاتھ بھی اب تک اپنے ان دشمنوں کو مقابلہ کیا ہے۔ اب تک تمہارے ساتھ رہتے ہوئے میں اس کی جھلک دیکھتی رہی ہوں۔ اس لیے تم پر پورا بھروسا بھی کیے ہوئے ہوں۔''

''بس! تو پھر اپنا یہی بھروسا قائم رکھو۔ ہم جلد اپنی منزل پالیں گے۔''

''بھگوان کرے ایسا ہی ہو۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔''

بہت سا وقت گزر گیا۔ سوشیلا غسل وغیرہ کرنے کے بعد بیڈ پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی جبکہ میں نے اپنے لیے ایک پرانے صوفے پر سونے کی جگہ بنالی تھی۔

☆☆☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔ آنکھ کھلنے کی بہ ظاہر وجہ معلوم نہ ہوسکی، یوں بھی میں ''کھٹکے'' کی نیند سوتا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں، مجھے بیڈ پر سوشیلا گہری نیند میں ڈوبی دکھائی دی۔ باقی کمرے میں خاموشی کا راج تھا، لیکن میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں اچانک ہی گونج کی سی آواز سنائی دی۔ میں بدکا۔ یہ آواز کسی گاڑی کے انجن کی تھی۔ میں بہ سرعت صوفے سے اُٹھ کر کمرے کی اس کھڑکی کی طرف لپکا جہاں سے بیک وقت سرائے کے احاطے اور پھاٹک کا نظارہ کیا جاسکتا تھا اور اسی باعث میں نے ایسی لوکیشن پر یہ کمرا لیا تھا۔

کھڑکی کے کواڑ کھلے ہوئے تھے، میں نے وہاں سے باہر جھانکا اور یکلخت جیسے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ گاڑی ایک ہی تھی اور اسے میں پہچان گیا تھا۔

''دشمن......'' میرے اندر ابھرا اور میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا، بیڈ کی طرف بڑھا، پھر سوشیلا کو بُری طرح جھنجوڑ کر جگایا...... وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

''دشمن یہاں آپہنچے ہیں، جلدی نکلو......'' میں نے اتنا کہا اور اسے لیے دروازے کی طرف لپکا۔ اسے کھولا اور راہداری میں آگیا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں احتیاط کے پیشِ نظر یہاں ''فروکش'' ہونے سے پہلے، سرائے کے محل وقوع کا اچھی طرح گھوم پھر کر جائزہ لے چکا تھا اسی لیے میں نے سیدھا ان سیڑھیوں کا رخ کیا جو سرائے کی چھت کی طرف جاتی تھیں۔

راہداری سنسان تھی اور اس کی چھت پر کہیں ہلکے اور کے بلب روشن تھے۔ سیڑھیوں پر آ کر کچھ سوچ کے میں نے سوشیلا کو اپنے پیچھے چپکے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود یوار کی آڑ لے کر اسی طرف دیکھنے لگا جہاں سے ممکنہ طور پر نمن اندر داخل ہوتے وقت میری نظروں میں آسکتے تھے۔

سرائے کے باہر شبینہ چوکیدار موجود تھا۔ گاڑی میں مجھے چندر ناتھ اور سے جی کوہارا سمیت پانچ چھ کے قریب نمن نظر آئے تھے۔ باقی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوچکے تھے اور کئی تتر بتر ہوگئے تھے۔

بھاری قدموں کے دھمک کی آواز اُبھری اور اگلے ی لمحے میں نے ان پانچوں کو راہداری میں دوڑتے ہوئے آتے دیکھا، یہ سب مسلح تھے۔ چندر ناتھ اور کوہارا کے ہاتھوں میں آٹومیٹک پستول تھا۔ جبکہ شیام اور کوریلا اور ان کا ایک ساتھی ایجنٹ رائفلیں اُٹھائے ہوئے تھے۔ انہیں شاید اس بات کی بھنک پڑ چکی تھی کہ یہاں آنے والا ''نیا جوڑا'' کون سے کمرے میں مقیم تھا اسی لیے انہوں نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا تھا، جہاں تھوڑی دیر پہلے میں اور سوشیلا تھے۔ گینڈے جیسی جسامت کے حامل سے جی کوہارا نے ہی دروازے پر ایک زوردار لات مار کے اسے کھولا تھا۔ (جو ظاہر ہے اندر سے پہلے ہی کھلا ہوا تھا)۔ وہ سب دندناتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ذرا فاصلے سے دیوار کی آڑ لیے ان کی یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔ وہی ہوا، ہمیں وہاں نہ پاکر وہ سب بپھرے ہوئے انداز میں وہاں سے برآمد ہوئے تھے اور پھر تیزی سے ادھر اُدھر پھیل گئے۔ میں نے چندر ناتھ کو جھلائے ہوئے انداز میں یہ کہتے سنا۔

''وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ادھر ہی تھے۔ انہیں ہماری آمد کا علم ہوچکا ہے۔''

ساتھی ایجنٹ اور کوریلا کو چندر ناتھ نے باہر پھاٹک اور احاطے کی طرف ناکا بندی کے لیے بھیج دیا تھا۔ شیام اسی طرف جہاں میں دبکا کھڑا تھا، جبکہ وہ خود اور کوہارا مخالف سمت کی طرف بڑھ گئے۔ مگر وہاں سے ٹلے نہیں تھے۔ وہ ایک ایک کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑا رہے تھے اور کھلتے ہی اندر گھس کر تلاشی لے رہے تھے۔ شیام ہاتھ میں رائفل تھامے اسی طرف آرہا تھا اور اسے شاید اندازہ ہوچکا تھا کہ اُوپر چھت کی طرف جانے والی سیڑھیاں اسی طرف ہوسکتی تھیں۔

وہ جیسے ہی اس طرف پہنچ کر گھوما، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اس کی گردن اپنے ایک بازو کے شکنجے میں جکڑ لی اور دوسرا ہاتھ اس کی گن پر ڈالا۔ مگر شیام نے بھی کم پھرتی کا مظاہرہ نہیں کیا، وہ قابو میں آتے ہی بڑی تیزی کے ساتھ مچلا تھا اور میرے بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش چاہی، اور اسی دوران، چونکہ اس کی ایک اُنگلی گن کے ٹریگر پر تھی، اُسے اس نے جنبش دے ڈالی۔ گولی چلنے کے دھماکے کی گونج اُبھری، ادھر میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا، کڑاکے کی آواز کے ساتھ ہی شیام کا میری گرفت میں تنا ہوا بدن ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا، مگر مرتے مرتے بھی وہ کم بخت میرے لیے مشکل کھڑی کر گیا تھا۔ اس نے گن چلا دی تھی۔ جو اب میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ گولی کی آواز ابھرتے ہی چندر ناتھ اور سے جی کوہارا کا اس طرف متوجہ ہونا عین ممکن تھا، پھر میری جھلک دیکھتے ہی ان دونوں نے بیک وقت مجھ پر برسٹ فائر کیا، میں اس سے پہلے پیچھے ہوگیا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھرنے کے دوران ہی میں سوشیلا کو لیے سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔

سرائے کی چھت پر خنک ہوائیں سبک خرام تھیں، اُوپر چاند پوری طرح روشن تھا۔ تارے بھی ٹمٹمارہے تھے۔

رات کے اس سمے، سرائے میں اچھی خاصی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ یہ بھی ہمارے لیے بہتر ہی ہوا تھا۔ لیکن یہ کچھ اچھا نہیں ہوسکتا تھا، اسی لیے میں نے اپنی سی کوشش جاری رکھتے ہوئے چھت پر آتے ہی، بائیں جانب رخ کیا جہاں سے نیچے احاطے اور پھاٹک کی طرف دیکھا جاسکتا تھا، وہاں منڈیر کے قریب جھکے جھکے انداز میں پہنچ کر میں نے ذرا سر ابھار کر نیچے دیکھا اور اسی وقت ایک ریڈ ڈاٹ کو تھرکتے ہوئے اپنی پیشانی پر جمتے دیکھا، ایک پل کے ہزارویں حصے میں اپنے سر کو میں نے جنبش دے کر جھکایا اور اسی وقت گولیوں کی بھیانک آواز ابھری۔ مجھے اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو میرے سر کے پرخچے اُڑ چکے ہوتے۔ نیچے باہر موجود کوریلا اور اس کے ساتھی ایجنٹ نے اندر فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی سب سے پہلے چھت کی منڈیروں پر عقابی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ یہ ان کی بروقت ذہانت تھی، میری قسمت ہی یاور تھی کہ میں ایک بھیانک موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچا تھا۔ فائر اس کے ساتھی ایجنٹ نے کیا تھا، اتنے قریب سے موت کی جھلک دیکھنے پر میرا فطری جنون بیدار ہوگیا تھا۔ میں نے پل کے پل محتاط انداز سے کے ساتھ اعداد شماری کی اور سوشیلا سے کہا۔

''تم منڈیر سے جھانکنے کی غلطی مت کرنا۔'' اس کے بعد میں نے کوئی شے بھانپ کر اُٹھائی، یہ کسی لکڑی کی بینچ کا

ٹوٹا ہوا لکڑی کا ٹکڑا تھا، وہ میں نے ایک طرف منڈیر پر اُچھالا اور اپنی گن سمیت سر ابھارا۔ نیچے پھاٹک کے پاس مجھے کوریلا اور اس کا ساتھی ایجنٹ سر اُٹھائے منڈیروں کو تاڑتے ہی نظر آئے، پھر میرے نشانے پر کوریلا کا ساتھی ایجنٹ آگیا، اسی نے مجھ پر برسٹ فائر کیا تھا۔ کم بخت نے اپنی گن پر اسنائپر رائفل میں لگنے والی ''ڈاٹ'' لائٹ لگا رکھی تھی۔ میں نے اسی کا نشانہ لیا اور لبلبی دبا دی، جب تک کوریلا یا اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی، وہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا اور اسی وقت کوریلا نے مجھ پر ایک برسٹ داغا، میں بھلا اب اس کے نشانے میں کہاں آنے والا تھا، میں اپنا ''کام'' کر کے پھرتی سے پلٹ چکا تھا۔

نیچے سرائے میں مقیم مسافر اور لوگ بے سروپا انداز میں چیختے چلاتے، ادھر اُدھر دوڑنے بھاگنے میں لگے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر اچھی خاصی افراتفری مچ گئی تھی۔

میں نے سوشیلا سمیت اس بڑی سی پانی کی ٹینکی کی آڑ لے رکھی تھی، یہ سیمنٹ کی بنی ہوئی تھی اور اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس قدر کہ اس کا پلستر جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا اور وہاں سے اب زنگ آلود سریئے جھانکنے لگے تھے۔

یہاں سے مجھے، چندر ناتھ اور کوہارا سیڑھیوں کی اختتامی چوکھٹ سے نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ چندر ناتھ اور کوہارا مجھے چھاپنے کے لیے جنونی بنے ہوئے تھے، ان کی یہ درانہ وار حرکت ان کے لیے جانی نقصان کا پیام لا سکتی تھی، مگر میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ایک دوسرے کو کور کیے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے سوشیلا کے کان میں کچھ کہا اور وہ تیزی سے منڈیر کی دوسری جانب بڑھی، وہاں اس نے اپنے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکالی، میں نے ذرا ابھر کر چندر ناتھ اور کوہارا کا ردِعمل دیکھنا چاہا، کوہارا نے اسی طرف رخ کیا تھا جبکہ چندر ناتھ اپنا پستول سنبھالے اس سمت بڑھنے لگا جدھر میں چھپا کھڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت کوہارا کی گن گرجی، منڈیر کے سنگ ریزے اُڑے تھے، جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوہارا نے اندھا فائر جھونکا ہے۔ مجھے سوشیلا کی فکر ہوئی، مگر میری نظریں چندر ناتھ پر جمی ہوئی تھیں جو چھت پر بکھرے ہوئے کاٹھ کباڑ اور الا بلا کی آڑ لیے ٹینکی کے اسی گوشے کی طرف بڑھ رہا تھا، جہاں میں دبکا کھڑا تھا۔ میں اسے نشانہ بنانے کی کوشش میں تھا، لیکن مجھے کوہارا کی جانب سے خطرہ تھا، وہ میرے چندر ناتھ پر حملہ کرنے پر چونک سکتا تھا۔ یوں بھی چندر ناتھ ابھی پوری طرح سے میرے نشانے پر نہیں آیا تھا۔

''شہزی......''

معاً سوشیلا چیخی۔ میں پلٹا اور اپنے عقب کی منڈیر پر میری نگاہ پڑی جہاں سے کوریلا چڑھنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور اب میرا نشانہ باندھنے کی کوشش میں تھی کہ سوشیلا کی بروقت اس پر نگاہ پڑ گئی۔ کوریلا نے اپنی گن سے برسٹ داغا اور میں اس سے ایک ثانیے قبل بہ سرعت اپنی جگہ بدل چکا تھا۔ سیمنٹ کی سال خوردہ ٹینکی سے سنگ ریزے اُڑے اور میرے چہرے اور آنکھوں پر پڑے۔ مجھے شدید چبھن کا احساس ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے تکلیف کے باعث سسکاری خارج ہو گئی۔ یہ ایک خطرناک عمل تھا، کوریلا مجھ پر دوسرا برسٹ بھی داغ سکتی تھی، اس لیے میں نے اس تکلیف کی پروا کیے بغیر اپنی جگہ بدلتے ہی، ایک محتاط اندازے سے اس پر برسٹ جھونک مارا، کیونکہ میری آنکھوں میں سنگ ریزے پڑنے کی وجہ سے میں عارضی اور فوری طور پر دیکھنے سے قاصر تھا، جب تک میں اپنی آنکھیں مسلتا، کوریلا مجھے دوبارہ نشانہ بنا سکتی تھی اور ظاہر ہے اس بار اس کا نشانہ خالی نہیں جا سکتا تھا، میرے محتاط انداز کی فائرنگ نے اسے پچھاڑ کر رکھ دیا۔ میری سماعتوں میں اس کی چیخ سنائی دی جو دور ہوتے ہوئے ایسی ہی معلوم ہوئی تھی جیسے وہ گہرے کنوئیں میں جا گری ہو۔ وہ سرائے کی چھت سے نیچے جا پڑی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور تیزی سے ٹینکی کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس کی صفائی وغیرہ کے لیے ایک زنگ آلودہ مختصر سی فولادی سیڑھی کو میں نے استعمال کیا تھا۔ ابھی میں چھت پر پہنچا ہی تھا کہ مجھے سوشیلا کے چیخنے کی آواز سنائی دی، میں چھت پر سینے کے بل لیٹ کر چیخ کی سمت رینگ گیا اور نیچے جھانکا تو دھک سے رہ گیا۔

سے جی کوہارا نے سوشیلا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

پلان

سلیم انور

کوشش اور ہمت سے بڑے سے بڑے معرکے سر ہو جاتے ہیں... مگر بعض صورتِ حال میں جدوجہد کے ساتھ خوش قسمت ہونا بھی ضروری قرار پاتا ہے... ایک کامیاب منصوبہ ساز کی بہترین کارکردگی کی دلچسپ روداد... عین وقت پر قسمت نے اپنا دائو آزما ڈالا...

—— حسیناؤں کے جھرمٹ میں رہنے کا خواب دیکھنے والے شائق کا المیہ

میں ایک سستے سے موٹیل کے سستے سے کمرے میں رہ رہا تھا۔ مجھے انشورنس کے چیک کی آمد کا انتظار تھا اور میں وقت گزار رہا تھا۔ بیمے کی رقم حاصل کرنے کے بعد میرا میکسیکو منتقل ہونے کا پروگرام تھا تاکہ اسٹرانگ بیئر اور لاطینی دوشیزاؤں کے شباب سے لطف اندوز ہو سکوں۔

بہرحال یہ میرا پلان تھا۔

میری بیوی اس آگ میں جل کر مر گئی تھی جس نے ہمارا مکان خاکستر کر دیا تھا۔ یہ ایک المناک حادثہ تھا لیکن میرے

اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات زیادہ خوش گوار نہیں تھے تو حقیقت میں، میں غم یا صدمے سے بہت زیادہ نڈھال نہیں تھا۔

ہمارا مکان ایک متمول علاقے میں تھا۔ سرمایہ کاری کے لحاظ سے یہ قدرے مہنگا علاقہ تھا۔ ہمارا یہ محلہ درحقیقت پانچ مکانات پر مشتمل تھا جو نصف دائرے نما ایک پختہ سڑک پر بنے ہوئے تھے اور یہ سڑک ایک بند گلی کے مانند تھی۔ یہاں بے شمار درخت، جھاڑیاں اور وسیع قدرتی نظارہ تھا۔

رہائش کے لحاظ سے یہ ایک آئیڈیل جگہ تھی۔

جس رات ہمارے گھر میں آگ لگی تو اس وقت تمام پڑوسی سٹی کاؤنسل کی ایک میٹنگ میں علاقے میں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ کی تعمیر کے خلاف احتجاج کرنے گئے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ محلے کی خبرگیری کرنے اور عقابی نگاہوں والی بڑھیا برتھا بھی اس شب گھر سے دور کہیں گئی ہوئی تھی۔

میں خود بھی اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں ایک شراب خانے میں تھا۔ میں ویسے بھی انجمنوں، تنظیموں کی رکنیت کا شائق نہیں ہوں۔

اسی رات ہمارے نصف دائرے کے مکانات میں سے سب سے آخری مکان میں چوری بھی ہوئی تھی۔ چونکہ محلے کی خبرگیری کرنے والی عقابی چشم بڑھیا برتھا اپنے گھر میں موجود نہیں تھی اس لیے کوئی چشم دید گواہ بھی نہیں تھا۔ مجموعی طور پر یہ ہمارے محلے کے لیے ایک منحوس اور بری رات تھی۔

بیمے کی رقم خاصی تگڑی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی میں سے ہر ایک کی بیمہ پالیسی دس دس لاکھ ڈالر کی تھی۔ اور حادثاتی موت کی صورت میں (جیسے کہ گھر میں آگ لگنے سے موت واقع ہوجائے) تلافی کی رقم دگنی ہونے کا تحفظ حاصل تھا۔ پھر مکان کا بیمہ الگ تھا۔ رہن کی رقم کی ادائی کے بعد تین لاکھ ڈالر مزید ملنے تھے۔

سو میں اس سستے سے موٹیل کے کمرے میں بیٹھا بیمے کی رقم کے چیک کی آمد کا انتظار کررہا تھا۔ دن میں میرا زیادہ وقت ٹیلی وژن دیکھنے میں گزر جاتا تھا۔ میں نے اس علاقے کا کوئی شراب خانہ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے علاوہ میں سیاہ بالوں والی ان حسیناؤں کے تصور میں کھو جاتا تھا جن کی رفاقت سے میں نے بھرپور لطف اندوز ہونے کا پلان بنایا ہوا تھا۔

☆☆☆

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

میں اس وقت کمرے میں موجود چھوٹی سی میز پر بیٹھا وہ چند فارم پُر کر رہا تھا جو ریاست کے وکیل نے مجھے بھیجے تھے۔ یہ وکیل بھی عجیب شے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس ڈیل سے وہ چند سو ہزار ڈالر اینٹھ لیں گے۔ لیکن وہ میرے پلان سے واقف نہیں تھے۔

دستک خاصی زوردار تھی۔ میں قدرے اُچھل پڑا اور میرا سدرن کمفرٹ کا گلاس الٹتے الٹتے بچ گیا... میں نے اپنا گلاس احتیاط سے میز پر رکھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ ایک دراز قامت ہسپانوی تھا جس کا قد چھ فٹ کے قریب رہا ہوگا۔ اس نے اپنے لمبے بال پیچھے کی طرف کھینچ کر گردن کی پشت پر باندھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک زخم کا نشان تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

”جی؟“ میں نے کہا۔

”میں اپنی رقم لینے کے لیے آیا ہوں۔“

”ایکسکیوز می؟“

”میں تمہاری بیمے کی رقم میں سے اپنا حصہ لینے کے لیے آیا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ ”مجھے اندر آنے نہیں دو گے؟“

اس سے قبل کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ مجھے دھکیلتا ہوا اندر کمرے میں آگیا اور پلٹ کر میرے مقابل کھڑا ہوگیا۔

”بہتر ہوگا کہ تم دروازہ بند کردو۔“ اس نے کہا۔ ”میں ایسی جگہ موجود ہونا پسند نہیں کرتا جہاں گزرنے والے لوگ مجھے دیکھ سکیں۔“

”سنو، تم......“ میں اسے تنبیہ کرنے ہی والا تھا کہ اس نے میری بات تیزی سے کاٹ دی۔

”میں اس شب وہاں موجود تھا۔“ اس نے کہا۔ اب اس کے ہونٹوں پر سے مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی۔

”ہوں؟“

”اس شب جب تمہاری بیوی مری تھی اور تمہارا مکان جل کر خاکستر ہوگیا تھا۔ میں وہاں موجود تھا۔ تمہارے گھر سے تین مکان کے فاصلے پر۔“ اس دراز قامت ہسپانوی نے کہا۔

اس شخص کی بات سمجھنے کے لیے راکٹ سائنس داں ہونا ضروری نہیں تھا۔ پانچ مکانوں پر مشتمل ہمارے اس محلے میں اس شب جو واحد فرد موجود تھا، وہ وہ چور تھا جس نے رابنسن کے گھر میں چوری کی تھی اور رابنسن کا گھر ہمارے گھر سے تین مکان کے فاصلے پر تھا۔

میں نے دروازہ بند کردیا۔

”بہتر!“ اس نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ دوبارہ لوٹ آئی تھی۔

”یہ سب کیا ہے؟ تم کون ہو؟ تمہیں یہ خیال کیوں کر آیا کہ میں......“ میرے ذہن میں ایسے درجنوں سوالات تھے جو ایک ساتھ میری زبان سے ادا ہونے کی کوشش کررہے تھے۔

”کیا خیال ہے اگر میں آرام دہ حالت میں آجاؤں؟“ اس نے اپنا لیدر جیکٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں کچھ وقت ایک ساتھ گزارنا پڑے گا۔“

اس نے اپنے جیکٹ کی بائیں ہاتھ کی جیب سے ایک سیلولر فون نکالا اور اپنے بیلٹ سے کلپ کرلیا۔ ”اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”بالکل ضرورت پیش آسکتی ہے اگر کوئی نشے باز کوئی منشیات خریدنا چاہتا ہو؟“ میں نے کہا۔

اس تبصرے پر اس نے تیز نظروں سے مجھے گھورا اور بولا۔ ”تمہارے ساتھ کوئی پرابلم ہے؟“

”مجھے بس سیل فونز سے نفرت ہے۔“

یہ سُن کر اس نے شانے اچکا دیے اور اپنے جیکٹ کی داہنی جیب میں سے ایک چھوٹی نال کا ریوالور نکال کر چند لمحوں تک اس کا جائزہ لیتا رہا، پھر اسے اپنی کمر میں اڑس لیا۔ اس کا داہنا ہاتھ ریوالور کے ابھرے ہوئے دستے پر جما رہا۔ اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنا جیکٹ کاؤچ پر اچھال دیا۔

آتشی اسلحے کے بارے میں، میں کوئی ماہر نہیں ہوں لیکن مجھے شبہ تھا کہ یہ چھوٹی سی شے میرے بیش قیمتی جسم میں ایک خاصا بڑا سوراخ کھول سکتی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ بہتر یہی ہوگا میں اس دراز قامت ہسپانوی کی بات دھیان سے سنوں۔

”بات سیدھی ہے۔“ اس ہسپانوی نے کہنا شروع کیا۔ ”میں اس رات وہاں موجود تھا۔ نیم دائرے والی سڑک کے آخری مکان میں۔ کیا تمہیں کبھی اس مکان میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟ ویل یقیناً ہوا ہوگا کیونکہ تم اس کے پڑوسی ہو۔ بہرحال، وہاں ڈائننگ روم میں ایک بوفے ہے، بے ونڈو کے عین مقابل۔ میں وہاں بوفے کی اشیا کو ٹٹول رہا تھا کہ شاید میرے مطلب کی کوئی شے ہاتھ آجائے۔

”تب میں نے تمہیں سڑک کی جانب سے آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے تم چپکے چپکے چوری چھپے ادھر آرہے ہو۔ میں تمہیں اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک تم اس مکان میں داخل نہیں ہوگئے۔ پھر تمہیں اس مکان سے واپس باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھا۔ پھر اسی طرح تم چپکے چپکے چوری چھپے واپس سڑک کی طرف چلے گئے۔ پھر اس مکان سے جس میں تم داخل ہوکر نکلے تھے، دھواں نکلنے لگا۔ پھر اس کی کھڑکیوں سے شعلے بلند ہونے لگے اور مکان میں آگ لگ گئی۔

”بتاؤ، تم نے اس عورت کو کس طرح بیڈ تک محدود کیے رکھا تھا؟ خبرنامے میں انہوں نے بتایا تھا کہ بے احتیاطی سے جلتی ہوئی سگریٹ اس مکان میں آگ لگنے کا سبب بنی تھی۔ یہ ایک ہولناک ٹریجڈی تھی۔ تو کیا تم نے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے اس عورت کو اضافی خواب آور گولیوں کی خوراک دے دی تھی جس سے وہ سوتی رہی اور آگ نے اسے بھسم کردیا۔ ایسی ہی بات تھی نا؟

”بہرحال اب ہم سیدھی اور کھری کام کی بات کرتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ مسکرانے لگا۔

”تم مجھے خبطی لگتے ہو اور یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری بیوی ایک آرٹسٹ، ایک پینٹر تھی اور بہت عمدہ فنکارہ تھی۔ لگتا ہے کہ اس کے اسٹوڈیو میں موجود رنگ کے کسی تھنر یا کسی اور شے نے آگ پکڑلی تھی۔ یہ سب کچھ اخبارات میں آچکا ہے۔“

”مضحکہ خیز صفحات تمام اخبارات شائع کرتے ہیں۔“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

سو وہ میری کہانی کے جھانسے میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی وقت ہے میں اپنا پینترا بدل لوں۔

میں نے شانے اچکا دیے اور بولا۔ ”تو کیا ہوا۔ تم نے ایک کہانی گھڑی ہے اور میرا سراغ لگاتے ہوئے مجھ تک آن پہنچے ہو۔ تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو، یہی بات ہے نا؟“

”تم اتفاقات پر یقین رکھتے ہو، دوست؟“

”ہوں۔“

”میں تمہاری تلاش میں بالکل بھی نہیں تھا لیکن تم تو جانتے ہو کہ تم شراب خانوں میں جانے کے بے حد شوقین ہو۔ مجھے بھی شراب خانوں میں جانے کا بے حد شوق ہے۔ اب تم جمع تفریق کرلو، یہ حساب کا سیدھا اور آسان سوال

ہے۔''

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔

''تمہارے پاس کسی بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''مجھے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس ہسپانوی نے جواب دیا۔ ''جو کچھ مجھے چاہیے، وہ اگر تم مجھے نہیں دو گے تو مجھے جو کچھ بھی معلوم ہے وہ میں پولیس کو بتا دوں گا۔ یہی میرا ثبوت ہے۔''

''وہ تمہاری بات کا یقین کرلیں گے...... ایک نقب زن کا...... ایک منشیات فروش کا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟ اس کے علاوہ تمہیں رابنسن کے مکان میں اس رات چوری کرنے کے جرم میں جیل بھیج دیں گے کیونکہ تم خود اعتراف کرو گے کہ تم وہاں موجود تھے جو تم نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔'' میں نے اسے احساس دلاتے ہوئے کہا۔

اس نے مجھے ان نگاہوں سے دیکھا جیسے کہ میں کوئی چھوٹا بچہ ہوں۔ ''تمہارے خیال میں کیا پولیس مجھے سزا سے مستثنیٰ قرار نہیں دے گی؟ ایک بڑے قاتل کے عوض ایک چھوٹی سی چوری کی واردات کے تبادلے کے طور پر؟ میں پولیس کو اچھی طرح جانتا ہوں، دوست۔ ہوسکتا ہے کہ بیمہ کمپنی مجھے کسی انعام سے بھی نواز دے...... اس تمام رقم کی بچت کے عوض جو تم دھوکے سے ان سے بٹورنے کی کوشش کررہے ہو۔ ہوش میں آجاؤ، دوست۔ حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔''

اس نے حقیقت میں مجھے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ لیکن میں اسے اس بات کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا، پھر سانس باہر نکالا اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا اپنے ہاتھ کو پیچھے اپنی گردن تک لے گیا۔

وہ سمجھ گیا کہ میں وقت گزاری کررہا ہوں۔ میری اس حرکت پر وہ صرف مسکراتا رہا۔

''فرض کیے لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کہ تم درست ہو۔ ایک لمحے کے لیے یہ تصور کرلیتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تھا۔''

''اس میں فرض کرنا کوئی ضروری نہیں ہے، میرے دوست۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جیسا کہ میں کہہ رہا تھا ہم تصور کرلیتے ہیں صرف گفتگو کی خاطر کہ میں نے ایسا کیا تھا جیسا کہ تمہارے خیال میں، میں نے کیا ہے۔ صرف تصور کی حد تک، اوکے؟'' میں نے کہا۔

''تم اپنے طور پر کھیل جاری رکھو، دوست۔''

''اوکے۔ ہم تصور کررہے ہیں۔ مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے، کوئی چڑچڑا خفیہ پولیس ایجنٹ جو مجھ سے ایک قتل کا اعتراف کرانے کی کوشش کررہا ہو؟'' میں نے اپنے خدشات کو زبان دیتے ہوئے کہا۔

''میں؟ اور پولیس مین؟ ہاہا!''

''ہاں...... میں کیوں کر یقین کرلوں کہ تم پولیس والے نہیں ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''تمہیں میری زبان پر اعتبار کرنا ہوگا، مین۔ میری زبان پر! میں کوئی پولیس والا نہیں ہوں۔''

''تمہاری زبان پر؟ بس یہی کچھ؟ بلا کسی ثبوت کے؟'' میں بدستور اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''دیکھو دوست ہمارے کام کی لائن میں ایک شخص کا سب کچھ اس کی زبان ہوتی ہے۔ تم تو جانتے ہوگے؟ اگر تم کسی کی زبان پر اعتبار نہیں کرسکتے تو پھر تم زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ تمہارا وجود دیرپا نہیں ہوسکتا۔ تمہارے الفاظ جیسے کہ مقدس ہوتے ہیں۔ سمجھ گئے؟ میری زبان پر سوال مت اٹھاؤ، دوست۔''

وہ قدرے جھنجلایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ میرے حق میں اچھا تھا یا بُرا۔ اگر وہ قدرے غصے سے بھرا ہوا تھا تو پھر اس سے ڈیل کرنا قدرے آسان ہوتا؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔

''اوکے، اوکے۔ مان لیا کہ تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ سو ہم ایک بار پھر تصور کیے لیتے ہیں کہ میں تمہیں کیا دوں؟ دس ہزار؟''

اس نے اپنا منہ ایک طرف پھیر لیا اور یوں مسکرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''تم مجھ سے مذاق کررہے ہو؟''

''پچاس ہزار...... اس سے زیادہ میرے پاس نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم کل دوبارہ لوٹ کر نہیں آؤ گے اور ایک لاکھ ڈالرز کا مطالبہ نہیں کرو گے؟'' میں نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''میری زبان۔'' اس نے جواب دیا۔ ساتھ ہی ان نظروں سے مجھے دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا اب بھی میں اس کی بات پر اعتبار کرنے میں جھجک محسوس کررہا ہوں؟

میں نے ایک گہرا سانس لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ یہ یقینی طور پر میرے پلان کا حصہ نہیں تھا۔ مجھے کچھ پینے کی طلب ہونے لگی۔

پینے کے تصور سے میرے ذہن میں اچانک ایک اچھوتا خیال عود کر آیا۔

''آل رائٹ...... ہوں، ویسے تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس دراز قامت ہسپانوی سے پوچھا۔

''مائیکل۔ دوست مجھے مکی کہہ کر پکارتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ ہم بھی آج سے دوست ہوجائیں گے۔ سو تم بھی مجھے مکی کے نام سے پکار سکتے ہو۔''

''رائٹ مکی، اوکے! تم کچھ پینا چاہو گے؟ میرے پاس کچھ سدرن کمفرٹ موجود ہے۔''

''کیوں نہیں دوست۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔'' اس نے قدرے بے تابی سے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور چھوٹی سی اس میز کی جانب گھوم گیا جس پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

بوتل تین چوتھائی بھری ہوئی تھی۔ میں نے بوتل کے اوپری حصے کو اپنے داہنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور تیزی سے بائیں جانب گھومتے ہوئے بوتل کے نچلے حصے سے مکی کی پیشانی پر ایک زوردار ضرب لگادی۔

وہ اس اچانک افتاد پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کا سر ضرب پڑتے ہی پیچھے کی طرف چلا گیا اور کاؤچ کی پشت سے ٹکرانے کے بعد دوبارہ آگے کی جانب آگیا۔ مکی نے اپنے بیلٹ میں اڑسے ہوئے ریوالور کے دستے کی جانب ہاتھ بڑھانا چاہا۔ اس مرتبہ میں نے الٹے ہاتھ سے بوتل کو واپس پوری قوت سے گھمایا۔ نشانہ اس کی داہنی کنپٹی تھی۔

ایک چٹاخ کے ساتھ اس کا سر بائیں جانب گھوم گیا۔ وہ ایک طویل لمحے تک یونہی ساکت بیٹھا رہا اور پھر دھیرے دھیرے پھسلتے ہوئے نیچے فرش پر گر پڑا۔

میرے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ میں نے بوتل واپس میز پر رکھ دی اور مکی کے مڑے تڑے بدن پر جھک گیا۔ حیرت انگیز طور پر اس کا چہرہ زیادہ خون آلودہ نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر خون کے صرف چند قطرے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اس کی نبض ٹٹولی...... نبض ساکت تھی!

اب مکی مجھے کبھی تنگ نہیں کرسکتا تھا۔

میرا پلان دوبارہ ٹریک پر آگیا تھا۔

اب مجھے بس اس کی لاش سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا لیکن میں نے پہلے کچھ پینے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں لاش کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں اطمینان سے سوچا جاسکتا تھا۔

میں نے تھوڑی سی وہسکی گلاس میں انڈیلی اور کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ میری نگاہیں اپنے سابقہ پارٹنر کی لاش پر جمی ہوئی تھیں۔

وہسکی پینے کے دوران میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مکی کی لاش کو ٹھکانے لگانا زیادہ دشوار نہیں ہوگا۔ بس مجھے رات کی تاریکی کا انتظار کرنا ہوگا۔ میں مکی کی لاش کو اس کی کار میں ڈال کر سڑکوں پر گھومتا رہوں گا اور کوئی ویران تاریک گلی تلاش کروں گا جہاں کار سمیت اسے چھوڑ سکوں۔ پھر پیدل واپس موٹیل آجاؤں گا۔

پھر یہ اندازہ لگانا پولیس کا کام ہوگا کہ مکی کی موت کی وجہ اس کے منشیات کے کاروبار کے کسی سودے میں اختلاف کا نتیجہ ہے یا اس کی لائن کے کسی حلیف سے مڈبھیڑ ہونے پر اسے موت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

بات سیدھی اور آسان تھی۔ میں مطمئن ہوگیا۔

تبھی دزوازے پر ہونے والی دستک نے مجھے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔ اب کیا مصیبت ہے؟

میں نے ایک نگاہ مکی کی لاش پر ڈالی۔ اب کیا، کیا جائے؟ میں نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھا تاکہ میری آواز گھٹ جائے۔ یوں لگے جیسے کہ میں باتھ روم میں ہوں یا کچھ کررہا ہوں۔ ''ایک منٹ پلیز۔'' میں نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

میں مکی کی ڈھیلی ڈھالی لاش کو کروٹیں دلاتا ہوا کاؤچ کے نیچے تک لے گیا۔ وہ بمشکل تمام کاؤچ کے نیچے فٹ ہورہی تھی۔ مجھے اسے کاؤچ کے نیچے دھکیلنے کے لیے خاصا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ تب میں فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں پیروں سے زور لگاتے ہوئے اسے کاؤچ کے نیچے پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔

اب وہ لاش نیچے جھکے بغیر دکھائی نہیں دے سکتی تھی۔ میں تیزی سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے کاؤچ پر پڑا ہوا مکی کا جیکٹ دبوچا اور اسے بھی مکی کی لاش کے پاس کاؤچ کے نیچے گھسیڑ دیا۔

پھر میں نے اپنا رومال نکالا اور خون کے اس چھوٹے سے دھبے کو صاف کردیا جو مکی نے صوفے کے اوپر چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے رومال واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر میں تیزی سے باتھ روم کی جانب لپکا ایک تولیا جھپٹا اور

دروازے کی جانب بڑھ گیا جیسے کہ میں باتھ روم سے نکل کر اپنے ہاتھ پونچھ رہا تھا۔

دروازے پر موجود شخص ایک باوردی پولیس مین تھا۔ دراز قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک۔ اس کی ناک کسی بلب کے مانند تھی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے۔ اس کے ساتھ ایک پارٹنر بھی تھا۔ جو اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھی ایک باوردی پولیس مین تھا۔ وہ پارٹنر پستہ قد تھا۔ دیکھنے میں وہ جابر اور بدمزاج لگ رہا تھا۔

دراز قامت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جبکہ اس کا پارٹنر صرف گھورے جا رہا تھا۔

''گڈ ڈے، سر۔ میں آفیسر ملرونی ہوں۔ اور یہ میرا پارٹنر آفیسر ڈاؤنس ہے۔ ہم یہاں سرکاری کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔''

''جی؟''

''یس سر۔'' وہ خود کو خوش مزاج ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ایک کار جس کی ڈیوکس یوزڈ کارس سے چوری کرنے کی رپورٹ درج ہے وہ یہاں عین باہر ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے، سر؟''

''نہیں، یقیناً نہیں۔ بھلا مجھے کیونکر علم ہوسکتا ہے؟'' میں نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''ویل سر، دالان کے عین مقابل کمرے میں مقیم مسز اوڈویل کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس کار کے ڈرائیور کو اس کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اور ان کا کہنا ہے کہ وہ شخص کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مسز اوڈویل ہر چیز پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟ وہ اجنبیوں کے معاملے میں ہمیشہ چوکس رہتی ہیں۔''

گریٹ! عقابی نگاہ والی ایک اور بڑھیا! اور وہ بھی یہاں ریورسٹی میں!

''ویل، میرے خیال سے مسز اوڈویل غلطی پر ہیں۔ میں یہاں تمام دن موجود رہا ہوں اور تنہا! میں اپنے قانونی کاغذات اور دیگر معاملات پر کام کرتا رہا ہوں۔ کیا مسز اوڈویل بہت زیادہ تو پیتی نہیں ہیں۔ دکھائی تو ایسا دے رہا ہے۔ ہے نا؟''

''مجھے علم نہیں ہے، سر۔ سو آج تم سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آیا؟'' آفیسر ملرونی نے کہا۔

''نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ کمرے میں صرف میں، میری بوتل اور کاغذات کا پلندہ ہے۔''

آفیسر ملرونی نے اپنے بریسٹ پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک تصویر باہر نکالی۔ اس نے وہ تصویر میرے چہرے کے سامنے کردی۔

وہ مکی کی تصویر تھی۔

آفیسر ڈاؤنس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری رکھنے کی کوشش کی۔

''یہ وہ شخص ہے جس کے بارے میں ہم معلومات کر رہے ہیں، سر۔ اس کا نام مکی ہے۔ مائیکل اوریسٹس سانچیز۔ یہ پولیس اسٹیشن پر خاصا معروف ہے۔ مسز اوڈویل اس بارے میں پُریقین ہیں کہ انہوں نے جس شخص کو کار سے نیچے اترتے، یہاں آتے اور اس کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، وہ یہی شخص ہے، سر!'' آفیسر ملرونی نے کہا۔

''میں نے بتایا نا کہ مسز اوڈویل غلط ہیں۔''

''ایسا ممکن ہوسکتا ہے، سر۔ لیکن اپنی رپورٹ کی توضیح کرنے کی خاطر اگر تم بُرا نہ مانو تو کیا ہم اندر آکر ایک نظر جائزہ لے لیں؟''

''کیا تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے، آفیسر؟'' میں نے پوچھا۔

میرے اس سوال پر آفیسر ڈاؤنس کے چہرے کے تاثرات نمایاں طور پر بدل گئے۔ البتہ آفیسر ملرونی صرف شانے اچکا کر رہ گیا۔

''نہیں، سر۔ لیکن میں دوڑ کر عدالت سے تلاشی کا وارنٹ لاسکتا ہوں۔ میرے پاس مسز اوڈویل کی شناخت کا مناسب جواز موجود ہے۔ لیکن میں تمہیں یہ صاف صاف بتا دوں سر کہ اگر مجھے وارنٹ کے حصول کے لیے عدالت جانا پڑا تب بھی میں اپنے پارٹنر کو یہاں پارکنگ لاٹ میں نگرانی کے لیے چھوڑ جاؤں گا تاکہ وہ اس کمرے پر نگاہ رکھے رہے۔ صرف اس صورت میں کہ اگر مکی حقیقت میں یہاں موجود ہوا اور حقیقت میں یہاں سے کھسکنے کی کوشش کرے گا تو پھر......؟ اس لیے ہم سب کے لیے یہ زیادہ سہل ہوگا کہ تم ہم دونوں کو صرف اندر آنے کی اجازت دے دو۔'' اس نے قابلِ فہم بات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

لیکن اس کے پارٹنر آفیسر ڈاؤنس کے ہونٹوں پر وہی بناوٹی ہنسی رقصاں تھی۔

''ویری ویل، آفیسر ملرونی۔ پلیز، اندر آجائیں۔'' میں نے دروازے سے ایک جانب ہٹتے ہوئے کہا۔

جب میں کمرے میں پلٹا تو تب میری نگاہ خون کے اس چھوٹے سے دھبے پر پڑ گئی جو کاؤچ پر موجود تھا۔

لعنت ہو، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ میرا خیال تھا کہ میں سب کچھ صاف کر چکا ہوں۔ میں نے تیزی سے اپنے ہاتھ خشک کرنے کے بعد کیا کرنا ہے۔ تولیا عین اس مقام پر جا گرا جہاں خون کا وہ دھبا پڑا ہوا تھا۔ تولیے نے اس دھبے کو اب مکمل طور پر چھپالیا تھا۔

وہ دونوں پولیس آفیسر اندر آگئے۔

آفیسر ملرونی کمرے کے وسط میں آکر رک گیا۔ البتہ آفیسر ڈاؤنس دروازے کے اندر ایک جانب اس طرح کھڑا ہوگیا کہ وہ کمرے کے اندر دیکھنے کے ساتھ ساتھ دروازے سے باہر بھی نگاہ رکھ سکے۔

آفیسر ملرونی نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کی۔ اس نے سب طرف دیکھ ڈالا۔ حتیٰ کہ جھک کر بیڈ کے نیچے بھی جھانک لیا۔ میں اس دوران یہی دعا مانگتا رہا کہ کہیں وہ کاؤچ کے نیچے نہ جھانک لے۔

لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

''اگر میں باتھ روم کے اندر کا جائزہ لے لوں تو کوئی حرج تو نہیں ہے، سر؟''

''بڑی خوشی سے آفیسر!''

وہ باتھ روم کے دروازے کی جانب چل پڑا۔ چھوٹے سے اس کمرے میں داخل ہونے سے قبل اس نے اپنے ہولسٹر کا فلیپ کھول کر اپنا سروس ریوالور باہر نکال لیا۔ میں نے نوٹ کیا کہ آفیسر ڈاؤنس نے بھی بالکل یہی کیا۔

کچھ دیر بعد آفیسر ملرونی واپس کمرے میں آگیا۔ اس نے اچٹتی نگاہ اپنے پارٹنر پر ڈالی اور شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہاں سب کچھ کلیئر ہے، پارٹنر۔''

ان دونوں نے اپنے ہتھیار واپس رکھ لیے۔

پھر آفیسر ملرونی پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''زحمت کے لیے معافی چاہتے ہیں، سر۔ لگتا ہے کہ مسز اوڈویل واقعی غلطی پر تھیں۔''

''دیٹ از او کے۔ کوئی آزار نہیں پہنچا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں، سر۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ہم ایک دو دن تک اس گاڑی پر نگاہ رکھیں گے۔ اگر کوئی اسے لینے کے لیے نہیں آیا تو پھر ہم اسے ٹو کر کے لے جائیں گے۔''

بیپ، بیپ، بیپ......

میں اچھل پڑا۔ آفیسر ڈاؤنس نے بھی یہی کیا۔ البتہ آفیسر ملرونی مجھے گھورنے لگا۔

ایک طویل لمحے تک ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی حرکت نہیں کی...... بیپ، بیپ......

آفیسر ملرونی بولا۔ ''یہ سیل فون کی آواز لگتی ہے۔''

''اوں، ہاں، یہ اسی کی آواز ہے۔ اس نے تو مجھے چونکا دیا۔'' میں نے کہا۔ اوہ گاڈ، مجھے سیل فون سے شدید نفرت ہے۔

آفیسر ملرونی نے اپنا سر کاؤچ کی جانب جھکایا اور بولا۔ ''کیا تم اپنا سیل فون ہمیشہ کاؤچ کے نیچے رکھتے ہو؟ کیا ایسا ہی ہے؟''

بیپ، بیپ، بیپ......

میں نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

آفیسر ملرونی نے معنی خیز نظروں سے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا اور دونوں نے ایک بار پھر اپنے ہتھیار نکال لیے۔

بیپ، بیپ...... اس مرتبہ گھنٹی آدھی بج کر بند ہو گئی۔

آفیسر ملرونی کاؤچ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ کاؤچ کے نیچے ڈال دیا جیسے کچھ ٹٹول رہا ہو۔

اس نے اپنا ہاتھ کاؤچ کے نیچے سے نکالنے کے بعد میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا، پھر آفیسر ڈاؤنس کو سر کی جنبش سے اشارہ کیا۔

آفیسر ڈاؤنس نے اپنے سروس ریوالور کا رخ میری جانب کردیا۔

پھر آفیسر ملرونی گھٹنوں کے بل فرش پر الٹا لیٹ گیا اور کاؤچ کے نیچے جھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور آفیسر ڈاؤنس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت نکال دیے۔

''گڈ اولڈ مسز اوڈویل!'' اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔

میرا بیمے کی رقم حاصل کرنے اور سیاہ بالوں والی حسیناؤں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کا پلان اب خاک میں مل چکا تھا۔

میرے خیال میں مجھے اب ایک نئے پلان پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

جیل سے فرار ہونے کے پلان پر!

بلاعنوان

بابر نعیم

ایک چالاک چور کی ہوشیاری... اپنی دانست میں اس نے ڈیڑھ ہوشیاری دکھائی تھی... مگر کبھی کبھی ایک معمولی سی غلطی... پھانسی کا پھندا بن جاتی ہے...

ہوس ولالچ میں پڑوسی، پڑوسی کا دشمن بن بیٹھا تھا

میں نے اپنی بڑی سی کار ایک چرچراہٹ کے ساتھ اس چھوٹے سے صاف ستھرے لینڈ اسکیپ مکان کے سامنے لے جا کر روک دی۔ میرا پارٹنر ڈیٹکٹیو ڈینی ڈیٹن ایک اسٹریٹ لائٹ کے نیچے ایک باوردی پولیس مین کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

''فارنسک اور میڈیکل ایگزامنر کا عملہ راستے میں ہے اور بس پہنچنے والا ہے، کونی۔'' ڈینی نے مجھے بتایا۔ ''بظاہر مقتولہ ریگینا کرافٹ شاپنگ سے گھر واپس لوٹی تو وہاں ایک چور پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ریگینا کی اچانک آمد پر بوکھلا کر اس پر حملہ کر دیا۔ ریگینا کی لاش اور بکھرے ہوئے سودا سلف نے داخلی دروازے کو بلاک کیا ہوا ہے۔ میرے ساتھ مکان کے عقبی حصے میں چلو۔ میں وہاں سے تمہیں مکان کے اندر لے جاؤں گا۔''

میں اپنے پارٹنر ڈیٹکٹو ڈینی کے پیچھے چل پڑا۔ ہم عقبی راستے سے مکان میں داخل ہو گئے۔ اندر کا منظر بالکل وہی تھا جیسا کہ ڈینی بیان کر چکا تھا۔ مقتولہ درمیانی عمر کی ایک عورت تھی۔ اس کی لاش داخلی دروازے کے عین اندر پڑی ہوئی تھی۔ سودا سلف کے تھیلے اس کے اطراف میں بکھرے ہوئے تھے۔

''کوئی گواہ؟'' میں نے پوچھا۔

ڈینی نے شانے اچکا دیے۔ ''باہر موجود پٹرول مین کا کہنا ہے کہ مکان کے دونوں اطراف کے لوگوں اور سڑک پار لیڈی ان تمام نے چیخوں کی آواز سنی تھی۔ وہ تفتیش کے سلسلے میں اپنے گھروں میں موجود ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نے اپنی بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر بہتر ہو گا کہ ہم ان سے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیں۔''

سب سے پہلے ریگینا کے پڑوسی وین ملر اور اس کی بیوی مارسیا کا نمبر تھا۔ ان کی عمریں ساٹھ برس سے زیادہ کی تھیں اور وہ دونوں ریگینا کے برابر کے مکان میں رہتے تھے۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے چیخیں سنی تھیں؟'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''یقیناً سنی تھیں۔'' وین ملر نے جواب دیا۔ ''اس وقت اندھیرا پھیلنا شروع ہوا تھا اور میں اپنی آرام کرسی پر نیند کا جھونکا لے رہا تھا۔ مارسیا مکان کے عقب میں کوڑا کرکٹ سمیٹنے گئی ہوئی تھی۔''

''مجھے دو چیخیں سنائی دی تھیں۔'' اس کی بیوی مارسیا نے بتایا۔ ''مجھے چیخیں سن کر ایسا لگا جیسے کہ ہارٹ اٹیک ہونے والا ہو۔ میں دوڑ کر مکان کے اندر آ گئی تو دیکھا کہ وین اپنا کوٹ پہن رہا تھا۔''

''مجھے کامل یقین تھا کہ چیخوں کی آواز ریگینا کے گھر سے آئی ہے۔ میں نے سوچا بہتر ہو گا چل کر چیک کرتے ہیں۔'' وین ملر نے کہا۔

''اور؟'' میں نے پوچھا۔

''اور میں وہاں چلا گیا۔ ریگینا کے گھر کے مقابل رہنے والا نوجوان جارج فیئرلی وہاں باہر موجود تھا۔ اس نے چیخ کر کہا کہ اس نے کسی کو یہاں سے دوڑتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ بھی اسی طرف دوڑ پڑا۔ میں نے ریگینا کے دروازے کی گھنٹی بجائی اور اسے پکارا لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔'' وین ملر یہ کہہ کر رک گیا۔

''پھر کیا ہوا؟'' میرے پارٹنر ڈینی نے پوچھا۔

''میں نے داخلی دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ وہ بس اتنا ہی کھل رہا تھا کہ صرف سر اندر جا سکے۔ ریگینا کی لاش اندر کی جانب سے دروازے کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ دروازہ بلاک ہو کر رہ گیا تھا اور کھل نہیں سکتا تھا۔''

جب ہم ان دونوں میاں بیوی سے سوالات پوچھنے کے بعد پلٹے تو ایک بھاری بھرکم عورت تیزی سے ہماری طرف آئی اور بولی۔ ''کیا تم پولیس کے لوگ ہو؟''

میں مسکرا دیا۔ ''ہاں۔ میں ڈیٹکٹیو کونی ہوں اور یہ میرا پارٹنر ڈیٹکٹیو ڈینی ڈیٹن ہے۔ اور تم......؟''

''میرا نام سینڈرا بشپ ہے۔ میں سڑک پار رہتی ہوں۔'' اس عورت نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''ہمیں کچھ بتانا چاہتی ہو؟'' میں نے اسے شہ دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... بہ شرطیکہ وین ملر اور مارسیا نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہو۔''

''کیا؟''

''یہی کہ یقیناً معاملہ ریگینا کی دولت اور جیولری کا لگتا ہے۔'' سینڈرا بشپ نے جواب دیا۔

ڈینی اور میری نظریں بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب اٹھ گئیں۔ ''نہیں، انہوں نے تو اس بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔

''ہوں۔ اوکے، ریگینا کو حال ہی میں ورثے میں نہایت قیمتی سکے اور جیولری ملی تھی۔''

''اس بات سے کون کون واقف تھا؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''وین ملر کی فیملی، جارج فیئرلی اور میرے خیال سے بیشتر پڑوسی۔'' سینڈرا بشپ نے بتایا۔

''کیا تم ہمیں اور کچھ بتا سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

سینڈرا بشپ نے اپنے ہاتھ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''صرف یہ کہ میں نے چند ہولناک چیخیں سنی تھیں جو ریگینا کے گھر کی جانب سے آئی تھیں۔ شاید ریگینا کا دوسرا پڑوسی جارج فیئرلی اس بارے میں کچھ جانتا ہو۔''

جارج فیئرلی کو جب میں نے وین ملر کے اس بیان کے بارے میں بتایا کہ کس طرح چیخوں کی آواز سن کر وہ حقیقت جاننے کے لیے گھر سے باہر نکلا تھا اور اس کا سامنا جارج فیئرلی سے ہوا تھا جس نے کسی کو مخالف سمت بھاگتے ہوئے دیکھا تھا تو جارج فیئرلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی اس نے ہمیں اندر بلا لیا۔

''وین ملر، ریگینا کو چیک کرنے چلا گیا تھا اور میں اس چور کو پکڑنے کی کوشش میں اس کے پیچھے لپک گیا تھا۔''

’’چور کو پکڑنے کی کوشش میں؟‘‘ ڈینی نے قدرے حیرانی سے کہا۔ ’’اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟‘‘

’’ریگینا کی چیخیں سن کر میں بروقت باہر نکل آیا تھا تو میں نے کسی کو اس کے داخلی دروازے سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔‘‘ جارج فیئرلی نے کہا۔

’’وہ کوئی مرد تھا یا عورت تھی؟‘‘

’’میں یہ بتا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ سورج ڈھل چکا تھا۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی تھا۔ حقیقت میں بہت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔‘‘

’’کس سمت بھاگا تھا؟‘‘

’’ملر کے مکان کے عقبی حصے کی جانب۔ اس طرف کوئی نہیں رہتا۔ وہ بھاگنے کے لحاظ سے بہترین راستہ ہے۔‘‘

میں اپنے پارٹنر ڈینی کو ایک طرف لے گیا۔ ’’چلو دیکھتے ہیں کہ فارنسک اور میڈیکل کے لوگوں نے کیا تلاش کیا ہے۔‘‘

’’چور نے ابتری مچادی تھی۔‘‘ ایک فارنسک ڈیٹیکٹو نے ہمیں بتایا۔ ’’تمام درازیں بکھری ہوئی ہیں۔ لیونگ روم کی میزیں الٹی پڑی اور ان کا سامان الٹ پلٹ ہے۔‘‘

’’اور اس کے علاوہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں، عقبی بیڈ روم کی کھڑکی پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔‘‘

’’پرانے سکے اور جیولری؟‘‘ ڈینی نے سوال کیا۔

’’ان میں سے کوئی چیز ہمیں نہیں ملی۔ البتہ باہر ایک بریسلیٹ پڑا ہوا ملا ہے جو دیکھنے میں خاصا قیمتی لگ رہا ہے۔‘‘

’’مکان کے سامنے کے حصے سے ملا ہے؟‘‘

’’نہیں، مکان کے عقب سے۔ بیڈ روم کی کھلی ہوئی کھڑکی کے عین نیچے زمین پر سے۔‘‘

’’تھینکس۔‘‘ میں نے کہا۔

پھر ڈینی اور میں میڈیکل ایگزامنر کی تلاش میں نکل گئے۔

میڈیکل ایگزامنر نے ہمیں بتایا کہ اسے شیشے کا بنا ہوا وزنی بک اینڈ ملا ہے جو کتابوں کی قطار کو سیدھا رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ یہ آلۂ قتل ہوسکتا ہے جو اس نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ لیکن اس پر کسی کی انگلیوں کے نشانات موجود نہیں ہیں۔

’’موت کا سبب سر پر پڑنے والی کاری ضرب ہے۔‘‘ میڈیکل ایگزامنر نے کہا۔ ’’موت فوری طور پر واقع ہوگئی تھی۔‘‘

’’تو وہ بس فرش پر گری اور مرگئی۔‘‘ ڈینی غائب دماغی سے بولا۔ ’’میں تو مزید کچھ اور کی توقع کررہا تھا۔‘‘

پھر ڈینی نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ’’قاتل تو غالباً اب تک بہت دور نکل گیا ہوگا، کونی۔‘‘

’’اس کے برعکس میرے خیال میں وہ قاتل چور بالکل ہماری دسترس میں ہے۔ آؤ، تلاشی کا وارنٹ حاصل کرتے ہیں۔‘‘

’’تلاشی کا وارنٹ؟‘‘ ڈینی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

’’ہاں، اس مجرم کے ہاتھ سے جیولری کا ایک پیس بھاگنے کے دوران نیچے گر گیا ہوگا لیکن اس کی بقیہ کمائی غالباً اس کی رہائش گاہ میں موجود ہوگی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’کس کی رہائش گاہ میں؟ وہ مجرم کون ہے؟‘‘ ڈینی جیسے پھٹ پڑا۔

’’جارج فیئرلی۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘

’’اس نے بتایا ہے کہ اس نے کسی کو ریگینا کے داخلی دروازے سے نکل کر باہر کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اس کے پیچھے لپکا تھا۔ لیکن یہ بات سچ نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ ریگینا کی لاش نے دروازے کو اس حد تک کھلنے سے روکا ہوا تھا کہ کوئی اس راستے سے نکل کر بھاگ نہ پاتا.... اس دروازے میں صرف سر ڈالنے کی حد تک گنجائش تھی۔ کوئی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس دروازے سے دوڑتا ہوا نہیں نکل سکتا تھا۔‘‘

’’ہاں، یہ بات تو درست ہے۔‘‘ ڈینی نے اتفاق کیا۔

میں مسکرا دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ’’اور چونکہ ریگینا کی موت فوری طور پر واقع ہوگئی تھی تو ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ قاتل کے بھاگ نکلنے کے بعد وہ کھسکتی ہوئی دروازے تک پہنچی ہوگی۔ اس کے بجائے مجھے یقین ہے کہ جارج فیئرلی بیڈ روم کی کھڑکی سے فرار ہوا ہوگا اور اس عجلت میں بریسلیٹ اس کے ہاتھوں سے بیڈ روم کی کھڑکی کے باہر گر گیا ہوگا جو فارنسک کے سراغ رساں کو وہاں زمین پر پڑا ہوا ملا ہے۔‘‘

’’اور چوری کا باقی تمام سامان غالباً اس کے مکان میں چھپا ہوا ہوگا۔‘‘ ڈینی نے بے ساختہ کہا۔

بعد میں تحریری اجازت نامے کی رُو سے تلاشی لینے پر مسروقہ سامان جارج فیئرلی کے گھر سے برآمد ہوگیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔

تفتیش پر جارج فیئرلی کی مدافعت جواب دے گئی اور اس نے اقرارِ جرم کرلیا۔

* * *

میراث

منظر امام

کسی بھی انسان کے لیے سب سے قیمتی شے کیا ہے... مختلف لوگ اس کا مختلف جواب دیں گے... منظر امام کے تخلیق کردہ کردار بھی ایسے ہی انوکھی نوعیت کے ہوتے ہیں... جن کے ظاہر شعلے جیسی صفت رکھتے ہیں تو باطن شبنم کی طرح نرم و نازک... ہمارے قرب و جوار میں سانس لیتی کہانی کے خوب صورت موڑ...

ایک بددماغ شخص کا قصہ جو اپنے پیچھے ایک میراث چھوڑ گیا......

بہت مزے کے لوگ تھے۔

اور بہت مزے کی شرارتیں۔ شرارتیں تو آج بھی ہوتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ آج کی شرارتوں میں بدتمیزی اور گستاخی زیادہ ہوا کرتی ہے جبکہ اس زمانے کی شرارتوں میں ذہانت بھی شامل ہوتی تھی۔

یا تو آبادی زیادہ نہیں تھی یا پھر لوگ پُرسکون ہوتے تھے۔ بہرحال وہ افراتفری نہیں تھی جو آج ہماری زندگی کا

حصہ بن گئی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانے میں ہر طرف ایک خواب ناک اور مسرور کن سا اطمینان ہوتا تھا۔

ایسا اطمینان شاید اس وقت ہوتا ہے جب پیسوں کی بھاگ دوڑ نہ لگی ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ اس وقت لوگ امیر نہیں ہوا کرتے تھے یا غربت کا وجود نہیں تھا۔

یہ سب تھا لیکن ہر کوئی اپنے اپنے حلقے میں اطمینان کی زندگی گزار رہا تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی جلن یا حسد وغیرہ نہیں تھی۔ کاش آج کے عہد کے بچے اگر اس دور کی ایک جھلک دیکھ پاتے...

بہرحال تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں بھی شرارتیں ہوا کرتی تھیں لیکن بہت ذہین شرارتیں۔

اسی زمانے کی بات ہے کہ ہمارے محلے کے بازار میں ایک حکیم صاحب نے آکر مطب شروع کردیا۔ وہ خود کو حکیم الامت کہلایا کرتے اور ان کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے بنارس کے مستند حکیموں سے حکمت سیکھی ہے۔

ایک بار میں یوں ہی ان کے پاس چلا گیا تو وہ بہت دلچسپ آدمی ثابت ہوئے۔ میں کئی دفعہ اپنی کہانیوں میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہم اس زمانے میں دل چسپ کرداروں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ یہ کردار ہمارے لیے تفریح کا بہت بڑا ذریعہ بن جاتے تھے۔ تو وہ حکیم صاحب بھی ایک ایسا ہی کردار ثابت ہوئے۔

میں جب ان کے سامنے پہنچا تو انہوں نے پہلا سوال یہ کیا ”میاں تمہارا تعلق... سے تو نہیں ہے۔“ ان کے اس سوال نے مجھے حیران کردیا۔

”فرض کریں جناب۔ اگر میرا تعلق وہیں سے ہو تو پھر...“

”تو پھر میں علاج نہیں کروں گا۔“ انہوں نے بہت اطمینان سے فرمایا۔

”وہ مارا۔“ میں دل ہی دل میں اچھل پڑا۔ ایک اور دلچسپ کردار سے مڈبھیڑ ہوگئی تھی۔ ”یہ کیا بات ہوئی جناب۔“ میں نے کہا۔ ”مریض تو مریض ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق کہیں سے بھی ہو۔“

”برخوردار اتنا فلسفہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ بس میں بعض لوگوں کا علاج نہیں کرتا۔“

اب حکیم صاحب سے لطف لینے اور ان کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کردوں۔ میں نے بھی فوراً پینترا بدلا۔ ”جناب۔ آپ بالکل ٹھیک کرتے ہیں۔ مجھے بھی ایسے لوگ پسند نہیں ہیں۔ میں بہت دور رہتا ہوں ان سے۔“

”واہ میاں، تم تو میرے ہمنوا نکلے۔“ حکیم صاحب نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم جیسے نوجوانوں سے مل کر واقعی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کس سلسلے میں میرے پاس آئے ہو لیکن ایک بات میں ابھی سے کہے دیتا ہوں۔“

”جی فرمائیں۔“

”میاں، تم جو بھی علاج کرواؤ گے، میں تم سے پیسے نہیں لوں گا۔“

”وہ کیوں؟“

”ارے بھئی، تم میرے ہم خیال جو ہو۔“ حکیم صاحب نے کہا۔ ”ایسے ہم خیال لوگ ملتے کہاں ہیں؟“

اس کے بعد تو ایک نئی تفریح ہاتھ آگئی تھی۔ مجھے جب بھی فرصت ملتی میں حکیم صاحب کے پاس جاکر بیٹھ جاتا۔ عام طور پر وہ بے چارے فارغ ہی ہوتے تھے۔

میں جاتے ہی اس مخصوص علاقے کے لوگوں کی برائی شروع کردیتا۔ کبھی کبھی کوئی من گھڑت واقعہ بھی سنادیتا کہ دیکھیں جناب۔ اس آدمی نے میرے ساتھ کیا بدتمیزی کی ہے اور کیوں نہ ہو۔ اس کا تعلق تو وہاں سے ہے نا اور اتنا سنتے ہی حکیم صاحب شروع ہوجاتے۔ میرے لیے چائے منگوائی جاتی۔ میں نے اس زمانے میں تمباکونوشی شروع کی تھی۔ حکیم صاحب سگریٹ تک منگوادیتے۔

ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا۔ ”قبلہ، آج مجھے یہ بتادیں کہ آخر اس علاقے کے لوگوں سے آپ کو شکایت کیا ہے؟“

اس پر انہوں نے ایک دردناک کہانی سنادی اور کہانی صرف اتنی تھی کہ انہوں نے ایک لڑکی سے محبت کی تھی اور اتفاق سے اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہوگئی اور حکیم صاحب یہ سمجھنے لگے کہ اس نے انہیں دھوکا دیا ہے۔

بس اس بات پر انہیں لڑکی کے ساتھ اس کے شہر حتیٰ کہ علاقے تک سے چڑ ہوتی چلی گئی۔

ایک دن حکیم صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”میاں کل اگر تمہارے پاس فرصت ہو تو میرے ساتھ ایمپریس مارکیٹ تک چلنا۔ کچھ دوائیں خریدنی ہیں۔ اکیلے جانے سے وحشت ہوتی ہے۔“

میں اس زمانے میں فارغ ہی ہوا کرتا تھا اس لیے حکیم صاحب سے وعدہ کرلیا۔ دوسرے دن میں حکیم صاحب کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ ہمارے لیے آمدورفت کا بڑا ذریعہ بسیں ہوا کرتی تھیں۔ بس میں بیٹھے اور ایمپریس مارکیٹ آگئے۔

مجھے چائے کی خواہش ہوئی تو میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ”قبلہ کیوں نا چائے پی لی جائے۔“

”ضرور۔“ حکیم صاحب جلدی سے بولے۔ ”لیکن پہلے یہ معلوم کرلو کہ اس ہوٹل میں اس علاقے کا کوئی شخص تو کام نہیں کرتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں ان کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

”ہاں بھئی۔ یہ میرا اُصول ہے۔ میں صرف اسی ہوٹل میں کھاتا پیتا ہوں۔ جہاں اس جگہ کا کوئی شخص نہ ہو۔ چاہے وہ ہوٹل کا مالک ہو یا ملازم۔ مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ بس اس علاقے سے تعلق نہیں ہونا چاہیے۔“

اتفاق دیکھیں کہ اس ہوٹل میں اسی علاقے کے لوگ تھے اور صرف وہی نہیں بلکہ چائے پینے یا کچھ کھانے کے لیے جس ہوٹل بھی گئے، وہاں کوئی نہ کوئی اس علاقے کا آدمی ضرور ملتا رہا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ حکیم صاحب نے کچھ بھی کھانے پینے نہیں دیا اور تقریباً چار پانچ گھنٹوں تک دواؤں کی خریداری کرتے رہے۔ اس سلسلے میں بھی ان کی احتیاط کا وہی عالم تھا۔

میں ان کے پاگل پن کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب ایسا بھی کیا کہ کسی ایک جگہ کی کسی لڑکی نے بے وفائی کی ہو تو اس علاقے کے ہر آدمی سے نفرت ہوجائے۔ ایسا جنون میں نے صرف ان ہی میں دیکھا تھا۔ کمال کے آدمی تھے حکیم صاحب۔

جب ان سے خاصی بے تکلفی ہوگئی تو میں نے ان سے کہا۔ ”قبلہ، آپ کہاں تک اس علاقے کے لوگوں سے پرہیز کرتے رہیں گے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ آپ جو کچھ کھاتے ہیں۔ یعنی سبزیاں دالیں اور اناج وغیرہ۔ یہ سب اسی علاقے سے آتا ہے۔ آپ کو ایسا ہی جنون ہے تو آپ فاقے کرنا شروع کردیں۔“

”میاں۔ یہی تو وہ بات ہے جو تم نہیں جانتے۔“ حکیم صاحب مسکرا کر بولے۔ ”تمہیں اگر اس سلسلے میں میرا تقویٰ دیکھنا ہے تو میرے ساتھ چلنا اتوار کے دن۔“

”کہاں؟“

”تم چلو تو سہی۔ میں تمہیں کچھ خاص دکھانا چاہتا ہوں۔“

میں بھی اس کہانی کو انجام تک پہنچانے پر تل گیا تھا۔ اسی لیے اتوار کی صبح حکیم صاحب کے ساتھ چل پڑا۔ ہم لی مارکیٹ آگئے۔

اس زمانے میں لی مارکیٹ سے اندرونِ شہر کی بسیں چلا کرتی تھیں۔ اب تو ایسی بسیں پورے شہر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حکیم صاحب ایک بس میں سوار ہوگئے۔ یہ بس اندرونِ سندھ جارہی تھی۔ میں بھی خاموشی سے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دادو پہنچ کر ہم بس سے اُتر گئے۔ یہاں آڑھتی موجود تھے۔ اناج کا لین دین کرنے والے۔ ان ہی میں سے ایک حکیم صاحب کا خاص آدمی تھا۔ پربھورام نام تھا اس کا۔

اس نے بڑے تپاک سے حکیم صاحب کا استقبال کیا۔ حکیم صاحب اس کے اور اس کے گھر کی کسی عورت کے لیے کچھ دوائیں بھی لے کر آئے تھے۔

اور اس دن پتا چلا کہ حکیم صاحب اپنا اناج اور سبزیاں وغیرہ سندھ کے اسی آڑھتی سے لیا کرتے تھے۔ باقاعدہ پندرہ دنوں کے بعد یا تو خود حکیم صاحب اس طرف آجاتے یا وہ آڑھتی کھانے پینے کی چیزیں حکیم صاحب کو پہنچادیا کرتا اور اس میں بھی یہ احتیاط رکھی گئی تھی کہ حکیم صاحب جو کچھ کھارہے ہیں، اس میں اس علاقے کے لوگوں کی شمولیت نہ ہو۔

اس پاگل پن کا کوئی علاج نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسا جنونی آدمی نہیں دیکھا تھا۔

ہم دوست اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے۔ ہمیں حکیم صاحب کے اس انتہائی پاگل پن پر حیرت ہوتی تھی۔ کمال کے آدمی تھے موصوف۔

ایک بار میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ ”جناب۔ بات چاہے کچھ ہی ہو، اس علاقے کے لوگوں نے اردو زبان کی بہت خدمت کی ہے۔“

”ارے رہنے دیں۔“ حکیم صاحب نے بُرا سا منہ بنالیا۔ ”میں تو اسی لیے وہ شاعری نہیں پڑھتا جو اس علاقے کے کسی فرد نے کی ہو۔“

”حکیم صاحب، یہ تو زیادتی ہے آپ کی۔“

”نہیں میاں، بس اپنے اپنے اصول کی بات ہے۔“

ایک بار میرے کچھ دوستوں نے شرارت کے طور پر ایک عورت کو پکڑ لیا۔ وہ بہت تیز عورت تھی۔ اس کی ساکھ بہت خراب تھی۔ وہ کچھ پیسوں کے عوض کچھ بھی کر گزرنے کو

تیار ہوجاتی تھی۔ ہم لوگوں نے اسے حکیم صاحب سے بھڑا دینے کا پروگرام بنایا اور لطف کی بات یہ تھی کہ اس کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ جو حکیم صاحب کی چڑ تھا۔ اس عورت سے گفتگو کی ذمّے داری میری تھی۔ میں نے جب اسے حکیم صاحب کے اس پاگل پن کے بارے میں بتایا تو وہ اچھل پڑی۔ ‘‘ارے اس کی تو ایسی کی تیسی۔ میں دو منٹ میں اسے سیدھا کردوں گی۔’’

‘‘لیکن بہت ہوشیاری کے ساتھ۔’’ میں نے کہا۔

‘‘تم اس کی فکر ہی نہ کرو۔ میں اسے اپنے جال میں ایسے پھانسوں گی کہ وہ ساری اکڑ بھول جائے گا۔’’

‘‘اب یہ بتاؤ کہ اس کام کا معاوضہ کتنا ہوگا؟’’

‘‘ارے لعنت بھیجو معاوضے پر۔ میں تو ثواب سمجھ کر یہ کام کروں گی۔’’

‘‘اب میرا کام یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں ماحول تیار کروں اور ماحول کی تیاری کے لیے میں نے ایک دن حکیم صاحب سے کہا۔ ‘‘قبلہ، مجھے آپ کی ایک بات پسند نہیں آئی۔’’

‘‘ہاں ہاں کہو۔’’

‘‘اپ محبوبہ کے جانے کے بعد اس نعمت سے محروم رہ گئے ہیں حالانکہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔’’

‘‘میاں، تمہارے کہنے کا مطلب کیا ہے؟’’

‘‘میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی آپ کی عمر بھی ایسی نہیں ہے۔ آپ کم از کم ایک شادی تو ضرور کرسکتے ہیں۔’’

حکیم صاحب دل ہی دل میں یقیناً خوش ہوگئے ہوں گے کیونکہ میں نے تحریک ہی ایسی دی تھی۔ وہ اس وقت تو کچھ نہیں بولے لیکن دو چار دنوں کے بعد انہوں نے خود ہی یہ ذکر چھیڑ دیا تھا۔ ‘‘میاں، تم اس دن جو کہہ رہے تھے۔ میں نے اس پر غور کیا ہے۔’’

‘‘غور کیا کرنا ہے جناب۔ بس کسی کو دیکھنا شروع کردیں۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘اور یہ کام آپ کے بس کا نہیں ہے تو مجھے حکم دیں۔ میں کہیں نہ کہیں سے کوئی مناسب رشتہ ڈھونڈ ہی لاؤں گا۔’’

‘‘بھئی۔ تم خود ہی کوئی مناسب رشتہ دیکھ لینا۔’’ حکیم صاحب نے اشارہ دے دیا۔ ‘‘بس عمر زیادہ نہ ہو۔’’

واہ حکیم صاحب۔ میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ اب آئے ہو جال میں۔

گرین سگنل مل گیا تھا۔ ہم دوست پھر اسی عورت کے پاس پہنچ گئے۔ ‘‘بس اب تم مریضہ بن کر حکیم صاحب کے پاس جانا شروع کردو۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘تمہارا لب و لہجہ بالکل صاف ہے۔ تم آسانی سے انہیں چکر دے سکتی ہو۔’’

‘‘کیا وہ یہ پوچھیں گے؟’’

‘‘ان کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے۔’’ میں نے بتا دیا۔ ‘‘اگر تم نے یہ بتا دیا کہ تمہارا تعلق فلاں جگہ سے ہے تو وہ تمہارا علاج نہیں کریں گے۔ بھگا دیں گے تمہیں۔’’

‘‘عجیب خبطی آدمی ہے۔’’

بہرحال وہ عورت (شاہینہ) منصوبے کے مطابق حکیم صاحب کے پاس پہنچ گئی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے پہلی ہی ملاقات میں بے چارے حکیم صاحب کو چت کردیا تھا۔

اس کا اندازہ حکیم صاحب سے ملاقات کے بعد ہوا۔

‘‘بھئی، آج ایک بہت عجیب مریضہ میرے پاس آئی تھیں۔’’ انہوں نے بتایا۔

‘‘کیوں قبلہ، اس میں ایسی کون سی بات تھی جو آپ کو عجیب محسوس ہوئی؟’’

‘‘بھئی۔ وہ تو۔ اب کیا بتاؤں۔ اس نے تو پہلی ملاقات میں مجھے مجبور کردیا کہ میں اس میں دلچسپی لینے لگوں۔’’

‘‘یہ کیسے ہوا حکیم صاحب؟’’

‘‘وہ انتہائی مہذب خاتون ہیں۔’’ حکیم صاحب نے بتایا۔ ‘‘شادی کو صرف دو برس ہوئے تھے کہ شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد وہ بے چاری ایک صاف ستھری زندگی گزار رہی ہیں۔’’

میں مسکرا کر رہ گیا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مہذب خاتون کیسی صاف ستھری زندگی گزار رہی ہے۔

شاہینہ ہفتے میں ایک بار حکیم صاحب کے پاس علاج کے بہانے آجایا کرتی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے حکیم صاحب کو پوری طرح اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔

شاہینہ سے جب ملاقات ہوئی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ‘‘ابھی تو میں نے ابتدا کی ہے۔ تم لوگ دیکھتے رہنا۔ میں اس بوڑھے کو کس طرح اپنا دیوانہ بناتی ہوں۔’’

‘‘دیوانے تو وہ بن گئے ہیں۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘بس ان پر ہاتھ ذرا ہلکا رکھنا۔’’

اور کچھ دن گزر گئے۔ حکیم صاحب سے جب ملاقات ہوئی تو وہ اسی کی باتیں کرتے۔ شاہینہ کا جادو ان کے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

ایک بار انہوں نے کہا۔ ‘‘میاں، تمہیں یاد ہے ایک بار کیا مشورہ دیا تھا؟’’

‘‘بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا تھا کسی کو اپنا ہم سفر بنالیں۔ زندگی سکون سے گزر جائے گی۔’’

‘‘تو بس میاں، میں ان ہی خاتون کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔’’

‘‘اور خود ان خاتون کا کیا خیال ہے؟’’

‘‘بھئی انسان کا رویہ اس کے دل کا حال بتا دیتا ہے۔ ان کا رویہ یہ بتاتا ہے کہ انہوں نے بھی مجھے قبول کرلیا ہے۔’’

ہم لوگوں کا پلان یہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد جب حکیم صاحب پوری طرح اس کی محبت میں گرفتار ہوجائیں گے تو پھر ان پر یہ انکشاف کردیا جائے گا کہ محترم شاہینہ اسی جگہ سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں کے لوگوں سے آپ نفرت کرتے ہیں۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی۔

حکیم صاحب پر دل کا دورہ پڑا اور راتوں رات انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اس زمانے میں آج کی طرح نہ اتنے اسپتال تھے اور نہ جدید سہولیات تھیں۔ حکیم صاحب کو جناح میں داخل کردیا گیا تھا۔

اب یہاں سے اس کہانی کا ایک نیا رخ سامنے آتا ہے۔

شاہینہ کو جب حکیم صاحب کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بے چین ہوگئی اور ہمارے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔ ہم اس عورت کو بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جو معاشرے میں بہت بری کہلاتی تھی اور وہی بری عورت حکیم صاحب کی خدمت میں لگی ہوئی تھی۔

اس نے گویا حکیم صاحب کے سارے معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیے تھے۔ وقت پر دوا... کھانے پینے کا خیال، اگر کوئی قیمتی دوا بازار سے لانی ہوتی تو وہ خود جاکر لے آتی۔

حکیم صاحب اس کے انتہائی ممنون تھے۔ خود میرے سامنے کئی بار حکیم صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن اس نے ہنس کر ٹال دیا۔ ‘‘ارے حکیم جی، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔’’

ہمیں امید تھی کہ شاہینہ کی توجہ اور محبت سے حکیم صاحب کی صحت بحال ہوجائے گی۔ اصل چیز ہوتی ہے، سکونِ قلب اور وہ انہیں مل رہا تھا۔

لیکن ایک رات اچانک ان کی حالت بگڑ گئی۔ یہ اتفاق تھا کہ اس رات میں بھی اسپتال میں موجود تھا۔ اس لیے مجھے فوراً پتا چل گیا۔ شاہینہ اس وقت بھی ان کے ہمراہ تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں حکیم صاحب کے بستر کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ اس وقت حکیم صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ‘‘میاں، اب میرے رخصت ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میں اب زندہ نہیں رہوں گا۔’’

‘‘ارے نہیں حکیم صاحب، ایسا نہیں کہتے۔ آپ ٹھیک ہوجائیں گے۔’’

‘‘جانے دو میاں۔’’ حکیم صاحب زیرِلب مسکرائے۔ جیسے چراغ بجھتے بجھتے بھڑکنے لگتا ہے۔ ‘‘بس دل کا ایک بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں اس کے بعد سکون مل جائے گا۔’’

‘‘جی فرمائیں حکیم صاحب، میں سن رہا ہوں۔’’

‘‘میاں، اب احساس ہوا ہے کہ محبت شاید سب سے طاقت ور جذبہ ہے۔’’ حکیم صاحب نے کہا۔ ‘‘میں جس جگہ کے لوگوں سے نفرت کرتا تھا، وہاں کی ایک عورت نے میرا ساتھ دیا ہے۔ میں شاید اس کا یہ احسان قیامت میں بھی ادا نہ کرسکوں۔’’

‘‘حکیم صاحب کیا آپ کو یہ بات معلوم ہے؟’’ میں نے حیرت سے پوچھا۔

‘‘ہاں میاں، اس لیے تو دل پر بوجھ ہے۔ اس نے تو دو چار ملاقاتوں ہی میں بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور اسے میرے پاس کیوں بھیجا گیا ہے۔ تم لوگوں نے تو شاید شرارت کی تھی لیکن اس شرارت نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ خدا معاف کرے۔ میں نے لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں کی ہیں۔’’

اور حکیم صاحب مر گئے۔

ایک حیرت انگیز کردار کی ایک حیرت انگیز کہانی ختم ہوگئی۔ لیکن ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ کیا آپ کے ارد گرد حکیم صاحب جیسے اور شاہینہ جیسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ خدارا انہیں احساس دلائیں کہ محبت کسی ایک جگہ... علاقے... طبقے یا زبان کی میراث نہیں ہے بقول شاعر محبت ایسا دریا ہے کہ بارش روٹھ بھی جائے تو پانی کم نہیں ہوتا۔

فتنۂ دلگیر

سلیم فاروقی

روح کے اندر کے خزانے آدمی کے چہرے پر حُسن بن کر جھلکتے ہیں... دلوں میں اس کے لیے محبت اور عقیدت پیدا کر دیتے ہیں... ہر فرد کی روح اس کے چہرے... اس کی آنکھوں اور اس کے جسم کی ہر جنبش سے جھانکتی ہے... نیک اور پاکیزہ روح کا دارومدار افعال و اعمال پر ہوتا ہے... ایک ایسے ہی شخص کی زندگی کی پرت در پرت... جو اپنے عزائم کو مکمل کرنا چاہتا تھا... چاہے اس کے لیے اپنے چہرے... اپنے جسم اور اپنی روح کو کتنا ہی گھائل کیوں نہ کرنا پڑے... وہ صرف خود ہی گھائل نہیں ہو رہا تھا... اپنے سے جڑے رشتوں کو بھی غیر معتبر بنا رہا تھا... وقت کی گردشوں اور واقعات کی کروٹوں کے ہمراہ آگے بڑھتا مال و زر کا ناقابلِ یقین سلسلہ...

خواہشات کے ترازو میں محبت اور دیانت کا کڑا امتحان......

فہد گھر میں داخل ہوا تو مشتاق احمد سامنے ہی تخت پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ جمیلہ بیگم ان کے نزدیک ہی بیٹھی تھیں۔ اس نے مشتاق احمد کو سلام کیا۔ ”السلام علیکم ماموں جان، السلام علیکم امی!“

”وعلیکم السلام، بیٹا جیتے رہو۔“ مشتاق احمد نے جواب دیا۔ ”ماشاء اللہ بہت بڑی عمر ہے تمہاری۔ ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔ تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

”کیسی خوش خبری ماموں جان؟“

”بیٹا! تمہاری ملازمت کے لیے میں نے اپنی کمپنی میں بات کی ہے، امید ہے کہ عثمانی صاحب میری بات ٹالیں گے نہیں۔“

”واقعی ماموں جان۔“ فہد نے بے دلی سے کہا۔ اسے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تھی۔

”ہاں بیٹا۔“ مشتاق صاحب پُرجوش لہجے میں بولے۔ ”عثمانی صاحب بہت خیال کرتے ہیں میرا۔ تم کل میرے دفتر آ جاؤ۔ میں تمہیں عثمانی صاحب سے ملوا دوں گا۔“

”جی ماموں جان۔“ یہ کہہ کر فہد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

مشتاق احمد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر ملازم تھے اور اپنی بیٹی نادیہ کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ دس سال پہلے مشتاق احمد کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی صرف ایک بیٹی نادیہ تھی جو اس وقت سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔

فہد کے والد اسد علی کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ بہن کی بیوگی اور کچھ نادیہ کی وجہ سے وہ جمیلہ بیگم کے ساتھ ہی رہنے لگے تھے۔ وہ مکان کے کرائے کے بہانے بہن کی مدد کرتے رہتے تھے۔

فہد انتہائی ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے دو مہینے قبل ہی ایم بی اے میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ وہ اب اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانا چاہتا تھا۔ تعلیم کا تو صرف بہانہ تھا، وہ امریکا جا کر وہیں سیٹل ہونا چاہتا تھا۔ بچپن ہی سے اسے دولت مند بننے کا جنون تھا۔ وہ کسی بھی طرح راتوں رات دولت مند بننا چاہتا تھا۔

اسے اپنی ماموں زاد نادیہ سے بھی بے انتہا محبت تھی۔ نادیہ بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ ان کی محبت دیکھ کر مشتاق احمد اور جمیلہ بیگم نے تین سال پہلے ان کی منگنی کر دی تھی۔ فہد اور نادیہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔

وہ نہا دھو کر باتھ روم سے نکلا تو نادیہ اس کے کمرے میں موجود تھی۔

وہ اسے دیکھ کر بولی۔ ”تمہیں ابو کی بات اچھی نہیں لگی نا؟“

”کون سی بات؟“ وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

”وہی جاب والی؟“ نادیہ نے اسے غور سے دیکھا۔

”وہ... نہیں تو... مجھے تو بری نہیں لگی میں تو...“

”مجھ سے جھوٹ مت بولو مسٹر پرفیکٹ۔“ نادیہ نے کہا۔ ”میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے واقف ہوں۔“

”ہاں۔“ فہد نے طویل سانس لی۔ ”میں ابھی جاب نہیں کرنا چاہتا۔ میں...“

”جانتی ہوں کہ تم مزید پڑھنا چاہتے ہو، بہت آگے جانا چاہتے ہو۔“

”میں تمہیں بہترین زندگی دینا چاہتا ہوں نادی۔“ فہد نے کہا۔ ”میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنا چاہتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ...“

”اچھا، تم پریشان مت ہو۔ میں ابو کو سمجھا دوں گی۔“

”نہیں۔“ فہد نے انکار کر دیا۔ ”تم ان سے کچھ مت کہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری کسی بات سے انہیں دکھ پہنچے۔ میں خود ہی کچھ کر لوں گا۔“

”فہد۔“ نادیہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تم جتنی دیر لگاؤ گے، ہماری منزل اتنی ہی دور ہوتی جائے گی۔“

”بس تھوڑا سا صبر کرو مائی ڈیئر کزن۔“ فہد نے کہا۔ ”مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو۔“

”مسئلہ میرا نہیں، پھپو کا ہے۔“ نادیہ نے سر جھکا کر کہا۔

”اچھا تو آپ محض امی کی وجہ سے شادی کریں گی؟“ فہد نے ہنس کر کہا۔ ”اچھا بہانہ ہے۔ لڑکیوں کی تو زندگی کا

مقصد ہی شاید دلہن بننا ہوتا ہے۔‘‘

’’جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ نادیہ چڑ کر بولی۔ ’’مجھے ایسا کوئی شوق نہیں ہے۔‘‘ وہ روٹھ کر جانے لگی۔

فہد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ’’تمہیں شوق ہو یا نہ ہو، مجھے تو ہے۔ میں بھی تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنے کو بے تاب ہوں۔ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں نادی... آئی لو یو۔‘‘

نادیہ کی خوب صورت پلکیں شرم سے جھک گئیں۔

ماموں کا دل رکھنے کو فہد دوسرے دن ان کے آفس چلا گیا۔ مشتاق احمد کا دفتر ایک کثیر المنزلہ عمارت کے پانچویں فلور پر تھا۔

مشتاق احمد کا آفس بہت شاندار تھا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بولے۔ ’’عثمانی صاحب تھوڑی دیر پہلے تمہارے ہی بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ اتنے مصروف آدمی ہیں، اس کے باوجود انہیں میری بات یاد تھی۔ تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔‘‘ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد پیون اندر آیا اور اس نے کہا۔ ’’سر! مشتاق صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔‘‘ وہ فہد کو عثمانی صاحب کے کمرے میں لے گیا۔

عثمانی صاحب کا شاندار آفس اور قیمتی فرنیچر دیکھ کر فہد مزید مرعوب ہو گیا۔ عثمانی صاحب بہت باوقار شخصیت کے مالک تھے۔

مشتاق احمد، عثمانی صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے عثمانی صاحب سے کہا۔ ’’سر! یہ ہے میرا بھانجا فہد۔‘‘

فہد نے انہیں سلام کیا تو وہ بولے۔ ’’بیٹھو بیٹا! مشتاق صاحب بتا رہے تھے کہ تم نے ایم بی اے میں فرسٹ پوزیشن لی ہے؟‘‘

’’جی ہاں۔‘‘ فہد نے سر جھکا کر کہا۔

’’آپ فہد کا انٹرویو لے لیں۔‘‘ مشتاق نے کہا۔ ’’میں بعد میں حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’کیسا انٹرویو مشتاق صاحب؟‘‘ عثمانی صاحب مسکرائے، پھر فہد سے بولے۔ ’’بیٹا! تم بہت اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں امریکا اور یورپ میں بھی اپنا آفس کھولنا چاہتا ہوں۔‘‘

یہ سن کر فہد کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اور اس نے پہلی دفعہ دلچسپی سے عثمانی صاحب کو دیکھا۔

’’ہاں میاں، یہ بتاؤ سیلری کیا لو گے؟‘‘ عثمانی صاحب نے اچانک پوچھا۔

’’سر! میں ابھی اتنا تجربے کار نہیں ہوں کہ آپ سے کوئی مطالبہ کر سکوں۔‘‘ فہد نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

’’بھئی مشتاق صاحب! آپ کا بھانجا تو بہت ذہین ہے۔ اس نے کس خوب صورتی سے بال دوبارہ میری طرف پھینک دی۔‘‘ پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولے۔ ’’فی الوقت میں تمہیں ڈیڑھ لاکھ روپے مہینا دے سکتا ہوں، ساتھ ٹیکس ہوم مع گاڑی۔‘‘

فہد کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ اس نے بمشکل کہا۔ ’’ڈیڑھ لاکھ۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ سر۔‘‘ مشتاق احمد نے ممنونیت سے کہا۔

ان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ فہد خود بھی بہت خوش تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ عثمانی صاحب اتنی شاندار تنخواہ دیں گے پھر گاڑی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے مشتاق احمد کی گاڑی پر ڈرائیونگ سیکھ ضرور لی تھی۔

زندگی اچانک ہی خوب صورت ہو گئی تھی۔ جب فہد جدید ماڈل کی چمچماتی ہوئی گاڑی میں بیٹھا تو بہت دیر تک تو اسے یقین نہیں آیا کہ یہ گاڑی اس کی ہے۔

جمیلہ بیگم، فہد کی شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔

نادیہ کو یہ خوشی راس نہ آسکی۔ ایک دن مشتاق احمد سوئے تو پھر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ ان کی حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔

ان کی موت سے فہد کو بھی شدید صدمہ پہنچا تھا اور جمیلہ بیگم کے تو وہ بھائی تھے۔ نادیہ کی وجہ سے وہ اپنا غم بھول گئیں۔

عثمانی صاحب کو بھی مشتاق احمد کی موت کا بہت صدمہ تھا۔

آہستہ آہستہ زندگی پھر اپنی ڈگر پر آ گئی۔ فہد بہت کم وقت میں عثمانی صاحب کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ عثمانی صاحب نے چھ ہی ماہ میں اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیا تھا۔ فہد اب اکثر ان کے گھر بھی جانے لگا تھا۔

وہیں پہلی دفعہ فہد کی ملاقات عثمانی صاحب کے بیٹے طارق سے ہوئی۔ طارق پیدائشی طور پر معذور تھا اور وہیل چیئر پر تھا۔ وہ اپنی اس معذوری سے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ آہستہ آہستہ طارق اس سے بے تکلف ہو گیا۔ اب وہ ہر چھٹی کے دن عثمانی صاحب کے گھر جانے لگا تھا۔

جمیلہ بیگم کو بیٹے کا سہرا دیکھنے کی شدید آرزو تھی لیکن مائی کی موت کے باعث وہ مجبور ہو گئیں لیکن ان کی بدقسمتی ی انتہا تو یہ تھی کہ جب دوبارہ انہوں نے فہد کی شادی کی یاریاں کیں تو خود بھی بھائی کے پیچھے روانہ ہو گئیں۔

جمیلہ بیگم کی موت نے فہد کی دنیا اندھیر کر دی۔ وہ پنی ماں سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس موقع پر اگر نادیہ نہ وتی تو شاید فہد سنبھل نہ پاتا۔ نادیہ نے ہر ہر لمحے فہد کی لجوئی کی، اس میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا کی۔

وقت کے ساتھ ساتھ فہد بھی سنبھل گیا۔

فہد اور نادیہ کے علاوہ نزدیک کا کوئی رشتے دار نہیں تھا اس لیے اس تنہا گھر میں صرف وہ دونوں تھے۔ فہد نے اس تنہائی کا کبھی بھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ نادیہ اس کے ساتھ رہتی نرور تھی لیکن اپنا کمرا اندر سے لاک کر کے سوتی تھی۔

ایک دن فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ’’رات میرے سر میں شدید درد تھا۔ مجھے سر درد کی گولیاں نہیں مل رہی تھیں اور ہارانی اپنا کمرا لاک کیے مزے سے سو رہی تھیں۔‘‘

’’تو مجھے اٹھا دیتے۔‘‘ نادیہ نے ہنس کر کہا۔

’’یار! ایک بات بتاؤ۔‘‘ فہد منہ بنا کر بولا۔ ’’یہ تم اپنا کمرا لاک کیوں کرتی ہو، کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟‘‘

’’مجھے خود پر اعتماد نہیں ہے۔‘‘ نادیہ نے سر جھکا کر کہا۔ ’’تم کیا سمجھتے ہو، صرف تمہارے ہی جذبات ہیں۔ میں بھی تو جذبات کے ہاتھوں بے قابو ہو سکتی ہوں۔‘‘ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ’’تم اب کیا انتظار کر رہے ہو، دوری کی اس دیوار کو گرا کیوں نہیں دیتے؟‘‘

’’ابھی تو میں آفس جا رہا ہوں۔‘‘ فہد ہنس کر بولا۔ ’’واپسی میں اس دیوار کو ڈھانے کی کوشش کروں گا۔‘‘

’’مذاق میں مت ٹالو فہد۔‘‘ نادیہ نے کہا۔

’’میں مذاق نہیں کر رہا ہوں ڈیئر کزن۔‘‘ فہد نے کہا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

پھر فہد ایک کاروباری دورے پر کوریا اور ملائیشیا چلا گیا اس لیے نادیہ سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

وہ لوٹا تو اس نے عثمانی صاحب کو کامیابی کی نوید سنائی۔ عثمانی صاحب بھی خوش ہو گئے اور بولے۔ ’’تم نے میرا مان رکھ لیا فہد! کمپنی کے کئی سینئر افسران کا خیال تھا کہ تمہاری وجہ سے یہ دورہ ناکام ہو جائے گا لیکن اب میں فخریہ انداز میں کہہ سکتا ہوں کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔‘‘

اچانک ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے ریسیور اٹھایا اور بولے۔ ’’یس، ہاں بات کراؤ... وعلیکم السلام... ہاں اکرم... کیا... اچھا، میں ابھی پہنچتا ہوں۔‘‘

انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ شدید پریشانی کے عالم میں تھے۔

’’سر! خیریت تو ہے؟‘‘ فہد نے پوچھا۔ ’’آپ اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟‘‘

’’اکرم کا ٹیلی فون تھا۔‘‘ فہد جانتا تھا کہ اکرم ان کا گھریلو ملازم ہے۔ ’’وہ بتا رہا تھا کہ طارق وہیل چیئر سمیت سیڑھیوں سے گر گیا ہے۔‘‘

’’چلیے، میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔‘‘ فہد نے کہا۔

وہ لوگ گھر پہنچے تو اکرم ڈاکٹر کو بلا چکا تھا اور طارق بیڈ پر لیٹا تھا۔

ڈاکٹر نے عثمانی صاحب کو بتایا کہ مسٹر طارق معمولی زخمی ہوئے ہیں۔ وہ وہیل چیئر ہی کی وجہ سے بچ گئے۔ ان کی وہیل چیئر زینے کی لینڈنگ پر الٹ کر رک گئی تھی۔ ان کے ہاتھوں اور سر میں معمولی چوٹیں آئی ہیں۔‘‘

طارق بیڈ پر لیٹا مسکرا رہا تھا۔ وہ بولا۔ ’’سوری ڈیڈی! میری وجہ سے آپ کو...‘‘

’’اچھا، خاموش رہو۔‘‘ عثمانی صاحب نے اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

طارق کی وجہ سے عثمانی صاحب بہت دل گرفتہ تھے۔ فہد نے اچانک کہا۔ ’’سر! آپ طارق کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟‘‘

عثمانی صاحب نے چونک کر اسے دیکھا، پھر افسردگی سے بولے۔ ’’کون اس معذور کو اپنی بیٹی دے گا؟ میں نے کوشش بھی کی تھی لیکن صاحب زادے بہت حسن پرست ہیں، انہیں خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی چاہیے۔‘‘

فہد اس دن گھر پہنچا تو خاصا الجھا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ نادیہ اس کے لیے کافی لے آئی اور بولی۔ ’’کیا پریشانی ہے مسٹر پرفیکٹ؟‘‘

’’اوں... نہیں کچھ نہیں۔‘‘ فہد چونک کر بولا۔

’’تم جانتے ہو کہ میں تمہارے مزاج کے ہر رنگ، ہر روپ سے واقف ہوں... مجھ سے مت چھپاؤ، بتاؤ کیا پریشانی ہے؟‘‘

’’کوئی پریشانی نہیں ہے۔‘‘ فہد نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’اور کوئی پریشانی ہے بھی تو تم دور نہیں کر سکتیں۔‘‘

’’تم مجھے بتاؤ تو سہی۔‘‘ نادیہ نے پوچھا۔

’’میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔‘‘ فہد نے بات بنائی۔ ’’تم ذرا میرا سر دبا دو۔‘‘

نادیہ اس کا سر دبانے لگی اور بولی۔ ''اب بتاؤ کیا بات ہے؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' فہد نے کہا۔ ''بس آفس کی کچھ پریشانی ہے۔'' نادیہ خاموش ہوگئی۔

نادیہ کے جانے کے بعد بھی فہد بہت دیر تک سوچتا رہا۔ وہ عجیب الجھن میں پڑ گیا تھا۔ اس کا دولت مند بننے کا جنون اب پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کی سوچ بھی مجرمانہ تھی، وہ نادیہ کو یہ سب کیسے بتا سکتا تھا لیکن اسے بتائے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ نادیہ ہی تو اس الجھن کا بنیادی کردار تھی۔

وہ یہی سوچتا سوچتا سو گیا۔

نادیہ بھی جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ بات یہ نہیں ہے، فہد کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ خیر، میں بھی اس سے معلوم کرکے رہوں گی۔

صبح ناشتے کی میز پر فہد اور نادیہ دونوں ہی اپنی اپنی سوچ میں گم تھے۔

نادیہ نے اس کی طرف دیکھا اور چونک کر بولی۔ ''فہد! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے، کیا آفس سے چھٹی کا ارادہ ہے؟''

''ہاں یار! آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ آج میں تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' نادیہ پھر چونکی۔

''مطلب یہ کہ آج چھٹی انجوائے کروں گا، تم سے ڈھیروں باتیں کروں گا۔ تمہیں کچھ یاد ہے، آخری دفعہ ہماری تفصیل سے کب بات ہوئی تھی؟''

''اچھے بچوں کی طرح آفس جاؤ۔ ابھی تفصیل سے بات کرنے کا وقت نہیں آیا۔'' نادیہ نے ہنس کر کہا۔

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔'' فہد نے اچانک بات شروع کردی۔ ''مجھے اور تمہیں دولت مند بننے کا ایک سنہرا موقع ملا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم مشکل سے ایک سال میں ارب پتی بن سکتے ہیں۔''

''تم نے پھر خواب دیکھنا شروع کردیے۔ ہم اب بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں سے بہتر ہیں۔ اللہ نے ہمیں سب کچھ دے دیا ہے۔ اپنا گھر ہے، بہترین گاڑی ہے اور تمہاری بہترین جاب ہے، اب اور کیا چاہیے؟''

''احمق ہو تم۔'' فہد منہ بنا کر بولا۔ ''اگر تم نے میری بات مان لی تو اپنے جیسے لوگ تو میں خود ملازم رکھ لوں گا۔ اس ڈھائی لاکھ روپے کی تنخواہ میں کیا رکھا ہے۔ کہاں ڈھائی لاکھ اور کہاں سو کروڑ یعنی ایک ارب روپے مہینا۔''

''ایسی کون سی لاٹری نکلنے والی ہے؟'' نادیہ بھی کچھ سنجیدہ ہوگئی۔

''لاٹری ہی سمجھو نادی، بس تمہارا تعاون چاہیے، تمہاری رضامندی چاہیے میری پیاری بیوی۔'' پھر وہ جلدی سے بولا۔ ''ہونے والی۔''

''میری پیاری بیوی'' کے الفاظ سن کر نادیہ کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگی تھیں۔ وہ تو نہ جانے کب سے فہد کی پیاری بیوی بننے کی حسرت میں زندہ تھی۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''دیکھو فہد! اس قسم کے راتوں رات امیر بننے کی خواہش انسان سے جائز اور ناجائز کی تمیز چھین لیتی ہے۔''

''پہلے تم وعدہ کرو کہ میرا ساتھ دو گی؟'' فہد نے کہا۔

اب اس بحث کا آخری مرحلہ آنے والا تھا۔

نادیہ چند لمحے تک سوچتی رہی، پھر بولی۔ ''میں تیار ہوں، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے غلط مت سمجھنا نادیہ، اس سے پہلے یہ ذہن میں رکھنا کہ میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔ میں تمہیں اپنی ذات سے بڑھ کر چاہتا ہوں۔''

''میرے بغیر تم تو ادھورے رہو گے، میں پوری مر جاؤں گی۔'' نادیہ نے کہا۔

''نادیہ... میں چاہتا ہوں کہ... تم... تم...''

''آگے بھی بولو۔'' نادیہ ہنس کر بولی۔ ''میں کیا؟''

''چاہتا ہوں کہ... تم شادی کرلو۔''

نادیہ نے طویل سانس لی اور ہنس کر بولی۔ ''یہ بات تو میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ مجھ سے شادی کرلو۔''

''مجھ سے نہیں... تمہیں... طارق سے... شادی کرنا ہوگی۔'' فہد نے گویا دھماکا کردیا۔

نادیہ سکتے کی سی حالت میں اسے دیکھنے لگی، پھر بولی۔ ''کیا؟... کیا کہا تم نے؟'' یہ کہہ کر وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔ ''بس بہت مذاق ہوگیا فہد، اب سنجیدہ ہوجاؤ۔''

''میں سنجیدہ ہوں جان۔'' فہد نے کہا۔ ''اتنا سنجیدہ تو میں زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔''

''ہاں، تو اب کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' نادیہ نے اسے گھورا۔

''تم عثمانی صاحب کے بیٹے طارق سے شادی کرلو۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ میں اس معذور سے کیوں شادی کرلوں؟''

''ہاں، اب تم نے بنیادی سوال کیا ہے۔'' فہد نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

نادیہ نے غور سے اسے دیکھا، پھر بولی۔ ''اگر تم سنجیدہ ہو تو مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم مجھ سے ایسی بات کررہے ہو؟'

''تم پوری بات سنو گی تو تمہیں یقین آجائے گا۔ اگر تم نے طارق سے شادی کرلی تو ہم زیادہ سے زیادہ ایک سال میں ارب پتی ہوجائیں گے۔''

''اور ارب پتی کیسے ہوجائیں گے ذرا یہ بھی بتادو؟''

''اس بات کو یوں سمجھو، شادی کے بعد نہ عثمانی صاحب رہیں، نہ طارق تو پھر اربوں روپے کی وہ دولت اور بزنس کسے ملے گا؟ طارق کی بیوی کو ملے گا نا؟''

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے تمہیں ان دونوں کی موت کا علم ہے۔''

''ہاں، مجھے علم ہے۔'' فہد جھنجلا کر بولا۔ ''میں انہیں زندہ رہنے دوں گا تو وہ رہیں گے نا۔''

''فہد...!'' نادیہ کے لہجے میں شدید حیرت تھی۔ ''تم... تم... نہیں۔''

''تم اس کی فکر مت کرو نادیہ۔'' فہد نے کہا۔ ''میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک سال کے اندر اندر میں عثمانی اور طارق دونوں سے تمہاری جان چھڑوا دوں گا۔''

''کیا تم واقعی یہ چاہتے ہو؟'' نادیہ اب بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔

''ہاں، ہاں میں یہی چاہتا ہوں۔'' فہد جھنجلا گیا۔

''تم تو مجھ سے محبت کے دعوے کرتے رہے ہو بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے بھی کررہے تھے۔'' نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہی ہے تمہاری محبت؟''

''میری محبت تو پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ جائے گی اگر تم میری بات مان لوگی۔''

''اور اگر میں انکار کردوں تو؟'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو پھر میرا جواب بھی سن لو، تمہارے انکار کے بعد ہمارے راستے الگ ہوجائیں گے۔''

''فہد!'' نادیہ چیخ کر بولی۔

''میں اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گا لیکن اس لڑکی کو برداشت نہیں کروں گا جو مجھ سے محبت کا دعویٰ تو کرتی ہے، عمل نہیں کرتی۔''

اس کی بات پر نادیہ بلک بلک کر رونے لگی اور اچانک اٹھ کر فہد کے سینے پر گھونسے مارنے لگی، پھر روتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے بغیر مرجاؤں گی فہد! مجھے اپنے ہاتھوں سے ماردو۔''

''مجھے مارنے کا کام تو تم کررہی ہو۔'' فہد نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' نادیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اترن پہننے کا اتنا ہی شوق ہے تو میں راضی ہوں۔''

فہد نے بے اختیار اسے سینے سے لگالیا اور بولا۔ ''یہ جدائی تو عارضی جدائی ہوگی۔ پھر ہم ملیں گے، کبھی نہ بچھڑنے کے لیے، اس وقت ہماری دنیا ہی الگ ہوگی۔''

''آج کے بعد ایک نئی نادیہ جنم لے گی۔'' نادیہ نے کہا۔ ''دو حصوں میں بٹی ہوئی نادیہ۔''

''ایسا کیوں سوچتی ہو جان، تم میری ہو صرف میری ہی رہوگی۔''

''جاؤ، پھر عثمانی صاحب سے کہہ دو کہ میں ان کے معذور بیٹے سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ اپنے بیڈ پر گر کر وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

☆☆☆

عثمانی صاحب کے چند دوستوں اور دفتری عملے کی موجودگی میں نادیہ اور طارق کی شادی ہوگئی۔ فہد کی ہدایت کے مطابق نادیہ نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ مشتاق احمد کی بیٹی ہے۔ نکاح کے وقت عثمانی صاحب کچھ چونکے تھے۔ پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ اس نام کے تو لاکھوں لوگ ہوں گے۔ ضروری تو نہیں کہ یہ وہی مشتاق احمد ہوں۔ فہد بھی اس نکاح میں شریک تھا۔ اس نے عثمانی صاحب کو یہ بتایا تھا کہ نادیہ اس کے ایک شناسا کی بیٹی ہے۔ ایک سال پہلے اس شناسا کا انتقال ہوچکا ہے۔

نادیہ کو رخصت کرکے فہد واپس گھر آیا تو گھر اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ اسے جمیلہ بیگم کا خیال آیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ وہ غصے میں بپھری ہوئی اسے قہر آلود نگاہوں سے گھور رہی ہیں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

اچانک اس کے کانوں میں مشتاق احمد کی آواز گونجی۔ ''فہد! تو نے میری بیٹی کو بھی بازار کی جنس بنادیا۔ اسے بیچ دیا دولت کی خاطر۔'' فہد گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا اور پیدل ہی بے مقصد گھومتا رہا۔

دوسرے دن آفس میں عثمانی صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ بہت خوش تھے اور فہد کے احسان مند تھے

کہ اس نے اتنی خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی کو ان کی بہو بنایا۔

شام کو طارق نے اصرار کر کے اسے گھر بلا لیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا۔ طارق تو خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا۔ اس کے نزدیک ہی نادیہ بیٹھی تھی۔ اس پر بھی خوب روپ چڑھا تھا۔ فہد، نادیہ سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے نادیہ کو کچن کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ موقع دیکھ کر اس کے پیچھے لپکا اور کچن میں پہنچ گیا۔

آہٹ پا کر نادیہ مڑی اور اسے درشت انداز میں گھورا۔ ''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' اس کا لہجہ بھی سرد تھا۔

''تم یہاں خوش تو ہو مائی ڈیئر کزن؟''

''میں یہاں بہت خوش ہوں۔'' نادیہ نے کہا۔ ''آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''نادیہ! تم مجھ سے کس انداز میں بات کر رہی ہو؟'' فہد نے تلخ لہجے میں کہا۔

''آپ بھی تمیز سے بات کریں۔'' نادیہ نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کے باس کی بہو ہوں، سمجھے۔''

فہد چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''اچھا مذاق ہے۔ میں تمہیں...''

''مسٹر فہد!'' نادیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے کہا ہے کہ تمیز سے بات کریں۔ میں اب مسز طارق عثمانی ہوں۔ آپ میرے ملازم ہیں اس لیے ملازموں کی طرح رہیں۔''

''میں تو شروع سے تمہارا غلام ہوں نادی۔'' فہد نے جذباتی ہو کر کہا۔

''مر گئی وہ نادیہ۔'' نادیہ چیخ کر بولی۔ ''آپ نے خود ہی اپنی محبت کو سکوں میں تول دیا۔ اب پلیز یہاں سے جائیں اور آئندہ یہاں آنے کی زحمت مت کیجیے گا۔ جب آپ دولت کی خاطر مجھے بیچ سکتے ہیں تو میں بھی دولت کے لیے سب کچھ کر سکتی ہوں۔ آپ ہی کہتے تھے نا کہ پیسا ہی سب سے بڑی سچائی ہے، سب سے بڑی قوت ہے۔ بس اب آپ یہاں سے جائیں۔''

فہد دل گرفتہ سا وہاں سے واپس آ گیا۔ طارق اسے کھانے کے لیے روکتا رہا لیکن وہ ضروری کام کا بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

گھر آ کر وہ نادیہ کے طرزِ عمل کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوچا، نادیہ بہت ذہین ہے۔ وہ مجھ سے ایسا سلوک اس لیے کر رہی ہے کہ میں اسے جلد از جلد طارق سے نجات دلا دوں۔ مجھے اب جو کچھ کرنا ہوگا، بہت جلد کرنا ہوگا۔

''جلدی میں کہیں کام بننے کے بجائے بگڑ نہ جائے۔'' اس کے اندر سے آواز آئی۔ مجھے بہت محتاط ہو کر سب کچھ کرنا ہوگا۔ اور جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ نادیہ بالآخر مجھے ہی ملے گی۔ اس نے مطمئن ہو کر سوچا۔

اب اسے عثمانی صاحب کی بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ عثمانی صاحب اس پر اندھا اعتماد کرنے لگے تھے اس لیے کمپنی کے کئی اکاؤنٹس فہد ہی آپریٹ کرتا تھا۔ آصف علی صاحب اس کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ پہلے تو وہ بھی محتاط رہے لیکن شروع شروع میں فہد نے بہت دیانت داری سے کام کیا۔ عثمانی صاحب بھی اس سے یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ فہد، آصف تمہاری دیانت کی بہت تعریف کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ فہد صاحب ایک ایک پیسے کا حساب رکھتے ہیں۔

کمپنی کا آڈٹ ہوا تو فہد نے جو پیسے خرچ کیے تھے، ان کا پورا حساب موجود تھا۔

اب فہد اکاؤنٹ سے بڑی بڑی رقمیں نکالنے لگا۔ اس نے دو ماہ کے اندر اندر کمپنی کے اکاؤنٹ سے کئی کروڑ نکال کر اپنے اکاؤنٹ میں منتقل کر لیے۔ آفس کے ہر ڈپارٹمنٹ میں اس کی رسائی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ کسی وقت موقع دیکھ کر اکاؤنٹس کا ریکارڈ بھی غائب کر دے گا۔ آڈٹ ہوگا تو آصف صاحب پھنسیں گے۔

ایک دن موقع دیکھ کر اس نے ریکارڈ غائب کر دیا۔

آصف صاحب گھبرائے ہوئے اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! اکاؤنٹس کے تینوں رجسٹر غائب ہیں اور کمپیوٹر سے بھی سب کچھ ختم کر دیا گیا ہے۔ میں تو بہت مصیبت میں ہوں۔''

''آپ پریشان مت ہوں۔'' فہد نے کہا۔ ''آپ سب سے پہلے تو یہ خبر عثمانی صاحب کو دیں۔ اگر انہیں کسی اور کے ذریعے معلوم ہوا تو بات خراب ہو جائے گی۔''

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں۔'' آصف نے کہا۔ ''میں ابھی عثمانی صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

اُن کے جانے کے بعد فہد کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

تھوڑی دیر بعد عثمانی صاحب نے اسے بلایا۔ وہ کچھ

یشان نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے فہد سے کہا۔ ''کمپنی کے اؤنٹ سے بہت بڑی رقم غائب ہے۔''

''غائب ہیں؟'' فہد نے پوچھا۔

''ہاں، ان کا کوئی حساب نہیں مل رہا ہے۔ آصف احب کا ریکارڈ کھاتہ غائب ہے۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' فہد نے پریشان ہونے کی داکاری کی۔ ''ریکارڈ یہاں سے کہاں جا سکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں۔''

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے فہد بہت خوش تھا۔ اس نے بہت آسانی سے کروڑوں کی رقم ہڑپ کر لی تھی۔

دو دن سکون سے گزر گئے۔ تیسرے دن آصف صاحب خوشی خوشی اس کے پاس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! ریکارڈ کا مسئلہ حل ہو گیا۔''

''کیسے؟'' فہد نے چونک کر پوچھا۔

''آئی ٹی میں ایک لڑکا ہے حسن۔'' آصف صاحب نے کہا۔ ''وہ آئی ٹی کا ماہر ہے، یوں سمجھ لیں کہ وہ کمپیوٹر کا کیڑا ہے۔ میری پریشانی سن کر وہ بولا کہ آپ اتنی سی بات ے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ میں چند منٹ میں اکاؤنٹ ا پورا حساب ری اسٹور کر دوں گا۔ یہ تو بہت معمولی کام ہے۔''

فہد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ام بتایا آپ نے حسن؟''

''ہاں حسن رضا۔'' آصف صاحب نے بتایا۔ ''بہت ہین لڑکا ہے۔''

ان کے جاتے ہی فہد نے جاوید کو کال کی اور بولا۔ ''یار! تجھ سے بہت ضروری کام ہے۔ شام کو میریٹ میں مل۔''

''یار! ضروری کام کے بغیر تو مجھے کب یاد کرتا ہے۔ چل کوئی بات نہیں، میں آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔''

جاوید، فہد کا اسکول کے زمانے کا دوست تھا۔ وہ شروع ہی سے غلط لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ میٹرک میں اس نے بورڈ آفس سے پرچے چرانے کی کوشش کی لیکن قسمتی سے پکڑا گیا۔ اسے چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ جیل جا کر تو ہ اور مشاق ہو گیا۔ وہاں اس کا رابطہ ایسے لوگوں سے ہو گیا و اپنے اپنے فن میں طاق تھے۔

☆☆☆

فہد، جاوید کو ٹیلی فون کر کے فارغ ہوا تو اس کے ذہن سے خاصا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جاوید اسے اس الجھن سے نجات دلا دے گا۔ اسے کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ وہ کافی منگانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انٹر کام کی بیل بج اٹھی۔

دوسری طرف عثمانی صاحب تھے۔ ''فہد، ذرا میرے روم میں آؤ۔'' انہوں نے اتنا کہہ کر انٹر کام رکھ دیا۔

فہد ایک مرتبہ پھر ٹینشن میں مبتلا ہو گیا۔ اب نہ جانے عثمانی صاحب کو کون سی نئی خبر ملی تھی؟ بہرحال جانا تو تھا۔

وہ عثمانی صاحب کے کمرے میں پہنچا تو ان کا موڈ خاصا خوش گوار تھا۔ انہوں نے فہد کو دیکھتے ہی بہت بے تکلفی سے کہا۔ ''آج کل کہاں مصروف رہتے ہو، مجھ سے بھی ملاقات نہیں ہوتی ہے؟''

''سر، کمپنی کے کام ہی اتنے ہیں، مجھے تو اکثر گھر جانے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ یوں بھی اکیلا آدمی ہوں، گھر جا کے کروں گا بھی کیا، اس لیے کمپنی کے جو کام التوا میں پڑے ہوئے ہیں، وہی نمٹاتا ہوں۔''

''ویسے آج تو تمہیں گھر چلنا پڑے گا۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''جی...... جی سر؟...... گھر؟'' فہد ایک دم گھبرا گیا۔

اس نے ایک ہفتے پہلے کمپنی کے اکاؤنٹ سے پانچ کروڑ مزید نکالے تھے جو اَب تک اس کے بیڈ روم کی الماری میں موجود تھے۔ وہ کمپنی کے کاموں میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے بینک جانے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ سمجھا کہ شاید عثمانی صاحب کو کسی طرح اس رقم کا علم ہو گیا ہے۔ وہ اکاؤنٹنٹ آصف بھی کمپنی کے اکاؤنٹس پر چیل کی سی نظر رکھتا تھا۔ ''ممکن ہے اسی نے عثمانی صاحب کے کان بھرے ہوں۔'' فہد نے سوچا۔

''بھئی، تم کن سوچوں میں گم ہو گئے؟'' عثمانی صاحب کی آواز پر وہ چونک اٹھا۔

''کچھ نہیں سر...... میں سوچ رہا تھا......''

''نو ایکسکیوز۔'' عثمانی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آج طارق کی برتھ ڈے ہے۔ وہ خود تو کبھی اپنی سالگرہ مناتا نہیں تھا لیکن اس مرتبہ نادیہ نے ضد کر کے اسے سالگرہ منانے پر مجبور کر دیا۔''

فہد نے سکون کی سانس لی۔ عثمانی صاحب اس کے گھر نہیں آ رہے تھے بلکہ اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

''نادیہ کہتی ہے کہ طارق زندگی کے ہنگاموں میں

دلچسپی لیں گے تو ان کا دل بھی بہلے گا اور ان کا علاج بھی بہتر طریقے سے ہو سکے گا۔"

اسی وقت آصف دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوا اور بولا۔ "سر، ہمارا بہت نقصان ہو جائے گا۔"

"ہاں، مجھے یاد آیا، آپ نے بتایا تھا نا کہ ہمارے آئی ٹی ڈپارٹمنٹ میں کوئی لڑکا ہے...... کیا نام ہے اس کا......"

"حسن سر!" آصف جلدی سے بولا۔

حسن کا نام سن کر فہد بری طرح چونک اٹھا۔

"تو پھر اسی کو لاہور بھیج دیں۔" عثمانی صاحب نے کہا، پھر فہد سے بولے۔ "ہماری لاہور برانچ آفس کا ایک ڈیٹا ڈیلیٹ ہو گیا ہے۔ جتنی تعریف آصف صاحب نے حسن کی، کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ حسن اسے جلدی بحال کر دے۔"

"سر، امید تو ہے۔" آصف جلدی سے بولا۔

"تو پھر اسے آج ہی لاہور روانہ کر دیں؟" آصف نے پوچھا۔

"فہد صاحب کو اگر حسن سے کوئی ضروری کام نہیں ہے تو آج ہی بھیج دیں۔" عثمانی صاحب نے کہا۔

"نو پرابلم سر!" فہد نے سکون کا سانس لیا۔ "لاہور برانچ کا کام زیادہ ضروری ہے۔"

فہد کو مزید کچھ دن کی مہلت مل گئی تھی۔ وہ یوں بھی آج جاوید سے نہیں مل سکتا تھا کہ اسے طارق کی برتھ ڈے پارٹی اٹینڈ کرنا تھی۔

عثمانی صاحب کی روانگی کے بعد فہد نے حسن کو بلایا اور اسے لاہور جانے کے بارے میں بتایا۔ پھر اس نے جاوید کو کال کی اور اسے بتایا کہ یار، آج میری ایک ضروری میٹنگ ہے۔ میں بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔

کچھ دیر آفس میں بیٹھ کر وہ گھر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

طارق کی سالگرہ میں شہر کے تمام ہی قابلِ ذکر لوگ موجود تھے۔ تقریب بہت شاندار تھی۔ فہد کی نظریں تو صرف نادیہ پر جمی ہوئی تھیں۔ آج تو وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھی۔ اس پارٹی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی موجود تھی لیکن سب کا حسن نادیہ کے سامنے ماند پڑ گیا تھا۔

نادیہ اس وقت مہمانوں کی تواضع میں تتلی کی طرح پورے ہال میں گھومتی پھر رہی تھی۔

فہد نے اس کو تنہا دیکھا۔ اس وقت نادیہ کسی کام سے کوریڈور میں آئی تھی۔ کوریڈور بالکل سنسان تھا۔ سارے ملازمین بھی اس وقت ہال کمرے میں موجود تھے۔ فہد نے اچانک اس کا راستہ روک لیا اور مسکرا کر بولا۔ "نادیہ! آج تو تم ہمیشہ سے زیادہ حسین لگ رہی ہو۔"

"میرا راستہ چھوڑیں مسٹر فہد!" نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"اتنی اوور ایکٹنگ مت کرو نادیہ۔" فہد کچھ جھنجلا گیا۔ احتیاط اچھی چیز ہے لیکن......"

"تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟" نادیہ کا لہجہ اس مرتبہ درشت تھا۔

"میں جانتا ہوں، تم اس وقت غصے میں ہو لیکن فکر مت کرو۔ میں وعدے کے مطابق ایک سال میں تمہاری جان چھڑا دوں گا۔ پہلے عثمانی، پھر طارق۔" فہد مسکرایا۔ "دونوں آگے پیچھے عالمِ بالا کی طرف کوچ کر جائیں گے، اب تو ہنس دو۔"

نادیہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی لڑکی نے اسے آواز دی۔ اور نادیہ اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

عثمانی صاحب اس کی تلاش میں تھے۔ وہ بہت زیادہ پریشان بھی لگ رہے تھے۔

"سر، خیریت تو ہے؟"

"بیٹا، تم کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔ ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ میرے دوست ابراہیم موتی والا پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کی ہے۔ وہ میری ہی طرف آ رہے تھے۔"

"فائرنگ کی ہے؟" فہد چونک اٹھا۔ "ان کی دشمنی تھی کسی سے؟"

"سب سے بڑے دشمن تو یہ بھتا خور ہیں۔" عثمانی صاحب نے کہا۔ "پچھلے دنوں انہیں دس لاکھ روپے بھتے کی پرچی موصول ہوئی تھی۔ عدم ادائیگی کی صورت میں انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھیں۔"

"سیٹھ صاحب نے پولیس کو رپورٹ نہیں کی؟" فہد نے پوچھا۔

"کی تھی۔" عثمانی صاحب تلخی سے بولے۔ "پولیس نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی کہ آپ کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے لیکن ہوا کیا؟ وہ بے چارہ شدید زخمی حالت میں اسپتال میں پڑا ہے۔ میں اب یہ پارٹی کینسل کر رہا ہوں۔"

''برتھ ڈے کا کیک کاٹا گیا اور عثمانی صاحب نے پارٹی کینسل کرنے کا اعلان کر دیا۔ وہاں آدھے سے زیادہ لوگ تاجر برادری کے تھے، سبھی کو اس واقعے کا افسوس تھا۔

اسی وقت فہد کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ مہمانوں کو رخصت کر کے اندر آ رہی تھی۔ فہد نے ایک مرتبہ پھر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ''نادیہ! میں یہ کہہ......''

''میرے راستے سے ہٹو فہد۔'' نادیہ نے بپھر کر کہا۔

''میری بات تو سن لو، پھر غصہ کر لینا۔ اب ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہے۔ بس اب تم غصہ تھوک دو۔''

اس کی بات سنے بغیر نادیہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

فہد بھی جھنجلا گیا۔ وہ نادیہ کو بچپن سے جانتا تھا۔ وہ کسی بات پر ناراض ہوتی تھی تو ہفتوں اس کا موڈ خراب رہتا تھا۔ فہد نے بھی عثمانی صاحب سے اجازت لی اور بولا۔ ''سر! میں گھر جانے سے پہلے سیٹھ موتی والا کی عیادت کو جاؤں گا۔''

''ہاں بیٹا ضرور جاؤ۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''اب تو کاروباری حلقے میں تقریباً سبھی تمہیں پہچانتے ہیں۔''

دوسرے دن فہد دفتر پہنچا ہی تھا کہ اس کا انٹرکام بجا۔ دوسری طرف عثمانی صاحب کی آواز سن کر اسے حیرانی ہوئی۔ عثمانی صاحب عموماً ساڑھے گیارہ بجے تک آتے تھے۔ عملاً تو پورا دفتر انہوں نے فہد کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ آواز سے خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ انہوں نے فہد کو فوری طور پر اپنے آفس میں بلایا تھا۔

فہد ان کے کمرے میں پہنچا تو وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ اس کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ ''بیٹا! مجھے بھتے کی کال آئی ہے! کال کرنے والے نے مجھ سے بیس کروڑ روپے مانگے ہیں۔ وہ بھی کل تک، رقم ادا نہ کرنے کی صورت میں اس نے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ دوسری افسوس ناک خبر یہ ہے کہ سیٹھ موتی والا آج صبح اسپتال میں انتقال کر گئے۔''

''اوہ۔'' فہد نے کہا۔ ''ویری سیڈ۔'' پھر وہ پُرتشویش لہجے میں بولا۔ ''سر! آپ نے پولیس سے رابطہ کیا؟''

''پولیس!'' عثمانی صاحب نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ایسے موقعوں پر پولیس سوائے تسلی، دلاسوں اور بڑے بڑے دعوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں کرتی۔'' پھر وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائے۔ ''مجھے موت کا خوف نہیں ہے فہد بیٹا، مرنا تو ایک دن سب کو ہے لیکن مجھے ایسی موت پسند نہیں ہے۔''

''آپ پریشان مت ہوں انکل! میرا ایک دوست ڈی آئی جی کرائمز کا کزن ہے۔ میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔ پولیس ہر صورت میں آپ کی حفاظت کرے گی۔''

فہد انہیں کسی حد تک مطمئن کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اس کا کام خود بہ خود آسان ہو گیا تھا۔ اس نے عثمانی صاحب سے جھوٹ بولا تھا۔ اس کا کوئی دوست ڈی آئی جی کرائمز کا کزن نہیں تھا۔ وہ اپنے آفس میں بیٹھ کر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے لگا۔ عثمانی صاحب بااصول آدمی تھے۔ وہ بھتے کے نام پر بیس کروڑ تو کیا بیس روپے بھی نہیں دیتے اور اس نامعلوم بھتا خور کے ہاتھوں مارے جاتے۔ پھر اس کے راستے میں صرف طارق تھا۔ اسے ٹھکانے لگانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس نے سوچا، بس چند مہینے کی بات ہے پھر نادیہ ہوگی اور عثمانی صاحب کی بے اندازہ دولت۔

☆☆☆

بابر نے اپنی ہیوی بائیک پارکنگ میں کھڑی کی اور بلڈنگ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہ صدر کی ایک .... سال خوردہ عمارت تھی۔ گراؤنڈ فلور پر الیکٹرانک کی دکانیں تھیں۔ دکانوں سے باہر الیکٹرانک آئٹمز، ٹھیلے پر فروخت کرنے والوں نے آدھی سے زیادہ سڑک روک رکھی تھی۔

بابر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا کیونکہ عمارت میں لفٹ نہیں تھی۔ بابر کا آفس چھٹے فلور پر تھا۔ آفس کیا بڑا سا ایک کمرا تھا جسے مالک نے درمیان میں پارٹیشن کر کے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اندرونی حصے میں ایک طرف چھوٹا سا ایک کچن تھا جہاں گیس نہیں تھی اس لیے چائے وغیرہ بنانے کے لیے بابر کو سلنڈر استعمال کرنا پڑتا تھا۔

بابر نے کچن کے سامنے لکڑی کا ایک مزید پارٹیشن لگا کر اس کی بدصورتی چھپانے کی کوشش کی تھی۔ کمروں میں اس نے کارپٹ ڈال لیا تھا تاکہ گندہ فرش چھپ سکے۔ سامنے کے حصے میں اس نے سیکریٹری کے لیے ایک ٹیبل، کرسی ڈال دی تھی۔ ایک طرف پرانا سا لیکن خوب صورت صوفہ سیٹ تھا۔ اندرونی کمرے میں بابر خود بیٹھتا تھا۔ سیکریٹری کا کمرا عموماً خالی رہتا تھا کیونکہ سیکریٹری سرے سے تھی ہی نہیں، اس کرسی پر عموماً بلال بیٹھ جاتا تھا۔

بابر چھ مہینے پہلے تک پولیس انسپکٹر تھا۔ اس کی محنت اور صلاحیت دیکھتے ہوئے محکمے نے اسے نہ صرف بہت جلد ترقی دی تھی بلکہ اسے خصوصی کمانڈو ٹریننگ بھی دلوائی تھی۔ اس میں بنیادی ''خرابی'' یہ تھی کہ وہ رشوت کو حرام

تا تھا۔ نہ وہ خود رشوت کھاتا تھا نہ دوسروں کو کھانے دیتا ۔ اس قسم کے لوگ پولیس سروس کے لیے انتہائی وزوں سمجھے جاتے ہیں۔

بالآخر اس نے تنگ آ کر پولیس کی ملازمت کو خیر باد ہ دیا۔

نئی ملازمت کے لیے مختلف کمپنیز میں سیکیورٹی آفیسر ے لیے اپلائی کیا لیکن وہاں کام گدھوں کی طرح لیا جاتا تھا تنخواہ کے نام پر اتنے پیسے ملتے تھے کہ اس کا مہینا بھی نکل تمام گزرتا تھا۔

آخر تنگ آ کر اس نے تین مہینے پہلے صدر کے علاقے ں یہ آفس لے کر اپنی سیکیورٹی ایجنسی کھول لی تھی۔ اسے ین تھا کہ شہر کے بڑے بڑے کاروباری لوگ اس کی لاحت سے واقف ہیں اور چند ہی مہینے میں اس کا کام چل ے گا۔

بلال پولیس میں اے ایس آئی تھا۔ بابر ہی کی طرح بھی معتوب تھا۔ اس نے بابر کے ساتھ کام کرنے کی اہش ظاہر کی تو بابر نے کہا۔ ''دیکھو بلال! ابھی سیلری کے م پر میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکوں گا۔ ہاں، جب ہمارا ام چل نکلے گا تو......''

''میں جانتا ہوں سر!'' بلال مسکرایا۔ 'میں بس آپ ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

یوں بلال بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ بلال بھی ی طرح خاصا ذہین اور پُرجوش افسر تھا۔ ایمان داری کا ں اسے بھی لاحق تھا۔

بابر آفس جا کر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل ٹھی۔

''السلام علیکم! الیوپرڈ سیکیورٹی ایجنسی۔'' بابر نے خوش اقی سے کہا۔

''بابر صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے از آئی۔

''جی ہاں، بول رہا ہوں۔'' بابر نے حیرت سے اب دیا۔ بولنے والا اس کا نام بھی جانتا تھا۔

''میں عثمانی گروپ آف کمپنیز سے بول رہا ہوں۔'' سری طرف سے آواز آئی۔ ''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا پ ہمارے آفس آسکتے ہیں۔ ہمارے سی ای او عثمانی احب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''جی! وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' اس نے حیرت ے پوچھا۔

''جی ہاں، اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو ابھی آ جائیں۔ عثمانی صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

''او کے، میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' بابر نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت بلال آفس میں داخل ہوا۔ اس نے بابر کو عجلت میں دیکھ کر پوچھا۔ ''سر، کہیں جا رہے ہیں آپ؟''

''ہاں یار۔'' بابر نے کہا۔ ''میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں کام ملنے والا ہے۔ اس نے جیکٹ کی زپ بند کرتے ہوئے کہا۔ بغلی ہولسٹر تو وہ پہلے ہی لگا چکا تھا۔

''سر! کوئی بڑا کلائنٹ ہے؟''

''بڑا نہیں، بہت بڑا ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''لیکن میں ابھی سے اسے کلائنٹ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو وہاں سے واپسی ہی پر معلوم ہوگا کہ عثمانی صاحب کلائنٹ ہیں یا کسی مشورے کے سلسلے میں بلایا ہے؟''

''عثمانی صاحب؟'' بلال نے حیرت سے کہا۔ ''عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او؟''

''ہاں، یار! ابھی ان ہی کے آفس سے کال آئی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔

''وش یو بیسٹ آف لک سر!'' بلال نے ہنس کر کہا۔

بابر نے اپنی ہیوی بائیک نکالی، ہیلمٹ لگایا اور تیز رفتاری سے عثمانی صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''یار، تو مجھ سے آج شام میریٹ میں مل لے۔ بقیہ بات وہیں ہوگی۔'' فہد نے جاوید سے کہا۔ حسن لاہور سے واپس آنے والا تھا اور فہد خطرے کی اس تلوار کو جلد از جلد ہٹانا چاہتا تھا۔

اسی وقت انٹرکام پر عثمانی صاحب نے اسے اپنے آفس میں طلب کر لیا۔

''ایک تو یہ بڈھا جان کو آ گیا ہے۔ نہ خود فارغ بیٹھتا ہے، نہ کسی کو بیٹھنے دیتا ہے۔'' فہد بڑبڑایا اور عثمانی صاحب کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

وہ آفس میں داخل ہوا تو عثمانی صاحب تنہا نہیں تھے بلکہ ان کے کمرے میں جیکٹ میں ملبوس ایک وجیہہ و شکیل نوجوان بھی موجود تھا۔ وہ کسرتی جسم کا مالک تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

فہد نے سر سے پاؤں تک بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ جوابی طور پر اس نے بھی فہد کو گہری نظر سے دیکھا۔

''آؤ فہد۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''ان سے ملو۔

مسٹر بابر خان! لیوپرڈ سیکیورٹی ایجنسی کے ایم ڈی ہیں۔ میں اپنی سیکیورٹی کے لیے ان کی خدمات حاصل کررہا ہوں۔'' پھر وہ بابر سے مخاطب ہوئے۔ ''بابر صاحب! یہ کمپنی کے ایم ڈی اور میرے رائٹ ہینڈ مسٹر فہد ہیں۔''

''ہیلو سر!'' بابر نے اپنا ہاتھ فہد کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو!'' فہد نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بابر کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ اس کا ہاتھ بھی بہت مضبوط تھا۔

''سر! اگر آپ اجازت دیں تو میں بابر صاحب سے کچھ سوالات کرلوں؟''

''شیور!'' عثمانی صاحب نے ہنس کر کہا۔

''بابر صاحب! آپ کی سیکیورٹی ایجنسی کس لیول کی ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ کمپنی پروفائل تو ضرور لائے ہوں گے؟''

''فہد صاحب! میں نے ابھی حال ہی میں بلکہ تین مہینے پہلے ہی اپنی سیکیورٹی ایجنسی شروع کی ہے اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او میرے پہلے کلائنٹ ہیں۔''

''وہاٹ؟'' فہد نے ناگواری سے پوچھا۔ ''آپ نے حال ہی میں کمپنی شروع کی ہے۔ آپ کی سیکیورٹی کا کوئی سابقہ تجربہ بھی نہیں ہے۔ آپ کس کے ریفرنس سے یہاں آئے ہیں؟'' فہد کا لہجہ تلخ ہوگیا۔ ''مسٹر بابر! عثمانی صاحب ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔ انہیں دھمکی آمیز فون موصول ہورہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں تو ہمیں کسی انتہائی پروفیشنل شخص کی ضرورت ہوگی۔'' پھر وہ عثمانی صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''سوری سر! میں بابر صاحب سے مطمئن نہیں ہوں۔''

''فہد!'' عثمانی صاحب مسکرائے۔ ''تم شاید بابر سے واقف نہیں ہو ورنہ ایسی بات کبھی نہ کرتے۔ بابر سابقہ پولیس آفیسر ہیں، بہترین کمانڈو ہیں۔ شہر کے جرائم پیشہ شخص ان کے نام سے کانپتے تھے اور آج بھی یقیناً کانپتے ہوں گے۔ ان کی کمپنی کی پروفائل نہ سہی لیکن ان کی ذاتی پروفائل میں درجنوں ایسے کیس ہیں جو دوسروں کے لیے ناممکن تھے۔ انہوں نے ہزار ملزمان سے زیادہ کو سلاخوں کے پیچھے پہنچایا ہے۔''

''او، آئی سی۔'' فہد نے کہا۔ ''سوری مسٹر بابر، مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اتنے باصلاحیت افسر رہ چکے ہیں۔''

''سر، فوری طور پر میں اجازت چاہوں گا۔'' بابر نے کہا۔ ''مجھے کچھ تیاری کرنا ہوگی۔ اس بھتا خور نے آپ کو چوبیس گھنٹے کا ٹائم دیا ہے۔ میں اس سے بہت پہلے یہاں پہنچ جاؤں گا۔''

''بابر صاحب! آپ فوری طور پر اپنی ایجنسی کے دو بہترین گارڈز تو یہاں بھجوا ہی سکتے ہیں۔'' فہد نے کہا۔ ''اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بابر کا نام اس نے بھی سن رکھا تھا لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا تھا خیر فی الحال تو مجھے حسن کا بندوبست کرنا ہے۔ فہد نے سوچا، اس وقت تک جاوید، بابر کا بھی کوئی علاج سوچ لے گا۔

بابر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو فہد کو اس کے دراز قد کا علم ہوا۔ وہ فہد سے بھی ایک ڈیڑھ انچ زیادہ ہی ہوگا۔ فہد خود بھی خاصا دراز قد تھا اور پابندی سے جم جاتا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد فہد بھی عثمانی صاحب سے اجازت لے کر وہاں سے اٹھ گیا۔ اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ بابر کی شخصیت اتنی رعب دار تھی کہ فہد مرعوب ہوکر رہ گیا تھا۔ پھر اس کے کریڈٹ پر بہت سے اِن کاؤنٹر بھی تھے۔ اگر اسے شبہ ہوجاتا کہ ملزم گرفتاری کے بعد سزا سے بچ جائے گا تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا تھا۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں... جاوید سے ملنے میریٹ روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

بابر آفس پہنچا تو خوشی اس کے چہرے سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ بلال اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''سر! لگتا ہے کہ آپ کی میٹنگ کامیاب رہی ہے۔''

''ہماری بسم اللہ بہت بڑے کلائنٹ سے ہوئی ہے۔'' بابر نے کہا۔ ''اب ہمیں ان پیسوں کو حلال کرنا ہے۔ عثمانی صاحب کو بھتے کے لیے گمنام ٹیلی فون کالز موصول ہورہی ہیں اور انہیں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ اب ہمیں ان کی حفاظت کرنا ہے۔ اب تم ایکشن میں آجاؤ۔ انہوں نے دس لاکھ کا چیک بھی دیا ہے۔''

اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک بروشر نکالا۔ یہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی پروفائل تھی۔ اس میں کمپنی کے سی ای او سے لے کر ایم ڈی، تمام ڈائریکٹرز، اکاؤنٹس منیجر اور تمام اسٹاف کا تعارف بھی تھا اور ان کی تعداد بھی۔

''یہ کمپنی کا ایم ڈی فہد ہے۔'' بابر نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ انتہائی ذہین اور باصلاحیت آدمی ہے۔ اس نے محض تین سال کے عرصے میں کمپنی کو بہت اوپر پہنچا دیا ہے۔ اس کے اسٹائل سے لگ رہا تھا کہ کمپنی میں اس کی

پوزیشن ہے پھر عثمانی صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے میرا رائٹ ہینڈ ہے۔''

''لیکن اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟'' بلال چھا۔

''تم جانتے ہو کہ میری چھٹی حس بہت تیز ہے۔ جس میں اس نے میری مخالفت کی ہے، اس پر مجھے شک تم ابھی عثمانی گروپ آف کمپنیز چلے جاؤ اور فہد پر نظر اس کے ساتھ اس کے بارے میں مجھے مکمل رپورٹ چاہیے۔''

''اوکے باس۔'' بلال اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا لور پینٹ کی بیلٹ میں پیچھے کی طرف لگایا اور اوپر سے ٹ پہن لی اور اپنا ہیلمٹ اٹھا کر روانہ ہوگیا۔

وہ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ہیڈ آفس پہنچا تو ہاں سے نکل چکا تھا یہ بات اسے آفس کے ایک سیکیورٹی ڈ نے بتائی تھی۔ وہ لفٹ میں سوار ہوکر اوپر پہنچا۔ دفتر کی شنٹ جاچکی تھی۔ اس کی جگہ پر کوئی نوجوان بیٹھا تھا۔

بلال جانتا تھا کہ فہد آفس میں موجود نہیں ہے۔ اس بلاجھجک اس نوجوان سے پوچھا۔ ''مجھے مسٹر فہد سے ملنا ہے۔''

''سر! مسٹر فہد تو ابھی تھوڑی دیر پہلے جاچکے ہیں۔'' وان نے جواب دیا۔

بلال نے پریشان ہونے کی اداکاری کی اور بڑبڑایا۔ یہ تو بہت برا ہوا۔ مجھے آج ہی ان سے ملنا تھا کیا آپ کو کے گھر کا ایڈریس معلوم ہے؟''

''میں تو عارضی طور پر یہاں بیٹھ گیا ہوں۔'' نوجوان نے کہا۔ ''ایسا کریں، آپ ڈائریکٹر اکاؤنٹس آصف احب سے مل لیں۔ وہ اس وقت آفس میں ہیں۔ انہیں فہد احب کا ایڈریس معلوم ہے۔''

''تھینکس مسٹر!''

بلال اس کا شکریہ ادا کر کے کوریڈور کی طرف بڑھ یا۔

☆☆☆

''یار، یہ معاملہ تو الجھتا ہی جائے گا۔'' جاوید نے کہا۔ حسن کو راستے سے ہٹائے گا تو اس کی جگہ کوئی اور آجائے۔ شہر میں آئی ٹی کے ماہرین کی کمی نہیں ہے۔ آصف کو تے سے ہٹائے گا تو اس کی جگہ کوئی دوسرا لے گا پھر یا تو وہ تجھے ہمیشہ بلیک میل کرتا رہے گا یا پھر تیرا سارا کچھ چٹھا عثمانی کو بتا دے گا۔''

''تو پھر اس پرابلم کا کوئی حل بھی ہے تیرے پاس؟'' فہد جھنجلا کر بولا۔ ''میرا ذہن تو اس وقت کام نہیں کررہا ہے، تو تو ان معاملات میں بہت شارپ ہے۔''

وہ دونوں میریٹ ہوٹل کے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

''میں عام طور پر لوگوں سے اتنی بات کرتا نہیں ہوں۔ نہ انہیں مشورے دیتا ہوں، صرف ان کے احکامات پر عمل کرتا ہوں۔'' جاوید نے منہ بنا کر کہا۔ ''لیکن تو چونکہ میرا دوست بھی ہے اور آڑے وقتوں میں میری مدد بھی کی ہے اس لیے تجھے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔ شاخوں کو صاف کرنے کے بجائے تو درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔''

''یار، صاف صاف بات کر۔'' فہد الجھ کر بولا۔ ''میں سمجھا نہیں، تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

''تو اپنی کمپنی کے سی ای او کو راستے سے ہٹا دے۔'' جاوید نے بے نیازی سے کہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔

فہد نے چونک کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ ''یار! میں بھی چاہتا تو یہی ہوں لیکن یہ کام اب بہت مشکل ہوگیا ہے۔''

''اونہہ۔'' جاوید ترش لہجے میں بولا۔ ''تو شاید مجھے ہلکا لے رہا ہے۔ یہ کام ہمیشہ مشکل ہی ہوتا ہے۔ یہ تیرا مسئلہ نہیں ہے۔''

''ابھی کچھ دن ٹھہر جا۔'' فہد نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''تجھے ابھی فیصلہ کرنا ہوگا فہد ورنہ خطرے کی تلوار ہمیشہ تیرے سر پر لٹکی رہے گی اور کسی بھی وقت گر کر تیری گردن اُڑا دے گی۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ابھی اس لیے نہیں کہ عثمانی صاحب نے اپنی سیکیورٹی کے لیے بابر خان کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔''

''بابر خان!'' جاوید بری طرح چونکا۔ ''وہ اِن کاؤنٹر اسپیشلسٹ؟''

''ہاں، وہی۔'' فہد نے جواب دیا۔

''وہ پولیس میں واپس کیسے آگیا۔ اس نے تو پولیس کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا؟''

''وہ اب پولیس میں نہیں ہے۔'' فہد نے کہا۔ ''بلکہ اپنی ذاتی سیکیورٹی ایجنسی چلا رہا ہے۔''

جاوید کا جوش و خروش ماند پڑ گیا۔ وہ آہستہ سے بولا۔ ''یہ تو بہت بری خبر سنائی تو نے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اسے وہاں لایا کون ہے؟''

''یار، لایا کوئی بھی ہو۔'' فہد جھنجلا کر بولا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس کے حوالے سے وہاں آیا ہے۔''

جاوید چند منٹ تک سوچتا رہا، پھر پُرخیال انداز میں بولا۔ ''یہ بھی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے لیکن تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے ہمیں حالات کا جائزہ لینا ہوگا۔''

''فی الحال تو تو حسن کو راستے سے ہٹا دے۔ اس طرح ہمیں کچھ دن کی مہلت مل جائے گی۔''

''چل پھر یوں ہی سہی۔'' جاوید نے کہا۔ وہ کچھ فکرمند نظر آرہا تھا۔ ''اس کام کے دس لاکھ لوں گا۔'' اس نے فہد سے کہا۔

''یار، تو ہوش میں تو ہے اتنے سے کام کے دس لاکھ؟''

''یہ اتنا سا کام نہیں ہے۔'' جاوید نے منہ بنا کر کہا۔ ''کروڑوں روپیا اور تیری عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ حسن نے اگر تمام ڈیٹا ری اسٹور کرلیا تو پھر تو سوچ لے کہ تیرا کیا ہوگا؟''

''یار، تو واقعی بہت کمینہ ہے۔'' فہد کھسیانی ہنسی ہنسا۔ ''چل دس لاکھ ہی سہی لیکن کام آج ہی ہونا چاہیے۔ حسن آج رات کی فلائٹ سے کراچی پہنچ رہا ہے۔''

''کام کی تو فکر مت کر۔'' جاوید نے کہا۔ ''ہاں تو جانتا ہے کہ میں ففٹی پرسنٹ ایڈوانس لیتا ہوں۔''

فہد نے بغیر کچھ کہے بریف کیس میں سے چیک بک نکالی اور اسے پانچ لاکھ کا چیک دے دیا۔

''اب میں چلتا ہوں۔'' جاوید نے کہا۔ ''مجھے کچھ انتظامات بھی کرنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

فہد فی الحال گھر نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے وہیں بیٹھا رہا اور کافی پیتا رہا۔

☆☆☆

ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائڈ لیمپ روشن کیا اور ریسیور اٹھا لیا۔ وال کلاک میں اس وقت چار بج رہے تھے۔

''ہیلو۔'' اس نے غنودہ لہجے میں کہا۔

''میں اظہر بول رہا ہوں سر۔'' دوسری طرف سے کمپنی کے جی ایم کی آواز سنائی دی۔

''بولو۔'' فہد نے چڑچڑے انداز میں کہا۔ ''کبھی کوئی کام خود بھی کرلیا کریں۔ آپ جانتے ہیں، اس وقت کیا ٹائم ہوا ہے؟''

''جانتا ہوں سر!'' اظہر نے کہا۔ ''لیکن آپ اطلاع دینا ضروری تھا۔ کمپنی کے آئی ٹی ایگزیکٹو حسن کا مر ہوگیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' فہد نے اداکاری کا مظاہرہ کیا۔ ''حسن تو لاہور میں تھا۔ کیا لاہور میں......''

''نو سر!'' اظہر نے کہا۔ ''وہ لاہور سے آج ہی ڈیڑھ بجے کے قریب کراچی پہنچا تھا۔ ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن عثمانی صاحب کا اور آپ کا حکم ہے کہ کی ایمرجنسی یا غیر معمولی واقعے کی اطلاع آپ کو دی جائے میں نے عثمانی صاحب کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے......''

''اٹز آل رائٹ اظہر صاحب۔'' فہد نے کہا۔ ''لیکن حسن کا مرڈر کیسے ہوا؟ وہ تو اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑ تھا۔ اس کی بھلا کس سے دشمنی ہوسکتی ہے؟ اس کی ڈیڈ باڈی کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک جناح اسپتال میں ہے۔ وہ جس کیب میں سوار تھا، اس کا ڈرائیور بھی مارا گیا ہے۔''

''حسن کے گھر والوں کو انفارم کردیں۔ میں جنا اسپتال پہنچ رہا ہوں۔'' ایک لمحے کو فہد کے ضمیر نے ا ملامت کی۔ اس کے والدین نے ہمیشہ اسے سچائی او دیانت داری کے ساتھ ساتھ قناعت پسندی کا سبق بھی سکھا تھا۔ اس کے ماموں نے بھی ہمیشہ اسے اچھائی کا درس دیا اسے اس قابل بنایا کہ آج وہ ملک کی ایک بہت بڑی فرم ایم ڈی تھا۔ اس نے دولت کے جنون میں اپنی محبت کو داؤ پر لگا دیا۔ نادیہ تو اس کی جان سے زیادہ ماموں امانت تھی، اس کی اپنی امانت تھی جسے اس نے دولت انبار میں زندہ دفن کردیا تھا اور آج ایک انسان کی جان لے لی تھی۔

یہ احساس صرف چند لمحوں کا تھا۔ اس نے سوچا کہ میں حسن کو راستے سے نہ ہٹاتا تو میرا ٹھکانا جیل ہوتا یا صاحب بہت زیادہ رعایت کا مظاہرہ کرتے تو غبن کی واپس لے کر شاید اسے معاف کردیتے لیکن پھر گروپ آف انڈسٹریز میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہوتی وہ نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم' کی تعبیر بن کر رہ جاتا۔

وہ اسپتال پہنچا تو جی ایم کے علاوہ وہاں آ صاحب، آئی ٹی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ انوار صاحب اور کے گھر والے موجود تھے۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم حسن اپنی ماں اور دو جوان بہنوں کا واحد کفیل تھا۔

ماں اور بہنوں کی حالت خراب تھی۔

فہد ان کے نزدیک پہنچا تو وہ سسک سسک کر رونے لگیں۔ فہد نے حسن کی بہن سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''روبینہ!'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔

''پڑھ چکی ہو یا پڑھ رہی ہو؟'' فہد نے پوچھا۔

''میں نے اس سال گریجویشن کیا ہے سر!'' اس نے کہا۔

''تم ایسا کرنا، میرے پاس آفس آجانا۔ میں حسن کی جگہ تمہیں جاب دے دوں گا۔'' فہد کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ وہ چند ڈائریکٹرز اور منیجرز کے علاوہ کسی کو بھی ملازمت سے نکال سکتا تھا اور ملازمت دے بھی سکتا تھا۔

حسن کی ماں اور بہنوں کی آنکھوں میں حسن کے لیے ممنونیت تھی۔

حسن کی باڈی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجی جا چکی تھی۔ اسی وقت پولیس کا ایک سب انسپکٹر وہاں آگیا اور بولا۔ ''مقتول کمپنی کے کس ڈپارٹمنٹ میں تھا؟''

''وہ آئی ٹی ایگزیکٹو تھا۔'' آئی ٹی کے ہیڈ انوار صاحب نے جواب دیا۔ بہت محنتی اور ذہین نوجوان تھا۔ کمپیوٹر کا تو وہ سمجھ لیں کیڑا تھا۔''

پولیس کی معمول کی کارروائی جاری تھی۔

آصف بہت پریشان تھا۔ اکاؤنٹس کا ڈیٹا ری اسٹور کرنے کی ایک امید بندھی تھی تو حسن کی موت کے ساتھ وہ بھی ختم ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ آخر اکاؤنٹس کے رجسٹر کہاں غائب ہوگئے۔ کمپیوٹر کا ڈیٹا تو کسی بھی وجہ سے ڈیلیٹ ہوسکتا تھا۔ لاہور برانچ کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ کچھ بھی کہتا لیکن عثمانی صاحب کی نظروں میں تو وہی ذمّے دار تھا۔

اب بابر زیادہ تر عثمانی گروپ آف کمپنیز کے آفس ہی میں رہتا تھا۔ وہ گاڑی میں عثمانی صاحب کے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا بلکہ اپنی بائیک پر ان کی گاڑی کے پیچھے آگے اور دائیں بائیں رہتا تھا۔

بابر نے ایک سیکیورٹی ایجنسی کے دو گارڈز بھی ہائر کر لیے تھے۔ وہ ایجنسی اس کے دوست ریٹائرڈ میجر سلطان کی تھی۔ سلطان نے اسے اپنی ایجنسی کے دو گارڈز دے تو دیے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی جتا دیا تھا کہ کسی گارڈ کو نقصان پہنچا تو اس کی پوری ذمّے داری بابر پر ہوگی۔ ان کی ماہانہ تنخواہیں بھی بابر ہی کے ذمے تھیں۔

ان ہی دنوں آفس میں ملازمت کے لیے ایک لڑکا آیا۔ یوں تو کمپنی میں بے شمار درخواستیں موصول ہوتی تھیں لیکن اس کی سی وی میں خاص بات یہ تھی کہ کوالیفکیشن میں آئی ٹی اسپیشلسٹ بھی لکھا ہوا تھا۔

سی وی دیکھ کر آئی ٹی ہیڈ انوار صاحب خوش ہوگئے۔ اس نوجوان کا نام عاصم تھا۔ انوار صاحب نے اس کی درخواست فہد کو بھیج دی اور اس پر یہ نوٹ بھی لگایا کہ یہ امیدوار ہمارے کام کا ہے۔ ہمیں ایک آئی ٹی اسپیشلسٹ کی ضرورت بھی اور یہ حسن سے بھی زیادہ ماہر ہے۔

درخواست پڑھ کر فہد پریشان ہوگیا۔ اسے جاوید کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ حسن کو راستے سے ہٹا دیا تو کوئی اور آجائے گا، پھر کوئی اور۔ شہر میں ذہین نوجوانوں کی کمی نہیں تھی۔

اس نے عاصم کی درخواست ایک مرتبہ پھر پڑھی اور انوار صاحب کو اپنے آفس میں بلا لیا۔

''یہ اپیلی کیشن آپ نے مجھے فارورڈ کی ہے؟'' فہد نے ان سے پوچھا۔

''یس سر! میں تو اسے ادارے کے لیے موزوں ترین سمجھتا ہوں۔''

''آپ نے اس شخص کا گزشتہ ریکارڈ چیک کیا ہے۔ اس نے آخری جاب گلیکسو میٹ سے چھوڑی ہے اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان سے مارکیٹ میں ہمارا بہت سخت کمپٹیشن ہے۔ آپ اس شخص کو آئی ٹی جیسے حساس ڈپارٹمنٹ میں جاب دینے کی بات کررہے ہیں۔ ممکن ہے اس نے وہاں سے جاب چھوڑی ہی نہ ہو اور وہ ان ہی لوگوں کے کہنے پر یہاں آیا ہو۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اگر وہ ہمارے رائبول گروپ کا آدمی ہوا تو ہمیں کتنا نقصان پہنچا سکتا ہے؟''

''سوری سر!'' انوار صاحب اب شرمندہ تھے۔ ''میں نے اس پہلو سے تو غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''مارکیٹ میں آئی ٹی کے ہزاروں لوگ ہیں۔ میں نے کئی لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ جلد ہی کسی کا انتظام ہوجائے گا۔'' فہد نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ بہت زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا اگر میں نے فوری طور پر اس مسئلے کا کوئی مستقل حل نہ نکالا تو میری ملازمت تو جائے گی ہی، میرا سارا پلان بھی چوپٹ ہو

جائے گا۔ اسی دولت کے لیے تو میں نے نادیہ جیسی محبت کرنے والی لڑکی کو اس دلدل میں اتار دیا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھایا اور جاوید کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

”میں نے تو تجھ سے پہلے ہی کہا تھا کہ حسن کو راستے سے ہٹانا اس پرابلم کا حل نہیں ہے۔“ جاوید نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ ایک دفعہ پھر میریٹ میں بیٹھے تھے۔

”اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔“ جاوید نے کہا۔ ”عثمانی صاحب کو اوپر پہنچا دیا جائے۔“

”لیکن بابر، ان کی سیکیورٹی بابر کر رہا ہے اور......“

”بابر کوئی سپر مین نہیں ہے۔“ جاوید نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”میں نے اس کے بارے میں بھی معلومات کی ہیں پولیس چھوڑنے کے بعد اس نے صدر کے ایک ڈربا نما فلیٹ میں اپنی سیکیورٹی ایجنسی کھولی ہے۔ وہ اس آفس کا سیکریٹری بھی خود ہے، اپنا اسسٹنٹ بھی خود ہے اور پیون بھی خود ہی ہے۔“

فہد جھنجلا کر بولا۔ ”میں اس وقت شدید ٹینشن میں ہوں جاوید، اگر تو ہٹا سکتا ہے تو اس بڈھے کو راستے سے ہٹا دے۔“

”بڈھے کو کب پھڑکانا ہے؟“ جاوید مطلب کی بات پر فوراً آ گیا۔

”جلد از جلد۔“ فہد نے کہا۔ ”مجھ سے اب مزید ٹینشن برداشت نہیں ہوگی۔ میں تجھے اس کام کے پچاس لاکھ روپے دوں گا۔“

”پچاس لاکھ؟“ جاوید کے چہرے پر ناگواری تھی۔ ”تو عثمانی گروپ آف کمپنیز کے سی ای او کو راستے سے ہٹا رہا ہے یا کسی ریڑھی والے یا بھک منگے کو۔ میں اس کام کے پانچ کروڑ لوں گا۔“

”پانچ کروڑ؟“ فہد نے حیرت سے دہرایا۔ ”یہ تو بہت زیادہ ہیں جاوید! ہم پرانے دوست ہیں اور......“

”اسی وجہ سے تو میں نے ڈسکاؤنٹ کیا ہے ورنہ اتنے معروف اور دولت مند لوگوں کو قتل کے دس کروڑ روپے بنتے ہیں۔“ وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”جلدی فیصلہ کر۔ مجھے ابھی ایک اور پارٹی سے بھی ملنا ہے۔ یہ کام تو کسی دوسرے پروفیشنل ٹارگٹ کلر سے کرا لے۔ ہوسکتا ہے، تیرا کام دس، پندرہ لاکھ ہی میں ہوجائے۔“

”یار، تیری پرانی کمینگی ابھی تک برقرار ہے۔“ فہد مسکرایا۔ ”ٹھیک ہے، میں تجھے پانچ کروڑ دوں گا لیکن کام اتنی صفائی سے ہونا چاہیے کہ......“

”اس کی تو فکر مت کر۔ ہاں تو شاید یہ بھول رہا ہے کہ میں ففٹی پرسنٹ ایڈوانس بھی لیتا ہوں۔“

”مجھے یاد ہے۔“ فہد نے کہا اور اپنا بریف کیس اٹھا کر چیک بک نکال لی۔ وہ اسے چیک دے کر بولا۔ ”کام کرنے سے پہلے مجھے انفارم ضرور کر دینا۔“

”اس کی تو فکر مت کر۔“ جاوید نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے میں پرسوں ہی یہ کام کرلوں۔“

☆☆☆

بابر حسب معمول دفتر میں موجود تھا کیونکہ ابھی تک عثمانی صاحب بھی موجود تھے۔

اچانک فہد کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جاوید کی کال تھی۔ اس کے کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا لیکن اس کے دل میں چور تھا اس لیے اس نے غیر شعوری طور پر اردگرد دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔ ”ہیلو۔“

”آج میں آپریشن کر رہا ہوں۔ میں اپنے آدمی کے ساتھ دفتر کے باہر موجود ہوں۔ بڈھا جیسے ہی باہر نکلے گا۔ میں اس کے پیچھے لگ جاؤں گا۔ اپنا سیل فون فری رکھنا، مشکل سے ایک گھنٹے میں تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

فہد کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بابر کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کسی سے سیل فون پر بات کر رہا تھا۔

اسی وقت عثمانی صاحب اپنے کمرے سے باہر نکل کر کوریڈور سے گزرے۔ ان کے پیون کے ہاتھ میں ان کا بریف کیس تھا۔ وہ باہر جانے کے بجائے فہد کے کمرے کی طرف آئے تو فہد خود باہر نکل آیا۔

”فہد!“ عثمانی صاحب نے اس سے کہا۔ ”طارق کی طبیعت صبح سے خراب ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ کوریا کی پارٹی کا ایک ضروری ٹیلی فون آئے گا۔ تم اس سے پہلے آفس سے مت نکلنا۔“

”اوکے سر۔“ فہد نے کہا۔ ”میں تو ابھی آفس ہی میں بیٹھوں گا۔ لاہور اور گجرات کے آفس منیجرز بھی کال کریں گے۔ ممکن ہے ملائیشیا سے بھی کسی کلائنٹ کی کال آجائے۔“

”اوکے بیٹا! اللہ حافظ۔“ عثمانی صاحب نے کہا اور وقار انداز میں چلتے ہوئے آفس کے داخلی دروازے کی رف بڑھے۔

فہد نے بابر کو بھی مستعدی سے اٹھتے دیکھا۔ اس نے پنی جیکٹ کی زپ بند کی اور ہیلمٹ اٹھا کر ان کے پیچھے وانہ ہوگیا۔

وہ دوبارہ اپنے کمرے میں بیٹھ گیا اور وقت گزاری کو پ ٹاپ کھول لیا لیکن اس کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا ابھی تو عثمانی ماحب کو نکلے دس ہی منٹ ہوئے ہیں مجھے خود پر قابو پانا پاہیے۔ اس نے انٹرکام اٹھایا اور کافی کے لیے کہا پھر خود کو کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

عثمانی صاحب باہر نکلے تو بابر کی عقابی نگاہیں اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔

عثمانی صاحب کے ڈرائیور نے گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئے تو بابر بھی اپنی ہیوی بائیک کی طرف دوڑا۔

اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ہیلمٹ پہننے سے پہلے ہی کان میں ہینڈ فری لگا لیا تھا۔ دوسری طرف بلال تھا۔ ”ہاں بلال۔“ بابر نے کہا۔

”سر، رشید نے آج آفس کے اردگرد دو مشکوک آدمیوں کو منڈلاتے دیکھا ہے۔“ بلال نے کہا۔ رشید اس گارڈ کا نام تھا جو سادہ لباس میں آفس کے باہر ڈیوٹی دیتا تھا۔ وہ گاڑیاں صاف کرتا تھا تاکہ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو سکے۔

”ٹھیک ہے۔“ بابر نے کہا۔ ”عثمانی صاحب آفس سے نکل چکے ہیں۔ تم ان کی گاڑی پر نظر رکھنا۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے آ رہا ہوں اور رابطہ منقطع مت کرنا۔ مجھے ایک ایک لمحے کی رپورٹ چاہیے۔“

”اوکے سر۔“ بلال نے کہا۔ پھر بابر کے کانوں میں صرف ٹریفک کا شور ہی گونجتا رہا۔ وہ عثمانی صاحب کی پراڈو سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس نے اسپیڈ بڑھائی اور گاڑی کو اوورٹیک کر کے آگے نکل گیا۔ پھر وہ پراڈو کے بائیں جانب آیا اور اسپیڈ کم کر دی۔ گاڑی اس کے نزدیک سے گزری تو اس نے بہت غور سے اردگرد چلنے والوں کا جائزہ لیا۔

”سر! میں نے موٹر سائیکل پر سوار دو آدمیوں کو دیکھا ہے۔“ بلال کی آواز آئی۔ ”پہلے تو مجھے صرف شبہ تھا، اب یقین ہوگیا ہے۔“

”اوکے۔“ بابر نے کہا اور بولا۔ ”اس وقت [illegible] کہاں ہیں؟“

”وہ عثمانی صاحب کی گاڑی کے بالکل پیچھے ہیں۔“ بلال نے کہا۔ ”میں نے انہیں کور کر رکھا ہے۔“

بابر نے اسپیڈ بڑھائی اور عثمانی صاحب کی گاڑی کے نزدیک پہنچ گیا۔

اچانک بلال کی ہیجانی آواز سنائی دی۔ ”سر! یہ دو نہیں بلکہ چار آدمی ہیں دوسری بائیک ابھی ابھی بائیں جانب کی سروس روڈ سے مین روڈ پر آئی ہے، دونوں بائیک والوں نے ایک دوسرے کو کوئی اشارہ بھی کیا ہے۔ دوسری بائیک بلیک کلر کی سیونٹی سی سی ہے اور......سر، وہ اسپیڈ کم کر کے آپ کے پیچھے آ گئے ہیں۔“

”تم میری فکر مت کرو۔ اس بائیک پر نظر رکھو جو عثمانی صاحب کی گاڑی کے پیچھے ہے۔“

”اوکے سر!“ بلال نے کہا۔ پھر دوسری طرف سے خاموشی چھا گئی۔

آگے سگنل بند تھا۔ سگنل پر تیزی سے بابر نے گن جیب سے نکالی اور بہت مہارت سے اس پر سائیلنسر فٹ کر لیا۔

اسی وقت سگنل کھل گیا۔ اچانک بابر کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی پشت پر زوردار مکا مارا ہو، بابر سمجھ گیا کہ پیچھے سے کسی نے اس پر فائر کیا ہے۔ لیکن بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے وہ بچ گیا تھا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کے سر کے پچھلے حصے میں زوردار جھٹکا لگا۔ دوسرا فائر اس کے سر پر کیا گیا تھا لیکن اس کا ہیلمٹ بھی خصوصی تھا اور مکمل بلٹ پروف تھا۔

اس نے پھرتی سے بائیک سائڈ اسٹینڈ پر لگائی اور اپنا ریوالور نکالتا ہوا اتر گیا۔ بائیک پر سوار دو افراد پر اس کی نظر پڑی۔ دونوں نے ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ وہ بابر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اور ٹریفک کی وجہ سے بھاگ بھی نہیں سکتے تھے۔

اچانک بابر کی طرح وہ بھی بائیک سے اترے اور انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی، بابر نے ایک کے پیر کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا اور لنگڑاتا ہوا پھر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے آدمی پر بابر نے جمپ لگائی اور اسے دبوچ لیا۔

ٹریفک سگنل کھل چکا تھا اور گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ جو گاڑیاں بابر اور ان اچکوں کے بائیکس کے پیچھے

تھیں انہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔

بابر نے ان دونوں کی تلاشی لی اور ان کی جیب سے ایک ایک ٹی ٹی برآمد کرلی، پھر پشت سے ان دونوں کی گردن دبوچی اور فٹ پاتھ کی طرف بڑھا۔ وہاں کئی موٹر سائیکل سوار بھی تماشا دیکھنے کو کھڑے ہوگئے تھے۔

''آپ لوگ ایک کام کریں۔'' اس نے نوجوانوں سے کہا۔ ''یہ دونوں بائیکس راستے سے ہٹا کر ایک طرف لگا دیں۔ میں ان دونوں کو تھانے لے جارہا ہوں۔''

اسی وقت وہاں سے پولیس کی ایک موبائل گزری۔ بابر نے ہیلمٹ اتار کے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

وین کا ڈرائیور بابر کا پرانا شناسا تھا۔ اس نے بابر کو سلام کیا۔ اے ایس آئی وین سے باہر آگیا اور بولا۔ ''بابر صاحب! خیریت تو ہے؟''

''یار، ان دونوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ تم انہیں لے کر تھانے چلو میں ابھی آتا ہوں۔ ہاں، وہ پیچھے ان کی بائیک بھی کھڑی ہے۔ اسے بھی تھانے لے جانا۔''

موبائل وین کے سپاہیوں نے پلک جھپکتے میں ان دونوں کو دبوچ لیا۔

یہ کہہ کر وہ اپنی بائیک کی طرف بھاگا۔ اس ہنگامے میں دس منٹ گزر چکے تھے۔ بابر نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور اسے خوفناک انداز میں دوڑاتا ہوا ٹریفک کے درمیان زگ زیگ چلتا ہوا رواں ہوگیا۔ بھری پری شاہراہ پر اس کی بائیک کی رفتار سو اور ایک سو بیس کو چھو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ اگر خدانخواستہ عثمانی صاحب کو کچھ ہوا تو اس کی سیکیورٹی ایجنسی شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مرجائے گی۔ اسے عثمانی صاحب کی زندگی کی فکر تھی۔ انہیں کوئی نقصان پہنچتا تو بابر کی ساکھ کو شدید نقصان پہنچتا۔

اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔ آگے ایک پیٹرول کا ٹینکر جارہا تھا۔

آئل ٹینکر اور ایک گاڑی کے درمیان مختصر سی جگہ سے گزرنے کے بعد بابر نے رفتار مزید بڑھائی اور بلال سے پوچھا۔ ''بلال تم کہاں ہو؟''

''میں اس وقت کالا پل کراس کر چکا ہوں۔ بائیک والے بھی اب کچھ کرنے کے موڈ میں نظر آرہے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ وہ پراڈو کے برابر پہنچ جائیں لیکن انہیں راستہ نہیں مل رہا ہے۔ ٹریفک بہت زیادہ ہے۔'' بلال نے کہا۔

''تم اگر کوئی خطرہ محسوس کرو تو بائیک والوں کو بلاجھجک اُڑا دینا۔ ویسے میں تم سے زیادہ دور نہیں ہوں۔''

بابر اس وقت ایف ٹی سی کے سامنے تھا۔ اس نے بائیک کی رفتار مزید بڑھائی دی۔

اس کی جنونی ڈرائیو کو دیکھ کر کئی گاڑی والے تو خود ہی سائڈ میں ہوگئے۔

وہ جیٹ فائٹر کی طرح اڑتا ہوا کالا پل عبور کرگیا.... پہلے اسے بلال کی بائیک نظر آئی، پھر پراڈو بھی نظر آگئی اس کے ساتھ ہی اس کی نظر ان دو موٹر سائیکل سوارں پر پڑی جو جان پر کھیل کر پراڈو کے برابر میں پہنچ گئے تھے۔

بابر نے ریوالور بائیں ہاتھ میں تھاما اور اپنی بائیک کی رفتار مزید بڑھا دی۔

بابر کی موٹر سائیکل کی گرج... سن کر وہ دونوں کچھ گھبرا گئے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے پسٹل نکالا اور پلک جھپکتے میں گاڑی پر فائر کردیا۔

بابر کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کیونکہ پراڈو بے قابو ہوئی تھی۔ بابر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پسٹل والے کی گردن پر فائر کردیا۔ دوسرا فائر بلال نے لیا جو موٹر سائیکل چلانے والے کی پیٹھ میں لگا۔ موٹر سائیکل بے قابو ہوکر پُرشور آواز کے ساتھ سڑک پر گری اور دور تک گھسٹتی چلی گئی۔ دونوں سوار بھی سڑک پر گرے اور سڑک پر کچھ دور گھسٹنے کے بعد رک گئے۔

انہیں چھوڑ کر بابر پراڈو کی طرف متوجہ ہوا جو لہراتی ہوئی فٹ پاتھ سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔

بابر چشم زدن میں وہاں پہنچ گیا۔ گولی ڈرائیور کے دائیں بازو میں لگی تھی لیکن عثمانی صاحب محفوظ تھے اور سہمے ہوئے ایک طرف جھکے بیٹھے تھے۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ حملہ آور پھر ان پر فائرنگ کریں۔

''آپ ٹھیک تو ہیں سر؟'' بابر نے اپنا ہیلمٹ اتارتے ہوئے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' عثمانی صاحب نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ڈرائیور کی فکر ہے۔''

''اس کی فکر مت کریں۔'' بابر نے کہا۔ ''اسے بازو میں گولی لگی ہے۔''

بلال اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ بابر نے اسے اشارہ کیا کہ ڈرائیور کو اسپتال لے جاؤ۔

اسی وقت فضا میں کسی ایمبولینس کا سائرن گونجا اور دوسرے ہی لمحے ایمبولینس پراڈو کے نزدیک آکر رک گئی۔

اس سے پہلے ہی ایمبولینس سے دو آدمی اسٹریچر لے کر گاڑی تک آگئے تھے۔ ڈرائیور اس وقت ہوش میں تھا۔ اس نے اسٹریچر پر لیٹنے سے انکار کردیا۔ اور اپنے پیروں پر چل کر ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

بابر نے بلال کو اشارہ کیا۔ وہ بھی ڈرائیور کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گیا۔

ایمبولینس سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہوگئی۔

ان سے کچھ فاصلے پر دوسری ایک ایمبولینس بھی موجود تھی جو مرنے والوں کی لاشیں اٹھا رہی تھی۔

بابر نے اپنی گاڑی وہیں فٹ پاتھ پر چڑھا کر لاک کی اور پراڈو کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''پہلے گھر چلو۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''میں اس وقت سکون چاہتا ہوں۔''

عثمانی صاحب کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بابر مشکل سے سات منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔

گاڑی کا ہارن سن کر چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ بابر نے عثمانی صاحب کو اندر تک چھوڑا اور بولا۔ ''مجھے ابھی بہت سے ضروری کام نمٹانا ہیں۔ مجھے واپسی میں کم سے کم دو گھنٹے لگیں گے پھر میں آپ کو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔ ہاں، آپ کو اسپتال جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آفس کے کسی بھی ذمے دار آدمی کو کال کرکے بتادیں۔ وہ اسپتال چلا جائے گا۔ ویسے ڈرائیور زیادہ زخمی بھی نہیں ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر بابر وہاں سے نکل آیا۔ اسے دوبارہ وہیں پہنچنا تھا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس کی بائیک وہیں کھڑی تھی۔

☆☆☆

فہد بہت بے چینی سے جاوید کی کال کا منتظر تھا۔ اس نے ایک گھنٹے میں خوش خبری سنانے کا وعدہ کیا تھا اب تو دو گھنٹے ہورہے تھے۔

اس نے گھبرا کر جاوید کو ٹیلی فون کردیا۔

دوسری طرف سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ''جی فرمایئے؟''

''مجھے جاوید صاحب سے بات کرنا ہے۔'' فہد نے کہا۔

''کون صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

فہد نے ایک عقل مندی کی تھی کہ جاوید کو ہمیشہ ایک دوسری سم سے کال کرتا تھا۔ جاوید کے سیل میں اس کا نمبر پارٹنر کے نام سے محفوظ تھا۔

''میں جاوید کا ایک دوست ہوں۔'' فہد نے کہا

''جاوید ... ایک حادثے میں زخمی ہوگئے ہیں۔ اور اس وقت جناح اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہیں۔ اس وقت جاوید کو آپ کی ضرورت ہے پارٹنر صاحب۔'' بولنے والے کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''آپ کون صاحب بات کررہے ہیں؟''

''میں انسپکٹر نعیم ہوں۔'' بولنے والے نے جواب دیا۔

فہد لرز کر رہ گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''

فہد نے پہلے تو وہ سم نکال کر توڑ پھوڑ کر پھینک دی جس کے ذریعے وہ جاوید سے بات کیا کرتا تھا، پھر وہ شدید اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ اس کے سر میں اچانک شدید درد شروع ہوگیا تھا۔ اس نے کافی منگائی اور اپنی دراز سے دو پین کلر ایک ساتھ پانی سے نگل گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر جاوید نے اس کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی بکواس کردی تو وہ بہت مصیبت میں پڑ جائے گا۔ اس نے اسپتال جانے کا ارادہ ملتوی کردیا کہ ممکن ہے عثمانی صاحب کی گاڑی پر فائر کرتے ہوئے جاوید کی بائیک کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی ہوگی یا فائر کرتے وقت بے قابو ہوگئی ہوگی۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا اور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ فہد نے سوچا۔ ورنہ زخمی ہونے کی اطلاع پولیس انسپکٹر کیوں دے رہا ہے؟

☆☆☆

بابر اس علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا جہاں اس نے حملہ آور کے دو ساتھیوں کو گرفتار کرکے پولیس کے حوالے کیا تھا۔

بابر پولیس اسٹیشن پہنچا تو اسٹاف کے بہت سے لوگ اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ اس نے پولیس کی جاب چھوڑی ضرور تھی لیکن وہ ماتحت عملے میں اب بھی ہردلعزیز تھا۔

ایک کانسٹیبل نے اسے لاک اپ تک پہنچا دیا جہاں دونوں حملہ آور بند تھے۔ اسے دیکھتے ہی ایک حملہ آور بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! میرا ساتھی زخمی ہے اور اس کا خون ضائع ہورہا ہے۔ اگر اس کا خون اسی طرح بہتا رہا تو یہ مرجائے گا۔''

''تو مرجائے۔'' بابر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم لوگوں نے بھی تو مجھے مارنے کی کوشش کی تھی۔'' پھر اس نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''اسے ابھی تک تم لوگوں نے فرسٹ ایڈ نہیں دی ہے؟''

''اس کا زخم ایسا نہیں ہے کہ یہ مر جائے۔'' کانسٹیبل نے کہا۔ ''گولی اس کی پنڈلی ادھیڑتی ہوئی گزر گئی ہے۔ ہم نے اسے فوری طور پر فرسٹ ایڈ دے دی تھی۔ اس کا خون اب رک چکا ہے۔''

''لیکن پھر بھی اس کا اسپتال پہنچنا ضروری ہے۔'' حملہ آور بولا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' بابر نے پوچھا۔

''میرا نام ارشد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''مجھ پر فائرنگ کیوں کی تھی؟'' بابر نے پوچھا۔

''فائرنگ؟'' اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''ہم آپ پر فائرنگ کیوں کرنے لگے۔ ہم تو آپ کو جانتے بھی نہیں ہیں۔ فائرنگ تو آپ نے ہم پر کی تھی۔ یہ بات تو ہمیں پوچھنا چاہیے۔''

''بہت اچھے جا رہے ہو۔'' بابر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں سچ اگلوانا بھی جانتا ہوں۔ اگر خود ہی سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔'' پھر وہ حوالات کے پاس سے ہٹ گیا۔ اس نے ایس آئی ساجد کو ہدایت کی کہ وہ ان دونوں سے اگلوائیں کہ ان دونوں کا ان حملہ آوروں سے کیا تعلق تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ ''ان لوگوں نے عثمانی صاحب کی گاڑی پر فائرنگ کی تھی۔ یہ عثمانی صاحب کی خوش قسمتی ہی ہے کہ اس حملے میں انہیں خراش تک نہیں آئی، ہاں ان کا ڈرائیور زخمی ہو گیا ہے۔ میں اگر وہاں موجود نہ ہوتا تو اس وقت عثمانی کی موت کی بریکنگ نیوز چل رہی ہوتی۔ تم ان لوگوں سے پوچھ گچھ کر کے مجھے بتاؤ میں اب چلتا ہوں۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ یہ دونوں صرف کرائے کے بدمعاش ہیں۔ انہیں اصل مجرموں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔''

بابر دوبارہ عثمانی صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں پولیس کی ایک موبائل موجود تھی۔ برآمدے میں پولیس کے دو سب انسپکٹر کھڑے تھے۔ شاید وہ لوگ ابھی ابھی آئے تھے۔

''سر، آپ یہاں کیسے؟'' ایک سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''عثمانی صاحب نے میری سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں۔'' بابر مسکرا کر بولا۔ ''آپ لوگ اپنی کارروائی کریں۔ میں عثمانی صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔''

''سر! آپ کوشش کریں، ممکن ہے عثمانی صاحب بیان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔''

''وہ اس وقت کوئی بات نہیں کریں گے، میں کچھ ہی دنوں میں ان کی عادت جان گیا ہوں۔ ہاں، کل تک میں انہیں راضی کر لوں گا۔''

اسی وقت کئی پریس رپورٹر اور مختلف چینلز کے نمائندے بھی وہاں پہنچ گئے۔

''اب ان لوگوں کو روکنا آپ کا کام ہے۔'' بابر نے کہا اور اندر کی طرف چل دیا۔

اس کا نام سن کر عثمانی صاحب نے اسے اپنے بیڈروم میں بلا لیا۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھے۔ کمرے میں ان کا بیٹا طارق اور اس کی بیوی بھی موجود تھی۔

اسے دیکھ کر عثمانی صاحب کھل اٹھے اور بولے۔ ''میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ اب ذرا مجھے تفصیلات بتاؤ۔''

بابر نے انہیں شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ جانتے تھے، تمہیں راستے سے ہٹائے بغیر وہ مجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔''

''جی سر، اسی لیے تو انہوں نے اپنے دو آدمیوں کو میرے پیچھے لگایا اور خود آپ کے پیچھے روانہ ہو گئے۔''

''بابر! میری ایک آفر ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے چیف سیکیورٹی آفیسر کا عہدہ سنبھال لو۔ کمپنی کے تمام گارڈز کو ٹرینڈ کرو یا پھر اپنی مرضی کے آدمی رکھو۔''

''سوری سر!'' بابر نے آہستہ سے کہا۔ ''میں آزادانہ کام کرنے کا قائل ہوں۔ شاید اسی لیے پولیس کی ملازمت میں ناکام رہا۔ میں نے اپنی ایک سیکیورٹی ایجنسی قائم کی ہے اور......''

''تم کسی کو جواب دہ نہیں ہو گے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی بلڈنگ میں ابھی ایک پورا فلور موجود ہے جسے ہم لوگ گودام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تم اپنی ایجنسی کا آفس وہاں قائم کر سکتے ہو۔''

''میں وہاں بیٹھ کر اپنا ذاتی کام کر سکوں گا؟'' بابر نے پوچھا۔

''آف کورس۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''تم اپنے طور پر وہاں کام کرو گے۔ یوں سمجھو، تمہاری ایجنسی کا عثمانی گروپ آف انڈسٹری سے صرف اتنا تعلق ہوگا کہ ہماری

کمپنی بھی تمہاری کلائنٹ ہوگی۔''

''مجھے آپ کی آفر منظور ہے......لیکن......''

''لیکن کیا؟'' عثمانی صاحب نے پوچھا۔

''لیکن میں اس وقت پورا فلور افورڈ نہیں کر سکوں گا۔ پورا فلور کیا میں تو اس کے دو کمرے بھی افورڈ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے میری جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔ تم اس کا معاوضہ نہیں لو گے؟''

''اس کا معاوضہ تو میں لے چکا ہوں۔'' بابر نے کہا۔

''وہ تو ابتدائی اخراجات تھے۔ میں کل ہی سے وہ فلور تمہارے لیے تیار کرواتا ہوں۔ اس کے اخراجات بھی تمہارے معاوضے میں شامل ہوں گے۔''

''سر، میں نے اتنا بڑا کام تو نہیں کیا ہے۔''

''میری جان تمہاری نظر میں سستی ہے؟'' عثمانی صاحب مسکرائے۔

''آپ کی جان تو اللہ نے بچائی ہے سر، میں نے تو صرف کوشش کی تھی۔''

''بس، اب میں کچھ اور نہیں سنوں گا۔'' عثمانی صاحب کے لہجے میں شفقت تھی۔

''بابر صاحب!'' نادیہ نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ ''آپ ڈیڈی کی بات مان جائیں۔ اتنا اصرار تو وہ اپنے بیٹے طارق سے بھی نہیں کرتے ہیں۔''

بابر نے پہلی دفعہ اس خوب صورت لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ سرتاپا قیامت تھی۔ بابر کو لڑکیوں سے دلچسپی نہیں تھی اس لیے اس نے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ اس کے نزدیک ہی وہیل چیئر پر طارق بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر بابر کو افسوس ہوتا تھا۔ اتنا خوب رو جوان وہیل چیئر پر بیٹھا اچھا نہیں لگتا تھا۔

''جب آپ کی ایجنسی کام شروع کر دے گی تو ہمیں گھر پر بھی تو سیکیورٹی کی ضرورت پڑے گی۔'' نادیہ نے کہا۔

''عثمانی صاحب لیوپرڈ سیکیورٹی ایجنسی کے پہلے کلائنٹ ہیں اس لیے سب سے پہلے میں ان ہی کی حفاظت کا فول پروف بندوبست کروں گا۔''

''او کے۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔

''اب مجھے اجازت دیں۔ مجھے ابھی پولیس سے بھی نمٹنا ہے۔''

☆☆☆

فہد ان دنوں بہت زیادہ پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ بات بے بات آفس کے دوسرے اسٹاف کی بے عزتی کر دیتا تھا۔ عثمانی صاحب کے زندہ بچنے کا اسے بہت افسوس تھا۔ اس سے کہیں زیادہ افسوس اسے جاوید کی موت کا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کا دوست تھا۔ افسوس اسے اس لیے تھا کہ اب اس کے پاس بھروسے کا کوئی آدمی نہیں تھا جو عثمانی صاحب کو ٹھکانے لگا سکے۔ وہ حد سے زیادہ مایوس ہو گیا تھا۔

نئی زندگی ملنے کی خوشی میں عثمانی صاحب نے اپنے گھر ایک پارٹی رکھی تھی۔ پارٹی میں اکثریت صنعت کاروں اور تاجروں کی تھی۔ ایک دو بیوروکریٹس بھی تھے۔ عثمانی صاحب نے فہد اور بابر دونوں کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ ان کے علاوہ آفس اسٹاف میں سے آصف، آئی ٹی ہیڈ انوار اور دو منیجرز شامل تھے۔

اس موقع پر نادیہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ طارق بھی بہت خوش تھا۔ فہد موقع کی تلاش میں تھا کہ نادیہ تنہا ہو تو اس سے بات کرے لیکن وہ تو مہمانوں کے درمیان گھوم رہی تھی۔ عثمانی صاحب کے کاروباری دوست ان کے لیے تحائف بھی لائے تھے اور پھول بھی۔

اچانک فہد کی نظر بابر پر پڑی۔ وہ نادیہ سے بہت بے تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ نادیہ بھی مسکرا مسکرا کر اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ فہد کے دل میں اچانک نفرت دوڑ گئی۔ فہد کا پلان اسی حرام زادے بابر کی وجہ سے چوپٹ ہوا تھا۔ بابر نے اسے دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا تو فہد مزید چڑ گیا۔ کمپنی کے دوسرے ملازمین اسے بہت عزت اور احترام سے مخاطب کرتے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر دور سے

وقت بڑا نازک ہے

دو جیب کترے بس اسٹاپ پر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک بار بار اپنی جیبی گھڑی نکال کر دیکھتا اور پھر جیب میں رکھ لیتا۔

اسے بار بار گھڑی نکالتے اور جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ کر دوسرے جیب کترے نے پوچھا۔ ''بھئی یہ تم بار بار اپنی گھڑی نکال کر وقت کیوں دیکھتے ہو؟''

''وقت بڑا نازک ہے۔ میں صرف یہ اطمینان کر رہا ہوں کہ گھڑی ابھی تک میری جیب میں ہی ہے۔''

ساہیوال سے ملک یاسین کی عقل مندی

ہی یوں ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے فہد کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔

آصف کو یہاں بھی یہی پریشانی تھی کہ اسے آئی ٹی کا کوئی ماہر نہیں مل رہا تھا۔ عثمانی صاحب نے اسے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ یا تو آپ اکاؤنٹ ری اسٹور کرائیں یا پھر اکاؤنٹ میں جو گھپلا ہے، اس کی ذمّے داری قبول کریں۔

بالآخر فہد کو نادیہ سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اس نے بہت بےتکلفی سے پوچھا۔ ''کیسی ہو نادی؟''

''میں نادی نہیں، نادیہ طارق عثمانی ہوں مسٹر فہد، مائنڈ اِٹ۔''

''اوہو، تم ابھی تک غصے میں ہو؟'' فہد نے مسکرا کر کہا۔

''تم نے تو اپنی سی کوشش کر لی لیکن ہوا کیا؟''

''کیسی کوشش مسز عثمانی؟'' فہد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ڈیڈی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش۔'' نادیہ نے نفرت سے اسے گھورا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' فہد کو اس کے انداز پر اچانک غصہ آ گیا۔ ''اور تم مجھ سے یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟''

''اپنی اوقات میں رہو ورنہ اس ملازمت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب اگر تمہاری طرف سے ڈیڈی کے خلاف کوئی کوشش ہوئی تو میں پولیس کو سب کچھ صاف صاف بتا دوں گی۔''

''نادیہ! تم غلط سوچ رہی ہو ایسا نہیں ہے۔ میں......''

نادیہ اس کی بات سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔

دوبارہ اسے نادیہ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ نادیہ کی طرف سے خاصا بددل ہو گیا تھا۔ پارٹی میں بھی اس کا دل نہیں لگا اور وہ عثمانی صاب سے اجازت لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر بھی وہ بہت دیر تک نادیہ کے رویّے پر غور کرتا رہا۔ وہ اداکاری نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعی اس سے شدید نفرت کرنے لگی تھی۔ اربوں کی جو دولت اس سے چند قدم کے فاصلے پر تھی اب اس کے لیے خواب و خیال ہوتی جا رہی تھی۔ اس پلان کا بنیادی کردار نادیہ تھی۔ وہی جب اس سے بدظن ہو گئی تھی تو دولت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس نے سوچا اربوں کی دولت نہ سہی، وہ فرم سے کروڑوں روپے تو اب بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ہاں یہ کرنا ہو گا۔ میں کمپنیز کے اکاؤنٹ سے دو چار ارب نکال کر پاکستان سے امریکا یا کینیڈا کی طرف نکل جاؤں گا۔

خواب میں اسے اپنی امی دکھائی دیں۔ وہ بہت افسردہ تھیں اور فہد سے ناراض بھی تھیں۔ انہوں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''فہد، کیا میں نے تجھے اسی دن کے لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ تو میری ہونے والی بہو کو بیچ دے، اس کا سودا کر دے۔''

''میں نے اس کا سودا نہیں کیا ہے امی۔'' فہد نے کہا۔ ''میں نے تو طارق سے اس کی شادی کرائی ہے۔''

''تو نے اس کی شادی...... دولت ہی کے لیے کرائی ہے۔'' امی کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

پھر اسے مشتاق صاحب نظر آئے۔ وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھور رہے تھے۔ اور اس کو لعن طعن کر رہے تھے۔

اچانک فہد کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔ اس نے سائڈ میز پر رکھا ہوا جگ اٹھا کر اس سے پانی لیا اور پورا گلاس ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اس نے سوچا، میں نادیہ سے آخری مرتبہ بات کروں گا اگر اب بھی اس کے دل میں میرے لیے محبت ہے تو مجھے بتا دے، ورنہ میں بھی آئندہ اس کی شکل نہیں دیکھوں گا۔ وہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟

دوسرے دن وہ آفس پہنچا تو اس کی طبیعت بہت بوجھل تھی۔ وہ اب جلد از جلد نادیہ سے آخری بات کرنا چاہتا تھا۔ عثمانی صاحب آفس میں موجود تھے۔ وہ ایک میٹنگ کے بہانے سے نکل گیا۔ اس نے سوچا، عثمانی صاحب کو علم بھی ہو گا کہ میں ان کے گھر گیا تھا تو میں طارق سے ملنے کا بہانہ بنا دوں گا۔

وہ عثمانی صاحب کے بنگلے پر پہنچا تو گارڈ نے اسے دیکھ کر گیٹ کھول دیا۔ لاؤنج میں ایک ملازمہ جھاڑ پونچھ میں مصروف تھی۔ فہد نے اس سے نادیہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ بیگم صاحبہ ٹیرس پر بیٹھی ہیں۔

فہد سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ نادیہ واقعی وہاں موجود تھی۔ فہد کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پہلے کی طرح پیچھے سے نادیہ کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔

نادیہ جب اس سے ناراض ہوتی تھی وہ ایسا ہی کرتا تھا جواب میں نادیہ مصنوعی غصہ دکھاتی، پھر مسکرانے لگتی۔

فہد اپنے دل پر ضبط نہ کر سکا او اس نے بےاختیار نادیہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

نادیہ نے بھڑک کر پلٹنے کی کوشش کی لیکن وہ فہد کی بانہوں کے شکنجے میں تھی اس لیے کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے بپھر کر کہا۔ ''فہد! مجھے چھوڑ دو۔''

''تم مجھے پہچانیں کیسے؟'' فہد نے کہا۔

''میں تمہیں بھی جانتی ہوں اور تمہاری ہر عادت کو بھی۔'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''چھوڑو مجھے۔'' اس مرتبہ نادیہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔

فہد نے اسے چھوڑ دیا اور بولا۔ ''نادیہ! آج میں تم سے صاف صاف بات کرنے آیا ہوں۔ اگر تم اب بھی اپنی ضد پر قائم ہو تو میں آئندہ نہیں آؤں گا بلکہ یہ شہر ہی چھوڑ دوں گا۔'' فہد ایک دم جذباتی ہو گیا۔

''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' نادیہ نے بےاعتنائی سے کہا۔

''تمہاری شادی سے پہلے ہمارے درمیان کیا معاہدہ ہوا تھا؟'' فہد نے کہا۔

''ہمارے درمیان نہیں بلکہ صرف تم نے اپنے طور پر یہ معاہدہ کیا تھا۔'' نادیہ کا لہجہ تلخ تھا۔

''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' فہد نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا اب تمہارے دل میں میری محبت کی کوئی رمق کوئی چنگاری ہے یا پھر پوری زندگی اسی معذور کے ساتھ گزارنا چاہتی ہو؟''

''تمیز سے بات کرو فہد۔'' نادیہ نے اسے جھڑک دیا۔ ''طارق میرے شوہر ہیں اور یہ میری نہیں تمہاری چوائس تھی۔''

''لیکن اس کی کچھ شرائط بھی تو تھیں۔'' فہد نے کہا۔

''تم کیا مجھے کھلونا سمجھتے ہو کہ جب جی چاہا اس سے خوب دل بہلایا اور پھر دولت کے لالچ میں اسے کسی دوسرے کے حوالے کر دیا۔ میں جیتی جاگتی، سانس لیتی عورت ہوں فہد۔ میرے بھی کچھ جذبات ہیں، کچھ احساسات ہیں۔ میں تمہاری اس گھناؤنی خواہش کی خاطر دو انسانوں کی جان نہیں لے سکتی۔ تم تو شاید دولت کے لیے اپنی ماں کا بھی سودا کر دیتے، اپنے باپ کا خون بھی کر دیتے۔''

''بکواس بند کرو نادیہ۔'' فہد اچانک بپھر گیا۔ ''تم میری مری ہوئی ماں کے لیے ایسا کہہ رہی ہو؟''

''میں تمہیں آئینہ دکھا رہی ہوں۔'' نادیہ نے تلخ انداز میں کہا۔ ''میں جانتی ہوں کہ ابھی ڈیڈی پر جو قاتلانہ حملہ ہوا ہے، اس میں تمہارا ہی ہاتھ ہو سکتا ہے۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ میں ایک سال میں تمہارے راستے سے دونوں کانٹے صاف کر دوں گا۔'' پھر وہ چیخ کر بولی۔ ''مجھے نہیں چاہیے ایسی دولت جسے حاصل کرنے کے لیے دو انسانوں کا خون کرنا پڑے۔ میں تمہیں بہت خوددار اور بااصول سمجھتی تھی۔ ترقی کی خواہش ہر انسان کو ہوتی ہے لیکن ایسا جنون صرف مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کو ہوتا ہے تم اسی دن میری نظروں سے گر گئے تھے جب تم نے طارق سے میری شادی کی بات کی تھی۔ میں اسے مذاق سمجھتی رہی لیکن تم تو دولت کے لیے اندھے ہو رہے تھے۔ اس وقت نہ تمہیں میری محبت یاد رہی، نہ میری وفا۔ اب میں تم سے نفرت کرتی ہوں فہد، شدید نفرت۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ مجھے اپنی شکل بھی مت دکھانا ورنہ تم اس ملازمت سے بھی جاؤ گے۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔''

فہد اس سے زیادہ توہین برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بپھر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ تمہاری یہ خوب صورت گردن دبوچ لوں اور اس وقت تک نہیں چھوڑوں جب تک تمہارے جسم میں سانس باقی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں نے تم سے محبت کی تھی، آج بھی کرتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں کرتا رہوں گا۔ اب تم کبھی یہاں میری شکل نہیں دیکھو گی۔'' یہ کہہ کر وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اتر گیا۔

☆☆☆

جب سے بابر نے جان پر کھیل کر عثمانی صاحب کی جان بچائی تھی، وہ اس کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کا ایک فلور تو انہوں نے بابر کو دے ہی دیا تھا، اس کی تزئین و آرائش بھی کمپنی ہی کرا رہی تھی۔ اس پر بابر نے شدید احتجاج کیا تھا لیکن عثمانی صاحب نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''تم آزادانہ طور پر اپنی سیکیورٹی ایجنسی چلانا چاہتے ہو نا، ضرور چلاؤ۔ عثمانی گروپ آف انڈسٹریز سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ہاں، کمپنی صرف تمہاری کلائنٹ ہو گی۔ اس کے علاوہ تم جسے چاہو اپنی خدمات فراہم کر سکتے ہو۔''

''میں چاہتا ہوں کہ آپ کے آفس کا کرایہ بھی میں ادا کروں۔'' بابر نے کہا۔

وہ لوگ اس وقت عثمانی صاحب کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہاں نادیہ بھی تھی اور طارق بھی موجود تھا۔

''میں جانتا ہوں تم بہت خوددار ہو۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''جب تمہاری ایجنسی مالی طور پر مستحکم ہو جائے تو تم ضرور کرایہ دے دیا کرنا لیکن ابھی نہیں۔''

اچانک عثمانی صاحب کو کچھ خیال آیا اور وہ نادیہ سے بولے۔ ''نادیہ بیٹا! ذرا میرا بریف کیس تو کسی سے منگوالو۔''

''میں خود ہی لے آتی ہوں۔ بریف کیس آپ کے بیڈروم کی الماری میں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

''میں نے یہاں بھی سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات کر دیے ہیں۔'' بابر مسکرایا۔ ''بظاہر آپ کو نظر نہیں آئے گا لیکن میرے آدمی ہر وقت یہاں کی نگرانی کرتے ہیں۔''

نادیہ، عثمانی صاحب کا بریف کیس لے کر واپس آگئی۔

عثمانی صاحب نے اس میں سے چیک بک نکالی اور بولے۔ ''میں آفس کے بکھیڑوں اور دوسرے کاموں میں بالکل بھول گیا کہ تمہیں پے منٹ بھی کرنا ہے۔''

''کیسی پے منٹ سر؟'' بابر حیرت سے بولا۔

''بھئی، میں نے سوچا تھا کہ تم نے اتنا بڑا کام کیا ہے۔ میں تمہیں اس کا انعام بھی دوں گا۔'' انہوں نے چیک لکھ کر بابر کی طرف بڑھایا۔

''نہیں انکل!'' بابر نے کہا۔ ''پلیز آپ مائنڈ مت کیجیے گا لیکن میں اپنے کام کا معاوضہ لے چکا ہوں۔''

''یہ انعام ہے بابر صاحب!'' نادیہ نے کہا۔ ''اسے آپ معاوضہ کیوں سمجھ رہے ہیں؟''

''دیکھو ہماری بیٹی کتنی سمجھ دار ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''جو بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی، وہ اس کی سمجھ میں آگئی۔''

''سر پلیز!'' بابر نے کہا۔ ''مجھے مجبور مت کریں۔ انعام، لاکھ، دو لاکھ یا زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ کا ہوتا ہے۔ ایک کروڑ کا نہیں، سوری سر، میں یہ چیک نہیں لے سکتا۔ میں نے اگر آپ کی جان بچائی ہے تو کوئی کمال نہیں کیا۔ یہ میرا پروفیشن ہے۔''

''لیکن میں نے کہا نا کہ یہ انعام ہے۔'' عثمانی صاحب سنجیدہ ہوگئے۔

''مجھے مجبور مت کریں سر۔'' بابر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ میری محنت کا صلہ مجھے مل چکا ہے اور میرے پاپا کہتے تھے کہ جو پیسا بغیر محنت کے آئے، وہ جائز نہیں ہوتا۔''

''او کے۔'' عثمانی صاحب کچھ کھسیانے سے ہوگئے۔ اب تک لوگ ان سے لیتے ہی رہے تھے، کسی نے اتنی خطیر رقم کا چیک محض اپنے اصولوں کی خاطر انہیں لوٹایا نہیں تھا۔

''میں تمہاری خودداری کی قدر کرتا ہوں، تم نہ جانے کس دور میں جی رہے ہو۔''

''سر، میں اسی دور میں جی رہا ہوں لیکن اپنے اصولوں اور ضابطوں کے ساتھ۔''

عثمانی صاحب نے وہ چیک دوبارہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔

''بابر صاحب!'' طارق نے کہا۔ ''سنا ہے آپ کو کُتّے پالنے کا شوق ہے؟''

''ہاں، کتوں کا شوق تو مجھے جنون کی حد تک ہے۔ کتوں کی وجہ سے اماں نے مجھے گھر سے نکال دیا، وہ کہتی ہیں کہ جس گھر میں کتے ہوں، وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ میں نے انہیں لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر کتا چوکیداری اور حفاظت کے لیے پالا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن وہ نہ مانیں۔''

''اور آپ نے گھر چھوڑ دیا؟'' نادیہ نے حیرت سے کہا۔

''تو کیا کرتا؟'' بابر نے کہا۔ ''لیکن گھر چھوڑنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدانخواستہ میرے دل میں اماں یا بابا جان کا احترام نہیں رہا۔ میں اب بھی دن میں کم سے کم دو دفعہ تو اماں کے پاس جاتا ہوں۔''

''بابر صاحب!'' طارق نے کہا۔ ''کتے پالنے کا شوق تو مجھے بھی ہے کیا آپ مجھے گرے ہاؤنڈ یا جرمن شیفرڈ کا ایک جوڑا دے سکتے ہیں؟''

''طارق صاحب! میرے پاس ڈوبر مین کا ایک بہترین پیئر ہے۔ میں نے اپنے ایک دوست سے لیا تھا۔ وہ میں آپ کو دے سکتا ہوں۔''

''ڈیڈی!'' طارق نے بچوں کی طرح کہا۔ ''کیا میں بابر صاحب سے وہ پیئر لے لوں؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔

''طارق صاحب!'' بابر نے کہا۔ ''ڈوبر مین بہت خونخوار کتا ہے۔ آپ کو اس سے مانوس ہونے میں ایک مہینا تو لگ ہی جائے گا۔''

''نو پرابلم۔'' طارق نے کہا۔ ''میں دن بھر گھر میں پڑا پڑا بور ہوجاتا ہوں، مجھے وہ پیئر لادیں۔''

دوسرے دن بابر ڈوبر مین کتوں کا وہ جوڑا لے آیا۔

وہ کتے دیکھنے میں تو اتنے خوفناک نہیں تھے لیکن بقول بابر کے انتہائی خونخوار تھے۔ ابھی ان کی عمر صرف چھ ہفتے تھی۔

طارق کو کُتّے کیا ملے کہ اس کے ہاتھ ایک نیا مشغلہ آگیا۔ اس نے بنگلے کے عقب میں ان کے لیے شاندار ڈاگ ہاؤس بنوادیا۔ اب اس کا زیادہ وقت کتوں ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔

مزید چار ہفتے میں کُتّے خوب بڑے اور تندرست و توانا ہوگئے۔

☆☆☆

فہد اب بہت زیادہ سنجیدہ ہوگیا تھا۔ وہ اسٹاف کے لوگوں پر اب ڈانٹ ڈپٹ بھی نہیں کرتا تھا۔

وہ چند لمحے سوچتا رہا، وہ اب تک خوف کے سائے میں جی رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی دراز سے ایک ڈائری نکالی۔ اس کا جائزہ لیا اور وہ ڈائری لے کر آصف کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ اس مسئلے کو کیس حل کرنا ہے۔

آصف اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ عموماً وہی آصف کو اپنے کمرے میں طلب کرتا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''جی فہد صاحب! کوئی خاص کام ہے۔ آپ مجھے بلا لیتے۔''

''خاص کام ہے اسی لیے تو آیا ہوں۔'' فہد نے مسکرا کر کہا۔ ''اسے کہتے ہیں بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں سر؟'' آصف نے کہا۔

''بھئی جس رقم کا حساب نہیں مل رہا تھا، وہ مل گیا ہے۔ وہ رقم نہ جانے کیسے میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈپازٹ کرادی۔ اس کا حساب اس ڈائری میں ہے۔ ویسے آپ کو یاد ہے کہ وہ رقم کتنی تھی؟''

''مجھے تو وہ فگر ازبر ہیں سر۔'' آصف کے چہرے پر اچانک طمانیت آگئی تھی۔ وہ فگر اکتیس کروڑ اکاون لاکھ چونسٹھ ہزار اور دو سو پندرہ روپے ہے، میری تو راتوں کی نیندیں حرام تھیں سر۔'' آصف نے کہا۔ ''مجھے تو خواب میں بھی یہی فگر نظر آتی تھی۔''

''اس ڈائری میں اتنی ہی رقم کا ایک چیک بھی ہے۔ وہ آپ میرے اکاؤنٹ سے کمپنی کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرادیں۔ اب تو خوش ہیں آپ؟''

''سر، آپ نے تو میری بہت بڑی الجھن دور کردی۔ آج رات مہینوں بعد میں سکون کی نیند سوسکوں گا۔''

''آپ عثمانی صاحب کو بتادیجیے گا کہ وہ رقم غلطی سے فہد صاحب نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادی تھی۔ اب بینک اسٹیٹ منٹ دیکھ کر انہیں علم ہوا کہ میرے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم تو ہی نہیں۔ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ وہ رقم فہد صاحب کے اکاؤنٹ میں [illegible] ہے۔'' یہ کہہ کر فہد کھڑا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے حساب لگایا تو اسے علم ہوا کہ اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں اب صرف ستائیس لاکھ روپے بچے ہیں۔ یہ رقم اس کی محنت کی کمائی کی تھی۔

اس نے ایک کارٹن میں وہاں سے اپنا ذاتی سامان سمیٹا، درازیں خالی کیں اور سارا سامان پیون کے ذریعے اپنی گاڑی میں رکھوادیا۔

عثمانی صاحب صبح سے کسی اہم میٹنگ میں تھے۔ میٹنگ کے بعد آفس آنے کے بجائے ان کا گھر جانے کا پروگرام تھا۔

فہد روانگی سے پہلے آفس کے ہر فرد سے ملا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

گھر جاکر وہ صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ اس نے گھر کے کام کاج کے لیے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو صبح آکر گھر کا جھاڑو پونچھا کرتی، برتن دھوتی، پھر فہد کے لیے کھانا بنا کر فریج میں رکھ کر چلی جاتی۔

اس رات اسے کئی مہینے بعد پُرسکون نیند آئی۔

☆☆☆

آفس کے بعد بابر کا زیادہ وقت عثمانی صاحب ہی کے گھر میں گزرتا تھا بلکہ اکثر وہ سیکیورٹی کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے لنچ کے وقت بھی عثمانی صاحب کے بنگلے پر چلا جاتا تھا۔ نادیہ اور طارق اب اس سے بہت زیادہ بے تکلف ہوگئے تھے۔

ایک دن نادیہ نے باتوں باتوں میں مسکرا کر کہا۔ ''بابر صاحب! ایک بات پوچھوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

''پوچھیں۔'' بابر مسکرایا۔ ''آپ کی بات کا برا مان کر میں اپنا ہی نقصان کروں گا۔''

''یہ بتایئے، پیسے کیا آپ کو کاٹتے ہیں یا آپ کو رقم سے ازلی بیر ہے؟''

''میں سمجھا نہیں میڈم۔'' بابر نے کہا۔

''آپ نے ڈیڈی کا دیا ہوا ایک کروڑ روپے کا چیک واپس کردیا، پچھلے دنوں طارق نے آپ کو پچاس لاکھ روپے دینا چاہے تو آپ نے انکار کردیا، آخر کیوں؟''

''مسز عثمانی!'' بابر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاپا

نے شروع ہی سے میرے ذہن میں یہ بات نقش کر دی تھی کہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت میں جو مزہ ہے وہ حرام کی دولت میں نہیں آتا بلکہ آدمی اس سے مزید پریشانیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو دولت بغیر محنت کے ملے، وہ حرام ہے۔ یہ میرا اپنا نقطہ نظر ہے ورنہ میں نے دولت کی خاطر لوگوں کو خون خرابہ کرتے دیکھا ہے، اپنا ایمان بیچتے دیکھا ہے۔ رشتوں کی بولی لگاتے دیکھا ہے اس دولت سے تو ایک وقت کی روکھی روٹی کہیں بہتر ہے۔''

''آپ نے بالکل صحیح کہا۔'' نادیہ نے کہا۔ ''اور آپ واقعی سب سے الگ ہیں۔''

''مجھے یہ خوف ہے کہ یہ اصول عموماً لوگوں کو پسند نہیں آتے، خاص طور پر لڑکیوں کو تو ان اصولوں سے بیر ہے، اس لیے میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''خیر چھوڑیے اس بات کو۔ آپ جم جوائن کرنے والی تھیں۔ اس کا کیا ہوا؟'' بابر نے موضوع بدل دیا۔

☆☆☆

اس دن حسبِ معمول طارق اپنی وہیل چیئر پر ڈاگ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اب اس کے ڈاگ ہاؤس میں ڈوبر مین کے علاوہ جرمن شیفرڈز اور گرے ہاؤنڈز کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ کتوں کو اپنے ہاتھوں سے غذا کھلاتا تھا تاکہ کتے اس سے مانوس رہیں۔

بنگلے میں طارق کے علاوہ ایک ملازم خیر دین تھا جو کتوں کی دیکھا بھال کرتا تھا۔ کتے اس سے بھی مانوس تھے۔

طارق نے خیر دین سے کہا۔ ''ڈوبر مین کے پنجرے کا دروازہ کھول دو۔''

خیر دین نے پنجرے کے دروازے پر لگا ہوا لاک کھول دیا۔

دونوں کتے اچھل کر باہر نکلے اور غراتے ہوئے خیر دین کی طرف بڑھے۔ ان کی غراہٹ میں پیار نہیں بلکہ شدید غصہ تھا۔ پھر اچانک دونوں کتوں نے خیر دین پر حملہ کر دیا۔ خیر دین بری طرح چیخا لیکن ڈوبر مین غصے میں سب سے پہلے سامنے والے کی گردن دبوچتا ہے اور ہاتھوں سے ادھیڑ دیتا ہے، پھر اپنے مضبوط جبڑے کے جھٹکے سے گردن توڑ دیتا ہے۔

''ٹائی سن!'' طارق نے چیخ کر کتے کو آواز دی اور وہاں پڑی ہوئی وہ چھڑی اٹھالی جو خیر دین اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔

طارق چھڑی لے کر کتوں کی طرف بڑھا۔ یہ اس کی شدید غلطی تھی۔ بپھرا ہوا ڈوبر مین چھڑی یا اس قسم کی کوئی اور چیز دیکھ کر مزید مشتعل ہو جاتا ہے۔ خیر دین کو چھوڑ کر دونوں کتوں نے طارق پر چھلانگ لگا دی۔ انہوں نے طارق کی وہیل چیئر الٹ دی اور اس کا نرخرہ ادھیڑ ڈالا۔

طارق اور خیر دین کی فلک شگاف چیخیں سن کر سب سے پہلے مالی وہاں پہنچا کیونکہ وہ اس حصے کے نزدیک تھا۔ خیر دین اور طارق کو خون میں لت پت دیکھ کر مالی وہاں سے سراسیمہ ہو کر بھاگا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ بچاؤ...... بچاؤ۔''

''کیا ہوا؟'' دو سیکیورٹی گارڈز کود کر اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے اس طرف اشارہ کر دیا جہاں ڈاگ ہاؤس تھا۔

دونوں گارڈز اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے ڈاگ ہاؤس کی طرف دوڑ پڑے۔

دونوں کتوں نے خیر دین اور طارق کا نہ صرف نرخرہ ادھیڑا تھا بلکہ ان کے چہرے اور جسم بھی بھنبھوڑ ڈالے تھے۔ گارڈز کو پہلی ہی نظر میں معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کوئی اب زندہ نہیں ہے۔

کتے گارڈز کی طرف بھی جھپٹے لیکن وہ دونوں پہلے ہی سے تیار تھے، ان کی گنز نے شعلے اگلے اور دونوں کتے وہیں ڈھیر ہو گئے۔

فائرنگ کی آواز سن کر بنگلے کے دوسرے ملازمین کے ساتھ نادیہ بھی ڈاگ ہاؤس کی طرف دوڑی۔ وہاں خیر دین اور طارق کی خون میں لت پت ادھڑی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ نادیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے وہ ہولناک منظر دیکھا پھر اس کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور وہ چکر کھا کر وہیں گر پڑی۔ بنگلے کے تمام ملازمین سہمے کھڑے تھے۔

☆☆☆

فہد نے اطمینان سے ناشتا کیا۔ پھر وہ اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ وہ اٹھ کر اپنا لیپ ٹاپ لے آیا اور اس پر تیزی سے کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے تنقیدی نظروں سے اپنی تحریر کا جائزہ لیا، پھر اسے ای میل کرنے والا تھا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے لیپ ٹاپ کو پرنٹر سے منسلک کیا، اس تحریر کے دو پرنٹ آؤٹ نکالے اور ان پر سائن کر کے انہیں ایک لفافے میں رکھ لیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی طمانیت تھی۔ وہ دوبارہ اخبار لے کر بیٹھ گیا۔ اور بزنس کا صفحہ کھول

کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

اچانک اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر آفس کے جی ایم اظہر کا نام بلنک کر رہا تھا۔ اس نے کال ریسیو کیے بغیر سیل فون صوفے پر اچھال دیا۔

فوراً ہی اس کے سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس مرتبہ بھی جی ایم کی کال تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر سیل فون دوبارہ ایک طرف رکھ دیا اور بڑبڑایا۔ ”جب میں بتا چکا ہوں کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو یہ لوگ کیوں مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں؟“

اس نے دوبارہ اخبار اٹھالیا۔ مشکل سے ایک منٹ گزرا تھا کہ اس مرتبہ اس کی لینڈ لائن کے ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی بجی۔ فہد جھنجلا کر اٹھا۔ ٹیلی فون کے اسکرین پر آصف کا نمبر تھا۔ اس نے جھٹکے سے ریسیور اٹھالیا اور ترش لہجے میں بولا۔ ”آصف صاحب! جب میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں آفس نہیں آسکوں گا، پھر آپ لوگ مجھے کیوں ڈسٹرب کر رہے ہیں؟ اب مجھے کال......“

آصف نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ”سر، عثمانی صاحب کے گھر میں بہت بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ ان کے گھر سے ابھی ان کے ملازم کا ٹیلی فون آیا تھا۔ طارق صاحب کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔“

”وھاٹ؟“ فہد نے حیرت سے کہا۔

”کیسا حادثہ آصف صاحب؟“ فہد گھبرا کر بولا۔

”تفصیلات کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں ایک دو ضروری کام نمٹا کر خود بھی ان کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی پہنچتا ہوں۔“ فہد نے کہا۔

پھر اس نے بہت عجلت میں کپڑے تبدیل کیے اور عثمانی صاحب کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہاں [illegible] منظر ہی عجیب تھا۔ گھر کے ملازمین سہمے ہوئے ایک طرف کھڑے تھے اور پولیس کا ایک سب انسپکٹر ان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ عثمانی صاحب نڈھال سے برآمدے ہی میں ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ اس وقت اپنی عمر سے بھی دس پندرہ سال بڑے لگ رہے تھے۔

فہد ان کے پاس پہنچا تو وہ اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔

فہد پریشان ہو گیا اتنے مضبوط اعصاب اور قوتِ ارادی کا شخص، عثمانی گروپ آف انڈسٹریز جیسے عظیم الشان بزنس ایمپائر کا مالک بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔ اپنے بال نوچ رہا تھا۔

وہ بوجھل قدموں سے ڈاگ ہاؤس کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک اے ایس آئی موجود تھا۔ اس نے فہد کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا۔

وہ منظر اتنا دل خراش تھا کہ فہد کو چکر سا آگیا۔ ایک طرف خیر دین کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ اس کے گرد خون کا تالاب سا بن گیا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر طارق کی وھیل چیئر الٹی پڑی تھی اور اس کے نزدیک ہی طارق کی لاش تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کسی جنگلی درندے نے بری طرح بھنبھوڑا ہو۔ ان دونوں سے کچھ فاصلے پر دونوں کتوں کی لاشیں پڑی تھیں۔

وہاں بابر بھی موجود تھا۔ پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور ایک حوالدار ڈاگ ہاؤس کا تفصیلی جائزہ لے رہے تھے۔

وہ بابر کے نزدیک پہنچ گیا اور اس سے پوچھا۔ ”مسٹر بابر! یہ سب کیا ہے؟“

”یہ ان خونخوار کُتوں کی کارستانی ہے۔“ بابر نے مردہ کتوں کی طرف اشارہ کیا۔

”عثمانی صاحب نے کُتے کب پال لیے؟“ فہد نے پوچھا۔ ”انہیں تو کتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی؟“

”یہ کتے عثمانی صاحب نے نہیں، طارق صاحب نے پالے تھے۔“ بابر نے کہا۔ ”انہیں کتے پالنے کا شوق تھا۔ یہ کتے اس وقت محض چند ہفتے کے تھے جب میں نے طارق صاحب کو لا کر دیے تھے۔ میں نے انہیں سمجھایا بھی تھا کہ آپ کو کتے پالنے کا شوق ہے تو کوئی بے ضرر سا فوکس ٹیریئر یا اسی نسل کا کوئی کتا پال لیں لیکن وہ ڈوبرمین، جرمن شیفرڈ اور گرے ہاؤنڈز پالنا چاہتے تھے۔ کہتے تھے کہ کتا اگر خونخوار نہ ہو تو اسے رکھنے کا کیا فائدہ؟“

بابر کی باتوں نے اسے اور بھی اس سے بدظن کر دیا تھا۔

پولیس اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ پولیس کا ایک فوٹو گرافر دونوں لاشوں کی تصویریں لے رہا تھا اور غالباً ویڈیو بھی بنا رہا تھا۔ فنگر پرنٹ ایکسپرٹ وہاں سے انگلیوں کے نشانات اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے، پھر پولیس نے دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیں۔

عثمانی صاحب اسی حالت میں بیٹھے تھے۔ بابر نے ان سے کہا۔ ”سر! آپ یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہوں گے، چلیں بیڈ روم میں چل کر آرام کرلیں۔“

”اب تو آرام ہی کرنا ہے۔“ عثمانی صاحب نے

کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ”جاؤ تم اپنا کام کرو۔“

بابر اُن کے سرد لہجے کو سن کر پیچھے ہٹ گیا۔

فہد نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”سر، کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے۔ چلیں اٹھیں۔“

اسے دیکھ کر عثمانی صاحب پھر بری طرح رونے لگے۔ فہد نے کہا۔ ”حوصلہ رکھیں سر! پلیز آپ روئیں مت۔“

وہ فہد کا سہارا لے کر اٹھے اور بوجھل قدموں سے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئے۔ عثمانی صاحب تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز ہو گئے۔

فہد کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس نے کمپنی کی وہ رقم لوٹا دی تھی جس کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے ملازمت سے استعفیٰ دینے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ بلکہ استعفے کا پرنٹ آؤٹ نکال کر اس پر سائن بھی کر دیے تھے کہ اچانک یہ سانحہ رونما ہو گیا۔ عثمانی صاحب بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے تھے۔ حالات پہلے والے ہوتے تو وہ عثمانی صاحب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا لیکن نادیہ کے رویّے کے بعد ایک دم سب کچھ اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایسے وقت میں عثمانی صاحب کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔

اس نے عثمانی صاحب کو کافی پلا کر کچھ دیر آرام کا مشورہ دیا اور خود کمرے سے باہر نکل آیا۔ اسے اب تک نادیہ دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ دکھائی دے بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ تو عدت میں ہوگی۔

وہ عثمانی صاحب کے بیڈ روم سے نکل کر لاؤنج میں آکر بیٹھ گیا۔ لاؤنج میں اس وقت آفس کے کئی لوگ موجود تھے۔ ان سبھی کے چہرے پر افسردگی کا تاثر تھا۔ ابھی ایک مرحلہ مزید باقی تھا۔ طارق اور خیر دین کے پوسٹ مارٹم کے بعد ان کی تدفین کا مرحلہ۔

پھر وہ اذیت ناک مرحلہ بھی طے ہو گیا اور طارق کی کٹی پھٹی لاش کو منوں مٹی کے نیچے دبا کر وہ لوگ واپس آگئے۔

طارق کے سانحے کو چھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ فہد آخری بار طارق کی موت کے موقع پر عثمانی صاحب کے بنگلے پر گیا تھا۔ پھر وہاں جانے کو دل ہی نہیں چاہا۔

ایک دن آفس کے جی ایم اور آصف صاحب اس کے پاس آئے۔ آصف نے اس سے کہا۔ ”فہد صاحب! عثمانی صاحب نے تو کسی بھی کام میں دلچسپی لینا چھوڑ دی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ پہلے کی طرح [illegible] کریں۔ ان کی عدم دلچسپی کی وجہ سے کئی [illegible] ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ مارکیٹ میں لوگوں [illegible] دی ہے کہ عثمانی صاحب بیٹے کی موت کے بعد [illegible] کھو بیٹھے ہیں۔“

”ہاں۔“ فہد نے کہا۔ ”اس قسم کی کچھ اطلاعات مجھے بھی ملی ہیں۔“

”عثمانی صاحب گھر میں پارٹی کریں گے تو لوگوں کی یہ غلط فہمی تو دور ہو جائے گی کہ وہ خدانخواستہ ذہنی توازن کھو چکے ہیں۔“ جی ایم اظہر نے کہا۔

”اور یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں۔“ آصف بولا۔ ”وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالتے۔“

”میں کوشش کروں گا، ممکن ہے وہ میری بات مان جائیں۔“ فہد نے کہا۔

وہ دونوں رخصت ہو گئے تو فہد نے سوچا، عثمانی صاحب ہر معاملے میں خوش قسمت ہیں۔ انہیں کام کرنے کے لیے پُرخلوص اور دیانت دار اسٹاف ملا ہے، سیکیورٹی کے لیے بابر جیسا فرض شناس انسان موجود ہے لیکن اولاد کے معاملے میں وہ نہ جانے کیوں بدقسمت نکلے۔

وہ ان کے کمرے میں جانے ہی والا تھا کہ انٹرکام پر انہوں نے خود ہی فہد کو بلالیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے دھچکا سا لگا۔ عثمانی صاحب شکن آلود سوٹ میں ملبوس تھے۔ انہوں نے غالباً دو دن سے شیو بھی نہیں بنائی تھی۔ ان کا چہرہ جو کبھی ہر وقت تر و تازہ رہتا تھا اب مرجھا کر رہ گیا تھا۔

”آؤ فہد!“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ”بیٹھو۔“

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”آج دسمبر کی پچیس تاریخ ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ نئے سال سے عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی نئی پالیسی جاری کر دوں۔ میں اس سلسلے میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”سر، پالیسی میٹر تو آپ ہمیشہ جنرل میٹنگ میں اناؤنس کرتے ہیں پھر......“

”میں ابھی تم سے صرف مشورہ کرنا چاہ رہا ہوں۔“ عثمانی صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں بھی کرب تھا۔

”فہد، میں نے عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے منافع میں سے اسٹاف کو شیئر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اتنی دولت کیا میں قبر میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

''ایسی باتیں مت کریں سر۔'' فہد نے کہا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آفس کے ہر ایمپلائی کا شیئر ون پرسنٹ ہوگا۔''

'ون پرسنٹ۔' فہد نے حیرت سے سوچا۔

''تمام منیجرز، ڈپارٹمنٹ ہیڈز کا شیئر پانچ پرسنٹ ہوگا۔'' عثمانی صاحب نے یوں کہا جیسے پانچ روپے کی بات کر رہے ہوں۔ یہ فہد جانتا تھا کہ یہ پانچ تقریباً ستر سے اسی لاکھ تک ہوگا۔

''سر!......''

''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔'' انہوں نے فہد کو ٹوک دیا۔ ''اس منافع میں تمہارا شیئر تھرٹی پرسنٹ ہوگا۔''

فہد کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ خاموشی سے عثمانی صاحب کو دیکھتا رہا۔

وہ مسکرا کر بولے۔ ''اگر تمہیں یہ کم لگ رہا ہے تو تھرٹی فائیو پرسنٹ کرلو۔''

''نہیں سر۔'' تھرٹی پرسنٹ بھی زیادہ بلکہ بہت زیادہ ہے۔''

انہوں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے فولڈر سے ایک پرنٹ آؤٹ نکالا اور بولے۔ ''اس میں پالیسی کی پوری تفصیل ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''ایک منٹ!'' یہ کہہ کر وہ لیپ ٹاپ پر مصروف ہوگئے۔ پھر اس میں سے دوسرا پرنٹ آؤٹ نکالا۔ اس پر اپنے سائن کیے اور اسٹمپ لگا کر فہد کو دے دیا۔ ''یہ تم آصف صاحب کو دے دینا۔''

''لیکن سر! ایک شرط پر۔'' فہد نے ہمت کر کے کہا۔ ''اس پالیسی کا اعلان ہم نئے سال کے موقع پر ایک تقریب میں کریں گے اور وہ تقریب آپ کے بنگلے پر ہوگی۔''

عثمانی صاحب فہد کی بات سن کر کچھ گم صم سے ہوگئے اور بولے۔ ''بھئی، ہم آفس میں اسٹاف کو ایک پارٹی دے کر بھی اس کا اعلان کر سکتے ہیں۔''

''نہیں سر!'' فہد نے کہا۔ ''آپ کو میری بات ماننا ہی ہوگی۔''

''اوکے۔'' انہوں نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس پارٹی میں صرف آفس کا اسٹاف ہی نہیں ہوگا بلکہ وہ تمام لوگ ہوں گے جو اس سے پہلے ہماری پارٹیز میں شریک ہوتے رہے ہیں۔''

عثمانی صاحب چند لمحے تک اسے خاموشی سے دیکھتے رہے پھر اٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور گلوگیر لہجے میں بولے۔ ''میں واقعی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا اسٹاف ملا جو میرے اپنوں سے بڑھ کر میرا خیال رکھتا ہے۔''

''تو پھر آپ تیار رہیے گا۔ میں رات کو ٹھیک آٹھ بجے آپ کو گھر سے پک کرلوں گا۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے لسٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں معمولی کلرک سے لے کر ہر شخص کا نام تھا، صرف بابر کا نام نہیں تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ بابر عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کا ملازم کب ہے؟

اس دن اسے عثمانی صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے لباس پر توجہ دی تھی بلکہ اپنا مخصوص پرفیوم بھی استعمال کیا تھا۔

وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں پہنچے تو وہاں موجود لوگ عثمانی صاحب کو دیکھ کر چونکے اور ان سے ملاقات کے لیے آگئے۔

فہد نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس نے انتہائی قیمتی اور ماڈرن لباس پہن رکھا تھا، چہرے پر وہی شادابی اور نکھار تھا اور وہ انتہائی خوش نظر آرہی تھی۔

'نادیہ یہاں اکیلی کیا کررہی ہے؟' فہد نے سوچا۔ پھر اسے دوسرا زوردار دھچکا لگا۔ بابر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ وہ بھی بہترین لباس میں تھا اور چہرے پر لگاوٹ کے آثار تھے۔

نوالہ فہد کے حلق میں اٹک گیا۔ اس نے پانی کے گھونٹ سے اٹکا ہوا نوالہ حلق سے نیچے اتارا اور عثمانی صاحب سے کہا۔ ''سر! یہاں کا کھانا تو بہت بکواس ہے۔ آپ کو سی فوڈز پسند ہے نا، چلیے ہم آج سی فوڈز ہی کھائیں گے۔''

اس نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

''تم بھی بعض اوقات میری طرح حرکتیں کرتے ہو۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔ ''ایک لمحے میں فیصلہ کرتے ہو اور اس پر عمل بھی کرلیتے ہو۔ مجھے تمہاری یہی عادت پسند ہے۔''

اب فہد انہیں کیسے بتاتا کہ اس نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟ اس کا تو کچھ کھانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''سر! شاید آپ نے بابر کی سروسز اپنی سیکیورٹی کے لیے حاصل کی ہیں؟''

''اس میں شاید کی گنجائش کہاں ہے؟'' عثمانی صاحب مسکرائے۔

''پھر آپ کا وہ سیکیورٹی چیف کہاں ہے؟'' اس نے

اپنے لہجے کی ناگواری کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''بھئی، اب تو مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کافی عرصے سے کوئی دھمکی آمیز فون یا بھتے کی پرچی بھی موصول نہیں ہوئی ہے اس لیے......''

''اس لیے آپ اپنی سیکیورٹی کی طرف سے بے پروا ہوگئے؟'' فہد نے ان کا جملہ پورا کردیا۔

عثمانی صاحب کی وجہ سے اس نے اگل نگل کر کھانا کھایا، پھر انہیں گھر چھوڑنے کے بعد وہ بھی اپنے گھر چلا گیا۔

فہد کو رہ رہ کر نادیہ کا خیال آرہا تھا۔ اس کی شادی طارق سے تو فہد نے کرائی تھی اس لیے وہ مجبور تھی لیکن بابر میں ایسی کیا خاص بات تھی جو وہ اس سے اتنی بے تکلف ہوگئی تھی کیا وہ بابر کو پسند کرنے لگی تھی؟ فہد نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ نہ صرف یہ ملازمت چھوڑ دے گا بلکہ ملک ہی سے چلا جائے گا لیکن اچانک طارق کی ناگہانی موت کے باعث وہ عثمانی صاحب کو استعفیٰ دینے کی ہمت نہ کرسکا۔

پھر وہ پارٹی کے انتظامات میں مصروف ہوگیا۔ ان کے پاس صرف پانچ دن تھے۔ فہد کے ساتھ آفس کے دوسرے اسٹاف نے مل کر پارٹی کے تمام انتظامات مکمل کرلیے۔

عثمانی صاحب کا بنگلا ایک عرصے بعد بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ اس مرتبہ مہمانوں کا استقبال عثمانی صاحب کے ساتھ فہد بھی کررہا تھا۔ شہر کے کاروباری حلقوں میں اب وہ جانا پہچانا جاتا تھا۔

فہد نے لان کے ایک سرے پر اسٹیج بھی بنوایا تھا اور ساؤنڈ سسٹم کا انتظام بھی کیا تھا۔ لان میں ہلکے سُروں میں مہدی حسن کی کوئی غزل بج رہی تھی۔

عثمانی صاحب اسٹیج پر آئے تو موسیقی یک لخت تھم گئی۔ انہوں نے کہا۔ ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ہر سال کی طرح میں نے اس سال بھی عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کی نئی پالیسی بنائی ہے۔ اس کی تفصیلات آپ لوگوں کو عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ایم ڈی مسٹر فہد رضا صاحب بتائیں گے۔''

فہد اسٹیج پر آیا تو بے شمار افراد کی پُرشوق نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ تقریر کا تو وہ بادشاہ تھا۔ اس نے کمپنی کی پالیسی کا اعلان کیا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر اس کا خیرمقدم کیا۔ اس نے اپنی تقریر ختم کرنے سے پہلے کہا۔ ''عثمانی صاحب نے مجھے جو شیئر دینے کا اعلان کیا ہے۔ میں تمام رقم ایدھی ٹرسٹ کو دینے کا اعلان کرتا ہوں۔ مجھے احساس ہوگیا ہے کہ خوشی دولت سے نہیں ملتی بلکہ انسانیت کی خدمت سے ملتی ہے۔''

''کمپنی کے مالک کا بھتیجا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم نیکر پہن کر دفتر آنے لگو......''

اسی وقت اس کی نظر نادیہ پر پڑی جو غیر یقینی کی حالت میں فہد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت تھی۔

وہ اسٹیج سے نیچے اترا تو اسے میڈیا کے لوگوں نے گھیر لیا۔ ان سے جان چھڑا کر وہ مہمانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ہر شخص فہد کے اس اعلان پر تبصرہ کررہا تھا۔

مہمان کھانے کے بعد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ فہد کئی گھنٹے سے اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا۔ جب ذرا سکون ہوا تو وہ کمر سیدھی کرنے کو لاؤنج کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لان میں مہمان اب تک موجود تھے۔ گھر کے سب ملازمین بھی باہر لان میں تھے۔ وہ جس صوفے پر بیٹھا تھا اس کی پشت خاصی اونچی تھی۔ پھر وہ صوفے پر نیم دراز تھا اس لیے باہر سے آنے والے کو نظر نہیں آرہا تھا۔

اچانک اسے چوڑیوں کی کھنک سنائی دی پھر قدموں کی آہٹ گونجی، آنے والی کوئی خاتون تھی کیونکہ اس کی ہیل کی آواز سے یہی لگ رہا تھا تھوڑی دیر بعد پھر قدموں کی آہٹ ہوئی، فہد کے کانوں میں بابر کی آواز آئی۔ ''تم یہاں بیٹھی ہو، میں تمہیں پورے لان میں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

فہد بری طرح چونک اٹھا۔ اسی وقت نادیہ کی آواز سنائی دی۔ ''میں بہت تھک گئی تھی اس لیے یہاں چلی آئی۔''

''نادیہ!'' بابر نے بہت پیار سے اسے پکارا۔ ''پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''کیسا فیصلہ؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کس فیصلے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ تم طارق سے محبت کرتی

تھیں۔ لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ تمہارے سامنے ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ تم کہو تو میں عثمانی صاحب سے بات کروں؟"

"میری ایک شرط ہے۔" نادیہ نے کہا۔

فہد کا دل اس کی کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"کیسی شرط ڈارلنگ؟" بابر نے رومینٹک ہونے کی کوشش کی۔

"میں اس دولت اور جائداد میں سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گی۔"

"کم آن ڈارلنگ!" بابر نے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ پیسا میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری دولت یا جائداد کی نہیں۔"

نادیہ خوشی سے چہکی۔ "پھر میں موقع دیکھ کر ڈیڈی کی وصیت تبدیل کرا دوں گی۔"

"یہ بعد کا مسئلہ ہے نادیہ۔" بابر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم تو مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم راضی ہو یا نہیں؟"

"ہاں، اس شرط پر میں راضی ہوں۔" نادیہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ویسے فہد نے آج مجھے حیران کر دیا۔ اس نے کروڑوں روپے سالانہ کی رقم ویلفیئر ادارے کو دینے کا اعلان کر دیا۔"

"یہ بھی اس کی کوئی چال ہوگی نادیہ؟" بابر نے ترش لہجے میں کہا۔ "ورنہ کروڑوں کی رقم اس دور میں کون چھوڑتا ہے؟"

فہد کا خون سمٹ کر اس کے چہرے پر آ گیا۔ غصے کی زیادتی سے اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اسے نادیہ سے یہ امید تو کسی بھی صورت میں نہیں تھی کہ وہ ایسی کوئی حرکت بھی کر سکتی ہے۔ فہد کا خیال تھا کہ اب نادیہ زندگی بھر شادی ہی نہیں کرے گی۔ وہ اس کی عادت کو اچھی طرح جانتا تھا لیکن اس کے بارے میں فہد کا اندازہ زندگی میں پہلی بار غلط ثابت ہوا تھا۔

اسے نادیہ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ ابھی ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔

"ویسے تم بھی عجیب ہو نادیہ۔" بابر نے ہنس کر کہا۔ "طارق سے......"

"مجھے طارق سے کبھی بھی محبت نہیں تھی۔" نادیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "بس ایک رشتہ تھا جسے میں نبھا رہی تھی۔"

اسی وقت لاؤنج میں کوئی اور داخل ہوا۔ پھر فہد کے کانوں میں ایک مرد کی آواز آئی۔ "سر! آپ یہاں بیٹھے ہیں، میں آپ کو باہر ڈھونڈ رہا ہوں۔" وہ غالباً بابر کا کوئی ماتحت تھا۔

"میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں۔" نادیہ نے کہا اور وہاں سے رخصت ہو گئی۔

فہد کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا جسم مفلوج ہو گیا ہو۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کچھ دیر بعد وہ کچھ سنبھلا تو اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کی، اس مرتبہ وہ کامیاب رہا اور ڈگمگاتے قدموں سے باہر کی طرف چل دیا۔ کوئی اس حالت میں اسے دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا کہ فہد بہت زیادہ نشے میں ہے۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے؟" عثمانی صاحب نے فہد سے پوچھا۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آفس پہنچے تھے۔

"سر! آپ خود ہی دیکھ لیں۔" فہد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"ہر اہم میل پڑھنا اور اس کا جواب دینا تمہاری ذمّے داری ہے۔" عثمانی صاحب نے کہا۔

"لیکن سر! یہ صرف آپ کے لیے ہے۔" فہد نے نظریں جھکا کر کہا۔

عثمانی صاحب نے فہد کا دیا ہوا فولڈر اپنی طرف گھسیٹا اور چشمہ لگا کر وہ تحریر پڑھنے لگے۔

تحریر پڑھ کر ان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ انہوں نے اپنا چشمہ اتار کے میز پر پھینکا اور درشت لہجے میں بولے۔ "وہاٹ نان سینس! تم عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کو چھوڑ رہے ہو؟"

"جی سر۔" فہد نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"کیوں؟" عثمانی صاحب نے کہا۔ "یہاں تمہیں کوئی تکلیف ہے، کوئی دوسرا ادارہ تمہیں اس سے زیادہ سیلری اور مراعات دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے بتاؤ۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سر۔" فہد نے کہا۔ "میں اب یہاں جاب نہیں کر سکتا۔ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں۔"

عثمانی صاحب چند لمحے اسے گھورتے رہے، پھر گلوگیر لہجے میں بولے۔ "تم سب مجھے چھوڑ جاؤ، طارق کی تو زندگی ہی اتنی تھی، وہ مجھے چھوڑ گیا تو یہ اللہ کی مرضی ہے لیکن اب تم بھی مجھے چھوڑ رہے ہو اور نادیہ بھی شادی کر رہی ہے۔ میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا لیکن......" عثمانی صاحب کی آواز بھرا گئی اور وہ آگے کچھ نہ بول سکے۔

فہد خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ایسا کرو۔" عثمانی صاحب نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "تم فوری طور پر استعفیٰ مت دو۔ کچھ دن چھٹی پر چلے جاؤ۔ دو مہینے، چار مہینے یا ایک سال۔" عثمانی صاحب نے کہا۔ "تم کام کر کے بہت تھک چکے ہو، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تمہارے سفر کے تمام اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ اس دوران میں تم ٹھنڈے دل سے سوچنا، پھر تم جو فیصلہ بھی کرو گے، مجھے منظور ہوگا۔ بس اب انکار مت کرنا۔" عثمانی صاحب نے کہا اور اس کا استعفیٰ پھاڑ کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔

فہد نے سوچا، چلو یونہی سہی۔ عثمانی صاحب بھی اس دوران میں ذہنی طور پر تیار ہو جائیں گے۔

"او کے سر۔" فہد نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"آج تم کافی نہیں پیو گے؟"

"آپ کی کافی سے بھلا میں انکار کر سکتا ہوں۔" فہد نے مسکرا کر کہا۔ وہ کشیدگی کم کرنا چاہتا تھا۔

عثمانی صاحب نے انٹرکام پر کافی کے لیے کہا، پھر اس سے بزنس کی باتیں کرتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد ان کی آفس میڈ کافی لے آئی۔

فہد نے کافی کا مگ اپنی طرف کھسکایا تو وہ جلدی سے بولی۔ "یہ کپ باس کا ہے سر! باس کافی میں شوگر نہیں لیتے ہیں۔"

"کبھی کبھی شوگر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔" فہد نے مسکرا کر کہا۔

اس نے کپ سے کافی پینا چاہی تو میڈ جلدی سے بولی۔ "سر پلیز! ڈاکٹر صاحب نے باس کو شوگر لینے سے بہت سختی سے منع کیا ہے۔"

"میرا کپ مجھے دے دو یار۔" عثمانی صاحب نے کہا۔ "یہاں قدم قدم پر خیر خواہ موجود ہیں۔" ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

فہد نے وہ مگ عثمانی صاحب کو دے دیا۔ اس مگ کا رنگ اسکائی بلیو تھا، فہد کا مگ آف وہائٹ تھا۔ شاید اسی لیے وہ مختلف مگ لے کر آئی تھی کہ پہچاننے میں آسانی رہے۔

آفس میڈ نے ٹرالی سے بسکٹ اور سینڈوچز نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے اور آہستہ سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

عثمانی صاحب نے اپنے مگ سے ایک سپ لیا اور انٹرکام پر اپنی سیکریٹری کو زیکو انٹرپرائزز کا نمبر ملانے کو کہا۔

"یہ لوگ پھر کوئی گڑبڑ کر رہے ہیں سر۔" فہد نے پوچھا۔ "ڈیو ڈیٹ گزرنے کے بعد بھی ان کی طرف سے پے منٹ نہیں آئی ہے۔"

"میرے خیال میں تم تو چھٹی پر ہو؟" عثمانی صاحب نے مسکرا کر کہا اور کافی کا سپ لیا۔

"میں ابھی تو آفس میں موجود ہوں۔ اس قسم کے معاملات......" اس نے دیکھا کہ عثمانی صاحب کے چہرے پر تکلیف کے آثار ہیں اور اسپلٹ چلنے کے باوجود ان کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملانے لگے تھے۔ فہد تشویش سے بولا۔ "سر، آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں...... میں...... ٹھیک ہوں...... ذرا پنکھا چلا دو اور میری...... ٹائی......" ان کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ "کھڑکی...... کھول...... دو...... میرا...... دم...... گھٹ رہا ہے......"

فہد جھپٹ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے سوچا کہ ایمبولینس کے لیے ٹیلی فون کرے پھر اس نے آپریٹر سے کہا۔ "میرے ڈرائیور سے کہیں، وہ فوراً گاڑی نکالے۔ عثمانی صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانا ہے۔ ہری اَپ۔"

"او کے سر۔" آپریٹر نے کہا۔

فہد نے عثمانی صاحب کی کرسی گھما کر انہیں بہت مشکل سے کندھے پر اٹھایا اور باہر کی طرف دوڑا۔ وہ کوریڈور ہی سے چیخا۔ "لفٹ اوپر منگاؤ۔"

آفس کا پورا اسٹاف فہد کے گرد اکٹھا ہو گیا لیکن فہد بھاگتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھا اور اس میں سوار ہو گیا۔ عثمانی صاحب اب گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

ڈرائیور نے فہد کی گاڑی داخلی دروازے کے سامنے لگا دی تھی۔ اس نے جلدی سے عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ فہد انہیں لے کر گاڑی میں سوار ہوا اور ڈرائیور سے بولا۔ "جتنی تیزی سے چل سکتے ہو اسپتال چلو۔ آج تمہاری مہارت اور ڈرائیونگ کا بھی امتحان ہو جائے گا۔"

ڈرائیور نے گاڑی کا انجن پہلے ہی اسٹارٹ کر رکھا تھا۔ اس نے گاڑی گیئر میں ڈالی اور زناٹے سے آگے بڑھا دی۔ ایک عقل مندی اس نے یہ کی تھی کہ لینڈ کروزر نکالی تھی۔

پھر فہد اس کی مہارت پر واقعی اش اش کر اٹھا۔ وہ گاڑی کو یوں دوڑا رہا تھا جیسے نوجوان لڑکے اپنی ٹریل موٹر سائیکلوں کو گھماتے ہیں۔

"کسی بھی سگنل کی پروا مت کرنا۔" فہد نے کہا۔

''بس یہ خیال رکھنا کہ اس کی وجہ سے گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرانہ جائے۔''

''جی سر۔'' ڈرائیور نے کہا اور گاڑی کی اسپیڈ مزید بڑھا دی۔ دو تین دفعہ وہ انتہائی سنگین حادثوں سے بال بال بچا لیکن وہ آندھی اور طوفان کی طرح گاڑی چلاتا ہوا آغا خان کے ایمرجنسی وارڈ تک پہنچ گیا۔

گاڑی دیکھتے ہی وارڈ بوائز اسٹریچر لے کر ان کی طرف دوڑ پڑے۔ اس تمام بھاگ دوڑ میں فہد بری طرح ہانپ گیا تھا۔ کئی مہینے سے وہ جوگنگ بھی نہیں کر رہا تھا۔

ڈرائیور پارکنگ میں گاڑی لگا کر آیا تو آفس کا دوسرا اسٹاف بھی وہاں پہنچ گیا۔ ہر آدمی فہد سے یہ سوال کر رہا تھا کہ اب عثمانی صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ابھی تک مجھے بھی کچھ معلوم نہیں ہے۔ ڈاکٹرز نے انہیں آئی سی یو میں شفٹ کر دیا ہے۔'' فہد نے جواب دیا۔

اس کی نظر بابر پر بھی پڑی۔ وہ بھی پریشان پریشان سا وزیٹنگ ایریا میں بیٹھا تھا۔ فہد کو دیکھ کر وہ اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''فہد! آخر ہوا کیا تھا؟''

''فہد؟'' فہد نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''تم میرا نام کب سے لینے لگے۔''

''سوری سر!'' بابر نے جلدی سے کہا لیکن لہجے کی ناگواری کو نہ چھپا سکا۔

''میں اس وقت بہت ٹینس ہوں اس لیے ابھی مجھ سے کچھ مت پوچھو۔''

''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس وقت آپ ہی عثمانی صاحب کے ساتھ تھے۔'' بابر نے کہا۔

''احمقانہ سوالات سے پرہیز کرو مسٹر سیکیورٹی آفیسر!'' فہد اس کی توہین کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ بابر کو کھڑے کھڑے وہاں سے نکال دیتا۔

اسی وقت نادیہ حواس باختہ سی وہاں پہنچ گئی۔

''ڈیڈی کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''ابھی تک ڈاکٹرز نے کچھ بتایا نہیں ہے۔'' فہد کا لہجہ خشک تھا۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

فہد اس جگہ ٹھہر گیا جہاں سیکیورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔ وہاں سے آگے جانا بند تھا۔

اسی وقت ایک نرس اندر سے برآمد [redacted] بولی۔ ''مسٹر فہد آپ ہی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' فہد نے جواب دیا۔ اس کا دل انجانے خدشات سے بری طرح دھڑکنے لگا۔

''ڈاکٹر سلطان آپ کو بلا رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''سیکیورٹی گارڈ نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

ڈاکٹر سلطان چند بہترین فزیشن اور کارڈیالوجسٹ میں سے ایک تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''مسٹر فہد! عثمانی صاحب کی کنڈیشن بہت کریٹیکل ہے۔ انہیں بہت سیریز ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ آئندہ بارہ گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ اگر یہ بارہ گھنٹے خیریت سے گزر گئے تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہو جائے گی۔'' پھر ڈاکٹر کچھ سوچ کر بولا۔ ''عثمانی صاحب کب سے ہارٹ پیشنٹ ہیں؟''

''عثمانی صاحب ہارٹ پیشنٹ نہیں ہیں۔ انہیں شوگر ضرور ہے لیکن وہ بھی کنٹرول ہے۔''

''انہوں نے کوئی ایسی چیز تو نہیں کھائی ہے جس سے ان کا بلڈ پریشر ایک دم شوٹ اَپ کر گیا ہو؟''

'ڈاکٹر صاحب! میں اس وقت ان کے ساتھ ہی تھا۔ ہم لوگ کافی پی رہے تھے۔ انہوں نے شاید ایک بسکٹ بھی کھایا تھا۔''

''پھر؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''عثمانی صاحب نے مشکل سے کافی کے دو تین گھونٹ ہی پیے تھے کہ ان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ چہرہ پسینے میں تر ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ ان کی حالت دیکھ کر میں نے ایمبولینس کا انتظار بھی نہیں کیا اور انہیں اپنی گاڑی میں لے کر دوڑ پڑا۔''

''اچھا۔'' ڈاکٹر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''عثمانی صاحب نے اس وقت کافی پی تھی اور ایک دو بسکٹ لیے تھے؟''

''جی ہاں سر، ہم دونوں ہی کافی پی رہے تھے۔'' فہد نے جواب دیا۔

''بسکٹس کی وہ پلیٹ اور بچی ہوئی کافی تو اب وہاں موجود نہیں ہوگی؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''وہ چیزیں اب بھی وہیں موجود ہوں گی۔ عثمانی صاحب کے روم کا ڈور آٹومیٹک ہے۔ وہ ایک دفعہ بند ہو جائے تو پھر عثمانی صاحب سے بھی نہیں کھلتا۔''

''وہاٹ ڈو یو مین؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب، عثمانی صاحب اتنی بڑی گروپ آف انڈسٹریز کے سی ای او ہیں ان کے روم میں بہت سی کانفیڈینشل فائلز اور ڈی وی ڈیز موجود ہیں۔ اس لیے میں نے ان کے دروازے کے لیے اس خصوصی لاک کا انتظام کیا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد چابی کے ساتھ ساتھ نمبروں سے کھلتا ہے اور غفور نمبرز کا کمبی نیشن ڈیلی ایک دن چھوڑ کر بدل دیتا ہے۔ صرف غفور ہی ان کے روم کا دروازہ کھول سکتا ہے۔''

''آپ نے بہت ضروری بات پوائنٹ آؤٹ کی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے اپنا گاؤن پہنا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر سلطان ''ابھی'' کہہ کر آدھے گھنٹے بعد واپس آئے اور بولے۔ ''فہد صاحب! یہ پولیس کیس ہے۔ کسی نے عثمانی صاحب کو زہر دیا ہے۔''

''وہاٹ؟'' فہد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا ہوا، آپ نے ہمیں بتا دیا۔''

''میں پولیس کو انفارم کر رہا ہوں۔ آپ ابھی یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔''

''آپ پولیس کو ضرور بلائیں لیکن پلیز پہلے مجھے عثمانی صاحب کی کنڈیشن کے بارے میں بتا دیں۔''

''ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آئندہ بارہ گھنٹے بہت سیریس ہیں۔''

''اب تو گیارہ گھنٹے رہ گئے ہیں ڈاکٹر۔'' فہد نے کہا۔

''چلیے گیارہ گھنٹے ہی سہی۔'' ڈاکٹر مسکرایا۔ ''آپ شاید عثمانی گروپ آف انڈسٹریز کے ایم ڈی ہیں۔''

''جی ہاں، فہد نے کہا اور بوجھل قدموں سے باہر نکل آیا۔

ایک مرتبہ پھر اسے آفس اسٹاف نے گھیر لیا۔ فہد نے صرف اتنا بتایا کہ عثمانی صاحب ابھی خطرے سے باہر نہیں ہیں۔ آئندہ بارہ گھنٹے ان کے لیے بہت اہم ہیں۔ انہیں بہت شدید قسم کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔''

''عثمانی صاحب ہارٹ پیشنٹ تو نہیں ہیں؟'' بابر نے کہا۔

''ہارٹ اٹیک تو کسی کو بھی دبے پاؤں دبوچ لیتا ہے۔''

وقت بہت سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ آفس کا بیشتر اسٹاف بالخصوص خواتین جا چکی تھیں۔ اب وہاں فہد، آصف، جی ایم اظہر اور آئی ٹی ہیڈ طاہر کے علاوہ بابر اور نادیہ تھے۔

فہد نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آصف اور اظہر اصرار کر کے اسے کیفے ٹیریا لے گئے۔ ان لوگوں نے نادیہ اور بابر کو بھی کیفے ٹیریا چلنے کو کہا۔

آصف کافی اور کچھ ہلکا پھلکا اسنیکس کا سامان لے آیا۔

ابھی انہوں نے کھانا ہی شروع کیا تھا کہ [illegible] ایس ایس پی کرائمز نواز احسن پر پڑی۔ وہ چونک [illegible] بولا۔ ''یہ ایس ایس پی یہاں کیا کر رہا ہے؟''

نواز احسن اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ اس [illegible] کاؤنٹر سے کافی کا ایک مگ لیا اور ان کے نزدیک ہی ایک میز پر آ بیٹھا پھر وہ بابر کو دیکھ کر بولا۔ ''تم ابھی تک پاکستان میں ہی ہو؟''

''سر، میں اپنا ملک چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں۔'' بابر مسکرایا۔

کیفے ٹیریا سے اٹھ کر وہ لوگ دوبارہ ایمرجنسی کے وزیٹنگ ایریا میں آ گئے۔

نرس نے ایک مرتبہ پھر فہد کو بلایا اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر سلطان آپ کو بلا رہے ہیں۔

ڈاکٹر سلطان نے مسکرا کر اسے دیکھا اور کہا۔ ''مبارک ہو مسٹر فہد! عثمانی صاحب کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ہم کل تک انہیں روم میں شفٹ کر دیں گے۔''

''تھینک یو ڈاکٹر!'' فہد نے ممنونیت سے کہا۔ ''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''نو۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ابھی ان سے کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ ویسے بھی ایس ایس پی نواز نے سختی سے تاکید کی ہے کہ ابھی کوئی ان سے نہ ملے۔''

''او کے ڈاکٹر۔'' فہد نے مسکرا کر کہا اور باہر آ گیا۔ باہر آ کر اس نے وہاں موجود لوگوں کو یہ خوش خبری سنائی تو ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔

بابر نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''تھینکس گاڈ! اگر خدانخواستہ عثمانی صاحب کو کچھ ہو جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرتا۔''

نادیہ کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔

''آپ لوگ اب گھر جا کر آرام کریں۔'' فہد نے کہا۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

''میں بھی یہاں رکوں گی۔'' نادیہ نے کہا۔

''میڈم نادیہ!'' فہد نے کہا۔ ''آپ کے یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یوں بھی یہاں مریضوں کے اٹینڈنٹ کو رکنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ کو پوری رات باہر لان میں گزارنا پڑے گی۔ دیکھیے، نیچے کتنے لوگ بینچوں پر بیٹھے ہیں۔''

''فہد سر ٹھیک کہہ رہے ہیں میڈم۔'' آصف نے کہا۔ ''آپ گھر جائیں۔ کل انشاء اللہ عثمانی صاحب کمرے میں

شفٹ ہوجائیں گے تو آپ یہاں آجایئے گا۔''

وہ سب اصرار کر کے نادیہ کو گھر لے گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ بابر بھی چلا گیا۔

ڈاکٹر سلطان بھی ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے فہد سے کہا۔ ''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ پے منٹ پر ایک روم بک کرالیں۔ میں دیکھتا ہوں، پرائیویٹ ونگ میں کوئی روم ضرور خالی ہوگا۔''

''تھینک یو ڈاکٹر اس سے مجھے بہت آسانی ہوجائے گی۔''

ڈاکٹر سلطان نے فہد کے لیے ایک روم بک کرادیا۔ آرام دہ بیڈ پر نیم دراز ہوکر فہد کو کافی آرام ملا۔ وہ صبح سے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا تھا اور اب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو فہد چونک پڑا۔ اس نے کہا۔ ''یس پلیز!''

دروازہ کھول کر ایس ایس پی نواز احسن اندر آگیا اور بولا۔ ''سوری سر، ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں لیکن مجھے......''

''اِٹز او کے آفیسر۔'' فہد نے کہا۔ ''فرمایئے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو مجھے تفصیل سے بتائیں کہ جب عثمانی صاحب کی طبیعت بگڑی تو اس وقت کیا حالات پیش آئے تھے؟''

فہد نے ایس ایس پی کو ہر بات تفصیل سے بتادی، صرف استعفے کی بات اسے نہیں بتائی۔

''وہ آفس میڈ کب سے آپ کے آفس میں کام کر رہی ہے؟''

''اس درجے کے ملازمین کی ذمّے داری جی ایم صاحب کی ہے، ویسے میں نے اس لڑکی کو اس دن پہلی دفعہ دیکھا تھا۔''

''چائے، کافی وغیرہ تو آپ بھی منگواتے ہوں گے؟'' نواز نے پوچھا۔

''جی ہاں، میں بھی چائے اور کافی وغیرہ پیتا ہوں لیکن میری چائے مجھ تک میری پی اے پہنچاتی ہے ممکن ہے وہ آفس میڈ اسے ٹرالی دے کر چلی جاتی ہو۔''

''تو پھر عثمانی صاحب کے کمرے میں وہ براہِ راست کیسے آگئی؟''

''عثمانی صاحب کی پی اے چھٹی پر تھی۔'' فہد نے جواب دیا۔

''آپ نے عثمانی صاحب کا مگ اٹھایا تو اس کا کیا ری ایکشن تھا؟''

''وہ گھبرا کر بولی تھی کہ سر، یہ مگ باس کا ہے۔ وہ شوگر نہیں لیتے۔ میں نے مذاق میں کہا کہ کبھی کبھی شوگر بھی لے لینا چاہیے۔ اس پر وہ مزید گھبرا گئی تھی اور بولی کہ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ عثمانی صاحب کو شوگر نہ دی جائے۔''

''او کے مسٹر فہد۔'' نواز نے کہا۔ ''اب آپ آرام کریں، صبح شاید میں پھر آپ کو زحمت دوں۔''

فہد جوتوں سمیت ہی بستر پر گر گیا اور ایسا سویا کہ صبح دس بجے وارڈ بوائے کے جگانے پر اس کی آنکھ کھلی۔

وہ فریش ہوکر باہر نکلا تو نادیہ اور بابر کے علاوہ جی ایم اظہر اور آصف بھی وہاں موجود تھا۔

''آپ لوگوں کو تو اس وقت آفس میں ہونا چاہیے تھا۔'' فہد نے سرد لہجے میں کہا۔

''آفس میں عجیب ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ پولیس نے عثمانی صاحب کا روم کھلوا کر بچی ہوئی کافی اور بسکٹ وہاں سے حاصل کر لیے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ آفس میڈ کل سے غائب ہے۔''

''وہاٹ؟'' فہد نے جھنجلا کر کہا۔ ''اظہر صاحب، اسے آپ نے اپائنٹ کیا تھا۔ اس کی فائل میں ایڈریس تو ہوگا؟''

''وہ ایڈریس غلط ہے، اس نے جو ٹیلی فون نمبر دیا تھا وہ بھی غلط ہے۔''

''اور آپ نے بغیر چھان بین کیے اسے ملازمت دے دی؟''

اسی وقت ڈاکٹر سلطان مسکراتا ہوا آیا اور بولا۔ ''فہد صاحب! ہم نے عثمانی صاحب کو روم میں شفٹ کردیا ہے۔ اب آپ ان سے مل سکتے ہیں صرف آپ۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''میں بھی ڈیڈی سے ملنا چاہتی ہوں ڈاکٹر۔'' نادیہ نے کہا۔

''اس کے لیے آپ کو ایس ایس پی نواز احسن صاحب سے اجازت لینا پڑے گی۔ یہ اب پولیس کیس بن چکا ہے میڈم، اقدامِ قتل کا کیس۔''

''فکر مت کریں میڈم!'' فہد نے کہا۔ ''میں نواز صاحب سے بات کروں گا۔ آپ کا حق تو مجھ سے زیادہ ہے۔ وہ آپ کو نہیں روکیں گے۔''

عثمانی صاحب کی حالت اب قدرے بہتر تھی۔ وہ تکیوں کے سہارے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ فہد کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ ''فہد! مجھے صرف تمہاری وجہ سے نئی زندگی ملی ہے۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اگر میں پانچ منٹ مزید لیٹ ہوجاتا تو میرا بچنا محال تھا۔''

''زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے سر۔'' فہد نے کہا۔

''آپ کی زندگی تھی اس لیے اللہ نے آپ کو بچالیا ورنہ میں لاکھ کوشش کرتا، کچھ بھی نہ ہوتا۔''

''اب تم آفس جاؤ، آج میری کئی اہم میٹنگز تھیں۔ یا تو انہیں کینسل کردینا یا پھر اپنے طور پر انہیں ڈیل کرلینا۔ اب تمہیں بھی بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں تو یہاں محفوظ ہوں، تم بابر کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

''سر، میرا جانا کیا ضروری ہے؟''

اسی وقت نرس نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ''مسٹر فہد! اب پیشنٹ کو آرام کرنے دیں۔''

''او کے۔'' فہد نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بابر باہر موجود تھا۔ فہد اسے اپنے ساتھ رکھنا تو نہیں چاہتا تھا لیکن اسے ساتھ لے جانا بھی ضروری تھا۔ جب سے وہ نادیہ کے عاشق کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ فہد کو اس سے نفرت ہوگئی تھی۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ 'مسٹر بابر! آپ آج سے میری سیکیورٹی کریں۔ میرے ساتھ آئیں۔''

''میں عثمانی صاحب کی سیکیورٹی کا ذمّے دار ہوں۔''

''آپ کی خدمات عثمانی گروپ آف انڈسٹریز نے حاصل کی ہیں اور اس ایگریمنٹ پر عثمانی صاحب کے نہیں بلکہ میرے سائن ہیں۔ ادارے کے ایم ڈی کی حیثیت سے میں آپ کو کسی کی بھی سیکیورٹی پر مامور کرسکتا ہوں۔ آیئے میرے ساتھ بلکہ آپ تو اپنی بائیک پر ہوں گے۔''

بابر کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جارہا تھا۔

فہد اسے حکم دے کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہ اسپتال سے پہلے گھر گیا۔ وہاں سے تیار ہوکر آفس پہنچا تو حیران رہ گیا۔ آفس کے اردگرد پولیس والے موجود تھے۔

فہد لفٹ سے نکل کر کوریڈور میں پہنچا تو وہاں بھی پولیس کے دو جوان موجود تھے۔ آفس کے ہال کمرے میں فہد کو ایس ایس پی نواز اور ایک سب انسپکٹر نظر آیا۔

فہد کے پیچھے ہی بابر بھی ہال کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ہنس کر نواز سے بولا۔ ''سر، آپ یہاں اپنا ٹائم کیوں ضائع کر رہے ہیں جاکر اس آفس میڈ کو تلاش کریں۔''

''آفس میڈ مل چکی ہے۔ وہ بہت بری طرح زخمی ہے لیکن میں نے ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں اس کا بیان لے لیا ہے۔'' اس نے سب انسپکٹر کو اشارہ کیا۔

وہ آگے بڑھا اور بولا۔ ''بابر صاحب! میں آپ کو عثمانی صاحب اور اس آفس میڈ آسیہ کے اقدامِ قتل میں گرفتار کرتا ہوں۔'' اس نے جیب سے اسٹیل کی پتلی سی لیکن مضبوط ہتھکڑی نکالی اور بابر کے ہاتھوں میں ڈال دی۔

بابر نے حیرت سے کہا۔ ''بلال تم......تم......''

''جی ہاں، میں بلال نے کہا۔ ''میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑی نہیں تھی بلکہ ملازمت چھوڑنے کا بہانہ کیا تھا تاکہ آپ کا اعتماد جیت سکوں۔ آپ کے جرائم کی فہرست تو بہت لمبی ہے بابر صاحب، اب تو دنیا کا ماہر سے ماہر وکیل بھی آپ کو پھانسی کے پھندے سے نہیں بچاسکتا۔''

نواز نے اسے ٹھڈا مارا۔

اسی وقت نادیہ آفس میں داخل ہوئی۔ وہ بابر کو اس حال میں دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی اور لمحے بھر کو گم صم ہوگئی۔

☆☆☆

''بابر کی جرائم کی لسٹ بہت طویل ہے سر۔'' ایس ایس پی نواز نے کہا۔

وہ لوگ اس وقت عثمانی صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عثمانی صاحب ایک دن پہلے اسپتال سے گھر آئے تھے اور اب ہر طرح چاق و چوبند تھے۔

''بابر بہت ذہین اور جی دار آدمی ہے۔'' نواز نے کہا۔ ''لیکن اس کی ذہنیت مجرمانہ ہے۔ اس نے ابتدا میں بہت اچھا کام کیا۔ کئی گینگز کا صفایا کیا۔ جرائم پیشہ لوگ بابر کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے کیونکہ وہ ملزم کو گرفتار کرنے کے بجائے گولی ماردیتا تھا کہ وہ عدالت سے بری ہوکر دوبارہ نہ آجائے۔ دو سال پہلے کچھ خطرناک گینگسٹر نے بینک کی ایک وین لوٹ لی۔ وہ وین تمام برانچوں سے کیش جمع کرنے کے بعد ہیڈ آفس جارہی تھی۔ وہ ایک معروف کمپنی کی وین تھی۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ مجرموں نے اسے کیسے لوٹا لیکن عین وقت پر بابر وہاں پہنچ گیا۔ آدمی جی دار ہے اس لیے اس نے پانچ خطرناک مجرموں کو ٹھکانے لگادیا اور لوٹ کا سارا مال لے کر وہاں سے غائب ہوگیا۔ مجرموں میں سے ایک آدمی مرا نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سارا روپیا بابر لے کر چلا گیا اس کے فوراً بعد وہ آدمی بھی چل بسا۔ پولیس اس کا باضابطہ بیان نہیں لے سکی۔ کرائم برانچ نے ڈراما کر کے بلال کو اس کے ساتھ لگادیا۔ اس سے پہلے کہ بلال اس سے کچھ اگلواتا، اسے عثمانی صاحب نے اپنی سیکیورٹی کے لیے رکھ لیا۔ ہاں، انہیں دھمکی آمیز فون جس

نے بھی کرائے میں اس کا نام لینا نہیں چاہتا لیکن وہ جعلی کالز تھیں لیکن جس نے بھی کرائی تھیں وہ عثمانی صاحب کی بہتری چاہتا تھا۔ بلال نے ان جعلی کالز کرنے والے کا سراغ بھی لگالیا ہے۔ وہ فلموں اور ڈراموں میں کام کرنے کا شوقین نکما سا ایک نوجوان ہے۔''

فہد نے نادیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے شرمندہ ہوکر نظریں جھکالیں۔

''پھر واقعی عثمانی صاحب پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس حملے کا ماسٹر مائنڈ بھی بابر تھا۔ اس پر ان دو آدمیوں کے خون کا الزام بھی ہے جو اس کے ہاتھوں مارے گئے۔

پھر اس نے کرمنل مائنڈ ہونے کا ایک اور خوفناک منصوبہ بنایا۔ وہ عثمانی صاحب کی دولت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اس نے میڈم نادیہ کو سیڑھی بنایا۔ اس نے طارق صاحب کو کتے پالنے کا مشورہ دیا۔ ڈوبر مین دنیا کے خونخوار ترین کتوں میں شمار ہوتے ہیں یہ درست ہے کہ وہ اپنے مالک اور رکھوالے کے علاوہ کسی سے مانوس نہیں ہوتا لیکن اگر کسی بھی کتے کو ایک خاص انجکشن دے دیا جائے یا محض اسے دیے جانے والے گوشت میں وہ انجکشن لگا دیا جائے تو بیس سے پچیس منٹ کے اندر وہ اتنا خونخوار ہوجاتا ہے کہ اپنے سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ بابر نے پولیس کا ایک ذہین افسر ہونے کے باوجود کئی جگہ فاش غلطیاں کیں۔ اس نے جس سرنج سے گوشت میں وہ انجکشن لگایا تھا اسے وہیں ڈسٹ بن میں پھینک دیا تھا جو پولیس نے اپنی تحویل میں لے لی۔ اس میں اس دوا کے قطرے بھی تھے اور سرنج پر بابر کی انگلیوں کے نشان بھی۔

طارق صاحب کو راستے سے ہٹانے کے بعد اس نے میڈم نادیہ کو نہ جانے کیسے اپنے قابو میں کرلیا۔ وہ ان سے شادی کرنا چاہتا تھا اس کے بعد وہ عثمانی صاحب کو بھی راستے سے ہٹادیتا لیکن اچانک نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے پہلے عثمانی صاحب کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لیے اس نے ایک ضرورت مند لڑکی کو بھاری معاوضے پر تیار کیا اور اسے ادارے میں آفس میڈ کی ملازمت دلائی۔ پھر اسے ایک سریع الاثر زہر کی شیشی دے کر کہا کہ اس میں سے چند قطرے عثمانی صاحب کو کافی، چائے یا پانی میں ملا کر پلادینا۔ وہ تو شکر ہے کہ عثمانی صاحب نے اس کافی کے صرف دو، تین گھونٹ ہی پیے ورنہ آج یہ یہاں موجود نہ ہوتے۔''

نواز بولتے بولتے شاید تھک گیا تھا۔ اس نے پانی پیا اور بولا۔ ''اب شاید آپ لوگوں کی سمجھ میں ساری بات آگئی ہوگی۔''

☆☆☆

دو دن بعد فہد پھر عثمانی صاحب کے گھر میں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر، میں کل چھٹی پر جارہا ہوں۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ......''

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' عثمانی صاحب نے کہا۔ ''لیکن صرف چھٹی پر!''

''اس پر میں غور کروں گا۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم فیصلہ میرے ہی حق میں کروگے۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔

فہد باہر نکلا تو اس کی نظر نادیہ پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر اسی انداز میں مسکرا رہی تھی جیسے شادی سے پہلے مسکرایا کرتی تھی۔

''میں نے سنا ہے تم طویل رخصت پر جارہے ہو مسٹر پرفیکٹ؟''

فہد نے چونک کر اسے دیکھا۔ مسٹر پرفیکٹ وہ اسے پیار میں کہا کرتی تھی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے میڈم نادیہ۔'' فہد نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو کیا اتنے طویل سفر پر تم اکیلے ہی جاؤ گے مسٹر پرفیکٹ؟'' نادیہ نے پوچھا۔

''میں تو اب اکیلا ہوں اور اکیلا ہی رہوں گا میڈم۔''

''اے مسٹر پرفیکٹ اب زیادہ اداکاری نہیں چلے گی۔ مجھے معاف کردو، کہو تو کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک بھی شروع کردوں؟''

''اس کی ضرورت نہیں ہے نادیہ۔'' عثمانی صاحب کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب سے وہاں موجود تھے۔ ''فہد اکیلا نہیں جائے گا بلکہ تم بھی اس کے ساتھ جاؤ گی۔''

''لیکن سر...... میں......''

''نو مسٹر پرفیکٹ۔'' عثمانی صاحب مسکرائے۔ ''میں نے سب انتظام کرلیا ہے۔ اب تمہاری یہ طویل رخصت اصل میں ہنی مون کی رخصت ہوگی لیکن اس سے پہلے تمہارا نکاح ہوگا۔ پھر شاندار ولیمہ ہوگا۔ اس کے بعد تم جاسکو گے رائٹ مسٹر پرفیکٹ۔''

''باس از آل ویز رائٹ سر۔'' فہد مسکرایا اور نادیہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

◆

سرورق کی دوسری کہانی

قاتل مقتول

مختار آزاد

ہر انسان کے کچھ مسائل ہوتے ہیں... جو بڑھتے بڑھتے المیے بن جاتے ہیں... کبھی کبھی یہ مسائل... یہ المیے زندگی میں اس طرح پیوست ہو جاتے ہیں... جن سے الگ ہونا ممکن نہیں رہتا... شاہراہِ حیات پر تنہا چلنے والی ایک معصوم لڑکی کی دل گداز کہانی... اس کے دکھوں... رونما ہونے والی ناانصافیوں کو سننے والا کوئی منصف نہیں تھا... وہ خود ہی منصف تھی... خود ہی مظلوم تھی... اس کی بے عنوان زندگی میں تازہ ہوا کا کوئی گزر نہ تھا... اسے چلنا تھا... اور سفر کو جاری رکھنا بھی ضروری تھا... چلتے چلتے اس نے بالآخر ایک فیصلہ کن راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرڈالا...

زہر پی کر انسانیت کو دوام حیات دینے والے

قاتل مقتول کی چونکا دینے والے انجام کی تیکھی کہانی

وہ مارچ کی ایک خنک شام تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں آگے بڑھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ابھی وہ سپر مارکیٹ کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اسے عین اپنے عقب سے کار کا ہارن سنائی دیا۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے فٹ پاتھ کی سمت تھوڑا سا اور سمٹ کر چلنے لگی۔ توقع کے مطابق چند سیکنڈ کے وقفے سے دوبارہ ہارن بجا مگر اس نے پھر کوئی توجہ نہ دی۔ اب ہارن والی سیاہ کرولا اس سے لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی

تھی۔ وہ تھوڑا سا اور سمٹ گئی۔ ایک بار پھر ہارن بجا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ گاڑی کا سیاہ شیشہ اتر چکا تھا۔

”گڈ ایوننگ میڈم۔“

نوری نے ذرا سی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر دبی دبی سی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

وہ بھی گھاگ شکاری تھا۔ مطلب سمجھ چکا تھا۔ اس نے چہرہ کھڑکی کے قریب کیا۔ ”یوں کیا پیدل چلی جا رہی ہیں، آیئے میں آپ کو چھوڑ دیتا ہو۔“

وہ رکی۔ فوراً کچھ کہنے کے بجائے چاروں طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پھر سوالیہ نگاہوں سے کار سوار کو دیکھا۔

”بیٹھ جائیں، ڈیفنس فیز فائیو چلنا ہوگا۔“ وہ سمجھ گیا تھا کہ وقت بھاؤ تاؤ کا ہے۔

”چلنے کا کیا دو گے؟“ نوری نے شانِ بے نیازی سے سر جھٹک کر سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

”تین ہزار۔“

”چھ ہزار، دو گھنٹے۔ منظور ہے تو دروازہ کھولو۔“ یہ کہتے ہوئے نوری نے آہستگی سے قدم آگے بڑھائے۔

”آ جاؤ......“ کار تھوڑا سا آگے بڑھ کر رکی۔ دروازہ کھلا لیکن وہ نہ بیٹھی۔

”فل پیمنٹ ایڈوانس۔“ اس نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

”او کے......“ کار سوار نے کہا۔ ”چھ ہزار ایڈوانس۔“ چند لمحوں کے بعد اس نے نوٹ کھڑکی سے اسے دکھائے۔ نوری نے مسکراتے ہوئے دروازہ اپنی طرف کھینچا۔ بیٹھتے ہی پیسے تھام کر پرس میں رکھے، اس کی طرف ادائے دلبری سے دیکھا اور والہانہ انداز میں مسکرا دی۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔ یہ بھی بزنس ڈیل کے پیکج میں شامل تھی۔ وہ اس کھیل کے سارے بھید بھاؤ سے خوب واقف تھی۔ جانتی تھی کہ بکرے کو قربانی سے پہلے چھری نہیں دکھائی جاتی۔

شون چورنگی سگنل سے کار آگے بڑھی تو نوری نے گہری نظر سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ عمر میں اس کے باپ کے برابر کا تو ہوگا۔ سفید بال، ماتھے پر شکنیں۔ عمدہ لباس مگر چہرے پر شیطانی مسکراہٹ۔

”کیا دیکھ رہی ہو جانِ جہاں۔“ اس نے بازاری لب و لہجے میں کہا۔

نوری کو اس کا یہ انداز بہت گھٹیا لگا لیکن وہ سمجھ گئی کہ درست شکار کا انتخاب کیا ہے۔ اس کے ایک جملے نے ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ کس قماش کا بندہ ہے۔ اب جو ہونے والا ہے، وہی اس کا کفارۂ ذات ہے۔ اس نے ایک ادا سے زلفوں کو جھٹکا اور خود سپردگی کی مصنوعی مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شام بخیر......“

”شام تو وہی جو چلے رات دیر تلک۔“ یہ کہہ کر اس نے نوری کی طرف دیکھا۔ ”شام ہو، گلاس ہو، تم ہو اور تنہائی تو پھر کس کمبخت کو صبح کا انتظار ہوگا۔“ وہ رومینٹک ہو رہا تھا۔

”تو پھر آپ بھی صبح کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ شام سہانی ہو تو آنے والے دن کے بکھیڑوں کی بات نہیں کرتے۔“ نوری نے اپنے دل کی سچی بات کو کچھ اس لگاوٹ سے کہا کہ وہ جھوم گیا۔

”کیا کہنے بھئی، لگتا ہے شاعری کا ذوق بھی رکھتی ہو۔“

نوری نے کچھ کہنے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ کار تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ ”سنو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کہیے حضور......“ وہ چہک کر بولا۔

”گلا خشک ہو رہا ہے۔“

”ارے تو ابھی گھر پہنچتے ہی اسے تر بتر کر دیتے ہیں۔“

”تمہارے گھر پر کولڈ ڈرنک تو ہوگی نا، ورنہ رستے میں کہیں رک کر لے لیتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرائی۔ ”ویسے بھی مجھے تھکن دور کرنے کے لیے کولڈ ڈرنک کی ضرورت پڑتی ہے اور شاید تمہیں تھکن کے لیے......“ یہ کہہ کر وہ ڈھٹائی سے **کھلکھلا کر ہنس دی۔**

”بے فکر رہو۔“ اس نے کار کی رفتار اور بڑھا دی۔

”میں خود بھی ڈرنک کا شوقین ہوں۔“ یہ کہہ کر اس کی طرف گردن موڑی ”اور سافٹ ڈرنک کا بھی اگر وہ تم جیسی ہو تو......“ جواباً اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”وہ تو میں سمجھ چکی ہوں، بتانے کی ضرورت نہیں۔“

اس پر بوڑھے شکار کا زوردار قہقہہ گونجا۔

کچھ دیر بعد کار خیابانِ مجاہد کے ایک وسیع و عریض مگ سنسان بنگلے کے پورچ میں رک رہی تھی۔ اندر داخل ہو ہوئے نوری مین گیٹ پر لگی نام کی تختی پڑھ چکی تھی: سیٹھ نعمان احمد چائے والا۔ وہ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ ا کے سوا وہاں تیسرا کوئی نہ تھا۔ حتیٰ کہ مین گیٹ پر چوکیدار بھی نہ تھا۔ سیٹھ نعمان نے ریموٹ کے الیکٹرانک لاک آپر کرتے ہوئے مین گیٹ کھولا تھا۔ بنگلے میں داخل ہو وقت وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہاں ملازمین یا گیٹ چوکیدار ہوئے تو وہ خود کو ان کی نظروں سے کس طرح بچا ں۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اس نے ذرا سی گردن موڑ کر یٹ پر نظر ڈالی۔ سیٹھ نے اندر آنے کے بعد گیٹ میں نے چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر کنڈی لگی رہنے دی ی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ اس گھر سے ہو کر آخر سیلاب بلا کو ہیں اور بھی تو جانا ہوگا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی ورنہ یکٹرانک لاک سسٹم دیکھ کر وہ تھوڑا سا پریشان ہو گئی تھی کہ تے ہوئے دروازہ کیسے کھولے گی مگر سیٹھ نے خود ہی یہ شکل آسان کر دی۔

اگرچہ وہ پہلی بار کسی ایسے سنسان بنگلے میں اجنبی مکین ے ساتھ داخل نہیں ہو رہی تھی۔ یہ اس کے کھیل کا حصہ ا لیکن اس کی ہمیشہ سے کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے پیچھے کوئی ہچان چھوڑ کر نہ جائے۔ البتہ اسے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان وا کہ اس شخص کو خود اپنی نیک نامی کا زیادہ خیال تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے کرتوتوں کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے کے لیے رازداری کا سارا انتظام خود ہی کر رکھا تھا۔ یہاں اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات تھی ہی نہیں۔

سیٹھ نعمان احمد چائے والا شہر کا معروف بزنس مین ھا۔ اس کے پردادا نے چائے کا بزنس شروع کیا تھا اس یے بمبئی سے کراچی آ کر بس جانے والا گجرات کا یہ روباری خاندان اب بھی چائے والا کے لقب سے جانا تا تھا۔ اگرچہ اب اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا ن ’چائے والا‘ کی یہ پہچان اس کا بزنس ٹریڈ مارک تھا۔ ری کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ آج اس کے جال میں پھنسنے لا شکار کاروباری دنیا کا کتنا بڑا نام ہے۔ اگرچہ کاروباری قوں میں اس کا نام بہت بڑا تھا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اتنا اعیاش تھا کہ اس کے دفتر میں نوکری کرنے والی کوئی لڑکی ک ماہ سے زیادہ نہیں ٹک پاتی تھی۔ اگر کوئی لڑکی اس کا نگ قبول کر لے تو وہ اسے زمین سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیتا یکن جوں ہی اس کا دل بھرتا، وہ ایک بار پھر کہیں اور اپنے لیے نوکری تلاش کر رہی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود کبھی کسی کو ی ہمت نہ ہوئی کہ اس کے اوپر کوئی انگلی اٹھا دیتی۔ سب کیاں جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے سیٹھ نعمان کے خلاف وئی بات کی تو شاید اس کے اپنے گھر والے بھی اس پر یقین کریں۔ اس نے اپنے ملازمین بالخصوص خواتین ملازمین ے گھر والوں میں اپنا بھرم ہی ایسا قائم کر رکھا تھا کہ بیٹیوں الے لٹیرے کو ہی اپنی عزت کا محافظ سمجھتے تھے۔ اس کا شکار جب کوئی لڑکی ملازمت چھوڑ کر جاتی تو وہ ان کے باپ، بھائی یا ماں سے رابطہ کر کے لڑکی کے کردار کی ایسی منظر کشی کرتا کہ وہ لوگ خود اپنی ہی نظروں میں گر جاتے کہ پلو سے بندھے اپنے ہی سونے میں کھوٹ نکلا۔ شکریہ ادا کرنے لگتے کہ سیٹھ صاحب نے ان کی عزت بچانے کی کتنی کوشش کی تھی۔

سیٹھ نعمان کو اب تو یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے کتنی لڑکیوں کی زندگی تباہ کی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو لڑکی ایک بار اس کی زندگی سے نکلی وہ اتنی رقم ضرور ساتھ لے کر گئی کہ اس کے بعد دونوں فریقوں کے درمیان سود و زیاں کا سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ کاروباری بندہ تھا۔ اس لیے ہر لین دین اس کے نزدیک ایک سودے سے زیادہ اور کچھ نہ تھا۔ ایک ہاتھ لیا، دوسرے ہاتھ دیا۔ ہاتھ جھاڑے، دامن جھٹکا اور سب کچھ صاف۔

سیٹھ نعمان کی بیوی بہت دین دار عورت تھی۔ وہ ایک شریف گھرانے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ یہ واحد عورت تھی، جس سے وہ ڈرتا تھا۔ اگرچہ اس کی بیوی کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ شوہر ایسا پاک باز نہیں جیسا ظاہر کرتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس کے اصل کرتوتوں کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔ جب تک بیوی زندہ رہی، وہ کبھی نشے کی حالت میں گھر نہیں لوٹا۔ ان دنوں جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل ہوتی تھی۔ بیوی کو دکھانے کے لیے وہ نہایت اہتمام سے نماز جمعہ کی تیاری کرتا، بیٹے کو ساتھ لے جا کر جامع مسجد میں نماز ادا کرتا۔ دونوں بیٹیوں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتا۔ بچوں کی دینی تعلیم کے لیے گھر پر بہترین انتظام کر رکھا تھا۔ دین دار بیوی نے دونوں بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کی پرورش اس طرح کی تھی کہ تینوں کا ظاہر و باطن شیشے کی طرح صاف ستھرا تھا۔ بیٹے پر بھی بدخصلت باپ کی کسی عادتِ بد کا کوئی اثر نہ تھا۔ یہ سب کچھ اس کی بیوی کی بدولت تھا۔ بیوی کو دکھانے کے لیے وہ باقاعدگی سے دینی مدارس، یتیم خانوں اور امدادی اداروں کی مالی معاونت کرتا تھا لیکن اس کے پردے میں اس کی شیطانی چالیں بھی جاری تھیں لیکن وہ کھاتا پیتا سب کچھ مگر خالی گلاس نہ توڑتا کہ بارہ آنے کی پکار سنائی دے۔ اس لیے گھر ہو یا باہر، ہر جگہ اس نے اپنا کردار سولہ آنے کھرا اور نیک نام سیٹھ کا بنا رکھا تھا۔

سیٹھ نعمان کی بیوی کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں بیٹیاں شادی شدہ تھیں اور امریکا میں رہ رہی تھیں۔ اکلوتا بیٹا بینکنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جرمنی سے لوٹنے والا تھا۔ کامران احمد اپنے باپ کے الٹ تھا۔ باپ جتنا رنگین مزاج، بیٹا اتنا ہی مشرقی اقدار اور آداب و حیا کا

پابند۔ اپنے مذہبی رجحانات کی بدولت ہی کامران نے ان دنوں نئی متعارف ہونے والی اسلامی بینکنگ کا انتخاب کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ بیٹے کی آمد کے بعد گھر پر اخلاقی پابندیاں لگ جائیں گی اور وہ اپنے ہی گھر میں کھل کھیل نہیں سکے گا، اسی لیے رنگین مزاج سیٹھ بیٹے کی آمد سے پہلے کا تمام تر وقت اپنی مرضی سے عیش و عشرت میں بتانے کا خواہش مند تھا۔ ویسے بھی اگلے روز کامران واپس لوٹ رہا تھا۔ سیٹھ نعمان نے بھی طے کرلیا تھا کہ بیٹے کے آنے سے پہلے اس گھر میں آخری بار اپنی من مانی کررہا ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی معمولی غلطی سے اس کی عمر بھر کی بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹے کے جرمنی جانے کے بعد اس نے ملازمین کے اوقات کار بدل دیے تھے۔ گھریلو ملازمین صرف صبح میں تین گھنٹے کے لیے جبکہ چوکیدار رات دس بجے اپنی ڈیوٹی پر آتا تھا۔ یوں جب وہ نوری کو ساتھ لیے گھر میں داخل ہوا تو بالکل بے فکر تھا۔ وہ آزادی کی آخری شام بھرپور طریقے سے منانا چاہتا تھا۔

بیڈروم میں داخل ہونے تک وہ گھر کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھی۔ اس سے پہلے وہ اتنے پُرآسائش اور وسیع و عریض گھر میں کبھی نہیں آئی تھی۔ سیٹھ نعمان بریف کیس تھامے اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔

''تم آرام سے بیٹھو، میں ذرا نہا کر فریش ہوجاؤں۔'' سیٹھ نعمان نے بریف کیس میز پر رکھا اور ائرکنڈیشنر آن کرتے ہوئے کہا۔

''یقیناً......'' وہ صوفے پر بیٹھی۔ ''مجھے کوئی جلدی نہیں۔ آخر یہ وقت تم نے خریدا ہے۔''

''ارے ارے......'' وہ باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک پلٹا۔ ''تم نے کولڈ ڈرنک کی فرمائش کی تھی نا، بس ایک منٹ۔''

''ہاں سچ...... پیاس سے گلے میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔'' نوری نے گلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس طرح کہا جیسے بولنے سے اسے گلے میں تکلیف محسوس ہورہی ہو۔

سیٹھ کمرے سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ پلٹا تو کولڈ ڈرنک اور مشروبِ مغرب کی بوتل کے ساتھ ساتھ دو گلاس اور کیوبس سے بھرا آئس باکس بھی ہاتھوں میں تھا۔

''لیجیے...... جب تک میں فریش ہوتا ہوں، تب تک آپ اپنی پیاس بجھایئے۔'' سیٹھ نے لوفر انداز میں آنکھ مارتے ہوئے کہا اور دوبارہ باتھ روم کی طرف بڑھا۔ ''بڑی گرمی ہے، شاید نہانے سے من کی آگ میں تھوڑی کمی آئے۔''

یہ سن کر نوری زور سے ہنسی اور اسی کے عامیانہ انداز میں بولی۔ ''یہ آگ پانی سے نہیں مٹتی۔ آگ کو آگ مارتی ہے۔''

''چلیے، فریش ہوکر یہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے باتھ روم کا دروازہ بند کردیا۔

کچھ دیر بعد سیٹھ باتھ روم سے نکلا تو نوری صوفے پر نیم دراز کولڈ ڈرنک پی رہی تھی۔ برابر میں اس کا بڑا سا وینٹی بیگ دھرا تھا۔

''کہیے کچھ پیاس بجھی؟'' اس نے گاؤن کی ڈوری باندھتے ہوئے کہا۔

''پانی نے تو آپ کی آگ اور بھڑکا دی ہوگی۔''

''ارے چھوڑیے...... وہ اس کے برابر آکر بیٹھا تو نوری نے ٹیبل پر سے گلاس اٹھایا۔ ''لیجیے...... خوبصورت شام کا پہلا جام۔''

''ہم دونوں اور اس خوبصورت تنہائی کے نام۔'' سیٹھ نے لقمہ دیا۔

''یادگار......'' نوری نے کولڈ ڈرنک سے بھرا گلاس لبوں سے لگایا۔

''یادگار کیوں؟'' سیٹھ چونکا اور آگے ہوکر نوری کو بانہوں میں بھرلیا۔

''اس لیے کہ کسی کو کیا پتا کہ ہم پھر کبھی ملیں گے یا نہیں۔'' اس نے بڑے ناز سے جواب دیا۔

''ہم کئی بار مل سکتے ہیں۔'' وہ پھر شیطانی انداز میں مسکرایا۔ ''میرا بٹوا بہت بھاری ہے۔''

''زندگی شرط ہے۔'' یہ کہتے ہوئے نوری نے دوسرے ہاتھ سے گلاس کو نیچے سے اوپر کی طرف کرکے اس کے لبوں سے لگادیا۔ ایک ہی گھونٹ میں سیٹھ نے گلاس خالی کردیا۔

کچھ دیر تک دونوں سحر انگیز لمحات میں ایک دوسرے میں کھوئے رہے اور پھر نوری کسمسائی۔ ''بیڈ پر چلیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

سیٹھ اس سے الگ ہوا اور مخمور چال چلتے ہوئے بیڈ کی طرف بڑھا اور پشت سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہوگیا۔ ''آجاؤ جانِ من۔'' اس نے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ ''میں ذرا فریش ہوکر آتی ہوں۔''

''اُفوہ...... اب اور کتنا انتظار کراؤ گی جانِ من۔'' سیٹھ نے مصنوعی لگاوٹ سے کہا۔

''بس ایک منٹ......'' نوری نے لگاوٹ سے جواب

پانچ منٹ بعد وہ باہر آئی اور بیڈ کے کونے سے ٹک ں۔ اس نے آہستگی سے سیٹھ کے چہرے پر انگلیاں ریں لیکن سیٹھ نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ اس نے ھوں کی پتلیاں ضرور پھرائیں مگر چاہنے کے باوجود اس ، منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔ اس کا چہرہ پتھریلا ہورہا ۔ نوری نے اس کی پیشانی کی طرف دیکھا۔ پسینے کی چند ریں نمودار ہورہی تھیں۔ اس نے گاؤن کھسکا کر سیٹھ کے ید بالوں سے بھرے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ جسم ٹھنڈا پڑ رہا ۔ اس کے اعصاب سن پڑتے جارہے تھے، البتہ حواس ۔ تک قدرے سلامت تھے۔

''مبارک ہو۔'' نوری نے اس کے چہرے کے قریب چہرہ کرتے ہوئے کہا اور پھر زوردار قہقہہ لگایا۔ ''زندگی آخری شام کے کچھ اور لمحات۔'' نوری نے اس کے ے پر انگلیاں پھرائیں۔ ''خوش نصیب عیاش ہو۔ حسینہ بانہوں میں زندگی کے آخری لمحات......'' اس نے بات وری چھوڑ کر پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

سیٹھ نعمان کا جسم مکمل طور پر بے جان ہوچکا تھا۔ وہ ن چکا تھا کہ اب جان کی بازی ہاری جاچکی ہے۔ اب وہ ی سے اپنے حواس بھی کھو رہا ہے۔ اس نے کچھ بولنے کی شش کی مگر قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔

''تو سیٹھ صاحب، اب ہم دونوں کے چلنے کا وقت لیا ہے۔'' کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے اٹھی۔ ''ملک ت کو خوش آمدید کہیے۔''

نوری ٹیبل کی طرف پلٹی۔ وہ سادہ سا بریف کیس تھا، ۔ بھی نہیں تھا۔ بریف کیس کھولتے ہی اس کی آنکھیں ت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بڑے نوٹوں سے بھرا تھا۔ اس نے جلدی جلدی سارے نوٹ اپنے وینٹی ۔ میں ٹھونسے اور صوفے پر بیٹھ کر منتشر سانسیں درست نے لگی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اتنے ڈھیر سارے ٹ اکٹھے دیکھے تھے۔ اس نے جلدی جلدی بڑے بڑے ونٹ لے کر کولڈ ڈرنک کا گلاس خالی کیا۔ وہ پہلی بار خود کو س محسوس کررہی تھی۔ اس کی وجہ سیٹھ کی وہ دولت تھی اب اس کی ہوچکی تھی۔ کچھ دیر تک وہ گہری گہری سانسیں لے کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ بعت کچھ سنبھلی تو وہ اٹھی، بیگ کندھے پر لٹکایا اور بیڈ کی ف پلٹی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے سیٹھ کی آنکھیں تور کھلی تھیں مگر بے نور آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ یکدم اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں [illegible] سنسناہٹ محسوس ہوئی۔ وہ تیزی سے پلٹی۔ چند لمحوں بعد وہ سنسان سڑک پر آگے بڑھ رہی تھی۔

اسے گھر جانے کی جلدی نہ تھی۔ اس کا دماغ بوجھل ہورہا تھا۔ آخر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ پلکیں بھیگنے لگیں۔ ''ایک بار پھر......'' اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''مجھے معاف کردے، مجھے معاف کردے اے اللہ۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

سگنل کے قریب پہنچ کر نوری نے انگلی کی پور سے نم آنکھیں صاف کیں۔ ''صدر چلو گے؟'' اس نے وہاں کھڑی ایک ٹیکسی کے ڈرائیور سے پوچھا۔

''بیٹھیے۔'' ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کرتے ہوئے جواب دیا۔

بیس پچیس منٹ بعد وہ ٹیکسی سے اتری اور سڑک کے قریب بنے فلیٹوں کی طرف بڑھنے لگی۔ گھنٹا بھر بعد جب نوری فلیٹ سے باہر نکل کر سڑک پر آئی تو اس کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ سفید رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس اور سرتا پیر سیاہ برقع میں ملفوف تھی۔ کاندھے پر وہی بڑا سا سرخ وینٹی بیگ ٹکا ہوا تھا۔ اس کا رخ بس اسٹاپ کی طرف تھا۔ دس منٹ بعد وہ منی بس میں بیٹھی گھر لوٹ رہی تھی۔ اس کا دل اب بھی بوجھل تھا مگر آنکھیں خشک تھیں۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔

☆☆☆

اس کا اصل نام نورین تھا لیکن جاننے والوں کے لیے وہ صرف نوری تھی۔ یہ نام اس کے باپ کا دیا ہوا تھا مگر ہوس کے ماروں نے اس کا نام ماتھے پر لٹکتا بدنامی کا جھومر بنادیا تھا، جسے اس نے برقع میں چھپانے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی نہ تھی مگر زمانے کی تند و تیز ہوا نے اسے بہت جلد یہ سبق سکھادیا تھا کہ زندہ رہنے کے لیے جسم کا خراج دینا مجبوری بن جائے تو کیوں نا اس کی پوری پوری قیمت بھی وصول کرلی جائے۔ کئی سال کی عسرت، تنگ دستی اور رزقِ حلال کی تگ و دو نے اسے زندگی اور زندہ رہنے کا سبق بہت اچھی طرح پڑھادیا تھا مگر نورین سے نوری بننے پر وہ خوش نہیں تھی۔ ہر شام وہ مرتی تھی۔ ہر روز سورج ڈھلے اس کا جسم ہوس کی کانٹوں بھری سیج پر نوچا کھسوٹا جاتا تھا۔ ہر صبح وہ ایک بار پھر جی اٹھتی تھی، ایک بار پھر کانٹوں کی سیج پر ہوس کے بھیڑیوں کی خوراک بننے کے لیے مگر اس کے باوجود دیکھنے والوں کے لیے وہ خوش حال اور خوش تھی۔

نورین کے من کا درد ظاہری مسکراہٹ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ شاید ہی کوئی اس کی اصلیت جانتا تھا۔

معاشرے کی دی ہوئی مجبوریاں، خدا کی طرف سے آئی آزمائشیں یا پھر پیٹ کی آنچ...... اس کے لیے سب مشکلات سے نکلنے کا حل پیسہ تھا مگر محنت سے کمایا ہوا۔ مڈل تعلیم، خالی ہاتھ مگر خوبصورت بدن اور نوکری کی تلاش...... بہت جلد اسے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ مجبوری کی قیمت ہر اس شخص کو چکانا پڑتی ہے جو بازار کے بھید بھاؤ نہ جانتا ہو۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اسے قدم قدم پر شاطروں اور عیاروں سے واسطہ پڑا تھا۔ کئی بار لٹنے پر بھی جب اس کی مجبوریاں سامنے کھڑی ہنستی رہیں تب اسے خیال آیا کہ بازار میں تو نکل آئی ہے اگر خود کو بازار کی جنس بنا دیا جائے تو وہ مول حاصل کرسکتی ہے جو من چاہا ہو۔ یہ احساس دلایا تھا اتفاقاً ملنے والی آنٹی رضیہ نے۔ ایسا ہوا بھی۔ جلد ہی وہ تنگ دستی سے تو پیچھا چھڑا گئی مگر دل پر گناہ کا بوجھ بڑھتا گیا۔ وہ سوچتی تھی کہ چہرے کی مسکراہٹ سب دیکھتے ہیں، اسی لیے مسکراتی رہتی تھی لیکن من کے آنسو کسے دکھائی دیتے ہیں۔

کئی برس کی خواری کے بعد نورین اپنے کام کی بدولت خوش حال زندگی بسر کرنے کے قابل تو ہوچکی تھی مگر اس کی روح ناآسودہ تھی۔ پیٹ کی آگ سرد کرنے کے لیے پیسے کا پانی اس کے پاس تھا۔ جسم کی زیبائش کے لیے وہ قیمتی لباس خرید سکتی تھی اور اکثر خریدتی بھی تھی۔ اب تو کئی سال ہوگئے نہ تو گھر میں فاقہ ہوا اور نہ ہی شدید بیماری کے باوجود اس کی بیوہ ماں کو دوا خریدنے کے لیے سلائی مشین چلانا پڑی۔ بظاہر سب کچھ بہت عمدگی سے چل رہا تھا۔

نورین کی ماں خوش تھی۔ وہ اکثر ملنے جلنے والیوں کو بڑے فخر سے کہتی تھی کہ بیٹی نے بیٹا بن کر دکھا دیا۔ ماں کی بات سن کر وہ اکثر سوچ میں ڈوب جاتی تھی۔ سچ ہے کہ اگر بیٹی خود کو لکڑی بنا کر چولھے میں جھونک دے تو گھر کا چولھا ضرور گرم ہوجاتا ہے۔

نورین کی ناآسودہ زندگی میں خوش حالی خود اس کے وجود کی مرہونِ منت تھی۔ وہ جوان تھی، کم عمر تھی اور بہت خوبصورت تھی مگر زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ اسے بھی اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ وہ بہت جلد جان گئی کہ معاشرے میں دوسروں پر اپنی دھاک جمانے کے لیے ان لوگوں کے سامنے بھی فرفر انگریزی بولنا ضروری ہے جو شاید وہ زبان بھی اچھی طرح نہیں بول پاتے ہوں، جس میں ان کی ماں نے لوریاں سنائی تھیں۔

☆☆☆

نورین کا باپ ایک سرکاری دفتر میں چپراسی تھا۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ابھی وہ ساتویں میں ہی تھی ایک روز اس کے باپ کو سڑک پار کرتے ہوئے تیز رفتار نے کچل دیا۔ وہ اسی گز کے ایک مکان میں رہتی تھی مکان بھی اس کے نانا کی موت کے بعد ترکے میں ملا تھا باپ ایماندار اور بے اختیار سرکاری ملازم تھا۔ وہ تو بھی نہیں سکتا تھا کہ اپنی کمائی سے گھر بنا سکے۔ میاں کی سال کی ملازمت کا جو پھل اس کی بیوہ کو ملا وہ معمولی سی پنشن تھی۔ اس رقم میں بیوہ کیا گھر چلاتی، کیا بیٹی کو پڑھاتی پھر بھی جیسے تیسے کر کے نورین نویں جماعت میں پہنچ ہی گئی سرکاری اسکول کی ماہانہ ٹیوشن فیس تو نہیں تھی مگر اس بار کے امتحان ہونے تھے۔ امتحانی فیس کی رقم نہ ہونے سبب کپڑے سی سی کر اخراجات پوری کرنے والی بیوہ بیٹی کو گھر بٹھا لیا۔ اب وہ بھی دن بھر گھر پہ رہتی۔ گھر کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی سلائی میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

نورین کے گھر کا ہوجانے کے بعد اس کی ماں طور پر سر اور کمر درد کے ساتھ سلائی مشین کی ہوکر رہ گئی تھی اس کی کوشش تھی کہ کپڑے سی سی کر گھر کا خرچہ نکل آیا تو پنشن کی رقم جمع کر کے وہ بیٹی کے بیاہ کے بارے سوچنے کے قابل ہوجائے گی۔ نورین ماں کے خیال اچھی طرح جانتی تھی۔ کبھی کبھار وہ دل میں حساب لگاتی بڑھتی مہنگائی میں مرحوم باپ کی پنشن جوڑ جوڑ کر سال میں اپنے گھر کی ہوسکتی ہے۔ وہ ذہین تھی۔ اسے سوچ فرسودہ نظر آتی تھی۔ اس پر وہ دل ہی دل میں لیتی تھی۔ شاید بیوہ ماں مرحوم شوہر کی پنشن جوڑ کے ہاتھ پیلے کر ہی دیتی مگر تقدیر کی کسے خبر۔ غیر میں تقدیر کی ایک کروٹ نے اس گھر کے حالات بدل دیا۔

سلائی کے لیے مستقل بیٹھے رہنے کے باعث کی تکلیف ہوگئی تھی۔ تکلیف حد سے بڑھی تو وہ اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹرز نے بتایا کہ ریڑھ کی مہروں پہ سوزش ہے۔ تقریباً چھ ماہ آرام کا مشورہ دوران استعمال کے لیے پرائیویٹ میڈیکل خریدنے کے لیے کئی ہزار روپے کی دواؤں کا ڈاکٹر نے بالکل مفت میں لکھ کر دے دیا۔

ختم نبوت ﷺ زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈ من "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- ❖ گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈ من کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- ❖ گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- ❖ کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے گی۔
- ❖ ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- ❖ اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈ من سے رابطہ کیجئے۔
- ❖ سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- ❖ تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- ❖ عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- ❖ **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- ❖ اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ من سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

ساتھ ہی یہ مفت مشورہ بھی بنا مانگے دیا کہ اگر آرام نہ آئے تو مزید اچھے علاج کے لیے کلینک پر مریضہ کو لے آئے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی مریضہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا تھا۔ ایک وقت کی معائنہ فیس تھی ہزار روپے۔ نورین نے کارڈ تو لے لیا مگر بے دلی سے۔ وہ بے چاری تو سوچ رہی تھی کہ ماں تو بستر پہ پڑگئی ہے، اب گھر کیسے چلے گا۔ دوا کا خرچ کیسے پورا ہوگا۔ زندگی کے ساتھ ضرورت کے نام پہ جڑے سیکڑوں اخراجات کس طرح پورے ہوں گے۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی بوڑھی ماں بھی اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

سوچنے سے مسئلے حل ہوتے ہوں تو شاید دنیا میں کوئی مسئلہ باقی نہ بچے۔ یہی حال ان کا بھی تھا۔ مسائل، سوچ، فکر، پریشانی اور بیماری...... ان کے گھر میں ڈیرے ڈال چکے تھے۔

جیسے تیسے کر کے پندرہ دن گزر گئے۔ ماں تو اٹھنے بیٹھنے سے قاصر تھی۔ مشین کی ہتھی نے گھومنا چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں مشین کی گھوں گھوں کب کی بند ہوچکی تھی۔ سناٹے، گرد آلود مشین اور بیماری...... کپڑوں کی سلائی سے ملنے والے دو پیسوں کا آسرا ختم ہوچکا تھا۔ جمع جتھے پر گزارا چل رہا تھا مگر کب تک...... بوڑھی ماں، بیٹی کے بیاہ کے لیے جمع رقم خود پہ خرچ ہوتا دیکھ کر دل ہی دل میں روتی تھی مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ ماں بیٹی پر مشکل یہ آن پڑی تھی کہ جمع جتھا خرچ ہونے سے جہاں کئی خوابوں کی کلیاں مرجھا رہی تھیں، وہیں ایک پریشانی یہ تھی کہ اس کے بعد کیا ہوگا...... پنشن سے گھر چلے یا دوا دارو کا خرچ پورا ہوگا۔

نورین نے ایک بار سوچا کہ خود کپڑے سینا شروع کردے مگر اس کے ہاتھ میں صفائی نہیں تھی۔ اس نے دو عورتوں کے لان کے سوٹ سیے اور وہ دونوں عورتیں سلائی اور سلے سوٹ اس کے منہ پر مار کر چل دیں۔ اس کے بعد کسی نے پلٹ کر خبر نہ لی کہ درزن نے دوبارہ کپڑے سینا شروع کیے یا نہیں۔ تقریباً ایک ماہ ہونے والا تھا۔ اب نورین یہ سوچ سوچ کر پریشان تھی کہ کیا کرے۔ وہ کونسلر صاحب کے گھر گئی۔ حاجی صاحب شفیق انسان تھے۔ انہوں نے بہت جلد اس کا شناختی کارڈ بنوا دیا۔ اب نورین خود کچھ کرنے کے لیے کمر کس چکی تھی۔ کم تعلیم کے باوجود نورین کا حوصلہ، صلاحیت اور اعتماد بلا کا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کرلے گی۔

پہلے پہل تو وہ ایک جاننے والی عورت کی وساطت سے گارمنٹس فیکٹری پہنچی۔ یہاں اسے بہت کم معاوضے پر سلے کپڑوں کی فنشنگ کا کام مل گیا مگر صبح آٹھ سے رات نو بجے تک کام اور پھر فیکٹری آنے جانے کے لیے مزید دو ڈھائی گھنٹے بس میں سفر...... صبح چھ بجے گھر سے نکلتی تو رات کے گیارہ ساڑھے گیارہ بجے گھر پہنچتی۔ اوپر سے یہ کہ اگر کہیں ہنگامے ہوجائیں تو پھر رات کے ایک دو بھی بج جاتے تھے۔ کبھی ہڑتال ہوجاتی تو دیہاڑی گئی۔ اوپر سے یہ مصیبت کہ بوڑھی ماں تو اٹھنے بیٹھنے سے لاچار تھی۔ وہ سارا دن بھوکی پیاسی پلنگ پر پڑی بیٹی کے آنے کی منتظر رہتی کہ کب وہ آئے گی اور اسے کھلائے پلائے گی۔ نورین کی زندگی بہت مشکل سے دوچار تھی مگر جیسے تیسے وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور تھی۔

ان دنوں کراچی کی بدامنی عروج پر تھی۔ ایک بار جو ہڑتال ہوئی تو تین دن تک چلی۔ چوتھے دن خدا خدا کرکے سڑکوں پر بسیں نکلیں اور جب وہ فیکٹری پہنچی تو معلوم ہوا کہ کچھ شرپسندوں نے اسے دوران پہلے ہی آگ لگادی تھی۔ روزگار ہی نہیں اس کے پچیس دن کی تنخواہ بھی گئی۔ اس روز وہ بس میں بیٹھی سارے راستے رو رو کر ہلکان ہوتی گھر لوٹ رہی تھی۔ برقع کے نقاب میں چھپی اس کی آنکھیں مجبوری کا نوحہ پڑھ رہی تھیں مگر ان سے کسی کو کیا واسطہ...... دنیا تو وہ دیکھتی ہے جو نظر آتا ہے۔

نورین بہت حسین تھی لیکن حسن بے نقاب نہ ہو تو پرستار قریب نہیں آتے۔ شمع کی روشنی نہ پھیلے تو پروانے شمع دان کے پاس نہیں آتے۔ جو دکھائی نہ دے، وہ دنیا کے بازار میں انمول نہیں بے قیمت ہے۔ برقع میں لپٹا نورین کا معصوم حسن اور روتا بلکتا دل...... ان سے کسی کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ البتہ کئی ایسے تھے کہ جو چلتی بس کی کھلی کھڑکی سے تیز ہوا کے ایسے جھونکے کے منتظر تھے جو اس کے رخ پہ پڑے نقاب کو پلٹ دے مگر اس روز کسی کی حسرت پوری نہ ہوئی۔ اسٹاپ آتے گئے، بس رکتی اور چلتی رہی، لوگ اترتے اور چڑھتے رہے مگر نقاب الٹنے کی حسرت...... وہ اترنے والوں کے ساتھ جانے کے بجائے ہر آنے والے کے دل میں گھر کرتی رہی۔ نورین بدستور بے آواز رو رہی تھی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے مگر نقاب کے پیچھے چھپی آنکھوں سے۔

جیسے تیسے کر کے مزید ایک ہفتہ گزر گیا۔ نورین بری طرح ٹوٹ چکی تھی مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ ایک بار پھر حوصلہ کیا اور ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ اس بار اس نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی دفتر میں نوکری کرے گی تاکہ ماں کی دیکھ بھال کا وقت مل سکے۔ ویسے بھی اب وہ کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل تو ہوچکی تھی مگر مہروں کی سوزش پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔

کئی روز کے بعد ایک نوکری مل ہی گئی۔ اسے سٹی اسٹیشن کے قریب واقع ایک بہت بڑے پلازہ میں دو کمروں پر مشتمل دفتر میں ملازمت ملی تھی۔ نیم تاریک دفتر کا ماحول بہت پُراسرار تھا۔ یہ ایک ریکروٹنگ ایجنسی کا دفتر تھا جو لوگوں سے پیسے لے کر انہیں دبئی، سعودی عرب وغیرہ میں ملازمت دلواتی تھی۔ نورین کو دفتر کے مالک نے ٹیلی فون آپریٹر رکھا تھا۔ ملازمت کے اوقات صبح نو سے شام پانچ تک تھے۔

دو تین دن تو ٹھیک گزرے۔ نورین سارا دن داخلی دروازے کے سامنے ایک میز اور کرسی پر مشتمل استقبالیہ پر بیٹھی رہتی۔ دن بھر لوگوں کے فون آتے رہتے۔ وہ انہیں ہولڈ کروا کر مالک سے بات کراتی۔ اکثر جوابات وہ خود دیتی تھی۔ دو دن میں ہی وہ سمجھ گئی کہ دفتر کا مالک عبدالقادر خود بات کرنے سے گریز کرتا تھا۔ زیادہ تر لوگ صرف یہی جاننے کے لیے فون کرتے تھے کہ ان کا ویزا کب آرہا ہے اور جواب میں نورین مالک کا رٹایا ہوا جواب سنادیتی تھی۔ ’’پروسیس ہورہا ہے، جیسے ہی ویزا آتا ہے، آپ کو اطلاع کردی جائے گی۔ بے فکر رہیں اور جانے کی تیاری کریں۔‘‘ پہلے ہی دن اس نے اتنی بار یہ جملہ دہرایا کہ پھر مشین کی طرح اسے ادا کرنے لگی تھی۔

ہفتہ، دس دن تو خیریت سے گزرے مگر پھر ایک دن عبدالقادر نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔ کچھ دیر تک وہ اسے کرید کرید کر گھر والوں، رشتے داروں اور ان کے مالی حالات کے بارے میں پوچھتا رہا۔ نورین بھی بھولپن میں اسے ہمدرد سمجھ بیٹھی اور سارا ماجرا کہہ ڈالا۔

’’بے فکر رہو۔‘‘ سب کچھ سننے کے بعد عبدالقادر نے میٹھے لہجے میں اس سے کہا۔ ’’یہ ملازمت تمہاری ہے اور جب تک تم چاہوگی، تمہاری ہی رہے گی۔‘‘

’’جی بہت شکریہ۔‘‘ یہ سن کر نورین کی ڈھارس بندھی کہ چلو ملازمت تو پکی ہے۔ اس خوشی میں بے چاری نے یہ نہ دیکھا کہ اس وقت عبدالقادر کے ہونٹوں پہ رقصاں مسکراہٹ اور اس کے سراپا کا طواف کرتی آنکھیں خاموشی کی زبان میں کیا کہہ رہی تھیں۔ فون کی گھنٹی بجی تو وہ دوسرے کمرے میں استقبالیہ کی طرف جانے کو مڑی۔

’’تم ایک کام کرو۔‘‘ اسے اٹھتا دیکھ کر عبدالقادر نے جلدی سے کہا۔

’’جی سر!‘‘ وہ ٹھہر گئی۔

’’کسی کا بھی فون ہو، کہہ دینا میں دفتر میں نہیں ہوں۔‘‘

’’جی بہتر سر۔‘‘ وہ پلٹ رہی تھی کہ اس نے پکارا۔

’’پوری بات سنو۔‘‘ اس نے ٹوکا۔

وہ خاموشی سے کھڑی ہوکر اسے دیکھنے لگی۔

’’میں نے بریانی، کھیر اور کولڈ ڈرنکس منگوائی ہیں۔ لڑکا لے کر آئے تو فون لائن آف کر کے دروازہ بند کردینا۔ سکون سے بیٹھ کر لنچ کریں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر...... اب میں جاؤں؟‘‘ اس نے معصومیت سے پوچھا۔ فون کی گھنٹی بدستور بج رہی تھی۔

عبدالقادر نے سر ہلا کر جانے کا اشارہ کیا۔

کوئی ڈیڑھ بجے ڈیلیوری بوائے کھانا لے کر آیا۔ اس نے کھانا اندر کمرے میں بھجوا دیا۔ ابھی وہ اٹھنے ہی والی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف ایک کلائنٹ تھا۔ وہ کئی روز سے فون کررہا تھا لیکن عبدالقادر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ لائن اسے ٹرانسفر نہ کی جائے۔ اسے مطمئن کرنے میں دس پندرہ منٹ لگ گئے۔ جب وہ اٹھ کر کمرے میں پہنچی تو عبدالقادر میز پر کھانا سجائے اس کا منتظر تھا۔ بریانی، رائتہ اور کھیر کے ساتھ کولڈ ڈرنکس سے بھرے دو گلاس بھی سامنے رکھے تھے۔ سمٹی سمٹائی نورین خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب وہ کسی غیر مرد کے ساتھ تنہائی میں لنچ کررہی تھی۔ اسے اس وقت خاصی شرم محسوس ہورہی تھی جو کہ فطری بات تھی۔ وہ اس طرح کے ماحول کی عادی ہی نہ تھی۔ کمرے میں ائرکنڈیشنر چلنے کی گھوں گھوں کے سوا مکمل خاموشی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے ایک گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے شکریہ کہتے ہوئے گلاس تھام لیا۔ وہ کولڈ ڈرنک پی کر جانے کے لیے اٹھی تو ہلکے سے لڑکھڑا گئی مگر فوراً کرسی تھام کر خود کو گرنے سے بچایا۔

’’کیا ہوا محترمہ......‘‘ عبدالقادر نے اپنائیت سے کہا۔

’’کچھ نہیں سر...... لگتا ہے پاؤں سن ہوگیا تھا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔‘‘

’’اچھا سر میں چلتی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

’’سنو......‘‘

’’جی سر!‘‘

''بھئی ابھی ابھی لنچ ختم کیا ہے۔ ویسے بھی تمہارے کمرے میں خاصی گرمی ہوگی۔ بہتر ہے کچھ دیر یہیں صوفے پر بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں سر...... فون آف ہے۔ لوگوں کے فون آرہے ہوں گے۔''

''ارے بھئی آنے دو۔ کچھ دیر آرام کرلوگی تو کوئی پہاڑ نہیں گر پڑے گا۔ ویسے بھی فون کرنے والوں کے پاس ہمارے فائدے کا تو کچھ ہے نہیں۔ اپنے مقصد سے فون کرتے ہیں، پھر کرلیں گے۔ تم آرام کرلو۔ کھانے کے بعد قیلولہ کرنا ویسے بھی صحت کے لیے بہت بہتر ہے۔''

''جیسا آپ کہیں......'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ نورین کو کھانے کے بعد جسم کچھ کچھ سن سا لگنے لگا تھا۔ سر بھی بھاری ہورہا تھا۔ ویسے بھی وہ ناشتا کرکے نہیں آئی تھی۔ اسے لگا کہ شاید بھوک کے باعث کھانے کے خمار سے ایسا ہورہا ہے۔ سر کا بھاری پن بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ آنکھیں کھلی رہیں لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنے اعصاب پر قابو کھوتی جارہی ہو۔ اس نے صوفے سے سر ٹکادیا۔ لاکھ کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ نیم تاریک ٹھنڈے کمرے میں صوفے پر ڈھے گئی۔ آنکھ بند ہونے سے پہلے اس نے آخری بار سامنے نظر ڈالی۔ عبدالقادر قریب کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شیطانیت رقصاں تھیں۔ نورین کا دماغ بدستور نیند تلے دبتا جارہا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوچکی تھی۔ وہ گہری نیند سوچکی تھی۔

نہ جانے کتنی دیر وہ گہری نیند میں رہی جاگنے پر پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جب اس کا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا اور اس نے خود پر نظر ڈالی تو سب کچھ سمجھ گئی۔ بے ترتیب لباس فرش پر پڑا دوپٹا اس کے لٹنے کی دُہائی دے رہا تھا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ عبدالقادر وہاں نہ تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپا اور زاروقطار رونے لگی۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ عبدالقادر کمرے میں داخل ہورہا تھا۔ اس نے لائٹ جلائی اور نورین کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

''اتنا اداس مت ہو۔'' وہ نورین کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور روئے جارہی تھی۔

''جو ہونا تھا، ہوچکا۔ اب رونے سے کیا فائدہ۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تڑپ کر اٹھی۔

''تم...... بےغیرت انسان۔''

''بکواس مت کرو۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر تیزی سے اٹھا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا۔ وہ فرش گرگئی۔ ''ایسا ناٹک کررہی ہے جیسے بہت انہونی بات ہوگئی ہو۔'' اس نے نہایت رعونت سے کہا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے قدموں میں پڑی نورین روئے جارہی تھی۔

کمرے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ آخر نورین بدقت تمام اٹھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ خباثت سے مسکرایا۔ ''باتھ روم میں جاکر منہ ہاتھ دھولو۔''

نورین نے اس کے چہرے کی طرف غصے سے دیکھا لیکن بِنا کچھ کہے اپنا لباس درست کرکے اٹیچڈ باتھ روم میں چلی گئی۔ رونے اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی طبیعت میں لٹنے کا احساس بظاہر تو کچھ کم ہوگیا تھا مگر اسے یوں محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اپنی بےتوقیری پر اس کے جسم کا رُوں رُواں دہاڑیں مار مار کر رورہا ہو۔ وہ باتھ روم سے باہر آئی تو سامنے عبدالقادر کھڑا تھا۔ اس نے نورین کو دونوں بازوؤں سے پکڑلیا۔ ''جو کچھ ہوا، اتنا برا بھی نہیں تھا۔''

''چھوڑو مجھے......'' وہ کسمسائی۔ ''مجھے جانے دو۔'' اس کی آواز بھرارہی تھی۔

''میں تمہیں روک نہیں رہا، جاؤ بڑے شوق سے جاؤ مگر ایک بات یاد رکھنا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نورین کو زبردستی صوفے پر بٹھادیا۔ ''پولیس کے پاس جانا چاہو تو فوراً جاؤ مگر یہ یاد رکھنا کہ بدنامی تمہارا مقدر ہوگی میرا نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک گڈی اس کی نظروں کے سامنے گھماتے ہوئے بولا۔ ''میری بات مانوگی تو یہ نہیں اس جیسی بہت سارے نوٹوں کی گڈیاں تمہارے پاس آتی رہیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے وہ نوٹ نورین کے ہاتھ میں پکڑانے کی کوشش کی مگر اس نے ہاتھ جھٹک دیا۔ نوٹ فرش پر بکھر گئے۔ یہ دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔ ''ابھی برا لگ رہا ہے لیکن جب تمہارا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو تمہیں اسی میں فائدہ نظر آئے گا۔ عیش کروگی عیش...... مان لو میری بات۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے نورین کو خود سے چمٹانے کی کوشش کی مگر اس نے غصے سے اس کے بازوؤں کو جھٹکا اور غصے سے تلملاتی ہوئی اٹھی۔

''لعنت بھیجتی ہوں ایسے نوٹوں پر اور تم جیسے مردوں پر......'' یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئی۔

''آنا ضرور، انتظار رہے گا۔'' پیچھے سے عبدالقادر نے کہا مگر اس نے کچھ کہے بِنا اپنا پرس اٹھایا اور دفتر سے نکل گئی۔

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ غصے میں پیچ وتاب کھاتے ہوئے پیدل چلتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک ہوچکی تھیں مگر اس کا دل بدستور روئے جارہا تھا۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ سر پر وارث نہ ہو تو پیٹ کی آنچ سرد کرنے کے لیے بیٹیوں کو کیا کچھ قیمت چکانا پڑسکتی ہے۔ اسے رہ رہ کر اپنی کم تعلیم پر بھی غصہ آرہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے اچھی تعلیم حاصل کی ہوتی تو شاید اسے ملازمت کے لیے ایسے گھٹیا مردوں کے بجائے باعزت اداروں میں نوکری ضرور مل جاتی۔ اس کے دماغ میں ایک کے بعد دوسری سوچ آندھی طوفان کی طرح داخل ہورہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے دماغ کی تنی ہوئی نسیں کسی بھی لمحے پھٹ کر سارا لہو اگل دیں گی۔ وہ بیک وقت اپنی یتیمی، بےچارگی اور غربت کے طوفان میں تھی تو دوسری طرف عزت لٹ جانے کا دکھ اسے مارے جارہا تھا۔

بےعزتی کا احساس اور لاچارگی کے دیے گئے دکھوں کا بوجھ اٹھائے وہ ایمپریس مارکیٹ تک پہنچ گئی۔ اچانک اسے لگا کہ جیسے زمین گھوم رہی ہو۔ ہر طرف آندھیاں چل رہی ہوں۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا اور پھر وہ سڑک پر ڈھتی چلی گئی۔ وہ بےہوش ہوچکی تھی۔ اسے گرتا دیکھ کر سڑک کنارے چلتی ہوئی دو نوجوان لڑکیاں تیزی سے اس کی طرف لپکیں۔ ''شاید گرمی سے بےہوش ہوگئی ہے، چکر آگئے ہوں گے۔'' ان میں سے ایک نے دوسری سے کہا۔

ان دونوں لڑکیوں نے نورین کو عورت ہونے کے ناتے سنبھالا۔ اسی دوران سامنے والے ہوٹل کا ویٹر پانی سے بھرا جگ لے آیا۔ ایک لڑکی نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ دوسری اس کے چہرے پر دوپٹے کے پلّو سے ہوا جھلنے لگی۔ کچھ دیر میں وہ ہوش میں آگئی۔

''میں چلتی ہوں۔'' نورین نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے لہجے سے نقاہت جھلک رہی تھی۔

''تم بےہوش ہوگئی تھیں۔'' ان میں سے نسبتاً بڑی لڑکی نے کہا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ بہتر ہے کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ ویسے تمہیں جانا کہاں ہے؟''

''ماڈل کالونی......''

''وہ تو بہت دور ہے۔ کہیں بس میں تمہاری طبیعت بگڑ گئی تو......'' دوسری لڑکی نے ٹوکا۔

''دیکھو......'' پہلی لڑکی نے نورین کو مخاطب کیا۔ وہ اس کا بازو تھامے کھڑی تھی۔ ''یہاں قریب میں ہی ہمارا فلیٹ ہے۔ تم ہمارے ساتھ گھر چلو۔ تھوڑی دیر پنکھے میں بیٹھو۔ تمہاری طبیعت بہتر ہوجائے تو ہم دونوں تمہیں خود بس میں بٹھادیں گے۔ اس وقت تمہارا سفر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''نہیں میں چلی جاؤں گی۔''

''ہرگز نہیں۔'' دونوں لڑکیوں نے بیک زبان ہوکر کہا۔

''مگر......''

نسبتاً بڑی عمر کی لڑکی نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم ہماری بہن جیسی ہو۔ ہم تمہیں خوامخواہ خطرہ مول نہیں لینے دیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھی۔ نورین بھی کچھ کہے بِنا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

صدر میں لکی اسٹار کے قریب واقع اپارٹمنٹس میں زیادہ تر کرسچن اور تھوڑے بہت مسلمان آباد تھے۔ قدیم انداز میں تعمیر کردہ اس اپارٹمنٹس بلڈنگ میں عام طور پر متوسط طبقے کے افراد رہائش پذیر تھے۔ وہ دونوں لڑکیاں آنٹی رضیہ کے ساتھ اسی بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام شازیہ تھا جو شازی کہلاتی تھی دوسری تھی نعیمہ عرف نمو۔ دونوں کا تعلق پنجاب سے تھا اور کراچی میں آنٹی رضیہ نہ صرف ان دونوں بلکہ ان جیسی کئی بےسہارا اور غریب لڑکیوں کی چھپر چھاؤں تھی۔ صبح سے شام تک ان گنت لڑکیوں کی فلیٹ میں آمدورفت رہتی تھی لیکن نمو اور شازی وہاں کی مستقل رہائشی تھیں۔ اس دوپہر دونوں گھر کا سودا سلف لینے کے لیے ایمپریس مارکیٹ پہنچی تھیں کہ انہوں نے نورین کو بےہوش ہوکر گرتا دیکھ لیا اور جب وہ اسے سہارا دے کر اپنے فلیٹ میں لائیں، اس وقت آنٹی رضیہ کے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا۔

نورین اس وقت تک پورے ہوش وحواس میں نہ تھی۔ اس کی نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی۔ لے دے کر صرف ایک ماں تھی وہ بھی مصیبتوں کی ماری ہوئی۔ ایسے میں وہ کس سے اپنے دل کا حال کہتی۔ کس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی۔

اب جو اسے ان لڑکیوں اور آنٹی کی توجہ ملی تو اس کا دل بھر آیا۔ شازی اور نمو نے مختصراً ساری کہانی آنٹی کو سنائی اور جب انہوں نے اسے بیڈ پر لٹا کر اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر پیار سے سہلانا شروع کیا تو نورین کا دل بھر آیا۔ وہ جی بھر کر روئی اور نہ جانے کیسے اس دوران اس کی آنکھ لگ گئی۔ شاید یہ اس خواب آور دوا کا اثر تھا جو عبدالقادر نے اسے سوفٹ ڈرنک میں ملا کر پلائی تھی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو شام کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ آنکھیں موندے لیٹی رہی اور پھر اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اسی دوران آنٹی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہیں آتا دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

''آنٹی میں چلتی ہوں، گھر پہنچنا ہے۔ شام ہو چکی۔'' اس نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''چلی جانا میری بچی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ''اب تمہاری طبیعت کافی بہتر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے نورین کے سراپا پر نظر ڈالی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''آج بہت گرمی ہے۔ لگتا ہے اسی کی وجہ سے تمہاری طبیعت خراب ہوئی تھی۔ میرے خیال میں تم نہا لو تو طبیعت ہلکی ہو جائے گی۔ پھر نمو اور شازی تمہیں اسٹاپ تک چھوڑ آئیں گی۔'' وہ پوچھنا تو بہت کچھ چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر کچھ کہنے سے گریز کیا کہ لڑکی اجنبی ہے، پہلی ملاقات ہے اور بھی ناخوش گوار حالات میں۔ ایسے میں اس نے نورین کو کریدنے کے بجائے پیار جتانے پر ہی اکتفا کیا۔

اسی دوران نمو اور شازی بھی کمرے میں آگئیں۔ وہ دونوں بہت ہمدرد تھیں۔ ان کے اصرار پر نورین غسل خانے کی طرف چل دی۔ نہا کر نکلی تو وہ تینوں چائے کے ساتھ اس کی منتظر تھیں۔ نہانے اور چائے پینے کے بعد اس کی طبیعت کافی ہشاش بشاش ہو گئی۔ تذلیل کا دکھ بھی کچھ کم ہو گیا تھا۔ چائے کے دوران بھی وہ تینوں مسلسل اس کی دلجوئی کرتی رہیں۔

نورین جب گھر پہنچی تو رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ ماں کو سلام کر کے وہ سیدھے اپنے کمرے میں گئی اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔

''کیا ہوا میری بچی......'' کچھ دیر بعد ماں نے کمرے میں آ کر لائٹ جلاتے ہوئے کہا تو اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں۔ ''لگتا ہے آج بہت کام کیا، تھک گئی ہو۔'' وہ پلنگ پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''بس امی......'' نورین نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بدقت تمام کہا۔

''کیا سر میں درد ہو رہا ہے؟''

''جی امی......''

''لاؤ سر دبا دوں۔''

''رہنے دیں۔''

''اچھا کھانا کھا لو، پھر گولی کھا کر سو جانا۔''

''امی مجھے بھوک نہیں ہے۔ سر میں درد ہے۔ آپ گولی لا دیں۔''

وہ ساری رات نورین نے نہایت کرب میں گزاری۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب وہ روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں نے جگایا تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ جسم بھی ہلکا ہلکا تپ رہا تھا۔

''تجھے تو حرارت ہو رہی ہے بیٹا۔'' ماں نے اس کے چہرے سے ہی بھانپ لیا تھا کہ بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ''سو جا۔ آج دفتر جانے کی ضرورت نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے چلی گئی۔

نورین دوبارہ سو گئی اور جب آنکھ کھلی تو دوپہر کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ کافی دیر تک وہ آنکھیں موندے بستر پر لیٹی رہی۔ اس نے کئی بار کن انکھیوں سے ماں کو کمرے میں آتا جاتا دیکھا لیکن بظاہر وہ سوتی بنی رہی۔ تذلیل کا گھاؤ اگرچہ تازہ تھا لیکن زخم مندمل ہونے لگے تھے۔ اگرچہ اس کا دل اب بھی دکھی تھا لیکن اب وہ اس سے آگے کا سوچ رہی تھی۔ عبدالقادر کے دفتر میں دوبارہ جانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پریشان تھی کہ ماں کو نوکری چھوڑنے کا کیا جواز بتائے۔ اس کی پریشانی یہ بھی تھی کہ چند روز کی ملازمت تھی وہ بھی کافی دن بعد ملی تھی، اب وہ کیا کرے گی۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی تذلیل کا راز سینے میں ہی دفن کر لے گی لیکن جیسے ہی موقع ملا، وہ عبدالقادر سے اس ظلم کا حساب ضرور بے باق کرے گی۔

وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے کمرے سے نکل کر باہر آئی تو ماں تخت پر بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھی۔ ''سلام امی......'' یہ کہتے ہوئے وہ ماں کے پاس بیٹھ گئی۔

ماں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''بالکل ٹھیک......'' وہ زبردستی مسکرائی۔

''جا کر منہ ہاتھ دھو لے، میں ناشتا بناتی ہوں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ناشتے کے بعد وہ ماں کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ''امی ایک بری خبر ہے......''

''کیا......'' یہ سنتے ہی اس نے حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ ''کیا ہوا، سب خیریت تو ہے نا؟''

''ہاں امی، سب خیریت ہے۔'' اس نے فرش پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔''

''لیکن کیوں......تم تو اپنے وقت پر دفتر جاتی تھیں، لیٹ گھر لوٹتی تھیں تو پھر......''

''بس امی، انہیں ماڈرن لڑکی چاہیے فیشن ایبل، پٹ پٹ انگریزی بولنے والی۔ یہ سب خوبیاں مجھ میں نہیں ہیں۔''

یہ سن کر ماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''اے پروردگار ہم پر اپنا کرم کر دے۔'' صاف ظاہر تھا کہ بیٹی کی ملازمت چھوٹنے کی یہ اطلاع ان پر کسی بم کے گرنے سے کم تباہ کن نہ تھی۔

''امی فکر نہ کرو......'' نورین نے نگاہیں اوپر کر کے دیکھا تو ماں کے چہرے پر لکھی پریشانی فوراً پڑھ لی۔

''بیٹا کیسے فکر نہ کروں۔''

''امی میں شام کو کونسلر صاحب کے پاس ان کے گھر جاتی ہوں۔ ان کی بہت جان پہچان ہے۔ ان سے کہتی ہوں۔ اللہ کوئی بندوبست کر دے گا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' ماں کے چہرے پر امید کی کرن تھی۔

''بس آپ فکر نہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اللہ تیری زبان مبارک کرے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر سبزی کاٹنے لگی۔

شام ڈھلے وہ کونسلر صاحب کے گھر گئی اور ان سے کسی ملازمت کا بندوبست کرنے کی درخواست کی۔ اس نے انہیں بھی ملازمت چھوٹنے کی وہی وجہ بتائی جو ماں سے کہی تھی۔

کچھ دیر تک سوچ و بچار کے بعد کونسلر صاحب نے نورین کی طرف دیکھا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ ایک صاحب کا خیال میرے ذہن میں آیا ہے۔ میرے دوست ہیں، امید ہے دو چار دن میں تمہارا کام بن جائے گا۔''

''بہت شکریہ انکل......'' ان کی یہ بات نورین کی ہمت بندھانے کے لیے کافی تھی۔

''ارے نہیں، تم میری بیٹی کی طرح ہو اور بیٹیاں باپ کا شکریہ ادا نہیں کرتی ہیں۔''

''جی انکل......'' وہ مسکرائی۔ اس وقت کونسلر صاحب اسے اپنے باپ جیسے لگے تھے۔

نورین گھر لوٹی تو اس کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ ذہن بھی ہلکا ہو چکا تھا لیکن جب اسے اپنی تذلیل یاد آتی تو اس کے ذہن و دل میں ہلچل مچنے لگتی تھی۔ تین چار دن گزر گئے۔ آخر ایک شام کونسلر صاحب ان کے گھر آئے۔ انہوں نے لانڈھی سائٹ ایریا میں واقع ایک دوا ساز فیکٹری میں نورین کے لیے ملازمت کا انتظام کر دیا تھا۔ پیکنگ گرل کی ملازمت تھی۔ پک اینڈ ڈراپ کے ساتھ ساتھ اوور ٹائم اور تنخواہ بھی اچھی تھی۔ لنچ کے لیے کینٹین تھی جہاں معمولی رقم میں بہترین کھانے کا انتظام تھا۔ نورین اور اس کی ماں کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی۔ نورین خوش تھی کہ اسے بسوں میں دھکے بھی نہیں کھانا پڑیں گے۔ ساتھ ہی وہ شام ساڑھے چھ تک گھر بھی واپس آجایا کرے گی۔ یہ بات بھی اس کے لیے قابلِ اطمینان تھی کہ اسے لڑکیوں کے ساتھ ہی کام کرنا پڑے گا۔ اس واقعے کے بعد سے اس کے دل میں مردوں کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ اب تک وہ یہی سوچ سوچ کے ہلکان تھی کہ کہیں اسے مردوں کے ساتھ کام نہ کرنا پڑے۔ اس خبر نے تو جیسے اس کے زخم ہی مندمل کر دیے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس بار اس کے دکھوں کا مداوا کر ڈالا ورنہ تو ایک طرف اس کے اندر تذلیل کے باعث ہونے والی کشمکش اور دوسرا غم روزگا کی فکر، دونوں نے جیسے اس کی زندگی اجیرن کر ڈالی تھی۔ ماں، بیٹی کے من سے تو ناواقف تھی مگر پیٹ کی آنچ سرد کرنے کا وسیلہ نہ ہونے سے وہ بھی بہت پریشان تھی مگر کونسلر صاحب کی شکل میں تو جیسے ان کی مشکل آسان ہو گئی ہو۔

اس رات دونوں ماں بیٹیوں نے تمام پریشانیوں سے نجات حاصل کر کے نہایت سکون سے کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ دونوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی روح پر لگنے والے زخم کو بھول چکی ہو۔

وقت دکھوں کا سب سے بڑا مداوا اور زخموں کا سب سے اکسیر مرہم ہے۔ نورین اپنی ملازمت سے بے حد خوش تھی۔ جس سیکشن میں وہ کام کرتی تھی وہاں مردوں کا عمل دخل

نہ ہونے کے برابر تھا۔ کینٹین میں بھی خواتین کا حصہ الگ تھا۔ لنچ کے لیے ایک گھنٹا ملتا تھا۔ کھانے کے دوران ہی اس کی ملاقات نجمہ سے ہوئی۔ دونوں بہت جلد اچھی سہیلیاں بن گئیں۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان کوئی مشترکہ بات نہ تھی۔ نجمہ نے کراچی یونیورسٹی سے فارمیسی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ وہ کئی سال سے ملٹی نیشنل دوا ساز کمپنی کی لیبارٹری میں کام کر رہی تھی۔ اس کے والد سول انجینئر تھے اور وہ گلشن اقبال میں ایک بڑے بنگلے میں رہتی تھی۔ خود کار چلاتی تھی۔ کمپنی نے اسے کار اور پیٹرول کی سہولت بھی دے رکھی تھی۔ اس کے مقابلے میں نورین ایک غریب گھرانے کی مڈل پاس لڑکی تھی۔ دونوں کی عمروں میں بھی فرق تھا۔ نجمہ اس سے کئی سال بڑی تھی لیکن اس کے باوجود بہت جلد دونوں میں دوستی کا رشتہ اس قدر مضبوط ہوگیا کہ ان کے درمیان کسی بھی قسم کا معاشی یا سماجی فرق باقی نہ رہا۔ وہ دونوں کینٹین میں ساتھ لنچ کرتی تھیں۔ اس دوران باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ نجمہ کئی بار اس کے گھر آئی۔ نورین کی ماں بھی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ دوسرے دولت مند لوگوں کے برعکس نجمہ کے ذہن میں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس سے ملنے کے بعد نورین کی زندگی میں خوش گوار تبدیلی آئی تھی۔ اس کی کوئی بہن تھی نہ کوئی سہیلی لیکن اس سے ملنے کے بعد لگا کہ جیسے اس کی زندگی میں بڑی بہن کی کمی پوری ہوگئی ہو۔

نورین، عبدالقادر کے دیے ہوئے زخم کو بڑی حد تک بھلا چکی تھی لیکن اس کے باوجود ذہن کے نہاں خانوں میں کہیں یہ زخم اب بھی تازہ تھا۔ کبھی کبھی رات کو لیٹے لیٹے اسے وہ بھیانک وقت یاد آتا تو اس کی نیند اڑ جاتی تھی۔ وہ گھنٹوں کروٹیں بدلتی رہتی۔ اس وقت اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات ہوتی کہ کاش اسے موقع ملے اور وہ عبدالقادر کو اس جرم کی اتنی بھیانک سزا دے کہ پھر وہ زندگی بھر کسی اور لڑکی کے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔ کئی بار اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اسے قتل کر رہی ہے اور وہ فرش پر پڑا، تڑپتا ہوا زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے، گڑگڑا رہا ہے لیکن وہ اس کی منت سماجت سے بے نیاز اس پر خنجر کے وار پہ وار کیے جا رہی ہے۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ خود اپنے خوف سے ہی اس کی آنکھ کھلتی تو پسینے میں شرابور ہوتی لیکن دن کا اجالا ایک بار پھر اس کی زندگی کو نارمل کر دیتا تھا۔ نورین جانتی تھی کہ اس کی زندگی کو معمول پر لانے میں کونسلر صاحب اور نجمہ کا بہت عمل دخل تھا۔ ان دونوں کے لیے اس کے دل سے ہمیشہ دعائیں نکلتی تھیں۔

نورین کی زندگی کے اس سب سے بڑے سانحے کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔ ملازمت بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ اچھی طرح کھانے پینے کے باوجود نورین کی ماں خاصی رقم پس انداز بھی کر لیتی تھی۔ اب اس کی ماں کا صرف ایک ہی خواب تھا کہ کسی طرح اتنی رقم جمع ہوجائے کہ وہ بیٹی کے ہاتھ پیلے کرکے سکون کی موت مر سکے۔ وہ دعا کرتی کہ دو چار سال بیٹی اور ملازمت کر لے تاکہ وہ اپنا فرض پورا کرنے کے قابل ہوسکے۔

نورین کو ملازمت کرتے ہوئے چھ ماہ ہو چلے تھے۔ اس کی روح پر لگا گھاؤ بھی کسی حد تک بھر چکا تھا۔ اب اسے بھیانک سپنے بھی نہیں آتے تھے۔ زندگی نئی ڈگر پر سکون سے آگے بڑھتی جا رہی تھی لیکن نورین کی زندگی میں تقدیر کے کئی موڑ آنا ابھی باقی تھے۔

☆☆☆

ایک شام نورین فیکٹری سے گھر لوٹی تو بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ ماں نے چائے بنائی۔ وہ دونوں برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اچانک جیسے ماں کو کچھ یاد آیا۔ ''لو...... میں تو بتانا ہی بھول گئی۔'' انہوں نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا امی، کیا بتانا بھول گئیں؟'' نورین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ارے بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور کمرے میں چلی گئی۔

''یہ لو۔'' باہر آکر اس نے ایک وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ ''کوئی عبدالقادر نام کا شخص آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تم اس کے دفتر میں ملازمت کرتی تھیں۔ بغیر بتائے نوکری چھوڑ آئی تھیں۔ کہہ رہا تھا یہ کارڈ دے دینا اور کہہ دینا کہ مجھے فون کرلے اور آکر اپنی ایک ہفتے کی تنخواہ لے جائے۔''

''کیا......'' ماں کی بات سن کر تو جیسے اس کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی۔ اس کے ذہن میں جھماکے ہو رہے تھے۔

''اور کیا کہہ رہا تھا وہ۔'' نورین نے اپنی دلی کیفیات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ نہیں چاہتی کہ ماں کو اس سانحے کے بارے میں کچھ پتا چلے۔

''اور تو کچھ خاص بات نہیں کی اس نے۔'' ماں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ ملیر کینٹ آیا تھا۔ یہاں کا فون نمبر تو تھا نہیں اس لیے اس نے تمہاری درخواست سے پتا نوٹ کر کے رکھا ہوا تھا کہ کسی دن اس طرف جانا ہوا تو تم سے مل کر یہ بات کہہ دے گا۔''

''اوہ میرے خدا!'' اس نے زیرِلب کہا۔

''کیا ہوا بیٹی؟''

''کچھ نہیں امی......''

''تم کہہ رہی تھیں کہ اس نے تمہیں خود نکال دیا تھا مگر وہ تو کہہ رہا تھا کہ تم نے خود......''

''ہاں امی میں نے خود ملازمت چھوڑی تھی۔''

''لیکن کیوں......''

''امی......'' نورین نے کچھ کہنا چاہا مگر رک گی۔

''تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟''

''امی...... میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ انہوں نے نہیں نکالا تھا، میں نے خود ہی وہ نوکری چھوڑ دی تھی۔ اس نے مجھے ذلیل کر دیا تھا۔''

''کیا......'' ماں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اچانک نورین کو خیال آیا کہ شاید وہ جذبات میں کچھ غلط کہہ گئی ہے۔ اس نے فوراً اپنے ذہن و دل پر قابو پانے کی کوشش کی اور لہجے کو نارمل کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''وہ دراصل دفتر کے ایک کام میں مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ جس پر انہوں نے کلائنٹس کے سامنے مجھے بری طرح ڈانٹا۔ بس میں یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکی۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ مجھے لگا کہ ابھی ہفتہ بھر ہوا نہیں کہ وہ اتنا بے عزت کر رہا ہے، آگے تو وہ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کرے گا۔ بس! پھر یہی سوچ کر میں نے چھوڑ دی تھی نوکری۔''

''اوہ......'' ماں نے یہ سن کر گہری سانس لی۔ وہ نہ جانے کیا کچھ سمجھ بیٹھی تھی لیکن یہ سن کر دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی۔ ''اچھی بات ہے بیٹی، ہاتھ بیچتے ہیں عزت نہیں جو کوئی بھی دو ٹکے دے کر ہماری بے عزتی کر دے۔''

''جی امی......'' نورین نے اوپری دل سے کہا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ پلکیں نم ہو رہی تھیں۔

''چل دل خراب نہ کر۔ منہ ہاتھ دھو کے تھوڑا آرام کر لے۔''

نورین اٹھ کر کمرے کی طرف جانے لگی۔

''ارے سن تو سہی......''

نورین پلٹی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اسے فون کرنے یا اس کے دفتر جانے کی۔ لعنت بھیج اس پر۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں ایک ہفتے کے چند سو روپوں کی۔ آنے دے۔ اگر اب کبھی اِدھر آیا تو اس کی وہ خبر لوں گی کہ پھر کسی لڑکی کو دوبارہ ڈانٹنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ تو فکر نہ کر......''

نورین کے ہاتھ میں اب تک وہ وزیٹنگ کارڈ تھا۔ اس نے ماں کی بات سنی اور خاموشی سے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کی باتیں آ رہی تھیں۔

اس رات وہ رات دیر گئے تک کروٹیں بدلتی رہی۔ وہ عبدالقادر کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوچکی تھی۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر اس کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ وہ من ہی من میں بہت ڈر رہی تھی۔ اس نے تو یہ بھی نہ سوچا تھا کہ وہ بے غیرت آدمی اتنی ڈھٹائی سے اس کے گھر کی دہلیز تک پہنچ جائے گا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر بھی پریشان تھی اگر وہ دوبارہ اس کے گھر آیا اور ماں نے اسے کھری کھری سنا دیں تو نہ جانے طیش میں آکر وہ کیا کچھ کہہ بیٹھے۔ کہیں وہ سب کچھ ماں کو نہ بتا دے۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا۔ ماں شاید یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے اور کہیں شرمندگی کے مارے وہ اپنی جان ہی نہ لے لے۔ اگر ماں نہ رہی تو وہ کیا کرے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا اور ماں کو سب پتا چل گیا تو وہ کس منہ سے ماں کا سامنا کرے گی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ نہ تو عبدالقادر کے دفتر جانا چاہتی تھی اور نہ ہی یہ چاہتی تھی کہ وہ دوبارہ اس کے دروازے پر آئے۔ اوپر سے ماں کا غصہ۔ وہ تکیے میں منہ دیے روئے جا رہی تھی۔ اس کی کوئی غلطی نہ تھی لیکن اس کے باوجود اس کی نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ جو گناہ گار تھا وہ چین کی نیند سو رہا تھا۔ صبح فجر کی اذان تک وہ جاگتی رہی۔ اس کے دل و دماغ میں جنگ چل رہی تھی۔ آخر کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عبدالقادر سے فون پر بات کرے گی۔ غصے یا پیار سے، جیسے بھی ہو وہ اس بات پر اسے رضامند کرنے کی کوشش کرے گی کہ اب نہ تو وہ کبھی اس کے گھر آئے اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی رابطہ کرے۔ جو ہو چکا، اسے وہ بھی بھول جائے۔

صبح ہو چکی تھی جب نورین کی آنکھ لگی۔ ماں نے جگانے کی کوشش کی لیکن بیٹی کی گہری نیند دیکھ کر جگانا مناسب نہ

سمجھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے جب نورین ہڑبڑا کر اٹھی۔ اس نے دیوار پہ لگی گھڑی پر نظر ڈالی لیکن ڈیوٹی پہ جانے کا وقت کب کا گزر چکا تھا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ کمرے سے باہر آئی تو ماں نے پوچھا۔

''جی امی، رات نیند ہی نہیں آرہی تھی۔''

''کیوں...... کیا کوئی پریشانی کی بات ہے؟''

''ارے نہیں امی...... آپ تو خوامخواہ پریشان ہوجاتی ہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ لگتا ہے پلنگ میں کھٹمل ہوگئے ہیں۔ ابھی دوا لاکر چھڑکتی ہوں۔ رات بھر کاٹتے رہے کمبخت، کہیں صبح جاکر آنکھ لگی تھی۔''

''ارے یہ بھی جان نہیں چھوڑتے۔'' ماں نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''تم برش کرلو، میں ناشتا بناتی ہوں۔''

''جی امی......'' یہ کہتے ہوئے وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

ناشتے سے فارغ ہوئی تو سوا بارہ بج رہے تھے۔ نورین نے ماں کی نظر بچا کر عبدالقادر کا وزیٹنگ کارڈ پرس میں رکھا۔ وہ برقع پہننے لگی تو ماں نے پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

''امی فیکٹری میں سپروائزر کو فون کردوں کہ طبیعت خراب ہے، ورنہ غیر حاضری کی تنخواہ کٹے گی۔''

''کہہ دینا کہ رات سے بخار ہے۔''

''یہی کہوں گی، تبھی میڈیکل کی چھٹی ملے گی۔''

''ٹھیک ہے۔ تم ہوکر آجاؤ تو پھر میں بازار جاؤں گی۔''

نورین گھر سے نکل کر مارکیٹ میں واقع پی سی او تک پہنچی۔ اگرچہ پی سی او اس کی گلی میں بھی تھا لیکن یہاں خواتین کے لیے علیحدہ بوتھ تھا۔ اسی لیے وہ کافی دور تک پیدل چل کر یہاں تک پہنچی تھی تاکہ کوئی اس کی بات نہ سن سکے۔ اس نے عبدالقادر کا نمبر ملایا۔ فون اسی نے اٹھایا۔

''ہیلو...... کون بول رہا ہے؟''

''نورین......'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''ارررے...... کیسی ہو جانِ من۔''

یہ سنتے ہی نورین کا جسم ٹھنڈا پڑنے لگا۔

''خاموش کیوں ہو، کچھ بولو۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی تمہیں میرا کارڈ ملے گا، تم مجھے فوراً فون کروگی۔'' عبدالقادر خوشی سے چہک رہا تھا۔

''آپ کو میرے گھر نہیں آنا چاہیے تھا۔'' نورین نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''تو تم بھی تو پلٹ کر نہیں آئی تھیں۔ آجاتیں تو میں کیوں تمہارے گھر آتا۔'' الٹا چور کوتوال سے شکوہ کررہا تھا۔

''آپ نے جو کیا، اس کے بعد وہاں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''ارے بھئی بھول جاؤ، اس بات کو۔ اب تو نارمل ہوجاؤ۔ واپس آجاؤ عیش کروگی عیش......''

یہ سنتے ہی نورین کو طیش آگیا۔ اس نے عبدالقادر کی بات کاٹی اور غصے سے کہا۔ ''لعنت بھیجتی ہوں تم اور تمہارے عیش کی دعوت پر۔''

''ارررے...... اتنا غصہ......؟''

''بکواس مت کرو۔''

''اچھا بکواس نہیں کرتا۔'' عبدالقادر کا لہجہ یکدم نہایت سنجیدہ ہوگیا۔ ''لیکن ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لو۔ تمہیں میرے پاس آنا ہی ہوگا۔'' وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''بھول جاؤ۔ ایک بار میری نادانی کا فائدہ اٹھالیا لیکن اب میں تمہارے جھانسے میں نہیں آنے والی۔''

''وہ تو تم آہی چکی ہو ورنہ فون کیوں کرتیں۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

''میں نے صرف یہ کہنے کے لیے فون کیا ہے کہ اب میرے گھر کبھی مت آنا ورنہ......''

''ورنہ کیا کرلوگی میری ننھی پری......''

''جان لے لوں گی تمہاری۔''

''وہ تم پہلے ہی لے چکی ہو، تبھی تو تمہارے در کا چکر لگایا تھا۔''

''تم کمینے انسان......''

''بکواس مت کرو۔ منہ بند کرو اور میرے پاس آجاؤ۔''

''ناممکن...... اب سب کچھ بھول جاؤ، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔'' نورین نے تقریباً چلّاتے ہوئے کہا۔

''ناممکن......'' عبدالقادر نے اس کے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے سکون سے کہا۔ ''تمہیں وقتاً فوقتاً میرے پاس آتے رہنا ہوگا ورنہ......''

''ورنہ کیا کرلوگے تم......'' نورین شدید غصے میں تھی۔

''اگر تم نہ آئیں اور میری بات نہ مانی تو میں صرف ایک ہفتے انتظار کروں گا اور پھر تمہارے گھر آؤں گا۔''

''اگر اب دوبارہ ہمارے گھر آئے تو میری ماں تمہیں چیر دے گی۔''

''ارے نہیں میڈم، اس طرح مت ڈراؤ ورنہ میں وہ تصویریں انہیں ڈاک سے بھیج دوں گا۔'' عبدالقادر نے ڈرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا اور بات مکمل کرکے زور سے ہنسا۔ ''کچھ سمجھ آیا میڈم......''

''کیا مطلب ہے تمہارا......'' نورین کچھ سمجھی نہ تھی۔

''ارے میں تو بھول ہی گیا تھا، تمہیں تو پتا ہی نہیں ہوگا کہ میں نے تمہاری کتنی اچھی تصویریں کھینچی تھیں اُس دن۔''

''کیا بک رہے ہو منحوس انسان......''

''جب تم لنچ کے بعد مزے سے خوابِ خرگوش میں تھیں تو میں نے تمہارے حسن کی ایسی ایسی تصویریں لی ہیں کہ بس......''

''کیا......'' وہ اب ساری بات سمجھ چکی تھی۔

''میڈم اگر وہ تصویریں تمہاری ماں نے دیکھ لیں تو خوشی سے مرجائیں گی، بہتر ہے تم دفتر آکر خود دیکھ لو، پھر سوچنا کہ مجھ سے دوستی رکھنا ہے یا نہیں۔''

''تم نے ٹھیک نہیں کیا۔'' وہ روہانسی ہورہی تھی۔

''میڈم ایک بار تصویریں دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ پھر تم کبھی مجھ سے تعلق توڑنے کا سوچوگی بھی نہیں۔ ویسے فائدے میں ہی رہوگی، عیش کرادوں گا عیش۔'' عبدالقادر کو نورین کے لہجے سے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ وہ اس کے لہجے سے شکست بھانپ چکا تھا۔ اب اس کا لہجہ حکمیہ تھا۔

دوسری طرف کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ نورین رو رہی تھی۔

''چپ کیوں ہو؟''

''خدا کے لیے میری جان بخش دو۔'' نورین نے روتے روتے کہا۔

''اوہ مائی گاڈ...... تم رو رہی ہو۔'' عبدالقادر پھر اداکاری پر اتر آیا تھا۔ ''دیکھو رومت۔ رونے سے مسائل حل ہوتے تو پھر پوری دنیا اپنے مسائل حل کرنے کے لیے زور زور سے، دہاڑیں مار مار کر رو رہی ہوتی۔'' وہ سمجھ چکا تھا کہ لوہا گرم ہوچکا ہے۔

''پلیز...... مجھے معاف کردو۔'' کمزور نورین خود کو اس کے سامنے بے بس پارہی تھی۔

''دیکھو میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔ بس جب میں بلاؤں تب تم آجایا کرو۔ باقی تمہیں نوٹ اور عیش دونوں ملیں گے۔''

''نہیں چاہئیں مجھے ایسے نوٹ، میں عزت سے دو وقت کی روٹی کمارہی ہوں۔'' نورین نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''بس! بات بہت لمبی ہوچکی، رونا دھونا بند کردو۔''

یہ سن کر لمحہ بھر کو نورین کو ایسا لگا کہ شاید عبدالقادر کا دل پسیج گیا۔ اس نے فوراً کہا ''جی......''

''جو کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔''

''کہیے۔''

''تمہارے پاس ایک ہفتے کا وقت ہے۔ میرے پاس آؤ یا پھر تیار ہوجاؤ۔'' عبدالقار نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

یہ سن کر نورین پریشان ہوگئی ''ایک ہفتے کے اندر تم میرے پاس نہیں آئیں تو اگلے ہفتے تمہاری وہ تصویریں تمہاری ماں کے پاس پہنچ جائیں گی۔''

ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...... پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی جولائی کا
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا، میری عزت دار ماں یہ برداشت نہیں کرسکے گی۔" نورین نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"ایک ہفتہ...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ دوستی یا پھر......"

"خدا کے لیے......" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن عبدالقادر نے فون بند کردیا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی چال کامیاب رہی ہے۔

نورین پی سی او سے نکلی تو اس کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوچکی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کی طرف چل دی۔ اس دن شدید گرمی تھی لیکن ذہن و دل کی تپتی بھٹی میں جلتی بھنتی نورین کو آگ برساتے سورج کی تمازت کا ذرا بھی احساس نہ تھا۔ وہ گھر پہنچی تو ماں اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئی۔

"کیا پیدل آرہی ہو۔" انہوں نے بیٹی کا برقع اتارتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے لو لگ گئی ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ اس بھری دوپہر میں تم کیوں باہر گئیں۔ بھاڑ میں جائے ایسی نوکری۔ تمہاری جان سے زیادہ تو نہیں ہے۔"

نورین پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کا پورا جسم تپ رہا تھا۔ ماں شربت بنا کر لائی تو اسے پینے کے بعد اسے اپنی طبیعت کچھ بہتر لگی۔

"تم سو جاؤ۔" ماں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

نورین نے آنکھیں موند لیں۔

شام کو وہ اٹھی تو طبیعت بظاہر کچھ بہتر تھی لیکن وہ اسی سوچ میں گرفتار تھی کہ اب کیا ہوگا۔ جو کچھ ہوچکا تھا، وہ اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلا چکی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جو ہوا وہ ایک لمحہ تھا۔ وقت پلٹ کر نہیں آتا لیکن اس کی زندگی اب ایک نیا موڑ لینے جارہی تھی۔ گیا وقت پلٹ کر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ وقت خراج کا طلب گار تھا اور کمزور بے بس نورین تہی داماں تھی۔ وہ نہ تو کسی سے اپنا دکھ کہہ سکتی تھی اور نہ ہی مدد مانگ سکتی تھی۔ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہوچکا تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بظاہر اسے یہی نظر آرہا تھا کہ ماں کو بچانا ہے تو عبدالقادر کی بات ماننا ہوگی لیکن اس کے بعد...... اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس دوپہر عبدالقادر نے جو جال اس پر پھینکا تھا، وہ اس میں بری طرح پھنس چکی ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ بات صرف ایک بار اور ملنے تک محدود نہیں، وہ اسے بار بار بلائے گا تاوقتیکہ خود اس کا دل نہ بھر جائے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ ایسی دلدل میں پھنس گئی ہے جس سے نکلنے کی جدوجہد میں وہ مزید دھنستی چلی جائے گی۔

شام کو وہ اٹھی تو فیصلہ کرچکی تھی کہ خواہ کچھ ہوجائے وہ اپنے رویے اور جذبات سے ماں کو ایسا ہرگز محسوس نہ ہونے دے گی کہ وہ پریشان ہے۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ماں کو بیچ میں لائے بغیر وہ تنہا اس مصیبت کا سامنا کرے گی۔ اپنے دماغ میں یہ طے کرکے جب وہ کمرے سے باہر آئی تو شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ ماں مغرب کی نماز ادا کرکے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ وہ "امی، میری پیاری امی......" کہتے ہوئے ان کے گلے لگ گئی۔ بیٹی کو کھلکھلاتا دیکھ کر ماں کی سانس میں سانس آئی۔ انہوں نے اس پر پھونکا۔

"امی...... چائے پلائیں۔"

"شکر ہے اللہ کا، میں تو دوپہر کو تیری حالت دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔"

"ارے گرمی بہت تھی نا باہر۔ اوپر سے مارکیٹ چلی گئی تھی کھٹمل کی دوا لینے۔ نہ دوا ملی اور نہ بس......" یہ کہہ کر اس نے منہ بنایا۔ "خوامخواہ پیدل چلنا پڑا دو میل دور تک۔"

"آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ پتا ہے لو کتنی خطرناک چیز ہے، جان بھی لے لیتی ہے۔"

"جی امی، آئندہ نہیں کروں گی۔" نورین نے چھوٹے بچوں کی طرح معصوم صورت بنا کر کان پکڑے تو ماں نے فرطِ محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

ماں کی آغوش میں جاکر نورین کا دل بھر آیا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ سب کچھ ماں کو صاف صاف بتادے۔

"چل ہٹ، چائے بناتی ہوں۔" ماں نے بڑے دلار سے بیٹی کو اپنی آغوش سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب نورین نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کی نظر ماں کے چہرے پر تھی۔ بیٹی کو کھلکھلاتا دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان صاف جھلک رہا تھا۔ نورین نہیں چاہتی تھی کہ حقیقت کا پتا چلنے پر اس کی ماں کا یہ اطمینان چلا جائے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا سب کچھ صاف صاف کہہ دینے کے بعد وہ ماں سے نگاہیں ملانے کے قابل رہ پائے گی۔ کیا ماں سب کچھ جاننے کے بعد اسے کبھی اپنی آغوش میں لے سکے گی۔

رات بھر وہ اسی ادھیڑبن کا شکار رہی۔ نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح ساڑھے چھ بجے ماں

نے اسے اٹھایا۔ وہ کسلمندی سے اٹھی۔ رات بھر بے آرامی اور کم نیند کے باعث اس کی ہمت نہ تھی کہ بستر سے اٹھے لیکن وہ ایک روز پہلے ہی چھٹی کرچکی تھی۔ فیکٹری جانا ضروری تھا۔ اس نے جیسے تیسے کرکے ناشتا کیا اور اسٹاپ پر آگئی۔

لنچ بریک تک بظاہر وہ اپنے کام میں مصروف تھی لیکن عبدالقادر کی دھمکی نے اس کے دل و دماغ کو بدستور اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وہ کینٹین پہنچی تو نجمہ وہاں موجود تھی۔ اس نے نورین کو دیکھ کر آواز دی۔ کچھ دیر بعد دونوں ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" کھانے کے دوران میں نجمہ نے خلافِ معمول اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں...... بالکل ٹھیک ہے۔" نورین نے چونکتے ہوئے کہا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" نجمہ نے نوالہ توڑا۔ "لگتا ہے تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہے۔"

"نہیں تو......" نورین نے دلی کیفیات کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کی۔

"گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں......" نورین نے نظریں ٹیبل پر جماتے ہوئے کہا۔ دراصل اس وقت بھی وہ عبدالقادر کی دھمکی کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔

"دیکھو......" نجمہ نے اسے مخاطب کیا۔

"جی"

"میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو کہ تمہیں کوئی پریشانی نہیں۔"

یہ سنتے ہی نورین نے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

نجمہ بھانپ گئی کہ کوئی ایسی تشویش ناک بات ضرور ہے جس کے باعث نورین نہ صرف سخت پریشان ہے بلکہ وہ اس بات کو بتانے سے بھی ڈر رہی ہے۔ "دیکھو...... اگر پریشانی کی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ، اس طرح چھپاؤ گی تو پریشانی اور بڑھے گی۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں......" نورین نے بدستور نظریں نیچی رکھتے ہوئے جواب دیا۔

نجمہ کا شک حقیقت میں بدل چکا تھا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے کھانے پر توجہ دی۔ لنچ سے فراغت کے بعد اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ بریک ختم ہونے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔

جہاز نیچے اتارو!

نجمہ نے نورین کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر فیکٹری کے پارک میں آگئی...... وہاں کچھ لوگ بیٹھے سستا رہے تھے۔ وہ اسے...... ایک درخت کے نیچے رکھی ہوئے بینچ پر لے آئی۔

"اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے......" نجمہ نے اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد نورین کے چہرے پر نگاہیں گڑاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو کچھ چھپانا مت۔ میں صرف سچ سننا چاہتی ہوں۔"

یہ سن کر نورین نے نگاہیں نیچی کرلیں۔ اس کی پلکیں نم ہورہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار کوئی ہمدرد دوست ملا تھا۔ وہ اس سے سب کچھ کہہ کر اپنا دل ہلکا کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیسے کہے۔

اسے روتا دیکھ کر نجمہ سمجھ گئی تھی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ اس کے گلے لگ گئی۔ اب وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد نجمہ نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور اپنی بوتل سے پانی پلایا۔ "دیکھو تم میری بہن اور دوست ہو۔ میں تم سے بڑی ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، سب کچھ سچ سچ بتادو۔ ورنہ یوں تم اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر خود کو بیمار کرلوگی۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہوا تو پھر تمہاری ماں کا کیا بنے گا۔"

نجمہ کا تیر نشانے پر لگا۔ ماں کا سن کر اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو بہنے لگے۔ آخر اس نے روتے روتے سب کچھ اسے بتا ڈالا۔ نورین کا حال سن کر تو جیسے خود نجمہ

کے پاؤں تلے کی زمین سرک گئی ہو۔ وہ بھی سکتے کے عالم میں رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہیں۔ آخر نجمہ نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''چلو اٹھو......'' اس نے نورین کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں رونے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں......''

''لیکن وہ، اس کی دھمکی......'' نورین نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''اس کا بھی کوئی حل نکل آئے گا۔'' نجمہ نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''بس اب تمہیں اپنے ذہن پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم تنہا نہیں ہو، تمہاری بڑی بہن تمہارے ساتھ ہے۔'' اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

وہ فیکٹری کے اندر جارہی تھیں۔ نجمہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح ایسا ہو کہ نہ صرف نورین کا عبدالقادر سے ہمیشہ کے لیے پیچھا چھوٹے بلکہ اس درندے نے جو کچھ کیا ہے، اسے اپنے کیے کی بھی سزا ملے۔ اسے یقین تھا کہ یہ اس کی پہلی یا آخری حرکت نہ تھی۔ نورین کی بپتا سن کر اس کے دل میں بھی انتقام کی آگ جل اٹھی تھی۔ وہ ہر صورت اسے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہتی تھی۔

اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم کی کہانی سنانے کے بعد نورین کا دل بھی کافی ہلکا ہوگیا تھا۔ اب وہ پہلے سے کافی مطمئن تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ شاید وہ عبدالقادر کے ظلم سے اب ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا جائے گی۔ ورنہ تو اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ اس نے جس لب و لہجے میں دھمکی دی تھی، اس کے چنگل سے بچنا آسان نہ ہوگا۔

اس رات کئی روز کے بعد نورین پُرسکون نیند سوئی تھی۔ معمول کے مطابق دوسرے دن وہ لنچ بریک میں کینٹین پہنچی تو نجمہ اس کی منتظر تھی۔ کھانا شروع ہوتے ہی نجمہ نے آہستہ سے کہا ''جلدی کھانا کھالو، لان میں چلنا ہے۔'' اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

''کچھ سوچا، کیا کرنا ہے؟'' نورین نے بھی اس کی پوشیدہ خوشی کو چہرے سے بھانپ لیا تھا۔

''کھانا کھالو، پھر سب سمجھاتی ہوں۔''

اس روز دونوں نے بہت جلد کھانا ختم کیا۔ جب وہ لان میں پہنچیں تو وہاں کوئی نہ تھا۔ لوگ یا تو لنچ میں مصروف تھے یا نماز میں۔ نجمہ اسے لیے ہوئے لان کے ایک پُرسکون گوشے میں پہنچی۔ وہاں دور دور تک کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی باتیں سن سکے۔

''پھر کیا سوچا آپ نے......'' بینچ پر بیٹھتے ہی نورین نے تجسس سے مجبور ہو کر پوچھا۔

''سوچ لیا جو سوچنا تھا۔'' یہ کہہ کر نجمہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ ''اب تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں میری چھوٹی بہن۔ اب باری اس درندے کی ہے، اسے تو اپنے کیے پر پچھتاوا کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔''

''کیا مطلب......'' نورین چونکی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں سکی۔

''تمہیں عبدالقادر کے پاس جانا ہوگا۔''

''کیا......'' یہ سنتے ہی نورین کا چہرہ اتر گیا۔ ''میں وہاں نہیں جاؤں گی۔''

''جانا پڑے گا، یہ ضروری ہے۔'' نجمہ نے کہا۔

''مگر......''

''پرسوں فیکٹری میں ماہانہ صفائی کے لیے چھٹی ہوگی۔ تم کل شام میرے ساتھ فیکٹری سے نکلو گی اور اسے فون کر کے کہو گی کہ تم اس سے پرسوں ملنے آرہی ہو۔''

''میں گئی تو وہ درندہ پھر......''

''کچھ نہیں کر سکے گا وہ ذلیل انسان۔ بس جیسا میں کہتی ہوں تم ویسا کرتی جاؤ۔'' نجمہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' نورین پریشان نظر آرہی تھی۔

''دیکھو میں سب کچھ تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر نجمہ نے کچھ توقف کیا جیسے کہ طے کر رہی ہو کہ نورین کو سب کچھ کیسے سمجھایا جائے اور کس طرح اسے اتنا پُراعتماد بنائے کہ جو اس نے سوچا ہے اس پر عمل کر سکے۔

وہ دونوں کچھ دیر تک خاموش رہیں۔

آخر نجمہ نے ایک گہری سانس لی اور نورین کی طرف دیکھا۔ ''دیکھو اصل بات یہ ہے کہ عبدالقادر مجرم ہے اور مجرم کو سزا نہ ملے تو پھر وہ جرم پہ جرم کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر ظلم پر بچ نکلنے کے بعد اسے اور شہ مل جاتی ہے۔ اس کی دست درازیاں بڑھتی رہتی ہیں اور جانتی ہو اس کا ذمّے دار کون ہوتا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئی اور نورین کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔

''وہ مظلوم جس نے ظلم سہا اور پھر خاموش رہ کر ظالم کی پردہ پوشی کی اور اس کی ہمت مزید بڑھائی۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں......''

''ہمیں اس سے تمہارا بدلہ بھی لینا ہے اور دوسری لڑکیوں کو اس کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچانا ہے اور یہ کام تمہیں کرنا ہے۔ اگر تمہارے قدم ذرا بھی لڑکھڑائے تو یاد رکھو، زندگی بھر اس کے بچھائے جال میں پھنس کر اس کی زیادتی کا نشانہ بنتی رہوگی۔''

''میں اس سے کیسے لڑ سکتی ہوں؟''

''تم لڑ سکتی ہو۔ بس اتنا سوچ لو کہ تمہیں ظالم کی مدد کر کے اس کے اگلے جرائم میں مددگار بننا ہے یا اس کے ہاتھوں کو روکنا ہے۔''

نورین خاموش رہی۔ اس کا ذہن نجمہ کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر وہ اس کی باتوں کو سمجھ گئی۔ نجمہ کی باتوں نے نورین کے اندر اعتماد کی ایک نئی اور طاقت ور روح پھونک دی تھی۔ اس کے اندر موجود انتقام کی چنگاریوں کو جیسے ہوا مل گئی ہو۔ اب وہ چنگاریاں دہکتے شعلے بن چکی تھیں۔ ''آپ بتائیے مجھے کیا کرنا ہے؟''

نجمہ اس کا اعتماد دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ''شاباش! شکر ہے تم ظالم کی مددگار نہیں بننا چاہتیں۔''

''اللہ اس زمین کو اس جیسے ظالم درندوں سے پاک کردے۔''

''آمین......'' نجمہ نے کہا۔ ''میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا اور پھر تفصیل سے سارا منصوبہ اسے سمجھانے لگی۔ ''اب آیا سمجھ میں......''

''سمجھ گئی۔'' نورین نے سر ہلایا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ نجمہ کے منصوبے سے سو فیصد متفق ہے۔

''تو یہ سب کچھ پرسوں کرنا ہوگا۔ کل شام تم وین کے بجائے میرے ساتھ میری گاڑی میں چلو گی۔ راستے میں رک کر کسی پی سی او سے تم اسے فون کر کے دوسرے روز آنے کا کہنا۔'' نجمہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔''

نجمہ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''اٹھو، بریک ٹائم ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی ہیں۔''

وہ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی ہوئی فیکٹری کے اندر پہنچ گئیں۔

اس شام جب نورین گھر پہنچی تو بہت خوش تھی۔ وہ اپنے اندر بلا کی خود اعتمادی محسوس کر رہی تھی۔ کئی روز کے بعد اسے ایسا لگا جیسے...اللہ نے نجمہ کی صورت میں مدد کا فرشتہ بھیج دیا ہو۔ وہ نجمہ کے دکھائے راستے پر چل کر عبدالقادر سے اس کی اگلی پچھلی، تمام حرکتوں کا بدلہ لینے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ اس رات اس کا ذہن اتنا ہلکا پھلکا تھا کہ رات دس بجے بستر پر لیٹی اور کچھ ہی دیر بعد میٹھی اور پُرسکون نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے دن وہ معمول کے مطابق لنچ بریک میں نجمہ سے ملی۔ اس موضوع پر دونوں نے کوئی بات نہ کی بلکہ لنچ کے بعد وہیں بیٹھ کر چائے پی اور جب وقت ہوا تو وہ دونوں اٹھ کر فیکٹری کی طرف چل دیں۔

فارمیسی ریسرچ سیکشن کی طرف بڑھتے ہوئے نجمہ نے نورین کی طرف دیکھا۔ ''آج شام ہم دونوں ساتھ چلیں گے۔''

''جانتی ہوں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

چھٹی کے بعد وہ دونوں نکلیں۔ کافی دور آنے کے بعد نجمہ نے گاڑی روکی۔ ''نمبر ہے نا تمہارے پاس، یہیں کوئی پی سی او دیکھ کر اسے فون کرتے ہیں۔''

نورین نے پرس سے عبدالقادر کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور بیٹھے بیٹھے باہر نظر ڈالی۔ ''وہ رہا پی سی او......''

نجمہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پی سی او کے قریب جا کر روک دی۔ ''سب کچھ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے نا۔''

''جی ہاں......اب اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں۔''

پی سی او میں پرائیویسی کا خیال رکھا گیا تھا۔ نورین نے خود نمبر ملایا۔ بوتھ میں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ کئی گھنٹیوں کے بعد فون اٹھایا گیا۔

''قادر ریکروٹنگ ایجنسی، کون بول رہا ہے؟''

نورین پہچان گئی۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ نجمہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اشارے سے بات کرنے کو کہا۔

''جی میں وہ نورین......'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹک رہی تھی۔

''او ہ تم......'' عبدالقادر نے بھی اس کی آواز پہچان لی۔ ''کیسی ہو تم، خوشی ہوئی کہ تم مجھے فون کر رہی ہو۔''

نورین نے بڑی حد تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پا لیا تھا۔

''تو ملنے کے لیے فون کیا ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''بتاؤ نا، میں نے ٹھیک کہا ہے نا۔''

''جی جی......''

''ویری گڈ......تم واقعی عقلمند ہو۔ اچھا بتاؤ کب آرہی ہو۔ ایسے آنا کہ لنچ بھی ساتھ کریں اور اس کے بعد......'' بات ادھوری چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔ ''یہ پروگرام ٹھیک رہے گا نا......''

''جی، ٹھیک رہے گا۔'' نورین کی گھبراہٹ ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنے اندر اعتماد محسوس کر رہی تھی۔

''توکب مل رہی ہو۔''

''آپ نے امی کو وہ تصویریں......''

''ارے نہیں بھیجی ہیں تمہاری قسم اور ویسے تمہارے پاس ہفتہ بھر کی تو مہلت تھی نا، اب تم دوستی کررہی ہو تو کیسے بھیجوں گا انہیں۔''

''اچھا کیا آپ نے ...... ورنہ تو میں ڈر رہی تھی کہ......''

''بھئی ڈرنا چھوڑو، اب ہم دوست بن رہے ہیں تو پھر کس چیز کا ڈرنا۔ ایک بار دوست بن جاؤ پھر دیکھنا کیا کچھ ہوگا تمہارے پاس۔ عیش کرادوں گا عیش......'' عبدالقادر اسے پوری طرح شیشے میں اتارنے کی کوشش کیے جارہا تھا۔ ''اچھا چھوڑو باقی باتیں، وہ تو ہم اکیلے میں بیٹھ کر کریں گے۔ یہ بتاؤ تم کب آرہی ہو؟''

''کل......'' نورین نے جان بوجھ کر اٹکتے ہوئے کہا۔

''واہ، یہ ٹھیک ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو کہتا ابھی لیکن اب تمہاری بات اوپر کل دوپہر میں ڈن ڈن ڈنا ڈن......'' وہ خوشی سے بے تاب ہورہا تھا۔

''ٹھیک ہے کل دوپہر میں آتی ہوں سوا ایک، ڈیڑھ بجے تک۔ بس یہ خیال رکھنا اس وقت کوئی اور نہ ہو وہاں۔''

''کوئی نہیں ہوگا میری جان، بس تم آجاؤ۔ پورا انتظام کردوں گا۔ تمہیں وہاں آتا جاتا کوئی نہ دیکھ پائے۔''

''ٹھیک ہے، اللہ حافظ۔'' نورین نے کہا۔

''کل ملتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر نے بھی فون رکھ دیا۔ اسے یقین نہیں ہورہا تھا کہ مچھلی اتنی آسانی سے جال میں دوبارہ آجائے گی۔

نجمہ بھی ریسیور سے کان لگائے دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ جیسے ہی وہ باہر نکلیں، نجمہ نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ ''شاباش میری شیرنی...... مجھے تمہارے اعتماد پر پورا بھروسا ہے۔''

''میں نے ٹھیک بات کی نہ؟'' اس نے تعریف سن کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم میں ہمت ہے، بس اسے اپنے اندر سے باہر نکالو ورنہ اس جنگل کے درندے تمہیں چیر پھاڑ کھائیں گے۔''

''کوشش کروں گی۔'' نورین نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

''دیکھو، اس نے کام خود آسان کردیا ہے، بس تم بے دھڑک جانا اور خوفزدہ ہوئے بغیر وہ سب کچھ کرڈالنا، جیسا میں نے سمجھایا ہے۔'' یہ کہہ کر نجمہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''بولو...... کرلوگی نا۔''

''مجھے یہ سب کچھ اپنے لیے کرنا ہے، کرلوں گی۔''

''یہ ہوئی نا بہادروں والی بات......'' نجمہ نے ونڈ اسکرین سے نگاہیں اس کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

نورین بھی ہنس پڑی۔

گاڑی ماڈل کالونی میں داخل ہوچکی تھی۔ تھوڑی دیر میں نورین کا گھر آگیا۔ نجمہ نے گاڑی گلی کے کونے پر پارک کی اور اس کے ساتھ گھر کی طرف بڑھنے لگی۔

نورین نے رات کھانے پر ہی ماں کو بتادیا تھا کہ کل فیکٹری میں چھٹی ہے۔ وہ دوپہر بارہ بجے کے قریب نجمہ کے ساتھ جائے گی۔ وہ گاڑی لے کر آجائے گی اور اسٹاپ سے پک کرلے گی۔ انہیں شاپنگ کے لیے طارق روڈ جانا ہوگا۔

دوسرے دن پونے بارہ بجے کے قریب نورین گھر سے نکلی۔ دس پندرہ منٹ بعد اسے صدر کی بس مل گئی، جہاں سے اس نے ٹاور کی بس لی اور جب وہ عبدالقادر کے دفتر والی بلڈنگ کے قریب پہنچی تو سوا ایک ہوچکا تھا۔ عبدالقادر عیاش طبع انسان تھا۔ اس نے اپنا دفتر بلڈنگ میں ایسی جگہ لیا تھا کہ کوریڈور سے گزرنے والوں کی اس پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

نورین نے برقع اوڑھ رکھا تھا، چہرے پر نقاب اور دھوپ کا چشمہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی اسے پہچان نہیں سکے گا۔ جب وہ کوریڈور کے اختتام پر الٹے ہاتھ کو مڑی تو عبدالقادر سامنے ہی نظر آگیا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑا اس کا ہی منتظر تھا۔ ''خوش آمدید میڈم......'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

نورین کچھ کہے بنا اندر داخل ہوئی۔ عبدالقادر نے دروازہ بند کیا۔ وہ اس وقت لاؤنج میں تھے۔ ''چلو اندر بیٹھتے ہیں۔''

وہ نیم تاریک کمرے میں داخل ہوئی تو اے سی کی ٹھنڈک میں اس نے راحت کی سانس لی۔

''برقع اتارو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ اب کیا تکلف تمہارے میرے بیچ۔''

''نورین نے کچھ کہے بنا نقاب اتارا۔ چشمہ اور پرس سینٹرل ٹیبل پر رکھا۔ عبدالقادر نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر صوفے کی طرف کھینچا۔

''ابھی ٹھہریں۔'' یہ کہہ کر نورین نے ہاتھ چھڑایا اور اٹیچڈ باتھ روم کی طرف بڑھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کی گھبراہٹ میں کافی کمی آچکی تھی۔

''میں نے بریانی منگوائی ہے۔ ابھی کھائیں یا بعد میں، کولڈ ڈرنک بھی ہے۔''

''رہنے دیں اپنی کولڈ ڈرنک......'' نورین نے ادائے دلبری سے منہ بنا کر کچھ اس طرح کہا کہ وہ اس پر ادرلٹو ہوگیا۔

''ارے اس دن کی بات کچھ اور تھی......'' عبدالقادر اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا وہ کولڈ ڈرنک پلا کر......'' نورین کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ دوستانہ انداز میں شکوہ کررہی ہو۔

''سوری......'' اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر عبدالقادر کا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔ وہ اس جھانسے میں آگیا تھا کہ نورین مکمل طور پر خود کو اس کے سپرد کرنے کو تیار ہوچکی، لیکن ایسا ہرگز نہ تھا۔

نورین کا رویہ منصوبے کا حصہ تھا۔ وہ بخوبی اپنا کردار ادا کررہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ صیاد خود اپنے دام میں آچکا ہے۔

عبدالقادر نے اسے سینے سے لگانے کی کوشش کی تو اس نے آہستگی سے خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا۔ ''تمہیں میرے گھر کا پتا کہاں سے ملا؟''

''تمہاری درخواست سے۔''

''اور وہ تصویریں کہاں ہیں؟'' نورین نے پوچھا۔

''فکر مت کرو، حفاظت سے رکھی ہیں۔''

''کہیں، کبھی کسی نے دیکھ لیں تو......'' نورین نے ادائے ناز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڑی بدنامی ہوجائے گی۔''

''لو میں تمہیں دکھاتا ہوں، کہاں رکھی ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالقادر اٹھا اور الماری کا تالا کھول کر چمڑے کا ہینڈ بیگ باہر نکالا اور اس کے قریب آیا۔ ''یہ دیکھو......'' اس نے ایک لفافہ باہر نکالا۔ تصویریں اور تمہارے خوبصورت ہاتھ کی تحریر اس میں ہے۔''

''مجھے دکھاؤ......'' نورین نے ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے وہ لفافہ بے پروائی سے میز پر ڈال دیا۔

نورین نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ''اگر تم یہ سب کچھ نہ کرتے اور پیار کرتے تو شاید میں ویسے ہی تمہارے قریب آجاتی۔''

''سچ......'' یہ سن کر تو عبدالقادر کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا تھا۔

نورین سمجھ گئی کہ نجمہ کا منصوبہ کامیاب جارہا ہے۔

''کھانا کھالیں، بھوک لگ رہی اور ویسے بھی میں کہاں جارہی ہوں۔'' عبدالقادر اس کے قریب بیٹھنے لگا تو اس نے بڑے چاؤ سے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔''

کچھ دیر میں عبدالقادر نے میز پر کھانا چن دیا۔ اس نے کولڈ ڈرنک کی سربہ مہر بوتل کھولی اور دو گلاسوں میں ڈال کر ایک اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے سامنے کھسکالیا۔

اس سے پہلے کہ وہ کھانے کو ہاتھ لگاتا نورین بولی۔ ''جائیں پہلے ہاتھ تو دھولیں۔''

''اوہ......'' وہ جلدی سے باتھ روم کی طرف بڑھا۔

اس نے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور جب تک وہ باہر آتا، نورین، نجمہ کی ہدایت کے مطابق اپنا کام کرچکی تھی۔ منصوبے کا سب سے کٹھن مرحلہ بھی گزر گیا تھا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس کے آنے سے پہلے نورین نے خود کو سنبھالا اور جیسے پہلے بیٹھی تھی، اسی طرح سمٹ کر بیٹھ گئی۔

''چلو کھانا شروع کرتے ہیں۔'' وہ اپنی دفتری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ سامنے ہی کھانا چنا ہوا تھا۔

''جی......'' نورین نے بریانی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عبدالقادر بہت بے صبری سے کھانے پر ہاتھ صاف کررہا تھا، ساتھ ہی بار بار نورین سے بھی جلدی کھانا ختم کرنے کا کہے جارہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر کھانا ختم ہونے میں دیر ہوئی تو وہ چلی جائے گی۔

نورین نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا کہ اس نے پلیٹ ایک طرف کھسکائی اور جلدی سے کولڈ ڈرنک کا بھرا گلاس اٹھایا۔ یہ دیکھ کر نورین دل ہی دل میں زور سے ہنسی۔ عبدالقادر نے ایک ہی گھونٹ میں گلاس آدھا خالی کردیا تھا۔ پھر اس نے ایک زوردار ڈکار لی اور اگلے ہی گھونٹ میں گلاس خالی کرکے زور سے ٹیبل پر رکھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر نورین کو تکنے لگا۔ یہ دیکھ کر وہ ذرا سی گھبرا گئی تھی۔ گھبراہٹ چھپانے کے لیے تیزی سے اٹھی اور باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھونے لگی۔ وہ جان بوجھ کر کچھ دیر تک باتھ روم میں رکی رہی۔ باہر آئی تو عبدالقادر بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھا تھا۔ یہ دیکھ کر نورین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تک اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ نجمہ نے کہا، وہ

درست ثابت ہوسکے گا۔ ''سر! کھانا کیسا تھا؟'' نورین نے اس کی کیفیت جاننے کی کوشش کی مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔

نورین آگے بڑھی۔ اسے بازو سے پکڑ کر ہلکا سا ہلایا مگر وہ ساکت رہا۔ نورین نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پتلیاں ایک جگہ ٹکی ہوئی تھیں، البتہ ان میں زندگی کی ہلکی سی رمق باقی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر آگے بڑھی۔ تصویروں والا لفافہ اٹھا کر اسے کھولا۔ اندر تصویریں، ان کے نیگیٹیوز اور شناختی کارڈ کی کاپی کے ساتھ دی گئی نوکری کی درخواست رکھی ہوئی تھی۔ اس نے لفافہ اٹھا کر پرس میں ٹھونسا۔ بریانی والا کھانے کا ڈبا اور اپنا گلاس شاپنگ بیگ میں ڈالا اور کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اب ٹیبل دیکھ کر لگتا تھا کہ کھانا صرف عبدالقادر نے ہی کھایا تھا۔

نورین کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نجمہ کی ہدایت کے مطابق اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے منصوبے کو کامیابی سے انجام تک پہنچایا۔ وہ کمرے سے نکلتے نکلتے پلٹی اور ایک بار پھر عبدالقادر کی آنکھوں میں جھانکا۔ پتلیاں اوپر کو چڑھ رہی تھیں۔ ہاتھ کرسی کے ہتھے سے نیچے لٹک رہے تھے۔ ''لعنت ہو کمینے درندے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ کوریڈور میں تقریباً سناٹا طاری تھا۔ وہ آگے بڑھتی رہی۔ بلڈنگ سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بریانی والا شاپنگ بیگ کچرے کے ڈھیر پر پھینکا۔ مشن مکمل ہوچکا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر اس نے ٹیکسی روکی۔ وہ نجمہ کے گھر جارہی تھی۔

گھنٹا بھر بعد وہ دونوں اکیلے کمرے میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ نورین نے تصویریں، ان کے نیگیٹیوز اور اپنے ہاتھ سے لکھی درخواست کو قینچی سے پرزہ پرزہ کرکے فلش میں بہادیا تھا۔

دوسرے دن تمام اخبارات میں عبدالقادر کی موت کی خبر تصویر کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ ''مقامی ریکروٹنگ کمپنی کے مالک کی پُراسرار موت۔'' خبر کے مطابق پولیس کا کہنا ہے کہ ابتدائی تفتیش اور میڈیکل رپورٹ سے پتا چلا ہے کہ متوفی دفتر میں تنہا تھا۔ لنچ کے بعد وہ بیٹھا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا۔ پولیس نے موت کو فطری قرار دے کر معاملہ نمٹادیا۔ ورثا لاش کو پوسٹ مارٹم کرائے بغیر تدفین کے لیے چکوال لے گئے۔

سب سے پہلے نورین کو یہ خبر نجمہ نے سنائی۔ وہ دفتر آنے سے پہلے اخبار دیکھ کر آئی تھی۔ نورین بہت خوش تھی۔ وہ یہ خبر اپنی آنکھوں سے پڑھنا چاہتی تھی۔ اس نے شام کو گھر جاتے ہوئے بک اسٹال سے شام کا ایک اخبار خریدا۔ اس میں عبدالقادر کی موت کی خبر اور تصویر نمایاں انداز سے شائع کی گئی تھی۔ خبر کو مرچ مسالا لگا کر چٹخارے دار بنادیا گیا تھا لیکن خبر میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس کے لیے پریشانی کا باعث بنتی۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ اخبار کو موڑ توڑ کر کچرا کنڈی میں پھینک چکی تھی۔

نورین، عبدالقادر سے پیچھا چھڑانے کے بعد بہت خوش تھی۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اب تقدیر کا تب اس کی داستانِ حیات کے اگلے پنوں پر چین ہی چین لکھ رہا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ چند ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن نجمہ نے اسے اپنا رشتہ طے ہوجانے کی خبر سنائی۔ وہ اس رشتے کا سن کر بہت خوش ہوئی لیکن یہ بات اسے اداس کرگئی کہ نجمہ شادی کے فوراً بعد لندن چلی جائے گی۔ اس کا ہونے والا شوہر برطانوی شہری اور ڈاکٹر تھا۔ نجمہ کی شکل میں اسے جیسے بڑی بہن مل گئی تھی مگر اب یہ تعلق موڑ بدلنے والا تھا۔ چند ہفتوں کے اندر اندر شادی ہوگئی اور نجمہ لندن چلی گئی، اس وعدے کے ساتھ کہ جب بھی وہ کراچی آئے گی، دوبارہ ضرور ملیں گے۔

نورین کو ملازمت کرتے ہوئے دو سال ہونے والے تھے۔ اپنی کارکردگی کی بدولت وہ پیکنگ گرل سے اسسٹنٹ سپروائزر بن چکی تھی۔ بظاہر وہ اپنی معمول کی زندگی سے بہت خوش تھی لیکن اچانک ایک موڑ آیا اور پھر زندگی اسے ایک ایسی راہ پہ لے آئی کہ جہاں سے ہر منظر بدل گیا۔

ایک دن صبح وہ فیکٹری کے لیے نکلی۔ آدھا گھنٹے تک اسٹاپ پر کھڑا رہنے کے باوجود وین نہ پہنچی تو اس نے بس کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا لیکن جب وہ فیکٹری پہنچی تو وہاں کا تو نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ فیکٹری راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ فائر بریگیڈ کی کئی گاڑیاں گزشتہ رات لگنے والی آگ پر قابو پا چکی تھیں مگر بچا کچھ نہیں سکے تھے۔ فیکٹری میں کام کرنے والے درجنوں ملازمین ٹولیوں کی شکل میں کھڑے اپنے مستقبل پر لگے سوالیہ نشان کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے مگر جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ وہ بھی ساتھی لڑکیوں کی ٹولی میں شامل ہوگئی۔ گھنٹا بھر بعد فیکٹری منیجر آیا اور اس نے فیکٹری کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک بینر لگادیا: ''فیکٹری تاحکم ثانی بند رہے گی، ملازمین آنے کی زحمت نہ کریں۔ واجبات کی ادائیگی کے لیے ہیڈ آفس بذریعہ لیٹر ملازمین کو مطلع کردے گا۔''

چند روز کے بعد اسے فیکٹری انتظامیہ کی طرف سے ایک لیٹر ملا۔ وہ ہیڈ آفس پہنچی تو اسے تین ماہ کی پیشگی تنخواہ اور دیگر واجبات کا چیک تھما کر شکریے کے ساتھ کوئی اور ملازمت تلاش کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس نے چیک کیش کرایا اور گھر لوٹ آئی۔

تین چار ہفتے گزر گئے۔ نورین گھر کی ہوکر رہ گئی تھی۔ پچھلے دو سالوں میں اس کی تنخواہ اور ملازمت کے بعد ملنے والی رقم کے بعد فی الحال گھر چلانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ متواتر اتوار کے اخبارات دیکھ رہی تھی۔ کئی جگہوں پر درخواستیں بھی بھیجیں مگر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔

''بیٹی کچھ سوچا تم نے، اب آگے کیا کرنا ہے۔'' ایک شام کھانے کے بعد ماں اس کے سر میں تیل لگا کر چوٹی باندھ رہی تھی۔

''سوچ تو بہت کچھ رہی ہوں، سمجھ نہیں آرہا، درخواستیں بھیجی ہیں لیکن لگتا ہے انہیں ڈگری میں زیادہ دلچسپی ہے۔''

''قسمت کا کھیل ہے سب۔'' ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''کاش تیرے ابا زندہ ہوتے تو اب تک تو خیر سے اپنے گھر بار کی ہوچکی ہوتی۔''

''امی......'' نورین نے گردن پھیری۔ ''آپ ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ میں ہوں نا آپ کا بیٹا۔''

''کیا کروں بچی......''

''مایوس مت ہوں۔''

''اللہ بخشے کونسلر صاحب کو۔ وہ بھی دنیا میں نہ رہے۔ اللہ کے بعد ایک انہی سے امید تھی کہ وہ ایسے وقت میں کچھ کردیتے۔''

''کوئی بات نہیں امی اللہ ہی کوئی راستہ نکالے گا۔''

''لگتا ہے تجھے خود ہی باہر نکل کر ہاتھ پیر چلانے ہوں گے۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے یہ تو پھر نوکری ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کچھ توقف کیا۔ ''کوئی جان پہچان والے ہیں تیری نظر میں۔''

یہ سن کر نورین سوچ میں پڑگئی۔ کچھ دیر بعد اس کے ذہن میں صدر والی آنٹی رضیہ اور اسے گھر لے جانے والی نمو اور شازی کا خیال ذہن میں آیا۔ وہ نوکری سے پہلے ایک بار دن میں ان کے گھر گئی تھی شکریہ ادا کرنے۔ شازی اور نمو سے تو ملاقات نہ ہوپائی تھی، وہ کہیں باہر تھیں البتہ آنٹی اس سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ بڑی شدت سے دوبارہ آنے کو بھی کہا تھا لیکن پھر وہ فیکٹری میں اتنی الجھی کہ دوبارہ ان سے رابطے کا خیال ہی نہ آیا۔ ''شاید وہ میری مدد کرسکیں......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی۔

''کیا ہوا، کیا منہ ہی منہ بڑبڑائے جارہی ہو۔'' ماں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''امی ایک ہیں جاننے والی، شاید کام بن جائے۔ ایسا کرتی ہوں کل دوپہر ان کی طرف جاتی ہوں۔''

''بھروسے کے لوگ تو ہیں؟''

''جی امی، بہت اچھے لوگ ہیں۔'' نورین کا لہجہ بہت پُرامید تھا۔ اسے یقین تھا کہ آنٹی سے مل کر کوئی راستہ ضرور نکل جائے گا۔

وہ ان لوگوں کو تقریباً بھول ہی چکی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ اتنے عرصے بعد ملنے جائے گی وہ بھی اپنے کام سے۔ سچ ہے انسان کو مصیبت میں ہی سب کچھ یاد آتا ہے۔ پریشانی نہ ہو تو وہ بس اپنے آپ میں ہی مگن رہتا ہے۔ اسے بھی رات کو رہ رہ کر یاد آتا رہا کہ انہوں نے ایک اجنبی کی کتنی خاطر مدارت اور دل جوئی کی تھی۔ وہ دوسرے دن ان سے ملنے کا ارادہ کرچکی تھی لیکن رات کے بارہ بج رہے ہوں گے کہ لائٹ چلی گئی اور پھر صبح سات بجے آئی۔ پھر جو وہ سوئی تو ماں کے جگانے پر ہی اٹھی۔ وہ ایک لفافہ ہاتھ میں لیے کھڑی تھیں۔ اس کے نام پر ایک خط آیا تھا۔ یہ چائے والا امپورٹ ایکسپورٹ فرم کی طرف سے تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے اخبار میں اشتہار دیکھ کر درخواست بھیجی تھی۔ اسے انٹرویو لیٹر ملنے کے دوسرے دن انٹرویو کے لیے بلایا گیا تھا۔ استقبالیہ کلرک کی نوکری تھی۔

دوسرے دن وہ بتائے گئے پتے پر پہنچی تو منیجر نے اسے رسمی انٹرویو کے بعد ملازمت پر رکھ لیا۔ تنخواہ مناسب تھی لیکن ایک شرط تھی کہ عام طور پر چھٹی چھ بجے ہوگی لیکن جس دن سیٹھ صاحب دفتر میں ہوں گے، اسے بھی ان کے جانے تک بیٹھنا پڑے گا۔ بے روزگاری کی ماری نورین نے اوور ٹائم سن کر فوراً سر ہلادیا، سوچ رہی تھی کہ اس طرح پوری تنخواہ بچا کر، اوپری خرچ اوور ٹائم سے پورا کرلیا کرے گی۔ اسے بہت افسوس تھا کہ چاہنے کے باوجود آنٹی سے ملنے نہ جاسکی۔ سوچ رہی تھی کہ اگر کسی دن دفتر سے جلدی اٹھی تو وہ ضرور ان کے گھر سے ہوتی ہوئی جائے گی۔ آخر اسے روزانہ صدر سے ہوکر ہی تو دفتر آنا جانا ہوتا تھا۔

دو ہفتے تو مزے سے گزر گئے۔ وہ اپنے ٹائم پر آتی اور ٹائم پر نکل جاتی تھی لیکن ایک دن منیجر نے اسے بلا کر کہا کہ سیٹھ صاحب بیرونِ ملک سے واپس آگئے ہیں۔ کل سے و

دفتر آئیں گے۔ روز تو نہیں البتہ مہینے میں تین چار بار ضرور آتے ہیں۔ اس لیے رکنا بھی پڑسکتا ہے۔ یہ سن کر وہ خوش تھی کہ چلو اسی مہینے سے اوور ٹائم ملنا بھی شروع ہوجائے گا۔

ابھی ملازمت کو ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے دو بار دفتر میں دیر تک رکنا پڑا۔ دفتر میں صرف سیٹھ صاحب، وہ اور ایک بوڑھا چپراسی تھا۔ چپراسی بھی کوریڈور میں کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ نورین کو بھی سیٹھ صاحب سے ملنے کا شوق تھا کہ دیکھوں تو سہی وہ کیسے ہیں لیکن وہ دفتر کے دوسرے دروازے سے سیدھے اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور منیجر کی بات کے برعکس وہ اب تک دیر تک رکے بھی نہیں تھے۔ اسے اوور ٹائم نہ بننے کا افسوس ہورہا تھا۔

ایک دن شام کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے اور وہ اٹھنے کی تیاری کررہی تھی کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

’’ہیلو سر!‘‘

’’سیٹھ بول رہا ہوں۔‘‘ ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ’’مجھے کام ہے تقریباً نو بج جائیں گے۔ تمہیں بھی دفتر میں رکنا ہوگا۔ کچھ ضروری فون کرنا ہوں گے۔‘‘

’’ٹھیک ہے سر۔‘‘ نورین کا جواب سننے سے پہلے انہوں نے فون رکھ دیا۔

ہلکی سردیوں کے دن تھے۔ دن چھوٹے ہوچکے تھے، سورج جلدی ڈوب جاتا تھا۔ شام کے ساڑھے سات بجے ہوں گے کہ انٹرکام کی گھنٹی بجی۔

’’اندر آؤ۔‘‘

وہ سیدھے سیٹھ صاحب کے کمرے کی طرف لپکی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

’’سر، آجاؤں۔‘‘ وہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سیٹھ صاحب کا چہرہ بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

’’قریب آؤ......‘‘ سیٹھ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔

’’جی سر۔‘‘ کہتے ہوئے وہ ان کے برابر جا کر کھڑی ہوگئی۔ دل ہی دل میں ڈر رہی تھی۔ اسے دفتری ملازمت کا تو تجربہ ہوچکا تھا لیکن وہ سیٹھ کے رُوبرو پہلی بار کھڑی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ نورین کی نظریں نیچی تھیں۔ ’’گھبراؤ مت......‘‘

’’جی......‘‘

’’تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ نئی آئی ہو کیا۔‘‘

’’جی سر، ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا ہے۔‘‘

’’بھئی یہ گھبرانا چھوڑو، ذرا گلاس پکڑاؤ۔‘‘

نورین نے ہاتھ بڑھا کر سامنے رکھا گلاس اٹھایا اور سیٹھ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا سیٹھ صاحب نے اس کی کلائی آہستہ سے پکڑ لی۔ نورین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عبدالقادر کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے غصے سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ’’سر چھوڑ دیں۔‘‘

’’رہنے دو۔ اوور ٹائم سے کیا ملے گا جو میں دے سکتا ہوں۔ چاہیے تو قریب آجاؤ۔‘‘ سیٹھ اب کھڑا ہوچکا تھا۔

اس سے پہلے کہ سیٹھ کی دست درازی بڑھتی، وہ زور سے چلّائی۔ ’’میرا ہاتھ چھوڑو۔‘‘ پوری قوت سے زور لگا کر اس نے سیٹھ کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑائی اور دروازے کی طرف لپکی۔

’’کل سے منحوس شکل لے کر دفتر مت آنا۔‘‘ سیٹھ چلّایا۔

نورین استقبالیہ پر پہنچی تو چپراسی اندر داخل ہورہا تھا۔ ’’کیا ہوا بیٹی۔ ایسا لگا کہ جیسے تم چلّائی ہو۔‘‘

’’کچھ نہیں بابا......‘‘ نورین نے برقع پہن کر بیگ سنبھالتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز روہانسی ہورہی تھی۔

’’سمجھ گیا بیٹی......‘‘ چپراسی نے افسردگی سے کہا۔ ’’آج پھر سیٹھ صاحب نے غلط لڑکی پر ہاتھ ڈال دیا۔ بیٹی تمہیں کچھ ہوا تو نہیں۔‘‘ لگتا تھا کہ وہ سیٹھ کے کرتوتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

’’نہیں بابا مگر اب میں کل سے نہیں آؤں گی۔ منیجر صاحب سے کہنا میری آج تک کی تنخواہ منی آرڈر کردیں۔‘‘ اس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل آئی۔

یہ تھا سیٹھ نعمان چائے والا سے نورین کا پہلا تعارف۔ وہ اس کا چہرہ تو ٹھیک سے نہ دیکھ سکی البتہ کرتوت کھل کر اس کے سامنے آچکے تھے۔

ایک بار پھر بیٹی کی بے روزگاری نے ماں کے سر پر پریشانیوں کا پہاڑ کھڑا کردیا تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا، دفتری ملازمت کا خیال دل سے نکال دو۔ کسی فیکٹری وغیرہ میں کام ڈھونڈو۔ واجبی تعلیم کے ساتھ تو یہی ہوتا رہے گا۔ نورین نے ماں کو سچائی نہیں بتائی تھی۔ اسی لیے وہ بے چاری تعلیم کو ملازمت سے نکالے جانے کی وجہ سمجھ رہی تھی۔ بیٹی اپنی تذلیل کے باعث نڈھال تھی لیکن ماں کا خیال تھا کہ وہ نکالے جانے کے باعث پریشان ہے۔

چند روز بعد اس نے یہ حقیقت تسلیم کرلی کہ وہ جہاں جائے گی اسی طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہی رہے گا لیکن اب کیا کیا جائے۔ آخر کافی سوچ و بچار کے بعد اس نے آنٹی رضیہ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ ان کے فلیٹ پر پہنچی تو دروازہ کھلا ہوا تھا، آنٹی رضیہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ وہ اسے پہچان نہ سکیں لیکن جب نورین نے تعارف کرایا تو انہیں سب کچھ یاد آگیا۔

’’شازی اور نمو کہاں ہیں؟‘‘

’’چلی گئیں، ہاتھ پیروں والی جو ہوگئی تھیں۔‘‘ انہوں نے دبے لفظوں میں مختصر سا گول مول جواب دیا۔

اس نے آنٹی کے ذومعنی جواب سے مطلب ان کی شادیاں ہوجانے کا لیا۔ ’’تو اب آپ اکیلی رہ رہی ہیں؟‘‘

’’وہ تو شروع سے ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ’’خیر چھوڑو...... یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟‘‘

’’آنٹی بہت پریشان ہوں، کئی مہینے ہوگئے لیکن نوکری نہیں ہے۔ ایک نوکری ملی تھی لیکن......‘‘ نجمہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

’’لیکن کیا......‘‘ انہوں نے چونک کر پوچھا۔

نورین نے انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دیا کہ کس طرح فیکٹری میں آگ لگنے سے ملازمت ختم ہوئی اور کس طرح سیٹھ نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔ اس نے جان بوجھ کر عبدالقادر والا قصہ گول کردیا۔

آنٹی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ’’بے وقوف لڑکی، مردوں کے اس معاشرے میں لڑکی کی تعلیم سے زیادہ اس کی شکل و صورت چلتی ہے۔‘‘

’’جی......‘‘ نورین نے ہونقوں کی طرح ان کی طرف دیکھا۔

’’اپنے آپ کو آئینے میں اچھی طرح دیکھ۔‘‘ یہ کہہ کر کچھ توقف کیا۔ ’’تو ہر روز ہزاروں روپے کما سکتی ہے، پھر چند روپلی کے پیچھے کیوں ماری ماری پھر رہی ہے۔‘‘

ہزاروں روپے روز کمانے کا سن کر اس کا تجسس بڑھا لیکن وہ کچھ سمجھ نہ سکی تھی۔ ’’آنٹی میں سمجھی نہیں، ذرا کھل کر سمجھائیں۔‘‘ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

’’لو یہ بھی کوئی بات ہے سمجھانے کی بھلا، جوان ہو، خوبصورت ہو۔‘‘ یہ کہہ کر تھوڑا توقف کیا۔ ’’چلو...... میں سمجھائے دیتی ہوں۔ مدد بھی کروں گی۔ لاکھوں روپے کمالے گی دو تین سال میں شازی اور نمو کی طرح۔‘‘

نورین کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تو وہ صرف ہزاروں روپے کے سپنے اپنی آنکھوں میں سجا رہی تھی لیکن لاکھوں کی بات سن کر تو اس کے دماغ میں جھماکے شروع ہوگئے۔ ’’وہ کیسے......‘‘ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

’’تجھے کام چاہیے تھا نا......‘‘

’’نورین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’چل...... میں دیتی ہوں تجھے کام۔‘‘ وہ بھی سمجھ گئی تھی کہ لوہا گرم ہے اور پھر آنٹی نے کام اور اس کی نوعیت سمجھانا شروع کی۔

نورین دم بخود بیٹھی اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

جیسے جیسے وہ بولتی جارہی تھیں نورین جیسے زمین میں گڑتی جارہی ہو۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئیں، نورین ایک جھٹکے سے اٹھی۔

’’کہاں جارہی ہو، بیٹھو تو سہی۔‘‘

’’میں چلتی ہوں۔‘‘ نورین کا لہجہ سپاٹ تھا۔

’’ٹھیک ہے جاؤ، بیچو خود کو دوسروں کی لگائی گئی قیمت پر اور رہو شرافت کا ہار گلے میں لٹکا کر۔‘‘

نورین دروازے کی طرف بڑھی۔ ’’سوچنا ضرور اور اگر بات سمجھ آئے تو پلٹ آنا۔ تم جیسوں کے لیے یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔‘‘

نورین کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئی۔

آنٹی کی باتوں نے اس کا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ اسے ان پر شدید غصہ آرہا تھا لیکن اگلے چند روز تک وہ جوں جوں ان کی باتوں پر غور کرتی رہی، اسے وہ باتیں حقیقت لگنے لگی تھیں۔ اس کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑتا جارہا تھا۔

اگلے دو ماہ تک وہ نہایت شدت سے نوکری کی تلاش میں لگی رہی۔ شہر میں ہڑتالوں، ہنگاموں، قتل و غارت اور سیاسی محاذ آرائی نے بے روزگاری میں اضافہ کردیا تھا۔ ہنگاموں اور ہڑتالوں کے باعث عام طور پر کارخانے بند رہتے تھے یا صرف ایک دو شفٹوں میں کام ہوتا۔ وہ جہاں گئی، اسے ’نو ویکنسی‘ کا بورڈ نظر منہ چڑاتے نظر آیا۔

دو ماہ کی خواری کے بعد اسے آنٹی رضیہ کی باتوں میں پوشیدہ سچائی زیادہ صاف نظر آنے لگی تھی۔ آخر مجبور ہوکر اس نے انتہائی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ مزید خوار نہ ہونے کا تہیہ کرچکی تھی۔ اس نے خود کو یقین دلا دیا تھا کہ اگر ہاتھ میں پیسہ ہو تو پھر پیشہ کوئی نہیں پوچھتا، ویسے بھی کٹھن حالات میں انہیں پوچھنے والا تھا ہی کون۔ دو چار عزیز

وار تھے لیکن سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔ برسوں ہو چکے تھے، کسی نے ان کے در پر قدم نہیں رکھا تھا کہ کہیں کچھ دینا نہ پڑ جائے۔

آخر لاچار ہو کر نورین نے ایک دن جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ اب اسے صرف اور صرف دولت کمانا تھی۔ اس نے بند دروازے پر دستک دی تو آنٹی رضیہ نے دروازہ کھولا۔ نورین کو دیکھ کر ہنسی۔ ''آخر تم نے حقیقت کو تسلیم کر ہی لیا۔'' وہ دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے بولیں۔

نورین سر جھکائے گھر میں داخل ہوئی۔

''دولت کمانے کی دنیا میں خوش آمدید نوری۔''

نورین نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

''آج سے یہی تمہارا نام ہے۔'' آنٹی نے ہنس کر کہا۔

نورین اب نوری بن چکی تھی۔

زندگی کی گردش انسان کو کب کہاں لا کر کھڑا کر دے، یہ اوپر والا جانے یا اس کی کتابِ تقدیر مگر ایک بات طے ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، انسان بہت جلد ان سے مطابقت پیدا کر لیتا ہے۔ یہی بات نورین سے نوری بن جانے والی مجبور لڑکی پر بھی صادق آئی تھی۔

شروع شروع میں تو وہ احساسِ ندامت کے باعث کئی بار موت کو گلے لگانے کا سوچتی رہی لیکن ہر بار ماں کا چہرہ اسے سسک سسک کر زندہ رہنے پر مجبور کرتا رہا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ پیسے کی قلت دور ہوگئی، گھر میں خوشحالی کا راج شروع ہوگیا، ندامت بھی کچھ کم ہوگئی، البتہ گناہ کے احساس کی ایک خلش رہ رہ کر ضرور سر اٹھاتی رہتی تھی مگر پیسے کے بوجھ اور پیٹ کی آنچ کے آگے اس کی شدت کا احساس ہمیشہ ماند پڑتا رہا۔ نورین نے نوری کی زندگی کو پوری طرح قبول کر لیا تھا۔ ماں، بیٹی کے بیٹا بن کر سہارا دیے جانے پر بہت خوش تھی۔ وہ جو کچھ جانتی تھی، بس اتنا تھا کہ بیٹی ایک فیکٹری میں سپروائزر ہے اور دوپہر سے شروع ہو کر رات گئے ختم ہونے والی شفٹ میں کام کرتی ہے۔ کبھی کبھی پوری پوری رات اوور ٹائم بھی لگتا ہے۔ بیٹی جسے تنخواہ کہتی تھی، ماں لاعلم رہی کہ وہ تن کی آمدن تھی۔

ایک دن وہ حسبِ معمول رضیہ آنٹی کے گھر پہنچی تو یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ انہیں پورے جسم پر لقوہ مار گیا ہے۔ وہ جیتے جی مردہ بن چکی تھیں۔ کچھ ہی دن کے اندر اندر ایک ایک کر کے وہاں آنے والیاں کسی اور آنٹی کی چھپر چھاؤں تلے چلی گئیں مگر گناہ کی دلدل میں دھنسنے کے باوجود نورین کا دل اب تک روشن تھا۔ اس نے آنٹی کو بے یار و مددگار نہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سال کی اس زندگی میں وہ دھندے کے بہت سے گُر جان چکی تھی۔ اب اس نے آزاد رہ کر کام کرنے کی ٹھانی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کسی طرح جلد از جلد وہ بہت سارا پیسہ کما کر اس زندگی کا چلن چھوڑ دے گی اور کوئی شریف انسان دیکھ کر گھر بسا لے گی۔

کچھ دن بعد اسے ایک اور خیال دل میں آیا۔ وہ اپنی گناہ کی زندگی سے تو متنفر ہو چکی تھی لیکن یہ ضرور سمجھتی کہ اس کی ذمّے دار وہ نہیں بلکہ عبدالقادر جیسے لوگ ہیں۔ اگر سیٹھ اس دن وہ حرکت نہ کرتا تو شاید اس کی زندگی کا چلن کچھ اور ہوتا۔ پھر اسے ایک نیا آئیڈیا سوجھا۔ بہت جلد اس نے اس پر عمل شروع کر دیا۔ جلد ہی اس نے اپنے تن کو رسوا کیے بغیر کافی پیسہ اکٹھا کر لیا۔ اس کے انتقام کی آگ بھی سرد ہونے لگی تھی۔ اب اسے کافی سرشاری حاصل تھی۔ وہ اپنے کام کو دھندے کے بجائے مشن سمجھنے لگی تھی۔

اسی دوران تین تلوار پر اسے سیٹھ نعمان چائے والا ٹکرایا۔ یہی وہ شخص تھا جس کی ایک حرکت نے نورین کو نوری بنا دیا تھا لیکن اسے تقدیر کہیے کہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے بظاہر اجنبی تھے۔ اس دن وہ سیٹھ کے گھر سے نکلی تو اس کے بیگ میں سیٹھ کے چالیس لاکھ روپے تھے۔ سیٹھ بھی انجام کو پہنچا اور اس کی بھی جھولی بھر گئی۔ سیٹھ نے یہ رقم سہ پہر کو ہی بینک سے نکلوائی تھی۔

نورین نے کبھی کسی واردات میں کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا لیکن اس دن اس سے ایک ہلکی سی چُوک ہوگئی۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر وہ سچ مچ حواس کھو بیٹھی تھی۔ اپنا کام پورا کر کے جلد از جلد نکلنے کے چکر میں وہ ایک معمولی سی غلطی کر گئی۔ اب تک وہ سیٹھ جیسے درجنوں شکار کر چکی تھی لیکن یہاں ایک بات غیر معمولی تھی۔ سیٹھ بہت نام والا اور بارسوخ تھا۔ دوسرا یہ کہ اس کے پاس موجود بھاری رقم بھی غائب تھی۔ اسی لیے پولیس اس کیس کو فطری موت قرار دے کر داخلِ دفتر کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔ اوپر سے بڑے لوگوں کا دباؤ تھا کہ تفتیش کو ہر حال میں انجام تک پہنچنا چاہیے۔ سیٹھ کی موت کو چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا لیکن اخبارات میں پولیس تفتیش کے حوالے سے کبھی کبھار کوئی نہ کوئی خبر آتی رہتی تھی مگر پولیس اب بھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی کی پہلی پوسٹنگ ہوتا تھی۔ ڈی آئی جی صاحب نے اسے پوسٹنگ کے لیے پولیس ہیڈ

کوارٹر بلایا تھا۔ سی ایس ایس میں نمایاں پوزیشن لے کر کامیاب ہونے والے زاہد شیروانی نے پولیس کا محکمہ منتخب کیا تھا۔ اسے بچپن سے ہی کھوج لگانے کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں 'چور سپاہی' اس کا پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ ہمیشہ اس کھیل میں سپاہی بنتا تھا۔ اکیڈمی سے تربیت مکمل کرنے کے بعد اس کی خدمات سندھ پولیس کے حوالے کی گئی تھیں۔ اسی سلسلے میں ہی اسے ڈی آئی جی صاحب نے طلب کیا تھا۔

''فی الحال میں تمہیں ٹاؤن میں تعینات کرنے کے بجائے اپنے ماتحت رکھنا چاہتا ہوں۔'' ڈی آئی جی صاحب نے رسمی گفتگو اور ملازمت کے اسرار و رموز نو آموز افسر کو سمجھانے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''یس سر!'' زاہد شیروانی نے مستعدی سے تائید کی۔

''یہ لو۔'' انہوں نے اے ایس پی کی طرف ایک فائل بڑھائی۔ ''ہائی پروفائل کیس ہے۔ بظاہر لگتا ہے کہ طبعی موت ہوئی ہے لیکن رقم غائب ہونے سے واردات کا شبہ ہے۔ اب تک کی تفتیش میں تمام مشتبہ افراد کو شک کے دائرے سے باہر کیا جا چکا ہے۔ کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔ وزیرِ اعلیٰ اور چیمبر آف کامرس کا بھی بہت دباؤ ہے۔ اب وزیرِ داخلہ خود اس کیس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ کیس خود لے لیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ ''کیس پراپرٹیز درخشاں تھانے کی تحویل میں ہے۔ پلیز...... اس پر کام کرو۔''

''ٹھیک ہے سر!''

''کوشش کرو کہ یہ اونٹ جلد از جلد کسی کروٹ بیٹھے تاکہ میری جان چھوٹے۔'' ڈی آئی جی خاصے دباؤ میں لگ رہے تھے۔

''سر! مجھے دو دن دیجیے۔ میں فائل اسٹڈی کر کے تفتیش شروع کرتا ہوں۔'' زاہد شیروانی کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

''اوکے، اب تم جا سکتے ہو۔''

اس کا پہلا دن تو دفتر کو ٹھیک ٹھاک کرانے میں گزر گیا، شام کو سروسز کلب پہنچا تو ڈنر کے بعد سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رات کے تین بج رہے تھے جب اس نے فائل سائڈ ٹیبل پر رکھی اور لائٹ آف کر کے اس پر غور کرتے کرتے سو گیا۔

تفتیشی فائل میں لگی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا کہنا تھا کہ موت کا سبب حرکتِ قلب بند ہونا تھا۔ اندرونی اعضا کے کیمیائی تجزیے سے بھی کوئی سراغ نہیں ملا تھا ماسوائے کولڈ ڈرنک اور شراب کے۔ لاش کے قریب سے کولڈ ڈرنک کی لگ بھگ نصف خالی بوتل، شراب کی ایک تقریباً بھری بوتل، دو گلاس، آئس باکس اور ایک خالی بریف کیس ملا تھا۔ دونوں گلاسوں کے کیمیائی تجزیے سے بھی پوسٹ مارٹم رپورٹ کی تصدیق ہوتی تھی۔ ایک گلاس میں الکوحل ملی کولڈ ڈرنک جبکہ دوسرے گلاس میں صرف کولڈ ڈرنک تھی۔ دو چیزیں ایسی تھیں جو موت کو طبعی تسلیم کرنے میں رکاوٹ تھیں۔ ایک تو خالی بریف کیس اور دوسرا کولڈ ڈرنک کا دوسرا گلاس، جس پر صرف دو ہاتھوں کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ ایک مردانہ اور دوسرے زیادہ واضح نشانات کسی عورت کی انگلیوں کے تھے۔ مردانہ نشانات سیٹھ کے فنگر پرنٹس سے میچ کر گئے البتہ یہ اب تک نہیں پتا چل سکا کہ دوسرے فنگر پرنٹس کس کے تھے۔ بریف کیس پر بھی عورت کے فنگر پرنٹس پائے گئے۔ اسے چابی سے کھولا گیا تھا۔ اس لیے زبردستی یا ڈکیتی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تفتیش میں سبھی مشتبہ افراد کو پہلے ہی بے قصور قرار دیا جا چکا تھا۔ لاش والے کمرے سے لے کر پورے گھر میں کہیں بھی مزاحمت کے آثار نہیں تھے۔ لے دے کر یہ جاننا باقی تھا کہ زنانہ انگلیوں کے نشانات کس کے ہیں۔ کیس کی یہی ایک کڑی تھی جو اَب تک غائب تھی۔ جب تک یہ کڑی نہیں ملتی نہ تو کیس داخلِ دفتر ہو سکتا تھا اور نہ ہی چالان عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ زاہد شیروانی کو یقین تھا کہ وہ اس لاپتا کڑی کا سراغ لگا لے گا لیکن کس طرح۔ یہ جاننا ابھی باقی تھا۔

دوسرے دن اے ایس پی زاہد شیروانی نے تھانے کا دورہ کیا۔ مال خانے سے کیس پراپرٹیز نکلوا کر کئی گھنٹے تک اس کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ اس کیس کے پہلے تفتیشی افسر سے بھی ملا مگر سب کچھ لاحاصل رہا۔ کوئی سراغ ایسا نہ مل سکا، جس پر آگے بڑھا جا سکتا۔ آخر اس نے کیس کی ازسرِنو تفتیش کا فیصلہ کیا۔ وہ نئے سرے سے تفتیش کا رخ متعین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تفتیش کا دائرہ سیٹھ کے اس اکلوتے بیٹے سے شروع کرنے کا فیصلہ کیا جو واقعے کے دن بیرونِ ملک سے وطن لوٹنے کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھ چکا تھا۔ یہ بینکار کامران احمد تھا۔

☆☆☆

سیٹھ نعمان کے بعد نورین نے طے کیا کہ وہ اب یہ سب کچھ چھوڑ کر اپنی پچھلی زندگی میں لوٹ جائے گی اور صرف نورین بن کر جیے گی۔ اس نے طے کر لیا کہ یہ اس کا آخری شکار تھا۔ اس روز رات کو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کیا اور سیٹھ کے بریف کیس سے ملنے

والی رقم کو گنا، چالیس لاکھ روپے تھے۔ پھر اس نے اپنی الماری کھولی اور خفیہ خانوں سے وہ رقم نکالی جو وہ اب تک اپنے حسن کے جلوے کی آڑ میں موت کی نیند سلا دیے گئے، ہوس کے مارے مردوں سے لوٹ چکی تھی۔

ساری رقم پینسٹھ لاکھ روپے سے زائد تھی۔ اس رات وہ کافی دیر تک جاگتی رہی۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساٹھ لاکھ روپے بینک کے فکسڈ ڈپازٹ میں رکھے گی۔ پانچ لاکھ روپے اس کی شادی کے لیے کافی ہوں اور بینک سے ملنے والا منافع روزمرہ اخراجات کے لیے کافی رہے گے۔

آخری شکار کو کئی مہینے گزر چکے تھے۔ اسے بینکنگ کے معاملات کا کچھ پتا نہیں تھا تاہم اسے پیسے کا اعتماد تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اتنی بڑی رقم فکسڈ ڈپازٹ کرنے کا سن کر کوئی بھی بینک منیجر اس کے آگے پیچھے پھرے گا۔ وہ سب کچھ کرلے گی۔

دوسرے دن وہ ایک غیر ملکی بینک کی کلفٹن برانچ پہنچی۔ اس نے منیجر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ایک نوجوان افسر اسے منیجر کے کیبن تک لے گیا۔

''ساٹھ لاکھ روپے......'' برانچ منیجر کامران احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''جی ہاں کیش......''

''میں بتاتا ہوں یہ سب کچھ کیسے **ہوگا**۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی بجائی۔ ''چائے یا ٹھنڈا۔''

''کولڈ ڈرنک......'' نورین نے اعتماد سے کہا۔

اس برانچ میں کامران احمد کا پہلا دن تھا۔ اسے برانچ کے حالات بہتر بنانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ہیڈ آفس کو شکایت تھی کہ ایک سال ہونے کو آیا، نئے اور بڑے ڈپازٹ نہیں آرہے تھے۔ وہ خوش تھا کہ قدرت نے پہلے ہی دن ایسا کلائنٹ بھیج دیا، جس سے ہیڈ آفس میں اس کی ساکھ دھاک بن کر بیٹھے گی۔ ''آپ رقم لائی ہیں۔''

''جی ہاں......'' نورین نے پلاسٹک کے معمولی شاپنگ بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں رکھے کپڑے کے تھیلے میں رقم موجود تھی۔

''واہ...... آپ خاصی عقلمند ہیں۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس معمولی تھیلے میں اتنی بڑی رقم ہوسکتی ہے۔''

''ہم نے اپنا گھر بیچا ہے۔ رقم بھی کیش میں لی تھی۔ کب تک اتنی بڑی رقم کو گھر میں رکھ سکتی ہوں۔'' نورین نے بات بنائی تا کہ رقم کے حوالے سے اس کے ذہن میں اگر کوئی شک ہے تو وہ باقی نہ رہے۔

''سب ہوگیا، بس آپ دستخط کریں۔'' کامران نے کاغذات اس کی طرف بڑھائے۔ ''ارے ہاں، شناختی کارڈ کی کاپی بھی چاہیے ہوگی۔''

نورین کا بینک اکاؤنٹ کھل چکا تھا۔ رقم فکسڈ ڈپازٹ ہوچکی تھی۔ ''دو دن میں آپ کی چیک بک آجائے گی۔ اگر زحمت نہ ہو تو آپ آجایئے گا۔''

''جی آجاؤں گی۔''

اس کے جانے کے بعد کامران اپنے دیگر امور کی انجام دہی میں مصروف ہوگیا لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس کے ذہن میں بار بار نورین کا چہرہ آرہا تھا۔ دوسرے دن بھی وہ اس کے ہی خیال میں کھویا رہا۔ وہ غیر شدی شدہ تھا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اسے کوئی لڑکی اچھی لگی تھی۔ بات صرف اس کی حد تک نہیں تھی۔

نورین خود بھی کامران احمد کی شائستگی سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اسے بھی وہ اچھا لگا تھا۔ جب سے سیٹھ نعمان کے بعد اس نے اپنی زندگی کا چلن بدلا تھا، تب سے وہ نہایت سنجیدگی سے شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اسے کامران پسند آیا تھا لیکن اس نے یہ خیال زبردستی اپنے ذہن سے دور کرنے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شکل وصورت ... اور رکھ رکھاؤ سے تو وہ کسی اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شادی شدہ بھی ہو۔

دو دن بعد جب نورین چیک بک لینے بینک گئی تو وہ سیدھے کامران کے کیبن میں گئی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ اس کا ہی منتظر تھا۔ اس نے اسے بہت عزت سے ریسیو کیا۔ چائے منگوائی۔ اسی دوران میں چیک بک دی۔

باتوں ہی باتوں میں وہ نورین سے اس کے بارے میں تقریباً سب کچھ معلوم کرچکا تھا۔ وہ اس کی باتوں میں پوشیدہ مقصد کو سمجھ رہی تھی لیکن سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔

''کیا آپ کی امی سے ملاقات ہوسکتی ہے؟''

نورین کے لیے یہ سوال غیر متوقع نہ تھا۔ وہ اسی کی امید کررہی تھی لیکن پھر بھی انجان بنی رہی اور ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتی ہے، جب آپ کہیں وہ مل سکتی ہیں۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور پھر پوچھا۔ ''کیا کوئی بینک کا مسئلہ ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ جب کہیں میں انہیں لے آؤں گی۔''

کامران یہ سن کر دل ہی دل میں بہت خوش ہوا۔ ''بینک کا تو کوئی کام نہیں مگر......''

''تو......'' نورین نے بظاہر حیرانی سے پوچھا۔ ''پھر کس لیے ملنا چاہتے ہیں آپ اُن سے۔''

''آپ کی وجہ سے۔''

''کیوں، کیا ہوا؟''

''آپ کا ہاتھ مانگنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر نورین نے بظاہر شرمانے کی اداکاری کی۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید اس کی زندگی کی آزمائشیں مکمل ہوچکیں۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ تصور میں خود کو دلہن بنا دیکھ رہی تھی۔

''آپ خاموش کیوں ہیں، کوئی جواب نہیں دیا۔''

''لیکن ......'' نورین نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کی زبان نے الفاظ کا ساتھ نہ دیا۔

''آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہیں۔'' کامران احمد لمحہ بھر کے لیے اس کے لہجے سے پریشان ہوگیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں وہ پہلے سے ہی کسی کے پیار میں تو مبتلا نہیں۔

''بات یہ ہے کہ ہم شریف اور غریب لوگ ہیں۔''

''کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے اللہ نے منہ میں سونے کا چمچہ دے کر پیدا کیا ہے لیکن پھر بھی ملازمت کو ترجیح دی۔''

''مگر آپ کے والدین......''

''دونوں اس دنیا میں نہیں رہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ افسردہ ہوگیا۔

''افسوس ہوا یہ سن کر......''

''کوئی بات نہیں۔ سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے اور یہی بہتر ہوتا ہے۔'' کامران نے یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا۔ ''آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

''کیا......''

''اگر میں آپ کی امی سے آپ کا ہاتھ مانگوں تو......''

اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری رہنے دی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں اور شاید امی کو بھی نہیں ہوگا لیکن ......'' نورین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیا......''

''ہم ایک دوسرے کو جانتے ہی کہاں ہیں۔''

''اوہ......'' یہ کہہ کر کامران نے گہری سانس لی۔ ''چلیے، ملتے رہتے ہیں، جان بھی جائیں گے ایک دوسرے کو۔''

نورین ہنس دی۔ وہ بھی مسکرا دیا۔

اگلے چند ہفتوں کے دوران وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آچکے تھے لیکن اب تک نہ تو کامران اس کی ماں سے ملا تھا اور نہ ہی نورین نے اس کا گھر دیکھا تھا۔

اس دن نورین اپنے فکسڈ ڈپازٹ کا پہلا منافع لینے بینک آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں کامران نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ وہ چاہتا تھا کہ نورین پہلے خود اس کا گھر بار دیکھ لے تا کہ اپنی ماں کو مطمئن کرسکے۔ وہ فوراً راضی ہوگئی۔ طے ہوا کہ دوسرے دن بینک کا ہاف ڈے ہے۔ وہ ایک بجے آئے گی اور پھر وہ اسے اپنا گھر دکھانے لے جائے گا۔ وہیں دونوں لنچ بھی کرلیں گے۔

☆☆☆

اے ایس پی زاہد شیروانی تن دہی سے سیٹھ نعمان کی موت کا عقدہ حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اس دوران وہ کئی بار بینک جا کر ان کے بیٹے سے بھی ملاقات کرچکا تھا لیکن اب تک ایسا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا کہ جس سے مبینہ قاتل تک پہنچا جاتا یا بریف کیس سے رقم غائب ہونے کا راز کھل پاتا۔ ڈی آئی جی صاحب بھی کئی بار پوچھ چکے تھے۔ وہ خود سخت جھنجلایا ہوا تھا۔ آخر اس نے ایک بار پھر جائے وقوع دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

زاہد شیروانی نے بینک فون کیا۔ وہاں موجود عملے نے بتایا کہ ہاف ڈے کے باعث منیجر صاحب گھر جاچکے ہیں۔ اس نے گھر فون ملایا لیکن وہ انگیج تھا۔ اس نے مزید ٹرائی کرنے کے بجائے اس سے گھر پر ہی ملنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی اسے گھر ہی دیکھنے جانا تھا۔

جب زاہد شیروانی، سیٹھ نعمان کے گھر پہنچا تو وہ کھانے کے بعد ڈرائنگ روم میں نورین کے ساتھ بیٹھا تھا۔ نوکر نے آنے کی اطلاع دی تو اس نے اسے وہیں بلوالیا۔

''السلام علیکم......''

''وعلیکم السلام......'' کامران نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

وہ اس وقت پولیس یونیفارم کے بجائے جینز ٹی شرٹ میں تھا۔ نورین نے بھی اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ نورین خاموشی سے کولڈ ڈرنک پیتی رہی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی محسوس ہورہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اچانک کسی پریشانی میں مبتلا ہوگئی ہو۔ اس وقت وہ یہ بھی بھول چکی تھی کہ کمرے میں اس کے سوا اور بھی دو افراد بیٹھے ہیں۔ زیادہ سوچ و بچار سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کمرے میں گھٹن ہورہی ہے۔ اس نے جلدی سے گلاس خالی کرکے سینٹر ٹیبل پر رکھا اور کھڑی

ہوگئی۔

''کیا ہوا......'' کامران احمد نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''بس میں اب چلتی ہوں۔''

''ٹھہرو...... میں چھوڑ آتا ہوں بس ذرا......''

''نہیں نہیں، آپ ان سے بات کریں' میں ٹیکسی لے لوں گی۔'' یہ کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

''ایک منٹ رکو، ڈرائیور سے کہتا ہوں، تمہیں چھوڑ آتا ہے۔'' کامران اس کے پیچھے لپکا۔

زاہد شیروانی یہ تو نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے اور اس کا کامران سے کیا تعلق ہے، نہ ہی کامران نے خود اس کا تعارف کرایا تھا لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ وہ رشتے دار نہیں البتہ ان کے درمیان قریبی تعلق ضرور ہے۔ اچانک اس کی نظر سامنے سینٹر ٹیبل پر پڑی۔ وہاں کولڈ ڈرنک کا خالی گلاس رکھا تھا۔ یہ وہی گلاس تھا جو کچھ دیر پہلے نورین کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا۔ رومال سے پکڑ کر گلاس اٹھایا اور اپنے ہینڈ بیگ سے ایک پلاسٹک کی تھیلی نکال کر اس میں پیک کرکے بیگ میں رکھ لیا۔

کچھ دیر بعد کامران کمرے میں لوٹا۔ چہرے سے کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ زاہد نے بھی اس کی پریشانی بھانپ لی تھی لیکن کچھ بولا نہیں۔ ''سوری......''

''ارے کوئی بات نہیں۔'' زاہد نے خوش دلی سے کہا۔ ''دراصل میں وہ کمرا دیکھنا چاہتا تھا۔''

''اوہ......'' ایک دم کامران کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہوگئے۔ ''وہ تو کمرا تب سے لاک ہے، میری تو ہمت ہی نہیں ہوتی اس کے اندر جانے کی۔ میں نوکر سے کہتا ہوں، وہ آپ کو لے چلتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، میں آپ کے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد زاہد شیروانی نوکر کی معیت میں کمرے کا معائنہ کرتا رہا مگر بظاہر اسے کوئی کام کی بات پتا نہ چل سکی۔ لوٹتے ہوئے اسے وہ گلاس یاد آگیا۔ اسے اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ اس کیس سے اتنا اکتا گیا تھا کہ اب چاہتا تھا کسی طرح اس کا انجام ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بنا سوچے سمجھے یونہی وہ گلاس اٹھا لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جائے وقوع سے ملنے والے زنانہ فنگر پرنٹس کا راز حل ہوئے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا۔ اس نے گلاس تو اٹھا لیا تھا لیکن سوچ رہا تھا کہ یقیناً اس پر وہ فنگر پرنٹس نہیں ہوں گے جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ کتابوں میں پڑھ چکا تھا کہ جب تدبیر کے راستے بند ہوجائیں تو تقدیر اتفاقات کے ذریعے راستے بناتی ہے۔ اس کیس میں بھی اب اسے قدرت سے اتفاقات کی ہی امید تھی ورنہ سر توڑ کوشش کے باوجود کوئی سرا پکڑ میں ہی نہیں آرہا تھا۔ دوسرے دن اس نے دفتر پہنچتے ہی نورین والا گلاس پولیس کی فنگر پرنٹس لیبارٹری بھجوا دیا۔

اگلے روز زاہد شیروانی نے طبیعت کی خرابی کے باعث چھٹی کی اور جب وہ تیسرے روز دفتر پہنچا تو رپورٹ آچکی تھی۔ رپورٹ پڑھتے ہی اس نے تفتیشی فائل کھولی اور اسے پڑھنے لگا۔ رپورٹ کے مطابق فنگر پرنٹس میچ کر گئے تھے۔ وہ سخت حیران تھا۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ سیٹھ کا قاتل خود اس کے بیٹے کے ساتھ ہے۔ اسے نورین کے ساتھ ساتھ کامران احمد پر بھی شک ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آیا اس میں وہ لڑکی تنہا ملوث تھی یا کامران بھی شریکِ جرم تھا۔ اسے اب زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ کیس کی گمشدہ کڑی مل چکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب چٹکی بجاتے ہی یہ راز کھل سکتا ہے۔ وہ فوراً ڈی آئی جی صاحب سے ملا۔ وہ کیس حل ہونے پر تو بہت خوش تھے لیکن کامران پہ زاہد شیروانی کے شک سے ان کے ماتھے پر بھی شکنیں پڑ گئی تھیں۔ وہ خود بھی ایک جوان اور اکلوتے بیٹے کے باپ تھے، ایسے میں کامران پر شک سے بطور انسان ان کا افسردہ ہونا فطری امر تھا۔

☆☆☆

اس دن گھر پر لنچ کے بعد آج پہلی بار نورین کامران کے بڑے اصرار پر اس سے ملنے بینک پہنچی تھی۔ کامران کافی پریشان تھا۔ وہ بہت اکھڑے اکھڑے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس دن اس سے ایسی کون سی غلطی ہوئی تھی، جس پر وہ اتنی ناراض ہے۔ ''اگر کوئی بات ہوئی ہے تو صاف صاف کہہ دو۔ دل میں رکھنے سے تو صرف غلط فہمیاں ہی بڑھتی ہیں۔'' کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے دوبارہ بات شروع کی۔

''ضروری نہیں ہے کہ ہر بات کہی جائے اور یہ بھی لازم نہیں کہ میں ہر بات تم سے کہوں۔ آخر ہمارا رشتہ ہی کیا ہے۔''

''میں سمجھ نہیں پا رہا کہ یہ خفگی کس لیے ہے۔'' کامران نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''خیر......'' نورین نے بے رخی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا اس بینک میں اکاؤنٹ ہے۔ آنا جانا تو رہے گا۔ بہتر ہے کہ ہمارے درمیان صرف اچھے تعلقات رہیں [illegible] بینک منیجر اور ایک اکاؤنٹ ہولڈر کے ہو[illegible] کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر اس کے [illegible] پر انگلیاں گڑاتے ہوئے بولی ''صرف پروفیشنل ریلیشنز۔''

''کیا......'' کامران حیرت زدہ تھا۔ ''یہ تم کہہ رہی ہو؟''

نورین نے کوئی جواب نہیں اور اپنا پرس تھام کر اٹھنے ہی والی تھی کہ اے ایس پی زاہد شیروانی سلام کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس وقت وہ وردی میں تھا۔ ''معافی چاہتا ہوں، بنا اجازت اندر آگیا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف باری باری دیکھ کر کہا۔ ''کہیں مخل تو نہیں ہوا آپ لوگوں کے بیچ......'' وہ ذومعنی لہجے میں دونوں سے مخاطب تھا۔

''نہیں نہیں، بالکل بھی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔'' کامران اس کی بات سن کر جھینپ گیا اور اٹکتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''اچھا......'' یہ کہتے ہوئے زاہد شیروانی نے ایک گہری نظر نورین پر ڈالی اور پھر کامران کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ آپ کو ابھی، اسی وقت میرے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا ہوگا۔''

''ابھی......'' کامران کے چہرے پر حیرانی تھی۔

زاہد شیروانی نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''جی ابھی، اسی وقت، میرے ساتھ......''

نورین چند لمحے تک خاموش کھڑی ان کی باتیں سنتی رہی۔ جب اس نے چلنے کا سنا تو دروازے کی طرف بڑھی۔

''میں چلتی ہوں مسٹر کامران......''

''ارے ارے...... رکیے تو۔'' یہ سنتے ہی زاہد تیزی سے پلٹا۔ ''آپ کہاں جا رہی ہیں محترمہ۔ آپ کو بھی چلنا ہے۔ بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔''

''میں......'' نورین چونک کر بولی۔ ''میرا کیا کام۔ میں نہیں جاؤں گی۔'' وہ دروازے کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

''آپ کہیں نہیں جاسکتی ہیں۔'' وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکا اور رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگیا۔

کامران کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ [illegible] کے قتل کیس میں پولیس اسے بلا سکتی ہے، ملنے آسکتی ہے لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اے ایس پی نورین کو ساتھ چلنے پر کیوں بضد تھا۔ ''دیکھیے آفیسر...... ان کا اس سے کیا تعلق۔ آپ انہیں کیوں ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ میں چل رہا ہوں نا آپ کے ساتھ۔''

''آپ دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے میرے ساتھ چلیں۔ دوستانہ انداز میں باہر نکل کر میری گاڑی میں بیٹھیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بدمزگی ہو ورنہ باہر ایک گاڑی میں سادہ لباس اہلکار موجود ہیں۔ زبردستی بھی لے جائے جاسکتے ہیں آپ دونوں۔''

''لیکن میں کیوں......'' نورین نے پھر مزاحمت کی۔

''محترمہ جیسا کہا ہے، ویسا کریں ورنہ......'' زاہد شیروانی کا لہجہ سخت تھا۔

نورین دل ہی دل میں بہت گھبرا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا ہوا کہ پولیس آفیسر کامران کے ساتھ اسے بھی ساتھ لے جانے پر اصرار کر رہا تھا۔

''چلیے......'' کامران آگے بڑھا۔

''محترمہ آپ بھی......'' زاہد شیروانی نے کہا۔

نورین سمجھ گئی تھی کہ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

وہ تینوں باہر نکلے تو کامران اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

''سوری سر......'' زاہد شیروانی نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر روکا۔ ''آپ دونوں میری گاڑی میں چلیں گے۔''

''اوکے......''

کچھ دیر بعد وہ تینوں پولیس ہیڈ کوارٹر جا رہے تھے۔ زاہد شیروانی گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ کامران اس کے برابر اور نورین پیچھے بیٹھی تھی۔ کامران اور نورین، دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ نورین کے تو پاؤں تلے جیسے زمین ہی نہ تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا کبھی پولیس سے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا، یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

نورین کی پریشانی تو بجا تھی لیکن کامران دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ ایک تو وہ پہلے اس کی بے رخی سے پریشان تھا، اب یہ نئی افتاد۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ہی باپ کے قتل کی تفتیش کرنے والا پولیس آفیسر اس سے ایسا کیوں سلوک کر رہا ہے اور نورین...... اسے کیوں اس معاملے میں گھسیٹ لیا گیا ہے۔ اس کی ضرورت کیا ہے۔ لاکھ سوچنے کے باوجود اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

زاہد شیروانی بہت خوش تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ دونوں اتنی آسانی ایک ساتھ ہتھے لگ جائیں گے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ پہلے وہ کامران کو پکڑے گا اور اس کے

ذریعے لڑکی تک پہنچے گا لیکن خوش قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی۔

دو گھنٹے بعد پولیس ہیڈکوارٹر کے تفتیشی کمرے میں چار افراد موجود تھے۔ ڈی آئی جی پولیس، اے ایس پی زاہد شیروانی، کامران احمد اور نورین۔ اس دوران نورین کے لیے گئے فنگر پرنٹس سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ جائے وقوعہ سے ملنے والے گلاس پر اسی کی انگلیوں کے نشانات تھے۔ کامران کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کی طرف سے شاباشی ملنے کے بعد زاہد شیروانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

''دیکھیے! سب بات ثابت ہو چکی ہے۔ تم سیٹھ نعمان کو پہچان چکی ہو۔ بہتر ہے کہ تم دونوں......'' ڈی آئی جی نے رک کر نورین اور کامران کی طرف چھڑی سے اشارہ کیا۔ ''سچ بول دو۔ اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''پلیز......'' یہ سن کر نورین چلّائی۔ ''پلیز پلیز...... کامران کو اس معاملے میں نہ گھسیٹیں۔ یہ بے گناہ ہے۔ میں تو صرف چند ماہ پہلے ہی اس سے ملی ہوں وہ بھی بینک اکاؤنٹ کے سلسلے میں۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔

زاہد شیروانی چونکا۔ ''اس کا مطلب کہ صرف تم......'' اس نے چند لمحے توقف کیا۔ ''کامران صاحب بے گناہ ہیں تو پھر گناہ کار تم ہو۔'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے نورین کو گھورتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں......'' اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ ''کامران کا کوئی قصور نہیں۔ یہ بے چارہ تو خود یتیم ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسی۔ ''فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بیٹا ہے، تعلیم یافتہ ہے، دولت مند باپ کی اولاد ہے ورنہ تو......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا......'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔

''اگر سب کچھ اس کے برعکس ہوتا تو شاید میری جگہ یہ ہوتے۔'' یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم کیا بک رہی ہو، سمجھ نہیں آرہا۔'' زاہد شیروانی نے ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے تفصیل سے اپنا بیان ریکارڈ کراؤ۔ ہم اسے ٹرانسکرپٹ کر کے تمہارے دستخط بیان پر لے لیں گے۔''

نورین نے گہری سانس لی۔ وہ جان چکی تھی کہ اب کھیل ختم ہو چکا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں اپنی ماں کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا۔ ''ٹیپ ریکارڈر آن کرو۔ میں بیان ریکارڈ کرانا چاہتی ہوں۔ سب کچھ صاف صاف بتاتی ہوں۔ اب کچھ چھپانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے گردن موڑی اور قریب بیٹھے کامران پر نظر ڈالی۔ ''آئی ایم سوری......''

کامران کے چہرے پر سخت پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''ٹیپ ریکارڈر آن کر رہا ہوں۔ پلیز بیان ریکارڈ کرائیے مگر سب کچھ صاف صاف......'' اس نے نورین کو خبردار کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی۔ ٹیپ ریکارڈ آن ہوگیا تھا۔

نورین کچھ دیر تک خاموش رہی اور پھر گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ ''یہ کہانی شروع ہوتی ہے میرے غریب باپ کی حادثے میں ہلاکت کے بعد......'' کمرے میں صرف اسی کی آواز گونج رہی تھی۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور آواز پاٹ دار تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر خوف سے آزاد ہو چکی۔ اسے یہ بھی فکر نہیں کہ جب اس کی ماں کے علم میں یہ سب کچھ آئے گا تو اس پر کیا گزرے گی۔ وہ بولتی رہی۔ باپ کی موت سے لے کر کامران سے ملاقات تک کی ساری کہانی صاف صاف بیان کر دی لیکن وہ احسان فراموش ہرگز نہ تھی۔ وہ نجمہ اور مفلوج آنٹی رضیہ کا تذکرہ بالکل غائب کر چکی تھی۔ اس کی نظر میں آنٹی تو خود زمانے کے ظلم و ستم کا شکار تھی، اسے اس حالت میں کیا اس معاملے میں گھسیٹنا۔

کامران، ڈی آئی جی صاحب اور اے ایس پی شیروانی حیرت سے دم بخود تھے۔ ان کی نگاہیں نورین کے چہرے پر جمی تھیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو کمرے میں مکمل سکوت چھا گیا۔

کامران احمد سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے علم نہ تھا کہ اس کا بظاہر فرشتہ صفت نظر آنے والا باپ اتنا شیطان بھی ہو سکتا ہے۔ اسے اب اپنے باپ کے بجائے نورین پر رونا آرہا تھا۔ اس کی پلکیں نم تھیں۔

''بطور انسان میری نظر میں تم مظلوم ہو لیکن قانون کی نظر میں تم مجرم ہو اور تم خود اس کا اعتراف کر رہی ہو۔'' ڈی آئی جی صاحب نے گمبھیر آواز میں کمرے کا سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ ہنسی۔ اس کی ہنسی میں اندر کا کرب جھلک رہا تھا۔

''ایک بات کا جواب دو۔ تمہارے بیان سے لگتا ہے کہ تم نے سیٹھ نعمان ہی کو نہیں، کئیوں کو قتل کیا ہے؟'' زاہد شیروانی نے سوال کیا ہے۔

''کیا فائدہ......'' وہ مسکرائی۔ جنہیں مرنا تھا مر گئے، گڑے مردے اکھاڑنے جاؤ گے تب بھی تمہیں کہیں کوئی اور گلاس نہیں ملے گا۔ غلطی ایک بار تھی، ہمیشہ نہیں۔ اگر اس دن گلاس کا صفایا کر دیتی تو یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔''

''لیکن پھر بھی، تم نے اس طرح کتنے لوگوں کی جانیں لی ہوں گی۔'' ڈی آئی جی نے پوچھا۔

''پلیز...... ریکارڈ درست کریں۔ میں نے ان کی جانیں لی نہیں، وہ خود اپنی جانیں لٹانے کے لیے آئے تھے۔''

''پھر بھی کتنے......'' ڈی آئی جی نے دہرایا۔

نورین کچھ دیر سوچ میں ڈوبی رہی اور پھر سب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''چھبیس شیطان......''

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ چھبیس لوگ مارے گئے اور کسی کو پتا بھی نہ چل سکا کہ موت فطری نہیں قتل تھا۔

''ایک اور سوال......'' زاہد شیروانی کی آواز کمرے میں گونجی۔ ''سیٹھ صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تو تصدیق نہیں کر رہی کہ انہیں زہر دیا گیا تھا یا موت غیر فطری تھی۔''

''کر بھی نہیں سکتی۔'' وہ پھر ہنسی۔ ''یہ راز صرف میرے سینے میں ہے۔''

''کیسا راز......'' وہ چونکا۔

''فکر نہ کرو۔ سب کچھ بتا چکی ہوں، یہ بھی بتا دوں گی۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''بتائیے، اب کہنے کو کیا کچھ باقی رہا ہے۔'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''قتل کا طریقہ اور آلۂ قتل......'' زاہد شیروانی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

نورین نے جواب دینے کے بجائے ٹیبل پر رکھے اپنے ہینڈ بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''ایک منٹ......'' زاہد شیروانی اٹھا اور آگے بڑھ کر بیگ چیک کیا۔ اس میں ایسا کچھ نہ تھا کہ جس پر شک کیا جاسکے۔

''اٹھا سکتی ہوں......'' وہ پلٹا تو نورین نے بیگ کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

ڈی آئی جی صاحب نے سر ہلا کر اجازت دے دی۔

''ایک گلاس پانی......'' نورین نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

زاہد شیروانی نے بوتل سے گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

نورین نے ہاتھ بڑھا کر گلاس سامنے کیا اور بیگ سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ یہ ہومیو پیتھک ڈراپس جیسی شیشی تھی۔

''یہ کیا ہے......'' ڈی آئی جی صاحب چونک کر بولے۔

''الرجی کی ہومیو پیتھک دوا...... دیکھ لیں۔'' اس نے شیشی آگے بڑھائی اور اپنی سرخ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''مجھے الرجی ہے۔ لگتا ہے پھر اٹیک ہو رہا ہے۔ دوا نہ لی تو بولنے کے قابل بھی نہیں رہوں گی۔''

''او کے، لیجیے۔'' ڈی آئی جی صاحب اس کے جواب سے مطمئن ہوگئے۔ ویسے بھی انہیں نہیں لگتا تھا کہ اتنا کھلا بیان ریکارڈ کرانے کے بعد اب وہ بچنے کی کوئی کوشش کر سکتی ہے۔

نورین نے پانی میں تین ڈراپس ڈالے۔ شیشی تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ اس نے شیشی کو جھٹک کر ایک اور قطرہ ٹپکایا۔ اب شیشی بالکل خالی ہو چکی تھی۔ اس نے ایک بار پھر سب کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ اسی دوران اس کی آنکھوں میں ماں کا چہرہ گھوم گیا۔ آنکھیں چھلک گئی تھیں۔ دیکھنے والے سمجھے کہ الرجی کا اثر ہے۔ اس نے سر جھکا کر آنکھیں بند کیں۔ تصور میں ماں سے معافی مانگی۔ ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول کر سر اوپر اٹھایا۔ ''کامران پر گہری نظر ڈالی اور آہستہ سے کہا۔ ''سوری...... میں واقعی تمہیں چاہنے لگی تھی۔''

''تو پھر دو چار روز سے خفا کیوں تھیں۔'' کامران نے اداسی سے پوچھا۔

وہ ہنسی۔ ''لنچ کے بعد جب میں کولڈ ڈرنک تھامے تمہارے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو دیوار پر لگی سیٹھ صاحب کی تصویر پہچان لی تھی۔ اس کے بعد......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر مسکرائی۔ ''میں خود کو تم سے نظر ملانے کے قابل تک نہیں سمجھ رہی تھی۔''

''اور وہ سیٹھ صاحب کی رقم۔'' زاہد شیروانی نے پوچھا۔

نورین نے گردن موڑ کر اس کی طرف چند لمحے خاموشی سے دیکھا اور پھر کہنے لگی ''میں اپنے شکار کے پاس یا اس کے گھر میں موجود تمام نقدی اپنا خراج سمجھ کر ساتھ لے جاتی تھی لیکن پہلی بار مجھے اتنی بڑی رقم ملی تھی۔ سوچا تھا کہ یہ آخری شکار ہوگا لیکن......''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب کہا۔ ''کیا معلوم تھا کہ اپنا آخری شکار میں خود ہی ہوں گی۔'' یہ کہہ کر نورین نے ایک ہی سانس میں بھرا گلاس ختم کر دیا۔ خالی گلاس ٹیبل پر رکھا اور گہری سانس لی۔ اب وہ بہت زیادہ پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر پولیس افسران کی طرف دیکھا ''اب بتاتی ہوں میں ان شیطانوں کو کیسے ختم کرتی تھی۔''

''کیسے......'' دونوں پولیس افسران نے بیک وقت کہا۔

''میں انہیں ایک ایسے کیمیائی مادّے کے ڈراپس کولڈ ڈرنکس میں ملا کر پلاتی تھی جسے اگر دوا میں شامل کیا جائے تو وہ خون کا پتلا پن ختم کر کے اسے نارمل کرتا ہے لیکن خالص حالت میں اس کا ایک قطرہ انسان کے اعصاب کو، دوسرا قطرہ اس کے جسم کو مکمل مفلوج کر دیتے ہیں اور تین سے چار قطرے چند منٹوں میں موت کی نیند سلانے کے لیے کافی ہوتے تھے۔''

''لیکن سیٹھ صاحب کی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو ایسا کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔'' زاہد شیروانی نے استفساریہ نظروں سے فائل کی طرف دیکھا۔

''کیسے ہوتا۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''اس دوا سے انسانی جسم میں خون گاڑھا ہونے لگتا ہے۔ حرام مغز میں فوری طور پر بلبلے بنتے ہیں اور جب لاش کا پوسٹ مارٹم کیا جا[illegible] ہے کہ موت فطری تھی۔ دل یا فالج کا دورہ پڑا تھا۔''

''تمہیں یہ دوا کہاں سے ملی؟'' ڈی آئی جی صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔ بیس سالہ ملازمت میں پہلی بار وہ قتل کا ایسا کیمیائی طریقہ سن رہے تھے۔

''بتایا تھا نا کہ میں نے دو سال میڈیسن فیکٹری میں کام کیا تھا، وہیں سے چرائی تھی یہ۔'' وہ [illegible] کا نام نہیں لینا چاہتی تھی۔

''اس دوا کے تین قطرے پینے کے بعد موت کتنی دیر میں واقع ہو جاتی ہے؟'' زاہد شیروانی کے لہجے سے بھی حیرانی جھلک رہی تھی۔

''زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔'' نورین کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''کہاں ہے وہ دوا؟'' زاہد نے پوچھا۔

''یہ رہی خالی شیشی۔'' نورین نے انگلی سے ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے شیشی اٹھائی۔ اس پر کوئی لیبل نہ تھا۔ ''مگر تم نے تو کہا تھا کہ یہ تمہاری الرجی کی دوا ہے۔''

''جھوٹ بولا تھا۔'' وہ ہنسی۔ ''زندہ رہتی تو مزید رسوا ہوتی۔ تب مردوں نے کیا اب مردوں کا بنایا قانون کرتا مگر......'' اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ ''مجھے یقین ہے کہ سیٹھ کی نیک نامی کی خاطر تم لوگ میری لاش کو رسوا نہیں کرو گے۔ آخر کو وہ عزت دار تھا نا۔'' نورین نے بدقت تمام طنزیہ ہنسی ہنسنے کی کوشش کی۔

''ایمبولینس منگواؤ......'' ڈی آئی جی نے چلّا کر کہا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ ایک دو منٹ میں کھیل ختم......بس میری لاش کو عزت سے میری ماں کے پاس پہنچا دینا۔ اسے کچھ پتا نہ چلے......'' اس نے رک رک کر لڑکھڑاتی زبان میں بدقت تمام کہا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں اور پھر اس کے ہاتھ کرسی کے ہتھے سے نیچے لٹکنے لگے۔ گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔

[illegible] اس کے گرد موجود سب ہم بخود کھڑے [illegible] کہنے کو کچھ نہ تھا۔ سب افسردہ تھے۔

آخر ڈی آئی جی صاحب نے کامران کے کندھے پر [illegible] بتاؤ، اس [illegible] کا کیا کریں۔ انکوائری اوپن ہوتی ہے تو پھر سیٹھ صاحب کا کردار سامنے آئے گا۔'' یہ کہہ کر چند لمحے توقف کیا [illegible] کریں؟''

''[illegible] آج جو کچھ ہوا، وہ سب بھول جائیں، جیسے نورین نے کچھ نہیں کہا۔ اب کچھ فائدہ نہیں۔'' کامران کی آواز بھرا رہی تھی۔

''ٹھیک کہتے ہو، کیس چلا تو پھر یہ کون طے کرے گا کہ قاتل کون مقتول کون......'' زاہد شیروانی نے افسوس سے کہا۔

ڈی آئی جی صاحب نے یہ سن کر گردن موڑی اور اپنے ماتحت افسر کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔ ''سارے ثبوت اور تفتیش جو تم نے کی ہے، اسے ضائع کر دو۔ ریکارڈ کے لیے لاش کا معائنہ کراؤ اور کاغذی کارروائی میں موت کا سبب دل کا دورہ اور مقام بینک ہوگا۔''

''میں نورین کی میت اس کی ماں کے پاس لے کر جاؤں گا۔'' کامران نے لاش کے بے جان پاؤں چھوتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

باہر سے ایمبولینس سائرن کی گونجتی آواز قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

◆

Pakistanipoint Waqar Azeem

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

آوارہ گرد

قسط 28

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا، مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ جلد ہی باپ اسے نئی عورت کے ایما پر اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ یہاں زیادہ تعداد ایسے بچوں کی تھی جو ماں باپ کے ہوتے بھی یتیم تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ ادارہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ ادھر ہی شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی، جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے جوان اکلوتے بیٹے نے بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں اچانک چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ دینی و دنیوی تعلیم و تربیت کے ساتھ یہ ادارہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ یہاں رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا قبضہ ہونے لگا، پھر سب کچھ بدلنے لگا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی ہے۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ جھتے کے معاملے میں شہزی اور اول خیر، کبیل دادا سے بھڑ جاتے ہیں، زہرہ بانو المعروف ”بیگم صاحبہ“ اول خیر کو گروہ سے بے دخل کردیتی ہے، بیگم صاحبہ کے سخت ترین حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی بھی ہے۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف ہے، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ جوڈان ہے لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ۔ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے والوں کے چنگل میں پھنسادیتا ہے اور اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہے جسے اپنی جان بچانے کی زیادہ فکر ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری حد پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنی ماں اور باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آ جاتا ہے، تانگیر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شپرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو تانگیر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلکری سے ہوتی ہے۔ شہزی کو میجر ریاض باجوہ کی بریفنگ کے دوران یاد آ جاتا ہے کہ یہ وہی آرکیالوجسٹ ہشام جھلکری ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ لاڑکانہ میں روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولووش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ بلیو تلسی کے چندرناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور راول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے ایک جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا ہے۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوتی ہے۔ وہ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"شہزی......!"

مجھے نیچے سے کوہارا کی وحشیانہ دہاڑ سنائی دی۔ اس کے خونخوار لہجے سے بڑی زخمی اور منتقمانہ غراہٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔

"تمہاری یہ خوب صورت ساتھی اس وقت میرے رحم و کرم پہ ہے...... میں تمہیں سامنے آنے کے لیے صرف چند سیکنڈوں کی مہلت دیتا ہوں، بصورتِ دیگر میں اس کے سر میں گولی اُتار دوں گا۔"

میرے ہونٹ باہم پیوست تھے۔ مجھے اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ مجھے ٹنکی کی چھت پر چڑھنے سے پہلے سوشیلا کو آواز دے کر بلا لینا چاہیے تھا، تاہم میں نے بھی اپنی اس غلطی پر ماتم کرنے میں مطلق وقت ضائع نہیں کیا اور اسی طرح ٹنکی کی چھت پر رینگتا ہوا، بالکل سرے پر پہنچ کر نیچے سوشیلا کو اپنی مہیب گن کی نال کے نشانے پر لیے کھڑے، کوہارا پر پروانہ وار جا پڑا۔

بلاشبہ یہ میری ایک خطرناک حرکت صحیح مگر سریع الحرکت ضرور تھی، اسی سبب مجھے اُسے بغیر کسی جانی نقصان کے بچھاڑنے میں کامیابی بھی ہوئی۔

میں اُس کے گینڈے جیسے جسم کو اپنے تنومند وجود کے زور پر رگیدتا لے گیا، یہاں تک کہ ہم دونوں کے ہاتھوں سے گن چھوٹ گئی۔ کوہارا نے اپنے بھاری بھرکم جثے کے برعکس غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا جس کی مجھے کم ہی توقع تھی، بس ادھر ہی میں مار کھا گیا، اس کا ہتھوڑے جیسا گھونسا میرے جبڑے پر پڑا تو میرا دماغ جھنجھنا گیا، ایک لمحے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے جبڑے کی ہڈی یا کم از کم جوڑ تو ضرور ہل گیا ہوگا، میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ مگر یہ وقت میرے ڈھے جانے کا نہیں تھا، ورنہ اس کی مجھے ہی نہیں سوشیلا کو بھی بڑی کریہہ ناک قیمت چکانا پڑتی۔

میں نے اپنے سر کو ایک دو بار جھٹکے دیے، پل کے پل ہوش سنبھالا اور پھر اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا سکیڑ کر اس کی ناف کے نیچے پوری قوت سے رسید کر ڈالا۔ کوبارا کے حلق سے جنگلی بھینسے جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور وہ ڈھیلا سا پڑنے لگا تو میں نے لیٹے ہی لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑ کر ”ڈبل پنچ“ بنا کر پوری طاقت سے اس کی ناک پر رسید کر دیا، اس کے اندر رہی سہی طاقت اور حواس بھی کھونے لگے، تو میں تیزی سے اُٹھا، عین اسی وقت چندر ناتھ میرے سامنے گن تانے آ گیا، اپنے تئیں اس نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس سے شاید ایک غلطی یہ ہو گئی تھی کہ وہ اپنی جھونک اور جوش تلے میرے بہت قریب آ چکا تھا۔ چونکہ اس وقت سارا کھیل وقت سے پہلے قدم بڑھانے اور مدِمقابل کو بچھاڑنے کا تھا اسی لیے میں ایک پل بھی ضائع کیے بغیر اپنے دائیں پاؤں کی ایڑی پر گھوما اور ایک لیفٹ راؤنڈ سرکل کک چندر ناتھ کے منہ پر رسید کر دی۔ یہ کک عموماً جان لیوا ثابت ہوتی تھی۔ اس سے گردن کی ہڈی کو بڑا زبردست جھٹکا لگتا تھا۔ چندر ناتھ کی قضا آئی ہوئی تھی کہ وہ اس ”مار“ کو نہ سہہ سکا اور کک کھاتے ہی وہ زمین سے چند انچ اُچھل کر گھوما اور دھب سے گرا تو پھر نہ اُٹھ سکا۔

مجھے سرِدست میدان صاف لگا مگر اسی وقت ....

چاند کی روشنی میں مجھے اپنے بائیں جانب زمین پر کسی کا وجود رینگتا ہوا سا دکھائی دیا۔ یہ کوریلا تھی جو خاصی زخمی ہونے کے باوجود مجھے بچھاڑنے کی ایک آخری کوشش میں چھت سے گرنے کے بعد اس طرف نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی۔ میں نہتا تھا، سوشیلا کی بھی اس پر میرے فوراً بعد ہی نگاہ پڑی تھی، کوریلا ابھی اپنی گن سے میرا نشانہ لینے میں مصروف تھی کہ میں نے بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس کے برسٹ فائر کرنے سے محض چند پل پہلے ہی میں اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔

ٹھیک اسی وقت پولیس سائرن کی آواز گونجی۔ میں تشویش زدہ سا ہو گیا۔ بھارتی پولیس کے چنگل میں جانے کا مطلب میرے لیے خاصا خطرناک نکل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے رہا سہا محاذ اور کوبارا سمیت کوریلا کو بھی چھوڑا، پھر سوشیلا کو پکارا۔

”سوشی! اس طرف دوڑو...... جلدی......“ کہتے ہوئے میں سرائے کی اس دیوار کی جانب بڑھا جو عقب سے گھوم کر بائیں جانب مڑ رہی تھی۔ میری حرکت اور آواز پر سوشیلا نے بھی متحرک ہونے میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی۔

رات کی تاریکی اور بھگدڑ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم دونوں سرائے کی کچھ ڈھے شدہ دیواروں سے چور راستہ بناتے ہوئے باہر تاریک ویرانے میں آ گئے اور پھر نہیں رکے، دوڑتے ہی چلے گئے۔

☆☆☆

پولیس کی گرفت سے بچنے اور عام لوگوں کی مشکوک نظروں سے بچتے ہوئے ہم نے آبادی سے ہٹ کر فرار کا راستہ اپنایا تھا۔

کافی دور جا کر ہم ایک جگہ پر ٹھہرے۔ ہم دونوں کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر رک کر چڑھی ہوئی سانسوں کو بحال کیا تو کچھ بولنے کے قابل ہوئے۔

”ہمیں یہ شہر چھوڑ کر ممبئی کا رخ کرنا ہوگا۔“ میں نے گرد و پیش کی تاریکی میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

”پولیس کا ہی نہیں بلکہ ہمارے دشمنوں کا بھی پورا زور ہماری تلاش میں بھگت گڑھ کو کھنگالنے میں صرف ہوتا رہے گا۔“

”ممبئی پہنچنے سے زیادہ مجھے اب کسی اور بات کی بھی تشویش ہونے لگی ہے۔“ سوشیلا بولی۔

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس اچانک نازل ہونے والی مہم میں تم نے اپنے بیشتر خطرناک دشمنوں کو تو بچھاڑ ہی دیا ہے مگر پولیس اب ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ وہ سب سے پہلے کاشی رام اور اس کے سرائے سے ہمارے بارے میں تفتیش کی ابتدا کرے گی۔ معاملہ قتل و غارت گری کے زمرے میں چلا جائے گا اور ہم دونوں کے لیے بھی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔“

”کاشی رام کے سرائے کو میدانِ جنگ بنانے میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا اور یوں بھی یہ مارا ماری غیر متوقع تو نہیں تھی۔ دشمنوں نے اچانک ہی ہم پر حملہ کر دیا تھا۔“ میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیا۔ مجھے یوں لگا تھا شاید سوشیلا نے مجھ پر طنز کرتے ہوئے ان تمام حالات کی ذمے داری میرے کاندھوں پر ڈال دی تھی۔ میں نے

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دیکھا، وہ میری اس بات پر بے اختیار مسکرائی تھی۔ چٹکی ہوئی چاندنی میں اس کی مسکراہٹ میں مجھے بڑی گیرائی آمیز... اپنائیت سی محسوس ہوئی تھی، وہ بڑے پیار بھرے انداز میں قدرے شوخی سے میرے سر کے بالوں کو چھیڑ کر بولی۔

"ایک تو تم بڑی جلدی جذباتی ہو جاتے ہو...... میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس میں تمہارا قصور ہے۔ ظاہر ہے ہم جن حالات سے دوچار ہیں، وہاں کسی بھی وقت دشمنوں سے ٹکراؤ ہونے کے امکانات رہتے ہیں۔ میں نے تو محض ایک خدشے کی بات کی تھی کہ اب ان حالات میں ہمیں اپنا اسٹریٹیجک پلان ذرا تبدیل کرنا پڑے گا......"

سوشیلا کے اس لگاوٹ بھرے انداز پر بے اختیار میں بھی اپنا سر جھٹک کر دھیرے سے مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔

پیش آمدہ تازہ کار اعصاب شکن لمحات کے بعد میں خود کو نجانے کیوں کافی پُرجوش سا محسوس کرنے لگا تھا، وجہ شاید یہی تھی کہ میں نے یہاں آتے ہی اپنے دشمنوں کے مشترکہ ٹولے کو بڑی زک پہنچائی تھی۔ بلیو تلسی کے دو ٹاپ ایجنٹوں، چندرناتھ اور شیام کو واصلِ جہنم کیا تھا اور کوریلا بھی خاصی زخمی ہوئی تھی میرے ہاتھوں، جبکہ سے جی کوہارا کے قریبی برمی ساتھی بھوک کو میں دوسرے محاذ میں پہلے ہی فنا گھاٹ کر چکا تھا، نیز کوبارا کو رنگون سے پہنچنے والی کمک میں اس کے مزید برمی ساتھی بھی میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے اور اب میں تصور کی آنکھ سے بلیو تلسی کے سی جی بھجوانی اور اسپیکٹرم کے جبری اور غاصبانہ قابض...... لولووش کو خارش زدہ کتوں کے مانند شکست خوردہ انداز میں غراتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ تھی کہ...... یہ سب متذکرہ بالا افراد، "چھوٹے بڑے" تفاوت کے ساتھ محض مہرے تھے۔ جب تک سی جی بھجوانی اور لولووش زندہ تھے، یہ مہرے میری راہ میں آتے رہیں گے...... اسی لیے میرا اصل شکار یہی دونوں افراد تھے۔ لولووش مجھ سے دور سہی، لیکن میں اس تک پہنچنے والا تھا، جبکہ سی جی بھجوانی کے شہرِ خرابے میں، پہلے ہی میں اسے واصل جہنم کرنے کے لیے موجود تھا۔ لہٰذا ایک نظر گردوپیش پر ڈالنے کے بعد میں نے سوشیلا سے کہا۔

"ہمیں اب اپنے آئندہ کے لائحۂ عمل میں تھوڑی ترامیم........ کرنا پڑے گی اور بہرصورت ہمیں فوری طور پر ممبئی کا رخ کرنا ہوگا۔"

"کیا وہاں تمہارا کوئی خاص شکار ابھی زندہ باقی ہے؟"

"ہاں!" میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ "میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ مجھے دشمنوں کے اصل ٹھکانے "سورت" پہنچنا ہے۔" میں نے اسے یاد لاتے ہوئے اسے اُکسایا بھی، تاکہ وہ مجھ سے بلیو تلسی وغیرہ کے سلسلے میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کرے۔ اسی لیے آگے بولتا رہا۔

"میں دراصل جلد از جلد...... سورت والی مہم (سی جی کو جہنم واصل کرنا) کو مکمل کر کے کے ایل ایڈوانی کے پیچھے پڑنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہر صورت میں وہ ہیرا اس کے قبضے سے حاصل کرنا ہے، جس کے پیچھے دنیا کے تین جنگی جنونی جرنیل، دنیا کو تیسری عالمی جنگ میں جھونکنے کی مذموم اور گھناؤنی سازش میں مصروف ہیں۔"

میں جانتا تھا کہ کے ایل ایڈوانی سے متعلق یہ موضوع سوشیلا کے لیے کس قدر "دلچسپی" تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ فوراً بولی۔

"ہاں! میں خود بھی یہی چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد تمہاری یہ مہم پایۂ تکمیل کو پہنچے اور پھر اس نامراد اور سفاک جرنیل کے ایل ایڈوانی کی بھی باری آئے۔"

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اب طلسم نور ہیرے کی برآمدگی والی مہم خود میرے لیے بھی خاصی ذاتی نوعیت کی حامل ہو چکی تھی کہ وہ ہیرا (طلسم نور) میرے وطن کی امانت تھی، نیز اس سے بڑھ کر اگر عالمی انسانیت کے جذبے کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس مشن کی اس لیے بھی اہمیت دوچند ہو جاتی تھی کہ تیسری عالمی جنگ کی صورت میں کس قدر بے گناہ زندگیاں اس جنگ میں جھونک دی جاتیں۔ مجھے یاد تھا، جب میں اطفال گھر میں تھا تو وہاں جنگِ عظیم اول اور دوم کی دستاویزی فلم دکھائی جاتی تھی اور اس میں کتنے ہی بے گناہ لوگوں کو موت کے منہ میں جاتے دکھایا گیا تھا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے سے جو ہلاکتیں ہوئیں سو ہوئیں، مگر کہا جاتا ہے کہ اس ایٹمی تابکاری کے اثرات کے باعث بعد میں بھی وہاں پیدا ہونے والے لوگ عرصے تک کسی نہ کسی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو کر سسکتی زندگی گزارتے رہے تھے۔ اب ایٹمی ماہرین کے تجزیے کے مطابق اس بار اگر دنیا کو تیسری ایٹمی جنگ میں جھونکا گیا تو کوئی ملک نہیں بچے گا۔ اس کی وجہ... ماہرین یہی بتاتے تھے کہ برسوں پہلے والے ایٹمی بموں کے مقابلے میں آج کے ایٹمی ہتھیار پچاس گنا سے بھی زیادہ تباہ کن اور مہلک اثرات والے ثابت ہو سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

تھی کہ آج کے تین بڑے جنگی جنونی جرنیلوں (امریکا، روس، بھارت) نے اپنے اس گھناؤنے منصوبے کو "ورلڈ بگ بینگ" کا نام دیا تھا اور سب سے پہلے وہ تین ممالک پاکستان، ایران اور چین کے درمیان ورلڈ بگ بینگ کی آگ بھڑکانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔ یوں تو وہ اس گھناؤنے عالمی منصوبے کی ابتدا جنوبی ایشیا سے کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، جن میں سات ممالک ہیں۔ انڈیا، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش، مالدیپ، نیپال اور بھوٹان، جبکہ انڈیا سیاسی، معاشی، سماجی وسعتِ رقبہ کی برتری کی وجہ سے ان سب ممالک میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ شاید اسی سبب انڈیا خود کو بڑے غرور سے جنوبی ایشیا کی منی سپر پاور سمجھنے کے زعم میں مبتلا رہتا ہے۔ تبت (عوامی جمہوریہ چین) کو بھی بعض معاشی، سیاسی اور ثقافتی وجوہات کی بنا پر جنوبی ایشیا کا ہی ملک سمجھتے ہیں، جبکہ ایران، پاکستان کے قریبی برادر اسلامی ملک ہونے کے باعث، اسے بھی جنگ کی آگ میں جھونکنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد تیسری عالمی جنگ کا دائرۂ کار جنوبی مغربی ایشیا اور پوری دنیا تک وسیع ہو جاتا۔ جس طرح کا یہ "ورلڈ بگ بینگ" کا گھناؤنا منصوبہ بنایا جا رہا تھا، لگتا ایسا ہی تھا کہ اس کے پیچھے صرف تین ہی جرنیل کارفرما نہیں ہو سکتے تھے، ایک پوری مضبوط لابی ان کی پشت پر ہو سکتی تھی۔ یہ تین جرنیل تو محض ان کے مہرے ہی ہو سکتے تھے۔

بہرکیف میں نے سوشیلا کی بات پر کہا۔ "میں اسی لیے جلد از جلد ممبئی جانا چاہتا ہوں......"

"میں متفق ہوں...... یوں بھی ہمارا اب یہاں بھگت گڑھ میں زیادہ دیر ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا، لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے کہا۔

"لیکن کیا......؟"

"اس کاشی رام کی وجہ سے ہم وہاں ممبئی جا کر بھی پھنس سکتے ہیں، کیونکہ پولیس کاشی رام کو ہی سب سے پہلے تفتیش کے سلسلے میں تختۂ مشق بنائے گی، اور وہ میرا ایسا سچا عاشق بھی نہیں ہے کہ اپنی جان چھڑانے کے لیے پولیس کو میرے اور ممبئی میں میری رہائش گاہ کے بارے میں نہ بتائے...... یوں ہمارے ممبئی پہنچنے سے پہلے ہی پولیس وہاں پہنچی ہوئی ہوگی، ہمیں گرفتار کرنے کے لیے۔"

"یہ خدشہ میرے ذہن میں بھی تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم ممبئی جاتے ہی تمہاری رہائش گاہ کا رخ کریں؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولی۔

"تمہاری تجویز بھی بری تو نہیں...... لیکن وہاں ایسا کوئی ٹھکانا ہمیں بلکہ مجھے ہی تلاش کرنا ہوگا، جہاں محفوظ طریقے سے رہتے ہوئے ہم اپنے مشن کو آگے بڑھا سکیں۔"

"یقیناً...... میں بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"ابھی یہاں سے تو نکلو...... اس سے پہلے کے ناکا بندی ہو جائے، پھر سوچتی ہوں۔" وہ بولی اور ہم نے آگے قدم بڑھا لیے۔

ہمارے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ ہم پیدل تھے۔ دشمنوں سے تو ابھی فوری طور ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن بھگت گڑھ کی پولیس ہمارے پیچھے ضرور لگ چکی تھی اور ان کے پیشِ نظر صرف واردات تھی، یہ نہیں تھا کہ کون کس کا اور کیوں دشمن تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ اس واردات کو سنسنی خیز اور سنگین قرار دینے میں ذرا بھی بخل سے کام نہیں لیتے۔ کیونکہ اس میں میرے ہاتھوں کئی افراد مارے گئے تھے۔ بلیو تلسی کا چندرناتھ اور شیام کی ہلاکت یقیناً سی جی بھوانی کو بلبلانے کے لیے کافی تھی اور وہ یہاں میری تلاش میں بھارت کا کونا کونا چھان مارنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ تازہ کارروائی کے بعد تو ہو سکتا ہے وہ پولیس کو بھی ہائی کمانڈ کے ذریعے بدستور ہمارے تعاقب میں لگانے کے احکامات جاری کروا سکتا تھا۔

سوشیلا نے بھگت گڑھ کے ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا تھا۔

اسٹیشن تک پیدل جاتے ہوئے سوشیلا نے بتایا تھا کہ بالاسور سے ممبئی تک کا سفر کم و بیش اٹھارہ سو کلومیٹر پر محیط ہے، نیز وہاں تک یہاں سے کوئی سیدھی ٹرین بھی جاتی ہے یا نہیں اس کا اُسے کوئی علم نہ تھا۔ بہرطور اسٹیشن وہاں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا، تھوڑی دیر بعد ہی ہم وہاں پہنچ گئے، اسٹیشن کیا تھا...... بس ایک پیلی سی مٹیالے رنگ کی سالخوردہ سی دیوار تھی، جس کی پیشانی پر لگے ایک پھیکے یرقان زدہ بلب کی روشنی میں مٹے مٹے الفاظ میں "بھگت گڑھ ریلوے اسٹیشن" لکھا ہوا نظر آیا۔ بلب کے گرد مچھروں کا جھرمٹ گردش کر رہا تھا۔

عمارت کے پیچھے ریلوے ٹریکس باہر سے ہی دکھائی دے رہے تھے، کیونکہ دائیں بائیں کی دیواریں منہدم تھیں۔ پلیٹ فارم کا پلستر بھی اکھڑا ہوا نظر آتا تھا۔ اِکّا دُکّا لوگ ہی پلیٹ فارم کے کسی لیمپ پوسٹ کی روشنی میں مٹرگشت کے انداز میں دکھائی دے رہے تھے، وہ بھی اپنی

مخصوص یونیفارم سے عملے کے ہی افراد نظر آتے تھے۔ باقی اسٹیشن پر سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ایک ایسے ہی آدمی کو روک کر ممبئی جانے والی کسی مسافر ٹرین کا پوچھا تو وہ خاصی حیرت سے پہلے میرا اور پھر میرے ساتھ کھڑی سوشیلا کا چہرہ تکنے لگا، جیسے وہ ہمیں کچھ زیادہ ہی انجان سمجھا ہو، پھر کچھ طنز سے بولا۔

"آپ سے کس نے کہہ دیا کہ یہاں سے کوئی ٹرین سیدھی ممبئی جاتی ہے؟"

"کہا تو کسی نے نہیں بھائی! لیکن آپ ہی بتا دیں کہ ہم پھر کیا کریں؟ ہمارے کسی عزیز کا وہاں ممبئی میں دیہانت ہو گیا ہے اور ہمیں ترنت پہنچنا ہے۔" اس بار سوشیلا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا تو وہ بولا۔

"بہن جی! پھر تو آپ لوگ بالکل صحیح وقت پر آئے ہیں۔ کیونکہ ابھی تھوڑی دیر میں اماراوتی ایکسپریس آنے والی ہے جو بھبنیشور تک جائے گی اور وہاں سے آپ کو سیدھی ممبئی جانے والی دھاولی ایکسپریس مل سکتی ہے۔"

"بھیا! تمہارا بہت شکریہ......" سوشیلا نے جلدی سے کہا۔ "ابھی یہ مسافر ٹرین کتنی دیر میں پہنچنے والی ہوگی؟"

"بس! آرہی ہے۔" وہ آدمی سامنے دور پٹریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ دیکھو...... اس کے انجن کی لائٹ بھی نظر آنے لگی ہے۔ آپ جلدی سے جا کر ٹکٹ خرید لیں، یہ چھوٹا اسٹیشن ہے، ٹرین یہاں زیادہ دیر نہیں رکے گی۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

ہم دونوں نے اس بھلے مانس آدمی کے اشارے پر اس طرف دیکھا تھا جہاں ایک مدور نما تیز لائٹ لحہ بہ لحہ قریب آتی نظر آرہی تھی۔

ہم فوراً پاس بنے ایک آفس کی کھڑکی کے سامنے پہنچے، یہاں وہی شخص ایک کرسی پر براجمان تھا اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اس نے ہمیں اس طرف آتے دیکھتے ہی دو ٹکٹ بھبنیشور کے کاٹ دیے تھے۔ سوشیلا نے پیسے دیے اور ہم دونوں جلدی سے واپس اسی جگہ آ کر کھڑے ہو گئے، جہاں پہلے موجود تھے۔ ٹرین وسل دیتی ہوئی آئی اور پلیٹ فارم پر رک گئی۔ چند ہی مسافر اُترے تھے اور اب اس میں سوار ہونے والے بھی کچھ مسافر نظر آنے لگے تھے۔ میں اور سوشیلا ایک ایسی بوگی میں داخل ہو گئے جس میں مسافروں کا رش نسبتاً کم ہی تھا۔

ہمارے سیٹوں پر بیٹھتے ہی ٹرین نے وسل دی اور رینگنا شروع کر دیا۔ گویا مزید کسی مصیبت میں پڑے بغیر بھگت گڑھ سے ہم بہ خیر و عافیت کے روانہ ہو چکے تھے۔

ٹرین اب خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ میں اور سوشیلا آمنے سامنے کی لمبی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ ہمارے آگے پیچھے والی سیٹوں پر بھی کچھ مسافر مرد و عورتیں موجود تھیں، کوئی اُوپر برتھ پر سو رہا تھا تو کوئی نیچے ہی خالی لمبی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا، وہ سب گہری نیند میں تھے، بوگی میں ہم فقط دو ہی مسافر جاگ رہے تھے۔ بوگی کی بیشتر بتیاں گل تھیں۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ یہ ایکسپریس ٹرین تھی اور صرف بڑے جنکشن ٹائپ کے اسٹیشنوں پر رکتی تھی۔ رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ باہر کے مناظر تاریک تھے۔ میں نے یونہی کھڑکی سے ذرا باہر نظر ڈالی۔ ٹرین ایک چھوٹے اور ویران اسٹیشن کو بغیر رکے کراس کر رہی تھی۔ میں سوشیلا کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمیں بھبنیشور پہنچ کر آگے ممبئی جانے کے لیے دوسری ٹرین پکڑنا چاہیے؟"

"شاید تمہارے ذہن میں بھی وہی خدشہ پل رہا ہے جو میرے ذہن میں بھی اس ٹرین میں سوار ہوتے وقت اُبھرا تھا۔" اس نے کہا۔ وہ خاصی زیرک دماغ تھی۔ میرے سوال کی تہ میں چھپے اس خدشے کو بھانپ گئی تھی جس کے تحت میں اس کی آئندہ کے سفر کی رائے لینا چاہتا تھا۔

"ہاں! تم نے ٹھیک اندازہ لگایا سوشی! بے شک عارضی طور پر سہی، ہم بھگت گڑھ کی پولیس کو چکما تو دے آئے ہیں...... لیکن اس کے باوجود ہمیں ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بھگت گڑھ کی پولیس اپنی تفتیش کا دائرہ اسٹیشن اور لاری اڈوں تک وسیع کرنے کے دوران اس ٹکٹ والے سے بھی ہمارے بارے میں پوچھ کچھ کر سکتی ہے اور اسٹیشن پر صرف ہم دونوں کی موجودگی کے باعث اس ٹکٹ بابو کو ہماری صورتیں بھی ازبر ہوں گی۔"

"بھبنیشور پہنچتے ہی ہم کسی اور ٹرین میں سوار نہیں ہوں گے۔ باہر نکل کر کسی بس وغیرہ میں سفر کو ترجیح دیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ زیادہ تو نہیں، لیکن...... کھینچ کھانچ کر بس کا کرایہ تو ہو ہی جائے گا۔"

میں نے مایوسی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور کھڑکی سے باہر پیچھے بھاگتے ہوئے تاریک مناظر کو دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا! شہزی......؟" سوشیلا نے بے اختیار پوچھا۔

"میرا خیال تھا اگر ہمارے پاس کچھ زیادہ پیسے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوتے تو ہم بھبنیشور سے آگے کسی ٹرین یا بس کے بجائے کوئی کرائے کی کار کروا لیتے، اس طرح وقت بھی بچ جاتا اور کچھ تحفظ بھی رہتا۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رقم کا معاملہ واقعی گمبھیر تھا جبکہ ممبئی دور، سفر جلد باشا تھا اور محفوظ طریقے سے بھی۔ ان ساری باتوں کے لیے رقم کی اہمیت اپنی جگہ تھی۔

"کاشی رام اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔" بالآخر اس نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ "لیکن بدقسمتی سے وہ موقع ہی نہ آسکا اور اس سے پہلے دشمنوں نے دھاوا بول دیا۔ ورنہ کاشی رام ہمارے بہت کام آسکتا تھا۔"

بیتے ہوئے پر ماتم کرنا میری عادت تھی نہ فطرت، جو گزر گیا وہ گیا۔ جو موجود ہے وہ آپ کا ہے، بصورت دیگر یہ بھی ہاتھ سے جاتا۔ اس لیے میں کاشی رام والے سنہری موقع کے ضائع چلے جانے پر کوئی متاسفانہ تبصرہ کیے بغیر بولا۔

"ان حالات میں بس کا سفر ہی بہتر رہے گا۔ مگر تم اس پر بھی کہہ رہی ہو کہ بس کا کرایہ بھی کھینچ کھانچ کر ہو جائے گا...... کیا اس کے لیے بھی کم ہیں پیسے؟"

"شاید...... کم پڑ جائیں۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "کیونکہ ٹرین کے مقابلے میں ایک تیز رفتار لگژری کوچ کا کرایہ بہت زیادہ ہوگا۔"

میں نے تھوڑا غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ موجودہ حالات میں جلد بازی کسی نقصان کا پیش خیمہ بھی ہوسکتی ہے۔ یوں بھی غور کرنے پر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ بس کے مقابلے میں ٹرین کا سفر ہمارے لیے زیادہ محفوظ ہوسکتا تھا۔ لیکن اس میں ایک ہی قباحت...... تھی کہ میں اور سوشیلا ٹکٹ دینے والے عملے کے ایک آدمی کی نظروں میں "ٹھیک ٹھاک" طریقے سے آچکے تھے۔ اسی لیے پولیس سب سے پہلے ریلوے پاتھ کو ہی کڑی نگرانی میں لینے کی کوشش کرتی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ اگر بھگت گڑھ کی پولیس نے ذرا غیر معمولی چابک دستی دکھائی تو اُسے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ مذکورہ اسٹیشن سے کون سی ٹرین کس وقت گئی ہے تو وہ اگلے کسی اسٹیشن میں، فون جیسے فوری رابطے کا استعمال کرتے ہوئے ہمارے لیے مشکل کھڑی کرسکتی تھی۔ گویا ہمیں ہر آنے والے اسٹیشن پر جہاں یہ گاڑی رکتی، یا روک دی جاتی، محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

"کیا سوچنے لگے؟" سوشیلا نے سیٹ پر جھکے جھکے انداز میں ذرا آرام لینے کی غرض سے پھیلتے ہوئے بیٹھ کر مجھ سے پوچھا۔

میں نے اُسے اپنے ذہن رسا میں پلنے والے اندیشناک خدشات سے آگاہ کیا تو وہ بھی چونک سی گئی۔ بولی۔ "اُف شہزی......! تم کس قدر باریکیوں میں جا کر سوچتے ہو، اس طرف تو میرا ابھی دھیان نہیں گیا تھا، مجھے تو واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کمال ہے، اتنے خوفناک حالات سے گزرنے کے بعد بھی تمہیں ڈر لگنے لگا ہے؟" میں نے ماحول کی کدورت دھونے کی غرض سے ذرا مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی بے اختیار مسکرا دی اور بولی۔

"ایسی بات نہیں، میں نے تو محض رواروی میں یہ کہہ ڈالا تھا۔ ورنہ تو میں بہت پُرجوش ہوں اور ذہنی طور پر تیار بھی۔"

اسی وقت ٹرین نے اپنی رفتار گھٹانا شروع کر دی۔ شاید کوئی اسٹیشن آنے والا تھا۔

"ابھی تو ایک اسٹیشن پر رکی تھی؟ اب دوبارہ......؟" سوشیلا کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ اس کا خیال ٹھیک ہی تھا۔ کیونکہ یہ کوئی لوکل ٹرین نہیں تھی کہ ہر اسٹیشن پر رکتی، ابھی وہ ایک اسٹیشن پر چند منٹوں کے لیے رکی تھی، وہ ایک جنکشن اسٹیشن تھا، اور اتنی جلدی دوبارہ کوئی جنکشن اسٹیشن نہیں آسکتا تھا۔

میں نے ذرا کھڑکی سے باہر جھانکا، مجھے ذرا دور کسی اسٹیشن کی روشنی دکھائی دینے لگی۔

"کوئی اسٹیشن آرہا ہے......" میں نے جلدی سے اور نیچی آواز میں کہا۔ "تم ایسا کرو دوسری طرف کی کھڑکی سے ذرا باہر جھانک کر دیکھو اور کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کرو تو مجھے بتاؤ، پتا نہیں پلیٹ فارم کس طرف آتا ہے؟" اس نے میری بات پر اثبات میں سر ہلایا اور پھر دوسری جانب کی کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔

ٹرین جب کسی متوقع اسٹیشن کے ذرا نزدیک پہنچی تو مجھے اسٹیشن کا وہ شیڈ نظر آگیا جو میری طرف کی کھڑکی کی طرف تھا۔ میں نے تب بھی سوشیلا کو دوسری کھڑکی سے ہٹنے نہیں دیا، کہ کہیں پولیس نے دونوں جانب سے ٹرین کو گھیرے میں نہ لے رکھا ہو۔

میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ ٹرین کا انجن شیڈ میں داخل ہو چکا تھا اور مجھے پلیٹ فارم صاف نظر آنے لگا تھا۔ مگر وہاں مجھے چند مسافروں کے علاوہ پولیس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

وردی میں ملبوس کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ یہی کچھ سوشیلا نے بھی مجھے بتایا۔ وہ اب دوبارہ سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تھی، جبکہ میں اب بھی کھڑکی سے باہر ہی تکنے میں مصروف تھا۔ اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ہیئت ایسی ہی تھی اس کی، جیسی کہ کسی دور اُفتادہ چھوٹے دیہاتی علاقے کے ریلوے اسٹیشن کی ہو سکتی تھی۔

ٹرین رینگنے کے انداز میں آہستہ آہستہ پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی اور میری نظریں وہاں نیچے کھڑے مسافروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دفعتاً میں چونکا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ بہ ظاہر مسافر بنے کھڑے ان لوگوں کے بشرے کچھ اور ہی تاثر دیتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کے پاس سامان کے نام پر ایک بچی تک نہیں تھی۔

”خطرہ......“

میرے ذہن میں اچانک ہی ابھرا اور پھر جیسے ہی ٹرین رکی۔ ان میں سے ہر ایک آدمی دوڑ کر ایک ایک بوگی میں سوار ہو گیا۔ ایک آدمی ہماری بوگی میں بھی داخل ہوا تھا۔

”اُٹھو، میرے ساتھ آؤ جلدی......“ میں نے فوراً سوشیلا سے کہا اور پھر سیٹ چھوڑ دی۔

اس سے پہلے کہ وہ آدمی ہمارے قریب آتا ہم اپنی سیٹ چھوڑ چکے تھے۔ ابھی ہم بوگی کی راہداری میں ہی تھے کہ اچانک میں نے انہی جیسے اور آدمیوں کو بھی تیزی کے ساتھ ٹرین کی مختلف بوگیوں میں سوار ہوتے دیکھا اور میری کنپٹیاں تک سنسنا اُٹھیں۔ یہ شاید پولیس کے ہی اہلکار تھے، جو دانستہ سادہ لباس میں تھے۔ دو تین مزید افراد اگلے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ اب ہم دونوں طرف سے پھنس گئے تھے۔ یہ تو شکر تھا کہ ابھی ہم دونوں ان میں سے کسی کی نظروں میں نہیں آئے تھے مگر زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکتا تھا۔

درمیان کا ایک دروازہ دیکھ کر میں نے اسی جانب رخ کیا اور بڑی پھرتی کے ساتھ پرلی طرف کے دروازے سے سوشیلا کو لے کر نیچے اُتر گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میرے عقب سے ایک تیز اور کرخت سی آواز اُبھری تھی۔

”رک جاؤ......“

”دوڑو سوشیلا......!“ میں چلایا اور پھر ہم دوسری طرف نیچے اُترتے ہی اندھا دھند دوڑ پڑے۔ اسی وقت پے درپے سیٹیاں بج اُٹھیں۔ ایک دو فائر بھی ہوئے، یہ شاید ہوائی فائر تھے۔

میں اور سوشیلا رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک قریب کھڑی مال گاڑی کی آڑ میں چلے گئے۔ مڑ کر دیکھا تو تاریکی میں کئی ہیولے اسی طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ مگر ہم نہیں رکے اور دوڑتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل آئے۔

ایک جانب کچے پکے مکانوں کا بے ترتیب سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ہم نے ادھر کا ہی رخ کیا۔ اُدھر پولیس کے سادہ لباس اہلکار بدستور سیٹیاں بجاتے اسی طرف ہی دوڑے چلے آرہے تھے۔ وہ اِکا دُکا فائر بھی کیے جا رہے تھے۔

ہم مکانوں کی گلیوں میں داخل ہو گئے جو سنسان پڑی ہوئی تھیں۔ انہی گلیوں میں سوشیلا اور میں دوڑتے چلے گئے، بالآخر ہمیں رکنا پڑا۔ آگے گلی بند تھی۔ ہمارے عقب میں پولیس کی سیٹیاں گونج رہی تھیں۔ میں ہونٹ بھینچے کھڑا سوچتا رہا۔ عقب میں دیکھا۔ واپسی کا در بند تھا، اگر اس گلی سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے تو دھر لیے جاتے۔

”اب کیا ہوگا......؟ یہ گلی تو بند ہے آگے سے...... جلدی سے واپس پلٹو۔“ سوشیلا نے پریشانی سے کہا۔

”واپسی کا در بند ہو چکا ہے......“ میں نے ڈرامائی لہجے میں کہا۔ جانے کیوں ایسی کسی سچویشن میں میرے دل و دماغ میں ایک عجیب سا جوش سوار ہو جایا کرتا تھا۔ میرا اندر کچھ کرنے پر مائل ہونے لگتا تھا۔ عقب میں پولیس کی بدستور وسلیں جاری تھیں اور اب تو گہری نیند میں ڈوبے ہوئے لوگ بھی جاگنے لگے تھے۔ اچانک میری گردشی نظروں نے اس بند گلی کے آخری سرے پر ایک گھر کا دروازہ دیکھا، وہ بند تھا، مگر اس کی جھری سے روشنی آتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ یہ جھری دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان تھی اور اس قدر چوڑی تھی کہ مجھے گمان ہوا کہ دروازہ کھلا پڑا تھا۔

”آؤ جلدی......“ میں نے اسی گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ سوشیلا حیران پریشان سی میرے ساتھ آگے بڑھی، وہ شاید سوچ رہی تھی کہ مجھے اس بند گلی میں ایسا کیا نظر آگیا تھا، جو میں نے فوراً آگے بڑھنے کا اعلان کر ڈالا تھا۔

میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک گلی کے دوسرے سرے پر مجھے تیز سیٹی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی متعدد دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز بھی اُبھری تھی۔

میں نے اسی وقت آؤ دیکھا نہ تاؤ......دروازے کے

قریب پہنچتے ہی اسے قدرے آہستگی سے اندر کی طرف دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ میں سوشیلا سمیت غڑاپ سے اندر گھس گیا۔ مختصر سے نیم پختہ صحن پر مشتمل یہ مکان بھائیں بھائیں کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سامنے چھوٹا برآمدہ تھا اور دو کوٹھری نما کمرے دکھائی دیتے تھے۔ ایک کا دروازہ بند اور دوسرے کا کھلا تھا۔ اندر روشنی تھی۔

میں نے پہلے جلدی سے دروازہ بند کیا اور سوشیلا کو وہیں صحن میں ہی کھڑے رہنے کا کہا پھر اس کے بعد خود دبے پاؤں کھلے دروازے والے کمرے کی طرف بڑھا۔

باہر سے سیٹیوں کی اب وقفے وقفے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

اس کوٹھری نما کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر میں رکا اور ذرا اندر کی طرف جھانکا تو جیسے یکایک میرے سینے میں سانسیں اٹکنے لگیں۔ اندر کا منظر ہی کچھ ایسا چکرا دینے والا تھا کہ میں بُت سا بن گیا۔

☆☆☆

کمرے میں روشنی تھی۔ جس کی محدود فضا میں ہلکی سی خوشبو کے علاوہ ایک عجیب بو بھی خلط ملط ہو گئی تھی۔ کمرے میں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں، کچھ دیواروں پر بھی چپکائی گئی تھیں۔ چارپائی کے گرد بھی کہیں کہیں سستے اور رنگین کاغذوں کی پٹیاں لگی ہوئی نظر آتی تھیں۔ جو سیج کا منظر پیش کرتی تھی۔ بظاہر یہ سارا منظر شبِ زفاف کا ہی نظر آتا تھا، کیونکہ چارپائی پر دو نئے نویلے دولھا دلہن بھی موجود تھے، اس طرح کہ دونوں لیٹی ہوئی حالت میں ایک دوسرے کو اپنی بانہوں میں لیے ہوئے تھے، لیکن دو دلوں کو ارمانوں کے ہنڈولوں پر جھولا جھولنے سے پہلے ہی نجانے کن ظالموں نے موت کی اندھیری گود میں پہنچا دیا تھا۔ وہ اب لاشوں کی صورت میں چارپائی پر پڑے ہوئے تھے۔ دلہن کے چہرے پر نودمیدہ ارمانوں کی مسکراہٹ، گویا اچانک جھپٹنے والی موت نے اس طرح چھین لی تھی کہ اس کے حنائی لب اسی طرح ہی وا رہ گئے تھے اور وہ مسکراہٹ بھی ثبت رہ گئی تھی۔

مجھے دونوں کی عمروں کا اندازہ، بیس، اکیس اور چوبیس، پچیس سے زیادہ کا نہ ہو سکا۔ غریب گھرانے سے ہی اس بدنصیب نئے نویلے جوڑے کا تعلق لگتا تھا، ان کے عروسی لباس بھی عام اور سستے سے دکھائی پڑتے تھے۔ دونوں کے جسم خون کی چھپڑی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہیں شاید تیز دھار آلے کی مدد سے پے در پے وار کر کے اور بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا اور یقیناً اسی وقت اُتارا گیا ہو گا جب یہ دونوں اپنی پھولوں سے سجی، محبت اور ارمانوں بھری سہاگ رات کی شروعات کرنے لگے تھے کہ کسی ظالم نے ان کی خوشیوں پر ایسا شب خوں مارا کہ اس بے چارے بدنصیب جوڑے کو تو مرتے وقت پتا بھی نہ چلا ہو گا کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ حملہ کرنے والے ایک سے زائد بھی ہو سکتے تھے۔

''او...... مائی گاڈ......!''

دفعتاً مجھے اپنے عقب سے سوشیلا کی کپکپاتی سی آواز سنائی دی۔ میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف پلٹ کے دیکھا، وہ جانے کب میرے پیچھے آ کر آن کھڑی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے اسے باہر صحن میں ہی کھڑے رہنے کی تاکید کی تھی، لیکن شاید مجھے اندر کوٹھری نما اس کمرے میں کھڑے زیادہ دیر ہو گئی تھی، اس لیے وہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کے یہاں چلی آئی تھی۔

''ی ی...... یہ، کیا ہوا، کس نے قتل کیا ہے ان کا؟'' وہ بولی۔

''کم از کم میں نے انہیں قتل نہیں کیا۔'' میں ایک

سبق

استاد نے شاگرد سے کہا۔ ''اب جبکہ تم نے یہ سبق اچھی طرح پڑھ لیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ بیٹے نے باپ کے سامنے اس کا پسندیدہ درخت کاٹنے کا اعتراف کر لیا تو باپ نے اسے کیوں نہ مارا؟''

''اس لیے کہ اسے معلوم تھا کہ ابھی بیٹے کے ہاتھ میں کلہاڑا ہے۔''

☆☆☆

ملٹری کے ایک سپاہی کو شراب پینے کے جرم میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا مگر وہ ایک اچھا سپاہی تھا۔ اس لیے کیپٹن نے مناسب سمجھا کہ پیار کے ساتھ اسے سمجھائے۔

''دیکھو ڈیوڈ! ایک دن تم سارجنٹ بن سکتے ہو بلکہ ترقی کر کے لیفٹیننٹ تک بن سکتے ہو، بشرطیکہ تم شراب پینے سے باز آ جاؤ۔''

''سچ کہتے ہو کیپٹن۔'' سپاہی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں نہیں معلوم کہ حلق سے نیچے چند قطرے اترتے ہیں اور میں کیپٹن بن جاتا ہوں۔''

کراچی سے امجد علیم کی عنایت

ٹھنڈی سانس خارج کر کے بولا۔

''تمہاری بات نہیں کر رہی ہوں میں......'' وہ بولی۔

''تو پھر تمہارا سوال ہی بے وقوفانہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت باہر دروازے پر کچھ لوگوں کے زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھریں۔ میں چونکا۔ پھر باہر سے دروازے پر زور زور سے دستک دینے کی آوازیں آنے لگیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے دروازہ ہی توڑ ڈالیں گے۔ میرا پہلا خیال پولیس کی طرف ہی گیا تھا اور میرے دماغ کے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ ہم دونوں اندر موجود تھے اور اندر دو لاشیں پہلے ہی سے ہمارے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ باہر پولیس تھی اور جو ہماری تلاش میں یہاں تک آ گئی تھی۔ ان دونوں لاشوں کی موجودگی میں ہمارا دھر لیا جانا، پرایا گناہ اپنے سر لینے کے مترادف تھا، چاہے زبردستی ہی سہی۔

میں نے سوشیلا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی کمرے کی روشنی گل کر دی۔ اب پورا گھر اندھیرے کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور باہر صحن میں آ کر اس طرف کا رخ کیا جہاں پہلے ہی ایک کونے میں بنے ہوئے حوائج ضروریہ کے نام پر ایک چھوٹی سی چار دیواری کھڑی کی گئی تھی . اود ساتھ ہی رسوئی تھی، ان کے درمیان ... مختصر سا خلا تھا جہاں کاٹھ کباڑ اور جانے کیا الا بلا ٹھنسا پڑا... تھا۔ میں سوشیلا کو لیے اس ..... میں گھس گیا، جگہ تنگ تھی، مگر میں اور سوشیلا کسمسا کر اس میں سما گئے اور اسی دوران ہی میرا ہاتھ کسی شے سے ٹکرایا اور میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، یہ کسی مین سوئچ کا بورڈ تھا۔ میں نے بروقت ہاتھ ہٹا لیا کہ کہیں کرنٹ ہی نہ لگ جاتا۔

ٹھیک اسی وقت دروازہ توڑ دیا گیا۔ کئی افراد اندر داخل ہو گئے۔ اسی وقت مجھے روشنیوں کے جھماکے بھی دکھائی دیے۔

میری دم بہ خود سماعتوں نے کئی آوازیں سنی تھیں۔

''ہائے رام......! اندر کیا ہوا، دوڑو، دیکھو......'' یہ کسی سن رسیدہ مرد کی آواز تھی، لہجے کی کپکپاہٹ سے تو یہی لگا تھا مجھے پھر دوسری آواز اُبھری۔

''دروازہ کھلا ہے، اس کوٹھری کا، اسی طرف آؤ۔''

''رک جاؤ تم سب......'' معاً میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں نے ایک کرخت آواز سنی تھی۔

''پہلے ہم جا کر دیکھیں گے کہ اندر ماجرا کیا ہے۔ رمیش! تم پہلے جلدی سے جا کر باہر کا دروازہ بند کر دو...... اور تم رندھیر! دوسری کوٹھری میں جاؤ۔ باقی میرے ساتھ آؤ۔''

''ہے سرکار......! یہ تو جلم ہے، آدمی امرنے جان کو ہیں یا جیندہ ہیں، ہمیں بھی تو دیکھ لینے دو۔''

یہ ایک جوان مرد کی آواز تھی، جبکہ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ پہلے والے کرخت لہجے کا کوئی پولیس انسپکٹر ہی لگتا تھا۔ میرے ذہن طباع میں فوراً ہی ابھرا تھا کہ لاشوں کے وارث اور پولیس، ایک ساتھ ہی ہمیں ڈھونڈتی ہوئی یہاں آ دھمکی تھی۔ پولیس تو ہمارے پیچھے پڑی ہوئی ہی تھی، مگر لاشوں کے وارث یہاں کیسے پہنچے تھے اور کس کی اطلاع پر......؟ اس کا مجھے سرِدست کوئی اندازہ نہ ہو سکا تھا۔

بہرکیف...... صورت حال گمبھیر تھی۔ ہم اگر دھر لیے جاتے تو دونوں گروہ کی طرف سے ہی عتاب کا نشانہ ٹھہرتے۔ جبکہ پولیس نے باہر کا دروازہ بھی بند کروا دیا تھا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو...... اور پولیس کو اپنا کام کرنے دو، ابھی سب کو پتا چل جاتا ہے۔ ہم سب بھی ادھر ہی ہیں۔'' وہی کڑک دار آواز اُبھری۔

''اوئے رامشے! ذرا شانت رہ۔ سرکار (پولیس) ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اگر کوئی مجرم ہے تو یہی لوگ اُسے پکڑیں گے۔'' اسی عمر رسیدہ آدمی نے جوشیلے نوجوان کو سمجھایا۔

میں نے جھانک کر دیکھا۔ صحن میں پولیس اور دیگر لوگ کھڑے تھے۔ میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ خطرہ سر پر تھا۔ مفر کی کوئی راہ تک سجھائی نہیں دیتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں کہرام مچ گیا۔ چیخ و پکار، دہائیاں اور دھمکیاں، بدلہ و انتقام کی باتیں۔ یہ یقیناً اس بدنصیب جوڑے کے وارث ہی تھے جو اس طرح کے غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے اور پولیس کو انہیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا، یہاں تک کہ وہاں اور بھی لوگ آ دھمکے، پولیس گھر کی تلاشی لینا چاہتی تھی، مگر وارثین پولیس کے اس عمل کو بے کار سمجھ رہے تھے کہ وہ اس طرح محض وقت ضائع کریں گے، جبکہ قاتل اپنا کام کر کے جا چکے تھے اور پولیس کو ترنت ان کی تلاش میں نکلنا چاہیے تھا، اب انہیں کیا معلوم تھا کہ پولیس تو خود ہماری تلاش میں یہاں پہنچی تھی اور یہاں یہ نیا معاملہ ان کے گلے آن پڑا تھا۔ مشتعل مجمع پولیس کی ایک بھی سننے کو تیار نہ تھا اور وہ جوش اور طیش میں پولیس سے بھی دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہو گئے تھے۔ ایسی نازک صورتِ حال میں پولیس کو بھی مجبوراً مصلحت کوشی پر اترنا پڑتا ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر میں لوگوں کا رش دم بہ دم بڑھتا ہی جا رہا تھا، ان میں اب عورتیں بھی شامل ہو گئی تھیں، لگتا ایسا ہی تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مقتولین اوران کے وارثین کا اسی علاقے سے تعلق تھا۔

یہ لوگ بار بار کسی گلوے لال نامی گروپ کا ذکر کر رہے تھے کہ یہ حرکت انہی کی ہوسکتی تھی۔ ان لوگوں کی آپس کی چلا چلا کر گفتگو اور یقین کی حد تک ہونے والی قیاس آرائیوں سے یہی لگتا تھا کہ یہ خالصتا رشتے کے سلسلے میں کوئی پرانا تنازع تھا، لڑکی مخالف گروہ کی تھی اور لڑکا ان کے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی، اور اب مخالف گروپ نے انتقاماً دونوں کو ہی عین سہاگ رات کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا، یہ ایک ایسا نازک اور سنگین معاملہ تھا اگر ہم ایسے نازک وقت میں ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو ہماری خیر نہیں تھی۔ یہ لوگ یہاں پولیس کی موجودگی کی پروا کیے بغیر پل کے پل میری اور سوشیلا کی تِکا بوٹی کر ڈالتے۔

لوگوں کا رش اتنا بڑھ گیا کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگا تھا۔ میرے ذہنِ رسا میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔

"اب نہیں تو کبھی نہیں......"

میرے ذہن میں ابھرا اور پھر میں نہیں رکا، میں نے اسی مین سوچ کے بورڈ کو بڑی احتیاط سے ٹٹولا اور پھر سوچ آف کر دیا، ایکا ایکی گھٹا ٹوپ تاریکی چھا گئی، اگرچہ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس ٹارچیں بھی تھیں، مگر اتنی نہیں تھیں کہ وہ اس کی روشنی کو پھیلا سکتے، میں نے سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور خلا سے باہر نکل گیا، پھر اسی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، لوگوں کی بھاری نفری کے درمیان پھنس پھنسا کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ بلاشبہ یہ میرا ایک خطرناک اور رسکی اقدام تھا، اگر کسی کو ہم پر شبہ بھی ہوجاتا یا ہم ادھر ہی دھر لیے جاتے تو اپنی صفائی پیش کرنے سے پہلے ہی ہماری تکا بوٹی کر دی جاتی۔ پرائی آگ میں بھسم ہونے سے پہلے ہی ہمیں ہر صورت میں یہاں سے نکل جانا تھا۔

شکر تھا کہ دروازے تک ایسا کوئی "حادثہ" پیش نہیں آیا، لیکن جیسے ہی ہم دروازے سے نکلے تو اندر سے کسی نے چلا کر خبردار کیا۔

"ہمیں کوئی دھکے دے کر باہر کو نکلا ہے۔ ہوشیار! جانے نہ پائے......"

جوشِ غیظ سے غراتی ہوئی اس آواز کے ابھرتے ہی وہاں تھرتھری مچ گئی۔ مجمع بکھرنے لگا۔

باہر بھی لوگ باگ موجود تھے اور یہ دیکھے بغیر کہ اندر اب کسی کے تل دھرنے کو جگہ نہیں بچی تھی، پھر بھی اندر گھسنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں برائے نام ہی چند لوگوں نے ٹارچیں تھامی ہوئی تھیں۔

باہر نکلتے ہی میری گردشی نظروں نے قریب ہی ایک پولیس جیپ دیکھ لی، جیپ کی حالت کھٹارا سی مگر اس سنگین تر نازک وقت میں وہ مجھے کسی جیٹ طیارے سے کم نہیں لگی۔ وہ کچھ فاصلے پر تھی اور وہاں اس کے قریب میں دو انڈین پولیس اہلکار خاکی وردی میں موجود تھے، ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وائرلیس قسم کی کوئی شے تھی، جبکہ دوسرے کے ہاتھ میں گن تھی اور وہ مجمع کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، دونوں ہی کچھ بوکھلائے ہوئے تھے۔

"سوشیلا! ہمت کرو...... ورنہ آج گئے۔" میں نے اس کے کان میں سرسراتی ہوئی سرگوشی کی اور پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا کہا۔ لوگوں کے ہجوم میں راستہ بناتے ہوئے ہم جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے، جبکہ اندر مکان سے ابھرنے والی ہوشیار اور خبردار آواز نے ہمیں ہی خبردار کیا تھا، باقی لوگوں کو ابھی اس کا ادراک نہ ہوسکا تھا یا پھر اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کی طرح محض گونج کر رہ گئی تھی، بہرحال جو کچھ بھی تھا، ایسا زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا تھا۔

ہجوم، اندھیرا اور افراتفری کا فائدہ اُٹھاتے ہی میں نے بالکل مناسب وقت میں "ٹائمنگ" کا بھی خیال رکھتے ہوئے، سریع الحرکت کا مظاہرہ کیا۔ کسی طرح ان دونوں کی نظروں میں آئے بغیر جیپ کے قریب پہنچا۔ جیپ بغیر ہڈ کی تھی اور حسبِ توقع مجھے اس کے اگنیشن سوچ میں چابی، ایک بڑے گچھے کی صورت میں جھولتی ہوئی بھی نظر آگئی۔ بس! میں یہی تسلی کرنا چاہتا تھا، اس کے ساتھ ہی میری عقابی گردش کرتی نظریں، مکان اور مشتعل ہجوم کی طرف بھی لگی ہوئی تھیں، جسے اب میں کچھ پھیلا ہوا دیکھ رہا تھا۔ شاید کافی سے زیادہ لوگوں کو کچھ شک ہوچلا تھا، ان میں پولیس والے بھی تھے۔

میں نے سب سے پہلے گن بہ دست اہلکار کی پشت پر لات جمائی اور اس سے پہلے اس کی گن پر ہاتھ مارا تھا، نتیجتاً اس کی گن میرے ہاتھ میں تھی اور وہ خود، دور لڑھکتا چلا گیا، وائرلیس والا اپنے ساتھ کھڑے ساتھی کو اُچھلتا پاکر خود بھی اُچھلا تھا اور اپنی سی پھرتی کے ساتھ اس نے، پشت پر سے گن اُچکنے کی بھی سعی چاہی تھی، مگر میں اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ میری دوسری لات کے مکمل طور پر حرکت میں آنے تک وہ بھی پرے جا گرا، اور میرے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا، پہلے میں اور بعد میں سوشیلا نے کھلی جیپ میں جمپ لگائی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اور تب تک میں جیپ اسٹارٹ کر چکا تھا۔

جیپ غرائی اور تیزی کے ساتھ اس بند گلی میں ریورس ہوتی چلی گئی۔ ہجوم میں زوردار واویلا مچانے کے انداز میں چیخنے چلانے کی آوازیں ابھریں اور اس کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔ مگر تب تک میں جیپ کو گلی سے نکال کر آبادی کے بیرونی ...راستے میں ڈال چکا تھا۔

تاریکی میں جیپ غراتی ہوئی دوڑنے لگی۔

”او...... گاڈ! یو آر گریٹ شہزی! آج تو بال بال بچے......“ وہ پچھلی سیٹ سے میرے برابر والی سیٹ پر جمپ مار کر بیٹھتے ہوئے، چہک کر بولی۔

”آج نہیں اکثر بچتے رہے ہیں۔ جب تک اللہ کی مدد شاملِ حال ہے، ایسے ہی چلتا رہے گا۔“ میں نے ونڈ اسکرین پر اپنی نظریں مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن تم نے اللہ کی عطا کی ہوئی عقل کو بھی تو خوب استعمال کیا ہے، ایسا ہر کوئی نہیں کرتا۔“ وہ بولی۔

”مجھے تو یہ کسی ہیرو کی ایکشن مووی کا سین لگ رہا ہے۔“

اس کی زبان سے اللہ کا ذکر سُن کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی۔ ورنہ اگر وہ اس کی جگہ بھگوان کا نام لیتی تو میری طبیعت یقینا مکدر ہو جاتی۔

بہرکیف اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر میری ساری توجہ اب جیپ دوڑانے پر لگی ہوئی تھی۔

مجھے مین روڈ کی تلاش تھی۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا، بالآخر میں ایک لمبی چوڑی سڑک پر جیپ کو لے آیا تھا۔ انڈین اہلکار سے چھینی ہوئی گن اب میرے کہنے پر سوشیلا نے سنبھال لی تھی۔

”کیا تم کوئی محفوظ مقام بتا سکتی ہو؟“

”شاید نہیں......“

”کوئی اندازہ یا مشورہ......؟ آخر کو یہ تمہارا ہی دیش ہے۔“

”ماسوائے اس کے کہ تم گاڑی مضافات میں لے چلو، یہاں شہر میں ہمارے لیے کوئی ٹھکانا محفوظ نہیں ہو سکتا۔“ بالآخر وہ مشورہ دینے کے انداز میں بولی تو میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

جیپ رات کی گھور تاریکی اور پُرہول ویران سناٹوں میں دوڑتی ہوئی شہری آبادی سے خاصی دور نکل آئی تھی۔ اس دوران سوشیلا روڈ سائڈ لگے سنگِ میل دیکھنے اور پڑھنے کی کوشش بھی کرتی جا رہی تھی، اسی کی رہنمائی میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ میں سرِ دست یہی راستہ اختیار کیے رہوں، کیونکہ سڑک آگے دو بڑے بائی پاس کو کراس کرے گی اور وہاں سے ہمیں کوئی مسافر بس مل سکتی تھی۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ چند کلومیٹر کے سفر کے بعد مجھے اس سڑک کے اُوپر سے ایک اوورہیڈ جاتا دکھائی دیا اور بالکل ایک ایسا ہی ...۔ اوورہیڈ دوسری جانب سے بھی نظر آیا تھا اور ایک مقام پر دونوں کا انٹرچینج بنا تھا۔ وہاں خاصی بھاری گاڑیاں اور ٹریلر ٹرک گزرتے ہوئے بھی نظر آ رہے تھے۔ وہیں مجھے ایک چوکی بھی دکھائی دی تھی جو شاید موٹر وے سے تعلق رکھنے والے عملے سے ہی ہو سکتی تھی۔

اب جیپ سے پیچھا چھڑانا ازبس ضروری ہو گیا تھا، یوں بھی اس کا فیول محدود رہ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک نظر دائیں جانب ڈالی اور جیپ اسی طرف جھاڑیوں میں موڑ لی۔ اندر ذرا گہرائی میں گھسنے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ یہ اب کسی کو فوری طور پر نظر آنے والی نہیں ہے تو میں اور سوشیلا نیچے اُتر گئے۔ گن بھی ہم نے وہیں چھوڑ دی۔ یہ میں نے محض اس احتیاط کے پیشِ نظر ساتھ رکھ لی تھی کہ پولیس کے تعاقب میں آنے کی صورت میں ان سے مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ہم پولیس کو اپنے راستے کی بھنک دیے بغیر اس طرح راہِ فرار اختیار کیے ہوئے تھے کہ وہ فوری طور پر ہماری گرد کو بھی نہ چھو سکی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ جلد یا بدیر پولیس ہمارا کھوج نکال سکتی تھی، جب تک کہ ہم یہاں سے بھی دور نہیں نکل جاتے۔

☆☆☆

ہمارے گردوپیش میں گھور سناٹا تھا۔ آگے رکو تھا۔ آس پاس جھنگر پھیلے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی خنک سی ہواؤں کی اسرار بھری شائیں شائیں جاری تھی۔

قریب ڈھینگروں کے درمیان تنگ سا راستہ اُوپر اوورہیڈ برج کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہاں سڑک کنارے لگے الیکٹرک پولز ایستادہ تھے۔ انٹرچینج پر کچھ گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور وہاں اچھی خاصی روشنی ہو رہی تھی۔

ہم دونوں ڈھینگروں کے درمیان سے چلتے ہوئے انٹرچینج کے دفتری عملے سے کافی دور ہو کر اُوپر چڑھنے لگے۔ میں ان کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا کہ بعد میں پولیس کو یہاں سے ہمارے متعلق کوئی انفارمیشن ملتی۔

اوورہیڈ کا یہ ڈھلانی راستہ خاصا عمودی تھا، جس سبب میرا تو اتنا نہیں البتہ سوشیلا کا اچھا خاصا دم پھول گیا تھا۔ تاہم میں نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچنے کے انداز میں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اُوپر چڑھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ہم اب ایک لمبی چوڑی ڈبل سڑک کے کنارے پر تھے۔ اس کے اُوپر بھی ایک سڑک جارہی تھی۔ تلے اُوپر سڑکوں کا ایسا ٹیکنیکل جال پاکستان میں بھی پھیلنے لگا تھا۔ یہ تو سڑک تھی، میرے پیارے پاک وطن کے ماہر انجینئروں اور کاریگروں نے تو دو دریاؤں تک کو ایک دوسرے کے اُوپر سے گزار رکھا تھا۔

یہ والی سڑک خاصی چوڑی اور ڈبل تھی۔ ٹریفک رواں دواں تھی، زیادہ تر لوڈڈ اور ہیوی بار بردار ٹرک گزر رہے تھے، تیز رفتار لگژری کوچز بھی گزر رہی تھیں۔ پرائیویٹ گاڑیاں بھی کچھ نظر آجاتی تھیں۔ قدرے بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں ہواؤں کا زور بھی تیز تھا۔

یہاں سے کوئی لفٹ ملنا مجھے عبث ہی نظر آرہا تھا بلکہ کوئی مسافر کوچ وغیرہ کا بھی یہاں ٹھہرنا ناممکن ہی ہوسکتا تھا۔ مگر میرے ذہن میں تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں منزل کا تعین کرنا چاہتا تھا کہ ہمیں سڑک کے کس رخ پر اپنا آگے کا سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔ چنانچہ ذرا دیر سستانے کے بعد میں نے سوشیلا سے یہی کہا تو وہ جواباً سڑک کے دونوں طرف ایک نگاہ ڈالنے کے بعد بولی۔

''کوئی ٹریفک سائن بورڈ دیکھے بغیر مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوگا شہزی! شہروں کے نام پڑھنا ضروری ہیں۔ تب ہی میں ٹھیک طرح سے بتاپاؤں گی۔''

اس کی بات معقول تھی۔ ذرا فاصلے پر ایک بڑا سا فل روڈ کور سائن بورڈ دونوں طرف دکھائی دے رہے تھے۔ جن پر مختلف شہروں کے ناموں کے ساتھ ان کی روڈ ڈائریکشن بھی دی گئی تھی۔ ہم اس طرف بڑھ گئے، یوں ہم نے باری باری دونوں طرف کی سڑک کے یہ مذکورہ سائن بورڈ چیک کیے تو ہمیں دوسری والی سڑک پر بھنیشور درج نظر آگیا، جو سامنے کے رخ پر تھا۔ ممبئی تک جانے کے لیے اسی شہر کا روٹ ہمیں درکار تھا۔ یوں ہم اسی ڈائریکشن پر سڑک کے کنارے کھڑے ہوگئے۔ میں اب گردو پیش کا جائزہ لینے لگا۔

''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ یہاں سے ہمیں کوئی سواری مل جائے گی تو بے کار ہے یہ سوچنا۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہاں سے بغیر رکے گولی کی رفتار سے ٹریفک رواں دواں ہے۔'' سوشیلا نے مجھے سوچتا پا کر کہا تو میں نے کہا۔

''اس بات کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ ہمیں چوری چھپے ہی کسی گاڑی میں سوار ہونا پڑے گا۔''

''اس کے لیے بھی کسی گاڑی کا رکنا ضروری ہے، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ یہاں ٹریفک کتنی تیز رفتار ہے۔'' وہ بولی۔

''اس کا حل ہے میرے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''ہمیں انٹر چینج تک جانا ہوگا۔ یہاں سے گزرنے والی گاڑیاں ٹول ٹیکس ادا کرنے کے لیے وہاں ذرا دیر کو رکتی ہیں۔''

''مگر اس طرح ہم متعلقہ عملے کی نظروں میں آسکتے ہیں۔''

''تم آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے یہ کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔

ابھی ہم انٹر چینج سے تھوڑا ہی قریب پہنچے ہوں گے کہ اچانک میری آنکھوں میں چمک ابھری، انٹر چینج کے ٹول پلازہ کو کراس کرنے کے بعد ایک ٹرک روانہ ہوا مگر ذرا آگے جا کر رک گیا، میں نے دیکھا اس کا ڈرائیور نیچے اتر کر بونٹ کی طرف بڑھا، اس میں شاید کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی۔

''جلدی آؤ، میں اس سنہری موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔'' میں نے کہا اور تیز تیز قدموں سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ سوشیلا میرے عقب میں تھی۔ ہم ٹرک کے عقب میں ذرا نزدیک پہنچ کر رک گئے۔ ٹرک میں دو ہی افراد تھے، ایک ڈرائیور اور دوسرا اس کا کوئی نوعمر ساتھی لڑکا تھا۔ وہ بھی نیچے اترا ہوا تھا اور ڈرائیور کی مدد میں شامل تھا۔ ٹرک درمیانے سائز کا تھا اور بار برداری کے کام آتا تھا۔ اس کے عقبی حصے میں بوریاں اور لکڑی کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور درمیان میں تنگ سہی لیکن اتنی گنجائش نظر آتی تھی کہ میں اور سوشیلا اس درمیان میں ''پھنس پھنسا'' کر سما سکتے تھے۔

میں نے پھر اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ پہلے خود اس کے پچھلے حصے میں سوار ہوا، اس کے بعد میں نے سوشیلا کا بھی ہاتھ پکڑ کر اسے اُوپر کھینچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن میں کھٹر پٹر کی آواز ابھری، اس کے دروازے کھلے تھے، شاید وہ دونوں مذکورہ افراد اس میں سوار ہوگئے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد ٹرک اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھ گیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا ہی تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں تیز سائرن کی سمع خراش آواز سنائی دی اور میں بری طرح ٹھٹکا۔

''پولیس۔''

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میرے ذہن میں اُبھرا۔ سوشیلا بھی اس آواز پر یہی اندازہ قائم کر کے متوحش سی نظر آنے لگی۔ میں نے ذرا آگے سرک کر جھانکا۔ مجھے انٹرچینج کی طرف ایک بڑی سی پولیس گاڑی رکتی دکھائی دی تھی، جس کی چھت پر سرخ اور نیلے رنگ کا گردشی ہوٹر گونج رہا تھا۔ ٹرک اس سے لحہ بہ لحہ دور ہوتا جا رہا تھا اور میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ یہ ٹرک کسی طیارے کی رفتار پکڑ لے۔ کوئی بعید نہ تھا کہ پولیس سیٹیاں بجا کر اس ٹرک کو روکنے کا حکم دے ڈالتی، یوں تو وہاں چند اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

خیر ہوئی کہ ٹرک سست روی سے ہی سہی ان سے بہت دور چلا گیا، حتیٰ کہ انٹرچینج اور پولیس کی گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

''ضروری نہیں ہے کہ ہم اس ٹرک کے ذریعے اپنی منزل کے قریب پہنچ سکیں۔'' ذرا سکون کے لمحات میسر آئے تو سوشیلا نے کہا۔ ''یہ اپنا رخ تبدیل بھی کر سکتا ہے، اس صورت میں ہم اپنے اصل راستے سے بھٹک جائیں گے۔''

''مجھے بھی اس بات کا ادراک ہے۔'' میں نے کسمسا کر ایک کونے میں خود کو اٹکاتے ہوئے جواب دیا۔

''ابھی تو ایک بات ہمارے حق میں ہوئی ہے کہ ہم فوری طور پر ایک بڑے خطرے سے باہر نکل جانے میں کامیاب ہو چکے ہیں، رہی بات اس ٹرک کے رخ بدلنے کی تو فی الحال یہ ہماری مطلوبہ سمت کی طرف ہی بڑھ رہا ہے، اب یہ تم دیکھو گی کہ کہاں سے اس کا راستہ بدلتا ہے، تو وہیں سے ہم بھی اُتر جائیں گے۔''

''کیا چلتے ٹرک سے چھلانگ لگا دو گے؟'' وہ ہنس کر بولی۔ میں نے کہا۔

''اس کی رفتار ہی اتنی ہے کہ بندہ اترے اور پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کے دوبارہ اس میں بہ آسانی سوار ہو جائے۔'' میری بات پر سوشیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''شش...... آہستہ ہنسو! ڈرائیور کیبن دور نہیں ہے یہاں سے، جہاں ہم چھپے بیٹھے ہیں۔'' میں نے اسے ٹوکا۔

''اس ٹرک کے کھڑکھڑانے کا شور ہی اتنا ہے کہ ہماری آوازیں ان تک نہیں پہنچ سکیں۔'' وہ بولی۔

''پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ہم پر تھکن غالب تھی اور بھوک پیاس کا بھی غلبہ طاری ہونے لگا تھا۔ تب پھر میرا دھیان ان بوریوں اور پیٹیوں کی طرف چلا گیا۔ ممکن تھا ان میں کھانے پینے کی اشیا ہوں۔ میں نے سوچا اور پھر ایک بوری پر ''طبع آزمائی'' شروع کر دی۔ بوری کینوس کی تھی، مگر میں نے کسی طرح اُس کا ایک سرا پھاڑ ڈالا، اس کے اندر سے کوئی ترکاری جھانکنے لگی۔ یہ کوئی کدو قسم کی سبزی تھی، اسے کون کھاتا، وہ بھی کچا، میں نے ایک اور بوری کو تختۂ مشق بنایا، اس میں کھیرے نکلے، یہ کھائے جا سکتے تھے، میں نے چار پانچ کھیرے نکال لیے۔ میں اور سوشیلا اسی سے پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔ بوریوں میں شاید اسی قسم کی مکی ترکاریاں تھیں، کچھ سوچ کر میں چوبی پیٹیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ایک کو کسی طریقے سے کھولا تو دل خوش ہوگیا، اس میں فروٹ تھے، سیب، دوسری میں کیلے۔ ''ویٹ'' فروٹ سے پیٹ بھرنے کے ساتھ ساتھ پیاس کا بھی کافی حد تک مسئلہ حل ہوگیا۔ خالی معدہ ان مقوی خوراکوں سے پُر ہوا تو نیند نے اپنا غلبہ دکھانا شروع کر دیا۔

سوشیلا شاید تھک کر سو گئی تھی، کیونکہ ذرا ہی دیر بعد اس کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی، مگر میں سونا نہیں چاہتا تھا، وگرنہ راستہ کھو دیتا، کیونکہ ابھی مجھے ٹرک کے راستوں کا تعین کرنا تھا۔ سوشیلا کے محتاط اندازے کے مطابق بھبنیشور کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر دور تھا، سوشیلا کے مطابق ہم اب بالاسور، بھگت گڑھ سے یہاں تک بیس تیس کلومیٹر کا سفر تو پاٹ ہی چکے تھے۔

میں سوشیلا کو سوتا چھوڑ کر ذرا آگے کو سرک آیا، اور اب ٹرک کے سرے پر تھا۔ میری نظروں کے سامنے سڑک جیسے پیچھے سے نکلی جا رہی تھی۔ دور پو پھٹنے کے آثار نمودیدہ ابھرنے لگے تھے۔ اب تک ٹرک کہیں نہیں رکا تھا اور اس کی رفتار میں بھی کچھ اضافہ لگتا تھا، یوں میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک ہماری مطلوبہ سمت کی طرف ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا اور میں خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اس ٹرک کی منزل کم از کم بھبنیشور تک تو ضرور ہو، تاکہ ممبئی تک کافی حد تک فاصلہ طے پا جائے۔ اس کے بعد ہماری منزل زیادہ دور نہیں ہوتی۔ سوشیلا نے بتایا تھا کہ اس سے پہلے یہاں سے سیدھا راستہ ممبئی تک رائے پور سے ہی جاتا تھا۔ اس سے پہلے جو عام سڑک تھی اس میں دیر لگتی تھی۔ اس ہائی وے کے بننے کے بعد راستہ سہل اور مختصر ہوگیا تھا، اسی لیے اس کا یہی مشورہ تھا کہ ہمیں اسی ہائی وے پر رہتے ہوئے اپنی منزل کی جانب پیش قدمی کرتے رہنا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے سوشیلا ایک بھارتی لڑکی تھی اور اسپیکٹرم کی ایک پرانی فیلڈ ورکر بھی، اُسے راستوں کا اندازہ تھا۔

روشنی اچھی خاصی پھیلنے لگی تھی، ٹرک کے اندر کا حصہ روشن ہونے لگا تھا، ایک طرف مجھے سوشیلا بوریوں اور پیٹیوں کے درمیان آڑی ترچھی بے سدھ سی پڑی نظر آئی، وہ بے چاری اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اپنے شریر کے تڑنے مڑنے کی بھی اسے پروا نہیں رہی تھی۔ نیند ہوتی ہی ایسی ہے کہ سولی پر بھی آجاتی ہے۔ خود میرا اپنا بھی نیند سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں بھی سوشیلا کی طرح ادھر ہی کہیں بوریوں اور پیٹیوں کے درمیان پڑ کر سو جاؤں...... اور پھر ایسا ہو بھی گیا، میں ابھی کہیں ٹک کر بیٹھا ہی تھا کہ پتا ہی نہ چلا کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو کوئی مجھے زور زور سے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کک...... کون...... کون؟'' میں بھی یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ نیند سے یک دم جاگو تو ابتدا میں دماغ ماؤف رہتا ہے، آہستہ آہستہ حواسوں میں آنے پر ہی بتدریج ادراک ہوتا ہے کہ ہوا کیا تھا۔ مجھے بھی کچھ سیکنڈوں کا وقت لگا تھا۔ حواس بحال ہوئے تو مجھے پہلی آواز سوشیلا کی ہی معلوم ہوئی تھی۔ وہ ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔

''شہزی...... اشہزی! اُٹھو...... پلیز! جاگ جاؤ۔''

اس کی آواز پہچان کر میں نے اسے دیکھنے کی کوشش چاہی تھی مگر عبث...... میں اسے دیکھنے تک سے قاصر تھا، بلکہ مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے گھٹا ٹوپ تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا بلکہ ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دیتا تھا۔

''میں جاگ گیا ہوں...... مگر یہ تاریکی......؟'' میں نے کہا۔

''ٹرک پر شاید کینوس ٹاپ کور چڑھا دیا گیا ہے۔'' سوشیلا نے نیچی آواز میں کہا۔

''ہم ابھی تک ٹرک میں ہی سوار ہیں؟''

''ہاں! مگر ٹرک رکا ہوا ہے، کہاں؟ اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میری خود ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آنکھ کھلی تھی، تو مجھے بھی تاریکی محسوس ہوئی تھی۔ لیکن میں نے ٹٹول ٹٹول کر احساس کر لیا تھا کہ یہ تاریکی کس قسم کی ہے۔ اندازہ ہونے کے بعد ہی میں نے تمہیں جگایا ہے۔''

میں چند ثانیے پُرسوچ انداز کی خاموشی کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''آؤ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر ذرا جائزہ اور کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔''

سوشیلا نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ہم دونوں دوسرے ہاتھ سے گرد و پیش کو اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے ایک اندازے سے ٹرک کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگے جو سرے تک جاتا تھا۔ یہاں پہنچ کر ہم رکے، اس جانب ٹرک کا ٹاپ کور ذرا نیچے کو جھکا ہوا تھا، میں نے اسے چھو کر اندازہ لگانے کی کوشش تو احساس ہوا کہ یہ اتنا موٹا نہیں تھا کہ اس سے باہر کی روشنی کراس نہ ہوتی ہو، صاف مطلب تھا کہ ٹرک مال سمیت کسی گودام کے اندر کھڑا کر دیا گیا تھا اور گودام کی بتیاں مکمل طور پر گل تھیں۔ شکر تھا کہ ہمارے سونے کے دوران مال ''ان لوڈ'' نہیں کیا گیا تھا ورنہ ہم کسی کی بھی نظروں میں آسکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وقت کا بھی ابھی صحیح طور اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تاہم مجھے یاد تھا کہ جس وقت مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے والا تھا اس وقت صبح ہونے لگی تھی۔

بہرحال کسی ذی نفس کی دور قریب یا اطراف میں غیر موجودگی کی تسلی کر لینے کے بعد میں آہستگی کے ساتھ کینوس ٹاپ کور ہٹانے کی کوشش میں لگ گیا، سوشیلا بھی ساتھ دینے لگی، ٹاپ کور کو چھونے کے بعد محسوس ہوا کہ وہ خاصا گیلا ہو رہا تھا۔ ممکن تھا کہ راستے میں بارش کی وجہ سے اس پر یہ ٹاپ کور چڑھا دیا گیا ہو، تب بھی ہماری قسمت ہی تھی کہ ہم ٹاپ کور چڑھاتے ہوئے کسی کی نظروں میں نہیں آسکے تھے، اس کی وجہ بھی شاید یہی رہی ہوگی کہ ہم ٹرک کے اندر کافی گہرائی تک اور بوریوں، پیٹیوں میں پھنس پھنسا کر گھسے چھپے بیٹھے تھے۔

کور خاصی مضبوطی سے اور کس کسا کر ڈالا گیا تھا، مگر ہم نے کون سا سارا کور ہٹانا تھا، ایک کونا سرکا کر آدم گزار سا سوراخ بنا کر سب سے پہلے میں نے نہایت محتاط انداز میں باہر جھانکا تو کچھ جگنو جیسی روشنی کا ادراک ہونے لگا، یہ ایک باریک جھری جیسی روشنی تھی، جو ایک عمودی سی کرن کی صورت میں نظر آرہی تھی، غالباً یہ گودام کے گیٹ یا دروازے کی کوئی باریک، متوازی جھری تھی، اور چونکہ روشنی بھی باہر سے آرہی تھی اسی لیے مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ باہر رات ہو چکی تھی، اگر یہ اندازہ درست تھا تو اس کا مطلب تھا ہم کئی گھنٹے اسی طرح بے سدھ اور طویل نیند میں غرق رہے تھے کہ رات یا شام آن پڑی تھی۔ میں دھک سے رہ گیا۔ اگر ایسا تھا تو اس کا مطلب تھا ہم اسی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ٹرک کے ساتھ اپنے راستے سے خاصی دور تک بھٹک چکے تھے بلکہ اپنی منزل سے بھی کوسوں دور ہو چکے ہوں گے۔ اس بات نے مجھے خاصا پریشان کر دیا۔ جبکہ مجھے جلد از جلد ممبئی پہنچ کر سورت کے کسی نواح میں واقع بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر بلیو ٹکسی کے چیف کرنل سی جی بھگوانی کو جہنم واصل کرنا تھا۔ اس کے بعد کے ایل ایڈوانی کا بھی قصہ پاک کرنے کے ساتھ اس کے قبضے سے اپنے وطنِ عزیز کی امانت طلسمِ نور ہیرا بھی حاصل کرنا تھا، جبکہ ہیرے سے متعلق میرا جذبۂ حب الوطنی اپنی جگہ، مگر اس کے حصول کا میری اور سوشیلا کی نگاہ میں ایک عالمی جذبۂ انسانیت اور بے گناہ جانوں کو کسی بھیانک جنگ کی آگ سے بچانے کا بھی کارفرما تھا۔ کیونکہ وہ ہیرا تیسری عالمی جنگ کی سازش کا ذریعہ بھی بنایا جا رہا تھا۔

خدا جانے اب یہ ٹرک ہمیں کہاں لے آیا تھا اور کس علاقے یا شہر میں کہ ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں اور سوشیلا نیچے اتر گئے۔ میں دبے پاؤں اسی جھری کی طرف بڑھا اور اس سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔ سامنے مجھے خاصا بڑا احاطہ نما میدان نظر آیا۔ اسی باریک جھری سے میں نے ذرا کوشش کر کے مقدور بھر اطراف کا بھی جائزہ لینے کی کوشش چاہی، تو مجھے ذرا ذرا فاصلے پر آہنی پائپ پر گلوب لگے ہوئے بھی دکھائی دیے تھے۔ یوں یہ منظر کسی فیکٹری کا ہی لگتا تھا۔ باقی یہ بات درست ثابت ہوئی تھی کہ ہم سارا دن سوتے رہے تھے اور باہر شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اب یہ نہیں پتا چلتا تھا کہ یہ ٹرک کب سے یہاں آن کھڑا ہوا تھا؟ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ سگریٹ پیتے ہوئے بھی اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے نظر آئے، یہ اپنی وضع قطع سے مزدور کم اور چوکیدار قسم کی شے زیادہ محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے دروازے کو کھولنے کی کوشش چاہی تو وہ باہر سے بند ملا۔ گودام میں یقیناً سوئچ بورڈ ہو سکتا تھا، مگر روشنی کر دینے سے کسی کو اندر موجودگی کا شبہ ہو سکتا تھا، لہٰذا لائٹ جلانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔

’’کیا ہے باہر؟‘‘ سوشیلا نے ہلکی آواز میں پوچھا۔

’’کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگتی ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’حیرت کی بات ہے، ٹرک اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر بھی ان لوڈ نہیں کیا گیا۔‘‘

’’اچھا ہی ہوا۔‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔ ’’ورنہ ہماری ٹرک میں موجودگی کا پول کھل جاتا۔‘‘

’’یہ بات بھی بہتر ہوئی۔ لیکن، آخر ہم یہاں سے نکلیں گے کیسے؟ اور نجانے اتنی طویل نیند کے بعد ہم کہاں سے کہاں آن پہنچے ہیں؟ کہیں دور ہی نہ نکل آئے ہوں، اپنی اصل منزل سے۔‘‘ سوشیلا کے لہجے سے بھی تشویش اور فکرمندی ہویدا تھی۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے سرگوشی میں کہا۔

’’یہ تو اب یہاں سے نکلنے کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔ میں یہاں سے نکلنے کی کوئی تدبیر کرتا ہوں۔‘‘

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک مجھے باہر سے کسی کی باتوں کی آوازیں آتی سنائی دیں، میں چونکا۔ میں نے دوبارہ ذرا جھک کر جھری سے آنکھ لگانی چاہی تاکہ باہر دیکھ سکوں کہ اچانک وہ آوازیں دروازے کے بالکل قریب آ گئیں اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی کھڑکھڑاہٹ ابھری۔ میں فوراً سوشیلا کو لیے ٹرک کے پیچھے جا چھپا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ تین چار افراد اندر داخل ہوئے۔ پھر کسی نے لائٹ آن کر دی۔ میں نے ٹرک کی آڑ سے ذرا اپنا سر ابھار کر دیکھا۔ ان میں ایک تو ٹرک کا ڈرائیور تھا باقی دو اجنبی تھے لیکن اس کے ساتھ وہ ’’چھوکرا ٹائپ‘‘ لڑکا نہیں تھا جو اس کا ہیلپر تھا۔

’’مال گیلا تو نہیں ہوا ہے؟‘‘ ایک موٹے آدمی نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔

’’نہیں بابو! تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے بارش کے چھینٹے پڑتے ہی ٹرک راستے ہی میں روک کر کپڑا چڑھا دیا تھا۔‘‘ ڈرائیور نے جواب دیا۔

’’ہوں ں......‘‘ موٹے آدمی نے ایک لمبی ہمکاری بھری۔ وہ شاید کوئی ٹھیکے دار ٹائپ کی شے تھا۔ بولنے کا انداز بھی تحکمانہ تھا۔ موٹے کا ساتھی بانس کی طرح لمبا اور پتلا تھا۔ وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’چل ارجن! سیٹھ کرشن داس کا مال اُتروا اور نوڈی صاحب کا مال لوڈ کرا دے۔‘‘

’’میں ابھی مزدور لگواتا ہوں، آپ فکر ہی نہ کرو، سنتوش بابو!‘‘ ارجن نامی آدمی نے کہا۔

’’دونوں کام ذرا ترنت کروا دینا ارجن! میں نے آج رات ہی روانہ ہونا ہے۔‘‘ ڈرائیور نے کہا۔

’’ابھی ہو جاتا ہے سارا کام، تم جاؤ مارواڑی کے پاس جا کر بھوجن پانی کرو جب تک۔‘‘ ارجن نے اس سے کہا۔ اس کے بعد یہ تینوں باہر نکل گئے۔ پھر وہی ہوا، جس کا

مجھے کچھ اندازہ سا تھا، یعنی جاتے وقت انہوں نے گودام کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ کامیابی کے احساس سے میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

”جلدی نکل چلو سوشیلا! اس سے پہلے کہ گودام میں مزدور داخل ہو جائیں۔“ ان تینوں کے گودام سے نکلتے ہی میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم دونوں محتاط روی کے ساتھ ٹرک کی آڑ سے ابھرے اور دروازے سے باہر نکل آئے۔ ایک طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا، اس کے ساتھ والی چھ فٹ باؤنڈری وال کی دیوار کے ساتھ چپکے چپکے چلتے ہوئے ہم کھلے احاطے میں آ گئے اور پھر وہاں سے باہر آ گئے۔

اس کے بعد ہم نہیں رکے اور تیز تیز قدموں سے نامعلوم سمت کی طرف بڑھتے ہی چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس گودام والے ایریا سے کافی دور چلے گئے۔ یہ مجھے کوئی بڑی آبادی والا شہر ہی لگا تھا۔ کیونکہ کافی دور آنے کے بعد پُررونق بازار، مصروف چوراہا اور ایک طرف رہائشی علاقے کے آثار نظر آنے لگے۔

اب ہم یہاں مٹرگشت کے انداز میں گھومنے لگے اور کوشش تھی کہ کسی سے کچھ اس طور راہنمائی لیتے کہ اُسے ہم پر کوئی شبہ بھی نہیں ہوتا۔

”اوہو...... ہم تو نکارہ گوا میں ہیں۔“ میرے ساتھ قدم بہ قدم چلتے ہوئے سوشیلا نے متحیر آواز میں کہا۔ اس کے لہجے سے خوشی کی جھلک کو محسوس کر کے مجھے یہ ادراک ہونے میں مطلق دیر نہیں لگی تھی کہ ہم ابھی اپنی منزل سے بھٹکے نہیں تھے، بلکہ کچھ اور بھی قریب ہو گئے تھے۔

”تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ یہ کون سا شہر ہے؟“ پھر بھی میں نے پوچھ لیا اور جواباً سوشیلا اپنا ایک ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی سے ایک دکان کی پیشانی پر لگے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

”وہ دیکھو دکان کے نام کے ساتھ ایڈریس بھی اور نیچے جلی حروف میں اس شہر کا نام درج ہے۔“ مجھے اس کی بیدار مغزی کا قائل ہونا پڑا۔ اُمید بھرے لہجے میں اس سے مستفسر ہوا۔

”تمہارا مطلب یہ تو نہیں کہ اس شہر سے ہماری منزل اور قریب ہو گئی ہے اور ہم اپنی منزل کے اور قریب ہو گئے ہیں؟“

”یہی مطلب تھا میرا۔“ وہ جوشِ مسرت و کامیابی سے بولی۔ ”ہم نے اپنی منزل تک کا ایک طویل سفر پاٹ لیا ہے، اب اسے میں حسنِ اتفاق ہی کہوں گی کہ اس ٹرک نے ہمیں بھٹکایا نہیں، جس کا ہمیں خدشہ تھا۔“

”ممبئی اب کتنے فاصلے پر رہ گیا ہے یہاں سے؟“ میں نے بھی جلدی سے پوچھ لیا۔

”بس! صرف ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر۔“ اس نے خاصے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”تو پھر نکلنے کی کرو۔“ میں نے بھی جلدی سے کہا۔ تب ہی مجھے خیال آیا کہ ممبئی میں بھی ہمارے لیے ایک بڑا خطرہ پہلے سے موجود ہو سکتا تھا، وجہ اس کی یہی تھی کہ بھگت گڑھ میں میرے اور دشمنوں کے بیچ ہونے والے ایک بڑے ٹکراؤ اور ان کی شکست کے دوران پولیس کے کود پڑنے پر انہوں نے سرائے کے مالک اور سوشیلا کے دوست بقول سوشیلا، اس کے ”بدھو عاشق“ کاشی رام کو پولیس والوں نے پوچھ گچھ کے لیے تختۂ مشق بنایا ہوگا اور اُس نے میرے بارے میں تو اتنا نہیں البتہ سوشیلا کے بارے میں اس کا سارا کچا چٹھا کھول دیا ہوگا، یوں ہمارے سلسلے میں پولیس کا دائرۂ تفتیش ممبئی تک وسیع ہو سکتا تھا اور یہ بھی بعید نہ تھا کہ پولیس کے جاسوسوں کے ساتھ ساتھ بلیو ٹلسی کے ”ہارپ ایجنٹ“ بھی پہلے ہی سے ممبئی میں میرے خلاف حرکت میں آ چکے ہوں۔ اگر کسی مصلحت کی وجہ سے ہماری تصاویر نہ بھی جاری کی ہوں، مگر خفیہ طور پر تو ہماری تلاش ممبئی میں بھی ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم اپنے اصل چہرے چھپا کے ممبئی میں داخل ہوتے۔ لیکن چہرے بدلنے کی بھی کوئی سبیل نہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بس! اب تو تن بہ تقدیر ہونے کے سوا کیا چارہ رہ جاتا تھا؟ سوچل سوچل کے مقولے پر ہی عمل پیرا تھے۔

”ممبئی پہنچنے کی اتنی جلدی ہمیں نہیں کرنی چاہیے، کیا تم بھول گئے کاشی رام کو؟“ بالآخر سوشیلا نے مجھے بھی کچھ یاد دلا دیا تو مجھے اپنی اُمیدوں پر اوس پڑتی سی محسوس ہوئی، ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”ہاں! مجھے یاد ہے۔ تمہارا یہ بدھو عاشق جو ہمارے لیے ایک بڑا مددگار ثابت ہونے والا تھا، اب ہمارے لیے سب سے بڑی مصیبت بن سکتا ہے، لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ پولیس کے سامنے تمہارے بارے میں سب کچھ اُگل دے؟“ میں نے کسی اُمید کے سہارے آخر میں کہا تو سوشیلا ایک نگاہ گرد و پیش میں ڈالنے کے بعد بولی۔

”اگر ہم نے اس اہم نقطے کو نظر انداز کر دیا یا معمولی سمجھا تو ہم ایک بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ان حالات میں نہایت

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ضروری ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ ہمارے دشمن بھی کاشی رام کو پوچھ گچھ کے لیے ’’یوز ٹو‘‘ کرنے کی کوشش کریں۔‘‘

’’میں تمہارے اس خدشے کو رد نہیں کر سکتا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن تم نے کہا تو تھا کہ اس صورتِ حال میں تم اس کا کوئی نعم البدل سوچو گی، کیونکہ تم جانتی ہو کہ یہاں میں اپنے ایک بڑے دشمن (سی جی بجوانی) کو جہنم واصل کرنے کی نیت سے ہی نہیں بلکہ جنونی جرنیل کے ایل ایڈوانی سے بھی ایک فیصلہ کن معرکہ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہوں اور اس کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ ہمیں ممبئی میں کوئی محفوظ ٹھکانا تلاشنا ہوگا۔‘‘

’’میں اس بارے میں غور کر رہی ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’لیکن مجھے اس وقت فون کی اشد ضرورت ہے۔ میں اپنی موسی کو فون کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہاں کی صورتِ حالات کا کچھ اندازہ ہو سکے۔‘‘

’’معذرت کے ساتھ پوچھوں گا، کیا تمہاری موسی قابلِ بھروسا تو ہے؟ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ زیادہ ڈرپوک تو نہیں ہے ناں؟‘‘

’’نہیں، وہ ایک دلیر خاتون ہیں، اور تم کیا اُسے کوئی بوڑھی عورت سمجھے ہوئے ہو؟‘‘ سوشیلا مسکرائی۔

’’میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ ذرا ہوشیار سی تو ہے ناں؟ کہیں پولیس کے ڈر خوف کے باعث وہ اُلٹا ہمیں پھنسا تو نہیں دے گی؟ اور یہ کہ اگر ہم اُسے کوئی تاکید کریں تو کیا وہ اسے بہ خیر و خوبی انجام دے سکے گی؟‘‘

’’یقیناً۔ وہ ایک پچاس سالہ خاتون ہیں مگر لگتی چالیس کی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ یوگا کی بھی ماہر ہیں اور بھارت کی معروف ایکٹریس ریکھا کی یوگا اکیڈمی بھی جوائن کر رکھی ہے اور باقاعدگی سے یوگا کرتی ہیں۔‘‘

’’اوہ...... پھر تو وہ واقعی چلت پھرت والی خاتون ہو گی۔‘‘ میں مسکرایا۔ ’’میں تمہاری موسی کو ایک عام سی عمر رسیدہ اور گھریلو خاتون ہی سمجھا تھا۔ ویسے یوگا کرنے والے بیدار مغز اور چابک دست ہوتے ہیں۔ مگر......‘‘ میں رکا۔

’’مگر کیا؟‘‘

’’تم فون پر اپنی رہائش گاہ کے لینڈ لائن پر ان سے بات کرو گی تو اس میں بھی خطرہ ہے کہ تمہارا فون ٹریس نہ کیا جا رہا ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ حالانکہ وہ ایک فون پہلے بھی انہیں کر چکی تھی، جب ہم بھگت گڑھ میں کاشی رام کی سرائے میں فروکش تھے۔ لیکن اس وقت حالات کچھ اور تھے مگر اب کشیدہ صورتِ حال تھی۔

’’یہ تم نے مجھے اچھا یاد دلایا، اتنی اہم غلطی کو میں فراموش کیے ہوئے تھی، لیکن میں ممبئی پہنچ کر موہن سے رابطہ کروں گی۔‘‘

’’یہ کون ہے؟‘‘

’’موہن میرے جیجاجی کا چھوٹا بھائی ہے۔ تمہاری ہی عمر کا ہوگا۔ وہ میرے جیجاجی کا چہیتا بھائی ہی نہیں بلکہ میری دیدی کا لاڈلا دیور بھی ہے۔ ہے تو عام سا نوجوان، مگر اپنے بھائی کی ہلاکت کا اُسے بھی غم و غصہ ہے۔ جب اُسے اس حقیقت کا علم ہوگا کہ ہم اس کے بھائی کی ہلاکت کا انتقام لینے کے مشن پر عمل پیرا ہیں تو وہ ہمارا بھرپور طریقے سے ساتھ دے گا۔‘‘

’’تو کیا اُسے علم ہے کہ اس کے بھائی کا قاتل کون ہے؟‘‘

’’ہاں!‘‘ سوشیلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’جب میں اس درندہ صفت انسان کے ایل ایڈوانی کے چنگل سے اپنی بہن اور اس کے پریوار کی رہائی کے لیے کوشاں تھی تو موہن میرے ساتھ تھا۔‘‘

’’اوہ...... پھر تو یہ بھی ہمارے لیے کام کا ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘ میں نے بھویں اُچکاتے ہوئے کہا۔ ’’کیونکہ یہ بہرحال ابھی پولیس یا ہمارے کسی دشمن کی نظروں میں نہیں آیا ہوگا۔ لیکن اس سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے سے پہلے مجھے اس کے حدود واربع سے آگاہ ہونا ہوگا، یہ کرتا کیا ہے؟ اکیلا رہتا ہے یا بیوی بچے بھی ہیں اس کے......؟‘‘

’’اپنے بڑے بھائی کے سوا اس کا اور کوئی نہ تھا۔ غیر شادی شدہ ہے۔ اب اپنے بھائی کا کاروبار سنبھالتا ہے، جو درحقیقت ان کے باپ کا ہی تھا۔‘‘

’’کیا کاروبار کرتا ہے؟‘‘

’’ماروتی گاڑیوں کی سب سے بڑی ڈیلر شپ اسی کے پاس ہے۔ یہی کاروبار ہے اس کا، بڑے بڑے معروف بھارتی ایکٹر اور ایکٹریس اس سے نئے ماڈل کی فل لوڈڈ گاڑیاں بک کرواتے رہتے ہیں۔‘‘

’’ہوں ں......‘‘ میں نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری بھری اور گومگو سے لہجے میں کہا۔ ’’چلے گا......‘‘

اب اسے فون کرنے کا مسئلہ تھا۔ سوشیلا نے کہا۔ ’’اگر موہن سے ٹیلی فون پر رابطہ ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہوگی، وہ خود ممبئی سے ہمیں یہاں لینے کے لیے پہنچ جائے گا یا گاڑی بھجوا دے گا۔‘‘

’’یہ تو اور بھی اچھی بات ہوگی۔ چلو پھر اسے فون

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرنے کی کوئی سبیل تلاشتے ہیں۔"

ہم آگے بڑھ گئے۔

موبائل اور اسمارٹ فون، فری پیکیجز اور واٹس ایپ، امو...... اور وائبر وغیرہ کی وجہ سے اب پبلک ٹیلی فون بوتھ سے لے کر عام پبلک کال آفس تک کا تصور بھی ناپید ہو چکا تھا۔ اس سبب ہمیں فون کرنے کی پریشانی لاحق تھی۔ بات بھی ایسی تھی کہ کسی کے سامنے نہیں کی جاسکتی تھی۔ ورنہ تو کسی دکان وغیرہ میں گھس کر درخواست کرسکتے تھے۔

بالآخر ہم نے کسی راہ گیر کو "اٹیچ" کرنے کا ارادہ کیا، عمل تو غلط تھا مگر اس کا مقصد نیک۔ لہٰذا سوشیلا کو میری تجویز بری نہیں لگی تھی۔ ہم اس مقصد کے لیے ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ گلی میں لوگوں کی آدک جاوک برائے نام تھی، شام ڈھل چکی تھی اور رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، میرے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں مگر میرے ہاتھ بھی ہتھیار سے کم نہیں تھے۔ جلد ہی ہمیں ایک "شکار" دکھائی دے گیا۔ اب ضروری تو نہیں تھا کہ اس کے پاس سیل فون ہوتا مگر آج کل بھلا کس کے پاس سیل فون جیسی "ایزی ایکسز" سہولت موجود نہ تھی؟ شکار بھی اپنی وضع قطع سے ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ وہ زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ اس نے ہماری طرف دیکھا تھا، میرے ساتھ سوشیلا جیسی ایک حسین لڑکی تھی، اس لیے کون شبہ کرتا کہ میں "اسنیچنگ" کرنے والا تھا؟

وہ جیسے ہی قریب آیا میں نے اسے کوئی پتا پوچھنے کے بہانے روکا، اس نے ایک نگاہ غلط سی پہلے سوشیلا پر ڈالی پھر مجھ پر۔ میں نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسے دبوچ لیا۔ وہ اس صورت حال پر پہلے تو بُری طرح گڑبڑا گیا مگر جب یہ دیکھا کہ میں نہتا ہوں تو مقابلے پر اُتر آیا۔

"شرافت سے اپنا سیل فون نکال کر میرے حوالے کردو۔" میں نے غرا کر کہا مگر اس نے مجھ پر گھونسا چلانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اس کی گردن دبوچ لی اور ساتھ ہی ہلکی سی "ڈوز" کے طور پر اس کا ٹینٹوا دبایا۔ وہ خرخرانے لگا۔

"اب کوئی حرکت مت کرنا، ہمیں صرف تمہارا سیل فون ایک ایمرجنسی کی صورت میں استعمال کرنا ہے اور بس۔ پھر تمہیں واپس لوٹا دیں گے۔"

اس نے فوراً اپنا سیل فون میرے حوالے کردیا جو میں نے سوشیلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بات کرلینے کے بعد اپنا ڈائلنگ نمبر ڈیلیٹ کر دینا"۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ذرا پرے جا کر اپنا مطلوبہ نمبر ملانے لگی۔

میں اس شخص کو دبوچے کھڑا رہا۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ ہم کوئی ضروری بات کر کے اس کا سیٹ اسے واپس لوٹانے کا "نیک" ارادہ رکھتے تھے۔ اس لیے اس نے مزید کوئی چون وچرا نہ کی اور یہی غنیمت جان کر چپکا کھڑا رہا۔ ذرا دیر بعد سوشیلا بات کر کے فارغ ہوئی اور اس طرف آگئی جدھر میں شکار کو دبوچے کھڑا تھا۔

میں نے پہلے معذرت اور پھر شکریہ کہتے ہوئے اسے اس کا سیل فون لوٹا دیا پھر میں اور سوشیلا وہاں سے فوراً رفوچکر ہوگئے۔

"بات ہوگئی تمہاری موہن سے؟" ذرا آگے جا کر میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں!" وہ جواباً بولی۔ "وہ خود ہمیں لینے آرہا ہے۔ اس نے مجھے ایک اسپاٹ کا نام بتایا ہے، جو یہاں کے کسی مشہور ریسٹورنٹ کا ہے۔ ہم وہاں کچھ کھا پی لیتے ہیں، تب تک وہ وہاں پہنچ جائے گا۔"

"ریسٹورنٹ میں کھانے پینے کے پیسے کون ادا کرے گا؟" میں نے کہا۔ "جبکہ میرے پاس تو کیا تمہارے پاس بھی اب ایک پھوٹی کوڑی نہیں بچی ہوگی۔"

"ہم پوری شان سے اس ریسٹورنٹ میں کھائیں گے پئیں گے۔ تب تک موہن بھی آجائے گا اور وہی بل پے کردے گا۔" اس کی بات پر میں نے شانے اُچکا لیے۔ مجبوری تھی کیا کیا جاسکتا تھا، مجبوری کا نام شکریہ کہتے ہوئے میں مسکرا بھی دیا تھا۔ یوں ہم مذکورہ ہوٹل کی طرف بڑھ گئے، ہمیں کچھ اندازہ تو نہیں تھا کہ وہ کس طرف اور کتنی دور تھا، تاہم کسی سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ چنانچہ ہم پیدل ہی وہاں جا پہنچے۔ ایک بڑے سے چمکتے دمکتے نیون سائن بورڈ پر "بیچ ریسٹورنٹ" کے الفاظ جل بجھ رہے تھے۔

یہاں بھی ہم نے کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ پوری طرح سے محتاط تھے، گویا یہ بیچ کے نام سے ریسٹورنٹ تھا، جو واقعی ساحلِ سمندر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ ہم نے اس میں داخل ہونے سے پہلے اچھی طرح اطراف کا جائزہ لیا تھا، بہ ظاہر ہمیں کوئی مشکوک ذی نفس دکھائی نہیں دیا۔ اس کے تین ڈائننگ ہال تھے، اوپن، انر اور واٹر ہال، ہم واٹر والے ہال میں آگئے۔ یہاں مدھم مدھم سی روشنی تھی۔ فرش لکڑی کا تھا، چوبی تختوں کے درمیان گیپ تھا اور اس کے نیچے سے پانی لہروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

پیروں میں دیکھنے سے یوں لگتا جیسے ہم چلتی ناؤ میں بیٹھے ہوں، یہی اس ہال کی خوبی تھی۔ شاید اسی لیے اس کا نام واٹر ہال رکھا تھا۔ یہ اچھا خاصا مہنگا ہوٹل لگتا تھا اور یہاں موجود لوگ بھی ہائی سوسائٹیز سے تعلق رکھنے والے ہی نظر آتے تھے۔ ایک باوردی ویٹر مینیو لے آیا۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے ایک نظر اردگرد بیٹھے لوگوں پہ ڈالی۔ اس کے بعد سوشیلا پر ذرا جھک کر بولا۔

"تمہارا یہ موہن وقت پر آ تو جائے گا ناں......؟ ایسا نہ ہو کہ وہ نہیں آسکا اور بل ہمارے گلے پڑ جائے۔ یہ خاصا مہنگا ہوٹل لگتا ہے۔" میری بات پر سوشیلا کے حلق سے ہلکے قہقہے کی صورت ہنسی نکل گئی۔ جس پر لوگ ہماری طرف متوجہ ہوئے، میں ذرا جھینپ کر اپنے سیدھے ہاتھ کی جانب کھلے سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔

میرے بائیں ہاتھ کی ایک ٹیبل پر ٹین ایجر "کپل" بیٹھا تھا۔ لڑکی خاصی خوب صورت تھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا میکسی اسٹائل فراک پہن رکھا تھا جو بغیر بازوؤں کا تھا، یوں اس لڑکی کے مرمریں گورے بازو برہنہ نظر آرہے تھے۔ بالوں میں ریشم کی سی ملائمت اور چمک صاف محسوس ہوتی تھی۔ لڑکی بیک وقت معصومیت اور حسن کا دلفریب نمونہ نظر آتی تھی، آنکھیں بھی اس کی گہری اور کشادہ تھیں، بلاشبہ وہ ایشوریا رائے ہی لگتی تھی۔ لڑکا بھی کم خوبرو نہ تھا۔ قد اس کا درمیانہ تھا۔ دونوں پر بھارتی ہیروز کی چھاپ صاف نظر آتی تھی۔ یہ تو چلو ان کا ملک تھا اور ان کی فلمیں تھیں، ایسی چھاپ کا کریز تو پاکستان میں بھی مجھے دیکھنے کو ملتا تھا۔ بھارتی ہیرو ہیروئن کا گیٹ اَپ اپنانے کا ایک کریز پروان چڑھا ہوا تھا۔ کوئی خود کو سلمان خان سمجھے ہوئے تھا تو کوئی عامر خان یا شاہ رخ خان۔ یہی حال لڑکیوں کا تھا، کوئی ریکھا بنی ہوئی تھی تو کوئی رانی مکرجی یا ایشوریا رائے کا ہیئر کٹ اپنائے ہوئے تھی۔

"یہاں یہی سب چلتا ہے۔" معاً سوشیلا نے کہا۔ اس نے شاید مجھے اس کپل کو دیکھتے ہوئے بھانپ لیا تھا کہ میں ان میں کیا "دیکھ" رہا تھا۔

"یہاں ہی نہیں، یہ سب کچھ میرے ملک میں بھی چلتا ہے۔" میں نے بھی جواباً ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "ہمارے مشہور ہیرو وحید مراد کے بالوں کا اسٹائل تو اس قدر مشہور ہوا تھا کہ ہر کسی کو دیکھو یہی اسٹائل اپنائے رکھتا تھا۔" میں نے دانستہ کسی بھارتی ہیرو کا ذکر نہیں کیا تھا۔ حالانکہ پاکستانی مشہور چاکلیٹی ہیرو وحید مراد کے دور کو تو ایک طویل عرصہ بیت چکا تھا، مگر اس کا اسٹائل اپنانے کے رواج سے تو میں آگاہ تھا۔

"یہاں تمہیں عامر خان سے لے کر اجے دیوگن، سلمان خان اور انیل کپور سب ہی نظر آئیں گے۔ اسی طرح لڑکیاں، کوئی رانی مکرجی بنی ہوگی تو کوئی ایشوریا رائے یا مادھوری ڈکشٹ تو کوئی کاجل......" سوشیلا کی بات جاری تھی۔

"ویسے ہم بھی اگر کچھ بننا چاہیں تو اسی وقت کسی مشہور بھارتی ہیرو ہیروئن کے رُوپ میں آسکتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"یہاں ایک چینجنگ روم بھی ہے، جسے فیشن روم کہا جاتا ہے۔ رقم ادا کرو، اور اندر چلے جاؤ، لباس سے لے کر میک اپ تک ہر چیز پروائڈ کریں گے، جس ہیرو یا ہیروئن پر ذرا بھی شائبہ آتا ہو، بنا دیں گے میک اپ کے زور پر۔" وہ بولی۔ "تو پھر کیا خیال ہے، چلیں ہم بھی اندر؟ پیسے موہن آکر ادا کردے گا۔ ویسے تم تو بنے بنائے جیکی شیروف ہو۔ تم پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ وہی لمبا چوڑا قد کاٹھ، تنومند جسم اور مردانہ وجاہت...... حتیٰ کہ شکل بھی اسی سے ملتی ہے۔ مونچھوں کا تمہاری اسٹائل بھی وہی ہے۔ بس، فرق اتنا ہے کہ تمہاری پیشانی ذرا چوڑی ہے۔"

"بس......بس...... مجھے ایسا کوئی بے کار کا شوق نہیں ہو رہا، نہ ہی مجھے اس طرح کی فضول مماثلتوں سے کوئی دلچسپی بھی ہے۔" میں نے ہاتھ اُٹھا کر بیزاری سے کہا۔

"چلو ناں...... مزہ آئے گا۔" وہ اصرار کرنے لگی۔

"مجھے سونم بننے کا شوق ہے۔ اس طرح بھیس بدلنے کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" میں اس کی بات پر چونکا۔ اس کی تجویز بری نہیں تھی، مگر بات وہی تھی کہ ہمارے پاس رقم کم تھی، تاہم جب ہم نے پتا کیا تو ہمارے ہوش اُڑ گئے، میک اپ وغیرہ کا خرچہ ایک لاکھ سے چار لاکھ تک تھا۔ کوئی چوری کی شے تو تھی نہیں کہ ہم کوئی اور طریقہ اختیار کرتے، البتہ سوشیلا نے یہ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی کہ موہن کو آلینے دو، اس کے بعد یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

اثنائے راہ ویٹر اپنے دونوں ہاتھوں میں دو ٹرے اُٹھائے آگیا۔

یوں یہ فضول موضوع ادھر ہی دفن ہوگیا۔ وہ ہماری میز پر کھانا سرو کرنے لگا۔ کھانے کے دوران اچانک میری نگاہ اسی ٹین ایجر کپل کی میز کے بالکل ذرا ہی پیچھے ایک اور میز پر پڑی اور میں چونکا۔ وہاں ایک پختہ العمر آدمی

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سگار تھا، اس نے بیش قیمت سفاری سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ پہلے گاہے بہ گاہے، پھر یک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا دیر پہلے ہی یہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے اسی طرح تکے جا رہا تھا، بڑے غور سے، جب میری نظر اس کپل پر پڑی تھی، اس وقت میں نے اس کی نگاہ کو سرسری معنی دیے تھے، مگر اب جو میں نے دیکھا تو وہ مجھے باقاعدہ اور بغور گھورتے ہوئے پایا۔ اب کی بار میں چونکا تھا اور اسی لیے میں بھی اس مرتبہ اس کے چہرے سے اپنی نظر نہیں ہٹا پایا تھا، یوں وہ مجھے بھی ٹکٹکی باندھے دیکھتے پا کر ہولے سے مسکرایا تھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں کچھ ایسی صورتِ حالات سے دوچار تھا کہ مجھے اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا تھا جبکہ پکی عمر کا یہ آدمی میری طرف یوں گھور رہا تھا جیسے یہ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، حالانکہ بھلا یہاں بھارت میں میرا کون واقف کار تھا۔ وہ اکیلا تھا، مجھے بے چینی کھانے لگی، جلد ہی میں نے اس کی میز پر دو اور افراد کو بھی بیٹھتے دیکھا، اس میں ایک خاصی فیشن ایبل خاتون تھی، جس کی عمر کا اندازہ مجھے، تیس، پینتیس، کے درمیان تک ہی ہو سکا تھا، جبکہ دوسرا ایک درمیانی عمر اور ٹھگنے قد کا شخص تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ مجھے بظاہر ان میں کوئی ایسی خطرناک بات اب محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کچھ دیر اور گزر گئی، ہم کھانے سے بھی فارغ ہو گئے، لیکن موہن نہیں آیا۔ اب تو میری ہی نہیں، بلکہ سوشیلا کی بھی بے چینی بڑھنے لگی۔

”اتنے بڑے ہوٹل میں پُرتکلف کھانے کا آرڈر دے کر تم نے پھنسوا ہی دیا۔ اب بل کون ادا کرے گا؟“ بالآخر میں نے سوشیلا سے نیچی آواز میں کہا۔

”مجھے پورا وشواش تھا کہ وہ ضرور آئے گا، بلکہ میں نراش نہیں ہوئی ہوں ابھی تک......“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے، مگر یہ تو سوچو، اُسے راستے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ راستے میں کچھ بھی ہونا ناممکن نہیں ہوتا۔“

”یہ تو تمہاری بات ٹھیک ہی ہے، مگر......“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔

اچانک ہال میں ہلکا سا شور ابھرا۔ میں چونکا اور دیکھا، چند نوجوان قہقہے لگاتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ یہ چار تھے تعداد میں۔ ان میں بھارتی اداکاروں کی چھاپ نمایاں تھی۔ ٹائٹ جینز اور بنیان ٹائپ کی چست شرٹس پہن رکھی تھیں، یہ دولت مند خاندانوں کے بگڑے ہوئے رئیس زادے نظر آتے تھے۔ ہلا گلا سا مچاتے ہوئے یہ وہاں ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے اس ینگ کپل کے بائیں ہاتھ پر تھی، یوں یہ چاروں نوجوان اُس سفاری سوٹ والے پراسرار آدمی اور ینگ کپل کے درمیان والی میز پر براجمان تھے۔ ہماری ٹیبل ان کے چوتھے رخ پر تھی اور تینوں میزوں کے تقریباً قریب ہی تھی۔

اس ہوٹل میں وہسکی بھی چل رہی تھی۔ یقیناً اس فائیو اسٹار ہوٹل کو ”شراب نوازی“ کا پرمٹ ملا ہوا ہوگا۔ یوں بھی یہ بھارت تھا اور وہسکی کا حصول کیا مشکل تھا۔

”تم بار بار اس طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ کھانا لگ چکا ہے۔“ معاً سوشیلا نے مجھے چونکایا اور میں اس طرف متوجہ ہوا۔ ویٹر کب کا کھانا سرو کر کے جا چکا تھا۔

میں سوشیلا سے کسی بات کا اظہار کیے بغیر کھانے میں مشغول ہو گیا، اور جو جانی پہچانی ڈشز تھیں انہیں کا انتخاب کیا تھا میں نے ہندوؤں کے ”کھاجوں“ سے متعلق میں نے کچھ عجیب و غریب ڈشز سن رکھی تھیں اس لیے یہ احتیاط رکھی تھی۔ اگرچہ کھانے کا آرڈر میں نے ہی مینیو دیکھ کر دیا تھا، مگر اس میں سوشیلا نے بھی اپنی پسند کا کچھ انتخاب کیا تھا۔ نیز آرڈر دینے کے بعد اس نے مجھ سے یہ بات بھی کہی تھی، اس طرح کے بعض ریسٹورنٹ اپنی طرف سے بھی کوئی خصوصی ڈش پیش کر دیتے ہیں۔

بہرحال...... میں اور سوشیلا خاموشی سے کھانے میں مگن ہو گئے اور چند منٹوں تک ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، وجہ اس کی شاید یہی رہی ہوگی کہ ہمیں بہت بھوک لگی ہوئی تھی، اس قدر کہ پیٹ جیسے کمر سے جا لگا ہو...... پھر کھانا بھی خاصا پُرتکلف اور مزیدار تھا۔ سوشیلا نے اپنے لیے وہسکی منگوائی تھی۔ مجھے اس کا اپنے ساتھ وہسکی پینا سخت ناگوار گزرا، اس قدر کہ میرا اسے بری طرح ٹوکنے کو جی چاہا تھا مگر میں نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ بے شک میری سوشیلا کے ساتھ کوئی ایسی ذاتی نوعیت کی انڈراسٹینڈنگ نہیں تھی کہ میں اس کی ”ذاتی عادات“ سے متعلق اعتراض کرتا، یا اس پر حکم چلانے کی کوشش کرتا، البتہ ایک اہم مشن کی حد تک ہمارے درمیان ایک دوسرے کا ساتھ دینے کی ہم آہنگی ضرور پائی جاتی تھی۔

”اے مسٹر......! اپنا ہاتھ ذرا دور رکھو......“ معاً میرے کان سے ایک نسوانی آواز ٹکرائی۔ مجھے شائبہ گزرا کہ کہیں میرے ہاتھ کی کہنی تو کسی کی پشت سے نہیں ٹکرا رہی تھی۔ لیکن جلد ہی مجھے پتا چلا کہ یہ اس ینگ کپل کی نوجوان

حسین لڑکی کی آواز تھی، جو اس نے اپنے ذرا ہی عقبی رخ پر دھری اس میز پر موجود ان چاروں نوجوانوں میں سے ایک کو بڑے غصے سے مخاطب کر کے کہی تھی۔ وہ نوجوان اپنی کرسی پر کچھ زیادہ ہی ''پھیل'' کر بیٹھا تھا۔ اس طرح کہ اس نے اپنے ہاتھ پہلو پر لٹکا رکھے تھے اور اس کے دائیں ہاتھ کی کہنی اس خوب صورت لڑکی کی پشت سے ''مس'' ہو رہی تھی۔ اب پتا نہیں وہ یہ اوباشانہ حرکت دانستہ کر رہا تھا یا نہیں، لیکن میں نے دیکھا اس نوجوان پر کچھ اثر نہیں ہوا، اس کے برعکس ان نے اپنی گردن قدرے گھما کر اس ینگ حسینہ کی طرف بڑے لوفرانداز سے گھورا اور مغرور لہجے میں بولا۔

''کوئی اور اس طرح ارجن کو ٹوکنے کی ہمت کرتا تو اس کے دانت ادھر ہی میز پر بکھرے ہوتے، کیا......؟'' وہ خالص فلمی اسٹائل میں لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مگر وہ کیا ہے کہ...... تمہاری جیسی حسین لڑکی اپن کی ہمیشہ سے کمزوری رہی ہے ناں...... اسی لیے چلے گا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے لڑکی کی طرف ایک ہوئی بوسہ بھی اچھال دیا۔ جس پر لڑکی کے نوجوان ساتھی کو بھی طیش آ گیا۔

''اے...... ذرا منہ سنبھال اپنا اور اُدھر ہو کر بیٹھ۔'' وہ غصے سے بولا تو وہی اوباش نوجوان ایک جھٹکے سے اپنی کرسی پیچھے کھسکا کر اُٹھ کھڑا ہوا، اس پر کچھ زیادہ ہی فلمی سین کا بھوت سوار تھا، وہ تھا بھی خاصا دراز قامت اور تنومند...... اس نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک پنجہ پھیلا کر اتنے زور سے ان کی میز کے درمیان میں مارا کہ میز پر سرو کی ہوئی کولڈ ڈرنکس اور دوسری اشیا اُچھل کر اس کپل کے کپڑوں پہ گریں۔

''تیرے نام کا کتا پالوں...... تُو مجھے...... یعنی ارجن کو......'' انتہائی غصیلے لہجے میں اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر اس نے نوجوان کی گردن دبوچ لی۔ وہ بے چارہ اس کے مقابلے میں تنک سک سا اور دبتا ہوا نوجوان تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی چلائی۔ اسی وقت دو ویٹرز دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ تب تک وہ اوباش نوجوان لڑکی کے ساتھی کو کرسی سمیت دھکیل کر گرا چکا تھا۔ اس کے باقی تینوں ساتھی اسی طرح اطمینان سے مسکراتے ہوئے کرسیوں کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

اس دوران وہ دونوں ویٹر اس بدمعاش لڑکے کے قریب آنے لگے تو باقی تین اوباش ساتھیوں نے یک دم اپنی جگہ سے حرکت کی اور ان کا راستہ روکے کھڑے ہو گئے، پھر ایک نے ان سے کہا۔

''نان آف یور بزنس......''

ویٹرز خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ بات بڑھے، کیونکہ یہ ان کے ہوٹل کی ساکھ کا معاملہ بھی تھا یا پھر ایسی باتیں معمول پر محمول کی جاتی تھیں کہ وہاں موجود لوگوں میں بھی کچھ زیادہ بے چینی دکھائی نہیں دے رہی تھی، اسی طرح میں اور سوشیلا بھی اسی طرف دیکھ رہے تھے، جیسے محوِ چشم تماشا کیے ہوئے ہوں۔

''دیکھیے جناب! اپنے ساتھی کو روکیے...... یہ پبلک اسپاٹ ہے اور......'' ایک ویٹر نے ان سے مخاطب ہو کر کہا تو ان تینوں میں سے ایک نے کہا۔

''ہمارا ساتھی ارجن خود رک جائے گا، اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو یہاں سب کچھ اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔''

دونوں ویٹر فوراً وہیں سے ہی واپس پلٹ گئے۔ وہ شاید اس کی اطلاع منیجر کو دینے گئے تھے۔

''چھوڑ دے مجھے ذلیل، کمینے......'' میں نے دیکھا وہی ارجن نامی بدمعاش لڑکے کو کرسی سمیت گرانے کے بعد اس کی گرل فرینڈ کے مرمریں برہنہ بازو کو سہلا رہا تھا۔ گرا ہوا نوجوان غصے اور غیرت کی شدت سے اٹھا تو ارجن کے باقی تینوں ساتھیوں نے اسے پکڑ لیا۔

''ارجن جب تک تجھے ''کس'' نہیں کرے گا، نہیں چھوڑے گا۔'' اس اوباش نے لڑکی کو دبوچ کر لوفرپن سے کہا۔ اس دوران لوگ باگ اپنی میزیں چھوڑنے لگے، بھلا کون پرائی آگ میں کودتا ہے، آج کے دور میں......؟ لڑکی بے بس نظر آنے لگی، ارجن اپنا مکروہ منہ لڑکی کے حسین چہرے کی طرف کرنے لگا۔

''لیو ہر الون...... پلیز!'' اس کا ساتھی لڑکا بے بسی سے چلایا۔ اُسے دبوچنے والے ارجن کے تینوں ساتھی لڑکے اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے۔ ٹھیک اسی وقت جب ارجن لڑکی کا بوسہ لینے کی کوشش میں تھا، اچانک ایک خالی کرسی کھسکتی ہوئی ارجن نامی اس لڑکے سے بڑے زور کے ساتھ ٹکرائی۔ وہ لڑکھڑا سا گیا اور جب سنبھلا تو اس کا چہرہ پُرغیظ اور آنکھوں سے شرارے پھوٹتے نظر آنے لگے۔ تب ہی اس کی تیزی سے گردش کرتی نظر مجھ پر جم گئی، میں تب تک اپنی ''کارروائی'' کر کے اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا، کارروائی کیا تھی، بس اتنا ہی کیا تھا کہ اپنے قریب والی کرسی کو ایک زوردار لات رسید کر دی تھی جو تیزی سے کھسکتی ہوئی ارجن نامی اس بدمعاش سے جا ٹکرائی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں اسی طرح اطمینان سے اپنی کرسی کو میز سے ذرا ہٹا کر اور سامنے پاؤں پھیلا کر بیٹھا رہا۔ سوشیلا میری اس حرکت پر پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔ اُس نے مجھ سے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا تھا کہ میں نے اسے اشارے سے خاموش رہنے کی تلقین کر ڈالی۔

”اس لڑکی سے دور ہو جا، ورنہ ایک اور کرسی تیرے سر پہ پڑے گی......“ میں نے وہیں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ارجن سے کہا۔

”تیرے نام کا کتا پالوں...... تیری یہ جرأت......“ ارجن اپنا فلمی مکالمہ دہراتا ہوا میری جانب لپکا اور جیسے ہی اُس نے مجھ پر غراتے ہوئے حملہ کرنا چاہا میں نے کرسی چھوڑ دی اور اُٹھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچ لی اور اپنا فوری طور پر تیار کیا ہوا خود ساختہ ڈائیلاگ اسے اسی کے لہجے میں سنا ڈالا۔

”میں تو تیرے نام کا کتا بھی پالنا پسند نہ کروں، غلیظ گٹر کی گندگی میں رینگنے والے کیڑے......“

”فنٹاسٹک......“

ہال میں ایک آواز ابھری۔ میں نے ایک نگاہ اس طرف ڈالی اور چونکا، یہ وہی ادھیڑ عمر سگار پیتا شخص تھا، جو تھوڑی دیر پہلے مجھے غور غور سے دیکھ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے شاید غافل دیکھ کر ارجن نے، جس کا چہرہ میرا جوابی ڈائیلاگ سننے کے بعد مزید لال بھبوکا ہونے لگا تھا، اپنے ایک ہاتھ کا گھونسا میرے چہرے پر جڑنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے بہ سرعت اس کا گھونسا اپنے بائیں ہاتھ پر روکا، مگر اس کی گردن نہیں چھوڑی اور اسی طرح اسے رگیدتا ہوا، ایک میز پر اس کا سر زور سے دے مارا، اسی وقت اس کے تینوں ساتھی لڑکے کو چھوڑ کر میری جانب جارحانہ انداز میں بڑھے، ردِعمل کے طور پر میں ان کی طرف سے بھی محتاط تھا۔ ارجن کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کی طرف پلٹا تھا۔ انداز میرا اطمینان بخش تھا، میرے اس قدر پُراعتماد انداز نے اُنہیں وہیں رکنے پر مجبور کر دیا، وہ شاید میرے ”فائٹ“ کرنے کا انداز دیکھ چکے تھے، اسی لیے کچھ خفیف سے نظر آنے لگے، میں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے، اسی وقت مجھے اپنے عقب میں ہلکا شائبہ محسوس ہوا اور پھر میری بائیں ٹانگ حرکت میں آئی، سنبھل کر مجھ پر عقب سے وار کرنے والا ارجن اُچھل کر بہت دور کسی میز پر جا پڑا تھا۔ میری گھورتی ہوئی نظریں ابھی تک اپنے سامنے ہک دک کھڑے اس کے تینوں ساتھیوں پر جمی ہوئی تھیں۔

”آ جاؤ، یا پھر یہاں سے چلے جاؤ......“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ اسی وقت ایک موٹا اور ٹھگنا سا آدمی سوٹ کوٹ میں ملبوس، ویٹروں کی فوج کے ساتھ وہاں نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ اُسے شاید غلط فہمی ہو گئی تھی، مجھ سے وہ بڑے غصے میں مخاطب ہو کر بولا۔

”میں آپ کو دنگا فساد کرنے کے جرم میں اندر کروا دوں گا۔ بل پے کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔“

اس سے پہلے کہ میں بھی اس کے ساتھ سخت جوابی کارروائی کرتا، وہی ادھیڑ عمر شخص اپنا ہاتھ اُٹھاتے ہوئے منیجر کی طرف بڑھا، وہ شاید اسے جانتا تھا، کیونکہ اس نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا تھا۔

”سوشیل! اس کا کوئی قصور نہیں ہے، وہ دیکھ رہے ہو، چاروں بدمعاش......“ اس نے ارجن اور اس کے تینوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کیا، جو مجھے معاندانہ نظروں سے گھورتے ہوئے وہاں سے کھسکنے کے انداز میں جانے لگے تھے۔

اس دوران وہ کپل بھی میری حمایت میں آگے بڑھا تھا اور منیجر سے میری صفائی میں وہی کچھ کہا جو اس ادھیڑ عمر شخص نے کہا تھا، ازیں علاوہ، وہاں موجود دیگر لوگوں نے بھی میرے حق میں گواہی دے ڈالی تو منیجر نے مجھ سے بڑے فدویانہ انداز میں سوری کہا اور واپس چلا گیا۔

ذرا دیر بعد سب معمول پہ آ گیا۔

”میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں؟ آپ نے مجھے ان بدمعاشوں سے بچایا اور گندہ ہونے سے بھی......“ ایک مترنم سی معصومیت بھری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ وہی معصوم صورت حسین لڑکی تھی۔ میں نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا، قریب سے اس کا .... حسن الگ ہی بہار دکھاتا محسوس ہوا۔ اس کا تنک سک سا ساتھی اپنا لباس درست کر رہا تھا۔ میں نے اس لڑکی سے مسکراتے ہوئے جواباً کہا۔

”شکریہ کس بات کا؟ کسی شریف انسان کے ساتھ یوں زیادتی ہوتے تو کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا......“

”بالکل دیکھ سکتے ہیں...... اور یہی ہمارے بے حس سماج کا دستور بن چکا ہے۔“ اچانک ایک تیسری آواز ابھری تھی، میں نے اس سمت دیکھا اور بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔ یہ وہی ادھیڑ عمر آدمی تھا، جو اب تک میرے لیے پُراسرار بنا ہوا تھا۔ وہ میرے

کاندھے پر دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں ینگ مین! میں نے غلط کہا؟“ مجھ سے ابھی کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا کہ وہی لڑکی بولی۔

”آپ صحیح کہہ رہے ہیں انکل! اس وقت یہاں کتنے لوگ موجود تھے، ان میں بیشتر تو کھسک ہی گئے تھے، باقی جو بیٹھے تھے وہ تماشائی بنے بیٹھے تھے۔“

”چلو رینا! دیر ہو رہی ہے۔“ اچانک اس کا ساتھی لڑکا اس کے قریب آ کر بولا۔ مجھے اس لڑکے کی بے اعتنائی پر ایک ناگوار سی حیرت ہوئی تھی۔ مجھے کسی کے شکریے کی پروا تو نہ تھی مگر اس لڑکے کی بے حسی مجھے کھل کر رہ گئی تھی، جس نے جھوٹے منہ سہی، مجھ سے شکریے کا ایک لفظ تک ادا نہیں کیا تھا۔ شاید اس میں خود اس کی بھی سبکی ہوئی تھی جو اس کے لیے جھینپ کا باعث بن رہی تھی، اور وہ اسی لیے وہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

”مہیش! یہ کیا؟ تم ان کا شکریہ ادا نہیں کرو گے؟“ رینا نامی اس لڑکی نے اپنے ساتھی لڑکے مہیش سے کہا تو وہ ذرا جزبز ہو کے گویا چار و ناچار مجھ سے بولا۔

”شکریہ آپ کا......“ انداز وہی بے اعتنائی والا تھا۔

خیر مجھے اس کی کیا پروا تھی۔ سوشیلا تب تک میرے ساتھ آن کھڑی ہوئی تھی، میں خاموشی سے اپنی میز کی طرف بڑھ گیا، سوشی میرے عقب میں تھی۔ اپنی کرسی پر براجمان ہونے کے بعد میں نے دیکھا رینا کو اس کا بوائے فرینڈ مہیش بازو سے پکڑے گویا زبردستی اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش میں تھا، جبکہ رینا کی یک ٹک سی نگاہیں ہنوز مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ مجھ سے اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی، اب پتا نہیں شاید وہ مہیش سے کترا رہی تھی یا پھر میری ساتھی سوشیلا سے۔ اس کی نگاہوں میں میرے لیے ستائش تو تھی ہی، مگر ایک تاثراتی شائبہ بھی جھلکتا محسوس ہوتا تھا، بالآخر اسی اثر پذیری کے زیر اثر وہ اپنے ساتھی کی گرفت سے اپنا مرمریں بازو چھڑا کر میری میز کی طرف بڑھی، اس کا ساتھی اس حرکت پر بھونچکا سا کھڑا اسے تکتا رہ گیا۔

”وہ پھر تمہاری طرف آ رہی ہے۔ ہوشیار......“ سوشیلا نے ترچھی نگاہوں سے رینا کی طرف گھورتے ہوئے مجھ سے کہا۔

”اِف یو ڈونٹ مائنڈ...... میں آپ کا نام جان سکتی ہوں......“

”شہزاد خان۔“ میں نے اپنا نام اصل نام بتایا۔

”بہت کیوٹ نام ہے، بالکل آپ کی طرح......“ وہ مسکرائی۔ موتیوں کی لڑی جیسی اس کے دانتوں کی جھلک اور نرم و گداز لبوں کا تھرکتا نظارہ، دل لبھانے جیسا ہی تھا۔

”شکریہ۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”وہ...... وہ در حقیقت میں یہ کہنے آئی تھی کہ آپ نے میری خاطر ان بدمعاشوں سے لڑائی کر تو لی ہے، مگر مجھے ڈر ہے کہ وہ باہر کہیں تاریکی میں آپ کی گھات میں بیٹھے نہ ہوں...... یہ بہت کینہ پرور معلوم ہوتے ہیں، خاص طور پر ان کا سرغنہ ٹائپ ساتھی ارجن......“

”نائس گرل! اس کا اندازہ یقیناً شہزاد صاحب کو بھی ہو گا۔ آپ اس کی چنتا نہ کریں، میں ان کے ساتھ ہوں......“ یہ وہی پُراسرار ادھیڑ عمر شخص تھا جو میرے لیے مسلسل ایک چیستان بنا ہوا تھا۔ وہ ہماری میز کے قریب ہی کھڑا ہوا تھا اور اس نے بھی مجھے اپنا نام بتاتے ہوئے سن لیا تھا۔

”ہیلو مسٹر شہزاد! مجھے نارائن گھوترا جی کہتے ہیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی اور اس سے زیادہ تمہارا رنگیلا انداز...... جو میں نے آج تک صرف فلموں میں ہی دیکھا ہے۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

”شیور...... گھوترا جی! پلیز ہیو اے سیٹ“ مجھ سے پہلے سوشیلا نے اسے مخاطب کر کے کہا جبکہ میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ طوعاً و کرہاً میں نے بھی اس سے ہاتھ ملا دیا۔ اس موٹے گھوترا جی کے درمیان میں ٹپک پڑنے سے وہ رینا نامی لڑکی بجھی بجھی سی نظر آنے لگی تھی۔ شاید وہ مجھے کوئی آفر کرنے والی تھی یا پھر کوئی نیک مشورہ...... وغیرہ، لیکن اس گھوترا جی کے یہ کہنے پر کہ...... چنتا کی کوئی ضرورت نہیں میں ان کے ساتھ ہوں۔“ وہ مایوس سی ہو گئی تھی۔

”رینا...... چلو...... دیر ہو رہی ہے......؟“ اس دوران وہی بے رخا سا اس کا ساتھی لڑکا مہیش اس کے قریب آ کر ذرا سخت لہجے میں بولا۔

رینا تذبذب میں مبتلا تھی۔ وہ اپنے ساتھی سے جواباً ذرا سخت لہجے میں بولی۔ ”مہیش! تم تھوڑی دیر خاموش نہیں رہ سکتے؟ تم نہیں جانتے ان بدمعاشوں کی کینہ پرور فطرت کو؟ شہزاد صاحب ہمارے محسن ہیں اور تمہارے بھی...... انہوں نے ہمیں بلکہ مجھے ایک مصیبت سے بچایا ہے اور ہمارا ابھی فرض بنتا ہے کہ ان کے وفاع کے لیے کچھ سوچیں...... تم دیکھ نہیں رہے ہو مہیش کہ ان کے ساتھ بھی ایک خاتون

ہیں۔“

مجھے رینا کی بات ٹھیک لگ رہی تھی، کسی بے نام سی اُنسیت کی غلط فہمی میں پڑے بغیر اس کا میرے لیے اس قدر تفکر بالکل جائز تھا اپنی جگہ۔

”مجھے یہی چنتا ہو رہی ہے کہ وہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں۔“ وہ پھر مجھ سے بولی۔ ”اگر آپ برا نہ منائیں تو میں اپنے دڈو کو فون......“

”سنیے مس......؟“ گھوترا جی نے پھر مداخلت کی اور استفساریہ لہجے میں اس لڑکی سے نام پوچھنا چاہا۔

”رینا......“

”جی مس رینا! آپ کا بوائے فرینڈ آپ کا بے چینی سے منتظر ہے آپ چلی جائیں اور شہزاد صاحب کی بالکل چنتا نہ کریں، میں ان کے ساتھ ہوں۔“

”آپ ہیں کون آخر؟ کوئی پولیس والے یا فوجی؟“ رینا نے چڑ کر کہا۔ ”میرے دڈو کو آپ لوگ نہیں جانتے، وہ ایک بڑے ریٹائرڈ جنرل ہیں...... کے ایل ایڈوانی کا نام کبھی سنا ہے آپ نے؟“

اس نام پر میں اندر سے تھرا گیا تھا اور یقیناً سوشیلا کی بھی یہ نام سن کر مجھ سے زیادہ حالت غیر ہوئی ہوگی۔ میں ڈرا نہیں تھا، بس! اس نام کا اب تک حوالہ ہی کچھ اس قسم کا بن چکا تھا کہ ہمارا ”دھک“ رہ جانا یہی معنی رکھتا تھا۔ ذہن میں ایک لمحے کو مبہم سا یہ سوال ضرور ابھرا تھا کہ کیا یہ واقعی اسی جرنیل کا نام تھا جو ان تین جنگی جنونی جرنیلوں میں شامل تھا جو دنیا کو ”ورلڈ بگ بینگ“ کے نام سے تیسری عالمی جنگ میں جھونکنا چاہتے تھے؟

”اوہ...... اچھا! چلو پھر تو میرا تعارف بھی سن لو تم......“ گھوترا جی بھی پیچھے ہٹنے والے نظر نہیں آرہے تھے۔ بڑی عجیب صورت حال ہوگئی تھی۔ ایک طرف رینا تھی اور دوسری جانب یہ گھوترا جی...... اب یہ اپنا کون سا چونکا دینے والا تعارف کروانے والے تھے، مجھے اور سوشیلا کو تو کم از کم کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

”ہم ہیں، نارائن گھوترا جی...... بس! کافی ہے اتنا تعارف ہمارا......“

”آپ ممبئی فلم انڈسٹری کے کوئی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر ٹائپ کی کوئی شے ہوں گے اور یہ ”بیچ ریسٹورنٹ“ ایسی ہی جگہ ہے جہاں آپ جیسے لوگ ہی نہیں، اداکار بھی آتے رہتے ہیں، عام لوگ اسی لیے اس ریسٹورنٹ کا رخ کرتے ہیں، تاکہ کسی اداکار یا مشہور فلم ساز سے ٹکراؤ ہو جائے تو کم از کم ایک عدد سیلفی ہی بنالی جائے، مگر گھوترا جی مجھے ایسا کوئی شوق ہی نہیں اسی لیے میں آپ سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی۔“ رینا نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ گھوترا جی رینا کی بات کا برا منا لے گا، مگر اس کے برعکس وہ اسرار بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے لڑکی سے بولا۔

”ایک دم برابر بولا تم چھوکری! جو فلموں کا ذوق نہیں رکھتے وہ شوق بھی نہیں رکھتے، تو پھر متاثر ہونا کیسا؟ لیکن آپ کا یہ جھوٹ آپ کا ایشور یا رائے والا یہ گیٹ اَپ ظاہر کر رہا ہے کہ آپ کو بھی اس لائن سے تھوڑی بہت دلچسپی تو ہے ہی، اینی وے...... رہی بات آپ کے جرنیل دڈو کی تو یہ بات سوچنے کی ہے کہ ہم سب کو ان کی عزت کرنی چاہیے، آخر کو وہ اس دیش (بھارت) کے رکھوالوں میں سے ہیں۔ میں انہیں سلام پیش کرتا ہوں۔“ گھوترا جی نے بڑی معاملہ فہمی دکھائی تھی، تاہم اس کے تعارف پر میں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ میرے لیے اس وقت گھوترا جی بالکل بھی دلچسپی کا باعث نہ تھا، جبکہ رینا میرے لیے ایک دم اہم بن گئی تھی۔ رہی بات اس کے معصومیت بھرے حسن کی، تو یہ اسی حد تک تھا جیسے ایک خوش رنگ پھول، بھلا کسے متاثر نہ کرتا ہوگا۔ مگر اب اس میں دلچسپی لینے کی ایک ٹھوس وجہ فوراً ہی سامنے آگئی تھی، اگرچہ ابھی تک پوری طرح اس کا علم بھی نہ تھا کہ رینا آیا اسی جنونی جرنیل کی پوتی تھی یا...... اس کا ”دڈو“ کوئی اور تھا۔ مگر کے ایل ایڈوانی اور اس کا ”لاحقہ“ اس قدر ٹیپیکل تھا کہ مغالطے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ میں نے دانستہ رینا سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا۔ اگرچہ طلسم نورہیرے کا مشن دوسرے مرحلے کا تھا، لیکن اگر لگے ہاتھوں یہ پہلے مکمل ہونے کی امید پر تھا تو کیا مضائقہ تھا؟

”آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں، مس رینا!“ بالآخر میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن...... یہ کچھ اچھا نہیں لگتا مجھے کہ میں اُلٹا آپ پر ہی بار بن جاؤں۔“

”بار کیسا؟“ وہ کھل کر بولی۔ ”میں خود بھی اب اس ریسٹورنٹ سے باہر جانے سے کترا رہی ہوں۔ میں ابھی دڈو کو کال کرتی ہوں۔ وہ مسلح محافظ ادھر بھیج دیں گے۔ پھر آپ جہاں جانا چاہیں، جا سکتے ہیں۔“

میں اس کی بات پر عجیب قسم کے شش و پنج کا شکار ہو گیا۔ موہن کا کچھ پتا نہ تھا۔ ابھی کھانے کا بل بھی دینا تھا۔ رینا کے ہمراہ جانا بھی اب میرے اہم ترین مشن کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کی ہمراہی بے شک مختصر سہی، مگر راہ و رسم کی کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

راہیں کھلنے کی اُمید تو تھی کہ بعد میں اسے اپنے مشن کے لیے ''یوز ٹو'' تو کرنے کی کوشش کر ہی سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے مس رینا ٹھیک کہہ رہی ہیں، وہ غنڈے باہر ہماری تاک میں ہی ہوں گے اور دھوکے سے ہم پر حملہ کر کے ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔'' سوشیلا نے اس سلسلے میں پہلی بار لب کشائی کی، میں نے اس کے بظاہر پُرسکون لہجے کی تہ میں ایک عجیب قسم کے جوش کی تپش محسوس کی تھی، جس کی ''وجہ'' بھی میں سمجھ سکتا تھا۔ باقی رہی سہی تصدیق اس کے مجھے ہلکے سے پہلو میں ٹہوکا مارنے نے کر دی، یعنی مجھے رینا کی بات اور مشورے پر ہی عمل کر لینا چاہیے تھا اور اس گھوتراجی کو چلتا کرنا چاہیے تھا۔

''جب تک آپ کے ڈڈو کے مسلح محافظ نہیں آجاتے تو ہمیں ادھر ہی ایک ساتھ بیٹھ جانا چاہیے، اچھا خاصا خوشگوار ماحول بن جائے گا اور وقت بھی خوب پاس ہوگا۔'' گھوتراجی نے پھر مداخلت کی۔ بات ٹھیک تھی اسی لیے ہم سب ایک ہی میز پر دائرے کی صورت بیٹھ گئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ کھانا ہم کب کا کھا چکے تھے، ویٹر ہماری میز سے برتن بھی سمیٹ چکا تھا۔ تو پھر ابھی تک بل ٹرے اس نے کیوں نہیں ہمیں پیش کی تھی۔

مجھے کچھ شک ہوا، اسے دور کرنے کے لیے میں یونہی خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ''یہ ویٹر ابھی تک بل کیوں نہیں لایا؟''

''بل میں آپ کا ادا کر چکا ہوں۔'' نارائن گھوتراجی نے میری جانب دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''بل آپ دے چکے ہیں؟ مگر کیوں؟ کھانا تو میں نے اور میری ساتھی نے کھایا ہے۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے گھوتراجی کی طرف دیکھا۔ اس نے اس سلسلے میں جواب دینے کے بجائے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ میری جانب بڑھایا اور عجیب سے لہجے میں کہا۔

''سمجھو تو یہ تمہارے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہے، کیونکہ ابھی میں تمہیں جو آفر کرنے والا ہوں اس کے لیے نجانے کتنے لوگ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، مگر کامیابی کا ایک ذرہ بھی حاصل نہیں کر پاتے ہیں، عام لوگوں کی طرح کچھ اندازہ تو اس کا تمہیں بھی ہوگا ہی، اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ تم اپنی اس خوش بختی کو ٹھوکر مارو گے۔ خیر!...... ممبئی فلم انڈسٹری کا ایک بڑا ڈائریکٹر تمہیں خود اپنا وزیٹنگ کارڈ پیش کرتے ہوئے یہ آفر دے رہا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے، میرے اسٹوڈیو میں آجانا، میں تمہیں اپنی ایک نئی بننے والی فلم میں مرکزی رول دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بھاری معاوضے کے ساتھ، جس کی نصف ادائیگی بھی پیشگی ہوگی۔''

بلاشبہ یہ ایک بڑی آفر تھی مگر میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ نہ ہی میرا ایسا ایم تھا۔ میں تو کسی اور ہی اسٹیج کا اداکار تھا، اور یہ اسٹیج تقدیر میرے لیے بہت پہلے سجا چکی تھی۔ لہٰذا میں نے کہا۔

''گھوتراجی آپ کی آفر کا شکریہ اور بل ادا کرنے کا بھی۔ مگر آپ کے شاید علم میں نہیں ہے کہ میں پہلے ہی ایک فلم میں کام کر رہا ہوں۔''

''کیا؟'' گھوتراجی پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ''کک...... کیا تم پہلے سے ہی بنے بنائے اداکار ہو؟ کس فلم میں کام کر رہے ہو؟ ہدایت کار کون ہے؟''

''تقدیر......'' میں نے جواب دیا۔

''فنٹاسٹک......'' وہ چہک کر بولا۔

''گھوتراجی! تقدیر میرے لیے ایک اسٹیج سجا چکی ہے اور اب میں اس پر اپنا کردار ادا کر رہا ہوں، کب تک ادا کروں، یہ میرے ہدایت کار تقدیر کو پتا ہے۔''

''بڑی گہری چوٹ کھائے ہوئے لگتے ہو۔ جوان! سچ کہو تو ہمارے رائٹر کو تمہارے لیے مکالمے لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی، بعض اداکار اپنے مکالمے خود ترتیب دیتے ہیں، تم بھی انہی میں سے ہو گے۔ میری آفر مان لو، فائدے میں رہو گے۔'' گھوتراجی بڑے گھاگ لہجے میں بولا۔

میں نے اس کا کارڈ نجانے کیا سوچ کر اپنی شرٹ کی جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ ''میں غور کروں گا۔''

''میں منتظر رہوں گا۔'' وہ یکدم خوش ہو کر بولا۔ ''باقی اداکاری کی فکر نہ کرو، میری نظریں بھانپ رہی ہیں کہ تم بنے بنائے اداکار ہو، تم پر اتنی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔''

سوشیلا اس موضوع میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی مگر رینا بالکل بھی نہیں، جبکہ اس کا ساتھی تو بری طرح بیزار اور غصے میں نظر آ رہا تھا۔

رینا اس دوران اپنے ''ڈڈو'' کو فون کر چکی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس کم بخت گھوتراجی نے مجھے ایک فضول کی بحث میں الجھا لیا تھا، ورنہ میں سوچنا چاہتا تھا کہ مجھے اب اس معجزانہ اتفاق سے کیسے فائدہ اُٹھانا چاہیے تھا؟ یہ سر پھرا ڈائریکٹر گھوتراجی میرا پیچھا چھوڑتا تو میں کچھ سوچتا۔ اب اس نے ہم پر بل کی ادائیگی کا احسان بھی کر لیا تھا، اس لیے میں اس کے ساتھ رکھائی سے بھی پیش نہیں آ سکتا تھا۔ لہٰذا بولا:

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''گھوتراجی! آپ سے مل کر مجھے واقعی بہت خوشی ہوئی ہے، یہ ... میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ کی آفر کو قبول کروں، لہٰذا میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن آپ کے اسٹوڈیو آؤں گا ضرور......''

''یہ ہوئی ناں بات......'' وہ یک دم خوش ہوکر بولا۔ ''یقین کرو مسٹر شہزاد! اگر میں تمہیں ممبئی کے فلمی اُفق پر چمکتا ہوا ستارہ نہ بنا دوں تو میرا نام گھوتراجی سے بھوتراجی رکھ دینا۔ چلتا ہوں...... ویسے ان صاحب کا آپ نے ابھی تک تعارف نہیں کروایا؟'' اس نے آخر میں اپنی کرسی سے اُٹھتے ہوئے سوشیلا کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''یہ میری دوست ہے۔''

''او...... اچھا اچھا! چلتا ہوں......'' وہ ایک بار پھر بڑی گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کر کے چلتا بنا، اس کے ہمراہ جو دو افراد تھے وہ بھی ساتھ ہو لیے تھے، پتا نہیں کون تھے وہ دونوں؟ اور اس گھوتراجی سے ان کا کیا تعلق تھا، مجھے نہ پتا چل سکا، نہ ہی اُنہوں نے قریب آنے اور کسی گفتگو میں حصہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔

گھوتراجی کے جاتے ہی میں نے ہی نہیں بلکہ رینا نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کا ساتھی مہیش بار بار میری طرف گھور کے دیکھ رہا تھا، میں اس کی نظروں میں رقابت اور ناگواری کے تاثرات بھانپ رہا تھا۔ علاوہ ازیں میرا ذہن بھی تیزی سے سوچنے کے عمل سے گزر رہا تھا، ایک مشن دور تھا اور دوسرا نزدیک، جبکہ نزدیک والے مشن کی ابھی اتنی جلدی قریب آنے کی توقع ہی نہیں تھی۔ کم اہمیت کا حامل تو یہ مشن بھی نہیں تھا۔ تاہم میں نے اب فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ تو یہی سہی...... یوں میں اندر ہی اندر ایک لائحہ عمل ترتیب دے چکا تھا۔ سوشیلا کی ذہنی کیفیت اس وقت کیا ہو رہی ہوگی اس کا میں بہ خوبی اندازہ لگا سکتا تھا اور وہ خود بھی خوش ہی ہوگی کہ اس کا دیرینہ مشن اس کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی گویا خود ہی چل کر ہمارے اتنے قریب آگیا تھا، اسی لیے وہ اس ''سنہری موقع'' کو گنوانا نہیں پسند کرسکتی تھی، البتہ اس نے اس کی تکمیل کے مکمل اختیارات میری صوابدید پر چھوڑ رکھے تھے۔

ادھر اُدھر کی باتوں میں تھوڑی دیر اور بیت گئی کہ اچانک ریسٹورنٹ میں دو افراد نمودار ہوئے اور سیدھے ہماری طرف لپکے۔ ان کا انداز مؤدبانہ اور نہایت محتاط تھا۔ دونوں سفید اور بے داغ کوٹ سوٹ میں ملبوس تھے۔

''او مائی گاڈ......!'' ان کے نمودار ہوتے اور ہماری طرف بڑھتے ہی میرے ساتھ کھڑی سوشیلا کے حلق سے بے اختیار یہ جملہ خارج ہوا تھا جو میرے لیے چونکا دینے کا باعث تھا۔ غیر ارادی طور پر میری نظر اس پر پڑی تھی۔ پل کے پل اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا تھا اور آنکھوں میں خوف نمایاں ہوکر جھلکنے لگا تھا، جبکہ اس کی پھٹی پھٹی سی نگاہیں دونوں افراد میں سے ایک پر جم کر رہ گئی تھیں۔

فوری طور پر تو میں سوشیلا کی اس اچانک بدلتی ہوئی سراسیمہ کیفیات کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ نہ صرف سوشیلا بلکہ وہ آدمی بھی ہمارے قریب آتے ہی سوشیلا کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا اور تب ہی اس نے اپنے ساتھی کے کان میں کوئی سرگوشی کی تھی، میری چھٹی حس پل کے پل خطرے کی بو محسوس کرنے لگی تھی کہ اچانک ان دونوں آدمیوں کے ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں رینگ گئے۔ دوسرے ہی لمحے جب باہر آئے تو ان میں پستولیں دبی ہوئی تھیں اور ان کا رخ میری اور سوشیلا کی طرف تھا۔ اس اچانک اور عجیب سی اُفتاد پر میرا پورا وجود سنسنا اُٹھا تھا۔

''ی ی...... یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ......؟'' رینا چلائی۔ ''یہ وہ غنڈے نہیں ہیں، وہ تو بھاگ چکے ہیں۔''

''آر یو آل رائٹ بے بی؟'' ان میں سے ایک نے، جو مجھ پر بدستور اپنی گن کی نال تانے ہوئے تھا، رینا کو مخاطب کرتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا، البتہ اس کے انداز سے محتاط روی بھی جھلکتی تھی۔ مجھے یہ ادراک ہو چکا تھا کہ یہ دونوں رینا کے ددّو (جنرل کے ایل ایڈوانی) کے بھیجے ہوئے محافظ ہی تھے۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، بٹ...... پلیز! پٹ دی گن ڈاؤن...... یہ مسٹر شہزاد ہیں اور میرے محسن ہیں، انہوں نے ہی ہمیں ان غنڈے لڑکوں سے بچایا تھا۔''

رینا ان کی طرف دیکھ کر بولی۔ وہ شاید یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے ددّو کے بھیجے ہوئے یہ دونوں مسلح محافظ مجھے اور سوشیلا کو وہی بدمعاش سمجھے ہوئے تھے، مگر مجھے سوشیلا کی ان دونوں کو دیکھتے ہی یکدم بدلنے والی کیفیات کو بھانپ کر اندازہ ہو چکا تھا کہ معاملہ کچھ اور...... نیز اس سے زیادہ گمبھیر تھا۔

''بے بی! تم نہیں سمجھوگی۔ یہ معاملہ صرف بدمعاشوں سے تمہاری مکتی (جان چھڑائی) کا نہیں، کچھ اور ہے۔'' یہ وہی آدمی تھا، جسے دیکھتے ہی سوشیلا خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ایک تنومند اور خاکستری رنگت والا کرخت صورت آدمی تھا، جو بار بار بڑی کینہ توز نظروں سے میری اور سوشیلا کی طرف گھورے جا رہا تھا جبکہ اس کا ساتھی بھی کم خطرناک نہیں نظر آتا تھا، وہ ایک گینڈے جیسی جسامت کا حامل گورے رنگ اور ٹھگنے قد کا تھا۔ اب میں کچھ باتیں محسوس کر کے سمجھنے لگا تھا کہ یہ معاملہ کیا ''رخ'' اختیار کرنے جا رہا تھا۔

''تم دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔'' وہی کرخت صورت شخص میری جانب گھور کے بولا تو میں نے بڑے اطمینان سے اپنے کاندھے اُچکا کر کہا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں تمہارے ساتھ جانے میں...... اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو کم از کم میرے سلسلے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ لیکن بہتر ہوتا کہ مجھے بتایا تو جاتا کہ میرا قصور کیا ہے؟'' میں نے دانستہ اپنے لیے ''ہم'' کے بجائے ''میں'' کا صیغہ لگایا تھا، میں خود کو سوشیلا سے الگ رکھنا چاہتا تھا۔ جان تو گیا تھا کہ سوشیلا نے اپنی بہن اور اس کی فیملی کو بچانے کے لیے ان لوگوں کے ساتھ ٹکر لی تھی، یا یوں کہہ لیں ان کے ساتھ ہیرے کے سلسلے میں ''ڈیلنگ'' کی تھی، جسے ان خبیثوں نے حاصل کر لینے کے باوجود انسانیت سوز بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، سوشیلا کو بے وقوف بنا کر اس کی بڑی بہن، اس کے دونوں چھوٹے معصوم بچوں سمیت شوہر کو بھی قتل کروا دیا تھا۔ یوں صورتِ حال کی گمبھیرتا میری سمجھ میں آتی چلی گئی تھی۔

رینا کا چہرہ غصے اور کافی حد تک شرمندگی کے باعث سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے ''محسن'' کے ساتھ بھلا ایسے کسی سلوک کی کب توقع رکھے ہوئے تھی؟ ایک بار پھر اپنے محافظوں سے ترخ کر بولی۔

''یوشٹ اَپ نان سینس! میں کہتی ہوں اپنی پستولیں ہٹا لو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے...... نہیں ضرورت ہے مجھے تمہاری مدد کی، میں ابھی اپنے دڈو سے بات کرتی ہوں۔''

بڑی عجیب صورتِ حالات ہو گئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، ادھر رینا نے اپنے سیل پر دڈو سے رابطہ کیا، میرا دل تیزی دھڑک رہا تھا۔ طلسم نور ہیرے جیسے انتہائی حساس اور اس سے بڑھ کر خطرناک معاملے سے متعلق ایک بڑا جرنیل غیر متوقع طور پر ہی میرے سامنے آنے والا تھا، یہ ایک حادثاتی اتفاق سہی، مگر ابھی ہم ذہنی طور پر اس مشن کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے تھے، اس کی وجہ بڑی ٹھوس تھی، سرِ دست ہمیں بلیو ٹلسی اور اسپیکٹرم سے خطرہ دو چار تھا، جبکہ مجھے بلیو ٹلسی کے سربراہ کرنل سی جی بجوانی کو

کیا آپ شوگر سے مستقل نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں ۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ
ضلع حافظ آباد۔ پاکستان
0300-6526061
0301-6690383

فون اوقات
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

بھی ٹھکانے لگاتا تھا، اس کے بعد ہی میں ایڈوانی مہم کے لیے سوشیلا کی مدد سے کوئی مربوط لائحہ عمل تیار کرتا۔ مگر یہاں تو بعد والی مہم پہلے گلے پڑتی نظر آرہی تھی، میرے ادراک کے مطابق کرخت صورت والا شخص جو ظاہر ہے ایڈوانی جیسے درندہ صفت آدمی کا گماشتہ ہی تھا، سوشیلا کا ان سے ماضی میں ٹکراؤ ہونے کی نسبت سے اسے پہچان رہا تھا۔ سوشیلا نے اپنی بدنصیب بہن اور اس کی فیملی کو بچانے کی خاطر ہی ایک ڈیل کے ذریعے وہ ہیرا (طلسم نور) ایڈوانی کے حوالے کیا تھا مگر اس درندہ صفت اور سفاک آدمی نے ہیرا حاصل کرنے کے بعد بھی سوشیلا کی بڑی بہن اور اس کے دونوں چھوٹوں بچوں سمیت اس کے شوہر کو بھی ختم کرادیا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ سوشیلا کو بھی راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹانے کی کرتا، کیونکہ ایڈوانی ہیرے والے راز کو اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہوگا کہ وہ ہیرا اب اس کے قبضے میں ہے۔ سوشیلا خطرہ محسوس کرتے ہی منظر سے غائب ہوگئی تھی مگر ایڈوانی سے اپنی بدنصیب بہن اور اس کی پوری فیملی کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بدلے کا عزم بھی کیے ہوئے تھی۔ تاہم اب معاملہ یوں تھا، جس کا مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ کرخت صورت آدمی، سوشیلا کو ماضی کے اسی بھیانک اور انسانیت سوز واقعے کی نسبت سے پہچان چکا تھا اور سوشیلا بھی...... اسی لیے یہ سارا بکھیڑا پڑ چکا تھا۔

”لو...... میرے دڈو سے بات کرلو۔“

رینا نے اپنے دڈو (جنرل ایڈوانی) سے بات کرنے کے بعد اپنا سیل اس کرخت صورت محافظ کی طرف بڑھا دیا۔ اپنے ”دڈو“ سے بات کرنے کے دوران میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنے دڈو کی خاصی لاڈلی پوتی تھی۔

کرخت صورت محافظ نے ایک بار پھر میری اور سوشیلا کی طرف معاندانہ نظروں سے دیکھا اور پھر رینا سے سیل فون لے کر اپنے کان سے لگایا۔

”ہیلو، سر......!“ کہہ کر اس نے چند سیکنڈ تک خاموشی اختیار رکھتے ہوئے دوسری جانب سے شاید ایڈوانی کے کچھ استفساریہ جملے سنے تھے، اس کے بعد ذومعنی لہجے میں بولا۔

”سر! یہاں کی صورتِ حال کچھ اور ہے، جو بے بی کی سمجھ میں نہیں آسکتی، وہ اپنی نادانی میں خود کو خطرے میں ڈال دیں گی۔ باقی فون پر ہم آپ کو کوئی تفصیل نہیں بتا سکتے۔ آپ بے بی کو سمجھا دیں۔“ ایک بار پھر قلیل سا وقفہ آیا، پھر اس نے سیل رینا کی طرف بڑھا دیا۔ ریسٹورنٹ رفتہ رفتہ لوگوں سے خالی ہونے لگا تھا، منیجر نے ایک بار پھر مداخلت کرنا چاہی تو کرخت صورت محافظ کے ساتھی نے اسے بُری طرح جھڑک کر خاموش رہنے پر مجبور کردیا۔

”جی دڈو؟“ اس نے استفساریہ کہا اور دوسری جانب سے اپنے دڈو کی باتیں سنتی رہی، میری نظریں اس کے چہرے پہ مرکوز تھیں، اب نجانے اس کا دڈو اپنی اس لاڈلی پوتی کو کیا بتا رہا تھا کہ اس کا چہرہ سُتنے کے قریب ہوگیا، بالآخر بولی۔

”ٹھیک ہے دڈو! اگر یہ بات ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے آدمیوں کو کوئی غلط فہمی ہی ہوئی ہے، میرے محسن شہزی اور ان کی ساتھی کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے، آپ کو معلوم ہے ناں کہ میں اس سلسلے میں کس قدر پکی ہوں؟“ اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کردیا اور میری طرف شرمندہ سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے معذرتی سے لہجے میں بولی۔

”شہزی صاحب! میرے دڈو کی مجبوری یہ ہے کہ وہ دیش کے ایک اہم اور کلیدی منصب پر فائز رہے ہیں، انہیں، بلکہ ان کے ان دونوں آدمیوں کو شبہ ہے کہ آپ ان کے مخالفین سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں اس کی کوئی پروا نہیں، مگر وہ آپ دونوں کو اپنے روبرو دیکھ کر چند سوالات کریں گے اور پھر معاملہ ختم......“

”یہ تو کوئی بات نہیں مس رینا!“ اچانک سوشیلا، جسے اس صورتِ حال نے کچھ ماؤف سا کر رکھا تھا، یکدم ہمت کر کے تڑ سے بول پڑی۔ ”تمہارے دڈو کے آدمیوں کو اگر یہاں موجود کسی بھی شخص پر اپنے مخالفین کا شبہ ہو تو کیا وہ انہیں اپنے روبرو پیش ہونے کا حکم دے ڈالیں گے؟ یہ تو کھلی بدمعاشی اور ناانصافی ہے۔“

”پھر ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔“ کرخت صورت والے آدمی کے ساتھی نے سوشیلا سے جارحانہ لہجے میں کہا تو رینا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ کو اگر ایسا کوئی خطرہ یا شبہ محسوس ہوتا ہے تو آپ میرے دڈو کے سامنے پیش ہو کر اس کی گلا خلاصی کروا لیں، لیکن میرا یہ وعدہ ہے، چاہے آپ دونوں ان کے مخالفین میں سے کیوں نہ ہوں، میں آپ پر آنچ تک نہیں آنے دوں گی، آپ نہیں جانتے کہ دڈو کی جان کسی دیو کی طرح میرے شریر میں قید ہے۔ کم از کم میری موجودگی میں دڈو آپ دونوں کا بال تک نہیں بگاڑ سکیں گے۔“ رینا نے پورے استحکام کے ساتھ گویا خم ٹھونک کر یہ بات ہم سے کہی

تھی، مگر سوشیلا مطمئن نہیں تھی، جبکہ میں بات کی تہ تک پہنچ چکا تھا اور سوشیلا نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور رینا سے مسکرا کر بولا۔

''مجھے آپ پر پورا بھروسا ہے۔ چلیں! ہم تیار ہیں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے۔'' سوشیلا نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھا مگر بول نہ پائی، میرے اور اس کے درمیان پہلے ہی یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ وہ میرے کسی بھی حتمی فیصلے پر کوئی چون وچرا نہیں کرے گی۔ سو وہ خاموش ہی رہی، وگرنہ تو اس کا بس چلتا تو وہ یہاں سے بھاگ جاتی۔ (اگرچہ یہ بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا)

میں نے دیکھا رینا کا حسین چہرہ کھل کر نکھرا نکھرا ہو گیا۔ پھر اس نے خاصے تیز لہجے میں اس کرخت صورت محافظ کو پہلی بار مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ سی آواز میں کہا۔

''بلراج سنگھ! یہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں، تم دونوں اب اپنے پستول جیبوں میں ڈال لو...... ورنہ میں بھی یہاں ان کے ساتھ کھڑی رہوں گی اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوں گی۔''

''بلراج سنگھ...... بلراج سنگھ۔''

اس شناسا سے نام کی میرے سوچتے ہوئے ذہن میں سوالیہ سی گردان ہونے لگی۔

اوہو...... یہ تو وہی بلراج سنگھ تھا، جس کے بارے میں سوشیلا نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جنرل کے ایل ایڈوانی کا قریبی دستِ راست تھا اور اسی نے وہ ہیرا اس سے لے کر ایڈوانی کو دیا تھا، بعد میں ایڈوانی کے حکم پر اس نے اس کی بہن اوشا اور اس کے شوہر اور بچوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ اس نام کے مع حوالے کے یاد آتے ہی میرے اندر تھرتھراہٹ سی عود کر آئی، جو کسی دہشت یا خوف سے نہیں بلکہ جوش بھری وہ لہر تھی جس نے میری رگوں میں خون کی گردش تیز کر دی تھی۔

اب مجھے ٹھیک طرح اندازہ ہو پایا تھا کہ سوشیلا کیوں بلراج سنگھ کو دیکھتے ہی اس قدر خوف زدہ سی ہو گئی تھی۔ یہ بھی مجھے جنرل ایڈوانی کا قریبی اور چہیتا گماشتہ محسوس ہوا تھا۔

ایک فیصلہ کن ارادہ باندھ کر میں نے ان کے ساتھ روانگی کی ہامی بھر لی تھی۔ رینا کا بھی مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنے ڈڈو کے کس قدر قریب اور اس کی لاڈلی تھی۔ لیکن وہ شاید اپنے ''ڈڈو'' کے کالے کرتوتوں سے آگاہ نہیں تھی۔ شاید اسی سبب مجھے کچھ خوش فہمی سی تھی کہ ایڈوانی اتنی جلدی ہمارے ساتھ کوئی سفاکانہ سلوک کرنے سے قاصر ہی رہے گا۔

بہرکیف رینا کی بات پر بلراج سنگھ نے منہ بناتے ہوئے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا تھا اور اس کے ساتھی نے بھی اسے دیکھ کر اس کی تقلید کی تھی۔

ہم ریسٹورنٹ سے باہر آ گئے۔ بیچ ریسٹورنٹ میں اگرچہ پارکنگ ایریا خاصا وسیع تھا، مگر گیٹ کے بالکل سامنے ہی ایک لمبی سی چمکتی ہوئی کار کھڑی تھی جو یقیناً بلراج سنگھ کی تھی۔ باوردی دو گیٹ مین خاصے پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ گاڑی غلط اور زبردستی پارک تھی، یہی وجہ مجھے ان کی پریشانی کی سمجھ میں آئی تھی اور انہیں دیکھ کر گیٹ مین نے سکون کا سانس لیا تھا۔

رینا اور اس کے بوائے فرینڈ کی کار پارکنگ ایریا میں کھڑی تھی، میں سوشیلا کے ساتھ دانستہ رینا کے پیچھے چلا تو بلراج نے پھر مجھ پر حکم چلایا۔

''تم ہمارے ساتھ بیٹھو گے، ہماری گاڑی میں......''

''ایز یو وش......'' میں نے کندھے اُچکائے اور اس کے ساتھ ہوا تو رینا نے پکارا۔

''نہیں مسٹر شہزاد! تم میری گاڑی میں بیٹھو گے۔''

میں نے فوراً سوشیلا کا ہاتھ پکڑا اور رینا کے ساتھ ہو لیا، وہ دونوں اپنے دانت پیستے رہ گئے۔ مہیش البتہ بری طرح مجھ پر خار کھائے بیٹھا تھا، بول ہی پڑا۔

''رینا! ان دونوں کو انہی کی گاڑی میں جانے دو ناں...... کیا فرق پڑتا ہے، ہم بھی تو وہیں جا رہے ہیں۔''

''تم پلیز خاموش رہو مہیش! یا پھر میں تمہیں ڈراپ کرتی چلوں گی۔'' رینا نے اس سے بھی رکھائی کے ساتھ کہا اور پھر مجھے آنے کا کہا۔ ''آئیں آپ لوگ......''

تھوڑی دیر بعد ہم رینا کی کار میں عقبی سیٹوں پر براجمان تھے۔ رینا کی کار بھی کم قیمت نہیں لگتی تھی۔ نامعلوم منزل کی طرف سفر شروع ہو چکا تھا۔ بلراج سنگھ کی گاڑی پہلے تو آگے رہی، مین روڈ پر آتے ہی وہ ہمارے عقب میں ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ رینا نے ہی سنبھالی ہوئی تھی، جبکہ اس کے برابر والی سیٹ پر مہیش براجمان تھا۔

دونوں گاڑیاں فراٹے بھرنے لگیں۔ سفر خاموشی سے جاری رہا۔ گاڑی شہر کے وسطی علاقوں اور بھری پُری آبادی کے درمیان سے گزرتی رہی۔ رات اپنے پہلے پہر میں تھی۔ نصف گھنٹے بعد رینا نے مہیش کے منع کرنے کے باوجود اُسے اس کے گھر پر ڈراپ کر دیا۔ اس کا گھر متمول علاقے میں تھا اور وہ بھی کسی بڑے آدمی کی اولاد معلوم ہوتا تھا، اس کی کوٹھی خاصی شاندار تھی۔

وہاں سے روانگی کے بعد رینا نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جماتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم آگے آسکتے ہو۔''

''نہیں، بس میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا، رینا نے دوبارہ اصرار نہیں کیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہی دونوں گاڑیاں شہر کی حدود سے باہر اس کے مضافات میں آگئیں۔ میں اس سارے راستے کو اچھی طرح ذہن نشین کرتا جارہا تھا۔ یہاں تک کے مہیش کی رہائش گاہ بھی ازبر تھی۔ مضافات میں بھی سفر کا اختتام تیس چالیس منٹ بعد ہی ہوگیا۔

آبادی سے الگ تھلگ یہ حویلی نما بنگلا عنابی رنگ کی اینٹوں سے بنا ہوا تھا، جس کے گرد خوب صورت لان پھیلا ہوا تھا اور اندر سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں، صاف لگتا تھا کہ انہوں نے دو اجنبیوں کی آمد کی بو سونگھ لی تھی۔

لمبا چوڑا گیٹ آٹو سلائڈ ہوا اور دونوں گاڑیاں اندر داخل ہوگئیں۔ سوشیلا کی حالت خاصی پتلی ہورہی تھی۔ میں نے اس کو مطمئن کرنے کے لیے اس کا ہاتھ دبایا تھا۔

سوشیلا جس خوف کا شکار تھی، وہ اس پر حق بجانب بھی تھی۔ ایڈوانی اور بلراج سنگھ کا اس کے ساتھ پہلے بھی ٹکراؤ ہوچکا تھا اور وہ ان کی سفاکانہ فطرت سے بہ خوبی واقف تھی۔ لیکن مجھ پر وہ بھروسا بھی کافی کرتی تھی۔ اس لیے اس نے بھی خود کو تن بہ تقدیر کردیا تھا۔

کار پورچ میں دونوں گاڑیاں ایک جھٹکے سے رکیں اور پھر ہم سب نیچے اُتر آئے۔

بلراج سنگھ تیر کی طرح ہماری طرف بڑھا تھا۔ اس کے انداز میں عجلت اور ایک درشت آمیز جوش سا اُمڈتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سمیت ہمیں کور کرنے کی کوشش کرنی چاہی تھی، لیکن رینا ان کے آڑے آگئی۔

''بے بی! انہیں دوسرے کمرے میں جانا ہوگا۔'' بالآخر جب رینا نے انہیں کوئی موقع نہ دیا تو بلراج کو ہی کہنا پڑا۔

''یہ مہمان ہیں اور اندر ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھیں گے۔'' رینا نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اور جب تک یہ یہاں ہیں، میں انہیں اپنی نگاہوں سے ایک پل کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔''

رینا کا ہمارے حق میں انداز و اطوار کافی حوصلہ افزا تھا۔ وہ بڑی سمجھداری کے ساتھ اپنے ڈیڈ کو یہ بھی باور کرا چکی تھی کہ اگر ہم ان کے مجرم ہوئے بھی تو وہ کم از کم اپنی موجودگی میں ان کے خلاف کوئی بھی ایسا ویسا قدم اُٹھانے نہیں دے گی۔ یہ بات اس کی کافی تسلی بخش تھی۔ اب ہمیں ایڈوانی کے روبرو کیا موقف اختیار کرنا تھا، وہ میں اپنے ذہن میں مرتب کر چکا تھا۔ جبکہ سوشیلا نے اُس بدبخت کو اپنی طرف سے کیسے قائل کرنا تھا، یہ میں راستے ہی میں مختصراً اشارتی گفتگو میں اسے سمجھا چکا تھا۔

بلراج سنگھ، رینا کے مسکت جواب پر ایک بار پھر بے بسی سے اپنے دانت پیس کر رہ گیا تھا۔

میں غیر محسوس طریقے سے بنگلے کے اطراف کا جائزہ لیتا رہا۔ رینا کی تقلید میں اندر قدم اٹھاتے ہوئے ہم ایک بڑی سی شاہانہ طرز کی نشست گاہ میں آگئے۔ رینا نے ہمیں یہاں ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''شہزاد صاحب! آپ دونوں یہاں سے کسی کے کہنے پر ہلیے گا بھی نہیں، آپ کسی قسم کی چنتا مت کریں، آپ نے چاہے کتنا ہی بڑا جرم کیا ہو، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ بس! آپ اس وقت میرے محسن ہیں اور میرے ساتھ ہیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کسی اندرونی گوشے کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں اور سوشیلا وہاں اکیلے رہ گئے۔ نشست گاہ کی سج دھج میں خاصی نفاست اور امارت ٹپکتی تھی۔ بیش قیمت شو پیس خوب صورت کارنس پر اور صوفوں کے قریب رکھے نظر آرہے تھے۔ دیواروں پر بھی پورٹریٹ اور خاندان کے پرکھوں کی بڑی بڑی شیشے کے فریم والی تصاویر ٹنگی ہوئی تھیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں ایڈوانی کی کون سی تصویر تھی، نہ ہی مجھے یہ جاننے کی جلدی تھی، کیونکہ ابھی کسی بھی وقت میرا اور اس کا سامنا ہونے ہی والا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دھیمے لہجے میں سوشیلا کو کچھ سمجھایا۔ ہمیں ابھی وہاں بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ رینا نمودار ہوئی۔ سوشیلا اور میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے ہمراہ مجھے ایک خاصا دراز قامت اور چوڑے شانوں والا شخص بھی ساتھ ہی نمودار ہوتا نظر آیا۔ اس نے نفیس قسم کا قیمتی سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا۔ عمر کا اندازہ پچپن ساٹھ کا ہی ہوا تھا مجھے، رنگت گندمی تھی اور سر کے بال بیچ سے اُڑے ہوئے جبکہ کنپٹیوں پر اپنی جگہ نیلگوں مائل سفیدی کی جھلک دکھاتے نظر آتے تھے۔ اس کی ناک موٹی اور آنکھیں چندی چندی سی تھیں، جن میں عجیب سا تاثر جھلکتا محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ مد مقابل کا ایکسرے لے رہی ہوں۔ پیشانی تنگ تھی۔ چہرے پہ سنجیدگی کھنڈی ہوئی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

جو اس کی کرخت مزاجی کی غماز ہی نظر آتی تھی۔ کیا شک تھا کہ یہی شخص جنرل ایڈوانی تھا۔

''یہ مسٹر شہزاد ہیں اور یہ ان کی ساتھی سوشیلا......'' رینا نے قریب آتے ہی ہمارا اس سے تعارف کروایا۔ اُس نے ہمارے قریب آنے کی زحمت تک گوارا نہ کی تھی اور ہمارے سامنے والے صوفے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں بھی اپنی جگہ صوفے پر جم کر بیٹھا رہا تھا اور میری سناٹے دار نظریں اس درندہ صفت اور جنگی جنونی شخص پر جمی رہیں۔

''اور...... یہ میرے دڈو ہیں، آرمی کے ایک مایۂ ناز جرنیل کے ایل ایڈوانی جی......''

(میں نے یہاں دیکھا تھا کہ کوئی آدمی خود کو بڑی شخصیت ظاہر کرنے کے لیے اپنے نام کے آگے ''جی'' ضرور لگاتا تھا، جیسے گھوترا جی...... وغیرہ، پتا نہیں یہ گھوترا جی...... مجھے اس نازک اور حساس وقت میں کیوں یاد آ گیا تھا؟)

''بڑی خوشی ہوئی آپ کے دڈو جان سے مل کر......''

میں نے اسی طرح صوفے پر بیٹھے بیٹھے کہا، میری عقابی نظریں ایڈوانی پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی سوشیلا کے چہرے پہ، جبکہ اس کے ذرا ہی دیر بعد اس کے وہ دونوں کارپردازِ خاص چیلے بلراج سنگھ اور اس کا ساتھی بھی وہاں آن موجود ہوئے تھے اور دونوں ہاتھ باندھے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

ایڈوانی، سوشیلا کو دیکھ کر اندر سے پریشان تو ضرور ہوا ہوگا، مگر اسے تسلی بھی ہوئی ہوگی کہ بھلا اب یہ اکیلی کمزور سی لڑکی اس کا کیا بگاڑ لے گی جو اس کی بربریت اور انسانیت سوز سفاکی کا ایک مظاہرہ دیکھتے ہی نجانے کہاں بھاگ کر غائب ہو گئی تھی کہ کہیں اس کی بھی شامت نہ آ جائے، تاہم اب ایک اجنبی کے ساتھ اسے دیکھ کر وہ اپنے ذہن میں کس قسم کے اندازے قائم کر رہا ہوگا، اس کا مجھے جو وجدانی ادراک ہو پایا، اس کے مطابق میں اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ایک ''پلانڈ'' میموری فیڈ کر چکا تھا۔

''تم اس لڑکی کے کیا لگتے ہو؟'' دفعتاً کشادہ سی نشست گاہ میں اس کی کھرکھراتی ہوئی جھٹکے دار آواز ابھری، اس آواز میں مجھے ایک آمرانہ دبدبہ سا محسوس ہوا تھا۔

''یہ میری دوست ہے۔ ایک بین الاقوامی این جی او میں ہم دونوں ساتھ کام کرتے ہیں۔'' میں نے بہ یک ترنت مگر نارمل سے لب و لہجے میں جواب دیا۔ اچھی طرح جانتا تھا میں کہ میرے سامنے کوئی معمولی آدمی نہیں بیٹھا تھا، ایک جرنیل تھا جس کی زندگی جنگوں اور تیر و تفنگ میں گزری تھی اور وہ بدمقابل یا مخاطب کی آواز اور لہجے سے ترنت یہ اندازہ قائم کر سکتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی عام آدمی بیٹھا تھا یا ایک تربیت یافتہ ...... کمانڈو...... یہی وجہ تھی کہ میں نے محسوس کیا اس نے میرے جواب کو بڑے غور سے سنا اور میری جانب ایکسرے کرتی نظروں سے دیکھا تھا۔

میری پروفیشنل آبزرویشن کے مطابق وہ یہ جاننے کی کوشش میں تھا کہ آیا میں واقعی سوشیلا کا کوئی ساتھی کولیگ ہی ہو سکتا تھا یا، اس نے مجھے کسی مقصد کی خاطر ''ہائر'' کر رکھا ہے۔ لامحالہ ایڈوانی جیسے جگادری جنگجو آدمی کے لیے ایسا سوچنا ایک فطری بات تھی۔

''تمہارے ساتھ بیچ ریسٹورنٹ میں کیا ہوا تھا؟'' اس نے اپنی لاڈلی پوتی کی طرف دیکھ کر پوچھا جو اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی۔ ایک نگاہ مجھ پر ڈالنے کے بعد اپنے دڈو سے بولی۔

''دڈو! میں اور مہیش بیچ ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ کچھ اوباش قسم کے لڑکے آئے اور ہم سے بدمعاشی کرنے لگے، انہوں نے مہیش کو پیٹا اور میرے ساتھ بدتمیزی کرنے لگے، وہاں موجود باقی لوگ تماشائی بنے ہوئے تھے مگر اِنہوں نے نہ صرف مجھے اُن بدمعاشوں سے بچایا بلکہ ان کے ایک ساتھی لڑکے ارجن کی خوب ٹھکائی بھی لگا دی، وہی زیادہ ولن بننے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''وہ بن نہیں رہا تھا، اُسے کسی نے خود ہیرو بننے کے لیے، ولن کا کردار ادا کرنے کو کہا ہوگا تاکہ وہ تمہاری نگاہوں میں ہیرو بن جائے اور تم سے راہ و رسم استوار کرنے کی کوشش کرے۔''

اچانک ہی ایڈوانی کاٹ دار طنز سے، ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پہ ڈال کر رینا سے بولا۔ ''یہ سب فلمی نقشے بازی ہے، بیٹی! تم ابھی معصوم ہو نہیں سمجھو گی یہ سب باتیں۔ بہرحال......'' وہ یہ کہتے ہوئے میری طرف متوجہ ہو کر گمبھیر لہجے میں بولا۔

''تمہارا شکریہ مسٹر......! یا جو بھی تمہارا نام ہے۔'' پھر اس نے پاس کھڑے اپنے مقربِ خاص کارپرداز بلراج سنگھ سے کہا۔

''ان دونوں کو کچھ پیسے دے دو اور انہیں ان کے گھر تک بھی چھوڑنے کا بندوبست کر دو۔ میں سونے جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک منٹ سر......!'' اچانک میں نے کہا۔ خود میں نے بھی اس کے ساتھ ہی صوفہ چھوڑ دیا تھا اور سوشیلا نے بھی

اس کی فوراً تقلید کی تھی۔

وہ رُکا اور میری طرف گھورنے کے انداز میں خاموشی سے دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں روایتی طور پر پیسے لینے کے معاملے میں کسی غیرت یا جو کچھ اس نے بکواس کی تھی اس کی صفائی میں کچھ کہوں گا، اس نے میرے بارے میں جو غلط اندازہ قائم کیا تھا میں نے اس پر کوئی بحث کرنا یوں بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ مجھے واقعی ایسا ہی سمجھنے کی غلطی پر کارفرما رہے تو اچھا تھا، یعنی اس کا مطلب تھا کہ میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو متاثر کرنے کے لیے یہ عامیانہ حرکت کی تھی تو یہی سہی، لیکن میں نے اس کے بالکل برعکس ایک عمومی مسکراہٹ سے کہا۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہوگی کہ اگر آپ ہمیں کم از کم اتنی رقم عنایت کردیں کہ ہم بہ آسانی کوئی ٹیکسی وغیرہ پکڑ کر اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکیں۔''

''رقم بھی مل جائے گی تمہیں، اس کی چنتا مت کرو، گاڑی ہماری ہوگی، بلراج سنگھ تم دونوں کو جہاں تم کہو گے چھوڑ آئے گا۔''

''دڈو! میں بھی ان کے ہمراہ جاؤں گی۔'' اچانک رینا نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر ایڈوانی سے کہا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش تلے اینٹھا ہوا تھا، صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے دڈو کی بات بُری لگی تھی۔ ''کیونکہ آپ نے جس انداز سے انہیں یہاں بلایا تھا، اس سے انہیں آپ سے یا آپ کے آدمیوں سے ڈر تھا کہ وہ انہیں کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔''

رینا نے اپنی بات مکمل کی۔ ایڈوانی نے اس موضوع کو زیادہ طول نہیں دیا۔ محض اثبات میں اپنا سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

القصہ کوتاہ اگلے چند منٹوں بعد ہم دوبارہ کار میں تھے، مگر اس بار رینا کے بجائے بلراج سنگھ کی گاڑی تھی۔ اسٹیئرنگ اسی کے ساتھی نے سنبھالے رکھا تھا، جبکہ وہ خود اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ پچھلی نشست پر میں، سوشیلا اور رینا براجمان تھے۔ سفر بہ ظاہر خاموشی سے جاری تھا۔

میں سمجھ رہا تھا کہ تقدیر بھرپور طریقے سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ چیز میرے جوشِ جنوں کو فزوں تر کرنے کا باعث بنتی تھی۔ ایڈوانی سے غیر متوقع ملاقات اور اس کے ٹھکانے کا پتا لگنا، بلراج سنگھ سے آمنا سامنا، یہ سب میرے ایڈوانی مشن سے قبل از وقت تھا اور خوب تھا، میں نہیں جانتا تھا کہ ایڈوانی مجھ سے مطمئن ہوا تھا یا نہیں، لیکن مجھے اندازہ تھا کہ ایڈوانی جیسا آدمی مجھ سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوا تھا ورنہ وہ میرے ساتھ اتنے مختصر سوالات نہیں کرتا۔ نہ ہی اس کی ہم سے ملاقات کا دورانیہ اس قدر قلیل ہوتا۔ ضرور اس کے شیطانی ذہن میں میرے اور سوشیلا کے خلاف کوئی اور خطرناک منصوبہ پل رہا ہوگا، جس کے ''تاروپود'' وہ پہلے سے ہی تیار کر چکا ہوگا، میں اگر اس کا نشانہ نہ بھی ہوتا تو سوشیلا کو دیکھنے کے بعد وہ اسے بھی ختم کروانے کی پوری کوشش کرے گا، کیونکہ وہ اس کے گھاؤنے منصوبے سے ہی آگاہ نہ تھی بلکہ وہ یہ راز بھی جانتی تھی کہ وہ بیش قیمت پُراسرار ہیرا طلسم نور...... ایڈوانی کے پاس ہے۔ بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ بلراج سنگھ کے ذریعے ہم دونوں کو ختم کرنے کی کوشش پر اب تک عمل پیرا بھی ہو چکا ہوتا، اگر اس کی لاڈلی پوتی رینا کا معاملہ درمیان میں نہ آتا۔ لیکن اب بھی وہ اپنے تئیں یہی سمجھ رہا ہوگا کہ ترپ کا پتا اس کے ہاتھ تو آہی چکا ہے، یعنی سوشیلا اس کے سامنے تھی، بلراج کو ساتھ بھیجنے کا مقصد بھی یہی ہوگا کہ اس طرح وہ ہمارے ٹھکانے سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہمارے خلاف کوئی خفیہ جارحانہ کارروائی عمل میں لاتا۔

اسی باعث سوشیلا کو ایڈوانی کی رہائش گاہ سے روانگی کے وقت اطمینان حاصل نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تشویش آمیز پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔

خطرے کی بُو مجھے اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ رینا کا کیا تھا، اس نے واپس لوٹ جانا تھا، پھر میں کون تُو کون......؟ بعد میں میرے اور سوشیلا کے ساتھ کیا ہوتا، اس کا بھلا اُسے کیا پتا چلنا تھا کہ ہم کہاں اور کس حال میں تھے؟

''یہاں اُتار دو۔'' دفعتاً میں نے ایک برج کراس ہوتے ہی کہا۔ یہاں گرد و پیش میں کسی آبادی کے آثار نظر آتے تھے۔

''یہاں کہاں اُترو گے تم؟'' بلراج نے کار روکنا تو کجا اس کی رفتار تک کم کیے بغیر کہا۔

''گاڑی ادھر ہی روک دو بلراج سنگھ......! ہمیں یہیں اُترنا ہے۔'' میں نے اس بار ذرا سخت لہجے میں کہا تو رینا بھی تحکمانہ لہجے میں اس سے مخاطب ہوکے بولی۔

''کار روک دو بلراج!''

بلراج نے غصے سے اپنے دانت بھینچ کر کار کو اس زور سے بریک لگائے کہ ہمیں اچھا خاصا جھٹکا لگا، کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی اس حرکت کا مزہ چکھا دیتا، لیکن ابھی معاملہ فہمی آڑے آرہی تھی اسی لیے میں اپنے طیش کو پی

گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ بلراج کا ہمارا ٹھکانا دیکھنے کا خواب پورا نہیں ہوسکا تھا، (یوں بھی بھلا ہمارا کہاں ٹھکانا تھا؟)

میں اور سوشیلا فوراً کار سے اُترے تو رینا بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے نیچے اُتر آئی۔

وہ ہم سے مخاطب ہونا چاہتی تھی کہ اچانک اس کا سیل فون سریلی ٹون میں گنگنایا۔ اس نے فون کان سے لگالیا۔

ہمارے اطراف میں خاموشی اور رات کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی، رینا اچانک آنے والی کال کو سننے میں بزی تھی کہ میں نے دیکھا اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا اور وہ فون اپنے کان سے لگائے ہوئے میری طرف خوف زدہ سی نگاہوں سے دیکھنے لگی اور پھر جیسے پل کے پل کایا ہی کلپ ہوگئی۔ وہ قریب کھڑے بلراج سنگھ سے میری طرف ہاتھ کی اُنگلی کا اشارہ کرتے ہوئے چلّا کر بولی۔

”بلراج ای ی...... یہ پاکستانی دہشت گرد ہے......“

رینا کا یہ کہنا تھا کہ میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے اُترتے چلے گئے۔

بلراج سنگھ تو جیسے پہلے ہی مجھ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا، اس نے گویا ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ سوشیلا کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔

صورتِ حال کی اس اچانک بدلتی ہوئی ”کایا کلپ“ پر میں سرتاپا سنسنا کر رہ گیا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہوا تھا......؟

پہر رات کے اس دم بہ خود اور سائیں سائیں کرتے سناٹوں میں، جیسے ہم سب کو ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ کہ یہ بات ہی ایسی تھی، جس نے ہمیں ہی نہیں ہمارے مدمقابل کو بھی یک گونہ سی جھٹکا دینے والی خاموشی میں مبہوت کرکے رکھ دیا تھا۔ یہ بات بلراج سنگھ وغیرہ کے لیے ایک انکشاف کی صورت سہی، مگر میرے اور سوشیلا کے لیے تو سنسنی خیز اس لیے بھی تھی کہ رینا، جو اب تک ہماری خیر خواہی کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے بجالارہی تھی، اسی نے ہی ہمیں ایک دم مجرم ثابت کر ڈالا تھا اور وہ بھی محض ایک فون کال پر......

یوں اس نے گویا ہم پر خار کھائے ہوئے بلراج سنگھ کی چاندی کر ڈالی تھی اور اسے ہم پر ہاتھ ڈالنے کا کھل کر موقع مل گیا تھا۔

اب بلراج سنگھ نے مجھے گن پوائنٹ پر لے لیا تھا جبکہ سوشیلا کو اس کے ساتھی نے فوراً دبوچ لیا تھا، اب اس کے ہاتھ میں بھی سیاہ پستول نظر آرہا تھا۔ سوشیلا کا حسین چہرہ خوف و دہشت سے سُت کر رہ گیا تھا۔

”مس رینا! کیا آپ اپنی بات کی وضاحت کرنا پسند کریں گی؟“ میں نے اپنے اندر کی سنسناتی اُتھل پتھل پر قابو رکھتے ہوئے، اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”شٹ اَپ!“ رینا کے بجائے بلراج سنگھ نے بہ دستور مجھے گن پوائنٹ پر لیے ہوئے درشتی سے کہا اور پھر رینا سے پوچھا۔

”بے بی، کس کی فون کال تھی؟“

میری برماتی ہوئی نظریں رینا پر جم گئیں۔ خود میں بھی یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر کس نے رینا کو فون کرکے یہ انکشاف کیا تھا اور ہمیں عین وقت پر پھنسوادیا تھا۔

”مہیش کی کال تھی۔“ رینا نے جواب دیا۔ ”اس نے ٹی وی نیوز دیکھی تھی، اس وقت ملک کے ہر چینل پر اسی کی اور اس کی ساتھی کی تصویر دکھائی جارہی ہے۔ مہیش کے پیا مہلوک شرما ایس پی ہیں، انہیں بھی آج شام ہی یہ انفارمیشن ملی ہیں کہ سوشیلا اور شہزاد احمد خان نامی ایک پاکستانی دہشت گرد چوری چوری سرحد پار کرکے مذموم کارروائیاں کرنے کے لیے بھارت ماتا میں داخل ہوا ہے اور اس نے ممبئی کا رخ کیا ہے۔ جب مہیش نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے یہ تفصیل بتائی۔ میں کبھی بھی اپنے ملک کے دشمن کا ساتھ نہیں دے سکتی۔“ رینا کے لہجے میں ایکا ایکی جوش اُمڈ آیا تھا۔

”میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا بے بی کہ سرا ایڈوانی تو انہیں پہلے ہی پہچان چکے تھے۔“ بلراج نے ایک زہریلی نظر مجھ پر ڈالنے کے بعد رینا سے کہا۔

پھر رینا نے سوشیلا سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی، تم ایک دیش دروہی (دشمن) کے ایجنٹ کی ساتھی بنی ہوئی ہو اور اس کے ساتھ مل کر اپنے ہی پیارے دیش کی جڑیں کھوکھلی کررہی ہو۔“

سوشیلا نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے میں اس کے لیے ایکا ایکی کوئی اجنبی صورت اختیار کرگیا ہوں۔ اس کے بعد جواب میں وہ رینا سے جو کچھ بولی اس نے مجھے بری طرح چونکا کے رکھ دیا۔

”مجھے اس کا بالکل بھی علم نہ تھا، میرا وشواس کرو رینا جی! اس نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ یہ ادھر ہی کا رہنے والا ہے اور حالات کا ستایا ہوا ہے۔ اس کے دشمن اسے جان سے مارنا چاہتے ہیں اور اس پر ایک جھوٹا قتل کا مقدمہ قائم کیے ہوئے ہیں، یہ ممبئی پہنچ کر اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ مل کر اپنے قانونی دفاع کے لیے مقدمہ لڑنا چاہتا ہے۔“

”یہ جھوٹ بول رہی ہے، بے بی! اس کی باتوں میں اب مت آنا۔“ بلراج نے زہریلے لہجے میں رینا سے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

’’میں ابھی مہیش سے بات کرتی ہوں کہ وہ اپنے پپا کو بتا دے کہ اس دیش دروہی کو ہم نے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ وہ پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ ابھی یہاں پہنچ جائیں گے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ اپنے سیل فون پر ایک بار پھر مہیش سے رابطہ کرنے لگی۔ میرے اندر بری طرح پکڑ دھکڑ مچی ہوئی تھی۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ رینا کا وہ بوائے فرینڈ بھارت کی پولیس کا ایک ایس پی کا بیٹا نکلا تھا۔

اب رینا ساتھ چھوڑ چکی تھی، کم و بیش سوشیلا بھی اپنی جان بچانے کے لیے یہی کچھ کرنے والی تھی۔ یہ ’’دشمن ایجنٹ‘‘ یا ’’دیش دروہی‘‘ ایک تھا ہی ایسا ’’ایلیمنٹ‘‘ جو کسی بھی دیس کے عام آدمی کے بھی خیالات بدل ڈالنے کا سبب بن سکتا تھا جبکہ رینا تو تھی ہی ایک بھارتی ریٹائرڈ جرنیل کی پوتی...... سوشیلا کا معاملہ تھوڑے سے تفاوت کے ساتھ مختلف سہی...... مگر تھی وہ بھی آخر کو اسی ملک کی شہری، ایک ’’دیش دروہی‘‘ کا ساتھی بننا اسے غدار بنانے کے لیے کافی تھا اور وہ اس ’’لیبل‘‘ سے بچنا چاہتی تھی، یہ معاملہ ہی اتنا حساس اور نازک تھا کہ وہ اپنا اور میرا مشترکہ مشن بھی بھلا بیٹھی تھی شاید۔

’’گڈ بے بی!‘‘ بلراج سنگھ چہک کر بولا۔ ’’تم ایک اور کام کرو، مہیش سے کہو کہ وہ اپنے پپا کو جنرل صاحب کی رہائش گاہ میں بھیج دے...... اور......‘‘

’’ٹھیک اسی وقت میں نے اسے تھوڑا غافل پا کر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ بلراج بھی میری طرف سے کم محتاط نہ تھا، جیسے ہی میں نے اپنی سی انتہائی کوشش کرتے ہوئے، اس کے ٹارگٹ کو ’’بلینک پوائنٹ‘‘ کیا تو اس نے غیر ارادی اور کچھ ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پستول کی لبلبی دبا دی۔

’’ڈز‘‘ کی آواز سے گولی چلی، جو میرے بجائے اس کے ساتھی کے کہیں لگی، وہ کربہ انگیز چیخ سے تڑپا، سوشیلا اس کی گرفت سے آزاد ہوئی، بلراج نے سنبھل کر دوبارہ مجھے نشانہ بنانے کی کوشش کی، تب تک میں بلراج سے جا بھڑا تھا، میں نے اسے اپنے وجود کی بڑی زبردست ٹھوکر رسید کی تھی، اس قدر کہ پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا۔ خود وہ بھی اپنی گاڑی سے اس بری طرح ٹکرایا تھا کہ میری یہ طوفانی ٹکر وہ کبھی نہیں بھلا پاتا، کیونکہ وہ کار سے ٹکرا کر چھپکلی کی طرح چت سے زمین پر گرا تھا۔ میں پستول اٹھانے کے لیے لپکا، تب تک سوشیلا اپنے مدمقابل کا پستول اپنے قبضے میں لے چکی تھی۔ پستول اس نے رینا پر تان لیا تھا۔ جو اب خاصی خوف زدہ نظر آنے لگی تھی۔

’’شہزی! رینا کو ساتھ لے چلو اسی گاڑی میں، جلدی، ہمارے پاس وقت نہیں بچا۔‘‘ سوشیلا کو میں نے خود سے یہ کہتے سنا تو مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی، اس کا حب الوطنی کا جذبہ نجانے کہاں عنقا ہو چکا تھا یا پھر کوئی اور بات تھی، بہرکیف جو کچھ بھی تھا، فوراً حرکت میں آنے کا متقاضی تھا۔

سوشیلا نے تب تک رینا کا سیل فون چھین کر ایک طرف اچھال دیا جو اس نے ٹھیک ہی کیا تھا کیونکہ اس میں ’’لوکیشن میپ‘‘ آن ہونے کا خطرہ موجود تھا۔ وہ رینا کو دبوچے کار کی طرف بڑھی، بلراج نے غراتے ہوئے زمین سے اٹھنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اسے اپنی جگہ محبوس رہنے کا درشت حکم دیا۔

’’تم دونوں نہیں بچ سکتے...... بے بی کو چھوڑ دو۔‘‘ وہ گرجا۔ میں نے طیش تلے ہونٹ بھینچ کر ایک لات اس کے پیٹ پر رسید کر دی اور وہ بری طرح کراہ کر رہ گیا پھر آناً فاناً ہم کار میں سوار ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

رینا اب ہمارے قبضے میں تھی۔ سوشیلا نے اسے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ وہ اب بھی تھوڑا ہمت کیے ہوئے تھی اور سوشیلا کی ملکی حمیت کو جگانے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ سوشیلا نے اسے بُری طرح جھڑک دیا تھا۔

’’کہاں چلنا ہے؟‘‘ میں نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ اور نظریں ونڈ اسکرین کے پار سامنے مرکوز رکھتے ہوئے سوشیلا سے پوچھا۔

’’مہیش کی رہائش گاہ پر......‘‘ سوشیلا نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور مجھے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

’’واٹ......؟ تم پاگل ہو گئی ہو؟‘‘

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ میری گدی سے پستول کی سرد نال آ لگی...... ساتھ ہی سوشیلا کی پھنکارتی ہوئی زہریلی آواز ابھری۔

’’جو میں نے کہا ہے وہی کرو...... ورنہ تمہاری گردن میں سوراخ کر دوں گی......‘‘

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

قسط:29

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اُس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے اُنسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال اُن کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، کلیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولووش

انائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ ہا تا ہے۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے ہے۔ لولوش ادر سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوتلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا نے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو نقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس ہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ۔سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے ں کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی پڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں ریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت پڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب تی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جونکی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک لینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی...... مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل بیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور دنوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ ہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ۔ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سوشیلا کے لہجے میں زہر کی کاٹ تھی......

حالات جس تیزی اور غیر متوقع انداز میں پلٹا کھا ہے تھے، اس نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم اتنی ہی ری کے ساتھ مجھے ان ساری باتوں کا وجدان بھی عطا ہو تھا کہ میری قوتِ مشاہدہ بھی وقت کے ساتھ بڑھ رہی ہ۔ جس کے مطابق، رینا کا مجھ سے ایکا ایکی بددل ہو جانا ۔ اسے ایک حد تک میری حقیقت کا پتا لگنا، میری بدقسمتی تھی، ورنہ تو میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھیک ک پوزیشن میں آچکا تھا۔ مگر اب تو وہ پتے بھی ہوا دینے جن پہ تکیہ کیا تھا یعنی اب سوشیلا کا بھی مجھ سے دل خراب سنے لگا تھا، دشمن ایجنٹ یا دیش دروہی، ایک ایسا ہی ہاٹ تھا کہ اس سے یہاں کا کوئی بھی آدمی میرے ساتھ سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی وہ خود پر ”غدار“ کا ٹھپا لگانا پسند کرتا، شاید یہی حال سوشیلا کا ہوا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ مجھے ایک ملک دشمن ایجنٹ سمجھنے کے بعد وہ اپنی ایڈوانی والی مہم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دے رہی۔ اس پر مجھے سخت پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ مجھے اپنے سلسلے میں پہلے ہی سوشیلا کو اعتماد میں لے لینا چاہیے تھا......

جب میں نے بلراج سنگھ پر حملہ کیا تھا تو اس وقت بھی سوشیلا کا میرا ساتھ دینے کا ایک اپنا مقصد تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی خود کو بلراج سنگھ کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، جانتی تھی وہ اچھی طرح کہ ایک بار وہ ان کے (جنرل ایڈوانی) کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ اس کے ساتھ بھی اس کی بہن والا حشر کریں گے لیکن اب جبکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ رینا کا

بوائے فرینڈ مہیش کا باپ بھارتی پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایس پی تھا تو اس نے اسی لیے مجھے اس کے حوالے کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اب سوشیلا سے متعلق اتنی صورتِ حال مجھ پر وجدانی محرکات سے واضح تو ہوگئی تھی کہ وہ ایک طرف خود کو ایڈوانی جیسے درندہ صفت انسان سے بچا رہی تھی اور دوسری طرف مجھے، یعنی ایک ''دیش دروہی'' کو پولیس کے حوالے کر کے اپنے سر سے یہ دوسری مصیبت (ایڈوانی کے بعد والی) یعنی غداری کا دھبا دھونا چاہتی تھی، وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میرا اور اس کا ساتھ ان مخدوش حالات میں زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

کرنل سی جی بھجوانی نے دونوں اطراف سے میرے گرد تارِ عنکبوت بُننا شروع کر دیے تھے۔ ایک طرف وہ اسپیکٹرم کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلا رہا تھا تو دوسری طرف اس نے پولیس بھی میرے پیچھے لگا دی تھی۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرے خوف سے اس قدر بوکھلا گیا تھا کہ خود اپنی کارروائی کو بھی ''سیکریٹ'' نہیں رکھ سکا تھا۔ چاہے جیسے بھی سہی، ایک بار میں اس کی گرفت میں آجاؤں...... ورنہ تو کوئی بھی ملک ہو، ان کی سیکریٹ ایجنسیاں، اپنی بعض خفیہ کارروائیاں اور ''کاز'' کو خفیہ ہی رکھتے ہیں۔

بہرحال میں نے بلاچون و چرا، کار کو اسی جانب موڑ لیا، جہاں مہیش کی رہائش پر تھوڑی دیر پہلے ہم نے اسے ڈراپ کیا تھا۔

''گڈ! تم نے یہ کام کر کے بھارت ماتا کا سر فخر سے بلند کر دیا...... مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن جہاں بات دیش اور آدرش کی ہوگی، میرا خیال ہے ہر بھارتی کا دل ایک ہو کر دھڑکے گا۔'' ریتا نے ستائشی لہجے میں سوشیلا سے کہا۔'' جبکہ میں بہ ظاہر خاموشی سے پُرسوچ انداز میں اپنے دانت بھینچے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔'' اس پر سوشیلا نے گہری متانت کے ساتھ اس سے کہا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ میں دھوکے سے اس کے جھانسے میں آگئی تھی۔''

''لیکن پھر تم نے میرے محافظوں کو کیوں چھوڑا، وہ یہ کام بہتر طور پر کر سکتے تھے۔'' ریتا نے اس سے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔'' اِدھر میرا ذہن بھی تیزی سے کچھ سوچنے میں مگن تھا۔

''تمہارے دڈو اور ان کے محافظ کا مقصد کچھ اور تھا میرے سلسلے میں...... زندگی رہی تو تمہیں تمہارے دڈو کی بھی اصلیت بتا دوں گی۔ تمہیں......''

''واٹ؟ کیا مطلب؟''

''چھوڑو اس موضوع کو، تم ابھی اپنے سیل پر مہیش سے رابطہ کرو اور......'' سوشیلا کی بات حلق میں ہی رہ گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایک نسبتاً تنگ اور ویران سا موڑ کاٹا اور تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ گھما کر بریک لگا دیے کہ کار مڑتے ہی اسکڈ ہوئی اور ایک طوفانی جھٹکے سے جام ہوگئی، چونکہ میں تو سنبھلا ہوا ہی تھا، مگر ریتا اور سوشیلا اس کے لیے تیار نہ تھیں، نتیجتاً انہیں ایک زبردست جھٹکا لگا اور ان کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی، ادھر میں نے کار رکتے ہی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنے اوپری دھڑ کو موڑا اور سوشیلا کے پستول پر ہاتھ مارا، اسے اپنے قبضے میں کرتے ہی، میں نے ان دونوں کو اپنی جگہ محبوس رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان دونوں عورتوں کے چہروں سے خوف اور سراسیمگی ٹپکنے لگی تھی اور وہ پھٹی پھٹی متوحش سی آنکھوں سے میرے چہرے کو تکے جا رہی تھیں۔

''میں تم دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن مس ریتا! میری صرف ایک بات غور سے سن لو، میں تمہیں اپنی حقیقت بتانا چاہتا ہوں...... کہ میں اصل میں ہوں کون......!''

اتنا کہہ کر میں نے ایک محتاط سی نگاہ گرد و پیش پر ڈالی، ہر سُو تاریک رات کا دم بہ خود سناٹا طاری تھا۔ یہ تنگ موڑ مین روڈ سے کسی ذیلی سڑک کی طرف مڑتا تھا، جس کے اطراف میں جنگل اور بنجر سا ویرانہ پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

''مس ریتا!''

میں نے ایک نظر اس کے ساتھ جڑی بیٹھی سوشیلا پر ڈالنے کے بعد ریتا سے مخاطب ہو کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے دل میں اپنے دیش بھارت کے لیے حب الوطنی کا یہ جذبہ ہے تو اس میں اگر جذبۂ آدم گری اور انسانیت بھی ہے تو یہ تمہاری ایک قابلِ احترام اور قابلِ لحاظ سوچ اور وسیع النظری کہلائے گی، جس کی ہر مذہب اور ہر ملک کے باشندے کو تائید کرنی چاہیے، اس میں تم مجھے بھی شامل کر سکتی ہو لیکن اگر تمہارا جذبہ صرف دیش بھگت تک محدود ہے اور اس کے سامنے تم انسانیت اور اس پر رائج اصولوں کی نفی کرتی ہو تو یہ محض ایک تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہوگا، ایک بات تو طے ہے کہ دنیا کا کوئی بھی

ہب ہو وہ سب سے پہلے انسانیت کے جذبے کا پرچار کرتا ہے اور اس کے احترام کا درس دیتا ہے۔ بلاوجہ کسی کو ستانا، زام تراشی کرنا، سازشیں کرنا...... یہ ایک انسان کو زیب ہیں دیتا۔

”تمہاری طرح مجھے بھی اپنے وطن پاکستان سے پیار ہے۔“ لیکن میرے اس جذبۂ حب الوطنی میں کسی تنگ نظری ور برتری کا کوئی غرور نہیں ہے، اب میری بات غور سے منا۔“

اتنا کہہ کر میں ذرا رکا اور پھر ایک نظر دوبارہ گرد و پیش ر ڈالنے کے بعد رینا سے بولا۔ اس کے ساتھ سوشیلا بھی یری باتیں غور سے سن رہی تھی۔

”تمہارے دیش کے مہاویر چکر...... جو آئے دن نسانیت کے پرچار اور سیکولر ہونے کا راگ الاپتے رہتے یں، کیا تم ان کے کرتوتوں سے واقف نہیں ہو؟ جبکہ آدھے سے زیادہ بھارتی جنتا کو پتا ہے کہ پاکستان جب سے معرضِ جود میں آیا ہے، بھارت نے اسے دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ ایک مخصوص لابی، جو ابتدا سے ہی میرے وطن کستان میں انتشار پھیلانے اور اسے توڑنے کے مذموم زائم کے منصوبے بناتی رہی ہے، جس کی مثال پاکستان میں را ور اس کے ایجنٹوں کی گرفتاری ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنے میں بھی تمہارے ہی ملک کے جرنیلوں، افسروں اور تعصب وجنونی سیاسی شخصیات کارفرما رہی ہیں۔ تمہارے یش کی ..... انتہا پسند ہندو تنظیموں، بجرنگ دل، اکالی دل، نیو سینا، آر ایس ایس نے یہاں مقیم کتنے ہی اقلیتوں کا جینا زام کر رکھا ہے، بابری مسجد کا واقعہ، گجرات میں مسلمانوں کا تل عام اور مقبوضہ کشمیر میں نہتے بے گناہ لوگوں پر بھارتی ظالم کی ویڈیو اور کوریج تو غیر ملکی صحافیوں نے بھی کی ہے۔ تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو ریناجی......! کہ ان حرکتوں کی وجہ سے خود تمہارے اپنے ہی لوگ اپنے دیش کا منہ پوری دنیا یں کالا کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ دنیا میں مہذب کہلا ہے ہیں۔ ہم نے (پاکستان نے) ان سب باتوں کے وجود...... ہمیشہ اچھے پڑوسی ہونے کے ناتے پھر بھی ھارت کی طرف دوستی، امن اور بھائی چارے کا ہی ہاتھ ڑھایا ہے، اور ہمیشہ پڑوسیوں سے اچھے تعلقات کا خواہاں رہا ہے، کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام سب کے ساتھ امن کا رس دیتا ہے، کیونکہ ہم اپنے نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ کے رمان پر چلتے ہیں کہ اگر تمہارا پڑوسی تم سے خوش نہیں ہے تو تم ومن نہیں ہو مگر تمہارے ملک کے مہاویر ہمارے گلے بھی ملتے ہیں اور اقوام متحدہ میں ہمارے خلاف زہر اگلتے ہیں، یعنی منہ میں رام رام اور بغل میں چھری رکھتے ہیں۔ ہم ایک انسان کی ہلاکت کو پوری انسانیت کی ہلاکت پر تعبیر کرتے ہیں، اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن ہمیں کم از کم اپنی تو کوئی راہ متعین کرنی چاہیے کہ رائج اور مہذب اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔

”ریناجی! اب ذرا انسانیت کی نظر سے دیکھو اور سوچو...... اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں......تو سنو...... میں بے شک ایک پاکستانی محبِ وطن شہری ہوں، لیکن اس سوچ کے ساتھ کہ اس جذبہ تلے، انسانیت کا جذبہ متاثر نہ ہو، خواہ وہ کسی اور ملک کا... شہری ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ میں ایک پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان بھی ہوں اور میرا مذہب اسلام مجھے یہی درس دیتا ہے۔ آخر میں ایک اور بات بتا دوں جو یقینی طور پر ایک عام مگر باشعور شہری کی حیثیت سے تمہیں بھی شاید اس کا کچھ اندازہ ہو۔“

ایک بار پھر میں نے لمحاتی توقف اختیار کیا اور آگے بولا ....”عام عوام چاہے جس ملک کی ہو، وہ امن پسند ہی ہوتی ہے، ان کا مفاد امنِ عامہ ہی ہوتا ہے لیکن یہ جنگ و جدل، نفرتوں کا زہر پھیلانا، اس کے پسِ پردہ بعض مفاد پرستوں کا اپنا ذاتی مقصد ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ انتہا پسند تنظیمیں ہوں یا سیاسی شخصیات، یہ انہی کے سارے کھیل ہوتے ہیں، جنہیں اپنے اقتدار، اپنی کرسی اور شاہانہ طاقتوں سے لبریز اپنی گدی ہی عزیز ہوتی ہے۔ یہ عام عوام کے جذبات کو ابھار کر محض اپنا الو سیدھا کرتے ہیں، انہیں آپس میں لڑاتے ہیں اور ان کے شعور اور ان کی سوچوں کو اپنے تابع بنا کر جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی اپنا غلام بنا لیتے ہیں، میں یہی کہوں گا کہ ہر انسان کو اللہ نے عقل دی ہے، وہ حقائق اور شواہد کے مطابق اپنے ادراکی شعور سے بہت کچھ خود بھی سمجھ سکتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے کی سوچ سمجھ کو اختیار کرے۔“

اس کے بعد میں نے اسے اپنے باپ کے بارے میں بتایا اور بلیوتلسی کے کرنل سی جی بھجوانی کی انسانیت سوز ریشہ دوانیوں کا بھی حال اسے سنایا، اس کے بعد میں نے اس کے اپنے ہی ددّو (جنرل ایڈوانی) کی سامنے کی مثال بھی دیتے ہوئے اس کے کالے کرتوں کے در وا کیے کہ کس طرح وہ عالمِ انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے لیے عمل پیرا تھا۔ یہ حقیقت تو یوں بھی، سوشیلا کی صورت میں اس

کے سامنے ہی تھی جس کی سوشیلا نے بھی تائید کی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئی تھیں۔

''اب بولو مس رینا! کیا کہتی ہو تم اپنے ان مہاویروں کے بارے میں جنہیں تم بھارتی جنتا اپنا نجات دہندہ اور نجانے کیا کیا سمجھتی ہو...... اگر تمہارے اندر ضمیر نام کی بھی کوئی شے ہے تو یقیناً تم اس پر شرمسار ہوگی...... میں جا رہا ہوں...... تم دونوں کو کوئی بھی نقصان پہنچائے بغیر...... لیکن اب سوشیلا کی جان کی حفاظت کی ذمّے داری تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اس کا میں نہیں تمہارا دڈو دشمن ہے۔ میں تو انسانیت کے ناتے اس کی مدد کر رہا تھا، اور یوں یہ بھی میرے اس مشن میں شامل تھی کہ ہم دنیا کو تیسری عالمی جنگ کی آگ میں جھونکنے سے بچائیں۔''

یہ کہہ کر میں مڑا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اسی وقت رینا اور سوشیلا بھی فوراً نیچے اتر آئی تھیں، میں اس وقت پستول اپنی پینٹ کی بیلٹ میں شرٹ کے نیچے اُڑس رہا تھا کہ مجھے ان دونوں کی کورس میں آواز سنائی دی۔

''شہزی...... !پلیز رک جاؤ......''

میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف گھوما۔''

آسمان پر چاند پوری طرح روشن تھا، اس کے گرد منور تاروں کا حصار قائم تھا۔ سبک خرام ہوا کے جھونکوں سے میرے سر کے بال پیشانی پر دائیں آنکھ کے نیچے لہرا تھرتھرا رہے تھے، میں نے ایک سر کے خفیف جھٹکے سے انہیں پرے کیا اور ان دونوں خواتین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میرے قریب آگئی تھیں۔ میں خاموش مگر تیز نظروں سے ان کے بشروں کو دیکھ رہا تھا، جہاں مجھے اپنی باتوں کے مثبت اثرات نظر آرہے تھے۔

''شہزی! میرا دل تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم بائے نیچر ایک اچھے انسان ہو...... تم نے اپنے جس انداز اور رویے سے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، کاش! یہ سب کچھ مجھے تم پہلے ہی بتا دیتے تو......'' سوشیلا یہ کہتے ہوئے چپ سی ہوگئی، اس کا لہجہ رندھ سا گیا تھا، رینا نے حوصلہ افزا انداز میں سوشیلا کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مجھ سے بولی۔

''تم نے اپنے اچھے انسان ہونے کی ایک جھلک مجھے بیچ ریسٹورنٹ میں دکھائی تو تمہارے اس عمل سے میں بے حد متاثر ہوئی۔ لیکن اب جو باتیں تم نے مجھ سے کہیں، وہ تمہارے اس سے بھی زیادہ ایک اچھے انسان ہونے کی غمازی کرتی ہیں۔ سچ کہوں تو میں تمہارے سامنے خود کو بہت چھوٹا انسان سمجھ رہی ہوں اور سوشیلا کے معاملے میں تو میں خود کو اس کی مجرم بھی سمجھنے لگی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میرے دڈو، جن پر ہمیشہ میں اس لیے فخر کرتی تھی کہ وہ اس دیش کے ایک کمانڈر جنرل رہ چکے ہیں لیکن افسوس کہ وہ تو انسانیت کے معیار اور میری نظروں سے بھی خود کو نیچے گرا چکے ہیں۔ اگر تم ہمیں معاف کر دو تو یہ تمہارا ہم پر بڑا احسان ہوگا؟''

''میں معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں بھلا۔'' میں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرے لیے یہی بہت ہے مس رینا! کہ آپ نے میری باتوں کو پورے اعتماد اور سچائی کے ساتھ صحیح جانا، بس! اب سوشیلا کی ذمّے داری تمہیں سونپتا ہوں، اس بے چاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے، ہو سکے تو اسے انصاف دلانے کی کوشش ضرور کرنا، بہ صورت دیگر اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دینا، میرا راستہ اور منزل تو پھر بھی الگ ہی تھا، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں پلٹا تو سوشیلا مجھے پکارتی ہوئی ایک دم میرے سامنے آگئی اور بولی۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟ کون ہے تمہارا یہاں؟ نہیں جانتے تم کہ سارے دیش کی پولیس اور خفیہ ایجنسی تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ مجھے اب اپنی کوئی پروا نہیں مگر تم......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی، میں نے غور سے اس کے سندر چہرے کی طرف دیکھا، اس کی کشادہ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ ایک اَن کہے تعلقِ خاطر کا پتا دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ نرم لبوں پر ایسا ارتعاش تھا کہ جیسے دل کی آواز ہونٹوں تک آتے آتے ٹھہر جائے۔ جیسے جدائی کے متوقع لمحات کے جاں گسل خوف کا اظہار ایک تاثر کا ثبات بن کر بہ زبانِ خاموشی چیخ اٹھے۔ اسی وقت رینا بھی چند قدم بڑھ کر میرے قریب آگئی۔ اس کی نگاہوں میں بھی ایک نامعلوم سے کرب کی آنچ دہکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مجھے......

''نہیں شہزی! تم نہیں جا رہے...... ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں مگر سوشیلا کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ تم واقعی ہر طرف سے بڑے خطرات میں گھرے ہوئے ہو بلکہ خود سوشیلا کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہے۔ پلیز شہزی! اب تو تم نے سب کلیئر کر دیا کہ تمہارا راستہ انسانیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی بھلائی کا راستہ ہے، برے کو برا ہی کہنا اور سمجھنا چاہیے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اچھا انسان سب کے لیے اچھا اور برا سب کے لیے برا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت کا شکار ہو سکتی

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

جہانگیر بکس

91
Since 1929
JAHANGIR BOOKS

آخری معرکہ 550/-

ب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو
ے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم
ں کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا
رہ غصّے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش
ئیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مُسافر 475/-

دلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی
ے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت
سوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-

م نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر،
نھوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں
ی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-

لہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی،
خلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان
سلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمُشدہ قافلے 500/-

انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد 300/-

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الارا داستان

پردیسی درخت 450/-

اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یُوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-

فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمّد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-

سیّد خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-

بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سبق آموز کُتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اُردو زبان کا پہلا لغت

جہانگیر بُک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609
021-32765086

ہو۔'' میں نے گلوخلاصی چاہی، حقیقت یہی تھی کہ تازہ کار حالات کی طرفہ کاری کے بعد خود مجھے ان مخدوش تر حالات میں اپنے راستے کا تعین کرنا مشکل ہی نظر آرہا تھا۔

''آئی ڈونٹ کیئر، کچھ نہیں ہوگا، ہم مل جل کر راستے آسان بنالیں گے لیکن اس وقت تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تم چلو ابھی میرے ساتھ......''

''کہاں......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''آؤ تو سہی، بعد میں بتاتی ہوں، وقت بہت کم ہے۔ آؤ سوشی! تم بھی۔''

وہ خاصی جوش میں آگئی تھی۔ وہ کار کی طرف بڑھی۔ ڈرائیونگ سیٹ اس وقت اسی نے سنبھالی، اس نے سوشیلا کو ہی اپنے برابر میں اور مجھے عقبی سیٹ بیٹھنے کا کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کار فراٹے بھرتی ہوئی کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

☆☆☆

ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسانی...... کاروبارِ زیست چلانے کے لیے تقدیر کی یہ طرفہ کاری ازل سے جاری ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا تھا کہ میری راہ میں مشکلات زیادہ اور آسانیاں بہت تھوڑی رہی تھیں۔ رینا کی صورت میں ان مخدوش ترین حالات کا پھندا میرے گلے کے گرد کچھ ڈھیلا تو پڑا تھا مگر اترا نہیں تھا۔ ابھی امتحان اور بھی تھے...... یہ کیا کم شکرگزاری کی بات تھی کہ بگڑتے ہوئے حالات یکلخت قابو میں آنے لگے تھے۔ کم سہی، لیکن فوری طور پر جیسے خطرہ میرے گلے کو آن پڑا تھا وہ عارضی طور پر سہی کچھ کم ضرور پڑا تھا۔

سوشیلا اور بالخصوص رینا کا میری باتوں سے متاثر ہونا، اس بات کا بیّن ثبوت تھا کہ میری وہ باتیں صرف زبان سے ہی ادا نہیں ہوئی تھیں بلکہ دل سے نکلی تھیں، ان میں جذبات کی سچائی کی تپش بھی شامل تھی۔ سچائی تو اپنا اظہار خود کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ رینا کو بھی اس راہِ پُرخار میں ہمرکاب بناؤں...... جبکہ سوشیلا کا معاملہ اور تھا۔ رینا کی ابھی عمر ہی کیا تھی، بہ مشکل اٹھارہ، انیس سال، اس نے ابھی کیا دیکھا تھا؟ مگر پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی، میں اس سے چار پانچ سال کے وقفے سے بڑا تھا اور سوشی بھی لگ بھگ میری ہی عمر کی تھی۔

اس دوران رینا کا سیل بار بار بج رہا تھا مگر اس نے کال اٹینڈ کرنے کے بجائے اسے سائیلنٹ پر کر دیا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ کال کن لوگوں کی ہوسکتی ہے۔ اس دوران میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کار نامعلوم منزل کی طرف دوڑی جارہی تھی۔ ہمارے بشروں پر گمبھیر خاموشی طاری تھی۔

اندازاً پندرہ، بیس منٹ بعد ہی رینا ہمیں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں لیے داخل ہوئی۔ گیٹ پر چوکیدار ایک بینچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے رینا نے مجھے نیچے جھک جانے کا کہا تھا۔ چوکیدار شاید رینا کو جانتا تھا۔ اس نے سیکیورٹی گیٹ کھول دیا، وہ کار لیے اندر آگئی۔ یہاں انڈرگراؤنڈ پارکنگ تھی۔ کار پارک کر کے ہم نیچے اتر آئے اور رینا کی تقلید میں لفٹ کی جانب بڑھے۔ تیسرے فلور پر ہم ایک 203/B اپارٹمنٹ کے دروازے پر رکے، اس میں ہتھنی قفل لگا ہوا تھا۔ رینا اس میں چابی گھمانے لگی۔ میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ دروازہ کھولنے کے درمیان بول پڑی۔

''یہاں تم دونوں محفوظ رہو گے۔ فی الحال یہ مناسب ٹھکانا ہے، آجاؤ...... یہ خالی ہے۔''

میں نے قدرے طمانیت کی سانس لی اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہ شاندار اپارٹمنٹ تھا۔ اب پتا نہیں یہ رینا یا اس کے ددو کی ملکیت تھا یا پھر اس کی کسی سہیلی وغیرہ کا تھا۔

''تم یہاں آرام سے کچھ وقت گزار لو، جبکہ میرا اب زیادہ دیر یہاں رکنا مناسب نہ ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''یہاں ضرورت کی ہر شے موجود ہے، مگر خبردار! کوئی فون اٹینڈ مت کرنا۔ میں واپس جارہی ہوں اور مزید حالات کی جان کاری لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ مہیش اور اپنے ددو سے بھی تم دونوں کے متعلق بات بنانا ہوگی، بلکہ اب تو مہیش کے پپا بھی مجھ سے تم لوگوں کے سلسلے میں پوچھ تاچھ کریں گے۔ انہیں بھی مجھے مطمئن کرنا ہوگا، یوں سمجھو مس گائیڈ کرنا ہوگا۔ بہر حال...... میں مناسب وقت دیکھ کر خود ہی آؤں گی۔''

''یہ کس کا فلیٹ ہے؟'' میں نے آسان الفاظ میں پوچھا

''میری ایک دوست کا ہے، وہ گوا گئی ہوئی ہے، اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آئے گی۔'' رینا نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ ہمیں مزید چند ہدایات دے کر جانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔

''ایک کام اور کرسکتی ہو؟''

''ہاں! کہو؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا تم کہیں سے ریڈی میک اَپ کے سامان کا بندوبست کرسکتی ہو؟''

وہ ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لی۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں، یہ میرے ہن میں بھی تھا۔ تم دونوں کا بہروپ بدلنا ضروری ہے، تم تانہ کرو، میں بہ آسانی یہ ساری چیزیں لے آؤں گی۔“ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ رینا اپنی عمر سے بڑھ کر عقل مند ثابت ہو ہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک ریٹائرڈ بھارتی جی افسر کی پوتی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ اس کا باپ بھی ایسی لسی پوسٹ پر رہا ہو، مگر ابھی تک مجھے رینا کے متعلق اتنی بان کاری نہیں ہوسکی تھی کہ رینا کے ماں باپ زندہ بھی تھے نہیں۔

بہرکیف...... میں نے حلق سے ایک گہری ہمکاری رج کر کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ اپارٹمنٹ خاصا آرام دہ ور کشادہ تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد میں ایک صوفے پر یٹھ گیا۔ سوشیلا سے ابھی میں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ریج سے پانی کی بوتل اور کچھ کھانے پینے کی اشیا نکال ائی۔ جس کی اجازت رینا نے بھی دی تھی۔

وہ اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ میں نے رف پانی پیا اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر تھکے تھکے نداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔

”مجھ سے ناراض ہو ابھی تک......؟“ معاً سوشیلا کی زم سی آواز ابھری۔

”نہیں۔“ میں نے یونہی اپنی آنکھیں موندیں رکھتے ہوئے مختصراً جواب دیا۔

”میرا یوں تمہاری طرف سے بہک جانا ایک فطری عمل تھا، میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا لیکن سچائی کا علم ہوتے ہی میرا ہی نہیں رینا کا بھی دل تم سے اب صاف ہو گیا ہے۔“ اس نے کچھ صراحت سے کہا تو میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی اور گہری نگاہوں سے مجھے تکے جارہی تھی۔ میں نے متانت سے کہا۔

”اس موضوع کو چھوڑو اب...... مجھے رینا کا ساتھ بھی اپنے مشن میں رکاوٹ لگ رہا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ اس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”مجھے تو بلکہ خوشی ہورہی ہے کہ رینا کی وجہ سے ہماری یہ مہم اور بھی آسان ہوجائے گی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر وہ تمہاری بہن اوشا اور اس کی فیملی کا ایک سنگ دل قاتل ہے، ہیرا برآمد کرنے کے بعد ہمیں اسے جہنم رسید کرنا تھا۔“

”وہ تو کریں گے ہی، اسے نرک میں پہنچانا تو ویسے بھی پوری عالمِ انسانیت پر احسان ہوگا۔“ وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بولی تو میں نے کہا۔

”تم شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھی ہو۔“

”مطلب؟“ اس نے وضاحت طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”جنرل کے ایل ایڈوانی رینا کا دادّو ہے، اور وہ اس سے محبت کرتی ہے، وہ کیسے چاہے گی کہ وہ ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو؟ یہی کچھ ہمیں سوچنا پڑے گا اب کہ رینا ہماری محسنہ کی صورت اختیار کرچکی ہے۔“

میری بات سن کر سوشیلا کو بھی ایک پُرسوچ سی چپ کھا گئی۔ اس نے شاید واقعی اس حساس نکتے پر سوچا ہی نہ تھا۔

”میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ رینا کو اپنے ساتھ یا اپنی کسی مدد وغیرہ میں شامل کرتے۔“

”ابھی جیسے چل رہا ہے، چلنے دو...... وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ پہلے ہیرا تو اس کے قبضے سے برآمد کرلیا جائے۔“ بالآخر اس نے ایک تھکی تھکی سی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ اس کی بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ اب اصل مسئلہ ہیرے کی برآمدگی کا تھا...... مجھے یہ دونوں اہم مشن اب کھٹائی میں پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ بلیو تلسی اور بھارتی پولیس کو بھنک مل چکی تھی ہم ممبئی یا اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

”ہمیں رینا کے پروں سے نکلنا ہوگا...... تم ایک کام کرو سوشی! موہن کو فون کرو کہ وہ کہاں ہے اور کہاں رہ گیا تھا؟“

بالآخر میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں آئے ایک خیال کے تحت حتمی لہجے میں سوشیلا سے کہا۔ ”ان حالات میں موہن ہمارے لیے بہتر ثابت ہوگا، کیونکہ اس کا اور ہمارا مشن ایک ہی ہے۔“

”لیکن تم یہ کیوں بھول گئے کہ موہن تک بھی ہمارے سلسلے میں وہ ساری خبریں پہنچ چکی ہوں گی، جس کے متعلق رینا نے کہا تھا کہ ہماری فوٹو اور کارگزاریاں ملک کے ہر ٹی وی چینل پر دکھائی جارہی ہیں۔ وہ میرے سلسلے میں تو شاید نہیں لیکن اب تمہارے بارے میں ابہام کا شکار ہوسکتا ہے۔“

سوشیلا کی یہ بات سوچنے کی تھی، میں نے کہا۔ ”تم مجھ سے قائل ہوچکی ہو، اب تم ہی موہن کے بارے میں بتا سکتی ہو کہ وہ میرے سلسلے میں کس حد تک متاثر یا قائل ہوسکتا

ہے؟''

''میرے تو خیال میں اسے قائل ہو جانا چاہیے۔ یوں بھی وہ کچھ اور ہی مزاج کا آدمی ہے۔'' سوشیلا میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ فون قریب ہی ایک خوب صورت فینسی اسٹینڈ پر رکھا تھا، وہ موہن کو فون کرنے کے لیے اٹھی تو میں نے اسے چند ضروری ہدایات دے ڈالیں کہ اسے موہن سے کیا بات کرنا تھی اور کیا بتانا تھا۔

''میری طرح وہ بھی ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بھرا بیٹھا ہے۔'' وہ جواباً بولی۔

یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہیلو! موہن؟'' سوشیلا نے نمبر ملاتے ہی استفساریہ کہا اور پھر دوسری جانب سے کچھ سنتی رہی، اس کے بعد اس نے میری ہدایات کے متعلق اسے بتایا۔

''موہن! تمہارے نہ آنے کی وجہ سے ہم وہاں بیچ ریسٹورنٹ میں ایک بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے تھے، باقی تفصیل تو ملاقات ہونے پر ہی بتا سکتی ہوں، بس! اتنا جان لو ابھی کہ...... وہاں اتفاقیہ طور پر ایڈوانی کے اسی جلاد صفت آدمی بلراج سنگھ نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اس سے بڑی مشکلوں سے جان چھڑا کر نکلے ہیں۔ او...... ابھی نہیں...... بس! فی الحال مجھ سے رابطے میں رہو اور واپس لوٹ جاؤ۔ ہم اس وقت اپنے ایک ہمدرد کا ٹھکانا نہیں چھوڑ سکتے، اس کی واپسی جلد ہوگی، اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گی۔''

دوسری طرف سے وہ موہن کی کوئی بات سنتی رہی اور پھر جواب میں بولی۔

''میں سب جانتی ہوں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، یہ سب ایڈوانی کی شرارت ہے، وہ اس ایشو کو ہاٹ بنا کر میرے خلاف جال بُننا چاہتا ہے۔ بتا رہی ہوں ناں کہ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں بلراج سنگھ کی نظروں میں آگئی۔ او کے! باقی تفصیل ملاقات پر ابھی تھوڑا انتظار کر لو، بائے۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر کے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟ کہاں رہ گیا تھا وہ......؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہی کہہ رہا تھا کہ راستے میں اس کی کار میں کوئی خرابی ہو گئی تھی۔ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ باقی اس تک بھی تمہارے متعلق خبریں پہنچ چکی ہیں۔''

''ٹی وی آن کرو ذرا......'' اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا، وہ بھی چونک کر بولی۔

''اوہو...... اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ سامنے ایک دیوار پر ایل ای ڈی لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی ریموٹ رکھا تھا، سوشیلا نے اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور دوبارہ میرے قریب آ کر صوفے پر براجمان ہو گئی۔

اب ہماری دھڑکتی ہوئی نظریں اسکرین پر جم گئی تھیں۔

تقریباً ہر بھارتی چینل پر اس وقت میری اور سوشیلا کی فوٹیجز دکھائی جا رہی تھیں۔ مبصر، تجزیہ کار اور نجانے کون کون، میرے حوالے سے پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے میں مصروف تھے۔ مجھے اسی بات کا زیادہ قلق ہونے لگا کہ یوں میرے ملک کو بدنام کیا جا رہا ہے، بھارت جو پاکستان کو عالمی برادری میں بدنام کرنے کے لیے ہمیشہ ہی ایسے کسی موقع کی تاک میں رہتا آیا ہے، یہ الگ بات تھی کہ بعد میں اس کا ہر دعویٰ کھوکھلا ہی ثابت ہوتا تھا۔ لیکن میں بھارت میں کسی قسم کی دہشت گردی نہیں کرنے آیا تھا، نہ ہی کوئی ملکی راز چرانے آیا تھا بلکہ مجھ پر دشمنوں نے جو جنگ مسلط کی تھی، میں اس کا جواب دینے آیا تھا۔ بلیوتلسی کا کرنل سی جی بھجوانی پاکستان کو دولخت کرنے کی لابی سے تعلق رکھتا تھا۔ را کا یہ ونگ (بلیوتلسی) خصوصی طور پر پاکستان کے خلاف مذموم خفیہ سازشوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جس کی مثال وطنِ عزیز میں بھارتی ایجنٹوں کی ملک دشمن خفیہ سرگرمیاں اور ایک بین الاقوامی گینگ اسپیکٹرم کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا۔ بلیوتلسی والے ہر ممکن طریقے سے اپنے خصوصی ہاٹ ناٹ ایجنٹ سندر داس سکینہ کو چھڑانے کے لیے اپنی سی پوری کوشش میں لگے ہوئے تھے اور میں ان کی ہر ایسی کوشش کو ناکام بناتا آیا تھا، کرنل سی جی بھجوانی مجھ سے بری طرح خوف زدہ تھا، وہ جان گیا تھا کہ میں یہاں بھارت میں اس کی یقینی موت بن کر آیا ہوں۔ یہی وجہ تھی وہ میرے خلاف یہاں اپنی کارروائی کو بھی خفیہ نہ رکھ سکا تھا اور بھارتی پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا تھا، حالانکہ یہ ایک خفیہ ایجنسی کے شایانِ شان بات نہیں تھی، مگر سی جی تو چاہتا تھا کہ چاہے جیسے بھی سہی، بس! کسی طرح میں دوبارہ اس کی گرفت میں آ جاؤں اور یہ وہ کر رہا تھا۔

میرے نزدیک سب سے اہم اور ضروری مشن یہی تھا کہ میں بھجوانی کا خاتمہ کر ڈالوں، جلد سے جلد......

وہ رات ہم نے وہیں سو کر گزار دی۔ اگلے دن صبح

ینا آگئی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا۔ اس کے اندر میک اپ کا سامان تھا اور کچھ کھانے پینے کی اشیا کے لاوہ دیگر چھوٹی موٹی ضرورت کا بھی سامان تھا۔ رینا نے ایا۔

''شہزی! تمہارا ابھی ممبئی جانا بالکل بھی مناسب نہیں وگا، وہاں چپے چپے پر تمہاری تلاش جاری ہے، سوشیلا کے ھر پر بھی چھاپا پڑا ہے، وہاں کوئی ادھیڑ عمر خاتون اکیلی میں، تارا...... اسے بھی پولیس پوچھ گچھ کے لیے گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ شنید ہے کہ بعد میں اس بے چاری کو خفیہ یجنسی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔''

''او...... مائی گاڈ...... میری موسی......!'' سوشیلا مدے سے نڈھال ہونے لگی اور اپنی پیشانی مسلتی ہوئی وفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ میں نے اسے تسلی ی۔

''حوصلہ کرو سوشی! پہلے رینا کی ساری بات سن لو۔'' ہتے ہوئے میں نے مستفسرانہ نظروں سے ایک بار پھر ینا کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بتانے لگی۔

''یہاں بھی تمہاری تلاش جاری ہے، دڈو کے محافظ ی بلراج سنگھ سمیت تمہاری کھوج میں مصروف ہیں۔ اب م خود ہی آگے اپنی راہ کا تعین کرو کہ تمہیں کرنا کیا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر چپ ہو گئی۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ وچتا رہا، رینا نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی، یہ سب کچھ برے لیے وہی تھا جس کی میں توقع کیے بیٹھا تھا لیکن میں چھ اور طرف سوچ رہا تھا، لہٰذا بولا۔

''یہاں ہم کب تک اور کتنے روز تک رہ سکتے ہیں؟''

''ایک سے ڈیڑھ ماہ......'' رینا نے جواب دیا۔

''اس دوران میں یہاں کوئی آئے گا تو نہیں؟ برا مطلب کسی قسم کا کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا ہمیں یہاں؟''

''میرے خیال میں تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اتفاق کی ت اور ہے، باقی تم دونوں کی اپنی احتیاط پر منحصر ہے۔''

''ہم......'' میرے منہ سے نکلا اور پھر میں اس امان کا جائزہ لینے لگا۔ رینا، سوشی کو تسلیاں دینے میں صروف ہو گئی۔ جب وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تو میں نے اس سے کہا۔

''سوشی! ہمیں اپنا بہروپ بدلنے میں دیر نہیں لگانی اہیے۔''

''چلیں! میں تیار ہوں۔'' وہ صوفے سے اٹھتے ۓ بولی۔ اپنی موسی کی گرفتاری اور بھارتی خفیہ ایجنسی کی حوالگی نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ تاہم اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

ہم دونوں کو اس کام میں تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ میں نے ادھیڑ عمر بڈھے کا میک اپ کیا تھا اور سوشیلا نے بھی میرے ہی جیسا بہروپ بھرا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب ہم رینا کے سامنے آئے تو ایک لمحے کو اسے بھی مغالطہ ہو گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''آ آ...... آپ کون؟...... او...... مائی گاڈ!''

ہماری مسکراہٹ اور لہجے نے اسے باور کرایا تو وہ ششدر سی رہ گئی۔

''تم واقعی اپنے کام میں ماہر ہو شہزی!''

''شکریہ!''

''تم نے نہ صرف اپنی شکل و صورت بدل ڈالی ہے

تعارف

شرابی رات دو بجے شراب کے نشے میں روڈ پر جا رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اسے روکا اور پوچھا۔ ''صاحب آپ کون ہیں؟''

شرابی نے کہا۔ ''میں کوئی بھی ہوں۔ تم سے میرا کیا کام؟''

کانسٹیبل نے کہا۔ ''بتاؤ ورنہ چالان کر دوں گا۔''

شرابی نے جواب دیا۔ ''پھر میرا پتا سنو۔ یہاں سے سیدھے گلی نمبر 6 میں جاؤ، وہاں مڑ کر مکان نمبر 48 دیکھو اور وہاں گھنٹی بجاؤ۔ نکلنے والے سے پوچھو کہ مائیکل گھر پر ہے اگر وہاں سے جواب ملے اِدھر نہیں ہے تو سمجھو کہ وہ میں ہی ہوں۔''

ڈاک خانے

ہمارا ڈاک کا نظام کتنا عمدہ اور فعال ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ چند سال پہلے ایک پوسٹ ماسٹر ریٹائر ہوئے انہوں نے محکمے کو عرض داشت لکھی جس میں استدعا کی گئی کہ

''براہِ کرم مجھے پنشن کی رقم بذریعہ ڈاک کبھی نہ بھیجی جائے۔ میں ہر ماہ خود آ کر یہ رقم لے جایا کروں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی دوسری صورت میں مجھے فاقوں مرنا پڑے گا۔''

انتخاب، امداداللہ سوکڑی کریم خان، بنوں

بلکہ چال ڈھال سے بھی پتا لگنے نہیں دیا کہ تم سہزی ہو! میں تو تمہیں لہجے اور آواز سے ہی پہچان پائی ہوں۔''

''پولیس کو تو جُل دیا جا سکتا ہے، مگر خفیہ ایجنسی والے بہروپ بدلے ہوئے کو بھی فوراً پہچان لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا! وہ کیسے؟''

''آئی ڈینٹی فکیشن اور باڈی لینگویج سے...... یعنی چال ڈھال اور لب ولہجہ، باتیں کرنے کا انداز......''

''او کے...... اپنا خیال رکھنا اور بڑی احتیاط سے اپنا کام کرنا...... معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑتے ہی میں ہیرے سے متعلق کچھ کرتی ہوں۔'' رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ پر ایک ذرا گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم عمر رسیدگی میں بھی خاصے گریس فل اور ہینڈسم لگ رہے ہو۔''

''شکریہ......'' میں اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا۔

وہ چلی گئی۔

''شکر ہے کہ ہمیں یہاں اچھا ٹھکانا مل گیا ہے۔'' سوشیلا نے رینا کے رخصت ہوتے ہی کہا۔ ''ایک مہینے کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اس دوران ہم اپنا مشن مکمل کر لیں گے۔''

''لیکن میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتا۔'' میں نے پُرسوچ متانت سے کہا تو سوشیلا قدرے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہی ہے کہ میں رینا کا ساتھ زیادہ دیر نہیں چاہتا، اس میں کئی خطرات ہیں۔''

''کیا تم ابھی تک اس کی طرف سے غیر مطمئن ہو؟''

''وہ ایک اچھی، سلجھی اور سمجھدار لڑکی ہے...... لیکن اس کا یہاں بار بار آنا جانا کسی کو بھی کھٹکا سکتا ہے۔''

''اور...... میں کیسی ہوں؟'' سوشیلا اچانک بولی۔ میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے گداز لبوں پہ شوخ سی مسکراہٹ تھی۔

''تم بھی ٹھیک ہی ہو......'' میں نے کہا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکان یکا یک دم توڑ گئی۔

''کیا مطلب...... ٹھیک ہی ہوں؟''

''چھوڑو اب اِن باتوں کو......'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں، مجھے بتاؤ ابھی، میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا، ہر مشکل گھڑی میں ہم ساتھ رہے ہیں، کبھی تم نے اور کبھی میں نے جان پر کھیل ایک دوسرے کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے اور تم میرے مقابلے میں اس ڈیڑھ چھٹانک کی لڑکی رینا کو مجھ پر فوقیت دے رہے ہو......؟'' وہ ایک دم بپھر گئی۔ میرے لیے اس کا یہ ایک نیا روپ تھا، جو اگرچہ خالصتاً نسوانی سہی لیکن میرے لیے اس میں حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میرا اور اس کا آپس کا تعلق ہی کیا تھا؟ محض ایک مقصد کے حصول تک...... اس کے بعد اس کا الگ راستہ تھا اور میرا الگ لیکن وہ تو اس طرح مقابلے بازی پر اتر آئی تھی جیسے میں اور وہ قربتوں کی حدود کی اس نہج پر ہوں جہاں ایک مرد کا ایک عورت کے سامنے کسی دوسری عورت کی تعریف کرنا اسے ناگوار گزرتا ہے۔ جبکہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ہمارے ساتھ کی اصل بنیاد ایک دوسرے کے مفادات کا مشترکہ حصول ہے۔ اس میں کسی ایسے تعلقِ خاطر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کے لیے اتنا جذباتی ہو جانا، جیسے سوشیلا ہو رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ کچھ عرصہ ساتھ رہنے سے بھی ایک طرح کی نامعلوم سی انسیت بھی آپوں آپ پروان چڑھتی ہے مگر...... میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔

''جواب دو مجھے......'' اسی وقت سوشیلا بھنائے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس نے باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر ٹکا رکھے تھے۔

''ارے...... رے! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سوشی! میں نے تو یونہی تمہیں ذرا چھیڑا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش چاہی، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہو کر دوبارہ اس سے بولا۔

''مجھے اسی بات کا دکھ ہے کہ چلو، رینا سے تو میری چند منٹوں کی ملاقات تھی اور وہ اچانک میرے خلاف ہو گئی تھی مگر تم تو کافی عرصے سے میرے ساتھ رہی ہو...... اور ہمارے درمیان یہ معاہدہ بھی ہو چکا تھا کہ...... تم کو وہی کچھ کرنا ہے جیسا میں کہوں گا لیکن تم نے تو مجھ پر بھی پستول تان لیا تھا، کم از کم مجھے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کا موقع تو دیا ہوتا، مگر تم نے تو مجھے رینا کے ساتھ مل کر مہیش کے پولیس افسر باپ کے حوالے کرنے کی ٹھان لی تھی۔''

''تمہارے دل میں ابھی تک بال ہے اس بات کی وجہ سے......'' وہ پھر شکوہ کناں ہوئی۔

''جبکہ میرا یہ رَدِعمل فطری تھا۔'' رینا کی کایا پلٹ نے مجھے بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں... میرا مقصد ملکی

مفاد سے بالاتر نہ ہو جائے اور میں ایک غدار کہلاؤں، اگرچہ غدار تو میں اب بھی کہلاؤں گی ہی، مگر اس بار تمہاری صفائی پیش کرنے سے رینا کی طرح میرا بھی دل صاف ہو گیا ہے اور میں اپنے ضمیر سے تو کم از کم مطمئن ہی ہوں......'' وہ رکی اور ایک گہری سانس لی تو میں اس میں ایک حسرت آمیز سی آزردگی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا وہ آگے بولی۔

''شہزی! کچھ باتیں انسان لبوں تک اس ڈر سے نہیں لا سکتا کہ وہ الفاظ جن کی حرمت دل میں ہی رکھنے سے قائم رہتی ہے، اسے کہہ دینے سے کہیں وہ اپنا مقام ہی نہ کھو دیں، بس! اسی لیے میں بھی کچھ باتیں اپنے دل میں اسی ڈر سے دبائے بیٹھی ہوں۔ لیکن کیا تم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد میرا کیا ہوگا؟ تم تو شاید اپنے وطن لوٹ جاؤ لیکن بعد میں میرا کیا بنے گا؟ میں کہاں جاؤں گی، یہ دھرتی تو میرے لیے تنگ کر دی جائے گی۔ جبکہ ان حالات میں تم پر بھی نہ صرف ایک غیر ملکی ایجنٹ کا الزام لگ چکا ہے اور مجھے بھی تمہارے ساتھ ایک مددگار کی صورت نتھی کر کے غدارِ وطن کا ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ جانتے ہو ناں...... ایک غدارِ وطن کی کیا سزا ہوتی ہے اور اسے کس قدر نفرت و غصے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور واپس الٹے پیر صوفے کی طرف لوٹ گئی اور تھکے تھکے انداز میں گر گئی۔

اس کی بات نے مجھے بھی اندر سے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ میں نے واقعی اس پوائنٹ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کی یہ بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی۔ میں مشن کی کامیابی کے بعد اِدھر اُدھر ہو سکتا تھا، بعد میں سوشیلا کہاں جاتی؟ تقدیر نے اسے میرے ساتھ نتھی کر دیا تھا اور ظاہر ہے کہ میں بھی اتنا بے حس نہ تھا کہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد سوشیلا کو اس کے حال پہ چھوڑ دیتا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر سر جھکائے سسک رہی تھی، میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑی آہستگی سے اس کے شانے پر رکھ دیا اور نہایت ملائمت آمیز مگر مستحکم لہجے میں بولا۔

''سوشی! میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا، مشن مکمل ہونے کے بعد بھی جب تک تمہیں کسی محفوظ مقام پر نہ سمجھوں، تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

میری بات پر اس نے سر اٹھایا، اس کی نمناک سی آنکھوں میں مجھے ایسی گہرائی محسوس ہوئی تھی جیسے قعرِ الفت میں وہ مجھے بھی لیے اترنے کو تیار ہو۔ وہ اسی نگاہوں سے مجھے تکتی ہوئی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر میرے قریب آ گئی، بہت قریب، اتنی...... کہ اس کی بے ترتیب سانسیں اپنی سانسوں کے قریب محسوس ہونے لگیں پھر وہ اپنے دونوں بازو میری کمر کے گرد پھیلا کر مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی، بازوؤں کا گھیرا اس نے میری پشت کے گرد لپٹا لیا تھا اور اپنا سر میرے فراخ سینے پر رکھ دیا تھا۔

''ایک بار پھر یہ وعدہ کرو شہزی کہ تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑ دو گے......''

میں نے محسوس کیا کہ سوشیلا کا نرم و نازک وجود میرے کڑیل وجود کے ساتھ رگڑ کھا رہا تھا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے دو جسم کسی چقماق پتھر کی طرح رگڑ کھا کر جذبات کی آگ ہی نہ بھڑکا دیں، میں نے اسے دھیرے سے خود سے علیحدہ کیا...... وہ پتا نہیں میری اس بات کا کیا مطلب سمجھ بیٹھی تھی، حالانکہ میں نے اب تک صرف سوشیلا سے ہی کیا کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسی کوئی ''آزمائش'' گھڑی آنے ہی نہ دی تھی...... آتی بھی تو خود ہی پہلو تہی کر لیتا، اب بھلا میں سوشیلا کو کیا بتاتا کہ میں کن راہوں کا راہی تھا اور ''کس کی'' خاطر تھا۔ میرا سفر ''جس کی'' خاطر تھا وہ مجھ سے کوسوں دور ہو کے بھی کس قدر قریب تھی۔ سوشیلا بھی اس وقت میرے جتنے قریب تھی، عابدہ کی قربت، جو میری روح اور سانسوں تک میں بسی ہوئی تھی، وہ اس کی رسائی کا عشرِ عشیر بھی نہ تھی۔

میں اسے الگ کر کے، چند قدم پیچھے کو سرک گیا۔ وہ اسی طرح گم صم سی کھڑی میری طرف تکتی رہی۔ میں کچھ دور جا کر اس کی طرف مڑا، وہ کچھ مجبور سی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''سوشی! تم نے شاید میری بات کا کوئی اور مطلب لے لیا ہے...... میرا مطلب تو......''

''کہ تمہارا تعلق کسی اور سے ہے؟'' سوشیلا نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا۔ وہ شاید میرے یوں آہستہ سے دور ہو جانے اور اس کی قربت سے پہلو تہی کرنے پر اپنے نسوانی وجدان سے کچھ بھانپ گئی تھی، تو میں نے بھی اس سے اشارتاً سہی مگر صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

''ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''کون ہے وہ خوش قسمت اور کہاں رہتی ہے؟ کیا تمہاری بیوی ہے؟'' سوشیلا نے کسی قدر کرب سے پوچھا۔ میں نے پھیکے سے لہجے میں جواب دیا۔

''وہ خوش قسمت ہے نہ میں، میری ابھی اس سے شادی نہیں ہوئی مگر وہ جہاں رہتی ہے، وہ جگہ جہنم سے کم نہیں، میں اسے اسی جہنم سے نجات دلانے کے لیے نکلا ہوں۔''

''اوہ...... بڑا دکھ ہوا یہ سن کر۔'' سوشیلا نے کہا۔ میں اس موضوع سے ہٹتے ہوئے فوراً آگے بولا۔

''میں آج شام تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''کہاں؟ اور اکیلے؟'' سوشی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''سورت جاؤں گا اور اکیلا ہی جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' وہ بولی۔

''یہ خطرناک مشن مجھ اکیلے کو ہی انجام دینا ہوگا۔ تمہاری وجہ سے میں کسی اضافی مشکل میں پڑ سکتا ہوں۔''

''نہیں شہزی! پلیز، مجھے اپنے ساتھ لے چلو ناں...... مجھے تمہاری چنتا (فکر) مار ڈالے گی یہاں، کہ نجانے تم کس حال میں ہوگے؟''

''مجھے خونخوار بھیڑیوں کے بھٹ میں گھس کر اپنا مشن مکمل کرنا ہوگا۔ تم کیا کرو گی وہاں؟''

''پھر بھی شہزی! تمہاری نظروں میں اگر میں ایک کھوٹا سکہ ہی سہی...... لیکن مجھے یقین ہے کہ میں...... اس مشن میں تمہارے لیے کچھ آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش تو ضرور کرسکتی ہوں، پستول چلانا مجھے آتا ہے، راستوں کے معاملے میں بھی تمہاری مدد ہوسکتی ہے۔'' میں نے غور کرنے کے انداز میں ہونٹ بھینچے اور اس کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں میں نے بھلا کب کھوٹا سکہ کہا ہے؟ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہ مشن کسی فرار کا منصوبہ نہیں ہے، جس میں اب تک تم میرا کامیابی سے ساتھ دیتی آرہی ہو بلکہ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ تمہاری موسی کو بھی اس خبیث سی جی بھجوانی کے قبضے سے چھڑانا ہے۔ یہ ایک خطرناک مہم ہے، تم وہاں میری کمزوری بھی بن سکتی ہو۔''

''اگر ایسا ہوا تو تم صرف اپنے مشن پر توجہ رکھنا، میری جان کی پروا مت کرنا، کیونکہ میں سمجھ چکی ہوں، تمہارا مشن انسانیت کی بھلائی ہے، حب الوطنی بعد میں......'' سوشیلا نے مستحکم لہجے میں کہا اور مجھے بلاشبہ اس کی بات پر خوشگوار سی حیرت ہوئی...... اب تک میرا اور سوشیلا کا ساتھ جتنا بھی تھا، وہ ''قرابت داری'' اور ''انسیت'' کے پودے کو تعلقِ خاطر کی ایک نامعلوم سی نمو دے چکا تھا۔ یہ تو خیر ایک انسان کی مثال تھی، جانور بھی ساتھ رہے تو انسان اس سے کافی مانوس ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں سوشیلا کو ایک جانور سے تشبیہ دے رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

میں نے بے اختیار خلوص اور کسی قدر اپنائیت سے اس کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھ دیا اور نرمی سے مسکرا کر بولا۔

''میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں سوشی! دیکھو، مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسا ہے، اس نے میری جتنی لکھی ہوئی ہے، میں اس سے ایک سیکنڈ تو کیا ایک پل کا ہزارواں حصہ بھی اضافی زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ...... اسی مولائے کریم نے مجھے اب تک بہت سی ایسی ناگہانی آفات اور خطرات سے بھی بچایا ہے کہ جب میں نے موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے دیکھا۔ یہ مشن مجھ اکیلے کے کرنے کا متقاضی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہوگی تو ہم جلدی نظروں میں آجائیں گے، اس لیے کہ اب میرے ساتھ تمہارا نام بھی نتھی ہو چلا ہے۔ چاہے ہم نے بھیس ہی کیوں نہ بدلا ہو، یہ بات دشمنوں کے ذہن میں پہلے سے ہوگی کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے......''

میرے رسانیت سے سمجھانے پر وہ بالآخر ایک گہری ہمکاری خارج کر کے خاموش ہوگئی۔ میں نے اسے یہاں میرے بعد اکیلے رہنے پر احتیاط اور ہوشیاری کی ہدایت کر دی۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ معلومات لیں اور شام کا ملگجا اندھیرا پھیلتے ہی اللہ کا نام لے کر میں فلیٹ سے نکل گیا۔

میں نے سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ فون کے ذریعے سوشیلا نے ریلوے انکوائری فون کر کے سورت جانے والی ٹرین کے بارے میں پتا کرلیا تھا۔ میں وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں مجھے خاصی سخت ''چیکنگ'' دیکھنے میں آئی۔ پلیٹ فارم پر موجود ہر ایک مسافر کے ٹکٹ کے علاوہ اس کی مکمل جانچ پڑتال کی جارہی تھی، یہ ان لوگوں کے لیے تھی جو یا تو اکیلے تھے یا پھر مرد، یعنی جو فیملی (عورتوں اور بچوں) کے ساتھ تھا، اس کی کوئی چیکنگ نہیں ہورہی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی، کیونکہ میں اکیلا تھا، چیکنگ کرنے والوں میں پولیس کا عملہ ہی تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہاں سادہ وردی میں بلیوتلسی کے اہلکار بھی ایک ایک مسافر پر کڑی نگاہ رکھے

ہوئے ہوں۔ جیسے ہی انہیں کوئی مشکوک آدمی ملتا وہ اسے ''چھاپ'' سکتے تھے۔ بے شک میری تصاویر وغیرہ کی صورت میں انڈین خفیہ ایجنسی بلیوٹنسی ہی نہیں بلکہ بھارتی پولیس کے پاس بھی پوری معلومات موجود ہوسکتی تھیں۔ سیکریٹ سروس والے بھیس بدلنے کے باوجود چال ڈھال اورلب ولہجے سے بھی پہچان لیتے تھے۔ یہی کچھ مجھے بھی اپنی ''پاور سیکریٹ سروس'' کی تربیت کے دوران سکھایا گیا تھا۔ میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میری چال ڈھال سے کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہو، اور حتی المقدور میں اپنے لب ولہجے کو بھی بدلنے کی پریکٹس کر چکا تھا اور ریہرسل بھی کی تھی۔ لیکن یہ چیکنگ والا مرحلہ میرے لیے لٹکتی تلوار ثابت ہو رہا تھا کیونکہ میرے پاس کوئی شناختی کاغذات نہ تھے اور ہوتے بھی کیونکر......؟ میں تو بھارتی شہری ہی نہیں تھا۔ اسی پر ہی مجھے دھر لیا جاتا۔

میں اسٹیشن کے مین گیٹ سے ہی مڑ گیا۔

سورت کا میں ٹکٹ خرید چکا تھا مگر اندر پلیٹ فارم پر جانے کے بجائے میں اس اسٹیشن کی عمارت کے ٹکٹ گھر والے حصے سے ہی مڑ کر باہر آ گیا اور اسٹیشن کی عمارت کے متوازی محتاط روی کے ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ میں ٹریکس کی طرف نکل آیا جہاں گڈز کے شیڈز اور ایک لوکو شیڈ نظر آیا۔ یہاں دوسرے قسم کے لوگوں کی چہل پہل زیادہ دیکھنے میں آ رہی تھی۔ یعنی عام ریلوے عملہ اور مزدور وغیرہ...... پولیس کا کوئی آدمی یہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اسی طرف بڑھ گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک نلکا لگا ہوا تھا اور میں یونہی جھک کر پانی پینے لگا۔

''لگتا ہے کسی ٹرین میں بغیر ٹکٹ سوار ہونا چاہتے ہو......''

اچانک ایک آواز پر میں چونکا اور سیدھا کھڑا ہو گیا، میرے سامنے ایک دبلا پتلا مگر خاصا چالاک سا شخص کھڑا مسکرا رہا تھا، میں نے پل کے پل اس کا جائزہ لیا۔ وہ ریلوے کے عملے کا ہی کوئی آدمی لگتا تھا، اس نے ہلکے نیلے رنگ کا وردی ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے کوئی موقع شناس معلوم ہوا۔ یہ ''گیس'' کر کے میں نے دانستہ چوری نظروں سے گردوپیش میں دیکھ کر اس سے کہا۔

''بات تو کچھ ایسی ہی ہے لیکن لگتا ہے کہ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرنا چاہتے ہو؟''

''ایک دم پرفیکٹ......'' وہ چٹکی بجانے والے انداز میں اپنے ایک ہاتھ کو ہلاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ ''میں ایسے لوگوں کے خوب کام آتا ہوں، بشرطیکہ......'' یہ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کے...... انگوٹھے کو...... شہادت کی انگلی میں رگڑ کر معنی خیز اشارہ کیا، یعنی نوٹ......

''اچھا بھائی! اگر یہ بات ہے تو میں تمہیں کچھ نہ کچھ روپے دے دوں گا، بولو! کیا مدد کر سکتے ہو؟''

''کہاں جانا چاہتے ہو؟''

''سورت۔''

''پانچ سو روپے۔'' اس نے چور ریٹ بتایا۔

''چلے گا......'' میں اشارتی لہجے میں کہا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' وہ بولا اور ایک طرف چلا، میں اس کے عقب میں ہو گیا۔ وہ مجھے لیے ایک چھوٹے سے آفس میں آ گیا، وہ شاید یہیں کام کرتا تھا۔ یہاں جابجا، مہریں، سلپیں اور نجانے کیا کیا الابلا پھیلا ہوا تھا۔

''یہ میرے صاحب کا آفس ہے۔ وہ اس وقت اپنے نائبین کے ساتھ کینٹین میں چائے وغیرہ پینے گیا ہوا ہے، تم اِدھر ٹھہرو میں تمہارا بندوبست کر کے آتا ہوں۔''

''بھائی! کتنی دیر لگاؤ گے؟'' میں نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے پا کر فوراً کہا۔

''ابھی آ جاتا ہوں، چنتا نہ کرو، یہاں ابھی کوئی نہیں آئے گا، آیا تو کہہ دینا، رامیش کا کوئی رشتے دار ہوں۔'' وہ چلا گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ پاکستان کی طرح یہاں بھی ریلوے کی چور بازاری گرم تھی، وہاں پولیس، کنڈیکٹر اور قلی وغیرہ کی ملی بھگت سے کام ہوتا تھا اور یہاں...... یہ اس طرح ہوتا تھا۔

ریلوے اور اس طرح کے اداروں کی تباہی میں اسی طرح کی ''کرپشن'' کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت تو یہی ''کرپشن'' میرے کام آ رہی تھی، کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ یہ مجھے اس طرح کسی پولیس اہلکار وغیرہ کی نظروں میں لائے بغیر اپنا بھی اور میرا بھی ''کام بہ احسن خوش اسلوبی'' کے کر جائے گا۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس کے ہمراہ ایک آدمی تھا۔ اس نے بھی ہلکے نیلے رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔

''لال جی! یہ ہے وہ، جس کو سورت جانا ہے، پانچ سو میں بات طے کی ہے میں نے۔'' رامیش نامی اس آدمی نے اپنے ساتھ آئے ہوئے شخص سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لال جی نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولا۔ ''بھیو!

سورت تک پورے بارہ سو کرایہ لگتا ہے۔ پانچ سو تو بہت تھوڑا ریٹ لگایا ہے۔''

''ارے ٹھیک ہے لال جی!'' رامیش نے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا۔ ''یہ بابا جی ہیں، کچھ ان بے چاروں کی عمر کا ہی خیال کرلو......''

میں نے بھی بولنا ضروری سمجھا اور ''بابا جی'' ہی کے لہجے میں بولا۔

''ارے بھئیو! کچھ میری عمر کا ہی خیال کرلو، گریب منش ہوں، سورت میں میری بیٹی بیاہی ہوئی ہے۔ اس سے ملنے جارہا ہوں۔ تھوڑے پیسے بچ جائیں گے تو اس بے چاری کے لیے اور اس کے بچوں کے لیے کچھ تھوڑا بہت سامان ہی لے جاؤں گا خیر کر......''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' لال جی نامی شخص ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا اور پھر رامیش سے مخاطب ہوکر بولا۔

''ابھی ٹرین کے آنے میں تھوڑی دیر ہے، اسے اِدھر ہی بیٹھائے رکھ، وہاں سخت چیکنگ بھی ہورہی ہے۔ پتا نہیں کیا معاملہ ہے، پہلے تو دیکھنے میں نہیں آئی، خیر...... جیسے ہی ٹرین آجائے، میں خود اسے لینے آجاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں اس امدادِ غیبی پر خدا کا شکر بجالانے لگا کہ کس طرح یہاں میرے ایک اہم مسئلے کا حل خود ہی نکل آیا تھا، ورنہ تو میرے اِدھر کا رخ کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ میں یہاں سے چھپ چھپا کر کسی طرح رینگتی ٹرین میں سوار ہوجاؤں گا۔

رامیش مجھے آفس کے باہر کھڑا کر کے جاچکا تھا، پیسے مجھے لال جی کو دینا تھے اور بعد میں شاید انہوں نے اس کی حصہ داری کرنا تھی، پتا نہیں روزانہ یہ کتنے ایسے شکار پھانستے ہوں گے۔ ٹرین آگئی تھی، اسٹیشن پر مسافروں کے شور اور بھگدڑ سے ٹرین کی آمد کا اندازہ ہوتا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رک گئی تھی۔ لیکن مسافروں کی بھاگا دوڑی کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی شدت آگئی تھی۔ مجھے رامیش یا لال جی کا انتظار تھا، دونوں ہی غائب تھے، مجھے بے چینی ہونے لگی کہ کہیں ٹرین نکل ہی نہ جائے۔

تھوڑی دیر اور گزری، دونوں کا پتا ندارد تھا۔ میں ایک خستہ حال سی سرکاری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جو کہ دروازے کے قریب ہی تھی، وہیں میں نے دو افراد کو دیکھا، وہ آفس کے سامنے آکر رک گئے تھے اور بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مسافر یا متعلقہ عملے کے آدمی تھے لیکن اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ بار بار اسی طرف دیکھ رہے تھے، میں انہیں اور وہ مجھے دروازے کے پار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ان پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ مجھے ان دونوں کا انتظار تھا۔ وہ نجانے کہاں غائب تھے، ٹرین نے وسل دی تو میری بے چینی فزوں تر ہوگئی، ٹرین مجھے سامنے کھڑی نظر آرہی تھی، دوسری وسل پر اس نے رینگنا شروع کردیا۔ میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی دروازے تک قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک لال جی دوڑا آیا اور مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''آجاؤ...... آجاؤ...... جلدی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا، میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دوڑنے کے انداز میں ایک بوگی کی طرف بڑھا اور میرے ساتھ ہی اس میں سوار ہوگیا۔ وہاں ایک سرخ لباس والا قلی کھڑا تھا، اس نے میری جانب اشارہ کر کے اسے کچھ بتایا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر لال جی نے مجھ سے نوٹ نکالنے کا اشارہ کیا، میں نے اپنی جیب سے فوراً نوٹ نکال کر اس کے حوالے کردیے، وہ چلتی ٹرین سے اتر گیا۔ ابھی ٹرین کی رفتار سلو ہی تھی۔ قلی نے مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا اور سیٹ نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ میں اس سیٹ سے ہلوں بھی نہیں۔

میں وہیں آکر بیٹھ گیا۔ ٹرین اب رفتار پکڑنے لگی تھی۔ شام ڈھل کر رات میں بدلنے والی تھی۔ بوگی میں رش اور افراتفری کا سماں تھا مگر رفتہ رفتہ یہ بھی پُرسکون ہوگیا۔ یہاں تک کہ ہر کوئی اونگھنے لگا۔

میں نے بھی طمانیت کا سانس لیا۔ شکر تھا کہ میں چیکنگ سے بچ گیا تھا، بس! میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے دیکھا وہ قلی ساتھ ہی کھڑا تھا، اس دوران ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی، وہ میری طرف بڑھا اور بولا۔

''میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔'' تم سے کوئی ٹکٹ کا پوچھے تو کہہ دینا کہ بڑے بابو چتن داس کا آدمی ہوں، آج کی بات اسے بتا دینا کہ وہ آج آفس کی بیرک نمبر.... دو میں بھوجن پانی کررہے تھے۔'' یہ شاید ٹکٹ چیکر کو یقین دلانے کا کوئی کوڈ ورڈ تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹرین اگلے اسٹاپ پر رکی اور وہ قلی اتر گیا۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک جانے والی ٹرین کھڑی تھی، وہ بس روانہ ہونے ہی والی تھی، اس نے وسل دی اور رینگنے لگی، اِدھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ قلی اس ٹرین میں سوار ہو گیا۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے سیٹ سے

ٹکا کرآنکھیں ..... موندلیں۔

کرپشن کا گھن چکر اسی طرح گول گھومتا ہے، ایک ٹیشن سے دوسرے اور پھر تیسرے تک سفر کرتا ہے اور پھر پس پہلے اسٹیشن پر آٹھہرتا ہے، نئے شکار کے انتظار میں۔ کام یقیناً صبح سے شام اور رات تک اسی فلمی چکر کی طرح ومتا رہتا تھا۔

''اپنا ٹکٹ دکھائیے...... پلیز......''

معاً ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں نے نک کر آنکھیں کھول دیں، میرے سامنے اگر کوئی ٹکٹ چیکر تا تو میرے لیے کوئی حیرانی کی بات نہ ہوتی، کیونکہ رے پاس تو سورت تک کا ٹکٹ تھا لیکن یہاں معاملہ اور ا، ٹکٹ چیک کرنے والے کوئی اور تھے جو سادہ وردی میں تھے۔

یکلخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ یہ دونوں ی تھے، جنہیں میں گڈز کے آفس والی بیرک کے سامنے کھ چکا تھا جو بظاہر آپس میں باتیں کرنے کے انداز میں مڑے تھے، مگر گاہے بہ گاہے میری طرف بھی دیکھ لیتے تھے، جبکہ میں نے ان کی اس حرکت کو عموی نظر سے دیکھا تھا راب یہی دونوں مجھ سے ٹکٹ کا پوچھ رہے تھے۔

میں نے اپنے اندر کی اتھل پتھل پر قابو پاتے ہوئے ب عام آدمی کی طرح بغیر کسی جھجک اور ڈر کے ان کا جائزہ اور پھر چڑچڑے بڈھے کا سا انداز اپناتے ہوئے ان ے بولا۔

''کیوں بھیو؟ آپ کون ہوتے ہو میرا ٹکٹ پوچھنے لے؟ کوئی ٹکٹ چیکر ہو؟''

میں جانتا تھا کہ میرا ٹکٹ چیک کرنے کے بعد یہ نوں مجھ سے آئی ڈی وغیرہ اور دیگر معلومات بھی لینے کی شش کریں گے۔

''ہم سادہ وردی میں خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔'' سرے نے ذرا تیز لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے ہا تو میں نے ایکا ایکی اپنے لہجے میں خوف سا سموتے ئے کہا۔

''اوہ...... سمجھا بھیو! پھر تو آپ سے بحث بے کار ہے۔ ای لو ہمرا ٹکٹ......'' کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب ے ٹکٹ نکال کر پہلے والے آدمی کے حوالے کر دیا اور ساتھ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ آیا یہ دونوں خفیہ پولیس کے آدمی تھے یا پھر بلیو تلسی کے کوئی ایجنٹ؟

''سورت جادت ہیں ہم...... اپنی بٹیا کے پاس......''

میرا لہجہ بوڑھوں والا ہی تھا، اس دوران میں نے اپنی باڈی لینگویج اور آئی ڈینٹی فکیشن... کا بھی خیال رکھا تھا۔ پہلے والے نے میرے ٹکٹ پر سرسری سی نگاہ ڈالی، اس کے ساتھی نے بھی یہی کیا۔ پھر دوسرا مجھ سے سرد لہجے میں مستفسر ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''پون۔'' میں نے ذہن سے گھڑ کر ایک فرضی نام بتا دیا۔

''اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔''

''وہ تو ہمرے پاس نا ئیں ہے۔ ہم جیب میں لیے تھوڑا ہی پھرت ہیں۔''

''تم اُدھر گڈز کے آفس میں کیا کر رہے تھے؟'' پہلے والے نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تو ہم اپنی بٹیا کے لیے ایک لوہے کا بڑا سا صندوقچہ لے جانا چاہتے تھے۔ اسی کا پوچھ رہے تھے کہ سورت تلک لے جانے میں کتنا خرچ آئے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

لیکن مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے ٹکٹ دکھانے کے بجائے، صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ میں کس طرح اپنا کرایہ بچا کر چور راستے سے ٹرین میں سوار ہوا ہوں۔ لیکن اس میں ایک خدشہ تھا کہ وہ میری تلاشی لے سکتے تھے اور ٹکٹ برآمد کر لیتے، یوں میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔

میری بات سن کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

''بھیو! خیریت تو ہے؟ کیا کوئی کھترناک مجرم ٹرین میں گھس آیا ہے؟'' میں نے اس بار اپنے لہجے کو ہونق سا بناتے ہوئے پوچھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آپس میں کُھسر پُھسر کرنے لگے۔ اس کے بعد ٹکٹ مجھے تھما دیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں ابھی تک ایک عام آدمی کی ایکٹنگ کیے ہوئے حیرت سے ان کی جانب تکتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر تکنے لگا۔ ساتھ ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

میرے مطابق یہ دونوں بلیو تلسی کے ایجنٹ نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ انہیں اگر...... مجھ پر یا کسی بھی شخص پر ایک بار شبہ ہو جاتا تو وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے، اسی لیے میں نے ان دونوں کے بارے میں یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ ان کا تعلق بھارتی خفیہ پولیس سے ہی ہو

سکتا تھا۔

بہرکیف...... یہی بہت تھا کہ بلاٹل گئی تھی۔

ٹرین نے اب خاصی رفتار پکڑ لی تھی۔ باہر رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک ایکسپریس ٹرین تھی، سوشیلا کے مطابق ممبئی یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر جبکہ سورت، دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کی دوری پر تھا۔ یہ تیز رفتار ٹرین تھی ممکن تھا کہ دو گھنٹوں کے اندر ہی پہنچا دیتی اور ہوا بھی ایسا ہی، رات پورے دس بجے تک میں سورت کے پلیٹ فارم پر تھا۔ یہاں بھی مسافروں کا رش دیکھنے میں آتا تھا، مگر چیکنگ ندارد...... میں نے سکون کا سانس لیا اور دیگر مسافروں کے جلو میں چلتا ہوا نکاسی والے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا...... اپنا ٹکٹ چیک کرایا اور عمارت سے باہر آگیا۔

سورت کے متعلق مجھے سوشی نے چند گنی چنی یا ضرورت کی حد معلومات دے دی تھیں، جبکہ میں نے خود بھی اپنے طور پر اس شہر مذکور کے محل وقوع کا ایک نقشہ بنایا تھا، جواَب صفحہ قرطاس سے میرے ذہن میں منتقل ہو چکا تھا، اس کے مطابق یہاں میری منزل کس جانب سے شروع ہوتی تھی، اس کا میں پہلے ہی تعین کر چکا تھا، لہٰذا میں نے ایک ٹیکسی والے کو روکا اور اسے سوریا روڈ چلنے کو کہا۔

''اور تساں نے کتھے جاڑاں ہے بابا جی؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال کر پوچھا۔ وہ کوئی سکھ ڈرائیور تھا۔ خاصا موٹا تازہ اور بھاری بھرکم چہرے والا......

میں نے جواباً کہا۔ ''بس! تم مجھے وہاں اتار دینا، میں آگے خود ہی چلا جاؤں گا۔''

''بیٹھو جی بیٹھو......'' وہ مست لہجے میں سر دھنتے ہوئے بولا۔ میں اس کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر براجمان ہوگیا۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ سکھ ڈرائیور سارے راستے بولتا رہا۔ میں نے اسے بھی فقط اپنے بارے میں یہی بتایا کہ میں ممبئی سے یہاں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔

''اے بیٹیاں بی وڈی نیاڑیاں ہوندیاں نیں...... ماں پیو وا جڈا خیال اے رکھدیاں نیں اتنا پتری لوکی نہیں رکھدے...... ہوندے۔''

''صحیح اکھیا تسی......'' میں نے بھی بالآخر پنجابی میں جواب دیا اور گویا پھنس گیا، وہ سکھ ڈرائیور حیرت سے اپنا سر گھما کر میری طرف دیکھنے لگا اور اسی لہجے میں بولا۔

''اوئے ہوئے...... تسی پنجابی ہو؟ تے ضرور مسلم ہو گے...... سکھ ہوندے تہ ایناں دے گیٹ اپ وچ ہی... ہوندے......'' اس کم بخت نے اپنی عقل سلیم کا خوب استعمال کیا تھا...... ظاہر ہے، اگر میں خود کو پنجابی سکھ ظاہر کرتا تو اس کا گیٹ اپ بھی ہوتا، کیونکہ سکھ کم از کم سر پر اپنے پگڑ تو ضرور ہی باندھتے ہیں، چاہے نیچے پتلون ہی کیوں نہ پہنی ہوئی ہو......

''آہو جی، توہاڈا اندازہ تے سو فیصدی درست ہے، ہن تسی اگے ویکھو' گڈی کدرے لگ نہ جائے......''

اس نے فوراً اپنا سر ونڈ اسکرین کی طرف گھما لیا۔ وہ پھر بھی چپ نہیں ہوا، بولتا رہا۔ آخر کار سوریا روڈ آگیا۔ سوشی سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق سورت بھارتی گجرات کا ہی ایک شہر تھا۔ اس کا پرانا نام سورج نگر اور سوریا نگر تھا، بعد میں سورت پڑ گیا۔

میں نے ٹیکسی سے اتر کر اسے کرایہ دیا اور پھر ایک طرف چل دیا۔ جب مجھے تسلی ہوگئی کہ وہ جا چکا ہے تو میں نے اپنی مطلوبہ سمت قدم بڑھایا۔ مجھے سورت کے جنوب مشرقی مضافات کی طرف روانہ ہونا تھا اور وہاں کسی ٹیکسی یا رکشے والے کو میں نہیں لے جا سکتا تھا، اس کے لیے مجھے احمد آباد جانے والی کسی مسافر بس میں سوار ہونا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر درمیانی رفتار سے پیدل چلتا ہوا آگے پہنچا تو احمد آباد جانے والی بس روانگی کے لیے تیار ہی کھڑی مل گئی، میں ایک قریبی اسٹاپ کا پتا بتا کر اس میں سوار ہوگیا۔ ذرا دیر بعد وہ روانہ ہوگئی۔

میں اپنی سیٹ پر بظاہر خاموش اور مطمئن انداز میں بیٹھا تھا، سیٹ میری کھڑکی کی طرف تھی اور دانستہ اسی سمت بیٹھا تھا جہاں مجھے اترنا تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق مطلوبہ مقام آدھے گھنٹے بعد آنا تھا، اس سے پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بلیوتکسی کے ہیڈ کوارٹر سے ہیلی کاپٹر میں سوار کروا کر سے جی کو ہارا کی یوٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو.. خوش قسمتی سے واپسی کے وقت میری آنکھوں سے پٹی تھوڑی سرکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ایک باریک جھری بن گئی تھی میں نے اسی میں سے واپس آتے سمے مقدور بھر کوشش اور ہوشیاری کے ساتھ اطراف اور گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا، حتیٰ کہ بلیوتکسی کے ہیڈ کوارٹر سے لے کر ہیلی کاپٹر میں سوا ہونے اور روانگی تک میں نے کافی حد تک راستہ ازبر کرلی تھا۔ یہ ساحلی مقام تھا۔ باقی میں نے سوشیلا سے کچھ اہ

نانیاں ڈسکس کر کے تسلی کر لی تھی۔

بہر حال ان ساری نشانیوں اور راستوں کو ذہن میں کھتے ہوئے میں اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔

نصف گھنٹے بعد میں بس رکوا کے اتر گیا۔ یہ کوئی روڈ ائنڈ ہوٹل تھا۔ سامنے اس کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ بس گے روانہ ہو چکی تھی۔ میں ہوٹل کی طرف بڑھا۔ یہاں چند بردار ٹرک اور دو تین مسافر لگژری کوچز کھڑی تھیں۔ افر اور دیگر لوگ چارپائیوں اور چوبی بینچوں پر بیٹھے مانے اور چائے وغیرہ پینے میں مصروف تھے۔ میرا یہاں ئی مصرف نہیں تھا، میں یونہی اس طرف روشنی دیکھ کر نکل ا تھا مگر اب پلٹ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں جا کر میں نے کسی بن نما دکان سے چھوٹی موٹی شے خرید کر کھائی اور پانی کی ٹی بوتل لی، اسے ختم کرتا ہوا میں گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا ۔ اپنا مطلوبہ علاقہ مجھے یہاں سے تھوڑی دوری کے صلے پر ہی محسوس ہو رہا تھا، میں اسی جانب بڑھ گیا۔ ہوٹل حدود پیچھے رہ گئی اور میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

سپر ہائی وے جیسی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ برے سیدھے ہاتھ پر تھی اور بائیں جانب تاریک بنجر انہ۔ مجھے یہاں کی فضا کافی مرطوب محسوس ہونے لگی۔ ب ہواؤں کے خوشگوار جھونکے بھی چل رہے تھے۔ جلد ہی ، یہ مسرت آمیز احساس ہونے لگا کہ میں بالکل ٹھیک ت میں تھا اور اب مجھے غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کرنا یے تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں دشمنوں کی ''کچھار'' کے پاس تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ اپنے ہیڈ کوارٹر کی حدود سے بھی ان کا کوئی لاسلکی یا مینول سیکیورٹی سسٹم کام کر رہا ..... بے شک میں دوسرے بہروپ میں تھا لیکن مجھے کی نگاہ سے ''اسپن'' تو کیا جاسکتا تھا۔ میری نقل و حرکت ی واچ کیا جاسکتا تھا یا پھر ایسا سرے سے کچھ بھی نہ ہو یہ میرے خدشات ہوں......

تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر مجھے اپنی سی محتاط روی کا تو رکھنا تھا۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے سڑک سے ہٹ کر یرانے کی راہ لی اور پھر جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا، خنک اور نیم جنگلاتی ہونے لگی۔ میں مزید محتاط ہو گیا۔ ہی میرا دل بھی ایک جوش تلے تیزی سے دھڑکنے لگا، لہ یہاں مجھے ویسے ہی درخت اور کچھ عمارتیں نظر آنے ، جنہیں میں پہلے دیکھ چکا تھا، پھر جب میں ایک ایسے پر آ کر رکا تو بے اختیار میرا جوش ایک سنسنی خیزسی کپکپی بدل گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ہیلی کاپٹر نے بلندی سے پہلی پرواز پکڑی تھی اور سمندر کی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ قدرے نیچے ''ڈگڈگاتا'' ہوا وہ بے آف بنگال کی طرف مڑ گیا تھا اور پھر وہ خاصا بلند ہو گیا تھا۔

یہاں رک کر میں نے گویا سانس روکے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ پھر اپنی مطلوبہ سمت کا تعین کر کے ایک طرف اللہ کا نام لے کر بڑھ گیا۔

یہ اسی ساحلی جنگل کا وسطی علاقہ تھا، جہاں سے بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر کی حدود شروع ہوتی تھی۔

اپنے ''ٹارگٹ'' کے قریب پہنچ کر یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس طرح کے عمل کو کمانڈو ایکشن ''گوریلا شپیر مہم'' کہا جاتا تھا، جو کسی چالاک چیتے کی طرح تن تنہا شکار کے پورے ریوڑ پر ہلاّ بول دیتا ہے۔ یہی میں کر رہا تھا۔ وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میری چال ڈھال اب عمر رسیدہ شخص سے بدل کر اپنی ''اصل'' میں لوٹ آئی تھی۔

آسمان پر چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ ستاروں کی روشنی سے گرد و پیش کا ماحول کچھ منور ہوتا تھا، اسی کی روشنی میں، مقدور بھر حد تک، زیادہ دور تو نہیں البتہ قریب کا منظر دکھائی دے رہا تھا، سو میں محتاط روی سے آگے بڑھتا رہا۔

دفعتاً ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں سے کوئی آواز ٹکرائی ہے، میں وہیں کیل ہو گیا اور تمام حساسیت گویا سماعتوں تک سمیٹ لیں۔ ایک ذرا سی بھی آہٹ پر میں نے پہلے ہی سے اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ وہ آواز نجانے کیسی تھی؟ مجھے اس کے آہنگ کا ادراک ہو سکا نہ ہی اس کی سمت کا اندازہ......

میں اسے عمومی نوعیت کا وہم جان کر پھر آگے بڑھا اور ابھی چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ اچانک ہی میرے عقب میں...... بہت قریب...... وھب...... وھب کی آواز ابھری جیسے کوئی پل کے پل ہی میرے سر پر پہنچ گیا ہو، میرے دیکھنے سے قبل ہی کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس کے زور پر میں گرا تو نہیں مگر میرے قدم لڑکھڑا ضرور گئے اور مجھ سے ٹکرانے والا اپنی جھونک میں میرے ساتھ تقریباً لپٹ ہی گیا مگر اس کے لپٹتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی تھی۔

اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح تیز تیز چل رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے اور حالت وحشت زدہ سی ہرنی کے مانند ہو رہی تھی جیسے اس کے تعاقب میں بھوکے اور خونخوار

شیروں کا پورا ٹولا لگا ہو۔

''کک...... کون......؟'' وہ متوحش انداز میں ہکلائی۔ وہ بالکل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور اپنا چہرہ اٹھائے یوں مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی گویا، وہ کوئی پہاڑ سر کر رہی ہو۔ اس کے چہرے کے دلکش نقوش، گھنی مگر بکھری ہوئی زلفوں کے درمیان یوں ضوفشاں ہو رہے تھے جیسے کسی چھتنار درخت کی شاخوں سے چاندنی چھنک رہی ہو......

اس کی آنکھیں کشادہ اور گہری تھیں، ستواں ناک اور چہرے کی ملائم جلد اس کے نرم و گداز جسم کی لطافت کا پتا دیتی تھی۔

''تم کون ہو......؟ اور یوں کس سے ڈر کے بھاگی جا رہی ہو؟'' میں نے اسے خود سے علیٰحدہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ سی آواز میں پوچھا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا، تو لامحالہ میں نے بھی اسی سمت دیکھا تو مجھے دور کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹ نظر آ گئی۔

''وہ...... وہ...... مم...... میرے پیچھے آ رہے ہیں، بھ...... بھگوان کے لیے مجھے بچالو...... یہ بہت ظالم لوگ ہیں...... انہوں نے...... انہوں نے، آہ......'' وہ پتا نہیں دفورِ غم سے کراہی تھی یا پھر کسی درد سے مگر اس وقت میرا اسے ہی نہیں بلکہ خود کو بھی ان سے بچانا ازبس ضروری تھا، لہٰذا میں اسے لیے ایک دم سیدھے ہاتھ کی طرف بڑھ گیا جہاں خودرو جھاڑیوں کا ایک مختصر سا سلسلہ، قریب بہتی ایک نہر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ کوئی سمندری شاخ تھی، میں اسے لیے اسی طرف بڑھ گیا اور وہاں دبکنے کی کوشش کی کہ ہیڈ لائٹ اسی طرف پڑی، کیونکہ وہ گاڑی جو غالباً اسی لڑکی کے تعاقب میں تھی، ہماری طرف مڑی، شاید اس کے سوار کی نگاہ بروقت ہم پر پڑ گئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی، یعنی گولی چلی۔ میں اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو لیے زمین پر گر گیا لڑکی کے حلق سے دہشت زدہ سی گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ ابھری اور میں اسے اپنے ساتھ چپکائے لڑھکنیاں کھاتا، کسی طرح جھنگر میں جا گھسا، پھر تیزی کے ساتھ اندر تک لڑکی سمیت خود کو گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ گاڑی کی آواز تیزی سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں لڑکی کو لیے ایک طرف دبک گیا۔ کچھے دار خودرو جھاڑیاں ایک طرف کر کے میں نے اس کے چھدرے چھدرے رخنوں سے گاڑی کی جانب دیکھنے کی سعی چاہی تو اس کے اندر سے مجھے تین چار چست وردی پوش مسلح افراد برآمد ہوتے نظر آئے۔ وہ کھلے تاروں بھرے آسمان تلے تھے۔

میرے اندر جھما کا ہوا، میں نے اپنے ساتھ دبکی لڑکی سے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے؟''

''کک...... کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' لڑکی گھگیائے ہوئے لہجے میں بولی۔ آواز نیچی ہی تھی۔ ''ہمیں ان لوگوں نے ٹریس پاس کے الزام میں دھر لیا تھا، پھر ہم چاروں کو اپنے ساتھ تفتیش کے بہانے لے گئے تھے ساتھ...... خود کو یہ کسی حساس ادارے کے اہلکار بتا رہے تھے مگر پھر......''

''ش...... شش......'' میں نے اسے بولنے سے روک دیا، کیونکہ اسی وقت وہ سب مخصوص وردی پوش جھنگر کے قریب آ گئے تھے اور ان میں سے ایک انہیں تحکمانہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

''وہ لڑکی جانے نہ پائے، ورنہ ہماری خیر نہیں ہو گی...... لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہمراہ یہ شخص کون تھا؟''

''یہ بھی انہی لوگوں کا کوئی ساتھی ہو سکتا ہے۔'' ایک نے جواب دیا۔

''بے وقوف......! ان چاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا، آگے بڑھو......''

''تم ادھر سے ہلنا بھی مت...... سمجھیں؟'' میں نے اس کے نرم و نازک گال اور کان کے قریب منہ کر کے کہا اور اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ پھر میں سانپ کی طرح ایک طرف تیزی سے رینگ گیا۔ یہ وہی سمت تھی جہاں سے یہ لوگ اندر در آنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ دو افراد آگے تھے اور باقی دو پیچھے ہاتھوں میں گنز تانے انہیں کور دیے قدم اٹھا رہے تھے۔ ان سے ٹاکرا ناگزیر تھا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں معاً ہی ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا اور میں کسی شکاری چیتے کی طرح بغیر آواز پیدا کیے ان کے پیچھے آ گیا، یہی وہ وقت تھا جب عقب میں رہ جانے والا شخص جانے کس طرح اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس کرتے ہی پلٹا اور میں اس پر جھپٹ پڑا، میں نے جھپٹتے ہی اپنا مخصوص کمانڈو ہتھیار استعمال کیا اور اس کی ہنسلی کی ہڈی کے قریب رگِ حساس کو مسل ڈالا...... وہ بغیر آواز پیدا کیے گرنے لگا تو میں نے اسے تھام لیا کہ کہیں اس کے گرنے سے دھمک نہ پیدا ہو

لیکن بدقسمتی سے اس کے آگے چلنے والے ساتھی کو اپنے پیچھے ہونے والی اس ''کھڑبڑ'' کی بھنک پڑ ہی گئی اور وہ پلٹا، میں نے اس کے بے سدھ ساتھی کو اس طرح سیدھا تھامے رکھا تھا کہ مدھم مدھم سی روشنی میں وہ چند سیکنڈ تو یہی سمجھا کہ اس کا ساتھی کھڑا ہے، وہ پلٹا اور میں اس پر جھپٹ پڑا، گن اس کے ہاتھ میں چونکہ پہلے ہی سے دبی ہوئی تھی، اس نے خطرے کی بو سونگھتے ہی پتا نہیں بوکھلاہٹ میں یا اپنے اندھے دفاع میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی کے دھماکے سے پورا جھنگر لرز گیا، اس کے ساتھی بھی چونکے، میں نے اس کے پہلے والے ساتھی کی گن پر قبضہ جماتے ہی اس پر گولی چلادی۔ وہ کریہہ انگیز چیخ خارج کرتے ہی گرا، تو تیسرے اور چوتھے نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر جنگلی بلّوں کی طرح چھلانگ لگادی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی شکاری، اپنے کسی آدم خور درندے کے بالکل قریب پہنچ گیا ہو اور لمحہ بھر کو اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

بہرکیف...... میں نے ان کی طرف اپنی گن سیدھی کرنا چاہی تھی کہ وہ مجھ پر آن پڑے۔ ان کا فائٹ کا انداز خاصا منجھا ہوا تھا، نتیجتاً میں ان کے پہلے ہی ہلّے میں ڈھے گیا۔ چھینی ہوئی گن بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر تاریکی میں کہیں جا پڑی۔ دونوں نے مجھے دبوچ لیا، ایک نے میری گردن پر اپنی گن کی سرد نال رکھ دی اور خونخوار لہجے میں غرایا۔

''خبردار...... ! اگر ذرا سی بھی حرکت کی......'' میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مجھے انہوں نے دبوچ کر اٹھا لیا اور یہی ان کی غلطی تھی۔ وہ مجھے کوئی عام سا شکار سمجھ بیٹھے تھے، جس نے ان کے ساتھ یونہی دل پشوری کے لیے ''مہم جوئی'' کی تھی، میں نے سیدھے کھڑے ہوتے ہی ان میں سے ایک کی ناف کے نیچے ٹانگ جڑ دی، اس کے ساتھی نے ٹریگر دبایا، ٹانگ رسید کرتے ہی مجھے اس کی طرف سے یہی توقع تھی، اسی وجہ کے تحت میں نے اس کے ساتھی کو اس طور ٹانگ جڑی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے چند انچ اچھل کر اس پر جا پڑا اور...... اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا، اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی، کیونکہ وہ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی یا دائیں بائیں کہیں گردے کے مقام پر لگی تھی۔ اس صورتِ حال نے آخری والے کو لمحہ بھر کے لیے بوکھلا دیا، میں نے اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بہ سرعت حرکت کی، وہ یہی سمجھا تھا کہ میں اس پر چھلانگ لگانے والا ہوں، اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کرنا چاہا، میں اتنا بے وقوف نہ تھا کہ اس حرکت کی طوالت میں اس کی دوسری گولی کی زد میں آتا، میں نے جھکائی دی اور اپنی ایک ٹانگ سوئپ کی، نتیجے میں وہ اچھلا اور دھپ سے گرا، میں اس پر جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی، وہ لیٹے لیٹے بھی ایک ہاتھ سے اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب موڑنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے ایک مہیب جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی۔ وہ وہیں ٹھنڈا پڑ گیا۔

''تت...... تم کک...... کون ہو؟''

وہ لڑکی اچانک ہی سامنے سے نمودار ہوئی، جو شاید کافی دیر سے خوف ناک کارروائی کا لہو رنگ منظر دیکھ رہی تھی، اس نے سامنے آتے ہی مجھ سے سہمے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''آؤ اس طرف، جلدی...... ورنہ ان کے اور بھی ساتھی آجائیں گے یہاں......'' میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے بنا تامل کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ لڑکی مجھے ایک عمر رسیدہ کے روپ میں یہ سب کرتا دیکھ کر یقیناً حیران ہو رہی تھی۔'' میں اسے لیے جھنگر سے باہر آگیا اور جنگل کی طرف بڑھ گیا، وہاں پہنچ کر ایک قدرے محفوظ مقام پر میں ٹھہرا اور لڑکی سے تفصیل جاننا چاہی۔

''اب مجھے تفصیل سے بتاؤ، یہ کیا معاملہ ہے؟ تمہارے ساتھ اور بھی تین ساتھی تھے، وہ کہاں ہیں؟''

میرے سوال پر اس کے پُرکشش چہرے پر افسردگی کی چھاپ گہری ہوگئی، بلکہ اس میں ایک وحشت زدہ سی بے چینی بھی محسوس ہوئی مجھے......

''مم...... میری مدد کرو پلیز......! مم...... میرے سوشیت کو بچا لو، نجانے ان ظالموں نے اس کا کیا حشر کیا ہو؟'' وہ میرے قریب آگئی، اس قدر...... کہ مجھے اس کے گرم تنفس کی تپش بالکل اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ تاروں کی مدھم مدھم ضوفشانی میں اس کا صاعقہ بار چہرہ بھی چاند کی طرح پھیکا پھیکا مگر اثر انگیز دکھائی دیتا تھا۔

''تم مجھے ساری تفصیل نہیں بتاؤ گی تو میں تمہاری اور سوشیت کی مدد کیسے کروں گا؟''

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بھینچی بھینچی آواز میں مختصراً بتانے لگی۔

''میرا نام پریتا ہے، میں اپنے منگیتر سوشیت اور اپنے

ایک اور دوست کپل، راج اور منی کے ساتھ سیر کی غرض کو اس طرف نکل آئے تھے، راج اور منی بھی ایک دوسرے کے منگیتر تھے، دراصل ہم چاروں ہی کلاس فیلو اور گہرے دوست بھی تھے، فائنل کے امتحانات کے اختتام کی خوشی میں ہم اپنی کار میں مرگ کے ساحلی علاقے کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں ہماری کار خراب ہوگئی اور ہم مدد تلاشنے کے لیے اس طرف نکل آئے تو یہاں کچھ مسلح آدمیوں نے ہمیں دھر لیا اور کہا کہ ہم ایک حساس سرکاری ادارے کی حدود میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے ہیں، لہٰذا انہوں نے ہم سے پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ گاڑی میں سوار کرالیا۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور اُن شیطانوں کی وہ بیرک نما چوکی تھی، جہاں ان کے تین اور بھی ساتھی موجود تھے، وہاں پوچھ گچھ کے بہانے ان ظالموں نے منی اور میرے ساتھ کھلواڑ (دست درازی) کی کوشش کی تو راج اور سوشیت کی غیرت جوش میں آگئی، مگر ان مورکھوں نے راج کو گولی مار دی۔ منی نیم پاگل ہوکر بے ہوش ہوگئی، راج کو بھی زخمی کر دیا، میں موقع تاک کر بھاگ نکلی، اور......'' اس سے آگے وہ فرطِ غم یا پھر اس جاں گسل احساس تلے رو پڑی تھی کہ وہ اپنے منگیتر کو ان ظالموں کے رحم وکرم پر چھوڑ آئی تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے ایک ذرا توقف کے بعد وہ یاس زدہ سے لہجے میں دوبارہ خود کو کوستے ہوئے بولی۔

''کاش! وہ شیطان مجھے بھی گولی مار دیتے...... آہ...... میرا سوشیت وہاں کس حال میں ہوگا، زندہ بھی ہوگا کہ......'' اس میں ایک بار پھر اپنا دردناک جملہ پورا کرنے کی سکت نہ رہی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اپنے طور پر کچھ ''اخذ'' کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا، جس کے مطابق یہ کوئی رومانی جوڑے تھے اور تفریح کی غرض سے بلیوتلسی کے علاقے میں آن پھنسے تھے اور چوکیداری پر مامور ان کے اہلکاروں کے چنگل میں جا پھنسے، جنہوں نے موقع اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی رات کی اس یکسانیت بھری بیزار کن ڈیوٹی کو ''رونق'' بخشنے کے لیے ان نوجوان جوڑوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔

''میں سمجھ گیا ہوں، یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں، یوں سمجھو ان شیطانوں کے قبضے سے میں بھی اپنی ایک ساتھی کو چھڑانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ یہ بتاتے ہوئے میرے ذہن میں سوشیلا کی ''موسی'' کا تصور تھا۔

''یہ لوگ بہ ظاہر خود کو دیش کا محافظ سمجھتے ہیں مگر ان کے اندر کا شیطان ان سے کچھ اور کرواتا ہے۔ خیر...... جانے دو، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ تم مجھے وہاں تک لے جاسکتی ہو جہاں یہ تم لوگوں کو لے کر گئے تھے؟'' میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ بھی میرا چہرہ غور سے تکے جا رہی تھی۔ جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو...... بالآخر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے سر کو ہلکی اثباتی جنبش دے کر کہا۔

''چلو، مجھے تمہیں لے کر پہلے اس جگہ پر جانا ہوگا جہاں ان لوگوں نے ہمیں روکا تھا تبھی مجھے وہاں سے اصل راستے کا اندازہ ہو پائے گا۔''

''چلو......'' میں نے بہ یک ترنت کہا۔

ہم دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ جھنگر کے اندر سے نکلے اور پھر پریتا کی نشاندہی پر ہم ایک طرف کو ہولیے۔ ان کی بیرک نما چوکی پر پہنچنا میرے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہاں میں ان کے ساتھیوں کو بھی چھڑا سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا، میرے اس مشن میں اس کا تھوڑا بہت اضافی بوجھ پڑ سکتا تھا، مگر اس کا مجھے بہت فائدہ ہوتا۔ انہیں چھڑا کر اور بلیوتلسی کا اصل سیاہ چہرہ میں ان کی انڈین عوام یعنی بھارتی جنتا کو دکھا کر ان سے بدل کر سکتا تھا۔ یہ بلیوتلسی کے خلاف ہی نہیں بلکہ میرا ''را'' والوں پر بھی ایک سماجی ضرب کے مترادف ہوتا۔ بھارتی جنتا کو یہ پتا چلنا چاہیے تھا کہ ان کے ملک کی انٹیلی جنس (را وغیرہ) صرف اپنے وطن سے مخلص ضرور ہو مگر بھارتی عوام ان کی نظروں میں محض قربانی کے بکرے کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتی، بھارتی جرنیل اور فوجی نیز انٹیلی جنس آفیسرز سمیت، سب کو اپنی انا پرستی، جنگی جنون اور اپنی بالادستی سب سے زیادہ عزیز رہی ہے، عوامی مفاد میں یہ لوگ اپنی عوام سے ہی قربانی مانگتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے ہی ان کی ''بلی'' بھی چڑھا دیتے ہیں۔ ممبئی میں ہونے والے بم دھماکے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

بھارت، پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے اور الزام تراشی میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں حقائق سامنے آنے پر اسے خود ہی کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

بہرکیف جس مقام پر پریتا مجھے لے کر پہنچی وہاں مجھے ایک کنکریٹ کی بنی چھوٹی سی چوکی کی عمارت دکھائی دی،

جہاں ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔

''میرا منگیتر سوشیت اور میری ساتھی منی وہاں ابھی تک قیدی ہوں گے، راج تو بے چارہ اب زندہ نہ رہا ہو شاید......'' پریتا نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا اور بہ غور اس چوکی کا جائزہ لینے لگا۔ دشمن کی چھینی ہوئی گن میرے قبضے میں تھی۔ پریتا کو مجھ پر یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میں بھی کوئی عام آدمی نہیں۔

عمارت چوکور تھی اور وہاں سناٹا طاری تھا، اس کی وجہ شاید یہی رہی ہوگی کہ میں ان کے بیشتر ساتھیوں کو ہلاک کر چکا تھا، اب پریتا کے مطابق یہاں دشمنوں کے صرف تین ساتھی ہونے چاہیے تھے۔ چوکی سے میرا اور میانی فاصلہ تیس چالیس گز تک ہی تھا، اس کے دائیں جانب خاردار تاروں کی باڑ شروع ہوتی تھی جو بائیں سمت تک چلی گئی تھی۔ وہاں یک ہرڈل راڈ گری ہوئی تھی، جس کے پار مجھے ایک نیم پختہ سا راستہ بل کھاتا ہوا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس راستے کو یکھ کر میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی...... راستے کا مقصد، اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ یہ بلیوٹکسی کی شہ رگ (ہیڈکوارٹر) تک جاتا تھا۔

ابھی میں اس بیرک نما چوکی کی طرف پیش قدمی کرنے کی نیت سے قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ معاً میں ٹھٹکا، یک آدمی کو میں نے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ پیچھے دروازے کی رف دیکھتا ہوا جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا، اس کے کاندھے مجھے کوئی انسانی وجود لدا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اندازہ یہی ہوتا ا کہ اس کے عقب میں اور ساتھی بھی چوکی کے دروازے سے نمودار ہونے والے تھے۔ اس کے کاندھے پر لدا ہوا سانی وجود ٹھکانے لگایا جانے والا تھا، جو پریتا کے ساتھی رمنی کے منگیتر راج کی لاش تھی۔ یہی ہوا...... وہ جب تک یپ کے پاس پہنچا، میں نے دو اور مسلح افراد کو نکلتے یکھا...... وہ تو اسی کے ساتھی معلوم ہوئے مگر جن دو افراد کو ہوں نے دبوچ رکھا تھا وہ مجھے قیدیوں ہی کی صورت نظر ئے۔

اسی وقت میرے کان کے بالکل قریب پریتا نے مناتی سی سرگوشی کی۔

''ی ی...... یہی، سس...... سوشیت اور منی ہیں......''

''ششش......'' میں نے ہولے سے اسے خاموشی کا شارہ دیا۔

''ی... یہ... لوگ ان دونوں کو کہاں لے جا رہے یں؟'' وہ میرے منع کرنے کے باوجود چپ نہ رہی، اس پر بوکھلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔ میں نے نیچی اور ذرا سخت آواز میں کہا۔

''تمہاری آواز اگر ان تک پہنچ گئی تو ہم بھی ان کی بربریت کا نشانہ بن جائیں گے، تم ذرا خاموش نہیں رہ سکتیں؟''

''سس...... سوری۔''

''اب تم اِدھر ہی رکو......'' میں نے اس سے کہا اور اس طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ اچانک ایک چلاتی ہوئی ہراساں آواز ابھری۔

''تت...... تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟'' یہ منی تھی، ایک اہلکار نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا، وہ چیخی، ٹھیک اسی وقت میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے ایک اور دل دوز منظر دیکھا۔ تھپڑ کھانے کے باوجود منی کے اندر جانے کہاں سے اتنی جرأت در آئی کہ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بازو اہلکار کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ اس کے ساتھی اور پریتا کے منگیتر نے خوف زدہ سی آواز میں اسے رک جانے کا بھی کہا، شاید اسے اس ہولناک حقیقت کا اندازہ تھا کہ وہ مار دی جائے گی، سوشیت کا خدشہ صحیح نکلا، اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا، جس اہلکار کی گرفت سے خود کو چھڑا کر منی جان بچانے کے.... احساسِ جوش تلے بھاگی تھی، اسی درندہ صفت نے اس پر گولی چلا دی تھی جو منی کی پشت میں لگی اور وہ وہیں ایک لرزتی ہوئی چیخ مار کر گر پڑی۔

اپنی ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر میرے ساتھ کھڑی تھر تھر کانپتی پریتا نے ایک ''بھنڈ'' مار دیا۔ وہ مارے دہشت و خوف کے اپنے حلق سے برآمد ہوتی چیخ کو نہ روک سکی تھی۔ اس کی چیخ کے ابھرنے کی دیر تھی کہ وہ دونوں اس طرف متوجہ ہوئے جس مختصر سے تاریک جھنڈ میں ہم دبکے ہوئے تھے، تب ہی ان دونوں نے اپنی گن سیدھی کر لی، پھر اس سے پہلے کہ وہ فائر کھولتے، میں خطرے کو پیشگی بھانپتے ہی اپنی گن سیدھی کر چکا تھا اور ان پر ایک برسٹ فائر کر دیا، منی کو گولی داغنے والا اہلکار ایک کریہہ انگیز چیخ خارج کرتے ہوئے گرا، میرا ہدف بھی یہی تھا، کیونکہ اس کے دوسرے ساتھی نے پریتا کے منگیتر سوشیت کو ہنوز اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی فوراً خود کو جیپ کی آڑ میں کر چکا تھا۔

ایک ''مرحلہ وار'' اندازے کے تحت میں نے حیران کھڑی پریتا کو دبوچا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ

بدلی، ٹھیک اسی وقت برسٹ فائر ہوا اور اس مختصر سے جھنڈ میں برستی گولیوں نے ہلچل مچا دی، جہاں ذرا ہی دیر پہلے میں اور پریتا دبکے ہوئے تھے۔ تھا میں بھی نہیں تھا، کیونکہ جگہ بدلنے کے بعد اب میرے لیے چھپنے یا آڑ لینے کی کوئی جگہ نہیں بچی تھی، فقط ایک ڈھلان سی تھی، جو کسی منہدم یا بیٹھے ہوئے ٹبے کی ہی ہو سکتی تھی، اسی پر میں سینے کے بل لیٹ گیا تھا اور پریتا کو بھی لٹا دیا۔ میں نے اپنی گن سیدھی کی اور یونہی جیپ کی باڈی پر برسٹ داغا۔

اسی وقت پریتا نے ایک اور بھنڈ مارا، وہ حلق کے بل چلائی اور میرا گن والا ہاتھ پکڑ لیا۔

''فائرنگ مت کرو بے وقوف بڈھے! میرا منگیتر اس حرامی کے قبضے میں ہے۔''

میں اس کی حرکت اور لب و لہجے پر ایک لمحے کو ششدر رہ گیا۔ شاید اس پر ہسٹریائی دورہ پڑ گیا تھا۔ ایسے میں بعض عورتیں گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتیں۔ مجھے بے وقوف کہنے پر طیش آ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنی گن سے ہٹایا اور غصے سے بولا۔

''بے وقوفی تم کیے جا رہی ہو...... خود پر قابو پانے کے بجائے چلا چلا کر دشمن کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ اب خاموش رہو ورنہ...... حالات کی ذمّے داری تم پر......''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ جوابی برسٹ فائر ہوا، میں نے اپنا سر جھکا لیا مگر ساتھ ہی مجھے قریب...... بہت قریب ''بھچاک'' کی عجیب سی ہولناک آواز سنائی دی اور میرا پورا چہرہ خون سے بھر گیا۔

یہ خون پریتا کا تھا۔ وہ مجھ سے بحث میں الجھ گئی تھی اور بروقت میں اسے دشمن کی برسائی ہوئی گولیوں کی مہیب بوچھاڑ سے نہیں بچا سکا۔ اس کا سر اُڑ گیا تھا اور اب وہاں خالی کاندھوں سے بھل بھل کرتا خون یوں ابلا پڑ رہا تھا جیسے، پانی کا کوئی پائپ پھٹ گیا ہو...... میں نے پلک جھپکتے ہی اپنی جگہ بدلی، کیونکہ دوسرا برسٹ فائر ہونے میں چند ہی سیکنڈ لگے تھے۔

پریتا کا انجام جس قدر اچانک تھا اتنا ہی ہولناک بھی۔ کاش اسے اس خطرنا کی کا علم ہو جاتا کہ وہ اور اس کے ساتھی، کن لوگوں کے نرغے میں آ چکے ہیں، تو شاید وہ میری ایک ایک ہدایت پر بلا چون و چرا عمل کرتی۔

دوسری جگہ چھوڑنے کے بعد میرے پاس اور کوئی جگہ چھپنے یا دشمن کی گولیوں سے بچنے کو نہیں مل سکی۔ لہٰذا میں .... بھی جوابی فائرنگ کی صورت اسے اپنی جگہ محبوس رہنے پر مجبور کرتے ہوئے، چوکی کی عمارت کی جنوبی دیوار کی طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی آڑ میسر آتے ہی مجھے آخری دشمن کی جھلک نظر آ گئی۔ اس کے لیے سوشیت بھی مسئلہ بنا ہوا تھا، مجھے نہیں پتا تھا کہ اسے اب تک اپنی منگیتر پریتا کی عبرتناک موت کا اندازہ ہوا بھی تھا یا نہیں، البتہ وہ بھی حالات کا کچھ ادراک کرتے ہوئے، اب شاید کچھ ہمت دکھانے پر آمادہ ہونے لگا تھا۔ دونوں کے درمیان گن جھپٹنے پر زور آزمائی ہو رہی تھی اور مذکورہ سمت کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اسی ''حوصلہ افزا'' منظر کی جھلک دیکھی تھی۔ تب ہی مجھے موقع ملا تھا، میں نے تیزی کے ساتھ اپنی گن کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور ایک گولی دشمن کی ٹانگ کا نشانہ لے کر داغ ڈالی، وہ چیخا اور لڑکھڑا کر جیپ کی باڈی سے اپنی پشت ٹکائی، گن ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی، جس کی نال کا رخ لامحالہ طور پر سوشیت کی طرف تھا۔ یقینی موت کے خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں مگر میں نے دوسرا فائر کر ڈالا، گولی دشمن اہلکار کے ہاتھ پر لگی اور اس کی گن سوشیت پر گرجنے سے پہلے ہی گر پڑی۔ سوشیت کو سکتہ ہونے لگا، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا وہ موت کو اتنے قریب دیکھ کر بھی زندہ ہے۔

دشمن نے حرکت کرنی چاہی تھی کہ میں ملک الموت کی صورت اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ زمین پر پڑا رہ گیا اور میری گن کی مہیب نال اس کے سینے کو چھو رہی تھی۔ ابھی میں اس سے درشت لہجے میں مخاطب ہونے ہی لگا تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں متعدد گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنی گن کا ٹھوس کندہ دشمن کے چہرے پر رسید کر دیا اور وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا، جبکہ اس کی ہیئت کذائی پہلے ہی خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔

میں نے قریب گم صم سے کھڑے سوشیت کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہا تھا۔

''اِدھر آ جاؤ...... ان کے ساتھی آ گئے ہیں۔'' میری آواز پر اس نے فوراً حرکت کی اور میرے ساتھ ہو گیا، میں نے ایک نظر اس طرف ڈالی جہاں سے مجھے ایک سے زائد گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس لہراتی چمکتی نظر آئیں، ان کا رخ اسی چوکی کی طرف تھا اور یہ سمت وہی تھی جہاں ہرڈل راڈ گرائی ہوئی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جو میرے محتاط اندازے کے مطابق .... بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر کی عمارت کی طرف جاتا تھا۔ یکلخت میری رگوں میں لہو بجلی کی لہریں بن کر دوڑنے لگا۔ میں نے

بہ غور ان گاڑیوں کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی سعی چاہی کہ یہ کتنی تعداد میں ہو سکتے تھے۔ گاڑیوں میں دو لمبی جیپیں اور ایک کار تھی۔ ہونٹ بھینچے بھینچے میں..... تیزی سے سوچتے ذہن کے ساتھ پلٹا اور سوشیت کو اپنے پیچھے آنے کا بھی اشارہ کیا۔

میں اس بیرک نما چوکی کے دروازے سے اندر جا گھسا۔ یہاں مجھے دو ہی کمرے نظر آئے ایک تو اقامتی طور پر مستعمل نظر آتا تھا جبکہ دوسرا تو باقاعدہ ایمونیشن ڈمپ کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہاں راکٹ لانچر اور دیگر اسلحہ کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ بم تھے۔ ایسا خطرناک اسلحہ دیکھتے ہی میرے اندر کا خطرناک اور تباہ کن کمانڈو چنگھاڑ مار کے بیدار ہوا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی زخمی شیر کو چیر پھاڑ کھانے کا موقع مل گیا ہو اور میرا شکار تھا...... کرنل سی جی بھجوانی......

اس کے ایک کونے میں سیمنٹ کا ایک پختہ زینہ بھی میں نے اوپر چھت کی طرف جاتے دیکھا۔

میں نے پل کے پل ایک بڑی سی کراس شیپ کی بیلٹ جسم پر باندھی۔ راکٹ لانچر اس میں اڑسا، فاضل راکٹ، چند دستی بموں کے ساتھ اس کے چرمی رخنوں میں پھنسائے۔ اپنی گن پھینک کر (جو دشمن سے ہی چھینی ہوئی تھی) ایک دوسری نسبتاً زیادہ خطرناک اور جدید گن اٹھالی۔

سوشیت ایک طرف کونے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ''عمر رسیدہ'' آدمی کو یہ ساری ''تیاری'' کرتے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہی تھا کہ میں تھا کون......؟

ساری تیاری سیکنڈوں میں باندھنے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم سوشیت ہو؟''

''ہاں......!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ باہر گاڑیاں رکنے اور مسلح سواروں کے اترنے کی آوازیں ابھریں۔

''تمہاری منگیتر سمیت باقی ساتھیوں کے قاتل یہاں آن پہنچے ہیں۔ مقابلہ میں ان سے کروں گا، تم ادھر ہی کھڑے تماشا دیکھتے رہنا، خبردار...... ! بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' اپنی منگیتر کی ہلاکت کا سنتے ہی اس بے چارے کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکے سے بیرک کا دروازہ کھلا، میں چونکہ پہلے ہی سے اس کے لیے تیار تھا اور اس زاویے سے کھڑا تھا کہ درانداز ہونے والا میری بھاری مشین گن کی زد میں تھا۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے بیرک کی محدود فضا آتشی رنگ و بو اور شور وشغب سے بھر گئی۔ زد میں آنے والا پہلا درانداز ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے لپکنے والے اس کے دو اور ساتھی بھی گولیوں کی طوفانی بوچھاڑ میں آگئے۔ مجھے ان سب کی مرحلہ وار چیخیں سنائی دیں، میں نے پینترا بدلا اور کمرے کی اسی سمت کو لپکا جہاں زینہ اوپر جاتا تھا۔ میں نے سوشیت کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا، وہ اپنا دل چھوٹا کیے بیٹھا تھا، اپنی منگیتر کی موت کا سن کر اس پر مردنی سی طاری ہو گئی تھی۔ تاہم اس نے میری تقلید کی۔

میں اوپر چھت پہ آگیا، یہ میرے لیے بہترین مورچا تھا۔ میں نے اس سمت والی منڈیر کی طرف دیکھا جو جھک کر دیکھنے سے سامنے کے رخ پر نیچے کا منظر پیش کرتی تھی مگر اس سے پہلے میں نے زینے سے نیچے کمرے اور بیرک میں متعدد بھاری بوٹوں کی دھمک محسوس کرتے ہی، ایک دو دستی بموں کی باری باری پنیں کھینچ کر زینے سے نیچے لڑھکا دیے اور پھر سوشیت کو لیے فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کے یکے بعد دیگرے نیچے دو سماعت شکن دھماکے گونجے اور مجھے اس بیرک کی چھت لرزتی ہوئی محسوس ہوئی، انسانی چیخوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی زینے کے خلا سے میں نے دھوئیں کے گاڑھے مرغولے اٹھتے دیکھے۔

دشمنوں کی ٹیم کو اس طرف سے بوکھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے بعد میں کمانڈو ایکشن کے دوسرے مرحلے پر آیا اور منڈیر کی طرف لپکا، یہ میرے دشمنوں پر آخری ضرب ثابت ہو سکتی تھی۔

منڈیر کی دیوار سے نیچے جھانکتے ہی مجھے باقی ماندہ دشمن ادھر ادھر پوزیشنیں سنبھالتے ہوئے دکھائی دیے، میں جانتا تھا کہ ان میں کوئی کسی بھی وقت مجھے دیکھ سکتا تھا اسی لیے ایک پل بھی ضائع کیے بغیر میں نے دو دستی بم ان پر اچھال دیے۔ ان میں سے کوئی خبرداری کے انداز میں چلایا بھی تھا مگر تب تک میرے پھینکے ہوئے دستی بم اپنا کام کر چکے تھے۔ ابھرنے والے سماعت شکن دھماکوں میں ان کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے اچھی خاصی بھگدڑ مچا دی تھی اور سمجھتا تھا اب کہ میں دشمنوں کی نفری کو طاقت سمیت کم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں تو میں نے منڈیر سے نیچے ایک جیپ کی کینوسی چھت پر چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت دو مسلح دشمن دائیں جانب سے ابھر کر گن سمیت میری طرف لپکے، میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ان پر جا پڑا۔ انہیں رگیدتے

ہوئے زمین تک گرنے پر میں ایک کی ٹھوڑی پر اپنے دائیں ہاتھ کے زوردار پنچ کو آزما چکا تھا۔ وہ وہیں اوغ کی خرخراتی آواز نکال کر ڈھیر ہوگیا جبکہ دوسرے کو میں نے دبوچ لیا۔

”تت...... تم کون ہو......؟“ وہ خاصا دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے جھٹکا لگا، اسے اس قدر خوف کے عالم میں دیکھ کر مجھے لگا میں بلیو تلسی کے تربیت یافتہ اہلکاروں سے نہیں بلکہ عام پولیسیوں سے نبرد آزما ہوں، یا پھر ممکن تھا کہ یہ بلیو تلسی کا کوئی فارورڈ ونگ گروپ ہو...... اصل تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ ابھی اندر کہیں موجود تھے۔

”اپنی موت سمجھو لو......“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”وہ کتا! سی جی بھجوانی کہاں ہے؟“

”مم...... میں نہیں جانتا۔“ وہ گھگیا کر بولا۔

”تو پھر اپنی کتے جیسی موت کے لیے تیار ہو جاؤ......“ دانت پیس کر یہ کہتے ہوئے میں نے دستی بم نکالا اور اپنے منہ کے قریب لے گیا......

”یی یی...... یہ کیا کرنے لگے ہو تم......؟“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

”تمہیں بھیانک موت سے ہمکنار کرنے لگا ہوں۔“ میں نے خوں رنگ لہجے میں کہا۔ ”یہ بم میں تمہاری پتلون کی (بیک) والی جگہ میں پھنسا کر آگے نکل جاؤں گا۔“

”بب...... بتاتا ہوں...... ٹھ ٹھ...... ٹھہرو......“

”جلدی بکو...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ میں غرایا۔

”وہ اِدھر ہی موجود ہے۔“

”اس کے ٹھکانے کی طرف یہی راستہ جاتا ہے؟“ میں نے آنکھوں اور چہرے کی مدد سے اسی نیم پختہ راستے کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں!“

”یعنی ہیڈ کوارٹر بھی ادھر ہے۔“

وہ چپ رہا۔ میں ایک بار پھر دستی بم کو اپنے منہ تک لے گیا، جیسے اس کی پن نکالنے ہی والا ہوں......

”ہاں...... ہاں۔“

”جھوٹ مت بولنا، کیونکہ تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں...... وشواس کرو میرا۔“

”ٹھیک ہے، اٹھو...... مگر خبردار! کوئی غلط حرکت کی تو پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“ میں نے اسے گرفت سے آزاد کرتے ہوئے تہدید کی۔

میں نے دونوں جیپوں کو چھوڑ کر کار کا انتخاب کیا اور سوشیت کو اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

اب ہم اس مذکورہ راستے پر گامزن تھے۔ میں دشمن اہلکار کو عقبی سیٹ پر گن پوائنٹ پر لیے بیٹھا تھا اور سوشیت کار چلا رہا تھا۔

”انکل...... ! کک...... کیا واقعی میری پریتا کو ان ظالموں نے مار ڈالا ہے؟“ کار چلاتے ہوئے سوشیت نے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ وہ میرے ”گیٹ اپ“ کی وجہ سے مجھے ”انکل“ کہنے پر حق بجانب تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

”ہاں! برخوردار......! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی، ان ظالموں نے اس بے چاری کو بھی بڑی بیدردی سے ختم کر ڈالا۔“

”یہاں ہوا کیا تھا؟“ مغلوب اہلکار نے پوچھ لیا۔ میں نے دانت پیس کر غصے سے کہا۔

”تم لوگ بھارتی سرکار کی وردی پہن کر یہاں کیا گُل کھلا رہے ہو، یہ بہت جلد منظرِ عام پر آنے والا ہے۔“ میں نے کہا اور پھر پریتا کی بتائی ہوئی رُوداد بلا کم و کاست بیان کر دی۔

”میں اپنے ساتھیوں کی اس غلط اور ظالمانہ حرکت پر شرمندہ ہوں...... مگر تم کون ہو؟“ وہ بولا۔ مجھے اس کے لہجے سے روایتی مکاری کی بو صاف محسوس ہونے لگی تھی مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سوشیت دکھ بھرے غصے سے بیک ویو مرر میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم جلاد ہو سب...... سرکار کی وردی میں بدمعاشی اور کھلواڑ کر رہے ہو یہاں...... تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور...... میری منگیتر پریتا کس کی بیٹی تھی۔ اس کے باپ گھوترا جی...... کو جب اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی ہلاکت کا علم ہوگا تو وہ پورے بھارت میں ایک بھونچال کھڑا کر دے گا۔“

”گھوترا جی...... گھوترا جی......“

یہ نام ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ میں بجنے لگا۔ یہ نام میرا سنا ہوا تھا، میں نے پل کے پل اپنی یادداشت کو کھنگالا اور بے اختیار میں نے سوشیت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”تم...... کہیں اس گھوترا جی کی بات تو نہیں کر رہے ہو جو بھارتی فلمی صنعت کا ایک بڑا کرتا دھرتا ہے؟“

’’ایگزیکٹلی...... انکل! وہی گھوترا جی ہیں...... کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟‘‘ وہ بولا۔

’’ہاں......!‘‘ میں نے مختصراً کہا۔

ممبئی کے قریبی شہر کے ساحل سمندر میں واقع بیچ ریسٹورنٹ میں اس کی اور میری ملاقات ہوئی تھی، جب رینا اور اس کے منگیتر مہیش کے ساتھ چند اوباش لڑکے بدمعاشی کر رہے تھے اور پھر میں ان کے بیچ کود پڑا تھا، بس پھر کیا تھا وہ گھوترا جی میرے پیچھے گویا ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے کہ میں ان کی نئی آنے والی ایکشن رومان فلم میں کام کروں، یہ جاننے کے باوجود کہ میں کوئی اداکار نہیں تھا نہ ہی مجھے اس کا تجربہ یا شوق بھی تھا، مگر گھوترا جی ماننے کو تیار نہ تھا، اب پتا نہیں میں نہیں جانتا تھا کہ اس رذیل بھجوانی نے پورے بھارت میں مجھے پاکستانی ایجنٹ ڈکلیئر کرنے اور میری تصاویر ’’وطن دشمن‘‘ کے روپ میں پورے بھارت میں پھیلا دینے کے بعد گھوترا جی کی اب میرے بارے میں کیا رائے یا تاثرات ہو سکتے تھے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

سامنے کسی عمارت کا خاکہ نمودار ہوتے ہی میں نے سوشیت سے کار روکنے کا کہا۔

سوشیت اب میرے لیے اہم ہونے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ’’دیکھو برخوردار......! ذرا بہادری سے کام لینا ہے اب تمہیں...... اگر تم اپنی منگیتر پریتا اور اپنے ساتھیوں سے سچی محبت کرتے ہو تو تم پر بھی لازم ہے تم اپنے ان معصوم اور بے گناہ ساتھیوں کے خونِ ناحق کا پورا پورا بدلہ لو...... ورنہ خاموشی سے جانا چاہتے ہو تو...... یہ راستہ اور کار تمہارے حوالے ہے، ابھی لوٹ جاؤ......‘‘ میں نے نجانے یہ بات اس سے کہہ کر اس کی کون سی رگ پھڑکا دی تھی کہ وہ ایک دم کار کو بریک لگا کر جوش سے بولا۔

’’ہرگز نہیں انکل......! میں اور پریتا بچپن کے ساتھی تھے اور ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ میں تو ابھی تک اپنی پریتا کی ناگہانی موت پر ذہنی طور پر تیار ہی نہیں ہو سکا ہوں، پھر راج اور منی کی دردناک موت کو بھی میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔ ہم سب گہرے اور بچپن کے دوست تھے، ہرگز نہیں انکل......! میں آپ کے ساتھ ہوں اور اپنی پریتا سمیت اپنے ان دونوں معصوم ساتھیوں کی موت کا بدلہ ضرور لے کر رہوں گا...... میں آپ کی طرح شہ زور تو نہیں ہوں انکل......! لیکن آپ شاید پریتا کے ڈیڈی گھوترا جی کو نہیں جانتے، وہ بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں اور دیکھنا جب انہیں اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی ہلاکت کا علم ہوگا اور وہ بھی ان جعلی اہلکاروں کے ہاتھوں، وہ ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔‘‘

مجھے جواب مل چکا تھا اور میں نے پیش آئندہ اور پیش آمدہ حالات کا فوراً تجزیہ کیا۔ اس کے بعد سوشیت سے بولا۔

’’گڈ...... اب تم اِدھر ہی رکے رہو...... یہاں سے ہلنا بھی مت...... میں ابھی لوٹ کے آتا ہوں...... ہاں، خطرہ محسوس کرو تو تمہیں جانے کی اجازت ہے۔ اپنی جان کی فکر کرنا پہلے......‘‘

’’آپ کوئی چنتا مت کریں انکل! آپ جتنی دیر میں بھی آئیں، مجھے ادھر ہی پائیں گے۔‘‘ اس کے لہجے کا استحکام میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ پھر میں خود سمیت دشمن اہلکار کو لیے کار سے نیچے اتر آیا اور سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ اگرچہ میں اپنے ہدف کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور مجھے ادھر پہلے بھی لایا گیا تھا اس لیے اب وہ میرے کام کا نہیں رہا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر میرے اشارے کی سمت دیکھا تو میں نے بہ سرعت اس کی رگِ حساس مسل ڈالی، وہ وہیں کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گر پڑا۔

میں نے پیچھے مڑ کر، کار کی کھڑکی سے حیران کن نظروں سے جھانکتے ہوئے سوشیت کو فتح کا انگوٹھا دکھایا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

یہ بالکل سو فیصد وہی جگہ تھی...... یعنی جہاں میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا اور واپسی کے وقت پٹی کی ایک جھری کھلی رہ جانے کی وجہ سے میں یہاں سے ساحل سمندر اور سے جی کوہارا کی یوٹ تک سارا راستہ ازبر کرتا رہا تھا۔ خشکی کے راستے سے یہاں تک آنے کے لیے میں نے سوشیلا سے مدد لی تھی۔

اب میرا ٹارگٹ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے وسیع و عریض احاطے میں مجھے چند گاڑیاں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں، کچھ مسلح افراد اس کے گرد اور چھت پر مٹر گشت کر رہے تھے۔ چھت والے مسلح پہرے داروں کے گلے میں انفراریڈ دوربینیں جھول رہی تھیں، جنہیں وہ گاہے بہ گاہے اپنی آنکھوں سے لگا کر گرد و پیش پر نظر ڈال لیتے تھے۔ چھت پر ایک بڑا پیالے کی شکل کا ڈش اینٹینا بھی نصب تھا، جس کے درمیان ایک سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی، یہ گردشی اینٹینا تھا۔ جس کا جائزہ لیتے ہوئے میں دفعتاً ہی چونکا تھا، کیونکہ میں نے اس لائٹ کے سنگم میں ایک تیز نارنجی

رنگ کی لکیر بھی وقتاً فوقتاً پھوٹتے دیکھی، میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا...... یہ ایک خطرناک سرچنگ ریز (کھوجی شعاع) تھی۔ جو خاصی دور دور تک پڑ رہی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس کے ساتھ طاقت ور گن بھی نتھی ہو۔ عمارت کے سامنے مجھے فقط ایک ہی بڑا سا اونچی چوکھٹ والا دروازہ نظر آرہا تھا، ایک دو سنگل پٹ کے دروازے مجھے سامنے کی رخ والی دیوار کے دونوں آخری سمتوں پر بھی نظر آئے۔ یہاں ذرا ذرا فاصلے پر لوہے کے پائپوں پر گلوب نما بلب روشن تھے۔ خاردار آہنی باڑھ نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

میرے پاس چوکی سے حاصل کردہ اسلحہ موجود تھا۔ میں چاہتا تو دندناتا ہوا اندر جا گھستا، مگر یہ نری خودکشی کا بھی سبب بن سکتا تھا۔ جبکہ ابھی تک یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ میرا اصل ''شکار'' (سی جی بھجوانی) اندر موجود بھی تھا یا نہیں، اگرچہ آخری دشمن اہلکار نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

ابھی میں دراندازی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے سرچ لائٹ کے سنگم میں مختلف زاویوں میں گردش کرتی اس تیز نارنجی روشنی کی لکیر کو یکدم سرخ پڑتے دیکھا۔ یہی نہیں، گھومتا ہوا یہ ریڈار سسٹم ڈش اینٹینا کو بھی میں نے تھمتے دیکھا۔ میرے ذہن میں کھٹکا ہوا۔ کھوجی شعاع کا رنگ بدلنا اور گردش کرتی سرچ لائٹ کا ڈش سمیت رک جانا خالی از علت نہ تھا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں ابھرا کہ کہیں میں تو اس کی ان دیکھی زد میں نہیں آگیا ہوں؟ مگر دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونکا۔

''سوشیت۔''

یہ نام اچانک ہی میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن رسا میں ابھرا تھا اور میری پیشانی پر تفکر آمیز سلوٹیں نمودار ہوگئیں۔ شاید وہ اس کی کھوجی شعاع کی زد میں آگیا تھا اور اب اس کی مع تصاویر کے لوکیشن اندر بیٹھے کسی سیکیورٹی روم کے مانیٹر میں ٹریس کی جارہی ہوگی۔ ان اسپائی آلات کی خفیہ کارکردگی کو بھلا مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا؟ اور سوشیت اس کی زد میں آچکا تھا۔ سوشیت کی زندگی خطرے میں تھی اور میرا مشن بھی اسی زد میں تھا، جبکہ مجھے اپنے مشن کے ساتھ سوشیت کی بھی جان بچانی تھی۔ کیونکہ وہ ان اہلکاروں (بلیوٹلسی) کی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ''کھلواڑ'' اور بہیمانہ قتل و غارت گری کا چشم دید گواہ تھا اور گھوترا جی جیسے آدمی کا ہونے والا داماد بھی۔

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے عمارت کے اندر سے چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ قریب کھڑی ایک جیپ میں تیزی سے سوار ہو رہے تھے، میں نے ان کی طرف ... سردست کوئی توجہ نہ دی اور دوڑتا رہا...... سوشیت کار کے باہر بونٹ سے ٹکا کھڑا تھا، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ خونی قاتلوں کی زد میں آچکا ہے جو اَب خونخوار بھیڑیوں کی طرح اس کی طرف لپکنے والے تھے۔ اس سے پہلے میں وہاں جا پہنچا مگر اس کے قریب جانے کی غلطی نہ کی اور دور کھڑے ہو کر اسے اشارے سے بلایا...... وہ بھی کچھ بے چین سا نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میری جانب لپکا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کھوجی شعاع اس کے تعاقب میں ہوگی۔ وہ اگر میرے قریب آیا تو میں بھی ٹریس کرلیا جاؤں گا، لہٰذا میں نے اسے فاصلے پر ہی رک جانے کا کہا اور بولا۔

''اُدھر ہی رک جاؤ...... تم دشمن کے ایک خطرناک سیکیورٹی سسٹم کی زد میں آچکے ہو اور وہ تمہیں ہلاک کرنے کے لیے نکل پڑے ہیں......'' اس کے چہرے کا رنگ یکدم فق ہوگیا۔ میں نے کہا۔

''ہمت اور حوصلے سے کام لو...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... بس! مجھ سے ذرا فاصلے پر رہنا......''

اس نے حلق میں اترتی رقیق شے کو نگلتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ یہی وہ وقت تھا جب قریب سے گاڑی کی آواز ابھری، یہ وہی لوگ تھے، میں نے سوشیت کو ایک درخت کی آڑ میں جانے کا اشارہ کیا اور خود اس راستے پر آگیا۔ جہاں سے وہ جیپ آرہی تھی، ذرا قریب آنے پر میں نے اپنے کندھے سے راکٹ لانچر اتار لیا...... اب دشمن کے ٹھکانے پر دھاوا بولنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، میں نے جیپ کا نشانہ لے کر فائر بٹن دبا دیا۔ ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز ابھری اور راکٹ فائر ہوا...... جب تک جیپ سواروں کو خطرے کا پوری طرح اندازہ ہوتا، راکٹ ان کی جیپ سے ٹکرا چکا تھا۔ ایک سماعت شکن دھماکے سے جیپ کو میں نے آگ کے گولے کی طرح فضا میں اچھلتے دیکھا اور چلّا کر سوشیت سے بولا۔

''تم اب یہاں سے ہلنا بھی مت، ادھر ہی دبکے رہو، ورنہ جان سے جاؤ گے، میرا انتظار کرو......''

اس کے بعد میں تیزی سے پلٹا۔

دشمن کی صفوں میں ہلچل مچ چکی تھی۔ میں دوڑتا ہوا...... عمارت کی اس دیوار کے قریب آگیا جو جنوبی سمت

میں تھی۔ یہاں ذرا رک کر میں نے دیکھا کہ اندر سے چند مسلح افراد برآمد ہو رہے تھے، میں تب اپنے کاندھے پر لدے ہوئے راکٹ لانچر کی نال میں دوسرا راکٹ پھنسا چکا تھا، دشمنوں کے اس نئے اور مختصر سے جتھے کو دیکھتے ہی میں نے ان پر راکٹ فائر کر دیا۔ دھماکا ہوا اور متعدد کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ میں نے دشمنوں کے ناپاک وجود کو فضا میں اُڑتے دیکھا، اس پر ہی میں نے بس نہیں کیا، اس وقت میرے وجود کی نس نس میں جوش و غیظ کا طوفان بپا ہو گیا تھا...... میری لہو رنگ نگاہوں کے سامنے بار بار میرے بوڑھے باپ کا چہرہ رقص کرنے لگا تھا۔ یہ وہی منحوس جگہ تھی جہاں میرے باپ تاج دین شاہ پر ایک طویل عرصہ تک ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے اور آج میں اس مقام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا تھا۔

میں نے ایک راکٹ اور فائر کر ڈالا۔ اس بار میرا نشانہ چھت پر نصب وہ ڈش اینٹینا کی طرح کا ریڈار تھا۔ وہاں آگ لگ گئی اور سارا اسکیورٹی سسٹم تباہ ہو گیا۔

بلیو تلسی کے ٹھکانے کے باہر دھوئیں اور بارود کے بادل منڈلانے لگے تھے، میں اس کی آڑ لیتا ہوا محتاط روی سے آگے بڑھنے لگا، خاردار فولادی تاروں کو میں نے ایک دستی بم مار کر پہلے ہی اُڑا دیا تھا، ایک سائرن بھی گونجنے لگا تھا، جو تھوڑی ہی دیر تک ہنکارنے کے بعد بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے راکٹ لانچر پھینک کر بھاری مشین گن سنبھال لی تھی اور آواز کی سمت میں نے بے دریغ فائر کھول دیا، متعدد چیخوں ...کی آوازیں سنتا ہوا میں اس سنگل پٹ والے دروازے کے قریب پہنچ گیا اور ساتھ ہی مین گیٹ کی طرف یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرینیڈ اچھال دیے، کان پھاڑ دھماکوں کی آوازیں سننے کے دوران ہی میں نے اپنی گن سے سنگل پٹ والے دروازے کو توڑا اور اندر جا گھسا، میرے عقب میں کسی نے فائر کھولا تھا اور اس کے آہنگ سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ باہر میری تلاش میں نکلے ہوئے دشمنوں کی تعداد ”تسلی بخش“ حد تک کم ہو چکی تھی۔

اندر قدم رکھتے ہی..... مجھے ایک راہداری دکھائی دی، جو تھوڑا آگے جا کر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ رہی تھی، میں نے اس جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی تک میرے سامنے کوئی ذی نفس نہیں آیا تھا، یا پھر لگتا تھا کہ ان کی ساری توجہ عمارت سے باہر تھی اور وہ باہر نکلتے چلے گئے تھے۔ میں نے اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی درانہ وار پیش قدمی کو جاری رکھا اور ایک کمرے میں آ کر دم لیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا، دفعتاً مجھے اس کے دوسرے دروازے کے باہر دوڑتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا اور محتاط روی سے اس دروازے کی طرف بڑھا جو میرے بائیں ہاتھ کی طرف تھا، اسے تھوڑا کھول کر باہر جھانکا تو یہ مجھے بڑے سے ہال کی صورت نظر آنے لگا، اور یہاں میں نے آٹھ دس مسلح افراد کو بھاری مشین گنیں اٹھائے لپکتے دیکھا، ان کا رخ سامنے کی جانب تھا۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ والی دیوار کی آڑ لے کر اپنی مشین گن سے ان پر فائر کھول دیا، کئی چھلنی ہو کر گرے، چند نے خود کو گرا کر گولیوں کی زد سے بچانے کوشش چاہی۔ یہی نہیں، انہوں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ لیٹے لیٹے پلٹ کر میری جانب برسٹ بھی چلائے، مگر میں ان کے نشانے سے بچا رہا، ورنہ جس تیزی کے ساتھ ان چند دشمنوں نے زیرک دماغی کے ساتھ جس پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے میری زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔

خطا جانے والی گولیوں کی دائیں بائیں بوچھاڑ پڑتے ہی میں نے خود کو ایک دم چوکھٹ والی دیوار کی آڑ میں کر لیا اور ساتھ ہی ایک آخری بچا ہوا، بیلٹ میں اُڑسا دستی بم نکال کر اس طرف اچھال دیا۔ سگریٹ جیسے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا، میرا پھینکا ہوا ہینڈ گرینیڈ لڑھکتا ہوا ان کی طرف چلا گیا اور دشمنوں نے اٹھ کر کھڑے ہونے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے، ہاتھوں، کہنیوں اور گھٹنوں کی مدد سے اپنے آپ کو دستی بم کی زد سے دور لے جانے کی اپنی سی کوشش چاہی تھی کہ کان پھاڑ دھماکے سے وہ پھٹ گیا۔ کریہہ انگیز چیخوں کی آواز پر میں نے تیزی مگر محتاط روی کے ساتھ پیش قدمی کی اور ان کے سروں پہ جا پہنچا، کافی سے زیادہ واصل جہنم ہو چکے تھے، باقی اِکّا دُکّا، جاں بہ لب تھے، میں نے ایک زخمی کو مشکوک سی حرکت کرتے دیکھ کر چھاپ لیا اور وحشت لہو رنگ غراہٹ سے بولا۔

”وہ کتا...... سی جی بھجوانی کدھر ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ جیسے مرنے کے قریب ہو، میں نے اس پر وقت ضائع نہیں کیا اور گن سنبھالے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مختلف کمرے کھنگالنے کے بعد میں جس کمرے میں پہنچا، تو اس کا نقشہ دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا۔

یہی کمرا میرے شکار سی جی بھجوانی کا تھا...... کیونکہ سامنے دیوار پر اس کی شیشے کے فریم والی اور قدِ آدم تصویر لگی ہوئی تھی، جس میں اس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی، چہرے پہ رعونت کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی۔ کمرا خاصا کشادہ تھا مگر باہر پھیلے بارود اور دھوئیں کے سبب یہاں کی محدود فضا بھی کچھ گدلی گدلی سی ہو رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں بڑا سا آرام دہ بیڈ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک فیملی سائز صوفہ بھی بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک بڑی سی میز رکھی تھی جس پر تین بڑی اسکرینز نظر آرہی تھیں، دو بالکل تاریک تھیں، جبکہ ایک آن تو تھی مگر اس میں اڑی لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا، اس کے سامنے ہی ایک نسبتاً اونچی پشت گاہ والی ایزی چیئر رکھی ہوئی تھی، جس پر بڑے ٹھسے کے ساتھ کوئی براجمان تھا۔

میری گن کا رخ اسی شخص کی پشت کی طرف تھا اور میری آنکھوں میں خون اترا آیا تھا، دفعتاً ہی کمرے کی دم بہ خود سی فضا میں ایک شناسا اور کرخت آواز ابھری۔

”آؤ شہزی......! میں تمہیں یہاں سوئیکار کرتا ہوں......“

اس آواز کے ابھرنے کے ساتھ ہی وہ شخص کرسی گھما کر میرے سامنے آگیا۔ وہ کرنل سی جی بھجوانی ہی تھا۔ وہی درندہ صفت شخص، جس نے میرے باپ پر انسانیت سوز تشدد کر کے اس غریب کی یادداشت ختم کر ڈالی تھی مگر اس سے بھی قطع نظر یہ وہی مردود و ملعون شخص تھا جو یہاں بیٹھا میرے وطن کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ سب سے بڑا جرم اس کا تو ایک یہ بھی تھا کہ یہ خبیث اور متعصب ہندو...... ماضی میں میرے وطن کو دولخت کرنے کی سازش میں کارفرما لابی کا بھی ایک اہم رکن رہ چکا تھا۔ اس کی دشمنی کے بہت سے حوالے تھے میرے ساتھ...... اور ہر حوالہ اسے میری نظروں میں واجب القتل قرار دے چکا تھا۔ لیکن...... ان سب باتوں کے باوجود مجھے اس کا ایزی چیئر پہ براجمان ہو کر مجھ سے یوں مخاطب ہونا اور مجھے ایک بوڑھے کے بھیس میں ہونے کے باوجود پہچان لینا، میرے لیے کچھ اچنبھے کا ہی باعث تھا، تاہم میں نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر دبنگ لہجے میں کہا۔

”بھجوانی......! اپنی موت کو آج پہچان لے جو تجھ سے اب زیادہ دور نہیں رہی ہے......“

”ہا...... ہا......“ اس نے ایک بدمست سا قہقہہ بلند

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ ستمبر 2016ء کی جھلکیاں

داستان باری

وہ ادبی دنیا میں ادیب گر کہلایا، ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم کا شاہکار ایک تحقیقی سوانح

آسمان چپ رہا

عراق کے جنگ زدہ ماحول سے ابھری سلمیٰ اعوان کی سوچ کے در وا کرنے والی تحریر

سو سال کی بچی

انور فرہاد کے قلم سے فلم نگری کی ایک انتہائی دلچسپ روداد

روڈیو

انسان اور سانڈ کے درمیان کھیلے گئے مقبول خونی کھیل کی منظر کشی علیم شاہد کی زبانی

شمشال سے ٹورنٹو

اگر یورپ میں سکونت کا ارادہ ہے تو ندیم اقبال کے کھٹے میٹھے تجربے کا نچوڑ اس سفر کہانی کو ضرور پڑھیں

جواب

عورت اگر عقل کا استعمال کرے تو اپنے ٹوٹتے گھر کو بہ آسانی بچا لیتی ہے، پل پل رنگ بدلتی شہانہ سعید کی دلچسپ سچ بیانی

اور بھی بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

کیا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ آخر اس بدبخت کو کس بات کا اطمینان تھا؟ یا پھر یہ اپنی یقینی موت کو دیکھ کر پاگل سا ہونے لگا تھا؟ میں کچھ اندازہ قائم نہ کر سکا۔

''تم مجھ سے پوچھو گے نہیں کہ میں نے یہاں بیٹھ کر تمہیں کیسے پہچان لیا؟'' وہ میری بات صرفِ نظر کرتے ہوئے پُرغرور لہجے میں بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ پوچھنا میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

''ایک بات تو یہ کہ یہاں تک پہنچنے والا ایک شہزی کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا ہے۔'' وہ آگے بولتا رہا۔ ''دوسرا یہ......''

کہتے ہوئے اس نے روشن والی اسکرین کے آگے ایک کی بورڈ کا بٹن پش کیا اور اسکرین پر میری موجودہ بھیس والی تصویر نمودار ہو گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خاص سوفٹ ویئر کی مدد سے وہ تصویر مختلف زاویوں سے گزرتی میری اصل شکل میں آگئی ..... میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے مردود کتے......! مرنے کے لیے تیار ہو جا......'' میں نے دانت پیس کر کہا اور اپنی گن کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے لبلبی پر اپنی انگلی رکھ دی۔

''نا نا...... نا...... شہزاد احمد خان...... شانت رہو...... اتنی جلدی مت کرنا مجھے ہلاک کرنے کی...... شاید تم ابھی مجھ سے پوری طرح واقف نہیں ہو کہ میں ہمیشہ اپنے پاس ایک ٹرمپ کارڈ ضرور رکھتا ہوں......'' وہ استہزائیہ نظروں ...... سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی بات پر گن کی لبلبی پر تھرکتی ہوئی میری انگلی ساکت ہو گئی۔ ورنہ اگلی جنبش پر میں برسٹ فائر کرنے ہی لگا تھا۔

''مانا کہ تم اپنے باپ کی طرح بہادر اور ذہین ہو، لیکن مکاری میں تم کبھی بھی سی جی بھجوانی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میری دور اندیشانہ فراست وہاں تک جاتی ہے جہاں تمہاری ذہانت بھی پانی بھرتی ہو گی۔ کوہارا کی یوٹ کو نشانہ عبرت بنانے اور میرے اہم ساتھیوں کو ہلاک کرنے کے بعد سے جب تم فرار ہو گئے تھے تو میں تمہارے خلاف ایک اور چال پر عمل پیرا ہو چکا تھا، مگر بظاہر تم یہی سمجھے ہوئے تھے کہ میں تمہیں پکڑنے کے لیے کوشاں ہوں...... ہیں ناں......؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا...... شہزی......؟''

اس کا لہجہ لمحہ بہ لمحہ زہریلا اور کاٹ دار ہو رہا تھا، جو میرے دل و دماغ میں طاری جوش اور غیظ کے طوفان کو فزوں سے فرو کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

بالآخر میں نے جھلا کر کہا۔ ''تم کچھ بھی بکواس کرتے رہو...... بھجوانی! آج تم میرے ہاتھوں نہیں بچ سکتے......''

''بس......! اب ذرا...... یہ دیکھ لو پہلے......'' اچانک اس نے ایک اور بٹن دبایا۔ اسکرین میں جھماکا ہوا۔ اس کے بعد ایک فلش پلیئر کی تاریک اسکرین ابھری اور اگلے ہی لمحے اس پر ایک ویڈیو کلپ دکھائی جانے لگی۔ یہ کسی سیلن زدہ سے کمرے کا منظر تھا۔ جو قید خانہ ہی نظر آتا تھا۔ تین افراد قیدیوں کی صورت ایک ساتھ کھڑے تھے، ان کے ہاتھ، چھت سے جھولتی فولادی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ چہرے سامنے کے رخ پر تھے، ان کی ہیئت کذائی بہت خستہ ہو رہی تھی۔ جسموں پر جابجا تشدد کے نشانات نظر آرہے تھے مگر ان تینوں کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ انہیں پہچان کر مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین کرنا دوبھر ہونے لگا۔ یہ تینوں قیدی، اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا تھے۔ جوشِ غیظ سے مغلوب الغضب ہو کر میں کرسی پر بڑے آرام سے براجمان، زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے سی جی بھجوانی پر جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی...... اور اپنا لہو رنگ چہرہ اس کی منحوس صورت کے بہت قریب لے جا کر پھاڑ کھانے والے انداز میں غرا کر بولا۔

''کک...... کہاں قید میں رکھا ہے تم نے انہیں......؟ جلدی بتا کتے! ورنہ میں تیرا برا حشر کروں گا۔''

اس کے اطمینان اور اعتماد بھرے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کے برعکس وہ گویا حظ اٹھانے والے انداز میں اسی طمانیت سے بولا۔ ''دھیرج...... مائی ڈیئر شہزی! دھیرج......!''

''نہیں ابھی بتا...... یہ کہاں قید ہیں؟ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا...... بول......''

''یہ میری قید میں ہیں اور نہ پاکستان میں ہیں نہ یہاں بھارت میں......'' وہ عجیب ڈرامائی اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''کہاں ہیں یہ تینوں؟''

''بتاتا ہوں...... گردن چھوڑو...... مجھے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہے......'' وہ ہولے سے کھانسی کا ٹھسکا مارتے ہوئے بولا۔

''ہرگز نہیں......''

''ہا...... ہہ...... ہا۔'' اس نے اپنے حلق سے پھنسا

پھنسا قہقہہ اُگلا۔ سانس رکنے کے باعث اس کا چہرہ سرخ اور پھر نیلا سا پڑنے لگا، آنکھیں حلقوم سے ابلنے کے قریب ہو گئیں مگر اس حالت میں بھی وہ اپنے ہونٹ پھیلا کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے میں مجھے اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک اور مکروہ دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کو نفی میں حرکت دی۔ اس کا اشارہ بھانپ کر میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اسے ایک ٹھسکا لگا اور وہ بری طرح کھانستے ہوئے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنی تذلیل آمیز شکست کے زیرِ اثر ''مینیا'' (ذہنی شکست وریخت کا شکار) کی حالت سے دوچار تھا۔

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا...... شہزی!'' وہ بڑے ہولناک لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ تم سے میں نے جو اَب تک شکست کھائی ہیں وہ میرے لیے موت سے بھی بڑھ کر اذیت ناک ہے، مگر یاد رکھنا، اگر تم نے مجھے مار دیا تو میں بڑے سکون سے مروں گا کیونکہ پھر تمہارے یہ تینوں لاڈلے ساتھی بھی نہیں بچیں گے۔''

اس کی حرکت اور گفتگو نے مجھے بری طرح جھلا کر رکھ دیا۔ میں اس وقت اپنے ایک بڑے دشمن پر بالادستی قائم کرنے کے باوصف خود کو بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

''بتاؤ مجھے...... تم نے میرے ساتھیوں کو کہاں قید میں رکھا ہے؟ اور یہ کیسے تمہارے ہتھے چڑھے؟''

''ہاں...... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ ایک بار پھر اپنی سانسیں بحال کرتے ہوئے بولا۔ اس کا یاس زدہ طمانیت بھرا لہجہ مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔ وہ مایوسی کی حد تک پہنچ چکا تھا مگر ایک نامعلوم سی تشفی آمیزی میں مبتلا تھا اور اس حالت میں میرا اسے ہلاک کرنا، دل مائل نہیں ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس مردود نے مجھے میرے جگری ساتھیوں کی قید و بند کی حالت میں تصاویر دکھا کر مجھے تشویش زدہ کر دیا تھا۔

''میں تمہیں خود بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کس طرح تمہارے ان تینوں جغادری اور اہم ساتھیوں پر ہاتھ ڈالا، جسے سن کر تم بلاشبہ میری ذہانت کی داد......'' ٹھیک اسی وقت میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ منہ سے کراہ آمیز چیخ سی خارج کر کے بھاری بھرکم کرسی سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر جھکتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ فرش پر کمر کے بل اسے پٹخ دیا، کرسی کو ایک لات رسید کر کے دور کر دیا اور پھر اپنی داہنی ٹانگ کا بوٹ اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''سی جی......! میں تم سے کوئی کہانی نہیں سننا چاہتا...... مجھے میرے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ، تم نے انہیں کہاں اور کس حالت میں رکھا ہوا ہے؟''

''میں نے کہا ناں...... کہ وہ تینوں نہ پاکستان میں ہیں نا بھارت ماتا میں......''

یہ کہتے ہوئے وہ ہنسا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا اسی طرح وقت ضائع کرتا رہے گا اور اتنی آسانی سے منہ سے کچھ نہیں اُگلے گا۔ میں نے پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور پھر اپنی بھاری گن کا ٹھوس کندہ اس کی کنپٹی پر جڑ دیا، وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اس کے ناپاک وجود کو اپنے کندھے پر لادا اور دروازے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں باہر نکلا تو سامنے سوشیت کی کار کھڑی تھی اور وہ خود ہراساں و پریشان کار سے اتر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونکا اور میرے قریب آتے ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''شکر ہے بھگوان کا تم زندہ ہو۔''

''جلدی نکل چلو یہاں سے...... اس سے پہلے کہ اس مردود کی...... مدد یہاں پہنچ جائے۔'' میں نے کہا اور کار کی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر سی جی بھجوانی کے بے سدھ وجود کو اندر ڈال دیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا کہ کہیں جلد ہی ہوش میں آ کر یہ کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔

سوشیت نے اس کے بارے میں مجھ سے استفسار کرنا چاہا تھا مگر میں نے اسے کار دوڑانے کی تاکید کر ڈالی۔ اس نے یہی کیا اور اگلے ہی لمحے کار فراٹے بھر رہی تھی۔

''تم نے تو ان کے ٹھکانے پر اچھی خاصی تباہی مچا ڈالی ہے۔ تم آخر ہو کون انکل......؟'' سوشیت سے پھر رہا نہ گیا۔ ''مجھے تو یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے گردن موڑ کر ایک نظر عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑے کرنل سی جی بھجوانی کی طرف دیکھا۔

''اپنی توجہ آگے مرکوز رکھو، راستہ بڑا گنجلک اور ٹیڑھا میڑھا ہے۔'' میں نے اس کا سوال ہی صرف نظر کر ڈالا۔

''کہاں چلنا ہے؟ پولیس اسٹیشن؟'' تھوڑی دور نکل آنے کے بعد سوشیت نے مجھ سے استفسار کیا۔

''یہ پولیس سے بھی اونچی شے ہے، پولیس تو اس کے لیے الٹا مددگار ثابت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر......؟'' وہ استفساریہ بولا۔

''میں تمہیں ایک مقام پر اتار دوں گا۔ تم رکشا یا

ٹیکسی لے کر کسی طرح اپنی بدنصیب منگیتر پریتا کے باپ گھوترا جی سے ملاقات کرنا اور انہیں ساری حقیقت بتا دینا کہ کس طرح ان لوگوں نے تم پر ظلم کیا تھا، ابھی معاملہ تازہ ہے، دیر ہوگئی تو تمہاری منگیتر اور باقی دونوں ساتھیوں کا خون رائگاں چلا جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ بہت اثر ورسوخ والے ہیں، بعد میں ان کے ساتھی لاشیں تک گم کر دیں گے ان کی۔''

''مگر......؟''

''بحث مت کرو......'' میں نے اسے ہچر مچر کرنے سے روک دیا اور آگے بولا۔

''مجھے گھوترا جی کا نمبر دے دو، میں بہت جلد ان سے رابطہ کرلوں گا۔'' میری ہدایت پر اس نے فوراً عمل کیا اور گھوترا جی کا سیل نمبر مجھے بتا دیا۔ میں نے اسے آسان طریقے سے فوراً ہی ذہن نشین کرلیا اور پھر عقبی سیٹ سے پشت ٹکا کر تھکے تھکے انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔

کچھ منٹوں بعد کار مین روڈ پر آگئی۔ میں نے سوشیت کو اترنے کا کہا اور خود کار کی اسٹیئرنگ کو سنبھال لیا اور سوشیت کو حیران وپریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

بہت ہی کم وقت میں، میں سوشیلا کے پاس اس کے ڈپلیکس میں پہنچا، (جو درحقیقت رینا کی کسی سہیلی ہی کا تھا)۔

رات اپنے آخری پہر میں تھی اور ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ اس رہائشی بلڈنگ کے گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ سوشیت کو چھوڑنے کے بعد میں نے بھجوانی کے بے سدھ وجود کو کار کی ڈکی میں ٹھونس دیا تھا۔

چوکیدار نے مجھے روک کر کچھ پوچھنے کی کوشش چاہی تھی، میں نے اسے وہی جواب دیا تھا جو رینا مجھے سکھا چکی تھی۔ یعنی میں ان کا مہمان تھا، وغیرہ۔ یوں بھی میں نے اپنا بھیس بدل رکھا تھا۔

کار پارکنگ میں آتے ہی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر مطمئن ہو کر میں نے کار کی ڈکی کھولی تو اچانک میرے چہرے پر ایک گھونسا پڑا، وار غیر متوقع اور اچانک تھا، گھونسا میری ناک پر پڑا تھا، جس نے ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجھنا دیا اور آنکھوں کے گرد اندھیرا ابھی چھانے لگا، پھر میں جب تک سنبھلتا، ایک لات بھی مجھے اپنے سینے پر کھانی پڑی، میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے کار کی ڈکی سے سی جی بھجوانی کو وحشیانہ غراہٹ سے یوں ابھرتے اور نمودار ہوتے دیکھا، جیسے تابوت میں سے کوئی لاش اچانک زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی ہو...... اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔ گنج پر بچے کھچے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر وحشت برس رہی تھی، اور لباس بری طرح مسک کر رہ گیا تھا۔

اس کم بخت کو جانے کب سے ہوش آچکا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ وہ مجھ پر ڈکی کھولتے ہی حملہ کر ڈالے، اور یہی اس نے کیا بھی تھا، مگر یہ اس کی خطرناک کوشش سہی، تاہم جان بچانے کی اس نے اپنی سی حرکت ضرور کی تھی۔ وہ شور بھی مچا سکتا تھا، میں نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور اس کی طرف لپکا۔ وہ ڈکی سے خود کو باہر اچکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہی میں نے اسے چھاپ لیا اور اس کی کنپٹی پر مکا جڑ دیا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کر ایک بار پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہی چوکیدار اسی طرف کو چلا آرہا تھا، انداز اس کا مٹرگشت کا ہی سا تھا، مگر میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا تھا، اور میرے پیچھے بہ ظاہر یونہی آگیا تھا، تاکہ مجھے نظروں میں لے سکے۔ یہ اس کی ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ میں نے جلدی سے خود کو پارکنگ کے اندر نصب ایک موٹے ستون کی آڑ میں کرلیا، وہ چوکیدار اسی طرف آرہا تھا، جہاں میں نے کار روکی تھی۔

میں اس کی تشکیکی نظروں سے کسی طرح بچتا بچاتا ہوا...... زینے کی طرف بڑھا۔ ڈپلیکس دوسرے فلور پر تھا۔ لفٹ بھی لگی ہوئی تھی مگر میں نے کسی خطرے کے پیشِ نظر اسے استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بے ہوش سی جی بھجوانی کو کاندھے پر اٹھائے زینے چڑھنے لگا، ابھی فرسٹ فلور پر ہی پہنچا تھا کہ اچانک میرے سیدھے ہاتھ والے ڈپلیکس کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پختہ العمر شخص برآمد ہوا...... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک گیا، پل کے پل اس کے چہرے پر شک کے آثار ابھرے۔

''سوری! یہ میرے بھائی صاحب ہیں، کلب میں زیادہ چڑھا لی تھی انہوں نے، اسی لیے کندھوں پر اٹھانا پڑا۔'' میں نے ذرا رک کر بغیر گھبراہٹ کے اس سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، حالانکہ میرا اس سے معذرت کرنے کا کوئی جواز بنتا نہیں تھا، تاہم یہ خوش اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر تو تھا ہی، ساتھ ہی اس میں اپنا ''جرم'' چھپانے کی بھی خواہش کارفرما تھی۔

''مگر...... آ...... آپ کون؟ پہلے کبھی آپ اس بلڈنگ میں نظر نہیں آئے؟'' وہ مجھے مشتبہ نظروں سے تقریباً گھورتے

ہوئے بولا۔ میں اپنے ڈپلیکس کا پتا نہیں بتانا چاہتا تھا، کیونکہ مجھے چوکیدار سمیت اس ''پڑوسی'' نے بھی دیکھ لیا تھا اور شک میں مبتلا ہوگیا تھا۔

''ارے جناب! میں تھک رہا ہوں...... یہاں اوپر تیسرے فلور پر کسی کے ہاں مہمان آیا ہوا ہوں......'' یہ کہہ کر میں اوپر چڑھنے لگا۔ وہ مجھے تکتا رہا، سیکنڈ فلور پر پہنچ کر میں نے ذرا نیچے دیکھا تو وہی کم بخت جھک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اب میں اس کے سامنے تو سیکنڈ فلور والے ڈپلیکس میں نہیں داخل ہوسکتا تھا اسی لیے مجبوراً مجھے اسے ڈاج دینے کے لیے تیسرے فلور پر چڑھنا پڑا...... وہ بھی سی جی بھجوانی کے حرام اور بھاری وجود کو اٹھائے، جبکہ میں پہلے ہی خاصا تھکا ہوا تھا۔ دیکھا کہ وہ شخص بدستور میرے تعاقب میں زینے طے کیے چلا آرہا تھا۔ میں غصے سے دانت پیس کر رہ گیا اور غصے سے بڑبڑایا۔

''یہ کمبخت جاسوس کی اولاد مجھے اس وزن کے ساتھ ٹاپ فلور پر چڑھا کر ہی رہے گا۔''

میں غصے سے پلٹا اور اس ''خوامخواہ'' کے جاسوس کی طرف لپکا۔ مجھے یوں اچانک پلٹتا پا کر پہلے تو وہ جاسوس موصوف حیران ہوا... مگر پھر میرے جارحانہ تیور دیکھ کر اس کے چہرے پر نزلہ گرنے کے تاثرات ابھرے، وہ بھی پلٹا، مگر میں تب تک اس کے قریب پہنچ چکا تھا اور کرنل سی جی بھجوانی کو مشکلوں سے اپنے کاندھوں پہ تھامے تھامے جاسوس موصوف کی پشت پر ایک عدد لات رسید کردی۔ وہ پہلے ہی مجھ سے ڈرا ہوا تھا، میری لات کھاتے ہی اس کے حلق سے لات کی ضرب سے زیادہ اس دہشت کے مارے چیخ ایک ''ہائیں'' کی صورت میں برآمد ہوئی اور وہ گھسڑتا ہوا...... نیچے جارہا۔ میں نیچے آگیا اور اپنے ڈپلیکس کا دروازہ کھڑکایا۔

شکر تھا کہ سوشیلا کھٹکے کی نیند سونے کی عادی تھی اور دوسری ہی دستک پر جاگ پڑی تھی۔ لہٰذا اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میں سی جی کو اٹھائے غڑاپ سے اندر جاگھسا، سوشیلا حیران و پریشان نگاہوں سے دروازے پر ہی کھڑی مجھے گھورتی رہ گئی۔

''یہ کسے اٹھالائے ہو یہاں......؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔ میں نے ایک صوفے پر بے ہوش سی جی بھجوانی کو پٹخا اور سیدھا کھڑے ہوکر سوشیلا سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''دروازہ بند کرو پہلے...... ایک مصیبت گلے پڑگئی ہے۔'' میرا اشارہ اس جاسوس موصوف اور چوکیدار کی طرف تھا مگر سوشیلا یہ سمجھی کہ میں سی جی بھجوانی کو مصیبت کہہ رہا ہوں، بولی۔

''تو پھر اس مصیبت کو تم یہاں کیوں اٹھا لائے ہو......؟''

اس نے دروازہ آہستگی سے بند کردیا تھا۔

''میں اس مصیبت کی بات نہیں کر رہا ہوں...... نیچے پڑگئی تھی مصیبت، بلکہ یک نہ شد دو شد......'' پھر میں نے اسے مختصراً چوکیدار اور اس جاسوس موصوف کے بارے میں بتادیا۔ وہ بھی خاصی تشویش زدہ ہوگئی، تاہم کچھ سوچ کر تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

''تم اپنے اصل روپ میں نہیں ہو، کوئی بات نہیں، جلدی سے اب جاکر واش روم میں اپنا یہ میک اپ اتار لو......''

''کرنا تو یہی پڑے گا، مگر.... میں اپنے اصل روپ

ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ''باتیں بہار و خزاں کی......'' پیش کیا جارہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کرسکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی ستمبر کا
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

میں اب بھی نہیں آنا چاہتا۔‘‘

’’تو پھر کوئی اور بہروپ بھر لو......‘‘ اس نے مشورہ دیا۔ اس کی بات معقول تھی، میں نے یہی کیا، حالانکہ میں خاصا تھکا ہوا تھا۔ لیکن واش روم جانے سے پہلے میں نے سوشیلا سے ایک مضبوط رسی لانے کا کہا۔ ابھی میں نے اسے سی جی بھجوانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، وہ بلا چون وچرا... میرا حکم مانتی رہی اور میرے ساتھ......سی جی کو رسن بستہ کرنے میں مدد بھی کی۔ اس احتیاط کے پیشِ نظر، کہیں وہ ہوش میں آتے ہی شور مچانا نہ شروع کر دے، میں نے اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ بھی چپکا دی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے واش روم کا رخ کیا اور جلدی جلدی بابے والا بہروپ بدل کر ایک دوسرا نوجوان لڑکے والا بہروپ بھر لیا۔ اس کام میں مجھے آدھا گھنٹے سے اوپر کا ہی وقت لگا تھا۔

لوٹ کے آیا تو سوشیلا میرے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ لاؤنج کی بتی بجھا کر اس نے زیرو پاور کا بلب روشن کر دیا تھا۔ کرنل بھجوانی کو دوسرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سوشیلا کو دھیرے دھیرے سب بتا ڈالا۔ وہ متحیر سی ہو گئی۔ بھارت کی ایک خطرناک انٹیلی جنس کے چیف افسر کو اس وقت ایسی حالت میں اپنے ڈپلیکس میں پا کر اور اس کی حیثیت کے بارے میں جان کر وہ کچھ غیر مرئی خوف میں مبتلا ہو گئی تھی۔

’’کیا ہوا......؟‘‘ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

’’کک...... کچھ نہیں، بس! یقین نہیں آ رہا کہ تم نے تن تنہا اتنا بڑا مشن کیسے مکمل کر لیا؟ اور پھر اتنی بڑی اور گھاگ ایجنسی کے سربراہ کو کھلونے کی طرح کاندھوں پر اٹھا کر یہاں بھی لے آئے۔‘‘

’’اس لیے کہ یہ ایک مکمل طور پر کمانڈو مشن تھا لیکن افسوس کہ یہ ابھی بھی ادھورا ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’تو کیا تم اسے یہاں لا کر ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟‘‘ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

’’میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ وہاں والا کام یہاں لا کر نمٹاؤں۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ’’مجھے اس کے منہ سے کچھ اگلوانا ہے۔‘‘

’’کیا؟‘‘

’’ابھی پتا چل جاتا ہے، تم ایک نمبر نوٹ کرو، کہیں میرے ذہن سے محو نہ ہو جائے۔‘‘ کہتے ہوئے میں نے اسے سوشیت کا بتایا ہوا وہ نمبر جو بدنصیب پریتا کے باپ اور مشہور فیملی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر گھوترا جی کا تھا، نوٹ کرا دیا۔

’’آؤ میرے ساتھ......‘‘ اس کے بعد میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے جہاں بھجوانی کو رسن بستہ حالت میں رکھا ہوا تھا۔

وہ ہوش میں تھا اور اسی طرح آڑا ترچھا قالین پر پڑا ہوا تھا۔

سوشیلا اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتی ہوئی ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی جبکہ میں بھجوانی کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اس سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’سی جی! میں تمہارے منہ سے اسکاچ ٹیپ ہٹا رہا ہوں، تاکہ ہم آپس میں کچھ معاملات کی باتیں کر سکیں۔ ظاہر ہے وہ بولنے سے ابھی قاصر تھا مگر اس کی آنکھوں سے ایک عیارانہ سی مسکراہٹ مترشح ہوتی صاف محسوس ہوئی تھی۔ تاہم اس نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔

میں نے آہستگی سے اس کے منہ پر سے اسکاچ ٹیپ ہٹا دی۔ وہ ہلکا سا کھانسا اور پھر قدرے ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

’’اگر تم اس خوش فہمی ہو کہ میں تمہیں ان تینوں ساتھیوں کے بارے میں بتا دوں گا تو یہ تمہاری خوش فہمی پر ماتم کرنے کے مترادف ہوگا، شہزی...... مائی ڈیئر......!‘‘

’’بکواس بند......‘‘ میں نے ہولے سے غرا کر کہا۔ ’’مجھے اس پر مجبور مت کرو کہ میں تمہاری زبان کھلوانے کے لیے تھرڈ ڈگری طریقے پر اتروں۔ جس کی کامیابی کا مجھے سو فیصد یقین بھی ہے۔ لیکن میں تمہارے شایانِ شان اس معاملے کو......‘‘

’’ہا......‘‘ اس نے میری بات کاٹ کر ہوا میں اُڑا دی اور زہرخند لہجے میں بولا۔

’’تمہارے جیسا جلد باز اور بے وقوف میں نے نہیں دیکھا۔ تمہارے ساتھی تو تمہاری ناک کے بالکل نیچے تھے۔ شہزی......!‘‘

اس بدبخت کی بات پر میں چونک اٹھا۔

’’کیا مطلب؟‘‘ میں نے بھویں سکیڑ کر اس کے مکروہ چہرے کا جائزہ لیا۔

’’تمہارے وہ تینوں ساتھی وہیں میری قید میں تھے مگر تم نے میری بات کا یقین ہی کب کیا تھا کہ وہ میرے

ھنسے میں ہیں یا میں محض بڑک مار رہا تھا......؟''

اس رذیل کی بات نے مجھے واقعی اندر سے بری رح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ دیکھا جاتا تو یہ مجھ سے واقعی ایک لطی ہوئی تھی۔ لیکن بسا اوقات پیش آمدہ حالات میں آدی ہی فیصلہ کرتا ہے جو اس وقت وہ اپنے تیئں درست سمجھتا ہے، بعد میں ہی اس کا ادراک ہوتا ہے کہ وہ صحیح ھا یا غلط...... لیکن باوصف اس کے مجھے سوچنا چاہیے تھا، اتنی ڑی بات بھجوانی جھوٹ کیسے کہہ سکتا تھا؟ مجھے وہیں اس کا نہ کھلوانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی، ممکن تھا کہ وہاں کسی خفیہ نہ خانے میں میرے تینوں ساتھی محبوس حالت میں مل جاتے مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا یک دم تینوں اس کے ہتھے کس طرح چڑھے ہوں گے؟ جبکہ بقول اس خبیث کے وہ تینوں اس وقت نہ پاکستان میں تھے اور نہ ہی بھارت میں، تو پھر کہاں تھے وہ؟

میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے مجھ سے یہ تو جھوٹ ہی بولا کہ وہ تینوں ساتھی نہ پاکستان کی سرزمین پر ہیں نہ ہی یہاں بھارت میں۔'

''یہاں مجھے تھوڑا جھوٹ سے کام لینا پڑا تھا۔'' وہ حیثانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد وہ اسی جگہ پہنچائے جا چکے ہوں گے، جہاں کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

ایک بار پھر میں اس کی بات پر چونکا۔

''کوئی بات نہیں، میں اب بھی وہاں جا کر انہیں نکال لاؤں گا، اس کے بعد ہی تم سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھنے لگا تو وہ ہنس کر بولا۔

''کہا نا...... میں نے کہ وہ اب تمہیں وہاں نہیں ملیں گے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''میری دلیر ساتھی کوشیلا انہیں وہیں لے جا چکی ہوگی جہاں کا میں نے ایسے کسی حالات میں انہیں پہنچانے کا پہلے ہی سے حکم دے رکھا تھا۔''

''میرے ساتھی تمہارے ہتھے کس طرح چڑھے تھے؟''

''زہرہ بانو سے اپنے گرفتار شدہ جاسوس کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ تمہاری مدد کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتی اور نہ ہی تمہارے ساتھی...... وہ ضرور کسی نہ کسی طرح بھارت آنے کی کوشش کریں گے، میں نے اپنا جاسوسی کا نیٹ ورک ان تمام راستوں پر پھیلا دیا جہاں سے ان کی آمد متوقع ہوسکتی تھی۔ جلد ہی میرے جاسوسوں نے یہ پتا لگا لیا کہ تمہارے تینوں مذکورہ ساتھی، وزٹ ویزے پر بائی ائر بھارت پہنچنے والے ہیں، ان کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں یہاں پہلے ہی سے ان کے خلاف جال بچھا چکا تھا۔ وہ بہ آسانی اس میں پھنس گئے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور مجھے اس کے مکارانہ ذہن اور بیدار مغزی کا قائل ہونا پڑا۔ یہ سارا کامن سینس اور چوطرف خیالات کی دوڑ کا نتیجہ تھا کہ بھجوانی کے ذہن میں بھی وہی امکانی خیال گردش کر رہا تھا جس کا مجھے بھی خدشہ تھا کہ میرے ساتھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کبھی نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ذہن کی داد دیتا ہوں، اب معاملے کی بات کرو، میرے پاس وقت کم ہے۔'' بالآخر میں نے کہا تو وہ زہرخند ہنسی کے ساتھ بولا۔

''معاملے کی بات پر آتے ہو تو پہلے، میرے اہم ایجنٹ سندر داس کی رہائی کی بات ہوگی۔''

''اس کو بھول جاؤ، وہ پرانی بات ہو چکی ہے۔ یوں بھی اب اس کا معاملہ ہمارے اختیار سے باہر جا چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے پھر، تم بھی اپنے ان تینوں ساتھیوں کو بھول جاؤ......'' وہ تاؤ دلانے والے لہجے میں بولا۔ تو میرا سر گھوم گیا۔ اسی وقت سوشیلا نے مجھ سے کہا۔

''شہزی......! تم پہلے پاکستان میں مقیم اپنے ساتھیوں کو فون کر کے کنفرم تو کرلو کہ آیا تمہارے یہ تینوں مذکورہ ساتھی کہاں ہیں؟''

''میں اس بارے میں سوچ چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اس میں ہماری فون کال ٹریس ہونے کا خدشہ ہے۔''

''تمہیں کہیں بھی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شہزی!'' معاً ہی بھجوانی بولا۔

''وہ تینوں میری قید میں ہی ہیں۔''

اس بار میں اپنے طیش پر قابو نہ پا سکا اور نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر اس کی گردن دبوچ لی اور خونخوار غراہٹ سے بولا۔

''تمہیں بتانا ہوگا سی جی! کہ میرے ساتھی اس وقت کہاں ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ اسے مطلق پروا نہیں تھی کہ اس کی جان اس وقت میرے رحم و کرم پہ ہے۔ ممکن تھا کہ یہ اس کی تربیت کا حصہ رہا ہو، یا پھر وہ ایک مخصوص اسپائی داؤ کھیل رہا تھا میرے ساتھ جس میں حریف کے پوری طرح زیر دست

آنے کے بعد مایوسی کا کھیل کھیلا جاتا ہے تاکہ مدِمقابل، اسے موت کی دھمکی دے کر بھی اس سے کچھ نہ اگلوانے سے مایوس ہو کر بیٹھ جائے، اسے سائیکو پیتھ مائنڈ کنٹرول کہا جاتا تھا۔ یعنی دوسرے کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ ''زیردست'' اب اس کے ''کام'' کا نہیں رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، نہیں بتاؤ......'' میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور اسے گھسیٹ کر صوفے پر اسی حالت میں پھینکا اور سوشیلا کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں بولا۔

''تم کوئی خالی سرنج تلاش کر کے لاؤ...... میں ابھی اس خبیث کا منہ کھلواتا ہوں، یہ شاید بھول رہا ہے کہ میں خود بھی کوئی شے ہوں...... جلدی کرو۔'' سوشیلا فوراً چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔

''مجھے کوئی پروپر سرنج تو نہیں ملی ہے، یہی ایک ٹیبل کی دراز میں رکھی ہوئی تھی، اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو......'' وہ ایک پتلی سی سرنج میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

یہ سرنج شوگر کے مریضوں کے لیے مستعمل ہوتی تھی، جس سے وہ خود کو انسولین بھر کر لگاتے تھے۔ شاید اس گھر میں کوئی شوگر کا مریض تھا، جو شوگر کنٹرول کرنے والی گولیوں کے بجائے انسولین استعمال کرتا تھا۔

''چلے گا، لاؤ......'' میں نے یہ کہتے ہوئے سوشیلا کے ہاتھ سے سرنج لے لی۔ وہ خالی تھی۔ میں نے دو تین بار اس کے پلنجر (plunger) کو اندر باہر کر کے اس کے اندر سے ہوا نکالی اور ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے سی جی بھجوانی کی طرف بھی دیکھا۔ اس کے چہرے پہ اب کچھ پُرسوچ سی الجھن ابھری تھی اور مجھے ''بلف'' کرنے والی ''مایوسی'' عنقا ہونے لگی تھی۔

''مجھ پر ایسی کوئی دوا اثر نہیں کرے گی، مائی ڈیئر شہزی! جو میرا منہ کھلوا سکے۔'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''تمہارا منہ کھلوانے کے لیے مجھے ایسی کسی مہنگی دوا پر پیسہ خرچ کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے سی جی......! میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں خاموش موت سے ہمکنار کر دوں، لیکن یہ موت ایسی ہوگی کہ تم اس میں تڑپ تڑپ کر بڑی جان کنی کے عالم میں اپنی جان دو گے، مگر تمہارے حلق سے ایک ذرا آواز بھی خارج نہ ہوگی۔ کیونکہ بہرحال میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رہی میرے ساتھیوں کی بازیابی تو ان کا میں اپنے طور پر کھوج لگا لوں گا۔ تم اپنے دیہانت کی تیاری کرو...... کرنل سی جی بھجوانی......''

میں نے اپنے لہجے میں دانستہ ہولناک سی قطعیت سموتے ہوئے سفاک لہجے میں کہا اور پھر اس کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی غیرمحسوس مگر بھانپتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کا بھی جائزہ لیا۔ حسبِ توقع مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے کی ایک لرزاں سی جھلک اٹدتی محسوس ہوئی۔ میں نے سرِدست اس کی مطلق پروا نہ کی، جانتا تھا کہ موت کو...... بلکہ ایک اذیت ناک موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑے طرم خاں کے بھی حوصلے جواب دینے لگتے ہیں۔

میں نے اس کے بازو کو دبوچا اور اس کی نس کا جائزہ لیا۔ اسے چھوڑ کر میں نے سرنج کا پلنجر کھینچا، اب اس کے اندر ہوا بھر گئی...... پھر میں نے سوشیلا سے کہا کہ وہ اس کا بازو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد میں اس کی نس ڈھونڈ کر سرنج دھیرے دھیرے اس میں کھبونے کے لیے قریب کرتا چلا گیا۔

''ی ی...... یہ یہ کیا کر رہے ہو تم؟ خالی سرنج لگا رہے ہو مجھے؟'' بالآخر وہ بولا۔ اس کے لہجے کی خوف زدہ سی لڑکھڑاہٹ عیاں تھی۔

''ہاں! میں تم پر کوئی دوا نہیں ضائع کرنا چاہتا، یہ آسان اور موثر طریقہ ہے، شاید تم اس کی خطرناکی سے واقف نہیں ہو، اس سے تمہاری رگوں میں دوڑتے خون میں ہوا کے ائر ببل (بلبلے) بن جائیں گے، جو دل کی شریانوں تک پہنچتے ہی تمہارے بوڑھے دل میں ہلچل مچا دیں گے، تمہیں اپنا دل پھٹنے کے قریب محسوس ہوگا۔ وہ رک جائے گا، جسے میڈیکل اصطلاح میں کارڈیک اریسٹ کہتے ہیں لیکن پھر دھڑکنا شروع کر دے گا، درد کی ایک شدید لہر تمہارے پورے وجود میں جلتے سلگتے انگارے کی طرح سرایت کر جائے گی۔ تم چیخنے کی کوشش کرو گے، مگر آواز نہیں نکلے گی۔ یوں تم ہارٹ اٹیک کے ایک ایسے جاں گسل عمل سے گزرو گے جو تمہیں بار بار پڑے گا، اب تم خود اندازہ کر لو۔''

اس کی موت کا ایک بھیانک نقشہ کھینچنے کے بعد میں نے سرنج کی نڈل اس کی نس میں ذرا چبھوئی تو وہ چلّا اٹھا۔

''ٹھ ٹھ...... ٹھہرو......''

میرا ہاتھ رک گیا مگر میں اسی پر جھکا رہا اور جھکے جھکے ہی اپنی بھویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں تم سے تمہارے ساتھیوں کے بدلے اپنی جان

بچانے کی ڈیل کرنے کو تیار ہوں۔'' بالآخر یہ اسی پٹری پر آگیا جس پر میں اسے لانا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھیوں کے بدلے میں، پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے اہم جاسوس سندر داس کی رہائی کا ''پہاڑا'' پڑھنا چھوڑ دے۔ میرا دل اپنی اس ''ٹیکنیکل'' چال پر بلیوں اچھل پڑا مگر میں نے دانستہ بے تاثر لہجے میں اس سے استفسار یہ کہا۔

''ڈن؟''

''ڈن۔''

میں ہٹ گیا اور سوشیلا کو بھی اشارہ کر دیا کہ وہ اس کا بازو چھوڑ دے۔

''سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ میرے ساتھیوں کو تم نے کہاں قید کر رکھا ہے مگر جھوٹ بولنے سے پہلے یہ یاد رکھنا، میں جب تک انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں، تم میری قید میں رہو گے۔''

''میں بھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' وہ بولا۔

''لیکن تمہیں پہلے میری زندگی کی ضمانت دینا ہوگی۔''

''مجھے خود اپنی زندگی کا نہیں پتا تو بھلا میں تمہاری زندگی کی ضمانت کس طرح سے دے سکتا ہوں۔''

''چالاک بن کر وقت ضائع کرو گے تو دونوں کا نقصان ہوگا۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں......؟'' وہ مکارانہ متانت سے بولا تو میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے کہا۔

''تمہاری زندگی کی ضمانت مشروط ہے، یہی کہ جب تک میں اپنے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا۔ اور...... یوں بھی تم یسی کسی پوزیشن میں نہیں ہو اس وقت کہ مجھ سے اپنی کوئی بات منوا سکو، کیونکہ مجھے خود پر پورا اعتماد ہے کہ تمہیں جہنم واصل کرنے کے بعد بھی میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر لوں گا۔ آخر کو تمہیں بھی تو میں نے چھاپ ہی لیا تھا نا......''

''مجھے پانی پلاؤ۔'' اس نے کہا۔ میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا، وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ ''وہسکی نہیں مل سکتی؟'' وہ بولا۔

''نہیں......'' کہتے ہوئے میں نے پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ نصف بوتل پانی پی چکا تو اس نے کمرے میں نظریں دوڑا کر استفسار کیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''اب تم فالتو سوالات کر کے وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ تو وہ ایک ذرا گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''جزائر انڈیمان کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا...... وہی جیل خانہ جس کا شمار کبھی دنیا کی خطرناک جیلوں میں کیا جاتا تھا۔ یعنی کالا پانی...... مگر آج ان عظیم جزائر پر گریٹ بھارت ماتا کا کنٹرول اور تصرف ہے...... آج بھی وہاں لوگ رہتے ہیں۔ بے شک اس کی ہیئت ماضی کے مقابلے میں کافی سے زیادہ بدل چکی ہے لیکن کسی مخصوص علاقوں تک وگرنہ آج بھی کالا پانی، کالا پانی ہی کی دہشت رکھتا ہے۔ ممبئی کے انڈر ورلڈ ڈان کے آدمیوں کا وہاں کچھ علاقوں پر قبضہ ہے، خیر......''

وہ اتنا بتا کر رکا اور جزائر انڈیمان کے ذکر پر میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔

اطفال گھر میں ہفتے میں ایک بار دکھائی جانے والی جو سبق آموز اور معلوماتی دستاویزی فلمیں بچوں اور لڑکوں کو دکھائی جاتی تھیں، ان میں آزادیِ وطن کا حصول اور نظریۂ پاکستان سے متعلق بتایا جاتا تھا، بلکہ یہی نہیں اسی قسم کے ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے۔ اسی طرح ''پاور سیکریٹ سروس'' میں بھرتی کے دوران بھی میں نے لائبریری سے تاریخی کتب پڑھی تھیں، ان میں ''کالا پانی'' کے بارے میں بھی پڑھا تھا، یوں بھی کالا پانی کے بارے میں کون نہیں جانتا؟

یہ وہی جیل خانہ تھا جہاں.... آزادیِ وطن کے لیے کوشاں مسلم مجاہدوں اور آزادی کے متوالے بڑے، بڑے مسلمان لیڈروں کو سزا کے طور پر ساری عمر قید رکھا جاتا تھا۔ وہاں ان کے ساتھ بڑا غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔

آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی قیدی کو انڈیمان بھیجنے کے لیے ''کالا پانی'' کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا تھا؟ ممکن ہے اس کا مطلب ''سمندر پار'' بھیجنا رہا ہو...... جو ہندوستان سے ہزاروں کوسوں دور واقع تھا۔ یوں بھی ایک ہندوستانی محاورے میں طویل فاصلے کے لیے ''کالے کوس'' جیسے الفاظ پہلے ہی سے رائج تھے۔ کالا پانی کی سزا ایسے باغیوں کو دی جاتی تھی جنہیں سزائے موت کے بجائے عمر قید کی سزا دینی ہوتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں یہ سزا انہیں بھی دی جانے لگی جو مملکتِ انگلشیہ کے نوآبادیاتی نظام میں مداخلت کرنے اور بغاوت کرنے کے مرتکب ہوتے۔

کالا پانی کا نام سنتے ہی ذہن میں ایسے جیل خانے کا تصور ابھرتا ہے جہاں جو بھی ایک مرتبہ گیا وہ شاذ ہی زندہ

واپس لوٹا، بلکہ اس کی لاش کو بھی اپنے وطن کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ کرۂ ارض پر یوں تو کئی اور جیلیں بھی موجود ہیں، امریکا نے القاعدہ اور طالبان قیدیوں کے لیے گوانتاناموبے جیسی اذیت ناک جیل بنائی ہے مگر کالا پانی جیل اس سے بھی بدتر تھی۔ اس جیل میں قیدی اگر سخت جسمانی مشقت سے نہیں مرتے تو ملیریا سے مرجاتے، کیونکہ جس جزیرے پر یہ جیل بنائی گئی تھی وہاں ملیریا کی بیماری عام تھی اور اس کا علاج نہ ہونے کے برابر۔

مجھے چند ثانیوں کے لیے گنگ پاکر سی. جی بھجوانی بولا۔

''تم شاید کالا پانی کا سن کر کسی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہو مگر چنتا مت کرو۔ تمہارے ساتھی وہاں اب بھی زندہ حالت میں موجود ہیں۔ لیکن تمہارا یا تمہارے کسی ساتھی کا وہاں جانا ناممکنات میں سے ہے۔''

''تم اپنی بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ میرے تینوں ساتھیوں کی رہائی کے لیے کیا کر رہے ہو؟'' میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ خبیثانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے، تم جتنے بھی طرم خاں کہلاؤ لیکن جزائر انڈیمان کا معاملہ تمہاری سوچ سے بھی......''

''چٹاخ...!'' کمرے میں ایک زوردار آواز کے ابھرتے ہی سی. جی کے حلق سے بھی کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی، میرے بھاری بھرکم الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس کا دایاں گال سرخ ہو گیا۔

''اب اپنے مکروہ منہ سے کوئی غلط بات مت نکالنا، مجھے صرف اپنے تینوں ساتھیوں کی رہائی چاہیے اور بس......'' میں نے غرا کر کہا تو اس نے اپنے سر کو ذرا جھٹکا دے کر شاید اپنے مضروب گال کو بغیر ہاتھ لگائے سہلانے کی کوشش چاہی تھی، کیونکہ رسن بستہ ہونے کے باعث وہ اپنا گال چھونے سے قاصر تھا۔

''پہلے میری رہائی کا بندوبست کرو۔'' اس نے بھی مسکت لہجے میں کہا۔

''نہیں پہلے مجھے اس بات کی تصدیق چاہیے کہ میرے تینوں ساتھی (اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا) تمہاری ہی قید میں ہیں......''

''ہم......ہم۔'' اس نے ہنکارا لیا اور بولا۔ ایک نمبر ملاؤ اسی وقت۔''

میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا، وہ کارڈلیس ریسیور لے آئی، سی. جی اسے نمبر بتانے لگا، وہ اسے پنچ کرتی چلی گئی، رابطہ ہونے کے بعد سوشیلا نے وہ مجھے تھمایا، جو میں نے سی. جی کے کان اور منہ سے لگا دیا۔

''ہیلو......کوریئلا......اِٹس می......ان تینوں قیدیوں سے بات......'' وہ کہتے کہتے اچانک رکا۔'' یوں لگا جیسے، اس کی آواز سنتے ہی دوسری جانب سے کوریئلا نے گویا چھوٹتے ہی اسے کوئی اہم خبر بتانا شروع کر دی ہو......اور بھجوانی اسے بہ غور سننے لگا، اس کی آنکھیں اور بھویں سکڑنے اور پھیلنے لگیں، چہرے پہ کئی رنگ آ کر گزرتے رہے، میری یک ٹک اور دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے تاثرات پر جم کر رہ گئی تھیں۔

پھر دفعتاً ہی وہ لرزیدہ سے لہجے میں بولا۔

''کک......کیا......؟ کلی منجارو......؟ کک......کیا تم صحیح کہہ رہی ہو کوریئلا......؟ او بھگوان......ی ی...... یہ تو غضب ہو گیا، وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا......'' یہ کہتے ہی سی. جی بھجوانی نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ اس کے چہرے سے بھی دہشت اُمڈتے محسوس کی۔ جس نے مجھے خود بھی اپنے تینوں ساتھیوں کے حوالے سے ایک عجیب اور نامعلوم سی سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا......نجانے یہ ''کلی منجارو'' کیا بلا تھی؟ اور کون تھی......؟ اور پھر دفعتاً ہی کلی منجارو (کلی من جارو) کے نام سے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا......میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔

اچانک میں نے سوشیلا کو چونکتے پایا، وہ دروازے کی طرف اپنا منہ پھیر کر بڑبڑائی۔

''شاید کوئی دروازے پر زور آزمائی کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلی، میں بھی خطرے کی بُو محسوس کر کے لاؤنج کی طرف لپکا، ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور تین مسلح افراد اندر گھستے چلے آئے، ان میں ایک پستول بہ دست بلراج سنگھ تھا اور باقی دو اس کے گن بردار ساتھی تھے۔ بلراج سنگھ...... جو مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا، مجھے سامنے دیکھتے ہی اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میری طرف کر کے گولی چلا دی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Downloaded From

آوارہ گرد

قسط:30

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

Downloaded From paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنا لیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔

بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کھیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور سرکاری حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔

عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر لنک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ایک نو دولتیا سیٹھ نوید ساہنی والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔

اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹیکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹیکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر لنک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر لنک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کو ہارا، شہزی کو ٹائیگر لنک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھکلری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نام دے رکھا ہے۔ لولش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلوتکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بھتوکی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگیوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک میخ کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی...... مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ یہی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی بھانجی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا اس کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلا اور کھیل داوا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی اُنڈیمان پہنچا دیے گئے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

عقل تو موقع اور حالات کے مطابق استعمال ہوتی ہے، لیکن عقلِ سلیم کا معاملہ ذرا اور ہوتا ہے، وہ کسی بھی رونما ہونے والے واقعے کی پہلے ہی سے تصویر کشی کر ڈالتی ہے اور اسی کے مطابق انسان عملی قدم اُٹھاتا ہے۔ یہ عقل زیادہ تر قیاس آرائی اور محتاط اندازوں کے بل پر ہوتی ہے۔

کچھ یہی سبب تھا کہ جیسے ہی میں نے دروازے کو ٹوٹ کر گرتے اور اس کے عقب سے پستول بدست بلراج سنگھ کی جھلک دیکھی تو میں نہ صرف چونک گیا تھا بلکہ محتاط بھی ہو گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ مجھے شہزی کی صورت میں اتنی جلد نہیں پہچان سکتا تھا، لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ اپنی دوسری "شکار" سوشیلا کو وہاں موجود پا کر اسے گولی مار سکتا تھا، لیکن ہوا اس کے برعکس، جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میری جانب کرتے ہی گولی چلا دی تھی۔

میں اس سے پہلے ہی اس کی خطرناک جنبش کو محسوس کرتے ہی، اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا...... محض ٹانگوں کے بل پر بروقت جسم کو جھکائی دی مگر اس کے باوجود خبیث بلراج سنگھ کی چلائی ہوئی گولی میرے دائیں بازو کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔

بلراج سنگھ کے مجھے پہچاننے یا نہ پہچاننے کی ایک اور وجہ بھی ذہن میں آئی تھی اور یہ مجھے ٹھوس وجہ لگی تھی۔ سوشیلا نے لاؤنج کی لائٹ گل کر رکھی تھی، اس کی جگہ البتہ زیرو پاور کا بلب جلتا چھوڑ دیا تھا، اس کی مقدور بھر روشنی میں، اس نے میرے قد کاٹھ کے "خاکے" کا اندازہ اور لامحالہ یہی

تصور کرتے ہوئے کہ ایک عورت (سوشیلا) اور دوسرا "مرد" میرے سوا اور کون ہوسکتا تھا، یہی سمجھ کر ہی اس نے مجھے پہلے نشانہ بنانا چاہا تھا۔

مجھے اپنے بازو میں گرم سلاخ سی گھستی ہوئی محسوس ہوئی تھی، جس کے باعث میرے منہ سے تیز سی سسکاری خارج ہوگئی تھی۔

مقصد صرف خود کو بلراج سنگھ کی گولی سے بچانا ہی نہیں تھا میرا، اسی لیے اسے "بلینک پوائنٹ" کا جھانسا دیتے ہی، میں نے زمین پر ٹکتے ہی پیراٹروپنگ کے انداز میں ایک اور جست بھری تھی۔

میری توقع کے عین مطابق وہ دوسری گولی چلانے کے لیے پر تول رہا تھا اور اسی وقت جب اس کے پستول کی نال میرے تعاقب میں حرکت پذیر ہو رہی تھی، میں بلراج سنگھ کے بائیں پہلو پر آتے ہی اسپرنگ کی طرح چکیلا اور اپنی بائیں ٹانگ سوئپ کر ڈالی، میری نصف سرکل میں گھومتی ہوئی ٹانگ بڑے زور سے بلراج سنگھ کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی تھی اور وہ فضا میں اُچھل کر گرا تو میں نے اس کا ہاتھ سے چھوٹا پستول بڑی چابک دستی کے ساتھ دبوچ لیا اور تلے اوپر دو فائر اس کے ساتھیوں پر جھونک مارے، جو چند ثانیوں کے لیے اس "حسن کیری" کو دیکھ کر ایک سکتے کی سی کیفیات میں آگئے تھے اور اب تک شاید یہی سوچتے رہ گئے تھے، کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں.....؟

کچھ نشانہ اور کافی حد تک اندازے کی بنیاد پر میری ان پر چلائی ہوئی دو عدد گولیوں میں سے ایک تو بلراج کے ساتھی کے سینے میں لگی اور دوسرے کے گن والے ہاتھ پر۔ نتیجے میں سینے پر کھانے والا ساتھی، اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کرتا ہوا گرتا چلا گیا جبکہ دوسرا کراہ کے بدکا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری۔

اِدھر میرے رگِ جاں میں جیسے پل کے پل پارا دوڑ گیا تھا۔ بلراج سنگھ نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی، لیکن میری لات کی دوسری ضرب اس کے پیٹ پر پڑی اور وہ ایک بار پھر اُچھل کر پرے، بلکہ جس دروازے سے اندر گرا تھا، اس سے بھی باہر جا پڑا۔ اس کے زخمی ساتھی نے اپنے حلق سے ایک بھیڑیے جیسی چیخ خارج کی اور اپنی گن اٹھانے کے بجائے سیدھا مجھ پر آرہا۔ میں اسے آسانی سے اپنے پستول کی گولی سے نشانہ بنا سکتا تھا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور جیسے ہی وہ دیوانہ وار مجھ پر پڑا، میں نے پستول کے ٹھوس آہنی دستے کا وار اس کی کنپٹی پر کر ڈالا۔ "چیخ" کی آواز ابھری اور وہ اپنے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ خارج کرتا ہوا چت سے گرا اور بے حس و حرکت ہوگیا۔

"تم کمرے میں جا کر بی جی کو دیکھو..... جلدی....."

میں نے ہک دک کھڑی سوشیلا سے تقریباً چلا کر کہا، جو بلراج کی وجہ سے ہنوز ایک سراسیمگی کی سی کیفیات میں مبتلا تھی، میری آواز سن کر وہ جیسے یکدم ہوش میں آگئی اور مذکورہ کمرے کی جانب لپک گئی، جبکہ میں بلراج کو چھاپنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا، وہ اُٹھ کر سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا، مگر یہ دیکھ کر میں چونک پڑا کہ وہاں وہی "مخبر" کھڑا تھا اور اس کے ہمراہ کمپلیکس کے چند دیگر رہائشی بھی حیرت اور پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ قریب کھڑے گویا یہ تماشا دیکھنے میں مگن تھے۔ وہ شاید اس "بوڑھے" کی ڈھنڈیا میں پڑے ہوئے تھے جس نے اپنے کاندھے پر کسی شرابی کو (بی جی بھوانی) کو ڈالے رکھا تھا، جو ظاہر ہے مجھ سے مطمئن نہیں ہوا تھا اور کسی طرح چند اور کو بھی اپنی مخبرانہ مہم میں شامل کر چکا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے یہاں.....؟ کون ہو تم لوگ؟" وہی مخبر تیز آواز میں مجھ سے بولا۔

"بی جی..... یہ پاکستانی دہشت گرد ہے فوراً پولیس کو فون کرو..... چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرو، اسے پکڑیں..... میں بھارتی آرمی سے تعلق رکھتا ہوں۔"

مکار اور شاطر بلراج سنگھ نے کایا پلٹتے ہی اپنی عبرتناک شکست کا اس طرح بدلہ لینے کی ٹھانی تو میں نے نفرت خیز انداز میں اپنے دانت کوستے ہوئے اس کے بھاری جبڑے پر ایک گھونسا رسید کر دیا اور ساتھ ہی ایک ہوائی فائر جھونک دیا۔

میرے بدلے ہوئے بہروپ کے باوجود بلراج سنگھ مجھے آئی ڈینٹی فکیشن سے پہچان چکا تھا شاید۔

مخبر اور اس کے "محلاتی" ساتھی فائر کی آواز سنتے ہی ایک دم بدک کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر کیا گل کھلا سکتے تھے، اسی لیے پل کے پل میں نے ایک فیصلہ کیا اور پستول کی نال کا رخ بلراج سنگھ کی طرف کیا۔ تب تک وہ خبیث بھی کافی حد تک سنبھل چکا تھا، اس نے نیچے پڑے پڑے اپنی لات چلائی اور میرے ہاتھ سے پستول نکل کر کمپلیکس کی سیڑھیوں پر نیچے کہیں گرتا چلا گیا۔ دوسری لات اس نے میری ٹانگوں پر چلائی تھی تاکہ مجھے بھی نیچے لڑھکا سکے، لیکن میں تب تک سنبھل چکا تھا اور میں اچھلا، اس کی "سوئپ" خالی چلی گئی، تو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے ایک زوردار لات اس کے سینے پر جڑ دی۔ اس کی حالت پہلے ہی پتلی ہو رہی تھی۔ وہ لات لگتے ہی آنکھیں موندے اکھڑی اکھڑی سانسیں خارج کرنے لگا۔

یہاں کا معاملہ خراب ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بلراج سنگھ کو ہماری یہاں کی بھنک کیسے پڑی تھی، تاہم ایک دشمن کے لیے یہ کچھ اتنا مشکل کام بھی نہ تھا، شاید اس نے اپنے گروگھنٹال کے ایل ایڈوانی کی بے بی ڈول پوتی ریتا کی ریکی کی ہوگی، حالانکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ریتا بھی مجھ سے عارضی طور پر سہی، بددل ہو گئی تھی، لہٰذا مکار صفت بلراج سنگھ نے پھر بھی میرے حوالے سے ریتا پر شک کی نگاہ رکھی ہوگی۔

میں اندر پلٹا اور کمرے میں پہنچا۔ سوشیت کی گاڑی کی چابیاں ہنوز میرے قبضے میں تھیں۔ تازہ کار حالات کا ادراک کرتے ہوئے میں نے میز کی دراز سے گھوتراجی (جو اب ایک دم میرے لیے اہمیت اختیار کر چکا تھا) کا دیا ہوا کارڈ اٹھا لیا۔ اگرچہ میں نے سوشیت سے اس کا فون نمبر بھی احتیاطاً لے لیا تھا۔ بلراج سے چھینا ہوا پستول تو سیڑھیوں میں جا گرا تھا۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر اس کے ایک جہنم واصل ساتھی کی تلاشی لے کر اس کی اندرونی جیب سے پستول نکال کر اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیا۔

ادھر سی جی بھوانی بھی اس تازہ صورتِ حال سے بری طرح گڑبڑایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پہ اسکاچ ٹیپ چپکا دی۔ اسے اپنے کاندھے پر ڈالا اور قریب کھڑی حیران پریشان سوشیلا سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"اب ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا خطرے سے خالی نہیں…… باہر گاڑی موجود ہے، فوراً نکل چلو……"

یہ کہتے ہی میں سی جی کے بھاری بھرکم وجود کو اٹھائے دروازے کی طرف لپکا، وہاں بلراج سنگھ سنبھالا لینے کی کوشش میں تھا، میرے کاندھے پر کسی وجود کو دیکھ کر اس کے ستے ہوئے چہرے پہ کچھ حیرت آمیز تاثرات ابھرے تھے، مجھے اسے ٹاپ کر کے آگے سیڑھیوں کی طرف بڑھنا تھا مگر خدشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے درمیان میں اڑنگا لگانے کی کوشش نہ کرے، اسی لیے میں نے اس کے چہرے پہ بھی اپنے بوٹ کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز خارج ہوئی، مگر دوسرے ہی لمحے سوشیلا نے ایک عجیب اور جنونی حرکت کر ڈالی۔ اس نے میرا پستول اچک لیا جو میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس رکھا تھا، پھر پستول کا رخ بلراج سنگھ کی طرف کرتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چیخ کر اسے للکارتے ہوئے بولی۔

"ذلیل درندے! تو نے ہی ایڈوانی کے کہنے پر میری بہن اور اس کے معصوم بچوں کے گھر کو آگ لگا کر ختم کیا تھا ناں…… آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی……" میں نے سوشیلا کا یہ روپ دیکھا تو ایک لمحے کو دنگ سا رہ گیا۔ اس کا چہرہ آتشِ انتقام کی سرخی سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور پستول والے ہاتھ میں واضح طور پر لرزش ہوتی دکھائی دے رہی تھی، نال کا رخ بلراج سنگھ کی پیشانی کی طرف تھا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ڈز…… گولی چلی اور بلراج کی کربناک چیخ ابھری، گولی کنپٹی کو چھیدتی اور اس کا دایاں کان اڑاتی ہوئی نکل گئی، خون کا فوارہ وہاں سے ابل پڑا اور بلراج سنگھ بری طرح تڑپنے لگا۔

"سوشی! اس خبیث نے یہاں ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دی ہے، وقت ضائع مت کرو نکل چلو، ابھی اصل شکار باقی ہے۔" میرا اشارہ کے ایل ایڈوانی کی طرف تھا۔ یہ کہتے ہی میں تیزی سے زینے اترنے لگا۔

گولیوں کی آوازوں سے وہاں خاصی بھگدڑ اور بےچینی پھیل گئی تھی۔ بلوے کی صورت میں کون قریب آنے کی جرأت کرتا ہے، یوں بھی رات کے آخری پہر کا وقت تھا، البتہ باہر تعینات چوکیدار سے مجھے ٹکراؤ کا خدشہ تھا، تاہم میں اور سوشیلا، کمپلیکس کی پارکنگ وے سے گزرتے ہوئے، گیٹ کی طرف لپکے، ڈنڈا بردار چوکیدار ایک طرف کھڑا فون پر کسی سے باتیں کر رہا تھا، وہ شاید پولیس کو مطلع کرنے میں مصروف تھا، میں نے اس کی طرف ایک فائر جھونک مارا، وہ بدکا اور ڈنڈا اپنے سیل فون سمیت پھینک کر ایک طرف کو دوڑ گیا۔

میں اور سوشیلا سوشیت کی کار میں سوار ہو گئے اور سی جی کو پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ وہ ہنوز رسن بستہ حالت میں تھا۔ میں نے کار اسٹارٹ کی اور ذرا ہی دیر بعد میں ڈپلیکس کی اس عمارت کا گیٹ توڑتا ہوا باہر نکلتا چلا گیا اور ایک طرف ویران اور تاریک سڑک پر کار کو طوفانی رفتار سے دوڑا دیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر میں اور سوشیلا اس شہرِ خرابہ اور نگاراں کی سڑکوں پر بے یار و مددگار کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں تھے۔ اس بار ہمارے ساتھ ایک اہم دشمن سی جی بھوانی بھی تھا۔ ہماری کوئی منزل نہ تھی۔

مجھے سی جی بھوانی سے ابھی مزید چند اہم سوالوں کے

جواب درکار تھے، مگر براج سنگھ کے اچانک شب خون مارے نے سے پوچھنے سے رہ گئے تھے۔ بالخصوص ''کلی منجارو'' کے سلسلے میں اس سے دریافت کرنا تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ کیونکہ جہاں تک میری محدود معلومات تھی اس کے مطابق کلی منجارو افریقہ کے ایک معروف اور دشوار گزار پہاڑی سلسلے اور وہاں آباد وحشی و آدم خور قبیلے کو کہا جاتا تھا، اس سے متعلق کئی ایڈونچرز اور تھرلرز ہارر موویز اور دستاویزی فلمیں بھی میں نے دیکھ رکھی تھیں، اگرچہ ان میں ''فینٹیسی'' کا عمل دخل زیادہ تھا۔ تاہم کچھ باتیں حقیقت پر بھی مبنی تھیں۔ لیکن دریافت طلب امر یہ تھا کہ آخر جزائر انڈیمان میں اس مقام اور قبیلے کا کیا ذکر؟

مجھے اپنے تینوں اہم ساتھیوں، اول خیر، شکیلہ اور کبیل وادا کی طرف سے فکر ہو رہی تھی۔ بجوانی کا کوریلا سے رابطہ کرنا اور کلی منجارو کا اس قدر خوف زدہ ہو کر ذکر کرنا، مجھے تشویش آمیز اُلجھن میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

''اب کہاں جا رہے ہیں ہم؟'' بالآخر عقبی سیٹ پر سی جی بجوانی پر نگاہ رکھے ہوئے براجمان سوشیلا نے مجھ سے وہی سوال کر ڈالا، جس کا جواب میں خود بھی ہنوز تلاش کر رہا تھا۔

''تم دونوں کو یہاں کہیں بھی ٹھکانا نہیں ملے گا...... بہتر ہے کہ ہمارے ساتھ مفاہمت کی راہ پر چلو...... تو بہتری کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی بجوانی نے کہا۔ مجھے اس کے لہجے سے مکاری اور فریب کی بُو آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرے کہنے پر سوشیلا نے سی جی کے منہ سے اسکاچ ٹیپ ہٹا دی تھی۔ میں نے اس کی بکواس کو صرف نظر کرتے ہوئے سوشیلا سے کہا۔

''موہن کب کام آئے گا؟ ہمیں اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''ہاں! مگر اس کے لیے ہمیں ممبئی کی طرف کا سفر کرنا پڑے گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میرا بھی یہی خیال تھا۔ جس پر صاد کرتے ہی سوشیلا نے مجھے بتایا کہ ہم ممبئی جانے والی مین روڈ پر ہی محوِ سفر ہیں۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچانے اور اس کے سربراہ کرنل سی جی بجوانی کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد اگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ خطرہ کچھ کم ہو گیا تھا تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا، لیکن بہرحال میری یہاں ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ دیگر بھارتی انٹیلی جنس بشمول ''را'' والے میرے پیچھے لگ چکے ہوں گے، یہ الگ بات تھی کہ اب میرے سلسلے میں تازہ کار رہنمائی کا حصول ان کے لیے مشکل تھا۔

سی جی بجوانی نے مجھے سوشیلا کی موسی کے بارے میں بتایا تو تھا کہ اُسے ضروری تفتیش کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاہم ابھی یہ بات کنفرم نہیں ہوئی تھی، ایک اندازے کے مطابق یہ ممکن تھا کہ وہ سچ ہی کہہ رہا ہو، کیونکہ موسی سے ابھی ہم ملے ہی کب تھے؟

''جن لوگوں نے تمہارے فلیٹ پر حملہ کیا تھا، یہ کون لوگ تھے؟''

ہماری منزل کا تعین ہوتے اور ممبئی کی طرف گامزن ہونے کے بعد سی جی نے سوال کیا۔

''تم اپنی چونچ بند رکھو...... اور مجھے بتاؤ کہ یہ کلی منجارو والا کیا معاملہ تھا؟ تمہاری ساتھی کوریلا نے تمہیں میرے ساتھیوں کے متعلق کیا بتایا تھا؟'' میں نے اُسے جھڑکتے ہوئے اُلٹا سوال کر ڈالا۔ وہ میرے سوال پر ایک بار پھر متفکر نظر آنے لگا، مگر کوئی جواب نہ دے پایا۔ [illegible] آمیز پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''[illegible] غیر متوقع طور پر ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ؟ اور...... کہاں ہوئی ہے؟''

''جزائر انڈیمان میں......'' وہ جواباً سنجیدگی سے بولا۔ ''جہاں تمہارے تینوں ساتھیوں کو ہم نے قیدی اور یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہاں ایک وحشی قبیلے نے حملہ کر دیا تھا، جو خوفناک افریقی نسل کے قبیلے...... کلی منجارو سے تعلق بتاتا لیکن......'' وہ کچھ بتاتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا......؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف گھورا۔

''میں مزید کچھ نہیں بتا سکتا...... تمہارے ساتھی اب ہمارے قبضے میں نہیں رہے، اس صورتِ حال میں اب تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟''

''کتّے والا سلوک کروں گا......'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''مکاری میں تمہارا کوئی ثانی نہیں اور میں تمہارے کسی جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ اس لیے مطلب کی بات کرو اور معاملہ صاف رکھو۔''

''اب تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو میں کیا کروں؟'' وہ بظاہر بے پروا انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے اس نازک صورتِ حال

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

میں کچھ معاملہ فہمی سے کام لینے کی کوشش کی اور بولا۔ ”تو پھر تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ میرے تینوں ساتھی تمہاری قید میں اور تمہاری ذمے داری میں تھے، اگر ان کا ذرا بھی بال بیکا ہوا تو میں تمہارا بہت برا حشر کروں گا، زندوں میں موت سے بدتر کر دوں گا تمہاری حالت......“ میں نے پُرغیظ لہجے میں کہا تو وہ حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

”اس سلسلے میں ایک ہی شخص ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”کون ہے وہ......؟“

”ممبئی کی زیرِ زمین دنیا کا ایک بڑا ڈان ہے وہ...... داؤد ابراہیم کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟ یوں سمجھو، وہ اسی کا آدمی ہے...... بھولا ناتھ نام ہے اس کا۔“

”شہزی......!“ معاً سوشیلا نے مداخلت کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”تم پیچھے آ جاؤ اور اسٹیئرنگ میرے حوالے کر دو۔“

میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھ کر کار کو بریک لگا دیے۔ سیٹ تبدیل کرتے ہی سوشیلا نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں اب بی جی کے ساتھ آرام سے بات کر سکتا تھا۔

”تو اس کا مطلب ہے، تم لوگوں کے بھارت کے انڈر ورلڈ بدمعاشوں سے بھی تعلقات ہوتے ہیں۔“ میرے لہجے میں طنز کی زہریلی کاٹ تھی۔ ”تا کہ جب چاہے تم لوگ اپنے ذاتی مفادات کے لیے ماورائے قانون کچھ بھی کر سکو، بھارت کی جتنی بھی مسلم دشمن، ہندو انتہا پسند تنظیمیں ہیں، تم ہی لوگ ان کی سپورٹ بھی کرتے ہو...... کیوں؟ غلط کہا میں نے؟“

”میرا خیال ہے، گفتگو کا سلسلہ مطلب کی بات پر رہے تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ بجوانی بے تاثر لہجے میں بولا۔ اس کے لہجے سے مجھے فطری ہٹ دھرمی اور بے حسی محسوس ہوئی۔

”یہ بتاؤ، بھولا ناتھ ہماری کیوں اور کیسے مدد کر سکتا ہے؟“ بالآخر میں مستفسر ہوا۔

”تم شاید بھول گئے، میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جزائر انڈیمان کے کچھ علاقوں میں داؤد ابراہیم اور حاجی مستان جیسے دو بڑے ڈان کا قبضہ ہے۔ جن کی باگ بھولا ناتھ اور عبدالشکور عرف ناناشکور نے سنبھالے رکھی ہے۔“

”یہ نانا شکور...... کوئی نئی بلا ہے؟“

”یہ حاجی مستان کا آدمی ہے اور بھولا ناتھ کا سخت حریف ہے، آج بھی انڈیمان میں زمین پر قبضے کے تنازعات کے باعث ان دونوں گروپوں کے درمیان لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، لیکن آج کل شاید ایک خاموش معاہدے کے تحت ان کے درمیان جنگ بندی ہو چکی ہے، اور یہ اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔“

اس کی بات پر میں دفعتاً ہی اندر سے کھٹکا۔ عقلِ سلیم کے گھوڑے دوڑائے تو مجھے بہت سی باتوں کا ازخود اندازہ ہونے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ بھولا ناتھ گروپ، بجوانی کا حلیف (دوست) تھا جبکہ نانا شکور حریف (دشمن) اور اس خبیث کے بھولا ناتھ سے خفیہ بلکہ ”مجرمانہ“ نوعیت کے تعلقات تھے اور کوئی بعید نہ تھا کہ بجوانی نے بھولا ناتھ گروپ کے ساتھ مل کر ہی اول خیر وغیرہ کو قابو کیا ہو اور اسی کی قید میں رکھا ہو۔

”ہوں......“ میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کی۔ ”تو تم نے بھولا ناتھ کی مدد سے ہی میرے تینوں ساتھیوں کو یرغمال بنایا تھا۔“

”کیا کہتے ہو پھر؟ بھولا ناتھ سے رابطے کی اجازت دیتے ہو مجھے؟“ وہ حسبِ توقع متعلقہ گفتگو تک محدود رہتے ہوئے بڑی مکاری کے ساتھ مجھ سے مستفسر ہوا۔

”ٹھکانے پر پہنچ کر کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔“ میں نے کسی برہمی کا اظہار کیے بغیر نیم رضامندی کا سا لہجہ اپناتے ہوئے کہا اور سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا۔

”تمہارے ساتھیوں کے سلسلے میں اب بھولا ناتھ ہی مدد کر سکتا ہے، کیونکہ [illegible] کے کئی متحارب قبیلے سے اچھے تعلقات ہیں......“ وہ [illegible] مجھے جھانسے میں آتا محسوس کر کے بولا۔

”سوشی! ہماری منزل کتنی دور ہے اب؟“ میں نے دانستہ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر سوشیلا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”زیادہ دور تو نہیں ہے، لیکن میں نے اصل راستے سے ہٹ کر جو متبادل راستہ اختیار کیا ہے وہ ذرا طویل ثابت ہو سکتا ہے۔“

”رائٹ، یہ ٹھیک ہے، احتیاط کے سلسلے میں کوئی کمپرومائز نہیں ہونا چاہیے۔“

پو پھٹنے لگی تھی، صبح کاذب کی نیلگوں سی روشنی میں ممبئی کی سڑکیں اُجلی اُجلی سی نظر آ رہی تھیں، ٹریفک کم ہی تھی، لوکل مسافر بسیں بھی اِکا دُکا ہی سڑک پر دکھائی دے رہی تھیں۔ ہم آبادی میں داخل ہو چکے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ سوشیلا بڑے دھیان بھری نگاہوں سے اطراف کا جائزہ

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

لیتی ہوئی کار کو خاصی رفتار سے دوڑائے جا رہی تھی، جلد ہی وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئی، جہاں دورُویہ بنگلے اور کوٹھیاں نظر آ رہی تھیں، یہ مجھے متمول علاقہ نظر آتا تھا۔ کار سوشی نے ایک نیلے اور سفید رنگ کے بنگلے کے گیٹ کے سامنے روک دی۔ صبح سویرے کا وقت تھا، اسی لیے ہمیں اُمید تھی کہ سوہن گھر پر ہی ہوگا۔

دو ایک بار ہارن دیے گئے تو بغلی گیٹ سے کوئی عمر رسیدہ سا مگر ساٹھا پاٹھا شخص برآمد ہوا۔

''گیٹ پر انٹرکام لگا ہوا ہے۔'' میں نے کسی خیال کے تحت فوراً سوشیلا سے کہا تھا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور میں خاموش رہا۔ ذرا دیر میں وہ شخص قریب آیا تو سوشیلا دروازہ کھول کر باہر اتر آئی۔ اس شخص سے کچھ کہا اور وہ شخص فوراً اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے انٹرکام کی طرف بڑھ گیا، وہاں اس نے ایک بٹن دبا کر اندر کسی سے بات کی پھر سوشیلا کو قریب آ کر بات کرنے کا کہا، اس نے بات کی اور فوراً پلٹی، وہ شخص بھی بغلی دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ جب تک سوشیلا نے دوبارہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، گیٹ کھل چکا تھا، سوشیلا نے کار آگے بڑھا دی۔

کار گیٹ سے اندر داخل ہوئی اور ایک نیم بل کھاتی سیمنٹ کی پختہ روش پر رینگتی ہوئی آگے بڑھنے لگی، میری نظریں دونوں طرف گردش کر رہی تھیں۔ روش کے بائیں جانب بڑا سا لان تھا، جہاں سیلون کے ناریل بھرے درخت اور کٹاؤ دار کثیر پتوں والے خوبصورت لانبے پودے ایستادہ تھے۔ لان کے وسط میں نیٹ لگا ہوا تھا، یہاں شاید بیڈمنٹن کھیلا جاتا تھا۔ کار پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں، ان کے قریب سوشیلا نے اپنی کار لے جا کر روک دی۔ اُوپر ٹیرس ریلنگ والی بالکونی نظر آتی تھی۔ اس کے عین نیچے دیدہ زیب اور بیش قیمت لکڑی کا محرابی دروازہ تھا۔ ہم کار سے اُتر کر اسی طرف، اس شخص کی راہنمائی میں بڑھے، ہمارے ساتھ ایک رسن بستہ آدمی کو دیکھ کر وہ چونکا ضرور تھا، مگر کوئی سوال ہم سے نہیں کیا تھا۔ سی جی بھوانی کو یہاں لانے کی میری مجبوری تھی، اگر میرے ساتھیوں کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اسے کب کا واصلِ جہنم کر چکا ہوتا، مگر کم بخت نے میرے لیے ایک مشکل کھڑی کر دی تھی۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ ایک پُرتعیش اور سجے سنورے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ آدمی چلا گیا۔ ہم صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ سی جی بھوانی کو میں نے فرش پر یعنی قالین پر ڈال دیا تھا۔ اس کے چہرے سے خاصے ذلت آمیز تاثرات اُبھر آئے تھے۔ میں نے اس کی مطلق پروانہ کی، ہمارے صوفوں پر براجمان ہوتے ہی ایک میری ہم عمر کا نوجوان سا لڑکا برآمد ہوا تھا، میں اُسے دیکھ حیران سا رہ گیا۔ اتنی سی عمر میں اس نے بہت ترقی کر لی تھی یا پھر شاید یہ سب اسے ترکے میں ملا ہو۔

وہ جسم کا موٹا تھا اور شاید اسی وجہ سے اپنی عمر سے تھوڑا بڑا ہی نظر آتا تھا۔ قد درمیانہ تھا۔ چہرہ پھولا ہوا اور آنکھوں کے نیچے اُبھرے ہوئے پپوٹے یا تو اس کی کم خوابی کے غماز تھے یا پھر کثرتِ شراب نوشی اس کی وجہ تھی۔

وہ بڑے پُرتپاک انداز میں ہم سے ملا اور ایک نظر قالین پر بندھے پڑے بھوانی کو دیکھا تو سوشیلا سے فوراً اس کے بارے میں پوچھا جبکہ وہ میرا تعارف پہلے ہی کروا چکی تھی۔

''اے مسٹر! میں انڈین [illegible] ایجنسی کا [illegible] ان لوگوں نے مجھے اغوا کر کے یہاں لا کر [illegible] بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے، کیا [illegible] سی جی بھوانی نام ہے میرا......''

ہم سے پہلے ہی [illegible] کر سوہن کی طرف [illegible] بولا تو وہ بے چارہ بھونچکا سا رہ گیا۔

''سی جی...... یہ سچ کہہ رہا ہے، سوشی؟'' وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں!'' سوشیلا [illegible] جبکہ مجھے سی جی کے اچانک گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے اور اس کی مکاری پر بے تحاشا طیش آیا، وہ یقیناً [illegible] کا فائدہ اُٹھا کر سوہن کو خوف زدہ کر کے ہم سے بدظن کرنا چاہتا تھا۔

''یہ شہزاد نامی شخص ایک دلیش دروہی اور پاکستانی ایجنٹ ہے......'' وہ اپنی عیارانہ ہرزہ سرائی جاری رکھتے ہوئے سوہن سے بولا۔

میرے جی میں تو آئی کہ اس رذیل صفت شخص کے منہ پر بوٹ کی ایک ٹھوکر رسید کر ڈالوں، مگر اس وقت کی نازک صورتِ حال مکمل طور پر سوشیلا کے ہاتھ میں تھی اور وہی سوہن کو قائل کر سکتی تھی، لہٰذا اُس نے یہی کیا۔

اس نے سی جی بھوانی کی اصلیت نیز اس کے درندہ صفت اہلکاروں کے تین بے گناہ ٹین ایجرز لڑکے لڑکیوں کے ساتھ زیادتی اور بعد میں ان کے بہیمانہ قتل کے بارے میں بتاتے ہوئے، یہ بھی بتایا کہ یہ خود ایک انڈین خفیہ ایجنسی کے سربراہ ہونے کی آڑ میں یہاں بھی کیا گل کھلاتا

بھر رہا تھا۔ کے ایل ایڈوانی کی زندہ گر اِنسانیت سوز درندگی کی مثال اس کے سامنے تھی جو اس نے موہن کے بھائی اور اس کے معصوم بیوی بچوں کے ساتھ کی تھی۔

میں نے دیکھا موہن اور سوشیلا کے درمیان اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ تھی جبکہ میرے بارے میں بھی سوشیلا نے موہن کو اعتماد میں لیتے ہوئے اسے قائل کرلیا تھا کہ میرا یہاں ایسا کوئی مقصد نہیں ہے، جس سے یہاں کسی بھی بھارتی شہری کی جان و مال یا ملک کو کوئی نقصان ہو، اس کی ضمانت سوشیلا نے پورے مستحکم انداز میں موہن کو دی تھی اور یہاں (انڈیا میں) میری موجودگی کو کسی تخریب کاری کی کارروائی کے بجائے، اپنے ساتھیوں کی رہائی اور کے ایل ایڈوانی سے انتقام سمیت، اس سے وہ ہیرا حاصل کرنے کی مہم تک میری کارگزاری کو محدود رکھا تھا۔ یوں اب موہن میری طرف سے خاصا مطمئن نظر آنے لگا۔ سی جی بجوانی کے کانوں میں، میں نے کار سے اُترتے وقت "ایئر ڈالس" گھسیڑ دیے تھے، وہ ہماری کوئی بات نہیں سن سکتا تھا۔ اب میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ بھی چپکا دی تھی۔

"پہلے اس کا کوئی بندوبست کرو، تب ہی ہم آرام سے بیٹھ کر کوئی آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔" موہن نے قالین پر قابلِ رحم حالت میں پڑے ہوئے بجوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم سے کہا۔ لہٰذا جب موہن کے اشارے پر میں بجوانی کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا، ایک طرف نظر آنے والے متصل کمرے کی طرف لے کر بڑھنے لگا تو وہ بڑی خونخوار آنکھوں سے موہن کو گھورنے لگا، وہ اندر ہی اندر اپنی اس ہیئت کذائی اور تذلیل پر طیش کے مارے بپھرا ہوا نظر آرہا تھا۔

بہرکیف اسے ایک کمرے میں بند کرنے کے بعد ہم تینوں کے درمیان چند رسمی گفتگو ہوئی اور پھر کچھ کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا، چائے پینے کے دور تک ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو خاصی آگے تک جا چکی تھی۔

"بلراج سنگھ کی زیرک دماغی کی وجہ سے صورتِ حال اب خاصی بگڑی ہوئی نظر آتی ہے، حالانکہ ریتا کا تمہاری مدد میں شامل ہونا بہت اہمیت کا حامل تھا۔" موہن نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے ایک سگریٹ سلگا لیا اور مجھے بھی اشارے سے پیشکش کی، جسے میں نے بھی اشارے سے ہی تھینکس کہتے ہوئے رد کردیا، اگرچہ میں بھی کبھی کبھار سگریٹ نوشی کرلیا کرتا تھا مگر اس وقت میرا جی نہیں چاہا تھا۔

موہن نے سگریٹ کا ایک کش لگاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس پر مستزاد اب مسٹر شہزی کو بھی دہری تہری مہمات کا سامنا ہے اور اس کے دشمنوں کی بھی کمی نہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ......"

"آپ اس بات سے پریشان نہ ہوں موہن کمار صاحب!" میں نے پہلی بار مداخلت کرتے ہوئے اس سے متانت بھرے انداز میں کہا۔ "میری ذاتی مہمات اپنی جگہ، مگر تقدیر اب بھی میرا ساتھ دے رہی ہے، میرا ایک بھی خواہ ناکام ہوتا ہے، یا ہاتھ سے جاتا ہے تو دوسرا تیار ہوتا ہے۔ صورتِ حال کچھ مخدوش ضرور ہوچکی ہے، لیکن میں نااُمید نہیں ہوں، اب بھی ترپ کے کئی پتے میرے ہاتھ میں موجود ہیں۔ آپ کا تھوڑا سا ساتھ درکار ہے......"

"اس کی تم چنتا مت کرو......" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا۔ "میں ہر طرح سے تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ تم مجھے بتاؤ کہ میں فوری طور پر تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"میں ابھی بجوانی کے ساتھ ایک معاہدے کے عمل سے گزر رہا ہوں، جو شاید آج ہی کسی نتیجے تک تو پہنچ جائے گا، لیکن اس کے علاوہ مجھے ایک اور شخص سے بھی آج ہی ملاقات کرنی ہے، اس کے علاوہ میں نے کچھ بیرونِ ملک ٹیلی فونک رابطے بھی کرنا ہیں اگر ممکن ہو تو......؟ یہاں کسی سکیورٹی یا ٹیلی فونک کال ٹریسنگ کا کوئی ایشو تو نہ ہوگا؟"

"بالکل نہیں، تم بلاجھجک یہاں سے کہیں بھی فون کرسکتے ہو۔" اس نے کہا اور پھر اپنا سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے یوز کرسکتے ہو ایزیلی۔" میں نے فون لے کر ڈائریکٹ زہرہ بانو کے سیل فون پر اس سے رابطہ کیا، دوسری طرف بیل ٹون جارہی تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

"ہیلو......" دوسری جانب سے شناسا آواز سنتے ہی میں نے وقت ضائع کیے بغیر کہا۔

"ہاں...... ہیلو، زہرہ......! یہ میں ہوں شہزی!"

"او...... مائی گاڈ! شکر ہے خدا کا، تمہاری آواز تو سنی...... تت...... تم کہاں ہو؟ کک...... کیسے ہو؟ ابھی تک رابطہ کیوں نہیں کیا۔" وہ لرزتی کپکپاتی آواز میں بولتی چلی گئی تو میں نے اپنے لہجے کو قدرے پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔

"زہرہ! میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرے پاس وقت کم ہے، مجھے جب بھی موقع ملتا ہے میں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سب سے پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم نے

WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

اول خیر سمیت، شکیلہ اور کمیل دادا کو میری تلاش یا کسی مدد کے لیے انڈیا روانہ کیا تھا؟''

میرے اس اہم سوال پر دوسری جانب یکلخت خاموشی سی چھا گئی اور اس لمحاتی خاموشی پر میرے اندر بے چینی کا ایک غبار سا اُٹھا۔ پھر فوراً ہی دوسری جانب سے زہرہ بانو کی خائف زدہ سی آواز ابھری۔

''ہاں اللّٰل...... لیکن وہ تینوں ہی شاید کسی مصیبت کا شکار ہو گئے ہیں، اُن سے رابطہ نہیں ہو پا رہا......''

''لیکن میں نے منع کیا تھا میرے مشورے کے بغیر ابھی ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جائے گا۔''

''تم سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہم یہاں سب تمہاری طرف سے فکر میں مبتلا تھے، اول خیر تو اکیلا ہی انڈیا جانے کا قصد کیے بیٹھا تھا۔ شکیلہ بھی تیار تھی اس کے ساتھ جانے کے لیے اور کمیل دادا...... پر مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ جب اول خیر اور شکیلہ نے تمہاری تلاش میں انڈیا جانے کی پوری تیاری باندھ لی تھی تو کمیل دادا پہلے ہی سے ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ میں بھی [illegible] چاہتی تھی، اور ہم کیا کرتے شہزی؟''

وہ آخر میں روہانسی سی ہو گئی۔ میں نے بھی اس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ یہ لوگ میرے بہت کچھ لگتے تھے۔ بھلا اس طرح کیسے اور کب تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے! لہٰذا میں نے فوراً موضوع بدل کر پوچھا۔

''ان تینوں کی روانگی کے بعد کب آپ کا ان سے آخری بار رابطہ ہوا تھا؟''

''انڈیا پہنچتے ہی کمیل دادا نے میری ہدایت کے مطابق مجھ سے رابطہ کیا تھا اور اپنے بخیر خیریت سے وہاں پہنچنے کی تسلی بھی کروائی تھی، مگر اس کے دو روز بعد سے آج تک کوئی رابطہ نہ ہوا۔''

''آپ فکر نہ کریں...... میں نے یہاں ان کا کھوج لگا لیا ہے اور انشاء اللہ بہت جلد ان تینوں تک پہنچ جاؤں گا۔ اماں جان اور ابا جی کیسے ہیں؟''

''وہ بالکل ٹھیک ہیں، تمہاری طرف سے اماں جان فکرمند ہیں، میں نے انہیں ٹال رکھا ہے مگر کب تک، خیر...... یہ بتاؤ، کیا واقعی تم نے......''

''ہاں زہرہ! میرا یقین کرو اور بے فکر رہو، مگر محتاط بھی رہنا...... میں بہت جلد اول خیر وغیرہ سے جاملوں گا...... اب فون بند کرتا ہوں، اور اب تم سے مستقل رابطے کا بھی کوئی بندوبست کرنے کی کوشش کرتا ہوں، او کے پھر......؟'' میں نے آخر میں اختتامی انداز میں کہا۔ زہرہ کا مجھے خدا حافظ کہنے کو جی نہ چاہا تو میں نے ہی اس سے تسلی تشفی کے چند الفاظ کہنے کے بعد خود ہی رابطہ منقطع کر دیا۔

''مجھے ذرا پرائیوسی میں بھی ایک اور کال کرنی ہے اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو......'' زہرہ بانو سے گفتگو کرنے کے بعد میں نے موہن کی طرف دیکھا۔

''شیور...... شیور...... آپ وہاں جا کر بات کر سکتے ہیں......'' اس نے کھلے دل سے ایک طرف اشارہ کیا، میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کونے کی طرف چلا گیا اور وہاں کھڑے ہو کر دھڑکتے دل سے آنسہ خالدہ کا نمبر ملانے لگا، مگر پیہم کوشش کے باوصف دوسری جانب سے ایک ریکارڈ شدہ انگریزی میں بھی میسج ملا کہ وہ کال بزی ہے اور میرا کال میسج ملتے ہی وہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گی، مگر میں نے اُسے وائس میسج دے دیا کہ میں خود ہی رابطہ کروں گا وہ نہ کرے، کیونکہ یہ میرا سیل فون نہیں ہے۔

اس کے بعد [illegible] موہن کے سیل فون کے لاگ ہسٹری [illegible] زہرہ بانو اور آنسہ خالدہ کے نمبرز ڈیلیٹ کر دیے اور واپس ان [illegible] درمیان صوفوں [illegible] کر بیٹھ گیا۔

ہم تینوں کے درمیان تھوڑی دیر تک ضروری اُمور پہ گفتگو ہوتی رہی، اس کے بعد موہن نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے اور جلد ہی لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ گھر میں اس ادھیڑ عمر چوکیدار اور اس کی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ موہن غیر شادی شدہ تھا۔ وہ سوشیلا کو مزید کچھ باتیں کہنے کے بعد تیاری کر کے رخصت ہو گیا۔

اب میں اور سوشیلا وہاں تنہا تھے۔ دونوں ملازم میاں بیوی قابل بھروسا تھے، جس کے بارے میں موہن نے بتایا تھا، لیکن باوجود اس کے جہاں تک میں ان سے رازداری برت سکتا تھا وہ برتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیز سوشیلا کے ذریعے میں نے انہیں کہلوا کر اپنی جگہ محدود کر دیا تھا۔

اس کے بعد میں ایک بار پھر سی جی بھوانی کی کلاس لینے اس کمرے میں آ گیا جہاں اسے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ''جل بھوجن'' کے لیے میں ناشتے کی ٹیبل سے مکھن توس اور چائے کا ایک مگ اٹھا لایا تھا۔ وہ اسے ''چگانے'' کے بعد میں اور سوشیلا قریب بچھی کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

''تم جانتے ہو کہ اس سلسلے میں بھولا ناتھ سے مدد لی جائے جو تمہارا حلیف ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر

ociety.com

اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"اس کے سوا اور کوئی چارہ ہے تو تم بتا دو؟" وہ بھی مکاری سے بولا۔ جبکہ میں اس کی شاطرانہ چال سمجھ رہا تھا۔

"بھولا ناتھ کو میں تمہارے بارے میں کیا بتاؤں گا؟ یہی کہ میں نے تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے اور تم میرے ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے میں میری مدد کرو؟"

"اس کے لیے تمہیں دوستانہ بنیادوں پر یہ معاملہ طے کرنا ہوگا۔"

"مثلاً؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہم اپنی دشمنی بھول جاتے ہیں اور دوست بن کر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔"

میں نے اس کی پُرفریب گفتگو میں آئے بغیر طنزیہ حیرت سے کہا۔ "اچھا...... ابڑے سادھوست بن رہے ہو بھوانی! میں تو اپنی دشمنی بھول جاؤں مگر تم نہیں بھولو گے اور میرے چنگل سے نکلتے ہی، سب سے پہلے میری ہی قبر کھودنے کی کوشش کرو گے۔ میرے ساتھیوں کی رہائی تو دور کی بات ہے۔ لیکن بہرحال ایک بات تو میں صاف گوئی سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر میرے ساتھیوں کی بہ خیریت رہائی کے سلسلے میں بھولا ناتھ میری مدد کر سکتا ہے تو میں تمہارے ریفرنس کے ذریعے اس سے ضرور ملوں گا۔ تم مجھے اس کا اتا پتا بتاؤ، اس سے کیسے ملا جائے؟" میری بات پر وہ عجیب انداز میں ہنسا اور بولا۔

"اس کے لیے تمہیں مجھے آزاد کرنا ہوگا اور ہم دونوں اس کے پاس چلیں گے......"

اچانک کمرے میں ایک زوردار چٹاخ کی آواز گونجی اور ساتھ ہی بھوانی کی کراہ ابھری۔ میرے بھاری ہاتھ کا تھپڑ بڑے زور سے اس کے چہرے پر پڑا تھا۔

"ذلیل انسان! بھول جاؤ کہ میں تمہیں آزاد کر دوں گا...... میں تمہیں کتے کی موت مارنے کا عزم لے کر ہی پاکستان سے چلا تھا۔ یاد رکھو! اگر میرے تینوں ساتھیوں میں سے کسی ایک کا بھی ذرا بال بیکا ہوا تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ بلیو ٹکسی سمیت را والے بھی کانپ جائیں گے۔ میرے ساتھیوں کی رہائی اب تمہارے ذمے ہے۔ لہٰذا تم خود کو کتے جیسی موت مرنے سے بچانے کے لیے میرے ساتھیوں کی رہائی کے بارے میں میری مدد کرو۔"

ایک زوردار تھپڑ کھا کے اس کا چہرہ مارے ذلت اور طیش کے سرخ ہو رہا تھا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس پر وہی نسانی کا دورہ پڑا، وہ چیخنے لگا۔ شاید اس نے اپنے ہی گھر میں میرے ہاتھوں اس ذلت آمیز شکست کو قبول نہیں کیا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ ذہنی طور پر پاگل اور جنونی ہو رہا تھا، بولا۔

"تم جیت کر بھی ہارو گے شہزی! تم مجھے جان سے مارو گے اور ادھر تمہارے تینوں ساتھیوں کو آدم خور وحشی قبیلے والے بھون کر کھا لیں گے۔ میرے لیے یہ مہنگا سودا نہ ہوگا۔"

"میرے لیے بھی یہ مہنگا سودا نہ ہوگا بھوانی کتے!" میں نے وحشت ناک لہجے میں کہا۔ "کیونکہ میں تمہیں پھر بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اپنے سر سے کفن باندھ کر پاکستان سے یہاں تمہیں تباہ و برباد کرنے آیا تھا تو جزیرہ انڈیمان بھی میں جا سکتا ہوں...... کیا تم اب بھی اس خوش فہمی میں ہو کہ میں اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کی سکت نہیں رکھتا؟ میں نے تو تم سے ایک سودا کرنا چاہا تھا، غیر مشروط...... میں اب زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔" یہ کہتے ہوئے میں فیصلہ کن انداز میں اُٹھا اور سوشیلا سے مخاطب ہو کر بولا۔

"سوشی...... ! ایک موٹا تکیہ لے کر آؤ......" اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور ایک تکیہ لے آئی۔ وہ میں نے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے پستول نکال لیا اور اس کی نال تکیے سے لگا کر بھوانی کے قریب آ گیا۔ میری آنکھوں اور چہرے پہ خونخواری اور سفاکیت عروج پہ پہنچی ہوئی تھی جسے محسوس کر کے بھوانی کا چہرہ سفید پڑنے لگا۔

"مم...... مجھے مت مارو...... میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔"

"ہرگز نہیں...... تم اب مجھ پر بوجھ بن چکے ہو، میں نے تمہارے ساتھ بہت وقت برباد کر لیا۔" کہتے ہوئے میں نے پستول کی نال لگا تکیہ اس کی کنپٹی کے ساتھ لگا لیا۔ سوشیلا نے پھیلی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اپنے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور چہرہ بھی اس میں چھپا لیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھوانی کو خوف زدہ کرنے کے لیے اداکاری نہیں کر رہی تھی۔ لیکن بھوانی پر اس کا خاطر خواہ نفسیاتی اثر پڑا۔ وہ گھگیاتے ہوئے دوبارہ رحم طلب لہجے میں مجھ سے بولا۔

"دد...... دیکھو...... مم...... میری وجہ سے تمہارا کام بلا تاخیر ہو جائے گا...... مجھے ابھی فون دو...... میں بھولا ناتھ کو فون کرتا ہوں...... تم اس سے جا کر ملو...... وہ تمہیں فل سپورٹ کرے گا میری وجہ سے......"

پستول کے ٹریگر پر میری اُنگلی رک گئی۔ میں بھی جانتا تھا، وہ میری دہشت تلے زیر ہو گیا تھا اور وہی کچھ

کرنے پر مجبور ہو گیا تھا جو میں اصل میں چاہتا تھا۔

یقینی موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اچھے اچھوں کا پانی پتا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ میرے ہاتھوں اپنی ذلت آمیز اور عبرت ناک شکست کو دیکھ کر مکار بھگوانی نے ابتدا میں مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ پاگل اور جنونی ہو کر اپنی موت سے بے پروا ہو گیا ہے اور یوں میں اپنے ساتھیوں کے اس کے ہاتھوں یرغمال ہونے پر اسے زندہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا، لیکن جب اس نے محسوس کیا کہ میں چالاکی سے (اگرچہ اس میں حالات کا ڈرامائی رخ بدلنے کا بھی دخل تھا) اس سے بہت کچھ اُگلوانے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اب میں نے بھی اس کی چنداں پروا نہ کی ہے اور از خود اپنے ساتھیوں کو تلاشنے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہوں تو وہ سمجھ گیا کہ اب مجھ سے معاملہ داری کے سوا کوئی چارہ نہیں، اس طرح کم از کم اس کی موت کچھ گھڑیوں یا کچھ دنوں کے لیے ٹل تو جائے گی، یوں وہ مجبور ہو گیا تھا کہ اپنی کوئی بات منوائے بغیر میری مانتا جائے۔

میں نے فوراً سوشیلا کو اشارہ کیا۔ وہ کارڈلیس فون لے آئی۔ میں نے بھگوانی سے کہا۔ "میں فون تمہارے کان سے لگا رہا ہوں، لیکن یاد رکھنا! کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش بھی نہ کرنا، نہ ہی کوئی اضافی یا معنی خیز جملہ بولو گے، یوں بات کرو گے، جیسے تم کسی کی قید میں نہیں بلکہ اپنے ہیڈکوارٹر کی پرتعیش نشست گاہ میں بیٹھے ہو، سمجھ گئے؟"

وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "اس کے لیے بہتر ہو گا کہ تم از کم میرے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر دو، اس طرح میں پورے اعتماد سے بات کر سکوں گا اور بھولا ناتھ کو شبہ تک نہ ہو گا کہ میں کسی کی قید میں یا دباؤ میں بات کر رہا ہوں۔"

میں نے ہونٹ بھینچ کر غور کرنے کے انداز میں اس کے مکروہ چہرے کی طرف دیکھا اور پھر سوشیلا کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور بھگوانی کے دونوں ہاتھوں کو آزاد کر دیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو سہلایا اور پنجے کھول بند کر کے اُنگلیوں کی ورزش کی، اس کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

"لاؤ...... فون مجھے دو......"

میں نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھانے سے پہلے اس کا اسپیکر آن کر دیا تھا، تا کہ دوسری جانب سے بھولا ناتھ کی جوابی گفتگو میں بھی سن سکوں۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگا، میں بہ غور اس کی ایک ایک حرکت کو جانچ رہا تھا۔ نمبر ملانے کے بعد اس نے ریسیور اپنے کان سے لگا لیا۔

"ہیلو......!" دوسری جانب سے ایک گمبھیر سی آواز ابھری۔ میں نے اپنی بھویں سکیڑ لیں اور تمام حسیات مع سماعت اس طرف مرکوز کر دیں۔ بھگوانی کی ذرا سی بھی غلطی بھارت کے ایک بڑے زیرِ زمین "ڈان" کو میرے پیچھے لگا سکتی تھی، جبکہ میں یہاں پہلے ہی کئی شکاری اور خونخوار کتوں سے بچتا پھر رہا تھا۔

"ہیلو......! بھگوانی اسپیکنگ! کیسے ہو دادا؟" رابطہ ہوتے ہی بھگوانی نے کہا۔ لہجہ اور انداز نارمل تھا۔

"آہاہ...... بھگوانی صاحب! نمستے...... زہے نصیب! بڑے دنوں بعد یاد کیا اس غلام کو...... کہیے کیسے مزاج ہیں صاحب سرکار کے......! پہلی بار ایک اجنبی نمبر سے غلام کو یاد کیا، خیریت تو ہے ناں جناب......؟"

مجھے بھولا ناتھ کا لب و لہجہ کسی تیسرے درجے کے اسٹریٹ لوفر کلاس بدمعاش کا سا محسوس ہوا تھا۔ ایک بڑے ڈان کا جو رعب اور دبدبہ ہونا چاہیے وہ اس [illegible] تھا یا پھر شاید وہ...... بھارتی ایجنسی کے ایک بڑے [illegible] سی بھگوانی سے [illegible] طلب تھا اور خود کو اسی لیے اس سے ذرا [illegible] رکھ کر گفتگو کرنے کا انداز خوشامدانہ اختیار کر رکھا تھا لیکن اس کا آخر میں نمبر کے بارے میں استفسار کرنا مجھے کچھ بے [illegible] سا کر گیا تھا، تاہم اس سلسلے میں بھی میں نے بھگوانی کو خاص ہدایت کر رکھی تھی کہ اس نے کیا کہنا تھا۔

"ہاں، دادا! بس ایک فوری مجبوری کے تحت دوسرا نمبر استعمال کرنا پڑا، میں دوبارہ اس نمبر پر نہیں ملوں گا۔ ویسے سب خیریت ہی ہے، تم سے ایک کام آن پڑا ہے دادا......!" بھگوانی نے اس سے کہا۔

"حکم حکم صاحب سرکار......! کیسا کام آن پڑا ہے اس غلام سے......؟"

میں نے بھگوانی کو فون دینے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ اس نے اول خیر وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کس طرح اور کیا گفتگو کرنا تھی۔

"ایک آدمی بھیج رہا ہوں تمہارے پاس...... اسے تمہاری مدد کے ساتھ فل سپورٹ بھی چاہیے، باقی کام کیا ہے، یہ وہ خود ہی وہیں آ کر تمہیں بتا دے گا......"

دوسری جانب سے دھڑکتی خاموشی چھائی رہی، میری بے چین اور تھکی ہوئی منتظر سماعتوں کو بھولا ناتھ کی یہ لمحاتی خاموشی بری طرح کھلنے لگی، جلد ہی وہ بولا۔

"بھیج دو اسے...... میرے پاس......"

اس بار جانے کیوں مجھے بھولا ناتھ کے لہجے میں وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

فدویانہ پن محسوس نہیں ہوا، جس نے مجھے کچھ [illegible] ٹھٹکا دیا۔ تاہم میں تیزی سے سوچتے ذہن رسا میں اس کروشی خیال کو نہ نکال پایا تھا کہ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں ہے، جتنا کہ میں اس کی اُمید رکھے ہوئے تھا۔

''اوکے دادا! ابھی بھیج رہا ہوں..... ذرا خیال رکھنا.....'' کہہ کر بجوانی نے رابطہ منقطع کر دیا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کارڈلیس ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔ مجھے اس کی مسکراہٹ میں کسی شاطرانہ چال کی بو آتی محسوس ہوئی تھی، یا پھر میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احتیاط پسند تھا۔

''بھولا ناتھ سے ملنے کے لیے مجھے کہاں جانا ہوگا؟'' میں نے اندر ہی اندر کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس نے مجھے ممبئی کے کسی ہوڑا کلب نامی جگہ کا پتا بتایا، اس کے بعد سوشیلا نے میرے اشارے پر اس کے دوبارہ ہاتھ جکڑ بند کر دیے۔

''تم واقعی بہت جینئس ہو شہزی! بڑے بہتر طریقے سے آگے بڑھ رہے ہو.....''

دوسرے کمرے میں آتے ہی سوشیلا نے شوخ لہجے میں مجھ سے کہا۔ جبکہ میرے چہرے پر اتھاہ خاموشی کا راج تھا۔ تاہم میں نے اس کے سامنے والا صوفہ سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا خیال ــ غلط ہے سوشی.....!''

''واٹ؟'' وہ چونک کر میری جانب سوالیہ آمیز اُلجھی نگاہوں سے تکنے لگی۔

''میرے دشمن مجھ سے زیادہ مکار اور چالاک ہیں، اگر میرا خدشہ درست ہے، تو ہم سے ایک فاش غلطی ہو چکی ہے اور شاید ہم اس مکار بجوانی کی چال میں آ گئے ہیں۔''

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور یکدم سوشیلا کا کھلا کھلا چہرہ بجھ سا گیا، اس کی کشادہ اور حسین آنکھیں متوحش انداز میں پھیلی رہ گئیں۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔ ''کک..... کیا مطلب.....؟''

''مطلب یہ کہ مُشتری ہوشیار باش! خدا کرے میرا خدشہ باطل ہو، مگر میں اپنی چھٹی حس اور اپنے اندر کی اچانک بیدار ہونے والی کھٹک کو رد نہیں کر سکتا۔ آؤ میرے ساتھ..... اور غور کرتی رہو کہ میں نے اچانک کس خطرے کی بو سونگھ لی ہے.....''

میں نے صوفہ چھوڑ دیا۔ سوشیلا متوحش سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے پاس جو پستول تھا، اس میں فقط چار گولیاں تھیں۔

سوشیلا ابھی تک کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ جبکہ میرے ذہن طباع میں ہنوز بجوانی کا یہ جملہ بار بار گردش کر رہا تھا جب بھولا ناتھ نے حیران ہو کر یہ کہا تھا۔

''..... پہلی بار ایک اجنبی نمبر سے غلام کو یاد کیا، خیریت تو ہے ناں جناب.....؟''

تو جواب میں بجوانی نے کہا تھا۔

''ہاں، دادا! بس ایک فوری مجبوری کے تحت دوسرا نمبر استعمال کرنا پڑا، میں دوبارہ اس نمبر پر نہیں ملوں گا۔ ویسے سب خیریت ہی ہے، تم سے ایک کام آن پڑا ہے دادا.....!''

لیکن سب سے زیادہ کھٹک مجھے تب ہوئی تھی، جب آخر میں مجھے بھیجنے کے سلسلے میں بھولا ناتھ کا جوابی انداز ایک دم بدل گیا تھا اور اس نے یہ کہتے ہوئے ''بھیج دو اسے'' فوراً رابطہ بھی منقطع کر دیا تھا۔

ان باتوں سے قطع نظر ایک بات اور بھی اچانک میرے ذہن میں کسی جھٹکے ہوئے خیال کی طرح ''کلک'' ہوئی تھی کہ بجوانی نے چونکہ یہاں کے نمبر بلکہ لینڈ لائن نمبر سے بھولا ناتھ سے بات کی تھی اور ممکن تھا کہ بھولا ناتھ جیسا بڑا ڈان اس ''اجنبی'' نمبر سے کھٹکا ضرور ہوگا۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ پہلے اس نمبر والے ٹھکانے کی اپنے طور پر تصدیق کرنے کی بھی کوشش کرتا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ ایسا سرے سے ہی کچھ نہ ہوتا اور یہ ساری ''کھٹک'' محض میرے اپنے ذہن کی اختراع یا حد سے زیادہ احتیاط پسندی کا شاخسانہ ہوتی، لیکن جانے کیا بات تھی کہ میری چھٹی حس خطرے کی گھنٹی بجا رہی تھی کہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہوگئی تھی۔

سوشیلا ابھی تک کچھ نہیں سمجھ پائی تھی، اور سمجھ بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ وہ ایسے حالات سے نہیں گزری تھی، میں نے البتہ اُسے اپنے اس کھٹک آمیز شبہے سے آگاہ ضرور کر دیا تھا۔

میں سوشیلا کو لیے بنگلے کی چھت پر آ گیا اور اس کے چار اطراف میں کسی مشکوک آدمی یا کسی اور قسم کی نقل و حرکت پر خود نظر آئے بغیر نگاہ دوڑاتے رہنے کی تاکید کی، اس کے بعد میں نے اُسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

اب وہ بنگلے کے عقب اور دائیں بائیں نگاہ رکھے ہوئے تھی اور میں بنگلے کے بیرونی گیٹ اور اس سے باہر کی سڑک پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

جلد ہی مجھے سوشیلا کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔

"خضری! ذرا ادھر آؤ......" میں تیزی سے جھکا جھکا اس کی طرف کو لپکا اور اس کے اشارے پر منڈیر کے دوسری طرف جھانکا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ ایک کار پچھواڑے آن کھڑی ہوئی تھی اور اس کے اندر سے تین کسرتی جسم کے افراد برآمد ہوئے تھے۔ ان کے انداز و اطوار خاصے جارحانہ تھے، اور صورت سے ہی چھٹے ہوئے بدمعاش نظر آتے تھے۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو نے عقبی دیوار سے اندر نقب لگائی...... ان کے پاس نقب زنی کا جدید اور خودکار مگر مختصر ترین سامان دیکھ کر میں بھی ششدر سا رہ گیا تھا۔ اپنے انداز و اطوار سے بھی یہ لوگ ٹاپ کیٹگری کے پروفیشنل دکھائی دیتے تھے۔ میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو چکی تھی۔

تیسرے آدمی کو میں نے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا، اس کا انداز البتہ اپنے دو ساتھیوں کی طرح چوروں جیسا نہ تھا، لیکن میں اس قبیل کے لوگوں کے کام کرنے کے انداز سے اچھی طرح واقف تھا۔

میں نے سوشیلا کو عقبی دیوار سے پھاند کر اندر در آنے والوں پر نگاہ رکھنے کی تاکید کی اور خود تیزی سے نیچے آیا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ وہاں وہی ادھیڑ عمر چوکیدار، اندرونی کیبن میں موجود تھا۔ میں لپک کر وہاں تک جا پہنچا، وہ مجھے اس طرح اندر داخل ہوتے دیکھ کر چونکا بھی اور پریشان بھی ہو گیا۔

"ادھر ہی جمے رہو، دشمن یہاں پہنچ گئے ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سرسراتی ہوئی سرگوشی کی۔

"د...... دشمن؟ کس کے دشمن؟" وہ ہکلایا۔

"اس وقت وہ سب کے دشمن ہیں۔" میں نے کیبن کے کھلے دروازے سے گیٹ کی طرف ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔ "تمہارے پاس کوئی گن شن ہے؟"

"یہ ڈنڈا ہے۔" اس نے پائپ والے بیڈ سے لگائے ہوئے ایک موٹے سے ڈنڈے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اس ڈنڈے کے ساتھ ادھر ہی رہو...... میں سب سنبھال لوں گا۔" میں نے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اندر کال بیل کی آواز سنائی دی۔ میں نے چوکیدار کو اشارہ کیا۔ وہ بغلی گیٹ کھولنے کے لیے آگے بڑھا اور میں اس کے دائیں جانب بڑے گیٹ کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ پستول میں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پھر میری ہدایت کے مطابق چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولنے سے پہلے آواز لگائی۔

"کون ہے؟"

"میں گیس کمپنی سے آیا ہوں، کنکشن چیک کرنا ہے، آپ کے پڑوسی نے شکایت کی ہے کہ آپ کی گیس باہر سے لیک کر رہی ہے۔" باہر سے جواب آیا۔ میں نے اشارہ کیا۔ چوکیدار نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ اچانک کسی نے اس کی کنپٹی کے ساتھ پستول کی نال لگا دی اور محتاط انداز میں اندر قدم رکھا، میں پہلے ہی تاک میں تھا، اس کی جھلک دیکھتے ہی میں نے اپنے پستول کی نال اس کی کنپٹی سے لگا دی۔

"خبردار...... میری انگلی ٹریگر پر ہے، کوئی غلط حرکت مت کرنا۔" میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

دفعتاً اندر چیخ کی آواز ابھری، یہ نسوانی چیخ تھی، اسی وقت گولی چلی۔ میرا دھیان لمحے بھر کو بھٹکا۔ پھر ایک اور گولی چلی، میرے منہ پر خون کے چھینٹے پڑے، خطرہ محسوس کرتے ہی میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دی، اسی وقت کسی کا بے سدھ وجود مجھ پر گرا، یہ اس بدنصیب چوکیدار کا تھا، جسے وہ بے رحم اپنے پستول کی گولی اس کے سر میں اتار کر ہلاک کر چکا تھا، میں نے اسی کے وجود کے سہارے، اس قسائی کو دھکا مارا، وہ مجھ پر بھی گولی چلانے والا تھا، اندر لگتا تھا، اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنی "کارروائی" کا آغاز کر دیا تھا۔ اگرچہ نسوانی چیخ پر میرا خدشہ سوشیلا کی طرف گیا تھا، مگر وہ نسوانی چیخ میرے لیے اجنبی تھی۔

دھکا اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا، اسی لیے وہ سنبھل نہ سکا اور لڑکھڑا گیا، مگر اس نے اپنے پستول کو ہاتھ سے گرنے نہیں دیا تھا اور لڑکھڑانے کے دوران ہی اس نے مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کی تھی، میں اب اسے دوسری بار گولی چلانے کا موقع کہاں دینے والا تھا، اس سے پہلے ہی میرے پستول کی نال نے دھماکے سے شعلہ اگلا، وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا، میری گولی اس کی پیشانی میں پیوست ہو گئی تھی، میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور مرکزی دروازے کی طرف لپکا ہی تھا کہ بری طرح ٹھٹکا، ایک دراندار، جس کے ہاتھ میں پستول تھا، میرا نشانہ لینے کی کوشش میں تھا، میرے پاس پلٹنے یا رک کر کہیں پیچھے ہٹنے کا نہ وقت تھا نہ موقع، تاہم میں نے اسی طرح دوڑتے ہوئے، ایک "اسکائی جمپ" لیا، گولی چلی، مگر نشانہ خطا گیا۔ چھوڑا اسے میں نے بھی نہیں تھا اور...... دورانِ جمپ ہی اس پر فائر جھونک مارا...... وگرنہ میرے زمین پہ آتے آتے یہ

دوسرا فائر کر کے مجھے جاں بحق کر سکتا تھا۔ اُدھر میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں پیوست ہوئی اُدھر میں اس کے بالکل قریب جا پڑا۔ پھر اس کی لاش ”ٹاپ“ کر چکنے لاؤنج پر اپنے جوتوں کے پھسلوان سولز کے باعث گویا اسکڈ کرتا ہوا، اندر نشست گاہ کے دروازے سے جا ٹکرایا، میری توقع کے عین مطابق وہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ وہاں میں نے تیسرے درانداز کو ایک عورت کی قالین پر پڑی لاش کے قریب کھڑے پایا، جس نے سوشیلا کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا، وہ اس سے شاید بھوانی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

مجھے ان کی غیر معمولی خود اعتمادی پر حیرت ہوئی تھی کہ انہوں نے کس طرح محض ایک اندازے کی بنیاد پر یہاں دھانہ وار اور بے دریغ شب خون مارا تھا، یا پھر ان کا لائن آف ایکشن ہی ایسا تھا، ان کے سامنے بے گناہ انسانی جان کی کوئی وقعت نہ تھی، ماسوائے اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کی تکمیل کے...... کیا غلط تھا کہ اِدھر ان کا اندازہ درست ثابت ہوا اور اُدھر میری چھٹی حس نے مجھے بروقت کھٹکا دیا۔ بس! محتاط انداز کی گھات اور مات کے درمیان تماشائے خوں رنگ کی ابتدا ہوئی۔

تیسرے درانداز نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا، شاید اُسے توقع نہیں تھی کہ میں اس طرح پستول بدست اس کے سامنے کسی طوفانی بگولے کی طرح آن پڑوں گا۔ ورنہ تو شاید وہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ اب تک اس کے دونوں ”پروفیشنل“ مار کا ساتھی مجھے ختم کر چکے ہوں گے۔

”پستول نیچے گرا دو...... تمہارے دونوں ساتھی ختم ہو چکے ہیں۔“ میں نے غراتی ہوئی آواز میں اس سے کہا۔ اُسے ابھی تک اپنے دونوں ساتھیوں کی ناکامی پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اسی وقت گولی چلی، سوشیلا کے حلق سے غیر ارادی چیخ ابھری، اور ساتھ ہی اس آخری دشمن کی بھی، کیونکہ میری محتاط نظروں نے اس کے پستول کی لبلبی پر اس کی اُنگلی کو متحرک ہوتے محسوس کر لیا تھا اور میں نے گولی اس کے پستول والے ہاتھ پر ہی چلائی تھی۔ سوشیلا سلامت تھی۔ وہ محض خوف سے چلائی تھی۔

دشمن کے ہاتھ سے خون بھل بھل کرنے لگا۔ قالین پر پڑی لاش بدنصیب چوکیدار کی بیوی کی ہی تھی۔ دونوں ملازم ختم ہو چکے تھے۔

”تم کون ہو تم؟ اور اس طرح درانداز ہونے اور خون خرابا پھیلانے کا کیا مقصد تھا تمہارا؟“ میں نے اس کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

”شہزی! یہاں سے اب فوراً نکلنے کی کرو...... پلیز! گولیوں کی آواز سن کر کسی نے پولیس کو فون کر دیا ہوگا۔“ سوشیلا نے کہا۔ ”یہ لوگ بھولا ناتھ ہی کے آدمی ہیں، یہ مجھ سے بھوانی کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔“

اس کی بات ٹھیک تھی۔ اسی وقت اس درانداز نے دوڑ لگائی، میں نے اس پر آخری گولی چلا دی، جو اس کی ٹانگ میں لگی، وہ چیخ مار کر گرا، میں نے لپک کر اس کا گرا ہوا پستول اُٹھا لیا اور پھر اسے اسی طرح دبوچ کر گھسیٹتا ہوا، اسی کمرے میں لے آیا جہاں بھوانی رسن بستہ حالت میں بندھا ہوا تھا۔ میں نے سوشیلا کو رسی کا بندوبست کرنے کا کہا۔

اُسے کوئی رسی تو نہیں ملی البتہ ایک مضبوط ریشمی ڈوری لے آئی، میں نے اسی سے اس کی بھی مشکیں کس ڈالیں۔

”ان دونوں کو لے چلنا ہے، جلدی...... تم کار اسٹارٹ کر کے دروازے کے قریب لے آؤ، چاہے تھڑے پر ہی کار کیوں نا چڑھانا پڑ جائے۔“

سوشیلا نے ایسا ہی کیا۔ میں جب تک ان دونوں کی ایک ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا باہر تک لایا، سوشیلا کار مرکزی دروازے تک لا چکی تھی۔

میں نے دونوں کو عقبی سیٹوں پر پھینکا اور سوشیلا کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

اگلے ہی لمحے سوشیلا نے کار بیک کی اور پھر گیئر بدل کر بڑا سا گیٹ توڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔

کار ایک بار پھر فراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

کاشی رام کے بعد یہ ہماری دوسری ”مددگار“ پناہ گاہ تھی جو ہم سے اب چھوٹ گئی تھی۔ یعنی موہن...... ہم ایک بار پھر بے سروسامانی کے عالم میں تھے، جبکہ بھوانی کے بعد اب ایک اور قیدی بھی ہماری گرفت میں آ چکا تھا۔ سوشیلا کو میں نے کار کو سردست مضافات کی طرف لے جانے کا کہا تو وہ ایک نگاہ ڈیش بورڈ کے فیول مانیٹر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

”گاڑی میں پیٹرول کم ہے، ہمیں بھروانا پڑے گا۔“

”ہاہا...... ہا...... شہزی! تمہارے لیے یہاں کہیں بھی جائے پناہ نہیں، جہاں جاؤ گے، دھر لیے جاؤ گے، بہتر یہی ہے کہ میرے ساتھ معاملہ داری کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

اچانک بھوانی کی زہریلی آواز ابھری۔ میں پہلے ہی پریشانی کے سبب جھلایا ہوا تھا، اس کی بات نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا اور میں نے پُرغیظ انداز میں اپنے دانت بھینچ کر اس کے جبڑے پر ایک گھونسا جڑ دیا، اس کے حلق سے اوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوئی اور منہ سے خون بہنے لگا۔ وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ شاید خون اس کے حلق میں بھی اتر گیا تھا جو ٹھسکے کا باعث بنا تھا، کار میں پہلے ہی اچھا خاصا خون پھیل گیا تھا، کیونکہ بھولا ناتھ کا گرگا بھی زخمی تھا۔ اس نے بھی مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دی تھی، ایک گھونسا میں نے اس کے چہرے پر بھی جڑ دیا تھا، لیکن میں نے دیکھا بھوانی کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی، اُس کے جسم کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ میں سمجھ گیا وہ مکاری کر رہا ہے۔

"اسے سنبھالو...... اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔" بھولا ناتھ کا گرگا مجھ سے خونخوار لہجے میں بولا۔

"جہنم میں جائے، یہ مکاری کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم نہیں جانتے یہ دادا کا محسن اور بہت قریبی دوست ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو اکھا (پورے) بھارت میں تمہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ دادا تمہارا جینا محال کر دے گا۔ تم پہلے ہی اس کے دو ساتھیوں کو ہلاک کر چکے ہو اور وہ اپنے ایک ساتھی کی ہلاکت پر دشمن کے پچاس آدمیوں کو موت کے گھاٹ...... ـــ اوغ......" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے میرا ایک زوردار پنچ اس کی ٹھوڑی پر پڑا تھا اور ایک بار پھر وہ خون تھوکنے لگا۔ وہ اپنے دادا (بھولا ناتھ) کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی رطب اللسان ہو رہا تھا۔

"شش...... شہزی! بھوانی کو دیکھو... بھنت" اچانک ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان سوشیلا نے بیک ویو میں دیکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور میں نے بے سدھ سے پڑے بھوانی کی طرف دیکھا تو اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ رسن بستہ حالت میں ہونے کے باوجود گول مول سا ہو گیا تھا، اس کے منہ سے ابھی تک خون موٹی لکیر کی صورت میں بہہ رہا تھا۔

"کوئی ویران جگہ پر گاڑی روکو ذرا......" میں نے کہا، میری آواز میں تشویش کی ہلکی سی رمق ابھر آئی تھی۔

ابھی ہم شہر سے "ایگزٹ" نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ذرا دیر بعد سوشیلا نے کوئی ویران سا علاقہ دیکھ کر کار روک دی۔ یہ ریلوے یارڈ کا ایریا تھا، جہاں زیادہ تر شیڈز اور تھوڑے تھوڑے فاصلوں سے مال بردار بوگیاں کھڑی نظر آرہی تھیں۔

کار کے رکتے ہی میں نے بھوانی کا جائزہ لیا۔ اس کی گردن پر اپنے ہاتھ کی چار انگلیوں کی پشت رکھ کر شہ رگ کو چیک کیا جو خاموش تھی، پھر دل پر ہاتھ رکھا اور اس کی ایک آنکھ کے پپوٹے کو اٹھا کر دیکھا اور پھر اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

"کرنل سی جی بھوانی کا دیہانت ہو گیا ہے۔"

"کیا......؟ تت...... تم نے اسے ہلاک کر دیا؟" گرگا پھر چلایا۔

"ہاں! مگر مجھے اس کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے، جلد یا بدیر میں نے اسے نرک میں پہنچانا ہی تھا۔ البتہ اس بات کا مجھے افسوس ہے کہ یہ پہلے مر گیا۔ خس کم جہاں پاک......" میں نے اچانک بے پروا انداز میں کہا اور پھر بھوانی کی لاش کو ٹانگ سے گھسیٹ کر اسی طرح رسن بستہ حالت میں کار سے باہر زمین پر پھینک دیا۔ یہ قابل نفریں شخص یوں بھی کسی طور پر رحم کے قابل نہ تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو ایک طویل عرصے تک میرے باپ کو قید میں رکھ کر انسانیت سوز تشدد کا نشانہ بناتا رہا تھا۔ یہی وہ بڑا دشمن تھا جو میرے وطن کو دولخت کرنے والوں کی لابی سے تعلق بھی رکھتا تھا، 'را' میں اس کا ایک بڑا عہدہ تھا، جسے بعد میں صرف پاکستان کے خلاف مذموم سازشوں کے لیے استعمال کرنے کے لیے الگ ونگ "بلیو فکسی" کی بنیاد ڈال کر اس کا سربراہ بن گیا۔ نیز میرے ذریعے پاکستان میں قید اپنے ایک اہم ترین جاسوس سندرداس سکینہ کو رہائی دلوانے کا خواب بھی اس کے ساتھ ہی جہنم میں بھسم ہو گیا تھا۔

سامنے کچرے کا ڈھیر تھا، بھوانی کی لاش کو میں نے اس طرف گھسیٹ کر ڈال دیا۔ وہ اسی قابل تھا۔ اس کے بعد دوبارہ کار کی طرف بڑھا۔ دور "لوکو شیڈ" کی طرف کسی انجن کی وسل ابھری۔ میں کار کا دروازہ کھول کر گرگے کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"تت...... تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔" وہ مرعوب ہونے کے باوجود زہر اُگلنے سے باز نہ آیا۔

"اس میں تمہارے دادا بھولا ناتھ کا قصور ہے، نہ وہ یہ مہم جوئی دکھانے کی کوشش کرتا نہ اس کا یہ حال ہوتا۔" میرا اشارہ بھوانی کی طرف تھا۔

"تم نے اپنی موت پر دستخط کر دیے ہیں۔" وہ بھناتے ہوئے لہجے میں بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میں نے پستول نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ "مجھے بھولا ناتھ کے ٹھکانے پر لے چلو گے یا تمہیں بھی ٹرک میں پہنچا کر یہاں کچرے میں تمہاری لاش پھینک دوں۔"

"او...... بڑے دل گردے والے ہو...... بجائے دادا سے بچنے کے تم اس کے پاس جانا چاہتے ہو......" وہ طنزیہ حیرت سے بولا۔

"بھوانی کو بھی یہی خوش فہمی تھی کہ وہ کوئی بڑی شے ہے...... وہ دیکھو، اس کا حشر......" میں نے زہرخند لہجے میں اس سے کہا اور کھڑکی سے باہر ذرا دور کچرے کے ڈھیر کے قریب پڑی بھوانی کی لاش کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

"ہوں ں...... کم تو تم بھی نہیں لگتے ہو...... چلو پھر، میں تمہیں دادا کے ٹھکانے کی طرف لے چلتا ہوں۔" وہ بولا۔

"مجھے صرف اس کا ٹھکانا بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟"

اگرچہ بھوانی نے مجھے بھولا ناتھ کے چند ایک ٹھکانوں کے متعلق غیر واضح انداز میں بتایا بھی تھا تاہم میں اس سے [illegible] پوچھنا چاہتا تھا۔

"کس ٹھکانے کا بتاؤں تمہیں؟" وہ [illegible] غرور لہجے میں بولا۔ "دادا کے یہاں بہتیرے ٹھکانے ہیں...... کسی پل وہ یہاں تو کسی پل وہ کہیں اور ہوتا ہے۔"

میں نے دوسرا ہاتھ [illegible] کے ساتھ اس کی بائیں ہنسلی کی ہڈی کی طرف بڑھایا اور اس کی رگ حساس مسل ڈالی، وہ ایک جھٹکے سے بے حس ہو کر ڈھیر ہو گیا۔

میں نے اسے بھی اٹھا کر بھوانی کے قریب لے جا کر ڈال دیا۔

"یہ بھی گیا......؟" تیزی سے کار میں سوار ہوتے ہی سوشیلا بولی۔

"پورا نہیں، نصف گیا۔ کار آگے بڑھاؤ...... دور پرے موجود لوگ اسی طرف متوجہ ہونے لگے ہیں۔" میں نے گرد و پیش پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوشیلا سے کہا اور اس نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔

میں اب اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا تھا اور کچھ سوچ کر اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔

"واٹ......؟ جی جی...... یہ تمہارے پاس کہاں سے آ گیا......؟" وہ میرے ہاتھ میں سیل فون دیکھ کر چونکی۔

"اسی گرگے کی جیب سے نکالا تھا میں نے۔"

"اب کس کو فون کرنے لگے ہو؟"

"سب سے پہلے تو موہن کو کرنا چاہیے، تاکہ وہ موجودہ خطرے سے نہ صرف آگاہ ہو سکے بلکہ محتاط بھی ہو جائے، کیونکہ وہ خود بھی خطرے میں گھر چکا ہے۔ یوں بھی اس کی رہائش گاہ میں لاشیں موجود ہیں اور اُسے اپنے لیے پہلے تو کچھ قانونی کارروائیوں سے گزرنا پڑے گا۔ اب پتا نہیں وہ پولیس کو ہمارے بارے میں کیا کچھ بتاتا ہے؟"

"تم اس کی چنتا مت کرو۔" وہ بولی۔ "کچھ بھی ہو جائے موہن ہرگز ہمارے خلاف پولیس کو کچھ نہیں بتائے گا، ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ہماری وجہ سے وہ بھی ایک بڑی مصیبت کا شکار ہونے لگا ہے۔ لیکن خیر! وہ بزدل نہیں ہے اور اس کے باوجود وہ ہماری ہر ممکن مدد پر عمل درآمد کرتا رہے گا، بشرطیکہ ہم اس کے ساتھ رابطے میں رہیں، یہ تم نے اچھا کیا کہ سیل فون ہتھیا لیا۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ زیادہ دیر ہمارے کام آ سکے گا، بہت جلد اس کی سم [illegible] دی جائے گی۔"

"ہاں! یہ تو تمہاری بات [illegible] ہے، [illegible] جلدی سے اس کے کونٹیکٹ نمبروں کا جائزہ لے لوں۔" [illegible] نمبروں کی فہرست چیک کی [illegible] ہو گا، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے سرسری [illegible] جا کر دیکھنا [illegible] لکھا، کوئی [illegible] آیا......

"مجھے جلدی سے موہن کا سیل نمبر بتاؤ......"

"لاؤ مجھے دو، میں خود ہی اس سے بات کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے [illegible] دو اور تم میری سیٹ پر آ کر آرام سے بات کرو اور [illegible]۔ اسپیکر آن کر دینا، تاکہ میں بھی اس کی بات سن سکوں اور اس کے بارے میں کچھ اندازہ قائم کر سکوں کہ اس کی گفتگو سے کیا تاثرات ظاہر ہوتے ہیں؟"

چند سیکنڈوں کے بعد کار روک کر ہم سیٹ بدل چکے تھے اور سوشیلا موہن سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے اُسے مختصر لفظوں میں ساری پیش آمدہ صورتِ حال کے بارے میں صراحت سے آگاہ کر دیا۔ مجھے موہن کی جوابی گفتگو سے اندازہ تو ہوا تھا کہ وہ یہ ساری "مہابھارت" سننے کے بعد کچھ متفکر تو ہوا تھا، تاہم اس نے سوشیلا کو تسلی دی تھی کہ وہ اس کی بالکل فکر نہ کرے، وہ محتاط بھی رہے گا اور اس صورتِ حال سے نمٹ بھی لے گا۔ تاہم اس بھلے مانس انسان نے فوری طور پر ہمارے لیے ایک اور محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کر دیا۔ اس نے سوشیلا کو ایک جگہ کا پتا بتایا جو میں نے بھی ذہن نشین کر لیا۔ وہ گاندھی برج کے قریب واقع ایک کالونی

تھی، وہیں ایک گودام نما مکان تھا۔ مکان خالی تھا، موہن نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا، اس پر تالا پڑا ہوا ملے گا اور اسے توڑ کر ہی ہمیں اندر داخل ہونا پڑے گا۔ وہ اسی کی ملکیت تھا۔

میں اور سوشیلا سیدھے وہیں پہنچے۔ یہ کوئی متوسط کالونی تھی اور یہاں زیادہ تر مزدور ٹائپ ہی لوگ رہتے دکھائی دے رہے تھے۔ مکان سوشیلا نے ہی تلاش کیا تھا، اس پر تالا تھا، میں نے کار کے ٹول بکس سے پانا نکال کر تالا توڑ ڈالا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، ایک ہی کمرا تھا اور اس کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ یہاں کافی عرصے سے کوئی نہیں آیا ہوگا۔ مکان میں گندگی بھی بکھری ہوئی تھی۔ میں اور سوشیلا نے جیسے تیسے اس کی صفائی کر کے اسے کچھ گھڑی بیٹھنے کے قابل بنایا۔ اس کے بعد میں نے سوشیت کے موبائل پر رابطہ کیا۔

شکر تھا کہ سیل فون ابھی تک کام کر رہا تھا...... شاید ابھی تک آج والی مہم جوئی کی اطلاع بھولا ناتھ تک نہیں پہنچی تھی۔ سوشیت سے رابطہ ہوتے ہی وہ میری آواز پہچان کر بولا۔

"شہزاد صاحب! آپ کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں ناں؟ آپ فوراً گھوترا جی کے پاس پہنچیں، میں بھی وہیں آرہا ہوں، اور میری کار......"

"بےفکر رہو، وہ ٹھیک سلامت ہے اور یہ بتاؤ گھوترا جی کو تم نے ساری حقیقت بتادی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جج...... جی ہاں! اسی وقت بتادی تھی۔" وہ بولا۔ "وہ تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں، وہ اپنی اکلوتی بیٹی پریتا کے غم اور ان درندہ صفت اہلکاروں کی انسانیت سوز بربریت پر بری طرح طیش کھائے ہوئے ہیں۔ انھیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے، وہ مجھ سے بیسیوں بار تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں۔ پلیز! تم ان سے رابطہ کرلو، وہ تمہارے بھی کسی کام آسکتے ہیں، بھارت کی بڑی بااثر شخصیت ہیں گھوترا جی......"

میں نے اسے تسلی بخش جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا اور سوچنے لگا کہ گھوترا جی ان حالات میں میرے کیا کام آسکتا تھا؟ آیا اب بجوانی جی کی ہلاکت کے بعد اس سے راہ و رسم بڑھانا ضروری تھا یا نہیں۔ جب میں نے اس سلسلے میں سوشیلا سے مشورہ چاہا، وہ فوراً بولی۔

"شہزی! ہم نے اپنے مشن کے دوران بدقسمتی سے بہت سے نئے دشمنوں کو بھی اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ ممبئی کے ڈان بڑے بااثر و رسوخ والے اور دشمنی کے معاملے میں بڑے سفاک اور خطرناک ہوتے ہیں۔ تمہیں بھی شاید اس حقیقت کا اندازہ ہو کہ اس بدبخت بجوانی نے مرتے مرتے بھی ہمارے لیے بھولا ناتھ کی صورت میں ایک مصیبت کو ہمارے پیچھے لگا دیا ہے۔ ہمارا یہاں سوائے اللہ کے کوئی مددگار نہیں ہے۔ (اس کے منہ سے دوسری بار آج بھگوان کے بجائے اللہ کا ذکر سن کر مجھے اچھا محسوس ہوا تھا) لیکن ہمیں زمینی ناخداؤں کی مدد کی بھی ضرورت بہرحال پڑتی رہے گی۔ کاشی رام ہمارے کسی کام نہ آسکا، موہن ایک کاروباری شخص ہے، اگرچہ اس کی نیت پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے لیکن بہرحال وہ جیسے تیسے ہماری مدد میں شامل ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی میری طرح کے ایل ایڈوانی سے اپنے بھائی اور اس کی فیملی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے، لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ بھولا ناتھ جیسے بدمعاشوں کی دشمنی افورڈ کر سکے گا۔ کے ایل ایڈوانی والا معاملہ اور بات تھی، مگر یہ ممبئی کے ڈان...... ایک الگ معاملہ ہے۔"

"تو تم کیا کہتی ہو پھر؟ کاشی رام کی طرح اب موہن کو بھی خیرآباد کہہ دینا چاہیے؟"

"نہیں، یہ اب ہماری خودغرضی ہوگی۔" وہ بولی۔ "کاشی رام کا معاملہ اور تھا، موہن کا اور ہے، وہ ہماری وجہ سے پھنس گیا ہے۔ پولیس وغیرہ سے اپنی جان جیسے تیسے چھڑا بھی لے گا تو بھولا ناتھ اُسے نہیں چھوڑے گا، ہم تک پہنچنے کے لیے وہ موہن کو تختۂ مشق بنا سکتا ہے۔"

میں اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں خاموشی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

مردود بجوانی مرتے مرتے بھی واقعی ہمیں ایک مصیبت میں ڈال گیا تھا۔ ورنہ تو بجوانی والی مہم نمٹانے کے بعد میں نے کے ایل ایڈوانی کے پیچھے پڑنا تھا۔ مگر اب تو بھولا ناتھ سے ٹکراؤ ناگزیر نہیں تو لازمی ضرور نظر آتا تھا۔ اپنے تینوں ساتھیوں کی جزائر انڈیمان کے وحشی قبیلے "کلی منجارو" سے بھی رہائی کا مرحلہ سر کرنا تھا۔ ایک کے بعد ایک مہم گلے پڑ رہی تھی اور میں خود کو یوں سمجھتا، جیسے میں ایک دائرے میں گردش کر رہا ہوں، یوں لگتا تھا جیسے گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آجاتا تھا، جدھر سے چلا تھا۔ تقدیر بھی اگرچہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ایک ہمدرد چھوٹتا تو دوسرا راہ میں گویا فرشِ راہ ہوتا، عجیب بات تو یہ تھی تینوں ہی ایک سے بڑھ کر ایک حیثیت کے حامل ملے تھے۔ کاشی رام پھر موہن اور اب یہ گھوترا جی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"اس کا مطلب ہے سوشیت کی بات غور طلب ہے، تو پھر ہمیں گھوترا جی کی طرف کا رخ کرنا چاہیے؟ اب تک اس کی جتنی تعریفیں سنی ہیں، اس کے مطابق وہ بھی کسی سے کم نہیں ہے اور...... کوئی بعید نہیں کہ وہ کم از کم میرے تینوں ساتھیوں کے سلسلے میں بھی کوئی مدد کر سکے۔"

"ہمیں ابھی آئندہ کی مہمات کے سلسلے میں ممبئی یا بھارت میں قدم جمانے چاہئیں۔" سوشیلا بولی۔ "اس طرح بھاگا دوڑی ہمارے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتی ہے۔"

"میں ابھی گھوترا جی سے بات کر لیتا ہوں۔" بالآخر میں نے فیصلہ کیا، وہ خاموشی سے میرا چہرہ تکتی رہی۔

گھوترا جی سے رابطہ ہوتے ہی دوسری جانب سے ایک آواز ابھری۔

"کون؟"

"گھوترا جی؟" میں نے فون پر استفساریہ کہا۔

"کیا کام ہے اُن سے؟ اور تم کون ہو؟" میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اس کا کوئی پی اے ٹائپ کا آدمی ہوگا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس سے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

"بلا تاخیر میری گھوترا جی سے بات کراؤ...... اُن کی بیٹی پریتا کے بارے میں بات کرنی ہے۔"

"تت...... تم کون ہو؟"

"اگر اب مزید کوئی فضول سوال کیا تو میں فون بند کر دوں گا، بے وقوف انسان!" میں نے اس بار قدرے برہمی سے کہا اور اس نے فوراً رابطہ ملا دیا۔

"ہیلو! کون؟"

"گھوترا جی! آپ سے میں اسی وقت ملنا چاہتا ہوں، مگر رازداری کے ساتھ، سوشیت نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہوگا۔" دوسری طرف سے گھوترا جی کی آواز پہچان کر میں نے کہا تو اگلے ہی لمحے دوسری جانب سے اس کی بوکھلائی ہوئی اور کچھ جوش میں ڈوبی آواز ابھری تھی۔

"ہاں...... ہاں! تم...... مجھے سوشیت نے تمہارے بارے میں بتایا تھا، وہ بھی پہنچ رہا ہے...... تت...... تم! فوراً میرے پاس آ جاؤ...... رازداری کی کوئی چنتا مت کرو، بس آ جاؤ۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا ایڈریس بھی سمجھا دیا۔

میں اور سوشیلا اسی وقت وہیں پہنچے۔ اس کی رہائش گاہ سمندر کے کنارے واقع تھی، جو بے حد عالیشان تھی۔ یہاں زیادہ تر بھارتی فلم انڈسٹری سے متعلق لوگوں کی ہی رہائش گاہ تھی۔ اس علاقے میں کسی غیر متعلقہ افراد کے داخلے کی بھی ممانعت تھی۔ تاہم اگر کوئی "وزیٹر" آ بھی جاتا تو اُسے شناخت کرنے کے بعد ہی داخلے کی اجازت ملتی۔

مگر یہ بہت اچھا ہوا کہ ہمیں ایسی کسی کارروائی سے گزرنا ہی نہ پڑا، ورنہ خاصی مشکل پیش آ جاتی۔ کیونکہ گھوترا جی خود ہی ایک لمبی چوڑی گاڑی میں ہمیں لینے وہاں آن پہنچا تھا اور ہمیں اپنا "مہمان" بتا کر ساتھ لے گیا۔

گھوترا جی مجھے شہزاد کی حیثیت سے ابھی تک نہیں پہچان پایا تھا۔ البتہ سوشیلا کو وہ فوراً پہچان گیا تھا، جب ہی گھوترا جی کا منہ حیرت سے کھلا تھا کہ میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تلقین کر ڈالی اور وہ بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

مین انٹرنس سے لے کر اس کی محل نما رہائش گاہ تک خاموشی رہی تھی۔ میں اور سوشیلا اس کی لمبی چوڑی سیاہ کار کی عقبی سیٹوں پر براجمان تھے۔ سوشیلا شاید یہاں پہلی بار آئی تھی اور کھڑکی سے باہر بھارتی فلمی صنعت کے مشہور ایکٹرز کی عالیشان محل نما کوٹھیوں کو حیرت و اشتیاق سے تکے جا رہی تھی۔ میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی۔ یہ پوش ایریا "جوہو" روڈ پر واقع تھا۔ یہاں ہر وقت ساحل سے آنے والی مست خرام و نرم خوشگوار ہواؤں کی اٹکھیلیاں جاری رہتی تھیں۔ ان ہواؤں میں گل بوٹوں کی مہک بھی رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں بھی وقت گزاری کے لیے یونہی قطار اندر قطار واقع ان عالیشان کوٹھیوں کی طرف تکے جا رہا تھا، چند جانے پہچانے بھارتی ایکٹرز کی رہائش گاہوں کے گیٹ پر میں نے چمکتی ہوئی نیم پلیٹ دیکھی تھیں، ان میں مجھے اجے دیوگن، امیتابھ بچن، سلمان خان، شاہ رخ خان اور عامر خان کے علاوہ، مشہور بھارتی ایکٹریسوں کی بھی کوٹھیاں نظر آئی تھیں۔

کوئی اور ہوتا تو اس علاقے میں آنے پر اپنی خوش قسمتی ہی تصور کرتا، مگر میرے لیے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ فلم نگری درحقیقت ایک خواب نگری تھی۔ ایک شہر نگاراں تھا، عروس البلاد کی ایک الگ دنیا تھی۔

گھوترا جی کی رہائش گاہ بھی ان میں سے ایک تھی۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی، سیاہ رنگ کے دو دروازے خودکار انداز میں سلائیڈ ہو گئے اور کار اندر داخل ہو گئی۔ وہاں ایک گن مین موجود تھا۔

رنگین کنکریٹ کی ایک دیدہ زیب روش پر کار رینگتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ روش کے اطراف وسیع لان تھا۔ وہاں روشنی تھی۔ دو اعلیٰ نسل کے بلڈ ہاؤنڈ کتے مٹرگشت

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

کرتے نظر آئے۔ کار کو دیکھتے ہی وہ ہولے سے بھونکتے ہوئے اس طرف آگئے۔ خوب صورت سی محرابی بالکونی کے نیچے ہی کار پورچ میں رکتے ہی گھوتر اجی نیچے اترا اور میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔ سوشیلا خوفناک صورت کتوں سے ڈر کے اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کے بجائے میرے ساتھ ہی اتر آئی اور میرے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

دونوں کتوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور کھلے خوفناک جبڑوں سے نکیلے شکاری دانتوں کی جھلک انہیں خاصا خوں خوار بنا رہی تھی۔ دونوں کتے مجھے سونگھنے لگے، میں خاموشی سے کھڑا رہا۔

”ٹائیگر...... جیکی...... گو آوے...... گو آوے......“

گھوتر اجی نے تیز سی آواز سے کتوں کو ہشکارا اور وہ ہلکی سی ”ہنچ“ مار کے دوبارہ لان کی طرف بڑھ گئے۔

کار پورچ میں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بعد میں ہماری کار کو وہی گیٹ پر موجود گن مین لے آیا تھا اور اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا، اور جاتے ہوئے اس نے گھوتر اجی سے ہولے سے کچھ کہا تھا جسے میں نہیں سن سکا۔

”سوشیت بھی آیا ہوا ہے اور میرے کچھ مہمان بھی اندر موجود ہیں۔“ منقش کے بیش قیمت اور خاصے موٹے محرابی چوبی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے گھوتر اجی نے ہم سے کہا۔ ”تم لوگ یہاں آرام سے بیٹھو، میں مہمانوں کو فارغ کر کے آتا ہوں۔“

میں اور سوشیلا ایک بڑے سے آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ گھوتر اجی ایک دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک میری عمر کا نوجوان لڑکا اسی دروازے سے برآمد ہوا۔ یہ سوشیت تھا، وہ ایک کھلنڈرا سا نوجوان تھا، مگر اس وقت اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا، وجہ ظاہر تھی کہ اسے اپنی منگیتر پریتا کے اس طرح بہیمانہ قتل پر بے حد افسوس اور دکھ تھا، غم اس کی آنکھوں سے گویا آنسوؤں کی صورت بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر میرے ساتھ بیٹھی سوشیلا پر ڈالی تھی اس کے بعد میری طرف دیکھ کر بولا۔

”آپ نے بہت اچھا کیا جو یہاں آگئے، گھوتر اجی کو بڑی بے چینی سے تمہارے یا تمہارے فون کا انتظار تھا۔“

”اِدھر آجاؤ، یہاں بیٹھو......“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ وہ مجھے خاصا حواس باختہ بھی دکھائی دے رہا تھا اور کافی زیادہ پریشان بھی...... اس کا دکھ اپنی جگہ، لیکن مجھے اس کے چہرے پر چھائے غم کی چادر تلے کچھ اور بھی دبا محسوس ہوا۔ وہ میرے قریب سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ خاموش تھا۔

”گھوتر اجی کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا رہا؟“

اس کے لیے میرا یہ سوال اچانک تھا، اسی سبب اس نے قدرے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن پھر فوراً ہی وہ میرے سوال کا مطلب سمجھ کر ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”وہ مجھے بھی اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہیں اور مجھ سے سخت خفا ہیں......“

مجھے اس کا اندازہ تھا، میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے دوسرا سوال کیا۔ ”تم جانتے ہو اس وقت اندر گھوتر اجی کے کون سے مہمان آئے ہوئے ہیں؟“

اس نے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے دیگر مقتول دوستوں کے والدین آئے ہوئے تھے، یہ لوگ مل کر قانونی طور پر خفیہ ایجنسی کے ان اہلکاروں اور ان کے سربراہ کے خلاف کورٹ اینڈ میڈیا ٹرائل کا پروگرام بنائے ہوئے ہیں...... لیکن......“ وہ اتنا کہہ کر رکا۔

”لیکن کیا......؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہ لوگ جا چکے ہیں کب کے، اس وقت گھوتر اجی کے پاس اندر...... نانا شکور بیٹھا ہے۔“

”نانا شکور......!؟“ میں اس نام پر چونکا۔

”کیا آپ جانتے ہیں اسے؟“ سوشیت یکدم میری طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

”کچھ زیادہ نہیں......“ میں نے محتاطاً کہا۔ ”فقط اتنا کہ وہ ممبئی کی زیر زمین دنیا کا ایک بڑا ڈان ہے۔“

”ہاں! آپ نے ٹھیک سنا ہے۔“ وہ بولا۔

نانا شکور کا ذکر میں نے جہنم واصل سی جی بھگوانی کی زبانی سنا تھا، یہ بھولا ناتھ کا سخت حریف گروپ تھا، تو اس کا مطلب تھا کہ گھوتر اجی کے نانا شکور سے تعلقات تھے۔ یہ میرے لیے ایک انوکھی اور کافی حوصلہ افزا خبر تھی، جس نے ایک دم میری نظروں میں گھوتر اجی کی اہمیت بڑھا دی تھی۔

”نانا شکور کے گھوتر اجی کے ساتھ بڑے پرانے اور گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔“ سوشیت آگے بتا رہا تھا۔ ”صاف نظر آتا ہے کہ گھوتر اجی اپنی بیٹی پریتا کا انتقام لینے پر تلے بیٹھے ہیں، شاید انہیں خدشہ ہے، یا پھر...... یہ اندازہ کہ قانون بھی ان درندہ صفت اہلکاروں کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا اور گھوتر اجی کسی صورت میں اپنی بیٹی کے قاتلوں کو

معاف نہ کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔"

ابھی اس نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ دروازے سے گھوترا جی اندر داخل ہوا، میں نے دیکھا اندر آتے ہی اس نے بڑی کڑوی اور ناگوار نظروں سے سوشیت کی طرف دیکھا اور پھر سخت لہجے میں بولا۔ "باہر تمہاری کار کھڑی ہے، تم جا سکتے ہو......"

وہ بے چارہ منہ لٹکائے اُٹھ کھڑا ہوا، مجھے سلام کیا اور خاموشی سے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

"اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے۔" میں نے گھوترا جی کے رویّے کا نوٹس لینے کے انداز میں دھیمے لہجے میں کہا۔ "جتنا آپ کو اپنی بیٹی پریتا کی اندوہناک موت کا دکھ ہے اتنا ہی اسے بھی اپنی منگیتر کی موت کا غم ہے، پریتا نے مجھے بتایا تھا کہ سوشیت اور وہ دونوں آپس میں شدید محبت کرتے تھے۔"

"کک...... کیا میری بچی پری (پریتا) سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی......؟" وہ حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات سے میری طرف دیکھ کر بولا تو مجھے اس کی کیفیت پر حیرت ہوئی، کیونکہ میرے خیال کے مطابق سوشیت نے اسے سیاہ رات والے واقعے کے بارے میں تفصیلاً اسے آگاہ کیا ہوگا، یا پھر گھوترا جی نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی ہو۔

"ہاں!" میں نے جواباً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے مختصراً کہا۔

"لل...... لیکن، کیسے؟ تم وہاں کیا کر رہے تھے؟" وہ اُلجھی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

"میں پہلے، واش روم جانا چاہوں گا، اپنے اصل چہرے اور حلیے میں آنا چاہتا ہوں میں۔"

"ہاں...... ہاں، ٹھیک ہے جاؤ......" وہ گومگو کے انداز میں بولا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے اصل روپ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ اپنا جواب سننے کے لیے بہت بے چین نظر آرہا تھا۔

"تم مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟" بالآخر وہ میری طرف شاکی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔ میں اس کی بات سن کر بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے گھوترا جی! میں تو خود آپ کے پاس کچھ کہنے بلکہ بعض ایسی حقیقتوں سے پردہ اٹھانے آیا تھا، جس کا جاننا آپ کے لیے بے حد ضروری تھا اور کارآمد بھی...... لیکن گھوترا جی اس سے پہلے آپ کے اعتماد کی ضرورت ہے۔"

"میں تم پر پورا وشواش کرتا ہوں، نوجوان! اور تمہاری کسی بات پر مجھے کوئی شبہ نہ ہوگا۔" وہ پورے استحکام بھرے لہجے میں بولا اور میں نے ایک نظر قریب بیٹھی سوشیلا کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے گھوترا جی کو اپنے بارے میں ساری اور اصل حقیقت بتا دی، جسے وہ بڑے دھیان اور انہماک سے سنتا رہا، اس دوران اس کے چہرے پر کئی حیرت اور تشویش بھرے اُتار چڑھاؤ بھی آتے رہے، مگر درمیان میں اس نے کہیں بھی میری بات نہیں کاٹی۔

ساری رام کتھا سننے کے بعد (جس میں، کے ایل ایڈوانی اور طلسم نور ہیرے کا ذکر میں نے حذف کر دیا تھا) اس نے متحیرانہ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر سیٹی کی آواز اپنے حلق سے خارج کی پھر سر جھٹک کر بولا۔

"یہ سب سیاسی چکر اور ذاتی مفادات کا کھیل ہے، ورنہ دونوں طرف کی عوام امن اور بھائی چارے کی فضا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر تمہارے ملک پاکستان میں ہماری بھارتی فلموں کا کافی چرچا ہے تو ادھر انڈیا میں پاکستان کے ٹیلی وژن ڈرامے بڑے مقبول عام ہیں...... اور دونوں ممالک کے عوام یہاں اور وہاں کے فنکاروں سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ یہ دونوں طرف کے عوام کبھی بھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کر سکتے، اس لیے کہ ان کے رشتے دار وہاں اور اُن کے رشتے دار یہاں بھی رہتے ہیں۔ ان دونوں ملکوں نے ایک طرح سے ایک دوسرے کے عوام کو پناہ دے رکھی ہے۔ بات بس ایک دوسرے کو برداشت اور دل سے تسلیم کرنے کی ہے۔ لیکن شہزاد احمد خان......"

گھوترا جی ذرا رک کر بولا تو اس کی آواز میں سچائی اور دیانت داری مترشح تھی۔

"ایک حقیقت یہ بھی ہے، جسے بتاتے ہوئے مجھے شرمندگی کا بھی احساس ہوتا ہے کہ بھارت کی ایک مخصوص لابی پاکستان کے خلاف اب بھی اپنے اندر زہر چھپائے ہوئے ہے۔ تم نے اب تک جو کیا وہ بھارت کے عوام کے خلاف نہیں، بلکہ ان کے خلاف کیا جو پُرامن سرحدوں میں شر اور فساد کا بیج بوتے رہے ہیں۔ تم نے سی جی بجوانی اور اُن درندہ صفت اہلکاروں کو ہلاک کر کے برا نہیں کیا، جنہوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

میری معصوم بیٹی اور ان کے بے گناہ دوستوں کے ساتھ درندگی آمیز اور انسانیت سوز سلوک کیا۔ وہ سب کیفرِ کردار کو پہنچ چکے۔"

گھوتر اجی نے وہی کچھ کہا تھا، جو کسی بھی ملک کے عام آدمی کی آواز ہوسکتی ہے، اور یہ حقیقت بھی تھی کہ میں جب سے بھارت کی سرزمین پر تھا، میں نے یہاں کے کسی بھی عام فرد کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوا تھا میں نے ان کی مدد ہی کرنے کی کوشش کی تھی۔

"گھوتر اجی! مجھے خوشی ہوئی ہے کہ آپ ایک کھلے دل و دماغ کے وسیع النظر انسان ہیں۔" میں نے صدقِ نیت سے اس کی توصیف کی۔ "تاہم مجھے افسوس بھی ہے کہ میں آپ کی بیٹی پرتیا کی جان نہیں بچا سکا، حالانکہ وہ میرے ساتھ ہی تھی اور میں نے ہر ممکن ان کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی، سوشیت کا بیان میری سچائی کا ثبوت ہے۔"

"آئی نو آل ریڈی...... مائی ڈیئر شہزی!" گھوتر اجی بولے۔

"اوکے گھوتر اجی! میرے یہاں آنے کا مقصد پورا ہوا...... میں محض آپ کی بیٹی پرتیا کے سلسلے میں آپ کو حقائق سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، تاکہ آپ کسی ابہام کا شکار نہ رہیں، کیونکہ سوشیت آپ کو میری حقیقت بتا ہی چکا تھا، اس لیے بھی میرا یہاں آنا ازبس ضروری تھا۔" میں صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ارے...... رے...... تم کہاں چل دیے؟" گھوتر اجی بھی ایک پریشان کن حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ممبئی کا ایک بڑا ڈان بھولا ناتھ اس وقت تمہاری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ تم نے میری سورگ باش بیٹی پرتیا کے قاتلوں کو اُن کے بھیانک اور عبرت ناک انجام تک پہنچایا ہے، تم نے ایک بڑا بوجھ میرے سر سے اُتار دیا، اب میں تمہیں بھلا تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ بیٹھو ذرا...... اور میری بات بھی ذرا دھیان سے سنو!" اس نے میرے قریب آکر میرا شانہ ہولے سے تھپتھپایا، میں ایک گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔

"بے شک تم نے بھارت کی سرزمین پر اپنے ایک بڑے دشمن کو ہی نہیں بلکہ یہاں کی خفیہ ایجنسی کے ایک بڑے سربراہ کو اس کے ہیڈکوارٹر سمیت ختم کر دیا ہے، لیکن شاید تمہیں اپنی اس بڑی فتح کے بعد پیدا ہونے والے کچھ "آفٹر شاکس" کا اندازہ نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو تم اسے کوئی اہمیت دینے کو تیار نہیں ہو۔ یہ پورا گینگ ہے، جسے تمہاری کمزوریوں کا علم ہے، سب سے بڑی کمزوری کو بھوانی بھی بھولا ناتھ سے ڈسکس کر چکا ہو گا، جو تمہارے ساتھی......"

"مجھے ان ساری باتوں کا پورا اندازہ ہے گھوتر اجی!" میں نے گہری متانت سے کہا۔ "اور میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے بھی سخت فکر و تشویش میں مبتلا ہوں...... لیکن میں نہیں چاہوں گا کہ میرے یہاں دیگر خیر خواہوں کی طرح آپ پر بھی "غدار" یا "دیش دروہی" کا لیبل چسپاں ہو جائے۔"

"ڈیم اٹ...... ! مجھے اس کی چنداں پروا نہیں...... میں سب جانتا ہوں......" گھوتر اجی نے اپنا ہاتھ جھٹک کر بے پرواہانہ انداز میں کہا۔ "لیکن مائی ڈیئر شہزی خان! میں تمہیں جو بات سمجھانا چاہ رہا ہوں وہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ بلیو ٹکسی اور اس کے سربراہ سمیت اہلکاروں کا کچا چٹھا تو میں عنقریب پرنٹ اینڈ الیکٹرانک میڈیا میں کھولنے ہی والا ہوں، مگر تم ان کے خاتمے کے باوجود محفوظ نہیں ہو یہاں...... بھولا ناتھ کسی ایک فرد کا نام نہیں ہے، یہ پورا ایک مافیا ہے۔ جس کی جڑیں بھارت کے کونے کونے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اس وقت تمہارے پیچھے پڑ چکا ہے۔ تمہارے تینوں ساتھیوں کی صورت میں ایک بڑی کمزوری بھوانی، بھولا ناتھ سے ڈسکس کر چکا ہے۔ بھوانی کی ایک اہم ساتھی کوریلا بھی زندہ ہے۔ بھولا ناتھ تمہیں قابو کرنے کے لیے تمہارے تینوں ساتھیوں کو بھی یرغمال بنا سکتا ہے یا ان کی جانوں سے بھی کھیل سکتا ہے۔" گھوتر اجی نے جس طرح میرے "پیش آئندہ" حالات کا باریک بینی سے تجزیہ کیا تھا، وہ غلط نہ تھا۔

میں نے کہا۔ "لیکن میرے ساتھی اس وقت انڈیمان کے ایک وحشی قبیلے "کلی متیارو" کی قید میں جا چکے ہیں اور نجانے وہ بے چارے کس حال میں ہوں گے، کچھ پتا نہیں۔" میرے لہجے اور چہرے سے از حد فکر و تشویش مترشح تھی، جسے محسوس کر کے گھوتر اجی مجھ سے ازراہِ تشفی بولا۔

"میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم خود اس وقت ایک بڑے خطرے سے دوچار ہو، بھوانی اور بلیو ٹکسی کا چیپٹر تو ایک حد تک کلوز ہو چکا، تاہم یہ ممکن ہے کہ اب بھی "را" سمیت بھارتی خفیہ ایجنسی کے ایجنٹ تمہاری تلاش میں ہوں، لیکن تم اس کی فکر مت کرو، تم شاید نہیں جانتے کہ میرے بھی ممبئی کے ایک بڑے "گیمبلر" سے تعلقات ہیں جو بھولا ناتھ کی ٹکر کا ہی گینگ ہے۔"

"نانا شکور نام ہے اس کا......" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرا خیال تھا کہ اُسے حیرت

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہوگی، مگر وہ اس کا ذرا بھی اظہار کیے بغیر بولا۔

”ہاں! تمہیں شاید، سوشیت نے بتایا ہو...... [illegible] میں تمہاری ملاقات نانا شکور سے بھی کروا دوں گا۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری زیادہ بہتر طور پر مدد کرسکتا ہے۔“

”آپ کی بڑی مہربانی گھوترا جی! لیکن میرے پاس اتنے کرنے کا زیادہ وقت نہیں ہے، ارادہ تو میرا یہی ہے کہ کسی طرح انڈیمان کی طرف نکل جاؤں اور خود ہی اپنے تینوں ساتھیوں کی تلاش کے سلسلے میں کچھ کروں......“

”امپوسیبل۔“ گھوترا جی سگار کا ایک کش لگاتے ہوئے بولا۔ ”اول تو دشمن سمیت بھارتی خفیہ اہلکار اس وقت بھارت کے چپّے چپّے پر تمہاری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پھر جزائر انڈیمان کے بیشتر علاقوں میں بھولا ناتھ گینگ کا قبضہ ہے، میں تمہیں یہ بے وقوفی ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ تم آج رات یہاں آرام کرو...... اور مجھے صرف کل تک کی مہلت دو، میں نانا شکور سے مل کر کچھ کرتا ہوں۔“

اس کی بات پر سوشیلا نے جو میرے کافی قریب سرک آئی تھی، ہولے سے مجھے ٹہوکا دیا، اس کا مطلب یہی تھا کہ [illegible] مجھے گھوترا جی کی بات مان لینی چاہیے، یوں بھی مجھے اس کی باتوں میں کافی وزن محسوس ہوا تھا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ بھولا ناتھ کی ٹکر کا ایک اور بڑا ڈان...... نانا شکور میری مدد کر سکتا تھا تو کیا برائی تھی۔

میں نے گھوترا جی کا شکریہ ادا کیا۔

وہ رات ہم نے اسی کی پُرتعیش رہائش گاہ میں گزاری...... اگلے دن صبح جاگے۔ گھوترا جی کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اس کا پی اے جو وہیں موجود تھا، اسے ہمارے سلسلے میں گھوترا جو ہدایات دے گیا تھا، ان میں ایک ہدایت تو یہی تھی کہ میں اور سوشیلا باہر نہیں نکلیں گے، دوسرے یہ کہ لینڈ لائن فون استعمال... نہیں کریں گے۔

میرے پاس اب گھوترا جی کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

☆☆☆

سہ پہر کے قریب اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے ہمراہ دو افراد بھی تھے۔ ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری اور سپاٹ تھے۔ گھوترا جی نے مجھے بتایا کہ یہ دونوں نانا شکور کے خاص آدمی ہیں اور ہمیں ان کے ساتھ جانا ہوگا۔ میں تیار ہوگیا مگر سوشیلا سے میں نے یہی کہا کہ وہ ادھر ہی گھوترا جی کے پاس رہے، اس پر گھوترا جی نے بھی سوشیلا کو بیٹی کہہ کر یہی مشورہ دیا کہ وہ میری اس تازہ مہم سے [illegible] تو اس نے صاف انکار کر دیا اور ایک بار پھر تنہائی کا موقع پاتے ہی وہ بولی۔

”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟ میں تم سے ہرگز الگ نہیں ہونا چاہتی ہوں، بس!“

”لیکن......“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ دوستانہ انداز کی دھمکیوں پر اُتر آئی۔ مثلاً یہ کہ اگر میں نے اسے خود سے دور کرنے کی کوشش کی تو وہ یہاں سے بھی کہیں اور چلی جائے گی اور ایڈوانی کی مہم پر بھی لعنت بھیج دے گی۔

میں جانتا تھا اگر وہ ایسا کرتی بھی تو زندہ نہیں بچ سکتی تھی، کیونکہ بلراج، سوشیلا کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا، کیونکہ اسے اس کے گرو گھنٹال ایڈوانی نے ختم کرنے کا ٹاسک دے رکھا تھا۔ (مجھ سمیت) بالکل اسی طرح جس طرح اس جلاد صفت ایڈوانی نے اس کی بہن کی پوری [illegible] سنگھ کے ہاتھوں بڑی بیدردی سے مروایا تھا۔

مجھے ہار ماننا پڑی اور اسے ساتھ لے جاتے ہی [illegible] نانا شکور کے یہ دونوں آدمی اپنی گاڑی میں آئے تھے، میں اور سوشیلا اس میں سوار ہو کر انجانی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ہم دونوں عقبی نشستوں پر سوار تھے۔

کار ذرا ہی دیر میں فراٹے بھرنے لگی۔ ممبئی کی گلیوں، بازاروں اور فٹ پاتھ کو دیکھ کر مجھے ان میں اور پاکستان میں کوئی خاص فرق دکھائی نہ دیا تھا۔

یہ سفر کوئی پون گھنٹے تک جاری رہا، اس کے بعد کار ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئی جسے متوسط ہی کہا جا سکتا تھا۔ کار اس کی تنگ سی گلیوں سے گزرنے لگی۔ یہ سارا سفر گویا ایک دھڑکتی ہوئی خاموشی میں گزرا تھا اور اس دوران میں نے ان کی محتاط روی کو بڑی گہری نظروں سے جانچا تھا۔ کار چلانے والا اور اس کے برابر میں بیٹھا اس کا ساتھی، دونوں ہی دورانِ سفر سارے رستے گرد و پیش پر کڑی نگاہ ڈالتے رہے تھے۔

ایک نسبتاً تنگ سی گلی سے گزرنے کے بعد کار ایک ایسی بڑی سی عمارت کے سامنے رک گئی، جس پر مجھے کسی مکان یا رہائش گاہ سے زیادہ ایک بڑے سے گودام کا گمان ہوا تھا۔ باہر کچھ لوگ اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتے دکھائی دیے۔ ایک اُچٹتی سی نگاہ انہوں نے ہم پر ڈالی تھی۔

کار ایک جھٹکے سے رکی تو وہ دونوں دروازہ کھول کر نیچے اُتر آئے، ایک کے اشارے پر میں اور سوشیلا بھی اُتر گئے تھے۔

عمارت بوسیدہ سی اور قدیم نظر آتی تھی۔ میں عمارت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ہمراہ سوشیلا کو لیے ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

ایک طویل سی نیم تاریک راہداری سے ہوتے ہوئے ہمیں ایک کمرے میں لایا گیا۔ کمرا مختصر فرنیچر کے ساتھ خالی پڑا تھا۔ ایک صوفہ اور دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک لکڑی کی دیوار گیر کیبنٹ تھی، اسی دیوار کے اُوپر چھت کے قریب چوکور روشندان تھا۔ کمرے کی حالت بہتر تھی۔

”یہاں بیٹھ جاؤ......“ ان دونوں میں سے ایک نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر وہ چلے گئے، دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا، وہ بھڑا ہوا تھا۔ میں اور سوشیلا الگ الگ کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

تھوڑی دیر گزری تھی، ایک ٹھگنا سا شخص اندر داخل ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی، اس میں چائے اور کچھ بسکٹ اور پیسٹریاں رکھی تھیں، وہ ٹرے اس نے میز پر رکھ دی، پانی کی بوتل ایک کانچ کا گلاس بھی ٹرے پر موجود تھا۔

”ہمیں کتنی دیر یہاں انتظار میں بیٹھنا پڑے گا؟“ وہ ٹھگنا سا آدمی جب ٹرے رکھ کر اسی طرح خاموشی سے واپس لوٹنے لگا تو بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

”مجھے نہیں معلوم......“ اس نے رکے بغیر جواب دیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ہمیں پانی کی طلب نہیں تھی، میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا اور اُسے صرف چائے کا مگ تھمانے کا کہا۔ اس نے بھی اپنے لیے چائے کا ہی انتخاب کیا۔

”ہم دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے اور یہاں کے ماحول پر دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔

چائے ختم کی تھی کہ ایک سانولی رنگت کا شخص اندر داخل ہوا۔ قد اس کا دراز تھا اور جبڑے چوڑے، آنکھیں بڑی تھیں اور بھویں کھنچی ہوئیں، ناک لمبی تھی، بال ہیئر کٹ تھے، یعنی بہت چھوٹے اور کانٹوں کی طرح کھڑے ہوئے۔ اس نے عام سا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ وہی دونوں آدمی تھے، جو ہمیں یہاں لائے تھے۔

میں اور سوشیلا اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے، کیونکہ اس شخص نے اندر داخل ہوتے ہی خیر مقدمی انداز میں ہماری طرف دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا تھا۔

”مجھے عبدالشکور کہتے ہیں...... بیٹھو!“ اس نے کہا، لہجہ اور آواز عام سا تھا، لیکن اس کی شخصیت میں مجھے ایک دبدبہ سا ضرور محسوس ہوتا تھا۔

اپنا مختصر سا تعارف کرواتے ہوئے وہ ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا، اس کے دونوں ساتھی اس کے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔

”تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا نہیں؟“ اس نے ایک نگاہ میز پر دھری ٹرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”چائے کی طلب ہو رہی تھی، وہ پی لی۔ آپ کا شکریہ!“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا اور منتظر رہا کہ وہ مقصد کی بات کی طرف آئے۔ مگر وہ بڑے غور غور سے میرا جائزہ لیے جا رہا تھا۔ ایک نگاہ اس نے سوشیلا پر بھی ڈالی تھی، مگر زیادہ تر اس کی نظریں میرے ہی چہرے اور وجود کا ایکسرے کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

”یقین نہیں آتا کہ تم نے تن تنہا، ایک غیر ملک، بلکہ ایک سخت حریف ملک میں اتنا بڑا معرکہ مارا ہے۔ ”را“ کے ایک پورے ونگ کو اس کے سربراہ سمیت نابود کر کے رکھ دیا...... اور سربراہ بھی کون...... جو بھارتی آرمی اور انٹیلی جنس کا ایک سابقہ سینئر آفیسر بھی رہ چکا تھا۔“

تھوڑی ابھی کھودی ہوئی میری ”متعلقہ“ معلومات کے مطابق اُس نے میرے بارے میں اپنی جس رائے کا اظہار کیا تھا مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ ”ڈان“ قسم کے لوگ اپنی ذات میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے، ان کی جملہ طاقت اور ہیبت صرف اور صرف انفرادی قوت پر منتج ہوتی تھی۔ اس سے باہر یہ کچھ بھی نہیں تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ میرے تنہا اس مشن کو سر کرنے پر اگر حیرت کا مظاہرہ کر رہا تھا تو وہ کچھ غلط بھی نہ تھا، لیکن میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ ایک ڈان تھا اور میں ایک کمانڈو...... ایک ڈان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ ہر غلط راستہ اختیار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا...... جبکہ ایک کمانڈو کے پیش نگاہ اس کا عظیم مقصد اس کے وطن سے نتھی ہوتا ہے، جس میں عام لوگوں کی بقا و فلاح کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ پھر اس میں اللہ کی مدد اور اس کے نیک بندوں کی دعائیں شامل رہتی ہیں، بس! یہی ایک تنِ تنہا کمانڈو کی ”طاقت“ ہوتی ہے۔ اگر یہ ”فلسفہ“ میں اپنے سامنے بیٹھے ”ڈان“ کو بتاتا تو وہ شاید اس کے سر سے گزر جاتا۔ ہاں! یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ اگر ایسا تھا تو پھر میں یہاں کیوں تھا؟ جواب یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے کسی کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، زمین پر رینگنے والے ایک حقیر کیڑے کا بھی ایک مقصد رکھا ہوگا، اسی طرح نانا شکور جیسے ڈان کو......

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

انہی جیسے جرائم پیشہ افراد کی منہ زوری روکنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ جیسے لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کاٹتا ہے...... انہی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اللہ ایسے لوگوں سے بھی کوئی نہ کوئی ایسا اچھا کام لیتا ہے، جو اُن کی آخرت میں بخشش کا سامان بن جاتا ہے۔

نانا شکور کے اس تبصرے پر میں خاموش رہا تھا تو وہ پھر بولا۔ ”بھولا ناتھ سے تمہارا اب تک کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا ہے؟ میرا مطلب ہے براہِ راست؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا کر مختصر جواب دیا۔

”جبکہ اس کے کچھ ساتھی تمہارے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں۔“

”ہاں۔“

”تمہارا ٹکراؤ بھولا ناتھ سے ہو چکا ہے۔“ نانا شکور نے اپنی بات مکمل کی۔

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے، لیکن مجھے اپنے تینوں ساتھیوں کی فکر ہو رہی ہے اور میں فوری طور پر جزائر انڈیمان جانے کا ارادہ رکھتا تھا، لیکن گھوتراجی کے مشورے سے مجھے تم سے رابطہ کرنا پڑا۔“ میں نے صاف گوئی سے جواب دیا، وہ اس کا برا منائے بغیر فراخ دلی سے مسکرا کر بولا۔

”آدمی کھرے ہو...... اور...... جی دار بھی...... اچھا لگا مجھے تمہارا یہ انداز......“ نانا شکور اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

”آج رات تیار رہنا...... ہم انڈیمان کی طرف کوچ کرنے والے ہیں اور میں بھی ساتھ ہوں، لیکن......“ کہتے ہوئے اس نے سوشیلا کی طرف دیکھا اور جملہ مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”یہ خاتون ہمارے ساتھ نہیں جا سکتی، اسے ادھر ہی رہنا ہوگا۔ یہاں اسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

اس کی بات پر میری نگاہ غیر ارادی طور پر قریب بیٹھی سوشیلا پر پڑی۔ وہ نانا شکور کی بات پر اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے کسمسائی اور میری طرف تکنے لگی۔ میں نے نانا شکور کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نانا صاحب! یہ میرے سوا اکیلی نہیں رہ سکتی، میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہوں گا، یہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے، اس نے اب تک میرے ساتھ شاملِ حال رہتے ہوئے، میری بہت مدد کی ہے۔“

میری بات پر نانا شکور نے شاید پہلی بار سوشیلا کو ایک لمحے کے لیے ذرا گہری نظروں سے دیکھا، اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی......“

”اگر آپ برا نہ مناؤ تو اس مشن کے لیے میں اور میری ساتھی سوشیلا ہی مناسب رہیں گے، کیونکہ میں سمجھتا ہوں آپ کے کسی ساتھی کے ساتھ ہونے سے ایک طویل ”کلیش“ ہونے کا خطرہ موجود رہے گا اور اس سے کافی سارا وقت برباد ہونے کا امکان ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ آپ ہمیں صرف جزیرہ انڈیمان تک بہ حفاظت پہنچا دیں اور اگر ممکن ہو سکے تو وہاں واقع بھولا ناتھ کے ایک اہم ٹھکانے کی بھی نشاندہی کر دیں تو یہ بھی میرے لیے کافی سے زیادہ ہوگا۔“

وہ میری بات پر ایک بار پھر اپنے مخصوص اسرار بھرے انداز میں مسکرایا، پھر بولا۔ ”میرا اصول ہے کہ دشمن کا مزاج سمجھ کر ہی اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ بھولا ناتھ سے ابھی تک تمہارا بلاواسطہ یا بالواسطہ ٹکراؤ نہیں ہوا ہے، اسی لیے تم ابھی اُسے نہیں جانتے ہو، مار کھا جاؤ گے۔ وہ اس وقت تمہاری کمزوری کو جاننے کی کوشش میں ہوگا اور کوئی بعید نہیں کہ وہ اب تک اس کوشش میں جت بھی گیا ہو۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”سی جی بھوانی جیسے اہم اور طاقت ور آدمی سمیت اپنے تین ساتھیوں کا تمہارے ہاتھوں حشر دیکھ لینے کے بعد وہ تمہاری خطرناکی سے واقف ہو چکا ہوگا اور اب تمہاری اسی کمزوری سے کھیلنے کی کوشش کرے گا، جس کے لیے تم فکر و تشویش کے مارے ادھ موئے ہوئے جا رہے ہو...... اس لیے اس کی اب بھرپور توجہ تمہارے انہی تینوں ساتھیوں کو چھیننے کی کوشش ہوگی، جنہیں وہ اپنی گرفت میں کرنے کے بعد تمہیں جھکانے کی کوشش کرے گا۔ میرے ذریعے فقط اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ یہ کام جلد ہو سکتا ہے اور بہ آسانی بھی۔“

اس کی بات میں وزن تھا، جس کا میں نے کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کی بات میں رد نہیں کر سکتا، نہ ہی اس کی حقیقت سے انکاری ہوں، مگر کیا وہ وحشی قبیلہ کلی منجارو اتنی آسانی سے میرے ساتھیوں کو ان کے حوالے کر دے گا؟ پتا نہیں میرے ساتھیوں کے ساتھ ان وحشیوں نے کیسا سلوک کیا ہو؟“ مجھے ایک بار پھر اپنے تینوں اہم اور قریبی جاں نثار ساتھیوں کی طرف سے تشویش کھانے لگی۔

وہ بولا۔ ''کچھ نہیں کہا جا سکتا...... خدا کرے وہ ان کی قید میں ہی ہوں اور زندہ ہوں، رہی بات بھولا ناتھ کے ان کو اپنے مطلب کے لیے چھڑانے کی تو وہ بھی اتنے طرم خان نہیں ہیں، لیکن بہرحال وہ بھی ایک ماسٹر آف گینگ ہے۔ اپنی سی کوشش تو ضرور کرے گا، ہم بھی تو یہی کرنے والے ہیں۔''

میں خاموش رہا۔ نانا شکور کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا تھا کہ بلیو تلسی کی ایک اہم ایجنٹ اور جہنم واصل سی جی بھوانی کی قریبی ساتھی کوریلا ابھی تک نہ صرف زندہ تھی بلکہ وہ جزیرہ انڈیمان میں ہی اپنے کچھ ساتھی ایجنٹوں کے ساتھ موجود تھی۔

اس پر نانا شکور نے یہی کہا تھا کہ...... ''بلیو تلسی اور کرنل بھوانی کا خاتمہ ہونے کے بعد ان تلوں میں اب تیل نہیں رہا ہوگا۔ اس لیے اس کی فکر مت کرو، وہ ویک ٹو پولین ہو چکی ہوگی...... یوں بھی اگر وہ ہمارے رستے میں آئی بھی تو اس سے بھی نمٹ لیں گے......''

کچھ گھنٹے اور بیت گئے۔ شام جھکنے لگی تو ہم ایک نئی، اہم اور عجیب سنسنی خیز اور خطرناک مہم کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

نانا شکور کے ہمراہ وہی دونوں آدمی تھے جو اب تک مسلسل اس کے ساتھ تھے اور ہمیں وہ یہاں تک لائے تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ یہ دونوں نانا شکور کے خاص آدمی تھے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ بھولا ناتھ کے مقابلے میں نانا شکور کتنا طاقت ور تھا، مگر یہاں اس کا وہ رعب اور دبدبہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا جو ایک ڈان کا ہونا چاہیے تھا۔ یا پھر میری اس سلسلے میں آبزرویشن نامکمل تھی۔ یہاں مجھے اس کی افرادی قوت بھی کچھ خاص نظر نہیں آ رہی تھی، اس کا ٹھکانا بھی بس واجبی سا ہی دکھائی پڑتا تھا۔ اسلحہ نام کی تو میں نے ابھی تک کوئی شے ان میں سے کسی کے پاس نہیں دیکھی تھی۔ البتہ یہ لوگ چہرے مہرے سے خاصے گھاگ اور ٹاپ پروفیشنل دکھائی دیتے تھے۔

طے یہی پایا تھا کہ بائی روڈ کرناٹک اور بنگلور کا روٹ اپنایا جائے اور ترچناپلی پہنچا جائے، وہاں چند گھنٹوں کا اسٹے کرنا تھا، وہاں ان کا ٹھکانا تھا، وہاں سے مدراس۔ (موجودہ نام چنائی) یہ بھارتی ریاست تامل ناڈو میں واقع تھا جو اس کا دارالخلافہ بھی تھا)

ترچناپلی کے ٹھکانے سے چنائی کی بندرگاہ میں ایک لانچ کا بندوبست کرنا تھا اور پھر وہاں سے جزائر انڈیمان کی طرف کوچ کرنا تھا۔

یوں ہم پانچوں ایک تیز رفتار اور طاقت ور ہارس پاور انجن والی کار میں بیٹھ کر ممبئی سے ترچناپلی روانہ ہو گئے۔

ممبئی سے چنائی تقریباً ساڑھے تیرہ سو کلومیٹر کا فاصلہ، بائی روڈ تھا، جبکہ ترچناپلی تک لگ بھگ نو سو کلومیٹر تھا۔ ہم پانچوں روانہ ہو گئے۔ کار نانا شکور کا ایک ساتھی چلا رہا تھا، اس کے برابر میں نانا شکور براجمان تھا۔ باقی ہم تینوں پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔

چنائی (مدراس) سے ہمیں ایک لانچ کے ذریعے جزائر انڈیمان کے لیے روانہ ہونا تھا۔ رات بھر سفر بخیریت جاری رہا تھا، صبح ہم ترچناپلی پہنچ گئے، وہاں ایک کلب میں زیر زمین واقع نانا شکور کا ٹھکانا تھا جہاں ہم نے دن بھر آرام کیا اور سہ پہر میں جاگے تو چنائی جانے کے لیے تیار تھے۔ بلکہ نانا شکور نے بتایا کہ چنائی سی پورٹ میں جزائر انڈیمان کی طرف روانگی کا بھی بندوبست کیا جا چکا تھا۔

چنائی بندرگاہ پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ بندرگاہ پر عجیب سی خاموشی طاری تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاند ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے ہیبت ناک اُفق کے عین اُوپر بڑے سے سنہرے اُرتھو کی طرح رکھا معلوم ہو رہا تھا۔ مرطوب سمندری ہوائیں چہروں سے ٹکراتیں تو جانے کیوں پورے جسم میں ہلکی سی تھرتھری دوڑ جاتی، کہیں لانچیں اور باربردار جہاز لنگر انداز نظر آ رہے تھے، ان کے مستول سربلند تھے۔ کہیں قریب ہی کسی جہاز کا بگل سوگوار سے انداز میں بجا تو فضا میں ہوک نما گونج سی اُٹھی۔ ہم ایک درمیانے درجے کی لانچ میں سوار ہو گئے۔ لانچ میں دو افراد اور بھی پہلے سے موجود تھے۔ وہی لانچ ''ہینڈل'' کر رہے تھے۔ لانچ زیادہ بڑی نہیں تھی، ایک ہی کیبن تھا، اسی میں ہم پانچوں بیٹھ گئے۔ جبکہ ذرا دیر بعد نانا شکور کے دونوں ساتھی اُٹھ کر چلے گئے۔ ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔ لانچ روانہ ہو چکی تھی۔ ایک خلاصی ٹرے میں چائے لے آیا تھا۔ وہ ہم پینے لگے۔

نانا شکور کے مطابق جزائر انڈیمان یہاں سے دو دنوں کی مسافت پر تھا۔ بحیرہ ہند کی مسافت کے دوسرے دن ہم نے بے آف بنگال میں داخل ہو جانا تھا۔ پورٹ بلیئر انڈیمان کا کیپٹل تھا۔

بے آف بنگال کے ذکر پر میرا دھیان لولوش کے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

مقرب خاص کار پرداز سے جی کوہارا کی طرف چلا گیا۔

انڈیمان سے متعلق مجھے نانا شکور نے مختصراً وہی بتایا تھا جو میں بھی جانتا تھا، جس کے مطابق جزائر انڈیمان، نکوبار بحرِ ہند (بے آف بنگال) میں واقع ہے۔ ہندوستان سے جزائر انڈیمان، نکوبار کی غیر معمولی دوری کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انڈیمان کی جنوبی سرحد ملیشیا صرف ایک سو کلومیٹر دور ہے۔ اسی طرح اس کی سرحد کی لمبائی کا اندازہ صرف اس سے ہوتا ہے کہ اس کی شمالی سرحد سے برما صرف ایک سو بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

برما یہاں سے قریب تھا اور لولوش اڑیسہ کمپنی کے سلسلے میں وہیں مقیم تھا۔ (تازہ صورتِ حال کا مجھے علم نہ تھا) لولوش سے دو دو ہاتھ کرنے کا مجھے بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں مجھے باسکل ہولارڈ جیسے خبیث یہودی کو جھکانا تھا، کیونکہ وہ اس کی چہیتی اور اکلوتی لاڈلی بیٹی انجیلا کا شوہر تھا۔ لیکن بھارت میں مجھے ابھی ایک اور اہم مشن بھی نمٹانا تھا اور وہ تھا طلسم نور ہیرے کا حصول، جس کے لیے بشام منگلری نے اپنی جان کی قربانی دی تھی، جبکہ اس کے سفاک قاتل سے جی کوہارا سے بھی اس کی موت کا بدلہ لینا تھا۔ نجانے اب وہ رذیل کہاں تھا؟

لولوش کو یقیناً اب تک اپنے دیرینہ حلیف کرنل سی جی بھوانی کی ہلاکت اور اس کے ونگ "بلیو ٹیکسی" کے خاتمے کی خبر مل ہی چکی ہوگی، اور میں نہیں جانتا تھا کہ اب اس خبیث لولوش نے مجھے زیر کرنے کے لیے کون سا نیا حربہ استعمال کیا ہوگا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ مجھے قابو کرنے کے سلسلے میں اس نے ہنوز سے جی کوہارا..... کو ہی ٹاسک دے رکھا ہوگا۔ مگر وہ میری تلاش میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوگا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

کوہارا، طلسم نور ہیرے کے ٹاسک پر بھی عمل پیرا تھا۔ لیکن مجھے بالکل بھی اس کی امید نہ تھی کہ وہ ایڈوانی جیسے ایک جناور جرنیل کے قبضے سے اس بیش قیمت ہیرے کو حاصل کرنے کی سکت رکھتا ہوگا۔

مجھے اپنی سی کوشش کے مطابق، جزائر انڈیمان کی مہم کو بہت مختصر اور صرف اپنے تینوں ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے تک محدود رکھنا تھا۔ بھولا ناتھ سے میں ٹکرانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود میرے گلے پڑنے لگتا تو الگ بات تھی۔ بہ قول نانا شکور کے اگر میرے ہاتھوں بھولا ناتھ کے آدمی نہ مرے ہوتے تو بھوانی کے جہنم واصل ہونے کے بعد بھولا ناتھ خود ہی میرے راستے سے ہٹ جاتا۔ کیونکہ میری براہِ راست اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

دو دنوں تک ہمارا سفر جاری رہا تھا، دوسرے دن کی ایک سرمئی شام میں ہم پورٹ بلیئر کی ایک جیٹی سے جا لگے۔ وہاں پہلے سے نانا شکور کے آدمی ہمیں لینے کے لیے موجود تھے۔ جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، انڈیمان کے کچھ علاقوں میں دو بڑے ڈان کا قبضہ تھا، ایک بھولا ناتھ اور دوسرے نانا شکور کا۔

نانا شکور کے ان ۔۔۔ آدمیوں کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ سب جدید اسلحے کی نمائش کے ساتھ وہاں ہمارے "سواگت" کے لیے موجود تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ میں نے نانا شکور کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ایسا جدید اور خطرناک اسلحہ دیکھا تھا۔

لانچ سے ہم نے جیٹی کے ایک چوبی پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو جانے کیوں میرے دل کو کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ معلوم نہیں یہ انڈیمان جیسی قاتل سرزمین کی ہیبت کا اثر تھا یا کچھ اور بات تھی۔ آسمان پر اس وقت کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا خاموش تھی اور اردگرد کا ماحول لاتعلق سا محسوس ہو رہا تھا۔

لانچ کے وہ دونوں آدمی لوٹ گئے تھے۔ اب ہم تینوں نئے لوگوں کی رہنمائی میں تھے۔

جیٹی سے باہر آئے تو احاطے میں دو لمبی چوڑی گاڑیاں کھڑی دکھائی دیں۔ ہم ان میں سوار ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد دونوں گاڑیاں اس عجیب اور پُراسرار جزیرے کے ایک نیم پختہ اور بل کھاتے راستے پر ہولی تھیں۔

سوشیلا بھی مجھے خاصی متحیر سی دکھائی دے رہی تھی۔ غالباً اس نے بھی میری طرح اس جزیرے کی "کالا پانی" کی حیثیت سے ہیبت ناکیوں اور خوف ناک تاریخی واقعات کی لہو رنگ داستانیں سن اور پڑھ رکھی ہوں گی۔ کیا معلوم تھا کہ تقدیر ایک دن مجھے بھی یہاں لے آئے گی۔ شکر تھا کہ میں قیدی کی حیثیت سے یہاں نہیں لایا گیا تھا۔ انڈیمان کی فضا ہی مجھے عجیب سی محسوس ہونے لگی تھی، یوں لگتا تھا جیسے میں کئی سال پیچھے چلا گیا ہوں۔ جب آزادیٔ وطن کے متوالے مجاہدوں کو یہاں قید کر کے انہیں انسانیت سوز سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس وقت کیسا منظر ہوتا ہوگا یہاں کا؟ مگر اب جیسے یہاں کچھ بھی نہیں تھا، مگر اس کی خاموش اور اسرار بھری فضا میں مجھے ان قیدیوں کی دبی دبی سسکیاں سنائی دیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ مگر اب یہاں اول خیر، کھیل

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

داوا اور شکیلہ کہیں قید تھے، اور مجھے ان کی طرف سے فکر کھائے جارہی تھی۔ نجانے ان بے چاروں کی کیا دلی کیفیات ہورہی ہوگی؟

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ان کا ٹھکانا یہاں کس مقام پر اور کتنی دور تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی میں نے اس بارے میں نانا شکور سے کوئی سوال کیا تھا۔

میں کار کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھنے میں محو تھا۔ یہاں مجھے خاصی تعداد میں رہائشی مکانات، ہوٹلز اور بازار وغیرہ دکھائی دے رہے تھے، زندگی یہاں کافی سرگرم معلوم ہوتی تھی۔

دونوں گاڑیاں اب نسبتاً مضافاتی علاقے میں داخل ہوگئی تھیں۔ اب ہمارے اردگرد بنجر ٹیلے اور نیم صحرائی میدان پھیلا ہوا تھا۔ رات اُتر آئی تھی جبکہ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس پہلے ہی سے روشن تھیں۔

جس کار میں ہم پانچوں سوار تھے، وہ پیچھے تھی، جبکہ آگے والی کار ایک نسبتاً تنگ سے موڑ کو کاٹنے سے پہلے ہی اچانک رک گئی۔ اسے رکتے دیکھ کر ہماری کار کے ڈرائیور نے بھی بریک لگا دیے۔

ہم سے آگے والی کار کے رکنے کی وجہ نامعلوم تھی، وجہ جاننے کے لیے نانا شکور نے اپنی جیب سے سیل نکالا، وہ آگے والی کار سواروں سے شاید کچھ دریافت کرنے والا تھا کہ اچانک تھکی ہوئی خاموش فضا میں ایک دل دہلا دینے والا دھماکا ہوا، میرے قریب بیٹھی سوشیلا کے حلق سے تو چیخ بھی خارج ہوگئی تھی۔ دھماکے کی شدت انگیز آواز اس لیے بھی زوردار تھی کہ وہ ہماری کار سے محض چند قدموں کے فاصلے پر ہوا تھا، جیسے کوئی دس کلووزنی بارود بھرا بم پھٹا ہوا، اور غالباً ایسا ہوا بھی تھا۔

پہلے سے کسی گھات لگائے ہوئے دشمن نے ہم سے اگلی کار کو نشانہ بنایا تھا اور بدنصیب کار سواروں کو شاید کسی ”گڑبڑ“ کا احساس بھی ہوا تھا مگر انہیں بچنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ہماری کار کی ونڈ اسکرین شعلوں اور آگ کے بگولوں سے سرخ ہوگئی تھی۔

”بیک...... بیک...... ہری اَپ......“ نانا شکور چلّایا۔ میرا دل سنسناتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ ڈرائیور نے گیئر بدلا اور ایکسیلیٹر دبا دیا۔ ہماری کار کا انجن غرایا، ابھی اس کے پہیے اسکڈ ہی کر رہے تھے کہ اچانک گولیوں کی بھیانک تڑاتڑ ابھری۔ زوردار چھناکے سے پہلے تو ہماری کار کی ونڈ اسکرین کے ٹوٹنے کی آواز ابھری تھی۔ ساتھ ہی ڈرائیور اور ایک اور ساتھی کی دلخراش چیخیں گونجیں۔ میں ڈرائیور کے عقب میں تھا، اور اسے لگنے والی گولیوں سے اُچھلنے والا خون میرا چہرہ تر کر گیا تھا اور میں سوشیلا کی گردن دبوچے خود بھی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھک گیا تھا۔ میرے برابر والا آدمی بھی ہلاک ہو چکا تھا، جبکہ نانا شکور نے میری پالیسی اپنائی تھی اور فوراً سے پہلے جھک کر خود کو گولیوں کی بوچھاڑ سے بچا گیا تھا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور مرے ہوئے ساتھی کی گود میں پڑی گن اور سوشیلا کا ہاتھ دبوچے کار سے نیچے رینگ گیا۔

تاریکی اور گرد و بارود کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے، میں سوشیلا کو لیے اس طرف کو لپکا جدھر یکے بعد دیگرے بنجر ٹیلے پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نسبتاً محفوظ جگہ پر سوشیلا کو چھوڑ کر میں طوفانی بگولے کی طرح واپس پلٹا اور کیا دیکھتا ہوں کہ چار پانچ مسلح افراد کار کو گھیرے ہوئے تھے اور اندر مجھے نانا شکور محبوس سا دکھائی دیا، اپنی یقینی موت کو سامنے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم سپاٹ ہوگیا تھا، دوسرے ہی لمحے فضا میں ایک بار پھر گولیوں کی بھیانک تڑاتڑ ابھری۔

میں نے نانا شکور کو موت کے یقینی قریب دیکھ کر ان مسلح افراد پر اپنی گن سے گولیوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ یہ حملہ ان کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ تین تو چیخیں مار کے وہیں گر پڑے، چوتھے نے میری گن کے گرجنے کی آواز کا محتاط اندازہ کرتے ہی کمال پھرتی سے مجھ پر اپنی گن کا آتشیں دہانہ کھول دیا۔ میں نے اس لمحاتی دورانیے میں نانا شکور کو کار کا دروازہ کھولتے، اُترتے دیکھا اور بہ سرعت جھکائی دے ڈالی۔ دشمن کی فائر کردہ گولیاں میرے اُوپر اور سر کے اتنے قریب سے گزری تھیں کہ مجھے اس کی آتشیں جھپک صاف محسوس ہوئی تھی۔

وہ مسلسل مجھ پر گولیاں داغے جارہا تھا، اور فائر کرنے کے موقعے سے مجھے سر بہ سر قاصر رکھے ہوئے تھا۔ تاہم مجھے تسلی تھی کہ میں نے اس مختصر سے وقت میں جو کام کرنا چاہا تھا وہ کامیابی سے کرچکا تھا، یعنی نانا شکور، جو کار کے اندر محبوس ہو کر بے بسی کے ساتھ اپنی موت کا منتظر تھا، اسے کار کے اندر سے بچ نکلنے کا موقع مل چکا تھا، مگر دشمن نے مجھے ٹارگٹ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کی چالاکی دیکھ کر میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ آگئی۔ میں نے پینترا بدلا اور ایک دوسری سمت سے سنگل شاٹ کھیلا، اُسے بلف کرتے ہی میں نے تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی، وہ اس

سنگل شاٹ فائر کی طرف متوجہ ہو کر اندھا دھند گولیاں برسانے میں مصروف ہو گیا اور میں اس کی بغلی سمت سے طلوع ہوا، جب تک اس کی نگاہ مجھ پر پڑتی میں ایک اور سنگل شاٹ مکمل کر چکا تھا۔ گولی اس کے گن والے ہاتھ پر لگی اور وہ چھوٹ گئی، اس نے زخمی ہو کر چیخ ماری، دوبارہ سنبھلا اور اپنی جیب سے شاید پستول نکالنا چاہا تو میں نے اسی ہاتھ کے بازو پر گولی چلا دی۔ وہ کرب انگیز چیخ مار کر گرا۔

میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ فوراً اس کے سر پہ جا پہنچا، اسی وقت سوشیلا اور نانا شکور وہاں آ گئے۔ سوشیلا شاید میری کارروائی دیکھتے ہوئے ٹیلے سے نکل آئی تھی جبکہ نانا شکور میری فائرنگ کی آواز کے آہنگ پر میری موجودگی کا درست اندازہ لگاتے ہوئے یہاں آ پہنچا تھا۔

"یہ تم نے اچھا کیا کہ اسے زندہ رکھا...... ابھی میں اس سے نمٹتا ہوں......" نانا شکور دانت پیس کر زمین پر پڑے [illegible] ہوئے دشمن کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

"پہلے [illegible] لو نانا کہ اس کے اور ساتھی تو ادھر کہیں گھات لگائے نہ بیٹھے ہوں......؟" میں نے احتیاط کے پیش نظر اس سے کہا اور کھوجتی نظروں سے اطراف میں دیکھا بھی۔

"ہوتے تو اب تک کود چکے ہوتے میدان میں۔" نانا شکور نے جواب دیا۔ "[illegible] کام سے، وہاں ان کی کوئی گاڑی کھڑی ہوگی۔ تم اسے لے کر آؤ۔" [illegible] میں زخمی کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لی اور پستول اور گن اپنے قبضے میں کر لی، پھر اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اٹھایا اور آگے [illegible] سوشیلا [illegible]۔

ہم اسی موڑ کے دوسری [illegible] نانا شکور کا اندازہ صحیح نکلا۔ یہاں ایک ٹیلے کے پیچھے جیپ کھڑی تھی۔ ہم تینوں اس میں سوار ہو گئے اور زخمی دشمن کو بھی اس میں سوار کروا لیا۔

اسٹیئرنگ نانا شکور نے سنبھالا تھا، سوشیلا میرے اشارے پر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی، جبکہ میں عقبی سیٹ پر زخمی دشمن کو لیے بیٹھ گیا۔

"بھولا ناتھ کو ہمارے یہاں آنے کی خبر بھی ہو گئی......! کیا کہتے ہو؟ ادھر ہی سوالوں کے جواب دو گے یا پھر اڈے پر جا کے؟" جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے نانا شکور نے اس زخمی دشمن سے پوچھا۔

"تم کس بھولا ناتھ کی بات کر رہے ہو؟ ہم تو تمہیں لوٹنا چاہتے تھے۔" اس نے جواب دیا۔ خود مجھے اس کے لہجے سے سفید جھوٹ کی بو آتی محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا!" نانا شکور طنزیہ استہزا سے بولا۔ "یہ کیسے ڈکیت تھے جو ہمیں روک کے اور گن پوائنٹ پر لیے بغیر بموں اور گولیوں سے چھلنی کر کے لوٹنا چاہتے تھے؟"

"تم کچھ بھی سمجھو، حقیقت وہی ہے جو میں بیان کر چکا ہوں۔" زخمی بڑی ڈھٹائی سے بولا جس پر مجھے غصہ آیا تھا۔

"میرے ساتھیوں کو ہلاک کرنے کا جرم تو تمہارے سر پر ہے ہی...... لیکن اگر تم نے سچ نہیں بولا تو ایسی اذیت ناک سزا دوں گا کہ تم مجھ سے زندگی کے بجائے موت کی بھیک مانگو گے......" نانا شکور نے دانت پیس کر کہا اور اپنی جیب سے سیل فون نکالا۔ ایک ہاتھ سے اس نے اسٹیئرنگ سنبھالا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے فون کان سے لگا ہوا تھا، اسی دوران اس نے ایک موڑ کاٹا تھا کہ اچانک میرے ساتھ بیٹھا زخمی بدکا اور اس نے چلتی جیپ سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

"گاڑی روکو...... روکو گاڑی نانا......!" میں چلایا۔ مگر نانا بڑے اطمینان سے بولا۔

"بیٹھے رہو سکون سے...... یہ کہیں نہیں جا سکتا......"

میں چپکا [illegible] رہا۔ نانا شکور نے سیل جیپ کے ڈیش بورڈ پر پھینکا اور بڑی تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ کاٹا تو اس طرف جہاں وہ زخمی گرا تھا اور گرتے ہی اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جیپ کے [illegible] آ گیا۔ جیپ کی تیز ہیڈ لائٹس اس کے چہرے پر پڑیں تو [illegible] خوف کے بے پایاں آثار دکھائی دیے، نانا شکور نے جیپ کی ایک ٹکر اسے رسید کر دی، وہ چیخ مار کر گرا۔ نانا شکور نے بریک لگائے، جیپ ریورس کی، اور تیزی سے کرتا چلا گیا۔

نجانے وہ اس کے ساتھ کیا گیم کھیلنا چاہتا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ نانا نے بڑی بیدردی کے ساتھ جیپ اس زخمی دشمن پر چڑھا دی۔ اس کے حلق سے بڑی دردانگیز چیخیں خارج ہو گئیں۔ نانا شکور نے جیپ اس کی دونوں ٹانگوں پر چڑھا کر کچل دی تھیں۔ وہ بری طرح چیخنے لگا۔ جیپ روک کر نانا شکور نیچے اترا اور اس پر جھک کر غراتے ہوئے بولا۔

"اب بھی وقت ہے، بتاؤ تمہیں بھولا ناتھ نے بھیجا تھا نا؟ اور وہ خود اس وقت کہاں ہے؟ ورنہ تمہارے دونوں بازوؤں کا بھی یہی حال کروں گا۔"

"رر...... رحم کرو نانا......!" وہ کراہا۔

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"تم نے ہم پر رحم کیا تھا؟ اب فضول بکواس نہیں سنوں گا۔" نانا شکور سفاکی سے بولا۔ "میرے پاس وقت کم ہے، ڈھونڈ تو میں لوں گا اسے، لیکن میرا وعدہ ہے، اگر تم مجھے سچ بتا دو تو میں تمہیں اسی حال میں زندہ چھوڑ دوں گا، مگر یاد رکھنا جھوٹ مت بولنا۔ میں ادھر ہی اپنے ساتھیوں سے فون پر رابطہ کر کے معلوم کروالوں گا۔"

"وہ......وہ ادھر ہی ہے۔ اسی جزیرے میں......"

"اس کا مجھے بھی اندازہ ہے۔ ٹھکانا بتاؤ؟"

"اسے جے ساؤتھ کالونی کے کلب میں...... ڈورا ڈاری اسٹریٹ میں......"

"اب آخری سوال کا جواب دے کر اپنی مکتی کروا لو......" نانا بولا۔ "کلی منجارو قبیلے کے وحشی جن تین آدمیوں کو اُٹھا کر لے گئے تھے، اس سلسلے میں تمہاری معلومات کیا ہیں؟"

اس سوال پر وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

"جواب دو......؟" نانا غرایا۔

"وہ...... وہ مجھے مار ڈالے گا...... بھولا ناتھ!" وہ منمنایا۔

"چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں تمہیں...... جواب دو......"

نانا کے اس سوال پر میں بھی دھڑکتے دل کے ساتھ اس بکے ستے ہوئے چہرے پر اپنی نظریں جمائے ہوئے قریب ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"بھولا ناتھ نے اپنے آدمیوں کا ٹولا ان تینوں کو اُن وحشیوں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے بھیج رکھا ہے۔"

"بھولا ناتھ اتنا بے وقوف کب سے ہو گیا کہ کلی منجارو سے ٹکر لینے کی کوشش کرنے لگا؟" نانا شکور زہر یلے طنز سے بولا۔ زخمی دشمن کو مفر کی راہ نہیں مل رہی تھی، بولا۔

"اُن وحشیوں سے جنگ کرنے کے لیے وہ ٹولا نہیں بھیجا گیا ہے۔"

"تو پھر؟"

"ان قیدیوں کی رہائی کے لیے ان کے سردار گوبارو سے بات چیت کرنے لیے وہ ٹولا تیار کیا گیا ہے اور اس میں دادا بھولا ناتھ کا ایک قریبی تامل ساتھی شا کا بھی شامل ہے، اُسے اس وحشی قبیلے کلی منجارو کی زبان آتی ہے۔"

اس کی بات سن کر میں نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ لیں۔ اگر یہ سچ کہہ رہا تھا تو اس کا مطلب تھا، بھولا ناتھ کے ساتھیوں کا مذکورہ ٹولا کلی منجارو سے کامیاب مذاکرات کرسکتا تھا، جس کا مطلب تھا میرے تینوں ساتھیوں کی بھولا ناتھ کے ہاتھ "حوالگی" کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا، جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ بھولا ناتھ جانتا تھا کہ میرے لیے اول خیر، کبیل دادا اور شکیلہ کس قدر اہم تھے۔ وہ خبیث اپنے "محسن" اور دیرینہ حلیف کرنل سی جی بھوانی سمیت اپنے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا انتقام میرے ان ساتھیوں سے لینے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ یہی وہ بات تھی جس نے مجھے اپنے محبوب ساتھیوں کی طرف سے ایکا ایکی سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"بہت ہے یہ معلومات...... بس اب تم ہمیشہ کے لیے چھٹی کرو......"

بڑی سفاکی سے کہتے ہوئے نانا شکور نے اپنے پستول کی نال کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے لبلبی پر انگلی رکھی تھی کہ میں نے اسے روک دیا۔

"نہیں نانا......! اسے مت مارو۔"

نانا میری طرف گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ جبکہ وہ دشمن بھی مجھے رحم طلب نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

"بس آخری سوال کا جواب دے دو......" اس بار میں نے اسے مخاطب ہو کر کہا۔

"وہ ٹولا کب اس وحشی قبیلے کی طرف روانہ ہوا تھا؟"

"آج صبح سویرے......" اس نے میرے سوال کا جلدی سے جواب دیا۔

"کلی منجارو، کا ٹھکانا کس طرف اور یہاں سے کتنی دور ہے؟"

اُس نے ایک بار پھر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "جزیرے کے جنوب مشرقی سمت، نارتھ بے کی طرف، جہاں خشک کالی چٹانوں کا بنجر اور سنگلاخ ویرانہ ہے، وہیں ان کے دامن میں چٹانوں کا گھنا جنگل واقع ہے۔"

"اس ٹھکانے سے تو میں بھی واقف ہوں، مگر......" اس بار نانا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا اور کچھ سوچتا سا بن گیا۔

"واپس پلٹو نانا...... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے اسے سوچتا پا کر سنجیدگی سے کہا۔

ہم تینوں دوبارہ جیپ میں سوار ہو گئے۔ ذرا ہی دیر بعد جیپ فرانے بھر رہی تھی۔ اسٹیئرنگ نانا شکور نے ہی

سنبھالے ہوئے تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ جیپ اب نیم جنگلاتی علاقے میں داخل ہوگئی تھی، سیاہ اور بنجر ٹیلوں نما کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، مگر وہ اب خال خال ہی نظر آرہے تھے۔ پھر جلد ہی آبادی کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے۔ مکانوں کے علاوہ بازار اور ہوٹلز، سرائے نما سب نظر آنے لگے۔ یہاں روشنیاں بھی تھیں اور چمک دمک بھی۔ گویا یہاں بھی شہر کی طرح زندگی اپنی پوری ہماہمی کے ساتھ سرگرم تھی۔ اس جزیرے کا جو ہیبت ناک اور خوفناک تصور میرے ذہن میں تھا وہ ماند سا پڑنے لگا تھا۔ تاہم وہ تصور پہلے کے ادوار سے تعلق رکھتا تھا۔ جب یہاں بنجر زمین اور ہول ناک ویرانوں کے سوا کچھ نہ ہوگا، سوائے بدنصیب قیدیوں کے اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے والے سپاہیوں کے...... کبھی یہاں ظلم و انسانیت سوزی کا سورج آگ بھی برساتا ہوگا، کبھی بے بس اور مجبور ولاچار قیدیوں نے اپنے ناکردہ گناہوں کے عذاب تلے سسکتے بلکتے اور اپاہج لمحوں میں بڑے کڑے ایام بتائے ہوں گے، مگر اب تو جیسے یہاں کچھ بھی نہ ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ انڈیا کا اب بھی یہاں مکمل تصرف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس جزیرے پر ممبئی کے انڈرورلڈ ڈان بھی قابض ہو چکے تھے اور انہوں نے یہاں اپنا اچھا خاصا اثرورسوخ قائم کر رکھا تھا۔ کئی جرائم پیشہ عناصر تو اپنی یہاں ''پرامن'' بادشاہت کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے، بھارتی حکومت کو نذرانے کے طور پر بھتا بھی دیا کرتے تھے۔ یہ سب باتیں ناناشکور سے میرے علم میں آئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جیپ ایک قدرے بڑی سی گھوٹی شیپ کی عمارت کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

عمارت میں عموعی طرز کی لائٹس روشن تھیں، البتہ گیٹ کی پیشانی پر ایک مخصوص نیون سائن جل بجھ رہا تھا، اور اس پر ایک کالے اسکارپیئن کی تصویر ابھر رہی تھی۔ اسی کے نیچے انگریزی حروف میں ''بلیک اسکارپیئن کلب'' لکھا ہوا تھا۔

گیٹ پر بھانت بھانت کے لوگوں کی آوک جاوک نظر آتی تھی۔ ان میں ینگ کپلز، مرد خواتین حتیٰ کہ عمر رسیدہ لوگ بھی تھے۔ گیٹ کیا تھا، بس ایک سنگل ڈور کا دروازہ تھا۔ جہاں دائیں بائیں دو موٹے تازے آدمی بنیان ٹائپ شرٹ اور چست پینٹ پہنے کھڑے، آنے جانے والوں کی چیکنگ وغیرہ کے بعد اندر جانے کی اجازت دے رہے تھے۔ ان کی بیلٹوں سے سیاہ رنگ کے اڑسے ہوئے پستولوں کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ناناشکور کو دیکھتے ہی وہ بدکے اور نجانے کون سی زبان میں لوگوں کو ہاتھوں کے اشارے سے اِدھر اُدھر ہونے کا کہنے لگے، راستہ بنتے ہی ناناشکور اور میں اور سوشیلا اس کے عقب میں چلتے ہوئے دروازے پر پہنچے تو ناناشکور نے ذرا رک کر ان سے کچھ کہا اور آگے بڑھ گیا۔

معلوم ہوا کہ یہ دروازہ داخلے کا تو تھا ہی مگر کسی زینے کے آغاز سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ وہاں بھی اندر کی طرف دو تنومند افراد چوکس کھڑے تھے، نانا کو دیکھتے ہی انہوں نے مودبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی اور پھر نانا کی تقلید میں سوشیلا اور میں اس کے پیچھے زینے طے کرتے ہوئے اُوپر ایک فلور پر پہنچے، وہاں ایک اور دروازہ نظر آیا، جو کھلا ہوا تھا اور باہر سے ہی مجھے اندر ہونے والے طوفان بدتمیزی قسم کے شور شرابے اور رنگین فلش لائٹوں کی جھلک دکھائی دی تھی، دائیں جانب ایک اور دروازہ تھا جو بند تھا، ناناشکور نے اُدھر ہی کھڑے ہوکے دستک دی۔

دروازے پر نصب ایک چھ بائی چار کی چوبی کھڑکی [illegible] ایک دم سلائیڈ ہوئی، ایک وحشت برساتی آنکھ نے ہمیں [illegible] ساتھ ہی دروازہ کھلتا چلا گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی ایک مختصر سی راہداری دکھائی دی، ہم اسی پر چلتے ہوئے ایک کمرے میں پہنچے۔ کمرا کشادہ اور عام سا ہی تھا، فرنیچر کے نام پر وسط میں ایک گول میز، اس کے گرد چار پانچ کرسیاں اور ایک فیملی سائز صوفہ جو دیوار سے لگا ہوا تھا۔

ناناشکور نے مجھے اور سوشیلا کو اسی صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ہمارے وہاں فروکش ہوتے ہی ایک نیم عریاں سی سانولی مگر تیکھے نقوش والی لڑکی ایک تھالی اُٹھائے اندر داخل ہوئی۔ وہ اس نے بڑے احترام سے ناناشکور کے سامنے رکھ دی۔ تھالی پر ایک بڑی شراب کی بوتل اور تین پیگ رکھے تھے۔

''میرا خیال ہے تم دونوں بھی اِدھر ہی آجاؤ......'' ناناشکور نے شراب کی بوتل کا کاگ اڑاتے ہوئے ہم دونوں کی طرف دیکھا، میں نے تو ہاتھ کھڑا کر کے انکار کر دیا تھا مگر سوشیلا فوراً اٹھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی، اس کی آنکھوں میں ندیدے پن کی چمک دیکھ کر مجھے کچھ حیرت ہوئی تھی۔ وہ شاید آج پہلی بار ہی میری نظروں کے سامنے پینے لگی تھی۔ جانے کیوں میرے ہونٹوں پہ آپوں آپ ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

"کمال ہے تم پیتے نہیں ہو؟ تو پھر کچھ اور منگواؤں تمہارے لیے؟" نانا شکور نے جھاگ اڑاتی بوتل سے ایک پیگ سوشیلا اور ایک اپنے لیے بناتے ہوئے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"شکریہ! مجھے اس وقت کسی شے کی طلب نہیں ہو رہی ہے۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔ مقصد یہی تھا کہ وہ جلد ہی یہ "دور" چلائے اور کام کی بات پر کچھ عملی اقدام کا بھی سوچے۔

سوشیلا نے بڑے بے تابانہ انداز میں ایک بڑا گھونٹ بھر کر اپنے معدے میں منتقل کیا تو ساتھ ہی جھٹکے جھٹکے انداز میں ایک ہنکارا بھی خارج کر ڈالا۔ یوں لگا جیسے وہ ایک جام کے لیے بڑا ترسی ہوئی تھی۔ نانا شکور نے بھی ایک گھونٹ بھر کر دوبارہ مجھ سے ہولے سے کہا۔

"ویسے کیسے ہوسکتا ہے، تم یہاں میرے ٹھکانے میں کچھ کھائے پیے بغیر رہو......" کہتے ہوئے اس نے میز کے نیچے اپنا ایک ہاتھ لے جا کر شاید کوئی بے آواز سا بٹن پش کیا تھا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلا۔ وہی لڑکی دوبارہ اندر داخل ہوئی۔

"میرے اس دوست کے لیے کوئی اچھا سا سوفٹ ڈرنک لے آؤ...... اور سینڈوچ بھی۔" نانا نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس لڑکی سے تحکمانہ کہا تو وہ لڑکی میری طرف قدرے حیرت بھری نگاہوں سے تکتی ہوئی مؤدبانہ انداز میں واپس لوٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک اور ٹرے اٹھا لائی، جس میں ایک کولڈ ڈرنک اور ایک ٹھنڈی بیئر کی بوتل اور کچھ سینڈوچز تھے۔ وہ میز پر رکھنے لگی تو میں نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اسے اشارہ کیا، وہ سمجھ گئی اور ٹرے لیے مسکراتے ہوئے میرے قریب آگئی۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹرے اس کے ہاتھ سے لے لی اور کولڈ ڈرنک کا ایک ٹھنڈا ٹھار گھونٹ بھرنے کے بعد ٹرے گود میں رکھ کر سینڈوچ اٹھا کر کھانے لگا۔

بیئر کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، کیا معلوم اس میں الکوحل شامل ہو؟

یہ سارا "دور" کچھ منٹوں تک محیط رہا، میں اپنی کرسی پر بیٹھا بار بار بے چینی سے پہلو بدلے جا رہا تھا۔ نانا شکور میری بے قراری بھانپ گیا اور پھر دوبارہ کسی کو بلایا۔

ایک شخص اندر داخل ہوا اور نہایت مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"یس باس!" آنے والے نے مؤدبانہ انداز میں اپنا سر جھکا کر کہا اور اسی طرح واپس لوٹ گیا۔ اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک گینڈے جیسی جسامت کا شخص وہاں پہنچا اور باادب نانا شکور کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

دبیر! بھولا ناتھ سے ہمارے ٹکراؤ کی ابتدا ہو چکی ہے۔ ہم اُسے جواب تو دے ہی چکے ہیں، لہٰذا تم یہاں ساتھیوں کو ہائی الرٹ کردو......"

"بہتر جناب! آپ اس کی فکر نہ کریں، ہمارے ساتھی یوں بھی یہاں ہر دم الرٹ ہی رہتے ہیں۔" دبیر نے مؤدبانہ کہا۔

"گڈ......! اب یہ بتاؤ کہ ڈورلوڈاری اسٹریٹ میں واقع بھولا ناتھ کے ایک اہم اڈے، اے سے جے ساؤتھ کالونی کے کلب میں ہمارا کوئی مخبر موجود ہے؟"

"بالکل ہے جناب! ہماری ایک ساتھی مس ڈولی وہاں پر ٹیزنگ ڈانسر ہے اور ویٹریس کے بھی وہاں فرائض انجام دیتی ہے۔" دبیر نے جواب دیا اور نانا شکور کی آنکھوں میں یک بیک چمک سی ابھری۔ بولا۔

"کیا اس وقت ڈولی سے بات ہوسکتی ہے؟"

"بالکل جناب! کچھ پوچھنا ہے؟"

"ابھی، اسی وقت اُس سے رابطہ کرو اور پوچھو کہ بھولا ناتھ نے اپنے ایک اہم آدمی شاکا کو کل متھارو کی جس مہم کے لیے روانہ کیا تھا، اس میں اب تک کیا پیش رفت ہوسکی ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے دبیر کو اس سلسلے میں تھوڑا بہت بریف بھی کردیا۔ دبیر تھوڑا وقت مانگ کر لوٹ گیا۔ اس کے بعد نانا شکور مجھ سے مخاطب ہو کر پُرغور لہجے میں بولا۔

"درحقیقت اس خطرناک مہم پر جانے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ بھولا ناتھ کا یہ ٹولا اب تک کتنی کامیابی حاصل کرسکا ہے؟ ممکن ہے وہ اپنی مہم سے کامیاب لوٹا ہو، یعنی تمہارے ساتھیوں کو وہ اس وحشی قبیلے سے چھڑا ہی لایا ہو۔"

"آپ نے یہ ٹھیک کیا نانا صاحب!" میں نے جیسے اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ "ورنہ ہمارا وقت برباد ہوسکتا تھا۔"

کافی دیر اسی طرح اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے گزری۔ پھر دبیر لوٹا۔ میں نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا کہ نجانے وہ مس ڈولی سے کیا خبر لایا ہوگا۔ وہ خاصا پُرجوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس نے نانا سے کہا۔

"جناب! میری ڈولی سے بات ہوچکی ہے۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

نے بتایا ہے کہ شاکا کو اپنے ساتھی ٹولے سمیت اس مہم پر گئے ہوئے آج تیسرا دن ہے اور وہ ابھی تک وہاں سے نہیں لوٹے ہیں۔"

"وہاں پہنچنے کے بعد ان کی کوئی اطلاع وغیرہ، یا کوئی خبر؟" نانا نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ میں پورے دھیان سے اور دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

"جناب! اُس کے پاس زیادہ بات کرنے کا وقت نہیں تھا، شاید وہ اور بھی بہت سی اہم باتوں سے ہمیں آگاہ کرنا چاہتی ہے، اسی لیے ڈولی خود یہاں تھوڑی دیر میں پہنچ رہی ہے۔"

"اچھا!" نانا نے پُرسوچ انداز میں اپنی بھنوؤں کو سکیڑا تھا، خود میں بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ ان کی ساتھی مخبر ڈولی نے میرے مطلب کی جو بات بتانا تھی وہ بتا چکی تھی، اب یہاں آکر وہ کون سے چونکا دینے والے انکشافات کرنے والی تھی، اس کے بارے میں مجھے یہی اندازہ ہو پایا تھا کہ وہ ان کے آپس کے ہی معاملات سے متعلق ہوں گے۔ نانا کو اس کی آمد کا بے چینی سے انتظار تھا۔ مگر مجھے اس انتظار سے کوفت سی ہونے لگی۔

تاہم اس کے بعد نانا نے دیبر کو ایک اور حکم دیا۔

"اسی وقت ہماری روانگی کی تیاری کرو۔ ہمیں ایک تیز رفتار جیپ اور دو ساتھی چاہئیں...... اسلحہ بھی رکھوا دو جلدی......" نانا شکور نے اسے تیکھی ہدایت دی۔

دیبر نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی اور لوٹ گیا۔

"کیا ہم اس قبیلے کا رخ کرنے والے ہیں؟" میں نے نانا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب اس کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔"

"یہ قبیلہ تھگی متجارو...... جزیرے کی کون سی سمت پر واقع ہے؟ میرا مطلب ہے آپ کو ان کے ٹھکانے کا تو علم ہوگا ہی؟" میں نے تسلی چاہی۔

"اس وحشی قبیلے کے ٹھکانے سے کون واقف نہیں......" وہ بولا۔ "آدھے جزیرے پر ان کی حکمرانی قائم ہے اور وہاں تک جانے کا راستہ انتہائی دشوار گزار اور گھنے خطرناک دلدلی جنگلوں پر مشتمل ہے۔"

"حیرت ہے، اب تک بھارتی حکومت اس وحشی قبیلے کی بیخ کنی کے لیے کچھ نہیں کر پائی۔" میں نے کہا تو نانا استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

"یوں تو انڈیا اس جزیرے پر اپنے مکمل کنٹرول کا دعویٰ کرتا ہے مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہماری مثال تمہارے سامنے ہی ہے کہ یہاں کن لوگوں کا قبضہ ہے، مگر تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہم سمیت یہاں جتنے بھی جرائم پیشہ عناصر ہیں، وہ سب بھارت کی چند مخصوص اور معتبر شخصیات کی سرپرستی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ وہ ہم سے ٹیکس کی صورت میں ہر ماہ بھتا لیتے ہیں اور در پردہ ہماری سپورٹ بھی کرتے ہیں۔ یوں ہم جیسوں کی اجارہ داری ایک عرصے سے یہاں قائم ہے، اگرچہ ماضی میں ہماری بھی بیخ کنی کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اور انہی "شخصیات" نے ہی ہماری درونِ خانہ پشت پناہی کی تھی۔ لیکن اس میں بھارتی حکومت کے بجٹ کو بڑا زبردست دھچکا پہنچا تھا۔ سارے گینگسٹر عارضی طور پر انڈر گراؤنڈ ہو گئے تھے اور انہوں نے جزیروں کے دور افتادہ اور دشوار گزار علاقوں کا رخ کر لیا تھا۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکنا پسند نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہاں وحشی قبائل کے علاوہ قدرتی آفات کی بھرمار تھی۔ جنگلی مچھر، زہریلے کیڑے اور خطرناک سانپوں، بچھوؤں اور ان دیکھی دلدلوں کا ایک گھن چکر تھا۔ ہم تو ان آفات اور حالات و ماحول کے عادی تھے، مگر سرکاری اہلکار جو آرام طلب اور کاہل مزاج تھے، ایک ہی دن میں گھبرا کر بھاگ اُٹھے تھے۔"

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے نانا کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج سے کئی برس پہلے جس منحوس جزیرے کو معصوم اور بے گناہ قیدیوں کے لیے جہنم زار بنایا گیا تھا، وہ آج خود بھارت کے گلے کا پھندا بنا ہوا تھا۔ اس حقیقت سے بہت کم دنیا واقف ہوگی کہ یہاں آج بھی "کالا پانی" اپنی تمام تر خطرناکیوں کے ساتھ بھارت کے گلے کا طوق بنا بحرِ ہند میں ہلکورے لے رہا تھا اور خود ان کے لیے ہی مصیبت بنا ہوا تھا۔ انگریز یہاں تباہی و بربادی کا جو بیج بو کر گئے تھے، اس کے مضمرات سب کے سامنے تھے۔

جانے کتنی دیر گزری تھی کہ دیبر نامی وہی شخص ایک چھنال سی چلتا پرزہ نظر آنے والی دبلی پتلی لڑکی کے ساتھ نمودار ہوا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہی ڈولی تھی۔ اس کی عمر مشکل بیس بائیس کے پیٹے میں ہوگی، نقوش تیکھے تھے اور رنگت سانولی، وہ خالص بھارتی حسینہ ہی معلوم ہوتی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک چبھتی نگاہ سوشیلا اور مجھ پر بھی ڈالی تھی۔ اس کے بعد وہ نانا سے مؤدبانہ پرنام

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کرنے لگی۔

"بتلاؤ کیا خبریں ہیں......؟" نانا شکور نے اس کے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے کہا تو وہ اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی، پھر جب کچھ بتانے سے پہلے اس نے ایک متذبذب سی نگاہ مجھ پر ڈالی تو نانا اس کی اُلجھن بھانپ کر بولا۔ "یہ اپنے ہی ساتھی ہیں، تم بولو......"

ڈولی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پہلے تو اُسے مقامی اور ان کے آپس کے معاملات کی نوعیت سے متعلق خبروں سے آگاہ کیا، جس کے لیے وہ ان کے حریف بھولا ناتھ کے ٹھکانے پر مخبری کے لیے پہلے ہی سے مقرر تھی۔ اس کے بعد وہ ہمارے مقصد کی بات پر آگئی۔

"ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی بھولا ناتھ نے اپنے ایک قریبی تامل ساتھی شاکا کو چار پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ایک عجیب سی مہم پر روانہ کیا تھا، ان کی منزل جزیرے کے جنوب مشرق میں واقع وحشی قبائل کا وہ علاقہ تھا، جہاں کلی مجارو جیسا سب سے زیادہ سفاک اور خطرناک قبیلہ آباد ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق تو نہیں تھا مگر یہ فرض ضرور بنتا تھا کہ میں ایک مخبر کی حیثیت سے اس کی بھی کھوجنا کروں، سو یہی معلوم ہوا کہ مذکورہ ٹولا کسی تین پاکستانی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں اس طرف روانہ کیا گیا تھا۔" وہ یہاں تک بتا کر ذرا رکی۔ میں نے بہ دستور پُرغور سی نظریں اس کے چہرے پہ جمائے رکھتے ہوئے، اس کے توقف پر بے چینی سے پہلو بدلا۔

وہ آگے کہنا شروع ہوئی۔ "کیونکہ انہیں روانہ کرنے کے بعد بھولا ناتھ شاکا سے اپنے خفیہ ٹرانسمیٹر پر رابطے میں رہا تھا۔ وہ لوگ کامیابی کے ساتھ وہاں تک پہنچ بھی گئے تھے۔ چوری چھپے ان کی آپس کی گفتگو سن کر مجھے یہ بھی اندازہ ہوا تھا کہ انہیں بھولا ناتھ نے اُن وحشی قبیلے سے جنگ کے لیے نہیں بلکہ خصوصی مذاکرات کے سلسلے میں روانہ کیا تھا، کیونکہ اس کا قریبی ساتھی شاکا ایک تامل تھا اور وہ چند قبائلی زبانیں بولنے سے نابلد نہیں تھا۔ مجھے کسی گہرے چکر کی بو آئی اور میں... مسلسل اپنی جان خطرے میں رکھتے ہوئے اور بہانے بہانے سے بھولا ناتھ کے قریب رہتے ہوئے، اس کی گفتگو سنتی رہی تو کچھ مزید چیزوں کا انکشاف ہوا، مجھے نہیں معلوم باس کہ یہ آپ کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہیں یا نہیں، لیکن بہرحال میں نے اس کا بھی کھوج لگالیا۔

شاکا کا بھولا ناتھ سے صرف دو دن رابطہ رہا تھا اس کے بعد وہ اچانک ٹوٹ گیا۔ وجہ نامعلوم رہی، تاہم بھولا ناتھ کی باتوں سے جو وہ یہاں اپنے دیگر ساتھیوں سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے کرتا رہتا تھا، اس کے مطابق شاکا اور اس کے مختصر ساتھیوں کا ٹولا وہاں کسی مشکل کا شکار ہوچکا تھا، نیز شاکا نے بھولا ناتھ سے ٹرانسمیٹر پر کچھ انکشافات بھی کیے تھے، جس کے مطابق کلی مجارو کی سرزمین اور وہاں بسنے والے یہ باسی کسی کے زیرِ نگیں ہوچکے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں ان لوگوں نے اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا ہے ان پر......"

"کون ہیں وہ لوگ......؟" نانا شکور نے ایک دم پوچھا۔

"ابھی کچھ پتا نہیں چل سکا ہے، لیکن سننے میں آیا تھا کہ کلی مجارو کی یہ سرزمین بہت سے لوگوں کے لیے ایک دم خاص اور پُراسرار اہمیت اختیار کرچکی ہے اور کئی ٹولوں نے وہاں کا رخ کر رکھا ہے۔ لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑی مہابھارت چھڑنے والی ہے۔" ڈولی نے بتایا اور میری تشویش فزوں تر ہونے لگی۔ نجانے وہاں کیا گڑبڑ ہونے والی تھی اور پتا نہیں کون لوگ وہاں کا رخ کیے ہوئے تھے؟ مجھے تو صرف اول خیر وغیرہ کی فکر لاحق ہورہی تھی۔

"شاکا کو وہاں جا کر اور بھی بہت سی باتوں کا علم ہوا تھا، لیکن شاید وہ اچانک کسی بڑی مشکل کا شکار ہوگیا ہے اور مزید بتانے سے قاصر رہا ہے تاہم مجھے لگتا ہے کہ اس نے بھولا ناتھ کو کوئی ایک ایسی اہم بات سے بھی ضرور آگاہ کیا ہے جسے سننے کا مجھے موقع نہ مل سکا تھا کیونکہ بھولا ناتھ بھی آج رات اس طرف روانہ ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔"

بالآخر ڈولی نے اپنی بات مکمل کی اور نانا شکور ایک گہری سانس لے کر پُرسوچ سی خاموشی میں مستغرق ہوگیا۔

میں اپنی فکر میں کھویا ہوا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی، مجھے کچھ ایسا لگتا تھا کہ کلی مجارو کی سرزمین میں کوئی بڑا، گہرا اور پُراسرار ڈراما ہونے والا تھا جس کا کہیں نہ کہیں تعلق میرے موجودہ حالات سے ضرور جڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب ہم اسی رات کی اسرار بھری تاریکی میں ایک بھاری بھرکم جیپ میں جزیرے کی جنوب مشرقی سمت روانہ ہونے لگے تو میرا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ کلی مجارو کی پُراسرار سرزمین میں کوئی بہت بڑا دمادم مست قلندر ہونے والا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

Downloaded From

آوارہ گرد

قسط:31

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

Downloaded From

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی۔ شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف ککل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ ککل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنا لیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون نگاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہن کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کھیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحب کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو عملاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے پی سی (جیوش پرلس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے پی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے۔ جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو وہ لتیا سیٹھ تو یہ سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام چھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ جنگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت واشگاف ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی۔ یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ۔ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی گوپارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے۔ سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگیوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے......اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی...... مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی ستم ظریفیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ گوپارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکس تک پہنچ جاتا ہے۔ وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹیکس کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے۔ اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کپیل داس اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی ٹھٹک رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ریتا نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

رات کی اس پُرہول تاریکی میں کلی منجارو کی اسرار بھری سرزمین کی طرف ہمارا سفر جاری تھا۔

جیپ کی اگلی دو نشستوں میں سے ایک پر ڈرائیور اور اس کے برابر میں نانا شکور، اس کے عقب کی ایک سیٹ پر میں اور سوشیلا جبکہ پچھلے حصے میں سامان اور اسلحے کے تھیلے وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہیں نانا شکور کا ایک ساتھی ری کوئل گن تھامے دبکا بیٹھا تھا۔

اگرچہ نانا شکور کا ارادہ اپنے اصل ٹارگٹ کی طرف روانگی سے قبل بھولا ناتھ سے حملے کا انتقام لینے کے لیے اس کے ٹھکانے اسے جے ساؤتھ کالونی کے کلب میں ہلا بولنے کا تھا مگر میرے .. اصرار پر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر کے اپنے کچھ خاص ساتھیوں کو یہ مشن سونپ دیا تھا۔

اس مہم میں ہم بس کل پانچ افراد ہی تھے۔ دلدلی علاقے پر مشتمل چھائی کا وہ جنگل جہاں سے اس وحشی قبیلے کی راجدھانی کی سرحدیں شروع ہوتی تھیں، اس سے کسی حد تک نانا شکور بھی واقف تھا، وہ یہاں سے پچیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا، چھائی کا گھنا دلدلی جنگل ہی قبیلے کی سرحد کہلاتی تھی۔ اس کے بعد قدم بہ قدم خطرہ شروع ہو جاتا تھا، وہاں ہمارا اپنے دشمنوں سے بھی ٹکراؤ ہونا لازمی تھا اور کلی منجارو سے بھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق یا یوں کہہ لیں کہ ڈولی سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں وہاں راستے میں ہمارا اجنبی دشمن ٹولے سے بھی سابقہ پڑ سکتا تھا، شاید انہی باتوں اور خدشات کی روشنی میں میرے دل میں یہ خیال ابھرا تھا کہ وہاں ایک بڑی جنگ کی شکل میں دمادم مست قلندر ہونے کی توقع تھی۔

رات کی ابھی ابتدا تھی۔ جیپ مناسب رفتار سے اپنی

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ ہمارے اطراف میں میلوں تک بنجر ویرانہ بکھرا ہوا تھا، فضا مرطوب سی تھی اور موسم خنک محسوس ہوتا تھا۔ جنگلی مچھروں اور کیڑوں مکوڑوں سے نمٹنے کے علاوہ ہمارے پاس مرہم پٹی اور اینٹی موسکیٹو اسپرے بھی تھا۔ مچھر دانی اور سلیپنگ بیگز تھے، خشک خوراک کے دستی کین اور خیمہ زنی کا سامان بھی۔ جبکہ فاضل فیول کے دو بڑے گیلن جیپ....... کے ساتھ نصب تھے۔ تیاری ہماری بھرپور تھی جبکہ ایڈونچر پُرخطر تھا اور سفر جاری تھا۔

نانا شکور اگلی سیٹ پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا جبکہ میں اور سوشیلا ایک دوسرے سے دھیرے دھیرے باتوں میں مصروف تھے۔ جیپ ہچکولے کھاتی مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ راستہ نیم پختہ اور کئی جگہوں پر بل کھاتا ہوا تھا، علاقہ میدانی تھا لیکن جلد ہی یہ سلسلہ چھوٹے بڑے ٹیلے نیوں پر محیط ہونے لگا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد روئیدگی اور لمبے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کے درمیان سے بل کھاتا راستہ اب اندیشوں بھرا محسوس ہونے لگا، جیپ کی ہیڈ لائٹس میں سامنے تک گھور تاریک سناٹے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

لگ بھگ کوئی دو گھنٹوں بعد نانا شکور نے ہمیں محتاط ہونے کا اشارہ دیتے ہوئے یہ اعلان بھی کر ڈالا کہ چھائی کے جنگلی علاقے کی حدود شروع ہو چکی تھی، جس کا مطلب تھا کہ کلی منجارو کی سرزمین میں ہم داخل ہو چکے تھے یا ہونے والے تھے۔

جیپ کی تیز ہیڈ لائٹس میں سامنے دور تک کا راستہ ویران اور تاریک ہی نظر آرہا تھا، تاہم ہمارے اطراف میں اب چھدری چھدری جھاڑیوں کے سلسلے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ چند درختوں کے بدہیت سے جھکے جھکے ہیولے بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ چھائی کا جنگل شروع ہو چکا تھا۔ کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد بتدریج جنگل گھنا ہوتا چلا گیا تھا جس مقام پر جنگل کی ترتیب بکھری بکھری سی معلوم ہوتی تھی وہاں نانا شکور نے اپنے ساتھی ڈرائیور کو جیپ روکنے کا کہا۔

جیپ رکتے ہی اس نے انجن بند کر دیا۔ ایکا ایکی ماحول میں جھینگے پن جیسا سناٹا چھا گیا۔

اب ہمارے سامنے چھائی کا گھنا تاریک جنگل تھا۔ کہیں کہیں روشنی کی کہکشاں چمک رہی تھی، یہ جگنو تھے۔ فضا مرطوب تھی اور ہوا بڑی سبک خرام...... ہم پانچوں جیپ میں تھوڑی دیر تک ساکت بیٹھے رہے۔ ہماری دم بہ خودی نظریں سامنے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبے جنگل پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نانا نے ڈرائیور کو رکنے کا کیوں کہا تھا۔

”کیا کوئی خاص بات ہے نانا صاحب؟“ بالآخر میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

”نہیں کوئی بات نہیں......“ وہ بہ دستور سامنے نظریں گاڑھے ہوئے بولا۔ ”میں دراصل راستے کا تعین کرنا چاہ رہا تھا۔“

”کیا بھول رہے ہو راستہ؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں دراصل محفوظ اور نسبتاً شارٹ کٹ راستے کا تعین کرنا چاہ رہا ہوں......“

”ہم......“ میرے منہ سے نکلا اور میں بھی اطراف میں یونہی دیکھنے لگا۔

”اس طرف چلو...... اور ہتھیار ہاتھوں میں پکڑ لو......“ چند منٹوں بعد نانا نے حکم صادر کیا۔ میں نے پستول نکال لیا تھا اور سوشیلا نے بھی یہی کیا جبکہ نانا اپنا پستول پہلے ہی نکال چکا تھا۔

اب جیپ کسی باقاعدہ راستے پر نہیں تھی۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے جیپ چلا رہا تھا۔ اچانک ڈرائیور کے حلق سے کراہ سی خارج ہوئی۔ اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی طور پر گردن کی طرف گیا تھا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا اور اسٹیئرنگ ہاتھ سے چھوٹتا چلا گیا۔ جیپ ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ شکر تھا کہ رفتار آہستہ تھی، تاہم پھر بھی ہم ایک دوسرے پر لڑھک گئے۔

”نیچے اترو...... کسی نے بلو پائپ فائر کیا ہے......“ نانا شکور چلایا۔

”بلو پائپ“ کے ذکر پر میرے پورے بدن میں ایک تیز سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ بلو پائپ ان وحشی جنگلی باسیوں کا بڑا ہی زہریلا اور خطرناک ہتھیار تھا۔ کسی درخت کی کھوکھلی شاخ کے اندر زہر میں بجھا ہوا کانٹا منہ سے پھونک مار کر پھینکا جاتا تھا اور زد میں آیا ہوا شکار اسی وقت بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ہم اس طرف جوابی فائر بھی نہیں کر سکتے تھے، یہ خاموش موت کی صورت میں اور بغیر دکھائی دیے جھپٹتا تھا، اس لیے اس سے دشمن کی سمت کا اندازہ نہیں ہو پاتا تھا۔

ہم سب ایک انداز سے چھلانگ مار کر نیچے اترے اور جیپ کی آڑ میں ہو گئے اور اپنے سامنے تاریک جنگل کے سینے میں نظریں گاڑ دیں۔ نانا شکور نے اس بار

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ksociet

سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ "یہ کلی منجارو کے پہرے داروں میں سے کوئی ہوگا۔ ایک دم ٹارچ روشن کرو اور اس کی روشنی چاروں طرف پھینکو، جو بھی دکھائی دے، گولیوں سے بھون ڈالو......"

ہم سب کے پاس ٹارچیں تھیں، جنھیں آن کرتے ہی ہم نے ان کی روشنی چاروں طرف پھینکی تو مجھے اندھیروں میں ڈوبے گھنے درختوں میں کچھ ٹنگ دھڑنگ انسانی ہیولے متحرک نظر آئے، میں نے اپنی گن کا رخ اس طرف کر کے فائر کھول دیا۔ رات کے پُرہول تاریک سناٹے میں میری گن زور سے گرجی اور میں نے ان درختوں سے کئی انسانی ہیولوں کو کربہ انگیز چیخیں مارتے ہوئے گرتے دیکھا۔ ناناشکور کے آخری بچے ہوئے ساتھی، جس کا نام جمی تھا، اسے بھی چھپے ہوئے زہریلے دشمن نظر آگئے تھے، چنانچہ اس کی ہیوی رنی کوکل گن بھی گرجی تھی۔ چند انسانی چیخوں کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ ناناشکور نے بھی ایک دم فائر بندی کا اشارہ دے دیا۔

"ان وحشیوں کی جانب سے یہ حملہ غیر متوقع تو نہیں لیکن قبل از وقت ضرور تھا......" ناناشکور ہمارے قریب آتے ہوئے بولا۔ "اتنی جلدی ان سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہ تھی......جس کا صاف مطلب ہے کہ ان وحشیوں نے اپنی سرحدوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی ہے۔" وہ اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے جیپ کی طرف بڑھا اور ہمیں بھی آنے کا اشارہ کیا۔

"ہمیں رات کے بجائے دن کے اجالے میں سفر کرنا چاہیے تھا۔" میں نے بھی قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "رات کے اوقات میں یہ اندھیرے جنگلی دلدلی علاقے ان وحشیوں کے لیے آسان شکار گاہیں ثابت ہو سکتی ہیں، ہم جیسے تو ان کے لیے آسان شکار ثابت ہوتے ہیں۔"

"تمہاری بات میں رد نہیں کر سکتا دوست!" ناناشکور جیپ میں سوار ہوتے ہوئے بولا۔ "لیکن دن میں اور زیادہ خطرہ ہوتا ہمیں......خیر، اب چلنے کی کرو۔"

ایک ساتھی کی جان گنوانے کے بعد ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ لیکن تازہ حملے کے بعد ہمیں اب ہر پل خطرے کا احساس دامن گیر رہنے لگا تھا۔ ناناشکور کا خیال تھا کہ کلی منجارو وحشیوں کی آبادی اب بھی کافی فاصلے پر تھی، مگر اس خدشے کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ جگہ جگہ ان لوگوں نے پہرے بھی بٹھائے ہوئے ہوں گے۔

"کیا ان وحشیوں کے دماغ میں اچھے وسیع تر دفاع کے لیے ایسی دور اندیشی کا عمل دخل سمجھ میں آنے والی بات ہو سکتی ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو ناناشکور نے صاف انکار کر دیا تب میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اس کا واضح مطلب ہے کہ ان وحشیوں کی راجدھانی میں ہی نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں بھی کسی ہم جیسے آدمیوں نے اپنی عمل داری قائم کر لی ہے۔"

میری بات پر ناناشکور نے گردن گھما کر حیرت آمیز توصیفی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ "ویل ڈن دوست! کیا کہنے تمہارے، تم نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔ اگرچہ ہماری ساتھی ڈولی نے بھی کچھ ایسی معلومات ہمیں فراہم کی تھیں لیکن ان میں ابہام تھا مگر تمہارے اس قیافے نے یہ شبہ بھی دور کر دیا۔"

"قیافوں سے شبہے دور نہیں ہوتے شکور صاحب!" میں نے ایک پُرسوچ ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ "حالاتِ دوراں، انسان کی بعض ایسی حسوں کو ابھارنے کا باعث بنتے ہیں کہ وہ پیش آمدہ سے پیش آئندہ حالات کو فوراً بھانپ لینے کی حس پالیتا ہے۔"

"تمہارا فلسفہ میرے لیے ثقیل سہی لیکن میں اپنی سوجھ بوجھ اور تجربے سے تمہارے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے اندر بعض ایسی قدرتی صلاحیتیں موجود ہیں جو وقت سے پہلے بہت کچھ بھانپ لیتی ہیں۔" نانا ہنستے ہوئے بولا۔

"یہ پاور آف آبزرویشن ہے اور اس صلاحیت کی عملی جھلک میں بارہا اپنی آنکھوں سے شہزی کے ساتھ رہتے ہوئے نمونے کے طور پر دیکھتی رہی ہوں۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی سوشیلا نے بھی بالآخر لب کشائی کی۔

"اصل بات یہ ہے کہ ہمیں ان سارے عوامل کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔" میں سنجیدہ موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "ہمارے دشمنوں کو عقل و وحشت کی قوت حاصل ہو چکی ہے۔ وہ اسی ذریعے سے فائدہ اٹھا کر ہمیں پینے کے در پے ہوگا۔ بس! دعا کرو وہ ہمارا کوئی دشمن نہ ہو۔"

"شہزی! ویسے تمہارا ذہن کیا کہتا ہے، اس بارے میں کہ ان وحشیوں کو کن لوگوں نے رام کیا ہوگا؟ بھولا ناتھ کے آدمیوں (شاکا وغیرہ) یا پھر یہ کوئی اور لوگ ہوں گے جن کے بارے میں ڈولی نے پورے یقین کے ساتھ مگر مبہم سی نشاندہی کی تھی؟" سوشیلا نے مجھ سے پوچھا۔

"سوشیلا جی نے تو میرے اندر کافی دیر سے پھڑ کنے والے اس سوال کو اچک لیا......پھر کیا کہتے ہو دوست! اس

بارے میں؟'' نانا شکور نے بے اختیار کہا۔

فضا میں اب سیلی سیلی سی نباتاتی باس پھیلنے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہاں جابجا کیچڑ زدہ زمین ہو......

اسی وقت جیپ کو ایک جھٹکا لگا، ہم سب چونک گئے۔ جیپ کا پچھلا حصہ ''بے ڈول'' سا ہونے لگا، ڈرائیور نے ایکسلریٹر پورا دبا دیا۔ جیپ کی رفتار آہستہ ہی تھی لیکن اب پچھلی سائڈ سے بے قابو ہو رہی تھی، صاف ظاہر تھا کہ اس کے عقبی دونوں ٹائر کسی ''کیچ زدہ'' گڑھے میں پھنسنے لگے تھے اور جیپ کا اگلا حصہ اوپر کو اٹھا جا رہا تھا۔

''دلدل۔'' معاً میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن رسا میں ابھرا اور میں چلا کر ڈرائیور سے بولا۔ ''ایکسلریٹر مت دو...... جیپ دلدل میں جا رہی ہے......''

میرے اعلان نے جیسے ایک لرزہ خیز تھرتھری مچا دی۔ جس کا الٹا اثر ہوا...... ڈرائیور نے بوکھلاہٹ میں جیپ سے چھلانگ لگا دی، نانا شکور بھی یہی حرکت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ میں نے پچھلی سیٹ سے ہاتھ بڑھا کر اسے روک لیا۔

''یہ بے وقوفی مت کرو...... نیچے بھی دلدل ہے۔'' وہ وہیں جہاں کا تہاں رہ گیا۔ ڈرائیور کی حالت دیدنی ہو گئی، وہ دلدل میں اتر گیا اور آن ہی آن میں سینے تک اندر دھنس گیا۔ دلدل میں دھنس کر مرنے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ وہ سارے تاثرات اس کے چہرے سے عیاں تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آواز اور لہجے سے بھی جھلکنے لگے۔

''م...... مجھے بچاؤ...... آہ......''

ہم اسے کیا بچاتے ہمیں اپنی پڑ چکی تھی۔ کیونکہ جیپ پوری دلدل میں دھنس چکی تھی اور ہم خود بھی اس میں پھنس رہے تھے۔ جیپ کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا اور وہ دھیرے دھیرے اندر دھنسی جا رہی تھی۔ میں نے نانا شکور سے انجن بند کرنے کا کہا۔

اس کا چہرہ ست کر رہ گیا تھا، اس کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس اچانک ظہور پذیر ہوتی خطرناک اور جان لیوا صورتِ حال سے کیونکر نمٹا جائے؟ جبکہ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا، میں اپنے حواسوں کو قابو کیے ہوئے تھا اور ساتھ ہی نظریں تیزی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ ڈرائیور ابھی تک اپنی جان بچانے کے لیے چلائے جا رہا تھا، وہ خاصا توانا اور جسیم تھا اور اب یہی خاصیت اس کی مصیبت بن رہی تھی۔ وہ جتنا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا، اتنا ہی اندر دھنس رہا تھا۔ میں نے چلا کر اس سے کہا۔

''حرکت مت کرو، کوشش کر کے جیپ کی باڈی کے ساتھ چپکے رہو......''

''جیپ بھی تو دھنس رہی ہے......'' یہ بات نجانے کس نے کہی تھی، مگر میں اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ہم بہ آسانی اس سمت جیپ سے اگر چھلانگیں لگاتے تو کنارہ زیادہ دور نہ ہوتا۔ میں نے تاک کر ایک لمبی زقند بھری، بلاشبہ یہ ''رن'' لیے بغیر ایک ہی جگہ جمے رہ کر لانگ جمپ لینے کی کوشش تھی جس میں، میں کامیاب رہا تھا۔ دلدل کے کنارے گرا تو کیچ میں لتھڑ گیا۔ کائی زدہ اور دیگر نباتاتی ناگواری...بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میرا جی الٹنے لگا، بڑی مشکلوں سے میں نے خود پر قابو پایا اور اسی وقت میرا ایک ہاتھ کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں پر پڑا اور میرے ہاتھ میں جھنڈدار گچھا آ گیا، اسے پکڑ کر میں کنارے پر آ گیا۔

''سوشی! رسی پھینکو جلدی...... مگر زیادہ مت ہلنا...... نانا تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی نہ ہونا۔ حواس اپنے قابو میں رکھو......''

وہ دونوں سمجھ گئے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا تھا، سوشی نے میری ہدایات پر فوراً عمل کیا اور جیپ میں موجود رسی نکال کر اس کا گچھا سا بنا کر میری طرف اچھال دیا۔

جیپ آدمی سے زیادہ دلدل میں دھنس گئی تھی اور کوئی وقت جاتا تھا کہ سوشی اور نانا شکور بھی دلدل میں جا گرتے۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ رسی کے ایک سرے کو اپنی کمر کے گرد لپیٹ کر باندھا، ادھر دلدل میں نصف سے زیادہ دھنسے ہوئے ڈرائیور نے ایک خطرناک حرکت کر ڈالی۔ وہ جیپ میں چڑھنے کی تگ و دو کرنے لگا۔ جس کے باعث جیپ کے دلدل میں دھنسنے کا عمل تیز ہو گیا۔ میں چلا کر نانا شکور سے بولا۔

''اس بے وقوف سے کہو کہ رک جائے، جتنا حرکت کرے گا اتنا دلدل کے اندر جائے گا...... اور اپنے ساتھ تم دنوں کو بھی لے ڈوبے گا۔ میری محنت اکارت چلی جائے گی اور تم سب بھی جان سے جاؤ گے۔''

نانا شکور نے یہی بات اپنے ساتھی سے کہہ دی۔ میں نے رسی کے دوسرے سرے کا گچھا بنا کر جیپ کی طرف پھینکا جو، سوشیلا نے اچک لیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے میری ہدایت پر دلدل میں چھلانگ لگا دی۔ میں نے اسے رسی کی مدد سے تیزی کے ساتھ باہر گھسیٹ لیا۔ جیپ ڈوب کر

جنگ آزما

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر بن گئی تھی

* * *

میڈیکل ایڈ کے نام پر عالمی پیمانے پر ہونے والے جرائم کی کہی ان کہی داستان، وہ نادانستگی میں ایک بہت بڑے گروہ سے ٹکرا گیا تھا۔

* * *

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

غائب ہو چکی تھی، نانا شکور دلدل میں سینے تک دھنسا ہوا تھا اور ڈرائیور گردن تک، نانا شکور نے اسے اپنے ساتھ چپکا لیا تھا۔ وہ دونوں اب حسرت زدہ مگر مردنی سی آنکھوں سے، کنارے پر موجود میری اور سوشیلا کی طرف تکے جا رہے تھے۔

”نانا...... میں رسی پھینک رہا ہوں، تم دونوں اسے تھام کر آ جاؤ گے، حوصلہ مت ہارنا......“

یہ کہتے ہوئے میں نے رسی کا لچھے دار سرا ان کی طرف اچھال دیا۔ میری کوشش کو دیکھتے ہوئے اب ڈرائیور نے بھی ذرا حوصلہ پکڑ لیا تھا اور اس نے چیخنا بند کر دیا تھا، حالانکہ وہ ایک بڑے گینگ کا آلۂ کار رہا تھا، مگر دلدل جیسی موت کا تصور بھی کم بھیانک نہ تھا۔

رسی نانا شکور کے قریب کیچ میں پڑی، جسے نانا شکور نے دبوچنا چاہا مگر ناکام رہا، نتیجے میں وہ گردن تک اندر چلا گیا، میں تشویش زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور تو بے چارہ پورا ہی اندر دھنس چکا تھا، اس کا سر بھی دلدل کی کیچ زدہ سطح سے غائب ہو چکا تھا مگر آخری لمحات تک جان بچانے کی فطری تگ و دو اس نے اپنا ایک ہاتھ دلدل کی سطح سے باہر نکالے رکھنے کی صورت میں جاری رکھے ہوئے تھی۔ میرا دل ان دونوں کے متوقع لرزہ خیز انجام سے کانپ سا گیا۔

”پپ...... پلیز...... ! شہزی انہیں بچالو...... آہ، میں یہ بھیانک منظر نہیں دیکھ سکتی۔“

میرے قریب کھڑی سوشیلا نے لرزیدہ آواز میں مجھ سے کہا۔ میں نے دیکھا، نانا شکور اب پتھرائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ اور ناک اندر دھنس چکا تھا۔ میرے وجود میں لرزہ طاری ہو گیا۔ میں نے رسی کھینچ کر دوبارہ ان کے طرف اچھالی تو وہ اس بار نانا شکور کے ہاتھ میں آ گئی جو اس نے باہر نکالا ہوا تھا۔ ہاتھ میں رسی آتے ہی نانا شکور نے اسے دبوچ لیا۔ اس کر یہہ حقیقت سے وہ بھی اچھی طرح واقف تھا کہ اگر اس بار رسی ہاتھ سے گئی تو وہ بھی گیا۔

”سوشی! میری مدد کرو......“ میں نے رسی کھینچنا شروع کر دی اور سوشیلا سے کہا۔ وہ فوراً حرکت میں آئی اور وہ بھی رسی پکڑ کر کھینچنے لگی۔

میں نے دیکھا نانا شکور کیچڑ میں لتھڑا ہوا باہر کو آنے لگا، اس نے اپنے ساتھی کو بھی ایک ہاتھ سے بہ مشکل دبوچ رکھا تھا...... پھر دفعتاً اسے جھٹکا لگا، بدنصیب ڈرائیور کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر وہ خود کنارے پر آ گیا، میں جلدی سے اس کی جانب لپکا اور اسے باہر نکال لیا۔ بدنصیب جمی (ڈرائیور) کو دلدل نے نگل لیا تھا۔

نانا شکور کے کپڑے، چہرہ، پورا جسم دلدلی کیچ سے آلودہ ہو رہا تھا۔

”سوشی! اسے سنبھالو، میں جمی کو دیکھتا ہوں۔“ میں نے سوشیلا سے کہا اور دلدل میں چھلانگ لگانے لگا تھا کہ سوشیلا چیخی۔

”نہیں شہزی......!“

اسی وقت نانا شکور نے میرا ایک پاؤں دبوچ لیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ”وہ ختم ہو چکا ہے، کوئی فائدہ نہیں اپنی جان گنوانے کا۔“

”میں ایک کوشش کر کے دیکھتا ہوں، تم میری رسی تھامے رکھو......“ میں چلایا، جمی کے اس عبرت ناک انجام پر میرا دل دکھنے لگا تھا۔

”نہیں...... نہیں شہزی! وہ بہت اندر جا چکا ہے...... یہ پانی نہیں ہے کہ تم اتنی آسانی سے اندر غوطہ لگا دو گے......“ سوشیلا جنونیوں کے انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی کہ میں اب تب میں کہیں اندر چھلانگ لگا ہی نہ دوں۔

شدید کرب کے عالم میں، میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میری نظریں اس منحوس دلدل کی کیچ زدہ سطح پر جمی رہیں، جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہمارے ساتھی کو اس نے بھوکے انداز میں نگلا تھا۔

”اٹس او کے...... شہزی! اس بے چارے جمی کی اسی طرح ہی لکھی تھی۔“ نانا شکور بولا۔

”ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ ہمارا بہت سا سامان اور اسلحہ، وقت سمیت پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔“

”کیا اس حالت میں ہمیں اپنا یہ پُرخطر سفر جاری رکھنا چاہیے؟“ سوشیلا نے نجانے کس خیال کے تحت یہ بے وقوفانہ سوال کیا تھا جس پر نانا شکور بُرا مناتے ہوئے اسے گھور کر بولا۔

”تمہارا کیا خیال لڑکی! ہمیں اپنے دو ساتھیوں کی جان گنوانے کے بعد واپس پلٹ جانا چاہیے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ وہ ذرا خفیف ہو کے بولی۔ ”میں نے ایسا احتیاط کے پیشِ نظر کہا تھا۔“

”آگے بڑھو...... ابھی ہمارے حوصلے پست نہیں ہوئے نہ ہی ہوں گے۔“ نانا شکور نے مضبوط لہجے میں کہا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

رات گہری ہو چلی تھی۔ ہم اپنی سواری، اسلحہ اور

کارآمد سامان سمیت دو ساتھی گنوا چکے تھے۔ اسلحے کے نام پر ہمارے پاس اب کچھ بھی نہیں تھا، ہاں! البتہ میرے اور نانا شکور کے پاس قرولی نما خنجر ضرور تھے، جو ہماری داہنی پنڈلی میں بندھی نیام میں اڑسے ہوئے تھے۔

مچھروں کی تیز خراش بھنبھناہٹیں الگ پریشان کر رہی تھیں۔ کسی تاریکی میں چھپے ہوئے پہرے دار وحشیوں کی طرف سے بلو پائپ فائر کیے جانے کا الگ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یہ ان کم بخت وحشیوں کا بڑا ہی جان لیوا اور خطرناک ہتھیار تھا جو آن ہی آن میں انسان کو یوں موت کے گھاٹ اتار کر رکھ دیتا تھا جیسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو اور بندہ پانی بھی نہ مانگ سکے اور پلک جھپکتے ہی موت کے منہ میں لمبی نیند جا سوئے۔

نانا شکور آگے تھا، سوشیلا درمیان میں اور میں سب سے پیچھے تھا۔ نانا شکور کی ہی ہدایت کے مطابق ہم نے یہ ترتیب رکھی تھی۔ تاہم اپنے گرد و پیش پر بھی ہماری نظریں گردش کر رہی تھیں، ٹارچ ہمارے پاس ایک ہی تھی، جو نانا شکور کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی لیکن وہ اس نے آف کر رکھی تھی۔ شکر تھا کہ آسمان صاف تھا اور طباق چاند کی روشنی اور اس کے ہمراہ تاروں کی موج ظفر موج کی ضو فشانی کے سہارے ہم راستے کا تعین کیے محتاط روی کے ساتھ منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے ہم نے پہلے ہی ہلے میں ان وحشی پہرے داروں کا قلع قمع کر ڈالا تھا، ورنہ اب تک ان سے مڈبھیڑ ہو چکی ہوتی۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔ مقصد نانا شکور کی تسلی بخش رائے لینا تھا کہ وہ کیا کہتا ہے؟

"ایک حد تک تمہاری بات درست ہے۔" وہ ایک جگہ رکا، ہم بھی رک گئے، گرد و پیش پر اس نے ایک گہری اور محتاط نظر ڈالی اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "دو تین کلومیٹر کے بعد اس راجدھانی کی اندرونی سرحد شروع ہوتی ہے، اصل خطرہ وہیں ہمارا منتظر ہے۔"

"تو کیا ان سے ٹکراؤ لازمی ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ان کی اندھیرے میں دیکھنے کی تیز حس رکھنے والی نظروں میں نہ آئے تو یہ اہم مرحلہ بغیر کسی ہنگامے کے طے ہو سکتا ہے، مگر اس کی امید کم ہی ہے۔" نانا شکور نے جواب دیا۔ "دیکھ لیے جانے کی صورت میں وہ سارے ہی تیر تفنگ اور تیز چوبی نرسلوں کے ساتھ ہم پر پل پڑیں گے۔"

"ہم..... مگر ہمارے پاس تو اسلحہ بھی نہیں ہے، ہم کیسے ان کا مقابلہ....." سوشیلا اچانک نانا شکور کو اپنی جانب سخت نظروں سے گھورتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ میرا ہولے سے مسکرانے کو جی چاہا تھا، تاہم بات رکھتے ہوئے فوراً ہی موضوع بدل کر نانا شکور سے بولا۔

"نانا صاحب! تمہیں یہاں کے ماحول کا کچھ تو تجربہ ضرور ہوگا، کوئی ایسی گزرگاہ ہو جسے اختیار کرتے ہوئے ہم ان وحشیوں کی نظروں میں آئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ سکیں؟"

"میں اسی پر غور کر رہا ہوں۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "لیکن میرا نہیں خیال کہ وہاں سے بھی ہم بہ آسانی ان کی اندرونی سرحد پار کر سکیں۔"

"کوئی بات نہیں، اگر ان سے حملہ ناگزیر ہوا تو پیچھے ہم بھی نہیں ہٹیں گے۔" میں نے کوہ شکن لہجے میں کہا تو نانا بولا۔

"میں بھی چاہتا ہوں کہ تم دونوں بھی ذہنی طور پر اس جنگ کے لیے تیار رہو، مگر تمہاری ساتھی مجھے ذرا تھڑدلی معلوم ہوتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے نانا صاحب! یہ بہت بہادر خاتون ہے....." میں نے سوشیلا کے بارے میں اس کی غلط فہمی دور کرنے کی سعی چاہتے ہوئے کہا۔ "میرے ساتھ یہ اب تک اس سے زیادہ خطرناک حالات میں، تنہا ہونے کے باوجود، کئی مواقع پر میری جان بھی بچائی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بار کی مہم ذرا مختلف نوعیت کی ہے تو اس نے محض احتیاط کے پیش نظر یہ بات کہی تھی۔"

"اچھا دفاع کیا تم نے اس کا۔" وہ بولا۔ "میں بس یہ چاہتا ہوں، تم دونوں خود کو ذہنی طور پر ہر قسم کے حالات کے لیے تیار رکھو، یہ ہماری جس قدر خطرناک مہم ہے اتنی ہی غیر یقینی بھی، کوئی بھی کسی وقت بھی، چشم زدن میں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ سکتا ہے، جیسے ابھی میرے دونوں ساتھی مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے۔ چلتے رہو۔" وہ یہ کہہ کر آگے بڑھتا رہا اور رکے ہم بھی نہیں۔

ہم بہت محتاط ہو کر آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ قدِ آدم جھاڑیوں اور سیاہ چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چاند کی روشنی میں بھی چٹانوں کی سنگلاخ سطح چمکتی نظر آ رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر نانا شکور رک گیا۔ پھر ہماری طرف مڑ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے ہمیں نہ صرف رکنے کا بلکہ خاموشی اختیار کیے رکھنے کا بھی اشارہ کیا۔

میں اور سوشیلا قدرے ٹھٹک کر رک گئے۔ ہم نے

دیکھا وہ کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا اور پھر چند سیکنڈوں کے بعد ہم سے قدرے نیچی آواز میں، ان کالی چٹانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"ان چٹانوں کے پیچھے کچھ لوگ آباد ہیں...... ذرا اب دھیان سے قدم آگے بڑھانا اور میرے ایک ذرا بھی اشارے کو رد نہ کرنا...... آؤ......" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا، میں اور سوشیلا جیسے پھونک پھونک کر آگے قدم بڑھانے لگے۔

ہم تینوں اب ایک نسبتاً بلند چٹان کی سنگلاخ سطح پر سینے اور کہنیوں کے بل پر عمودی رخ پر رینگ رہے تھے۔ نانا شکور نے اب "ترتیب" بدل دی تھی۔ ہم تینوں اب ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ رہے تھے۔

سرے پر پہنچ کر نانا شکور نے ہمیں وہیں دبکے رہنے کو کہا اور پھر خود چٹانی سرے سے اپنا ذرا سا سر ابھار کر دیکھا، میری اور سوشیلا کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں کہ اس نے ہمیں بھی ذرا اوپر کھسک آنے کا اشارہ دیا۔ میں اور سوشیلا بیک وقت رینگ کر سرے پر آ گئے۔

میں نے دیکھا، دوسری سمت ایک نیم جنگلاتی سی وادی سی تھی جہاں جابجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور ان کے دامن میں مجھے دو سفید رنگ کے "سیلانی خیمے" نصب دکھائی دیے۔ ایک بڑی سی گاڑی کھڑی تھی، خیمے کے سامنے الاؤ روشن تھا، جس کے گرد کچھ لوگ بیٹھے دکھائی دیے۔ ان کے پاس رائفلیں تھیں، یہ سب چونکہ اتنی دور سے ہیولوں کی صورت نظر آ رہے تھے اسی لیے ان کے چہرے نہیں پہچانے جا رہے تھے۔ تاہم اپنی وضع قطع سے ان میں ایک جوان عورت بھی دکھائی دیتی تھی، باقی تین چار کے قریب مرد تھے، ممکن تھا ایک دو خیمے کے اندر بھی موجود ہوتے۔

"یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟"

"شاکا گروپ......" نانا شکور سرسراتے لہجے میں بولا۔

"لیکن یہ تو یہاں بڑے آرام سے موجود ہیں؟" میں نے کہا۔ "جبکہ تمہاری ساتھی جاسوس ڈولی نے بھولا ناتھ کے ڈورا ڈوری کلب سے ان کے بارے میں جو معلومات دی تھیں، اس کے مطابق یہ گروپ کسی مصیبت کا شکار ہو چکا تھا، جس کا صاف مطلب ہے کہ وہ لوگ کلی منجارو کی آبادی والے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔"

"میرے ذہن میں اس وقت کسی اور گروپ کا تصور نہیں آ رہا۔" نانا شکور بولا۔ "اگرچہ ڈولی کی آخری انفارمیشن کے مطابق بھولا ناتھ بھی ازخود اپنے ساتھیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ہے مگر اتنی جلدی اس سے مڈبھیڑ ہونے کی مجھے ابھی کوئی توقع نہیں۔"

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچ رہا تھا۔ یہ درست تھا کہ نانا شکور کے ذہن میں بھولا ناتھ کے سوا اور کسی گروپ کا تصور نہیں آ سکتا تھا، لیکن کم از کم میرے اور سوشیلا کے معاملے میں بالکل ایسا نہیں تھا۔

ڈولی کی معلومات بالخصوص میرے لیے زیادہ سنسنی خیزی کی حامل تھی۔ کیونکہ میری نظر میں ایک صرف شاکا کا گروپ (بھولا ناتھ کا ساتھی) نہیں تھا، کورنیلا سمیت لولوش کے ساتھیوں سے جی کوہارا کا بھی تھا۔

جیسا کہ لولوش کا یہ جلاد صفت ساتھی پورے انڈیا میں میرے خون کی بو سونگھتا پھر رہا ہوگا اور اس وقت تک اسے یقیناً اپنے سب سے بڑے حلیفی گروپ "بلیوٹکسی" کے کرنل بھجوانی سمیت اس کے نیست و نابود ہونے کا علم ہو چکا ہوگا۔ میری اس عظیم اور شاندار فتح پر لولوش سے لے کر باسکل ہولارڈ تک دنگ رہ گئے ہوں گے۔ کوہارا انڈیا میں بیک وقت دوہرے مشن پر کاربند تھا، ایک مجھے قیدی بنا کر لولوش کے حوالے کرنا چاہتا تھا، دوسرے وہ جنرل کے ایل ایڈوانی کے قبضے سے طلسم نور ہیرا حاصل کرنا چاہتا تھا۔

یہ بات میرے ذہن میں آئی تھی کہ جس طرح بھولا ناتھ مجھے زیر کرنے کے لیے میرے تینوں قیدی ساتھیوں کو یرغمال بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، اس کی بھنک اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہوگی اور اس نے بھی اپنے چند بری ساتھیوں کے ساتھ یہاں کا رخ کیا ہو۔

یہ بات میں اپنے ذاتی تجزیے کے علاوہ ڈولی کی نانا شکور کو فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں کہہ سکتا تھا لیکن ڈولی نے اور بھی بہت سے گروپس کا ذکر کرنے کے ساتھ یہ اطلاع بھی دی تھی کہ ان میں سے ایک گروپ نے ان وحشی قبائلیوں پر اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔

اب پتا نہیں وہ کون سا گروپ تھا؟ اور اس نے کلی منجارو پر کس نوعیت کی اپنی عمل داری قائم کر لی تھی، آیا انہیں زیر کر کے اپنا غلام بنا لیا تھا یا پھر یہ کسی ایسے معاہدے یا دوستانہ تعلقات کی بنا پر انہیں اپنا حلیف بنانے پر مجبور کر دیا گیا ہوگا...... یہ کون لوگ ہو سکتے تھے، اس کے بارے میں ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

"یہ لوگ بلیوٹکسی کی باقیات اور ان کے حلیف ساتھیوں کا ہی گروپ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا تو نانا شکور

"تمہارا مطلب ہے یہ لوگ بھولا ناتھ کے آدمی (شاکا وغیرہ) نہیں ہو سکتے؟"

"یہی مطلب ہے میرا......" کہتے ہوئے میں نے اسے کوریلا اور سے جی کو ہارا کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا۔ اگرچہ بلیو تمسی کے ساتھ میری دیرینہ چپقلش کے متعلق گھوترا جی نے بھی اسے سرسری بتایا ہوگا، تاہم صراحت جاننے کے بعد اسے بھی میری بات سے متفق ہونا پڑا۔

"ان سے جنگ ناگزیر ہے تو ٹھیک...... ورنہ خاموشی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔" نانا شکور نے مشورہ دیا تو میں نے کہا۔

"سرِدست یہی بہتر رہے گا...... کیونکہ اس وقت ہمارا اصل ٹارگٹ یہاں کسی دشمن گروپ سے بھڑنا نہیں، اپنے ساتھیوں کو چھڑا کر بہ خیریت یہاں سے واپس لے جانا ہے......"

"صحیح...... آجاؤ پھر اس طرف......" میری رائے لینے کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے ایک طرف کو رینگ گیا۔

ہم تینوں اس سیاہ چٹانی ڈھلان کی آڑ میں اسی طرح کہنیوں اور سینے کے بل پر رینگتے ہوئے دوسری سمت کی طرف بڑھنے لگے۔ نانا شکور کے مطابق آبادی والا علاقہ کچھ زیادہ دور نہ تھا، اس سیاہ چٹانی وادی کے پیچھے کلی منجارو آباد تھے۔

کافی آگے جا کر ہم نے اپنے پیروں پہ چلنا شروع کر دیا۔ الاؤ اور وہ سیلانی خیمہ دور رہ گیا تھا۔ اب دیکھ لیے جانے کا کوئی خدشہ نہ تھا۔ ہم تینوں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ دفعتاً ہی ہم ایک عجیب سی ابھرنے والی آواز پر چونک پڑے۔ یہ بگل سے مشابہ آواز تھی۔

"رک جاؤ......" معاً ہی نانا شکور نے سرگوشی میں کہا اور ساتھ ہی ڈھلان میں ابھری جھاڑیوں کی آڑ میں ہو گیا، میں اور سوشیلا بھی اس طرف آ کر دبک گئے۔

"یہ کیسی آواز تھی؟" سوشیلا کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

"شاید ہم دیکھ لیے گئے ہیں......" نانا شکور نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ "بگل نما یہ آواز نرسنگے سے بجائی گئی ہے۔"

"او......" میرے منہ سے تشویش زدہ آواز خارج ہوئی۔

"اپنے گرد و پیش سے چوکنا رہتے ہوئے آگے بڑھتے رہو......" کہتے ہوئے نانا شکور نے حرکت کی اور ہم اس کی تقلید میں آگے بڑھنے لگے۔ یہاں چٹانی ڈھلان میں جابجا خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جلد ہی مجھے اپنے دیکھ لیے جانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس چٹان کی پتھریلی سطح ہی نہیں بلکہ جھاڑیاں بھی چقماق کی خصوصیت رکھتی تھیں جو ہمارے بھاری جوتوں کی رگڑ سے جگنو جیسی چنگاری چھوڑ رہی تھیں۔ اس کا مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا جب میں نے اپنے اور نانا شکور کے پیروں تلے یہ جگنو چمکتے پائے تھے۔ میں نے فوراً نانا اور سوشیلا کو اس خطرے سے آگاہ کر دیا۔

ٹھیک اسی وقت ہمارے بائیں سمت تیز روشنی نمودار ہوئی...... ہم نے چونک کر اس طرف دیکھا اور چہرے ہمارے فق ہو گئے۔ وہ آتشی تیر تھے جو اس طرف پھینکے گئے تھے۔ ہماری پھٹی پھٹی آنکھیں ان پر جم کر رہ گئیں، ہم ان کے نشانے پر تو نہیں تھے، تاہم جب وہ ذرا فاصلے سے ہمارے دائیں بائیں جھاڑیوں میں گرے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ ہمارے ساتھ کلی منجارو وحشیوں نے کیسی خطرناک چال چلی تھی۔ بھڑکتے شعلوں میں بجھے ہوئے ان تیروں نے آناً فاناً جھاڑیوں میں آگ لگا دی تھی۔ آن کی آن میں ہم تینوں بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں نہا گئے اور اسی وقت ہمیں کہیں قریب ہی تیز وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی شور کی آواز ابھری۔

پہلی بار

دیہاتی پہلی بار کراچی آیا اور اسٹیشن سے نکل کر ایک ٹیکسی میں بیٹھا۔ ٹیکسی خوفناک گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی۔ زوردار جھٹکے سے آگے بڑھی لہراتی ہوئی اور نہایت تیز رفتاری سے کئی سڑکوں سے گزری۔ کئی آدمی اس کے نیچے آتے آتے بچے کئی گاڑیوں سے اس کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ دیہاتی کی گھگھی بندھ گئی۔ آخرکار اس نے ڈرائیور کا کندھا ہلایا اور عاجزانہ لہجے میں بولا۔

"بھائی صاحب، ذرا آہستہ چلائیں، میں پہلی بار ٹیکسی میں بیٹھا ہوں۔"

اس پر ڈرائیور نے گونج دار قہقہہ لگایا اور بولا۔ "خوچہ! فکر مت کرو...... اگر تم پہلی بار ٹیکسی میں بیٹھی اے...... تو ام بھی پہلی بار ٹیکسی چلا رہی اے...... حساب برابر اے......"

☆☆☆

کی [illegible]، فلش گن، سسٹم کو سمجھنے میں ہمیں چنداں دیر نہ لگی تھی۔

"بھاگو اس طرف...... ورنہ ہم پر تیروں کی بارش ہو جائے گی......" نانا شکور یہ کہتے ہی دوڑا، میں اور سوشیلا بھی اس کے عقب میں دوڑے...... چلوں پہ تیر چڑھ چکے تھے، کیونکہ اگلے ہی لمحے ہمارے اردگرد تیر گرنے لگے۔ ہم میں سے کوئی کسی بھی وقت ان تیروں کی بے رحم بوچھاڑ کی زد میں آسکتا تھا اور کیا خبر ان کی انیاں زہر میں بجھی ہوئی ہوں۔ ہمارے اردگرد جلتی سلگتی جھاڑیوں نے جہنم کا منظر بنا رکھا تھا۔ اس کی تپش سے ہم پسینے میں نہا گئے تھے، یہ ہمارے لیے دہری تہری مصیبت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ ایک طرف اس کی روشنی ہمیں دشمنوں کی نظروں میں نمودار کیے ہوئے تھی تو دوسری طرف یہ ہمارے لیے تیز تپش کا باعث بن رہی تھی۔

"نانا...... ! ہمیں جلدی کسی محفوظ پناہ گاہ کی طرف پہنچنا ہوگا، ورنہ......"

"آہ......" میری بات حلق میں ہی رہ گئی، اسی وقت مجھے سوشیلا کی کراہ آمیز چیخ سنائی دی اور میں نے اسے منہ کے بل گرتے دیکھا۔ میں گھبرا گیا اور اسے آگے بڑھ کر سنبھالنا چاہا تو اسی وقت میری نگاہ اس کے پاؤں پر پڑی۔ اس کی پنڈلی پر ایک تیر پیوست تھا، وہ اپنی ٹانگ پکڑے کراہنے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دم تیر کو کھینچ کر نکال دیا، سوشیلا مارے اذیت کے مرغ بسمل کی طرح تڑپ گئی، میں نے اسے خود سے بھینچ لیا، وہ بھی مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کی جاں گسل تکلیف کو گویا میں نے اپنے اندر سمونا چاہا تھا اور اسے کافی سکون ملا تھا مگر وہ ہولے ہولے سسکنے لگی اور درد سے کراہنے بھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور وہیں بیٹھ کر اس کے زخم کو دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں سے دبا کر گندا خون نکالا تاکہ زہر کا کم سے کم اثر ہو۔ وہ ابھی ہوش تھی اور کراہ رہی تھی۔

"آہ...... شہزی! میں اب نہیں چل سکتی، تم دونوں چلے جاؤ، ورنہ مارے جاؤ گے میری وجہ سے......" اس نے کراہتے ہوئے قدرے دکھ بھری آواز میں کہا تو میرا جی کٹ کر رہ گیا۔

"کیسی بے وقوفوں جیسی باتیں کر رہی ہو، میں بھلا تمہیں اس حالت میں چھوڑ سکتا ہوں، چلو......" کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ نانا شکور بھی سوشیلا کی حالت پر تشویش زدہ تھا۔ ہم مزید وقت ضائع کیے [illegible] آگے بڑھے اور اس طرف سے بچ کر گزرنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں جھاڑیوں نے آگ پکڑ رکھی تھی۔ جلد ہی مجھے ایک اندھیری دراڑ نظر آگئی۔ فوراً ہی ہم اس اندھیری دراڑ میں داخل میں ہوگئے۔ یہاں مجھے اندازہ ہوا کہ دراڑ اندر سے خاصی گہری تھی۔ ہم تینوں اس میں بہ آسانی سما گئے۔

میں نے نانا کے ہاتھوں سے ٹارچ لے لی تھی، اسے روشن کر کے دراڑ کا جائزہ لیا تو مجھ پر ایک خوش کن انکشاف ہوا کہ یہ اندر سے غار کی طرح تھی اور یقیناً یہ کسی دوسری طرف کھلتا تھا۔

فوری طور پر ہم خطرے سے بچ گئے تھے، مگر خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ دراڑ کا سرا تنگ تھا مگر اندر سے یہ کشادہ تھی۔ ہم اس میں سما کر بیٹھ گئے تھے۔ کھلے سرے سے باہر جھاڑیاں جلتی ہوئی اب بھی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اب بجھنے کے قریب تھیں۔

"نانا...... ! تم سرے پر ذرا جا کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی بھی خطرے کو محسوس کرتے ہی مجھے بتاؤ...... میں تب تک سوشیلا کے زخم کا جائزہ لیتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا اور وہ فوراً اٹھ کر اس طرف کھسک گیا۔

اس کے بعد میں نے سوشیلا کو غار نما دراڑ کی پتھریلی زمین پر لٹا دیا اور اس کی پتلون کے پائنچے کو اوپر گھٹنے تک کھینچ دیا۔ زخم پر میں نے ٹارچ کی روشنی پھینکی تو وہاں سے مجھے خون رستا ہوا نظر آ رہا تھا اور زخم کے گرد نیلاہٹ ابھرنے لگی تھی۔

میں نے اسی کی پینٹ کو پائنچے سے پھاڑ کر اس کی پٹی بنا دی اور زخمی پنڈلی کے گرد باندھ دی۔ پھر سوشیلا کے چہرے کا جائزہ لینے لگا، جو بری طرح ستا پڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ پورا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پیشانی کو چھوا تو وہ تپ رہی تھی۔ وہ تیز بخار میں بھی جلا تھی۔ اگرچہ پسینا آنے کی صورت میں بخار کی شدت کم ہو سکتی تھی، لیکن لگتا ایسا ہی تھا جیسے تیر کی انی تیز اور سریع الاثر زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

ہماری ادویات وغیرہ کا سارا سامان جیپ سمیت چائی کے جنگلی دلدل میں غرق ہو چکا تھا۔

"شہزی!" اچانک مجھے نانا نے پکارا...... میں چونکا اور اس کی طرف متوجہ ہوا، اس کی نگاہیں دراڑ کے سرے سے باہر جمی ہوئی تھیں، میں اس کی طرف کھسکا اور باہر جھانکا۔ وہاں اب جلی ہوئی جھاڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا، [illegible] جلتی ہوئی جھاڑیوں کے بجھنے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے مدہم پڑ چکی تھی مگر وہاں اب اس کی جگہ روشنی کے دوسرے مخرج نے لے لی تھی۔ ننگ دھڑنگ وحشیوں کا ایک غول تھا، جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں جلتی ہوئی بانس اور پھونس کی مشعلیں اٹھا رکھی تھیں، ان کی ننگی سیاہ پشت سے لمبے کمان اور ترکش بندھے ہوئے تھے، کچھ کے ہاتھوں میں نیزے اور سنان نظر آرہے تھے، ان کی تعداد دس، پندرہ کے قریب تھی۔

"یہ ہمیں اس دراڑ میں تلاش لیں گے، شہزی!" نانا شکور نے کہا۔ اس کا کہنا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ اگر ہم اس خوش فہمی میں رہتے ہوئے یہاں مزید ڈیرا ڈالے رہتے کہ یہ دراڑ ان کی نظروں میں نہیں آسکتی تھی تو یہ ہماری بہت بڑی بےوقوفی ہوتی۔

"آؤ جلدی....." میں نے اس سے کہا اور پلٹا۔ جب سوشیلا کی طرف آیا تو میرا چہرہ ایک دم فق ہوگیا۔

اس کی ٹانگ زخم کی طرف سے سوج گئی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اب چلنے پھرنے سے بالکل قاصر ہو چکی تھی جبکہ وہ ہنوز نیم بےہوشی کے عالم میں تھی اور درد سے بھی ہولے ہولے کراہ رہی تھی۔ اس بےچاری کی ہیئت کذائی پر میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اسے فوراً سنبھال کر اپنے کاندھے پر اٹھانا چاہا تو وہ کراہ کر بولی۔

"میں سہارے سے چل لوں گی، کب تک مجھے تم اٹھاؤ گے....."

"شاباش سوشی! ہمت کرو..... اٹھو!" میں نے اسے مزید حوصلہ دیا۔ میرا دل اندر سے اس کی قابلِ رحم حالت پر کڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا، نانا شکور نے ہمیں آگے چلنے کو کہا اور خود ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ سوشیلا میرے سہارے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

اسی وقت عقب میں ہمیں دراڑ کے سرے پر مختلف آوازوں کا شور سا سنائی دیا۔ میرا دل ایک دم نازل ہوتے خطرے کی بو کو محسوس کرتے ہوئے بری طرح دھڑدھڑانے لگا۔

"اپنی رفتار تیز کرو..... یا اسے اپنے کاندھوں پہ اٹھالو....." معاً عقب سے نانا شکور کی پُرتشویش سی آواز سنائی دی۔ "وہ لوگ شاید دراڑ کے اندر داخل ہوگئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی میں نے اور کچھ نہیں سوچا اور سوشیلا کے نرم و نازک جسم کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا، اس کے حلق سے ہلکی سسکاری خارج ہوئی تھی۔ میں اسے اٹھائے تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔

باذوق پاکیزہ قارئین کے لیے خوشخبری
زندگی کے تلخ و شیریں حقائق کو نہایت مہارت سے پُراثر الفاظ کا جامہ پہناتی
بے شمار یادگار تحریروں کی خالق
شیریں حیدر
کی ایک اور دلکش و دلربا سلسلے وار تحریر
امرت
انشاءاللہ جلد ہی پاکیزہ صفحات کی رونق دوبالا کرنے جا رہی ہے.....

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کلی منجارو افریقی نسل کی ایک وحشی قوم سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کا مہذب دنیا سے کوئی لاحقہ نہ تھا، یہ دشمن کو دیکھتے ہی اسے کوئی موقع دیے بغیر بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ ان سے رحم یا کسی "موقع" کی ذرا بھی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔

ہم بھی نہتے ہی تھے، جبکہ ان وحشیوں کے پاس جدید ہتھیار نہ سہی لیکن ہم نہتوں کے مقابلے میں تو یہ بہرحال مسلح ہی تھے۔ یوں بھی تیر، سنان اور بھالے کم خطرناک نہیں ہوتے...... پل بھر میں گوشت پوست کے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار ڈالتے ہیں، پھر تعداد میں بھی زیادہ تھے، سوشیلا زخمی تھی۔ اس کی ٹانگ سوج رہی تھی اور پتا نہیں کب تک یہ عمل جاری رہتا تھا۔

"وہ قریب آنے لگے ہیں، ہمیں اب رک کر ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا......"

معاً ناتا نے کہا اور مجھے رکنا پڑا۔ ذرا پیچھے گردن گھما کر دیکھا تو تنگ و تاریک غار نما دراڑ میں آگ جیسی روشنی کو سلگتے دیکھا جو ان وحشیوں کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی سرکنڈوں اور بانس کی مشعلوں کی تھی، جس کا صاف مطلب تھا کہ ان لوگوں کو ہماری یہاں دراڑ کے اندر موجودگی کا احساس ہو چکا تھا۔

ان وحشیوں کی فطرت تھی کہ یہ لوگ ہجوم کی صورت میں وارد ہوتے تھے اور دشمن کو دیکھتے ہی غل غپاڑا مچانا شروع کر دیتے تھے۔ وہ شاید اس طرح دشمن کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کرتے تھے۔ میں نے سامنے دیکھا، دراڑ نما غار آگے سے داہنی جانب گھوم رہی تھی۔ میں نے ناتا سے کہا۔

"اس موڑ پر پہنچو......"

وہ شاید میرا مقصد سمجھ گیا تھا اور بلا چون و چرا اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔

موڑ کاٹ کر میں رک گیا۔ سوشیلا کے بے سدھ وجود کو پتھریلی زمین پر آہستگی سے رکھنے کے بعد میں پلٹا۔ دیکھا تو ناتا شکور اپنی پنڈلی والی نیام سے خنجر نکال چکا تھا، میں نے بھی یہی کیا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"یہ دراڑ اتنی چوڑی نہیں ہے کہ یہ سب وحشی ایک ساتھ ہم پر پل پڑیں...... اس لیے ایک ایک کو ہم بہ آسانی ڈھیر کر سکتے ہیں......" میں نے کسی خیال کے تحت ناتا سے کہا۔

"لیکن...... زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکے گا، یہ لوگ موقع محل کے مطابق اپنی حکمت عملی بدل سکتے ہیں۔" وہ بولا۔ "اب بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے، تم سوشیلا کو لے کر نکل جاؤ، مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں ان وحشیوں کا مقابلہ کرتا رہوں گا اور راستہ روکے رکھوں گا۔"

اس کی بات نے مجھے ہولا کر رکھ دیا، بولا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو ناتا......؟ میں ہرگز تمہیں ان وحشیوں کے رحم و کرم پر تنہا نہیں چھوڑوں گا۔" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک کلی منجارو کا غول قریب آ گیا۔ ہمیں مزید بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا کہ دو وحشیوں کو سنان سنبھالے موڑ سے نمودار ہوتے پایا۔ انہیں ہماری گھات کا اندازہ نہ تھا، اس لیے وہ اپنی جھونک میں جیسے ہی موڑ کاٹ کر ہمارے سامنے ابھرے تو ہم دونوں کے نرغے میں آ گئے، ایک کی گردن پر ناتا نے اپنے خنجر کی تیز دھار آزما ڈالی، اس وحشی کی شہ رگ کٹتے ہی خون کا فوارہ اس کی گردن سے اٹھا اور ناتا شکور کا چہرہ نہا گیا۔

دوسرے وحشی نے فوراً سنبھالا لینا چاہا اور ناتا پر اپنی سنان سے وار کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ میں نے خنجر ایک خاص ٹرک سے اس کی طرف اچھال دیا جو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ترازو ہو گیا۔ وہ اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کر کے گرا، تو ناتا اور میں نے بیک وقت پھرتی سے ان مردہ وحشیوں کے ننگے ہتھیاروں پر قبضہ جما لیا۔

ترکش اپنی پشت پر باندھنے کا ابھی ہمارے پاس موقع نہ تھا، تاہم ان کے تیز انیوں والے سنان ہم نے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

وحشیوں کو شاید ابھی تک اپنے ساتھیوں کے انجام کا صحیح طرح اندازہ نہیں ہو پایا تھا، اگرچہ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کی لرزہ خیز چیخ بھی سنی تھی لیکن اگر ان میں اتنی عقل ہوتی تو یہ وحشی ہی کیوں کہلاتے۔

بہرکیف ہمارے ہاتھوں اسی "جھونک" میں اپنے مزید چار پانچ ساتھیوں کی جانیں گنوانے کے بعد ہی انہوں نے محتاط روش اختیار کی اور پہلے تو انہوں نے چیخنا چلانا بند کیا، اس کے بعد اجنبی زبان میں نیچی آوازوں میں کچھ بولنے لگے۔ ان کی جلتی ہوئی مشعلوں کی روشنی اندر بھی پڑ رہی تھی۔

ہمارے پاس جو جدید اسلحہ تھا وہ پچائی کے جنگل میں غرق ہو گیا تھا۔ ورنہ ان باقی ماندہ وحشیوں کے لیے تو ایک دستی بم یا برسٹ ہی کافی تھا۔

"سوشیلا کو اٹھاؤ جلدی......" ناتا نے مجھ سے کہا۔ چند

سیکنڈوں میں ایک بار پھر سوشیلا میرے کاندھوں پر تھی۔

''نکل چلو اب......'' نانا نے کہا اور پھر ہم نے پیش قدمی شروع کردی۔

ایک مشعل ہمارے ہاتھ لگ گئی تھی، اسی کی روشنی میں ہم اس اندھیری دراڑ میں آگے بڑھتے رہے جبکہ نانا شکور میری طرف پیٹھ کیے بڑھ رہا تھا...... اس نے اب سنان چھوڑ کر تیر کمان ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور چلے پر ایک تیر بھی چڑھا رکھا تھا۔

اسے اپنے عقب میں (سامنے) جو بھی کوئی متحارو نظر آتا وہ اسے تیر کا شکار بنا ڈالتا۔ اس کی یہ حکمت عملی مجھے کارآمد لگی...... مگر بدقسمتی سے الٹے پیروں چلنے کے باعث ایک جگہ قدرے ابھری ہوئی پتھریلی سطح پر اس کا پاؤں رپٹا اور وہ پیچھے آرہا۔ یہ تو شکر تھا کہ میں آگے بڑھتے ہوئے پیچھے بھی گاہے بگاہے نگاہ ڈالتا آرہا تھا، میں نے اسے گرتے دیکھا تو رک گیا، اسے سنبھالا دینے کے لیے میں نے ابھی سوشیلا کو زمین پر لٹایا ہی تھا کہ دو وحشیوں کو خونخوار سی چیخیں مارتے ہوئے، گرے پڑے نانا شکور پر جھپٹتے دیکھا، سوشیلا کو اسی حالت میں چھوڑ کر میں سنان بکف ان کی طرف دوڑا۔

ایک نے مجھ پر اپنا نیزہ پھینکنا چاہا، جو دراڑ کی تنگ اور نیچی چھت کے درمیان اٹک کر رہ گیا، وہ اسے سیدھا کر ہی رہا تھا کہ میں نے سنان اس کے ننگ دھڑنگ پیٹ میں بھونک دی۔ وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا تو دوسرے وحشی کو نانا سے نبرد آزما ہوتے دیکھا لیکن، دوسرے ہی لمحے میں نے اس وحشی کی بھی آخری چیخ سنی، نانا نے اس پر شاید اپنے مہلک خنجر سے وار کیا تھا۔

اسی وقت دو تین مزید وحشیوں کو در آنے کا موقع مل گیا۔ اس تنگ اور نیچی چھت والی غارنما دراڑ میں یہ ہولناک جنگ بڑی کٹھن اور خطرناک تھی۔

کئی ایک مواقع پر میرے ہاتھ سے سنان چھوٹ گئی تھی۔ ایک وحشی موقع تاک کر چیختا ہوا مجھ پر پل پڑا۔ ہم دوبدو ہوگئے، اس کم بخت نے میری گردن دبوچ لی۔ اس کا چہرہ بڑا ہی مکروہ اور بدبو چھوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا مجھے۔

میں نے اس کے پیٹ میں اپنی داہنی ٹانگ کا گھٹنا رسید کردیا۔ وہ منہ پھاڑ کر حلق کے بل چیخا تو انتہائی ناگوار ... بو کا بھبکا میرے چہرے اور نتھنوں سے ٹکرایا۔ اف...... اس قدر تیز اور زہریلی... بو تھی کہ میرا جی الٹ گیا۔ مجھے قے سی ہوگئی حالانکہ میں مضبوط دل گردے کا آدمی تھا۔ نانا شکور اب کافی سنبھل چکا تھا۔ وہ بھی ان سے نبرد آزما تھا۔

تب ہی میرے کانوں سے سوشیلا کی چیخ ٹکرائی۔ میں اس طرف پلٹا اور دنگ رہ گیا۔ ایک وحشی اسے ٹانگ سے پکڑ کر کسی منحوس عفریت کی طرح گھسیٹے لے جارہا تھا۔ میں اس طرف دوڑا تو اسی وقت ایک وحشی نے عقب سے میری ٹانگوں کو دبوچ لیا یہ وہی تھا جس کے پیٹ میں، میں نے اپنا گھٹنا رسید کیا تھا، وہ شاید خاصا سخت جان ثابت ہوا تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی مجھے ٹانگوں سے دبوچ لیا تھا۔ میں منہ کے بل گرتے گرتے بچا اور سنگلاخ دیوار سے ٹکرایا، پھر پلٹ کر اپنی ایک ٹانگ چھڑائی اور وہی اس کے چہرے پر دے ماری۔ بھاری بوٹ کی ٹو نے اس کا گال پھاڑ ڈالا۔ وہ چیخ کر وہیں بے حس و حرکت نظر آنے لگا۔

میں نے اس سمت دیکھا جدھر ایک وحشی سوشیلا کو اٹھائے بھاگا تھا وہاں اب وہ نظر نہیں آیا۔ میں اندر سے ہول گیا، میں نے پلٹ کر ایک نگاہ نانا شکور پر ڈالی، وہ دو وحشیوں کے نرغے میں آچکا تھا۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے اسے یوں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا، لہٰذا میں اس کی مدد کو بڑھا، ایک وحشی نے اپنی سنان کا رخ میری جانب کر کے اچھالا۔ میں پھرتی کے ساتھ ایک طرف ہو کے خود کو اس سنان کی مہیب نوک سے بچا تو گیا تھا، مگر اس کی انی میرے بائیں بازو میں ضرور پیوست ہوگئی، میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔ میں ڈھنے لگا تھا کہ یکدم نانا شکور نے اس وحشی کو نجانے کیا داؤ آزما کر گرا ڈالا، جس نے سنان سے میرا وجود گھائل کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ نانا شکور کے اوپر گرا تھا کہ میں نے بھیانک چیخ سنی، میں دہل گیا، سمجھا یہی تھا کہ نانا شکور اس کی زد میں آگیا ہے، مگر ایسا نہ تھا، بلکہ اس کے اوپر گرنے سے نانا شکور کو اس پر اپنا خنجر آزمانے کا موقع مل گیا تھا۔

''اٹھو شہزی! دوڑو...... ان کی تعداد بڑھتی جارہی ہے......'' نانا شکور بولا۔

''اس طرف آؤ...... ایک وحشی سوشیلا کو اٹھا لے گیا ہے......'' میں نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھے ہوئے نانا سے کہا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اپنے زخمی بازو کی پروا کیے بغیر دیوانہ وار آگے بڑھا جارہا تھا، سوشیلا کی طرف سے مجھے بے انتہا تشویش کھائے جارہی تھی۔ وہ وحشی کے قبضے میں تھی اور وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ وہ اگرچہ اکیلا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے سوشیلا کو جا دبوچا تھا اور آن ہی آن میں اسے لے اڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ خبیث وحشی سوشیلا کو

لیے کسی بھی وقت اپنے ساتھیوں سے جاملتا یا پھر اسے لیے اپنے قبیلے کی طرف کا رخ کرتا۔ میں ہاتھوں کو ٹٹولنے کے انداز میں اس تنگ و تاریک غار نما دراڑ میں جتنی تیزی کے ساتھ چل سکتا تھا، چلا جا رہا تھا، مجھے اس بات کی بھی کوئی پروا نہ تھی کہ نانا شکور میرے عقب میں آ رہا تھا یا نہیں، بس ایک دیوانہ دھن سوار تھی اس وقت میرے سر پہ کہ سوشیلا کو جو وحشی دبوچ کر بھاگا تھا، مجھے اسے نہیں چھوڑنا تھا۔

اچانک مجھے ذرا ہی فاصلے پر سوشیلا کی چیخ سنائی دی۔ میری تشویش فزوں تر ہوگئی، میں نے پل کے پل مزید چند گز کا فاصلہ تیزی کے ساتھ طے کیا اور مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی، یہ یقیناً دراڑ کا دوسرا سرا تھا اور روشنی باہر چٹکی ہوئی چاندنی کی تھی۔

ٹھیک اسی وقت مجھے اس روشنی میں سرے پر اس وحشی کا ہیولا دکھائی دے گیا، جس نے کاندھے پر کسی کو اٹھا رکھا تھا، وہ بھلا سوشیلا کے سوا اور کون ہوسکتا تھا۔ منزل کو قریب پا کر میری رگوں میں کیا پورے وجود میں پارا دوڑ گیا اور پھر میں محض چند پل میں اس وحشی کے سر پہ جا پہنچا۔ وہ دراڑ کے تنگ سرے سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس پہ جھپٹا مارتے وقت میرے حلق سے بھی مارے جوشِ غیظ کے ایک دہاڑ خارج ہوگئی۔

وحشی کی پشت پر میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کا گھونسا تان کر پوری قوت سے رسید کیا تھا کہ اس کے حلق سے مارے تکلیف کے خاصی زوردار چیخ نکلی۔ وہ لہرا کر گرنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کے کاندھے سے سوشیلا کو اچک لیا، وحشی نے اپنا شکار ہاتھ سے جاتے دیکھا تو سنبھل کر پلٹا اور خوف ناک غراہٹ سے مجھ پر جھپٹنے کی کوشش چاہی۔ میں نے اسے ٹانگ رسید کی، جو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔ سوشیلا مارے دہشت کے چیخے جا رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا اور بجلی کی سی تیزی سے تڑپ کر دوسری ٹانگ وحشی کے چہرے پر رسید کر ڈالی، اس کے لیے مجھے زمین سے اچھلنا پڑا تھا، کیونکہ میری ایک ٹانگ اس کے ہاتھوں میں تھی۔

شکر تھا کہ یہ سب کچھ دراڑ کے باہر سرے کے قریب ہو رہا تھا اور یہاں جگہ خاصی کھلی تھی۔ لامحالہ مجھے زمین پر گرنا پڑا، میں اٹھ بھی جاتا، مگر بدقسمتی سے میں زخمی بازو کے رخ پر گرا تھا اور وہ نیچے پتھریلی زمین پر دب کر کھل گیا۔ اذیت کی ایک تیز لہر سی میرے سارے وجود میں سرایت کر گئی اور میں بلبلا اٹھا، یہی سبب تھا کہ مجھے دوبارہ اٹھنے میں دیر ہوگئی۔

بدبخت وہ وحشی بھی کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوا تھا۔ مجھ سے اتنی مار پٹنے کے باوجود وہ تن کر کھڑا ہوگیا تھا اور اپنے مختصر سے جانگیے میں بندھے ایک عجیب ساخت کے خنجر نما آلے سے مجھے مارنے کو لپکا، میرے پاس فوری دفاع کے لیے وقت نہ بچا تھا، فقط یہی کرسکتا تھا کہ مہلک چر کے سے خود کو بچا پاتا، وہ بھی بہ مشکل، مگر ٹھیک اسی وقت میں نے اس کی گردن میں ایک تیر پیوست ہوتے دیکھا جو اس کی گردن کے آر پار ہو کر وہیں اٹک گیا تھا۔ وحشی کے حلق سے چیخ بھی خارج نہ ہوسکی اور وہ اسی طرح خنجر نما آلہ پکڑے، تیورا کر گرا۔

سوشیلا اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ گھسٹتی ہوئی میرے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی کہ نانا شکور کو میں نے دراڑ کے باہر پایا۔ اس کے ہاتھوں میں کمان تھی۔ اس وحشی کو نشانہ اسی نے ہی بنایا تھا۔

وہ میری طرف لپکا اور مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

”شکریہ نانا...... تم بروقت تیر نہ چلاتے تو......“

”تمہارے زخم سے دوبارہ خون رِسنا شروع ہوگیا ہے......“ وہ میری بات کاٹ کر گہری تفکیر سے بولا۔

”سوشیلا کو سنبھالو اور نکلنے کی کوشش کرو......“ میں نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر کہا۔ ”وہ وحشی یہاں بھی کسی وقت پہنچ سکتے ہیں۔“

میں نے اپنے زخمی بازو پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے نانا نے بھی مجھ سے کوئی بحث نہ کی اور زخمی سوشیلا کو سہارا دے کر اٹھا لیا۔ اس کے بعد ہم جتنی تیزی سے اس جگہ سے دور ہوسکتے تھے، دور ہوتے چلے گئے۔

ایک نسبتاً محفوظ مقام پر ہم نے ڈیرا جمایا۔ یہ دو عمودی دیوقامت چٹانی پتھر تھے، جن کے درمیان ... تنگ سی جگہ تھی، لیکن ہم تینوں اس میں بہ آسانی سما گئے تھے۔ یہاں قدِآدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔

ہمارے سیدھے ہاتھ کی طرف ایک چٹانی درہ نظر آتا تھا، عقبی رخ پر اندھیری کھائیاں تھیں، جبکہ سیدھے ہاتھ اور سامنے کے رخ پر نیم پہاڑی جنگل تھا اور شاید کوئی چشمہ یا ندی بھی قریب میں کہیں موجودگی کا پتا دیتی تھی، اس پار کیا تھا، یہ ہمیں نہیں پتا تھا، کیونکہ وہاں سے وقفے وقفے سے پانی کے چھپاکوں کی آواز آجاتی تھی۔

آسمان صاف اور روشن تھا۔ طباق چاند عین وسط میں سنہرے تھال کی طرح جیسے الٹا ہوا نظر آتا تھا۔ باقی چہار سو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ویرانی اور ایک عجیب سی تھکی ہوئی خاموشی کا راج تھا۔

نانا شکور نے اپنی شرٹ پھاڑ کر میرے زخمی بازو پر پٹی باندھ دی تھی۔ لیکن ہمیں سب سے زیادہ فکر سوشیلا کی ہو رہی تھی۔ نانا شکور نے میری پٹی کرنے کے بعد سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کا بھی جائزہ لیا تھا۔ خود میں نے بھی دیکھا تھا۔ یہاں چاند کی روشنی صاف پڑ رہی تھی۔ ٹارچ کہیں گر گئی تھی، مشعل بھی نہیں تھی اور نہ ہی ہم ایسی کوئی شے جلا سکتے تھے کہ کہیں ہمارے اس ٹھکانے کی دشمنوں کو خبر نہ ہو جائے۔ کلی منجارو دوبارہ بھی نمودار ہو سکتے تھے۔ اس خدشے کو اب تادیر جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا کہ کلی منجارو قبیلے کو ایسے دراندازوں کا علم ہو چکا تھا جو نہ صرف ان کی راجدھانی میں گھسے چلے آئے تھے بلکہ ان کے قبیلے کے بہت سے افراد ہمارے ہاتھوں مارے بھی جا چکے تھے۔ چونکہ کلی منجارو ایک وحشی اور آزاد قبیلہ تھا اور یہاں یقینا سرداری نظام ہو سکتا تھا۔ ایک ہی ان کا سردار ہو سکتا تھا، یا پھر وہ لوگ جنہوں نے بہ قول ڈولی کے ان کے اذہان غلام بنا لیے تھے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ بھی ہمارے لیے مربوط پلاننگ کر سکتے تھے جنہوں نے ان وحشیوں پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر رکھا تھا۔ کون ہو سکتے تھے یہ لوگ، اس کا پتا ابھی چلانا باقی تھا۔

ہمیں بھوک اور پیاس کا احساس ہونے لگا۔ بھوک کسی حد تک برداشت کی جا سکتی تھی، مگر پانی کے بغیر گزارا مشکل ہی تھا۔ میرے ہونٹ پیاس کی شدت سے خشک ہو گئے تھے اور یہی حال نانا شکور کا بھی تھا جبکہ سوشیلا کی حالت زیادہ قابلِ رحم تھی۔

اسے ہم نے ایک چٹانی دیوار کے سہارے پر ٹکا کر نیم دراز کر رکھا تھا۔ تھوڑی دیر تک سستانے کے بعد میں نے نانا شکور سے کہا۔

”ہمیں پانی کے چند گھونٹ درکار ہیں، مجھے قریب میں پانی کے ہلکے ہلکے چھپاکوں کی آواز تو سنائی دی ہے، تم یہاں محتاط ہو کر بیٹھو، میں دیکھ کر آتا ہوں......“

میری بات پر نانا شکور نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی جبکہ سوشیلا میری بات سن کر یکدم ہراساں سے لہجے میں بولی۔

”شش...... شہزی! تم کہیں نہیں جاؤ گے...... ادھر ہی رکے رہو، جائیں گے تو ہم ساتھ، کہیں تم کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جاؤ......“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

”تم میری فکر مت کرو...... سوشی! پانی ہماری ضرورت ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ پانی کا خاصا ذخیرہ کہیں قریب ہی موجود ہے۔ میں صرف دیکھ کر آتا ہوں، لیکن ابھی ہمارا ایک ساتھ نکلنا بہتر نہ ہوگا۔ ہم اکٹھے ہی آگے بڑھیں گے۔“

میں نے دیکھا اسے میری بات پر کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوئی، اس نے ایک نگاہ قریب کھڑے نانا شکور پر ڈالی اور اس سے ملتجیانہ انداز میں بولی۔ ”نانا صاحب! یہ بھی بے چارہ میری طرح زخمی ہے...... اسے مت جانے دو، تم ٹھیک ہو ذرا، تم ہی چلے جاؤ ناں......“

”میں تیار ہوں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ نانا شکور نے اپنے شانے اچکا کر کہا اور خاصی معنی خیز نظروں سے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم ادھر ہی رہو شہزی! مجھے جانے دو...... میرا خیال ہے پانی کی موجودگی اس طرف لگتی ہے۔“ اس نے آخر میں اسی سمت ہی اشارہ کیا تھا جہاں میرا بھی محتاط اندازہ تھا۔

وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اب وہاں چٹانی پتھروں کے اس مختصر سے دامن میں سوشیلا اور میں رہ گئے تھے۔

نانا شکور اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ وقت جیسے چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا تھا، جبکہ ایک ایک لمحہ اندیشوں بھرا محسوس ہوتا تھا۔ دھڑکتی رات اس اسرار بھری فضا میں شاید اپنے آخری پہر کے سفر کی طرف گامزن تھی۔ فضا سرد سی ہونے لگی تھی۔ مست خرام ہواؤں میں کمی کا احساس جوں کا توں موجود تھا۔ البتہ آسمان کی ہیئت کچھ بدلنے لگی تھی۔ وہاں میں نے بادلوں کو ڈیرا ڈالتے ہوئے دیکھا تو متفکر سا ہونے لگا۔

”شہزی! میں تو تم لوگوں کے لیے مصیبت بن گئی......“ معاً سوشیلا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تم لوگوں کے ساتھ آنے کی ضد نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا سا تھا اور آواز بے چارگی لیے ہوئے تھی، میں نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم سوشی! تم بھلا ہمارے لیے کیونکر مصیبت بن گئی ہو؟ زخمی تو میں بھی ہوں، اس میں بھلا تمہارا کیا قصور ہے؟“

اچانک کہیں گولی چلنے کی آواز گم بھری، ہم دونوں بری طرح چونک کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے کہ اس بار برسٹ چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میں نے جلد بازی میں کوئی حرکت کرنے کے بجائے آواز کی سمت کا اندازہ لگایا

اور نانا شکور کی طرف سے مجھے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ جس طرف... گیا تھا وہاں ایسا کچھ نہیں تھا، ورنہ میں اسی طرف کا رخ کرتا۔

یہ آواز اس طرف سے آئی تھی، جدھر ہم نے تھوڑی دیر پہلے وہ سیلانی خیمہ دیکھا تھا۔ جہاں کچھ اسلحہ بدست لوگ الاؤ جلائے بیٹھے تھے اور ان کے ہمراہ ایک جوان عورت بھی تھی۔

”یہ...... فائرنگ کی آواز کیسی ہے؟“ سوشیلا نے کہا۔ میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اس سے کہا۔

”مجھے صورتِ حال کا جائزہ لینا ہوگا، تم گھبرانا مت، میں ابھی آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اس طرف کو بڑھا جدھر سے فائرنگ کی آواز آئی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ دوبارہ برسٹ چلا۔ اس بار آواز کچھ قریب سے آئی تھی۔ میں نے ایک چٹانی ٹیلے پر چڑھ کر دوسری طرف نیچے ذرا دور جھانکا، چاند کی روشنی وہاں تک پھیلی ہوئی ضرور تھی مگر اس طرف گھنے درختوں اور قد آدم جھاڑیوں کی کثرت کے باعث کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ میں کچھ سوچ کر واپس پلٹا اور چاہتا تھا کہ نانا شکور کے پیچھے جاؤں، میں نے اسے سوشیلا کے پاس دیکھ لیا تو سکون کی سانس لی۔

”یہ فائرنگ کی آواز کیسی تھی؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”لگتا ہے یہ سیلانی خیمے والے تھے، کیونکہ آتشی ہتھیار ان کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے، ان لوگوں کا بھی شاید ان وحشیوں سے ٹکراؤ ہو گیا ہے۔“ میں نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“ نانا شکور بولا۔

”ہرگز نہیں۔“ میں نے اس کے خیال سے صریحاً اختلاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اب یہاں سے ہلنا بھی مت اور ادھر ہی سوشیلا کے پاس رکے رہو...... میں ذرا آگے جا کر......“ آواز میرے منہ میں ہی دب گئی۔

اسی وقت دوبارہ مختصر سا برسٹ فائر ہوا جو بے حد قریب تھا۔ یہاں تک کہ مجھے ایک سے زائد افراد کی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔ میرے اعصاب یک لخت تن گئے۔ میں نے نانا شکور کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر وہ میرا اشارہ سمجھ کے ایک طرف کو آگے بڑھا اور میں نے اپنی پیش قدمی کا رخ اس طرف موڑا جدھر سے مجھے فائرنگ اور چیخوں کی آواز آئی تھی۔ اچانک مجھے کسی کے دوڑنے اور ہانپنے کی آوازیں سنائی دیں، وہ نائٹ پینٹ شرٹ میں ملبوس آدمی تھا، اس کے ہاتھ میں گن تھی، ٹھیک اسی وقت اس کی کریہہ ناک چیخ ابھری اور وہ منہ کے بل گرا تو میرے قدموں کے بالکل قریب تھا، اس کی پشت میں پہلو کے قریب ایک تیر پیوست ہو چکا تھا۔

لامحالہ میری نظر اس طرف پڑی جہاں سے وہ دوڑا چلا آرہا تھا، وہاں میں نے دو وحشیوں کو دیکھا، ان میں ایک کے ہاتھ میں تیر کمان اور دوسرے کے سنان تھی۔

وہ اپنے شکار کی طرف بڑھے چلے آرہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر ہی دبک گیا۔ تاہم میری نظریں اسی بدنصیب آدمی پر جمی ہوئی تھیں جو ان کا شکار ہوا تھا، میں یہ دیکھ کر چونکا تھا کہ وہ ابھی زندہ تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ گرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ سے گن بھی چھوٹ گئی تھی، وہ یقیناً خالی ہو گئی تھی، ورنہ وہ ان سے جان بچانے کی کوشش میں بھاگنے کے بجائے ان پر فائر ضرور کھولتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے پاس فاضل گولیاں بھی ہوتیں، مگر اسے گن لوڈ کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔

پل کے پل میں نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچا اور پھر ان دونوں وحشیوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔ سنان بدست وحشی نے اپنے شکار کو زندہ پا کر اپنی سنان اس کی پشت میں گھونپنے کے لیے بلند کی ہی تھی کہ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس پر جا پڑا، اس کا دوسرا ساتھی اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا، میں نے اپنے شکار کے جبڑے پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا تھا، وہ گھوم کر گرا تھا اور اس کی سنان میرے ہاتھ میں تھی۔ اس کا ساتھی اپنی پشت پر بندھے ترکش سے تیر نکال کر کمان کے چلے پر چڑھا ہی رہا تھا کہ میں نے سنان اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی کریہہ ناک تھی۔

میں نے سنان واپس کھینچی تو وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا۔ اس کا دوسرا ساتھی مجھ سے مقابلہ کرنے کے بجائے عجیب سے انداز میں چیختا چلاتا ہوا ایک طرف کو دوڑا۔ اس کی چیخ کے مخصوص آہنگ سے میں نے پل کے پل اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو اس طرف پکار کر بلانا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے اور بھی ساتھی یہاں موجود تھے۔ میں نے اس زخمی کو سنبھالا دینا چاہا۔

”آہ......“ وہ کراہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

منع کیا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ تیر سے گھائل ہونے کے بعد ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے کی کوشش چاہی تو بری طرح ٹھٹکا۔ وہ بری رنگ ونسل کا معلوم ہوا۔ چونکہ میرا مقابلہ سے جی کوہارا کے بری ساتھیوں سے ہوتا رہا تھا، اسی لیے مجھے اس کی مخصوص بریوں والی شبیہ نے اس بات پر چونکا دیا تھا کہ وہ یقیناً سے جی کوہارا کا ساتھی ہی تھا۔ وہ مجھے آخری سانسوں میں لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور پوچھا۔

"تم کون ہو؟ اور یہاں ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟ کیا تمہارے اور ساتھی بھی ہیں؟" میں نے اس سے انگلش میں کہا تھا۔ پہلے اس نے بری زبان میں کچھ کہنا چاہا تھا، مگر مجھے انگلش بولتے پا کر اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بہ مشکل کہا۔

"تت..... تم لوگ..... کک..... کون ہو؟"

"ہم اپنے ایک پاکستانی دشمن شہزاد احمد خان شہزی کی تلاش میں آئے ہیں یہاں، کیا تم اس کے بارے میں ہمیں کچھ بتا سکتے ہو؟" میں نے اپنی زیرک مغزی سے کام لیتے ہوئے اس سے وہی کہا جو میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کا بھی ایک مقصد ہو سکتا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے میں نے اس کے ستے ہوئے بشرے کا بہ غور جائزہ بھی لیا تھا۔ حسب توقع اس کے چہرے پہ باوجود نیم مردنی کے کچھ ایسے تاثرات ابھرے تھے کہ میرا اندھیرے میں پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر لگا ہو، بولا۔

"تت..... تم کہیں، بب..... بلیو ٹکسی کے..... آہ....." تکلیف کے باعث وہ اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا۔

"ہاں..... ہاں! ہم اسی کے ایجنٹ ہیں اور ہماری ایک ساتھی کوریلا بھی ادھر ہی کہیں موجود ہے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ وہ اپنے کچھ ساتھیوں کی تلاش میں ادھر آیا ہوا ہے۔"

"کک..... کوہارا کو جانتے ہو تم؟" وہ بولا۔

میرا دل یک بیک زور سے دھڑکا۔ ترنت بولا۔

"ہاں.....! کدھر ہے وہ؟"

"وہ ادھر ہی..... ہے اور..... اور....." اس کی آواز ڈوبنے لگی۔

"ہاں..... بولو، بولو کدھر ہے وہ؟" میں جوش سے بولا۔ اس کے چہرے پہ موت کی زردی چھانے لگی تھی۔ وہ بہ مشکل بتانے لگا۔

"تت..... تمہاری ساتھی کک..... کوریلا ہمارے ساتھ ہی ہے، وہ بھی باس کے ساتھ ادھر ہی....." اسی وقت اس نے ایک ہچکی لی اور دم توڑ گیا۔

میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ایک بات کی تصدیق تو ہوگئی تھی کہ وہ سیلانی خیمے والے سے جی کوہارا کا ہی گروپ تھا اور وہ عورت کوریلا ہی تھی۔ مگر یہ جاننے کی ضرورت تا حال تھی کہ اب وہ کہاں تھے؟ یہ بات طے تھی کہ ان لوگوں کا ہی ٹکراؤ کلی منجارو وحشیوں سے ہوا تھا اور اس کی وجہ ہم ہی ہو سکتے تھے، کیونکہ یہ وحشی ہم سے لڑتے ہوئے ہمارے تعاقب میں ہی یہاں تک آئے تھے اور یہ ممکن تھا کہ ان کی نظروں میں یہ لوگ بھی آگئے ہوں گے مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ لوگ (کوہارا اور کوریلا) اب کہاں تھے؟ آیا ان وحشیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے کہیں مر کھپ گئے تھے یا پھر کہیں اریب قریب جا چھپے تھے۔

بہرکیف کوہارا وغیرہ کی یہاں موجودگی کا مجھے ایک ہی مقصد سمجھ میں آتا تھا کہ وہ مجھے زیر کرنے کی نیت سے میرے تینوں ساتھیوں، اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا کو قابو کرنے کے لیے ہی یہاں آئے تھے، مگر مجھے اپنے اس خیال سے خود ہی اختلاف ہوا۔

یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر سکی تھی کہ چلو کوریلا کی موجودگی تو یہاں سمجھ میں آتی تھی کہ وہ پہلے ہی سے کرنل سی جی بجوانی کے حکم پر یہاں موجود تھی مگر کوہارا اس پُرخطر وادی میں کیسے اور کیوں کر ٹپک پڑا تھا؟ پھر کوریلا ان کے ساتھ کس طرح جا ملی تھی؟ کافی جواب طلب تھے۔

ابھی میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اچانک میں نے دائیں جانب آہٹ سنی، میں چونک کر مڑا اور بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا، وہ نانا شکور تھا۔ اس کے ہاتھ میں ستان تھی۔ میں نے مردہ بری کی تلاشی لی تو اس کے قبضے سے مجھے فاضل راؤنڈ کا ایک میگزین مل گیا۔ وہ میں نے اپنے قبضے میں کیا اور اس کی گن بھی اٹھالی، میگزین میں نے گن سے اٹیچ کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"یہ کس کی لاش ہے؟ تم نے اسے ہلاک کیا؟" نانا نے پوچھا۔

"نہیں یہ وحشیوں کا شکار ہوا ہے، اس کے پہلو میں زہریلا تیر پیوست ہے۔ واپس چلو، وحشی ادھر پہنچنے والے ہیں۔" میں نے اسے ساری بات بتا دی اور ہم سوشیلا کے پاس آگئے تو یہ دیکھ کر مجھے ایک جھٹکا لگا کہ اس کی حالت

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بہت ہی ناگفتہ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی ٹانگ پکڑے بُری طرح سسک کر رو رہی تھی۔ ٹانگ کا زخم خراب تو ہو ہی رہا تھا، مگر اس کی ٹانگ بھی پھول کر کپا ہونے لگی تھی، وہ بے چاری اب کسی سہارے سے چلنے پھرنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔

"پپ...... شہزی! تمہیں خدا کا واسطہ...... مم...... میری یہ ٹانگ کسی طرح کاٹ ڈالو، بہت درد ہو رہا ہے، آہ...... مم...... میں درد برداشت نہیں کر پا رہی ہوں۔"

وہ روتے ہوئے مجھ سے بولی۔ اس کی بے چارگی اور ہیئت کذائی پر میرا اپنا دل بھی دکھنے لگا تھا۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس وقت اذیت کے مارے مسخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ درد اور اینٹھن کی شدت سے وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

"تمہیں منع تو کیا تھا ہم نے کہ مت آؤ ہمارے ساتھ...... اب بھگتو اس درد کو، بلکہ اب تو ہمیں بھی تمہیں بھگتنا پڑے گا...... مصیبت کی طرح۔"

ناناشکور نے برہمی سے کہا تو اس کی بے حسی پر میرا دماغ الٹ گیا۔ میں اس کی طرف گھوما اور ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ میرے بھاری ہاتھ کا گھونسا کھا کر وہ چند قدم پیچھے کو لڑکھڑا گیا تھا۔ میں نے گھورتے ہوئے پُرطیش لہجے میں کہا۔ "دوبارہ سوشیلا کے لیے ایسی بات اپنے منہ سے مت نکالنا نانا......! ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

گھونسا کھانے کے بعد اس کے نچلے ہونٹ سے خون کی پتلی لکیر کھنچ آئی تھی، جسے اس نے اپنے ایک ہاتھ سے پونچھتے ہوئے میری جانب پُرغیظ نظروں سے گھورا تھا، غصے سے اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے شاید اپنے اندر کے امڈتے ہوئے ابال پر قابو پایا اور اپنا دایاں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔

"اٹس اوکے...... میں شاید غلط کہہ گیا تھا...... سوری......"

مجھے اس کی بات پر جس قدر غصہ آیا تھا وہ اسے گھونسا رسید کرنے اور اس کے "سوری" کہنے پر اب بتدریج فرو ہونے لگا، لیکن میرے اندر کی وہ کثافت پھر بھی نہ دھل سکی تھی جو اس نے سوشیلا کے بارے میں ایسے سفاکانہ اور بے حیایانہ الفاظ کہہ کر میرے اندر پیدا کر دی تھی۔

"پپ...... پلیز! میری وجہ سے تم دونوں آپس میں مت لڑو...... ہم سب خطرے میں گھرے ہوئے ہیں، میں اپنی غلطی پر پشیمان ہوں......" سوشیلا نے کراہتے ہوئے بہ مشکل کہا تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"سوشی! ہمت سے کام لو...... مایوس کیوں ہوتی ہو؟ میں ساتھ ہوں ناں...... اللہ پر بھروسا رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حالات مخدوش ضرور ہیں مگر مجھے یقین ہے، یہ بہت جلد بہتر ہو جائیں گے۔"

میری بات پر اس نے نیم باز سی نگاہوں سے مجھے دیکھا، اس کے لبوں پہ ایک پھیکی پھیکی سی مگر حوصلہ لیتی مسکراہٹ چمکی تو تھی مگر اس کا چہرہ اس کی معدوم پڑتی ہمت کا ساتھ دیتا ہوا نہیں محسوس ہوتا تھا۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں، میں نے دھیرے سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ تپ رہی تھی۔ اسے تیز بخار نے بھی آلیا تھا۔ سوشیلا کی طرف سے میری پریشانی اور تشویش بڑھنے لگی، اسے فوری طبی امداد کی ضرورت تھی جو سردست مجھے مشکل ہی نظر آتی تھی۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولا۔ "سوشی! ہمیں یہاں سے آگے نکلنا ہوگا، تم حوصلہ رکھو، میں کچھ نہ کچھ کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے جب سوشیلا کو اٹھانا چاہا تو وہ بُری طرح کراہ کے رہ گئی۔

"اب یہ کاندھوں پر اٹھائے جانے کے قابل بھی نہیں رہی ہے۔" ناناشکور نے کہا اور میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا تو وہ بولا۔ "فکر نہ کرو، میں کچھ ٹہنیوں اور جھاڑیوں کا اسٹریچر بناتا ہوں، تم ادھر ہی اس کے پاس رکو، مگر محتاط رہنا، ہم اب بھی دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے اس سے کہا۔

"یہ گن لے جاؤ اپنے ساتھ اور اپنا تیرکمان مجھے دے دو۔"

"رہنے دو...... تمہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔" نانا نے میری طرف دیکھے بغیر اپنا ایک ہاتھ اٹھا کر کہا اور جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔

"آدمی سخت ہے، مگر دل کا برا نہیں ہے، تم اس کی باتوں کا برا مت منانا سوشی! نہ ہی اپنے دل پہ لینا۔" میں نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سوشیلا سے کہا تو اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میں گن ہاتھ میں لیے وہیں اس کے پاس بیٹھ گیا۔

وقت اندیشناک اور وسوسہ انگیز لمحات کی دھمک دیتا، بھاری سِل کی طرح دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ ہر سو تھکی ہوئی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پتا کھڑکا اور دل دھڑکا جیسی صورت حال تھی۔

.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

نانا شکور کا کہنا درست تھا۔ سوشیلا کی حالت ایسی تھی کہ اب یہ کاندھوں پر بھی اٹھائے جانے کے قابل نہیں رہی تھی، اس طرح اس کی سوجی ہوئی ٹانگ کا درد بڑھنے لگتا، بلکہ یہ مزید خراب ہو سکتی تھی، اس کا زخم خراب ہو رہا تھا اور کافی سے زیادہ سیپٹک ہو چکا تھا۔

گن میرے ہاتھ میں تھی اور میں سوشیلا کے قریب بیٹھنے سے کترا رہا تھا، پتا نہیں کیوں وہ مجھے قریب پا کر اول فول بکنے لگتی تھی، بہت مایوسانہ باتیں کرنا شروع کر دیتی تھی۔ یہ سب میرے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد نانا شکور بہت سی خشک جھاڑیاں اور ٹہنیاں اور توڑ لایا، ان میں درختوں کی چھال بھی تھی۔ وہ اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑے سے گٹھر کی صورت میں لایا تھا۔

اس کے بعد میں نے بھی اس کا ہاتھ بٹانا ضروری سمجھا، یہی وجہ تھی کہ ہم نے تھوڑی سی دیر میں ہی ایک ''گزارے لائق'' اسٹریچر بنا لیا۔ ٹہنیوں کو لپیٹ کر اس کی رسی بنالی گئی تھی اور اس کی مدد سے جھاڑیوں اور درختوں کی چھال کو پھیلا کر ان سے نتھی کر لیا اور باقی ٹہنیوں کی ایک لمبی سی رسی کھینچ دی گئی، جسے جسم کے گرد لپیٹ کر اسٹریچر کو بہ آسانی گھسیٹا جا سکتا تھا۔ میں نے اور نانا شکور نے سوشیلا کو احتیاط سے اٹھا کر اس اسٹریچر پر لٹا دیا۔

''مجھے اگر ایک مخصوص پودے کی جڑی بوٹی مل جائے تو میں اسے پیس کر سوشیلا کے زخم پر لگا دوں گا، میں نے تلاشنے کی کوشش کی تھی، مگر نہیں نظر آیا وہ پودا۔'' نانا اسٹریچر کی ٹہنی نما رسی کو اپنی پشت پر باندھتے ہوئے بولا تو میں نے فوراً کہا۔

''یہ میں کر لیتا ہوں، تم......''

''نہیں، تمہارے پاس گن ہے اور تم ہماری حفاظت کے لیے ساتھ چلتے رہو گے۔'' اس نے انکار کیا۔ میں نے اپنی گن کی چال درست کی اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

اسی وقت مجھے شور کی سی آواز سنائی دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے شک تو تھا کہ جو آخری وحشی مجھ سے بچ کر چیختا چلاتا ہوا بھاگ نکلا تھا وہی اپنے ساتھیوں کو اس طرف نہ لے آیا ہو۔ میں نے نانا سے اپنے اسی خدشے کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

''ہمیں ان سے الجھنے کے بجائے چلتے رہنا چاہیے، جتنے یہ ہمارے ہاتھوں مریں گے اس سے زیادہ تعداد میں یہ دوبارہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے آ جائیں گے۔''

میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا اور ہم محتاط روی سے آگے بڑھتے رہے۔

سوشیلا کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہاں سے اس وقت تک نہیں ہٹتا جب تک کوریلا اور کوہارا کو نہ چھاپ لیتا، کیونکہ وہ دونوں خبیث بھی ادھر ہی کہیں اریب قریب میں موجود تھے۔

ہم آگے بڑھتے رہے اور میری نظریں تیزی سے گرد و پیش میں گردش کر رہی تھیں۔ وحشیوں کا ٹولا کہیں دور تھا، اور ہم ایک اندازے سے ان کی مخالف سمت میں بڑھ رہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب اندھیری گہری گھاٹیاں تھیں اور بائیں طرف سنگلاخ کالی چٹانیں تھیں۔

ہم انہی کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ چاند کہیں دور جا چھپا تھا، تاروں کی روشنی میں ہم پراسرار ہیولوں کی صورت آگے بڑھ رہے تھے۔

ایک مقام پر اسٹریچر کی رسی ٹوٹ گئی۔ ہمارا سفر تھم گیا۔ مگر نانا شکور نے چند ہی منٹوں میں وہ رسی کسی طرح دوبارہ جوڑ لی اور ہم پھر آگے بڑھ گئے۔

ہم اب اس چٹانی وادی کے دامن میں آ گئے تھے جہاں جابجا قدآدم جنگلی جھاڑیاں اور گھنے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، ایک جگہ پر ہمیں بہتی ہوئی نہری دکھائی دی۔ ہم اس کے کنارے آ گئے۔ ہمارے عقب میں سیاہ چٹانوں کے کوہان کسی خوابیدہ عفریت کی طرح جھکے جھکے نظر آ رہے تھے۔

ہم نہر کے کنارے آ گئے اور اپنے ہاتھوں کی اوک میں پانی لے کر پینے لگے۔ پانی صاف اور میٹھا تھا۔ اسی اوک میں پانی بھر بھر کر میں نے سوشیلا کے لبوں سے بھی لگایا۔ نانا کچھ سیر ہونے کے بعد مجھ سے یہ کہہ کر ایک طرف تاریک جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا کہ وہ اس پودے کی تلاش میں جا رہا ہے، جسے پیس کر اس کا لیپ سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے گا۔

ادھر جب میں تیسری بار اپنے ہاتھوں کی اوک میں پانی بھر کر اس کے چہرے کی طرف لے گیا تو وہ بے اختیار سسک پڑی، اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ اتر آئی۔ وہ اپنا منہ پھیر کر رو پڑی۔ پانی میری اوک سے قطروں کی صورت ٹپک کر اس کی مسکی ہوئی شرٹ پر گرنے لگا۔ میں نے باقی ماندہ پانی پھینک کر اسے سنبھالا دیا اور بڑی ملائمت سے بولا۔

''کیا ہوا سوشی؟ کیوں رو رہی ہو تم......؟'' میری

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

بات پر اس نے اپنی آنکھوں کی جھلملاتی نمی کو پونچھا اور دلگیر ... لہجے میں بولی۔

''شہزی! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں......''

''ہاں! کہو...... مگر پلیز، اس طرح رو کر مت کرو...... حوصلہ رکھو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''شہزی! مجھ سے ایک وعدہ کرو...... اگر...... اگر میں زندہ نہ رہی تو...... تم اس ظالم درندے ایڈوانی سے میری بہن اور اس کی فیملی کے قتل کا انتقام ضرور لو گے۔'' اس کی بات نے مجھے دکھ کے ایک گہرے احساس تلے رنجور سا کر دیا۔ اس کی حالت گویا اس نہج پر آ گئی تھی کہ وہ بے چاری اپنی زندگی سے ہی مایوس ہونے لگی تھی۔ اسے ایسی باتیں کرتے دیکھ کر میرا اپنا دل دکھ سے بھر گیا اور میں نے بے اختیار ایک دوستانہ اپنائیت سے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا اور بولا۔

''سوشی! تمہیں کچھ نہیں ہو گا، تم میرے ساتھ اس سفاک آدمی ایڈوانی سے اپنی بہن اور اس کے معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لو گی، لیکن ایسی مایوسانہ باتیں مت کرو، نانا شکور جڑی بوٹی ڈھونڈنے گیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں کا اور ایسے حالات کا عادی ہے۔ مجھے امید ہے وہ تمہارے علاج کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا اور تم جلد ٹھیک ہو جاؤ گی......''

میری بات پر اس کے چہرے پر پھیکے پن کے تاثرات ابھرے تھے جیسے وہ سمجھ رہی ہو کہ یہ سب محض ایک بہلاوے کے سوا کچھ نہ تھا، پھر دفعتاً ہی میں نے اس کے دکھ سے ستے چہرے پر ایکا ایکی خوف اور ہراس کے آثار اُمڈتے دیکھے، جس نے مجھے بھی ٹھٹکا دیا، اس کی ذرا دیر پہلے غمناک آنکھوں میں اب پل کے پل وحشت اتر آئی تھی اور پھر میری پشت کی جانب خوف زدہ سی نگاہوں سے تکتے ہوئے اس کے لبوں پر ارتعاش ابھرا۔ وہ اسی طرح کپکپاتی آواز میں اسی سمت دیکھتے ہوئے بولی۔

''شش...... شہزی! وہ...... وہ......'' کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کا میری پشت سے پرے اشارہ بھی کر ڈالا۔ میں نے یک بیک گردن موڑ کر اپنے عقب میں دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔

☆☆☆

تاروں بھری مدھم مدھم سی روشنی میں، سبک خرام بہتی، جھلملاتی نہر کے کنارے ایک خاصا جسیم شیر اپنی دونوں ٹانگوں پر جھکا پانی پی رہا تھا۔ یہ کالے رنگ کا شیر تھا، جو صورت سے ہی خوفناک اور کریہہ معلوم ہوتا تھا، اس کے سیاہ بھیانک جبڑوں سے خونخواری ٹپک رہی تھی۔

ابھی میں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ معاً اسی جیسے دو تین اور سیاہ رنگ کے شیر وہاں آن موجود ہوئے اور نہر کے کنارے بہتے پانی کی سطح میں تھوتھنیاں ڈال دیں۔

''شش...... شش...... آواز بالکل مت نکالنا......'' میں نے دم بخود سی سرگوشی میں سوشیلا سے کہا تھا۔ اس نے خوف کے مارے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا، جو واضح طور پر اس کے پورے وجود کی کپکپاہٹ کی غمازی کرتا محسوس ہو رہا تھا۔

گن مجھ سے ذرا فاصلے پر پڑی تھی۔ ان خوفناک اور خونخوار درندوں کی دہشت ہی ایسی تھی کہ اس نے مجھے ساکت سا کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے زیادہ فکر نانا شکور کی طرف سے ہو رہی تھی، جو اسی سمت جھاڑیوں کی طرف گیا تھا، جہاں اسے مخصوص جڑی بوٹی والے پودے کی تلاش تھی۔

میں اب بھی دعائیں مانگ رہا تھا کہ کاش! نانا شکور کی بھی ان درندوں پر نگاہ پڑ جائے اور وہ وہیں محتاط ہو کر فوراً چھپ جائے۔

وہ چاروں کالے شیر پانی پینے میں مصروف تھے۔ میں نے سوشیلا کو اشارے سے ہی کسی بھی قسم کی آواز نکالنے سے منع کر دیا تھا اور خود نہایت دھیرے سے اپنی گن کی طرف سرکنا شروع کیا تو اسی وقت پہلے والے شیر نے پانی کی سطح سے اپنا تھوتھنا نکالا اور ہوا میں منہ کر کے کچھ سونگھنے کی کوشش کرنے لگا، اسی وقت وہ ہولے سے غرغرایا...... میں اپنی جگہ رک گیا۔

اس نے شاید ''آدم بو'' سونگھ لی تھی اور اب وہ میری طرف ہی اپنی مقناطیسی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُف...... کس قدر تیز سرخ اور چمک دار آنکھیں تھیں اس درندے کی جس میں خونخواری کا عنصر غالب تھا۔ وہ یک ٹک میری جانب گھورتا رہا اور میرا پورا وجود جیسے اس کی مقناطیسی نظروں کے سامنے ''ہپناٹائزڈ'' ہو گیا۔ گویا ہم دونوں ہی اب ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہے تھے۔

میں نے گن کی جانب اپنی پیش قدمی اسی وقت ہی موقوف کر دی تھی۔ چہ جائیکہ وہ مجھ پر حملہ نہ کر دے۔

اس ایک شیر کا حملہ کرنے کا مطلب ہوتا اس کے باقی ساتھی بھی ہم پر پل پڑتے۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی بھی کہ لپک کر گن اٹھا لوں مگر میں نے اپنی اس نادانی کو

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

دبائے رکھتا۔ یہ شکاری درندے تھے، کوئی عام جانور نہیں کہ ایک گن سے ہلاک ہو جاتے، انھیں مارنے کے لیے مخصوص قسم کی طاقت ور اور بھاری گنیں مستعمل ہوتی تھیں، اسی لیے میں نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ان سے "پنگا" لینے کے بجائے، کنی کترائی جائے اور یہی میں کر رہا تھا۔

اسی وقت دوسرا شیر بھی پانی پی کر سیر ہو گیا اور اپنے پہلے والے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ تب ہی اس کی بھی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ہولے سے غرایا...... پھر اس کا پہلا والا ساتھی، اپنے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔

رات کی اس تاروں بھری روشنی میں نہر کے کنارے ان چاروں شیروں کی سیاہ چکنی جلد چمک رہی تھی اور آنکھوں سے خونخواری مترشح تھی۔

جلد ہی یہ چاروں میری طرف سے توجہ ہٹا کر آپس میں اٹھکیلیاں کرتے رہے۔ میں نے ذرا سکون کا سانس لیا۔ وہ اب جانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے...... اور میں کسی قسم کی جلد بازی کا مظاہرہ کر کے انھیں اپنی طرف مائل بہ حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میرے پاس اب موقع تھا کہ میں اپنی گن آگے بڑھ کر اٹھا لیتا۔

یہی وہ وقت تھا جب یہ چاروں آپس میں "دھینگا مشتی" کرتے ہوئے، ایک طرف کو تاریک جنگل کی طرف بڑھنے والے تھے کہ اچانک ان میں سے ایک نے زوردار دہاڑ ماری۔ تیسرے نمبر والے شیر نے جس طرف اپنا خونخوار تھوتھنا اٹھا کر دہاڑ ماری تھی، میری نظریں بھی غیر ارادی طور پر اسی طرف کو اٹھی تھیں اور اگلے ہی لمحے میرا چہرہ فق ہو گیا...... وہاں نانا شکور کھڑا تھا...... اس کے ہاتھ میں کچھ جھاڑی نما ڈنٹھل سا تھا، جو اس نے اپنے پیروں پر پھینک دیا تھا اور اپنی پشت سے کمان اور تیر کھینچ کر اس نے چلے پر تیر چڑھا لیا تھا۔ میرے لیے اس کی یہ حرکت خودکشی کرنے اور اپنی موت کو ازخود دعوت دینے کے مترادف تھی۔ تیسرے نمبر والے شیر کو شاید اس کی یہی حرکت بری لگی تھی اور اسی لیے اس نے غصے میں آکر دہاڑ ماری تھی۔

"نہیں نانا......! تیر مت چلانا...... یہ سب تمہیں چیر پھاڑ ڈالیں گے......" مجھے بے اختیار چیخنا پڑا تھا۔ میری تیز آواز پر باقی تین شیر میری طرف دیکھ کر غرانے لگے۔ ان کا انداز بتدریج جارحانہ اور خونخوار ہوتا جا رہا تھا۔

ادھر نانا شکور کو گھورنے والا شیر اس کی طرف غراتے ہوئے لپکا اور نانا شکور نے اپنے دفاع میں اور کوئی چارہ نہ دیکھتے ہوئے اس پر تیر چلا دیا۔ تیر شیر کی گردن میں پیوست ہو گیا۔ اس نے ایک دل دہلا دینے والی دہاڑ ماری اور وہیں سے ہی نانا شکور پر جست بھری، شکر تھا کہ نانا شکور نے اس کے تیور پہلے ہی بھانپ لیے تھے۔ اس نے تیر چلانے کے فورا ہی بعد اپنی جگہ بدلی تھی اور جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

ادھر میری طرف لپکنے والے تین شیر اپنے ساتھی کی دہاڑ پر رک گئے اور دوسری طرف متوجہ ہوئے۔

میں نے اب ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اپنی گن اٹھالی، ان میں سے چوتھا شیر غراتے ہوئے میری طرف لپکا۔ میں نے اس پر پورا برسٹ چلا دیا۔

گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور شیر اچھل کر گرا۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا تھا۔

گولیوں کی مہلک بوچھاڑ نے اس کی گردن چھید ڈالی تھی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے اور ہانپنے لگا۔ باقی شیر گولیوں کی گھن گرج سے بری طرح بدکے اور نہر والی جنگلی جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ نانا شکور کے پیچھے لپکا ہوا شیر بھی نجانے کدھر غائب ہو گیا تھا اور خود نانا شکور بھی۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور رگ و پے میں سنسناہٹ دوڑ رہی تھی، ان خونخوار درندوں سے نبرد آزمائی کا یہ میرا پہلا ہی موقع تھا۔ خود مجھ پر ان خونخوار درندوں کی دہشت سی طاری تھی۔

مجھے نانا شکور کی فکر ہوئی مگر مجھ میں اس طرف جانے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی، جدھر وہ، اپنی طرف لپکتے ہوئے زخمی شیر کے حملے سے بچ کر غائب ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر مڑ کر سوشیلا پر ڈالی۔ وہ بے چاری بھی بری طرح دہشت زدہ تھی اور خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، ٹانگ کے زخم کی وجہ سے وہ پہلے ہی ادھ موئی ہو رہی تھی۔ کمزوری اور نقاہت کے باعث اب تو اس سے ہلا چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

میں اس کی طرف آیا اور اسے تسلی دی، اس کے بعد نانا کو آواز دی۔ جواب ندارد...... ناچار میں نے اس کی طرف پیش قدمی کرنی چاہی جدھر وہ غائب ہوا تھا۔ ابھی میں نے ایک قدم اس طرف بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ نانا شکور اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ اسے سلامت دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ اس نے بھی مسکرا کر اپنا ایک ہاتھ فضا میں بلند کیا تھا اور پھر وہ پودوں کے اس ڈنٹھل کو اٹھانے کے لیے جھکا جو وہ سوشیلا کے لیے توڑ کر لایا تھا کہ اچانک اس کے عقب سے ایک خونخوار غراہٹ ابھری اور میں نے اسی کالے شیر کو نانا شکور کی عقبی تاریک جھاڑیوں سے نمودار ہوتے دیکھا۔

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

نانا کے پاس اب اس کے حملے سے بچنے کا وقت نہ تھا، شیر نے جست بھری اور وہ نانا شکور پر جھپٹا۔ دونوں گرے اور نانا شکور شیر کی گرفت میں مچلنے لگا، جبکہ شیر کی کوشش تھی کہ وہ اپنے تیز نکیلے دانتوں والے جبڑے میں اس کا نرخرہ دبوچ لے، مگر نانا شکور اسے کوئی ایسا موقع نہیں دے رہا تھا۔ یہ وہی شیر زخمی شیر تھا جس پر نانا شکور نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی تیر چلایا تھا، جو ابھی تک شیر کی گردن میں پیوست تھا۔

میں چند ثانیے کے لیے اپنی جگہ پر سن ہو کر رہ گیا، اور سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ کیا کروں، لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی گن سے برسٹ فائر کر دیا۔ یہ دھیان رکھا تھا کہ گولیاں نانا شکور کو پچھاڑنے کی کوشش کرنے والے شیر کے اریب قریب ہی زمین میں پیوست ہوں۔ میری یہ ترکیب کارآمد ثابت ہوئی۔ شیر نے بوکھلا کر نانا شکور کو چھوڑا اور قریب جھاڑیوں کی جانب جست بھری اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے احتیاط کے پیشِ نظر ان جھاڑیوں کی طرف، جدھر شیر غائب ہوا تھا، ایک برسٹ اور چلا دیا تاکہ وہ موذی پھر کسی موقع کی تاک میں وہیں کہیں دبک گیا ہو تو دور چلا جائے۔

اس کے بعد میں زمین پر پڑے نانا شکور کی طرف دوڑا اور اسے سنبھالا دیا۔ اس کے جسم پر خراشیں تھیں اور چہرے پر بھی سرخ لکیریں نمودار ہو گئی تھیں۔

”شکر ہے، بال بال بچا ہوں، ورنہ تو گیا تھا آج......“ نانا شکور ایک زندہ دل مسکراہٹ سے بولا۔

”تم ٹھیک ہو ناں......؟“ میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں! ٹھیک ہی ہوں دوست! تمہارا شکریہ......“ وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور ہولے سے کراہا بھی تھا۔ میں نے ڈنڈا اٹھایا اور نانا کے ساتھ چلتا ہوا سوشیلا کی طرف آیا۔

”ان کی ٹہنیوں میں جڑے پتوں کو الگ کر کے نہر کے پانی سے ان کا لیپ بناؤ۔ ذرا جلدی، یہ کالے شیر انتقام اور دشمنی کے معاملے میں ہم انسانوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمیں یہ جگہ فی الفور چھوڑنا ہوگی۔“ نانا نے سوشیلا کے قریب ہی درخت کے تنے سے پشت ٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات پر میں نے فوراً عمل کیا اور جلدی جلدی ان مخصوص پودوں کی ٹہنیوں سے پتے نوچ کر الگ کیے اور نہر کے قریب جا کر میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں پہاڑی پتھروں سے پیس کر جیسے تیسے لیپ تیار کیا اور ایک چھال پر اسے رکھ کر ان کے پاس آگیا۔

”تھوڑا لیپ بچ جائے تو تم اپنے بازو کے زخم اور میری خراشوں پر بھی لگا دینا، کہیں سیپٹک ہی نہ ہو جائے مجھے بھی......“

میں نے سوشیلا کی ٹانگ کے زخم کو دھویا۔ وہ تکلیف سے کراہنے لگی۔

”دوا اس کے زخم میں لگانے سے پہلے اس کے منہ میں کوئی کپڑا ٹھونس دو، کیونکہ اس دوا کے لگنے سے، اس کے زخم میں مرچوں جیسی آگ لگ جائے گی۔“

”نن...... نہیں، مم...... میں یہ مرہم نہیں لگاؤں گی......“ نانا نے اس لیپ کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ سوشیلا بے اختیار چلا اٹھی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور ہمت دلائی۔

”سوشی! تم تو ایک باہمت اور بہادر عورت ہو...... محض ایک ذرا سی تکلیف پر بچوں کی طرح بلک اٹھی ہو...... یہ تو دیکھو، اس تھوڑی سی تکلیف کے بدلے تمہاری ایک بڑی اذیت ناک تکلیف رفع ہو جائے گی، چلو شاباش ہمت کرو، یہ لو کپڑا، منہ میں دابو......“

میرے سمجھانے پر اس نے کچھ ہمت پکڑی اور اپنا منہ کھولا۔ میں نے کپڑے کی ایک دھجی کا گولا بنا کر اس کے منہ میں پھنسا دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے چھال سے لیپ اٹھایا اور اس کی ٹانگ کے زخم پر لگایا، مرہم لگتے ہی سوشیلا مرغِ بسمل کی طرح تڑپی اور دونوں ہاتھوں سے میرا شانہ دبوچ لیا۔

”جلدی سے مرہم رکھتے جاؤ......“ نانا بولا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور مرہم کو ہاتھ کی مدد سے اس کے سارے زخم پر لیپ کرتا چلا گیا۔ سوشیلا کا جسم درد اور جلن کے مارے خزاں رسیدہ پتے کے مانند کپکپا رہا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے آنسو پھوٹ نکلے تھے۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ اس کا کپکپاتا ہوا جسم ڈھیلا پڑنے لگا۔ چہرے کی زردی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے شانے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت بھی ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ تنے پر ٹکا ہوا اس کا سر بھی ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ میں نے ازراہِ تشویش نانا سے کہا۔

”اسے کیا ہوا......؟“

”فکر کی بات نہیں......“ نانا بولا۔ ”درد کی شدت

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سے یہ بے ہوش ہوگئی ہے۔"

"لیکن اس طرح یہ شاک میں جاسکتی ہے۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ مرہم کا اثر ہے۔ اب بتدریج اس کے زخم پر ٹھنڈک پڑتی جائے گی اور ذرا دیر بعد اسے خود ہی ہوش آجائے گا۔"

اس کے بعد میں نے نانا کی خراشوں پر بھی بچا کھچا مرہم لگا دیا۔ اس نے اپنے دانتوں تلے ایک چیخ دبالی تھی۔ تھوڑا بہت میں نے اپنے بازو کی پٹی کھول کر اس پر بھی لگا دیا۔ خاصی تیز ٹیس اٹھی تھی اس مرہم کے لگانے سے، جو میں نے اپنے دانت اور ہونٹ بھینچ کر بہ مشکل دبائی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے بیتنے لگا۔ آسمان پر اب سپیدۂ سحر کا ملگجا پن نمودار ہونے لگا تھا۔ جنگل میں پرندوں کی چہچہاہٹ گونجنے لگی تھی۔ سامنے نہر کا پانی پُرسکون انداز میں بہہ رہا تھا۔ اس دوران میں نے وہاں کچھ دوسرے جنگلی جانوروں کو کنارے پر آکر پانی پیتے دیکھا تھا۔ ان میں چیتل اور سانبھر بھی تھے اور ہرن بھی۔ چھوٹی نسل کی لومڑیاں اور سوروں کے غول کو بھی دیکھا تھا۔

سوشیلا اب شاید سو رہی تھی اور نانا بھی اسی درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے سو گیا تھا۔ اس کے زخم کی جلن پر بھی شاید مرہم کی ٹھنڈک پڑنے لگی تھی۔ تھکا ہوا میں بھی تھا اور نیند سے میرا بھی برا حال ہو رہا تھا۔ اب تو بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ میں نے سوچا، اگر اسی طرح بیٹھا رہا تو، نیند سے بوجھل آنکھیں مجھے بھی بے سدھ سلا دیں گی، لہٰذا میں تن سنبھالے اپنی جگہ سے اٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

نہر کے کنارے ہی ذرا فاصلے پر مجھے ایک جھکا جھکا درخت دکھائی دیا جس پر ٹماٹر کی طرح کے گول گول پھل لگے ہوئے تھے۔ میں اس طرف کو بڑھ گیا، قریب پہنچنے پر معلوم ہوا، یہ املوک قسم کا کوئی پھل تھا جسے عام فہم میں جاپانی پھل بھی کہا جاتا تھا۔ رنگ بھی اس کا نارنجی تھا۔ میں نے پہلے ایک توڑ کر کھایا۔ اس کا چھلکا سخت مگر گودا اندر سے نرم تھا۔ میں نے یہ بہت سارے توڑ لیے، اور اپنے ساتھیوں کی طرف آگیا۔ دیکھا تو سوشیلا کو ہوش آچکا تھا۔ اس کا حسین چہرہ ستا ہوا تھا تاہم طبیعت میں اس کی اب کافی بہتری نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد بھی حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے مسکرا کر ملائمت بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟" جواباً اس نے ایک نگاہ اپنی ٹانگ کے زخم پر ڈالی اور غیر ارادی طور پر میری نظر بھی زخم پر پڑی اور مجھے کافی حیرت ہوئی۔ لیپ نے اس کا زخم خاصی حد تک خشک کر دیا تھا۔ اس میں جو گندا مواد وغیرہ بہہ رہا تھا وہ رک گیا تھا۔ سوجن میں بھی کافی کمی آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"میرا خیال ہے زخم ٹھیک ہو رہا ہے......" میں نے کہا۔ "لو یہ پھل کھاؤ...... بہت شیریں ہے۔" میں نے املوک قسم کا پھل اسے دیا۔

"تم نے کھایا؟" اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا اور میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ وہ پھل کھانے لگی۔ میں قریب سوئے ہوئے نانا شکور کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا اور تنے سے لڑھک کر زمین پر آگیا تھا۔

"تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں، شہزی! تم بھی ذرا دیر کو سو لیتے......" معاً سوشیلا نے مجھ سے کہا۔ "تم یقیناً ہماری چوکیداری کرتے رہے ہو ساری رات......"

"ہاں! جب وقت ملے گا تو سو جاؤں گا، مگر ہمیں اب یہاں سے آگے روانہ ہونا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

سوشیلا نے ایک نگاہ قریب بے سدھ سوئے ہوئے نانا شکور پر ڈالی اور میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ زخم بھرنے اور کچھ افاقہ ہونے کے باعث سوشیلا کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

"یہ صاحب تو اس طرح یہاں جنگل میں پڑے سو رہے ہیں جیسے اپنے گھر کے بیڈ روم میں ہوں۔"

"نیند تو سولی پہ بھی آجاتی ہے، کیا کرتا بے چارہ! ویسے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، اسی کی کوشش سے تمہارا اتنا خطرناک زخم اب ٹھیک ہونے کو ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں، اس نے بروقت اپنی قابلیت کا استعمال کیا، ورنہ تو میری ٹانگ گلنے کے قریب ہو گئی تھی۔" سوشیلا کے لہجے میں نانا شکور کے لیے تشکرانہ اعتراف تھا۔ آگے بولی۔

"یہ بے چارہ بھی مرتے مرتے بچا تھا، اف...... کس قدر خوفناک درندے تھے وہ کالے شیر...... جب ایک نے اس پر حملہ کیا تو میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ شکر ہوا کہ تم نے بروقت فائرنگ کر کے اسے بچا لیا......"

"نانا کا خیال ہے یہ کالے شیر دشمنی اور انتقام کے معاملے میں انسانوں سے کم خطرناک نہیں ہوتے۔ گھات لگا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

کر یہ دوبارہ حملہ کر سکتے ہیں، اسی لیے ہمیں اس جگہ کو جلد از جلد چھوڑنا ہوگا۔"

"یہ تو آرام فرما رہے ہیں، اسے جگاؤ پھر......"

میں نے نانا شکور کو آہستہ سے جھنجوڑ کر جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ارے...... صبح ہوگئی اور ہم ابھی تک ادھر ہی ہیں......" وہ بوکھلا کر بولا۔ پھر اس کی نگاہ املوک پر پڑی، وہ اس پر ٹوٹ پڑا۔

"تم نے کھائے شہزی؟" وہ ایک املوک کا گودا نگلتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ اس کی باچھوں سے رس ٹپک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے وہاں سے کوچ کیا۔ سوشیلا کو اسی اسٹریچر پر لٹایا تھا۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی ٹانگوں اور کسی کے سہارے پر چل سکتی۔

اس بار میں اس کا اسٹریچر کھینچ رہا تھا۔ گن میں نے نانا شکور کو تھمانی چاہی تھی مگر اس نے گن لینے سے انکار کر دیا تھا اور اس نے اپنا تیر کمان ہی سنبھالے رکھا تھا۔

نیند اور تھکن کی وجہ سے میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور سوشیلا کو میری اس حالت کا اندازہ تھا، اس نے مجھے سرگوشی میں کہا بھی تھا کہ میں اسٹریچر نانا شکور کو تھما دوں، مگر میں نے انکار کر دیا، کیونکہ اس کی ذمے داری ہم دونوں نے باری باری نبھانی تھی۔ ابتدا میں نانا شکور نے ہی اسے کھینچا تھا اب میری باری تھی۔

اس چٹانی اور نیم ڈھلانی جنگل میں صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی اور پرندوں کی چہچہاہٹ سے جنگل گونجنے لگا تھا۔ ہم اس چٹانی اور نیم ڈھلوانی جنگل کے درمیان میں اپنی منزل کی جانب بڑھے چلے جا رہے تھے۔

ایک جگہ سے نہر پار کرنا پڑی تو اسٹریچر کو پار لگانے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، کیونکہ نہر پر کوئی باقاعدہ پل نہیں بنا ہوا تھا، عارضی طور پر ایک موٹے تنے والے درخت کا شہتیر دونوں کناروں پر گرا دیا گیا تھا۔ ہم وہیں ٹھہر گئے۔

"میرا خیال ہے کہ اسی طرح نہر کے ساتھ ساتھ تھوڑی دور اور آگے چلا جائے، کیا خبر کوئی باقاعدہ پل نظر آ ہی جائے۔" میں نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا تو نانا شکور بولا۔

"یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہوگی اور کیا معلوم آگے ہمارے لیے کون سی نئی مصیبت تیار کھڑی ہو۔ یوں بھی نہر کو پار کیے بغیر ہماری منزل قریب نہیں ہو سکتی، اسی حصے پر سے نہر پار کرنا پڑے گا۔" اس کا لہجہ حتمی تھا، پھر وہ میرے تذبذب کی وجہ سمجھتے ہوئے بولا۔

"سوشیلا کو تم کاندھے پر ڈال لو...... اور خالی اسٹریچر میں سنبھال لیتا ہوں، ابھی اس کی شاید سوشیلا کو مزید ضرورت پڑے گی، ورنہ میں اسے ادھر ہی پھینک دیتا۔"

میں نے سوشیلا کی طرف دیکھا۔ وہ اسٹریچر پر نیم دراز ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے اپنی زخمی ٹانگ کی طرف بے چارگی سے دیکھا۔

"جلدی کرو...... وقت نہیں ہے ہمارے پاس......" نانا بولا۔

میں نے سوشیلا کو احتیاط سے اٹھایا، اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی تکلیف کو دبانے کی سعی کی اور پھر میں نے اسے اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔

اس کی ٹانگ کا زاویہ بدلا تو اس کے زخم کی اذیت ناک تکلیف جاگ پڑی، باوجود کوشش کے برداشت نہ کر پائی اور کراہنے لگی، میں بھی مجبور تھا لہٰذا اس کی کراہوں کی پروا کیے بغیر پل کی طرف بڑھا۔ میرے عقب میں نانا شکور تھا۔ اس نے اسٹریچر کو لپیٹ کر اپنے کاندھے پر ڈال دیا تھا۔

شہتیر خاصا موٹا تھا، تاہم سیلن اور کائی زدہ ہونے کے باعث وہ کہیں کہیں سے پھسلواں بھی ہو رہا تھا۔ ہم پھونک پھونک کر قدم آگے بڑھاتے جا رہے تھے۔ درمیان میں آ کر شہتیر ذرا جھول کھا رہا تھا اور پانی کی سطح سے ٹکراتا بھی تھا۔ اسی سبب یہاں پھسلن زیادہ تھی۔ میں گویا اب سانس روکے ایک ایک قدم بڑے دھیان سے اٹھانے لگا۔ ٹھیک اسی وقت قریب ہی دائیں جانب پانی میں ایک زوردار چھپاکے کی آواز ابھری، جس نے مجھے بری طرح چونکا دیا، بلکہ میرا دھیان پلٹنے کی وجہ سے میں اپنا توازن بھی کھونے لگا تھا، بڑی مشکل سے میں نے خود کو سوشیلا سمیت نہر میں گرنے سے بچایا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کہیں، نانا شکور نہر میں نہ جا گرا ہو...... تب ہی اچانک نانا شکور کی عقب سے سرسراتی سرگوشی ابھری......

"اپنے پیر جمائے رکھنا شہزی! ہمارے دائیں جانب پانی میں مگرمچھ ہیں......" اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میرے قدم لڑکھڑائے۔ میں بھی گوشت پوست کا انسان تھا، اس وقت ہم جیسی صورت حال سے دوچار تھے، وہاں اچھے اچھوں کا پانی پتا ہو جاتا ہے۔ اس نازک صورت حال میں ہم گویا پل صراط کا سفر طے کر رہے تھے، ایسے میں

مگرمچھوں کے ذکر نے میرے پورے وجود میں سنسنی آمیز سی کپکپی دوڑا دی تھی اور میرے پاؤں ایک لمحے کو لڑکھڑا گئے تھے۔

''شش...... ہوشیار...... پاؤں جمائے رکھو اور یہ گن مجھے دو......'' عقب سے نانا شکور نے مجھے کہا۔

گن میرے بائیں کاندھے سے جھول رہی تھی، میں نے ایک ہاتھ سے سوشیلا کے نرم و نازک وجود کو اپنے دائیں کاندھے پر سنبھالے رکھا اور دوسرے ہاتھ سے گن کاندھے سے اتار کر نانا شکور کی طرف بڑھائی، وہ مجھ سے نسبتاً بہتر پوزیشن میں تھا، اس نے فوراً گن میرے ہاتھ سے اچک لی اور ایک بار پھر مجھے پیروں پہ جمے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے ہوشیار کیا کہ وہ برسٹ فائر کرنے والا ہے، تو میں نے اس سے کہا۔

''ٹھہرو نانا......! اگر ضروری ہے تو فائر کرو، ورنہ......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے برسٹ فائر کردیا۔

یہ میرے لیے اچانک تھا۔ میرے پاؤں ڈگمگا گئے، میں پانی میں گرنے سے بال بال بچا تھا۔ میرے دائیں جانب پانی میں طوفانی ہلچل پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی خونخوار انداز میں ایک زوردار غرانے کی آواز بھی ابھری۔ میں نے غیر ارادی طور پر اپنی گردن موڑ کر اس طرف دیکھا تو وہاں پانی کی سطح سرخ ہونے لگی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے بہت قریب دو غار جیسے بھیانک جبڑوں کو نمودار ہوتے دیکھا، ایک نے نانا شکور کے پیروں پر حملہ کیا تھا جبکہ دوسرے نے میری طرف ان کا حملہ ناکام گیا، میں گرتے گرتے بچا، مگر بدقسمتی سے نانا شکور خود کو نہ بچا سکا اور چیختا ہوا نہر میں جا گرا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ پل کے پل مگرمچھوں نے اس پر ہلا بول دیا۔ ساتھ ہی ایک برسٹ چلا۔ یہ اندھا فائر کیا تھا نانا شکور نے، اس کے بعد اس کی دردناک چیخوں اور مگرمچھوں کی غراہٹوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

سوشیلا بھی خوف سے چیخنے لگی۔ خونخوار مگرمچھوں کو نانا شکور کی ضیافت اڑانے کے لیے چھوڑ کر میں سوشیلا کو تھامے آگے بڑھنے لگا۔ میں نانا شکور کے لیے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے جلد بازی یا خوف کی بوکھلاہٹ میں ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ نانا شکور کو ایک مشہور مثال کے مطابق دریا میں بہتے ہوئے مگرمچھوں سے بیر نہیں لینا چاہیے تھا۔

میں کسی نہ کسی طرح دوسرے کنارے پہنچ گیا اور رکا پھر بھی نہیں کہ کہیں وہ بھوکے مگرمچھ میرا پیچھا کرتے ہوئے خشکی پہ ہی نہ آجائیں۔ سامنے گھنا جنگل اور پہاڑیاں تھیں۔ یہاں بھی ویسا ہی منظر تھا جیسا نہر کے دوسرے کنارے پر تھا۔ نہر سے کافی آگے جا کر میں ذرا سستانے کے لیے رکا اور سوشیلا کو اپنے کاندھے سے اتارا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے۔

نانا شکور ہم سے اچانک بچھڑ گیا تھا۔ میرا ذہن نہیں مان رہا تھا۔ میرا دل و دماغ اس حقیقت کو ماننے سے ہی قاصر تھا کہ نانا شکور کا ایسا بھیانک اور عبرت ناک انجام بھی ہوسکتا تھا۔ میرا دل اس کی یوں اندوہناک موت پر خون کے آنسو رو پڑا اور بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ذرا دیر میں وہ کسی جھاڑی سے، زندہ دل مسکراہٹ کے ساتھ نمودار ہوگا۔ یہ شکر تھا کہ اس نے مجھے کچھ نہ کچھ راستہ سمجھا دیا تھا جس کے سہارے میں اپنی اصل منزل کی جانب اپنا یہ پرمصائب سفر جاری رکھ سکتا تھا۔

''شہزی! لگ...... کیا نانا شکور واقعی ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہے؟'' معاً سوشیلا نے دکھ سے لرزتے لہجے میں مجھ سے کہا۔

''یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا ہے کہ نانا شکور جیسا بہادر اور جاں نثار دوست اب اس دنیا میں نہیں رہا۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے اصل دکھ تو اس بات کا ہے کہ نانا شکور کا انجام اتنا بھیانک بھی ہوسکتا تھا۔ وہ آخر کو ہماری مدد کے لیے اور اپنے دوست گھوترا جی کی وفاداری میں ہمارے ساتھ ہولیا تھا۔''

''اب تو نانا شکور کا چیپٹر کلوز ہوگیا شہزی! کیا ہماری منزل اب اس کی جانگاہ موت کے بعد بھٹک جائے گی؟'' سوشیلا نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

''ایسا نہیں ہوگا......'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''نانا شکور نے کافی حد تک ہمیں ہماری منزل تک پہنچا دیا ہے۔''

''پھر بھی نانا شکور کا خلا پُر نہیں ہوسکتا، اس خطرناک اور اہم ترین مہم میں، اس کی کمی ہمیں محسوس ہوتی رہے گی، اس کا ساتھ ہمارے لیے، بالخصوص تمہارے لیے بے حد غنیمت تھا۔'' سوشیلا کا کہنا درست تھا۔ میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کرکے اس کی بات کی تائید کرتے کہا۔

''نانا شکور کا ساتھ میرے لیے واقعی بڑے حوصلے کا باعث تھا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے...... اس نے ایک نیک کاز کے لیے اپنی جان قربان کی ہے۔ گناہ گار تو ہم سب

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہماراویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
See First
Default
Unfollow

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.

All Done

http://paksociety.com

ہی ہیں، لیکن کیا پتا اللہ کو اس کی یہ ادا پسند آجائے، اسے بخش دیا جائے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے زیرِلب آمین کہا تھا۔

اچانک سوشیلا خاموش ہوگئی، میری نظر غیر ارادی طور پر اس کے چہرے پر پڑی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ سننے کی کوشش کررہی تھی۔

"خیریت......؟" میں نے ہولے سے بدستور اس کی طرف تکتے ہوئے پوچھا۔

"شش......ذرا یہ آواز تو سنو......"

اس کی بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور میں نے اپنی سماعتیں متوجہ کیں تو معاً ہی میں ٹھٹکا۔ "یہ کسی گاڑی کی آواز ہے......" پہچانتے ہی میں نے کہا اور سوشیلا پریشان سی دکھائی دینے لگی۔

"تم ذرا اس طرف، جھاڑیوں کے اندر دبک کر بیٹھ جاؤ، میں صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں......"

"شش......شہزی! پلیز، زیادہ دور مت جانا......"

"بالکل فکر مت کرو...... حالات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ حوصلہ رکھو...... ابھی آتا ہوں میں......" میں اسے تسلی دے کر آواز کی سمت بڑھا۔

میں نہتا تھا، جبکہ سوشیلا کے لیے عارضی طور پر بنایا ہوا اسٹریچر بھی ناناشکور سمیت نہر میں جا گرا تھا۔ اس لیے میں ضرورت سے زیادہ ہی محتاط تھا۔ آواز واضح ہوتی جارہی تھی۔

وہ کوئی گاڑی ہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس دشوار گزار علاقے میں فور وہیلر کس طرح اور کہاں سے آگئی تھی؟ اور نہر پار کیسے پہنچ گئی؟ لیکن یہ کوئی خاص ایشو نہ تھا۔ ایک گاڑی کے ذریعے نہر کنارے کا بہت سارا راستہ پاٹا جاسکتا تھا، ممکن تھا کہ انہیں گاڑی سمیت نہر پار کرنے کا کوئی متبادل رستہ مل گیا ہو، ایک اور بات بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگی۔

یہ کیا ضروری تھا، گاڑی سوار نہر پار سے ہی آئے ہوں، وہ پہلے سے ہی یہاں موجود ہوسکتے تھے، اور کوئی بعید نہیں تھا کہ کل منجارو وحشیوں سے جنگ کے بعد یہ ان کا کوئی حلیف گروپ ہو......جو ہماری ہی تلاش میں نکلا ہو۔

میں قدِ آدم جنگلی جھاڑیوں اور اونچے نیچے سیاہ پہاڑی پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا ایک ڈھلان سر کرکے اوپر کی طرف پہنچا تو ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ اسی جیپ پر پڑی جسے میں نے کل رات کو چمائی کے جنگل کی آخری حدود اور نہر کی دوسری طرف پڑاؤ کی صورت میں موجود پایا تھا۔

میں محتاط روی سے چلتا ہوا تھوڑا اور قریب پہنچا۔ سامنے نہر کا کنارا تھا اور اسی کنارے کنارے پرانے ماڈل کی لمبے "ڈالے" والی جیپ کو اسی طرف دوڑے چلے آتے دیکھا، جہاں میں اور سوشیلا تھوڑی دیر کو ستانے کے لیے ڈیرا ڈالے موجود تھے۔

جیپ لحہ بہ لحہ اسی مقام کی طرف دوڑی چلی آرہی تھی، مخصوص ساخت کی اس جیپ میں فور سیٹر بند ڈرائیونگ کیبن، اس کا عقبی حصہ کھلا ہوا تھا، جہاں دو مسلح افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ ڈرائیونگ کیبن میں بھی مجھے اس کی ونڈ اسکرین سے دو افراد براجمان نظر آئے۔ مگر وہ ابھی پہچانے میں نہیں آرہے تھے۔

میں ابھی واپس سوشیلا کی طرف پلٹنے کے خیال سے رکا ہی تھا کہ اچانک میں نے جیپ کو رکتے دیکھا۔ میں خود بھی وہیں ٹھہر گیا بلکہ تھوڑا اور قریب پہنچ کر ایک سیاہ اونچے پہاڑی پتھر کی آڑ میں آکر بغور ان کی طرف دیکھنے لگا۔

جیپ کے ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ کھلا اور دو افراد نیچے اترے تو انہیں دیکھتے ہی فرطِ غیظ و جوش سے میرے پورے وجود کا لہو سمٹ کر چہرے اور آنکھوں میں اتر آیا۔ ان میں سے ایک میرے دشمنوں کی باقیات میں سے تعلق رکھتی تھی، یعنی کورینلا اور دوسرا ابتدائیے سے، وہ سے جی کوہارا تھا۔

اگرچہ سے جی کوہارا کو بھی میں نے یہاں کم زک نہیں پہنچائی تھی اور اس کا بے آف بنگال میں موجود اس کی سپر ٹاپ لگژری بوٹ کی صورت میں نیٹ ورک کو تباہی سے دوچار کرڈالا تھا بلکہ اس سمیت اس کے بیشتر ساتھیوں کو بھی ناکے گھاٹ اتار دیا تھا جبکہ خود وہ رنگون سے مجھے اپنے "گریٹ ماسٹر" لولوش کے ایما پر اغوا کرکے اس کے قدموں میں ڈالنے کے عزم سے آیا تھا۔

باقی جیپ کی عقبی سیٹوں سے ان کے جو دو ساتھی اترے تھے، وہ بھی اپنی وضع قطع سے برمی ہی معلوم ہوتے تھے۔

برما اس جزیرے سے نسبتاً نزدیک ہونے کی وجہ سے شاید لولوش اسے وقتاً فوقتاً نئی افرادی کمک بھیجتا رہتا تھا۔

ممکن تھا یہاں وحشیوں کے ساتھ ان کے ٹکراؤ کی صورت میں اس کے مزید ساتھی بھی مارے گئے ہوں۔ اب بہرحال اس کے دو ہی ساتھی بچے تھے۔ یہ اندازہ میں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

گزشتہ شب ہونے والی فائرنگ اور وحشیوں کی ہاہو کی آوازوں سے ہی لگایا تھا۔

اس کا صاف مطلب تھا کہ ہم نے... نہر کے دوسری طرف کے کنارے پر جو پڑاؤ دیکھا تھا وہ انہی کا تھا۔

اب یہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کوریلا یا سے جی کوہارا کو میری یہاں آمد کا پتا تھا یا نہیں، تاہم ان دونوں کی یہاں موجودگی کا ایک ہی مقصد مجھے سمجھ میں آتا تھا اور وہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کا مجھ پر تو کوئی بس نہیں چل سکا تھا، اور اب یہ میرے تینوں ساتھیوں کو یرغمال بنانا چاہتے تھے، یہ شاید انہیں ترنوالہ سمجھے ہوئے تھے۔

لیکن باوجود اس کے عقل اس بات کو تسلیم کرتی تھی، لیکن میری عقلِ سلیم کچھ اور ہی اشارہ کر رہی تھی کہ بات صرف اتنی بھی نہیں تھی۔ کوریلا کی یہاں موجودگی تو سمجھ میں آتی تھی کہ وہ پہلے ہی سے بجوانی کے حکم پر یہاں موجود تھی اور میرے تینوں ساتھی بھی اسی کی قید میں یہاں موجود تھے۔

بعد میں کلی منجارو کے حملے کے باعث کوریلا (بجوانی کے) یہاں تابعض ساتھی مارے گئے اور میرے تینوں ساتھیوں کو وحشی اٹھا لے گئے تھے، (یہ ممکن تھا کہ کوریلا کے کچھ ساتھیوں کو بھی انہوں نے یرغمال بنا لیا ہو، اگرچہ اس میں بھی ابہام تھا کہ بھلا ان وحشیوں کو انہیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟) لہٰذا اب کوریلا اپنے مشن میں یہاں مصروف تھی۔ مگر کوہارا کی یہاں موجودگی میری عقلِ سلیم سے بالاتر تھی۔ بے شک بجوانی کے ذریعے (جب وہ زندہ تھا) اسے اس صورتِ حالات کا علم ہو گیا ہو، کیونکہ آخرکار کوہارا کو بھی تو میری تلاش تھی، وہ بھی کوریلا سے رابطہ کر کے اس کی مدد کے طور پر ہی سہی یہاں آ گیا ہو۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ کوہارا رنگون میں مقیم اپنے گریٹ ماسٹر لولوش سے پل پل کی ہدایات لیتا رہا ہے۔

ان ساری باتوں کے باوصف پتا نہیں کیوں مجھے کوہارا کی یہاں موجودگی کا سبب صرف اس قدر ہی نہیں معلوم ہوتا تھا، اس کی اور بھی کوئی خاص وجہ تھی۔

میں نے اس نقطے کو ذہن میں رکھا اور اب ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے لگا تو میں چونک پڑا۔ وہ دونوں جیپ سے اترتے ہی زمین پر جھک کر کچھ دیکھنے لگے، انداز ان کا ایسا ہی تھا جیسے اپنی کھوئی ہوئی شے تلاش کر رہے ہوں۔ میں سنگِ سیاہ کی آڑ لیتا ہوا ذرا اور ان کے قریب ہوا تاکہ ان کے تبادلہ خیال کی صورت میں ہونے والی متوقع گفتگو کو سن سکوں۔

"وہ لوگ کسی مصیبت کا شکار ہو کر اپنا کوئی ساتھی گنوا بیٹھے ہیں، مگر زخمی ساتھی ان کے ساتھ ہی ہے......"

میں نے کوریلا کو سے جی کوہارا سے یہ کہتے سنا اور سُن ہو کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا، کوہارا اس کی بات پر بھونچکا ہو کے اس کی صورت تکتا رہ گیا۔ کوریلا نے پُرغور انداز میں اپنی بات جاری رکھی، بولی۔

"نہ صرف یہ بلکہ اب نہر پار کرنے کے بعد اس نے اپنے کسی زخمی ساتھی کو کاندھے پر اٹھا لیا ہے، کیونکہ یہاں سے اسٹریچر کے گھسیٹنے کے نشان معدوم ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ یقیناً نہر کا پل پار کرتے ہوئے کسی حادثے سے دوچار ہوئے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب یہ جو کوئی بھی ہیں، اب صرف دو ہی باقی بچے ہیں؟" کوہارا کو میں نے کوریلا سے یہ کہتے سنا۔

"ہاں!" کوریلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اس گروپ کو بھی ہماری طرح، ان وحشیوں سے مقابلہ ہونے کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں سے محروم ہونا پڑا ہے۔"

میں گویا سرتاپا سماعت بنا ان کی گفتگو کو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ کوریلا بلیو تمسی کی ایک گھاگ ایجنٹ تھی اور وہ یہاں اپنی ساری تربیتی صلاحیتیں آزما رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں کوہارا ایک جنگجو مگر گنوار اور جاہل آدمی تھا۔

بہرکیف اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا کوریلا کو باہر کی (جزیرے سے باہر کی) باتوں کا کس حد علم تھا؟ کیونکہ بجوانی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ کوریلا کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ اس کا چیف باس کرنل سی جی بجوانی میرے ہاتھوں واصلِ جہنم ہو چکا تھا اور میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں انڈیمان کا رخ کر چکا تھا وغیرہ۔ کیونکہ بلیو تمسی کا قلع قمع کرنے کے بعد یہ عین ممکن تھا کہ کسی ساتھی نے کوریلا کو فون وغیرہ کے رابطے کے بعد ساری صورتِ حال بھی گوش گزار کر دی ہو؟ میں نے بھی ریتا (کی شکل کے) کے ڈوپلیکس میں جب بجوانی کی کوریلا سے بات کروائی تھی تو وہ بھی بلراج سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی اچانک آمد کے باعث کافی حد تک ادھوری رہ گئی تھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ کوریلا یا کوہارا کے پاس اب لاسلکی رابطے کے لیے کوئی سامان بھی بچا ہو۔

لہٰذا اب مجھے ان دونوں خبیثوں کی جوڑی کے آپس

میں باتوں کے دوران ہی ان ساری حقیقتوں کا اندازہ لگاتا تھا۔ لگتا مجھے کچھ ایسا ہی تھا جیسے مستقبل میں بہت سے سنسنی خیز انکشافات متوقع تھے۔

''تمہارا کیا خیال ہے کوریلا! یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ ہمارے دشمن یا پھر کوئی اور دوست یا دشمن گروپ؟'' میں نے کوبارا کو کوریلا سے کہتے سنا۔

''ہمارا یہاں کوئی دوست گروپ نہیں ہو سکتا۔ دشمن گروپ ایک ہی ہے...... شہزی اور اس کی ساتھی سوشیلا...... اور میرا پہلا خیال شہزی کی طرف ہی جاتا ہے۔'' کوریلا نے گہری اور پُرسوچ متانت سے جواب دیا تو کوبارا نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''لیکن شہزی کو یہ کیسے پتا چلا ہوگا کہ اس کے تینوں ساتھیوں کو تم لوگوں نے یہاں قید کر رکھا تھا؟'' اس کے مستفسر ہونے پر کوریلا نے ایک گہری سانس لی ...... اور بولی۔

''مجھے ملنے والی آخری اطلاعات کے مطابق شہزی نے گوریلا ایکشن کے ذریعے ہیڈ کوارٹر پر ہلا بولا تھا اور چیف باس کو اٹھا لے گیا تھا۔ لیکن پھر ٹرانسمیٹر ڈیوائس سے محرومی کے بعد میرا کسی سے رابطہ نہ ہو سکا کہ اب وہاں کیا صورتِ حال ہے۔ تاہم اس نے چیف باس (کرنل بھوانی) سے اگلوا ہی لیا ہوگا اپنے ساتھیوں کے بارے میں، اسی خیال سے میں کہہ رہی تھی کہ شہزی بھی یہاں کا رخ کر سکتا ہے۔''

''حیرت ہے، ایک اکیلے شہزی نے اتنا بڑا پالا کیسے مار لیا؟ را کے ایک انتہائی تربیت یافتہ ایڈوانس ونگ (بلیو تمسی) کے ہیڈ کوارٹر میں گھس کر......''

''کمانڈو ایکشن ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' کوریلا نے اس کی بات کاٹ کر کہا...... ''اور شہزی بھی بہرحال کوئی عام شخص نہیں ہے، ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہے۔ بڑے کڑے دل سے ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ پاکستان کی انٹیلی جنس اور آرمی دنیا کی ٹاپ ٹین لسٹ میں سب سے اوپر ہے۔ کئی ممالک اپنی فوجی تربیت کے لیے پاکستانی آرمی سے مدد لیتے رہے ہیں۔ کیا تم خود اب تک شہزی کا کچھ بگاڑ پائے ہو؟ جبکہ اس نے تمہیں ابھی تک تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔''

''میری بات اور ہے......'' وہ تلخی سے بولا۔ صاف لگتا تھا کہ اس نے کوریلا کی بات کا برا منا لیا تھا۔ ''تم لوگوں کی تربیت بھی انہی خطوط پہ ہوئی ہوگی [illegible] رکھی ہے اور پھر تمہارے ملک میں گھس کر اس نے تمہارے ونگ کا بیڑا غرق کر ڈالا۔ اگرچہ کافی حد تک میں نے بھی شہزی پر قابو پا لیا تھا لیکن میری اپنی ایک بیوقوف ساتھی چندرکلا کی غداری کے باعث وہ بچ نکلا۔ مجھے تو لگتا ہے، جس وقت تم لوگ اسے میری بوٹ سے اپنے ٹھکانے پر لے کر گئے تھے، اس نے وہ یاد رکھا ہوگا، تم لوگوں کی تباہی وہیں سے شروع ہوئی ہے۔''

''ایک حد تک تمہاری بات درست بھی ہے۔'' کوریلا کو اعتراف کرنا پڑا، یا پھر وہ اس پُرخطر مہم میں اس

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

چند عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

کے ساتھ تھی اور مصلحت سے کام لے رہی تھی۔ تاہم آگے بولی۔

''اگرچہ ہم اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے کر گئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے بل بوتے پر اس کا محل وقوع بھانپ لیا ہو...... اور بعد میں اس نے بھیدی بن کر ہماری لنکا ڈھا دی۔'' اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی، میں نے کوہارا کو ہلکا سا قہقہہ لگاتے سنا جبکہ کوریلا کی بات پر میرے ہونٹوں پہ بھی زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔

یہ حقیقت ہی تھی کہ جس وقت بھوانی نے مجھے لینے کے لیے اپنے تین اہم ساتھیوں، چندرناتھ، شیام اور کوریلا کو کوہارا کی بوٹ پر بھیجا تھا تو وہ تینوں مجھے بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے گئے تھے، واپسی میں میری خوش قسمتی تھی کہ میری آنکھوں پہ بندھی ہوئی پٹی تھوڑا نیچے اتر آئی تھی اور میں نے باریک جھری سے سارے محل وقوع کا اندازہ کرلیا تھا۔

''لیکن کوہارا! میں تمہاری طرف سے ایک الجھن میں مبتلا ہوں......'' اچانک کوریلا نے یہ کہہ کر نہ صرف کوہارا کو بلکہ مجھے بھی چونکا دیا تھا۔

''کیسی الجھن؟'' میں نے کوہارا کو کہتے سنا۔

''یہی کہ تم نے کس وجہ کے تحت یہاں کا رخ کیا تھا؟''

کوریلا کا یہ وہی سوال تھا جو میرے ذہن میں بھی ایک الجھن کی صورت میں پہلے ہی سے کلبلا رہا تھا۔

اس لیے میں بھی کوہارا کا جواب سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہو گیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا اچانک فضا میں ایک گونج دار آواز ابھری۔ وہ دونوں چونک کر سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بھی آواز کی سمت اوپر سر اٹھا کر دیکھا۔ نہر والے جنگل کی سمت سے ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا اور ہمارے اوپر سے گزرنے لگا۔

''جیپ کی آڑ میں ہو جاؤ...... یہ وہی لوگ لگتے ہیں......''

میں نے سے جی کوہارا کو چلاتے ہوئے سنا اور پھر وہ سب جیپ کی آڑ میں چلے گئے۔ خود میں پہلے ہی پتھر کی آڑ میں تھا...... تاہم کوہارا کا ہیلی کاپٹر کو دیکھ کر یہ کہنا کہ ''جیپ کی آڑ میں ہو جاؤ...... یہ وہی لوگ لگتے ہیں'' مجھے الجھن میں مبتلا کر گیا، ظاہر ہے اس کا یہی مطلب ہوسکتا تھا کہ وہ انہیں جانتا ہوگا، تو پھر یہ ہیلی کاپٹر سوار کون لوگ ہوسکتے تھے؟ میرا اپنا ذہن بھی سوالیہ نشان بن گیا۔

ہیلی کاپٹر نے ایک نیچی اڑان بھری اور وہ عین جیپ کے اوپر آکر فضا میں معلق ہو گیا۔ میری نظریں بہ غور کاپٹر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا زاویہ کچھ اس طرح کا تھا کہ مجھے سردست اس میں سوار صرف دو ہی افراد دکھائی دے سکے تھے۔

ایک تو پائلٹ تھا دوسرا آدمی جو اس کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے اپنے ہاتھوں میں دوربین تھام رکھی تھی جو وہ اپنی آنکھوں سے لگائے نیچے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اسے دوربین گلے میں جھلا کر ایک میگا فون تھامتے دیکھا، وہ شاید ان سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

''ہیلو...... تم لوگ کون ہو؟ اپنا تعارف کراؤ...... ورنہ گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا......''

یہ دھمکی آمیز اعلان ہندی اردو میں ہی کیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے کا ایک دروازہ سلائڈ ہوتے دیکھا تو میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں رینگ گئیں، وہاں سے تین چست لباس میں ملبوس مسلح افراد کی جھلک دکھائی دینے لگی، جنہوں نے رائفلیں تھام رکھی تھیں اور ان کا رخ نیچے جیپ کی طرف تھا۔

ان لوگوں نے کوریلا وغیرہ کو دیکھ لیا تھا۔ میرے رگ و پے میں سنسناہٹیں گونج رہی تھیں۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ کوہارا اور کوریلا اس خطرناک صورت حالات میں کون سا قدم اٹھاتے ہیں۔ میری دھڑکتی نظریں کبھی جیپ کو دیکھنے لگتیں تو کبھی فضا میں معلق ہیلی کاپٹر کو...... تب ہی میں نے دیکھا کہ کوریلا ایک دم اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے سامنے آگئی۔

''چالاکی مت دکھاؤ...... سب سامنے آؤ...... یہ آخری موقع ہے...... ورنہ فائر کھول دیا جائے گا......''

ہیلی کاپٹر سے وہی شخص میگا فون پر بولا...... اور ٹھیک اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری، میں [illegible] گیا۔ گولیاں جیپ کی ہی آڑ سے برسائی گئی تھیں، جدھر کوہارا اور اس کے دو ساتھی چھپے بیٹھے تھے۔

یہ یقیناً انہی کی حرکت ہوسکتی تھی اور اس میں بلاشبہ کوریلا کا کوئی دوش نہ تھا۔ بلکہ الٹا وہ اپنے سر پر لٹکی ناچتی موت کے سامنے کھڑی تھی۔

نیچے سے ہیلی کاپٹر کی طرف برسٹ کیے بعد دیگرے فائر کیے گئے تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر سے دو افراد کو رائفلوں سمیت چیختے ہوئے نیچے گرتے دیکھا۔ ایک تو زمین پر گرا تھا، جبکہ دوسرا پشت کے بل جیپ کے ہڈ کے آہنی راڈ پر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

پڑا...... اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی، کیونکہ اس کا وجود کمان کی طرح مڑ گیا تھا، جبکہ پہلا والا سر کے بل زمین پر گرا تھا۔

اسی وقت دوسرا برسٹ نیچے سے فائر کیا گیا تو اوپر والے مسلح آدمی نے ان پر بھی جوابی فائر کھول دیا۔ اس کی فائرنگ سے فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری ''گنتی'' غلط نہیں تھی۔ وہ تین ہی تھے پہلے، اب ایک رہ گیا تھا۔ میگا فون والا حلق کے بل مارے طیش کے چلایا تھا، اس کی آواز میگا فون پر بھی ابھری تھی، جو ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی رہ گیا تھا۔

ادھر کوریلا نے خود کو بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ زمین پر لٹا دیا تھا اور پھر بہ سرعت کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر رینگتی ہوئی جیپ کے نیچے چلی گئی تھی۔ اس کی زندگی ابھی شاید باقی تھی جو اس طرح موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی۔

ہیلی کاپٹر نے حرکت کی۔ وہ ہوا میں ہی بیک ٹرن لے کر اوپر اٹھنے لگا، تو میں نے دیکھا، سے جی کوہارا کسی درندے کی طرح دہاڑتا ہوا جیپ کے عقب سے نکلا۔

''شوٹ کرو......شوٹ کرو......''

اس کے ساتھ ہی وہ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے تابڑ توڑ گولیاں برسانی شروع کر دیں۔

کئی گولیاں ہیلی کاپٹر کی باڈی پر لگیں اور شاید اس کے دم والے پنکھے پر بھی لگیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہیلی کاپٹر فضا میں ڈگمگانے لگا اور گول گھومتے گھومتے پیچھے سے دھوئیں کی لکیر بھی چھوڑنے لگا۔ اس کے بعد وہ نہر پار والے کنارے پر ایک سماعت شکن دھماکے سے گرا اور اس میں آگ لگ گئی۔

کوہارا نے فتح کے نشے میں ایک زوردار اور جنگجویانہ سا نعرہ بلند کیا تھا کہ اسی وقت میں نے کوریلا کو جیپ کے نیچے سے نکلتے اور تیزی سے کوہارا کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کا حسین چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بھویں سکیڑ لیں اور اگلے ہی لمحے اس نے کوہارا کے قریب جا کر اس کے چہرے پر یکے بعد دیگرے دو تین تھپڑ جڑ دیے اور بپھرے ہوئے لہجے میں اس سے بولی۔

''جاہل، بے وقوف......! تمہیں اس طرح فائرنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو مرتے مرتے بچی ہوں۔ جب میں نے کہا تھا کہ انہیں میں باتوں کے ذریعے قابو کر لوں گی تو...... آہ......''

ٹریفک سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر ایک کار سوار خاتون کا تعاقب کر کے بڑی مشکل سے انہیں روکا اور چالان بک نکالتے ہوئے بولا۔ ''محترمہ آپ اسی میل فی گھنٹا کی رفتار سے جارہی تھیں۔''

خاتون بے پروائی سے بولی۔ ''تو پھر کیا ہوا؟ تم بھی تو اسی رفتار سے میرے پیچھے آرہے تھے۔''

مرحا گل، ورابن کلاں سے

اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ سے جی کوہارا کے دائیں ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ کوریلا کے گال پر پڑا تھا اور وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

میں نے دیکھا سے جی کوہارا کا چہرہ مارے طیش وغیظ کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

اس کے دونوں مسلح ساتھیوں نے زمین پر گری کوریلا کی طرف اپنی رائفلوں کا رخ کر دیا تھا۔ کوہارا کا شاید ابھی تک غصہ نہیں اترا تھا۔ وہ دانت پیستا ہوا کوریلا کی طرف بڑھا اور اپنے دائیں ہاتھ کی مٹھی میں اس کے بال دبوچ کر بیدردی سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا اور اس کے قریب اپنا گینڈے جیسا بھیانک منہ کر کے غرایا۔

''تو اپنی اوقات میں رہ کتیا! میری باس نہیں ہے تو...... میں جو مناسب سمجھوں گا وہی کروں گا۔ آئندہ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو تیری ادھر ہی مٹی پلید کر دوں گا، کبھی تو......'' کہتے ہوئے اس نے اسے پرے دھکیل دیا۔

میرے لیے یہ صورت حال دلچسپی کا باعث بننے لگی تھی۔ میرے دشمن آپس میں ہی لڑ پڑے تھے۔ لیکن دیکھا جاتا تو کرنل بھوانی کے جہنم واصل ہونے اور بلو تلسی کے خاتمے کے بعد کوریلا کی شاید اپنی بھی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ بیکار ہو گئی تھی۔ وہ بہرحال را کے ایک ایڈوانس ونگ (بلو تلسی) کی ٹاپ ایجنٹ رہ چکی تھی اور اب بھی ان کی (را، کی) ساتھی ہی کہلاتی تھی۔

کوریلا کا حسین چہرہ احساس ذلت تلے مسخ ہو چکا تھا اور وہ کوہارا کو بڑی خونی نظروں سے گھورے جارہی تھی۔

''مت بھولو کہ اس وقت تم بھی ایک طرح سے میرے ہی تابع ہو...... اس مہم میں جو میں بہتر سمجھوں گا کروں گا [illegible] مشورہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں

ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہے۔" کوہارا نے روایتی [illegible] کہا۔

"میں تمہاری تابعداری کے لیے تمہارے ساتھ نہیں ملی تھی......" کوریلا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔ "ایک دیرینہ مشترکہ مشن کی وجہ سے ہم پلہ ساتھیوں کی حیثیت سے ہی ہم ایک دوسرے کے ساتھ شامل تھے۔"

"حیثیت!!" کوہارا استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "کون سی حیثیت کی بات کر رہی ہو تم مس کوریلا؟ شہزی نے تم سب کی حیثیت زیرو کر ڈالی ہے۔ تمہارے چیف باس سمیت چندر ناتھ، شیام اور دیگر ٹاپ ایجنٹ اس کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں، تم بھی اس لیے بچ گئی ہو کہ یہاں میرے ساتھ موجود ہو......"

"ہلیو تکسی جیسے کئی ونگ را کے پیٹ سے جنم لیتے رہیں گے...... اور لیتے رہے ہیں کوہارا!" کوریلا نے جواب دیا۔ "ہلیو تکسی کے خاتمے کو تم یہ مت سمجھو کہ میرا عہدہ یا میری حیثیت بھی ختم ہو چکی ہے، میں اب بھی را کے ایک بڑے عہدے دار کی حیثیت رکھتی ہوں۔ مگر تمہارے گریٹ ماسٹر لولوش نے اب تک شہزی کا کیا بگاڑ لیا ہے؟ اس نے تمہیں بھی تو یہاں دھول چٹا دی ہے۔ اب تم لوگ بھی شہزی سے مقابلہ کرنے کے بجائے اس کے قیدی ساتھیوں کو چارہ بنانا چاہتے ہو...... اس بزدلانہ حرکت میں ہم دونوں شامل ہیں۔"

"گریٹ ماسٹر کی بات مت کرو......" کوہارا اس کی طرف گھور کر بولا۔ "تمہیں کیا معلوم کہ اس کے کیا مقاصد ہیں اور وہ کتنی بڑی ہستی ہے، گریٹ ماسٹر کا دائرۂ کار پوری دنیا میں مکڑی کے جال کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کے کئی مقاصد ہیں، تم تو صرف ایک شہزی کو رو رہے ہو، جبکہ گریٹ ماسٹر لولوش اسے ایک حد سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ایک دن شہزی کچے دھاگے کی طرح اس کی طرف کھنچا چلا آئے گا...... اور تم سب منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔ یہاں انڈیمان میں بھی میں صرف شہزی کے ساتھیوں کو یرغمال بنانے ہی نہیں بلکہ کسی اور اہم مشن پہ آیا ہوں......"

"مجھے اس کا پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ تمہارا درحقیقت یہاں اصل مشن کچھ اور ہے......" کوریلا نے فوراً زیرک لہجے میں کہا۔ کوہارا کے چہرے پر میں نے ایک رنگ سا بدلتے دیکھا۔

"خیر......" اس نے کاندھے اچکائے...... "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن اپنے مشترکہ مشن میں ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہنا چاہیے اور اس کے لیے ہمیں باہمی مشورے سے ہی آگے بڑھنا چاہیے۔"

"مجھے کسی کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے مس کوریلا!" سے جی کوہارا اکھڑپن سے بولا۔ "تم اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو تمہیں اب ایک ماتحت بن کر میرے ساتھ رہنا ہوگا...... ورنہ اپنا راستہ بدل لو......" اس نے آخر میں بڑی رکھائی سے کہا۔

"مائی فٹ!" کوریلا نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ "مجھے یہ ہرگز قبول نہیں، ساتھ ہوگا تو برابری کی بنیاد پر جیسا پہلے تھا، ورنہ نہیں۔ اس جزیرے میں ہم دونوں ہی اپنے بیرونی ساتھیوں کی مدد سے محروم ہیں، مگر میرا معاملہ اور ہے...... مجھے جیسے ہی اپنے ساتھیوں سے رابطے کا موقع ملا...... وہ یہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے۔"

"ہم......!" کوہارا نے ایک سنسناتی ہوئی ہنکاری خارج کی اور بولا۔ "مت بھولو کہ برما کی سرحد بھی اس جزیرے سے زیادہ دور نہیں۔ خیر...... اپنا راستہ لو اور خبردار میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

کوریلا غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی جیپ کی طرف بڑھی۔ کوہارا نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ گن لیے اس کے راستے میں آ گیا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ مجھے جیپ سے اپنا سامان اتارنا ہے۔" کوریلا نے قریب کھڑے کوہارا کی طرف دیکھا۔

"تم یہاں سے کچھ نہیں لے جا سکتیں......" کوہارا نے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

"یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے مسٹر کوہارا......" کوریلا کے لہجے میں تہدید تھی۔

"اچھا برا کرنا اب میرے ہاتھ میں ہے...... شکر کرو کہ میں تمہیں یہاں سے زندہ جانے دے رہا ہوں......" کوہارا نے بھی پھنکارتے لہجے میں کہا اور کوریلا کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

ٹھیک اسی وقت فضا میں ایک تیز نسوانی چیخ اُبھری...... "شہزی......"

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

کوریلا اور سے جی کوہارا بھی بُری طرح چونک اٹھے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

آوارہ گرد

قسط:32

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب [illegible] نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محتر پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن بعد وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، وہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ [illegible] کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی [illegible] شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے نظم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ [illegible] کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا [illegible] اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی [illegible] ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ [illegible] دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف ککل [illegible] اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ ککل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک [illegible] اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنا لیتا ہے۔ شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ [illegible] کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان [illegible] حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ [illegible] استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت [illegible] خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے [illegible] تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا، شہزی سے [illegible] کھانے لگتا [illegible] اس کی وجہ زہرہ بانو کا [illegible] طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا [illegible] زہرہ بانو [illegible] شاہ نامی ایک نوجوان کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ [illegible] کی جنگ چلتے چلتے ملک دشمن [illegible] سر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی [illegible] اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، [illegible] جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اپنکسٹرم" [illegible] تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں [illegible] حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص ٹریننگ کیمپ میں [illegible] جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو معطل ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ [illegible] سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اپنکسٹرم کا سربراہ لولوڈش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس [illegible] بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے [illegible] جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوڈش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری [illegible] جاتی ہے، جسے لولوڈش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو دولتیا سیٹھ نوید ساتھ والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوڈش [illegible] سے اور دوسری وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ [illegible] دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹیکسی کا ایک افسر کرنل سی [illegible] بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اپنکسٹرم اور بلیو ٹیکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے [illegible] وہ دونوں [illegible] میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی [illegible] میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی [illegible] کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی [illegible] شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں [illegible] برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے، وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام [illegible] سے ہوتی ہے جو کبھی اپنکسٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ [illegible] زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اپنکسٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر [illegible] لولوڈش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اپنکسٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن [illegible] ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک [illegible] اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ [illegible] کا نام دے رکھا ہے۔ لولوڈش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹیکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹیکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن غازی سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے مقصد [illegible]

ان کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ [illegible] بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایلی ایڈوانی [illegible] اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی [illegible] ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی [illegible] ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگیوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی [illegible] شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث [illegible] خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی [illegible] مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی [illegible] راہول [illegible] تے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے ..... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا [illegible] دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ [illegible] حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی [illegible] تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ سوہن او[illegible] کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا [illegible] ٹائپ کے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان [illegible] مسرت کر [illegible]۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے [illegible] ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے [illegible] ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج[illegible]تے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور [illegible] بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ [illegible] کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر [illegible] میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور یوں اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو [illegible] رٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی شہزی [illegible] نے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈمان" پہنچا دیے گئے [illegible] نام [illegible] کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں سے جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچ کرتا ہے۔ [illegible] ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی متجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا [illegible] تک حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا فشکور سے ہوتی ہے، جو کمپنی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ [illegible] ان کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا فشکور کے ہمراہ کلی متجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا فشکور کی سربراہی میں رات کی [illegible] جاری تھا۔ [illegible] دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا فشکور کے گارڈ [illegible] مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے بازو میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر [illegible] پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا فشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے اس سناٹے میں اب شہزی [illegible] کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چیخ کی یہ آواز سوشیلا کی تھی اور اس نے میرا نام لے [illegible] مدد کے لیے پکارا تھا۔

[illegible] وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس نے یوں میرا نام چیخ مارتے ہوئے ایک نئی مصیبت کو پکار لیا تھا۔

[illegible] اعصاب یکلخت تن گئے۔ میں دہری اور خطرناک [illegible] کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک طرف کوہارا جیسا سفاک اور [illegible] دشمن چونک گیا تھا، دوسرے سوشیلا کو نجانے کس مصیبت [illegible] گھیرا تھا۔

میں نے پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور ایک آخری نظر [illegible] لنے کے بعد میں تیزی سے پلٹا اور دوڑتا ہوا اس [illegible] طرف لپکا جدھر میں نے سوشیلا کو چھوڑا تھا۔ وہاں پہنچا تو بُری طرح ٹھٹک کر رکا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی میرے پورے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔

سوشیلا جس چھتنار کے سونے نے والے درخت سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھی تھی اس کی جھکی ہوئی شاخوں سے ایک موٹا اژدھا اپنا غار سا منہ پھاڑے جھول رہا تھا۔

مجھے اعتراف تھا کہ میں نے آج تک صرف فلموں میں ہی ایسا خوفناک اور بڑا اژدھا دیکھا تھا مگر آج حقیقت میں اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں سنسنی آمیز پھریری دوڑ گئی تھی۔

اژدھا درخت کی کسی موٹی شاخ سے لپٹا ہوا نصف نیچے کی طرف جھول رہا تھا...... اور اس کا خوف ناک منہ

سوشیلا کے چہرے سے صرف ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر ہوگا۔ کھلے ہوئے منہ سے دو بڑے نکیلے اور زہرناک دانت صاف جھانک رہے تھے۔ اس کی دوشاخہ زبان باہر کو لپلپا رہی تھی اور وہ جیسے سوشیلا کو نگلنے کے لیے پَر تولے ہوئے تھا جبکہ سوشیلا کا چہرہ خوف و دہشت کے مارے پیلا پڑ چکا تھا۔

اژدھے کی پھنکاریں بڑی خوفناک اور سنسناتی ہوئی تھیں۔ میرے پاس اسلحہ نام کی کوئی شے نہ تھی، میں نے قریب جا کر یونہی اژدھے کو ذرا ہشکارا تو وہ سوشیلا کی طرف سے رخ پھیر کر ایک خوف ناک پھنکار کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا...... میں نے سوشیلا کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور اس نے بھی ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی زخمی ٹانگ کے باوجود خود کو ایک طرف دھیرے دھیرے سرکانا شروع کردیا۔

میں نے ایک ٹہنی اٹھالی تھی اور اس سے بار بار اژدھے کو ہشکار رہا تھا، مقصد میرا یہی تھا کہ وہ سوشیلا کی طرف سے ہٹ جائے اور ایسا ہوا بھی تھا، مگر اب یہ موذی مصیبت میرے گلے پڑ گئی تھی۔ وہ درخت سے اتر کر زمین پر آگیا تھا اور میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے کوہارا وغیرہ کی طرف سے بھی پریشانی لاحق تھی، کیونکہ چیخ کی آواز انہوں نے بھی سن لی تھی بلکہ انہوں نے تو سوشیلا کو میرا نام لیتے ہوئے بھی یقیناً سن لیا ہوگا۔ میں اب دہری پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

لیکن ابھی تو میں اژدھے کی طرف سے ہی اپنی توجہ نہیں ہٹا پا رہا تھا کہ دوسری پریشانی کی طرف دھیان دیتا۔ البتہ سوشیلا اپنی جگہ سے کہیں غائب ہوگئی تھی، شاید قریب جھاڑیوں میں جادبکی تھی۔

اژدھا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بلاشبہ اس کی لمبائی اور موٹائی غیر معمولی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ یہ بہ آسانی کسی بھی حیوان کو زندہ نگل جانے کی پوری استعداد رکھتا تھا اور وہ شاید یہی کچھ کرنے کے لیے میری طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ میں بھی اسی پر نظریں جمائے الٹے پیروں پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس موذی کی مقناطیسی آنکھوں نے مجھ پر عملِ تنویم کردیا ہو، میں اس کی طرف سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ تب ہی اچانک مجھے ٹھوکر لگی، شاید میرا پاؤں رپٹا تھا۔ میں کمر کے بل زمین پر جا گرا اور وہ قوی ہیکل اژدھا تیزی سے رینگتا ہوا میرے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور اس نے میری گردن کی طرف اپنے لمبے تیز نکیلے دانت بھی بڑھائے۔

وہ مجھے...... نگلنے کے لیے بالکل باعزم تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور میں نے اژدھے کے چہرے کا دوسرا خوفناک منظر دیکھا۔ اس کا منہ گولیوں سے چھلنی ہوکر اور بھی بھیانک دکھائی دینے لگا تھا۔

وہ میرے بالکل قریب گرا اور تڑپنے لگا۔ میں جلدی سے تھوڑا مزید پیچھے کھسک کر اٹھ کھڑا ہوا تو پستول کی سرد نال میری گدی سے آن لگی اور ساتھ ہی غراتی ہوئی آواز بھی ابھری۔

"شہزی! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا، ورنہ تمہارا حشر بھی اس اژدھے سے مختلف نہ ہوگا۔"

اس بے رحم اور سفاک آواز کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ شاید مجھے اس نے اپنی طرف گھومنے کا موقع دیا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی اور کوریلا اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ اسی کے کسی ساتھی نے...... اژدھے پر برسٹ چلایا ہوگا اور ظاہر ہے اس میں کوہارا کی ہی ہدایت شامل ہوسکتی تھی، کیونکہ میں اژدھے کا نہیں اس کا شکار تھا۔

اژدھا ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ سوشیلا غائب تھی۔ مجھے اس طرف سے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ ورنہ اس بے رحم کوہارا سے کوئی توقع نہ تھی کہ وہ سوشیلا کو دیکھتے ہی اسے بھی برسٹ مار کر ہلاک کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہم دونوں میں سے ایک شکار کو مردہ اور دوسرے کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔

"مجھے بالکل بھی امید نہ تھی کہ میرا دیرینہ دشمن اور شکار...... کلی منجارو کی سرزمین پر میرے سامنے ہوگا۔" کوہارا نے پُرغرور لہجے میں کہا۔

میں نے اپنے شکستہ پڑتے اعصاب کو ایک گہری سانس لے کر پُرسکون کیا اور کوہارا کی طرف دیکھ کر بے خوفی سے بولا۔

"تم نے الٹ کہا کوہارا......! اصل میں یہی الفاظ میرے کہنے کے تھے۔" میری اس جوابی لفظی کارروائی نے اس کے غرور کی جیسے دھجیاں بکھیر دیں، اس کے مکروہ گینڈے جیسے چہرے کے تاثرات بگڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

"تم تو پھر بھی شاید مجھ سے مایوس ہوگئے تھے اور یہاں کم از کم میری تلاش میں تو نہیں آئے تھے مگر میں ضرور تمہاری تلاش میں تھا۔ اپنے ہم وطن ساتھی ہشام جھلکری کو تم نے جس بیدردی سے ہلاک کیا تھا، اس کا تمہیں حساب اپنی جان دے کر ہی چکتا کرنا ہے کوہارا......"

بات سن کر وہ غضب آلود انداز میں دہاڑا اور میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول یا۔ یہ ہوائی فائر تھا جو اس خبیث نے اپنے اندر کے لیے کیا تھا۔

اب مجھ سے بچ کر نہیں جاسکتے شہزی! نہیں تم نے یہاں آکر میرا کام کس قدر آسان کردیا

ٹھیک اسی وقت ایک زوردار پھنکار نما خرانے کی ری اور ہم سب بُری طرح ٹھٹکے۔ دوسرے ہی لمحے یک ساتھی کی کربناک چیخ سنائی دی۔ ہم کے یا اور اژدھے نے حملہ کردیا تھا۔ وہ شاید پہلے ے کا جوڑی دار نر یا مادہ تھا۔ کہیں قریب موجود اپنے ساتھی کا ان کے ہاتھوں حشر دیکھ لیا تھا اور موقع اس نے سب سے پہلے کوہارا کے مسلح ساتھی پر حملہ

مخصوص سانپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے جانور انتقام کا پورا پورا مادہ رکھتے ہیں۔

اس اژدھے نے اچانک ہی جھنڈ دار درختوں سے کے ساتھی پر حملہ کیا تھا اور اس کی گردن پر کاٹ دوسرے کو اپنی موٹے رسے جیسی دم میں گھیر لیا اس پر ایسی دہشت طاری ہوگئی تھی کہ ...... گن ہونے وہ فائر نہ کرسکا تھا اور گن اس کے ہاتھ سے گئی تھی۔

اسے دبوچ کر اژدھے نے پرے اچھال دیا۔ میں کوہارا کے اس دوسرے ساتھی کو ہوا میں اڑتے ہوئے جنگلی جھاڑیوں میں گرتے دیکھا تھا۔

میں محتاط تھا، جبکہ کوہارا نے اپنے پستول کا رخ کی طرف کو کردیا اور اس پر تکے اوپر فائر جھونک میرے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میں نے ایک جھاڑیوں میں جست بھری اور اندر ہی اندر دور تک چلا گیا، وہاں سوشیلا کو میں نے ایک جگہ جنگلی گھاس پر سسکتے ہوئے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رو پڑی اور ے بولی۔

"ہے بھگوان! تم زندہ ہو...... شکر ہے...... میں تو سمجھی تھی ...... لیکن یہ فائرنگ کی آوازیں......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر تسلی دی اور ہانپتے ہوئے کہا۔

"سوشی! حالات اس سے بھی زیادہ نازک اور خطرناک ہوگئے ہیں۔ کوہارا اور کوریلا یہاں آچکے ہیں اور یہ فائرنگ کی آواز انہی کے ساتھیوں کی تھی۔" پھر میں نے اسے مختصراً بتایا کہ معاملہ کیا تھا۔

کوہارا کی یہاں موجودگی کا سن کر سوشیلا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اپنے دشمنوں میں دو افراد سے سب سے زیادہ خار کھاتی تھی۔ ایک بلراج سنگھ دوسرا سے جی کوہارا......

"ان کی اس طرف جیپ کھڑی ہے، ہمت کرو، یہی موقع ہے، ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا ہمارے پاس......" میری بات اور پیش آمدہ صورت حال نے اسے یوں بھی پہلے ہی سے بہت کچھ باور کرادیا تھا۔ لہٰذا اس نے سہارا لینے کے لیے میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اسے اٹھا لیا۔

اس کی ٹانگ کا زخم کافی بھر گیا تھا، مگر اب بھی بہرحال وہ بغیر سہارے کے چلنے سے قاصر تھی۔ میں نے بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا، اسے کاندھے پر ڈال کر چل پڑا اور جیپ کے پاس آکر ہی دم لیا۔ میں نے سوشیلا کو جیپ میں سوار کرایا اور ابھی میں سوار ہونے ہی والا تھا کہ اچانک سوشیلا چیخی۔

"شہزی...... بچو!"

مگر تب تک کوئی عقب سے مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا، جس پر سوشیلا کی اچانک ہی نگاہ پڑی تھی۔ مجھ پر جست بھرنے والے نے بیک وقت مجھے ٹھوکر بھی رسید کردی تھی۔ میں جیپ سے ٹکرا کر نیچے گرا اور میری پیشانی جیپ کے کسی لوہے سے ٹکرائی، ایک لمحے کے لیے تو میرا دماغ ہی جھنجھنا سا گیا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور تاریکی سے نجات حاصل کرنا چاہی تھی کہ ایک لات میرے چہرے سے ٹکرائی، تب تک دھندسی میری آنکھوں سے چھٹ چکی تھی اور میں نے کوریلا کو خود پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ وہ بڑی مکاری سے کوہارا اور اس کے ساتھیوں کو اژدھے سے الجھا چھوڑ کر میرے تعاقب میں چلی آئی تھی۔

اسے عین آخری لمحات میں اپنا راستہ کھوٹا کرنے پر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر اسی لمحے سوشیلا نے زخمی ہونے کے باوجود اسے مجھ پر یوں پل پڑتے دیکھ کر جنونی انداز میں چیختے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی اور اسے لیتی ہوئی نیچے آرہی۔ کوریلا نے اس کے پیٹ پر اپنا گھٹنا رسید کردیا، سوشیلا کرب ناک آواز سے چیخی، اسی وقت میں نے کوریلا کی پشت پر ایک زوردار لات رسید کردی۔ وہ

کراہتی ہوئی خاصی دور جا گری۔ میں نے پیٹ پکڑے تڑپتی سوشیلا کو سنبھال کر دوبارہ جیپ میں ڈالا اور خود بھی سوار ہوگیا۔

توقع کے عین مطابق اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔

چابی گھماتے ہی غراہٹ کے ساتھ جیپ کا طاقت ور انجن اسٹارٹ ہوگیا۔

اسی وقت کوریلا ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی جیپ کی طرف دوڑی۔ اس کی آخری حد تک کوشش یہی تھی کہ مجھے جیپ لے کر نکلنے نہ دے۔ مقابلہ میں بھی ان کا کرنا چاہتا تھا، مگر ابھی میرے سر پر صرف اپنے ساتھیوں کو اس وحشی قبیلے سے بچانے کی دھن سوار تھی، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جانیں خطرے میں پڑتی جارہی تھیں، نیز وہ کس حال میں ہیں، یہ بھی ابھی تک نہیں پتا تھا اور پھر زخمی سوشیلا بھی میرے ساتھ تھی، وہ کسی بھی وقت میری کمزوری بن سکتی تھی۔

میں نے بجلی کی پھرتی کے ساتھ جیپ کو گیئر ڈالا اور ایکسلیٹر پورا دبا دیا۔ ٹھیک اسی وقت جب جیپ غلیل سے نکلے تیر کی طرح چھوٹی تھی، کوریلا اس پر لانگ جمپ لگا چکی تھی۔ وہ سیدھی جیپ کے عقبی حصے میں گری۔ میں نے جیپ روکی نہیں تھی مگر کوریلا کی مصیبت گلے پڑ چکی تھی۔ میں جیپ کو بدستور دوڑائے چلا جارہا تھا اور منتظر تھا کہ کوریلا مجھے قابو کرنے کی نیت سے میرے قریب آئے تو میں اسے اس ''مہم جوئی'' کا مزہ چکھاؤں، مگر وہ مکار لومڑی ثابت ہوئی اور اس نے بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے عقب کی سیٹ پہ لیٹی سوشیلا پر ہلا بول دیا۔ اور اس کی گردن دبوچ لی۔ سوشیلا کی گھٹی گھٹی آواز سن کر میرا دماغ گرم ہوگیا اور میں نے جیپ کو بریک لگا دیے۔ جیپ ایک جھٹکے سے رکی اور میں نے پلٹ کر کوریلا کو دبوچنا چاہا تھا کہ اس نے تاک کر میرے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ بھی ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھی، لیکن اس وقت وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد یہی ہوسکتا تھا کہ وہ مجھے نکلنے نہ دے اور تب تک کوہارا یہاں ٹپک پڑے۔

میں نے اس کے گھونسے کی پروا کیے بغیر ایک ہاتھ سے اس کے بالوں کو مٹھی میں دبوچ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی اور اس نے سوشیلا کی گردن چھوڑ دی، مگر بعد میں مجھے ادراک ہوا کہ اس میں سوشیلا کی اپنی کوشش کا بھی دخل تھا۔ اس نے اپنی دوسری ٹانگ اس کے پیٹ میں جڑ دی تھی۔

بہرحال کوریلا ذرا دیر کو ڈھیر سی گئی اور پھر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا تو اس کی نازک اندام گردن پر ایک زوردار مخصوص پنج رسید کر کے اس کا منکا توڑ ڈالتا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کا چہرہ دبوچ کر اسے جیپ سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ چیخ مار کر گری اور ذرا دور تک لڑھکتی چلی گئی، میں نے فوراً جیپ آگے بڑھا دی اور کوریلا اپنا ہاتھ ملتی رہ گئی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں..... سوشی؟'' میں نے سامنے نظریں رکھتے ہوئے سوشیلا سے پوچھا، وہ..... دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا سہلا رہی تھی، مری پھنسی پھنسی آواز سے بولی۔

''ہاں..... ٹھ..... ٹھیک ہوں تم گاڑی چلاتے رہو۔''

میں جیپ کو دوڑاتا چلا گیا۔ ناہموار راستوں پر جیپ زبردست ہچکولے کھانے لگی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کوہارا سے بھی دو دو ہاتھ کر کے اس سے اپنا پرانا حساب چکتا کرلیتا۔

اگرچہ ناشکور نے مجھے باقی کے راستے کا ادراک کروا دیا تھا، لیکن بہرحال اس کی بات کچھ اور تھی، وہ ساتھ ہوتا تو منزل تک پہنچنے کی مجھے کچھ زیادہ فکر نہ ہوتی، مگر اب اس کے بغیر مجھے منزل کا بقیہ ماندہ سفر کٹھن ہی محسوس ہورہا تھا۔

اب اس نئی افراتفری میں تو مجھے آگے کی منزل کا ادراک کچھ مشکل ہی نظر آرہا تھا، کیونکہ اس میں راستہ بھٹکنے کا احتمال بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری تھی، یہاں رکنا بھی ٹھیک نہیں تھا۔

کوہارا یا کوریلا سے میں خوف زدہ نہیں تھا، مگر وہ میرا راستہ کھوٹا کر سکتے تھے اور میں جلد سے جلد اپنے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیپ کی رفتار میں نے کم کر دی تھی۔ جیپ کو زیادہ دیر تک میں استعمال میں نہیں لاسکتا تھا۔ کیونکہ آگے کا جیو دشوار گزار راستہ تھا، وہ کم از کم ''وہیکل ڈرائیو'' کا بالکل بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

جب مجھے اس بات کی اچھی طرح تسلی ہوگئی کہ میں کوہارا وغیرہ سے بہت دور نکل آیا تھا تو میں نے ایک مقام پر جیپ روک دی۔

سیاہ چٹانی سلسلہ اور ڈھلوانی جنگل بتدریج گنجان ہوتا

چلا گیا تھا۔ نانا شکور نے مجھے یہی بتایا تھا کہ قربِ منزل کی ایک اہم نشانی یہ بھی تھی کہ ایک تو پہاڑی سلسلہ، جو پہلے ذرا دور دور دکھتا تھا، وہ قریب ہو کر گنجان ہوتا چلا جائے گا، جبکہ چھائی کا گھنا جنگل رفتہ رفتہ اپنی باقیات کے ساتھ ختم ہو کر ٹنڈ منڈ خشک اور کانٹے دار ببول کی جھاڑیوں میں بدل کر نیم صحرائی علاقے میں بدل جائے گا۔

میں جیپ ایک چٹانی راستے کے درمیانی تنگ اور پتھریلے راستے پر روک کر نیچے اتر آیا تھا۔ سوشیلا ابھی جیپ میں ہی سوار تھی۔

میں اطراف میں نظریں دوڑانے لگا۔ میرے سامنے بھی پتھریلا تنگ راستہ بل کھاتا ہوا دور تک جا رہا تھا۔ چٹانوں کی ڈھلوان پر جنگل ناپید ہونے لگا تھا، کہیں کہیں سوکھی ٹہنیوں والے ٹنڈ منڈ سے درخت نظر آتے تھے، یا پھر جھاڑیوں کی بہتات تھی، زمین ریتیلی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں گرمی اور حبس کے علاوہ سیاہ چٹانوں کی تپتی سنگلاخ سطح سے بادِ سموم سر ٹکرا رہی تھی۔ دن نکل آیا تھا اور سورج چٹانی افق سے کافی اُبھر آیا تھا۔ مجھے گرمی اور پسینے کا احساس ہونے لگا۔

وہ نیم صحرائی علاقہ قریب لگتا تھا۔

درحقیقت میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا اس مقام پر مجھے جیپ چھوڑ دینی چاہیے تھی یا ابھی اسے استعمال میں لاتے ہوئے باقی کا کسی حد تک سفر آسان کیا جا سکتا تھا۔

''ہم منزل کے کتنے قریب ہیں شہزی؟'' مجھے کافی دیر اطراف کا جائزہ لیتے اور سوچتے پا کر سوشیلا نے پوچھا۔

''منزل تو اب شاید زیادہ دور نہیں ہے مگر..... سمجھ میں نہیں آرہا کہ باقی کا سفر پیدل طے کیا جائے یا پھر جیپ میں.....؟''

''اس بلا کی گرمی اور سنگلاخ چٹانی راستوں میں فی الحال تو یہ جیپ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی ثابت ہو سکتی ہے۔'' وہ بولی۔

''یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا اور ایک ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرا تو وہ مجھے پسینے سے تر محسوس ہوئی۔ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی۔ کچھ سوچ کر میں چند قدم چلتا ہوا جیپ کے عقبی حصے کی طرف چلا آیا، جہاں مقدور بھر کیمپنگ وغیرہ کا سامان لدا ہوا تھا۔ میں اوپر چڑھ گیا اور سامان کی اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی، سوشیلا مجھے مالِ غنیمت کا جائزہ لیتے ہوئے خاموشی سے دیکھنے لگی۔

سامان میں مجھے خیمہ زنی کے علاوہ کچھ خشک خوراک کے ڈبے، پانی کی دو چھاگلیں، کافی، چائے بنانے کا تھوڑا بہت سامان، چھوٹے موٹے برتن، ماچس لائٹر سب پڑے ملے۔ ان میں دو ٹارچ بھی تھیں، سگریٹ کا ایک ادھ کھلا بنڈل، کسی شکار کیے گئے پرندے کا بچا کھچا گوشت، جو کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، اس کے علاوہ جس اصل شے کی مجھے تلاش تھی وہ اسلحہ تھا، جو ایک کھلے پڑے چرمی بیگ میں بکھرا بکھرا سا پڑا تھا، صاف نظر آتا تھا کہ اس میں کافی سے زیادہ اسلحہ استعمال کیا جا چکا تھا۔

تاہم جو بھی بطور 'غنیمت' باقی بچا تھا اس میں دو پستول تھے۔ فاضل راؤنڈ کے گتے کے دو ڈبے تھے، اس کے علاوہ ایک رائفل تھی اور ایک لمبے پھل والا چاقو اور موٹے دستے والا خنجر بھی رکھا ملا۔

اسلحہ تھوڑا سا تھا مگر میری آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی فوری کام میں لانے والی اشیا کو یکجا کیا۔ پستول بھرے ہوئے تھے، چھوٹا میں نے سوشیلا کو تھما دیا اور دوسرا میں نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا، جبکہ رائفل ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر ٹکا دی۔ فاضل راؤنڈ کے ڈبے بھی میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیے۔

اس سب سے فارغ ہو کر سوشیلا اور میں نے باری باری پانی پیا اور کچھ زادِ راہ کے طور پر سنبھالے رکھا۔ اس کے بعد میں ڈرائیونگ ... سیٹ پر آبیٹھا۔

''تم کیا جیپ چھوڑنا چاہتے تھے؟ مگر کیوں.....؟'' سوشیلا نے پوچھا۔

''ہاں! ارادہ تو پہلے میرا یہی تھا۔'' میں نے خشک خوراک کا ایک ڈبا کھول کر سوشیلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن..... اب ارادہ بدل لیا ہے۔'' کہتے ہوئے میں نے دوسرا ڈبا اپنے لیے کھولا۔

تھوڑا بہت کھا پی لینے کے بعد میں نے یونہی ایک نگاہ گردوپیش میں ڈالی پھر سوشیلا سے بولا۔ ''تم ادھر محتاط ہو کر بیٹھو، میں ذرا کسی قریبی پہاڑی پر چڑھ کر منزل کے راستوں کا تعین کر کے آتا ہوں۔'' میری بات پر سوشیلا نے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی تھی۔

میں نے مسکرا کر اس کے چہرے کی نرماہٹ بھرے گال کو تھپتھپایا اور پھر چھلانگ مار کر جیپ سے نیچے اُترا۔

ایک قریبی پہاڑی کا رخ کیا تو وہ سورج کی تمازت سے بری طرح تپ رہی تھی۔ اس قدر کہ میرے جوتے تک گرم ہونے لگے، مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اوپر چڑھتا

رج میرے عین سر پر چمک رہا تھا اور میں پسینے ور ہو رہا تھا۔ قدرے بلندی پر پہنچ کر میں نے طرف نگاہ دوڑائی۔

میرے سامنے اب حدِ نگاہ تک صحرا اور کالی چٹانوں بکھرا تھا۔ کہیں کہیں صحرا میں ٹیلوں اور ٹبوں کی نوں پر کیکٹس اُگے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس کے یک موٹی سیاہ رنگ کی پٹی سی دکھائی دی اور میرا دل یب سے جوش تلے یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مجھے نانا شکور نے اسی گاڑھی اور کالی پٹی کے بارے تا تھا اس کے دکھائی دے جانے کا مطلب یہی تھا کہ نزل پر پہنچ چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں اپنی منزل کے قریب یا تھا مگر یہ جتنی قریب دکھائی دے رہی تھی اتنی تھی نہیں۔ رح حدِ نگاہ پھیلے ہوئے ریگ زار میں سراب انسان کو تا ہے، بالکل اسی طرح کسی بلند پہاڑی چوٹی کیلئے ت یا ایسی ہی کوئی شے دکھائی دے جائے تو وہ اتنی ہوتی نہیں ہے جتنی کہ نظر آتی ہے، ایسی سراب زدہ زل تک پہنچنے کے لیے بڑے صبر اور استقامت کی رت ہوتی ہے۔

بہرکیف میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اچانک بری طرح ٹھٹک کر رک گیا اور پھر جیسے میرے اوسان خطا ہو

☆☆☆

وہ بڑا دہشت ناک منظر تھا..... منظر کیا تھا بلکہ ایک چلتی ہوئی بڑی زہریلی مصیبت تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ میں پلٹا تھا، اگر مجھے پلٹتے ہوئے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو ے عقب میں اور دائیں بائیں پھیلے ہوئے قطار اندر قطار رینگتے ہوئے سیاہ موٹے بچھو میری ٹانگوں اور بعد میں جسم سے چمٹ چکے ہوتے۔ اُف..... یہ بچھو تھے یا موٹی سل کے چوہے۔ ان کا سائز ایسا ہی تھا۔ کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے یہ سیاہ پہاڑی بچھو، جن کی ہیئت شبیہ ہی بتا رہی تھی کہ یہ کس قدر زہریلے اور ڈنک رنے کے حامل ہو سکتے تھے۔

ان کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ یہ خاصے جوش میں نظر آتے تھے۔ لگتا تھا بڑے عرصے بعد ان کے ہاتھوں (میری صورت میں) کوئی شکار لگا تھا۔ ایک روایت کے طور پر میں ن رکھا تھا کہ اگر کسی بچھو کو کافی عرصے تک ڈنک مارنے کے لیے کوئی ''شکار'' نہ ملے تو یہ خود کو ہی ڈنک مار مار کر ختم کر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ڈنک انسان یا کسی بھی حیوان کو پاگل کر سکتا تھا۔

عموماً یہ راتوں میں ہی نکلتے ہیں لیکن شاید ان کی حد سے بڑھی ہوئی اشتہا نے انہیں دن میں بھی نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے پل کے پل اپنا رخ بدلا اور جیپ کی طرف دوڑ لگا دی، ساتھ ہی اپنی گردن بھی پیچھے موڑ کر دیکھتا جاتا۔ وہ سب اسی طرح گھوم کر میرے پیچھے لپکے تھے۔ اس منظر نے چونکہ میرے پورے وجود میں پھریری سی دوڑا دی تھی، دوسرے میں ڈھلوان سے دوڑتے ہوئے نیچے اتر رہا تھا اسی لیے میرا پاؤں رپٹ گیا اور میں منہ کے بل نیچے آرہا۔ میری پیشانی کسی ابھرے ہوئے چٹانی پتھر سے ٹکرائی اور میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا۔

میں اوندھے منہ سخت پتھریلی سطح پر گرا تھا، جو پہلے ہی دھوپ کی تمازت اور شدت سے تپ رہی تھی۔ اس پر مستزاد سر کی چوٹ سے میرے رہے سہے اوسان خطا ہونے لگے تھے اور میری نیم باز آنکھیں تیزی سے اپنی جانب پلٹتے ان کالے بچھوؤں کو بے بسی سے تکے جا رہی تھیں۔

برساتی ہوئی دھوپ اور گرمی نے پہلے ہی مجھے ہلکان کر رکھا تھا۔ بس! جاتے ہوئے اور کسی دیے کی طرح بجھتے ہوئے حواس تھے میرے جو دم توڑنے کے قریب تھے اور تاریک پڑتے ذہن میں کوئی چلّا رہا تھا۔

''نہیں شہزی! آنکھیں کھول دو..... تم تو بہت ہمت والے تھے، اٹھو، دوڑو، ورنہ اگر ایک بار تم ان جہنمی بلاؤں کے نرغے میں آگئے تو بس پھر گئے..... اور میں شاید جا ہی رہا تھا۔ میں نے اس آواز پر اپنے وجود کو غیر ارادی طور پر ہلانے جلانے کی کوشش بھی چاہی تھی اور تھوڑی جنبش بھی شاید ہوئی تھی مگر سر میں لگنے والی اس نکیلے پہاڑی پتھر کی چوٹ نے مجھے اندھیاروں کی طرف دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ٹھیک اسی وقت جب میری آنکھیں بالکل ہی بند ہونے لگی تھیں اور میں ہوش و حواس سے بے خود ہونے لگا تھا، مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم پر آن گنت رینگتے ہوئے کیڑے سوار ہونے لگے ہوں، ٹھیک اسی وقت ایک تڑپا دینے والا ڈنک مجھے لگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

زندگی کیا ہے..... پانی کا بلبلہ اور موت ..... اس بلبلے کو آنِ واحد میں ہڑپ کر جانے والی ایک آن دیکھی

عفریت، جو جیتی جاگتی زندگی کو پل بھر میں نامانوس اور اسرار بھرے اندھیاروں میں لے جاتی ہے، ایسے اندھیارے جو ازل سے پُراسراریت کی دبیز تہ میں چھپے ہوئے ہیں، قرن ہا قرن سے ایک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے، اور جو ہوتا ہے وہ صرف مرنے کے بعد ہی ہوتا ہے اور وہ صرف مرنے والا ہی جانتا ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ ”قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے۔“

سنا ہے کہ جب انسان مرنے والا ہوتا ہے تو صرف چند پل پہلے ہی اسے موت کے فرشتے کی جھلک یا اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہوتی ہے۔ پھر جب ملک الموت انسان کی روح قبض کر رہا ہوتا ہے تو مرنے والے کے لاشعور میں شاید آخری بار ... اس کے اپنوں اور پیاروں کی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

میری آنکھیں بھی یہی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ماں کا چہرہ، باپ کی صورت، عابدہ کی صاعقہ بار جھلک اور پھر زہرہ بانو اور میرے قریبی دوستوں کی شبیہیں...... باری باری میری آنکھوں کے سامنے رقص کناں ہونے لگی تھیں۔ ان کے پس منظر میں تاریکی تھی، ایک دھند آمیز موت کی سی تاریکی۔

عجیب بات تھی کہ مجھے ہوش کا ادراک بھی تھا اور مدہوشی کا مدام بھی۔ ہوش اور مدہوشی کے اس اسرار بھرے سنگم میں مجھ پر رفتہ رفتہ یہ بھی باور ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ بیتی کیا تھی!

یہ حقیقت ہے کہ جب انسان اپنے حواس چھوڑ بیٹھتا ہے تو ہوش آنے یا آنکھیں کھلنے پر اس کے ذہن میں وہی واقعہ ثبت ہوتا ہے، جو آخر میں اس کے ساتھ بیتا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ذرا عقل و خرد کا یارا ہوتے ہی مجھے یاد پڑا کہ میں کیوں اس حال کو پہنچا تھا اور میرے ساتھ کیا بیتی تھی!

”اف......! تو کیا میں مر چکا تھا؟ شاید اسی لیے یہ سب مجھے نظر آرہا تھا...... دھند دھندی سی تھی، تاریکی اور یہ بدہیئت شکلیں......؟ یہ سب کیا تھا؟

کیا میں مر چکا تھا؟ بھلا بچ بھی کیسے سکتا تھا؟ نیم صحرائی اور جلتی بلتی پہاڑی پر میرے بے سدھ وجود پر اتنی تعداد میں چوہے جتنے بڑے کالے اور زہریلے بچھوؤں نے ہلا بول دیا...... تو بھلا میں بچا ہوں گا......؟

مجھے اپنے پورے بدن میں اینٹھن کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے آگ بھر دی ہو......

مجھ پر ایک بار پھر غشی طاری ہونے لگی لیکن میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ دھند چھٹی تو میری آنکھوں کے آگے اندھیروں کی جگہ روشنی نے لے لی۔

وہ عجیب و غریب صورتیں بھی نظر آنا بند ہو گئیں۔ پہلی بار مجھے کچھ زندگی کا احساس ہونے لگا۔ سماعتوں سے کچھ آوازیں بھی ٹکرانے لگیں۔ میں نے ان آوازوں پر غور کیا تو ٹھٹکا...... یہ آبی پرندوں کی مخصوص ”قیں...... قیں......“ کی آوازیں تھیں جس کے سنگم میں سمندری لہروں کا شور بھی تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں ساحل کے قریب تھا۔ اس بات نے مجھے تفکر میں مبتلا کر دیا۔ تو کیا میں لب بام اپنی منزل سے دور کر دیا گیا تھا؟

سب سے پہلے میں نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکا کہ میں مر چکا تھا یا میری آنکھ عالم بالا میں کھلی تھی، کیونکہ مجھے درد اور دکھن کے احساس کے ساتھ ہی کچھ زندگی نما آثار محسوس ہونے لگے تھے، مگر ذہن میں اب بھی سوالیہ نشان تھا کہ میں اس قدر خطرناک اور یقینی موت کے چنگل سے کیونکر بچ نکلا؟

بے شک زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں تھی اور جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، ضرور کوئی میرے ساتھ عین آخری لمحات میں معجزہ ہوا تھا۔ اللہ کو شاید ابھی میری زندگی منظور تھی۔

حواس پوری طرح جاگے تو میں نے اپنے گرد و پیش میں نظریں دوڑائیں اور ساتھ ہی اپنا بھی جائزہ لیا تو چونک پڑا۔ میں نیم برہنہ حالت میں تھا۔ نیچے صرف ایک جانگیا تھا۔ میرا کسرتی بدن تانبے کی طرح چمک رہا تھا مگر اس میں کبھی اینٹھن کا احساس ہوتا تو کبھی ایک ٹھنڈک پڑتی محسوس ہوتی۔ میری ٹانگ میں پنڈلی اور ران کی طرف کوئی لیپ لگا ہوا تھا، یہ شاید مرہم تھا، اسی طرح سینے اور پیٹ کے مقام پر بھی یہی مرہم ملا ہوا تھا۔ اسی میں سے کبھی اینٹھن اور کبھی ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی تھی۔

میرا ذہن اب تیزی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کے لائق ہو چلا تھا۔ جب میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں کسی چوبی دیواروں والے خاصے کشادہ کیبن میں تھا۔ یہ کون سی جگہ ہو سکتی تھی اور مجھے لانے یا بالفاظِ دیگر مجھے موت کے منہ سے نکال لانے والے کون لوگ تھے؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

میں زمین پر بچھے کسی کھال نما بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عجیب سی بُو کا مجھے احساس ہونے لگا۔ میرے اردگرد فرش پر

یا کیا الا بلا بکھری ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیبن ں ایک دیوار سے جھروکا سا بنا ہوا تھا، قریب اس کے بنا ہوا تھا، دروازہ کیا تھا، بس ایک چوکھٹ نما راہ گزر اور اس پر سوکھی کھال کا ٹاٹ سا جھول رہا تھا، وہ اسی کے پیچھے سے آرہی تھیں اور روشنی بھی۔ میں انداز ہ نہیں کر پایا تھا، تاہم روشنی کے انعکاس سے ازہ تو ہوتا تھا کہ یہ شام کا وقت ہو سکتا تھا۔

سوشیلا“......

معاً ہی میرے ذہن میں اُبھرا...... وہ جانے کہاں ہے فکر و تشویش نے آلیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ مجھے یا۔ لیکن جلد ہی میں سنبھل گیا۔ میرے کانوں تک شور شور کی آوازیں آرہی تھیں، جو بتدریج واضح ہوتی تھیں۔ لہروں کا شور، لوگوں کے بولنے کی آوازیں تھا اصاح بتاخ، ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جیسے بار برداری ی سامان لادا جا رہا ہو۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہلکا سا یا، لیکن میں سنبھل کر چند ثانیے کے لیے کھڑا رہا۔ اس بعد دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے پیروں میں ہوتا نہیں تھیں۔ میں نے ٹاٹ ہٹایا اور چوبی کیبن سے آیا تو دنگ رہ گیا۔

سامنے ایک گودی کا منظر تھا جبکہ اس کے پس منظر میں نیلا سمندر تھا، اس کے پار قوس کی شکل میں ساحل کے ساتھ بنا ایک پورا شہر آباد تھا، جہاں سفید رنگ کی عمارتیں اور نیلے پیلے رنگ کے مکان اور کاٹیج نظر آرہے وہاں کہیں کہیں بتیاں ٹمٹماتی نظر آرہی تھیں، گویا ایک شہر کا منظر نظر آرہا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا خنک چل رہی تھی۔ کچھ لمبی اور زرد والے آبی پرندے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے پانی میں ڈبکی لگانے اور چھوٹی مچھلیوں کے شکار میں تھے۔

سمندر میں چھوٹی بڑی لانچیں اور ایک دو بڑے شپ لنگر انداز نظر آرہے تھے۔ میں جس کاٹیج میں تھا، یہ اس گودی کے چوبی اور تختہ دار پلیٹ فارم یا ”وارف“ پر بنا ہوا تھا اور سامنے ایک اسی طرح کی پانچ فٹ چوڑی چوبی روش، تقریباً چالیس پچاس گز تک سمندر میں چلی گئی تھی، جہاں ایک بڑی سی کارگو لانچ پلیٹ فارم سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے مستول پر پھڑپھڑاتے ہوئے پھریرے کو دیکھ کر میں تھا...... جس پر اینکر اور ایک شپ کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا...... یہی نہیں، ایسے ہی مونوگرام والی اور بھی لانچیں وہاں لنگر انداز تھیں، ایک بڑے شپ کی باڈی پر بھی یہ مونوگرام کندہ دکھائی دیا تھا مجھے۔ اس مونوگرام کو دیکھ کر میرا ذہن جھٹکے کھانے لگا۔

بہادری

ایک عورت ایک ڈینٹسٹ کے کمرے میں داخل ہوئی اور محبت سے بولی۔ ”مجھے بہت جلدی ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو ایک دانت فوراً نکالنا ہے، براہِ کرم اپنی فیس بتا دیں۔“

ڈاکٹر نے فیس بتائی تو عورت نے کہا۔ ”یہ تو بہت زیادہ ہے۔“

ڈاکٹر: ”اس میں میری فیس کے علاوہ جلد کو سن کرنے والی ادویات کی قیمت بھی شامل ہے۔“

عورت: ”آپ ادویات کو چھوڑیں اور یونہی دانت نکال دیں۔“

ڈاکٹر حیرت سے: ”آپ جیسی بہادر عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔“

عورت: ”دانت میرا نہیں میرے شوہر کا نکالنا ہے وہ باہر بیٹھا ہوا ہے۔“

انتخاب، الیہ بلال، کراچی

یہ مونوگرام میرے لیے غیر شناسا نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق، ان کے عائلی وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی صاحب نے اڈیسہ کمپنی (جہاز راں کمپنی) کے شیئرز میرے نام کرتے ہوئے، حوالے کیے تھے تو میں نے سرسری سا ان کا جائزہ لیا تھا، ان پر ہی میں نے اس طرح کا بنا ہوا مونوگرام دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن میں فوراً اڈیسہ کمپنی کا تصور ابھرا تھا۔

”تو کیا یہ لانچ اڈیسہ کمپنی کی تھی...... جس کے صرف دو ہی مالک تھے، ایک میں اور ایک برازیلین نژاد لولووش۔

یہ سوچتے ہی مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک بار پھر بڑے غور سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، میرے سیدھے ہاتھ پر سفید ریت پر مشتمل ساحلی میدان سا تھا، جہاں ٹرک اور کچھ چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میرے بائیں جانب دو تین اور بھی ایسے ہی مگر نسبتاً بڑے کاٹیج بنے ہوئے تھے، جن کے دروازوں کے سامنے لکڑی کے تختہ دار فرش پر فولڈنگ چیئرز اور میزیں دھری...... تھیں، وہیں کچھ لوگ موجود کھانے

پینے اور پائپ سگریٹ پینے میں مشغول تھے۔ ان میں کچھ مقامی اور کچھ غیر مقامی بھی نظر آتے تھے، یہ غیر ملکی سیاح بھی ہوسکتے تھے۔

"ہیلو......!"

ایک مترنم سی آواز پر میں چونکا...... اور آواز کی سمت میں نے گردن موڑ کر دیکھا، میرے بائیں جانب جہاں اور بھی چند لکڑی کے کیبن نما کاٹیج بنے ہوئے تھے، اس رخ پر ایک طرح دار حسینہ کھڑی نظر آئی۔ چپٹی ناک مگر دل فریب نقوش اور سیب جیسے گالوں والی ایک گوری چٹی لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا اور عمر انیس، بیس کے پیٹے میں ہی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے کی جلد بہت ملائم اور شفاف محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سیاہ ریشمی رنگ کا بڑا چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا جو صرف اس کی گوری اور سڈول پنڈلیوں تک ہی گویا پھنسا ہوا تھا، نیچے ہائی ہیل کے گولڈن بلیک سینڈل تھے جبکہ شرٹ اس کی کھلی ڈلی مگر شارٹ ہی تھی، اس کا رنگ گلابی تھا۔

مجھے یہ پہلی ہی نگاہ میں کوئی بڑی حسینہ معلوم ہوئی تھی...... وہ "ہیلو" کہنے کے بعد اب بڑی گہری... نگاہوں سے میرے نیم برہنہ اور توانا کسرتی جسم کو تکے جارہی تھی۔

"ہہ...... ہائی!" میرے ہونٹوں سے بے اختیار برآمد ہوا تو وہ اسی طرح دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے چند قدم مزید میرے قریب آگئی اور ایک نگاہ میرے زخموں پر ڈالنے کے بعد اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے اسی مترنم سی آواز میں بولی۔

"میرا نام سوتگ کھلا...... ہے، میں ریٹائرڈ میجر کیم کھلا کی بیٹی ہوں...... تم اب کیسے ہو؟"

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں بہت سی باتیں، خدشات اور احتیاطی روش سے متعلق خیالات گردش کرنے لگے اور میں نے فوراً اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تمہارے زخم اب کچھ بہتر لگ رہے ہیں......" وہ نغمہ بکھیرتی آواز میں بولی۔

"لگتا ہے تم بھی کالے بچھوؤں کا شکار کرنے چھائی اور کلی منجارو کی خطرناک سرزمین کی طرف قسمت آزمائی کے لیے نکلے تھے۔"

"ہاں...... ہاں، شاید کچھ ایسا ہی تھا...... لل...... لیکن یہ میری یادداشت کو کیا ہوگیا ہے؟ ہم...... مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں آرہا ہے......" میں نے بھولنے کی اداکاری کی۔

"اوہو...... لگتا ہے، بچھوؤں کے زہر نے شاید تمہارے سینٹرل نروس سسٹم پر ایفکٹ کیا ہے......" وہ قدرے تشویش زدہ سے لہجے میں بولی۔

"ہاں......! شش...... شاید ایسا ہی کچھ ہوا ہے میرے ساتھ......" میں نے اداکاری کے طور پر اپنی پیشانی کو ہاتھ سے چھوا تھا۔

"اٹس او کے! ڈونٹ وری، تم ٹھیک ہوجاؤ گے... آؤ میرے ساتھ۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا اور میں اس کے ہمراہ چل دیا۔

وہ مجھے جس کیبن میں لائی تھی اس کی شان و شوکت دیکھ کر ہی میں حیران رہ گیا۔ یہ کیبن آرام دہ اور ہر قسم کی اشیا اور فرنیچر سے مزین نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بٹھا دیا تھا اور خود میرے سامنے ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

"سوری! تمہیں اس بے کار سے کیبن میں رکھنا میری مجبوری تھی بلکہ میری نہیں یہ تمہارے علاج کے سلسلے میں مجبوری سمجھو...... لیکن اب تم بہتر ہو، میرا خیال ہے جوشم نے تمہارا صحیح علاج کیا ہے، میں اسے بلاتی ہوں تاکہ وہ ایک بار پھر تمہارا تفصیلی معائنہ کرلے۔"

اس نے لاسلکی والا ڈیوائس نما آلہ نکال کر برمی زبان میں کسی سے بات کی۔

تھوڑی دیر میں ہی کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک موٹا سا گنجے سر والا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر دھوتی نما کپڑا لپٹا ہوا تھا اور اوپری جسم میں شلوکا ٹائپ کا کچھ پہن رکھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سوتگ کھلا کو تعظیم پیش کی اور اپنا سر جھکا دیا۔

سوتگ کھلا نے اس سے برمی زبان میں تحکمانہ کچھ کہا اور پھر وہ، جو بلاشبہ جوشم ہی تھا، میری طرف اپنی چھوٹی اور گول گول آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

"تم اس طرف آکر ذرا لیٹ جاؤ......" سوتگ کھلا نے قریب پڑے ایک آرام دہ بستر کی طرف اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر وہاں دراز ہوگیا۔ جوشم میری طرف بڑھا اور پھر جھک کر میرے زخموں کا بڑے غور سے معائنہ کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد وہ سیدھا ہوا اور پھر باادب ہوکر سوتگ کھلا سے برمی زبان میں کچھ کہنے لگا۔

سوتگ کھلا بھی اس سے بارعب لہجے میں کچھ پوچھتی رہی۔ اس کے بعد جوشم نے جھک کر اسے تعظیم پیش کی اور

وازے کی طرف لوٹ گیا مگر جاتے وقت جب وہ بند کرنے لگا تو میری طرف اس نے اپنی چندی نکھوں سے دیکھا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے سہی، اس ایک لمحے میں اس کی میری جانب اٹھتی نظروں نے انے کیوں میرے اندر ایک بے چینی کی نہ معلوم سی لہر دوڑا ۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا، ایسا کیوں ہوا تھا؟

"تم اب بالکل ٹھیک ہو......"

جوشم کے جانے کے بعد سوتگ کھلا نے میری طرف ربا مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جوشم کہہ رہا تھا مہیں تین کالے بچھوؤں نے ڈنک مارا تھا۔ ان سیاہ بچھوؤں کا زہر بڑا خطرناک ہوتا ہے جو انسان کو پہلے گل اور جنونی بنا ڈالتا ہے اس کے بعد انسان مرجاتا

"میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا مس سوتگ کھلا......!" میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا اور محتاط طریقے سے اصل موضوع کی طرف آنے لگا۔

"اگر آپ لوگ میری مدد نہ کرتے تو آج میری لاش اس پہاڑی صحرا میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں کسی خفتہ جذبے کی ابھرتی اور گلاب سے لبوں پر اس کی بھیدوں بھری مسکراہٹ نے لے لی اور وہ بتانے لگی۔

"میں اسے تمہاری خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ اس وقت اپنی پوری شکاری ٹیم کے ساتھ وہاں موجود تھی جس وقت اور میرے ساتھی ان نایاب کالے بچھوؤں کا شکار کرنے تھے۔ حالانکہ اس نسل کے بچھو دھوپ اور گرمی سے تے ہیں، لیکن شاید انہیں کافی عرصے سے کوئی شکار نہیں ملا تھا اور وہ تمہاری وجہ سے اپنے بلوں سے نکلنے پر گئے تھے۔ ہم نے وہاں پہلے سے ہی ٹریپنگ کر رکھی تھی۔ جوشم ہمارے ساتھ ہی ہوتا ہے، ہم اکثر زہریلے ں کا شکار ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے وہ ہمارا وید اور ہے۔"

وہ خاموش ہوئی تو میں نے سوچتے اور اپنے ذہن پر نے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ کچھ یاد آرہا ہے کہ یہ بچھو اچانک ہی نجانے کہاں سے نمودار ہوئے تھے، اور ہاں...... میرے ساتھ میری ایک ساتھی (سوشیلا) بھی تھی، کیا وہ تم لوگوں کو نہیں ملی وہاں؟" یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرلیں۔

"نہیں، ہمیں وہاں تمہارے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا، سوائے تمہاری جیپ کے۔"

"او...... شاید میں اب بھی کچھ بھول رہا ہوں...... میں اکیلا ہی تھا۔" میں نے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا۔

"ویسے تم ہو کون؟ اور وہاں اتنے خطرناک علاقے میں کیا کر رہے تھے؟" سوتگ کھلا نے اچانک میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ مجھے اس سے اس سوال کی پہلے سے امید تھی اور میں کسی وجہ سے اپنے بارے میں اسے سچ بتانے سے گریزاں تھا لہٰذا اس کے سوال پر میں نے ایک بار پھر اپنا سر پکڑ لیا۔

مجھے ابھی تک اس کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکی تھی تو میں اس پر کیسے اتنی جلدی بھروسا کرلیتا، جبکہ یہ لڑکی تھی بھی برمی، تاہم اس نے میری جان بچائی تھی۔

"اوکے...... اوکے، اپنے ذہن پر بوجھ مت لو ابھی...... آہستہ آہستہ تمہیں سب یاد آہی جائے گا۔ اس بات کی تسلی مجھے جوشم نے بھی دی تھی۔" وہ مجھے پریشان اور فکرمند سا دیکھتے ہوئے بولی اور یوں اس کا سوال گول ہوتے ہی میں نے چالاکی سے اس کے بارے میں پوچھنے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔

سرداریاں

سردار بوٹا سنگھ کی بیوی بیاہ کے تیسرے دن انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ ان تین دنوں میں اس نے آنے جانے والوں کو اپنے شوہر کی بہت سی برائیاں بتائیں جو اس کے جاتے ہی پورے محلے میں گونجنے لگیں۔

"یار! تو بڑا ظالم ہے۔" ایک بے تکلف دوست نے سردار جی کو راستے میں روک کر شکایت کی۔ "نئی نویلی دلہن کو اتنا ستایا کہ بے چاری تنگ آکر گھر سے بھاگ گئی۔"

"گرو جی قسم، یہ سب جھوٹ ہے۔ ستانا کیا، میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اسے بالکل اپنی بہن کی طرح گھر میں رکھا۔" سردار بوٹا سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔

* * *

سردار جوگیندر سنگھ نے بے روزگاری سے تنگ آکر اپنے ایک ساتھی کی مدد سے ایک بچے کو اسکول سے واپسی پر اغوا کرلیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے پانچ لاکھ روپے لے کر آئے... وہ اسے مار ڈالیں گے۔

بچے کے جانے کے بعد یکایک وہ فکرمند ہوگئے۔ بچہ تم نے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا تو ساری مہم جوئی غارت ہو جائے گی، کوڑی بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے ساتھی نے تسلی دی کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچہ بھی ایک سردار کا پوت ہے۔ اس کا باپ اسے رقم دے کر ضرور بھیجے گا۔ ایسا ہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد بچے نے پوری رقم لاکر ان کے حوالے کردی۔

محمد کاشف کی سوغات، صادق آباد سے

''آپ لوگ کون ہو؟ اور کیا کرتے ہو...... اور یہ جو باہر لانچیں لنگر انداز ہیں کیا یہ آپ کی ہیں؟''

اس نے میرے سوال پر ایک گہری سانس لی اور بتانے لگی۔ ''ہم بچھوؤں کے بیوپاری ہیں...... فی زمانہ یہ بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ ان بچھوؤں سے خاص قسم کی منشیات بھی تیار کی جاتی ہے جو جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ اب مغربی ممالک میں بھی بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔ لیکن بچھوؤں کا زہر زیادہ تر ادویات بنانے اور کینسر کی دوا بنانے کے کام آتا ہے۔''

''بچھوؤں کا زہر تو واقعی دواؤں میں کام آتا ہے، مگر یہ بچھوؤں کا نشہ کرنا، اس کی معلومات میری صفر ہیں، یہ نشے اور منشیات کے طور پر کیسے کام آتا ہے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔ میرے سوال پر وہ اسرار بھری مسکراہٹ...... سے بولی۔

''کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں، جو بار بار بچھوؤں کے کاٹنے کا شکار ہوتے رہیں تو انہیں اس کے زہر کی عادت ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایک بچھو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس پال لیتے ہیں، وہ ان سے خود کو کٹواتے رہتے ہیں۔ دوسرے نشے کی لت۔ اس کی دُم سے ڈنک نکال کر اسے سکھایا جاتا ہے اور پھر اسے پیس کر چرس اور ہیروئن میں ڈال کر پیا جاتا ہے، کچھ لوگ بہت سارے بچھوؤں کو جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور اس کا دھواں سونگھتے ہیں اور سرور میں جھومتے ہیں اور کچھ......؟''

وہ ایک ادا سے میری طرف دیکھ کر بولی تو اس کی نگاہوں میں خمار اُترا ہوا میں نے صاف محسوس کیا تھا۔ یہی نہیں اس کے شفاف گلاب جیسے گالوں میں بھی مخصوص قسم کی سرخی دوڑ گئی تھی، لہجہ مدہوشی میں مدغم ہوتا جا رہا تھا۔

''میں...... آپ کی بات سُن رہا ہوں۔''

''ہم رنگون کے علاقے ماکینٹ میں رہتے ہیں، ہم سے مراد میں اور میرے پاپا، ہم دونوں باپ بیٹی کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں بھی ان سے بے حد پیار کرتی ہوں۔ رنگون میں ہمارا اپنا گھر ہے جو زیادہ بڑا تو نہیں لیکن بہت خوبصورت اور آرام دہ ہے...... میرے پاپا آرمی میں لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے تھے، پھر ترقی کرتے ہوئے کیپٹن اور میجر بنے۔ پتا نہیں وہ آرمی میں کیسے چلے گئے، ورنہ تو ان کا رجحان کاروبار وغیرہ اور سیر سپاٹے کرنے کا زیادہ تھا۔ میں خود بھی اپنے پاپا کی طرح سیلانی اور ایڈونچر طبیعت کی مالک ہوں۔

کسی غلطی کی پاداش میں میرے پاپا کو قبل از وقت ریٹائرڈ کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار شروع کرنے کی ٹھانی اور ایک دوست کے مشورے پر انہوں نے بچھوؤں ...کی سوداگری شروع کر دی۔ اس سے اس قدر منافع ہوا کہ ہم امیرانہ شان و شوکت سے رہنے لگے، ہمارا چھوٹا گھر عالیشان حویلی میں بدل گیا، نوکر چاکر گاڑیاں، اب کیا کچھ نہیں ہے ہمارے پاس، پہلے ہم صرف دونوں باپ بیٹی بچھوؤں کا شکار کرتے تھے [illegible] ہمارے ساتھ غلاموں اور خادموں کی پوری پلٹن ہوتی، اس کام میں ہمیں بڑا مزہ آتا ہے، خاص کر مجھے تو بہت ہی ایڈونچر لگتا ہے۔''

[illegible] بتا کر خاموش ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے اپنی امارات سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس کی اور اس کے ''پاپا'' کی تعریف کی، پھر باتوں باتوں میں دھڑکتے دل سے [illegible] انداز میں اصل بات کی طرف آیا اور بظاہر سرسری انداز میں بولا۔

''یہ لانچیں اور جو دو شپ دور سمندر میں لنگر انداز ہیں وہ سب آپ کی، میرا مطلب ہے آپ کے پاپا [illegible] ہی ملکیت ہیں؟'' میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے میں مرعوب آمیز حیرت بھی سمو لی تھی۔

''نہیں، ہماری تو نہیں ہیں مگر جب ہمارے ہی اختیار میں ہوتی ہیں......'' اس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں غرور کی جھلک تھی۔

''اچھا!'' میں نے یونہی [illegible] سے لہجے میں کہا۔ حسبِ توقع وہ پھر رطب اللسان ہو کر بولی۔

''بس! یونہی سمجھو کہ یہ ہماری ہی ہیں......''

میری تسلی نہیں ہوئی، تاہم میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں! یہ تو ہے...... آپ کے زیرِ استعمال ہیں تو یقیناً ایک طرح سے آپ ہی کی ہوئیں...... ویسے مجھے ان کے پھریروں میں لگا ہوا جو مخصوص مونوگرام ہے، وہ مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے، شاید یہ کسی کمپنی کا ہے؟''

''ہاں! اڈیسہ کمپنی کا ہے یہ مونوگرام......'' اس نے کہا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا......

''اس کے ساتھ ہماری پرانی ٹھیکے داری ہے۔ ہمیں جتنے شپ اور لانچیں درکار ہوتی ہیں وہ ہمیں بلا تاخیر کرائے پر ہائر کر دی جاتی ہیں لیکن......'' وہ کہتے کہتے رکی تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''لیکن کیا......؟ مس سونگ کھلا؟''

فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے اتنی نی دلچسپی کا اور اتنی بے چینی سے اظہار نہیں کرنا چاہیے ب تیر کمان سے نکل چکا تھا، یہ کہہ چکنے کے بعد اگر ں کوئی تاویل پیش کرنے کی کوشش کرتا تو یہ مزید نے والا عمل کہلاتا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر یہ ری باپ بیٹی کسی نہ کسی حوالے سے لولووش (اور اس کمپنی [illegible] تھے تو میرا بھی ذکر، چاہے سرسری ش یا اس کے کسی خاص کماشتے کے لیے [illegible] بنے [illegible] میں نے اب ان دونوں باپ بیٹی کو گے کا [illegible] بنانے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع ا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کی فکر بھی تھی پنے تینوں ساتھیوں کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔

''خیر چھوڑو یہ باتیں، تم بلاوجہ بور ہو گے...... تم اب ے میں مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم کون ہو، کس [illegible] رکھتے ہو؟ اور وہاں اس قدر خطرناک اور جزیرے ترین دور دراز علاقے میں کیا خاک چھانتے پھر تے؟'' اس نے بدستور میٹھی میٹھی نگاہوں سے میرا اور چہرے کا طواف کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ میرے دا اور کسرتی نیم برہنہ جسم کو عجیب عجیب سی نگاہوں سے تکتی جاتی تھی۔

میں نے بھی اس کی بات [illegible] کرتے خود کو سمجھایا کہ...... ''شہزی میاں [illegible] ٹھنڈا کر کے ورنہ منہ جل جائے گا...... تقدیر [illegible] اپنے ے بڑے دشمن کی شہ رگ تک پہنچنے کا جو سنہرا موقع دیا ے مناسب وقت پر ہی استعمال میں لاتا......''

[illegible] کر کے موضوع بدلا جواباً اس سے بولا۔

سچ بتاؤں تو مجھے [illegible] بارے میں کچھ بھی یاد نہیں یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو دماغ میں دھندی ہے...... کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے میں اور میرے ساتھی کسی وحشی اور آدم خور قبیلے کے نرغے میں آ گئے سب مارے گئے تھے، میں بڑی مشکل سے جان ر بھاگا تھا، پھر میری چشمِ تصور میں ایک چھوٹے جہاز کا ابھرتا ہے، جو کسی ٹیکنیکل خرابی کے باعث کہیں گر کر تباہ اور...... اور...... آہ، میرا سر...... درد سے پھٹا جا رہا

میں نے کمال اداکاری کے ساتھ اپنا سر تھام لیا اور صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا، یوں، جیسے بے ہوش ہونے لگا ہوں، یا میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا ہو۔

میری توقع کے عین مطابق سونگ کھلا کے حسین چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے اور وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور میری جانب بڑھی۔

وہ میرے بالکل قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور میری پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں اس کے جوان رعنا وجود کی قربت سے گھبرا سا گیا، مگر مجبوری تھی کہ ایسے ہی بے سدھ سا پڑا رہا، تاہم ہولے سے کراہنے کے انداز میں بولا۔

''مس کھلا! کیا تم اپنے وید جوشم سے میرا علاج نہیں کروا سکتیں؟ کم از کم میری یادداشت تو ٹھیک ہو جائے، مجھے پتا تو چلے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟'' کہتے ہوئے میں نے اپنے لب و لہجے میں بے بسی اور مایوسی سمو لی تھی، وہ [illegible] رسان کے ساتھ میرے اور قریب آ گئی، اس قدر کہ مجھے اس کی گرم سانسوں کی بھبک اپنے چہرے پہ محسوس ہونے لگی اور بہت دھیرے سے میرے بالوں بھرے فراخ سینے پر اپنے ہاتھوں کی نرم گرم سی انگلیاں پھیرتے ہوئی بولی تھی۔

''تم میرے ہوتے ہوئے کسی بات کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ...... چلو، اٹھو، باہر کھلی فضا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ بہت اچھا موسم ہو رہا ہے باہر کا، تم نے تو شاید ابھی تک کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہوگا۔''

اس کی بات صحیح تھی۔ میری نیند تو گویا بے ہوشی کے عالم میں ہی پوری ہو چکی تھی، مگر بھوک کا احساس بڑھ گیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اسے بہ آہستگی دور کرتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ وہ بھیدوں بھرے انداز میں مسکرائی۔ کیونکہ جب میں اٹھا تو میرا وجود اس کے بدن کو چھونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فریفتگی سی اتر آئی تھی وہ ''لوزر'' سی ہو رہی تھی اور میں بھی ابھی دانستہ اسے اسی میں مبتلا رکھنا چاہ رہا تھا، اس لیے جب اس نے یونہی مجھے سہارا سا دیا تو میں تقریباً اس کے شباب آفریں بدن سے لپٹ ہی گیا تھا، میں نے اس کے دہن سے دبی دبی سسکاری کی مدھر آواز سنی تھی...... اور جب وہ پوری طرح اس قربت سے حظ اٹھانے کے مخمور سے موڈ میں نظر آنے لگی تو میں دانستہ تھوڑا لڑکھڑایا اور اسی بہانے خود کو اس کے آتشی اور دہکتے ہوئے بدن سے دور کر دیا۔

''مجھے کپڑوں کی ضرورت ہے...... باہر میرا یوں نیم برہنہ حالت میں تمہارے ساتھ بیٹھنا کچھ اچھا نہ لگے گا۔''

میری بات پر وہ ایک دم ہی کھلکھلا کر ہنسی تھی اور میری ناک کی پھننگ کو وہ بڑے دلار سے چٹکی لیتے ہوئے کھنکتے لہجے میں بولی۔

’’بہت شرمیلے ہو تم ...... ورنہ تو تمہارے جیسے جوان اور بھرپور توانا ورزشی جسم کے مالک مرد اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں......‘‘

’’پلیز، مجھے میرے ہی کپڑے دلا دو۔‘‘ میں نے اس کی معنی خیز گفتگو کا کوئی نوٹس لیے بغیر اس سے پھر گزارش کی تو وہ اثبات میں اپنے سر کو ہلاتے ہوئے بولی۔

’’کپڑے مل جائیں گے...... مگر تمہارے نہیں، تمہارے سائز کے کپڑے منگوا دوں گی، وہ کپڑے تو بالکل بھی پہننے کے قابل نہیں رہے۔‘‘

’’ویسے ہم ہیں کہاں؟ میرا مطلب ہے......‘‘

’’یہ پورٹ بلیئر کا علاقہ ہے جو انڈیمان کا صدر مقام بھی کہلاتا ہے۔ آؤ......‘‘ اس نے جواب کہا۔

ہم باہر آ گئے...... رات سمندر میں جھک آئی تھی۔ نیک خرام ہوا میں آبی نباتات کی بو رچی ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ کبھی کسی بگلے کی السائی ہوئی آواز ابھرتی تو فضا ہولے سے متحرک جاتی۔ گودی میں روشنیاں چمکنے لگی تھیں۔ دو لانچیں سمندر کی وسعتوں کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھیں۔ لکڑی کی جو روش سمندر کے کافی آگے تک بنائی گئی تھی اور جہاں دو شپ لنگر انداز تھے، اب وہاں ایک ہی نظر آ رہا تھا جبکہ دوسرے کی دور جاتی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ سمندری لہریں چوبی پلیٹ فارم کے ستونوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

’’یہ جگہ وہاں سے کتنی دور ہو گی جہاں میں تھا......؟‘‘

ہمارے کیبن کے سامنے سمندری لہروں کے اوپر آگے کو نکلے ہوئے تختے پر تین چار فولڈنگ چیئرز بچھا دی گئی تھیں اور درمیان میں اسی طرح کی ٹیبل بھی دھری پڑی تھی۔ وہاں براجمان ہوتے ہی میں نے سونگ کھلا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

اسی وقت دو افراد وہاں آن دھمکے، یہ بھی برمی تھے۔ سرسری نگاہ مجھ پر ڈال کر ان میں سے ایک نے سونگ کھلا کے سامنے سر کو جھکانے کے انداز میں جنبش دی تو اس نے اس سے کچھ کہا۔ ایک تو چلا گیا دوسرا وہیں کھڑا رہا۔ مجھے جانے کیوں اس سے کوفت ہونے لگی۔ میں خاموش رہا۔

’’ہم اس وقت پورٹ بلیئر کے مقام پر فش روک کے جزیرے میں موجود ہیں اور یہ انڈیمان کا صدر مقام یعنی ساؤتھ انڈیمان کہلاتا ہے...... اس کے پیچھے لٹل انڈیمان ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’جبکہ تم آج تپتی دوپہر میں نارتھ انڈیمان میں کالے بچھوؤں کا شکار ہونے والے تھے۔‘‘

’’اوہ......‘‘ میرے منہ سے نکلا۔

میں نے ایک بار پھر قریب تنے کھڑے اس آدمی کی طرف دیکھا تھا۔

سونگ کھلا نے اسے اس آدمی کو مخصوص اشارہ کیا جس کی موجودگی مجھے کوفت میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ اسے سونگ کھلا نے شاید جانے کا اشارہ کیا تھا، وہ سر کو تعظیمی جنبش دے کر خاموشی سے چلا گیا۔

’’یہ کیوں کھڑا ہو گیا تھا؟‘‘ میں نے ایک نظر جاتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔

’’یہ ہمارے باڈی گارڈز میں سے ایک تھا۔‘‘

’’باڈی گارڈز......؟‘‘ میں نے چونکتے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

’’ہاں!‘‘ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پہ ایکا ایکی ایک گہری متانت سی کھنڈ آئی۔ پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کا بھوت چکراتا سا محسوس ہوا جس نے مجھے اندر سے کچھ ٹھٹکا دیا۔

’’میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ ہماری کچھ لوگوں سے دشمنی چلی آ رہی ہے......‘‘ بالآخر وہ بولی۔

’’کون لوگ ہیں وہ......؟ اور دشمنی کی کوئی خاص وجہ؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے کہ...... دشمن خود کو ظاہر نہیں کر رہا ہمارے سامنے...... وہ چھپ کر ہم پر [illegible] چکا ہے۔ ہمارا ذاتی شپ تھا، میں اور پاپا اس میں اپنے کیبر کے عملے سمیت سوار تھے، اس میں بم لگا دیے گئے تھے، وہ تباہ ہو گیا، ہمارے بہت سے خلاصی مارے گئے، خود میں اور پاپا مشکلوں سے سمندر میں چھلانگ لگا کر لائف جیکٹوں کے سہارے ساحل تک پہنچے تھے۔‘‘

’’او...... اسکیئرنگ......‘‘ میں نے مختصراً تبصرہ کیا۔

’’دو بار میرے پاپا پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا، مجھے بھی ایک بار اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بدھا کی مہربانی سے ہم دونوں باپ بیٹی بچے رہے......‘‘

’’پھر تو بڑے خطرناک حالات سے تم دونوں باپ بیٹی گزر رہے ہو......‘‘ میں نے کہا۔ ’’ویسے یہ ہیں کون لوگ؟

لوگوں نے پتا چلانے کی کوشش تو کی ہی ہو گی؟‘‘ میں سے کریدنے کی کوشش چاہی۔

’’ظاہر دشمن سے چھپا ہوا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ...‘‘ اس نے کہا۔

اسی وقت دو افراد کھانوں کی بڑی بڑی دو ٹرے اٹھا ۔ ان کی اشتہا انگیز خوشبو سے میری بھوک دوچند ہو ۔ کھانا بہت لذیذ اور نت نئی ڈشز پر مشتمل تھا۔ زیادہ تر فوڈ‘‘ تھا۔ [illegible] رائس، بھنا ہوا گوشت، کباب اور فش ائی تھی۔ موٹی موٹی نان کی طرح کی روٹیاں تھیں۔ ڈیزرٹس میں پڈنگ اور رسیلے پھل تھے۔

’’پاپا بھی آ رہے ہیں......‘‘ معاً میرے کانوں [illegible] نگ کھلا کی آواز ابھری۔ میں تھوڑا چونک سا گیا۔ میں تقریباً کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔

’’پاپا......‘‘ سونگ کھلا کہہ کر مسکرائی۔ میں کرسی پر بیٹھے گھومنے کے انداز میں پلٹا تو دو افراد کو قریب آتے ۔ ان میں سے ایک درمیانے قد کا سوٹڈ بوٹڈ آدمی تھا۔ نے شارک اسکن کا بیش قیمت کوٹ سوٹ پہن رکھا س کا چہرہ گول اور سر کے بال ہلکے گرنیلگوں مائل سفید تھے۔ ہونٹ پتلے اور کاندھے ڈھلکے ہوئے سے تھے۔ اس کی صورت میں مجھے سونگ کھلا کی شبیہ نظر آتی تھی اور اسی سبب میرا ان کے بارے میں فوری اندازہ یہی تھا۔ یہ سونگ کھلا کا باپ میجر کیم کھلا ہی ہو سکتا تھا جبکہ ساتھ اس کے ایک لمبا تڑنگا اور گنجے سر والا آدمی مجھے اس کا باڈی گارڈ ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پہ کرخت سی سنجیدگی تھی اور بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ وہ بڑی برماتی نظروں سے میری طرف یونہی گھور رہا تھا۔

’’یہ میرے پاپا میجر کیم کھلا ہیں......‘‘ سونگ کھلا نے ان کے قریب آ کر رکتے ہوئے تعارفاً مجھ سے کہا۔ میرا درست ثابت ہونے پر میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے کیم کھلا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا، مجھے اس کے انداز سے یوں لگا جیسے اس نے چاروناچار ہی مجھ سے مصافحہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہو...... پھر جب میں نے اس ت صورت کی طرف بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ صرف مجھے گھورتا رہا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مجھے ہلکی سی خجالت کا احساس ہوا اور میں نے اپنا خالی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

کیم کھلا نے مجھے فوراً نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بیٹی سے کچھ کہا تھا۔ سونگ کھلا مسکرا مسکرا کر اپنے پاپا سے باتیں کر رہی تھی، دونوں باپ بیٹی کے درمیان برمی زبان میں مختصر سی گفتگو ہوتی رہی...... پھر وہ وہاں بیٹھے بغیر واپس لوٹ گیا، مگر جاتے جاتے ایک برماتی ہوئی نظر اس نے میرے چہرے پر ڈالی تھی۔

اس کے جانے کے بعد سونگ کھلا کچھ خفیف سی ہو کر مجھ سے بولی۔ ’’پاپا آج کل اسی مسئلے کی وجہ سے کچھ پریشان سے ہیں، اسی لیے وہ تم سے کوئی بات نہ کر پائے تھے۔‘‘

اس نے بھی شاید میرے ساتھ اپنے باپ کی بے رخی محسوس کر لی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’کوئی بات نہیں، میں یہ بات سمجھ رہا تھا...... ویسے کیا کہہ رہے تھے میرے بارے میں؟‘‘

’’کچھ خاص نہیں۔‘‘ وہ بولی۔ ’’میں نے یہی بتایا کہ تم ابھی تک ایک شاک کی کیفیات سے گزر رہے ہو، اسی لیے تم اپنے بارے میں ابھی کچھ بتانے سے قاصر ہو۔‘‘

میں نے محسوس کیا کہ یہاں سوائے سونگ کھلا کے کوئی مجھ پر اتنی آسانی سے بھروسا نہیں کر رہا، مجھے اب اپنی یادداشت کھونے کا یہ ڈراما زیادہ دیر نہیں چلانا چاہیے۔ اگر ان کا کسی نہ کسی حوالے سے لولووش سے تعلق تھا تبھی تو ایک اجنبی اور گمنام آدمی کی حیثیت سے میری خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی، لہٰذا اب یہی بہتر تھا کہ میں اب یہ ڈراما موقوف کر کے اپنی کوئی جعلی شناخت کے حوالے سے اپنا تعارف کروا ہی دوں۔

’’نہیں سونگ! میرا خیال ہے میری یادداشت اب دھیرے دھیرے بحال ہونے لگی ہے۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں شاید اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چھوٹے دو انجنوں والے جہاز میں تھا، کسی خرابی کے باعث وہ گر کر تباہ ہو گیا اور خوش قسمتی سے میں بچ نکلا۔ پھر مجھے...... ہاں! میرے ساتھ ایک ساتھی بھی تھا۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ یہاں پہنچ کر میں رکا اور ذہن پر زور دینے لگا۔ پھر بولا۔

’’ہاں! مجھے کچھ لوگ جیپ میں ملے تھے، وہ شاید کوئی شکاری تھے یا پھر پتا نہیں کون تھے، ان پر وحشیوں نے حملہ کر دیا تھا، وہاں سے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی اور اس کی جان بچا کر بھاگ نکلا تھا، میرا ساتھی وجے اچانک کہیں گم ہو گیا، میں اس کی تلاش میں اس بنجر پہاڑی اور نیم صحرائی علاقے میں کالے بچھوؤں کے نرغے میں جا

پھنسا...... اور...... اور مائی گاڈ! مجھے سب یاد آرہا ہے......"

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ سونگ کھلا متحیرانہ انداز میں میرا چہرہ تکے جارہی تھی۔

"م...... میرا نام...... ررر...... راج کمار ہے اور میں...... ممبئی میں رہتا تھا، اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا، مگر کسی پرانے خاندانی تنازع میں میرے ماں باپ کو قتل کردیا گیا اور مجھے ایک پرانا خاندانی نوکر اپنے ساتھ لے گیا تھا، میں وہیں رہنے لگا تھا۔ اس کا ایک میری ہی عمر کا بیٹا بھی تھا، ہم دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ وہ ایک فلائنگ کلب جوائن میں چھوٹی موٹی ملازمت کیا کرتا تھا، مجھے بھی اس نے وہیں لگوالیا...... وہاں میں چھوٹا موٹا کام کرلیا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اسٹاف کے طور پر ہم دونوں ایک جہاز پر رنگون جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔"

"تھینکس گوتما بدھا! تمہیں سب یاد آگیا...... یقین جانو مجھے بے حد خوشی ہورہی ہے۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "تو تمہارا نام راج ہے...... راج کمار! ہاؤ سوئٹ نیم، بالکل رومانی سا نام ہے...... اور شہزادوں جیسا بھی...... تمہیں تو ہندی (اُردو) بھی آتی ہوگی، میں بھی یہ تھوڑا بہت بول لیتی ہوں۔"

میں جواب میں مسکرادیا۔ میں جانتا تھا کہ برما میں ہندی اور اردو بھی بولی جاتی تھی، وہاں کافی تعداد میں مسلم گھرانے بھی آباد تھے۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنے چہرے پہ فکرو پریشانی کے آثار بھی طاری کرلیے۔

"کیا ہوا؟ تم ایک دم پریشان سے ہوگئے؟" وہ اس بار اردو میں بولی۔

"وجے نجانے کس حال میں ہوگا، میں اس کے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا، وہ میرا محسن بھی تھا۔ م...... مجھے واپس جانا ہوگا، اسی علاقے میں، میں اپنے محسن کے بیٹے وجے کو بے یارو مددگار وہیں چھوڑ آیا...... آہ! میں کتنا خود غرض ہوں...... نہیں، مس سونگ کھلا مجھے دوبارہ وہاں جانا ہوگا......"

میں نے ایک فرضی کہانی بنائی تاکہ وہاں دوبارہ جاکر اپنے تینوں ساتھیوں اور سوشیلا کو تلاش کرسکوں...... جبکہ سوشیلا بے چاری پر تو مجھے رہ رہ کر ترس آرہا تھا، وہ پہلے ہی زخمی بھی اور نجانے بے چاری اب کس حال میں تھی اور کہاں تھی۔ مجھے یہ سوچ کر بھی بے حد دکھ محسوس ہونے لگا کہ وہ میرے بغیر اس خطرناک وحشیوں کے علاقے میں کس قدر ہراساں اور پریشان ہورہی ہوگی۔

تاہم میری ڈرامائی بے قراری اور تفکر آمیز بے [illegible] (جو ایک طرح سے حقیقی بھی تھی) پر سونگ کھلا پریشان سی ہو گئی۔

اس نے فوراً میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور از راہ تشفی بولی۔ "تم فکر مت کرو...... ہمارے پاس لانچوں اور تیز رفتار موٹر بوٹس کی کیا کمی ہے! ہم اسے تلاشنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یوں بھی ہمیں کالے بچھوؤں کے شکار کے لیے دوبارہ اس علاقے کا رخ کرنا پڑے گا۔"

اس کی بات پر میں اندر سے چونکا تھا۔ سونگ کھلا میرے بہت کام آسکتی تھی مگر اس کے ساتھی اور باپ کیم کھلا سے مجھے "بھتی" نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر سونگ کھلا بھی میں کچھ تھا کہ ہم نفس کی میر سو لیے، اپنے آدمیوں پر اس کا حکم ہی چلتا تھا، رہا اس کا باپ تو وہ اپنے باپ کی اکلوتی اور لاڈلی تھی۔

یہ بدھ مذہب کے پیروکار تھے اور ہندوؤں کی طرح ان کے دلوں میں بھی مسلمانوں کے لیے تعصب اور نفرت کا جذبہ موجود ہوسکتا تھا، اگرچہ میرا ابھی انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ میں الحمدللہ ایک مسلمان ہی تھا، میں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا، اسی لیے مصلحتاً خود کو انڈین ہندو ہی ظاہر کیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ اب شاید میری شناخت کے بعد میں ان کی رکھائی اور بے رخی کا زیادہ شکار نہ ہوں۔

تاہم میں نے سونگ کھلا کے تسلی دینے پہ...... خوش ہو کر اس سے کہا۔ "کیا واقعی؟ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گی؟ لیکن...... آئی تھنک، تمہارے پاپا یہ کب چاہیں گے کہ......"

"ان کی تم فکر مت کرو......" وہ بولی۔ "دراصل وہ ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ کسی نئے اور اجنبی آدمی پر کم ہی اعتبار کررہے ہیں، مگر اب تم نے اپنے بارے میں بتادیا ہے تو مجھے امید ہے اب ان کی تمہاری طرف سے کافی تسلی ہو جائے گی۔"

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "تم ایک کام کرو...... تم جا کر کپڑے بدلو، تمہارے سائز کے کپڑے میں نے نکلوا دیے ہیں، میں تب تک پاپا سے مل کر آتی ہوں...... اینڈ ڈونٹ وری...... پاپا اچھے آدمی ہیں......"

وہ یہ کہہ کر وارف کے چوبی تختے پر چلتی ہوئی سیدھی چلی گئی، جدھر اور بھی کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں اسی پُرتعیش کیبن میں آگیا۔ وہاں میں نے کپڑے پہنے جو بس میرے جسم پر فٹ ہی آئے تھے۔ بوٹ بھی تھے۔ ڈریس آرام دہ

اچھا تھا۔ نئے کپڑے پہن کر مجھے تازگی کا احساس ہوا۔ کو تازہ دم محسوس کررہا تھا۔ پھر میں کیبن سے نکلا ارف پر آگیا۔ اس کی ریلنگ پر ٹک کر میں ی طرف دیکھنے لگا۔

مختلف لانچوں کی اس وقت بھی آمدورفت جاری تھی۔ ی کے بکسوں اور چھوٹے کنٹینروں میں سامان بھی ہا تھا۔ میں ریلنگ کے سہارے یہ سارا نظارہ کرتا درحقیقت سونگ کھلا کی واپسی کا انتظار تھا، میں اس قت امریکا آنسہ خالدہ کو فون کرنا چاہتا تھا اور زہرہ عابدہ تو میرے لیے ایک خواب کی حیثیت اختیار ارہی تھی۔ میں اس کے پاس جانے کے لیے جتنی بھی ا تھا اتنا ہی اس سے دور ہوتا جاتا تھا، گویا میں ایک طم خیز سمندر میں خود طوفان تھا اور عابدہ ایک خوفناک بھنور پھنسی ہوئی تھی، میں جس قدر طوفانی موجوں کا مقابلہ کرتا ر میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس کی طرف مجھے کوئی تند اور دیوہیکل لہر مجھے پھر اس سے اور دور پٹخ دیتی، نجانے وہ بے چاری کہاں کے کون سے قیدخانے میں پُرمصائب شب و روز گزار رہی تھی، کچھ پتا نہیں تھا مجھے، مگر آنسہ خالدہ اس کے لیے اپنی سی کوششوں میں معروف بھی تھی اور مجھے اس سے پل پل کی خبریں بھی دیتی رہتی تھی، موہن کے گھر میں میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر نہیں کر ا تھا، جبکہ زہرہ بانو سے پھر بھی بات ہوگئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اگر میں کسی طرح لولوچش پر کامیابی ہاتھ ڈال دیتا تو عابدہ کی بازیابی وغیرہ کے سلسلے میں کچھ راہ نکل سکتی تھی، کیونکہ آفٹر آل...... لولوچش اس خبیث صب یہودی نژاد امریکی سی آئی اے کے عہدے دار ہولارڈ کا چہیتا داماد تھا۔ پھر اس کی بیوی انجیلا ہولارڈ ہولارڈ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ میں برما میں ان کے ذریعے با آسانی ہولارڈ پر عابدہ کے سلسلے میں خاطر خواہ دباؤ ڈال سکتا تھا۔

درحقیقت یہ میری نہیں بلکہ اول خیر کی "پری پلاننگ" تھی اور میں اسی پر کاربند رہنے کی کوشش کررہا تھا۔ سونگ کھلا کی صورت میں مجھے یہ پلانڈ منصوبہ بندی اب کسی نارے لگتی نظر آرہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے ور خیر، شکیلہ اور کبیل دادا کی طرف سے بھی تشویش و یشانی لاحق تھی، سوشیلا کو بھی تلاشنا تھا اور یہ سب مجھے نئی صورت حالات میں کچھ ہوتا ہوا نظر آرہا تھا۔

مجھے وہاں ریلنگ کے سہارے کھڑے کھڑے کافی دیر ہوگئی، مگر سونگ کھلا نہیں آئی۔ میں اپنے کیبن میں آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ کچھ دیر اور بیت چلی تھی، باہر ہر سو سناٹا چھانے لگا تھا۔ ایک دھڑکا دینے والی خاموشی تھی۔ آرام دہ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند سی آنے لگی اور پھر نجانے کس پہر جب میری آنکھ لگنے کے قریب ہی تھی کہ ایک کھٹکے سے میں چونک پڑا۔

یہ آواز میرے کیبن کے دروازے کے بالکل قریب سے ہی آئی تھی۔ میں آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کے قریب آیا اور اس کی جھری سے ذرا باہر جھانکا تو مجھے دو سائے متحرک نظر آئے۔ وہ میرے کیبن کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے...... پھر وہ شاید آپس میں کوئی بات کر کے آگے بڑھے۔ اپنی حرکات و سکنات سے مجھے مشکوک ہی لگے تھے۔

نجانے پھر میرے جی میں کیا آئی کہ میں ان کے آگے بڑھتے ہی بے آواز دروازہ کھولے باہر آگیا اور کیبن کی دیوار سے چپکے ہوئے ان کے پیچھے دبے پاؤں بڑھنے لگا۔

آگے جاکر اس وارف کا چوبی فرش دائیں جانب کو گھوم رہا تھا۔ وہ دونوں جو تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہونے لگے تھے، فقط ان کے متحرک ہیولے ہی نظر آتے تھے، اسی طرف کو مڑے، میں بھی اس طرف کو گھوم گیا۔

سامنے بائیں جانب ایک اور وارف سمندر کے اندر تک جاتا ہوا نظر آیا وہاں مجھے ایک بڑا سا کیبن دکھائی دیا۔ ان کا رخ اسی طرف تھا مگر وہ رک گئے، اس وقت میری رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبے پھل والا چھرا نظر آنے لگا جبکہ دوسرے نے سیاہ نال والا پستول نکال لیا تھا۔

ان کے یوں یکدم رکنے اور اسلحہ نکالنے کی وجہ بھی مجھے سمجھ میں آگئی۔ کیونکہ مذکورہ کیبن کے سامنے دو مسلح آدمی پہرے پر کھڑے نظر آئے، ان میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا دوسرا گردوپیش میں نظر ڈالے ہوئے تھا۔ پھر پہلے والے نے اپنا سگریٹ ساتھی کی طرف بڑھایا، اب وہ اس کے گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

اسی وقت میں نے ان دونوں مشکوک آدمیوں کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ چونک پڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا، نجانے

وہ دونوں یوں اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں نے اِدھر اُدھر گردنیں گھما کر دیکھا بھی، مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیے، تب ہی اچانک جب میں نے اس طرف دیکھا جہاں وہ دونوں مسلح پہرے دار کھڑے تھے تو بری طرح ٹھٹکا۔

ان پر وہی دونوں مشکوک افراد بڑی خاموشی کے ساتھ پل پڑے تھے۔ ایک نے چھرا گھونپ دیا اور دوسرے نے اپنے شکار کو دونوں ہاتھوں کا داؤ آزما کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا، پھر ان کی لاشیں سمندر برد کرنے کے بعد وہ کیبن کے دروازے کی طرف بڑھے۔

انہیں کیبن کے دروازے کا رخ کرتے دیکھ کر یکلخت میرے اعصاب تن گئے اور میں بلا تاخیر مگر محتاط روی کے ساتھ اس طرف کو لپکا، وہ جب تک نجانے کیا طریقہ آزما کر اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی اسی جانب کو تیزی سے لپکا۔ دروازہ اب بھڑا ہوا تھا، میں آہستگی سے اندر داخل ہوا تو بری طرح ٹھٹکا۔

اندر ہلکی روشنی تھی۔ سامنے فولادی پایوں والے دو آرام دہ بیڈ بچھے ہوئے تھے، ان پر کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا جبکہ ایک شخص قریب ایزی چیئر پر اونگھ رہا تھا، اس کی گود میں پستول رکھا ہوا تھا، یہ سونگ کھلا کے باپ کا وہی باڈی گارڈ تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب یہ دونوں اپنے پستول نکال کر ان کا نشانہ لینے کے لیے پر تول رہے تھے، میں پیچھے سے ان پر اپنے دونوں بازو پھیلائے جا پڑا۔

وہ دونوں دھڑام سے گرے۔ میرا حملہ ان کی توقع کے برخلاف تھا۔ میں ان سمیت نیچے آن پڑا اور ساتھ ہی شور مچا دیا۔

سب سے پہلے اس لمبے تڑنگے باڈی گارڈ کی آنکھ کھلی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھا، مگر اس کا پستول گود سے گر پڑا، پھر بستروں پر دراز دونوں افراد جاگے، ایک بیڈ پر میجر کیم کھلا اور دوسرے پر اس کی بیٹی سونگ کھلا تھی، سونگ کھلا نے چیخ ماری تھی۔

میں نے ایک حملہ آور کو چھاپ لیا تھا جبکہ دوسرا صورت حال بگڑنے پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

''اس کے پیچھے جاؤ...... یہ اسی کا ساتھی ہے، یہ یہاں میجر صاحب کو ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔'' میں اس بوکھلائے ہوئے باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر چلایا، وہ فوراً اپنا پستول تھامے باہر کو لپکا۔ میجر کیم کھلا نے بھی اپنے تکیے کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا۔

حملہ آور خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی عمر مجھ سے آٹھ دس سال بڑی ہی لگتی تھی، جسم توانا تھا مگر میں نے کھڑی ہتھیلی کا ایک وار کر کے اسے ادھ موا کر دیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد باڈی گارڈ خالی ہاتھ ملتا ہوا آ گیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ باڈی گارڈ نے کمرے کی ساری روشنیاں آن کر دی تھیں۔ ان کے کچھ اور مزید ساتھی بھی آ گئے تھے۔ اچھی خاصی ہلچل مچ گئی تھی وہاں......

سونگ کھلا خوش تھی اور میجر کیم کھلا نے ایک تھپڑ پہلے تو اپنے اس لمبے چوڑے وجود رکھنے والے باڈی گارڈ کو جڑا اس کے بعد اس نے اسے کوئی درشت حکم دیا۔ وہ اس بے سدھ پڑے حملہ آور کی مشکیں کسنے لگا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر......'' میجر کیم کھلا مجھ سے مخاطب ہو کر توصیفی لہجے میں بولا اور پھر اپنی لاڈلی بیٹی سونگ کھلا کی طرف دیکھ کر انگریزی ہی میں پوچھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اس نوجوان کا......؟''

''راج کمار۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں مسٹر راج کمار! تم نے ہماری جان بچا کر ثابت کر دیا کہ تمہارے بارے میں ہمارا خیال غلط تھا مگر حقیقت بھی ہے کہ ہم پچھلے کئی دنوں سے کچھ ایسی صورت حال سے دوچار تھے کہ ہمیں اپنے سائے پر بھی شبہ کرنا پڑ رہا تھا۔''

''اس بھروسے کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں میجر کیم کھلا صاحب!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ بھی اپنی جگہ بالکل سچ تھے، لیکن ایک بات میں آپ سے بھی ضرور کہوں گا کہ آپ نے ان خطرناک حالات میں اپنی حفاظت کا کچھ خاص بندوبست نہیں کیا تھا ورنہ آپ کے چھپے ہوئے دشمن اتنی آسانی سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ بہت چالاک اور ہوشیار تھے۔''

''اب یہ چھپے ہوئے نہیں رہیں گے۔ ان کا ساتھی تم نے پکڑ کے ہم پر دوسرا بڑا احسان کیا ہے، اب یہ سب اگل دے گا۔'' میجر کیم کھلا نے فرش پر جکڑ بندوں میں پڑے اس حملہ آور کی طرف خوفناک نظروں سے دیکھا۔

''ذلیل کتے! ظالم وحشی! تیرے ہاتھ نجانے کتنے بے گناہ برمی مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں...... تو نے ان امن پسند مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ ڈالیں، تو زندہ نہیں بچے گا ...... اور میں مر جاؤں گا مگر جیسے سفاک اور ظالم انسان کو اپنے ساتھیوں کے میں کچھ نہیں بتاؤں گا......''

ملز بند میں فرش پر پڑا وہ حملہ آور بلا خوف اور غضب لہجے میں برمی میجر کیم کھلا کو للکارتے ہوئے بولا تھا۔ یہ الفاظ اردو میں ہی ادا کیے تھے جنہوں نے کانوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ گھول کر رکھ دیا تھا۔ پورے وجود میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ چٹخنے لگے اور میرا دھڑکتا دل جیسے ایکا ایکی رک گیا بہادر مسلم شخص کی گرجدار آواز نے میرے اندر ہلچل ی تھی۔ مجھ سے نادانستگی میں ایک بہت بڑی غلطی ہو میں نے اپنے ہی ایک مسلم بھائی کو ایک ایسے بے ضمیر کے سپرد کر ڈالا تھا جس کے ہاتھ پہلے ہی برمی انوں کے بے گناہ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ میرا پچھتاوے اور دکھ سے بھر گیا تھا مگر میں نے اپنے کے تاثرات چھپائے رکھتے ہوئے دل ہی دل میں ر لیا تھا کہ اب چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی میں اس بہادر مسلم مجاہد کی زندگی بچا کر رہوں گا۔ رے دل میں اب بدھ مت کے اس پیروکار برمی ھلا کے خلاف نفرت سی بھرنے لگی تھی۔ اب مجھے ہوا تھا کہ اس کے ''دشمن'' کون ہو سکتے تھے اور کیوں جان لینے کے درپے تھے۔

میجر کیم کھلا کا وہ باڈی گارڈ طیش بھرے انداز میں انت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا اور نفرت سے اپنے بھینچ کر اس برمی مسلم کے چہرے پر اپنے بھاری بوٹ رسید کر ڈالی۔ برمی مسلم کے حلق سے اذیت کے راہ خارج ہو گئی، میں نے دیکھا اس غریب کے منہ ون کی لکیر سی بہہ نکلی تھی۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا، شاید دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ سی بڑی مشکلوں سے میں نے اپنے اندر کے طوفانی قابو پائے رکھا تھا۔ مجھے اس وحشی برمی باڈی گارڈ پر طیش آیا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس ظالم کا چ ڈالوں، مگر میں ابھی بے بس تھا۔

''اسے میرے حوالے کر دو...... میں اس کے منہ سے اگلوا لوں گا۔'' میں نے فوراً میجر کیم کھلا کی طرف کر کہا۔

''یہ بہت بہتر رہے گا پاپا!'' سونگ کھلا فوراً میری میں بولی۔ ''یہ بہادری کا کام مسٹر راج کمار نے ہی انجام دیا ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ یہی اس کے منہ سے یہ آسانی اس کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں بھی سب اگلوانے میں کامیاب رہے گا۔''

''تم ان مسلم برمیوں کو نہیں جانتی ہو بیٹی!'' میجر کیم کھلا نے کہا۔ ''یہ بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں، اپنا مقصد بھی عیاں نہیں کرتے، جان دینا زیادہ پسند کریں گے۔ میں اسے ہوگرالی کے حوالے کروں گا۔ تشدد کے نت نئے حربے ایجاد کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔'' میجر کیم کھلا نے کہا۔ پھر پاس کھڑے اپنے اسی قسائی صورت تخیم باڈی گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس کے درندہ صفت انسان کی آنکھوں میں، میں نے خاص چمک سی ابھرتے دیکھی تھی۔ ہوگرالی...... شاید اسی کا ہی نام تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔

اس برمی مسلم کا ہوگرالی جیسے قصاب کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یقیناً اذیت ناک موت ہی ہو سکتا تھا۔

اس کی جیسے مراد بر آئی تھی۔ میں اندر سے پریشان سا ہو گیا۔ ہوگرالی اسے ٹانگ سے پکڑ کر کسی جانور کی طرح بیدردی سے گھسیٹتا ہوا کیبن سے باہر لے گیا۔

میں جانتا تھا کہ برمی مسلم اپنی جان دے دے گا مگر اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے گا۔ میں بے بسی اور دکھ کے مارے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول بھینچ رہا تھا، لیکن میں نے اپنی یہ کیفیات ظاہر نہیں ہونے دی تھیں، میں نہیں جانتا تھا کہ اس رذیل میجر کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنے ضمیر کا قیدی بننا پڑے گا، تاہم یہ سب کچھ میری لاعلمی میں ہوا تھا اور میں اس کا فوراً ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

میجر کیم کھلا مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا اور دوستانہ انداز میں میرا شانہ ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر راج! ہماری بیٹی نے تمہارے بارے میں ہمیں سب بتایا تھا، تم واقعی دلیر اور جاں نثار آدمی ہو، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کام میرے تربیت یافتہ باڈی گارڈ نہ کر سکے اب تک، وہ تم نے کر دکھایا! یہ سب تم نے کہاں سے اور کیسے سیکھا؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں کون تھا اور کیا کیا تربیت اور کیسی کیسی لڑائیاں لڑ چکا تھا، تاہم بولا۔ ''میجر صاحب! شاید آپ کی بیٹی سونگ کھلا نے یہ نہیں بتایا کہ میں ایک انڈین فلائنگ کلب میں کام کرتا تھا۔ وہاں فائٹنگ کلب بھی تھا، مجھے اس کا شوق تھا، بس جو بھی تھوڑا بہت ہے، وہیں سے سیکھا تھا۔''

''گڈ!'' میجر کیم کھلا خوش ہو کر بولا۔

"میں نے پاپا کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔" سونگ کھلا قدرے چہک کر بولی۔ میری اس کامیابی اور اپنے باپ کا اعتبار جیت لینے کے بعد وہ خاصی خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی، میرا دھیان بار بار اس قیدی کی طرف جا رہا تھا۔ وہ قسائی صفت برمی ہوگرالی نجانے اس غریب کے ساتھ کیسا انسانیت سوز سلوک کر رہا ہوگا۔ لیکن مجھے جو بھی کرنا تھا، وہ نہایت رازداری، محتاط روی اور صبر و استقامت سے کرنے کا متقاضی تھا۔ لہٰذا سونگ کھلا کی طرف دیکھ کر میں مسکرا کر رہ گیا۔

"آؤ نوجوان! بیٹھو ہمارے ساتھ...... ہم قدر شناس ہیں اور ہیرے کی قدر جانتے ہیں، تم چاہو تو ہمارے ساتھ مستقل رہ سکتے ہو۔"

وہ یہ کہتا ہوا مجھے لے کر ایک طرف بچھے صوفہ سیٹ کی طرف بڑھا اور ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔

میں نے اس کی بات پر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی کہ یہ منافق شخص منہ پر ہی کتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے تو پہلے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی کرنا پسند نہیں کیا تھا...... اور اب بات کر رہا تھا قدر شناسی کی...... بہرکیف میں صوفے پر براجمان ہوگیا تھا اور وہ بھی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے نفیس قسم کا سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور سونگ کھلا بھی ایسا ہی کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ریشمی لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھی۔

میجر کیم نے اس سے کچھ کہا تھا، وہ قریب ایک دیوار گیر کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی اور ذرا دیر میں وہ شراب کی بوتل اور تین بلوریں پیگ اٹھا لائی۔ شراب کو دیکھ کر ہی میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی۔ یہ بڑی مصیبت کی بات ہوتی تھی میرے لیے کہ بیرونِ وطن مجھے اس خرافات سے جان چھڑانی نہ صرف مشکل بلکہ میرے لیے اور میری شناخت کو مخفی رکھنے کے حوالے سے "خطرے" میں بھی پڑنے لگتی تھی۔

میں دل ہی میں وہ بہانہ تلاشنے لگا جس سے بغیر کسی شک وشبے کے یہ بلا ٹلی رہے۔

"سونگ بیٹی بتا رہی تھی کہ تمہیں اپنے ساؤتھ انڈیمان میں اپنے کسی ساتھی کی تلاش ہے؟" میجر کیم نے فوراً میرے مقصد کی بات کر ڈالی تو میں نے بھی بلا تامل اس سے کہا۔

"جی ہاں! دجے میرا دوست ہی نہیں بلکہ میرے محسن کا بیٹا بھی ہے، ان دونوں باپ بیٹے کے مجھ پر بہت احسانات ہیں......"

"ہاں! مجھے معلوم ہوا سونگ سے کہ اس کے [illegible] نے تمہاری خاندانی دشمنوں سے جان بچائی تھی اور [illegible] لے گیا تھا۔"

"جی ہاں! یہی بات ہے۔"

"تم واقعی ایک سچے انسان ہو کہ اپنے محسن کو نہیں بھولے...... خیر! تم فکر نہ کرو، ہم تمہاری اس سلسلے میں تمام مدد کریں گے۔"

"بے حد شکریہ آپ کا میجر صاحب! میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔"

اپنے بارے میں انڈین بتانے کے بعد وہ مجھ سے شستہ اردو ہندی میں ہی باتیں کر رہا تھا۔ سونگ نے بھی اردو میں بولنا شروع کر دیا تھا۔

"یہ لیں......" اس نے تینوں پیگ [illegible] کے بعد ایک میری طرف بڑھایا تو میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"بے آرامی کی وجہ سے میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے، اس کے پینے سے بڑھ جایا کرتا ہے۔ پھر کبھی سہی، ابھی موڈ نہیں......"

"اوکے...... نو پرابلم......" وہ دل نشیں انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر دونوں باپ بیٹی نے اپنے پیگ سے ایک گھونٹ بھرا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے بارہا چاہا کہ اس خبیث اور متعصب مسلم دشمن کو کریدوں کہ وہ برما میں ایک عرصے سے مقیم مسلمانوں کے لیے کیوں موذی جان بنا ہوا تھا، مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ تاہم اس مختصر سی گفتگو میں میجر کیم کھلا کا لب لباب یہی رہا کہ میں ان کا ساتھی [illegible] دیگر ان کا غلام بن کر رہوں...... جبکہ سونگ کھلا تو یوں بھی یہی چاہتی تھی کہ میں وہاں سے اب کہیں نہیں جاؤں، جبکہ میں بار بار چالاکی سے اپنے کسی فرضی ساتھی اور محسن، دجے کی تلاش کے سلسلے میں اپنی پریشانی کو ظاہر کرتا رہا۔

اس کے بعد میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ساتھ ساتھ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کم از کم اس وقت سونگ کھلا میرے گلے کا ہار نہ بنے کیونکہ میں ہوگرالی کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

میں وارف پر چلتا ہوا بظاہر اپنے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک کیبن کے قریب سے گزرتے ہوئے میری سماعتوں میں کسی کی گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ سی سنائی

دی۔ میں ٹھٹک کر رکا، اسی وقت دو برمی اس طرف آتے [illegible] دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لوہے کی بالٹی [illegible] تھی۔

وہ دونوں اسی کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں ایک طرف کو کیبن کی چوبی آڑ میں ہو گیا۔ وہ دونوں ہنستے، باتیں کرتے ہوئے کیبن کے پاس آئے اور دروازے سے داخل ہو گئے۔

میں آہستگی سے آگے بڑھا۔ کیبن کی چھت سے ایک بلب جھول رہا تھا، وہاں پانی ٹپک کر نیچے بہہ رہا تھا۔ پورے وارف پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں سے جگنو جیسی روشنی پھوٹتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے اطراف میں ایک نظر ڈالی اور پھر دبے پاؤں کیبن کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک دروازے سے [illegible] کی آواز ابھری مگر میرے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں پلٹتا اس لیے وہیں ٹھہر گیا۔

دروازہ کھلا اور وہی دونوں افراد باہر نکلے، پھر مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ تاہم مجھے پہچان کر ایک نے مسکرا کر [illegible]

"کیا تم بھی اندر جا کر اس مسلے کا حشر دیکھنا چاہتے [illegible] جاؤ، چلے جاؤ...... تمہارا ہی شکار تھا وہ......"

"نہیں، میں دراصل اپنے کیبن میں آرام کرنے جا رہا تھا۔ اپنے کیبن کا راستہ شاید بھول رہا تھا۔" میں نے دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ "میجر صاحب نے اسے یوں بھی میرے حوالے کرنے کے بجائے ہوگرالی کے حوالے کر دیا ہے۔"

وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں بھی انہیں دکھانے کے لیے تھوڑا پلٹا تھا اور دیوار [illegible] ٹھہر گیا تھا۔

وہ دونوں آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے جہاں سے آئے تھے اسی طرف کو چلے گئے۔ پھر ایک موڑ کاٹتے [illegible] ان دونوں میں سے ایک نے اپنی ذرا گردن گھما کر میری طرف دیکھا تھا، میں ایک دم آڑ میں ہو گیا۔

دوبارہ ابھرا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر دبے پاؤں مطلوبہ کیبن کی طرف بڑھا اور دروازے کے پاس پہنچ کر میں نے اس کی جھری سے ذرا اندر جھانکا تو خون کھول اٹھا۔ اندر کا منظر بڑا دردانگیز تھا۔

وہ درندہ صفت ہوگرالی اس مسلم برمی کو ایک آہنی [illegible] کسے ہوئے تھا اور اسے فولادی زنجیروں سے باندھ کر چھت سے الٹا لٹکایا ہوا تھا، جبکہ فرش پر عین اس کے سر کے بالکل نیچے پانی کی بھری ہوئی بالٹی تھی جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پانی یقیناً کھولتا ہوا تھا۔ ایک چرخی کی مدد سے وہ مردود ہوگرالی اس بدنصیب قیدی کو نیچے لاتا اور اس کا سر کھولتے پانی کی بالٹی میں ڈبو کر ایک دم باہر نکالتا، قیدی کی کرب ناک چیخیں بڑی دل دہلا دینے والی ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اسی وقت اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کا نقاب بنایا اور چہرے پر چڑھا لیا۔ میں نہتا تھا اور اسی طرح دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

ہوگرالی نے دروازے کی کھڑبڑ پر کوئی توجہ نہ دی تھی، وہ شاید یہی سمجھا تھا کہ اس کا کوئی ساتھی ہوگا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس نے چرخی روک دی ہے اور اب آگے بڑھ کر وہ اس بدنصیب قیدی کے بالوں کو مٹھی میں دبوچ کر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا تو میں دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے عقب میں جا پہنچا، اسی وقت اسے بھی کچھ شک گزرا، وہ تیزی سے میری طرف پلٹا اور تب ہی میرے ہاتھ کا ایک زوردار پنچ اس کے بھاری جبڑے پر پڑا۔ اس کے حلق سے کراہتی ہوئی "اوغ" جیسی آواز خارج ہوئی اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔

وہ خاصا سخت جان تھا اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے پستول نکالنا چاہا، میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے لانگ جمپ لگائی اور اس کے پیٹ پر اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا رسید کر دیا، وہ رکوع کے بل جھکتا چلا گیا مگر گینڈے جیسی طاقت اور برداشت کا مالک ہوگرالی، ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ تڑپا اور اس نے اپنے گنجے سر کی ٹکر میرے پیٹ میں رسید کر ڈالی، اس کا یہ وار اچانک ہی تھا، کیونکہ اس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا رسید کرنے کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ اب تب میں یہ ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے گا اس لیے میں نے ذرا تساہل برتا اور یہی میری غلطی بن گیا۔

اس کے سر کی ٹکر کسی گینڈے کی ٹکر سے کم نہ تھی جس نے مجھے دھکیل دیا تھا، یہی نہیں وہ مجھے اسی ٹکر پر لگائے ہوئے دیوار سے جا لگا، میں نے سنبھلتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی تالی اس کی کنپٹیوں پر بجا دی۔ میرے اس ڈبل کلیپنگ پنچ نے اس کا دماغ جھنجھنا کر رکھ دیا اور وہ کھڑے کھڑے بار بار اپنے سر کو جھٹکے دینے لگا، تب ہی میں نے موقع تاک کر اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ تیورا کر

گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک میرے اس پے در پے جاں کش وار پر کب کا ڈھیر ہو چکا ہوتا..... مگر ہوگرا ائی خلافِ توقع سخت جان ہی نہیں بے پناہ قوتِ برداشت کا حامل ثابت ہوا تھا، اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مر چکا تھا یا صرف بے ہوش تھا، تاہم میرے پاس وقت نہیں تھا، یہاں کوئی بھی آ سکتا تھا اور پھر سارا کھیل بگڑ جاتا مجھے یقین تھا ہوگرا ائی نقاب کے باعث مجھے پہچان نہیں سکا ہوگا۔

میں نے پھر ایک لمحے کی بھی دیر لگائے بغیر سر کے بل معلق اس بدنصیب قیدی کو نیچے اِتارا اور پھر اس کے آہنی جکڑ بند کھول ڈالے۔ وہ بھی ابھی تک مجھے نہیں پہچان پایا تھا تاہم وہ شاید سمجھا یہی تھا کہ میں اس کا کوئی "سرفروش" ساتھی ہی ہوں۔

"جلدی نکلو، آؤ میرے پیچھے....."

میں نے اس سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

غیر انسانی تشدد کے باعث اس بے چارے کی حالت غیر سی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا تو اس نے بھی ذرا ہمت سے کام لیا۔ میں نے پہلے آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وارڈ دور تک ویران تھا..... پھر میں اسے لیے باہر آ گیا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھا۔

اگلے چند سیکنڈوں بعد میں اسے لیے اپنے کیبن میں آ چکا تھا۔ میں نے دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔

"تم اکرام ہو؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پھر کون ہو تم؟"

"بتاتا ہوں، پہلے ذرا تمہاری مرہم پٹی کر دوں۔" میں نے کہا۔

کیبن میں اس قسم کا فرسٹ ایڈ موجود تھا جس میں مرہم پٹی وغیرہ کا سامان رکھا ہوتا تھا، میں نے بہت کم عرصے میں یہ کام نمٹایا۔ وہ جلد باز ثابت ہوا۔ یا پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا کہ اس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر میرے چہرے سے رومال کا نقاب کھینچ لیا۔

"تم.....!" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت حیرت اور غیظ ناک تاثرات اُبھرے تھے۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

"ہاں! میں....." میں نے کہا۔ "لیکن میرا نام راج کمار نہیں، شہزاد احمد خان ہے..... اور میں الحمدللہ ایک مسلمان ہوں اور پاکستان کا باشندہ ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کون ہو..... پتا تب چلا جب اس مردود میجر کیم کھلا کے کمرے میں، تمہیں اس کے حوالے کیا اور تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر میں نے بھی اسی وقت اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ اب تمہاری ان برمی کتوں سے جان بچانا بھی میرے ذمے ہے....."

میری بات سن کر وہ بے حد متاثر اور خوش ہوا۔ اس نے بے اختیار میری پیشانی پر بوسہ دے ڈالا اور توصیفی لہجے میں بولا۔ "نوجوان! بے شک تم نے پہلے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ لاعلمی میں کیا، لیکن میری حقیقت کا پتا چلتے ہی تم نے وہی قدم اٹھایا جو ایک سچے مسلمان کو اپنے مسلم بھائی کے لیے اٹھانا چاہیے..... لیکن دوست! یہ بھی حقیقت ہے کہ برما کے متعصب بدھ بھکشوؤں کی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے، حالانکہ یہ لوگ خود کو بدھا کا پیروکار تو کہتے ہیں مگر اس کی نیک تعلیمات پر ذرا بھی عمل نہیں کرتے، بدھا نے تو امن آشتی، محبت انسانیت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے مگر یہ لوگ برما میں ایک عرصے سے مقیم امن پسند مسلمانوں کو برداشت نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمین پر صرف برمیوں کا حق ہے، مسلمانوں کا نہیں، کتنے ہی گھرانے وہاں انہوں نے بے خانماں کر ڈالے۔ عالمی سطح پر بھی بے حسیانہ خاموشی چھائی ہوئی ہے کوئی ہماری مدد کو آگے نہیں بڑھ رہا..... اب تو برما کی آرمی بھی ان کا ساتھ دے رہی ہے۔

"میانمار اور روہنگیا کے مسلمانوں پر ان متعصب بدھ بھکشوؤں کے غنڈوں، برمی سیکیورٹی فورسز اور آرمی کے افسروں نے ظلم اور ہلاکت خیزی کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں، خواتین کی بے حرمتی کی گئی.....

"ظلم کی حد تو یہ ہے کہ جو بے چارے مسلم برمی اپنے طور پر کشتیاں کروا کر دریائے ایراوتی کے راستے، ظلم و ستم کی اس بستی سے نکلنے لگے تو انہیں دھوکے سے تھائی لینڈ اسمگل کر دیا گیا، جہاں خواتین کو جسم فروشی پر مجبور کیا گیا اور ان کے بچوں اور مردوں کو وہاں کے امراء نے اپنے محلات میں غلام اور نوکر بنا لیا گیا ذرا تصور کر میرے مسلم بھائی شہزاد احمد خان..... ان بے چاروں کے دل کی کیا حالت ہو گی..... یہی کتا میجر کیم کھلا تھا، اس نے برمی مسلمانوں پر بڑا ظلم کیا ہے اور صلے میں اسے بدھ بھکشوؤں نے بڑے انعامات سے نوازا..... میرے کئی عزیز و اقارب اس کے

ہاتھوں مارے گئے۔"

کہتے کہتے وہ بے چارہ رو پڑا...... جبر و ظلم کی یہ داستانِ الم سن کر میرا اپنا جگر اجذبات تلے چھلنی ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی دی تو اس نے کہا۔

"لیکن نوجوان! تم بھی مجھے کسی ایسے ہی نیک کاز میں مصروف نظر آتے ہو۔ تمہاری لڑائی بھڑائی کے انداز سے مجھے تو یہی ظاہر ہوا کہ تم بھی نہیں ہو...... میرا نام محمود الحسن ہے......" یہ کہتے ہوئے اس نے آخر میں اپنا نام بھی بتا دیا۔

"ہاں محمود بھائی! تمہاری بات غلط نہیں ہے۔ ایک مجبوری کے تحت میں ان کے ساتھ ہوں، بس یوں سمجھو، لوہے کو لوہے سے کاٹ رہا ہوں......"

پھر ایک ثانیے ٹھہرنے کے بعد میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہیں اب زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ یہاں کوئی بھی آ سکتا ہے اور پھر کہیں تمہاری وجہ سے میرا ابھی منصوبہ فیل نہ ہو جائے۔"

"میں واقعی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" وہ بولا۔ "لیکن، بھائی! میں نے اس برمی میجر کو زندہ نہیں چھوڑنا ہے، آج یا کل اسے جہنم واصل کر کے ہی رہوں گا۔ تم صرف مجھے اتنا ہی بتا دو کہ تمہارا آئندہ کا کیا منصوبہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں اس سے تمہارے منصوبے کو تو فرق نہیں پڑے گا؟"

"تم نے اچھی بات کہی محمود بھائی! ابھی اس مردود برمی میجر کیم کھلا کا زندہ رہنا میرے مفاد میں بہتر ہو گا۔ مگر تم اس کی فکر نہ کرو، بس، مجھے تھوڑا وقت دے دو، جب تک تم کوئی اور اہم مشن نمٹا سکتے ہو۔ یوں بھی تمہارا کاز اب میرا مشن بھی بن چکا ہے بلکہ یہ ہر سچے مسلمان کا کاز ہے کہ اسلام دشمنی کرنے والوں اور نہتے بے گناہ مسلم بھائیوں کا خون بہانے والوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچانا چاہیے...... میجر کیم کھلا سے ابھی میں نے بہت سے کام لینے ہیں، اس کے بعد میں ہی اسے جہنم واصل کر دوں گا...... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

محمود الحسن نے ایک بار پھر مجھے بڑی گرمجوشی سے اپنے گلے لگایا اور پھر رخصت ہوتے وقت اس نے بڑے رنجور، بڑی بے بسی اور بے چارگی سے مجھ سے ایک درخواست کرتے ہوئے آخر میں کہا۔

"میرے دوست...... میرے مسلم پاکستانی بھائی! تم سے ایک گزارش کرتا جاؤں گا...... برما کے نہتے، مظلوم اور بے خانماں مسلمانوں کے لیے کچھ کر سکو تو ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا...... میرا مطلب تھا یہ میجر کیم کھلا اور اس کا گماشتہ ہوگرالی وہاں برما میں مسلم دشمنوں کے سب سے بڑے سپورٹرز ہیں...... اور صلے میں انہیں بہت دولت اور مراعات حاصل ہیں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں بھی مسلم دشمن غنڈے ہیں ان سب کی پشت پناہی بھی یہی رذیل میجر کیم کھلا کرتا ہے۔ اس کے جہنم واصل ہو جانے کے بعد ان بدمعاشوں کی کافی حد تک کمر ٹوٹ جائے گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو دوست! میجر کیم کھلا کو میں اس کے گماشتے ہوگرالی سمیت ختم کر دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی کے ساتھ دبا کر پورے عزم سے کہا اور پھر وہ رخصت ہو گیا۔ ابھی اسے گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ اچانک گولی چلنے کی آواز ابھری۔ میں ٹھٹکا، پھر دوسری گولی چلی اور کسی کے چھپاکے سے پانی میں گرنے کی آواز ابھری۔ میں تڑپ کر اپنے کیبن سے باہر آیا تو دیکھا وہ برمی بھی وارف کی ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے پانی کی سطح پر کسی کی لاش تیر رہی تھی۔

ان میں سے ایک برمی نے مجھے اشتباہ انگیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ قیدی تمہارے کیبن سے کیوں نکلا تھا؟ یہ ہوگرالی کو......" اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ پل کے پل ہی میں نے حالات کی کایا پلٹنے کا ادراک کرتے ہی اس کی ٹھوڑی پر زوردار گھونسا رسید کر دیا تھا۔ وہ اچھل کر پانی میں جا گرا...... دوسرے نے مجھ پر اپنے پستول کی نال کا رخ کرنا چاہا تھا، مگر میرے پورے وجود میں تو جیسے پارا دوڑا ہوا تھا، میں نے کسی چیتے کی طرح اس کے پستول پر اپنے ایک ہاتھ کا جھپٹا مارا اور پستول ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ دھماکا ہوا اور اس کی پیشانی میں سرخ روشندان بن گیا۔

وہ چند ثانیے اسی طرح کھڑا رہ گیا اور پھر پیچھے کی طرف گرا، ریلنگ سے ٹکرایا اور پانی میں ایک زوردار چھپاکے سے جا گرا۔ میں نے دوسرے برمی کو تاڑا۔ جو تیرتا ہوا وارف کی چوبی سیڑھیوں کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اوپر سے ہی اس کا نشانہ لے کر تلے اوپر دو تین فائر جھونک دیے، پھر رات کے سناٹے میں اس کی کریہہ انگیز چیخ ابھری اور اس کا نامراد وجود پانی کی سطح پر تیرتا نظر آنے لگا......

☆☆☆

صبح ہو چکی تھی، پانی سے تینوں کی نعشیں نکال لی گئی

[illegible] ارف کے چوبی اور گیلے فرش پر رکھ دی گئی تھیں۔ اردگرد میں، میجر کیم کھلا، اس کی بیٹی سونگ کھلا اور ان کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی کھڑے تھے۔

ان تینوں میں سے دو لاشیں انہی برمیوں کی تھیں جو میرے ہاتھوں ہی جہنم واصل ہوئے تھے، جبکہ تیسری محمود الحسن کی تھی۔ وہ بدقسمتی سے رات کو میرے [illegible] نکلا ہوا مارا گیا تھا اور جنہوں نے مارا تھا، انہیں [illegible] بھی رازداری سے محمود کی موت کا بدلہ لیتے ہوئے ختم [illegible]۔ مجھے محمود کے مرنے کا بے حد افسوس تھا۔

میں نے چالاکی اور زیرک دماغی سے کام لیتے [illegible] یہی بتایا تھا کہ میں آرام کرنے کے لیے جب اپنے [illegible] آ کر لیٹا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میں نے [illegible] آواز سنی۔ باہر نکلا تو اپنے ساتھیوں کو (میجر کے ساتھیوں کا) قیدی کے ساتھیوں سے جنگ کرتے ہوئے [illegible]

چونکہ میں خود نہتا تھا اسی لیے اندر ہی چھپا رہا۔ شاید [illegible] کو اس کے ساتھی چھڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئے [illegible] ہمارے ان دو ساتھیوں کی بروقت ان پر نگاہ پڑ گئی [illegible] نے بڑی بے جگری سے ان کے ساتھ مقابلہ کیا، [illegible] قیدی بھی مارا گیا، مگر وہ فرار ہوتے ساتھیوں [illegible] دونوں کو بھی مار ڈالا وغیرہ وغیرہ۔ میری یہ جھوٹی کہانی تیر بہدف تھی...... کسی کو بھی شبہ [illegible] ہو سکا تھا، ماسوائے ہوگرالی کے۔

اس نے مجھ سے سوالوں کی بوچھاڑ کروائی تھی اور میں ظاہر ہے بے فکری سے اس کے سوالوں کے جوابات دیتا رہا تھا، [illegible] بھی میجر کیم کھلا کی جان میں نے ہی اس قیدی (محمود) [illegible] ہاتھوں بچائی تھی بلکہ اسے پکڑوایا بھی تھا، اسی لیے کسی [illegible] بھی مجھ پر شک نہ ہو سکا تھا، مگر یہ مردود ہوگرالی مجھ سے [illegible] کر رہا تھا، یہ تو سونگ کھلا کی مہربانی تھی کہ اس [illegible] انداز ہو کر ہوگرالی کو ڈانٹ پلا دی کہ وہ مجھ پر [illegible] شک کر رہا ہے اور اپنی نااہلی کو چھپا رہا ہے، نتیجے میں ہوگرالی کو میجر کیم کھلا کی بھی سخت اور بے نقط سننا پڑی تھی کہ [illegible] سے نہ کچھ اگلوا سکا تھا نہ ہی اس کو قید میں رکھ سکا۔

جب ہوگرالی کی اچھی خاصی دھلائی ہو گئی تب جا کر [illegible] بخت نے میری جان چھوڑی...... لیکن باوصف اس [illegible] مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ مجھ سے پوری طرح مطمئن ہوا ہو گا۔ مجھے اس سے بہرحال از حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد نعشوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ پیدا ہوا۔ پولیس کو یہ اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔ بقول میجر کیم کھلا کے غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پڑ سکتے تھے۔ ایک اور بات کی بھی مجھے بھنک ملی تھی کہ ان لوگوں کے پاس کالے بچھوؤں کا بہت سا ذخیرہ موجود تھا، جو یہاں کے (انڈیا کے) قانون کے مطابق غیر قانونی تھا، کیونکہ ایک تو یہ ذخیرہ اسمگل کیا جانے والا تھا، دوسرے ان کالے بچھوؤں کی نایابی و کمیابی کی وجہ سے اس کے شکار پر نہ صرف بڑی سخت قسم کی پابندی عائد تھی بلکہ بھاری جرمانے کے ساتھ قید بامشقت بھی تھی۔

کالے بچھوؤں کے شکار پر اس قدر کڑی پابندی اور کڑی سزا کا ایک ہی مطلب تھا کہ بھارت اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس پر مقامی اور قبائلی لوگوں کا زیادہ حق تھا۔

لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا یہی سہل طریقہ سوچا گیا کہ انہیں سمندر برد کر دیا جائے...... اور یہی کیا گیا۔

میرا دل و دماغ بوجھل سا تھا...... ایک تو برما کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی چتا نے مجھے اداس سا کر دیا تھا دوسرے محمود کے اس طرح اچانک غیر متوقع انداز میں مارے جانے نے مجھے دکھی اور رنجیدہ خاطر سا کر دیا تھا۔

لاشوں کو رازداری سے سمندر برد کرنے کے لیے انہیں پہلے کپڑے میں لپیٹنا تھا اور پھر بھاری پتھر باندھ کر غرقِ آب کرنا تھا، اس لیے ابھی تینوں کی نعشوں کو خالی کیبن میں رکھوا دیا گیا تھا۔

یہ وہی کیبن تھا جہاں جوشم نامی وید نے میرے زخموں کا علاج کیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا، میں نے موقع پا کر وہاں کا رخ کیا۔

تینوں لاشیں کیبن کے سیلن زدہ فرش پر رکھی ہوئی تھیں۔ برمی کتوں کی لاشیں چھوڑ کر میں محمود کی لاش کے قریب آیا اور جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا پھر پُرعزم لہجے میں اس کے سینے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے جذبات سے لرزتی آواز میں بولا۔

"اے دوست! میرے مسلم بھائی! آفرین ہے تجھ پر اور تیری شہادت پر...... تو اپنا آرام و سکون چھوڑ کر اپنے مسلم بھائیوں کو ان برمی کتوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہا اور اپنی جان کی بھی پروا نہ کی مگر میں نے بھی تجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ تیرا ادھورا مشن میں پورا کروں گا، یعنی میجر کیم کھلا اور اس کے درندہ صفت گماشتے ہوگرالی کو

واصل جہنم کر کے رہوں گا۔"

تھوڑی دیر بعد ان کی لاشیں کپڑے میں لپیٹ کر ایک بھاری پتھر سے باندھ کر ذرا دور گہرے سمندر میں لے جا کر پھینک دی گئیں۔

"کیا ہوا......؟ راج! تم خاصے دکھی نظر آ رہے ہو؟"

میں واپس پلٹا ہی تھا کہ معاً ایک مترنم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جس نے مجھے بری طرح ٹھٹکا دیا۔ یہ سونگ کھلا تھی۔ جو نجانے کب سے میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

"نن...... نہیں، بس! ایسے ہی مجھے اپنا محسن دوست وجے یاد آ رہا تھا، نجانے وہ بے چارہ اب تک کس حال میں ہوگا...... سوچتا ہوں، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اس کے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

"او...... ڈونٹ وری، راج......!" وہ بڑی محبت بھری ملائمت سے بولی۔ "میں نے تم سے وعدہ کیا ہے راج......! اور پاپا کا تو تم دل بھی جیت چکے ہو......"

"میں جلد سے جلد نکلنا چاہتا ہوں...... لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ مجھے اب دوبارہ اس علاقے تک جانے کا کوئی اندازہ بھی نہ رہا ہے...... میں کیسے دوبارہ وہاں تک پہنچوں گا......؟"

میں نے تشویش آمیز تفکر سے کہا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہاں تک ناشکور نے ہی مجھے پہنچایا تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس بے چارے نے مرنے سے پہلے بھی مجھے آگے کی منزل کا پتا ازبر کرا دیا تھا، لیکن یہاں پورٹ بلیئر سے ساؤتھ انڈیمان روانہ ہونا میرے لیے مشکل ہی نظر آتا تھا۔ لیکن سونگ کھلا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ انڈیمان کے یہ سارے جزائر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ دوری نہیں تھی۔

"مس سونگ کھلا! میں اپنا سفر وہیں سے ہی شروع کرنا چاہتا ہوں جہاں سے منقطع ہوا تھا مگر......" میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بڑے دل فریب انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"اس راستے پر تو میں تمہیں آنکھ بند کر کے پہنچا دوں گی، تم کیوں فکر کرتے ہو؟"

"بس پھر مس سونگ کھلا! آپ یہ کام جلد از جلد کر ہی ڈالیں......"

"میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے پاس تیز رفتار لانچوں اور موٹر بوٹس کی کوئی کمی نہیں ہے، میں آج ہی تمہاری روانگی کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔ ہوگرالی تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ ہر معاملے کا ایکسپرٹ ہے، پاپا نے اسے ہر طرح کی تربیت دلوا رکھی ہے۔ تاہم نقشہ اس کے پاس بھی ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے ہماری پوری ٹیم کا بھی وہاں دوبارہ کالے بچھوؤں کا شکار کرنے کا پروگرام بنا جائے۔"

ہوگرالی کے ذکر پر میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ "ہوگرالی کے بجائے اگر کوئی اور آدمی روانہ کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ جو صرف اتنا کر دے کہ مجھے اس علاقے تک چھوڑ کر خود لوٹ آئے......"

"اپنے ساتھی وجے کو تلاش کرنے کے بعد تم واپس یہاں کیسے لوٹو گے؟ اور ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ تم نے اپنے ساتھی کو ڈھونڈ لیا ہے؟ نہیں، ہمارا ساتھی وہیں رہے گا، تمہارے ساتھ، تم کسی بڑے مشن پر نہیں جا رہے ہو جو تمہیں وہاں اتنی دیر لگے گی۔"

اس کا کہنا صحیح تھا مگر وہ اس کی اپنی سوچ تھی، جبکہ حقیقت صرف میں ہی جانتا تھا کہ میرے لیے یہ مہم کتنی مختصر یا طویل ثابت ہو سکتی تھی اور وہ بھی انتہائی رازداری کی متحمل بھی۔

میں اپنے ساتھ اس مہم میں کم از کم ہوگرالی تو کیا سونگ کھلا کے کسی بھی آدمی کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ پھر وہیں اٹکا تھا، میں تنہا اس علاقے تک نہیں جا سکتا تھا، نہ ہی مجھے یہاں سے اس کا اندازہ بھی تھا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی تو میں نے اس کے ساتھ شیئر کرتے ہوئے کہا۔

"ایک کام ہو سکتا ہے...... مس سونگ! آپ اپنے کسی بھی ایک آدمی کو میرے ساتھ روانہ کر دیں اور جو مجھے ساؤتھ انڈیمان کے اس ساحل کے قریب اتار دے، جو مذکورہ علاقے سے قریب ہو، اس کے بعد میں......"

"نہیں......" سونگ نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں اس پُرخطر علاقے میں یوں اکیلا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی...... بس! میں نے فیصلہ کر لیا ہے، ہوگرالی ادھر ہی ہوگا اور ہم پانچ افراد کی ٹیم تیار کر کے تمہارے ساتھ ہی روانہ ہو جائیں گے...... اور مل کر تمہاری اس مہم کو سرانجام دینے کی کوشش کریں گے۔"

میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا، لہٰذا کچھ سوچ کر میں نے بھی چپ سادھ لی۔

اس دوران میرے دل میں خیال آیا کہ اس سے اڈیسہ کمپنی کے حوالے سے بھی کچھ کرید کروں...... لیکن

اس قدر خطرناک دشمن تھا کہ مجھے محتاط رہنے کی ت تھی۔ ذرا سی بھی جلد بازی کم از کم ہوگرالی کو ری طرف سے بدکا سکتی تھی۔

نگ کا معاملہ اور تھا، میں دراصل جاننا چاہ رہا تھا کہ پنی کے ان کے ساتھ کس حد تک اور کس نوعیت کے ی مراسم تھے۔ نیز یہ لوگ لولوش کے بھی کس قدر تھے۔ ابھی تو میں ان کے لیے عمومی حیثیت کا ہی مل تھا یا کم از کم اس کے باپ کی نظروں میں میری اتنی حامل کی حیثیت نہ تھی، یوں کہہ لیں ایک عام یا کسی فار کو اتنا ایکسپوز نہیں کر سکتا تھا...... مگر میں کہ آنے والے دنوں میں ایسا زیادہ نہیں چل سکتا یا بدیر مجھے سونگ کھلا سے اڈیسہ کمپنی کے باپ نے کے کاروباری مناسبت کی "منہج" کا پتا چلانا ازبس ہوتا۔

پی سنجار والی مہم کے بعد مجھے اور بھی بہت سی مہمات تھیں۔ لیکن پھر مسئلہ وہی تھا کہ واپسی میں میرے ہمراہ وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ یہ بھی چلو کوئی مسئلہ نہ تھا...... ں میں، پلنج ان کا کوئی اور دوسرا بندوبست کر سکتا تھا۔ تو بہرحال آنا ہی تھا۔

یے۔ تورنگون (برما) جا کر لولوش سے دو دو ہاتھ کرنا دونوں باپ بیٹی کے ذریعے یہ آسانی ہو سکتا تھا، جنرل کے ایل ایڈوانی کے قبضے سے وہ طلسم نور ہیرا مد کرنا تھا، اس کے لیے اس کی لاڈلی پوتی رینا یے مددگار کے طور پر موجود تھی۔

نے اپنے دشمنوں کے خلاف گویا شطرنج کی بساط ع کر دی تھی، اور اب بس سوچ سمجھ کر "ٹائمنگ" مہرے آگے پیچھے سرکانا باقی تھا۔

لگتا تھا کہ مجھے اپنے مشن کا "بیس کیمپ" اب لوٹنا پڑے گا۔

سونگ کھلا کی بات تو تھی...... بلکہ اب تو کافی حد تک ے انداز و اطوار اور "حرکات و سکنات" سے لگتا تھا کہ وہ اب باقاعدہ پینگیں بڑھانے کی طرف مائل ہونے ی تھی۔

اس کے باپ میجر کیم کھلا کا دل جیتنے کے بعد سے تو وہ شاروں کنایوں میں یہ بھی جتا چکی تھی کہ اب میں مستقل کے ساتھ رہ سکتا ہوں اور ان کے کاروبار میں بھی ان کا بٹا سکتا ہوں، وہ مجھے اشاروں کنایوں میں یہ بھی باور نے لگی تھی کہ میری ان کے ساتھ (سونگ کھلا کے ساتھ) آئندہ کی زندگی بڑی اچھی اور پُرسکون گزر سکتی تھی اور مجھے یہاں سے کہیں بھی واپس پلٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے ابھی اسے "آرے" سے لگا رکھا تھا جب تک کہ اپنی مہمات کو سر نہ کر لیتا یا آگے نہ بڑھا لیتا۔

لنچ ہم نے اکٹھے وارف پر ہی کیا تھا جو خاصا پُرتکلف تھا۔ موسم کے تیور بھی بدلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سونگ کھلا نے بتایا تھا کہ بارانی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں اکثر و بیشتر بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔

پھر وہی ہوا...... مطلع ایکا ایکی ہی ابرآلود ہو گیا تھا۔ آسمان پر ایک دم ہی کالے بادل امڈے چلے آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہر سو طوفانی بارش کی دھندی چھانے لگی......

ہم تب تک لنچ ختم کر چکے تھے۔ ایک خادم نے یہاں فوراً بڑا سا چھاتا لگا دیا تھا۔

ہم تھوڑی دیر تک سمندر پر برستے آسمان کا یہ دلکش نظارہ کرتے رہے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اسی دوران اچانک میری نگاہ سامنے کیبن پر پڑی جہاں ہوگرالی اور جوتم...... میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کھسر پسر میں مصروف تھے۔ انہیں میرا شاید سونگ کھلا کے ساتھ اس قدر زیادہ گھلنا ملنا شروع ہی سے نہیں بھا رہا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کس "جوڑ توڑ" میں لگے ہوئے تھے، یہ الگ بات تھی کہ یہ دونوں میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجا سکتے تھے، کیونکہ یہاں شاید یہی دو افراد تھے جنہوں نے مجھے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

ہوگرالی کو تو مجھ پر پورا پورا شبہ تھا ہی اور وہ کسی موقع کا منتظر نظر آتا تھا کہ کسی طرح میرا چہرہ بے نقاب کر ڈالے یا کوئی ایسی میری کمزوری اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ میجر کیم کھلا سمیت سونگ کھلا سے بھی مجھے بدظن کر سکے۔

میں نے ان کی طرف سے توجہ ہٹالی اور اپنے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے کام لیتے ہوئے، اپنے سامنے بیٹھی، میرے ساتھ مستقبل کے سپنے بنتی سونگ کھلا سے کہا۔

"مجھے ایک سیل فون کی ضرورت تھی...... عارضی طور پر سہی، بعد میں لوٹا دوں گا، میرا تو کہیں کھو گیا تھا۔ میں انڈیا میں مقیم اپنے کچھ عزیزوں سے بات کر کے انہیں اپنی خیر خیریت دینا چاہتا ہوں......"

"عارضی طور پر کیوں؟ میں تمہیں مستقل طور پر اپنے ہی نام کی سم والی ایک ہینڈی (موبائل فون) دے دیتی ہوں۔"

"شکریہ۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

اسی وقت اس نے اپنے خادم کو آواز دی جو تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ وہ بارش کے پانی میں بھیگا ہوا تھا، تاہم اس نے برساتی نما کوئی شے اپنے اوپر ڈال رکھی تھی۔

سوتنگ کھلا نے اس سے کچھ کہا تھا، وہ سر کو اثباتی جنبش دے کر چلا گیا، میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہوگرالی اور جوشم کھڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے، اب وہ دونوں غائب تھے۔

لنچ کرنے کے بعد ہم دونوں اسی آرام دہ کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ وہی آدمی ... وارد ہوا، جسے شاید سوتنگ نے "بینڈی" لانے کا کہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون تھا جو اس نے بڑے ادب سے سوتنگ کی طرف بڑھا دیا۔

یہ بظاہر ایک عام سا سیل فون تھا۔ وہ اس سے لینے کے بعد سوتنگ نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور میری طرف سیٹ بڑھاتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

"یہ رکھ لو...... اور جس سے جی چاہے باتیں کر لو، اس میں بیلنس پورے پیکج کے ساتھ موجود ہے۔"

"تھینک یو مس سوتنگ!"

"ناٹ مینشنڈ۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں بھی ہولے سے ہنس دیا۔

چند لمحات دھڑکتی خاموشی میں بیت گئے، میں چاہ رہا تھا کہ مجھے ذرا تنہائی ملے تو میں کچھ ضروری رابطے کر سکوں۔

باہر بدستور شرائے دار طوفانی بارش کا شور و شغب جاری تھا اور رہ رہ کر کڑکتی بجلی کے بم جیسی دل دہلا دینے والی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"راج!" معاً سوتنگ نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے مگر گہرے لہجے میں کہا۔

"جی؟" میں نے اس کے سجیلے سے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" اس نے کہا۔

میرے لیے اس کا یہ سوال اچانک نہیں تھا اور نہ ہی غیر متوقع بھی۔ میں نے نفی والے انداز میں مختصراً کہا۔

"نہیں۔"

میرے اس جھوٹ پر اس کی گہری آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ابھری تھی۔ "کمال ہے، اتنے خوب رو اور اسمارٹ جوان کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

وہ جس آزاد معاشرے کی پروردہ تھی، اس میں یقیناً یہ حیرت کی بات ہو سکتی تھی، تاہم میں نے اپنے چہرے پر فوراً ایک اداس سی متانت سموتے ہوئے کہا۔

"مس سوتنگ! سچی بات کہوں تو میں نے کبھی آج تک کسی کو ایسی نظروں سے دیکھا ہی نہیں، یا کہہ لیں کہ میرے حالات نے کبھی ایسی فرصت ہی نہیں دی۔ آنکھ ایک گھرانے میں کھولی جہاں پہلے ہی دشمنیاں پروان چڑھی ہوئی تھیں جس نے بالآخر مجھے تنہا کر دیا، اس کے بعد بس زندگی میری اب تک نہ بھاگ دوڑ میں ہی گزری ہے۔ اب یہاں آپ کے پاس خود کو ذرا آزاد سا محسوس کرنے لگا ہوں تو دل میں اب ایک خلا کا سا احساس ہوتا ہے......"

بڑی چالاکی سے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے ایک یاس زدہ سی ہنکاری خارج کی تھی اور سوتنگ کھلا کا چہرہ کسی اندرونی جذبات کی امید برآوری تلے چمکنے لگا تھا۔ میری باتوں نے اسے بے اختیار سا کر دیا اور اس نے بڑی اپنائیت اور پیار سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے چونکنے [illegible] حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کی تو وہ جیسے مخمور سے لہجے میں بولی۔

"راج! بالکل ایسا ہی ایک خلا ایک عرصے سے میں بھی اپنے اندر محسوس کرتی آئی ہوں۔"

"ارے......" میں نے بھی اسی حیرت کا اظہار کیا جو اس نے میرے سلسلے میں کیا تھا اور معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "آپ بھی تو خاصی خوب صورت ہیں، بھلا آپ پر کوئی عاشق نہ ہوا ہوگا؟"

وہ پھیکے پن سے مسکرائی [illegible] دکھی سے لہجے میں بولی۔ "ہاں! مجھ سے کسی نے محبت کا دعویٰ کیا تھا...... مگر وہ بے وفا نکلا...... بہت جلدی بدل گیا...... میں نے بھی اسے بھلا دیا۔ لیکن جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا [illegible] حال میں زخمی دیکھا، یقین کرو تم مجھے زخمی نہیں بلکہ مجھے اپنے اندر کے زخموں کی مرہم کی صورت میں نظر آئے...... ہاں، راج! یہی سچ ہے کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔ آؤ ہم ایک دوسرے کا خلا بھر دیں، یک قلب دو جاں ہو جائیں...... ہماری بہت اچھی زندگی گزرے گی اور تمہیں میری صورت میں ہر طرح کا عیش و آرام بھی ملے گا، مجھ سے شادی کے بعد تمہیں ایسی زندگی ملے گی جس کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے......"

اس کے ہاتھ کی جسارت اس کے لب و لہجے کی طرح آوارہ سی ہونے لگی تو میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑایا اور خوف زدہ سی ایکٹنگ کرنے کے انداز میں اس سے بولا۔

"...سس...... سوتنگ کھلا جی...... ! ای ی...... یہ آپ کیا ...رہی ہیں؟ میں تو ایک غریب سا آدمی ہوں...... کہاں ...پ اور کہاں میں۔ آپ کے پاپا نے یہ سنا تو وہ کھڑے ... مجھے گولی مار دیں گے، یا پھر اس قصاب کی نسل ...الی کے سپرد تو ضرور ہی کر دیں گے......"

میں نے اس کے اور اپنے بیچ ایک روایتی تفاوت کا ...ھل: نقشہ کھینچتے ہوئے خوف کا تاثر دیا۔ ظاہر ہے میں ...صلی ہی کہاں [illegible]...... اب اسے کیا پتا کہ میں کون تھا کیا تھا ...س کمپنی کی اصل [illegible] نے پولیس وغیرہ محکمے پہلی [illegible] اس [illegible] ایک [illegible] خود ہی ہوں۔

"...ہے... نہیں، نہیں، پاپا ایسے ہرگز نہیں [illegible] ...ہو۔" وہ بڑے رسان سے بولی۔ "انہوں ...ری زندگی کے اس اہم فیصلے میں مجھے خود مختار کر رکھا ... اس سلسلے میں جو چاہے میں فیصلہ کروں انہیں کوئی انکار ہوگا...... اور پھر تم کیوں پاپا سے ڈر رہے ہو؟ وہ تو تمہیں ... بہادر اور جاں نثار انسان کی حیثیت سے پسند کرنے ...... "

"تھوڑی سی تصحیح کر لیں مس سوتنگ کھلا!" میں نے ... "مجھے بہرحال ایک داماد کے روپ میں کبھی دیکھنا ... چاہیں گے، ہاں ایک وفادار ملازم کی الگ بات ..."

"ہرگز نہیں وہ تمہیں ملازم نہیں سمجھیں گے، میں ...دوں کنایوں میں پہلے ان پر یہ باور کروا دوں گی کہ تم میری پسند ہو...... اس کے بعد برملا اپنی پسند ان سے کہہ ...الوں گی۔"

مجھے ...پر شہزادہ گلفام ہونے کی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ ...خوبصورت لڑکی مجھ سے ملے اور مجھ پر فریفتہ ہو ... تاہم اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ اگر میں خوبرو اور ...مردانہ وجاہت کا حامل تھا تو یہ بھی اللہ ہی کی دین تھی ...تھی۔ کھلا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں کون تھا اور ...اگر پتا چل جاتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے شوٹ کر ...بھی کرتی تو کم از کم میں اس کے "پاپا" کو تو شوٹ کرنے ...کر ہی چکا تھا...... لیکن میرا ضمیر بہرحال یہ گوارا نہیں کرتا ...میں اسے کسی جھوٹی محبت کا جھانسا دے کر اپنا مطلب ...رہوں۔ اگر وہ مجھے پسند کر رہی تھی تو کرتی رہے میں کسی کو ...نہیں سکتا تھا مگر اپنی طرف سے میں اس کی کسی بھی قسم کی ...رائی تک کو بھی معیوب سمجھتا تھا، میں اسے جو تاثر دینا ...دے چکا تھا...... اور وہ بھی یہی سمجھے ہوئے تھی کہ میں

کیا آپ شوگر سے مستقل نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے سخت پریشان ہے۔ کیونکہ شوگر انسان کو اندر ہی اندر کھوکھلا اور اعصابی طور پر کمزور کر دیتی ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے خاص قسم کا ایک ایسا شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جس کے استعمال سے ان شاء اللہ شوگر سے مستقل نجات مل سکتی ہے شفاء منجانب اللہ پر ایمان رکھیں۔ شوگر کے وہ مریض جو آج تک اپنی شوگر سے نجات حاصل نہیں کر سکے وہ ایک بار ہمارا شوگر نجات کورس بھی آزما کر دیکھ لیں۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر اپنی تمام علامات بیان کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP شوگر نجات کورس منگوالیں۔

المُسلم دارالحکمت رجسٹرڈ

ضلع حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون اوقات

صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

اپنی "کم مائیگی" اور اس کی شان و شوکت تلے ایک نفسیاتی نوعیت کے اندیشے میں مبتلا ہوں اور وہ میری یہ "جھجک" ختم کرنا چاہتی تھی، مگر باوصف اس کے میں اسے ایسی کسی قسم کا "گرین سگنل" بھی دینے کے موڈ میں نہ تھا لہٰذا محتاط لہجے میں گہری متانت سے بولا۔

"مس سونگ کھلا! میرا خیال ہے میں اس وقت کسی ایسے بڑے اور اہم فیصلے کے موڈ میں نہیں ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل اور ذہن پر ایک بوجھ ہے، ایک فرض کا بوجھ..... وہ میں پہلے اتارنا چاہتا ہوں۔"

پھر ایک ذرا توقف کے بعد میں نے اس موضوع سے ہی پہلوتہی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ "ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے سونگ..... اگر آپ برا نہ منائیں تو....."

"ارے نہیں..... نہیں، میں بھلا تمہاری کسی بات کا کیوں برا مناؤں گی، پوچھو.....؟" وہ دل نشیں انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"آپ نے اپنے جن نامعلوم دشمنوں کا ذکر کیا تھا، میرا خیال ہے وہ اب کل والے واقعے کے بعد نامعلوم نہیں رہے ہیں..... کیونکہ آپ بھی اسی کمرے میں تھیں جب میں نے آپ کے ایک دشمن کو پکڑا تھا، اس کی باتوں سے تو اس روز مجھے یہی لگا تھا کہ یہ دشمنی کوئی عام نوعیت کی نہیں ہے، یہ تو پوری قوم سے تم لوگوں نے..... یا یوں کہہ لیں، تمہارے پاپا نے ٹکر لے رکھی ہے اور وہ یہاں تک تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا میرا..... کہ آخر تمہارے پاپا کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی ایسی آگ میں کودنے کی..... یا پھر وہ واقعی برما میں مقیم مسلمان کمیونٹی سے نفرت کرتے ہیں؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اپنے تئیں بڑا حساس معاملہ چھیڑا تھا..... لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اس نازک اور حساس معاملے میں کم از کم سونگ کھلا کا بھی پوائنٹ آف ویو لینے کی کوشش کروں۔ آخر اس کے نظریے کا بھی تو کچھ پتا چل سکے.....

میں نے یہ اہم اور نازک سوال کرنے کے بعد بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا کہ آیا اسے میرے اس سوال پر کسی قسم کی تشکیک کا احساس ہوا تھا یا اسے برا لگا تھا، مگر اس کے چہرے پر عام سے ہی تاثرات طاری رہے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

"ہاں! یہ معاملہ پاپا کے لیے گمبھیر ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی بنتا جارہا ہے پتا نہیں کیوں پاپا نے اس معاملے میں اب تک اپنی ٹانگ پھنسا رکھی ہے۔"

"اب تک سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"پاپا جب آرمی میں تھے تب ان کی یہ مجبوری تھی کہ وہ (متعصب) بدھ بھکشوؤں کے دباؤ پر برما میں آباد مسلم کمیونٹی کی بے خانمائی میں ان کی مدد کریں اور پاپا کو ایسا، حالت مجبوری کرنا پڑا..... مگر باوجود اس کے وہ مسلم آبادیوں کے خلاف اتنے سرگرم نہیں تھے، لیکن جب انہیں برما سیکیورٹی فورسز کا فارمیشن انچارج بنایا گیا تو انہیں اپنی مرضی کے خلاف ایک بار پھر مجبوری کی بنا پر بدھ بھکشوؤں کی ماننا پڑی۔

برما میں اس مذہبی گروہ کا بڑا اثر ورسوخ چلتا ہے۔ مگر جلد ہی پاپا اس خون خرابے سے اکتا گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے دوبارہ آرمی جوائن کر لی، مگر اس پاداش میں بدھ بھکشوؤں نے انہیں آرمی سے قبل از وقت ہی ریٹائر کروا دیا..... حالانکہ پاپا کرنل کے رینک تک کی پوزیشن میں جا چکے تھے، یعنی صرف چند ماہ اور آرمی میں رہتے تو انہیں کرنل کا عہدہ مل جاتا..... انہوں نے نہتے اور بے گناہ مسلم کمیونٹی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا مناسب خیال نہ کیا اور ان کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ اب تم دیکھ ہی رہے ہو کہ پاپا نے اپنے کاروبار کی بنیاد ڈال لی، جو ان کی ہی نہیں میری بھی ایڈونچرز فطرت کے عین مطابق ہے۔"

"حیرت ہے..... جبکہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ برما میں مقیم مسلمان بے گناہ ہیں، پھر بھی ان پر وہاں یہ ظلم وستم کیا جاتا رہا؟ آخر مسلمانوں سے ایسی نفرت کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے تھی..... جبکہ انسان سے نفرت کا درس تو کوئی بھی مذہب نہیں دیتا، پھر بدھا تو بذاتِ خود محبت انسانی کا درس دیتے رہے ہیں۔ آخر تمہارے یہ بدھ بھکشو مذہبی انتہا پسندی اور منافرت کی طرف کیوں اچانک مائل ہوئے؟"

"میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں راج؟ شاید اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے....."

میں خاموش ہوگیا۔

سونگ کھلا نے اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس پر مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں آیا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنے باپ کی اس بربریت اور سفاکی سے خود بھی شرمندہ تھی، یہ الگ بات تھی اس کی یہ "شرمندگی" میرے اور اس کے بیچ "تعلقات" کی وجہ سے تھی، یعنی خود کو

امنے شرمندہ ہونے سے بچانا اس کا مقصود تھا یا پھر اپنا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔

میں نے دانستہ اس موضوع کو طول نہیں دیا، کیونکہ جو چاہتا تھا وہ جان چکا تھا۔ اس کا باپ متعصب ا آلۂ کار بن چکا تھا۔ یہ ممکن تھا اسے اس سلسلے میں "نیشنل سپورٹ" بھی حاصل رہی ہو..... جو مراعات وخ کی صورت میں بھی ہو سکتی تھی۔ تاہم یہ بات مجر کیم کھلا، برمی مسلمانوں کے ساتھ اس ظلم وستم بھکشوؤں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا اور اس کی لاڈلی بیٹی کو ولی [illegible] تھا کہ اس کا باپ بے گناہ [illegible] کیا ظلم ڈھا رہا تھا۔ اسے بس اپنی پرآسائش زندگی ی اللہ بس۔ قطعی میرے سامنے اس نے اُس کی ے کی حد تک مذمت کی تھی۔

میں درحقیقت اس طرح کی سچویشن سے گھبراتا ں لیے میں نے تم سے اس کے بارے میں ذرا ز میں گفتگو کی ضرورت محسوس کی تھی، کیونکہ میں ا تھا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کی بھی تعلق داری سا بھی ابہام ہو..... کیا خبر کب میرے لیے یا کے درمیان کسی مصیبت کا باعث بنے، کیونکہ میں رہا ہوں کہ آپ کی اور میری اس دوستی کو ہو گرا لی ید نما بھکشو تم سخت ناپسندیدگی کی نظروں سے تھا....."

ں نے چالاکی سے بات بنائی تو وہ تیکھے لہجے میں مالی فت! یہ دونوں کون ہوتے ہیں ہماری دوستی کو رنے والے..... یہ دونوں ہمارے نوکر ہیں۔"

"مگر یہ دونوں نوکر بہت سے لوگوں کو میرے خلاف تے ہیں۔ جس طرح بھکشوؤں نے برما میں مقیم کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا اور وہ اس میں نہ صرف پنجہ حکومتی سطح پر بھی کامیاب ہوتے نظر آ رہے ہ باہر مسلمانوں کے خلاف اس ظلم پر کسی طبقے ی تک کوئی آوازِ حق بلند نہیں کی ہے۔"

گفتگو کو کس رخ پہلے جا رہے ہو راج؟" معاً کھلا میری طرف دیکھ کر قدرے عجیب سے لہجے میں ے اندر سے کھٹکنا پڑا، بات بناتے ہوئے اپنے فاسو کر بولا۔

خیال ہے کہ گفتگو کی یہ نہج آپوں آپ نہیں آئی حالات کا تقاضا اس کی اصل وجہ ہے۔ خیر اس موضوع کو، بس یونہی یہاں ان دو افراد کی چبھتی نظروں نے مجھے شاید تھوڑا سا وہمی بنا دیا تھا۔"

"وہم کرنا بھی سائیکی کی ایک قسم ہوتی ہے اور مجھے سائیکی قسم کے لوگ پسند نہیں ہیں۔"

وہ اچانک اس بار بدلے ہوئے سے لہجے میں بولی، جس نے مجھے..... چونکا دیا، مگر میں نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کر دی۔ مصلحت کوشی آڑے آتی تھی، وگرنہ تو میں اسے اس بات کا ایسا جواب دیتا کہ یہ برملا تو نہیں البتہ اندر سے خود سمیت اپنے پاپا، اور اپنے تعصبی بدھوں کو ہی نفسیاتی مریض ماننے پر مجبور ہو جاتی..... پھر یہ الگ بات ہوتی کہ اس کے بعد جیسے..... چراغوں میں تیل نہ رہا یعنی پھر میری اور اس کی یہ دوستی یقینی طور پر عداوت میں بدل جاتی۔

بحث کسی بھی نوعیت کی ہو، بڑھتی ہے تو اس میں تلخی عود کر آتی ہے۔ تاہم اب بھی سچ اور حق کہنے سے میں پیچھے نہیں ہٹا تھا، باتوں باتوں میں، اسے میں یہ جتانے اور باور کرانے میں کامیاب رہا تھا کہ ان کے دیس میں جو کچھ مسلم کمیونٹی کے ساتھ ہو رہا تھا وہ ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، میرے اتنے حق گوئی کہنے پر اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ بٹ..... آئی ڈونٹ کیئر..... شہزاد احمد خان شہزی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ مصلحت اندیشی بھی ایک حد تک ہوتی ہے۔ میں سچ کو ایسی کسی مفاداتی سولی پر چڑھا کر اسے مسخ نہیں کر سکتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ اللہ اگر ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھولتا ہے..... یوں بھی تمہیں اس موضوع کو سیریس نہیں لینا چاہیے تھا، یہ ہمارا اور ہمارے ملک کا داخلی معاملہ ہے..... وہ جانے ان کا کام۔ کیا تمہارے دل میں مسلمانوں کا درد سمویا ہوا ہے؟ یہ کہتے ہوئے وہ مجھے کچھ شاکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب تک چند دنوں کی اچھی خاصی "تعلق داری" جو اس کی طرف سے کسی حد تک "قلب داری" کی جانب بڑھ رہی تھی اس میں ہلکی سی مجھے دراڑ پڑتی محسوس ہو رہی تھی..... تاہم اس کی بات پر میرا دماغ گھوم گیا، اپنی طبیعت ہی ایسی تھی..... گویا یہ کہہ کر اس نے اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ناجائز کریں وہ درست ہے اور کسی کو اس میں دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں، اس سے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ ہونے لگا۔ برمی مسلمانوں کے خلاف اس کے اندر کا بغض ظاہر کرنے میں بے شک مجھے بڑی قیمت چکانی پڑ رہی تھی شاید..... لیکن میں نے بھی تلخی سے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے آپ کی نگاہوں میں انسانی حقوق اور جبر کی کوئی اہمیت نہیں۔"

"تم تو خود ہندو ہو اور میں ان کی مذہبی تاریخی اور

سیاسی ادوار سے اچھی طرح واقف ہوں، انہوں نے کبھی مسلمانوں کو اپنا دوست نہیں سمجھا ہے…… پھر تمہیں کیوں ان کا اس قدر غم کھائے جارہا ہے؟"

"میں نے تو آپ سے عام سی بات کہی تھی کہ آپ کی نظروں میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا…… اور ساتھ ہی اپنے ایک خوف کا اظہار کیا تھا…… کہ دشمنی کہیں کوئی بڑا گل نہ کھلا دے……" میں نے مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

میری بات پر وہ چند ثانیوں تک پرسوچ انداز میں بہ غور میرا چہرہ تکتی رہی اس کے بعد وہ بھی یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر بولی۔ "تمہارا خوف بے جا ہے…… تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میرے ساتھ مستقبل میں کسی پنپنے والے تعلق سے کہیں یہی مصیبت تمہارے گلے بھی نہ پڑ جائے جو اس وقت میرے اور پاپا کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔"

"گفتگو کی غایت کو اب آپ سمجھی ہیں میڈم!" میں نے بھی چل سو چل، جیسا وہ سمجھی تھی ایسا ہی تاثر قائم رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تو اس کی آنکھوں سے معنی خیز شگوفے سے پھوٹتے محسوس ہوئے۔

میں جو چاہ رہا تھا وہی وہ سمجھ رہی تھی میں اس کا "ٹریک" تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

اچانک وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "روانگی کا کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں تھوڑی دیر میں……" وہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے انداز میں مجھے رکھائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں وہیں بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

باہر بارش بدستور جاری تھی، زور کچھ ٹوٹا ہوا لگتا تھا، مگر اب بھی وقفے وقفے سے بجلی کی کڑکتی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ سوچ کر کیبن کے دروازے کے پاس آ کر ذرا ٹھہرا اور اس کی جھری سے باہر جھانکا تو سونگ کھلا کو چند ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑا پایا…… وہ بھکشو (وید) جوشم اور ہوگرالی سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ دونوں اس کی ہر بات پر بار بار اپنے سر کو فدویانہ انداز میں تفہیمی جنبش دے رہے تھے اور گاہے بہ گاہے گردن ذرا موڑ کر کیبن کی طرف دیکھ لیتے تھے، جس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہونے چلا تھا۔

سونگ کھلا شاید میرے ہی سلسلے میں اپنے ان دونوں گماشتوں کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ اس کے بعد، وارف پر تیز تیز آگے بڑھ گئی……

ہوگرالی اور جوشم چند ثانیے وہیں کھڑے رہے اور ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور معنی خیز انداز میں اپنے سروں کو جنبش بھی دیتے جاتے تھے۔ میرا دل کسی مخفی خطرے کے پیشِ نظر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

میں پلٹ آیا اور سوچنے لگا کہ سونگ کھلا کے رویے میں تبدیلی آنے کے بعد مجھے فوری طور پر کون سا قدم اٹھانا چاہیے تھا؟

پہلا خیال میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ سونگ کھلا کو اب زیادہ آزمانا بے وقوفی ہی نہیں بلکہ خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہوسکتا تھا۔ اگر اس کی نیت میں کوئی فتور در آیا تھا تو اس کا مجھے آج ہی آج میں اندازہ [illegible] چاہیے تھا اور اس کے لیے سونگ کھلا کا آج میری یہاں سے روانگی کا بندوبست کرنے یا نہ کرنے کا انحصار تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے اپنا کوئی علیحدہ لائحہ عمل تیار کرلینا چاہیے تھا۔

میں نے سیل فون پر اسی وقت آنسہ خالدہ سے رابطہ کیا۔ پچھلی بار میری صرف زہرہ بانو سے بات ہوسکی تھی مگر…… آنسہ خالدہ سے رابطہ ممکن نہ ہوسکا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے اسی سے رابطہ کیا تھا۔

دوسری طرف رِنگ جارہی تھی…… اور میرا دل [illegible] طرح دھڑک رہا تھا، چوتھی رنگ کے بعد دوسری طرف سے کسی نے کال ریسیو کی اور 'ہیلو' کہا۔

اس نسوانی آواز پر میں بُری طرح چونکا تھا۔ ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی بھیانک آواز گونجی…… میں بری طرح ٹھٹکا۔ دوسری جانب سے فون پر…… ہیلو…… ہیلو…… کہا جا [illegible] دوسرے ہی لمحے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور مجھے پورا کیبن لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ دھماکا اس قدر شدید تھا کہ میں کانپ گیا تھا اور سیل فون بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میں ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرا دھماکا میرے کیبن کے بالکل سامنے ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر اندر آن گرا۔ دھوئیں اور بارود کا بگولا سا اندر در آیا تھا جس نے ماحول میں کثافت پھیلا دی تھی اور مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا……

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

میراسایہ

سرور آرا

شادی لڑکی کی ہو یا لڑکے کی… فی زمانہ دونوں کے رشتوں کی دستیابی مسئلۂ فیثاغورث بنتا جارہا ہے… دونوں فریقین کے درمیان مصالحت کرانا… اور ان کے ملاپ کی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں… اسی تناظر میں بُنی گئی تحریر کے حیرانگیز تانے بانے۔

لبوں پر تبسم ریزیاں بکھیرنے والا شگفتہ و فرحت آفریں سایہ

میں ایک عام سے ہوٹل میں ایک عام سی چائے پی رہا تھا کہ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

تنی ہوئی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھوں والا وہ بندہ مجھے کچھ پُراسرار سا دکھائی دیا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکا لی اور اسی وقت اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"تمہارا نام عارف ہے نا؟"

"جی ہاں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"میں عارف ہوں لیکن آپ، آپ کون ہیں؟"

آوارہ گرد

قسط:33

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے بھرپور ایک تازہ دم دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے نظم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا۔ شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش جاتی ہے۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں معطل کا ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل جی بجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھیڑنا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوتک کو بے بس کردیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایلی ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی

ں ے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا ھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک الل کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے ے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک سچ کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے......

او بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اں چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ساتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لفنگا ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل ے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ ریتا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی ریتا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلّا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے ل کے پل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا گر ے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی امول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی نگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچ کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ”کلی منجارو“ پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں ی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، شیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود روع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو تا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ ستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی نگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان ں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اگر میں فوری طور پر وہاں سے حرکت نہ کرتا تو حصِ م کا شکار ہو کر جان سے جا سکتا تھا۔

مجھے یہ کوئی اچانک حملہ لگتا تھا، جس کے متعلق پہلا خیال میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ یہ محمودالحسن کے جاں فروش ساتھیوں کا کوئی ٹولا ہی ہو سکتا تھا اور یہ غالباً اس مجاہد لے نے اپنے ساتھی کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا یا پھر یہ حملہ ان کی کسی پرانی ”پری پلاننگ“ کا حصہ بھی ہو سکتا تھا۔

خطرہ مجھے بھی تھا، مجھے ان برمیوں کا ساتھی سمجھا جا سکتا تھا۔ یہ ٹولا مرنے مارنے پر تُلا بیٹھا تھا اور یقینی طور پر ان کا ٹارگٹ میجر کیم کھلا ہی ہو سکتا تھا۔

میں نے لرزتے کیبن کے دروازے کی طرف دوڑ لگائی اور قریب پہنچا تو مجھے باہر وارف پر دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ دھوئیں اور بارود کے سلگتے بادلوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ہر طرف ایک افراتفری سی مچی ہوئی تھی، تاہم فائرنگ کے آہنگ سے محسوس ہوتا تھا کہ اب یہ تبادلہ فائرنگ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ یعنی جوابی حملے کے لیے یہ برمی بھی تیار ہو چکے تھے، تاہم یہ ابھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ انہیں کتنا نقصان ہوا تھا۔

سوئے اتفاق میں نہتا ہی تھا، حالانکہ ایک پستول میرے پاس تھا، مگر اس افراتفری میں جانے وہ کہاں رکھا تھا

یا کھو گیا تھا۔

اسی وقت ایک دھماکے سے کیبن کی چھت نیچے آرہی، اب میرا اندر محبوس رہنا محال ہی تھا، میں نے دروازے سے باہر جست بھری اور وارف پر اندازے سے بیرونی راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

بارش ابھی تک ہو رہی تھی اور رن گھمسان کا پڑا ہوا تھا...... مجھے چیخ و پکار اور شور کی بھی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں، ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے قریب ہی ایک سے زائد دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

تاریکی اور خنک آبی دھند میں مجھے وہ دو مسلح ہیولے ہی نظر آئے۔ جنہوں نے سروں پہ سیاہ رنگ کے صافے سے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا تھا ان کے بارے میں کہ یہ کون ہو سکتے تھے، ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں، ابھی وہ مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر تھے کہ اچانک ان پر تین مسلح افراد ٹوٹ پڑے۔ وہ اچانک ہی اندھیرے کا فائدہ اُٹھا کر اُن پر پل پڑے تھے لیکن غافل وہ دونوں بھی نہیں تھے۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انہوں نے بھی اپنے بچاؤ کے لیے بروقت حرکت کی تھی مگر بدقسمتی سے شاید ایک آدمی ان تینوں چھاپاماروں کی گرفت میں آگیا تھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے مجھے اس کی کرب انگیز چیخ سنائی دی تھی۔

میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور کیبنوں اور چوبی تختوں سے راستہ بناتا ہوا ایک طرف کو لپکا۔ اسی وقت مجھے لگا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا تھا۔ حالانکہ بارش کا شور ہنوز جاری تھا، نیز جنگ کی صورت حال سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ متوقع جاں فروشوں کا حملہ ور گروپ کاری وار لگا چکا تھا اور اب...... اپنی اس کمانڈو مہم کو آخری نہج پر پہنچانے کے لیے کوشاں تھا۔ اس لیے اب دوبدو لڑائی کے علاوہ اِکا دُکا فائر یا کسی گرینیڈ کے دھماکے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

اپنے تعاقب کا شبہ مجھے اس وقت ہوا تھا جب میں بیرونی راستے والے اس حصے کی طرف بڑھا تھا جدھر درمیانی سطح کی موٹر بوٹس موجود تھیں۔

میں اس سارے قصے پر لعنت بھیج کر نارتھ انڈیمان کی طرف اپنے ادھورے رہ جانے والے مہماتی سفر کی شروعات وہیں سے کرنا چاہتا تھا جہاں سے یہ منقطع ہوا تھا، شکر تھا کہ میں اپنی منزل سے زیادہ دور نہ تھا جبکہ یہاں پورٹ بلیئر کے شارک آئی لینڈ میں کسی بھی انڈین پولیس یا کوسٹ گارڈ کی پیٹرولنگ ٹیمیں آسکتی تھیں۔ جس کے شبے کا اظہار اس طرح کے حالات میں ان دونوں باپ بیٹی کو میں نے ایک دوسرے سے کرتے سنا تھا۔ اسی لیے می یہی کوشش تھی کہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جاؤں۔

شارٹ موٹر بوٹ چلانا میرے لیے نسبتاً آسا ہوتا۔

اپنے تعاقب کا یقین کرنے کے لیے میں ایک ا جگہ آکر رکا جہاں گودی کے کنارے ایک بڑی لانچ ساتھ دو چھوٹی موٹر بوٹ مجھے دکھائی دی تھیں، یہاں لکڑی پیٹیاں اور بڑے بڑے بھاری بھرکم کینوس بورے رکھے نظر آرہے تھے۔ میں فوراً ان کے درمیان جا دبکا۔

بارش کا شور تھمنے لگا تھا، دور کیبنوں کی طرف سے کو چنگاری ایک شعلہ فشاں دھماکے سے بھڑکتی نظر آجاتی تھی تاہم آگ بھی وہاں روشن تھی۔ کچھ کیبن شاید ہینڈ گرینڈ سے آگ کی لپیٹ میں آگئے تھے، گودی پر پھیلا ہوا اسل بھی جل کر خاکستر ہونے لگا تھا۔ بحر ہند کے کنارے کا حصہ اب ایک سلگتے علاقے کا منظر پیش کرتا نظر آتا تھا، انڈین نیوی پولیس کے کود پڑنے کا خدشہ زیادہ پریشان رہا تھا، اسی لیے میری کوشش تھی کہ یہاں سے جتنی جلدی ہوسکے دور نکل جاؤں، لیکن اس نامعلوم متعاقب نے اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا، میں صرف چند ثانیے کے یہاں دبکا بیٹھا رہا، جب عقب میں کوئی نظر نہ آیا تو گوشے سے نکلا اور ایک بار پھر بیرونی راستے کی طر بڑھا، مگر ابھی چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ اچانک مجھے ا بالکل قریب کوئی واضح آہٹ سنائی دی۔ چھٹی حس خطرے کا الارم بجایا اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے سا حرکت کرتے ہوئے پلٹنے کی کوشش چاہی تھی کہ کوئی بھا بھرکم وجود کے ساتھ مجھ پر پل پڑا۔

میں نے بیک وقت نہ صرف سنبھلنے بلکہ نامعلوم ح آور کے وار سے بچنے کی بھی کوشش کرتے ہوئے اس جوابی وار کیا اور نتیجے میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے گتھم گتھا ہو کر پیٹیوں کے درمیان جا پڑے، مگر حملہ آور کچھ زیادہ ہی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور مجھ پر پل پڑا۔

اس نے میرے چہرے پر ایک گھونسا جڑ دیا، مج اس کی طاقت کا اندازہ ہوا، اس کا ہاتھ بھاری تھا۔ مجھے جبڑا ہلتا محسوس ہوا تو میرا دماغ بھی گھوم گیا۔ قہر وغضب لہر نے میرے اندر جنونی طاقت بھر دی، میں نے اس پیٹ پر اپنا گھٹنا رسید کر دیا۔ لیکن بدقسمتی سے تاریکی باعث یا پھر اندازے کی غلطی تھی کہ میرا گھٹنا اس کے پیہ

سینے میں لگنے کے بجائے، کسی ٹھوس چوبی پیٹی کے کونے سے ٹکرا گیا۔

یہ چوٹ شدید تھی، جس کے باعث میرے حلق سے بے اختیار چیخ سی خارج ہوگئی۔ جس نے حملہ آور کے حوصلے کو مہمیز کیا اور اس نے مجھ پر اسی وقت دوسرا بھرپور وار کیا۔

اس بار اس نے میری کنپٹی پر مُکا رسید کیا اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا، مجھے اپنے سر کو ایک دو بار ہی جھٹکے دینے کا موقع ملا تھا کہ اس نے میرے پیٹ پر لات بھی رسید کردی۔ میرے حلق سے تکلیف دہ کراہ خارج ہوگئی۔

وہ مردود تاریکی کے باوجود بڑے ٹھیک اندازوں سے مجھ پر کامیاب وار پہ وار کیے جارہا تھا، اور خود میرے حملوں سے بچ رہا تھا۔

تب ہی میں نے اس سے تھوڑی مار کھانے کے بعد اس کی ''پوزیشن'' کا اندازہ کیا اور بالآخر اس کے جسم کے نازک حصے پر لات چلادی۔

اس کا رزلٹ خاطر خواہ نکلا، مجھے اس کی ''اوغ'' سے مُشابہ چیخ سنائی دی تھی۔ پھر میں نہیں رکا، اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اب میں بھی اس پر جنونی انداز میں پل پڑا۔

ہم دونوں اب لڑتے لڑتے نسبتاً کشادہ جگہ پر آگئے، جدھر دور قریب سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی تمازت اور روشنی پڑ رہی تھی اور تب ہی حملہ آور کو دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ بدبخت ہوگرالی تھا۔ اسے پہچانتے ہی میں نے فوراً مصلحت سے کام لیا اور چلا کر بولا۔

''کیا تم مجھے نہیں پہچان رہے ہو ہوگرالی......؟ میں راج ہوں...... مجھ پر کیوں حملہ کیا ہے تم نے؟''

''میں تمہیں اچھی طرح پہچان گیا ہوں......'' اس نے غضب ناک لہجے میں کہا اور آخر میں ایک گندی گالی دی، جس نے میرا دماغ گھما دیا۔

''یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہوا ہے...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' کہتے ہوئے اس نے تیزی سے گرد و پیش نگاہ دوڑائی، اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے یک بیک شبہ ہوا کہ اس کے دیگر ساتھی بھی پہنچنے والے تھے یا پہنچ چکے تھے۔

میں نے اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی تک میری طرف سے غلط فہمی کا شکار ہو...... یہ موقع میرے ساتھ لڑنے کا نہیں......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے عقب سے مجھے دو تین افراد دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔

میری پیشانی پر تفکر کی پرچھائیں نمودار ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ یہ مسلح تھے۔

''خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا، ورنہ میرے ساتھی تمہیں گولیوں سے بھون دیں گے۔'' اپنے ساتھیوں کی آمد پر وہ غیظ ناک انداز میں چیخا۔

میں ایک گہری سانس خارج کر کے وہیں کھڑا رہا۔ اس کے مسلح ساتھی تعداد میں تین تھے۔

ہوگرالی کی شاید مجھ پر نگاہ پڑ گئی تھی، اس نے مجھے فرار ہوتے دیکھ کر ہی میرا تعاقب کیا تھا اور جس حال میں بھی تھا میرے پیچھے دوڑ پڑا تھا، ساتھ ہی اپنے چند ساتھیوں کو بھی اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا تھا۔

''میں تمہاری تحویل میں ہوں...... کیا کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے کہا۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرو......'' ہوگرالی بھیڑیے کی سی خونخوار غراہٹ سے بولا۔ اس کا خار کھایا لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کافی دیر سے مجھ پر اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ ''چلو اس طرف ......'' اس نے آخر میں مجھ سے تحکمانہ کہا۔

وہ خود میرے قریب آنے سے اب کترا رہا تھا، شاید وہ میرے لڑائی بھڑائی کے انداز سے سمجھ چکا تھا کہ میں کوئی عام شخص نہیں تھا۔

شاید یہی بات اس کے لیے ابتدا سے ہی مجھ پر شبہ کرنے کی وجہ بنی رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ بری مسلم گروپ کے حملے کا جواب دینے کے بجائے یہاں کیا کر رہا تھا؟ یا پھر وہ سب مارے گئے تھے، جبکہ ان کا بھی کم نقصان نہیں ہوا ہوگا۔

لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا رخ ان جلتے ہوئے کاٹیجز (کیبن) کے بجائے، اس جانب تھا جدھر دو تین موٹر بوٹس موجود تھیں۔ ان میں ہم سوار ہوگئے۔ مجھے بدستور گن پوائنٹ پر لیا ہوا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے بہت زیادہ ڈرے ہوئے اور محتاط دکھائی دے رہے تھے۔

ہوگرالی کا یہ کہنا کہ یہ سارا بکھیڑا میرا ہی پھیلایا ہوا تھا تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ میں نے جس طرح اپنی نادانستگی میں بری مسلم گروپ کے محمود کو پکڑوایا تھا تو اس کی حقیقت جاننے کے بعد میں نے ہی اسے، اپنی جان پہ کھیل کر ان ظالم برمیوں کی قید سے چھڑوایا بھی تھا۔ تب سے ہی ہوگرالی

اور اس کے ''ہم نشیں'' جو شم کو مجھ پر شبہ تھا کہ میں ان کے دشمنوں کی جاسوسی کرنے کے لیے ان میں شامل ہوا ہوں، وغیرہ۔

بہرکیف اب میں دیکھنا یہ چاہ رہا تھا کہ اس تازہ حملے کے بعد کیا حالات تھے؟ کون زندہ بچا تھا اور کون مر چکا تھا؟ نیز اب یہ مجھے کہاں اور کس کے پاس لے جا رہے تھے؟

موٹر بوٹ میں ان کے ساتھ سواری کا مطلب یہ تھا کہ ان کا اب زمینی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اسی بات کی بُو محسوس کر کے مجھے اپنے اندر رہ رہ کر نامعلوم سنسنی خیزی کا احساس ہو رہا تھا۔

موٹر بوٹ مناسب رفتار سے ان کے گودی والے ٹھکانے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ سامنے ان کا ٹھکانا جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور کسی ویران مرگھٹ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں سے اب دھواں سا اُٹھنے لگا تھا۔

مگر ان کی منزل کسی اور جانب تھی، ٹھیک اسی وقت ایک بگل کی آواز ابھری، ہم سب ہی چونکے تھے، آواز کی جانب دیکھا تو میرے جسم میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، وہ انڈین کوسٹ گارڈ کی لانچ تھی۔ وہاں سے فلش لائٹ پھینکی جا رہی تھی۔

''وہی بات ہوئی جس کا ڈر تھا، میں اسی وجہ سے بھاگ رہا تھا۔ اب کیا جواب دو گے انہیں مسٹر ہوگرالی؟''

میں نے چلا کر پریشانی سے کہا تو ہوگرالی نے مجھے خونخوار نظروں سے گھور کر کہا۔ ''تم اپنی چونچ بند رکھو...... میں نمٹ لوں گا ان سے، مگر یاد رکھنا، تم نے کسی قسم کی چالاکی دکھانے کی کوشش کی یا بچاؤ کی صورت سمجھتے ہوئے خود کو ان کے حوالے کرنا چاہا تو میں تمہیں ہی مجرم ثابت کر دوں گا۔''

اس کی بات پر میں چونکا۔ میں بھلا کیسے خود اپنے پاؤں پہ کلہاڑی مارتا اور کیوں؟ میں تو خود ان سے بچنے کی کوشش میں تھا، تاہم ہوگرالی کو میں اپنی یہ کمزوری نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس کے عزائم کا اندازہ ہوتے ہی کہ یہ مجھے سردست اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا، مجھے یہ سن کر قدرے اطمینان ہوا تھا۔ گویا دشمن ہی دشمن کو بچا رہا تھا تو مجھے کیونکر اعتراض ہو سکتا تھا۔

ادھر ہوگرالی نے اپنے کسی ساتھی کو حکم دیا کہ جوابی اشارہ دے دیا جائے تاکہ کوسٹ گارڈ والے ان پر فائرنگ ہی نہ کھول ڈالیں۔ چنانچہ اس کے ایک ساتھی نے ٹارچ روشن کر کے جوابی اشارہ دے دیا اور لانچ روک دی گئی۔

ایسے میں میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے میں کتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا؟ یا یہ خود کو اور مجھے کس طرح اس انڈین کوسٹ گارڈ سے بچا سکتے تھے؟ کیونکہ میرے پھنسنے کے بھی امکانات بہرحال موجود تھے۔

ہوگرالی نے اپنے ساتھیوں کو اسلحہ ڈاؤن کرنے کا اشارہ کر دیا تھا اور خود ان سے مخاطب ہونے کے لیے اسی رخ پر عرشے پر آ کھڑا ہوا تھا جبکہ میں ان کے ساتھیوں کے بیچ گھل مل کر کھڑا ہو گیا تھا، جن کی تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں تھی۔

کوسٹ گارڈ والوں کی لانچ ہمارے قریب آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس کے عرشے پر مجھے دس بارہ مسلح افراد چوکس کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں روشنی تھی اور مستول پر ایک ریڈار گردش کر رہا تھا، جس پر ایک سرچ اور دوسری گردشی فوگ لائٹ نصب تھی۔

یہ سب سفید رنگ والی کوسٹ گارڈ کی مخصوص وردیوں میں تھے۔ انہی میں ایک اپنے شولڈر اور اس پر بنے مونوگرام سے ان کا آفیسر دکھائی دیتا تھا۔ یہ ایک دراز قامت شخص تھا اور اس کے ہمراہ ایک ساتھی ہاتھ میں میگافون لیے کھڑا تھا۔ لانچ کے قریب آتے ہی وہ بولنے لگا۔

''فرسٹ آرڈر...... اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے ایک قطار میں ریلنگ کے سامنے آ جاؤ...... ہری اپ۔''

ہوگرالی نے سب کو ان کا حکم ماننے کا اشارہ کیا اور پھر ہم سب اس کی تعمیل میں اسی طرح قطار بنائے ریلنگ کے سامنے کھڑے ہو گئے، ہوگرالی بھی ہمارے ساتھ تھا۔

ہم پر فلش لائٹ پھینکی گئی، جس کے باعث ہماری آنکھیں چندھیانے لگیں تو ہم نے اپنی آنکھوں پہ ہاتھوں کے چھجے بنا لیے۔

''سیکنڈ آرڈر...... تمہاری لانچ کے ساتھ سیڑھیاں لگائی جا رہی ہیں، تم سب اسی طرح قطار میں چلتے ہوئے ہماری لانچ تک آؤ گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہم انڈین کوسٹ کی لانچ کے عرشے پر کھڑے تھے۔ ہماری جامع تلاشی لی گئی اور چند اہلکار ہماری موٹر بوٹ پر بھی تلاشی وغیرہ کے سلسلے کے لیے اُتر گئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اسی دراز قامت آفیسر نے ہوگرالی کو گھورتے ہوئے سوال کیا تو وہ رواں ہندی میں بولا۔

"آفیسر! ہمارا تعلق فشری کمپنی سے ہے۔ ہم نے یہاں چند دنوں سے ڈیرا ڈالے رکھا تھا کہ کچھ بحری لٹیروں نے ہم پر حملہ کر دیا، اور ہمارا سارا نایاب شکار اور سامان لوٹ کر لے گئے۔ ہماری مدد کو کوئی بھی نہیں آیا۔ ہمارا سب کچھ ان ظالموں نے ختم کر ڈالا۔" یہ کہتے ہوئے ہوگرالی کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کی اداکاری دیکھ کر خود بھی ایک لمحے کو حیران سا رہ گیا۔

"تم کس علاقے سے تعلق رکھتے ہو؟" آفیسر کے لہجے میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔

"آفیسر! ہم برما سے بے آف بنگال ہی چینل پر چلے تھے اور نارتھ ٹو ساؤتھ شکار کرتے ہوئے یہاں پورٹ بلیئر میں آکر ٹھہرے تھے۔"

"پرمٹ دکھاؤ......" انڈین آفیسر نے تحکمانہ کہا، اب اس کے لہجے کی تلخی کچھ کم ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

ہوگرالی نے جلدی سے اپنی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک چرمی ڈائری نما کوئی شے نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ آفیسر نے اس سے یہ ڈائری نما شے لی اور کھول کر اس کے صفحات اُلٹ پلٹ کر دیکھنے اور پڑھنے لگا۔ اس کے بعد اپنے ساتھ چوکس کھڑے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ وہ اسے تھامے ہوئے اندر بڑے سے کیبن میں چلا گیا۔ اس دوران ہوگرالی اور اسی انڈین کوسٹ آفیسر کے درمیان ہی باتیں ہوتی رہیں۔

میں شکر ادا کر رہا تھا کہ ہم لوگوں سے چیدہ چیدہ پوچھ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ اب تک ہوگرالی سے ہی مصروف گفتگو تھا اور میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسی تک ہی محدود رہے، ہم سے کسی قسم کی پوچھ کچھ نہ کرے، ظاہر ہے پھر اس "پوچھ کچھ" کی لپیٹ میں، میں بھی آسکتا تھا، پھر میری "اصلیت" بھی آشکارا ہونے کا خطرہ ہوتا۔ اگرچہ ایسا خطرہ تو اب بھی محسوس کر رہا تھا، یعنی اپنے پہچان لیے جانے کا ڈر۔

تھوڑی دیر میں وہی ماتحت اہلکار ڈائری نما شے میں ملفوف وہ کاغذات لے آیا اور اپنے آفیسر کو تھمانے کے بعد اس کے کان میں جھک کر کچھ کہا۔

میری دھڑکتی ہوئی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ جب میں نے دیکھا کہ اس آفیسر نے وہ ڈائری نما کاغذات کی کتاب ہوگرالی کے حوالے کر دی۔ میں جیسے سراپا سماعت تھا۔ وہ اس سے بولا۔

"مسٹر ہوگرالی! ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے برادر ملک کے ساتھیوں کو نقصان اُٹھانا پڑا۔ ہماری کوشش ہے کہ آپ کی مدد کریں لہٰذا ہم بہت جلد ان مجرموں تک پہنچ کر آپ کے نقصان کا ازالہ کریں گے۔"

بظاہر خرانٹ نظر آنے والے اس انڈین آفیسر کی یہ بات میرے لیے حیران کن تھی، اس قدر جلد یہ معاملہ حل ہونے کی مجھے غیر یقینی سی مسرت ہونے لگی یا پھر شاید اس میں ہوگرالی کی ذہنی فراست اور مکاری کا کمال تھا، لیکن ایک بات بھی طے تھی کہ ہوگرالی والوں کا یا میجر کیم کھلا کا مقصد اس کاروبار کی آڑ میں کچھ بھی رہا ہو، بہرحال ایک معتبر جہازراں کمپنی کے (اڑیسہ کمپنی) توسط اور بری ریٹائرڈ آرمی آفیسر کے تعارف اور کاغذات کی شناخت بھی اس آفیسر کے لیے ایک معتبر تعارف رہی ہو۔ پھر برما کے انڈیا کے ساتھ تعلقات اچھے اور "برادرانہ" بھی تھے۔

بہرکیف کچھ بھی سہی، ان کے ساتھ ساتھ میری بھی "بچت" ہوگئی تھی کہ بات اِدھر ہی ختم ہوگئی تھی۔ ورنہ اگر معاملہ زیادہ آگے بڑھتا تو کم از کم میں ضرور لمبے چوڑے چکروں میں پھنس سکتا تھا۔

ہم سب کو واپس ہماری بوٹ میں اُتار دیا گیا۔ کوسٹ گارڈ والوں کی سرچ لائٹ آف ہو چکی تھی، تاہم ریڈار والی گردشی لائٹ جوں کی توں تھی۔

موٹر بوٹ میں آتے ہی ہوگرالی کے ساتھیوں نے فوراً مجھ پر گنیں تان لیں۔ میں بے پروا انداز میں اپنے سر کو جھٹکا دے کر مسکرا دیا اور ہوگرالی کی طرف دیکھ کر توصیفی لہجے میں بولا۔

"مان گئے تمہیں استاد! کیا غچا دیا ہے تم نے ان لوگوں کو ورنہ تو ہم سب ایک لمبی چوڑی تفتیش کے بہانے گئے تھے کام سے۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ میری طرف دیکھ کر نفرت انگیز انداز میں غرایا۔ "میں نے ان سے وہی کہا جو سچ تھا۔"

"مگر اپنے پرانے دشمنوں کو بحری قزاقوں کا نام دے کر تم نے ان کے ساتھ کون سا سچ بولا ہے؟"

میں دانستہ گفتگو کی پچ کو اپنے مطلب پر لایا تاکہ ہوگرالی کے منہ سے اس معاملے میں آئندہ کے عزائم واضح ہو سکیں۔۔ وہ ہنکارتے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

"مقصد صرف اتنا ہی تھا کہ ہم پر قزاقوں نے نہیں، برما کے [illegible] آپ نے حملہ کیا تھا، اس معاملے

سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی جبکہ میرے جھوٹ بولنے کا مقصد یہی تھا کہ ہم اپنے معاملات خود ہی حل کرنا جانتے تھے۔"

"اچھی بات ہے۔ تم نے شاید کسی لمبے چوڑے چکر سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولا ہوگا، مگر تمہیں سچ بولنا چاہیے تھا، تاکہ یہ لوگ اس سلسلے میں تمہاری مدد کرتے، ان کے پاس پوری فورس ہے۔ اس مسلم لڑاکا گروپ نے نجانے تم لوگوں کا کتنا جانی و مالی نقصان کر ڈالا ہوگا۔ لیکن خدا کے لیے یہ تو بتادو کہ میجر صاحب اور ان کی بیٹی سونگ کھلا خیریت سے تو ہیں ناں.....؟" میں نے اپنے لہجے میں تفکر سموتے ہوئے کہا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"یہ مٹھی بھر لڑاکا مسلم گروپ اپنی اس غلطی کی سزا عنقریب بھگتنے والا ہے۔ ہمارے چند آدمیوں کو مارنے کے سوا یہ گروپ کچھ نہیں کر پایا ہے۔ ہاں! ہمارا مالی نقصان بہت کیا ہے، ہمارا سب کچھ تباہ کر دیا ہے، اب دیکھنا ہم برما جاکر ان کی اس غلطی کی سزا پوری مسلم کمیونٹی سے لیں گے۔ جس کا پلان میجر صاحب بنا چکے ہیں، وہ اور ان کی بیٹی اس حملے سے بال بال بچے ہیں اور اب تم نہیں بچو گے، کیونکہ تمہاری ہی وجہ سے یہ سب ہوا ہے، نہ تم محمود کو میری قید سے چھڑاتے، نہ وہ اپنے لڑاکا ساتھیوں کے ساتھ یہاں کا رخ کرتا۔"

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ مجھے سونگ کھلا کے بچنے یا نہ بچنے سے کوئی سروکار نہ تھا، مگر میجر کیم کھلا کے اس حملے سے بھی زندہ بچ جانے پر افسوس ہوا تھا۔ اس ظالم اور بدبخت کی عمر خدا نے ابھی شاید دراز کر رکھی تھی یا پھر یہ "نیک کام" میرے ہی ہاتھوں انجام پانے والا تھا اور اب میری اس ہٹ لسٹ میں یہ مردود ہوگرالی بھی شامل ہو چکا تھا۔ تاہم میں نے پریشان ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"تمہارا ابھی تک میری طرف سے دل صاف نہیں ہوا ہے۔ میرا بھلا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے؟ میں خود ایک انڈین ہندو ہوں......"

میری بات پر اس نے بڑی تیز اور خرانٹ نظروں سے میرے چہرے کو گھورا اور پھر زہر میں بجھی مکروہ مسکراہٹ تلے بولا۔ "ابھی پتا چل جاتا ہے تمہاری حقیقت کا......"

اس کے لہجے کی سنسنی خیز کاٹ پر ایک لمحے کو میں خود بھی اندر سے دہل گیا اور پہلا خدشہ یہی میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں اس مردود کو کسی ٹھوس حوالے سے میری اصلیت کا تو نہیں پتا چل گیا؟ یا پھر یہ ایسے ہی ابھی تک میرے بارے میں ایک تشکیک بھرا اندازہ قائم کیے ہوئے ہے؟ جبکہ میجر کیم کھلا کی مجھے پوری حمایت حاصل تھی۔

گودی سے تقریباً آٹھ دس ناٹیکل میل کے سفر کے بعد سمندر کی پُرسکون لہروں پر ایک بڑی سی لانچ کھڑی نظر آئی، جس پر روشنی ہو رہی تھی۔ تاریک پانیوں میں یہ لانچ کسی قندیل کی طرح رکھی نظر آتی تھی۔

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس حملے کے بعد "میجر کمانڈ" کو فوری طور پر گودی سے دور کر دیا گیا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی سے اسی لانچ پر رہائش پذیر ہوں۔ خطرے کی صورت میں یہ فوراً دور دور چلے گئے تھے۔

ہوگرالی کی بات پر میں بظاہر بے پروا انداز میں اپنے کاندھے اُچکا کر رہ گیا اور ساتھ میں اپنا سر بھی اس انداز میں جھٹکا جیسے مجھے ہوگرالی کے خیال سے بالکل اتفاق نہ ہو۔ یہ محض اس کا لغو خیال تھا۔

بوٹ لانچ کے قریب آکر روک دی گئی۔ پھر اس کے ساتھ سیڑھیاں لگا دی گئیں اور ہم سب سیڑھیوں کے ذریعے لانچ میں جا سوار ہوئے۔

عرشے پر ہی مجھے اکادکا مسلح افراد دکھائی دیے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ برمی مسلم گروپ نے ان کی افرادی قوت کو زبردست دھچکا پہنچایا تھا۔ ان کے جو مزدور مارے بھی گئے تھے وہ بھی لڑاکا افراد ہی ہو سکتے تھے۔

مجھے وہاں جوشم بھی کھڑا نظر آیا۔ وہ اپنے مخصوص چوغے نما لباس میں تھا اور میری طرف بڑی خونخوار نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے چھاپ لیا اسے......" ہوگرالی نے جوشم سے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔

"یہ جھوٹ ہے، میں فرار نہیں ہو رہا تھا۔" میں نے فوراً کہا۔

"منہ بند رکھو اپنا، اس کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے کہ تم دوست ہو ہمارے یا دشمن۔" جوشم نے اپنے مخصوص اور کڑکڑاتے لہجے میں میری طرف گھور کر کہا۔

ہوگرالی کے ساتھ اب جوشم بھی شامل ہو گیا۔ صرف دو افراد اس کے ہمراہ تھے۔ باقی باہر ہی رک گئے تھے۔ ہوگرالی نے کسی آدمی سے اپنی زبان میں کچھ کہا تھا جو ظاہر ہے میرے پلے نہیں پڑ سکا تھا، البتہ اس کے بعد اس آدمی نے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔

مجھے یہ لوگ لے کر ایک ایسے کیبن میں آگئے جہاں میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ موجود تھی، ایک خدمت گار ٹائپ آدمی بھی وہاں موجود تھا۔

میں نے اپنے چہرے پر خوف، اُلجھن اور پریشانی طاری کر لی تھی۔ میجر کیم کچھ اُلجھا ہوا اگر طیش میں نظر آرہا تھا جبکہ سونگ کے چہرے پہ کچھ زہریلے سے تاثرات تھے۔

میجر کیم نے ہوگرالی اور جوشم کے سوا باقیوں کو کیبن سے نکل جانے کا اشارہ کیا تھا۔

''یہ فرار ہو رہا تھا، میں نے اسے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دبوچ لیا۔'' ہوگرالی نے بڑے فخر سے بتایا تو میں خار کھائے لہجے میں بولا۔

''تم نے کیا مجھے اپنے کسی دشمن کے ساتھ فرار ہوتے پکڑا تھا؟ میں تو اس صورت حال سے خود گھبرایا ہوا، خوف زدہ اور پریشان تھا کہ کہاں جاؤں؟ کہ میں بھی نہ مارا جاؤں......''

میری دلیل مضبوط تھی، یہی وجہ تھی کہ میجر کیم نے جب یہی بات تصدیق طلب لہجے میں ہوگرالی سے پوچھی تو میرا خیال تھا کہ اس کے پاس اثبات میں جواب کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کیونکہ سچ بھی یہی تھا۔ لیکن اس وقت جیسے میرے پیروں تلے زمین نکل گئی جب اس بدذات نے صاف انکار کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ لڑاکا مسلم گروپ کے اُن چند مسلح افراد کے ساتھ تھا، جنہیں ہم نے فرار ہوتے وقت ہلاک کر ڈالا، لہٰذا اب اس میں کوئی شبہ باقی نہیں ہے سر! کہ یہ ان کا ہی جاسوس ہے...... اور اس نے یہ بھی ہم سے جھوٹ بولا ہے کہ یہ انڈین ہندو ہے، بلکہ یہ ایک مسلمان ہے، اس کی تصدیق کرنے کی اجازت مجھے دی جائے تو میں ابھی اس کا پول کھول کر رکھ دوں گا......''

ہوگرالی نے کہا تو میجر کیم کھلا کا چہرہ سیاہ پڑ گیا جبکہ میں نے دیکھا سونگ کھلا کے چہرے کا زہریلا پن اور گہرا ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ بھی عود کر آئی تھی، صاف لگا تھا کہ وہ بھی ہوگرالی اور جوشم کے ساتھ مجھے پھنسانے کی سازش میں ان کی شریک کار بن چکی تھی۔

ہوگرالی کا جھوٹ اپنی جگہ، مگر مجھے اس بات نے پریشان کر دیا تھا کہ میرے سلسلے میں ہندو، مسلم کی جو ''تصدیق'' کروانے کی بات اس نے جس اعتماد سے کی تھی اس پر مجھے واقعی گہری تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ یہ ''تصدیق'' منٹوں اور سیکنڈوں کی بات تھی۔ پھر یہ آشکارا ہونے کے بعد کہ میں ہندو نہیں ایک مسلم تھا تو اس ''سچ'' سے ہوگرالی کا جھوٹ سچ ہو جاتا۔ ان کی کوشش یہی تھی کہ یہ کسی طرح مجھے میجر کیم کھلا کے سامنے مجرم اور برمی مسلم لڑاکا گروپ کا جاسوس ٹھہرا کر دلیں۔

میں نے پل کے پل حالات کا تجزیہ کیا۔ ''تصدیق'' والی بات کے بعد میرا میجر کیم کے سامنے اپنی صفائی کا جواز پیش کرنا فضول ہی ہوتا۔ اس سے ہوگرالی کا جھوٹ از خود ثابت ہو جاتا۔ بات کچھ بھی رہی ہو، گھوم پھر کر ادھر ہی آجاتی تھی کہ میں بہرحال ان کا دشمن تھا۔

تب ہی میرے اندر کا کمانڈو اکا ایکی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا اور تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں اپنی موجودہ پوزیشن کو دیکھتے ہوئے میں نے بات سنبھالنے کی غرض سے میجر کیم کھلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میں نہیں جانتا کہ ہوگرالی اور جوشم کو ابتدا سے ہی مجھ پر کیوں شبہ ہوتا رہا ہے؟ اور اس کے پیچھے ان کا آخر مقصد کیا ہے؟ آج نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ہوگرالی نے میرے منہ پر سفید جھوٹ بھی بڑے دھڑلے سے بول دیا کہ اس نے مجھے مسلم لڑاکا گروپ کے ساتھ فرار ہوتے ہوئے پکڑا ہے، جبکہ میجر صاحب......! سچ وہی تھا جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ حیرت ہے، آپ اس سے یہ سوال کیوں نہیں کر رہے کہ اگر اس نے مجھے ان لوگوں کے ساتھ فرار ہوتے ہوئے پکڑا بھی تھا تو پھر ان لوگوں کے ساتھ مجھے بھی ہلاک کر دیا ہوتا، مجھے کیوں زندہ چھوڑ دیا؟''

''اس لیے کہ ہمیں یقین ہے تم ان لڑاکا مسلم گروپ کے جاسوس ہو......'' ہوگرالی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''جب سے تم ہمارے ساتھ ملے ہو، تب سے ہی مسلم لڑاکا گروپ نے ہم پر حملے شروع کر رکھے تھے۔ ورنہ انہیں کیا معلوم تھا کہ ہم رنگون سے میلوں دور یہاں انڈیمان کے کنارے ٹھکانا کیے ہوئے ہیں؟''

اس کی دلیل بے پرکی ہونے کے باوجود مضبوط نظر آتی تھی۔ کیونکہ یہ سب تب سے ہی ہونا شروع ہوا تھا جب سے میں ان کے ساتھ ملا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''بقول مس سونگ کھلا کے...... اور میری یہاں پر حاصل کردہ اپنی معلومات کے مطابق میجر صاحب کو خصوصی طور پر برمی بدھ بھکشوؤں نے برمی مسلم کمیونٹی آبادی اور مہاجروں کو برما سے بے دخل کرنے کا اسپیشل ٹاسک دے

رکھا ہے اور وہ کافی عرصے سے اس پر بڑی کامیابی سے (میں نے دل ہی دل میں اس کی کامیابی پر لعنت بھی بھیجی) عمل بھی کرتے چلے آرہے ہیں، تو یہ بات یقینی نہیں کہ میجر صاحب بھی مسلم لڑاکا گروپ کا ٹارگٹ بن چکے ہوں۔ میں اگر جاسوس ہوتا تو اس روز میجر صاحب کو کیوں ایک مسلم لڑاکا گوریلے کے قاتلانہ حملے سے اپنی جان پر کھیل کر بچاتا؟"

"ہم پر اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے...... کیونکہ بعد میں تم نے ہی محمود نامی اس گوریلے کو میری قید سے چھڑایا تھا مجھ پر دھوکے سے وار کر کے......" ہوگرالی نے فوراً توجیہہ پیش کی۔

اسی وقت لانچ حرکت میں آگئی تھی۔ ہمیں ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں آتے ہی ہوگرالی نے اپنے جس ساتھی سے کچھ کہا تھا وہ شاید لانچ کی روانگی کا ہی حکم تھا۔

بہرکیف میرے اور ہوگرالی کے درمیان گرما گرم جرح جاری تھی کہ اچانک سونگ کھلا نے اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے ہمیں اشارے سے خاموش کرا دیا اور خود اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

"تمہارے سچ اور جھوٹ کا فیصلہ ابھی ہو جاتا ہے...... کہ تم واقعی راج کمار ہو یا اور کوئی......" یہ کہنے کے بعد وہ اپنے باپ کی طرف بڑھی اور جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔

اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور پھر خود میری طرف معنی خیز مگر زہریلی مسکراہٹ سے تکتی ہوئی کیبن سے باہر نکلتی چلی گئی۔ کیبن کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں پایا تھا مگر دل میں بے چینی سی ضرور گھر کرنے لگی تھی کہ ہوگرالی نے اپنے سچ نما جھوٹ کو چھپانے کے لیے جو "شوشہ" چھوڑا تھا، وہ کوئی گل نہ کھلا دے اور وہی ہوا۔

سونگ کھلا کے کمرے سے نکلتے ہی میجر کیم کھلا نے مجھ سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "اپنی پینٹ اُتارو......"

میں دھک سے رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک غیر روایتی مگر "آک ورڈ" طریقے سے میرے سچ اور جھوٹ کو اس بے ہودہ کسوٹی پر پرکھا جائے گا مجھے اس کی توقع تو تھی، کیونکہ ہوگرالی نے شوشہ ہی یہ ایسا چھوڑا تھا۔

میں ایک دم پُرسکون ہو گیا اور میجر کیم کھلا سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میجر صاحب! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا...... میں ہندو نہیں ایک مسلمان ہی ہوں...... لیکن......"

"دبوچ لو اسے......" میرا جملہ پورا ابھی نہیں ہوا تھا کہ میجر کیم کھلا نے کرخت لہجے میں ہوگرالی کو حکم دیا اور اس نے میرے دونوں بازو پکڑ کر پیچھے کی طرف موڑ کر بظاہر مجھے بے بس کر دیا۔

میں نے میجر کیم کھلا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میجر صاحب! مسلمان ہونے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں آپ کے دشمنوں کا ساتھی ہوں؟ میں واقعی ایک انڈین ہی ہوں۔ لیکن مسلمان ہوں۔"

"تم نے پھر ہم سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟"

"اس کی ایک وجہ تھی۔"

"کیا وجہ تھی؟"

"جب مجھے آپ کی بیٹی مس سونگ نے اپنے دشمنوں کے بارے میں بتایا تھا تو میں ڈر گیا تھا کہ کہیں آپ لوگ بھی مجھے اپنا دشمن نہ سمجھ بیٹھیں...... حالانکہ میرا برما سے تعلق نہیں......"

مجھے مجبوراً محتاط رہتے ہوئے یہ کہنا پڑ گیا تھا، تاکہ میری گلوخلاصی کی کچھ صورت نکل سکے۔ کیونکہ متعصب برمیوں کو صرف برما کے مہاجر مسلمانوں سے نفرت تھی، وہ انہیں بے دخل کرنا چاہتے تھے جبکہ میں نے اپنا تعلق بھارت سے جوڑا تھا۔

"بات تب بھی ایک ہی ہے۔" اس بار ہوگرالی زہرخند لہجے میں بولا۔ "جب تمہیں یہ پتا چلا کہ محمود ایک مسلمان ہے تو تمہیں سخت پچھتاوا ہوا کہ تم نے نادانستگی میں اپنے ہی ایک مسلمان بھائی کو پکڑوا دیا اور پھر بعد میں تم نے ہی اسے نقاب پہن کر میری گرفت سے آزاد بھی کروا دیا......" یہ کہتے ہوئے وہ میجر کیم کھلا سے بولا۔

"سر! میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، اُس روز اسی نے ہی اپنے چہرے پر نقاب چڑھا کر قیدی محمود الحسن کو آزاد کروایا تھا کیونکہ مسلم لڑاکا گروپ کبھی بھی اپنے چہرے پر نقاب نہیں لگاتے۔ کیونکہ وہ ظاہر ہوتے ہیں، وہ اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں آج یہ اتنا بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ کیونکہ محمود کو اس کی مدد سے آزادی ملتے ہی اُسے اپنے لڑاکا گروپ کو حملے کے لیے تیاری کا موقع ملا...... اگر اب بھی میری بات پر شبہ ہے تو میں ایک آخری ثبوت پیش کرنے کو تیار ہوں......"

ہوگرالی کی اس آخری بات پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بدبخت مردود مجھے ہر قیمت پر آشکارا کرنے اور میجر

کیم کھلا کی نظروں میں ایک سنگین مجرم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس نے بہ آواز بلند کسی کو بلایا۔ ایک ساتھی فوراً اندر آگیا۔ ذرا دیر میں سونگ بھی اندر آگئی۔ اس وقت اس کا حسین چہرہ مجھے ایک زہریلی ناگن کی صورت نظر آرہا تھا، وہ کہیں دور نہیں گئی تھی، شاید دروازے کے قریب ہی کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی۔

میرے اور سونگ کھلا کے تعلقات میں اسی روز سے ہی گرہ پڑ گئی تھی جب میں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اسے اس کے باپ کا مکروہ چہرہ دکھایا تھا۔ اگر اس کا دل بھی بے گناہ انسانوں کے حوالے سے ہی سہی، میری بات کی حمایت کرتا تو میرے لیے بھی یہ سوشیلا اور رینا کی طرح قابل احترام ٹھہرتی، مگر اس کے برعکس اسے اپنے باپ کی بربریت پر کوئی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی اور اُلٹا وہ مجھ سے خائف اور بددل ہونے لگی تھی۔ پھر مجھے بھی اس کی پروا نہیں رہی تھی۔ نہ ہی مجھے اس کی کسی مدد کی ضرورت رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں رہتے ہوئے مجھے اب تک بہت سی باتوں کا اندازہ ہو چکا تھا کہ میری منزل کتنی قریب تھی، یہ شکر ہی تھا کہ ابھی میں انڈیمان میں ہی تھا۔

تاہم میں بے چین ہو گیا تھا کہ نجانے اب ہوگرالی تابوت میں کون سی آخری کیل ٹھونکنے والا تھا؟

ہوگرالی نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ ایک رسن بستہ شخص کو دبوچے وہاں آن پہنچا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک درمیانے قدوقامت اور سانولے رنگ کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر کہیں سے بھی خوف اور ڈر کا شائبہ تک نہیں تھا، اس کے برعکس اس کی آنکھوں میں مجھے ایک عزم اور سرکشی کا طوفان سا کروٹیں لیتا محسوس ہوا۔

”سر! دشمن کا ایک آدمی ہماری گرفت میں آچکا تھا۔ یہ ان کے لیڈر محمود الحسن کا ایک قریبی ساتھی ہے۔ عزیز نام ہے اس کا۔ میں نے اسے پوچھ گچھ کے لیے ابھی تک زندہ چھوڑ رکھا تھا، مگر یہ بھی ان کی طرح پتھر ہے، کچھ نہیں بتا رہا، یہ اب یہاں کام آجائے گا اور اس بات کا بھی پتا چل جائے گا کہ اس کا (میرا) دل اپنے اس مسلمان بھائی کے لیے کتنا دھڑکتا ہے۔ آپ میرا اشارہ سمجھ گئے ہیں۔“

ہوگرالی نے میجر کیم سے کہا اور آخر میں اس کے لہجے سے بڑی سفاکیت آمیز سی لیزی جھلکنے لگی تھی۔ مجھے بھی وقوع پذیر ہونے والی ایک لمحہ ان قیامت کا اندازہ ہو چلا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ برمی مسلم قیدی اب میری جانب اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ یہ سارا کھیل ابھی شاید پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

میجر کیم کھلا کے مکروہ چہرے پر بڑی بے رحمانہ مسکراہٹ ابھری جیسے اس نے ہوگرالی کی بات پر پورا پورا صاد کیا ہو۔ وہ اُٹھا اور ایک قریبی میز کی دراز سے سیاہ رنگ کا پستول نکال لیا۔ اس کے بعد چند قدموں کے فاصلے پر ٹھہر کر اس نے پستول کی نال کا رخ اس بدنصیب قیدی کے سینے کی طرف کر دیا۔ قیدی نے اپنی یقینی موت کو سامنے دیکھ کر بھی میجر کیم کھلا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھی تھیں۔

”ٹھہر جاؤ میجر صاحب!“ میں نے یکدم چلّا کر کہا۔ ہوگرالی کے چہرے پر ایکا ایکی فاتحانہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ جوشم بھی کب کا اندر آچکا تھا۔ اس کے مکروہ ہونٹوں پر بھی شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی جبکہ میجر کیم کھلا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ قیدی کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ میجر کیم کھلا کی اُنگلی پستول کے ٹریگر پر تھرکنے لگی تھی۔

”میں کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرا ہوں میجر صاحب! اسی لیے کوئی بھی انسان ہو خواہ کسی مذہب سے بھی تعلق رکھتا ہو، میری طرح ایک عام انسان یہ اندوہناک منظر دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔“

”ڈز…… ڈز……“

میری بات پوری ہوئی تھی کہ کیبن کی دم بہ خود فضا میں دو فائر ہوئے اور اس بدنصیب برمی قیدی کے سینے میں دو سرخ روشندان بن گئے۔ جہاں سے خون اُبل پڑا تھا، وہ کھڑے کھڑے تیورا کر کیبن کے فرش پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

یکلخت میرے اندر سناٹے اُترتے چلے گئے، ایسے سناٹے، جن کی دھڑکتی خاموشی کے پیچھے نجانے کتنے طوفان چھپے ہوتے ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے ایسی ننگی بربریت مجھے ہمیشہ ہتھے سے اُکھاڑنے کا باعث بنتی تھی اور پھر یہ تو معاملہ ایک مسلمان کا متعصب برمی کے ہاتھوں بیدردی سے ہلاک ہونے کا تھا۔ یہ مجھے جانتے نہیں تھے کہ میں اصل میں کون تھا اور کیا تھا۔ کتنی قیامتیں ہر وقت میرے اندر کروٹیں بدلتی رہتی تھیں۔ کتنے طوفانوں سے میں اب تک گزرتا رہا تھا اور خود کو سورما سمجھنے والے نجانے کتنوں کو میں فنا کے گھاٹ کے اُتار چکا تھا۔

پل کے پل میں نے پیش نظر ماحول کا جائزہ لیا۔

وہاں میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی کے علاوہ ہوگرالی اور جوشم بھی موجود تھے، ایک ان کا ساتھی اور بھی تھا۔

تب پھر ایکا ایکی جیسے میرے وجود میں پارا دوڑ گیا، اندازِ برق کی طرح میں متحرک ہوا تھا اور ہوگرالی کے پیٹ پر میری زوردار لات پڑی۔ یہ حملہ اس کے لیے اچانک اور کاری ثابت ہوا، وہ اپنے حلق سے ایک بھیانک چیخ خارج کرتا ہوا کیبن کی دیوار سے جا ٹکرایا، میجر کیم کے ہاتھ میں پستول تھا، اس کا رخ اس نے میری جانب موڑنا چاہا تھا کہ میں ماہیِ بے آب کی طرح مچلا اور اپنے وجود کو اس طرح سوئپ کیا کہ میں اس کے پستول سے کیے جانے والے متوقع فائر سے بھی بچ سکوں اور اسے رگیدتا بھی چلا جاؤں۔

گولی چلی اور کیبن کی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ دوسرا فائر داغنے کے لیے اس نے پوزیشن بدلنا چاہی تھی کہ میری قینچی کی طرح چلتی ہوئی ٹانگیں، اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائیں، نتیجتاً وہ کیبن کے فرش سے چند انچ اُچھلا اور جب دھڑام سے نیچے آرہا تو اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا۔

جوشم نے حلق سے 'مسٹری ہوشیار باش'' جیسی کوئی آواز خارج کی تھی کہ وہاں موجود اس کے ساتھی نے بہ سرعت حرکت کی اور وہ میری جانب لپکا۔ میں تب تک میجر کیم کھلا کے ہاتھ سے گرا ہوا پستول اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔

پہلی گولی میں نے اسی پر چلائی تھی اور وہ اپنے سرخ پڑتے سینے پر ہاتھ رکھتا ہوا کربہ انگیز چیخ کے ساتھ نیچے آرہا تو میرا دوسرا نشانہ میجر کیم کھلا تھا۔

میجر کیم کھلا کو ہلاک کرنے کا مشن صرف میرا ہی نہیں، محمود اور برما کے ان تمام خانماں برباد مظلوم مسلمانوں کا بھی تھا، جس پر اس خبیث نے زمین تنگ کر رکھی تھی۔ جس کے بدلے میں وہ وہاں کے متعصب بدھ بھکشوؤں سے مال و مراعات حاصل کرتا رہا تھا۔

میرے دوسرے فائر نے میجر کیم کھلا کی پیشانی میں سرخ روشندان بنا دیا۔ وہ بے رحم خبیث بغیر کوئی آواز نکالے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

سونگ کھلا جو اَب تک تیزی سے بدلتی اس صورت حال پر ہک دک کھڑی تھی، اپنے باپ کو واصلِ جہنم ہوتے دیکھا تو اس کا جیسے سکتہ ٹوٹا اور اس نے اپنے حلق سے ایک تیز تھراتی ہوئی چیخ خارج کی۔

ہوگرالی تو میری ایک ہی لات کھا کر دیوار سے ٹکرانے کے بعد ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ میں سب سے پہلے کسی شکاری باز کی طرح سونگ کھلا پر جھپٹا اور اسے کسی کمزور چڑیا کی طرح دبوچ لیا۔ اس کی حسین و دلکش آنکھوں میں خوف کی پھریریاں سی لہرانے لگی تھیں، اس کے لیے میرا یہ جارحانہ اور جنگجوانہ روپ نیا تھا۔

میرا یہ مرحلہ وار گوریلا ایکشن جیسے ہی اپنے منطقی انجام کو پہنچا، میری توقع کے عین مطابق کیبن کے دروازے سے دو تین مسلح بری دھڑدھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

''خبردار......! کسی نے ذرا بھی غلط حرکت کی تو یہ جان سے جائے گی۔'' میں بھیانک لہجے میں غرا کر بولا۔

میں نے تب تک سونگ کھلا کو دبوچ کر اس کی کنپٹی سے پستول کی نال لگا دی تھی۔ وہ سب میرا یہ خونیں روپ دیکھ چکے تھے۔ اب جو سونگ کھلا کو اس حال میں دیکھا تو اپنی جگہ جہاں کے تہاں ٹھہر گئے۔

جوشم تو جیسے دم بہ خود ہی ہو کر رہ گیا تھا جبکہ ہوگرالی قدرے سنبھلنے کے بعد دیوار کے ساتھ ہی پشت لگائے کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک پیٹ پر تھا۔ چہرے سے غیظ ناکی کے علاوہ تکلیف کے آثار بھی تھے۔

''اِسے چھوڑ دو......تم یہاں سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔'' وہ مجھے خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے غرایا۔ میں نے اس کی طرف باز جیسی تیکھی نظروں سے دیکھا اور میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

''ہوگرالی......! ہمارا اور تمہارا قصہ اِدھر ہی ختم ہوسکتا ہے، اگر مجھے یہاں سے مزید کوئی خون خرابا کیے بغیر نکل جانے دیا جائے......'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہ صورت دیگر اس جنگ کو بڑھانا چاہتے ہو تو اپنا شوق پورا کرلو......اپنے بچاؤ کے لیے میں یہاں، مس سونگ کھلا سمیت لاشیں گرانے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاؤں گا......''

میرے لہجے کی سفاکی اور جوشِ جنوں خیزی نے ان پر خاطر خواہ اثر ڈالا اور سونگ کھلا ہی کے منہ سے لرزیدہ سی آواز برآمد ہوئی۔ وہ خوف اور تحکمانہ انداز کے ملے جلے لب و لہجے میں بولی۔

''اِسے نکل جانے دیا جائے......تم سب اپنے ہتھیار ڈال دو......جلدی۔''

ہوگرالی نے اب اپنے مضروب پیٹ سے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ میری جانب گھور کر دیکھتے ہوئے وہاں موجود اپنے مسلح ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔ ''ہتھیار پھینک دو...... اور اِسے جانے دیا جائے۔''

ساتھیوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل چاہتے ہوئے جب

اپنے ہتھیار جھک کر فرش پر ڈالنے چاہے تو قریب کھڑے ادھیڑ عمر جوشم نے چلا کر کہا۔ ”کوئی بھی اپنے ہتھیار نہیں پھینکے گا......“

ہتھیار زمین پر ڈالنے والے اس کی آواز پر رک گئے۔ ہوگرالی اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف تکنے لگا جبکہ سونگ کھلا کے چہرے پر برہمی کے تاثرات ابھرے تھے۔

”یہ یہاں سے ہرگز نہیں جائے گا......“ وہ آگے بولا۔ ”یہ ان مسلم لڑاکا گروپ کا خطرناک جاسوس ہے اور اس نے ہمیں اور ہمارے مشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ یہ مس سونگ کھلا کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا اور اسے بھی مار کر بھاگ جائے گا۔ ہم ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔“

میں اس کی بات پر اندر سے ذرا پریشان سا ہوا تھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو، جوشم! ہوش میں تو ہو......؟“ ہوگرالی نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے حیرت سے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے یہ مس سونگ کھلا کو ہلاک کر ڈالے؟“

”ہم نے میجر صاحب کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا ہے تو مس سونگ کھلا کا صدمہ بھی ہمیں برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ یہاں سے نہیں جائے گا۔“

میں نے دیکھا اس کی بات پر ہوگرالی کے مکروہ چہرے پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

”یہ کیا بکواس کر رہے تم؟“ معاً ہی سونگ کھلا لرزتی ہوئی آواز میں غصے سے بولی۔

”جوشم بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے، مس سونگ!“ ہوگرالی نے اچانک بدلے ہوئے اور مکروہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ تمہاری ہی غلطی تھی کہ تم نے اس اجنبی پر بھروسا کیا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود اس کے ساتھ تم نے راہ و رسم اور محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش بھی کی...... یہ سارا تمہارا ہی کیا دھرا ہے، مگر ہم دشمنوں کے اس خطرناک جاسوس کو زندہ یہاں سے ہرگز نہیں جانے دیں گے، تم اب اپنی اس غلطی کی سزا بھی خود ہی بھگتو......“

میرے اندر لمحہ بھر کو ہول سا اُٹھا تھا۔ شاید میجر کیم کھلا کی موت کے بعد ان کی نظروں میں سونگ کھلا کی کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔

جوشم جو مجھے خالصتاً متعصب بدھ بھکشوؤں کے روپ میں ہی نظر آرہا تھا، اس نے بڑی چالاکی سے اس نازک صورتِ حال میں سونگ کھلا کی حیثیت کو ”مائنس“ کر دیا تھا۔

سونگ کھلا کا غصہ اور برہمی سب فرو ہونے لگا تھا اور اب اس کے حسین چہرے پر موت کی زردی پھیلنے لگی تھی۔ میں خود اس کایا پلٹتی صورتِ حال پر اس قدر تشویش آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا تھا کہ اپنی اس کیفیات کو چھپا نہ سکا تھا جو شکنوں کی صورت میں میری فراخ پیشانی پر نمودار ہونے لگی تھیں۔ کچھ بھی سہی، میں نے سونگ کھلا کو ایسا کوئی جرم کرتے نہیں دیکھا تھا جس کی وجہ سے میں اسے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتا اور پھر یہ میری اپنی فطرت کے خلاف بھی تھا کہ میں ایک عورت ذات کو یوں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار ڈالتا۔

یہ حالات اور ہی نہج پر آنے لگے تھے جبکہ وہ اب میری جانب رحم طلب نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔ ان خوبصورت اور کشادہ آنکھوں میں ایک گلہ بھی تھا، جس کے اظہار پر اس کی تصویر یوں بنتی تھی کہ وہ مجھ سے جیسے کہہ رہی ہو......

”راج......! میں نے تمہیں ان سب لوگوں میں اس وقت پسند کیا تھا جب یہ سب تمہیں ناپسند کرتے تھے اور تمہیں اپنا دشمن سمجھتے تھے، مگر میں نے انہیں تمہارے خلاف ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھانے دیا تھا جس سے تمہاری ذات کو نقصان پہنچتا، درمیان کی غلط فہمی اور بات تھی، مگر اب...... میری زندگی تمہارے ہاتھ میں اور داؤ پر لگی ہوئی ہے تو کیا میں یہ سمجھوں کہ میں نے تمہیں، کالے زہریلے بچھوؤں سے بچا کر اپنی موت کے پروانے پر دستک دی تھی......؟

دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں اور خیال بھی کلک ہوا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ مکار جوشم کی کوئی چال ہو۔ یہ دیکھنے کی غرض سے میں نے بدستور اسی سفاکی سے جوشم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی کہو، مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گا...... مجھے راستہ دو......“

اسی وقت جوشم نے قریب کھڑے اپنے آدمی کی گن پر جھپٹا مارا اور اس کا رخ ہماری طرف کر دیا۔

سونگ کھلا کو میں نے ڈھال بنا رکھا تھا اور وہ جوشم کی گن کے نشانے پر تھی۔ اس کا نرم و گداز سا نازک بدن میری باز جیسی گرفت میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہا تھا کہ اچانک جوشم نے گن لے کر ہماری طرف برسٹ فائر کر دیا۔

☆☆☆

جوشم کا نشانہ سونگ کھلا سمیت میں ہی تھا جبکہ میں نے

پوری یکسوئی اپنی باز جیسی آنکھوں میں سمیٹ لی تھی جو اس کی ایک ذرا جنبش پر مرتکز تھی۔ جیسے ہی میں نے ٹریگر پر اس کی انگلی کو حرکت کرتے دیکھا، سونگ کھلا سمیت میں نے خود کو ایک طرف گرا دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ کیبن کی دیواروں تک کو چھید گئی۔ گرتے ہی میں نے سونگ کھلا کو سنبھالا اور اپنے پستول پر گرفت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سے جوشم کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔

میں فقط اس مردود بھکشو کی چیخ ہی سن سکا تھا کیونکہ میں دروازے کی چوکھٹ کے قریب ہی گرا تھا اور جوشم پر فائر کرتے ہی میں نے سونگ کھلا سمیت لڑھکنی لگا دی تھی۔

یہاں سونگ نے ایک عجیب حرکت کی اور میرے چہرے پر ایک لات رسید کر کے خود کو میری گرفت سے چھڑا کر ایک طرف کو بھاگی، اور پھر نجانے کیا سوچ کر میں بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

عقب میں چیخنے چلّانے کا شور سا ابھرا۔ مگر ہم آگے پیچھے دوڑتے ہی رہے اور تب ہی میں نے سونگ کھلا کو عرشے کی ریلنگ سے نیچے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ میں دوڑتا ہوا قریب پہنچا اور ریلنگ سے لگ کر نیچے جھانکا۔ وہاں دنبالے کے ساتھ ایک چھوٹی موٹر بوٹ نتھی تھی۔

غالباً یہ وہی موٹر بوٹ تھی جس پر ہوگرالی وغیرہ مجھے سوار کرا کر گودی سے اس لانچ تک یرغمال بنا کر لائے تھے۔

میں نے دیکھا، سونگ کھلا اب اس کے بونٹ پر گری ہوئی تھی مگر اس نے پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ایک لیور کھینچ کر بوٹ کو دنبالے سے الگ کر دیا۔

پل کے پل میں اس کا مقصد سمجھ گیا اور اسی وقت عقب میں برسٹ چلنے کی آواز ابھری، میں نیچے جھک گیا اور دوسری جانب سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

سمندری رات جوبن پر تھی۔ آسمان پر ہنوز کالے بادلوں کا بسیرا محسوس ہوتا تھا کیونکہ ستارے کہیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نہ ہی دور کہیں جھکے چاند کی روشنی بھی محسوس ہوتی تھی۔ میں شور زدہ اور بپھرے ہوئے سمندر میں تیرتا ہوا موٹر بوٹ کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ سونگ کھلا نے اس کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو رہی تھی۔ اب شاید اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں بچا تھا اس کے سوا...... مگر مجھے اپنے بیچ منجدھار میں پھنسنے کی فکر ہوئی جو میرے لیے کسی لحاظ سے بھی خطرے سے خالی نہ تھی۔

موٹر بوٹ نے ایک گردشی موڑ کاٹا اور وہ میرے قریب سے طوفانی رفتار کی طرح گزری تو اس کے پیچھے جانے کس طرح کھلی رہ جانے والی موٹی رسی میرے ہاتھوں میں آ گئی جسے میں نے فوراً مضبوطی سے پکڑ لیا۔

بوٹ لحظہ بہ لحظہ لانچ سے دور ہوتی چلی گئی مگر میں پانیوں میں غوطے کھانے لگا۔ میں صرف رسی کو تھامے ہی رکھ سکتا تھا، آگے نہیں بڑھ سکتا تھا کہ بوٹ تک پہنچ کر اس میں سوار ہونے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ موٹر بوٹ کی رفتار اور دوسرے پانی کے دباؤ سے مجھے اپنا وجود ہی سنبھالے رکھنا مشکل نظر آ رہا تھا۔

تاہم میں نے رسی کو بدستور تھامے رکھا تھا۔ بوٹ سے اس کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ لیکن مجھے اس خطرے کا بھی احساس تھا کہ اگر میں نے جلد ہی کوئی ایسی کوشش نہ کی تو میں زیادہ دیر جم نہ پاؤں گا اور رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ جائے گی، تب میں نے اللہ کا نام لیا اور اپنی سی کوشش کرتے ہوئے رسی سے بوٹ تک کا اپنا فاصلہ کم کرنے لگا، رفتار کم سہی مگر بڑھوتری کی جانب تو مائل تھی۔

اس کوشش میں میرے بازو شل ہو گئے تھے، سانسیں پھولنے کی وجہ سے غوطے بھی لگ رہے تھے، بڑا مشقت طلب کام تھا یہ، مگر میں نے بھی ہمت نہیں ہاری، میں نے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیا تھا کہ میں بوٹ تک اسی طرح پہنچ کر رہوں گا کیونکہ اس کے علاوہ میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا، رسی چھوٹ جاتی تو گہرے پانیوں کا یہ ہلکورے لیتا ہول ناک ویرانہ میرا مقدر ہوتا۔

بالآخر ہمت اور حوصلے کے ساتھ میں بوٹ کے دنبالے تک پہنچ ہی گیا مگر تب تک میری رہی سہی ہمت بھی جواب دینے لگی تھی۔ کوئی پل جاتا تھا کہ رسی میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی کہ میں نے اپنے شل زدہ وجود کی آخری کوشش کرتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ دنبالے کی عقبی دیوار پر ابھرے ہوئے ایک آہنی کنڈے سے ٹکرا دیا اور اسے دبوچ لیا۔ کچھ دیر ستایا اور اس کے بعد میں دنبالے پر چڑھ کر اندر جا گرا۔

میرے اعصاب شل ہو چکے تھے، پورے بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ سانسیں بری طرح پھولی ہوئی تھیں، میں تھوڑی دیر تک اسی طرح نڈھال اور بے سدھ سا پڑا رہا۔ تاآنکہ میرے اعصاب پُرسکون اور بے ترتیب سانسیں بحال نہ ہو گئیں۔

اس کے بعد میں ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھا اور

وہاں میں نے شیشے کی ونڈ اسکرین کے پیچھے سونگ کھلا کو وہیل سنبھالے ہوئے پایا۔ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں، غالباً اسے میرے اس طرح بوٹ میں سوار ہونے کی بالکل اُمید نہ رہی تھی۔

میں اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے اس اوپن ڈرائیونگ کیبن میں آیا تو سونگ کھلا وہیل چھوڑ کر مجھ پر کسی جنگلی بلی کی طرح جھپٹی۔

”تم......تم......خونی! ظالم! بے رحم! تم نے میرے پاپا کو بے رحمی سے مار ڈالا...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخنے چلّانے لگی اور اس نے اپنے نکیلے ناخنوں سے میرے چہرے پر کھرونچے ڈالنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو قابو کیا اور غصے سے دانت پیس کر بولا۔

”اپنے پاپا کے لیے تم کیا کہو گی؟ جس نے اتنے سارے بے گناہ اور مظلوم مسلم خاندانوں کو بے گھر کیا اور اُن کا خون بہایا۔ اُس بدنصیب قیدی کے بارے میں کیا کہو گی تم، جسے تمہارے پاپا نے ہم سب کے سامنے چشم زدن میں گولی مار کے ہلاک کر ڈالا......“

”وہ مجرم تھے۔“ وہ نفرت سے اپنے دونوں ہاتھ جھٹک کر میری گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

”کیا جرم کیا تھا اُنہوں نے؟“ میں نے تیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اُنہوں نے ہم پر کئی بار قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ ایک بار رنگون میں ہماری رہائش گاہ پر بم پھینکا تھا اور آج ہمیں تباہ و برباد کر ڈالا اُنہوں نے......اور اس بار وہ صرف تمہاری وجہ سے کامیاب ہوئے۔“ وہ نفرت سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

”اچھا!“ میں نے طنزیہ کہا۔ ”تم بھولی ہو یا مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہو؟ کبھی تالی ایک ہاتھ سے بجی ہے؟ مجھے ایک سوال کا جواب دو صرف...... وہ لوگ تمہارے دشمن کیوں بنے؟ مجھے پہلے اس سوال کا جواب دو؟“

وہ میری بات پر لاجواب سی ہو گئی اور منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے زہر خند لہجے میں اس سے کہا۔

”مس سونگ کھلا! دنیا کا کوئی بھی مذہب کسی بے گناہ پر ظلم کرنے کا درس نہیں دیتا ہے مگر تم لوگ شاید یہ درس فراموش کر بیٹھے ہو۔ کیا بگاڑا تھا تم لوگوں کا اُن معصوم اور بے گناہ برمی مسلمانوں نے؟ تم لوگوں نے جن کا آرام و سکون غارت کر دیا اور اُنہیں نہ صرف اپنی سرزمین سے بے دخل کر دیا بلکہ ان کی املاک اور جائدادوں کو آگ لگا دی، بے رحمی اور بے دردی سے ان کا قتلِ عام کیا۔ وہ اس وار کو بھولیں گے کبھی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ تمہارے پاپا کے مرتے ہی تمہارے اپنے لوگ، جن کی حیثیت تمہارے ملازموں کی سی تھی، تمہارے ہی جان کے دشمن بن گئے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ وہ تمہیں اب بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا اور پھر وہ وہیل کے سامنے والی ایک چھوٹی سی دیوار گیر بینچ پر بیٹھ گئی اور گومگو سے لہجے میں بولی۔ ”کچھ بھی سہی، تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میں تمہیں پسند کرتی تھی۔ مگر تم ان کے جاسوس نکلے۔“

”میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا، مس سونگ کھلا!“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ”رہا سوال تمہاری پسند و ناپسند کا وہ تمہارا اپنا ذاتی فعل تھا، میں ایسا کچھ نہیں سمجھتا تھا، نہ ہی اب سمجھتا ہوں مگر میں تمہارے اس الزام کو رد کرتا ہوں کہ میں تمہارے دشمنوں کا جاسوس تھا۔“

”تو پھر تم کون ہو؟ اور نارتھ انڈیمان کے اس کالے بچھوؤں والے صحرا میں کیا کر رہے تھے؟“

”میں اپنے ساتھیوں کو ایک وحشی قبیلے کی قید سے چھڑانے کے لیے نکلا تھا۔“ میں نے جواب دیا اور پھر اس سے گفتگو کا سلسلہ موقوف کرنے کی غرض سے کمپاس کی طرف آیا۔

بوٹ کا رخ رنگون کی طرف تھا۔ میں نے اس کا رخ نارتھ انڈیمان کی طرف موڑنا چاہا تو سونگ کھلا ایک بار پھر جنگلی بلی کی طرح غرا کر میری طرف لپکی۔

”تم نے بوٹ کا رخ کیوں بدل ڈالا؟ میں اپنے شہر رنگون لوٹ رہی تھی۔“

”تم چاہے جہنم میں جاؤ، مگر پہلے مجھے میری منزل پر اُتارو گی۔“ میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”اس میں اتنا فیول نہیں ہے کہ تمہیں نارتھ انڈیمان کے ساحل پر اُتارنے کے بعد میں رنگون کا رخ کر سکوں۔“ وہ غصے سے بولی۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

وہ شکست خوردہ ہی نہیں زخمی بھی محسوس ہوا مجھے۔ اس کی حالت بڑی [illegible] ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے اسی وقت بوٹ سے نیچے دھکا دے ڈالے۔

"میں چیک کرتا ہوں فیول، مگر تم بوٹ کا رخ نہیں بدلو گی۔" میں نے اس کی طرف سخت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔

سونگ کا جھوٹ کھل گیا۔ فیول کافی تھا۔ میں ابھی ڈائلز پر ہی جھکا ہوا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے پلٹا ہی تھا کہ میں نے کسی کو ایک آہنی سریے سے خود پر وار کرتے پایا۔ بس، وہ ایک جھلک ہی تھی، میں اپنا سر ہی بچا سکا تھا ورنہ اس موٹے سریے کی ایک ضرب میرا مغز کھول دینے کے لیے شاید کافی تھی، سریا میرے دائیں کاندھے پر لگا اور مجھے اپنے شولڈر کی ہڈی چٹختی ہوئی محسوس ہوئی۔ شدت تکلیف سے میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی تھی۔

مجھ پر اس طرح حملہ کرنے والی سونگ کھلا ہی تھی۔ ابھی میں سنبھل ہی رہا تھا کہ اس نے دوبارہ ہسٹریائی چیخ خارج کرتے ہوئے مجھ پر سریا چلانے کی کوشش چاہی تو تب تک میرا اپنا دماغ گھوم چکا تھا، میں نے ایک زوردار گھونسا اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ کسی بلبلائی ہوئی لومڑی کی طرح چیخ کر اُچھلی اور اوپن ہڈ والے ڈرائیونگ کیبن کے مختصر قدمچوں پر آڑی ترچھی ہو کر جا پڑی اور بے حس و حرکت ہوگئی۔ میں نے اسے اسی طرح ہی پڑے رہنے دیا اور دوبارہ ڈیش بورڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

سونگ کھلا مجھے پسند کرنے کا دعویٰ رکھتی تھی۔ پسند میں محبت کا دخل بھی رہتا ہے۔ یہ سب محض اس کی ڈھکوسلے بازی ہی تھی۔ اس کے اندر کی کالی نیت کا مجھے تو اسی وقت ہی اندازہ ہوگیا تھا جب وہ مجھ سے نرم خوئی سے گفتگو کر رہی تھی اور میں نے موقع محل جان کر اس سے ان کے دشمنوں کے بارے میں پوچھا تھا اور جب اس نے مجھے ان کی "حقیقت" بتائی تھی تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اصل دشمن برمی مسلم لڑاکا گروپ نہیں بلکہ یہ لوگ تھے۔ اس پر جب میں نے ذرا کھل کر سونگ کھلا سے بات کی تو اس کا رویہ ایک دم چینج ہوگیا تھا جو پھر "ریورس" نہ ہو سکا تھا اور مسلسل میرے ساتھ زہریلا ہی رہا تھا۔

مجھے تو یوں بھی اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ تھی، فقط اس حد تک کہ اس نے میری جان بچائی تھی اور اب میں نے بھی اس کے اپنے ہی لوگوں سے جان بچا کر حساب بے باق کر دیا تھا، تو میں نے اس سے تعلق ختم کر دیا تھا۔ اپنی منزل پر پہنچ کر میں اسے رنگون کی طرف بہ سلامت روانہ کر دینے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔

میری منزل زیادہ دور نہیں تھی۔ کمپاس کا جائزہ لینے کے علاوہ بھی ابتدائی ملاقات میں سونگ کھلا نے مجھے انڈیمان کا محلِ وقوع سمجھا دیا تھا۔ کوئی اسی رفتار سے روانگی پر اب یہاں سے بہ مشکل پندرہ بیس ناٹیکل میل کا فاصلہ پچیس سے تیس منٹ میں طے ہو سکتا تھا۔

میں نے وہیل کو ایک جگہ پر ایڈجسٹ کیا اور مختصر سے عرشے پر آ گیا۔ یہ سمندری رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ مطلع ابھی تک ابر آلود تھا۔ جس کے باعث چہار اطراف گھور تاریکی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آسمان بھی سیاہ اور تاریک تھا۔ جسے دیکھ کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس پر کالے بادلوں کا راج تھا۔ کہیں کہیں دور تاریک اُفق کے ہولناک ویران سناٹوں میں بجلی چمکتی ہوئی عجیب سا منظر پیش کرتی تھی۔ ہوا چل رہی تھی، اس میں خنکی کے ساتھ اب سردی کی کاٹ بھی شامل ہونے لگی تھی۔

مجھے بھوک کا احساس ہوا، مگر بوٹ میں کھانے پینے کا سامان ناپید ہی تھا۔ ایک چھوٹا پانی کا مشکیزہ ضرور پڑا نظر آیا، مگر اس میں بھی آدھا ہی پانی تھا۔ میں نے اس میں سے چند گھونٹ بھرے۔ اس کے علاوہ مجھے غوطہ خوری کا مختصر سا سامان بھی نظر آیا تھا، جو میرے لیے شاید بیکار ہی تھا۔

خیالات کی رو میں مجھے اچانک ہی یاد آیا کہ میں نے آنسہ خالدہ سے بات کرنا چاہی تھی مگر اس کے سیل فون پر مجھے کسی اور خاتون کی آواز سنائی دی تھی جو میرے لیے اجنبی تھی اور میں اس بات پر بری طرح چونکا تھا۔

حالات ہی اس طرح تواتر کے ساتھ پیش آتے چلے گئے تھے کہ میں اس پر توجہ نہیں دے سکا تھا اور نہ ہی اس بارے میں زیادہ سوچ پایا تھا کہ آخر آنسہ خالدہ کے سیل پر اس کے بجائے کسی اور اجنبی عورت کی آواز کیوں ابھری تھی؟

اچانک فضا میں عجیب سی آواز ابھری......
"قیں...... کلغ...... قیں......"

کوئی سی ایگل پھڑپھڑاتا ہوا قریب سے گزرا تھا۔ پتا نہیں یہ منہ اندھیرے کس شکار کی تلاش میں نکلا تھا، بہرحال اس نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑا تو مجھے سونگ کھلا کی طرف متوجہ ہونا پڑا، جو میرا ایک ہی گھونسا کھا کر ابھی تک بے سدھ سی پڑی تھی۔

میرے دائیں شانے میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔ میں نے دونوں بازوؤں کو دائیں بائیں اور اُوپر نیچے کرتے ہوئے وارم اپ کیا اور سونگ کھلا کی طرف بڑھا تو چونک

پڑا۔

اس کے چہرے سے خون بہہ بہہ کر کیبن کے قدمچوں پر پھیل سا گیا تھا۔ خون اس کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ میری پیشانی پر تشویش آمیز پریشانی کی شکنیں نمودار ہوگئیں۔

میں نے اسے فوراً سنبھالا اور اس کا چہرہ صاف کیا۔ خون بہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سپید ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ ہوش میں آئی اور کھانسنے لگی، جس کے ساتھ اس کے منہ سے بھی خون نکلا، میں نے پانی کا مشکیزہ اس کے منہ سے لگایا، اس نے کلی کی اور سارا پانی غٹاغٹ پی گئی۔

میں نے اسے وہیں قدمچے پر ہی ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور قریب پڑا وہ آہنی سریا اُٹھا کر سمندر میں اچھال دیا۔

بوٹ مناسب رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔ سونگ کھلا نے اپنا خون دیکھا تو اس پر ایک بار پھر ہسٹریائی سا دورہ پڑھا۔ مگر اس بار اس نے کوئی جارحانہ حرکت نہ کی اور مجھے، وحشی، جانگلی، بولنے لگی۔

میں اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی نوٹس لیے بغیر کیاس کا جائزہ لیتا رہا۔ میری منزل لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ مگر شاید تاریکی کی وجہ سے ساحل کی پٹی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے احتیاطاً موٹر بوٹ کی رفتار ہلکی کردی تھی۔ اس کے بعد وہیں کھڑے کھڑے گردن موڑ کر سونگ کھلا سے بولا۔

''میری منزل قریب آچکی ہے۔ میں ساحل پر اُتر جاؤں گا اور تم فوراً یہاں سے روانہ ہوجانا......''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ میں نے بھی اس کی کوئی پروا نہ کی اور اس طرف اپنی نظریں جمادیں جدھر میری منزل کا ساحل تھا۔ اچانک میں بری طرح ٹھٹکا اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے بوٹ کی لائٹیں بجھادیں۔

مجھے مذکورہ سمت روشنی سی نظر آئی تھی۔ کلی منجارو کے اس گوشہ ویران ساحل پر جہاں بیابان اور خوفناک صحرا تھا، وہاں کسی روشنی کا مطلب تھا کہ کوئی گروپ وہاں پہلے سے ہی فروکش تھا۔

کلی منجارو کی سرزمین پر میرے دوست کم اور دشمن زیادہ تھے، اس لیے مجھے ہر لمحہ احتیاط کی ضرورت تھی۔

ذرا دیر بعد میں نے بوٹ کا انجن بھی آف کردیا۔ بوٹ میں چپو موجود تھے۔ کچھ سوچ کر میں نے بوٹ کو چپوؤں کی مدد سے کھینا شروع کردیا۔ سونگ کھلا مجھ سے اُکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہاری منزل آگئی ہے تو ہوجاؤ، میں نے لوٹنا ہے جلدی۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کام کرتا رہا۔ جواب نہ پاکر غصے سے وہ اپنی جگہ سے تو شاید کمزوری کی وجہ سے اسے چکر آگیا اور وہ دھڑام نیچے آرہی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ میں اسے سنبھالنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی نظریں قر آتے تاریک ساحل پر مرکوز کردیں۔

تب ہی اچانک میرے تیزی سے کام کرتے ہو ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا اور نے سب سے پہلے چپو چلانا بند کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھ ہوا۔

تھوڑی دیر پہلے بوٹ میں غوطہ خوری کا جو مختصر سامان دیکھا تھا، میں نے اُسے اپنے لیے بیکار سمجھا تھا اب وہی میرے کام آنے والا تھا۔ میں اُسے اُٹھا لایا تیزی سے اسے پہننے لگا۔

فلیپر چڑھانے، پشت پر آکسیجن سلنڈر لگانے لباس پہننے تک میں نے تھوڑی ہی دیر لگائی تھی، اس کے سونگ کھلا کی طرف متوجہ ہوا جو حیرت اور عجیب سی نگاہ سے میری طرف تکے جارہی تھی، جبکہ مجھ سے برہمی کا تا بھی ہنوز اپنی جگہ موجود تھا۔

''میری بات اب غور سے سنو...... ! میں سمندر میں غوطہ لگا کر ساحل کی طرف جارہا ہوں اور تم ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر یہاں سے اپنی منزل کی جانب روانہ ہوجانا۔ رنگون کی بندرگاہ یہاں سے سو، ڈیڑھ سو ناٹیکل میل سے زیادہ دو نہیں ہے۔ تم دن چڑھے تک پہنچ جاؤ گی۔ سمجھ گئیں؟''

سونگ کھلا نے منہ بنا کر کہا۔ ''مجھے راستہ سمجھانے کی ضرورت نہیں، میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بھی اسی طرف دیکھا جہاں تاریک ساحل کی طرف سے دکھائی دیتی ہوئی وہ روشنی خاصی قریب آچکی تھی اور اس نے بھی دیکھ لی تھی۔ مگر اس کے بارے میں اس نے کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور بدستور نفرت خیز لہجے میں بولی۔

''تم جلد از جلد میری بوٹ سے دفع ہوجاؤ...... چاہے جہنم میں جاؤ، بس!''

میرے جی میں تو آئی اس [illegible] ایک اور گھونسا رسید کر دوں مگر میں ایسا کرں [illegible] غصے سے دانت پیس کر

لعنت

ہوٹل کے استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچ کر ایک صاحب نے پوچھا۔ ''آپ کا ہوٹل کیسا ہے؟''

''بہترین جناب!'' استقبالیہ کلرک نے فخر سے کہا۔ ''آپ یہاں قیام کریں گے تو بالکل یہی محسوس کریں گے جیسے اپنے گھر میں ہیں۔''

''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے ہوٹل پر...''

مہمان نے کہا اور اپنا سوٹ کیس اٹھا کر رخصت ہو گیا۔

انتخاب، تجمل حسین حیدری، محلّہ مسجد کھجور، پنڈ دادن خان

بولا۔ ''اپنی بکواس بند کرو اور زبان کو بھی لگام دو...... میرے پانی میں کودتے ہی تم پلٹ کر تھوڑے فاصلے تک چپوؤں کی مدد سے بوٹ لے جاؤ گی اور تھوڑی دور تک جانے کے بعد ہی موٹر بوٹ کا انجن اسٹارٹ کرو گی۔ یہ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ وہاں ساحل پر مجھے شبہ ہوا کہ میرا دشمن گروپ موجود ہے، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس طرح ساحل سے ایک دم پلٹتی ہوئی تمہاری بوٹ کو دیکھ کر تعاقب میں لگ جائیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ناگواری سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے مختصراً کہا اور مجھے اس کی ہٹ دھرمی اور اکڑ پر ایک بار پھر غصہ آنے لگا، حالانکہ میں نے یہ اس کے فائدے کی ہی بات کی تھی۔

بہرطور میں نے پھر بھی اس کے لیے کلمۂ خیر ادا کیا اور ماسک درست کرنے کے بعد اللہ کا نام لے کر پانی میں کود گیا اور بوٹ سے ذرا پرے ہٹ گیا۔ ابھی میں دانستہ پانی کی سطح پر ہی تھا۔

میں نے دیکھا کہ سونگ کھلا نے غصے اور اپنی عداوت میں وہی حرکت کر ڈالی جس کا مجھے ڈر تھا۔ اس نے میری احتیاطی ہدایت کے برخلاف عمل کرتے ہوئے بوٹ کو چپوؤں کی مدد سے کھینے کے بجائے، اس کا انجن اسٹارٹ کر ڈالا، اس بے وقوف نے عداوت اور ضد میں آ کر بوٹ کو اسٹارٹ کر کے چند منٹوں تک اسی طرح ہی وہاں موجود رکھا، جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرا ''معاملہ'' بگاڑنا چاہ رہی تھی۔

اس نے بوٹ کی تمام بتیاں بھی جلا ڈالی دی تھیں۔ اس کی اس قبیح حرکت پر میرا دماغ غصے کی آگ سے بھر گیا۔ اس کے بعد ہی، بلکہ میرے متوقع دشمنوں کو باخبر کرنے کے بعد اس نے بوٹ آگے بڑھائی تھی، گویا اپنے تئیں، میری اچھی طرح ''بگاڑنے'' کے بعد وہ روانہ ہوئی تھی۔

میں نے پانی کی سطح سے تاریکی میں ڈوبے ساحل کی طرف دیکھا جہاں مجھے ابھی تک روشنی سی نظر آ رہی تھی۔ اچانک مجھے ان روشنیوں میں حرکت سی محسوس ہوئی اور اسی وقت ایک اور روشنی چمکی، اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے اسی طرف آنے لگی۔ مجھے اپنی سماعتوں میں کسی انجن کے غرانے کی بھی آوازیں آنے لگیں۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ساحل کی طرف سے ایک اور بوٹ طوفانی رفتار سے اسی طرف بڑھنے لگی جس طرف میں تھا...... مگر مجھے اپنی زیادہ فکر نہ تھی، یہ میں نے سونگ کھلا کے بھلے کے لیے بھی کیا تھا، مگر وہ عناد کے مارے اندھی ہو گئی تھی۔ دشمن بوٹ کا رخ اسی کی بوٹ کے تعاقب میں تھا۔

میں نے تو فوراً ہی پانی کے اندر غوطہ لگا لیا تھا اور اندر ہی اند [illegible] لی طرف اس سمت بڑھنا شروع کر دیا [illegible] طرف میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق دشمن پناہ گاہ کی حدود دور پڑتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں ساحل کے قریب ابھرا اور تیزی سے ریت میں آ کر دم لیا۔ سب سے پہلے میں نے غوطہ خوری کے لباس سے پیچھا چھڑایا اور وہیں دبک کر پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔

میرے عقب میں تاریکی میں ہلکورے لیتا ہوا سمندر تھا اور سامنے اندھیرے میں ڈوبا ہوا چھدرا جنگل، سیدھے ہاتھ کی جانب روشنی تھی، جہاں مجھے ایک بڑا سا سیلانی خیمہ نصب دکھائی دیا تھا۔ وہاں مجھے ایک پرانے ماڈل کی لمبی سی بند جیپ بھی کھڑی دکھائی دی۔

گویا ان کے پاس بوٹ کے علاوہ جیپ بھی تھی، جس کا ''میل'' میری سمجھ میں نہ آ سکا تھا کہ یہ لوگ کس طرح بیک وقت خشکی اور پانی کا سفر کر کے یہاں تک پہنچے تھے، نیز یہ تھے کون؟ آیا میرے دشمن یا پھر کوئی اور عام سیلانی گروپ۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ایک ہی گروپ ہو اور دو مختلف راستوں سے سفر کرتا ہوا یہاں ایک دوسرے سے آن ملا ہو؟ لیکن جس طرح ان لوگوں نے فوری طور پر سونگ کھلا کی بوٹ کا پیچھا کیا تھا، اس سے ایک بات کا تو پتا چلتا تھا کہ یہ

کوئی عام سیلانی گروپ نہیں ہوسکتا تھا، ورنہ انہیں کیوں خطرہ محسوس ہوتا۔ دال میں کالا ضرور تھا اور مجھے یہ قریب جائے اور جانے بغیر نہیں پتا چل سکتا تھا۔

میں نے راستہ بدلا اور جس طرف چھدری چھدری جھاڑیوں کا سلسلہ تھا اُس طرف سے ہوکر آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ذرا ہی دیر بعد میں ان کے قریب تھا۔ وہاں الاؤ روشن تھا اور کچھ لوگ بھی وہاں بیٹھے نظر آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور تعداد میں بھی پانچ، چھ کے قریب تھے، اگر بوٹ میں تعاقب پر دو تین ہی افراد گئے ہوں تو کل ملا کر ان کی تعداد سات آٹھ ہی بنتی تھی۔

ان کی باتوں کا آہنگ سنائی دیتا تھا مگر جملے ابھی واضح نہیں ہو رہے تھے، میں تاریکی کا حصہ بنا تھوڑا اور آگے بڑھا اور تھوڑا مزید قریب پہنچ کر ٹھہر گیا اور وہیں دبک گیا۔

مجھے اب کچھ کچھ الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے، یہ لوگ ہندی اردو میں باتیں کر رہے تھے۔ سب سے پہلے تو میں نے الاؤ کی روشنی میں بہ غور ان کے بشروں کا جائزہ لیا۔ مجھے سرِ دست ان میں سے ایک بھی چہرہ شناسا محسوس نہیں ہوا تھا۔ تاہم یہ لوگ مجھے ایک ٹولے کی شکل میں ہی نظر آئے تھے اور انہیں لیڈ کرنے والا بھی ان کے درمیان موجود تھا جو اپنی وضع قطع سے ان کا سرغنہ ہی نظر آتا تھا کیونکہ باقی لوگ اسے ''باس'' کہہ کر اور مودبانہ انداز میں ہی مخاطب تھے، وہ ایک دبنگ قسم کا آدمی لگتا تھا۔ قد کا گھٹا ہوا اور کسی بھارتی سُور کی طرح مضبوط اور جسیم تھا۔ اس نے چست پتلون اور شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ کرخت اور گول سی بدہیئت آنکھوں میں وحشیانہ چمک محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس کا لہجہ اس کی دبنگ شخصیت سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

ان کے پاس مجھے جدید گنیں دکھائی دی تھیں۔ یہ لوگ باتیں کرنے کے دوران سمندر کی طرف اسی سمت گاہے بہ گاہے دیکھتے بھی جاتے تھے جدھر ان کے ساتھی ایک تیز رفتار بوٹ پر سونگ کھلا کے تعاقب میں گئے تھے۔

''باس! ہم اپنی منزل کے قریب ہیں۔ آگے کا سفر ہمیں خشکی پر ہی کرنا ہوگا۔ کیونکہ کلی منجارو قبیلے کا ٹھکانا خشکی کے راستے پر یہاں سے بہت قریب ہے۔''

ایک ساتھی کو میں نے اسی دبنگ شخص سے جب یہ کہتے سنا تو ایکا ایکی میرا ماتھا ٹھنکا۔ کلی منجارو کی مہم میرے بہت سے دشمنوں کی مشترکہ مہم کی صورت اختیار کر گئی تھی اور بھی جانے کتنے لوگ آگے چل کر ظہور پذیر ہونے والے تھے۔ کیونکہ نانا شکور کی جاسوسہ ڈولی جو بھولا ناتھ کے کلب میں مخبر کی حیثیت سے چھوڑی ہوئی تھی، میرا یہ اندازہ اسی کا فراہم کردہ معلومات کے مطابق تھا۔ میرا ذہن تیزی سے سوچنے اور قیافات قائم کرنے میں مصروف تھا کہ ان کی قلعی بھی کھل گئی۔

''صبح ہونے والی ہے اور ہم روشنی پھیلتے ہی یہاں سے جیپ میں روانہ ہو جائیں گے جبکہ ہمارا ایک ساتھی ادھر ہی بوٹ کے قریب رہے گا اور مسلسل ہمارے رابطے میں رہے گا۔ بوقتِ ضرورت یہ بوٹ بھی ہمارے کام آسکتی ہے۔ مجھے اپنے ساتھی شاکا کی زیادہ چنتا کھائے جا رہی ہے، نجانے اس کے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟ وہ رابطے میں بھی نہیں ہے' وہ زندہ ہے یا مر چکا۔''

''باس'' کی زبانی یہ سن کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ اول تو مجھے ذرا قریب آکر سننے پر ''باس'' کا لب ولہجہ بھی کچھ شناسا لگا تھا اور اب شاکا کے ذکر پر میرے اندر ایک ہی نام ابھرا تھا۔

''بھولا ناتھ۔''

شاکا...... بھولا ناتھ کا ہی خاص آدمی تھا، جسے کلی منجارو کی مہم میں پہلے روانہ کیا گیا تھا اور اسے اس وحشی قبیلے کی زبان آتی تھی۔ وہ ان سے اُن تینوں قیدیوں (میرے ساتھیوں) کی حوالگی کے سلسلے میں مذاکرات کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ ساتھ ہی مجھے بھولا ناتھ کا لہجہ بھی یاد آنے لگا تھا۔

یہ آواز میں نے پہلی بار اس وقت کارڈلیس کے وائس اسپیکر پر سنی تھی، جب بھوانی سے میں نے اس کی بات کرائی تھی۔ فون پر اصل آواز کچھ دبی دبی سی آتی محسوس ہوتی ہے اور اتنی جلدی نہیں پہچانی جاتی تاہم ذرا غور کرنے اور شاکا کے ذکر پر یہ پہچاننا مشکل بھی نہ رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا تھا، کیونکہ میں اس وقت خونخوار بھیڑیوں کی کچھار کے قریب ہی تھا۔

اس کے ایک ساتھی کو میں نے کہتے سنا۔ ''باس! میرا تو خیال تھا کہ شاکا کو اس وحشی قبیلے سے مذاکرات کرنے کے بجائے خاموشی سے وہاں پہنچ کر اپنے دشمن شہزاد احمد کے ان تینوں ساتھیوں کو وہیں ٹھکانے لگا کر اپنے تینوں ساتھیوں کا بدلہ لے لینا چاہیے تھا۔ اب تو بھوانی صاحب بھی دیہانت (مرگئے) کر گئے۔ رہا شہزی تو اسے بھی ہم یہاں تلاش کر کے ختم کر ڈالیں گے۔''

"میں اب یہی سوچ رہا ہوں......" بھولا ناتھ بولا۔

"شاکا لگتا ہے ناکام ہو گیا ہے، اب ہم شہزی اور اس کے تینوں ساتھیوں کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ بھولا ناتھ اپنے دشمنوں کو معاف کرنے کا عادی نہیں ہے۔" اس کے لہجے کے آخر میں سفاکی اُتر آئی تھی اور اس کے نئے خطرناک عزائم جان کر کہ وہ اب اپنے تئیں اول خیر وغیرہ کے "ڈیتھ وارنٹ" جاری کر چکا تھا، مجھے ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

"لیکن باس! ہمارا اصل مشن دشمن سے انتقام لینے سے زیادہ اہم ہے......" ایک نے کہا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"اصل مشن۔" میرے ذہن میں یہ لفظ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ ان کا اصل مشن کیا تھا؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

"ہاں! اصل مشن کو ہی میں زیادہ اہمیت دوں گا۔ اسی لیے تو میں بھی اس وقت تم لوگوں کے ساتھ ہوں...... ورنہ شاکا کے بعد میں تم لوگوں کو بھی بھیج سکتا تھا۔" میں بھولا ناتھ کو یہ کہتے ہوئے پورے دھیان سے سن رہا تھا۔

"شاکا سے آخری گفتگو پر ہی میں چونکا تھا۔ میں بگ باس کے علم میں بھی یہ اہم راز لا چکا ہوں اور ان کی بھی مجھے یہی ہدایت تھی کہ میں بلاتاخیر اس مشن پر از خود روانہ ہو جاؤں۔"

میں ان کی اس گفتگو پر چونکا تھا تو گویا بھولا ناتھ کا بھی یہاں آنے کا کوئی اہم مشن تھا، اور وہ کیا تھا؟ یہ میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن مجھے ایک اچنبھا ضرور ہوا تھا کہ کوہارا بھی یہاں موجود تھا اور اب بھولا ناتھ بھی...... تو یہ سوال لامحالہ ہی میرے ذہن ابھرا تھا کہ کیا ان دونوں کے اس اہم مشن کی نوعیت ایک ہی تھی؟ یہ میرے دشمن گروپس کا کوئی مشترکہ مشن تھا جسے وہ الگ الگ اپنے ٹولے کی صورت میں سرانجام دینے کے لیے کوشاں تھے؟

صورتِ حال واقعی کافی گمبھیر ہونے لگی تھی۔ پتا نہیں کلی منجارو کی بستی میں کیا کھچڑی پک رہی تھی اور اب یہ وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

"وہ آرہے ہیں باس......!" معاً ایک نے جیسے اعلان کیا اور وہ سب بیک وقت سمندر کی طرف دیکھنے لگے۔

مطلع صاف ہونے لگا تھا اور آسمان پر اب صبح کاذب کی سپیدی نظر آنے لگی تھی، کچھ تاریکی نما روشنی کا بھی ظہور ہونے لگا تھا۔

میری بھی غیر ارادی طور پر نظریں اسی طرف کو اُٹھ گئیں جو بوٹ سونگ کھلا کے تعاقب میں گئی تھی وہ اب اسی تیزی کے ساتھ واپس لوٹ رہی تھی اور میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں یہ خدشات سر اُٹھانے لگے کہ اگر بدقسمتی سے سونگ کھلا ان بھیڑیوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے تو میری بھی یہاں موجودگی کا راز آشکارا ہو سکتا تھا اور پھر آناً فاناً میری یہاں ڈھنڈیا پڑ سکتی تھی۔ اگرچہ سونگ کو میں نے اپنا اصل نام نہیں بتایا تھا تاہم اس سے میرا ناک نقشہ معلوم کیا جا سکتا تھا یوں تو بھولا ناتھ نے بھی مجھے نہیں دیکھ رکھا تھا، مگر کیا خبر اُس نے میری کوئی تصویر دیکھ رکھی ہو جو پہلے ہی مخصوص اداروں میں پھیلائی جا چکی تھی۔ جیسے میں ابھی بعض ٹھوس حوالوں سے بھولا ناتھ کو پہچان رہا تھا۔

"لگتا ہے باس! واپس لوٹتا ہوا شکار ہمارے ساتھیوں کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔" ایک نے اپنے گلے میں جھولتی دوربین کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ واقعی کوئی شکار ہی ہو سکتا ہے، کیونکہ اس بوٹ کا قریب آکر اچانک پلٹ جانا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ساحل پر موجود ہمارا عارضی ٹھکانا دیکھ لیا تھا۔" پھر دوسرے نے تبصرہ کیا تو بھولا ناتھ گھاگ لہجے میں بولا۔

"مجھے تو ایک اور بات کا بھی شبہ ہوتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں یہ بوٹ کسی خاص مقصد کے لیے اس ساحل کے قریب آئی ہو اور وہ پورا کر کے واپس لوٹ رہی ہو۔"

"ہاں! میرے دل میں بھی یہی خدشہ آتا ہے۔" تیسرے ساتھی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا، گویا ان خبیثوں کا بھی قیافہ غضب کا تھا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" بھولا ناتھ نے کہتے ہوئے ایک موٹا سگار سلگا لیا۔

بوٹ کے انجن کی گذ...... گذ کرتی آواز قریب آگئی اور اس میں سے دو افراد اسی طرف کو تیزی سے لپکے۔ میں گویا سانس روکے اس طرف دیکھنے لگا اور پھر جیسے میرا پورا وجود سن ہو کر رہ گیا۔ وہی ہوا تھا جس کا ڈر تھا۔

سونگ کھلا نے اپنی منتقمانہ روش میں آکر جو بے وقوفی کر ڈالی تھی وہ اب نہ صرف اس کے بلکہ میرے گلے بھی پڑنے والی تھی۔ تاہم مجھے اپنی نہیں اس کی زیادہ فکر ہونے لگی تھی۔ کچھ بھی سہی، وہ بہرحال میری محسنہ تھی، اگرچہ میں نے بھی اس کی جان بچا کر اس کا حساب بے باق کر دیا تھا

لیکن باوصف اس کے میرا دل کبھی نہ چاہ سکتا تھا کہ میں اس نازک سی سونگ کھلا کو ان بھیڑیے صفت درندوں کی خوراک بنتے دیکھوں۔

سونگ کھلا ان کے ہتھے چڑھ چکی تھی۔ اُس کا چہرہ خوف و دہشت سے پیلا پڑا جا رہا تھا اور وہ بھولا ناتھ کے دونوں ساتھیوں کے شکنجے میں بری طرح مچل رہی تھی۔ اس پر شاید تشدد بھی کیا گیا تھا، کیونکہ اس کے چہرے پر سرخی اور گالوں پر خراشوں کے نشان تھے۔

"م...... مجھے چھوڑ دو پلیز......! م...... میرا اُس آدمی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو خود اس کی دشمن تھی۔"

جب اسے بھولا ناتھ کے رُوبرو کیا گیا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی تھی جبکہ بھولا ناتھ اسے خوف ناک نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ وہ جیسے اپنے ان دونوں ساتھیوں کے کچھ بولنے کا منتظر تھا، جسے سمجھتے ہوئے ان میں ایک نے قدرے صراحت سے بتایا۔

"باس! اس نے راج نامی جس آدمی کی کہانی ہمیں سنائی ہے اس کا ناک نقشہ اس نے جو بتایا ہے وہ ہمارے دشمن شہزی پر ٹھیک ٹھیک اُترتا ہے۔ اُسے ساحل پر ہماری موجودگی کا شبہ ہوا تو وہ احتیاط کے پیشِ نظر غوطہ خوری کا لباس پہنے پانی میں اُتر گیا اور اگر یہ سچ کہہ رہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ شہزی اس وقت ہمارے آس پاس ہی موجود ہے......" اس نے جیسے وہاں دھماکا کر دیا۔

"مگر ہماری معلومات کے مطابق تو اس کے ہمراہ نانا شکور اور ایک سوشیلا نام کی ساتھی بھی تھی، وہ کہاں ہے؟" بھولا ناتھ نے ان کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ دونوں اس سوال کا جواب نہ دے سکے، یہی وہ وقت تھا جب بھولا ناتھ کو اپنے اس فضول سوال پر وقت ضائع جانے کا احساس ہوا اور وہ بھیڑیے جیسی غراہٹ سے تحکمانہ انداز میں چیخا۔

"یہ سچ کہہ رہی ہے، فوراً فلش لائٹیں آن کر دو اور چاروں طرف پھیل جاؤ......"

بھولا ناتھ نے جیسے پل کے پل اپنی ذہنی فراست کے بل بوتے پر اس "سچویشن" کا بالکل ٹھیک اندازہ قائم کیا تھا اور پورے اعتماد سے میری "ڈھنڈیا" ڈالنے کا حکم دے ڈالا تھا۔

میرے لیے اب وہاں ٹکے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا، میں نے یہ "اعلان" سنتے ہی فوراً سے پیشتر اپنی جگہ سے حرکت کی اور زمین پر لیٹے لیٹے تیزی کے ساتھ رینگتا ہوا جتنی دور سرک سکتا تھا سرک لیا...... مگر تب تک اس ٹھیٹ

بھولا ناتھ کے ساتھیوں نے نہ صرف طاقت ور چارجر لا آن کر دیں بلکہ اپنی جدید ساخت گنیں سنبھالے چار طرف پھیلتے چلے گئے۔

میرے لیے اب زیادہ دیر سرکتے رہنا محال میں نے اُٹھ کر دوڑ لگا دی۔ اسی وقت مجھے دو فائر کی آ سنائی دی۔ میں دہل گیا، میں یہی سمجھا تھا کہ یہ دونوں گولیا مجھ پر فائر کی گئی تھیں۔ مگر ایسا نہ تھا۔ کیونکہ فائر کی آواز ساتھ ہی سونگ کھلا کی لرزہ خیز چیخ ابھری تھی۔ اس نے یا موقع جان کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تھی یا پھر اس رحم انسان بھولا ناتھ نے اسے اب "بیکار" شے سمجھتے ہو گولی ماری تھی۔ میں سونگ کھلا کی موت پر افسوس ہی کر سک تھا کہ وہ مفت میں ماری گئی تھی۔

ابھی تو مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی۔ میں کب تک بچ جلد ہی ان بھیڑیوں کی نظروں میں آ گیا۔ کیونکہ چند لمحو بعد ہی عقب سے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری تھی میں نے فوراً خود کو زمین پر گرا دیا۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... سونگ کھلا نے اپنے ساتھ میرے مرنے مارنے کا بھی سامان کر دیا تھا۔ بھولا ناتھ کے خطرناک عزائم جاننے کے بعد اب یہ بات شک و شبے سے بالاتر تھی کہ وہ مجھے بہرصورت مردہ دیکھنے کا خواہشمند تھا اور اس پر مستزاد کہ میں اس کے نرغے میں بھی تھا۔

بھولا ناتھ کی قسمت پر نازاں ہوئے بغیر میں نے خو کو زمین پر گراتے ہی لڑھکنیاں کھائیں اور ان ٹیلوں ٹبوں کی آڑ میں چلا گیا جہاں جا بجا چھدری اور کہیں نصف قدِ آدم جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف وہی بنجر صحرا تھا جہاں کالے بچھوؤں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔

میں اس وقت بالکل نہتا تھا۔ مگر میرے کوہ شکن حوصلوں کے بادبان بلند تھے۔ اندازہ تھا مجھے کہ یوں بھاگتے رہنا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا نیز مجھے پیش آمدہ صورت حال کو ڈیل کرنا تھا۔

دشمن کو زعم تھا کہ ان کا "شکار" تنہا اور وہ خود تعداد میں زیادہ تھے اور جدید ہتھیاروں سے لیس بھی، یہی زعم میں ان کا "ویک پوائنٹ" بنا [illegible] سوچنے لگا اور وہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

اسی وقت میں [illegible] ذہن طباع نے دشمن کی حرکات و سکنات کی "[illegible]" [illegible] اور سراپا سماعت بن گیا۔ جلد ہی مجھے [illegible] کی آواز سنائی دے گئی۔ وہ اپنی [illegible] سے چلے آ رہے تھے۔ یہ بات

گئی تھی کہ اُنہیں اب تک میرے ''خالی ہاتھ'' ہونے کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو چکا تھا اور وہ مجھے تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے۔

دوڑتے قدموں کی دھپ...... دھپ مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر سنائی دی تھی اور ٹھیک اسی وقت میں نے ایک ہیولا لپک کر اپنے بالکل قریب سے گزرتے پایا۔ اسے میں نے دانستہ ''جانے دیا۔'' جب دوسرا گزرنے لگا تو میں کسی چیتے کی طرح چابک دستی کے ساتھ اس پر جھپٹا۔ یہ حملہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا۔ چنانچہ گرتے ہی اس نے کمال پھرتی کے ساتھ اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے سنبھلنے کی کوشش کی تھی مگر میں اب کہاں اسے کوئی موقع دینے والا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ میرے لیے کتنا قیمتی اور ہر لمحہ موت کی جانب دستک دیتا ہوا محسوس بھی ہوتا تھا۔

اس نے میرے شکنجے سے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی اور میں نے اس کی ایسی کوئی تیاری پکڑنے سے پہلے ہی اس کی ٹھوڑی پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا، جو میری توقع کے عین مطابق خاصا زوردار ثابت ہوا۔

میرا گھونسا لگتے ہی اس کے دانتوں تلے شاید اس کی زبان آگئی تھی۔ وہ بری طرح بلبلا کر چیخا تھا، ایک مقصد اس کے چیخنے کا اپنے آگے نکل جانے والے ساتھی کو اس طرف متوجہ کرنا بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اب اس کے لیے کافی دیر ہو چکی تھی۔

میں نے اسے ذرا ڈھتے پا کر، اس کی گن پر جھپٹا مارا اور وہ گرفت میں آتے ہی اس کا ٹھوس کندا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ اسی وقت بے حس و حرکت ہو گیا۔

آگے نکل جانے والے ساتھی کو اس کا تب اندازہ ہو سکا تھا جب میں دشمن کی گن پر قبضہ جماتے ہی اپنے اندر طوفانی جذبات اُمڈتے ہوئے محسوس کرنے لگا تھا اور بہ سرعت اپنی جگہ چھوڑ کر شست باندھ کر اس طرف کو ہو گیا جدھر میری توقع کے مطابق اس کا دوسرا ساتھی پلٹتے ہی مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے ارادے سے نمودار ہوا تو میں نے اس پر برسٹ چلا دیا۔ وہ کربہ انگیز چیخ مارتا ہوا رقصِ اجل کرتا گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

یہ لوگ کسی طور پر بھی رحم کے مستحق نہ تھے۔ وجہ یہی تھی کہ بھولا ناتھ میرے اور راول خیر وغیرہ کے ڈیتھ وارنٹ جاری کر چکا تھا۔ وہ ہمیں زندہ یا مردہ دیکھنے کا بے قراری سے متمنی تھا۔

اس مختصر سی فائرنگ سے اِدھر اُدھر میری تلاش میں پھیلے ہوئے باقی دشمن ساتھی اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے اس لیے میں نے فوراً سے پیشتر اپنی جگہ بدلی اور ایک نسبتاً جھکے جھکے مگر قدرے وسیع قطعہ اراضی پر محیط بڑے سے ٹیلے کی ڈھلان پر جا چڑھا، جہاں نصف قدِ آدم جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں ان کے بیچ جا کر چیتے کی طرح گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

یہاں سے میں متوقع طور پر ایک سے زائد دشمنوں کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ جلد ہی مجھے ملگجی سی روشنی میں تین سے چار مسلح ہیولے دوڑتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ وہ سب محتاط تھے اور ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنے دونوں ساتھیوں کے انجام کا کافی حد تک ادراک ہو چکا تھا۔ وہ اسی جانب آکر تین اطراف میں پھیل گئے اور میں ان کو نشانہ بنانے کا سوچتا ہی رہ گیا۔

کسی بھی قسم کی جلد بازی میرے لیے نقصان کا باعث بن سکتی تھی۔ افرادی قوت میں بہرحال وہ زیادہ تھے اور محض ایک گن میرے ہاتھ میں آجانے سے میں ان پر اس طرح اندھا دھند نہیں پل پڑ سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے بھی چابک دستی اور چوہے بلی کا کھیل کھیلتے ہوئے انہیں ایک ایک کر کے نشانہ بنانے کی سوچنے لگا۔ یہی سبب تھا کہ اس آٹومیٹک گن سے میں نے سنگل شاٹ کھیلنے کا فیصلہ کیا، تاکہ برسٹ کی صورت میں فالتو گولیاں ضائع نہ ہوں۔

ابھی یہ سوچ کر میں اپنی جگہ سے حرکت کرنے ہی والا تھا کہ اچانک میں ان میں سے کسی ایک کی نگاہ میں آگیا۔ اُس نے وہیں سے ہی مجھ پر برسٹ چلایا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی یا پھر ملگجی سی روشنی کے سبب دشمن کا نشانہ خطا چلا گیا۔ گولیوں کی پوری طوفانی بوچھاڑ میرے سامنے محض چند فٹ کے فاصلے پر پڑی اور گرد و غبار کا وہاں طوفان سا بپا ہوا۔ میں بری طرح بدکا اور حواسوں کو قابو رکھتے ہوئے میں نے بھی پھر مزید ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اُسی طرف تلے اُوپر دو فائر کر ڈالے، جس کا نتیجہ ایک لرزتی ہوئی کربناک چیخ کی صورت برآمد ہوا۔

''اندھا دھند فائرنگ مت کرو...... ہم لوگ اس وقت ڈینجر زون میں ہیں......'' ایک چلّاتی ہوئی آواز ابھری، اس میں آواز میں پریشانی اور جھلاہٹ آمیز طیش کا عنصر شامل تھا۔

یہ آواز بھولا ناتھ کی تھی۔ میں بھی اس کی ہدایت پر ٹھٹک کر رہ گیا تھا، کیونکہ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ اس کی ''ڈینجر

زون'' سے مراد یہی تھی کہ ہم اس وقت ایک وحشی قبیلے کی حدود میں نہیں تو اس کے اریب قریب ضرور موجود تھے، فائرنگ کی آواز پر وہ سب اس طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

''اسے ترنت گھیرنے کی کوشش کرو...... وہ اکیلا ہے۔'' بھولا ناتھ پھر چلایا۔

میں نے فوراً حرکت کی اور ایک طرف کو رینگ گیا۔

صبح کی روشنی چار دانگ پھیلنے لگی تھی۔ سورج نمودار ہوتے ہی باقی ماندہ اندھیرا بھی کائی کی طرح چھٹتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اب ہر سُو روشنی پھیل گئی تھی۔

دشمن نے اسٹریٹجی بدل دی تھی۔ وہ اب حملہ کرنے کے بجائے مجھے گھیرنے کی کوشش میں تھے، یہ بات میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھی۔ کیونکہ ہم دشمن کے لحاظ سے ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ فائرنگ کرنے سے میں بھی کترا رہا تھا۔

اب اس کا حل یہی تھا کہ میں بھی ان کی طرح اپنی حکمت عملی کو بدلوں اور ان سے مزید بھڑے بغیر یہاں سے اپنی منزل کی طرف خاموشی سے نکل جاؤں جو زیادہ دور نہیں رہی تھی۔

میں نے یہی کیا اور ایک محتاط انداز سے رخ بدلا اور جزیرے کی اندرونی سمت نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔

یہ ابھی مجھے ایک دم گھیرنے کی پوزیشن میں نہیں آئے تھے، یہی سبب تھا کہ میں ان کی حکمت عملی جانتے ہی ٹیلوں ٹبوں اور ان کی ڈھلوان پر اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا مقررہ سمت کی طرف کھسکنے لگا، لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ اچانک ایک تیز چلاتی ہوئی آواز ابھری۔ یہ بھولا ناتھ کی آواز نہیں تھی اس کے کسی ساتھی کی تھی۔ وہ خبردار کرتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

''وحشیوں کا ٹولا اسی طرف آرہا ہے، واپس گاڑی کی طرف پلٹو...... ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی میرے اپنے اوسان خطا ہونے لگے تھے۔ وحشیوں کے ٹولے سے مراد اگر کلی منجارو قبیلے کے لوگ تھے تو یہ کم تشویش ناک بات نہیں تھی۔

میرے دشمنوں کو اپنی پڑ گئی تھی اور وہ میری گھات چھوڑ کے جیپ کی طرف دوڑے۔ میں چاہتا تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھا سکتا تھا اور اس بھاگا دوڑی میں انہیں نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اس میں میرا بھی نقصان ہوتا۔ ان وحشی جانگلیوں کے خونی نرغے میں خود میں بھی آسکتا تھا جبکہ خود مجھے بھی اپنا بچاؤ کرنا تھا۔

بھولا ناتھ کو میرے انتقام نے اندھا کر دیا تھا۔ ج کے لیے وہ خود بھی یہاں کی خاک چھانتا ہوا آنکلا تھا۔ اگر وہ اس مقصد کے لیے اپنے ساتھیوں کو بھی ٹاسک سونپ س تھا جیسا کہ وہ شاکا کو بھیج کر یہ کر چکا تھا۔ لیکن باوجود ا کے مجھے نہیں لگتا تھا کہ بھولا ناتھ کا یہاں صرف یہی ایک مقصد تھا۔

بقول نانا شکور مرحوم کی جاسوسہ ڈولی کے...... شا نے وہاں پہنچ کر بھولا ناتھ کو کچھ ایسی باتیں بھی بتائی تھیں جس کے بعد بھولا ناتھ کو اس نے یہ کہتے سنا تھا کہ اگر ایک بات ہے تو میں بھی پہنچ رہا ہوں اور وہ ''بات'' کیا تھی؟ اس سے آگے ڈولی نہیں سن سکی تھی۔

پھر اس کے بعد بھولا ناتھ کا اچانک ان سے رابط منقطع ہو گیا تھا جو بعد میں بھی بحال نہ ہو سکا تھا۔ یہی ن مجھے ان کی آپس کی باتوں سے بھی یہی اندازہ ہوا تھا کہ کسی اور مشن پر آئے تھے۔ میرا معاملہ تو ان کے لیے ج ''لگے ہاتھوں'' نمٹانے کا جیسا لگتا تھا۔

ایک دل دہلا دینے والی چیخ نے میرے خیالات یکدم منتشر کر کے رکھ دیا۔ یہ بھولا ناتھ کے ہی کسی ساتھی ک آخری چیخ سے مُشابہ آواز تھی۔ میں نے چونک کر آواز ک سمت دیکھا تو اس جانب دس، بارہ سنان بردار وحشی نم آئے۔ ایک نے بھولا ناتھ کے ساتھی کو اپنی سنان م پروئے رکھا تھا۔ لیکن میں ان وحشیوں کو دیکھ کر چونک ا تھا۔ کیونکہ ان میں صرف کلی منجارین ہی نہیں تھے بلکہ چس پینٹ شرٹ میں ملبوس چار، پانچ کی تعداد میں وہ افراد بھ شامل تھے جن کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھیں۔ گویا یہ لوگ جو ''تہذیب یافتہ'' کہلائے جاتے تھے، ان کا ان ک منجارین وحشیوں کے ساتھ ہونا یہی ثابت کرتا تھا کہ یہ لوگ آپس میں ساتھی تھے۔

ان کے لباس شہری سہی، مگر ان کا رنگ ایک ہی تھا، یع ڈارک براؤن اور ہلکا نیلا، سر پہ ایک ہی طرح کی ٹیچی دا ٹوپیاں تھیں۔ یہ سب چاق و چوبند اور چوکس نظر آرہے تھے۔

میری پیشانی یکلخت شکن آلود ہو گئی۔ اب میرا یہاں سے یوں چپ چپاتے نکل جانے کا ارادہ یکسر بدل گیا تھا، ورنہ سوچا میں نے یہی تھا کہ انہیں آپس میں اُلجھتا چھوڑ ک آگے اپنی منزل کی طرف نکل جاؤں۔

قدیم و جدید ساتھیوں کے اس ملاپ کا راز ڈولی کی بتائی ہوئی معلومات (جو درحقیقت شاکا کی ہی تھیں، جس سے اس نے بھولا ناتھ کو کسی لاسلکی رابطے کے ذریعے آگاہ کی

تھا اور نا ناشکور کی جاسوسہ ڈولی نے بھی وہ رازداری سے سن لی تھیں) کو سچ ثابت کر رہا تھا جس کے مطابق اس وحشی قبیلے پر ایک دوسرے گروپ نے اپنا تسلط جما رکھا تھا یا اپنا ساتھی بنایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا کھوج لگانا ازبس ضروری محسوس ہوا۔ میں اب اپنی جگہ پر دبک کر ان کی حرکات و سکنات کا بہ غور جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔

میرا ان سے فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ ان کی گفتگو کو میں سرِدست سننے سے قاصر تھا۔ تاہم میں نے دیکھا تھا کہ یہ سوٹ پوش ٹولا، جانوروں کی کھالوں کے مختصر لباس میں ملفوف ان ننگ دھڑنگ وحشیوں پر حاکمانہ اثر رکھے ہوئے تھا۔ وہ ان پر حکم چلا رہا تھا۔ انہی کے حکم اور اشارے پر یہ لوگ اسی جانب کو دوڑ پڑے تھے جدھر بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی بھاگے تھے۔ وہاں ان کی جیپ موجود تھی اور یہ سب اس میں سوار ہو کر ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتے تھے۔

تب ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ اسی طرح کا ایک ''سوٹ پوش'' ٹولا اس ہیلی کاپٹر میں بھی سوار تھا، جنہوں نے سے جی کوہارا اور کوریلا پر بھی حملہ کیا تھا، جسے بعد میں کوہارا مار گرانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تو گویا یہ انہی ہیلی کاپٹر والوں کے ہی ساتھی تھے۔

انہیں آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے بھی کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ دوڑے جا رہے تھے اور اس بات سے بے خبر تھے کہ میں بھی ان کے تعاقب میں چلا آ رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ ان کی بھولا ناتھ اور اس کے ٹولے پر نگاہ پڑ چکی تھی، بلکہ یہ ان کے ایک آدمی کو بھی شکار کر چکے تھے، جبکہ میں دو کو جہنم واصل کر چکا تھا۔

جلد ہی یہ لوگ وہاں جا پہنچے تھے جہاں یہ سب خیمہ زن تھے۔ وہاں اب بھی خیمہ نصب تھا، باقی سامان بکھرا بکھرا سا نظر آ رہا تھا۔ وہیں مجھے مڑی ہوئی زرد چونچوں والے تین چار مردار خور گدھ ساحل کی ریت پر پڑی ایک لاش کے قریب پھدکتے ہوئے نظر آئے۔ لاش ابھی پوری طرح نچی ہوئی نہیں تھی، مگر دور سے ہی میں نے اس لاش کو پہچان لیا تھا، یہ بدنصیب سونگ کھلا کی لاش تھی جسے رات آخری پہر میں بھولا ناتھ نے بڑی سنگ دلی کے ساتھ گولی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔

سونگ کھلا جیسی حسین اور نرم و نازک حسینہ کا یہ عبرت ناک انجام دیکھ کر مجھے افسوس ہوا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی، اس کے ساتھ میں نے بہرحال انڈیمان کے صدر مقام پورٹ بلیئر کے کنارے اچھا وقت گزارا تھا، یہ الگ بات تھی کہ بعد میں حالات تلخ ہوتے چلے گئے تھے اور پھر نہ سنبھل سکے یہاں تک کہ وہ بالآخر تباہی و بربادی اور سونگ کھلا کی موت پر منتج ہوئے۔

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ جس بدنصیب عورت کی لاش اس وقت نارتھ انڈیمان کے اس دور افتادہ ساحل پر مردار خور گدھوں کی خوراک بن رہی تھی وہ صرف چند روز پہلے کس قدر شاہانہ زندگی گزارتی رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ جیپ اپنی جگہ موجود تھی، جبکہ بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی اپنے دشمنوں کو تعاقب میں آتے دیکھ کر ایک دم پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ شاید ان لوگوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے پاس ابھی جیپ میں سوار ہونے کا وقت نہ تھا۔ اُدھر ان کے تعاقب میں آنے والوں نے ان پر اپنے ہتھیاروں سے حملہ کر دیا۔

دونوں گروپوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑ گیا اور میں ایک طرف دبکا یہ جنگ کا منظر دیکھتا رہا۔ ابھی میں ان کے بیچ نہیں کودا تھا، مگر ہونٹ بھینچے سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ حالانکہ میں چاہتا تو اس موقعے سے فائدہ اُٹھا کر اپنی منزل کی جانب بڑھ سکتا تھا لیکن ان وحشیوں کے ساتھ سوٹ پوش مسلح افراد کو دیکھ کر میرا کچھ اور کرنے کا ارادہ ہو گیا تھا۔

میں نے ایک فیصلہ کیا اور گھات لگانے کے انداز میں اسی طرف بڑھنے لگا جہاں نو وارد گروپ بھولا ناتھ کو چھاپنے کے چکروں میں تھا۔

دونوں طرف سے خوب ٹھنی ہوئی تھی اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں ان کے بیچ میں کود پڑتا، تاہم یہ الگ بات تھی کہ میں اوکھلی میں سر دیے جا رہا تھا اور یہ داؤ پر بھی لگ سکتا تھا۔ لیکن میرا اوکھلی میں سر دینے کا جو مقصد تھا وہ اہم ہی نہیں میری بہت سی بے چینیوں کو رفع کرنے کے علاوہ کافی سے زیادہ آگہی دینے کا سبب بن سکتا تھا۔

میرا شکار کوئی وحشی نہیں، ان کے ساتھی گروپ کا کوئی فرد تھا جو اُن پر حکمرانی حاصل کر پاتا تھا یا قریبی دوست بن چکا تھا۔

جہاں یہ لوگ سمت باندھے بھولا ناتھ وغیرہ سے نبرد آزما تھے۔ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، اصل بات یہ تھی کہ مجھے رازداری سے ان کے قریب پہنچنے کی گھات میسر تھی۔ اس طرف جھنڈ دار درخت اور گھنی جھاڑیاں تھیں، میں انہی کی اوٹ لیتا ہوا محتاط روی کے ساتھ ان کی طرف بڑھنے لگا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ جاری تھی اور مجھے ان کی فائرنگ سے بچ کر ہی آگے بڑھنا تھا بصورتِ دیگر میں کسی بھولی بھٹکی گولی یا برسٹ کی زد میں آسکتا تھا۔

میں زمین پر جھکا جھکا ہوا آگے سرکتا رہا۔ اسی وقت ان میں سے کافی سے زیادہ افراد آگے کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو بھولا ناتھ وغیرہ پسپا ہو رہے تھے یا پھر انجام کو پہنچ رہے تھے۔

میں ذرا رکا اور پھر آگے بڑھا، اسی وقت ایک برسٹ چلا۔ میں غیر ارادی طور پر جھکا اور زمین کے ساتھ چپک کر رہ گیا۔ اُوپر کھات میں رہ جانے والے ان کے وہ چند ساتھی جو تین چار کی تعداد میں تھے دو چیخ مار کر گرے..... تو باقی دو جوابی فائرنگ سے بچنے کے لیے پیچھے کی طرف کو مڑے، یہی وہ وقت تھا جب ان میں سے ایک کی خدا جانے کس طرح مجھ پر نگاہ پڑ گئی، پہلے تو اس کی آنکھوں میں حیرت سی اُمڈی، مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کیا تھا کہ میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا، میری گن نے آتشیں قہقہہ اُگلا اور وہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ آخری جو بچا اُسے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ برسٹ کہاں سے اور کس نے چلایا، جب اس نے عقب میں مڑ کر دیکھا تو میں تب تک اس کے سر پر پہنچ چکا تھا، اب اس کے پاس اپنی گن کا رخ میری طرف پھیرنے کا موقع نہ رہا تھا۔ میں اس پر جھپٹا اور اس کی گن چھین لی۔ یہ گلی منجارو گروپ کے ''مہذب''..... ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

وہاں ساحل کی طرف ابھی جنگ جاری تھی۔ اِدھر میں نے اپنے شکار کو دبوچ رکھا تھا، گن چھینتے ہی میں نے اسے نیچے گرا لیا اور اس کی کنپٹی پر گن کا ٹھوس آہنی کندا رسید کر دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

میرا کام ہو گیا تھا۔ میں ... باقیوں کو آپس میں ''مصروف'' چھوڑ کر اپنے بے ہوش شکار کو کاندھوں پہ ڈالے اُلٹے پاؤں دوڑا اور ٹیلوں ٹبوں کی آڑ میں آ گیا۔ یہاں پہنچا تو اچانک میری نگاہ سامنے پڑی اور میں ٹھٹک گیا۔

سامنے ہی ایک ٹیلے کی ڈھلان کے قریب ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔ میرے ذہن میں جھماکا ہوا، یہ جیپ بلاشبہ انہی لوگوں کی تھی۔ میں نے پل کے پل اپنا یہاں ٹھہرنے کا ارادہ بدلا اور اپنے شکار کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تقریباً دوڑتا ہوا جیپ کے قریب آیا تو حسبِ توقع اس کے اگنیشن سوئچ پر چابی لگی دیکھ کر میری آنکھوں میں ایک چمک سی اُبھری، جیپ میں اور بھی تھوڑا بہت سامان رکھا تھا۔

میں نے اپنے شکار کے بے سدھ وجود کو سیٹ پر ڈالا اور خود اس کے برابر والی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہو گیا۔ چابی گھمائی تو ایک تیز غراہٹ کے اس کا انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے گیئر ڈالا اور ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا دی۔ اس کا رخ بدلا اور منزل کی جانب موڑ کر ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔

میں جیپ کو ناہموار اور اُونچے نیچے راستوں پر دوڑاتا چلا جا رہا تھا۔ میری کوشش یہ تھی کہ جہاں دو مخالف گروپ آپس میں لڑ مرنے میں مصروف تھے، میں وہاں سے کافی دور نکل جاؤں۔

گلی منجارو کی سرزمین میں جہاں میرے بہت سے دشمن تھے وہیں میری ایک خوش قسمتی یہ بھی تھی کہ اپنے اپنے مفادات نے انہیں بھی ایک دوسرے کی جان کا دشمن بنا رکھا تھا۔ سے جی کوہارا اور کوریلا کی مثال میرے سامنے تھی، لیکن میرے لیے اب یہ بات بے چینی پیدا کرتی تھی کہ میں اس بات کا جلد سے جلد کھوج لگاؤں کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جو ان وحشیوں پر اپنا غلبہ قائم کر چکے ہیں اور انہیں اپنا بے دام غلام اور دوست بھی بنا چکے ہیں۔ یہ راز اب مجھے میرا یہ شکار اُگلنے والا تھا۔

ایک محفوظ مقام پر میں نے جیپ روک دی۔ میرے شکار کو ہوش آنے لگا تھا۔ میں نے اس کی ٹوپی اُتار کر خود پہن لی تھی۔ اس سے دھوپ آنکھوں میں نہیں پڑتی تھی۔ یہ تقریباً میرے ہی قد و قامت کا آدمی تھا، رنگت بھی سرخ و سپید تھی، مگر اس پر کسی یورپین کا گمان نہیں ہوتا تھا۔ وہ انڈین ہی لگتا تھا۔

میں نے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر رسی سے باندھ دیے تھے۔ روانگی سے پہلے جیپ کی مختصر تلاشی کے دوران مجھے بس یہی ایک کام کی شے نظر آئی تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ تڑپنے لگا۔

''بس! حرکت نہیں..... تم پوری طرح میرے قابو میں ہو......''

میں نے اس کی طرف گن کا رخ کرتے ہوئے کھردرے سے لہجے میں کہا۔ وہ ٹھہرا اور پہلے گرد و پیش کا ایک طائرانہ سا جائزہ لیا، شاید وہ اپنے ساتھیوں کی موجودگی کا احساس کرنا چاہتا تھا۔

''یہاں اس بنجر ویرانے میں صرف میں اور تم ہیں......'' میں نے اس کی متلاشی اور گردشی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے اس سے تحکمانہ کہا۔ ''میری تم سے کوئی دشمنی

نہیں ہے۔ مجھے صرف سوالوں کے جواب چاہئیں۔''

''تم انہی کے ساتھی ہو جو ساحل کے قریب......'' اس نے اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''نہیں......'' میں نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''وہ میرے دشمن تھے اور انہوں نے میری ایک ساتھی کو ہلاک کر ڈالا تھا، تم نے شاید اس کی لاش وہاں ریت میں پڑی دیکھ لی ہوگی۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور بہ غور اپنی آنکھیں سکیڑے میری طرف دیکھتا رہا۔

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میرے سوالوں کے جواب دو گے یا پھر میں تمہیں گولی مار کر آگے بڑھ جاؤں......؟''

میں نے آخر میں سفاکی سے کہا تو وہ مجھے اسی طرح گھور گھور کر شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے گومگو سے لہجے میں بولا۔ ''کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''تم لوگ کون ہو اور کس گروپ سے تعلق رکھتے ہو؟ ان کلی منجارین وحشیوں پر تم لوگوں نے کس طرح اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے؟ اور کیوں؟''

اس نے میرے جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر ادھر اُدھر دیکھا اور پھر تھوک پھینکا۔

مجھے اس کے انداز میں تضحیک اور حقارت کا عنصر محسوس ہوا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اسی لہجے میں استہزائیہ ہنسی سے بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے سوالوں کے جوابات دے دوں گا؟''

اس کے انداز بے پروائی نے میرا دماغ گھما دیا اور میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا ٹھوس آہنی کندا اس کی ٹھوڑی پر ''دھا'' دیا۔ اس کے حلق سے تیز کراہ خارج ہو گئی۔ اس کا کوئی دانت ٹوٹ گیا تھا، جسے اس نے خون آلود لعاب تھوک کی صورت، نیچے بھربھری مٹی میں اُچھال دیا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کا گریبان دبوچا اور جیپ کی سیٹ سے نیچے گھسیٹ کر گرم تپتی ریت پر پھینک دیا۔ پھر اس کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا اور گن کی نال اس کے منہ کے اندر گھسیڑ ڈالی اور غرا کر بولا۔ ''میرے تین ساتھی ان وحشیوں کے قبضے میں ہیں...... جنہیں آزاد کرانے کی خاطر میں نے یہاں تک کا دشوار گزار سفر کیا ہے...... سمجھے تم؟ مجھے بتاؤ گے تم کہ وہ کہاں اور کس حالت میں ہیں؟ ورنہ گولی مار کر تمہارا حلق پھاڑ دوں گا......''

میں نے کہنے کے بعد گن کی نال اس کے منہ سے باہر کھینچ لی۔ اسے کھانسی کا ایک زبردست ٹھسکا لگا، میں نے شاید جوشِ غیظ تلے گن کی نال اس کے حلق تک اُتار دی تھی۔ میں نے اُسے ذرا سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ تھوڑا کھانستے رہنے کے بعد میری طرف اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھنے لگا پھر ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''مم...... مجھے تمہارے ان تینوں ساتھیوں کا کچھ بھی نہیں پتا......''

''کیسے نہیں پتا تمہیں؟'' میں غضب ناک لہجے میں غرا کر بولا۔ ''تم ان کے ساتھی ہو اور میرے تینوں ساتھی انہی کی قید میں ہیں۔''

''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہوتی تو میں تم سے کیوں چھپاتا؟ ہمارا یوں بھی تمہارے ساتھیوں سے بھلا کیا لینا دینا۔''

مجھے اس کے لہجے سے مکاری کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے پھر، اگر تم نے واقعی مجھ سے سچ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں...... ہاں! البتہ اپنے ساتھیوں کی آزادی کے سلسلے میں جو کر سکتا ہوں وہ تو میں ضرور ہی کروں گا...... یوں بھی میں منزل کے قریب ہوں اور میرے پاس تم سے سچ اُگلوانے کا وقت بھی نہیں......''

بڑے ڈرامائی انداز اور لہجے کو دانستہ سنسنی خیز بناتے ہوئے میں نے گن جیپ کے ساتھ ٹکائی اور اس کی طرف بڑھا، اس کی پسینے سے تر پیشانی پر اُلجھن آمیز پریشانی کی شکنیں سی ابھریں۔ پھر وہ لکنت زدہ لہجے میں مجھے اپنی طرف جھکتا دیکھ کر بولا۔

''تت...... تم کیا کرنا چاہتے ہو......؟''

''خاموش......! ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کے بعد اس کی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔

''ی ی...... ی...... یہ کیا کر رہے ہو تم؟''

میں نے ایک تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا اور پھر اس کی شرٹ کے بٹن کھول کر وہ اُتار لی۔ اس کے لیے مجھے اس کم بخت کے دونوں رسن بستہ ہاتھ کھولنا پڑے، اور یہ کام میں نے نہایت محتاط طریقے سے پہلے اس کے دونوں پیروں میں رسی باندھ کر کیا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس کے ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے تھے پھر اسی طرح اس کی پتلون بھی اُتار لی۔

اب وہ صرف ایک جانگیا میں تھا اور باقی سارا اس کا جسم برہنہ تھا۔

”تم اس طریقے سے بھی کامیاب نہیں ہوسکو گے......“ وہ اب کہیں جاکر میری اس حرکت کا مطلب سمجھا تھا۔

”یہ میرا دردِ سر ہے...... تمہارا نہیں۔“ میں نے بے پروا انداز میں کہا۔ ”تم اپنی فکر کرو کہ یہاں بنجر اور تپتے صحرائی ویرانے میں ننگے بدن تپتی دھوپ کے نیچے کسی کی مدد کے انتظار میں جانے کب تک بیٹھے رہو گے؟“

میں نے خوفناک نقشہ کھینچ کر اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا چاہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ یعنی اب اس کا لباس اور ٹوپی میں نے پہن لی تھی۔ لباس کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے کچھ شناختی کاغذات برآمد ہوئے جس کے مطابق اس کا نام دیال داس تھا۔ شہریت اس کی بھارتی تھی اور رہنے والا یہ ممبئی کا تھا۔ میری پیشانی پر سوچ آمیز شکنیں نمودار ہوگئیں۔

نام دیال داس، شہریت بھارتی اور رہائش ممبئی...... یہ کون سا گروپ ہوسکتا تھا اور یہاں ایک دور افتادہ جزیرے کے ایک وحشی قبیلے کو کس طرح اپنا تابع بنا چکا تھا اور کیوں......؟ نیز یہاں ان کے فروکش ہونے کا مقصد کیا تھا؟

یہ ایک بڑا سوالیہ نشان تھا میرے لیے۔ دیال داس مجھے یہ ساری حقیقت بتا سکتا تھا۔

”پپ...... پلیز! مجھے اپنا لباس تو پہنا دو...... میں سچ کہہ رہا ہوں، مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں علم نہیں ہے۔“

”چلو، مانے لیتا ہوں، تمہیں میرے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں پتا...... مگر یہ تو بتا سکتے ہو کہ تم لوگ ہو کون؟ اور یہاں ایک وحشی قبیلے کو تم لوگوں نے کس طرح اپنا تابع بنا رکھا ہے؟“

میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا تو وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”ہم ایک غیر ملکی این جی او...... ”سروائیول انٹرنیشنل“ کے ملازم ہیں۔ وہ یہاں پر بسے ہوئے قبائیلیوں کی بقا اور ان کی ناپید نسل کو بچانے اور ان کے حقوق کی آواز کو بھارتی حکومت اور عالمی برادری تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ ہمارے تابع ہیں، بلکہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ ہمارا مقصد جاننے کے بعد یہ ہمارا ہر طرح سے ساتھ دینے کو تیار ہیں۔“

”اچھا!“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ کہا۔

”یہ کیسی این جی او ہے جو ایک طرف تو ان قبائیلیوں کی بقا و بہبود کے لیے کام کر رہی ہے اور دوسری طرف اُن لوگوں کا بیدردی سے خاتمہ کر رہی ہے جو باہر سے آکر ان کی عمل داری میں دخل انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہیں؟“

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں یہاں ان لوگوں کی بربریت کے مظاہرے دیکھ چکا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ جیسے بات بناتے ہوئے بولا۔ ”ہماری جنگ ہر اُس شخص سے ہے جو مجرمانہ مقاصد کے ساتھ یہاں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”مثلاً...... ان کے مجرمانہ مقاصد کیا ہوسکتے ہیں؟ اس کی ذرا تشریح کرنا پسند کرو گے؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بدستور استہزائیہ لہجے میں کہا۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھے ہوئے تھا، سمجھ رہا تھا میں اس کی باتوں میں آجاؤں گا۔

”وہ...... وہ...... مقاصد کسی بھی قسم کے ہوسکتے ہیں۔“

”چلتا ہوں میں...... خود ہی مجھے حقیقت کا پتا چل جائے گا۔“ میں نے کاندھے جھٹکے اور پھر اس کے منہ میں اسی کا رومال ٹھونس دیا۔ وہ بے چین ہوکر اِدھر اُدھر اپنا سر مارنے لگا۔ میں اسے چھوڑ کر جیپ لیے آگے بڑھ گیا۔

دال میں کچھ کالا تھا۔ کلی منجارو کی سرزمین میں یہ گروپ کیا کر رہا تھا، اس کا مجھے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی قابلِ تحسین فعل نہیں ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ کچھ بھی کرتا رہے مجھے اس کی پروا نہ تھی، میں تو اپنے ساتھیوں کو چھڑانے کے بعد اُلٹے پیروں اس منحوس جزیرے سے فرار چاہتا تھا۔

دیال داس کا میں بھیس بھر چکا تھا۔ ساتھ ہی اپنی ”پری پلاننگ“ کے مطابق میں اس سے باتیں کرنے کے دوران اس کے لب و لہجے اور آواز پر بھی غور کرتا رہا تھا۔ اس کا لہجہ دبا دبا اور آواز بھاری مگر گھٹی گھٹی تھی۔ رہا شکل و صورت کی مماثلت کا مسئلہ تو وہ اپنی جگہ تھا، مگر دیکھنا تھا کہ اتنی گنجائش کے دوران میں کب تک ان کے درمیان ان کا ساتھی بن کر رہ سکتا تھا اور کیا کر سکتا تھا تاہم میری کامیابی کا دورانیہ مختصر ترین بھی ثابت ہوتا تو یہ میرے لیے بہت ہوتا۔ یہی سوچ کر میں نے یہ سارا روپ دھارا تھا۔ تاہم متوقع کامیابی کے اس قلیل ترین عرصہ کو کچھ طول دینے کی غرض سے میں نے اپنی ”پری پلاننگ“ کے مطابق اپنے چہرے پر کچھ اس طرح کی مصنوعی خراشیں ڈال لی تھیں جس سے میرا چہرہ پوری طرح نہیں پہچانا جاتا تھا۔

میں نے ایک لائحہ عمل کے تحت اپنی منزل کا راستہ عارضی طور پر بدل لیا تھا اور اب اسی سمت کو واپس لوٹ رہا تھا جہاں میرے شکار کے ساتھی بھولا ناتھ گروپ سے برسر

پھکار تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے جیپ روک دی اور صورتِ حالات کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے وہاں لاشیں بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ ان میں وحشیوں کی بھی لاشیں تھیں، میں نے ان کا جائزہ لیا تو اِکا دُکا مجھے ہوش میں مگر زخمی حالت میں نظر آئے۔ باقی غائب تھے۔ جیپ بھی نہیں نظر آرہی تھی۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے ان کا ساتھی بن کر دو کلی منجاریوں کو اُٹھایا اور جیپ میں اس طرح ڈال دیا کہ وہ دور سے ہی جیپ میں لدے ہوئے نظر آتے رہیں۔

میں ابھی پلٹ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک فائر ہوا، میں بری طرح ٹھٹک گیا۔ میں نے گردن موڑ کر عقب میں دیکھا تو وہاں مجھے چار افراد کھڑے دکھائی دیے۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، وہ انہی کے ساتھی تھے۔ تین کلی منجارین اور ایک پینٹ شرٹ میں ملبوس۔ اس نے اپنی گن کا رخ فضا میں کر رکھا تھا، اس بات کا فوری ادراک ہوتے ہی کہ اپنی جیپ پہچان کر اور غالباً مجھے اپنے مخصوص لباس میں دیکھ کر مجھے متوجہ کرنے کے لیے اس نے ہوائی فائر داغا تھا۔

اب آر تھا یا پار میں نے فوراً جیپ کا اسٹیئرنگ گھمایا اور ان کی طرف موڑ کر قریب جا پہنچا۔

اپنے کلی منجارین ساتھیوں کو جیپ میں پڑا دیکھ کر وہ تینوں وحشی ان کی طرف بڑھے۔ جبکہ شرٹ پینٹ والا غصے سے اپنے دانت بھینچتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے منہ پہ ایک زوردار تھپڑ رسید کر کے پُرطیش لہجے میں بولا۔

”تم کدھر دفان ہو گئے تھے دیال!“

اس کے تحکمانہ لہجے نے فوراً ہی مجھے باور کرا دیا کہ یہ اس گروپ کو لیڈ کر رہا تھا۔ تھپڑ کھانے سے میرے سر کی ٹوپی نیچے گر پڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں چونکنے پن کی علامات ابھری تھیں۔ میں جلدی سے جیپ سے اُتر کر ٹوپی اُٹھانے کے لیے جھکا اور پھر اسے دوبارہ سر پہ جمانے کے بعد لرزتے لہجے میں بولا۔

”سر! میں جیپ لینے کے لیے بھاگا تھا، تاکہ دشمنوں کا تعاقب کیا جا سکے۔ مگر وہاں پہنچا تو دشمنوں کے دو ساتھی مجھ سے بھڑ گئے، میرے ہمراہ یہ دونوں بھی تھے۔“ میں نے جیپ میں بے سدھ پڑے دو کلی منجارین کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ دونوں زخمی ہو گئے، میرا بھی یہی حال ہوا مگر میں نے ان دونوں سے جم کر مقابلہ کیا اور ایک کو ہلاک کر ڈالا اور دوسرے پہ تشدد کر کے یہ حقیقت اُگلوانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ تھے کون؟“

اس سے بات کرنے کے دوران میں نے اپنی ٹوپی کا چھجا ذرا نیچے جھکا لیا تھا۔ وہ میرے چہرے کی خراشوں سے مجھے پہچاننے کے معاملے میں تھوڑی دیر تذبذب کا شکار رہا تھا مگر میری بات اور انکشاف نے اسے اس اُلجھن سے فرو کر دیا۔ بولا۔ ”کون تھے وہ؟“

”بھولا ناتھ اور اس کے ساتھی تھے وہ......“ میں نے دیال سنگھ جیسے گھٹے گھٹے اور بھرائے ہوئے لہجے میں بتایا تو وہ بری طرح ٹھٹکا۔ جس سے مجھے صاف اندازہ ہوا کہ وہ اس سے غائبانہ واقف تھا۔

”کیا تم صحیح کہہ رہے ہو؟“

”جی ہاں، جناب! بالکل صحیح کہہ رہا ہوں...... آہ......“ آخر میں دانستہ میں کراہا...... اور اپنے خراش زدہ چہرے پہ یونہی ہاتھ پھیرا۔ اسی اثنا میں اس کے دو ساتھی اور وہاں آ گئے اور ایک نے مجھے دیکھ کر اپنا غصہ نکالتے ہوئے برہمی سے کہا۔

”تم کہاں مر گئے تھے؟ ہمیں گاڑی کی ضرورت تھی۔“

مجھے یہاں دیال داس کی حیثیت کا اندازہ بھی ہونے لگا تھا کہ وہ ان کا ساتھی ضرور تھا مگر اس کی وقعت ان کی نظروں میں ایک ادنیٰ ملازم سے زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھا یا شاید ان کے درمیان نیا تھا۔ یہ بات میرے مفاد میں جاتی تھی، یوں یہ مجھ پر زیادہ توجہ نہیں رکھ سکتے تھے۔

”اس نے بڑا کام کیا ہے۔“ تحکمانہ انداز میں مجھ سے بات کرنے والے نے ان سے کہا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر جب اس نے انہیں یہ ”حقیقت“ بتائی تو وہ چونک پڑے۔

”اوہ...... سر! اس کا مطلب ہے جنرل صاحب کا خدشہ درست ثابت ہوا......“ دوسرے نے قدرے فکر سے کہا تو میرے اندر ”جنرل“ کے ذکر پر ایک دھماکا سا ہوا۔

جنرل کے لاحقے نے میرے اندر ”جنرل کے ایل ایڈوانی“ کا تصور ابھارا تھا مگر یہ ابھی قبل از وقت تھا کہ بھلا اس کا یہاں کیا کام اور کیا مقصد؟ تاہم میں اندر سے کھٹک ضرور گیا تھا۔

”گوبارانڈیمان کے ذان کو بھلا کس طرح اس کی بھنک پڑی ہوگی......؟ یہ ازجمن سمجھ میں نہیں آتی۔“ تحکمانہ انداز میں بات کرنے والے نے خود کلامیہ بڑبڑاہٹ سے کہا۔

”صاف سی بات ہے سر! اسی طرح خبر ہوئی ہوگی جیسے اوروں کو ہوئی “ اس کے پہلے والے ساتھی نے کہا۔

میں یہ غور گویا گنگی باندھے ان کی گفتگو سنے جا رہا تھا۔ باقی وہ تینوں کلی منجارین جیپ میں پڑے اپنے دونوں ساتھیوں کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

''یہ سارا کچھ جنرل صاحب کی لاڈلی پوتی اور اس کے پاکستانی یار کا کیا دھرا ہے، جس کی یہاں آمد کے شواہد بھی ہمیں ملے ہیں......'' وہ دانت پیس کر بولا اور میرے اندر جیسے پے در پے دھماکے ہونے لگے۔

''جنرل صاحب......''، ''لاڈلی پوتی''...... ''اس کا پاکستانی یار''...... بات کچھ کچھ واضح ہو رہی تھی۔

''تب پھر ہمیں بلراج صاحب سے کہنا پڑے گا کہ جتنی جلد ہو سکے وہ جنرل صاحب کو اس بات پر قائل کریں کہ وہ یہاں سے اپنا بوریا بستر گول کریں...... اُس منحوس ہیرے کی وجہ سے ایک بڑی عالمی تنظیم کا گروپ بھی ہمارے پیچھے لگ گیا ہے۔''

ہیرے اور بلراج کے ذکر نے میرا رہا سہا شبہ بھی دور کر دیا کہ یہ لوگ کس کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر ابھی تک میں یہ سمجھنے سے قاصر ہی تھا کہ بھلا جنرل ایڈوانی کو یہ کیا سوجھی تھی کہ وہ شہر چھوڑ کر یہاں ان وحشی قبائلیوں کی پناہ میں آیا ہوا تھا اور یہ اہم سوال اپنی جگہ پر تھا کہ اس نے ان وحشی قبائلیوں کو کس طرح رام کر رکھا تھا؟

میری ''پری پلاننگ'' کی ابتدا میں ہی بہت سی سنسنی خیز باتوں کا انکشاف ہوا تھا اور کئی چونکا دینے والے حقائق سے پردہ ہٹا تھا اور آگے بھی جانے کیا کچھ سامنے آنے والا تھا۔

''بلراج سنگھ، جنرل صاحب کا چہیتا ہے جو جنرل صاحب کی مرضی ہوتی ہے وہی بلراج صاحب کی، ہم کچھ نہیں کر سکتے، زیادہ اعتراض اُٹھائیں گے تو ہمیں خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا جائے گا، بلراج سنگھ جیسے درندہ صفت اور کینے انسان سے میں اچھی طرح واقف ہوں......''

تحکمانہ انداز میں کہنے والے کی اس بات سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہوا تھا کہ یہ لوگ بھی خائف تھے۔

''چلو اب واپس چلیں......'' اس نے کہا اور مجھے جیپ اسٹارٹ کرنے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ جیپ میں سوار ہو گئے اور میں نے ایک جھٹکے سے جیپ آگے بڑھا لی۔

میرا دل اپنی اس کامیابی سے بے طرح دھڑک رہا تھا مگر بقول شاعر ؎ ابھی آگے امتحاں اور بھی تھے...... کے مصداق کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ میری اس کامیابی کی عمر کتنی ہو سکتی تھی؟

جیپ دوڑاتے ہوئے میرے ذہن میں ان لوگوں کی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

شمارہ جنوری 2017ء
کی جھلکیاں

سراب
طویل سرگزشت کا آخری حصہ

اعلیٰ حضرت
اس شخصیت کا زندگی نامہ
جس نے ذہنی انقلاب لایا

شمشال سے تورنٹو
ایک چونکانے والے موڑ پر، دلچسپی
سے بھرپور الگ انداز کا سفرنامہ

سنگ دل
ایک دوشیزہ کی دلچسپ سچ بیانی

نو آموز تخلیق کار
فلمی دنیا کے دو ہدایت کاروں کی ان کہی کہانی

اس کے علاوہ
بھی بہت سی سچ بیانیاں، سچے
قصے، تاریخی واقعات

باتوں سے کئی طرح کے منصوبے آنے لگے، میں ان پر غور بھی کرتا جاتا اور ساتھ ہی سامنے نظریں اور ان کی آپس کی باتوں پر توجہ بھی رکھے ہوئے تھا۔

''کیا ہوگیا ہے تمہیں دیال؟ اس طرف سے چلو ..... کیا راستہ بھول گئے ہو؟''

اچانک میرے برابر میں بیٹھے ہوئے گروپ لیڈر نے مجھے درشت لہجے میں ٹوکا تو میں نے فوراً بات بنائی۔ ''سر! میں تو احتیاط کے پیشِ نظر دوسرا راستہ اختیار کرنا چاہتا تھا...... چلیں جیسے آپ کی مرضی.....'' یہ کہتے ہوئے میں نے جیپ کو اسی کے اشارے پر ڈال دیا۔

ظاہر ہے مجھے پوری طرح ان کے ٹھکانے کے راستوں کا اندازہ نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف نانا شکور کے بتائے ہوئے راستوں کا ادراک تھا جو غلط تو نہیں تھے، مگر بہرحال ان لوگوں کے حساب سے مجھے نسبتاً شارٹ کٹ راستہ ہی اپنانا چاہیے تھا، جس سے میں ناواقف تھا۔

''پتا نہیں کیوں جرنل صاحب نے نئے لوگوں کو بھی بھرتی کرلیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، وہ اتنے لوگوں کا ہجوم بنا کر کس کے لیے فوج بنانا چاہتے ہیں؟''

عقبی سیٹ پر بیٹھے اس کے ایک ساتھی نے بیزار کن تبصرہ کیا تو مجھے یہ خوش کن اندازہ ہوا کہ میں نے جس دیال داس نامی آدمی کا ''حادثاتی'' بہروپ بھرا تھا وہ ان میں کوئی نووارد ہی تھا۔

میں نے موقع پاتے ہی اپنے لہجے میں بے چارگی اور لجاجت سموتے ہوئے کہا۔ ''کیوں صاحب جی! کیوں مجھ غریب کی روزی پر لات مارنا چاہتے ہیں؟''

''تم اپنے کام سے کام رکھو دیال!'' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے مجھے گھرکا۔

میرے بہروپ میں خاطرخواہ ''رنگ'' بھرنے لگا تھا اور مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میری باقی کی ''گیم'' بھی اب بغیر کسی خون خرابے اور مارا ماری کے خیر خیریت سے گزرے گی۔ تقدیر میرا ساتھ دے رہی تھی، اگرچہ اس کی تدبیر میں ہی کررہا تھا۔

جلد ہی ہم ایک بستی میں داخل ہو گئے جہاں بے ترتیب سی قطاروں کی صورت میں کھپریل کی مخروطی چھتوں والی جھونپڑیاں تا حدِ نظر پھیلی ہوئی تھیں اور ننگ دھڑنگ جانگلی مرد عورتیں اور بچے اِدھر اُدھر چکراتے پھر رہے تھے۔

میرے لیے اب ایک مشکل پیش آگئی تھی کہ مجھے ان کی منزل کا پتا نہیں تھا کہ انہوں نے کہاں اور کس طرف جانا تھا۔ میری یہاں ذرا سی بھی غلطی مجھے پھنسا سکتی تھی۔ اچانک میں نے جیپ روک دی اور اسٹیئرنگ سے ہاتھ ہٹا کر اپنے خراش زدہ چہرے پر رکھ کر کراہنے لگا۔

''آہ ..... بڑی جلن ہو رہی ہے میرے زخموں پر.....شاید یہ دھوپ کی وجہ سے ہے.....اُف۔''

میری اس چالاکی کا خاطر خواہ اثر نکلا، لیڈ کرنے والے نے اپنے ایک ساتھی کو پکارا۔ ''اوئے..... بھگت! چل تُو سنبھال اسٹیئرنگ کو اور دیال! پیچھے جا تو.....''

میں اُف..... اور ہائے وائے کرتا ہوا جیپ سے اُترا اور پھر پچھلی سیٹ پر آگیا۔ جیپ آگے بڑھ گئی اور میں نے اندر ہی اندر اطمینان کی سانس خارج کی۔

میں نے اپنے انداز و اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں پہلی بار اس بستی میں داخل ہوا تھا۔ تاہم میں دُزدیدہ نظروں سے اطراف کا جائزہ بھی لیتا جارہا تھا۔

اس پسماندہ سی بستی میں ایک جیتی جاگتی زندگی آباد تھی۔ تہذیب و تمدن سے کوسوں دور یہ باشندے دنیا والوں کے سامنے وحشی کہلاتے تھے، مگر حقیقت میں ان کی زندگی بڑی قابلِ رحم تھی۔ تپتی دھوپ اور بلا کی گرمی میں یہ لوگ ننگے پنڈوں کے ساتھ روزمرہ کے کاموں میں مشغول تھے۔ یہاں مال مویشی بھی نظر آرہے تھے جن میں گائے بھینسوں اور بکریوں کے علاوہ کُتّے اور سؤر بھی شامل تھے۔

مجھے ایک بات پر حیرت ہوئی تھی۔ یہ لوگ کہیں سے بھی جنگجو نظر نہیں آرہے تھے۔ اس کے برعکس ان کے جسم نحیف و نزار اور مدقوق تھے۔ کئی ایک کو تو میں نے چلتے چلتے گرتے ہوئے بھی دیکھا تھا، چند ایسے بھی تھے جنہیں میں نے کسی معذوری کے باعث چوپایوں کے مانند بھی چلتے ہوئے دیکھا۔ عورتوں کی حالت مجھے زیادہ قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔

ان کے اُوپری جسم بالکل برہنہ تھے۔ نیچے تک کھلا لاچا سا باندھے رکھا تھا۔ جسم سوکھے اور نچڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ چہرے گول اور کانوں میں پیتل کے بالے تھے۔ مردوں کا بھی یہی حال تھا۔ ان کی پسلیاں تک باہر کو آرہی تھیں۔ یہ سارے مجھے ان لوگوں سے بالکل مختلف نظر آرہے تھے جن وحشیوں سے میرا ٹاکرا ہو چکا تھا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ اگر میں اُن وحشیوں کا موازنہ اِن سے کرتا ہوں تو یہ لوگ مجھے ان سے قطعی مختلف نظر آرہے تھے۔ اِن کے چہروں سے تو بے بسی، اُداسی اور مایوسی کے ساتھ بے چارگی بھی ٹپک رہی تھی۔ یہ تو خود قابلِ رحم نظر آرہے

تھے مجھے، بھلا کسی اور کے لیے کیا خطرہ بن سکتے تھے۔ یوں میں اُن وحشیوں کی طرف دیکھتا ہوں جن سے میرا مقابلہ ہوتا رہا تھا تو وہ اِن کے مقابلے میں توانا، صحت مند اور جنگجو نظر آتے تھے، یہ الگ بات تھی کہ ان کی ''ہیئت'' ایک ہی تھی۔ یعنی وہ بھی قبائلی تھے تو یہ بھی انہی جیسے ہی نظر آتے تھے۔ ان کے چہروں سے مفلوک الحالی ٹپکتی تھی تو کلی منجارین کے چہروں سے بے رحمی اور سفاکی مترشح ہوتی تھی۔

یہ کیا چکر تھا؟ ابھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا مگر لگتا ایسا ہی تھا کہ کوئی بڑا اور گہرا چکر تھا اور اس کا تعلق اس خبیث جنرل کے ایل ایڈوانی سے جڑتا تھا۔

میں بظاہر جیپ کی عقبی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا اور میرے برابر میں اُن کا ساتھی۔ بالکل پچھلے حصے میں کلی منجارین تھے۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا میرا (دیال کا) ساتھی اُن ننگ دھڑنگ قبائلی جوان عورتوں کو شیطانی نظروں سے دیکھتے ہوئے مجھے ہلکا شہوکا مار کر سرگوشی میں بولا۔

''اوئے دیالے! وہ دیکھ...... ہماری بلیک کوئین ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے...... لگ رہا ہے اسے کل رات مزہ آیا تھا۔''

''ہیں...... آں...... ہاں، کہاں ہے وہ؟ مجھے تو نظر نہیں آرہی ہے؟'' میں نے جیسے خیالات سے چونک کر کہا۔

''وہ دیکھ، اُس طرف، جہاں دو جھونپڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔''

اس نے کہا اور میں نے اس طرف نظریں پھینکیں۔ وہاں دیگر قبائلی ادھیڑ اور جوان عورتیں بھی کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھیں، مگر ان کے چہروں سے کہیں بھی خوشی یا خیر مقدمی کی مسکراہٹ چھلکتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی جگہ خوف، نفرت اور سراسیمگی کا عنصر غالب نظر آتا تھا۔ صرف ان میں ایک وہ واحد عورت تھی، جو قدرے صحت مند اور متناسب جسم کی مالک تھی اور اس کے چہرے کے نقوش بھی خاصے کشش انگیز تھے، باقی رنگ اس کا بھی اپنی ہم قبیلہ عورتوں جیسا ہی کالا سیاہ تھا۔ یہ سب اُوپری دھڑ سے برہنہ تھیں اور ان کا شباب غربت، مصائب اور سخت کوش زندگی کی دھوپ میں ڈھلتا ہوا ہی لگ رہا تھا۔ مگر وہ ''بلیک کوئین'' ذرا صحت مند دکھائی دیتی تھی۔

وہ اپنی ساتھی خواتین سے ذرا پیچھے کھڑی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بھی ہلا دیا تھا، تب ہی اچانک ایک عورت کی اس پر نگاہ پڑ گئی اور پھر دونوں میں لڑائی ہوگئی۔

جیپ آگے جا چکی تھی۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ سارا چکر کیا تھا۔ تاہم اس ''بلیک کوئن'' (پتا نہیں یہ اس عورت کا نام تھا یا پھر میرے ساتھی نے خود سے رکھ چھوڑا تھا) کون تھی؟ اور اس نے اور دیال نے کل رات اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔ کچھ شرمناک سا اندازہ تو ہوا، پھر اس سے آگے میں کچھ سوچ نہ سکا۔

جیپ ان جھونپڑیوں سے راستہ بناتی ہوئی بہت کم رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی اور یہ قبائلی جانگلی ایک طرف کھڑے ہو کر ہماری طرف گھورنے میں محو تھے، ان کی آنکھوں میں اب بھی ہمارے لیے ناپسندیدگی اور سراسیمگی کے جذبات موجود تھے۔

معاً ہی میری نگاہ ایک عجیب سے شخص پر پڑی۔ عجیب تو خیر اسے نہیں کہہ سکتے تھے، بلکہ اسے قابلِ رحم کہنا ہی زیادہ مناسب تھا۔ اگرچہ یہاں مجھے ایسے کچھ اور بھی جانگلی دکھائی دیے تھے، یہ بھی انہی میں سے ایک تھا، کچھ زیادہ معذور تو نہیں تھا یہ جیسا دیگر کچھ معذور ایسے تھے جنہیں میں نے چوپایوں کی طرح چلتے دیکھا تھا۔ اس کی صرف ایک ٹانگ میں 'لنگ' تھا۔ وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔ اچھے ڈیل ڈول کا مالک تھا مگر اس کے ننگ دھڑنگ جسم پر کوڑھ کے داغ نظر آتے تھے۔ چہرہ بھی کوڑھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ لنگڑا لنگڑا کر ہماری جیپ کے ذرا قریب آکر ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا تو میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر پُرغور نظر ڈالی تو یکایک مجھے ایک جھٹکا لگا۔

اس لنگڑے کوڑھی کا چہرہ مجھے شناسا سا محسوس ہوا، پھر ایکا ایکی میرے ذہن میں اس کے تصوراتی خدوخال اور شبیہ واضح ہونے لگی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ اب میں بھی اس کی طرف گردن موڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر اور ''پہچان'' کر میں نے اپنے سر سے ٹوپی بھی اتار دی تھی تاکہ یہ بھی مجھے اچھی طرح ''پہچان'' لے۔ یہ کبیل دادا تھا۔

☆☆☆

کبیل دادا یہاں دانستہ ایک کوڑھی کے بھیس میں تھا یا اسے واقعی کوڑھ ہو چکا تھا۔ ابھی اس کا اندازہ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی تھی۔ پتا نہیں اس نے بھی مجھے پہچانا تھا یا نہیں۔ وہ تب تک دور ہو گیا تھا مگر میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اسی طرح بدستور لنگڑاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ کچھ دور جانگلی بھی چلے آرہے تھے۔ بیشتر اپنی اپنی بولیوں میں ان سے بے چارگی کے عالم میں کچھ کہہ رہے

تھے۔ انداز ان کا داد و فریاد کرنے جیسا ہی تھا۔ کبیل دادا بھی ان میں ایسا ہی لگتا تھا۔

میرے اندر شدید قسم کی دھکڑ پکڑ سی مچ گئی تھی، میں سوچ رہا تھا باقی میرے ساتھی کہاں تھے؟ اول خیر اور شکیلہ کہاں تھے؟ اور کس حال میں تھے؟ اور پھر سوشیلا...... وہ بے چاری کہاں اور کس حال میں تھی، کیا وہ ابھی ان کے ہتھے نہیں چڑھی تھی یا پھر چھائی کے جنگلوں میں کسی موذی حیوان یا خونخوار درندے کا شکار ہو گئی تھی۔

میں چاہ رہا تھا جیپ کی رفتار مزید آہستہ ہو جائے تاکہ کبیل دادا جیپ کے کچھ اور نزدیک ہو جائے اور وہ مجھے پہچان بھی لے۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑا اور گہرا چکر چل رہا تھا جبکہ کبیل دادا کی ذہنی فراست کا میں بھی معترف تھا۔ وہ یہاں قیدی ہو کر بھی قیدی نہیں تھا اور شاید اپنی ہی کسی مہم بازی میں مصروف...... ان لوگوں کی آنکھوں میں کوڑھی معذور بن کر دھول جھونک رہا تھا۔

اچانک ایک پکی عمر کی عورت روتی ہوئی جیپ کے سامنے آ گئی۔ اس نے ایک تین چار سال کا بچہ اپنی گود میں اُٹھا رکھا تھا۔ عورت کا رنگ انہی کی طرح سیاہ تھا۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیے، جیپ کی رفتار پہلے ہی آہستہ تھی۔ وہ رک گئی۔

میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہمیں لیڈ کرنے والا سرغنہ اس عورت سے اسکی زبان میں چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا جو میرے لیے سر بہ سر اجنبی تھی۔ وہ انہی کی بولی بول رہا تھا شاید۔ اس کے بولنے کے انداز میں درشتی اور دھمکی تھی۔ لہجہ حاکمانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ اپنی گن بھی اس پر تانے ہوئے اسے جیپ کا راستہ چھوڑنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مگر وہ عورت اپنے معصوم بچے کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھائے اس کے سامنے بلند کر کے روئے جاتی تھی اور ساتھ ہی نجانے کیا بولے بھی جا رہی تھی، مگر چونکہ جذبات و احساسات کی ایک ہی زبان ہوتی ہے اسی لیے صاف لگتا تھا کہ وہ فریاد کر رہی تھی اور اس کا بچہ بھی بیمار نظر آتا تھا۔ وہ ان سے مدد مانگ رہی تھی شاید۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اسی اثنا میں اسی کے قبیل کے دیگر مرد عورتوں نے اسے تھام لیا اور راستے سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی وقت ایک فائر ہوا۔ وہ بدنصیب عورت تیورا کر گری۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی، جس سے اس کا بھیجا اُڑ گیا تھا۔ لوتھڑے فضا میں بلند ہوئے تھے، وہ بچہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑا...... باقی قبائلی خوف سے چیخیں مار کر کائی کی طرح چھٹتے چلے گئے۔ وہ بیمار بچہ، دھوپ تپتی ننگی اور بھربھری مٹی والی زمین پر گر پڑا۔ اس کے اع ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

یہ دل دہلا دینے والا منظر مجھے سرتاپا لرزا گیا تھا، کسی خوف سے نہیں بلکہ ایک معصوم، لاچار اور مصیبتوں کی ماری ایک بے گناہ دُکھیاری عورت کی اس طرح سفاکانہ ہلاکت پر...... مگر میں چونکا بھی تھا، کہ یہ گولی کس نے چلائی تھی؟ کیونکہ یہ گولی ہمارے (دیال داس کے) گروپ سرغنہ نے نہیں بلکہ کسی اور نے چلائی تھی۔

اس اثنا میں دیگر قبائلی جانگلیوں کے ساتھ کبیل دادا بھی لنگڑاتا ہوا ہماری جیپ کے ذرا قریب آ گیا...... وہاں تھوڑا شور اور چیخ و پکار سی مچ گئی تھی، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کبیل دادا کو اشارہ کر دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میں نے ٹوپی کو جھاڑنے اور جھٹکنے کے انداز میں ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے دیکھ کر یک شناسائی کی چمک ابھر آئی تھی۔ میں نے اسے ایک مخصوص اشارہ کیا اور ٹوپی دوبارہ سر پر رکھ کر اس کے چھجے میں اپنا نصف حد تک چہرہ چھپا لیا۔

جلد ہی وہ بے رحم اور سفاک انسان ہمیں نظر آ گیا۔ وہ دائیں جانب کے ایک کچے اور بل کھاتے ہوئے راستے پر، بے ترتیب پھیلی ہوئی جھونپڑیوں کے درمیان سے نمودار ہوا تھا اور اس کے ہمراہ اسی جیسے (ہمارے جیسے) دو مسلح افراد اور تین عدد کلی منجارن بھی تھے، جنہوں نے اپنے ہاتھوں میں ستان اور بھالے پکڑ رکھے تھے۔ وہ بے رحم شخص خاصا نزدیک آ چکا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول تھا، جس کی نال سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گولی اسی نے چلائی تھی۔ وہ ہمارے سرغنہ کے قریب آ گیا۔ اس نے ترچھی ٹوپی پہن رکھی تھی جسے اس نے اُونچی کر رکھی تھی۔ میں اسے یک ٹک تکے جا رہا تھا اور میرے اندر سیاہ طوفانوں کے بگولے اُٹھ رہے تھے۔

”نمستے چھوٹے سرکار جی!“ ہمارے سرغنہ نے اسے سلام کیا، انداز خوش آمدانہ تھا۔

وہ بے رحم چھوٹا سرکار ہمارے سرغنہ سے خرانٹ لہجے میں بولا۔ ”تم کیوں اس مریل کتیا پر اتنا وقت ضائع کر رہے تھے؟ لگتا ہے ایک گولی تجھ پر بھی خرچ کرنا پڑے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ سرغنہ اپنی جگہ گم صم سا رہ گیا اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"پچ...... پچھ...... چھوٹے سرکار! غلطی ہوگئی، آئندہ ان کیڑے مکوڑوں کو روندتا ہوا گزر جاؤں گا۔"

"ہاں! یہ ٹھیک ہے، یہ لوگ اسی قابل ہیں۔ انہیں غلام ہی رہنے دو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ انہیں بالکل بھی بولنے نہ دو......" ترچھی ٹوپی والا بولا، اور پھر ایک نظر ہم سب پر ڈالی۔ دیگر نے فوراً ہاتھ ہلا کر اسے سلام کیا، جبکہ گلی منجاریں نے اپنے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر سر کو خم کیا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی میں نے بھی ہاتھ ہلا دیا تھا حالانکہ میں اس ترچھی ٹوپی والے المعروف "چھوٹے سرکار" کو دیکھ کر سکتے میں آچکا تھا۔

یہ جنرل کے ایل ایڈوانی کا مقرب خاص کار پرداز...... بلراج سنگھ تھا،

☆☆☆

قبائلی اُس بدنصیب عورت کی لاش کو اُٹھا کر لے گئے تھے اور اس کے بیمار بچے کو بھی۔ مجمع اب چھٹ چکا تھا۔

میرے اندر سرسراہٹیں ہو رہی تھیں اور پورے وجود پر جیسے لاتعداد چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں۔ میرا ذہن یہ سوچنے سے یکسر قاصر تھا کہ آخر یہاں اس ذلیل ایڈوانی اور اس کے دست راست بلراج سنگھ نے کون سا پُراسرار چکر چلا رکھا تھا؟ یہ ابھی تک واضح نہیں ہو پا رہا تھا۔

"رتن لال! آج کیا پالا مار کے آرہے ہو؟ کیا کوئی نیا شکار؟"

اچانک چھوٹے سرکار...... بلراج سنگھ نے ہمارے سرغنہ کو مخاطب کر کے کہا تو وہ فوراً جیپ سے اُتر آیا اور ساتھ ہی ہمیں بھی اُترنا پڑا۔ میں نے دانستہ خود کو ان کے پیچھے رکھا تھا۔ اگر اس ظالم کو پتا چل جاتا تو یہ مجھے اِدھر ہی کھڑے کھڑے گولیوں سے چھلنی کر ڈالتا۔

"چھوٹے سرکار! باہر کی صورت حال بڑی خراب ہے۔" وہ خالص ہندی لہجے میں بولا۔ "ایک نہیں، دو نہیں، بلکہ بہت سے گروپ یہاں آن وارد ہوئے ہیں۔ بلکہ اب تو ایک بھولا ناتھ نامی بڑا ڈان بھی یہاں قدم رکھ چکا ہے۔ ہمارا ان سے بڑا جبردست ٹکرا بھی ہوا تھا، ہمارے ساتھی بھی کچھ مارے گئے، مگر ان کا کوئی بھی نہیں بچا تھا۔"

"اور وہ خود...... بھولا ناتھ؟" بلراج سنگھ نے ٹوپی اُتار کر اور اپنی آنکھیں اُچکا کر اس سے پوچھا۔

"وہ سالا بچ نکلا...... پر تو اب کیا کرے گا، اس کے اکھا آزی (ساتھی) مارے گئے ہیں...... وہ اب باؤلے کتوں کی طرح اس جنگل کی خاک ہی چھانتا رہے گا۔"

رتن لال نے جواب دیا اور اسی وقت بلراج سنگھ کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ اس کے بھاری ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ رتن لال کے چہرے پر پڑا تھا۔

"بھولا ناتھ کا نام شاید تم نے نہیں سن رکھا ہے یا پھر اُس کی حقیقت سے واقف نہیں ہو...... وہ اکیلا بھی کسی سے کم نہیں ہے اور یہاں رہتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں کی پوری فوج بلا سکتا ہے، جانتے نہیں ہو تم کہ وہ نارتھ انڈیمان کے ساؤتھ ایریا کا بادشاہ کہلاتا ہے، سب کو چھوڑ کر تمہیں اُسے نشانہ بنانا چاہیے تھا۔ وہ ضرور اپنے ساتھی شاکا کی تلاش میں یہاں آیا ہوگا۔"

رتن لال تھپڑ کھا کر اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔

"چھوٹے سرکار! آپ چنتا نہ کریں...... ہم اُسے بھی ڈھونڈ نکالیں گے اور......"

"تم اب تک شہزی اور اس بری گروپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تو بھولا ناتھ کا کیا کر لوگے۔" بلراج سنگھ غضبناک لہجے میں بولا۔

غالباً بری گروپ سے اس کی مراد کوہارا کا گروپ تھا۔ میں نے اندازہ لگایا۔

اسی وقت پیچھے سے شور کی آوازیں ابھریں۔ ہماری نظریں اس طرف کو اُٹھیں جدھر بلراج سنگھ اور اس کے ساتھی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے کچا دھول اُڑاتا ہوا راستہ تھا۔ وہاں سے اب ایک قافلے کی شکل میں لوگوں کا ایک ہجوم سا گزرتا ہوا نظر آنے لگا، وہ دوسری طرف نکلنے والے راستے کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ یہ بھی انہی کی طرح کمزور اور مدقوق قبائلی تھے، اور ان کے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے اور ان پر ڈنڈا بیڑیاں لگی ہوئی تھیں جبکہ انہیں جانوروں کی طرح ہانکنے والے، گلی منجاریں تھے اور ان کی "سپروژن" بلراج سنگھ جیسے چند مسلح آدمی کر رہے تھے۔ ان سارے مصیبت کے مارے قبائلیوں کی حیثیت غلاموں کی سی ہی نظر آتی تھی۔ یہ سب قیدی جوان اور پکی عمروں کے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔

مجھے یہ سارا گھن چکر کوئی بڑا ہی گمبھیر معاملہ نظر آرہا تھا جبکہ ابھی تک مجھے اپنے عزیز ساتھیوں کی کوئی جھلک بھی نہیں نظر آرہی تھی۔

پھر پتا نہیں یہ کون سا وقت تھا کہ میری یہ دعائیہ خواہش اسی وقت پوری ہوگئی۔

ان لوگوں نے تو ان پر ایک ہلکی سی نگاہ ڈالی تھی مگر میری نظریں غلاموں کے اس قافلے پر جم سی گئی تھیں۔ تب

ہی مجھے اُن دو افراد کی جھلک نظر آ گئی جو ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے چہرے بھی دیگر غلام قیدیوں کی طرح سُتے ہوئے نظر آرہے تھے اور ڈنڈا بیڑیوں سے یہ بھی ''لدے'' ہوئے تھے۔

ان دونوں کو پہچانتے ہی میں فرطِ جذبات سے اس قدر بے اختیار اور دیوانہ ہونے لگا تھا کہ میرا دل انہیں پکارنے کو چاہا تھا، مگر شکر ہوا کہ میں نے اپنی اس بے اختیاری خواہش کو بڑی مشکلوں سے دبائے رکھا تھا۔

سب سے پہلے مجھے نظر آنے والا میرا یار، دوست، بھائی اور مربی..... اول خیر اور پھر شکیلہ تھی۔ شکیلہ کی حالت تو مجھے سب سے زیادہ پتلی نظر آرہی تھی۔

میری بے چین اور منتظر آنکھوں کو سوشیلا کی بھی تلاش تھی۔ مگر وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی، اس کی ایک ٹانگ شدید زخمی تھی، ممکن ہے کہ وہ کسی اور جگہ قید ہو، مگر پھر ایک بات کا تصور کرتے ہی میں اندر سے لرز سا گیا۔ اگر وہ بدقسمتی سے بلراج سنگھ کے ہتھے چڑھ چکی ہوتی تو یہ درندہ صفت انسان سوشیلا کو تو دیکھتے ہی جان سے مار ڈالتا..... وہ یہاں کب زندہ رہ سکتی تھی۔ نجانے وہ غریب اس حالت میں، جبکہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو چکی تھی۔ جانے کہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔ پتا نہیں زندہ بھی تھی وہ بے چاری کہ نہیں..... مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔

تھوڑی دیر میں یہ قافلہ ایک طرف مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہیں شاید کسی بیگار پر لے جایا جارہا تھا۔ میں اپنی جگہ مُن ہو کر رہ گیا تھا، دل تھا جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

اپنے تینوں جری ساتھیوں کو زندہ پا کر مجھے جو خوشی ہوئی تھی وہ میرے لیے ناقابلِ بیان تھی۔ یہ میرے وہ وفادار اور جاں نثار ساتھی تھے جو میری تلاش (مدد) کے لیے پاکستان سے انڈیا آئے تھے مگر نجانے کیسے دھوکے سے اس رذیل بھوانی کے ہتھے چڑھ گئے اور یہاں پہنچا دیے گئے۔ انہیں اب اس حالت میں دیکھ کر مجھے یوں ہی لگا تھا جیسے ماضی کے ''کالے پانی'' کی خوں رنگ داستان دہرائی جارہی ہو۔

میرے اندر ڈھتے حوصلے اب توانا ہونے لگے تھے، اُمیدِ واثق کی اِک ذرا جھلک نے میرے اندر کوہ شکن عزم و حوصلے کی ایسی جوت جگا دی تھی کہ میں اب کسی بھی وقت کسی بھی بڑے طوفان سے درانہ وار ٹکرا جانے کے لیے تیار تھا۔

''تم ایک دم بیکار اور کام کے چور آدمی نکلے ہو..... اب مجھے خود اس ''آپریشن کلین اَپ'' کے لیے نکلنا پڑے گا اور تم میرے ساتھ ہوگے۔'' بلراج سنگھ نے رتن لال کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا اور پھر ایک تیز سی نگاہ ہم سب پر ڈالی۔ میں اندر سے خائف بھی تھا کہ کہیں کم بخت مجھ سے کوئی بات نہ چھیڑ دے۔ کیونکہ میرا اس سے کئی بار ٹاکرا ہو چکا تھا اور بہت دفعہ ایک دوسرے کے ساتھ دوبدو نبرد آزما بھی ہو چکے تھے۔

اگر وہ مجھ سے مخاطب ہوتا تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میری کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی جھلک تاڑ کر فوراً کھٹک جاتا، کیونکہ میں نے اسے ہر بار اور ہر محاذ پر شکست دی تھی۔ وہ مجھ پر بری طرح اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ اب یہاں میرے لیے توجہ طلب امر یہ تھا کہ آیا اس رذیل بلراج سنگھ کو یہ معلوم تھا کہ میرے تینوں ساتھی درحقیقت میرے ہی ساتھی تھے؟ شاید نہیں..... پتا ہوتا تو یہ جلاد صفت انہیں بھلا کب زندہ رہنے دیتا؟ یہ تو شکر تھا کہ اول خیر وغیرہ یہاں عام بیگار قیدیوں کی حیثیت سے تھے۔ تاہم یہ بات واضح ہو چکی تھی یہاں پر جنرل کے ایل ایڈوانی کا تسلط قائم تھا، کیوں، کیسے اور کس مقصد کے تحت؟ یہ ابھی پردۂ راز میں تھا۔

''جو نئے آدمی بھرتی ہوئے ہیں، ان کی فوراً ابھی اور اسی وقت ایک ٹیم بناؤ..... کم از کم پانچ افراد ہونے چاہئیں۔'' معاً بلراج سنگھ کی پاٹ دار آواز گونجی۔ وہ ہنوز رتن لال سے مخاطب تھا۔

''یس سر!'' وہ فوراً مؤدبانہ بولا۔

''ان نئے بھرتی ہونے والوں کی فہرست بنا کر مجھے دو اور ان میں سے پانچ افراد چن کر ٹیم میں شمولیت کے لیے نکال لو، باقی پانچ پرانے آدمی ہوں گے اور ہاں، ان نئے بھرتی ہونے والوں پر بھی کڑی نگاہ رکھو..... ان پر ابھی اتنی جلدی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تمہاری اس وقت ٹیم میں کون کون شامل تھا؟''

بلراج نے آخر میں پوچھا اور پھر تب ہی اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''اے.....! یہ تم نے اپنے چہرے پر اتنی نیچی ٹوپی کیوں کر رکھی ہے، اُوپر کرو اِسے.....''

اس نے رتن لال کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی نجانے کس طرح اچانک مجھے تاڑ کر کہا اور میرے پورے جسم میں لاتعداد چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن
جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

قسط: 34

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہ کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ا بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا۔ شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون محتا بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش جاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہز ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشم بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عنا کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیہ بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ت وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائ ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیا چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لی ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیا ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام پھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھ بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے

بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پرفریبیوں کے باوجود وہ اس بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا ون کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل انی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیراثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے یل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے یاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر بچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں انی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جماتی کے گھنے دلدلی جنگل پہلی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے جسم میں تیر لگ جاتا جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے اکر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی ملالی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا لم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان اتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اس خبیث کی آواز مجھے اپنی کنپٹی پر گولی کی طرح لگی تھی۔

میں ایسی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا کہ ہٹانے سے وہ مجھے پہچان نہیں پائے گا۔ یہ تو میں نے طور پر کسی کی نظروں میں نہ آنے اور ممکنہ حد تک بچنے اپنی مہم کو تھوڑا آگے بڑھانے کے لیے کر جھکا رکھی تھی۔ میرے پاس دیال داس سے حاصل کیے ہوئے کاغذات بھی تھے۔

دیال داس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک بین الاقوامی ''سروائیول انٹرنیشنل'' سے تعلق رکھتا ہے، وغیرہ۔ نے اس کی اس بکواس پر بالکل بھی اعتبار نہیں کیا تھا۔

رتن لال اور اس کے ساتھیوں کو اپنی پڑی ہوئی تھی اور اسی لیے وہ اب تک مجھ پر کوئی خاص توجہ نہیں دے پائے تھے پھر میں نے اس ہوشیاری اور موقع محل کے مطابق دیال داس کا روپ بھر رکھا تھا۔

اس کے باوصف میں نے اپنے چہرے پر خراشیں بھی ڈال رکھی تھیں لیکن مجھے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا اور اب شاید وہی وقت آچکا تھا۔

ایسے ہی وقت میں میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا، میرے پاس تاخیر کرنے کے لیے ایک پل کا بھی وقت نہ تھا، ورنہ یہ خبیث مزید شبہے میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ میں نے دانستہ بوکھلانے کی اداکاری کی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنی ٹوپی

کی طرف ہاتھ ابھی بڑھایا ہی تھا کہ اچانک کسی نے آگے بڑھ کر بلراج سنگھ کی ٹانگیں پکڑ لیں اور گڑگڑانے لگا۔

میری آنکھیں پھیل گئیں۔ یہ کوڑھی کا بھیس بھرے ہوئے کبیل واوا کی حرکت تھی۔ میں اسے جاں نثارانہ حرکت ہی کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ بلراج جیسے سفاک انسان سے اس بات کی پوری توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ جو ''چھوٹے سرکار'' کی صورت میں یہاں کا ''اَن داتا'' بنا ہوا تھا، وہ کسی کو بھی بے دریغ گولی مار دینے کا مجاز تھا۔

''مم...... ہمم...... ہمم...... مم...... موں موں...... ہوہو......''

کبیل دادا کسی گونگے کی طرح اپنے منہ سے بے ربط آوازیں نکال رہا تھا اور اس نے بلراج کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں۔

اگر وہ مجھے بچانے کے لیے ایسا کر رہا تھا تو یہ اس کی چال بازی کی بہترین اداکاری تھی مگر اس میں اس کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

بلراج سنگھ کی میری طرف سے توجہ ہٹی اور پھر اس نے کبیل دادا کو انتہائی حقارت سے اپنے ایک پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ کبیل دادا اسی طرح کی بے ربط آوازیں نکالتا ہوا دور جا پڑا۔

بلراج سنگھ کے ہاتھ میں ہنوز پستول دبا ہوا تھا۔ اسی وقت کچھ دیگر قبائلی کبیل دادا کو کھینچ کر دور لے گئے کہ کہیں وہ اسے بھی اس الم نصیب عورت کی طرح گولی نہ مار دے۔

میرا دل بے اختیار مچل اُٹھا تھا کہ میں کبیل دادا کے پاس جا کر اس کے گلے لگ جاؤں...... تاہم تسلی تھی کہ میرے محبوب ساتھی زندہ تو تھے۔ اب یہی تسلی انہیں بھی کبیل دادا کی صورت ملنے والی تھی کہ میں بھی زندہ سلامت یہاں پہنچ چکا تھا۔

''چھوٹے سرکار......! ہمیں بھولا ناتھ کا خاتمہ کرنا ہو گا۔ یہ ہمارے لیے مشکلیں کھڑی کر سکتا ہے، دشمنوں کے بہت سے گروپ یہاں قدم جمانے لگے ہیں۔'' رتن لال نے کہا۔

بلراج سنگھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''تم نے اب تک بھاڑ ہی جھونکی ہے، ایک بھی دشمن کو تم پکڑ نہیں سکے ہو اب تک...... میں یہاں کے معاملات دیکھوں یا تمہارے جیسے نکمے انسان کے ساتھ جنگلوں کی خاک چھانتا پھروں...... جی تو چاہتا ہے تمہیں ادھر ہی گولی مار دوں...... دفع ہو جاؤ میری نظروں سے......''

وہ بکتا جھکتا ہوا اپنے ساتھیوں سمیت اسی طرف بڑھ گیا جہاں سے نمودار ہوا تھا۔

اس خبیث کو جاتے دیکھ کر بے اختیار میرے سینے کے پنجر میں اٹکی ہوئی سانس کسی بے چین پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر آزاد ہوئی تھی۔ کبیل دادا اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر بلراج سنگھ کا دھیان میری طرف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''چلو اوئے...... تم لوگ کیا میرا منہ تک رہے ہو...... اپنی چھو لداری کی طرف چلو۔'' معاً رتن لال نے کہا اور ہم سب جیپ میں سوار ہو گئے۔

اس دوران میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جہاں کبیل دادا کو اس کے دیگر قبائلی ساتھی لیے ایک طرف کو ہٹ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کبیل دادا مجھے دیکھ کر مسکرا رہا تھا، فرطِ محبت اور عقیدت سے میرا جی بھر آیا تھا۔ میں نے بھی جیپ میں سوار ہوتے وقت اس کی طرف ٹوپی جھاڑنے کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلا کر جوابی اشارہ کر دیا۔

کبیل دادا میرے لیے لائقِ احترام تھا۔ وہ میرا نہیں، میرے مرحوم بھائی لئیق شاہ کا جاں نثار ساتھی رہ چکا تھا اور کئی موقعوں پر وہ اپنی جان پر بھی کھیل کر اس کے کام آتا رہا تھا اور اب میرے بھی کام آ رہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح ان کی قید سے رہا ہو کر ان جنگلیوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا، تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بڑی ہوشیاری سے یہ سب کیا ہو گا اور اب بھی وہ اپنے باقی دونوں ساتھیوں کو آزاد کرانے کے لیے کسی خفیہ منصوبے یا مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ مجھے دیکھ کر یقیناً اس کی ہمت بھی بڑھی ہو گی۔ تاہم تقدیر ساتھ دے رہی تھی تو ہمیں بھی محتاط ہو کر اس سارے خطرناک گورکھ دھندے سے نمٹنا تھا، جس کی کوکھ میں جانے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔

یہ کیا کم تھا کہ ایک طرف کبیل دادا اپنی مہم میں مصروف تھا اور دوسری جانب میں بھی یہاں ان کے ساتھیوں کے بھیس میں آ چکا تھا۔ تاہم کبیل دادا کے مقابلے میں میری یہاں پوزیشن کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک ماتحت کی حیثیت سے میرا بلراج سنگھ کے ساتھ دوبارہ سامنا بھی ہو سکتا تھا، یہی نہیں اصل دیال داس، اگر زندہ تھا تو وہ بھی لوٹ کر یہاں آ سکتا تھا اور میرا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ مجھے سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ مجھے دیال داس کو ہلاک ہی کر دینا چاہیے تھا مگر میں ان حکم کے غلاموں کی جان لینے سے احتراز ہی برتنے کی کوشش کیا کرتا تھا مگر جہاں ضروری ہوتا انہیں زندہ بھی نہیں چھوڑتا تھا۔

بہرحال مجھے اب جلد از جلد کوئی اور بہروپ بھر لینا چاہیے تھا، کبیل دادا کا بہروپ نسبتاً مجھ سے زیادہ محفوظ اور بہتر تھا۔

جیپ دھول اُڑاتے راستوں پر آہستہ روی سے چلتی ہوئی ایک بڑی سی چھو لداری کے سامنے آن رکی۔ میرے دل کو ہنوز دھڑکا لگا ہوا تھا۔

ان کے ساتھیوں میں دیال واس کا کوئی قریبی ساتھی مجھے ''ڈمی'' ساتھی کی صورت میں پہچان سکتا تھا۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا اور مجھے اس سے پہلے اپنا کوئی اور بندوبست کر لینا چاہیے تھا جس کی سبیل سرِدست مجھے سجھائی نہیں دے رہی تھی۔

جیپ کے رکتے ہی ہم سب کدکڑے مار کر نیچے اُتر آئے۔ جب ہم چھولداری کی طرف بڑھنے لگے تو رتن لال نے ہانک لگا دی۔

''اوئے...... دیالے! تُو اندر کیا گھاس کھانے کا جا رہا ہے؟ جا اپنی ڈیوٹی سنبھال جا کر......''

میں رک گیا تاہم شش و پنج کا بھی شکار ہونے لگا کہ جانے میری کہاں اور کیا ڈیوٹی تھی؟ اگرچہ چھو لداری میں جانے سے میں خود بھی کترا رہا تھا مگر یہاں میرے لیے ایک اور مشکل کھڑی ہو گئی تھی کہ مجھے کہاں جانا تھا؟ جلد ہی یہ مشکل آسان ہو گئی۔ جب رتن لال نے میرے ساتھ ہی ایک اور ساتھی سے بھی یہی کہا اور میں اس کے پیچھے لگ گیا۔

وہ سر جھٹکتا ہوا ایک طرف کو ہو لیا اور میں بھی اس کے ساتھ ہی چل دیا۔ میرے ساتھ چلنے والے ساتھی کو رتن لال نے وجے کے نام سے پکارا تھا۔

''یار وجے! میں تو یہاں کی ڈیوٹیوں سے تنگ آ چکا ہوں...... کیا تم خوش ہو؟''

میں نے کسی مقصد کے تحت اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنی بات کے ردِعمل کے طور کن انکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف بھی دیکھا تو وہاں مجھے کسی بیزاری کے بجائے حیرت کے آثار نمودار ہوتے دکھائی دیے اور وہ اسی لہجے میں بولا۔ ''کیا تم اس شاہی ڈیوٹی سے بیزار ہو گئے ہو؟ کیوں؟''

مجھے اچانک محتاط ہونا پڑا۔ ظاہر ہے کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں جنرل کے ایل ایڈوانی یا بلراج سنگھ کے آدمی یا ملازم کس طرح کی زندگی گزار رہے تھے؟ جیسا کہ میں نے ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ایڈوانی گروپ کے زیادہ تر آدمی جو یہاں موجود تھے وہ اُجرتِ خاص پر ''ہائر'' کیے گئے تھے اور جو اس کے قریبی اور کارپردازِ خاص کہلاتے تھے، جیسے بلراج سنگھ وغیرہ، وہ ان پر حکم چلانے کے لیے مسلط کیے گئے تھے۔

تاہم جنہیں اچھی تنخواہوں پر ہائر کیا گیا تھا انہیں ضرور یہاں اچھی سہولیات بھی میسر تھیں مگر حیرت کی بات تو یہ تھی کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی کے فن سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور ہر طرح کا اسلحہ چلانا بھی جانتے تھے، جس کا ایک ہی مطلب نکلتا تھا کہ یہ لوگ انڈیا ہی کے کسی جرائم پیشہ گروہ سے حاصل کیے گئے ہوں گے۔ یہ کام جنرل ایڈوانی نے بلراج سنگھ کے ذریعے ہی کروایا ہوگا۔

میں نے فوراً ہی بات بناتے ہوئے کہا۔ ''کچھ خاص نہیں، بس یار! شہر سے دور ہے یہ جگہ...... جنگل، جانگلی اور بس یہ پسماندہ بستیاں...... کبھی کبھی من گھبراتا ہے یہاں سے...... ورنہ تو ظاہر ہے جنرل صاحب نے یہاں ہماری سہولیات کے لیے کیا کچھ نہیں کر رکھا ہے......''

''ہوں...... میں تمہارے اندر کے خوف سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' معاً ہی وجے نے اسرار بھرے لہجے میں کہا اور میں اندر سے دھڑک اُٹھا کہ نجانے اس نے میری کون سی چوری پکڑ لی تھی۔

''کیا مطلب؟'' بے اختیار میں نے پوچھ لیا۔

ہم دونوں چلتے ہوئے سیاہ رنگت والی ٹیکریوں کے قریب آ گئے۔ یہاں مجھے ریت اور مٹی کی قدرے اُونچی اُونچی خودساختہ ڈھیریاں بھی نظر آئیں۔ یہاں کھپریل کی ڈھلوانی چھت والی ایک چھوٹی سی مڑھی تھی۔ ہم اس کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

میری نظریں گرد و پیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ مڑھی کے قریب ہی مجھے ایک چھوٹا سا تقریباً ایک ہزار واٹ کا جنریٹر رکھا دکھائی دیا۔ اس کے اُوپر ایک چھتری سی بنائی گئی تھی، یہ درحقیقت ''سولر پینل'' تھا جو دھوپ کی تمازت میں خوب چمک رہا تھا۔ گویا یہاں شمسی توانائی کے استعمال کو بھی ذریعہ بنا رکھا تھا۔

ایک چھوٹا سا مین سوئچ بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اگرچہ یہ جنریٹر پیٹرول پر بھی تھا۔ ایک دو بجلی کی تاریں بھی مجھے مڑھی کی ڈھلوانی چھت کے اُوپر سے اندر جاتی نظر آئیں، ان کا کنکشن اندر ہی کیا گیا تھا۔

اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلگاتے ہوئے بولا۔ ''تم شاید بھول رہے ہو...... دیال

داس! تم اکثر میرے سامنے اپنے ایک خوف کا اظہار کرتے رہے ہو۔'' اس نے ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ میں اندر سے ایک بار پھر کھٹک سا گیا۔ جانے اس کم بخت دیال داس نے اور کیا کیا اس سے اپنے متعلق کہہ رکھا تھا جو اب میرے گلے بھی پڑ سکتا تھا۔ البتہ یہ بات میرے لیے ذرا حوصلہ افزا تھی کہ دیال داس یہاں کا سب سے نیا اور تازہ کار ملازم تھا اور ظاہر ہے کم ہی لوگوں کا دیکھا بھالا بھی ہوگا۔

میں نے اسے بولنے کا موقع دینے کی غرض سے خاموشی اختیار کر لی تھی، تاکہ یہ خود ہی اُگل دے کہ آخر دیال داس نے اس کے سامنے اپنے کس خوف کا اظہار کیا تھا؟

میری خاموشی پر وہ خود ہی ترنگ میں (شاید سگریٹ کے ترنگ میں) ایک اور گہرا کش لگاتے ہوئے بولا۔ ''ویسے یار دیالے! تم نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا، بعد میں جب میں نے تمہاری اس بات پر غور کیا تو ہاں قسم! خود مجھے بھی ایسا لگا تھا کہ ہم ملازم نہیں بلکہ ان جاوا قبائلیوں کی طرح قیدی بن چکے ہیں۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ رام گوپال اور اجے سنگھ کا بھی یہی خیال ہے کہ ہم جنرل ایڈوانی کے زرخرید نہیں بلکہ اس کے غلام بن چکے ہیں۔ اشوک اور مہترا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ جب اُنہوں نے یہاں سے واپس جانے کی بات کی تھی تو وہ غائب کر دیے گئے یا حادثاتی طور پر مارے گئے۔''

''شش......'' میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ دیا۔

اپنی حالات گزیدہ زیرک دماغی اور زود فہمی سے میں پل کے پل سمجھ گیا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہو سکتا تھا، اس کے منہ سے ''جاوا قبیلے'' کا سن کر ہی مجھے احساس ہو چلا تھا کہ یہاں جو ستم رسیدہ نظر آنے والے قبائلی جنگلی تھے وہ کسی صورت میں بھی کلی منجارین نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے ہی مجھے ان سے مختلف لگے تھے۔

''دوست! اسی لیے تو میں نے اب تک اپنے اندر کا خوف دبا رکھا ہے، اگر چھوٹے یا بڑے سرکار کے کسی حواری کو اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو سمجھو اپن بھی...... اشوک اور مہترا کی طرح گئے......''

میں نے ہولے سے کہا۔ وجے اب مجھ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگا تھا۔ شاید میں نے بھی اس کے دل کی بات چھیڑ دی تھی اور یہ میرے لیے سود مند ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ میرا رازدار بن سکتا تھا اور میں چالاکی سے اس کے منہ سے بہت کچھ اُگلوا سکتا تھا۔

''آؤ...... دیالو! ایک چکر ٹیکری کا لگاتے ہیں پھر اندر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔'' وہ بولا اور ٹیکری کی طرف چلا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ ٹیکری پر چڑھ کر وجے نے تو گرد و پیش میں بس سرسری سی نگاہ دوڑائی تھی مگر میں نے ذرا غور سے جائزہ لیا تھا۔

تپتا ہوا آگ اُگلتا سورج جیسے عین آسمان کے بیچ ٹکا ہوا تھا۔ میرے سامنے اور دائیں بائیں حدِ نگاہ تک ریگ زار کا میدان سا دکھائی دیتا تھا جہاں کہیں ٹنڈ منڈ درخت اور سوکھے برساتی کھالے نظر آجاتے تھے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں ہماری کیا ڈیوٹی تھی؟

اس کے بعد ہم نیچے اُتر آئے۔ وجے نے پہلے جنریٹر کا تھروٹل کھینچ کر اسے اسٹارٹ کیا پھر میرے ساتھ مڑھی کے اندر داخل ہو گیا۔ مڑھی میں داخل ہوتے ہی مجھے غیر معمولی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ باہر کی تیز چلچلاتی دھوپ اور غضب ناک گرمی جھیلنے کے بعد مڑھی کی ٹھنڈک اور بھی زیادہ خوشگواریت کا احساس دلانے لگی۔

مڑھی زیادہ کشادہ تو نہیں تھی مگر دو افراد کے لیے کافی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران ہی رہ گیا تھا کہ اندر روزمرہ سہولیات کی تقریباً سب ہی اشیا موجود تھیں۔ آرام دہ دو میٹریس جو زمین پر دیواروں کے دائیں بائیں بچھے ہوئے تھے۔ قریب ہی مچھر دانی بھی لپٹی پڑی نظر آئی، ایک چھوٹا فریج، الیکٹرک اسٹوو اور ایک ائر کنڈیشن کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے چھوٹے سائز کا پلاسٹک باڈی والا روم ائر کولر بھی دھرا پڑا تھا۔ دو کرسیاں تھیں۔ وجے نے اپنی گن ایک طرف رکھ دی اور کرسی پر تھکے تھکے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یار...... ذرا ٹھنڈی بیئر کی بوتلیں نکال لینا......''

میں نے بھی اپنی گن ایک طرف رکھی اور فریج کی طرف بڑھا۔ اسے کھولا تو اندر مجھے کھانے پینے کی بہت سی اشیا رکھی دکھائی دیں۔ ان ساری چیزوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایڈوانی نے باہر کی دنیا سے رابطہ بھی جوڑے رکھا تھا، یوں بھی یہ علاقہ پورٹ بلیئر سے کتنا دور تھا۔ جبکہ ان کے پاس آمد و رفت کے لیے ہیلی کاپٹر سے لے کر گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ رسد و رسل کا انتظام و انصرام ان کے لیے کیا مشکل تھا۔

میرا خود بھی بھوک سے زیادہ پیاس سے بُرا حال تھا۔ فریج میں بیئر کی بوتلوں اور کین کے علاوہ پانی کی بھی بوتلیں

تھیں۔ بیئر ساری الکحولک تھیں، ان میں ایلمونیم کی چپٹی بوتلیں بھی تھیں، ان میں بھی شراب ہی تھی۔

میں نے اس کے لیے بیئر کاٹن اور اپنے لیے صرف ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی اور بیئر کاٹن وجے کی طرف بڑھا دیا جبکہ پانی کی بوتل اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اسے ختم کرنے کے بعد میں نے وجے کی طرف دیکھا جو کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑتے ہوئے کسی خیال سے کہا۔

''اب دیکھو ناں یار! آخر ہمارے پیارے بھی ہیں، ان سے بھی ملنے کو جی کرتا ہے...... کب تک ہم ان سے دوری برداشت کرتے رہیں گے؟''

اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ سے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر خود ہی اُٹھ کر فریج کی طرف بڑھا۔ اس نے شراب کی ایک چپٹی بوتل نکالی اور دوبارہ کرسی پر آبیٹھا۔ آبِ خبیثہ کا ایک گھونٹ بھرنے کے بعد وہ اب ایک نئی ترنگ میں بولا۔

''تم نئے ہو ناں، اسی لیے تمہیں معلوم نہیں، میرے ساتھ بھی رہتے ہوئے تمہیں بھلا عرصہ ہی کتنا ہوا ہے! بہ مشکل ایک یا دو دن، اس میں بھی تمہاری ڈیوٹی ایک دن کے لیے میرے ساتھ اس پٹے میں لگی ہے۔ پہلے دن تو رات میں تمہیں دیکھا تھا اور افراتفری میں ایک خطرناک مہم پر جانا پڑا، سچی کہوں تو مجھے تمہاری صورت بھی اچھی طرح یاد نہیں رہی تھی۔'' وہ اپنی کہے جا رہا تھا، لگتا تھا جیسے آج وہ اپنے اندر کا کوئی دبا دبا غبار باہر نکالنے کی کوشش چاہ رہا تھا۔

''یا پھر تمہیں انہوں نے بتایا ہی ہوگا کہ مہینے میں ایک بار ہمیں ایک گاڑی لے جاتی اور ہمارے گھر چھوڑ دیتی ہے۔ وہاں صرف تین دنوں کا قیام ہی ممکن ہوتا ہے اور پھر واپسی...... بس! یہی بات مارے ڈالتی ہے کہ چھٹیاں کم دیتے ہیں یہ لوگ......''

''اور اگر کوئی وہاں سے، میرا مطلب ہے اپنے گھر سے واپس ہی نہ آنا چاہے تو......؟'' میں نے کسی خیال پر اُسے اُکسانے کی غرض سے پوچھا تو وہ چٹکی بجا کر بولا۔

''پھر اس کی ہمیشہ کے لیے چھٹی...... اس کا اُوپر کا ٹکٹ کٹ جاتا ہے، یا پھر اس کے گھر والوں کو عذاب ناک موت سے دوچار کر دیا جاتا ہے۔''

اس کی بات پر مجھے اچانک سوشیلا کی وہ بات یاد آ گئی جب جنرل کے ایل ایڈوانی نے اپنے سفاک اور بے رحم گماشتے بلراج سنگھ کے ذریعے اس کی بڑی بہن اور [illegible] اور شوہر کو بڑی بیدردی سے ہلاک کروا دیا تھا۔ جس کا انتقام لینے کے لیے سوشیلا خود یہاں تک آ پہنچی تھی، مگر اب اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

''تم نے صحیح کہا دوست!'' میں نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔ کچھ اس طرح کہ آج ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے رازدار بنے اپنے دلوں کے پھپھولے پھوڑ رہے ہوں۔

''اب دیکھو ناں...... بھگوان نہ کرے گھر پہ کوئی بیمار ہو جائے، کسی قسم کی ایمرجنسی ہو جائے تو کیا پتا چلے؟ کون ان بے چاروں کی مدد کو آئے۔ رابطہ بھی تو نہیں کرنے دیتے ہوں گے یہ لوگ؟''

''ہفتے میں صرف ایک بار......'' وہ استہزائیہ ہنسی سے بولا۔ مگر اس کی ہنسی میں چھپا ہوا درد اپنے غالب عنصر کا پتا دیتا تھا۔

وہ شراب پی کر نشے کی پینگ میں بولے جا رہا تھا۔ میرے ذہن میں آیا کہ اس سے یہ بھی لگے ہاتھوں پوچھ لوں کہ آخر ان لوگوں (جنرل کے ایل ایڈوانی اور بلراج وغیرہ نے) ان لوگوں کو کس بنیاد پر کیسے اور کہاں سے ''ہائر'' کیا ہے؟ نیز ان کا مقصد کیا تھا؟ مگر یہ سوال اسے میری طرف سے چونکا سکتا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے میں بھی تو دیال داس کی صورت میں ایک ہائر شدہ ملازم تھا۔

مجھے یہ سوال اس سے گھما پھرا کر کرنا تھا کہ اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ بھی نہ ہوتا۔ بے شک وہ نشے کی پینگ میں تھا، باوجود اس کے میں اپنا (کبیل دادا کا بھی) کھیل بگاڑنا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے جلد بازی سے کام لیے بغیر میں ہنسا پھر استفساریہ انداز میں بولا۔

''غلطی ہماری ہے وجے! ہم ان کے ملازم ہی کیوں بنیں، بڑی تنخواہوں کے لالچ نے شاید ہمیں یہاں پھنسا دیا۔'' درمیانے انداز کی بات میں تاریکی کے پھینکے ہوئے میرے اس تیر نے اپنا ہدف ضائع نہیں جانے دیا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

''ہاں! تم نے ٹھیک کہا دیالے! ہم ہی زیادہ پیسوں کے لالچ میں اس کم بخت بلراج سنگھ کے شکنجے میں پھنس گئے۔ مگر یار! ہم سب مجبور بھی تو تھے۔ ممبئی کی اندھیری گلیوں اور رات کے ویران ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر راہ چلتوں کو لوٹنے کے علاوہ ہماری اور کیا زندگی تھی، تیسرے درجے کے مجرم ہی تو تھے ہم......''

میں سمجھ گیا اور اسے مزید بولنے پر اکسانے کی غرض سے کہا ''میں بھی ایسا ہی ایک تیسرے درجے کا اسٹریٹ اسنیچر ہوں لیکن حیرت کی بات ہے، ان لوگوں نے کیسے ایسے

لوگوں کو چن چن کر لیا کہ ہم ان کے نرغے میں آ گئے؟''

''ہاہا...... ہاہا......'' وہ ہنسا۔ شراب کی چپٹی بوتل اپنے منہ سے لگا کر ایک اور گھونٹ بھرا اور بولا۔ ''یہ کام اس مردود بلراج سنگھ کے انہی حواریوں نے ہی تو کیا تھا۔ وہ آج بھی ہم جیسے لوگوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ عموماً ان کا شکار ایسے ہی اسٹریٹ اسنیچر ہوتے ہیں، جو راہ چلتے ہوؤں کو لوٹنے کے دوران پکڑے جاتے ہیں اور پھر یہ لوگ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ یوں ہم بھی ان کے جال میں پھنس گئے۔''

''حیرت ہے کسی نے یہاں سے، میرا مطلب ہے، ان کے چنگل سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی؟''

''کی ہوگی، بتایا ناں ابھی میں نے تجھے، اشوک اور مہترا کے بارے میں......''

''ہاں! مگر یار سچی بات کہوں، تمہیں تو معلوم ہو شاید یہ بات کہ تم پرانے ہو، مگر میں نیا ہوں، آخر ہمیں یہاں لانے کا مقصد کیا ہے ان کا؟ بس! یہی ڈیوٹی کرنا ہے، [illegible] سنبھالتے رہنا ہے، بس؟''

میں نے یہ آخری اور اہم سوال جو اپنی جگہ بڑا احساس اور نازک اور خطرناک بھی تھا، اس سے نہایت محتاط انداز میں کر ہی ڈالا اور اپنی دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

اس نے اس بار بڑے سکون سے چپٹی بوتل کو اپنے منہ سے لگا کر شراب کا ایک گھونٹ اپنے معدے میں منتقل کیا ایسے میں اسے ایک ٹھسکا بھی لگا اور وہ کھانسنے لگا۔

''آرام سے یار......! پانی دوں؟'' میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور دوبارہ گھونٹ بھرا، پھر بوتل کو اپنے چہرے اور سرخ پڑتی آنکھوں کے سامنے لاتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

''یہ سالی بھی بڑی اسٹرانگ ہوتی ہے، بالکل ناراض محبوبہ کی طرح...... ایک دم تیکھی سی...... آہ...... ظالم شراب نے کیا یاد دلا دیا...... سانوری...... کہاں ہوگی اب وہ؟ میرا انتظار کرتے کرتے اس نے بھی کسی اور کی راہ پکڑ لی ہوگی۔''

سانوری شاید اس کی کوئی چیٹر قسم کی محبوبہ تھی۔ میں بے چینی سے اس کے اصل جواب دینے کا منتظر رہا۔ درمیان میں محبوبہ کو یاد کر کے وہ شاید میرا سوال ہی بھول گیا۔ مجھے سخت کوفت ہونے لگی۔ میں نے کہا۔

''اچھا چل چھوڑ یار! میرے سوال کا تو جواب دے ناں......؟''

''کون سا سوال؟'' اس نے پھر گھونٹ بھرا۔

''یہی کہ...... آخر ان کا ہمیں یہاں لانے کا اصل مقصد ہے کیا؟ تم پرانے ملازم ہو یہاں کے...... شاید تمہیں پتا ہو، میں تو نیا ہوں، میں ابھی تک نہیں جان سکا۔''

''ہاہا...... ہاہا...... مقصد......'' اس نے پھر ایک بدمست سا قہقہہ لگایا اور میں ڈرا کہ کہیں پھر اس کم بخت شرابی کو ٹھسکا نہ لگ جائے اور میرا سوال پھر اُدھورا رہ جائے۔ شکر تھا کہ اس بار ایسا کچھ نہیں ہوا، وہ بولا۔

''مقصد، کیسا مقصد یار دیالے......؟ یہ تو آج تک ہمیں بھی نہیں پتا چلا۔ جب سے یہاں لائے گئے ہیں، بس یہی ڈیوٹی دیتے آ رہے ہیں، پہرا یا دشمنوں کے ساتھ مارا ماری......''

مجھے اس کا جواب سن کر سخت مایوسی ہوئی اور فوراً مجھے دیال داس کی وہ بات یاد آ گئی جب اس نے میرے ہاتھوں زدوکوب ہوتے وقت بھی یہی بتایا تھا کہ وہ لوگ صرف حکم کے غلام تھے اور انہیں کچھ نہیں پتا تھا۔

پھر دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک خیال کلک ہوا، کبیل دادا...... ہاں! وہ اگر کسی کوڑھی کا بھیس بھرے ہوئے تھا تو یقیناً اس نے اپنی اب تک کی مہم جوئی کے دوران یہاں ہونے والے ''گھن چکر'' کے بارے میں بہت کچھ پتا چلا لیا ہوگا، لہٰذا اب میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ میں سب سے پہلے کبیل دادا کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اپنے قدم یہاں دشمنوں کے گڑھ میں مضبوطی سے جمالوں اور پھر ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کروں، جبکہ کبیل دادا بھی میرے ساتھ تھا۔ اس کی موجودگی بلاشبہ میرے لیے بڑے حوصلے کی بات تھی۔

چنانچہ اب میری پہلی کوشش یہی تھی کہ جلد از جلد کبیل دادا سے ''بالمشافہ'' رابطے میں آ جاؤں تب ہی ہم کوئی مشترکہ پلاننگ کر پائیں گے۔ کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں ان جاوا قبائلیوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اپنی جھونپڑیوں تک ہی محدود تھے۔ یہی سبب تھا کہ میں ازخود کبیل دادا سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، جب ہم رتن لال کے ساتھ جیپ میں بستی میں داخل ہو رہے تھے تو اسی وجے نے ہی ان قبائلیوں میں سے کسی ایک حبشن کو جسے اس نے ''بلیک کوئین'' کا نام دیا تھا، دیکھ کر مجھے ہلکا سا ٹہوکا مارا تھا کہ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ خوب صورت اور تیکھے نقوش والی عورت ان کے ساتھ (وجے اور دیال داس کے ساتھ) ناجائز خفیہ

سمبندھ رکھے ہوئے تھی۔ کچھ سوچ کر میں نے وجے کو دوبارہ مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یار وجے! اُس بلیک کوئین سے دوبارہ ملنے کو جی چاہ رہا ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟“

میں نے شاید اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی تھی، وہ فوراً چمک کر اور اپنی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں میچ کر بولا۔ ”لگتا ہے، تجھ پر بھی اس سیاہ ناگن کے حسن و شباب کا نشہ چڑھ گیا ہے۔ دھیرج...... رات تو ہو لینے دے...... آج چلیں گے اس طرف......“

وہ نشے کی پنگ میں ہنسنے لگا اور مزید بولا۔ ”یاد ہے، پچھلی بار تو اس کے ساتھ جونک کی طرح چمٹ ہی گیا تھا، میری باری ہی نہیں آنے دے رہا تھا۔ مشکل سے اور زبردستی اندر گھس کر میں نے تجھے اس حسین ناگن سے علیحدہ کیا تھا۔“ اس کی یاوہ گوئی پر میں دانستہ جھینپی جھینپی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

”ہاں یار، وجے! وہ سالی شے ہی ایسی ہے، ایک دم تیز تاڑی کی طرح، چڑھتی ہے تو اُترنے کا نام نہیں لیتی۔ چل ناں یار! سالی کی قربت یاد آرہی ہے۔“ مجبوراً مجھے بھی عامیانہ پن کی سطح پر اُترنا پڑا تو وہ مجھے ایک دم گھورتے ہوئے بولا۔

”کہا ناں...... دیالے! ذرا دھیرج رکھ...... رات کو چلیں گے......“

”کاش! وہ خود ہی اِدھر آجائے۔“ اس کے منہ سے کچھ مزید اس قسم کا اُگلوانے کے لیے میں نے کہا تو وہ چمک کر بولا۔

”مروائے گا ہمیں...... یہاں ڈیوٹی کی جگہ پر ہم ایسا کچھ نہیں کر سکتے، رتن لال کے کسی حواری نے دیکھ لیا ناں تو کوڑے پڑ جائیں گے، اس قسائی بلراج سنگھ کے سامنے بھی پیش کیا جا سکتا ہے ہمیں...... میں تو اس مردود کا سامنا کرنے سے بھی گھبراتا ہوں۔“

”ہاں، یار! اس بات کا ڈر تو مجھے بھی ہے۔“

”چنتا نہ کر...... پہلے کی طرح ہی کریں گے۔“ وہ ازراہِ تشفی بولا۔ ”پہلے میں جاؤں گا تو اِدھر ہی رہنا، پکٹے پر۔ اس کے بعد تُو ہو آنا......“

”یار! اس طرح جانے سے مجھے بھی ڈر لگتا ہے، اگر وہاں رتن لال یا کسی قبائلی کی نگاہ ہم پر پڑ گئی تو...... وہ سب جنگلی کہیں غیرت میں آکر ہم پر ٹوٹ ہی نہ پڑیں......“ ایسی باتیں پوچھ کر دراصل میں اس سے یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہاں کے اندرونی معاملات کس نوعیت کے ہو سکتے تھے۔

”ہاہا...... ہاہا......“ اس نے پھر ترنگ میں ایک آزا منش قہقہہ اُگلا اور بولا۔ ”غیرت اور ان جنگلیوں کو......ک بات کرتا ہے یار دیالے! باریہہ...... ہماری مشکل خود ہ آسان کر دیتی ہے۔ بس آم کھانے سے مطلب رکھ...... باقی سردرد اس کے لیے چھوڑ دے۔“

باریہہ...... شاید اسی حبشن عورت، بلیک کوئین کا ہ نام تھا۔ جبکہ اِدھر میں کبیل دادا سے ملنے کو بے چین تھا او باریہہ کے بہانے ہی یہ ممکن ہو سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری. میں چونک پڑا۔

”جا یار! کیری آگئی ہے، بھوجن لے آجا کر......“ اس نے کہا اور میں نے قدرے طمانیت کی سانس لی او مڑھی سے باہر آگیا۔

لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ وجے ”سینیارٹی“ کا فائد اُٹھاتے ہوئے دیال داس پر اسی طرح حکم چلایا کرتا تھا۔

باہر ایک کیکڑا ٹائپ جیپ کھڑی تھی۔ جس کے پیچھے بہت بڑا ڈالا نتھی تھا۔ اس پر ایک بڑی دیگ رکھی ہوئی تھی اور ایک موٹا سا کالا بھجنگ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے سر کی ٹوپی قدرے جھکائی اور اس طرف بڑھا، وہ تب تک بڑی سی دیگ کا ڈھکن کھول کر اس کے اندر پورا جھک گیا تھا، جب اندر سے برآمد ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی پوٹلی تھی، وہ اس نے میری طرف بڑھا دی۔ اس کے بعد ڈھکن زور سے بجا دیا۔ اس کیکڑا ٹائپ کیری کے ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ دھول اُڑاتی ہوئی اگلے پکٹے کی طرف بڑھ گئی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا پلٹا اور مڑھی کے اندر آیا تو چونک پڑا۔

وجے کرسی پر لیٹا لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ گود میں اور دوسرا کرسی کے ہتھے سے نیچے جھول رہا تھا اور خالی چپٹی بوتل فرش پر گری پڑی تھی۔

میں نے سر جھٹکا اور کھانے کی پوٹلی ایک طرف رکھ دی۔ نیند مجھے بھی آرہی تھی۔ پوٹلی اُٹھا کر میں نے کھولی تو اس کے اندر اُبلے ہوئے چاول، گوشت اور ایک عجیب سے سیال سے بھری ہوئی ربڑ کی بوتل تھی۔

میں نے سوائے چاولوں کے کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا، وہ زہر مار کرنے کے بعد میں فریج کی طرف بڑھا اس میں فروٹ کے نام پر جو کچھ تھا وہ کھایا اور میٹریس پر آکر دراز ہو گیا۔

☆☆☆

کسی کے زوردار ٹھوکر مارنے پر میری آنکھ کھلی اور میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پھر وجے کو دیکھ کر میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے قریب ہی میٹریس پر بیٹھ کر چپڑ چپڑ کھانے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے شاید وہیں بیٹھے بیٹھے ہی میری طرف لات چلائی تھی۔ مجھے اس کا یہ انداز ناگوار لگا مگر میں برداشت کر گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔

”کب کی نیند نہیں کی ہوئی ہے تو نے جو اس طرح گدھے گھوڑے بیچ کر بے سدھ پڑا سوتا رہا تھا؟“

وہ اب نشے کی پنگ میں نہیں تھا، اسی لیے مجھے احتیاط کا دامن تھامے رکھنا تھا، اُلسائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سویا تو بہت تھا...... مگر جانے کیا بات ہے...... نیند کچھ زیادہ ہی آگئی۔“

”اچھی بات ہے...... آج رات کو ویسے ہی جاگنا ہے۔“ وہ حسبِ عادت ایک آنکھ میچ کر بولا۔ ”اچھا جا اُوپر ذرا ایک چکر پکٹے کا ہی لگا آ...... میں بھوجن کر کے بلیک کوئین کی طرف جاتا ہوں، میرے لوٹنے کے بعد تُو چلے جانا، ہاں...... سگریٹ بیڑی دھیان سے پینا اور پکٹے کا پورا خیال رکھنا۔ آج کل حالات خطرناک ہیں......“

میں نے خاموشی سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور اپنی گن اُٹھائی، سگریٹ کی ڈبی اور لائٹر اس نے میری طرف اُچھال دیا۔ میں مڑھی سے باہر آگیا۔

میری نظروں کے سامنے جیسے ایکا ایکی ایک اسرار بھرا سا خوابناک منظر چھا گیا۔ ہماری مڑھی چونکہ اس ٹیلے نما ٹیکری کی ڈھلانی سمت پر واقع تھی، اسی لیے سامنے اور اطراف کا جھکا جھکا سا منظر کسی لینڈ اسکیپ کی طرح میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ رات اپنی تمام تر اسراریت کے ساتھ جھکی ہوئی تھی۔ اُوپر کھلے آسمان پر ”سپر مون“ کا منظر بنا پورا چاند، ایک بڑے سے سنہرے اَرتھ کی طرح ٹکا ہوا رہا تھا، جس کی طلسماتی اور چٹکی ہوئی چاندنی اطراف کے جنگلاتی ماحول کو بیک وقت ایک عجیب سی آسیبی اور پُرفریب چادر میں ڈھانپے ہوئے تھی۔ دور کہیں ہلکی سی روشنی کسی جگنو کی طرح چمکتی تو یوں لگتا جیسے جنگل نے اپنی آنکھ تھوڑی دیر کے لیے نیم واہ کی ہو۔ ہر سو گہرے سناٹے کا راج تھا۔

میں نے اُوپر پکٹے کی طرف دیکھا اور پلٹ کر آگے بڑھا۔ ٹیکری کے سرے پر مورچہ سا بنا ہوا تھا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ تو میں کبھی کبھار ہی پیا کرتا تھا، ورنہ اس کی مجھے کوئی خاص طلب نہیں ہوتی تھی اور پھر وجے نے بھی مجھے اس سلسلے میں احتیاط برتنے کا کہا تھا اسی لیے میں نے بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میرا دھیان ابھی تک کبیل دادا اور یہاں کے گورکھ دھندے پر اٹکا ہوا تھا۔

ذرا دیر بعد میں نے وجے کو بھی مڑھی سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا، وہ کسی ہیولے کی طرح ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پہلے وہیں کھڑے کھڑے مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا اور جواب میں، میں نے بھی ایسا ہی اشارہ دیا تو وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ اسی بلیک کوئین سے ملنے جا رہا تھا۔ میں گردن موڑے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ چند ہی سیکنڈوں میں اس کا ہیولا اسرار بھری تاریکی نے نگل لیا۔ میں گردن موڑ کر بیٹھ گیا۔ میری نظریں اب سامنے جمی ہوئی تھیں۔ جہاں ریگ زار سا میدان پھیلا ہوا تھا اور وہاں ایستادہ ٹنڈ منڈ سے درخت، چٹکی ہوئی چاندنی میں بڑے پُراسرار سے نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے بدروحیں، اپنی بانہوں جیسے سوکھے بالوں والے سر جھکائے اُداس سی کھڑی ہوں...... اور ابھی چیختی چلاتی ہوئی میری طرف لپکیں گی۔ دل میں عجیب سی ہیبت طاری کرتا منظر تھا میری نظروں کے سامنے۔ یہ بستی کا شاید کوئی سرحدی علاقہ تھا۔

اندیشناک اور وسوسہ انگیز لمحوں کی دھمک دیتا ہوا وقت، کسی بھاری سل کی طرح سرک رہا تھا کہ اچانک مجھے کہیں قریب ہی ایک آہٹ کا احساس ہوا۔ میں بے اختیار چونکا اور ایک اندازے سے آواز کی سمت دیکھا۔ آواز میرے عقب سے ابھری تھی۔ میری دھڑکتی نظروں نے مڑھی کی سمت جاتی ڈھلوان کی طرف دیکھا اور یک بیک ہی میرا دھڑکتا دل جیسے رک سا گیا۔ وہ کوئی لمبا تڑنگا شخص تھا اور لنگڑا کر چلتا ہوا ڈھلان سے اُوپر آرہا تھا۔ ہلکے سے لنگ کے ساتھ وہ تھوڑا جھکا جھکا چل رہا تھا۔

”کبیل دادا......“ میرے ذہن میں ابھرا اور میرا دل کیا روح تک میں سرشاری اُتر آئی، میں وفورِ جذبات تلے اپنی گن وہیں پھینک تیزی سے نیچے ڈھلوان اُترنے لگا، اسی لمحے شاید فرطِ جوش تلے میرا پاؤں رپٹا اور میں منہ کے بل گرتا، لڑھکتا ہوا سیدھا کبیل دادا کے قریب جا گرا۔

”ہولے...... میرے یار......! ہولے......“ کہتے ہوئے اس نے فوراً جھک کر مجھے تھام لیا۔ ہم دونوں ہی گر پڑے۔

اب پتا نہیں جذبات کی شدت تلے ہانپنے لگے تھے یا اور کوئی وجہ تھی، مگر اتنا میں ضرور کہہ سکتا تھا کہ مجھ سے تو کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میں بس یک ٹک اپنے اُوپر جھکے

ہوئے کبیل دادا کا کھردرا اور بردبار سا بھاری چہرہ تکے جا رہا تھا۔ وہی چہرہ جس سے مجھے اپنے بڑے بھائی لئیق شاہ کی خوشبو آتی تھی، وہی چہرہ تھا یہ جس سے ہزار اختلافات اور کئی مو[illegible] دست و گریبان ہونے کے باوجود میرے دل میں آج تک اس کے لیے نفرت کا ایک بیج تک نہیں پڑا تھا۔ دوست تو بے بدل میرا اول خیر بھی تھا، مگر کبیل دادا کی بات اور تھی۔ اول خیر کے انداز میں اگر کھلنڈرا پن تھا تو کبیل دادا کا انداز بردبارانہ تھا۔ اول خیر یار باش تھا تو کبیل دادا کا انداز ناصحانہ ہوتا۔ اول خیر کی شخصیت میں بے باک پن تھا تو کبیل دادا کی شان میں ایک بزرگانہ وقار محسوس ہوتا تھا مجھے۔ اول خیر کی یاری میں، بے نیازی تھی تو کبیل دادا کی دست گیری میں ایک قسم کا احترام محسوس ہوتا تھا مجھے کبیل دادا کی چھاؤں میرے لیے شفیق تھی تو اول خیر کا ساتھ حوصلہ افزا تھا۔

کبیل دادا کی [illegible] اور یک ٹک نظریں میرے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں، جبکہ میری آنکھیں گلے میں اُترنے والی رقت تلے بھیگنے لگی تھیں...... آہ! ایک عرصے بعد کوئی اپنا ملا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے کسی پُرشفیق بزرگ کا تحفظ بھرا سایہ آنصیب ہوا تھا۔ ایک طویل اور اپنے پیاروں سے دوری میں آبلہ پائی کا یہ سفر کٹھن تو تھا ہی، مگر ان کی جدائی میرے لیے اب تک جاں گسل بھی بنی رہی تھی۔ ایک کی قربت پاتے ہی میرے شکستہ و ریختہ وجود کو جیسے نخل امید کی ٹھنڈک نے آن لیا ہو۔

"گگ...... کبیل دادا......! یار......! میں بہت تھک گیا ہوں......" بہت ٹوٹا، شکستہ اور لرزاں لہجہ تھا میرا۔

"لل...... لیکن یار...... کبیل! میں نے آج تک حالات کے آگے سپر نہیں ڈالی، پر یار......! تیرے جیسے پیاروں کی جدائی میرے لیے بڑی اذیت ناک ثابت ہوتی رہی ہے۔"

کبیل دادا نے مجھے تھامے رکھا تھا۔ ہم دونوں ٹیکری کی ڈھلوانی زمین پر گرے پڑے انداز میں بیٹھے تھے اور دونوں ہی اب ایک دوسرے کے ساتھ بغل گیر ہو گئے تھے۔ شفاف چاندنی میں کبیل دادا کا سیاہی رنگت مائل چہرہ دمک رہا تھا۔ رنگ تو اس کا ویسے سانولا ہی تھا مگر شاید قبائلیوں اور کوڑھی کے بھیس میں اس نے اپنی سانولی رنگت کو سیاہ کر رکھا تھا۔ تاہم مجھے وہ خاصا کمزور نظر آیا تھا۔

اس کے چہرے پر بھی ایک آسودہ سی مسکراہٹ دمک رہی تھی۔ وہ میرے سر پہ بڑی محبت اور شفقت سے اپنا ایک ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"شہزی! میرے یار! میرے بھائی! سنبھال خود کو اور حوصلہ کر...... تو بہت ہمت والا انسان ہے، ایسی شکستہ باتیں نہ کر...... تیری جدائی ہمارے لیے بھی کسی تازیانے سے کم نہیں تھی۔ پر تقدیر کے آگے کس کی پیش چلی ہے بھلا۔ شکر ہے کہ ہم ایک بار پھر یکجا ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم سب خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔ چل، اُٹھ! کسی محفوظ مقام پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں......" اس نے کہا اور میں نے ہولے سے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ میرے ساتھ ہنوز لنگڑا کر چلنے لگا تو میں نے اس کی ٹانگ کی طرف دیکھا، جہاں لکڑی کی پھٹی نما ایک کھپچی سی بندھی ہوئی تھی۔

"یار کبیل! کیا تو واقعی......؟" میرے لہجے میں تشویش اُتر آئی تھی۔

"ہاں!" وہ بولا اور میرے اندر دکھ کی لہر سی اُمڈی۔ "کہا ناں...... کہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔ مگر میں کوڑھی نہیں ہوں۔" میں نے اسے فوراً سہارا دے دیا۔

"ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں...... میرا ایک ساتھی، میرا مطلب ہے ان کا ساتھی، وجے بھی ادھر ہی میرے ساتھ ہوتا ہے، وہ ابھی آجائے گا، ویسے اتنی جلدی اس کے آنے کی اُمید نہیں ہے۔"

مڑھی سے ذرا ہی فاصلے پر اس کی آڑ لیے ہم دونوں بیٹھ گئے۔ میں نے اس سے کچھ کھانے پینے کو پوچھا۔ مڑھی کے اندر سب کچھ موجود تھا۔ اس نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا، مجھے اس سے بہت کچھ پوچھنا تھا، بہت سے سوالات تھے، یہاں سے متعلق بھی اور وہاں "بیگم ولا" سے متعلق بھی۔

وہ ایک محتاط سی نظر گرد و پیش پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"مجھے تیرا انتظار تھا یہاں پہنچنے کا......"

میں اس کی بات پر چونکا۔ "کیا مطلب؟ تجھے کیسے پتا چلا کہ میں......"

"اس مردود بلراج سنگھ اور اس کے حواریوں کی باتیں سن کر...... وہ بار بار تیرا نام لے کر پریشان ہوتے تھے۔ یہاں تک بھی تذکرہ کیا تھا انہوں نے کہ تم اس منحوس جزیرے میں داخل ہو چکے ہو......"

"اوہو......" میرے منہ سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔ "تو تم نے مجھے پہچان کیسے لیا؟ پھر عین وقت پر تم نے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال کر مجھے بلراج سنگھ کی نظروں میں آنے

سے بھی بچالیا......''

میری بات پر وہ بڑے گہرے دوستانہ لہجے میں مسکرایا اور بولا۔ ''ارے یار! میں تو تیرا سایہ بھی دیکھ لوں تو تجھے پہچان لوں...... ویسے میں شش و پنج کا شکار تو تھا، مگر جب تو نے میری طرف دیکھ کر مجھے اشارے کے ساتھ آنکھ ماری تھی اور اپنی ٹوپی اُونچی کی تھی تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آیا تھا۔ پر یار شہزی! شاید بلراج سنگھ بھی تجھے پہچان لے گا، مجھے اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا رہا تھا کہ اس کا اور تیرا آپس میں کئی بار زوردار ٹکراؤ ہوتا رہا ہے۔''

''ہاں! اس کا خدشہ تو مجھے بھی ہے۔ اسی لیے میں اس سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ویسے میں نے انہی کے ایک ساتھی دایال واس کا بھیس بھر رکھا ہے جو یہاں نیا نیا بھرتی ہوا تھا اور کم ہی لوگوں کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا لباس اور شناختی کاغذات میرے پاس ہیں۔ اس کا ڈیل ڈول اور قد بت مجھ سے ہی ملتا تھا۔ چہرے کی بھی مماثلت ایک حد تک شائبہ دیتی تھی، باقی کی کسر میں نے اپنے چہرے کو تھوڑا زخمی کر کے پوری کر لی۔ لب و لہجہ اس کا عام سا تھا جس کا اندازہ میں نے اس سے باتوں کے دوران کر لیا تھا۔''

میں نے کہا اور پھر اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرف دیکھ کر تفکر آمیز تشویش سے پوچھا۔ ''تیری یہ ٹانگ کیسے ٹوٹی؟''

میری بات پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ''بلراج سنگھ نے توڑی تھی۔ اسی وجہ سے تو میں بچ سکا ہوں۔ پھر میں نے ایک کوڑھی معذور کا بھیس بھر لیا، قبیلے کی ایک مہربان عمر رسیدہ عورت نے مجھے اپنا بیٹا بنا لیا اور اسی نے میرا یہ بھیس بھرا اور میری ہڈی جوڑ کر اس پر یہ پٹی باندھ دی، فکر نہ کر، یہ دو ایک روز میں اپنی جگہ آ جائے گی...... اس کے بعد میں ان قبائلیوں میں شامل ہو گیا، مگر افسوس ابھی تک مجھے اول خیر اور شکیلہ کو ان کی قید سے چھڑانے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔ پر اب تو بھی آ گیا ہے تو ان کے لیے کچھ کرتے ہیں...... مل کر......''

''یہ بتا کبیل! کیا اس حرام زادے بلراج سنگھ کو معلوم ہے کہ تم تینوں میرے ساتھی ہو؟''

اس نے ذرا دیر کے لیے اپنے ہونٹ بھینچے اور ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ ''پہچان لیتا تو ہم آج زندہ کہاں ہوتے، وہ ہمیں کھڑے کھڑے گولی مار دیتا۔ بس! ہم عام قیدیوں کی طرح ان کی گرفت کا شکار ہو گئے تھے۔ تاہم ہر لمحے یہ خدشہ ایک خطرناک لٹکتی ہوئی تلوار کی طرح ہمارے سروں پہ معلق رہتا تھا کہ وہ کبھی بھی ہماری حقیقت جان لے کے بعد ہمیں ختم کر سکتا ہے۔ بہت ظالم اور سفاک آدمی یہ مردود بلراج سنگھ......''

اس کی بات پر میں نے بے اختیار سکون کی سانس تھی۔ پھر بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ''تم لوگ ان کے ہتھے کیسے چڑھے تھے؟ اگرچہ سی جی بھجوانی کو جہنم واصل کر سے پہلے مجھے معلوم ہو چکا تھا اور زہرہ بانو سے بھی میری فون پر بات ہوئی تھی کہ تم تینوں بلیو تلسی والوں کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔''

''ہاں!'' وہ ایک نظر گردوپیش میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے فون کے بعد ہم سب بے چین ہو گئے تھے۔ تم سے کسی قسم کا رابطہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہو ہی کہ تم انڈیا میں ہو، ہم تینوں نے پاکستان سے انڈیا روانگی مشترکہ پروگرام بنایا تھا مگر ممبئی کے ائرپورٹ پر ہی بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔

''وہاں سے ہمیں بلیو تلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا، یہاں بھی ہمیں کچھ ایسی اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ تم نے بل تلسی اور کرنل سی جی بھجوانی کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ ا ڈرپوک اور بزدل بھجوانی نے اس خوف سے کہ کہیں تم ہمیں ان کی گرفت سے چھڑا نہ لو...... ہم تینوں کو اپنے تحفظ لیے اور تمہیں جھکانے کے لیے ہی اس نے اپنے قیدیوں یعنی ہمیں محفوظ کرنے کی غرض سے اپنے ایک تین رکن گروپ، جس کی کمانڈ کوریلا نامی ایک ٹاپ ایجنٹ کے سپر کی گئی تھی، کے ساتھ ہمیں اس منحوس جزیرے انڈیمان پہ دیا گیا تھا۔

''اس بدبخت سی جی بھجوانی کے ممبئی کے ایک انڈرورل ڈان بھولا ناتھ کے ساتھ بھی خفیہ دوستانہ تعلقات تھے۔ ا کا وہاں بھی ایک بڑا گروہ سرگرم تھا۔ اسی کی مدد سے ہمیں وہاں پہنچا دیا گیا اور ایک دور افتادہ علاقے میں ہمیں قید دیا گیا جہاں بھولا ناتھ کے مخالفین گروہ کے اور بھی بہت سے اہم ساتھی ایک عرصے سے قید و بند کی زندگی گزار ر تھے۔ وہاں ہم پر مستقل نظر رکھنے کے لیے کوریلا نامی ا ایجنٹ کو بھی مستقل تعینات کر دیا گیا تھا۔ ایک روز کچھ لوگ ان سے کسی بات پر مذاکرات کرنے وہاں آئے۔ بھولا نا کے اس نجی قید خانے کا نام ''ڈیول کیج'' تھا جس کا انچار بھی کسی شیطان سے کم نہ تھا۔ اس کا نام...... آلوک شرما تھا قیدیوں کے ساتھ وہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتا تھا۔ وہاں اسی کا حکم چلتا تھا۔ بھولا ناتھ نے اپنے ا یطان صفت گماشتے کو ہر قسم کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی مگر مارے سلسلے میں خصوصی ہدایات دے رکھی تھیں کہ ہم پر ایک تو کڑی نگرانی کی جائے دوسرے یہ کہ ہماری جانوں کو وئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔ باقی اس نے ہم پر ناروا سلوک اور ہر قسم کے جسمانی تشدد کی کھلی چھوٹ دے رکھی تھی تاکہ م قابو میں رہیں اور یہاں سے فرار ہونے کا خیال بھی اپنے ل میں نہ لائیں۔

میں تمہیں سارا قصہ سناتا ہوں اس طرح شاید تمہیں یادہ آسانی سے ساری بات سمجھ میں آئے کیونکہ تم بھی کسی د تک ان حالات سے صرف غائبانہ طور پر واقف ہو...... ی ساری کتھا سننے کے بعد تمہیں بھی اب تک کے یہاں حالات کا بہتر طور پر اندازہ ہو سکے گا۔ میں اپنی کہانی یول کیج سے شروع کروں گا۔''

یہ کہتے ہوئے کبیل داد نے چند ثانیے کے لیے توقف رنے کے بعد اپنے اور اول خیر وغیرہ کے اب تک کے یش آمدہ حالات کے بارے میں بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

انڈیمان کے اس دور اُفتادہ گوشۂ جزائر میں بنے اس ید خانے ''ڈیول کیج'' پر رات بھی بڑی لرزتی ہوئی اُترتی وس ہوتی تھی۔

تقریباً دو ہزار مربع گز کے وسیع و عریض قطعۂ اراضی یہ عمارت کنکریٹ کی بنی ہوئی تھی۔ سنگ دلی اور بے حسی اس کے ٹھوس در و دیواروں سے آہوں اور سسکیوں کی ورت ٹپکتی محسوس ہوتی۔

اصل عمارت کے گرد تقریباً نو فٹ اُونچی باؤنڈری ال بنائی گئی تھی جس کے اُوپر خم دار فولادی بریکٹوں کے اتھ تین رویہ آہنی خاردار باڑھ لگائی گئی تھی۔ اس خوفناک تاثر دیتی دیواروں کے اندر وہ مربع عمارت اپنے لوہے ے مین گیٹ سے پیچھے کو سرکی ہوئی محسوس ہوتی تھی، جس کی ے عمارت کے عقبی حصے کی باؤنڈری وال اور عمارت کی ی دیوار کے درمیان صرف تین چار فٹ کا خلا ایک تنگ سی کیاری کا منظر پیش کرتا تھا، جبکہ دائیں بائیں اسی طرح کا اصلہ باؤنڈری وال سے قریباً پندرہ سولہ گز کا بنتا تھا جہاں اس شیطانی قید خانے کے عملے کی رہائشی بیرکس بنائی گئی یں۔ آلوک شرما بھی ایسی ہی کسی ایک بیرک میں رہتا تھا۔

یہاں ہمہ وقت ایک ٹرک دو جیپیں اور تین چار انے ماڈل کی مگر ہیوی بائکس کھڑی رہتی تھیں۔ جبکہ عمارت مرکزی دروازے پر جو بادی النظر میں کسی بڑے سے گودام کے ''شٹر ڈاؤن'' دروازے کا منظر پیش کرتا تھا، اس کے اندر تھوڑے فاصلے پر ہی عمارت کے سائز جتنا ہی بڑا سا لوہے کی سلاخوں والا پنجرہ نما قید خانہ تھا اور اس کے اندر بھی لگ بھگ بارہ اسکوائر فٹ کے الگ الگ کمرا نما سلاخ دار قید خانے بنائے گئے تھے جس کے اندر قیدیوں کو ٹھونسا ہوا تھا۔

ان کے سلاخوں والے دروازے بھی الگ الگ سمتوں میں کھلتے تھے، یوں ایک ہی جگہ سب کے اجتماع سے اندر گرمی، گھٹن، ناگوار بدبو اور گندی سیلن ہر وقت رہتی تھی۔ شاید اسی لیے اسے ''ڈیول کیج'' کہا جاتا تھا۔

روشندان بھی بنے ہوئے تھے جہاں سے تازہ ہوا آتی تو تھی مگر وہ ناکافی ہوتی۔ پنجروں سے باہر کی دیواروں پر اُونچائی میں جو روشندان بنے ہوئے تھے، ان میں موٹی موٹی لوہے کی گرلیں نصب تھیں۔ یوں بھی یہ روشندان آدم گزار نہیں تھے۔

ہم تینوں کو بھی ایک ایسے ہی ''کیج'' میں مقید کر رکھا تھا۔ چونکہ ہم تینوں یہاں کے خاص قیدی تھے، اس لیے شکر تھا کہ اس ''پنجرے'' میں صرف ہم تینوں کو ہی رکھا گیا تھا۔ ...... چونکہ باقی دیگر ''پنجرے'' بھی آمنے سامنے ہی تھے اور اس پر مستزاد یہ سب مرد قیدی تھے، جبکہ شکیلہ کی صورت میں عورت قیدی ایک ہی تھی، جس کے باعث ہماری اکثر دوسرے قیدیوں کے ساتھ بدمزگی ہوتی رہتی تھی۔ وہ شکیلہ کو دیکھ کر فحش اشارے کرتے اور نازیبا جملے کستے تھے۔

یہ بات اول خیر کو بُری طرح کھلتی تھی اور وہ آپے سے باہر ہو کر ان کی ماں بہن ایک کرنے لگتا۔ وہ سب اس پر بے ہنگم قہقہے لگایا کرتے تھے اور پنجرے الگ الگ ہونے کی وجہ سے اول خیر بے بسی کے مارے محض اپنے دانت کچکچا کر رہ جاتا تھا۔ میں اسے سمجھاتا کہ کوئی فائدہ نہیں ان حرام زادوں کے منہ لگنے کا خاموشی بہتر ہے۔ پھر شکیلہ بھی اسے سمجھاتی اور وہ خاموش ہو جاتا۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب چھٹے ہوئے بدمعاش تھے جو بھولا ناتھ نامی ڈان کے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ان قیدیوں کے ذریعے اپنا کوئی مطالبہ منوانے کی کوشش کرتے ہوں گے یا پھر بھاری تاوان کا تقاضا کرتے ہوں گے، بیشتر قیدیوں کو آلوک شرما جیسے جلاد نگراں کے ہاتھوں میں نے بیدردی سے مرتے ہوئے بھی دیکھا تھا جنہیں چھوڑنا مقصود ہوتا تھا اُنہیں یہاں سے نکال لیا جاتا تھا۔

آزاد ہونے والے خوش نصیب قیدیوں کی آنکھوں

پر پٹی باندھ دی جاتی تھی، اسی سے یہ بات عیاں ہوتی تھی کہ انہیں اب چھوڑا جارہا تھا، ہمیں بھی یہاں آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا۔

وہ رات نصف پہر میں تھی۔ ہمیں فرش پر بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے گندے سندے گودڑ ... نما بستر دیے ہوئے تھے۔

شکیلہ کو میں نے اس کونے پر لٹایا ہوا تھا جو حصہ عمارت کی بیرونی دیوار کی طرف تھا، یعنی اس سمت میں کوئی پنجرہ نہ تھا۔ اول خیر اس سے ذرا پرے لیٹا تھا، میں درمیان میں پڑا تھا۔

دیگر پنجروں کے بیشتر قیدی بے سدھ سوئے ہوئے تھے، ان کے بے ہنگم خراٹے فضا میں گونج رہے تھے۔ ہمیں یہاں لائے ہوئے آج پانچواں روز تھا مگر یہاں آکر تو ہماری ایک ہی دن میں حالت غیر ہونے لگی تھی اور بہ قول اول خیر کے...... ہم بڑے بُرے پھنسے تھے۔

کچھ قیدی جاگ رہے تھے۔ مجھے نیند نہ آئی تو میں بھی اُٹھ کر ایک طرف کونے میں سلاخ دار دروازے کے ساتھ پشت ٹکائے سیلن زدہ فرش پر بیٹھ گیا۔

میں سخت بے چینی اور پریشانی کا شکار تھا۔ بار بار ایک ہی پچھتاوا میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگتا تھا کہ شہزی کی تلاش میں ہم نے شاید جوش اور جلد بازی سے کام لیا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ ان دنوں بھارت اور پاکستان کے داخلی و خارجی حالات تناؤ کا شکار تھے، ہمیں محتاط ہوکر بھارت میں داخل ہونا چاہیے تھا، ایسے میں جبکہ بلیو تلسی کا ایک گھاگ ایجنٹ سندر داس سکسینہ بھی پاکستان میں پکڑا جاچکا تھا اور بلیو تلسی کے ساتھ شہزی کی ٹسل بھی چل رہی تھی، ہمیں کم ازکم اپنی شناخت چھپا کر آنا چاہیے تھا۔ جبکہ ہم یوں ہی وزٹ ویزے پر منہ اُٹھائے چلے آئے تھے۔ اگرچہ بیگم صاحبہ (زہرہ بانو) کے مشورے کے مطابق ہی ہم بجائے پاکستان کے، دبئی اور عرب امارات کے راستے ہی انڈیا میں داخل ہوئے تھے۔ مگر پہلے شک کی بنا پر اور بعد میں بھارتی خفیہ ایجنسی اور بلیو تلسی کی کڑی نگرانی کی وجہ سے پورے پورے دھر لیے گئے تھے۔ آئے تو ہم شہزی کی مدد کو تھے مگر اب اُلٹا اس کے لیے مصیبت ہی بننے والے تھے۔

رات دبے پاؤں سرک رہی تھی...... قید خانے کی بیشتر بتیاں گل تھیں، کوئی اِکا دُکا جل رہی تھی۔ میں ژولیدہ سا بیٹھا چھت کو گھور رہا تھا، کئی بار میں نے یہاں سے فرار کا سوچا تھا مگر بس! صرف سوچ کر ہی رہ گیا تھا۔ ایک تو ہمیں باہر نہیں نکالا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ عملے کے لوگ مسلح ہو تھے اور بہت اشد ضرورت پڑتی، مثلاً دنگا فساد یا آپس لڑنے جھگڑنے والے قیدیوں کو سدھارنا ہوتا تو تب ہی عملہ اندر داخل ہوتا تھا، وہ بھی اکیلا نہیں، ان کے ساتھ مسلح افراد ہوتے تھے۔

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک کسی نے ہولے سے پکارا۔ میں نے قدرے چونک کر اس طر دیکھا۔ وہ ایک قیدی ٹنگو تھا، ہمیں اس نے یہی نام بتایا ت وہ میرے بائیں ہاتھ والے پنجرے میں قید تھا۔ اس ہمراہ چار قیدی اور بھی تھے۔ وہ سب فرش پر بے سُ پڑے سو رہے تھے۔ ٹنگو سے ہمارے تعلقات اچھے دوستانہ تھے۔ باقی زیادہ ہم اس کے بارے میں نہیں جا تھے۔ دوستی بھی ہماری بس بات چیت کی حد تک ہی تھ یوں بھی ہم نے کسی سے زیادہ راہ و رسم نہیں رکھی تھی۔ ٹنگو تمیز کے دائرے میں رہتا تھا اسی لیے اس سے میں اور کبھار اول خیر تھوڑی بہت باتیں کرلیا کرتے تھے۔

"کیا ہوا دوست! نیند نہیں آرہی ہے؟" اس مجھے جاگتے دیکھ کر پوچھا۔ اس کے لہجے میں عجیب قسم کا بو پن محسوس ہوتا تھا مجھے۔ وہ جوان سا مرد تھا۔ قد کا چھوٹا تھا صحت و شخصیت بھی بس واجبی سی ہی تھی۔ رنگت خاکستری چہرے پر بائیں جانب کے گال پر ایک چیرے کا نشا اسے تیسرے درجے کے بدمعاشوں کی قطار میں کھڑا کر تھا۔ مگر وہ مجھے کیا یہاں موجود کسی بدمعاش کو بھی گینگسٹر نہ لگتا تھا، بعد میں اس نے میرے اس سوال پر مجھے بتایا کہ وہ اپنے مخالف گروہ کے لیے مخبری کا کام کرتا تھا۔ اُ پورا یقین تھا کہ وہ اپنے گروہ کے لیے غیر اہم تھا اور بہت اسے بھی ایسے دوسرے غیر اہم قیدیوں کی طرح باہر کہ لے جاکر ایک دن گولی ماردی جائے گی۔

مگر میرا آج اس سے بھی باتیں کرنے کا موڈ نہیں رہا تھا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں آج کچھ زیادہ پریشان، بے چین اور قنوطیت کا شکار ہورہا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسی بے دلی اور بیزاری سے جواب دیا۔

"ہاں یار! بس، نیند ہی نہیں آرہی آج......"

"ایک اہم خبر ہے میرے پاس...... سنوگے تو پھڑ اُٹھوگے......" وہ سرگوشی میں رازداری سے بولا۔ میں م ہوئے بغیر بولا۔

"کیا ہمیں آزاد کیا جانے والا ہے؟"

"ایسی تو فی الحال کوئی بات نہیں۔" وہ بولا۔ "لو

گریٹ پیو، پھر بتاتا ہوں۔" اس نے اپنے ہونٹوں میں ی سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھائی۔ میں نے کچھ بغیر سر کے خفیف اشارے سے انکار میں سر ہلا دیا۔

"سمجھ گیا......" وہ سر دھن کر بولا اور اپنی جیب سے نکال کر سلاخوں کے پیچھے سے میری طرف اُچھال یلٹ میرے سامنے گرا تو میں نے اُٹھا لیا اور اس میں ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں داب لیا۔ اس نے میری طرف پھینکا۔

گریٹ سلگانے اور ایک گہرا کش لینے کے بعد میں موش مگر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ لوگ ہمارا سودا کرنا چاہ رہے ہیں......"

"کیا مطلب؟ کھل کر بات کرو......" میں نے اب دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے، کیسے عجیب آدمی ہو تم؟ ایک ذرا لے بھی نہیں...... یا تو تم بہت زیادہ مایوسی اور پریشانی ہو یا پھر تمہارا مزاج ہی ایسا ہے۔" ٹنگو نے جز بز ہو ے بارے میں تبصرہ کیا۔ میرے ہونٹوں پہ بے تاثر اہٹ ابھری اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

"ہاں! میرا ایسا ہی مزاج ہے، تم آگے بات

"ارے بھائی! ہمیں خریدا جارہا ہے......" اس نے نکانے کی غرض سے گویا انکشاف کیا۔

"اچھا! کون ہے خریدار ہمارا......؟"

"کچھ نامعلوم لوگ......"

"وہ یہاں تک پہنچے کس طرح؟"

"یہی تو کھلبلی مچی ہوئی یہاں......" وہ بولا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"پہرے دار آپس میں باتیں کررہے تھے، صرف نے ان کی بات سنی تھی، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی...... تادوں تو سارے قیدیوں میں کھلبلی مچ جائے گی، ہنگامہ کھڑا ہوجائے گا ادھر......" وہ اپنے لہجے اور زور دینے کے انداز میں بولا۔ اس بار مجھے اس کی واقعی تھوڑا چونکنے پر مجبور کردیا۔

ات واقعی اہم تھی۔ میں یہی تو چاہتا تھا کہ یہاں ہت حرکت ہونی چاہیے۔ تاکہ ہمیں بھی کچھ کرنے خاطر خواہ موقع مل سکے۔ جبکہ اس قید میں یکسانیت مود تھا۔

"یا باتیں کررہے تھے وہ پہرے دار آپس میں......؟" میں نے بالآخر اس کی بات میں دلچسپی لیتے ہوئے سرگوشی میں ہی پوچھا۔ "تھوڑی تفصیل تو بتاؤ تاکہ کچھ اندازہ لگاسکوں میں؟"

اس پر ٹنگو نے مجھے کچھ مزید باتیں بتائیں جس پر مجھے یہاں کچھ گڑبڑ ہونے کے امکانات نظر آنے لگے، ایسی گڑبڑ جس سے ہم بھی فائدہ اُٹھاسکتے تھے۔ ٹنگو آگے بتانے لگا تو اچانک وہ کہتے کہتے رک گیا کیونکہ اسی وقت میرے بائیں ہاتھ والے پنجرے سے ایک غراتی ہوئی آواز ابھری۔

"یہ کون رات کے اس وقت بک بک کررہا ہے...... نیند خراب ہورہی ہے میری۔ منہ بند کرو اپنا......" میں نے تیز سی نظروں سے اس طرف دیکھا۔

وہاں ایک سلاخ دار دروازے کے قریب ہی وہ مسٹنڈا سا بدمعاش داور لیٹا ہوا تھا۔ سیاہ رنگت اور گنجے سر والا یہ بیل جیسا موٹا تازہ بدہیئت شخص خود کو یہاں قیدی لیڈر کہلوانے کی شدید خواہش رکھتا تھا۔ شکیلہ کو یہی بدمعاش سب سے زیادہ تنگ کرتا تھا۔ میں اس کے منہ کم ہی لگتا تھا۔ لگتا بھی تو کیسے، اس کا منہ آزاد تھا اور ہم قید۔ پنجرے بھی الگ الگ تھے، اول خیر تو اس رذیل پر بری طرح اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ دونوں کے درمیان بڑی پکی پکی گالیوں کا تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔

داور خود کو مخالف گروہ کا نمبر دو کہتا تھا اور خوب اکڑ کر کہتا تھا کہ میرے سرغنہ اسے بھاری تاوان دے کر چھڑا لیں گے اور یہی نہیں وہ اس کی خاطر ان کا ہر مطالبہ بھی مان لیں گے۔

"اچھا بھائی! سوری...... نہیں کرتے باتیں، تم سوتے رہو۔" میں نے معاملہ فہمی سے کہا تو وہ مزید اکڑ گیا۔ مجھے ایک گندی گالی دیتے ہوئے پُرطیش لہجے میں بولا۔

"سوری کی ماں کی...... اور تیری بھی...... بند کر منہ اپنا اب۔"

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ ہم دونوں ہی الگ الگ پنجروں میں بند تھے۔ ایک جگہ ہوتے تو میں نہ صرف اس کی ساری نمبر دو والی اکڑفوں ناک کے راستے نکال دیتا بلکہ ایسا سبق بھی سکھاتا کہ یہ آئندہ مجھ سے بات تک کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اسی لیے میں نے اس کتے کا زیادہ منہ کھلوانا پسند نہیں کیا اور اپنے اندر کے اُبال پر قابو پائے چپ ہی رہا۔ پھر بہت ہولے سے ٹنگو سے کہا۔

"اچھا ٹنگو! کل بات کریں گے۔"

اس بے چارہ کان دبائے چپ ہو گیا ــ وقت

گزرتا رہا اور میں ٹنگو کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ رات کے کسی آخری پہر میری آنکھ لگی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو شور کا بم چخ پھیلا ہوا تھا اور کوئی مجھے جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ شکیلہ تھی۔ دیکھا تو اول خیر سلاخوں کے ساتھ اس قدر چپکا ہوا اس بدمعاش داور کے ساتھ منہ ماری اور گالم گلوچ میں لگا ہوا تھا کہ جیسے اس کا بس چلے وہ سلاخوں کے درمیان سے نکل کر داور کی گردن دبوچ لے۔

”تیری تو...... تُو سمجھتا کیا ہے خود کو کالے بیل کی شکل اور ڈھول جیسے پیٹ والے کالے بھارتی سئور......“ یہ اول خیر کے الفاظ تھے۔ اس کی جوابی کارروائی پر داور بھی کسی وحشی سانڈ کی طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اُتری ہوئی تھی اور اس کے چڑھے ہوئے تیور بتاتے تھے کہ اگر یہ فولادی سلاخیں اس کے راستے میں حائل نہ ہوتیں تو وہ اول خیر کو اُدھیڑ کر رکھ دیتا۔ اِدھر داور بھی بپھرے ہوئے لہجے میں اول خیر سے کہہ رہا تھا۔

”دعا کر اب...... سالے! (ایک گندی گالی)...... ان سلاخوں کو، جو داور عرف بزوکا کا راستہ روکے ہوئے ہے، ورنہ تیرا وہ حشر کرتا کہ تیرے اپنے بھی تجھے پہچاننے سے انکار کر دیتے...... تُو نہیں جانتا میں کون ہوں......“

”ابے جا سالے تیسرے درجے کے لونڈے...... بزوکے کی اولاد! تیری دو ٹکے کی اوقات تیری شکل سے ظاہر ہے...... تُو کیا میرا بگاڑے گا۔“ اول خیر نے بھی سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ اُسے جواب کھڑکا دیا۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”دادا! اول خیر کو روکو۔“ مجھے خاموش دیکھ کر شکیلہ نے مجھ سے منت کی۔

اسی وقت میں نے دیکھا اس بدذات داور نے انتہائی نازیبا حرکت کی۔ اور ہماری طرف منہ کر کے ہر طرف اپنی غلاظت پھیلا دی۔

اول خیر کی حالت پتلی ہو گئی۔ ہمارے پنجرے میں ہونے والی غلاظت سے ناگوار سی بُو پھیلنے لگی۔ مجھے اب بجائے داور کے اُلٹا اول خیر پر غصہ آ گیا جو اب داور کی اس حرکت پر بے بس سی ہونق نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی غصے سے اپنے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھ کر اول خیر کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا، وہ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اس کے چہرے پر پہلے حیرت اس کے بعد ندامت کے آثار ابھرے تھے، اسے شاید اب کہیں جا کر میری بات سمجھ میں آئی تھی۔

”کتنی بار تجھے سمجھایا تھا کہ اس کتے کی اولاد کے مت لگ...... کر دی ناں ہماری جگہ ناپاک......“

”ہاہاہا...... ہاہا......“ داور سمیت سارے ق اوباشانہ انداز میں قہقہے لگانے لگے اور جو چند قیدی اس پنجرے میں اس کے ساتھ قید تھے وہ شکیلہ کی طرف د بڑے ہی فحش جملے کسنے لگے۔ میں پہلے ہی اس عذاب نا جیل خانے سے اُکتایا ہوا اور پریشان تھا اُوپر سے مصیبت مجھے ہلکان کر گئی۔ میں سلاخوں سے لگ کر گلا پھا چلّانے لگا اور عملے کے آدمیوں کو پکارنے لگا۔

بے بسی اور ذلت کے مارے میں اپنا سر سلاخوں بھی مارنے لگا۔ تب ہی اول خیر نے آ کر مجھے س اور سہارا دے کر...... ایک طرف کھڑا کر دیا۔

اول خیر جو آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکا وہیں کھڑا اس بدذات داور کے آگے اپنے دونوں جوڑ کر بولا۔ ”معاف کر دے بھائی! ہمیں معاف دے...... تُو جیتا ہم ہارے۔ ہماری وہ سطح نہیں جو ہے۔ اب بس کر دے...... جس کو تُو مانتا ہے اس کی ہے تجھے۔“

داور مکروہ ہنسی ہنستا ہوا ہماری طرف دیکھنے لگا، کے ایک چمچے نے اس کی پیٹھ ٹھونک کر اسے ایک سُلگتی سگریٹ پیش کی۔

اول خیر میری طرف پلٹا تو میں اس کا ہاتھ جھٹک دور جا کھڑا ہوا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ سلاخو سہارا لیے ہوئے تھے۔ اول خیر میرے پیروں پر بیٹھ گیا رقت بھرے لہجے میں بولا۔

”دادا...... مجھے معاف کر دے...... تُو نے صحیح ک کہ یہ ہماری سطح کے نہیں ہیں...... بس! میں اپنے غصے پر نہیں پا سکا تھا۔ اس کمینے خبیث نے ہمارے لیے بڑ گندے الفاظ استعمال کیے تھے اور...... اور شکیلہ کو...... نے ہماری......“

اُس نے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ میرا اپنا خراب ہو چکا تھا۔ یہ میرے لیے ایسے کٹھن اور عذاب نا لمحات تھے کہ خود مجھے اپنا آپ ہی نہیں اچھا لگ رہا شکیلہ بھی بے چاری سسکتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی تھی۔ خنزیر نسل اب بھی وہیں کھڑا ہمیں حقارت آمیز انداز دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کی شیطانیت ابھی سوئی نہیں تھ پھر لغو بیانی کرنے لگا۔

”بس...... ! اتنا دم تھا...... ابھی تھوڑی دیر پہلے بڑی مار رہا تھا، خوب بول رہا تھا، اتنی جلدی تیری بولتی بند“

میرے دماغ کی نسیں پھٹنے کے قریب ہونے لگیں تو نے دانت بھینچ کر قریب کھڑے اول خیر کی طرف دیکھے اپنا سر جھکائے جھکائے اس سے کہا۔ ”اول خیر! اس کو ادے...... ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

اول خیر پھر اس کی جانب گھوما تو شکیلہ نے اسے روک خود آگے بڑھ کر داور سے لجاجت آمیز انداز میں ”میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں...... بھائی! اب خاموش ہو جاؤ اور گندگی مت پھیلاؤ...... ہم پہلے یشان ہیں...... تم لوگوں کو تو چھڑانے والے ہیں مگر الی نہیں سوائے خدا کے۔“

شکیلہ کی داد و فریاد پر اُس خبیث کی آنکھوں میں ت کی چمک ابھر آئی، وہ بولا۔ ”اری شہزادی! یہ بات چھوڑ کیوں نہیں دیتی ان کنگلوں کو...... تیرے جیسی عورت کو تو میں اپنے دل میں بٹھا کر رکھوں گا۔ میرے ساتھ سمبندھ کر لے۔ یہاں سے میرے تجھے بھی جلدی مکتی مل جائے گی۔“

”شکیلہ......“ میں نے شکیلہ کو آواز دی۔ اس قدر زور میری آواز بھی پھٹ گئی۔ ”اِدھر آ جا......“ وہ بے روتی ہوئی ایک طرف کو پلٹ گئی۔

اسی وقت عملے کے دو افراد ہاتھوں میں خاردار ہنٹر وہاں آن دھمکے۔ ”کس بات کا شور مچا رکھا ہے تم لوگوں ؟“ وہ سیدھے ہمارے ہی پنجرے کی طرف بڑھے ایک نے تحکمانہ انداز میں پوچھا تھا، پھر شاید کسی نے ف خاموش سا اشارہ کر دیا۔ وہ اس طرف آئے تو نے آگے بڑھ کر انہیں اصل بات بتا دی۔ میں اپنی آنکھیں سکیڑے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا کہ وہ دونوں رذیل پہرے دار بجائے داور پر کے اُلٹا اول خیر پر برہم ہونے لگے۔ ایک نے رخت لہجے میں کہا۔

”ضرور اس میں تمہارا ہی کوئی قصور ہوگا...... ابھی میں......“ وہ یہ کہہ کر داور کے پنجرے کی طرف وہ بڑے آرام سے پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ لگائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

”اوئے...... موٹے سانڈ! یہ کیا حرکت ہے؟“

”کیا حرکت ہے؟ میں تو آرام سے کھڑا سگریٹ پی رہا ہوں......“ اس نے بے پروا انداز میں جواب دیا تو دوسرا اکڑ کر اس سے بولا۔

”یہ کہہ رہے ہیں کہ تو نے ان کے ساتھ پھر بلوا کیا ہے اور ان کے پنجرے میں پیشاب کر دیا ہے؟“

”اسی بات پر تو میرا جھگڑا تھا ان سے...... کہ یہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی باہر چلے جاتے، اسی پر یہ دونوں مجھ پر گرم ہو گئے۔“

”یہ جھوٹ بول رہا ہے...... یہ گندی حرکت اسی نے کی ہے۔ تم بے شک ان سب سے پوچھ لو......“ اول خیر بولا۔ مگر میں نے دیکھا کسی نے بھی ہمارے حق میں گواہی نہ دی، حتیٰ کہ ٹنگو بھی اپنے کان دبائے ایک طرف لاتعلق سا کھڑا رہا۔ صاف لگتا تھا کہ داور خاصے اثر و رسوخ والا قیدی تھا۔

اول خیر پہرے داروں سے بحث کرنے کے پورے موڈ میں نظر آ رہا تھا مگر وہ اس کی کوئی بات ماننے سے انکاری تھے۔ میں نے اول خیر کو خاموش کرا دیا اور ان دونوں پہرے داروں سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

”ہم سے غلطی ہو گئی...... آئندہ ایسا نہیں ہوگا...... مگر اب یہاں صفائی تو کروا دو۔“

”تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں ہم، گندگی تم پھیلاؤ اور صاف ہم کریں۔“

وہ دونوں پہرے دار ہمیں غصیلی نظروں سے گھورتے اور سرزنش کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

”چچ چچ چی چی......“ ان ہنٹر بردار پہرے داروں کے پلٹتے ہی داور ہماری طرف تاؤ دلانے والے انداز میں دیکھتے ہوئے ہمارا تمسخر اُڑانے لگا۔

ہماری کوئی پس و پیش نہیں چل رہی تھی۔ پنجرے میں اس مردود داور کی پھینکی ہوئی غلاظت کی ناگوار بو پھیل گئی تھی جس نے ہم تینوں کو ایک جگہ پر محصور ہونے پر مجبور کر ڈالا تھا۔ پہلے ہی یہ قفس نما قید خانہ زیادہ بڑا نہ تھا اب اس میں بھی ایک کونے پر ہم محدود ہو کر رہ گئے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے بڑی خونی نظروں سے داور کو گھورا تھا۔ میرے پورے وجود میں اس رذیل کے لیے نفرت کا ایک طوفان اُمڈا ہوا تھا...... مگر بے بس تھا، ورنہ اگر یہ باہر تو کیا ہمارے ہی قفس خانے میں ہوتا تو میں اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

وہ قہقہے لگانے لگا تو باقی قیدی بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ جبکہ اس کے ”ہم قفس“ اس کی مٹھی چاپی میں بھی لگ

گئے تھے۔

بڑی جاں گسل اور عذاب ناک گھڑیاں بتا رہے تھے ہم تینوں اس ذلالت بھرے قید خانے میں...... جہاں ہمیں مفر کی کوئی راہ تک سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ دل و دماغ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ اول خیر سے زیادہ مجھے شکیلہ کی فکر ہوتی تھی۔ وہ عورت ذات تھی اگرچہ ایسی مشکلات کی عادی تھی، لیکن یہ معاملہ ہم تینوں کے لیے ہی مختلف تھا۔ ایک بے بسی سی بے بسی تھی یہاں میری وجہ سے ان دونوں بے چاروں کو کچھ حوصلہ تھا ورنہ تو یہ دونوں بھی کبھی کبھی بے حوصلگی کا شکار ہونے لگتے تھے۔

’’واوا! لگتا ہے اس بار بڑے برے پھنسے ہیں...... مفر کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی......‘‘ اول خیر ہولے سے مگر پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ جگہ مزید تنگ ہونے کے بعد ہم تینوں ساتھ اور قریب قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے نیچی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اس کی دیکھا دیکھی شکیلہ نے بھی کلس کر کہا۔

’’اس سے تو ہزار درجہ بہتر ہوتا کہ ہم اس کمینے سی جی بھجوانی کی قید میں ہی ہوتے...... یہاں تو جیسے واقعی ماضی کے کالے پانی کی خوں رنگ داستان دہرائی جا رہی ہے ہمارے ساتھ......‘‘

میں انہیں حوصلہ دینے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔ اول خیر کسی خیال کے تحت بولا۔ ’’ایک بات سمجھ نہیں آتی۔ اگر اپنا شہزی کاکا...... اس رذیل بھجوانی کے ہتھے نہ چڑھ سکا تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟ کیا اسی طرح ہم ادھر ہی پڑے رہیں گے، جب تک شہزی کاکا ان کے ہتھے نہیں چڑھ جاتا؟‘‘

’’خدا نہ کرے کہ شہزی بھجوانی کے ہتھے چڑھے...... یہ تم کیسے بدفعل اپنے منہ سے نکال رہے ہو اول خیر؟‘‘ شکیلہ نے اسے گھورتے ہوئے بے اختیار کہا۔ ’’مرو ہو کر تم ابھی سے اتنے پریشان ہو گئے ہو کہ اب شہزی کے پھنسنے کی دعا کرنے لگے......؟‘‘ اس پر اول خیر نے بھی اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

’’بی بی! میں شہزی کے پھنسنے کی بھلا کیوں دعا کروں گا۔ جبکہ مجھے تو خود بھی اس بات کا اندازہ ہے کہ اگر شہزی کو جلد یا بہ دیر اس حقیقت کا علم ہو بھی جائے کہ ہم تینوں بھجوانی کے نرغے میں ہیں تو وہ میراجی دار یار...... ہماری رہائی کے سلسلے میں فوراً ہی بھجوانی سے اپنے بدلے میں ہماری رہائی کے لیے کوشاں ہو جائے گا۔ رہی بات میرے یہاں

پریشان ہونے کی تو اس کی اصل وجہ تم ہو......‘‘

’’میں......؟‘‘ شکیلہ کڑے تیوروں سے اس طرف گھورنے لگی۔

’’اور کیا...... تمہاری ہی وجہ سے ہمیں غیرت میں آ
بار بار اس خبیث شیطان داور سے منہ ماری کرنا پڑ رہی
اور اب اس نے کیا قبیح حرکت کر ڈالی ہے۔ یہ بھی تمہا
وجہ سے ہوا ہے۔‘‘

شکیلہ کو بھی اس کا احساس تھا وہ بے چاری اپنا د
مسوس کر رہ گئی اور بھنچی بھنچی سی سسکتی ہوئی آواز میں اتنا
کہہ سکی...... ’’میرے لیے غیرت میں آنے کی ضرورت نہ
ہے تمہیں......‘‘

میں نے اول خیر کو ڈانٹا۔ ’’اول خیر! ایسا م
کہو...... اس میں تمہارا بھی قصور ہے...... تم کیوں بار
اس کمینے داور کے منہ لگتے ہو؟ کیا یہ غیرت صرف
تمہارے ہی اندر ہے، میں نہیں محسوس کر رہا اس با
کو...... مگر جانتا ہوں کہ یہ ایک گٹر ہے، اس میں گند صا
کرنے کے نام پر جتنا ڈنڈا گھماؤ گے اُتنا ہی تعفن اُ
گا...... اس لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔‘‘

پھر میں نے قریب کھڑی دھیرے دھیرے س
ہوئی شکیلہ کے سر پر شفقت بھرے انداز میں اپنا ہا
پھیرا...... ’’دل چھوٹا مت کرو اپنا...... شکیلہ! سب ٹھی
ہو جائے گا، میں اور اول خیر ہیں ناں تمہارے ساتھ۔‘‘

میری بات پر شکیلہ کو حوصلہ ہوا۔ اس پر اول خ
بھی کچھ شرمساری کا احساس ہوا اور اس نے بھی ہو
سے کہا۔ ’’اوکا کی......! مجھے معاف کر دینا، میرا مق
تمہارا دل دکھانا نہیں تھا...... بس! تمہارے لیے یہ کم
داور گندے گندے جملے بکتا تھا...... اسی لیے میں آپے
باہر ہو جاتا تھا۔‘‘

شکیلہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور ہولے
بولی۔ ’’معلوم ہے مجھے تمہارا کہ تم میرا کتنا خیال ر
ہو......‘‘

’’شاباش! یہی زندہ دلی قائم رکھو اور میری
سنو......‘‘ میں نے کہا اور پھر انہیں ہلکی سرگوشی میں گفتگو
بات بتا دی۔ شکیلہ کے چہرے پر کچھ اُمید چمکتی نظر آ
میں نے دیکھا کہ اول خیر کچھ زیادہ مطمئن نہ ہوا، بولا۔

’’کیا ضروری ہے کہ ہم اس کھوکھلی اُمید پر
دھرے بیٹھے رہیں، یہاں موجود قیدیوں کی جو نوعیت
ہم سب ہی جانتے ہیں، ممکن ہے وہ لوگ اپنے کسی ا

اتھیوں کی بات کرنے آئے ہوں......‘‘

’’اگر ٹنگو مجھے یہ نہیں بتاتا کہ ان لوگوں کے ساتھ ان
ما گرمی بھی ہوئی ہے تو میں بھی پہلے یہی سمجھے ہوئے تھا۔
یہاں عنقریب کسی بڑی گڑبڑی کی بُو آ رہی ہے۔‘‘

میں نے کہا تو اول خیر میرا اشارہ بھانپ کر کچھ سوچنے
ر ہو گیا۔ میں نے ان دونوں کو پورے ہوش و حواس
رہنے اور اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنے کی تلقین بھی کر
ا۔

دوپہر کے کھانے میں پتلی دال اور چاول دیے
۔ وہ ہم نے وہیں کھڑے کھڑے ہی زہر مار کیے۔
ہم گندگی سے بچنے کے لیے کب تک کھڑے
...... ایک کونے میں چھوٹی سی جگہ بنا کر ساتھ ساتھ بیٹھ

وقت گزرتا رہا...... مایوسیوں کے اندھیروں میں
چھوٹی سی چمکتی اُمید بھی ٹوٹے اور شکستہ انسان کے لیے
صلے سے کم نہیں ہوتی۔ اسی کے سہارے وقت بیتا چلا
۔ رات آئی تو دو سوکھی روٹیاں اور ایک گتے کی پلیٹ
باسی سا سالن دیا گیا جس میں ایک بوٹی اور آلو کا ٹکڑا تیر
تھا۔ اس کے بعد سلور کے ٹیڑھے میڑھے مگوں میں مردار

سی چائے دی گئی۔

داور اپنے ساتھیوں کے ساتھ دائرہ بنائے تاش کھیلنے میں مگن تھا اور سگریٹ کے کش بھی لگا رہا تھا، وہ گاہے بہ گاہے ایک تمسخرانہ مسکراہٹ سے ہمارے پنجرے کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ مگر ہم اس خبیث سے نظریں ملانے سے ہی کترا رہے تھے۔

گندگی ہونے کی وجہ سے مچھروں کا زور بڑھنے لگا، یہ ایک نیا عذاب کھڑا ہو گیا تھا ہمارے لیے۔ اب نیند کسے آتی۔

کافی وقت اور سرک گیا...... قیدیوں کی تاش بازی چلتی رہی، ہنسی ٹھٹول بھی ہوتا رہا...... بیشتر قیدی سو گئے تھے، ان کے خراٹوں کی سمع خراش آوازیں گونج رہی تھیں۔

معاً میں چونکا۔

چست لباس میں ملفوف وہ چار افراد پنجروں کے درمیانی خلا میں جگہ بناتے ہوئے تیز تیز قدموں سے چلتے، ہماری طرف ہی آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر یک دم میرے اعصاب تن گئے۔ یہ ہمارے شناسا تھے۔

میری یک ٹک سی نظریں انہی پر جم کر رہ گئی تھیں اور میں نے اسی دوران اول خیر کو ہلکے سے ٹہوکا دے دیا۔ وہ

قارئین اور ایجنٹ حضرات
کے لیے
اہم اعلان

ری 2017ء کے شماروں سے ادارے کے رسائل ہر ماہ مندرجہ ذیل ترتیب سے تاریخ وار دستیاب ہوں گے

سسپنس ڈائجسٹ : 15 تاریخ
ماہنامہ سرگزشت : 20 تاریخ
جاسوسی ڈائجسٹ : 26 تاریخ
ماہنامہ پاکیزہ : 30 تاریخ

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز۔۔۔ کراچی

بھی چونکا اور میری نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''او خیر...... دادا! یہ چنڈال چوکڑی اس وقت کیا کرنے آرہی ہے ہمارے پاس؟ ضرور کوئی خاص وجہ ہے۔''

یہ چاروں ہمارے شناسا تھے، جو بلیو ٹلسی کے وہی ایجنٹ تھے جن کی لیڈر ایک تیز طرار اور سرو قد حسینہ تھی۔ جس کا نام ہمیں کوریلا معلوم ہوا تھا۔ کرنل سی جی بھجوانی نے ہمیں انہی کے سپرد کر کے، یرغمالی بنا کر بھولا ناتھ کے ذریعے ''ڈیول کیج'' جیسے اس منحوس قید خانے میں بھیجا تھا اور درحقیقت ہم انہی کی سپرویژن میں تھے۔ ان چاروں کو بھی اسی جگہ رہائشی کوارٹر دے رکھا تھا۔

وہ سب سے آگے تھی اور باقی اس کے تینوں ساتھی پیچھے چلے آرہے تھے۔ اس کے قریب پہنچنے تک میں نے کوریلا کے چہرے سے ٹپکتی ایک تفکر آمیز پریشانی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ مجھے کچھ ''گڑبڑ'' کا احساس ہونے لگا اور میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

وہ ہمارے ''پنجرے'' کے قریب آکر کھڑے ہو گئے۔ کوریلا نے ایک اُچٹتی سی نگاہ ہم تینوں پر پھینکی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''کدھر رہ گئے یہ لوگ......؟''

''میں بُلا لاؤں میڈم؟'' اس کے ایک ساتھی نے مؤدبانہ انداز میں اس سے کہا۔

''جاؤ منوہر! دیکھو ان کو کہاں رہ گئے ہیں یہ لوگ......'' کوریلا نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اسی سے کہا تو اچانک دوسرا ساتھی بولا۔

''لو...... میڈم! وہ آرہے ہیں......''

ان سمت، بیک وقت میری دھڑکتی ہوئی نظریں بھی اسی جانب اُٹھ گئیں جدھر یہ چاروں دیکھنے لگے تھے، جہاں ڈیول کیج کا جلاد صفت انچارج...... آلوک شرما اپنے دو اسلحہ پوش ساتھیوں کے ساتھ تیز تیز قدموں سے اسی سمت چلا آرہا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بھی کچھ تفکر آمیز پریشانی اور اُلجھن کے آثار دیکھے تھے۔

آلوک شرما۔ پچاس، پچپن برس کی عمر کا ایک ہٹا کٹا شیطان صفت آدمی تھا۔ چہرہ گول تھا اور رنگ سیاہی مائل۔ چہرے پر جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے، جو کبھی اس کی چیچک کی بیماری کے چھوڑے ہوئے ہی معلوم ہوتے تھے۔ قد دراز تھا۔ اس کے موٹے تازے جسم پر خاکی پینٹ شرٹ تھی جو بادی النظر میں کسی شکاری لباس کا پتا دیتی تھی۔

''نکالو انہیں باہر......'' کوریلا نے انچارج آلوک شرما کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس پر مجھے وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا اور کوریلا سے بولا۔

''میڈم! میں آپ کو ایک بار پھر تسلی دیتا ہوں...... ایسا کچھ نہیں ہوگا، آپ چنتا نہ کریں، میں نے ابھی ابھی باس (بھولا ناتھ) سے بات کی ہے کہ وہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے خود ہی پہنچنے والے ہیں۔''

''لیکن، ہمیں ان لوگوں کے تیور کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دے رہے ہیں۔'' کوریلا نے بارعب لہجے میں آلوک شرما سے کہا۔

اب پتا نہیں ''ان لوگوں'' سے اس کی مراد ہم تینوں، یعنی میں (کبیل دادا)، اول خیر اور شکیلہ تھے یا پھر کوئی اور......

تاہم میں بڑے غور سے ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سُن رہا تھا۔

لگتا تو کچھ ایسا ہی تھا کسی معاملے پر ان لوگوں کے درمیان کوئی اچانک سے فیصلے ہوئے ہیں، جن میں کچھ ابہام پیدا ہوگیا تھا۔ وہ اب آپس میں اسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

''لیکن ہم اپنے چیف (کرنل سی جی بھجوانی) کے آرڈر سے روگردانی نہیں کرسکتے۔'' کوریلا بولی۔

''آپ کا کہنا بجا ہے میڈم! ہمارے باس کے لیے بھی آپ کے چیف صاحب کا حکم سرآنکھوں پر ہے۔ مگر ابھی ایسی کوئی خطرے والی بات ہے ہی نہیں...... باس نے خو اس کی ضمانت دی ہے اور آپ کی تسلی کرانے کے لیے ہی و ادھر آرہے ہیں۔ اگر آپ کی تسلی ہوجاتی ہے تو ٹھیک، ورن جیسے آپ چاہیں گی بالکل ویسا ہی ہوگا۔'' آلوک شرما نے ک تو کوریلا بولی۔

''لیکن ہماری تسلی سے زیادہ آپ کو چیف کو مطمئ کرنے کی ضرورت ہے۔ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو تعلقات خرا ہونے کا اندیشہ ہوجائے گا۔''

''باس کو بھی یہی چنتا ہے کہ آپ لوگوں سے ان ک تعلقات میں ایک بال برابر بھی فرق نہ آنے پائے۔'' آلوک شرما سے بولا۔ ''یہی وجہ ہے کہ وہ آپ کی پور پوری مدد کرنے کی پُرزور اچھا رکھتے ہیں۔ وہ اس بات اپنی سبکی خیال کرتے ہیں کہ بھجوانی صاحب کے وہ ایک کا بھی نہ آسکے...... بلکہ......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا ک

اچانک ایک تیز بپ کی آواز اُبھری۔

دیگر پنجروں میں جاگے ہوئے قیدی ہماری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے میں محو تھے۔ مردود داور بھی تاش کی بازی چھوڑ کر اب کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے اسی طرف دیکھنے میں محو تھا۔ ہم تینوں بھی ان کے چہروں کی طرف تکتے ہوئے ان کی آپس کی باتوں کو بڑے غور سے سنے جارہے تھے۔

تیز بپ کی آواز اس فونک ڈیوائس کی تھی جو اس کی بیلٹ کے ساتھ ہی نتھی تھا، وہ اس نے نکالتے ہوئے پہلے کوریلا سے معذرت کی اور پھر کسی سے بات کرنے لگا۔

''یس باس! آپ آگئے ہیں، ہم ابھی پہنچتے ہیں...... کیا؟ او...... اچھا...... یہ تو بہت اچھا ہوا کہ آپ نے بھجوانی صاحب سے بھی بات کر لی...... یہاں ان کے ساتھی اسی تازہ صورتِ حال سے پریشان اور فکر مند ہو رہے تھے۔ ابھی پہنچتے ہیں ہم۔''

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کرلیا۔ وہ یقیناً اپنے باس بھولا ناتھ سے ہم کلام تھا۔ پھر وہ کوریلا سے مخاطب ہو کر بولا۔

''لو جی میڈم! باس تشریف لا چکے ہیں اور اُنہوں نے بھجوانی صاحب سے بھی بات کر لی ہے۔ تشریف لائیں، وہیں چل کر آرام سے گفتگو کرتے ہیں۔''

کوریلا اُلجھی ہوئی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ ہمیں یہاں سے نکال کر کہیں اور لے جانے والی تھی۔ کہاں......؟ یہ وہی جانتی تھی یا اس کے ساتھی۔

بہرکیف وہ لوگ ہم سے بغیر کچھ کہے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم تینوں آپس میں کھسر پسر کے انداز میں تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ اس دوران میں نے کن انکھیوں سے داور والے پنجرے کی طرف دیکھا اور چونک سا گیا۔

وہ عملے کے کسی آدمی سے رازداری سے باتیں کرنے میں محو تھا اور اُس سے باتوں کے دوران اس کی نظریں ہمارے ''کیج'' پر ہی جمی ہوئی تھیں، جس سے لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ ہمارے متعلق ہی اس سے کوئی بات کر رہا تھا۔ ممکن تھا اس سے وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہو...... مگر میں نے اسی دوران ایک اور بات محسوس کی، وہ ہماری طرف کم مگر شکیلہ کی طرف زیادہ گھور رہا تھا۔

''تو کیا یہ خبیث اسی کے متعلق کوئی بات کر رہا تھا؟'' میرے ذہن میں ابھرا۔ میں اندر سے کھٹکا۔ اس بدبخت نے یہاں کے پہرے داروں سے اچھی خاصی بنالی تھی۔ اس کی کچھ بھی وجہ رہی ہو، حقیقت یہی تھی جس کا ہم سب بھی کئی بار نمونہ دیکھ چکے تھے۔

جس قیدی کے ساتھ معاملہ داری کامیابی کے ساتھ نمٹائی جانے والی ہوتی اس کا زیادہ اور خاص خیال رکھا جاتا تھا اور داور عنقریب رہا ہونے والا تھا (اس مردود کی رہائی پر کم از کم میں، شکیلہ اور اول خیر تو ضرور ہی سکھ کا سانس لیتے)

تھوڑی دیر بعد وہ پہرے دار اسے تسلی دینے کے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے اور ایک کمینی سی نگاہ شکیلہ پر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ گیا تو میں چونکا۔ وہ پہرے دار جس رخ پر کھڑا تھا اس کے ساتھ ہی ٹنگو کا پنجرہ تھا، وہ بہ ظاہر ذرا قریب ہو کے لاتعلق سا کھڑا تھا مگر مجھے لگا تھا کہ اس نے ضرور ان کی آپس میں ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ میں بے چین سا ہوگیا۔

ٹنگو اپنے گروہ میں بھی ایک مخبر کی حیثیت رکھتا تھا اور وہ شاید یہاں بھی اپنی عادت سے مجبور ہو کر لوگوں کی باتوں میں کان لگانے کا عادی تھا۔ شکر تھا کہ میں نے ٹنگو سے اچھے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔

بعض لوگ فطرتاً بڑے یار باش قسم کے آدمی ہوتے ہیں، وہ بھی کچھ ایسی ہی فطرت کا مالک تھا۔ میں نے اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کے ساتھ دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ البتہ اول خیر کو وہ جانے کیوں بُرا لگتا تھا۔

شام جھکنے لگی تھی، ڈیول کیج کی بتیاں جلنے لگی تھیں، مگر یہاں زیادہ روشنی نہیں کی جاتی تھی۔ ہلکا سا اندھیرا تو یوں بھی اس منحوس قید خانے کا مقدر ہی بنا رہتا تھا۔

میں بار بار کن انکھیوں سے داور کا چہرہ دیکھنے لگتا تھا۔ نظر مجھے یہی آرہا تھا کہ وہ کمینہ خبیث شکیلہ پر بُری طرح فریفتہ ہوگیا تھا اور پہرے دار کے ساتھ کسی سازش میں مصروف تھا۔

میں اس تلخ اور کریہہ حقیقت کو تسلیم کر چکا تھا کہ ہم تینوں اس شیطانی قید خانے میں بے بس پنچھی تھے جبکہ حالات ہمارے تصور سے بھی شاید زیادہ خراب۔

اگرچہ مجھے پوری اُمید تھی کہ ٹنگو آج رات میرے سامنے رازدارانہ گفتگو کے دوران بعض سنسنی خیز انکشافات کرنے والا تھا مگر مجھے بھی کچھ کرنا چاہیے تھا، میں اس شیطان صفت اور غلیظ آدمی داور کی شکیلہ پر بدنیتی کو تاڑ چکا تھا اور اب بغیر کسی شور شرابے یا ہنگامہ کرنے کے اس معاملے کو دیکھنا چاہتا تھا۔

تاہم زیادہ بہتر میں نے یہی سمجھا تھا کہ پہلے ٹنگو سے

بات کر لی جائے، دیکھوں تو وہ کیا کہتا ہے۔ یوں بھی مجھے اندرونی و بیرونی حالات کچھ خراب ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

رات ہوئی اور ٹنگو سے میری گفتگو کی ابتدا ہوئی۔ وہ جیسے موقع پاتے ہی مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنے اور میرے پنجرے کی سلاخوں کے قریب آ گیا۔

''مشتری ہوشیار باش......!'' وہ میری طرف دیکھ کر محتاط لہجے میں بولا تو میں قدرے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔

''یہ کمینہ خصلت، داور تمہاری ساتھی (شکیلہ) کے خلاف کسی گھناؤنی سازش میں مصروف ہے۔''

اس نے نیچی آواز میں بتایا اور میرا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا، وہی ہوا جس کا مجھے اندازہ اور خدشہ تھا۔ تاہم بولا۔ ''یار ٹنگو! ذرا کھل کر بولو، کہنا کیا چاہتے ہو تم؟''

''داور یہاں سے جانے والا ہے اور اس کے گروہی ساتھیوں کے ساتھ بھاری مطالبے پر معاملہ سیٹ ہو گیا ہے، اسی لیے اس بدبخت کی یہاں زیادہ اُوپر ہو رہی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''اس نے اپنے ایک ہم راز پہرے دار کے ساتھ تمہاری ساتھی کے خلاف ایک سازش تیار کی ہے اور اپنے ساتھ یہاں کے شیطان صفت انچارج آلوک شرما کو بھی ملانے کی کوشش میں ہے۔''

''سازش کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے اس کی طرف سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔

''نمبر ایک......'' وہ بولا۔ ''تمہاری ساتھی کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملانا۔ نمبر دو...... دوسری صورت میں (یعنی شکیلہ کے جھانسے میں نہ آنے کی صورت میں) اسے زبردستی اغوا کرنا اور مجبور کر کے جھکانا......''

یہ سن کر میرے پورے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ غیظ و غضب کی ایک طوفانی لہر تھی جو اچانک ہی میرے اندر سے اُٹھی تھی۔ میں نے اپنے اندر کے غبار پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ''کیا ضروری ہے کہ آلوک شرما اس معاملے میں اس کا ساتھ دے؟ کیونکہ ہم اصل میں اس کے قیدی نہیں ہیں اور جن کے قیدی ہیں وہ لوگ (کوریلا اور اس کے تین ساتھی ایجنٹ) بھی یہاں رہائش پذیر ہیں۔''

وہ میری اس بات پر ایسے ہنسا جیسے میں نے کوئی بچوں والی بات کہہ ڈالی ہو۔ بولا۔ ''ارے بھائی! کس دنیا میں رہتے ہو، جس طرح جنگ اور محبت میں سب جا
اسی طرح جرائم کی دنیا میں بھی سب چلتا ہے اور پھر تم یہ ک
بھول رہے ہو کہ یہ ڈیول کیج ہے یہاں ہر کام شیطانی ہے۔ بہت سے بہانے ہیں ان کے پاس۔ بھولا ناتھ صر
ممبئی کا ہی نہیں اکھا بھارت کا بھی بڑا ڈان ہے۔ بلکہ ا
پورے براعظم کی زیرِ زمین دنیا کا بے تاج با
کہلاتا ہے۔ بڑی بڑی شخصیات کے لیے اگر یہ کام کرتا تو ان کی کمزوریاں بھی رکھتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں سکتا۔'' وہ چند ثانیوں کے لیے رکا اور دوسرے کیج کی طر
دیکھنے لگا جہاں داور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ تاش
میں مگن تھا۔

مجھے ٹنگو کی کسی بات سے اختلاف نہ ہو سکا۔ بھا
کی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی اگر بھولا ناتھ سے خفیہ تعلقات ر
ہوئے تھی تو بھولا ناتھ بھی ان کا راز داں تھا۔ بھولا ناتھ کا
ساتھی اگر اپنی مطلب برآری کے لیے خلاف اُصول حر
کرتا بھی تھا تو کون اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔

ٹنگو کی بات کا صاف مطلب یہ تھا کہ مجھے اس خوش
میں نہیں پڑنا چاہیے تھا کہ ہم بلیوٹلسی کے قیدی تھے اور
کے مفادات کی حد تک محفوظ بھی بلکہ اصل حقیقت یہ تھ
ڈیول کیج میں مقید تھے اور صرف بھولا ناتھ کے قیدی
اور آلوک شرما کے مکمل اختیار میں۔

میں ان ساری باتوں کا ادراک کر کے اندر سے لر
گیا۔ جلدی سے بولا۔ ''یار ٹنگو! تُو واقعی بہت یار باش
یاروں کا یار آدمی ہے۔ تیرا یہ احسان میں ساری زندگی
بھول سکتا کہ تُو نے مجھے باخبر رکھا، مجھے تو واقعی پریشانی تشویش سی ہونے لگی ہے۔''

''چنتا مت کر تُو......'' وہ عجیب سے لہجے میں بو
''ایک اور کٹھن چکر بھی درمیان میں چل پڑا ہے۔'' میں
کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ آگے بولا۔ ''
ہی تو بتایا تھا میں نے تجھے، کیا بھول گیا؟ وہی دونوں پہر
داروں کی آپس کی ہونے والی گفتگو میں نے سنی تھی۔ باہر کے لوگوں سے ہم قیدیوں کا سودا بھی ہو والا ہے...... بہرحال۔'' وہ اپنی بات ختم کرکے سگر
سُلگانے لگا اور مجھے بھی پیشکش کی مگر میں نے انکار میں
دیا۔

''تجھے میں نے یہ سب بتا دیا، اب تُو جان اور
کام...... میں چلا اس طرف......'' وہ یہ کہہ کر دوسرے کو
میں کھسک گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے کوئی پرانا فلمی گ

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی
طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس
لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا
اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار
رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

فروری 2017ء سے

ماہنامہ سرگزشت

کے صفحات پر

ملاحظہ کریں

گانے لگا۔

دنیا میں کتنا غم ہے
تیرا غم کتنا کم ہے
لوگوں کا غم دیکھا تو، میں اپنا غم بھول گیا......

اول خیر اور شکیلہ میرے قریب قریب بیٹھے تھے۔ وہ مجھے ٹنگو کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ میں ان کی طرف سرک گیا۔

میرا چہرہ جوش اور تشویش سے بیک وقت پریشان کن تاثرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ داور کی شکیلہ کے خلاف اس قبیح سازش کے آشکارا ہوتے ہی میں زیادہ دیر اس خوش فہمی کا شکار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کہ یہ قبیح سازش شکیلہ کے لیے جاں سوز مصیبت اور میرے اور اول خیر کے لیے غیرت کی آگ میں خاکستر شدہ ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔

”کیا ہوا دادا......؟ تم اس سے ٹنگو جاسوس سے بات کر کے ایک دم پریشان سے نظر آنے لگے ہو؟“ اول خیر نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے ایک بھنچی بھنچی سی ہمکاری خارج کرتے ہوئے، دھیمی دھیمی آواز میں انہیں سب بتا دیا، جسے سن کر نہ صرف اول خیر بلکہ شکیلہ بھی اس بار غصے سے سرخ ہو گئی۔

عورت چاہے شکیلہ ہی ہو، اپنے بارے میں اس طرح کی ناپاک سازش کا سن کر یہی ردِعمل ظاہر کرتی ہے۔ بے شک اس غصے کی تہ میں تشویش اور پریشانی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے اور شکیلہ تو یوں بھی ایک مرد مار اور جنگجو عورت تھی۔ لیکن موجودہ حالات میں تو ہم جیسے بھی پریشان ہی تھے۔

”مت گھورو اس کمینے کی طرف...... وہ شک میں پڑ جائے گا۔“

تاش کھیلتے داور کی طرف پُرطیش نظروں سے گھورتے دیکھ کر میں نے اول خیر اور شکیلہ کو سرزنش کی تو اول خیر دانت پیس کر خود کلامیہ بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔ ”اس کتے کی نسل کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی ہے اب تک، کاش! میں کسی طرح اس کے پنجرے کے اندر پہنچ جاؤں، پھر میں اس کا حشر کیا کرتا ہوں......“

”خود پر قابو پائے رکھو اول خیر! یہ وقت جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا ہے۔ شیر پنجرے میں بند ہو تو اُس پر گیدڑ بھی چلاتا ہے اور ہم پنجرے میں بند ہیں جبکہ داور ایک گیدڑ کی صورت ہم پر چلا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک طرح سے آزاد ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں دادا! مگر ہمیں کچھ کرنا ہوگا، ٹنگ باتوں سے یہی لگتا ہے کہ......“

”تم میری بات غور سے سنو......“ میں نے اچا اس کی بات کاٹتے ہوئے نہایت سنجیدہ لہجے میں کہا۔ دونوں ہی میری بات پر خاموشی سے گوش برآواز ہو گئے۔

”اول خیر......! میں شکیلہ سے کوئی بات کر والا ہوں...... خبردار، تم زیادہ اُونچی آواز میں مت بولن اپنا دھیان اسی طرف ہی رکھنا۔“

میرے اچانک اس طرح کے پُراسرار انداز اول خیر کو کچھ چونکا سا دیا تھا جبکہ شکیلہ بے چاری پریشان سی نظر آنے لگی تھی۔ تاہم دونوں پُرغور انداز میر ی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے بات کر کی ابتدا کی اور انداز اپنا ایسا ہی رکھا جو عام سا ہوتا کہ چونکا دینے کا سبب نہ ہو، بالخصوص داور کو، جس کی شکر جیسی نظریں ہمہ وقت ادھر ہی اٹکی رہتی تھیں۔

”جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں بتا یہ کمینہ مردود...... داور، شکیلہ کے خلاف کوئی شیطانی منص بندی میں مصروف ہے، مجھے یہ بات ٹنگو نے بتائی ہے او غلط بھی نہیں ہے، کیونکہ میں خود بھی داور کو ایک پہرے کے ساتھ راز و نیاز کرتے دیکھ چکا ہوں، وہ بار بار شکیل طرف اشارہ کر کے اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے آ میں کھسر پسر کر رہے تھے۔“

”کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے دادا اول خیر نے بے تابی سے پوچھا۔

”سنتے رہو...... وہی بتانے لگا ہوں......“ میں اسے ٹوک دیا۔ اس بار میں نے براہِ راست شکیلہ کی طر دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا اور نیچی آواز میں بولا۔

”شکیلہ......! یہ کام تمہارے کرنے کا ہے...... ابھی کرنا ہے۔ اب میری بات غور سے سنو......!“

میں چند سیکنڈ تک اسے اچھی طرح اپنی منصوبہ ب سمجھاتا رہا۔ جسے اس نے فوراً ذہن نشین کرلیا۔

وہ یہ ”کام“ بڑی خوبی کے ساتھ کرنے کے لیے تھی۔ مگر اول خیر کو اس پر اعتراض تھا، دبے دبے سے میں بولا۔

”دادا......! اس میں بڑا رسک ہے۔“

”اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ میں گہری متانت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ذہن میں اس سے اچھا کوئی اور لائحہ عمل ہے تو ت

......“ میری بات پر وہ محض سوچتا رہ گیا۔ اُسے بھی احساس ہا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ موجودہ حالات میں ہارہ پھینکے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

”میں تیار ہوں دادا......!“ شکیلہ نے پورے اعتماد اور جوش سے کہا اور اس کے بعد میں نے منصوبے کے مطابق ان دونوں کو گرین سگنل دے دیا۔

اسی وقت اول خیر اور شکیلہ کے درمیان کسی بات پر ر ما گرم بحث چھڑ گئی۔ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں بیزار کُن انداز میں ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کی تلقین رنے لگا۔

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، میں اب بیزار ہو ہلی ہوں...... اُکتا گئی ہوں تم سے......“ شکیلہ نے اول خیر ے یہ الفاظ خاصے زوردار لہجے میں کہے تھے کہ قریب کے نجرے میں تاش کھیلتا ہوا داور چونک پڑا اور بہت دلچسپی ے ان کی بحث کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”اپنا قصور میرے سر مت تھوپو تم...... تم خود ہمارے لیے مصیبت بن چکی ہو۔“ اول خیر نے بھی غصے سے شکیلہ کی رف دیکھ کر کہا۔ اتنے میں مجھے اُٹھنا پڑا اور ان دونوں کے میان بیچ بچاؤ کرانے لگا تو شکیلہ مجھ سے بھی بھڑ گئی۔

”سارا کیا دھرا تمہارا ہے، تم نے ہم سب کو پھنسوایا ہے۔“

مجھے بھی اس کی بات پر غصہ آگیا اور اس پر برہم ہو کر ولا۔ ”بکواس بند کرو اپنی...... اصل مصیبت ہی تم ہو۔ تم مارے ساتھ نہ ہوتیں تو آج یہ مصیبت ہمیں نہ بھگتنی پڑتی۔ ب خاموش ہو جاؤ اور مجھے سونے دو...... ورنہ پیٹ ڈالوں گا تمہیں۔“

میں نے کہا اور ایک کونے میں سلاخوں سے پشت ٹکا تا بن گیا۔ اس طرح کہ میں ادھ کھلی آنکھ سے شکیلہ کو بھی ھتا رہوں۔ اول خیر بھی اپنا سر جھٹک کر ایک طرف کو جا ٹھا اور اُونگنے کے انداز میں جماہیاں لینے لگا۔

اس ڈرامے کا دورانیہ ہم نے مختصر رکھا تھا۔ تاکہ یادہ شور شرابا نہ ہو اور کہیں پہرے دار ہی یہاں نہ آن مکیں۔

منصوبے کے مطابق شکیلہ ہم سے تھوڑے فاصلے پر جا ھی ہوئی اور ہولے ہولے سسکنے لگی۔

میں نے ادھ کھلی آنکھوں سے داور کی طرف دیکھا، اس کے مکروہ چہرے پر گہری سوچ اور معنیٰ خیز مسکراہٹ کے تاثرات مچل رہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں تاش کے پتوں کا پنکھ تھا جو اس نے فرش پر پھینک دیا۔

اس خبیث کی نظریں ایک طرف کھڑی سسکتی ہوئی شکیلہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو اس کے ساتھیوں نے اعتراض کیا مگر اس نے گیم سے ہاتھ کھینچ لیا اور انہیں اپنا کھیل جاری رکھنے کو کہا۔ وہ معنیٰ خیز انداز میں مسکرانے لگے۔

ذرا دیر بعد میں نے دیکھا کہ داور آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا شکیلہ کی سلاخوں کے قریب آگیا۔ دونوں پنجروں کے درمیان فاصلہ تقریباً تین چار فٹ کا تھا۔

کیج میں اب خاموشی چھا گئی تھی۔ داور نے ایک نظر مجھ پر اور اول خیر پر بھی ڈالی تھی، جبکہ ہم دونوں سوتے بن گئے تھے۔

تاہم میں نے دانستہ اپنا فاصلہ شکیلہ سے کم رکھا تھا تاکہ ان کی آپس میں ہونے والی ”متوقع“ گفتگو سن سکوں۔

”میں نے تو پہلے ہی تجھ سے کہا تھا کہ تیرے یہ دونوں ساتھی نکمے اور بے کار ہیں، اپنی زندگی اور کب تک ان کے ساتھ خوار کرے گی؟“

داور نے موقع پا کر اپنے پنجرے کی سلاخوں سے ٹیک لگا کر ہلکی آواز میں شکیلہ سے کہا۔ شکیلہ نے ایک غمگین سی نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، پھر ذرا اپنی گردن گھما کر ہم دونوں پر بھی ڈالی، اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور پھر وہ داور سے بولی۔

”تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو...... ان دونوں کے ساتھ میں بھی بری پھنسی ہوں، اب کرتے کچھ نہیں ہیں اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کسی غیبی امداد کے انتظار میں ہیں۔ ہُنہ......“

میں نے اپنی ادھ کھلی آنکھ سے دیکھا کہ شکیلہ کی بات پر داور کے بدہیئت ہونٹوں پہ ایک ذرا مکروہ مسکراہٹ اُبھری، پھر اس سے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”اب بھی وقت تیرے ہاتھ میں ہے جانم! میرے ساتھ مل جا...... چھوڑ دے ان کا ساتھ...... میرا یہاں رعب تو تُو نے بھی اب تک دیکھ ہی لیا ہے ناں...... عنقریب جانے والا ہوں یہاں سے...... بہت اہم ہوں میں اپنے ساتھیوں کے لیے۔ تجھے بھی ساتھ لے جاؤں گا اپنے......“

اس کی بات پر شکیلہ کے سُتے ہوئے چہرے پر ایک دم رونق اُتر آئی اور وہ بولی۔ ”تمہاری بات تو ٹھیک ہے ویسے میں نے خود بھی دیکھا ہے کہ یہ پہرے دار تم سے بہت احترام سے بات کرتے ہیں، لیکن کیا تم سچ کہہ رہے ہو......

کہ میں تمہارے ساتھ شامل ہو کر آزاد ہو سکتی ہوں؟ لیکن...... لیکن یہ کیسے ممکن ہوگا؟ بہت مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟ کیا تم ان دونوں سے ڈرتی ہو؟ میں جو ہوں...... کیا بگاڑ لیں گے بھلا میرا یہ دونوں۔" داور نے اپنا سینہ پھلا کر کہا۔

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ دونوں بھلا تمہارا کیا بگاڑ لیں گے، یہ تو خود اپنے لیے کچھ نہیں کر پا رہے ہیں...... مگر یہ پہرے دار اور آلوک شرما...... مجھے تمہارے ساتھ بھلا کہاں جانے دیں گے؟"

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو جانم!" وہ اس کی طرف مخمور سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

شکیلہ بڑی کامیابی کے ساتھ میری منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے اسے بے وقوف بنا رہی تھی۔ اب داور کسی بھی وقت اپنی سازش کے تاروپود اس کے سامنے ظاہر کرنے والا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو، بس...... میرا ساتھ دو اور میری ساتھی بن جاؤ......"

"لیکن ایسا میں نہیں چاہتی۔" شکیلہ نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ انہیں پتا بھی نہ چلے کہ میں نے ان سے غداری کی ہے، بلکہ تم زبردستی مجھے اپنے ساتھ......" شکیلہ نے بڑی مکاری سے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو داور نے چٹکی بجا کر کہا۔

"یہی کام تو میں کر رہا ہوں جانم! چنتا مت کرو، تم یوں بھی عنقریب میرے ساتھ ہی جانے والی تھیں۔" اس کی بات پر شکیلہ چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس خبیث کی بات پر وہ بے چاری بھی ایک لمحے کو اندر سے لرز گئی ہوگی۔ جبکہ خود میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب ترپ چال شکیلہ کے ہاتھ میں تھی کہ وہ کیسے داور کے منہ سے "سچ" اُگلواتی ہے؟

شکیلہ نے ایک دم اپنی گھبراہٹ آمیز پریشانی پر مسرت کا پرتو چڑھا کر کہا۔ "کک...... کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو......؟ مگر کیسے، کب کرو گے یہ سب؟"

"بس! تم دیکھتی جاؤ جانم!" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"نہیں، پھر بھی، مجھے بتاؤ تو آخر تمہاری پلاننگ کیا ہے؟ تاکہ مجھے بھی تسلی ہو کہ تم نے کیا چالاکی چلی ہے......"

اس کی بات پر میں نے داور کو تذبذب کا شکار ہوتے دیکھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کچھ بتانے سے گریزاں تھا۔ اس پر شکیلہ نے چالاکی سے اپنا منہ پھلا کر کہا۔

"میں سمجھ گئی، تم بھی مجھے میرے ساتھیوں کی ط صرف بہلانا چاہتے ہو، وہ بھی اب تک میرے ساتھ کرتے رہے ہیں......" یہ کہہ کر شکیلہ اس کی طرف پرے ہٹنے لگی تو وہ بول پڑا۔

"اری جانم! ناراض کیوں ہوتی ہو...... میں تو لیے...... اچھا سنو، مگر اپنے تک ہی محدود رکھنا یہ بات......

"میں بھلا اپنے پاؤں پہ کلہاڑی کیوں ماروں گی۔

اس نے شکیلہ کو کیج کے آخری سرے کی طرف سر کو کہا اور پھر اُسے اپنے سازشی منصوبے کی تفصیل سے آ کرنے لگا۔

میری پلاننگ کامیاب گئی تھی اور "آپس کی لڑائی' ڈراما بھی اور ڈرامے کے بغیر اس میں شاید وہ رنگ نہ بھر بہرکیف تھوڑی دیر تک شکیلہ اس سے مسکرا مسکر باتیں کرتی رہی۔ اس کے بعد سونے کا بہانہ کر کے ہٹ گ میں نے دیکھا اس خبیث داور نے اس کا گال چھونے کوشش کی تھی مگر وہ بڑی مکاری سے اسے طرح دے تھی۔

جب ہم نے دیکھا کہ داور بھی اپنے کیج کے اَ کونے میں جا بیٹھا اور اُونگنے لگا ہے تو شکیلہ ہماری طر کھسک آئی۔ ہم نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا۔ جاگ رہا تھا۔ کیج قریب قریب بنے ہونے کی وجہ سے سب ایک دوسرے پر نگاہ رکھ سکتے تھے، اسی لیے ہم تین ایک دوسرے کے قریب قریب ہو کر بظاہر اس طرح لی گئے جیسے سونے لگے ہوں، مگر آنکھیں موندے بغیر اَ دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے، دھیمی آواز میں باتیں کر لگے۔

"اس خبیث نے یہاں کے دو پہرے دارو ساتھ ملا کر مجھے اغوا کرنے کا منصوبہ بنا رکھا ہے۔"

"مگر اس نے خود اپنے منہ سے تمہیں، تمہارے اغوا کا کیسے بتا دیا؟" اول خیر نے اُلجھے ہوئے لہجے میں ف سوال کیا تو وہ بولی۔

"ظاہر ہے اب وہ صاف تو میرے سامنے اغوا کا استعمال نہیں کرے گا، اس نے اشارتاً کہا تھا، پہلے پو بات سن لو۔" چند ثانیے توقف کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"اس نے مجھے اپنا احسان اور اپنی مجھ سے دو جتانے کے لیے یہی بتایا تھا کہ وہ دو پہرے داروں کی سے مجھے آج رات ہی کے آخری پہر یہاں سے نکالنے (اغوا کرنے کا) ارادہ کیے ہوئے تھا۔ کیونکہ اس

وں کے ان کے ساتھ کسی معاملہ داری پر کامیاب ات ہو چکے ہیں اور آج رات داور کو یہ لوگ آزاد نے والے ہیں۔ میرے سلسلے میں یہ خبیث آلوک شرما کو ہماری رشوت کی بھی پیشکش کر چکا ہے۔"

"تم نے اپنا کیا ردِعمل اس پر ظاہر کیا تھا؟" میں نے ے گہری سنجیدگی سے پوچھا تو وہ بولی۔

"ظاہر ہے، میں یہ سب سننے کے بعد اندر سے بری ہول کر رہ گئی تھی، مگر میں نے اس پر یہ سب ظاہر نہیں کیا بلکہ اُلٹا اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا اور اس کے ساتھ چلنے راضی ہوگئی تھی۔ وہ مردود اپنا کام یوں آسان ہوتے دیکھ وش ہوگیا تھا۔"

"اول خیر......" شکیلہ کی پوری بات سننے کے بعد میں اچانک گمبھیر سے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

"ہاں دادا! بولو...... کیا کرنا ہے اب......؟" اول خیر ہماری سے بولا۔ اس کے لہجے سے بھی پریشانی اور تشویش ظاہر ہونے لگی تھی۔

"اس مردود کا علاج کرنا ہوگا اب...... یہ ہماری لو للکار رہا ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ ابھی تک اس کی غلاظت پھیلانے والی قبیح حرکت پر ہی طرح جلا بیٹھا تھا...... اب جو اس کی نئی سازش سامنے تو میں نے اس کا حتمی علاج کرنے کا سوچ لیا تھا۔

ہمیں کیا کرنا تھا وہ میں نے اول خیر اور شکیلہ کو اچھی سمجھا دیا تھا۔ یہ سب رات کے آخری پہر میں ہونا تھا، داور کو یہاں سے نکالا والا تھا کیونکہ تاوان وغیرہ ہماری رشوت کے عوض اب داور کو اس ڈیول کیج سے ملنے والی تھی۔

آخری پہر سے تھوڑی دیر پہلے ہی میں اور اول خیر ہوئے سرکتے ہوئے کیج کے دروازے تک آگئے اور ے ترچھے لیٹ گئے تھے، جیسے نیند میں ادھر اُدھر جا ہیں۔ اپنی "کارروائی" کا ادھر سے ہی آغاز تھا۔ شکیلہ بھی قریب تھی۔ وہ داور کے ساتھ بنائے گئے ے کے مطابق جاگ رہی تھی۔ نیز وہ اب داور کو محبت اشارے کنائے کرنے میں مصروف ہوگئی۔

رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی اور تقریباً سب ہی گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے، میں اور اول خیر اسی طرح خراٹے لینے میں مصروف تھے۔

بھی کبھی کوئی پہرے دار آکر گشت کرتا گزر جاتا نہیں یہاں لانے والے بلیو تلسی کے ایجنٹ یعنی کوریلا کے ساتھی بھی ہمارے کیج کا ایک چکر لگا کے اور مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔

منصوبے کے مطابق شکیلہ نے داور کی طرف مسکرا کر ایک ہوائی بوسہ اُچھال دیا۔ اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں، وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس کی سلاخوں کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

شکیلہ نے اس سرگوشی میں کہا۔ "اب میں زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتی، تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔ یوں بھی ہم تھوڑی دیر میں آزاد ہونے والے ہیں۔"

داور نے فوراً ہلکی سی سیٹی بجا کر پہرے دار کو بلایا اور اس سے کچھ کہا۔ وہ اسی وقت پلٹ گیا اور تھوڑی ہی دیر میں انہی دونوں پہرے داروں میں سے ایک وہاں آگیا، جن سے داور نے پہلے ہی سے خفیہ ساز باز کر رکھی تھی۔ وہ اس سے بولا۔

"یہ میری ساتھی بن چکی ہے، اور اپنے دونوں ساتھیوں سے سخت بیزار ہو چکی ہے، ہمارا کام آسان ہو گیا ہے۔ اسے نکال کر میرے کیج میں ڈال دو......"

میں نے پہرے دار کو کہتے سنا۔ "وہ تو ٹھیک ہے، مگر یہاں معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے......"

میں اس کی بات پر چونکا اور ٹنگو کی وہ بات یاد آنے لگی جو اس نے پہلے ہی مجھے خدشے کی صورت میں بتائی تھی کہ یہاں کچھ اندر ہی اندر گڑبڑ چل رہی ہے۔

"کیسی گڑبڑ......؟" میں نے داور کو چونک کر پہرے دار سے یہ کہتے ہوئے سنا۔ "ہماری تو سودے بازی ہو چکی ہے۔ آدھی رقم بھی میرے ساتھیوں نے تم لوگوں کو دے دی ہے؟"

"تمہاری بات نہیں ہے۔" پہرے دار سرگوشی میں بولا۔ "کچھ لوگ آلوک شرما سے ان سارے ہی قیدیوں کا منہ مانگے داموں سودا کرنا چاہتے ہیں...... وہ شاید انہیں ہمیشہ کے لیے اپنا قیدی بنانا چاہتے ہیں، ان سے کوئی بیگار لینا چاہتے ہوں گے۔ مگر آلوک شرما نے صاف انکار کر دیا تھا کہ ان قیدیوں کی نوعیت کچھ اور ہے، تب ان کے زیادہ دباؤ پر آلوک شرما نے بھولا ناتھ سے بات کی اور اُسے بھی منہ مانگے داموں کی پیشکش کی تو بالآخر یہی طے پایا کہ ایسے قیدی جن سے سودے بازی کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی اور جنہیں ان کے گروہی ساتھی نہیں پوچھتے، اُنہیں اب ہلاک کرنے کے بجائے، ان لوگوں کو بیچ دیا جائے۔"

"ہاں تو ٹھیک فیصلہ کیا ہے تمہارے باس نے، پھر کیا

گڑبڑ ہے؟'' داور نے کہا۔

''ٹھیک تو ہے مگر آلوک شرما جی کو نجانے کیوں کسی خطرے کی بو آنے لگی ہے کہ وہ لوگ نیت میں فتور رکھتے ہیں اور سودے بازی کے بجائے کچھ اور کرنا چاہتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے حملہ؟''

''ہاں۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا، یہ تمہارے آلوک شرما جی کا محض وہم ہے۔'' داور ہنسا۔ ''ویسے وہ لوگ ہیں کون؟''

''پتا نہیں، ہوں گے کوئی ہمارے ہی جیسے لوگ۔'' پہرے دار نے کہا تو داور بیزاری سے بولا۔

''اچھا چھوڑو اب یہ باتیں۔'' اس نے شکیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب اسے اغوا کرنے کی ضرورت نہیں رہی، یہ خود ہی میرے پاس آنے پر تیار ہوگئی ہے، تم اس کا پنجرہ کھول کر اسے میرے پنجرے میں ڈال دو......''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کیونکہ اب میرے اور اول خیر کے حرکت میں آنے کا وقت آچکا تھا۔ پہرے دار نے تھوڑے تذبذب کے بعد اس کی بات مان لی اور پھر میں نے اس کے قدموں کی سرسراہٹ سنی۔

میں اور اول خیر پہلے ہی منصوبے کے مطابق سرک کر دروازے کے قریب آن پڑے تھے۔ پھر جیسے ہی میں نے فرش پر پڑے پڑے ادھ کھلی آنکھ سے دروازہ کھلتے دیکھا تو ایک دم بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آیا۔ میری فوراً ہی تقلید اول خیر نے بھی کی تھی۔

میں نے کھلتے دروازے کو لیٹے لیٹے ایک زوردار لات رسید کی تو وہ بڑے زور سے پہرے دار کی پیشانی پر ''وج'' گیا۔ اس کے لیے یہ سب غیر متوقع اور اچانک تھا اسی لیے مار کھا گیا۔ وہ اپنے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ خارج کر کے، داور والے کیج کی سلاخوں سے جا ٹکرایا اور اول خیر نے باہر نکل کر اس کی گردن دبوچ لی اور میں نے چابیوں کا گچھا اس سے جھپٹ لیا۔

''اے...... اے...... یہ کیا [illegible] دونوں......''

داور جواب تک یہ سب کچھ ایک [illegible] میں دیکھنے میں محو تھا، چلایا مگر میں تب تک [illegible] دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگیا اور زخمی [illegible] جھپٹا۔

اس وقت میرا رواں رواں آگ بنا [illegible]

جیسے خبیث نے ہمیں بہت ستایا تھا، میں اب اسے چھوڑنے والا تھا۔ وہ بھی مجھے اس طرح لال بھبوکا د ایک لمحے کو دہشت زدہ سا ہوگیا تھا، مگر دوسرے ہی حرکت میں آیا، تب تک میں خوف ناک غراہٹیں خارج ہوا اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے اپنی لات چلانی چاہی تھی مگر میں نے لات اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر موڑ ڈالی، وہ پورے وجود کے ساتھ گھومتا چلا گیا۔ میں نے دانت پ اس کی گدی دبوچ کر اس کا سر دوسری طرف کی سلاخو دے مارا اور پھر گھما کر اسے کیج سے باہر دھکیل دیا۔ تب اول خیر اس پہرے دار کو انٹا غفیل کر چکا تھا۔

اس ہلکی سی اُٹھا پٹخ میں چند قیدی جاگ پڑ اول خیر نے انہیں اس شیطانی اور منحوس قید خانے آزادی کے نام پر خاموش رہنے پر مجبور کر ڈالا۔

اب ہم دونوں ہی داور پر پل پڑے اور مار مار ک کا بھرکس نکال دیا۔ اس کے بعد بے ہوش پہرے دا داور کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر انہیں ان کی شلوارو ازار بند سے رسن بستہ کرنے کے بعد اپنے کیج میں [illegible] کر بند کر دیا۔

جو قیدی جاگ گئے تھے' وہ حیرت اور خوشی مارے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھے جا تھے، ہم نے انہیں بدستور خاموش رہنے کی تلقین دروازے کی طرف سرک گئے۔

افسوس اس بات کا تھا کہ پہرے دار کے پاس ہمیں اسلحہ نام کی کوئی شے نہیں مل سکی تھی۔ ہم آزاد تھے ابھی خطرے کی چھاؤں تلے تھے۔ ہم تینوں محتاط روی ساتھ مرکزی دروازے کی طرف سرکنے لگے۔ اس ش قید خانے سے رہائی کا جذبہ ہمارے دل و دماغ پر [illegible] حاوی تھا، شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ ہم نے [illegible] اور عذاب ناک دن کاٹے تھے۔ اگرچہ [illegible] یہ ایام مختصر سہی مگر ایک ایک دن سو دن پر بھاری [illegible] یہاں۔

ہم دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے نہایت محتاط روی [illegible] ہوئے مرکزی دروازے تک پہنچے تو یہ د [illegible] گئے کہ وہاں کوئی پہرے دار نہ تھا۔ اس طرف [illegible] میں چند قیدی جاگ رہے تھے اور پریشان س [illegible] تھے، اندر کی گڑبڑ کا انہیں بھی اندازہ ہو چکا تھ [illegible] دیکھ کر وہ ہماری منتیں کرنے لگے کہ ان کا پنجر

[illegible] جائے مگر ہمارے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کہ ان ک [illegible]۔ تاہم ہم نے انہیں تسلی دی کہ ہم سب کو آزاد [illegible] کوشش ضرور کریں گے۔ ایک قیدی نے انکشاف [illegible] انداز میں ہم سے کہا۔

''[illegible] یہاں بھی کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ یہاں موجود [illegible] ایک دم یہاں سے غائب ہوئے ہیں اور [illegible]

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ گولیوں اور دھماکوں کی [illegible]۔ ہم دروازے پر ہی رک گئے۔ میں خود تھوڑا [illegible] ہوگیا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا۔ ابھی میں پیش [illegible] بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اچانک [illegible] ہوئی سماعتوں میں ایک عجیب سی آواز ٹکرائی اور [illegible] لمحے اندر سفید رنگ کا دھواں بھرنے لگا۔

''[illegible]'' میرے ذہن میں ابھرا تھا اور میرے [illegible] ہوئے، میں اسی انداز میں چلایا۔

''[illegible] ساتھ آگے بڑھو......'' یہ کہتے ہی میں [illegible] طرف بڑھا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے رکنا پڑا۔ [illegible] لباسوں میں ملبوس اور کافی سے زیادہ تنگ [illegible] کھڑے دکھائی دیے، چست لباس والوں کے [illegible] جدید ہتھیار تھے جبکہ ننگ دھڑنگ وحشیوں نے [illegible] تیر تفنگ تھامے ہوئے تھے۔ ایک عجیب سی گاڑی [illegible] مجھے نظر آئی جو ایک جیپ کے ساتھ نتھی تھی، [illegible] بڑے دو سلنڈر رکھے ہوئے تھے اور گیس اس [illegible] ایک فائر کینن کے ساتھ اندر پھینکی جا رہی تھی۔ یہ [illegible] اثر گیس تھی جس کے باعث ہمیں بھی چکر آنے [illegible] میں کوئی ہوش نہ رہا۔

[illegible] آنکھ کھلی تو ہم نے خود کو جانوروں کے کسی ریوڑ [illegible] بڑے سے میدان میں پایا۔ اس طرح کہ [illegible] میں زنجیریں بندھی ہوئی تھیں۔ میدان کے [illegible] سرکنڈوں کے بانسوں کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ ہم [illegible] ایک پیروں میں لوہے کے بڑے کڑے [illegible] تھے اور ان میں زنجیریں باندھی گئی تھی، جن کے [illegible] دوسرے قیدی کے کڑے سے منسلک تھے [illegible] سلسلہ ایک قیدی سے دوسرے قیدی تک چلا جاتا [illegible] سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا ہوا تھا۔

[illegible] اردگرد جنگل، اُونچے درخت اور جنگلی [illegible] ہوئی تھیں جن کے پار ہمیں مخروطی چھتوں [illegible] جھونپڑیوں کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

ڈیول کیج میں بے ہوش کر دینے کے بعد ہم سب بکھر چکے تھے۔ میں نے اول خیر اور شکیلہ کو ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ قیدیوں کا ایک ازدحام سا تھا میرے گرد اور یہ سب شور مچا رہے تھے۔ دفعتاً ہی زوردار آواز میں ڈھول پیٹے جانے کی آواز گونجی اور چست لباس میں ملبوس چند مسلح افراد جن کے ہمراہ ننگ دھڑنگ وحشی بھی تھے۔ وہاں آن موجود ہوئے اور ایک ہوائی برسٹ فائر کر کے ہمیں خاموش کرا دیا۔

مجھے لگتا ایسا ہی تھا کہ ہمارے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوا ہے۔ ہم ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں آ چکے تھے۔ تاہم یہاں کی حالت اس ڈیول کیج جیسے منحوس قید خانے سے لاکھ درجے بہتر تھی۔

اس کے بعد کسی نے ہم سے خطاب کیا کہ ہم سے یہاں ایک عارضی مدت تک بیگار لی جائے گی اس کے بعد آزاد کر دیا جائے گا بلکہ جو جہاں کہے گا اُسے وہاں پہنچا دینے کا بھی بندوبست کر دیا جائے گا، مگر شرط صرف یہ ہو گی کہ انہیں یہاں جو کام سونپا جا رہا ہے اُسے پورا کیا جائے۔

میں جانتا تھا کہ یہ محض بہلاوا تھا تاکہ ہم کوئی گڑبڑ پیدا نہ کریں اور نہ ہی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ تاہم ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کے خطرناک نتائج کے بارے میں بھی بتا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

کبیل دادا نے اپنے اور اول خیر وغیرہ کے پاکستان سے آنے تک کے حالات سے مجھے تفصیلی آگاہ کیا اور اس کے بعد اس نے وہی کچھ بتایا جس کا مجھے بھی اندازہ ہو ہی چکا تھا۔ جس کے مطابق وہ یہاں بیگار کاٹنے لگے، کچھ لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی چاہی تھی، وہ یا تو مار دیے گئے یا پھر غائب ہو گئے۔ اس دوران شکیلہ اور اول خیر بھی اس سے مل گئے تھے۔ کبیل دادا نے سرِدست انہیں فرار کی ایسی کسی کوشش سے باز رکھا تھا اور خود اس کے عوامل پر دن رات غور کرنے لگا، ساتھ ہی وہ عملی طور پر بھی یہ پتا لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ آخر یہاں کون لوگ یہ سب کر رہے ہیں۔ ضرور اس سارے گورکھ دھندے میں ان کا کوئی خاص مقصد ہی ہو سکتا ہے، یوں تھوڑا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے معلوم ہوا کہ جنہوں نے بیک وقت دو وحشی قبائل کو اپنا تابع اور ایک کو دوستی کے جھانسے میں اپنے ساتھ ملا رکھا ہے۔ وہ درحقیقت کسی بھارتی ریٹائرڈ جنرل کے ایل ایڈوانی کا گروہ ہے، جس کی کمانڈ اس کے مقربِ خاص کارپرداز بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ خود جنرل ا زیادہ تر ادھر ہی رہتا تھا البتہ کبھی کبھی وہ اپنے ذاتی پلین ممبئی بھی چلا جاتا تھا۔

اس کا یہاں مستقل ٹھکانا بنانے کا ایک مقصد تھا ہی گھناؤنا تھا۔ وہ روس اور چین کے دو جرنیلوں کے سا کر پوری دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے میں دھکیلنے منصوبے پر عمل پیرا تھا، تاکہ دنیا ان کے تابع ہو جائے یعنی یہ تینوں جنونی جرنیل پوری دنیا کو صرف تین بر اعظ میں تقسیم کر کے اپنی حکومت قائم کر سکیں۔ اپنے اس گھنا منصوبے کا نام انہوں نے ''ورلڈ بگ بینگ'' رکھا ہوا تھا

ان کے ساتھ اور لوگ بھی شامل تھے۔ جو تین بڑ سپر پاورز ملکوں، امریکا، روس اور چین کے اہم اور عہدوں پر فائز تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ ایسے سربرآوردہ لوگوں کو بھی اپنا ہمنوا بنانے میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے یہ لوگ جنوبی ایشیا میں جنگ کے تیار کرنے میں مصروف تھے، ان میں امریکا، اسرائیل بھارت کی مقتدر شخصیات ان کا خفیہ طور پر ساتھ دے ر جنگ کی ابتدا یہ لوگ پاک بھارت سے کرنا چاہتے جس کے بعد لامحالہ ان کے حلیف، چین ایران اور تر اُدھر، سری لنکا، برما اور مالدیپ وغیرہ کو بھی لپیٹ لیا کیونکہ وہ ان کے حلیف تھے اور ان کے مفادات دوسرے کی بقا سے وابستہ تھے۔ یہ ایک عالمی بساط تھ خفیہ مہروں کو اس پر بڑی مہارت سے سرکایا جا رہا تھا۔

دنیا اس خوفناک سازش سے بے خبر تھی، مگر ز دماغ مبصر جو عالمی رائے عامہ اور حالات پر گہری نظر ہوئے تھے، وہ اشاروں کنایوں میں ایسی کسی سازش سونگھ رہے تھے، جو افغانستان، مصر، عراق، شام، فل کشمیر اور اب پاک بھارت کشیدہ صورتِ حال کو رکھے ہوئے تھے۔

جنرل ایڈوانی یہاں اپنے مشن اور ٹھکانے کو م بنانے کے لیے باقاعدہ ایک عمارت تعمیر کروا رہا تھا نام اس نے ''ڈارک کیسل'' رکھا تھا۔ اس کی بنیادیں تھیں، جبکہ اس کے اخراجات بیرونی خفیہ ہاتھوں بھی موصول ہو رہے تھے اور یہ خود بھی خود انحصاری کے اص چلتے ہوئے یہاں کی معدنیات اور قدرتی وسائل کو بر کار لا رہا تھا۔ جس کے لیے اس نے پہلے کلی منجارو قبی سردار نیکابوغ سے معاملت داری کی اور اسے نجانے اپنا ہمنوا بنا لیا جبکہ جاوا قبیلہ پہلے ہی کلی منجارو کا محکوم

[illegible] ان سے کم تھا۔ تاہم اُنہوں نے ان کا ڈٹ کر [illegible] تھا، مگر جنرل ایڈوانی نے اس سلسلے میں کلی منجارو کی [illegible] اور وہ جاوا قبیلے پر اپنا غاصبانہ قبضہ قائم کرنے میں [illegible] ہو سکے۔ اب بھی جاوا قبیلے کے اصل جنگجو مفرور [illegible] جاتا تھا کہ وہ ایک نئی طاقت بن کر دوبارہ حملہ کرنے [illegible] تھے۔ ان میں جاوا قبیلے کے سردار موغا کا جوان بیٹا [illegible] اور بیٹی نتالیہ شامل تھے، جس کے باپ کو کلی منجارو [illegible] کے حلیف جنرل ایڈوانی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔ جاوا [illegible] بھر جنگجو گروپ کہیں روپوش تھا۔ اگرچہ اس کی [illegible] تلاش جاری تھی تاکہ انہیں دوبارہ متحد ہونے اور اپنی [illegible] اجتماع کرنے کا موقع نہ دیا جا سکے۔

کلی منجارو زیادہ وحشی قبیلہ تھا جو ان کا حلیف تھا جبکہ [illegible] ان کی مصلوب رعایا کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کا [illegible] جاوا قبیلے کی ایک سیاہ فام عورت کے ساتھ کسی بہانے [illegible] پر ہوا تھا اور اسی نے کبیل دادا کو یہ ترکیب بتائی [illegible] اگر کسی طرح کوڑی کا بھیس بھر کے ان کے ساتھ [illegible] جاوا قبیلے) مل جاؤں تو کسی حد تک وہ اپنے ساتھیوں [illegible] یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر سکتا ہے۔

[illegible] وہی بدنصیب عورت تھی جو مجھے یہاں آتے ہوئے [illegible] اور اپنے گود کے بیمار بچے کو لے کر ہماری (رتن [illegible]) جیپ کے سامنے فریاد کرتی ہوئی آ گئی تھی۔ اس کا [illegible] تھا اور وہ اس کا علاج چاہتی تھی۔ مگر سنگ دل بلراج [illegible] اسے گولی مار دی تھی۔ اسی عورت نے اپنی جان [illegible] میں ڈال کر کبیل دادا کو کوڑھی کے بھیس میں اور جاوا [illegible] فرد کے روپ میں یہاں سے نکال لیا تھا۔ پہرا سخت [illegible] لیے ابھی کبیل دادا اسی عورت کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ [illegible] کے ساتھ اس کی اشاروں کی زبان میں بات ہوتی [illegible] ایک طرح ''بین لاقوامی'' بولی کا ہی درجہ رکھتی ہے۔ [illegible] بان جاوا عورت نے اپنے اور کبیل دادا کے سر پر [illegible] ہاتھ رکھے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب بھائی [illegible]۔ عورت کا شوہر کچھ ہی دن پہلے ایک خطرناک [illegible] میں مبتلا ہو کر مر چکا تھا۔

کبیل دادا کی زبانی یہ ساری کتھا سننے کے بعد میں [illegible] اپنے بھی حالات سے مختصر الفظوں میں آگاہ کیا اس [illegible] بعد اسے جنرل کے ایل ایڈوانی کے بارے میں اور اس [illegible] ہیرے کے بارے میں بھی بتایا پھر میں نے اسے [illegible] اور ہشام چھلگری سے متعلق بھی بتایا۔ کبیل دادا یہ سن [illegible] ان رہ گیا تھا۔

''یار یہ کیسے پاگل اور جنونی لوگ ہیں......'' وہ بولا۔ ''کیا یہ نہیں جانتے کہ اگر اس طرح پوری دنیا کو جنگ کے دہانے میں دھکیلیں گے تو پھر خود کس سیارے میں رہیں گے؟''

اس کی بات سُن کر میں تلخی سے مسکرایا بولا۔ ''ہٹلر بھی اسی طرح جوع الارض کی حرص میں مبتلا تھا۔ کتنے لوگوں کو اس نے جنگ کی آگ میں جھونکا۔ لگتا ہے ان تینوں جنگی جرنیلوں کے اندر بھی ہٹلر کی روح حلول کر گئی ہے۔ ویسے یار کبیل دادا! انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ طویل عرصے تک آرام سے نہیں بیٹھ پاتا، یا پھر کائنات کا اُصولِ تغیر و تبدل کہ کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ جنگ تو پھر جنگ ہے...... رکی رہتی ہے تو برسوں امن رہتا ہے، ہوتی ہے تو اس کا سلسلہ نہیں رکتا......''

یہ کہہ کر میں رکا اور پھر پوچھا۔ ''یار...... ! یہ تو بتا تُو نے اب تک یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کیوں نہ کی؟ یا تجھے موقع نہ مل سکا؟''

''یہی سمجھ لے شہزی!'' وہ بولا۔ ''مجھے اپنی اور اول خیر وغیرہ کی رہائی کی فکر تھی اور یہاں سے فرار ہونا بہت مشکل ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی تھا۔ ان کلی منجارو وحشیوں نے جگہ جگہ ایسے خطرناک ٹریپ نصب کر رکھے ہیں کہ مفرور وہاں جاتے ہی کسی اندھے جال یا ٹریپ کا شکار ہو کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اسی لیے میں دوسرے طریقے پر غور کر رہا تھا، جو ابھی سرِدست میرے دماغ میں نہیں آ سکا تھا۔''

''تم فکر نہ کرو دادا......! شکر ہے خدا کا کہ ہم آپس میں مل گئے ہیں۔ اب کچھ سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھاتے ہیں۔ مجھے پہلے پتا چلانا ہو گا کہ آخر یہ جنگی جنونی ایڈوانی یہاں کر کیا رہا ہے؟ اور مجھے اس کے قبضے سے ہیرا بھی برآمد کرنا ہے جو ہمارے وطن کی امانت ہے۔''

میری بات پر کبیل دادا مسکرا کر بولا۔ ''تمہارے ملنے کے بعد تو مجھے بھی اُمید ہو چلی ہے کہ اب ہم جلد بہ دیر یہاں سے نکل ہی جائیں گے، مگر پھر بھی میرا مشورہ یہی ہو گا کہ ہمیں کسی قسم کی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ کیونکہ ابھی ہمارے لیے یہی بڑی کامیابی ہے کہ ہم بظاہر اب بھی ان کے قیدی ہیں، مگر یہاں سے نکلنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، ہمیں ایک تحفظ تو ملا ہوا ہے کہ ہم نے مختلف بھیس بھر رکھا ہے۔ اسی میں رہتے ہوئے ہم آئندہ کوئی لائحۂ عمل ترتیب دے سکتے ہیں۔'' وہ چند لمحے رکا پھر ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔

''کاش! وہ مہربان جاوا عورت زندہ ہوتی تو ہمارے

بہت کام آسکتی تھی مگر...... افسوس۔‘‘

اس کی بات پر اچانک میرے ذہن میں اس جاوا عورت کا بھی خیال ابھرا جس کا نام وجے نے باریہہ بتایا تھا اور وہ ہماری دوست تھی۔ میں نے کبیل دادا کو جب اس کے بارے میں بتایا تو وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

’’اگر ایسا ہے تو پھر تمہیں اسے اپنی محبت کے جال میں پھنسانا چاہیے، وہ یقیناان کے راز سے بھی واقف ہوگی۔‘‘

’’وہ میرا پول بھی کھول کر مجھے کسی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’ہاں یہ تو ہے، اس کے لیے تمہیں احتیاط سے اُسے شیشے میں اُتارنا ہوگا۔‘‘

’’میں اسی کوشش میں ہوں...... مگر میں باریہہ سے سامنا نہیں کرنا چاہتا، ابھی تھوڑی دیر میں وجے آجائے گا تو میری اس کے پاس جانے کی باری ہوگی مگر یار کبیل! ایسا نہیں ہوسکتا کہ تُو کسی طرح میری اول خیر اور شکیلہ سے ایک ملاقات کرا دے...... میری آنکھیں ترس گئی ہیں انہیں دیکھنے کو اور پھر یقینا مجھے دیکھ کر انہیں بھی کافی حوصلہ ملے گا۔‘‘

’’تمہارے پاس آنے کا یہی تو میرا مقصد تھا۔ وجے آجائے تو چلیں گے۔‘‘ کبیل دادا بولا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات اپنے آخری پہر کی جانب گامزن تھی۔ اس کے ذرا دیر بعد ہی میں نے وجے کو آتے دیکھا جو ٹارچ کی روشنی کیے لڑکھڑاتے قدموں سے مڑھی کی جانب آرہا تھا۔ میں نے کبیل دادا کو ایک جانب کھسکا دیا اور خود پکٹے پر جا چڑھا۔

جب وجے قریب آیا تو اس کے دوسرے ہاتھ میں ادھ بھری شراب کی بوتل تھی۔ ’’جا اوئے...... اب تُو جا تیری باری ہے۔‘‘

میں نے دل ہی دل میں اس پر ایک عدد لعنت بھیجی اور بظاہر خوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’میں تو خود اس کالی ملکہ کے پاس جانے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں یار! پر تُو نے خاصی دیر لگادی۔‘‘

وہ بدمست قہقہے لگاتا ہوا مڑھی کے اندر چلا گیا اور میں ٹارچ لیے آگے بڑھ گیا۔ گن میری پشت کے ساتھ ٹکی ہوئی تھی۔ میں کبیل دادا سے جاملا، جو ذرا پاس ہی کی جھاڑیوں میں میرے انتظار میں دبکا بیٹھا تھا ہم آگے بڑھ گئے۔

کبیل دادا کو راستوں کا اندازہ تھا اور یہ بھی کہ کون سا راستہ زیادہ محفوظ تھا۔ وہ ایسے راستے پر مجھے لیے ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک وسیع قطعہ اراضی پر بڑی چھولداریاں بنائی گئی تھیں۔ یہاں برائے نام پہرا تھا۔ اس کے بارے میں کبیل دادا نے مجھے یہی بتایا مفرور قیدیوں کے بھیانک انجام کے بعد ان قیدیو فرار ہوکر مرنے کے بجائے بیگار کاٹنا اور رہائی کی اُمید وقت گزارنا زیادہ بہتر سمجھا تھا، یوں بھی اندر وہ سب بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔

بہر حال کبیل دادا مجھے چھپتا چھپاتا ہوا ایک چھولد میں لے آیا۔ اندر گھسے تو دیکھا سب ہی جانوروں کی ادھر اُدھر پڑے ہوئے بے سدھ سو رہے تھے۔

’’کیا شکیلہ کو بھی ان مردوں کے درمیان رکھ ہے؟‘‘ میں نے بڑے کرب سے پوچھا۔

’’نہیں...... وہ اس کے ساتھ والی چھولداری کے ایسے گوشے میں ہے جہاں کچھ اور عورتیں بھی ہیں۔‘‘ دادا نے بتایا اور میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔

اس وقت وہ مجھے اول خیر سے ملانے آیا تھا۔

’’دادا......! ہمیں دیکھ کر کوئی قیدی جاگ کر شور مچادے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’نہیں، یہ بے چارے سارا دن کے تھکے ہو ہوتے ہیں اور بے ہوش والی نیند سوئے ہوتے ہیں۔‘‘

’’لیکن یار! اول خیر اور شکیلہ کے لیے بھی کوئی بندوبست کردے کہ ان بے چاروں کو یہ سخت مشقت کا پڑے......‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں! کل تک میں ان کا کچھ ایسا ہی بندوبست کر والا ہوں...... مگر مسئلہ یہ ہے کہ پہلے قیدیوں کی گنتی نہیں کرتی تھی۔ اب ہونے لگی ہے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

چھولداری کے اندر بڑی گھٹن تھی۔ کہیں کسی مشعل ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی، پورا ماحول ہی کسی جانوروں ریوڑ کا منظر پیش کرتا تھا۔ کبیل دادا اور میں سینے اور گھٹنو کے بل رینگتے ہوئے ایک کونے میں آگئے اور وہاں میں اول خیر کو گول مول ہوکر ایک کھال نما لحاف لپیٹے سویا ہوا تو بے اختیار میرا دل بھر آیا۔

’’خود پر قابو پائے رکھنا شہزی! زیادہ جوش میں آ کا مطلب آوازوں کا شور ہوگا جو باہر اُونگتے ہوئے پہرے دار کو اس طرف متوجہ کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ کبیل دادا نے مدھم سی روشنی میں میرے چہرے پر کرب کے آثار اُمڈتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

اس کے بعد اس نے اول خیر کا کھال والا لحاف

تکی سے ہٹایا اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے جگا دیا۔ سا کر جاگا اور کبیل دادا نے سرگوشی میں اس سے کچھ وہ اپنی آنکھیں مسلتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ میری چھلکتی ہوئی یں اپنے یارِ بے بدل پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی متحیر سی یں مجھ پر۔ وہ بس یک ٹک مجھے دیکھے چلا گیا۔

’’اول خیر......! کوئی آواز مت نکالنا...... یہ ہمارا ی ہے...... دیکھ خدا کی قدرت اور تقدیر کا تماشا......‘‘ یل دادا نے ہولے سے اس سے کہا اور بس...... اس کے د ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ چکے تھے۔ مارے بدن جذبات کی شدت سے لرز رہے تھے۔ ہم منہ ے کچھ نہیں بول رہے تھے مگر ہمارے جسموں کی لرزتی ہوئی ش سے محبت و بے غرض دوستی کی جو لہریں پھوٹ رہی یں، وہ بہت سے ایسے حوالوں کا پتا دیتی محسوس ہوتی تھیں ہ میرے اور اول خیر کے درمیان کیسا رشتہ تھا۔

’’او...... خیر...... کاکے......!‘‘ میں نے اپنے کان یں جہاں اس کا چہرہ دبا ہوا تھا اس کی مخصوص آواز سنی اور یرا دل بھر آیا، میرا بھی چہرہ اس کے ایک کاندھے پر کان ی سمت رکھا ہوا تھا، میں نے ہلکی سی لرزتی سرگوشی میں کہا۔

’’جیو میرے یار......! تمہارے اس جملے کو سننے کے یے تو میرے کان ترس گئے تھے۔‘‘

کبیل دادا نے ہمیں بہت دھیرے سے ایک وسرے سے الگ کیا اور بیک وقت دونوں کو ہی مخاطب رتے ہوئے اپنے مخصوص ناصحانہ انداز میں بولا۔ ’’اس گھڑی کو بہت جانو اور اچھے وقت کی اُمید اب مضبوط ھو...... سب ٹھیک ہوجائے گا مگر اس کے لیے حوصلے اور مت کی ضرورت ہے اور اس سے زیادہ احتیاط کی، ہم رندوں کی بستی میں موجود ہیں۔‘‘

میں اور کبیل دادا تھوڑی دیر وہاں اول خیر کے پاس ٹھہرے رہے، اس کے بعد کبیل دادا مجھے لے جانے لگا تو اول خیر تڑپ کر بولا۔ ’’یار دادا......! اتنی جلدی، ابھی تو اپنے شہزی کاکے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں ہے، ایک تو کم ت روشنی بھی کم ہے پر اس کی خوشبو ہی میرے لیے بہت ے، تھوڑا اور ٹھہر جا۔‘‘

اس کی بات سن کر میرے ستے ہوئے چہرے پر ملراہٹ سی پھسل گئی، تب کبیل اُسے حوصلہ دیتے ہوئے گوشی میں بولا۔ ’’ہمت پکڑ یار، خیرے! شہزی اب ہمارے درمیان ہے، جانتا ہے ناں اپنے اس یار کو...... کیا شے ہے یہ...... اب آگیا یہ، سمجھو سب ٹھیک ہوگیا۔‘‘ اس کی بات پر اول خیر نے کچھ حوصلہ پکڑا۔

’’ہم سب ایک دوسرے کے لیے حوصلے کا ہی درجہ رکھتے ہیں...... کوئی کسی سے کم نہیں، کبیل دادا نے بھی یہاں کچھ کم پالا نہیں مارا ہوا...... ان کے درمیان رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی میں لگا ہوا ہے، انشاء اللہ ہم سب مل کر اپنا مشن انجام تک پہنچائیں گے۔‘‘ میں نے کبیل دادا کی بات کے جواب میں یہ کہنا ضروری سمجھا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اول خیر اور کبیل دادا کے ملتے ہی خود میری اپنی ہمت سوا ہوئی تھی، بہت حوصلہ بڑھا تھا میرا۔

’’میں اسے شکیلہ سے ملوانے لے جارہا ہوں تاکہ اس بے چاری کو بھی کچھ حوصلہ ہو...... رب راکھا۔‘‘

کبیل دادا نے کہا پھر ہم دونوں اس چھولداری سے باہر نکل آئے۔ ہر سو گہرے سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔ ہم دونوں چھولداریوں کے بیچ تنگ بل کھاتی سی جگہ پر رینگتے ہوئے ایک اور چھولداری کے پاس آگئے، یہاں کبیل دادا نے پہلے ہی سے ایک چور سی جگہ بنا رکھی تھی، جو احاطے کے دور افتادہ کونے میں اور جنگل کے نسبتاً قریب تھی۔ اس طرف سرکنڈوں کے نکیلے بانسوں کی باڑ تھی۔ چھولداری کے نیچے کی جگہ تھوڑی کھدی ہوئی تھی اور ایک آدم گزار سا سوراخ بنا ہوا تھا۔ ہم دونوں باری باری اسی کے اندر رینگ گئے تھے۔

چھولداری کا یہ گوشہ نسبتاً چھوٹا تھا۔ کبیل دادا پہلے بھی ان کے پاس آتا جاتا رہا تھا۔ شکیلہ اسی سوراخ کے قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔

وہاں اریب قریب میں اور بھی عورتیں بے سدھ سی لیٹی ہوئی تھیں، ان سب نے کھالوں کے لحاف اوڑھ رکھے تھے۔

میں نے بڑی دکھ زدہ سی نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھال اوڑھے بے سدھ سی لیٹی ہوئی تھی۔ کبیل دادا نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے اسے جگایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لحاف ہٹایا اور کبیل دادا کے ساتھ مجھے دیکھ کر پہلے تو وہ مجھے پہچانی ہی نہیں، مگر جب کبیل دادا نے اس کے کان میں کچھ کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

وہ بھی خاصی کمزور نظر آرہی تھی۔ کڑے اور کٹھن حالات اور جاں گسل لمحات میں اپنے آپ کو اب تک زندہ رکھے ہوئے شکیلہ نے بھی ہمت اور حوصلے کا دامن تھامے رکھا تھا۔ اس کے جسم پر کھال جیسا ہی کوئی ڈھیلا ڈھالا لباس تھا، جو گھٹنوں سے ذرا ہی اُوپر تھا۔ اس کے بال جو کبھی دراز

اور ریشم کی طرح ملائم ہوا کرتے تھے، اب کھچڑی سے نظر آرہے تھے۔ چہرے پر کبھی شفق رنگ پھوٹا کرتے تھے، اب وہاں ایک اُداس چاند کی سی زردی پھیلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پھول سے ہونٹوں پہ کبھی لالی شوخ رنگ لیے ہر وقت دمکتی رہتی تھی وہاں اب ایک اُجاڑ سے کھنڈر میں گونجنے والی آہ وبکا کا منظر دکھاتی محسوس ہوتی تھی۔

”ششش...... شہزی! ی ی...... تم...... تم ہو...... تم ہی ہوناں......“ اس کے سوکھے لبوں پر ایک آہ سے مُشابہ لرزتی آواز برآمد ہوئی تھی۔

اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ میرے فراخ سینے پر اپنا سر رکھے رو پڑی۔ میں پیار اور شفقت بھرے انداز میں اس کے کھچڑی سے بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگا۔ پھر اسی جذبات تلے اس کا گال چوما اور پیشانی پر بھی بوسہ دیا۔ وہ سسکے جارہی تھی۔ مجھے خود سے بھینچ کر روئے جارہی تھی۔ میں نے حوصلہ دیا اور کبیل دادا نے بھی اسے صبر اور ہمت کی تلقین کی، ساتھ موجودہ حالات کی نزاکت سے بھی اسے آگاہ کیا۔ بڑی مشکل سے شکیلہ نے خود کو سنبھالا تھا۔ وہ بہت خوش اور مطمئن سی نظر آنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر تک سرگوشیوں ہم باتیں کرتے رہے پھر وہاں سے واپس ہولیے۔

کبیل دادا مجھے لیے آبادی والے حصے میں آگیا، وہاں اس کی جھونپڑی تھی۔ ہم اس میں داخل ہوگئے۔ اندر ایک چربی کے تیل کا چراغ جل رہا تھا جس کی روشنی دانستہ دھیمی رکھی گئی تھی۔

کبیل دادا نے مجھے پانی پلایا اور کچھ کھانے کو بھی دیا۔ اول خیر اور شکیلہ سے ملنے کے بعد میرے دل ودماغ کو ایک بے چینی سی کھا گئی تھی۔ میں نے کبیل دادا سے کہا۔

”کبیل دادا! اب بہت جلد سے جلد ہم دونوں کو ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں اول خیر اور شکیلہ کو مزید اس حالتِ زار میں نہیں دیکھ سکتا۔“

وہ میری بات سُن کر بولا۔ ”جی تو میرا بھی اپنے ساتھیوں کو اس حالت میں دیکھ کر کڑھتا ہے، حالانکہ تُو دیکھ ہی رہا ہے کہ خود میری اپنی کیا حالت ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بے چارہ اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھنے لگا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور چپ ہو رہا۔ میں نے اس سے اماں جی اور بابا جی کا حال لیا اس کے بعد زہرہ بانو کے بارے میں پوچھا۔

زہرہ بانو کے ذکر پر وہ میری طرف دیکھ کر
انداز میں ہنسا اور بولا۔ ”میری بھی کیا تقدیر ہے
جب تُو نے میری برسوں پرانی خواہش پر عمل کرنے
تقدیر نے ہمیں اتنے بڑے گھن چکر میں ڈال دیا
بات اپنی جگہ ہی رہ گئی، پوری نہ ہوسکی، پھر سوچتا ہو
ہی ہوا کہ یہ حقیقت بیگم صاحبہ (زہرہ بانو) کے کا
نہیں پہنچی، وگرنہ وہ کہیں مجھ سے ہمیشہ کے لیے نا
ہوجاتیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر
سائے منڈلانے لگے۔ میں اس کی بات کا مطلب
تھا۔ زہرہ بانو سے اس کی خاموش اور یک طرفہ اُلفت
ہوئے اور اس کے دل سے اپنے لیے غلط فہمی کو دور
غرض سے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ زہرہ بانو کی شا
دادا سے ہوجانی چاہیے، یوں زہرہ بانو کی تنہائی کا بھی
جاتا اور اماں جی کی خواہش بھی پوری ہوجاتی۔ کیو
طرح وہ بھی زہرہ بانو کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

بہرکیف میں نے ازراہِ تسلی اس کے شانے کو
ہوئے کہا۔ ”فکر کیوں کرتے ہو دادا......! شہزی
اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ تقدیر ہمیں یہ نیک کام کر
ایک دن موقع ضرور دے گی...... بس، ہر چیز کا ایک
مقرر ہوتا ہے۔ تُو اپنا دل چھوٹا نہ کر اور بتا مجھے وہاں
میں کیا ہو رہا ہے؟ وزیر جان پکڑا گیا؟ اُس بھارتی
سندرداس سکینہ کا کیا ہوا؟ چوہدری ممتاز وغیرہ......
خان عرف خان جی صاحب...... ایڈووکیٹ خانم شا
بہت سے لوگ ہیں کن کن کے نام لوں......“ میں جو
کہتا چلا گیا اور ساتھ ہی۔ کبیل دادا کا چہرہ تکنے لگا
مجھے ایکا ایکی گہری سنجیدگی کے آثار اُمڈتے ہوئے
ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ یک دم تار
پڑنے لگا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے متعلق کوئی اہم خبر
سینے میں رکھے ہوئے تھا، پھر میری طرف دیکھ کر
اور بہت عجیب سے لہجے میں بولا۔

”شہزی......! تمہیں چوہدری ممتاز خان کی بی
نوشابہ یاد ہے......؟“

نجانے کیوں کبیل دادا کے اس انداز سے پو
میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے
جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت می
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خ
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ہملٹن برگٹ کی نظریں جھاڑیوں پر پڑی ہوئی عورت کی لاش پر سے ہوتی ہوئی اس شخص پر چلی گئیں جو سوئمنگ پول کے گرد بنی ہوئی اینٹوں کی دیوار پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنے بازو دو چھوٹی بچیوں کے گرد ڈال رکھے تھے جن کی عمریں پانچ اور سات سال ہوں گی۔ وہ اس کے گھٹنوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اٹلانٹا پولیس ڈپارٹمنٹ کے سراغ رساں ڈیریس ڈیون پورٹ نے ان کے بارے میں بتایا۔ ”یہ لوگ ٹین کے ڈبے جمع کر رہے تھے جب اس آدمی

رقابت اور انتقام کو کوئی بھی روپ دیا جائے... اس کے حتمی نتائج تباہی کی صورت میں ہی سامنے آتے ہیں... قتل کی ایسی ہی ایک واردات کا ماجرا... واقعات اور جزئیات اسے خودکشی ظاہر کررہے تھے... مگر سراغ رساں کی سوچوں کا دائرہ مختلف سمتوں میں گھوم رہا تھا...

قدرت اور حقیقت کے بھیدوں میں مقید کہانی کے اسرار و رموز......

قدرت کا انعام

جمال دستی

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط:35

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سسپنس اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

Downloaded From paksociety.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کردیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہوجاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس

تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کا یا کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیملر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کمبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کمبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

نوشابہ کے اچانک ذکر پر میرا چونکنا بے محل نہ تھا۔ ماضی کے حوالے سے میرے کئی دشمن تھے۔ کچھ روپوش تھے، کچھ میرے ساتھ نبرد آزما بھی۔ تیسری قسم میرے ایسے دشمنوں کی بھی تھی جو اندر تھے، یعنی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی گرفت میں تھے۔ ان میں ایک چوہدری ممتاز بھی تھا اور نوشابہ اسی کی بیٹی تھی۔ وہ مجھے اپنے بھائی فرخ کا قاتل سمجھے ہوئے تھی۔ حالانکہ اس کا بھائی فرخ خود اسی کی چلائی ہوئی گولی سے ہلاک ہوا تھا مگر وہ اپنے بھائی کی موت کا ذمے دار مجھے سمجھے ہوئے تھی جبکہ میرا وہاں کسی کو بھی ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ یہ سب نوشابہ کی مہم جوئی کی وجہ سے ہوا تھا، جو خود کو کسی ''شوٹنگ کلب'' کا ممبر بھی بتاتی تھی۔ اپنے باپ ممتاز خان کی گرفتاری کے بعد اس نے میرے خلاف بھی مقدمہ قائم کر دیا تھا، جس سے میں بری کر دیا گیا تھا مگر نوشابہ نے پھر بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

اس کے بعد مجھے اس سے متعلق یہ شنید ملتی رہتی تھی کہ وہ اب اپنے باپ کی رہائی کے لیے اس کی سیاسی ساکھ کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہی تھی بلکہ اسے ''کیش'' بھی کر رہی تھی جس کے تحت اس نے ''عوامی کارڈ'' کھیلنے کا منصوبہ بنایا۔ پھر کیا ہوا، وہ کہاں تک کامیاب ہوئی؟ مجھے اس کا علم نہ تھا۔

''کیوں شہزی؟ نوشابہ یاد آگئی؟''

مجھے کافی دیر تک سوچتا پا کر کبیل دادا نے مجھے سرگوشی کا ٹہوکا مارا۔

"ہاں! بھولی تو وہ مجھے کبھی نہیں تھی، مگر...... خیر! تم بتاؤ آگے...... مزید اس کے بارے میں کیا بتانا چاہ رہے تھے تم؟" میں نے پوچھا۔ وہ ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

"شہزی! ممکن ہے ایسا تمہاری غیر موجودگی کے سبب ہوا ہو کہ وہاں ہمارے دشمن پھر سے طاقت پکڑنے لگے ہیں۔ وزیر جان انڈر گراؤنڈ ہو گیا اور وہاں سے اس نے گل کھلانا شروع کر دیا۔ پہلے چوہدری ممتاز کی رہائی کے سلسلے میں اس نے نوشابہ کو ہتھیار بنایا جبکہ خود نوشابہ بھی کسی ایسے ہی سہارے کی متلاشی تھی۔ وہ اس کے زیرِدست اور پشت پناہی میں آ گئی۔

اب وزیر جان، نوشابہ اور اس کی (اس کے باپ کی) سیاسی پارٹی کے ذریعے عوامی کارڈ کھیل رہا ہے اور یہ دباؤ اس قدر بڑھا کہ چوہدری ممتاز خان کو رہا کرنا پڑ گیا۔"

"او...... میرے خدا!" چوہدری ممتاز کی رہائی کا سن کر بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا تو کبیل دادا دھیمی آواز میں مجھے سرزنش کرتے ہوئے بولا۔

"ماٹھا رہ شہزی! اور سنتا جا، وقت کم ہے۔" کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا جھونپڑی کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں جھولتے ہوئے کھال کے ٹاٹ کی درزوں سے تاریکی کے سوا کچھ نہیں نظر آتا تھا۔

"چوہدری ممتاز بری نہیں ہوا، تاہم وہ ضمانت پر رہا ہوا ہے۔ ابھی اس پر غداری اور ملک دشمن عناصر کی سہولت کاری کے جرم میں کیس چل رہا ہے۔ تاہم اس نے خود کو دانستہ پس منظر میں کر لیا ہے اور دونوں باپ بیٹی پسِ پردہ وزیر جان کی ہدایات کو ہی فالو کیے ہوئے ہیں۔ وزیر جان ایک خطرناک دماغ کا حامل شخص ہے اور یہ دونوں باپ بیٹی مکمل طور پر اس کی ہدایات پر عمل پیرا رہتے ہوئے اپنی توپوں کا رخ "بیگم ولا" کی طرف کیے ہوئے ہیں۔

بیگم صاحبہ اور تمہارے خلاف نوشابہ نے میڈیا ٹرائل بھی کروایا اور یہ ڈکلیئر کرنے کی مذموم سازش میں بھی مصروف رہی کہ بیگم ولا کی عمارت اور تم اور بیگم صاحبہ غیر ملکی ایجنٹوں اور دہشت گردوں کے سہولت کار بنے ہوئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں بیگم ولا پر پولیس اور رینجرز کا مشترکہ چھاپا بھی پڑا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ وہاں بیگم صاحبہ کے خدمت گاروں کا ہم سمیت ایک پورا اسلحہ پوش گروہ بھی موجود رہتا ہے۔ نتیجتاً وہاں اسلحہ بھی پکڑا گیا، اگرچہ وہ لائسنس یافتہ تھا، تاہم پوچھ گچھ کے لیے بیگم صاحبہ، مجھے اور اول خیر سمیت شکیلہ اور چند دیگر مشکوک (ان کی نظر میں) افراد کو گرفتار کر کے لے گئے۔"

کبیل دادا اتنا بتا کر رکا۔ میں جیسے ایک سکتے کی سی کیفیت میں بہ غور اس کی باتیں سن رہا تھا، لہٰذا جب وہ سانس لینے کو رکا تو میں نے کہا۔

"لیکن میجر ریاض...... تو ساری حقیقت جانتے تھے اور بیگم صاحبہ اُن سے مدد لے سکتی تھیں؟"

"بیگم صاحبہ نے یہی تو کیا تھا۔" کبیل دادا بولا۔ "ریاض صاحب کے درمیان میں پڑنے سے ہی ہمیں رہائی ملی تھی اور معاملہ کچھ وقتی طور پر سہی، ٹھنڈا پڑا تھا۔ تاہم ان دنوں وہ علالت کے باعث طویل رخصت پر تھے اور ان کا چارج کسی اور نے سنبھالے رکھا تھا مگر نوشابہ کی اس مہم جوئی کے نتیجے میں ہمیں اور بیگم ولا کو مشکوک بنا دیا گیا ہے۔ خیر...... آگے سنو!"

وہ چند ثانیے کے لیے متوقف ہوا پھر آگے کہنا شروع کیا۔ "اس واقعے کے بعد وزیر جان کی تلاش کے سلسلے میں بیگم صاحبہ نے میری سرکردگی میں ایک گروپ تشکیل دیا جبکہ اول خیر اور شکیلہ کو نوشابہ کے پیچھے لگا دیا گیا۔ خود بیگم صاحبہ خان جی (زبیر خان) سے چوہدری ممتاز اور وزیر جان کے سلسلے میں مدد لینے ان کے پاس جا پہنچیں۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر درمیان میں کہا۔ "بھلا خان جی سے بیگم صاحبہ کو کیا مدد کی ضرورت پیش آ گئی تھی؟"

"اعتراض تو مجھے بھی اس پر تھا، مگر...... شاید وجہ اس کی یہی رہی ہو کہ خان جی اس وقت چوہدری ممتاز خان کی مخالف سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ گویا جس طرح نوشابہ اور چوہدری ممتاز نے چالاکی سے سیاسی گود کی پناہ لے لی تھی اسی طرح شاید بیگم صاحبہ بھی اس کا توڑ نکالنے کے لیے کوشاں تھیں۔"

"مگر خان جی تو اپنے بیٹے کے قتل کے بعد سے ہی سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے؟" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں! مگر اب وہ پھر فعال ہو گئے ہیں۔" کبیل دادا نے جواب دیا۔

"لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے بیگم صاحبہ اور خان جی کے درمیان تو کبھی بھی کسی بھی سلسلے میں آج تک کوئی بات چیت نہیں ہوئی تھی؟"

"اس سلسلے میں بات چیت کے لیے تمہارا حوالہ کیا کم

تھا؟'' کبیل دادا مسکرایا اور میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

''خان جی نے سب سے پہلے تمہارے بارے میں بیگم صاحبہ سے پوچھا تھا۔ میں بھی ساتھ تھا۔ تمہارے بارے میں ان کا اس قدر پریشان اور بے چین ہونا مجھے ہی نہیں بیگم صاحبہ کو بھی حیران کر گیا تھا۔'' وہ آگے بتانے لگا۔

''خیر......! انہوں نے بیگم صاحبہ کو اس سلسلے میں پوری تسلی اور مدد کی اپنی طرف سے یقین دہانی کے ساتھ وعدہ بھی کیا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔

''لیکن شہزی! سچ تو یہ بھی ہے کہ چوہدری ممتاز جس سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے وہ برسرِاقتدار آچکی ہے۔ یہ ان دونوں باپ بیٹی کے لیے ایک بڑا ٹرننگ پوائنٹ ہے جو اُن کے حق میں جاتا ہے۔ ہماری جنگ ان سے جاری تھی کہ ہمیں یہاں تمہاری تلاش میں نکلنا پڑا......'' اس نے اتنا بتا کر اپنی بات ختم کی تو میں نے پوچھا۔

''عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا...... ان سانپوں کی جوڑی کے بارے میں کوئی خبر؟''

کبیل دادا نے نفی میں اپنا سر ہلا دیا۔ البتہ ایڈووکیٹ خانم شاہ کے بارے میں اس نے فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ابھی تک بسترِ علالت پر تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر وقت کا اندازہ کیا۔ رات نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ مجھے اس بلیک کوئن کے پاس بھی جانا تھا، جس کا نام مجھے وجے نے باربیہ بتایا تھا۔ چاہے خانہ پُری کے لیے ہی سہی، میرا باربیہ سے ملنا ضروری تھا۔ ورنہ اگر وہ یا وجے اُس سے میرے بارے میں پوچھ لیتا تھا تو مسئلہ ہو جاتا کہ میں اس کے پاس نہیں آیا تھا تو پھر کہاں گیا تھا اتنی دیر؟

میں کبیل دادا کو اپنے اب تک کے حالات سے مختصراً ہی آگاہ کر پایا تھا پھر بولا۔ ''دادا! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وقت ابھی ہماری مٹھی میں ہے۔ یہ تب تک رہے گا جب تک کہ ہم کسی جلد بازی کا مظاہرہ کیے بغیر اپنا کام خاموشی اور رازداری سے کرتے رہیں۔ اب ہم چاروں کے لیے حالات بھی غیر یقینی نہیں رہے اس لیے کہ ہم اب مل گئے ہیں۔ بس! صبر اور استقامت سے باقی کے حالات سے بھی نمٹ لیں گے۔ میں اب چلوں گا...... تم یہی بہروپ بھرے رکھو اور ہاں! مجھے تمہاری ٹانگ کی فکر ہونے لگی ہے۔'' میں نے آخر میں فکر مند ہو کر اس سے کہا تو وہ ہنس کر اپنی ٹانگ میں بندھی پٹی کو دیکھ کر بولا۔

''اس کی فکر نہ کر شہزی! یہ ٹھیک ہو جائے گی جلدی...... تو جا اب! کل تک تو بھی کچھ آگے سوچ رکھ، میں بھی اب اس نئی صورتِ حال کے مطابق کچھ منصوبہ بناتا ہوں۔''

میں اور کبیل دادا ایک دوسرے کے گلے ملے اور جدا ہو گئے۔

بستی پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ اطراف کے جنگل میں کالی بھٹ تاریکی کو ''سُپر مون'' کا سا منظر پیش کرتے ہوئے، آسمان پر ٹکے طباق چاند کی روشنی بھی چیرنے میں ناکام ہی محسوس ہوتی تھی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی ہوئی اس سنہرے ارتھ جیسے ضوفشاں چاند کے سامنے آجاتی تھیں۔ دور پرے جنگل کے پار سیاہ چٹانوں کی طرف سے جنگلی جانوروں کے کبھی چلّانے کی آوازیں سناٹے کو کسی حد مجروح کرتیں، اس کے بعد پھر وہی آسیبی سناٹا منحوس گدھ کی طرح غلیظ پر پھڑ پھڑائے اس جنگل بستی پر آبیٹھتا تھا۔

میں کچھ اندازے سے بھی اس طرف بڑھتا چلا گیا، جدھر بلیک کوئن یعنی باربیہ کی جھونپڑی تھی۔ باربیہ کھوٹا سکہ سہی میرے لیے، مگر حالات اور تجربے سے میں نے بھی کھوٹے کو کھرا کرنا سیکھ لیا تھا، لہٰذا اس کے پاس جانے کا میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ میں اس سے ایک بار مل کر یہ ضرور دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ آخر میرے کس کام آسکتی تھی۔

کبیل دادا بھی اسے جانتا تھا۔ اسی نے ہی مجھے اس کی مڑھی کے بارے میں بتایا تھا اور مختصراً یہ بھی کہ وہ بستی کی ایک چلتا پرزہ عورت ہے اور اس کے بارے میں جاوا بستی کے لوگ دبے لفظوں میں یہی کہتے ہیں کہ وہ غاصب دشمنوں کی جاسوس ہے۔ کیونکہ اسے ہر قسم کی سہولیات حاصل تھیں اور وہ دیگر جاوا قبائل کے ستم رسیدہ قبائلیوں کے برعکس بہت مزے کی زندگی گزار رہی تھی۔

میں نے یہ بات ذہن میں رکھی تھی۔ میں تھوڑی دیر میں اس بلیک کوئن کی جھونپڑی کے قریب جا پہنچا۔ اس کی جھونپڑی کے اردگرد چوڑے پتوں اور لانبی ٹہنیوں والے پودے پھیلے ہوئے تھے، کچھ خودرو جھاڑیاں بھی تھیں، ان میں بھی کہیں کہیں جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے، جن کی مہک دل و دماغ کو مخمور سا کر رہی تھی۔ اندر روشنی تھی۔ دروازے پر ایک کھال کا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ میں شش و پنج کے انداز میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

''اندر آجاؤ...... میرے شہزادے!'' دفعتاً ہی اندر

سے ایک مترنم سی آواز ابھری۔ لب ولہجہ مجھے ہندی لگا تھا۔ مگر بولنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ٹوٹے پھوٹے جملے جوڑ کر بول رہی ہو، وجے نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اس بلیک کوئن کو ہندی بھی آتی ہے، جو اس نے انہی کے درمیان (دوستی) سیکھی تھی۔ یوں بھی بہ قول وجے کے ہی...... جاوا قبیلے کو یوں بھی تھوڑی بہت ہندی آتی تھی۔ نیز وہ کلی منجارو جیسے وحشی اور جنگجو قبیلے کے مقابلے میں مہذب آبادیوں سے زیادہ قریب رہے ہیں، جبکہ کلی منجارو غیر متمدن اور مہذب دنیا سے دور دراز علاقوں میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ وہ صرف اپنی بولی کے اور کوئی زبان نہیں بول سکتے تھے۔

بہرحال پہلی بار اس تشویش آمیز خدشے نے میرے اندر سر اٹھایا تھا کہ کہیں یہاں آکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کرلی تھی۔ اگر وہ دشمن کی جاسوس نکلی تو مجھے پھنسا سکتی تھی۔ تاہم ابھی یہ یقینی بات نہ تھی کہ وہ ایسی کوئی جاسوس تھی بھی یا نہیں۔

میں ایک گہری سانس لے کر اور دھڑکتے دل سے اندر داخل ہوگیا۔ میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ یہ محض کہنے کو جھونپڑی تھی۔ اندر سے وہ کسی آرام دہ اور پُرسہولت کمرے سے کم نہیں تھی۔ کہیں قریب ہی دھرے پڑے ایک چربی والے چراغ کی روشنی میں وہاں مجھے فرش پر ایک صاف ستھری کھال کی دری بچھی نظر آئی۔ موٹے کپڑوں کے نشستی گودڑ بھی دو تین رکھے ہوئے تھے جو عرف عام میں میٹریس یا فوم والے گدے ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا جس میں شراب کی بوتلیں اور پانی وغیرہ کی صراحیاں بھی رکھی نظر آئیں۔ ایک آرام دہ گودڑ پر مجھے وہ کالی حسینہ، ہوش اُڑا دینے والے انداز میں نیم درازسی بیٹھی ہوئی دکھائی دی، جو میری طرف مخمور نگاہوں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس نما کوئی شے تھی۔ شاید اس میں شراب تھی۔ اس نے کھال کا ہی نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ وہ پوری کالی نہیں تھی، سیاہ رنگت میں سانولے پن کا شائبہ دیتی تلچھٹ اس کے رنگ وروپ کو نرالی اور پرکشش چھب دیے ہوئے تھی۔ چراغ کی روشنی میں اس کا جسم تانبے کی طرح ہی چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے سیاہ گھنے بال اس کی برہنہ پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ نرم وگداز لب بڑے سیکس اپیل انداز میں نیم وا تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خمار اور بے اختیار اپنی طرف کھینچ لینے والی بڑی ''خطرناک'' کشش پھوٹ رہی تھی اور یہی ہوا بھی کہ میں نے اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔

''کیا بات ہے؟ آج وہ پہلے والی بے چینی اور بے صبری تمہارے اندر نظر نہیں آرہی ہے۔'' وہ میری طرف اس بار کچھ عجیب انداز سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا مجھ سے تمہارا دل بھر گیا ہے دیال داس؟''

''ایسی بات نہیں، میری شہزادی!'' میں نے اس کے قریب دبیز کھال والی فرشی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا اور بڑے پیار سے اس کا نرم وملائم ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگالیا تو اس کے نیم والبوں سے ایک سسکی سی پھوٹی۔

''آہ...... کتنے گرم ہوتے ہو تم انڈین لوگ...... ایک ذرا چھوتے ہی تن بدن میں آگ بھر دیتے ہو......'' مخمور اور ڈوبے ڈوبے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنی گھنیری پلکوں والی آنکھیں موندسی لیں۔

''آؤ ناں! اور قریب آجاؤ، دبوچ لو مجھے، بھینچ لو خود سے مجھے، تمہاری قربت، جانے کیوں سب مردوں سے زیادہ مجھے بھاتی ہے، اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ تمہارے اندر بڑی بے صبری اور وارفتانہ پن ہے......''

وہ اپنی کہے جارہی تھی۔ مگر میں ایسے ہی اپنے چہرے پر دانستہ اداسی سی طاری کیے بیٹھا رہا۔

اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اس مرتبہ حیرت سے بولی۔ ''کیا ہوا تمہیں؟ تم اترے اترے کیوں نظر آرہے ہو؟ طبیعت ٹھیک نہیں تمہاری؟''

''ایسی بات نہیں۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟ کھنچے کھنچے سے کیوں ہو؟ تم تو آتے ہی مجھ سے لپٹ جاتے تھے، جھنجوڑ ڈالتے تھے مجھے۔'' اس کے انداز میں خودسپردگی تھی، وہ ایسے میں مجھے ایک جنگلی اپسرا کی صورت میں ہی نظر آرہی تھی۔

''باربیہ! جب سے میں نے تمہاری قربت کا مزہ چکھا ہے، سچ پوچھو تو مجھے تم سے محبت سی ہوگئی ہو، شاید یہی وجہ ہے کہ میں اب حصے داری برداشت نہیں کرسکتا، میری مردانگی اور محبت یہ گوارا نہیں کر رہی ہے کہ میں اب تمہارے قریب اپنے سوا کسی اور مرد کو برداشت کروں......'' میں اس کے ساتھ ڈبل گیم کھیلنا چاہتا تھا۔

میری بات پر اس نے بہت گہری گہری سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تو مجھے چراغ کی روشنی میں اس کی آنکھوں کے سپید ڈیلوں میں گلابی اور سرخ ڈورے کھنچے ہوئے صاف نظر آنے لگے تھے اور میں اس کے قریب ہونے کے باوصف ایک ذرا فاصلہ کیے اس آگ کو اپنے

ناسور

◆

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی
طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس
لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

◆

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا
اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرِ پیکار
رہنے میں بیتنے لگا۔

◆

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

فروری 2017ء سے

ماہنامہ **سرگزشت**

کے صفحات پر

ملاحظہ کریں

لفظوں کی گرمی سے، ہولے ہولے ہوا دے رہا تھا۔

''کیا تم میرے قریب اپنے سوا کسی اور مرد کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے؟'' اس نے کچھ عجیب سے ہی انداز میں مجھ سے کہا تھا۔

''نہیں۔'' میں نے بدستور اپنے چہرے پر روکھے پن کا خول چڑھائے رکھا تو اس نے اچانک ہی اسی ہوشربا انداز میں کہنیوں کے بل سرک کر میرے گلے میں اپنی مرمریں بانہوں کا ہار ڈال دیا اور پھر جب اس نے بے اختیار اپنے لب میرے گال پر رکھے تو وہ مجھے دہکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس کے پیاسے لبوں کی حلاوت نے پہلی بار مجھے بھی ایک لمحے کے لیے بے خود سا کر کے رکھ دیا۔ میں نے بھی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے وسیع تر مفادات اور اہم منصوبوں کی تکمیل کی خاطر اس کی یہ جسارت برداشت کر لی۔ مگر پھر اس قبائلی حسینہ کی آورگی بڑھنے لگی تو میں نے آہستگی سے خود کو اس سے ذرا دور کر لیا۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے پسند کرنے لگے ہو۔'' اس نے کہا۔

''کیا تمہیں محبت کے معنی آتے ہیں؟ کیا تم جانتی ہو کہ ایک مرد اور ایک عورت کا پیار کیا ہوتا ہے؟ اور...... اور کیا تم پیار صرف اسے ہی سمجھتی ہو کہ ایک عورت، کئی مردوں کے ساتھ اپنے تعلق کو استوار کرتی ہے، جس میں صرف جنسی بھوک کا حیوانی جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے، محبت کے جذبے کا کوئی تصور نہیں ہوتا؟''

میری بات اس نے پہلی بار بہت غور اور دھیان سے سنی تھی شاید، اسی سبب وہ کچھ سوچتی ہوئی سی بن گئی تھی۔

''تم......! میری بات سمجھ رہی ہو؟ بس، یہی ایک پھانس ہے جو اب مجھے تمہاری طرف بڑھنے سے روکتی ہے......''

میں نے اسے گم صم سی خاموشی میں پا کر دوبارہ کہا تو وہ جیسے اپنے پُرسوچ خیالات کے بھنور سے یک دم ابھر کر بولی۔

''ہاں! میں سمجھ رہی ہوں تمہاری بات...... تو کیا تم مجھ سے واقعی محبت کرنے لگے ہو؟''

اسے پہلی بار بے خودی و بے اختیاری سے ذرا سنجیدگی کی طرف آتے پا کر میں نے بھی من ہی من میں سکون کی سانس بھری تھی اور بولا۔ ''محبت صرف کہہ دینے سے ہی نہیں ہو جاتی باریہہ!'' میں دانستہ اب اسے اس کے نام سے ہی پکار رہا تھا۔ آسان لفظوں میں آگے بولا۔

''یہ ایک جذبہ ہے، بغیر کہے خود ہی ہو جاتا ہے۔ محبت سے پہلے انسیت ہوتی ہے، ایک لگاوٹ ہوتی ہے محبوب سے...... وہ اسے صرف اپنے لیے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ بس! یوں سمجھو تم سے کچھ اسی قسم کے ہی جذبات میں اپنے اندر محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں تمہارے قریب ہوں کا پجاری بن کے نہیں ایک اچھا دوست بن کے رہنا چاہتا ہوں۔ دوستی، انسیت، لگاوٹ اور پھر محبت...... فردِ واحد سے محبت۔''

اس نے میری بات پورے دھیان سے سنی تھی اور اسی غور بھری نگاہوں سے وہ میرے چہرے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھی۔ پھر کیا ہوا اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور چہرہ بھی......

شاید میں اسے اس کی بے راہ روی کا خاطر خواہ احساس دلانے میں کامیاب رہا تھا۔ میری بدستور مگر بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں اسے اور کیسے سمجھاتا اور کیسے خود سے دور رکھتا؟ کیونکہ اصل دیال داس نے اس کے ساتھ نجانے کتنی راتیں گزاری ہوں گی۔ وہ مجھے... وہی دیال داس سمجھے ہوئے تھی اور اگر میں منصوبے کے تحت اس کے ساتھ روابط رکھتا تو مجھے بھی لامحالہ اس گندے جوہڑ میں آغشتہ ہونا پڑتا۔

لہٰذا اس سے بچنے اور باریہہ کے قریب رہنے کا ایک یہی طریقہ مجھے سمجھ میں آیا تھا کہ اسے ایک طرف بے راہ روی سے روک سکوں اور دوسری جانب اس سے اپنے نیک مقاصد کے لیے خاطر خواہ فائدے حاصل کر سکوں۔ میں تو محبت کے نام پر بھی کسی کو دھوکا دینا گناہ ہی سمجھتا تھا، مگر ایک نیک مقصد اور کسی کو بری راہ سے راہِ راست پر لانے کے لیے اگر میں باریہہ سے محبت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا تو یہ محبت جذبۂ انسانیت سے بھی تو تعبیر ہو سکتی تھی۔

تب ہی میں نے دیکھا کہ باریہہ اپنا منہ دوسری جانب کیے اپنا سر جھکائے ہوئے تھی، اس کی کشادہ آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے کھال کی دری پر ٹپک کر جذب ہو رہے تھے۔

وہ ایک عورت تھی، نازک اندام اور نازک سا دل رکھنے والی۔ قدرت نے عورت کو، خواہ وہ کسی بھی خطے کی ہو، شرم اور لجا کی جو چادر دے رکھی ہے، وہ حقیقت میں اس کا ہتھیار ہے، جو اسے ضمیر کے خلاف کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے روکتا ہے۔ کوشش کرتا ہے، وہ جب تک اسے

اوڑھے رکھے گی، کوئی اس کی طرف ایک ذرا آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ اس ہتھیار سے وہ کئی برائیوں سے بچی رہتی ہے۔

یہ سب باتیں اس سے کرنے کے دوران میں نے اس کے اندازِ تخاطب سے یہ بھی جانچنے کی کوشش چاہی تھی کہ آیا یہ واقعی میرے دشمنوں کی جاسوس تھی یا اس کی اپنی کوئی مرضی تھی؟

اب جبکہ میں نے دیکھا کہ باریہہ کے منہ زور اور بے راہ رو جذبات کا طوفان قابو میں آیا ہے تو میں بہت دھیرے سے اس کی طرف بڑھا اور پیار سے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ کا لمس محسوس کرتے ہی وہ یک دم سسک پڑی۔

”تمہارے آنسو اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمہیں غلط اور صحیح کا احساس ہو چکا ہے۔ میرا مطلب تمہیں دکھی کرنا ہرگز نہیں تھا۔ ہم اچھے دوست ہیں، بس تم یہ بے راہ روی کی روش چھوڑ دو...... اور میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کا اشکبار چہرہ اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اپنی طرف موڑ دیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میرے گلے لگ گئی۔ میں نے اسے کچھ لمحات خود سے لگائے رکھا پھر آہستگی سے علیحدہ کر دیا۔ اب میں اپنے مقصد کی طرف آیا اور ملائمت آمیزی سے بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ غلط راستہ اپنی کسی ذاتی مجبوری کے تحت ہی اختیار کیا ہوگا۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں؟“

وہ ایک دم میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں؟“

میں اس کی بات پر ٹھٹکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے کہنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے کسی اہم راز سے آگاہ کرنا چاہ رہی ہو۔ میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے دل میں جو تھا وہ سب کچھ میں نے تم پر بھروسا کر کے ہی کہہ دیا تھا، اب تم بھی مجھ پر اسی طرح کا بھروسا کر سکتی ہو، کیا خبر ہم ایک دوسرے کے کسی کام آسکیں، باقی یہاں کے حالات مجھے کچھ تسلی بخش نظر نہیں آتے۔“ کچھ اندازہ کرتے ہوئے اور لگے ہاتھوں میں نے اندھیرے میں تیر بھی چلا دیا۔ وہ بولی۔

”تم ان لوگوں کے ساتھی ہو، جنہوں نے ہماری زمین پر زبردستی قبضہ جما کر نہ صرف ہمیں اپنا غلام بنا لیا ہے بلکہ ہم پر ظلم و ستم کا بھی بازار گرم کر رکھا ہے۔ مگر میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ان کے کچھ ساتھی ایسے ہیں جو اُن کے زرخرید ملازم سہی مگر وہ یہاں سے تنگ آئے ہوئے ہیں، شاید تمہارے علم میں یہ بات بھی ہو کہ کچھ ایسے لوگوں نے یہاں سے فرار ہونے کی بھی کوشش کی تھی، مگر وہ مارے گئے۔“

”ہاں!“ میں نے اِثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ مجھے کبیل دادا نے یہ بتایا تھا ”میں خود بھی انہی لوگوں میں سے ہوں۔“ میں نے اسے مزید اپنا اور اس کا ہم خیال بناتے ہوئے کہا تو وہ مزید بتانے لگی۔

”یہ لوگ فقط ان لوگوں سے ہی بچے ہیں جو اُن کے قریبی ساتھی ہیں، اگرچہ ان کی تعداد کم ہے مگر وہ اتنی قوت میں ہیں کہ انہوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان پر طاقت اور پیسے کے بل بوتے پر اپنا تسلط جما رکھا ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رکی تو میں نے اسے مزید کھولنے کے لیے یہ بھی بتایا۔

”میرے علم میں یہ بھی ہے کہ تمہارے قبیلے جاوا کے سردار موغا کو گلی منجارو اور اس کے حلیف جنرل ایڈوانی نے ہلاک کر ڈالا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس کا جوان بیٹا ڈنگرال اور بیٹی نتالیہ اپنے چند جنگجو محافظ ٹولے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کے چند روز بعد ہی ہمارے (ایڈوانی وغیرہ کے) جاسوسوں نے بتایا کہ جاوا کا یہ بچا کھچا ٹولا جزیرے کے کسی گمنام گوشے میں اپنی طاقت سمیٹنے میں مصروف ہے اور کسی وقت بھی حملہ کرنے والا ہے۔ لیکن...... میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ ان کا مقابلہ کرسکیں، یہ لوگ (ایڈوانی وغیرہ) طاقت میں ان سے کئی گنا ہیں۔ اس لیے کہ ان کی سرکردگی میں بھارت کا ایک بڑا ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہے اور اس کی پشت پر اس کے اپنے ہی لوگ نہیں بلکہ چند دوسرے ملکوں کے جرنیل شامل ہیں۔“

میں اتنا کہہ کر رکا تو یہ جاوا حسینہ پوری طرح کھل گئی، پھر اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا، الف سے ی تک ساری رام کتھا سنا ڈالی، جس کے مطابق باریہہ خود ڈنگرال اور نتالیہ کے جنگجو ٹولے کی جاسوس تھی اور یہاں دشمنوں کے بیچ میں ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے مجبوری کے تحت ایک فاحشہ عورت کا بہروپ بھرا تھا۔

”اگر یہ بات ہے تو پھر تم اپنی قوم اور قبیلے کے لیے بڑی قربانی دے رہی ہو، ان کی آزادی اور ان غاصبوں کو اپنی سرزمین سے نکالنے کے لیے تم اس مٹھی بھر جنگجو ٹولے

کے ہاتھوں کو مضبوط کر رہی ہو۔ لیکن یہ کام اور طریقے سے بھی کرنے کا تم سوچ سکتی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔'' وہ سادہ انداز اور لب و لہجے میں بولی۔ ''ورنہ میں بھی ان کی قید میں ہوتی یا پھر ماردی جاتی۔''

میں نے اس بحث میں پڑے بغیر، تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ اس سے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''ٹھیک ہے، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم اپنی عزت کی اب تک کتنی قیمت چکا چکی ہو؟ میرا مطلب ہے تم اپنے اصل مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو سکی ہو؟''

''میں وجے اور تمہیں شراب اور شباب کے نشے میں ان سے اپنے مطلب کے راز اگلوانے کی کوشش میں تھی۔ مگر تم چونکہ نئے بھرتی ہوئے تھے اس لیے تم سے ابھی تک میں خاطر خواہ اپنے مطلب کی باتیں نہیں اگلوا پائی تھی، کیونکہ تم کچھ زیادہ جان کاری نہیں رکھتے تھے، کم و بیش وجے کا بھی یہی حال تھا، البتہ رتن لال اور بلراج سنگھ کے قریب پہنچنا ہی درحقیقت میرا اصل ٹارگٹ تھا۔

یہاں کے اصل اور اندر کے رازوں سے ان دونوں کو ہی آگاہی تھی، مگر بدقسمتی سے میں ابھی تک ان دونوں میں سے کسی ایک تک بھی رسائی حاصل نہیں کر پائی ہوں، اگرچہ اپنی کوشش میں نے ترک نہیں کی ہے۔ اس میں ان دونوں کی غیر معمولی محتاط پسندی کا دخل تھا۔

بلراج سنگھ تو اپنی ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتا ہے، جبکہ رتن لال عیاش پرست تو ہے مگر وہ بلراج سنگھ سے بہت دبتا ہے۔ اگرچہ نیچے کے سارے معاملات رتن لال ہی دیکھتا ہے، ہدایات وہ بلراج سنگھ سے لیتا ہے۔

میں وجے اور تمہارے ذریعے رتن لال اور بلراج سنگھ تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی، جس میں مجھے ابھی تک کوئی کامیابی نہیں حاصل ہوئی تھی، تاہم میں ناامید بھی نہیں تھی، پھر جلد ہی مجھے اندازہ ہونے لگا کہ میں تم دونوں سے کوئی اور کام تو لے ہی سکتی ہوں، یعنی اپنی دوستی کا دم بھرتے ہوئے ان سے انڈین آرمی آفیسر ایڈوانی کی ملازمت حاصل کرلوں۔ تم نے تو نہیں البتہ وجے نے اس کا وعدہ ضرور کر رکھا ہے۔ دیکھو اب کب وہ اپنا وعدہ پورا کرتا ہے۔''

وہ یہاں تک بتا کر خاموش ہو رہی۔ میں پُرغور انداز میں ہونٹ بھینچے اس کی سنتا رہا۔ وہ اب تک بالکل صحیح خطوط پر کام کر رہی تھی۔ تنہا رہتے ہوئے اپنے جاوا قبیلے کے لیے اس کی اتنی کوششیں بھی کم نہ تھیں۔ اسے اپنی جان کی پروا نہ تھی، وہ بس ان غاصبوں کو اپنی دھرتی سے نکالنا چاہتی تھی۔

اس حساب سے ہم دونوں اب ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔ اب مجھے بھی اس سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے تھا، ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے تھے۔

اب میرے مطمحِ نظر فوری طور پر دو اہم مقاصد تھے۔ پہلا تو یہ کہ اپنے تینوں ساتھیوں سمیت مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور دوسرا جنرل کے ایل ایڈوانی کو جہنم رسید کرنے سے پہلے اس کے قبضے سے اپنے وطنِ عزیز کی وہ امانت حاصل کرنا تھی، جس کی خاطر بشام چھلگری نے اپنی جان قربان کردی تھی اور طلسم نور ہیرے کی آڑ میں جو بھیانک عالمی سازش کھیلی جا رہی تھی، اسے ناکام بنانا بھی تھا۔ جبکہ یہاں وہ یعنی ایڈوانی کیا کھیل کھیل رہا تھا اسے بھی بے نقاب کرنا ضروری تھا۔

میں اب یہ غور کر رہا تھا کہ جاوا قبیلے کی یہ بلیک کوئن باریہہ میرے کس حد تک کام آسکتی تھی۔ اس کا جواب اثبات میں تھا کہ وہ جن خطوط پر کام کر رہی تھی، اسے کچھ ترامیم کے ساتھ کرنے دیا جاتا۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے ایک خیال بجلی کی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں آیا اور میں نے باریہہ سے کہا۔ ''باریہہ! میں نے بھی تم سے کچھ نہیں چھپایا، اس لیے کہ میں سمجھ رہا ہوں، ہم دونوں ایک دوسرے کے بہتر طور پر کام آسکتے ہیں، یہاں میرے بھی کچھ ساتھی قید و بند کی زندگی گزار رہے ہیں، مگر میرا مقصد صرف انہیں رہائی دلانا ہی نہیں ہے، بلکہ اس خبیث آرمی آفیسر (جنرل کے ایل ایڈوانی) کو بھی ان کے حواریوں سمیت جہنم واصل کرنا ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ تمہاری دھرتی پر اپنے کسی خاص مقصد کے لیے قابض ہوا ہے۔ اس کا بھی کھوج لگانا ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اب اصل بات کی طرف آنے لگا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سننے میں محو تھی۔ میں ایک ذرا توقف کے بعد بولا۔

''اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تمہارا اب بھی ٹھکرال اور نتالیہ سے کوئی خفیہ رابطہ ہے؟''

یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمادیں۔ اس نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر پھر رک گئی۔ ایک نگاہ مڑھی کے دروازے پر ڈالی اور پھر اپنے ہونٹوں پہ ایک انگلی رکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی، دروازے تک گئی، دروازے پر جھولتا کھال کا ٹاٹ

ذرا پرے کر کے باہر جھانکا اور پھر واپس پلٹ آئی۔ میں بڑے غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں محو تھا۔

''ہاں!'' اس نے میرے قریب آ کر نیچی آواز میں کہا۔ ''شنگرال اور رتنالیہ سے میرا رابطہ رہتا ہے۔ میں جان پر کھیل کر ان کی خفیہ کمین گاہ میں جا کر ملتی ہوں اور انہیں یہاں کی تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرتی رہتی ہوں۔ وہ دونوں بہن بھائی مجھے نئی ہدایات دیتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جنرل ایڈوانی یہاں اپنی اسٹیٹ ڈارک کیسل بنا کر مہاراجا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے۔''

''وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں، لیکن جنرل ایڈوانی کا اس کے پیچھے بھی بہت اہم مقصد ہے، ہمیں اصل میں اسے سبوتاژ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جنرل کی پشت پہ ایک بہت بڑی عالمی طاقت ہے، وہی اسے سپورٹ کر رہی ہے۔ خیر! مجھے بتاؤ۔''

''تو تم ان کی خفیہ کمین گاہ سے بھی واقف ہو۔'' میں نے پُرغور لہجے میں اس سے کہا۔ ''وہ خود اب تک کیا کر رہے ہیں اور کتنی تعداد میں ہیں؟''

''وہ اپنی افرادی قوت جمع کرنے اور طاقت اکٹھی کرنے میں مصروف ہیں، مگر ابھی وہ ان پر حملہ کرنے کی قوت میں نہیں آئے ہیں۔'' باریہہ نے جواب دیا۔

''اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ بلراج سنگھ نے جاوا قبیلے کو اپنا قیدی رعایا بنا رکھا ہے۔ جان بوجھ کر ایسے لوگوں کو جو جوان اور توانا ہیں، ان سے بیگار لی جاتی ہے اور اپنی قید میں رکھا ہوا ہے۔ اس بات کا تو انہیں بھی پتا ہے کہ جاوا قبیلے کا سرداری ٹولا جو سردار موغا کے بچھڑے ہوئے اور بے خانماں خاندان سے تعلق رکھتا ہے وہ کسی دشوار گزار اور دور افتادہ گوشے میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ یہ انہیں باوجود کوشش کے ابھی تک تلاش تو نہیں کر سکے ہیں مگر ان کی طرف سے اچانک حملے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ وہ مٹھی بھر جاوا جنگجو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

''ہم......'' میں نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری خارج کی اور پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''باریہہ! کیا تم ضرورت پڑنے پر مجھے شنگرال اور ان کے ساتھیوں سے ملوا سکتی ہو؟''

''ہاں! کیوں نہیں......'' اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

''بس! تو پھر ٹھیک ہے، تم لوگ مجھے بھی اپنا ساتھی سمجھو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اور...... یہ بھی سن لو کہ میں دیال داس نہیں ہوں، بلکہ میں نے اسے ہلاک کر کے اس کا بھیس بھر رکھا ہے۔ مجھے بس تم ایک دوست کہہ سکتی ہو۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ موجودہ حالات میں تمہارا اگلا منصوبہ کیا ہوگا؟''

میری بات پر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''میرا جو منصوبہ ہے تم اس سے واقف ہو ہی چکے ہو۔ بلکہ اب تو تم بھی میرے ساتھ شامل ہو چکے ہو۔ ہم مل کر اگلا کوئی لائحہ عمل تیار تو کر ہی سکتے ہیں۔''

''یہ تم نے بہت اچھی بات کہی، دیکھو جب تک ہمارا راز آشکار انہیں ہوتا، سمجھو ہم نصف کامیاب ہیں، کیونکہ اس وقت ہم جلتے ہوئے آتش فشاں کے بالکل دہانے پر کھڑے ہیں۔ ہماری ذرا سی غلطی یا جلد بازی یا یوں سمجھ لو کہ معمولی سی تکرار اور باہمی اختلاف نہ صرف ہمیں ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے بلکہ جان گنوانے کے ساتھ ساتھ ہمارا سارا منصوبہ بھی ناکام ہو سکتا ہے۔''

آخری بات میں نے پیش بندی اور حفظِ ماتقدم کے طور پر اس سے کہی تھی۔ وہ بھی خاصی سمجھدار تھی، میرا اشارہ سمجھتے ہوئے اس نے فوراً اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ تاہم اس کے بعد بھی میں نے اپنی اس آخری بات کی وضاحت کرتے ہوئے اس پر یہ باور کرا دیا کہ وہ موقع نکال کر پہلی فرصت میں شنگرال وغیرہ سے مل کر اس نئی صورتِ حال سے آگاہ کرے اور جب تک ہماری طرف سے کوئی ''اشارہ'' (گرین سگنل) نہ ملے وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کریں گے جو قبل از وقت ہو اور ہمارے لیے مشترکہ نقصان کا بھی سبب بنے۔

اس نے میری بات کا ادراک کرتے ہوئے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ اس کے بعد میں اس سے کچھ مزید گفتگو، ہدایات کی صورت میں کرنے کے بعد اس کی مڑھی سے چلا آیا۔

رات کی تاریکی میں اپنے ٹپکنے والے جھونپڑے میں پہنچا تو وجے لمبی تانے سویا خراٹے لے رہا تھا۔ جنگل کی فضا رات میں مرطوب ہونے لگی تھی، جس کے باعث ٹھنڈ میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ جزیروں کے موسم بھی صحراؤں جیسے ہوتے ہیں، یعنی دن میں جھلستی گرمی اور راتوں میں ٹھٹھرتی ہوئی ٹھنڈ۔

نیند کا خمار مجھے بھی چڑھا ہوا تھا مگر خیالات کی یلغار سے دماغ جاگا ہوا تھا۔ اول خیر اور شکیلہ سے بھی ملاقات ہو چکی تھی میری۔ کبیل دادا کے ساتھ تو میں آج تھا ہی،

بار یہ سے بھی اہم معاملات طے ہو چکے تھے۔ تقدیر ساتھ دے رہی تھی اور مجھے اس سنہری موقعے سے فائدہ اٹھانا تھا۔ بے شک یہ عمل سست رو سہی مگر نتیجہ خیز ثابت ہوسکتا تھا۔

رات کے شاید آخری پہر ہی میری آنکھ لگی تھی کہ علی الصباح اس کم بخت وجے نے مجھے پیروں کی ٹھوکریں مار کر جگا دیا۔ مجھے اس طرح جگانے پر غصہ تو بہت آیا مگر اسے مجبوری وقت جان کر پی گیا۔

”چل بے اٹھ! کیا دن چڑھے تک سوتا رہے گا۔ لگتا ہے اس کالی کتیا نے تمہیں ساری رات اپنے ساتھ بزی رکھا ہے۔“ وہ لوفرانہ ہنسی سے بولا۔ اس کے عامیانہ پن پر میں نے بھی سر جھٹک کر ہنسنا ضروری سمجھا اور اس سے بولا۔

”یار! اس نے تو شراب پلا کر مجھے سلا ہی دیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ زیادہ التفات نہیں جتا رہی تھی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بھویں اچکا کر بولا۔

”لگتا ہے کالی کوئن تجھے زیادہ پسند کرنے لگی ہے۔ تو شاید اسے پیاسا چھوڑ کر جلدی لوٹ آیا تھا۔ میرے ساتھ تو اس نے کسی خاص التفات کا اظہار نہیں کیا تھا۔“ میں نے جان بوجھ کر ایسا کہا تھا اس سے...... فخر و غرور سے اس کی باچھیں پھیل گئیں۔

”سچ بتا وجے جانی! تو نے اس کالی پری پر کیسا جادو کیا ہے؟“ میں نے اسے مزید چڑھایا تو وہ سینہ پھلا کر بولا۔

”ہاں، یار! کہتا تو صحیح ہے تو بھی، سالی جب بھی میرے ساتھ ہوتی ہے، چپکتی ہے تو چھوڑتی ہی نہیں۔ اچھا چل اوپر جا...... ناشتا گاڑی آنے والی ہے۔ یہ لوگ بھی بلراج اور رتن کے جاسوس ہوتے ہیں۔ ہمیں پکھٹے کے بجائے یہاں بیٹھا دیکھیں گے تو شکایت کر دیں گے۔“ اس نے آخر میں کہا اور پھر ہم اپنی گنیں تھامے اوپر پکھٹے کے چبوترے میں آگئے۔

ابھی ہمیں یہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ میری سماعتوں سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز ٹکرائی۔ وجے نے مجھ سے کہا۔ ”جا اوے دیالے! نیچے جا کے ان سے ناشتا پکڑ لے، ورنہ نکل جائیں گے یہ لوگ آگے۔“

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ دیال داس نیا بھرتی ہوا تھا اور اسی لیے شاید یہ مردود وجے اس پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ ناچار میں نے بھی اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور گن سنبھال کے پکھٹے سے نیچے اترنے لگا۔ ایک پرانی سی جیپ تھی جس کے پیچھے ٹرالی لگی ہوئی تھی۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے، ان کے اریب قریب میں چھوٹے بڑے دیگچے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جھونپڑے میں گھس کر برتن نکال لایا۔ گن میں نے اسٹریپ کے ساتھ کاندھے پر جھلا دی تھی۔ خالی برتن سنبھالے میں ان کے قریب آگیا۔ ایک موٹے سے آدمی نے بڑے سے کفگیر سے سوپ نکال کر بھرا، پھر چائے دی، ابلے ہوئے انڈے، بریڈ اور مکھن اور ایک بڑی سی پلیٹ میں حلوہ ٹائپ کی کوئی لیپ دار شے ڈال دی۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ میں یہ ساری چیزیں لیے اوپر آگیا۔

وجے اور ہم خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔ میں نے تو صرف ابلے ہوئے دو عدد انڈے کھائے اور چائے پی تھی، جبکہ وجے ندیدوں کی طرح ساری اشیا چٹ کر گیا تھا۔

اس کے بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے وجے کے ”ویوز“ لینے کے لیے اس سے خود کلامیہ انداز میں کہا۔ ”یار! میں نے سنا ہے ہمارے جیسے جو لوگ رتن لال اور چھوٹی سرکار (بلراج سنگھ) کے قریبی ملازم ہیں، ان کے بڑے عیش ہوتے ہیں۔ کاش! ہم بھی ایسے ہی ہوتے۔“

”اسی طرح کوئی شکایت کا موقع دیے بغیر اگر کام کرتے رہے تو ہماری بھی پیشی ہوجائے گی ایک دن......“ وجے سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے بولا اور ایک میری طرف بھی بڑھا دی۔ کبھی کبھی شوقیہ میں بھی پی لیا کرتا تھا۔ سو میں نے لے لی اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”پیشی؟ کیسی پیشی؟“

”اس کا یہاں مطلب ترقی ہوتا ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”تیری تو ابھی دور دور تک کی آشا نظر نہیں آتی، پرنتو مجھے تو ہے۔“

پتا نہیں وہ شیخی مار رہا تھا یا سچ بول رہا تھا، کیونکہ گزشتہ روز کی اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ خود بھی یہاں کی نوکری سے بیزار ہی تھا، مزید براں اس نے اپنے خوف کا بھی اظہار کیا تھا اور اپنے دوستوں، اشوک اور مہترا کی بھی مثال دی تھی۔ جو فرار کی کوشش میں خاموشی کے ساتھ موت کی نیند سلا دیے گئے تھے۔ مگر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے اس کی اپنی زندگی کسی تیسرے درجے کے رہزن کی سی تھی جسے عرف عام میں ”اسٹریٹ اسنیچر“ کہا جاتا تھا۔ وہ ممبئی کے تاریک ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کرتا تھا، جبکہ یہاں اسے نسبتاً آرام تھا، مگر آزادی اس کی سلب ہو چکی تھی۔

JBD

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

91 جہانگیر بکس

آخری معرکہ 550/-

جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مُسافر 475/-

اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-

نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-

شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

گمشدہ قافلے 500/-

انگریز کی اسلام دشمنی، بنیئے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستانِ مجاہد 300/-

فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنالی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-

اسلام دشمنی پرمبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-

لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-

سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-

فرڈی ننڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-

راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمّد بن قاسم 425/-

عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-

برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-

تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-

سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-

گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-

بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-

اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

WORLD TIMES
جہانگیر
اُردو لغت
جامع ترین

جہانگیر

اُردو لُغت

(جامع ترین)

ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

سبق آموز کتب سلسلہ

دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ	165/-
اقوالِ آئمہ کرامؒ	165/-
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ	195/-
اقوالِ شیخ سعدیؒ	140/-
حکایاتِ رومیؒ	180/-
دلچسپ و عجیب حقائق	170/-
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ	199/-

دلچسپ و حیرت انگیز باتیں	150/-
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات	180/-
بڑے لوگوں کے روشن واقعات	165/-

جہانگیر بُک ڈپو

022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety
پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1
پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii. Click Liked.
iii. Select Get Notifications.
iv. Select See First. All Done

Liked
Message
Get Notifications
Add to Interest Lists
Unlike
See First
Default
Unfollow

http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com http://paksociety.com

بہرکیف...... ممکن تھا کہ یہاں اتنا عرصہ رہتے ہوئے اس نے اپنی کچھ "ٹور" بنالی ہو۔ لہٰذا میں نے قدرے چونک کر اس سے پوچھا۔

"پر یار! تُو تو خود یہاں کی نوکری سے بیزار تھا اب یہ اچانک کیسے تجھے یہاں رہتے ہوئے پیشی یا ترقی کا خیال آگیا؟" تو وہ ہنس کر بولا۔

"کل رات کو جب تو اس بلیک کوئن کے پاس گیا تھا تو رام گوپال اور اجے سنگھ میرے پاس آئے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ باہر کے جن ملازموں نے اپنی اچھی کارکردگی دکھائی ہے ان میں سے سات افراد کی چھوٹے سرکار کے پاس پیشی ہونے والی ہے۔ ان میں ہم لوگ بھی شامل ہیں، اور پھر رتن لال تو سسرا ہمارا ہی آدمی ہے۔ وہ ہماری سفارش ضرور کرے گا۔ ہمارے اس کے ساتھ اچھے تعلقات جو رہے ہیں۔"

میں نے اس سے خوش آمدانہ لہجے میں کہا۔ "یار وجے! میں نے بھی تیری خدمت کی ہے۔ یار! تیری اگر پیشی ہوجائے تو میری بھی رتن لال یا چھوٹی سرکار سے سفارش کر دیجیو نا......"

وہ میری بات سن کر ہنسنے لگا۔ پھر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ہاں...... ہاں! کردوں گا تیری بھی سفارش، پہلے مجھے تو آگے بڑھ جانے دے۔"

"لگتا ہے تیرے چھوٹی سرکار سے اچھے تعلقات ہیں۔"

"ہاں......! چھوٹی سرکار سے تو نہیں پرنتو اس سسرے رتن لال سے میرے اچھے تعلقات ہیں۔"

"اچھا!" میں نے قدرے توصیفی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

"رتن لال اپنا یار ہے۔ اسی نے تو مجھے یہ خوش خبری سنائی تھی کہ میں بہت جلد پیشی چڑھنے والا ہوں۔" یہ سن کر میں نے فوراً اس کے کاندھوں کو دبانا شروع کر دیا اور بولا۔

"ارے یار! پھر تو تیرا کام سمجھو ہوا پڑا ہے، پر یار اپنے اس خدمت گار کو مت بھول جانا، میری بھی رتن لال سے سفارش کر دینا، تاکہ میں بھی پیشی چڑھ جاؤں۔"

"ہاہا...... ہاہا...... ضرور ضرور، کیوں نہیں......" وہ بولا، پھر اس نے مجھے جھونپڑے سے شراب کی بوتل لے کر آنے کا کہا۔ میں اٹھ کر ڈھلان سے نیچے آگیا اور اس کے لیے بوتل لے آیا۔ وہ مے خوری میں لگ گیا۔ جب میں نے اسے دوسرا پیگ بنا کر دیا تو وہ دوسرا بھی نصف چڑھا کر ٹن ہونے لگا۔

"یار! ایک بات تو بتا، تیری رتن لال سے اتنی گہری یاری ہے تو تجھے پتا تو ہوگا کہ آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟ دوسرے لوگوں کی طرح مجھے بھی یہ تجسس ہوتا ہے کہ پتا تو چلے آخر یہاں کون سے اتنے بڑے پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے؟"

اس نے ایک ہچکی لی اور ترنگ میں بولا۔ "بڑے مزے ہیں بے اِدھر...... میں تو دعا کرتا ہوں کہ یہ پروجیکٹ اسی طرح چلتا رہے اور ہم بھی دھندے سے لگے رہیں۔"

وہ میری اصل بات گول کر گیا، میں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "یار! اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ یہاں کا ماحول اور کام اب مجھے بھی اچھا لگنے لگا ہے، چاہتا ہوں اِدھر ہی رہوں اور ان کا کام ختم ہی نہ ہو۔"

"ہاں! یہاں صرف قیدیوں کی زندگی ہی قابلِ رحم ہے، ہماری نہیں، اور اگر ہماری پیشی (ترقی) ہوجاتی ہے تو سمجھو پو بارہ......" وہ تھوڑا رک کر نشے کی پینگ میں میرے آخری سوال کے جواب میں بولا۔

"ویسے اِدھر کا کام ختم کدھر ہوگا سسرے! ان سالوں نے یہاں بہت بڑا خزانہ دریافت کر رکھا ہے اور یہ سالے جزیرے کے اس حصے کو ایک اسٹیٹ بنانے والے ہیں، ڈارک کیسل کی تعمیر اس کی کھلی مثال ہے۔ اسی لیے تو رام گوپال اور اجے سنگھ کہہ رہے تھے کہ جتنی جلد ہماری پیشی ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے، پھر ڈارک کیسل اور اسٹیٹ بن جانے کے بعد ہماری ٹور ہی نرالی ہو جائے گی اور ان سارے ملازموں کی جو ان کے منظورِ نظر اور وفادار کہلاتے ہیں۔"

میں ابھی اس سے مزید کچھ پوچھنے والا تھا کہ اچانک نیچے سے کسی نے آواز لگائی۔ ہم نے چونک کر اپنی گردنیں موڑ کر عقب میں نیچے کی طرف دیکھا۔ ایک خاصا لحیم شحیم گن بردار شخص ڈھلان کے قریب کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"اوئے، یہ تو اجے ہے۔" دوسرے ہی لمحے وجے نے یہ کہہ کر میری پریشانی دور کردی۔

"آجاؤ...... آجاؤ......" اس نے بھی اپنا ہاتھ ہلا دیا۔

"نیچے آؤ وجے! تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔" اجے نے دور ہی سے ہانک لگائی تو وجے نے مجھے اِدھر ٹیلے پر ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کی اور نیچے چلا گیا۔

اجے یقیناً اجے سنگھ ہی تھا۔ وجے کا دوست، ایک اور ان کا دوست تھا، رام گوپال۔

میں نے اپنی گن سنبھالی ہوئی تھی اور گردن ذرا موڑے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اجے سنگھ نے ایک نظر اوپر میری طرف ڈالی تو میں نے مسکرا کر خیر مقدمی انداز میں اپنا ہاتھ ہلا دیا۔ کیونکہ اگر اجے سنگھ اور رام گوپال وجے کے دوست تھے تو یقیناً ان کی دیال سنگھ کے ساتھ بھی دعا سلام ہو سکتی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ اجے نے کوئی جواب نہ دیا اور وجے سے ہاتھ ملا کر اسے جھونپڑے کی طرف لے گیا۔

دونوں جب اندر چلے گئے تو جانے کیوں میری چھٹی حس نے مجھے کسی نامعلوم سی کھٹک کا ٹھوکا دیا۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ اجے نے آخر صرف وجے کو ہی نیچے کیوں بلایا تھا؟ وہ اوپر بھی آسکتا تھا، کہیں وہ وجے سے کوئی اہم بات تو نہیں کرنے آیا تھا؟

میں نے یونہی ایک نگاہ اطراف میں ڈالی اور پھر بہ ظاہر ایک مختصر سے گشت کے انداز میں ایک طرف کو اٹھ کر چل دیا، اس کے بعد مڑھی نما اس جھونپڑے کی عقبی سمت سے نیچے اترنے لگا اور بہت دبے پاؤں چلتا ہوا اس کی ایک دیوار کے قریب چلا گیا۔

سورج سوا نیزے پر چمکنے لگا تھا۔ گرمی بڑھتی جارہی تھی اور بادِ سموم چہرے کو جھلسائے دے رہی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ مغربی گوشے میں ایک بڑا صحرا تھا اور ہوا اب اسی سمت سے آرہی تھی۔

دیوار کے پاس ایک کھڑکی تھی۔ میں اس کے قریب جا پہنچا، سالخوردہ ساپٹ پہلے ہی ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا، البتہ وہاں ایک چیتھڑا سا ٹاٹ جھول رہا تھا، میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اسے پرے ہٹا دیا تو سامنے ہی مجھے وہ دونوں بیٹھے آپس میں باتیں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اجے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وجے کے چہرے پر بڑے پُرسوچ اور گمبھیر تاثرات تھے۔

''کیا سوچنے لگا رے......؟ چنتا مت کر، ہمت کر، پھر دیکھ پو بارہ ہیں تیرے میرے......'' اجے سنگھ اس سے نیچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''یہ جگہ بہت جلد ایک اسٹیٹ کی حیثیت بننے والی ہے۔ اس لیے کہ اسے چند بھارتی اہم شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے، جو اس اسٹیٹ کو ایک باقاعدہ آزاد ریاست کا درجہ دلوانے والے ہیں، اور بھارتی حکومت کو بھاری رائلٹی دینے کے علاوہ دیگر وسیع تر ملکی فوائد کا لالچ بھی اس میں کارفرما ہوگا۔ جنرل ایڈوانی مہاراجا بننے کے خواب دیکھ رہا ہے، ڈارک کیسل کا بھی کام آخری مراحل میں ہے۔ اسی لیے چھوٹی اور بڑی سرکار کو اپنے وفاداروں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت پیش آگئی، اسی کارن عنقریب پیشی ہونے والی ہے۔'' اجے سنگھ نے اپنی بات پوری کی تو وجے بولا۔

''پر یار! ہمیں تو آشا ہے کہ ہم اس چھوٹی اور بڑی سرکار کی اس پیشی پر پورا اتریں گے، پھر ہمیں اس کھٹ راگ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''یہی بات تو تیری بدھی میں نہیں سما رہی ہے بے وقوف! یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔'' اجے سنگھ جواب میں بولا۔

میں دھڑکتے دل اور پورے دھیان سے اُن کی یہ خفیہ گفتگو سن رہا تھا اور مجھے ان کی باتوں سے بہت اہم اور سنسنی خیز انکشافات کی بُو آتی محسوس ہو رہی تھی۔

اجے سنگھ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ ضروری تو نہیں کہ ہمیں بھی پیشی کے لیے منتخب کیا جائے۔ آشا کی بات الگ ہے مگر ہم محض ایک امید کے سہارے پر تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھ سکتے ناں! فرض کرو پیشی ہو بھی جاتی ہے تو یہ کیا ضروری ہے ہمیں ہی منتخب کر لیا جائے؟ اور بھی تو بہت لوگ ہیں۔''

''تم آخر کہنا کیا چاہ رہے ہو؟ ذرا کھل کر بولو ناں اجے؟'' وجے نے اس سے نیچی آواز میں کہا۔

''پتے کی بات ہی کہوں گا جو میں سن رہا ہوں وجے!'' اجے سنگھ نے نہایت رازداری سے کہا۔ ''اس پیشی میں جو بھی انتخاب ہوگا، وہ صرف پرانے نمک خوار ملازموں کی کسوٹی پر ہی نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں وفاداری اور ایسا کام دیکھا جائے گا جس سے انہیں اندازہ ہو سکے کہ ہم بننے والی اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کے صحیح وفادار ہیں...... ایک بار ہم اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کے وفادار ملازموں میں شامل ہو گئے تو سمجھو وارے نیارے...... بہت مراعاتیں اور دولت کمائیں گے ہم، تم نے وہ مثال سنی ہے ناں کہ شاہ کے نوکر بھی شاہ...... بس! ہم بھی شاہ کے نوکر کہلائیں گے تو سمجھو کیا حیثیت ہوگی ہماری، خوب ٹھکا ہوگا ان شاہی ملازمین کا۔''

''تو ہمیں آخر کس طرح اپنی وفاداری دکھانی ہوگی کہ ہماری ترقی یقینی ہو جائے؟''

وجے نے اس بار غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو اجے سنگھ مکروہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''اب کی ناں سسرے تو نے بدھی سمان بات، سن رے! اشوک اور مہترا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ جانتے ہو ناں؟'' اس کی بات پر وجے نے ہونقوں کی طرح اپنا سر ہلا دیا۔

"انہوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی اور جن دو افراد نے انہیں گھیر کر ہلاک کیا تھا وہ اب کہاں ہیں؟"

"کہاں ہیں؟"

"وہ بغیر پیشی کے ہی ترقی پا چکے ہیں اور اس وقت اسٹیٹ اور ڈارک کیسل کی دوسری قطار کے وفاداروں میں اُن کا شمار ہونے لگا ہے، اس سے اندازہ کرو کہ یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنے والے چھوٹی اور بڑی سرکار کی نظروں میں کس قدر خطرناک اور اہم مجرم تصور کیے جاتے ہیں۔"

"ہاں! یہ تو ہے، اسی لیے تو میں نے یہاں سے بھاگنے کا خیال ہی اپنے دل سے نکال دیا ہے۔" وجے بولا۔

"جو بات میں تجھے سمجھانا چاہ رہا ہوں وہ سن بڑے غور سے......" اجے سنگھ بولا۔ "اگر ہم بھی ایسا کوئی کارنامہ انجام دے ڈالیں تو سمجھو اس بار کی پیشی میں ہمارے پوہ بارہ......"

"وہ کیسے؟"

"رام گوپال اور دیال داس (یعنی میں) کی بلی چڑھا کر......"

"کیا مطلب؟" وجے کا منہ کھلا رہ گیا۔ مگر میں اس خبیث مردود اجے سنگھ کی اس مکروہ اور سفاک پلاننگ کو سمجھ گیا تھا اور میرے پورے رگ وپے میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"میں اب بھی نہیں سمجھا؟"

"ارے، گھامڑ! رام گوپال کو میں آج رات اُدھر لاؤں گا، دیال داس (میں) تو اِدھر ہی موجود ہے، تو ابھی اس سے یہی کہنا کہ یہاں سے ہم نے فرار کا منصوبہ بنایا ہے اور میں اسی لیے یہاں آیا تھا، رات کو رام گوپال کو لے کر میں آؤں گا۔ یہ دونوں ہمارے شکار ہوں گے۔ بہ ظاہر ہم بھی ان کے ساتھ فرار ہونے کی کوشش کریں گے، مگر ان دونوں کو آگے نکل جانے کا موقع دے کر پیچھے سے ان کی پشت پر گولیوں کی باڑھ ماریں گے، ان کے مرتے ہی ہم کہہ دیں گے کہ ان دونوں نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اب سمجھے تم میری رتنا کماری؟"

یہ کہتے ہوئے اجے سنگھ مکروہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی برس رہی تھی۔ اگر وہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اپنے ہی دو ساتھیوں کو قربان کر رہا تھا تو یہ اس کی مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ انتہائی درجے کی غیر انسانی حرکت تھی، یہ بدمعاش اور تیسرے درجے کے مجرم تھے، ان سے ایسی توقعات رکھی جا سکتی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ میری بروقت محتاط روی اور بیدار مغزی نے اس گھناؤنی سازش کو بے نقاب کر دیا۔

اس ذلیل اور مکروہ اجے سنگھ کی اس سازش کو وجے نے بھی پسند کیا اور پھر دونوں آج رات کو ہی اپنی اس گھناؤنی سازش پر عمل پیرا ہونے کے لیے لائحہ عمل تیار کرنے لگے۔ باقی باتیں عمومی تھیں، جو میرے کام کی نہ تھیں اور یوں بھی اب اجے سنگھ رخصت ہونے کے لیے تیار تھا تو میں خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں اوپر ٹیکری پر آ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وجے بھی اوپر آ گیا۔

"کیا کہہ رہا تھا اجے؟" میں وجے کے چہرے پر بہ ظاہر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر بولا۔

"ایسے ہی ملنے آیا تھا۔" وجے نے سرسری سا جواب دیا۔ اسی دوران دوپہر کا کھانا دینے والی گاڑی آ گئی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں اجے اور وجے کے اس گٹھ جوڑ اور آج رات ہونے والی اپنے اور رام گوپال کے خلاف سازش کے بارے میں سوچنے لگا۔

رام گوپال کو اس سازش کا پتا نہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح اس سازش سے آگاہ کر سکتا ہوں؟ اس کے لیے رازداری اور اجے اور وجے سے تھوڑی دیر کے لیے دوری درکار تھی۔

میں آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا اور ساتھ ہی اس پر غور کرنے لگا کہ آیا اجے اور وجے کو ان کے منصوبے پر عمل پیرا ہونے سے پہلے ہی کیوں نہ جہنم واصل کر ڈالوں؟ لیکن اس پر جب میں نے تھوڑا اور غور کیا تو ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ایک اور منصوبہ میرے ذہن میں آیا، یہ منصوبہ در منصوبہ والی بات تھی یعنی ان کی چال انہی پر الٹنا اور اسے اپنے لیے کارآمد بھی بنانا۔

اجے اور وجے جو گڑھا میرے اور رام گوپال کے لیے کھود رہے تھے ... اس میں ہمارے بجائے انہی دونوں سازشیوں کو ہی گرا ڈالنا تھا، مگر مسئلہ اب رام گوپال کا تھا، مجھے اسے اعتماد میں لینا تھا، وگرنہ میرا یہ چال الٹنے کا کھیل خراب ہو جاتا۔ سوچ طلب بات تو یہ تھی کہ آخر رام گوپال میری بات پر کیسے یقین کر لیتا؟ شبہ تھا کہ وہ مجھ سے کہیں بددل ہو کر بدک نہ جاتا۔ نہ ہی مجھے اس کا اندازہ تھا کہ رام گوپال دیال داس سے کتنا قریب تھا، قرائن سے تو یہی لگتا تھا کہ وجے کی ہی ان کے ساتھ انڈراسٹینڈنگ زیادہ تھی۔

میں یعنی دیال داس چونکہ نیا بھرتی ہوا تھا اسی لیے وہ مجھ پر کم ہی اعتبار رکھ سکتے تھے، بہت غور و خوض کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ رام گوپال کو بتانے یا بالفاظِ دیگر اپنا ہم

خیال بنانے کا مجھے بہرحال رسک لینا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر اجے اور وجے کی چال اُن پر نہیں الٹی جا سکتی تھی، بلکہ الٹا ان کے دام میں پھنس جانے کا خطرہ تھا۔

رات تک میں نے اس پر مزید غور کیا مگر اور کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ بالآخر وہ خطرناک موڑ آن پہنچا جب وہ مردود اجے سنگھ اپنے منصوبے کے مطابق اپنے ساتھی رام گوپال کو ہمارے جھونپڑے پر لے آیا۔

باتیں ہوتی رہیں، اس دوران میں بھی محتاط رہا۔ پھر پینے پلانے کا دور چلا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اصل وقت سے تھوڑی دیر قبل مجھے اتنا موقع مل جائے کہ میں ذرا تنہائی میں رام گوپال سے کوئی رازدارانہ گفتگو کر سکوں، مگر ایسا نہ ہو سکا، حتیٰ کہ وہ منحوس گھڑی سر پر آ گئی ، جب اجے سنگھ نے اپنے فرار کا وہ منصوبہ ہمارے سامنے رکھ دیا جس کے درپردہ میرے اور گوپال کے قتل کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا۔

”لیکن کیوں؟ ہمیں بھلا اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر یہاں سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے؟“ رام گوپال نے حیران ہو کر اجے سنگھ اور وجے کی طرف دیکھا۔ جسے سن کر ان دونوں سازشیوں کو تو نہیں البتہ مجھے ضرور خوشی ہوئی تھی۔

”میں نے تو سنا ہے، بلکہ...... یہ تو وجے نے بھی مجھے بتایا تھا کہ عنقریب یہ جگہ ایک بڑی ریاست بننے والی ہے اور ہم یہاں کے وفاداروں کی حیثیت سے ایک پیشی سے گزر کر بڑے عہدوں پر پہنچنے والے ہیں، اُدھر واپس ممبئی کی اندھیری گلیوں اور ٹھٹھرتے فٹ پاتھوں پر ہمارے لیے کیا رکھا ہے؟“

رام گوپال نے اپنی بات مکمل کی تو وجے نے منہ بنا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اجے سنگھ کے چہرے کو تکنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو کہ ”اسے اب خود ہی رام کرو......“

”کون سی دنیا میں رہ رہا ہے گوپالے تو؟“ اجے سنگھ نے اپنے لہجے میں طنز سموتے ہوئے کہا اور بڑی چالاکی سے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”چھوٹی اور بڑی سرکار کے پاس اپنے ذاتی وفاداروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ انہیں ہی اعلیٰ عہدوں پر رکھیں گے، ہم کس کھیت کی مولی ہیں بھائی! ہم اسی طرح ہی ان کے قیدی بنیں رہیں گے بعد میں بھی۔“

”مگر ہم قیدی کب ہیں؟ ہمیں تنخواہیں ملتی ہیں، اصل قیدی تو وہ ہیں جن سے یہ لوگ ہر روز بیگار لیتے ہیں۔“ گوپال نے مثال پیش کی، جو غلط نہ تھی۔ بیگار قیدیوں کے ذکر پر مجھے اول خیر اور شکیلہ یاد آ گئے، جن کا شمار ملازموں میں نہیں بلکہ بیگار کاٹنے والے قیدیوں میں ہوتا تھا۔ جبکہ گبیل دادا کا ابھی شمار نہ ملازموں میں ہوتا تھا نہ ہی قیدیوں میں، اگرچہ وہ بھی جاوا کے کمزور باشندوں اور قیدی رعایا کی فہرست میں شامل تھا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت زار کا سوچ کر میرا دل دکھ سے بھر آیا تھا۔

ادھر رام گوپال ان کے جھانسے میں نہیں آ رہا تھا، جس کے باعث وجے تو پریشان تھا مگر اجے سنگھ نے ہمت نہیں ہاری تھی وہ ہنوز رام گوپال کو بڑی چالاکی سے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”بے وقوف! یہ وجے بھی پہلے اسی خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ پھر اس کی بدھی میں بات سمجھ آئی کہ ہم چاہے اِدھر کتنا بھی خون پسینا ایک کر دیں آخر کو ہم قیدی ہی کہلائیں گے۔ یہاں حالات غیر یقینی ہیں، جاوا قبیلے کا وہ روپوش جنگجو ٹولا بہت جلد طاقت پکڑنے والا ہے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں حملہ کر دے گا اور پھر اس جنگ میں ہمیں ہی آگے جھونکا جائے گا، اب بھی تو ہمارے جیسے کتنے ہی مختلف ٹولوں سے لڑتے ہوئے ختم ہو چکے ہیں۔ یاد نہیں تمہیں، بھولا ناتھ جیسے ایک بڑے ڈان کا ٹولا یہاں حملہ آور ہوا تھا۔ بے شک ان سب کو ہلاک کر دیا گیا تھا مگر اس میں ہمارے بھی تو آدمی مارے گئے تھے اور یہ سب ہمارے ہی جیسے وہ ساتھی تھے جنہیں بڑی بڑی تنخواہوں کا لالچ دے کر یہاں لا کر پھنسایا گیا تھا، ہاں......! میں اسے پھنسنا ہی کہوں گا، مہترا اور اشوک نے بھی تو یہ صورتِ حال دیکھ کر یہاں سے فرار کی ٹھانی تھی، مگر ان کی منصوبہ بندی کچی تھی اسی لیے مار دیے گئے۔ یہ لوگ ہم پر کبھی بھی اتنا بھروسا نہیں کر سکتے کہ ہمیں اسٹیٹ اور ڈارک کیسل بن جانے کے بعد اس کے خاص اور مراعات یافتہ عہدوں پر رکھ لیں۔ میرا منصوبہ بے داغ ہے۔ اپنے دیس اور اپنے شہر میں ہم آزاد تھے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟ سوائے ہر لمحہ موت کے دھڑکے کے......“

گویا مکار اجے سنگھ نے اس چالاکی سے نقشہ کھینچا کہ رام گوپال کو اس کی بات پر صاد کرنا ہی پڑا۔ یوں بھی ان جیسے لوگوں کے ساتھ ایسے ہی حالات پیش آ چکے تھے، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اب صورتِ حالات کی تبدیلی کے امکانات (ان کے نزدیک) اچھے بھی نظر آنے لگے تھے۔ جس کے باعث ہی مکار اور سازشی ذہن اجے سنگھ نے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ تاہم پھر بھی میں نے اِک نگاہ بہ غور اور بھانپتی ہوئی سی رام گوپال کے سوچتے چہرے پر ڈالی تھی، وہ اب بھی مجھے اندر سے کچھ ابہام کا شکار نظر آتا تھا۔

اس کے بعد اجے سنگھ ہمیں یہاں سے فرار کی ”ڈمی“

منصوبہ بندی سمجھانے لگا۔ ظاہر ہے میں اسے ڈمی ہی کہوں گا کیونکہ یہ سرے سے فرار کا منصوبہ تو تھا ہی نہیں، یہ تو میری اور رام گوپال کی ہلاکت کی منصوبہ بندی تھی۔ یہی وجہ تھی اس کے فرار کے منصوبے میں مجھے کئی خامیاں اور سقم محسوس ہوئے تھے، جسے رام گوپال نے بھی محسوس کیا تھا مگر وہ اس کا اظہار نہ کرسکا تھا۔

رات کی تاریکی گہری پڑتے ہی ہم سب اجے کے اشارے پر اٹھ کھڑے ہوئے اور پکٹے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ اس کی جنوب مشرقی سمت تھی اور یہاں سے ہمیں آبادی کے عقبی رخ سے ہوکر آگے جنگل میں داخل ہونا تھا، جس کا یہاں سے مختصر سلسلہ ختم ہوتے ہی خودرو مگر قدِآدم جھاڑیوں اور ٹیکریوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ اس کے بعد ہم نے دم دبا کر بھاگنا تھا۔ کپیل دادا اور خود وجے کی بتائی گئی معلومات کے مطابق اس طرف بھی کم سخت پہرا نہ تھا۔ یہاں چھوٹی سرکار کے انتہائی قریبی وفاداروں کا جدید اسلحہ پوش ٹولا ہر وقت گشت کرتا رہتا تھا، جو خفیہ کہلاتا تھا۔

منصوبے کے مطابق اجے سنگھ نے پہلے مجھے اور رام گوپال کو ہی اس طرف قدم بڑھا کر تقریباً تیس، چالیس گز تک دور نکل جانے کی تاکید کی تھی اور اس کے بعد اجے اور وجے نے ہمارے پیچھے آنا تھا۔ مقامِ اتصال پر ہمیں رک کر دوبارہ اکٹھے ہوجانے کا کہا گیا تھا، اور یہی وہ مقام ہوتا جہاں اجے سنگھ کے گھناؤنے منصوبے کے مطابق ان دونوں نے ہمیں گولی مار کے ہلاک کرنا تھا۔

ہم چاروں تاریکی کا حصہ بنے اپنے قدم بڑھا چکے تھے۔ آبادی کے عقبی حصے سے ہوتے ہوئے ہم جنگلی جھاڑیوں اور بڑے بڑے چوڑے پتوں والے گھنے درختوں کی آڑ لیے بڑھتے ہوئے قریباً نصف کلومیٹر چلتے ہوئے جنگل کے اس مختصر سے سلسلے میں داخل ہوگئے، جس کے بعد مذکورہ ٹیکریوں اور قدِآدم خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد بالآخر وہ خوفناک لمحہ آن پہنچا جسے میں موت کی ہی گھڑی کہہ سکتا تھا۔ یہاں تھوڑا موقع پاتے ہی اجے اور وجے نے مجھے اور رام گوپال کو اشارہ کردیا۔

ہرسُو ہولناک تاریک سناٹے کا راج تھا، ایسے میں یہ ماحول اور بھی تھرا دینے والا محسوس ہوتا تھا، جبکہ مجھے معلوم بھی تھا کہ مجھے اور رام گوپال کو بہیمانہ ہلاکت خیزی کے تارِ عنکبوت میں پھنسایا جانے والا تھا۔ جبکہ بے چارہ رام گوپال تو بے خبر تھا مگر اس کے چہرے سے نامعلوم سی بے چینی مترشح تھی۔

اب نجانے یہ فرار کے دوران مارے جانے کے ڈر کا سبب تھا یا پھر اس کی چھٹی حس، تاہم مجھے اس بات کا اندیشناک خدشہ تھا کہ کہیں یہ بدبخت اجے سنگھ ہمیں راستے ہی میں گولیوں کا نشانہ نہ بنادے۔ ایک آخری کوشش میں نے یہ کی تھی، تاکہ خون خرابا نہ ہوسکے کہ میں اجے سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کرتا، مگر اس میں خطرہ بہت تھا۔

وہ مردود سازشی ذہن کا مالک ایک سفاک انسان ثابت ہوا تھا جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کسی کے ساتھ تو کیا اپنے ہی ہم وطن ساتھیوں کی بھی جان لینے میں عار ہی نہیں محسوس کرتا تھا۔ بھلا ایسا خبیث انسان میرے سمجھانے میں کیا آتا؟

بہرکیف اجے سنگھ کا اشارہ پاتے ہی میں اور رام گوپال دوڑنے کے انداز میں تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے ٹیکریوں اور خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھنے لگے، اور جب ان سے قریباً کوئی بیس، پچیس گز دور ہوئے تھے کہ میں راستے ہی میں رام گوپال کا کاندھا دبوچ کر اسے ایک دم دائیں جانب کی ٹیکریوں کی طرف لے گیا۔

وہ میری اس اچانک حرکت پر بھونچکا سا رہ گیا تاہم پھر ایک جگہ ٹھہر کر تیز لہجے اور گھورتی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ اچانک تم نے راستہ کیوں بدل لیا؟“

”اس طرف آجاؤ پہلے...... ابھی بتاتا ہوں...... معاملہ تمہاری سوچ سے بھی زیادہ گڑبڑ ہے؟“ میں نے ہانپتی ہوئی سی سرگوشی میں اس سے کہا اور عقب میں ایک ذرا گردن موڑ کر دیکھا۔ چاندنی میں چمکتے آسمان کی مقدور بھر ضوفشانی میں اس طرف ان دونوں کے ہیولوں کو غائب پایا، جدھر ہمیں رخصت کرنے کے بعد اجے سنگھ اور وجے کھڑے تھے۔

”کیسی گڑبڑ؟ مجھے بتاؤ......“ رام گوپال اس بار قدرے درشت لہجے میں بولا اور ایک دم اپنے کاندھے سے خودکار گن اتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ میں اس کی حرکت پر بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا اور بالآخر میں جس قدر جلدی اور مختصر ترین الفاظ میں اسے اجے سنگھ اور وجے کی اس گھناؤنی اور ہلاکت خیز سازش کے بارے میں آگاہ کرسکتا تھا وہ میں نے اس سے بتا ڈالا۔ جسے سن کر اس بے وقوف نے الٹا اپنی گن کی نال میرے سینے سے لگادی۔

”سچ سچ بتاؤ تم یہاں کیا کرنا چاہتے ہو میرے ساتھ؟“

”بے وقوف! میری نہیں تو اپنی ہی زندگی کی فکر کر

لو...... اجے سنگھ اور وجے ہم دونوں کو......" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ رائفل کے ٹرائیگر پر اس کی انگلی نے جنبش کی...... میری آنکھیں پھیل گئیں، مگر دوسرے ہی لمحے رائفل سے گولی کے دھماکے کے بجائے ہلکی سی "ٹرچ" کی آواز برآمد ہوئی۔ مدھم مدھم سی روشنی میں، میں نے رام گوپال کے چہرے پر حیرانی کے تاثرات ابھرتے دیکھے، مگر وہ بے وقوف پھر بھی ان کی سازش نہ سمجھ سکا جبکہ میں پل کے پل اس کا ادراک کر بیٹھا تھا کہ ان دونوں خبیثوں ہی کی رائفل خالی کرنے کی حرکت ہوسکتی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ میری رائفل کا بھی یہی حال کیا گیا ہو، مگر اس موٹے دماغ رام گوپال نے اسے بھی میری کسی خفیہ سازش سے تعبیر کیا اور بڑے زور کی لات میرے پیٹ پر جڑ دی۔ اس کی یہ حرکت میرے لیے اچانک تھی۔ میرے منہ سے "اوغ" جیسی کرب انگیز آواز خارج ہوئی اور میں پلٹ کر جھاڑیوں میں جا گرا۔ اس نے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اُڑسا ہوا لمبے پھل والا خنجر نکال لیا۔ میری گن کاندھے پر تھی۔ اسی وقت میں نے اجے سنگھ اور وجے کو ایک طرف کی تاریک ٹیکری سے ابھرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ ہمارے قریب آگئے۔ میں نے غیر محسوس انداز میں لیٹے لیٹے اپنے ایک ہاتھ کو پشت کی جانب حرکت دینا شروع کر دی۔

"یہ...... یہ بدبخت دیال داس، کوئی چال چل رہا تھا۔" رام گوپال نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر اسی وقت میں نے اجے سنگھ کو اس کے ساتھ کھڑے وجے کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے پایا...... میرے وجود میں موت کی سنسنی دوڑ گئی۔ رام گوپال کے سر پر موت ناچ رہی تھی اور اس بے وقوف کو کچھ معلوم نہ تھا، بلکہ اس احمق نے مجھے بھی اپنے ساتھ پھنسا دیا تھا۔

اجے سنگھ کے بدہیئت ہونٹوں پہ لمحے بھر کو میں نے مکروہ مسکراہٹ ابھرتے دیکھی اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کی نال رام گوپال کے پہلو سے لگا دی۔ اس کی اس غیر متوقع حرکت پر ایک ثانیے کے لیے رام گوپال کا چہرہ متغیر ہوا اور بالکل آخر میں اس احمق کو اپنی فاش غلطی کا احساس ہوا تھا پھر اس کے اگلے ہی ثانیے میں گولی چلنے کا سمع خراش دھماکا ہوا۔ گولی اس کے پہلو کے آر پار ہو کر قریب کھڑے وجے کے پیٹ میں گھس گئی، چونکہ گولی قریب سے چلائی گئی تھی اور وجے کربہہ ناک چیخ کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑے گر کر تڑپنے لگا، جبکہ رام گوپال پہلے ہی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھے چکا تھا۔

سفاک اجے سنگھ کو وجے کی موت کا بھی کوئی دکھ نہ تھا اور نہ ہی یہ حادثہ تھا بلکہ بدطینت اجے سنگھ نے وجے کو بھی ایک پنتھ دو کاج سے "نمٹا" دیا تھا۔ اب اس کا شکار صرف میں رہ گیا تھا، جبکہ اس نازک اور خطرناک صورتِ حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر میرا پشت کی طرف جاتا ہاتھ رائفل پر پڑ چکا تھا لیکن اسے ابھی سیدھا ہاتھ میں لینے کا موقع نہیں رہا تھا۔ جبکہ اجے سنگھ اپنی دھواں اُڑاتی رائفل کی نال کا رخ میری جانب کیے ہوئے بڑے مکروہ انداز کی ہنسی ہنس رہا تھا۔ وہ کسی بھی لمحے مجھ پر بھی گولی چلا سکتا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ سے کہا۔

"میرا مقصد سب کو مارنا نہیں تھا۔ ایک کا میرے ساتھ بچنا ضرروی ہے، تم نے شاید اس رات میری اور وجے کی باتیں چھپ کر سن لی تھیں، اسی لیے مجھے شک ہوا تھا کہ تم رام گوپالے کو میرے بتائے ہوئے راستے پر لے جانے کے بجائے درمیان میں اچانک کیوں راستہ بدل گئے تھے، یہاں آ کر میں نے تمہاری وہ باتیں بھی سن لیں جو تم گوپالے کو سمجھاتے ہوئے کر رہے تھے۔"

اس کی باقی بکواس پر تو میں نے لعنت بھیجی جو میرے لیے عمومی نوعیت کی ہی تھی تاہم کام کی بات کو میں نے پکڑا اور اس سے کہا۔ "تمہارا خیال صحیح ہے اجے! اگر تم نے مجھے بھی مار ڈالا تو تمہاری اس بات کا کوئی بھی یقین نہیں کرے گا، جس کا منصوبہ تم وجے کے ساتھ بنا چکے ہو......" میں نے بھی پل کے پل اس مکار کی کمزوری کو سمجھتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"خبردار! اب یہ بات راز میں رکھنا...... میں فلش گن چلانے لگا ہوں، تھوڑی ہی دیر میں چھوٹی بڑی سرکار کے وفادار اہلکار یہاں پہنچ جائیں گے، بلکہ گولی کی آواز سن کر اسی طرف آ ہی رہے ہوں گے۔ ان سے یہی کہنا کہ وجے اور رام گوپال فرار کی کوشش کر رہے تھے۔ کھڑے ہو جاؤ......" اس نے آخر میں کہا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اجے سنگھ نے اپنی بیک کٹ سے فلش گن نکالی اور سگنل فائر کر دیا۔

فضا میں ایک زوردار پٹاخا چھوٹا اور تاریک آسمان پر سرخ انگارا سی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ میں ہنوز اس بدفطرت اجے سنگھ کی طرف سے محتاط تھا، کہ کیا خبر یہ میرے ساتھ اب بھی کوئی گل کھلا رہا ہو، اسی وقت مختلف گاڑیوں اور شور کی آواز سنائی دی۔ میرا ذہن تیزی کے ساتھ چال در چال اس

منصوبے پر غور کر رہا تھا جو اب میں اجے سنگھ کے ساتھ کھیلنے والا تھا۔

اس کا دھیان ذرا بٹا اور میں اس پر جھپٹا، سب سے پہلے اس کی گن دور پھینکی اور اس کی فلش گن پر قبضہ جمایا۔ پھر اس کی کنپٹی پر میں نے ایک مُکا جڑ دیا۔ وہ کم بخت سخت جان ثابت ہوا...... انٹاغفیل تو نہیں ہوا البتہ جھول گیا اور لگا لہرانے...... میں نے اسے دبوچ لیا۔ ٹھیک اسی وقت ہر طرف سے تیز سی سرچ لائٹیں مجھ پر پڑیں۔ روشنیوں کے اس سیلاب سے میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔

میں چیخا۔ ”یہ لوگ فرار ہو رہے تھے، دو کو میں نے ہلاک کر دیا اور ایک کو پکڑ لیا ہے، میں سرکار کا وفادار ملازم دیال داس ہوں......“

مجھے ڈر تھا کہیں یہ لوگ مجھ پر فائر ہی نہ کھول دیں۔ مگر اسی وقت سرچ لائٹوں کی ”بیم“ لو کر دی گئی...... گل نہیں کی گئی تھیں۔ میں نے اندر ہی اندر طمانیت بھری سانس لی۔

اجے سنگھ میری گرفت سے آزاد ہونے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر میں نے اسے دبوچ رکھا تھا۔

”ی یہ...... جھوٹ بول رہا ہے، یہ خود ان دونوں کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔“

تب ہی ایک بھاری اور رعب دار آواز ابھری۔

”دیال داس! چھوڑ دو اِسے اور اپنی گن پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لو، تم وفادار ہو یا غدار، اس کا فیصلہ سرکار کرے گی۔“ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔

میری تھوڑی دیر پہلے چندھیائی ہوئی آنکھیں اب کچھ کچھ دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، وہ سات افراد تھے، مخصوص چست وردیوں والے چار اسلحہ پوش اور باقی تین ننگ دھڑنگ جنگجو سنان بردار کلی منجارین......

دو چست وردی پوش میری طرف بڑھے، ایک نے اجے سنگھ کو گرفت میں لے لیا اور دوسرے نے مجھے، وہ میری جامہ تلاشی لینے لگا، میں خاموش مگر دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے کھڑا رہا۔ جبکہ باقی چند دوسرے رام گوپال اور وجے کی لاشوں کو سنبھالنے لگے۔ ان کے عقب میں ایک بڑی سی جیپ کھڑی تھی جس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اس گروپ کی کمانڈ ایک لمبا اور قدرے چوڑے جبڑوں والا شخص کر رہا تھا جس کی وردی کی بناوٹ میں بس اتنا ہی فرق تھا کہ وہ اس کے باقی ساتھیوں سے مختلف دکھائی دے۔ وہ میری ہی طرف گھورے جا رہا تھا۔

اجے سنگھ کو اسی نے ہی جھڑک کر خاموش کرایا تھا۔ تاہم ہم دونوں کو ہی گرفت میں لے لیا گیا تھا اور ہمیں اس لمبی سی اوپن ہڈ والی گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔

”ہٹ نمبر تھری کی طرف چلو......“ چوڑے جبڑوں والے نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے تحکمانہ کہا اور اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

میرے سوچتے ذہن میں دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی اور دل بے چینی سی محسوس کر رہا تھا کہ نجانے اب یہ لوگ کیا فیصلہ کرنے والے تھے، مزید یہ کہ اب ہمیں کس کے سامنے پیش کیا جانے والا تھا؟ رتن لال یا پھر میرے دشمن نمبر ایک بلراج سنگھ۔

بلراج سنگھ کے سامنے پیش کرنے میں مجھے پہلا دھڑکا اپنے پہچان لیے جانے کا تھا، فیصلہ تو بعد کی بات تھی کہ وہ میرے حق میں ہوتا یا پھر اس مردود اجے سنگھ کے۔

ظاہر ہے اب تن بہ تقدیر ہونے کے سوا کیا چارہ تھا، سو دھڑکتی ہوئی خاموشی سے آنے والے وقت کا انتظار کرتا رہا۔

چوڑے جبڑے والے نے ڈرائیور کو ہٹ تھری کی طرف چلنے کا کہا تھا۔ گاڑی تھوڑے ہچکولے کھاتی تاریکی میں مناسب رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب ایک بپ کی تیز سی آواز ابھری جو کسی لاسلکی الارم کی ہی لگی تھی مجھے۔ میرا خیال درست ثابت ہوا، کیونکہ اگلے ہی لمحے چوڑے جبڑوں والے نے کوئی شے اپنے کان کے قریب لے جا کر، ”ہیلو، پیٹرولنگ بلیو آر، سچانند از ہیئر کہا۔“

دوسری جانب سے کوئی اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ جواب میں اس نے وہی کچھ بتایا جو یہاں ہوا تھا۔ کیونکہ رات کے اس خاموش پہر میں گولیاں چلنے کی آواز دور تک گئی تھی۔

”اوکے! ہم اب ہٹ تھری کی طرف ہی جا رہے ہیں، صورت حال قابو میں ہے، کوئی فرار نہیں ہو سکا ہے۔ مسٹر رتن لال کو خبر کر دو...... کلیئرڈ......“

آخر میں یہ کہہ کر چوڑے جبڑوں والے نے، جس کا نام سچانند تھا سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے اس کی مختصر جوابی گفتگو سے کچھ خوش کن اندازہ تو ہوا تھا کہ یہ لوگ مجھے اور اجے سنگھ کو رتن لال کی عدالت میں ہی پیش کرنے والے تھے۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی آبادی والے حصے میں آ گئی اور یہاں کھپریل کی مخروطی چھتوں والے جھونپڑوں سے جادی قبائل باہر نکل کر ہماری طرف تکنے میں محو تھے۔ شاید

فائرنگ کا یہاں یہی مطلب لیا جاتا تھا کہ کسی نے فرار ہونے کی ہی کوشش کی ہوگی۔

انہی چند جاوی قبائلیوں کے درمیان سے مجھے ایک شخص لنگڑاتا ہوا ابھرتے دکھائی دیا۔ وہ آبادی کے درمیان سے گزرتے ناپختہ کچے راستے کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ یہ کبیل دادا تھا۔ دیگر قبائلیوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی ایک سلگتی ہوئی مشعل تھی ہوئی تھی۔

جب ہماری گاڑی اس کے بالکل قریب سے گزری تو ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے گاڑی پر اس حالت میں بیٹھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر تشویش کے سائے لرزاں ہوگئے۔ یقیناً وہ بے چارہ مجھے اس طرح دشمنوں کے درمیان دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ مگر میں نے نظر بچا کر کبیل دادا کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کردیا اور تھوڑا مسکرایا بھی تھا تاکہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر اس کا ذہنی تناؤ اور تفکر کم ہوسکے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرلے کہ میں کوئی چال چلنے لگا تھا۔

گاڑی میں عقبی بینچ نما لمبی سیٹوں پر بیٹھے ایک دو چست وردی پوشوں نے ہاتھ کے اشارے اور چلاّتے ہوئے ان قبائلیوں کو واپس اپنے جھونپڑوں میں جانے کا حکم دیا تھا۔ مگر وہ وہیں رکے رہے اور دور ہوتی ہماری گاڑی کو تکتے رہ گئے۔

اس کے چند ثانیے بعد ہی ہماری گاڑی ایک فائبر ٹک ہٹ کے سامنے رک گئی۔ مجھے اور اجے سنگھ کو بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارا گیا مگر آگے بڑھنے سے ابھی ہمیں روکے رکھا گیا تھا، دیگر افراد بھی وہیں چوکس سے کھڑے ہوگئے تھے۔

ان میں دو افراد کے ہاتھوں میں طاقت ور بیٹری کی چارجر لائٹیں بھی تھیں۔ جن کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ گاڑی سے رام گوپال اور وجے کی لاشیں بھی اتار کر ہٹ کے سامنے عین دروازے کے قریب رکھ دی گئی تھیں۔

وہاں ایک چھوٹی سی جیپ اور بھی کھڑی تھی۔

مجھے وجے سے زیادہ رام گوپال کے مرنے کا افسوس تھا۔ وہ اگر بروقت میری بات کا ادراک کرلیتا تو شاید یوں بے موت نہ مارا جاتا۔ اسی طرح وجے بھی مجھ سے غداری کا ثبوت دیتے ہوئے، بدطینت اجے سنگھ کی باتوں میں آکر اپنی قیمتی جان گنوا بیٹھا تھا۔

سچانند گاڑی سے اتر کر اپنے ساتھیوں کو کوئی تحکمانہ ہدایت دینے کے بعد اور اپنی چست پتلون کی بیلٹ درست کرتا ہوا ہٹ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

مجھے اور اجے سنگھ کو ذرا فاصلے سے ساتھ کھڑا رکھا تھا۔ وہ میری طرف بار بار کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی سازش کے ناکام جانے اور الٹا اس میں خود ہی پھنس جانے پر وہ مجھ سے بہت خار کھائے ہوئے تھا۔

ہمارے ہاتھ وغیرہ بندھے ہوئے نہیں تھے۔ تاہم گن پوائنٹ پر ہمیں ضرور لیا ہوا تھا۔ یوں بھی ہم بھلا کہاں اور کیسے بھاگ سکتے تھے؟ ان کے نرغے میں ہی تھے۔

یہ دشمنوں کا زعم سہی مگر ایک حقیقت بھی تھی۔ یہ سارا ان کا علاقہ تھا۔ یہاں سے وہاں میلوں تک ان کی ہی اجارہ داری تھی۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ اندر سے سچانند رتن لال کے ساتھ برآمد ہوا۔ اس کے ہمراہ دو گن بردار بھی تھے۔ رتن لال نے ڈھیلا ڈھالا لباس پہن رکھا تھا۔ مجھے اس سے امید تھی کہ یہ فیصلہ میرے حق میں دے گا۔ کیونکہ میں اس کی بٹالین سے تعلق رکھتا تھا اور یہ مجھے جانتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے صرف ایک نگاہ مجھ پر ڈالی تھی اس کے بعد اجے سنگھ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اسے اپنی طرف متوجہ پاتے ہی اجے سنگھ نے وہی راگ الاپنا شروع کردیا تو رتن لال نے اسے بری طرح جھڑک کر خاموش رہنے پر مجبور کردیا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے سچانند سے تفصیلات پوچھیں۔ پھر کچھ سوچتا رہا اور لاشوں کی طرف بڑھ گیا۔ ایک ساتھی نے سچانند کے اشارے پر چارجر لائٹ کی روشنی لاشوں پر پھینکی، وہ جھک کر ان کا جائزہ لیتا رہا پھر سیدھے کھڑے ہو کے سچانند سے بولا۔

”یہ معاملہ گمبھیر لگتا ہے، تم ایک کام کرو سچانند!“

”سر!“ وہ مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے بولا تھا۔

”ہٹ فور کے ساجن داس سے بات کرو، اس سے پوچھو کہ کیا بلراج صاحب جاگ رہے ہیں؟“

بلراج سنگھ کے ذکر پر مجھے اپنے پیٹ میں گرہیں پڑتی محسوس ہونے لگیں اور میری ساری خوش فہمی ہوا ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ رتن لال ہی اس مسئلے کو آسانی سے حل کرسکتا تھا، لیکن شاید یہ معاملہ واقعی نازک اور اہم تھا اسی لیے رتن لال اسے اپنی صوابدید پر حل کرنے کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ مجھے اب ایک تفکر آمیز بے چینی سی کھا گئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بلراج سنگھ میرے حق میں کیا فیصلہ دیتا، یہ میرے لیے اب دور کی بات ہوگئی تھی، پہلا تو یہ ڈر ہی مجھے کھائے جا رہا تھا کہ کہیں یہ بدذات بلراج سنگھ مجھے پہچان

ہی نہ لے۔ اگرچہ میں نے اپنا حلیہ، یہاں بھی رہتے ہوئے کافی حد تک بدل لیا تھا، اپنے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال بھی بڑھا لیے تھے۔ دائیں گال پر ہلکے سے زخم کا نشان بھی بنا لیا تھا جو کانٹے دار جھاڑی میں پھنسنے کا رہینِ منت تھا۔ اسے میں نے صاف کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ آواز البتہ میں نے پہلے ہی تھوڑی بدل رکھی تھی، تاکہ اگر کبھی بلراج سنگھ سے میرا سامنا ہو بھی جاتا تو میں اسی آواز میں اس سے گفتگو کرتا، تاکہ کسی میرے قریبی ساتھی کو (دشمن ساتھی کو) بھی اس کا شبہ نہ ہونے پائے۔

بہرطور اس دوران سچانند نے ساجن داس سے رابطہ کیا تو اس نے یہی جواب دیا کہ بلرج سنگھ سو رہا تھا۔ لہٰذا ہمیں اگلے دن صبح اس کے سامنے پیش کرنے فیصلہ کر لیا گیا تھا اور پھر ہمیں ایک چھوٹی سی قیدیوں والی چھولداری میں بند کر دیا گیا۔

مجھے اور اجے سنگھ کو الگ الگ ہی رکھا گیا تھا اور باہر پہرا لگا دیا گیا تھا۔ رات تو یوں بھی آخری پہر میں تھی اور صبح ہونے میں چند ہی گھنٹے رہ گئے تھے، تاہم میں بھی تھکا ہوا تھا، مگر صبح بلراج سنگھ کے رُوبرو پیش کیے جانے سے میرا ذہن کچھ پریشان بھی ہو رہا تھا، جانے وہ بدبخت میرے حق میں کیا فیصلہ صادر کرنے والا تھا؟ اور یہ دھڑکا الگ لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ مجھے پہچان ہی نہ لے۔ ساتھ ہی مجھے کبیل دادا کی بھی فکر ہونے ہونے لگی کہ وہ مجھے مجرموں کی طرح ان کے نرغے میں دیکھ کر یقیناً تشویش اور پریشانی سے دوچار ہو گیا تھا۔ مجھے یہ ڈر بھی ہوا کہ کہیں وہ کوئی ایسا ویسا قدم ہی نہ اٹھا بیٹھے اور میرے ساتھ خود بھی کسی مصیبت کا شکار ہو جائے، البتہ مجھے کچھ تسلی تو تھی کہ میں نے اسے اسی لیے آنکھ کا اشارہ کیا تھا کہ اسے زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور معاملہ ابھی ہاتھ سے نہیں نکلا، وغیرہ۔

صبح سویرے ہی مجھے ایک پہرے دار نے جگا دیا۔ میں السائی ہوئی آنکھوں کو مسلتا ہوا اٹھ بیٹھا اور پھر پہرے دار کے ایما پر اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔

باہر ایک جیپ کھڑی تھی اس میں ڈرائیور سوار تھا، اس کے عقب میں اجے سنگھ بیٹھا تھا۔ دو گن بردار جیپ سے اترے چوکس کھڑے تھے۔ مجھے بھی جیپ میں سوار کرا دیا گیا تھا اس کے بعد باقی اسلحہ پوش بھی اس میں سوار ہو گئے اور جیپ آگے روانہ ہو گئی۔

مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی کہ ہمیں اب بلراج سنگھ کے ہٹ فور کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ ہٹ زیادہ دور نہیں تھا، وہ رتن لال کے ہٹ کے عقب میں ہی پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر بنا ہوا تھا جو نسبتاً بڑا ہی دکھتا تھا۔

وہاں پہنچے تو رتن لال کو پہلے ہی سے میں نے موجود پایا۔ وہاں اس کے گن بردار ساتھی بھی موجود تھے جن کی تعداد تین تھی، یہ وہی تھے جو ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

ہٹ کے ایک بڑے گوشے میں مجھے اور اجے سنگھ کو کھڑا کر دیا گیا تھا۔

”پتا کر کے بتاؤ کہ بلراج صاحب اور سچانند کب لوٹ رہے ہیں؟“ معاً رتن لال نے ہمیں ساتھ لانے والوں میں سے ایک سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا تو اس نے جواب میں کہا۔

”یس سر! چھوٹے سرکار سچانند کے ساتھ لاشوں کا جائزہ لے کر بس ابھی ترنت پہنچنے والے ہیں۔“

رتن لال ایک کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لگا رہا تھا۔ ساتھ ہی گاہے بہ گاہے میری اور اجے سنگھ کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

”سر! آپ تو مجھے جانتے ہی ہیں کہ میں سرکار کا کتنا وفادار ہوں...... سرکار کو میری بے گناہی اور بہادری کا ضرور بتائیے گا۔“ میں نے اسے اپنی طرف دیکھتا ہوا پایا تو فوراً بولا۔

”وفادار تو میں بھی ہوں...... غدار تم ہو، فرار تم ہو رہے تھے، میں نہیں۔“ اجے سنگھ خاموش نہ رہ سکا۔ میں نے بھی رتن لال کو سامنے پا کر دانستہ اجے سنگھ کی طرف دیکھ کر اس سے کہا۔

”تم اپنا جرم مجھ پر تھوپنے کی سازش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ رتن لال صاحب کے ساتھ میں نے کئی مہمات میں اپنی جان پر کھیل کر ساتھ دیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میں نے دزدیدہ نظروں سے رتن لال کی طرف دیکھا تو اسے پُرغور سے انداز میں اپنا سر ہلاتے ہوئے دیکھا۔ اس میں اسی قدر حقیقت تھی کہ اس روز بھولا ناتھ اور اس کے ٹولے سے ہونے والی لڑائی میں دیال داس ان کے ہی ہمراہ تھا جسے قابو کرنے کے بعد میں نے اس کا روپ دھار لیا تھا۔ اس لیے میں نے اسی بات کے حوالے سے یہ بات اجے سنگھ کو جتائی تھی اور مجھے پوری امید تھی کہ رتن لال اب بلراج سنگھ کے سامنے بھی میری سفارش کر سکتا تھا۔ جواب میں اجے سنگھ نے بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہا تو رتن لال نے اسے جھڑک دیا۔

”منہ بند رکھو اپنے۔ ابھی بلراج صاحب آ جاتے

ہیں۔ فیصلہ ہوجائے گا۔ وہ لاشوں کا جائزہ لینے گئے ہوئے ہیں...... ابھی آکر وہ تم دونوں سے ایسے سوالات کریں گے کہ انہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ تم دونوں میں سے اصل مجرم کون ہے اور کون چالاکی چلنے کی کوشش کررہا ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ اجے نے بھی چپ سادھ لی۔ مگر میرے اندر جو بے چینی تھی سوا ہوتی جارہی تھی۔ مجھے اصل خطرہ اس بات کا نہیں تھا کہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے۔ بلکہ خدشہ جو حقیقت میں مجھے پریشان کیے ہوئے تھا وہ میرے پہچان لیے جانے کا تھا۔ اگر فیصلہ میرے حق میں بھی ہوتا، جس کی مجھے کافی حد تک امید تو تھی لیکن اگر بلراج سنگھ میری اصلیت کو اپنی کسوٹی پر پرکھ لیتا تو معاملہ میرے تصور سے بھی زیادہ سنگین ہوسکتا تھا، حد تو یہ تھی کہ میں اب ذہنی طور پر بھی خود کو اس خطرے کے لیے تیار کرنے لگا تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسا ہو بھی جاتا ہے تو مجھے پہلے سے اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ سوچ لینا چاہیے، مگر کافی غور و خوض کے باوجود میں نے خود کو سرِدست بے بس ہی پایا۔

اسی وقت میرے سیدھے ہاتھ کے ایک کچے دھول اڑاتے راستے پر مجھے ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ رتن لال ایک دم الرٹ ہوگیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بھی ایک مخصوص اشارہ کردیا۔ خود میرا بھی دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بلراج سنگھ سے یوں تو میرا پہلے بھی سامنا ہوتا رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک دلیر مگر سفاک اور کینہ پرور دشمن تھا۔ میرا اس کا سامنا جب بھی ہوا تھا وہ کسی اور ہی حالات میں ہوا تھا مگر اب بات اور تھی۔ وہ اب بالادست تھا اور میں زیر دست، ایک ذرا سی بھی مجھ پر شبہے کی بھنک پڑتے ہی وہ مجھے دوسرا سانس لینے کا موقع دیے بغیر ہی گولی مار سکتا تھا، جبکہ میرے لیے مفر کی کوئی راہ ہی نہ ہوتی۔

اسی وقت دو گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی چشم زدن میں ہمارے سامنے آکر رک گئیں اور آگے والی گاڑی میں بلراج سنگھ کو دیکھ کر میری سانسیں بھی سینے میں اٹکنے لگیں۔

اس نے پی کیپ چڑھا رکھی تھی، پیروں میں لانگ بوٹ تھے۔ بائیں پہلو پہ بیلٹ کے ساتھ ہولسٹر جھول رہا تھا، جس میں سے ایک خوفناک سیاہ رنگ کے ریوالور کے دستے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ اس کے عقب میں چار گن بردار بھی تھے۔ بلراج سنگھ نیچے اتر آیا، باقی لوگ بھی نیچے اتر آئے، پیچھے والی جیپ میں سچانند اور اس کے ساتھی تھے وہ بھی نیچے اتر آئے تھے۔ رتن لال کے مطابق غالباً سچانند، بلراج سنگھ کو رام گوپال اور وبھے کی لاشوں کا معاینہ کروا آیا تھا۔

ہٹ کے اندر سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے ایک بڑی سی کرسی سنبھالی ہوئی تھی جو اس نے عین میرے اور اجے سنگھ کے سامنے ہی ذرا فاصلے پر رکھ دی۔ وہ یقیناً بلراج سنگھ کے بیٹھنے کے لیے تھی۔

بلراج سنگھ نے ہم دونوں پر بہ ظاہر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر میں نے دیکھا کہ رتن لال، جو اس کے قریب آگیا تھا، اس کے کان میں کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

اس کے بعد بلراج سنگھ کو میں نے اجے سنگھ کی طرف بڑھتے دیکھا اور اسے بولنے کو کہا تو اجے جیسے بولنے کا ہی منتظر تھا۔ فرفر شروع ہوگیا اور جو کچھ بھی اس نے کہا وہ سارا جھوٹ ہی تھا۔ میں اس دوران چپ ہی رہا تھا۔

جب اجے کی بکواس ختم ہوگئی، جسے بلراج سنگھ نے یک ٹک سی سرد مہری اور اسی انداز کی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے سنی تھی۔ اس کے بعد بلراج سنگھ نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ مجھے اجے کا چہرہ پُرامید سا محسوس ہونے لگا۔ میرا دل کسی خیال سے دھڑکنے لگا۔

بلراج سنگھ نے اسے میرے دائیں جانب اپنے سامنے کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور پھر میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا۔

جب وہ میرے عین سامنے کھڑا ہوگیا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ چند ثانیے میرے چہرے کو تیز بھانپتی ہوئی نظروں سے گھورتا رہا تو میں نے اپنا چہرہ تھوڑا سا جھکا لیا۔ میرے اندر کی حالت شدید اتھل پتھل کا شکار تھی۔ اس کی سپاٹ خاموشی سے مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر ایک عدد گولی میری پیشانی میں ٹھونک دے گا۔

''تم بتاؤ، کیا معاملہ تھا یہ......'' دوسرے ہی لمحے اس کی گمبھیر اور پاٹ دار آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، میرے اندر دور تک یک گونہ سی طمانیت اترتی چلی گئی۔ اپنے بڑے دشمن کے سامنے میری پہلی کامیابی نے میرے ڈھتے ہوئے حوصلوں کے بادبان بلند کردیے تھے۔ وہ مجھے نہیں پہچان پایا تھا۔

''......مگر یاد رکھنا، حقیقت کیا ہے، میں اس کی تہ تک پہلے ہی پہنچ چکا ہوں۔ اس لیے جھوٹ مت بولنا۔'' اس نے گھرگھراتے لہجے میں اپنا جملہ مکمل کیا اور تب پہلی بار مجھے اپنے رگ و پے میں ایک سنسناتی ہوئی لہر دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ جانے کیوں اس کی تہدید میں مجھے موت کی نامعلوم سی سرسراہٹ محسوس ہوئی تھی۔

تب ہی میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے وہی حقیقت بتانا شروع کر دی، جو میں اسے بتانے کا پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ حقیقت تو وہی تھی جو اجے سنگھ اور وجے نے میرے اور گوپال کے خلاف سازش کے طور پر تیار کی تھی۔ لیکن اب اس کا ذکر کرنا خوامخواہ ہی معاملے کو طول دینے کے مترادف ہوتا، جبکہ اجے سنگھ کی چال میں پہلے ہی اسی پر الٹ چکا تھا اور اس طرح مجھے وہ ایک کھلا اور آسان موقع دے چکا تھا۔

چنانچہ میں نے اس موقعے سے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے بلراج سنگھ کو بتایا کہ مجھے ان تینوں پر پہلے ہی شبہ ہو چکا تھا کیونکہ ان تینوں کو اکثر میں نے آپس میں باتیں کرتے ہوئے پایا تھا اور جب میں ان کے پاس جاتا تو یہ ایک دم خاموش ہو کر کوئی اور بات چھیڑ دیا کرتے تھے۔"

"یہ جھوٹ......" اجے سنگھ نے درمیان میں چلّانا چاہا تھا کہ اسی وقت بلراج سنگھ کا ایک ہاتھ حرکت میں آیا اور اجے سنگھ کے گال پر اس کے بھاری ہاتھ کا زوردار تھپڑ پڑا۔ اجے سنگھ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑاتا چلا گیا۔

"تمہیں بولنے کا موقع دے دیا گیا تھا۔ دوبارہ بولنے والے کو میں گولی مار دیا کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا۔ اعشاریہ، اڑتالیس بور کے اس ریوالور کی گولی کھوپڑی کے آرپار ہو جایا کرتی تھی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ "یہ تینوں میرا عندیہ بھی لینے کے لیے کچھ ایسی باتیں کیا کرتے تھے جیسے میرے بارے میں یہ اندازہ لگا سکیں کہ میں یہاں خوش ہوں یا نہیں۔ مگر چونکہ مجھے یہاں کام کرنے میں لطف آرہا تھا، اور خود کو میں سرکار کا نمک خوار ہی نہیں، بلکہ احسان مند بھی سمجھتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میں .... رتن لال صاحب کے ساتھ بڑی بڑی مہمات میں شامل رہا ہوں۔ کوئی بڑا کارنامہ تو میں نے انجام نہیں دیا ہے مگر پیچھے بھی آج تک نہیں ہٹا ہوں۔ میں بتا رہا تھا کہ جب ان تینوں نے دیکھ لیا کہ میں یہاں خوش ہوں اور اکثر انہیں یہ بھی بتایا کرتا تھا کہ عنقریب یہ جگہ ایک اسٹیٹ کا درجہ رکھنے والی ہے اور ہم سب بہت جلد اچھے عہدوں پر فائز کیے جانے والے ہیں تو یہ مجھ سے دور ہونے لگے۔ کیونکہ یہ تینوں خود کو یہاں ایک قیدی کی طرح محسوس کرتے تھے۔ مگر میں بھی ان کی تاک میں رہنے لگا، بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے ان سے اپنی جان کا خوف ہونے لگا تھا کہ کیا خبر یہ مجھے سوتے میں ہلاک کر کے خود نکل جاتے۔ میں نے بھی ان سے کترانا اور دور رہنا شروع کر دیا۔

کل رات یہ تینوں گشت کے بہانے سے نکلے تو میں نے ان کا پیچھا کیا۔ یہ تینوں واقعی فرار ہونے کی کوشش میں تھے۔ ان کا پیچھا کرتے ہوئے جب یہ لوگ ایک مقام پر آکر رک کر آپس میں باتیں کرنے لگے تو مجھے لگا کہ رام گوپال اور وجے بالکل بھی میری طرح اس فرار سے ناخوش تھے اور خوف زدہ بھی۔ مگر یہ اجے سنگھ بدستور ان کی ہمت بندھائے جا رہا تھا۔ تب ہی میں نے اچانک ان کے سامنے آکر انہیں سمجھانے کی کوشش کرنی چاہی لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا کہ یہ میری غلطی تھی۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ گولیاں بھی چلیں اور غلطی میں ایک دوسرے کو بھی لگیں، مگر میں اجے سنگھ کو زندہ پکڑنے میں کامیاب ہو گیا اور فوراً میں نے فلش گن سے سرخ سگنل فائر کر دیا۔ شکر تھا کہ سچا نند کی گشتی ٹیم بلیو آر وہاں پہنچ گئی اور ان لوگوں نے اجے سنگھ کو میری گرفت میں دیکھا۔"

میں اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ بات جھوٹ تھی یا سچ، مگر گھوم پھر کر ایک طرح سے سچ پر ہی مبنی تھی۔ کیونکہ اجے نے تو واقعی ایسا منصوبہ بنا رکھا تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ کریہہ ناک تھا، یعنی مجھے اور رام گوپال کو دھوکے سے ہلاک کرنا اور پھر پیشی میں سرخ رُو ہونا۔

اسی وقت بلراج سنگھ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریوالور کی نال کا رخ میری پیشانی کی طرف کر دیا اور میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے بلراج سنگھ میری اس جھوٹ سچ کی پلاننگ کو جان گیا تھا۔ جبکہ اجے سنگھ کے چہرے پر ایک دم بشاشت اور خوشی کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے تھے۔ بلراج سنگھ کی گھورتی ہوئی زہرناک نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ میرے لیے اب اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ تھا۔ بلراج سنگھ کو جنرل کے ایل ایڈوانی کی طرف سے ہر قسم کا "فری ہینڈ" ملا ہوا تھا۔

اس کے ریوالور کی بھیانک نال کا رخ میری جانب تھا اور ٹریگر پر انگلی ایک ذرا جنبش کی منتظر تھی کہ اسی وقت بلراج سنگھ کا یہی ہاتھ اچانک ہی متحرک ہوا اور "ٹھائیں" سے اس نے گولی چلا دی۔ میرے ساتھ کھڑا اجے سنگھ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ نکلی تھی۔ میرے سینے میں اٹکی اٹکی ہوئی سی سانس خارج ہو گئی، مگر اب بھی کچھ پتا نہ تھا کہ میرے بارے میں بلراج سنگھ کیا فیصلہ صادر کرتا ہے؟

Hashmi
Ispaghol

Poora Pakistan
Raha Hai Bol
Hashmi Ispaghol

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے

- ✓ معدے کو صاف
- ✓ بلڈشوگر کا لیول برقرار
- ✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
- ✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raho

www.hashmisurma.com HashmiSince1794

Benchmark.pk

اس کے ایک ہی اشارے پر اجے سنگھ کی لاش کو وہاں سے ہٹادیا گیا۔ اس کے بعد بلراج سنگھ میری جانب مڑا اور بہ غور آنکھیں سکیڑے میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس جلاد صفت کو اپنی جانب اس طرح گھورتے پا کر سینے میں میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے رتن لال کی طرف دیکھ کر اسے مخصوص اشارہ کیا اور پھر خود تیز تیز قدموں سے اپنے ہٹ کے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ سچانند اور رتن لال وہیں کھڑے رہے تھے، البتہ بلراج سنگھ کے وہاں سے جاتے وقت ان دونوں نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

''چل اوئے، تیری تو مکتی ہوگئی۔'' رتن لال میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور میں یونہی دانستہ ہونق چہرے کے ساتھ اس کا منہ تکنے لگا تو وہ پاس ہی کھڑے مسکراتے ہوئے سچانند سے بولا۔

''اسے اپنی جگہ پر چھوڑ آؤ...... لگتا ہے اس کے پوہ بارہ ہیں۔''

سچانند نے بھی معنی خیز انداز میں اپنا سر ہلایا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا، میں گم صم سا ہی کھڑا تھا، فوراً اس کی جانب لپکا۔ اب میرے ساتھ ان کا رویّہ بدل گیا تھا۔

میں سچانند کی جیپ میں سوار ہوگیا اور وہ روانہ ہوگئی۔ جیپ میں صرف میں اور سچانند تھے، تیسرا ڈرائیور تھا۔

''لگتا ہے تم نے چھوٹے سرکار کا من جیت لیا ہے، وہ بہت جلد تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے موڈ میں دکھائی پڑتے ہیں۔ اپنے چھوٹے سرکار بلراج صاحب ہیں بھی بڑے دیالو، ایک بار کسی کی وفاداری جانچ لیں تو سمجھو وارے نیارے ہیں اس کے......''

سچانند نے ایک ذرا گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا۔ میں اس کی عقب والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی بات نے میرا سیروں خون بڑھا دیا تھا۔ اگر وہ درست کہہ رہا تھا، جس کی کسی حد تک مجھے بھی امید تھی تو یقیناً پھر میں نے بلراج سنگھ جیسے آدمی کو بلف کر کے ایک بڑا پالا مار لیا تھا۔

تقدیر نے اکثر و بیشتر اس طرح بھی میری مشکل راہوں کو آسان کیا ہے کہ میرے خلاف دشمنوں کی چلائی ہوئی چالیں خود انہی پر الٹ دیں، جیسا کہ اب ہوا، اجے سنگھ میرے خلاف جو گڑھا کھودے ہوئے تھا وہ خود اسی میں جا گرا تھا اور اس کا فائدہ میری جھولی میں آن گرا تھا۔

سچانند کی باتوں سے مجھے لگا تھا کہ میرا عہدہ ترقی پانے والا تھا۔ دوسرا مجھے اجے سنگھ کی وہ رازدارانہ گفتگو کے الفاظ بھی یاد تھے جو میں نے چھپ کر سنے تھے جس میں وہ وجے کو اپنے ساتھ ملاتے ہوئے کہہ گیا تھا کہ ایک بار اگر سرکار کو ہماری وفاداری پر یقین ہوجائے تو سمجھو پوہ بارہ ہیں اور اب میں نسبتاً بہتر پوزیشن میں آنے والا تھا۔

میں اپنے جھونپڑے میں آگیا تھا۔ خالی خالی جھونپڑے کو دیکھ کر مجھے وجے یاد آنے لگا اور مجھے افسوس بھی ہوا کہ اس نے اجے سنگھ کا ساتھ دے کر کتنی بڑی غلطی کی تھی اور اپنی جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

جھونپڑے میں چھوڑنے کے بعد میری گن بھی مجھے لوٹا دی گئی تھی۔ مجھے بھوک اور اس سے زیادہ پیاس ستانے لگی تو میں فریج کی طرف بڑھا، اسے کھولا تو وہ خالی تھا۔ صرف بیئر کی ایک بوتل پڑی تھی۔ پیاس شدت اختیار کرنے لگی تو میں نے بیئر نکال لی اور اس کے لیبل پر چسپاں ٹیگ کو دیکھا تو وہ الکوحل فری نہ تھی، شدید پیاس کے باوجود میں نے اسے دوبارہ فریج میں رکھ دیا۔ لگتا تھا ان دونوں میں اجے سنگھ اور وجے نے سارا فریج ہی خالی کردیا تھا۔ میں فریج کا دروازہ بند کر کے پلٹا ہی تھا کہ اچانک میں نے جھونپڑے کے دروازے پر کسی کی آہٹ سنی اور میں نے یک دم ہی گن کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک شخص لنگڑاتا ہوا اندر داخل ہوا اور بے اختیار میرے تنے ہوئے اعصاب پُرسکون ہوتے چلے گئے۔ وہ کبیل دادا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز تفکر کے سائے لرزاں تھے۔ میں اسے دیکھتے ہی وفورِ جذبات تلے اس کے گلے لگ گیا۔

''یہ...... تیرے ساتھ کیا ہو رہا تھا، شہزی؟'' اس نے مجھ سے الگ ہونے کے بعد الجھن آمیز پریشانی سے پوچھا۔

''کچھ نہیں میرے یار! کیوں پریشان ہوتا ہے تو......'' میں مسکرایا۔ مجھے مسکراتا پا کر اس کی کچھ تسلی ہوئی اور وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک ذرا جھونپڑے سے باہر جھانکا اور پھر کبیل دادا کے قریب آ کر ہولے ہولے اسے ساری بات بتادی۔ جسے سن کر وہ ششدر سا رہ گیا۔ پھر بولا۔

''شہزی تو ایک بڑے خطرے میں پڑنے سے نہ صرف بال بال بچا ہے بلکہ تو نے تو ایک بڑا پالا بھی مار لیا ہے۔ مگر یار! تو جتنا ان کے قریب ہوگا اتنا ہی خطرہ بھی تیرے لیے بڑھے گا۔'' میں نے اس کی بات پر خفیف سی

مسکراہٹ سے کہا۔

''جتنا بڑا فائدہ اتنا ہی بڑا خطرہ، اس کا مجھے بھی احساس ہے، پر یار دادا! اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے، ویسے مجھے اسی دن کا تو انتظار ہے جب میں ان کی ناک کا بال بنوں گا اور پھر ان کی بیخ کنی کروں گا۔'' پھر ایک لمحہ ذرا توقف کے بعد اس سے بولا۔

''پر یار گبیل! تو ابھی خود کو محدود ہی رکھنا، میں نے فلم آگے چلادی ہے، اس کے ختم ہونے کا انتظار ضرور کرنا، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''مگر مجھے اول خیر اور شکیلہ کی فکر ستا رہی ہے شہزی!'' وہ بولا۔ ''وہ دونوں بے چارے ان کی قید میں ہیں اور بیگار کاٹ کاٹ کر ان کی بہت بری حالت ہو رہی ہے۔''

''اس کا احساس مجھے بھی ہے گبیل دادا!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آزردہ سے لہجے میں کہا۔ ''میں بہت جلد ان کے لیے بھی کچھ کرتا ہوں۔''

''ایک خبر ہاتھ لگی ہے میرے......'' گبیل دادا نے موضوع بدلا۔

''کیسی خبر؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، ٹھیک اسی وقت مجھے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں ہی ٹھٹک گئے۔ میں نے اسے اسی طرح بیٹھے رہنے کا کہا اور جلدی سے اٹھ کر جھونپڑے سے باہر آگیا۔

سامنے ہی ایک نیلے رنگ کی بند وین کھڑی تھی۔ اس میں ایک ڈرائیور اور اس کے برابر میں ایک گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی سوار تھا۔ وہی دروازہ کھول کر نیچے اترا تھا۔ پھر اس نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور وین کا عقبی دروازہ سلائیڈ کیا۔

''سرکار نے تیرے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھیجی ہیں۔ اعلیٰ درجے کی ولایتی شراب کے علاوہ انواع و اقسام کے کھانے پینے کی چیزیں...... لے سنبھال۔''

اس نے ہنستے ہوئے کہا اور مجھے دروازے کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس میں کھانوں کے مہر بند ڈبے، صاف پانی کی بوتلیں اور مشروبات تھے۔ مجبوراً مجھے شراب کا ایک چھوٹا کریٹ بھی اٹھانا پڑا۔ یہ ساری چیزیں میں نے وین سے اس آدمی کی مدد سے اتروالیں، اس کے بعد وہ دروازہ بند کر کے وین میں بیٹھ کر چلا گیا۔

میں یہ ساری چیزیں خود پر لاد کر جھونپڑے میں چلا آیا اور فرش کے درمیان میں رکھ دیں۔

گبیل دادا جھونپڑے کی کھڑکی نما سوراخ سے لگا کھڑا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ''واہ رے شہزی! لگتا ہے تیری موجوں کے دن آرہے ہیں۔''

میں نے سب سے پہلے کھانے پینے کی اشیا ایک طرف کیں اور دو ڈبے اس کی طرف بڑھا دیے۔ ایک کٹر بھی اسے تھما دیا۔ وہ کین سنبھالے کٹر سے اس کی سیل کھولنے لگا اور پھر میں نے اسے چمچ تھما دیا وہ اس میں سے فروٹ کے ٹکڑے نکال کر کھانے لگا۔ باقی چیزیں میں نے کچن میں سیٹ کر دیں۔ کچھ پکانے کی اشیا بھی تھیں جو... فریج میں رکھ دیں۔

''ایک ہیلی کاپٹر ہفتے میں ایک بار آتا ہے، یہ ساری چیزیں اعلیٰ درجے کی اسی میں شہر سے لائی جاتی ہیں۔'' وہ کھانے کے دوران بتانے لگا۔

''تم کوئی خبر لائے تھے؟'' میں نے اسے یاد دلایا اور خود بھی ایک کین کٹر سے کھولنے کے بعد اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''اب تجھے بھی جلد سب معلوم ہو جائے گا پر مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ یہاں ایک بڑی گیم کھیلی جارہی ہے، اپنی جان کا رسک لے کر میں نے ان کا ایک اہم راز جان لیا ہے۔ مگر شہزی! مجھے سب سے زیادہ فکر شکیلہ اور اول خیر کی ہورہی ہے۔ ڈرتا ہوں آگے جاکر ان کے ایک بڑے کھیل میں ہم سب کہیں کھو نہ جائیں۔''

وہ مجھے خاصا دل برداشتہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ازراہِ تشفی بولا۔ ''گبیل دادا! حوصلہ رکھو، ہم دونوں ساتھ ہیں اور ایک طرح سے آزاد بھی۔ اول خیر اور شکیلہ سے تمہاری ملاقات آسان ہوتی ہے، میری نہیں، تم انہیں میری طرف سے حوصلہ دیتے رہا کرو۔'' میری بات پر گبیل دادا خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''ان دونوں کا تو اسی روز حوصلہ آسمان کو چھونے لگا تھا جب انہوں نے تمہیں دیکھا تھا۔ پر خیر! میں تجھے بتاتا ہوں۔ جزلی کے ایل ایڈوانی یہاں اپنی جوا سٹیٹ ڈارک کیسل کے نام سے بنوانا چاہتا ہے، ممکن ہے اس کے پس پردہ اس کا اپنا وہ بھیانک منصوبہ ''ورلڈ بگ بینگ'' ہی کارفرما ہو، مجھے اب پتا چلا ہے کہ جاوا کی یہ سرزمین اس کے لیے اہم کیوں تھی۔ ایک بھارتی مسلم شخص نصیر شاہ جو ایک بہت بڑی کان کن کمپنی ''ایموزون مائننگ کمپنی'' کا براسپیکٹر ہے مگر درحقیقت وہ ایک قابل گریجویٹ مائننگ انجینئر ہے، اسی نے کئی سال پہلے یہاں ہیروں کی ایک کان

دریافت کی تھی۔ مگر اپنا کام شروع کرنے کے لیے اسے بہت بڑے سرمائے کی ضرورت تھی، جو اس کے پاس نہ تھا، ایموزون مائننگ نے اس کے لیے اپنے توسط سے بڑے بڑے بینکوں سے قرضہ بھی لینے کی کوشش چاہی تھی۔ مگر ایک تو قرضے کی رقم بہت زیادہ تھی، جو چالیس ملین ڈالر بنتی ہے، دوسرے یہ کہ اگر کسی بینک نے اتنا بڑا سرمایہ دینے کی ہامی بھری بھی تو اس کی شرائط سخت تھیں؛ ایک تو ان کا مارک اپ (سود) زیادہ تھا، دوسرے یہ کہ وہ کان دریافت ہونے کے بعد اس کی رائلٹی میں بھی حصہ داری چاہتے تھے۔ اسی دوران ہی اس کی بھنک جب جنرل ایڈوانی کو پڑی تو اس نے اسے اپنی ممبئی والی رہائش گاہ پر بلوالیا۔

جنرل ایڈوانی کو اپنے بھیانک منصوبے کی تکمیل کے لیے ایک تو ایسے دورافتادہ علاقے کی ضرورت تھی جسے وہ اپنی آزاد ریاست کا درجہ دے سکے، دوسرے وہاں سے اس کی مستقل مالی سپورٹ کا کوئی معقول بندوبست ہوتا رہے، جس کے تحت وہ کاروبارِ ریاست چلا سکے۔ نصیر شاہ سے جب اس کی ون ٹو ون ملاقات ہوئی تو اس کی باتیں سن کر ایڈوانی کو اپنے دیرینہ خوابوں کی تعبیر ملتی محسوس ہونے لگی۔ یعنی ایسا علاقہ جو اس کی خواہشات کے عین مطابق دورافتادہ بھی تھا اور یہاں دیگر معدنیات کے علاوہ ہیرے کی کان کی موجودگی کا بھی انکشاف کیا جاچکا تھا اور یہ انکشاف کسی عام آدمی یا بڑبولے نے نہیں بلکہ ایک منجھے ہوئے اور پروفیشنل پراسپیکٹر نصیر شاہ نے کیا تھا۔ جو خود بھی ایک بڑی مائننگ کمپنی کا دیرینہ رکن تھا۔ لہٰذا موقع شناس کے ایل ایڈوانی نے نصیر شاہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے چالیس ملین ڈالر کی خطیر رقم کا سرمایہ فراہم کرنے کی بھی ہامی بھرلی۔ بلکہ ہر طرح کے تعاون کا بھی یقین دلایا۔ اس کے بعد کی کیا صورتِ حال ہے، یہ ابھی پردے میں ہے۔ اب پتا نہیں اس بے چارے کو اغوا کرکے اِدھر کہیں چھپا رکھا ہے، ہلاک تو اسے نہیں کرسکتے، کیونکہ ہیروں کی کان تک رسائی اور اس کی کھدائی وغیرہ پر وہ اتھارٹی رکھتا ہے، کیونکہ وہ ایک گریجویٹ مائننگ انجینئر اور کان کنی کا بڑا قابل شخص سمجھا جاتا ہے۔''

کبیل دادا اتنی صراحت بتانے کے بعد خاموش ہوا تو میری پُرغور سی نظریں ہنوز اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا سانس لینے کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔

''چونکہ جنرل ایڈوانی کا اصل منصوبہ ورلڈ بگ بینگ ہے اور اس کی وجہ وہ اس طلسمِ نور ہیرے کو بنانا چاہتا ہے، جو پاکستان کے علاقے موئن جودڑو سے برآمد ہوا تھا۔ وہ اب بہت جلد اس ہیرے کو وجہ نزاع بنا کر روس، پاکستان اور بھارت کے بیچ جنگ چھڑوانا چاہتا ہے۔ طلسمِ نور ہیرا چونکہ پاکستان کی ملکیت ہے، مگر جنرل ایڈوانی اس ہیرے کو جان بوجھ کر روس کی ملکیت ظاہر کرے گا، ان شورش پسند جرنیلوں کے ہرکارے ایک پورے نیٹ ورک سسٹم کے تحت مذکورہ ممالک میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ پروپیگنڈا مختلف ممالک سے کیا جائے گا۔ بھارت میں بھی یہی پروپیگنڈا ہوگا، آج کل پاک بھارت کے تعلقات یوں بھی خطرناک حد تک خراب ہوچکے ہیں، بھارت کو جیسے ہی اس کا علم ہوگا کہ طلسمِ نور ہیرا اس کی ملکیت ہے وہ پاکستان پر بپھر جائے گا۔ امریکا اور اسرائیل اس کی مدد میں شامل ہوں گے۔ پاکستان کے ساتھ چین کے مفادات نتھی ہیں، چین بھی حلیف بن کر اس جنگ میں کودے گا تو اُدھر روس بھی لامحالہ بھارت کا ساتھ دے گا، جبکہ بھارت کے ساتھ بھوٹان، مالدیپ اور سری لنکا وغیرہ پہلے ہی ساتھ ہیں، کیونکہ بھارت ان کا خودساختہ ''منی سپر پاور'' بنا ہوا ہے۔

پاکستان کے ساتھ چین شامل ہوگا تو ایران بھی مدد کو کود پڑے گا، کیونکہ امریکا اور اسرائیل کو بھارت کی مدد کرتے ہوئے ایران بھی برداشت نہیں کرسکے گا۔ پہلی عالمی جنگ میں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا، پہلے دو ممالک کے درمیان ٹھنی تو سارے ہی ملک حلیف یا حریف ہونے کے ناتے اس میں کود پڑنے پر مجبور ہوگئے تھے۔''

میں کبیل دادا کی ان ساری معلومات پر دنگ رہ گیا تھا، اگرچہ اس حد تک مجھے بھی جان کاری تھی، مگر یہ بہت اہم راز تھا اور ماسوائے چند افراد کے کسی کو اس کا علم نہ تھا۔ جس کا مطلب تھا کبیل دادا نے یہاں رہتے ہوئے یہ اہم ترین معلومات اپنی جان پر ہی کھیل کر حاصل کی ہوں گی، اور میں تو جانتا ہی تھا، تاہم جنرل ایڈوانی کے اسٹیٹ ڈارک کیسل کو بنانے کا مقصد یہی تھا کہ وہ طلسمِ نور ہیرے کا شوشہ چھوڑنے سے پہلے ''ڈارک کیسل اسٹیٹ'' کی تکمیل چاہتا تھا تاکہ وہ اس دور دراز علاقے میں اپنا ''کام'' بہ احسن وخوبی انجام دے سکے اور میں اسے ہیرے کا شوشہ چھوڑنے سے پہلے اس کی اسٹیٹ کو ہی ایڈوانی سمیت نیست و نابود کردینا چاہتا تھا۔ اب تو یہ اور بھی ضروری ہوگیا تھا، اس میں صرف میرے ملک کی بقا ہی نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی بھی بقا شامل تھی۔

وہ مجھے یک ٹک کسی پُرسوچ خاموشی میں پا کر گہری تشویش تلے آگے بولا۔ ''شہزی! اسی لیے کہتا ہوں کہ ڈارک کیسل کی یہ منحوس ریاست وجود میں آنے سے پہلے ہی

ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا ہوگا۔“

میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی اور پھر ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”کبیل دادا! یہاں میرے پیشِ نظر اور بھی بہت کچھ ہے۔ سب سے پہلا اور اہم مقصد عابدہ کی رہائی ہے۔ جس کے لیے میں ایسا کوئی گراؤنڈ بنانے کی تگ ودو میں ہوں کہ عابدہ کو اسیر کرنے والے دشمن خود میرے آگے گھٹنے ٹیک کر عابدہ کو میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے لیے میں نے امریکی سی آئی اے سینٹر کے ڈی ایجنٹ اور ٹائیگر ٹیگ کے چیف باسکل ہولارڈ کو جھکانا ہے اور اس کی پڑیا اس کے چہیتے داماد برازیلین نژاد لولوڈش کے پاس ہے، جو آج کل رنگون میں ہی مقیم ہے۔ اس کا ایک اہم برمی ہرکارا...... سے جی کوہارا بھی یہاں میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ جبکہ بھارت کا ایک بڑا ڈان بھولا ناتھ کا ایک پورا گینگ میرے پیچھے ہے۔ اپنے وطنِ عزیز کی سرمایۂ حیات امانت طلسم نور ہیرا بھی میں نے جنرل کے ایل ایڈوانی سے حاصل کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں تم تینوں کو یہاں سے بہ خیریت اپنے ملک پاکستان چلتا کروں گا۔“

میں نے بہت پختہ العزم ہو کر یہ سب کبیل دادا سے کہا تھا جسے سن کر وہ بھونچکا سا ہو کر میری صورت دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ شاید یہی سمجھے ہوئے تھا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ کبیل دادا کو بھی میری ان ”پیش آئندہ“ مہمات کا کسی حد تک اندازہ تھا مگر ان میں سے چند ایک سے وہ ناواقف بھی تھا۔

”لل...... لیکن شہزی! ہم تیرے ساتھ ہیں اور تیری مدد کے لیے ہی بیگم صاحبہ نے ہمیں یہاں بھیجا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ بھارت میں قدم رکھتے ہی خود ہم اس مردود سی جی بھجوانی کے چنگل میں پھنس گئے، لیکن ہر بار ایسا نہیں ہوسکتا۔ مجھے تو تم دیکھ ہی رہے ہو، تمہاری غیر موجودگی میں خود بھی یہاں سے اپنی اور شکیلہ وغیرہ کی رہائی کے سلسلے میں کوشاں تھا۔ اب تم آگئے ہو تو یہ کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔“

میں نے کبیل دادا کی بات پر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”کبیل! تم نے مجھے پاکستان میں بیگم ولا اور چوہدری ممتاز کے سلسلے میں جو حالات بتائے ہیں، مجھے ان کی طرف سے تشویش ہونے لگی ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ میں بھی پاکستان کی طرف عازمِ سفر ہو جاؤں، مگر پھر سوچتا ہوں کہ تقدیر نے مجھے یہاں کے جن معاملات میں الجھا رکھا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ لہٰذا میرا تمہیں یہی مشورہ ہے کہ تم، اول خیر اور شکیلہ یہاں سے رہائی پاتے ہی فوراً پاکستان نکل جاؤ۔ زہرہ بیگم اکیلی ہیں وہاں...... نوشابہ الگ گل کھلانے میں مصروف ہے۔ عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا کا بھی کچھ نہیں پتا کہ وہ سانپوں کی جوڑی اب کون سا نیا گل کھلانے کے چکروں میں ہے، ممکن ہے ان دونوں نے اب تک شادی بھی کرلی ہو......“

یہ آخری بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں اچانک ہی سرمد بابا کی وصیت یاد آگئی جو اُن کے عائلی وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے مجھے اور عارفہ کو پڑھ کر سنائی تھی، جس کے مطابق اگر ان کی بیوہ بہو، سیٹھ نوید سانچے والا سے شادی کرلیتی ہے تو اس کے پاس جائیداد اور کاروبار وغیرہ کی جو پاور آف اٹارنی ہے وہ ان کے پوتی پوتے پنکی اور دانی کے نام منتقل ہو جائے گی، لیکن اگر وہ کسی اور شریف انسان سے شادی کرتی ہے تو پھر یہ پاور اسی کے پاس رہے گی۔ جبکہ اڈیسہ کمپنی کے شیئر کا حصہ (جو ہمارے نام تھا) اس کا نصف میرے نام اور باقی نصف پنکی اور دانی کے نام تھا۔

اس سلسلے میں اس ضمیر فروش عورت عارفہ کیا چکر چلا سکتی تھی، وہ میری غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس میں یقیناً مصروف ہوگی اور کوئی بعید نہیں کہ اس نے باسکل ہولارڈ کے علاوہ لولوڈش سے بھی اس سے سلسلے میں کوئی خفیہ ساز باز کر رکھی ہو۔ جیسا کہ سیٹھ نوید سانچے والا بھی اس کے ساتھ تھا اور یہ ساری پٹیاں وہی اسے پڑھواتا تھا۔ جس کے بارے میں سرمد بابا کو ہی نہیں بلکہ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ وہ محض دولت اور وسیع وعریض کاروبار پر قبضہ جمانے کے لیے عارفہ کو بے وقوف بنائے ہوئے تھا اور اس کے احساسِ محرومی سے فائدہ اٹھانے کی تگ ودو میں تھا۔ پاکستان میں بھی بہت سے اہم اور گمبھیر معاملات حل طلب تھے۔

ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے کبیل دادا سے دوبارہ مخاطب ہو کر کہا۔ ”کبیل دادا! تم اس کی فکر نہ کرو، جب میں دیکھوں گا کہ یہاں کے معاملات طول پکڑتے محسوس ہو رہے ہیں تو میں بھی پاکستان لوٹنے کی کوشش کروں گا پہلی فرصت میں...... اب میں اپنا ایک پاؤں ایک کشتی میں اور دوسرا دوسری کشتی میں رکھنے کے قابل ہو گیا ہوں...... بس! تقدیر اسی طرح یاوری کرتی رہے تو سمجھو دادا! ایک دن یہ سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔“

میں نے دیکھا کبیل دادا بڑے دھیان اور توجہ کے ساتھ میری یہ ساری باتیں سن رہا تھا، پھر حلق سے ایک گہری

سانس خارج کر کے بولا۔ ''شہزی! تیری باتیں سنتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے حالات تجھے کسی خود فریبی میں مبتلا کیے ہوئے ہیں، لیکن پھر تیرا ماضی جھانکتا ہوں تو مجھے یہ بات سرے سے ہی غلط محسوس ہوتی ہے۔ ایک حوالے سے تو ٹھیک بھی لگتا ہے مگر دوسرے زاویہ نگاہ سے تو مجھے شدید الجھن کا بھی شکار لگتا ہے۔ شہزی! تو ہے کیا بلا آخر......؟''

کبیل دادا کی اس بات پر میں پھیکے انداز میں ہنسا اور بولا۔ ''میں کوئی بلا نہیں ہوں یار! بس، تمہاری طرح کا ہی ایک عام انسان ہوں میں بھی...... یہ الگ بات ہے کہ میں نے آج تک، چاہے جیسے بھی حالات ہوں، انہیں فیس کیا ہے، ایک چیلنج سمجھ کر اور کرتا رہوں گا کہ یہی میری سرشت بھی ہے اور شاید تقدیر کا لکھا بھی......''

پھر موضوع بدلتے ہوئے میں نے اس سے نصیر شاہ والی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس سے تبادلۂ خیال کی غرض سے مزید کہا۔ ''ایڈوانی کا درحقیقت اپنے مکروہ مفادات کی خاطر جاوا قبیلے کی اس ریاست پر غاصبانہ طور پر قابض ہونے کا اصل مقصد ان کے وسائل پر قبضہ جمانا تھا، جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہے۔ لیکن تقدیر نے اب مجھے بھی اس کا موقع دیا ہے کہ میں ان کے اندر گھس کر ان کا منصوبہ سبوتاژ کرسکوں، کیا خبر اس کے بعد مجھے کچھ ایسی آسانیاں میسر آجائیں جس کے بل بوتے پر میں اپنے مزید دیرینہ مقاصد کی کشتی کو اور آگے کھینچ سکوں۔ اس دوران اگر پاکستان کا بھی مجھے ایک چکر لگانا پڑا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کبیل دادا!''

''وہ تو ٹھیک ہے، شہزی!'' کبیل بولا۔ ''میرا خیال تو یہی تھا کہ ہم چاروں مل کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کریں تو پھر کامیابی کے بعد ہم پاکستان لوٹ جائیں گے، رہا مسئلہ عابدہ کا تو وہ اپنی جگہ اہم اور گمبھیر تو ہے ہی، اس کے لیے بیگم صاحبہ کا بھی یہی مشورہ تھا کہ ہم باضابطہ طور پر امریکا کا رخ کرتے اور عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی قانونی پیش رفت کرتے۔''

میں اس کی بات سن کر تلخی سے مسکرایا۔ ''بے ضابطہ کو باضابطہ طریقے سے کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا، دادا! اس کے لیے بھی مجھے وہی زبان اور وہی ہتھیار استعمال کرنا پڑے گا جس کے لیے میں کوشاں بھی ہوں اور پُرامید بھی......''

اس کے بعد میں نے کبیل دادا کو کچھ ہدایات دیں اور پھر وہ مجھ سے گلے مل کر رخصت ہو گیا۔

میں کچھ کھانے پینے میں مصروف ہو گیا۔ شام ہوئی تو ایک کار مجھے لینے آن پہنچی۔ یہ سرخ رنگ کی فورڈ کار تھی۔ اس میں ڈرائیور سمیت دو افراد سوار تھے۔ انہیں بلراج سنگھ نے مجھے لینے کے لیے بھیجا تھا۔ میں اس میں سوار ہو گیا اور کار روانہ ہو گئی۔

میرا دل کامیابی کے احساس تلے بے طرح دھڑک بھی رہا تھا مگر ساتھ ہی دل و دماغ خدشات کا شکار بھی تھے۔ میں دشمنوں کے قریب رہنا چاہتا تھا، مگر بلراج سنگھ کے قریب نہیں، کیونکہ ہم زیادہ نہیں تو دو ایک بار ضرور آمنے سامنے ہو چکے تھے، میری ایک ذرا سی غلطی اسے بدکا سکتی تھی، کبھی کبھی سامنا ہونے کی بات اور تھی (اگرچہ اس میں بھی مجھے پہچان لیے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا)، ہاں، ایڈوانی وغیرہ کی اور بات تھی۔ لیکن بلراج میرا شکار بھی تھا، میں سب سے پہلے اسے جہنم واصل کر کے ایک طرف سوشیلا کا انتقام پورا کر لیتا تو دوسری طرف اپنے ایک سفاک اور زیرک دماغ دشمن سے بھی چھٹکارا پا لیتا۔ تاہم اب دیکھنا یہ تھا کہ آیا میری یہ ''پیشی'' خصوصی تھی یا عمومی؟ لیکن مجھے اتنی جلدی پیشی کی امید نہ تھی۔

کار کا سفر تھوڑی دیر اور جاری رہا تو مجھے کچھ اچنبھا سا ہوا، کیونکہ میرے اندازے کے مطابق ہٹ فور جہاں بلراج سنگھ رہتا تھا، وہ زیادہ دور نہ تھا، تو پھر کیا مجھے کہیں اور لے جایا جا رہا تھا؟ مگر کہاں؟ اور کس کے پاس؟

''کیا تم مجھے بلراج صاحب کے پاس لے جا رہے ہو؟''

''ہاں! بتایا تو تھا تمہیں!'' ڈرائیور کے برابر میں بیٹھے ہوئے اسی آدمی نے جواب دیا۔

''مگر اُن کا ہٹ تو اتنا دور نہیں تھا۔''

''خوش قسمت ہو کہ تمہیں بلراج نے اپنے ہٹ میں نہیں بلکہ بڑی سرکار کے ہاں بلایا ہے......'' اس نے جیسے انکشاف کیا اور میرے پورے رگ و پے میں موت کی سرسراہٹ زہریلے سانپ کی طرح رینگتی چلی گئی۔

''تت...... تمہارا مطلب ہے، بڑی سرکار، یعنی جنرل ایڈوانی صاحب؟'' میں نے دانستہ اپنے لہجے میں حیرت آمیز خوشی سموتے ہوئے کہا۔

''ہاں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔ وہ مجھے زیادہ بولنے یا بتانے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ میرے اندر سنسنی سی طاری ہونے لگی تھی۔ تقدیر مجھے دانستہ اپنے اہم ترین دشمن کی شہ رگ کے نزدیک پہنچانے پر تلی ہوئی تھی کہ میں وہاں پہنچتے ہی اس کا گلا گھونٹ دوں۔

حالات اب بھی غیر یقینی تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ جیتی

بازی ہار میں پلٹ جاتی یا پھر دشمنوں کے گڑھ میں میری گرفت مضبوط ہو جاتی۔

جیپ آبادی سے کافی دور شمال مشرق کی سمت ایک سنگلاخ سے علاقے میں داخل ہوگئی۔ نارتھ انڈیمان کے جزیرے کا یہ گوشہ ساحلِ سمندر کے قریب تھا، جاوا کی بستی کی حدود ادھر سے ہی شروع ہوتی تھی۔ یہاں کم بلند چٹانوں کا سلسلہ اور جنگل کا ملا جلا امتزاج تھا اس پر سونے پہ سہاگا، ساحلی علاقہ بھی تقریباً قریب ہی تھا، جس نے یہاں کی قدرتی خوبصورتی کو دو چند کر دیا تھا۔

ایسی ہی ایک نسبتاً کم بلند چٹان پر مجھے دور ہی سے ایک قلعہ بندی عمارت کے آثار نظر آنے لگے جو نامکمل تھے۔ وہاں کچھ مزدور البتہ کام میں جتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

جھکی جھکی شام کے پس منظر میں اس عمارت کی بناوٹ دلوں میں ہیبت طاری کیے دے رہی تھی۔ کار اس بل کھاتے راستے پر آگئی جو سیدھا قدرے عمودی اور ڈارک کیسل کی ادھوری عمارت کی طرف جاتا تھا۔ یہ پختہ اور کنکریٹ سے بنا ہوا تھا۔ اس کے دو رویہ تراشیدہ منڈیروں اور سنگ سرخ کا کام جاری تھا۔ روش کے اختتام پر ایک وسیع احاطہ تھا، جس کے ایک جانب فینسی حوض اور فوارے لگائے جارہے تھے۔ ایک طرف کھلی نشست گاہ کے طور پر بناوٹ کا کام ادھورا پڑا نظر آرہا تھا۔

کار سے ہم اتر آئے اور ایک نظر میں نے کھڑے ہو کر ڈارک کیسل کی اس عظیم الشان عمارت پر ڈالی، جس کی بناوٹ میں قدیم طرز تعمیر کو مدِنظر رکھا گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ڈارک کیسل کا کام چالیس فیصد تک ہو چکا تھا۔ پہاڑی مقام پر اس وسیع و عریض محل نما عمارت کی تعمیر آسان کام نہ تھا۔

''ابھی تو یہ عمارت پوری بنی بھی نہیں اور تم اس کے سحر میں اتنا کھو گئے۔'' مجھے لانے والے ٹھگنے شخص نے غرور و فخر تلے مجھ سے کہا۔ ''پوری بن جائے گی تو کہیں پاگل ہی نہ ہو جاؤ، چلو آگے بڑھو......''

بائیں جانب مجھے ایک ہیلی پیڈ بھی دکھائی دیا۔ وہاں ایک چوپڑ نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی عقبی چٹانوں کی طرف مجھے ایک سیدھی اور سپاٹ سی ائر اسٹریپ (ہوائی پٹی) بھی نظر آئی، گویا یہاں بوقت ضرورت فوکر یا جی سیون ٹائپ کے طیارے بھی اُڑائے جاسکتے تھے۔ کچھ بوسٹر قسم کے کنورٹر اور اینٹنا بھی نصب ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک بڑے پیالے کی شکل کا ریسیور بھی نصب تھا جس کے درمیان میں روٹر لگا ہوا تھا۔

ہم دروازے کی خوبصورت محراب سے اندر داخل ہوگئے۔ ہم بلند چھت والے ہال میں آگئے۔ وہاں کچھ لوگوں کو میں نے اریب قریب آتے جاتے دیکھا، ان میں نیلی اور خاکی لباس میں ملفوف افراد کی تعداد زیادہ تھی، جن کے سروں پہ پلاسٹک فائبر کی پی کیپ تھیں، ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے نقشے، فیتے اور تھری اسٹینڈ کیمرے تھے۔

''یہ سب پروفیشنل ہیں، یعنی انجینئرز......آگے بڑھتے رہو۔''

مجھے ان کی طرف غور سے دیکھتے پا کر ٹھگنے نے بتایا۔

ہم دونوں آگے بڑھتے رہے اور ایک نسبتاً بہتر کمرے میں داخل ہوگئے، نسبتاً بہتر سے میری مراد، یہ کمرا رہائش وغیرہ کے قابل بنایا گیا تھا۔ مجھے وہ اسی کمرے میں لے کر پہنچا تو اس کی اندرونی ساخت سے صاف پتا چلتا تھا کہ یہ بھی ایک عارضی طور پر ہی بندوبست تھا۔ چند کرسیاں اور ایک میز تھی۔ جو اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں، فرش پر بچھی دری بھی میلی اور بکھری بکھری نظر آرہی تھی، قریب ایک بڑی سی آرام دہ مسہری تھی۔ مجھے ایک کرسی پر ٹھگنے شخص نے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''ادھر ہی بیٹھے رہنا، جب تک میں نہ آجاؤں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھ کر سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ وہ چلا گیا۔ کمرے کے باہر لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کام کی رفتار مجھے خاصی تیز نظر آتی محسوس ہوئی تھی۔ اندر باہر انجینئر اور ورکرز بہ شمول مزدور سبھی تن دہی اور انہماک کے ساتھ کام میں مصروف تھے۔

بلراج سنگھ کی طرح یہاں بھی میرا معاملہ، یعنی جنرل ایڈوانی کے سامنے پیش ہونا، ویسا ہی تھا کہ کہیں یہ مردود ایڈوانی مجھے پہچان نہ لے، تاہم اس کی طرف سے مجھے ایک تسلی تو تھی کہ اس سے میری ایک ہی بار ملاقات ہوئی تھی، جب میں اس کی لاڈلی پوتی رینا کے ساتھ ہی شاید اس کے رُوبرو ہوا تھا۔

بہرکیف میں اسی طرح سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ بیٹھا رہا، پھر کچھ منٹ گزرے تو کمرے میں وہی ٹھگنا شخص بلراج سنگھ کے ساتھ نمودار ہوا، میں نے فوراً کرسی سے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے سلام پیش کیا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' اس نے سلام کا جواب دیے بغیر مجھ سے کہا اور جیسے الٹے قدموں واپس مڑا، میں اس کے پیچھے ہولیا۔

وہ کمرے سے نکلا اور دائیں جانب مڑ گیا۔ اس کی

چال خاصی تیز تھی، میں نے بھی اپنے پیروں کی رفتار بڑھادی۔ مجھے یہاں لانے والا ٹھگنا شخص عمارت سے باہر نکل گیا تھا۔

بلراج سنگھ مجھے مختلف راہداریوں، جن کے فرش کہیں کہیں سے اکھڑے ہوئے تھے اور ان میں سنگ مرمر جیسی ٹائلیں لگائی جا رہی تھیں، چھتوں پر فانوس اور فینسی بلب بھی نصب کیے جا رہے تھے، سے گزارتا ہوا ایک بڑے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچ کر رک گیا اور مجھے کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے وہ خود دروازے کو آہستگی کے ساتھ اندر دھکیلتا ہوا داخل ہو گیا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد اس نے اندر سے جھانک کر مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

اندر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں واقعی کسی مہاراجا کے محل میں داخل ہو گیا ہوں۔ سامنے ہی ایک اونچے سے تخت پر ایک بڑی اور اونچی پشت گاہ والی کرسی پر جنرل کے ایل ایڈوانی بڑے ''کروفر'' کے ساتھ براجمان تھا۔ اس نے لباس بھی شاہی طرز کا راجا مہاراجوں والا پہنا ہوا تھا۔ زرق برق، چمکتا ہوا اور چہرے پر شاہوں والی رعونت اور آنکھوں میں سرد مہری اور ہونٹوں پر تحکمانہ سا رعب و دبدبہ...... وہ شاید مجھے اپنی ادھوری شان و شوکت دکھا کر مرعوب کرنا چاہتا تھا، یا شاید اپنے جن وفاداروں کو یہاں بلواتا تو وہ انہیں اسی حالت میں ہی ملتا تھا۔ میں نے بھی جیسے فوراً ہی مرعوب ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے...... خود کو اس کے سامنے جھکا دیا اور خاص نوکر شاہی انداز میں بولا۔

''عالم پناہ! یہاں آنا اور آپ سے ملنے کا شرف پانا مجھ جیسے ایک ادنیٰ خادم کے لیے باعثِ فخر و خوشی کی بات ہے، مگر اس سے بڑھ کر اپنی قسمت پر نازاں بھی ہوں کہ مجھے یہ شرفِ باریابی بخشا گیا۔ جس کی میں اب ہر بار ہی آشا رکھوں گا۔''

نہایت نپے تلے لب و لہجے میں یہ سب کہا تو ایڈوانی کا چہرہ مزید رعونت اور پُرغرور سا نظر آنے لگا۔ میں اس بدبخت کی مطلق العنان ذہنیت اور سوچ سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک جابر جنرل اور ہٹلر جیسے عالم غارت گر جیسی متاعِ خرد دور رکھنے والے انسان سے ایسی ہی ''اکڑ'' رکھنے کی توقع کی جاسکتی تھی۔

وہ ایک جابرانہ سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''ہمیں تمہارا یہ انداز پسند آیا، ہماری وفاداری کا دم بھرنے والے کبھی ہم سے مایوس نہیں ہوں گے۔ تم نے اپنی جان پر کھیل کر دو غدار بھگوڑوں کو ان کے انجام تک پہنچایا اور تیسرے کو گرفتار، ہم تمہیں اس کا انعام دینا چاہتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ پیشی سے پہلے ہی تمہیں ہماری اس عظیم الشان راجدھانی کا ایک بڑا عہدہ سونپا جانے والا ہے۔''

میں نے پھر اپنے سینے اور سر کو قدرے خم کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ''مہاراجا سرکار کی جے ہو، میری ایک بڑی اچھا پوری کر دی سرکار نے، اس عظیم ریاست اور مہاراجا سرکار کا میں بھی ہمیشہ دم بھرتا رہوں گا۔''

''بلراج......'' دفعتاً ایڈوانی کھرکھراتی آواز میں بولا۔

''جی سرکار!'' بلراج سنگھ یک لخت سر کو خم دیتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔

''اسے مس شلپا کے پاس لے جاؤ اور اس سے کہو کہ دو گھنٹے میں اس کا تفصیلی انٹرویو لینے کے بعد ہمیں رپورٹ کرے اور یہ بھی کہ وہ اسے یہاں کس کارِ لائق سمجھتی ہے، باقی حتمی فیصلہ ہمارا ہوگا۔''

ہزار اندیشوں اور وسوسوں کے باوجود میری بلراج سنگھ کے بعد جنرل ایڈوانی سے بھی یہ مختصر ملاقات کامیاب اور مفید ثابت ہوئی تھی۔ میرا دل خوشی اور کامیابی کے احساس تلے بلیوں اچھلنے لگا، بغیر کسی خون خرابے اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا رسک لیے بغیر میں دشمنوں کے ساتھ ایک ''وفادار'' کی حیثیت سے شامل ہو چکا تھا، ورنہ تو میں منصوبہ بندیاں ہی کرتا رہا تھا اور بلاشبہ کامیابی کے اس مقام تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا، تب تک پتا نہیں کیا کیا کچھ ہو چکا ہوتا۔ یہ میری ایک لمبی چھلانگ تھی، بلاشبہ اور نیک نیتی کے ساتھ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میری اس بڑی کامیابی کا اصل ''کریڈٹ'' اجے سنگھ اور اس کی سازش کو جاتا ہے، جو وہ خود اپنے لیے کرنا چاہتا تھا وہ میرے لیے کر گیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس میں کافی حد تک میری بیدار مغزی اور غیر معمولی احتیاط پسندی کا دخل بھی تھا۔

میں نے یہاں اپنا ذہن ہر وقت بیدار، آنکھیں کھلی اور کان ہر آہٹ پر لگا رکھے تھے، ایک ذرا سی بھنک کو بھی میں درخورِ اعتنا نہیں جانتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے کیسل کی سیر کرائی جائے گی، مگر ایسا نہ ہوا، بلراج سنگھ مجھے لے کر ایک کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک صحت مند اور متناسب خدوخال کی خوب صورت

اور پُرکشش عورت ایک میز پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ جس کی اسکرین ایک بڑے سائز کی ایل ای ڈی سے مشابہ تھی، جو ایک اندازے کے مطابق بیالیس انچ کی تو ہوگی، جس سے بیک وقت ٹی وی اور کمپیوٹر اسکرین اور سی سی کلوز سرکٹ کیمرے کا کام لیا جارہا تھا۔ کیونکہ اس وقت اسکرین چار سرکٹ میں تقسیم تھی اور ہر سرکٹ اسکرین میں ڈارک کیسل کے بیرونی اور کبھی اندرونی گوشوں کا منظر پیش کیا جارہا تھا۔ وہاں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔

لڑکی خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں ماہر معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ گورا اور آنکھیں تیز کٹار اسی تھیں۔ قد بھی دراز ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یوں تو مغربی طرز کا چست لباس پہن رکھا تھا، مگر دکھائی وہ انڈین ہی دیتی تھی۔ بال کرلی اور گھنے تھے، جنہیں اسٹائلش انداز دے رکھا تھا۔ شاید یہی مس شلپا تھی۔

اس کے ہمراہ ایک عمر رسیدہ آدمی بھی تھا جو اس کی کرسی کے قریب کھڑا تھا مگر اس کی نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر موٹے سیاہ فریم والی عینک تھی، اس کے سر کے بال چھوٹے اور سفید تھے۔ وہ جھکی جھکی کمر والا عمر رسیدہ اس لڑکی سے ڈکٹیشن کے انداز میں کچھ کہنے میں مصروف تھا اور لڑکی شاید اسی کی ہدایت پر کِی بورڈ کی مدد سے کیمرا زوم کررہی تھی۔

ہماری آہٹ پر بھی جب وہ ہماری طرف متوجہ نہ ہوئے تو بلراج سنگھ نے ہولے سے کھنکھارا...... سب سے پہلے وہ لڑکی چونکی اور شاید بلراج کو دیکھ کر وہ ایک دم مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ عمر رسیدہ شخص بھی قدرے چونک کر ہماری طرف مڑا۔

''سر!'' لڑکی نے بلراج کی طرف دیکھ کر ہولے سے مؤدبانہ کہا۔ اس کی مترنم آواز بھی اس کی پُرکشش شخصیت سے ہم آہنگ تھی۔ جبکہ عمر رسیدہ شخص اپنی عینک درست کرنے لگا۔ وہ بس خاموشی سے ہماری طرف تکنے میں محو ہوگیا تھا۔

''مس شلپا! یہ دیال داس ہے۔'' بلراج سنگھ نے متانت کے ساتھ خوبصورت لڑکی سے کہا۔ پھر اس نے شلپا سے...... وہی کچھ مختصراً کہہ دیا جس کی ہدایت ابھی تھوڑی دیر پہلے جنرل ایڈوانی نے اسے دی تھی۔

شلپا نے پہلی بار ایک بھرپور نگاہ مجھ پر اور میرے چہرے پر ڈالی، اس کے بعد وہ بلراج کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر ''او کے سر'' بولی۔

''کون ہے یہ؟'' اس مجہول سے نظر آنے والے عمر رسیدہ شخص نے اپنی عینک کو چھوتے ہوئے ذرا سر نیا کرکے میری طرف دیکھا، جس کا جواب دینا بلراج نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے دروازے کی جانب پلٹ جانا مناسب سمجھا۔

''بیٹھیے آپ......'' وہ مترنم سی آواز اور شستہ لہجے میں بولی اور میں بھی اس کی طرف مسکراتے دیکھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

''پروفیسر ہیرالال صاحب! آپ مجھے دو گھنٹے دے دیں، اس کے بعد میں خود ہی آپ کے پاس آکر یہ مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں......''

ایک قریبی کرسی پر میرے براجمان ہوتے ہی شلپا نے اس عمر رسیدہ شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ قدرے چڑچڑے لہجے میں بولا۔

''ارے کیا غضب کررہی ہو لڑکی؟ تم کیا مسئلہ حل کروگی، یہ کوئی گڈے گڑیا کی شادی ہے، ہیرے کو توڑنا ہے، اس طرح کہ اس کی شفافیت اور ڈائمنشنل اثرات کو نقصان بھی نہ پہنچے۔ یہ صرف پروفیسر ہیرا ہی کر سکتا ہے......''

اس بوڑھے پروفیسر کے بولنے کا انداز مجھے لکھنوی سا لگا، جو مجھے کوئی ہیرا اسپیشلسٹ ٹائپ کی کوئی شے لگا تھا۔ نام بھی اس کا یہی تھا۔

''بجا فرمایا آپ نے......'' شلپا نے اس بار قدرے سرد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''...... سو، پلیز، ناؤ لیوی آلون فار ٹو آورز......''

پروفیسر ہیرالال منہ بناتا ہوا اور میری طرف ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا ہوا کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''آپ کا پورا نام دیال داس ہی ہے؟'' وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''آپ اپنے بارے میں مختصراً بتائیں، گھر، والدین، تعلیم اور پیشہ، یہاں کیسے آئے، وغیرہ......'' جس کا جواب میں نے بالترتیب دیا۔

''میں ممبئی میں رہتا ہوں، والدین کا پتا نہیں، ہوش سنبھالا تو خود کو اناتھ آشرم میں پایا، جہاں ایک موٹا کالا شرابی نوعمر لڑکوں سے اپنے بدن کی مالش کرواتا تھا اور مارتا پیٹتا تھا۔ تنگ آکر میں وہاں سے بھاگا تو ایک بے اولاد جوڑے نے مجھے رکھ لیا۔ آدمی کی دکان تھی، جہاں شام میں، میں بھی بیٹھا کرتا تھا، وہیں سے میں نے کچھ تعلیم بھی حاصل کرلی، وہ آدمی منشیات کا دھندا کرتا تھا، ایک بار چھاپا لگا تو اس نے

مجھے پکڑوا دیا۔ شاید اسی لیے ہی اس نے مجھے گود لیا تھا کہ آڑے وقت میں وہ مجھے قربان کر سکے۔ مجھے آٹھ سال کی سزا ہوگئی، وہیں جیل میں ایک دادا ٹائپ آدمی سے میری دوستی ہوگئی، ہم ایک ساتھ ہی سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو پھر میں اس کے ساتھ ہی شامل ہوگیا۔ حالات نے مجھے بدل دیا۔ کچھ اس دادا کا بھی قصور تھا، کیونکہ وہ ایک تیسرے درجے کا اٹھائی گیرا، جواری اور جیب کترا تھا۔ اسی نے ہی مجھے اس کام پر لگا دیا۔ ایک پولیس مقابلے میں وہ مارا گیا مگر میں نے اس کا پیشہ مرنے نہیں دیا، اس نے میری تربیت کی تھی، مجھے اسلحہ اور چاقو چلانا سکھایا تھا یوں میں راہ چلتے لوگوں کو لوٹنے لگا۔

اس کے علاوہ شاپ لفٹنگ (دکانوں سے چوری کرنا) بھی کر لیا کرتا تھا، وہیں کہیں فٹ پاتھ پر سو جاتا، ممبئی کی گلیوں میں آوارہ گردی کرتا، ذہن کا ہوشیار اور چالاک تھا۔ پولیس ہتھے کبھی نہیں چڑھا، مگر اپنی ذہنی فراست اور چالاکی کی بدولت، جس میں میری تعلیمی قابلیت بھی شامل تھی، ایک گینگ میں شامل ہوگیا، مگر جلد ہی وہاں سے بھی مجھے نکلنا پڑا، کسی وجہ سے ممبئی کی پوری پولیس اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ زندگی میں سکون نہیں رہا، پھر ایک بھلے مانس سے میری ملاقات ہوگئی اور میں یہاں آ گیا، اب مجھے لگتا ہے کہ میں آج اپنے صحیح مقام پر کھڑا ہوں۔''

میں نے یہ سب انہی باتوں کی روشنی میں بتایا تھا جس کی معلومات میں گاہے بہ گاہے وجے سے اِدھر اُدھر کی باتوں سے لے لیا کرتا تھا۔ کچھ رتن لال کے منہ سے بھی سن رکھی تھیں، جبکہ اصل دیال داس کے شناختی کاغذات سے بھی میں نے مدد لی تھی۔ جبکہ اس کی ایک بات کو جان بچانے کے خوف سے جھوٹ سمجھتے ہوئے کہ وہ کسی بین الاقوامی این جی او کارکن بھی رہ چکا تھا، اس کا ذکر کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ بعد میں یہاں آ کر اس کا یہ جھوٹ بھی کھل چکا تھا۔

بہرکیف شلپا نے میری زبانی یہ سب بڑے غور سے سنا تھا، پھر اپنے سامنے رکھے نوٹ پیڈ پر اس نے تیزی کے ساتھ کچھ لکھا اور سر اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''بہت اچھے...... تو تم نے خود کو یہاں ہر طرح سے فٹ پایا......؟'' اندازِ تخاطب سوالیہ تھا لہٰذا میں نے بھی اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا نکال کر مسکراتے ہوئے پوری تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''ایک دم فٹ......!''

''گڈ''! شلپا نے بھی اسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ پھر اگلا سوال کیا۔ ''دیال داس صاحب! آپ کے خیال میں یہاں آپ کس قسم کے عہدے کے لیے خود کو اہل سمجھتے ہیں؟''

شلپا کے ان نپے تلے سوالات پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہو رہی تھی کہ اس دور افتادہ اور ایسے علاقے میں جہاں ان لوگوں نے ایک غریب اور پسماندہ جانگلی قوم جاوا قبیلے پر غاصبانہ تسلط جمانے کے بعد انہی لوگوں کی سرزمین پر انہیں قیدی بنا کر رکھا ہوا تھا، نہ صرف یہ بلکہ ان کے بعض قدرتی وسائل، جن میں تازہ دریافت شدہ ہیرے کی کان بھی شامل تھی، پر بھی اپنا قبضہ جما کر بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یہاں اب اپنی ایک ایسی اسٹیٹ بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے جیسے یہ سرزمین انہیں تحفے یا کسی خراجِ تحسین کی صورت میں ملی ہو۔ یہاں پر بڑے عہدوں کی بھرتیاں بھی عجیب اور بھدے طریقے سے کی جا رہی تھیں، یعنی تعلیمی قابلیت کے بجائے یہ جانچا جا رہا تھا کہ وہ کتنا اپنے ماضی کی دنیا سے بیزار اور اکتایا ہوا تھا، نیز جرائم کی دنیا میں خواہ ایک تیسرے ہی درجے کا مجرم ہی کیوں نہ ہو، اس کا اتنا ہی اونچا معیار سمجھا جا رہا تھا، جیسا کہ میں نے یہاں کے ماحول کا مشاہدہ اور تجربہ حاصل کیا تو انہی باتوں کا سہارا لیتے ہوئے میں نے اپنے بارے میں یہ سب جھوٹ بولا تھا اور میں شاید متوقع طور پر ''کوالیفائی'' بھی کرنے لگا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اس نے خود ہی مجھ سے میری اہلیت کے مطابق پوچھ بھی لیا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کا جواب میں نے اپنے منصوبے کے مطابق دیتے ہوئے کہا۔

''مس شلپا! سچی بات کہوں گا کہ میں یہاں ڈارک کیسل میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی سمجھ رہا ہوں، اگر مجھے اسی کے اندر ہی کوئی ایسی ذمے داری دے دی جائے جو میں بہ احسن و خوبی انجام دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری ایک اور بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا میرے سلسلے میں سفارشی نوٹ بھی میری خوش قسمتی پر آخری کیل ثابت ہو سکتا ہے۔''

''اگر میں جنرل صاحب سے تمہیں اپنے ساتھ ہی یہاں رکھنے پر ایک سفارشی نوٹ لگا دوں تو......؟''

شلپا نے ایک خاص ادا کے ساتھ اور اپنا نچلا ہونٹ اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی بالائی قطار تلے دباتے ہوئے گہرے اور معنی خیز لہجے میں کہا تو میں اندر سے جیسے پورا ہی ''دھڑک'' اٹھا۔

اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے دوران میرا بہت

سی اور ہر قسم کی عورتوں سے واسطہ پڑتا رہا تھا اور میں ان کی ’’سائیکی‘‘ سمجھنے لگا تھا۔ ان میں کچھ خود پسند اور انا پرست ہوتی تھیں، بیشتر ایسی تھیں جو احساسِ کمتری اور عدم تحفظ کا شکار تھیں، تیسری قسم میں احساسِ محرومی کی ماری ہوئی شامل تھیں۔ چوتھی قسم وہ تھی جو بھرپور جذبات اور احساسات رکھے ہوئے تھیں مگر مجبوری کی بنا پر ان پر ذمے داریوں کا بوجھ بڑا ہوا تھا اور وہ ان کی یکسانیت سے سخت اکتائی اور بیزار رہتی تھیں، شلپا مجھے اسی سائیکی سے تعلق رکھنے والی ہی عورت لگتی تھی۔ ایک اور بات بھی تھی جو پسندیدگی کی ہوسکتی تھی، ساتھ کام کرنے والوں میں کسی کے ساتھ اس کا ’’لگا‘‘ نہیں کھایا ہوگا۔ ایک ساتھی کولیگ کو تو میں دیکھ چکا تھا جو ادھیڑ عمر تھا، یعنی پروفیسر ہیرالال، جس کی شخصیت ہی بذاتِ خود خشک تھی۔ باقی یہاں اور کتنے جواں مرد ہوں گے، اس کا مجھے ابھی نہ اندازہ ہوسکا تھا نہ ہی پتا چل سکا تھا۔ ممکن تھا اور بھی ہوں گے، مگر اس کے قریب آنے کا انہیں موقع نہیں ملتا ہوگا۔

یہی وجہ تھی شلپا نے مجھے اپنے ساتھ ہی یہاں کام کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ میں نے فوراً چہرے پر دیدنی سی خوشی سجاتے ہوئے کہا۔ ’’اگر ایسا ہوجائے مس شلپا تو مجھے اور کیا چاہیے کہ میں آپ جیسی ایک سینئر کارکن کے ساتھ رہتے ہوئے اپنا کام نہ صرف زیادہ بہتر طریقے سے کر پاؤں گا بلکہ آپ سے سیکھنے کا بھی موقع ملتا رہے گا مجھے......‘‘

’’کلیئر......‘‘ اس نے مدھم سے لہجے میں کہا اور تیزی سے کچھ لکھتی چلی گئی۔ میرا انٹرویو اس نے کم از کم دو گھنٹے تک کرنا تھا، جو اس نے ایک ہی گھنٹے میں نمٹالیا، باقی کا ایک گھنٹا اس نے اِدھر اُدھر کی عمومی باتوں میں پورا کیا تو میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا، وہ باقی کا ایک گھنٹا نہیں پورا کر رہی تھی بلکہ عمومی اور غیر متعلقہ نوعیت کی گفتگو میں بھی اس نے اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرلی تھیں، مثلاً اس نے آخر میں مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ میں نے یہاں رہتے ہوئے اپنے جیسے کتنے لوگوں کو اپنا گہرا دوست بنایا ہے، جن کے بارے میں تم یقین سے کہہ سکو کہ وہ اسٹیٹ اور جنرل ایڈوانی کی وفاداری کا دل سے عزم رکھتے ہیں، تو اس کے اس سوال پر میرے ذہن رسا میں ایکا ایکی ایک جھماکا ہوا تھا۔ میں نے فوراً اپنا سر اثبات میں ہلاتے ہوئے پورے تیقن بھرے مگر قدرے محتاط بھرے لہجے میں جواب دیا۔

’’جی ہاں، مس شلپا! نہ صرف وفاداروں کا بلکہ غداروں کا بھی مجھے اندازہ ہوا ہے۔‘‘

وہ میری توقع کے عین مطابق چونک کر بولی۔

’’غدار......؟ کون ہیں وہ......؟‘‘

اسے ایک دم اس ایشو پر اتنا سنجیدہ پاکر میں بھی اندر کھٹکے بغیر نہ رہ سکا تھا، جانتا تھا کہ ان کے نزدیک غداروں کا منفی کردار کس قدر نا قابلِ قبول اور اہم تھا۔ ایک ذرا سی بھنک پر وہ انہیں ختم کرڈالتے تھے یا پھر بیگار قیدی کی صورت میں انہیں ہمیشہ کے لیے پابندِ سلاسل کردیا جاتا تھا۔

چنانچہ میں نے بھی اپنے چہرے اور لہجے میں سنجیدگی سی طاری کرتے ہوئے جواباً اس سے کہا۔ ’’غداروں اور وفاداروں کے درمیان تمیز قائم کرنا الگ بات ہے اور ان کے متعلق حتمی فیصلہ کرنا ایک الگ مسئلہ ہوتا ہے۔‘‘

وہ میری بات کو یک ٹک اور بڑے دھیان سے.... سن رہی تھی۔

’’بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ جلد بازی میں غدار کو وفادار اور وفادار کو غدار سمجھ لیا جاتا ہے۔‘‘ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ’’اس طرح اگر ہوجائے تو سمجھو بڑا ناقابلِ تلافی نقصان ہوجاتا ہے، اگر ہم وفادار کو غدار کے شبہے میں ہلاک کردیتے ہیں تو ہم ایک وفادار کو کھودیتے ہیں، جن کی اس وقت ہمیں شدید ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہم ایک غدار کو وفادار سمجھ کر اپنا لیتے ہیں تو اس کے نقصان کی تلافی تو ممکن ہی نہیں ہوسکتی۔ وہ ہمارے بیچ گھس کر دیمک کی طرح چپکے چپکے ہماری جڑیں کھوکھلی کرتا رہے گا، میری ہی مثال آپ لے لیں......‘‘ میں نے اتنا کہہ کر لمحہ بھر کو توقف کیا۔ شلپا کی آنکھوں میں اب سنجیدگی کے علاوہ اشتیاق اور دلچسپی بھی اُمڈ آئی تھی۔

’’میں نے بروقت اجے سنگھ اور رام گوپال کی سازش کو بے نقاب کرڈالا...... اور میں نے بلراج سنگھ اور جنرل صاحب کے سامنے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ وہ میرے دوست تھے، اگر ان کا مقصد صرف فرار ہی ہوتا تو شاید میں انہیں ہلاک نہیں کرتا، مگر ان کا اصل مقصد کچھ اور تھا، وہ اسٹیٹ کے کچھ ایسے خفیہ رازوں سے واقف ہوگئے تھے، جن کا باہر جانا اس اسٹیٹ کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ خیر...... جب اجے سنگھ کو میں نے پکڑوایا تو خود میں بھی نرغے میں آگیا اور مجھے بھی غدار بھگوڑا سمجھا جانے لگا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے رتن لال صاحب کے ساتھ کئی خطرناک مہمات میں کام کرتے ہوئے اپنی جان کو کئی بار

خطرے میں ڈالا تو انہیں مجھ پر وشواش آگیا، اس میں بے شک بلراج صاحب کی محتاط نظری تھی کہ انہوں نے اجے سنگھ اور میرے درمیان غدار اور وفادار کی پہچان کر لی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلے میں بہت محتاط روی اور گہری نظر نیز ان کے ساتھ انہی کے بھیس میں رہتے ہوئے ہی ایسے لوگوں کا پتا چل سکتا ہے۔''

میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ اپنی بھویں ذرا اچکا کر مستفسر ہوئی۔ ''تمہارا خیال ہے، تم ہمارے جاسوس بن کر ایسے لوگوں کی مخبری کرو گے جو اسٹیٹ کے غدار یا وفادار ہیں؟''

''جی ہاں!'' میں نے فوراً منصوبے کے تحت، اپنی بات کی اہمیت جتانے کی غرض سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ ''لیکن میں یہاں بھی رہتے ہوئے اپنا کام سرانجام دیتا رہوں گا جس کے قابل آپ مجھے سمجھیں گی۔''

''ہم......'' شلپا نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری بھری، پھر آخر میں میرے چہرے پر اپنی نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ بتاؤ اجے سنگھ اور رام گوپال وغیرہ ہمارے کون سے ایسے اہم اور خفیہ راز سے واقف ہوگئے تھے جس کے بل بوتے پر وہ یہاں سے جانے کے بعد انہیں ہمارے خلاف استعمال کر سکتے تھے؟''

میں نے کبیل دادا کی بات اس کے سامنے دہرا دی پھر بولا: ''ہیروں کے کان کی دریافت اور پراسپیکٹر اینڈ مائننگ انجینئر نصیر شاہ کی یہاں موجودگی......''

میں نے بتایا اور شلپا کی آنکھیں جیسے پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ ''او...... مائی گاڈ! تت...... تو کیا وہ ہمارا اتنا اہم راز جان چکے تھے؟''

''جی ہاں، مس شلپا!'' میں نے اپنے لہجے میں گہری سنجیدگی سموتے ہوئے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

شلپا کی حالت سے مجھے صاف محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے یہ کس قدر اہم بات تھی، تو جنرل اور بلراج سنگھ کے لیے کس قدر اہم ہو سکتی تھی۔

وہ جلدی جلدی نوٹ لکھتی چلی گئی، اس کی حالت ایک دم ہی دگرگوں ہوگئی تھی، پھر وہ نوٹ بک سنبھال کر اٹھی اور مجھ سے بولی۔

''دیال داس! تمہارا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ تم نے ایسے خطرناک غداروں کو ختم کر ڈالا...... یہ تمہارے انٹرویو کا ایک ایسا اہم نقطہ ہے، جسے سن کر مجھے پورا وشواش ہے کہ جنرل صاحب تمہیں ہوسکتا ہے بلراج سنگھ سے بھی بڑا عہدہ دینے پر مجبور ہو جائیں۔ تم اِدھر ہی بیٹھو، میں ابھی انہیں جا کر تمہارے انٹرویو کے نتیجے سے آگاہ کرتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

اس کی بات سن کر میرا دل بے پایاں مسرت تلے بلیوں اچھل رہا تھا۔ بلراج سنگھ کے مساوی عہدہ ملنا بھی کم بڑی بات نہ تھی، مگر یہاں تو یہ محترمہ شلپا میرے لیے اس سے بھی بڑا عہدہ ملنے کے لیے پُرامید تھی تو میں کیوں نا ہوتا بھلا......

میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ شلپا تقریباً بیس منٹ بعد واپس لوٹی۔ میں نے کچھ بے چین سی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ میرے سلسلے میں جس قدر جوش اور پُرامید ہو کر جنرل ایڈوانی کے پاس گئی تھی، لوٹی تو وہ بات مجھے محسوس نہ ہوئی، جس کا واضح مطلب تھا کہ وہ نراش لوٹی تھی۔ تاہم میں بے چینی سے اس کے بولنے کا منتظر تھا کہ وہ میرے لیے بالآخر کتنی اچھی خبر لائی تھی؟

وہ تھکے تھکے سے انداز میں اپنی کرسی کی جانب بڑھی اور نوٹ پیڈ میز پر پھینک کر کرسی پر براجمان ہوگئی، میری نظریں اس کے دلکش چہرے پر ہنوز جمی ہوئی تھیں۔

''لگتا ہے میرے بارے میں جنرل صاحب نے کوئی خاص بڑا فیصلہ نہیں دیا۔''

''وہ تمہیں بلا رہے ہیں، جاؤ، بلراج بھی وہاں موجود ہے۔''

اس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر مجھ سے کہا تو میں نے اس کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی سی برتی اور ذرا آگے جھک کر اس کی کشادہ اور گہری آنکھوں میں جھانکا۔ ''خیرت تو ہے، کیا میرے لیے کوئی نیا حکم صادر کیا جانے والا ہے؟''

وہ ایک بار پھر میرا جواب دینے کے بجائے میرا چہرہ غور سے دیکھنے لگی جیسے کچھ اخذ کرنا چاہ رہی ہو، جیسے کچھ بھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسے یوں دیکھتا پا کر جانے کیوں میرے اندر پریشان کن سی بے چینی نے سر ابھارا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

قسط:36

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے [illegible] ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہوجاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لیئق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوتلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونکی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہوچکی تھی۔ جونکی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہوجاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلّا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ”کلی منجارو“ پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو بمبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میری نظریں شلپا کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ میں اُس کی اپنی جانب یوں گھورتی ہوئی نگاہوں کا مطلب نہیں جان سکا تھا۔

”ک ک...... کوئی خاص بات ہے......؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ میری بات پر وہ فوراً سیدھی ہوکر بیٹھ گئی اور حلق سے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”نہیں، کوئی خاص بات نہیں ہے......“

”آپ ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے سلسلے میں جس طرح ... پُراُمید نظر آرہی تھیں، اب جنرل صاحب کے کمرے سے لوٹنے کے بعد اُتنی ہی مایوس سی دکھائی دے رہی ہیں، کیا اندر میرے سلسلے میں کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

میں نے اپنے اندر کی بے چینی کو رفع کرنے کی غرض سے شاید کچھ جلد بازی سے کام لیا تھا۔ شلپا میری طرف سے کسی تشکیک میں مبتلا ہوسکتی تھی۔ وہ سوچ سکتی تھی کہ آخر میرے اندر ایسا کون سا چور تھا جس نے مجھے یہ سوال پوچھنے پر مجبور کرڈالا تھا۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنی اس جلد بازی کو ”کور اَپ“ کرتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب تھا کہ میں اِدھر ہی آپ کے ساتھ کام کرتا، لیکن مجھے لگتا ہے، میرے بارے میں اور کوئی فیصلہ کر لیا گیا ہے اور آپ کے سفارشی نوٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔“

میری بات سن کر اُس کے لبوں پر بے تاثر سی

مسکراہٹ ابھری تھی، پھر وہ بولی۔ ’’ہاں! تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے، مسٹر دیال! کچھ ایسی ہی بات ہے، بہرحال اندر جاؤ...... پھر دیکھتے ہیں۔‘‘

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی۔ شلپا کا میری بات کو درست تسلیم کرنا، اس بات کا غماز تھا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ ایک بار پھر جنرل کے ایل ایڈوانی کے کمرے کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

’’یس......!‘‘ اندر سے ایک گمبھیر سی آواز اُبھری تھی۔ یہ بلراج سنگھ تھا۔ نجانے ان دونوں نے شلپا کے میرے ساتھ لیے گئے انٹرویو کا کیا نتیجہ نکالا جس کا شاید شلپا کو تو کچھ اندازہ ہو چکا تھا مگر میں ہنوز اس طرف سے ابھی مخمصے کا ہی شکار تھا۔

میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ سامنے جنرل ایڈوانی اپنی مخصوص چیئر پر براجمان تھا اور اس کے قریب ہی بلراج سنگھ موجود تھا۔ دونوں کی برماتی ہوئی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے پہلے ہی کی طرح فوراً انہیں سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

’’شلپا کی زبانی ہمیں تمہارے نیک...... خیالات کا تفصیلی علم ہوا ہے۔‘‘ بلراج سنگھ نے مجھ سے مخاطب ہونے کے انداز میں کہا۔ جنرل ایڈوانی خاموش مگر بہ غور مجھ پر اپنی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

’’ہمیں خوشی ہے کہ تم ہم سے وفاداری کے لیے پُرعزم ہو اور یہاں پوری دیانت داری سے کام کرنا چاہتے ہو۔ تمہارے انٹرویو پر جنرل صاحب نے مکمل اطمینان کا اظہار کیا ہے، تمہیں پہلا کام سونپا جا رہا ہے مگر کوئی خاص عہدہ سونپنے سے پہلے، تمہیں ایک آزمائش سے گزارا جائے گا جو ایک طرح سے تمہارا امتحان بھی ہو گا۔ اگر تم اس مشن میں کامیاب ہو گئے تو سمجھو اس عظیم ریاست میں سونپے جانے والے عہدوں میں تمہارا عہدہ سرِفہرست ہو گا۔‘‘ وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا۔ میری فدویانہ سی نظریں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں مگر اندر سے میں بے چینی کا شکار تھا۔ میں نے اپنے سر کو خفیف سا جھکانے کے انداز میں کہا۔

’’میری ہمیشہ کی طرح یہی خواہش اور کوشش ہو گی کہ مجھے جو بھی کام، مشن اور ذمّے داری سونپی جائے، میں اپنی ذہنی فراست سے ہی نہیں بلکہ اپنی جان پر بھی کھیل کر اسے پورا کرنے کی کوشش کروں......‘‘

’’گڈ......‘‘ بلراج کے منہ سے نکلا۔ پھر بولا۔ ’’آج کا دن تم آرام کرو...... شلپا کے پاس جاؤ...... کل صبح تمہیں ایک اہم کام میں مصروف کر دیا جائے گا...... یاد رکھنا یہ کام، ہماری اس عظیم ریاست کی تعمیر میں ایک اہم ستون کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اب تم اس مشن کی اہمیت کا اندازہ خود ہی لگا سکتے ہو...... جا سکتے ہو اب۔‘‘

اس نے میرے اندر کی بے چینی بڑھا کر بات ختم کر دی۔ مشن کی نوعیت جاننے کا اصرار کرنا مناسب نہ تھا اور یوں بھی میں اب ان کے ایک اہم ملازم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ تاہم یہ اچھا ہوتا اگر مجھے اس مشن کی نوعیت کا ابھی علم ہو جاتا تو اپنے تئیں کچھ غور و خوض کرنے کا موقع مل جاتا یوں آئندہ کی ’’پری پلاننگ‘‘ کرنے میں مجھے آسانی ہوتی۔ میں سر جھکائے شلپا کے پاس لوٹ آیا مگر وہ اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی۔ میں اطراف میں نظریں ڈالتا ہوا کرسی پر براجمان ہو گیا۔

تھوڑی دیر گزری کہ ایک دروازے سے شلپا نمودار ہوئی، میں نے دیکھا اس کا موڈ خراب سا ہو رہا تھا۔ وہ اسی کمرے سے نمودار ہوئی تھی جہاں تھوڑی دیر پہلے وہ جھکّی پروفیسر ہیرالال بڑبڑاتا ہوا داخل ہوا تھا۔

’’خیریت ہے مس شلپا! آپ خاصی اَپ سیٹ سی لگ رہی ہیں۔‘‘ میں نے اس کی طرف مسکراتی نظروں سے دیکھا تو وہ فوراً اپنے ہونٹوں پر دلآویز سی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولی۔

’’کچھ نہیں، بس یہ بڈھا کھڑوس پروفیسر ہیرالال میرا موڈ خراب کرتا رہتا ہے۔ ایک تو اس کے کام کی رفتار چیونٹی کی طرح ہے، اُوپر سے نخرے بہت دکھاتا ہے، اینی وے...... تم بتاؤ، اندر سے ہو آئے......؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ میں نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا پھر اسے بتا دیا کہ مجھ سے اندر کیا کہا گیا تھا۔ ’’میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ اب میرا امتحان ختم ہوا مگر اب مجھے ایک نئی چِنتا کھائے جا رہی ہے کہ پتا نہیں وہ مشن کیا ہو گا اور آیا میں اسے پورا کر بھی پاؤں گا کہ نہیں۔‘‘

میری بات پر وہ ...... مسکرائی تھی۔ مجھ سے باتیں کرنے کے بعد اس کا موڈ شاید کچھ بہتر ہو گیا تھا، بولی۔

’’پریشانی کوئی بات نہیں، تمہیں کل جو بھی مشن دیا جائے گا، وہ تم ضرور کامیابی سے پورا کر لو گے، کیونکہ تمہیں اس سلسلے میں مکمل طور پر نہ صرف بریف کیا جائے گا بلکہ گائڈنس بھی دی جائے گی۔‘‘

’’یہی تو میں چاہ رہا تھا کہ اگر مشن کی نوعیت کے بارے میں کچھ پتا چل جاتا تو میں بھی اس کی کامیابی کی کوئی اُمید رکھتا۔‘‘ میں نے چالاکی سے فطری تجسس کے اظہار کے طور پر کہا۔ ’’اب مجھے یہی چِنتا ہو رہی ہے کہ پتا نہیں اس مشن کے لیے مجھے کہاں جانا پڑے گا؟‘‘

’’تمہیں کہیں نہیں جانا پڑے گا۔‘‘ شلپا میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے لہجے میں بولی۔ ’’وہ مشن اسی چہار دیواری کے اندر ہی رہتے ہوئے تمہیں انجام دینا پڑے گا۔‘‘ اس کی بات پر میں چونکا، میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ وہ اس مشن کے بارے میں جانتی تھی۔

’’کیا مطلب؟ شلپا جی! میں سمجھا نہیں؟‘‘ میں نے متحیرانہ لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا اور دانستہ اسے لبھانے والے انداز میں اس کے نام کے ساتھ ’’جی‘‘ کا اضافہ بھی کر دیا۔ جس پر وہ بھی اپنی سیاہ گھری پلکوں کا جال اُٹھا کر دل موہ لینی والی مسکان سے بولی۔

’’مجھے تمہارا شلپا جی کہنا اچھا لگا۔‘‘

’’تھینک یُو۔‘‘ میں نے تھوڑی سی شرمانے کی اداکاری کی۔ وہ ریجھ گئی۔ تاہم پھر ایک دم متانت سے بولی۔

’’مجھے صحیح جان کاری تو نہیں مگر ایک محتاط اندازے سے اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں کہ تمہیں وہی مشن سونپا جانے والا ہے جو اس وقت چھوٹی اور بڑی سرکار کے لیے دردِ سر بنا ہوا ہے، کیونکہ اندر تم سے یہی کہا گیا تھا ناں کہ تمہارا یہ مشن کس قدر اہم ہے جو اس عظیم ریاست کے لیے ایک ستون کا درجہ رکھتا ہے۔‘‘

’’ہاں!‘‘ میں نے مختصراً یہ کہتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

’’بس تو پھر اس سلسلے میں بےفکر رہو۔‘‘ وہ بولی۔ ’’مشن مشکل ضرور ہے، پر تمہیں کہیں جانا نہیں پڑے گا۔‘‘ پھر وہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ’’آؤ...... میں تمہارا کمرا دکھا دوں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔‘‘

میں سمجھ گیا کہ وہ بھی کچھ بتانے سے کترا رہی تھی۔ میں نے بھی مزید اس معاملے کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا اور کرسی چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

مختلف راہداریوں سے گزرتی ہوئی وہ مجھے دوسری منزل کے قدرے کونے میں واقع ایک کمرے میں لے آئی۔ کمرا آرام دہ اور کشادہ تھا، جہاں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ مختصر سا مگر دیدہ زیب فرنیچر، میز کرسی، الماری اور صاف ستھرا اٹیچ باتھ۔ ایک طرف فریج رکھا تھا۔ اے سی بھی آن تھا۔ آرام دہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر ایک ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ’’کسی شے کی ضرورت ہو تو ڈبل زیرو دون پر کال کر کے بتا دینا۔ پیش کر دی جائے گی۔ اب تم ڈارک کیسل کے ایک اہم عہدے دار ہو۔‘‘ شلپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جب وہ جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔

’’شلپا جی! اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ڈنر ہم دونوں اسی کمرے میں کریں؟‘‘

وہ میری بات پر معنی خیز انداز میں مسکرائی پھر بولی۔

’’حلوہ گرم کھاؤ گے تو منہ جل جائے گا...... ٹھنڈا کھانے میں مزہ آئے گا...... مشن پورا کر کے اپنے اعتماد کی آخری کیل ٹھونک دو...... پھر کوئی دوری نہیں...... ہمارے بیچ......‘‘ یہ کہتے ہوئے شلپا نے میرے ہونٹوں پہ اپنے نرم و گداز لبوں کا بوسہ دے دیا اور دلنشیں انداز میں مسکراتے ہوئے کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں اس کی اس حرکت پر ہک بک سا رہ گیا۔ مجھے شلپا سے اس قدر جلد بے باکی کی توقع بالکل نہ تھی۔ میں تو ابھی اسے دور دور سے ریجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اس کا عملی مظاہرہ بھی کر گئی تھی۔

بہرحال...... میں سر جھٹک کر بیڈ پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح مجھے شلپا نے ہی آ کر جگایا۔ میں نے غسل کیا، پھر ناشتے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد شلپا مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے کر پہنچی۔ یہ اسی فلور پر دوسری راہداری کے سرے پر واقع تھا۔ یہ ایک بالکل سپاٹ کمرا تھا جس کے وسط میں فقط ایک میز اور آمنے سامنے کے رخ پر دو کرسیاں رکھی تھیں، چھت پر عین میز کے اُوپر بلب جھول رہا تھا۔ عجیب سا ماحول تھا کمرے کا...... کمرا بھی چھوٹا تھا، بمشکل دس بائی بارہ کا، چھت بھی نیچی سی تھی۔ دیواریں بھی سکڑی ہوئی تھیں۔

کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ شلپا نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چلی گئی، اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی کوئی کمرے میں داخل ہوا۔ یہ بلراج سنگھ تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے غیر محسوس انداز میں سانس اندر کھینچی تھی۔ وہ نپے تلے قدموں سے چلتا ہوا میز کے قریب آیا اور میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ ایک سگریٹ نکال کر سلگایا اور پھر پیکٹ سمیت میرے سامنے

میز پر رکھ دیا۔

"سگریٹ پیو۔" اس نے ایک گہرا کش لیتے ہوئے ہلکے سے کہا۔ میں نے بھی اپنے لیے ایک سگریٹ سلگا لیا۔

"ویال! اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم ہمارے وفاداروں میں شامل ہو چکے ہو۔ تم سے اب اونچی سطح کا کام لینا چاہتے ہیں، تاکہ تمہارے شایانِ شان تمہیں کوئی عہدہ دے سکیں۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ میرا دھیان اسی کی بات پر تھا۔

"اس لیے تمہیں اب ثابت کرنا ہوگا کہ تم کس طرح اس عظیم ریاست ڈارک کیسل کے اعلیٰ عہدے داروں میں شامل ہو سکتے ہو۔ تمہیں سونپا جانے والا یہ اہم مشن بھی کم معمولی بات نہیں کیونکہ ہم نے تمہیں اس کا اہل سمجھا ہے۔ مشن بظاہر آسان بھی لگتا ہے، مگر یہ اتنا ہی مشکل بھی ہے اور مشن بھی ایسا ہے کہ تمہیں ڈارک کیسل کی اس عمارت کے اندر ہی رہتے ہوئے انجا[illegible] آسان ہے، اس کے بعد تمہارا اصل امتحان ہوگا اور وہی اصل، مشکل ترین مرحلہ ہوگا تمہارے لیے......"

اس کے بعد وہ مجھے مشن سے متعلق [illegible] بتانے لگا۔

☆☆☆

میں نیم بے ہوشی کی حالت میں اپنے منہ سے [illegible] سی آوازیں خارج کر رہا تھا۔ اپنی آنکھیں بھی میں نے نیم وا سی کر رکھی تھیں، تاکہ کچھ دیکھتا بھی رہوں۔ جہاں مجھے لا کر پھینکا گیا تھا وہ جگہ بھی خاصی گھٹن آمیز اور سیلن زدہ سی لگتی تھی۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ یہ جگہ ساحلی علاقے کے قریب واقع تھی۔ یہاں بیمار سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میری متلاشی نظروں نے اس ہیولے کو دیکھ لیا تھا، جو زنجیروں کی جھنکار کے ساتھ ایک کونے سے میری جانب کو سرکا [illegible]...... یہی میرا اصل شکار تھا۔

"کک...... کون ہو تم......؟" اس نے میرے مضروب جسم کو سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"آ...... آہ......" میں نے کراہنے کی اداکاری کی اور کافی حد تک ہوش میں آنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے خوف زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تت...... تم کون...... کون ہو تم؟"

"یہی سوال تو میں تم سے کر رہا ہوں......" وہ بولا۔ اس کے چہرے کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور وہ ایک پختہ العمر شخص تھا، جیسا کہ مجھے بتایا گیا تھا اس کے بارے میں۔ شانے چوڑے مگر جسم کمزور سا نظر آتا تھا، شاید طویل اسیری کے باعث ایسا ہوا تھا۔

"میرے خدا...... اتت...... تو کیا تم بھی میری طرح یہاں قید ہو......؟" میں نے کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تم ان کے کوئی ساتھی ہو؟"

میری بات سن کر اس نے اپنے پیروں میں پڑی ہوئی آہنی بیڑیوں کو ہلایا، ایک جھنکار سلاسل کی صدائے جرس جیسی آواز کو سن کر بے اختیار میرے حلق سے ایک کراہتی ہوئی آواز خارج ہو گئی۔

"اللہ...... رحم کرنا مجھ پر......"

"اوہ...... تم مسلمان ہو......؟" اس نے پوچھا۔

"الحمدللہ......" میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا تھا۔ "کیا تم بھی......؟"

"الحمدللہ...... میں بھی مسلمان ہوں...... لگتا ہے تم بھی [illegible] ان کے [illegible] ارادوں کے آگے سپر نہیں ڈالی ہوگی۔" وہ بولا۔

[illegible] میں نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ [illegible] سا ہو رہا ہے، مجھے تمہاری کوئی [illegible] ...... کیا، پپ...... پانی مل سکتا ہے؟"

[illegible]، وہی ملتا ہے، جو یہ لوگ ایک مقررہ وقت پر لا کر دیتے ہیں...... پھر اسی پر گزارا کرنا ہوتا ہے۔"

"آہ...... یہ تو بڑی عذاب ناک قید ہے۔ شش...... شاید میں یہاں بچ نہ پاؤں...... مم...... میں سانس کا مریض ہوں۔"

[illegible] میں نے اپنی ہانپتی ہوئی سانسوں کے تموج [illegible] اضافہ کر دیا اور ساتھ ہی کھانسنے بھی لگا۔ میرا ہاتھ سینے پر تھا[illegible] آدمی تشویش میں مبتلا ہو گیا اور اس کے منہ سے میرے لیے دعائیہ کلمات برآمد ہونے لگے۔

"یا اللہ میرے اس مسلمان بھائی کی خیر فرمانا۔"

میرے اندر خوشی کے سوتے پھوٹنے لگے تھے۔ میں اسے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میرے مشن کا پہلا مرحلہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔ لیکن...... نہیں، میں اسے کب بے وقوف بنانا چاہتا تھا۔ میرا اصل مشن تو خود اس کی مدد کرنا اور ایڈوانی کے اس ناپاک منصوبے کو سبوتاژ کرنا تھا۔ لیکن اس وقت میں انہی کے مشن کو پورا کرنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا بلکہ "پھینکا" گیا تھا۔

Pakistanipoint.com
Waqar
Azeem

بلراج نے مجھے اس مشن کے سلسلے میں بریف کرتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ نصیر شاہ نامی وہ انڈین مائننگ انجینئر...... ان کے گلے کی ہڈی بنا ہوا تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے جاوا ریاست میں ہیروں کی کان دریافت کی تھی، مگر سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ شکر خورے کو شکر مل ہی جاتی ہے، یوں نصیر شاہ کو جنرل ایڈوانی کے ہتھے چڑھنا پڑا۔ ایڈوانی نے اس کے نیک منصوبے کے لیے سرمایہ دینے کی ہامی بھری تھی۔ مگر نصیر شاہ ایڈوانی کے ناپاک منصوبے سے ناواقف تھا۔ پھر جب اسے پتا چلا کہ جس قبیلے (جاوا) کی حالت سدھارنے کے لیے وہ اس منصوبے پر کام کرنا چاہتا تھا، اُسے پہلے ہی جنرل ایڈوانی اپنے کسی مذموم مقاصد کے لیے ”ہائی جیک“ کر چکا تھا۔ (اگرچہ ابھی بھی شاید نصیر شاہ کو جنرل ایڈوانی کے ”ورلڈ بگ بینگ“ کے منصوبے کا علم نہیں ہوگا) لہٰذا اس کے بعد نصیر شاہ نے ان کے کام آنے اور کان کی نشاندہی اور اسے کھدوانے کی جملہ ذمے داریوں سے صاف انکار کر دیا۔ ایڈوانی سے ایک غلطی یہ ہوگئی تھی کہ وہ نصیر شاہ کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس کے اندر بھی عام بشری کمزوریاں ہوں گی اور وہ اس کے لالچ میں آکر ان کے ساتھ مل جائے گا، انہوں نے نصیر شاہ کو سب سے پہلے یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اپنے اس آرٹیکل کی تردید کر دے جو ایک بین الاقوامی جریدے میں شائع ہی اسی لیے کروایا گیا تھا تاکہ اس سلسلے میں دنیا کے مشہور بینک اس سے رابطہ کریں، مگر ماسوائے چند ایک بینکوں کے مالکان کے کسی نے دلچسپی نہیں لی، امریکا اور یورپی مالیاتی اداروں کے ان سربراہان نے بھی اس شرط پر اس سے ملاقات کرنا چاہی تھی کہ اگر وہ نو دریافت شدہ کان کے سلسلے میں انہیں مطمئن کر دیتا ہے تو پھر ہی اسے سرمایہ فراہم کرنے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ مگر نصیر شاہ پُراُمید تھا کہ وہ انہیں خاطر خواہ طریقے سے بریف کر کے مطمئن کر لے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ نیویارک اور لندن میں مذکورہ سربراہان کے ساتھ میٹنگ کا کوئی حل برآمد نہ ہوسکا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ نصیر شاہ نے ہیروں کی جو کان دریافت کی تھی وہ ایک ایسے پُرخطر اور پہاڑی علاقے میں تھی، جہاں کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں کی جانے والی یہ مہم جوئی ناممکنات میں سے تھی۔ ایک تو وہ پہاڑی سلسلہ، جسے نصیر شاہ نے ”ڈی، ایم، ایم“ (ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز) کا نام دے رکھا تھا، اس کی بلندی کسی ہمالیائی پہاڑی سے کم نہ تھی۔ لہٰذا وہاں تک کان کنی سے متعلق بھاری مشینری کی ترسیل بالکل بھی ممکن نہ تھی۔ یہ سرمایہ ضائع کرنے والی بات ہوتی۔ ان کے انکار سے نصیر شاہ عارضی طور پر بددل ہوا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ ایک اور یورپی مالیاتی ادارے ”سان اینڈ جیک کمپنی“ کے سربراہ سے اس نے رابطہ کیا۔ یہ کمپنی یورپین ڈائمنڈ مارکیٹ کی ممبر بھی تھی۔

ایک فری لانسر پراسپیکٹر کی حیثیت سے نصیر شاہ پہلے بھی ان کے لیے کام کرتا رہا تھا۔ وہ اس کی مہمات پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔ آج تک انہوں نے اس کی مہمات کے سلسلے میں جو بھی اسے سرمایہ فراہم کیا تھا اس میں نقصان نہیں ہوا تھا اگرچہ وہ چھوٹے پروجیکٹ تھے، مگر آج تک مذکورہ کمپنی اس کے رائلٹی نواز بن کر دو ملین سے زیادہ کما چکے تھے، جس میں چالیس سے تیس فیصد نصیر شاہ کی بھی حصے داری تھی۔ لیکن موجودہ ”ڈی ایم ایم“ منصوبہ ان میں ایک میگا پروجیکٹ کی حیثیت رکھتا تھا، یہ ایک ”بونینزا“ تھا، جس کا مطلب تھا کہ آج تک دریافت ہونے والی ایک بڑی کان۔ اسی طرح اس کے لیے سرمائے کی بھی زیادہ ضرورت تھی اور اتنا بڑا رسک لینے کو کوئی تیار نہ تھا، حتیٰ کہ مذکورہ کمپنی، سان اینڈ جیک نے بھی نصیر شاہ سے معذرت کر لی، نصیر شاہ بددل ہوکر واپس بھارت آگیا تو جنرل ایڈوانی نے اس کا آرٹیکل پڑھ کر اس سے فوراً رابطہ کرلیا۔

ایڈوانی اسے بھی دولت کا پجاری سمجھا تھا مگر یہ حقیقت اُسے بعد میں معلوم ہوئی تھی کہ نصیر شاہ بے شک دولت کمانا چاہتا تھا، مگر جائز طریقے سے اور وہ ایک کٹر مسلمان بھی تھا، اس کا اصل مقصد یہ بھی تھا کہ جاوا قبیلے کی حالت سدھر جائے، وہ اسے ایک مضبوط اسلامی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا تھا، کیونکہ بھارت کی مسلم تبلیغی جماعتیں جاوا قبیلے کا دورہ کرتی رہتی تھیں اور یہ قبیلہ واقعی اسلام سے کافی حد تک متاثر بھی تھا۔ نصیر شاہ نہیں چاہتا تھا کہ بھارت ان پر اپنا تسلط قائم کرے اگرچہ وہ اب تک ایسا کر بھی نہیں پایا تھا۔ مگر ہیرے کی کان دریافت ہونے کے بعد نصیر شاہ چاہتا تھا کہ وہ یہاں اپنی مہم جوئی شروع کرنے سے پہلے انہیں مکمل اعتماد میں لے کر ان کی ریاست کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت سے منظم کرے۔

بھارت میں جنرل ایڈوانی سے ملاقات دوستانہ طرز کی تھی۔ نصیر شاہ خوش تھا کہ اب اُسے اپنی مہم کو سر کرنے کا موقع ملنے والا تھا۔ ایڈوانی نے اسے کہا کہ وہ اپنے چھپنے والے آرٹیکل کی فوراً نفی میں ایک اور مضمون پبلش کروائے کہ اس کے پہلے والے آرٹیکل میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ اس منصوبے میں خطیر سرمایہ لگنے کے باوجود اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے تھے جس کے باعث کسی کمپنی کو مالی فوائد حاصل ہوتے۔

اگرچہ یہ مضمون خود نصیر شاہ کی ساکھ کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتا، مگر اسے اس کی پروا نہ تھی کیونکہ یہ کا میگا پروجیکٹ اتنا بڑا تھا کہ اس کی کامیابی کے بعد نصیر شاہ کو اتنی دولت مل جاتی کہ پھر ساری عمر اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یوں وہ ایک نیک کام کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتا۔ ایڈوانی یہ تردیدی آرٹیکل اس لیے بھی چھپوانا چاہتا تھا تاکہ بھارتی حکومت کے مالیاتی ادارے یا خود ان کی اعلیٰ قیادت کہیں اس میں ذاتی طور دلچسپی لے کر یہاں کا رخ نہ کر بیٹھے۔

یوں نصیر شاہ کے علاوہ بھی ایڈوانی نے اس کے مضمون کے خلاف چند ایک اور آرٹیکل بھی مختلف ناموں سے پبلش کروا دیے جس میں نصیر شاہ کے اس دعوے کو جھوٹا اور لغو قرار دیا گیا تھا کہ یہ صرف پیسا اینٹھنے کے ذریعے کے سوا کچھ نہ تھا۔

اپنے اپنے مفادات کا کھیل تھا یہ، گویا شطرنج کی ایک بڑی بازی تھی یہ...... لیکن اس میں نیک مقصد فقط نصیر شاہ کا ہی تھا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اُسے مفاد پرست ایڈوانی ”یوز ٹو“ کرنا چاہتا ہے، اِدھر ایڈوانی سے یہی غلطی ہوئی تھی کہ اس نے نصیر شاہ کو یہاں لاکر جب جاوا قبیلے پر اپنی اجارہ داری دکھائی اور اسے لالچ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے لیے ”ہائر“ کرنے کی کوشش چاہی تو نصیر شاہ کا ماتھا ٹھنکا۔ اُسے ایڈوانی کے مکروہ منصوبے کا علم ہوتے ہی اس بات پر پشیمانی ہونے لگی اور اس سے زیادہ اسے اپنی اس غلطی کا تب احساس ہوا جب اس کے انکار پر ایڈوانی نے اسے ڈارک کیسل کے ہی ایک خفیہ تہ خانے میں قیدی بنا لیا۔ اُس وقت تک جب تک وہ ان کی بات نہیں مان لیتا۔

یہ سب باتیں مجھے مشن سے متعلق بریف کرتے ہوئے بلراج نے بتائی تھیں، کیونکہ میرا کردار ان کے سامنے مثبت سے زیادہ منفی تھا (یعنی مجھے انہوں نے اپنے ہی قبیل کا سمجھا تھا) اسی لیے مجھ سے اس نے کوئی بات نہیں چھپائی تھی، جو شاید ان کے مشن کا حصہ بھی تھیں اور مجبوری بھی۔

اگر میں ان کے ایک وفادار ساتھی کی حیثیت سے اس مشن کو دیکھتا ہوں تو یہ ناممکن حد تک ایک مشکل مشن تھا۔ نصیر شاہ جیسے کٹر مسلم شخص سے، جو ان کے ناپاک اور مذموم مقاصد سے آگاہ بھی ہو چکا تھا، یہ سب کروانے کے لیے رضامند کرانا آسان نہ تھا۔ وہ مر جاتا مگر ان کی بات کبھی نہیں مانتا۔ ایسا ہی ایک کردار بشام چھلگری بھی مجھے نہیں بھولا تھا جس نے تن تنہا اسپیکٹرم اور لولوش سے ٹکر لی تھی اور انہیں طلسم نور ہیرے کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی بلکہ خاموشی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ بالآخر وہ بدنصیب سے جی کو ہارا اور اس کے بے رحم ساتھی بھومک کے ہاتھوں بیدردی سے مارا گیا تھا۔

دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ ربّ العزت کی مرضی اور حکمت کے تحت ہی ہوتا ہے۔ اللہ کے حکم سے کیسے کہاں اور کیا کام انجام دینا ہوتا ہے اس کا صرف اللہ کو ہی علم ہوتا ہے، انسان کو اللہ نے کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا کیا ہے، بے کار سے بے کار شخص بھی خواہ وہ کسی بھی ملک اور مذہب و نسل سے تعلق رکھتا ہو، بے محل و بے مصرف نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے اس سے بھی کوئی نہ کوئی کام لینا ہی ہوتا ہے۔

میں یہاں کسی اور مشن کے لیے آیا تھا، مگر اب یہ کام بھی ایک نیک فریضہ سمجھ کر مجھ کو نمٹانا تھا۔ اگرچہ ایک طرح سے یہ بھی میرے اصل مشن کا حصہ ہی تھا۔

نصیر شاہ نے ایک نیک مقصد کو نا کام اور اس کی جگہ باطل اور ناپاک مقصد کو ظاہر ہوتے دیکھا تو اس نے جان کی پروا کیے بغیر ایڈوانی کے سامنے انکار کر دیا۔ پابندِ سلاسل ٹھہرایا گیا تو بھی اس نے ہار نہیں مانی۔ اسے ہلاک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس سے کام لیا جانا تھا، اپنی مرضی کا...... جو اس نے نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی، مگر اس سے وہ کام کروانے کے لیے رضامند کرنے پر مجھے یہ ٹاسک دے دیا گیا تھا۔ یہ کام مجھے...کس طرح انجام پذیر کرنا تھا، اس سلسلے میں بھی مجھے بلراج نے آگاہ کر دیا تھا۔ مشن ان کا تھا اور کام میرا...... جو سرِدست میں ان کی مرضی کے مطابق کر رہا تھا۔

شکر ہے کہ میں پہلے مرحلے میں کامیاب ہو چکا تھا، یعنی نصیر شاہ اس چالاکی کو نہیں سمجھ پایا تھا جو دشمنوں نے چلی تھی۔

جب اسے میں نے اپنے بارے میں یہ کہتے سنا کہ ”یا اللہ میرے اس مسلمان بھائی کی خیر فرمانا“ تو میں نے انجان بنتے ہوئے اس سے کہا۔

”کک...... کیا تم بھی...... میرا مطلب ہے، تم بھی مسلمان ہو؟“

''الحمدللہ......'' وہ زیرِلب بولا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' میں نے ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا (اگرچہ میں اس کا نام جانتا تھا)۔

''نصیر شاہ......'' اس نے اپنا نام بتایا۔

''کک...... کیا......؟ تم، ...... نصیر شاہ ہو......؟ لیکن نہیں، شاید میں ہی غلط سمجھا ہوں...... اس نام کے تو اور بھی بہت سے لوگ ہو سکتے ہیں، ضروری نہیں کہ تم وہی ہو۔'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تو وہ بولا۔

''تم کس نصیر شاہ کی بات کر رہے ہو......؟''

''وہی...... جس نے نارتھ انڈیمان کی ایک دور اُفتادہ ریاست میں ہیروں کی کان ڈھونڈنے کا دعویٰ کیا تھا۔'' میں نے کہا تو وہ جیسے چونک کر بولا۔

''اوہ...... تو...... تو پھر تم کون ہو......؟ اور ان ظالموں نے تمہیں کس مقصد کے لیے یہاں قید میں ڈال دیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ میں نے اس سے منصوبے کے مطابق وہی کہا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔

''میں ممبئی کے ایک بڑے بزنس مین حاجی ریاست علی خان کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار ہے۔ ان لوگوں نے میرے والد سے ایک معاہدہ کیا تھا، کچھ بھاری مشینریز امپورٹ کروانا تھیں انہوں نے جاپان اور جرمنی سے۔ سودا خاصا منافع بخش تھا۔ میرے والد نے معاہدہ کرلیا۔

''جب آرڈر وغیرہ کا سلسلہ چلا تو درآمد و برآمد کے سلسلے میں ڈیوٹی پے منٹ کے مسئلے میں معاملہ اٹک گیا۔ مگر اصل مسئلہ تب پیدا ہوا جب میرے والد صاحب کو یہ معاملہ راز میں رکھنے کا کہا گیا، وہ چونک پڑے، انہیں شبہ ہوا کہ معاملہ کچھ اور تھا، وہ اُصول پرست تھے اس لیے اس بات پر اڑ گئے کہ انہیں بتایا جائے کہ اس کے درپردہ معاملہ کیا ہے؟ کیونکہ اُنہوں نے آج تک کسی ہیرا پھیری اور غیر قانونی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ پارٹی کوئی بھی ہو، اُن سے صاف اور شفافیت کی بنیاد پر سودے بازی ہو۔ بہرحال، جب والد صاحب کی تسلی نہیں ہوئی تو اُنہوں نے معذرت کرلی۔

''چونکہ میرے والد صاحب کی کمپنی بین الاقوامی طور پر ایک ساکھ رکھتی تھی اور یہ لوگ بھی انہی سے ہی اپنا کام کروانا چاہتے تھے، انہوں نے والد صاحب کو جھکانے کے لیے دھمکیاں بھی دینا شروع کر دیں، بالآخر انہیں زبردستی اپنے مطابق کام پر رضامند کرنے کے لیے مجھے اغوا کرلیا گیا آگے کا مجھے کچھ پتا نہیں کیا ہوا۔'' میں اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔ میں نے اس سے وہی کہا تھا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔ یہ لوگ بڑے چال باز تھے، مخالف کی فطرت کو بھانپ کر ہی انہوں نے یہ چال چلی تھی۔ نصیر شاہ کس قبیل کا آدمی تھا اور کیا تھا، اسی کے مطابق ہی انہوں نے مجھے مسلم ظاہر کروایا تھا ان کے سامنے (اگرچہ الحمدللہ میں مسلمان ہی تھا لیکن بلراج وغیرہ کے لیے تو ظاہر ہے میں نے دیال داس کا بھیس بھر رکھا تھا)

نصیر شاہ کو میرے اس جھوٹ پر فوراً یقین آ گیا اور کیوں نہ آتا، یہ جھوٹ سچ کے پردے میں لپیٹ کر بولا گیا تھا۔

''تمہارے والد صاحب نے ان مردودوں کی بات نہ مان کر بہت اچھا کیا۔'' نصیر شاہ بولا ''لیکن...... بیٹا! نام کیا ہے تمہارا؟'' وہ رکا۔

''جمال حسن۔'' میں نے غلط نام بتایا۔

''ہاں، جمال بیٹا! مجھے اس بات پر تشویش ہے کہ یہ ظالم لوگ کہیں تمہیں جانی نقصان... پہنچانے کی کوشش نہ کریں، لیکن یہ بھی کچھ اچھا نہ ہوگا اگر تمہارے والد حاجی ریاست علی نے ان کے دباؤ میں آ کر ان کم بختوں کی بات مان لی...... لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ لوگ میرے بغیر تو اپنے مکروہ منصوبے میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتے، تو انہوں نے اتنی مہنگی اور بھاری مشینری کی تیاری ابھی سے کیوں شروع کر دی؟''

اس کا کھٹکنا خالی از علت نہ تھا۔ یہ اس کی واقعی درست بات تھی، ایڈوانی وغیرہ کا کام تو تب ہی آگے بڑھ سکتا تھا جب یہ نصیر شاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا۔ اسی طرح کی کچھ ایسی باتیں تھیں جو مجھے اپنی عقلِ سلیم کے مطابق سمجھتے ہوئے ان کا جواب دینا تھا۔ میں چونکہ ابھی اس کی ''حقیقت'' سے واقف نہ تھا اسی لیے دانستہ قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب؟ آ...... آپ سے انہیں کیا پرخاش ہے؟'' میرے استفسار پر اُس کے ہونٹوں پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ عود کر آئی۔ ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''درحقیقت میں ہی وہ اصل آدمی ہوں جو ان کے گلے میں ہڈی بن کر پھنسا ہوا ہوں۔ میرے بغیر یہ اپنا کام ایک انچ بھی آگے نہیں سرکا سکتے ہیں اسی لیے تو میں حیران ہوا ہوں اس بات پر...... کہ انہوں نے اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کیسے شروع کر دیا ہے؟''

''ان کا وہ ناپاک منصوبہ کیا ہے؟'' میں نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔ کیونکہ اس پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میں نہ ان کے منصوبے سے واقف ہوں اور نہ ہی اس حقیقت سے کہ نصیر شاہ کون تھا اور اسے یہاں کیوں قیدی بنا رکھا تھا، مگر میں یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد مجھ سے ساری بات کہہ ڈالے، تاکہ میں اپنے منصوبے کو آگے بڑھاتا۔ خود سے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں سب جانتا ہوں۔ ورنہ وہ سمجھ جاتا کہ میں اس کے دشمنوں کا آدمی بن کر اسے دھوکا دینا چاہتا ہوں۔ جبکہ اصل بات یہی تھی کہ میں خود ایڈوانی وغیرہ کے ساتھ ''ڈبل کراس'' کرنے والا تھا مگر اس کے لیے مجھے موقع اور نصیر شاہ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت تھی۔ یہاں میں اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، کیونکہ ہماری ایک ایک گفتگو ایڈوانی یا بلراج سنگھ خفیہ مائیکروفون بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ خفیہ کیمروں کے ذریعے ہماری اور بالخصوص میری باڈی لینگوئج پر بھی کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہوں۔

میری بات پر بالآخر نصیر شاہ نے وہ ساری حقیقت بیان کر کے میرا کام مختصر کر دیا۔

''او...... کک...... کیا واقعی ایسا ہی ہے؟'' میں نے دانستہ حیرت کا اظہار کیا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''ہاں! ایسا ہی ہے......''

''تت...... تو اس کا مطلب ہے کہ میرے والد صاحب نے بالکل صحیح کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا اُنہوں نے؟'' نصیر شاہ اپنی بھویں اُچکا کر سوالیہ نظروں سے میرے چہرے کو تکنے لگا۔

''یہی کہ...... پچھلے کچھ عرصے سے تبلیغی جماعتوں پر نامعلوم افراد کے حملے ہوتے رہے ہیں۔ یہ جماعتیں انڈیمان کے دور دراز آباد آزاد قبائلی علاقوں میں اسلام پھیلانے کے مشن پر جاتی رہی ہیں مگر جاوا قبیلے کی طرف آنے والی جماعتوں پر وحشی قبائلیوں کے حملے کروا کر ان کا راستہ روکنے کا مطلب اب سمجھ میں آیا...... کیونکہ جیسا کہ میں نے ابھی تمہیں بتایا کہ میرے والد حاجی ریاست علی صاحب بھی دیگر متمول افراد کی طرح ایسی جماعتوں کی مالی سپورٹ کے لیے چندے وغیرہ دیتے ہیں۔ انہیں جب معلوم ہوا تو انہیں بھی اس بات کا افسوس ہوا تھا۔ مگر حقیقت پھر بھی کوئی نہیں جان سکا ہے اب تک کہ یہاں کیسا بھیانک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میرے والد ایک مذہبی انسان ہیں، وہ ایک تبلیغی جماعت کو باقاعدگی سے چندے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی خود بھی اس میں شامل ہوتے رہتے ہیں، ریاست جاوا قبیلے سے متعلق آرٹیکل ان کی نظروں سے بھی گزرا تھا۔ جب مشینریز وغیرہ کی ترسیل کے سلسلے میں میرے والد کو یہاں کا وزٹ کروایا گیا تو ان کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا۔ بے اختیار انہوں نے نصیر شاہ کے اس آرٹیکل کا ذکر کر دیا جس پر وہ بدک گئے کہ یہ بات تو میرے والد کو بھی معلوم ہے، تاہم انہوں نے میرے والد کو ہر طرح کا لالچ دیا مگر وہ نہ مانے۔''

میری بات سے نصیر شاہ اب پوری طرح سے متاثر ہو چکا تھا۔ ہم دونوں کافی دیر تک آپس میں گھل مل کر باتیں کرنے لگے۔

میں بلراج کے منصوبے کے دوسرے مرحلے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب اس کے تیسرے اور آخری منصوبے کی طرف قدم بڑھانا باقی رہ گیا تھا۔ یہی سب سے نتیجہ خیز مرحلہ بھی تھا، بلراج وغیرہ کے لیے نہیں بلکہ میرے لیے...... کیونکہ منصوبے کے اس اہم ترین مرحلے میں، مجھے نہ صرف ایڈوانی وغیرہ کو ڈبل کراس کرنا تھا بلکہ اپنی اصل شناخت کے ساتھ نصیر شاہ کو بھی اعتماد میں لینا تھا اور یہی مرحلہ سب سے زیادہ خطرناک اور حساس بھی تھا۔

بلراج سنگھ کے حوالے سے نصیر شاہ کے ساتھ آگے چل کر مجھے... کون سی گیم کھیلنا تھی، اب میں اس کی تیاری میں تھا۔

نصیر شاہ بے چارہ خود سے زیادہ میرے لیے فکرمند نظر آ رہا تھا۔ وہ میری فرضی کہانی پر بھروسا کرنے کے بعد مجھ سے بہت زیادہ کلوز ہونے لگا تھا۔ تب ہی ایک موقع پر جب میں نے دیکھا کہ اب کافی دیر بھی گزر گئی ہے تو میں نے کہا۔

''ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنا ہوگی۔''

''ناممکن ہے یہ......'' وہ تہ خانے کی سیلن زدہ سی دیوار سے اپنی پشت ٹکا کر بولا۔ وہ مجھے خاصا مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔''

''کرلو کوشش...... یہ تہ خانہ اس منحوس عمارت کے جانے کون سے گوشے میں واقع ہے، ہمیں تو اس کا بھی کوئی

اندازہ نہیں ہے، اس میں کھڑکی تو کیا روشن دان تک نہیں ہے، سامنے دروازہ ہے، وہ بھی غار جیسا، باقی اس کی دیواریں تو تم دیکھ ہی رہے ہو...... کس قدر ٹھوس اور مضبوط ہیں۔ کم خوراکی بھی یہاں کسی جان لیوا عذاب سے کم نہیں، میں بھی تمہاری طرح صحت مند اور قابلِ رشک جسمانی مضبوطی کا حامل شخص تھا، مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے، باقی میں تو مایوس ہوگیا ہوں۔‘‘

‘‘مسلمان ہوکر مایوسی جیسے گناہ کا ارتکاب کیوں کر رہے ہو، دوست؟’’ میں نے نیم بازسی مسکراہٹ سے کہا۔

‘‘مایوس تو نہیں ہوں، پر دعا ہی کر سکتے ہیں صرف......’’ وہ بولا۔

‘‘یہاں رہتے ہوئے کیا تم نے فرار ہونے کے کسی منصوبے پر غور کیا ہے کبھی؟’’ میں نے اس سے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

‘‘اس قبر جیسی جگہ پر بھلا فرار کا کیا منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔’’ وہ پھیکے پھیکے سے لہجے میں بولا۔ ‘‘یہاں سے اگر نکلنے میں کامیاب ہو بھی جاتا ہوں تو جاؤں گا بھی کہاں؟ یہ سارا علاقہ ان کی دسترس میں ہے، انہوں نے تو ایک وحشی قبیلے کو بھی اپنا غلام بنا رکھا ہے۔’’ وہ شاید کلی منجارین قبیلے کی بات کر رہا تھا۔

‘‘یہاں سے نکل جائیں ایک بار تو ان کے علاقے سے بھی باہر نکلنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گے۔’’ میں نے اپنے لہجے کو باعزم بناتے ہوئے کہا۔

‘‘میرے ذہن میں پہلے تو اس منحوس تہ خانے سے آزادی حاصل کرنے کا منصوبہ آرہا ہے، بشرطیکہ تم ساتھ دو اور ہمت کرو......’’

وہ غور طلب نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکے جارہا تھا۔ بولا۔ ‘‘تم نوجوان ہو اور تمہارے ذہن میں ضرور ایسا کوئی منصوبہ آسکتا ہے، میں تمہاری بات سے متفق ہوں، یہاں پڑے رہ کر مرنے سے بہتر ہے کہ کوشش کرکے ہی کیوں نہ مرا جائے۔’’

‘‘انشاء اللہ ہم زندہ بھی رہیں گے اور یہاں سے نکل بھی جائیں گے۔’’ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

‘‘منصوبہ بتاؤ مجھے......’’

‘‘یہاں کھانا وغیرہ دینے تو کوئی آتا ہی ہوگا ناں...... ہم پہلے اسے قابو کرنے کی کوشش کریں گے۔’’ میں نے وہی کہا جو بلراج نے مجھے بتایا تھا۔ فرار کا منصوبہ اسی کا تھا اور اس کے بعد بلراج وغیرہ کا (اور بعد میں میرا بھی) اصل منصوبہ شروع ہوتا۔

نصیر شاہ میری بات پر ہنس کر بولا۔ ‘‘وہ اکیلا نہیں آتا ہے، دو آتے ہیں اور مسلح ہوتے ہیں۔’’

‘‘تمہیں نہیں معلوم کہ میں بلیک بیلٹ ہوں۔ ممبئی کے فائٹنگ اینڈ شوٹنگ کلب کا باقاعدہ ممبر ہوں۔ مگر انہیں میری اصلیت معلوم نہیں۔’’

‘‘اچھا......!’’ وہ بولا۔ مجھے اس کا لہجہ طنزیہ محسوس ہوا جو میرے منصوبے کے لیے خطرناک تھا۔

‘‘تم اتنے لڑاکا مار ہو تو پھر چوہے کی طرح ان کے پھندے میں کیسے پھنس گئے؟’’ اس نے کہا۔ اس کی بات بھی منطقی لحاظ سے غلط نہیں تھی۔ میں نے بھی اس کے طنز کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہوئے کہا۔

‘‘میں تو تمہیں خاصا ذہین سمجھا تھا مگر تم...... خیر! دھوکے سے تو شیر کو بھی گیدڑ گھیر لیتے ہیں۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی۔ مجھ پر ایک سے زیادہ افراد نے اچانک اور بے خبری میں حملہ کردیا تھا۔’’

وہ ہنسا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ‘‘تم بُرا مان گئے میری بات کا دوست! جوان ہوناں، اینگری ینگ مین بھی، میں مذاق کر رہا تھا، تمہاری بات صحیح ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری فکر ہے، معاملہ گلے پڑ گیا تو سب سے پہلے تم جان سے جاؤ گے۔’’

مجھے خوشی تھی کہ وہ میرے جھانسے میں آرہا تھا۔ اب اسے کیا معلوم تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے مشترکہ فرار کا یہ منصوبہ ہی جعلی تھا اور یہ انہی لوگوں کا ہی بنایا ہوا تھا جنہوں نے ہمیں قید میں ڈالا تھا۔ یہ تو ہم نے نصیر شاہ کو ‘‘بلف’’ کرنے کے لیے کرنا تھا تاکہ بعد میں وہ متاثر ہوکر مجھ پر کامل بھروسا کرنے لگے اور پھر میں اصل مشن کا آغاز کرسکوں۔

اصل مشن ہمارا (بلراج وغیرہ کا) کا یہی تھا کہ نصیر شاہ کو میں اپنے ساتھ فرار کروا کر ایک طے شدہ مقام پر جاکر روپوش ہوجاؤں جس کا بندوبست بلراج نے اسی علاقے میں ایک ایسے مقام پر پہلے سے کر رکھا تھا جو ‘‘ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز’’ کے اطراف میں یا قریب تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے منصوبے کے مطابق نصیر شاہ کے اس عزم کو مہمیز کرتے ہوئے ایک نیا کھیل شروع کرنا تھا۔ بظاہر یہ کھیل بلراج وغیرہ کے خفیہ منصوبے کا ہی حصہ ہوتا مگر اس کے درپردہ میں نے اپنا کھیل کھیلنا تھا۔ میری بیدار مغزی اور تقدیر کے دیے گئے مواقع میری رہنمائی کر رہے تھے۔

چنانچہ نصیر شاہ میرے ساتھ اس ‘‘جعلی فرار’’ کے لیے تیار ہوگیا۔

مقررہ وقت پر جب تہ خانے کا دروازہ کھلا اور دو اسلحہ بدست افراد اندر داخل ہوئے تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک پر قابو پالیا اور اسے گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے اس کے ساتھی کو بھی نہتا ہونے پر مجبور کردیا۔ سوچی سمجھی بلکہ ‘‘تیار شدہ’’ اسکیم تھی تو پھر بھلا اس میں کیا مشکل ہوتی، مگر نصیر شاہ اس چال بازی کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ یا پھر شاید وہ ان حالات سے پہلے کبھی نہیں گزرا تھا، یوں بھی پلاننگ مربوط تھی۔ اگرچہ ان دونوں ہتھیار بندوں نے اس ‘‘ڈرامے’’ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے آسانی سے ہار نہیں مانی تھی، دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت ہمارے درمیان کشاکشی ہوئی تھی۔ نصیر شاہ اپنی آنکھیں پھاڑے یہ سب ‘‘ڈراما’’ دیکھ رہا تھا۔

‘‘آؤ، نکل چلو جلدی......’’ میں نے ان دونوں افراد کو ‘‘زیر’’ کرنے کے بعد ہک دک سے کھڑے نصیر شاہ سے کہا اور پھر وہ جیسے یکدم چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا۔

میں اُسے لیے تہ خانے سے باہر آگیا۔ سامنے ویران اور نیم تاریک سی راہداری تھی۔ میں اسے لیے اسی طرف کو بھاگا۔ وہ تھوڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ شاید اتنا عرصہ پابندِ سلاسل رہنے کے بعد چلنے میں اُسے دقت ہورہی تھی۔

مجھے نکاسی کے سارے راستے بتا دیے گئے تھے۔ میں انہی پر چلتا ہوا ایک زینے پر پہنچا اور وہاں سے میں نے عمودی سفر شروع کیا، راہ میں ایک دو ہتھیار بندوں سے میرا مصنوعی ٹاکرا ہوا اور پھر وہاں سے میں عمارت کی ایک ایسی فصیل پر آگیا جو نامکمل اور مختصر سی تھی۔ یہاں سے ایک راستہ نشیب میں جارہا تھا، یہ کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا تاہم اسے چور راستہ ضرور کہہ سکتے تھے۔

رات نصف پہر میں تھی اور اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم دونوں فصیل سے اُترتے ہوئے، مختصر سے ایک جنگل میں اور پھر وہاں سے ساحل کی طرف آگئے، وہاں میں ذرا ٹھہر کر کچھ سوچنے لگا۔ میں اپنی حرکات وسکنات سے بدستور یہی ظاہر کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ یہ جو کچھ بھی ہورہا تھا رئیل تھا۔

‘‘ہمیں سمندر میں چھلانگ لگا دینی چاہیے، کسی نہ کسی کنارے تو پہنچ ہی جائیں گے ہم......’’ نصیر شاہ نے بچکانا مشورہ دیا۔ اس سے مجھے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ ہوا۔

‘‘سمندر کے اس حصے میں شارک مچھلیوں کی بہتات ہے، کسی دوسرے قریبی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہم مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر ان کے شکم میں ہوں گے۔’’

‘‘اوہ......’’ اس کے منہ سے ابھی اتنا ہی نکلا تھا کہ وہی ہوا جس کا مجھے انتظار تھا، یعنی فصیل کی طرف سے ہم پر فائرنگ ہوئی، رات کی تاریکی میں فصیل کی طرف سے شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نصیر شاہ کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

‘‘اس طرف دوڑو...... جلدی......’’ میں چیخا اور بھاگا، اس نے بھی فوراً ہی میری تقلید کی۔ ہم ساحل کے کنارے کنارے دوڑتے ہوئے، یہ جا وہ جا کے مصداق، ایک ایسی جگہ جا پہنچے جہاں ہمیں ساحل سے لگی کھڑی ایک موٹر بوٹ نظر آئی۔ یہ چھوٹی سی اسپیڈ و بوٹ تھی۔ ہم اس میں سوار ہوگئے، میں نے تھر وٹل کھینچا اور پھر اس کا انجن بیدار ہوتے ہی میں نے اسے آگے بڑھا دیا...... تاریکی میں بوٹ سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی ایک طرف کو لپکی۔

یہ سب دیکھ کر نصیر شاہ نے بھی اب خاصی ہمت پکڑ لی تھی۔ رہائی پانے کی جستجو اب ایک دم ہی اس کے اندر بھی جاگ اُٹھی تھی۔

‘‘مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ ہم اس منحوس جگہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہ بوٹ ہمیں اس جزیرے سے نکال سکتی ہے۔’’ نصیر شاہ مسرت سے بولا تو میں اندر سے کھٹکا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ اس کے لیے یہاں سے نجات ناممکن بات تھی، تاہم میں نے اس کی خوش فہمی کو رفع کرنے کی غرض سے کہا۔

‘‘خاطر جمع رکھو، ہنوز دلی دور است...... اس بوٹ میں اتنا فیول نہیں ہے۔ ہمارے لیے یہی بہت ہوگا کہ ہم نزدیکی ساحل پر پہنچ کر وہاں سے آگے نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔’’ میری بات سن کر اس کے اُمید بھرے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔

‘‘مگر کم از کم پورٹ بلیئر تک ہی پہنچنے کی کوشش کرو......’’

‘‘ناممکن، وہاں تک جانے کے لیے اتنا فیول نہیں ہے۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں تو خود ہی ڈائل دیکھ لو...... تمہاری ضد سے مجبور ہوکر اگر میں پورٹ بلیئر کا رخ کر بھی لوں تو خطرہ ہے، فیول گہرے سمندر میں ختم ہوجائے گا اور ہمارے تعاقب میں آنے والے اسی طرح کی بوٹس میں ہمیں بہ آسانی گھیر لیں گے۔’’

اسے اب میری بات سمجھ میں آئی اور وہ چپ ہو رہا۔ میں منصوبے کے مطابق بالآخر بوٹ کو ساحل کے ساتھ ساتھ ہی دوڑاتا رہا اور پھر ایک طرف روک کر بوٹ سے اُتر گیا اور نصیر شاہ کو بھی جلدی سے نیچے اُترنے کا کہا۔

ہمارے سامنے اب نیم پہاڑی علاقہ تھا، جس کی سنگلاخ .... ڈھلانوں پر جنگل اُگا ہوا تھا۔ ہماری اصل اور خفیہ کمین گاہ کا ادھر ہی ٹھکانا بنایا گیا تھا۔ میں اسے لیے مقررہ سمت بڑھا مگر آگے بڑھنے سے پہلے نصیر شاہ کو دکھانے کی غرض سے میں نے بوٹ کو اسٹارٹ کر کے خالی ہی اس کا رخ کھلے سمندر کی طرف کر کے بڑھا دیا۔ تاکہ تعاقب میں آتے ہوئے دشمنوں کو ہماری کمین گاہ کا شبہ نہ ہو سکے، یہ بات بھی میں نے نصیر شاہ کے گوش وگزار کرنا ضروری سمجھا تھا تاکہ وہ اس ڈرامے کے بھرپور رنگ میں رنگ جائے۔ اس کے بعد ہم دونوں تاریکی میں آگے بڑھ گئے۔ میری کوشش تھی یہ سب کچھ نصیر شاہ کو اچانک اور بالکل فطری لگے۔

مجھے اس راستے پر جس خفیہ ٹھکانے کے بارے میں بتایا گیا تھا وہ یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہمارا تعاقب بھی کیا گیا تھا غرضیکہ ان سارے ''لوازمات'' کا استعمال کیا گیا تھا جو کسی قیدی کے اس طرح فرار کے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت ہمارا تعاقب بھی کیا گیا تھا اور فائرنگ بھی کی گئی تھی۔

بالآخر ہم دونوں گرتے پڑتے اس نیم چٹانی جنگل میں داخل ہونے کے بعد اس پرانے کاٹیج کے قریب جا پہنچے، جو ہماری ''خفیہ'' کمین گاہ کے طور پر استعمال ہونے والی تھی۔

بظاہر یہ ایک شکاری کیبن ہی نظر آتا تھا۔ ہم اس کے اندر داخل ہو گئے۔ یہ دو چٹانوں کے درمیان ایک ایسے درے کے بیچ میں اور قدرے نشیب میں واقع تھا کہ بادی النظر میں کسی کی اس طرف نگاہ ہی نہیں جا سکتی تھی۔

اندر گھپ تاریکی تھی۔ باہر سناٹا تھا۔ دور کہیں کسی جنگلی جانور کے چلانے کی اچانک آواز ابھرتی تو سناٹے کی چادر پر جیسے خنجر چل جاتا اور وہ دور تک چاک ہوتی چلی جاتی تھی۔ چاند کی سنہری سنہری روشنی ہر سو ایک طلسماتی سی اثر پذیری چھوڑے ہوئے تھی۔ کیبن کے اندر بھی اس کی ضوفشانی بکھری ہوئی تھی۔

یہ ایک مکمل طور پر لکڑی کا کیبن تھا جو زیادہ خستہ حالی کا تو شکار نہ تھا مگر کچھ متروکہ سا ضرور نظر آتا تھا۔ چونکہ ساحل سے یہ زیادہ دور نہ تھا اسی لیے یہاں قریب میں ہی ایک قدرتی پہاڑی نالا بھی بہہ رہا تھا جس کی بلندی سے آبشار کی طرح کا بہاؤ ایک تسلسل سے گر رہا تھا۔ یہ پانی یقیناً کسی قدرتی بننے والی ''کاریز'' کا شاخسانہ ہی ہو سکتا تھا جو سمندر کی طرف سے کسی کٹاؤ کا رہین منت تھا۔ بیک وقت جھرنے اور آبشار کا احساس دلاتا پانی گرنے کا شور رات کی دم بہ خودسی خاموشی میں عجیب سا جلترنگ پیدا کرتا تھا۔

کیبن کی حالت اندر سے بھی خاصی سالخوردہ تھی۔ ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ یہی میں چاہتا تھا، ورنہ ہر شے اپنی جگہ اور ستھری ستھری ہوتی تو نصیر شاہ کے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہو سکتی تھی۔ تاہم اس بہانے سے کچھ ایسی ضروری اشیا بہم پہنچا دی گئی تھیں، جو ہمارے یہاں کچھ عرصہ رہتے ہوئے کام آ سکیں، میں نے اور نصیر شاہ نے ان ساری اشیا کو ترتیب سے لگا دیا۔ ایک دو لیمپ ملے، جن میں تھوڑا بہت کیروسین آئل بھی تھا۔ ایک کو میں نے روشن کر دیا تھا۔ لکڑی کے تختہ نما دو بستر تھے۔

''لگتا ہے یہاں کوئی شکاری ٹیمیں آ کر رہتی رہی ہیں اسی لیے ان کی اشیا بچی ہوئی ہیں۔'' میں نے خیال ظاہر کیا تو نصیر شاہ بولا۔

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے، مگر کیا تمہارا یہاں زیادہ دن ٹھہرنے کا پروگرام ہے؟''

''پتا نہیں۔'' میں نے شانے اُچکائے۔ ''حالات دیکھ کر ہی کچھ فیصلہ کیا جا سکتا ہے مگر ہمیں کسی جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔'' میں کچھ ٹھہر کر بولا۔

''کچھ عرصہ ہمیں ادھر ہی روپوش رہتے ہوئے دشمنوں پر یہ ظاہر کرنا ہوگا کہ ہم ان کے علاقے سے ہی نہیں بلکہ اس جزیرے سے بھی نکل چکے ہیں، میں نے وہ بوٹ اسی لیے کھلے سمندر میں چھوڑ دی تھی مگر ابھی ہماری پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔''

''تم بہادر ہی نہیں بلکہ.... ذہین بھی ہو جمال! بہت کمال کر دیا تم نے یہ سب کر کے۔'' نصیر شاہ نے میری بہادری سمیت میری ذہانت کی بھی توصیف کر ڈالی تو میں دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کہ اب اسے کیا پتا تھا کہ یہ سب کچھ ''پلانڈ'' تھا۔

کچھ خشک خوراک کے ڈبے اور ٹن تھے۔ کونے میں کچن تھا، اس کی بھی حالت کچھ ابتر سی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر کچن کی حالت سدھاری۔

یہ بالکل ایک ایسا ہی ایڈونچر لگتا تھا، جیسے ہم کسی غرقاب شدہ جہاز سے اپنی جانیں بچا کر ایک ویران سے جزیرے میں آن بسیں ہوں اور اب ہماری بقا کی جنگ شروع ہونا تھی۔

یہ سب نمٹانے کے بعد میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ ''اپنا کام'' سے میری مراد یہی تھی کہ اس میں بلراج وغیرہ کے منصوبے کا کوئی دخل نہ تھا اور وہ کام یہ تھا کہ میں نصیر شاہ کو اصل حقیقت بتانے سے پہلے یہ تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں یہاں بھی تو کوئی خفیہ کیمرا یا مائیکرو فون نصب تو نہیں، جن سے ہماری یہاں ہونے والی ساری گفتگو ڈارک کیسل کی اُدھوری عمارت میں فروکش، کے ایل ایڈوانی اور بلراج سنگھ سن رہے ہوں۔

اگرچہ اس کا امکان کم ہی تھا کیونکہ میں ان دونوں پر اپنا اعتماد قائم کر چکا تھا تب ہی تو اُنہوں نے مجھے اپنے اس اہم ترین راز اور مشن کے لیے منتخب کیا تھا۔

پوری طرح تسلی ہو جانے کے بعد میرے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑنے لگی تھی۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میں اب نصیر شاہ سے وہ بات کرنے والا تھا جس کا تعلق خالصتاً میرے پلان سے تھا۔ یعنی اس کا تعلق بلراج سنگھ وغیرہ سے نہ تھا۔ نصیر شاہ کے لیے یہ دوسرا ''شاک'' ہو سکتا تھا اور میرے لیے خطرے کا باعث بھی، اگر وہ ڈرپوک ثابت ہوتا اور انکار کر دیتا، تو میرے لیے دونوں ہی صورتوں میں مصیبتیں کھڑی ہو جاتیں، مگر زندگی نے مجھے یہی تو سکھایا تھا کہ رسک لیے بغیر کوئی بھی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ تاہم نصیر شاہ کا اپنی دریافت کے سلسلے میں پُرعزم ہونا ظاہر کرتا تھا کہ وہ ضرور میرا ساتھ دینے پر تیار ہو جاتا۔

بہرحال معاملہ حساس اور نازک بھی تھا مگر کامیابی کی صورت میں میرا ڈبل کراس منصوبہ دوررس نتائج کا حامل بھی کہلاتا۔ یہ رسک لینے کا فیصلہ اور اس پر عمل درآمد کرنے کے سوا اب میرے پاس کوئی چارہ بھی تو نہیں بچا تھا۔ کیونکہ میرے نزدیک ایڈوانی کے اس بھیانک منصوبے کو اس نامراد سمیت سبوتاژ کرنا ہی اوّلین مقصد تھا۔

جب رات کچھ مزید سرک گئی اور میں یونہی اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد.... کیبن کے ایک کمرے میں نصیر شاہ کے سامنے بیٹھا تو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اصل بات کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔

''نصیر شاہ! مجھے ایک بات بتاؤ، تم نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اور اتنی محنت اور دشوار گزار سفر کے بعد ایک بونیزا پروجیکٹ کے حامل دریافت کا سہرا اپنے سر پر سجایا تھا، کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ پایۂ تکمیل تک پہنچے؟''

نصیر شاہ میری بات سن کر کچھ ہکا بکا سا ہو کے میرا منہ تکنے لگا۔ لیمپ کی مدھم سی روشنی میں اس کے چہرے اور آنکھوں سے کچھ ایسے تاثرات اُمڈتے ہوئے نظر آنے لگے جیسے اُسے مجھ سے ایسی بات کرنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ جو شخص اپنی آزادی کے لیے یہاں تک جستجو میں مصروف تھا بھلا اسے کیا پڑی تھی ایسی بات کرنے کی۔ غالباً یہی بات اس کے لیے حیرت کا سبب بنی تھی۔ وہ بولا۔

''میرا عزم اور عہد اپنی جگہ مگر تم کیوں ایک دم اس میں اتنی دلچسپی دکھانے لگے؟''

اس کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ذہن اب میری طرف سے شکوک وشبہات کا شکار ہونے والا ہے تو میں نے اسے سب کچھ بتا دیا...... جسے سُن کر وہ کئی ثانیوں تک ہکا بکا سا میرا چہرہ تکتا رہا تھا۔

''ہاں، میرے بھائی! نصیر شاہ......! حقیقت یہی ہے کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھ رہے تھے مجھے یا جو کچھ میں نے تمہیں اپنے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے آخر میں جیسے اپنی سچائی اور بات کا احاطہ کرنے کی غرض سے کہا۔

''جیسے میں اب تک اپنے نیک عزائم کے آگے ڈٹا ہوا ہوں تو میں تم سے بھی یہی اُمید کروں گا کہ تم بھی انسانیت کی بھلائی کی خاطر اپنے اس نیک مقصد سے پیچھے نہیں ہٹو گے۔ تمہارا مقصد صرف دولت اور اپنی فیلڈ میں شہرت کمانا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تم ایک ایسے قبیلے کو اپنی اس مہم کے ذریعے خوش حال کر دو جو بے چارے پہلے ہی ان غاصبوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اپنی ہی سرزمین میں قیدی بن کر بیگار کاٹ رہے ہیں جبکہ یہ لوگ اسلام سے بھی متاثر ہیں۔ انسانیت اور مذہب کے حوالے سے بھی کیا تم پر فرض نہیں بنتا کہ ان کی مدد کرو......؟ ورنہ یہ مت سمجھنا کہ اگر تم کان کھودنے سے باز رہو گے اور اپنی جان بچا کر بھاگ بھی جاؤ گے تو یہ جنرل ...... ایڈوانی اور اس کے ہم عصر جنرلز بڑے اثرورسوخ والے اور بے پناہ وسائل کے حامل ہیں، تم نے یہ راز آشکارا تو کر ہی دیا ہے کہ یہاں ہیروں کی کان ہے، یہ لوگ دوسرے ذریعے سے اسے کھدوانے کی کوشش کریں گے، پھر سوچو کیا ہوگا؟ یہ صرف ایک جاوا قبیلے کا نقصان نہیں ہوگا میرے مسلم بھائی نصیر شاہ! بلکہ یہ پوری دنیائے انسانیت پر ستم ہوگا۔ ان کا ''ورلڈ بگ بینگ'' جیسا بھیانک منصوبہ پورا ہو جائے گا۔ وہ کریہہ تاریخ پھر دہرا دی جائے گی جو آج سے کئی سال پہلے ہٹلر نے نجانے کتنے بے گناہ انسانوں کے لہو سے لکھی تھی۔

کہیں پھر کوئی ملک کوئی شہر بلکہ کیا خبر پوری دنیا ہی ہیروشیما اور ناگاسا کی بنا دی جائے۔ سوچو...... غور کرو...... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے...... میرا ساتھ دو گے یا پھر فرار کو ترجیح دو گے، میرا وعدہ ہے، تم اگر فرار چاہتے ہو تو میں تمہاری اب بھی پوری مدد کروں گا، مگر پھر تم اپنے ضمیر پر یہ بوجھ لے کر کتنا عرصہ جی لو گے؟ پانچ سال، دس سال، پندرہ سال یا پچیس سال، آخر تو تمہیں اور ہم سب کو مرنا ہی ہے ناں...... تو کیوں نہ کوئی نیک کام کر جائیں جو ہماری آخرت بھی سنوارنے کا باعث بنے۔''

میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کاٹیج کے باہر تاریک سناٹا تھا۔ ہر سو ہو کا عالم تھا، پاس ہی جھرنے بہنے کا اسرار بھرا سرسراتا ہوا ہلکا شور اُبھر رہا تھا۔ کاٹیج کی فضا بھی جیسے ایکا ایکی دم بہ خود سی ہو گئی تھی۔ تب پھر اسی دھڑکتی ہوئی خاموشی میں نصیر شاہ کی فرطِ جوش وجذب تلے آواز ابھری۔

''خدا کرے کہ تم نے ابھی جو مجھے ساری حقیقت بتائی ہے، وہ سب سچ ہو...... اللہ کرے کہ تم نے اب بھی مجھ سے کوئی جھوٹ نہ بولا ہو اور واقعی تم اپنے کاز میں سچے بھی ہو تو یقین کرو شہزی! میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھوں گا کہ میں نے یہ نیک کام کرنے کی بالآخر وہ عظیم سعادت حاصل کر لی جس کی تکمیل اب میرے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکی ہے۔ میں بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا بھرپور ساتھ دوں گا، میں تو زندگی سے مایوس ہی ہو گیا تھا مگر موت سے پھر بھی نہیں ڈرا تھا، بس ایک ہی قلق تھا کہ میرا مشن ادھورا رہ جائے گا، لیکن اب مجھے خوشی ہو گی کہ میرا مشن ضرور پورا ہو گا۔ تب مجھے موت بھی آجائے تو میرا ضمیر اور دل تو مطمئن ہو گا۔''

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور بولا۔ ''یہی سچ ہے دوست! میرے مسلم بھائی! جو میں نے تم سے کہا اور تمہیں پوری تفصیل سے بتایا بھی ہے...... تم اگر اسی طرح میرا ساتھ دیتے رہے تو یقین کرو، یہ کھیل کچھ دنوں کا ہے، کیونکہ میں اور میرے ساتھی ان دشمنوں کی جڑیں کاٹنے میں پہلے سے ہی مصروف ہیں اور ہم یہاں بہت سی پلاننگ کی ابتدا کر چکے ہیں، بس اب دشمن پر آخری وار کرنے کی دیر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنے تینوں جری ساتھیوں، کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ سمیت جاوی حسینہ باریہہ کے بارے میں بھی بتا دیا، جو روپوش سردار خاندان اور ان کے ساتھیوں کی جاسوس بھی تھی۔

''تب پھر میں یہی کہوں گا کہ آفرین ہے تم پر بھی...... اور تمہارے ساتھیوں پر کہ تم سب یہاں ایک نیک مقصد کے لیے اپنی جانیں جوکھم میں ڈالے ہوئے ہو...... لیکن اب مجھے بھی اپنے ساتھ ہم رکاب و ہم قدم ہی سمجھو۔'' نصیر شاہ یہ کہتے ہوئے مجھ سے ایک بار پھر بھرپور طرح بغل گیر ہوا اور بڑی گرم جوشی سے ہاتھ بھی ملایا۔

''مجھے بتاؤ شہزی! اب تمہارے ذہن میں کیا پلاننگ آتی ہے؟'' اس نے آخر میں پوچھا تو میں ایک گہری اور پُرسوچ ہمکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''پلاننگ تو میرے ذہن میں بہت پہلے سے ہی تھی، مگر اب ایڈوانی کے تازہ ترین مگر ناپاک عزائم جان کر میں نے اس میں کچھ ترمیم کی ہے۔ بس یوں سمجھو سب کچھ ویسا ہی کرنا ہو گا، جیسا یہ چاہ رہے ہیں...... اس طرح ہمیں دہرا فائدہ ہو گا، سرمایہ ان کا لگے گا، مدد بھی ان کی ہو گی لیکن آخر میں جب سب کچھ ہماری اور ان کی مرضی کے مطابق کام پورا ہو جائے گا تو پھر ایڈوانی اور بلراج سمیت ان کے زرخرید کتوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے گی، تب تک میں اور میرے ساتھی اندر ہی اندر دونوں سانپوں کی جوڑی کی بامبیوں میں آگ گرم رکھیں گے۔''

نصیر شاہ میری بات سن کر بڑے کھلے دل سے متاثر کن مسکراہٹ سے بولا۔ ''ویل ڈن شہزی! بلاشبہ تمہارا منصوبہ شان دار ہے...... مگر یہ بتاؤ اب تم میرے سلسلے میں انہیں کیسے اعتماد میں لو گے؟ کیا ایڈوانی اور بلراج اتنے ہی بے وقوف ہوں گے کہ تمہاری اس بات کا یقین کر لیں گے کہ تم نے مجھے راضی کر لیا ہے؟''

''یہ میں نے کب کہا؟'' میں نے کہا۔ ''ان کا منصوبہ یہ تو ہرگز نہ تھا کہ میں تمہیں رضامند کروں کیونکہ یہ تو انہیں بھی پتا ہے کہ تم کبھی مان کے نہیں دو گے، ان کا تمہیں فرار کرانے کا اور ہی مقصد تھا، وہ یہ کہ میں تمہیں فرار کے بہانے یہاں طے شدہ مقام پر لا کر روپوشی اختیار کیے رکھوں اور پھر تمہارے سامنے میں خود کو بھی ان کا ایک قیدی ظاہر کرتے ہوئے خود کو ممبئی کے کسی تاجر کا اکلوتا بیٹا بتاؤں اور تمہیں اس بات پر رضامند کروں کہ میرا باپ جس کا شمار ممبئی کے ہی نہیں بلکہ پورے بھارت کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے، اور مزید یہ کہ یہاں رہتے ہوئے مکمل اعتماد میں لینے کے بعد تمہیں کان کی نشاندہی اور اس کی کھدائی کے لیے رضامند کروں، اپنے فرضی باپ سے تمہارے اس میگا پروجیکٹ کے لیے سرمائے کا بھی بندوبست کروں، اس کے بعد خفیہ

طور پر تم کان کی کھدائی کا کام شروع کر دو، اس سلسلے میں تمہیں لیبر (مزدور) بھی فراہم کیے جائیں گے جو درحقیقت ایڈوانی کے ہی آدمیوں کی وہ ٹیم ہو گی جن میں مائننگ انجینئرز بھی شامل ہوں گے۔ تب تک ایڈوانی وغیرہ یہی ظاہر کریں گے کہ وہ تمہاری اور میری تلاش میں ناکام ہو کر اس پروجیکٹ سے ہی بددل ہو گئے ہیں اور اب یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیے ہوئے ہیں، کیونکہ اب حکومت کی مداخلت بھی اس خطے میں ہونے لگی تھی وغیرہ......''

میں نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''بس! دوست، یوں سمجھو سب کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا کہ وہ چاہتے تھے، مگر تب تک میں اور میرے ساتھی، موقع پاتے ہی اور ایک مناسب وقت میں ایڈوانی اور بلراج کا خاتمہ کر ڈالیں گے، کلی منجارین کو مار بھگانے میں جاوا کے روپوش جنگجو کافی ہوں گے، یوں بھی ایڈوانی وغیرہ کے مارے جانے کے بعد کلی منجارین کی طاقت ختم ہو جائے گی۔''

''شاندار منصوبہ ہے۔'' نصیر شاہ نے کہا۔

اس طے شدہ لائحہ عمل کے بعد دو راتیں اور دو دن کیبن میں گزار کے میں اکیلا ہی ڈارک کیسل پہنچا اور ایڈوانی وغیرہ کو ''گرین سگنل'' دے دیا۔

''ویل دیال داس......! ویل۔ تم ہماری توقعات پر پورے اُترے ہو۔ تم نے بہت بڑا کام کیا ہے، ایسا کام جو ہم نہ کر سکے۔'' ایڈوانی نے مجھے اپنے گلے لگاتے ہوئے بے پناہ مسرت سے کہا، بلراج بھی وہیں موجود تھا اور اس کے مکروہ چہرے پر بھی شادمانی کے آثار تھے۔ شلپا بھی اسی کمرے میں موجود تھی۔ وہ بھی میری اس ''کامیابی'' پر خوش تھی۔

میں نے کسرِ نفسی کے طور پر کہنا ضروری سمجھا۔ ''جناب! میں کیا اور میری اوقات کیا ہے، یہ تو سب آپ لوگوں کی جامع اور مربوط منصوبہ بندی کا کارنامہ ہے، میں نے تو بس آپ کے وفادار کی حیثیت سے اس پر عمل کیا ہے۔''

''گڈ......'' بلراج نے کہا۔ ''جنرل صاحب ایک اعلیٰ دماغ اور فہم وفراست کے حامل انسان ہیں، اور ایسے ہی لوگ حکمرانی کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔''

وہاں ہلکے پھلکے جشن کا اہتمام کیا گیا۔ رتن لال اور سچانند جیسے ان کے کئی قریبی اور وفادار ساتھیوں کے علاوہ اور بھی لوگوں کو اس جشن میں شریک کیا گیا تھا۔

چند گھنٹوں بعد ایڈوانی اور بلراج سنگھ کمرے میں اکیلے رہ گئے تو میں نے انہیں پوری تفصیل کے ساتھ بریفنگ دے ڈالی کہ نصیر شاہ پر میں نہ صرف اپنا اعتماد قائم کر چکا ہوں بلکہ اسے کان کی کھدائی پر رازدارانہ طریقے سے رضامند بھی کر چکا ہوں، اور اب جزیرے سے نکلتے ہی میں ممبئی کا رخ کروں گا، جہاں اپنے فرضی باپ کو سرمایہ دینے کے لیے راضی کروں گا، جس کی مجھے پوری اُمید ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے، وغیرہ۔

لہٰذا اب میں چند دن یہاں ڈارک کیسل میں گزاروں گا اور تب تک کان کنی سے متعلق سارے ساز وسامان کا بندوبست کر دیا جائے۔

میری اس بریفنگ کے بعد تیزی سے ترسیل کام شروع کر دیا گیا۔ یہ لوگ پہلے ہی سے ایک جرمن کمپنی سے کان کنی میں مستعمل ہونے والی بھاری مشینریز وغیرہ کا معاہدہ کر چکے تھے۔ جبکہ کھدائی والے مقام کی نشاندہی کے فوراً بعد ہی وہاں تک ایمرجنسی بنیادوں پر مزدور قیدیوں کو دن رات لگا کر سڑک کی تعمیر اور ایک ائراسٹرپ (ہوئی پٹی) بنوانے کا کام شروع کروانا تھا۔ اس ائراسٹرپ کو ''ہائی ٹیل'' کا نام دے گیا تھا۔

اس سلسلے میں بلراج کے ساتھ میری میٹنگ جاری تھی اور میں نے اسے نصیر شاہ کی ہدایت کے مطابق بتایا کہ کھدائی کے مقام پر قیدی مزدوروں اور مسلح محافظوں کے مستقل ٹھکانے کے لیے ایک بیس کیمپ ٹائپ کی ''خیمہ بستی'' قائم کرنا بھی ازبس ضروری تھا۔

بلراج سنگھ کا برتاؤ اب میرے ساتھ آفیسر اور ماتحت جیسا نہیں رہا تھا بلکہ اب وہ میرے ساتھ ایک ''کولیگ فرینڈ'' کی حیثیت سے پیش آ رہا تھا۔ میری حیثیت تو اب ایڈوانی تک کو تسلیم ہو چکی تھی، بلراج بھلا کس کھیت کی مولی تھا۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ایڈوانی کی نظروں میں بلراج کی اہمیت کم اور میری زیادہ ہو گئی تھی۔ میرے لیے یہ کیا کم تھا کہ میں ان دونوں کا بھرپور اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اب اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے تینوں ساتھیوں کو ساتھ ملانے کا بھی بہترین موقع میرے ہاتھ آ چکا تھا، جس کے میں انتظار میں تھا۔ بلراج نے میری خواہش کے مطابق مجھے ایسے ساتھی چننے کا اختیار دے دیا تھا جو میری ٹیم میں شامل رہتے ہوئے ''افسرانہ شان'' کے ساتھ اس سارے کام کی دیکھ بھال کریں کیونکہ ظاہر ہے اب اس پورے پروجیکٹ کا ''سپروائزر'' لامحالہ مجھے بنا دیا گیا تھا۔ بلراج کے ذمے بیرونی کام تھے، تاہم اس کا اور

میرا عہدہ مساوی ہوگیا تھا، فقط وہ سینئر تھا، جبکہ رتن لال اور سچانند سرحدوں کے محافظ بٹالنوں کی سرکردگی میں مصروف تھے اور یہ دونوں ایک حد تک میری ماتحتی میں تھے۔ تاہم ان کے ذمے دشمن ٹولوں کی تلاش اور ان کی سرکوبی کرنا تھا، جن میں کوہارا اور شاکا سمیت اب بھولا ناتھ کا ٹولا بھی شامل ہو چکا تھا، ان کی تلاش جاری تھی۔ وہ میرے مقابلے میں بھی آسکتے تھے، کیونکہ وہ میرے دشمن تھے۔ ان میں کوریلا کا کیا بنا تھا؟ اور وہ کوہارا سے ناراض ہوکر کدھر غائب ہو گئی تھی، یہ مجھے نہیں معلوم تھا جبکہ سوشیلا کی طرف سے تو میں بالکل ہی مایوس ہو چکا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ آیا زندہ بھی تھی یا نہیں۔

میں اندرونی اور داخلی معاملات کے ''سیاہ وسفید'' کا مالک بن چکا تھا۔ بلراج مجھے فارملٹی کی حد تک سُپر ویژن کرتا تھا مگر اختیار میرا چلتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ ڈارک کیسل کے مجھ سمیت چار بڑے عہدے داروں، بلراج سنگھ، رتن لال اور سچانند کو کسی پاس کی ضرورت نہیں تھی، تاہم دوسروں کے لیے پاس جاری کرنے کا اختیار صرف بلراج سنگھ کو تھا۔ میں نے ایڈوانی اور بلراج کی خواہش کے مطابق وفاداروں کی ٹیم وغیرہ تشکیل دینے کے بہانے بلراج سے ڈارک کیسل میں آزادانہ آنے جانے کے لیے کچھ پاس جاری کرالیے جن پر کے ایل ایڈوانی کے دستخط ہوتے تھے۔ جبکہ ہم چار بڑے عہدے داروں کو کسی پاس کی ضرورت سرے سے ہی نہیں تھی مگر یہ پاس میرے ساتھیوں، کبیل دادا اور اول خیر کے کام آسکتے تھے، یا وہ جاوی جنہیں میں باریہہ کی مدد سے اپنے ساتھ ملا لیتا۔

لہٰذا اس سے پہلے کہ قیدی مزدوروں کو ایک نئی جفاکشی میں لگاتا میں کبیل اور اول خیر وغیرہ کو اپنی ٹیم میں شامل کرلینا چاہتا تھا۔

اس مقصد کے لیے میں نے ایک سروے کے بہانے سب سے پہلے کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ سمیت چند اور بھی جاوی قیدیوں کے دانستہ ''انتخاب'' میں حصہ لیا۔ یہ جاوی ساتھی وہی تھے جن کے بارے میں باریہہ مجھے بتا چکی تھی۔

باریہہ بھی اب میری ''ٹیم'' میں شامل ہونے والی تھی۔ کبیل دادا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ وہ مجھے اُستاد ماننے لگا تھا۔ حقیقت یہی تھی کہ یہ سب آسانی سے ہاتھ نہیں آیا تھا میرے، اس کے لیے میں بڑی صبر و استقامت اور کئی مواقع پر اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس سنہری موقع کی تلاش میں تھا، بے شک اس میں تقدیر کے ساتھ کا بھی دخل تھا.... تاہم اب موقع کی تلاش میں اور اپنے اہم مشن یعنی ایڈوانی کے قبضے سے وہ طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے میرا یہ مشن پہلے جس سست روی کا شکار ہوگیا تھا اب اس میں تیزی آگئی تھی۔

''کبیل دادا! تم اور باریہہ بظاہر میرے نائبین کی حیثیت سے رہو گے مگر ہم سب مشترکہ طور پر ہی اندر ہی اندر اپنا اصل مشن جاری رکھے ہوئے ہوں گے۔'' میں نے باریہہ کے جھونپڑے میں آکر کبیل دادا اور باریہہ کو ساری باتوں سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

''باریہہ! تمہاری نگاہ میں جو جاوی ساتھی ہیں جن پر تم مکمل بھروسا اور اس حوالے سے اعتماد رکھتی ہو کہ وہ بغیر کسی ڈر وخوف کے ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں، انہیں ساتھ ملا لینا۔ یاد رہے، انہیں سمجھا دینا کہ انہوں نے اپنی کارکردگی سے خود کو ریاست ڈارک کیسل اور جنرل ایڈوانی کا وفادار ہی ظاہر کرنا ہے، انتخاب کے سلسلے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا۔ ساتھی بے شک تھوڑے ہوں مگر پرفیکٹ اور کام کے ہونے چاہئیں۔''

باریہہ نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

''ایک کام اور کرنا ہوگا تمہیں باریہہ!'' میں نے ذہن میں ابھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت اس سے کہا۔

''شنگرال اور نتالیہ کو بھی جا کر تمہیں بریف کرنا ہوگا، بلکہ موقع نکال کر کبھی میں بھی تمہارے ساتھ ہولوں گا ان کے پاس...... مگر تم یہ بتاؤ کہ میری تم سے اُس روز والی ملاقات کے بعد کیا تمہاری ان سے ملاقات ہوئی؟''

''میں تو اگلے دن کی صبح ہی اُن کے پاس یہ خوش خبری سنانے چلی گئی تھی کہ تمہاری صورت میں ہماری مظلوم قوم کو ایک نجات دہندہ مل چکا ہے۔'' باریہہ نے پورے جوش سے بتایا اور بولی۔ ''شنگرال اور نتالیہ نے تم پر بھرپور اعتماد کا بھی اظہار کیا ہے۔ ان کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ جلد از جلد تم سے مل سکیں۔''

''بس تو ٹھیک ہے پھر، انہیں اب تازہ ترین صورتِ حالات کے بارے میں جا کر آگاہ کر دینا اور اب بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا، ورنہ میری اب تک کی ساری محنت اور وقت تو ضائع جائے گا ہی بلکہ ہم سب کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ بڑی مشکلوں سے میں نہ صرف اپنے بلکہ اپنے ساتھیوں کے بھی یہاں قدم جمانے میں کامیاب ہوا ہوں۔'' باریہہ اور کبیل دادا نے پورے استحکام کے ساتھ اپنے سروں کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے ہر طرح سے احتیاط روی سے کام کرنے کا اظہار کیا تھا۔

میرے جسم پر اب ایڈوانی کے سالار عہدے داروں والی مخصوص وردی تھی۔ اس کے بعد میں نے کبیل دادا اور باریہہ کو خصوصی پاس تھما کر قید خانے کی طرف اول خیر اور شکیلہ کو بھی ساتھ ملانے کے لیے روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی باریہہ کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ ابھی سرِدست صرف انہی ساتھیوں کو پاس تھمائے، جن پر اسے پورا اعتماد ہے اور بعد میں یہ سب ڈارک کیسل پہنچیں اور شلپا نامی ایک لڑکی سے ملاقات کریں، میں تب تک اُس سے وائرلیس سیٹ پر رابطہ کرتا ہوں۔ (ویسے مجھے ایک بٹن جتنا چھوٹا ٹرانسمیٹر بھی دے دیا گیا تھا تاکہ میں فوری طور پر رابطے میں رہ سکوں، یہ بٹن نما جدید طرز کا اسپائی ٹرانسمیٹر میرے دائیں کالر کے نیچے لگا ہوا تھا) بلکہ ہوسکتا ہے میں وہیں چلا جاؤں اور اب ہماری ملاقات ڈارک کیسل میں ہوگی، کیونکہ آگے میں نے ہی تم لوگوں کو ایڈوانی کے ''وفاداروں'' کی حیثیت سے گائڈ بھی کرنا ہے، مگر خبردار! وہاں کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نکلنی نہ پائے، جو انہیں ہمارے حوالے سے شک وشبہے میں مبتلا کر ڈالے، کیونکہ وہاں جگہ جگہ خفیہ کیمرے اور مائیکرو فون نصب ہیں۔ کوئی بات کرنی ہو، کوڈ میں کریں گے، جس کے بارے میں بعد میں تمہیں بتاؤں گا، تاہم میری پہلی کوشش یہی ہوگی کہ تم سب کو بیس کیمپ میں منتقل کر دوں، تاکہ ہم آرام سے اور بغیر کسی خوف کے اپنا آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرتے رہیں۔

ان دونوں کو رخصت کر کے میں جیپ میں اپنے ماتحت ساتھیوں (دشمن کے ساتھیوں) کے ساتھ اس جگہ پہنچا جہاں اور بھی مسلح ساتھی موجود تھے۔ وہ سب مجھے دیکھ کر ایک دم الرٹ اور دست بستہ ہو گئے۔ میں نے انہیں ایڈوانی سے ملنے والے احکامات سے آگاہ کرتے ہوئے کچھ معمول کی ضروری ہدایات دیں اس کے بعد وہاں سے ڈارک کیسل پہنچا۔

بلراج بیرونی معاملات نمٹانے کے لیے پورٹ بلیئر گیا ہوا تھا۔ اب وہاں بلراج کے بعد میرا ہی حکم چل رہا تھا۔ حتیٰ کہ شلپا بھی میری ماتحتی میں آگئی تھی۔ مگر میں نے اس سے پہلے جیسے ہی دوستانہ تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دل کش انداز میں مسکرائی....

''نیا عہدہ ملنے کی تمہیں بھرپور طریقے سے بدھائی تو مل ہی چکی ہے مسٹر دیال داس! مگر اب ہمیں مت بھول جانا۔'' اُس نے یہ بات مجھ سے ایک نرالی ادا کے ساتھ کہی تھی اور میں بھی جیسے عاشقانہ سے انداز میں بولا۔

''آپ جیسی حسین ساتھی کو بھلا کون کافر بھول سکتا ہے۔''

''او......'' اس نے مسرت آمیز انداز میں اپنے نرم و گداز لبوں کو گولائی کی شکل دی تو ایسے میں اس کے حسن کی خرمستی دیکھنے کے لائق تھی، مگر میرا اس میں دلچسپی لینا مجبوری تھی۔ اس کا ''افسر'' بننے کے بعد میں کم از کم شلپا کے ساتھ ایسی کوئی فضا قائم نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے ہمارے درمیان.... کسی قسم کی ''پروفیشنل جیلسی'' جیسے جذبات پروان چڑھتے بلکہ شلپا ہی کیا، میں تو رتن لال اور سچانند کے ساتھ بھی ایسا ہی دوستانہ برتاؤ رکھنے کی کوشش کرتا۔ کیا خبر اس جیلسی کی آڑ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور بلاوجہ کی مشکل کھڑی ہو جاتی۔

بہرحال شلپا کو تھوڑا اُلجھانے کے بعد میں ایڈوانی کے کمرے میں گیا اور اسے معمول کی رپورٹ پیش کی، اس کے بعد شلپا کو بھی نئے بھرتی ہونے والے وفاداروں اور ساتھیوں سے متعلق بریف کیا جو یہاں آنے والے تھے۔ ان کی یہاں رہائش اور لاجسٹک کی فراہمی کے سلسلے میں اسے کچھ ہدایات دیں اور پھر اپنے کمرے میں آکر تھوڑا آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گیا۔

شلپا میری قُربت کے لیے بے قرار ہوئی جا رہی تھی اور میں بدستور بہانے بہانے سے اسے ٹالے ہوئے تھا۔ اس نے جب جگانے کے لیے میرے کمرے میں انٹری دی تو میں فقط ٹائٹ پینٹ میں بیڈ پر بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔ میرا کمرا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں موجود تھی جیسی کہ کسی عہدے دار کو تفویض کی جانی چاہیے۔

میں جب آنکھیں ملتا ہوا بیڈ پر اُٹھ بیٹھا تو وہ ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے کھڑی تھی۔ اس کے گداز اور نرم لبوں پہ بڑی سیکس اپیل مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ مجھ پر بیباکانہ انداز میں جھک آئی تھی۔

میرے جی میں تو آئی کہ اسے پرے دھکا دے دوں مگر میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ ڈارک کیسل کے اندر میرا اس سے ایسا سلوک گویا ایسا ہی تھا جیسے سمندر میں رہتے ہوئے مگرمچھ سے بیر لینا۔

لہٰذا میں نے مصلحت کوشی کا گھونٹ بھرتے ہوئے جبراً محبت بھری مسکراہٹ سے اسے خود سے لپٹا لیا اور

دھیرے سے اور کچھ شرمیلے پن کی اداکاری کرتے ہوئے اس کا نرم و نازک گال چوم لیا کہ مجھے اپنی جانب مائل بہ اُلفت سمجھے کہ میں اس کے حسنِ تجلّی کا شکار ہونے لگا ہوں، اسے خود سے پیار بھرے انداز میں دور کرتے ہوئے بیڈ سے اُٹھ بیٹھا اور اس حرکت پر جھینپتے ہوئے بولا۔

''یہاں خفیہ کیمرے نصب ہیں، کہیں چھوٹی یا بڑی سرکار کو ہماری کوئی حرکت بُری نہ لگے۔''

''تم ڈرپوک ہی نہیں خاصے شرمیلے بھی ہو، ایسی کوئی بات نہیں، یہاں جو بھی ایک دوسرے سے اپنی اپنی انڈراسٹینڈنگ کے مطابق اگر ایک دوسرے کا قریبی ساتھی یا دوست بن جاتا ہے تو اس پر کسی بھی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ چاہے وہ ایک ہی کمرے میں کیوں نہ رات گزار لیں......'' وہ کھنکتی ہوئی ہنسی سے بولی۔

اس کی ''رات گزارنے'' والی بات پر مجھے اپنی سانسیں رکتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

''یہاں کے مینرز میں، بڑی یا چھوٹی سرکار کے لیے جو سب سے زیادہ ناپسندیدہ بات ہے وہ دو ساتھیوں کا آپس میں تکرار اور جھگڑا ہے۔ یہ بات یہاں ناقابلِ معافی سمجھی جاتی ہے اور پھر تمہیں کیا پروا ہے تم بھی تو اب چھوٹی سرکار بن چکے ہو، نہیں معلوم کہ تم اب بلراج کے بعد یہاں سیکنڈ اِن چیف ہو۔'' وہ آخر میں معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

''پھر بھی میں تو نیا ہوں اور اب بھی خود کو بلراج صاحب کی ماتحتی میں ہی سمجھتا ہوں۔''

میں نے کہا اور پھر چائے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ چائے کی چسکی لی اور موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔ ''میں نے حسبِ وعدہ نئے ساتھیوں اور وفاداروں کی کھیپ تیار کر لی ہے۔ وہ آنے ہی والے ہوں گے۔ انہیں ابتدائی ہدایات دینے کے بعد روم نمبر سیون میں بھیج دینا۔''

''کتنے ساتھی ہیں؟''

''ابھی فی الحال تو آٹھ، دس کے قریب ہوں گے مگر ان میں چند ایک مستقل طور پر میرے ساتھ ہی ہوں گے، باقی کو تم ہی ڈیل کرو گی اور ہاں شلپا جی! ان میں زیادہ تر قیدیوں جیسی حالت میں ہیں، پہلے انہیں فریش ہونے اور نیا لباس دینے کے علاوہ کچھ کھانے پینے کا ان کے لیے بندوبست کر دینا۔ یہ سب وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے ہر طرح جانچ اور پرکھ لیا ہے۔ یوں بھی ہمارے نئے میگا پروجیکٹ کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت پڑے گی جو ٹیم ورک کی صورت میں ہمارے کام آتے رہیں۔''

تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ چلی گئی۔ میں نے بھی قدرے سکون کی سانس لی۔ وہ خاصی ''تیاری'' کے ساتھ اور ''خاص'' مقصد کے لیے ہی اس طرح یوں میرے کمرے میں آ گئی تھی۔ اب میں نے بھی اس سے ''محتاط'' رہنے کا سوچ لیا تھا، اس کا یہی طریقہ تھا کہ میں خود کو یہاں ریاست کے کاموں میں اس قدر مصروف کر لوں کہ اسے کبھی میرے پاس تنہائی میں آنے اور ایسی کسی ''خرمستی'' کے لیے موقع ہی نہ مل سکے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے غسل وغیرہ کر کے نئی وردی چڑھا لی۔ ڈارک کیسل کا پورا عملہ اب میری نظروں میں تھا۔ کس کا کمرا کہاں تھا اور کون کیا کرتا تھا۔ باقی کمرے کن کاموں کے لیے مستعمل تھے، وہ سب میں نے ایک دو روز میں جان لیے تھے۔

مجھے طلسم نور ہیرے کی تلاش تھی۔ ایڈوانی اور بلراج کو جہنم واصل کرنے سے پہلے میں اپنے ملک کی...... امانت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کا حصول یوں ازبس ضروری ہو چکا تھا۔ کیونکہ ورلڈ بگ بینگ کا کریہہ ناک منصوبہ اسی ہیرے پر ہی انحصار کرتا تھا۔ ظاہر ہے وہ نادر اور قیمتی ہیرا کمرے کی میز پر تو مجھے رکھا ہوا نہیں ملنا تھا۔ اس کے بارے میں صرف مجھے ایڈوانی ہی بتا سکتا تھا اور اس سے ہیرے کے بارے میں پوچھنا اپنی موت کو آواز دینے کے ہی مترادف تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اب چونکہ میں بھی ان کے قریبی وفاداروں میں شامل ہو چکا تھا، ہوسکتا ہے کسی حوالے وہ مجبور ہو کر کبھی مجھ سے خود ہی اس کا ذکر بھی کر دے، مگر میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس نے ہیرے کے بارے میں سوائے بلراج سنگھ کے کسی اور کو بھی بتایا ہوگا۔

میں ابھی کمرے سے نکلنے ہی والا تھا کہ انٹرکام پر شلپا نے مجھے بتایا کہ نئی کھیپ آ چکی تھی اور اب وہ ان کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہے، اس کے بعد وہ ان سب کو میری ہدایت کے مطابق روم نمبر سیون میں پہنچا دے گی۔

''گڈ مس شلپا! میں ایک گھنٹے بعد وہیں، ملوں گا اور تم بھی ذرا وہاں آ جانا۔'' میں نے کہا اور دانستہ اسے بھی ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد میں روم نمبر سیون میں تھا جہاں شلپا لگ بھگ نو افراد کے ساتھ موجود تھی۔

مذکورہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنے جذبات اور چہرے کے تاثرات کو مکمل طور پر ایک افسرانہ انداز کا روپ دے دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ

میرے چہرے اور لب و لہجے سے میرے اندر کے اُن جذبات کی ایک ذرا جھلک بھی ظاہر ہونے پائے جو یقینی طور پر اول خیر اور شکیلہ کو دیکھنے کے باعث ہوتی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اس سارے ''منظرنامے'' کی ایک ایک جھلک اس وقت بلراج سنگھ نہیں تو ایڈوانی تو ضرور ہی کسی کمرے میں بیٹھا بہ غور دیکھ رہا ہوگا۔ بعد میں یہی ''ویڈیو ٹیپ'' بلراج سنگھ بھی ملاحظہ کرتا تھا۔

کبیل دادا سے تو میں ملتا رہتا تھا۔ مگر اول خیر اور شکیلہ کے سامنے میں دوسری بار جا رہا تھا۔ ان میں باریہہ کے علاوہ، کچھ جاوی قبیلے کے بھی لوگ شامل تھے، جو درونِ خانہ باریہہ کے ساتھی اور اپنے سابقہ سردار اور اس کے بیٹے اور بیٹی کے وفاداروں میں سے تھے مگر ایک مشترکہ مفاد کے لیے وہ میرا ہر طرح سے ساتھ دینے کے لیے تیار تھے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے بظاہر ایک طائرانہ سی نگاہ حاضرین پر ڈالی تھی۔ ان میں میری متلاشی نظروں نے اول خیر اور شکیلہ سمیت، کبیل دادا اور باریہہ کو بھی بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی منظر تھا جیسے کسی کلاس روم کا ہونا چاہیے۔

میری کرسی ان کے سامنے والی کرسیوں سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ جس کے برابر میں شلپا بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے اپنی مخصوص وردی میں دیکھ کر میں نے بھی سکھ کا سانس لیا تھا۔ کبیل دادا کا لنگ اب بہتر ہونے لگا تھا، ٹانگ کی ہڈی پر کافی دن کھپچیاں باندھے رکھنے سے وہ اپنی جگہ آ گئی تھی اور اس کا زخم بھی بھر چکا تھا جبکہ کوڑھ کے داغ جو ظاہر ہے مصنوعی ہی تھے، وہ بھی نئے حالات کے مطابق اور میرے ہی مشورے سے رفتہ رفتہ مٹانے لگا تھا اور اب برائے نام ہی داغ رہ گئے تھے۔

میز پر کچھ اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ میں اپنی کرسی پر آ کر براجمان ہو گیا۔ ایک نگاہ حاضرین پر ڈالی۔ اپنے ساتھیوں کے بشروں پہ ایک بے پایاں مسرت آمیز حیرت اور خوشی کے تاثرات میں دیکھ سکتا تھا، یقیناً وہ مجھے خطرناک دشمنوں کے درمیان میں اس ''پوزیشن'' میں دیکھ کر متحیر اور متاثر بھی ہو رہے تھے۔ تاہم میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کبیل دادا نے اول خیر وغیرہ کو اس سلسلے میں خاص طور پر بریف کر دیا تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر اپنے اندرونی بلکہ ''بیرونی جذبات'' کو بھی خصوصی طور پر کنٹرول رکھیں، مگر...... میں اول خیر اور شکیلہ کے چہروں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ باوجود کوششِ ضبط کے ایسا کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ ممکن تھا، تھوڑی دیر بعد ہی اس طرح کے جذباتی ہیجان سے نجات پا لیتے۔

میں نے ان سب کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے تو معمول کے مطابق انہیں ریاست اور جنرل ایڈوانی کی وفاداری کا دم بھرتے رہنے کا حلف لیا اور پھر انہیں اس ''وفاداری'' کے فوائد گنوائے اور انہیں جنرل ایڈوانی کا شکریہ بھی ادا کرنے کو کہا کہ جس نے ان سب کو اپنی وفاداری میں آنے کا موقع فراہم کیا جس کے عوض وہ اب شاہانہ زندگی گزارنے والے تھے، وغیرہ۔

اس کے بعد میں نے انہیں ان کا کام سمجھایا جو سرِدست عمومی نوعیت کا تھا۔ پھر انہیں نئے تعمیر ہونے والے بیس کیمپ کے بارے میں بھی بتایا جو میگا پروجیکٹ کی تیاری کے سلسلے میں اُس نو دریافت شدہ کان کے علاقے میں قائم کیا جانے والا تھا، جہاں ان سب نے ایک ٹیم ورک کے طور پر کام کرنا تھا۔

اس کام میں مجھے کم و بیش ایک سے ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا اور پھر سب کو رخصت کر دیا۔

اس کے کچھ دیر بعد جب میں جنرل ایڈوانی کو معمول کے مطابق اس کی رپورٹ کرنے اس کے کمرے میں پہنچا تو چونک پڑا۔

☆☆☆

وہاں شلپا موجود تھی اور جنرل ایڈوانی اس سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ چونکہ مجھے اور بلراج کو دستک دیے بغیر جنرل کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت تھی اس لیے میں نے شلپا کو ایڈوانی سے آخری جملہ کہتے ہوئے سن لیا تھا۔

''سر! آپ بالکل چنتا نہ کریں، دیال داس، بلراج صاحب کی غیر موجودگی میں بھی سارا کام بہ خوبی سنبھالے ہوئے ہے۔''

شلپا کو میرے بارے میں ایڈوانی سے یہ کہتے سن کر مجھے اپنی احتیاط پسندی اور زود فہمی پر از خود ناز ہونے لگا... کہ میں نے اب تک شلپا کے بارے میں جو اندازے اور اس سے اپنے برتاؤ کے لیے جو فیصلے کر رکھے تھے وہ ایسے غلط بھی نہ تھے۔ میرے علاوہ ایڈوانی اب بھی شلپا سے ہی کچھ خاص باتوں کی جان کاری لیا کرتا تھا۔ مجھے شلپا کی اہمیت کا بھی اچھی طرح احساس ہو گیا تھا۔ باقی میرے چونکنے کی وجہ اس سے زیادہ اہم تھی، جس نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا تھا۔

جنرل ایڈوانی کی بھاری بھرکم چیئر کے دائیں جانب

جو بڑی سی اسکرین تھی۔ اس میں مجھے ایک جگہ پر اُس کیبن کا منظر نظر آیا تھا جہاں میں اور نصیر شاہ فروکش تھے۔ یہ بظاہر ہم دونوں کی خفیہ کمین گاہ تھی۔ اور میرا خیال تھا کہ یہاں ابھی کوئی خفیہ کیمرا نصب نہیں کیا گیا ہوگا، مگر اب یہ سب میری نظروں کے سامنے تھا، ڈر مجھے اس بات کا تھا کہ یہ کب اور کس وقت نصب کیا گیا ہوگا؟ اس وقت، جب میں نصیر شاہ کو اپنے اس ڈبل کراس منصوبے سے متعلق تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا یا تب جب ان سب باتوں سمیت میں نصیر شاہ کو اپنے اعتماد میں لے چکا تھا؟ یقینی طور پر بعد میں ہی ایسا ہوا ہوگا، ورنہ میرا پول کھل جانے کے بعد میں اس وقت زندہ ہی کب ہوتا، میری اصلیت جان لینے کے بعد تو ایڈوانی مجھے بلا تاخیر ختم کروا دیتا۔ مگر اب بھی یہ میرے لیے پریشانی اور انتہائی تشویش والی بات تھی، کیونکہ اس طرح میں اب نصیر شاہ سے آزادی سے باتیں نہیں کرسکتا تھا، نہ وہ مجھ سے کرتا۔ اس سے بھی بڑھ کر اب فوری طور پر ہم دونوں کو یہ خطرہ لاحق ہو چلا تھا کہ میں اب کیسے نصیر شاہ کو یہ بات بتاتا کہ اب ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے؟ وہ مجھے دیکھتے ہی کہیں کوئی ایسی ویسی بات اپنے منہ سے نکال دیتا کہ یہاں بیٹھا ہوا ایڈوانی چونک جاتا۔ اس کے بارے میں مجھے بعد میں سوچنا تھا۔

''آؤ...... آؤ...... دیال داس! آجاؤ...... تمہارے ہی بارے میں شلپا جی سے باتیں ہو رہی تھیں۔'' مجھ پر نظر پڑتے ہی ایڈوانی نے کہا۔ شلپا بھی میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں بھی بظاہر اپنے اندر کی تشویشناک بے چینی کو ایک فدویانہ سی مسکراہٹ تلے دباتا ہوا، قریب گیا اور ایک کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''جناب! میری تو یہی کوشش ہے کہ مجھ سے غیر دانستہ طور پر بھی ذرا سی غلطی نہ ہونے پائے......'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ میں اب ریاست کے معاملات اور اس کی حساسیت کو سمجھنے لگا ہوں۔ اس میں بلاشبہ بلراج صاحب اور شلپا جی کا بڑا ہاتھ اور ساتھ ہے۔''

میرے نپے تلے جملوں اور الفاظ کی ادائیگی میں ریاست اور ایڈوانی سے وفاداری کی وہ ساری جھلکیاں موجود تھیں، جس سے ایڈوانی جیسے مطلق العنان اور جابر شخص کی انانیت کو تقویت ملتی تھی۔

''اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم نے اپنے چند ہی کارناموں سے خود کو ہماری نوازشوں کے قریب کرلیا ہے، مگر تمہیں نئے وفادار ساتھیوں کی بھرتی اور انہیں غیر معمولی اہمیت دینے کے سلسلے میں احتیاط ضرور کرنا ہوگی۔ ہمارا تجربہ ہے کہ دشمن ہمیشہ وفاداری کے بھیس میں ہی دھوکا دیا کرتے ہیں۔'' جنرل ایڈوانی نے کھرکھراتے لہجے میں کہا تو مجھے اس کے ''تجربے'' کا دل سے قائل ہونا پڑا، کیونکہ ایک ایسا ہی ''وفادار'' میری صورت میں اس کی لنکا ڈھانے کے لیے اس کے بے حد قریب آچکا تھا اور وہ بے خبر تھا۔ یہاں وہ شاید اپنے کسی تجربے میں مار کھا گیا تھا یا پھر تقدیر میرا ساتھ دینے پر تلی ہوئی تھی۔

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے جناب!'' میں نے اپنے سر کو ذرا خم کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن ہمیں بہرحال افرادی قوت کی ضرورت پڑتی رہے گی اور اس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ ہم کچھ ایسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملاتے رہیں جو بظاہر ہمارے ساتھی ہوں مگر حقیقت میں ہمارے ملازم نما غلام ہی ہوں، ان کی حیثیت اب بھی قیدیوں ہی کی سی رہے گی، ہم ان پر پوری نگاہ رکھیں گے۔ کامل بھروسا صرف ہم اپنے ہی چند آدمیوں پر کریں گے۔''

''گڈ...... ہمیں تمہاری یہ کارکردگی بھی پسند آئی۔ ایسا ہی ہونا چاہیے، میں ابھی شلپا کو بھی کچھ ایسی ہی ہدایت دے رہا تھا۔'' ایڈوانی نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے معمول کی تھوڑی تفصیل سے آگاہ کیا پھر ایک نگاہ اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''جناب! میرا تو خیال نہیں تھا کہ اس کیبن میں کسی خفیہ کیمرے کی ضرورت تھی۔ لیکن چونکہ یہ آپ ہی کا فیصلہ ہوسکتا ہے تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

''ہاں! یہ ہمارا ہی فیصلہ تھا۔'' ایڈوانی نے ایک نگاہ اسکرین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ اسکرین میں وہ نصیر شاہ کو دیکھ رہا تھا جو کیبن کی چوبی کھڑکی سے باہر جنگل کی طرف جھانک رہا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک بنیان اور پتلون نظر آرہی تھی۔

''ایک بات بتاؤ...... دیال داس!''

''یس باس!''

''کیا نصیر شاہ کو تم پر ذرا بھی شُبہ نہیں ہوا کہ جو کچھ تم نے ہمارے طے شدہ لائحۂ عمل کے مطابق اس سے کہا، اس پر اس نے اتنی آسانی سے اعتبار کرلیا؟''

''اس سلسلے میں آپ کی تشویش اور شُبہ غلط نہیں ہے۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔ وہ اپنی بھویں سکیڑ کر بہ غور سوالیہ نظروں سے میرے چہرے کی طرف تکتا رہا۔ میں نے مزید کہا۔

''جناب! دراصل میں یہ کہتے ہوئے پہلے آپ سے معافی چاہوں گا کہ جو منصوبہ آپ نے نصیر شاہ کے سلسلے میں بنایا تھا، وہ اپنی جگہ درست سہی مگر اس میں کچھ ابہام تھا۔ ایسی کسی بھی منصوبہ بندی کے نقائص اور سقم عموماً اس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ہی سمجھ میں آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر طرح سے مکمل اور جامع اور مربوط منصوبے اور اس طرح کی گہری چالیں بُری طرح سے ناکامی سے بھی دوچار ہوتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا، جب میں نصیر شاہ کے ساتھ فرار ہوکے اس خفیہ پناہ گاہ پہنچا اور منصوبے کے مطابق میں نے اسے جب اعتماد میں لینے کی کوشش چاہی تو...... مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ نصیر شاہ سے یہ ساری باتیں ہضم نہیں ہو رہی تھیں اس لیے اس سے پہلے کہ وہ میری طرف سے بھی کسی شبہے کا شکار ہوتا، میں نے فوراً اپنے تئیں اس میں ذرا ترمیم کر ڈالی۔ اب وہ بالکل مطمئن ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے جنرل ایڈوانی کو اپنی چند ایک اضافی ترامیم سے آگاہ کیا جو میرے ذہن میں ہی تھیں اور مجھے اپنے ''ڈبل کراس'' منصوبے میں کام آنے والی تھیں۔ ایڈوانی یہ سن کر بے حد خوش ہوا۔ تاہم بولا۔

''مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ ہماری طرف سے کسی شبہے میں نہ پڑ جائے اور تمہیں بھی ہمارا آدمی نہ سمجھنے لگے، کیونکہ بلراج نے جب یہ منصوبہ بنایا تھا تو اس میں مجھے کچھ خامیاں محسوس ہوئی تھیں، بلراج میرا پرانا اور وفادار ہی نہیں ذہین آدمی بھی ہے، لیکن یہ بات بھی ماننے والی ہے کہ اگر اس کے منصوبے میں خامیاں تھیں بھی تو تم نے اپنی ذہنی فراست کے مطابق اس میں حقیقت کا رنگ خوب بھرا۔ کیوں مس شلپا؟'' آخر میں اس نے شلپا کی طرف دیکھا تو وہ جھٹ سے میری تعریف میں ایک نگاہِ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بالکل جناب! آپ کی بات درست ہے۔ ایک ایسے ضدی اور قیدی شخص کو یہاں رکھتے ہوئے کان کی کھدائی پر رضامند کرنا کچھ کم بڑا کارنامہ نہیں ہے، مگر دیال داس نے کھیل ہی ایسا کھیلا کہ وہ نہ سمجھ سکا۔''

''میں نے درحقیقت اس کی کمزوری بھانپ لی تھی۔'' میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔ اور بھلا میں کیا کہتا۔ اگرچہ ان کی بات بھی غلط نہیں تھی، منصوبے میں کئی سقم موجود تھے، یہ تو میں نے ان کا بھانڈا پھوڑ کر اپنی اصلیت بتا کر نصیر شاہ کو رضامند ہی نہیں بلکہ اپنا ہم خیال بھی بنالیا تھا، اس میں ان کے یا بلراج کے منصوبے کی کامیابی کا کیا دخل تھا بھلا۔

''میں چاہ رہا تھا کہ اس سے پہلے وہ کسی شک وشبے کا شکار ہو، ہمیں تیزی سے کام کی ابتدا کردینی چاہیے۔''

''کام کی ابتدا تو ہوچکی ہے، بیس کیمپ بن رہا ہے، عارضی ائراسٹرپ اور سڑک کا کام ہنگامی بنیادوں پر جاری ہے، بھاری مشینری اور دیگر سامان تیسرے دن پہنچ جائے گا۔ سی اور اوٹر طیارے بھی ائراسٹرپ بنتے ہی آجائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے کچھ اور پروفیشنل مائننگ انجینئرز کا بھی بندوبست کیا ہے، بلراج انہیں لے کر پہنچنے والا ہے، ان کے کام سنبھالتے ہی، نصیر شاہ کی پھر ضرورت نہیں رہے گی اور پھر اسے اگلے جہاں پہنچا دیا جائے گا۔ باقی کام تو تمہارے سپرد ہے۔'' ایڈوانی نے سفاکی سے یہ کہتے ہوئے بات ختم کردی۔ میں نے دل ہی دل میں اس رذیل انسان پر لعنت بھیجی کہ نصیر شاہ تو نہیں البتہ تیری قضا جلد آنے والی ہے۔

میں نے خفیہ کیمرے کے سلسلے میں ایڈوانی سے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کے کمرے کے علاوہ اس کی ایک اسکرین شلپا کے کمرے میں بھی تھی۔ وہیں شلپا کے ساتھ بیٹھ کر اس کے ساتھ چند میٹھی میٹھی باتوں کے دوران میں نے کیمرے کی لوکیشن اور اس کی تعداد وغیرہ کا اس سے چالاکی سے اُگلوا لیا۔ اس کے بعد میں کام کے بہانے شلپا سے بھی جان چھڑا کر نکل آیا۔ مجھے کیبن کا رخ کرنا تھا اور پریشانی میں مبتلا تھا کہ اب نصیر شاہ سے کیونکر بات ہوسکتی ہے؟ بہت سوچ بچار کے بعد مجھے یہی ایک صورت سمجھ میں آسکی کہ اسے کسی طرح کیبن سے باہر لاکر ہی خطرے کی خبر کروں۔

میں وہاں پہنچا اور کیبن کے باہر کھڑا ہوا تو مجھے وہ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوا نظر آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اندر سے ہی کچھ بول نہ پڑے۔ تاہم میں نے اپنے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر اسے کیبن سے باہر آنے کا اشارہ کیا، تو وہ کچھ اُلجھن کا شکار نظر آنے لگا۔

اس نے بیک وقت اپنے ہاتھ اور سر کو سوالیہ انداز میں حرکت دی، جیسے پوچھنا چاہ رہا ہو کہ معاملہ کیا تھا، مجھے سخت کوفت ہوئی کہ وہ میری بات یا اشارہ سمجھنے کے بجائے خاموش سی بحث کر رہا تھا، بالآخر میں نے ہاتھوں کے اشارے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور اپنی ایک آنکھ پر مٹھی رکھ کر اسے خفیہ کیمرے اور دوسرے ہاتھ کا اُدھورا سا

بھونپو بنا کر اپنے کان پر رکھا۔ پھر کاٹیج کے اندر اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھے بغیر کھڑکی میں کھڑے کھڑے ہی گردن موڑ کر اپنے پیچھے دیکھنے لگا اور میں نے دانت بھینچ کر اپنا سر پیٹ لیا۔ مگر پھر اچانک میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم کھڑکی سے ہی باہر کود پڑا اور سرپٹ میری طرف دوڑ کر آنے لگا، اس کی اس حرکت پر میں خود بھی گھبرا سا گیا کہ کہیں اس کے کیبن میں کوئی جنگلی جانور تو نہیں گھس آیا۔ اس نے ہنوز جسم پر بنیان پہن رکھی تھی اور نیچے پتلون تھی۔ میرے قریب آتے ہی وہ رک گیا اور ہانپنے لگا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی سوال تو میں تم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ تم اندر کیوں نہیں آ رہے؟'' جب میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ ایک دم پُرسکون ہو گیا اور بولا۔

''یار! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھا شاید تم مجھے کسی دشمن کی آمد کے اشارے دے رہے ہو۔'' اس کی بات سن کر میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ بہرحال میرے پاس وقت کم تھا اور میں نے اسے بتا دیا کہ اب ہم اپنی کوئی رازدارانہ گفتگو کیبن کے اندر نہیں کر سکتے، ممکن ہوا تو لکھ کر یا کسی ایسے گوشے میں جا کر کریں گے جہاں کیمرے کی خفیہ آنکھ اس گوشے کا احاطہ نہ کر سکتی ہو، مگر اس میں بھی یہ دھیان رکھنا ہوگا کہ ہمیں زیادہ دیر اس طرح نہیں کرنا ہوگا، ورنہ شبہ پیدا ہونے کا احتمال پیدا ہو سکتا تھا۔ کیمرے کے سامنے ہم دونوں بالکل ویسے ہی باتیں کریں گے، جیسا کہ دشمن کا منصوبہ تھا۔

''مگر یہ ہوگا کیسے؟ اس خفیہ کیمرے کو کس طرح تلاش کرنا ہوگا۔'' نصیر شاہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

''اس کی لوکیشن میں نے جانچنے کی کوشش تو کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''تم اندر چلو، میں دیکھتا ہوں اور ہاں نارمل رہنے کی کوشش کرنا اور غلطی سے بھی کوئی ایسا ویسا جملہ اپنے منہ سے نہ نکالنا جو ہمیں پھنسا دے۔ ورنہ جو چال ہم دشمن پر اُلٹنے میں مصروف ہیں اس کا شکار ہم خود ہی نہ ہو جائیں۔''

اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور کیبن کی طرف لپک گیا۔ میں نے خود کو کیموفلاج کیا اور جنگلی پتوں اور گھنے پودوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا، کیبن کے گرد چکر لگانے لگا، بظاہر میرا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں یونہی اطراف میں گردش کر رہا ہوں۔

جلد ہی مجھے ایک درخت کی جھولتی ہوئی موٹی شاخ پر وہ گھونسلا سا بنا نظر آ گیا جو کیبن کے اس روشندان پر جھکی ہوئی تھی، جس کا رخ کیبن کے وسط میں تھا۔ شاخ کو اس طرح اندر کی طرف جھکا کر گھونسلا بنایا گیا تھا کہ کوئی پرندہ اس طرف نہ آ سکے۔ میں اس درخت پر چڑھا تو مجھے مزید اس کی مضبوطی کا احساس ہوا، گھونسلے کے اندر تنکوں کے بیچ میں باریک فولادی تاروں سے ایک ننھے کیمرے کو فوکس بھی کر رکھا تھا، اس طرح کہ اُسے مرضی کے مطابق حرکت دی جا سکے اور وہ گھونسلا بھی نہ ٹوٹنے پائے، یقیناً یہ کیمرا ایڈوانی کے کسی آدمی نے رات کے کسی ایسے پہر میں نصب کیا ہوگا جب ہم بے خبر سو رہے ہوں گے، یہ تو شکر تھا کہ اس کم بخت نے ہماری باتیں نہیں سُنی تھیں، سنتا بھی کیسے، میں نے اس سلسلے میں غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا تھا، اور نصیر شاہ سے اصل موضوع پر بات کرنے سے پہلے اچھی طرح کیبن کے اطراف کا بھی جائزہ لیا تھا، نیز ہم نے یہ باتیں کیبن کے کونے والے حصے میں بیٹھ کر کی تھیں۔ تاہم اب اس خفیہ کیمرے کی آنکھ کیبن کے اُسی فیصد حصے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

میں اسے چھیڑے بغیر درخت سے نیچے اُتر آیا۔ مجھے احساس تھا کہ میری یہ حرکت مجھے پھنسا بھی سکتی کہ کیا خبر دوسرا کیمرا ادھر ہی کہیں سے اپنی خفیہ آنکھ سے مجھ گھور رہا ہو۔ لیکن ایک تو میں اس کا سدباب ڈارک کیسل سے روانہ ہوتے وقت ہی کر آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ابھی ایک ہی کیمرا نصب کیا گیا تھا۔ دوسرا نصب کرنے کا دشمن کا کیا ارادہ تھا اس سے میں ابھی واقف نہیں تھا مگر مجھ سے یہ بھی چھپا نہ رہتا۔

میں کیبن کے اندر آ گیا۔ نصیر شاہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسی فیصد جگہ چھوڑ کر کیبن کے بقیہ بیس فیصد جگہ کا تعین کیا اور نصیر شاہ کو لے کر اس طرف چلا۔ اب ہم دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے۔

وہ اس خفیہ کیمرے کی وجہ سے خاصا تشویش زدہ سا نظر آ رہا تھا، میں نے اسے حوصلہ دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، جب تک میری ڈارک کیسل میں آوک جاوک جاری رہے گی، میں دشمن کے ہر ایسے ''ٹرپ'' اور ''بوبی ٹرپ'' کو ٹریس کرتا رہوں گا، لیکن ہمیں پھر بھی احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ہوگا۔ میں نے اسے موجودہ صورتِ حالات کے بارے میں بتایا اور پھر ایک ڈراما کرنے کی غرض سے ہم دانستہ کیمرے کی ''آنکھ'' کے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ اب ہماری گفتگو کا لبِ لباب اور ہو گیا تھا۔ یعنی میں اب نصیر شاہ سے ایڈوانی کے منصوبے کے مطابق ہی گفتگو کر

رہا تھا اور اُسے بتا رہا تھا کہ اب ایڈوانی وغیرہ ہماری تلاش سے مایوس ہو چکے ہیں نیز میں نے بھی آنے جانے کا ایک راستہ بنا لیا ہے، جس کے تحت خفیہ راستے سے میں پہلے پورٹ بلیئر اور پھر وہاں سے ممبئی چلا گیا تھا اور اپنے باپ کو اس کام کے لیے رضامند کرلیا ہے، جلد ہی وہ نہ صرف بھاری مشینریز اور آدمیوں کی کھیپ روانہ کرنے والا ہے بلکہ انڈین آرمی کے افسر سے بھی ایک وفد کی صورت میں ملاقات کرکے انہیں، ایڈوانی وغیرہ کے خلاف ریڈ لگانے کا بھی بندوبست کیا جارہا ہے تاکہ ہم یہاں بلاخوف اور آزادی کے ساتھ اپنا ”کام“ جاری رکھ سکیں، وغیرہ۔ اس پر نصیر شاہ نے بھی مصنوعی طور پر مسرت کے اظہار کے ساتھ میری تعریف بھی کی اور ساتھ ہی میرے فرضی باپ کے لیے بھی توصیفی کلمات ادا کیے۔

سب کچھ منصوبے کے مطابق ہورہا تھا۔ ڈی، ایم، ایم (ڈائمنڈ ماؤنٹین مائنز) کا مقام جسے بعد میں ”بونینزا“ (سب سے بڑی نو دریافت شدہ کان) کا نام دے دیا گیا تھا۔ وہاں بیس کیمپ قائم کردیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ نصیر شاہ، باریہہ اور کبیل دادا سمیت اول خیر اور شکیلہ کو وہاں منتقل کردیا۔ ان میں باریہہ کے جاوا قبیلے کے تین ساتھی، تورا کی، سلاسکو اور لوبو بھی تھے، میں انہیں جانچ چکا تھا اور اُنہوں نے مجھ پر بھی مکمل اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ ان میں بیشتر ہندی اُردو جانتے تھے۔ یہ زبانیں سکھانے کا فریضہ بھارتی مسلم تبلیغی جماعتوں نے پہلے سے انجام دے رکھا تھا۔ جو یہاں انہیں اسلامی تعلیمات کے دوران عربی اردو اور تھوڑی بہت ہندی بھی سکھاتے تھے۔

ایک مکمل ٹیم کی صورت میں دشمنوں کے ٹھکانے سے الگ تھلگ مقام پر قدم رکھتے ہی اول خیر اور شکیلہ مجھ سے کھل کر ملے، شکیلہ تو میرے شانے پہ سر رکھے رو ہی پڑی تھی۔ اول خیر کی شرارتی نس پھڑکی اور بولا۔

”نازو (نازک) بی بی! اب یہ آنسو بہانے کا وقت نہیں ہے، تمہاری یہ جذبات نگاری کہیں ہمارے شہزی کاکے کا اتنی محنت اور جان جاکھم میں ڈال کر بنایا ہوا منصوبہ ہی نہ فیل کرڈالے، اس لیے ذرا خود پر کنٹرول کرنا بھی سیکھو۔“ کبیل دادا منہ دبا کر ہنسنے لگا۔ شکیلہ نے غصے بھری نگاہوں سے اول خیر کو گھورا اور پھر مجھ سے الگ ہوکے بولی۔

”شاید قید اور بیگار کاٹتے کاٹتے تمہاری نظروں پہ اثر پڑا ہے، یہاں ہمارے سوا اور کون...... نظر آرہا ہے جو ہم پر شک کرے گا؟“

”دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔“ اول خیر باز آنے والا کب تھا تو چپ رہنے والی شکیلہ بھی نہیں تھی۔

”پہلے محاورے تو صحیح بولنا سیکھ لو...... دیواروں کی آنکھیں نہیں کان ہوتے ہیں۔“

کبیل دادا نے انہیں ٹوکنا چاہا، مگر میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش کردیا۔ میں ان کی نوک جھونک پر مسکرا رہا تھا۔ اتنے عرصے بعد تو اپنے پیارے اور دل وجان سے عزیز دوستوں کا یوں اپناپن دیکھنے کا موقع ملا تھا، اور شاید حالات کی کچھ موافقت بھی تھی کہ ان کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔

”ایک ہی بات ہے، جو دیواریں کان رکھتی ہیں تو آنکھیں بھی رکھتی ہوں گی۔“ اول خیر پیچھے ہٹنے والا نہ تھا۔

”تو پھر منہ بھی رکھتی ہوں گی...... تمہاری طرح، بھاڑ سا......“ شکیلہ بولی۔

”میرا خیال ہے میں تمہیں اب کام کی کچھ باتیں سمجھا دوں۔“ میں نے اپنی مسکراہٹ پر ذرا سنجیدگی کا پرتو چڑھانا ضروری سمجھا تو وہ سب میری طرف متوجہ ہوگئے۔

میں نے ان سب کو ایک بار پھر پیش آئند حالات کے بارے میں بریف کیا اور کچھ ہدایات بھی دیں کہ انہیں یہاں رہتے ہوئے کرنا کیا تھا۔

”اب وسائل سارے دشمن کے ہوں گے اور فائدہ ہم حاصل کریں گے۔“ میں نے آخر میں کہا۔ ”کان کنی کے کام کی جب ٹھیک ٹھاک ابتدا ہوجائے گی تو ہم ایڈوانی اور بلراج سنگھ کا خاتمہ کرڈالیں گے۔ رہے ان کے ساتھی تو وہ سب گنے چنے ہیں، ان سے جنگ کرنا کوئی مشکل نہ ہوگا، یوں بھی ان کی بڑی اور چھوٹی سرکار کے خاتمے کے بعد ہمت جواب دے چکی ہوگی، روپوش ساتھی (ٹشنگرال اور نتالیہ وغیرہ) بھی ہم سے آن ملیں گے، اس کے لیے باریہہ اور سلاسکو میرے ساتھ ان کے خفیہ ٹھکانے پر جائیں گے۔“

بعد میں اول خیر بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگیا تھا۔ باریہہ نے بتایا تھا کہ ان ٹشنگرال والوں کا خفیہ ٹھکانا بونینزا کے مغرب میں اور جزیرے کے تقریباً آخری سرے پر ساحل سمندر کے قرب میں واقع تھا مگر باریہہ کے مطابق یہ طویل سفر سمندر کے راستے سے ساحل کے ساتھ ساتھ بمشکل تین سے چار ناٹیکل میل تھا، وہ ایک کشتی کے ذریعے ہی وہاں تک جایا کرتی تھی۔ اگرچہ اس میں اس کے لیے جان کا بھی بہت رسک رہتا تھا، لیکن اس نے اپنے لیے ایسے حالات موافق کررکھے تھے کہ اُسے کوئی خاص دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ٹشنگرال والوں کے ٹھکانے پر صرف اشد ضرورت کے تحت ہی جاتی تھی۔ ہمارے لیے البتہ کشتی کے راستے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ لیکن ہمیں جیپ کی سہولت حاصل تھی۔ اس راستے کا بھی باریہہ کو علم تھا اور وہی ہماری رہنمائی کررہی تھی۔ جیپ میں ہی ڈرائیو کررہا تھا اور باریہہ میری برابر والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ راستہ مجھے وہی سمجھا رہی تھی۔ جزیرے کی سرد رات اپنے جوبن پر تھی، جزیروں کی فضا بھی ریگستانی موسموں جیسی ہوتی ہے، دن میں گرمی اور راتیں سرد۔ گھنے جنگل اور ناپختہ راستوں پر ہماری جیپ منزل کی جانب گامزن تھی۔ ہمارے پاس جو ہتھیار تھے وہ دشمنوں کے ہی دیے ہوئے تھے۔ باریہہ کو اسلحہ چلانا نہیں آتا تھا مگر اس کے اور سلاسکو کے پاس نیزے اور تیر کمان تھے۔ ترکش ایک تھا جس میں زہریلے تیر بھرے ہوئے تھے۔

میں جیپ مناسب رفتار سے ہی دوڑا رہا تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس بھی بیم نہیں کی تھیں، ذرا فاصلے تک روشنی جاتی کافی تھی، ہمارے اطراف میں تاریک ویرانہ تھا، دائیں جانب پہاڑیوں کے مختصر سلسلے کے ہیولے نما آثار دکھائی دے رہے تھے، بائیں جانب جنگل تھا۔ آسمان پر چاند کہیں دور جھکا ہوا تھا، البتہ تاروں کے ٹمٹماتے جھرمٹ ماحول پر طلسماتی اثر پذیری کیے ہوئے تھے۔

کچھ اور آگے جاکر ہمارے بائیں جانب کا جنگل ہمارے راستے میں آگیا اور جیپ اس کے اندر داخل ہوگئی۔ جیپ پر ہڈ چڑھا ہوا تھا۔ جسے بہ وقت ضرورت فولڈ بھی کیا جاسکتا تھا۔

یہاں سے ہمارا سفر کچھ اور آگے طے ہوا تھا، اس دوران باریہہ نے بتایا کہ ٹشنگرال والوں کی کمین گاہ زیادہ دور نہیں رہی ہے۔ اچانک ہمیں زور کا جھٹکا لگا۔ جیپ کا اگلا ٹائر شاید کسی نسبتاً گہرے کھڈ میں جا پڑا تھا، یہ تو شکر تھا کہ اسی خدشے سے میں نے جیپ کی رفتار کم رکھی تھی۔ مگر یہ کھڈ بڑا واہیات ثابت ہوا تھا، ٹائر اس پر پڑتے ہی پوری جیپ کو یکلخت جام کرگیا تھا اور اسی سبب جیپ کا پچھلا حصہ اُچھلا تھا، ہم چاروں ہی اس کے زوردار جھٹکے کی زد میں آکر تقریباً ایک دوسرے کے اُوپر اُلٹ پلٹ پڑے۔ جیپ بھی اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ میں خود بھی اس اچانک جھٹکے کے باعث اور کچھ باریہہ کے میرے اُوپر پڑنے کے سبب اس زور سے دروازے سے ٹکرا گیا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور میں نصف حد تک لٹک گیا۔ باریہہ نے ہی مجھے بازو سے پکڑا تو میں سیدھا ہوا۔

”اوہ...... بڑا زبردست جھٹکا تھا۔ ساتھیو تم ٹھیک تو ہو ناں......“ میں نے سنبھلتے ہی پوچھا۔ اول خیر اور سلاسکو نے خیریت بتادی۔ جیپ کا انجن بند ہوگیا تھا۔ انجن بند ہوتے ہی ہمارے چہار اطراف میں ایکا ایکی ہی سناٹا طاری ہوگیا تھا۔

میں نے اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی، ایک بار، دوسری اور تیسری مرتبہ کی کوشش میں جیپ کا انجن غرایا اور بیدار ہوگیا۔

”ریورس کر کے ہی اگلا ٹائر گڑھے سے نکلے گا۔“ پیچھے بیٹھے اول خیر نے کہا۔

”ایسا ہی کررہا ہوں۔“ میں نے کہتے ہوئے ریورس گیئر لگایا اور ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جیپ ”فرنٹ وہیل“ تھی حالانکہ عموماً جیپیں فور وہیل یا بیک وہیل ہوتی ہیں۔ اپنی حیرت کو فوراً ہی رفع کرتے ہوئے میں نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ ایک دو بار کے بعد ہی جیپ ایک جھٹکے سے گڑھے سے نکلی اور بیک ہوتی چلی گئی۔ میں نے فوراً بریک پر پاؤں رکھ کر گیئر بدل دیا کہ کہیں عقب میں کسی درخت سے ہی نہ ٹکرا جائے۔ ابھی میں نے گیئر ڈال کر جیپ آگے بڑھائی ہی تھی کہ گولی چلنے کے دھماکے کی آواز اُبھری۔ ہم سب بُری طرح ٹھٹک گئے۔

میں نے فوراً ایکسلیریٹر سے پاؤں ہٹالیا۔ اسی وقت یکے بعد دیگرے دو تین فائرز کی مزید آواز گونجی اور اس کے فوراً ہی بعد برسٹ چلا۔ ہم سب نے غیر ارادی طور پر اپنے سر جھکا لیے تھے اور اب تک کی ہونے والی فائرنگ سے اندازہ ہوچکا تھا، نشانہ ہم نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی میں نے ساتھیوں کو ہتھیاروں سمیت جیپ سے نیچے اُترنے کا کہا اور خود بھی ایسا ہی کیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس بھی میں نے گل کردی تھیں۔

میں نے سب کو جیپ کی آڑ میں ہوجانے کا کہا اور سن گن لینے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اسی رفتار سے سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہوسکتے تھے؟

کچھ سیکنڈوں تک ایک تواتر سے ہونے والی فائرنگ میں کمی آگئی تھی، اور اب اکا دکا ہی فائر ہورہے تھے۔

”دو گروہ آپس میں نبرد آزما لگتے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔

”دوسرا گروہ کہیں ایڈوانی کا نہ ہو...... ایسی صورت میں ہم بھی ان کی نظروں میں آجائیں گے، ہمیں آگے نکل

جانا چاہیے۔'' باربیہ نے مجھ سے پہلے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ اول خیر خاموش تھا۔ اسے زیادہ حالات کا اندازہ نہ تھا۔

''تمہاری بات معقول ہے باربیہ......! لیکن وہ ہمارے راستے میں آسکتے ہیں، بہتر ہوگا کہ پہلے ادھر ہی دبکے رہتے ہوئے دیکھیں ہوتا کیا ہے؟'' میں نے کہا، ساتھ ہی میری متلاشی نظریں گردوپیش کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔

اسی وقت ایک گاڑی کی آواز ابھری، وہ موڑ کاٹ رہی تھی، ایک ثانیے کے لیے اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی ہم پر بھی پڑی تھی، پھر وہ ہماری عقبی سمت والے راستے پر ہولی، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ رک گئی۔

''ہم دیکھ لیے گیے ہیں۔'' معاً اول خیر نے سرسراتی سرگوشی میں کہا اور اس کا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ اسی وقت گاڑی نے پھر موڑ کاٹا تھا اور اب اس کا رخ ہماری طرف ہوتے ہی، اس کی روشنی بھی ہم پر پڑنے لگی۔

''ہوشیار......'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس طرف سرک جاؤ......'' کہتے ہوئے میں جھکے جھکے انداز میں ہی جیپ کی آڑ لیتا ہوا قریب کی جھاڑیوں میں گھس گیا، ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی، مگر بدقسمتی سے سلاسکوان کی نظروں میں آگیا تھا، اسی لیے وہ گاڑی تیزی سے دوڑتی اُچھلتی اسی طرف کو نکل آئی جہاں ہم چھپنے کی کوشش میں تھے۔ ساتھ ہی اُنہوں نے ایک فائر بھی کردیا تھا۔ نشانہ خطا گیا تھا اور سلاسکو نے چھلانگ لگا دی تھی جبکہ گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس کی روشنی چھدری جھاڑیوں کو چیرتی ہوئی ہم پر پڑ رہی تھی جبکہ میں اسے پہچاننے کی کوشش میں تھا کیونکہ یہاں پر کسی بھی گاڑی کی موجودگی کا مطلب یہی تھا کہ وہ ایڈوانی کے ساتھی ہی ہوسکتے تھے اور میرا یہ شبہ درست بھی ثابت ہوا۔ دشمن ٹولے کی تلاش رتن لال ہی کی ذمے داری تھی اور اسی لیے وہ ریاست کی حدود اور اس کے باہر بھی ہر وقت اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ گشت کرتا رہتا تھا۔

وہ جھاڑیوں میں اندھا دھند فائرنگ کرسکتے تھے۔ تاہم میں نے گاڑی کے قریب پہنچتے ہی اسے پہچان لیا، میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا وہ رتن لال کی ہی پک اپ نما گاڑی تھی جس کے عقبی ڈالے میں آٹھ دس مسلح افراد اور اس سے نصف ڈرائیونگ کیبن میں سوار تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ہتھیاروں سمیت اپنے ہاتھ کھڑے کرکے باہر آجاؤ، ورنہ ہم پر یہ لوگ بے دریغ فائر کردیں گے۔''

''مگر...... یہ ہم پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کرسکتے ہیں۔'' باربیہ نے خطرہ ظاہر کیا تو میں بولا۔

''مجھے پہچان لینے کے بعد وہ ایسا نہیں کریں گے، بہ صورت دیگر یہ ہمیں یہاں بھی......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک چیختی ہوئی آواز ابھری۔

''تم سب دیکھ لیے گئے ہو...... ہاتھ کھڑے کرکے سامنے آجاؤ، ورنہ سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا جائے گا۔'' میں اس چلاتی ہوئی آواز کو پہچان گیا تھا، یہ رتن لال تھا۔

ہمیں بالآخر وہی کرنا پڑا تھا جس کا میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ساتھیوں کو مشورہ دیا تھا۔ ہم اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کرکے باہر آگئے۔

''دیال داس! تم......؟ یہاں کررہے ہو؟''

گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں مجھے پہچانتے ہی وہ حیرت سے بولا۔ اس کے چہرے پر اُلجھن کے تاثرات بھی نظر آنے لگے تھے۔

''شکر ہے بھگوان کا، تم نے ہمیں پہچان لیا۔'' میں نے ہاتھ گراتے ہوئے چالاکی سے کہا۔ ''ہم احتیاط کے پیش نظر ہی یہاں چھپے تھے کہ پتا نہیں تمہاری گاڑی کہیں کسی دشمن کے ٹولے کے قبضے میں نہ آچکی ہو یا تم اندھا دھند ہم پر فائر نہ کربیٹھو۔''

''میں بھی تمہاری گاڑی پہچان تو گیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''اور میرے ذہن میں بھی یہی تھا کہ کہیں اس گاڑی میں ساتھیوں کے بجائے دشمن ٹولا نہ ہو۔ یوں بھی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہمارا ایک دشمن ٹولے سے ٹکراؤ ہوچکا ہے۔''

''ہاں! ہم فائرنگ کی آواز پر ہی رک گئے تھے۔'' میں نے بات بنائی۔

''مگر تم لوگ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

ہم پر تنی ہوئی گنیں اب نیچے کرلی گئی تھیں اور میرے ساتھیوں نے اپنے ہاتھ۔

''ہم بیس کیمپ سے آرہے تھے۔ مجھے یہاں ایک دشمن ٹولے کی اطلاع ملی تھی۔''

''اوہ...... تمہیں بھی یہی اطلاع تھی۔'' رتن لال اپنی ٹوپی اُتارتے ہوئے بولا۔

''مگر ہمارا ابھی کسی دشمن ٹولے سے ٹکراؤ نہیں ہوا ہے، تم نے کیا انہیں ختم کرڈالا؟ کس دشمن ٹولے سے تعلق تھا ان لوگوں کا؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شاکا اور کوہارا سے...... بھولا ناتھ بھی ان کے ساتھ مل چکا تھا اور اسی خبیث نے ان سب کو یکجا کیا تھا۔''

''کیا؟ واقعی......؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاکا تو مارا گیا، بھولا ناتھ بھاگنے میں کامیاب ہوگیا ہے، کوہارا اور بھولا ناتھ نے آپس میں گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ البتہ ان کے دو ساتھی ہماری گرفت میں آسکے، کچھ مارے گئے مگر ان میں سے ایک تو خود کو بھارتی انٹیلی جنس کی ایجنٹ بتاتی ہے اور دشمن ٹولے سے انکاری ہے جبکہ دوسری کا اس سے کوئی تعلق نہیں مگر وہ بھی کسی دشمن ٹولے سے تعلق رکھنے سے انکار کرتی ہے جبکہ وہ زخمی بھی ہے۔''

رتن لال نے مجھے بتایا اور بھارتی انٹیلی جنس کی ایجنٹ کے ذکر پر میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں لامحالہ کوریلا کا ہی خیال ابھرا تھا اور پھر کسی اندیشناک خدشے تلے میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

میرے پورے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں، مجھے یوں لگا جیسے اب آن کی آن میں میرا سارا منصوبہ پانی ہونے والا تھا۔

☆☆☆

رتن لال کے اشارے پر جن دو قیدیوں کو رسن بستہ حالت میں انہوں نے گاڑی سے اتار کر میرے روبرو کیا تھا وہ ایک تو میرے خدشے کے مطابق کوریلا تھی مگر دوسری عورت کو دیکھ کر میرا دل جیسے ایک لمحے کو دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔ وہ سوشیلا تھی...... زیادہ زخمی نہیں تھی، اس کی ٹانگ کا زخم شاید خراب ہوگیا تھا، حالانکہ جب وہ میرے ساتھ تھی تو اس کا زخم کچھ بھرنے لگا تھا، مگر شاید بعد میں نامساعد حالات کی وجہ سے ایسا ہوا تھا۔ اسے بیدردی سے سہارا دیا گیا تھا۔

البتہ نہ سوشیلا مجھے پہچان پائی تھی اور نہ ہی کوریلا...... مگر اُس نے اول خیر کو فوراً پہچان لیا تھا۔ میری دھڑکتی ہوئی نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کہ اب کیا بم پھٹتا ہے، مگر شاید وہ ابھی کسی تذبذب کا شکار تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ خاموش رہتی۔ وہ ایک گھاگ ایجنٹ تھی، حالات کا اپنے طور پر جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی شوشہ چھوڑتی۔ اول خیر پر نگاہیں جمانے کے بعد وہ ہم سب کو بھی باری باری تیز سی نگاہوں سے گھورے جارہی تھی۔

تاہم سوشیلا کے سلسلے میں رتن لال نے وضاحت کی تھی کہ وہ کوہارا کی قید میں تھی، وہ یونہی ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی۔

یہ ایک طرح سے سوشیلا کے ساتھ اچھا ہی ہوا تھا، میں سمجھ گیا تھا کہ سوشیلا کسی طرح بھولا ناتھ یا کوہارا کے ہتھے چڑھ گئی ہوگی۔ بعد میں مقابلے کے دوران اس نے موقع جان کر فرار ہونا چاہا ہوگا مگر کوریلا کی طرح وہ بھی رتن لال اور اس کے ساتھیوں کے چُنگل میں آگئی۔ بہرحال سوشیلا کو زندہ دیکھ کر مجھے ازحد خوشی ہوئی تھی، مگر اس کی ٹانگ کا زخم ابھی تک خراب ہی لگتا تھا۔ حالت اس غریب کی بڑی ناگفتہ بہ ہورہی تھی۔ اگرچہ حالت کوریلا کی بھی کچھ کم خراب نہ تھی۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کے علاوہ چہرے پر بھی خراشوں کے نشانات تھے۔

''ان دونوں کو میرے حوالے کردو...... اور تم لوگ واپس لوٹ جاؤ۔'' میں نے رتن لال سے کہا۔ ''تمہیں بھولا ناتھ اور کوہارا کے تعاقب میں جانا چاہیے۔ یہ دونوں ریاست کے خطرناک دشمن ہیں۔ ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''

میری بات پر رتن لال کچھ تذبذب کا شکار سا نظر آنے لگا مگر پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، کوریلا نے رتن لال سے پوچھا۔

''کیا یہ لوگ تمہارے ساتھی ہیں؟''

''شٹ اَپ!'' رتن لال نے غصے سے اسے جھڑکا۔ ''اپنا منہ بند رکھو۔''

''سمجھ تو میں گئی تھی کہ یہ تمہارے ساتھی ہیں مگر مجھے یقین اس لیے نہیں آرہا تھا کہ تمہارے ان ساتھیوں میں تمہارے ہی ایک بڑے دشمن کا قریبی ساتھی بھی موجود ہے۔'' کوریلا نے جیسے دھماکا کرہی دیا۔ اس کی بات رتن لال کو چونکا دینے والی تھی۔

''کک...... کیا بکواس کرنا چاہ رہی ہو تم......؟'' رتن لال کو بالآخر اس کی بات پر توجہ دینا پڑی تھی۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں درمیان میں نہیں بول سکتا تھا، مجھے بھی اس کے اس ''انکشاف'' پر لامحالہ ''چونکنے'' کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ کھل کر بات کرو......؟'' میں نے بھی کوریلا کی طرف دیکھ کر درشت لہجے میں کہا۔

''وہ...... شخص......'' کوریلا نے اپنے چہرے کو اول خیر کی طرف اُٹھاتے ہوئے اشارہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ''اس شخص کا نام اول خیر ہے، اور یہ ہم سب کے ایک خطرناک دشمن شہزاد احمد خان عرف شہزی کا بہت قریبی دوست ہے۔ جو ایک پاکستانی خطرناک ایجنٹ بھی ہے۔''

کوریلا کو اس حقیقت کا اندازہ پوری طرح سے تھا بھی یا نہیں کہ میری اوران کی دشمنی کی کیا نوعیت ہوسکتی تھی، مگر چونکہ اتنا وہ بھی جانتی تھی کہ میں اپنے ان تینوں ساتھیوں کی تلاش میں یہاں کا رخ کیے ہوئے ہوں، تو کیا خبر (اس کے مطابق) میں نے یا میرے ساتھیوں نے کسی قسم کی ان کے ساتھ بھی ساز باز کر رکھی ہو تو اس نے یقیناً بڑی چالاکی سے ہمیں ایک خطرناک ''پاکستانی ایجنٹ'' کا نام دے ڈالا تھا۔

اب کوریلا کے اندازے کی سو فیصد درستی ہی تھی کہ میں اور میرے ساتھی ایڈوانی وغیرہ کے دشمن نمبر ون کی حیثیت رکھتے تھے۔

پس یہی وہ خطرناک اور فیصلہ کن لمحہ تھا جس میں پل کے پل مجھے فوری بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغیر کسی خون خرابے کے اس مشکل اور نازک ترین صورتِ حال سے اس طرح نمٹنا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، کیونکہ میں اب اس ''پوزیشن'' میں تھا کہ میرے لیے خون خرابا نقصان دہ ہی ثابت ہوتا۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ رتن لال کو میں اول خیر کے خلاف کچھ کرنے کا موقع دیتا، میں نے ایک خطرناک اور ''ڈبل گیم'' کھیلتے ہوئے فوراً پلٹ کر اول خیر کو دبوچ لیا اور اسے نہتا کرتے ہی باریہہ اور سلاسکو کو اسے قابو میں رکھنے کا حکم بھی دے ڈالا اور ہکا بکا سے کھڑے رتن لال سے بولا۔

''ایک دشمن کا دوسرے دشمن کے لیے نشاندہی کرنے کے ایک ذرا سے شبہے کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' میرا اشارہ کوریلا اور اول خیر کی طرف تھا۔

''ان دونوں قیدیوں کو اب میرے حوالے کر دو۔ ان دونوں کو آمنے سامنے بٹھا کر پوچھ گچھ کروں گا اور ڈارک کیسل پہنچ کر جنرل صاحب کو بھی اس کی اطلاع دینا ہوگی۔''

رتن لال کے لیے میری بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا تاہم وہ میرے اس طرح متحرک ہونے سے خاصا مطمئن بھی نظر آرہا تھا۔ جیسے میں نے اس کا دردِ سر اپنے سر لے لیا ہو۔ یوں بھی وہ میری اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا کہ آج کل ڈارک کیسل کے دو بڑے اور اہم ترین معاملات میرے ہاتھ میں تھے اور میں بہ خیر و خوبی انہیں نبھا رہا تھا اور کیسے ''نبھا'' رہا تھا یہ صرف میں ہی جانتا تھا یا میرے ساتھی...... مگر یہ بھی سچ تھا کہ یہ نئی تازہ کار صورتِ حالات میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے نہ صرف سنگین حد تک خطرناک ہونے لگی تھی بلکہ میرا سارا منصوبہ بھی دھرا کا دھرارہ جانے والا تھا۔ میں ان دونوں کو ہی جنرل ایڈوانی کے حوالے کسی بھی صورت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سوشیلا کو تو ظاہر ایڈوانی یا بلراج سنگھ دیکھتے ہی گولی مار دیتے، جبکہ کوریلا اول خیر وغیرہ کی نشاندہی کر کے انہیں مروا سکتی تھی۔

لہٰذا مجھے اب کیا کرنا تھا اس کا فیصلہ بھی مجھے فوراً سے پیشتر کرنا تھا۔ صورتِ حال سنگین حد تک مخدوش ہوگئی تھی، جس پر اگرچہ میں نے فوری طور پر قابو تو پا لیا تھا مگر ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

بہر حال ابھی تو سرِ دست میری کھیلی جانے والی ڈبل گیم میں ایک اسکور کا اور اضافہ ہو چلا تھا اور رتن لال سر دھنتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنی راہ پہ ہولیا۔

''تمہارا شکریہ......''

رتن لال اور اس کے ساتھیوں کے جاتے ہی کوریلا نے آہستگی کے ساتھ میرا شکریہ ادا کیا۔ میں جانتا تھا ایسا اس نے کیوں کہا تھا۔ وہ ایک نمبر کی حرافہ، مکار اور خطرناک ایجنٹ تھی۔ بلکہ بلیوتلسی کی باقیات کہا جاتا تو غلط نہ تھا، مگر یہ اصل پیداوار ''را'' کی تھی۔ شکریہ اس نے میرا اسی لیے ادا کیا تھا کہ میں نے اسے رتن لال اور اس کے جنگجو مسلح ساتھیوں سے لے کر اپنی کسٹڈی میں لے لیا تھا۔ اگر میں اول خیر کو بھی گرفت میں نہ لے لیتا تو کوریلا کے ذہن میں شبہ ابھرتا کہ ہم بھی اس کے دشمنوں کے ساتھی ہیں، اور وہ رتن لال سے احتجاج کرتی یا خود کو میرے حوالے کرنے پر پس و پیش سے کام لیتی۔

بھارت کی کوئی بھی خفیہ ایجنسی ہو، ان میں نوجوان اور خوب صورت عورتوں کو آتشیں ہتھیار استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خوب صورتی اور جسمانی حسن و شباب بھی ''یوز ٹو'' کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔

یہی سبب تھا کہ وہ میری طرف دل لبھانے والی نگاہوں سے دیکھ کر مسکرائی بھی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی اپنے حسن کے روایتی جال میں مجھے پھنسا کر کسی طرح بے وقوف بنا کر اپنا مقصد حاصل کر لے گی۔ نہیں جانتی تھی وہ کہ میں اسے کتنا جانتا تھا۔ البتہ سوشیلا بے چاری بہت سراسیمہ اور خوف زدہ تھی۔ ابھی کوریلا کے سامنے میں سوشیلا سے اپنی حقیقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، یوں اگر سوشیلا کو میری حقیقت پتا چل جاتی تو وہ خوشی کے مارے ایک عدد چیخ ضرور اپنے حلق سے خارج کرتی۔

''پلیز......! میرے ہاتھ تو کھول دو ناں...... دیکھ رہے ہو، میں پہلے ہی کس قدر خراب حالت میں ہوں۔''

میں نے کوریلا کے شکریے کا کوئی جواب نہیں دیا اور اس کی بات بھی سنی ان سنی کرتا ہوا جیپ میں سوار ہوگیا۔

مجھے اب شنکرال سے ملاقات کا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تھا۔ وہاں کا سفر ادھورا چھوڑ کر ہم بیس کیمپ کی طرف روانہ ہوگئے۔

کیمپ پہنچ کر تو گبیل دادا اور شکیلہ کو دیکھ کر کوریلا کی حالت اور بھی غیر ہوگئی۔ انہیں دیکھتے ہی وہ حلق کے بل چلّائی۔

''یہ...... یہ دونوں بھی اسی کے ساتھی ہیں، دشمن ہیں یہ تمہارے......''

''بکواس بند کرو اپنی......'' میں نے اسے جھڑکا۔ گبیل دادا اور شکیلہ جو پہلے ہی ہمیں اتنی جلدی لوٹتا پا کر حیران ہو گئے تھے اور پھر اول خیر کو یوں رسن بستہ اور کوریلا کو دیکھ کر تو جیسے سکتے میں آ گئے تھے۔ میں نے انہیں اشارہ کر دیا کہ وہ ابھی خاموش رہیں اور تماشا دیکھیں۔

''م...... میں سچ کہہ رہی ہوں...... یہ......'' کوریلا کا جملہ میرے ایک زوردار تھپڑ نے پورا نہیں کرنے دیا۔ عورتوں پہ اس طرح ہاتھ اُٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا مگر کوریلا کا معاملہ اور تھا۔

میں نے اول خیر کو جکڑ بندوں سے آزاد کیا تو کوریلا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں شکوک و شبہات کے ساتھ ایک طرح کے مخفی خوف کی جھلک بھی اُتری۔ پھر میرے حکم پر کوریلا کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے کیمپ کے دوسرے گوشے میں پہنچا دیا گیا۔ سوشیلا کو میرے کہنے پر فوراً ہی آرام دہ حالات میں بٹھا دیا گیا تھا، میرے اس سلوک سے وہ بے چاری نہیں بلکہ میرے ساتھی بھی حیران ہو رہے تھے، تاہم میں نے محسوس کیا تھا کہ سوشیلا بڑے غور غور سے مجھے تکے جا رہی تھی، وہ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب ہم سب دوسرے اور نسبتاً وسیع گوشے میں موجود تھے۔

سب سے پہلے تو میں نے ساتھیوں کو رونما ہونے والی نئی اور اچانک صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ کس طرح پانسا پلٹتے ہی مجھے اول خیر کو دکھاوے کی خاطر دوست سے قیدی بنانا پڑا تھا۔ اس کے بعد سوشیلا کی طرف متوجہ ہوا۔ اول خیر کی طرح اسے بھی جکڑ بندوں سے آزاد کر دیا گیا تھا اور وہ حیران سی ہو کر مجھے تکنے لگی تھی۔

''سوشیلا......! تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے بہت خوش ہو رہی ہے۔ میں شہزی ہوں...... پہچان لو مجھے...... اچھی طرح......''

میں نے اس بار اپنے سر سے مخصوص وردی والی ٹوپی اُتارتے ہوئے سوشیلا سے اپنی اصل آواز میں کہا تو وہ یہ سنتے ہی جیسے ایک دم سکتے کا شکار ہوگئی۔

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے اس کا سر اپنے شانے سے لگا لیا اور جب اس کا سکتہ ٹوٹا تو وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں اسے دلاسا دینے لگا، دیگر ساتھی حیرت بھری نظروں سے ہماری طرف تکے جا رہے تھے۔ لیکن باریہہ کی آنکھوں میں حیرت سے زیادہ اُلجھن اور کچھ ''اَخذ'' کرنے کے تاثرات نمایاں تھے۔

''خدا کا شکر ہے سوشیلا کہ تم زندہ سلامت ہو لیکن اب حوصلہ رکھو، انشاء اللہ سب ٹھیک ہونے والا ہے۔'' سوشیلا نے اپنا سر ہٹایا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ آنکھیں ہنوز آبدیدہ تھیں، ان کی جھلملاہٹ میں پیش آمدہ حالاتِ دگرگوں کے خار و خس بہتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنا غم ہلکا کر رہی تھی۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''شش...... شہزی! مجھے اپنی کب پروا رہی ہے، خوشی تو مجھے بھی تمہیں زندہ دیکھ کر ہو رہی ہے، میں تو خود کئی مواقع پر موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ دیکھ کر جیتی رہی ہوں اب تک...... فقط ایک ہی آرزو ہے میری کہ اُن مردودوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں پھر موت کا بھی غم نہ ہوگا مجھے......''

''ایسا ہی ہوگا مگر اب مرنے کی باتیں مت کرو، تم زندہ رہوگی اور یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھوگی۔'' میں نے اسے تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ پھر اس کی ٹانگ کے زخم کا معائنہ کیا، باریہہ کو میں نے قریب بلا لیا تھا۔ سوشیلا سے متعلق میں نے انہیں مختصراً الفاظ میں بتا کر ان کی حیرت دور کر دی تھی۔ انہیں بھی سوشیلا کے حالاتِ زندگی جان کر افسوس ہوا تھا، مگر باریہہ نے ایسا کوئی اظہار نہیں کیا۔

''باریہہ! سوشیلا کی ٹانگ کا زخم ران تک خراب ہوگیا ہے۔ تم ایک قبائلی خاتون ہو، ذرا دیکھو اس کا علاج کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟''

باریہہ نے سرسری سا ہی زخم کا معائنہ کیا تھا پھر عام سے لہجے میں بولی۔ ''کچھ جڑی بوٹیوں کا مجھے علم تو ہے، جن کا لیپ ایسے زخموں کو جلد بھر دیتا ہے مگر وہ پودے عام نہیں پائے جاتے، انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

''ہم......'' میں کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر بولا۔ ''آبادی میں جاکر شاید کوئی دوا مل جائے؟''

''یہ ممکن ہے۔'' باریہہ نے آہستگی سے کہا۔

میں نے ایک دنیا دیکھ رکھی تھی۔ یہ بات مجھے بھی فوراً ہی محسوس ہوگئی تھی کہ باریہہ، سوشیلا کے سلسلے میں کوئی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کررہی تھی بلکہ میرا اور اس کا والہانہ پن دیکھ کر میں نے اسے بار بار اپنے ہونٹ سکیڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ مجھے باریہہ کی یہ حرکت اچھی تو نہیں لگی تھی مگر میں نے اسے ابھی ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کے اس عمل سے بے نیازی ہی ظاہر کرتا رہا۔ وہ شاید عورت ہونے کے ناتے کسی جیلسی کا شکار ہورہی تھی جو اس کی غلط فہمی کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ میرا سوشیلا کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔

بہرحال سوشیلا کے زخم کا مداوا مجھے ہی کرنا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے موجودہ حالات کی متوقع سنگینی کے بارے میں سارے ساتھیوں کو آگاہ کیا۔ سوشیلا کو بھی اس عرصے میں کافی حد تک علم ہونے لگا تھا۔

''ہمیں کم از کم کوریلا سے تو جان چھڑا لینی چاہیے۔ ایسی صورت میں یہ ہمارے لیے کم خطرناک ثابت نہ ہوگی۔'' کبیل دادا نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''اسے گولی مار کر ختم کردیا جائے۔''

مقابلے کی بات اور ہوتی ہے مگر اس طرح کوریلا کو قیدی کی حالت میں بیدردی سے گولی کا نشانہ بنانا مجھے قطعی مناسب نہیں لگا، لہٰذا میں نے سرِ دست کوریلا کے موضوع سے ہٹ کر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ابھی ہمیں فوری طور پر رتن لال کو ان دونوں کے سلسلے میں مطمئن کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے سوشیلا اور کوریلا کو ہم ڈارک کیسل لے جاکر ایڈوانی کے سامنے پیش نہیں کرسکتے۔ کوریلا ہماری اصلیت اُسے بتا سکتی تھی، جبکہ سوشیلا کو تو وہاں دیکھتے ہی گولی ماردی جاتی۔''

''آسان حل ہے اس کا۔'' اول خیر بولا۔ ''رتن لال سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی اور نتیجے میں دونوں کو ہی گولی کا نشانہ بنانا پڑا۔''

''یہ بھی مناسب تجویز ہے۔'' میں نے کہا تو شکیلہ بولی۔

''سوشیلا تو چلو ہماری ساتھی کہلائے گی، مگر کوریلا کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ اسے ہم زیادہ دیر قیدی بنا کر یہاں نہیں رکھ سکتے، کیونکہ اس بیس کیمپ میں بلراج اور اس کے ساتھیوں کا بھی آنا جانا لگا رہے گا۔'' شکیلہ کی بات بھی غلط نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''مگر میں اس طرح ایک عورت ذات کو بے بسی کی حالت میں گولی نہیں مار سکتا۔ اس لیے اس کا دوسرا راستہ ذہن میں آنے تک اسے ادھر ہی اور مقید رکھنا ہوگا، اس کے لیے ایک خفیہ گوشہ مختص کردیا جائے۔ اس بیس کیمپ میں مکمل طور پر میرا تصرف ہے، بلراج اور اس کے ساتھی یہاں ویسے بھی کبھی نہیں آسکتے، کیونکہ نصیر شاہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس لیے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے، اتفاق اور بات ہے، مگر اس سچویشن کو سنبھالا جاسکتا ہے، تاہم بونینزا میں کام کی ابتدا ہوتے ہی ہم اپنا اصل مشن شروع کردیں گے۔''

''مگر شنگرال والوں سے تمہارا ایک بار مل لینا ضروری ہوگا شہزی!'' باریہہ نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور بولا۔

''شنگرال وغیرہ کی اہمیت کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے۔ آج تو یہ معاملہ پیش آگیا اس لیے وہاں نہیں جاسکے، کل صبح منہ اندھیرے نکل چلیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد مجھے ڈارک کیسل میں اپنی اصل کارروائی آغاز کرنا ہوگا، ہوسکتا ہے میں کل ہی جنرل ایڈوانی کو جہنم رسید کرڈالوں۔ یہ کام ہوتے ہی شنگرال اور ان کے ساتھیوں کو گرین سگنل دے دیا جائے گا اور وہ دوبارہ اپنی زمین پر اپنا قبضہ جمالیں گے۔ باقی کان کنی کا کام چلتا رہے گا، یہ انہی کی فلاح کا سبب بنے گا، ہم اپنا مشن پورا کرتے ہی آگے کی راہ لیں گے۔''

اس رات ہم بیس کیمپ میں سو گئے۔ صبح جاگتے ہی ہم نے ایک بار پھر اپنی اُدھوری منزل کی راہ لی اور جزیرے کے اس گوشے میں جاپہنچے جہاں شنگرال اور اس کی بہن نتالیہ موجود تھے۔

ان کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے ایک چیتھڑے کا پھریرا بنا کر لکڑی سے جیپ کے بونٹ کے آگے ذرا بلند کرکے باندھ دیا تھا۔ ایسا احتیاط کے پیشِ نظر کیا تھا کہیں ہمیں دشمن سمجھ کر تیروں اور نیزوں کی بوچھاڑ نہ کردی جائے، کیونکہ ایک تو ہم سب جنرل ایڈوانی کے ساتھیوں کی مخصوص وردیوں میں تھے دوسرے جیپ بھی تھی۔ اس بار بھی میرے ہمراہ باریہہ کے علاوہ اول خیر اور سلاسکو تھے۔

ان کی حدود میں پہنچتے ہی ہمارے اردگرد کے ٹیلوں سے آٹھ دس ننگ دھڑنگ جانگلی ہاتھوں میں بھالے اور تیر چڑھائے نمودار ہو گئے، باریہہ نے مجھے جیپ روکنے کا اشارہ کیا اور خود سیٹ سے کھڑے ہوکر اجنبی زبان میں چلاّ کر کچھ بولی تو ایک دم سب نے دائیں بائیں سرک کر ہمیں راستہ دے دیا۔

''چلو۔'' باریہہ نے کہا اور میں نے جیپ آگے بڑھا دی۔ ایک موڑ کاٹ کر جب ہم ایک مختصر سے میدان میں پہنچے تو وہاں مجھے جابجا کھپریل کی ڈھلوانی چھتوں والی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ایسی ہی ایک نسبتاً بڑی چھت والی جھونپڑی کے سامنے باریہہ نے مجھے جیپ روکنے کا کہا اور اسی وقت ایک جانگلی کو میں نے مذکورہ جھونپڑی کے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے جیپ اسی طرف لے جاکر روک دی اور پھر ہم سب نیچے اُتر آئے۔

اسی شخص کے ساتھ دو افراد نمودار ہوئے۔ ایک جوان مرد اور دوسری اس کی ساتھی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ بھی دیگر جادی قبیلے کی عورتوں کی طرح تیز سانولا تھا، مگر چہرے کے نقوش جاذبِ نظر تھے۔ جسم بھی متناسب تھا، آنکھیں بڑی تھیں۔ باریہہ نے ان دونوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ وہی دونوں بہن بھائی شنگرال اور نتالیہ تھے۔ جن کے باپ کو جنرل ایڈوانی نے وحشی قبیلے کلی منجارو کے ساتھ مل کر ہلاک کرڈالا تھا۔

ہم نیچے اُتر آئے۔ باریہہ نے آگے بڑھ کر ان سے میری طرف اشارہ کرکے کچھ کہا تو شنگرال بڑی گرمجوشی کے ساتھ میری جانب بڑھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو ہندی میں مجھ سے مختصراً خیر مقدمی گفتگو کی پھر اپنی بہن نتالیہ سے ملوایا۔ اس کے بعد ہم اندر آکر ایک کھال بچھے فرش پر بیٹھ گئے۔ اندر دو تین خدام موجود تھے۔ انہوں نے ہی ہمارے لیے کچھ کھانے پینے کی اشیا رکھی تھی جو ایک بڑے سے کھلے برتن میں تھی۔ ان میں تازہ پھل، شہد اور بھنے ہوئے گوشت کے پارچے تھے۔ انہیں ''جائنٹ پیس'' کہا جاسکتا تھا۔

میں نے شنگرال سے اب تک کے حالات پر کھل کر گفتگو، جیسے جیسے میری گفتگو اپنے اختتام کو پہنچی، دونوں بہن بھائی مجھ سے ازحد متاثر نظر آنے لگے۔ میں نے انہیں نصیر شاہ کے بارے میں بھی بتایا اور بونینزا نامی ہیروں کی اس کان کے متعلق بھی کہ بہت جلد جادا قبیلے کی تقدیر بدلنے والی ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی قسم کی جلد بازی نہ کی جائے۔

''میں بہت جلد جنرل ایڈوانی کا خاتمہ کرنے والا ہوں، مگر میں چاہتا ہوں اس سے پہلے اس کا قریبی ساتھی بلراج سنگھ وہ سارے وسائل لے کر یہاں پہنچ جائے، تاکہ کان کی کھدائی کا کام شروع ہوسکے، اس کے بعد یہ سب تمہارے اور جادا قبیلے کے ہاتھ میں سونپ دیا جائے گا۔ مگر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تمہیں بھی تیار رہنا ہوگا۔''

ایک لمحہ توقف کے بعد میں بولا۔ ''تم اپنے جنگجو ساتھیوں کو تیار رکھنا اور چوکنا بھی رہنا۔ میری کوشش ہوگی کہ بغیر کسی ہنگامے کے جنرل ایڈوانی کو ہلاک کرنے کے بعد میں اس کی موت کو عارضی مدت کے لیے راز میں رکھوں اور تب تک اس کا کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ڈارک کیسل پر قبضہ جمالوں۔''

''جنرل کی موت کے بعد ہمارے ازلی دشمن کلی منجارین سے جنگ ناگزیر ہوگی ہماری۔'' شنگرال نے کہا۔ ''مگر اب ان سے بھی مقابلہ کرنے کے لیے ہم تیار بیٹھے ہیں۔''

شنگرال کی اس بات پر میں نے کہا۔ ''کلی منجارین کا ٹھکانا کس طرف ہے؟''

''ان موذیوں کا ٹھکانا کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ بنجاروں اور قافلوں کی صورت میں رہتے ہیں، ان کی نفری تعداد بھی زیادہ نہیں ہے، یہ تو اس مردود جنرل ایڈوانی کی وجہ سے اتنی طاقت پکڑنے لگے ہیں۔'' شنگرال نے کہا تو اس کی بہن نتالیہ بھی نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

غرقِ محبت

''کب تک مجھ کو بھولو گے!''

چاہتوں کا بھیدوں بھرا یہ سوال اسے حال سے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اس نے محبوب کی آہٹوں پر کان اور راہوں میں پلکیں بچھائے زندگی تمام کردی مگر...... فاصلوں میں کمی نہ آئی۔ ابھی تو زندگی کی تلاش جاری تھی کہ اچانک اس انداز میں رقصِ اجل شروع ہوا کہ وہ چاہتوں کے مدفن پر حسرتوں کے پھول چڑھانے پر مجبور ہوگیا۔

جون 2017ء کے شمارے میں سسپنس
کے آخری صفحات پر جادوئی انداز لیے......
محبوب قلمکار **طاہر جاوید مغل** کی چونکا
دینے والی سحرانگیز طویل داستان آپ کی توجہ کی منتظر

''ان کلی منجارین نے ہمارے باپ کو قتل کیا اور ہماری زمین پر دشمنوں کی مدد سے قبضہ جمایا۔ ان سے ہم اب بھی نمٹنا اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہماری عسکری قوت ہمارے ساتھ ہے۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''باریہہ کے علاوہ میرے اور ساتھی بھی تم سے رابطے میں رہیں گے۔ وقت کم ہے اور جنگ بھاری ہے۔ میں اب چلوں گا، مگر تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ جب تک میری طرف سے تم لوگوں کو کوئی اشارہ نہ ملے، تب تک کوئی جلد بازی نہیں کرو گے، ورنہ ہماری جانیں داؤ پر لگ جائیں گی اور میں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ خاک ہو جائے گا۔''

دونوں بہن بھائیوں نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میرے اشارے کے بغیر کچھ بھی نہیں کریں گے۔ میں نے رخصت ہوتے وقت شنگرال سے پوچھا۔

''یہاں تمہارے جنگجوں ساتھیوں کی کتنی تعداد ہے؟''

''پہلے کم تھی، اب زیادہ ہو گئی ہے۔'' شنگرال کے بجائے نتالیہ نے جواب دیا۔ ''باریہہ نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر چن چن کر ایسے لوگ یہاں خفیہ طور پر بھیجے تھے جو جنگ کا جذبہ اپنے اندر رکھتے تھے۔''

''تمہارا مطلب اُن لوگوں سے تو نہیں ہے، جنہیں ایڈوانی نے تمہاری ہی بستی میں محبوس اور قیدی بنا رکھا ہے؟ جو درحقیقت تمہارے ہی ساتھی ہیں؟''

''ہاں! میں انہی کی بات کر رہی ہوں۔''

''اوہ...... پھر تو واقعی باریہہ نے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔'' میں نے باریہہ کی تعریف کی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ باریہہ نے صرف اپنی جان ہی داؤ پر لگا کر یہ جان لیوا کام انجام نہیں دیا تھا بلکہ اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی تھی۔

اس کے بعد ہم چاروں بیس کیمپ لوٹ آئے۔

''او...... خیر کا کے......! مجھے تو تُو بھی کسی جنگی جرنیل سے کم نہیں لگتا...... بڑی زبردست منصوبہ بندی کی ہے تُو نے......'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس دور دراز کے جزیرے میں بیک وقت وحشی قبائل اور جدید اسلحہ سے لیس جنرل ایڈوانی جیسے خبیث اور طاقت ور دشمنوں کے خلاف تو نے بڑا جال بچھا ڈالا ہے، شطرنج کی ایک پوری بساط بچھا دی ہے، مگر اب مہرے سرکانے کی دیر ہے۔''

''مہرے سرکا چکا ہوں میں اول خیر!'' میں نے اس کی بات پر کہا۔ ''اب بس مات دینے کی دیر ہے۔''

''او...... خیرا!'' وہ دھیرے سے بولا۔

اسی وقت میرے کالر میں اڑسے ہوئے ٹرانسمیٹر کی بپ کی آواز ابھری۔ میں چونکا۔

''یس! دیال داس اسپیکنگ......''

''سر! بلراج سنگھ آ چکے ہیں۔ آپ نے اُن دونوں قیدیوں کو ابھی تک ڈارک کیسل نہیں پہنچایا؟'' اس کی بات پر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، جلدی سے بولا۔

''میں ان سے کچھ ضروری پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ ابھی میں نے اتنی جلدی انہیں ڈارک کیسل پہنچانا ضروری نہیں سمجھا تھا، کیوں؟ ویسے خیریت تو ہے ناں......؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''سر! آپ کے شاید علم میں نہیں...... اس بات پر چھوٹی سرکار (بلراج سنگھ) ناراض ہو سکتے ہیں۔ وہ بہت جلد کارنر میٹنگ بلوانے والے ہیں۔''

''او کے، تمہیں چنتا کرنے کی ضرورت نہیں، میں انہیں رپورٹ میں مطمئن کروں گا۔''

''جیسی آپ کی مرضی جناب! میں نے تو اپنا کام کر دیا، اب آپ جانیں اور چھوٹی سرکار، اٹس اوور......''

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچنے لگا۔ میری پیشانی پر ان گنت سلوٹوں کا جال سا پھیل گیا تھا۔ اسی وقت کبیل دادا اور شکیلہ بھی وہاں آن موجود ہوئے۔

''کیا بات ہے؟ کوئی گڑبڑ ہو گئی شہزی؟'' کبیل دادا نے غور سے میرا چہرہ تکتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اسے رتن لال کی کال سے متعلق بتا دیا۔ جسے سن کر اول خیر اور شکیلہ تو پریشان نظر آنے لگے تھے جبکہ کبیل دادا کچھ سوچنے میں محو ہو گیا تھا۔ تب میں نے ہی کہا۔

''اس کا ایک ہی حل مجھے سمجھ میں آتا ہے۔ بتا دوں گا کہ دونوں قیدی فرار ہونے کی کوشش میں شوٹ کر دیے گئے۔''

کبیل دادا نے میری بات فوراً ہی رد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت زیادہ اوور کانفیڈنس کا شکار ہو رہے ہو شہزادے! اس میں تمہارا نہیں بلکہ پے در پے کامیاب ہونے والی تمہاری پلاننگ کا زیادہ دخل ہے اور ایسے ہی مواقع پر میں تمہارے جیسا آدمی بھی مار کھا جاتا ہے۔''

''ہمیں اسی رات رتن لال کو اس کے ساتھیوں سمیت جہنم واصل کر دینا چاہیے تھا۔'' اول خیر بولا۔

''یہ اتنا آسان نہ ہوتا۔ اچھی خاصی لڑائی لڑنا پڑتی ہمیں۔ بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ ہوتا اس میں......'' باریہہ بھی وہاں آ گئی تھی اور اس نے بھی سب سن لیا تھا۔

''بلراج اتنا سیدھا نہیں ہے کہ وہ تمہاری یہ بات آسانی سے مان لے گا۔''

''قیدیوں والی اڑچن اب ہمارے گلے پڑتی نظر آ رہی ہے، اسے فیس کرنا ہی ہوگا۔'' کبیل دادا بولا۔

''کوئی چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے ہی میں نے ایسا کہا تھا...... کہ مجھے بلراج سے اس ضمن میں کیا کہنا ہے۔'' میں نے اپنی پہلی والی بات کے حوالے سے کہا۔

''تو پھر اس کارنر میٹنگ کو اٹینڈ کرنے کے لیے تمہیں اکیلے ڈارک کیسل نہیں جانا چاہیے۔'' کبیل دادا بولا تو میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ لہجے میں آگے بولا۔ ''شہزی! تمہیں اب خود کو ذہنی طور پر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ ہم چاروں تمہارے ساتھ چلیں گے۔ میٹنگ میں تو خیر ہمیں شرکت کی اجازت نہیں ہوگی، مگر ہم وہیں کسی کمرے میں موجود رہیں گے، یوں بھی تمہارے ساتھ ہوں گے تو کون ہمیں ڈارک کیسل میں داخل ہونے سے روکے گا؟''

''ہاں! یہ تو ہے...... مگر یار کبیل! میرا نہیں خیال کہ بلراج اتنی سی بات پر مجھ سے ایک دم ناراض ہو جائے گا اور گولی مارنے کی کوشش کرے گا، کیونکہ میں ان کے بونینزا والے میگا پروجیکٹ میں ایک اہم کردار ادا کر رہا ہوں۔''

میری بات پر کبیل دادا ٹھٹھا مار کے ہنسا۔

''میں نے کب کہا کہ وہ تمہیں وہیں کھڑے کھڑے گولی مار دے گا۔ اس کے دل میں شک پیدا ہو جائے گا تمہاری طرف سے۔ نصیر شاہ کی پلاننگ کے تحت بونینزا پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا گیا ہے۔ جس کی دریافت کی نشاندہی کی جا چکی ہے، دیگر ماہر مائننگ انجینئرز کی ٹیم نے اس پروجیکٹ کو ٹریس کر لیا ہوگا۔ لیکن پھر بھی بلراج نے تمہیں موقع دینا چاہا بھی تو زیادہ سے زیادہ ایک دن کا موقع دے گا۔ پھر در پردہ ہم سب کی قبریں کھودنا شروع کر دے گا۔''

کبیل دادا کے متوقع ہولناک انکشاف کو رد کرنے کی کوئی بھی وہاں جرأت نہ کر سکا۔ ہم سب کو ایک گمبھیر سی چپ کھا گئی تھی۔ عین آخری لمحات میں ساری اسکیم فیل ہوتی نظر آ رہی تھی۔

بالآخر میرے اور کبیل دادا کی مشترکہ مشاورت کے تحت یہی طے پایا کہ میرے ساتھ میرے یہ چاروں مذکورہ ساتھی بھی ہوں گے، جو وہاں موجود رہیں گے، کسی بھی قسم کے ممکنہ اور فوری خطرے سے نمٹنے کے لیے ہم سب حرکت میں آ جائیں گے۔ بلراج کو یہی بتانا پڑے گا کہ میں نے پوچھ گچھ کے لیے دونوں قیدیوں کو اپنے پاس رکھا ہوا تھا، ابھی اس سے یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ ان دونوں قیدیوں کو فی الحال میری ہی دسترس میں رہنے دیتا، یہ امکان کبیل دادا کا تھا، دوسرا امکان یہ تھا کہ بلراج ان دونوں قیدیوں (کوریلا اور سوشیلا) کو پیش کرنے کا حکم دیتا تب مشکل پیش آ سکتی تھی، لہٰذا تب ہی اچانک بیس کیمپ میں موجود سلاسکو ہم سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ کر کے بتائے گا کہ دونوں قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور وہ اور تورک ان کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میرا سگنل ملتے ہی تورک نے اسی وقت میٹنگ کی موجودگی میں ہی یہ کال مجھے کرنا تھی۔ اس کے بعد میں حرکت میں آ جاؤں گا اور بعد میں بلراج سے یہ کہنے کا ازخود ''گراؤنڈ'' بن جائے گا کہ دونوں قیدیوں کو بالآخر گولی مار دی گئی۔

کبیل دادا کے اس مشورے پر مجھ سمیت سب نے صاد کیا تھا۔ بہرحال اب تخت تھا یا تختہ...... حالات کو فیس اَپ کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

بلراج سنگھ کان کنی سے متعلق بھاری مشینریز پہنچا چکا تھا۔ بونینزا کی سمت جانے والی سڑک اور عارضی ائراسٹرپ ہنگامی بنیادوں پر تیار کی جا چکی تھی۔ ایک سی ون پلین، انجینئرز اور کان کنوں کی پوری ٹیم سوار کرا کے لایا تھا جبکہ دو عدد اوٹرز طیاروں میں بھاری مشینریز تھیں۔ ان میں دو بھاری اور حجم میں بڑے بلڈوزرز کو بڑے بڑے پیراشوٹس کے ذریعے بونینزا کے بلند پہاڑی علاقے میں اُتارا گیا تھا، کیونکہ وہاں تک کا علاقہ دشوار گزار تھا اور سڑک بھی وہاں تک لے جانا ممکن نہ تھی۔

اس کے اگلے دن بلراج نے ڈارک کیسل کے ایک کمرے میں کارنر میٹنگ بلا لی، جس میں میرے اور شلپا سمیت، رتن لال، سچانند اور تین چار دوسرے اہم ساتھی شریک تھے۔ جبکہ کبیل دادا اور اول خیر وغیرہ دوسرے کمرے میں موجود کسی بھی قسم کی اچانک اور خطرناک متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے ''چوکنا'' بیٹھے تھے۔

سب بلراج سنگھ کے ان دو دن کی غیر موجودگی میں کیے گئے کاموں میں اُسے بریفنگ دینے لگے۔ مگر جب رتن لال اُس رات والے اپنے اور سے جی کو ہارا کے بھولا ناتھ

سمیت ٹکراؤ کے متعلق بلراج سنگھ کو رپورٹ دینے لگا تو میرا دل سینے میں انجانے خدشات کے باعث تیزی سے دھڑکنے لگا۔

بلراج کرید کرید کر ان دونوں قیدیوں سے متعلق رتن لال سے پوچھنے لگا تو اس نے میری جانب اشارہ کرکے کہا۔

’’سر! اس سے آگے کی رپورٹ آپ کو دیال داس ہی دیں گے، کیونکہ وہ دونوں قیدی خواتین ان کے کہنے پر ان کے ہی حوالے کردی گئی تھیں۔‘‘

یہاں مجھے بلاتاخیر اور پورے اعتماد کے ساتھ بلراج سنگھ جیسے گھاگ آدمی کو اپنی اس بارے میں رپورٹ پیش کرنا تھی۔ لہٰذا میں نے پہلے تو دانستہ گھما پھرا کر بات کرتے ہوئے موضوع کو نصیر شاہ اور بیس کیمپ کی طرف موڑنا چاہا تو بلراج سنگھ کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

’’وہ مجھے سب معلوم ہو چکا ہے، دیال داس! مجھے اب صرف ان دونوں قیدیوں کے بارے میں بتاؤ...... جو رتن لال نے تمہارے کہنے پر حوالے کردیے تھے۔‘‘

’’وہ میرے ہی قبضے میں ہیں اب تک...... مگر......‘‘ یہ کہتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

’’مگر کیا......؟ تم نے انہیں پہلی فرصت میں ڈارک کیسل کیوں نہیں پہنچایا؟‘‘ اس نے میری بات کاٹی۔

’’میں وہی بتانے لگا ہوں جناب!‘‘ میں نے جلدی سے کہا۔ ’’چونکہ یہ دونوں قیدی ہمارے دشمن ٹولوں سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ ان سے کچھ ضروری پوچھ گچھ کرلی جائے۔‘‘

’’یہ پوچھ گچھ ان سے تم یہاں بھی لاکر کر سکتے تھے؟‘‘ اس نے کہا۔

’’وہاں کرنے میں، میں نے کوئی عار نہیں سمجھا تھا، کیونکہ میں نے ان کے مفرور ساتھیوں کے خلاف فوری ایکشن لینا تھا۔‘‘

’’مگر رتن لال کے مطابق ان میں سے ایک قیدی عورت خود کو ان کا ساتھی سمجھنے کے بجائے قیدی ہی کہنے پر بضد تھی۔ یہ کیا معاملہ تھا؟‘‘ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا کیونکہ وہ سوشیلا کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا اور تب ہی ایک نکتہ میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں سوشیلا نے رتن لال کو اپنا نام نہ بتادیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔

’’ویسے اس کا نام کیا تھا؟‘‘ بلراج نے یہ سوال میرے بجائے رتن لال سے پوچھا تو میں دھڑکتے دل سے یہی دعا کرنے لگا کہ کاش سوشیلا نے اپنا نام نہ بتایا ہو۔ میری نظریں رتن لال پر جم گئیں۔

’’سوشیلا......‘‘ رتن لال نے نام بتایا اور پھر جیسے ایٹم بم پھٹ پڑا۔ بلراج سنگھ اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔

’’کک...... کیا نام بتایا تم نے...... سس...... سوشیلا......؟‘‘

’’جی سر بالکل یہی نام بتایا تھا۔‘‘ رتن لال نے سر ہلایا۔ میرا ہاتھ اپنی بیلٹ میں اڑسے ہوئے پستول کی طرف رینگ گیا۔

’’اس کا حلیہ بتاؤ...... جلدی۔‘‘ وہ حلق کے بل چیخا۔

رتن لال نے سوشیلا کا حلیہ بتایا تو وہ بولا۔ ’’وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ ان کی قیدی بھی ہوسکتی ہے اور ساتھی بھی...... اس کا مطلب ہے وہ مردود شہزی بھی ان کے ساتھ ہوگا......‘‘ بلراج خود کلامیہ بڑبڑایا اور اسی وقت حکم جاری کردیا کہ بیس کیمپ روانہ ہوا جائے، سوشیلا ہمارا بہت اہم شکار ہے۔ چلو، ابھی بیس کیمپ...... ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے پائے۔ سب ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس وقت ان سب کا بیس کیمپ جانا میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے خطرے سے خالی نہ تھا اور سارے منصوبے کا بھی افشائے راز ہونا یقینی امر ہوتا۔ کیونکہ وہاں سوشیلا ہی نہیں کوریلا بھی تھی اور کوریلا ہماری حقیقت جان چکی تھی۔

’’سر! اتنی جلدی نہ کیجیے...... کیونکہ وہاں نصیر شاہ......‘‘

’’بھاڑ میں گیا اب نصیر شاہ......‘‘ بلراج میری بات کاٹ کر جنونانی لہجے میں بولا۔

’’ہم نے جتنا اُس سے کام لینا تھا لے لیا، اب باقی کام اُس سے گن کی نوک پر لیں گے مگر سوشیلا سے میں خود ابھی جاکر ملوں گا۔‘‘

بلراج زخمی شیر کی طرح دہاڑے جارہا تھا اور اب میرے لیے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ جو کچھ کرنا تھا ابھی اور اسی وقت کرنا تھا۔ میرے اندر کوئی چیخ چیخ کر ایک ہی گردان کیے جارہا تھا۔

’’اب نہیں...... تو کبھی نہیں...... اب نہیں...... تو کبھی نہیں......‘‘

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گواہی

جمال دستی

سچ اور جھوٹ کا تمام تر دارومدار ملزم کے بیان پر ہوتا ہے... بیان کی کڑی ہی ملزم کو مجرم ٹھہراتی ہے... ایک سیدھے سادے نوجوان کی دوراندیشی جو پولیس کو بیان دینے کا فیصلہ کر بیٹھا...

سراغرسی پر مبنی ایک مشاہداتی تحریر......

’’میں نائٹ شفٹ میں کام کرتی ہوں۔‘‘ پیٹریشیا نے بتایا۔ ’’آج صبح جب میں گھر واپس پہنچی تو میں نے اپنا پچھلا دروازہ کھلا ہوا پایا اور میری جیولری کا بکس غائب تھا۔‘‘

سراغ رساں گریسی نے موقع کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مکان کے عقبی دروازے کو لات مار کر توڑا گیا تھا اور

آوارہ گرد

قسط: 37

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جونگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جونگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اوران دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کایا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی۔ کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ”کلی منجارو“ پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اڑدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی مجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا یا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے گروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مگر شہزی کا ایک امتحان ابھی باقی تھا۔ ایڈوانی اور بلراج، شہزی سے کوئی اہم کام لینا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے منصوبے کے تحت شہزی کو بے ہوش کر کے ایک قید خانے میں پہنچا دیا جاتا ہے جہاں شہزی کو نصیر شاہ کو قابو کرنا تھا جو ہیروں کی کان دریافت کر چکا تھا اور ایڈوانی کے راستے کی بڑی رکاوٹ تھا مگر شہزی، نصیر شاہ سے مل کر ایڈوانی کے خلاف ڈبل گیم کھیلنے والا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے اعصاب بری طرح چیخ رہے تھے۔ رگوں میں سنسناہٹ اُترنے لگی تھی اور دوڑتا ہوا لہو لاوا بن کر اچھلنے لگا تھا۔

کس وقت اور کب کیا کرنا ہے، بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ حقیقت بھی گمان لگتی ہے...... اس وقت؟ یہ سب فطری بھی محسوس ہو اور غیر فطری بھی۔ گویا...... ”فیکٹ اینڈ پرفیکٹ“ اُصول کے تحت اس سنگین اور جان لیوا خطرناک صورتِ حالات میں کب اور کیسا قدم اُٹھانا چاہیے، میں اسی شش و پنج میں تھا۔

میں نے بلراج سنگھ کے حکم کے سامنے فوراً چپ سادھ لی تھی۔ وہ چلا چلا کر گاڑی نکالنے اور ہمیں ساتھ چلنے کے احکامات صادر کر رہا تھا۔ اسی وقت میں نے موقع تاک کر، سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فوراً بیس کیمپ میں موجود تورک کو اپنے ٹرانسمیٹر سے سگنل دے دیا۔

ڈراما در ڈرامے کا ایک اور ”ایکٹ“ شروع ہونے لگا تھا، اب اس کا کلائمیکس دیکھنا تھا کیسا ہوتا ہے۔

جب تک ہم عمارت سے نکل کر باہر کھڑی جیپ میں سوار ہوئے، اچانک میرے کالر پر اٹکے ہوئے ٹرانسمیٹر سے بپ کی آواز اُبھری۔

”سر! بیس کیمپ سے ایک ساتھی کی کال آرہی ہے، آپ کا حکم ہو تو اسے اٹینڈ کرلوں؟“

میں نے دانستہ بلراج سنگھ سے مودبانہ انداز میں یہ

[illegible] ظاہری خیال کیا تاکہ کچھ حقیقت کا گمان ہو سکے۔

پل کے پل مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ ”کاؤنٹ [illegible]“ شروع ہوچکی ہے۔ اب کسی بھی وقت ایٹم بم پھٹنے [illegible] آر یا پار......

”ترنت کرو......“ وہ کھرکھراتی آواز میں بولا۔ ”[illegible]...... انہیں ہرگز یہ نہ بتانا کہ ہم لوگ وہاں پہنچ رہے [illegible] کیونکہ ہماری آمد ایک طرح سے بیس کیمپ میں ریڈ کا [illegible] رکھتی ہے۔“

”اوکے سر!“ میں نے اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پہ قابو رکھتے ہوئے کہا اور کال اٹینڈ کرلی۔

”او...... نو...... کک...... کب اور کیسے ہوا یہ سب......؟ کیا؟ دونوں قیدیوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ پھر...... او...... ہلاک کر دیے گئے؟ پوری تفصیل بتاؤ۔“ میں نے کہا اور کن انکھیوں سے اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر بیٹھے ہوئے بلراج کی طرف بھی دیکھا کہ اس پر اس اچانک جھوٹی خبر کا کیا اثر ہوتا ہے۔

میرے منہ سے یہ سب سن کر وہ اپنی سیٹ سے یوں اُچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ میں اس کے بالکل عقب میں سیٹ پر بیٹھا تھا اور میرے ساتھ شلپا بیٹھی تھی، اس کے برابر میں سچانند اور بالکل آخری کی نشستوں پر رتن لال اور دو مسلح افراد براجمان تھے۔

”کک...... کیا ہوا ہے وہاں؟“

بلراج نے غراتی ہوئی آواز میں اپنا سر گھما کے میری طرف دیکھا اور ساتھ ہی اس نے ڈرائیور کو جیپ روکنے کا بھی اشارہ کیا تھا۔ جیپ ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس کی محدود فضا میں اچانک ہی خاموشی طاری ہوگئی۔

”سس...... سر! اُن دونوں قیدیوں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہاں موجود ساتھیوں نے دونوں کو فرار ہوتے ہوئے گولیوں کا نشانہ......“

میری بات حلق میں ہی اٹک گئی۔ کیونکہ اسی وقت بلراج کے منہ سے خونخوار انداز کی وحشیانہ غراہٹ ابھری اور پھر میں نے اس کا ایک ہاتھ حرکت میں آتا محسوس کیا، دوسرے ہی لمحے اس نے ایک لمبی نال والا پستول نکال کر میری پیشانی سے لگا دیا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔

”کون ہو تم......؟ اور کس مقصد کے تحت ہم میں شامل ہوئے ہو؟ شاید میں نے تم پر اندھا وشواش کر کے زندگی کی بھیانک غلطی کر ڈالی ہے۔“

اس کا یہ رویّہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا، کیونکہ اب میں اسے زیادہ دیر بہلا نہیں سکتا تھا۔ بالآخر وہی ہوا جس کا وسوسہ میرے اندر پہلے ہی سے پکتا رہا تھا۔

مگر میں نے حالات کو سنبھالا دینے کی کوشش میں کوئی جارحانہ موڈ اختیار کیے بغیر دانستہ ہکلاتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”سس...... سر! ای ی...... یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”نیچے اُترو تم۔“ بلراج دہاڑا اور اپنی طرف کے دروازے کو ایک زوردار لات رسید کر کے اسے کھولتے ہی نیچے اُتر گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی ہم سب بھی اُتر آئے۔

”اسے نہتا کردو......“

جیپ سے باہر آکر بلراج نے بدستور مجھ پر وہ بھیانک نال والا پستول تانے ہوئے تحکمانہ کہا۔ سچانند اور رتن لال چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے۔

ابھی ہم ڈارک کیسل کی حدود میں ہی تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں اندر موجود چاروں ساتھی مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔

مجھے نہتا کر دیا گیا اور پھر دو مسلح افراد نے مجھے گرفت میں لے لیا۔ میں ابھی تک حیرت آمیز خوف زدہ ہونے کی ایکٹنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ بلراج نے بیس کیمپ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

اس موجودہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال سے شلپا بھی پریشان اور بری طرح اُلجھی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

ہم سب ڈارک کیسل کے مرکزی گیٹ کے سامنے احاطے پر موجود تھے۔ بلراج نے اندر جانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے مجھ پر اپنا پستول تان کے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

”تمہارا چہرہ، انداز و اطوار ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے مجھے مگر تمہارے کارنامے دیکھتے ہوئے میں نے ان پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور ادھر ہی شاید میں مار کھا گیا۔“ وہ اب کی بار اپنی بے رحمی ٹپکاتی آنکھوں کو سکیڑ سکیڑ کر مجھے غور سے تکے جا رہا تھا۔ ”یہ ٹوپی اُتارو اور اپنا چہرہ سیدھا کر کے میری طرف دیکھو......“

اس کا آخری جملہ سننے کے بعد جو تھوڑی بہت اُمید تھی، وہ ختم ہو چلی تھی۔ میرے سر سے ٹوپی اُتاری گئی اور جب میں نے سامنے کھڑے بلراج کے چہرے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ میرا بظاہر یک ٹک سا تنا کھڑا وجود اندر سے کسی خوابیدہ آتش فشاں کے مانند بھڑکنے لگا تھا۔ جو کسی وقت بھی جوالا مکھی بن کے پھٹنے کے قریب تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں پستول تھامے ہوئے چند قدم میرے اور قریب آگیا۔ پھر میری گردن میں ایک ہاتھ ڈال کر میرا چہرہ اپنے چہرے کے بالکل قریب کرلیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اسے ایک زبردست شاک کی کیفیت میں بدکتے دیکھا۔

وہ ایک دم مجھ سے یوں دور ہٹتا چلا گیا جیسے اس نے میرے اندر کی بھڑکتی آگ کی حدت کو محسوس کرلیا ہو۔ وہ کچھ ایسے ی خوف زدہ اور جوشِ غیظ تلے ملے جلے تاثرات لیے یک م مجھ سے چند قدم پیچھے ہٹ کر دور ہو گیا۔

”شش...... شہزی...... تت...... تم شہزی ہو...... یرے دشمن نمبر ایک......“

وہ جنونانہ انداز میں چلّایا اور اسی وقت اس کا پستول الا ہاتھ میری طرف اُٹھتا چلا گیا، پھر اس سے پہلے کہ میں وئی حرکت کرتا ”ڈز“ کی آواز سے گولی چل چکی تھی۔

☆☆☆

بلراج سنگھ مجھے پہچانتے ہی اسی وقت گولی مارنے کا رادہ رکھتا تھا مگر اچانک ہی نامعلوم سمت سے فائر کی جانے الی گولی نے اس کا پستول والا ہاتھ زخمی کرڈالا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا، جبکہ خود بلراج سنگھ ختا ہوا بے اختیار چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔

ابھی ہم سب حیرت زدہ کھڑے تھے کہ دفعتاً گولیوں ں خوفناک تڑتڑاہٹ ابھری اور مجھے دائیں بائیں سے قابو لیے بلراج کے اسلحہ بدست ساتھی کریہہ انگیز چیخیں مار کر رتے چلے گئے۔ تب ہی میں نے ڈارک کیسل کی دو قریبی وٹی بُرجیوں میں سے ایک کی آڑ سے کبیل دادا کی جھلک ھی اور دوسری آڑ سے اول خیر اور شکیلہ کو متحرک دیکھا۔ اج پر گولی غالباً کبیل دادا نے ہی چلائی تھی جبکہ باقیوں اول خیر اور شکیلہ نے۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی میرے اندر ابلتا ہوا آتش فشاں ا اُگلنے لگا اور میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں بجلی دوڑ گئی۔ ں نے سچانند اور رتن لال پر کسی زخمی شیر کی طرح جھپٹا مارا۔ ے کے سینے پر میری زوردار لات پڑی اور دوسرے کے ے پر گھونسا۔ وہ دونوں ہی کراہ خارج کرتے ہوئے ی کی طرف اُلٹ گئے۔ میں نے اسی وقت بلراج سنگھ کی ب جست لگائی جو سنبھلتے ہی اپنے گرے ہوئے پستول کی ف لپکا تھا، جیسے ہی اس کا دوسرا ہاتھ پستول پر پڑا، میں اس کے جھکے ہوئے چہرے پر اپنی دائیں ٹانگ کی ضرب لگادی۔ وہ ”اوغ“ کی آواز خارج کر کے اُلٹ گیا۔

میرے ساتھیوں نے رتن لال اور سچانند پر برسٹ مارا، جس کے باعث وہ اندر کی جانب گرتے پڑتے دوڑنے پر مجبور ہو گئے جبکہ شلپا نے جانے کیا سوچ کر وہیں کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لیے تھے۔ اس کے چہرے سے شدید قسم کا خوف مترشح تھا۔

”اندر جاؤ اور ایڈوانی کو قابو کرو۔“ میں بُرجیوں کی جانب منہ کر کے حلق کے بل چلّایا اور پھر بلراج کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ خاصا چالاک ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ اس نازک مگر خطرناک گھڑی میں مجھ سے دوبدو مقابلہ کرنے کی ٹھانے گا مگر اس کے برعکس اس نے بھی رتن لال اور سچانند کی طرح دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں بھی اس کے تعاقب میں دوڑا اور ساتھ ہی میں نے اپنے کالر سے اٹکے ٹرانسمیٹر پر بیس کیمپ میں تورک سے رابطہ کیا اور ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہمارا راز فاش ہو چکا ہے اور جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اسی وقت دو ساتھیوں کو ننگرال والوں کے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ کر دو کہ ڈارک کیسل پر حملے کے لیے روانہ ہو جائیں۔ باقیوں کو ادھر بھیج دو، جلدی......“ یہ حکم صادر کرتے ہی میں نے دروازے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بلراج پر جھپٹا مارا۔ مجھے پتا تھا وہ اگر ڈارک کیسل میں داخل ہو گیا تو اس کی بھول بھلیوں میں غائب ہو کر ہم سب کے لیے شیطانی روح ثابت ہو گا۔ وہ میری گرفت میں تو نہیں آیا البتہ میرے گرتے گرتے، دونوں ہاتھ اس کی ٹانگوں سے ٹکرا گئے۔ وہ اس سے ذرا ر پٹا کھا کر دروازے کی چوکھٹ کے سنگِ مرمر والے فرش پر پھسل کر گرا مگر حیرت انگیز طور پر اپنے حواسوں پر قابو رکھتے ہوئے وہ پھر اُٹھ کر اندر بھاگا اور چوکھٹ پار کر گیا مگر میں مسلسل تعاقب میں تھا۔

میرے پاس اگر پسٹل وغیرہ ہوتا تو میں فوراً ہی اسے نشانہ بنانے میں ذرا عار محسوس نہ کرتا۔ تاہم میں نے اپنی عقابی نظروں سے اسے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا، اسی وقت ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور دو گن بردار نمودار ہوئے، وہ ان سے چیخ کر کچھ کہتا ہوا ایک دم ان کے پیچھے جا چھپا اور میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں خود کو ان کی متوقع فائرنگ سے بچانے کی کوشش کرتا، کیونکہ وہ اس کے ہی ساتھی تھے۔ میں نے اپنے دوڑنے کی رفتار کم کیے بغیر ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو چکنے اور ”سلیپری“ فرش پر گرایا۔ جب تک وہ اپنی گنز مجھ پر جھکاتے میں ان دونوں کے پیروں سے ٹکرایا۔ دونوں

ہی بیک وقت اُچھل کر گرے اور ان کے عقب میں بزدلوں کی طرح چھپا ہوا بلراج سنگھ یوں اچانک مجھے موت کی طرح اپنے سر پہ پا کر بری طرح بوکھلا گیا۔ مگر اچانک ہی اس کے اندر غیظ آلود جوش نے سر اُبھارا اور وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ وہ مجھ پر جھپٹا۔ اس نے جھک کر میری گردن دبوچنے کی کوشش چاہی تھی، میں فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، میں نے موقع تاک کر اس کے جھکے ہوئے چہرے پر اپنے سر کی زوردار ٹکر رسید کر ڈالی جو اس کی ناک پر لگی۔

ضرب کاری ثابت ہوئی اور وہ کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ پیچھے کی طرف لڑکھڑایا اور چکرانے کے انداز میں گر پڑا۔ ادھر وہ دونوں گن بردار سنبھالا لینے اور گن سیدھی کر کے مجھے نشانہ بنانے کے لیے پر تولنے میں مصروف تھے، جبکہ میں ان کی طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوا تھا، ایک کو تو میں نے اپنے کاندھے کی ٹھوکر رسید کر دی، دوسرے کی گن پر ہاتھ مارا۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ برسٹ فائر ہوا اور کوریڈور کے چکنے فرش پر پڑنے والی گولیاں اِدھر اُدھر ہونے لگیں، کیونکہ میں نے اس کی گن کی نال کا رخ عین وقت پر نیچے کر دیا تھا، ورنہ اس کا فائر کیا ہوا برسٹ مجھے چاٹ جاتا۔ تاہم اس طرح گولیاں اُچٹنا بھی کم خطرناک بات نہ تھی۔ میں نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے گن کھینچ لی اور لٹھ کی طرح گھما کر اس کی کنپٹی پر اس کا ٹھوس کندا رسید کیا۔ پٹاخے کی آواز چھوٹی، وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ دوسرا بھاگا تو میں نے اس پر بھی برسٹ فائر کیا۔ زد میں آ کر وہ ہولناک چیخیں خارج کرتا ہوا کوریڈور کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ بلراج پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری ہولناکیاں دیکھ رہا تھا۔

''خبردار بلراج! حرکت مت کرنا ورنہ تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ چیخا۔

''فائر...... فائر...... مت چھوڑنا اِسے......'' اس کی وحشت زدہ...... نظروں کو اپنے عقب میں دیکھتا پا کر میں تیزی سے گھوما، مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں اس رذیل کے ایک روایتی جھانسے میں آ گیا تھا، پُرطیش انداز میں ہونٹ بھینچ کر میں بگولے کی طرح اس کی طرف پلٹا تو وہ مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ اس کا وجود مجھ سے ٹکرایا اور ہم دونوں ہی نیچے آ رہے۔ گرتے ہی اس نے میرے پیٹ پر اپنی ٹانگ کا گھٹنا رسید کیا، چوٹ اچانک اور زوردار تھی۔ میرے حلق سے کربناک سی چیخ بلند ہوئی، اس نے میرے گن والے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔ دوسرے ہی لمحے گن اُس کے قبضے میں تھی۔ مگر اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر میں نے فرش پر پشت کے بل پڑے پڑے اپنے مضروب وجود کو پھرکی کی طرح گھمایا اور میری ہوا میں دو پنکھ کی طرح گردش کرتی ٹانگوں کی بیک وقت ضربات بلراج کے چہرے پر پڑیں اور اس کے حلق سے کرب ناک چیخیں خارج ہو گئیں۔ اس کا دماغ بری جھنجھنا گیا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، وقت ضائع کیے بغیر میں بہ سرعت حرکت میں آیا اور اکڑوں بیٹھے بیٹھے اپنے سیدھے بازو کا آرم لاک اس کی گردن کے گرد کس دیا۔ پھر اس کے کان میں سنسناتی ہوئی سرگوشی کی۔

''تمہارا کھیل ختم ہوا...... بلراج کُتّے......! بس ایک آخری بار سوشیلا کی بہن اُوشا کی معصوم فیملی کا تصور کر لے کہ کس طرح تو نے ایڈوانی کے کہنے پر انہیں آگ میں جھونکا تھا۔''

''مم...... مجھے مم...... معاف کر دو شش...... شہزی!'' وہ بھنچی بھنچی آواز میں بولا۔

''میں نے اپنی ساتھی سوشیلا سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا...... جس نے ہر بُرے وقت میں میرا ساتھ دیا۔ گو ٹو ہیل ناؤ...... بہت جلد ایڈوانی بھی وہیں پہنچنے والا ہے۔''

نجانے میں نے اپنے کون سے بپھرے ہوئے جذبے کی تسکین میں اس سے یہ مختصراً مکالمہ بازی کی تھی اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ وہ یک دم بے حس و حرکت ہو گیا۔ اس کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔

اسے جہنم واصل کرتے ہی میں گن اٹھا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔ فائرنگ کی آوازیں وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھیں۔ اسی وقت میں نے کبیل دادا کو دوڑتے ہوئے آتے دیکھا۔ اس کے ہمراہ باریہہ تھی۔

میں اُٹھ کر ایک طرف کو بھاگا۔ وہ میرے پیچھے دوڑتے رہے۔

''ایڈوانی جانے نہ پائے۔'' میں چلایا۔ عقب میں دوڑتے ہوئے کبیل دادا اور باریہہ کو میرے عزم کا احساس ہوا اور پھر وہ رکے نہیں۔

ایڈوانی کے کمرے کے قریب پہنچتے ہی میں نے دروازے پر ایک زوردار لات رسید کی اور وہ کھلتا چلا گیا۔ میں طوفانی بگولے کی طرح اندر داخل ہو گیا۔ ایسے میں میری نس نس میں لہو مثلِ پارا کی طرح گردش کر رہا تھا۔ میری متلاشی نظریں خالی کمرے میں تیزی سے گردش کر رہی تھیں...... یہی وہ وقت تھا جب میری گردشی نظروں نے سامنے اس کی مخصوص نشست والی رائٹ وال کے ایک خلا کو سرسراتی آواز میں بند ہوتے دیکھا۔

''فرار'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں آناً فاناً ابھرا اور میں تیزی سے پلٹا تو کبیل دادا اور باریہہ کو دیکھا۔

''میرے پیچھے آؤ...... وہ بھاگ رہا ہے۔''

میں کمرے سے نکل کر کوریڈور میں آیا تو کچھ سوچ کر رکا اور پھر باریہہ سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''باریہہ! تم اسی وقت آبادی کی طرف دوڑ جاؤ اور سارے قیدیوں کو رِہا کر کے دیگر لوگوں کو بتا دو کہ وہ سب آزاد ہیں اور یہاں آ جائیں۔''

اس کو حکم دیتے ہی میں نے کبیل دادا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اندھا دھند دوڑتا ہوا مرکزی دروازے کے بجائے اس سمت لپکا جہاں سے ایک راستہ ڈارک کیسل کے عقب میں جاتا تھا۔ ڈارک کیسل کی اس عمارت میں وقت گزارنے کے باوجود مجھے اس مردود ایڈوانی کی اس خفیہ راہ گزر کا پتا نہ چل سکا تھا۔ بس ایک محتاط اندازے سے میں نے اسی طرف کا رخ کیا جہاں سے اس کے برآمد ہونے کا شبہ تھا مگر وہاں پہنچ کر بھی مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔

ادھر اول خیر اور شکیلہ ڈارک کیسل میں موجود گنتی کے چند مسلح دشمنوں سے نبردآزما تھے۔ مجھے ان کی فکر نہ تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اول خیر اور شکیلہ جیسے تربیت یافتہ لڑاکوں سے لڑنا، ڈارک کیسل کے ان تیسرے درجے کے زرخرید بدمعاشوں کے بس کی بات نہ تھی...... مجھے صرف اپنے اصل شکار ایڈوانی کی فکر ہو رہی تھی اور اس ہیرے کی جو میں نے اس مردود کے قبضے سے برآمد کرنا تھا۔

میں چند ثانیے ہونٹ اور دانت بھینچے اس عقب کا منظر پیش کرنے والے بُرج پر آ کر نیچے نشیب میں دیکھتا رہا۔ وہاں ایک مختصر سا ہیلی پیڈ بنا ہوا تھا۔ وہاں دو پنکھ والا ایک چاپڑ موجود تھا۔ ایک خیال کے تحت میں نے کبیل دادا سے کہا۔

''کبیل! یہ چاپڑ دیکھ رہے ہو...... تم فوراً اس کے ندر کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ ممکن ہے ایڈوانی اس تک رسائی حاصل کرنے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کرے۔ جب تک میں اس کے کمرائے خاص کی تلاشی لے کر آتا ہوں۔''

میری بات پر کبیل دادا نے بلاتردّد حرکت کی اور چاپڑ کی طرف بڑھ گیا۔

میں پلٹا اور دوبارہ دوڑتا ہوا ایڈوانی کے کمرے میں آیا جس کا دروازہ ہنوز کھلا ہوا تھا۔ اسی وقت مجھ سے اول خیر اور شکیلہ بھی آن ٹکرائے۔ انہیں دیکھ کر میں ایک لمحے کے لیے حیران سا ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے جوش سے مسکرا دیا۔ دونوں نے ایمونیشن روم سے خاصی تعداد میں اسلحہ قبضے میں کر کے زیورات کی طرح اپنے جسموں پر سجا لیا تھا۔

''باقی دشمن کہاں گئے؟ ان میں وہ وحشی جنگلی کلی منجارو بھی تھے؟'' میں نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو اول خیر نے بتایا۔

''بیشتر مارے گئے ہیں اور کچھ بھاگ گئے ہیں، باقیوں نے ہتھیار ڈالے دیے ہیں۔ ان میں جانگلی بھی تھے جن کی تم بات کر رہے ہو۔''

''لیکن شہزی! صرف اتنے ہی دشمن نہیں ہیں یہاں، آبادی کی طرف اور ان کے دوسرے ٹھکانوں کی طرف بھی ہمیں ہلّا بولنا ہوگا۔'' شکیلہ بولی۔

''اس کے لیے میں باریہہ کو آبادی کی طرف پہلے ہی روانہ کر چکا ہوں اور ساتھ ہی تورک کو بھی پیغام پہنچا دیا ہے کہ وہ جلد سے جلد ننگرال اور نتالیہ کو لے کر اپنے جنگجو ساتھیوں سمیت یہاں پہنچ جائے۔ بے فکر رہو، ان کے بیشتر ساتھی ان سے بددل بھی ہیں۔ سچانند مارا گیا اور رتن لال اپنے دیگر چند ساتھیوں (شلپا سمیت) کے ساتھ ہماری گرفت میں ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہمیں اپنے اصل شکار جنرل ایڈوانی کو ڈھونڈنا ہے۔ وہ ابھی تک ڈارک کیسل میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے۔''

وہ سب میرے حکم پر ایڈوانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ میں اور کبیل دادا وہیں کھڑے رہے تو وہ بولا۔

''شہزی! مجھے نہیں لگتا کہ اس شکست کے بعد ایڈوانی ڈارک کیسل کے کسی خفیہ گوشے میں چھپا رہ سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ جانتا ہے کہ ڈارک کیسل کی یہ عمارت اس کی قبر بھی بن سکتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خفیہ راستے سے کہیں دور جا کر ابھرے اور جزیرے سے فرار ہونے کی کوشش کرے؟''

کبیل دادا کی اس بات پر اچانک ہی میرے ذہن رسا میں سرنگ کا لفظ ابھرا اور میں فرطِ جوش سے بولا۔

''تمہارا خیال سو فیصد درست لگتا ہے دادا! ممکن ہے کہ وہ سرنگ نما کسی خفیہ راستے سے راہِ فرار حاصل کرنے کی کوشش میں ہو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ خفیہ سرنگ یا ایسا کوئی متوقع راستہ تلاش کیسے کیا جائے؟''

''اس کے لیے ہمیں قریب ترین ساحل پر کڑی نگاہ رکھنا ہوگی۔ اس کام کے لیے جاوا قبیلے کے لوگوں کو ہر طرف پھیلا دو کہ ان کا اصل غاصب دشمن فرار ہونے کی کوشش میں اپنی کسی خفیہ کمین گاہ میں چھپا بیٹھا ہے۔''

مجھے کبیل دادا کی یہ تجویز کارآمد محسوس ہوئی۔ یہ کام میں نے شکیلہ اور ادل خیر کے ذمے لگا دیا جو چند جادی افراد کے ہمراہ آبادی کی طرف روانہ ہوگئے۔

اس کے بعد میں نے اور کبیل دادا نے ایک بار پھر ڈارک کیسل کے اندر اور باہر کا ایک ایک گوشہ ٹھونک بجا کر دیکھ لیا مگر اس کی کوئی بھنک یا نشان نہ ملا۔

شنگرال اور اس کے جنگجو ساتھیوں کو لانے کے لیے پہلے سے موجود جیپوں اور گاڑیوں کا استعمال کیا گیا تھا، وہ بھی پہنچ چکے تھے۔ کلی منجارو قبیلے کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ تھا، نہ ہی وہ اتنی طاقت میں تھے، تاہم جنرل ایڈوانی وغیرہ سے ان کا اتحاد ہونے کے باعث وہ طاقت ور کہلاتے تھے۔ ان میں سے بھی کئی مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے اور باقی ماندہ فرار ہوگئے تھے۔

بازی پلٹ چکی تھی۔ تخت اور تختے کے اس خطرناک کھیل میں ''تخت'' ہمارے حصے میں آیا تھا اور ''تختہ'' دشمنوں کا نصیب، وہ اب تختہ دار پر چڑھ چکے تھے۔

ابھی میں ایڈوانی کی طرف سے پریشانی کا شکار تھا کہ اطلاع ملی کہ جزیرے کے شمال مغرب میں کوئی پُراسرار سی نقل و حرکت دیکھی گئی ہے۔ میں اور کبیل دادا جیپ میں وہاں پہنچے اور ابھی اس مقام سے صرف چند سو گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ چونک پڑے۔ وہاں شور اور ساتھ ہی گولیاں چلنے کی آوازیں ابھریں۔ کبیل دادا نے جیپ وہیں روک دی اور ہم دونوں اپنی گنز سنبھالے نیچے اُترے۔

یہ ساحلِ سمندر کے قریب کا علاقہ تھا۔ اس کے قریب ہی جھکی جھکی چٹانوں کا مختصر سا سلسلہ بھی نظر آتا تھا۔ وہاں ہمارے کچھ ساتھی موجود تھے، مگر اب گولیوں کی آوازوں کے ساتھ ہی وہ خوف زدہ ہو کے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ یہ ہمارے اسلحہ بدست یا جنگجو ساتھی نہیں تھے بلکہ جاوی قبیلے کے ہی لوگ تھے۔ ان کے پاس روایتی ہتھیار تھے۔ چند ایک کے پاس آتشیں ہتھیار بھی تھے اور وہی نامعلوم سمت سے ہونے والی فائرنگ کا نشانہ بنے تھے۔

ابھی تک مجھے اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ یہاں ہو کیا رہا تھا؟ تاہم محتاط روی سے اس مقام کے قدرے قریب پہنچے تو میں بری طرح ٹھٹکا۔

دو گلے ملتی چٹانوں کے بیچ سے میں نے کھاڑی نما نالا سا بہتا دیکھا، یہ خاصا چوڑا تھا اور بہتا ہوا سمندر کی طرف جاتا تھا۔ پل کے پل میرے سوچتے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا اور میں بدکا۔

''میرے پیچھے آؤ دادا......!'' یہ کہتے ہوئے میں اپنی گن سنبھالے اس چٹانی نالے کی طرف بھاگا۔

''ہولے شہزی! اس طرف سے گولیاں چلی تھیں۔''

مجھے اپنے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے کبیل دادا کی آواز سنائی دی مگر میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے ذہن کو اچانک ہی جو بھنک پڑی تھی وہ بری طرح سر پہ سوار تھی۔ میں اندھا دھند اس چٹان سے پھوٹنے والے نالے کی طرف کو دوڑ رہا تھا اور ابھی میں اس سے محض چند ہی قدموں کے فاصلے پر تھا کہ دفعتاً میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں ایک گھر گھراتی آواز اُبھری اور میں نے اپنی گن سیدھی کرلی۔

اچانک ہی ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کو دیکھا۔ اس کا رخ سمندر کی طرف تھا۔ اس میں مجھے ایک ہی فرد سوار دکھائی دیا تھا۔

''گولیاں برساؤ اس پر......'' میں حلق کے بل چیخا اور اپنے دونوں پیر ساحل کی ریت پر کیل کرتے ہوئے میں نے موٹر بوٹ پر تڑاتڑ فائرنگ کردی۔ کبیل دادا نے بھی فوراً میری تقلید کی تھی۔ موٹر بوٹ ابھی سمندر سے چند ہی گز دور تھی کہ اس میں آگ بھڑک اُٹھی۔ میں دیوانہ وار اس طرف دوڑا۔ بوٹ اُلٹ کر ساحلی ریت پر آن پڑی تھی۔ میں نے ایک شخص کو کودتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایڈوانی تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا بریف کیس تھا اور دوسرے ہاتھ میں ٹامی گن ٹائپ کا ہتھیار تھا۔ اس نے نارنجی رنگ کی لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا اور میں اس کی طرف لپکا۔ اسی وقت بوٹ میں دھماکا ہوا اور وہ سلگتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔

''ایڈوانی...... رک جاؤ...... ورنہ گولی مار دوں گا۔''

اسے سمندر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ کر میں چلّایا اور ساتھ ہی اس کے پیروں پر برسٹ چلایا۔ وہ رک گیا اور چلّا کر بریف کیس والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے ہذیانی آواز میں بولا۔

''شہزی! میرے قریب مت آنا، ورنہ یہ بریف کیس سمندر میں پھینک دوں گا اور تمہارا ملک ہمیشہ کے لیے اپنی نادر امانت سے محروم ہو جائے گا۔''

یہ کہتے ہی اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹامی گن سے مجھ پر جوابی برسٹ بھی فائر کر دیا۔ مگر اس سے پہلے ہی میں خود کو ریت پر گرا چکا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں شہزی؟'' کبیل دادا کی آواز اُبھری۔ میں نے جواب میں کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم محتاط رہو۔''

''لیکن شہزی! تم اس خبیث کے نشانے پر ہو۔'' کبیل دادا بولا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میری بے چینی اور جوش انتہا کو چھو رہا تھا۔

میں ہک دک سا رہ گیا۔ ایڈوانی کا اشارہ میں سمجھ تو چکا تھا تاہم اسے ''مشغول'' رکھنے اور پل کے پل کوئی راہ سوچنے کی غرض سے میں نے چلّا کے کہا۔

''ایڈوانی! تم اب کہیں نہیں جا سکتے۔ بہتر یہی ہے کہ خود کو اس بریف کیس سمیت میرے حوالے کر دو۔''

''ہرگز نہیں...... شہزی!'' وہ پاگلوں کی طرح چلّایا۔ ''تم نے مجھے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ میری لاش کو ہی تم اب پا سکو گے۔ میں خود کو سمندر کے حوالے کر رہا ہوں، تمہارے ہیرے سمیت، لیکن اتنا بتا دوں یہ ہیرا تمہیں اگر مل بھی گیا تو تم پھر بھی اسے حاصل نہیں کر سکو گے...... ہاہا...... ہاہا، جس پاکستانی پروفیسر (کریم بخش) نے یہ ہیرا دریافت کیا تھا اور اس کا نام طلسم نور ہیرا ایسے ہی نہیں رکھا تھا۔ وہی اس کی طلسمی وجہ ہے، جسے جانے بغیر تمہارے پاس ہوتے ہوئے بھی یہ ہیرا تمہارے پاس نہیں ہوگا۔ ہاہا...... ہاہا...... تمہاری اس کامیابی کو داغدار بنا کے جا رہا ہوں میں......''

شکست نے شاید اس کا دماغی توازن بگاڑ کر رکھ دیا تھا مگر اس مردود کی بات نے مجھے واقعی پریشان سا کر دیا تھا۔

''آخر کیا مطلب تھا اس شیطان کی بات کا......؟ کہ اگر یہ ہیرا میں سمندر کی تہ سے برآمد بھی کر لوں، تو بھی یہ میرا نہیں رہے گا...... آخر ایسی پُراسرار وجہ کیا تھی اس ہیرے میں......؟ جو میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے پاس نہ ہوگا۔ میں نے اس کی بات کو لغو خیال کرتے ہوئے ذہن سے جھٹک دیا اور موجودہ صورت پر غور کرنا شروع کیا۔

دونوں صورتوں میں میرے لیے ایک مشکل کھڑی ہو گئی تھی اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے جانے دوں یا گولی مار دوں، دونوں ہی صورتوں میں طلسم نور ہیرے والا بریف کیس سمندر بُرد ہونے کا اندیشہ تھا۔

اس نے ایک بار پھر برسٹ چلانے کی کوشش چاہی، مگر وہ نہ چلا، شاید وہ پہلے سے ہی میرے ساتھیوں سے مقابلے میں اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے ان پر کافی ساری گولیاں برسا چکا تھا۔

میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ وہ سینے تک سمندر میں جا چکا تھا۔ خالی گن اس نے جھلّا کر پھینک دی تھی۔ میں نے دیوانہ وار دوڑنا شروع کر دیا۔ پیچھے سے کبیل دادا بھی چیختا ہوا مجھے محتاط رہنے کی تلقین کرتا دوڑ پڑا تھا۔

ایڈوانی بریف کیس سمیت سمندر میں کود چکا تھا اور خود کو لہروں کے سپرد کر دیا تھا۔ میں بھی سمندر میں اُتر گیا۔ اس نے لائف جیکٹ پہن رکھی تھی۔ مجھے ڈوبنے کا خطرہ تھا مگر مجھ پر یہ دُھن سوار تھی کہ اس امانت کو بچانا ہے۔ کبیل دادا عقب سے چلّاتا اور مجھے روکتا ہی رہ گیا۔ میں درانہ دار ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں کود پڑا۔

لہروں کے شور میں آوازیں دبنے لگی تھیں۔ لائف جیکٹ نہ ہونے کے باعث مجھے تیرنے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ موجیں مجھے ساحل پر دھکیل رہی تھیں جبکہ ایڈوانی لائف جیکٹ کے باعث مقابلتاً تیرتا ہوا کھلے سمندر کی طرف نکلا جا رہا تھا۔ تب ہی ایک خیال بہ سرعت میرے ذہن میں ابھرا۔ کم از کم اس مردود جرنیل کو ہیرے سمیت تو میں ہرگز جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ اس کی دیوانگی تھی۔ اس لامتناہی سمندر میں تیر کر یہ کب تک زندہ رہ سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے اندر فطری طور پر ایک آخری امید چمکی ہو کہ شاید وہ موجوں کے سہارے کسی قریبی ساحل پر پہنچ جائے۔

میں نے بالآخر اپنی گن سیدھی کی اور اس پر گولیاں برسا دیں۔ اس کے حلق سے اُبھرنے والی چیخیں بڑی لرزہ خیز تھیں۔ وہ خونم خون ہو گیا۔ بریف کیس غائب ہو چکا تھا۔ میں تیرتا ہوا واپس پلٹا اور ساحل پر آتے ہی میں نے وہاں اپنے اردگرد جمع ہو جانے والے جاوی قبائلیوں سے کہا۔

''میں نے تمہارے ایک بڑے اور آخری دشمن کو ختم کر دیا ہے، مگر اس نے میرے ملک کی ایک اہم امانت سمندر میں ڈبو دی ہے۔ تم میں سے کوئی غوطہ خور تو ہوگا جو اس سیاہ بریف کیس کو ڈھونڈ لائے۔''

میرے یہ کہنے کی دیر تھی، چار پانچ ننگ دھڑنگ جاویوں نے اسی وقت سمندر میں چھلانگ لگا دی اور میں تسلی آمیز سانس خارج کر کے نڈھال سا ریت پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت کبیل دادا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بھی میرے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''شہزی! تم واقعی بہت عظیم ہو، خواہ تم دوست ہو یا ایک عام انسان، ہر روپ میں تم عظیم ہو، شاید اس لیے بھی کاتبِ تقدیر تمہاری ہمت اور پُرخلوص جذبے پر تمام راہیں آسان کرتی رہتی ہے۔'' اس کی بات پر میں فقط خفیف سی مسکراہٹ سے اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔

میں اب یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ خدا کرے کہ وہ ہیرے والا بریف کیس مل جائے، اس وقت میرے اندر کی پریشان کن بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی، میری اُمید بھری بے قرار نظریں سامنے بے کراں پھیلے سمندر پر جمی ہوئی تھیں، غوطہ خور زیادہ گہرائی تک نہیں جاسکتے تھے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانس لینے کے لیے سطحِ سمندر پر اُبھرتے اور پھر غائب ہوجاتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا اور میرا اُرواں اُرواں اس وقت تشویشناک بے چینی تلے پھڑک رہا تھا، میرا تو کوئی بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا جبکہ کبیل دادا نجانے کیا کیا کچھ میری تعریفوں میں کہے جا رہا تھا۔

کافی دیر ہم امید و ناامیدی کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے رہے۔ پھر وہ جاوی غوطہ خور ناکام ابھرے۔ میں انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر لرز گیا اور ان کی طرف لپکا۔

''کیا ہوا......؟ نہیں ملا تمہیں وہ بریف کیس؟''

انہوں نے اپنے سر جھکا کر نفی میں سر ہلا دیا تو میں فرطِ غم سے چیخ پڑا۔

''تم لوگ کیسے غوطہ خور ہو؟ ایک بریف کیس نہیں ڈھونڈ سکے؟ میں نے تم لوگوں کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر کیا کچھ نہیں کیا اور تم میرے وطن کی ایک اہم امانت تک کو تلاش نہیں کر سکے......''

مجھ پر غم اور شکست خوردگی نے بہت منفی اثر ڈالا تھا۔ کبیل دادا مجھے سنبھالا دینے لگا تو میں نے اس بے چارے کا ہاتھ بھی جھٹک دیا اور دیوانہ وار سمندر کی طرف لپکا۔

''میں خود اس ہیرے کو تلاش کروں گا۔''

''رک جا شہزی! میرے یار! کیا ہوگیا ہے تجھے؟'' کبیل دادا مجھ سے لپٹ گیا۔ باقی لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔

''چھوڑ دے مجھے کبیل دادا......! میں خود......'' میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک چیخ کی آواز ابھری۔

کسی نے ہمیں اس آخری غوطہ خور کی طرف متوجہ کیا تھا جو سمندر سے ابھر کر ساحل کی طرف تیرتا ہوا آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کے بریف کیس کی جھلک نظر آئی تھی۔ میرے اندر کی مایوسی اور غم و شکست خوردگی پل کے پل بے پایاں مسرت میں بدل گئی، مگر دوسرے ہی لمحے میں دھک سا رہ گیا۔ جب وہ آخری جاوی غوطہ خور ساحل پر نڈھال سا ہو کر گرا تو اس کے ہاتھ سے بریف کیس بھی چھوٹ کر ریت پر گر پڑا تھا، مگر اس طرح کہ وہ کھلا پڑا تھا اور میرا منہ چڑا رہا تھا...... میرے اوسان خطا ہونے لگے، اُمید کے اس آخری ٹمٹماتے چراغ میں جیسے روشنی ہی نہ رہی۔ مگر پھر بھی نجانے کیسی دیوانگی مجھ پر سوار تھی کہ میں پاگلوں کی طرح اس کی طرف بھاگا اور بریف کیس اُٹھا کر اسے یوں جھاڑنے لگا جیسے اس کے اندر طلسمِ نور ہیرا نہیں بلکہ کوئی سوئی رکھی ہو۔

بریف کیس کو بالکل خالی پا کر میں نے اُسے غصے سے ایک طرف اُچھال دیا اور گھٹنوں کے بل ساحلی ریت پر گر گیا۔ مجھے سامنے بیکراں پھیلے ہوئے سمندر سے جنرل ایڈوانی کے فاتحانہ قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ وہ کسی بدروح کی طرح چیخ کر کہتا سنائی دیا۔

''ہاہا...... ہاہا......! شہزی! میں نے تمہاری اس اُدھوری کامیابی کو داغ دار بنا کر ہی چھوڑا...... اگر میں اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا تو تم بھی خالی ہاتھ ہی رہے۔''

اس اثنا میں اول خیر اور شکیلہ، پھر اس کے تھوڑی دیر بعد باریہہ بھی وہاں کچھ ساتھیوں کے ساتھ آن پہنچی۔ مجھے یوں اس حالتِ دیوانگی میں ...... دیکھ کر انہیں دکھ آمیز سی حیرتوں نے گھیر لیا۔ کبیل دادا مغموم سے لہجے میں دھیرے دھیرے انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔

''او...... خیر کاکے! دل چھوٹا کیوں کرتا ہے۔'' معاً ہی اول خیر کی مخصوص آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی وہ میرے قریب بھی آ گیا اور اپنا ایک ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر سہلانے لگا۔

''ہم سب تیرے ساتھ ہیں ابھی...... مل کر اس ہیرے کو تلاش کرلیں گے......''

''کیسے تلاش کرلیں گے یار......؟'' میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''اُس بریف کیس کو اس بدبخت ایڈوانی نے اپنی زندگی کے عین آخری لمحات میں کھول کر سمندر بُرد کر دیا تھا۔ کاش! میں اس پر فائرنگ نہ کرتا، مگر وہ ہیرے سمیت فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتا تو میری ساری محنت اکارت چلی جاتی، میں اور کیا کرتا یار اول خیر......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''تُو نے جو کیا بالکل صحیح اور موجودہ حالات کے مطابق کیا ہے۔'' وہ مجھے تسلی دے رہا تھا۔

''مگر یار! اب اُس ہیرے کو سمندر میں تلاش کرنا بھوسے میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف ہوگا۔'' میں نے شدید مایوسی کے عالم میں کہا۔

''خیر ہے...... خیر ہے کاکے!'' وہ تشفی آمیز انداز میں میرا کندھا تھپتھپا رہا تو شکیلہ بولی۔ ''عمارت کی اگر تلاشی لی جائے تو ایسا ممکن نہ ہوگا کہ یہاں کوئی آکسیجن سلنڈر سمیت غوطہ خوری کا لباس نہ ہو، اگر وہ ہمیں نہیں بھی ملتے تو ہمارے لیے یہ سارا سامان ہائر کرنے میں کیا مشکل ہے، اب ہمیں بھلا کس بات کا خطرہ ہے، یا ہم کون سے قیدی ہیں۔ ہم مکمل فتح حاصل کر چکے ہیں۔ خود ہی ہیرے کو تلاش کرلیں گے۔''

''شکیلہ ٹھیک کہہ رہی ہے، شہزادے!'' کبیل دادا نے اس کی تائید کی۔

مگر میرا دل ناکامی کے احساس تلے گھٹنے لگا تھا۔ وہ ہیرا گہرے پانیوں میں جا چکا ہوگا اگر شکیلہ کی بات پر ذرا دیر کے لیے صاد کر بھی لیا جاتا تو ہم کون سا اتنے ماہر غوطہ خور تھے۔ میرا چہرہ بدستور اُترا ہوا پا کر اس بار باریہہ نے بڑے پتے کی بات کہی جس سے پہلی بار میرے بجھے ہوئے دل میں ایک موہوم سی آس نے سر اُبھارا۔ وہ بولی۔

''شہزی! فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، ہیرا جہاں گرا ہے، وہ ساحل اور سمندر کا کنارہ ہے...... رہی بات ماہر غوطہ خوری کی تو اس مسئلے کا حل بھی یہی ہے جو شکیلہ نے بتایا یعنی اگر ہمیں غوطہ خوری کا مخصوص سامان مل جاتا ہے تو ماہر غوطہ خوروں کی ہمارے پاس کمی نہیں۔ وہ آرام سے سمندر اور ساحل کے اس حصے میں جا کر اس ٹکڑے کو کھنگال ڈالیں گے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ جو کچھ کیا جائے جلد ہی کر لیا جائے، اس میں تاخیر، ہیرے کو گہرے پانیوں میں لڑھکا دینے کا باعث بنے گی۔''

اس کی بات معقول تھی اور پھر سب کچھ جلدی جلدی نمٹایا گیا۔ ہم سب عمارت میں گھس گئے اور اس کے چپّے چپّے کو کھنگال ڈالا۔

باریہہ کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ہمیں کم از کم غوطہ خوری کا سامان مل گیا تھا، ہم میں سے تو کسی کو بھی غوطہ خوری کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا، ہم یہ لباس پہن کر سمندر کے اندر کی سیر تو کر سکتے تھے، مگر اندر کائی زدہ پودوں اور ریت میں کسی شے کو تلاش کرنا مشکل تھا۔

بالآخر یہی طے پایا اور پانچ جاوی غوطہ خوروں کا لباس پہنے پانی میں اُتر گئے۔ میں نے اللہ سے ہیرا مل جانے کی دعا کی اور اول خیر اور شکیلہ کو وہیں ساحل پر رکنے کا کہا۔ اس کے بعد میں باریہہ اور کبیل دادا کے ساتھ دیگر حالات کا جائزہ لینے کے بعد شنگرال وغیرہ کے ساتھ آن ملا...... نتالیہ بھی بھائی کے ساتھ تھی اور دونوں بہن بھائی مجھ سے بے حد متاثر ہی نہیں ہوئے بلکہ میرے ممنون بھی ہو رہے تھے۔

انہوں نے مجھے بتایا کہ اپنی سرزمین پر ان کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں ڈارک کیسل کی عمارت ڈھانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اپنے غاصب دشمن کی کوئی بھی نشانی وہاں رہنے نہ دی جائے۔ اس کے بعد میں نے نصیر شاہ وغیرہ کو بھی بیس کیمپ سے بلا لیا تھا، میں نے شنگرال اور نتالیہ کو نصیر شاہ سے آگاہ کیا اور بونینزا پروجیکٹ کے بارے میں بھی تفصیلی بریفنگ دیتے ہوئے انہیں بتایا کہ یہ اب ان کی ملکیت ہے اور اس پروجیکٹ کو جس قدر ممکن ہوسکے راز میں رکھا جائے اور اس دوران انہیں (جاوا قبیلے کو) اپنی افرادی قوت بڑھانے کے ساتھ ساتھ روایتی ہتھیار چھوڑ کر آتشیں ہتھیاروں کی تربیت دیتے ہوئے اپنی باقاعدہ ایک عسکری قوت قائم کریں تاکہ اپنی سرزمین کا جنگی اُصولوں کے تحت تحفظ کرسکیں۔ ان کے پاس اب بونینزا کی صورت میں ایک کثیر سرمایہ ہے جس کے بل بوتے پر یہ لوگ اپنی طاقت بڑھا سکتے ہیں، افرادی قوت کے لیے انہیں دیگر اریب قریب کے قبائلیوں کو بھی اپنے ساتھ ملانا ہوگا اور انہیں بھی جدید خطوط پر تربیت دیتے ہوئے تہذیب و تمدن کے ساتھ ایک بڑے اتحاد کی صورت میں ایک بڑی مسلم ریاست کی داغ بیل ڈال کر رہنا ہوگا جبکہ بھارت کی مسلم تبلیغی جماعتیں انہیں وہ ساری ممکن مدد خود ہی فراہم کردیں گی جن کی انہیں ضرورت ہوگی۔ یہ کام نصیر شاہ بہتر طور پر کرسکتے ہیں۔

وہاں اسلام زندہ باد اور میرے حق میں قبائلیوں نے نعرے بلند کرنا شروع کر دیے تھے۔

سوشیلا کو بھی...... بلراج اور ایڈوانی کی میرے ہاتھوں ہلاکت کا علم ہوگیا تھا اور وہ بے اختیار خوشی اور فرطِ جذبات سے مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

''شہزی! تم نے اپنا وعدہ پورا کر کے آج مجھ سے اپنی دوستی کا حق ادا کر دیا۔ آج میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آتشِ انتقام ہمیشہ کے لیے سرد ہوگئی جس نے مجھے بے چین

اور مایوس کیے رکھا تھا۔“ وہ شدتِ جذبات سے رو پڑی۔

میں اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگا۔

اس کی ٹانگ اب کافی حد تک بہتر ہو گئی تھی، وہ اب بغیر سہارے کے مگر تھوڑے لنگ کے ساتھ خود بھی چل لیتی تھی۔

یہ سارے اللہ کے کام ہوتے ہیں کہ وہ کسے نیک اور بڑے کاموں کی توفیق عطا فرماتا ہے، میں اسے اپنی خوش قسمتی ہی سمجھتا تھا کہ اسلام کی سربلندی کے لیے یہ نیک اور بڑا کام میرے ہاتھوں تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔

میں اب اللہ سے یہی دعائیں مانگ رہا تھا کہ ہیرا مل جائے تو میں اپنے ساتھیوں سمیت اس سرزمین سے اپنے وطن پاکستان کوچ کر جاؤں اور اب عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی مربوط منصوبہ بندی ترتیب دوں۔

میری اپنی مہمات مجھے کہاں سے کہاں لے آئی تھیں...... عابدہ کا خیال آتا تو دل مسوس کر رہ جاتا، مگر دل میں اُمید ابھی زندہ تھی اور صحبتِ یار بھی باقی تھی۔ اللہ کا ساتھ تو میرے ساتھ ہمیشہ سے ہی تھا، البتہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے میرا یہ ایمان تھا کہ ہر کام کے کرنے کا ہی نہیں بلکہ ہونے کا بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔

☆☆☆

طویل جد جہد کے بعد میری پیاسی اور منتظر سماعتوں نے بالآخر یہ خوش خبری بھی سُن لی کہ وہ نایاب و نادر طلسمِ نور ہیرا سمندر کی تہ سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ باریہہ کا مشورہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس نے یہی کہا تھا کہ ہیرا ابھی ساحل کے قریب ہی سمندر میں کہیں موجود ہوگا اور ضرور مل جائے گا اور ہوا بھی یہی تھا۔

وہ ہیرا دو جاوی غوطہ خوروں کے ہاتھ لگا تھا، جسے بعد میں میری ہدایت کے مطابق اول خیر اور شکیلہ نے اُن سے لے کر فوراً اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

اس ہیرے سے متعلق بھی میں باریہہ سمیت شنگرال وغیرہ کو آگاہ کر چکا تھا کہ اس پر ہمارا حق ہے، اس کا ان کی سرزمین یا قبیلے سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ میرے ملک پاکستان کی امانت ہے۔

جب وہ ہیرا اول خیر اور شکیلہ لے کر میرے پاس پہنچے تو میں نے شدت کی بے چینی اور سنسنی آمیز تجسّس کے زیرِ اثر اس باکس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ایک بار پھر میرے ذہن میں اس خبیث جہنم رسید جنرل ایڈوانی کی بکواس گردش کرنے لگی۔ ”تم ہیرے کو پا کر بھی نہ پاسکو گے۔“

میں ایک عجیب سی دلی و ذہنی کیفیات سے دوچار تھا۔ خوشی بھی تھی اور ہول بھی آتا تھا۔ وہ ایک باکس تھا۔ یا یوں کہہ لیں ایک چھوٹا سا صندوقچہ، جو بارہ انچ چوڑا اور بارہ ہی انچ لمبا تھا، جبکہ گہرائی نو انچ تھی۔ صندوقچے پر ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے، جو عام سی نوعیت کے تھے، تاہم صندوقچہ کہیں سے بھی قدامت کی شبیہہ نہیں دیتا تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ ہیرے کو دریافت کرنے کے بعد اسے بعد میں اس صندوقچے میں رکھا گیا ہوگا۔

اس کے ڈھکن اور ”گرد پوش“ میں خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اس صندوقچے کو خصوصی طور پر شاید اسی ہیرے کو رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

مجھے اس نادر روزگار طلسمِ نور ہیرے سے متعلق بشام چھلگری مرحوم کی وہ گفتگو یاد آنے لگی جو اس نے پوری تفصیل کے ساتھ مجھے بتائی تھی کہ موئن جودڑو لاڑکانہ میں ڈوکری کے مقام پر ایک مشہور تاریخی کھنڈرات کا حامل علاقہ ہے، جہاں آج سے کچھ سال پہلے...... سندھیالوجی کے ایک پروفیسر کریم بخش نظامانی نے کھدائی کروائی تھی۔ ان کی کوششوں سے ہیرا دریافت ہو گیا تھا۔

”پروفیسر کریم بخش نے اس ہیرے کا نام ”طلسمِ نور ہیرا“ رکھا تھا۔ یہ نام رکھنے کی وجہ وہ اپنی عرق ریزی اور نجانے کتنی اجنبی، نامانوس اور متروکہ زبان کی تحقیق کے مطابق، ایسی پُراسراریت بتاتے تھے جو اس ہیرے سے وابستہ تھیں۔ نجانے کیا بات تھی جو میں نے اس ہیرے کی بازیافت کے بعد محسوس کی تھی وہ یہ کہ پروفیسر کریم بخش نظامانی گم صم اور عجیب سے رہنے لگے تھے، ان کی ازحد خوشی کو جیسے ایک اسرار بھری چپ کھا گئی تھی۔

”جب میں نے طلسمِ نور ہیرے کو کھدائی کے بعد پہلی بار دیکھا تو اسے دیکھتے ہی مجھ پر ایک عجیب سا سحر طاری ہو گیا تھا، یہ ہیرا جو ایک بڑے سے کالے اژدھے کے منہ کے اندر کسی سچے نگینے کی طرح رکھا ہوا تھا۔ اس وقت دنیا میں سب سے بڑے، قیمتی اور تاریخی عظمت کے حوالے سے کوہ نور ہیرے کی اہمیت جانی جاتی ہے۔ کوہِ نور ہیرا خوب صورتی میں بھی اپنی مثال آپ ہے لیکن پاکستان سے برآمد ہونے والا یہ طلسمِ نور ہیرا خوب صورتی اور وزن اور سائز میں اس سے بھی نسبتاً بڑا تو تھا ہی، نیز تاریخی ورثے کے حوالے سے بھی اس کی عظمت کوہ نور ہیرے سے بڑھ کر ہی تھی، اس کے علاوہ اس ہیرے میں مجھے ایک عجیب سی پُراسراریت بھی محسوس ہوئی تھی، باوجود کوشش کے میں زیادہ دیر اپنی نظریں نہیں جما پا رہا تھا، ملٹی ڈائمنشنل یعنی کئی رخی یہ ہیرا مجھے اپنے اندر سے غیر مرئی لہریں چھوڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جو میری آنکھوں کے راستے میرے پورے وجود میں سرایت ہو رہی تھیں، جب میں نے تھوڑی کوشش سے اس پر اپنی نگاہیں جمانا چاہیں تو مجھے یوں لگا جیسے میں گردوپیش سے لاتعلق کسی اور ہی دنیا کی طرف پرواز کرنے لگا ہوں، میری سماعتوں میں عجیب و غریب خوفناک آوازیں آنے لگیں، جس میں چیخ و پکار، پھنکاریں، تیر و تفنگ، میدانِ جنگ کا سا سماں اور دیوہیکل درندوں کی دہاڑیں، بے ہنگم قہقہوں کے درمیان آہیں اور سسکیاں اور نجانے کیسی کیسی دل ہولا دینے والی آوازیں تھیں۔ پھر مجھے اپنا وجود منتشر سا محسوس ہونے لگا تھا کہ اچانک مجھے کسی نے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا، میں جیسے ایک خواب سے بیدار ہو گیا، میں نے دیکھا، پروفیسر صاحب نے مجھے سنبھالا ہوا تھا، وہ خود بھی مجھے پریشان اور حیران نظر آ رہے تھے۔

”مرنے سے پہلے وہ اس بات پر متفکر تھے کہ اگر یہ ہیرا...... نہ ملا تو یہ...... دنیا میں تیسری جنگ عظیم کا سبب بن سکتا ہے، کاش! یہ جلد ہمیں مل جائے، ورنہ اس کے اثرات کسی ہائیڈروجن اور ایٹم بم سے کم نہیں ہوں گے۔

”میرا تعلق بھی چونکہ آثارِ قدیمہ سے تھا اور پروفیسر کریم بخش نظامانی صاحب کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ مجھے بھی اس نادر و انمول ہیرے کے چوری ہونے کا سخت ملال تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوا، میں نے بے حد کوشش کی کہ کسی طرح حکومت اور مقتدر حکومتی حلقے اس ہیرے کی تلاش میں میرا ساتھ دیں مگر انہیں تو اپنی خرمستیوں سے ہی کہاں فرصت تھی۔ ان کے لیے تو یہ سب ایک دیوانے کا خواب ہی تھا مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ وطنِ عزیز کو کس قدر ہمیت کے حامل تاریخی نوادر سے محروم کر دیا گیا تھا، جو اگر پاکستان میں ہوتا تو اس کا کس قدر فائدہ ملک کو ہوتا۔ مگر فسوس کسی حکمراں جماعت نے اسے تلاشنے یا کھوجنے کا بیڑا نہ اٹھایا۔“

بشام چھلگری کی باتوں کے بحرِ سحر کے بھنور سے اُبھر کر میں نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا۔

بہرحال...... میں اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا، تب ی مجھے یہ دیکھ کر ایک دیدنی سی حیرت ہوئی، اس صندوقچے ں کوئی ”کی“ سوراخ نظر آ رہا تھا نہ ہی کوئی ایسا ”کھٹکا“ س سے اسے کھولا جائے۔

”یہ کیسا باکس ہے؟ اس میں کوئی سوراخ نظر نہیں

آ رہا؟ اور نہ ہی ایسا کوئی کھٹکا بھی، جس سے اسے کھولا جائے؟“ میں بڑبڑایا۔ گبیل دادا نے وہ صندوقچہ میرے ہاتھ سے لیا اور وہ بھی اس کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ پھر صندوقچے کو اپنے کان کے قریب لے جا کر ہلایا۔ اس کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔

”لاؤ...... مجھے دو...... میں دیکھتی ہوں۔“ باریہہ نے کہا اور گبیل دادا نے خاموشی سے وہ صندوقچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ میری یک ٹک سی نظریں باریہہ کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اس عجیب صندوقچے پر جمی ہوئی تھیں اور سماعتوں میں جہنم رسید ایڈوانی کے وہی زہر آلودہ الفاظ گردش کر رہے تھے۔

”تم اس ہیرے کو پا کر بھی نہ پاسکو گے۔“

اس کی بکواس کا کیا مطلب تھا آخر......؟ میں نے سوچا مگر نہیں...... یہ اس کی محض بکواس نہ تھی۔ کچھ ایسا تھا اس صندوقچے میں جس کا کوئی خفیہ میکنزم تھا اور کوئی بعید نہیں کہ صندوقچہ ایڈوانی نے ہی خاص اسی نادر ہیرے کو دوسروں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی تیار کروایا ہو۔

باریہہ اس صندوقچے کو خاصی دیر تک ٹھونک بجا کر دیکھتی رہی پھر جیسے خودکلامیہ انداز میں ہولے سے بڑبڑائی۔

”ڈونگی......“ کچھ ایسا ہی لفظ اس کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

”کیا کہا تم نے......؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”ڈونگی......“ وہ دوبارہ اسی انداز میں بولی۔ ”یہ ڈونگی ہے...... سلاسکو کا باپ ایرک ایسے ڈونگی سردار بوغا کے لیے بنایا کرتا تھا۔ ان کے جواہرات اور خاص قسم کی مہروں کو رکھنے کے لیے......“

”سلاسکو...... کہیں وہی تو نہیں جو ہمارا ساتھی ہے؟“

”ہاں وہی سلاسکو......“ کہتے ہوئے اس نے چیخ مار کر سلاسکو کو پکارا۔

شنگرال اور نتالیہ نے بھی اس صندوقچے کو پہچان لیا تھا اور باریہہ کی بات کی تائید بھی کر دی تھی۔

”سلاسکو......“ وہ پھر چیخی اور تھوڑی ہی دیر بعد سلاسکو ہمارے رُوبرو تھا۔ باریہہ نے صندوقچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

”ایسے صندوقچے تمہارا باپ بنایا کرتا تھا۔ یہ کیسے کھلتا ہے؟“ باریہہ نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے

بلسا اور وہ صندوقچہ اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگا مگر وہ بھی ھول نہیں پایا تو نتالیہ نے کہا۔

’’مجھے دو...... میں نے بابا کو ایک بار اپنے سامنے ایسا ی صندوقچہ کھولتے ہوئے دیکھا تھا۔‘‘

سلاسکو نے فوراً وہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ نتالیہ نے وہ صندوقچہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ پہلے تو اس کا بغور اچھی طرح معائنہ کرتی رہی اس کے بعد وہ زمین پر بیٹھ گئی اور صندوقچہ اپنی گود میں رکھ لیا، پھر مخصوص انداز میں اس کے چاروں طرف ہاتھ پھیرنے لگی، تب ہی اچانک کلک کی آواز ابھری اور وہ کھل گیا اور اس کے اندر رکھے طلسم نور ہیرے کی خوبصورتی دیکھ کر ہم سب کے منہ بھی کھل گئے۔

’’بلاشبہ...... اسے دورِ حاضر کا اب تک دریافت ہونے والا خوبصورت ترین نوادر کہا جا سکتا ہے، مگر افسوس اس کی خوبصورتی کو تیسری عالمی جنگ میں جھونک کر بدصورت بنایا جا رہا تھا۔‘‘ سب سے پہلے نصیر شاہ نے اس پر تبصرہ کیا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو خود کو فراموش کر چکا تھا۔ صندوقچہ میرے ہاتھوں میں تھا اور میرا اپنا سر اس پر جھکا ہوا تھا۔ باقی وہاں موجود لوگ بھی باری باری قریب آ کر اسے حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور تعریف کیے بغیر نہیں رہتے۔

وہ ہیرا مرغی کے انڈے کے برابر تھا۔ دن میں بھی اس کی روشنی اور تیزی قابلِ دید تھی۔

یہ سوچ کر میرا سینہ فخر سے پھول گیا تھا کہ اتنا قیمتی اور دنیا کا خوبصورت ترین ہیرا میرے وطن کی ملکیت تھا۔

اپنی کلی منجارو والی مہم، طلسم نور ہیرے سمیت پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہی اب میں واپس پاکستان لوٹنے اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔

میں نے اس سلسلے میں ایک میٹنگ صرف اپنے چاروں ساتھی، کبیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور سوشیلا کے ساتھ کرنے کی ٹھانی اور شنگرال سے درخواست کی وہ مجھے آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے میرے مذکورہ چاروں ساتھیوں سمیت کچھ دنوں کے لیے تنہا چھوڑ دے۔ اس نے مسکرا کر اور بغیر برا منائے مجھے اس کی اجازت دے دی۔

جاوا قبیلے کی کمان مکمل طور پر یونیزا پروجیکٹ سمیت شنگرال اور نتالیہ کے سپرد کر کے میں ڈارک کیسل کے اس حصے میں اپنے چاروں ساتھیوں سمیت آ گیا۔

ایسے میں باریہہ نے ہمارے ساتھ شامل ہونے کی ہامی بھری تھی مگر میں نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے فقط شکایتی نگاہوں سے گھور کر رہ گئی مگر پھر فوراً ہی معنی خیز نگاہوں سے مسکرائی بھی تھی۔ تاہم ایک موقعے پر جب میں اپنے ساتھیوں کو ڈارک کیسل کا رخ کرنے کا اشارہ کر چکا تھا اور باریہہ سے آخری بار بات کر رہا تھا تو اس نے کہا۔

’’شہزی!...... مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری اصل منزل کہیں اور ہے، اس جزیرے سے بھی دور، ان سمندروں سے بھی آگے، لیکن تم نے ہم پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، اس کا بدلہ تو ساری عمر ہم نہیں اُتار سکتے۔‘‘

اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ ’’میرے احسان کا بدلہ بس یہی ہوگا کہ تم سب لوگ یہاں اپنی سرزمین میں آزاد اور خوش رہو۔ نصیر شاہ تم لوگوں کی قسمت بدلنے آیا ہے۔ اس سے پورا تعاون کرنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ کی طرف سے تم لوگوں کے لیے انعام ہے کہ یہاں دنیا کی سب سے بڑی ہیروں کی کان دریافت ہوئی اور اس جزیرہ انڈیمان کے جن دور افتادہ قبیلوں میں سب سے پہلے اسلام کی روشنی پھیلی ہے، وہ جاوا قبیلہ ہے۔‘‘

میری بات پر باریہہ نے عقیدت اور احترام سے اپنا سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر میں اسے خدا حافظ کہہ کر ڈارک کیسل کی طرف چل دیا۔

ڈارک کیسل کی عمارت کو ابھی مسمار نہیں کیا گیا تھا۔ یہ کام ہمارے کوچ کرنے تک موقوف رکھا گیا تھا۔ ایسا میری ہدایت پر ہی کیا گیا تھا۔

اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی میٹنگ کا آغاز کرنے سے پہلے میں آنسہ خالدہ اور زہرہ بانو سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

بالخصوص آنسہ خالدہ سے بات کرنے کی میری بے چینی عروج پر تھی۔

ہم سب سے پہلے ایسے کمرے میں آ گئے جو جہنم واصل ایڈوانی کے زیرِ استعمال تھا اور یہاں بیٹھ کر دنیا بھر سے وہ لاسلکی رابطے میں رہتا تھا، لیکن جب یہ سارا سسٹم آپریٹ کیا گیا تو میں نے جھلا کر پینل بورڈ پر ہاتھ مارا۔

’’وہ بدبخت یہ سارا سسٹم کوڈ لگا کر لاکڈ کر چکا ہے، اب یہ محض کھلونوں سے بڑھ کر ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔‘‘

’’اوہ......‘‘ شکیلہ کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

ہم سب نے ان آلات کے ساتھ بہت سر کھپایا تھا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

’’میرا خیال ہے اب ہمیں یہاں سے جلد از جلد کُوچ کرنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔‘‘ بالآخر کبیل دادا نے کہا۔

’’اس سلسلے میں سوشیلا بہن ہماری خاطر خواہ مدد کر سکتی ہے۔‘‘ شکیلہ نے کہا۔ ’’ایڈوانی اور بلراج سنگھ کے مرنے کے بعد اب یہ بالکل آزاد ہے اور بھارت کی شہری بھی۔‘‘

شکیلہ کی بات خاصی حد تک درست تھی۔ میں ابھی خاموش تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی بھی شناختی کاغذات نہ تھے۔ سوشیلا کا کہنا تھا کہ کاغذات کی تیاری میں خاصا وقت لگ جائے گا۔ کاغذات کی موجودگی کے باوجود ہر صورت میں خطرہ تھا۔

سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے کہا۔ ’’اتنا رسک اٹھانے سے بہتر ہے کہ ہم نارتھ انڈیمان سے ہی کُوچ کرنے کی کوشش کریں۔ یہ قبائلی لوگ کب کام آئیں گے، یہ ہماری ایسے خفیہ اور نسبتاً محفوظ سمندری راستوں کی راہنمائی کر سکتے ہیں۔ جس سے ہم سب اپنا فرار کامیاب بنا سکتے ہیں۔‘‘

ہم سب اسی کمرے میں مختلف نشستوں پر بیٹھے تھے جہاں کبھی شلپا بیٹھی ہوتی تھی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی اور کوئی نہیں بولا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ سب اس تجویز سے متفق تھے۔ ہم ماہی گیروں کا روپ دھار کے یہاں سے نکلیں۔

جب ہم نے یہی تجویز شنگرال اور نتالیہ کے سامنے رکھی تو انہیں بھی ہمارا اسی طرح یہاں سے نکلنا زیادہ مناسب لگا۔ اس کے لیے ایک عدد فشنگ بوٹ کی ضرورت تھی جو جدید اسٹائل کے بجائے پرانی اور کلاسک طرز کی ہوتی اُتنا ہی ہمارے بہروپ کو اثر انگیز بناتی۔ یہ ان دونوں بہن بھائیوں کا مشورہ تھا، اس کے لیے اُنہوں نے ہمیں ایسی کچھ بوٹس بھی ساحل پر لے جا کر دکھائیں، جنہیں جنرل ایڈوانی کے ’’دورِ حکومت‘‘ میں بے کار جان کر لنگر انداز کر دیا گیا تھا۔ یہ قبائلی اسی کے ذریعے سمندر میں مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ایسی ہی ایک نسبتاً بہتر حال بوٹ کو ہم نے منتخب کر لیا۔ اس میں ایندھن سے چلنے والی موٹر بھی فٹ تھی۔

اس بوٹ کو منتخب اور ’’فائنل‘‘ کرنے کے بعد شنگرال نے اپنے ماہر خلاصیوں اور کاریگروں کو اس کی صفائی اور ضروری مرمت پر لگا دیا۔ ایندھن کا ایک ٹینک اضافی بھی رکھ دیا گیا۔ باقی ماہی گیری کا سارا ساز و سامان پہلے ہی سے اس میں موجود تھا اسے اُٹھا کر دانستہ عرشے وغیرہ پر پھیلا دیا، ساتھ ہی ایک بڑا سا جال بھی ایک مستول پر جھلا دیا، تاکہ دور سے ہی دیکھنے پر اندازہ ہو جائے کہ یہ ماہی گیروں کی کشتی ہے۔ اس کے علاوہ سمندر سے کچھ مچھلیاں پکڑ کر لا دی گئیں۔

اس ساری تیاری میں دو سے ڈیڑھ دن لگ گئے تھے اور اب بس روانگی کی دیر تھی۔

کمپاس وغیرہ ہم نے رکھ لیے تھے اور شنگرال نے اپنے قبیلے کے اُن لوگوں کو ہمارے پاس بٹھا کر ہمیں اچھی طرح سے محفوظ سمندری راستوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے رات کا وقت مقرر کیا تھا، آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں قطبی تارے کے بارے میں بھی بتایا جسے دیکھ اور سمجھ کر ہم سمت کا تعین کرتے رہتے۔

بلاشبہ ہمارا یہ فرار کسی ’’گریٹ اسکیپ‘‘ سے کم نہ تھا۔ اس کے لیے ہم نے اگلے دن رات کا ہی وقت مقرر کیا تھا۔ اسلحہ بھی ہم نے چھپا رکھا تھا۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر ہم اسے اپنے دفاع کے لیے استعمال کرتے۔

سوشیلا کو پورٹ بلیئر اور پھر ممبئی پہنچانے کی ذمے داری بھی شنگرال نے لے لی تھی۔ مگر میں پہلے سوشیلا کو یہاں سے بہ خیریت روانہ ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں تیاری کر لی گئی تھی۔

اس مقصد کے لیے چھوٹی اور تیز رفتار موٹر بوٹ کام میں لانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، جو وہاں تین چار کی تعداد میں موجود تھیں۔ ان کا تعلق ’’مالِ غنیمت‘‘ سے تھا۔

سوشیلا کو اگلے دن صبح روانہ ہونا تھا اور اسی دن کی رات ہم سب کو اس جزیرے سے روانگی اختیار کرنا تھی۔ سوشیلا سمیت ہم سب روانگی سے متعلق معاملات طے اور فائنل کر چکے تھے۔

ہم پانچوں ڈارک کیسل کے ایک کمرے میں بیٹھے رات کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد چائے کا دور چلا اور ہمارے گریٹ اسکیپ کے اس منصوبے پر ہی غور و خوض اور اس سے متعلق گفتگو ہوتی رہی، تاہم اس بار کی گفتگو کا زیادہ تر لب لباب بچے کھچے دشمنوں اور ان کی باقیات پر مبنی رہا۔ اس میں سے جی کو ہارا، بھولا ناتھ اور کوریئلا تھے۔ جن کے بارے میں کسی احتیاط کے پیش نظر میں نے شنگرال اور نتالیہ کو آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں ان سے اب کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ کیونکہ ایک تو ان کے بہت

سے ساتھی ہلاک کردیے گئے تھے اور وہ دونوں اب یہاں یا اس کے آس پاس خاک چھاننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

تاہم شنگرال ان کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھا جبکہ کوریلا ایک قیدی کی صورت میں ان کے پاس ہی تھی۔ اس کا فیصلہ سوچ سمجھ کر بعد میں کیا جانے والا تھا اور میں نے شنگرال وغیرہ کو اس کے بارے میں تفصیلی آگاہ کردیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جاوا قبیلہ بہت جلد اپنے بونینزا پروجیکٹ اور بھارتی تبلیغی مسلم جماعتوں کی سپورٹ سے اپنی ذاتی عسکری اور سماجی قوت میں آجائے گا۔

اس کے بعد ہم سونے کے لیے اپنے کمروں کا رخ کرنے لگے۔ ہم سے چند منٹ پہلے ہی سوشیلا اُٹھ کر کمرے سے نکل چکی تھی۔ شکیلہ اور سوشیلا کا ایک ہی کمرا تھا۔ کبیل دادا اسی کمرے میں سوتا تھا جبکہ اول خیر اور میں اس کے برابر والے کمرے میں۔

چنانچہ کبیل دادا تو وہیں ایک کونے میں بچھے بیڈ پر پاؤں پسارے لیٹ گیا، جبکہ میں، اول خیر اور شکیلہ اپنے کمروں میں جانے کے لیے رخصت ہوئے۔

کمرے کے برابر میں ہی ایک مختصر ریلنگ کی صورت میں راستہ بالکونی کی طرف جاتا تھا جس کا رخ کھلے سمندر کی طرف تھا۔

قریب سے گزرتے ہوئے اس طرف جب میری نظر پڑی تو میں چونک سا گیا اور میرے بڑھتے ہوئے قدم آپوں آپ کیل ہوگئے۔ بالکونی کی ریلنگ سے سوشیلا لگی کھڑی تھی اور اس کی میری جانب پشت تھی، چہرہ سامنے بیکراں پھیلے پُرسکون سمندر کی طرف تھا۔ جس کے صاف وشفاف تاروں بھرے آسمان پر چاند کا زرد تھال اٹکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سوشیلا وہاں جانے کیا دیکھنے میں محو تھی۔

میرے ساتھ چلتے ہوئے اول خیر اور شکیلہ بھی رکے مگر پھر اول خیر نے ہولے سے معنی خیز انداز میں کھنکھار کر شکیلہ کو آگے بڑھنے کا ٹہوکا دیا اور دونوں اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھتے چل گئے۔ میں نے بالکونی کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے۔

میں سوشیلا کے بالکل عقب میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ فضا نرم اور ہلکورے لیتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ سمندری ہواؤں کے خنک جھونکوں میں تیزی نہیں تھی۔ بلکہ ان میں ایک تھپکنے اور سہلانے کا انداز تھا۔ ان کی سبک خرای میں سوشیلا کے ریشمی بال لہرا رہے تھے۔ وہ یک ٹک سمندر کی جانب تکے جا رہی تھی اور اس کے انداز میں ایک کھویا پن محسوس ہوتا تھا۔

''سوشی......!'' میں نے ہولے سے اسے پکارا اور تب ہی مجھے اس کی ہلکی سسکی کی آواز سنائی دی۔ اس نے میری طرف گردن موڑے بغیر اپنا سر بھی خفیف سا جھکا لیا۔

یہ محسوس کرکے کہ وہ رو رہی تھی، میرے اپنے دل کو ایک گھونسا لگا۔ ہم جدا ہونے والے تھے، ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں تھا۔ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کبھی نہیں کھائی تھیں۔ نہ ہی کبھی ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا تھا۔ ہاں! بہت سا وقت ایک ساتھ ضرور بِتایا تھا۔ مشکل اور کٹھن حالات میں ساتھ رہے تھے اور اس دوران میں ایسے لمحات اور ایسی گھڑیاں بھی آئی تھیں، جب ہم قلبی طرح نہیں تو جسمانی طور ایک دوسرے کے قریب بالکل قریب بھی ہوگئے تھے۔ ایسی ساعتوں نے بھی ہمارے کانوں میں پُرشوخ سرگوشیاں کی تھیں جب ہم بھگت گڑھ کے کارواں سرائے اور خون آشام مہارانی کی حویلی کے ایک ہی کمرے میں سوئے تھے۔ وہ خطرناک پل بھی مجھے نہیں بھولے تھے جب انڈیمان کے تاریک جنگلوں میں ہم دونوں یک جسم رہے تھے۔ ممبئی کی شامیں اور سی سائڈ ہوٹلز یاد تھے مجھے جب، جہاں ہم مسکراتے اور ہنستے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ کیا کوئی دلی جذبہ، یا جذباتی رشتہ......؟ ایسا نہ تھا تو پھر جیسا مجھ سے بچھڑنے کا اسے دکھ تھا تو مجھے بھی ویسا ہی کیوں ہو رہا تھا۔ یا پھر شاید قربت اور اپنایت کے رشتے سے تو ضرور میرا اور اس کا کوئی رشتہ استوار ہو ہی چکا تھا۔

''تم رو رہی ہو......سوشی!''

بے اختیار اور اچانک ہی میرے منہ سے یہ نکلا تو اپنی آواز اور لہجے کی اس بوجھل سی...... بھنچی بھنچی سی...... لڑکھڑاہٹ پر ششدر رہ گیا۔

''یقین...... نہیں آتا...... کہ کل کا طلوع ہونے والا سورج ہماری راہیں جدا کردے گا۔'' وہ ہولے سے ڈبڈبائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''تمہارے عہد کی پختگی اور سچائی نے مجھے شدت کے ساتھ اس بات کا احساس دلایا ہے کہ تمہارے جیسے سچے دوست یوں بچھڑنے کیوں لگتے ہیں؟ ہمیشہ کا ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔ ان سے جدا ہوجانے کے دکھ کا احساس مارے کیوں ڈالتا ہے۔''

میں نے ہولے سے اس کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو اس نے بھی اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا اور میری جانب پلٹی تو اس کا چہرہ اشکبار تھا۔ آنسوؤں کی جھلملاہٹ سے آنکھیں ہی نہیں اس کا چہرہ بھی چمک رہا تھا۔ ہونٹ خفیف سے وا تھے اور ان پر تھرتھراہٹ غالب تھی۔ وہ پلٹ کر میرے بہت قریب ہوگئی، اتنی کہ اس کی غمزدہ سی سانسوں کی بازگشت بھی مجھے نوحہ کناں محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے تھام کر ان نمناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''سوشی! سچ تو یہی ہے کہ خود مجھے بھی تم سے جدا ہونے کا اتنا ہی وکھ ہے جتنا تمہیں ہے۔ مگر ہم مجبور ہیں، ہمیں جدا ہونا پڑتا ہے، ہمیں زندگی کے دھارے پر بہنا پڑتا ہے۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ لیکن کیا یہ کم نہیں کہ ہماری اچھی یادوں میں اچھے دوستوں جیسی یادوں کا بھی خوشگوار اضافہ ہوا...... انشاء اللہ زندگی رہی تو پھر کبھی کسی موڑ پر ہم ضرور ملیں گے، اچھے دوستوں کی طرح...... مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہاری معصوم بہن اور اس کی فیملی کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچایا، کیا تمہیں اس کی خوشی نہیں؟'' میں نے جان بوجھ کر موضوع بدل دیا۔ وہ بولی۔

''کیوں نہیں شہزی! میں تو بہت خوش ہوں، آج میری ویدی اُوشا کی آتما کو شانتی مل گئی ہوگی اور تمہارا یہ احسان تو......''

''نہیں سوشی!'' میں نے اس کی بات کاٹ وی۔

''احسان کی بات مت کرو، بھلا دوست بھی ایک دوسرے پر احسان کرتے ہیں؟ وہ تو ایک دوسرے کے برے وقت میں کام آتے ہیں اور پھر دیکھا جائے تو ہم دونوں ہی تو ایک دوسرے کے کام آئے ہیں۔ میں نے تمہاری جان کے دشمنوں اور تمہاری بہن کے قاتلوں کو جہنم رسید کردیا، اپنے ملک کی امانت ان سے چھین لی۔ پھر سب سے بڑی بات جس کا کریڈٹ ہم دونوں کو جاتا ہے، وہ یہ کہ ہم نے دنیا کو ایک بڑی خوف ناک جنگ سے بھی بچالیا۔ ورلڈ بگ بینگ کی اہم منصوبہ سازی کی ابتدا جنرل ایڈوانی اسی جگہ سے کرنا چاہتا تھا اور یہی جگہ اس کی قبر ثابت ہوئی۔''

اس بات پر سوشی ہولے سے طمانیت بھرے انداز میں مسکرائی۔ میں اپنے ہاتھ سے اس کے مہین چہرے سے آنسو پونچھنے لگا اور پھر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''سوشی! اب تمہاری جان کا کوئی دشمن نہیں بچا، میری دعا ہے کہ تم ممبئی جا کر اپنی ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز کرو۔'' اس پر سوشیلا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے نرم و نازک لبوں سے لگا لیا۔ ''شہزی! دل کی گہرائیوں سے میری بھی یہ دعا ہے کہ تمہاری عابدہ بہت جلد تمہیں مل جائے۔ یاد رکھنا! یہ ایک سچے دوست کی وعا ہے، جو ضرور قبول ہوگی۔''

''انشاء اللہ......'' میں نے زیرِلب کہا۔ ''چلو اب آرام کرلو، صبح تمہیں سفر بھی کرنا ہے۔''

میں اسے اس کے کمرے تک چھوڑ کر جہاں شکیلہ بھی موجود تھی۔ اپنے کمرے میں آگیا۔

☆☆☆

اگلے دن صبح سوشیلا روانہ ہوئی۔ روانگی سے قبل سب نے اسے کھلے دل کے ساتھ الوداع کیا، سوشیلا تھوڑی دیر کے لیے میرے گلے سے بھی لگی تھی۔ میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی پیشانی پر بوسہ بھی دیا۔

''ممبئی پہنچتے ہی اپنی ٹانگ کا زخم کسی اچھے ڈاکٹر کو ضرور دکھا دینا۔''

''ہاں! ویسے اب تو کافی بہتر ہوگئی ہے۔'' سوشیلا نے بھی شاید جدائی کی اس بوجھل بوجھل سی فضا کو کم کرنے کی غرض سے مسکرا کر کہا۔ جواباً میں بھی مسکرا دیا۔ پھر بعد میں سوشیلا نے مجھے بھی آج رات کو اپنے ساتھیوں سمیت بہ خیریت منزل تک پہنچنے کی وعا دی۔

شنگرال کے دو آدمیوں اور ایک عورت کے ساتھ ساتھ سوشیلا کو موٹر بوٹ میں سوار کرا دیا گیا تھا۔ عورت باریہہ تھی، میں نے اس سے خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ وہ سوشیلا کے ساتھ پورٹ بلیئر تک جائے۔ وہاں سے سوشیلا کو خود ہی ممبئی کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ اس نے مجھے دو کونٹیکٹ نمبرز بھی دیے تھے جو میں نے ذہن نشین کرلیے تھے۔

ہم ساحل کے کنارے آ کر کھڑے ہوگئے۔ سوشیلا کی موٹر بوٹ گہرے پانیوں کی طرف روانہ ہوگئی اور وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتی رہی جب تک اسے ساحل پر میں کھڑا نظر آتا رہا۔ بوٹ اوجھل ہوتے ہی میں ایک گہری سانس خارج کرکے پلٹا تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''او...... خیر کاکا! ہولے ذرا......'' اول خیر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی شکیلہ اور کبیل دادا بھی مسکراتے چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

''اپنا کاکا...... لگتا ہے اس بھارتی حسینہ کے بچھڑنے سے اُداس ہوگیا ہے۔'' کبیل دادا نے بھی مسکرا کر کہا۔ میں یوں ہی اپنا سر جھٹک کر ہنسا۔

اپنے ساتھیوں کو مطمئن اور مسرور دیکھ کر مجھے بھی دلی طمانیت ہوا۔

باقی سب اِدھر اُدھر ہو گئے تھے، ساحل پر سمندر کے قریب صرف ہم چاروں ہی کھڑے تھے۔

”ہوتا ہے...... ہوتا ہے ایسا...... وڈے استاد جی!“ اول خیر اپنا سر دھنتے ہوئے کبیل دادا سے بولا۔ اس پر شکیلہ نے البتہ قدرے سنجیدگی سے کہا۔

”جب کوئی بے تعلق اور بے رشتہ سا شخص لمبے عرصے تک ہر آڑے وقت میں ساتھ نبھاتا رہے اور پھر بچھڑ جائے تو اس سے ایک تعلق ایک نامعلوم سا رشتہ سا قائم ہونے لگتا ہے، جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا مگر اس کا بچھڑنا بھی ایک دکھ سے کم نہیں ہوتا۔“

”اچھا جی...... نازکی بیگم! مجھے نہیں پتا تھی یہ بات...... کہ آپ شاعری بھی کرتی ہیں۔“ اول خیر نے عادتاً شکیلہ کو چھیڑا تو وہ اسے گھور کر بولی۔

”تمہیں شاعری کا پتا بھی ہے کہ یہ ہوتی کیا ہے۔ کم از کم موقع محل دیکھ کر ہی بات کر لیا کرو، سارا موڈ خراب کر دیا۔ ہُنہ۔“

”او...... سوری نازکی بیگم! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس وقت کسی خاص موڈ میں تھیں۔“ اول خیر باز نہیں آیا۔

”جہنم میں گیا موڈ اور تم......“ شکیلہ نے غصے سے اسے گھورتے ہوئے پاؤں پٹخا اور پلٹ گئی۔ میں ہنسا تو کبیل دادا نے بھی حلق سے بے اختیار قہقہہ اُگل دیا اور پھر ہم سب عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

ایک طویل اور جاں گسل مہم کے بعد بالآخر ہمارے روانہ ہونے کی بھی رات آ گئی۔ سوشیلا کو پورٹ بلیئر تک پہنچانے باریہہ اور دو ساتھی گئے تھے، وہ سہ پہر تک لوٹ آئے تھے اور باریہہ نے میری ہدایات کے مطابق سوشیلا کو وہاں سے ممبئی جانے والی ایک مسافر لانچ میں بٹھا کر روانہ کر دیا تھا اور پھر یہ تینوں واپس لوٹ آئے تھے۔ سوشیلا کی طرف سے تسلی ہوتے ہی میں نے سکون کی سانس لی۔

روانگی سے پہلے ایک بار پھر ہمیں اچھی طرح سے راستہ سمجھا دیا گیا۔ شنگرال کے حکم پر ہمیں ایک نقشہ بھی بنا کر تھما دیا گیا تھا۔ ہم نے ماہی گیروں کا بھیس بھرا اور پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر لانچ (فشنگ بوٹ) میں سوار ہو گئے۔ یہ عام سی ہی بوٹ تھی، اس میں فقط ایک ہی موٹر تھی۔ جس کی آواز کسی پھٹ پھٹی موٹر سائیکل سے تقریباً ملتی جلتی تھی۔ ہمیں رخصت کرنے کے لیے شنگرال اور نتالیہ سمیت باریہہ اور نصیر شاہ کے علاوہ قبیلے کے دیگر لوگ بھی ..... الوداع کہنے کے لیے ساحل پر موجود تھے، ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ رات اپنے جوبن پر تھی اور موسم خوشگوار تھا۔ لانچ پر پہلے ہی ضروری ”سامان“ لادا جا چکا تھا۔ شنگرال، نتالیہ اور نصیر شاہ نے بڑی گرم جوشی اور دعاؤں کے ساتھ ہمیں رخصت کیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد لانچ ساحل سے دور ہونے لگی۔ ہم عرشے پر ریلنگ کے قریب کھڑے ساحل کی طرف ہاتھ ہلاتے رہے کیونکہ ساحل پر ابھی تک وہ لوگ موجود تھے۔ مشعلوں کی روشنی سے دور ہوتا ساحل کسی قندیل کی طرح جلتا ہوا نظر آ رہا تھا اور پھر جب ایک نقطے میں تبدیل ہو گیا تو ہم پلٹ کر کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔

لانچ میں ماہی گیری سے متعلق سامان ہی نہیں بلکہ کافی تعداد میں مچھلیاں اور جھینگے بھی پھیلا دیے گئے تھے، جن کی سیلی سیلی بساند پھیلی ہوئی تھی، تاہم کھلے حصے میں رکھنے کے باعث زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا، ورنہ دماغ کی رگیں ہی پھٹ جاتیں، کیونکہ ہم ایسی ”اشیا“ کے عادی نہ تھے۔ بقول شنگرال کے یہ اشیا ”رشوت“ کا کام بھی کرتی تھیں۔ کوسٹ گارڈز والوں سے جان چھڑانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مچھلیاں اور جھینگے ان کی کمزوری تھے۔

بہرکیف...... ہم چاروں ہندوستانی مچھیروں کے گیٹ اَپ میں تھے۔ میلی چیکٹ واسکٹیں پہن رکھی تھیں اور نیچے کھلے گھیر والی پیلی شلواریں تھیں، البتہ میں نے چمڑے کی پتلون نما سی کوئی شے چڑھا رکھی تھی، بقول باریہہ اور شنگرال کے، ہم میں سے کوئی ایک اس گیٹ اَپ میں بھی ہونا ضروری تھا، یہ لباس بھارتی ماہی گیروں کے مُکھیا کا ہوتا ہے۔ شکیلہ نے کاٹھیاواڑی انداز کی اودے رنگ میں خوب کس کر ساڑی باندھی تھی۔ اس بھیس میں وہ پکی بھارتی عورت نظر آتی تھی۔ ایک بندیا بھی اس نے اپنی پیشانی پر چسپاں کر دی تھی۔ اس کا انگ انگ کسی ہوئی ساڑی سے پھوٹا پڑ رہا تھا اور قیامت ہی ڈھا رہا تھا، شکیلہ کو اس روپ میں دیکھ کر اول خیر کو اس پر کوئی زوردار پھبتی کسنے کے لیے بے چینی ہونے لگی جو اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتی تھی، مگر میں نے اُسے گھورتے ہوئے اشارے سے باز ہی رکھا تھا، مجھے ڈر تھا کہیں اول خیر کی جملہ بازی سے زچ ہو کر شکیلہ یہ ساڑی اُتار کر کوئی دوسرا لباس نہ پہن لے۔ جبکہ حالات کا تقاضا تھا کہ ہم چاروں پر اپر گیٹ اپ میں ہوں تو دال گلنے کی اُمید ہوتی۔

شکیلہ نے کافی بنائی تھی اور ایک ایک مگ ہمیں تھما کر خود بھی بیٹھ گئی۔ کیبن کے شیشوں والی کھڑکی سے پرے تاریک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اُوپر کھلا تاروں بھرا آسمان تھا جس کی ٹمٹماتی روشنی عجیب سا طلسماتی تاثر ابھار رہی تھی۔ چاند بھی دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ تھوڑی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔

لانچ کو مناسب رفتار پر ایڈجسٹ کر دیا گیا تھا۔ ابھی ہم بحر ہند ہی کی حدود میں تھے اور کسی وقت بھی بھارتی کوسٹ گارڈز سے ہماری ممکنہ مڈبھیڑ ہو سکتی تھی گویا ابھی ہم ریڈ زون میں ہی تھے، پھر بھی ہم نے جو سمندری راستہ اختیار کر رکھا تھا وہاں بھارت ہی نہیں بلکہ پاکستانی کوسٹ گارڈ کے ٹکراؤ کا بھی امکان کم ہی تھا۔

”ہمیں نہ صرف بھارت بلکہ اپنے ملک کے بھی کسٹمز سے بچ کر ہی اپنی منزل پر پہنچنا ہوگا۔“ وہیل ونڈو کے قریب بیٹھے کبیل دادا نے گرما گرم کافی کا ایک گھونٹ بھر کر کہا۔

”میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں دادا......!“ میں نے کہا۔ ”پاکستانی کوسٹ گارڈ سے اگرچہ ہمیں اپنی جان کا تو کوئی خطرہ نہ ہوگا، مگر ہم بلاوجہ کی لمبی چوڑی تفتیش اور پوچھ تاچھ میں پڑ کر وقت برباد کر بیٹھیں گے۔“

”وقت ہی نہیں بلکہ اچھی خاصی پنچایت میں بھی پڑ جائیں گے۔“ اول خیر نے کہا۔

”اگر ان سے بھی ٹکراؤ ہو گیا تو کیا ہوا......“ شکیلہ کافی کا مگ ہونٹوں سے ہٹا کر بولی۔ ”انہیں اپنی اصلیت بتانے کی کوئی ضرورت نہیں، بس! ماہی گیری والا ہی موقف اختیار رکھیں گے۔“

”ہاں! اس سے ممکن ہے کہ ہمیں زیادہ لمبے چوڑے پوچھ گچھ کے عمل سے نہیں گزارا جائے۔“ کبیل دادا بولا۔ ”کیونکہ دونوں طرف کے ملکوں کی سمندری حدود میں ماہی گیروں کے غلطی سے سرحد پار کرنے کے واقعات عام طور پر رونما ہوتے رہتے ہیں۔“

”بس دوستو! دعا یہی کرو کہ بھارتی کسٹمز سے بچ کر نکل جائیں۔“

”انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ شکیلہ نے دعائیہ لہجے میں کہا تو اول خیر نے اپنا خالی مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کافی اور مل جائے گی؟“

”اتنا معزز بننے کی کیا ضرورت ہے؟“ شکیلہ نے اس کے ہاتھ سے خالی مگ لیتے ہوئے طنزیہ کہا۔ ”صاف کہو، کافی اور چاہیے۔“

”لو...... عزت راس نہ آئی......“ اول خیر چڑ کر بولا۔ ”اب تم ہماری نوکرانی تو ہو نہیں کہ میں تمہیں حکم دینے کے انداز میں کہتا...... ”اے چھوکری! اور کافی لاؤ......“

اول خیر کی اس چوٹ پر، کچن کی طرف بڑھتی ہوئی شکیلہ رک گئی اور غصے سے اس کی طرف پلٹی۔ ”کیا کہا......؟ میں نوکرانی ہوں؟ جاؤ پھر خود ہی کافی لاؤ اپنے لیے...... میں نہیں جاتی۔“ اس نے خالی مگ تختے پر رکھ دیا اور وہیں اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اول خیر نے ہتھیلی سے اپنا سر پیٹا اور بولا۔

”دھت تیرے کی...... پیار سے بولو تو مصیبت، ویسے بولو تو وبال......“ پھر ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”اچھا بابا! شکیلہ بیگم صاحبہ! ایک مگ اور کافی لا دو، تو بڑا احسان ہو جائے گا۔“

میں اور کبیل دادا مسکرا رہے تھے۔ شکیلہ منہ بسورتی رہی۔ آخر اول خیر خود ہی اُٹھنے لگا تو وہ بولی۔ ”بیٹھے رہو جہاں ہو...... لے آتی ہوں۔“ اس نے مگ اُٹھایا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

”یار، اول خیر! کیوں بے چاری کو اتنا ستاتے ہو...... دیکھو، پھر بھی وہ تمہارا خیال رکھتی ہے اتنی لڑائی کے بعد......“ کبیل دادا اس سے بولا۔

”او خیر...... وڈے استاد جی! میں اسے کہاں ستاتا ہوں، بس یہی ہر وقت نیم چبائے رہتی ہے۔“ اول خیر بولا۔ اتنے میں شکیلہ کافی لے آئی اور مگ اول خیر کو تھما کر اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

پھر اس سے پہلے کہ شکیلہ اور اول خیر کے درمیان دوبارہ کوئی نئی بحث چھڑتی، میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے ہمیں ایک نظر میپ دیکھ لینا چاہیے...... اس کے بعد قطبی تارے سے مدد لیتے ہیں، پتا چلے کہاں پہنچے ہیں۔“

شنگرال کا دیا ہوا میپ جو ایک کھال پر بنا ہوا تھا، ہم نے درمیان میں ایک اسٹول پر پھیلا دیا۔ کیبن کی چھت پر ہلکے پاور کا بلب لگا ہوا تھا، اسی کی روشنی میں ہم میپ پر جھک گئے۔

ہمیں نارتھ انڈیمان کے اس دور دراز اور گمنام ساحل سے روانہ ہوئے ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ہم ابھی بحرِ ہند اور بے آف بنگال کے کسی درمیانی سی چینل کے

اریب قریب ہی تھے۔ ہمیں یہ سفر رات بھر جاگ کر کرنا تھا۔ اگرچہ ہم نے باری باری سونے جاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن چونکہ ہم نے دن بھر اس جنگل بستی میں آرام کیا تھا اس لیے سب ہی جاگے ہوئے تھے۔

دو راتیں اور دو دن خیریت سے بیت گئے۔ ہم باری باری سوتے جاگتے تھے۔ لانچ کی رفتار ایک حد سے زیادہ نہیں تھی۔ ہمارے لیے یہ بھی بہت تھی۔ منزل تک فاصلہ طے ہو رہا تھا اور اندازہ تھا کہ ہم بحرِ ہند سے تین سو سے زائد ناٹیکل میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے اور اب بحرِ ہند اور بحرۂ عرب کے درمیانی چینل پر گامزن تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ ابھی تک کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ آئندہ کی بھی خیریت ہی معلوم ہوتی تھی۔

یوں بھی جس سمندری راستے پر ہم گامزن تھے وہ نسبتاً محفوظ تو تھا مگر اس کا راستہ ذرا طویل تھا، اسی طوالت اور حفاظت کے پیشِ نظر ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ دھر لیے جانے کا خطرہ بالکل ہی نہ تھا، کیونکہ طویل راستہ اختیار کرنے پر ہمیں برما کی بحری حدود کے بالکل قریب سے گزرنا پڑتا اور یوں وہاں بھی مذکورہ ملک کی بحری قوت سے ٹکراؤ کا خطرہ رہتا، تاہم ہم نے اپنی طرف سے یہی کوشش اور احتیاط کر رکھی تھی کہ ان کی سمندری حدود کو ''ٹچ'' کیے بغیر اپنی منزل کی طرف گامزن رہیں۔

سفر جاری تھا اور لانچ کھلے سمندر میں مناسب رفتار سے اپنی منزل کی جانب بڑھی جا رہی تھی۔ رات اپنے نصف پہر سے کچھ اور سرک چکی تھی۔ مستول پر چڑھ کر دوربین سے چاروں اطراف کا جائزہ لینے کی ڈیوٹی میں نے ہی لے رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے میرے پاس ایک سنگل لینس دوربین تھی۔

یہ تیسری رات کا سفر تھا۔ کافی کا دور چلا تو اول خیر کو جانے کیا سوجھی کہ اس نے کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کی بات چھیڑ دی۔ کبیل دادا ہک دک سا رہ گیا۔ اگرچہ اسے اندازہ تو ہوگا ہی کہ جب ''بیگم ولا'' میں، میں نے کبیل دادا سے اس سلسلے میں بات کی تھی تو ضرور میں نے یہ اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے اول خیر اور شکیلہ سے تو مشورہ ضرور ہی کیا ہوگا۔

''اتنے عرصے تک میری اپنے وطن سے دوری اگرچہ ایک نیک مقصد کے لیے تھی مگر اب دل میں شدت کے ساتھ خواہش ابھرتی ہے کہ میرے پر نکل جائیں اور میں اُڑ کر اپنے ملک کی گود میں جا پہنچوں۔''

''او خیر...... کاکا! خود ہمارے دلوں میں بھی یہی آرزو مچل رہی ہے۔'' اول خیر بھی ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔ ''وطن سے دور رہ کر پتا چلتا ہے کہ اپنا ملک کیسی قدر و قیمت رکھتا ہے۔''

''ہاں یار! یہ تو تُو نے ٹھیک کہا، بس! اب اللہ کرے کہ ہم خیریت سے پہنچ جائیں۔'' کبیل دادا نے سر ہلا کر کہا۔ تو اول خیر دزدیدہ نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہو کر کھلنڈرے سے لہجے میں بولا۔

''شہزی کاکے! جب تک زندگانی ہے، اس کے بکھیڑے تو چلتے ہی رہیں گے، مگر پاکستان پہنچ کر ہمیں سب سے پہلے ایک اہم فرض سے تو ضرور سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ بہت عرصہ ہوا کوئی شہنائی سنے، کھلی آگ میں پکے ہوئے دیگوں کے گرما گرم پلاؤ زردے اور قورمے کھائے ہوئے۔'' کہتے ہوئے اس نے پاس بیٹھے کبیل دادا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے آنکھ بھی مار دی تو میں بے اختیار مسکرا کر کبیل دادا کی طرف دیکھنے لگا، وہ اس ذکر پر اور مجھے اپنی طرف معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ کر کچھ بوکھلا سا گیا اور چور سا بننے لگا تو میں نے بھی کھل کر اول خیر کی تائید میں کہہ ڈالا۔

''بات تو تمہاری بری نہیں، میں خود یہی چاہتا ہوں کہ اب کبیل دادا کے سر پر سہرا سج جانا چاہیے۔ خوب دھوم دھام سے اس کا بھی وہیا کریں۔''

''مم...... میں...... میرے سر پہ سہرا......؟'' کبیل دادا نے اپنی بوکھلاہٹ کا عملی اظہار کیا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تو اور کیا یار......! زہرہ بانو اور تیرے وہیا کی خواہش میری ہی نہیں بلکہ ان دونوں کی بھی ہے۔''

''یہ دونوں......؟'' کبیل دادا کا چہرہ شرم سے سرخ سا ہونے لگا۔ اس نے شکیلہ اور اول خیر کے مسکراتے چہروں کی طرف چور سی نظروں سے دیکھا۔

''تو اور کیا دادا!'' میں نے اس بار متانت سے کہا۔ ''جب میں نے تجھ سے یہ بات کہی تھی تو اس کے کچھ ہی دن بعد میں نے زہرہ بانو سے بھی یہ بات کہنا تھی، مگر تقدیر نے مجھے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ پر اب......''

''یہ گمبھیر مسئلہ ہے شہزی!'' کبیل دادا نے میری بات کاٹی۔ ''مجھے ڈر ہے کہ تیرے بات کرنے سے بیگم صاحبہ مجھے گھر بدر اور دربدر ہی نہ کر دے۔''

''میرے خیال میں ایسا نہیں ہوگا دادا!'' شکیلہ نے بھی اس موضوع میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ایک طویل عرصہ بیگم صاحبہ کے ساتھ بتایا ہے۔ اُس کے ہر برے وقتوں میں تم ہی کام آتے رہے ہو، ہم تو بعد میں شامل ہوئے ہیں۔ اتنی بات پر وہ...ناراض نہیں ہوں گی۔''

''یہ اتنی سی بات نہیں ہے، شکیلہ!'' کبیل دادا نے اس سے کہا۔ ''تم لوگ بیگم صاحبہ کا وہ معاملہ نہیں سمجھ سکتے جو میں سمجھتا ہوں، میرا خیال ہے، اس موضوع کو دفن ہی کر دو۔''

''ہم سب اُن کا معاملہ اچھی طرح سمجھتے ہیں، وڈے استاد جی!'' اس بار اول خیر نے بھی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کا جو معاملہ تھا وہ ماضی کا حصہ بن چکا اور میرا خیال ہے کہ بیگم صاحبہ نے بھی اب اتنا عرصہ گزار لینے کے بعد اسے تقدیر کا لکھا تسلیم کر لیا ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھو کہ بیگم صاحبہ سے اتنی بڑی اور اہم بات کرنے والا کون ہے......؟ میں؟ شکیلہ؟ یا کوئی اور......؟ نہیں...... یہ بات اپنا شہزی کاکا کرے گا بیگم صاحبہ سے......''

''میں پھر بھی بیگم صاحبہ کی ناراضگی کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔'' کبیل دادا نے ہولے سے کہا۔ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اُداسی کی ایک پُرالم تصویر نظر آنے لگا۔ آفرین تھا اس عاشق پر جس نے اپنی خاموش وفا کا گلا اس وجہ سے گھونٹ رکھا تھا کہ کہیں اس کا محبوب ناراض ہو کے اسے اپنے قدموں سے ہی نہ دھتکار دے اور وہ اپنی اسی خوشی پر ہی راضی تھا کہ وہ جسے حاصل کرنے کی صرف تمنا ہی کر سکتا اور جس کا حصول اس کی نظر میں ناممکنات سے بھی تھا تو کیا ہوا اس نامراد عاشق کے لیے یہ کیا کم ہے کہ وہ اپنے محبوب کے اتنے قریب تو تھا کہ اظہار کے بعد وہ اس سے دور ہی نہ ہو جائے اور اسی بات کا ڈر اسے کسی بچے کی طرح ہی اب تک خوف زدہ کیے ہوئے تھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ شہزی کے بھی بس کی بات نہ ہو گی۔ میں گھر بدر کر دیا جاؤں گا۔'' کبیل دادا بولا۔

''تمہیں اس بچوں والے خوف سے نجات حاصل کرنا ہوگی کبیل دادا!'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم مطمئن رہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا، ہوا بھی تو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ میں، شکیلہ اور اول خیر اور سب سے بڑی بات اماں جی...... میں انہیں بھی ساتھ ملا کر ہی بیگم صاحبہ سے بات چھیڑوں گا......'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔

کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کے معاملے میں شکیلہ بھی ہماری طرح کم پُرجوش نہ تھی، فوراً بولی۔

''دادا......! شہزی ٹھیک کہتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بیگم صاحبہ کو اس بات پر شاک پہنچے مگر وہ سب ایک فطری اور عارضی عمل ہوگا اور پھر تم تو بیگم صاحبہ سے محبت بھی کرتے ہو، آخر کب تک تم یوں یک طرفہ بحرِ الفت میں بے مقصد بہتے رہو گے؟''

''واہ......! کیا ادبی اور شاعرانہ لفظ بولا ہے نازک بیگم نے...... یک طرفہ بحرِ اُلفت......واہ۔''

اول خیر کی پھر رگِ ظرافت پھڑکی تو شکیلہ اُسے پُرغیظ نگاہوں سے گھور کر بولی۔

''تم اپنا منہ بند ہی رکھو، دیکھتے نہیں کس قدر سنجیدہ موضوع پر بات ہو رہی ہے اور تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔''

''یار شہزی! میرا تو خیال ہے پہلے ان دنوں کے بارے میں سوچ لیا جائے تو بہتر رہے گا، دونوں آپس میں کچھ زیادہ ہی لڑنے لگے ہیں۔'' کبیل دادا نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے موقع محل جان کر مسکراتے ہوئے شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھتے ہوئے تائید میں کہا۔

''واقعی کبیل دادا! تم نے خوب مشورہ دیا۔ خدا کرے تمہارا بیگم صاحبہ سے جلد نکاح ہو جائے تو پھر ان دنوں کے فرض سے بھی ساتھ ہی فارغ ہو جائیں۔''

''کیا...میں اور اس لنگور سے شادی کروں گی......؟ میری جوتی ہی جلے گی پھر تو......''

شکیلہ تلملا کر بولی تو اول خیر کو تو جیسے اسے ستانے کا بہانہ ہاتھ آ گیا، جلدی سے بولا۔

''ارے...... رے...... رے، مجھے تو اس چڑیل سے معاف ہی رکھو بھائیو! میں لنڈورا ہی بھلا......''

''اوہو...... بے چارے نے خود کو لنگور سے چوہا بنا لیا...... ویسے یہ خطاب بھی برا نہیں ہے۔'' شکیلہ نے بھی خوب چوٹ کی تو میں نے کبیل دادا سے زچ ہو کر کہا۔

''دیکھ رہے ہو ناں تم دادا......! ان کی مہابھارت...... بھلا ان کی جوڑی چل سکتی ہے؟''

''یہی جوڑی تو چل سکتی ہے۔'' کبیل دادا ہنستے ہوئے بولا۔ ''شہزی! یہ بھی پیار کی ایک قسم ہوتی ہے، مجھے معلوم ہے دونوں کے دلوں میں کیا ہے۔''

میں کبیل دادا کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرا اس طرف کبھی دھیان ہی نہیں گیا تھا مگر گھاگ کبیل دادا......شکیلہ اور اول خیر کی اس طرح کی ''چونچ ماری'' سے بہت پہلے ہی نتیجہ اخذ کر چکا تھا۔

شکیلہ کی چوٹ پر اول خیر پہلی بار اپنا سامنہ لے کر رہ گیا، وگرنہ ہمیشہ وہ شکیلہ کو زچ کر دیا کرتا تھا۔

کبیل دادا نے البتہ عابدہ کا موضوع چھیڑ دیا اور بولا۔ ''یہ سب باتیں وقت کے ساتھ ہوتی رہیں گی مگر ہمیں ایک اور اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دینا ہوگی۔ وہ حل کیے بغیر بھلا ان سب باتوں کا کیا مزہ آئے گا۔ ہمیں عابدہ بہن کی رہائی کے سلسلے میں پہلے سوچنا ہوگا۔ کیونکہ یہ مسئلہ زیادہ حل طلب ہے۔'' اس کی اول خیر اور شکیلہ نے بھی فوراً تائید کی تھی۔

آفرین تھا میرے یاروں پر کہ وہ خودغرض نہیں تھے۔ عابدہ کے معاملے کو وہ اپنی اولین ترجیح دیتے تھے۔ اس کے بغیر باجوں گاجوں اور شہنائیوں کا بھلا کیا مزہ آئے گا۔ لیکن میں بھی اتنا خودغرض نہ تھا کہ اپنے ایک طویل اور گمبھیر مسئلے کے لیے ایسے کام بلاوجہ ہی التوا میں ڈال دیتا جن کا پہلے ہونا ضروری تھا۔

''تم نے عابدہ بہن کی رہائی کے سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے، شہزی......؟'' مجھے سوچتا پا کر بالآخر کبیل دادا نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا تو میں ایک دکھی دکھی سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''عابدہ کی بازیابی کے لیے میں اپنے طور پر کوشاں تھا اور امریکا میں مقیم ایک مسلم لبنانی خاتون...... آنسہ خالدہ اس سلسلے میں میری خاطر خواہ مدد میں مصروف تھی اور ساتھ ہی میری راہنمائی بھی کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ عابدہ پر عنقریب امریکا کی ایک دہشت گردی کی عدالت میں مقدمہ چلنے والا ہے، آنسہ خالدہ اس کا کیس لڑنے کے لیے وہاں کے ایک مشہور وکیل کی خدمات بھی حاصل کر چکی تھی۔ اسی نے کہا تھا کہ عابدہ کا کیس جیتنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان سے عارفہ کو بھیجا جائے، جو کورٹ میں عابدہ کے حق میں صرف اس قدر گواہی دے کہ وہ اس کی ہیلپر بن کر... پاکستان سے امریکا آئی تھی، مگر اس احسان فراموش... عارفہ نے امریکا جانے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ اس کے لیے وہ بدذات عورت مجھ سے سودے بازی پر اُتر آئی، یہ بھی نہ سوچا کہ عابدہ محض اسی کی خاطر ہی وہاں گئی تھی اور مصیبت میں پھنس گئی تھی۔'' یہ سب بتاتے ہوئے میرا دل بھر آیا تھا۔ لہجے میں رقت اُتر آئی تھی اور آواز ڈبڈبانے لگی تھی۔

''......مگر پھر کچھ نہ ہوسکا اور...... عابدہ کو بالآخر سزا ہو گئی...... اب بس اللہ ہی اس کا حامی و ناصر ہے...... اُسے امریکا کی ایک خطرناک جیل... میں جو کیلی فورنیا میں ہے قید کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا، کچھ پتا نہ چل سکا، نہ ہی آنسہ خالدہ کچھ جان سکی کہ عابدہ وہاں کس حال میں ہے۔ خالدہ سے بعد میں دو ایک بار ہی رابطہ ہوسکا، اس کے بعد موقع ہی نہ ملا۔''

میں اتنا بتا کر خاموش ہوگیا۔ اول خیر اور شکیلہ تو کافی حد تک یہ سب جانتے ہی تھے مگر کبیل دادا کو عابدہ سے متعلق کوئی خیر خبر کم ہی تھی۔ اب جو اس نے یہ دردناک کتھا سنی تو اس کا چہرہ اُتر کر رہ گیا اور پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولا۔

''یار شہزی! تُو تو واقعی انوکھا کاکا ہے...... اتنا بڑا دکھ اور اتنا بڑا درد اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے اور مجھے خبر تک نہیں، اس پر بھی تُو اپنے اندر کا زخم دبائے ہوئے میرے سر پر سہرا سجانے کی باتیں کر رہا ہے...... اور...... اور، تجھے اپنے سے زیادہ یاروں کی خوشیوں کی فکر ہے......! تیرے جیسا ایثار پیشہ اور بےغرض یار تو ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا شہزی! میں تجھے سلام پیش کرتا ہوں......'' یہ کہتے ہوئے کبیل دادا نے مجھ سے الگ ہو کر اپنا دایاں ہاتھ پیشانی پر لے جا کر مجھے سلام پیش کیا، میں مسکرا دیا۔

''نہیں شہزی! ہرگز نہیں...... اب پاکستان پہنچتے ہی سب سے پہلے ہم مل کر عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کوئی جامع اور مربوط پلاننگ کریں گے اور اس نیک دل خاتون آنسہ خالدہ سے بھی فوری طور پر رابطہ کر کے امریکا جانے کا قصد کریں گے۔'' کبیل دادا نے آخر میں اپنی جگہ سنبھالتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

''میں نے بھی یہی سوچ رکھا ہے دادا!'' میں نے کہا۔ ''اڈیسہ کمپنی کی ایک برانچ رنگون کے علاوہ امریکی ریاست سان ڈیاگو میں بھی ہے۔ آنسہ خالدہ ہمیں اسپانسرشپ دینے کے لیے تیار ہے۔ رہی سہی کسر اڈیسہ کمپنی کی برانچ آفس سے مدد لے کر پوری کر دی جائے گی۔ آخر وہ میرے نام ہی ہے' میں امریکا روانگی کا حتمی ارادہ کر چکا ہوں لیکن اس سے پہلے تیری اور بیگم صاحبہ......''

''نہیں یار نہیں...... ابھی میرے مسئلے کو رہنے دے، یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' کبیل دادا نے میری بات کاٹ کر کہا اور پھر شکیلہ اور اول خیر کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یار! تم لوگ ہی اِسے کچھ سمجھاؤ......''

''وڈے استاد جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شہزی......!'' اول خیر نے مجھ سے کہا۔

''عابدہ بہن کا مسئلہ حل کرنا ہے سب سے پہلے...... اس کے بعد ہی کچھ اور......'' شکیلہ نے بھی اس کے خیال کی تائید میں یہی کچھ کہا۔

''بڑوں کا فرمان ہے کہ سب سے پہلے وہ کام نمٹاؤ جو تمہارے اختیار میں ہے اور پہلے کرنے کا ہے......''

اچانک ایک آواز پر ہم سب بری طرح ٹھٹکے۔ یہ آواز کیبن کی چھت سے آئی تھی، میں نے فوراً کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا اور چونک سا گیا۔ وہ کوئی لمبی چونچ والا پرندہ تھا۔

''سی ایگل۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''شاید کہیں قریب ہی کوئی ٹاپو وغیرہ ہے۔'' میں نے کہا اور نیچے ہوگیا۔ اول خیر بھی اپنی جگہ سے تھوڑا اُچک کر کھڑکی کی چھت پر دیکھ رہا تھا۔

''یہ محترم رات کے اس آخری پہر میں شاید اوور ٹائم لگا رہے ہیں۔'' اور پھر دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے ایک عجیب سی آواز خارج ہوئی۔ جیسے وہ چونکا ہو۔

''کیا ہوا...... اول خیر؟''

''روشنی...... دور سامنے...... ذرا باہر نکل کر دیکھو......'' وہ بولا۔ ہم سب بیک وقت حرکت میں آگئے اور کیبن سے باہر عرشے میں آگئے۔ ہمیں دیکھ کر کیبن کی چھت پر بیٹھا ہوا وہ شبینہ طائر...... کلغ...... کلغ کی آواز نکالتا ہوا گھبرا کر پرواز کر گیا۔

سنگل لینس دوربین میری پتلون کی بیلٹ میں اُڑسی ہوئی تھی۔ اس میں انفرارِیڈ لینس نصب تھا، میں نے اسے لمبا کر کے اپنی ایک آنکھ سے لگا لیا اور روشنی کی سمت دیکھنے لگا۔

وہ کوئی بحری کشتی تھی، جس کا حجم خاصا بڑا تھا۔ ہماری لانچ کے رخ سے ہٹ کر وہ برما کی سمندری حدود کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دوربین پرانی ہونے کے باعث مجھے اس بحری کشتی میں کچھ زیادہ دکھائی نہ دے سکا تاہم وہ آنکھ سے ہٹاتے ہوئے ساتھیوں سے تشفی آمیز انداز میں بولا۔

''فکر کی بات نہیں...... کوئی مسافر کشتی ہے۔ جس کا رخ برما کے کسی ساحل کی طرف ہے۔''

''مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میں ذرا آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' شکیلہ ایک جماہی لے کر کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ کیبن میں ایک دیوار کے ساتھ دو تین ''بنک بیڈ'' نصب تھے۔ وہ ان میں ایک پر جا کر لیٹ گئی۔ کبیل دادا بھی تھکا تھکا سا بڑھ گیا اور اس نے بھی ایک بنک بیڈ سنبھال لیا۔ میں اور اول خیر جاگ رہے تھے اور باتوں میں مصروف رہے، تھوڑی دیر بعد اول خیر بیٹھے بیٹھے اُونگھنے لگا۔ میں کھڑکی سے لگی بینچ پر بیٹھا اُوپر تاروں بھرے آسمان کو گھورنے لگا اور پھر سمندر کی نرم خو مرطوب ہواؤں نے میرے ذہن پر بھی اپنا اثر چھوڑا تو مجھے بھی نیند آگئی اور میں کھڑکی کی چوکھٹ پر ہی اپنا چہرہ دھرے سو گیا۔

☆☆☆

ایک تیز آواز پر میری آنکھ یک دم کھلی تھی اور میں بری طرح ہڑبڑا کر اُٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی بڑا سا بھونپو میرے کان کے قریب کر کے کسی نے بجا دیا ہو۔

بھونپو کے بنکارنے پر ہم سب ہی اُٹھ بیٹھے تھے اور کیا دیکھتے ہیں ایک مخصوص بناوٹ اور ساخت کی لانچ ہماری لانچ کے بالکل قریب لنگر انداز تھی اور اس پر لگے پھریرے کو دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ انڈین کوسٹ گارڈز کی لانچ تھی جس پر بھارت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اس کی ریلنگ سے ٹکے مخصوص وردیوں میں کچھ مسلح افراد نظر آرہے تھے۔

صبح ہو چکی تھی اور آسمان پر کہیں کہیں بادل تیر رہے تھے۔ ہماری لانچ کا پھٹ پھٹی ٹائپ انجن شاید رات بھر چلتے رہنے کے باعث ہیٹ اَپ ہو کر بند ہو چکا تھا اور لانچ موجوں کے سہارے پر تھی۔

اسی وقت چار پانچ کی تعداد میں مسلح انڈین کسٹمز کے اہلکار ہماری لانچ میں اُتر چکے تھے اور کیبن کے باہر ہی کھڑے ہو کر انہوں نے ہم پر اپنی گنز تان لی تھیں اور ہندی اردو میں ہمیں ہاتھ اُوپر اُٹھائے باہر آنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ہم سب نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور ہاتھ کھڑے کیے کیبن سے باہر آگئے۔

اسی وقت ایک بار پھر اُن کی لانچ سے بھونپو کے بنکارنے کی آواز اُبھری۔

''تم سب ہمارے نشانے پر ہو...... کوئی غلط حرکت کرنے کا سوچنا بھی نہیں۔ اب اگلے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عرشے پر پیٹ کے بل لیٹ جاؤ اور دونوں ہاتھ اپنی پشت پر باندھ لو...... ترنت......''

یہاں بھی ہم نے اُن کے حکم کی تعمیل کی اور عرشے کے سیلن زدہ اور ٹھنڈے ٹھار فرش پر اسی طرح لیٹ گئے جس طرح کہا گیا تھا۔

اس کے بعد کوئی افسر ٹائپ آدمی مزید چار مسلح

اہلکاروں کی معیت میں اپنی لانچ سے اُتر کر ہماری لانچ پر آیا اور ہمارے قریب کھڑے ہو کر باری باری ہم سب کو گھورنے لگا، ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ایسی صورتِ حالات میں ہمیں کیا کرنا تھا۔

پھر اس بھارتی افسر نے شاید اپنے ساتھی اہلکاروں کو کوئی اشارہ کیا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے ان میں سے تین چار اہلکار فوراً حرکت میں آ گئے تھے۔

انہیں لانچ کی تلاشی لیتے پا کر میرا دل سینے میں بے طرح دھڑکنے لگا تھا اور دل میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ وہ ہیرا ان کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ باقی اسلحہ ہم نے ایک چھوٹے سے چوبی باکس میں باندھ کر لانچ کے پیندے سے ایک رسی کے ذریعے نیچے گہرے پانی میں جھلا دیا تھا اور اس کا میکنزم کچھ اس طرح سے ترتیب دے رکھا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت ایک تختہ ہٹا کر اسے فوراً اوپر بھی کھینچ لیا جاتا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوٹے اور پھر میری سماعتوں نے ایک کو اپنے افسر سے مؤدبانہ انداز میں فقط یہ کہتے سنا۔

''سر...... اِکلیئر......''

''ہم......'' افسر کے زور سے ہنکاری بھرنے کی آواز ابھری۔ اس کے بعد ہماری بھی لیٹے لیٹے جامہ تلاشی لی گئی۔ اس کے بعد ہمیں سیدھے کھڑے ہونے کا حکم مل گیا۔

''حجور...... (حضور) جان کی امان ہو تو عرض کیا جائے۔'' میں نے فوراً اپنے لہجے کو عام ماہی گیروں والے انداز میں سموتے ہوئے کہا تو میں نے دیکھا کہ اس خرانٹ نظر آنے والے بھارتی افسر کی نظریں میری کلائی پر بندھی گھڑی پر جم گئیں۔ گھڑی فقط میں نے ہی پہن رکھی تھی جو میں نے ڈارک کیبل سے حاصل کی تھی۔

''یہ والا ہاتھ آگے کرو اپنا......'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے تحکمانہ کہا، سینے کے پنجرے میں میرا دل جیسے ماہی بے آب کی طرح پھڑک رہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہونے والا تھا یا پھر کچھ بھی نہ ہوتا۔ بہرطور...... میں اس کی اس حرکت کا مطلب نہ سمجھ سکا اور پھر جب میں نے اپنی رسٹ واچ والا ہاتھ اس کی جانب کیا تو اس نے میری کلائی پکڑ کر گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی۔ میری یک ٹک اُلجھی ہوئی مگر بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور تب ہی میں نے اس کے چہرے پر تناؤ کی پہلے جیسی کیفیت کو ٹوٹتے پایا۔ وہ کچھ مطمئن ہوا تھا۔ پل کے پل میں اس کی اس حرکت کو سمجھ گیا کہ وہ کیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔

''تم لوگ دیکھنے میں تو مانجھی اور ماہی گیر لگتے ہو...... کیا تم غلطی سے پاکستان کی سرحد پار کر کے اِدھر آن گھسے ہو؟''

افسر نے قدرے نرم لہجے میں کہا تو میں اس ہندو بھارتی افسر کی مکاری پر اَش اَش کر اُٹھا تھا۔ اس نے بڑے شاطرانہ انداز میں اندھیرے میں اپنا تیر چلایا تھا تاکہ ہم اس کے نرم لہجے اور اس کے ''سمجھنے'' کو اپنی نجات کی اُمید سمجھ کر فوراً سچ اُگل دیں کہ...... ''ہاں، حجور! آپ نے بالکل ٹھیک کہا لہٰذا ہمیں واپس جانے دیا جائے۔''

مگر چالاکی سے سچ اُگلوانے کے بعد یہ ہمیں اپنے ساتھ گرفتار کر کے بھارت کی کسی خوفناک جیل میں ڈال دیتے اور اگلے دن بھارت کا متعصب میڈیا کتے کی طرح پوری دنیا میں ہماری تصاویر دکھا کر بھونک رہا ہوتا کہ ''ہم نے پاکستان کے جاسوسوں کو دھر لیا جو بھارت میں ماہی گیروں کا روپ دھار کر دہشت گردی کرنے آئے تھے۔''

میں نے فوراً کہا۔ ''حجور......! توبہ...... توبہ...... ہم بھلا پاکستانی ہووے ہیں؟ ہم تو اُدھر پچھم کی اور...... میں ایک مچھیروں کی بستی میں رہوت ہو...... مچھلیاں پکڑ رہے تھے، اعلیٰ نسلی جھینگوں کی تاریپھ (تعریف) سن کے ایدھر آوت گئے، ہمرا قصور، ہمیں ماپھ کرو......'' میں نے مخصوص لہجے میں یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

بھارت میں چند نچلے درجے کے غریب ہندوؤں کو بولتے دیکھ کر میں نے یہی لب ولہجہ اپنایا تھا جس کی جھلک میں بھگت گڑھ میں سوشیلا کی ہمسفری و ہم رکابی میں دیکھ چکا تھا، یوں بھی بعض انڈین فلموں میں بھی میں نے کرداروں کو ایسا بولتے سنا تھا۔ نیز ایسی بولیاں میری ٹریننگ کا بھی حصہ رہ چکی تھیں۔ اول خیر اور شکیلہ بھی اس سے آگاہ تھے، البتہ کبیل دادا کا معاملہ اور تھا، تاہم میرا خیال تھا کہ اس کے بولنے کی نوبت کم ہی آتی، مگر کچھ نہ کچھ تو ضرورت کی حد تک وہ بھی بول ہی لیتا۔

میں نے دیکھا اعلیٰ نسل کے جھینگوں کا سن کر اس بھارتی افسر کی چُندی چُندی آنکھوں میں مخصوص چمک اُبھری تھی، ساتھ ہی وہ ہمارے ساتھ کھڑی شکیلہ کو بھی گرسنہ نظروں سے گھورتا جاتا تھا۔

''کیدھر ہیں جھینگے؟''

''وہیں ہیں جی، ایک دم تاجا (تازہ) ہیں...... نوش کیجیے......'' میں نے مؤدب لہجہ اختیار کیا اور اول خیر کو چلا کر مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اوئے رے کھٹیا! صاحب کے لیے جھینگوں کا بورالا دے۔'' اول خیر فوراً حرکت میں آیا اور عرشے پر ہی بنے ایک ڈک کی جانب بڑھ گیا اور اندر ہاتھ مار کر جھینگوں سے بھرا بورا کھینچ لایا۔ یہ لوگ خوش ہو گئے...... جاتے سمے ان کے افسر نے کہا۔

''خیال رکھنا اب اس سے آگے مت جانا...... پڑوسی ملک کی حد شروع ہو جاتی ہے، پھنس گئے تو کام سے گئے۔''

''جی جی جور! کھیال رکھیں گے، بڑے دیالو ہیں آپ جو ہمیں بتا دیا۔''

القصہ کوتاہ، یہ بلا بھی ٹل گئی اور ساتھ ہی ہمیں معلوم بھی ہو گیا کہ ہم پاکستانی حدود سے زیادہ دور نہ تھے۔

اُن کے جانے کے بعد ہم نے خوشی سے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا دیے...... ہم اب ایک بڑے خطرے سے بچ کر نکل چکے تھے۔

تب ہی کبیل دادا نے پوچھا۔

''شہزی! اس بھارتی افسر کی یہ حرکت سمجھ نہ آئی کہ اس نے تمہاری کلائی میں بندھی گھڑی کو کیوں دیکھا تھا؟''

میں اس کے سوال پر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا اور جواباً بولا۔

''یہ بہت چالاک افسر تھا، مگر ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ یہ گھڑی دیکھ کر اس میں انڈیا اسٹینڈرڈ ٹائم کا اندازہ کرنا چاہ رہا تھا، یہ تو شکر تھا کہ ہم انڈیا کی سرحد سے ہی چلے تھے اور اس گھڑی میں بھارت کے معیاری وقت کا ہی تعین تھا، اگر پاکستان کے مطابق ہوتا تو ہمیں فوراً دھر لیا جاتا۔ کیونکہ پاکستان کے معیاری وقت سے بھارت کا وقت آدھا گھنٹا آگے ہے...... لہٰذا اب مجھے پاکستان کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے اپنی گھڑی میں آدھا گھنٹا پیچھے کر دینا چاہیے، تاکہ اگر ہم پاکستانی کوسٹ گارڈ کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ ہمیں بھارتی نہ سمجھ بیٹھیں۔''

''اوہ...... اتنی باریکی...... کمال ہے۔'' شکیلہ حیرت سے بولی تو اول خیر کی رگ پھڑکی۔

''او خیر...... بی بی! یہ باریکیاں تمہارے موٹے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ اسی لیے اب تم بھی ذرا اصل روپ میں آجاؤ اور یہ بندیا اور...... حواسوں پر قیامت...... مم...... میرا مطلب ہے...... دلوں پہ گھبراہٹ طاری کر دینے والی یہ ساڑی بھی اُتار پھینکو...... پاکستان آنے والا ہے۔'' اول خیر کی اس بات پر میں اور کبیل دادا منہ دبا کر ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگے کہ اسی وقت شکیلہ اول خیر کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتی ہوئی آگے بڑھی۔

''کیا بکواس کی میرے بارے میں تم نے......؟ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ اسے مارنے کو لپکی تو اول خیر فوراً بھاگ کر کبیل دادا کے پیچھے ہو گیا اور بولا۔

''بچاؤ وڈے استاد جی! شادی سے پہلے ہی یہ حال ہے تو بعد میں کیا ہوگا......''

باز وہ پھر بھی نہ آیا تھا۔ مجبوراً کبیل دادا کو ہی اس کی سفارش کرنا پڑی۔

''جانے دو شکیلہ! اس کی عادت ہے اول فول بکنے کی...... تم جاؤ، اندر لباس رکھا ہے، بدل لو جاکر......''

وہ غصے سے اول خیر کو گھورتی ہوئی اور اپنا پاؤں پٹختی کیبن کے عقبی حصے کی طرف چلی گئی۔ میں ہنستا رہا اور کبیل دادا بھی مسکرانے لگا۔

کبیل دادا نے جا کر موٹر کو چیک کیا، وہ دھواں چھوڑنے لگی تھی۔

''اس کی تھوڑی سی اوور ہالنگ کرنا پڑے گی۔'' کبیل دادا نے انجن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے ہیڈ کھولنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یار دادا! ہم تو منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں، موٹر کو خراب نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں...... شہزی! ذرا اول خیر کو اِدھر بھیج دو۔''

میں نے اول خیر کو آواز دی۔ وہ عرشے پر ریلنگ کے پاس کھڑا دوربین آنکھ سے لگائے کھلے پانیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قریب آگیا۔ وہ دونوں کام میں جت گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے تک موٹر درست کرتے رہے، کبیل دادا کو انجن اور موٹر مرمت کرنے کا خاصا تجربہ تھا۔ لانچ کے اسٹور میں ٹول اور دیگر سامان موجود تھا۔

شکیلہ نسبتاً ڈھنگ کا لباس پہن آئی تو میں نے اسے کچھ کھانے وغیرہ بنانے کا کہا۔

اتنے میں موٹر کے چلنے کی آواز ابھری۔ اضافی ایندھن ڈالا گیا اور لانچ ایک بار پھر منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ تب تک شکیلہ جھینگے اور مچھلی فرائی کر چکی تھی۔ اس نے کافی بھی بنائی تھی۔ کھانے کے کچھ خشک ڈبے بھی تھے۔ یہی کچھ کھا پی کر ہم نے پیٹ بھرا۔

لانچ کی روانگی کے بعد ہم نے مقدور بھر اپنا انڈین ملاحوں اور ماہی گیروں والا لباس بدل لیا۔ میرا لباس تو عام

سا ہی تھا، شکیلہ بھی بدل چکی تھی، جبکہ کبیل دادا اور اول خیر نے فقط گیروا رنگ بدل لیا تھا۔

ہم ایک بار پھر میپ پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ہم پاکستانی حدود میں داخل ہو چکے تھے اس لیے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اسلحہ سمندر بُرد کر دیا۔ قریب ترین ساحل کیٹی بندر پڑتا تھا اس کے بعد کراچی (کیماڑی) کا ساحل تھا۔ ابھی ہم کیٹی بندر سے چند ہی ناٹیکل میل دور تھے کہ سفید اور نیلے رنگ کی ایک تیز رفتار موٹر بوٹ کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

ہم ایک دم الرٹ ہو گئے۔ نکاسی کا یہ آخری مرحلہ تھا۔ اگرچہ اب کوئی بڑا خطرہ باقی نہ رہا تھا، مگر ہم کسی لمبی چوڑی تفتیش میں بھی پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ منزل پر پہنچ کر کسی اور کھڑاگ میں پڑ کر بہت سا وقت ضائع ہوتا۔ دل میں تو آئی کہ پاکستانی کوسٹ کو اپنا سیدھے سبھاؤ تعارف کروا دوں کہ میرا رینجرز سے تعلق ہے اور میں ایک کمانڈو ہوں۔ مگر قباحت یہ تھی کہ اس وقت میرے پاس اس طرح کی کسی شناخت کے لیے کوئی تحریری ثبوت نہ تھا۔ پھر یہ رینک مجھے ریاض صاحب نے آنریری طور پر دیا تھا اور اسے کافی حد تک خفیہ بھی رکھا تھا۔ چلو یہ شرط بھی رکھی جاتی تو ابھی کیا معلوم تھا کہ موجودہ وقت میں وہ خود کہاں اور کس پوزیشن میں تھے۔ وہ میری کیا ضمانت دے سکتے تھے؟ جبکہ اس سلسلے میں کبیل دادا نے میرے بھارت آنے کے بعد کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ وہ طویل رخصتی پر بھیج دیے گئے تھے، ممکن تھا ریٹائر ہو چکے ہوں، اگرچہ آرمی آفیسر کوئی بھی ہو خواہ ریٹائر ہی ہو وہ سول انتظامیہ کے برعکس، اپنے تعلقات برقرار رکھتا ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے میں اس لمبے چوڑے بکھیڑوں سے بچنا ہی چاہتا تھا اور کوشاں تھا کہ تھوڑے میں ہی گلوخلاصی ہو جاتی۔

پاکستانی کوسٹ کی وہ بوٹ قریب آگئی تھی۔ ہم نے عرشے پر مچھلیاں اور جال وغیرہ پھیلا دیے تھے۔ کبیل دادا نے میرے اشارے پر لانچ کا انجن بند کر دیا تھا۔ میں نے شکیلہ کو دانستہ کچن میں بھیج دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ وہاں خود کو کسی کام میں مصروف رکھے اور ایک فٹ کا گھونگٹ نکال کر شرمیلی خاتون کا رول پلے کرتی رہے۔

بوٹ ہماری لانچ کے قریب آکر رک گئی تھی۔ سفید وردی میں ملبوس کوسٹ آفیسر اور اس کے چار پانچ اہلکار ساتھ کھڑے تھے، ان میں سے کچھ کے سینوں پر دوربینیں جھول رہی تھیں، ایک اہلکار نے اپنے آفیسر کو بھی دوربین دی تھی۔ اپنی بوٹ سے ہماری لانچ کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ایک دوسرے اہلکار نے اُسے میگا فون تھما دیا۔ وہ اسے اپنے منہ کے قریب لے جا کر بنکارتے ہوئے بولا۔

''تم تینوں ریلنگ کے پاس آجاؤ...... قریب......''

ہم تینوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جب قریب آئے تو اس آفیسر نے میگا فون ہٹا کر ہم سے پوچھا۔

''تم لوگ کون ہو اور اس لانچ میں کتنی تعداد میں موجود ہو؟''

میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ کے قریب لے جا کر بھونپو سا بنا کر جواب میں کہا۔

''ہم... کُل چار افراد ہیں سرکار......! ماہی گیری کرتے ہیں۔ چوتھی ہماری زنانی ہے وہ اندر کچن میں ہے۔ کہو تو بلا دیں۔''

''اُسے باہر بلاؤ۔''

''ری نوراں......! باہر آ...... اپھسر (آفیسر) آئے ہیں۔'' میں نے شکیلہ کو پکارا، اگلے ہی لمحے وہ میری ہدایت کے مطابق ایک فٹ کا گھونگھٹ نکالے، شرماتی لجاتی ہوئی باہر نکل کر ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔

''ہم سیڑھی لگا رہے ہیں، تم سب ایک ایک کر کے

غرقِ محبت

''کب تک مجھ کو بھولو گے!''

چاہتوں کا بھید دں بھرا یہ سوال اسے حال سے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اس نے محبوب کی آہٹوں پر کان اور راہوں میں پلکیں بچھائے زندگی تمام کر دی مگر...... فاصلوں میں کمی نہ آئی۔ ابھی تو زندگی کی تلاش جاری تھی کہ اچانک اس انداز میں رقصِ اجل شروع ہوا کہ وہ چاہتوں کے مدفن پر حسرتوں کے پھول چڑھانے پر مجبور ہو گیا۔

جون 2017ء کے شمارے میں سسپنس

کے آخری صفحات پر جادوئی انداز لیے......

محبوب قلمکار **طاہر جاوید مغل** کی چونکا

دینے والی سحر انگیز طویل داستان آپ کی توجہ کی منتظر

ہماری بوٹ پر آؤ گے اور ہاں...... کاغذات اور پرمٹ ساتھ ہیں تو وہ بھی لیتے آؤ......''

''کاجات (کاغذات) تو کوئی نہیں ہمرے پاس سرکار......! ہمرے تو کپڑے بھی پورے نہیں ہوتے سرکار! بھلا کاجات کیا ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

آفیسر نے کوئی جواب نہ دیا تب تک سیڑھی لگائی جا چکی تھی، ہم چاروں ان کی ہدایت کے مطابق ایک ایک کر کے سیڑھی کے ذریعے ان کی بوٹ میں آ گئے۔

دو اہلکاروں نے گنز تان لی تھیں۔ ان سب کی چبھتی ہوئی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ آفیسر نے اچھی طرح ہمارے..... چہروں کا جائزہ لینے کے بعد دو افراد کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور لانچ کی تلاشی میں جت گئے، جبکہ دو اہلکار ہم تینوں کی اچھی طرح جامہ تلاشی لینے میں مصروف ہو گئے۔ مجھے تسلی تھی کہ ہمارے پاس ایسا کوئی غیر قانونی ''سامان'' نہ تھا جو تھا اُسے ہم پہلے ہی سمندر بُرد کر چکے تھے۔ کاغذات کا معاملہ البتہ اپنی جگہ تھا۔ شکیلہ کی اُنہوں نے کوئی تلاشی نہیں لی تھی، تاہم ایک اہلکار نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ''گائیگر'' قسم کے ہینڈ چیکر سے اسے دیکھ لیا تھا۔

جب یہ ساری کارروائی ''بہ خیریت'' نمٹ گئی تو آفیسر نے بالکل آخر میں وہی کیا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ کوسٹ گارڈز والے سب سے پہلے یہی چیز چیک کرتے تھے، یعنی میری گھڑی...... اس نے اس کا وقت دیکھا پھر ایک گہری سانس لی۔ کیونکہ میں پہلے ہی اپنی گھڑی کو معیاری پاکستانی وقت کے مطابق ٹائم سیٹ کر چکا تھا۔

اس کے انداز و اطوار سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ ہمارے سلسلے میں مطمئن ہے، تاہم کڑک دار لہجے میں بولا۔

''تم لوگ اس طرح کھلے پانیوں میں بغیر کسی پرمٹ اور کاغذات کے کیوں داخل ہوئے؟ کیا نہیں جانتے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، تم سب کو لمبی انکوائری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔''

''سرکار......! معافی چاہتے ہیں، آج کیٹی بندر سے گھوڑا باڑی تک کوئی شکار ہاتھ نہیں لگا۔'' میں نے ملتجیانہ سے لہجے میں کہا۔ ''لالچ میں اِدھر نکل پڑے، شکار تو اعلیٰ درجے کا ہاتھ لگا ہے، پر یہ والی مصیبت بھی گلے پڑ گئی، ماپھی چاہتے ہیں سرکار! آپ کا حکم ہو تو آپ کی کھدمت میں کچھ پیش کر دیں؟''

آفیسر نے ایک نظر عرشے پر پھیلے ہوئے بورے دیکھے۔ پھر اس کے پاس ہی کھڑے ایک ساتھی اہلکار نے اس کے کان میں جھک کر کچھ کہا پھر وہ مجھ سے تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''کیا شکار ہاتھ لگا ہے؟''

''سرکار! مچھلی ہے اور جھینگا ہے۔''

''کیکڑا نہیں ہے؟''

''نہیں سرکار......! وہ ابھی ہاتھ نہیں لگا، شاید بھٹ آئی لینڈ جاویں تو مل جائے۔''

''یہ خراب تو نہیں ہوا؟''

''ارے نہیں سرکار! ہمارا آج کا پیشہ تھوڑا ہی ماہی گیری کا...... جدی پشتی پیشہ ہے، آپ بے پھکر رہیں، مال پکڑتے ہی ہم اس میں سب سے پہلے نمک مصالحہ لگا دیتے ہیں۔''

''ہمم مم......'' آفیسر نے ہنکارا ابھرا۔

''ٹھیک ہے، مگر آئندہ احتیاط رکھنا...... مال نکال لو، پر زیادہ نہیں تم اپنے لیے بھی رکھ لو، آخر محنت کرتے ہو۔''

مال کے نئے پرانے ہونے پر میں اندر سے ذرا ڈرا بھی تھا۔ اگر یہ لوگ باریک بینی سے چیک کر لیتے تو کیا خبر انہیں اندازہ ہو جاتا کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔

یہ بلا بھی بہ خیریت ٹل گئی۔ ہم نے وہیں سے بابا بھٹ آئی لینڈ اور کیماڑی کا رخ کیا۔ پھر ایک کھاڑی میں پہنچ کر رکے تو ٹھیکے دار اور مزدور گلے کو آن پڑے۔ ہم نے ایک ٹھیکے دار سے بات طے کر کے بچا کھچا مال اور لانچ اونے پونے فروخت کر ڈالی اور وہ رقم سنبھالے ہم بندرگاہ سے باہر آ گئے۔

کراچی میں خوب کڑاکے کی گرمی پڑ رہی تھی۔ تیز دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی مگر ہم اندر سے جتنے مطمئن اور مسرور تھے، اس خوشی کے آگے یہ تکلیف کچھ بھی نہیں تھی۔ اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی بے اختیار جسم و جاں تو کیا روح بھی سرشار ہو گئی تھی۔ اپنوں سے ملنے کی خوشی کا تصور اتنا جاں فزا تھا کہ دل کرتا اُڑ کر بیگم ولا پہنچ جاؤں۔ اپنی ماں جی کو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولا تھا اور باپ، اس سے تو ملتے ہی بچھڑ گیا تھا۔ میں...... میں جانتا تھا اماں جان مجھے سوتی جاگتی آنکھوں سے ہر وقت اور ہر گھڑی یاد کرتی ہوں گی۔

ایک خوشی یہ بھی تھی کہ میں اپنے ساتھیوں سمیت اپنے ملک کی قیمتی امانت بھی ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ نادر و نایاب بیش قیمت طلسم نور ہیرا میں نے کبیل دادا کے ہی مشورے سے انجن روم میں ایسی جگہ چھپا رکھا تھا جہاں تیل اور آئل کی موٹی تہ جمی رہتی تھی۔ یہی نہیں وہاں ہم نے...... مچھلیوں کی آلائش بھی پھیلا رکھی تھیں۔ ایسی گندی جگہ پر کسی کا دھیان بھی نہ جاتا۔

لانچ اور مال کے روپوں سے ہم نے سب سے پہلے پنے پہننے کے لیے نئے اور صاف ستھرے جوتے اور پڑے خریدے۔ باہم مشورے سے ہم نے یہی فیصلہ کیا ا کہ ایک دن مکمل آرام کرنے کے بعد ہی ملتان کے لیے رانہ ہوں گے۔

لانچ اور مال بے شک اونے پونے بیچ گئی تھی کیونکہ ں کے کاغذات بھی نہیں تھے، تاہم پھر بھی اتنے پیسے ہو لئے تھے کہ ہم بہ آسانی کرایہ کر کے ملتان پہنچ جاتے۔ تھوڑا رید حساب کیا گیا تو ہم نے سب سے پہلے ایک عدد مارٹ فون بھی خرید لیا اور اس میں ''سپر کارڈ'' ڈاؤن رنے کے بعد ہم ہوٹل آ گئے، وہاں ہم نے ایک ہی بڑا سا فیملی روم'' لے لیا۔

بیڈز پر لیٹے تو ہر کوئی خاصی دیر تک خالی الذہنی کی لت میں رہا۔ کبیل دادا وغیرہ کا تو اتنا عرصہ انڈیا میں نہیں بیتا ا مگر میں نے کافی عرصہ بِتایا تھا اور جن حالات میں گزرا تھا، میں ہی جانتا ہوں، اب وہ سب ایک فلمی منظر کی طرح برے پردۂ تصور میں چلتا محسوس ہوتا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ند پل کے لیے تو مجھے یقین بھی نہیں آتا تھا کہ میں اپنے اتھیوں اور طلسمِ نور ہیرے سمیت اپنے ملک میں بہ خیریت و فیت پہنچ چکا تھا، تاہم میں ذہنی طور پر آئندہ کے متوقع الات کے لیے بھی خود کو تیار رکھے ہوئے تھا۔ جانتا تھا میں کہ س طرح حادثاتی طور پر میں انڈیا پہنچایا گیا تھا اس کے بعد ے یہاں کے بہت سے ایسے نازک، خطرناک اور حساس عیت کے معاملات اُدھورے رہ گئے تھے۔ اب وہ سب برے ساتھ کون سا نیا گل کھلانے والے تھے۔ یہ تو آنے والا ت ہی بتاتا مگر قرائن سے لگتا تھا کہ میرے لیے اب یہاں ہ پہلے والے حالات نہیں رہے تھے۔ ریاض صاحب کا کچھ نہیں تھا۔ میری غیر موجودگی میں میرے دیدہ و نادیدہ منوں نے کتنی قوت پکڑ لی تھی، اس کا اندازہ تو مجھے کبیل دادا ی کہانی سن کر پہلے ہی ہو چکا تھا۔ بالخصوص نوشابہ کے کردار نے میرے ازلی دشمنوں کو ابھارنے اور ان کو بھی جنہیں میں نے انڈر گراؤنڈ ہونے پر مجبور کر دیا تھا، ایک قوت پکڑنے کا ب بنا تھا۔ یہ کچھ کم خطرناک صورتِ حال نہ تھی۔

چوہدری ممتاز خان اپنی لاڈلی اور چہیتی بیٹی نوشابہ کی جہ سے ہی رِہا ہوا اور زیرِ زمین تنظیم اسپیکٹرم کا زونل چیف وزیر ان بھی کیل کانٹوں کے ساتھ لیس ہو کر ابھر آیا تھا۔ ان سب کے ساتھ مل کر نوشابہ میرے ساتھ ایک نیا محاذ کھڑا کر چکی تھی۔ گو نوشابہ محض چند ہی برس کے فرق سے مجھ سے عمر میں چھوٹی تھی، لیکن لگتا تھا کہ ممتاز خان نے اس کی تربیت دوسرے ہی انداز میں کی تھی۔ بہ قول کبیل دادا کی کہانی کے اس نے قوت پکڑتے ہی اپنا اثر و رسوخ بڑھایا تھا اور پھر بیگم ولا پر وار کیا تھا، جس کے نتیجے میں زہرہ بانو (بیگم صاحبہ) کو خاصا دھچکا پہنچا تھا۔ بلاشبہ نوشابہ، زہرہ بانو کے سامنے ''کل کی چھوکری'' تھی مگر اس کل کی چھوکری نے اپنا حلقہ اثر تیزی سے قائم کیا تھا اور اس میں کیا شک تھا کہ اس کی پشت پناہی کرنے والا وزیر جان جیسا ایک عالمی ڈان تھا۔

کبیل دادا، اول خیر سمیت شکیلہ کا بھی یہی خیال تھا کہ میری لمبے عرصے کی غیر موجودگی سے میرے دشمن خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی منتشر طاقتوں کو مجتمع کر کے ایک نئی قوت بن کر اُبھرے تھے۔ رہی بات میرے بہی خواہوں کی جن میں ایڈووکیٹ خانم شاہ، زبیر خاں (خان جی) کس پوزیشن میں تھے، مجھے ابھی اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ میں ان سانپوں کی جوڑی کو بھی نہیں بھولا تھا کہ عارفہ اور سیٹھ نوید سانچے والا اب تک کیا کیا تارِ عنکبوت بُن چکے ہوں گے، یہ میرے نہیں، میری جانِ جاناں عابدہ کے مجرم تھے۔ میں نے ان کی عیش بھری زندگی کو اپنے سینے کی آتشِ انتقام سے بھسم کرنے کا بھی عہد و ارادہ کر رکھا تھا۔

بہت سے اُدھورے رہ جانے والے حسابات چکتا کرنا تھے مجھے......

ہم بہت تھکے ہوئے تھے بستروں میں گرتے ہی سو گئے۔ جاگے تو رات کی خبر لائے۔ روم سروس سے کچھ منگوا کر کھایا پیا گیا۔ پھر چائے کا دور چلا تو میں نے سیل فون سے زہرہ بانو سے بات کرنی چاہی تا کہ انہیں اپنے آنے کی خوش خبری سنا دوں، کیونکہ وہ بہت فکرمند ہوں گی۔ اباجی کا تو معلوم نہیں مگر اماں جی تو ہوش و حواس میں تھیں، ان کا میری اس طویل اور اچانک غیر متوقع جدائی میں کیا حال ہو رہا ہو گا۔ وہ ماں تھیں میری، اتنے عرصے بعد ملی تھیں اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد دوبارہ ماں بیٹا مل کر بچھڑ گئے تھے۔ مگر کبیل دادا نے مجھے بیگم ولا رابطہ کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم شاید بھول رہے ہو، شہزی! میں نے تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے اچانک غائب یا چلے جانے سے گیدڑ بنے دشمن بھی شیر ہو گئے تھے اور اُنہوں نے اپنا اثر و رسوخ ہی نہیں بلکہ مجرمانہ ہتھکنڈوں سے بیگم والا کے مکینوں کی زندگی

تنگ کرنا شروع کردی تھی۔ جس کے نتیجے میں بے چاری بیگم صاحبہ تک کو خان جی سے مدد لینے کے لیے جانا پڑا تھا۔ کیونکہ وہ بھی آج کل سیاست میں پوری شدمد کے ساتھ ”اِن“ رہنے لگے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے میرا کہ اس وقت دشمنوں کی نظریں ہی نہیں بلکہ سماعتیں بھی بیگم ولا پر لگی ہوں گی اور ممکن ہے فون کالز بھی ٹریس کی جارہی ہوں۔“

”میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہا ہوں مگر میں لینڈ لائن پر نہیں بلکہ زہرہ بانو کے سیل فون پر رابطہ کروں گا۔“ میں نے کہا۔

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب ہم اپنی منزل سے کون سا دور ہیں۔ چاہو تو آج رات پنجاب جانے والی کسی لگژری کوچ میں سوار ہوجاتے ہیں اور کل پہنچ جائیں گے۔“

”او...... خیر! شہزی کا کے! استاد جی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ اول خیر بولا۔

”بیگم ولا میں ہم اپنی آمد کو جس قدر خفیہ رکھیں اُتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔“

شکیلہ نے میری تائید میں البتہ ان دونوں کی باتوں سے اختلاف کیا، بولی۔

”لیکن...... باوجود اس کے ہمیں بیگم صاحبہ سے رابطہ ضرور کرنا چاہیے، آخر ان سب کی خیریت اور وہاں کے حالات کا تو اندازہ ہو...... یوں منہ اُٹھائے بیگم ولا کا رخ کرنا ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ ہوگا۔“

شکیلہ کی بات مجھے معقول لگی تھی، تاہم میں نے جب تائید طلب نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھا تو وہ چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ٹھیک ہے شہزی! تم رابطہ کرو مگر ابھی یہ مت بتانا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں، البتہ بیگم صاحبہ کو تسلی دے دینا وہ بھی اصرار نہیں کریں گی۔“

میں زہرہ بانو کو فون کرنے کے فوراً بعد ہی آنسہ خالدہ سے بھی رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ پہلے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ زہرہ بانو کے سیل فون کا نمبر ملا دیا۔ بیل جاتی رہی مگر کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔

”کیا ہوا......؟“ اول خیر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

”پتا نہیں کیوں وہ فون نہیں اُٹھا رہی ہیں۔“ میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا تو شکیلہ بولی۔

”ہوسکتا ہے وہ اَن نون نمبر دیکھ کر فون ریسیو نہ کررہی ہوں، لینڈ لائن پر ہی کرلو۔“

”آخری بار ٹرائی کرکے دیکھتا ہوں۔“ میں نے کہا اور نمبر ری ڈائل کیا۔

دوسری جانب بیل جارہی تھی اور تب ہی تیسری بیل کے بعد زہرہ بانو کے بجائے کوئی اجنبی مردانہ آواز ابھری۔

”ہیلو، کون؟“ صاف لگتا تھا کہ دوسری جانب سے مخاطب ہونے والے شخص نے اپنی آواز کو جان بوجھ کر رعب دار بنانے کی کوشش کی تھی۔

”تم کون ہو؟ کیا یہ بیگم صاحبہ کا سیل نمبر نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔ دوسری جانب پل بھر کو خاموشی رہی۔ میرا دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا پھر وہی مردانہ آواز اُبھری۔

”یہ انہی کا ہی نمبر ہے مگر آپ کون ہیں؟“ پوچھا گیا۔

مجھے تسلی ہوئی، شکیلہ کا خیال درست ثابت ہوا تھا، اَن نون نمبر دیکھ کر شاید زہرہ بانو نے اپنا سیل ساتھی کو تھما دیا تھا۔

”بیگم صاحبہ سے میری بات کراؤ...... اُنہیں شہزی کے متعلق بتانا ہے۔“

میں نے دانستہ اپنے ”نک نیم“ کا ہی ذکر کرنا مناسب سمجھا تو دوسری جانب اچانک گم صم سی خاموشی چھا گئی مگر اس کا دورانیہ چند پل ہی محیط رہا تھا کہ اگلے ہی لمحے زہرہ بانو کی لڑکھڑاتی آواز ابھری۔

”کک...... کون......؟ شش...... شہزی کے بارے میں تم کیا بتانا چاہتے ہو......؟“

زہرہ بانو کی آواز سنتے ہی میں نے خود بھی اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ملائمت آمیزی سے کہا۔

”زہرہ بانو......! یہ میں ہی ہوں...... شہزی! پہچان لیا مجھے...... تو آگے بات کی جائے؟“ میرے کہنے کی دیر تھی کہ دوسری جانب جیسے چند ثانیوں کے لیے زہرہ بانو کو سانپ سونگھ گیا مگر پھر جلد ہی وہ بول پڑی تو اس کی آواز میں مجھے ایک جذباتی سا ارتعاش محسوس ہوا۔

”شش...... شہزی! کک...... کیا...... ی ی...... یہ...... واقعی تم بول رہے ہو......؟“ اس کا اندازِ تخاطب غیر یقینی سا تھا۔

”میں ہی بول رہا ہوں، کیا اتنے عرصے میں آپ میری آواز بھی نہیں پہچان پارہی ہیں؟“

”او...... مائی گاڈ مجھے یقین نہیں آرہا ہے، کک...... کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں؟“

”ہرگز نہیں، ورنہ آپ اپنے ساتھی سے فون کیونکر لیتیں؟“

”تت...... کہاں ہو؟ کیسے ہو؟ بب...... باقی ساتھی کہاں ہیں؟ جلدی بتاؤ مجھے۔“

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں اور اللہ کے فضل سے سب ساتھی بھی ٹھیک ہیں اور میرے ساتھ ہی ہیں۔“ میں نے پُرسکون سے لہجے میں کہا تا کہ وہ بھی خود کو پُرسکون کرلے۔

”تت...... تم لوگ ہو کہاں......؟“

”شش...... کیا فون پر یہ بتانا ضروری ہے؟“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”لل...... لیکن......“ اس کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔ میں فوراً بولا۔

”بس! اتنا سمجھ لو...... ہم خطرے سے نکل آئے ہیں اور کسی بھی وقت بیگم ولا پہنچ رہے ہیں، اب تم سرِ دست مجھے مختصراً یہ بتاؤ کہ وہاں کی تازہ صورتِ حال کیسی ہے؟ کیا آجائیں ہم؟“

”ہہ...... ہاں، نن...... نہیں......“ جانے کیوں وہ اٹکنے لگی، پھر جیسے چند ثانیے اپنے حواسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے بعد بولی تو پہلے کے مقابلے میں اس کا لہجہ نہ صرف محتاط بلکہ سنبھلا ہوا بھی محسوس ہوا۔

”سنو شہزی......“

”میں سن رہا ہوں......“ میں نے دھیان لگائے رکھا۔

”اب فون پر پوری تفصیل تو نہیں ہوسکتی...... لیکن یہ درست ہے کہ تمہارے جانے کے بعد دشمنوں نے نئے سرے سے طاقت پکڑ لی ہے، ابھی زیادہ تو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائے ہیں مگر وہ اندر ہی اندر کوئی مضبوط محاذ قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ اُنہوں نے بیگم ولا کی ریکی بھی شروع کر رکھی ہے۔ کون آرہا ہے؟ کون کہاں جارہا ہے، وہ سب نظروں میں رکھے ہوئے ہیں، مگر بات صرف اتنی سی بھی نہیں ہے...... تم سن رہے ہو ناں شہزی......؟“

”بولتی رہیں، میں سن رہا ہوں......“ میں نے تیزی سے کہا۔ میں اس کی آخری بات پر بے چین سا ہوا تھا۔

”لگتا کچھ ایسا ہی ہے کہ بیگم ولا ہمارے دشمنوں کا ایک مشترکہ ”ٹارگیٹڈ پوائنٹ“ بن چکا ہے۔ کچھ اور مشکوک لوگوں کو بھی قریب میں منڈلاتے دیکھا ہے، سمجھ لو کہ ایسے لوگ جن سے بہ ظاہر ہماری دشمنی کا کوئی تعلق بھی بنتا نظر نہیں آتا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ چوہدری ممتاز یا نوشابہ وغیرہ کے گماشتوں کے علاوہ...... کوئی اور لوگ...... جنہیں پُراسرار کہا جائے......“

”ایگزیکٹلی......! یہی کہنا چاہ رہی تھی میں......“ وہ فوراً بولی۔

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے، پھر بولا۔

”بس، پھر اب خود کو ذرا سنبھالیں اور تھوڑا سا انتظار کریں۔ زیادہ تفصیل نہیں بیان کرسکتا، آگے آپ سمجھدار ہیں، کیا اب میں فون بند کردوں؟“ میں نے اشارہ دیا۔

”شکر ہے میرے اللہ......! کہ تم اور باقی ساتھی خیریت سے ہو۔“ اس کی دعائیہ آواز اُبھری۔

اس کے بعد میں نے اسے خدا حافظ کہہ دیا۔ دل کو کچھ سکون ملا۔ میں نے ساتھیوں کو بتادیا، اس کے بعد آنسہ خالدہ کا نمبر ملایا۔

آنسہ خالدہ کا نمبر ملاتے ہوئے مجھے یاد آیا تھا کہ آخری بار اس سے میں نے بھارت میں ہی رینا کی سہیلی کے فلیٹ میں ... ٹیلی فونک بات کرنی چاہی تھی کہ بلراج آن کودا تھا مگر مجھے یاد تھا کہ میرا رابطہ ہوگیا تھا اور مجھے دوسری جانب سے آنسہ خالدہ کے بجائے کسی اجنبی خاتون کی آواز سنائی دی تھی، میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

بہرحال اب اس سے رابطہ کرتے وقت میرا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ مجھے عابدہ سے متعلق کیا ”اَپ ڈیٹ“ دیتی ہے؟...... لیکن یہ کیا...... دوسری جانب سے انگلش میں کسی خاتون کی ریکارڈ شدہ آواز میں بتایا گیا کہ یہ نمبر درست نہیں...... اور بھی بہت کچھ بتایا جارہا تھا، مطلب اس کا ایک ہی تھا۔ یہ نمبر اب کسی کے استعمال میں نہیں رہا تھا یا پھر میرے کونٹیکٹ لسٹ سے بلاک ہوگیا تھا۔ میری کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ دل جیسے اب رک رک کر دھڑکنے لگا تھا۔ ہاتھوں پیروں میں جان ہی نہ رہی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا آخر؟ آنسہ خالدہ کا نمبر کیوں بند ہوگیا تھا؟

یہ سن کر میرے تو اوسان ہی خطا ہوگئے اور میرا چہرہ فق ہوکر رہ گیا تھا۔ میرے چہرے کی رنگت بدلتے دیکھ کر تینوں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ میں نے دو تین بار ٹرائی کیا مگر بدستور وہی ریکارڈ شدہ میسج ملتا رہا۔

”کیا ہوا شہزی؟ خیریت تو ہے، تمہارا چہرہ کیوں اچانک اُتر کر رہ گیا ہے؟“

کبیل دادا نے پوچھا۔ شکیلہ اور اول خیر بھی میری اس کیفیت کو دیکھ کر پریشان ہوگئے تھے۔ میں نے جب انہیں ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں بتایا تو وہ بھی تشویش زدہ سے نظر آنے لگے۔

”آنسہ خالدہ کے ساتھ کچھ ہوا ہے؟“ میں بڑبڑایا۔

”او...... خیر کا کے! پریشان نہ ہو...... کیا خبر اس نے اپنا نمبر تبدیل کرلیا ہو؟“ اول خیر نے کہا۔ یہ ممکن تھا۔ میں

نے ایک لمحہ سوچ کے جواب دیا۔

”اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھے مطلع کرتی۔“

”کیا ہوگیا ہے یار تجھے؟“ کبیل دادا مسکرا کر بولا۔ ”وہ تجھے کیسے اور کس نمبر پر مطلع کرتی......؟ تیرے پاس اس عرصے میں سیل فون کب رہا؟“

”لیکن زہرہ بانو کا نمبر اس کے پاس تھا......کم از کم اس پر ضرور اطلاع کرتی، کیا وہ نہیں جانتی تھی کہ میں اس سے عابدہ سے متعلق پل پل کی خبر لیتا رہتا تھا۔“

”او خیر...... کاکے! ابھی بیگم صاحبہ سے بات ہی کتنی ہوئی ہے تیری؟ ہوسکتا ہے آنسہ خالدہ نے اُنہیں اس سلسلے میں کوئی پیغام دے رکھا ہو۔“ اول خیر نے میرا دلی اور دماغی بوجھ ہلکا کرنا چاہا تو میں بولا۔

”کیسی بات کر رہا ہے یار تو......؟ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ابھی مجھے ضرور بتاتی۔“

”شہزی! حوصلہ رکھو......“ شکیلہ نے میرا حال دیکھ کر قریب آتے ہوئے میرے شانے پر اپنا ایک ہاتھ دھرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”تمہاری ابھی بیگم صاحبہ سے باتیں ہی کتنی ہوئی ہیں، صرف چند سیکنڈ؟ وہ اتنے قلیل وقت میں تمہیں کیا کیا بتاتیں، جبکہ تم نے خود ہی اُنہیں مختصر بات کرنے کا اشارہ بھی دیا، پھر یہ بھی تو دیکھو کیسے حالات میں ہوئی ہیں؟ اُنہیں یاد نہیں رہا ہوگا۔“

شکیلہ کی بات سے میرے دل کو کافی ڈھارس ہوئی مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ پوری طرح تسلی نہ ہو پائی۔ میں بے چین سا ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا، پھر بھی کچھ نہ سوجھا تو ایک بار پھر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے زہرہ بانو کے سیل کا نمبر ملا دیا۔ وہ تینوں خاموش کھڑے تھے۔ اُنہیں یقیناً میری اس دلی کیفیت اور بے قراری کا احساس تھا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ زہرہ بانو سے میں اسی وقت پوچھ کر اپنی یہ تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ ورنہ ملتان پہنچتے پہنچتے مجھے ایک پل کے لیے بھی چین نہ آتا۔

دوسری جانب سے زہرہ بانو نے فوراً میری یہ دوسری کال ریسیو کی تھی۔

”خیریت شہزی؟“ وہ تیزی سے بولی۔

”میری غیر موجودگی میں آنسہ خالدہ کا فون آیا تھا؟“ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

”ہاں! آیا تو تھا مگر......“ وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

”مگر کیا......؟“

”بات کرنے والی آنسہ خالدہ نہیں تھی۔“ زہرہ بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔

”پھر کون تھی وہ......؟“ میری بے چینی فزوں تر ہو رہی تھی۔

”آں......“ وہ کچھ سوچنے لگی۔ اِدھر میرا دل تھا کہ جیسے رکے جا رہا تھا۔

”تمہارے جانے کے کچھ روز بعد ہی کی بات تھی......اسی لیے کچھ بھول رہی ہوں......“

”کیسے بھول رہی ہیں آپ......؟“ میں چڑ سا گیا۔ وجہ میری عابدہ اور آنسہ خالدہ سے متعلق پریشانی ہی تھی۔ ”کیا آپ نہیں جانتیں کہ آنسہ خالدہ ہمارے لیے عابدہ کے حوالے سے کس قدر اہمیت کی حامل خاتون رہی ہیں......؟ آپ کو اس کی ایک ایک بات کو اہمیت دینی چاہیے تھی۔“

”میرے خدا، شہزی پلیز، ناراض مت ہونا...... مجھے یہ سب معلوم ہے، مگر شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ...... تمہارے بعد یہاں میں کن عذاب ناک حالات سے دوچار رہی ہوں...... میں بتاتی ہوں، یاد آرہا ہے، مجھے......“ وہ بڑے رسان سے بولی تھی۔ میں نے بھی ذرا اپنے اندر کے جذباتی پن پر قابو پانے کی کوشش چاہی اور بے اختیار ایک گہری سانس بھی خارج کر کے رہ گیا۔

”فون آنسہ خالدہ اور عابدہ کے حوالے سے ہی آیا تھا۔“ صرف چند ہی سیکنڈوں کے بعد وہ دوبارہ بتانے لگی اور میں سرتاپا سماعت بن گیا۔

”مگر...... جو خاتون بول رہی تھی۔ وہ کوئی اور اجنبی تھی......وہ تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ پہلے تو یہی کہتی رہی کہ تمہارے سیل کا نمبر نہیں لگ رہا تھا تو شہزی نے آنسہ خالدہ کو بیگم ولا کا لینڈ لائن نمبر بھی دے رکھا تھا۔ سو بولی...... کہ شہزی کو آنسہ خالدہ کا فقط اتنا پیغام پہنچا سکتی ہو تو دے دینا کہ آنسہ خالدہ......“

زہرہ بانو بولتی جا رہی تھی اور...... میں...... جیسے اپنے آپ میں ہی نہ رہا تھا......شاید حواسوں کا مختل پڑ جانا اِسے ہی کہتے ہیں...... کہ انسان جہاں کھڑا ہوتا ہے اس کا بھی احساس جاتا رہتا ہے کہ وہ زمین پر ہے یا کہیں اور......شاید پیروں تلے زمین نکل جانا اِسے ہی کہتے ہیں...... میں کچھ ایسی ہی کیفیات کا شکار ہو رہا تھا اس وقت۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

غلط پیغام

تمکین رضا

چال اور ڈھال کی قیامت خیزی سے انکار ممکن نہیں... مگر کبھی کبھی ایک اتفاقی حادثہ پوری بساط کو لپیٹ دیتا ہے... شاطرانہ انداز میں سوچی گئی چال کا دلچسپ احوال...ایک پیغام نے بازی کا رخ بدل دیا...

اس شاطر کا المیہ جس کا منصوبہ بے داغ تھا

دونشستوں والی چھوٹی سی کیوٹ کار کنٹری روڈ سے ایک قابلِ دید آبشار سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ن کار کا اندرونی منظر نہ کیوٹ تھا اور نہ ہی قابلِ دید۔ کار کی ڈرائیور سیٹ پر ایک نوجوان عورت موجود تھی۔ اس کا خون آلود سر کار کی کھلی کھڑکی سے باہر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کے کان کے پیچھے گولی کا سوراخ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

سراغ رساں شرمین ہومز گولی کے نشان کا جائزہ لے رہا تھا۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط:38

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے مزین ایک تروتازہ و شاداب دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون عتاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، کیتھی شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ ہاسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور دشمن ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ [illegible] اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگیوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آپہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ وہاں سے فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔

مرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان ل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی نگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس لور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان ے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں ہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کا یاکلپ ہو جاتی ہے۔ مگر ی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، ی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی موانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ ی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا ں پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی موانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، یلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ تا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو تے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی ہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ م بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ دھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ نیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ لا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے اپنی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کھیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کھیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے اتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹکسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

زہرہ بانو نے مجھے بتایا تھا کہ...... وہ اجنبی خاتون جس نے اپنا نام سوزی بتایا تھا، وہ آنسہ خالدہ کی کوئی قریبی سہیلی تھی۔ سوزی کے کہنے کے مطابق آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں بہت زیادہ فعال تھی اور اس کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں اس نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کی تھی۔ حتیٰ کہ جب عابدہ پر مقدمہ چلا اور وہ تمہاری طرف سے مایوس ہونے کے باوجود بھی عابدہ کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ جب عابدہ کو سزا ہو گئی اور اُسے کیلی

فورنیا کے مضافات میں واقع امریکا کی دوسری خطرناک جیل میں قید بامشقت، سزا کے طور پر بھیج دیا گیا تو آنسہ خالدہ تب بھی چین سے نہیں بیٹھی تھی۔

اُس نے ایک بین الاقوامی مبصر اور سینئر رپورٹر کی حیثیت سے کورکوران جیل کا دورہ کیا اور عابدہ سے ملاقات کی کوشش بھی چاہی مگر اسے عابدہ سے ملنے نہیں دیا گیا، اس کے لیے خصوصی پاس کی ضرورت تھی جو کیلی فورنیا کے میئر سے حاصل کیا جاتا تھا۔

آنسہ خالدہ نے اسی وقت کیلی فورنیا کے میئر سے اس خصوصی پاس کے لیے ملاقات کی کوشش کی تو اس میں بھی کئی دن لگ گئے، وجہ میئر کی عدم دستیابی تھی، جب وہ ملا تو اس نے بڑی ردوکد کے بعد پاس اسے دے دیا اور آنسہ خالدہ اپنی کار میں ایک بار پھر کورکوران روانہ ہوگئی۔

وہاں کی لیڈی چیف وارڈن نے آنسہ خالدہ کو پھر بھی ملنے نہیں دیا جس کے باعث آنسہ خالدہ اور لیڈی چیف وارڈن کے بیچ خاصی تلخ کلامی ہوئی۔ بعد میں آنسہ خالدہ نے پتا نہیں اپنے کون سے خفیہ ذرائع سے پتا چلانے کی کوشش کی تو اسے شبہ ہوا کہ عابدہ جیل سے غائب کردی گئی تھی، جس پر آنسہ خالدہ نے لیڈی وارڈن کو اپنے اس خدشے کا اظہار کرتے ہوئے یہ دھمکی دی کہ اگر اُسے عابدہ سے نہیں ملنے دیا گیا تو وہ اپنے اخبار میں (جس میں وہ کام کرتی تھی) اور ٹی وی چینل کے ذریعے اپنے اس شبہے کا کھلے عام اظہار کردے گی کہ عابدہ کو کسی خاص مقصد کے تحت جیل سے غائب کردیا گیا تھا۔

اس کے دوسرے دن ہی آنسہ خالدہ خود غائب کردی گئی جس کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔ سوزی کو خدشہ تھا کہ آنسہ خالدہ کے غیاب یا اغوا میں سی آئی اے چیف باسکل ہولارڈ کا ہی ہاتھ ہے اور کچھ پتا نہیں کہ اس نے آنسہ خالدہ کے ساتھ کیا حشر کیا ہو......

تاہم عابدہ کے معاملے میں باسکل ہولارڈ کے لیے وہاں فقط ایک آنسہ خالدہ ہی تھی جو اُن کے لیے دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ خدا جانے کہ اب وہ زندہ بھی تھی یا تاریک راہوں میں ماردی گئی تھی۔

زہرہ بانو سے تمام تفصیل جاننے کے بعد میں کئی لمحوں تک سکتے کی حالت میں رہا، میرے کانوں میں اب عابدہ کی خاموش فریادوں اور سسکیوں کی گونج میں ایک اور بے بس عورت کی فریاد بھی شامل ہوتی محسوس ہونے لگی تھی لیکن...... نہیں، ذرا ہی غور کرنے پر ان سسکیوں کے پیچھے ایک مکروہ اور زہریلی ہنسی کی بازگشت بھی سنائی دی۔ میر چشمِ تصور میں بدنصیب عابدہ اور آنسہ خالدہ کی فریاد ک صورتوں کے ساتھ عارفہ کا بھیانک چہرہ بھی کسی زہر ناگن کی طرح پھنکاریں مارتا ہوا رقصاں دکھائی دینے لگا۔

یہی وہ کم ظرف اور احسان فراموش عورت تھی جس وجہ سے عابدہ ایک بھیانک اور عالمی شطرنج بازوں کی گہ چال کا شکار ہوکر ان کے پھندے میں بری طرح پھنس تھی۔ میں عابدہ، عارفہ اور پھر سیٹھ نوید کے بارے م سوچنے لگا، ان کے تعلق میں گہری سازش پوشیدہ تھی۔

”کوئی لمبی کھیڈ ہوگئی ہے شہزادے! کیا سو لگا؟“

معاً ہی مجھے کبیل دادا کی آواز سنائی دی اور میں ایک لمبی سانس خارج کی۔

”ہاں، کبیل دادا! بہت لمبی بازی کھیلی جا رہی ہے ایسی بازی جس کی بساط کے مہرے بہت دور تک پھیلا د گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے..... زہرہ بانو سے فو پر کہا۔

”سوزی کے بارے میں کوئی تفصیل؟“

”کوئی تفصیل نہیں، سوائے اس کے کہ وہ آنسہ خالد کی روم میٹ اور دوست ہے۔“ زہرہ بانو نے جواب دیا۔

”اس نے آنسہ کے نمبر سے رابطہ کیا تھا؟“

”نہیں، میرا خیال ہے یہ سوزی نام کی اس خاتون ا اپنا نمبر تھا۔“

”آپ نے محفوظ کرلیا یہ نمبر؟“

”ہاں! نمبر سیو ہو چکا ہے۔“

”اسی وقت مجھے بھیج دیں۔“

”لل...... لیکن شہزی!“

”میں جو کہہ رہا ہوں، وہی کریں زہرہ!“ میں اس کی بات کاٹ کے بولا۔

”ابھی بھیجتی ہوں مگر تم لوگ......“

”ہماری فکر چھوڑیں۔“ میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ”میں بتا چکا ہوں، ہماری فکر کرنے کی اب ضرورت نہیں، ہم خیریت سے وطن لوٹ چکے ہیں اور ایک مناسب وقت پ بیگم ولا میں ہماری آمد ہوجائے گی۔“

”او کے...... او کے......“ زہرہ نے جلدی سے کہا اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔ میں تھکا تھکا اور ٹوٹا ٹوٹا سا ایک کرسی پر گرگیا۔ میں نے اپنا سر صدمے کے باعث اتنا جھکا لیا تھا کہ میری ٹھوڑی سینے سے جا لگی تھی۔

”اوخیر...... کاکے! حوصلہ پکڑ...... کیا ہوا؟ بیگم صاحبہ نے کیا بتایا ہے عابدہ کے بارے میں؟“ اول خیر نے فکرمندی سے پوچھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ بھی میری طرف تشویش آمیز نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں یرے دھیرے سب بتادیا۔

”یااللہ! عابدہ بہن کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا...... اس کی عصمت و جاں کی حفاظت فرمانا۔“ شکیلہ نے فوراً عابدہ کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے اور بے اختیار ہم سب کے لبوں سے زیرِ لب آمین برآمد ہوا تھا۔

”لگتا ہے شہزی! عابدہ کا معاملہ واقعی گمبھیر سا ہوگیا ہے۔“ کبیل دادا نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں انفرادی طور پر تم کچھ بھی نہیں کرسکتے، بات کڑوی ضرور ہے مگر شہزادے! حقیقت یہی ہے۔“

کبیل دادا کی بات پر میرے دل کو جیسے گھونسا لگا۔ کبیل دادا صاف اور کھری بات کہہ ڈالتا تھا۔ جھوٹی اُمید اور طفل تسلیاں دینا اس کا شیوہ نہیں تھا۔ دیکھا جاتا تو یہ کچھ غلط بھی نہ تھا۔ میں واقعی انفرادی سطح پر اب تک عابدہ کے لیے بھلا کر ہی کیا پایا ہوں؟ ایک عارفہ کو تو میں امریکا جاکر وہاں کی عدالت میں عابدہ کے حق میں گواہی دینے پر مجبور نہیں کرپایا تھا جس کے نتیجے میں عابدہ کو...... سزا ہوگئی۔ پہلے اور بعد میں بھی آنسہ خالدہ ہی کے آسرے پر تھا کہ وہ کچھ کر پائے، مگر صورتِ حال یہ تھی کہ خود اُس بے چاری کا بھی پتا نہ تھا کہ وہ کہاں غائب کردی گئی تھی؟

میں اسی طرح مایوس اور خاموش سا خالی الذہنی کی حالت میں کرسی پر بکھرا بکھرا سا بیٹھا رہا۔

”یہ سارا کیا دھرا اسی عارفہ کا ہے۔“ اول خیر دانت پیس کر بولا۔

”میں تو کہتا ہوں کہ ملتان جاتے ہی سب سے پہلے اسی گردن ناپنی چاہیے۔“

”عارفہ کی حیثیت محض ایک فارورڈ بلاک کی سی ہے اور بس...... عابدہ کے حوالے سے شہزی کا خوف سر پہ ضرور سوار رہتا ہوگا، اسی لیے اس نے ہمارے دشمنوں کی پشت پناہی لی ہے اور کیا خبر گیو اینڈ ٹیک کی صورت میں وہ ان کی جاسوس کا بھی کردار ادا کررہی ہو۔“ شکیلہ نے کچھ غور کرنے کے انداز میں کہا تو کبیل دادا نے اپنی پہلی والی بات کے تسلسل میں اپنا بیان نما مشورہ جاری رکھا۔

”اگر ہم انفرادی سطح پر کچھ کرنے سے قاصر ہیں تو پھر ہمیں اجتماعی سطح پر کچھ کرنا ہوگا، یعنی حکمراں طبقے اور سربرآوردہ سیاسی شخصیات کے علاوہ مقتدرہ سماجی شخصیات، پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے عابدہ کی رہائی کو ملک کا ”ہاٹ ایشو“ بنادیں......“

کبیل دادا کی بات پر میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری اور اسی انداز و لہجے میں بولا۔ ”تب بھی کچھ نہیں ہوگا۔ ہاں البتہ فصلی بٹیروں کو اپنی سیاسی دکانیں چمکانے موقع مل جائے گا۔ عابدہ کی رہائی کی آڑ میں شوروغل ہوگا، امریکا کے خلاف جھنڈے لہرائے جائیں گے۔ نعرے بازی ہوگی۔ غلغلہ مچے گا اور پھر سب پانی کا بلبلہ بن جائے گا۔ یوں یہ ایشو زیادہ ہاٹ بن جائے گا، ہمارے لیے نہیں عابدہ کے دشمنوں کے لیے۔“

میرے لب و لہجے اور لفظ لفظ میں مایوسی اور تلخی بھر آئی تھی۔ اسی دوران زہرہ بانو نے مجھے میسج کرکے سوزی کا نمبر بھیج دیا۔ میں نے فوراً نمبر سیو کیا اور ڈائل کردیا۔

میں سوزی سے خود بھی بات کرنا چاہتا تھا، کچھ باتیں ہوتی ہیں جو رہ جاتی ہیں اور براہِ راست کچھ نئی باتوں کا پتا چلتا ہے۔ دو تین بار رابطے کی کوشش کرتا رہا مگر سوزی سے بات نہ ہوسکی۔ میں بری طرح جھنجلا گیا، ایسے میں جانے کیوں اول خیر ذرا سرک کر میرے قریب آگیا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے غصے اور جھلاہٹ میں سیل فون پھینکا تو اول خیر نے فوراً اسے کیچ کرلیا۔

”اوخیر...... کاکے! اس کی ابھی ہمیں سخت ضرورت ہے۔“ وہ شاید میرے ذہنی خلجان کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ اسے ادراک ہوگیا تھا کہ میں سیل فون کے ساتھ کیا حرکت کرنے والا تھا۔

میں کرسی سے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبیل دادا، شکیلہ اور اول خیر خاموش تھے۔ عابدہ کا جب بھی ذکر چھڑتا، میں شدید ذہنی دباؤ اور جھنجلاہٹ کا شکار ہوجاتا، درمیان میں کسی کو بھی بولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، فقط تسلی کے چند بول ادا کردیے جاتے تھے۔

”میں اس ناگن کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس احسان فراموش حرافہ نے میری عابدہ کے ساتھ جو کیا ہے، اس کا خمیازہ اسے ضرور بھگتنا پڑے گا۔“

”شہزی! تم نے ٹھیک کہا ہے۔“ شکیلہ بولی۔ ”ہمیں شور شرابا کرنے کے بجائے اپنے طور پر ہی عابدہ کی رہائی کے لیے کچھ سوچنا ہوگا اور بیگم ولا پہنچتے ہی ہمارا کام، اس سلسلے میں سر جوڑ کر بیٹھ کے اس کا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا اور خود ہی عملی کارروائی کرنا ہوگی۔ بات بڑی ہے، مگر ناممکن ت

نہیں۔"

شکیلہ کی بات پر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں اب یہی کرنا چاہیے تھا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ تاہم اس وقت ہمارا بہ خیریت ملتان اور بیگم ولا پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔ یہاں بھی ہمارے دشمنوں کی کمی نہ تھی۔

دن بھر سوتے رہنے کے باعث ہماری رات کی نیند اُڑ چکی تھی۔ کبیل دادا کا خیال تھا کہ اب سونے کے بجائے، صبح چھ بجے والی ٹرین میں برتھیں بک کروا کے ملتان کا قصد کیا جائے اور وہیں لمبی تان کر سوتے ہوئے طویل سفر کاٹا جائے۔ کیونکہ رات اب نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اول خیر نے روم سروس کے ذریعے چائے اور کچھ کھانے پینے کے لیے منگوالیا۔

ہم آپس میں عابدہ اور امریکا مہم کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔

چائے ختم کی ہی تھی کہ میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ یہ زہرہ بانو کی کال تھی۔ میں نے فوراً سیل فون کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا۔

"شش...... شہزی! میرا خیال ہے تم ابھی ملتان مت آؤ......" دوسری جانب سے زہرہ بانو کی کچھ تشویش زدہ سی آواز اُبھری جس نے خود مجھے تفکر میں مبتلا کر دیا، فوراً پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا؟ خیریت؟ کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں شہزی! میرا دل گھبرا سا رہا ہے۔ تمہاری اور ساتھیوں کی آمد کی جہاں مجھے خوشی ہے وہیں، خدشات اور طرح طرح کے وسوسے بھی دل و دماغ کو پریشان کر رہے ہیں۔"

"تم کیا شہزی کو کمزور سمجھنے لگی ہو یا دشمنوں کو طاقت ور......" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بات تو نہیں......" وہ کہتے کہتے رہ گئی۔ "لل...... لیکن میرا خیال ہے یہاں کے کچھ حالات سنبھل جاتے اس کے بعد......"

"حالات کو کیا ہوا ہے؟ میرے لیے سب پہلے جیسا ہی ہے۔"

"سب کچھ اب پہلے جیسا نہیں رہا ہے شہزی!" وہ فوراً بولی۔ "موجودہ اور پیش آمدہ حالات کا تمہیں اندازہ نہیں، نہ ہی علم ہے۔ نوشابہ جیسی ٹین ایجر لڑکی کو آگے لانے والوں نے نہ صرف اس کے ہاتھ مضبوط کر دیے ہیں بلکہ وہ خود بھی ایک نئی طاقت سے اُبھرے ہیں۔ دشمنوں نے ایک دوسرے کی سپورٹ میں ایک چین سی بنالی ہے اور ان کی اصل طاقت کا سبب بھی یہی ہے۔"

"کم از کم آپ کے منہ سے یہ باتیں سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے زہرہ!" میں نے کہا۔ "یقین نہیں آتا کہ میں اُسی خاتون سے مخاطب ہوں، جو ایک نڈر اور دلیر عورت تھی اور وہ بھی جو بذاتِ خود ماضی میں نجانے کیسے کیسے پُرآلام مصائب سے گزری اور خود سے کئی گنا بڑھ کر طاقت ور دشمنوں کو ناکوں چنے چبوائے، مگر آج......"

"مجھے تمہاری فکر ہے شہزی!" وہ تڑپ کر بولی۔ "دشمن بزدل ہے اور بزدل دشمن کبھی کبھی بہت بڑی فتح بھی حاصل کر لیتا ہے۔"

"تم میری فکر نہ کرو، میرا اللہ مالک ہے۔ میں اور باقی ساتھی صبح کی ٹرین سے روانہ ہو رہے ہیں اور میرا خیال ہے تمہارا ان حالات میں بار بار مجھ سے رابطہ کرنا کسی خطرے سے کم نہیں ہے۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی، بولی۔ "یہ خدشہ اپنی جگہ سہی شہزی! لیکن......"

"انشاء اللہ کل ملیں گے۔ خدا حافظ۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ کی سوالیہ نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں زہرہ بانو کے خدشات کے بارے میں بتا دیا۔ جسے سن کر وہ تینوں بھی متفکر سے نظر آنے لگے مگر جواباً تینوں نے خاموش رہنا ہی بہتر جانا۔

صبح سویرے منہ اندھیرے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا اور اسٹیشن کا رخ کیا۔ ٹکٹ ہم لے چکے تھے، نیند سے ہمارا برا حال تھا۔ کبیل دادا کی آرام کرنے والی ترکیب کارگر ثابت ہوئی تھی، ٹرین کے روانہ ہوتے ہی ہر کوئی اپنی اپنی برتھ پر چڑھ کر سو گیا۔

لیٹتے ہی ہمیں نیند نے آلیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر سوتے بیت گئی۔ شور پر میری آنکھ کھلی۔ ٹرین رکی ہوئی تھی۔ مسافروں کا شور تھا مگر بیشتر مسافر اُترے ہوئے تھے اور بوگی خالی خالی سی دکھتی تھی۔ گرمی بھی تھی۔ میں پسینے سے شرابور تھا۔ یہ شاید اندرونِ سندھ کا کوئی علاقہ تھا۔ سندھ کی گرمی تو یوں بھی بڑی مشہور تھی۔ میں نے برتھ پر لیٹے لیٹے تھوڑا گردن جھکا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا چاہا، مقدور بھر ہی باہر کا منظر نظر آسکا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ کوئی اسٹیشن ہوگا مگر مجھے کھڑکی سے باہر خودرو جھاڑیوں والی بنجر زمین کے سوائے کچھ نظر نہ آیا، یا پھر کچھ لوگ نیچے اُترے چہل قدمی کر رہے تھے۔ پلیٹ فارم عنقا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ شالیمار جیسی ایکسپریس ٹرین یوں جنگل میں کیونکر روک دی گئی تھی۔

"بھائی! کون سا اسٹیشن ہے؟" میں نے اسی طرح گردن لٹکا کر ایک قریب کی سیٹ پر سگریٹ پیتے عمر رسیدہ شخص سے پوچھ لیا۔ اس سے مخاطب ہونے کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ میرے نیچے والی برتھ پر بے سدھ لیٹی شکیلہ کو گھورنے میں محو تھا۔ مجھے جاگتا دیکھ کر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تاہم جواب میں میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اسٹیشن......؟ یہ اسٹیشن کہاں ہے بھائی؟ بنجر میدان ہے۔" اس نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"ارے...... پھر ٹرین کیوں رکی ہے؟ کیا انجن خراب ہو گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اُوپر ہی لیٹے رہو بھائی آرام سے...... انجن خراب نہیں ہوا ہے۔" وہ شخص شاید چڑا بیٹھا تھا، شاید میں نے اس کی "نظر داری" میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ اسی لہجے میں جواب دیا۔ لوگوں کی عادت تھی، انسان کس کس کی ہوس زدہ نگاہ کو روک سکتا تھا۔

"انجن خراب نہیں ہوا تو پھر ٹرین کیوں رکی ہوئی ہے؟ کوئی اسٹیشن بھی نہیں ہے؟"

میں نے قدرے پریشانی سے کہا مگر وہ بداخلاق سا آدمی میری بات سنی ان سنی کر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر یہی سوچا کہ نیچے اُتر کر خود ہی پتا کرنا چاہیے۔ ایک نظر میں نے اپنے ساتھیوں پر ڈالی۔ وہ بے خبر سو رہے تھے۔ میں برتھ سے نیچے اُترا اور اپنے دل کی بھڑاس نکالے بنا نہ رہ سکا اور اس بداخلاق شخص سے بولا۔

"بھائی صاحب! اگر کوئی انسان کچھ پوچھ رہا ہو تو اسے بتانے میں زبان نہیں گھس جاتی۔"

آدمی بڑا ڈھیٹ واقع ہوا، بدستور بے پروا... انداز میں باہر ہی دیکھتا رہا۔ میں ٹرین سے نیچے اُتر آیا۔ غضب کی گرمی پڑ رہی تھی۔ حالانکہ ابھی صرف گیارہ ہی بج رہے تھے۔ دھوپ بھی خوب جم کر نکلی ہوئی تھی۔ اگرچہ ہوا بھی کھل کر چل رہی تھی مگر اس میں بادِ سموم کی جھلسا دینے والی کاٹ بھی تھی۔

پتا چلا ہم نواب شاہ سے تھوڑا ہی آگے تھے اور آگے پھاٹک پر ایک مال گاڑی پھنس گئی تھی۔ اس کی کچھ بوگیاں پٹری سے اُتر گئی تھیں۔ لوگوں میں رل مل کر مجھے ایک اور پریشانی کا علم ہوا، کچھ لوگ جنہیں زیادہ جلدی تھی اور ان کی منزل بھی قریب تھی' وہ اپنا سامان اُٹھائے پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے۔

میں دوبارہ بوگی میں سوار ہوا تو دیکھا اول خیر جاگا ہوا تھا اور برتھ پر پاؤں لٹکائے اسی بداخلاق آدمی کو کھری کھری سنا رہا تھا، جو شاید اسے بھی میری طرح "تلی" دینے کے بعد اب کھڑکی سے باہر تکے جا رہا تھا۔ میں بے اختیار اپنا سر جھٹک کر رہ گیا۔

"او خیر...... کاکے! کیا ہوا ہے؟ یہ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ کوئی اسٹیشن بھی نہیں......" مجھے دیکھتے ہی وہ بولا۔

"لمبا مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے!" میں نے جواب دیا اور پھر اسے بتا دیا کہ کیا مسئلہ درپیش آچکا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اسے گرمی بھی بہت لگ رہی تھی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ یہی حال قریب کی برتھ پر لمبی تانے سوئے ہوئے کبیل دادا کا تھا اور شکیلہ کی حالت تو زیادہ پتلی اور "نازک" ہو رہی تھی۔ اول خیر نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اسے اٹھانے کو کہا۔

"سونے دے بے چاری کو یار! تھوڑی دیر پہلے میں اور تم بھی اسی طرح سو رہے تھے۔"

"ہماری بات اور ہے کاکے!" وہ منہ بسور کر بولا۔ "یہ کاکی کم پٹاخا زیادہ ہے۔ ہر کوئی آتے جاتے اسے گھور کر گزر رہا ہے۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ شکیلہ انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ گئی۔

"ہائے اللہ! کس قدر سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ اُوپر سے کم بخت ٹرین بھی رکی ہوئی ہے۔" کہتے ہوئے وہ برتھ سے نیچے اُتر آئی اور جب کھڑکی سے باہر دیکھا تو پریشان کن حیرت سے بولی۔

"ارے......! یہ ٹرین اس سخت گرمی اور دھوپ میں یہاں تپتے ہوئے بنجر ویرانے میں کیوں رک گئی ہے؟"

"انجن کا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔" اول خیر نے کہا تو شکیلہ بھی شاید نیند کے خمار میں تھی یا پھر گرمی نے اس کا زیادہ ہی برا حال کر دیا تھا۔ اسی لیے سوچے بنا روا روی میں کہہ گئی۔

"تو پھر بدلنے میں کیا مشکل ہے؟"

انجن کو جیک لگا رہے ہیں...... ذرا ہی دیر میں ٹائر بدل دیا جائے گا۔" اول خیر نے کہا اور شکیلہ کی بدحواسی پر خود بھی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ میں اور کبیل دادا پہلے ہی مشکل سے اپنی ہنسی روکے ہوئے تھے۔ اب جو اول خیر کو بھاڑ سا منہ کھول کے قہقہہ مارتے دیکھا تو کبیل دادا کا بھی پھنسا پھنسا قہقہہ پھوٹ نکلا۔ میں ہنسے جا رہا تھا۔ شکیلہ کو فوراً ہی احساس ہوگیا کہ اول خیر نے اسے کس طرح "سنجیدگی" سے بے وقوف اور خشک ماحول کو زعفران بنا دیا تھا۔

"تم دونوں بھی اس کے ساتھ ملی بھگت کرتے ہو اسی لیے تو یہ سر پہ چڑھا رہتا ہے ہر وقت میرے...... ہنہ......" شکیلہ جھلا گئی تھی، اسی لیے بے چاری کبیل دادا اور مجھ پر بھی بگڑ گئی۔ ہم برتھیں چھوڑ کر اب سیٹوں پر آ بیٹھے تھے۔ پیاس کی شدت سے حلق سوکھ رہا تھا۔ اس ویرانے میں پانی ملنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

میں نے انہیں بھی ساری صورتِ حال بتا دی۔ وہ بھی پریشان اور فکرمند ہوگئے۔ ان کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

"میرا خیال ہے پہلے ڈائننگ ہال جا کر کولڈ ڈرنک وغیرہ پی لیں اس کے بعد کچھ سوچتے ہیں۔" میں نے کہا۔ طلسمِ نور ہیرا میرے پاس تھا۔ ہیرے کو ڈبے سے نکال کر میں نے اسے کپڑے کی دھجی کی پٹی بنا کر اس میں گانٹھ کی صورت مضبوطی سے باندھ دیا تھا۔ وہ اب میری پینٹ کی بیلٹ میں اڑسی ہوئی تھی۔ جسے یہ آسانی میں ہاتھ لگا کر اس کی موجودگی کا احساس کر لیتا تھا۔

ہم لوگ ٹرین کے اندر ہی بوگیاں بدلتے ہوئے ڈائننگ کار پہنچے تو وہاں پہلے ہی لوگوں کا رش تھا۔ یہاں افراتفری کا کچھ ایسا منظر دیکھنے کو ملا کہ کوئی چیز حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم محسوس نہ ہوتا تھا۔ تاہم اول خیر نے ان کے بیچ گھس گھسا کر منرل واٹر کی ایک بوتل لینے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ ہم نے باری باری پانی پیا اور خالی بوتل ساتھ لیے دوبارہ اپنی بوگی میں آ کر سر جوڑے بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد پتا چلا کہ نواب شاہ سے ایک انجن آ رہا ہے، جو ٹرین کو واپس نواب شاہ تک کھینچ لائے گا اور روٹ کلیئر ہونے تک تمام مسافروں کو وہاں اسٹیشن پر انتظار کرنا پڑے گا۔ یہاں سے نواب شاہ (پیچھے کی جانب) زیادہ دور نہ تھا جبکہ مسافروں نے پکا تہیہ کر رکھا تھا کہ نواب شاہ کے پلیٹ فارم پر وہ ریلوے انتظامیہ کے خلاف بھرپور احتجاج کریں گے۔

"ہمارے لیے تو مشکل ہو جائے گی۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہیے جو دوسرے مسافر کر رہے ہیں۔" اول خیر نے کہا۔

"لیکن ان کا اسٹاپ قریب ہے۔ ہمیں ملتان جانا ہے۔" کبیل دادا بولا۔

"ٹریک کی حالت مجھے ایسی نہیں لگتی کہ وہ چند گھنٹوں میں ٹھیک ہو جائے۔" میں نے بھی اس کی تائید میں کہا۔ بالآخر اسی متفقہ فیصلے پر صاد کیا گیا کہ ٹرین سے اُتر کر پیدل ہائی وے تک سفر کیا جائے اور وہاں سے پنجاب جانے والی کسی تیز رفتار کوچ میں سوار ہوا جائے۔

اس فیصلے کے بعد عمل کرنے میں ہم نے مطلق دیر نہیں لگائی اور اپنا مختصر سا سامان اُٹھائے روانہ ہوگئے۔

سورج عین ہمارے سروں پر مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ شدید دھوپ کے مارے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ ہم چاروں بل کھاتی ناپختہ سی پگڈنڈی پر پیدل چلتے رہے۔

"اُف......! سندھ کی گرمی کے بارے میں سن تو رکھا تھا آج اس کا مزہ بھی چکھ لیا۔"

شکیلہ نے تھکے تھکے انداز میں چلتے ہوئے کہا۔ میں سب سے آگے تھا، شکیلہ میرے پیچھے اور اول خیر تھا، سب سے آخر میں کبیل دادا چلا آ رہا تھا۔

"ابھی تو صرف چکھا ہے، نازکی بیگم! آگے چل کر کھانی بھی پڑے گی گرمی......" اول خیر ایسے وقت میں بھی اس سے پنگا لینے سے باز نہیں آیا۔

"دیکھو، اول خیر! مجھ سے اس وقت منہ ماری مت کرنا، میں پہلے ہی دھوپ اور گرمی کی شدت سے ہلکان ہو رہی ہوں......" شکیلہ نے اسے تنبیہ کی۔ وہ ہانپنے بھی لگی تھی۔

"صرف تمہاری نہیں ہماری بھی یہی حالت ہو رہی ہے اس وقت...... ہم بھی انسان ہی ہیں تمہاری طرح......"

"اچھا!" شکیلہ مضحکہ خیز لہجے میں بولی۔ "مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ تم بھی انسان ہو......"

"شکیلہ! اب تم خود اس سے اُلجھ رہی ہو۔ یہ تو آ بیل مجھے مار...... والی بات ہوگئی۔" کبیل دادا نے ہولے سے شکیلہ کو ٹوکا۔ اول خیر کو تو بہانہ چاہیے تھا، بولا۔

"او خیر...... وڈے استاد جی! یہ گڑی بیل نہیں مج ہے مج...... نیلی بار کی مج......"

ہم اسی طرح...... ان دونوں کی نوک جھوک میں پیدل چلتے ہوئے بالآخر ہائی وے پر آ گئے۔ یہاں کچھ مسافر لاریاں اور لگژری ائرکنڈیشن کوچز آتی جاتی نظر آتی تھیں مگر سب فل تھیں، ہمیں کسی کوچ میں سیٹ نہ مل سکی۔ ایک دو میں سیٹیں خالی تھیں مگر ہم چار تھے اور سیٹیں ایک یا دو تھیں۔

ہم نے ایک قریبی روڈ سائڈ ہوٹل میں پانی پیا اور چائے بسکٹ تناول کیے۔ اس کے بعد پھر سڑک کنارے آ گئے۔ یہاں خاصی دھوپ تھی۔ کوئی سایہ دار جگہ نہ تھی۔ چونکہ کوچز شہر سے ہی اور بہت دیر دیر سے آ رہی تھیں، اسی لیے بھری ہوئی تھیں۔ ایک سندھ زمیندارہ نام کی لمبی مسافر لاری کو تو دیکھ کر ہی ہول آ گیا تھا، وہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی اور اس کی چھت پر بھی چلچلاتی دھوپ میں مسافر سوار تھے۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور بغیر ائرکنڈیشنڈ کی تھی۔ اس کا کرایہ بھی سستا تھا۔

ہم پر مایوسی اور جھنجلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ ابھی ہم ایک بار پھر واپس ہوٹل کی طرف تھوڑا سستانے کے لیے جانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ نواب شاہ سے آتی ہوئی ایک کوچ طوفانی ہارن دیتی ہوئی وہاں آن رکی۔ کنڈیکٹر نے دروازہ کھولا اور ہم سے منزل پوچھی۔

"آ جاؤ...... آ جاؤ...... یہ کوچ ملتان ہی جا رہی ہے اور تم چاروں کے لیے جگہ بھی خالی ہے۔" کنڈیکٹر نے گویا ہمیں مژدۂ جانفزا سنا دیا۔ ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے جلدی سے اس میں سوار ہوگئے۔ کوچ ائرکنڈیشن تھی اور سیٹ بھی بیٹھنے کو مل گئی۔ ہم دھوپ اور گرمی کے باعث اس قدر ہلکان ہو رہے تھے کہ سیٹوں پر براجمان ہوتے ہی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کافی دیر تک اپنی تھکن اُتارتے اور سکون لیتے رہے اس کے بعد حواس بحال ہوئے تو کوچ کا جائزہ لیا۔

کوچ میں چند سیٹیں اور بھی خالی تھیں۔ ذرا ہی دیر بعد کنڈیکٹر کرایہ لینے آ گیا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یہ کوچ براستہ دادو، سیہون شریف اور لاڑکانہ سے ہوتی ہوئی کندھ کوٹ، کشمور اور صادق آباد، رحیم یار خان سے ملتان جا رہی تھی۔

مقصد ہمارا ملتان پہنچنا تھا، چاہے جس راستے سے جائے۔

لاڑکانہ کے ذکر پر مجھے بے اختیار بشام چھلگری کی یاد آ گئی اور میرا دل اس معصوم سے شخص کو یاد کر کے مغموم سا ہوگیا۔ اس کی وجہ سے میں اپنے وطنِ عزیز کی ایک اہم امانت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو "اسپیکٹرم" جیسی بین الاقوامی این جی اوز میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا مگر جیسے ہی اسے "اسپیکٹرم" کی اصلیت اور "خطرناکی" کا علم ہوا، وہ ان سے نہ صرف کنارہ کش ہو گیا بلکہ طلسمِ نور ہیرے کے سلسلے میں بھی محتاط ہوگیا۔ تاہم بعد میں وہ ہیرا اس کے ہاتھوں چالاکی سے وکرم اور سوشیلا نے ہتھیا لیا تھا۔ حالانکہ بقول بشام کے ہی اس ہیرے کو وہاں کے ایک مقامی اور بااثر زمیندار نے چوری کروا لیا تھا لیکن یہ بشام ہی تھا جس نے اپنی ہی کوششوں سے اس ہیرے کو نہ صرف دوبارہ اس زمیندار سے حاصل کیا بلکہ اس زمیندار کو قومی ورثہ چوری کرنے کے جرم میں سزا بھی دلوانے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ آزاد ہوگیا تھا مگر بدقسمتی سے وہ ہیرا بشام سے وکرم لے اُڑا تھا۔ (سوشیلا اس کی ساتھی تھی، جو بعد میں میری ساتھی بن گئی تھی)

مجھے وہ دردناک منظر بھلائے نہیں بھولتا تھا جب بے رحم نسے جی کو ہارا اور اس کے قصائی فطرت ساتھی بھومک نے بشام کو گولی مار کر اس کی لاش بے آف بنگال کے پانیوں میں پھینک دی تھی۔ میری سماعتوں میں بشام کی وہ درد انگیز فریادیں بھی آج تک گونجتی رہتی ہیں۔

بشام کو سفاکی سے ہلاک کرنے والے بھومک کو تو میں جہنم واصل کر چکا تھا مگر مجھے کوہارا کے زندہ بچ جانے کا آج تک قلق تھا۔ شاید ابھی کاتبِ تقدیر نے اس کی زندگی کے ایام کچھ طویل کر رکھے تھے لیکن میں نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ وہ جب بھی سامنے آیا، میں اس سے بھی بشام کے بے گناہ خون کا بدلہ ضرور لوں گا۔ جزائر انڈیمان میں بتائے ہوئے سنسنی خیز اور ایڈونچرز روز و شب میں مجھے کوہارا سے نمٹنے کا خاطر خواہ موقع نہ مل سکا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں بیک وقت اور اس سے بھی زیادہ کئی اہم محاذوں پر برسرِ پیکار تھا۔

بشام کے بارے میں یہ سب سوچتے ہوئے مجھے اس کی بیوی اور دو بچوں کا خیال آیا کہ پتا نہیں ان بے چارے معصوم اور بدنصیبوں کو اپنے باپ اور شوہر کی ہلاکت کا علم بھی تھا کہ نہیں؟ بشام کے اغوا کے بعد اس کا یہ بدنصیب کنبہ کہاں چین سے بیٹھا ہوگا؟ انہیں تو کچھ خبر بھی نہ ہوگی کہ بشام اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ بشام اپنے کنبے کا واحد کفیل تھا۔ اس نے وطنِ عزیز کی امانت بچانے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دیا تھا اور ایک گمنام سپاہی کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

بشام مرحوم کے بارے میں اس طرح سوچتے سوچتے اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی کلک ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بشام خراج تحسین کا حق تو رکھتا تھا تو کیوں نا ایسا کروں کہ میرے پاس موجود طلسم نور ہیرے کو جب میں ملکی حکام کے حوالے کرنے لگوں تو اس کا کریڈٹ...... بشام بھلکری کے نام کردوں...... اس طرح ہی شاید بشام کی بیوہ اور بچوں کی کچھ مدد کا بھی آسرا ہو جاتا...... یوں بھی وہ ہی اب اس کے اعزاز کے حق دار تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں نے یہ کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا۔ تائید ایزدی بھی یہی نظر آتی تھی کہ میں نے اس وقت لاڑکانہ کے روٹ کا بھی سفر اختیار کر رکھا تھا۔ کچھ سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے یہ کام انجام دے ڈالنے کا مصمم فیصلہ ہی نہیں پختہ ارادہ بھی کرلیا۔

ابھی میں نے کھبیل دادا وغیرہ کو اپنے اس اچانک فیصلے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ مصلحتاً مناسب موقع کا منتظر تھا۔

"شہزادے [illegible] ساتھ کی سیٹ پر موجود [illegible] دادا نے [illegible] ٹہوکا دیا اور میں خیالات سے چونک کر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"کچھ نہیں یار دادا! بس، یوں ہی [illegible] فلم سی ذہن کی اسکرین پر چل رہی تھی۔ کتنے کردار تھے، کتنے لوگ تھے، ان میں دوست، [illegible] جیسے وہ سب خواب ہی ہو گئے۔ [illegible] لگتا ہے جیسے میں ایک خواب سے بیدار ہوا ہوں۔"

میری بات پر کھبیل دادا [illegible] کر رہ گیا۔ ہماری عقب کی دو سیٹوں پر اول خیر اور شکیلہ موجود تھے۔ [illegible] خاصی تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔

ہم نے سیٹوں کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں اور اسی طرح سوتے رہے [illegible] سیہون شریف [illegible] سفر اسی طرح کٹ گیا۔ ایک روڈ سائڈ ہوٹل پر کوچ رکی تھی۔ ہم بھی نیچے اُتر آئے۔

ہم چاروں کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔

وہاں ہمارے ساتھ کی میز پر دو آدمی بھی بیٹھے تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے۔ اپنے حلیے سے دونوں مقامی لگتے تھے۔ انہوں نے ہم پر بھی ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

یوں ہی ان کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے مختصر ترین دورانیے میں اچانک میں چونکا۔ اجرک پوش کی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے ایک اخبار کی جھلک نظر آرہی تھی اور اس میں چھپی ہوئی تصویر کو دیکھ کر ہی میں چونکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس کے سامنے بیٹھے ٹوپی والے چھریرے جسم کے مالک ساتھی نے مجھے دیکھا اور پھر شاید اپنے اجرک پوش ساتھی سے سرگوشی میں کچھ کہا تھا جس پر وہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میں یہ اخبار دیکھ سکتا ہوں......"

اسے اپنی جانب متوجہ پاکر میں نے اس سے کہہ ڈالا۔ وہ تھوڑا خفیف سا ہوا مگر اس نے رول کیا ہوا وہ اخبار میری طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ بھائی! ابھی ذرا دیر میں لوٹائے دیتا ہوں......" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ بھی بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولا۔ "کوئی بات نہیں۔" زبان اردو مگر لہجہ سندھی تھا۔

میں نے جلدی سے اخبار لے کر کھولا۔ وہ کوئی مقامی [illegible] کھول کر بغور اسے [illegible] دیکھنے لگا۔

"او خیر...... کاکے! ایسا کیا دیکھ لیا ہے تُو نے اس اجنبی [illegible] اخبار میں......" اول خیر نے مجھے اس قدر محو [illegible] نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سر اُٹھا کر اس شخص کی طرف دیکھا جس سے میں نے یہ اخبار لیا [illegible] گمشدہ" کی تھی۔ بس یہی ایک لفظ میری [illegible] سکا۔ اخبار بھی چند روز پرانا تھا۔ ایک عجیب بات اور میں نے محسوس کی تھی کہ اس تصویری خبر یا اشتہار کو قلم سے نشان زدہ کیا ہوا تھا۔

"کیا تم اس تصویر سے متعلق مندرجات پڑھ کر مجھے کچھ بتا سکتے ہو......؟"

میں نے مذکورہ آدمی سے کہا۔ میں اس سے اردو میں ہی بات کر رہا تھا۔

وہ شخص ایک دم چونکا تھا اور کوئی جواب دینے سے پہلے اس نے پہلی بار بڑی بربانی نظروں سے مجھے دیکھا تھا پھر جواباً بولا۔

"یہ ایک گمشدہ شخص کی تلاش کا اشتہار ہے۔" اس نے جانے کیوں مختصراً بتایا تو میں بولا۔

"جی بھائی! مجھے بھی اتنا ہی سمجھ آسکا ہے مگر کیا تم اس اشتہار کے مندرجات پڑھ کر بتا سکتے ہو کہ اس تصویر والے شخص کے بارے میں کیا لکھا ہے؟ مجھے سندھی نہیں آتی۔" میں نے درخواست کرنے کے انداز میں کہا۔ جانے کیوں وہ شخص بڑے غور سے میرا چہرہ تکنے لگا تھا جبکہ اس کا ساتھی

Pakistanipoint.com Waqar Azeem

بھی کچھ اُلجھن کا شکار نظر آ رہا تھا۔ مذکورہ شخص نے مجھے بتایا۔

"یہ تصویر بشام جھلگری نامی ایک ایسے شخص کی ہے جو کچھ عرصہ پہلے اچانک.... پُراسرار طور پر... غائب ہو گیا ہے۔ لاڑکانہ کا رہائشی تھا۔ ایک بیوی اور دو چھوٹے بچے ہیں مگر بدقسمتی سے پولیس اسے اب تک تلاش نہیں کر پائی ہے۔ یہ اشتہار گاہے بہ گاہے لگتا رہتا ہے۔"

"اوہ......" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں نے بشام جھلگری کے بدنصیب کنبے کی تلاش اور ان سے متعلق جو کچھ ارادہ کر رکھا تھا۔ قدرت شاید اس سلسلے میں میری مدد کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"نیچے اس کا پتا وغیرہ تو لکھا ہوگا؟"

"ہاں! لکھا ہے۔" اس نے کہا اور مجھے بتا دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اس دوران میں ہمارا کھانا آ گیا تھا۔

کھانا بڑا لذیذ تھا۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ ساتھ ہم سندرو اس سکینہ کی سزائے موت سے متعلق بھی دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کرتے رہے جو مختصر ہی رہی۔

کھانے سے سیر ہونے کے بعد ہمیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ پاس ہی سگریٹ کیبن تھا۔ کبیل دادا گولڈ لیف کا ایک پیکٹ خرید لایا۔

"اوخیر......وڈے استاد جی! یہ ہوئی نہ بات......"

اول خیر سگریٹ کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ہم سب کبھی کبھار ہی پینے والوں میں سے تھے۔

اول خیر وغیرہ نے مجھ سے اخبار کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔

اسی وقت ہماری کوچ نے ہارن دینا شروع کر دیا۔ مسافر سوار ہونے لگے۔ ہم نے بھی اپنی جگہ چھوڑی اور بل دے کر کوچ میں سوار ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ وہ دونوں افراد بھی ایک دم اپنی جگہ چھوڑ کر ہماری والی کوچ میں سوار ہو رہے تھے۔ کنڈیکٹر سے اُنہوں نے کوئی بات کی تھی اور پھر وہ آخری والی دو سیٹوں پر جا کر براجمان ہو گئے۔

کھانے کے بعد ہماری آنکھیں بوجھل سی ہونے لگیں اور ہم نے سیٹ کی پشت گاہ سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ نجانے کتنی دیر بیت چلی تھی کہ اچانک میری آنکھ کھلی۔

"کاکے! نیا پواڑا پے گیا ہے۔" مجھے اپنے کان میں اول خیر کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا ہے؟" میں نے قدرے ہڑبڑا کر پوچھا۔ "کوچ میں خرابی ہو گئی ہے؟"

"ہاں...... کہہ رہے ہیں کہ آئل لیک ہونے کی وجہ سے انجن سیز ہو گیا ہے۔" اول خیر نے بتایا۔

"ویسے ہم اس وقت ہیں کہاں......؟" کبیل دادا نے کھڑکی کے بند شیشے سے باہر جھانکا۔

"دادو کے کہیں آس پاس ہی ہیں۔" اول خیر نے بتایا۔

"اوہ...... تو ابھی ہم سندھ میں ہی ہیں۔" شکیلہ بولی۔

شکیلہ بیٹھی رہی جبکہ میں، اول خیر اور کبیل دادا نیچے اُتر آئے۔ دیکھا، مسافر کوچ کے ڈرائیور اور عملے پر بری طرح گرم ہو رہے تھے۔ میں نے ایک مسافر کو بس کے عملے سے غصے سے یہ کہتے سنا۔

"اڑے بابا! یہ کس جگہ پر منہ کالا کر دیا ہے تم نے...... یہ تو سارا علاقہ دھاڑیلوں (ڈاکوؤں) کا ہے، ابھی اِدھر کوئی ہتھیار بند گروہ آ گیا نی...... پھر گئے ہم سب کام سے......"

"اڑے چاچا! خیر کا جملہ منہ سے نکالو...... کیوں بدفعالیاں بک رہے ہو......" ایک اجرک پوش جوان مرد نے اس عمر رسیدہ شخص کو جھڑکا۔ باقی سب نے بھی زیرِ لب کلمۂ خیر کا وِرد کیا۔

اب یوں ہوا کہ مسافروں نے کرایہ واپس کرنے کا تقاضا شروع کر دیا۔ پہلے تو ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہچر مچر کرنے لگے مگر مسافروں کے دباؤ کے آگے انہیں مجبوراً ان کے پیسے واپس کرنا پڑے۔ پیچھے سے جو بسیں کوچز تھوڑی دیر بعد آ رہی تھیں، مسافر ان میں سوار ہونے لگے۔

یوں ہوتے ہوتے ... بہت کم مسافر رہ گئے۔ ہمیں بھی کرایہ واپس مل گیا تھا۔ یہ کارِ خیر اول خیر نے انجام دیا تھا۔ کنڈیکٹر نے پہلے تو اڑی بازی دکھانے کی کوشش کی تھی، کیونکہ ہمارا روٹ لمبا تھا اور کرایہ زیادہ بنتا تھا پھر ہم چار تھے۔ کنڈیکٹر کو بہت سے پیسے ہمیں لوٹانے پڑ رہے تھے۔ وہ چالاک نصف سے بھی کم کرایہ دینے کے لیے پر تولے ہوئے تھا۔ دوسری مجبوری سے ہماری اس طرح فائدہ اُٹھا رہا تھا کہ اب بیشتر مسافر دوسری بسوں میں سوار ہو کر روانہ ہو چکے تھے، اب ہم سمیت چند ہی مسافر باقی بچے تھے، انہیں بھی ان بدمعاشوں نے اس کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ..... کرایہ لوٹانے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی "کمی" کے باعث ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہم سے اکڑ رہے تھے۔ ان کی بدمعاشی پر مجھ سے زیادہ کبیل دادا کو طیش آ گیا اور اس نے اول خیر کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کنڈیکٹر کی گردن اپنے ایک ہاتھ سے دبوچ لی اور غصے سے غرا کر بولا۔

"اوئے......! ایک تو اتنے لمبے روٹ پر اتنی بڑی کوچ چلا رہے ہو اور یہ بھی نہیں پتا چلا تم کو کہ آئل لیک ہو رہا ہے، جبکہ ڈائل پر اس کا کاشن بھی آ جاتا ہے۔ شرافت سے پورے پیسے نکالو ہمارے...... زیادہ بدمعاشی کی تو اِدھر ہی سڑک پر لمبا لٹا دوں گا۔"

اسی وقت میں نے دیکھا کہ موٹا تازہ ڈرائیور اور اس کا ساتھی لڑکا جارحانہ انداز میں کوچ کی طرف بڑھے، میری اور اول خیر کی عقابی نظریں ان دونوں کو بپھرے ہوئے انداز میں کوچ میں چڑھتا دیکھ رہی تھیں، فوراً ہی وہ دوبارہ نمودار ہوئے۔

"او...... خیر!" اول خیر کے منہ سے ہولے سے برآمد ہوا اور خود میرے وجود میں طیش ناک اُبال کی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ ہم سے باقاعدہ لڑنے کے موڈ میں آ گئے تھے۔ ان دونوں نے ہاتھوں میں لوہے کے پانے اور آئرن راڈ اُٹھائے ہوئے تھے۔

ان کی ڈھٹائی اور سینہ زوری پر اول خیر کو بھی طیش آ گیا تھا۔ لہٰذا وہ دونوں... ہی جارحانہ انداز میں کبیل دادا کی طرف لپکے، ان دونوں نے شاید واقعی ہمیں عام سے مسافر سمجھنے کی غلطی کر ڈالی تھی۔

لہٰذا اول خیر اور میں نے بیک وقت بجلی کی طرح اپنی جگہ سے حرکت کی...... لڑکے نے اول خیر پر سریے سے وار کرنا چاہا تو اول خیر نے بڑے اطمینان سے اپنی ایک لات چلائی، جو لڑکے کے پہلو میں لگی۔ وہ اپنے حلق سے اوغ کی آواز نکالتا ہوا اپنے مضروب پہلو پر ہاتھ رکھے وہیں سڑک پر بیٹھ گیا۔ اس موٹے تازے ڈرائیور نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بڑے سے آہنی پانے کو میرے چہرے پر رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں پُرغیظ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اس پر جھپٹا۔ اس کا آہنی پانے والا ہاتھ جو فضا میں بلند تھا، مجھے قریب آتا دیکھ کر نیچے آیا۔ وار کرنے کی اس کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی وہ کلائی دبوچ لی تھی اور دوسرے ہاتھ کے گھونسے نے اس کے جبڑے کو بری طرح ہلا کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے بھی خرخراتی آواز نکلی تھی، میں نے اسی پر ہی بس نہیں کیا تھا اور اس کی کلائی موڑ دی۔ پاناٹن......ٹن...... کرتا ہوا سڑک پر گرا اور اس کے بعد ڈرائیور بھی۔ کیونکہ میں نے اس کی کلائی والی وہ ہڈی ہی توڑ ڈالی تھی۔ وہ بری طرح گرم سڑک پر پڑا تڑپتا رہا۔ اُدھر اول خیر اس لڑکے سے بھڑا ہوا تھا اور کوئی تیسری بار اسے بس کی باڈی سے ٹکرا کر نیچے گرا چکا تھا۔

"بس......! کافی ہے۔" اچانک کبیل دادا کی آواز ابھری۔

"ان کی بدمعاشی تو دیکھو، کمینے، لوہے کے سریے لیے آ گئے تھے۔ تمہاری تو......" اول خیر نے موٹی سی گالی دے ڈالی۔ شکیلہ بھی نیچے اُتر آئی تھی۔

"چل بیٹا! اب شرافت سے ہمارے اور ان کے بھی پیسے واپس لوٹاؤ، جنہیں تم نے دھونس دھمکی سے چپ رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔" کبیل دادا نے کنڈیکٹر سے کہا۔ کنڈیکٹر کو اپنے دونوں ساتھیوں کے حشر سے خاطر خواہ عبرت حاصل ہو چکی تھی۔ اس نے فوراً جیب سے کرائے کے پیسے نکال کر نہ صرف ہمیں بلکہ ان چند مسافروں کو بھی لوٹا دیے۔ ان بچے کھچے مذکورہ مسافروں کی تعداد چار تھی۔ دو مرد ایک جوان عورت دوسری ایک ضعیف خاتون تھی۔ جوان عورت کی گود میں بچہ بھی تھا۔

وہ دونوں آدمی بھی ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے ابھی تک کوئی ذرا سی بھی چون وچرا نہ کی تھی۔

دادو سے لاڑکانہ چونکہ اب شارٹ روٹ رہ گیا تھا اسی لیے سیہون، دادو اور لاڑکانہ تک مسافر ویگنیں بھی چلتی تھیں۔ وہ گاہے بگاہے ادھر سے گزر رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے اس مقام سے آگے جا کر کسی گاڑی کو ہاتھ دینا چاہیے۔" کبیل دادا نے کسی خیال کے تحت کہا۔ ہم اس کی بات کا مطلب سمجھ گئے اور آگے بڑھ گئے۔

چند فرلانگ پیدل مارچ کرنے کے بعد عقب سے آتی ہوئی ایک مسافر ویگن کو میں نے ہاتھ دیا۔ وہ لاڑکانہ جا رہی تھی۔ ہم اس میں سوار ہو گئے۔ میرے ساتھیوں کو حیرت ہوئی تھی مگر میرے اشارہ کرنے پر وہ خاموشی سے سوار ہو گئے۔ اسی دوران میری اچانک عقبی سیٹوں پر نگاہ پڑی، وہ دونوں افراد بھی پہلے سے ہی سوار تھے اور میری جانب گھور رہے تھے۔ میں ہولے سے شناسا انداز میں مسکرایا تھا۔ انہیں دیکھ کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ لوگ ہماری طرح منزل کے ستائے ہوئے

تھے۔

دو گھنٹے بعد یعنی رات تک ہم لاڑکانہ پہنچ چکے تھے۔ یہاں عام سے ہوٹل تھے۔ سرائے بھی تھیں۔ ایک ہی ہوٹل ڈھنگ کا تھا، یہ سپنا ہوٹل تھا۔ ہم یہاں آگئے اور دو کمرے کرائے پر لے لیے۔ شکیلہ میرے کمرے میں ہوتی تھی۔ اس وقت ہم ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے، چائے منگوائی گئی اور اس دوران جب ساتھیوں نے مجھ سے یوں اچانک لاڑکانہ قصد کرنے کا سوال کیا تو میں نے انہیں بتا دیا۔

''او خیر...... لگتا ہے۔ اپڑیں شہزی کاکے کا انڈیا مشن ابھی پورا نہیں ہوا......'' اول خیر نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں، اول خیر! مگر یہ مشن اتنا مشکل یا خطرناک نہیں ہے، مجھ پر یہ فرض لازم بنتا ہے کہ میں ہشام کی بیوہ اور اس کے بچوں سے مل کر نہ صرف انہیں اس تلخ حقیقت سے آگاہ کردوں بلکہ انہیں دیکھوں میں کہ وہ کس حال میں ہیں؟ اور وہ اعزاز کے بھی حقدار ہیں۔ کیونکہ... طلسم نور ہیرے کی بازیابی کا کریڈٹ میں ... ہشام کے نام کرنے کا اصولی فیصلہ کر چکا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا تو کبیل دادا متاثر کن لہجے میں بولا۔

''یار شہزادے! کبھی کبھی مجھے تجھ پر بڑا رشک آتا ہے...... کہ تُو دل کا کس قدر سخی انسان ہے۔ ایسے مواقع پر ...... تو لوگ دوسروں کا کریڈٹ بھی اپنے سر لینے کی کوشش کرتے ہیں مگر تُو ہے کہ...... بس! کیا کہوں آگے......'' کبیل دادا سر جھٹک کر چپ ہو رہا تو میں بولا۔

''دادا......! انسان کا ضمیر بھی کوئی شے ہے یار......! حق دار کو حق نہ ملے یہ تو مجھے یوں بھی برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن سچ کہوں گا کہ میرے اندر کوئی ایسا انسان ضرور بیٹھا ہے جو میری رہنمائی کرتا ہے۔ کیا غلط ہے اور کیا صحیح، اس کا مجھے خود ہی ادراک ہونے لگتا ہے۔ تمہیں تو سب معلوم ہی ہے، وہ حالات بھی جن سے میں نے تمہیں آگاہ کیا۔ بتاؤ مجھے، کیا میرا یہ فیصلہ غلط ہے؟''

''ہرگز نہیں، شہزی!'' شکیلہ بولی۔ ''ہشام چھلگری نے اس ہیرے کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کی تھی لیکن افسوس پھر بھی وہ دھوکا کھا گیا مگر اسی ہیرے کی وجہ سے وہ سے جی کو ہارا جیسے سفاک اور خطرناک دشمن کے ہتھے چڑھا اور اس نے مرنے سے پہلے اس ہیرے کی گمشدگی سے متعلق تمہیں بھی آگاہ کیا۔''

میرے ساتھی میرے اس نیک مقصد کی برآوری پر متفق تھے۔

سپنا ہوٹل خاصا شاندار تھا۔ اس اجرک پوش نے مجھے جو پتا سمجھایا تھا، اس پر روانگی کا ارادہ اگلے دن صبح کا تھا ہمارا۔

وہ رات ہم نے سو کر گزاری اور اگلے دن ٹوٹے پھوٹے سفر کی تکان اُتار کر تازہ دم ہو گئے۔

جب ہم ہشام چھلگری کے کنبے کی تلاش میں ہوٹل سے نکلنے لگے تو کبیل دادا نے مجھے حسبِ سابق ایک مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''ایک بار پھر سوچ لے شہزی! ہمیں ہشام چھلگری کے گھر والوں کا پتا تو معلوم ہو ہی گیا ہے تو جلدی کس بات کی ہے؟ بعد میں آرام سے یہ کام نمٹا لیں گے، میرا مطلب تھا کہ اس وقت ہمارے پاس طلسم نور ہیرے کی صورت میں ایک قیمتی قومی امانت موجود ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم کسی سے جنگ کرنے نہیں جا رہے ہیں دادا! میں صرف ہشام کی بیوہ کو اس کے بدنصیب شوہر کی خبر دوں گا کہ وہ اب اس کی تلاش اور جاں گسل انتظار ترک کر دے۔ بے چاری کو کچھ تو سکون مل ہی جائے گا۔ باقی اعزاز والی باتیں اور حکومت کی طرف سے اس بدنصیب کنبے کی کفالت کے بارے میں اس کی رہنمائی بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اس کا حق ہے۔''

''میرا خیال ہے شہزی صحیح کہہ رہا ہے دادا!'' شکیلہ نے میری تائید میں کبیل دادا سے کہا۔

''میں صرف اس لیے کہہ رہا تھا......'' کبیل دادا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے ان دونوں اجرک اور ٹوپی پوش افراد پر کچھ شبہ سا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کسی خاص مقصد کے لیے ہماری ریکی کر رہے تھے۔''

''اس شبہے کی کوئی خاص وجہ تو ہوگی تمہارے دل میں؟'' اول خیر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شاید وہ بھی کبیل دادا کی اس شبہے والی بات پر کھٹکا تھا۔

''ایک نقطہ میرے ذہن میں آیا تھا۔'' کبیل دادا نے جواب دیا۔ ''ان کے پاس ہشام چھلگری کی گمشدگی والا جو اخبار تھا، وہ پرانا تھا۔ اس تصویری اشتہار پر میری بھی نگاہ پڑی تھی، جب تم اسے غور غور سے دیکھ رہے تھے، کیا تم نے محسوس نہیں کیا تھا کہ اس اشتہار کو قلم زد کیا ہوا تھا؟''

''تو تمہارا خیال ہے کہ وہ دونوں بھی ہشام چھلگری کی تلاش میں تھے؟'' میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ہاں!''

''ممکن ہے وہ لوگ ہشام چھلگری کے رشتے دار ہوں؟''

''اب یہاں تم میری بات ٹھیک طریقے سے سمجھو گے۔'' کبیل دادا پُرمعنی انداز میں مسکرایا۔ ''اسی پوائنٹ کو ذہن میں رکھ کے سوچو ذرا...... شہزی! اگر یہ بات تھی تو پھر ان دونوں نے ہم سے ہشام سے متعلق ایک بات بھی نہ کی بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے انہوں نے ہماری ریکی ضرور شروع کر دی جبکہ ان کی منزل کوئی اور تھی۔ اس بات کی پوری تسلی کرنے کے بعد ہی وہ ہم سے الگ ہوئے تھے کہ ہم لاڑکانہ پہنچ چکے ہیں۔''

''تت...... تو تمہارا خیال ہے دادا کہ ہمارے ہوٹل سے باہر نکلتے ہی وہ ہم پر......''

''سو فیصد ممکن ہے یہ بات......'' کبیل دادا نے کہا۔

''شہزی! وڈے استاد جی غلط نہیں کہہ رہے ہیں، باہر ہمیں خطرہ ہے۔'' اچانک اول خیر نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ میرے پورے وجود میں سنسنی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔

''اس امکان کو نظرانداز نہیں کر سکتے مگر یہ کام انجام ضرور دینا ہوگا لیکن اگر ایسا کچھ ہے بھی تو یہ لوگ ہیں کون؟ ہمیں ان سے کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

''اس طلسم نور ہیرے سے متعلق ہم سے زیادہ تمہیں ہی جان کاری ہے شہزی!'' کبیل دادا بولا۔ ''یہ تو تم ہی سوچ کے گھوڑے دوڑا کر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ ہمیں ان دونوں مشکوک افراد سے کس قسم کا خطرہ ہو سکتا ہے؟''

ابھی میرے پاس یہ سب سوچنے اور ماضی کے حالات کا تجزیہ کرنے کا وقت نہ تھا۔ میں نے کہا۔

''محتاط رہو اور آگے بڑھو......''

ہم ہوٹل سے باہر آگئے۔ البتہ ہوٹل کا قیام ہم نے ترک نہیں کیا تھا۔ ہمارا مختصر سامان وہیں کمروں میں رکھا تھا۔ ہوٹل سے باہر آکر ہم نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ حالانکہ صبح کا وقت تھا مگر سورج تو جیسے ابھی سے ہی سوا نیزے پر آیا معلوم ہوتا تھا۔ گرمی اسی طرح شدت کی پڑ رہی تھی۔ دس بج رہے تھے۔ اخبار کے اشتہار کے مطابق (جو اس اجرک پوش شخص نے مجھے بتائی تھی) ہشام کی بیوہ لاہوری محلے میں کے ایک مکان میں رہتی تھی۔ وہاں تک ہم ایک تانگے میں سوار ہو کر پہنچے تھے۔

اس دوران میں ہم اپنے گرد و پیش سے بہت محتاط بھی رہے تھے مگر ہمیں پھر دوبارہ وہ دونوں مشکوک افراد دکھائی نہیں دیے تھے۔ ہم تانگے سے اُترے کرایہ دیا اور لوگوں سے پوچھتے ہوئے ہشام چھلگری کے گھر کے دروازے تک جا پہنچے۔

میں نے ایک نظر مکان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سا چھوٹا مکان تھا، بمشکل اسی گز پر ہوگا اس کے در و دیوار خستہ حالی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ مجھے اپنے سینے میں دکھ کی ایک لہر کا احساس ہوا اور پھر میں نے ہونٹ بھینچ کر دروازے پر دستک دے ڈالی۔

پہلی ہی دستک پر ...... اندر سے ایک نسوانی آواز اُبھری۔ مقامی زبان (سندھی میں) کسی نے کچھ پوچھا تھا۔ مجھے اس عورت کی آواز اور لہجہ دونوں ہی گھٹا گھٹا سا محسوس ہوا تھا۔ تاہم اپنے تئیں مطلب سمجھتے ہوئے میں نے اردو میں کہا۔

''کیا یہ ہشام چھلگری کا گھر ہے؟''

اندر یک دم ہی چند ثانیے کے لیے دھڑکتی سی خاموشی طاری ہوگئی پھر جب دوبارہ وہی نسوانی آواز اُبھری تو اس بار لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ واضح طور پر موجود تھی۔

''جج...... جی ہاں! لل...... لیکن آپ کون ہیں؟''

اس بار عورت نے بھی سندھی لہجے میں اردو بولی تھی۔

''بہن جی! اگر زحمت نہ ہو تو آپ سے ہشام چھلگری کے متعلق کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

اس دوران میں میری ہدایات کے مطابق کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ، گرد و پیش میں عقابی نظریں ڈالے ہوئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ اب کی بار خاتون فوراً دروازہ کھول دے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ لگتا تھا وہ شاید کچھ خوف زدہ اور سہمی ہوئی تھی۔ اس کی پھر سراسیمہ سی آواز اُبھری۔

''آپ لوگ...... پپ...... پولیس کے آدمی ہیں یا...... زمیندار شاہنواز خان نے آپ کو بھیجا ہے؟''

''دیکھیں بہن جی!'' میں نے بند دروازے کی طرف منہ کر کے ملائمت آمیزی سے کہا۔

''ہم نہ پولیس والے ہیں نہ ہی کسی زمیندار کے آدمی ہیں۔ ہم تو خود اس علاقے میں اجنبی ہیں اور ایک خاص مگر نیک مقصد کے لیے ہی یہاں آئے ہیں۔ مجھے آپ ہشام چھلگری کا دوست کہہ سکتی ہیں۔''

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اسی وقت دروازہ کھل گیا اور دروازے کے عقب سے جس خاتون کا چہرہ برآمد ہوا، اسے دیکھ کر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

* * *

چونکنے کی وجہ عام سہی مگر حقیقت یہ تھی مجھے اس خاتون کو دیکھ کر ایک نامعلوم سے کرب کا احساس ہوا تھا انسان فطرتاً جمال پرست ہے مگر اس جمالیاتی ذوق میں کسی ہوس یا منفی جذبہ کارفرما نہ تھا۔ یہ بھی بس ایسا ہی جذبہ تھا جیسا کہ ہم کسی خوش رنگ پھول یا مہکتے گلشن، دل فریب نظارے کا لطف لیتے ہیں اور بس...... وہ ایک جوان اور حسین عورت تھی۔ چہرہ کتابی تھا اور اس کی کشادہ آنکھیں کسی خاموش جنگل کی جھیل جیسی گہرائی لیے ہوئے تھیں۔ ان میں اُداسی کا رنگ بھی ایک معصوم سی خوب صورتی لیے ہوئے تھا۔ وہ سروقد تھی۔ اس کے گھنے ریشمی بال ایک چٹیا کی صورت میں بندھے ہوئے تھے۔ میرے دل میں اسے دیکھ کر کرب کی لہر کا پیدا ہونا یہی معنی رکھتا تھا کہ کتنی حسین خاتون اور کتنی بدقسمت تھی کہ اس بھرے حسن اور جوانی میں بیوہ ہو گئی اور...... کتنا خوش قسمت تھا بشام چھلگری جس کی اس قدر حسین بیوی تھی مگر افسوس......

"جی آ...... آپ کون......؟" اس نے مجھے ایک نگاہ دیکھنے کے بعد ان تینوں پر بھی نظر ڈالی تھی اور کچھ گھبرا سی گئی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھلکی ہوئی چادر سر پر رکھی۔

"گھبرائیں نہیں بہن! ہم غلط لوگ نہیں ہیں۔ مناسب ہوگا کہ اندر آرام سے بیٹھ کر گفتگو کی جائے۔" اس بار میرے خفیف سے اشارے پر شکیلہ نے اس عورت سے تشفی بھرے انداز میں کہا۔ "لیکن...... کیا آپ ہمیں پہلے یہ تسلی دے سکتی ہیں کہ آپ بشام کی کیا لگتی ہیں؟"

"وہ میرے شوہر ہیں۔" اس عورت نے دھیرے سے کہا۔ "مم...... مگر وہ...... کافی عرصے سے لاپتا ہیں۔"

"جی ہاں بہن! ہمیں معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی کے متعلق ہی تو ہم آپ کو کچھ بتانے آئے ہیں۔"

"اندر آجایئے۔" اس نے فوراً ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ ہم سب اندر آگئے۔

گھر اندر سے بھی غربت اور تنگ دستی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اکھڑی ہوئی اینٹوں والا دھوپ میں جلتا مختصر سا صحن اور سامنے اسی طرح کا جھکا جھکا برآمدہ اور دو کوٹھری نما کمرے نظر آرہے تھے۔ ایک نوعمر لڑکا جو بمشکل تیرہ برس کا ہوگا اور ایک معصوم سی لڑکی جو لڑکے سے دو تین سال ہی چھوٹی نظر آتی تھی، برآمدے کے ایک ستون کے ساتھ کھڑے ہماری طرف حیرت بھری نظروں سے تکے جا رہے تھے جن میں نامعلوم سے خوف کی بھی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔ مجھے اب یہ بات کھٹکنے لگی تھی کہ ایسا کیوں تھا؟ مغمومیت کی فضا تو سمجھ میں آتی تھی مگر یہ خوف...... کی فضا یہاں کیوں چھائی ہوئی تھی حتیٰ کہ بچے بھی اسی کی لپیٹ میں تھے۔ مجھے کچھ حیرت تو اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ بشام چھلگری "اسپیکٹرم" کے ایک فیلڈ آفیسر کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس حساب سے اس کی تنخواہ بھی اچھی ہو گی مگر پھر یہ تنگ دستی؟ یا پھر ممکن ہو کہ "اسپیکٹرم" کی اصلیت آشکارا ہونے کے بعد اس سے کنارہ کشی اور بعد میں روپوشی اور اس کے غیاب کے بعد اس بدنصیب کنبے کی یہ حالت ہوئی ہو؟

"اس کمرے میں آجایئے۔" عورت نے کہا۔ اس کا لہجہ شستہ اور پڑھے لکھوں جیسا تھا۔ اس نے عام سی سرلون کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ ہم اندر ایک کمرے میں آگئے۔ یہاں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر رنگ دار چادر بچھی ہوئی تھی۔ مقامی زبان میں اسے رلی کہا جاتا تھا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک چارپائی پر کون کون بیٹھے کہ وہ خاتون دو عدد بغیر پشت گاہ والی کرسیاں لے آئی۔

میں تو کرسی پر بیٹھ گیا مگر میں نے اس خاتون کو بھی دوسری کرسی پر اپنے سامنے بیٹھ جانے کا کہا۔ باقی کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ چارپائی پر پاؤں جھلائے بیٹھ گئے۔

کمرے میں چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ ایک روشن دان تھا۔ بغیر سلاخوں کا...... وہاں سے دن کی روشنی آرہی تھی، تاہم پھر بھی عورت نے لائٹ آن کر دی تھی۔

دونوں بچے بھی اب دروازے پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ عورت نے انہیں برابر والے کمرے میں جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے تو عورت ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں آپ کے لیے پانی وغیرہ......"

"نہیں بہن! رہنے دیں۔" میں نے اسے منع کیا اور ایک گہری سانس خارج کی۔ اسے اس کے شوہر کے بارے میں کچھ بتاتے ہوئے میرا دل بھاری سا ہو رہا تھا۔

"آ...... آپ میرے شوہر کے بارے میں بتانا چاہ رہے تھے؟" عورت نے کہا۔ وہ خاصی مضطرب الحال اور آزردہ خاطر نظر آنے لگی تھی۔

"آپ کو سب بتا دیا جائے گا بہن!" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے یہ بتایئے کہ آپ لوگ اتنے خوف زدہ اور ڈرے ہوئے کیوں ہیں؟"

میں نے غور کیا کہ میری بات پر عورت کے چہرے پر سراسیمگی کے سائے کچھ اور گہرے ہوئے اور پھر وہ کچھ کہتے کہتے بھرا سی گئی...... اس کے سر پر اوڑھی ہوئی چادر سرک گئی تھی۔ وہ سسک پڑی۔ میں نے فوراً کرسی سے اُٹھ کر اس کی چادر اس کے سر پر رکھ دی اور اپنا ایک ہاتھ بھی اس کے سر پر رکھ دیا اور بولا۔

"میں نے آپ کو بہن کہا ہے تو اب میں آپ کو دل سے سمجھوں گا بھی...... بشام کی میرے دل میں کیا اہمیت ہے۔ اس کا اندازہ آپ صرف اس بات سے لگا سکتی ہیں کہ میں نے آپ کی مدد کرنے کے لیے ہی اس اجنبی علاقے میں پہلی بار قدم رکھا ہے۔ یہ تینوں میرے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ساتھی ہیں اور بشام بھی میرا ایک ایسا ہی دوست اور بھائی تھا۔"

"تھا......؟" وہ عورت چونکی۔ اس نے اشکبار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں کرسی پر دوبارہ براجمان ہو چکا تھا۔

"خ خ...... خدا کے لیے مجھے جلدی بتایئے کہ بشام کدھر ہے؟ کہاں ہے وہ؟ تاکہ ہماری اس عذاب ناک زندگی سے جان چھوٹے۔"

میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور کہا۔ "حوصلہ رکھیں بہن! میں نے کہا ناں...... میں آپ کو سب بتا دوں گا...... ہم بہت دور سے آئے ہیں اور صرف اسی لیے آئے ہیں کہ آپ کی مدد کی جا سکے جس کی آپ حق دار بھی ہیں۔"

عورت نے کہا۔ "میں کیا بتاؤں...... میں تو خود بدنصیبی کی زندگی گزار رہی ہوں اور کب سے اپنے گم شدہ شوہر کی راہ تک رہی ہوں...... پھر خود کو بہلا لیتی ہوں مگر ان دونوں معصوموں کو کیسے بہلاؤں جو ہر روز مجھ سے ایک ہی سوال پوچھتے ہیں کہ...... "اماں! بابا، کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ کب آئیں گے؟" اتنا بتا کر وہ چپ ہوئی اور اپنی چادر سے نمناک آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس بار کبیل دادا نے عورت سے سنجیدگی کے ساتھ مخاطب ہو کر کہا۔

"بہن! آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"ارم۔" خاتون نے ہولے سے اپنا نام بتایا۔ اس کے بعد کبیل دادا نے خود سمیت ہم سب کا بھی تعارف کروایا۔

"ارم بہن! ہم چاروں کو آپ غور سے دیکھ لیں۔" کبیل دادا دوبارہ اپنے مخصوص انداز میں ارم سے مخاطب ہوا۔ "یہاں میں اللہ کو گواہ بنا کر آپ سے کہتا ہوں کہ ہم چاروں کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ ہم ایک دوسرے کے نہ بھائی لگتے ہیں نہ بہن۔ ہم ایک دوسرے کے عزیز رشتے دار بھی نہیں ہیں۔ لیکن ارم بہن! کیا آپ یقین کریں گی کہ ہم چاروں پھر بھی ایک دوسرے پر جانیں چھڑکتے ہیں، کہیں کبھی یقینی موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں تو اپنے ساتھی کی ڈھال بن جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا میں صرف ایک خونی رشتہ ہی بڑا نہیں کہلاتا۔ انسانیت اور دوستی کا رشتہ اس سے بڑھ کر افضل ہے۔ ہم چاروں بھی ایسے ہی دوست ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔" اتنا کہہ کر کبیل دادا ذرا تھما پھر اصل بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔

"ہم یہاں آئے تو اور مقصد کے لیے تھے، اگرچہ وہ بھی ہم پورا کر کے ہی جائیں گے مگر یہاں آپ کو ایسی خوف کی حالت میں پا کر ہم بے چین ہو گئے ہیں۔ آپ نہیں جانتیں کہ آپ کے شوہر بشام نے ملک و قوم کے لیے کتنا بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اور ہم اس کے قدردانوں میں سے ہیں۔ اسی ناتے ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں، ہم پر بھروسا کریں اور ہم سے اب کچھ نہ چھپائیں۔ آپ میری بات کا مطلب شاید سمجھ گئی ہوں گی۔"

ارم نے ایک نگاہ اُٹھا کر کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ وہ اب کچھ سنبھلنے لگی تھی۔

"شاید اللہ سائیں نے مجھ بدنصیب عورت کی دعا سن لی ہے۔ اپنے شوہر (بشام) کی گمشدگی کے بعد میں واقعی بہت کمزور اور مجبور ہو گئی ہوں۔ لیکن...... خدا کے لیے پہلے مجھے یہ تو بتایا جائے کہ میرا شوہر کہاں ہے؟"

"بہن! کہا نا ہم نے کہ ہم آپ کو سب بتا دیں گے لیکن پہلے آپ اپنی مصیبت کے بارے میں بتائیں۔" اس بار شکیلہ نے اس سے تشفی آمیز لہجے میں کہا تو ارم چند لمحے کے لیے خاموش سی ہو گئی۔ شاید وہ اپنی کوئی دکھ بھری داستان سنانے کے لیے مناسب الفاظ کا سہارا تلاش کر رہی تھی پھر کہنا شروع ہوئی۔

"ہماری حالت پہلے ایسی نہ تھی، جیسی اب آپ کو نظر آرہی ہے۔ میرا شوہر بشام ایک بین الاقوامی این جی اوز میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ دادو میں ہمارا شاندار بنگلا تھا۔ ہم بہت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ نجانے پھر کسی کی ہماری ہنستی بستی زندگی کو نظر لگ گئی اور پھر کچھ نہ رہا۔ بشام کے ایک استاد پروفیسر کریم بخش، آرکیالوجسٹ تھے۔ دونوں استاد شاگرد موئن جو دڑو میں مل کر ایک بڑے پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس کے لیے ہمیں بھی اپنا پورا گھر بار لاڑکانہ شفٹ کرنا پڑا۔ کھدائی کے دوران میں کوئی نادر و قیمتی ہیرا اُن کے ہاتھ لگا جسے قومی امانت سمجھتے

ہوئے حکومت کے ذمّے داران کے حوالے کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ وہ ہیرا ایک مقامی زمیندار شاہنواز خان نے اُڑا لیا۔ بشام کو اس کی خبر ہوگئی کہ وہ ہیرا زمیندار شاہنواز نے اُڑایا ہے تو اس نے اس کے خلاف قانونی کارروائی کی اور وہ ہیرا اس کے قبضے سے برآمد کرا لیا مگر زمیندار شاہنواز چونکہ ایک بااَثر شخص تھا، اس نے خود کو قانون کی گرفت سے چھڑا لیا مگر اب وہ ہمارا دشمن بن چکا تھا۔ اپنی سبکی کو اس نے انا کا مسئلہ بنا لیا، ساتھ ہی وہ ہیرا ابھی دوبارہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہا۔ ہمیں بھی تنگ کرنے اور ستانے لگا۔ پھر بدقسمتی سے وہ ہیرا دوبارہ اُڑا لیا گیا۔ بشام بھی ان دنوں بہت پریشان رہنے لگا تھا اس کی وجہ وہ یہی بتاتا تھا کہ وہ اسپیکٹرم نامی جس بین الاقوامی این جی اوز میں کام کرتا تھا وہ اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی اس کے پسِ پردہ عالمی پیمانے پر وہاں مجرمانہ سرگرمیاں پروان چڑھنا شروع ہوگئی تھیں۔ بشام کو ان لوگوں سے بھی جان کا خطرہ ہونے لگا تھا، لہٰذا اُنہوں نے ان کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور لاڑکانہ میں ہی روپوشی کی زندگی بتانے لگا۔

اس دوران زمیندار شاہنواز مسلسل ہمیں تنگ کرتا رہا اور دھمکیوں کے ذریعے اس ہیرے کو لوٹانے کا کہتا تھا جبکہ ہیرا پہلے ہی دھوکے سے اُڑایا جا چکا تھا پھر ایک دن اچانک بشام غائب ہوگیا۔ میں یہی سمجھی تھی کہ زمیندار شاہنواز خان نے ہی دشمنی میں اسے اغوا کرایا ہے مگر جلد ہی مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ کام کسی اور آدمیوں کا ہے، کیونکہ شاہنواز کو خود بشام کی تلاش تھی۔ اب وہ دن ہے اور... میں بے سکون ہوکر رہ گئی ہوں۔ شاہنواز کو شبہ ہے کہ بشام کسی خاص مقصد کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوا ہے اور وہ ہیرا ابھی اسی کے پاس ہے، یوں اب وہ آئے روز اپنے مسلح آدمیوں کے ذریعے مجھے ڈراتا دھمکاتا ہے۔ بشام کے بارے میں پوچھتا ہے۔ مجھے اغوا کی دھمکیاں دیتا ہے۔ ہر وقت اس کے آدمی ہماری نگرانی کرتے رہتے ہیں اور ہمیں اپنے گھر میں ہی قیدی کی حیثیت سے رہنا پڑتا ہے۔ بس بھائی! یہی مجھ دکھیاری عورت کی داستان ہے۔“

ارم اتنا بتا کر خاموش ہوگئی۔ کمرے میں چند ثانیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد میں نے کسی خیال کے تحت ارم سے پوچھا۔

”کیا وہ ہیرا تم نے دیکھ رکھا تھا؟ میرا مطلب ہے تمہارے شوہر بشام کے پاس تھا تو یقیناً اس نے تمہیں بھی دیکھنے کو دیا ہوگا؟“

”ہاں۔“ ارم نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

”اس ہیرے کو دریافت کرنے والے پروفیسر کریم بخش نے جو نام دے رکھا تھا وہ تمہیں معلوم ہے؟“

”ہاں۔“ ارم نے پھر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور تب ہی میں نے فوراً کہا۔

”طلسم نور ہیرا......؟“

”ہاں...... ہاں! شہزی بھائی! بالکل یہی نام تھا اس ہیرے کا مگر......“

میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر اپنی شرٹ کے نیچے اور پینٹ کی بیلٹ میں اُڑسے ہوئے کپڑے کی گانٹھ میں بندھے طلسم نور ہیرے کو کھول کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اس کے سامنے کر دیا۔ ہیرے کو دیکھ کر ارم کی آنکھوں میں شدید حیرت کے تاثرات ابھرے۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی پھر اٹکتے ہوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ی ی...... یہ تت...... تمہارے پاس کک...... کیسے آیا؟“

”شش......“ میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھی۔ ”تمہیں دل سے بہن کہا ہے تو سمجھتا بھی ہوں...... اب تم بھی اس بھائی کا مان رکھو گی اور یہ راز اپنے تک ہی محدود رکھو گی۔ یہ میں نے تمہیں اسی لیے دکھایا ہے تاکہ تمہیں میری باتوں کا یقین آجائے جو ابھی میں تم سے کہنے والا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے ہیرا دوبارہ کپڑے کی گانٹھ میں بند کر کے شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اڑس لیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ارم بہن! اب میں تم سے جو کچھ کہنے والا ہوں وہ تم نے بڑے حوصلے اور خاموشی کے ساتھ مگر بہ غور سننا ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے دھیرے دھیرے مگر مختصر الفظوں میں وہ سب بتا دیا جو صرف اس کے شوہر بشام کی اس ہیرے کو ملک دشمنوں سے بچانے کی تگ و دو اور اپنی جان کی قربانی تک محدود تھا۔

ارم، اپنے شوہر بشام کے عبرت ناک انجام اور اس ہیرے کی کتھا سن کر جیسے ایک دم سکتے میں آگئی جبکہ ہیرے کے حصول کے سلسلے میں بھی مختصراً میں نے یہی بتایا تھا کہ ہم نے یہ کس طرح ملک دشمنوں سے حاصل کیا تھا اور اس میں بھی بشام کی رہنمائی کا ہی دخل تھا، نیز اب ہم یہ ہیرا حکومت کے ذمّے دار اہلکاروں کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ خراجِ تحسین کے طور پر تمہیں بھی اتنا انعام دلوانے کی کوشش کریں گے جس کا تم اور تمہارے بچے حق رکھتے ہیں۔

ارم ہچکیاں لے کر رو پڑی تھی۔ ایسے میں اول خیر نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا اور وہ جلدی سے اُٹھ کر ارم کے پاس چلی گئی اور اسے سنبھالا دیتی ہوئی چارپائی پر لے آئی اور اپنے قریب بٹھا کر اسے تسلیاں دینے لگی، کھبیل دادا اُٹھ کر ارم والی خالی کرسی پر آبیٹھا تھا۔ کمرے کی فضا ایک بار پھر مغموم سی ہوگئی تھی۔ وہ دونوں بچے بھی کافی دیر بیت جانے کے باعث دوبارہ معصوموں کی طرح ہمارے کمرے کی چوکھٹ میں آن کھڑے ہوئے تھے اور سراسیمہ سی نظروں سے ہمیں گھورے بھی جا رہے تھے مگر پھر اپنی ماں کو روتے دیکھ کر لڑکے نے ہمت کی اور اندر آگیا اور اپنی ماں کے پاس آن کھڑا ہوا۔ میں نے اسے قریب بلا کر پیار کیا جبکہ اول خیر نے دروازے پر کھڑی بچی کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیر کر اسے پیار کیا اور اندر لے آیا۔

ارم نے روتے ہوئے اپنے دونوں بچوں کو خود سے لپٹا لیا۔ یہ رقت آمیز منظر دیکھ کر ہم چاروں بھی مغموم سے ہو گئے۔

”حوصلہ پکڑو میری بہن!“ بالآخر میں نے اپنے اندر کے بوجھل پن پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے خوف زدہ ہونے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ پھر ایک لمحے توقف کے بعد کسی خیال سے پوچھا۔

”تمہارا بشام مرحوم کے سوا اور کوئی ہے؟ میرا مطلب ہے، تمہارا کوئی عزیز یا بھائی وغیرہ؟“

”نہیں بھائی! میرا...... بشام کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔“ ارم نے غمگین سے لہجے میں کہا تو میں بولا۔ ”ٹھیک ہے پھر تم ہمارے ساتھ چلو، یہاں اب تمہارا اکیلے رہنا یوں بھی مناسب نہیں ہوگا۔“

”تمہارا شکریہ بھائی!“ ارم نے دھیرے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں...... پڑھی لکھی ہوں، اب بھی محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر گزارا کر لیتی ہوں۔“

”دیکھو بہن!“ کھبیل دادا نے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تم سے جو کہا تھا تم نے شاید اس پر غور نہیں کیا۔ ہم چاروں کا بھی آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن ہم چاروں کا ساتھ کسی خونی رشتے سے کم بھی نہیں ہے۔ اس میں تم بھی شامل ہو جاؤ گی تو کون سا فرق پڑ جائے گا؟ اور پھر ہم تو تمہیں اور تمہارے ان دونوں معصوم بچوں کو ان کا حق اور جائز مقام دلانے کا عہد بھی کر چکے ہیں۔ شہزی نے اس بیش قیمت اور قومی امانت کی بازیابی کا کریڈٹ مرحوم بشام بھائی کو ہی دینے کا حتمی فیصلہ... کر لیا ہے جو اس کا حق بھی تھا۔“

کھبیل دادا کی بات پر ارم سوچ میں پڑ گئی تو شکیلہ نے بھی اسے سمجھایا۔

”ارم بہن! یہاں رہو گی تو شاہنواز تمہارا اور تمہارے بچوں کا جینا دوبھر کر دے گا، یوں بھی وہ اب تک تم لوگوں پر عرصۂ حیات بھی تنگ کر چکا ہے۔“

”تم لوگوں کا خلوص اپنی جگہ مگر میں کسی پر بوجھ نہیں بن سکتی۔“ اس نے کہا۔

”تم کسی پر بھی بوجھ نہیں بنو گی بہنا!“ میں نے پیار سے سمجھایا۔ ”ہم تمہاری جو مدد کریں گے تو تم پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ تم اس کا حق رکھتی ہو۔ حکومت انعامات کے ضمن میں تمہاری بھرپور مدد کرے گی۔ یہ ملکی اور قومیت کا معاملہ ہے۔ تمہارے لیے ایک قابلِ فخر اعزاز کا سوال ہے۔“

”بھائی! یہ تو تم لوگوں کا سچا جذبۂ انسانیت ہے، ورنہ تم لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک غریب دکھیاری کے لیے اتنا دردِ سر مول لیتے۔“ ارم بولی۔

”کوئی دردِ سر نہیں۔ بس فیصلہ ہوگیا بہن! اب تم ہمارے ساتھ چلو گی مگر خود مختار بن کر......“ اول خیر بولا۔ ”اور یہ خیال بھی اپنے دل سے نکال دو کہ تم کسی پر بوجھ بنو گی۔ شہزی بھائی کو تم نہیں جانتیں، وہ بے شک عمر میں ہم سے چھوٹا ہے مگر ہم اسے اپنا بڑا کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ دل کا بڑا ہے اور اپنے کام کا بھی۔ ابھی ایک فیصلہ کر دو مگر سوچ لینا کہ اس معذرت اور معافی کے ساتھ کہ تم یہاں بالکل غیر محفوظ ہو۔ تمہارے ساتھ دو چھوٹے معصوم بچے ہیں، خود تم جوان اور اکیلی ہو۔ ایسے میں شاہنواز جیسے درندے......“

”وہ بہت خطرناک اور بااثر آدمی ہے۔“ ارم نے فوراً کہا۔ ”مم...... مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں اس کے آدمی تم لوگوں کو بھی......“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازے پر کسی نے زور زور سے دستک دی۔ ہم سب چونک گئے۔ ارم کے چہرے سے یک دم ہی ہراس مترشح ہونے لگا۔ تاہم وہ فوراً بولی۔

”آ آ...... میں دیکھتی ہوں جا کر......“

”تم ٹھہر جاؤ بہن! ہم دیکھ لیتے ہیں، باہر کون ہے؟“ میں نے کہا تو وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔

”نہیں شہزی بھائی! مجھے ہی دیکھنے دیں۔“ میں چپ رہا۔ ارم کمرے سے نکلی۔ ہم کمرے میں کھڑے ارم کو صحن

سے دروازے کی طرف جاتا دیکھتے رہے۔ ارم نے دروازہ کھولے بغیر ہی اندر سے پوچھا۔

”کون......؟“

”دروازہ کھولو مائی! اندر کون لوگ آئے ہوئے ہیں؟“ باہر سے کسی کی بھاری اور کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔ صحن مختصر ہونے کے باعث میرے کانوں تک بھی یہ کرخت سی مردانہ آواز آئی تھی۔ ارم کے لیے شاید یہ آواز غیر شناسانہ تھی۔ کیونکہ دوسرے ہی لمحے میں نے اسے فکرمند سا محسوس کیا۔

”میں...... اندر میرے کچھ عزیز رشتے دار آئے ہوئے ہیں؟“

”رشتے دار......؟ اور تیرے......؟“...... یہ وہی کرخت سی بھاری مردانہ آواز ابھری۔ جس میں کوٹ کوٹ کر طنز اور ناگواری بھری ہوئی تھی۔ ”میں کہتا ہوں دروازہ کھولو اور انہیں باہر نکالو...... ہم اُن سے بات کرنا چاہتے ہیں، ورنہ......!“ دھمکی آمیز انداز میں جملہ دانستہ اُدھورا چھوڑا گیا تو ارم نے آگے بڑھ کر لرزتے ہاتھوں سے دروازے کی کنڈی کھول دی۔

میں ہونٹ بھینچے کھڑا دروازے کی طرف گھورتا رہا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک موٹا تگڑا اور لحیم شحیم سا آدمی اندر داخل ہوگیا۔ ارم اسے راستہ دینے کے لیے پہلے ہی ایک طرف جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے عقب میں تین افراد اور بھی تھے۔ دو کو تو میں دیکھتے ہی چونکا تھا۔ یہ وہی دو مشکوک اجرک پوش تھے، جن سے میں نے اخبار لیا تھا اور تبھی سے وہ ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔ تیسرا کوئی اور تھا۔

ان کے چہروں سے جارحانہ انداز مترشح ہوتا تھا۔ ان چاروں نے کھلے گھیر والی شلوار قمیص پہن رکھی تھیں اور کوئی بعید نہ تھا کہ ان کے بغلی ہولسٹرز میں اسلحہ بھی ہوتا۔ وہ کرخت آواز والا لمبا تڑنگا شخص خاصا خونخوار اور کوئی چھٹا ہوا بدمعاش ہی نظر آتا تھا۔ اس کے بال بڑے تھے، قلمیں اس کے سیاہ رُودگالوں تک لمبی تھیں، گھنی مونچھیں اور چہرے پر چھدری سی داڑھی تھی۔

وہ میری ہی عمر کا نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے آن کی آن میں مدمقابل کو پچھاڑ دینے کی وحشت ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کے ہونٹ موٹے اور رنگ کالا تھا۔ بالوں میں تیل چپڑا ہوا تھا۔

انہیں اس طرح دیدہ دلیری سے اندر آتے دیکھ کر میں بھی اپنے آپے میں نہ رہا اور کمرے کے کھلے دروازے سے باہر صحن میں آگیا اور پورے قد کے ساتھ اس بدمعاش کے بالکل آمنے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھے اس طرح سامنے آتا دیکھ کر اس بدمعاش کی موٹی موٹی وحشت زدہ سی آنکھوں میں پہلے تو ایک عجیب سا رنگ آکر گزرا اس کے بعد ان میں نفرت اور جنگجوانہ سی چمک لہرائی۔

”کون ہو تم لوگ......؟ اور اس طرح کیوں اندر گھسے چلے آئے ہو؟“ میں نے اس بدمعاش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسی تلخی اور بغیر کسی دباؤ والے لہجے میں کہا۔ اسی اثنا میں کبیل دادا اور اول خیر بھی میرے پیچھے کمرے سے نکل آئے تھے۔ وہ میرے دائیں بائیں سینہ تانے کھڑے ہوگئے تھے۔

میرا تجربہ تھا کہ ایک اکیلی، کمزور اور مجبور، دکھوں کی ماری ہوئی عورت پر اس طرح کی سینہ زوری کرنے والے فطرتاً بزدل ہوتے ہیں۔ اکڑتے بھی ہیں تو کسی کی شہ پر...... ورنہ اپنی حیثیت میں یہ کچھ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک تو میرے اس طرح کے بغیر مرعوب ہوئے انداز اور لہجے کی دررانہ وار تلخی اور اس کے بعد کبیل دادا اور اول خیر کے تیوروں کو دیکھتے ہی بھانپنے کے انداز میں اسے چند ثانیوں کے لیے چپ سی کھا گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے سر پر وہی خرانٹ پن سوار ہوگیا۔ اس کے موٹے اور بھدے نقوش والے چہرے کے تاثرات کریہہ ہوئے۔ ایک نظر کبیل دادا اور اول خیر پر ڈالنے کے بعد وہ اکھڑپن سے بولا۔

”یہی سوال ہم نے تم سے پوچھا ہے جواب دو مجھے کہ...... تم لوگ......“

”تم ہم سے یہ سوال پوچھنے کا حق ہی نہیں رکھتے مسٹر!“ اس بار کبیل دادا نے فوراً اس کی بات کاٹ کر اور دبدبے والے انداز میں کہا تو اس کی موٹے ڈیلوں والی آنکھوں میں جارحانہ چمک کسی آندھی کی طرح اُمڈی مگر دوسرے ہی لمحے اسی مشکوک اجرک پوش نے مداخلت کر ڈالی اور دو قدم آگے بڑھتے ہوئے اپنے اس سردار نما ساتھی سے مخاطب ہوکر بولا۔

”ڑے سائیں ٹھہرو...... یہ تو وہی لوگ ہیں جن سے میں اور جانو جرمن مل چکے ہیں۔ مجھے بات کرنے دو اِن سے ذرا......“

یہ اجرک پوش آدمی یا تو واقعی مصالحتی مزاج کا حامل تھا یا پھر کسی معاملہ فہمی کی آڑ میں کوئی چالاکی چلنا چاہتا تھا۔ اس کا دوسرا ٹوپی پوش ساتھی جسے اس نے جانو جرمن کے

JBD

جہانگیر بکس 91

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
[illegible]

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی ... کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
[illegible]

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہورِ اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 500/-
[illegible]

داستان مجاہد 300/-
[illegible]

پردیسی درخت 450/-
[illegible]

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے ... کی داستان

معظم علی 475/-
[illegible]

خاک اور خون 550/-
سسکتی، کرچی کرچی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
[illegible]

قافلۂ حجاز 599/-
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالمِ اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمتِ عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965 کی جنگ کے پس منظر میں ... کی داستان

انسان اور دیوتا 450/-
[illegible]

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
[illegible]

آخری چٹان 450/-
[illegible]

سو سال بعد 225/-
[illegible]

سفید جزیرہ 325/-
بحر اوقیانوس کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی کہانی

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
حکایاتِ رومیؒ 180/-
دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر
اردو لغت
(جامع ترین)
[illegible]

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609
021-32765086

ضروری کاغذات سمیٹے، بچوں کو لیا، شٹل کاک ٹائپ برقع پہنا اور پھر کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

میں اور اول خیر مکان میں اکیلے رہ گئے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ اس دوران میں نے زہرہ بانو سے فون پر رابطہ کر کے موجودہ صورت حال سے مختصراً آگاہ کیا۔ وہ کچھ فکرمند تو ہوئی، مگر مزید کچھ نہ بولی۔ تاہم سلسلہ منقطع کرنے سے تھوڑی دیر پہلے اس نے یہ ضرور کہا۔ مناسب ہو سکے تو کسی پھڈے میں ٹانگ پھنسانے سے بہتر ہو گا کہ جان چھڑا کر نکل آنا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی مگر دشمنوں کی ناک کے نیچے سے نکلنے کے لیے ان کا سامنا کرنا بھی ضروری ہے۔

مزید اور بھی کافی وقت بیت گیا، مگر وڈے سائیں کے آدمی ہمیں لینے کے لیے نہیں آئے۔ اس پر مجھے سخت اچنبھا ہوا اور ہم سے بڑھ کر یہ سن کر کبیل دادا وغیرہ کو حیرت ہوئی تھی جب بعد سہ پہر وہ سارے کام کروا کے بہ خیریت لوٹے تھے۔

"بڑی عجیب بات ہے یہ......" شکیلہ بڑبڑائی۔ ارم کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ کبیل دادا نے تو آتے ہی مجھ سے پوچھا تھا۔

ارم اپنے سارے مذکورہ کام نمٹا آئی تھی۔ واپسی میں اس نے مالک مکان خاتون سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس نے اسے ایک تالا چابی دے دی تھی کہ جب بھی جاؤ تو یہ والا تالا مکان میں لگا دینا۔

"چلو، اچھا ہوا اس امتحان میں پڑے بغیر معاملہ ٹل گیا۔" اول خیر بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ شاہنواز خان اپنے حواریوں کی باتوں سے ہمارے بارے میں اندازہ لگا چکا ہو گا کہ ہم دبنے یا "جھلے لگن" والے لوگ نہیں ہیں۔ وہ چپکا ہو کے بیٹھ گیا ہو گا۔"

"ایسا نہیں ہے اول خیر......" کبیل دادا نے اچانک پُرخیال لہجے میں کہا۔ "کیا خبر وہ کوئی اور کھچڑی پکانے میں مصروف ہو......"

صرف میں نے کبیل دادا کی اس بات سے اتفاق کیا تھا بولا۔ "یہ ممکن ہے کہ شاہنواز کسی اور طریقے سے اس صورت حالات سے نمٹنے کا خفیہ ارادہ رکھتا ہو۔"

"خفیہ بھی اور مجرمانہ بھی......" شکیلہ نے ٹکڑا لگایا۔

"مگر ہم اُسے کب موقع دینے والے ہیں؟" اول خیر بولا۔ "سارے کام نمٹا تو لیے ہیں، بس آج رات ہی چپ چپاتے کوچ کر جاتے ہیں۔ ارم بہن کا اتنا کوئی خاص زیادہ سامان نہیں ہے۔ پرائیوٹ ٹیکسی کروا کے جتنی جلد ہو سکے اس علاقے سے تو کم از کم نکل ہی جاتے ہیں۔"

ارم کھانا بنانے میں مصروف ہو گئی۔ شکیلہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی مدد کر رہی تھی۔ ارم مرغی کا سالن، روٹیاں اور وائٹ رائس بنا رہی تھی۔

اول خیر دونوں بچوں کے ساتھ "بچہ" بنا اُن کا دل بہلانے میں مصروف تھا۔ میں اور کبیل دادا کمرے میں بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔

رات کے نو بجے تھے۔ شاہنواز کے آدمی نہیں آئے تھے۔ ارم نے کھانا اچھا بنایا تھا۔ ہم نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔

لاڑکانہ سے پنجاب کے لیے کوچز نہیں چلتی تھیں۔ اس کے لیے پہلے سکھر یا روہڑی تک کا سفر کرنا پڑتا تھا جو یہاں سے لگ بھگ دو گھنٹوں کی مسافت پر تھا، وہاں تک عام مسافر لاریاں اور ویگنیں جاتی تھیں جو ہر گھنٹے بعد روانہ ہوتی تھیں، کیونکہ وہاں کی سواریاں بہت ہوتی تھیں۔ ہم نے روہڑی یا سکھر پہنچ کر آگے ملتان تک کوچ یا ٹرین کا سفر جاری رکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

دس بجے تک ہم کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ ارم نے اپنی تیاری کر لی تھی اور جو بھی ضروری سامان تھا وہ باندھ لیا تھا جو اتنا زیادہ نہ تھا، فقط ایک سوٹ کیس اور سفری بیگ۔ گیارہ بجے وہ سونے کے لیے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی، شکیلہ بھی اس کے ساتھ تھی جبکہ میں، اول خیر اور کبیل دادا اسی کمرے میں سونے کے لیے لیٹ گئے۔ ارم نے یہاں باہر صحن میں رکھی ہوئی ایک اضافی چارپائی ڈال لی تھی اور فرش پر رلی بچھا دی تھی۔ وہاں اول خیر لیٹ گیا تھا۔

گرمی اور حبس کے باعث کمرے کی ایک کھڑکی جو باہر کھلتی تھی، ہم نے کھولے رکھی تھی۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا۔ زیرو بلب نہ تھا، تاہم باہر کی اسٹریٹ لائٹ کی کچھ روشنی کھلی کھڑکی سے اندر آ رہی تھی۔

موجودہ حالات کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم میں سے کسی ایک کا جاگتے رہنا ضروری تھا۔ اس کے لیے پہلے دو گھنٹے میں نے اور بعد میں اول خیر اور کبیل دادا نے جاگنا تھا۔

اول خیر کے تو جلد ہی خراٹے گونجنے لگے تھے جبکہ کبیل دادا بھی شاید سینے پر ہاتھ رکھے سو گیا تھا، نیند سے میری آنکھیں بھی بھاری ہونے لگی تھیں لیکن جانے کیا بات تھی کہ دل عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا بار بار دھیان اسی بات کی طرف جاتا تھا کہ شاہنواز کے آدمی جو ہمیں اپنے وڈے سائیں کی اوطاق میں لے جانے کے لیے بضد تھے، وہ ہمیں لینے کیوں نہیں آئے تھے؟

ابھی رات اتنی زیادہ نہیں گزری تھی۔ باہر گلی میں چند ایک لوگوں کے آنے جانے کی آہٹیں اور باتوں کی آوازیں آ جاتی تھیں، کبھی کوئی زوردار قہقہہ بھی بلند ہو جاتا۔

اچانک باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں اُٹھ بیٹھا اور ابھی کمرے سے نکل کر صحن میں آیا ہی تھا کہ اچانک باہر سے دروازے کو زور زور سے پیٹا جانے لگا۔ آواز اس قدر زیادہ تھی کہ تقریباً سوئے ہوئے سبھی لوگ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے تھے۔ اول خیر اور کبیل دادا مجھے کمرے میں موجود نہ پا کر سب سے پہلے باہر کو لپکے تھے۔ میں اس وقت دروازے کی طرف جا کھڑا ہوا تھا۔

"کون ہے بھائی! اتنی زور زور سے دروازہ کیوں پیٹ رہے ہو؟"

"اڑے او...... اندر جو بھی ہے فوراً دروازہ کھولو، ورنہ توڑ دیا جائے گا...... پولیس نے مکان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔"

باہر سے ایک کڑک دار اور کرخت آواز ابھری۔ میں چونک پڑا۔ اول خیر اور کبیل دادا بھی یہ سن کر بری طرح چونکے تھے۔ ادھر میں نے پولیس کا نام سنتے ہی پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور اپنی پینٹ سے بندھا طلسم نور ہیرا نکال کر پھرتی سے قریب کھڑی شکیلہ کی طرف اُچھال دیا اور وہ اسے کیچ کیے اندر کمرے کی طرف لپک گئی۔

متوقع اور غیر متوقع حالات کے پیدا ہونے پر میری پہلے سے ہی توجہ اسی نادر و قیمتی امانت پر مرکوز ہونے لگتی تھی، جسے ہم نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر حاصل کیا تھا۔

دوبارہ دستک ہوئی اور اس بار پولیس کا دروازہ توڑنے کا پورا ارادہ لگتا تھا کہ میں نے آگے بڑھ کنڈی گرا دی۔ دھڑ سے دروازہ کھلا اور چار پانچ مسلح وردی پوش پولیس والے اندر گھستے چلے آئے۔ انہوں نے آناً فاناً ہمیں اپنی گرفت میں لے لیا۔

"ی ی...... یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے چلّا کر کہا۔

...انسپکٹر کی وردی میں ملفوف ایک درمیانی قامت کا شخص جس کا پیٹ وردی سے تھوڑا باہر کو آ رہا تھا۔ اس کے سینے پر لگے ٹیگ پر میں نے اس کا نام رجب دین پڑھ لیا تھا۔ وہ میری جانب خرانٹ سی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"ایسی حرکتیں تم جیسے مجرموں کے لیے ہی کی جاتی ہیں۔" پھر اس نے سپاہیوں کو مقامی زبان میں کوئی حکم دیا۔ یہ مطلب ظاہر ہوتے ہی کہ ہمیں تھانے لے جایا جا رہا تھا، کبیل دادا بولا۔

"انسپکٹر! تمہارے پاس اس غیر قانونی گرفتاری کے وارنٹ ہیں یا کسی کے کہنے پر تم یہ سب کر رہے ہو؟" میں نے دیکھا، کبیل دادا کے یہ کہنے پر اس خرانٹ انسپکٹر کی جھلسی ہوئی رنگت والے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرا اور پھر وہ چند قدم کبیل دادا کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رول تھا وہ اسے کبیل دادا کے فراخ سینے پر ٹھونک بجانے کے انداز میں مارتا ہوا بولا۔

"میرا نام انسپکٹر جمیل شاہ ہے اور میں خطرناک مجرموں کے سلسلے میں کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ اب تم اپنی زبان بند رکھو گے، ورنہ اِدھر ہی تھانہ کھول دیا کرتا ہوں میں......"

"انسپکٹر صاحب! یہ میرے عزیز ہیں، کیا جرم کیا ہے انہوں نے؟" اسی وقت ارم آگے بڑھ کر انسپکٹر جمیل شاہ سے مقامی زبان میں بولی تو انسپکٹر اس کی طرف چند لمحے بڑی قہربار نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر زہریلے لہجے میں بولا۔

"او...... مائی! تُو تو پہلے ہی ہماری نظروں میں مشکوک تھی۔ تیری باری بھی آئے گی، پہلے ان کا بیان لے لیا جائے۔"

اس کے بعد چند پولیس والوں نے گھر کی تلاشی لی اور یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ہم تینوں کے علاوہ اور کوئی مرد گھر پر موجود نہ تھا، ہمیں ہتھکڑیاں پہنا کر باہر کھڑی موبائل میں سوار کرا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس مجھے، کبیل دادا اور اول خیر کو لیے ایک خستہ حال سی پیلی اور سفید رنگ کی عمارت والے تھانے میں لے آئی جو لاڑکانہ شہر کے وسط میں ہی تھا۔

اول خیر اور کبیل دادا پریشان سے تھے اور میں اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا۔ میں زمیندار شاہنواز سے کسی اور ہی چال کی توقع کیے بیٹھا تھا مگر اس نے دوسرے رخ سے اپنی چال چلنے کی کوشش چاہی تھی۔ ورنہ بھلا پولیس کو کیسے ہمارا پتا چلتا؟ یہی کچھ سوچ کر میں نے فوراً بیدار مغزی

کا مظاہرہ کرتے ہوئے طلسم نور ہیرا شکیلہ کے حوالے کر دیا تھا۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ اس وقت صرف ہم تینوں ہی نشانے پر ہو سکتے تھے۔

تاہم مجھے انسپکٹر... رجب دین کی اس بدمعاشی اور دھونس دھاندلی پر بری طرح طیش آرہا تھا۔ ہمیں ابھی لاک اَپ تو نہیں کیا گیا تھا مگر ایک قدرے کشادہ کمرے میں لے جا کر کھڑا کر دیا تھا۔ اس دوران میری کھولتی ہوئی کیفیات کو بھانپتے ہوئے کبیل دادا نے میرے کان میں ایک سرسراتی سرگوشی ضرور کر ڈالی تھی۔

”شہزادے! اس انسپکٹر کے ساتھ زیادہ گرما گرمی مت کرنا۔ یہ مجھے شاہنواز خان کا ہی راتب خور لگتا ہے اور...... یہ ان کا ہی علاقہ ہے، ہمارے ساتھ کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔“

لیکن مجھے ان ہتھکڑیوں سے بڑی سبکی اور تذلیل کا احساس ہو رہا تھا، یہی سبب تھا کہ جب انسپکٹر رجب دین اپنے ابھرے ہوئے پیٹ سے ڈھلکتی بیلٹ کو دونوں ہاتھوں سے اُوپر کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تو میں نے کہا۔

”انسپکٹر! ہم کوئی عادی مجرم نہیں ہیں۔ آپ نے کوئی بات کرنی ہے تو یہ ہتھکڑیاں......“

”منہ بند رکھو اپنا...... سب جانتے ہیں ہم......“ وہ درشت لہجے میں مجھے گھور کر بولا۔

”کیا جانتے ہیں آپ ہمارے بارے میں؟ ہم چور اُچکے ہیں؟“ میں بھی چپ نہیں رہا۔ میرا چہرہ اس ماورائے قانون بدمعاشی پر غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”انسپکٹر! آخر کسی نے تو ہماری رپورٹ کی ہوگی ناں؟ ایسے ہی تو نہیں آپ نے ایکشن لیا ہوگا۔“ کبیل دادا نے فوراً مداخلت کر ڈالی۔ وہ رجب دین سے مخاطب تھا۔

”ظاہر ہے......“

”کس نے کی ہے؟“

”زمیندار شاہنواز نے۔“ انسپکٹر نے جواب دیا۔

”کمال ہے، ہم اُسے جانتے تک نہیں اور اس نے ہمارے خلاف رپورٹ کر دی؟ اس کی کوئی وجہ تو ہوگی؟“

”وجہ وہ خود ہی یہاں بتائے گا، ابھی آنے والا ہے وہ......“ انسپکٹر بولا۔

”اُسے ہم سے ایک ہی دن میں ایسی کون سی شکایت ہوگئی ہے؟ جبکہ ابھی تک تو نہ اس نے اور نہ ہی ہم نے اسے دیکھا ہے۔“ اس بار اول خیر نے کہا۔

انسپکٹر نے سیاہ رول کو میز پر رکھا اور کرسی سنبھال لی۔ پھر اس کی پشت گاہ سے کمر ٹکا کر بہ غور ہمیں دیکھتا رہا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اسے ہمارے خلاف خوب اچھی طرح سے ”ڈکٹیٹ“ کیا گیا ہے۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کسی کھڑکی یا دروازے سے گزر کر اندر کمرے میں بھی ایک لمحے کے لیے ابھری تھی۔

اسی وقت ایک اردلی اندر داخل ہوا اور انسپکٹر رجب دین سے مؤدبانہ مخاطب ہو کر بولا۔

”سر! سائیں وڈا آیا ہے۔“

”اندر بھیج دو اُنہیں۔“ انسپکٹر نے تحکمانہ کہا اور اردلی اُلٹے پاؤں واپس لوٹ گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاصے ڈیل ڈول اور اُونچے قد و قامت کا بھاری بھرکم شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے کاندھوں پر اجرک تھی اور سر پر ٹوپی۔ رنگت سرخ و سپید تھی مگر چہرے پر چیچک کے گڑھے نما داغ صاف نظر آتے تھے۔ اس کا چہرہ بھاری اور گردن خاصی چربیلی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے لگتے تھے جو اس کی کثرت مے نوشی کی چغلی کھاتے رہے تھے۔ چہرے سے روایتی رعونت ٹپک رہی تھی اور آنکھوں میں اس وقت پُرطیش چمک ہلکورے لے رہی تھی۔

اس نے بیش قیمت کلف دار شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھی، مجھے اس کی عمر کا اندازہ تو ساٹھ سے متجاوز ہی محسوس ہوتا تھا، تاہم اس نے اپنے سر اور مونچھوں کے بالوں کو رنگا ہوا تھا۔ صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ اس کے ہمراہ دو مسلح محافظ بھی تھے اور یوں لگتا تھا جیسے یہ تھانہ بھی اس ”وڈے سائیں“ کی اوطاق ہو۔ انسپکٹر رجب دین اسے دیکھتے ہی اپنے چہرے پر خوش آمدانہ مسکراہٹ لیے اس کے استقبال کے لیے فوراً ہی اپنی کرسی سے یوں اُٹھ کھڑا ہوا تھا جیسے وہ اس کا کوئی بڑا افسر ہو۔

”آؤ...... آؤ سائیں وڈا! بھلی کرے آیو......(خوش آمدید)۔“ رجب دین اس سے بولا۔ مگر شاہنواز خان نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے تو ہم تینوں کو بڑی پُرغیظ نظروں سے گھورا اور پھر انسپکٹر کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر اس پر یوں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھ گیا جیسے...... تھانے کا انچارج ہی وہی شخص تھا۔ اس کی کرسی اب انسپکٹر کی میز اور ہم تینوں کے درمیان ایسے رخ پر تھی کہ اس کے سیدھے ہاتھ پر انسپکٹر اور بائیں جانب ہم کھڑے تھے۔

”انسپکٹر!“

دفعتاً اس کی گونج دار اور غصیلی آواز ابھری۔ اس نے ذرا گردن موڑ کر رجب دین کی طرف دیکھا۔ پھر ہم پر گھورتی ہوئی غضب ناک نظریں جما دیں۔

”ان تینوں نے بشام چھلگری کو قتل کر کے...... اس کی خوبصورت بیوہ کو ورغلانے کا جرم کیا ہے۔ اپنے گھناؤنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ اُسے خاموشی سے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔“

اس کی دروغ گوئی پر میرے تن بدن میں جیسے آگ سی لگ گئی۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی تھی کہ اسے کیسے پتا چلا ہم ارم سمیت کوچ کرنے والے تھے؟

”او خیر...... کاکے! ہولا رہویں......“ اول خیر نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ شاید کبیل دادا کی طرح اس نے بھی کسی گہری اور خطرناک سازش کی بُو سونگھ لی تھی۔ لیکن میری آتش مزاجی اس کھلی ناانصافی اور دیدہ دلیرانہ انداز میں اتنے بڑے جھوٹ اور الزام تراشی پر مجھے کچھ کرنے پر اُکسا رہی تھی۔

اس کے حواریوں نے یقیناً اسے ہماری زبانی بشام چھلگری کی موت کے بارے میں بتا دیا تھا۔ تب ہی مجھے اس غلطی کا احساس بھی ہوا کہ ہمیں یہ حقیقت ابھی نہیں ظاہر کرنا چاہیے تھی۔ مجھے اب اس بات کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو چلا تھا کہ ارم کے گھر کی مسلسل نگرانی کی جا رہی تھی اور ممکن تھا کہ اس کے آدمیوں نے آج صبح دن میں ارم اور شکیلہ وغیرہ کی ریکی کی ہو، جو بقول ارم کے ہی مسلسل اس کی کڑی نگرانی میں مصروف تھے۔ انہیں اسکول اور پھر بینک جاتے دیکھا ہو۔ شاہنواز کے حواری بھی اسی نگرانی کے باعث ارم کے ہاں آئے تھے اور ہمارا پوچھا تھا۔

”آپ اتنا بڑا الزام ہم پر کس ثبوت کی بنا پر لگا رہے ہیں جناب؟ ہم تو آپ کو جانتے تک نہیں ہیں کہ آپ ہیں کون......؟“ کبیل دادا نے بڑے نپے تلے انداز میں براہِ راست زمیندار شاہنواز خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کی بات پر شاہنواز خان کی آنکھوں سے مترشح ہوتی طیش کی چمک مزید گہری ہوگئی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا اور وہ کبیل دادا کو گھورتے ہوئے غراتے لہجے میں بولا۔

”ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔ یہ پورا علاقہ ہمیں جانتا ہے مگر تم یہ نہیں جانتے ہو کہ اس وقت تم تینوں کس کی جاگیر تلے کھڑے ہو......“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

”اندازہ تو ہمیں اس بات کا بھی خوب ہو رہا ہے کہ یہ سرکاری عمارت بھی آپ کی جاگیر میں ہی شامل ہے، شاہنواز خان......!“ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اس مطلق العنان اور مغرور شخص پر جب میں نے کسی مصالحت گوئی کا اثر زائل جاتا محسوس کیا تو میں نے بھی صاف لفظوں میں اور بےخوفی سے کہہ ڈالا۔

”لیکن...... یاد رکھنا سائیں! ہمارا تعلق آپ کی جاگیر سے نہیں ہے۔ جہاں صرف آپ کا حکم چلتا ہو...... کتنی دیر تک آپ ہمیں اس سازش کا نشانہ بنائے رکھو گے؟ آخر تو معاملہ عدالت تک جائے گا ہی......“

”بکواس بند کرو اپنی......“ شاہنواز حلق کے بل دہاڑا ساتھ ہی اس نے مجھے ایک عدد گندی گالی سے بھی نواز دیا۔ میرا دماغ گھوم گیا اور اپنی آنکھوں میں مجھے گرمائش سی اُترتی محسوس ہونے لگی۔ ایسی تذلیل میں پہلی بار ہی سہہ رہا تھا۔ اگر میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ ہوتیں تو میں اس زدیل شخص کو گالی کا جواب ہاتھوں سے دیتا۔ لیکن خاموش پھر بھی نہیں رہا اور قہر آلود نظروں سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”شاہنواز خان! خود پر اتنا اُدھار رکھو کہ تمہیں کسی بڑے نقصان کی صورت میں اس کی تلافی نہ کرنی پڑ جائے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں...... ہمیں اپنی کمزور، بےبس اور کچلی ہوئی رعایا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ تم ہمارے بارے میں بھلا کیا جانتے ہو گے، جانتے تو ہم ہیں اچھی طرح سے تمہیں۔ جس نے ایک قومی امانت لوٹنے کی کوشش کی تھی اور جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔ شکر کرو کہ تم پر غداری کا مقدمہ قائم نہیں ہوا تھا۔“

اس کی ناک نیچی کرنے کی خاطر میں نے اس کی اوقات یاد دلانا ضروری سمجھا تھا۔ اس کے قریب کھڑے دونوں مسلح حواری مجھے جارحانہ نظروں سے گھورنے لگے تھے جبکہ میری بات پر شاہنواز ہی نہیں بلکہ انسپکٹر رجب دین بھی چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ شاہنواز کی اکڑفوں البتہ جاتی رہی تھی مگر غصہ اس کا ہنوز ناک کی پھنگی بنا ہوا تھا جبکہ اس کی وسمہ لگی گھنی بھنوؤں والی آنکھوں میں اُلجھن کے تاثرات بھی ہلکورے لینے لگے تھے، وہ اپنی آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھور کے بولا۔

”تم کون سی امانت کی بات کر رہے ہو؟“

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس امانت کی بات کر رہا ہوں...... میں یہ جانتا ہوں کہ ہمیں پھنسانے کی سازش اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں اُلٹا تم ہی پھنسو گے۔“

مجھے ایک بار پھر اس کے غبارے سے ہوا نکلتی محسوس ہوئی مگر اس کا کروفر جوں کا توں رہا۔ اس نے دوبارہ ہم سے مخاطب ہونے کے بجائے انسپکٹر رجب دین کو مخاطب کر کے کہا۔

”تم فوراً اِن کے خلاف پرچہ کاٹو...... ہشام کے قتل اور اس کی خوب صورت بیوہ کو ورغلانے کا...... میں دیکھتا ہوں یہ کیسے بچتے ہیں؟“ تحکمانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر چند قدم ہماری طرف بڑھا پھر میرے چہرے کو گھورتے ہوئے بولا۔

”اگر تم لوگ اکڑ دکھانے کے بجائے میرے آدمیوں کے ساتھ میری اوطاق میں ملنے آجاتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔“

تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا، میں سمجھ گیا کہ مقصد اس کا کچھ بھی رہا ہو مگر ہمارے ملنے سے انکار پر اس کی انا کو ٹھیس پہنچی تھی اور اس کا اس نے بدلہ لیا تھا، مگر بات فقط اتنی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے بھی کچھ معاملہ فہمی کی طرف آتے ہوئے مگر سپاٹ لہجے میں اس سے کہا۔

”ہم نے آپ سے ملنے سے انکار کب کیا تھا۔ آپ کے آدمیوں نے غلط بتایا ہو گا آپ کو۔ ہم تو خود آج شام ہی آپ سے ملنے آپ کی اوطاق میں آ رہے تھے۔“

وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر تک مجھے سوچتی ہوئی سی نظروں سے دیکھتا رہا اس کے بعد اس نے ایک نگاہ اول خیر اور کبیل دادا پر ڈالی۔ حالانکہ وہ اپنا حکم ”صادر“ کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے لگا تھا، لیکن شاید میری آخری بات نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”کیا نام ہے تمہارا......؟“ اس نے سرد لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

”شہزاد احمد خان۔“ میں نے جواب دیا۔

پھر وہ جانے کے بجائے انسپکٹر رجب دین کی طرف مڑا جو ”وڈے سائیں“ کو کرسی چھوڑتے پا کر فدویانہ انداز میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔

”انسپکٹر! مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میں اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”برابر سائیں وڈا......!“ انسپکٹر فوراً بولا۔ مگر میں نے دیکھا کہ کبیل دادا اور اول خیر یک دم فکرمند نظر آنے لگے۔

”میں ابھی موبائل پر اسے آپ کی طرف بھجوائے تا ہوں۔“

”نہیں...... اِسے ہم خود اپنے ساتھ لے کر جائیں لے۔“ زمیندار شاہنواز خان بولا۔

”تم ان کے دونوں ساتھیوں کو لاک اَپ کیے رکھنا ر ابھی یہ سب راز میں رکھنا۔ بعد میں دیکھتے ہیں اس مالے کو۔“

”مجھے آپ کے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہیں۔“ ں نے کہا۔ ”لیکن بہتر ہو گا کہ میرے ان دونوں ساتھیوں وبھی میرے ساتھ چلنے کی اجازت دی جائے۔“

”تم کیا سمجھ رہے ہو تمہیں آزاد کیا جا رہا ہے؟“ اہنواز نے طنزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”مگر یہ ماورائے قانون ہے۔ میں پھر اس طرح ہمارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ میری جان کو خطرہ ہو گا۔“ میں نے کہا۔ اگرچہ میں اس بات سے ڈرتا تو نہیں تھا مگر مجھے اپنی ہیں بلکہ کبیل دادا اور اول خیر کی فکر تھی۔

”انسپکٹر......! تم سرکار کے ملازم ہو یا اس جاگیردار کے......“ کبیل دادا اس کھلی ناانصافی پر چپ نہ رہ سکا۔

”اپنی زبان بند رکھو...... یہ وڈے سائیں یہاں کی ترم اور معتبر شخصیت ہیں۔ اپنی جاگیر کے لوگوں کی جان و ال کی اچھی طرح حفاظت کرنا جانتے ہیں۔“ انسپکٹر رجب ین نے کبیل دادا کو جھڑکا اور پھر آواز دے کر دو پولیس الوں کو اندر بلایا۔

”ان دونوں کو لاک اَپ کر دو۔“ اس نے کبیل دادا اور اول خیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سپاہیوں سے تحکمانہ کہا۔ ہ دونوں تپ گئے۔ میں نے انہیں تسلی دی مگر وہ مطمئن نہیں تے۔ انہیں لاک اَپ کر دیا گیا۔ وہ چلّاتے رہے۔

”شہزی! اس کے جاگیردار کے ساتھ ہرگز مت جانا۔“

میں خاموش رہا۔ شاہنواز کے ساتھ دو پولیس کے آدمی بھی کر دیے گیے تھے۔ میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھولی نہیں گئی تھیں۔ میں نے شاہنواز سے کہا۔

”اگر تم دوستانہ ماحول کے بجائے مجھے اس طرح یدی کی حالت میں ساتھ لے جا کر بات کرو گے تو تمہارا تمد پورا ہو گا نہ ہی میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینا ضروری سمجھوں گا۔“ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ مجھے کیوں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا اور مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

میری بات پر شاہنواز خان کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ اُبھری اور وہ سرسراتے لہجے میں مجھ سے بولا۔

”پولیس والے تو پھر بھی رعایت کرتے ہیں مگر ہم اس چڑیا کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”انسپکٹر......! سرکار کی وردی پہن کر یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو...... تمہیں اس کا حساب دینا ہو گا......“ میں غیظ ناک لہجے میں رجب دین سے بولا۔ میری آواز شاید کبیل دادا اور اول خیر تک بھی پہنچ گئی تھی۔ مجھے شاہنواز خان کے دونوں مسلح حواریوں نے دبوچ لیا اور دروازے کی طرف گھسیٹ کر لے چلے جبکہ دونوں پولیس والے ان کی مدد میں پیش پیش تھے۔

☆☆☆

دو پولیس والے ساتھ تھے مگر مجھے پولیس کی گاڑی میں نہیں بلکہ شاہنواز خان کی لینڈ کروزر میں درمیانی سیٹ پر بٹھایا گیا تھا۔ خود وہ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں براجمان تھا۔ میرے دائیں بائیں پولیس کے اہلکار اور عقبی سیٹ پر مسلح حواری تھے۔

یہ سفر خاموشی سے جاری تھا اور میں بھی خود کو تن بہ تقدیر کیے بظاہر خاموش بیٹھا وقت کا منتظر تھا۔ یہ ممکن تھا کہ میرے ساتھیوں کو اس بات کا پچھتاوا ہو رہا ہو کہ ہم نے سیدھے ملتان جانے کے بجائے لاڑکانہ کا رخ کیوں کیا تھا لیکن میرے دل میں ایسا کچھ نہیں آیا تھا، میرا دل جس شے کو کرنے پر آمادہ ہو جاتا تھا تو وہ میں کر گزرتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ جو درست اور نیک کام انسان کرنا چاہے تو اس کا خیال ازخود ہی دل میں آجاتا ہے۔ خیال تو برے کام کرنے کا بھی آتا ہے انسان کو...... مگر اس کے کرنے سے پہلے ضمیر اسے نہ کرنے کی دل پر دستک ضرور دیتا ہے جبکہ نیک کام یا مقصد کو کرنے کے لیے خود ہی اندر حوصلہ اور ہمت پیدا ہونے لگتی ہے اور اسے کرنے کی دل بھی گواہی دیتا ہے۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے بند تھے اور اندر اے سی آن تھا۔ میں گرد و جوار کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ شکر تھا کہ میری آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی، یوں بھی میرے لیے یہ سارا علاقہ اجنبی تھا، تاہم جہاں تک ہو سکتا تھا میں تھانے سے یہاں تک اور ارم کے گھر تک کا راستہ ذہن نشین کیے ہوئے تھا۔

مجھے ارم کے سلسلے میں تشویش لاحق ہونے لگی۔ اس کے ہمراہ اگرچہ شکیلہ بھی موجود تھی اور وہ بظاہر کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس لیے مجھے کچھ تسلی تو ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ دونوں خواتین زمیندار شاہنواز خان کے حواریوں کے

سامنے بھلا کیا حیثیت رکھتی تھیں؟ یہ تو شکر تھا کہ ہمارے ساتھ ارم اور شکیلہ کو بھی پولیس نے گرفت میں نہیں لیا تھا، ہوسکتا تھا کہ اس میں بھی شاہنواز خان کی ”ہدایات“ کا دخل ہو۔ تاہم مجھے شکیلہ کے پاس موجود طلسم نور ہیرے کی بھی فکر تھی۔

قریباً دس پندرہ منٹ بعد قدرے مضافات میں بڑی سڑک پر سفر کرنے کے بعد لینڈ کروزر دائیں جانب کے نشیبی راستے کی سمت مڑ گئی۔ یہ کچے کا علاقہ معلوم ہوتا تھا، کیونکہ راستہ ناپختہ اور بل کھاتا ہوا، بنجر میدان سے ذرا آگے جا کر کھیتوں کھلیانوں کے درمیان سے ہوتا ہوا کسی دیہی آبادی والے علاقے تک چلا گیا تھا۔ کچے کے سفر میں ہمیں مزید دس پندرہ منٹ لگ گئے اور بالآخر گاڑی ایک قرمزی پتھروں والی بڑی سی حویلی کے سامنے پہنچی۔ سامنے ایک دیوہیکل چوبی طرز والا گیٹ نظر آتا تھا۔ وہاں موجود چوکیدار نے گاڑی پہچانتے ہی فوراً گیٹ کھول دیا تھا، لینڈ کروزر اندر داخل ہوگئی۔ خاصے وسیع احاطے کے ایک جانب جہاں ایک عدد نئے ماڈل کی کار بھی کھڑی تھی، لینڈ کروزر اس کے قریب لے جا کر روک دی گئی۔

ہم سب نیچے اُتر آئے۔

حویلی سے متصل مجھے ایک بڑی سی بیٹھک کا دروازہ دکھائی دیا تھا۔ شاید یہی اس زمیندار کی اوطاق تھی۔ اسی جانب سے چند مسلح افراد لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہمارے قریب آگئے۔

”اڑے او...... بخشل!“ شاہنواز نے انہی میں سے ایک خاصے لمبے تڑنگے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”حاضر سائیں وڈا......!“ وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مؤدبانہ بولا۔

”کوڑا خان آگیا ہے؟“

”ہاؤ سائیں وڈا! آگیا ہے وہ...... پر......“ بخشل نامی یہ شخص کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زمیندار شاہنواز نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔

”اُسے میرے پاس بھیج دو......“

”ٹھیک ہے سائیں!“

”اور...... سنو......“

”جی سائیں!“

”ان دونوں کو ذرا دیر کے لیے اندر اوطاق میں بٹھاؤ...... اور ان کے لیے چاں پاڑیں (چائے پانی) کا بندوبست کرو، بلکہ جو کھانا پینا چاہیں وہ انہیں فراہم کرو۔“ شاہنواز نے تحکمانہ کہا۔

”برابر سائیں وڈا......“ بخشل نامی وہ قدآور شخص سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آؤ سائیں......“ اس نے دونوں پولیس والوں سے کہا۔ وہ ان کے ساتھ اوطاق کی طرف بڑھ گئے۔ وہ افراد وہیں رکے رہے۔ شاہنواز ان سے مخاطب ہوکر رعب سے بولا۔

”وادن......!“

”حاضر سائیں!“

”اندر مہمان کمرے کے ساتھ والے کمرے میں اس کو لے جا کر بٹھاؤ...... میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچتا ہوں۔“

”برابر سائیں......!“

مجھے ان دونوں کے حوالے کردیا گیا۔

حویلی کی عمارت کچھ پرانی سی مگر کسی قلعے کی طرح مضبوط نظر آتی تھی۔ خاصی بلند بھی تھی جس کے دریچے تاریک تھے ایک آدھ میں فقط روشنی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ایک دروازے سے مجھے جب اندر لے جایا گیا تھا تو اس کی بلندی پر مجھے ایک دریچے سے روشنی آتی محسوس ہوئی تھی، جو فوراً ہی بجھ بھی گئی تھی مگر میں نے وہاں کسی کی جھلک بھی محسوس کی تھی، کسی سائے کو میں نے پردہ سرکا کر نیچے جھانکنے کی کوشش کرتے دیکھا تھا، تب تک میں اندر داخل کیا جاچکا تھا۔ مذکورہ کمرا اسی دیوار کے عقب میں ہی بنا ہوا تھا اور اس کی کھڑکی باہر وسیع احاطے میں کھلتی تھی۔

اس کمرے کی فضا مجھے عجیب سی محسوس ہوئی تھی۔ فرنیچر کے نام پر وہاں صرف ایک بوسیدہ سا صوفہ اور ایک سرکنڈوں کا بنا مونڈھا دھرا دکھائی دیا تھا۔ بس، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چھت پر پنکھا تھا۔ جسے بلب روشن کرتے ہی چلا دیا گیا تھا۔ کمرے کی فضا البتہ کچھ ٹھنڈی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا فرش بغیر پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ مجھے صوفے پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ میرے ہاتھوں میں ہنوز ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں جس سے میں سخت کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔

انسپکٹر سے پہلے مجھ سے شاید شاہنواز خان نے کسی قسم کی ”تفتیش“ کرنا تھی۔ یہاں مجھے جنگل کا قانون محسوس ہو رہا تھا۔ جہاں اصل قانون کی حکمرانی کے بجائے ایک جاگیردار کا خودساختہ حکم چلتا تھا۔

میں اندر سے بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ میں نے کبھی ایسے زور و جبر پر اپنا سر نہیں جھکایا تھا، نہ ہی اس کا عادی تھا میں......

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ شاہنواز کھنکھارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کر تھوڑا چونکا۔ اس نے کلف ار شلوار قمیص اُتار دی تھی اور اب نیچے چار خانوں والا ہبند اور اُوپر اس کے فقط ایک بنیان ٹائپ صدری تھی۔ اس کے پورے جسم پر کسی بن مانس کی طرح بال اُگے ہوئے تھے۔ اس کے عقب میں ایک خدمت گار ہاتھ میں ہوٹی سی ٹرے اُٹھائے اور سر جھکائے چلا آرہا تھا۔ میں نے دیکھا ٹرے پر ایک بوتل، گلاس اور پلاسٹک کا اول رکھا تھا۔ شاہنواز میرے سامنے سرکنڈوں کے ونڈھے پر بیٹھ گیا اور تہبند سنبھالتا ہوا اپنی دونوں ٹانگیں ی اُونچی کرلیں۔ خدمت گار نے اس کے سامنے ٹرے ھ دی اور واپس چلا گیا۔

شاہنواز نے ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پر الی، باؤل کے اندر رکھی برف کی دو ٹکڑیاں کانچ کے گلاس میں ڈالنے کے بعد اس میں شراب اُنڈیلی پھر ایک گھونٹ بھرنے کے بعد مجھ سے کھرکھراتی آواز میں بولا۔

”تم لوگ مجھ سے چالاکی نہیں چل سکتے، کیونکہ میں تم وگوں کی کارستانی سمجھ چکا ہوں۔ تم نے وہ...... طلسم نور ہیرا اصل کرنے کے چکر میں بے چارے بشام کا قتل کر ڈالا...... معاملہ اِدھر ہی ختم ہوسکتا ہے اگر تم وہ ہیرا میرے حوالے کر دو...... بصورت دیگر تم چاروں پر نہ صرف قتل کا مقدمہ قائم ہو جائے گا بلکہ قومی ورثے کے حامل اس بیش قیمت ہیرے کی پوری بھی تم لوگوں کے سر پر آجائے گی۔ باقی میرے اثر و رسوخ کا تو تم نے اب تک اندازہ لگا ہی لیا ہوگا۔“

”ہم نے بشام کا قتل نہیں کیا ہے اور نہ ہی وہ ہیرا ہمارے پاس ہے۔“ میں اس کی باتوں سے مرعوب ہوئے بغیر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو پھر ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت ہوتی؟“

”چلو مان لیا وہ ہیرا تمہارے پاس نہیں لیکن تم بشام کی بیوہ کے پاس کیا کرنے آئے تھے؟ کیا بشام نے ہیرا اپنی بیوی ارم کو دے رکھا تھا؟ تم لوگ اس سے وہ چھیننے آئے تھے؟“

”نہیں، ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے آئے تھے۔“

”کیوں؟“

اسی وقت ایک شخص اندر داخل ہوا۔ یہ بخشل تھا۔

”سائیں وڈا! وہ...... کوڑا خان آیا ہے۔“ اس نے شاہنواز سے مؤدبانہ کہا۔

”بھیج دو اُسے اندر......“

”حاضر سائیں۔“ بخشل لوٹ گیا۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک شخص اندر داخل ہوا۔

میں اسے پہچان گیا تھا، وہی موٹے اور بھدے نقوش والا شخص جو اپنے حواریوں کے ساتھ دندناتا ہوا ارم کے گھر گھسا چلا آیا تھا۔ وہ خاصا پُرجوش سا نظر آرہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی تھی۔ پھر شاہنواز سے مخاطب ہو کر بھاری سی آواز میں بولا۔

”سائیں وڈا!“ اُس چھوکری کو تو ہم لے آئے ہیں مگر دوسری چھوکری جو اِن کی ساتھی تھی، وہ بڑی چالاک ثابت ہوئی۔ وہ اس کے دونوں بچوں کو لے کر کہیں بھاگ گئی ہے۔“

اس کی بات پر میرا دماغ سنسنا اُٹھا جبکہ شاہنواز نے یہ سنا تو اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور وہ کوڑا خاں کو ایک موٹی سی گالی دے کر بولا۔

”اڑے ہو حرامی کی اولاد! تم کتنے لوگ تھے اور وہ چھوکری دو بچوں کو لے کر آسانی سے تم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر چلتی بنی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہیرا اسی کے پاس ہوگا......“

شاہنواز خان بے شک غصیلے مزاج کا آدمی سہی لیکن میں اس کی زود فہمی اور زیرک دماغی کا قائل ہونے لگا تھا۔ اس نے نجانے کیا سوچ کر بالکل ٹھیک اندازہ قائم کیا تھا مگر میں اندر سے بری طرح متفکر اور تشویش زدہ ہوگیا تھا۔ گویا ہمیں پولیس کے حوالے کرنے کے بعد اس عیار انسان نے اپنے حواریوں کو ارم اور شکیلہ کو بھی گھر سے اُٹھوانے کا ٹاسک دے رکھا تھا۔ مجھے اب صحیح معنوں میں حالات کی نزاکت اور خطرناکی کا اندازہ ہونے لگا تھا کہ ہم کسی معمولی انسان کی گرفت میں نہیں تھے۔ شاہنواز بہت تیزی کے ساتھ ہمارے خلاف جال بچھائے جارہا تھا، ایک طرف اس نے بڑی مکاری سے قانون کا سہارا لیتے ہوئے ہمیں ایک ایسے الزام میں پھنسوا دیا تھا جس کے لیے ہمارے پاس اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہ صرف کچھ وقت درکار ہوتا بلکہ اس میں کئی پیچیدگیوں سے بھی گزرنا پڑتا ہمیں۔ تب تک یہ خبیث اپنا گل کھلاتا رہتا۔ دوسری طرف یہ اپنی ذاتی طاقت کا بھی بڑی ڈھٹائی سے مظاہرہ کررہا تھا۔ گویا چکی کے دونوں پاٹوں کے درمیان میں ہمیں پیس رہا تھا۔

اب میں نے اس خطرناک صورت حالات سے ”اپنے طور پر“ نمٹنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے زیادہ فکر شکیلہ کی تھی، ایک تو ہماری طرح وہ بھی یہاں اجنبی تھی، دوسرا یہ کہ اس کے پاس وہ قیمتی ہیرا تھا جبکہ ارم کے دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ رات کے اس پہر اب جانے وہ بے چاری

کہاں ان بھاری بھرکم ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی تگ ودو میں مصروفِ کار تھی، یہ مجھے نہیں پتا تھا۔

"سس...... سائیں وڈا......! ہم اس چھوکری کو بھی تلاش کررہے ہیں۔ جانو جرمن تین ساتھیوں کے ساتھ......"

"تم پھر اِدھر کیا کررہے ہو...... (گندی گالی)۔" شاہنواز طیش ناک لہجے میں کوڑا خان سے بولا۔ "تم بھی دفع ہوجاؤ یہاں سے اور اب اس چھوکری کو پکڑ کے ہی میری نظروں کے سامنے آنا ورنہ تمہیں میں اپنے بھوکے کتّوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

"بب...... برابر سائیں...... برابر......" کوڑا خان کا چہرہ خوف سے سفید پڑگیا اور وہ تیزی سے لوٹ گیا۔

"شاہنواز خان! تم یہ سب اچھا نہیں کررہے ہو......" میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے ... تہدید کی تو وہ کھڑے کھڑے میری طرف پلٹا اور نفرت و غصے سے اپنے ہونٹ سکیڑ کر ایک زوردار تھپڑ میرے چہرے پر رسید کردیا۔ بدبخت کا ہاتھ بھی بڑا بھاری تھا جس نے میرا دماغ جھنجھنا ڈالا تھا۔ شاید اس نے اپنا سارا طیش اور غیظ و غضب اپنے تھپڑ میں سمو دیا تھا جس کے باعث میں صوفے سمیت پیچھے کو اُلٹ گیا تھا۔

"سیدھا کرو اِسے......" (گالی) وہ دہاڑا۔

صوفہ اُلٹتے ہی میں بھی رسن بستہ حالت میں آڑا ترچھا ہوگیا تھا۔ اس کے حواریوں نے مجھے دبوچا اور صوفہ سیدھا کرکے مجھے اس پر پٹخ دیا۔ میں کسمسا کر سیدھا ہوا تو شاہنواز نے جھک کر میرا گریبان پکڑلیا اور اپنا مکروہ چہرہ میری آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے پُرغیظ لہجے میں بولا۔

"یاد رکھو! میں اپنے مفادات کے سلسلے میں کسی پر رحم نہیں کھاتا۔ اس گوٹھ کے قبرستان میں بنی آدھی قبریں میری بنائی ہوئی ہیں، جہاں میرے دشمن ابدی نیند سو رہے ہیں۔ میں اس میں چار قبروں کا اور اضافہ کردوں گا، اگر تم نے میری بات نہ مانی......"

اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔ وہ بری طرح اعصاب زدہ ہورہا تھا، اس کی باچھوں سے جھاگ بہنے لگا تھا۔ اسی وقت ایک حواری نے قریب آکر شاہنواز کو سنبھالا دیا اور نہایت احترام کے ساتھ اسے تھام کر موڑھے پر بٹھا دیا اور آدھا بھرا وہسکی کا گلاس اس کے ہاتھ میں بھی تھما دیا۔ اس نے میری طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھورتے ہوئے ایک گھونٹ بھرا اور چند سیکنڈوں بعد دوسرا۔ خود میری اپنی حالت اندر سے سرخ آندھیوں کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہ ہتھکڑیاں ٹوٹ جائیں اور میں اس بڈھے گدھ کو اس کی مطلق العنانی اور غرور کا مزہ چکھادوں۔ وہ طاقت اور دولت کے گھمنڈ میں اپنے آپ کو خدا سمجھے ہوئے تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس کا زور و جبر آج تک صرف کمزور اور بے بس لوگوں پر چلتا رہا ہوگا۔

"مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ تم لوگوں نے بشام کا قتل کیا یا نہیں......"

شراب کے چند گھونٹ بھرنے کے بعد اس کی حالت کچھ معمول پر آئی تو وہ ہانپتی سی آواز میں بدستور میری طرف گھورتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے بس، وہ ہیرا چاہیے۔ بشام تو میرا ابھی دشمن تھا، وہ جائے جہنم میں...... کیونکہ اس بدبخت نے ہی تو وہ مجھ سے چھینا تھا، بڑا محبِ وطن بنتا تھا وہ اسے سرکار کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ ہونہہ...... سرکار...... وہ ہیرا ہماری جاگیر کے قریب کھدائی سے ملا تھا۔ اس پر ہمارا حق زیادہ بنتا تھا۔"

"اُسے موئن جودڑو کے علاقے سے دریافت کیا گیا تھا اور اس کی حیثیت ایک قومی ورثے اور نوادرات کے اعتبار اور حوالے سے مستند ہوچکی تھی۔" میں نے بھی ذرا سنبھالا لیتے ہوئے اسے باتوں میں مشغول رکھنا چاہا۔

"بکواس بند کرو......" وہ پھر گرجا۔ "ہماری جاگیر اسی علاقے تک پھیلی ہوئی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اس سے بحث میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ بولا۔

"کیا وہ ہیرا تمہاری اسی ساتھی چھوکری کے پاس ہے؟"

"نہیں......" میں نے نفی میں سرہلایا۔

"تو پھر کہاں چھپا رکھا ہے تم نے اُسے......؟" اس کے لہجے میں بھیڑیے کی سی غراہٹ عود کر آئی۔

"حیرت ہے، تمہیں اس بات کا ابھی تک علم ہی نہیں ہوسکا ہے کہ بشام بہت پہلے اس ہیرے کو حکومت کے حوالے کرچکا ہے۔" میں نے چالاکی سے جھوٹ بولا۔ "مگر بدقسمتی سے خود بشام کچھ نامعلوم افراد کے ہاتھوں ہلاک ہوگیا، کیونکہ اس ہیرے کو حاصل کرنے کے لیے کچھ خطرناک قسم کے ملکی اور غیر ملکی لوگ بھی پڑے ہوئے تھے۔"

"جھوٹ بول رہے ہو تم۔" وہ بولا۔ "وہ ہیرا اگر حکومت کے حوالے کیا جاتا تو اب تک یہ اعلان ہوچکا ہوتا کیونکہ اس ہیرے کی گمشدگی کی وجہ سے لوگ حکومت کو بُری طرح تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں کہ وہ اپنے اس قدر قیمتی قومی ورثے کی حفاظت تک نہ کرسکی، تو عوام کی کیا حفاظت کرے

گی۔ یہ ملکی ساکھ کا معاملہ ہے جو حکومت کو فخر سے کرنا ہے، وہ ہیرا اب بھی تم لوگوں کے پاس ہے۔"

وہ صرف غصے کا ہی تیز نہ تھا اس کے پاس دماغ بھی تھا، اس نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ کیونکہ وہ ہیرا اب ملکی سطح پر ہائی لائٹ ہوچکا تھا۔ اس کی تلاش بھی جاری تھی۔ میں نے کہا۔

"ہیرا میرے پاس ہوتا تو تم اب تک میری جامہ تلاشی لے کر اُسے اپنے قبضے میں کرچکے ہوتے۔"

"ہم...... تو تم ایسے نہیں بتاؤ گے۔" اس کے لہجے میں دھمکی عود کر آئی۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ تمہاری باتوں میں آجاؤں گا، وہ بیش قیمت ہیرا تم اپنی گانٹھ میں باندھے نہیں پھر رہے ہوگے۔ تم نے اسے کہیں چھپا رکھا ہوگا۔"

"بخشل!" اس نے آواز دی۔ بخشل فوراً حاضر کردیا گیا۔

"اُس چھوکری کو اِدھر لاؤ...... ابھی پتا چل جاتا ہے۔" شاہنواز خان نے اس سے تحکمانہ انداز میں کہا اور وہ "حاضر سائیں" کہتا ہوا پلٹ گیا۔ میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں یہ بدبخت اور ظالم شخص بے چاری الم نصیب ارم کو کسی تشدد کا نشانہ نہ بنا ڈالے۔

تھوڑی ہی دیر میں بخشل ارم کو بیدردی سے دبوچے وہاں لے آیا۔ اس نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور اس کے چہرے کا ہراس اور گہرا ہوگیا۔

"چھوکری......! ان کا تمہارے پاس آنا اور تیرا ان کے ساتھ روانگی کا پروگرام یوں ہی نہیں ہوسکتا۔" شاہنواز نے ڈری سہمی کھڑی ارم کو غصیلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اور نہ ہی تم سب مل کر مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو، جانتی ہوناں میرے آدمیوں کو...... وہ ابھی تھوڑی دیر میں اُس اداکارہ چھوکری کو تیرے دونوں بچوں سمیت یہاں دبوچے آپہنچیں گے۔ پھر سارا معاملہ سیدھا ہوجائے گا۔ پر ہم چاہتے ہیں کہ ایسی نوبت آنے سے پہلے ہمیں صاف صاف بتاؤ وہ ہیرا کہاں ہے اور یہ لوگ تمہارے پاس کیا لینے آئے تھے؟"

"اداکارہ چھوکری۔" کا لقب اس نے یقیناً شکیلہ کو ہی دیا ہوگا، شاید اس لیے کہ شکیلہ کی وضع قطع کسی اداکارہ سے کم نہ تھی۔ صحت مند جسم پر چست کپڑے، اسٹائلش انداز میں سیٹ کیے ہوئے بال اور رنگ و روپ اور چال ڈھال بھی اس کی کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ اسمارٹ بھی نظر آتی تھی۔

بہرحال ارم نے ایک ڈرتی ڈرتی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی پھر شاہنواز سے بولی۔

"سس...... سائیں! وہ...... وہ ہیرا میرے پاس نن...... نہیں ہے۔ باقی یہ لوگ میرے مرحوم شوہر کے بھائیوں جیسے دوست تھے اور مجھے اس کے مرنے ہی کی خبر دینے آئے تھے۔"

"اچھا......!" شاہنواز نے اس کی طرف بدستور طنزیہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "مگر تم پھر اس کے ساتھ کدھر جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھیں؟"

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "اپنے شوہر کے مرنے کا سن کر میں خود کو اکیلی اور بے یار و مددگار سمجھنے لگی تھی۔ پھر تمہارے آدمی بھی مجھے خوف زدہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے اسی خوف سے بچنے کی خاطر ان سے خود ہی یہ درخواست کی تھی وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔"

میں اس کی سمجھداری اور دانش مندی پر دل میں تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔ ارم نے بڑی چالاکی اور ڈرامائی انداز میں ایک ایسا سچ نما جھوٹ بولا تھا کہ جسے سننے کے بعد شاہنواز چند ثانیوں کے لیے سوچتا ہوا سا بن گیا بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ وہ لاجواب سا ہوکر رہ گیا۔

کمرے میں تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اس دوران شاہنواز بوتل سے گلاس میں مزید وہسکی ڈالنے لگا اور ایک گھونٹ معدے میں اُتارنے کے بعد موڑھے سے پشت ٹکا کر ہم دونوں کی جانب باری باری گھورتا رہا۔

اسی وقت ایک حواری اندر داخل ہوا۔

"سس...... سائیں وڈا! کوڑا خان آگیا ہے۔ چھوکری اور دونوں بچے اس کے ساتھ ہیں۔"

اس اطلاع پر زمیندار شاہنواز خان کے چیچک زدہ چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھری تھی اور پھر میرا دل ہی نہیں بلکہ میرے دماغ کی سرحدوں پر نسیں بھی جیسے دھڑدھڑانے لگی تھیں......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 39

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، تجسس، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید ساچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لفنگے ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون ا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ ے پل کے پل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر ل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ چانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ ناناشکور زی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اڈھیڑ کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آ جاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر تا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب راج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کمیل دادا اس کے سامنے آ جاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کمیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیو ٹمسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو جاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے نی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت اج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور سمندر برد کر کے نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کر کے ہندوستانی مچھیروں وپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام چھلگری کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب ارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے ا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شاہنواز خان کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ مکروہ ے پر فتح مندی کے آثار اسے اور بھی منحوس صورت بنا تے۔ عقوبت خانے جیسا منظر پیش کرنے والے ے میں ہونے کے باعث شاہنواز کے چہرے کے چیچک زدہ گڑھوں میں پھنسے پسینے کے ننھے قطرے، عجیب سا تاثر پیش کر رہے تھے۔

آنے والے اس کے حواری نے شکیلہ اور ارم کے دونوں بچوں کے دھر لیے جانے کی اطلاع بہم پہنچائی تھی اور

گہری تشویش سے میرا چہرہ ست کر رہ گیا تھا جبکہ خود ارم بھی بری طرح متوحش نظر آنے لگی تھی۔ شاہنواز اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے آنکھیں سکیڑے مجھے گھورے جا رہا تھا۔

شکیلہ کا ہتھے چڑھنا ہم سب کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ طلسم نور ہیرا اسی کے پاس تھا اب شکیلہ کا اس بدبخت زمیندار کے ہتھے چڑھنے کا مطلب تھا کہ ہیرا بھی گیا۔

اسی وقت ایک چھوٹے اور موٹے سے جسم والا اجرک پوش شخص اندر داخل ہوا اور پورے جوش کے ساتھ مؤدبانہ ہو کر زمیندار شاہنواز خان سے بولا۔

''سائیں وڈا...... ! شکار حاضر ہے...... آگے کیا حکم ہے......؟''

''تینوں کو اِدھر ہی لے آؤ۔'' زمیندار نے تحکمانہ کہا۔

چند ثانیے بعد ہی میری پُرتشویش نظروں کے سامنے شکیلہ اور دونوں بچے تھے۔ شکیلہ کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے جبکہ ارم کے دونوں بچے بری طرح خوف زدہ نظر آ رہے تھے اور رونے کے انداز میں ہولے ہولے ''ٹھسک'' رہے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ انہیں بری طرح ڈرا دھمکا کے رونے چلّانے سے باز رکھا گیا تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ شکیلہ ان کے قبضے میں کیسے آ گئی تھی، پھر جلد ہی مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آئی کہ ممکن تھا کہ دونوں معصوم بچوں کی ذمّے داری اس کے پاؤں کی زنجیر ثابت ہوئی ہو۔ پھر اس علاقے سے ناآشنا بھی تھی، کہاں جاتی۔ کہاں تک بھاگتی، بچتی؟

بچّے اپنی ماں کو وہاں موجود پا کر ''اماں...... اماں......'' کہتے ہوئے اس کی طرف لپکے اور ممتا کی ماری ارم نے فوراً ہی انہیں اپنی آغوش میں لینے کے لیے یوں اپنے بازو پھیلا دیے۔ جیسے مرغی شکرے کو دیکھتے ہی چوزوں کو اپنے پروں تلے ڈھانپ لیتی ہے۔ وہاں تو ایک نہیں کئی شکرے موجود تھے۔

میری وہاں موجودگی شکیلہ کے لیے شاید غیر متوقع تھی، مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس پر مستزاد مجھے بھی اپنی طرح رسن بستہ پا کر اس کا چہرہ اُتر سا گیا تھا۔ اس کے بکھرے بال اور کپڑے گرد و غبار سے اٹے تھے، چہرے پہ خراشوں کے نشان بھی نمایاں تھے۔ اس کی سانس پھولی ہوئی محسوس ہوتی تھی اور لگتا تھا کہ اس نے شاہنواز کے بھیڑیا صفت اور اجرک پوش حواریوں کا بغیر ہتھیار کے مقابلہ کرنے کی اپنے تئیں پوری کوشش کی تھی۔

میں نے دیکھا زمیندار شاہنواز خان، شکیلہ کو بڑی خونخوار اور گرسنہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سر کو مخصوص انداز میں خفیف سی جنبش دی۔ دونوں مسلح حواریوں نے شکیلہ کو دبوچے ہوئے آگے دھکیل دیا، وہ لڑکھڑاتی ہوئی شاہنواز کے قریب آن کھڑی ہوئی۔

''اس کی تلاشی لی ہے تم لوگوں نے؟'' شاہنواز اپنے حواریوں کی طرف دیکھتے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

''ہاؤ سائیں وڈا...... ! پر اس سے کچھ نہیں ملا......''

کوڑا خان نے جواب دیا۔

''ہم......'' شاہنواز نے ایک گومجدار سا ہنکارا بھرا اور شکیلہ سے بڑے کرخت لہجے میں بولا۔

''چھوکری...... ! کیا نام ہے تیرا......؟''

''شکیلہ......''

''وہ ہیرا کدھر ہے......؟''

''کون سا ہیرا......؟ کیسا ہیرا......؟'' شکیلہ نے ایک دم انجان بننے کی اداکاری کی مگر یہاں مسئلہ یہ تھا کہ یہ بدبخت شاہنواز اب تک ہمارے بارے میں بہت سے درست اندازے قائم کر چکا تھا۔ لہٰذا اس کا شکیلہ کے جھانسے میں آنے کا امکان کم ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہنواز خان بھنّائے ہوئے انداز میں اپنی چار خانوں والی تہبند سنبھالتے ہوئے مونڈھے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے بڑھ کر اس نے شکیلہ کے بکھرے بکھرے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کی گردن کو جھٹکا دیا۔ تکلیف کے سبب شکیلہ کے منہ سے کراہ نما چیخ سی برآمد ہوئی تھی اور اسی انداز میں اس کا دہن بھی وا ہو گیا تھا اور وہیں شاہنواز اپنا بھیانک چہرہ لاتے ہوئے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

''چھوکری...... ! اُدھر دیکھ...... اُس طرف......'' اس نے مٹھی میں جکڑے ہوئے بالوں سے شکیلہ کا چہرہ بے دردی کے ساتھ میری طرف گھمایا۔

''ایک تیرا یار یہاں میری گرفت میں ہے اور باقی دونوں اس وقت تھانے میں ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ یہ میری جاگیر ہے اور یہاں صرف میرا قانون چلتا ہے۔ بس...... ! آخری بار پوچھ رہا ہوں اب اگر جھوٹ بولا تو دوبارہ میں تیرے منہ سے سچ سننے میں بھی وقت ضائع نہیں کروں گا...... جواب دے...... وہ ہیرا کہاں ہے؟''

بلند چھت والی اس اوطاق نما کمرے میں سسکتی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ میں اب طیش اور اُبال کی کیفیات سے نکل کر تشویش اور فکرمندی کے حصار میں مقید ہو چکا تھا اور اس گمبھیر صورتِ حال سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے میں گم تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شکیلہ طلسم نور ہیرے کے متعلق کچھ بھی نہیں بتائے گی۔ جانتی تھی وہ اس ہیرے کی قدر و قیمت کو اور اس سے بڑھ کر یہ بھی کہ اس ہیرے کے حصول کے لیے میں کتنے کٹھن مراحل سے گزرا تھا اور کتنی پُرمصائب منزلیں طے کی تھیں۔ اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس ظالم اور جابر شخص کی کسی درندگی کا شکار ہو جبکہ موجودہ گھڑیاں مجھے یہ باور کروا چکی تھیں کہ ہم پر نازل ہونے والی یہ مصیبت معمولی نہ تھی۔ جس نے ہم سب کو آن کی آن میں بے بس اور لاچار سا کر دیا تھا۔ لہٰذا...... شکیلہ کے بولنے سے پہلے ہی میں نے اس سے کہہ ڈالا۔

''شکیلہ! ہیرے کے بارے میں اسے سب سچ سچ بتا دو...... جو میں نے تمہارے حوالے کر رکھا تھا......''

یہ کہتے ہوئے میرا چہرہ شکست خوردہ سا نظر آنے لگا تھا۔ آواز اور لہجہ بھی ہارے ہوئے جواری جیسی مثل پیش کر رہا تھا۔ جس سبب شاہنواز کے بدہیئت ہونٹوں پہ بڑی زہرخندی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ فتح کے نشے نے اسے سرتاپا فرعون بنا دیا تھا۔ وہ اپنے جبر و زور سے جو بازی کھیل رہا تھا، اس میں اسی کی جیت ہو رہی تھی۔ ناانصافی اور زور و زبردستی سے حاصل کی ہوئی جیت شاہنواز جیسے انسانوں کو ہمیشہ فرعونیت ہی عطا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

میری بات پر شکیلہ جیسے ایک کڑے امتحان سے آزاد ہو گئی تھی لیکن جب وہ اٹکتے ہوئے لہجے میں شاہنواز کے سوال کا جواب دینے لگی تو اس کی آواز بھی میری آواز سے ہم آہنگ ہی محسوس ہوتی تھی۔

''وہ...... وہ...... ہیرا، میں نے وہاں گرا دیا تھا۔''

''کہاں......؟'' شاہنواز نے ایک بار پھر اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے شکیلہ کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

''قق...... قبرستان والی جگہ میں......''

اس جواب پر میری شکرے ایسی چست نظروں نے شاہنواز کے چہرے پر یکلخت اُلجھن آمیزی کا جال سا بُنتے دیکھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ شکیلہ اب بھی سچ بول رہی تھی یا پھر نجانے کس اُمید اور کیا سوچ کر اس کے ساتھ بلف کر رہی تھی۔ تاہم لگ تو ایسا رہا تھا کہ اس نے جب دیکھا کہ وہ اب شاہنواز خان کے حواریوں سے نہیں بچ سکتی تو اس نے ہیرے کو ان کے قبضے میں جانے سے بچانے کی خاطر وہیں کہیں چھپا دیا تھا یا کسی اندھے گڑھے میں پھینک دیا تھا تاکہ حالات سازگار ہوتے ہی وہاں سے بہ آسانی دوبارہ برآمد کر لیا جائے، مگر یہاں کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے فی الحال یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

شاہنواز نے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے شکیلہ کے سر کو ایک آخری بار زور سے جھٹکا دیتے ہوئے چھوڑا اور گرج کر بولا۔

''بخشل......!''

''حاضر سائیں وڈا......!''

''تم اِدھر رکو اور اوطاق میں بیٹھے ان دونوں سپاہیوں کو رخصت کر دو۔ اس پر کڑی نظر رکھنا......''

''برابر سائیں...... ! ایسا ہی ہو گا۔'' بخشل نے فدویانہ انداز میں اپنے سینے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے خم ہو کے کہا۔ اس دوران میں شاہنواز کوڑا سے بولا۔

''اڑے بابا جلدی کرو...... گاڑی نکالو اور اس چھوکری کو بھی ساتھ لے لو۔ ہیرا ملا تو ٹھیک ہے ورنہ اس کو بھی وہیں کسی پرانی قبر میں گاڑ دیں گے۔''

اس نے آخر میں شاید شکیلہ کو ہراساں کرنے کی خاطر اپنا لہجہ خوفناک اور سفاک بناتے ہوئے کہا تھا۔ کوڑا خان فوراً حرکت میں آ گیا۔ ساتھ کھڑے وہ دونوں حواری بھی نکل گئے جو کوڑا خان کے ساتھ شکیلہ کو لائے تھے۔

میں بے بسی سے اپنے ہونٹ چباتا رہ گیا۔ ان سب کے جانے بعد اب بھی وہاں تین مسلح حواری موجود تھے۔ بخشل انہیں مقامی زبان میں کچھ ہدایت دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر جلد ہی لوٹ بھی آیا۔

اندیشوں اور وسوسوں بھری رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ ارم اپنے دونوں بچوں کو لیے ایک شکستہ سے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ بخشل اپنے تین مسلح ساتھیوں کے ساتھ وہاں موجود رہا۔ بخشل نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا اور وہ باہر چلا گیا۔

اس کے بعد بخشل خود اسی مونڈھے پر براجمان ہو گیا جہاں کچھ دیر پہلے زمیندار شاہنواز خان بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالی اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی، اس نے ماچس نکال کر سلگا لی۔ ایک گہرا کش لگاتے ہوئے اس نے سامنے کھڑے اپنے دونوں ساتھیوں

میں سے ایک کی جانب ڈبی ماچس سمیت بڑھا دی۔ وہ دونوں بھی اپنے لیے سگریٹ منتخب کرنے لگے۔

باہر رات دبے پاؤں سرک رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ بخشل مقامی زبان میں ہولے ہولے اپنے دونوں ساتھیوں سے کچھ کہہ رہا تھا جو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

احاطے کا منظر پیش کرنے والی کھڑکی میرے سامنے تھی اور وہاں سے ہلکی روشنی آتی دکھائی دیتی تھی۔ شاہنواز وغیرہ جاچکے تھے اور مجھے شکیلہ کی فکر کھائے جارہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ ہیرا نہ ملا یا کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا تو کہیں یہ جنونی اور مشتعل مزاج درندہ صفت وڈیرا شکیلہ کو جان سے ہی نہ ماردے۔

انہی اندیشوں اور وسوسہ انگیز ساعتوں میں وقت کی چادر تھوڑا اور سرکی تو دفعتاً ہی مجھے کھڑکی سے پرے ایک سائے کی جھلک دکھائی دی، پہلی سمجھا تھا میں کہ ان کا ہی کوئی ساتھی ہوگا مگر اس سائے کی حرکات وسکنات میں مجھے چوروں کی سی خاموشی اور محتاط آمیزی محسوس ہوئی تھی۔ تب ہی میں اندر سے بُری طرح چونکا تھا۔

اچانک رات کے سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اس کے فوراً بعد ہی تلے اُوپر رائفلوں کے دو برسٹ بھی فائر ہوئے۔ میں تو چونکا ہی تھا مگر مجھ سے زیادہ یہ تینوں بری طرح بدک کر اُچھلے تھے۔ ان کا چونکنا اور بے چینی سمجھ میں آتی تھی۔ ظاہر ہے رات کے اس سمے، شاہنواز خان جیسے جاگیردار کی حویلی کے اریب قریب اس طرح گولیاں چلنا معمولی بات کہاں ہوسکتی تھی۔

وہ تینوں ہتھیار سنبھالتے ہوئے دروازے کی طرف لپکے۔ بخشل کے ہاتھ میں بھی ایک پستول نظر آرہا تھا مگر ابھی یہ لوگ باہر احاطے میں کھلنے والے دروازے سے محض دو تین قدم ہی پیچھے ہوں گے کہ اچانک دھڑ سے دروازہ کھلا۔ دونوں نے اپنے ہتھیار سیدھے کرنے چاہے تھے کہ ایک کان پھاڑ برسٹ فائر ہوا، وہ دونوں کھڑے کھڑے رقصِ اجل کرتے ہوئے گرے، بخشل چالاک اور بیدار مغز ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا یہ حشر دیکھتے ہی دروازے سے ہٹ کے سیدھے ہاتھ کی طرف جست لگائی۔ دو خطرناک قسم کے بھاری ڈیل کی جسامت والے ڈھاٹا پوش دھواں اُڑاتی رائفلوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور ایک نے بخشل کی جانب برسٹ فائر کیا۔ جس دوسرے دروازے کی طرف اس نے جست بھری تھی وہ شاید حویلی کے کسی اندرونی گوشے کی طرف کھلتا تھا۔ جہاں سے ابتدا میں زمیندار شاہنواز خان داخل ہوا تھا۔ بخشل اپنی چابک دستی کے ساتھ اس دروازے سے پار ہو چکا تھا، برسٹ دروازے پر لگا اور وہ تختہ تختہ ہوگیا۔

دوسرے نے اپنی بے رحم گن کا رخ میری جانب موڑ دیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا اور پل کے پل مجھے گیہوں کے ساتھ گھن پس جانے کا محاورہ یاد آگیا۔ سیاہ ڈھاٹے کے اُفق سے اس کی جھانکتی ہوئی آنکھوں میں مجھے خوں ریزی کی جھلک صاف دکھائی دی تھی۔ اس کا ساتھی تو بخشل کے تعاقب میں دوڑ لگا چکا تھا۔

”م...... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں...... تم دیکھ سکتے ہو کہ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بندھی ہوئی ہیں۔“

کسی پرانی دشمنی کا شاخسانہ سمجھتے ہوئے میں نے چلّا کر اس سے کہا، زبان میری ظاہر ہے غیر مقامی تھی لیکن بہرحال...... ٹوٹی پھوٹی اردو تو یہ لوگ بھی جانتے ہی ہوں گے۔

اس طرح کی غلط فہمی میں مارے جانے کی دہشت سے چند لمحے کے لیے اچھے اچھوں کا پتّا آب ہو جایا کرتا ہے، کیونکہ میری تیز نظروں نے رائفل پر اس کی اُنگلی کو جنبش کرتے دیکھ لیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اس کے دو مسلح ساتھی اور بھی اندر داخل ہوئے۔ وہ شاہنواز کے حواریوں کی لاشوں کو پھلانگ کر اندر در آئے تھے۔ ان کے جسم خاصے گٹھیلے اور جاندار نظر آتے تھے جبکہ آخرالذکر دو میں سے ایک اپنے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ قدآور اور بھاری جسامت کا حامل تھا اس نے بھی اگرچہ اجرک کا ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور اس کے اُفق سے جھانکتی ہوئی آنکھوں میں مجھے وحشت سی ہلکورے لیتی محسوس ہوئی تھی۔ تاہم مجھ پر اور ارم سمیت اس کے دونوں معصوم بچوں پر نگاہ پڑتے ہی اس نے اپنے ساتھی کی گن پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکا دیا۔

”کون ہو تم دونوں......؟ اور یہ تمہارے ہاتھوں میں بندھی ہوئی ہتھکڑیاں تو پولیس والوں کی نظر آتی ہیں۔“ اس نے گونجیلی سی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس کا لہجہ بھاری اور کھردرا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

”اس وڈیرے نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے، پہلے یہاں کے تھانے دار کو اپنے ساتھ ملایا اور ہمیں ایک جھوٹے جرم میں بے گناہ پھنسانے کے بعد تشدد کرنے کی غرض سے یہاں لے آئے......“

”ہم......“ اس نے اپنے حلق سے ایک گونجیلی سی اری خارج کی اور اپنے ساتھیوں سے تحکمانہ بولا۔

”ان پر ابھی نظر رکھو...... میں آتا ہوں......“

وہ شاید ان کا کوئی سرغنہ تھا اور مجھے یہ لوگ اپنی سوس وضع قطع سے کوئی خطرناک ڈاکوؤں کا ٹولا نظر آتا تھا بلہ مجھ سے مخاطب ہونے والا قدآور شخص ان کا سرغنہ ہی سوس ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی روسی ساختہ گن دبی ہوئی تھی۔ یقیناً باہر بھی ان کے ساتھی گھات لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔

بہرحال...... وہ تیزی کے ساتھ اسی دروازے کی طرف بڑھا تھا جو حویلی کے اندرونی گوشے میں کھلتا تھا اور جہاں بخشل کے تعاقب میں ان کا ایک ساتھی روانہ ہوا تھا۔ دروازہ ٹوٹ چکا تھا، وہ غائب ہوگیا۔ ذرا ہی دیر بعد حویلی کے اندر سے رونے اور چلانے کی گھٹی گھٹی سی آوازیں اُبھریں اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہیں سرغنہ اور پہلے سے اندر گھسے بیٹھے اس کے ساتھی نے خوں ریزی تو نہیں پھیلانی شروع کردی تھی۔ ظالم تو یہ بھی دکھائی دیتے تھے، یہ الگ بات تھی کہ چور کو مور پڑے ہوئے تھے۔ کم سفاک لوگ وڈیرا اور اس کے حواری بھی تو نہیں تھے۔ شاید آج سیر کو سوا سیر ٹکرا گیا تھا۔ مگر میرے لیے امرِ واقعہ یہ تھا کہ میں ان سے اپنی اور ارم سمیت اس کے دونوں بچوں کی جان کس طرح چھڑا سکتا تھا؟ کچھ اُمید تو ہو چلی تھی کہ شاید زمیندار شاہنواز خان کے ساتھ کسی پرانی دشمنی کی خار میں وہ ہمیں آزاد کردے۔

تھوڑی ہی دیر میں ان کا ایک اور ڈھاٹا پوش ساتھی اندر داخل ہوا اور وہاں موجود اپنے ساتھیوں میں سے ایک سے بولا۔

”سردار سائیں کدھر ہے؟“ ساتھ ہی اس نے ہم پر بھی ایک نظر ڈالی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”اُوپر گیا ہے، ابھی آتا ہے۔ باہر تو خیریت ہے ناں......“ وہ مقامی زبان میں باتیں کررہے تھے، کچھ سمجھ آرہی تھی، کچھ نہیں۔

”ہم نے پتا چلا لیا ہے، وہ مردود وڈیرا کہیں گیا ہوا ہے مگر ان کا ایک اہم ہتھیار بند ساتھی حویلی کی پچھلی دیوار سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔“

ابھی اس نے اتنا ہی بتایا تھا کہ اسی ٹوٹے ہوئے دروازے سے سرغنہ اور اس کا ساتھی نمودار ہوئے مگر یہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا کہ سرغنہ کے ساتھ ایک جواں سال اور نازک اندام لڑکی بھی تھی۔ اس نے مخصوص علاقائی طرز کا لباس پہن رکھا تھا۔ ایک خوبصورت سی نقشین کڑھائی والی چادر اس نے کچھ اس طرح اوڑھ رکھی تھی جس کا تیر نما نقاب سا آگے کاڑھ رکھا تھا، وہاں سے اس کی دلکش اور گہری پلکوں تلے کجراری سی آنکھیں جھانک رہی تھیں۔

پھر اس نے شاید سرغنہ کے اشارے پر تیر نما نقاب کو ذرا آگے کر کے گھونگھٹ بنا لیا۔ جس کے باعث وہ کمرے میں موجود لوگوں کو دیکھنے سے قاصر تھی۔ وہ سرغنہ کے ایک ساتھی کے ساتھ فوراً ہی باہر نکل گئی۔

اچانک مجھے یاد آیا تھا کہ جس وقت مجھے یہاں لایا گیا تھا تو اس بلند و بالا حویلی کی بالائی منزل کے دریچے سے پردہ ہٹا کر کسی نے نیچے جھانکنے کی کوشش چاہی تھی، تو کیا یہ وہی لڑکی تھی؟...... بہرکیف...... مجھے اس پراسرار معاملے سے کیا لینا دینا تھا۔

”مقصد پورا ہو چکا ہے ہمارا...... اب اس وڈیرے کے پاس جیتے جی مرجانے کے سوا کچھ نہیں بچا ہے۔ اب نکل چلو یہاں سے......“ اسی وقت سرغنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا تو میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

”پلیز...... آپ کی مہربانی ہوگی اگر آپ ہمیں بھی اس قید سے آزاد کرتے جائیں۔“

سرغنہ نے خاصی معنی خیز مگر گھورتی نظروں سے میری جانب دیکھا اور گویا خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

”ہم...... کہیں باہر کے علاقے کے دکھتے ہو تم...... موٹی آسامی بھی معلوم ہوتے ہو......“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس آدمی کو بھی اسی طرح ساتھ لے چلو......“ یہ کہہ کر وہ لڑکی کو جو بلاشبہ شاہنواز کی بیٹی ہی معلوم ہوتی تھی، لیے پلٹا تو ایک ساتھی نے فوراً کہا۔

”اور اس چھوکری کا کیا کریں؟“ اس کا اشارہ ارم کی طرف تھا۔ اس کے دونوں بچے اپنی ماں سے چمٹے ہوئے سراسیمہ نظروں سے ان کی طرف تکے جارہے تھے۔

سرغنہ رکا اور پلٹا۔ ایک گھورتی نظر ارم پر ڈالی اور بولا۔ ”اس کی ضرورت نہیں......“ کہتے ہی وہ باہر نکل

گیا۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر کہہ نہ پایا۔ اس کے دو مسلح ساتھی میری جانب بڑھے۔ میں سخت تشویش کا شکار ہو گیا۔ جب وہ مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے لگے تو ارم اُٹھ کر ان سے داد فریاد کرنے لگی کہ مجھے ساتھ نہ لے جائیں مگر تب تک وہ مجھے لیے باہر نکل آئے تھے۔ باہر رات اپنے نصف پہر میں داخل ہو چکی تھی۔

وہ جواں سال خوبصورت لڑکی ویسے ہی سرغنہ کے ہمراہ تھی۔ وہ بار بار میری جانب عجیب سی نگاہوں سے تکتی جاتی تھی، اور اک تو اب تک مجھے ہو چلا تھا کہ یہ دوشیزہ زمیندار شاہنواز خان کی بیٹی ہی ہو سکتی ہے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے یہاں شب خون مارا تھا۔ حیرت بھی تھی کہ اس سارے ‘‘گھن چکر’’ میں لڑکی کی اپنی مرضی بھی شامل محسوس ہو رہی تھی۔

بہرحال وہ اپنا کوئی دیرینہ ‘‘کام’’ نمٹا کر رخصت ہونے لگے تھے۔ یہ سب پہلے سے سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا ہی شاخسانہ لگتا تھا۔

میں اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا کہ مجھے آخر کس مقصد کے لیے ساتھ لے جایا جا رہا تھا؟ جبکہ بقول اسی کے ہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکے تھے۔ لیکن اس سرغنہ کے بڑبڑاتے ہوئے مجھے ‘‘موٹی آسامی’’ کہنے پر میرا دل کسی اندیشناک خیال تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک نکلا تھا۔ باہر ان کے اور بھی ہتھیار بند ساتھی موجود تھے۔ یہ سب سیاہ اور سفید رنگ کے گھوڑوں پہ سوار تھے۔ ایک مشکی گھوڑے کی رسی کسی نے تھام رکھی تھی۔ سرغنہ لڑکی کو لیے اسی گھوڑے کی طرف بڑھا تھا اور اس نے سہارا دے کر پہلے لڑکی کو سوار کرایا اور پھر خود بھی سوار ہو گیا جبکہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بھی ایک دوسرے خالی گھوڑے پر سوار کرا دیا گیا بلکہ گھوڑے پر ‘‘ڈال’’ دیا گیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ پیٹ کے بل مجھے اس طرح گھوڑے پر لادا گیا تھا کہ میرا سر ایک طرف اور ٹانگیں دوسری جانب جھولنے لگیں۔ اس کے بعد ڈاکوؤں کے اس ٹولے نے ہوائی فائرنگ کی اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے تاریکی کی راہ لی۔

گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے اور میں خود کو ایک چوہے دان سے نکل کر دوسرے میں پھنستا محسوس کرنے لگا۔ گویا آسمان سے گرا کھجور میں جا اٹکا تھا۔

میرے گھڑسوار نے مجھے بھی ایک ہاتھ سے تھامے رکھا تھا کہ کہیں میں اس ‘‘دگڑمستی’’ میں گر نہ پڑوں، کیونکہ میں ہنوز رسن بستہ حالت میں تھا۔ جھٹکے بڑے طوفانی تھے۔ اس طرح کی ‘‘گھڑسواری’’ میرے لیے پہلا تجربہ تھی، جس کے باعث دل و دماغ عجیب سی گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ نیز یوں پیٹ کے بل پر پڑے رہنا میری آتی جاتی سانسوں کی ڈور کو بھی اُلجھائے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جلد ہی میرا اپنا دم بھی یوں بری طرح پھولنے لگا جیسے گھوڑے کے ساتھ میں خود بھی دوڑ رہا ہوں۔

بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا میں...... میری ساری منصوبہ بندی اور آئندہ کے پروگرام اپنے بظاہر مربوط لائحۂ عمل سمیت سبوتاژ کر دیے گئے تھے۔ ساتھی بکھر گئے تھے۔ ارم اپنے دونوں بچوں سمیت حویلی میں پڑی رہ گئی تھی۔ شکیلہ پہلے ہی اس درندہ صفت وڈیرے شاہنواز خان کے قبضے میں تھی اور جانے اس بے چاری کا اس پرانے قبرستان میں کیا حشر ہوا ہو، کبیل دادا اور اول خیر، اس خبیث اور راتب خور انسپکٹر رجب دین کے چنگل میں داخلِ زندان کر دیے گئے تھے۔ اور خیر سے...... میں ڈاکوؤں کے اس ٹولے کا شکار ہو کر ایک اور ہی پُراسرار چکر کا زندانی بننے لگا تھا۔ ایک اور اہم اور انتہائی تشویشناک پہلو کو شاید میں نظرانداز کر رہا تھا اور وہ تھا طلسم نور ہیرا...... وہ بھی ہاتھ سے اب جاتا ہوا ہی محسوس ہو رہا تھا۔

گویا سب کچھ بکھر چلا تھا اور تشویش طلب امر تو یہ تھا کہ ہم سب ہی خطرے میں گھرے ہوئے تھے۔ انڈیمان کی پُرمصائب اور خطرناک مہم سے واپسی پر میں نے سوچا تھا کہ اب کچھ دن حالات کی پیش آمدہ کشاکشی سے نجات کی صورت میں گزریں گے اور نئے حالات کے بارے میں آرام اور تفصیل سے غور و فکر کرنے کا موقع ملے گا مگر یہاں تو جیسے ایک کے بعد ایک جاری رہنے والی مصیبت نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ نئے حالاتِ دگرگوں جیسے کوئی تارِ عنکبوت تھا جس سے جتنا خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا اُتنا ہی پھنستا چلا جاتا تھا اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے یہ بھی میرے لیے انڈیمان جیسی پُرخطر اور دشوار گزار مہم ثابت ہونے والی تھی۔ ایک خیال پچھتاوے کی صورت میں یہ بھی آتا تھا کہ کہیں اس سلسلے میں میرے اپنے ہی کسی غلط اقدام کا دخل تو نہیں تھا؟

غور کرنے پر اپنے کئی اقدام پر میں دل ہی دل میں پچھتا رہا تھا۔

گھوڑوں کا یہ سفر مجھے کسی ویسٹرن اسٹائل کی انگلش مودی سے کم محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں جیسے خود کو کاؤبوائے یا

انڈیز کے جنگل میں پھنسا ہوا ہی محسوس کر رہا تھا۔ نصف گھنٹے کے اس بیہودہ اور نامعقول سفر نے میرے رسن بستہ کو شکستہ و ریختہ کر کے رکھ دیا تھا۔

گھوڑوں کی رفتار بتدریج کم ہونے لگی تھی اور اب وہ دُلکی سی چال چلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے بھی کچھ سکون کی سانس لی تھی کہ ان طوفانی جھٹکوں سے نجات مل گئی۔ تاہم میرے جسم کی چولیں تک ہل چکی تھیں اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں اب دوبارہ زمین پہ کھڑے ہونے کی سکت باقی رہی ہوگی۔

میرے کانوں سے اب جھینگروں اور کہیں دور آوارہ جانوروں کے بولنے کی آوازیں ٹکرانے لگی تھیں۔ ساتھ ہی جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ ہم کسی گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ خدا جانے یہ بھی کون سا علاقہ تھا، میں اس سے یکسر نابلد تھا۔

بالآخر ایک مقام پر گھوڑا رک گیا۔ میری آنکھوں سے پہلے پٹی کھولی گئی، جو کافی دیر تک بندھی رہنے کے بعد کھلی تو کچھ دیر تک میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا طاری رہا، اسی دوران مجھے بیدردی سے گھوڑے کی پیٹھ پر سے کھینچ کر اُتارا گیا تو وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا، یعنی میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہی نہ ہو پایا تھا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میرے نتھنوں میں بھربھری مٹی کے ذرے اور چھدری خودرو جھاڑیوں کے سخت اور خشک تنکے گھس گئے تو چھینکوں نے میرا مزید برا حال کر دیا اور فوراً ہی الرجی کی صورت میں میری ناک سے رطوبت بھی خارج ہونا شروع ہو گئی۔ میری اس قابلِ رحم ہیئت کذائی پر ڈاکوؤں نے قہقہے لگانا شروع کر دیے جو مجھے اس سے نہایت کریہہ اور نفرت انگیز لگے۔

تب ہی ایک رعب دار سی سنجیدہ آواز اُبھری۔ جیسے کسی نے انہیں تحکمانہ انداز میں ڈانٹا ہو...... کیونکہ اس کے بعد ہی فوراً سب کے قہقہوں کو ایک ساتھ بریک لگ گئے تھے۔ یہ بارعب آواز اسی سرغنہ کی تھی۔ پھر اس نے اور بھی کچھ کہا تھا۔ مجھے کسی نے سنبھالا دے کر کھڑا کر دیا تھا۔

میری آنکھیں لحہ بہ لحہ کچھ دیکھنے کے لائق ہونے لگی تھیں۔ گردوجوار میں اندھیرا تھا۔ جنگل تھا اور لمبے گھنے درخت تھے۔ علاقہ کچے کا ہی معلوم ہوتا تھا جس کی زمین پر ریت اور مٹی کی آمیزش تھی، نیز سطح کبھی کہیں کہیں سے اُونچی نیچی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا اور پورے چاند کے ساتھ تارے بھی جگمگا رہے تھے۔ انہی کی ملگجی روشنی میں مجھے سرکنڈوں کے کچھ جھونپڑ نظر آئے۔ وہاں اسی طرح کے کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان کے چہروں پہ ڈھاٹے نہیں تھے۔ ان میں کئی ایک کے ہاتھوں میں کیروسین لیمپ تھے ہوئے تھے، کچھ جھونپڑ کے اندر بھی اسی طرح کی روشنی لرزتی نظر آتی تھی۔ ایک دو جگہ چولہے سلگ رہے تھے اور وہاں کچھ عمر رسیدہ قسم کے افراد کھانا وغیرہ بنانے میں معروف تھے۔

بلاشبہ مجھے یہ، ان لوگوں کا کوئی خفیہ ‘‘جنگل ڈیرا’’ ہی محسوس ہوا تھا۔ مجھے ساتھ لانے والوں نے اپنے چہروں سے ڈھاٹے اُتار لیے تھے۔ میری آنکھیں بھی مکمل طور پر دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں۔

ان کے چہرے میرے لیے اجنبی ہی تھے، جن سے وحشت اور خونخواری مترشح ہوتی تھی۔ لمبی اور چوڑی قلمیں تھیں، گھنی مونچھوں کے علاوہ کسی کے چہرے پر سیاہ داڑھی بھی تھی۔ سرغنہ کے چہرے کا البتہ میں نے کچھ غور سے جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی اور روشن تھیں۔ گھنی مونچھوں کے علاوہ اس کے چہرے پر چھدری سی داڑھی بھی تھی۔ چہرہ چوڑا تھا اور صحت قابلِ رشک تھی۔ اس کا جسم خاصا کسرتی اور مضبوط نظر آتا تھا۔

بلاشبہ وہ ڈاکوؤں کے اس متوقع ٹولے کی سرداری کے لائق سمجھا جانا چاہیے تھا، لیکن جس بات نے مجھے کچھ چونکنے پر مجبور کیا تھا، وہ اس کی عمر تھی جس کا اندازہ کسی بھی طرح بیس بائیس سال سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ اتنی کم عمری میں اس غلط راستے کا انتخاب اپنی جگہ مگر اس پر مستزاد وہ ان کا ‘‘سردار سائیں’’ تھا۔ جس کا مطلب تو یہی نکلتا تھا کہ وہ اسی طرح کے ‘‘کارہائے نمایاں’’ ہی انجام دینے کے بعد اس ‘‘حیثیت’’ تک... پہنچا ہوگا۔ مجھے اتنی کم عمری میں اس کی یہ روش اختیار کرنے پر اندر ہی اندر افسوس بھی ہوا تھا۔ تاہم ان سب باتوں کے باوصف...... اور اس کے ڈیل ڈول سے قطع نظر، مجھے اس کے چہرے سے وہ خونخواری اور وحشتیں عنقا ہی محسوس ہوئی تھیں جو ان جیسے لوگوں کی خاص پہچان ہوتی ہے اور جو اس کے دیگر ساتھیوں کے بشروں پہ بدرجہ اتم موجود تھیں۔ لڑکی اس کے ساتھ کھڑی تھی وہ بھی مجھے خاصی دلیر اور بے خوف سی دکھائی دیتی تھی۔ چادر کے تیر نما نقاب سے اس کی جھانکتی ہوئی نگاہوں میں کسی قسم کا کوئی ملال یا خوف و پریشانی کی اِک ذرا جھلک تک بھی نہیں محسوس ہوتی تھی۔ اس کے برعکس وہ مطمئن اور خاصی خوش بھی دکھائی دیتی تھی۔

سرغنہ نے اُونچی آواز میں کچھ کہا تھا اور اسی وقت ایک پاس کی جھونپڑی کے اندر سے دو عمر رسیدہ عورتیں برآمد ہوئیں، مجھے کچھ حیرت سی ہوئی، گویا یہاں خواتین بھی تھیں۔ سرغنہ نے انہیں تحکمانہ انداز میں کچھ کہا اور پھر لڑکی سے بھی دھیمی نیچی آواز میں کچھ بولا۔ لڑکی نے بھی اس کی طرف مسکراتی سی نگاہ ڈال کر ہولے سے اپنے سر کو ہلکی جنبش دی اور پھر وہ ان دونوں عورتوں کے ساتھ مذکورہ جھونپڑی کی طرف بڑھ گئی۔

سرغنہ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ ہم دونوں ایک ہی قد و قامت کے حامل تھے۔ فقط عمروں میں ایک دو سال کا تفاوت آتا تھا۔ اس کے بعد اس نے شاید اپنے کسی ساتھی کو کوئی مخصوص اشارہ کیا اور ایک طرف بڑھ گیا۔

دو ڈاکو میری طرف بڑھے اور بازو سے دبوچ کر ایک طرف کو لے چلے۔ چند گام چلے تھے، سامنے ملگجی سی تاریکی میں سوکھے کھجی کے ایک درخت کے پاس جہاں زمین قدرے ڈھلوان تھی، ایک چھوٹی سی مڑھی ٹائپ جھونپڑی دکھائی دی، جو خاصی شکستہ اور جگہ جگہ سے گرد کی موٹی تہوں سے اَٹی پڑی نظر آتی تھی۔ اس کی چھت بھی ایک طرف سے پچکی ہوئی تھی۔ داخلی راستے پر پیوند زدہ ساٹاٹ جھول رہا تھا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ یہاں عرصے سے انسانوں نے رہنا چھوڑ دیا تھا یا پھر یہ قیدیوں اور مغویوں کے لیے ہی استعمال کی جاتی تھی۔ مجھے اسے دیکھ کر ہی ہول آگیا اور یہ اندازہ کرتے ہی مجھے اس کا مکین بنایا جانے والا تھا، میں وہیں دروازے پر ہی رک گیا۔

"پہلے یہاں صفائی اور روشنی کا تو بندوبست کرو...... اندر سانپ یا بچھو نہ ہوں......"

"ہاہا...... ہاہا...... یہاں کے سانپ بچھو سب اپنے یار ہیں......" ایک ڈاکو نے جیسے میرے اعتراض سے حظ اُٹھاتے ہوئے قہقہہ خارج کرکے کہا۔ "ہم ان سے کہہ دیں گے کہ تمہیں نہ کاٹیں۔" مجھے اس کی بات نہایت بیہودہ لگی تاہم میں نے بھی مصلحتاً انہی کے انداز میں کہا۔

"ہوسکتا ہے یہ تمہارے یار ہوں...... مگر میرے ساتھ شاید لحاظ نہ کریں......"

اسی وقت دوسرے ڈاکو نے ایک چھوٹی سی ٹارچ نکال کر روشن کردی اور سنجیدگی سے بولا۔ "ابھی اس سے کام چلاتے ہیں، بعد میں روشنی کا بھی بندوبست کردیا جائے گا۔ چلو اب ہمارا وقت ضائع مت کرو۔"

ٹارچ کی روشنی جھونپڑی پر پڑی تو میں بدکا، اندر سے میں نے دو تین موٹے تازے جنگلی چوہوں کو بھاگتے نکلتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی ایک لاغر سا کتا بھی، جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی، لنگڑاتا ہوا نکل کر ایک طرف کو لپکا تھا۔

"میں اس گندی جگہ میں داخل نہیں ہوسکتا...... پہلے یہاں کی صفائی کرو......" مجھے غصہ آگیا۔ "یہاں ایک لمحہ بھی رہنے پر میں موت کو ترجیح دینا پسند کروں گا۔"

مگر اسی وقت مجھے پہلے والے ڈاکو نے زور سے دھکا دیا اور میں گرتا پڑتا اندر جا پڑا۔

اُف...... اندر گھستے ہی جیسے میرے دماغ کی نسیں تک پھٹنے کے قریب ہونے لگی تھیں۔

گندگی اور تعفن زدہ سی بدبو کا ایک بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا تھا جس نے آن کی آن میں مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مجھے ایک ثانیے کے لیے یوں لگا جیسے میں خود بھی گندگی کی پوٹ بن کر رہ گیا ہوں...... ٹارچ کی روشنی میں اندر آوارہ جنگلی جانوروں کے فضلے بکھرے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نشانیاں یہاں انسانوں کے بھی حوائج ضروریہ کی نظر آتی تھیں۔

نفرت کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی جس نے مجھے ہوش و حواس سے یکسر بیگانہ کر دیا۔ ہتھکڑیاں میرے ہاتھوں میں بندھی ہوئی تھیں۔ میں اپنی آنکھوں میں وحشتِ خوں رنگ جذبوں کے شعلے دہکائے ان کی طرف پلٹا۔ ان دونوں کے چہروں پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جس نے میرے اندر کی آتشِ لہو رنگ مزید بڑھکا دی۔ ان دونوں کا فاصلہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا، میں نے دانستہ سر جھکا کے یوں حرکت کی جیسے بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاشا چاہ رہا ہوں اور اسی طرح میں ان کے خاصے قریب ہوگیا، یہی وہ وقت تھا جب ایک ڈاکو اپنے ساتھی سے کچھ کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں میں بندھی ہتھکڑیوں کی پروا کیے بغیر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کی اور ایک ڈاکو کو جس کی کسی حد تک میری جانب پشت ہو چکی تھی، زور سے اپنے کاندھے کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔

ان کے لیے شاید میری یہ حرکت اچانک اور غیر متوقع تھی، اسی سبب وہ اپنے ساتھ کھڑے ساتھی سے اس زور کے ساتھ ٹکرایا کہ دونوں کو خاصا زور کا جھٹکا لگا۔ دوسرا تو اپنا

توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر گر پڑا جبکہ پہلا والا لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے وجود میں اس وقت جیسے قہر و غضب کی بجلیاں سی دوڑنے لگی تھیں۔ میں نے اس کے رائفل والے ہاتھ پر لات رسید کر دی۔ وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر تاریکی میں کہیں جا گری، دوسری لات میری اس کے سینے پر پڑی، وہ اُچھل کر پرے جا گرا۔

میں جانتا تھا کہ ایسی حالت میں زیادہ دیر تک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اسی لیے میں نے راہِ فرار اختیار کرنا چاہی تھی کہ برسٹ فائر ہوا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ مجھ پر فائر کیا گیا تھا اسی لیے میں نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ لیکن اتنے قریب سے اگر مجھ پر برسٹ فائر کیا جاتا تو میں کہاں بچ سکتا تھا اور یہیں میں اپنی اس لمحاتی بے وقوفی سے مار کھا گیا۔ دشمن کا مجھے خوف زدہ کرنے کا مقصد پورا ہو چکا تھا اور جب میں نے بندھے ہوئے ہاتھوں سے کسی حد تک سہارا لیتے ہوئے بہ مشکل اپنے گھٹنے سکیڑ کر اُٹھنے کی کوشش چاہی تو اسی وقت ایک نال میری کنپٹی سے آن لگی۔ ساتھ ہی ایک خونخوار سی غراتی آواز بھی میرے کان سے ٹکرائی۔

’’بھیجا اُڑا دوں گا اگر اب کوئی حرکت کی تو......‘‘

میں پھولی پھولی سانس میں ہانپتا ہوا وہیں پڑا رہ گیا۔ اسی وقت وہاں کئی لوگ دوڑے چلے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں کیروسین آئل والے لیمپ اور ٹارچیں بھی تھیں۔

’’کیا ہو رہا ہے یہ......‘‘

میں ان کے سرغنہ کی آواز پہچان گیا تھا۔ میں نے سر گھما کر بڑی شعلہ فشاں نظروں سے سرغنہ کی طرف دیکھا تھا، اور اپنی ہی کوشش سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ لڑکی بھی آ گئی، اس کے ہمراہ دو عورتیں بھی تھیں۔ وہ میری طرف اپنی غزال چشم آنکھوں سے دیکھتی ہوئی سرغنہ کے قریب جا کھڑی ہوئی جس نے اس کے کاندھے پر اپنا ایک بازو رکھ کے اپنے اور قریب کر لیا تھا۔ لڑکی کے چہرے پر اب کوئی نقاب نہیں تھا۔ لیمپس کی روشنی میں اس کا چہرہ بھی مجھے کسی الاؤ کی طرح دہکتا ہوا نظر آ رہا تھا اور آنکھیں شاعرانہ تصور لیے ہوئے تھیں۔

’’سردار سائیں! اس بدبخت نے ہم پر حملہ کر دیا تھا۔‘‘ ان دونوں پٹے ہوئے ساتھیوں میں سے ایک نے... میری شکایت کرتے ہوئے سرغنہ سے کہا تو میں نے سرغنہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

’’میں انسان ہوں اور ایک کلمہ گو مسلمان بھی...... کیا تم لوگوں کی انسانیت اس قدر مر چکی ہے کہ مجھے ایک ایسی جگہ پر قید کر کے رکھا جا رہا ہے جو اس قدر غلیظ اور گندی ہے کہ وہاں صرف جانوروں کو ہی رکھا جا سکتا ہے، انسانوں کو نہیں۔‘‘

للکار سے مُشابہ میری آواز کو سرغنہ نے بڑے غور سے سنا تھا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنے ان دونوں پٹے ہوئے ساتھیوں کو دیکھنے لگا پھر گمبھیر آواز میں بولا۔

’’اس نے تم دونوں پر حملہ کیا تھا؟‘‘

’’ہاؤ سردار سائیں!‘‘ دوسرا بولا۔ ’’یہ یہاں اس جھونپڑی میں داخل ہونے سے انکار کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا یہاں جانوروں اور انسانوں کا فضلہ پھیلا ہوا ہے، میں یہاں رہنے پر مرنے کو ترجیح دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں اور پھر اس نے ہم پر اچانک حملہ کر دیا۔‘‘

جنگل کی فضا جیسے ایک دم ہی تھم چکی تھی۔ ڈاکوؤں کا یہ ٹولا گنیں اور لیمپس تھامے جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا۔ سرغنہ اور لڑکی کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ مجھ سمیت ان کے ساتھی ڈاکو یہی سمجھ رہے تھے کہ بس! اب سردار سائیں کی گن کا برسٹ چلے گا اور میں خون کی چھپڑی میں پڑا تڑپ رہا ہوں گا۔

سرغنہ نے لڑکی کو دھیرے سے پرے کیا اپنی گن کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میرے قریب آیا اور بالکل قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے وہ اپنی بڑی بڑی روشن آنکھوں سے عجیب انداز میں مجھے گھورتا رہا اس کے بعد سپاٹ لہجے میں مگر تحکمانہ بولا۔

’’اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر دو۔‘‘

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ موت مجھ سے چند ہی فٹ کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میری اس دلیرانہ وار حرکت اور اسے للکارنے کے انداز نے اس کا دماغ گھما کے رکھ دیا ہو۔ تاہم میں نے اپنے ہتھکڑی بندھے ہاتھوں کو سر سے فضا میں بلند کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے سرغنہ نے اپنی گن کی نال میرے دونوں ہاتھوں کے درمیان جھولتی آہنی ہتھکڑیوں کی کڑی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور میرے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے۔ میرے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے تھے مگر مجھ سے زیادہ وہاں کھڑے لوگوں کے مارے حیرت کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔

’’اب کیا کہتے ہو؟‘‘ سرغنہ نے اپنی گن نیچے کرتے ہی مجھ سے کہا۔

’’میں تمہارا شکریہ ہی ادا کر سکتا ہوں...... لیکن میں پھر بھی اس گندی جھونپڑی......‘‘

میری آواز حلق میں رہ گئی۔ کیونکہ اسی وقت سرغنہ نے بہ آوازِ بلند سب کو وہاں سے جانے کا حکم دیا تھا۔

’’میرے ساتھ آؤ......‘‘ بعد میں اس نے مجھ سے کہا اور پلٹا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے مجھ پر اتنی جلدی بھروسا کیسے کر لیا تھا؟ میں اس کے ساتھیوں کے لوٹ جانے سے اس پر پیچھے سے حملہ بھی کر سکتا تھا۔ اب تو میرے دونوں ہاتھ بھی آزاد ہو گئے تھے۔ یا پھر اسے اپنی طاقت کا کچھ زیادہ ہی زعم تھا۔ میں نے اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔ وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ میں ان دونوں کے پیچھے چلتا ہوا ایک نسبتاً کشادہ جھونپڑے میں آ گیا۔

اندر سے اس جھونپڑے کی شان دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے انڈیمان کی ’’بلیک کوئن‘‘ باربہ کے جھونپڑے کا منظر گھوم گیا۔ ضرورت کی کیا شے وہاں موجود نہ تھی۔ زمین پر صاف ستھرا فرشی قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف روم کولر رکھا ہوا تھا۔ چھوٹے سائز کا فریج تھا۔ آرام دہ گدے تھے۔ دو تکیے تھے۔ بلب کی روشنی تھی۔ بجلی کا انتظام یقیناً کسی قریب ہائی ٹینشن لائنوں سے کنڈا ڈال کر ہی لیا گیا ہو گا۔ ایک طرف بھانت بھانت کا ہتھیار رکھا ہوا تھا۔ دو بڑے موبائل فون سیٹ پڑے تھے۔

اِدھر بیٹھ جاؤ......‘‘ اس نے ایک تکیے کے پاس بیٹھتے ہوئے مجھ سے کہا اور ساتھ ہی دوسرا تکیہ اس نے میری طرف اُچھال دیا۔ لڑکی اس کے قریب پاؤں سکیڑ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہلکے سرخ رنگ کا علاقائی لباس زیبِ تن کر رکھا تھا۔ وہ اس وقت میرے سامنے بالکل بے پردہ تھی۔ میں کن انکھیوں سے اس کے ملکوتی سراپا کا جائزہ لے سکتا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ سرغنہ کی ’’پسند‘‘ لاجواب تھی۔ لڑکی بلاشبہ ملکوتی حسن کا شاہکار نظر آتی تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا اور امارت بھری زندگی نے اس کے حسن و شباب کو دوچند کر دیا تھا لیکن میرے لیے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ایک ناز و نعم میں پلی بڑھی لڑکی نے ایک جنگل کے باسی شخص کا انتخاب کیوں کر کیا تھا؟ کیا محبت اتنی ہی سر پھری ہوتی ہے کہ بس! جس پر دل آ گیا تو پھر پیچھے مڑ کر کیا دیکھنا؟ کہ کون کیا ہے اور کیسا ہے؟

’’میں بہادروں کی قدر کرتا ہوں اور تمہاری جی داری مجھے اچھی لگی۔ مجھے تم نسلی (خاندانی) آدمی لگتے ہو...... نام کیا ہے تمہارا......؟‘‘ سرغنہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میرا نام شہزاد احمد خان ہے، عرفیت شہزی رکھتا ہوں......‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’واہ......‘‘ سرغنہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ’’جیسے مجھے پریل چانڈیو عرف...... پرودھاڑیل کہتے ہیں......‘‘ وہ ہنسا۔ ’’جانتے ہو...... دھاڑیل کسے کہتے ہیں......؟‘‘

’’نہیں......‘‘ کچھ اندازہ ہونے کے باوجود میں نے انکار میں سر ہلایا۔

’’ڈاکو کو......‘‘ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی وہ عجیب سی وحشیانہ چمک مزید گہری ہو گئی جو رہ رہ کر اس کی آنکھوں میں بجلی کی طرح چمک جاتی تھی۔

’’تمہارا شکریہ دوست......!‘‘ میں نے سلسلۂ جنبانی جاری رکھنے کی غرض سے ہولے سے کہا اور غیر ارادی طور پر میری نظر اس کے پاس بیٹھی لڑکی پر پڑی۔ پہلی بار میں نے اس کی شاعرانہ سی آنکھوں کو مسکراتے ہوئے محسوس کیا، نہ صرف یہ بلکہ...... اس کے عنابی لبوں پہ غیر محسوس سی مسکراہٹ بھی تھی۔

’’دوست......؟‘‘ وہ جیسے بناوٹی انداز میں بولا۔ ’’جانتے بھی ہو کہ دوست کسے کہتے ہیں؟‘‘

میں نے جواب میں اپنا دایاں ہاتھ سینے کے بائیں حصے پر مارا تو میری کلائی میں بندھے فولادی کڑے سے منسلک ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی کی زنجیر ہولے سے بج اٹھی تھی۔

میرے اس جگری انداز پر اس کی آنکھیں پھیل گئیں...... پھر دوسرے ہی لمحے وہ ایک پُرجوش سی جذباتی آواز میں بولا۔

’’تمہارے بارے میں میرا اندازہ ٹھیک جا رہا ہے...... تم عام آدمی ہرگز نہیں ہو سکتے...... اپنے بارے میں ذرا تفصیل سے بتاؤ گے کہ کون ہو تم اور یہ سب کیا چکر تھا؟‘‘

اس نے میرے دونوں ہاتھوں میں بندھی ٹوٹی ہوئی ہتھکڑی کے جھولتے ہوئے فولادی کڑوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ کر بے اختیار مسکرا دیا اور اس کی بات کا جواب معنی خیز انداز میں اسی سوال سے دیا، تاکہ اس کا بھی ’’معاملہ‘‘ جان سکوں۔

’’کچھ ایسا ہی اندازہ میں نے تمہارے بارے میں بھی لگایا ہے...... کم از کم وڈیرے شاہنواز خان کی حد تک اس کی جاگیر اور اس کے جنگل کے کالے قانون کی ناانصافی کا میری طرح تم بھی شکار رہے ہو......‘‘

میری بات نے اسے چونکا دیا۔ وہ اپنی آنکھیں سکیڑ

کر بولا۔ ''آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو...... لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی...... تم اس علاقے کے تو نہیں لگتے، پھر اس رذیل وڈیرے کے ظلم کا کیسے شکار ہوئے؟ کیا اس کی طاقت جاگیر سے باہر بھی زور پکڑنے لگی ہے؟''

''وہ صرف کمزوروں پہ زور چلانے کا عادی ہے۔ جی داروں سے اس کی ٹکر پہلی بار ہوئی ہے......'' میں نے کہا اور آگے بولا۔ ''مجھے پتا چلا تھا کہ شاہنواز خان میرے ایک مرحوم دوست بشام چھلگری کی جوان اور خوبصورت بیوہ کو ستا رہا تھا اور اس کی جان کا دشمن بنا ہوا تھا...... اور میں نے اس کی بیوہ کو اپنی بہن کہا تھا اور پنجاب سے اس کی جان چھڑانے کے لیے اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ یہاں لاڑکانہ آیا تھا لیکن افسوس کہ دھوکے میں مار کھا گئے ہم......'' میں نے طلسم نور ہیرے کا ذکر ابھی گول کیے رکھنا ہی مناسب سمجھا تھا۔

اِدھر چونکہ پریل اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ اسی لیے پریل سے باتوں کے دوران میری لامحالہ نظر اس کے چہرے پر بھی پڑ جاتی، اسی سبب جب میری اس بات پر لڑکی کے چہرے پر غیر ارادی نگاہ پڑی تو میں نے اس کی کاجل سی سیاہ آنکھوں میں اچانک ہی کچھ عجیب سے تاثرات محسوس کیے اور تب ہی اس نے اپنا چہرہ پریل عرف پرودھاڑیل...... کی طرف کرتے ہوئے اس کے کان میں کچھ کہا تھا۔ جسے سن کر پریل نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارے دوست بشام چھلگری کی بیوہ کا نام کیا تھا؟''

''ارم......''

''ہم......'' کہتے ہوئے اس نے لڑکی سے کچھ کہا تھا اور ساتھ ہی اس نے اثبات میں بھی اپنے سر کو جنبش دی پھر مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو کے بولا۔

''اتفاق سے...... ارم نامی وہ عورت...... سونہڑیں کی بچپن کی سہیلی ہے......''

''سونہڑیں...... کون......؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے پرودھاڑیل کی طرف دیکھا تو وہ اپنے ساتھ بیٹھی اس جواں سال اور نازک بدن لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ سونہڑیں ہے...... اس خبیث وڈیرے شاہنواز...... کی بیٹی......''

اگرچہ مجھے اس کا اندازہ پہلے ہی ہو چکا تھا بلکہ ان کی آپس کی معاملہ داری کا بھی، اسی لیے میں نے اس بارے میں اسے زیادہ کریدنا مناسب خیال نہ کیا البتہ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ سونہڑیں نے اس وقت ارم کو کیوں نہیں پہچانا تھا جب وہ اپنے باپ کی حویلی سے نکل رہی تھی۔ بہرحال اب مجھے یہاں سے اپنی نجات کی اُمید اور بھی سوا ہو چلی تھی۔ تاہم میں نے برسبیل تذکرہ کہا۔

''یہ خوشی کی بات ہے مگر حیرت ہے کہ سونہڑیں بھی اپنی سہیلی کی مصیبت کم نہ کر سکی؟ حالانکہ یہ شاہنواز خان کی ہی بیٹی ہے۔''

میں نے ایک نازک بات کر دی... جس پر پرودھاڑیل بھڑک سکتا تھا۔

''ایک جابر باپ کے گھر میں اس کی بیٹی خود مظلوم ہو تو وہ بھلا کسی اور کی کیا مدد کر سکتی ہے؟'' پرودھاڑیل تلخی سے بولا۔ ''ایک بیٹی اور اپنے ہی باپ کے گھر میں مظلوم......؟'' میں نے دانستہ اپنے لہجے میں حیرت سموتے ہوئے کہا۔ اندازہ تو مجھے ان دونوں کے بارے میں بہت سی باتوں کا ہو چلا تھا تاہم پورے قصے کا جاننا ضروری تھا۔

میری بات پر وہ ہولے سے زہریلے انداز میں ہنسا اور بولا۔

''یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت...... لیکن......''

وہ کہتے کہتے رکا۔ کیونکہ سونہڑیں اس کی طرف ایک بار پھر کچھ کہنے کے لیے جھکی تھی۔ وہ براہِ راست ہماری گفتگو میں حصہ نہیں لے رہی تھی...... شاید اسے اردو بولنا نہیں آتی تھی یا پھر کوئی اور وجہ ہو...... ورنہ اردو تو عام فہم زبان تھی۔ ٹی وی ڈرامے اور الیکٹرانک میڈیا نے اردو کو ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا تھا۔

''یہ سونہڑیں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔'' پرودھاڑیل نے اپنی بات فوراً ہی قطع کرتے ہوئے مجھ سے کہا تو میں نے سونہڑیں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے ڈالی تو اس کی مترنم، دھیمے سروں میں ڈھلی آواز میری منتظر سماعتوں سے ٹکرائی۔

''شہزاد صاحب! جب ارم کے لیے میں کچھ نہ کر سکی تو میں نے پس پردہ اس کی مدد کرنے کی غرض سے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اگر اس علاقے سے چلی جائے اور کسی دوسرے شہر میں جا کر رہے تو میں اس کی مالی مدد کر سکتی ہوں، مگر وہ پھر بھی نہیں مانی تھی۔''

''وہ اپنے شوہر کی طرح ایک خوددار خاتون ہے...... محترمہ سونہڑیں صاحبہ......!'' میں ہولے سے مسکرا کر بولا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ بالکل صاف اور شستہ لہجے میں اردو بول رہی تھی اور پرو کے مقابلے میں خاصی پڑھی لکھی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا لہجہ بہت میٹھا اور دھیما سا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی آواز کا فسوں جگاتے ہوئے مجھ سے بولی۔

''ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... لیکن اُسے اپنے دو چھوٹے معصوم بچوں کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ جب آپ کو حویلی میں لایا جا رہا تھا تو میں نے اُوپر سے جھانک کے دیکھا تھا۔ بابا جانی (شاہنواز خان) ارم کے سلسلے میں کچھ زیادہ ہی الجھی ہو رہے تھے۔ اسی لیے مجھے کھد بد تو ہوئی کہ ضرور کوئی گہرا معاملہ ہے، تب سے میں بابا جانی اور ان کے حواریوں کے ساتھ ہونے والی باتیں چھپ کر سنتی رہتی تھی۔''

''جی ہاں!'' میں نے مختصراً کہا اور ساتھ ہی میرے دل کو خدشہ لاحق ہونے لگا کہ اگر یہ سب اتنا کچھ جانتی تھی تو یقیناً اُس ہیرے سے متعلق بھی اسے بھنک ضرور پڑ چکی ہو گی۔ اب وہ یہاں اس کا بھانڈا نہ پھوڑ ڈالے جس سے میں بچنا چاہ رہا تھا۔

''وہ میری رازداں سہیلی بھی تھی۔'' وہ آگے بتانے لگی۔ میرا دل دھڑکے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا وہ اب خاموش ہو جائے......

''کسی قیمتی ہیرے کا کوئی چکر تھا۔ جسے بابا جانی پہلے بھی ہتھیا چکے تھے، مگر وہ ارم کا شوہر بشام ان کے قبضے سے برآمد کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بابا جانی کو سزا بھی ہوئی تھی مگر وہ بعد میں رہا کر دیے گئے۔ اب پھر وہی منحوس چکر کی لپیٹ میں آ گئے اور یہی ہیرا ارم اور اس کے بچوں کے لیے مصیبت بنا جس کے باعث اس کا شوہر بشام بھی مارا گیا۔'' بالآخر اس نے بھانڈا پھوڑ ڈالا......

''آپ اس ہیرے کے بارے میں کیا جانتے ہیں......؟'' آخر میں اس نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں اس کے باپ کی طرح اب اس کا یہ محبوب ڈاکو بھی میرے گلے نہ پڑ جائے...... تاہم میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

''اگر آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو یقیناً یہ بھی جانتی ہوں گی کہ وہ ہیرا اصل میں وطنِ عزیز کی ایک قومی امانت ہے اور اسی کی خاطر بشام نے اپنی جان قربان کر دی تھی مگر اب ایک بار پھر وہ قومی امانت خطرے میں پڑتی نظر آ رہی ہے۔''

''وہ ہیرا اب ہے کس کے پاس......؟'' پرودھاڑیل نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

مجھے اس سے اسی سوال کا ڈر تھا۔ لیکن اب جبکہ سونہڑیں نے بھانڈا خود ہی پھوڑ دیا تھا تو جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''ہیرا میرے قبضے میں ہی تھا اور میں اسے سرکار کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ بشام کی بیوی ارم ایک قومی اعزاز کی حق دار تھی۔ کیونکہ اس نے ایک قومی امانت کو بچانے کی خاطر ہی اپنی جان دی تھی۔ لیکن افسوس یہاں شاہنواز خان کو ہماری بھنک پڑ گئی اور وہ ہمارے پیچھے پڑ گیا۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے مختصراً اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں بتا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ اب وہ ہیرا ایک بار پھر خطرے میں تھا۔ میں نے کہتے ہوئے اُسے آخری پیش آمدہ حالات کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی عاجزانہ سی درخواست بھی ان دونوں سے ہی کر ڈالی۔

''میرا یا میرے ساتھیوں کا اس ہیرے سے کوئی لالچ نہیں ہے، ماسوائے اس قومی فریضے کہ وہ امانت وطن عزیز کے سپرد کر دیا جائے۔ کیا میں اُمید کروں کہ آپ دونوں اس سلسلے میں میری مدد کریں......؟''

میں نے دیکھا کہ پرودھاڑیل کے چہرے پر عجیب طرح کی مسکراہٹ اُبھری تھی جبکہ سونہڑیں کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے تاثرات ثبت تھے۔ تب ہی پریل نے معنی خیز سی مسکراہٹ کے ساتھ سونہڑیں کی طرف سے دیکھتے ہوئے اس سے مقامی زبان میں کچھ کہا تھا جس پر سونہڑیں نے اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر کچھ کہا تھا جس پر پرودھاڑیل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا اور سونہڑیں بھی ہولے سے اپنا سر جھٹک کر مسکرا دی۔ تب ہی اس نے شستہ اردو میں مجھ سے کہا۔

''شہزاد صاحب! اس قومی امانت کو بچانے کا فرض ہم سب پر ہی عائد ہوتا ہے۔ آپ......'' اس کی بات اُدھوری رہ گئی۔ ایک ڈاکو ساتھی اندر داخل ہوا اور اس نے پرودھاڑیل سے کچھ کہا۔ جس پر وہ ایک دم اپنی گن سنبھالے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہم سے فقط اتنا کہہ کر فوراً ہی جھونپڑ...... سے نکلتا چلا گیا کہ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہے۔

جھونپڑے میں اب سونہڑیں اور میں رہ گئے تھے۔ پرودھاڑیل اپنے ڈاکو ساتھی کے ساتھ باہر چلا گیا تھا۔ رات شاید اپنے نصف پہر کے سفر میں تھی۔ فضا میں جنگلی نباتات کی بو رچنے لگی تھی۔ جھونپڑ کا دروازہ وا تھا۔ باہر سے

ہلکی روشنی اندر آرہی تھی۔

میں سونہڑیں کے ساتھ خود کو یہاں بیٹھا عجیب سا محسوس کرنے لگا مگر پھر اچانک خیال آیا کہ پرودھاڑیل کی غیر موجودگی میں ذرا کھل کر مجھے سونہڑیں سے باتیں کرنے کا موقع مل سکے۔ لہٰذا اسی گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سونہڑیں سے مخاطب ہو کر بولا۔

”اس سلسلے میں، آپ کے جذبات کی میں قدر کرتا ہوں...... سونہڑیں صاحبہ! اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ ہی.... میری مدد کرسکتی ہیں اور ضرور کریں گی...... کیونکہ یہ معاملہ اب آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا ہے...... مگر پرودھاڑیل......“ میں نے اسے کچھ کہنے کے لیے اُکسانے پردانستہ آخر میں اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا اور اس کے گل رخ چہرے پر اپنی بھانپتی ہوئی نظریں جمادیں۔

یہ سب ضروری تھا۔ مجھے کسی پر تو ایسی مشکل گھڑی سے نجات پانے اور مدد کے سلسلے میں بھروسا کرنا ہی پڑتا، اب جبکہ وہ ہیرا ابھی خطرے میں تھا۔ تنہا میں کیا کرسکتا تھا۔ ان کی مدد میرے لیے بہت کارآمد ثابت ہوسکتی تھی۔ کچھ موقع محل پاتے ہی میں نے سونہڑیں سے کہا۔

”میں آپ کے دلی جذبے کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ایک بات پوچھنا چاہوں گا آپ سے...... کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے میں اس قیمتی ہیرے کا ذکر کر کے کہیں آپ نے کوئی غلطی تو نہیں کردی......؟ میرا مطلب ہے......“ میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولی۔

”میں آپ کا مطلب سمجھ رہی ہوں...... یہ راز صرف ہم تینوں تک محدود رہے گا۔ پریل پر تم مکمل بھروسا کرسکتے ہو۔ اس کے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... پریل کو اس ہیرے سے کوئی لالچ نہیں ہے۔“

”پریل بھی تو ایک ڈاکو ہے...... اتنے قیمتی ہیرے کو دیکھ کر اس کی نیت نہیں بدل سکتی؟“ میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

”کہا نا...... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں...... وہ ایسا نہیں ہے۔“ وہ بولی۔ ”ابھی اس ہیرے کے ذکر پر اس نے مجھ سے مذاق میں یہی کہا تھا کہ وہ شاہنواز خان کی حویلی سے اصل ہیرے کو اُڑا لایا ہے...... اب اس ہیرے کے سامنے دنیا کے تمام ہیرے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔“ یہ بتاتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ بھیدوں بھری مسکراہٹ ابھری تھی اور شرم کی لالی اس کے دہکتے گالوں کو مزید فروزاں کر گئی......... پریل کی محبت کا فخر اور دیوانہ وار محبت کرنے والوں کا سارروایتی غرور اس کے کھنکتے لہجے سے صاف عیاں ہو رہا تھا...... میں اس کے اور پریل کے بیچ معاملے کو کسی خیال تحت جانچنے کی غرض سے مسکرا کر بولا۔

”یہ بہت اچھی بات ہے کہ پریل آپ سے اور آپ اس سے سچی محبت کرتی ہیں۔ لیکن کچھ حیرت بھی ہوتی ہے کہ آپ اتنے بڑے خاندان کی ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں اور پریل ایک ڈاکو......“

”وہ پہلے ایک شریف انسان تھا۔“ سونہڑیں اسی جوشِ محبت تلے بولی۔ ”وہ ایک غریب ہاری کا اکلوتا بیٹا تھا۔ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ مگر اس تلخ حقیقت سے واقف بھی تھا کہ ہمارا میل نہیں ہوسکتا، وہ مجھ سے دور ہونے لگا۔ اس کی وجہ بھی میں ہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے جیسی نازونعم میں پلی بڑھی لڑکی کو اپنی خواہش پر قربان کر کے محل سے نکال کر جھونپڑی میں لے آئے۔ لیکن میرے دل میں اس کی محبت گھر کرتی چلی گئی۔ وہ مجھ سے جتنا دور ہونے کی کوشش کرتا میں اتنا ہی اس کے قریب کھنچتی چلی گئی...... بالآخر ہمارے عشق کا یہ راز مشک کی طرح پھیل گیا اور میرے بابا جانی کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ یہ بھی ایک حقیقت تھی۔۔ جس پر مجھے ہمیشہ ہی ندامت ہوتی رہی تھی کہ میں ایک ایسے شخص کی بیٹی تھی جو ایک جابر اور ظالم شخص تھا۔ آئے دن غریب ہاریوں پہ ظلم کرنا، ان کے حقوق غصب کرنا اور ان کے حقوق کی آواز کو جبر تلے کچلنا بابا جانی کا شیوہ بن چکا تھا۔ پریل سے میرے عشق کی بھنک پڑتے ہی اُنہوں نے اپنے حواریوں کے ذریعے اس کے گھر کو آگ لگادی۔ جس میں اس کے غریب ماں باپ اور ایک جوان بہن مرگئی، خود پریل زخمی ہو کر مرتے مرتے بچا اور گوٹھ سے راہِ فرار اختیار کرلی۔ اس کے بعد اس کی زندگی کا ڈھب بدل گیا۔ لیکن...... میں نے بھی اس سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ایسی حویلی میں رہنے کے بجائے میں اس کے ساتھ جھونپڑی میں رہنا پسند کرلوں گی جس حویلی کی بنیادوں میں بے گناہوں اور غریبوں کا خونِ ناحق بھرا ہوا تھا۔ سو میں نے اپنا یہ وعدہ پورا کرلیا......“

وہ اتنا بتا کر چپ ہوگئی۔ مجھے اس کی روایتی داستان سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ میں تو یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا پریل پہ ہیرے کے سلسلے میں مجھے کس قدر بھروسا کرنا چاہیے تھا، نیز اُسے واقعی سونہڑیں سے اتنی محبت تھی کہ وہ اس ”ہیرے“ (اپنی محبت) کے سامنے دنیا

کی ساری دولت کو واقعی ہیچ سمجھتا ہو...؟ یہی بات تھی کہ مجھے اب بھی اس کا صحیح اندازہ نہیں ہوا پایا تھا بجز اس کے کہ ان کڑے حالات میں پریل پر بھروسا کرنا میری مجبوری تھی......

ٹھیک اسی وقت اس کی طرف تکتی ہوئی میری آنکھوں کو داہنی جانب کسی کی حرکت کا شائبہ گزرا...... میں نے ایک ذرا آنکھیں گھما کر جھونپڑی کی سیدھے ہاتھ والی دیوار کی طرف دیکھا تو وہاں مجھے باریک رخنوں میں کسی کا دبا دبا سایہ حرکت کرتا محسوس ہوا، میں ایک دم اُٹھ کر باہر نکلا اور اسی جانب بڑھا تو ایک گٹھیلے جسم کے آدمی کو وہاں سے اُٹھ کر ایک دم نکلتے دیکھا......

ہلکی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا ایک طرف کو بڑھ گیا۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں میں مجھے غضب کا کینہ بھرا ہوا محسوس ہوا تھا۔ صورت بھی اس کی کرخت اور ناپسندیدہ سی تھی۔ وہ پریل کے ہی گروہ کا آدمی لگتا تھا۔ میں اس سے یہ کہنے کی ہمت نہ کرسکا تھا کہ وہ یہاں چھپا ہماری باتیں کیوں سن رہا تھا؟ ممکن تھا کہ ایسا اُسے پریل نے حکم دے رکھا ہو...... جو اچانک ہی کسی وجہ سے اُٹھ کر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔

میں واپس پلٹا تو ٹھٹک کر رکا...... وہاں سونہڑیں کھڑی تھی۔ ہم اندر آگئے۔

”تم یوں اچانک اُٹھ کر کہاں چل دیے تھے؟“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی تم شاید بھاگ رہے ہو......“

”اب ایسی بے وقوفی تو میں کبھی نہیں کرسکتا......“ میں نے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اندر داخل ہو کر وہ میرے آگے چلتی ہوئی ذرا رکی، پیچھے مڑ کر اس نے میرے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی، کیروسین کے لیپ کی مدھم مدھم تھرکتی سی روشنی میں اس کے دہکتے رخسار پر مسکراہٹ کا ایک گڑھا پڑا جو مجھے بہت بھلا محسوس ہوا۔

”اُمید تو مجھے بھی تم سے ایسی نہیں تھی...... مگر......“ اس نے خود ہی اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور آگے بڑھ کر واپس تکیے کے پاس جا کے اپنی جگہ پر بیٹھ گئی اور میں نے بھی اپنی فرشی نشست سنبھال لی۔

”شاید باہر کوئی ہماری باتیں سن رہا تھا۔“ بالآخر میں نے اسے بتایا۔

”وہ لائق ماچھی تھا......“ سونہڑیں نے بتایا۔

بعض مشاہیر

کی عادات عجیب وغریب ہوتی ہیں مثلاً

- مشہور فرانسیسی مصنف وکٹر ہیوگو، گھر میں داخل ہوتے اور جونہی ذہن میں کوئی خیال آتا، لکھنا شروع کردیتے اور صفحات کو اِدھر اُدھر زمین پر گراتے جاتے۔
- امریکہ کے ایک صدر جیمس گارفیلڈ یونانی زبان' بائیں ہاتھ سے اور لاطینی زبان دائیں ہاتھ سے تحریر کرتے تھے۔
- مشہور برطانوی داستان نویس' سرز ہیربرٹ پارکر اپنے سیکریٹری کو زبانی ٹائپ کرواتے اور آنکھوں کو رومال سے بند کرلیتے، ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کے خیالات مجتمع رہتے ہیں۔
- بیتھوون جو ایک بہت عظیم موسیقار گزرے ہیں، موسیقی کے اشارات اخبارات کے کناروں پر لکھتے تھے اور ہر وقت ان کاغذات کو جیب میں ٹھونسے رہتے تھے۔

”لائق ماچھی......؟“

”ہاں! پریل کے گروہ میں اسے نائب کی حیثیت حاصل ہے۔“ اس نے جواب میں کہا اور آگے بولی۔ ”میں جب اُٹھ کر تمہارے پیچھے دروازے پر آئی تھی تو میں نے اسے جاتے دیکھا تھا۔ اچھا ہوا تم نے اس سے اُلجھنے کی کوشش نہیں کی...... وہ خاصا غصہ ور اور اکھڑ مزاج آدمی ہے۔“

”لیکن...... مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری باتیں سن رہا تھا اور اس نے ہیرے سے متعلق ہماری گفتگو بھی سن لی ہے۔“ میں نے کہا۔ میرے لہجے سے تشویش آمیز پریشانی ہویدا تھی۔

”فکر مت کرو اس کی...... یہ پریل کا قابلِ بھروسا آدمی ہے...... گروہ میں پہرا لگانے کی ذمّے داری اسی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے پریل جلدی میں کہیں آگے چلا گیا ہے۔“ وہ بولی۔ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”مجھے کسی اور جگہ جا کر بیٹھنا چاہیے۔“

”نہیں، پریل نے تمہیں یہاں سے جانے کا نہیں کہا تھا، ابھی اِدھر ہی بیٹھے رہو۔“

میں چپ ہو رہا۔ وہ میرے سامنے قالین پر کوئی چند

فٹ ...... کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ اس میں اب وہ پہلے والا شرمیلا سمٹا پن عنقا ہونے لگا تھا۔ وہ خاصی پھیل کر بیٹھی تھی۔ اب تو اس نے اپنے سیدھے ہاتھ پر رکھے تکیے پر بھی اپنی ایک کہنی ٹکا دی تھی۔ مجھے اسے دیکھنے کا بھرپور موقع مل رہا تھا۔ جسم پہ لی ہوئی چادر۔۔۔ بھی اس کے گل بدن وجود سے کافی ڈھلک گئی تھی۔ مقامی لباس میں بھی اس کے جسم کے پیچ وخم جیسے تراشیدہ لگتے تھے۔ میرے دل کو اس وقت لائق ماچھی کی طرف سے پریشانی لگ گئی تھی۔ لیکن پھر سونہڑیں کے یہ کہنے پر کہ وہ پریل کا نائب اور اس کا بھروسے کا آدمی تھا تو بھلا اس کا اندازہ سونہڑیں کو کیونکر ہو سکتا تھا؟ ممکن تھا پریل کے ساتھ اس کے خفیہ تعلق کے دوران اس نے ذکر کیا ہو اور ملایا بھی ہو، مگر باوجود اس کے میرے دل کو بے چینی سی لگ گئی تھی۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سونہڑیں کچھ سمٹ گئی۔ میں یہی سمجھا پریل لوٹ آیا ہے مگر وہ لائق ماچھی تھا۔ اس نے ایک کڑوی سی نظر میرے چہرے پر ڈالی، میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، پھر وہ سونہڑیں سے نہایت ادب سے مخاطب ہوکر بولا۔

''بھاجائی! (بھابھی) بھوک لگی ہے تو مانی ٹکر (روٹی وغیرہ) لادوں......؟''

''پریل اچانک کہاں چلا گیا ہے؟ اس نے کچھ کھایا پیا ہے؟'' سونہڑیں نے جواب دینے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''بھاجائی! سردار سائیں، جنگل ڈیرے سے باہر ہیں، ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' سونہڑیں بولی۔ ''مجھے تو بھوک نہیں ہے...... مگر مہمان سے پوچھ لو۔'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

''مہمان......؟ کون مہمان......؟'' لائق ماچھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری چست نظروں نے فوراً اس کے چہرے اور لہجے سے جھلکتا مصنوعی پن تاڑ لیا تھا۔ وہ دانستہ انجان بن گیا تھا۔

''یہ مہمان......'' اس نے میری طرف اشارہ کرکے کہا۔

''یہ اور...... مہمان......؟ کیا کہتی ہو بھاجائی......؟ یہ تو قیدی ہے قیدی...... پتا نہیں سردار سائیں نے اسے یہاں کیوں بٹھایا ہے......'' لائق ماچھی نے میری طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ مجھے اس کی اندر کو دھنسی آنکھوں اور لہجے سے کینہ اور بغض کا چھپا ہوا زہر صاف نظر آرہا تھا۔

''لائقو......! تمیز سے بات کرو......'' سونہڑیں نے اچانک اسے جھڑک دیا۔ ''کیا پریل اتنا بے وقوف ہے کہ ایک قیدی کو یہاں بٹھائے گا؟ یہ اب پریل کا مہمان بن چکا ہے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔

''آپ نے شاید اب تک کچھ نہیں کھایا ہوگا...... آپ کے لیے کچھ منگوادوں......؟''

''نہیں...... نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔ شکریہ......'' میں نے کہا تو لائق ماچھی اس بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوکر ذرا اکھڑے لہجے میں بولا۔

''تم باہر آجاؤ، بھاجائی صاحبہ نے آرام کرنا ہوگا...... میں تمہیں دوسرے جھونپڑے میں......''

''یہ اِدھر رہے گا۔ جب تک پریل نہیں آجاتا......'' سونہڑیں نے اس کی بات کاٹی تو میں نے یک دم کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے یہ مناسب رہے گا۔ پریل کے آنے تک میں دوسری جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں لائق ماچھی کی طرف بڑھا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے ابھی تک ناگواری کے تاثرات مترشح ہورہے تھے۔

''آجاؤ......'' اس نے مجھ سے کہا اور میں اس کے پیچھے چل دیا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے کہ ایک پرائی چھوکری کے ساتھ رات کے اس وقت جھونپڑے میں اکیلے بیٹھے ہو......'' جھونپڑے سے باہر آتے ہی لائق ماچھی نے جیسے اپنے اندر کا زہر اُگلا...... میں نے بھی کوئی رعایت نہیں کی اور سرد لہجے میں اسے جواب دیا۔

''تھوڑی دیر پہلے پریل مجھے خود ہی یہاں لے کر آیا تھا اور دوستانہ ماحول میں میرے ساتھ باتیں کی تھیں، پھر اچانک اسے کہیں جانا پڑ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر چلا گیا، حالانکہ بعد میں، میں نے سونہڑیں سے کہا بھی تھا کہ میں کہیں اور جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔''

ماچھی نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لیے ایک دوسرے جھونپڑے میں آگیا۔ وہاں سگریٹ اور چرس کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی وہاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے اور ان کی مٹھیوں میں شاید چرس بھرے سگریٹ دبے ہوئے تھے۔ ان میں وہ دونوں ڈاکو بھی موجود تھے جن سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔

''اِدھر بیٹھ جاؤ......'' لائق ماچھی نے جھونپڑے کے ایک تاریک سے کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس گدلے اور پراگندہ سے ماحول میں میرا بیٹھنے کو تو کیا لمحہ بھر کے لیے کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

''میرا تو یہاں دم گھٹ جائے گا...... بہتر ہوگا کہ میں باہر ہی کہیں بیٹھ جاؤں...... مجھے کوئی دری شری لادو......''

میری بات پر وہاں جھونپڑے میں ایک زوردار قہقہہ پڑا۔ خود ماچھی کا چہرہ بھی...... طنز کی صورت اختیار کر گیا۔ اسی وقت تاش کھیلتے اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے لائق ماچھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''چھوٹے سائیں! صاحب کو باہر مسہری بچھادو...... جنگل کی تازہ ہوا میں تشریف فرما ہونا چاہتے ہیں۔''

''ہاہاہا...... ہاہا......'' اس کی بات پر ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا...... لائق ماچھی بھی ان کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔

''میرا خیال ہے میں خود ہی باہر جاکر اپنے لیے کہیں جگہ بنالیتا ہوں......'' کہتے ہوئے میں جھونپڑے سے باہر نکلنے لگا تو لائق ماچھی نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔

''تم اب یہاں سے باہر نہیں جاسکتے...... یہ میرا حکم ہے اور وڈے سردار سائیں کے بعد گروہ میں میرا ہی حکم چلتا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ایکا ایکی جارحانہ چمک نمودار ہوگئی۔ میرا اپنا دماغ بھی اس کی ڈھٹائی اور میرے ساتھ مسلسل ایسا سلوک روا رکھنے پر گھومنے لگا، لیکن میں اس کینہ پرور آدمی سے کسی قسم کا کوئی جھگڑا کرکے اسے موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

''تم مجھے کسی قید خانے سے نکال کر یا قیدی کی حیثیت سے یہاں نہیں لائے ہو...... جو مجھ پر اس طرح کا حکم چلا رہے ہو...... راستہ چھوڑو میرا...... میں باہر ہی کہیں بیٹھ جاتا ہوں......'' یہ کہہ کر میں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کے کاندھے سے اپنا شانہ ٹکراتا ہوا...... جھونپڑے سے باہر آکر کھڑا ہوگیا۔ قریب ہی جٹادار درخت کی جڑ اس طرح بنی ہوئی تھی کہ میں اس پر ٹک کر بیٹھ سکتا تھا۔

پیاس اور نیند سے میرا برا حال ہونے لگا تھا۔ پریل اگر کہیں نہیں جاتا تو شاید وہاں کھانے پینے کا دور چلتا...... تاہم مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کہ پریل کی غیر موجودگی میں اس کی محبوبہ کے ساتھ جھونپڑے میں یہ رات گزارتا...... عجیب سی صورتِ حال تھی اور تھکن کے مارے برا حال ہورہا تھا میرا...... ابھی مجھے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ موٹے موٹے جنگلی مچھروں نے مجھے پریشان کرنا شروع کردیا۔ اب میں کبھی اپنے گال پہ چانٹا رسید کرتا تو کبھی گردن پر...... لگتا ایسا ہی تھا جیسے باقی کی نصف رات اسی ''مارا ماری'' میں گزرے گی۔ ایک گھنٹا مجھے ہو چلا تھا...... میں سخت بیزار ہورہا تھا۔ پریل بھی ... پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ وہ اگر ہوتا تو کہیں آرام کی سبیل بنتی......

ایک بار تو جی میں یہ آئی بھی کہ بھاگ نکلوں۔ ہاتھ تو میرے یوں آزاد ہوچکے تھے مگر پھر یہ سوچ کر اب بات کچھ اور نہج پر آگئی تھی۔ پریل سے میرے دوستانہ روابط کی اُمید ہو چلی تھی اور یہی نہیں بلکہ اس کی محبوبہ بھی اپنی دکھیاری سہیلی ارم کی وجہ سے میری ہم خیال ہونے لگی تھی...... جس طرح لوہے کو لوہا اور زہر کو زہر کاٹتا ہے اسی طرح پریل کا یہ ڈاکو ٹولا شاہنواز خان کے مقابلے میں میری فل سپورٹ کرسکتا تھا۔ اگر میں فرار ہوجاتا تو کہاں جاتا؟ کیا کرتا بھلا......؟ اُلٹا انہیں بھی اپنا دشمن بنالیتا......

اسی وقت میں نے جھونپڑے سے اندر تاش کھیلتے ڈاکوؤں کو ہنستے قہقہے لگاتے باہر نکلتے دیکھا، مجھ پر انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی تھی اور آگے بڑھ گئے تھے۔

میں نے ان کی تعداد پر غور کیا...... وہ دو افراد (جن سے میری ہاتھا پائی ہوئی تھی) اور لائق ماچھی ہنوز اندر تھے۔ شاید یہ ان کا جھونپڑا تھا، یہ اور وہ اِدھر ہی آرام کرتے تھے۔ اچانک میں نے لائق ماچھی کو جھونپڑے سے باہر نکلتے دیکھا تو میں نے کچھ سوچ کر فوراً جڑ سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں موند لیں۔ لیکن ایک باریک جھری سے اس طرف دیکھنے بھی لگا۔

وہ جھونپڑے سے باہر نکل کر وہیں رک گیا تھا اور میری طرف گھورتا جاتا تھا۔ چند سیکنڈوں بعد وہ دوبارہ اندر چلا گیا۔ میں نے جھونپڑے کی روشنی مدھم ہوتے دیکھی...... اس کی سرکنڈوں کی مشرقی دیوار پر چھپر نما کھڑکی کی چوکھٹ نظر آتی تھی جو خاصے عقبی کونے میں تھی اور جہاں سے ان تینوں کے سائے لرزتے نظر آنے لگے تو مجھے کچھ کھٹکا ہوا...... میں تو یہی سمجھا تھا کہ یہ تینوں بھی اب آرام کرنے کی غرض سے روشنی گل کرکے سو جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ تب ہی میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔

''کیا یہ تینوں رات کے اس سے سر جوڑے بیٹھے تھے......؟ کیوں......؟''

میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ جنگل ڈیرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ جھینگروں اور مچھروں کی سمع خراش بھنبھناہٹ کے شور سے دماغ جھنجھنا رہا تھا۔ میں دھیرے سے سیدھا ہوا اور اسی طرف کو رینگ گیا جہاں مجھے ان تینوں کے سائے چھپر سی کھڑکی کی چوکھٹ سے کیروسین کی ہلکی روشنی میں لرزتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنا بھی دھیان کر رکھا تھا کہ کہیں اندر بیٹھے یہ تینوں میرا سایہ نہ دیکھ لیں...... تاہم جھونپڑی کے اس طرف چھوٹی بڑی خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، میں اسی طرف کو سینے کے بل پر رینگ گیا اور قدرے قریب میں جا دبکا۔ کھڑکی ظاہر ہے ہوا خوری کے لیے کھلی رکھی گئی تھی اور میں اس دیوار کے سہارے تھوڑا اُونچا ہوا اور کھڑکی کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

وہ تینوں بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، میں ان کی بولی تو سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن...... ان کے انداز گفتگو اور حرکات و سکنات سے کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بہت رازداری کے متقاضی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ جب میں ان کی زبان کا ایک لفظ بھی اُچکنے یا سمجھنے سے قاصر رہا تو اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ ایک خیال آیا کہ سونہڑیں کے پاس جا کر اسے ان کی باتیں سناؤں...... وہ ہی سمجھ سکے گی یہ تینوں آپس میں کیا گفتگو کر رہے تھے۔ ناکام ہونے کے بعد میں پلٹ کر واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر اچانک ایک خیال کے تحت میں دوبارہ اپنی جگہ سے ہلا اور اسی جھونپڑے کے اندر داخل ہو گیا۔

وہ تینوں مجھے دیکھ کر چونکے...... تینوں ہی چونکہ مجھ سے خار کھائے ہوئے تھے اسی لیے میری آمد پر انہوں نے بڑی ناگواری سے گھور کر دیکھا تھا۔ میں خاموشی سے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔ ماحول کا گدلا پن اب ویسا نہیں رہا تھا۔ نفری کم ہوتے ہی جھونپڑ کی فضا کچھ کھلی کھلی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

''اڑے او...... اندر کیوں آگیا ہے......؟ وہیں باہر بیٹھ...... جا چلا جا...... باہر...... ہم ضروری باتیں کر رہے ہیں۔'' لائق ماچھی نے میری طرف گھور کر زہرخند لہجے میں کہا۔

''باہر مچھر ہیں بہت...... سو نہیں پا رہا۔'' میں نے جواب میں کہا۔ ''تم لوگ بے شک آپس میں باتیں کرو...... مجھے کون سا تمہاری زبان سمجھ میں آرہی ہے......؟''

اسی وقت باہر کچھ کھڑبڑاہٹ ہوئی...... وہ تینوں اپنی گنیں سنبھالتے ہوئے یک دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میرا دل انجانے خدشات تلے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسی وقت انہی جیسے دو افراد اندر داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں روسی ساختہ کلاشنکوفیں دبی ہوئی تھیں۔ میں نے دیکھا اُن کے چہرے جوش سے سرخ ہو رہے تھے۔ وہ انہی کے ساتھی تھے۔ لیکن ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ وہی تھا جس کے ساتھ پریل اچانک کہیں نکل گیا تھا۔ اُس وقت میں، پریل اور سونہڑیں آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے، یہی وہ شخص تھا جو ایک دم اندر آیا تھا اور پریل کے کان میں جھک کر کچھ کہا تھا جس کے بعد پریل ایک دم ہی اُٹھ کر اس کے ساتھ کہیں چلا گیا تھا۔

بہرکیف...... مجھ پر ان کی نظر پڑی تو اُن کے چہرے جیسے تاریک پڑ گئے اور وہ دونوں جیسے سوالیہ نظروں سے لائق ماچھی کی طرف دیکھنے لگے اور ساتھ ہی ان میں سے ایک نے لائق ماچھی سے کچھ کہا بھی تھا۔ جس کا مختصراً جواب لائق ماچھی نے میری جانب ایک نگاہ ڈالنے کے بعد انہیں دیا تھا۔ صاف لگا تھا مجھے کہ انہوں نے میرے متعلق ہی چند گھڑی ...... آپس میں کوئی گفتگو کی تھی، اس میں ''سردار سائیں'' کے الفاظ ان پانچوں نے ہی دو تین بار دہرائے تھے۔ اس کے بعد ماچھی نے ان سے کچھ پوچھا تھا جس کا جواب ان دونوں نوواردافراد نے جوش اور فتح سے مسکراتے ہوئے دیا تھا۔

اب وہ پانچوں ہی خاصے پُرجوش اور خوش نظر آرہے تھے۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں ان کے چہروں پر مرکوز تھیں اور تب ہی پل کے پل مجھے کسی پُراسرار گڑبڑ کا احساس ہوا، یوں، جیسے اندر ہی اندر کوئی خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہو...... کوئی خفیہ کھیل جس میں کشت و خون اور لہو رنگ جذبات کی بُو آتی ہو...... لیکن اب فتح مندی اور خوشی جیسے جذبات کے علاوہ ان کی آنکھوں اور چہرے سے ایک اور رنگ بھی شعلہ فسوں ہو رہا تھا جس میں سفاکیت اور بے رحمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی نظر آتی تھی۔ ایکا ایکی میری چھٹی حس پھڑکنے لگی...... اور پھر مجھے...... ''خطرہ...... خطرہ......'' کا ایک نامعلوم سا احساس دلانے لگی۔ مگر میں فوراً ہی ان کے معاملے سے بظاہر لاتعلق ہو کر ایک کونے میں جا بیٹھا، جیسے مجھے اس سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو...... لیکن مجھے احساس تھا کہ یہ لوگ اب دھیمی دھیمی آواز میں میرے ہی بارے میں آنکھوں سے اشارہ کر کے باتیں کر رہے تھے۔ پھر جیسے وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئے اور یک بیک میری طرف دیکھنے لگے......

''کھڑے ہو جاؤ......'' دفعتاً ہی لائق ماچھی نے حکم دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''خیریت تو ہے...... کیا کوئی گڑبڑ ہوئی مجھ سے......؟'' میں نے کہا اور پھر اسی ڈاکو کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''سردار سائیں پریل تمہارے ساتھ ہی گیا تھا۔ وہ اب کہاں ہے؟''

میری بات پر لائق ماچھی کی اندر کو دھنسی ہوئی کینہ پرور آنکھوں میں سفاکی کی لہر اُبھری اور اس کی گھنی مونچھوں تلے ہونٹوں پر زہرخند مسکراہٹ رقصاں ہو گئی جبکہ جس سے میں مخاطب ہوا تھا، میری بات پر اس کے چہرے پہ کئی رنگ آکر گزر رہے تھے۔ اس نے کچھ خاص اسرار بھری نظروں سے لائق ماچھی کی طرف دیکھا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کوئی جواب دیے بغیر اپنے انہی دونوں ساتھیوں ...... جن سے میری ہاتھا پائی ہو چکی تھی، ایک سے کچھ بولا۔ وہ جیسے مجھ پر پہلے ہی اُدھار کھائے بیٹھا تھا، فوراً چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور ایک مضبوط سی رسی اُٹھا لایا...... یکلخت میرے پورے وجود میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں...... سنسنی کی اس تیز لہر نے جو سرتاپا میرے اندر سرایت کرتی چلی گئی تھی، پل کے پل مجھے باور کرا دیا کہ کچھ ایسا ہو چکا ہے جسے ''سازش'' کہا جاتا ہے۔ یہ سب...... یعنی پانچوں کے ہاتھوں میں اس وقت گنز دبی ہوئی تھیں جبکہ میں نہتا تھا...... لیکن نہیں...... میرے ہاتھ اگر ایک بار باندھ دیے جاتے تو پھر میں کسی بھی بڑی مصیبت کا شکار ہو سکتا تھا۔ ایک اور لرزتا ہوا خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

''سونہڑیں......'' اسی لڑکی کا خیال ایک متوقع خدشے تلے آیا تھا میرے ذہن میں کہ کیا اب وہ بھی کسی قسم کی سازش یا خطرے کا شکار ہونے والی تھی؟ بازی میرے ہاتھ میں آتے آتے پھسلنے لگی تھی۔ تقدیر ساتھ دیتے دیتے پلٹنے لگی تھی۔ پھر یہی وہ وقت تھا جب میرے اندر کا ''پاور ایجنٹ'' ایک بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہوا...... میں جھونپڑے کے دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ دونوں نوواردا اندر آکر وسط میں کھڑے تھے۔ لائق ماچھی اور اس کا ایک ساتھی ان کے آمنے سامنے تھے جبکہ ایک ڈاکو اپنے ہاتھوں میں رسی اُٹھائے میری جانب بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے ایک خاص زاویے سے ان کے اور اپنے درمیان ساتے پایا، میرے پیروں میں جیسے پارا دوڑ گیا۔

سوال

اسپتال کی تعمیر کے لیے بنیاد کھودی جا رہی تھی۔ قصبے کی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین بھی معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک حاضر جواب لڑکے نے اس سے پوچھا۔ ''یہ گڑھے کس لیے کھودے جا رہے ہیں؟''

چیئرمین لڑکے کو پہچان کر مسکرایا اور بولا۔ ''ان گڑھوں میں قصبے کے سارے بدمعاشوں کو ڈال دیا جائے گا۔''

لڑکے نے برجستہ کہا۔ ''اگر سارے بدمعاش ڈال دیے جائیں گے تو ان پر مٹی کون ڈالے گا؟''

ساہیوال سے محمد اکرام کا استفسار

جنرل شرمن کے اعزاز میں ایک تقریب ہو رہی تھی۔ جنرل نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں جہنم اور ٹیکساس دونوں کا مالک ہوتا تو ٹیکساس کو کرائے پر دے دیتا اور جہنم میں رہنا پسند کرتا۔''

ٹیکساس کا ایک باشندہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''آپ نے بالکل درست فرمایا۔ ہر شخص اپنے وطن میں رہنا پسند کرتا ہے۔''

کراچی سے نورالعین کا تعاون

جاپانی کہاوت

''تم جوانی سے جتنا دور ہوتے جاؤ گے، ورزش کے لیے تمہیں اتنا ہی زیادہ پیدل چلنا پڑے گا۔''

''تمام پیدائشی احمق یہی سمجھتے ہیں کہ وہ پیدائشی عقلمند ہیں۔''

''بیماریِ دل کا علاج یہ ہے کہ کسی اور کی بیماریِ دل کا علاج کیا جائے۔''

''وہ جو اپنے ہاتھ پاؤں سے کام کرتا ہے مزدور ہے۔ وہ جو دماغ سے کام کرتا ہے سائنس داں یا سیاست داں ہے...... مگر وہ جو صرف دل سے ہدایت لے کر کام کرتا ہے شاعر ہے، عاشق ہے یا احمق ہے۔''

ڈھاکا سے نہال خرم کا مطالعہ

میں نے اسی وقت ایک جست بھری اور دروازے سے باہر جا پڑا...... گرتے ہی میں نے فوراً اُٹھ کھڑے ہونے کی بے وقوفی نہیں کی تھی، کیونکہ مجھے یقین تھا کہ جھونپڑے سے مجھ پر برسٹ چلایا جائے گا، مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، نچلا میں پھر بھی نہیں بیٹھا تھا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل زمین پر ''کرولنگ'' کرتا ہوا بائیں جانب کی گھنی جھاڑیوں کی طرف نکلتا چلا گیا۔ تاہم اس دوران میں نے ان پانچوں کو جھونپڑے کے اندر سے نکلتے ضرور دیکھا تھا۔ لائق ماچھی تو اپنی گن سنبھالے وہیں کھڑا رہا تھا مگر اس کے باقی ساتھی میری تلاش میں پھیل گئے تھے۔ مجھے ابھی تک اس بات پر حیرت تھی کہ انہوں نے مجھ پر فائرنگ کیوں نہیں کی تھی؟

میں ایک دو جھونپڑیوں کے عقب سے اسی طرح آگے بڑھتا ہوا ایک جگہ دبک کر ٹھہر گیا، ایسا میں نے کچھ سوچ کر کیا تھا کیونکہ میرے تعاقب میں ایک ڈاکو آرہا تھا۔ بیشتر جھونپڑوں پہ سناٹا طاری تھا۔ ساری رات غل غپاڑا کرنے کے بعد وہ سب شاید بے سدھ سو رہے تھے۔ یہاں معاملے کی گمبھیرتا کی بُو میں نے سونگھ لی تھی۔

وہ ڈاکو ٹارچ کی روشنی ڈالتا ہوا میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ میں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ اگر ایسا ہے تو میں بھی اسی رازداری کے ساتھ اس گہری سازش سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کروں گا...... وہ ڈاکو ٹارچ کا چمکارا جھاڑیوں میں مارتا ہوا جیسے ہی میرے قریب آیا، میں چیتے کی طرح اُچھل کر اس پر پل پڑا اور سب سے پہلے اس کی گن پر ہاتھ مارا، وہ اس حملے کے لیے تیار نہ تھا ہوتا بھی تو پھر بھی مار کھا جاتا، میرا حملہ ہی ایسا خطرناک اور چابک دست تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری تو ٹارچ بھی دوسرے ہاتھ میں نہ رہی، تب تک میں نے اپنا دایاں بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کر کے ایک مہیب جھٹکے کے ساتھ اس کا منکا توڑ ڈالا۔ اس کا وجود زندگی کی روح سے خالی ہوتے ہی ڈھیلا پڑ گیا، میں نے اس کی لاش گھسیٹ کر ایک طرف کھڈ میں ڈال دی اور گن اُٹھالی۔ ٹارچ بھی اٹھا کر میں نے بجھا دی تھی اور اسے اپنی پتلون کی بیلٹ میں اڑس لی تھی۔ گن سنبھالے میں اسی لائق ماچھی والے جھونپڑے کی طرف پلٹا۔ میں شکاری چیتے کی طرح جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا جھونپڑے کے قریب پہنچا تو وہاں لائق ماچھی ہنوز اسی طرح کھڑا دکھائی دیا۔

میں چند ثانیے اپنی جگہ دبکا اس کی حرکات وسکنات کا انداز کرتا رہا۔ وہ جلدی جلدی سگریٹ پی رہا تھا اور اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا تھا، تب ہی جب میں نے اس پر جھپٹنے کا ارادہ کیا تھا تو وہ جلدی سے ایک طرف کو بڑھ گیا۔ میں بھی تاریکی میں جھاڑیوں کی آڑ لیے اس کے پیچھے ہولیا۔ اس کا رخ سونہڑیں کے جھونپڑے کی طرف تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ دروازے پر پہنچا، میں بھی چھپتا چھپاتا آگے بڑھا، ٹھیک اسی وقت جب وہ سونہڑیں والے جھونپڑے کے اندر قدم رکھ چکا تھا، مجھے اپنے عقب میں جھاڑیوں کی تیز سرسراہٹ سنائی دی۔ میں جنگلی بلے کی طرح بدک کر پلٹا اور اسی وقت ایک شخص نے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس کے جھپٹتے ہی میں بھی لپکا اور ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ اس نے کلاشنکوف کا کندا میری کنپٹی پر مارنے کی کوشش چاہی تھی، یہ کوشش اگر کامیاب ہو جاتی تو میں گیا تھا، میں نے اس کا ہاتھ روکا مگر پھر بھی کندے کا بھاری وار میرے شانے پر پڑا، ایک لحہ کو وہ مجھے چٹختا ہوا لگا، نتیجے میں میرے حلق سے کراہ خارج ہو گئی مگر اس تکلیف کے ساتھ میرا دماغ بھی بھنا گیا تھا۔ تکلیف ایسے ہی جوش کو مہمیز کرنے کا سبب بنتی ہے، میں نے اس کے جبڑے پر مکا رسید کر دیا۔ اول تو اسے مجھ سے شاید اس قدر زورآزمائی کی توقع نہ تھی، دوسرے میرے مکے کی ضرب نے اسے سمجھا دیا تھا کہ میں نچلا رہنے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ وہ تکلیف سے گھٹی گھٹی آواز میں چیخا اور تب ہی مجھے اس کے چہرے کو قریب سے بغور دیکھنے کا موقع ملا تو میں ٹھٹکا، یہ وہی تھا جو پریل کو اپنے ساتھ لے کر کہیں گیا تھا۔

پل کے پل کچھ سوچ کر میرے ذہن نے پلٹا کھایا اور اسے مارنے یا انٹاغفیل کرنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے میں نے اس پر قابو پانے کا فیصلہ کیا اور پھر میرے ہاتھ پاؤں میں بجلی دوڑ گئی، میں نے سب سے پہلے اسے کلاشنکوف جیسے خطرناک ہتھیار سے محروم کیا۔ مگر اس کوشش میں اسے میرے پیٹ پر کہنی رسید کرنے کا موقع مل گیا، دوبدو لڑائی کے ایسے موقعوں پر کہنی کی پہلو یا پیٹ میں پڑنے والی ضرب بڑی جاں کش ہوتی ہے اور چند ثانیوں کے لیے وہ بندے کو ڈھا دیتی ہے۔ اسی سبب میں سب سے پہلے اس مہیب وار کا خیال رکھتا تھا۔ اسی لیے اپنے پیٹ کو میں سخت کر دیا کرتا تھا۔ اس کی کہنی کی ضرب میرے پیٹ پر پڑی تھی اور یقیناً اسے بھی اس ''سختی'' کا احساس ہوا ہوگا، مگر میں اس پر جلد قابو پا کر اپنی دھاک بٹھانا چاہتا تھا اور یہی میں نے کیا۔ کہنی کی مہیب تکلیف کو معمولی کرنے کا گُر آزمانے کے بعد میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔

اس کی شاید دانتوں تلے زبان آگئی تھی یا پھر کوئی دانت ٹوٹ گیا۔ کیونکہ دو ثانیوں بعد ہی اس کے منہ سے بھل بھل خون بہہ نکلا تھا۔ ساتھ ہی وہ گھٹے گھٹے انداز میں کراہنے بھی لگا، میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس کا دایاں ہاتھ گھما کر اس طرح مروڑ ڈالا کہ اسے پشت کے بل ہو جانا پڑا اور اس پر سوار ہو گیا۔

اس کا بازو ٹوٹنے کے قریب ہو گیا اور اس نے منہ کھول کر چیخنا چاہا تو دوسرے ہاتھ سے ـــ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس کا چہرہ بھربھری مٹی والی زمین کے ساتھ لگا دیا۔ اس کی چیخ نہ صرف گھٹ کر رہ گئی بلکہ منہ سے خارج ہونے والی ہوا کے باعث مٹی اُڑ کر اس کی اپنی ہی آنکھوں میں پڑ گئی۔

''مجھے ایسا ویسا آدمی سمجھنے کی غلطی مت کرنا......'' میں اس کی پشت پر سوار ہو کر اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔ ''تمہارے ایک ایک ساتھی جو اس سازش میں شریک ہیں میرے ہاتھوں انجام کو پہنچ رہے ہیں، اپنی جان کی بخشش چاہتے ہو تو سچ سچ بتاؤ......تم نے سردار سائیں کے ساتھ کیا کیا ہے؟''

وہ جواب دینے کے بجائے غراہٹ سے مشابہ آوازیں خارج کرنے لگا تو میں نے ایک ہاتھ سے اس کا مروڑا ہوا بازو مزید گھمایا اور ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ مٹی میں بھی دبایا۔ وہ تکلیف اور دم گھٹنے سے خرخرا کر رہ گیا۔

''بازو ٹوٹنے کے بعد تمہاری گردن کی باری آئے گی......اس سازش سے میں پردہ تو اُٹھا ہی لوں گا کیونکہ اس کا یقین ہو چکا ہے۔ مگر تُو جان سے جائے گا...... آخری بار پوچھ رہا ہوں......''

میں نے اس کے بازو پر دباؤ کم کیا اور بالوں سے پکڑ کر اس کا سر اُٹھایا۔

''جواب دو......''

ٹھیک اسی وقت مجھے اپنے عقب میں کسی کی آہٹ سنائی دی اور پھر پہلے اس سے کہ میں سنبھلتا...... میرے سر پر بھاری اور کندشے کا وار ہوا اور میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا......

☆☆☆

ہوش آیا تو پہلا احساس مجھے شور کا ہوا...... کھلتی آنکھوں کے سامنے پہلے تو تارے سے ناچتے رہے، اس کے بعد سر کے پچھلے حصے میں درد کا احساس ہوا اور بے اختیار چوٹ سہلاتے ہوئے میرے منہ سے تکلیف کی کراہ خارج ہو گئی۔ سر کے پیچھے مجھے گومڑ کا احساس ہوا۔ اس میں شدید دکھن ہو رہی تھی اور جس نے پورے وجود کو تھکا مارا۔ سستی اور نقاہت کا احساس الگ ستانے لگا تھا۔ وجہ اس کی میرا بھوکا پیاسا ہونا تھا۔ حلق میں تھور اُگے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں نے چاہا سر جھٹک کر آنکھوں کے گرد طاری اندھی لہروں کو ہٹا دوں، مگر یہ سوچ کر ہمت نہ کر سکا کہ اس طرح گومڑ کی دکھن اور سوا ہو جائے گی۔ ایک خوش کن احساس ہوا تھا کہ میں شاید رسن بستہ نہیں تھا، لیکن یہ میری خام خیالی ہی رہی جب میں نے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو میرے ایک پاؤں میں سنگل ڈلی ہوئی تھی جس کا دوسرا سرا زمین میں گڑے آہنی کلے سے بندھا ہوا تھا۔ جبکہ ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں کے کنڈے ہنوز اسی طرح بندھے ہوئے تھے۔

اپنے اطراف کے جائزے سے لگتا تھا میں ابھی تک ڈاکوؤں کے چنگل میں ان کے جنگل ڈیرے میں ہی تھا اور یہ تنگ سا جھونپڑا تھا جہاں صرف زمین، جھونپڑے کی چھت اور صرف میں ہی تھا۔ کھڑکی کوئی نہیں تھی۔ نکاسی کی راہ میں کوئی گن بردار بیٹھا ہوا نظر آرہا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ باہر مجھے صبح کاذب کی روشنی بھی پھیلی ہوئی نظر آرہی تھی۔

مجھے پیاس اور بھوک کے مارے چکر آنے لگے، ہونٹوں پہ پپڑیاں جم گئی تھیں، سوکھے حلق سے آواز تک برآمد نہیں ہو پا رہی تھی نہ ہی کچھ سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کا ذہن میں یارا ہو رہا تھا۔ نقاہت کی ایک اور وجہ شاید میرے سر کا زخم بھی تھا، جہاں چوٹ لگنے کے بعد کافی سارا خون بھی بہہ گیا ہوگا۔ تاہم پھر بھی میں نے حلق سے بہ بمشکل آواز نکالی۔

''پپ...... پانی...... کک......کوئی ہے......؟ پانی پلا دو مجھے......''

اتنی سی ہی آواز نکال کر میں زمین پر پڑا ہانپنے لگا۔ تب ہی میں نے دیکھا اس شخص کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی گن سنبھالتے ہوئے گردن گھما کر میری طرف دیکھا تھا پھر اندر آنے کے بجائے وہ غائب ہو گیا۔

میں یہی سمجھا تھا کہ وہ پانی لینے گیا ہوگا مگر اس کی واپسی پانی کے بجائے چند افراد کے ساتھ ہوئی۔ یہ چار کی

تعداد میں تھے اور میرے شناسا بھی۔ انہیں دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سی سانس خارج ہوگئی۔ یہ لائق ماچھی تھا اور باقی اس کے وہی ساتھی تھے۔

میرا ذہن رفتہ رفتہ اب کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہونے لگا تھا۔ میں کس طرح ان کے دوبارہ نرغے میں آگیا تھا۔

''پ...... پانی...... خدا کے لیے مجھے ایک گلاس پانی پلادو......'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ لائق ماچھی نے غصے سے اپنے دانت بھینچتے ہوئے میرے پہلو میں اپنے پاؤں کی ایک زوردار ٹھوکر رسید کردی۔ میں پہلے ہی جسمانی تکلیف، کمزوری اور بھوک پیاس سے نڈھال ہورہا تھا، پہلو میں پڑنے والی اس جاں کش ضرب نے گویا میری رہی سہی طاقت بھی ختم کردی۔ مجھ میں تو اب درد سے چیخنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ بڑا برا پھنسا تھا میں...... گویا ایک دلدل سی تھی کہ جس قدر ہاتھ پاؤں چلاتا تھا اُتنا ہی اندر دھنستا چلا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی ڈوبتی سماعتوں میں لائق ماچھی کی غراتی ہوئی آواز گونجی۔

''صرف میرے سوالوں کا جواب دو...... تمہیں کیسے ہماری سازش کا پتا چلا......؟ تم تو ہماری زبان بھی نہیں جانتے تھے؟''

''م...... مجھے کچھ نہیں معلوم...... م...... تو محض ایک اندازہ قائم کررہا تھا...... اور تمہارے سامنے ہی تو تھا۔'' میری یہ دلیل شاید اس کی سمجھ میں آگئی اور پھر وہ ایک پُرغرور سا قہقہہ خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم خاصے ذہین ہو...... واقعی میں ایک سازش کے تاروپود بُن رہا ہوں اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوچکا ہوں......''

''م...... مجھے تم لوگوں کے اندرونی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... بس...... میری جان چھوڑ دو اور...... مجھے یہاں سے جانے دو......'' میں نے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا تو وہ انتہائی زہریلے لہجے میں بولا۔

''ایسے کیسے تجھے جانے دیں گے ہم...... جب تک کہ وہ ہیرا ہمارے قبضے میں نہیں آجاتا......''

''ہیرا......؟'' میں دانستہ انجان بن گیا۔ ''کیسا ہیرا......؟ کک...... کونسا ہیرا......؟''

اچانک ہی مجھے اس کے حلق سے بھیڑیے جیسی غراہٹ اُبلتے سنائی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنا ایک پاؤں میری گردن پر رکھ دیا اور اس پر دباؤ بڑھانے لگا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے اس کے بھاری پاؤں کے جوتے تلے دباؤ سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے، زمین پر پڑے اپنے لمبے چوڑے وجود کو کسمسانے کی کوشش چاہی مگر بے سود...... ایک ذرا ناکام سی حرکت کے بعد میں ساکت ہوگیا۔

''مجھ سے چالاکی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی......'' وہ اپنی آنکھوں میں نفرت وغیظ کا سارا زہر سموتے ہوئے بولا۔ وہ مجھ پر خاصا جھک آیا تھا۔

''میں اسی ہیرے کی بات کررہا ہوں جس کے بارے میں رات تم، پریل اور اس کی محبوبہ کے جھونپڑے میں باتیں کررہے تھے۔''

''اگر...... یہ بات ہے تو پھر تم نے یہ بھی ضرور سن لیا ہوگا کہ وہ ہیرا اب میرے بجائے کس کے پاس ہے......'' میں نے بالآخر سچ اُگل دیا۔ میرے اندر مزید زخم سہنے کی تاب نہ تھی۔

''خ خ...... خدا کے لیے اب مجھے پانی پلادو اور یہ ٹانگ میری گردن پر سے ہٹادو...... میں سانس نہیں لے پارہا ہوں......''

اس ذلیل شخص نے اتنا تو رحم کیا مجھ پر اور اپنا پاؤں میری گردن سے ہٹادیا۔ مجھے کھانسی کا ٹھسکا لگ گیا اور میں دو تین بار کھانس کر رہ گیا۔ میں ہانپنے لگا۔ تب ہی لائق ماچھی کو...... اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہتے سنا۔ ''پاڑیں'' کا لفظ ہی سمجھ پایا تھا۔ جو یقیناً ''پانی'' ہی ہوسکتا تھا۔

''میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں......'' وہ اس بار انسانوں کی طرح میرے پاس اکڑوں بیٹھ کر بولا۔ ''وہ ہیرا تمہاری کسی ساتھی لڑکی کے پاس تھا جس کے پیچھے وڈیرے شاہنواز نے اپنے آدمی دوڑائے تھے۔ خیر...... میں دیکھتا ہوں......''

یہ کہہ کر وہ واپس پلٹ گیا۔ جھونپڑے میں ایکا ایکی سناٹا طاری ہوگیا۔ پتا نہیں یہاں اب ان لوگوں کے درمیان آپس میں کیا کھچڑی پکنے لگی تھی۔ مجھے اس کا کچھ زیادہ اندازہ نہیں ہو پارہا تھا۔ البتہ ہیرے...... کی مصیبت یہاں تک آپہنچی تھی، دولت چیز ہی ایسی ہوتی ہے...... ایک کے بعد ایک فتنہ کھڑا کرتی ہے...... ایسے ہی تو نہیں اس روئے زمین پر زن...... زر اور...... زمین کو سب سے بڑے فتنے کی جڑ کہا گیا ہے۔

تھوڑی دیر میں اس کا وہی ساتھی جو باہر پہرے پر بیٹھا تھا جست کے ٹیڑھے میڑھے جگ میں پانی لے آیا...... میں اب اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اس نے جگ مجھے تھما دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے جگ لیتے ہی اپنے منہ سے لگالیا اور غٹاغٹ چڑھانے لگا، یہاں تک کے خوب سیر ہوگیا۔ صحیح کہا گیا ہے کہ بھوک سے زیادہ پانی کی طلب پریشان کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ پانی پیتے ہی میری جان میں جان آگئی اور میں کچھ سوچنے سمجھنے اور ہلنے جلنے کے قابل ہوسکا...... پانی کی کمی نے تو جیسے میرے پورے بدن کی طاقت ہی چھین لی تھی۔ لیکن نقاہت اپنی جگہ تھی۔ حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے اسے پھر آواز دی۔

''اب کیا ہے......؟ چپ ہوکے پڑے نہیں رہ سکتے تم......؟'' اس نے مجھے باہر سے ہی بیٹھے جھڑک دیا۔

''یار......! کچھ کھانے کو نہیں مل سکتا......''

''مل جائے گا...... تیار ہورہا ہے......'' اس نے کہا۔ مجھے کچھ تسلی ہوئی، میں نے پھر اسے پکارا۔

''کیا تم بتاسکتے ہو کہ تمہارا سردار سائیں واپس لوٹ آیا ہے......؟''

''بس! اب خاموش پڑے رہو...... ورنہ کھانا نہیں دوں گا......'' اس نے درشت لہجے میں دھمکی دی...... مجھ میں بھی اب زیادہ بولنے کی سکت کہاں رہی تھی۔

پریل دھاڑیل المعروف سردار سائیں کے ساتھ ضرور کچھ ہوچکا تھا...... ورنہ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک روا نہ رکھا جاتا۔ مجھے سونہڑیں کی بھی فکر ہوئی...... وہ ارم کی سہیلی تھی۔ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی، لیکن اس غریب کو بھلا کیا معلوم کہ وہ خود تقدیر کے چکر میں آگئی تھی۔

وہ بے چاری تو پریل کے عشق میں اپنا سب کچھ تیاگ کر یہاں چلی آئی تھی اور اب سونہڑیں کا واحد سہارا پریل تھا لیکن اب اگر خدانخواستہ پریل کے ساتھ کچھ ایسا ویسا ہوچکا تھا تو...... میں کڑے دل سے سوچنے لگا کہ اس غریب کا کیا ہوگا...... یہ تو پھر نہ اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی...... یا ممکن ہے وہ گھر لوٹا دی جائے، مگر بدطینت اور شیطان صفت لائق ماچھی سے ایسی انسانیت کی رتی بھر بھی توقع نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہیرے کے راز سے بھی آگاہ ہوچکا تھا۔ ہر شخص کی نیت اس کے لیے خراب ہورہی تھی۔

وقت انہی وسوسہ انگیز اور اندیشناک لمحات کے جلوؤں میں بڑھتا رہا۔ اتنے میں ایک بڑے سے چھابے میں وہی آدمی میرے لیے کھانے یا ناشتے کے نام پر کچھ لے آیا۔

میں اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ ایک مگ میں چائے تھی۔ پراٹھا تھا اور اس پر مصالحے دار آلو رکھے تھے، جبکہ مجھے دو تین پراٹھوں کی تو بھوک تھی ہی...... خیر اس پر بھی میں نے شکر کیا کہ ملا تو سہی کچھ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے...... سو وہ منٹوں میں چٹ کرگیا۔ بھوک اور پیاس سے جان چھوٹی تو میں نے مفر کی راہ پر غور کرنا شروع کردیا۔

میری عقابی نظروں اور زیرک دماغ نے فوراً تاڑ لیا کہ میں بیک وقت چالاکی اور ہمت سے اس سنگل سے نجات حاصل کرسکتا ہوں، جو ''سنگل'' ہی تھی۔ ہاتھ میرے آزاد تھے۔ میں نے ایک نظر اس آدمی کی طرف دیکھا، وہ کھلے دروازے کی طرف پشت کیے دوسری طرف دیکھ رہا تھا اور سگریٹ بھی پیے جارہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ بھی تھا۔ گاہے بہ گاہے وہ اپنی صرف گردن موڑ کر میری طرف دیکھ کر میری موجودگی کی تسلی کرلیا کرتا تھا۔

میں نے اسی دوران ہی پہلے سنگل کے اس کڑے کا ہاتھ پھیر کر جائزہ لیا جو میری داہنی ٹانگ کے ٹخنے والی جگہ پر بندھا ہوا تھا، وہ خاصا مضبوط نظر آتا تھا، دوسرے میں نے ذرا آگے بڑھ کر اس ''کِلّے'' کا جائزہ لیا جو زمین میں گڑھا ہوا تھا، سنگل کا دوسرا سرا اسی کلّے سے منسلک تھا۔ یہ مجھے گھوڑوں کو باندھنے والا ہی سنگل اور کلا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے کلّے کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے اُکھیڑنے کی معمولی سی کوشش کرکے دیکھا اور پھر ٹانگیں سکیڑ کر مایوس چہرے کے ساتھ بیٹھا رہا۔

کیونکہ اسی وقت کھلے دروازے کے باہر موجود ڈاکو نے حسب سابق اپنی گردن موڑ کر میری طرف ایک ذرا نظر سے دیکھا تھا۔ جب اس نے اپنی تسلی کرنے کے بعد میری طرف سے اپنا چہرہ گھمالیا تو میں نے اس بار کلّے کو اکھیڑنے کی باقاعدہ کوشش شروع کردی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ تک نہیں ہل سکا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ زمین میں کافی گہرائی تک گاڑا گیا تھا۔ بے بسی کے مارے میں جھلا سا گیا۔ میں نے اس کلّے سے منسلک فولادی کڑے کا بھی جائزہ لیا۔ وہ بھی مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ ہتھوڑے چھینی کے بغیر اس کا ٹوٹنا ممکن نہ تھا۔

کھا پی کر کچھ جان میں جان آچکی تھی۔ ذہن سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر اور گزری، صبح کی سحر خیزی تیز دھوپ اور بلا کی گرمی میں بدلتی جارہی تھی۔ اس جھونپڑے میں پنکھے وغیرہ کا کوئی بندوبست

نہیں تھا۔ میں مسلسل سوچ بچار میں ڈوبا ہوا تھا کہ یہ سب چکر کیا ہے...... لائق ماچھی تو پریل ڈاکو کا قریبی تھا۔ مگر اب اس کا رویّہ بے چین کر رہا تھا۔

میرے قیاسات اور تجزیے مسلسل جاری تھے۔ میں نہایت باریک بینی اور حالات کو آبزرو کر کے ہی یہ محتاط اندازے قائم کیا کرتا تھا۔ اب یہ میری بدقسمتی ہی تھی کہ ڈاکوؤں کے اس گروہ کے سردار سے میری دوستی ہوتے ہی اس سازش کے تاروپود کھینچ دیے گئے تھے۔ پریل غائب تھا یا کر دیا گیا تھا، میں ایک بار پھر ان کی قید میں تھا اور سونہڑیں بے چاری کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کس حال میں تھی......؟

اچانک مجھے باہر کہیں شور کی آواز سنائی دی، میں ٹھٹکا...... اسی کے ساتھ دو تین فائر ہوئے اور ایک برسٹ چلا...... میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا کہ نجانے اب کیا نیا ماجرا ہو چلا تھا......؟ پہرے دار کو بھی میں نے اچھل کر کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس نے ایک گردن موڑ کر ایک نظر میری طرف ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ اب خاموشی چھائی رہی۔ کئی لمحات اسی طرح نامعلوم اور اندیشوں بھرے وسوسوں تلے بیت گئے۔ نصف گھنٹے بعد میں نے اسی پہرے دار کو واپس آتے دیکھا۔ وہ کافی خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر میری طرف بڑھائی۔

''لو...... نئے سردار کی خوشی میں سگریٹ پیو......'' وہ خاصا ترنگ میں تھا۔ لوگ نشے کی پینک میں تو بہکتے ہی ہیں مگر خوشی کا نشہ بھی کم نہیں ہوتا۔ اس میں بھی انسان ترنگ میں آ جاتا ہے۔ یہ فتح اور غرور کا نشہ ہوتا ہے۔ میں نے بھی اسے اسی نشے میں بہکنے دیا اور شکریہ کہہ کر اس سے سگریٹ لے کر اپنے ہونٹوں میں داب لی۔ اس نے دیا سلائی جلائی اور جھک کر میری سگریٹ سلگانے لگا تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ وہی حرکت کر ڈالی...... جس کے بارے میں پہلے ہی میں ارادہ کیے ہوئے تھا اور ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ ایک طرح سے میرے دونوں ہی ہاتھ آزاد تھے۔ پیروں کو بھی ایک حد تک حرکت دے سکتا تھا۔ البتہ کام رِسکی تھا...... میری اس خطرناک مہم جوئی کے دوران ان کا کوئی بھی ساتھی یہاں آ سکتا تھا۔ اسی سبب مجھے یہ ''کام'' فوری طور پر نمٹانا تھا۔ میرے فیصلے کی قوت تھی کہ میں سوچتا اور اس پر عمل کر ڈالتا تھا۔ زیادہ غور کرنے سے کئی سقم ازخود پیدا ہونے لگ جاتے ہیں...... میرا تجربہ تھا کہ وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً فیصلہ کن قدم اُٹھا لینا چاہیے اور...... میں نے یہی کیا تھا۔ میں نے اس کی جھکی ہوئی گردن پر جھپٹا مار کر دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی...... اور دباتا چلا گیا۔

یہ سب تیزی سے کرنے کا متقاضی تھا اسی لیے میں نے اسے سنبھلنے کا ایک ذرا بھی موقع دیے بغیر جھٹکا دے کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا۔ وہ جھول گیا، میں نے اسے ایک طرف پھینکا اور گن قبضے میں کر لی۔ اسے سنبھال کر میں نے سنگل شاٹ پر اسے ایڈجسٹ کیا اور نال سنگل پر رکھ کر فائر کر دیا۔

جھونپڑے میں گولی چلنے کی دھماکے دار آواز اُبھری، گرد و غبار کا بادل سا اُڑا اور سنگل ٹوٹ گئی۔ میں جانتا تھا کہ گولی کی آواز پر کوئی اِدھر متوجہ ہو سکتا تھا اسی لیے میں صرف ایک دو لمحات کے درمیان ہی جھونپڑے سے نکل کر ایک طرف کی گھنی جھاڑیوں میں بھاگا...... ان کی یہ خفیہ پناہ گاہ جو ''جنگل ڈیرے'' سے منسوب کی گئی تھی۔ خاصے گھنے جنگل میں تھی۔ یہاں موٹے چوڑے تنوں والے گھنے درختوں، سرکنڈوں اور قدِ آدم خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی، سورج کی کرنیں بھی چھن کر آ رہی تھیں، کہیں تو دن میں بھی اندھیروں کا گماں ہونے لگتا تھا۔

میں انہی جھاڑیوں میں دبک کر چند ثانیے کے لیے اطراف کی سن گن لیتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی تھی ابھی تک کوئی ردِعمل یا گولی کی آواز پر کسی قسم کی ذرا بھی نقل و حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔ ممکن تھا یہاں اس طرح کی اِکا دُکا گولی چلنا عام بات رہی ہو...... یا پھر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی شور اور فائرنگ بھی ہوتی رہی تھی۔ وہ کیا معاملہ تھا مجھے ابھی اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ میں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا...... اس طرف بڑھا جہاں سونہڑیں یا پریل دھاڑیل کا جھونپڑا تھا۔ اچانک ہی میں ایک آواز پر ٹھٹک گیا۔ اپنے سیدھے ہاتھ کے ذرا عقب میں مجھے چار افراد دکھائی دیے، انہوں نے دو آدمیوں کی لاشیں اٹھا رکھی تھیں جو خون میں لت پت نظر آ رہی تھیں۔

وہ اسے شاید کہیں ٹھکانے لگانے جا رہے تھے۔ میری پیشانی پر پُرسوچ سی سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ نجانے کیا کھچڑی پک رہی تھی یہاں...... میں نے انہیں گزر جانے دیا اور دوبارہ حرکت کی۔

کچھ ہی سیکنڈ کے بعد میں اپنے مطلوبہ جھونپڑے کے نزدیک جا پہنچا۔ اس کا پچھواڑا میرے سامنے تھا۔ وہاں میں نے کچھ مسلح ڈاکوؤں کو دیکھا۔ سامنے نظر آنے والے

ان ڈاکوؤں کی تعداد چار پانچ تھی۔ کتنے جھونپڑے کے سامنے کے رخ پر تھے۔ مجھے اس کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اندھا دھند ان سے جا بھڑنا، بے وقوفی ہوتی۔ یہ یہاں پر پورے گروہ کی صورت میں تھے اور میں ان کی کمین گاہ میں تھا۔

میں چند ثانیے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ ساتھ ہی میں اس بار اپنے گردوپیش سے بھی پوری محتاط تھا۔ گزشتہ شب میری اسی معمولی سی غلطی نے مجھے نقصان پہنچایا تھا اور کسی نے مجھ پر اچانک پیچھے سے وار کر دیا تھا۔ میں دم سادھے وہیں پڑا رہا۔ کلائیوں میں ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں کے کنڈوں سے مجھے اب سخت اُلجھن ہونے لگی تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ اب دائیں پاؤں میں سنگل کا آہنی کڑا ابھی پھنسا رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ جھولتی سنگل کا کچھ حصہ بھی منسلک تھا۔ گویا یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔ ابھی ٹوٹی ہوئی ہتھکڑیوں سے جان نہیں چھوٹی تھی کہ یہ سنگل بھی گلے کو بلکہ پاؤں کو آ لگی تھی۔ شکر تھا کہ آزاد تھا۔

میں نے داہنی جانب حرکت کی اور بے آواز سرکتا ہوا اس طرف کو رینگ گیا۔ میں جھونپڑے کے سامنے کے رخ کا بھی جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ایک مناسب جگہ پر مجھے رکنا پڑا۔ یہاں سے اگرچہ ہنوز سامنے کے رخ کا منظر میری نظروں سے اوجھل تھا مگر میرے یک دم رکنے کی وجہ دو جڑواں تنوں والے گھنے درخت تھے جنہوں نے اپنی چھتنار سی شاخوں سے مذکورہ جھونپڑے کے اُوپر چھاؤں کر رکھی تھی۔ اس کے غیر معمولی پھیلاؤ اور جھونپڑے کی عین چھت تک رسائی کو دیکھتے ہی میرے ذہن طباع میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال کلک ہوا تھا۔ میں نے پہرے دار ڈاکو کی کلاشنکوف کو کاندھے پر منتقل کیا اور درخت پر چڑھنے لگا، پھر اس کی گھنی شاخوں سے ہوتا ہوا ایک موٹی شاخ پر کسی سانپ کی طرح لیٹا رینگتا آگے سرکنے لگا۔

وہ موٹی شاخ میرے وزن تلے جھولنے لگی مگر اس میں غیر معمولی لچک اور مضبوطی کا میں پہلے ہی اندازہ کر چکا تھا اسی لیے رکا نہیں اور آگے سرکتا رہا۔ پھر اگلا قدم اُٹھانے سے پہلے میں ٹھہر گیا۔ جھونپڑے سے قدرے اُونچائی پر آ کر اب مجھے سامنے کا بھی منظر کسی حد تک دکھائی دینے لگا تھا۔ وہی مسلح افراد جھونپڑے کے گرد مٹر گشت کرنے کے انداز میں غالباً پہرا دے رہے تھے۔

میں وہیں چند لمحے موٹی شاخ پر کسی اژدھے کی طرح لیٹا رہا۔ ہوا بالکل بند تھی۔ پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ سورج کی کرنیں درخت کی گھنی شاخوں پر پڑ رہی تھیں۔ گرمی اور حبس کی کیفیات سے سانس بھی ٹھیک طریقے سے نہیں لی جا رہی تھی۔ میں بہت احتیاط کر رہا تھا۔ چہ جائیکہ شاخ ہولے سے بھی مزید جھک کر ہلکی سی بھی کڑکڑاہٹ پیدا کرتی تو وہ چونک سکتے تھے۔

میں نے چھت کا جائزہ لیا اور یہ اندازہ قائم کرنے لگا کہ اس پر جھکے ہوئے درخت کا فاصلہ کتنا ہو سکتا تھا نیز، اگر میں چھلانگ لگاتا تو کس قدر آواز پیدا ہو سکتی تھی۔ جلد ہی مجھے اس کا ادراک ہو گیا کہ دونوں ہی کام خطرناک اور ناممکن تھے۔ جب تک کہ پہرے دار ادھر اُدھر نہیں ہو جاتے، جو ظاہر ہے نہیں ہو سکتے تھے۔ مجھ پر مایوسی غلبہ پانے لگی۔ اس قدر کوشش کے باوجود میں لب بام شکست خوردہ سا ہو گیا تھا۔ اب ایک ہی حل رہ گیا تھا کہ میں اسی طرح ٹہنی پر لیٹے ہوئے پورا دن گزار دوں اور رات کا انتظار کروں، ممکن تھا کہ تب کوئی سبیل پیدا ہو جاتی۔ لیکن بات پھر وہی تھی۔ اول تو ابھی کچھ دیر بعد ہی پورے جنگل ڈیرے میں پوری شد مد کے ساتھ میری تلاش شروع ہو جاتی۔ دوسرے یہ کہ اس میں وقت کا زیاں بھی ہوتا اور تب تک خدا جانے حالات مزید کس خطرناک اور نازک نہج پر پہنچ جاتے۔ میں نے ایک بار پھر اپنی شکرے ایسی چست آنکھوں کو سکیڑ کر اس جھکی جھکی موٹی ٹہنی اور جھونپڑ کی چھت کے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگاتے ہوئے تھوڑا مزید غور کیا کہ اگر میں ٹہنی کے آخری سرے تک پہنچ جاتا ہوں تو وہاں پہنچتے ہی ٹہنی میرے وزن کے سہارے بہت حد تک نیچے جھول سکتی تھی اور یوں چھت کا ازخود ہی درمیانی فاصلہ کم ہو جاتا اور میں کوئی آواز پیدا کیے بغیر ہی چھت پر کود پڑتا۔ لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ وہ شاخ آخری حد تک میرے لمبے چوڑے وجود کو سہار سکتی تھی؟ کیا خبر وہ دھیرے دھیرے جھولنے کے بجائے ایک دم ہی تڑاخ سے ٹوٹ جاتی اور وہ آواز نیچے موجود مسلح پہرے دار سن لیتے...... اور نیچے کھڑے کھڑے ہی میری طرف اپنی گنوں کا رخ کر کے گولیوں کی بوچھاڑ کر ڈالتے...... لیکن...... میں یہ خطرناک کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

چنانچہ...... میں نے بہت آہستہ آہستہ، کسی شکار کی جستجو میں اسے ہڑپ کرنے کے لیے، ایک صبر آزما اژدھے کی طرح موٹی شاخ پر رینگنا شروع کر دیا...... ساتھ ہی میں یہ بھی اندازہ لگاتا جاتا تھا کہ آگے جا کر شاخ میرے وزن سے کس حد تک نیچے جھکتی جاتی تھی...... فرق پڑ رہا تھا...... مگر غیر محسوس سا...... میں نے اللہ کا نام لیتے ہوئے اپنی سی

کوشش جاری رکھی اور بالآخر وہ فیصلہ کن لمحہ آن پہنچا...... میں چھت پر اُترنے لگا اور شاخ بھی کافی حد تک نیچے جھول گئی تھی۔

نیچے تین مسلح پہرے دار ایک دوسرے کی سگریٹ سلگانے میں مصروف تھے۔ باقی دو جھونپڑے کے گرد چکر لگا رہے تھے، ٹھیک اسی وقت جب میں چھت پر اُترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ان آخرالذکر ڈاکوؤں میں سے ایک نے سر اُٹھا کے جھونپڑے کی چھت کی جانب دیکھا اور میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا...... میں یہی سمجھا کہ شاید میں دیکھ لیا گیا ہوں، ڈاکو نے بہ نگاہ غائر ہی اُوپر چھت کی سمت دیکھا تھا اور میں نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی تھی، مبادا کوئی پتا ہل جاتا اور اُسے شک ہو جاتا۔ کیونکہ ہوا بالکل بند تھی، ماحول میں سناٹا طاری تھا۔ پتا کھڑکا، دل دھڑکا والی صورت حال تھی۔ اسی سبب میں بالکل نہیں گھبرایا تھا اور دم سادھے پڑا رہا تھا۔ وہ ڈاکو مٹر گشت کے انداز میں ایک طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے میں نے دیکھا کہ ان میں دو ڈاکو آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک طرف کو جا رہے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ غائب ہو گئے۔ اب شاید صرف تین ہی وہاں موجود تھے، ان میں سے بھی دو ہی نظر آ رہے تھے۔

میں نے آہستہ سے حرکت کی، کچھ اور آگے کو سرکا۔ میں نے دل تھام کر اپنا ایک پاؤں جھونپڑ کی چھت پر رکھا اور پھر دوسرا۔ اس کے بعد نہایت آہستگی سے شاخ چھوڑ دی۔ میرے وزن سے خالی ہوتے ہی شاخ تھوڑا اُوپر کو اُٹھ گئی تھی جبکہ میں چھت پر آتے ہی سینے کے بل اس سے چپک کر لیٹ گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے ایک ڈاکو کی آواز سنائی دی...... اس نے چلا کر اپنے کسی ساتھی سے کچھ کہا تھا۔

کسی خدشے تلے میرا دل تیزی سے دھڑدھڑانے لگا۔ میں اس پوزیشن میں نہ تھا کہ ان سے درانہ وار جا بھڑتا۔ میں وہیں ساکت رہا۔ تب ہی کسی کے قدموں کی تیز تیز چاپ سنائی دی۔ اس کے بعد دو ڈاکوؤں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔

ان کی زبان سے میں نابلد تھا۔ پتا نہیں وہ دونوں آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے؟ میں نے سر اُٹھا کر آوازوں کی سمت دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے دوبارہ سر جھکانا پڑ گیا اور فوراً ہی اپنی اس خطرناک غلطی کا احساس ہوا، وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے چھت کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت ایک کو میں نے قدرے بلند آواز میں کچھ کہتے سنا۔ نجانے اس نے کیا کہا تھا، لیکن ان دو لمحات کے درمیان مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے جھونپڑے میں ہلکی سی تھرتھراہٹ ابھری ہو۔ میں دھک سے رہ گیا۔

''کیا کوئی اُوپر آ رہا تھا...؟'' ایک اندیش ناک خیال میرے ذہن میں ابھرا اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ نجانے مجھ سے کہاں غلطی ہوئی تھی کہ ان کو شاید جھونپڑے کی چھت پر کسی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اب میں یہ اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ جھونپڑے کی چھت پر آنے کے لیے جو ڈاکو کمربستہ ہوا تھا، وہ کس رخ سے اُبھرے گا؟ یہ بہت خطرناک صورت حال تھی، مگر میں نے اپنے حواسوں کو منتشر نہ ہونے دیا، اب کسی خطرے کا انتظار کرنا اسے آواز دینے کے مترادف ہوتا لہٰذا ایک محتاط اندازے کے تحت میں نے جھونپڑے کی چھت پر اس جانب رینگنا شروع کر دیا جہاں نیچے کی دیوار سے کھڑکی بنی ہوئی تھی۔

مجھے یہ کھڑکی اور اس کا رخ اسی لیے یاد رہا تھا کہ گزشتہ شب میں اور پردھازیل اسی کے قریب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں اس طرف کو بڑھا اور چھت کے سرے پر آیا تو ٹھہرنا پڑ گیا۔ وہاں ایک ڈاکو گن تھامے پہرے پر کھڑا تھا۔ میں نے دانتوں تلے ہونٹ بھینچ لیے۔ چھت پر میرے آنے کا یہی مقصد تھا کہ کچھ دیر یہاں سستا کر اس جانب اُترنے کی کوشش کروں گا۔ یا پھر شاید چھت پر کوئی ایسا سوراخ یا رخنہ دکھ جاتا جس سے جھونپڑے کے اندر داخل ہونے کی سعی کرتا۔ میں تیزی سے رینگنے کے انداز میں ہی پلٹا۔ کسی وقت بھی ایک ڈاکو چھت پر پہنچنے والا تھا اور میرے لیے مفر یا چھپنے کی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں دوسرے سرے کی جانب سرکا تو پل کے پل میرا دل مسرت کے بے پایاں احساس سے دھڑکا۔ اسی جانب مجھے ایک روشندان سا نظر آ گیا۔ روشندان کیا تھا، بس ایک چوکور سا کھلا سوراخ تھا۔ میں نے جلدی سے سینے کے بل آگے سرک کر نیچے جھانکا اور ایک کونے میں کسی کو رلی اُوڑھے سوتے پایا۔ اندازہ یہی تھا میرا کہ یہ سونہڑیں کے سوا بھلا اور کون ہو سکتا ہے؟ میں اپنے جسم کو سمیٹ کر اندر کود گیا۔ رلی پوش سویا نہیں تھا، لیٹا تھا، دھمک کی آواز پر یک دم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ سونہڑیں ہی تھی، مگر اس کی ہیئت کذائی بتاتی تھی کہ وہ کن پیش آمدہ کڑے حالات سے دوچار رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں متورم سی ہو رہی تھیں، آنسوؤں کی خشک لکیریں چہرے کو پژمردہ بنائے ہوئے تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے خزاں رسیدہ چہرے پر مسرت آمیز حیرت کا شائبہ سا بہار

کے جھونکے کی طرح لہرایا۔ میں نے فوراً اپنے ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا اور تیزی نگاہ جھونپڑے کے نکاسی والے راستے پر ڈالی۔ اسی وقت مجھے چھت پر کسی کے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ سرکنڈوں کی جھونپڑی ہلتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے بے اختیار سر اُٹھا کے چھت کی طرف دیکھا تھا اور اسی وقت باہر کسی کے چلا کے بولنے کی آواز بھی ابھری تھی جسے سونہڑیں فوراً سمجھ گئی اور مجھ سے نیچی آواز میں بولی۔

"اس طرف چھپ جاؤ...... جلدی...... کسی کو تم پر شبہ ہوا ہے۔" ساتھ ہی اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں روم کولر رکھا تھا۔ میں اس کے پیچھے جا کر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا مگر پوری طرح چھپ نہ سکا تو سونہڑیں نے پھرتی سے اُٹھ کر اس طرف جہاں سے میرے وجود کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا تھا، وہاں پر کچھ دوسرا چھوٹا موٹا سامان رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے کسی کے اندر در آنے کی آہٹ سنی اور سونہڑیں واٹر کولر سے پانی نکال کر پینے لگی، وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے بھی تھوڑی سی جگہ پا کر اس طرف کو دیکھنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ مسلح ڈاکو پہلے تو بڑی متلاشی نظروں سے جھونپڑے کا جائزہ لینے لگا اس کے بعد قدرے درشت سے لہجے میں سونہڑیں سے کچھ کہا تھا جس کا جواب بھی سونہڑیں نے اسی درشتی اور نفرت سے دیا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے ان کے بیچ بہت گہری دشمنی ہوئی تھی۔

اس کے بعد وہ شخص بکتا جھکتا چلا گیا۔

"تم ابھی اِدھر ہی چھپے رہو......" اس ڈاکو کے باہر نکلتے ہی سونہڑیں نے مجھ سے سرگوشی میں کہا۔

"سونہڑیں......! تم کیسی ہو......؟" میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور آگے بولا۔ "میں یہاں کسی اور ہی معاملے کی بُو محسوس کر رہا ہوں...... کیا میرا یہ خیال صحیح ہے کہ پریل کے خلاف کوئی سازش کی گئی ہے؟"

میری بات نے جیسے اس کے ضبط کے بندھن کھول ڈالے...... وہ پہلے تو مجھے حیرت سے تکتی رہ گئی تھی۔ اس کے عنابی لبوں پہ اَن کہے جملے آتے آتے رہ گئے تھے۔ پھر میری بات پر جیسے وہ سسک پڑی اور بولی۔

"شکر ہے اللہ سائیں کا کہ تم زندہ ہو...... ورنہ...... ورنہ تو میں سمجھی تھی کہ تمہیں بھی پریل کی طرح......" رقت کے باعث وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور رو دی۔

میں دھک سے رہ گیا۔ پھر اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "حوصلہ رکھو سونہڑیں......! پریل نے میرے ساتھ دوستی کا دم بھرا تھا اور میں اس دوستی کو نبھاؤں گا...... لیکن...... خدا کے لیے مجھے تھوڑی سی تفصیل بتا دو...... کہ ہوا کیا ہے آخر......؟ کیونکہ میں تو اب تک کچھ ہی باتوں کا اندازہ لگا سکا ہوں...... اس سے زیادہ نہیں......"

اس نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھے اور پھر دھیرے دھیرے بتانے لگی۔

"اس مردود لائق ماچھی پر پریل کو ہی نہیں، مجھے بھی بہت بھروسا تھا بلکہ وہ واقعی ایسا تھا بھی، کیونکہ کئی مواقع پر اس نے پریل کی جان بچائی تھی۔ لیکن...... افسوس! کہ دولت کا لالچ انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا۔ چوری کے ایک مال کی حصے داری کے سلسلے میں لائق ماچھی، پریل سے بددل ہونے لگا تھا۔ جس کا پریل کو بھی اندازہ تھا، مگر اس نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔ دونوں کے درمیان یہ خلیج بڑھتی گئی اور لائق ماچھی نے اندر ہی اندر جانے کب سے پریل کے خلاف گروہ میں پھوٹ ڈالنی شروع کر دی۔ وہ گروہ کے جمع شدہ مال پر ہاتھ صاف کرنے کی سوچ رہا تھا اور دیگر افراد کو بھی اس کا لالچ دے کر رفتہ رفتہ اپنے ساتھ ملانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، بالآخر اس مار آستین نے اسی رات جب تم، پریل اور میں اس جھونپڑے میں دوستانہ ماحول بنائے بیٹھے باتیں کرنے میں مصروف تھے تو اس قیمتی ہیرے سے متعلق لائق ماچھی نے ہماری باتیں سن لی تھیں، جس کا بعد میں تمہیں بھی شبہ ہوا تھا، تاہم اسی دوران اس خبیث لائقو نے اپنی سازش کے تحت دھوکے سے پریل کو کہیں بھیج دیا اور پریل سے یہ کہا گیا کہ دادو کا کوئی ہندو سیٹھ ہے جو اُن کے مال کی خرید کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کے معاملات پریل اور لائقو (لائق ماچھی) ہی طے کیا کرتے تھے، مگر اس روز اس سازشی لائقو نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔

پریل دو ساتھیوں کے ساتھ گیا، جو درحقیقت لائقو کے ہی آدمی تھے۔ پریل کو کسی ویرانے میں ہلاک کر کے......"

یہ سب بتاتے ہوئے سونہڑیں اپنا جملہ مکمل نہ کر پائی اور سسک پڑی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ پریل ہلاک کر دیا گیا ہے؟"

میں نے چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

"اس بدبخت لائقو اور عارب خان نے بتایا ہے، جو اُسے دھوکے سے لے کر گیا تھا۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ پریل جیسا آدمی اس طرح

آسانی سے دھوکا کھا کر اپنی جان سے ہاتھ دھو سکتا ہے؟"

میں نے کسی خیال کے تحت سونہڑیں سے کہا اور وہ یک دم یوں چونک کر میرے چہرے کی طرف تکنے لگی جیسے میں نے اسے پریل کے زندہ ہونے کی خوش خبری سنا دی ہو...... ایک دم بولی۔

"اللہ سائیں تمہاری زبان مبارک کرے...... سچی بات تو یہی ہے کہ خود مجھے بھی ابھی تک پریل کی موت کا یقین نہیں آ رہا ہے۔ میرا پریل ایک ڈاکو ضرور تھا مگر وہ ایسا ہمیشہ سے نہیں تھا۔ اسے میرے ظالم باپ کے جبر نے اس حال تک پہنچایا تھا اور وہ غریب کسانوں یا متوسط لوگوں کو نہیں بلکہ امیروں، سیٹھوں اور اسی طرح کے جاگیرداروں کو لوٹا کرتا تھا اور اسی رقم سے وہ غریبوں کی مدد بھی کیا کرتا تھا۔ وہ بہت بہادر تھا...... کیا واقعی میری طرح تمہارا دل بھی یہی کہتا ہے کہ پریل زندہ ہوگا......؟" وہ بالکل معصوم بچی کی طرح خوش اُمیدی سے بولی تو مجھے بے اختیار اس پر ترس آ گیا۔

اس کی بات سن کر مجھے اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی سلطانہ ڈاکو کی کہانی یاد آ گئی۔ پتا نہیں وہ ایک فرضی یا روایتی کردار تھا یا سچا...... لیکن اس سے قطع نظر...... میں نے پنجاب کے بھی چند ایسے بدنام زمانہ ڈاکوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا، جو امیروں کو لوٹتے تھے اور ان کے مال سے غریبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ عموماً یہ ایسے ڈاکو ہوتے تھے، جو انہی کی طرح حالات کے مارے اور وڈیروں چوہدریوں کے ستائے ہوئے ہوتے تھے۔

سونہڑیں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ پریل کو اپنے ساتھیوں سے محبت تھی۔ وہ ان کا بڑا خیال رکھا کرتا تھا اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا تھا۔ اگر کسی کو حصہ داری پر ذرا بھی اعتراض ہوتا تو وہ اپنے حصے سے دے کر اس کا اعتراض فوراً دور کر دیا کرتا تھا مگر بدطینت لائق ماچھی تو کچھ اور ہی چاہتا تھا۔ وہ خود گروہ کا سردار بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

بہرکیف میں پریل کے زندہ یا مردہ ہونے کے بارے میں سونہڑیں کو کسی قسم کی خوش فہمی میں تو نہیں رکھنا چاہتا تھا، بس ایک دل کی بات تھی جس کا میں نے اظہار کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "سونہڑیں! سنا تو یہی ہے کہ دل جس شے کی گواہی دے، وہ جھوٹی تو نہیں ہوتی لیکن...... انسان کا دل بھی ایک سمندر ہے۔ یہ اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا ہے۔ یہ سمجھنے نہ سمجھنے والی بات ہے۔ تم نے عارب خان نامی جس آدمی کا نام لیا تھا میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش چاہی تھی۔ مگر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ وہی آدمی تھا جو دھوکے سے پریل کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔"

"تم نے عارب خان کو کیسے پہچان لیا......؟"

سونہڑیں نے پوچھا۔ وہ شاید ناساعد حالات کی پریشانی کے سبب بھول گئی تھی تب میں نے اسے یاد دلایا کہ اسی شب عارب ہی تو تھا۔ جو جھونپڑے میں داخل ہوا تھا اور پریل کو ساتھ لے گیا تھا۔

"اب ہمیں آگے کا سوچنا ہوگا۔" بالآخر میں نے اس سے کہا۔ "تم یہ بتاؤ...... تمہارے سلسلے میں ان خبیثوں نے کیا ارادہ کر رکھا ہے؟"

"لائقو بے حد لالچی آدمی ہے۔" سونہڑیں نے جواب دیا۔ "اس نے آج میرے بابا جانی (شاہنواز خان) سے میرے سلسلے میں رابطہ کیا ہے، وہ میری واپسی کے سلسلے میں بابا جانی سے بطور تاوان کے بھاری رقم کا مطالبہ کرنا چاہتا ہے۔"

"میرا خیال ہے، اگر ایسا ہے تو تمہارے لیے ان حالات میں یہی بہتر ہوگا کہ تم اب اپنے گھر لوٹ جاؤ......"

میں نے اسے نیک مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ بات تلخ اور مشکل ضرور تھی لیکن سونہڑیں اس وقت بدقسمتی سے خطرناک اور غیر یقینی حالات کا شکار ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ میری بات پر اس کے حسین اور معصوم چہرے پر یک دم خوف و ہراس کے تاثرات اُمڈ آئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

"نن...... نہیں...... نہیں...... میں اب دوبارہ حویلی نہیں جا سکتی، وہاں اب میرے لیے کچھ نہیں بچا...... میں بدنصیب تو اپنی کشتیاں جلا کر وہاں سے پریل کے ساتھ نکلی تھی۔"

میں اس کے فطری خوف کی وجہ جانتا تھا۔ پوچھا۔

"کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟"

"ہاں......!"

"بس، پھر تمہیں ضرور واپس گھر لوٹ جانا چاہیے۔"

"میرے بابا جانی مجھے زندہ زمین میں گاڑ دیں گے۔"

"کیوں......؟"

"میں نے اُن کی عزت داغ دار کر ڈالی ہے۔" وہ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ "تم انہیں نہیں جانتے...... وہ غیرت اور انا کے معاملے میں اپنی اولاد، خصوصاً عورت کے معاملے میں کسی رشتے، جذبے کو

خاطر میں نہیں لاتے......"

میں نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو سونہڑیں......! ماں باپ کے لیے اولاد، اولاد ہی ہوتی ہے۔ چاہے جیسی بھی سہی، وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔ تم ان سے معافی مانگ لینا...... ورنہ تم خود بتاؤ...... اگر خدانخواستہ پریل بھی دنیا میں نہیں رہا تو تمہارا اس بھری دنیا میں کون سہارا بنے گا......؟"

"تم مجھے بس! ان کی قید سے کسی طرح نکال دو...... میں اپنے پریل کو خود ہی تلاش کرلوں گی...... یہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔" وہ مجھ سے درد بھرے لہجے میں التجا کرتے ہوئے بولی۔ یہ سب کہتے ہوئے وہ بے بس نظر آرہی تھی۔ وہ معصوم تھی، ابھی اسے زمانے کے سرد و گرم کا ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ انسان نما درندوں کے اس جنگل میں وہ ایک ہراساں ہرنی کے مانند بھٹکتی رہے گی، مگر اس کے ہاتھ رسوائیوں اور ذلتوں کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ لہٰذا میں نے اسے بڑے رسان سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مسئلہ یہاں سے تمہیں نکالنے کا نہیں ہے سونہڑیں! میری بات کو ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے کی کوشش کرو۔ یہاں سے نکلو گی تو کہاں جاؤ گی؟ کدھر پریل کو تلاش کرو گی؟ مت بھولو کہ تم ایک عورت ذات ہو، جوان اور خوبصورت ہو۔ یہاں قدم قدم پر تمہیں انسان نما بھیڑیے ملیں گے۔ پریل کو ڈھونڈنا تو ایک طرف رہا، تمہیں کہیں اپنی زندگی اور عصمت کے لالے نہ پڑ جائیں...... اس سے زیادہ بہتر یہی ہوگا کہ تم اپنے گھر کی چاردیواری میں واپس لوٹ جاؤ...... یہ سمجھ کر کہ تقدیر نے تمہارے اور پریل کا بس، اسی قدر ساتھ رکھا تھا۔ حویلی میں تمہارے اپنے لوگ ہوں گے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تمہیں برا بھلا کہیں گے اور بس......"

میری بات شاید اس کی سمجھ آئی یا نہ آئی تاہم وہ بے چاری بے اختیار اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اپنا چہرہ ڈھانپ کے رو پڑی۔

میں نے اسے خاموش کرایا اور ایک احتیاط بھری نظر نکاسی کے راستے پر پھینکی اور اس سے کہا۔ "یہ شکر کرو کہ لائق ماچھی تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر اغوا برائے تاوان کے بدلے سہی...... بہ خیریت تمہارے بابا جانی کے حوالے کرنے کا ارادہ تو کر چکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تمہارے بابا جانی بلا دیر اسے تاوان کی رقم دے کر تمہیں اس کے پنجے سے چھڑالیں گے۔"

"اور...... اور...... پریل......! اس کا کیا ہوگا......؟"

سونہڑیں نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"میں اب تمہاری طرف سے بے فکر ہونے کے بعد اس کی تلاش کی کوشش کروں گا، مگر اس کے لیے یقین سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، سچی بات ہے کہ تمہاری طرح میں بھی اس کی جانب سے کچھ زیادہ پر اُمید نہیں ہوں۔ لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں اسے تلاشنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں گا، پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرے اپنے ساتھیوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہوئی ہیں...... میرے کچھ ساتھی پولیس کے اور کچھ تمہارے بابا جانی کے نرغے میں ہیں، مجھے ان کے لیے بھی کچھ کرنا ہے۔ پریل تھا تو مجھے اُمید ہوئی تھی وہ میرا یہ کام آسان کردے گا...... مگر......" میں نے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

سونہڑیں نے میری ساری بات سننے کے بعد ہولے سے سسکتے ہوئے اپنے سر کو نفی میں جنبش دی۔ میں نے بھی ایک بھینچی بھینچی سی سانس خارج کرتے ہوئے اسے حوصلہ دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتا، میں نہیں چاہتا کہ یہ لوگ مجھے تمہارے پاس دیکھ لیں اور تمہارے خلاف کوئی انتقامی کارروائی کر ڈالیں......"

"تم جا رہے ہو......؟" اس نے ایک عجیب سی تڑپ کے ساتھ پوچھا۔

"میں ابھی کہیں نہیں جا رہا...... مجھے عارب کی تلاش ہے، میں پہلے اس سے پریل کے بارے میں حقیقت اُگلوانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا، میں نے سونہڑیں سے پوچھا۔

"اس مردود لائقو نے تمہیں کیا بتایا تھا......؟"

"یہی کہ...... اب میں پریل کو بھول جاؤں اور اپنی فکر کروں......" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔

"میں اس مردود کی بات پر صدمے کے مارے چلّا اُٹھی تھی، اس ظالم نے میرے منہ پر تھپڑ رسید کر ڈالا تھا اور کہا کہ مجھے اس بات کا شکر کرنا چاہیے کہ وہ مجھے اپنے کسی انتقام کا نشانہ بنانے کے بجائے...... بابا جانی کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس پر میں نے اس سے التجا کی تھی وہ مجھے پریل کے پاس پہنچا دے تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ اس کے لیے مجھے مرنا پڑے گا اور میں اس بے رحم انسان کی بات سن کر بے ہوش ہوگئی تھی۔" وہ اتنا بتا کر سسک کر رونے لگی تو میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"تم اللہ سے پریل کی زندگی کے لیے دعا کرو...... میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں پریل کو کسی بھی حالت میں اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا اور تمہیں ضرور اس کی اطلاع بھی دینے کی کوشش کروں گا، ورنہ پریل جس حال میں بھی ملا، میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔"

اسے کچھ حوصلہ ہوا اور اُمید بھی، وہ اسی لہجے میں مجھ سے بولی۔ "تت...... تم اس خبیث عارب خان کو قابو کرنے کی کوشش کرو...... وہ اور اس کا ایک ساتھی، جس کا نام مجھے معلوم نہیں، وہ ہی اسے لائقو کے کہنے پر دھوکے سے کہیں ساتھ لے گئے تھے۔"

"تم بے فکر رہو...... میں دیکھتا ہوں......" میں نے کہا۔

اس کے بعد میں نے سونہڑیں کو اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھنے کو کہا اور خود نکاسی والے راستے کی طرف بڑھا اور ذرا پردہ ہٹا کر باہر جھانکنے کی کوشش چاہی تو مجھے وہاں صرف ایک ہی آدمی کھڑا دکھائی دیا جو سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ زیادہ اُبھر کر یا باہر نکل کے دیکھنے میں، دیکھ لیے جانے کا احتمال تھا۔

میں پلٹا اور دبے پاؤں کھڑکی کی طرف آیا وہاں بھی کپڑے کا ایک ٹکڑا جھول رہا تھا۔ میں نے اسے ہٹا کر دیکھا اور تو بری طرح چونک پڑا۔ وہاں میں نے جس ڈاکو کو چھت کی سمت گھورتے پایا تھا وہ عارب خان تھا۔ یہی میرا شکار تھا اور گزشتہ شب میرے چنگل میں آنے سے یہ مردود بال بال بچا تھا۔

"یہی ہے میرا شکار......" بے اختیار فرطِ جوش تلے میرے منہ سے خود کلامیہ برآمد ہوا تھا۔

"کیا ہوا......؟" مجھے عقب سے سونہڑیں کی سرگوشی سے مشابہ آواز سنائی دی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے اس کی طرف پلٹا اور بولا۔

"مجھے اپنا شکار نظر آ گیا ہے...... لیکن میں اس کھڑکی کے راستے دوسری طرف نہیں نکل سکتا۔ لیکن دروازے کے باہر جو آدمی کھڑا ہے...... وہ عارب خان ہے۔ میں اسے چہرے سے پہچانتا تھا جو گزشتہ رات پریل کو دھوکے سے ساتھ لے کر گیا تھا۔ تم بھی ایک نظر ذرا اُسے دیکھ لو......"

میری بات پر سونہڑیں فوراً اس طرف کو لپکی اور ایک نگاہ کھڑکی سے باہر ڈالنے کے بعد پلٹ کر اس نے فوراً اثبات

آپ کا خط

ایک افسر کو بات بات پر گالی دینے کی عادت تھی۔ ایک دن اس کا اردلی ایک خط لایا اور وہ خط اپنے صاحب کو دیا۔

صاحب نے پوچھا۔ "کس الو کے پٹھے کا خط ہے؟"

اردلی نے جواب دیا۔ "آپ کا سر۔"

افسر صاحب بہت بھنایا اور زور سے بولا۔ "کس کمینے نے بھیجا ہے؟"

اردلی نے ادب سے جواب دیا۔ "حضور آپ کے والد صاحب نے۔"

پنڈدادن خان سے حسین حیدری کا پروانہ،

ترمیم شدہ محاورات

دیواروں کے دونوں طرف کان ہوتے ہیں۔ (ایک سننے کے لیے اور دوسرا......)

ناچ نہ جانے ڈسکو ڈانسر

خیالات کی جنگ میں مضبوط جلد والی کتابیں ہتھیاروں کا کام دیتی ہیں۔

اونٹ رے اونٹ آج کل سیدھی طرح بیٹھ۔

تیل دیکھ اور تیل کا اچار دیکھ۔

ایک کلو مچھلی سارے گھر کو کنگلا کردیتی ہے۔

جوق در جوق (مذاق مذاق میں)

مریض بڑھتے گئے جوں جوں دعا کی۔

☆☆☆

میں آپ کے کثیر الاشاعت ماہنامے کی معرفت اردو ادب کے کرتا دھرتاؤں کی توجہ اس صریح غلطی کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کا ارتکاب مسلسل ڈیڑھ ہزار برس سے ہو رہا ہے۔ اس ناچیز کی رائے ہے کہ اب تک کی تمام کتابیں ضبط کرلی جائیں یا بڑے پیمانے پر اشتہار بازی کی جائے تاکہ عوام الناس اپنے پاس موجود نسخہ جات میں اس لفظ کی تصحیح کرلیں۔ باخبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ معروف و مشہور شخص "حاتم" جو قبیلہ "طے" کا رہنے والا تھا۔ وہ مرد تھا، لیکن اکثر سننے اور پڑھنے میں آیا ہے کہ لوگ اسے تائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ لہٰذا حاتم کے جاننے والے یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ آئندہ اسے "تایا" کہہ کر پکاریں۔

ایمن کا کراچی سے انکشاف

میں اپنا سر ہلا دیا۔

میں نے اسے دوبارہ اپنی جگہ جانے کا اشارہ کیا اور خود بے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ پردے کا ایک کونا ذرا ہٹا کر باہر جھانکا تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا وہاں کوئی نہ تھا اور میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر قدم رکھ دیا، پھر بڑی سرعت کے ساتھ گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد میں جھونپڑے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی جانب کو سرکتا چلا گیا جہاں عارب کھڑا چھت کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دیوار کے سرے پر اب مجھے بیک وقت دونوں جانب محتاط سی نگاہ رکھنا پڑ رہی تھی۔ نیز میرا یہاں زیادہ دیر رکنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا، میرے دیکھ لیے جانے کا مطلب دھماکے سے کم نہ ہوتا، میں نے جھک کر ایک ڈھیلا اُٹھایا اور سامنے عارب کے عقب میں جھاڑیوں کی طرف اُچھال دیا۔ شکار کو جُل دینے کا میرا یہ نشانہ بے خطا نہیں گیا، حسب توقع وہ بری طرح بدکا اور اپنی کلاشنکوف تھامے اسی جانب کو محتاط قدموں کے ساتھ بڑھتا چلا گیا اور میں نے بھی بہ سرعت اپنی جگہ سے حرکت کی...... میں اس کے بالکل عقب میں نہیں لپکا تھا بلکہ ذرا فاصلے سے اس کے دائیں جانب سے نیچے جھکا جھکا جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

پتا نہیں اب یہ شکار کو جلد از جلد چھاپ لینے کی فطری عجلت کا شاخسانہ تھا یا پھر کوئی غلطی مجھ سے سرزد ہوئی تھی کہ میرا پاؤں ایک جھاڑی میں رپٹ گیا۔ میں منہ کے بل گرا، چلچلاتی دھوپ زدہ گرمی اور سناٹے میں جھاڑیوں کی کھڑبڑاہٹ کا شور کسی بھرے مجمع کے احتجاج سے کم ثابت نہ ہوا اور یہی وہ وقت تھا جب مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے سے دائیں ہاتھ پر موجود عارب بالکل چوکس انداز میں کلاشنکوف ہاتھ میں تھامے ہوئے موجود تھا، وہ بری طرح بدکا اور میری طرف مڑا جبکہ ادھر میں بھی اپنی اس غلطی کا خمیازہ بھگتنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا لہٰذا گرتے ہی میں نے عارب کی جانب لوٹ لگائی تھی؛ وہ مجھ پر اپنی کلاشنکوف سیدھی کرتے ہی رہ گیا تب تک میری قینچی کی طرح حرکت کرتی ہوئی ٹانگیں اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرا چکی تھیں؛ وہ اُچھل کر میرے بالکل قریب گرا اور کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر چکی تھی، عارب نے سنبھلنے کی کوشش کے دوران ہی میرے جبڑے پر مُکا رسید کرنا چاہا تھا لیکن میں نے اپنے چہرے کو جھکائی دے کر اس کی ضرب سے اپنا چہرہ بچایا اور اس کی کنپٹی پر اپنے دائیں ہاتھ کا گھونسا بھرپور طاقت کے ساتھ رسید کر دیا۔ وہ ہلکی سی کراہ نما اوغ کی آواز نکالتا ہوا دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا، یہی میں چاہتا تھا۔ میں اپنے زبردست شکار پر کسی شکاری چیتے کی طرح پنجہ گاڑنے چند ثانیے وہیں دم سادھے ہوئے گردوپیش کی ممکنہ سن گن لیتا رہا اور پھر تسلی ہونے کے بعد میں نے بے ہوش عارب کی گن اپنے قبضے میں کی اور پھر اس کے بے سدھ وجود کو کاندھے پر ڈال کر ایک طرف کو ہولیا۔

☆☆☆

لائق ماچھی اور عارب خان وغیرہ کی بغاوت کے باعث میرا اپنا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ ورنہ تو پریل سے میرے دوستانہ مراسم استوار ہو چکے تھے، جس کے باعث میرا اور میرے ساتھیوں کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں، وہ میری بھرپور مدد کر سکتا تھا۔ مگر اب صورتِ حالات اور تھی۔ لہٰذا میں اب خود بھی اس معاملے کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ آخر پتا تو چلے کہ قصہ آخر کیا ہے؟

بے ہوش عارب کو کاندھے پر اُٹھائے میں ایک ایسی جگہ پر پہنچا جو میرے تئیں محفوظ تھی۔ یہاں چھدری چھدری جھاڑیوں کے علاوہ کچھ ریت اور مٹی کی ٹکریاں بھی تھیں۔ مگر یہ علاقہ گرمی اور دھوپ سے تپ بھی رہا تھا۔ میرا پورا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا اور سانسیں پھول گئی تھیں۔ میں نے عارب کے بے سدھ وجود کو اس جگہ پر پھینکا اور پھر اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ جس کے لیے مجھے صرف اس کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور ہلکے چانٹے مارنے پڑے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر بیدار ہوا اور نیم غنودہ سی آوازیں حلق سے خارج کرنے لگا، میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے اس کی گردن دبوچ لی اور اسی لہجے میں غرا کر بولا۔

"یہاں اس تپتے ہوئے بنجر ویرانے میں تمہیں کوئی بھی بچانے نہیں آئے گا۔ اسی لیے میرے سوال کا بلا تاخیر جواب دینا ہوگا......"

اس نے ڈیلے گھما کر اطراف میں دیکھنا چاہا تو میں نے اس کی "آسانی" کی خاطر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ جان گیا کہ یہاں لانے کا میرا کیا مقصد ہو سکتا تھا، باوجود اس کے وہ تڑپا اور میری گرفت سے اس نے نکلنے کی کوشش چاہی تھی۔ مجھے اس کے ڈھیٹ پنے پر طیش آ گیا، پہلے ہی اس کم بخت کو اس گرمی اور سخت دھوپ میں لاد کر یہاں تک لانے پر میری اپنی حالت طیش ناک سی ہو رہی تھی۔ اس حرکت پر میں نے بھنا کر اس کے چہرے پر اپنے بھاری ہاتھ کا تھپڑ ید کر دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا چہرہ، سوا ے پر آئے ہوئے سورج کی طرف کر دیا۔ اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں، وہ منہ پھاڑ کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں شاید گالیاں دے رہا تھا کہ میں نے ریت مٹی کی مٹھی بھر کر اس کے منہ میں ڈال دی۔ اس کی گرمائش اور گھٹن سے اس کی حالت غیر ہو گئی۔

"عارب! میں تمہیں پہچان چکا ہوں...... اور تمہیں زندہ چھوڑنے کا ارادہ میرا بالکل بھی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ میں نے ایک بار ناکام ہونے کے بعد اس بار دوبارہ تم پر قابو اسی لیے ہی پایا ہے۔" میں نے اسے نفسیاتی طور پر خوف زدہ اور مرعوب کرنے کے انداز و وحشت خوں رنگ لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں بہت اذیتیں دے کر مار ڈالوں گا، بشرطیکہ مجھے سچ سچ بتا دو پریل کا تم نے کیا کیا ہے؟"

وہ کھانس رہا تھا، میں نے اسے اُٹھا کر بٹھا دیا۔

"خبردار! اب کی بار کسی ڈھٹائی سے کام مت لینا۔ تمہاری لاش گدھ اور چیل نوچ ڈالیں گے اور میں آگے نکل جاؤں گا...... اب تک تو تم بھی جان ہی چکے ہو گے کہ میں عام آدمی نہیں ہوں......"

"مم...... میں نے پپ...... پریل کو۔ لل...... لل...... لائق ماچھی کے کہنے پر......" وہ اتنا بتا کر رکا اور کھانسنے لگا۔ میں نے اسے موقع دیا تاکہ وہ گرم ریت اور مٹی اپنے منہ سے کھانس کھانس کر تھوک ڈالے اور میرے سوالوں کے جوابات بہ آسانی دے سکے۔

"بولتے رہو...... میں اس وقت تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کی رعایت کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

"مم...... میں نے پریل کو ہلاک نہیں کیا ہے...... اُسے مرنے کے لیے ایک ایسی اندھی کھائی میں باندھ کر چھوڑ آیا ہوں جہاں رات کو بھوکے جنگلی کتے اور لگڑ بھگے ڈیرا ڈالتے ہیں۔" اس نے اپنی بات مکمل کی اور ہانپنے لگا۔ میں اندر سے ہول گیا۔ وہ سیاہ رات تو کب کی گزر چکی تھی۔ پتا نہیں اب تک ان بھوکے کتوں اور لگڑ بھگوں نے پریل کا کیا حشر کیا ہوگا...... میں نے نفرت و طیش کے مارے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچنے لگا۔ وہ گھٹن کے مارے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دی اور زہرخند لہجے میں بولا۔

"لعنت ہو تم پر! تمہیں اپنے ہی سردار سائیں کے خلاف یہ غداری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی...... اگر تمہیں کسی قسم کی کوئی ناراضی اور اختلاف تھا تو تمہیں اس کا اظہار کرنا چاہیے تھا، بلکہ میں نے تو سنا تھا کہ وہ اپنے حصے سے نکال کر بھی اپنے ساتھیوں کو نواز دیا کرتا تھا۔ پھر...... پھر تم نے کیوں اس کے ساتھ غداری کی......؟"

میری بات پر عارب شرمساری کی اداکاری کرتے ہوئے بولا تھا یا پھر واقعی اس کے ضمیر نے اُسے ملامت کی تھی۔

"مجھے خود بھی اس کا بعد میں افسوس ہوا تھا...... مگر......" وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا اور ہانپنے لگا۔ میں اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"اگر تمہارا ضمیر واقعی ملامت کر رہا ہے تو اس کی سچائی کا ثبوت دو...... مجھے اسی وقت وہاں لے چلو جس گڑھے میں تم نے اُسے دھوکے سے باندھ کر پھینکا تھا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں......" وہ اپنی سانسوں کو معمول پہ لاتے ہوئے بولا۔

"لیکن...... کیا وہ ابھی تک زندہ ہوگا......؟"

"خدا کرے ایسا ہی ہو......" میں نے کہا۔

"لیکن...... تم اُسے وہاں زندہ چھوڑ آئے تھے اور اس طرح کسی کو مردہ تصور کر لینا مناسب نہیں جب تک کہ آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔" میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ عارب کو جانے کیا ہوا وہ بھوں...... بھوں...... کر کے رو دیا۔ ایک خونی ڈاکو کو...... اس طرح روتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور کچھ عجیب سا بھی لگا۔ پتا نہیں وہ ڈراما کر رہا تھا یا نہیں۔ میں نے اس سے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"کیا ہوا......؟ کیوں رو رہے ہو تم......؟"

"مجھے اپنے آپ پر شرم آ رہی ہے۔ میں نے کتنی نیچ اور گری ہوئی حرکت کی ہے۔ اس مردود لائقو کے کہنے پر میں نے اپنے ہی سردار سائیں کے ساتھ غداری کر ڈالی...... صد حیف ہے مجھ پر......"

"اب تم یہ ساری باتیں چھوڑو......" میں نے کہا۔

"......اور چلنے کی تیاری کرو......"

"چلو...... میں تیار ہوں......" وہ بولا۔ میں نے ایک نظر بہ غور اور بھانپتی ہوئی سی اس کے چہرے پر ڈالی اور اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

مجھے یہاں، اس علاقے میں بسنے والوں کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ نہ ہی علاقوں اور مقامات کا...... کسی حد تک نشریاتی

(مراد، خبریں وغیرہ) اور کتابی معلومات ضرور رکھتا تھا۔ اس کی گن میرے قبضے میں تھی اور وہ میں نے اب اس پر تانی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے ایک طرف کو اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی اور پریل جیسے آدمی کو اتنی زیادہ دور دھوکے سے لے جایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تاہم عارب اور اس کا دوسرا ساتھی قمن نے مل کر پریل کو پہلے دھوکے سے پانی میں کوئی نشہ آور شے پلادی اور اس کے بے ہوش ہو جانے کے بعد ہی وہ اسے ایک ہولناک گڑھے میں ڈال کر چلے آئے کہ کل صبح تک صرف اس کا پنجر ہی پڑا ملے گا۔

عارب خان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے احتیاط کا دامن تھامے رکھا تھا۔ میں اس کی بھوں...... بھوں اور ضمیر کی للکار جیسی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا اور اس پر بھروسا کرنے کی خطرناک غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، چہ جائیکہ میرا بھی کہیں یہ بدبخت، پریل چانڈیو جیسا حشر کر ڈالے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے یہ سوچ سوچ کر ہی جھرجھری سی آجاتی تھی کہ نجانے اب تک پریل کا بھوکے جنگلی جانوروں نے کیا حشر کیا ہوگا؟ بس ایک خوش اُمیدی کے سہارے اور کچھ آنکھوں اور دلی تسلی کے لیے کہ کیا خبر اسے میری کسی مدد کی ضرورت ہو، اس کی تلاش میں نکل پڑا تھا۔

ہم دونوں جھلسا دینے والی دھوپ، گرمی اور لوؤں کے گرم تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اب خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ موقوف ہونے لگا تھا، بلکہ ختم ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کی جگہ خشک مٹی کی ڈھیریوں اور گہرے کھڈوں کی بہتات نظر آنے لگی۔ ان گہرے کھڈوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ریتی بجری مافیا کے لوگ یہاں بھی خاصے سرگرم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند ہی کھڈ قدرتی ہوں گے باقی مٹی کھود کے لے جانے والوں کا شاخسانہ تھا۔

”کتنی دور رہ گیا ہے اب وہ گڑھا......؟“

بالآخر میں نے ایک جگہ رک کر ہانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔ اس چلچلاتی دھوپ اور لوؤں کے ریگ زار خار میں زیادہ دیر پیدل چلنے کی میری ہمت جواب ہی دینے والی تھی۔ عارب نے تو تیز دھوپ سے بچنے کے لیے اپنے سر پر اجرک کا رومال سا بنا کر ڈال لیا تھا جبکہ میرا سر خالی تھا۔ میں اس کے ساتھ اجرک کے اس بڑے رومال کا ”شیئر“ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی۔

”وہ سامنے دیکھ رہے ہو......“ اس نے میری بات پر اپنا ہاتھ اُٹھا کر اُنگلی کے اشارے سے کہا اور میں اس کی سمت دیکھنے لگا۔

”اُس طرف دو برابر میں بنی ہوئی ٹیکریوں کے درمیان ایک گہرا گڑھا ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا تم...... یہاں جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں کی بہتات ہوتی ہے...... یہ بڑے مکار جانور ہوتے ہیں، انہیں انسانوں سے لڑائی کا خوب تجربہ ہے کہ کب ان کی آگ اُگلتی گنز خالی ہوکر خاموش ہوجاتی ہیں اور کب یہ بے بس ہوکر خالی گنز کو لاٹھی کی طرح سے استعمال کرنے پر مجبور ہو رہتے ہیں۔ بس...... وہی لمحہ ان پر پل پڑنے اور چیر پھاڑ ڈالنے کا ہوتا ہے۔“ عارب اتنا بتا کر خاموش ہو رہا۔ اس نے بڑے ہولناک انداز میں اس بنجر ویرانے کا ایسا خوفناک نقشہ کھینچا تھا کہ ایک لمحہ کو تو خود میں بھی لرز سا گیا تھا۔ گن صرف میرے پاس تھی۔ اس میں بھی کتنی گولیاں تھیں مجھے اس کا ٹھیک سے کوئی اندازہ نہ تھا۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ اگر جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں کے غول نے حملہ کر دیا تو ...کتنوں کو میں مار گراؤں گا اور کتنوں کا مقابلہ کر پاؤں گا؟

”مگر میں نے تو سنا ہے کہ یہ لوسی کتے اور لگڑ بھگے ایک ہی فائر کی آواز پر دور بھاگ جاتے ہیں اور دوبارہ قریب آنے کی جرأت نہیں کرتے......؟“ میں نے اس سے کہا تو عارب خان میری بات پر ٹھٹھا مار کے ہنسا تھا۔

”کیا بات کر رہے ہو سائیں......! یہ کوئی لوسی کتے ہیں؟ جنگلی ہیں جنگلی کتے! انہیں انسانوں سے مقابلے کرنے کا نسلی تجربہ ہے۔ لوسی کتے تو شہر کی گلیوں میں آوارہ پھرنے والے ہوتے ہیں۔ جنگلی کتے تو دوسرے کتوں سے زیادہ ہی خونخوار اور چالاک ہوتے ہیں، شکار کا انہیں خاص تجربہ ہوتا ہے۔“

”میرا خیال ہے اس وقت وہ اپنی کھوؤں میں آرام کر رہے ہیں ہوں گے۔ آؤ......“ میں نے کہا اور آگے قدم بڑھا دیا۔ عارب خان بھی آگے چلتا رہا۔ میں نے اس کے چہرے سے اُلجھن اور پریشانی کے تاثرات تاڑ لیے تھے، جس کا مجھے یہ اندازہ نہیں ہوا پایا تھا کہ آیا وہ جنگلی کتوں اور لگڑ بھگوں سے خوف زدہ تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی اس کی پریشانی کی......؟

اچانک ایک آواز پر ہم دونوں ہی بُری طرح چونکے تھے۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

پہلی غلطی

تمکین رضا

جیسے ہی موسم کے تیور بدلتے ہیں... برسات کی جھڑی لگتی ہے تو درختوں کے نیچے گھنا سبزہ ان بارشوں کا پانی اپنے اندر جذب کر لیتا ہے... یہی قدرآور اور عمر رسیدہ گھنے درخت تند و تیز آندھیوں کا زور توڑنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں... یوں یہ زمینی دوست اپنی دوستی کا حق ادا کر دیتے ہیں... ہماری زندگی میں یہی کردار بزرگ ہستیاں ادا کرتی ہیں... جیسی بھی شکست و ریخت ہو... سختی ہو... ترشی ہو... وہ ہمارے لیے سائبان بنے رہتے ہیں... ایک ایسے ہی سرپرست کی کہانی... جو ہمہ وقت اپنی ذمے داری نبھانے کے لیے تیار تھا۔ وہ اپنی اولاد کو غلط اور مجرمانہ کاموں سے بچانا چاہتا تھا۔

اس پہلی غلطی کا احساس... جو آنے والے دنوں پر بھاری تھی

اس سہ پہر میری ملاقات ساحل پر بیٹھے ہوئے کلے ال برج سے ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں سگریٹ دبا ہوا ار وہ مجھے اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ہم کافی عرصے بعد مل رہے ہیں۔“

گو کہ ہم ایک دوسرے سے کئی میل کے فاصلے پر رہتے ہیں لیکن میں اسے عرصہ دراز سے جانتا ہوں۔ وہ اور میرا باپ ایک ساتھ ہی پلے بڑھے اور وہ دونوں اسکول کی

''کام بتاؤ۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مجھے ایک مخبر کی تلاش ہے۔''

''کھیتی باڑی شروع کررہے ہو۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''اس کے کینیڈین سے رابطے ہوں۔ وہ یورپین بھی ہوسکتا ہے اور شاید کشتی سے سفر کرتا ہے۔''

وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''میں تمہاری مدد کو استعمال کرسکتا ہوں۔''

اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ وہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ایک زرخیز بیج بو دیا ہے۔

سلویا کے ساتھ ڈنر کرنے اور فلم دیکھنے کے بعد میں نصف شب کے قریب گھر پہنچا۔ میں نے بیرونی زینے کے قریب اپنی گاڑی کھڑی کی۔ وہاں بالکل تاریکی تھی۔ اچانک مجھے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں فوراً ہی گھٹنوں کے بل جھک گیا تاکہ گولی کا نشانہ بننے سے بچ سکوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے جیپ کا دروازہ کھولا اور اس میں سے اپنا بریٹا نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے سر پر ہاتھ مارا۔ میں نے پلٹ کر حملہ آور کے کپڑے پکڑ لیے اور اسے گھسیٹتا ہوا زینے سے دور لے جانے لگا۔ کوسٹ گارڈ کی کشتی سے آنے والی روشنی میری عمارت پر پڑی تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور وہ غراتا ہوا گلی کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرا شخص میرے قریب سے دوڑتا ہوا گیا اور تاریکی میں گم ہوگیا۔ میں نے گن ہاتھ میں پکڑے ہوئے گوداموں کے درمیان دوڑ لگائی اور ایک سفید رنگ کی ایس یو وی کار کی نمبر پلیٹ پڑھنے میں کامیاب ہوگیا جو مشرق کی جانب کمرشل اسٹریٹ پر مڑ رہی تھی۔

دوسرے دن اس نمبر پلیٹ کی مدد سے میں اسٹیفی رابنسن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا جو مونجوئے ہل پر واقع ایک اپارٹمنٹ ہاؤس کی دوسری منزل پر رہتی تھی۔ وہ ایک خوش شکل عورت تھی۔ عمر بیس اور پچیس کے درمیان، قد پانچ فٹ آٹھ انچ کے قریب۔ وہ سفید قمیص اور سفید پتلون میں ملبوس تھی۔ وہ مجھے اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئی اور مذاق کے انداز میں بولی۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔ ''البتہ حیران ضرور ہوں کہ تم گزشتہ رات کیا کرنا چاہ رہی تھیں؟''

''اس نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم غلط دروازے پر آگئے ہو۔''

''تم اسٹیفی رابنسن نہیں ہو؟''

''میں نہیں جانتی کہ تم کیا چاہتے ہو لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''گزشتہ شب تمہاری کار میرے احاطے میں تھی۔''

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''میری کار؟''

میں نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ بعض اوقات لوگ اسے واپس کردیتے ہیں لیکن اس نے وہ کارڈ رکھ لیا اور میری طرف بڑھنے لگی۔

''میں تنہا رہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور پیچھے ہٹتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔

میں نے دروازے سے کان لگادیے۔ وہ فون پر کسی سے چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔ ''تم نے میری کار کے ساتھ کیا کیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ تم نے اسے کیوں دی؟ ابھی ڈیوڈ نامی ایک شخص میرے دروازے پر آکر الزام تراشی کررہا تھا۔ تم نے میرے لیے مسئلہ کھڑا کردیا۔''

پھر قدرے توقف کے بعد وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے گاڑی واپس لے کر آؤ اور باسٹن سے کہہ دینا کہ یہ کار میری ہے اور دوبارہ مجھ سے گاڑی مت مانگنا۔''

میں نے جیپ میں سوار ہونے سے قبل پریس ہیرالڈ میں ایک خاتون دوست کو فون کرکے باسٹن کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ ''مجھے چند منٹ درکار ہوں گے۔''

گھر آنے کے بعد اس کے فون کے انتظار میں، میں اپنی ڈاک دیکھنے لگا۔ اس میں چند بلوں کے علاوہ کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری دوست نے فون پر بتایا۔ ''ڈائریکٹری میں ایسے تین نام ہیں۔ ان میں دو عمر رسیدہ بہنیں ہیں جو بیڈفورڈ کے علاقے میں سی ویو پر رہتی ہیں جبکہ تیسرے شخص ریڈ باسٹن کی کانگریس اسٹریٹ پر بیریز، کے نام سے سینڈوچ شاپ ہے۔ وہ مونجوئے ہلز میں رہتا ہے۔

جب میں سینڈوچ شاپ پہنچا تو ایک دبلی پتلی لڑکی نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اس کے سینے پر سینڈی، کا ٹیگ آویزاں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ میں بول پڑا۔

''میں مسٹر باسٹن سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ موجود ہیں؟''

وہ یہ سوال سن کر چونک گئی اور بولی۔ ''وہ......''

''لیکن وہ یہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے بتادو کہ ایک آئرش اس سے ملنا چاہتا ہے۔''

وہ کوئی بحث کیے بغیر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کے عقب میں بغیر آستینوں والی قمیص پہنے ایک اور شخص بھی تھا۔

''پیچھے سے گھوم کر آؤ۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں ایک دروازہ ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہاں کوئی شخص گھات لگائے میرا انتظار کررہا ہوگا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ باسٹن نے سبز رنگ کا دروازہ کھولا اور میں اس میں سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے دفتر میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''محکمۂ صحت کی پابندی کی وجہ سے میں تمہیں کچن میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' اس نے میرا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دیا۔ اس نے ایک نظر ڈالنے کے بعد اسے ایک فریم شدہ تصویر کے سامنے رکھ دیا جس میں ایک عورت اور دو چھوٹی لڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ میں نے اسٹیفی کو کہتے ہوئے سنا تھا کہ باسٹن نے اسے سفید ایس یو وی کار دی تھی لیکن تصویر والی عورت اسٹیفی نہیں تھی۔

''کیسے آنا ہوا؟'' باسٹن نے پوچھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اسٹیو نائٹ تمہارے لیے کام کرتا ہے۔''

''اسٹیو نائٹ۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہاں یاد آیا۔ وہ اوپر کے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس نے میرے ہاں بھی کچھ مرمت کا کام کیا تھا لیکن وہ میرا ملازم نہیں ہے بلکہ ٹھیکے پر کام کرتا ہے۔ تم اس سے فون پر بات کرلو۔ اب اس نے کیا کردیا؟''

''میں نے سوچا کہ وہ تمہارے پاس کام کرتا ہوگا کیونکہ وہ سفید ایس یو وی چلا رہا تھا جو تم نے ایک سال پہلے کمبرلینڈ فورڈ سے خریدی تھی۔''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ مجھے دیر تک دیکھتا رہا پھر غصے سے بولا۔ ''اگر یہ بلیک میلنگ ہے تو تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔'' اس نے کرسی کو پیچھے دھکیلا اور کھڑا ہوگیا۔

''میں اسٹیو نائٹ کو تلاش کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارے پیسوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''وہ یہاں نہیں ہے۔'' وہ غصے سے بولا۔ ''اور تم بھی یہاں سے چلے جاؤ۔''

یہ صرف بلیک میلنگ کا خوف نہیں تھا۔ وہ اس سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ کوئی اور ہی معاملہ تھا۔ لہٰذا میں نے باہر رک کر انتظار کیا۔ چند منٹ بعد ہی باسٹن اپنی کیڈی لک میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ میں بھی مناسب فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کا رخ شمال کی جانب تھا پھر اس نے گرے کی طرف گاڑی موڑی اور کنٹری روڈ پر ہولیا۔ سڑک پر جابجا موڑ ہونے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب رہا۔ جب میں سفیدے کے درختوں کے گرد چکر کاٹ کر ابھری ہوئی سطح پر آیا تو میں نے دیکھا کہ باسٹن کی کار چوتھائی میل کے فاصلے پر ایک گڑھے کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔

میں نے اپنی جیپ ایک صاف جگہ پر کھڑی کی اور گڑھے کے کنارے لیٹ کر اندر جھانکنے لگا۔ وہ ایک سوراخ پر سے مٹی ہٹا رہا تھا۔ پھر اس نے کھدائی روک کر اپنی مٹھی اس جگہ رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کھڑے ہوکر اپنے گھٹنوں پر سے مٹی صاف کرنے لگا۔ ایک نظر اِدھر اُدھر دیکھا پھر کار کی طرف چل دیا۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا تاکہ میدان صاف ہوجائے۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد میں مڈل اسٹریٹ پر واقع پولیس اسٹیشن میں مائیک کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کس کے لیے یہ کام کررہے ہو۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن وہ ایجنٹ بیک فائر کرسکتا ہے۔''

''اس کا بھی کوئی نتیجہ نکلے گا۔''

''اس میں تمہاری جان بھی جاسکتی ہے۔ اس نے جو عورت اس پارٹمنٹ میں رکھی ہوئی ہے، پہلی بات تو یہ کہ وہ کینیڈین ہے اور دوسرے وہ اسے استعمال کررہی ہے۔''

''باسٹن کو؟ مگر کس لیے؟''

''میں اتنا جانتا ہوں کہ اس عورت کا باپ فارماسسٹ ہے اور وہ تمہارے تصور سے بھی زیادہ امیر ہے۔ پورے امریکا میں اس کی لاتعداد گولیاں فروخت ہوتی ہیں۔ ہوم لینڈ سیکیورٹی اور ایف بی آئی نے اس پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس معاملے میں تم کیوں دلچسپی لے رہے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے الگ ہوجاؤ۔''

گویا وہ جانتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے لیکن اس کی خواہش تھی کہ میں اس معاملے میں نہ پڑوں۔ دوسرے دن صبح ساڑھے آٹھ بجے میں لیفٹی کے ڈائنر میں ناشتا کررہا تھا جب

مجھے کوسٹ گارڈ کے چیف آفیسر وینڈل ہومز کا فون آیا ہے۔ ہم دوست نہیں تھے لیکن وہ کبھی کبھی اپنی کشتی پر سے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا کرتا تھا۔

"میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔" اور چند لمحوں بعد وہ میرے ساتھ آخری بوتھ میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نیو اورلینز کا رہنے والا سیاہ فام تھا اور گزشتہ دو برس سے مین میں تعینات تھا۔

میں نے اس کے لیے کافی منگوائی تو وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی سرکاری معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کے بارے میں معلومات ظاہر کررہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، بتاؤ کیا بات ہے۔"

اس نے ایک بار پھر خالی اسٹولوں کی جانب دیکھا اور میز پر انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا جیسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ "میرے ایک جاننے والے نے مانٹریال سے فون کرکے تمہارے بارے میں پوچھا تھا، ایک دفعہ اس سے تمہارا ذکر ہوا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اگلے گھاٹ پر ایک پرائیویٹ سراغ رساں رہتا ہے۔"

"میرے بارے میں پوچھا تھا؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی ذاتی بات نہیں۔ کچھ لوگ ایک جھینگے پکڑنے والے کے بارے میں بات کررہے تھے۔ وہ ہمارے ساحل کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ کوئی اسمگلنگ کا معاملہ ہے۔"

"اس جھینگے پکڑنے والے کا کوئی نام تو ہوگا؟"

"تمہارے علاوہ اس نے ایلس کا نام لیا تھا۔ کیا تم کسی ایلس کو جانتے ہو؟"

"پرستان میں۔" میں نے کہا۔ "تم اپنی بات جاری رکھو۔"

"اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا کہ تم کسی معاملے میں ملوث ہو۔" اس نے کہا۔ "لیکن جو کچھ اس نے سنا۔ اس سے یہی لگتا ہے کہ یہاں کچھ ہورہا ہے۔ میں نے سوچا کہ تمہیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔"

"اس نے تمہیں فون کیوں کیا؟"

"وہ برطانیہ کے کسی میڈیا گروپ سے وابستہ ہے اور کسی کہانی کی تلاش میں ہے۔"

"لیکن اس نے تمہیں ہی فون کیوں کیا؟ کیا اس میں کوسٹ گارڈ بھی ملوث ہے؟"

"اوہ نہیں۔ یہ ذاتی گفتگو تھی۔ اگر سرکاری ہوتی تو میں تم سے بات نہیں کرسکتا تھا۔ یہ تو تم بھی جانتے ہو۔"

میں بہت جلدی بات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتا لیکن اگر کوئی جھوٹ بول رہا ہو تو مجھے پتا چل جاتا ہے۔ اگر کینیڈین مین کے ساحل پر کسی جھینگے پکڑنے والے کی نگرانی کررہے تھے تو اس میں کوسٹ گارڈ کی شمولیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ یہاں مجھ سے کچھ معلوم کرنے آیا تھا۔ شاید اسے اس کے کمانڈنگ آفیسر نے یہ سمجھ کر بھیجا ہو کہ ہم دونوں دوست ہیں۔ غالباً اس نے ہمیں ایک دوسرے کو ہاتھ ہلاتے دیکھ لیا ہو۔

"بہرحال میں اس اطلاع کے لیے تمہارا شکرگزار ہوں۔" میں نے کہا۔ "گویا کینیڈا میں کوئی شخص یہ سمجھ رہا ہے کہ میں کسی قسم کی مجرمانہ سرگرمی میں ملوث ہوں۔ انہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم کچھ دیر بیٹھے اس معاملے پر غور کرتے رہے لیکن کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔ گو کہ بوتھ سے باہر جاتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مایوس ہوکر گیا ہے۔

کوئی شخص یہ جاننا پسند نہیں کرتا کہ اس کے بارے میں تفتیش ہورہی ہے لیکن اس سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میرے کام میں ایسا ہوتا ہے۔ اگر کینیڈینز کے پاس میرا نام تھا تو محض کلے کے ساتھ ساحل پر بیٹھا دیکھ کر انہیں یہ معلوم نہیں ہوا ہوگا۔

میں گاڑی چلاتا ہوا کلے کے پاس پہنچا۔ وہ تہ خانے میں کرسی پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ مجھے اس کا عقبی دروازہ کھلا دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ وہ رات میں مقفل ہوتا ہو۔ تہ خانے میں دیوار کے ساتھ کچھ باکس اور ایک شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔

"کیا شکار کی تیاری ہے؟" میں نے اس کے قریب جاکر کہا۔

اس نے گن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اسے تیل دے رہا ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کینیڈینز تمہاری اور ایلس کی نگرانی کررہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "انہیں معلوم ہے کہ میں تمہارے پاس آیا تھا۔ وہ میرا نام بھی جانتے ہیں اور یہ معلومات انہیں تمہاری فون کال کی مانیٹرنگ سے ملی ہوں گی۔"

اس نے سگریٹ بجھا کر میری طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

"مجھے بتاؤ کلے کہ کیا ہورہا ہے ورنہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔"

"آؤ اوپر چلتے ہیں۔" اس نے کہا۔

کچن کی میز پر ہم آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"ممکن ہے کہ ایک کسان یہ سمجھتا ہو کہ اس بوئے کے ساتھ کوئی چیز لٹکا سکتا ہے اور یہ توقع کرے کہ وہ اسی جگہ رہے گا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔"

"اس میں اینکر نہیں تھا؟"

"بالکل تھا۔ ایک جال کو پرانی موٹر کے ساتھ باندھ دیا گیا جو پندرہ فٹ نیچے چٹانوں پر رکھی ہوئی تھی۔"

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا پھر بولا۔ "وہ ایلس کی موٹر تھی اور میری جھونپڑی میں مقفل تھی۔ میرے علاوہ اس کی چابی صرف ایلس کے پاس تھی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ جھونپڑی کا دروازہ ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔"

"اسٹیو نائٹ یا کوئی اور وہ چابی لے سکتا ہے۔"

"اس نے انہیں وہ چابی نہیں دی ہوگی۔ اس کا مجھے پورا یقین ہے۔"

"لہٰذا تم اس کے ٹریلر پر گئے؟"

"وہ ٹریلر اسٹیو کا ہے۔ میں نے اس کی پڑوسن سے بات کی تھی۔"

"میں بھی اس سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"تم جو چاہو کرو۔" اس نے کہا۔ "بس ایلس کو ڈھونڈ لاؤ۔ وہ مجرم نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس چکر میں پھنس گئی ہے۔"

مجھے اسٹیو نائٹ کا ٹریلر تلاش کرنے میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت لگا۔ میں اس کی پہلی سیڑھی پر کھڑا دروازے پر دستک دے رہا تھا کہ ایک عورت چلتی ہوئی میرے پاس آئی۔

"تم جانتی ہو کہ ایلس کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہاں نہیں ہے۔" وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "تم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"تم جانتی ہو کہ وہ کب واپس آئے گی؟"

وہ متجسس ہونے کے ساتھ کچھ پریشان بھی تھی۔ اس نے میرا چہرہ ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "تم اس کی طرف سے آئے ہو یا دوسرے لوگوں کی طرف سے؟"

"میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تم کن دوسرے لوگوں کی بات کررہی ہو؟"

"تم اس سے کیا چاہتے ہو؟"

"دیکھو۔" میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں اسے نقصان پہنچانے نہیں آیا لیکن شاید تم ایسا سمجھ رہی ہو، کیوں؟"

"اسٹیو۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تمہارا خیال ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہے؟"

"اسے ایک اجنبی سفید کار میں لے کر گیا تھا۔ میں نے اسٹیفن کو گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا۔ میں اندھیرے میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔"

"وہ اسٹیو نہیں تھا؟"

"نہیں، وہ لمبے قد کا تھا لیکن اسٹیو بھی اس کے بعد سے یہاں نہیں آیا۔ کیا تم پولیس والے ہو؟"

"میں پولیس والا تو نہیں لیکن ایلس کا ہمدرد ضرور ہوں۔ اسٹیو کتنے عرصے سے یہاں رہ رہا تھا؟"

"شاید تین ہفتوں سے۔"

"اس سے پہلے وہ کہاں رہتا تھا؟"

"مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں۔"

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں؟"

"شاید وہ کرتی ہو لیکن اسٹیو اس کے ساتھ بُری طرح پیش آتا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات دیکھے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا جیسے اس کا مالک ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس کے ساتھ کیسے رہ رہی تھی۔"

"جب تم نے ایلس کے چہرے پر نشانات دیکھے تو پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟"

"کس لیے؟ وہ کچھ بھی نہ کرتے اور وہ میرے پیچھے لگ جاتا۔ اور شاید میرے بچوں کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا۔"

کافی دیر ہوچکی تھی اور میرا خیال تھا کہ ٹاؤن آفس بند ہوچکا ہوگا۔ اس لیے میں ایک اسٹیٹ ایجنسی کے دفتر میں چلا گیا اور وہاں بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھا کہ "کیا ریڈ باسٹن اپنی جائداد فروخت کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ یہ گیرٹروڈز کارنر پر واقع ہے۔"

"تم نے کہاں سے سنا؟" یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔ "میرا نام میری بارٹن ہے۔" پھر اس کی انگلیاں لیپ ٹاپ پر حرکت کرنے لگیں۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ریڈ باسٹن۔ کنٹری روڈ فائیو، ہم اسے ڈیئر مل بھی

کہتے ہیں۔“

وہ چند سیکنڈ اسکرین کو دیکھتی رہی پھر دیوار پر لگے ہوئے نقشے پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ جگہ ہائی وے سے دس میل کے فاصلے پر ہے لیکن وہ غیر آباد ہے کسی جنگل کی طرح۔ میں تمہیں اس سے اچھی دکھا سکتی ہوں۔“

”اس سڑک پر کوئی سائن بورڈ ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ ”چیس سیوز“ کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جاسکتی ہوں۔“

”شکریہ! میں اسی طرف جا رہا ہوں، تلاش کرلوں گا۔“

”تمہیں وہاں درختوں اور دلدل کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہوگیا۔ اس سڑک پر چوتھائی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد صنوبر کے درختوں کے پیچھے مجھے روشن کھڑکیاں نظر آئیں۔ میں نے اپنی جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دیں اور ایک خالی جگہ سے گزرتا ہوا ایک چھوٹے سے کاٹیج تک پہنچ گیا جس کے قریب ہی ایک کیڈلک اور ایک سفید رنگ کی ایس یو وی کار کھڑی ہوئی تھی۔ میں جیپ سے اتر کر کاٹیج کے قریب گیا اور ایک کھڑکی میں جھانکنے لگا۔ ایک آدمی جسے میں نہیں جانتا تھا پورچ میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا آدمی بھی سیڑھیوں سے اترا۔ اس کی چپٹی ناک اور چہرے پر زخموں کے نشان تھے۔

”میرا خیال ہے کہ تم ہی اسٹیو ہو؟“ میں نے کہا۔

اندر سے کسی نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”اسے اندر لے آؤ۔“

ریڈ ایک بڑے کمرے کے دروازے پر ٹانگیں پھیلائے..... کھڑا تھا۔ ”تم پولیس والے ہو لیکن کسی وارنٹ کے بغیر مداخلتِ بے جا کے مرتکب ہو رہے ہو۔“

میں اس آدمی کی طرف مڑا جو اسٹیو کے ساتھ اندر آیا تھا۔ ”وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم نے اسٹیو کے ٹریلر سے اٹھایا تھا؟“

وہ جواب دینے کے بجائے باسٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم اسے سفید رنگ کی ایس یو وی کار میں لے گئے تھے۔“ میں نے کہا۔

اسی وقت اسٹیلی رابنسن کمرے میں داخل ہوئی۔ ”تم!“ اس نے کہا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہاں کیوں آئے؟

ریڈ نے اپنی جیکٹ سے پستول نکالا اور بولا۔ ”ابھی تمہاری پریشانی ختم ہوجائے گی۔“

میں اسٹیلی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ دوسرے کمرے سے کسی عورت کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر اسٹیو کو دوسرے آدمی کی طرف دھکیلا اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں اندھیرے میں اپنی جیپ تک پہنچا اور ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے اپنی گن نکال کر واپس آگیا۔

اسٹیو اور دوسرا آدمی ایلس کو پورچ کی طرف دھکیل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ اس نے عقبی کھڑکی سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کے چہرے پر خون نظر آرہا تھا۔

ریڈ نے جالی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اسے کمرے میں اکیلا کیوں چھوڑا؟“

”کیری گن کہاں ہے؟“ اسٹیلی نے پوچھا۔

”وہ جاچکا ہے۔“

چاروں کمرے میں آگئے۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑا ایلس کو دیکھ رہا تھا جو گھٹنوں پر ہاتھ رکھے فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ریڈ نے آگے بڑھ کر ایلس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ”اٹھو، یہ شخص پولیس کو لے کر دوبارہ آسکتا ہے۔ تم بتا دو کہ وہ مال کہاں چھپایا ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جائیں گے ورنہ تمہاری خیر نہیں۔ میں بقیہ زندگی جیل میں نہیں گزارنا چاہتا۔“

”اسے بتا دو کہ تم نے وہ سامان اٹھایا تھا، میں نے نہیں۔“ اسٹیو نے کہا۔ ”جیسا کہ میں نے بتایا مسٹر باسٹن۔ یہ ضرور میرے پیچھے اس گڑھے تک گئی ہوگی۔“

”مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں۔ وہ مال اسی کے پاس ہے اور وہ مجھے چاہیے۔“

ایلس اپنی جگہ سے اٹھی اور پتھر کے بت کی طرح ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ جیسے ہی ریڈ نے اپنی جیکٹ کی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ ”کوئی حرکت نہ کرنا۔“

پھر میں نے ان تینوں سے کہا کہ وہ اوندھے منہ فرش پر لیٹ جائیں لیکن اسٹیلی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ اچانک ہی ریڈ نے اسے اپنی جانب کھینچا۔ اسٹیلی نے اپنی کہنیاں اس کے گرد لپیٹ دیں اور فرش پر پھسلتی چلی گئی۔

میں نے ریڈ کے چہرے کا نشانہ لیا اور اسے مڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسٹیلی ایلس کی جانب رینگ رہی تھی۔ ریڈ نے مجھ سے دور ہوتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”کوئی حرکت نہ کرنا۔“

وہ بدتمیزی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم کیا کرلوگے؟“

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور میں نے گولی چلا دی۔ وہ اسٹیلی پر جاگرا۔ اس کا بازو اور چہرہ کرسی سے ٹکرایا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ ایلس نے کرسی سے چھلانگ لگائی۔ اسٹیلی نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہونے کی کوشش کی اور اسٹیو باہر کی طرف بھاگا۔ دوسرا آدمی میرے راستے میں آگیا جب میں پورچ میں آیا تو دیکھا کہ اسٹیو کیڈلک میں جا رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور چلاتے ہوئے کہا۔ ”رکو۔“

میں جلدی سے واپس اندر آیا۔ اسٹیلی، ایلس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور ایک پستول فرش پر پڑا ہوا تھا جو غالباً اس نے ریڈ کی جیکٹ سے نکالا ہوگا۔ میں نے وہ پستول اٹھا لیا اور دوسرے آدمی کے پیچھے گیا لیکن وہ جاچکا تھا۔

”تمہارے پاس فون ہے؟“ میں نے ایلس سے پوچھا۔

”میرا فون اس بیگ میں ہے۔“ اسٹیلی نے ایک میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹروپ بی بیرکس میں اپنے ایک دوست کو فون کیا تو وہ بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ جگہ کہاں ہے۔ تم وہیں ٹھہرو۔“

انہوں نے دوسرے آدمی کو ہائی وے سے گرفتار کیا جب وہ برونس وک کی طرف پیدل جا رہا تھا جبکہ اسٹیو نائٹ کی تلاش سرگرمی سے جاری تھی۔ اس نے کیڈی لک ایک سپر مارکیٹ کی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ دی تھی اور وہاں سے ایک فورڈ پک اپ لے کر بھاگ گیا تھا۔ ان سب باتوں کا علم مجھے بیرکس کے کانفرنس روم میں ہوا۔

ایلس کو اسپتال لے جایا گیا جہاں اسے ایک رات پرائیویٹ روم میں رکھا گیا۔ ایک پولیس والا اس کے دروازے پر پہرا دیتا رہا۔ آگستا سے ایک ایف بی آئی ایجنٹ آیا اور اسٹیلی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ میں نے ریڈ پر گولی چلانے کا اعتراف کرلیا اور مجھے رات بھر حوالات میں تفتیش کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ صبح ہونے پر مجھے ایک چھوٹے سے دفتر میں لے جایا گیا۔

ایف بی آئی ایجنٹ ایڈاموس ایک میز پر بیٹھی لیپ ٹاپ سے کھیل رہی تھی۔ اسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اس

بے وقوف بچہ

چھوٹا بچہ حجام کی دکان میں داخل ہوا۔ حجام نے بچے کو دیکھتے ہی اپنے گاہک سے آہستہ سے کہا۔

”یہ لڑکا دنیا کا سب سے بڑا بے وقوف ہے۔ دیکھو ابھی تمہارے سامنے ثبوت پیش کرتا ہوں۔“

حجام نے اپنے ایک ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ رکھا اور دوسرے ہاتھ میں، دو روپے کی ریزگاری رکھی اور بچے کو بلا کر کہا۔ ”بیٹا کون سے ہاتھ والے پیسے لوگے؟“

بچے نے دو روپے کی ریزگاری لی اور دکان سے نکل گیا۔

”دیکھا میں نے کیا کہا تھا... یہ بے وقوف کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگا اپنی زندگی میں۔“ حجام نے اپنے گاہک سے کہا۔

گاہک بال کٹوا کر باہر نکلا تو اس نے بچے کو آئس کریم کھاتے ہوئے پایا۔ اپنی معلومات کے لیے اس نے بچے کو روک کر پوچھا۔ ”بیٹے! تم نے دس روپے کے بجائے دو روپے کی ریزگاری لی، ایسا کیوں کیا؟“

بچے نے آئسکریم کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔ ”جس دن میں نے دس روپے کا نوٹ اٹھالیا اسی دن یہ کھیل ختم ہوجائے گا۔“

(امریکا سے جاوید کاظمی کے شگفتہ پارے)

سبب

غریب باپ کا نکما بیٹا میٹرک کے امتحان میں فیل ہوا تو اسے بیٹے پر رہ رہ کر غصہ آنے لگا کیونکہ اسی محلے کی ایک لڑکی اسی امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئی تھی۔

”اس لڑکی کو دیکھو... اس نے اپنے گھر اور خاندان کا نام روشن کردیا... اور ایک تم ہو، نکمے، آوارہ اور جاہل۔“

باپ غصے میں آکر بیٹے کو بار بار یہی طعنے دے رہا تھا۔

اسی لعنت ملامت میں دو روز گزر گئے۔ تیسرے دن بیٹے نے باپ کی زبان سے یہی سب سنا تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے جل کر کہا۔ ”ابا! میں اس لڑکی کو اور کتنا دیکھوں۔ سال بھر اسی کو دیکھتے رہنے کے چکر میں پڑ کر میں امتحان میں فیل ہوا ہوں۔“

(کوئٹہ سے حسن سردار کی بے بسی)

نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولی۔ ‘‘بیٹھ جاؤ۔’’

‘‘ایلس تو ٹھیک ہے؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘میں نے اس کے برعکس کچھ نہیں سنا۔’’ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ‘‘تم نے ریڈ باسٹن پر گولی کیوں چلائی؟’’

‘‘وہ مسلح تھا اور دو عورتوں کو دھمکا رہا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت میں گولی چلائی۔’’

اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے ہوئے بولی۔ ‘‘اس بارے میں صبح سماعت ہو گی۔ جب تم سو رہے تھے تو ہماری ایلس کے باپ سے بات ہوئی۔ تم دونوں دوست ہو۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟’’

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

‘‘ٹھیک ہے۔ ایلس اسٹاک برج تمہاری دوست ہے اور تم اسے عرصہ دراز سے جانتے ہو اور تمہیں پورا یقین ہے کہ اس نے وہ ممنوعہ سامان نہیں چرایا جو ہمیں اس کے باپ کی جھونپڑی سے ملا۔ اس پر کلے کی انگلیوں کے نشانات تھے لیکن ایلس کے نہیں۔ اس سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو؟’’

‘‘اس کا مطلب ہے کہ اس نے ان چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔’’

‘‘شاید وہ جانتی ہو کہ ان بوتلوں میں کیا ہے اور اس نے دستانے پہن رکھے ہوں جبکہ اس کے باپ کو یہ بات معلوم نہیں تھی۔’’

صاف ظاہر تھا کہ کلے نے میرے مقابلے میں انہیں بہت کچھ بتا دیا تھا۔

‘‘وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ان بوتلوں میں جو کچھ ہے۔ وہ اس نے چرا کر بیراک بوئے میں چھپا دیا تھا۔ اس طرح وہ جھوٹ بول کر اپنی بیٹی کو بچانے کی کوشش کر رہا ہے؟’’

‘‘میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نے مجھ سے اپنی بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔’’

‘‘تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ ریڈ باسٹن کے کاٹیج میں ہے؟’’

‘‘یہ مجھے وہاں جا کر پتا چلا۔’’

‘‘تم وہاں اس لیے گئے تھے کہ چند گواہوں کو خاموش کر سکو۔’’

‘‘کیا تم یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہو؟’’

‘‘تم پر فی الحال کوئی الزام نہیں ہے مسٹر کیری گن۔ یہ محض ایک غیر رسمی تفتیش ہے۔’’

‘‘لیکن تم ایلس اور اس کے باپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو۔’’

‘‘نہیں، اسے صرف گواہ کے طور پر روکا گیا ہے۔ تاہم اسے نائٹ کے ٹریلر پر جانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ البتہ وہ اپنے باپ کے ساتھ گھر جا سکتی ہے۔’’

‘‘کیا تم اسے تحفظ فراہم کر رہی ہو؟’’

وہ مسکرائی اور لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے بولی۔ ‘‘مجھے یقین ہے کہ تمہاری خدمات کس لیے حاصل کی گئی تھیں۔’’

☆☆☆

‘‘بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔’’ اس شام سلویا نے میرے بستر کی چادر بدلتے ہوئے کہا۔ ‘‘وہ ایلس کو چارے کے طور پر چھوڑ رہے ہیں۔’’

‘‘وہ ایسا نہیں کریں گے۔’’

‘‘تم بہت سادہ لوح ہو۔ اب معاملہ مختلف ہو گیا ہے۔ وہ محض زہر نہیں بلکہ ہتھیار ہے۔ اسٹیو نائٹ پر بغاوت کا جرم عائد ہو سکتا ہے۔ وہ اسے پکڑنے کے لیے سب کچھ کریں گے۔ یہ ایک جنگ ہے ڈیوڈ اور ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔’’

‘‘میں نہیں سمجھتا کہ وہ ایک عورت کی زندگی خطرے میں ڈالیں گے۔’’

‘‘پھر تم اسے پکڑ دو۔’’

ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں سماعت کئی گھنٹوں تک جاری رہی اور اس کا اختتام میرے حق میں ہوا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ میں نے جو کچھ گولی چلانے کے بارے میں بتایا۔ وہی بیان ایلس اور اسٹیمی نے بھی دیا۔ انہوں نے میرا یہ موقف بھی تسلیم کر لیا کہ میں ممنوعہ اشیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور مجھے ایک پرانے دوست نے اپنی بیٹی کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔

‘‘کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ایلس نے وہ زہر چوری کیا تھا؟’’ میں نے بوٹی سمپسن سے پوچھا جو میرے ساتھ سگریٹ پینے باہر آئی تھی۔

‘‘تم کبھی نہیں جان سکتے کہ ڈسٹرکٹ اٹارنی کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اس بوئے تک جا سکتی ہے جہاں وہ کلے کو ملا۔ جھینگے پکڑنے والے کبھی وہاں نہیں جاتے۔ کیا وہ وہاں کوئی چیز چھپا سکتے ہیں؟’’

ایلس کو وہ جگہ معلوم تھی۔ اس نے اسکول کے زمانے میں جھینگوں کی تلاش میں کھاڑی کا چپا چپا چھان مارا تھا۔ اس کی اپنی کشتی بھی تھی۔ میں سیدھا اس کے پاس آیا۔ کلے آتش دان کے پاس اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا اور ایلس اخبار پڑھ رہی تھی۔

‘‘تمہارا خیال ہے کہ انہوں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘انہوں نے مجھے گرفتار نہیں کیا۔ بس اتنا کہا کہ مجھے گواہی دینا ہو گی۔’’

‘‘یہ ان کی بہترین گواہ ہے۔’’ کلے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے یہ بھی میری ہی غلطی ہے کہ انہوں نے اس کی حفاظت پر کسی کو مامور نہیں کیا۔

‘‘میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا۔’’ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

‘‘دیکھ لینا۔ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔’’ کلے نے کہا۔

‘‘یہ میں نے اسی کے لیے کیا تھا۔’’ ایلس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ‘‘یہ بدقسمتی ہے۔’’

اس نے ایف بی آئی کو بتایا کہ اسٹیو نے اسے پیرس لے جانے اور پُرتعیش زندگی گزارنے کا جھانسا دیا تھا لیکن یہ وہ کیسے کرے گا۔ وہ تو قلاش ہو چکا تھا۔ باسٹن نے اسے معاملات سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی لیکن اسٹیمی نے شیخی بگھارتے ہوئے اسے سب کچھ بتا دیا۔

‘‘میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔’’ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ‘‘مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں جانے دے گا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں صرف اسے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔’’

‘‘تم اس سے محبت کرتی تھیں؟’’ میں نے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ‘‘میں اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکتی۔ کبھی کبھی میں چاہتی تھی کہ اس سے نجات حاصل کر لوں۔’’

‘‘جب اس نے پہلی بار مارا تو تم نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا؟’’

‘‘میں نہیں جانتی لیکن میں صرف اسے بچانے کے لیے ایسا کر رہی تھی۔ شاید مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ شاید میں اس کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔ میں احمق تھی۔ مجھے ان کی بات سننی چاہیے تھی۔’’ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

‘‘کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ تمہارے پیچھے آئے گا؟’’

‘‘میں یہ توقع نہیں کر سکتی کہ تم ہر رات میری حفاظت کے لیے آتے رہو گے۔’’

‘‘پولیس اسے تلاش کر لے گی۔ اب زیادہ دیر روپوش رہنا ممکن نہیں۔’’

چوتھی شام میں کلے کے گھر جانے والی سڑک پر جا رہا تھا کہ میری نظر ایک کار پر پڑی جو جھاڑیوں میں آدھی چھپی ہوئی تھی۔ میں نے اپنی جیپ اس طرح کھڑی کی کہ اسے نکلنے کا راستہ نہ مل سکے۔ میں نے اپنی بریٹا گن نکالی اور جنگل میں داخل ہو کر اس راستے پر چل پڑا جو کاٹیج کی طرف جاتا تھا۔ میں ایک کھڑکی کے باہر کھڑا ہو گیا اور اندر جھانک کر دیکھا۔ اسٹیو صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور کلے کی شاٹ گن اس کے زانو پر رکھی ہوئی تھی۔ کلے آتش دان کے پاس بیٹھا ہوا تھا جبکہ ایلس کرسی پر بیٹھی اسٹیو کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے خوف ٹپک رہا تھا۔

میں اسٹیو کا موڈ نہ جان سکا اور نہ ہی یہ سمجھ میں آیا کہ وہ ایلس سے کیا کہہ رہا تھا۔ اگر میں مداخلت کرتا تو شاید وہ یہ سمجھ کر ایلس کو گولی مار دیتا کہ پولیس نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔ چنانچہ میں کاٹیج کے عقبی حصے کی طرف گیا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر میں دبے پاؤں چلتا ہوا لیونگ روم کے دروازے پر پہنچا۔ جیسے ہی اسٹیو کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور شاٹ گن کا رخ میری طرف کر دیا۔ میری گولی اس کے سینے کے وسط میں لگی۔ گن اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اس نے جھک کر اٹھانا چاہا لیکن فرش پر گر پڑا۔

صبح ہوتے ہی کمرے میں فارنسک ٹیکنیشن مقامی ڈاکٹر اور دو پولیس سراغ رساں آ گئے۔ رسمی کارروائی کے بعد لاش کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ دن میں یا اگلے روز ہم سے پوچھ گچھ ہو گی۔

ایلس نے کہا کہ وہ رات بھر نہیں سو سکی۔ وہ مجھے اور کلے کو کچن میں لے گئی اور ہمارے لیے کافی بنائی۔ ‘‘میں یہیں رہوں گی تمہارے پاس۔’’ اس نے اپنے باپ سے کہا۔ ‘‘یہ نہیں جانتی کہ کب تک لیکن میری ایک شرط ہے۔’’

‘‘وہ کیا؟’’ کلے نے پوچھا۔

‘‘تم مجھے کام کرنے سے نہیں روکو گے۔’’

‘‘منظور ہے لیکن تم بھی کسی ایسے شخص سے دوستی نہیں کرو گی جو مجھے پسند نہ ہو۔’’

‘‘میں یہ غلطی دوبارہ نہیں دہراؤں گی۔’’ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ یہ غلطی نہ کرتی تو ہم کبھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔

☆☆☆

آسان مشکل

مظہر سلیم ہاشمی

فتح کا نشہ تو کچھ دیر بعد اُتر جاتا ہے... مگر شکست کے بعد جو زخم لگتے ہیں... وہ جلد ٹھیک نہیں ہوتے... ایک ایسے ہی خونیں جرم کی روداد... جو نہایت آسانی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا تھا...

خبر کی تلاش میں سرگرداں ایک ٹی وی رپورٹر کا کارنامہ......

سان فرانسسکو کے ایک نواحی قصبے میں آج صبح سے ہی غیر معمولی چہل پہل تھی۔ یہاں کے اکلوتے تھانے میں چیف نارمن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ ذہین اور قابل افسر تھا لیکن اپنی ایمان داری کی پاداش میں اس جگہ تعینات کیا گیا تھا۔ زندگی بڑی بیکاری سی گزر رہی تھی کیونکہ یہاں جرائم نہ ہونے کے برابر تھے اور زیادہ سے زیادہ شکایت بھی کسی کی نشے میں غل غپاڑا کرنے کی آ جاتی تھی، لیکن آج صبح سے وہ اس قتل کی واردات پر غور کر رہا تھا۔

’’کل رات پچھلے پہر قصبے کے سب سے امیر لینڈ لارڈ کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔‘‘ ٹی وی پر ایک زنانہ آواز گونجی اور وہ اپنی سوچ کے دھارے سے باہر نکل آیا، غالباً اس کے نائب گراہم نے آواز اونچی کر دی تھی۔ وہ بھی نوجوان رپورٹر کی رپورٹ غور سے دیکھنے لگا۔

’’چیف نارمن کے مطابق پولیس نہایت جانفشانی سے معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے مگر ابھی تک تفتیش کا دائرہ نامعلوم افراد کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔ آپ تک تازہ ترین اَپ ڈیٹ ہم پہنچاتے رہیں گے، میں ہوں شیلی ریورز......‘‘ رپورٹ کے باقاعدہ اختتام سے پہلے ہی گراہم نے آواز بند کر دی۔

چیف نارمن نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کھڑکی سے باہر جھانکا۔ لینڈ لارڈ مسٹر ہیمپٹن کا دو منزلہ مکان نظر آ رہا تھا جہاں لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

’’یہاں کے لوگوں کو کوئی اور کام نہیں ہے کہ سارا دن جائے وقوعہ پر گھوتے پھر رہے ہیں......‘‘

’’نہیں چیف۔‘‘ گراہم بولا۔ ’’بس ایک چھوٹا سا کیسینو ٹائپ کلب ہے وہاں چلے جاتے ہیں۔‘‘

’’وہ بھی بڑی بکواس جگہ ہے، کام دھندا کچھ کرنا نہیں ہوتا ان لوگوں نے اور الزام انتظامیہ پر کہ وہ کرپٹ ہے۔‘‘ چیف نارمن نے نخوت سے کہا۔

’’چیف، وہ کلب میرے بھتیجے کا ہے جی۔‘‘ گراہم کے لہجے میں اب دبا دبا احتجاج تھا۔

’’اچھا زیادہ بحث نہ کرو اور مجھے ایک مرتبہ پھر سے اب تک اکٹھے ہونے والے حقائق بتاؤ۔‘‘ چیف نارمن نے جھینپ مٹانے کے لیے ڈانٹ کر کہا......وہ شرمندہ سا ہو گیا تھا۔

’’چیف، ہمیں مسٹر ہیمپٹن کی لاش اُس کے گھر کے ڈیپ فریزر سے ملی، جب ڈاکیا چارلس یہ اطلاع لے کر آیا کہ گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ عام طور پر جمی ہوئی لاش ملنا ایک اچھی خبر ہوتی ہے......‘‘

یہ کہہ کر گراہم ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ ’’معافی چاہتا ہوں، میرا مطلب تھا کہ پولیس کے لیے اچھی خبر کہ کوئی ثبوت ضائع نہیں ہوتا......‘‘

’’کام کی بات کرو گراہم......‘‘ نارمن نے ایک بار پھر ٹوکا۔

’’اوہ چیف، میرا مطلب یہ ہے کہ جمی ہوئی لاش ثبوتوں کے حوالے سے اچھی خبر ہوتی ہے پر اس کیس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ کوئی بھاری چیز سر پر مار کر قتل کیا گیا ہے اور لاش کو فریزر میں ڈال دیا گیا۔ اس سے زیادہ کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ لاش فریز ہو جانے کی وجہ سے پوسٹ مارٹم میں قتل کے وقت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گھر کی بھی تلاشی لی ہے، ڈکیتی کا کوئی نشان تک نہیں ملا ہے۔ ملزمان کے بیانات بھی لے لیے ہیں، میرا مطلب ہے اس سے رابطہ رکھنے والے لوگوں کے بیان......‘‘

آخری بات اس نے چیف نارمن کے گھورنے پر بدلی تھی۔

’’ہمارے پاس مسٹر ہیمپٹن کے بیٹے ڈون، بیٹی جیسیکا، دوسری بیوی ایرن اور چارلس ڈاکیے کے بیان موجود ہیں۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو......‘‘ گراہم نے اپنی بات مکمل کی۔

چیف نارمن کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ’’مجھے لگتا ہے کہ ہم کوئی اہم تفصیل نظر انداز کر رہے ہیں...... ایک بار پھر سب کو بلاؤ، میں اس بار سب سے خود بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ نارمن یہ کہہ کر کیس کی فائل کی جانب متوجہ ہو گیا جبکہ گراہم نے نظر بچا کر اس کو زبان دکھا دی۔ کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی اور اُدھر چیف نے کام دگنا کر دیا تھا۔

☆☆☆

’’میرا باپ قصبے کا امیر ترین شخص تھا، کوئی بھی اُس کی دولت کے لیے اس کو مار سکتا ہے...... آپ کے خیال میں، میں نے اپنے باپ کو مارا ہے؟‘‘ ڈون کے انداز میں برہمی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ ’’پچھلے اتوار کو ہی ہم نے اکٹھے ڈنر کیا تھا اور رات میں نے حویلی میں ہی گزاری تھی، ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے...... اور جب سے میں نے اپنا بزنس شروع کیا ہے وہ تب سے مجھ پر فخر کرتے تھے۔‘‘ لفظ تعلقات پر ڈون نے زور دے کر اپنی بات مکمل کی۔

’’اپنا بزنس کیا تم نے اپنے باپ سے بھاری قرضہ لے کر شروع نہیں کیا؟‘‘ چیف نارمن نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

’’ہاں، لیکن ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے۔‘‘ ڈون گڑبڑا کر بولا۔

’’اچھی بات ہے...... کیا ان اچھے تعلقات کی وجہ سے تم اکثر اپنے باپ سے ملنے آتے تھے؟‘‘ چیف نارمن نے ایک اور سوال کیا۔

’’پہلے میں اکثر ہر ہفتے شہر سے ملنے آتا تھا، پر جب

سے اس کمینی...... میرا مطلب اس ایرن سے انہوں نے والدہ کی وفات کے بعد دوسری شادی کی ہے میرا آنا جانا کم ہوگیا ہے۔ وہ ان کی دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئی ہے۔ اب توانہوں نے قرضہ بھی......" ڈون بولتے بولتے رک گیا۔

"واپس مانگ لیا ہوگا۔" چیف نارمن نے بات پوری کر دی۔ "آپ جا سکتے ہیں پر ابھی آپ قصبہ نہیں چھوڑ سکتے۔" چیف نارمن نے یہ کہہ کر اسے چلتا کیا۔

☆☆☆

"مجھے یقین نہیں آ رہا وہ مر چکے ہیں۔" جیسیکا کی آنکھوں سے وہ آنسو بہنے لگے جن کا بیان دینے سے قبل نام و نشان تک نہ تھا۔ "میں اور وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔"

"اچھا......تو آپ پچھلے اتوار کو ان سے ملنے یہاں آئی تھیں فیملی ڈنر کے لیے؟" چیف نارمن نے پوچھا۔

"نہیں، جب سے انہوں نے ایرن سے شادی کی ہے، فیملی ڈنر تب سے لڑائی جھگڑے کی جگہ بن چکے ہیں۔ ایرن اور ڈون کی آپس میں بالکل بھی نہیں بنتی اور اکثر اوقات بات تلخ کلامی سے بڑھ جاتی تھی۔ اس لیے میں نہیں آئی۔" جیسیکا نے انکار میں جواب دیا۔

"آپ کی اس بارے میں بات ان سے کب ہوئی؟" اس بار سوال گراہم نے کیا۔

"سوموار کی رات بات ہوئی تھی، وہ بتا رہے تھے کہ اتوار کو ڈنر پر ایرن اور ڈون کی وجہ سے بہت بدمزگی ہوئی۔ ڈون تو چلا گیا تھا صبح ہی بغیر ناشتا کیے لیکن ایرن نے دماغ کھایا ہوا ہے، اس کو بھی کل صبح اس کی بہن کے ہاں سامان ڈیا کو بھجوا دیں گے۔" جیسیکا بولی۔

"اس کے بعد پھر کوئی بات ہوئی؟" چیف نارمن نے پوچھا۔

"ہاں اس منگل کی شام کو میں نے پھر فون کیا تھا۔ بڑے افسردہ محسوس ہو رہے تھے، ایرن کے جانے کے بارے میں بھی بتایا تھا۔" اس نے گلوگیر ہوتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے آپ سے اپنے قتل کے بارے میں تو کوئی بات نہیں کی؟" گراہم کے اس سوال پر چیف نارمن نے سر پیٹ لیا۔

"دیکھیں جی...... آپ کو لگ رہا ہوگا کہ مجھے ایک بہت بڑی جائداد ملنے والی ہے اس لیے میں نے اپنے باپ کا قتل کر دیا تو ایسی کوئی بات نہیں...... جتنا مجھے ملے گا اس سے دگنا ڈون کو ملے گا...... اور تو اور اس نے ایک بہت بڑی رقم بھی بطور قرض لے رکھی تھی ڈیڈی سے......آپ اس پر تحقیق کریں، میری جان بخش دیں......" اس کے انداز میں درشتگی آ گئی تھی۔

چیف نارمن نے گراہم کو اشارہ کیا کہ وہ جیسیکا کو باہر تک چھوڑ آئے۔

☆☆☆

ایرن کے چہرے پر بظاہر افسردگی تھی مگر آنکھوں کی مسکراہٹ چیف نارمن کی تیز نگاہوں میں آ گئی تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی چونتیس پینتیس سالہ خوبصورت نقوش والی عورت تھی۔ مسٹر ہیمپٹن کا اس سے دوسری شادی کرنا بنتا تھا جبکہ پہلی بیوی بھی اگلے جہان روانہ ہو چکی تھی۔

"مسٹر ہیمپٹن تو مجھ قسمت کی ماری سے بڑی محبت کرتے تھے، پر یہ رذیل ڈون ہی آ کر ان کے کان بھرتا تھا۔" اس نے سمع خراش لہجے میں کہا۔ خوبصورتی اس میں صرف دکھائی دیتی تھی، سننے میں اس کی آواز بہت بری تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ خاموش رہتی تو بہت اچھی لگتی۔

"باپ کا اتنا پیسہ کھا لیا پر چین نہیں آیا اس کمینے کو...... مار دیا آخر۔ چیف...... آپ اس کو گرفتار کر لو۔ اتوار کی رات بھی وہ مسٹر ہیمپٹن کو بڑی باتیں سنا کر اپنے گھر گیا تھا۔ او خدایا! اب میرا کیا ہوگا؟" آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کے چہرے کا نقلی غم اصلی خوف میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو اس نے بھوں بھوں کر کے رونا شروع کیا تو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

اس سب رونے دھونے میں چیف نارمن کو مزید کام کی صرف اتنی بات معلوم ہو سکی کہ ڈرائیور چھٹی پر تھا تو صاحب نے اسے ائرپورٹ چھوڑنے کے لیے ٹیکسی منگوا دی تھی اور اس بات پر ان کی بحث بھی ہوئی تھی۔ چیف نارمن نے اس کو روانہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔

"کیا محبت بھرا خاندان ہے، اب ڈاکیے کو بلا لوں؟" گراہم کے استفسار پر چیف نارمن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں مزید گہری ہو گئی تھیں۔

"چیف...... مجھ غریب کو کیوں پکڑ لیا آپ نے؟ میں نے تو الٹا آپ کو اطلاع دی تھی کہ کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے مسٹر ہیمپٹن کے گھر میں۔" چارلس ڈاکیے کے انداز میں خوف تھا۔

"پکڑا نہیں ہے، بس تھوڑی سی معلومات چاہیے تھی، ایک بار پھر سب کچھ تفصیل سے بتاؤ۔" چیف نارمن نے نرمی سے کہا۔

"مسٹر ہیمپٹن جناب اس کے بڑے شوقین تھے، کیا بولتے ہیں جناب آن لائن شاپنگ کے۔ جب بھی ان کا سامان آتا تھا وہ پہلے سے گیٹ پر موجود ہوتے تھے۔ منگل والے دن بھی میں سامان لے کر گیا تھا۔ اس وقت وہ مسز ہیمپٹن سے تو تکار کر رہے تھے اور ایک ٹیکسی بھی گیٹ پر موجود تھی۔ پھر مسز ہیمپٹن بھی لڑتی جھگڑتی ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔ اس دن ہیمپٹن صاحب نے پیکٹ لینے کے بعد کوئی انعام بھی نہیں دیا تھا مجھے۔ پر آج صبح جب میں پیکٹ لیکر پہنچا تو وہ گیٹ پر نہیں تھے۔ میں نے بیل بھی بجائی پر کوئی نہیں آیا۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا میں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔" چارلس نے اپنا بیان مکمل کیا۔

چیف نارمن کے کہنے پر گراہم نے چارلس کو باہر بٹھا دیا اور خود واپس آ کر بیٹھ گیا۔

"ایک گوشہ نشین مقتول، جو خال خال ہی کسی سے رابطہ کرتا ہے، کئی لوگوں سے اس کی دشمنی ہے، قتل کرنے کے بھی کئی محرک موجود ہیں، کوئی گواہ نہیں، کوئی ثبوت نہیں اور میری جان اس گورکھ دھندے میں پھنس گئی۔" نارمن نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کیس کا مکمل تجزیہ کر ڈالا۔

"چیف...... خود پر بھروسا رکھیں، کچھ نہ کچھ تو جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔" گراہم نے دلاسا دیتے ہوئے کہا، انداز میں اس کے بھی بے یقینی سی تھی۔

"یہ کیس تو چوں چوں کا مربا بن گیا ہے...... کیسے حل کیا جائے اس کو؟ کوئی بھی نہیں جانتا کہ مسٹر ہیمپٹن کی موت کب ہوئی...... اب کیا کیا جائے؟" اس نے شکایتی انداز میں پھر گراہم سے پوچھا۔

"چیف...... لنچ ٹائم ہو رہا ہے...... اس کے بعد کچھ اور غور کرتے ہیں۔" گراہم بولا۔

یہ بات نارمن کے دل کو لگی چنانچہ وہ اٹھ کر قریبی ریستوران کی جانب روانہ ہو گیا۔ کوشش کر کے اس نے کیس کی تفصیلات کو دماغ سے نکالا اور ساری توجہ کھانے کی جانب مرکوز کر دی۔ اسے یاد آیا تھا کہ اگر ایک معاملے پر سے دھیان ہٹا لیا جائے تو اس سے جڑی کچھ باتیں لاشعور سے شعور تک آسانی سے پہنچ جاتی ہیں۔ برگر اور فرائز کھاتے ہوئے ایک بات جو اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی، واضح ہو گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کی یہ مشکل آسان کر دی تھی۔ پولیس اسٹیشن واپس پہنچ کر اس نے گراہم کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ ایک بار پھر سے شکایات کا پٹارا کھولنے کے بجائے اس نے سوچا کے اپنے ذہن میں امنڈنے والے خیالات کے بارے میں اس سے مشورہ کر لے۔

سیڑھی سے گرے ہیں...... بیچارے دیوار میں کیل ٹھونکنے چڑھے تھے!

"اگرچہ یہ کوئی واضح ثبوت نہیں پر ہم ہوشیاری سے کام لیں تو قاتل کو گھیرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔" چیف نارمن نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد بات کے لیے تمہید باندھی۔

"چیف...... گھیرنے کو تو آپ کسی کو بھی گھیر سکتے ہیں۔" گراہم نے قدرے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"تمہارے میں سر پہ کوئی چیز دے ماروں گا۔" چیف نارمن کا انداز تنبیہی تھا، یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ میز پر دھرے کاغذات پر موجود پیپر ویٹ کی جانب بڑھ گیا۔

"سوری چیف......" گراہم نے مزاج کی تبدیلی محسوس کرتے ہی معذرت پیش کر دی اور پھر مزید کہا۔ "آپ بتائیں کہ کس سراغ کی بات کر رہے ہیں؟"

"ایک شخص نے اس کیس کے بارے میں انکشافانہ انداز میں ایک بات کہی ہے، اگر میرا اندازہ صحیح نکلا تو ہم یہ کیس وقت سے پہلے حل کر لیں گے۔"

"کیا بات کہی ہے؟ کس نے کہی ہے؟" گراہم نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھو، ڈاکیا کہتا ہے کہ وہ اپنی ڈاک وصول کرنے کے لیے گھر پر ہی ہوتا تھا، صحیح؟" چیف نارمن نے بات شروع کی۔

"بالکل صحیح۔"

"اور آخری بار اس کا کسی سے کنفرم رابطہ ہوا تو وہ اس کی

بیٹی کا منگل کی شام کو کیا گیا فون ہے۔ لاش منجمد ہو چکی ہے اور ایسی حالت میں ہے کہ ہم تعین ہی نہیں کر سکتے کہ اس کو تین گھنٹے پہلے مارا گیا ہے کہ تین دن پہلے۔ اب بتاؤ قتل کا وقت کیا ہوگا؟'' چیف نارمن نے بات پوری کرنے کے بعد سوال داغ دیا۔

''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' گراہم کے لہجے میں تحیّر تھا۔ ''منگل کی شام سے لے کر ڈاکیے کے لاش ڈھونڈنے کے موقع تک کوئی بھی وقت ہو سکتا ہے۔'' وہ محتاط انداز میں بولا۔

''ہم اس کیس کے بارے میں سب سے زیادہ جانتے ہیں، اور قتل کے وقت بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پائے جبکہ......'' وہ گراہم کو تفصیل سے اپنے دماغ میں آنے والے انوکھے خیال کے بارے میں بتانے لگا۔

☆☆☆

تک سک سے تیار شیلی ریورز اس وقت تھانے میں چیف نارمن کے سامنے بیٹھی تھی۔ گراہم نے اس کو کیس کے بارے میں اہم پیش رفت سے آگاہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔ ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں وہ میک اَپ کے ساتھ پولیس اسٹیشن کے فرسودہ ماحول میں بالکل الگ ہی نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر بچی دل آویز مسکراہٹ کئی دل جلوں کی جان لینے کے لیے کافی تھی۔

''مس ریورز ...... آپ کا اس کیس پر معلومات کا ذریعہ کون ہے؟'' چیف نارمن نے رسمی سلام دعا کے بعد مدعا بیان کیا۔

''آپ ہی تو ہیں۔ آپ بھول بھی گئے، آپ نے ہی مجھے لاش کی دریافت کے بعد سب کچھ بتایا تھا۔ جو کہ آپس کی بات ہے کچھ زیادہ نہیں تھا۔'' شیلی ریورز نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔ اس کی دلکش آواز میں شکایت در آئی تھی۔

''صحیح، مجھے یاد ہے اچھی طرح، بس میں آپ سے اس بات کی تصدیق کرنا چاہ رہا تھا کہ میرے علاوہ تو کوئی اور آپ کو اس کیس پر معلومات نہیں دے رہا۔'' یہ کہتے ہوئے چیف نارمن نے کن انکھیوں سے گراہم کی جانب دیکھا جو یہ سن کر ہوشیار ہو گیا۔

''نہیں، اور تو کوئی بھی نہیں ہے۔ جو آپ نے بتایا وہی میں نے رپورٹ کر دیا۔'' مس ریورز نے سادگی سے جواب دیا اور پھر تجسس سے بولی۔ ''کیا کوئی نئی معلومات ہیں جن کو میں رپورٹ کر سکوں؟''

''ہاں ہمیں ایک مشتبہ شخص کے بارے میں اطلاع ملی ہے، کیا تم نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ مسٹر ہیمپٹن کو کل رات کے کسی پہر قتل کیا گیا ہے؟'' چیف نارمن نے اس کے سوال کا جواب دیتے ساتھ ہی اپنا ایک سوال کر دیا۔

''بالکل کہا ہے۔'' مس ریورز نے جواب دیا۔

''کون سے پہر؟ کیا رات کے آخری پہر میں؟'' چیف نارمن نے اگلا سوال کیا۔

''ہاں جی...... اوہ...... شٹ۔'' اب کی بار شیلی روانی میں جواب دیتے دیتے گڑبڑا گئی۔

''ہمم م...... شٹ کہیں یا لعنت بھیجیں مس ریورز...... مسٹر ہیمپٹن کی آخری بار کسی سے بات ہوئی تو وہ اس کی بیٹی تھی اور رات تھی منگل کی۔ قتل کا ٹائم معلوم کرنا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ لاش کو کسی نے فریزر میں ڈال کر اس کی قلفی ہی بنا دی ہے۔ ہم بہترین اندازہ بھی لگائیں تو قتل کا وقت منگل کی رات سے لے کر آج صبح تک کا کوئی لمحہ ہوگا۔ پر ایسا لگتا ہے کہ آپ کو پوری معلومات تھی کہ کب موت ہوئی...... میں نے جب پہلی بار آپ کو رپورٹ کرتے سنا تو مجھے شک ہوا...... خیر تھوڑی دیر بعد شک ہوا کہ جو تفصیل آپ بتا رہی ہو وہ اس معاملے میں کسی انجان شخص کی ہو ہی نہیں سکتی۔''

تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ اب اعترافِ جرم کر لو کیونکہ جو کچھ کہا وہ ابھی ریکارڈ کر لیا گیا ہے اور ٹی وی رپورٹ کی ریکارڈنگ حاصل کرنا بھی کوئی مشکل کام نہیں۔''

چیف نارمن جیسے جیسے بات مکمل کرتا جا رہا تھا ویسے ویسے مس ریورز کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور چمکتا رنگ گراہم کے ہاتھ میں موبائل کیمرا دیکھ کر مزید زرد پڑ گیا۔

''لعنت ہو اس قصبے پر...... چینل والوں نے مرغوں کی لڑائی یا گھوڑوں کو نہلانے والی مزید رپورٹس قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' وہ پھٹ پڑی۔ ''مجھے نوکری سے نوٹس مل چکا تھا...... کسی اصل خبر کی تلاش میں، میں مر رہی تھی، پھر مجھے خیال آیا کہ میں ہی کیوں مروں؟ کوئی اور مرے گا تو خبر بنے گی اور رات میں ایک تنہا بڈھے کو مارنا کون سا مشکل کام ہے؟'' وہ ہذیانی انداز میں بولتی جا رہی تھی۔ یہ اس کا اعترافِ جرم تھا۔

چیف نارمن کے اشارے پر گراہم اس کو لاک اَپ میں بند کرنے لے گیا۔ وہ تاسف سے اس حسین پیکر کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو خبر بنانے کے چکر میں خود خبر بن گئی تھی۔

☆☆☆

ممنوعہ علاقہ

تنویر ریاض

ماضی سے جڑی کئی داستانیں آج بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں زندہ ہیں... ان کا پُراسرار حصار اس قدر قوی ہے کہ مکین اس سے نکل ہی نہیں پاتے... کرۂ ارض کے ایک ایسے ہی خطے سے تعلق رکھتی کہانی... پہاڑوں اور چٹانوں کی گہرائیوں میں کئی انہونی قصے سانس لے رہے تھے... آثارِ قدیمہ کے ماہر کی تلاش و جستجو کا سفر جاری تھا... مگر کوئی اَن دیکھی مخلوق انہیں اس علاقے سے نکلنے پر مجبور کر رہی تھی...

پُراسرار سرزمین سے وابستہ تحیر انگیز واقعات کی بازگشت

میں گریٹ وال کافی شاپ میں اکیلا بیٹھا نیم گرم کافی کی چسکیاں لے رہا تھا جبکہ سڑک پار لوگ ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ان دکانوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں کسی یورپی ملک غالباً سوئٹزرلینڈ سے کوئی نئی کھیپ آئی تھی۔ میرا نام ال یونگ ہے اور انگریزی میں اس کا مطلب فرسٹ ڈریگون ہے۔ میرے ڈیڈی امریکن اور ماں کورین تھی۔ اس لیے باپ نے میرا امریکی نام رکھا لیکن ماں کا اصرار تھا کہ میرا کورین نام بھی ہونا چاہیے۔ ڈیڈی کا ارادہ تھا کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کا نام سیکنڈ ڈریگون رکھیں گے لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا کیونکہ اس سے پہلے ہی میرے والدین میں طلاق ہو گئی۔ بہرحال میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو امریکی نہیں سمجھا۔ میرے ڈیڈی امریکی فوج میں نان کمیشنڈ افسر تھے۔ اس لیے ہمیں دنیا کے کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہمارا زیادہ وقت کوریا میں گزرا۔ لہٰذا میں انگریزی اور کورین زبان بڑی روانی سے بول لیتا ہوں اور اب میرا قیام بیجنگ میں ہے جہاں میں گزر اوقات کے لیے سراغ رسانی بالخصوص گمشدہ

افراد کی تلاش کا کام کرتا ہوں۔ میرا کوئی باقاعدہ دفتر نہیں ہے کیونکہ اس طرح چینی حکام مجھے تلاش کر کے بھتہ مانگنا شروع کر دیں گے۔ وہ اس رشوت کو ٹیکس کا نام دیتے ہیں۔ گاہکوں کو تلاش کرنے کے لیے مجھے ماؤتھ پبلسٹی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے میں ان گاہکوں کے انتظار میں زیادہ وقت کافی شاپ میں گزارتا ہوں۔

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گاہک کو آنے میں بیس منٹ کی تاخیر ہو گئی تھی۔ میں مایوس ہو کر وہاں سے اٹھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کافی شاپ میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ اس نے ایک نظر خالی شاپ پر دوڑائی اور میرے پاس آ کر بولی۔

”کیا تم انگریزی میں بات کر سکتے ہو؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا تو اس نے پوچھا۔ ”تم ال یونگ ہو؟“

میں نے ایک بار پھر سر ہلایا تو وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں ملی کورم ہوں۔“

ایک چینی ویٹرس ہمارے قریب آئی تو کورم نے اسے اشارے سے منع کر دیا۔ وہ منہ بناتے ہوئے چلی گئی۔

”میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ مسز کورم نے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم قابلِ بھروسا ہو اور انگریزی بھی بول لیتے ہو۔ اس کے علاوہ باڈی گارڈ کے طور پر بھی کام کر چکے ہو۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں میرے کندھوں اور بازوؤں پر جمی ہوئی تھیں۔ تم خاصے مضبوط نظر آتے ہو۔“

اس کی بات سن کر میں مسکرا دیا۔ ”تمہاری فیس کتنی ہے؟“ مسز کورم نے پوچھا۔

میں نے اپنی فیس بتا دی جس پر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے مزید کہا۔ ”نقد۔ آدھی فیس پیشگی۔“

وہ کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی۔ ”ہم نقد ادائیگی نہیں کرتے۔“

”ہم کون؟“ میں نے پوچھا۔

”میری کارپوریشن۔ کورم انٹرنیشنل۔ تم نے یہ نام ضرور سنا ہوگا۔“

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے واقعی میں نے وہ نام سن رکھا ہے۔

”اس کا ایک بہت بڑا اسکینڈل بن گیا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے اپنے پہلے شوہر انڈی کورم سے طلاق کا دعویٰ دائر کر رکھا تھا جس نے اس کمپنی کی بنیاد رکھی۔ میں نے اس کے آدھے اثاثوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اس پر وہ اتنا پریشان ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ طلاق کی کارروائی مکمل ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔“

”اور تمہیں ورثے میں پوری کمپنی مل گئی۔“ میں نے کہا۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے یہ خبر اخبار میں پڑھی تھی۔

”ہاں، اسی لیے اس کا خاندان مجھ سے نفرت کرتا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ایک جہاز ائرپورٹ پر میرا انتظار کر رہا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ ”تم میرے ساتھ چل رہے ہو یا نہیں؟“

میں کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”اگر اس کام میں سفر بھی کرنا ہے تو میری فیس میں پچاس فیصد کا اضافہ کر لو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور کافی شاپ سے باہر نکل گئی۔ میں اپنا پاسپورٹ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اور اپنی کل جمع پونجی بھی چمڑے کی پیٹی کے ساتھ باندھ رکھی تھی جو اس وقت تقریباً چھ سو ڈالر سے بھی کم تھی اسی لیے میں نے فوراً ہی مسز کورم کی پیشکش قبول کر لی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا اس لیے ہم بآسانی اپنے پاسپورٹ دکھا کر سیکیورٹی پوسٹ سے گزر گئے۔ رن وے پر ایک پرائیویٹ جہاز روانگی کے لیے تیار تھا۔ پائلٹ، معاون پائلٹ اور وردی میں ملبوس دو فضائی میزبان ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تعظیماً جھک گئے۔ ایک فضائی میزبان نے مسز کورم کا سفری بیگ پکڑ لیا جبکہ میرے پاس ایسا کوئی بیگ نہیں تھا۔

ہم نے اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ جہاز کے دروازے بند ہوئے اور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ میں نے مسز کورم کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

وہ یہ سوال سن کر کچھ پریشان ہو گئی اور بولی۔ ”میرے شوہر کو تلاش کرنے۔“

”مسز کورم۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

”پھر ہم اسے کیسے تلاش کر سکتے ہیں؟“

”کیونکہ وہ گم ہو گیا ہے۔“

میں نے اپنے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”وہ گم نہیں ہوا مسز کورم، وہ مر چکا ہے۔“

”تم میرے پہلے شوہر کی بات کر رہے ہو تو وہ واقعی مر چکا ہے۔“

”پھر تم کس کی بات کر رہی ہو؟“

”میرا دوسرا شوہر بیری ابریسٹن۔ میں نے اپنے پہلے

شوہر کے مرنے کے بعد اس سے شادی کر لی تھی۔“

کچھ دیر بعد اس کی آنکھ لگ گئی۔ میں نے ایک فضائی میزبان سے پانی مانگا جب وہ آئی تو میں نے اس سے آہستہ سے پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ ”تم نہیں جانتے؟“

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں۔“

”یولان باتار۔“ اس نے جواب دیا۔

”تمہارا مطلب ہے منگولیا؟“

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں منگولیا۔ تمہیں اور کچھ چاہیے؟“

”نہیں شکریہ۔“ میں نے کہا۔

ائرپورٹ پر ایک شخص پلے کارڈ لیے کھڑا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ منگولین کسٹم آفیسر ہے۔ اس نے ہمیں فرسٹ کلاس سروس دی اور پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد بذاتِ خود ہمیں وی آئی پی ٹرمینل تک لے کر گیا۔ میں نے شیشے کی کھڑکی سے دیکھا۔ کچھ افسروں نے جہاز کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ میں نے مسز کورم سے پوچھا۔

”یہ جہاز کا معائنہ کر رہے ہیں اور سامان کا بھی۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔“

”لیکن میرے پاس کچھ سامان ہے۔“

جہاز سے کچھ سامان باہر آیا اور کنویئر بیلٹ پر لڑھکنے لگا۔ وہ دو مضبوطی سے بندھے ہوئے کرمچی تھیلے تھے۔ ان کے پیچھے دو پیٹھ پر لادنے والے تھیلے تھے۔ پندرہ منٹ میں سامان کا معائنہ مکمل ہو گیا اور اسے دوبارہ جہاز میں رکھ دیا گیا۔ ہم بھی واپس اپنی نشستوں پر آ گئے۔ اب ہماری منزل مغربی منگولیا کا شہر ہووڈ تھا۔ یہ تین گھنٹے کی پرواز تھی۔ وہاں اترنے کے بعد ہمیں کسٹم کے مرحلے سے نہیں گزرنا پڑا۔

”یہاں سے ہم ٹرین میں سفر کریں گے۔“ مسز کورم نے کہا۔

”تیس منٹ بعد ہم ٹرین کے ایک فرسٹ کلاس کیبن میں تنہا بیٹھے تھے۔ ٹرین اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور دو منٹ میں شہر کے مضافات سے نکل گئی۔ مسز کورم نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور سیل فون کان سے لگا لیا پھر منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”سگنل نہیں آ رہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب تمہارے پاس میرے سوالوں کا جواب دینے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔“

”کیسے سوال؟“

”تم نے کہا کہ اپنے شوہر کو تلاش کرنے یہاں آئی ہو۔“ میں بولا۔ ”لیکن تم نے شروع میں یہ بات نہیں بتائی تھی۔ کیا تم اس کی وضاحت کرو گی؟“

اس نے ایک گہری سانس لے کر فون اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ دیا اور بولی۔ ”وہ پرنسٹن یونیورسٹی میں میرا ہم جماعت تھا لیکن گریجویشن کے بعد ہمارے راستے جدا ہو گئے۔ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری کرنے لگا اور میں نے ہارورڈ بزنس اسکول سے ماسٹرز کرنے کے بعد وال اسٹریٹ میں ملازمت کر لی۔ میں بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور مجھ پر زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کی دھن سوار تھی جبکہ بیری میوزیم میں جا کر قدیم انسانی ڈھانچوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ یہ وہ منزل نہیں تھی جس کی میں نے آرزو کی تھی پھر میری ملاقات انڈی کورم سے ہوئی۔ وہ مجھ سے بیس برس بڑا اور ایک مختلف کلچر سے تعلق رکھتا تھا لیکن ذہانت اور صلاحیت میں اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے قدم پھسل گئے۔“

”اور تم نے اس سے شادی کر لی؟“ میں نے کہا۔

”شروع میں سب کچھ بہت اچھا تھا۔“ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”لیکن پھر اس کے رویے میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ ایک روایتی بیوی کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کام کروں اور خاندان والے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بالآخر میں اس صورتِ حال سے تنگ آ گئی۔ میں باہر نکل کر دوبارہ اپنا کام شروع کرنا چاہ رہی تھی۔“

”بیری کے بارے میں کیا کہو گی؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”وہ بہت ہی پیارا اور معصوم انسان ہے اور اب بھی ڈھانچوں پر کام کر رہا ہے۔ اس سے میری ملاقات نیویارک کی ایک سائنس کانفرنس میں ہوئی اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔“

”وہ کب سے لاپتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ منگولیا آیا تھا؟“

”ہاں، دارالحکومت کی مخالف سمت میں الطائی پہاڑیوں کے پاس ایک دور افتادہ گاؤں تساگان گول ہے۔ وہ وہیں سے لاپتا ہوا ہے۔“

”اور اب ہم وہیں جا رہے ہیں؟“

”ہاں، وہ اپنے ایک ساتھی سائنس داں رک بینی کے ساتھ وہاں گیا تھا پھر انہوں نے پہاڑوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ انہیں وہاں ایک مہینا قیام کرنا تھا لیکن تین مہینے ہو چکے ہیں اور ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔“

"کیا مقامی انتظامیہ نے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی؟"

"ہاں کی ہے لیکن وہ پہاڑی سلسلہ بہت وسیع ہے اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس طرف گئے ہوں گے۔"

"کیا انہوں نے کوئی پیغام بھی نہیں چھوڑا؟"

"ہے مگر وہ کچھ مبہم سا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پہاڑ کی پہلی چوٹی سر کرنے کے بعد وہ اس جگہ کا سروے کریں گے اور پھر فیصلہ کریں گے کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں آثارِ قدیمہ تلاش کیے جائیں۔"

"گویا وہ ان پہاڑیوں میں کہیں بھی ہوسکتے ہیں؟"

"ہاں۔"

"انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟" میں نے پوچھا۔

"آثارِ قدیمہ اور انسانوں کی بنائی ہوئی کچھ چیزیں۔"

"مثلاً؟"

"پتھروں کے اوزار اور اس طرح کی دوسری چیزیں۔ یہ بیری کا خاص مضمون ہے۔ وہ ہومی نیڈ پر ریسرچ کررہا تھا۔ انہیں جدید انسان کا پیشرو کہا جاتا ہے۔ یہ انسانوں سے پہلے کی نسل ہے۔"

"ہمیں ایک ترجمان کی بھی ضرورت ہوگی۔" میں نے کہا۔ "کیا تم نے اس کا کوئی انتظام کیا ہے؟"

"کیا ہے۔ اس کا نام بوسوکی ہے۔ وہ ہمیں اولگی کے اسٹیشن پر ملے گا۔"

"وہاں سے وہ گاؤں کتنی دور ہے؟"

"تقریباً دو سو میل یا اس کے لگ بھگ۔ وہاں ہمیں سڑک کے راستے سے جانا ہوگا۔ اولگی اسٹیشن پر ایک گاڑی ہمارا انتظار کررہی ہوگی۔ فکر نہ کرو۔ میں نے سب انتظام کررکھا ہے۔"

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ نیند کی آغوش میں چلی جاتی، میں نے کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "مجھے بیری کے کام اور ہومی نیڈ کے بارے میں کچھ اور بتاؤ۔"

"زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کچھ سائنس دانوں نے خیال ظاہر کیا کہ موجودہ انسان سے ہم وجود والا آخری ہومی نیڈ کی نسل تیس ہزار سال پہلے معدوم ہوگئی تھی۔ گزشتہ عشرے میں مزید باتیں دریافت ہوئیں انڈونیشیا کے جزیرے فلوریس آئی لینڈ کے ایک غار میں ملنے والے ڈھانچوں اور دیگر اشیا سے پتا چلا کہ وہ چھوٹے قد کے لوگ تھے اور ان کی لمبائی بمشکل تین فٹ تھی اور بارہ ہزار سال پہلے تک بھی ان کا وجود تھا جبکہ کچھ نے یہ دعویٰ کردیا کہ وہ ابھی تک فلوریس آئی لینڈ کے جنگلوں میں موجود ہیں۔ چین کے ریڈ ڈیئر غار میں ان کی ایک اور قسم دریافت ہوئی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ساڑھے گیارہ ہزار سال پہلے تک اس کا وجود تھا۔ منگولیا سے قریب سائبیریا میں ڈینی سودن کے نام سے ان کی ایک اور قسم ملی، اس کا ایک ہی دانت ملا جس کے ڈی این اے ٹیسٹ سے معلوم ہوا کہ کم ازکم ان کی ایک جینز موجودہ انسانوں میں سے کسی ایک گروپ کو ورثے میں منتقل ہوئی ہے جس نے انہیں بلندی پر رہنے کی صلاحیت دی ہے۔ بیری کا خیال ہے کہ اس بارے میں مزید دریافت ہوسکتی ہے۔ اس نے مغربی منگولیا کا جغرافیہ دیکھا ہے اور اس جگہ کی نشاندہی کرلی ہے جہاں اسے کام کرنا تھا۔"

"اور یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ لاپتا ہوا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "اور اب ہم وہیں جارہے ہیں۔"

وہ رات ہم نے ٹرین میں سو کر گزاری اور اگلے روز سورج نکلتے ہی اولگی پہنچ گئے۔ وہاں ایک آدمی ہمارے استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے اپنا تعارف بوسوکی کے طور پر کروایا وہ ہمیں ایک پرانی لینڈ روور تک لے گیا۔ دو مزدوروں نے ہمارا سامان اس میں رکھا اور بوسوکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے ہم بلوتا ئی گاؤں کی طرف جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔ "اس کے بعد تسا گان گول۔"

ہم بڑی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستہ بے حد ناہموار اور کچا تھا۔ بار بار جھٹکے لگنے سے میری کمر میں درد ہونے لگا تھا۔ راستے میں دو جگہ رک کر بوسوکی نے گاڑی کے پیچھے بندھے ہوئے جیری کین میں سے پیٹرول ڈالا۔ بالآخر نصف شب کے قریب ہم تسا گان گول پہنچ گئے۔ صرف چند گھروں میں مٹی کے تیل کے لیمپ روشن تھے۔ گاؤں کے وسط میں اینٹوں سے بنی ایک عمارت تھی جہاں برقی روشنی تھی۔ بوسوکی نے اس عمارت کے سامنے گاڑی روک دی۔ میں نیچے اترا اور اپنے جسم کو سیدھا کرکے اس جانب دیکھنے لگا۔ جہاں سے ڈیزل جنریٹر کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔ رات سرد تھی اور درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے کچھ کم تھا۔ میں نے مسز کورم کو گاڑی سے نیچے اترنے میں مدد دی اور ہم ایک ساتھ عمارت میں داخل ہوگئے۔

وہ ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ہمیں دیکھ کر خاکی وردی میں ملبوس ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تعظیماً جھکتے ہوئے خیر مقدمی انداز میں بولا۔ "مسز کورم۔"

"میرے شوہر کا کچھ پتا چلا؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"اس کا کیا مطلب ہے؟" وہ برہم ہوتے ہوئے بولی۔

اس کے سینے پر سینکم کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی اور میں نے اندازہ لگالیا کہ وہی مقامی پولیس کمانڈر ہے۔ "ہمیں ایک لاش ملی ہے۔" ایک مقامی شخص اسے لے کر آیا تھا۔" اس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے لیکن میں پھر بھی کہوں گا کہ تم اسے شناخت کرلو۔"

"نہیں۔ میں ایسا نہیں کرسکتی۔"

"پلیز۔" کمانڈر نے کہا۔ "اس طرف چلو۔"

وہ ہمیں ایک عقبی کمرے میں لے گیا۔ جہاں ایک کاکیشیائی شخص لکڑی کی بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ یا گیارہ انچ اور عمر پچیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے پر درجن بھر زخم تھے۔ لگتا تھا جیسے کسی کند چیز سے ضربیں لگائی گئی ہوں۔ میں نے قریب جاکر لاش کو بغور دیکھا۔ اس کے ہاتھوں اور کہنی سے کلائیوں تک بھی زخم تھے۔ جن سے لگتا تھا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے جدوجہد کی تھی لیکن زیادہ دیر حملہ آور کا مقابلہ نہ کرسکا۔

کمانڈر سینکم نے اس کی لاش کو پلٹا تو اس کی کمر کے نچلے حصے میں مزید زخم دکھائی دیے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مسز کورم اب مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ چہرے پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اسے سہارا دیا اور چند لمحوں بعد پوچھا۔ "کیا یہ تمہارا شوہر ہے؟"

"نہیں۔" وہ بولی۔ "یہ اس کا معاون ہے۔ جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔ رک بینی۔" یہ کہہ کر وہ دوبارہ رونے لگی۔

وہ رات ہم نے ایک گنبد نما خیمے میں گزاری جسے خاص طور پر ہمارے لیے تیار کیا گیا تھا۔ ایک منگول عورت نے ہمارے لیے لکڑی کے چولھے پر کھانا بنایا جو ابلے ہوئے گوشت پر مشتمل تھا۔ صبح تک مسز کورم پوری طرح غم سے نجات پاچکی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ گاڑی میں سے وہ دو تھیلے لے آؤں جو خیموں کے علاوہ تھے۔ ہم نے جب انہیں کھول کر دیکھا تو ان میں ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ بوٹ، برف میں پہننے والے جوتے، ٹارچ اور فرسٹ ایڈ بکس وغیرہ۔ سب سے زیادہ خوشی مجھے کپڑے دیکھ کر ہوئی۔ ان میں ایک بھاری بھرکم جیکٹ بھی تھی جسے میں نے فوراً ہی پہن لیا۔

"تمہیں میرا سائز کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے اندازہ لگالیا تھا کہ تم جیسے لمبے چوڑے آدمی کے لیے یہی سائز موزوں رہے گا۔" پھر اس نے میز پر ایک نقشہ پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرف۔" اس نے پہاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں سے ہم ان چوٹیوں کو دیکھ سکتے ہیں جن کے دامن میں ایک طویل وادی ہے۔ مقامی شکاری بعض اوقات وہاں تک جاتے ہیں لیکن اس سے آگے نہیں۔"

"کوئی وہاں کا سفر کیوں کرے گا؟" میں نے کہا۔ ہم تو اپنے آپ کو اس جگہ بھی بے آرام محسوس کررہے تھے۔

"کوئی بھی نہیں۔" اس نے کہا۔ "بظاہر وہاں جانے کی کوئی وجہ نہیں لیکن ہزاروں سال پہلے منگولیا کا موسم گرم تھا۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ قدیم انسان نے اس علاقے میں پناہ لی ہوگی تاکہ یہاں سے وہ نیچے رہنے والوں اور شکاریوں پر حملے کرسکیں۔"

"وہ وہاں محفوظ ہوں گے؟" میں نے کہا۔

"بہت زیادہ۔" اس نے کہا۔ "لہٰذا بیری نے سیٹلائٹ فوٹو دیکھے اور اس علاقے کو تلاش کے لیے منتخب کیا۔" اس نے نقشے پر بنے ہوئے ایک سرخ دائرے پر انگلی رکھی۔

"نقشے پر یہ چھوٹا دکھائی دے رہا ہے لیکن اگر پیمانہ درست ہے تو یہ کافی بڑا علاقہ ہے۔"

"ہاں، ایک ہزار مربع کلومیٹر سے بھی زیادہ۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن پہلے ہمیں یہ پتا لگانا ہوگا کہ اس گریجویٹ طالب علم کی لاش کہاں سے ملی تھی تاکہ وہیں سے ہم اپنی تلاش شروع کریں۔"

"ہاں۔" مسز کورم اتفاق کرتے ہوئے بولی۔ "پہلے ہم وہاں جاکر اس جگہ کا معائنہ کریں گے اور پھر اس علاقے کا رخ کریں گے۔"

ہماری بوسوکی سے ملاقات پولیس اسٹیشن میں ہوئی۔ اس نے پہلے ہی دو آدمیوں کا انتظام کرلیا تھا جو ہمارا سامان پہاڑیوں تک لے جاتے۔ جب مسز کورم اپنی نگرانی میں لینڈ روور سے وہ سامان اتروا رہی تھی تو میں چپکے سے کھسک لیا اور گاؤں میں اس جگہ پہنچا جس کے باہر بار کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ میں مرکزی دروازے سے داخل ہوکر اندر گیا۔ دس فٹ کے فاصلے پر بائیں جانب ایک اور دروازہ تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی پھر میں نے اس پر ہلکے سے دستک دی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو زور زور سے کھٹکھٹانا شروع کردیا۔ اندر سے کسی نے غصے میں کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ بالآخر دروازہ کھل گیا اور ایک بھاری بھرکم شخص برآمد ہوا۔

"تم انگریزی سمجھتے ہو؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلادیا۔ پھر میں نے چینی زبان میں پوچھا۔ "تم چینی بول سکتے ہو؟"

اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف منہ کر کے چلایا۔ ”نیان۔“

ایک نوجوان عورت باہر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم کیسی ہو؟“

اس نے چینی میں جواب دیا اور اس طرح ہماری گفتگو شروع ہوگئی۔ وہ مجھے اندر لے گئے اور میں نے ان کے سامنے کچھ رقم رکھ دی۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے مشروب کی پیشکش کی لیکن میں نے منع کر دیا۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ مرد کا نام ٹورل اور عورت کا نیان تھا جو جانتی تھی کہ قصبے میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ میری قومیت کے بارے میں متجسس تھے اور ان کا خیال تھا کہ میں کسی حد تک منگولین سے ملتا جلتا ہوں۔ اس کے بعد وہ گھل مل گئے اور مجھ سے پرانے دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ان سے وہ تمام سوالات پوچھ لیے جو اس وقت میرے ذہن میں آئے پھر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا آیا۔

مسز کورم میرے اس طرح غائب ہو جانے پر ناراض ہو رہی تھی لیکن میں نے اسے کسی نہ کسی طرح ٹال دیا۔ ایک بار پھر ہمراہ سفر شروع ہوگیا۔ ہم اس جگہ جا رہے تھے جہاں رک بنی کی لاش ملی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی ہمارے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پولیس کمانڈر کے کہنے پر دو دن سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ عقب میں ایک ٹیلا تھا جسے اس نے اپنا کیمپ بنا رکھا تھا۔ اس بوڑھے شخص نے اپنا نام کچلک بتایا۔ یوسوکی نے ترجمان کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا۔

”اس کا کہنا ہے کہ وہ مارکیٹ جا رہا تھا کہ اس کی نظر پتھروں پر پڑی۔ وہ سمجھا کہ یہ ٹیلے سے پھسل کر گرے ہوں گے جب وہ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی ملبے کے ڈھیر پر پڑا ہوا ہے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس نے لاش کو اپنے چھکڑے پر ڈالا اور تسا گان گول چلا گیا۔ جب اس نے کمانڈر سینگم کو اس جگہ کی بابت بتایا تو اس نے حکم دیا کہ وہ وہیں واپس جائے اور انتظار کرے۔“

”لہٰذا یہ یہاں دو دن سے بیٹھا ہوا ہے؟“ مسز کورم نے پوچھا۔

”ہاں، اسے یہی حکم ملا تھا۔“

ہم نے اس بوڑھے سے کچھ مزید سوالات کیے۔ مثلاً یہ کہ کیا وہ اکثر اس جگہ سے گزرتا ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ہمارا دوسرا سوال تھا کہ کیا اس نے پہلے بھی کسی کو اس حالت میں پڑا ہوا دیکھا جس کا جواب اس نے نفی میں دیا۔ مسز کورم نے اس سے رک کے جسم پر آنے والے زخموں کے بارے میں پوچھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ کیا بوڑھے نے اس سے پہلے بھی اس طرح کے زخم دیکھے ہیں۔ وہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نظر آ رہا تھا لیکن یوسوکی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کسی سادہ لوح دیہاتی سے یہ توقع نہیں کر سکتیں کہ وہ زخموں کا تجزیہ کر سکے۔“

مسز کورم نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر بھی میں سننا چاہوں گی کہ یہ کیا کہتا ہے۔“

یوسوکی نے اس بوڑھے کے سامنے وہ سوال دہرایا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا ”ال مستی“۔

”دیکھو۔“ یوسوکی نے کہا۔ ”کیسی احمقانہ باتیں کر رہا ہے بلکہ اس سے بھی بُری۔ یہ تو توہم پرستی ہے۔“ وہ بوڑھا اب بھی مسکرا رہا تھا۔ مسز کورم نے پوچھا۔

”یہ ال مستی کیا ہے؟“

”پرانی توہم پرستی۔ فرضی داستان۔ جنگلی شخص جو پہاڑوں پر رہتا ہے۔ ان دیہاتیوں کی سمجھ میں جب کوئی بات نہیں آتی تو یہ اس کا نام لے دیتے ہیں۔ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔“

”پھر بھی اسے بتا دو کہ میں اس کی رائے کی قدر کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر مسز کورم نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکالے اور بوڑھے کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا۔“ مسز کورم نے یوسوکی سے کہا۔ بوڑھے نے سیٹی بجا کر گھوڑے کو بلایا۔ اسے اپنے چھکڑے کے ساتھ جوتا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

دوسرے دن ہم کچی سڑک کے اختتام تک پہنچ گئے۔ اس کے آگے چوٹیوں کے درمیان ایک خالی جگہ تھی جس کے بارے میں یوسوکی نے بتایا کہ اس کے آگے ایک اونچی وادی ہے پھر عمودی چٹانوں کی دو قطاریں ہیں اور پروفیسر بیری کو امید تھی کہ اسے یہاں کوئی ایسا ثبوت مل جائے گا کہ کسی زمانے میں ہوی نیڈ کے آباؤاجداد یہاں رہتے تھے۔

یوسوکی ہمارے ساتھ خوش نہیں تھا لیکن کورم انٹرنیشنل نے اسے مسز کورم کی معاونت کرنے کے سلسلے میں بھاری معاوضہ دیا تھا۔ مجبوراً اس نے اپنی پشت پر ایک تھیلا، رسیاں اور دوسرا ضروری سامان لادا اور پہاڑیوں کی طرف ہماری راہ نمائی کرنے لگا۔ میں اور مسز کورم اس کے پیچھے اور ہمارے عقب میں دونوں مزدور بھاری سامان لے کر چل رہے تھے۔

ہم دن بھر چلتے رہے اور اندھیرا ہونے سے پہلے ایک جگہ کیمپ لگا لیا۔ یوسوکی اور میں ایک خیمے میں، دونوں مزدور دوسرے اور مسز کورم کا الگ خیمہ تھا۔ چھوٹے ہیٹر خیمے کے وسط میں رکھ دیے گئے۔

ہم اس طرح تین دن تک سفر کرتے رہے۔ چوتھے روز سہ پہر میں مسز کورم نے نقشے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ”بس اس پہاڑ کی چوٹی تک جانا ہے۔ انہی میں سے کوئی ایک سطح مرتفع ہے جس کے بارے میں میرے شوہر کو یقین تھا کہ ہوی نیڈ یہاں زندہ رہ سکتے ہیں۔“

”اب یہاں کوئی رہتا ہے؟“ میں نے یوسوکی سے پوچھا۔

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ یہ ایک الگ تھلگ جگہ ہے اور یہاں سوائے پہاڑی بھیڑوں کے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا اور دیکھا کہ ایک سفید کھال والی بھیڑ ہمیں گھور رہی تھی۔

”یہ ایک خطرناک چڑھائی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

مسز کورم بولی۔ ”لیکن ہم اسے سر کر سکتے ہیں۔ یہ مزدور ہماری مدد کریں گے۔“

اس کا خیال غلط نکلا۔ اگلی صبح دونوں مزدور غائب ہو چکے تھے۔

گاؤں میں بارٹینڈر ٹورل نے مجھے بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کو ایک دن امیر بننے کی توقع تھی۔ اس علاقے میں کئی سالوں سے یہ کہانیاں گردش کر رہی تھیں کہ ان پہاڑوں میں تانبے کے بڑے ذخائر چھپے ہوئے ہیں۔ چند برس قبل روسی ماہر ارضیات کی ایک ٹیم نے یہاں کا سروے کیا تھا۔ جب وہ تسا گان گول واپس آئے تو وہاں جشن کا سا سماں تھا۔ روسیوں نے ٹورل کے بار سے بہت سی شراب خریدی۔ اس جشن کے نتیجے میں گاؤں کی بہت سی عورتیں حاملہ ہوگئیں جس کا ثبوت ان کے کچھ بچوں کے چہرے ہیں پھر روسی یہاں سے چلے گئے۔ چند مہینوں بعد جاپان سے ایک اور ٹیم آئی۔ یہ لوگ روسیوں کے مقابلے میں تجارتی ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے کسی عورت کو حاملہ نہیں کیا اور نہ ہی بار میں زیادہ پیسے خرچ کیے۔

کئی ماہ بعد یوسوکی نے انکشاف کیا کہ نہ تو روسی اور نہ ہی جاپانی واپس آ رہے ہیں۔ گو کہ تانبے کے ذخائر کی تصدیق ہوگئی تھی لیکن انہیں نکالنے اور اس دور دراز علاقے سے لے جانے کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اس کے لیے سڑکیں، پل اور ہوائی اڈا بنانا پڑتا۔ اس لیے انہیں اس منصوبے میں کوئی کشش نظر نہیں آئی۔ یہ خبر سن کر لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی اور یوں لگا جیسے ان کی قسمت میں امیر بننا نہیں ہے پھر چینی آ گئے۔

وہ جاپانیوں سے بھی زیادہ محتاط تھے۔ انہوں نے مقامی لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کیا اور خود ہی پہاڑوں میں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی کسی کو خبر نہ ہوئی کہ چینیوں کے عزائم کیا تھے۔ یہ خبر بھی یوسوکی نے ہی سنائی کہ وہ اس علاقے کے معدنی حقوق خریدنا چاہ رہے تھے۔ وہ دارالحکومت میں حکام سے مذاکرات کر رہے تھے اور انہوں نے اس کے لیے بھاری رقم کی پیشکش کی تھی۔ وہ کان کنوں اور مائننگ مشینری لانے اور یہاں سے خام مال چین لے جانے کے لیے سڑکیں، پل اور ہوائی اڈا تعمیر کرنے کے لیے بھی تیار تھے۔ وہ روسیوں اور جاپانیوں کے مقابلے میں زیادہ دوراندیش تھے اور اس منصوبے میں بھاری سرمایہ کاری کرنے کے خواہش مند تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آئندہ دس برسوں میں انہیں اپنی لگائی ہوئی رقم واپس مل جائے گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ملک کی پھیلتی ہوئی صنعت کو خام مال مہیا کر سکیں گے۔

تاہم اس سلسلے میں مذاکرات کامیاب نہ ہو سکے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ چینیوں کی جانب سے جو رشوت پیش کی گئی، وہ ناکافی تھی جبکہ دوسرے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ منگولین افسروں نے دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے رشوت کی پیشکش ٹھکرا دی کیونکہ انہیں اپنے ملک کا مفاد عزیز تھا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ چین کی نظریں ہمیشہ سے ہی منگولیا کی قیمتی معدنیات پر رہیں۔ بہرحال منگولیا کی حکومت نے چین کی پیشکش ٹھکرا دی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے اسے قبول کر لیا تو اس کا مطلب چین سے آئے ہوئے لوگوں کی لامحدود خواہشات اور غلبے کو قبول کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں ایک دن وہ اپنا ملک گنوا دیں گے۔

”اس طرح ہم واپس وہیں آ گئے جہاں سے چلے تھے۔“ ٹورل نے مجھے بتایا۔

”کیا یوسوکی اب بھی چینیوں کے لیے کام کرتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ پیسوں کی خاطر کسی کے لیے بھی کام کر سکتا ہے۔“

☆☆☆

”مزدور کیوں چلے گئے؟“ مسز کورم نے پوچھا۔

”توہم پرستی۔“ یوسوکی نے جواب دیا۔ ”ان کا ماننا ہے کہ ان پہاڑیوں کی رکھوالی ہو رہی ہے۔“

”کون کر رہا ہے؟“

”شیطانی روحیں۔ منگولیا کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ چنگیز خان کا مقبرہ اسی ملک میں ہے لیکن کوئی اس کے محل وقوع سے واقف نہیں۔ لیکن اس علاقے میں رہنے والے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ مقبرہ انہی پہاڑیوں میں کسی دور دراز مقام پر ہے۔

شاید اسی سطحِ مرتفع یا اس کے پاس جہاں تمہارا شوہر تحقیق کر رہا تھا۔‘‘

’’کیا تم سمجھتے ہو کہ اسی لیے اس کے معاون رک بنی کو قتل کیا گیا تا کہ اسے اس افسانوی مقبرے کو دریافت کرنے سے روکا جائے۔‘‘ مسز کورم نے پوچھا۔

’’عین ممکن ہے۔‘‘ یوسوکی نے جواب دیا۔

’’کیا اس مقبرے کی حفاظت شیطانی روحیں کر رہی ہیں یا وہ جنگلی لوگ جن کا ذکر اس بوڑھے نے کیا تھا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’دونوں۔‘‘ یوسوکی نے جواب دیا۔ ’’یہاں کے لوگ یہی سمجھتے ہیں گو کہ یہ احمقانہ باتیں ہیں۔‘‘

’’مزدوروں کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘ مسز کورم بولی۔ ’’ہم اپنا سفر جاری رکھیں گے۔‘‘

ہمیں اس بلند ہموار مقام تک پہنچنے میں تین دن لگ گئے۔ وہ بالکل ویران اور بنجر جگہ تھی جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔

’’بظاہر یہی لگتا ہے کہ رک واپس جا رہا تھا جب اسے قتل کیا گیا ہے لیکن اس کے واپس جانے کی کیا وجہ تھی؟‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

’’ممکن ہے کہ بیری زخمی ہو گیا ہو۔‘‘ مسز کورم نے کہا۔ ’’اور رک اس کی مدد کے لیے لوگوں کو بلانے جا رہا ہو۔‘‘

ہم نے اپنا سامان اٹھایا اور آگے بڑھ گئے۔ اس میدان کو عبور کرنے میں ڈیڑھ دن لگ گیا۔ پھر ہمیں چٹانوں کی ایک قطار نظر آئی جن میں غار بنے ہوئے تھے۔ ہم نے بغور اس جگہ کا مشاہدہ کیا لیکن وہاں بھی زندگی کے آثار نظر نہیں آئے۔

دو دن کی تلاش کے بعد محسوس ہوا کہ ہماری خوراک کا ذخیرہ تیزی سے کم ہو رہا ہے۔ یوسوکی نے واپسی کی تجویز پیش کی۔ اس پر مسز کورم بولی۔ ’’تم دونوں جا سکتے ہو۔ میرے حصے کا راشن چھوڑ دو۔ میں بیری کی تلاش جاری رکھوں گی۔‘‘

’’اگر تم نے اپنی خوراک آدھی کر دی تو یہ ذخیرہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ دن چلے گا پھر تم کیا کرو گی۔ کھائے پیے بغیر تو واپس تساگان گول تک بھی نہیں پہنچ سکتیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں اسے تلاش کر لوں گی۔‘‘

یوسوکی نے کہا۔ ’’میں اپنے حصے کا راشن تم دونوں کے لیے چھوڑ کر واپس جا رہا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنا سامان اٹھایا اور واپس جانے لگا۔

’’تمہارا کیا ارادہ ہے؟‘‘ مسز کورم نے پوچھا۔

’’میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔‘‘ میں نے کہا۔

اگلے دن کے اختتام تک ہم بُری طرح تھک چکے تھے۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے اس پاگل عورت کا ساتھ کیوں دیا۔ سورج غروب ہونے لگا تو ہم نے اپنے تھیلے زمین پر پھینکے اور خود بھی تھک کر لیٹ گئے۔ میری نظریں آسمان پر تھیں کہ میں نے سورج کی ڈوبتی ہوئی شعاع کو کسی دھات سے ٹکراتے دیکھا۔

’’مجھے دوربین دینا۔‘‘

وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے دوبارہ کہا تو اس نے دوربین مجھے پکڑا دی۔ میں نے اسے آنکھوں سے لگایا تو وہ روشنی دوبارہ نظر آئی۔

’’وہاں۔‘‘ میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’غار کے دہانے کے سامنے دیکھو۔‘‘

’’کون سا غار؟‘‘ اس نے دوربین پکڑتے ہوئے کہا۔

’’نیچے کی جانب ایک چوڑا غار ہے۔ وہاں کوئی دھات نظر آ رہی ہے۔‘‘

اس نے اپنا سانس روک لیا۔ روشنی ایک بار پھر دھات کی سطح سے ٹکرائی۔ ’’میں دیکھ رہی ہوں۔‘‘ وہ بولی۔

’’اب وہاں تک جانے کا وقت نہیں رہا۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’ہم جا سکتے ہیں۔‘‘

’’بہت جلدی اندھیرا ہو جائے گا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔ ہمارے پاس ٹارچیں ہیں۔‘‘

ابھی ہم نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو گیا۔ ہم ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھتے رہے لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ کسی چٹان سے ٹکرا کر پیر نہ پھسل جائے بالآخر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا اور میں نے کہا۔ ’’ہم اس اندھیرے میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہم میں سے کسی ایک کو بھی حادثہ پیش آ سکتا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ صبح کی پہلی کرن نمودار ہونے تک ہم یہاں رک جاتے ہیں۔‘‘

ہم نے اپنے خیمے لگانے کی بھی زحمت نہیں کی اور اپنے سامان پر ہی لیٹ گئے۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ سخت سردی کے باوجود گہری نیند سو گیا پھر ایک چیخ سے میری آنکھ کھل گئی۔ وہ مسز کورم کی آواز تھی۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس لیے ایک بیلچہ لے کر ہی آواز کی سمت چل دیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ آواز کم از کم سو گز کے فاصلے سے آئی تھی۔ اس نے صبح ہونے کا انتظار نہیں کیا اور خود ہی اس جانب چل دی جہاں اس نے روشنی دیکھی تھی۔ میں اندازے سے اسی سمت میں آگے بڑھنے لگا پھر مجھے کسی کے کھانسنے کی آواز آئی۔

’’مسز کورم؟‘‘ میں نے کہا۔

’’میں یہاں ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔

میں اس آواز کی سمت چل دیا۔ وہ ایک ٹیلے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی باہر آ گئی۔

’’تم نے چیخ کیوں ماری تھی؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ میں نے کسی آدمی کو دیکھا تھا۔‘‘

’’یہاں؟‘‘ میں نے تعجب سے کہا۔ ’’کیا وہ کوئی منگول تھا؟‘‘

’’میرا خیال ہے کہ نہیں۔ وہ بے لباس تھا۔‘‘

’’پھر تو وہ سردی سے جم گیا ہوگا۔‘‘

’’ہاں لیکن اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں کیا۔ وہ بالکل نارمل لگ رہا تھا۔‘‘

’’کیا وہ تمہاری طرف بڑھا تھا؟‘‘

’’نہیں، وہ وہاں کھڑا رہا۔‘‘ اس نے پہاڑی کے شمالی حصے کی جانب ایک چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’اور جب تم چلائیں تو کیا ہوا؟‘‘

’’جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ غائب ہو چکا تھا۔‘‘

’’کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتی ہو؟‘‘

’’میں نے صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ اس کا قد عام منگولوں کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ سر پر بہت زیادہ بال تھے اور اس نے ہاتھ میں چھڑی پکڑی ہوئی تھی۔‘‘

میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا اور بولا۔ ’’اگر مقامی لوگ یہ بات سن لیں تو یہی کہیں گے کہ تم نے کسی جنگلی انسان کو دیکھ لیا جسے وہ ال مستی کہتے ہیں۔‘‘

اس نے اپنے آپ کو بھینچتے ہوئے کہا۔ ’’ایسا مت کہو۔ یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ میری نیند پوری نہیں ہوئی اور ذہن پر بھی بوجھ ہے۔‘‘

’’گویا تم نے اس کا تصور کیا تھا؟‘‘

’’بالکل۔‘‘ وہ بولی۔ ’’ایسا ہی ہے۔ یہ یقیناً میرا تصور ہی ہوگا۔ چلو ہم اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔‘‘

ہم نے بیٹری بچانے کے لیے ایک وقت میں ایک ہی ٹارچ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا حالانکہ میری جیب میں دو فالتو بیٹریاں بھی تھیں۔ میں غار میں داخل ہو کر چند فٹ اندر آ گیا۔ اچانک ہی کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ ہم دونوں اپنی جگہ پر منجمد ہو کر رہ گئے۔ یہ آواز ہمارے دائیں جانب سے آئی تھی۔ اس کے اوپر چٹان میں قدرتی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مسز کورم نے ان سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اسے ایک گھنی داڑھی والے شخص پر جھکے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بخار سے متاثر تھیں لیکن وہ ہماری موجودگی سے باخبر تھا۔ وہی پروفیسر بیری ایڈلیسٹن تھا۔ بالآخر مسز کورم نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔

ہم دونوں نے اسے غار سے باہر نکالا اور مسز کورم اپنے شوہر کے لیے پینے کا پانی لے کر آئی۔ پھر ہم نے اس کے گندے کپڑے اتارے۔ اس کا جسم صاف کیا اور اسے دوسرے کپڑے پہنائے جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ ہم غار کے دہانے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز کورم نے کہا۔ ’’ہم اسے اس حالت میں واپس نہیں لے جا سکتے۔ میں اس کے پاس رک جاتی ہوں۔ تم مدد لے کر آؤ۔‘‘

’’میرے واپس آنے سے پہلے تم بھوکی مر جاؤ گی؟‘‘

’’کیا تمہارے پاس اس سے بہتر کوئی تجویز ہے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ میں نے آہستہ سے کہا۔ ’’صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔‘‘

میری آنکھ ایک زوردار آواز سے کھل گئی۔ یوں لگا جیسے چند فٹ کے فاصلے پر کوئی کودا ہو۔ مسز کورم چلاتے ہوئے بولی۔ ’’یہ کیسی آواز تھی؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم۔ اپنی ٹارچ روشن کرو۔‘‘

غار کے سامنے والے حصے پر کچھ نہیں تھا لیکن آگے چل کر کونے میں مجھے ایک مردہ جسم نظر آیا۔ میں نے جھک کر اسے چھوا۔ وہ ابھی تک گرم تھا۔ ’’یہ کیا ہے؟‘‘ مسز کورم نے پوچھا۔

’’ایک پہاڑی بھیڑ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ مر چکی ہے۔‘‘

’’ضرور یہ اوپر سے گری ہوگی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ہم خوش قسمت ہیں۔ کل کے کھانے کا انتظام ہو گیا۔‘‘ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

جب میں روانہ ہونے لگا تو اس نے مجھے ایک چیز دکھائی۔ ’’مجھے تو یہ پتھر سے بنائی ہوئی دستکاری لگتی ہے۔‘‘

’’تمہارے خیال میں یہ کتنی پرانی ہوگی۔‘‘

’’ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔ میرے شوہر کو اس غار میں ملی ہے اور یہ ہومی نیڈ کے پیشے کا ایک یقینی ثبوت ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم یہ اپنے ساتھ لے جاؤ اور کسی ایسے شخص کو دکھاؤ جو اس کی صحیح جانچ کر سکے۔‘‘

میں نے اسے اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ’’وہ جب صحت یاب ہو جائے گا تو خود اس کی جانچ کر سکتا ہے۔‘‘

واپسی کا سفر طے کرتے ہوئے میں نے ان تمام واقعات پر غور کیا جو اب تک پیش آئے تھے۔ میں نے جو کچھ پولیس اسٹیشن میں دیکھا۔ یوسوکی نے جو بتایا اور جو کچھ ٹورل اور اس کی بیوی سے سنا۔ اس سے ایک ہی بات ذہن میں آئی کہ کیا کوئی شخص یہ نہیں چاہتا کہ کوئی سائنس داں یا ماہرِ آثارِ قدیمہ اس

علاقے میں آئے۔ کیا اسی لیے رک بینی کو قتل کیا گیا۔ ٹورل کے کہنے کے مطابق ہمارے گائڈ یوسوکی کو بے پناہ فائدہ ہوتا اگر چینی سرمایہ دار تانبا نکالنے کے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور وہ اب بھی اس کوشش میں لگے ہوئے تھے لیکن اس وقت تک اس علاقے کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رکھنا ضروری تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں تانبے کے علاوہ سونے یا یورینیم کے ذخائر بھی ہوں جس کا پتا روسی اور جاپانی نہ لگا سکے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس علاقے میں کسی کو بھی نہ آنے دیا جائے۔ چاہے وہ کوئی سائنس داں یا ماہرِ آثارِ قدیمہ ہی کیوں نہ ہو اسی لیے انہوں نے رک کو قتل کر دیا۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت میں کافی تھک چکا تھا۔ چنانچہ ندی کے کنارے رک کر اپنا منہ دھونے لگا۔ اچانک ہی بے خبری میں مجھ پر حملہ ہو گیا۔ مجھے لڑنے بھڑنے کا اچھا خاصا تجربہ ہے لیکن میں حتی الامکان لڑنے سے گریز کرتا ہوں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ دونوں وہی مزدور تھے جو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کے نیزے تھے جن کے سروں پر پتھر کی کوئی نوک دار چیز مضبوطی سے بندھی ہوئی تھی۔ یہ بالکل ویسا ہی پتھر تھا جو پروفیسر کو ملا تھا۔ میں نے فوراً اپنی جیب سے چاقو نکالا اور ان کے سامنے لہرانے لگا۔ انہوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں چاقو لہرا کر انہیں دھمکانے لگا۔

میں ندی سے صرف پانچ فٹ کے فاصلے پر تھا جب میرا پاؤں ایک دو فٹ اونچے ٹیلے سے ٹکرایا، میں تیزی سے اس پر چڑھ گیا اور قریبی حملہ آور کے چہرے پر اپنا چاقو پھینک دیا۔ دوسرا میری طرف بڑھا تو میں نے جھک کر مٹھی بھر ریت اٹھائی اور اس کے چہرے پر پھینک دی پھر میں نے چھلانگ لگائی اور اس کے منہ پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ وہ نیچے گرا۔ میں نے اس کا نیزہ چھین لیا اور اسے فضا میں بلند کیا جیسے ہی دوسرا آدمی میری طرف آیا تو نیزے کی نوک اس کے پیٹ میں لگی پھر میں نے اس پر گھونسوں کی بوچھاڑ کر دی اور وہ زمین پر گر گیا۔

میں نے جلدی جلدی ان دونوں کی تلاشی لی۔ ان کے پاس چاقو تھے جو میں نے ندی میں پھینک دیے۔ وہ دونوں ابھی تک سانس لے رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ زخمی وہ تھا جس کے پیٹ میں نیزے کی نوک لگی لیکن زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔

دوسرے دن میں تساگان گول پہنچا۔ پولیس کمانڈر نے میری بات سنی لیکن میں نے غور کیا کہ وہ کچھ لکھ نہیں رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ان دونوں مزدوروں نے ہی غالباً یوسوکی کے کہنے پر رک بینی کو قتل کیا تھا۔ اس کا محرک یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ حملہ ال مستی نے کیا ہے۔ اس طرح مقامی آبادی میں خوف و ہراس پھیلایا جائے اور وہ کسی بھی سائنس داں کو اس علاقے میں نہ جانے دیں کیونکہ ان میں کچھ ماہر ارضیات بھی ہو سکتے ہیں جو تانبے کی صحیح مالیت اور دوسری دھاتوں کی موجودگی کا پتا لگا لیں گے جو یوسوکی نہیں چاہتا تھا۔ اسے چینی اسی بات کے پیسے دے رہے تھے کہ وہ اس علاقے میں کسی غیر ملکی کو نہ آنے دے اور انہیں اتنا وقت مل جائے کہ معدنی حقوق لینے کے لیے مقامی انتظامیہ کو قائل کر سکیں۔

میں نے پولیس کمانڈر سے مطالبہ کیا کہ مسز کورم اور پروفیسر کی جان بچانے کے لیے فوری کارروائی کی جائے۔ فوراً ہی نصف درجن رضا کار بھرتی کیے گئے اور ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں کورم کارپوریشن کی جانب سے معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ میں نے ٹورل کو بھی ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اور ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم نے ایک اسٹریچر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس بار یہ فاصلہ ڈیڑھ دن میں طے ہوا۔ رضا کاروں نے بڑی مہارت کے ساتھ پروفیسر کو اسٹریچر پر لٹا کر چٹان سے اتارا اور اسے رسیوں کے ذریعے دو گھوڑوں کے پچھلے حصے سے باندھ دیا۔ اس طرح ہم واپس بحفاظت گاؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ٹورل نے اپنے بار میں ہی مسز کورم اور اس کے شوہر کے لیے بستر لگا دیا پھر مسز کورم نے پولیس کمانڈر کے دفتر سے فون کر کے بیجنگ میں اپنے نمائندے سے رابطہ کیا جس نے وعدہ کیا کہ طبی سہولتوں سے آراستہ ایک ہیلی کاپٹر بارہ گھنٹے میں وہاں پہنچ جائے گا تاہم اسے آنے میں چودہ گھنٹے لگ گئے۔

"تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہے ہو؟" مسز کورم نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے اپنے کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

مسز کورم نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہاں کیا کام ہو سکتا ہے؟"

"مجھے کچھ معاملات کو دیکھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "کورم انٹرنیشنل کو میرے بل کے ساتھ مکمل رپورٹ مل جائے گی۔"

ہم نے یوسوکی کو قصبے کے نزدیک ایک کیمپ میں تلاش کر لیا۔ ہمیں دیکھتے ہی کتوں نے بھونکنا شروع کیا تو ٹورل ان پر روایتی انداز میں چلانے لگا۔ دونوں مزدور بھی ایک خیمے سے برآمد ہوئے۔ ان کے چہرے بُری طرح زخمی تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر آواز لگائی۔ "یوسوکی۔"

وہ ایک خیمے سے برآمد ہوا تو میں نے کہا۔ "تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی؟"

"تم اس زمین پر چلے گئے تھے جس کی حفاظت عظیم خان کرتا ہے۔" اس نے اپنا بازو لہراتے ہوئے کہا۔ "وہاں پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے کسی جگہ ہمارے خان کا مقبرہ ہے اور وہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ ہم اس کی حفاظت کریں گے اور ہمارے اتحادی ال مستی بھی اس کی نگہبانی کرتے ہیں۔"

"کیا تم نے کبھی کسی ال مستی سے بات کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی نہیں۔ انسان ان سے بات نہیں کر سکتے۔ البتہ عظیم خان ان سے مخاطب ہوتا تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ یہاں آیا اور اس نے انہیں طلب کیا۔ وہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے اور اسے تحائف پیش کیے۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اس کے مقبرے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں اور یہ کہ وہ ہمیشہ اس کی حفاظت کریں گے۔ وہ اس پر تیار ہو گئے۔ اس کے عوض خان نے وہ پورا علاقہ انہیں دے دیا۔ وہاں کوئی انسان نہیں جا سکتا اور یہ ہمارا مذہبی فریضہ ہے کہ اس جگہ کی حفاظت کریں۔"

"وہاں کوئی ال مستی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ محض ایک افسانہ ہے۔ تمہارے لوگوں نے ہی رک اور مجھ پر نیزوں سے حملہ کیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ یہ ال مستی نے کیا ہے۔ تم صرف غیر ملکیوں اور اپنے ہم وطنوں کو خوف زدہ کرنا چاہتے تھے۔"

"ال مستی کا وجود ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

"پھر وہ باہر سے آنے والوں کا پیچھا کیوں نہیں کرتے جیسا کہ انہیں خان نے حکم دیا تھا۔"

اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "وہ بچوں کی طرح ہیں اور انسانوں سے شرماتے ہیں اسی لیے ہم نے اس جگہ کی حفاظت کی ذمّے داری اٹھائی ہوئی ہے۔"

جب وہ اپنی بات ختم کر چکا تو میں نے کہا۔ "اس کے عوض چینی تمہیں کیا دیتے ہیں؟"

وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا۔ وہ سب ہماری طرف بڑھنے لگے۔ ٹورل نے فوراً ہی شاٹ گن کا رخ ان کی جانب کر لیا۔

"تم نے اپنے دو ساتھیوں کی مدد سے رک بینی کو قتل کیا۔ تم تینوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

میں ان کتوں کو بھول گیا تھا۔ اچانک ہی وہ ہماری طرف لپکے۔ ٹورل نے گولی چلا کر ان میں سے ایک کو زخمی کر دیا۔ میں نے دوسرے کتے کی ٹانگ پکڑ کر اسے گھمایا اور دور پھینک دیا۔ تیسرے نے ٹورل کی ٹانگ پر جبڑا مارا۔ میں نے اپنا بازو اس کی گردن میں ڈال دیا لیکن اس وقت تک ٹورل کی ٹانگ بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کے زخم کا معائنہ کیا۔ اس جگہ سے گوشت غائب تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اتاری اور اس کے استر کا کپڑا پھاڑ کر اسے مضبوطی سے زخم پر باندھ دیا تاکہ خون بہنا رک جائے پھر مجھے یاد آیا کہ ہم یہاں کیوں آئے تھے۔ میں نے شاٹ گن اٹھائی اور کھڑا ہو گیا لیکن اس سے پہلے ہی یوسوکی اور اس کے دونوں معاونین گھوڑوں پر فرار ہو چکے تھے۔ میں نے ٹورل کو اپنی کمر پر لادا اور ندی پر لے آیا جہاں ہم نے اپنے گھوڑے چھوڑے تھے۔ میں نے اسے اس کے گھوڑے پر سوار کرایا اور تساگان گول تک پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔ اس کی بیوی نے زخم صاف کر کے اینٹی بایوٹک مرہم لگایا۔

پولیس کمانڈر نے یوسوکی اور دونوں مزدوروں کا تعاقب کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے خیال میں میرے فراہم کردہ ثبوت سنی سنائی پر مشتمل تھے اور ان کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اتنے وسیع علاقے میں ان تینوں آدمیوں کو تلاش کرنا مشکل تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی یوسوکی سے ملا ہوا تھا۔

واپسی کے سفر میں دو ہی باتیں میرے دماغ میں گردش کر رہی تھیں۔ اول تو یہ کہ وہ بھیڑ وہاں کس نے پھینکی تھی۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ دونوں مزدور ایک پہاڑی بھیڑ پکڑتے اور اسے کسی گن یا چاقو کے بغیر مار دیتے اور اگر انہوں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تو کیا وہ اس کا گوشت ہمیں عطیہ کر سکتے تھے۔ یہ بات خلافِ عقل تھی کیونکہ اس کے ایک دو دن بعد ہی انہوں نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اپنی جیب سے پتھر کا وہ ٹکڑا نکالا جو پروفیسر نے مجھے دیا تھا۔ وہ ایک انتہائی نفیس چقماق کے پتھر سے بنا ہوا تھا اور اس پر ایک انتہائی باریک کام کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا موازنہ ان پتھروں سے کیا جو ان مزدوروں کے نیزوں سے اتارے تھے۔ ان کی شکل ناہموار اور نوک کند تھی۔ ان باتوں پر غور کرنے کے بعد میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی ال مستی کا کوئی وجود ہے اور کیا اب بھی ان کے بچے کھچے آثار دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تحقیق کرنا پروفیسر آرنسٹن جیسے لوگوں کا کام ہے۔

میں بیجنگ واپس آ گیا۔ جہاں گریٹ وال کافی شاپ میں میری ملاقات ایک اور دراز قد سنہرے بالوں والی حسینہ سے ہوئی جو میرے لیے ایک ایسا کام لے کر آئی تھی جسے میں انکار نہ کر سکا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آئندہ کبھی بھی مجھے ایسا دلچسپ کیس نہیں ملے گا۔

☆☆☆

احتیاط

سلیم انور

کچھ جرم ایسی نوعیت کے ہوتے ہیں... سلجھانے کی کوشش میں مزید الجھتے چلے جاتے ہیں... ایک ایسے ہی پیچیدہ کیس کے تفتیشی مراحل... حالات و واقعات اسے مجرم ثابت کررہے تھے... مگر اسے یقین تھا کہ اس کا مؤکل بے گناہ ہے...

نہایت احتیاط سے کھیلی گئی چالیں...... ہر مہرہ اپنی جگہ مستحکم تھا......

بالائی منزل کی راہداری میں پڑا ہوا قالین پرانا، بوسیدہ اور گردآلود تھا گو کہ اس پر مٹی کی تہ نہیں تھی لیکن یہ اتنا دبیز تھا کہ اس پر چلتے ہوئے اوورکوٹ میں ملبوس مسلح شخص کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ چھت میں لگے ہوئے بلب کی روشنی میں کمرے کا بوسیدہ رنگ، ادھڑا ہوا پلاستر اور کھڑکی کی شکستہ لکڑی صاف نظر آرہی تھی۔ کمرے سے آنے والی مردانہ آوازوں نے اس شخص کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے درمیانی دروازے پر زوردار لات ماری اور کمرے میں داخل ہوگیا۔

”خاموشی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہو۔“ اس نے وہاں موجود تینوں آدمیوں کو حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”تم میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا۔“

پھر وہ ان کے قریب آیا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور ان کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان میں ایک درمیانی عمر کا چھ فٹ طویل قامت شخص تھا۔ اس کے برابر میں اس سے قدرے چھوٹا لیکن مضبوط جسم والا آدمی صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ ان کے بالمقابل بیٹھا ہوا شخص دیکھنے میں ہی سخت گیر لگ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تمہارا لوٹ کا مال گم ہوگیا ہے۔“ مسلح شخص نے کہا۔ ”لیکن تم ایک دوسرے کو الزام دینا بند کرو اور پُرسکون ہوجاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے بلکہ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ وہ مجھے مل گیا ہے۔“

”وہ تمہارے پاس ہے۔“ ان میں سے ایک نے اٹھنا چاہا لیکن پستول کی نال کا رخ اپنی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا۔

”بالکل اسی طرح جیسے تم نے اسے حاصل کیا تھا۔“ مسلح شخص نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب اس کے چار حصے ہوں گے۔ میں اپنے حصے کو فیس سمجھوں گا کیونکہ اسے میں نے تلاش کیا ہے۔“

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

☆☆☆

وہ مسلح شخص میں تھا۔ اس سے پندرہ گھنٹے قبل یعنی دس بجے صبح میں فالس کریک پہنچا جہاں کی آبادی کل دو ہزار نو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ میں اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اس قصبے کے قریب سے گزر چکا تھا لیکن پہلی بار یہاں رکنے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے وائٹ اوکس قبرستان کی تلاش تھی جس کا پتا مجھے اسٹیشن کے کاؤنٹر پر بیٹھنے والی عورت نے بتایا دیا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی شیوی کی طرف بڑھ گیا۔ گزشتہ دو گھنٹے سے ہلکی برف باری ہورہی تھی اور میں نے اسی موسم میں شکاگو سے یہاں تک ایک سو دس میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس قبرستان میں کوئی دفتر نہیں تھا لیکن اس وقت وہاں ایک قبر کھودی جارہی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر اس جگہ پہنچا تو اس آدمی نے اپنا کام روک کر مجھ سے پوچھا۔ ”تم نئے پادری تو نہیں ہو؟“

”نہیں، مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھ ڈانگری سے پونچھے اور جیب سے

وہسکی کی بوتل نکالتے ہوئے بولا۔ ”یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم پادری نہیں ہو۔“

”میں صرف حقائق تلاش کرنے آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گزشتہ ہفتے وینڈل سنیرٹ نامی ایک شخص کو یہاں دفنایا گیا تھا۔“

اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”قبر نمبر 137۔“

”میں اس کی تجہیز و تدفین کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ کیا اس سے پہلے دعائیہ تقریب ہوئی تھی؟“

”ہاں۔“ اس نے آہستہ سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

”تم یہاں موجود تھے؟“

اس نے ایک بار پھر آہستہ سے سرہلایا۔

”تمہارا نام؟“

”براؤنی۔“

”تمہارے علاوہ اور کون آیا تھا؟“

”تابوت گاڑی آدھ گھنٹے تاخیر سے پہنچی۔ اس کی بیوہ۔ بہن، پادری اور ایک دوسرا کھدائی کرنے والا جیک کورے یہاں موجود تھے۔“

”کوئی سرکاری افسر یا جنازہ بردار نہیں آیا؟“

”نہیں، میں نے جیک اور پیپ کے ساتھ مل کر تابوت اتارا، اور ڈرائیور کی مدد سے اسے قبر میں رکھ دیا۔“

”یہ ولارڈ پیپ کون ہے؟“

”وہی تجہیز و تکفین کا انتظام کرتا ہے۔“

”مرنے والے کی بہن کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟“

”ہیرائل سنیرٹ، پہلے وہ ہیرائل جانسن تھی پھر ہیرائل ہوگ بنی اور اب اس نے دوبارہ اپنے نام کے ساتھ سنیرٹ لگا لیا ہے۔“

”تم اسے جانتے ہو؟“

اس نے کچھ سوچا پھر سرہلاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھنے کی حد تک۔“

”یعنی وہ بھی فالس کریک میں رہتی ہے؟“

”ہاں، ہوگ کے مرنے کے بعد اس کی دولت سمیت پرانے سنیرٹ ہاؤس میں واپس آگئی تھی۔

”شکریہ۔“ میں نے اپنے پرس سے دس ڈالر کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔

اولڈ سنیرٹ ہاؤس ایک منزلہ مکان تھا جس کے سامنے پتھر کے ستونوں کا پورچ بنا ہوا تھا۔ میں ایک مرتبہ

اس کے سامنے سے گزرا تو میری نظر وہاں کھڑی ہوئی مرسیڈیز سیڈان پر گئی پھر میں نے اپنی گاڑی سامنے سڑک کے کنارے کھڑی کی۔

گھنٹی کی آواز پر ایک عورت نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر غائب ہوگئی البتہ اس کی لرزیدہ آواز سنائی دی۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا تم ہیرائل سنیرٹ ہو؟''

''تم کون ہو؟''

''میرا نام آر جے کار ہے اور میں بیمہ کمپنی سے آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی جیب سے فائیو اسٹار کمپنی کا کارڈ نکالا جس کے لیے میں کبھی کبھی کام کیا کرتا تھا پھر ایک چھوٹا سا ہاتھ باہر آیا اور اس نے مجھ سے کارڈ لے کر چند سیکنڈ بعد واپس کردیا۔

''دراصل میں ایولین سنیرٹ کو تلاش کررہا ہوں۔ اس کے شوہر کی موت کے حوالے سے کچھ معاملات طے کرنا ہیں۔''

''ایولین یہاں نہیں ہے۔''

''باہر جو کار کھڑی ہوئی ہے، کیا وہ اس کی نہیں ہے۔''

''ہاں لیکن وہ کار نہیں چلاتی۔ زیادہ تر وینڈل ہی ڈرائیونگ کیا کرتا تھا لہٰذا اس نے قصبے کے ایک شخص سے کہا کہ وہ دو دن کے لیے اسے اس کی بہن ایلا کے پاس چھوڑ آئے۔''

''اس کی بہن کہاں رہتی ہے؟''

''شمال کی جانب لیکن مجھے اس کا پتا ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ وہ آج سہ پہر تک واپس آجائے گی۔''

''کیا تمہیں اس کی واپسی کے وقت کا کچھ اندازہ ہے؟''

''تم اسے پریشان نہیں کرو گے۔''

''امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے صرف کچھ معلومات چاہئیں اور ایک فارم پر دستخط کروانا ہیں۔''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''اس نے کہا تھا کہ تین بجے سے پہلے اس کی واپسی کا کائی امکان نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں سوا تین بجے دوبارہ آؤں گا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے چل دیا۔ میں نے سرسری طور پر دیکھا کہ ایک کار میری گاڑی سے سو گز پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ اس وقت میرا ذہن زیادہ ضروری مسائل میں الجھا ہوا تھا۔ مثلاً یہ کہ لنچ کہاں کروں اور اس چھوٹے سے قصبے میں اگلے چار گھنٹے کیسے گزاروں گا۔

بہرحال مجھے ہر قیمت پر ہوٹل کی تلاش میں قصبے کے مرکز کی طرف آنا تھا۔ میں نے اپنی کار ایک ٹرک شاپ کے باہر روکی جہاں ایک بورڈ پر لکھا ہوا تھا۔ ''کھانا یہاں کھائیں۔ گیس بھروائیں۔'' میں نے کھانا کھانے میں کافی وقت لگایا اور بارہ بج کر پچیس منٹ پر فارغ ہوا اس کے بعد بھی میرے پاس ڈھائی گھنٹے تھے۔ میں ایک موہوم امید کے ساتھ پبلک لائبریری میں داخل ہوگیا۔ اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت کا سائز اسکول کے ایک کمرے کے برابر تھا۔

تین منٹ بعد میں دوبارہ فٹ پاتھ پر آگیا اور اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے کانوں میں مختلف سمتوں سے سائرن بجنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن ان سب کا رخ مشرق کی طرف تھا۔ ایسا نہیں کہ میں یہ آوازیں سن کر فوراً ہی عمارت سے باہر آگیا تھا بلکہ میری نظر آٹھ ضرب دس سائز کی اس تصویر پر چلی گئی تھی جسے لائبریری کے کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ایزل پر لگایا گیا تھا۔ یہ ایک ستر سالہ عورت کی تصویر تھی جو وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''اس ماہ کے لیے لائبریری کی سرپرست۔'' اس کے نیچے چھوٹے حروف میں ہیرائل سنیرٹ (ہوگ) لکھا ہوا تھا۔

میں نے کار اسٹارٹ کی اور سائرن کی آواز کے پیچھے چل دیا۔ اس امید پر کہ شاید میرا اندازہ غلط ہو جیسے ہی میں نے گاڑی کنٹری سائڈ روڈ پر موڑی تو مجھے اس کی رفتار کم کرنا پڑگئی اور کچھ فاصلے پر جاکر میں رک گیا۔ دو سو گز کے فاصلے پر دو پولیس کاریں، ایک ایمبولینس اور آگ بجھانے والی گاڑی کھڑی ہوئی تھی اور سنیرٹ ہاؤس ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ میں نے اپنی گاڑی کے گلو کمپارٹمنٹ سے دوربین نکال کر آنکھوں پر لگائی تو سارا منظر واضح ہوکر سامنے آگیا۔ ایک فربہ عورت وہیل چیئر پر بیٹھی رو رہی تھی اور اس کے قریب کھڑا ہوا مرد اسے تسلی دے رہا تھا۔ ایک میڈیکل ٹرانسپورٹ وین اس مرسیڈیز کار کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی جسے میں پہلے دیکھ چکا تھا البتہ اب اس کار کی ڈکی کھلی ہوئی تھی اور دو سوٹ کیس زمین پر پڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے کچھ کپڑے باہر گرے تھے۔ اس کار کے ساتھ ہی پولیس والے اور طبی عملہ ایک انسانی جسم پر جھکا ہوا تھا۔

میں نے اپنی کار پچاس گز آگے بڑھا کر روک دی اور دوبارہ دوربین آنکھوں سے لگالی۔ زمین پر پڑا ہوا جسم سی عورت کا تھا۔ وہ ایک عمر رسیدہ عورت تھی اور یہی لگ رہا تھا کہ وہ مرچکی ہے بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔ ہیرائل سنیرٹ کو روتا ہوا دیکھ کر سمجھ گیا کہ مرنے والی ایولین سنیرٹ ہے جس کی تلاش میں، میں فالس کریک آیا تھا۔ اب میرا یہاں رکنا بیکار تھا لہٰذا میں وہاں سے شکاگو واپسی کے لیے روانہ ہوگیا۔ مجھے اپنا کام کرنا تھا اور اس کے لیے میرے پاس بہت کم وقت تھا کیونکہ پولیس والے اور شاید قاتل بھی مجھے ڈھونڈنے اور اس کام سے روکنے کی کوشش کرتے۔

وہ جمعرات کا روز تھا۔ اس سے پہلے سوموار کے دن شام پانچ بجے ایک متوقع کلائنٹ ونس روزیلو کی جانب سے ایک فون کال موصول ہوئی جسے پولیس ہراساں کررہی تھی۔ ویسے تو یہ وکیل کا کیس تھا لیکن میں نے سوچا کہ اس کی بات سن لی جائے۔ وہ ایک چالیس سالہ طویل قامت شخص تھا اور کیتھولک ہائی اسکول میں ایڈمنسٹریٹر کے طور پر کام کررہا تھا۔ اس نے جو بتایا وہ کچھ یوں ہے۔

''اس کا آغاز سات جنوری کو ہوا۔ اس دن طوفان کی وجہ سے میں اسکول نہ جاسکا لیکن اوک پارک میں زندگی معمول کے مطابق تھی۔ بچے اسکول اور بیوی کام پر چلی گئی۔ میں گھر میں فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ موسم کی پیش گوئی لمحہ بہ لمحہ تبدیل ہورہی تھی۔ چنانچہ میں نے راستے کی صفائی کا کام ملتوی کردیا جب تک برف باری نہ رک جائے۔ اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کام کرسکتا ہوں تو میں نے سنو بلوور نکالا اور گیرج کے اطراف کی گلی صاف کی پھر سڑک سے گھر تک آنے کا راستہ اور سامنے کا حصہ صاف کیا پھر ایک بیلچے کی مدد سے سیڑھیوں اور پورچ سے برف ہٹائی۔ میں تمہیں بیلچہ دکھاتا لیکن وہ پولیس کے پاس ہے۔ لہٰذا میں اسے لفظوں میں بیان کرتا ہوں۔ یہ ایک بھاری بھرکم برف ہٹانے کا بیلچہ ہے اور اس کا بلیڈ چوبیس انچ سائز کا ہے۔ جب میں اپنا کام ختم کرچکا تو میں نے اسے گھر کے سامنے برف میں گاڑ دیا اور بلوور کو گیرج میں رکھنے چلا گیا۔ کیا تم میری بات سن رہے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

''میں عقبی دروازے سے گھر میں گیا۔ مجھے باتھ روم جانا تھا اس کے بعد ایک ڈرنک لیا پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے میری بیوی بول رہی تھی۔ ہم نے کچھ معاملات پر گفتگو کی اور جب میں واپس گھر کے باہر آیا تو بیلچہ غائب تھا۔ البتہ مجھے برف میں وہ شگاف نظر آرہا تھا جہاں میں نے بیلچہ گاڑا تھا۔

میں نے پورچ سے باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا پھر مجھے بلاک کے آخری کونے پر واقع اپارٹمنٹ بلڈنگ کے سامنے کچھ گڑبڑ نظر آئی۔ جب میں اپنی بیوی بیتھ سے فون پر بات کررہا تھا تو میں نے اس سمت سے سائرن کی آواز سنی تھی لیکن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ میں بیلچہ ڈھونڈتا ہوا اسی جانب بڑھ گیا اور جب میں نے سڑک پار کی تو کچھ لوگوں نے بتایا کہ عمارت کے داخلی راستے کے باہر ایک بوڑھے شخص کی لاش ملی ہے جس کے سر کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا گیا ہے اور اس کی موت دس منٹ پہلے واقع ہوئی ہے۔

''میں گھبراہٹ میں آگے بڑھا اور پہلا پولیس والا جو مجھے نظر آیا، اس سے پوچھا۔ ''کیا اسے بیلچے سے قتل کیا گیا ہے؟'' جب وہ پولیس والا مڑا تو میں نے دیکھا کہ وہ میرا ہی بیلچہ تھا اور اس بوڑھے شخص کو دیکھ کر مجھے اچانک یاد آیا کہ جب میں سنو بلوور گیراج میں رکھنے واپس جارہا تھا تو میں نے اس شخص کو سامنے والی فٹ پاتھ پر جنوب کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔''

میں اس جرم کی تفصیل ٹریبون میں پڑھ چکا تھا لیکن میں نے روزیلو کو بولنے دیا۔

''وہ پولیس والا مجھے اپنے ساتھی کے پاس لے گیا اور میں نے اسے اپنے چوری ہونے والے بیلچے کے بارے میں بتایا۔ اس نے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس شام انہوں نے فون کرکے مجھے پولیس اسٹیشن بلایا جہاں میرا بیان اور فنگر پرنٹ لیے گئے۔

''دو دن بعد سادہ لباس میں ایک سراغ رساں مور میرے پاس آیا اور مجھ سے اکیلے میں بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں اسے اسی کمرے میں لے کر آگیا اور اس نے مجھ سے کچھ اس طرح کے سوالات کرنا شروع کردیے۔ 'میں وینڈل سنیرٹ سے کب ملا؟ ہمارے درمیان کیا بحث ہوئی؟ میں اس کی نگرانی کیوں کررہا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ مجھ پر ہی اس کے قتل کا شبہ کررہا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بیلچے پر میری ہی انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ اس کے بعد وہ چار مرتبہ پھر آیا اور ہفتہ کی رات مجھے پولیس ہیڈکوارٹرز طلب کیا گیا جہاں مجھے تقریباً تین گھنٹے تک تفتیشی کمرے میں بیٹھنا پڑا۔ وہ مجھے صرف اس لیے ذہنی اذیت پہنچارہے تھے کیونکہ ان کے خیال میں، میں نے ہی اس بوڑھے کو قتل کیا تھا لیکن ان

کے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں نے ایک جاننے والے وکیل سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ مجھے پولیس سے تعاون نہیں کرنا چاہیے لیکن یہ کہنے کی حد تک آسان تھا جبکہ میرے ایک پڑوسی کا کہنا تھا کہ اگر میں نے ان سے تعاون نہیں کیا تو وہ مجھے ہراساں کرنے کے لیے تمام طریقے آزمائیں گے، وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

''میری ذہنی حالت دگرگوں تھی لیکن اس پڑوسی نے میری بہت مدد کی۔ وہ اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے منیجر کے پاس گیا کیونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وینڈل سیغرٹ وہیں رہا کرتا تھا۔ منیجر نے بتایا کہ سیغرٹ اور اس کی بیوی تقریباً تین چار سال سے اس عمارت میں کرائے پر رہ رہے تھے۔ وہ ریٹائرڈ ہو چکا تھا اور ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا زیادہ وقت بوڑھوں کے مرکز میں گزرتا جبکہ وہ نرسنگ ہومز میں بھی رضا کارانہ خدمت انجام دیا کرتا تھا۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کے ساتھ کیا ہوا۔ اس کی بیوہ پہلے روز ہی کہیں چلی گئی۔

''بظاہر یہی لگتا ہے کہ کسی شخص نے موقع سے فائدہ اٹھا کر میرا بیلچہ اٹھایا اور اسے قتل کر کے فرار ہو گیا لیکن پولیس مجھ پر شک کر رہی ہے۔ میرے پڑوسی نے مجھے کسی پرائیویٹ سراغ رساں سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا جو پہلے اس کی بیوہ اور پھر خاندان کے دوسرے لوگوں سے بات کرے اور وہ سب کچھ کرے جو اس کے خیال میں مناسب ہو۔''

''پہلی بات جو میں بتانا چاہتا ہوں۔'' اس کی بات ختم ہونے پر میں نے کہا۔ ''اور وہ یہ کہ میں کبھی بھی پولیس کے مقابلے پر کسی قتل کی تحقیقات نہیں کرتا۔ البتہ ایک کام میں کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ مرنے والے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لوں لیکن میں بلا معاوضہ کوئی کام نہیں کرتا۔''

''اور وہ معاوضہ کتنا ہوگا؟''

''پانچ سو پچاس ڈالر روزانہ۔'' میں نے اسے 1997ء والا معاوضہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''اگر شہر سے باہر جانا پڑا تو ساڑھے چھ سو۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔''

اگلے روز سہ پہر میں مجھے فرصت تھی۔ سب سے پہلے میں نے شکاگو پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایک قریبی دوست ولیم کو فون کیا۔

''مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اوک پارک میں وینڈل سیغرٹ نامی شخص کو بیلچے سے قتل کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تفصیلات درکار ہیں۔ ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ وہ چھوٹے قد کا چہتر سالہ شخص تھا۔''

''تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''اوک پارک پولیس بیلچے کے مالک پر شبہ کر رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے اور مقتول کے بارے میں جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''وہ اس شخص پر شبہ کر رہے ہیں جس کا بیلچہ چوری ہو گیا تھا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''اس لیے کہ بیلچے پر صرف اسی کی انگلیوں کے نشانات ہیں، کسی اور کے نہیں۔''

''وہ اتنے احمق نہیں ہو سکتے۔ ممکن ہے کہ انہیں کوئی گم نام شخص نے اطلاع دی ہو۔ مثلاً کوئی پڑوسی وغیرہ۔''

''میں پوچھ لوں گا جب تک تم میرا کام کر دو۔''

اس سے بات کرنے کے بعد میں نے کمپیوٹر کھولا لیکن سیغرٹ کے بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ روزیلو کو معلوم ہوا تھا کہ سیغرٹ بوڑھوں کے مرکز جایا کرتا تھا چنانچہ میں نے اوک پارک سینئر سینٹر لکھ کر وہاں کی ویب سائٹ کھولی اور وہاں کا پتا معلوم کر لیا۔ بیس منٹ بعد میں وہاں کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس نے میری کہانی پر فوراً ہی یقین کر لیا۔ میں اس سے ایک فری لانس صحافی کے روپ میں ملا اور بتایا کہ مقتولین کی زندگی اور ان کے رشتوں پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سیغرٹ بوڑھوں کے مرکز میں بہت فعال تھا۔ اس نے میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے بتایا کہ سیغرٹ نے کئی پروگراموں کا انتظام کرنے میں مرکز کی بہت مدد کی اور وہ ہر مہینے لوگوں کو دریا کے کنارے واقع کیسینو تک لے جانے کے لیے بس کا انتظام بھی کرتا تھا۔

''البتہ اس کی ایک بات ہمیں پسند نہیں تھی۔'' اس عورت نے آواز نیچی کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ اس حادثے کے بعد مجھے یہ ذکر کرنا چاہیے یا نہیں۔ مسٹر سیغرٹ ایک دلکش شخصیت کے مالک تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ ہم انہیں اس کی اجازت دے دیں۔ میں نہیں جانتی کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ وہ ایک طرح کا جوا تھا یا لاٹری کی کوئی قسم، ہاں مجھے یاد آ گیا۔ اس نے نوٹس بورڈ پر ایک پمفلٹ بھی چسپاں کیا تھا جو لاٹری کے ٹکٹوں کی فروخت اور قرعہ اندازی کے بارے میں تھا لیکن ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ دریا میں کشتی کی سیر ایک الگ معاملہ تھا۔ مسٹر سیغرٹ مایوس تو ہوئے لیکن انہوں نے اس پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔''

بوڑھوں کے مرکز سے فارغ ہونے کے بعد میں اس عمارت میں گیا جہاں سیغرٹ رہا کرتا تھا۔ وہ 1960ء کے آخر میں تعمیر کی گئی تھی۔ سیغرٹ کی رہائش یونٹ نمبر 305 تھی چنانچہ میں نے 304 کی گھنٹی بجائی جس پر اے۔ میکنائر کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔

''کون ہے؟'' ایک بوڑھی عورت نے انٹرکام پر پوچھا۔

''مسز میکنائر۔ میرا نام کار ہے اور میں اسٹار میگزین کے لیے سیغرٹ کی موت پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ کیا تم لوگ اسے جانتے تھے؟''

''اوہ، ہاں۔''

''کیا تم اس کے بارے میں مجھے کچھ بتانا پسند کرو گی؟ ہم مرکزی ہال میں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں، تم اوپر آ جاؤ۔ میرا بھانجا بھی آیا ہوا ہے۔''

''اس کا بھانجا تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا جبکہ اس کی خالہ ایک ذہین اور متحرک ستر سالہ عورت تھی۔ اس سے پندرہ منٹ کی گفتگو کے دوران صرف ایک ہی کام کی بات معلوم ہوئی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے چلا آیا اور لفٹ کے ذریعے چوتھی منزل پر پہنچا اور وہاں سے آگ بجھانے والی سیڑھی کے ذریعے اتر کر سیغرٹ کے اپارٹمنٹ میں پہنچ گیا۔

جیسا کہ میرے کلائنٹ کے دوست نے بتایا تھا کہ سیغرٹ ایک اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ ہر چیز بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بیڈ روم کو اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کی میز، درازوں، الماری اور سیف کی تلاشی لی اور بالآخر مجھے اپنے مطلب کی چیز مل گئی۔ وہ سولہ بینکوں کی فہرست تھی جن میں سے دس الی نوئس اور چھ شکاگو میں تھے۔ ہر بینک کے نام اور پتے کے آگے ایک کوڈ نمبر درج تھا۔ اس کے علاوہ انکم ٹیکس گوشواروں کی فائل بھی تھی۔ سب سے آخری گوشوارے میں قابل ٹیکس آمدنی اڑسٹھ ہزار چار سو سولہ ڈالر ظاہر کی گئی تھی جو منافع اور حصص کی خرید و فروخت کے ذریعے حاصل ہوئی جبکہ پنشن، سود اور سوشل سیکیورٹی سے کچھ نہیں ملا۔ دیگر کاغذات میں الی نوئس میں واقع نرسنگ ہومز اور بوڑھوں کے مرکز کی ایک ڈائریکٹری اور دو بنڈل لاٹری کے پمفلٹ کے ملے۔ جس

کنسلٹنٹ

بل سرسبز پہاڑی کے دامن میں بھیڑوں کے بڑے سے گلّے کو چرا رہا تھا۔ کچے راستے پر دور سے دھول اڑاتی ہوئی ایک شاندار جیپ نمودار ہوئی۔ بل کے قریب سے گزرتے ہی جیپ رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے قدرے ریورس کیا اور انجن بند کر کے نیچے آ گیا۔

وہ بیش قیمت سوٹ میں ملبوس، قیمتی پرفیوم کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ آنکھوں پر رے بین کا چشمہ جما ہوا تھا۔ اس نے بل سے کہا۔ ''اگر میں تم کو یہ بتا دوں کہ اتنے بڑے ریوڑ میں تمہاری بھیڑوں کی تعداد کتنی ہے تو کیا تم ایک بھیڑ مجھے دے دو گے؟''

بل کو دلچسپی محسوس ہوئی۔ ''ہاں دے دوں گا۔''

نووارد نے اپنی جیب سے ٹیبلیٹ نکالا۔ اسے الیکٹرانک نوٹ پیڈ سے منسلک کیا اور انٹرنیٹ پر ناسا کا پیج نکالا۔ صفحہ کھلتے ہی اس نے سیٹلائٹ سے چلنے والے جی پی ایس کو جوڑا، اس پر کھیلتے ہوئے اس نے بل کی چراگاہ کا تعین کیا، اس کا ڈیٹا بیس نکالا اور تقریباً 60 اسپریڈ شیٹس پر پیچیدہ فارمولوں میں الجھے رہنے کے بعد اپنے چھوٹے سے پرنٹر پر ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رپورٹ نکالی اور بل سے کہا۔ ''اس وقت یہاں 15862 بھیڑیں موجود ہیں۔''

''بالکل درست!'' بل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اب تم ایک بھیڑ لے سکتے ہو۔''

وہ ریوڑ کے قریب گیا اور ایک جانور کو اٹھا کر اپنی جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔

وہ لوٹا تو بل نے کہا۔ ''اب اگر میں تمہارے پیشے کے بارے میں بتا دوں تو کیا تم میرا جانور مجھے واپس دے دو گے؟''

نووارد راضی ہو گیا۔ بل نے کہا۔ ''تم کنسلٹنٹ ہو؟''

وہ حیران رہ گیا۔ ''بالکل درست... تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟''

''بہت آسان سی بات ہے۔'' بل نے اطمینان سے کہا۔ ''تم بن بلائے میرے پاس آئے... دوسری پہچان یہ تھی کہ تم ایک ایسے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش میں تھے جس کا جواب میں پہلے سے جانتا تھا اور اس کے معاوضے میں ایک بھیڑ کے طلب گار تھے... تیسری اور آخری پہچان یہ تھی کہ تمہیں یہ تک پتا نہیں تھا کہ یہاں کون کون سے جانور ہیں... تم نے بھیڑ کے بجائے میرا کتا اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا ہے... مہربانی کر کے اب اسے واپس کر دو۔ وہ بہت بے ضرر ہے... صرف بھٹکنے والی بھیڑوں پر غراتا ہے۔''

(جان محمد کی جامشورو سے حاضر دماغی)

میں لوگوں کو بڑے انعامات کا لالچ دے کر اس کا ممبر بننے کی ترغیب دی گئی تھی اور نئے ممبر بنانے کی صورت میں کمیشن دینے کا لالچ بھی دیا گیا تھا۔ اس کی ممبر شپ فیس چونسٹھ ڈالر اور اس کے بعد چار ڈالر ہفتہ تھی۔

میں یہ تاثر لے کر وہاں سے باہر نکلا کہ ایولین سنیرٹ ان چیزوں کے بارے میں متوقع سوالات سے بچنے کے لیے وہاں سے چلی گئی تھی۔ اس کی پڑوسن مسز میکنائر نے مجھے اس کا عارضی پتا دے دیا تھا جس کے مطابق وہ اوک پارک کے قلب میں واقع ایک چھوٹے سے ہوٹل میں چلی گئی تھی لیکن جب میں نے اسی روز تقریباً ساڑھے تین بجے اس ہوٹل کے منیجر سے بات کی تو اس نے بتایا کہ ایولین سنیرٹ ایک ہفتہ قبل ہی ہوٹل سے جا چکی تھی اور اس نے اپنے اگلے ایڈریس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کچھ پیسے خرچ کرنے کے بعد منیجر نے مجھے اس کا روم رجسٹریشن کارڈ دیکھنے کی اجازت دے دی۔ اس فہرست میں انیس سو ننانوے ماڈل کی گرے رنگ کی مرسیڈیز کار، سیف میں موجود ذاتی اشیا اور اسٹور میں رکھے ہوئے دو سوٹ کیس شامل تھے۔ جب میں نے تفصیل جاننا چاہی تو اس نے بتایا کہ ذاتی اشیا میں جیولری باکس اور ایک بھاری پارسل شامل تھا جبکہ اسٹور میں رکھا ہوا سامان اس کے قیام کے دوران ہی کہیں منتقل کر دیا گیا تھا۔

اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ اب تک کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ میں نے منیجر سے پوچھا۔

’’کیا تمہیں مسز سنیرٹ کے بارے میں کوئی ایسی بات یاد ہے جس سے اس کے مستقبل کے منصوبے کے بارے میں کچھ اندازہ ہو سکے؟‘‘

منیجر نے کہا کہ نہیں لیکن اس کے پیچھے کھڑا ہوا ڈیسک کلرک اچانک ہی بول پڑا۔

’’کیا تمہیں یاد نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اسے اپنے شوہر کے گھر جانا ہے۔ اس کا مطلب تھا تدفین میں شرکت کرنے کے لیے۔‘‘

میں نے کورونرز آفس فون کر کے اس مردہ خانے کا پتا معلوم کیا جہاں سنیرٹ کی لاش رکھی گئی تھی۔ اس کے لیے مجھے تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا کہ میں مرنے والے کا دور کا رشتے دار ہوں۔ دوسرا فون میں نے مردہ خانے میں کیا جہاں سے مجھے معلوم ہو گیا کہ سنیرٹ کو فالس کریک کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔

اگلے روز میں نے کلائنٹ سے بات کی اور اسے بتایا کہ اس معاملے میں کچھ پیش رفت ہوئی ہے لیکن مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے مجھے ایک دن کے لیے گھر سے باہر جانا ہوگا۔

’’کہاں؟‘‘ اس نے پوچھا تو میں نے اسے فالس کریک کے بارے میں بتا دیا۔

اسی رات مجھے ولیم کی جانب سے منفی جواب موصول ہوا لیکن جب میں نے اسے لاٹری کے بارے میں بتایا تو اس نے بتایا کہ وہ دوبارہ کوشش کرے گا اور اس دھاندلی کا پتا لگائے گا۔

دوسرے دن میں نے اپنی بیوی گنی کو فون کیا۔ وہ اسی وقت کہیں باہر سے آئی تھی۔

’’ہیلو، میں ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی ہوں۔‘‘

’’حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں، فون نیچے رکھ دو اور باہر جا کر دیکھو کہ کوئی کار میں بیٹھ کر ہمارے مکان کی نگرانی تو نہیں کر رہا۔ اس کے بعد ہی ہم بات کر سکتے ہیں۔‘‘

میری بیوی نے باہر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا۔ ’’آر جے، مطلع صاف نظر آ رہا ہے۔‘‘

’’میں چاہتا ہوں کہ تم اور اسٹیو جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ۔ تم دونوں رات کے لیے ایک ایک بیگ تیار کر لو۔‘‘

’’یہ کیا کہہ رہے ہو؟‘‘

’’احتیاط ضروری ہے گو کہ میں قتل کی تحقیقات میں فالس کریک کی پولیس کو مطلوب نہیں ہوں لیکن یہ ممکن ہے یا قاتل ہی میرا پیچھا کرتا ہوا آ جائے گو کہ میں جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔ وہاں سے صرف گزرا ضرور ہوں لیکن اس سے پہلے میں نے وہاں کا راستہ پوچھا تھا اور مقتولہ سے بات کی تھی۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔ اس دوران تم سامان پیک کر کے منی وین کے ذریعے اسکول جاؤ اور وہاں سے اسٹیو کو لے کر نارتھ ایونیو پر واقع ویسٹ لیک موٹل میں آ جاؤ۔ میں پارکنگ لاٹ میں ہوں گا اور جب تم کمروں میں پہنچ جاؤ گی تو تم سے آن ملوں گا۔‘‘

ساڑھے چھ بجے میں نے اپنی بیوی کو اس کیس کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور بہ آوازِ بلند اس لاٹری کا پوسٹر بھی پڑھ کر سنایا۔ اس نے پہلا سوال یہی کیا۔ ’’کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ وینڈل سنیرٹ بڑے پیمانے پر کوئی لاٹری اسکیم چلا رہا تھا کیونکہ......‘‘

’’پہلی بات تو یہ کہ وہ کوئی اسکیم نہیں بلکہ دھاندلی تھی اور بظاہر اس کا مقصد ریٹائرڈ لوگوں کو بے وقوف بنانا تھا۔

میرے خیال میں یہ اس کا اپنا نفع بخش مشغلہ تھا جو اس نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے اختیار کیا۔ اس نے ہر کمیونٹی سے پچاس کے قریب لوگوں کو اس کا ممبر بنایا اور انہیں مزید ممبر بنانے پر آمادہ کیا۔ وہ انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایک دو فرضی قرعہ اندازی کر دیتا اور فرضی انعام یافتگان کے پیغامات کی تشہیر کی جاتی۔

کھیل کھیل میں اس نے اپنے لیے ایک معقول آمدنی کا بندوبست کر لیا۔ وہ صرف سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والی آمدنی ظاہر کرتے تھے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر سولہ سیف ڈپازٹ باکس حاصل کر رکھے تھے اور ممبران سے ہمیشہ نقد رقم وصول کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا مکان یا اپارٹمنٹ خریدنے کے بجائے کرائے پر رہنا مناسب سمجھا تاکہ ہنگامی صورتِ حال میں وہاں سے جا سکیں جیسا کہ ایولین سنیرٹ نے کیا اور یہ ظاہر کر کے چلی گئی کہ اسے اپنے شوہر کی تدفین میں شرکت کرنا ہے۔

’’سیف ڈپازٹ باکس کے بارے میں کیا وضاحت کرو گے؟‘‘

’’اس کا مختلف استعمال ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص قانون سے بچنا چاہے تو اپنی شناخت چھپانے کے لیے وہ اس طریقے سے اپنی رقم محفوظ کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلطی پر ہوں لیکن قیاس یہی ہے کہ ان سولہ باکس میں نقد رقم ہی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ ان خفیہ سیف ڈپازٹ باکس کا ٹیکس کے لیے آڈٹ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب آپ کوئی غیر قانونی کام کر رہے ہوں تو اپنی نقد رقم ایسی جگہوں پر رکھنا پڑتی ہے جن کا ٹیکس ڈپارٹمنٹ کو علم نہ ہو۔‘‘

بیوی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم نہیں سمجھتے کہ پہلا قتل بغیر سوچے سمجھے کیا گیا تھا لیکن دوسرا قتل اتفاقیہ نہیں تھا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’میرے ذہن میں جو منظر نامہ اُبھر رہا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ایک شخص سڑک کے کنارے چلا جا رہا ہے کہ اس کی نظر اپنے دشمن وینڈل سنیرٹ پر جاتی ہے۔ وہ غصے سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ قسمت اس کا ساتھ دیتی ہے اور اسے برف میں گرا ہوا بیلچہ نظر آ جاتا ہے۔ اس وقت اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ مقتول کے قریب پہنچ کر بیلچے کو باسکٹ بال بیٹ کی طرح گھماتا ہے اور اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو جاتا ہے۔‘‘

’’یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس نے سردی کی وجہ سے دستانے پہن رکھے تھے۔ اس لیے بیلچے کے دستے پر اس کی انگلیوں کے نشانات نہیں آئے۔‘ میں نے کہا۔

’’میرا دوسرا تبصرہ یہ ہے۔‘‘ گنی بولی۔ ’’ایولین سنیرٹ خوف زدہ تھی۔ وہ اوک پارک سے اس لیے فرار نہیں ہوئی کہ اس کے شوہر کو اتفاقیہ طور پر تشدد کر کے قتل کر دیا گیا تھا۔ اسے شبہ تھا کہ یہ اتفاقیہ نہیں ہے اور اسے ایک خاص شخص پر شک تھا۔ اس نے تم سے اس لیے بات کر لی کہ اسے تم سے کوئی ڈر نہیں تھا لیکن اس نے محسوس کیا کہ جب تم اسے تلاش کر سکتے ہو تو قاتل بھی ایسا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا سامان باندھا اور اسے کار میں لے جا کر رکھ دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ کوئی تمہارا پیچھا کرتے ہوئے اس تک پہنچ سکتا ہے۔‘‘

’’لیکن کسی نے میرا پیچھا نہیں کیا۔ سڑک پر دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی اور فالس کریک میں تو بہت کم ٹریفک ہوتا ہے۔‘‘

’’میں ایک اور امکان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔‘‘ گنی نے کہا۔ ’’غور کرو کہ ولیم نے کینہ پرور پڑوسیوں اور گمنام ٹیلی فون کے بارے میں کیا کہا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کا محرک بھی عداوت ہو۔ کسی نے روزیلو کو اکسایا ہو کہ وہ ایولین سنیرٹ کو تلاش کرنے کے لیے پیشہ ور سراغ رساں کی خدمات حاصل کرے اور یہ وہی پڑوسی ہو سکتا ہے جس نے روزیلو کو تمہارے زائد اخراجات ادا کرنے میں مدد کی پیشکش کی تھی۔‘‘

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون تک گیا اور ولیم کی آنسرنگ مشین پر یہ پیغام چھوڑ دیا۔ ’’آر جے کار کی طرف سے۔ اگر تمہیں وینڈل سنیرٹ کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہو تو اس نمبر پر فون کر کے کمرا نمبر 119 سے رابطہ کرنا۔‘‘

اس کے بعد میں نے روزیلو کو فون کر کے کہا۔ ’’فالس کریک میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے بارے میں پھر بتاؤں گا فی الحال میری بات غور سے سنو۔ اگر کوئی پولیس والا تمہارے پاس آئے تو اسے یہ ہرگز مت بتانا کہ تم نے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ اب تم مجھے اس پڑوسی کے بارے میں بتاؤ جو تمہاری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔‘‘

’’بل ہیچ۔ لیکن کیوں؟‘‘

’’کیونکہ اس طرح میرا وقت بچ جائے گا۔‘‘

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔ ’’وہ دو

ماہ قبل میرے پڑوس میں آیا تھا۔ جب تک یہ قصہ شروع نہیں ہوا، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس روز وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اس کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔''

''اس کی عمر کتنی ہوگی؟''

''چالیس کے قریب، شاید وہ بیرونِ ملک کام کرتا رہا ہے۔''

''آخری بار اس نے تم سے کب بات کی تھی؟''

''گزشتہ شب۔ وہ ڈنر کے بعد فون کرتا ہے۔ اس کی یہ بات مجھے پسند نہیں کہ اسے کس طرح چھوٹی سی چھوٹی بات بھی معلوم ہو جاتی ہے۔''

''اگر وہ آج رات فون کرے تو اسے یہ ہرگز مت بتانا کہ میری تم سے بات ہوئی تھی یا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔''

اس سے بات کرنے کے بعد میں نے گنی سے کہا۔ ''کم از کم ایک آدمی اس معاملے میں ضرور ملوث ہے۔ اس کا نام بل بچ ہے اور وہ حال ہی میں روزیلو کے پڑوس میں آیا ہے۔ روزیلو کا خیال ہے کہ وہ بیرونِ ملک فوجی خدمت سرانجام دے رہا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ جیل میں تھا۔ اس نے گزشتہ شب روزیلو سے فون پر بات کی تھی اور کچھ عجب نہیں کہ روزیلو نے اسے میرے فالس کریک جانے کے بارے میں بتا دیا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

یہ کہہ کر میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ گنی میرا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری بلٹ پروف جیکٹ بیگ میں ہے۔ تم آج رات اس کے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اگر ولیم کا فون آئے تو اس سے کہنا کہ ایک سابق قیدی بل بچ کا ریکارڈ چیک کرے۔''

''کہہ دوں گی۔ تم اپنا پستول ساتھ رکھو اور ہر دو گھنٹے بعد مجھے فون کرتے رہنا۔''

چالیس منٹ بعد میں بل بچ کی دہلیز پر کھڑا ہوا تھا۔ گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہ آیا تو میں نے اپنی مہارت سے کام لیتے ہوئے دروازے کا تالا کھولا۔ ایک ہاتھ سے اوورکوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے پستول پر گرفت مضبوط کی اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولتا ہوا اندر چلا گیا۔ کمرا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر آواز لگائی۔ ''بل بچ!''

کوئی جواب نہ آنے پر میں نے دروازہ بند کیا اور اوورکوٹ کی جیب سے ٹارچ نکالی۔ کمرے میں ایک بیڈ پڑا ہوا تھا اور اس کا ایک دروازہ کچن میں کھلتا تھا۔ وہاں ایک چولھا، سنک کاؤنٹر، ریفریجریٹر اور کاؤنٹر کے اوپر دو کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ میں نے وہیں سے تلاشی شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور جب ایک کیبنٹ کھول کر دیکھا تو اس کے اوپری خانے میں ایک جیولری باکس رکھا ہوا تھا۔

اس باکس میں دو انگوٹھیوں اور چین کے علاوہ زیادہ تر ہیرے رکھے ہوئے تھے جن کی تعداد کسی بھی طرح سو سے کم نہ تھی۔ میں نے وہ باکس کاؤنٹر پر رکھا اور بڑے آئٹم کو تلاش کرنے لگا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس باکس کے ساتھ ہی رکھا ہوگا۔ میں تھوڑا سا مایوس ضرور ہوا لیکن تلاش جاری رکھی اور صرف تیس سیکنڈ بعد ریفریجریٹر کے فریزر میں جوتے کے ڈبے کے برابر رکھا ہوا پیکٹ مل گیا جس پر سفید کاغذ لپٹا ہوا تھا اور اسے ایک پلاسٹک ٹیپ سے سربمہر کیا گیا تھا۔

میں نے وہ پیکٹ بھی جیولری باکس کے برابر میں رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ان چیزوں کو اپارٹمنٹ میں نہیں چھوڑ سکتا تھا اور نہ ہی اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا، اگر انسپکٹر مور جیسے کسی پولیس آفیسر نے پکڑ لیا تو روزیلو کے ساتھ ساتھ میں بھی پھنس جاؤں گا اور ہم پر الزام آجائے گا کہ روزیلو نے وینڈل سنگرٹ کو قتل کرنے کے بعد میری خدمات حاصل کیں تاکہ میں سنگرٹ کی بیوی کو تلاش کرکے قتل کر دوں اور اس سے یہ دونوں چیزیں حاصل کر لوں۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور میں جانے سے پہلے بقیہ اپارٹمنٹ کی بھی تلاشی لینا چاہ رہا تھا۔

بیس سیکنڈ بعد میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ دونوں چیزیں اپنے ساتھ لے جانا چاہئیں چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے۔ اچانک ہی مجھے ایک خیال آیا۔ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ ایک ٹیلی فون لگا ہوا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں ہوٹل کا نمبر ملایا اور گنی سے رابطہ ہونے پر کہا۔

''ولیم کا فون آیا؟''

''نہیں۔''

''اگر اس کا فون آئے تو کہنا کہ میں اس کی وائس میل پر پیغام چھوڑ رہا ہوں۔ وہ پیغام یہ ہے۔ 'میں نے ثبوت کے طور پر دو چیزیں ضبط کی ہیں جو سہ پہر میں ایولین سنگرٹ کو قتل کرنے کے بعد جائے وقوعہ سے چرائی گئی تھیں۔ ان میں

ایک ہیروں سے بھرا ہوا جیولری باکس ہے اور دوسرے پیکٹ میں میرے خیال کے مطابق کرنسی ہے۔''

''تم کہاں سے بول رہے ہو؟'' گنی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''بل بچ کے اپارٹمنٹ سے لیکن زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔''

''تمہیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مجھے فون کرتے رہنا۔''

میں نے ولیم کا نمبر ڈائل کرکے وہ پیغام اس کی وائس میل پر بھیج دیا۔ اس کے بعد میں واپس کمرے میں آیا اور کوئی ایسی چیز تلاش کرنے لگا جس سے بل بچ کی اصلیت کا پتا چل سکے۔ ایک بڑی سی میز کی دراز میں کچھ کاغذات پڑے ہوئے تھے جن میں اسٹور سے خریداری کی رسیدیں، پیدائش کا سرٹیفکیٹ، پولیس ڈپارٹمنٹ کا خط اور ایک فوٹو شامل تھا۔

اس کے بعد میں نے الماری کا جائزہ لیا۔ بستر کے نیچے جھک کر دیکھا لیکن کوئی چیز نہیں ملی۔ پھر میری نظر ایک کیلنڈر پر گئی جس پر تاریخوں کے گرد سرخ سیاہی سے نشان بنے ہوئے تھے۔ مجھے بل کی غیر موجودگی کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ وہ چھ سے بارہ کی شفٹ میں کام پر گیا ہوا تھا۔ میں نے کچن سے وہ دونوں چیزیں اٹھائیں اور کمپارٹمنٹ سے باہر آگیا۔

میں نے دوبارہ گنی کو فون کرکے پوچھا کہ ولیم کا فون آیا اور اس کا جواب سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ''ایولین سنگرٹ کے قتل کی انکوائری میں تمہارے جیسے حلیے کا ایک شخص موضوع بنا ہوا ہے۔ تمہیں وہاں کے لوگوں نے شناخت کر لیا ہے کیونکہ تم نے ہی قبرستان کا پتا پوچھا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ انہوں نے تمہاری تصویر فیکس یا ای میل کے ذریعے ہر جگہ بھیج دی ہے۔ ولیم کا کہنا ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو تاکہ وہ اس معاملہ کو سلجھا سکے۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا، کم از کم اس وقت نہیں۔''

''میں نے اسے یہ صورتِ حال بتا دی تھی۔'' گنی نے کہا۔ ''بہرحال اس نے وینڈل کے بارے میں جو مزید معلومات حاصل کی ہیں۔ ان کے مطابق وہ انیس سو نوے کے آغاز تک جرائم کی دنیا میں متحرک تھا لیکن کبھی گرفتار نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے کسی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا۔ ولیم کی رائے میں وہ بہت ماہر تھا یا پس پردہ رہتا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلے کام نہیں کرتا تھا۔ کیا تم اس سے اتفاق کرتے ہو؟''

''میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی متفق ہو گیا تھا۔ سب باتیں ایک ہی جانب اشارہ کر رہی ہیں۔''

''بل بچ کے بارے میں ولیم کا کہنا ہے کہ اسے تشدد اور جنسی زیادتی کے الزام میں سزا ہوئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ کسی جرم میں ملوث نہیں رہا۔''

''غالباً شکاگو میں؟''

''ہاں، ایک وحشیانہ جرم کی بڑی سزا۔ یہ واقعہ نارتھ ڈسٹرکٹ کے قریب پیش آیا جہاں ولیم اس وقت پیٹرول آفیسر تھا۔''

''تم نے ولیم کو میرے پیغام کے بارے میں بتایا تھا؟''

''اس کا کہنا تھا کہ چرائی ہوئی رقم تلاش کی جا سکتی ہے کیونکہ نوٹوں کے سیریل نمبر ریکارڈ پر موجود ہیں۔''

''درست، میں نے سنگرٹ کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی ہے کیونکہ وہ ایک غیر قانونی لاٹری چلا رہا تھا تو میں یہی سمجھا کہ وہ پہلے سے کوئی معمولی مجرم ہوگا لیکن ولیم سے ملنے والی معلومات، ہیرے اور کرنسی سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ بڑا مجرم تھا۔''

''بہتر ہوگا کہ تم کام کی بات کرو۔'' گنی نے کہا۔

''میں عقبی سیڑھیوں سے نیچے آیا اور اس گلی کی جانب بڑھنے لگا جہاں میں نے اپنی منی وین کھڑی کی تھی۔ میں نے دیکھا کہ روزیلو کے مکان کے باہر پولیس کی گاڑی کھڑی ہوئی ہے اور روزیلو دو باوردی اور ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والے کے ساتھ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا منصوبہ تبدیل کر دیا اور کروزر کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ روزیلو کو ویج ہال لے کر جائیں گے اور وہ جگہ میں نے دیکھ رکھی تھی۔ اچانک ہی ایک فورڈ ٹورس نمودار ہوئی اور پولیس کار کے پیچھے آکر رک گئی۔ یہ ایک اتفاق بھی ہو سکتا تھا لیکن میرا اندازہ اس کے برعکس تھا۔ ٹورس نے پولیس کار کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس کے پیچھے میں تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ دونوں گاڑیاں ایک جگہ رک گئیں اور میں نے بھی اپنی گاڑی میونسپل بلڈنگ کی لاٹ میں کھڑی کر دی جہاں سے میں ان پر نظر رکھ سکتا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' گنی نے پوچھا۔

''سادہ لباس والا روزیلو کو اندر لے گیا اور ٹورس سڑک کے کنارے کھڑی ہو گئی۔ میں نے اس گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لیا لیکن ڈرائیور کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ دس منٹ

بعد سادہ لباس والا باہر آیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے دیکھ لیے جانے کا ڈر ہو۔ وہ محتاط انداز میں کار کی طرف بڑھا، ڈرائیور سے کچھ باتیں کیں اور واپس بلڈنگ کی طرف چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹورس نے یوٹرن لیا اور میں بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ وہ کار ایک اسٹور کی پارکنگ لاٹ میں رکی اور ڈرائیور اتر کر اسٹور میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی بل ہچ کے ساتھ ہوئی۔ میں نے اسے پہچان لیا کیونکہ اس کی تصویر اپارٹمنٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر ہچ واپس اپنے کام پر چلا گیا۔ میں نے ایک بار پھر اس کار کا تعاقب شروع کر دیا لیکن ایک جگہ سگنل بند ہو جانے سے اسے جاری نہ رکھ سکا اور دفتر واپس آگیا۔ ویسے بھی مجھے فوری طور پر کمپیوٹر کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔"

"وہ کس لیے؟" گنی نے پوچھا۔

"مجھے فورڈ ٹورس کی نمبر پلیٹ کے بارے میں معلومات درکار تھیں۔ اس کے علاوہ مجھے اس پیکٹ کو دیکھنے کی بھی بے چینی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے کھولا۔ اس میں کچھ نوٹ بیس اور پچاس لیکن زیادہ تر سو والے تھے اور ان پر کیپا لینا ویسکوئز کے دستخط تھے۔ جو انٹرنیٹ کے مطابق دسمبر 1989ء سے جنوری 1993ء تک اسٹیٹ بینک کی گورنر رہی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں اس زمانے میں ہونے والی کسی ڈکیتی کے بارے میں جان سکتا لیکن قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ وینڈل بھی نوے کے اوائل میں ہی منظر سے غائب ہو گیا تھا۔"

"وہ نمبر پلیٹ کس نام پر ہے؟"

"کار کے مالک کا نام جان بی رینڈل ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بل ہچ سے باتیں کرنے والا جان بی رینڈل نہیں بلکہ حلیے سے کوئی بدمعاش لگ رہا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے؟"

"پولیس کو اطلاع دے دی جائے۔" گنی نے مشورہ دیا۔

"پولیس ویسے ہی میرے اور روزیلو کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور یہ علاقہ بھی ولیم کی حدود میں نہیں آتا۔ پولیس کو اطلاع دینے کا مطلب اپنے اوپر ایک اور الزام لینا اور اس کے نتیجے میں جیل کی ہوا کھانا ہے۔"

"اچھا، مجھے سوچنے دو۔" گنی نے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ بولی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ جو کہوں وہی کرو گے چاہے اس کے لیے تمہیں اپنا پستول ہی کیوں نہ استعمال کرنا پڑے۔"

"وعدہ۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

وہ تینوں ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایڈ مور اور دوسرا میرے کلائنٹ کا پڑوسی بل ہچ تھا جبکہ ان کے مقابل اس کمرے کا کرائے دار آرٹ ون بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں نے لوٹ کے مال میں سے اپنا حصہ مانگا تو مور بولا۔ "ہم کیسے یقین کرلیں کہ وہ مال تمہارے پاس ہے؟"

میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک سربمہر لفافہ نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس میں بیس نوٹ پچاس ڈالر کے اور دو ہیرے ہیں۔ یہ میں نمونے کے طور پر لایا ہوں تاکہ تمہیں یقین آجائے۔"

ولسن نے پھرتی سے وہ لفافہ اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھنے لگا، پھر وہ تینوں باری باری اسے دیکھنے لگے۔ اس دوران میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ وہاں کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔ جب وہ لفافہ دیکھ چکے تو میں نے اسے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور بولا۔ "ہمیں ایسی شرائط طے کرنا چاہئیں جن میں ہر ایک اور خاص طور پر میرے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ وہ مال میرے دفتر میں ہے چنانچہ ہمیں وہیں بیٹھ کر بات کرنا چاہیے۔ اس وقت ایک بج کر پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ میرا دفتر نارتھ اریلم پر ہے۔ میں وہاں پونے دو بجے ملوں گا۔ گاڑی عمارت کے عقبی لاٹ میں کھڑی کرنا اور میں تمہارے لیے عقبی دروازہ کھول دوں گا۔ تم ایک ایک کر کے آؤ یا اکٹھے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میرے ساتھ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ یہ ایک صاف ستھرا سودا ہے۔ جس میں ہر ایک کو پچیس فیصد حصہ ملے گا۔ اب تم سے وہیں ملاقات ہوگی۔" یہ کہہ کر میں پیچھے ہٹا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

ایک بج کر پینتالیس منٹ پر میں اپنے دفتر سے اتر کر نیچے ہال میں آیا تو شیشے کے دروازے کے باہر وہ تینوں کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ماسٹر کی سے دروازے کا تالا کھول کر انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ولسن سب سے آخر میں تھا جیسے ہی وہ دروازے سے گزرا۔ میں نے اس کے پیچھے جا کر اس کی جیکٹ کی جیب سے آٹومیٹک ریوالور نکال لیا اور اس کی پسلیوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"تم ہی وہ شخص ہو جس پر میں بالکل بھروسا نہیں کرتا۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے پستول کا میگزین خالی کیا اور ریوالور مور کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے پاس رکھو اور یہاں سے جاتے وقت اسے واپس کر دینا۔"

ہم لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے تک آئے۔ میں نے انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ سامان یہاں نہیں ہے۔ پہلے مجھے تمہارے رویے کے بارے میں اطمینان کرنا ہے۔" پھر میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور اس پر ایک نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ "وہ پیکٹ بھیج دو۔ عمارت کا عقبی دروازہ غیر مقفل ہے۔ وہ وہاں سے آسکتا ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور بولا۔ "دس پندرہ منٹ میں وہ سامان یہاں پہنچ جائے گا۔ اس وقت تک ہم کچھ باتیں کر لیتے ہیں۔ میں فالس کریک میں ہونے والے قتل کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے دوسرے لوگوں کو نظرانداز کر کے پولیس انسپکٹر مور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے کلائنٹ کو اس بوجھ سے آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم اس کا بندوبست کرسکو۔"

"کیسے؟"

"میں نہیں جانتا لیکن تم کافی ہوشیار ہو۔ کوئی نئی کہانی بنا سکتے ہو۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "یا ولسن کو پولیس کے حوالے کر دو۔ یہی وہ شخص ہے جس نے دونوں قتل کیے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

ولسن اچھل کر کھڑا ہو گیا اور میں نے بھی ایسا ہی کیا لیکن میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ میرے تیور دیکھ کر ایک بار پھر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔" مور نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ سیمرٹ کی خفیہ اطلاع پر ولسن اور دوسرے لوگ پکڑے گئے تھے۔ سارا مال سیمرٹ نے ہی ہڑپ کر لیا۔"

"اس کے علاوہ رقم سے بھرا ہوا ایک اور بیگ بھی تھا۔" ولسن بولا۔ "وہ اس نے کہاں چھپایا؟"

"شاید وہ رقم اس نے کسی کاروبار میں لگا دی ہوگی۔" مور نے کہا۔

"تم!" میں نے پستول کا رخ بل ہچ کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ "تم بالکل خاموش ہو۔"

"اپنی زبان بند رکھو۔" اس نے جواب دیا۔ مور نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم بڑوں کے درمیان یہ لوگ نابالغ ہیں۔"

پانچ منٹ بعد ہی صورتِ حال میرے حق میں ہو چکی تھی لہٰذا میں نے وقت گزاری کے لیے کہا۔ "مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ کیا تم میں سے کوئی بیئر پینا پسند کرے گا۔"

میں ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر پستول ہاتھ میں لیے ہوئے اٹھا اور کونے میں رکھے ہوئے چھوٹے سے ریفریجریٹر تک گیا جیسے ہی میں نے اس کا دروازہ کھولا اچانک ہی شکاگو پولیس کا کیپٹن ولیم کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ریوالور تھے۔

"تم سب لوگ زیرِ حراست ہو۔" اس نے نفرت

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

آمیز لہجے میں کہا۔

☆☆☆

چار بج کر پینتیس منٹ پر میں موٹیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ گنی میرے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ مجھے بہت زور کی نیند آرہی تھی لیکن گنی کے اصرار پر اسے پوری تفصیل بتانا پڑی۔ ''میں نے تمہارے منصوبے کے مطابق عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے کیپٹن ولیم کو اس کے گھر پر فون کر کے صورت حال بتائی۔ اس نے ایڈ مور کو پولیس انسپکٹر کے طور پر شناخت کر لیا جس نے 1979ء میں بل بچ کو شکاگو میں گرفتار کیا تھا۔ میری درخواست پر ولیم اس مشن میں حصہ لینے پر تیار ہو گیا۔''

''اس کے بعد میں نے اوک پارک پولیس اسٹیشن فون کر کے ایڈ مور کے بارے میں معلوم کیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی شفٹ بارہ بجے شب ختم ہو جائے گی پھر میں میلروز پارک گیا جہاں جان بی رینڈل انشورنس کمپنی کا دفتر ہے۔ میں جس فورڈ وین کا تعاقب کر رہا تھا وہ اسی عمارت کے عقب میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔ عمارت کی دوسری منزل پر چھوٹے اپارٹمنٹس تھے چنانچہ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بدمعاش اسی عمارت میں رہتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنی موٹر سائیکل کے بجائے مالک مکان کی گاڑی استعمال کرتا ہے۔''

''اب مجھے ایڈ مور پر نظر رکھنا تھی۔ چنانچہ میں نے اس کے انتظار میں ایک گھنٹا گزارنے کی خاطر کسی جگہ بیٹھ کر سینڈوچ اور بیئر کا سہارا لیا پھر گاڑی چلاتا ہوا اوک پارک میونسپل بلڈنگ پہنچا۔ وہ بارہ بج کر پچیس منٹ پر باہر آیا اور اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اس کا تعاقب کرنا شروع کیا۔ وہ میرے انداز کے عین مطابق جان بی رینڈل انشورنس بلڈنگ پہنچا اور اپنی کار کھڑی کر کے اوپر چلا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی گاڑی سے باہر آتا۔ ایک ٹیکسی وہاں آکر رکی اور اس میں سے بل بچ برآمد ہوا۔ وہ خاصا مشتعل لگ رہا تھا جس کا مطلب ہے کہ وہ اسٹور سے فارغ ہو کر گھر گیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ لوٹ کا مال غائب ہو چکا ہے تو وہ جھگڑا کرنے چلا آیا۔''

اس کے جانے کے چند منٹ بعد میں بھی اوپر گیا اور باہر آنے والی آوازوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ کس اپارٹمنٹ میں ہیں۔ میں نے دروازے پر زوردار ٹھوکر لگائی اور پستول ہاتھ میں لیے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر انہیں سانپ سونگھ گیا پھر میں نے گم شدہ مال کا ایک نمونہ دکھا کر انہیں پیشکش کی کہ اگر وہ مجھے چوتھا حصہ دار بنا لیں تو میں ان کی رقم اور ہیرے واپس کر سکتا ہوں اگر وہ اس پر راضی ہیں تو پونے دو بجے میرے دفتر پہنچ جائیں۔

''میں نے راستے میں ایک پبلک فون سے کیپٹن ولیم کو کال کی اور وہ مجھ سے پہلے دفتر پہنچ گیا۔ ہم نے انہیں گرفتار کرنے کے لیے مختلف طریقوں پر غور کیا اور فیصلہ کیا کہ پہلے ان کے اعتراضات سننا بہتر ہوگا چنانچہ وہ الماری میں چھپ گیا پھر میں ان لوگوں کو اوپر لے کر آگیا۔ ولسن کو غیر مسلح کیا اور باتوں باتوں میں ان سے سب کچھ اگلوا لیا۔ میرا دفتر شکاگو میں ہے اور وہ علاقہ اس کی حدود میں آتا ہے چنانچہ وہ انہیں گرفتار کر سکتا تھا۔''

''ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ مجھے یہ رقم برآمد کرنے پر چالیس ہزار ڈالر اور ہیروں کی مالیت کا دس فیصد بطور انعام ملے گا۔''

''اس طرح کے لطیفے میں پہلے بھی سن چکی ہوں۔'' گنی منہ بناتے ہوئے بولی۔

''پرانے لطیفے ہی بہترین ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

دوسری صبح بل بچ نے دورانِ تفتیش بتایا کہ وقوعہ والے روز سزا یافتہ قیدی آرٹ ولسن علاقے میں آیا اور اس نے وینڈل سیفرٹ کو فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرتے دیکھا تو غصے میں آگیا۔ اس نے روزیلو کا بیلچہ اٹھایا اور سیفرٹ کی پشت پر وار کر کے اسے گرا دیا۔ دوسرے روز اس نے روزیلو کو پھنسانے کے لیے بچ کے ذریعے ایک اسکیم تیار کی کیونکہ وہ ایڈ مور اور بچ کے گزشتہ تعلق سے واقف تھا۔ اس نے وینڈل کی بیوہ کا پیچھا کر کے لوٹی ہوئی رقم تلاش کرنے کا منصوبہ بھی بنایا۔ اس طرح ان تینوں کے درمیان یہ سازش پروان چڑھی۔ مور نے اپنی صفائی میں کہا کہ وہ لوٹ کا مال برآمد کرنے کے لیے ان دونوں کے ساتھ شامل ہوا تھا لیکن حکام بالا نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا اور اسے اس جرم میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور میڈیا میں بھی اس کے جرم کی تشہیر کی گئی۔

اس کارروائی کے نتیجے میں میرا مؤکل ونس روزیلو بے گناہ ثابت ہوا اور مجھے پچاس ہزار ڈالر انعام میں مل گئے۔ جس سے میری بیٹی جینی کے میڈیکل کالج میں پہلے سال کے اخراجات پورے ہو سکتے تھے اور یہ سب احتیاط کا نتیجہ ہے جو میں نے اس کیس میں قدم قدم پر کی تھی ورنہ میں بھی روزیلو کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔

☆☆☆

• سرورق کی پہلی کہانی

سوگوزیاں

روبینہ رشید

بعض عورتیں زندگی کے سفر میں کسی بھی مرحلے میں حفاظتی بیلٹ کی محتاج نہیں ہوتیں... وہ ہر حیثیت اور ہر میدان میں اپنی خوداعتمادی... دل آویز تمکنت... جراتِ فکر و اظہار اور بے خوفی کا لوہا منوا لیتی ہیں... ایک ایسی ہی دل کش... نازک اندام ماہ جبین کی داستاں... جو کم عمری سے ہی مسائل میں الجھتی چلی گئی... دوست... احباب... رشتے دار آنکھوں پر دولت و خودغرضی کا نقاب اوڑھے اس کے ہمراہ رہے... مگر وہ ہر ایک محاذ پر مضبوطی سے ڈٹی رہی... مگر اچانک ہی وہ قتل کی ایک واردات کی چشم دید گواہ بن گئی... اور پھر پے در پے رونما ہونے والے واقعات نے اس کے حواس گم کر دیے...

[illegible]

[illegible]

وہ اپنے شاندار فلیٹ کی بڑی سی کھڑکی میں کھڑا سمندر کی موجوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ بلند ہوتی لہریں ہوا کے دوش پر اٹھکیلیاں کرتی آگے بڑھتیں اور پھر ساحل کے قریب آکر سرنگوں ہو جاتیں۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک اس کے دیکھتے ہی دیکھتے موجوں کا رنگ تبدیل ہونے لگا، پانی اب خون کی رنگت میں بدلتا جا رہا تھا اور پھر یہ سرخ رنگت آگ کے شعلوں میں ڈھل گئی۔ شعلے

کسی سیلاب یا سونامی کے مانند آگے بڑھنے لگے۔ ان کی اونچائی اس کے تیسری منزل پر واقع اپارٹمنٹ سے بھی بہت بلند تھی۔ وہ ایک لمحے کو سکتے کے سے عالم میں کھڑا شعلوں کے اس سمندر کو اپنی جانب بڑھتا دیکھتا رہا پھر لپک کر دروازے کی طرف بھاگا مگر اس کے کمرے سے باہر نکلنے سے قبل ہی کھڑکی کا بڑا سا شیشہ شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ شعلوں کی سرخ لپکتی زبانیں تیزی سے اس کے قریب آتی جارہی تھیں۔ اچانک فضا سیٹی نما تیز آواز سے گونج اٹھی۔

’کیا یہ صورِ اسرافیل ہے؟ کیا قیامت آچکی ہے؟‘ اس کے متوحش، خوف زدہ ذہن میں سوال گونج رہے تھے۔ سیٹی کی آواز رفتہ رفتہ ناقابلِ برداشت ہوتی جارہی تھی۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک تو وہ ساکت بیٹھا دیوار کو گھورتا رہا، موبائل کی گھنٹی بج بج کر اب بند ہوچکی تھی۔

’تو یہ خواب تھا۔‘ وہ بڑبڑایا۔ اب تک وہ اس تیز تپش کے احساس سے باہر نہیں آپایا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ حواس قدرے بحال ہوئے تو وہ ایک گہری سانس لے کر صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

اس کے اردگرد شعلے یا لاوا وغیرہ کچھ نہیں تھا، سامنے کھڑکی سے سمندر بھی معمول پر نظر آرہا تھا مگر وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں اب کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں رہا تھا۔ ایک فیصلے نے اسے گویا آتش فشاں کے دہانے پر لاکھڑا کردیا تھا جہاں خطرات کی تپش اسے جھلسا دینے کے لیے بے تاب تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شاید اس طوفان کا مقابلہ نہیں کر پائے گا مگر اس کے باوجود وہ مطمئن تھا۔ سالوں بعد یہ پہلا موقع تھا جب کچھ کرنے یا آگے بڑھنے کے لیے اسے کسی بھی قسم کے نشے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی۔

اس کے سامنے اس کا مقصد تھا جسے اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا تھا۔

☆☆☆

ایلیا صبح سے ہی شدید غصے میں تھی۔ دن کی شروعات ہی اس کے پلان کے خلاف ہوئی تھی۔ ایک اہم اسائنمنٹ پر ہفتے بھر کی شدید اور مسلسل محنت کے بعد یہ اس کا پہلا آف تھا۔ اور وہ یہ ٹھان کر سوئی تھی کہ صبح نہایت آرام سے اٹھا جائے گا پھر برنچ کیا جائے گا۔ دوپہر میں کوئی اچھی سی مووی دیکھی جائے گی مگر ایسا صرف اس نے سوچا تھا۔

ہوا تو یہ کہ پہلے تو صبح ہی صبح دروازے پر پڑنے والی زوردار دھچکا دار دستک نے اسے اچھل کر بستر سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا۔ بیڈروم سے دروازے تک پہنچتے پہنچتے فیصل کی جانب سے آنے والی کسی بُری خبر سے لے کر کسی بڑی ایمرجنسی تک بے شمار وسوسے اس کا دل ہولا چکے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی بلڈنگ کے چوکیدار خان کا بھاری بھرکم مونچھوں سے سجا چہرہ دیکھ کر وہ تلملا کر رہ گئی۔

”خان کیا دروازہ توڑنے کا ارادہ تھا، ایسی کون سی افتاد پڑگئی ہے صبح صبح۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”میڈم...... ابھی صبح صبح ہے؟ پورا دس بجے کا ٹائم ہے۔“ وہ اسے جواباً گھور کر گویا اس کی کم علمی پر بُرا مناتے ہوئے بولا۔ ”ابی ام نے پانی چڑھایا ہے اور سب کو بتا بھی دیا ہے اسی لیے آپ کا دروازہ بجایا ہے۔ بعد میں آپ لوگ ہی ناراض ہوتے ہو کہ ام کو بتایا نہیں۔“

”بہت مہربانی ہے تمہاری۔“ وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی اور بستر پر جاکر گرگئی۔

دوسری بار اس کی آنکھ شدید گرمی کے احساس سے کھلی تھی۔ اس نے بلبلا کر پہلے اے سی اور پھر پنکھے کی جانب دیکھا مگر دونوں ہی ساکت و جامد تھے جس کا واضح مطلب بجلی سے اچانک محرومی کے صدمے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ یو پی ایس سسٹم کئی روز سے گڑبڑ کررہا تھا۔ اس کا سوئچ ڈھیلا ہوگیا تھا جسے ہر بار ٹھیک کرنا پڑتا تھا۔ وہ گرتے پڑتے اٹھی اور یو پی ایس چلایا جس سے پنکھے میں تو زندگی لوٹ آئی مگر اے سی کے چلنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ بے بسی کے عالم میں بستر پر بیٹھے بیٹھے اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ تڑپ ہی اٹھی۔ چوکیدار صاحب کی دل دہلا دینے والی انٹری کے بعد وہ صرف 25 منٹ ہی سو پائی تھی۔ اسے بجلی والوں پر سخت غصہ آرہا تھا، ہزار وعدوں وعید کے باوجود جب چاہیں تب اور جہاں چاہیں اس جگہ بجلی بند ہونے کے اس وتیرے نے شہر کے لوگوں کو ایک قسم کے شدید ذہنی دباؤ اور تناؤ کا شکار بنا رکھا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بل تو پورا بلکہ پورے سے بھی دگنا ہی آئے گا چاہے بجلی آدھا ماہ غائب رہی ہو اور اگر بل بھرنے میں ذرا بھی تاخیر ہوجائے تو ہزاروں کے حساب سے جرمانے الگ اور بجلی کٹ جانے کا یقینی خدشہ الگ، حد ہوگئی ہے۔ گویا شہریوں کے لیے بنیادی حقوق میں شامل انسانی ضروریات کا حصول بھی اب حسن آرا کے سات سوالوں کی طرح ہوگیا تھا جن کے جواب لانے کے لیے انتظامیہ کے شہزادوں کو کسی حاتم کی ضرورت ہے۔ وہ کافی دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

اب نیند کا تو سوال باقی نہیں رہا تھا۔ بجلی دو گھنٹے بعد آئی تھی اس دوران ایلیا نے اپنے سارے کام نمٹا لیے تھے۔

اس فلیٹ میں وہ اور اس کا چھوٹا بھائی فیصل رہتے تھے۔ فیصل بی بی اے کے آخری سال میں تھا۔ کرکٹ اس کی محبت تھی اور وہ ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں ہی شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ایلیا شہر کے ایک مشہور چینل کی رپورٹر تھی۔ امی اور ابو کی رحلت کے بعد وہ بہن بھائی ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ کئی سال قبل جب ایک ٹریفک حادثے میں ان کے سر سے ماں باپ کا سایہ اچانک اٹھ گیا تب ایلیا میڈیا سائنسز کے آخری سال میں تھی اور فیصل نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ تب کئی رشتے داروں نے انہیں تنہا رہنے سے روکا اور اپنے گھر لے جانے کی کوشش بھی کی تھی۔ شاید وہ دونوں خالہ کے گھر چلے بھی جاتے اگر اس روز ایلیا خالہ اور خالو کی گفتگو اتفاق سے سن نہ لیتی۔

”یہی موقع ہے تیمور! دونوں ہمارے ساتھ رہیں گے...... باجی اور بھائی جان اس چھ سو گز کے مکان کے علاوہ بینک بیلنس اور زیور بھی چھوڑ کر گئے ہیں۔ فیصل ابھی بچہ ہے اور جو ایلیا کہتی ہے وہ وہی کرتا ہے۔ میں اپنے حامد سے ایلیا کا نکاح کرادوں گی تو سمجھو سب کچھ اپنا ہوجائے گا۔“ یہ اس کی بہت پیاری خالہ کی آواز تھی۔ ایلیا کا دل پھٹ سا رہا تھا۔

”جو کرنا ہے جلدی کرلینا۔ دیکھ نہیں رہیں بھائی جان کے بھائی صاحب کو...... کیسے اپنے بیٹے شاہد کو ہر کام پر دوڑا رہے ہیں جیسے وہی مالک ہوں ہر چیز کے۔“ خالو جان بولے۔

”ہاں ہاں سمجھتی ہوں میں ان کے ارادے...... مگر تم فکر نہ کرو، ایلیا میری مٹھی میں ہے، اس کے کانوں میں چچا کی بابت چند باتیں ڈال دوں گی تو ان کی طرف دیکھے گی بھی نہیں۔“ خالہ بات مکمل کرکے ہنسی تھیں۔

ایلیا کے لیے اس سے زیادہ کچھ سننا ممکن نہیں تھا۔ اس رات اس نے بہت سوچا اور اس ایک رات نے اسے بہت سمجھ دار اور ذمے دار بنا دیا تھا۔ اسے اپنا ہی نہیں فیصل کا بھی خیال رکھنا تھا۔

’ماں باپ اپنے بچوں کے مستقبل کے تحفظ کے لیے جو لوازمات چھوڑ کر جاتے ہیں بسا اوقات وہی ان کے لیے دلی و ذہنی تکالیف کا جہان خرید لاتے ہیں۔ پیسا اتنی ہی عجیب چیز ہے اور اس پر مرنے والے اس سے بھی زیادہ عجیب جو دھوپ میں رکھی برف کو پانیوں میں چھپا کر یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ غالباً پگھلے گی ہی نہیں۔‘ اس نے دکھ سے سوچا۔ وہ خالہ جان، چچا جان، بڑی پھوپی کے اس روز کے تاثرات آج تک نہیں بھول پائی تھی جب اس نے سب کو بٹھا کر بتا دیا تھا کہ وہ اور فیصل ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں جائیں گے اور یہ کہ وہ دونوں اپنا خیال خود رکھ سکتے ہیں۔

”اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہ پاؤ گے تم دونوں؟“

”نہیں، ہمیں اتنے بڑے گھر کی ضرورت نہیں ہے۔“ ایلیا نے سکون سے جواب دیا تھا۔ ”اس لیے میں نے ابو کے وکیل کے توسط سے یہ گھر فروخت کردیا ہے۔ اس کی جگہ ہم نے کلفٹن میں ایک چھوٹے فلیٹ کا سودا کرلیا ہے اور باقی کی رقم فیصل کے نام سے انویسٹ کردی ہے جہاں سے ماہانہ منافع ملتا رہے گا۔“

”اوئی ذرا سی لڑکی کے اتنے بڑے بڑے کام۔“ پھوپی چمک کر بولی تھیں۔ ”یہاں چچا، پھوپا، خالو سب بیٹھے تھے، کسی سے مشورہ تک لینا گوارا نہیں کیا اور خود ہی سب فیصلے کرکے بیٹھ گئی۔“

شام تک وہ سب ایلیا کو بدلحاظ، بے شرم اور نہ جانے کون کون سے خطاب دے کر گھر سے رخصت ہوگئے تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنی سوچ پر عمل درآمد کرلیا تھا اور اب وہ دونوں اپنے چھوٹے سے گھر میں خوش تھے۔ کافی پیچھے پیچھے پرانی یادیں گویا فاسٹ فارورڈ میں اس کے سامنے سے گزر گئی تھیں۔ ’میں شرطیہ قنوطی ہوتی جارہی ہوں۔‘ اس نے خود کو ڈپٹا۔

شام تک وہ بے مقصد ٹی وی دیکھتی رہی۔ فیصل سے لمبی چیٹ کی۔ بوریت اس کا مزاج پوچھے لے رہی تھی۔ بالآخر اس نے اپنی دوست سمعیہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا۔ جب اس کی گاڑی اپارٹمنٹ میں بنے گیراج سے باہر نکلی، شام کی رنگت سرمئی ہوچلی تھی۔

☆☆☆

وہ مسلسل سوچے جارہا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اس کے پاس اب بہت زیادہ وقت نہیں بچا تھا۔ اس کے پاس جو ثبوت تھے اسے ان کو جلد از جلد کسی ایسی محفوظ جگہ پہنچانا تھا جہاں سے وہ دوبارہ ان کے ہاتھ نہ لگ پائیں اور ان کے خلاف وہ سب بھی ہو پائے جو بہت پہلے ہوجانا چاہیے تھا۔ اس حوالے سے پولیس کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ ان کی دسترس اور پہنچ سے بخوبی واقف تھا۔

”پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟“ اس نے اپنے آپ سے

سوال کیا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے موبائل اٹھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ کوئی نمبر ملاتا فون گنگنا اٹھا۔ اسکرین پر جو نام نظر آرہا تھا، وہ اسے چوکنا کرنے کے لیے کافی تھا۔ فون چند لمحے بج کر بند ہوگیا تھا۔ اس فون کال کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ لوگ حرکت میں آچکے تھے اور کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔ اس نے الماری میں رکھے چھوٹے سے ہینڈ بیگ کو اٹھایا۔ اس میں ضروری چیزیں بھریں۔ ٹیکسی کے طور پر میسر پرائیویٹ کاروں کے ادارے کے ایپ پر جاکر گاڑی بک کرلی، اسکرین پر چمکتی تحریر کے مطابق اس کی گاڑی پانچ منٹ میں گیٹ پر پہنچنے والی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے مڑکر اپنی چھوٹی سی جنت کو دیکھا جس کے حصول اور آراستہ و پیراستہ کرنے کے شوق نے اسے اس مصیبت میں پھنسایا تھا۔ اس کے بعد وہ تیز تیز قدموں سے چلتا فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

گیٹ کے باہر کار اس کی منتظر تھی۔ وہ اپنی کار پہچانے جانے کے خوف سے بلڈنگ میں ہی چھوڑے جارہا تھا۔ اس نے چوکنے انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر مطمئن ہوکر کار کی پچھلی نشست پر جابیٹھا۔ ”چلو ہمیں کینٹ اسٹیشن کی طرف جانا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور نشست سے سر ٹکا دیا۔ کار کے چاروں شیشوں پر سیاہ جالی کے کور لگے ہوئے تھے جس سے باہر سے اندر دیکھنا ناممکن سا تھا۔ وہ خود کو خاصا محفوظ محسوس کررہا تھا۔

جیسے ہی اس کی کار آگے بڑھی۔ گیٹ پر اسی لمحے پہنچنے والی چھوٹی سی سیاہ کار اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

☆☆☆

”تمہیں یقین ہے کہ وہ اس کار میں موجود ہے؟“ اس بھرائی ہوئی تحکمانہ آواز نے پوچھا۔

”جی سر، وہی ہے، میں نے اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اگر ایک منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو وہ ہاتھ سے نکل جاتا۔“

”ٹھیک ہے اس کا پیچھا کرو اور جہاں وہ اُترے اس سے ہمارا سامان واپس لو۔“

”طارق کے لیے کیا حکم ہے سر؟“

”ختم کردو...... اور ہاں کوئی چاقو وغیرہ استعمال کرنا اور کام صفائی سے ہونا چاہیے۔ مجھے گواہوں اور دیگر مسائل کا بکھیڑا نہیں چاہیے۔ وہ کیمرا یا موبائل جس میں اس نے وہ سب ریکارڈ کیا ہے وہ ضرور حاصل کرلینا، سمجھ رہے ہو نا تم......؟“

”جی جی سر، آپ مطمئن ہوجائیں۔“

”تم جیسے ایک گدھے کی وجہ سے یہ مشکل شروع ہوئی ہے۔ یاد رکھنا غفور تمہارے پاس غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا۔“ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”جی سر......“ وہ تھوک نگل کر بولا۔ اس کی چھوٹی سی سیاہ کار آگے والی کار کے بالکل پیچھے چل رہی تھی۔ وہ قدرے طویل القامت اور صحت مند شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے ہلکا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر سیاہ کروشیے کی ٹوپی تھی۔ اس وقت اس کی پوری توجہ اس کار اور طارق پر تھی۔ اسے علم تھا کہ باس کو ناکامی پسند نہیں تھی۔ ناکامی کی صورت میں جو اس کے ساتھ ہوسکتا تھا اس کا تصور ہی اسے تھرا دینے کے لیے کافی تھا۔ شام کی روشنی سرمئی ملگجی سی ہلکی تاریکی کے قالب میں ڈھلتی جارہی تھی۔ آگے جانے ولی کار کینٹ اسٹیشن کے بارونق علاقے سے دو گلی پیچھے ایک گلی میں جارکی تھی۔ یہاں پرانی عمارتوں کے درمیان نئی عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ اس وقت وہاں ویرانی کا راج تھا۔

طارق محتاط انداز میں گاڑی سے نیچے اُترا اور کونے میں بنی عمارت کی جانب بڑھا۔ اگلی گاڑی کے آگے بڑھتے ہی غفور بھی کار سے باہر آگیا اور تیزی سے طارق کی طرف لپکا۔ اس سے قبل کہ طارق سنبھل پاتا غفور کے دھکے نے اسے سڑک پر لٹا دیا تھا۔

”کک...... کون ...... کیا کررہے ہو...... بچاؤ۔“

طارق کے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ غفور نے اس کے گرتے ہی ہاتھ میں پکڑے چاقو کو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے کندھے پر لٹکا بیگ چھین لیا۔ طارق کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ بھی کرپاتا، غفور کے ہاتھ میں موجود چاقو ایک بار پھر حرکت میں آگیا تھا۔

”فون کہاں ہے تیرا......؟“ وہ طارق کے چہرے کے قریب منہ لاکر غرایا۔ ”اس میں ہی ہے نا وہ فلم......؟“

”وہ تمہیں نہیں ملے گی۔“ طارق بمشکل بولا۔

”بکواس نہ کر......تو تو اب مر ہی رہا ہے، کیا کرے گا چھپا کر......؟“ وہ اس کی جیب کی تلاشی لیتے ہوئے بولا۔ اگلے ہی لمحے طارق کا نیا آئی فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ فون کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

طارق کے جسم سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے غفور کی آواز لمحہ بہ لمحہ اس سے دور ہوتی جارہی ہو۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے غفور نے اپنا ہاتھ لہرایا اور خون آلود چاقو ایک بار پھر فضا میں بلند ہوا۔

”تیرا دی اینڈ آگیا بیٹا۔“ غفور سفاکی سے مسکرایا۔ اس سے قبل کہ چاقو ایک بار پھر طارق کے جسم میں جگہ بناتا۔ ایک تیز چیخ نے غفور کو ساکت کردیا تھا۔

☆☆☆

سمعیہ کا گھر کینٹ کے علاقے میں تھا۔ اگرچہ کلفٹن سے کینٹ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر ٹریفک کے جم غفیر کی بنا پر ایلیا کے وہاں پہنچتے پہنچتے رات کا اندھیرا چھلک آیا تھا۔ سمعیہ کا اپارٹمنٹ ایک نو تعمیر عمارت میں تھا جس میں مہمانوں کے لیے پارکنگ کی سہولت میسر نہیں تھی۔ ایلیا کو اپنی گاڑی کو دو گلی پیچھے لانا پڑا تھا۔ گاڑی پارک کرکے وہ دوسری جانب جانے کے لیے مڑ ہی رہی تھی کہ ایک عجیب سی گھٹی گھٹی چیخ نما آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اضطراری طور پر مڑکر دیکھا۔ بظاہر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس آواز کو اپنا وہم سمجھ کر مڑنے ہی والی تھی کہ اس بار قدرے واضح چیخ سنائی دی۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے چیخنے والا شدید تکلیف کے عالم میں ہو۔ وہ تیزی سے مڑی۔ وہ جس گلی کے سامنے کھڑی تھی وہاں خاموشی طاری تھی۔ اردگرد کی سڑکوں پر حسبِ معمول روڈ لائٹس بند تھیں جس کی وجہ سے ماحول قدرے پُراسرار لگ رہا تھا۔ ایلیا کو خوف محسوس ہورہا تھا مگر اس کی رپورٹنگ کی حس اس خوف پر حاوی آگئی تھی۔ وہ دوبارہ پلٹی۔ اس بار اس کا رخ اگلی گلی کی جانب تھا۔ اس گلی میں قدرے روشنی موجود تھی۔ ایلیا گلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ گلی کے درمیان...... ایک شخص زمین پر گرا پڑا تھا۔ دور سے ہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہ شدید زخمی ہوچکا تھا۔ دوسرا شخص اس پر جھکا ہوا تھا، اس نے سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر کالی ٹوپی موجود تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بیگ تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں خون آلود چاقو تھا جسے اس نے بلند کر رکھا تھا۔

ایلیا کے منہ سے بے اختیار زوردار چیخ بلند ہوئی تھی۔ اس کی چیخ نے چاقو والے شخص کو بری طرح چونکا دیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سراسیمہ ہوکر ایلیا کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا مگر ایک تو ایلیا اس سے خاصے فاصلے پر تھی دوسرے اس کے چیخنے سے لوگوں کے جمع ہونے کا خطرہ لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہا تھا۔ طارق یوں بھی خون میں ڈوبا ہوا تھا، اس سے بیگ اور فون وہ پہلے ہی چھین چکا تھا۔ غفور نے لمحہ بھر میں فیصلہ کیا اور زقند لگا کر پچھلی گلی کی طرف لپکا جہاں اس کی کار موجود تھی۔

اس دوران ایلیا نے فون نکال کر پولیس کے ہنگامی نمبر پر کال ملا دی تھی۔ حملہ آور کو بھاگتا دیکھ کر وہ زمین پر پڑے شخص کی جانب لپکی۔ عقب سے لوگوں کے قدموں کی آواز نے اس کا خوف پہلے ہی بہت کم کردیا تھا۔

”آپ...... آپ ٹھیک ہوجائیں گے، میں ایمبولینس کو بلاتی ہوں۔“ وہ قریب پہنچ کر بولی۔ طارق کو اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہورہی تھی مگر یہ اس کا آخری موقع تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اب وہ بچ نہیں پائے گا مگر وہ مرنے سے پہلے اپنا کام پورا کرنے کی آخری کوشش ضرور کرنا چاہ رہا تھا۔ ”میری...... میری بات سنو۔“ وہ بمشکل بولا۔ اس نے پورے جسم کی طاقت اپنی گویائی میں بھر دی تھی مگر ایلیا کو سرگوشی نما وہ آواز سمجھنے کے لیے اس کے چہرے کے قریب اپنے کان لانا پڑے تھے۔

”بولیے...... بولیے۔“

”میری مدد کرو...... میرے کوٹ کی اندر والی جیب میں ایک چور جیب ہے اس میں...... اس میں ایک......“ وہ تھک کر چور ہوگیا تھا۔ ”میموری کارڈ...... نکالو......“ وہ بمشکل بول پایا۔

”میموری کارڈ......“ ایلیا بولی۔

”جی...... تم سیکڑوں...... سیکڑوں لوگوں کی جان بچالو...... وہ...... مار ڈالے گا...... سب کو......“ طارق کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔

”مگر آپ زخمی ہیں۔“ ایلیا اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

”خدا کے لیے...... نکال لو...... ورنہ...... ورنہ یہ ثبوت ضائع ہوجائے گا...... میں جان دے کر بھی ہار جاؤں گا...... نکال کر چھپالو۔“ طارق کا چہرہ اب سفید ہوتا جارہا تھا۔

ایلیا نے اس کے کوٹ کی اندرونی جیب کو ٹٹولا، وہ خالی تھی۔ دوسری جانب کی اندرونی جیب سے اسے ایک چھوٹا سا پیکٹ مل گیا۔

”چھپا...... چھپالو...... سب کے آنے سے پہلے......“ طارق بولا۔ ”کسی ذمے دار افسر تک پہنچانا...... تمہاری ذمے داری ہے...... میرا قرض ہے...... کردینا۔“ الفاظ اب ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے ہونٹوں سے نکل رہے تھے۔ ”بھائی...... بھائی سمجھ کر۔“ اس کے منہ سے اب خون کی لکیر

نکل رہی تھی۔ ایلیا نے پیکٹ اپنے بیگ میں ڈال لیا۔

''آپ بچ جائیں گے...... وہ دیکھیں ایمبولینس پہنچ گئی ہے۔ پولیس بھی آرہی ہے۔''

''میں...... نہیں بچوں گا۔'' وہ بولا۔ ''تم وعدہ کرو......''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ایلیا بالآخر بولی۔

''اس کا پاس ورڈ ہے...... کر دینا...... بھائی بھائی......'' لفظ دم توڑ گئے تھے۔ ایلیا سکتے کے سے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اسی لمحے ایمبولینس ان کے برابر رکی اور اس سے رضا کار اتر کر زخمی کی جانب لپکے تھے۔ وہ اسے اسٹریچر پر لٹا رہے تھے۔ اس کی نبض دیکھ رہے تھے۔

اچھے خاصے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ ایلیا پیچھے ہٹتی جا رہی تھی۔ وہ اس وقت پولیس کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اس پیکٹ کی حفاظت کا اور اسے ذمے دار ہاتھوں تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے لیے وہ اس سب کو سمجھنا چاہ رہی تھی۔ موقع واردات سے دور ہوتے ہوئے جو آخری بات اس کی سماعت نے سنی وہ اس شخص کی موت کی خبر تھی۔

☆☆☆

''وہ یقینی طور پر مر گیا ہوگا باس......'' غفور اس وقت ایک بھری پری سڑک کے درمیان.... کار چلا رہا تھا۔

''ہوگا سے کیا مطلب ہے تمہارا......؟'' سوال اس قدر سرد اور غصے میں کیا گیا تھا کہ وہ لرز کر رہ گیا۔

''سر وہاں اچانک ایک لڑکی آگئی تھی اور وہ چیخنے لگی تھی، اس کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا۔'' اس نے بمشکل بتایا۔

''اف کس قدر جاہل ہو تم...... کیا اس نے تمہارا چہرہ دیکھ لیا تھا۔''

''نہیں نہیں، وہاں خاصا اندھیرا تھا۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''اور جو چیز تمہیں اس نمک حرام سے لینی تھی؟''

''وہ ایک بیگ لے کر جا رہا تھا سر، وہ بیگ اور آپ کی ہدایت کے مطابق اس کا فون میرے پاس ہیں اور میں انہیں آپ کو پہنچانے آرہا ہوں۔'' غفور نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، خیال رکھنا کوئی تمہارا پیچھا نہ کر رہا ہو۔''

''کوئی نہیں ہے سر۔'' غفور پُرجوش انداز میں بولا۔ ''میں تقریباً پہنچ گیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، نیچے آجاؤ۔'' ان الفاظ کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی کار کے پہنچتے ہی گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ وہ کار کو اندر پورچ کے آخری کونے تک لے گیا۔ پھر بیگ اٹھا کر لکڑی کا بڑا سا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ جگہ اس کے لیے اچھی طرح جانی پہچانی ہو۔ چھوٹے سے لاؤنج کو عبور کر کے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور پھر نیچے اُترتا چلا گیا۔ زیر زمین کسی ہوٹل کی لابی کا سا منظر تھا جس کے دونوں اطراف کمروں کے بند دروازے تھے۔ غفور نے پہلے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

''آجاؤ......'' اندر سے آنے والی اس سرد آواز نے اسے خوش آمدید کہا۔ غفور مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ سامنے کرسی پر ایک قدرے چھوٹی قامت کا دبلا پتلا شخص بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''فرقان...... سر کہاں ہیں؟'' غفور نے پوچھا۔

''وہ کچھ مصروف ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم سے طارق کا بیگ اور فون لے لوں۔''

''او کے......'' غفور نے دونوں چیزیں اس کی جانب بڑھا دیں۔ ''اب میرے لیے کیا حکم ہے، مجھے رکنا ہے یا گھر جاؤں؟''

''سر نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہیں ان کا یہ پیغام دوں کہ اب تمہاری زندگی سے زیادہ تمہاری موت ان کے لیے فائدہ مند ہے۔'' فرقان مسکرا کر بولا۔ غفور کچھ کہہ پاتا اس سے قبل ہی اس کا بایاں ہاتھ بلند ہوا جس میں سیاہ رنگ کا سائلنسر لگا ریوالور موجود تھا۔ اس کی انگلی کی جنبش سے آگ کا ایک شعلہ غفور کے دل میں اُتر گیا۔ وہ حیرت سے خاقان کو دیکھتا ہوا اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

ڈی ایس پی ابراہیم احمد گھر کی جانب جا رہا تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے ایک ہائی پروفائل اغوا کی وجہ سے مسلسل ڈیوٹی پر تھا۔ چند گھنٹوں کی نیند میں بھی دھیان کیس پر ہی لگا رہتا تھا۔ آج ہی مغوی بازیاب ہوا تھا۔ ابراہیم کا ارادہ گھر جا کر پوری نیند لینے کا تھا۔ موبائل کی بیل بجی تو اس نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ ڈرائیونگ کے دوران فون استعمال نہیں کرتا تھا مگر اسکرین پر دفتر کے نمبر دیکھ کر اس نے کار سڑک کی ایک جانب لگائی اور فون ریسیو کر لیا۔

''کیا ہو گیا عمران...... ابھی تو آفس سے نکلا ہوں

JBD

جہانگیر بکس 91

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ 550/-
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجہ اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اس نے جواب دیا میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں۔ نسیم حجازی کی ایک لازوال تحریر

اندھیری رات کے مسافر 475/-
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

ثقافت کی تلاش 300/-
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگروؤں کی چھن چھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر و کسریٰ 625/-
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے 500/-
انگریز کی اسلام دشمنی، ہندو کی عیاری [illegible] سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز داستان

داستان مجاہد 300/-
[illegible] کے بعد راجہ داہر نے [illegible] سے دس ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج [illegible] فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت 450/-
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یوسف بن تاشفین 500/-
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی 475/-
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون 550/-
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ 450/-
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز 599/-
راہ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمد بن قاسم 425/-
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی 300/-
1965 کی جنگ کے پس منظر میں ہندوؤں [illegible] کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا 450/-
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان 450/-
سلطان خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد 225/-
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ 325/-
بحر اکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین 475/-
اندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

جہانگیر اردو لغت
(جامع ترین)
ملفوظی صوتی تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 165/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

میں......؟ عمران بھی ڈی ایس پی تھا اور ابراہیم کا پارٹنر بھی۔ وہ دونوں پرانے دوست تھے۔ انہوں نے ایک ہی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک ساتھ ہی کرمنالوجی پر اسپیشلائزیشن کی تھی۔ ایک ساتھ ہی ڈپارٹمنٹ کو جوائن کیا تھا۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ڈپارٹمنٹ نے ان دونوں کو اسپیشل سیل میں تعینات کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ابراہیم خاصا سنجیدہ مزاج تھا جبکہ عمران بذلہ سنج۔ کبھی کبھی تو وہ اپنی باتوں سے ابراہیم کو بھی زچ کر دیتا تھا۔

"کیا بتائیں بھائی، مجھے تو اب یہ لگنے لگا ہے کہ شیطان اس شہر میں اوور ٹائم کرتا ہے۔"

"ہوا کیا ہے عمران......" ابراہیم نے پوچھا۔

"کینٹ کے علاقے میں ایک شخص کو چاقو کے وار کر کے ہلاک کر دیا گیا ہے، قاتل فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔" عمران کسی ماہر نیوز کاسٹر کے انداز میں بولا۔

"افسوسناک...... اسٹریٹ کرائم؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"بادی النظر میں یہی لگا تھا۔" عمران بولا۔

"یہ ایک ایسی بیماری ہے جس نے ہماری زندگی کو خوف کے پنجوں میں پھنسا دیا ہے۔" ابراہیم بولا۔ "مگر یہ تو علاقے کے تھانے کا کیس ہے عمران۔"

"میں جانتا ہوں مگر اس کے باوجود میں نے اینگری ینگ مین ڈی ایس پی ابراہیم احمد کو فون کیا ہے تو کوئی تو وجہ ہوگی نا۔"

"میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں۔" ابراہیم ہونٹ بھینچ کر بولا۔ "اور تمہاری اطلاع کے لیے میں سڑک پر کھڑا ہوں لہٰذا براہِ کرم کم لفظوں اور بغیر کسی تمہید کے بات فرمائیے۔"

"واہ، واہ، کیا ادبی انداز ہے، تم کو تو رائٹر بننا چاہیے تھا، ڈاکٹر واٹسن کی جگہ شرلاک ہومز کیوں بن گئے تم۔" عمران چہکا۔

"عمران کیا میں فون بند کردوں؟" ابراہیم غرایا۔

"نہیں، مجھے دوبارہ کرنا پڑے گا، تو کام کی بات یہ ہے کہ آپ واپس آجائیے ہمیں مقتول سے ملنے جانا پڑے گا۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں، یہ تھانے کا کیس ہے ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟" وہ دانت پر دانت جما کر تحمل سے بولا۔

"تعلق ہے ڈی ایس پی...... کیونکہ مقتول وہ شخص ہے جسے آپ اور میں بڑی تگ ودو سے ڈھونڈ رہے تھے۔" عمران اس بار سنجیدگی سے بولا۔

"کون...... کون ہے وہ......؟ کیا تمہارا مطلب ہے کہ طارق کو قتل کر دیا گیا ہے؟" ابراہیم چونک کر بولا۔

"جی ہاں۔"

"اوہ...... میں آرہا ہوں۔" ابراہیم فون بند کرتے ہوئے بولا۔ وہ طارق سعد کو گزشتہ دو ماہ سے فالو کر رہے تھے۔ ان کی تفتیش کے مطابق وہ دہشت گردی کے کسی بڑے ریکٹ کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ ان کے پاس اس کے خلاف ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دو ہفتے قبل وہ اچانک گم ہو گیا تھا۔ ابراہیم اور عمران نے اس کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کیونکہ وہی ان کے لیے اس ریکٹ تک پہنچنے کا دروازہ تھا مگر وہ نہیں ملا تھا اور اب ملا تھا تو وہ ان کے کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ ابراہیم ہونٹ بھینچے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ طارق کو کون قتل کر سکتا تھا۔ اس کے اپنے ریکٹ والے یا پھر یہ کام کسی مخالف گروہ کا تھا۔ طارق سعد شہر میں ہونے والے ایک کریکر دھماکے کی تفتیش کے دوران ان کی نظر میں آیا تھا۔ ثبوت و شواہد اس کام میں طارق کی براہِ راست نہیں تو بالواسطہ شمولیت ثابت کر رہے تھے۔ ایک موقع پر تو وہ اسے گرفتار کرنے کی تیاری بھی کر چکے تھے مگر انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کسی اور کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہا ہے لہٰذا بڑے مگرمچھ کے شکار کے لیے اسے چارے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ حکمتِ عملی یہ تیار کی گئی تھی کہ اس کے سامنے آئے بغیر اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جائے تا کہ اصل آدمی سامنے آسکے۔ اس دوران ہر کام میں حتی الامکان رازداری اور احتیاط برتی گئی تھی پھر بھی دو ہفتے قبل وہ اچانک غائب ہو گیا تھا اور اب اس کی لاش ملی تھی۔

"یہ معاملہ ان کی سوچ سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔ اجراہیم نے ہونٹ سکیڑ کر سوچا اور ایکسلیریٹر پر پیر رکھ دیا۔

☆☆☆

وہ عجیب سا میموری کارڈ تھا۔ عام طور پر میموری کارڈ کو فون پا کٹ میں لگایا جائے تو اس میں موجود ڈیٹا دیکھنا مشکل نہیں ہوتا مگر یہ میموری کارڈ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ ایلیا مختلف طریقوں سے اسے کھولنے کی کوشش کر چکی تھی مگر اسے ہر بار ناکامی... ہوئی تھی۔

اسے یاد تھا کہ اس شخص نے مرتے مرتے پاس ورڈ کا لفظ بولا تھا مگر اسے پاس ورڈ بتانے کی مہلت نہیں مل پائی تھی۔ اور اس پاس ورڈ کے بغیر اس کارڈ کا کھلنا ممکن نہیں تھا اور اب وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔

عام حالات میں یہ اس کے لیے ایک شاندار بریکنگ نیوز تھی۔ وہ اس کی چشم دید گواہ تھی۔ وہ قاتل کا چہرہ دیکھ کر اسے پہچان سکتی تھی اور اس کے پاس قتل کی وجہ بھی موجود تھی۔ باقی مسالا نیوز روم میں لگا دیا جاتا جہاں کی ڈیمانڈ خبر میں زیادہ سے زیادہ سنسنی پیدا کرنا ہی قرار پا چکا تھا اور یہ تو تھی ہی ایک سنسنی خیز جاسوسی فلم...... مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس نے ایک مرتے ہوئے شخص سے رازداری کا وعدہ کیا تھا اور وہ یہ وعدہ ہرگز توڑ نہیں سکتی تھی۔

دوسری طرف وہ شہر کے حالات سے اچھی طرح واقف تھی اور یہ آگہی اسے مختلف النوع قسم کے خوف میں مبتلا کر رہی تھی۔ اسے تقریباً یقین تھا کہ یہ قتل اسٹریٹ کرائم کا نتیجہ نہیں بلکہ سوچا سمجھا باقاعدہ پلاننگ کے تحت کیا گیا ہے اور اس کی وجوہات میں اس میموری کارڈ کی تلاش بنیادی اہمیت کی حامل ہو سکتی تھی جواب اس کے پاس تھا..... جب انہیں اس بیگ میں میموری کارڈ نہیں ملے گا تو وہ یقیناً اسے تلاش کریں گے اور جس طرح وہ قاتل کو دیکھ چکی تھی قاتل بھی اسے دیکھ چکا تھا۔ جو لوگ ایک میموری کارڈ کے لیے ایک شخص کی جان لے سکتے تھے ان کے لیے دوسری اور تیسری جان لینا کیا مشکل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ فیصل کی زندگی کسی قیمت پر خطرے میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

فیصل اس کی واپسی سے پہلے ہی واپس آگیا تھا۔ اس کی طبیعت بہتر نہیں تھی اور وہ پیٹ کی ایک سمت مسلسل درد کی شکایت کر رہا تھا۔ ایلیا آتے ہی اس کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی جس نے مٹھی بھر دوائیوں کے ساتھ ساتھ اسے خوب پانی پینے کو کہا تھا اور زیادہ درد کی صورت میں فوری اسپتال لے جانے کی ہدایت کی تھی۔ دواؤں سے اسے تھوڑا آرام آیا تو وہ سو گیا تھا اور اس کے سونے کے بعد سے ایلیا اس کارڈ کو کھولنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

اس معاملے کو سمجھنے کے لیے اس کارڈ کا کھلنا نہایت ضروری تھا۔ اس شخص نے اس کارڈ کو چھپا کر رکھنے اور کسی ذمے دار ایماندار افسر تک پہنچانے کا وعدہ لیا تھا۔ اس نے دہرایا۔ 'مجھے یہی کرنا چاہیے۔' مگر وہ یہ کارڈ کسے دے۔ جو اس کا غلط استعمال بھی نہ کرے، وہ سوچے جا رہی تھی۔ اچانک اس کے ذہن کی اسکرین پر ایک چہرہ جگمگایا۔

"ابراہیم...... بس......! اس کام کے لیے وہ بہترین شخص ہے۔" اس نے سوچا۔ "ایماندار اور کڑک افسر......" وہ اسے کئی سالوں سے جانتی تھی۔ امی کی طرف سے وہ ان کا دور پار کا رشتے دار بھی تھا مگر ایلیا کی اس سے ملاقات پیشہ ورانہ حوالوں سے ہی ہوتی آئی تھی۔ "ابراہیم اسے کھلوا بھی لے گا اور اس بے چارے کے قتل کے ذمے داروں تک بھی پہنچ جائے گا۔" اس سوچ نے اس کے ذہن پر چھائے دباؤ کو بہت ہلکا کر دیا تھا۔

"صبح سب سے پہلے میں یہی کام کروں گی۔" اس نے سوچا اور بستر پر دراز ہو گئی۔

☆☆☆

"یہ طے ہے کہ یہ عام اسٹریٹ کرائم نہیں ہے۔ لاش کی جیب میں اس کا بٹوا موجود تھا جس میں 50 ہزار روپے کی رقم تھی جسے ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا ہے۔"

عمران اور ابراہیم اس وقت فرانسک ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر شازیہ تھی۔ وہ لاش کا معائنہ کر چکے تھے۔ اسے دل اور پھر جگر میں چاقو کے دو وار لگے تھے جو مہلک ثابت ہوئے تھے۔ ابتدائی رپورٹ کے مطابق زخم 6 انچ سے زیادہ گہرے تھے یعنی چاقو کافی بڑا تھا۔

"اس کے پاس موبائل فون وغیرہ نہیں تھا؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"ہاں یہ حیران کن بات ہے کہ اس کے پاس فون نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ قاتل اس کا فون ساتھ لے گیا ہو۔" ڈاکٹر شازیہ بولی۔

"آپ نے ایمبولینس کے عملے سے بات کی تھی؟" عمران کو کچھ خیال آیا۔

"جی ہاں، میں نے خود بات کی تھی۔ اس کے پاس فون نہیں تھا۔" وہ بولی۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہی ہوں، ایسی شکایات آئی ہیں کہ حادثوں کے شکار افراد کو سڑک سے اٹھائے جانے کے بعد ان کے فون، بٹوے غائب ہو جاتے ہیں مگر اس کیس میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ یوں بھی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ البتہ ایک چیز تھوڑی سی عجیب تھی۔"

"وہ کیا......؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"اس کے کوٹ کی اندرونی جیبوں کو بہت جلدی میں ٹٹولا گیا تھا کیونکہ ایک جیب کا معمولی اور دوسرے کا اندرونی استر الٹ کر باہر آیا ہوا تھا۔ ہم نے اس پر سے بھی انگلیوں کے نشانات اتروائے ہیں۔ فنگر پرنٹ اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ کو کل دوپہر تک مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔" ابراہیم بولا اور پھر وہ دونوں باہر نکل

گئے۔ ابراہیم یہاں عمران کی گاڑی میں آیا تھا۔ ”اس کے پاس یقیناً کوئی ایسی چیز تھی جس کے لیے اس کا قتل کیا گیا ہے۔“ ابراہیم کافی دیر سوچنے کے بعد بولا۔

”ہوسکتا ہے...... اسی لیے موبائل فون غائب کر دیا گیا ہو۔“ عمران نے جواب دیا۔

”سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہو گا؟“

”ایک منٹ......“ ابراہیم کچھ سوچتے ہوئے چونک کر بولا۔ ”ڈاکٹر نے بتایا کہ ایمبولینس وہاں پولیس سے پہلے پہنچ گئی تھی۔“

”ہاں......“ عمران نے سر ہلایا۔

”ایمبولینس کو کس نے کال کیا تھا اور پھر پولیس کو فون کس نے کیا؟“

”ظاہر ہے کہ وہاں موجود کسی شخص نے کیا ہو گا۔“ عمران سر جھٹک کر بولا۔

”عمران یہ معلوم کرنا ہوگا۔ ایمبولینس اور پولیس کو کن نمبروں سے کال کی گئی۔“ ابراہیم اس کا جواب سنے بغیر بولا۔

”اوکے...... ہم دفتر پہنچ ہی گئے ہیں ابھی معلوم کیے لیتے ہیں۔“

دفتر پہنچتے ہی انہیں سسٹم میں خرابی کی اطلاع ملی تھی اور یہ طے ہوا تھا کہ صبح تک انہیں اس بارے میں تمام معلومات مل جائیں گی۔

”تم کیا سوچ رہے ہو؟“ آفس سے نکلتے ہوئے عمران نے ابراہیم کی جانب دیکھا۔

”کچھ خاص نہیں، فی الحال سب کچھ الجھا ہوا اور گڈمڈ ہے۔ کل کا دن خاصا ہنگامہ پرور ثابت ہوگا۔“ ابراہیم مسکرایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

”آخر وہ سب کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ ثبوت، وہ ویڈیو اور وہ تمام ڈیٹا۔“ وہ غرایا۔ ”آئی ٹی والے اس کا پورا فون چھان چکے ہیں اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔“

کمرے میں اس وقت دو ہی افراد تھے۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا چھوٹی سی قامت والا فرقان تھا جو اس وقت مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ سامنے رکھی میز کے پیچھے ایک لمبا اور بھاری بھرکم جسامت کا مالک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔

مجموعی طور پر اس کی شخصیت خاصی پروقار نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ریم لیس گلاسز موجود تھے مگر اس وقت ان شیشوں سے جھلکتی نگاہوں میں شدید غصہ چھلک رہا تھا۔

”سر، اس نے یہی موبائل دیا تھا اور آپ نے بتایا تھا کہ ثبوت اسی میں ہوں گے اور ایک بیگ تھا۔“ فرقان دھیمی آواز میں بولا۔

”اس بیگ میں اس کے کپڑوں اور دیگر چیزوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے؟“ وہ سختی سے بولا۔ ”تمہیں غفور کو ٹھکانے لگانے سے پہلے سب کچھ دیکھنا چاہیے تھا۔“

”سر! آپ کا حکم تھا اور پھر کلائنٹ بھی منتظر تھا۔“

”حالات کے مطابق عقل استعمال کرنی چاہیے کہ نہیں...... طارق کے گھر کو چھان ڈالو...... اس کا لیپ ٹاپ اور دیگر سامان چیک کرواؤ...... فوراً......“ وہ غرایا۔

”ٹھیک ہے سر۔“ فرقان بولا۔

”تو اب دفع کیوں نہیں ہو رہے تم......؟“

”سر، غفور نے بتایا تھا کہ وہاں اچانک ایک لڑکی آگئی تھی۔ اس کی چیخ و پکار کی وجہ سے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا تھا اور جب وہ طارق کو چھوڑ کر نکلا تب وہ زندہ تھا......“ فرقان ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”ہاں، یہ اس نے مجھے بھی بتایا تھا...... پھر......“ اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”میں...... میں سوچ رہا تھا سر کہ شاید طارق نے وہ چیز اس لڑکی کو دے دی ہو۔“

سفید بالوں والا چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ شاید فرقان کی بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

”ہوسکتا ہے...... لعنت ہے...... میں تم لوگوں کو اس لیے پال رہا ہوں کہ ایک کام بھی ٹھیک طریقے سے نہ ہو۔“ وہ چلایا۔ ”اس لڑکی کا پتا لگاؤ۔ فرقان مجھے کل تک اس کا اتا پتا چاہیے۔“

”کوشش کرتا ہوں۔“

”کوشش کے بچے...... پولیس اسٹیشن میں جو بندے پال رکھے ہیں ان کو ہوشیار کرو۔ وہ لڑکی یقیناً گواہوں میں شامل ہوگی۔ اگر نہ بھی ہو تو ہمیں اس کو ڈھونڈ کر نکالنا ہوگا اور یاد رکھو ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر پولیس اب تک اس تک نہیں پہنچی ہے تو ہمیں اس سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔“

”بالکل ٹھیک ہے سر...... میں نکلتا ہوں۔“ فرقان تیزی سے بولا۔

”غفور کا سارا کام ہو گیا تھا؟“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جی سر، ڈاکٹر آصف نے جب باڈی فارغ کی میں نے اسی وقت پیکٹ بنا کر سمندر پر بھجوا دیا تھا۔“

”گڈ...... اب جاؤ اور یاد رکھو میں کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتا۔“ وہ غرایا۔

☆☆☆

ایلیا صبح ہی ابراہیم سے بات کرنا چاہ رہی تھی مگر اس کا فون بند آ رہا تھا بالآخر اس نے پیغام چھوڑنا مناسب سمجھا۔

”ابراہیم میں ایلیا بات کر رہی ہوں۔ مجھے آپ سے آج ایک انتہائی اہم معاملے میں ضروری بات کرنے کے لیے ملنا ہے۔ میں اس وقت دفتر جا رہی ہوں مگر ایک دو گھنٹے میں لوٹ آؤں گی۔ آپ مجھے کال کر لیں اور بتا دیں کہ آپ کس وقت مل سکیں گے۔“

ابراہیم کے نمبر پر پیغام چھوڑ کر وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی۔ اسے واقعی ایک ایمرجنسی کام کے سلسلے میں دفتر جانا تھا اور ساتھ ساتھ فیصل کی فکر بھی لگی ہوئی تھی۔

”تمہیں اچانک یہ درد کیسے ہو گیا فیصل......“ اس نے دوا دیتے ہوئے فکرمندانہ لہجے میں پوچھا۔

”آپی مجھے خود نہیں معلوم، مگر اتنا شدید درد تھا کہ میں نے دوا لی اور ٹورنامنٹ چھوڑ کر آ گیا۔“ وہ بولا۔ ”بہت شدید درد تھا۔“

”میں تمہیں ہمیشہ کہتی ہوں نا کہ انرجی ڈرنکس کا پیچھا چھوڑو، یہ سخت نقصان دہ ہیں اور ڈائٹ ڈرنکس بھی گردوں پر برا اثر ڈالتے ہیں اگر زیادہ استعمال کیے جائیں تو......“ وہ اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ”اب تو اتنا کچھ ہوتا ہے گوگل پر بھی مگر عقل نہیں تم لوگوں کو۔“

”آپی میں بیمار ہوں، برائے مہربانی یاد رکھیے بیمار کے حقوق میں شامل ہے کہ اسے ڈانٹا نہ جائے۔“ فیصل مسکرایا۔

”بکو مت...... میں دو گھنٹے میں آجاؤں گی، ذرا بھی تکلیف ہو تو مجھے فون کر دینا۔“ وہ اسے ہدایات دیتے ہوئے گھر سے نکل گئی تھی۔ وہ میموری کارڈ اس کے پرس میں موجود تھا۔

☆☆☆

ابراہیم دفتر پہنچ چکا تھا۔ اسے طارق کی رپورٹس کا انتظار تھا۔ اس دوران اس نے طارق کے موجودہ ٹھکانے کی تلاش میں کچھ آفیسرز کو روانہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ طارق کے قتل کے پیچھے ایسا ضرور تھا جو اسے اس نیٹ ورک تک پہنچا سکتا تھا۔ اس کی اطلاعات کے مطابق یہ نیٹ ورک دہشت گردی کی کئی کارروائیوں میں سہولت کار کے طور پر کام کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہیومن ٹریکنگ اور دیگر جرائم میں بھی ملوث تھا۔ طارق پر نظر رکھنے کا مطلب بھی اس نیٹ ورک کے کرتا دھرتاؤں تک پہنچنا تھا۔

”اتنا سناٹا کیوں ہے بھائی، کیا چل رہا ہے؟“ عمران کمرے میں داخل ہوا تو ابراہیم اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”اتنا سوچتا کیوں ہے تو یار...... دماغ کو بھی تھوڑے ریسٹ کی ضرورت ہوتی ہے، کسی وقت ہڑتال پر چلا گیا نا تو لگ پتا جائے گا۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔ دوسرے ہاتھ میں اس کی اپنی کافی تھی۔

”عمران......“ ابراہیم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”فرانسک سے رپورٹس آ گئی ہیں؟“

”تقریباً......“ وہ کافی کا سپ لے کر بولا۔

”اب اس تقریباً کا کیا مطلب ہے؟“ اس نے بے بسی سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ ہے میرے سڑو پارٹنر کہ ڈاکٹر شازیہ رپورٹ لے کر آ رہی ہیں۔“

”انہیں خود آنے کی کیا ضرورت تھی بھجوا دیتیں تو جلدی آ جاتیں رپورٹس۔“ ابراہیم بولا۔

”ہم...... سوال تو بڑا اچھا ہے، اب اگر میں جواب دوں گا تو تو پھر قاتلانہ نظروں سے مجھے گھورے گا اور میرا شہید ہونے کا ارادہ نہیں ہے ویسے وہ ہے اچھی......“

”فضول باتیں بند کرو عمران۔“ وہ گویا تنگ آ کر بولا۔

”یہ فضول نہیں انسانوں جیسی باتیں ہیں مگر تیرے لیے ان کا سمجھنا تھوڑا مشکل ہے۔ لو ڈاکٹر صاحبہ آ گئیں......“

ڈاکٹر شازیہ دراز قد اور خوب صورت خاتون تھیں۔ کمرے میں داخل ہو کر دعا سلام کے بعد انہوں نے رپورٹس ابراہیم کی طرف بڑھا دی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحبہ کوئی خاص بات......“ اس نے لفافہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں...... پوسٹ مارٹم میں تو وہی کچھ ہے جو ہم جانتے ہیں وجۂ موت چاقو کے وار وغیرہ مگر یہ معلوم ہوا ہے کہ مقتول کینسر کا مریض تھا۔“

”اوہ اچھا......“ ابراہیم بولا۔ ”اور فنگر پرنٹ رپورٹ......؟“

”اس کے جسم پر دو طرح کے فنگر پرنٹس ملے ہیں۔

اندرونی جیبوں والے فنگر پرنٹ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے جبکہ پیٹ پر زخم کے اردگرد سے جو فنگر پرنٹ ملے ہیں، انہیں ریکارڈز میں شناخت کرلیا گیا ہے۔" ڈاکٹر شازیہ متانت سے بولیں۔

"کیا......؟ اور آپ یہ اتنی تاخیر سے بتا رہی ہیں...... کس کے فنگر پرنٹس ہیں؟"

"میں اس کا ریکارڈ بھی ہمراہ لائی ہوں۔ وہ میز پر ایک فائل رکھتے ہوئے بولیں۔ "یہ غفور عرف کالا ہے۔ بدمعاش ہے، پیسے لے کر قتل اور بہت سے دیگر جھگڑوں میں ملوث رہ چکا ہے۔"

ابراہیم اس فائل کو پوری توجہ سے پڑھ رہا تھا۔

"عمران، اس غفور کے لیے ٹیم بھیجو، اسے فوراً پکڑنا ہوگا، اب یہی ہمیں کچھ بتا سکتا ہے۔" ابراہیم تیزی سے بولا۔ "اور اس نمبر کا پتا چلا جس نے ایمبولینس اور پولیس طلب کی تھی۔ وہ یقیناً کوئی عینی شاہد ہوگا اگر ہمیں اس کا پتا چل جائے تو بہت مدد ہوسکتی ہے۔"

"بالکل...... اصل میں لوگ ڈرتے ہیں سامنے آتے ہوئے، یہ تو پھر بھی ایک قتل کا معاملہ ہے۔" عمران بولا۔

"میں نے ایمرجنسی کے ریکارڈ روم اور ایمبولینس سسٹم سے بات کرلی ہے۔ تھوڑی دیر میں معلومات مل جائیں گی۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

ابراہیم نے اس دوران غفور کی فائل پر لگی تصویر کو موبائل کے کیمرے میں محفوظ کرلیا۔ صبح سے اس نے موبائل پر توجہ نہیں دی تھی۔ مس کالز چیک کرتے ہوئے اسے ایلیا کا پیغام ملا۔ ایلیا کا پیغام سنتے ہی اس کے ذہن کی اسکرین پر اس کا چہرہ دمکنے لگا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، چمکتی ہوئی سانولی رنگت، لمبے سیاہ بال، اسے ایلیا پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ وہ اس کی والدہ کی کسی کزن کی بیٹی تھی۔ ظاہری رنگ وروپ سے زیادہ اس کی سمجھ بوجھ اور قوت فیصلہ سے وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ جس طرح اس نے والدین کی موت کے بعد اپنے معاملات کو سنبھالا تھا اس سے اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ ایلیا سے اس کی کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر وہ ہر بار کسی کیس یا معاملے سے متعلق ہوئیں۔ ابراہیم اس سے اپنی پسندیدگی کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کر پایا تھا۔ وہ اس معاملے میں بہتر وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کا نمبر ملاتا عمران آندھی کے مانند کمرے میں داخل ہوا۔

"ابراہیم سمندر سے اسی طرح کی ایک اور لاش برآمد ہوئی ہے۔" وہ اندر آتے ہی بغیر کسی تمہید کے بولا۔

"اوہ......" ابراہیم اس کی بات سنتے ہی کھڑا ہوگیا تھا۔ "تم نے ان سے کہہ دیا نا کہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں۔"

"ہاں ظاہر ہے۔" عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

راستے میں زیادہ تر خاموشی رہی تھی۔ چند ماہ قبل بھی ایک مچھیرے کے جال میں ایک بڑا سیاہ خصوصی طرز کا تھیلا پھنسا تھا جسے کھولے جانے پر اس میں سے ایک نوجوان کی لاش ملی تھی۔ اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا مگر جس چیز نے ڈپارٹمنٹ کو ہلا دیا تھا اور جس کے بعد یہ کیس اسپیشل یونٹ کے حوالے کیا گیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کے جسم سے گردے، جگر وغیرہ نکال لیے گئے تھے۔ یہ کام جس صفائی سے کیا گیا تھا وہ کسی ماہر سرجن کے سوا کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ کئی مہینوں کی خاموشی کے بعد اس دوسری لاش کا برآمد ہونا ایک نیا سوال بن گیا تھا۔

ان کے وہاں پہنچنے تک لاش کو لے جانے کے لیے ایمبولینس پہنچ چکی تھی۔ ابراہیم اور عمران کے آنے کے بعد اس سیاہ تھیلے کو کھولا گیا تھا۔

اس میں موجود لاش زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اس کے جسم پر کپڑوں کے نام پر کچھ بھی نہیں تھا۔ پیٹ پر لگے لمبے لمبے بے احتیاطی سے کھینچے ٹانکے یہ بتا رہے تھے کہ اس کے اعضا بھی نکالے جا چکے تھے مگر ابراہیم کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

اس کے سامنے لاش کی صورت میں غفور عرف کالا پڑا ہوا تھا۔

☆☆☆

اس کا دن خاصا مصروف گزرا تھا۔ وہ صرف ایک ضروری کام کے لیے دفتر آئی تھی مگر یہاں پہنچ کر رمضان ٹرانسمیشن سے متعلق ایک خصوصی میٹنگ میں بہت وقت لگ گیا۔ اس کے بعد عین اس وقت جب وہ نکلنے والی تھی، نیوز روم کے حوالے سے ایک میٹنگ میں اسے طلب کرلیا گیا تھا۔ وہ فیصل کو دو گھنٹے کا کہہ کر آئی تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد اس سے بات بھی کر رہی تھی۔ اگرچہ وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے مگر ایلیا کو اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ بمشکل چار بجے وہ دفتر سے نکل پائی۔ گھر کی طرف آتے ہوئے اسے اس میموری کارڈ کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی ابراہیم کا بھی...... اس نے موبائل نکال کر چیک کیا۔ اس کی نہ تو کوئی کال تھی اور نہ ہی کوئی پیغام...... اس نے کندھے اچکا کر موبائل برابر کی سیٹ پر رکھ دیا۔ گھر پہنچ کر وہ اسے خود کال کرے گی، اس نے سوچا۔

مگر گھر پہنچ کر فیصل کی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ ہی بھول گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ تکلیف میں تھا۔

☆☆☆

"یہ معاملہ روز بروز الجھتا جا رہا ہے۔ اب جو تصویر بن رہی ہے اس کے مطابق یہ نظر آ رہا ہے کہ غفور نے طارق کو قتل کیا جو شاید کسی اور گینگ کے لیے کام کر رہا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ طارق اور غفور کسی ایک ہی شخص کے لیے کام کر رہے ہوں اور بعد میں کسی بڑی غلطی، اختلاف یا گڑبڑ کے نتیجے میں طارق کے قتل کا فیصلہ کیا گیا مگر پھر غفور کو فوری طور پر 24 گھنٹے کے اندر اندر قتل کردیا جاتا ہے اور پھر اس کی لاش کی یہ حالت کی جاتی ہے۔" ابراہیم اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ عمران اس کے سامنے موجود تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کام ایک ہی نیٹ ورک سے کیے جا رہے ہیں۔ قتل و غارت گری اور انسانی اعضا کی مجرمانہ سوداگری......"

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں الگ گینگ ہوں اور طارق کی موت کا بدلہ لینے کے لیے غفور کو مارا گیا ہو۔" عمران بولا۔

"ہاں، یہ بھی ہوسکتا ہے اور پھر وہ دوسرے فنگر پرنٹس...... رپورٹ منگواؤ عمران، پولیس اور ایمبولینس کو کس نے بلوایا تھا۔ ہمیں اس عینی شاہد کی بہت شدید ضرورت ہے۔ وہاں قاتل اور مقتول کے علاوہ کوئی تیسرا شخص بھی تھا ہمیں اسے تلاش کرنا ہے اور ہوسکتا ہے کہ فون کرنے والے نے اس کو دیکھا ہو۔" ابراہیم میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

عمران نے اس کی بات سن کر سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کی واپسی چند لمحوں میں ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"تمہاری بات قدرے درست لگ رہی ہے ابراہیم۔" وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" ابراہیم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایمبولینس اور پولیس ایمرجنسی دونوں کو ایک ہی نمبر سے کال کی گئی ہے۔"

"کیا انہوں نے پتا لگایا کہ یہ نمبر کس کا ہے؟" ابراہیم کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" عمران نے جواب دیا۔ "اب یوں لگ رہا ہے جیسے اس کیس میں کچھ رنگ آنے والے ہیں۔"

"کیا مطلب ہے یار......"

"وہ نہیں سنا تم نے، وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔" عمران مسکرایا۔

"تم ہر وقت اتنی فضول باتیں کیسے کر لیتے ہو عمران۔" ابراہیم نے بھنا کر پوچھا۔

"لو اگر یہ بات فضول ہے تب بھی اس میں میرا کیا قصور ہے، تم شاعر سے کہو جا کر......"

"تم سیدھے سیدھے مجھے بتاؤ گے کہ معلوم کیا ہوا ہے......؟"

"کیوں نہیں مگر اس کے لیے تمہیں اس قدر لال پیلا ہونے کی ضرورت کیا ہے۔" عمران مزے لے رہا تھا اور ابراہیم اس بار کچھ کہنے کے بجائے اسے دیکھتا رہا تھا۔

"او کے...... یہ نمبر کسی مس ایلیا ساجد کا ہے۔" وہ دوسرا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اور یہ اس کا کچھا چٹھا میرا مطلب ہے کہ پتا وغیرہ ہے۔"

ابراہیم نے عمران کے ہاتھ سے کاغذ لیا، اس پر لکھے پتے کو غور سے پڑھا۔ اس کے بعد موبائل نکال کر ایلیا کے نمبر کو چیک کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر موبائل میز پر رکھ دیا۔

یہ ایلیا کا نمبر ہی تھا۔ اس کے ذہن میں ایلیا کے پیغام کے الفاظ ناچ رہے تھے۔ "یقیناً وہ اسی معاملے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہوگی اور اس حوالے سے پریشان ہوگی تب ہی اس نے مجھے میسج کیا ہوگا۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا ہوا پارٹنر......" عمران نے پوچھا۔

"یار یہ ایلیا ہے، میری کزن، اس نے صبح مجھے ملنے کے لیے میسج بھی کیا تھا۔" وہ خالی الذہنی سے بولا۔

"تم پھر تم اسے فون کرو...... تاکہ تفصیلات کا علم ہو سکے۔" عمران نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں وہی کرنے جا رہا ہوں۔" ابراہیم نے فون نکالا۔ اس نے ایلیا کے نمبر پر کئی کالز کیں مگر نمبر ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔

"کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو۔" عمران بولا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" ابراہیم اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ "ہمیں دیکھنا پڑے گا۔" اور وہ دونوں تیزی سے کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

☆☆☆

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ یہی لڑکی ہے؟" فرقان نے پوچھا۔

"سو فیصد...... ڈی ایس پی صاحب نے اس کا نمبر

نکلوایا ہے۔ میں نے اسی وقت نمبر، نام اور پتا تمہیں بھیج دیا تھا۔" دوسری طرف سے کوئی دبی دبی آواز میں بولا۔ یہ مجید تھا جو پولیس ہیڈ آفس میں کام کرتا تھا۔ فرقان کے گینگ اور دیگر مجرموں کو ان کی ضرورت کے مطابق اہم خبریں پہنچانا ہی اس کا اصل کام تھا اور اسی وجہ سے وہ نہایت قلیل تنخواہ پر ڈپارٹمنٹ میں جما ہوا تھا۔

"دیکھ لینا مجید، باس آج کل بہت غصے میں ہے، خبر کو پکا ہونا چاہیے۔"

"سو فیصد پکی اور صحیح خبر ہے۔" وہ یقین سے بولا۔

"بس تو پھر تمہارا انعام تمہیں مل جائے گا۔" فرقان فون بند کرتا ہوا بولا۔

وہ جانتا تھا کہ باس اس وقت مصروف ہے اور وہ شام سے پہلے اس سے رابطہ نہیں کرے گا اس دوران اس نے خود ہی ابتدائی معلومات کی کنفرمیشن کا فیصلہ کیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ ایلیا کی بلڈنگ میں فرسٹ فلور پر واقع اس کے فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے چند لمحے دروازے کے سامنے رک کر سانس بحال کیا اور پھر کال بیل پر انگلی رکھی۔

دو لمحوں بعد دروازہ کھل گیا تھا اور اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

"جی بولیے۔"

"مجھے ایلیا بی بی سے بات کرنی ہے۔" وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"میں ہی ایلیا ہوں۔ کیا کام ہے آپ کو مجھ سے......" ایلیا نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن مجھے تو جس ایلیا سے ملنا تھا وہ آپ نہیں ہیں۔" وہ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھیے مسٹر، یہ میرا گھر ہے یہاں کوئی اور ایلیا نہیں رہتی اور اس وقت میں مصروف ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ فرقان کا کام بھی ہو چکا تھا۔ اب اسے صرف باس کے گرین سگنل کا انتظار تھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیوں سے اترا اور چند لمحے میں اس کی گاڑی سڑک پر ٹریفک کے سمندر میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

فیصل کو کافی تکلیف ہو رہی تھی اور ایلیا اس سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ ڈاکٹر توصیف کو فون کر چکی تھی۔ ڈاکٹر توصیف ان کے فیملی ڈاکٹر تھے اور ایلیا کے والد کے قریبی دوست بھی۔ ان کی رحلت کے بعد سے وہ ان دونوں کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ابھی بھی ایلیا کا فون ملتے ہی وہ ان کی طرف آنے کے لیے نکل گئے تھے۔ ایلیا ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی لیے دروازے پر بیل بجتے ہی وہ دوڑتی ہوئی باہر آئی تھی مگر وہاں وہ دبلا پتلا عجیب سا آدمی کھڑا تھا۔

"پتا نہیں کون تھا۔" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سر جھٹکا۔ نہ جانے کیوں وہ شخص کچھ ٹھیک نہیں لگا تھا لیکن اس وقت وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے کچھ ٹھیک سے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ فیصل میں اس کی جان تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو اس کی ساری تکلیف خود لے لیتی مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ہر انسان کو اپنے اعمال کی طرح اپنے حصے کی تکلیف سے بھی خود ہی گزرنا ہوتا ہے۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار آنے والے ڈاکٹر صاحب تھے۔ انہوں نے فیصل کا معائنہ کیا اور پھر اسے اسپتال لے چلنے کی ہدایت کی۔

"مگر ڈاکٹر صاحب...... فیصل کو ہوا کیا ہے؟" ایلیا روہانسی ہو رہی تھی۔

"پریشان مت ہو ایلیا، یہ اپنڈی سائٹس کا معاملہ لگ رہا ہے اور اس کے لیے فوری آپریشن ضروری ہوتا ہے۔ یہ خود اتنا خطرناک نہیں جتنا تاخیر نقصان پہنچا سکتی ہے۔" وہ شفقت سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپی تم پریشان مت ہو۔" فیصل بمشکل بولا۔

ڈاکٹر توصیف ان دونوں کو قریب ہی ایک بڑے اسپتال لے آئے تھے۔ شہر کے متمول علاقے میں واقع یہ اسپتال شیشے کے مانند چمک رہا تھا۔ ڈاکٹر توصیف وہاں کام کرنے والے ایک سینئر ڈاکٹر سے راستے میں بات کر چکے تھے۔ اسی لیے وہاں پہنچتے ہی فیصل کو اسٹریچر پر چیک اپ کے لیے اندر لے جایا گیا تھا۔

"تم کو فکر کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے ایلیا، ڈاکٹر ساجد میرے بہت اچھے دوست ہیں اور یہ فیصل کا بہت خیال رکھیں گے۔" ڈاکٹر توصیف اسے تسلی دیتے ہوئے بولے۔

"کیا آپ جا رہے ہیں؟" ایلیا نے پوچھا۔

"نہیں...... پہلے ساجد سے میری بات ہو جائے اس کے بعد جاؤں گا۔" تھوڑی ہی دیر میں ڈاکٹر ساجد باہر آ گئے تھے۔

"تم ٹھیک سمجھے ہو، اپنڈی سائٹس کا ہی معاملہ ہے، فوری آپریشن کرنا ہوگا۔ ہم ضروری تیاریوں کے بعد تھوڑی

دیر میں بچے کو آپریٹ کر دیں گے۔" وہ عام سے انداز میں بولے۔

"آپریشن......" ایلیا کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

"ڈونٹ وری ینگ وومن......" ڈاکٹر ساجد بولے۔

"اس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور اب تو یہ آپریشن لیزر کی مدد سے ہوتا ہے، آپ بالکل فکر نہ کریں، وہ اچھے ہاتھوں میں ہے اور ڈاکٹر توصیف میرے بہترین دوست ہیں یعنی اب ہم ان کا دگنا خیال رکھیں گے۔"

"شکریہ ساجد، مجھے اطمینان ہے کہ تم یہاں ہو۔" ڈاکٹر توصیف بولے۔ ڈاکٹر ساجد کچھ دیر بعد اندر چلے گئے۔ ایلیا کو آپریشن سے پہلے فیصل کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی تھی جو اس وقت انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے رخصت ہوتے ہی وہ وارڈ میں چلی آئی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد فیصل کو آپریشن کے لیے لے جایا گیا۔ ایلیا بہت خوف زدہ تھی۔ وہ فیصل کے سامنے کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے وہ مسکراتی رہی تھی۔

فیصل کے آپریشن روم میں جانے کے بعد وہ وہیں لابی میں بنی انتظار گاہ میں جا بیٹھی۔ اسے ابو اور امی کی یاد بُری طرح ستا رہی تھی۔ اس وقت اسے کسی کی ضرورت تھی مگر ہزاروں کانٹیکٹس اور تعلقات کے باوجود آج اس وقت اس کے پاس کوئی ایک نام ایسا نہیں تھا جسے وہ بلا سکتی۔

اس نے غیر ارادی طور پر پرس سے فون نکالا اس کا بٹن دبایا مگر فون آن نہیں ہوا۔ شاید کسی وقت دباؤ پڑنے سے فون بند ہو گیا تھا۔ اس نے فون آن کیا اور پھر اسے بیگ میں رکھنے لگی۔ اسی دوران بیل پورے زور و شور سے بجنے لگی۔ اس وقت وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اسکرین پر چمکتے ابراہیم کے نام نے اسے فون اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

"ہیلو......" وہ آہستگی سے بولی۔

"اوہ شکر ہے، ایلیا تم کہاں ہو؟ میں کب سے تمہیں فون کر رہا تھا۔" ابراہیم کی جھنجلائی ہوئی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"میں اسپتال میں ہوں۔" اس نے اسی طرح جواب دیا۔

"اسپتال میں......؟ مگر کیوں؟" اس کے لہجے میں در آنے والی فکر اس وقت ایلیا کو اچھی لگی۔

"فیصل کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تھی اس کا...... اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہو رہا ہے اس وقت۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"اوہ، اللہ اسے صحت دے، تم فکر نہ کرو، کون سے اسپتال میں ہو؟" اس نے پوچھا۔ "کیا میں تم سے یہاں آ کر مل سکتا ہوں مجھے بھی تم سے ہنگامی طور پر بات کرنی ہے۔"

"فیصل کا آپریشن ہو جائے خیر سے پھر ہم ملتے ہیں۔ مجھے بھی آپ سے کچھ اہم بات کرنی تھی۔ میں نے میسج بھی بھیجا تھا۔"

"ہاں میں نے دیکھا ہے وہ...... ٹھیک ہے ہم رات دیر سے یا کل صبح مل سکتے ہیں۔ تم اس وقت پریشان ہو، میں سمجھتا ہوں مگر صرف ایک بات بتا دو، کل شام 7 سے 8 بجے کے دوران تم کہاں تھیں؟"

"میں...... میں اپنی دوست کے گھر کے پاس تھی۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

"علاقہ؟"

"کینٹ کا پچھلا علاقہ......"

"میں جانتا ہوں، وہاں کل رات ایک قتل ہوا ہے۔ جس نمبر سے ایمبولینس اور پولیس کو ملایا گیا ہے وہ تمہارا نمبر ہے ایلیا اور مجھے یقین ہے کہ پولیس کو بیان نہ دینے اور وہاں سے غائب ہو جانے کی تمہارے پاس یقینا کوئی وجہ ضرور ہو گی کیونکہ تم جیسی ذہین رپورٹر کو اس حوالے سے کوئی خوف تو ہو نہیں سکتا۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں، میں خوف کی وجہ سے وہاں سے غائب نہیں ہوئی تھی مگر اس وقت ایک ایسی وجہ تھی جس کی وجہ سے میں سامنے نہیں آنا چاہتی تھی۔"

"کیا تم نے وہ قتل ہوتے دیکھا تھا؟" ابراہیم نے پوچھا۔

دوسری طرف چند لمحے کی خاموشی رہی تھی۔

ابراہیم نے اپنا سوال دہرایا۔ "ایلیا کیا تم اس واقعے کی عینی شاہد ہو؟ کیا وہ سب تمہارے سامنے ہوا تھا یا تم بعد میں پہنچی تھیں؟"

"میں جب وہاں پہنچی تو وہ اسے چاقو مار چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں مقتول کا بیگ تھا شاید وہ ایک وار اور کرتا مگر میرے چیخنے پر وہ فوری طور پر وہاں سے بھاگ نکلا۔" ایلیا نے بتایا۔

"میں تمہارے پاس اسی وقت آ رہا ہوں۔" ابراہیم گہری سانس لے کر بولا۔

''اس وقت میرا بھائی آپریشن تھیٹر میں ہے، ہم کل صبح بات کر سکتے ہیں۔'' ایلیا نے متانت سے کہا۔

''اوکے، میں تمہیں ایک تصویر بھیج رہا ہوں، اسے دیکھ کر ڈیلیٹ کر دینا۔'' ابراہیم بولا۔ ''میں دوبارہ فون کر رہا ہوں۔'' اس نے یہ کہہ کر کال بند کر دی تھی۔ چند لمحوں میں کلک کی ہلکی سی آواز نے میسج کی اطلاع دی۔ ایلیا نے وائس ایپ کھولا اور جیسے سکتے میں آ گئی۔

☆☆☆

فرقان اس وقت بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اسے باس نے فوری طور پر طلب کیا تھا اور اس کا موڈ سخت خراب محسوس ہو رہا تھا، اتنا کہ اس نے اس کا جواب سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

یقیناً کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی تھی مگر گڑبڑ تو گزشتہ کافی دنوں سے ان کی ہم رکاب ہو گئی تھی۔

سب سے پہلی گڑبڑ طارق کی طرف سے ہوئی تھی۔ طارق باس کا رازدار بندہ تھا۔ ہر آپریشن (ان کے ہاں کام کو آپریشن ہی کہا جاتا تھا) میں وہی سارے معاملات سنبھالا کرتا تھا پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ وہ غائب ہو گیا اور ان سب کی شامت آ گئی۔

اس کے گھر اور ہر اس جگہ پر اسے تلاش کر کر کے جہاں اس کی موجودگی کی ذرہ بھر امید بھی ہوتی وہ سب تھک گئے تھے مگر وہ ان سے ہمیشہ دو قدم آگے ہی رہتا تھا۔

پھر پتا چلا کہ اس کے پاس کچھ ایسے ثبوت موجود ہیں جو باس کے سارے دھندوں کو بند کر کے اس کے چہرے سے شرافت کے نقاب کو نوچ کر پھینک دینے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں جس کے بعد اس کی تلاش میں تیزی آ گئی اور آخرکار غفور اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ غفور کو تو خود اس نے باس کے حکم پر ختم کر دیا تھا۔ تو پھر اب نئی گڑبڑ کیا ہوئی ہے۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ باس انتہائی خطرناک آدمی تھا انسانوں کو جان سے مار دینا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور یہ تو اس کے سب آدمی جانتے تھے کہ وہ ایک سے زیادہ غلطی برداشت نہیں کرتا تھا۔

انہی سوچوں میں الجھے الجھے وہ اس جگہ تک جا پہنچا تھا جہاں باس نے اسے طلب کیا تھا۔ گاڑی کو پارکنگ میں لگا کر وہ عمارت میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک بڑا اسپتال ہے اور یہاں ہر وقت لوگوں کا رش لگا رہتا تھا۔ وہ استقبالیہ سے گزرتا ہوا اندر کی عمارت کی طرف بڑھا۔ اس طرف بھی بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے بس فرق صرف یہ تھا کہ وہ مختلف انتظار گاہوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کو ڈاکٹر سے ملنا تھا تو کسی کے رشتے دار آپریشن کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ بڑی انتظار گاہ سے گزر کر بائیں ہاتھ کی طرف مڑتے ہی وہ جم سا گیا تھا۔

☆☆☆

اسکرین پر نظر آنے والی تصویر پر اس کی نگاہیں جم سی گئی تھیں۔

اسے تو وہ لوگوں کے مجمع میں بھی پہچان سکتی تھی۔

وہ وہی قاتل تھا۔ جسے اس نے گزری شام ایک نہتے شخص پر چاقو چلاتے دیکھا تھا۔ اس نے وہاں سے بھاگتے ہوئے جس خون آشام نظروں سے ایلیا کو دیکھا تھا اس کا تصور ہی اسے دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر لوگوں کا خوف نہ ہوتا تو وہ اسے بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ ابراہیم کے اس تصویر کو بھیجنے کا مطلب یہ ہی تھا کہ پولیس اس تک پہنچ گئی تھی۔ اسے تیز رفتار اور صحیح سمت میں ہونے والی اس تفتیش سے نہ صرف خوشی ہوئی تھی بلکہ دلی اطمینان بھی ہوا تھا۔ فون جیسے ہی گنگنایا اس نے اسے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو ایلیا، کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟''

''ہاں، یہی اس شخص کا قاتل ہے، میں اسے آسانی سے پہچان سکتی ہوں، اس کے پاس ایک چاقو بھی تھا۔''

''ہوں...... یعنی سب کچھ تمہارے سامنے ہوا تھا۔'' ابراہیم نے ہنکارا بھرا۔ ''جب وہ بھاگ گیا تب تم نے کیا کیا؟''

''ابراہیم صبح تک اس بات کو روکا نہیں جا سکتا۔'' اس نے اس بار ہلکے سے غصے سے پوچھا اس کا بھائی اسپتال میں تھا اور اس شخص کو صرف اپنا بیان درکار تھا۔ اس نے چڑ کر سوچا۔

''روکا جا سکتا ہے مگر میں تمہیں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ فیصل اس وقت اچھے ہاتھوں میں ہے اور تم یہاں ڈاکٹرز کے انتظار کے دوران فون پر تو بات کر ہی سکتی ہو۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے پولیس اور ایمبولینس کو فون کر دیا تھا؟'' ایلیا بولی۔

''کیا وہ شخص اس وقت تک مر چکا تھا؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''نہیں...... وہ زندہ تھا۔ شدید زخمی تھا...... اسی لیے تو میں نے ایمبولینس پہلے منگوائی تھی۔'' ایلیا بولی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے؟ کیا تم اس کے قریب گئی تھیں؟ کیا اس نے تم سے کوئی بات کی تھی؟ یا پھر تمہارے سامنے کوئی اور اس کے قریب گیا تھا؟'' ابراہیم تابڑتوڑ سوال کر رہا تھا۔

''ابراہیم کوئی اور اس کے پاس نہیں گیا تھا۔'' ایلیا دھیرے سے بولی۔ ''میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی۔ اس لیے اس کے پاس گئی تھی۔''

''اوکے...... اوکے اس نے تم سے کچھ کہا تھا۔ یاد کرو اس کے الفاظ کیا تھے؟''

''اس نے...... اس نے کہا تھا کہ وہ نہیں بچے گا۔'' ایلیا بولی۔ اسے حقیقت میں سب کچھ یاد کر کے تکلیف ہو رہی تھی۔ ''اور یہ بھی کہ اسے ہر صورت ختم ہونا ہے......''

''اور...... اور کیا کہا تھا اس نے......؟''

''اس نے کہا تھا کہ میں اس کی مدد کر کے سیکڑوں لوگوں کی زندگی بچا سکتی ہوں۔''

''وہ کیسے...... تم اس کی مدد کس طرح کر سکتی تھیں؟ کیا چاہ رہا تھا وہ؟''

''تم اگر ایک لمحے چپ رہو تو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔'' ذہنی تناؤ نے ایلیا کو چڑچڑا کر دیا تھا۔ ''پلیز مجھ سے اس طرح تفتیش مت کرو...... اس کے پاس کچھ ثبوت تھے...... ایک میموری کارڈ میں...... جو اس کی اندرونی جیب میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں وہ نکال لوں اور اسے کسی ذمے دار اور ایماندار پولیس افسر کے ہاتھ میں دوں، اسی وجہ سے میں وہاں سے نکل آئی تھی۔ کیونکہ بیان کی صورت میں مجھے سب بتانا پڑتا۔ اور اسی لیے میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ فون بند ملا تو میسج کیا تھا...... سن رہے ہونا......'' اس نے بات مکمل کر کے پوچھا۔ مگر دوسری جانب سناٹا تھا۔ نہ جانے کال کس وقت کٹ گئی تھی۔ ایلیا نے مایوسی سے فون کو دیکھا اور دوبارہ ابراہیم کا نمبر ملایا مگر فون بند جا رہا تھا۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔'' اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو...... حالات اسے مسلسل شکی بناتے جا رہے تھے۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے کہ اس کی بیٹری ختم ہو گئی ہو اور وہ اسے دوبارہ فون کر لے۔ اس نے خود کو ڈانٹا پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ابراہیم کی ہدایات کے مطابق اس شخص کی تصویر کو ڈیلیٹ کر دیا۔ یوں بھی وہ اپنے فون میں کسی سفاک قاتل کی تصویر محفوظ رکھنے

2017
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعروسخن اور
مرزا امجد بیگ کی کھوج کا نتیجہ

غرق محبت

محبت کے دل آزار معاملات...... جہاں کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا مگر حالِ دل کسی پر کھلتا بھی نہیں۔ آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کا شاہکار

سلسلے وراثت کے

سورج ڈوبتا ہے اور پھر اگلے دن نکلتا ہے...... دراصل ڈوبنے اور ابھرنے کا حصہ ہی تاریخ ہے جبکہ بادشاہت اور وراثت کا سلسلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے۔ ابتدائی صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کے قلم کی روانی

شیش محل

انتقام کی گہری کھائی سے نکلتے ہوئے حسرتوں اور کچھ خواہشوں کے درمیان گزرتے لمحات اور دلنشیں واقعات پر مشتمل اس دلربا داستان کا آخری پڑاؤ...... **اسما قادری** کے خیالات کی پرواز

وقت

دھیرے دھیرے اپنا رنگ جماتا اور کرداروں سے آنکھ مچولی کرتا ہوا یہ وقت مزید واقعات کی تخلیق کرتا ہے...... **حسام بٹ** کی حیرت انگیز تحریر

اس کے علاوہ

منظر امام، ظفر اقبال ظفر، کبیر عباسی، تنویر ریاض، سلیم انور اور شاکر لطیف کا دلچسپ انداز

میں ذرہ بھر بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆

آپریشن تھیٹر کے سامنے موجود انتظارگاہ میں وہ کھڑی تھی۔

فرقان درمیان میں موجود ستون کی آڑ سے اسے صاف دیکھ پا رہا تھا۔ یہ وہی تھی ایلیا، جس کے بارے میں وہ باس کو بتا کر کچھ رعایت حاصل کر سکتا تھا اور اب تو بڑی خبر یہ تھی کہ وہ یہیں موجود تھی۔ اس نے اپنا موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا اور گفتگو جاری تھی۔ فرقان نے ستون کی آڑ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تصویر کھینچی اور باس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

باس واقعی غصے میں بپھرا ہوا تھا۔ کمرے کی زمین پر موجود خون کی باریک سی لکیر بتا رہی تھی کہ وہ فوراً فیصلے اور سزا کے مراحل سے گزر چکا تھا مگر اب بھی اس کی پیشانی پر بَل موجود تھے۔

''ایک اور گدھا آیا۔'' وہ فرقان کو دیکھ کر غرایا۔ ''کیا کرتے پھر رہے ہو تم؟ میں نے تمھیں جو کام دیا تھا اس کا کیا بنا؟''

''کام ہو گیا ہے باس۔'' وہ فوراً بولا۔

''کون ہے وہ لڑکی......؟''

''باس وہ ایک رپورٹر ہے، اس کا پتا پولیس اسٹیشن سے ملا تھا پھر میں نے اس کے فلیٹ پر جا کر یقین دہانی کی کہ یہ وہی لڑکی ہے۔''

''واہ تو آپ نے اس سے پوچھ لیا کہ تم وہی لڑکی ہو؟'' باس نے کٹیلے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں باس، بس اس کی شکل دیکھنی تھی۔''

''اور اس کو اپنی شکل بھی دکھا دی۔'' باس چلّایا۔

''احمقو! کیا تم اپنے ساتھ مجھے بھی مروانا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم بھی میرے لیے قیمتی بن جاؤ...... ہاں......''

باس کے ان جملوں کے ساتھ فرقان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''نہیں باس، پلیز مجھ پر رحم کریں۔ میں بہانے سے وہاں گیا تھا، اسے مجھ پر ذرا بھی شک نہیں ہوا اور...... اور میں نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا۔'' وہ آخر میں جھوٹ پر آ گیا تھا۔ ''کمال یہ ہوا ہے باس کہ میں نے اسے ابھی اوپر آپریشن تھیٹر کے سامنے دیکھا ہے۔''

''کسے......؟''

''اسی لڑکی ایلیا کو باس......'' فرقان بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اس کے عزیزوں میں سے کوئی اسپتال میں ہے، وہ آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی تھی۔''

''اور تم یہ مجھے ابھی بتا رہے ہو۔'' وہ غرایا۔ ''کون سا آپریشن تھیٹر تھا؟''

''اس پر نمبر 2 لکھا تھا۔'' وہ بولا۔

''اچھا......'' باس چند لمحے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا پھر اس نے کریڈل سے ریسیور اٹھا لیا۔ وہ کسی سے آپریشن تھیٹر نمبر 2 میں ہونے والے آپریشن اور اس کے اٹینڈنٹ اور مریض کے بارے میں معلومات لے رہا تھا۔

''نرس شبانہ کو میرے پاس بھیجو فوراً'' وہ ریسیور رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

چند لمحے بعد شبانہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی عام شکل و صورت والی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ واضح چیز اس کی آنکھیں تھیں جن میں مکاری لہرا رہی تھی۔

''نرس شبانہ، آپریشن تھیٹر 2 میں جو آپریشن ہو رہا ہے تمھیں اس کی اٹینڈنٹ کو یہاں لے کر آنا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر......'' نرس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''تم یہ کام کس طرح کرو گی؟''

''میں اس سے کہوں گی کہ بڑے ڈاکٹر صاحب بُلا رہے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''خوب......'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔ ''اور اس کے بعد تم یہ بات اور اس لڑکی کو بھول جاؤ گی، سمجھ رہی ہو نا؟''

''جی سر...... میں سمجھ گئی۔'' نرس شبانہ کے لیے شاید یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لیے اس نے حیرت کے اظہار کے بجائے سر ہلا کر جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ نرس کے باہر نکلتے ہی باس بھی اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ابراہیم ساکٹ میں فون چارجر لگا کر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ آئی فون کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوتا ہے کہ اگر وہ آف ہو جائے تو پھر مخصوص فیصد بیٹری چارج ہوئے بغیر آن نہیں ہوتا، ان کے چہرے پر بے بسی اور غصے کے ملے جلے تاثرات تھے۔

''میرا فون لے لو......'' عمران نے پیشکش کی۔

''یار اس کا نمبر اسی فون میں ہے اور شاید وہ اس وقت انجانے نمبر سے کال ریسیو بھی نہ کرے۔'' ابراہیم

بولا۔ ''بس پانچ منٹ میں چارج ہو جائے گا۔'' اس نے غفور کو شناخت کر لیا ہے اور ہمارے پاس جو دوسرے فنگر پرنٹس ہیں، وہ ایلیا ہی کے ہیں۔ طارق نے مرتے وقت ثبوت غالباً اس کے حوالے کر دیے تھے۔ اسی لیے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ بس اتنی ہی بات ہو سکی، اس کے بعد لائن کٹ گئی تھی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس نے وہ ثبوت کہاں رکھے ہیں؟''

''تو ہم وہاں چلے چلتے ہیں۔'' عمران بولا۔

''وہ اس وقت اسپتال میں ہے، اس کا بھائی آپریشن تھیٹر میں ہے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''تب بھی ہمارا وہاں جانا اس کے لیے مددگار ہی ثابت ہو گا۔ ایسی پریشانی میں انسان کے لیے دوسرے لوگوں کی موجودگی سہارے سے کم نہیں ہوتی۔'' عمران بولا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... یہ فون بھی آن ہو رہا ہے، میں اسے کال کرتا ہوں پھر اس کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔'' ابراہیم فون اٹھاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

ایلیا پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے انتظارگاہ کی نشست پر آ کر بیٹھ گئی۔ زندگی اچانک رولر کوسٹر کا سفر بن گئی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ زندگی سے زیادہ حیران کن کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اس نے سوچا، کل شام وہ تنہا بیٹھی بور ہو رہی تھی اور وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا اور اب ہر لمحے نئی بات سامنے آ رہی تھی۔ ان 24 گھنٹوں میں وہ نہ صرف ایک قتل کی چشم دید گواہ بن چکی تھی۔ بلکہ مقتول کی مدد کی کوشش اسے خود خطرے کے سرخ نشان کے اندر لے آئی تھی۔ پولیس اسے تلاش کر رہی تھی، اس کا اندازہ اسے ابراہیم کی باتوں سے ہو گیا تھا اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل بھی اسے ڈھونڈ رہا ہو۔

یہ سوچ کر اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس وقت وہ یہ سب سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ فیصل بخیریت گھر آ جائے یہ اس کی آرزو تھی۔

''بی بی......'' وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس کے سامنے ڈیوٹی نرس کھڑی ہوئی تھی۔

''جی بولیے۔'' وہ گھبرا کر یک دم کھڑی ہو گئی۔

''میرے بھائی کا آپریشن ختم ہو گیا؟ کیسا ہے وہ؟''

اس کے اچانک کھڑے ہونے سے ہاتھ میں موجود پانی کا گلاس چھلک پڑا۔ گلاس کو بچانے کی کوشش میں اس کے زانو پر رکھا فون پھسل کر سیٹ کے نیچے چلا گیا۔ ایلیا اس وقت اتنی پریشان تھی کہ اسے فون کے گرنے کی خبر نہیں ہو سکی تھی۔

''آپریشن جاری ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔'' نرس پیشہ ورانہ انداز میں بولی۔ ''آپ کو اصل میں بڑے ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔''

''مجھے...... مگر کیوں؟'' ایلیا اور ہول گئی تھی۔ ''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ میرا بھائی ٹھیک ہے نا؟''

''وہ ٹھیک ہیں، آپ پلیز آیئے ڈاکٹر صاحب کو آپ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔'' شبانہ یہ کہہ کر آگے بڑھی۔ ایلیا بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آخر کوئی ڈاکٹر اسے کیوں بلا سکتا تھا۔ ہر سوچ کا سرا فیصل کی حالت اور صحت پر جا کر ختم ہو رہا تھا اور یہ سوچ اسے خوف زدہ اور پریشان کر رہی تھی۔

اب اسپتال کا انتظامی علاقہ شروع ہو گیا تھا یہاں کوریڈور میں خاموشی تھی۔ کیونکہ یہاں وہی لوگ آ سکتے تھے جن کا اسپتال سے کوئی تعلق تھا۔

نرس ایک دروازے کے سامنے جا کر رک گئی اور پھر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے آنے والی آجاؤ کی آواز پر اس نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھول لیا اور ایلیا کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ ایلیا ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کوئی بری خبر نہیں سننا چاہتی تھی... بلکہ سچ تو یہ تھا کہ وہ کوئی بُری خبر سن ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

''وہ فون نہیں اٹھا رہی......'' ابراہیم فون بند کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں جا کر دیکھنا پڑے گا۔''

''او کے...... ہو سکتا ہے کہ وہ مصروف ہو، ڈاکٹر سے بات کر رہی ہو یا پھر اس کے بھائی کا آپریشن ختم ہو گیا ہو...... کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔'' عمران بولا۔

''ہاں ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر نہ جانے کیوں میری چھٹی حس خطرے کا سگنل بجا رہی ہے۔''

''تو ہم اسپتال چلے چلتے ہیں۔'' عمران اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمھیں کبھی کسی کے لیے اتنا زیادہ پریشان نہیں دیکھا۔''

''میں نے تمھیں بتایا نا کہ ایلیا میری مام کی کزن کی بیٹی ہے، شی از فیملی......'' ابراہیم کار کا دروازہ کھول کے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"مانتا ہوں مگر پھر بھی اس کے متعلق کچھ ایسا ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہے۔" عمران بولا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے عمران، احمقانہ باتیں مت کرو۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔ "ساتھ ساتھ اس نے ایلیا کا نمبر دوبارہ ملایا تھا اور رابطہ نہ ہونے سے بند کر دیا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ ہم اس وقت ایک مشکل کیس کے درمیان پھنسے ہیں مگر پھر بھی یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم اپنے بچپن کے دوست سے باتیں چھپانے لگے ہو اور وہ بھی وہ باتیں جنہیں تمہارا چہرہ، تمہاری آنکھیں بیان کر رہی ہیں۔"

"عمران......" ابراہیم نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا۔

"او کے چپ ہو جاتا ہوں میں...... مگر اب ایلیا جی سے ملنے کا شوق دو چند ہو گیا۔"

انہیں آپریشن تھیٹر نمبر 2 ڈھونڈنے میں بالکل وقت نہیں لگا تھا۔

"مجھے فیصل ساجد کو دیکھنا ہے، ان کا آج اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہوا ہے۔" ابراہیم نے کاؤنٹر اسٹاف سے گفتگو شروع کی۔

"جی...... جی......" کاؤنٹر پر موجود افسر کمپیوٹر چیک کرتے ہوئے بولا۔ "وہ یہیں ہیں اور ابھی ان کا آپریشن ختم نہیں ہوا۔"

"او کے، ان کی اٹینڈنٹ کہاں ہیں؟"

"وہ وہیں انتظار گاہ میں تھیں، ہو سکتا ہے کہ کسی کام سے اِدھر اُدھر گئی ہوں، آپ وہیں ان کا انتظار کیجیے۔" وہ بات ختم کر کے دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے آپریشن تھیٹر نمبر 2 کے باہر بنی انتظار گاہ میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت انتظار گاہ بالکل خالی تھی۔ ابراہیم نے چاروں طرف گھوم کر جائزہ لیا۔

"وہ یہاں بھی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں عجیب سی بے قراری تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ کسی کام سے باہر نکلی ہو، تم اسے اب کال کرو۔" عمران کرسی پر ڈھیر ہوتا ہوا بولا۔

ابراہیم نے ری ڈائل دبایا...... بیل بج رہی تھی۔ وہ فون کو دیکھتا رہا پھر کال بند کر دی۔ عمران اس دوران چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"ابراہیم ذرا پھر کال کرو۔" وہ بولا۔

"یار فون پک نہیں ہو رہا۔" وہ بولا۔

"تم دوبارہ کال کرو تو......" عمران کے اصرار پر اس نے پھر نمبر ملایا۔ دو بیل بجنے تک عمران کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر نشست کے نیچے جھکا، جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایلیا کا فون تھا۔ ایلیا نے غالباً بیل تقریباً بند کر رکھی تھی۔

"یہ...... یہ فون تو یہاں پڑا ہے۔" اس کی آواز سن کر ابراہیم اس کی جانب لپکا۔

"تب ہی...... تب ہی اتنی دیر سے کال اٹینڈ نہیں ہو رہی۔ وہ اپنا فون یہاں گرا کر کہاں جا سکتی ہے۔" ابراہیم فکرمندی سے بولا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتے۔" عمران کندھے اچکا کر بولا۔ "ہو سکتا ہے کہ اسے ابھی تک فون کے گم ہو جانے کے بارے میں کچھ پتا ہی نہ ہو۔"

"ہمیں کچھ دیر اس کا یہیں انتظار کرنا چاہیے۔ اس کے بھائی کا آپریشن ہو رہا ہے اور وہ اپنا فون کھو چکی ہے۔ یقیناً وہ کسی بھی لمحے یہاں واپس آئے گی۔" ابراہیم، ایلیا کے فون کو دیکھتے ہوئے نشست پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

"آپ تشریف رکھیے نا، کھڑی کیوں ہیں؟" وہ کمرے میں داخل ہو کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ ایک خاصا بڑا کمرا تھا جہاں بڑی میز، کرسیاں، مریض کے لیے مخصوص اسٹول، پیشنٹ بیڈ اور طبی آلات موجود تھے۔

سامنے میز کے پیچھے ایک طویل القامت شخص بیٹھا تھا۔ اس کی رنگت گوری تھی۔ ذہین چمکتی آنکھوں پر بغیر فریم کا چشمہ سج رہا تھا اگرچہ اس کے سر پر بال نہیں تھے مگر بحیثیت مجموعی وہ ایک باوقار اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر پُرشفقت مسکراہٹ تھی۔

"جی...... جی، میرا نام ایلیا ہے۔ ایلیا ساجد، میرے بھائی کا آپریشن ہو رہا ہے۔ مجھے آپ کی نرس یہاں لے کر آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔" وہ قدرے سنبھل کر بولی۔

"بالکل، میں نے ہی اس سے یہ کہا تھا مگر آپ بیٹھیں تو سہی۔" وہ دوبارہ مسکرایا۔

"شکریہ......" ایلیا اس کے سامنے موجود کرسی پر بیٹھ گئی۔ "اصل میں مجھے اپنے بھائی کی بہت فکر ہو رہی ہے۔ برائے مہربانی مجھے ٹھیک ٹھیک بتایئے، میرا بھائی ٹھیک ہے نا؟"

"آپ کا بھائی بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تک تو غالباً اس کا آپریشن ہو چکا ہو گا۔ وہ بہترین ہاتھوں میں ہے۔" وہ اطمینان دلاتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے اللہ کا، ورنہ جب نرس نے مجھے آپ کا پیغام دیا، میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔" ایلیا پہلی بار مسکرائی تھی۔ "پھر کیا میں جان سکتی ہوں کہ آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟"

"بالکل جان سکتی ہیں۔ دراصل میں آپ کے کئی نیوز پیکجز دیکھ چکا ہوں۔ جس طرح آپ معاشرے کے مسائل کی صاف عکاسی کرتی ہیں اس سے میں بہت متاثر ہوں، آپ کو میں نے ویٹنگ ایریا میں دیکھا تو معلومات کیں اور جب پتا چلا کہ آپ کے بھائی ایڈمٹ ہیں تو ان کے لیے خصوصی ہدایات دیں پھر سوچا کہ کیوں نہ آپ کے ساتھ ایک کپ چائے پی جائے۔ یہاں صحت کے شعبے میں بہت سے ایسے مسائل ہیں جس پر توجہ کی ضرورت ہے۔"

"جی آپ درست کہہ رہے ہیں، اس حوالے سے بہت کام کی گنجائش ہے۔" ایلیا کا اس طرح کے لوگوں سے ٹاکرا ہوتا رہتا تھا۔ ان میں سے کچھ واقعی مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ ہوتے تھے اور باقی مسائل کے حل کے ساتھ ساتھ شہرت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ 'تو یہ ڈاکٹر صاحب بھی میڈیا کانشس ہیں۔' اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اس وقت میں خاصی الجھی ہوئی ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ کی مدد سے یقیناً میرے بھائی کو زیادہ توجہ مل سکے گی۔"

"بالکل ملے گی، انہیں وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"بہت شکریہ...... پھر اب میں چلتی ہوں۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

اسی وقت ایک اور نرس اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جس میں چائے اور بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔

"لیجیے چائے بھی آ گئی، آپ بیٹھیے پلیز......" ڈاکٹر صاحب اصرار سے بولے۔

"ڈاکٹر صاحب اس وقت چائے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔"

"چائے موڈ سے نہیں پی جاتی۔ ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ آپ نے گھنٹوں سے کچھ نہیں کھایا۔ یاد رکھیے مریض کی دیکھ بھال ایک صحت مند اور چاق چوبند اٹینڈنٹ ہی اچھی کر سکتا ہے، یہ ایک ڈاکٹر کی ہدایت ہے اور آپ کو اس پر عمل کرنا ہے۔"

ڈاکٹر کے اصرار پر ایلیا بیٹھ گئی۔ اسے یہ باوقار ڈاکٹر اچھا لگا تھا۔ کیا تھا کہ اسپتالوں کا اسٹاف پریشان لوگوں سے مسکرا کر باتیں کرے، ان سے ہمدردی کا اظہار کرے۔ مدد کرے۔ اس نے سوچا، عام طور پر تو نرسنگ اور دیگر اسٹاف کا رویہ ہی مریضوں کے ساتھ آنے والے افراد کو بھی ذہنی طور پر بیزار اور پریشان کر دیتا ہے۔

اس نے چائے کی پیالی تھامی، ایک بسکٹ لیا۔ واقعی اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دفتر میں وہ جلدی بھاگنے کے چکر میں تھی اور گھر پہنچ کر فیصل کی پریشانی میں لگ گئی تھی۔ گرم چائے کا بڑا سا گھونٹ اسے بہت اچھا لگا تھا۔

اسپتال کے دیگر حصوں کے برخلاف اس حصے میں بالکل خاموشی تھی۔ اس قدر خاموشی کہ شاید ایک پن بھی گرے تو اس کی آواز سنی جا سکتی تھی۔ پنکھے، اے سی، سب بے آواز انداز میں اپنا کام کر رہے تھے۔

"آپ کی ڈیوٹی کی ٹائمنگ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"میں دن کی شفٹ میں ہوتی ہوں مگر جب اسائمنٹ ہو تو پھر کوئی وقت نہیں ہوتا۔" وہ مسکرائی۔

"ہماری طرح......" ڈاکٹر بھی مسکرایا۔ "یہاں بھی یہی حال ہے۔"

"جی......" ایلیا کو نہ جانے کیوں اپنی اور پھر ڈاکٹر کی آواز قدرے دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چائے کا ایک اور گھونٹ لیا اور پھر سر کو جھٹکا۔ 'کہیں اس کا بی پی تو لو نہیں ہو رہا۔' اس نے سوچا۔ اس کے ہاتھ میں آدھا بسکٹ موجود تھا اس نے اس بسکٹ کو کھانے کا ارادہ کیا مگر پوری طاقت لگانے کے باوجود وہ اپنے ہاتھ کو معمولی سی جنبش ہی دے پائی تھی۔ اس نے گھبرا کر سامنے بیٹھے ڈاکٹر کی جانب دیکھا اس کی کیفیت بھی کچھ اس جیسی ہی تھی۔ اس کی گردن ڈھلک رہی تھی۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایلیا نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ کمرے میں چھن کی ہلکی سی آواز گونجی۔ اس کے ہاتھ میں موجود کپ زمین سے جا ٹکرایا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اردگرد گہری تاریکی چھا گئی۔

☆☆☆

"دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔" ابراہیم بولا۔ "ہمیں یہاں آئے ڈیڑھ گھنٹے سے بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ فیصل کا

آپریشن ختم ہو چکا ہے، اسے کمرے میں شفٹ کیا جا چکا ہے مگر ایلیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔ یہ سب نارمل نہیں ہے پھر اس کا فون جس طرح یہاں زمین پر پڑا ملا ہے...... یہ ماننے والی بات نہیں ہے کہ اسے اب تک اپنے فون کی گمشدگی کا پتا نہ چلا ہو۔"

"درست کہہ رہے ہو تم ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔"

"عمران میرا خیال ہے کہ کاؤنٹر اسٹاف ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کاؤنٹر بالکل سامنے ہے مگر ہم کو اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر اس کام کو کرنے کی کوشش کرنا ہوگی۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ اگر یہاں کا کوئی شخص اس میں ملوث ہے تو وہ لازماً چوکنا ہو جائے گا جس کی وجہ سے ہم ایلیا کو کھو سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"ہم الگ الگ کوشش کرتے ہیں۔" عمران سر ہلا کر بولا اور ابراہیم کاؤنٹر کی جانب بڑھا۔ کاؤنٹر پر اس وقت ایک میل اسٹاف موجود تھا۔

"جی سر......" وہ ابراہیم کو دیکھ کر مؤدب انداز میں بولا۔

"اصل میں یہاں ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کے بھائی مسٹر فیصل کا آپریشن ہو رہا تھا۔" ابراہیم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی جی...... وہ یہیں تھیں......" اسٹاف نے سر ہلا کر کہا۔

"مگر اب ڈیڑھ گھنٹے سے وہ یہاں نہیں ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ گھر چلی گئی ہوں۔"

"نہیں، ان کے بھائی کا آپریشن ابھی ختم ہوا ہے۔" ابراہیم بولا۔ "ویسے کیا آپ نے انہیں کہیں باہر جاتے دیکھا ہے؟"

"نہیں، میں تو ابھی یہاں آیا ہوں سر۔ ویسے میں معلوم کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے برائے مہربانی آپ معلوم کریں۔" وہ پلٹ کر انتظارگاہ کی طرف بڑھا۔ اسپتال میں اس طرح کسی کو تلاش کرنا ہرگز آسان کام نہیں تھا لیکن انہیں کہیں سے ابتدا کرنا ہی تھی۔

عمران اس دوران آپریشن تھیٹر سے متعلق اسٹاف، باتھ روم میں موجود خاتون اسٹاف اور گارڈز سے معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ کسی نے بھی ایلیا کو کہیں جاتے نہیں دیکھا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں باقاعدہ تفتیش شروع کرنا ہوگی۔" عمران بولا۔

"میں نے دفتر سے ایک سب انسپکٹر کو ایلیا کے فلیٹ پر بھیجا ہے۔ اگر وہ کسی کام سے گھر گئی ہوگی تو وہاں مل جائے گی یا کم از کم یہ ضرور پتا چل جائے گا کہ وہ اس دوران وہاں آکر گئی ہے یا نہیں۔ اس کے دفتر بھی فون کر چکا ہوں۔ اس وقت اس کی ڈیوٹی بھی نہیں ہے اور وہ دفتر گئی بھی نہیں ہے۔" ابراہیم بولا۔

"ٹھیک ہے...... تو اب ہمیں کیا کرنا ہے؟" عمران نے پوچھا۔ وہ دونوں انتظارگاہ سے قدرے ہٹ کر کھڑے ہوئے تھے۔

"سر! کیا میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتی ہوں۔" ایک قدرے عمر رسیدہ خاتون نے ان کے قریب آکر پوچھا۔ اس نے اسپتال کا یونیفارم پہن رکھا تھا اور غالباً صفائی ستھرائی یا آیا کے کام پر مامور تھی۔

"جی فرمائیے۔" ابراہیم اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ اس لڑکی کو ڈھونڈ رہے ہیں نا جو ادھر بیٹھی تھی؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

"جی اماں...... اسی کو...... کیا آپ جانتی ہیں، وہ کہاں گئی ہے؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"دیکھا تو تھا میں نے......" وہ سر جھکا کر بولی۔ "مگر ڈرتی ہوں میری نوکری کا مسئلہ نہ ہو جائے۔"

"آپ کی نوکری کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا کیونکہ کسی کو بھی یہ پتا نہیں چلے گا کہ آپ نے ہماری مدد کی ہے۔" ابراہیم بے تابی سے بولا۔

"میں غریب عورت ہوں، بیوہ عورت، بچوں کی ذمے داری ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رک گئی۔ ابراہیم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کو اس کے جبڑے تن گئے تھے اور آنکھوں میں غصے کی سرخی لہرائی تھی۔ پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کے تین نوٹ نکال کر اس عورت کی جانب بڑھائے جنہیں اس نے فوراً لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ ابراہیم اب کچھ کہے بغیر اسے استفہامیہ انداز میں دیکھے جا رہا تھا۔

"میں نے ڈیڑھ دو گھنٹے قبل اسے نرس شبانہ کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔" وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "نرس شبانہ بڑی منہ چڑھی ہے انتظامیہ کی۔" اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔ غالباً اس کا مسئلہ نرس شبانہ سے تھا جس کی وجہ سے وہ یہ اطلاع دینے آئی تھی۔

"نرس، شبانہ...... کہاں ہے وہ؟"

"یہ تو آپ کاؤنٹر پر پوچھ لیں پر میں نے پکی خبر دی ہے آپ کو...... مگر میرا نام نہیں آنا چاہیے۔" وہ قدرے سرد مہری سے کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

"ہمیں نرس شبانہ کا پتا کرنا ہوگا۔" وہ چند لمحے اسے غصے سے دیکھنے کے بعد عمران کی جانب مڑا تھا۔ "تمہارا خیال درست تھا، گڑبڑ ہے اور یہیں سے کچھ ہوا ہے۔ ہمیں محتاط رہ کر کام کرنا ہوگا۔ ان کو یہ اطلاع نہیں ملنی چاہیے کہ پولیس یہاں پہنچ گئی ہے۔" عمران نے سر ہلایا۔

کاؤنٹر سے انہیں اطلاع ملی کہ نرس شبانہ کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے اور وہ گھر کے لیے نکل گئی ہے۔ اس کے گھر کے پتے کے حصول کے لیے عمران کو ایک نئی کہانی اور پانچ سو روپے خرچ کرنا پڑے تھے۔ وہ نیلم کالونی کی ایک گلی کی باسی تھی۔ ابراہیم اور عمران جب اس کے گھر پہنچے تب تک وہ گھر نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں خود کو اس کے کسی مریض کا اٹینڈنٹ ظاہر کر کے باہر آگئے اور اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی کر کے بیٹھ گئے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نرس شبانہ گلی میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے اسپتال کے یونیفارم پر چادر لی ہوئی تھی مگر اس کی شناخت مشکل نہیں تھی۔ اس کے گلی میں مڑتے ہی ابراہیم گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کے قریب لے آیا۔

"نرس شبانہ......" عمران گاڑی سے اتر کے اس کے قریب پہنچ کر بولا۔ "ہمیں تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کیا بات؟ آپ بولیں۔" وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔" عمران سرد لہجے میں بولا۔

"میں نہیں بیٹھوں گی...... کون ہو تم لوگ......" وہ زور سے بولی۔

"پولیس......" عمران نے اپنا کارڈ اس کے سامنے کر دیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر اسے اندر دھکیل دیا۔

"مگر آپ مجھے کیوں پکڑ کر لے جا رہے ہیں؟ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے اپنے گھر اور دفتر اطلاع کرنے دیں۔ آپ اس طرح مجھے نہیں پکڑ سکتے؟" وہ مسلسل بول رہی تھی۔ اس نے اپنے پرس سے فون نکالا جسے عمران نے فوراً چھین لیا تھا۔

"ہم تمہیں اسٹیشن تک لے جا رہے ہیں اور مطمئن رہو تمہیں سب کو اطلاع کا موقع ملے گا مگر ابھی نہیں......" اسے سیٹ پر بٹھا کر گاڑی تیزی سے آگے کی جانب بڑھ گئی۔ شبانہ کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں سے خوف چھلک رہا تھا۔

☆☆☆

ایلیا کی آنکھ کھلی تو چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے اور جہاں ہے وہاں کیوں ہے؟ آہستہ آہستہ خیر اسے سب کچھ یاد آیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھوں کو مسلا اور چاروں طرف نظر دوڑائی۔ یہ وہ کمرا نہیں تھا جہاں وہ بے ہوش ہوئی تھی مگر یہ کمرا بھی اچھی طرح فرنشڈ تھا۔ وہ خود ایک صوفے پر تھی جبکہ پیشنٹ بیڈ پر وہی ڈاکٹر موجود تھا جس نے اسے بلایا تھا۔ وہ اب بھی بے ہوش پڑا تھا۔

"یہ سب ہو کیا رہا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ اور یہ...... یہ چکر کیا ہے؟" وہ بڑبڑاتی ہوئی کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کو تو اسے یوں لگا جیسے سارا کمرا ڈول رہا ہو۔ سامنے میز پر اس کا پرس پڑا تھا۔ اس نے لپک کر پرس کھولا اور موبائل تلاش کرنا چاہا مگر موبائل اس میں نہیں تھا۔

وہ واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ پتا نہیں فیصل کیسا ہوگا؟ اس کا آپریشن کس طرح ہوا ہوگا؟ اگر اس اسپتال سے اسے اور اسپتال کے ڈاکٹر کو اس طرح اغوا کیا جا سکتا ہے تو کیا اس کا بھائی وہاں محفوظ ہوگا؟ اس آخری خیال نے اسے پھر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے؟" وہ سوچے جا رہی تھی۔ "کہیں اس کا تعلق اس قتل ہونے والے سے تو نہیں، کہیں انہیں یہ معلوم تو نہیں ہو گیا کہ اس نے مجھے وہ میموری کارڈ دیا تھا......" وہ اب خوف زدہ ہو رہی تھی۔ خیالات کی ڈور اب اس قتل سے قاتل اور پھر ابراہیم کی طرف مڑ گئی۔ ابراہیم قاتل تک پہنچ چکا تھا تب ہی تو اس نے اس کی تصویر اسے بھیجی تھی مگر اب وہ کہاں تھا؟ کیا وہ کبھی یہ جان پائے گا کہ ایلیا کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

وہ سوچوں کو جھٹکتی ہوئی پیشنٹ بیڈ کی طرف بڑھی اور ڈاکٹر کو جھنجوڑ ڈالا۔

"ڈاکٹر صاحب...... ہوش میں آیئے۔"

"میں کہاں ہوں، یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آنکھ کھولتے ہی پوچھا۔ وہ بھی ایلیا سے کم پریشان اور خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"یہ تو مجھے آپ بتائیں گے۔" ایلیا نے اسے گھورا۔ "آپ کے کمرے میں آپ کی منگوائی ہوئی چائے پی کر میں بے ہوش ہوئی تھی اور اب یہاں ہوں، یہ سب کیا ہے ڈاکٹر

صاحب؟"

"مجھے خود معلوم نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں تو خود آپ کے سامنے یہاں ہوں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "یقیناً ہمارے اسٹاف میں سے کوئی مجرمانہ کاموں میں مصروف ہے اور اسی چکر میں یہ سب ہوا ہے، آپ سوچیں کیا وجہ ہو سکتی ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر پکڑ کر بولا۔ "میں مریض بھی ہوں دل کا، مجھے اگر وقت پر دوا نہ ملی تو میری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔"

"اوہ، ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ میں یہ دروازہ بجاتی ہوں، دیکھتی ہوں کیا ہوتا ہے۔ آپ یہ سوچیے کہ کیا یہ کمرا آپ کے اسپتال کا ہے؟" ایلیا دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔

"نہیں...... مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر یہ پیشنٹ بیڈ...... یہ اسپتال میں ہی ہوتا ہے۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

ایلیا نے دروازے کے ہینڈل کو گھمایا تو وہ اس کی توقع کے برخلاف کھلتا چلا گیا۔

"یہ دروازہ تو کھلا ہے، آیئے ڈاکٹر صاحب، جلدی آیئے۔ ہم باہر نکل کر دیکھتے ہیں کہ یہ چکر کیا ہے اور ہم کہاں ہیں؟" ایلیا باہر نکلتے ہوئے بولی۔ ڈاکٹر اس کے عقب میں تھا۔ وہ ایک طویل اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی لابی تھی جہاں اس کمرے کے علاوہ کوئی اور دروازہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"میں نے یہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔ ایلیا ہاتھ کے اشارے سے خاموشی کا کہہ کر دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ لابی لکڑی کے ایک بڑے دروازے پر آ کر ختم ہوئی تھی۔ ایلیا نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جہاں دو بڑے پیشنٹ بیڈ لگے تھے۔ اردگرد موجود چیزوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس جگہ کو باقاعدہ آپریشن تھیٹر کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔

فضا میں دواؤں کی مخصوص بو کے ساتھ ساتھ کچھ عجیب سی بو بھی شامل تھی۔ ایک طرف بنی دیوار کے ساتھ قدِآدم فریزر نما مشینیں لگی ہوئی تھیں۔ ایلیا کو یک دم شدید گھبراہٹ کا احساس ہوا اور وہ دروازے کی جانب مڑی۔ ڈاکٹر اس کے عقب میں موجود نہیں تھا۔ وہ اس ہال میں تنہا کھڑی تھی۔ ایلیا لپک کر دروازے کے پاس پہنچی، اور ہینڈل گھما کر اسے کھولنا چاہا مگر یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ دروازہ لاک تھا۔ وہ گھبرا کر مڑی اور ساکت رہ گئی۔

☆☆☆

"اب شروع ہو جاؤ۔" ابراہیم سرد لہجے میں بولا۔ وہ اس وقت ہیڈ آفس میں انٹروگیشن روم میں تھے۔ کمرے کے وسط میں ایک چوکور میز رکھی ہوئی تھی جس کے اردگرد چھ سے زائد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شبانہ، ابراہیم کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے نرس شبانہ، اس لیے مجھے فوراً اپنے سوال کا جواب چاہیے۔ تم ایلیا کو کہاں لے کر گئی تھیں؟"

"میں کسی کو بھی کہیں نہیں لے کر گئی تھی۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔ "میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے بالکل معلوم نہیں کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"میں نے یہ کہا کہ مجھے اپنے سوال کا جواب چاہیے مگر جھوٹ نہیں...... ہمیں سچ اگلوانا آتا ہے مگر میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ جو تم جانتی ہو وہ بتا دو ورنہ دوسری صورت میں بتاؤ گی تو تم پھر بھی مگر وہ صورتِ حال تمہیں زیادہ پسند نہیں آئے گی۔" ابراہیم غرایا۔

"مگر صاحب......" اس نے کچھ کہنا چاہا تو عمران بول اٹھا۔

"تم یہ بتانے میں اپنی طاقت ضائع مت کرو کہ تم ایلیا کو وہاں سے نہیں لے کر گئی تھیں کیونکہ اس کا نہ صرف ہمارے پاس ثبوت ہے بلکہ گواہ بھی ہے۔"

"ثبوت...... گواہ......؟" شبانہ چونک گئی۔

"ہاں ثبوت ہے یہ سیل فون، جب تم اسے لے کر جا رہی تھی تب یہ نیچے گر گیا تھا اور اس کا کیمرا ویڈیو بنا رہا تھا۔" ابراہیم نے اسے بلف کیا۔ "اور یہ فلم دیکھ کر ہم نے تمہیں شناخت کرایا ہے۔ تمہارے اسپتال کے کئی لوگوں نے بتایا کہ تم ہی اسے لے کر جا رہی تھیں۔"

"صاحب میں غریب عورت ہوں۔ میری ماں بہت بیمار ہے۔" وہ اس وار پر ڈھے گئی تھی۔

"تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم تمہاری ماں کو بھی یہاں لے کر آئیں۔" ابراہیم غرایا۔

"نہیں صاحب مگر میرا قصور نہیں ہے۔ میں تو ایک ملازمہ ہوں، مجھے جو حکم ملا وہ میں نے کیا اور......" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تو ہم بھی تم سے یہی جاننا چاہتے ہیں کہ تمہیں کیا حکم ملا تھا اور کس نے حکم دیا تھا؟"

"مجھے بڑے ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ میں ان بی بی کو ان کے کمرے میں لے آؤں۔" وہ بالآخر بولی۔

"بڑے ڈاکٹر صاحب؟" عمران نے پوچھا۔

"جی وہ مالک ہیں اسپتال کے۔ ڈاکٹر شریف احمد خان۔" وہ بولی۔

"تو تم ایلیا کو ان کے کمرے میں پہنچا کر چلی گئی تھیں؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"جی صاحب جی...... اس کے بعد میری ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی اور میں تھوڑی دیر بعد اسپتال سے نکل گئی تھی۔

"اوکے...... ہمیں اسپتال کے لیے نکلنا ہوگا اور اس بڑے ڈاکٹر صاحب کو دیکھنا ہوگا۔" ابراہیم کھڑا ہو گیا۔ "ایلیا کی جان خطرے میں ہے عمران، اس نے ضرور کچھ ایسا دیکھ لیا ہے جس کے بعد وہ اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔" وہ دونوں تیزی سے کوریڈور سے باہر نکلے ہی تھے کہ ابراہیم کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔ عمران اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ فون بند کر کے اس نے خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھا۔

"کیا ہوا ہے ابراہیم، کیا کوئی بُری خبر ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"ہاں...... میں نے ایلیا کے گھر پر دو سب انسپکٹر کو معلومات لانے کے لیے بھیجا تھا۔"

"ہاں...... تو......؟"

"انہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی۔ ان سے قبل ہی کوئی ایلیا کے فلیٹ میں گھسا ہوا تھا۔ ان کے وہاں پہنچنے پر وہ اندر ہی چھپ گیا تھا۔ اے ایس آئی مسعود نے کسی کو وہاں سے نکلتے دیکھا تو اسے للکارا...... جواب میں وہ فائرنگ کرتا ہوا وہاں سے فرار ہو گیا۔"

"وہ وہاں کیا چرانے آیا تھا؟" عمران بڑبڑایا۔

"اس کے ہاتھ میں ایلیا کا لیپ ٹاپ تھا جو اس چکر میں تباہ ہو گیا ہے۔"

"شکر ہے کہ وہ گھر پر نہیں تھی۔" عمران بولا۔ "ورنہ زیادہ نقصان ہو سکتا تھا۔"

"نقصان تو ہوا ہے۔" ابراہیم افسردہ لہجے میں بولا۔ "اس کی فائرنگ سے مسعود کو تین گولیاں لگی ہیں اور وہ اس وقت قریبی اسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ عالم بتا رہا ہے کہ اس کی حالت کریٹیکل ہے۔"

☆☆☆

اس کے بالکل سامنے ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا شخص کھڑا تھا۔ اس نے سرجن...... والا لباس پہن رکھا تھا، اس کی آنکھوں میں سفاکی چھلک رہی تھی اور سب سے زیادہ خوف زدہ کر دینے والی چیز اس کے ہاتھ میں موجود ریوالور تھا۔

"تت ...... تم کون ہو؟ کیا چاہیے تمہیں مجھ سے......؟" وہ بمشکل بولی۔

"تم بہت عقل مند ہو، اگر تم وقت ضائع کیے بغیر کام کی بات کرنا چاہتی ہو تو مجھے یہ بات پسند ہے۔" وہ سرد لہجے میں بولا۔ "اور کام کی بات ہمیشہ اچھے اثر پذیر ماحول میں کرنی چاہیے لہٰذا آؤ ہم اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" وہ ریوالور سے اسے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

اس ہال نما کمرے سے منسلک ایک اور کمرا تھا جو غالباً ان کا سٹنگ روم تھا وہاں صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان میں سے ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور ایک شخص ان کے سر پر پستول رکھے کھڑا تھا۔ ایلیا نے خوف زدہ نظروں سے اس منظر کو دیکھا اور سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو اب ہم بھی سیدھے سادے طریقے سے بات کرتے ہیں۔" فرقان بولا۔

"جی......"

"دیکھو بی بی ہماری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے مگر تمہارے پاس ہماری ایک ایسی چیز آ گئی ہے جس سے تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔"

"کیسی چیز......؟" ایلیا نے ہمت کر کے پوچھا۔

"اپنی یادداشت کو حاضر کرو ایلیا بی بی۔" فرقان غرایا۔ "وہی چیز جو تمہیں ہمارے ایک غدار نے مرتے وقت دی تھی...... کچھ یاد آیا؟" وہ مکاری سے ہنسا۔ "یاد آ جائے تو اچھا ہے، ورنہ ہمارے پاس یادداشت واپس لانے کے کئی طریقے ہیں۔ پہلے تو یہ ڈاکٹر اوپر جائے گا پھر تمہارا بھائی......"

"نہیں نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے......؟"

"کیوں...... جب ہمارا کام نہیں ہوگا تو ہم ایسا ہی کریں گے۔" وہ بولا۔ "اور اگر تم ان دونوں کی اور اپنی جان بچانا چاہتی ہو تو وہ چیز ہمارے حوالے کر دو۔"

ایلیا کا دماغ تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ اتنا تو وہ سمجھ ہی سکتی تھی کہ اگر ان کی چیز ان کے ہاتھ لگ گئی تب بھی وہ اسے، فیصل یا ڈاکٹر صاحب میں سے کسی کو بخشنے والے نہیں تھے۔ ابراہیم اس کے لیے امید کی واحد کرن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ یہاں ہے اور اسے امید تھی کہ اگر وقت نے ساتھ دیا تو شاید وہ اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر تب تک وہ خود کو، فیصل کو اور ڈاکٹر صاحب کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کرے......

''کیا سوچ رہی ہو؟'' فرقان نے پوچھا۔ ''یاد آیا کہ نہیں۔'' اس کے الفاظ سے زیادہ سفاکی اس کے لہجے میں تھی۔

''وہ...... وہ میرے گھر پر ہے...... میرے لیپ ٹاپ میں......'' وہ تیزی سے بولی۔

''وہ ہے کیا چیز......؟'' فرقان نے پوچھا۔

''وہ میموری کارڈ ہے۔'' اس بار وہ سچ بول رہی تھی۔ اس نے مجھے ایک میموری کارڈ دیا تھا۔ یقین کرو میں بالکل سچ بول رہی ہوں۔ میں نے اسے اپنے لیپ ٹاپ میں لگایا ہے مگر وہ کھلا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ اس میں کوئی ایسا انتظام ہے کہ اسے کھولنا آسان نہیں ہے۔'' وہ بولے جارہی تھی۔

''تو وہ تمہارے لیپ ٹاپ میں ہے؟'' فرقان نے پوچھا۔

''جی...... آپ اسے لے آئیں، میں اس میں موجود خفیہ ساکٹ سے وہ کارڈ آپ کو نکال دوں گی۔ آج کل سب کچھ اتنا ہیک ہورہا ہے کہ ٹی وی والوں نے ہمیں سخت ڈیجیٹل سیکیورٹی کا نظام بنا کر دیا ہے۔'' وہ کسی طرح وقت لینا چاہ رہی تھی۔ اب یہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس چال کا اسے کوئی فائدہ ہوگا بھی کہ نہیں...... ناکامی کی صورت میں تکلیف وہ موت ہی اس کا مقدر تھی اور فیصل کے بارے میں سوچتے ہوئے تو اس کا دل کٹنے لگا تھا۔ وہ اور بے چارے ڈاکٹر دونوں اس کی وجہ سے موت کے منہ میں جا پہنچے تھے۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ایلیا کو کچھ عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔

''گڈ بے بی......'' وہ اچانک کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ اب ان کے چہرے پر کرختگی اور سفاکی پھیلی ہوئی تھی۔ ''فرقان تم اس کے فلیٹ پر جاکر لیپ ٹاپ لے کر آؤ۔''

''سر، وہ میں نے پہلے ہی حمزہ کو روانہ کردیا ہے۔''

''گڈ۔'' ڈاکٹر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ پھر وہ ہکا بکا کھڑی ایلیا کی جانب مڑا۔ ''بہت حیران ہورہی ہو نا تم...... کیا کریں بے بی کرنا پڑتا ہے۔ ویسے میں اچھا اداکار ہوں نا......؟'' وہ مسکرایا۔ ''فرض کرو اگر یہ پلان ناکام ہوجاتا تو میں تمہارا ہمدرد بن کر تمہارے ساتھ باہر نکل جاتا اور اس صورت میں بھی ہمارا پلان مکمل ہوجاتا۔''

''مگر کیوں...... آپ اتنے بڑے سرجن ہیں، سب کچھ ہے آپ کے پاس...... پھر بھی......'' ایلیا کا خوف موت کو یقینی دیکھ کر کم ہوتا جارہا تھا۔

''صرف سرجن ہونے سے کچھ نہیں ہوتا...... جب بہت آگے جانا ہو تو پھر سب کرنا پڑتا ہے۔ تم رپورٹر ہو نا، خبر تو پوری چاہیے تمہیں...... تاکہ عالم بالا میں جاکر رپورٹ کر سکو...... ہے نا...... تو سنو...... اسپتال بھی چلاتا ہوں میں مگر ساتھ ہی میں لوگوں کے مسائل بھی حل کرتا ہوں۔ اب یہ دیکھو کہ آبادی کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے، اگر ہر ماہ، سو پچاس لوگ کم نہ ہوتے جائیں تو یہاں تو چلنے کی جگہ بھی نہ رہے۔ تو جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کی مدد کرتا ہوں۔ وہ جو تم لوگ اپنی خبروں میں کہتے ہو سہولت کار...... تو سہولت کاری کرتا ہوں۔ ان کے لیے۔ اس تہ خانے میں میرا پرائیویٹ اسپتال اور بہت بڑا گودام ہے جہاں ہتھیار آتے ہیں اور پھر باہر استعمال ہوتے ہیں۔'' وہ شیطانی انداز میں ہنسا۔

ایلیا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔

''پھر یہ تو تم جانتی ہو نا کہ دنیا کچھ لو کچھ دو کے اصول پر کام کرتی ہے تو میں ان کی مدد کرتا ہوں اور وہ میری مدد اور حفاظت کرتے ہیں۔ طارق، وہی جسے تم نے مرتے دیکھا، میرا کارندہ تھا، بندہ ذہین تھا مگر جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ اسے کینسر ہوگیا ہے اسے نیک بننے کا مرض لاحق ہوگیا۔ اگلے مہینے ایکشن کے لیے ہمارے پاس بہت زیادہ اور جدید ہتھیار آئے ہیں۔ اس نے ان کے لین دین کی فلم بنالی اور غائب ہوگیا، اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ مجھے برباد کردے گا۔ پر ہوا کیا...... اپنی جان سے گیا۔ اور وہ جس نے اسے مارا غفور تھا...... وہ بھی میرا کارندہ تھا مگر اس کے پاس دماغ بالکل نہیں تھا۔ اس لیے اس قتل کے بعد اسے بھی مارنا پڑا۔''

''تت...... تم نے اسے بھی مار ڈالا۔'' ایلیا کے لیے یہ خبر شاک سے کم نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابراہیم کو اس کی کوئی خبر نہیں مل سکتی تھی۔

''ہاں، مارنا پڑا مگر اس کی اصل قاتل تم ہو۔''

''میں......'' ایلیا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''ہاں تم...... تم نے اسے دیکھ لیا تھا اور وہ ہمارے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا تھا اس لیے اسے اڑانا پڑا۔ وہ مر کر بہت قیمتی ہوگیا۔'' وہ ہنسا۔ ''جیسے اب تم قیمتی ہوجاؤ گی۔''

''کیا...... کیا مطلب؟'' ایلیا دہشت زدہ ہوگئی تھی۔

''دیکھو دنیا میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کو ہر وقت کسی نہ کسی چیز کی ضرورت رہتی ہے۔ گردے، جگر، آنکھیں، کھال اور میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ میں تمہارے جسم سے یہ اعضا حاصل کروں گا جو بیرون ملک لاکھوں ڈالرز میں بکیں گے، تو تم قیمتی ہوجاؤ گی نا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

''تم ایسا نہیں کر سکتے...... نہیں کر سکتے۔'' ایلیا لرز رہی تھی۔

''تم جانتی ہو کر سکتا ہوں اور کروں گا، تمہارے معاملے میں تو یہ گیٹ ون گیٹ ون فری والا معاملہ ہے۔'' وہ سفاکی سے ہنسا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اور تمہارا بھائی فیصل، وہ تو بے چارہ ویسے ہی بستر پر پڑا ہے۔ تمہارے بعد اس کی باری آئے گی۔''

''نہیں...... نہیں۔'' ایلیا چیخ پڑی تھی۔

ڈاکٹر کے اشارے پر فرقان اور دوسرے شخص نے اسے پکڑ کر پیشنٹ بیڈ پر گرا دیا تھا۔ وہ مچل رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ رو رو کر ان کو بتا رہی تھی کہ وہ کارڈ اس کے لیپ ٹاپ میں نہیں ہے مگر شاید ان کی سماعت تک اس کی آوازیں پہنچ ہی نہیں رہی تھیں۔ اچانک اسے اپنے بازو میں کسی سوئی کے چبھنے کی تکلیف محسوس ہوئی۔ اس کے حواس گم ہونے لگے اور پھر ڈاکٹر، اس کے لوگ، کمرے کا دہشت زدہ کردینے والا ماحول، فیصل کی فکر، ابراہیم کی آمد کی امید سب ہی دھندلکے میں ڈوب گئے۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر دراز تھی۔ اس نے حواس بحال ہوتے ہی اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھا، اسے کہیں درد کا کوئی احساس نہیں ہورہا تھا۔ اس نے حرکت کی کوشش کی تو کسی نے نرمی سے اس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آرام سے لیٹی رہو......'' اس کے سامنے ابراہیم تھا۔

''تم...... تم کہاں تھے...... وہ ڈاکٹر ہی اصل مجرم ہے۔ وہ انسانوں کے گردے نکال کر فروخت کرتا ہے۔'' وہ بے اختیار بول رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں مگر تم گھبراؤ نہیں تمہارے سارے اسپیئر اور ضروری پارٹس اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''اور...... اور فیصل......'' وہ اب اٹھ کے بیٹھی تھی۔

''وہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ اسپتال پر کارروائی کے لیے آتے ہوئے اس کی حفاظت کا ہم نے سب سے پہلے انتظام کردیا تھا۔'' وہ بولا۔

''شکر ہے...... شکر ہے یہ سب ختم ہوا۔ تم فلموں کے ہیرو کے مانند اچانک کیسے پہنچ گئے۔'' ایلیا نے اسے غور سے دیکھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ نرس شبانہ کے پکڑے جانے اور اس کے بیان کے بعد ہم نے اسپتال میں کارروائی کی۔ ظاہر کیے بغیر تمام سینئر لوگوں کو ان کے کمروں میں پکڑا گیا اور بالآخر اسپتال کا نمبر 2 ماہر سرجن اس خون آشام ڈاکٹر کا اسسٹنٹ نکلا۔ جب اس کا گردہ نکالا جانے لگا تو وہ پھٹ پڑا اور یوں ہم بروقت اس کے اس مکروہ دھندے سے متعلق جگہ پہنچ سکے۔'' ابراہیم بولا۔

''اس جگہ ہتھیاروں کی بڑی کھیپ بھی تھی جو وہ رمضان کے دنوں میں استعمال کرنے والے تھے۔'' ایلیا لرز کر بولی۔

''ہاں سب برآمد ہوگیا۔ اس کے دو آدمی مارے گئے مگر وہ زندہ گرفتار ہوگیا ہے۔'' ابراہیم بولا۔ ''کمال کی بات تو یہ ہے کہ وہ الٹا ہمیں دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ سچ پوچھو تو وہ اتنا نامور اور دولت مند ہے کہ عام حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا بہت مشکل ہوتا مگر اب وہ نہ صرف رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہے بلکہ اتنا کچھ برآمد ہوچکا ہے کہ وہ بچ نہیں سکتا۔''

''یعنی اب اس میموری کارڈ کی ضرورت نہیں رہی۔'' ایلیا بولی۔

''کون سا میموری کارڈ......'' ابراہیم نے اسے گھورا۔

''میں نے تمہیں فون پر بتایا تھا نا جو اس شخص نے مرتے وقت مجھے دیا تھا۔''

''فون بند ہوگیا تھا مگر تمہیں سب سے پہلے کام کی بات کرنی چاہیے تھی نا...... وہ کارڈ کہاں ہے؟''

''وہ میرے اس پرس میں ہے۔'' ایلیا نے میز پر رکھے چھوٹے پرس کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہارا مطلب یہ سارا وقت تمہارے پاس رہا۔'' ابراہیم نے پرس اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' وہ مسکرائی اور پرس میں سے فیس پاؤڈر باہر نکالا۔ اس میں پاؤڈر کے دو حصوں کے علاوہ ایک آخری اور تیسری تہ بھی تھی جس میں وہ چھوٹا سا پیکٹ چپکا ہوا تھا۔ اس نے وہ نکال کر ابراہیم کی جانب بڑھا دیا۔ ''مگر مجھے اس کا پاس ورڈ معلوم نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''پولیس کے ہیکرز اسے نکال لیں گے۔'' وہ مسکرایا۔

''تم نے کمال کردیا، مطلب تم اتنی خالی دماغ نہیں ہو جتنی میں سمجھ رہا تھا۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔ ''اور میں سوچ رہا ہوں کہ چونکہ تمہیں ایک عقل مند آدمی بلکہ ہیرو کے ساتھ کی ضرورت ہے تو کیوں نہ میں اس کام میں تمہارا سہولت کار بن جاؤں۔''

''تم اپلائی کرو پھر دیکھتے ہیں۔'' ایلیا بھی شرارت سے مسکرا دی۔

☆☆☆

دہشت نگر

اسما قادری

کٹھن اور مشکل وقت مزید دشوار تر ہو جاتا ہے... جب یہ گھڑیاں تنہا رہ کے بتانی پڑیں۔ ایک ایسی ہی عورت کی کتھا... ایک واقعے نے اس کی زندگی کے تمام رنگین لمحوں کو سوگ کی چادر پہنادی... بے بسی... لاچاری اور تنہائی کے باوجود مثبت اندازِ فکر... خیر کے جذبے کا احساس اس کے اندر موجود رہا... اس جذبے نے اسے ان حقائق تک پہنچا دیا... جو ہر ایک کی آنکھوں سے اوجھل تھے... لمحہ بہ لمحہ شکستگی اور فتح کے قریب آتی جاتی کہانی کے سنسنی خیز موڑ...

گھنے قدآور درختوں کی چھاؤں میں آ جانے والے بے حجابوں کی داستان

''سامان تو سارا سیٹ ہو گیا ہے آپی! اب آپ ایسا کریں کہ مجھے مہینے کے سودے کی لسٹ دے دیں۔ کل صبح مجھے واپس جانا ہے تو بہتر ہے میں یہ کام بھی نمٹا کر چلا جاؤں۔'' سینٹرل ٹیبل کا شیشہ احتیاط سے فکس کرنے کے بعد زوہیب نے کہا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ان دو دنوں میں اس نے کام بھی تو بہت کیا تھا۔ وہ پرسوں یعنی جمعے کی رات اسلام آباد سے کراچی پہنچا تھا اور آج اتوار کی شام تک اس کا زیادہ تر وقت مصروف گزرا تھا۔ سائرہ کی بڑے لگژری اپارٹمنٹ سے اس دو کمروں کے چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹنگ کا سارا عمل اسی کی محنت سے مکمل ہوا تھا۔ بڑے اپارٹمنٹ کی مناسبت سے سائرہ کے پاس فرنیچر اور دیگر سامان اچھی خاصی مقدار میں تھا۔ اس چھوٹے فلیٹ میں منتقلی کے لیے اسے اپنے سامان کا کافی بڑا حصہ فروخت کرنا پڑا تھا۔ سائرہ ایک تنہا عورت تھی اور اسے معاشرے کے عمومی رویے کا اندازہ تھا کہ یہاں نہ صرف عورت کو بے وقوف سمجھا جاتا ہے بلکہ بہت کامیابی سے اسے بے وقوف بنا بھی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ فون پر اس کی شفٹنگ کا سن کر جب زوہیب نے مدد کے لیے کراچی آنے کی پیشکش کی تو وہ اسے رد نہیں کر سکی حالانکہ پچھلے چھ ماہ سے وہ خود انحصاری کی پالیسی پر عمل پیرا تھی اور پوری کوشش کر رہی تھی کہ میکے یا سسرال میں سے کسی کو اپنے کاموں کے لیے زحمت نہ دے۔ زوہیب کے آنے سے اسے خاصی

آسانی ہو گئی تھی۔ زائد سامان کی فروخت کے علاوہ منتقل ہونے والے سامان کی پیکنگ اور پھر نئے فلیٹ میں اس سامان کی سیٹنگ میں اس نے بہت زیادہ مدد کی تھی اور اب پھر اسے ایک اچھی پیشکش کر رہا تھا۔

''تم رہنے دو زوہیب! خاصے تھک گئے ہو۔ سودا ایک آدھ دن میں، میں خود لے کر آجاؤں گی۔'' زوہیب کی تھکن کے پیشِ نظر اس نے کہا۔

''تھکن کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ رات کو بھرپور نیند لوں گا تو ساری تھکن اُتر جائے گی۔ لائیں جلدی سے لسٹ دے دیں، میرے جانے کے بعد آپ کہاں خوار ہوتی رہیں گی۔''

''تم ایک بار ہی یہ کام کردو گے، آئندہ بھی مجھے یہ کام خود ہی کرنا ہے۔'' زوہیب کے اصرار پر اس کے ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ آگئی تو وہ کچھ بے چین سا ہو کر اس کے قریب آبیٹھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ اسلام آباد شفٹ ہو جائیں، وہاں سب کے درمیان رہیں گی تو یہ سارے مسائل نہیں ہوں گے اور امی کو بھی آپ کی طرف سے بے فکری ہو جائے گی۔''

''وہاں شفٹ ہونے کی صورت میں یہ مسائل تو نہیں ہوں گے لیکن دوسری طرح کے مسائل کھڑے ہو جائیں گے اور وہ مسائل براہِ راست میرے بچوں پر اثر انداز ہوں گے اس لیے بہتر ہے کہ یہاں رہ کر میں خود تکلیف اٹھا لوں اور اپنے بچوں کو ڈسٹرب نہ ہونے دوں۔ وہ پہلے ہی دانش کے جانے سے بہت ڈسٹرب ہیں اور بڑی مشکل سے اب جا کر تھوڑا تھوڑا ایڈجسٹ ہونا شروع ہوئے ہیں۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح صاف انکار کیا۔

''ہو سکتا ہے آپ ٹھیک سوچ رہی ہوں لیکن......'' زوہیب نے اسے کوئی دلیل دینی چاہی لیکن اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں زوہیب۔ تم خود بھی حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں سال میں ایک بار دس دن کے لیے آتی ہوں تو بھی دونوں بھابیوں کے تیور بگڑنے لگتے ہیں۔ کبھی کوئی معمولی سا کھلونا ٹوٹ جانے پر یا کسی بچے کو دھکا بھی لگ جانے پر دونوں منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ میرے مستقل وہاں رہنے کی صورت میں تو آفت ہی آجائے گی اور خوامخواہ امی بے چاری بھی ٹینشن میں رہیں گی۔ روحی کی شادی کے بعد اب کہیں جا کر تو گھر کے حالات تھوڑے بہتر ہوئے ہیں۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں۔ وہ دونوں پتا نہیں کیوں اتنی کم ظرف ہیں کہ اپنے علاوہ کسی کو گھر میں دیکھنا ہی نہیں چاہتیں۔ روحی کی جب تک شادی نہیں ہوئی تھی آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا رہتا تھا اور بے چاری روحی روتی رہتی تھی۔ میرے خیال میں تو غلطی دونوں بھائیوں کی بھی ہے کہ انہوں نے اپنی بیویوں کو ضرورت سے زیادہ سر چڑھا رکھا ہے اور انہیں کچھ کہتے ہی نہیں ہیں۔'' زوہیب کو تھوڑا سا

غصہ آنے لگا۔

‘‘ہمارے معاشرے میں زیادہ تر خواتین بھابیوں کے مزاج ہی کی ہوتی ہیں۔ اصل میں گھر عورت کی راجدھانی ہوتا ہے جہاں وہ دوسرے کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتی۔ امی تو خاصی بے ضرر خاتون ہیں اس لیے ان سے بہوؤں کو اتنا مسئلہ نہیں ہے جبکہ روحی کے بارے میں تم جانتے ہو کہ وہ بھی تھوڑے.... تیز مزاج کی ہے اس لیے اس کی ان دونوں سے کسی نہ کسی بات پر کھٹ پٹ ہو جایا کرتی تھی۔ میرے ساتھ بچوں کا مسئلہ ہے۔ بچوں پر کتنی ہی نظر رکھی جائے یا انہیں روکا ٹوکا جائے وہ کچھ نہ کچھ کر ہی دیتے ہیں اس لیے میرا آنا انہیں کھٹکتا ہے اور یہ جو تم آج بڑھ بڑھ کر بھائیوں کے خلاف بول رہے ہو تو یہ اس لیے ہے کہ ابھی تمہاری شادی نہیں ہوئی۔ تمہاری شادی ہوگی تو تم بھی ان ہی کی طرح ہو جاؤ گے اور معاملات کو اپنی بیوی کی آنکھ سے دیکھنے لگو گے۔ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے یہ سیٹ اَپ چل رہا ہے اور ابھی شاید مزید بہت عرصے تک چلتا ہے گا اس لیے اس پر بات کرنا بے کار ہے۔’’ اس نے چھوٹے بھائی کی جذباتیت کو خاطر میں لائے بغیر اس کے سامنے حقائق بیان کیے تو وہ خاموش ہو گیا اور ذرا سے وقفے کے بعد بولا۔

‘‘باقی باتیں چھوڑیں اور مجھے لسٹ دیں۔’’ اس بار اس نے بھی انکار نہیں کیا اور پرس میں سے لسٹ نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ نیا مہینا شروع ہو چکا تھا اور کچن کا سامان تقریباً ختم ہو گیا تھا لیکن لسٹ تیار کر لینے کے باوجود وہ اس لیے خرید کر نہیں لائی تھی کہ شفٹنگ میں خوامخواہ سامان خراب ہوگا۔

‘‘آپ کھانا تیار مت کیجیے گا، میں باہر ہی سے کچھ کھانے کے لیے لے کر آجاؤں گا۔’’ باہر نکلتے نکلتے زوہیب نے اسے ہدایت کی تو اس نے سر ہلا دیا اور خود کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کھانا پکانے سے چھٹی مل گئی تھی لیکن کچن کی سیٹنگ ابھی باقی رہتی تھی۔ وہ جلدی جلدی کارٹن کھول کر کراکری اور دیگر سامان ترتیب سے رکھنے لگی۔ یہ کچن ان کے سابقہ کچن کے مقابلے میں خاصا چھوٹا تھا لیکن دیواروں میں نصب ڈھیر سارے کیبنٹس کی وجہ سے آسانی ہو گئی تھی اور سامان رکھنے کی خاصی گنجائش نکل آئی تھی۔ وہ خاصی دیر تک یہ کام نمٹاتی ہی پھر فارغ ہو کر اپنے اور بچوں کے مشترکہ بیڈروم میں پہنچ گئی۔ زویا اور طلحہ دیواروں پر اپنے من پسند اسٹیکر چسپاں کرنے میں مصروف تھے۔ وہ اپنے بیڈروم میں اس طرح کی چیزیں پسند نہیں کرتی تھی اور اسے سادہ دیواریں پسند تھیں لیکن اب چونکہ یہ اس کا اور بچوں کا مشترکہ بیڈروم تھا تو اس نے انہیں ان کا شوق پورا کرنے سے نہیں روکا تھا۔ وہ بے چارے پہلے ہی بہت کمپرومائز کر رہے تھے۔ خوب صورت اور کشادہ اپارٹمنٹ سے اس دو کمروں کے فلیٹ میں منتقل ہونا بھی یقیناً ان کے لیے ایک دھچکا تھا لیکن انہوں نے ماں کی مجبوری کو سمجھ لیا تھا۔ حالات بچوں کو وقت سے پہلے سمجھ دار بنا دیتے ہیں ورنہ ابھی اس کے بچوں کی عمر ہی کیا تھی۔ طلحہ صرف سات سال کا تھا اور زویا دو مہینے بعد پانچ سال کی ہوتی۔ اتنے چھوٹے بچے عظیم ترین نقصان سے دوچار ہونے کے بعد اب زندگی میں دوسرے سمجھوتے کرنا بھی سیکھ رہے تھے۔ وہ نم آنکھوں سے بیڈروم کے دروازے پر کھڑی بچوں کی مصروفیت کو دیکھ رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی نے متوجہ کر لیا۔

‘‘ماموں آئے ہوں گے۔’’ گھنٹی کی آواز بچوں نے بھی سن لی تھی اور طلحہ بولتے ہوئے دروازے کی طرف جانے لگا تھا کہ اس نے اشارے سے اسے روک دیا۔ نئی جگہ پر احتیاط بہتر تھی اور بچے کا یوں بے دھڑک دروازہ کھول دینا مناسب نہیں تھا۔ اس نے خود بھی دروازہ کھولنے سے قبل ڈور آئی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ باہر اسے ایک ادھیڑ عمر خاتون کھڑی نظر آئیں۔ ان خاتون کو شناخت کرنے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی، وہ سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھیں۔ پراپرٹی ایجنٹ کے ساتھ یہ فلیٹ دیکھنے آنے اور آج یہاں شفٹ ہونے پر اس کی ان خاتون سے سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مطمئن ہوتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولنے پر اس کی نگاہ خاتون کے دائیں جانب موجود ٹرالی پر پڑی۔ چھوٹے سائز کی اس ٹرالی پر ڈھکن لگی ہوئی کچھ ڈشز رکھی ہوئی تھیں اس کے باوجود اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اپنا راستہ بنا لیا تھا۔

‘‘میں اندر آجاؤں، اجازت ہے؟’’ خاتون نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

‘‘کیوں نہیں، بالکل آجائیں۔’’ اسے شرمندگی ہوئی کہ ٹرالی کا جائزہ لینے کے چکر میں فوری طور پر انہیں اندر آنے کو نہیں کہا تھا۔ وہ ذرا سا پیچھے ہٹی تو خاتون ٹرالی دھکیلتے ہوئے اندر آگئیں اور نرم.... لہجے میں بولیں۔

‘‘میں نے سوچا کہ گھر کی سیٹنگ میں تمہیں کھانا بنانے کا وقت نہیں ملے گا اس لیے خود کھانا تیار کر کے لے آئی ہوں۔’’

‘‘آپ نے کیوں زحمت کی آنٹی! میرا چھوٹا بھائی مارکیٹ گیا ہوا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ واپسی میں وہ کھانا لے کر آجائے گا۔’’ وہ خاتون کے اخلاق سے متاثر ہونے کے باوجود تکلف کا مظاہرہ کرنے لگی۔

‘‘زحمت کیسی بیٹا! پڑوسیوں کا ایک دوسرے پر حق ہوتا ہے۔ کبھی مجھے ضرورت پڑی تو تم میری مدد کر دینا۔’’ انہوں نے ایک بار پھر مسکرا کر اسے جواب دیا اور کمرے کے دروازے سے جھانکتے بچوں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ انہیں متوجہ پا کر بچوں نے سلام کیا تو وہ بچوں کو قریب بلا کر ان سے باتیں کرنے لگیں۔ ان کے نام اور اسکول سے متعلق چھوٹے چھوٹے چند بے ضرر سوالات کرنے کے بعد انہوں نے بچوں کو اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو اپنے کمرے میں جا سکتے ہیں۔ بچے محض تجسس میں یہاں تک چلے آئے تھے ورنہ ان کی مصروفیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور کمرے کو سجانے کا کام جاری تھا اس لیے اجازت پاتے ہی واپس چلے گئے۔

‘‘بہت پیارے بچے ہیں۔’’ خاتون نے بچوں کی تعریف کی اور گفتگو کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ‘‘میرے بھی دو بچے ہیں۔ بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اور میں یہاں اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی ہوں۔ میرا بیٹا سرکاری ملازم ہے۔’’

‘‘میں خواتین کے ایک رسالے کی ایڈیٹر ہوں۔ میرے شوہر ایک رائٹر تھے۔ چھ ماہ قبل وہ ہم سے بچھڑ گئے اور اب میں ہی اپنے بچوں کے لیے ماں اور باپ دونوں ہوں۔’’ اس نے سادگی سے انہیں اپنے بارے میں آگاہ کیا۔

‘‘سن کر بہت افسوس ہوا۔ کیسے انتقال ہوا تھا تمہارے شوہر کا۔’’ خاتون نے اس کے سراپا... پر ایک دکھی نظر ڈالی۔ جوانی میں بیوہ ہو جانے پر اسے اکثر ہی ایسی ترحم بھری نظروں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور اب وہ ان نظروں کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔

‘‘راہزنی کی واردات تھی۔ شاید انہوں نے مزاحمت کی تھی۔ ہمیں تو دو دن بعد بس ان کی لاش ہی ملی۔’’ اس کے لیے یہ سب دہرانا تکلیف دہ ہوتا تھا لیکن بے شمار بار اسے اس تکلیف سے گزرنا پڑتا تھا۔

‘‘اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ حالات ہی ایسے ہیں کہ بندہ گھر سے باہر نکلے تو اس کی صحیح سلامت واپسی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ دہشت گرد اور لٹیرے کسی آسیب کی طرح ہمارے ملک پر قابض ہو گئے ہیں۔’’ خاتون نے سن کر افسوس کا اظہار کیا اور اس موضوع پر مزید گفتگو کرنے کے بجائے اندازہ قائم کرتے ہوئے بولیں۔ ‘‘اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں اپنے بھائی کے ساتھ رہو گی۔’’

‘‘جی نہیں۔ میرا بھائی اسلام آباد میں رہتا ہے اور یہاں صرف دو دن کے لیے آیا تھا تاکہ شفٹنگ میں میری مدد کر سکے۔ کل صبح کی فلائٹ سے وہ واپس اسلام آباد روانہ ہو جائے گا۔’’ سائرہ نے انہیں بتایا اور خاتون کے مزید تفتیشی سوالات کے لیے تیار ہو گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ اس کے تنہا رہنے کا سن کر وہ اس کے میکے اور سسرال کے لوگوں کے متعلق مزید سوالات کریں گی کہ وہ لوگ کہاں ہیں اور وہ ان میں سے کسی کے ساتھ کیوں نہیں رہتی لیکن اس کے اندازے کے برعکس خاتون نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور ملائمت سے بولیں۔

‘‘بھائی کے جانے کے بعد خود کو تنہا مت سمجھنا۔ تمہارے دروازے کے بالکل سامنے میرا دروازہ ہے۔ آدھی رات کو بھی کوئی ضرورت محسوس ہو تو بلاتکلف آواز دے لینا۔ پڑوسیوں کے پڑوسیوں پر بڑے حق ہوتے ہیں۔ میں تمہارے کسی کام آسکوں تو یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہوگی۔’’

‘‘جی بہت شکریہ۔’’ اسے خاتون کے الفاظ نے متاثر کیا ورنہ ایسے حالات میں جبکہ قریبی رشتے بھی ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں، کون کسی غیر کے کام آنے کو تیار ہوتا ہے۔

‘‘شکریہ کی کوئی بات نہیں۔ ضرورت پڑنے پر میں بھی تمہیں ہی پکاروں گی فی الحال تم مجھے اجازت دو۔ مجھے اندازہ ہے کہ ابھی تمہیں بہت سا کام سمیٹنا ہوگا اور میں جم کر یہاں بیٹھی رہی تو تمہارا وقت ضائع ہوگا۔’’

‘‘ارے نہیں آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پلیز آپ بیٹھیں ناں، میں نے تو ابھی آپ سے چائے، شربت کا بھی نہیں پوچھا۔’’ خاتون اپنی جگہ سے اٹھیں تو سائرہ نے بوکھلا کر انہیں روکنے کی کوشش کی۔

‘‘فی الحال کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بعد میں کسی دن فرصت سے آؤں گی تو چائے، شربت وغیرہ پی لوں گی۔ ابھی تم بھی مصروف اور تھکی ہوئی ہو اور مجھے بھی گھر جانے کی جلدی ہے۔ میرے بیٹے نے کہا تھا کہ آج وہ میرے ساتھ رات کا کھانا کھائے گا۔ ایسے مواقع بہت مشکل سے آتے ہیں کہ ہم ماں بیٹا ایک ساتھ کھانا کھا

سکیں۔ اس لیے میں کبھی ایسے چانس کو مس نہیں کرتی۔'' انہوں نے نہایت خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف چل دیں۔

''دوبارہ ضرور آیئے گا آنٹی۔'' ان کے پیچھے دروازے تک جاتی سائرہ نے ان سے اصرار کیا۔

''بالکل آؤں گی۔ ہم پڑوسی ہیں اور پڑوسیوں کا تو ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا ہی رہتا ہے اور ہاں...... مجھے آنٹی پکارا جانا زیادہ اچھا نہیں لگتا۔ غیریت کا سا احساس ہوتا ہے اس لفظ سے۔ اس لیے تم مجھے خالہ جان کہہ کر پکارو تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔''

''جی مجھے بھی خوشی ہوگی۔'' اسے بھلا ان کی خواہش ماننے پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے چند قدم کے فاصلے پر موجود اپنے فلیٹ کے اندر چلی گئیں تو وہ بھی دروازہ بند کرکے اندر آگئی اور زوہیب کو فون کرنے لگی تاکہ اسے کھانا لانے سے منع کرسکے۔ پڑوسن خالہ جان نے اتنا پُرتکلف کھانا پہنچا دیا تھا کہ اب بازار سے کھانا لانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سائرہ کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس سے چھوٹے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ ایف ایس سی میں پوزیشن نہ بننے کے بعد اس نے دلبرداشتہ ہوکر سائنس کے مضامین چھوڑ دیے تھے اور اردو ادب میں ایم اے کرلیا تھا۔ وہ ادبی رجحان کی مالک تھی..... وہ یونیورسٹی کی ادبی سوسائٹی کے لیے بہت متحرک کردار ادا کرتی رہی اور ایم اے کے آخری سال میں یونیورسٹی میگزین کی ادارت کا فریضہ بھی انجام دیا۔ یہ تجربہ آگے چل کر اس کے بہت کام آیا اور اس نے اسلام آباد میں ہی ایک چھوٹے اور غیر نامور رسالے کی مدیرہ کے طور پر ملازمت کرلی۔ اس ملازمت میں تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ اسے بھی زیادہ تنخواہ کا لالچ نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ کچھ بہت ہی شاندار کر دکھانے کے جذبے سے سرشار تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ اس چھوٹے سے پرچے کو کہیں سے کہیں لے جاسکتی ہے۔

اس دوران کراچی کے ایک رسالے کے لیے اپنے افسانے وغیرہ ارسال کرتی رہی جہاں وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے لکھ رہی تھی۔ اپنی تحاریر کے سلسلے میں اس کی اکثر پرچے کی مدیرہ سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ کوئی تحریر بہت شاندار ہونے کی صورت میں ادارے کی سرپرست خاتون بھی بطور خاص فون کرکے اسے تعریف اور حوصلہ افزائی نوازتی تھیں چنانچہ ایک گہرا تعلق قائم ہوگیا تھا اور اس تعلق ہی کی وجہ تھی کہ جب پرچے کی مدیرہ اپنی علالت کے باعث ملازمت سے سبکدوشی پر مجبور ہوئیں تو اسے ان کی جگہ کام کرنے کی پیشکش کی گئی۔ سائرہ کے لیے یہ ایک بہت اچھی پیشکش تھی۔ مسئلہ صرف اسلام آباد سے کراچی جانے کا تھا۔ اسے سب سے زیادہ امی کی طرف سے مخالفت کا خدشہ تھا لیکن پھر اس کے ذہن میں کراچی میں مقیم اپنی اکلوتی خالہ کا خیال آگیا۔ خالہ بے اولاد تھیں اور ان کے گھر میں اس کے لیے آرام سے جگہ بن سکتی تھی۔ اس نے خالہ سے بات کی اور خالہ نے خود امی کو قائل کرلیا کہ وہ سائرہ کو ان کے پاس کراچی بجھوادیں۔ ابو تو پہلے ہی قائل تھے کہ اسے ایک اچھے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یوں وہ کراچی پہنچ گئی اور رسالے کو جوائن کرکے بڑی خوبی سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ادارت کے ساتھ اس نے لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا ہوا تھا۔ دانش کا قلم بھی اس رسالے کے لیے لکھتا تھا جس میں اس کی تحاریر وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی تھیں۔ اپنے کام کے حوالے سے دانش کا ادارے کے دفتر میں آنا جانا لگا رہتا تھا اور سائرہ سے بھی ملاقات ہوجاتی تھی۔ وہ دونوں عام طور پر ایک دوسرے کی تحریر پر ہی گفتگو کیا کرتے تھے لیکن آہستہ آہستہ گفتگو میں دوسرے موضوعات بھی شامل ہونے لگے اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا کہ کب ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔ پھر دانش نے اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اسے پروپوز کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی۔ سائرہ نے اپنے دل کو ٹٹولا تو اسے بھی بطور جیون ساتھی دانش اپنے لیے ایک اچھا انتخاب محسوس ہوا۔ اس نے اس رشتے کا اپنے گھر والوں سے ذکر کیا۔ اس کے گھر میں کسی کو اس کی پسند کی شادی کرنے پر اعتراض نہیں تھا لیکن امی کو دانش کی ذریعۂ آمدنی کی طرف سے کچھ تحفظات ضرور تھے۔ وہ ہر ماں کی طرح سے یہی سوچتی تھیں کہ داماد کوئی محفوظ ملازمت کرتا ہوتا کہ ان کی بیٹی ایک آرام دہ زندگی گزار سکے۔ انہیں دانش کی ''ہوائی روزی'' پر اعتراض تھا۔ سائرہ نے انہیں سمجھایا کہ دانش ایک پروفیشنل رائٹر ہے جو نہ صرف بہت مستقل مزاجی سے لکھتا ہے بلکہ اس کی بہت زیادہ ڈیمانڈ بھی ہے اسی لیے اسے اپنی تحریروں کے عوض بہت معقول معاوضہ ملتا ہے۔ اس موقع پر ابو نے بھی اس کا ساتھ دیا اور امی کو سمجھایا کہ اب رائٹرز کا.... وہ پرانے وقتوں والا حال

نہیں ہے کہ خالی خولی شہرت پر گزارا ہوتا رہے اور پیٹ خالی ہو۔ یوں معمولی سی مخالفت کے بعد اس کی اور دانش کی شادی ہوگئی اور انہوں نے ایک خوش گوار زندگی کا آغاز کردیا۔ شادی کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ دانش کے گھر والے اس سے بہت مختلف اور قدرے دقیانوسی سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔ دانش خود بھی اس فرق سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس نے شادی کی ابتدا ہی سے سائرہ کو الگ اپارٹمنٹ میں رکھا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ وہ دونوں اکثر و بیشتر سب سے ملنے کے لیے جاتے رہتے تھے اور وہاں سے بھی آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

پہلے ہی سال طلحہ کی پیدائش ہوئی تو اسے دفتر سے دو تین ماہ کی چھٹی لینی پڑی۔ طلحہ کے بعد زویا پیدا ہوئی تو وہ کچھ اور مصروف ہوگئی۔ دونوں بچوں کی پیدائش پر سائرہ کی امی اسلام آباد سے کراچی آئی تھیں جن کی وجہ سے کافی سہارا ہوگیا تھا۔ وہ باقاعدگی سے دفتر جارہی تھی۔ بچوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دانش زیادہ تر گھر پر ہی رہ کر کام کرتا تھا۔ وہ بچوں کو اسکول سے گھر لے آتا تھا۔ کھانا سائرہ تیار کرکے دفتر جاتی تھی جسے صرف مائیکروویو میں گرم کرنے کی زحمت کرنی پڑتی تھی۔ صفائی اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے انہوں نے ماسی رکھ لی تھی اور زندگی سہل طریقے سے رواں دواں تھی۔

سائرہ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس کی یہ پُرسکون زندگی بالکل اچانک ہی تلپٹ ہوجائے گی۔ اس روز دانش اور وہ بچوں کو اسکول چھوڑ کر ایک ساتھ رسالے کے دفتر گئے تھے۔ وہاں دانش کو کچھ امور پر تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ تین بجے کے قریب وہ دفتر سے روانہ ہوگیا تاکہ چار بجے بچوں کو اسکول سے پک کرسکے۔ ان کے بچے ایک ایسے اسکول میں پڑھتے تھے جہاں بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ ساتھ قرآن پاک بھی حفظ کروایا جاتا تھا اسی لیے ان کے اسکول کے اوقات دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں زیادہ تھے۔

وہ دفتر میں کام میں مصروف تھی کہ چار بج کر چالیس منٹ پر اسے بچوں کے اسکول سے ٹیلی فون کال موصول ہوئی۔ کال کرنے والے انتظامیہ کے فرد نے اسے بتایا کہ حسبِ معمول بچوں کے والد انہیں اسکول سے پک کرنے نہیں آئے ہیں اور نہ ہی ان سے فون پر رابطہ ہورہا ہے اسی لیے اسے زحمت دی جارہی ہے کہ وہ آکر بچوں کو اسکول سے لے لے۔ سائرہ کے لیے یہ ایک انتہائی حیرت انگیز اور تشویشناک اطلاع تھی۔ دانش بچوں کے سلسلے میں ایسی غیر ذمے داری کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ٹریفک جام میں پھنسنے کی صورت میں بھی اسے کم از کم اسکول انتظامیہ سے رابطہ کرکے انہیں آگاہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے فوری طور پر دانش کا نمبر ملا کر چیک کیا تو اسے بھی نمبر بند ہی ملا۔ اب بس اسی قیاس آرائی کے تحت اپنی تشویش کو کم کیا جاسکتا تھا کہ دانش کہیں ٹریفک جام میں پھنس گیا ہے اور اس کا سیل فون بیٹری ڈاؤن ہوجانے کے باعث پاورڈ آف ہے۔ اس وقت زیادہ اہم مسئلہ بچوں کو اسکول سے پک کرنا تھا۔ وہ دفتر میں صورتِ حال بتا کر فوری طور پر ٹیکسی میں روانہ ہوئی اور بچوں کو اسکول سے پک کرکے گھر پہنچی۔ اتنی دیر ہوجانے کے باعث بچے تھکن اور بیزاری کا شکار تھے اور اس سے پوچھ رہے تھے کہ بابا انہیں اسکول سے لینے کیوں نہیں آئے۔ سائرہ کو خود معلوم نہیں تھا تو ان کو کیا بتاتی۔ کسی نہ کسی طرح انہیں بہلا کر اور تھوڑا بہت کھلا پلا کر آرام کرنے کے لیے لٹا دیا اور خود فون پر مصروف ہوگئی۔ دانش کا ہر وہ عزیز، رشتے دار یا دوست جس کا نمبر اس کے پاس موجود تھا اس سے رابطہ کرکے اس نے دانش کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی اور گاہے گاہے دانش کا نمبر ملا کر بھی چیک کرتی رہی لیکن ہر طرف تاریکی تھی اور یہ تاریکی اس کی پوری زندگی پر محیط ہوگئی۔ دانش کی تلاش میں وہی سب کچھ کیا گیا جو ایک گم شدہ شخص کو تلاش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ آخرکار یہ تلاش دانش کی تشدد شدہ لاش کورنگی انڈسٹریل ایریا سے دریافت ہونے پر منتج ہوئی۔ اس کے جسم پر متعدد زخم تھے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ میں پیٹ پر چاقو سے لگائے گئے زخم کو مہلک اور جان لیوا قرار دیا گیا۔ لاش دریافت ہونے کے بعد دو اہم نکات اٹھائے گئے تھے۔ نمبر ایک دانش کورنگی انڈسٹریل ایریا کیا کرنے گیا تھا؟ نمبر دو یہ کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق دانش کی موت رات نو بجے سے بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی جبکہ وہ دوپہر تین بجے دفتر سے روانہ ہونے کے بعد سے لاپتا تھا۔ دانش کی انڈسٹریل ایریا میں موجودگی کا تو یہ جواز ڈھونڈ لیا گیا کہ ان کے گھر کی طرف جانے کے لیے ایک راستہ وہاں سے بھی ہوکر گزرتا ہے جسے شارٹ کٹ بھی کہا جاسکتا ہے لیکن ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور ویرانی کے باعث وہ لوگ عموماً اس راستے کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ وقت بچانے کے لیے دانش نے وہ راستہ اختیار کیا ہوگا۔ موت کے وقت کے بارے میں بھی یہ اندازہ لگا لیا گیا کہ لٹیرے دانش کو زخمی

حالت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں گے اور فوری طور پر اس کی موت واقع نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کی لاش جس جگہ ملی تھی وہ ایک ایسی فیکٹری کا ڈھانچا تھا جس کا مالک دورانِ تعمیر مر گیا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا بیرونِ ملک زیرِ تعلیم تھا۔ بیٹا اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا لہٰذا مرنے والے کی بیوہ نے کاروبار سنبھال لیا تھا۔ وہ اپنے بااعتماد اسٹاف کی مدد سے کام تو کر رہی تھی لیکن کسی نئے بکھیڑے کو سنبھالنے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے اس نے نئی فیکٹری کی تعمیر کا سلسلہ رکوا دیا تھا اور اس کام کو بیٹے کی واپسی تک مؤخر کر دیا تھا۔

دانش کے کیس پر کام کرنے والا پولیس افسر اسے راہزنی کی واردات قرار دینے پر مصر تھا اور اس کے لیے دلیل یہ تھی کہ دانش کی موٹر سائیکل، والٹ اور موبائل تینوں چیزیں غائب ہیں۔ دانش نے یقیناً ان تینوں چیزوں کو دینے میں مزاحمت کی ہوگی اس لیے لیٹروں نے طیش میں آکر اسے تشدد کا نشانہ بنایا۔ سائرہ پولیس افسر کے اس نظریے سے پوری طرح مطمئن نہیں تھی لیکن خود اس کے پاس بھی کوئی جواز نہیں تھا کہ وہ کہہ سکتی کہ دانش کو باقاعدہ اغوا کر کے، تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ہلاک کیا گیا ہے۔ وہ تو تفتیشی افسر کے اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکی تھی کہ دانش کی کسی سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی؟ اس کے خیال کے مطابق ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ دانش دوستانہ مزاج رکھنے والا آدمی تھا اور کسی سے بھی اس کے چھوٹے موٹے اختلافات سے زیادہ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ مرنے سے پندرہ بیس دن پہلے اس کی اپنے بڑے بھائی سے کچھ تلخی ضرور ہوئی تھی۔ وہ اس سے دو لاکھ روپے قرض مانگ رہے تھے اور دانش نے انہیں یہ رقم دینے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔ دانش اچھا کماتا تھا لیکن کھلے ہاتھ سے خرچ کرنے کی عادت کی وجہ سے وہ رقم جوڑ نہیں پاتا تھا پھر ان کے اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی اچھا خاصا تھا۔ وہ جو تھوڑی بہت بچت کر پاتے تھے وہ سائرہ ہی کرتی تھی اور اس نے دانش سے صاف کہہ رکھا تھا کہ وہ اپنی اس بچت میں سے کسی کو کچھ نہیں دے گی اس لیے دانش کسی موقع پر اس سے اس رقم کا مطالبہ نہ کرے۔ دانش کو مجبوری میں اپنے بڑے بھائی کو انکار کرنا پڑا تھا لیکن وہ اس کے عذر کو تسلیم کیے بغیر ناراضی کا اظہار کرتے رہے تھے حالانکہ اس سے قبل بھی وہ کئی بار دس، بیس یا پچیس ہزار کی رقم قرض کے نام پر دانش سے لے چکے تھے اور انہوں نے کبھی وہ رقوم واپس نہیں کی تھیں۔ بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ دانش کی والدہ نے بھی اسے کافی باتیں سنائی تھیں کہ اس نے بڑے بھائی کی ڈوبتی ہوئی دکان کو سہارا دینے کے لیے اس کی کوئی مدد نہیں کی۔ ان باتوں سے دانش ڈسٹرب ہوا تھا اور اس نے سائرہ کے سامنے خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ عنقریب شائع ہونے والی اپنی کتاب کی رائلٹی بڑے بھائی کو دے دے گا۔ سائرہ نے اس کے اس خیال کی مخالفت کی تھی اور اسے سمجھایا تھا کہ وہ بہت بار اپنے بھائی کی مدد کر چکا ہے اور یہ مدد اصل میں ان کو نکما بناتی جا رہی ہے۔ ان کی اچھی چلتی ہوئی جگہ پر موجود دکان کے ڈوبنے کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ محنت سے کام نہیں لیتے تھے اور دکان کو صحیح طرح وقت دینے کے بجائے زیادہ تر گھر میں آرام کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ اس نے دانش کو سمجھایا تھا کہ اس کے گھر والوں کے علاوہ اس کی کمائی پر اس کے بیوی اور بچوں کا بھی حق ہے اور انہیں لازماً کچھ رقم بچوں کے مستقبل کے لیے پس انداز کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہمیشہ اس طرح کام نہیں کر سکے گا اور آگے چل کر بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے انہیں رقم کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت دانش معلوم نہیں قائل ہوا تھا یا نہیں لیکن اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ پھر چند دن بعد وہ دنیا میں ہی نہیں رہا۔ سائرہ نے اپنے جیٹھ سے دانش کی تلخی کا ذکر پولیس افسر سے کرنا غیر ضروری خیال کیا۔ وہ کبھی بھی شک نہیں کر سکتی تھی کہ رقم دینے پر انکار کی صورت میں بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کو اس طرح سے منصوبہ بندی کر کے قتل کر سکتا ہے بس پھر جب کسی پر شک وشبہ ہی نہیں تھا تو پولیس کی اس تھیوری کو ہی قبول کرنا تھا کہ راہزنی کی واردات میں مزاحمت کے نتیجے میں دانش اپنی جان سے چلا گیا۔ سائرہ نے بھی بادلِ ناخواستہ اس بات کو قبول کر لیا اور زندگی کے دیگر مسائل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے اپنی ملازمت برقرار رکھی اور اس کے لیے وہ گھر پر رہ کر عدت پوری کرنے سے معذور تھی۔ اس کی اس مجبوری پر اس کی ساس نے خاصا واویلا کیا اور آنے جانے والوں کے سامنے اس کی برائیاں کرتی رہیں جن پر دکھ محسوس کرنے کے باوجود اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

اس کی امی اور بھائیوں نے اسے پیشکش کی تھی کہ وہ ان کے پاس اسلام آباد آجائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس کی شادی کے بعد گزرنے والے آٹھ سالوں میں میکے میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ دو بھائیوں اور ایک بہن کی شادی ہوگئی تھی اور چھوٹے بھائی کی بھی بات طے تھی۔ اگلے سال اس کی شادی ہونے کا

ماہنامہ سرگزشت کراچی

کا ایک اہم خاص نمبر

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو ''بے وقت کی موت'' کا شکار ہوئے۔
لیکن اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے۔

اس خاص شمارے کے لیے آپ بھی لکھیں

کیونکہ سرگزشت کا خاص نمبر

اہمیت کا حامل ہوتا ہے، لوگ مجلد کرا کر رکھتے ہیں۔

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں تو پہلے آگاہ کر دیں
تاکہ کوئی دوسرا اس شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے۔

امکان تھا۔ اس کی امی اب گھر کی اسی طرح حکمران رہ گئی تھیں جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلبے کے دور میں بہادر شاہ ظفر نام نہاد حکمران تھا۔ ایسے میں میکے جاکر رہنا اس کے حساب سے حماقت تھی اور اس کا کراچی میں رہنا ہی ٹھیک تھا کہ یہاں اس کے پاس کم از کم اچھے ماحول میں ایک مناسب نوکری تو موجود تھی۔ دفتر والوں نے اس کے حالات کو دیکھتے ہوئے اس پر ایک مہربانی یہ کی تھی کہ اسے تین سوا تین بجے دفتر سے اٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ رہ جانے والا کام وہ گھر پر لاکر مکمل کر لیتی تھی۔ اوقات کار میں یہ تبدیلی اس نے بچوں کی وجہ سے کی تھی۔ صبح وہ انہیں اسکول چھوڑ کر دفتر چلی جاتی تھی اور دفتر سے واپسی میں انہیں اسکول سے لے لیتی تھی۔ پہلے اسے وقت کی بچت کا اتنا خیال نہیں ہوتا تھا اس لیے پبلک ٹرانسپورٹ سے دفتر آنا جانا کر لیتی تھی اب اپنی ضرورت کے تحت اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ مہران خرید لی تھی جس پر مزید واویلا مچا تھا اور اس کے جیٹھ کو طعنہ دینے کا موقع مل گیا تھا کہ ان کے قرض مانگنے پر تو دانش کی جیب سے پھوٹی کوڑی نہیں نکلی تھی اور اب اس کی بیوہ اس کی رقم پر عیش کر رہی تھی۔ سائرہ نے انہیں وضاحت بھی دی تھی کہ اس نے گاڑی اپنی ذاتی بچت سے خریدی ہے لیکن وہاں کوئی قائل ہونے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔ چنانچہ وہ یہ کوشش کر کے اپنی مصروفیات میں گم ہو گئی۔ دانش کے نہ ہونے سے وہ جس جذباتی بحران سے گزر رہی تھی اس کا تو خود اس کے سوا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اپنے دل کی خستہ حالی کے باوجود اس نے اگر خود کو سنبھال لیا تھا تو اس کی وجہ اس کے بچے تھے۔ وہ ان کے ذہن کو الجھنوں اور دکھوں سے دور رکھنا چاہتی تھی اور اپنے طور پر کوشش کر رہی تھی کہ انہیں کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ ملازمت کے ساتھ اس نے افسانہ نگاری کو بھی زیادہ وقت دینا شروع کر دیا تھا تاکہ معاشی مسائل سے نمٹنے میں آسانی رہے لیکن بہرحال یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے اخراجات میں کمی کے لیے سب سے پہلے اس لگژری اپارٹمنٹ کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلے پر ورآمد میں کچھ وقت صرف اس لیے لگا کہ بچوں کا تعلیمی سیشن مکمل ہو جائے۔ موجودہ فلیٹ اس نے اپنے دفتر کے قریبی علاقے میں ایسی جگہ لیا تھا جہاں اس کے بچوں کے اسکول کی ایک برانچ موجود تھی اور اس نے آسانی سے انہیں وہاں ٹرانسفر کروا لیا تھا۔ اس فلیٹ میں منتقلی سے قبل اس کے اپنے سسرال والوں سے تعلقات میں مزید خرابی آگئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ وہ پبلشر جو دانش کی نئی کتاب چھاپ رہا تھا وہ اس کے انتقال پر تعزیت کے لیے سائرہ سے ملنے کے لیے آیا تھا اور اس وقت اس نے سائرہ کو رائلٹی کا چیک بھی دیا تھا۔ اس روز اس کے جیٹھ بھی وہاں موجود تھے اور انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ دانش کی رقم ہے اس لیے اس پر اس کے گھر والوں کا بھی حق ہے جبکہ سائرہ کا موقف تھا کہ اس رقم پر کسی بھی شخص سے زیادہ دانش کے بچوں کا حق ہے اور وہ اس رقم کو بچوں کے نام سے بینک میں محفوظ کر دے گی۔ اس معاملے میں بہت بحث مباحثہ ہوا لیکن کوئی سائرہ کے ساتھ زبردستی اس لیے نہیں کر سکا کہ چیک اس کے نام سے بنا ہوا تھا اور اس کے سوا کوئی اسے کیش نہیں کروا سکتا تھا۔ اس کے کھسیائے ہوئے سسرالیوں نے ردِعمل میں اس سے اپنے تعلقات ختم کر لیے جس پر اسے زیادہ دکھ اس لیے نہیں تھا کہ خودغرض اور مطلب پرست لوگوں سے ملتے جلتے رہنے میں کوئی بھلائی نہیں تھی اور الٹا ذہن ہی ڈسٹرب ہوتا تھا۔ اب وہ یہاں اس چھوٹے سے فلیٹ میں تھی اور پُرامید تھی کہ زندگی سکون سے گزر جائے گی۔

☆☆☆

سائرہ اور بچوں کا آہستہ آہستہ نئے فلیٹ میں دل لگ گیا تھا اور اس میں کچھ کردار ان کی پڑوسن خالہ جان کا بھی تھا۔ وہ سائرہ اور بچوں کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اکثر و بیشتر کوئی نہ کوئی چیز بھجواتی رہتی تھیں۔ جواب میں سائرہ نے بھی ایک دو بار وقت نکال کر پُرتکلف کھانا بنا کر انہیں بھجوایا تھا لیکن انہوں نے خود ہی اسے ٹوک دیا تھا کہ وہ یہ زحمت نہیں کیا کرے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اس کی روٹین بہت ٹف ہے اور وہ اس طرح کے کاموں میں زیادہ وقت صرف کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ تھی بھی حقیقت۔ خالہ جان جن کا نام طاہرہ خاتون تھا، کی روشن خیالی اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ خود اچھی خاصی سگھڑ خاتون تھیں لیکن اس حقیقت کو سمجھتی تھیں کہ ایک ورکنگ ویمن کا طرزِ زندگی کسی گھریلو عورت سے مختلف ہوتا ہے۔ طاہرہ خاتون کی وجہ سے اسے ایک آسانی اور ہو گئی تھی۔ اپنی تنہائی اور فراغت کا بہانہ بنا کر انہوں نے شام کے وقت بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا اور انہیں ہوم ورک کروانے کے ساتھ ساتھ ان کا قرآنی سبق بھی سن لیتی تھیں۔ وہ سائرہ سے بچوں کی تعریف کرتی تھیں کہ اس کے بچے بہت ذہن اور فرمانبردار ہیں اور بہت تیزی سے حفظ کر رہے ہیں۔ ان کی ہدایت پر بچے انہیں نانو کہنے لگے تھے اور وہ واقعی ایسے سائرہ کا ان حالات میں ساتھ دے رہی تھیں جیسے وہ اس کی ماں ہوں۔ سائرہ کی اپنی امی تو جوڑوں کے درد کی وجہ سے بیٹی کے پاس آکر رہنے اور اس کا ساتھ دینے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ اپنے گھر میں ان کے پاس ایک آرام دہ کمرا تھا اور دوسرے نمبر کے بیٹے کے چینل پر اچھے معالجین کی سہولت بھی میسر تھی۔ کچھ وہ اپنے پوتے پوتیوں سے دور ہونے سے بھی گھبراتی تھیں۔ بہرحال سائرہ اب اپنی زندگی میں ایڈجسٹ ہو چکی تھی اور دانش کی کمی کے علاوہ اسے کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس روز وہ دفتر سے واپس آئی تو اس کے پاس پبلشر کا فون آگیا اور اس نے سائرہ کو بتایا کہ دانش کی کتاب کی طباعت کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے لیکن اس کے پاس دیباچہ اور انتساب موجود نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ مرنے سے پہلے دانش نے یہ دونوں کام مکمل کر لینے کی اطلاع دی تھی لیکن وہ اسے یہ چیزیں بھجوا نہیں پایا تھا اس لیے سائرہ تھوڑی سی زحمت کرے اور دانش کے سامان میں سے یہ چیزیں ڈھونڈ کر اسے بھجوا دے۔ سائرہ نے وعدہ کر لیا کہ وہ یہ چیزیں فراہم کر دے گی۔ وہ بچوں کے سو جانے کے بعد رات کو دیر تک لکھنے لکھانے کے کام میں مصروف رہتی تھی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا لیکن نیند محسوس کرنے کے باوجود وہ بستر پر جانے کے بجائے دانش کے سامان میں مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے لگی۔ دانش کے لکھنے کا کام بہت پھیلا ہوا تھا اور وہ بیک وقت کئی کہانیوں پر کام کرتا تھا اس لیے اس کی چیزوں میں سے کچھ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ خود بھی لکھنے لکھانے کے شعبے سے وابستہ ہونے کی وجہ سے سائرہ ان چیزوں کی قدر و قیمت سمجھتی تھی اور گھر کی کئی اشیا فروخت کر دینے کے باوجود وہ دانش کا پورا سامان جوں کا توں لے آئی تھی اور اس دو کمروں کے فلیٹ میں بھی ایک کمرا اسٹڈی روم کے طور پر مختص تھا۔ جہاں تین دیواروں کے ساتھ کتابوں کی الماریاں اور ایک دیوار کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ سائرہ بچوں کے ساتھ ہی سوتی تھی اور لاؤنج میں صوفے وغیرہ ڈال کر اس نے مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام کر لیا تھا یہ اور بات کہ مہمان کے نام پر ان کے گھر صرف طاہرہ خاتون ہی آیا کرتی تھیں۔

تلاش کا کام اس نے ان فائلوں سے شروع کیا جن میں دانش اپنے مکمل اور نامکمل مسودے رکھا کرتا تھا۔ اس کام میں اسے بہت زیادہ دیر نہیں لگی اور تیسری فائل میں ہی اسے مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔ اس نے انتساب پڑھا۔ دانش کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔ ''اپنی شریکِ حیات کے نام جس کی پُرسکون رفاقت تخلیقی عمل میں میری سب سے بڑی معاون ہے۔'' ان الفاظ کو پڑھ کر سائرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ خود لکھنے کے شعبے سے وابستہ تھی اور اسے اندازہ تھا کہ کسی مصنف کے لیے اس کی تحریر کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور دانش نے جن الفاظ میں اپنی آخری کتاب کو اس سے منسوب کیا تھا وہ اس کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھے۔ لیکن اس اعزاز نے اس کو آنسوؤں کی برسات میں بھگو دیا۔ وہ جو زندگی کی جدوجہد میں خود کو کسی مشین کی طرح ڈھال چکی تھی پھر سے پگھل کر گوشت پوست کی عورت میں تبدیل ہونے لگی اور تنہائی کی ماری اس عورت کے دل نے خواہش کی کہ وہ کچھ وقت یونہی دانش کی یادوں میں کھو کر گزار دے۔ دانش وہ شخص تھا جو پور پور اپنی تحریروں میں جھلکتا تھا سو وہ فائل میں موجود نامکمل مسودے کو پڑھنے لگی۔ ابتدائی چند صفحات پڑھنے کے بعد ہی وہ بری طرح چونک گئی۔ جو کچھ لکھا تھا وہ محض تخیلاتی کہانی نہیں تھی۔ اس کہانی کے چند کردار اور واقعات سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ کہانی دو ایسے کرداروں کے گرد گھوم رہی تھی جن میں سے ایک قلم کار اور دوسرا اس کا اتفاقی دوست تھا۔ سائرہ سمجھ سکتی تھی کہ قلم کار کے روپ میں دانش نے خود اپنا کردار بیان کیا ہے جبکہ دوسرا کردار دانش کا نیا بننے والا وہ دوست تھا جس کا نام دانش نے اسے توقیر بتایا تھا۔ توقیر اسے مسجد میں ملا تھا اور دانش کے مطابق وہ بہت دین دار اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود وہ دونوں اچھے دوست بن گئے تھے۔ توقیر دانش کے لکھنے کی صلاحیت سے متاثر تھا اور دانش اتنی کم عمری میں توقیر کے کردار کی خوب صورتی اور اس کی دین داری سے متاثر ہوا تھا۔ دانش خود بھی مذہبی رجحان رکھتا تھا لیکن سائرہ نے محسوس کیا تھا کہ توقیر سے دوستی کے بعد اس رجحان میں نمایاں اضافہ ہوا تھا اور اس کی تحریروں میں بھی یہ رنگ جھلکنے لگا تھا بلکہ بعض اوقات تو سائرہ کو ایسا لگا تھا کہ اس نے غیر ضروری طور پر اپنی تحریروں میں ایسی چیزیں شامل کی ہیں جو کہانی کی ڈیمانڈ ہی نہیں تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں دانش کو ٹوکا تو وہ ہنس دیا اور اسے بتایا کہ توقیر نے اسے یہ بات سمجھائی ہے کہ اس کے پاس قلم کی طاقت ہے اور بے شمار لوگ اس کی تحریر کے مداح ہیں تو اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں کو دین کی تبلیغ کے لیے استعمال کرے۔ بات ایسی تھی کہ سائرہ اعتراض نہیں کر سکی البتہ اس نے دو تین بار دانش سے یہ فرمائش ضرور

کی کہ وہ توقیر کو کھانے پر گھر لے کر آئے لیکن پھر دانش نے اسے بتایا کہ توقیر نے گھر آنے اور سائرہ سے ملاقات کرنے پر معذرت کر لی ہے کیونکہ وہ کسی نامحرم عورت سے بلاضرورت ملاقات کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اس جواب کے بعد سائرہ نے اصرار کرنا چھوڑ دیا لیکن ایک بار وہ اتفاقی طور پر توقیر کو دیکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس روز وہ بچوں کے ساتھ ایک کولیگ کی بیٹی کی برتھ ڈے پارٹی میں شرکت کے لیے اس کے گھر گئی ہوئی تھی۔ دانش نے اپنے کسی پروگرام کی وجہ سے اس کے ساتھ جانے سے معذرت کر لی تھی۔ سالگرہ کا کیک کٹنے کے بعد وہ ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں لے کر ٹیرس پر لگی ریلنگ کے ساتھ آ کھڑی ہوئی تھی اور ایک مہمان خاتون کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اردگرد کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ اس کی کولیگ کا گھر کافی کھلی جگہ پر تھا اور سامنے کے رخ مکانات کے بجائے چند دکانیں، فاسٹ فوڈ سینٹر اور ٹیوشن اکیڈمی کے علاوہ ایک عدد مسجد بنی ہوئی تھی۔ مسجد سے باہر آتے افراد کو بے خیالی میں دیکھتے ہوئے اس کی نظر دانش پر پڑی تو چونک گئی۔ اس کے ساتھ بیس بائیس سال کا ایک لڑکا بھی موجود تھا۔ لڑکا خوش شکل اور باریش تھا۔ سائرہ کو اندازہ ہو گیا کہ یہی لڑکا توقیر ہے۔ بعد میں اس نے دانش سے پوچھا تو اس نے بھی تصدیق کر دی۔ یہاں تک کہانی میں کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن آگے چل کر دانش نے فرضی ناموں کے ساتھ کہانی کے جو واقعات بیان کیے تھے وہ خوفناک تھے۔ کہانی کے ان واقعات سے سائرہ کو اندازہ ہوا کہ مرنے سے کچھ عرصہ قبل دانش پر توقیر کی حقیقت کھلنا شروع ہو گئی تھی۔ ایک بار دانش نے اسے ایک ایسے شخص کے ساتھ دیکھا تھا جس کی شہرت اچھی نہیں تھی اور کہا جاتا تھا کہ وہ شخص منشیات اور اسلحے کی سپلائی کا کام کرتا ہے۔ دانش نے اس سلسلے میں توقیر سے استفسار کیا تو اس نے بہانہ بنا دیا کہ وہ اس شخص کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوشاں ہے۔ دانش نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور اس کے لیے اپنے دل میں کوئی شک محسوس نہیں کیا لیکن دوسرا واقعہ چشم کشا تھا۔ دانش اپنا ایک چیک جمع کروانے بینک گیا ہوا تھا۔ اچانک وہاں چار ڈاکو گھس آئے اور وہی سب کرنے لگے جو ڈاکو کرتے ہیں۔ وہ ڈاکو نقاب میں تھے اس کے باوجود لوگوں کو دھمکیاں دیتے ایک ڈاکو کی آنکھوں اور آواز نے دانش کو چونکا دیا۔ اس نے تصدیق کے لیے ڈاکو کے دائیں ہاتھ کو دیکھا تو اسے جلے کا وہ نشان نظر آ گیا جو توقیر کے ہاتھ پر موجود تھا۔ توقیر نے بھی دانش کو دیکھ لیا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے بھانپ لیا کہ وہ اسے پہچان چکا ہے اس لیے بینک سے نکلنے سے قبل لمحہ بھر کے لیے اس کے پاس رکا اور سرگوشی میں پھنکارتی آواز میں صرف اتنا بولا۔ ''اپنا منہ بند رکھنا۔'' اس واقعے کے بعد دانش کو امید نہیں تھی کہ توقیر اس سے ملاقات کرے گا لیکن اس نے ملاقات کی اور دانش کے استفسار کے بغیر ہی اسے بتانے لگا کہ ان کی تنظیم ایک بڑے مقصد کے لیے فنڈ ریزنگ کر رہی ہے اور زیادہ رقم کے حصول کے لیے مجبوراً انہیں ڈکیتی کی یہ واردات کرنی پڑی ہے۔ اس کی دلیل تھی کہ ملک اللہ کا ہے اور اللہ کے کام کے لیے کہیں سے بھی رقم حاصل کی جا سکتی ہے۔ دانش ظاہر ہے اس دلیل سے قائل نہیں ہوا لیکن وہ توقیر کے خلاف منہ کھولنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ توقیر کا تعلق کچھ بہت ہی خطرناک لوگوں سے ہے اور اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینے میں ہی بہتری ہے لیکن توقیر نے اسے یہ بھی نہیں کرنے دیا اور دھمکیوں کی شکل میں دانش سے فرمائش کرنے لگا کہ وہ ان کے مطلوبہ مقاصد کو مہمیز دینے والی تحریریں لکھا کرے۔ اصل میں وہ کوئی بہت مضبوط نیٹ ورک تھا جو اپنے مطلوبہ اہداف کے حصول کے لیے ہر زاویے سے کام کر رہا تھا اور ان کا ایک طریقۂ کار یہ بھی تھا کہ تحریر کے ذریعے اس طرح لوگوں کی ذہن سازی کی جائے کہ جب انہیں مذہب کے نام پر منفی سرگرمیوں میں ملوث کرنے کی کوشش کی جائے تو کسی طرح کی دشواری پیش نہ آئے۔ دانش اتنا باہمت نہیں تھا کہ ان لوگوں کے خلاف کھڑا ہو سکے لیکن وہ ان کے مفادات کے لیے بھی کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکا اور اس نے توقیر سے درخواست کی کہ وہ اس سے دوستی ترک کر کے اسے اس کی دنیا میں جینے دے۔ فرضی ناموں کے ساتھ دانش نے اپنی زندگی کی جو کہانی لکھی تھی وہ بس یہیں تک تھی اور دانش نے نہیں لکھا تھا کہ توقیر نے اس کی بات مان لی تھی یا نہیں مانی تھی۔ البتہ وہ خود دانش کے انجام سے توقیر کے ردِعمل کا اندازہ کر سکتی تھی۔ دانش کی موت پر پہلے ہی شک و شبہے میں مبتلا اس کا ذہن اس تحریر کو پڑھنے کے بعد سارے حساب کتاب جوڑنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ آخری دنوں میں دانش نے توقیر کا ذکر کرنا ترک کر دیا تھا لیکن وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دے پائی تھی۔ دوسرے ان دنوں دانش بھی بہت زیادہ مصروف رہنے لگا تھا اور اس کے لکھنے کے اوقات میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید وہ اپنی دیگر تحریروں کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کی یہ کہانی بھی لکھ رہا تھا جسے شائع کروانے کی شاید اسے ہمت کبھی نہ ہو پاتی لیکن بطور قلم کار وہ اپنی زندگی کے اتنے اہم واقعات کو کاغذ پر اتارنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا تھا جو آج سائرہ کے لیے اس کی موت پر سے پردہ ہٹانے کا سبب بن گئے تھے اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ دانش راہزنی کی واردات کا نہیں بلکہ دہشت گردی اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بنا تھا لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ ان انکشافات کے بعد اسے کیا کرنا چاہیے۔ پولیس والوں کی کام چوری وہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس فرضی ناموں سے لکھی گئی کہانی کو پڑھ کر وہ کبھی نہیں مانتے کہ یہ دانش کی اپنی زندگی کے واقعات ہیں۔ بالفرض یہ کیس کھل بھی جاتا تو اس کی اور بچوں کی زندگیاں خطرے میں پڑ سکتی تھیں۔ دانش نے بھی شاید اسی لیے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ توقیر نے ہی اسے اس سلسلے میں ہدایت دی ہو۔ بات جو بھی تھی خود اس کے سامنے یہ سوال تھا کہ کیا وہ دانش کے قاتلوں کو یونہی آزاد چھوڑ دے گی کہ وہ ہر طرف موت بانٹتے پھریں۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ توقیر صرف ایک فرد نہیں تھا بلکہ وہ دہشت گردوں کا پورا گروہ تھا جس نے دانش کو اس کے انکار کی عبرت ناک سزا دی تھی۔

سوچتے سوچتے اس کے اعصاب شل ہونے لگے اور اس نے اضطراب کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ تین بجے سے اوپر کا وقت ہو چکا تھا اور ان کی بلڈنگ کے سامنے والی سڑک بالکل ویران پڑی تھی البتہ اسٹریٹ لائٹ کی وجہ سے ماحول روشن تھا اور اس روشن ماحول میں وہ بلڈنگ کے بالکل سامنے آ کر رکنے والی سیاہ کار کو نہ دیکھ پاتی یہ کیسے ممکن تھا۔ کار رکی، اس کا دروازہ کھلا اور اس نے انہیں آڑ میں کھڑے شخص کو کار میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا۔ روشنی اتنی تھی کہ اس نے اس شخص کو اچھی طرح پہچان لیا۔ وہ طاہرہ خاتون کا بیٹا ولی تھا۔ پینتیس سال سے کچھ متجاوز ولی اپنے سنہری بالوں اور ورزشی جسم کی وجہ سے خاصا ہینڈسم لگتا تھا اور یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ عورتیں اسے پسند کرتی ہوں گی۔ سائرہ کی اس سے ایک آدھ بار رسمی سی ہی گفتگو ہوئی تھی اور اس کے ذہن میں ولی کے لیے کوئی منفی تاثر نہیں ابھرا تھا۔ ولی کی شادی نہ ہونے پر ایک بار اس نے طاہرہ خاتون سے باتوں باتوں میں استفسار کیا تھا تو انہوں نے اسے بتایا تھا کہ چند سال قبل ان کی خواہش پر ولی نے شادی کی تھی لیکن یہ شادی زیادہ عرصہ نہیں چل سکی کیونکہ ولی کی بیوی اس کے معمولات پر سمجھوتا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ سائرہ نے اس بات کی وضاحت کے لیے طاہرہ خاتون کو زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن رات کے اس پہر ولی کو پُراسرار طور پر ایک گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر وہ چونک گئی تھی۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ ولی نے اپنے سیاہ چست لباس پر بغلی ہولسٹر پہن رکھا ہے اور اس ہولسٹر میں ایک پسٹل لٹک رہا ہے۔ یہ سب کیا تھا؟ اس کا پہلے ہی سے چکراتا ذہن کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچ رہی تھی کہ کیا ولی کے یہی معمولات تھے جن سے اس کی بیوی سمجھوتا نہیں کر سکی تھی۔

☆☆☆

''اچھا ہوا تم لوگوں سے یہیں ملاقات ہو گئی۔ میں ذرا ایک کام سے جا رہی ہوں، واپس آؤں گی تو خود بچوں کو پڑھانے تمہارے فلیٹ پر آ جاؤں گی۔ ولی بہت تھکا ہوا آ کر سویا ہے اس لیے تم بچوں کو مت بھیجنا۔'' وہ بچوں کو اسکول سے لے کر آ رہی تھی تو سیڑھیوں پر ہی اس کی طاہرہ خاتون سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے الفاظ پر اسے فوراً ہی یاد آیا کہ اس نے رات گئے ولی کو اسلحے سمیت ایک پُراسرار گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں نہ جانے کیا کارنامہ انجام دے کر آیا تھا کہ اب شام چار بجے بھی تھکا ہارا سو رہا تھا۔

''آپ زحمت نہ کریں خالہ جان میں خود بچوں کو پڑھا لوں گی۔'' اس نے روکھے لہجے میں طاہرہ خاتون سے کہا اور بچوں کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کے لہجے اور انداز پر طاہرہ خاتون حیران کھڑی رہ گئی ہیں لیکن خود اس کا ذہن اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ وہ کسی دوسرے کے ردِعمل پر توجہ نہیں دے سکتی تھی۔ پہلے دانش کے قتل کے بارے میں انکشاف، پھر رات گئے ولی کی پُراسرار اور مشکوک روانگی کا منظر اور آج دفتر میں اتفاقاً چھڑ جانے والی گفتگو نے اس کے ذہن کو بری طرح الجھا دیا تھا۔ دفتر میں آج دہشت گردی کا موضوع چھڑ گیا تھا اور کسی ساتھی نے یہ الفاظ کہے تھے کہ آج کل کسی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ دہشت گردوں نے آبادیوں میں بھی اپنے ٹھکانے بنا لیے ہیں اور آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ آپ کا پڑوسی ہی کسی دہشت گرد تنظیم کا ہرکارہ ہے اس لیے آج کل اپنے آس پڑوس سے خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ زمانے گئے جب پڑوسی، عزیز رشتے داروں سے بڑھ کر

ہوتے تھے پھر اسی کولیگ نے خاص طور پر اسے مخاطب کر کے کہا تھا۔

"آپ کو خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے سائرہ صاحبہ! ایک تو آپ اکیلی ہیں دوسرے رہتی بھی فلیٹ میں ہیں اور کرائے کے فلیٹ ان دہشت گردوں کی پسندیدہ پناہ گاہیں بن چکی ہیں۔ یہ مت سوچیے گا کہ یہ دہشت گرد چھڑے چھانٹ مرد ہی ہوتے ہیں۔ اب تو ان کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی ہیں اور یہ باقاعدہ فیملی کی شکل میں رہتے ہیں۔" اپنے دفتری ساتھی کی اس نصیحت پر وہ حقیقتاً خوف زدہ ہوگئی تھی اور اسے ولی اور طاہرہ خاتون خاصے مشکوک لگنے لگے تھے۔ طاہرہ خاتون کے فلیٹ میں سجے سازوسامان، ان کے پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اچھے خوش حال لوگ ہیں پھر بھی وہ لوگ اس کی طرح ایک چھوٹے سے کرائے کے فلیٹ میں رہ رہے تھے۔ سائرہ اور اس کے بچوں کے علاوہ ان کے ہاں کسی کی آمدورفت کا سلسلہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ گھریلو کاموں میں مدد کے لیے کوئی جزوقتی ملازمہ تک نہیں رکھی گئی تھی اور اس عمر میں بھی طاہرہ خاتون ہی ہر کام کرتی تھیں۔ ایک بار سائرہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ ولی ملازمہ رکھنے کے حق میں نہیں ہے اسی لیے ان پر کام کا بوجھ کم کرنے کے لیے وہ اس چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگیا ہے۔ بڑے گھر کے مقابلے میں اس چھوٹے فلیٹ کو سنبھالنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ ولی کھانے پینے کے معاملے میں بھی بہت سادہ مزاج ہے اور وہ صرف اپنے ککنگ کے شوق کی تسکین کے لیے پُرتکلف کھانا بنایا کرتی ہیں۔ پہلے یہ سب باتیں سائرہ کو اتنی عجیب نہیں لگی تھیں لیکن اب وہ ایک مختلف زاویے سے دیکھ رہی تھی تو اسے سب کچھ مشکوک نظر آرہا تھا۔ خصوصاً ولی کی گھر میں اجنبیوں کی آمدورفت روکنے کی کوشش۔ آخر اس کی زندگی میں ایسا کیا تھا جو وہ دوسروں سے خفیہ رکھنا چاہ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوگئی تھی۔ بچوں کو ہوم ورک کروانے اور کھانا تیار کرنے کے دوران بھی وہ اسی مسئلے پر سوچتی رہتی تھی۔ اگر اس کے پڑوسی ٹھیک لوگ نہیں تھے تو یہ اس کے لیے ایک خطرناک بات تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ فوری طور پر رہائش بھی تبدیل نہیں کرسکتی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا پھر اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ دوسری جگہ صحیح لوگوں سے واسطہ پڑے۔ ان ہی سوچوں میں گھرے اسے وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا۔ اطلاعی گھنٹی کے بجنے پر وہ چونکی۔ حسب توقع دروازے پر طاہرہ خاتون کھڑی تھیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک ڈش اٹھا رکھی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے انہیں اندر بلانا پڑا۔

"بچوں کو پڑھانے سے تو تم نے منع کردیا تھا اس لیے میں نہیں آئی۔ ابھی یہ لبنانی کباب بنائے تھے تو سوچا کہ تمہیں دے آؤں، بچے ایسی چیزیں شوق سے کھاتے ہیں۔" وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں مخاطب تھیں لیکن آج سائرہ پہلے جیسی نہیں تھی اس لیے خشک سے لہجے میں بولی۔

"آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔ بچوں نے کھانا کھالیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، تم یہ کباب فریج میں رکھ دو، کل مائیکروویو میں گرم کر کے لنچ میں دے دینا۔" اس کے روکھے پن کے باوجود ان کے لہجے کی ملائمت قائم تھی۔ سائرہ نے بے دلی سے کبابوں کی ڈش اٹھا کر فریج میں رکھ دی۔ بچے اندر کمرے میں کارٹون دیکھنے میں مصروف تھے اس لیے انہیں طاہرہ خاتون کی آمد کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ سائرہ خود بے دلی سے ان کے مقابل بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے سائرہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" طاہرہ خاتون نے اس سے دریافت کیا۔

"میری طبیعت کو کیا ہونا ہے بالکل ٹھیک ہوں۔" اس کا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا سا تھا۔

"مجھے تم ہمیشہ سے مختلف لگ رہی ہو۔ شاید رات کو سوئی بھی نہیں ہو۔ تمہاری آنکھیں سرخ ہورہی ہیں اور چہرہ اترا ہوا ہے۔ کہیں کسی پریشانی میں تو مبتلا نہیں ہو؟" انہوں نے اس بار بھی نرم لہجے میں کہا تو سائرہ کو تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی۔

"رات کام کے چکر میں بہت زیادہ دیر تک جاگتی رہی تھی اس لیے نیند پوری نہیں ہوسکی۔" اس بار جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ خاصا نرم تھا۔

"اللہ تمہیں ہمت دے۔ اکیلی جان پر بہت ذمے داری آگئی ہے۔ اللہ تمہیں اپنی کوششوں میں سرخ رو کرے۔" انہوں نے بہت ہمدردی اور خلوص سے اسے دعائیں دیں تو اس کے دل میں ان سے براہِ راست بات کرنے کا خیال آگیا اور قدرے جھجکتے ہوئے بولی۔

"میں نے کل رات تین بجے کے بعد ولی کو ایک گاڑی میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ کوئی مسئلہ تھا کیا جو وہ اتنی رات کو کہیں گئے تھے؟" اس کے سوال نے طاہرہ خاتون کے ذہن میں ایک جھماکا سا کیا اور انہیں ادراک ہوگیا کہ سائرہ کس الجھن میں ہے۔ ولی کی خصوصی تیاری کے ساتھ روانگی نے یقیناً اس کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے تھے۔ وہ ایک گہرا سانس لے کر اس کی طرف غور سے دیکھنے لگیں اور پھر دھیمے لہجے میں بولیں۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ولی سرکاری ملازم ہے لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیا ملازمت کرتا ہے۔ ہم یہ بات کسی کو بتاتے بھی نہیں ہیں لیکن تم مجھے بالکل بیٹی کی طرح عزیز ہو اس لیے میں تمہیں یہ بات بتا رہی ہوں کہ ولی حکومت کی ایک خفیہ فورس کا اہلکار ہے اور کل رات بھی اسے ایمرجنسی میں ایک اہم مشن پر جانا پڑا تھا۔ اگر تمہیں ٹیلی ویژن دیکھنے کا موقع ملا ہو تو تم نے صفورا گوٹھ میں دہشت گردوں کے ٹھکانے پر خفیہ فورس کی کارروائی کی خبر دیکھی ہوگی۔ ولی وہ کارروائی کرنے والی ٹیم کا حصہ تھا۔ اس کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد بھی اسے بہت دیر تک اپنے دفتر میں رکنا پڑا تھا اور وہ تقریباً دوپہر کے بارہ بجے گھر آکر چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد ایک بار پھر اپنے آفس جاچکا ہے۔ ولی کی بیوی کو اس کی یہ جاب پسند نہیں تھی جس میں آنے جانے کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے اور ہر وقت جان بھی خطرے میں رہتی ہے۔ اس نے ولی پر زور دیا کہ وہ اپنی جاب چھوڑ کر اس کے پاپا کے ساتھ ان کے بزنس میں شامل ہوجائے لیکن ولی نہیں مانا۔ اس کے لیے اس کی جاب صرف گھر کا چولہا جلانے کا ذریعہ نہیں ہے، وہ اس جاب کے ذریعے اپنے حب الوطنی کے جذبے کی تسکین کرتا ہے اور یہ جذبہ میں نے ہی اس کے دل میں ڈالا ہے اس لیے میں اس کا پورا ساتھ دینے کی کوشش کرتی ہوں اور عام ماؤں کی طرح اس سے یہ شکوہ نہیں کرتی کہ وہ مجھے وقت نہیں دیتا یا میری زندگی دوسری عورتوں سے قدرے مختلف ہے۔ میں پیسا ہونے کے باوجود اپنے گھر میں کوئی ملازمہ نہیں رکھ سکتی۔ مجھے میل جول میں بہت احتیاط رکھنی پڑتی ہے کیونکہ ولی کی ملازمت میں رازداری کی بہت اہمیت ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے سیڑھی بنا کر اس تک پہنچ سکے۔" اس کے ایک سوال کے جواب میں طاہرہ خاتون نے اسے اتنا کچھ بتا دیا کہ اس کی ساری الجھنیں دور ہوگئیں اور وہ شرمندہ ہونے لگی کہ اس نے کیسے لوگوں پر شک کیا۔

"سوری خالہ جان! آپ نے شاید میرے رویے کو محسوس کیا ہو لیکن میری بھی مجبوری ہے کہ میں ہر شخص پر اعتبار نہیں کرسکتی۔" اس نے فوراً معذرت کرلی۔

"کوئی بات نہیں بیٹا آج کل حالات ہی ایسے ہیں کہ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ میں بھی شاید اول دن پڑوسی ہونے کا حق ادا کرنے کے بعد تعلقات کو طول نہیں دیتی لیکن تم مجھے اچھی لگیں اور تمہارے حالات نے بھی مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی استطاعت کے مطابق تمہارا خیال رکھ سکوں۔ تم سے دوستی رکھنے کے لیے مجھے ولی سے باقاعدہ اجازت لینی پڑی تھی۔" اپنی بات کے اختتام پر وہ ذرا سا مسکرائیں۔

"اور ولی صاحب نے یقیناً یہ اجازت میرا سب اگلا پچھلا کھنگالنے کے بعد ہی دی ہوگی۔" اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آگئی جس کے جواب میں طاہرہ خاتون نے صرف چھوٹا سا قہقہہ لگانے پر اکتفا کیا، زبان سے کچھ نہیں بولیں۔

☆☆☆

"دانش صاحب کے قتل کے بعد آپ نے کبھی اپنے اردگرد توقیر نامی اس شخص کو دیکھا؟" اس کے مقابل بیٹھے ولی نے اس کی ساری داستان سننے کے بعد دریافت کیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دانش کے قتل کے معاملے پر اس طرح زبان بند کر کے نہیں بیٹھ سکتی۔ عام پولیس والوں کی نیت اور صلاحیت پر بھروسا کرنا آسان نہیں تھا لیکن دہشت گردوں سے جنگ کرنے والے ایک خفیہ ادارے کے پُرعزم اور ایمان دار اہلکار تک رسائی مل جانے کے بعد اس کے لیے چپ رہنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے طاہرہ خاتون کی مدد سے ولی سے ملاقات کا وقت لے لیا اور اب دونوں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔

"نہیں، وہ کبھی میرے سامنے نہیں آیا، ایک بار میں نے اسے اتفاقاً ہی دیکھ لیا تھا۔" اس نے ولی کے سوال کا جواب دیا۔

"دانش صاحب کے بعد آپ نے اپنے اردگرد کسی مشکوک فرد یا سرگرمی کو تو محسوس نہیں کیا کہ جیسے آپ کی نگرانی کی جارہی ہو یا آپ کے گھر کی تلاشی لی گئی ہو؟" ولی نے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑگئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"دانش کے بعد جب میں نے اپنا آفس جوائن کیا تھا تو دو تین بار مجھے ایسا لگا کہ کوئی شخص میرا پیچھا کررہا ہو لیکن پیچھا کرنے والوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی اس لیے میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر بھلا دیا۔ اب مجھے یہ بھی یاد آرہا ہے کہ ایک بار دفتر سے گھر آنے پر مجھے گھر میں کچھ بے ترتیبی محسوس ہوئی تھی لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں چونک جاتی۔ ہلکا سا ایک احساس ہوا تھا اور میں نے یہ سوچ کر ٹال دیا تھا کہ صبح میری مصروفیت کے

دوران بچوں نے چیزیں اِدھر اُدھر کردی ہوں گی۔"

"میرے اندازے کے مطابق دانش صاحب کی ہلاکت کے بعد ان لوگوں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی ہوگی کہ آپ ان کی موت کی اصل وجہ تو کھوجنے کی کوشش نہیں کررہی ہیں یا دانش صاحب ایسی کوئی شے تو نہیں چھوڑ گئے ہیں جو آپ کو شک میں مبتلا کردے۔ انہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا کہ وہ ایک نامکمل مسودے کی صورت میں اپنے قتل کا نشان چھوڑ گئے ہوں گے۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ ابتدا میں آپ کو ایسی کوئی چیز نہیں ملی اور نہ ہی آپ نے کسی کے سامنے شک وشبے کا اظہار کیا اس لیے وہ آپ کی طرف سے مطمئن ہوگئے۔ اب آپ آسانی سے ان دہشت گردوں تک پہنچنے میں میری مدد کرسکتی ہیں۔"

"تھینک یو ولی صاحب، آپ نے میری بات سنی اور اس پر اعتبار کیا ورنہ مجھے شک تھا کہ فرضی ناموں سے لکھی گئی ایک نامکمل کہانی کے مسودے پر آپ اعتبار کریں گے بھی یا نہیں۔" ولی کو اس کیس کے معاملے میں سنجیدہ دیکھ کر سائرہ نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ہم شک کی بنیاد پر کام کرتے ہیں میڈم! اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ توقیر کے کردار کو لے کر دانش صاحب نے واقعی کوئی تخیلاتی کہانی لکھی ہو لیکن میری تربیت مجھے اس مسودے کو محض تخیلاتی کہانی قرار دے کر شک کرنے سے نہیں روک سکتی۔ اب آپ کو کرنا یہ ہے کہ میرے ساتھ میرے آفس چلیں اور وہاں ایکسپرٹ کی مدد سے توقیر کا خاکہ بنوائیں۔ خاکہ بن جانے پر ہمارے لیے اس شخص تک رسائی کی ایک راہ کھل جائے گی۔"

"آپ جب کہیں میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔" ولی کی بات سن کر سائرہ نے ایک عزم سے جواب دیا۔ اس پر دانش کی محبت کا یہ قرض تھا کہ وہ اس کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کرے اور یہاں تو ملک وقوم کی سلامتی کا بھی معاملہ تھا۔ دانش کو مارنے والے عام قاتل نہیں دہشت گرد تھے اور دہشت گردوں کو انجام تک پہنچانا ضروری تھا۔

☆☆☆

"آپ کا بہت بہت شکریہ سائرہ صاحبہ کہ آپ نے وقت نکالا توقیر کا خاکہ بننے سے ہمیں اسے تلاش کرنے میں مدد ملے گی۔" ولی خود اسے اپنے دفتر کی پارکنگ میں اس کی گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا۔ دفتر میں بھی اس نے سائرہ کا بہت خیال رکھا تھا۔ ایکسپرٹ سے توقیر کا خاکہ بنوانے کے دوران وہ ایک دوجگہ خاصی کنفیوز ہوگئی تھی اور اسے ڈر محسوس ہورہا تھا کہ وہ کوئی غلطی نہ کرجائے، ایسے موقع پر ولی نے اس کی کیفیت بھانپ کر اسے خوب تسلی دی اور سمجھایا کہ وہ خود کو بالکل ریلیکس رکھ کر کام کروائے۔ اس کے کنفیوز ہوکر بار بار خاکے میں تبدیلیاں کروانے سے وہ جھنجلایا نہیں تھا بلکہ الٹا اسے ہی سمجھاتا رہا تھا کہ اس نے صرف ایک بار توقیر کو دیکھا ہے اس لیے اگر وہ اس کا خاکہ بنوانے میں تھوڑی سی کنفیوز ہورہی ہے تو اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب خاکہ مکمل ہوا تو سائرہ نے محسوس کیا کہ وہ توقیر سے بہت حد تک مشابہ ہے۔ اس کے منع کرنے کے باوجود ولی نے اس کی چائے اور اسنیکس سے خاطر مدارت بھی کی تھی اور اب اسے اس کی گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور اس کا شکریہ ادا کررہا تھا۔

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے ولی صاحب کہ آپ نے میری بات پر یقین کرکے دانش کے قاتلوں تک پہنچنے کی کوشش کا آغاز کردیا ورنہ میں اکیلی عورت کیا کرسکتی تھی۔" سائرہ نے پوری سچائی سے کہا۔

"آپ نے ہمت کی اور ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی کروانے کا سوچا، یہ بھی بہت بڑی بات ہے ورنہ ہمارے ہاں تو اکثر لوگ یہی سوچتے ہیں کہ دنیا سے جانے والا چلا گیا اب ہم زبان کھول کر اپنی اور اپنے بچوں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالیں۔ حالانکہ ایسا کرکے وہ اپنی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال رہے ہوتے ہیں۔" وہ اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے آپ کو اپنے اور دفتر کے جو فون نمبرز دیے ہیں انہیں سنبھال کر رکھیے گا۔ ذرا سی بھی کوئی گڑبڑ محسوس ہونے پر آپ فوری طور پر رابطہ کرسکتی ہیں۔"

"جی شکریہ، اب مجھے اجازت دیں ورنہ میں دفتر کے لیے بہت لیٹ ہوجاؤں گی۔" گھڑی کی تیزی سے بھاگتی ہوئی سوئیوں نے سائرہ کو اجازت لینے پر مجبور کیا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال کر ٹریفک کے بہاؤ میں لاتے ہوئے اس کی ذہنی رو خودبخود ولی کی بیوی کی طرف چلی گئی۔ کتنی عجیب عورت تھی وہ جو اتنے وجیہہ اور پروا کرنے والے مرد کو صرف اس لیے چھوڑ کر چلی گئی تھی کہ وہ اپنی زندگی کے غیر معمولی معمولات کو تبدیل کرنے سے قاصر تھا حالانکہ اسے تو ولی پر فخر ہونا چاہیے تھا کہ وہ وطن کے لیے اتنی بہادری سے کام کررہا ہے۔ اپنی جان کی بازی لگا کر دوسروں کی حفاظت کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ایسی جرأت مندی ہر ایک میں نہیں ہوتی۔ خود دانش میں بھی اتنی جرأت مندی نہیں تھی حالانکہ دانش بہت مثبت سوچ رکھنے والا ایک ہمدرد اور پُرخلوص انسان تھا لیکن توقیر کی اصلیت سامنے آنے پر وہ زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرسکا تھا کہ کہیں اس کی اپنی فیملی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

حسبِ معمول اپنے فرائض انجام دے کر وہ دفتر سے واپسی میں بچوں کو لینے اسکول پہنچی تو وہاں ایک پریشانی اس کے انتظار میں تھی۔ بچے اسکول میں موجود نہیں تھے اور چوکیدار کے مطابق انہیں ان کے کوئی انکل ساتھ لے گئے تھے۔ کون انکل اس بارے میں چوکیدار کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سائرہ نے اس غیر ذمے داری پر شور مچایا تو وہ بولا کہ بچوں نے خود اس شخص کو اپنے انکل کے طور پر شناخت کیا تھا تب ہی اس نے بچے اس آدمی کے حوالے کیے تھے۔ اس آدمی کا کہنا تھا کہ آج سائرہ کی طبیعت خراب ہے اسی لیے وہ بچوں کو لینے آیا ہے۔ اس صورتِ حال پر سائرہ کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس نے پہلے طاہرہ خاتون کا نمبر ملایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے فلیٹ پر چیک کرکے بتائیں کہ بچے پہنچ گئے ہیں یا نہیں۔ طاہرہ آنٹی نے اسی وقت اسے بتادیا کہ بچے موجود نہیں ہیں۔ اسے لگا کہ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسک گئی ہے۔ اس کا دھیان فوری طور پر ولی کی طرف گیا اور اس نے اس کا نمبر ملا کر روتے ہوئے اسے بچوں کے اسکول سے غائب ہونے کی اطلاع دی۔ ولی نے اسے تسلی دیتے ہوئے فوری طور پر اپنے پہنچنے کا یقین دلایا۔ سائرہ کو اس دوران اسکول کے آفس میں لے جاکر بٹھادیا گیا تھا۔ بچوں کے اس طرح غائب ہونے سے اسکول انتظامیہ خود پریشان تھی۔ اس سے ان کے اسکول کی ریپوٹیشن پر اثر پڑسکتا تھا۔ انہوں نے سائرہ کو زیادہ دیر باہر کھڑے ہوکر شور کرنے کا موقع نہیں دیا تھا اور اب بھی کوشش کررہے تھے کہ کسی کو اس واقعے کا علم نہ ہو۔ اسٹاف میں سے دوخواتین مسلسل سائرہ کو تسلیاں دے رہی تھیں۔ اسے جوس بھی پیش کیا گیا تھا جسے پینا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ کسی کے سوال کا جواب نہیں دے پارہی تھی۔ انتظامیہ کے لوگ اس پر زور دے رہے تھے کہ وہ سوچے کہ بچوں کے ایسے کون سے انکل ہیں جنہیں پہچان کر بچے ان کے ساتھ چلے گئے ہیں لیکن سائرہ کا دماغ کام ہی نہیں کررہا تھا اور مسلسل بُرے بُرے وسوسے دل میں آرہے تھے۔ ولی کے اسکول پہنچنے تک وہ رو رو کر اچھی خاصی نڈھال ہوگئی تھی۔ ولی کی آمد پر ایک بار پھر چوکیدار کی آفس میں طلبی ہوئی۔

"تم نے بچوں کو کسی اجنبی کے ساتھ کیسے جانے دیا؟" ولی نے سخت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"امارا قصور نئی ہے صاب! اس آدمی نے ام سے جھوٹ بولا تھا کہ بچوں کی ماں کا طبیعت خراب ہے اس لیے وہ بچوں کو لینے آیا ہے۔ بچوں نے خود اس آدمی کو پہچانا تھا۔ ام کو ایسا کوئی ہدایت نہیں تھا کہ بچوں کو ماں کے سوا کسی کے ساتھ نہیں بھیجنا ہے اس لیے ام نے ان کو جانے دیا۔" چوکیدار بھی اس صورتِ حال پر گھبرایا ہوا تھا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے جناب! جن پیرنٹس کو اپنے بچوں کے حوالے سے کوئی خدشہ ہوتا ہے وہ پیشگی ہمیں انفارم کردیتے ہیں اور ہم کسی بھی صورت میں بچوں کو پیرنٹس کے علاوہ کسی کے ہینڈاوور نہیں کرتے۔ مسز دانش کی طرف سے ہمیں ایسی کوئی انسٹرکشن نہیں ملی تھی۔" پرنسپل جو پہلے چوکیدار کو اچھی خاصی باتیں سنا چکا تھا اب اسکول کے مفاد میں اس کی حمایت کررہا تھا۔

"بچوں کو لے جانے والے آدمی کا حلیہ تفصیل سے بتاؤ۔" ولی نے کسی بھی وضاحت پر توجہ دیے بغیر چوکیدار کو حکم دیا اور آنسو بہاتی سائرہ سے مخاطب ہوکر سنجیدگی سے بولا۔ "پلیز سائرہ صاحبہ! چوکیدار جو حلیہ بتارہا ہے اسے غور سے سنیں۔ ہوسکتا ہے آپ اس حلیے کے کسی شخص کو جانتی ہوں۔" سائرہ اس کی بات سمجھ گئی اور خود پر قابو پاکر چوکیدار کی طرف متوجہ ہوگئی۔ چوکیدار نے حلیہ بتانا شروع کیا اور دوچار نشانیوں سے ہی سائرہ پہچان کے مراحل طے کرکے تیز آواز میں بولی۔

"یہ جو حلیہ بتارہا ہے، وہ میرے جیٹھ کا ہے۔ میں ابھی انہیں کال کرتی ہوں۔" ولی کے کسی ردِعمل سے قبل ہی اس نے اپنے موبائل سے کال ملائی اور دوسری طرف سے ہیلو سنتے ہی بولی۔

"طلحہ اور زویا کہاں ہیں ثاقب بھائی؟ آپ میری پرمیشن کے بغیر انہیں اسکول سے لے کر کیوں گئے؟"

"وہ میرے بھائی کے بچے ہیں اور میرا بھی ان پر حق ہے۔ ویسے بھی امی کو بچوں کی بہت یاد آرہی تھی اس لیے میں بچوں کو ان سے ملوانے کے لیے لایا ہوں۔"

"بچوں سے ملنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آپ کو گھر آنا چاہیے تھا۔" ان کے اطمینان سے جواب دینے پر اسے

غصہ آنے لگا۔

''کون سے گھر......؟ تم تو چپکے سے پہلے والا گھر چھوڑ کر بھاگ گئی ہو۔ وہ تو میں نے کوشش کر کے پرانے اسکول سے معلوم کیا کہ تم نے بچوں کو اسکول کی کون سی برانچ میں ٹرانسفر کروایا ہے۔'' جواب میں انہوں نے بھی تنی کا مظاہرہ کیا۔

''آپ مجھ سے میرے فون پر بھی رابطہ کر سکتے تھے۔'' سائرہ کا غصہ مزید بڑھنے لگا۔

''تم سے ہمارا اب کوئی رشتہ نہیں رہا ہے۔ ہاں بچوں سے ہمارا رشتہ ہے اور تم ہمیں بچوں سے ملنے سے نہیں روک سکتیں۔'' وہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

''میں ابھی اور اسی وقت اپنے بچوں کو لینے آرہی ہوں۔'' سائرہ طیش میں آگئی۔

''آتے ہوئے دو لاکھ کا چیک بھی تیار کر کے لے آنا۔ بچوں کی طرح بھائی کے مال پر بھی ہمارا حق بنتا ہے۔ تم بچوں کو مکمل اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے رکھ لو لیکن کم سے کم مال میں سے تو تمہیں ہمارا حق دینا ہوگا۔'' ان کا مکارانہ لہجہ سن کر سائرہ بیک وقت غصے اور دکھ میں مبتلا ہوئی اور نفرت سے بولی۔

''آپ اتنے گھٹیا انسان ہوں گے، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ آپ یتیم بچوں کے مال پر نظر رکھے ہوئے ہیں

''تم بھی تو اس مال پر عیش کر رہی ہو۔ دانش کی زندگی میں تم بسوں میں دھکے کھاتی پھرتی تھیں اور اب اس کے پیسوں سے گاڑی میں اڑتی پھرتی ہو۔ جب تم اس مال پر عیش کر سکتی ہو تو میں اپنی ضرورت کے لیے کیوں نہیں مانگ سکتا۔''

''بند کریں اپنی بکواس۔ میں بچوں کو لینے آرہی ہوں۔'' انہیں قائل کرنے کی کوشش کرنا بے کار تھا اس لیے اس نے فون بند کر دیا۔ ولی اور وہاں موجود دوسرے لوگ یک طرفہ گفتگو سے ہی خاصی حد تک بات سمجھ چکے تھے۔ سائرہ نے کسی سے کچھ نہیں کہا اور ولی سے مخاطب ہو کر بولی۔

''آپ کے تعاون کا شکریہ ولی۔ آپ جائیں، میں بچوں کو خود لینے جاتی ہوں۔''

''میرے خیال میں، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ اکیلے میں آپ کو پریشانی ہو سکتی ہے۔'' ولی بھی اس کے پیچھے ہی چل پڑا۔ سائرہ کو اس کی بات ٹھیک لگی۔ فون پر اس سے اتنی بدتمیزی کرنے والا ثاقب گھر جانے پر اس سے دگنی بدسلوکی کر سکتا تھا۔ پھر اس کا مطالبہ بھی تو تھا۔ چیک نہ دینے پر وہ واقعی بچے اس کے حوالے نہیں کرتا تو وہ کیا کرتی۔ ولی کے کہنے پر اس نے اپنی گاڑی اپنی بلڈنگ کی پارکنگ میں کھڑی کی اور پھر ولی کی گاڑی میں ثاقب کے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اسے ایک اجنبی مرد کے ساتھ دیکھ کر ثاقب ذرا سا گڑبڑا گیا لیکن پھر بدتہذیبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ کس کے ساتھ گھوم رہی ہو۔ میرے بھائی کو مرے چار دن نہیں ہوئے اور تم نے گل چھرے اڑانا شروع کر دیے۔'' اس کے الفاظ پر سائرہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ غصے میں وہ کچھ کہتی اس سے قبل ولی نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور خود بے حد سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''اپنا تعارف میں خود کروا دیتا ہوں۔ اگر آپ پڑھنا لکھنا جانتے ہیں تو اس کارڈ سے میرا مکمل تعارف جان سکتے ہیں۔'' اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر ثاقب کو تھما دیا۔ جس کے مندرجات پڑھ کر اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی اور وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

''آپ نے کیوں زحمت کی سر! ہمارا معمولی سا گھریلو تنازعہ ہے۔ آیئے اندر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' ولی نے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ طوعاً و کرہاً سائرہ کو بھی اندر جانا پڑا۔ اندر قدم رکھتے ہی اس کی اپنی ساس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

''آئے ہائے سائرہ! تجھے ذرا شرم اور لاج نہیں ہے۔ میرے بیٹے کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو تو چہرے پر سرخی پوڈر ملے، رنگین جوڑا پہنے گھوم رہی ہے۔'' انہوں نے اس کی ہلکی سی لپ اسٹک پر اعتراض کیا۔

''سائرہ صاحبہ کی عدت پوری ہو چکی ہے محترمہ اور شرعاً ان کے بننے سنورنے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔'' ولی بے ساختہ ہی دانش کی ماں کو ٹوک بیٹھا۔

''تم کون ہو میاں؟ بغیر داڑھی کے پتلون قمیص والے مولوی۔'' انہوں نے ٹوکے جانے پر خشمگیں نگاہوں سے ولی کو گھورا۔

''چپ رہو اماں اور اندر جاؤ۔'' ثاقب نے اس صورتِ حال پر ماں کو ٹوکا اور ان لوگوں کو اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ دانش کی ماں بھی اس کی ہدایت کے برخلاف اندر چلی آئی۔

''مجھے آپ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کرنی مسٹر ثاقب! آپ نے جو حرکت کی ہے اس کے نتیجے میں آپ پر حبس بے جا اور اغوا برائے تاوان کا کیس بن سکتا ہے اور ان جرائم کی سزا کتنی سخت ہے اس کا آپ کو بھی اندازہ ہوگا۔ آپ نے سائرہ صاحبہ سے جو کچھ کہا وہ یہ اپنے موبائل میں ریکارڈ کر چکی ہیں جو ثبوت کے طور پر عدالت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ بچے میری ایک کال پر پولیس ٹیم آکر آپ کے گھر سے بازیاب کروا لے گی۔ اب آپ بتائیں کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟'' راستے میں سائرہ نے اسے ساری تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے اس نے پورے اعتماد سے گفتگو کا آغاز کیا۔

''آئے ہائے، کیسا اغوا اور کیسی پولیس؟ بچے ہمارے اپنے ہیں۔ بچوں کے دادی اور تایا سے ملنے پر پولیس کیا کر سکتی ہے۔'' دانش کی ماں واویلا کرنے لگی۔

''میں نے تم سے کہا ہے نا اماں چپ ہو جاؤ۔'' ثاقب نے غصے سے ماں کو ٹوکا اور پھر عاجزی سے ولی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مالی مسائل کی وجہ سے میں نے ایسے ہی سائرہ سے ایک مطالبہ کر دیا تھا ورنہ میرا بچوں کو اغوا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف انہیں اماں اور دوسرے لوگوں سے ملوانے لایا تھا۔ آپ لوگ ابھی انہیں لے جا سکتے ہیں۔ اماں! آپ بچوں کو یہاں بلا لیں۔'' آخری جملہ اس نے اپنی ماں سے کہا جنہیں خود بھی بیٹے کے رویے سے اندازہ ہو گیا تھا کہ صورتِ حال کچھ نازک ہے اس لیے فوراً ہی بچوں کو لے آئیں۔ بچے سائرہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئے اور پوچھنے لگے کہ اس کی طبیعت کو کیا ہوا تھا جو اس نے ثاقب انکل کو انہیں اسکول سے لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ سائرہ نے بچوں کو ایسے ہی بہانہ بنا کر بہلا لیا اور فوراً ہی واپسی کے لیے کھڑی ہوگئی۔

''اگر آئندہ آپ میں سے کسی کا بچوں سے ملنے کا دل چاہے تو فون کر کے پہلے سائرہ صاحبہ سے اجازت لے گا پھر بچوں سے ملاقات کرے گا۔ دوسری صورت میں ان کی طرف سے فوراً اغوا کی ایف آئی آر کٹوا دی جائے گی اور آپ لوگوں کے لیے اپنی جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔'' ولی بھی کھڑا ہو گیا اور دھیمے لیکن فیصلہ کن لہجے میں ثاقب کی طرف دیکھتے ہوئے اسے دھمکی سے نوازا۔

''فکر مت کریں سر! آئندہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'' ثاقب صرف اس کا کارڈ دیکھ کر تیر کی طرح سیدھا ہو چکا تھا۔

''مجھے کوئی فکر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے، تم اپنی فکر کرو۔'' ولی نے اسے جھڑکنے والے لہجے میں کہا اور باہر

ہوشیار شوہر

گھریلو جھگڑے کے بعد بیوی نے اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیئے۔

شوہر نے پوچھا۔ ''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' بیوی نے جواب دیا۔ ''اپنی ماں کے گھر۔''

تھوڑی دیر کے بعد شوہر نے بھی اپنے کپڑے بکس میں رکھنا شروع کر دیا۔

جس پر بیوی نے پوچھا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟'' شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''اپنی ماں کے گھر۔''

بیوی نے سوال کیا۔ ''اور بچوں کا کیا ہوگا؟'' شوہر نے جواب دیا۔

''جب تم اپنی ماں کے یہاں جا رہی ہو اور میں اپنی ماں کے یہاں تو میرا خیال ہے کہ بچے بھی اپنی ماں کے یہاں جائیں گے۔''

دکانداری

عید گزر چکی تھی۔ سیزن ٹھنڈا تھا۔ قمر لبے بازار میں گھوم رہے تھے۔ ایک جگہ انہیں فٹ پاتھ پر ڈبلے ہینگر پر بہت سے کوٹ نظر آئے۔ انہوں نے دیکھ بھال کر ایک عمدہ کوٹ کا انتخاب کیا اور اسے لے کر دکان میں چلے گئے۔ دکاندار کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ قمر لبے نے کوٹ اس کے سامنے ڈالا۔ دکاندار نے بے زاری سے قمر لبے کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور بولا۔ ''زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو۔''

قمر لبے بھونچکا رہ گئے۔ اتنا شاندار کوٹ اور اتنا سستا! جھٹ ڈیڑھ سو نکال کر دکاندار کے سامنے ڈال دیے۔

نوٹ دیکھ کر دکاندار چونکا ہوا اور پھر صورتِ حال سمجھ میں آتے ہی اس نے قمر لبے سے کوٹ جھپٹ لیا۔ ''اب رکھ اسے یہاں اور اٹھا اپنے پیسے...... دو ہزار کا کوٹ ڈیڑھ سو میں لینے آیا ہے۔''

''ابھی تم ہی نے اس کے ڈیڑھ سو بتائے تھے۔'' قمر لبے نے احتجاج کیا۔

''ہاں، بتائے تھے...... یہ سمجھ کر کہ تو یہ کوٹ بیچنے آیا ہے...... مجھے کیا پتا کہ تو خریدار ہے۔''

بنگلا دیش سے خرم علیم کی عنایت

نکل گیا۔ سائرہ پہلے ہی بچوں سمیت باہر جا چکی تھی۔

''بہت مطلبی اور موقع پرست لوگ لگتے ہیں دانش صاحب کے گھر والے۔'' راستے میں ولی نے تبصرہ کیا۔

''ہاں بس دانش ہی اپنی فیملی سے مختلف تھے اور میں ان کی خاطر ان لوگوں سے اب تک تعلق نبھاتی رہی ہوں۔'' اس نے تائید کی اور پھر ولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ کا بہت شکریہ! آپ کی وجہ سے مجھے ان لوگوں سے نمٹنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی ورنہ یہ اتنی آسانی سے بچوں کو میرے حوالے نہیں کرتے۔''

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے پڑوسی ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ بس اب آپ احتیاط سے کام لیں اور اسکول والوں کو ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ اسکول سے آپ کے سوا کسی کے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' ولی نے اسے ہدایت دی۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے، یہ دونوں کام تو مجھے کرنے ہی پڑیں گے۔'' اس نے پچھلی نشست پر بیٹھے بچوں کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دن بھر کے تھکے ہارے بچے ابھی تک اسکول یونیفارم میں ہی تھے اور گاڑی کی آرام دہ نشست پر بیٹھے تقریباً غنودگی میں چلے گئے تھے۔ گاڑی رکی تو وہ چونک کر اٹھ گئے۔

''گھر آ گیا؟'' اردگرد دیکھتے ہوئے طلحہ بولا۔

''بالکل آ گیا۔ اب آپ لوگ باقی آرام اپنے گھر جا کر کریں۔ مجھے اپنی گاڑی میں واپس دفتر جانا ہے۔'' ولی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اوفوہ، ولی انکل! آپ کتنا آفس جاتے ہیں۔ اس سے اچھا تو آپ آفس میں ہی گھر بنا لیں۔'' طلحہ نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے اعتراض کے ساتھ تجویز پیش کی تو ولی ہنس دیا اور بولا۔

''تم تو میری بیوی بننے کی کوشش کر رہے ہو یار۔''

''میں کیسے آپ کی بیوی بن سکتا ہوں۔ میں تو بوائے ہوں اور بیوی گرل ہوتی ہے جیسے مما ہیں۔ ایسا کریں آپ مما کو بیوی بنا لیں۔'' ناسمجھی میں کہے گئے اس کے یہ الفاظ سائرہ کو سخت شرمندہ کر گئے۔

''فضول مت بولو طلحہ! بہت بدتمیز ہو گئے ہو۔ گھر چلو میں تمہیں ان فضول باتوں کا مزہ چکھاتی ہوں۔'' شرمندگی غصے میں ڈھل گئی اور وہ سخت لہجے میں طلحہ کو ڈانٹنے لگی۔

''اٹس اوکے سائرہ! بچہ ہے ناسمجھی میں ایک بات کہہ بیٹھا ہے، آپ اسے اطمینان سے سمجھا سکتی ہیں۔'' اس کے غصے کو دیکھتے ہوئے ولی نے اسے ٹوکا اور جب وہ بچوں سمیت گاڑی سے اتر گئی وہ ہاتھ ہلاتا ہوا وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سائرہ کو ایک بار پھر اس کی سابقہ بیوی کی بدنصیبی پر افسوس ہوا جو اتنے نفیس اور شائستہ آدمی کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

''ہیلو سائرہ! کیا آپ اس وقت میرے آفس آ سکتی ہیں؟'' لنچ ٹائم سے کچھ پہلے سائرہ کو ولی کی کال موصول ہوئی۔

''کیوں خیریت تو ہے؟'' اس نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

''لاہور میں ہونے والی ایک بینک ڈکیتی میں ہمیں ایک بندے کی فوٹیج ملی ہے۔ اس بندے کی شکل آپ کے بنوائے ہوئے خاکے سے کافی مشابہ ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ آپ دیکھ کر کنفرم کر دیں۔ میں آپ کو تصویر واٹس ایپ کر دیتا لیکن رازداری کی وجہ سے نہیں کر رہا۔ آج کل کچھ بھی محفوظ نہیں ہے اور میں نہیں چاہتا کہ مجرموں کو بھاگنے کا موقع مل سکے۔'' ولی نے اسے بتایا۔

''ٹھیک ہے میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' اس کی دھڑکنیں اس اطلاع پر مزید تیز ہو گئیں اور اس نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔ لنچ ٹائم کی وجہ سے اسے دفتر سے نکلنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ ولی کے آفس میں بیٹھی تصدیق کر رہی تھی کہ فوٹیج میں نظر آنے والا شخص توقیر ہی ہے۔ ڈکیتی کی اس واردات میں بھی اس نے نقاب لگا رکھا تھا لیکن اس کا نقاب پل بھر کے لیے کسی وجہ سے ہٹ گیا تھا اور بینک میں موجود کیمرے نے اس کی تصویر محفوظ کر لی تھی۔

''یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اتفاق سے اس ڈکیتی سے متعلق ہمارے محکمے کو کچھ کلیوز ملے ہیں اور پوری امید ہے کہ مجرم گرفتار ہو جائیں گے۔ توقیر کی گرفتاری عمل میں آ گئی تو دانش کے قاتل ہی نہیں ملک و قوم کے دشمن بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں گے۔'' ولی بہت پُرامید نظر آ رہا تھا۔ سائرہ کو بھی امید ہو چلی تھی کہ اب دانش کے قاتل زیادہ دن آزاد نہیں رہ سکیں گے۔ اس رات وہ بہت دنوں بعد سکون کی نیند سوئی۔ دو دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ ان دو دنوں میں ولی اسے نظر نہیں آیا۔ طاہرہ خاتون کو بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ ولی کے اس

طرح کے معمولات کی عادی تھیں لیکن ایک ماں کی حیثیت سے پریشانی فطری بات تھی۔ اپنی اس پریشانی کے حل کے لیے وہ زیادہ وقت جائے نماز پر بیٹھی دعا کرتی نظر آتی تھیں۔ سائرہ بھی اپنے دل میں اس کی کامیابی اور بہ سلامت واپسی کی دعا کرتی رہی۔ اسے یقین سا تھا کہ ولی توقیر والے کیس پر ہی کام کر رہا ہے۔ دو دن بعد اسے ولی کی کال موصول ہوئی تو وہ اس کے بلانے پر ایک بار پھر اس کے آفس پہنچ گئی۔ ولی کو دیکھ کر اسے جھٹکا سا لگا۔ اس کا حلیہ خاصا ابتر ہو رہا تھا۔ ملگجا لباس، بے ترتیب بال اور سرخ آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ گزرے دو دنوں میں اس نے بالکل بھی آرام نہیں کیا ہے۔

''ہم نے توقیر کو گرفتار کر لیا ہے لیکن توقیر کے بجائے ریاض کے نام سے اس کی شناخت سامنے آئی ہے۔ آپ ایک بار خود دیکھ کر تصدیق کر دیں کہ یہ شخص وہی توقیر ہے یا نہیں جسے آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ دیکھا تھا۔'' سائرہ کو سامنے پا کر ولی نے کہا اور پھر اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت سائرہ نے کہنی تک فولڈ کی ہوئی اس کی دائیں آستین کے اندر سے سفید بینڈیج کی جھلک دیکھی۔

''آپ کے ہاتھ پر کیا ہوا ہے ولی؟'' اس نے بے ساختہ ہی بے قراری سے پوچھا۔

''کچھ نہیں گولی چھوتی ہوئی نکل گئی ہے، ایک دو دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیسے لگی گولی؟'' سائرہ نے قدموں کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''ڈاکوؤں سے پانچ گھنٹے مقابلہ کرنے کے بعد ہم ان میں سے دو کو زندہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں باقی کے چار مارے گئے۔ وہ لاہور کی ایک نواحی بستی میں چھپے ہوئے تھے اور ان کے پاس عام ڈاکوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ اسلحہ موجود تھا۔ مجبوراً میری ٹیم کو بھی بھاری اسلحہ استعمال کرنا پڑا۔ یہ تو اتفاق ہی ہے کہ دو بندے زندہ ہاتھ آ گئے ورنہ اس طرح کے مقابلوں میں عموماً سارے دہشت گرد مارے جاتے ہیں اور ہم خواہش کے باوجود زندہ افراد کو گرفتار نہیں کر پاتے۔ اصل میں یہ لوگ ہمیشہ سر پر کفن باندھ کر لڑتے ہیں اور گرفتاری دینے کے مقابلے میں جان دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کیس میں تو میں نے اپنی ٹیم کے ہر رکن کو توقیر کے سلسلے میں خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی اس لیے وہ زندہ گرفتار ہو پایا ہے لیکن زخمی ہے۔'' تہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے ولی نے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔ تہ خانے میں بھی مکمل عمارت موجود تھی اور کئی کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ولی نے ایک دروازے کا قفل کھول کر سائرہ کو اپنے ساتھ اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر پہنچی تو سامنے بیڈ پر بند آنکھوں کے ساتھ لیٹے شخص کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس شخص کی رنگت میں زردی گھلی ہوئی تھی اور بیڈ کے ساتھ رکھے اسٹینڈ سے گلوکوز کی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ دائیں ہاتھ کی رگ میں پیوست سوئی سے قطرہ قطرہ گلوکوز کا محلول اس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ اس کے دونوں پیروں پر بینڈیج تھی جس پر بڑے بڑے خون کے سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ سائرہ نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو غور سے دیکھا اور تصدیق کر دی کہ یہی شخص توقیر ہے۔ شناختی عمل سے گزر کر ولی واپس اسے اوپر لے آیا۔

''کیا اس نے دانش کے قتل کا اعتراف کر لیا ہے؟'' سائرہ نے دریافت کیا۔

''ابھی اس سے تفتیش کا آغاز نہیں ہوا ہے۔ آپ نے اس کی حالت دیکھی ہی ہے۔ اس کے دونوں پیروں میں گولیاں لگی ہیں اور خون بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اصولاً اسے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے اپنے اختیارات استعمال کر کے اسے آپریشن کے چند گھنٹوں بعد ہی لاہور سے یہاں شفٹ کروا لیا ہے۔ ہمارا ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ ایک آدھ دن میں اس سے تفتیش کا آغاز ہو جائے گا۔ اسپتال میں رہتا تو ڈاکٹر دس طرح کی احتیاطیں بتاتے اور وقت ضائع ہوتا۔ دوسرے ڈر اس کے ساتھیوں کی طرف سے تھا۔ خود کو بچانے کے لیے یہ لوگ اسپتالوں میں اپنے بندوں کو ہلاک کروانے سے بھی نہیں چوکتے۔''

''بہت ہی بے ضمیر لوگ ہوتے ہیں یہ دہشت گرد۔'' سائرہ نے جھرجھری سی لی۔

''ہاں لیکن افسوس کہ انہیں اپنی اس بے ضمیری کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اپنے تئیں یہ کوئی نیک کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اصل میں ان کی برین واشنگ ہی کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ انہیں غلط بھی ٹھیک نظر آتا ہے۔ ہمارے دشمنوں کی یہ حکمت عملی ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ ہمارے لوگوں کو ہی ہتھیار بنا کر ہمیں ہلاک کر رہے ہیں اور دنیا میں بدنامی بھی ہماری ہی ہے کہ ہم شدت پسند اور دہشت گرد ہیں۔'' وہ بہت دکھی نظر آ رہا تھا۔ ایک ایسی جنگ لڑنا جس میں اپنوں ہی سے مقابلہ کرنا پڑتا

تھا واقعی بہت اعصاب شکن تھا لیکن اس کے سوا کوئی حل بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

"نانو! آج ہم ثوبیہ آنٹی سے اسکائپ پر بات کریں گے۔ ان کا بے بی بہت پیارا ہے۔ ہمیں اسے دیکھنا ہے۔" زویا نے طاہرہ خاتون سے فرمائش کی۔ جدید دور کے وہ بچے پاکستان میں بیٹھے بیٹھے طاہرہ خاتون کی بیرونِ ملک مقیم بیٹی سے بھی تعلقات بنا چکے تھے اور اس کے چند ماہ کے بیٹے پر دل وجان سے فدا تھے۔

"نانو کو بالکل تنگ نہیں کرنا ہے۔ واپس آنے کے بعد میں آپ لوگوں کی کوئی کمپلین نہ سنوں۔" سائرہ نے پرس میں اپنا موبائل رکھتے ہوئے بچوں کو ہدایت کی۔ آج ان کے اسکول میں کوئی اتفاقی چھٹی تھی اور آج ہی سائرہ کو توقیر کے سلسلے میں گواہی کے لیے عدالت جانا تھا۔ توقیر نے تفتیش کے دوران اعتراف کرلیا تھا کہ دانش کے قتل میں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا ہی ہاتھ ہے۔ دانش کی اچھی فطرت کی وجہ سے وہ اس کے اپنے راز سے واقف ہوجانے پر بھی فوری طور پر اسے قتل کرنے کا فیصلہ نہیں کرسکا تھا اور دھمکیوں سے ہی اس کی زبان بند رکھنے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب بھی رہا تھا لیکن جب اس نے اپنے ایک ساتھی سے یہ معاملہ شیئر کیا تو اس نے دانش کو ایک خطرہ قرار دیا جو توقیر کے ذریعے ان کی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔ وہ اپنے رازوں سے باہر کے کسی بندے کے واقف ہونے کے بالکل قائل نہیں تھے چنانچہ دانش کی موت کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس روز دانش، سائرہ کے ساتھ دفتر گیا تو توقیر ان کا پیچھا کررہا تھا۔ وہ دفتر کے باہر دانش کا انتظار کرتا رہا اور جب دانش دفتر سے باہر آیا تو یوں اس کے سامنے پہنچا جیسے اتفاقاً اس سے ملاقات ہوگئی ہو۔ اس نے دانش سے لفٹ مانگی اور دانش نے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھالیا۔ عام راستوں پر ٹریفک جام کے بہانے اس نے دانش کو کورنگی انڈسٹریل ایریا والے راستے سے چلنے کی ترغیب دی اور پھر ادھوری تعمیر شدہ ویران فیکٹری کے سامنے توقیر کے ساتھیوں نے دانش کو چھاپ لیا۔ وہ دانش کو عمارت کے اندر لے گئے اور اپنی جنونی فطرت کی تسکین کے لیے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے خوب تشدد کا نشانہ بنایا، ساتھ ہی اس سے یہ بھی پوچھتے رہے کہ اس نے توقیر کے متعلق کسی کو کچھ بتایا تو نہیں ہے۔ سب سے زیادہ انہیں یہ شک تھا کہ دانش نے اپنی بیوی کو ضرور بتایا ہوگا لیکن دانش نے اس کی تردید کی۔ اپنا اطمینان ہوجانے پر انہوں نے دانش کو ہلاک کردیا اور یہ کام خود توقیر نے اپنے ہاتھ سے کیا۔ اس نے ہی دانش کے پیٹ پر چاقو کا وہ مہلک وار کیا تھا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ بعد میں بھی توقیر نے اپنے ساتھی کی مدد سے سائرہ کی نگرانی اور گھر کی تلاشی کے ذریعے مزید اطمینان کرلیا کہ دانش کے مرنے کے بعد اس کے لیے کوئی خطرہ تو باقی نہیں رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ دانش ایک ادھورے مسودے کی شکل میں اپنے قاتل کی نشاندہی کرگیا ہے اور اس کی ذہین اور بہادر بیوی نے قاتل کو انجام تک پہنچانے کا فیصلہ بھی کرلیا ہے۔ بینک ڈکیتی والے معاملے میں شاید وہ بچ نکلتا لیکن دہشت گردی کے چکر میں ولی کے ذریعے اس کا خاکہ پہلے ہی ہر جگہ پہنچ چکا تھا اسی لیے زیادہ شدومد سے اسے اور اس کے ساتھیوں کو تلاش کیا گیا اور آج وہ دن تھا جب اسے عدالت کے روبرو پیش ہونا تھا اور سائرہ کو بھی ایک گواہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضری دینی تھی۔ اس وقت وہ عدالت جانے کی تیاری کررہی تھی اور بچوں کی طرف سے مطمئن تھی کہ طاہرہ خاتون ان کا خیال رکھیں گی۔

"یہ بہت پیارے بچے ہیں سائرہ اور میں ان سے بالکل بھی تنگ نہیں ہوتی ہوں۔ تم بے فکری سے جاؤ اور خیریت سے اپنا کام نمٹا کر آؤ۔ تب تک ہم تینوں مل کر مزے کریں گے۔" طاہرہ خاتون نے اسے بچوں کو ٹوکتے دیکھ کر بچوں کی طرف داری کی تو بچے کھل اٹھے۔ ایسی محبت و شفقت انہیں پہلی بار مل رہی تھی۔ ددھیال والوں نے بھی انہیں ایسی اہمیت دی ہی نہیں تھی اور ننھیال دور تھا جہاں کبھی کبھار ہی جانے کی وجہ سے وہ زیادہ بے تکلف نہیں تھے۔

"ٹھیک ہے خالہ جان، جیسی آپ کی خوشی۔ مجھے اجازت دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ میں لیٹ ہوجاؤں اور ولی کو شکایت ہو۔" اس نے اپنا بڑا سا دوپٹا قرینے سے اوڑھا اور پرس کندھے سے لٹکا کر جانے کے لیے بالکل تیار ہوگئی۔

"جاؤ بیٹی! اللہ کی امان میں۔" طاہرہ خاتون نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ ان کے خلوص کو محسوس کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل دانش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ بہت اچھا انسان تھا اور اس کے ساتھ نے سائرہ کو بہت خوشیاں دی تھیں۔ اس کا ساتھ چھوٹنے پر وہ بہت دکھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش توقیر کی حقیقت آشکار ہوجانے کے بعد دانش اس کی دھمکیوں سے خوف زدہ ہوکر خاموشی اختیار کرلینے کے

بجائے کسی بااختیار ادارے کے فرد سے رابطہ کرنے کی ہمت کرلیتا تو شاید وہ سب نہ ہوتا جو ہوا اور توقیر پہلے ہی قانون کی گرفت میں آجاتا۔ اپنی ان سوچوں میں وہ اتنی مگن تھی کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ اس کی روانگی کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل اس کے پیچھے لگ چکی ہے۔ اس موٹر سائیکل پر دو نوجوان لڑکے سوار تھے اور پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ نائن ایم ایم کا ایک پسٹل اس طرح اپنے اور اپنے ساتھی کے درمیان چھپا رکھا تھا کہ دور سے دیکھنے والوں کو اس کے مسلح ہونے کا احساس بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ سائرہ کی گاڑی موڑ کاٹ کر ایک قدرے کم رش والی سڑک پر پہنچی تو موٹر سائیکل کی رفتار بڑھ گئی اور وہ لوگ اس کے عقب سے نکل کر بالکل گاڑی کے متوازی چلنے لگے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے اپنا پسٹل باہر نکال کر اس کا رخ سائرہ کی طرف کیا تو اتفاقاً اس کی نظر پڑ گئی۔ نہایت دہشت کے عالم میں اس نے بے اختیار ہی اپنی گاڑی کو بریک لگا دیے۔ سیکنڈ کے دسویں حصے میں فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی اور وقت کا یہ مختصر دورانیہ ہی سائرہ کی زندگی بچا گیا۔ لڑکے کے ٹریگر دبانے تک سائرہ کی گاڑی رک چکی تھی اور موٹر سائیکل آگے بڑھ گئی تھی اس لیے نشانہ خطا ہوگیا تھا۔ ایک تو سائرہ کا چلتی ہوئی سڑک پر یک دم گاڑی روک لینا اوپر سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ، وہاں عجیب سا بھونچال آگیا۔ پیچھے سے آنے والی ایک گاڑی بریک لگاتے لگاتے بھی سائرہ کی گاڑی کو تھوڑا سا ٹچ کرگئی۔ اسے ہلکا سا دھچکا لگا لیکن اس دھچکے کا احساس دوبارہ ابھرنے والی گولیوں کی تڑتڑاہٹ نے زائل کردیا۔ اسے لگا کہ حملہ آور نے ایک بار پھر اسے نشانہ بنانے کی کوشش کی ہے لیکن جب کوئی گولی آکر اسے نہیں لگی اور اس نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ دونوں موٹر سائیکل سوار لڑکے اپنے ہی خون میں لت پت سڑک پر پڑے تھے اور ان کی موٹر سائیکل الٹی پڑی تھی۔ وہ دہشت زدہ سی یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اس کے آس پاس موجود دیگر گاڑیوں والوں کی بھی کم و بیش یہی حالت تھی اور ٹریفک کی روانی معطل ہوچکی تھی۔

”آر یو او کے سائرہ!“ اس نے اپنے بہت قریب سے سنائی دینے والی آواز پر سر اٹھا کر دیکھا تو اسے ولی کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس کی طرف والی کھڑکی پر جھکا فکرمندی سے اس کی خیریت دریافت کررہا تھا۔ اس نے بمشکل اثبات میں اپنا سر ہلا کر اسے اپنی خیریت سے آگاہ کیا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہوکر ولی اپنے موبائل پر کسی سے رابطہ کرنے لگا۔ پہلے وہاں پولیس پہنچی اور پھر ولی کے محکمے کے افراد بھی پہنچ گئے۔ اس دوران ولی، سائرہ کو اپنی گاڑی میں منتقل کرچکا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے آکر پولیس کے ساتھ وہاں کے معاملات سنبھالے تو وہ سائرہ کو لے کر روانہ ہوگیا۔ انتظار کے دورانیے میں اس نے کسی سے سائرہ کے لیے جوس منگوا کر اسے پینے کے لیے دے دیا تھا اور اب وہ قدرے سنبھل چکی تھی۔ ولی اسے بتانے لگا۔

”میں کسی کام سے دومنٹ کے لیے گھر آیا تھا۔ امی نے بتایا کہ آپ ابھی ابھی نکلی ہیں۔ میں جلدی میں تھا اور تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا اس لیے وقت کے فرق کے باوجود میں اس وقت اس جگہ پر آپہنچا جب وہ لڑکا آپ پر فائر کررہا تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر ایک لمحے کے لیے تو میں بھی گڑبڑا گیا تھا کہ شاید آپ نشانہ بن گئی ہیں لیکن آپ کا بروقت بریک لگانا آپ کی زندگی بچا گیا۔ ناکام ہونے پر وہ دوبارہ آپ پر فائر کھول سکتا تھا اسی لیے میں نے دیگر گاڑیوں کی موجودگی کے باوجود خطرہ مول لیتے ہوئے ان دونوں پر فائر کھول دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ محفوظ رہیں اور کسی دوسرے شخص کو بھی نقصان نہیں ہوا۔“ گاڑی چلاتے ہوئے ولی اسے تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔ سائرہ کی گاڑی کو اس نے ورکشاپ پہنچانے کی ہدایت کردی تھی۔ اس کے پچھلے حصے کو نقصان پہنچا تھا اور مرمت کی ضرورت تھی۔

”مگر یہ کون لوگ تھے جنہوں نے مجھ پر یوں سرعام قاتلانہ حملہ کر ڈالا؟“ سائرہ ابھی تک مکمل طور پر حادثے کے اثرات سے نہیں نکل سکی تھی اور اس کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

”یقیناً یہ توقیر کے ساتھی ہوں گے جو نہیں چاہتے کہ آپ عدالت کے روبرو توقیر کو شناخت کریں اور اس کے خلاف کچھ بولیں۔“ ولی نے اندازہ لگایا۔

”لیکن ان لوگوں کو کیسے معلوم ہوا کہ میں گواہی دینے عدالت جارہی ہوں؟“ سائرہ کی ذہانت سوال اٹھانے سے کیسے چوک سکتی تھی۔

”مجھے نہایت شرمندگی سے اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس میں میرے محکمے ہی کی کوئی کالی بھیڑ شامل ہوگی۔ ان دہشت گردوں نے ہمارے ملک میں اپنے پنجے اس طرح گاڑ لیے ہیں کہ کوئی بھی محکمہ مکمل طور پر ان سے محفوظ نہیں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ ہمیں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے لیکن پھر بھی کبھی نہ کبھی ان کا داؤ چل جاتا ہے۔

بہر حال مجھے اور مجھ جیسا جذبہ رکھنے والے میرے دوسرے ساتھیوں کو زندگی کی آخری سانس تک یہ جنگ جاری تو رکھنی ہی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے اپنی سرزمین سے دہشت گردی اور دہشت گردوں کی جڑیں اکھاڑنی ہی ہوں گی۔“ وہ بہت پُرعزم تھا۔ سائرہ متاثر سی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”اب آپ کیا کہتی ہیں۔ آپ توقیر کے خلاف گواہی دینے عدالت جائیں گی یا نہیں؟“

”آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا؟“ ولی کے پوچھنے پر سائرہ چونک گئی۔

”میں نے سوچا کہ کہیں آپ اس حملے سے ڈر نہ گئی ہوں۔ آپ اپنے بچوں کے لیے سنگل پیرنٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کو یہ ڈر ہوسکتا ہے کہ آپ کے بعد آپ کے بچے کیا کریں گے۔ انسان اپنی زندگی کی پروا کرے یا نہ کرے بچوں کے لیے ضرور ڈرتا ہے۔“ اس نے نہایت صاف گوئی سے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ دانش بھی اسی بات سے ڈرتے تھے اور شاید میں بھی ڈر جاتی اگر میری آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ آپ نے اس ملک کی خاطر اپنی ازدواجی زندگی قربان کردی۔ آپ کے اپنے بچے نہیں ہیں پھر بھی آپ کو فکر ہے کہ اپنے ملک کے بچوں کو دہشت گردی سے پاک سرزمین دے سکیں تو پھر میں کیسے اس جنگ سے دستبردار ہوسکتی ہوں۔ آج مجھے موت سے ڈر نہیں لگ رہا کہ مجھے علم ہوگیا ہے کہ اس ملک میں آپ جیسے ایسے چند لوگ موجود ہیں جنہیں اس ملک کے بچوں کی فکر ہے اور اللہ ایسے ہی لوگوں کے سہارے میرے بچوں کو بھی پروان چڑھا دے گا۔ اصل پالنے والی تو اللہ ہی کی ذات ہے نا وہ چاہے جس سے یہ کام لے لے۔“ سائرہ نے پہلے کبھی اللہ کی ذات پر اتنا بھروسا نہیں کیا تھا لیکن آج ایک انسان کی مضبوط شخصیت و کردار نے اس کا اللہ پر یقین مضبوط کردیا تھا۔

”ویری گڈ! آپ کے اس فیصلے سے مجھے خوشی ہوئی اور اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم یہ جنگ جیت کر رہیں گے۔ جس ملک کی عورت اتنی بہادر اور باہمت ہے اس ملک کو تو قائم رہنا ہی رہتا ہے۔“ ولی نے اس کے فیصلے کو سراہا تو وہ مسکرا دی۔

☆☆☆

کمرائے عدالت میں سائرہ نے توقیر کو پہچان لیا۔ وہ ماضی کے مقابلے میں خاصا کمزور لگ رہا تھا۔ اتنے دن حراست میں رہ کر خصوصی تفتیش کا سامنا کرنا آسان بات نہیں تھی پھر اسے دونوں پیروں میں گولیاں بھی لگی تھیں۔ وہ زخم ٹھیک ہوگئے تھے لیکن وہ اب بھی واکر کے سہارے کھڑا ہوا تھا۔ سائرہ کو اس کی حالت پر افسوس ہوا کہ غلط راہ پر چل کر اس نے عین جوانی میں اپنی زندگی برباد کرلی تھی۔ اس جیسے اور بھی کئی تھے جو اپنے تئیں کسی کاز کی خاطر جدوجہد کررہے تھے لیکن اصل میں وہ اپنی اور دوسروں کی زندگیاں تباہ کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ توقیر بینک ڈکیتی کی وارداتوں میں بھی اسی لیے ملوث ہوا تھا کہ انہیں اپنی تنظیم کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ لوٹ مار کی ان وارداتوں کو وہ فنڈ ریزنگ کا نام دیا کرتے تھے۔ عدالت کی کارروائی شروع ہوئی اور توقیر کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی، جواب میں دورانِ تفتیش دیے گئے اپنے بیان کے بہت سے حصوں سے وہ منحرف ہوگیا۔ اس نے کہا کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ رہ رہا تھا وہ ڈاکو یا دہشت گرد ہیں۔ انہوں نے اسے گھریلو کام کاج کے لیے رکھا تھا۔ ڈاکے والے دن اسے اس بہانے سے اپنے ساتھ بینک لے گئے تھے کہ انہیں وہاں کوئی چیک جمع کروانا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی بینک منیجر سے ہونے والے ایک جھگڑے کی وجہ سے اندر نہیں جانا چاہتا۔ ملازم ہونے کے سبب اسے اپنے مالکان کی بات ماننی پڑی اور بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ انہوں نے بینک ڈکیتی کی ایک واردات میں اپنے ساتھ ملوث کرلیا ہے۔ اپنے ساتھ دھوکا دہی کی بنیاد پر اس نے عدالت سے نرم سلوک کی بھی درخواست کی۔ دانش کے قتل سے وہ سرے سے منحرف ہوگیا اور کہا کہ وہ مدت سے لاہور میں رہ رہا ہے اور دانش کو بالکل نہیں جانتا۔ دانش کی کسی توقیر سے دوستی تھی جبکہ وہ ریاض ہے۔ توقیر کے اس طرح کے بیان پر سائرہ کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ مجرموں کا اس طرح عدالت کے روبرو اپنے سابقہ بیان سے منحرف ہو جانا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ توقیر کے بیان کے باوجود اس نے گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر اسے شناخت کیا اور کہا کہ اسے پورا یقین ہے کہ یہی شخص اس کے شوہر کے قتل کا ذمے دار ہے۔ اس مرحلے پر اس نے توقیر کی سخت نظروں اور اس کے وکیل کے استہزائیہ ریمارکس کی بھی پروا نہیں۔ توقیر کے وکیل نے اسے ایک خبطی عورت قرار دیا تھا جو کہانیوں کی دنیا میں رہتی تھی اور جس نے اپنے شوہر کی لکھی تخیلاتی کہانی کو حقیقت سمجھ

لیا تھا۔ وکیل کے ایسے تبصرے پر سائرہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور عدالت کے روبرو اپنی زبان سے کوئی غلط بات نہیں نکلنے دی۔ استغاثہ کے وکیل نے وکیلِ صفائی کے اس رویے پر آبجیکشن کیا اور دلیل دی کہ اگر توقیر یا ریاض وہ شخص نہیں ہے جو سائرہ کے شوہر دانش کے قتل میں ملوث تھا تو پھر آج سائرہ کو عدالت میں حاضر ہونے سے روکنے کی کوشش کیوں کی گئی اور اس پر قاتلانہ حملہ کیوں کروایا گیا؟ وکیلِ صفائی نے اس اعتراض کو ہوشیاری سے رد کر دیا اور شک کا اظہار کیا کہ ہو سکتا ہے ان لوگوں نے اپنے کیس میں جان ڈالنے کے لیے خود یہ حملہ کیا ہو کیونکہ قاتلانہ حملہ کرنے والے دونوں موٹر سائیکل سوار تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے تھے اور کوئی گواہی دینے والا نہیں تھا کہ ان لڑکوں کو اس کام کے لیے کس نے ہائر کیا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کارروائی کے لیے دانش ہی کی غائب شدہ موٹر سائیکل استعمال کی گئی تھی۔ عدالت کے ایک کونے میں بیٹھا ولی یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ اس کے وکیل نے ایک اور گواہ عدالت کے روبرو پیش کرنے کی اجازت چاہی تو وہ مسکرا دیا۔ گواہ کی حیثیت سے کٹہرے میں آنے والے اس سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے سے سائرہ بھی واقف نہیں تھی۔ وکیل نے اس لڑکے کا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ اس ادھوری تعمیر شدہ فیکٹری کا چوکیدار ہے جہاں دانش کو قتل کیا گیا تھا۔ صالح خان نامی اس گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور بتانے لگا۔

”میڈم نے ام کو فیکٹری کی حفاظت کے لیے چوبیس گھنٹے کا ملازم رکھا ہوا تھا پر تنخواہ بہت کم دیتا تھا کہ تم کو ادھر کرنا کچھ نہیں ہے اور بس آرام سے رہنا ہی ہے۔ ام اپنے گاؤں سے روزگار کے لیے آیا تھا۔ ادھر امارا زیادہ جان پہچان نہیں تھا اس لیے کم تنخواہ پر بھی نوکری کر لیا۔ بعد میں امارا تعلقات بنا تو ایک دوسری فیکٹری کے چوکیدار نے ام کو مشورہ دیا کہ دن کے ٹیم (ٹائم) ام اس کی فیکٹری میں لوڈر کا کام کر لے۔ اس نے بولا کہ وہ امارا ساتھ دے گا اور چائے اور کھانے کے وقفے میں ام کو فیکٹری سے باہر جانے دے گا تاکہ ام میڈم والا فیکٹری کا بھی راؤنڈ مار لے، ادھر امارا نوکری کا ٹیم چار بجے ختم ہو جاتا تھا لیکن کبھی کبھی ام چار بجے سے پہلے بھی چھٹی کر لیتا تھا۔ اکیس دسمبر کو بھی ام پونے چار بجے چھٹی کر کے میڈم والا فیکٹری کی طرف چل پڑا۔ فیکٹری کے باہر تین موٹر سائیکل کھڑا دیکھ کر امارا ماتھا ٹھنکا۔ مالک لوگ میں سے کوئی ادھر آیا ہوتا تو گاڑی میں آتا۔ ام کو لگا کہ یہ کوئی لونڈا لوگ ہے جو نشے یا موج مستی کے چکر میں فیکٹری کو خالی دیکھ کر اس میں گھس گیا ہے۔ ام اپنا سامان فیکٹری کے تہ خانے میں تالا لگا کر رکھتا تھا اور سوتا بھی وہیں تھا اس لیے کسی کو امارے وہاں رہنے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ امارا بندوق بھی نیچے تہ خانے میں ہی رکھا تھا۔ ہم جس دوسرا فیکٹری میں کام کرتا تھا ادھر ہتھیار ساتھ لے جانے کا اجازت نہیں تھا۔ ام باہر پڑا لکڑی کا ایک ڈنڈا اٹھایا اور چپکے سے اندر چلا گیا۔ ام نے سوچا تھا کہ لڑکا لوگ کو تو ام اس ڈنڈے سے بھی قابو کر لے گا کہ شہری لوگ امارا طرح جاندار نہیں ہوتا۔ آوازوں کو سن کر ام ایک ہال کی طرف گیا اور چپکے سے اندر جھانکا تو چکرا کر رہ گیا۔ ادھر تین بندوں نے ایک اکیلے بندے کو گھیرا ہوا تھا اور اس بندے کی حالت سے پتا چل رہا تھا کہ اس پر بڑا سختی کیا گیا ہے۔ ظالموں نے اس بے چارے کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز نہ نکلنے پائے۔ ام اتفاق سے وہاں پہنچا تو تھا لیکن اس لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ ان تینوں بندوں کے پاس ہتھیار تھا۔ ام ایسا گھبرا گیا کہ باہر جا کر کسی سے مدد مانگنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی وقت ان تینوں میں سے ایک جس نے کالے رنگ کا کوٹ پتلون، کالا جوتا اور کالا ہی اونی ٹوپی لگایا ہوا تھا اپنی پتلون کے پائچے کے نیچے سے چاقو نکالا اور زخمی آدمی سے بولا۔

’اچھا دانش صاحب اب الوداع! تم زندہ رہے تو میرے لیے ہمیشہ خطرہ ہی بنے رہو گے۔‘ اپنی بات بولتے کے ساتھ ہی اس نے زمین پر پڑے اس آدمی کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا۔ چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے لیکن امارا دماغ سے ابھی تک وہ منظر نہیں نکلا۔ وہ بے چارہ مظلوم آدمی زمین پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا اور قاتل کے چاقو سے اس کا تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس ظالم آدمی نے تڑپتے بندے کے سر پر اپنے جوتے سے زور سے ٹھوکر لگایا اور اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے چلنے کا بولا۔ ان تینوں کو نکلتا دیکھ کر ام جلدی سے چھپ گیا اور جب ان کی موٹر سائیکلیں جانے کی آواز آئی تب ام باہر آیا۔ اس ٹیم ام پر ایسا گھبراہٹ طاری تھا کہ اماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ام دو تین گھنٹے پاگلوں کی طرح سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ امارا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ فیکٹری سے لاش نکلنے پر ام کیا جواب دے گا۔ کچھ سمجھ نہیں پڑا تو ام میڈم کے پاس پہنچ گیا اور اسے سب سچ بتا دیا۔ میڈم نے ام کو اماری حرکت پر بہت ڈانٹا پھر بولا کہ تمہارا بہتری اسی میں ہے کہ اب تم اس فیکٹری کا رخ نہ کرو۔ مجھ سے کوئی معلوم کرنے آئے گا تو میں بول دوں گی کہ چوکیدار کئی دن پہلے نوکری چھوڑ کر گاؤں جا چکا ہے اور میں نے ابھی تک کوئی نیا چوکیدار نہیں رکھا۔ میڈم کسی چکر میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ ام نے بھی اس کا بات مان لیا اور اپنا سامان لے کر چپکے سے اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔ ابھی دس بارہ دن پہلے ایک افسر امارے پاس آیا اور بولا کہ جو ہوا اسے سب مالوم ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ام اس کیس میں گواہی دے۔ اس نے ام کو ایک آدمی کا تصویر بھی دکھایا جسے دیکھ کر ام نے پہچان لیا کہ یہ وہی بندہ ہے جس نے چاقو سے اس بندے کو مارا تھا۔ امارے دل پر بڑا بوجھ تھا اس لیے ام گواہی دینے کے لیے تیار ہو گیا۔“ اس لڑکے نے اپنا بیان مکمل کر کے سر جھکا لیا۔

”کیا تم کٹہرے میں کھڑے ملزم کو دیکھ کر بتا سکتے ہو کہ دانش کریم کو فیکٹری میں تشدد کا نشانہ بنانے والے تینوں افراد میں یہ شخص بھی شامل تھا یا نہیں؟“ وکیل نے اس سے سوال کیا۔

”یہی وہ شخص ہے جس نے چاقو کا وار کر کے اس بندے کو ختم کیا تھا۔“ چوکیدار لڑکے نے کٹہرے میں کھڑے توقیر کو غور سے دیکھتے ہوئے پورے یقین سے جواب دیا۔ اس کے بعد فیکٹری کی مالکن کو بھی گواہوں کے کٹہرے میں بلایا گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اسی نے کسی مسئلے میں الجھنے سے بچنے کے لیے چوکیدار کو خاموشی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن واقعے کے چھ ساڑھے چھ ماہ بعد ایک شخص اس تک پہنچ گیا۔ اس شخص کے پاس ایسے کئی ثبوت تھے جن سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے فیکٹری کو بالکل لاوارث نہیں چھوڑ رکھا تھا بلکہ وہاں ایک چوکیدار موجود تھا جو اس حادثے کے بعد غائب ہو گیا۔ اس شخص کے سامنے وہ زیادہ دیر انکار پر قائم نہیں رہ سکی اور وعدہ کر لیا کہ قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے عدالت میں گواہی دینے ضرور پہنچے گی۔ ان گواہیوں کے بعد کیس کا رخ بالکل ہی واضح ہو گیا اور صاف ظاہر ہونے لگا کہ اس کیس کا کیا فیصلہ ہو سکتا ہے لیکن ابھی فیصلے کا مرحلہ نہیں آیا تھا۔ بہت سے قانونی تقاضے پورے کرنے باقی تھے۔ سب سے بڑھ کر صفائی کے وکیل کو ان گواہوں پر جرح کرنا تھی۔ سماعت خاصی طویل تھی اور پہلی ہی پیشی میں کیس خاصا کھل گیا تھا۔ جج نے باقی کارروائی کے لیے اگلی تاریخ کا اعلان کر کے عدالت برخاست کر دی۔ سائرہ اپنی جگہ سے اٹھ کر فوراً ولی

چابی

خوں ریز معرکہ جاری تھا۔ بادشاہ سلامت نے تازہ دم لشکر لے کر بنفسِ نفیس محاذ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مسئلہ تھا ان کی حسین و جمیل اور زہد شکن ملکہ کا جو کم سنی کے باعث کسی بھی فریب کا شکار ہو سکتی تھی۔

انہوں نے ملکہ کی ضرورت کی تمام اشیا ایک وسیع کمرے میں جمع کر کے، اسے مقفل کر دیا اور کمرے کی چابی اپنے مقرب خاص کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”یقینا! ہم جنگ جیت جائیں گے... اگر پندرہ روز تک ہماری واپسی نہ ہو تو کمرے کا تالا کھول کر ملکۂ عالیہ کو ان کے پدر بزرگوار کے گھر پہنچا دینا۔“

مقربِ خاص نے سینے پر ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر بادشاہ کی ہدایت تسلیم کر لی۔

بادشاہ سلامت کو اپنے لشکر کے ساتھ کوچ کیے چند ہی گھنٹے گزرے تھے کہ مخبروں نے عقب سے دھول کے بادل اڑتے دیکھے۔ ذرا سی دیر میں گھڑ سوار ان سے آملا۔ چہرہ محترم اور شناسا تھا۔ بلا روک ٹوک بادشاہ سلامت تک جا پہنچا۔

”تم کیسے آئے؟“ بادشاہ سلامت نے تیکھے تیوروں کے ساتھ سوال کیا۔

”عالی جاہ!“ مقربِ خاص نے جیب سے چابی نکال کر بادشاہ کو پیش کرتے ہوئے، پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان کہا۔ ”یہ چابی غلط ہے، قفل میں نہیں لگ رہی!“

ایک سہیلی دوسرے سے: ”تمہارا لباس تو بہت قیمتی ہے۔ غالباً تمہارے شوہر کو اچھی ملازمت مل گئی ہے۔“

دوسری سہیلی مسکرا کر: ”نہیں، مجھے ایک اچھا شوہر مل گیا ہے۔“

☆☆☆

امام غزالیؒ سے کسی نے پوچھا: ”آپ علم کے اتنے بلند مرتبے پر کیسے فائز ہوئے؟“

امام غزالیؒ نے جواب دیا۔ ”جو بات مجھے معلوم نہیں، میں نے اسے پوچھنے میں کبھی عار محسوس نہیں کیا۔“

کراچی سے حمیرا اقبال کا شکوہ

کے پاس گئی اور بولی۔

''تھینک یو سو مچ ولی! مجھے یقین ہے کہ یہ سارا آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ پولیس کے اس کاہل تفتیشی افسر نے تو اس کیس پر ذرا بھی محنت نہیں کی تھی اور سیدھے سیدھے لوٹ مار کی واردات قرار دے کر بات ختم کر دی تھی۔ اتنی اہم گواہیوں کے بعد مجھے یقین ہے کہ دانش کا قاتل کسی صورت نہیں بچ سکے گا۔'' وہ بہت پُرجوش ہو رہی تھی۔ ولی اس کی اس کیفیت پر بردباری سے مسکرایا اور بولا۔

''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے سائرہ! ان گواہوں کو تلاش کرنے کے لیے میں نے خود ذاتی طور پر کوشش کی تھی اور میرے ایک بہت ہی بااعتماد معاون کے علاوہ کسی کو ان کے بارے میں معلوم نہیں تھا ورنہ آج آپ کے بجائے ان دو گواہوں کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جاتی۔''

''آپ نے بہت ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیا۔ آپ جیسے لوگ ہمارے ملک کا فخر ہیں۔'' سائرہ نے پوری سچائی سے اس کی تعریف کی تو وہ ہنس دیا اور خوشگوار موڈ میں بولا۔

''بہت شکریہ محترمہ! آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔ آپ کی اپنی گاڑی تو ورکشاپ میں کھڑی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے، چلتے ہیں۔'' سائرہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ اسی وقت توقیر کو بھی عدالت کے کمرے سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔ کئی چینلز کے نمائندے عدالت میں موجود تھے جو توقیر کی ویڈیو بنانے کے ساتھ ساتھ سائرہ کو بھی اپنے کیمروں کی زد میں لینے کی کوشش کر رہے تھے اور مقتول کی بیوہ کی حیثیت سے اس سے سوال جواب کرنا چاہتے تھے۔ کیمروں کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے ولی جان بوجھ کر اس سے قدرے دور ہو گیا لیکن ہجوم کی وجہ سے وہاں زیادہ جگہ نہیں تھی۔ سائرہ، توقیر اور اس کو لے جانے والوں کے عین پیچھے چل رہی تھی۔ پھر اچانک وہ ہوا جس کا کسی کو گمان بھی نہیں تھا۔ وہ کوئی کیمرا مین تھا جس نے اچانک ہی اپنے بیگ سے گن نکالی اور اندھا دھند فائر کھول دیا۔ اس کا نشانہ حفاظتی تحویل میں چلتا توقیر تھا۔ دو گولیاں توقیر کے سر میں لگیں اور وہ وہیں گر گیا۔ اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ اس کے ساتھ چلتے افراد میں سے بھی ایک گولی کا نشانہ بنا تھا۔ ایک گولی سائیں کی سی آواز کے ساتھ سائرہ کے کان کے بالکل قریب سے گزری اور وہ ہراساں ہو کر چیخنے لگی۔ اس کی چیخوں کو مزید ہونے والے ایک فائر کی آواز نے بریک لگائے اور اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، کیمرا مین کے روپ میں موجود قاتل گولی کھا کر نیچے گرا تھا اور ولی کی پسٹل کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ گولیاں چلتے ہی وہ اس کے قریب آ پہنچا تھا اور قاتل کو نشانہ بنانے کے بعد اب اپنے لوگوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس کارروائی کے دوران اس نے سائرہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے خاموش تسلی دی۔ اتنی بھگدڑ میں کسی نے اس کا یہ عمل نہیں دیکھا لیکن سائرہ پر حیرت انگیز اثر ہوا اور وہ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ اسے لگا کہ ولی کے ہوتے ہوئے وہ بالکل محفوظ ہے۔ ایک ہی دن میں دوسری بار موت کے اتنے قریب سے ہو کر گزر جانے کے بعد اس کا اس طرح پُرسکون ہو جانا معمولی بات نہیں تھی۔

''چلیں میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔ اس کے بعد مجھے اپنے آفس جانا ہوگا۔'' اس نے سائرہ سے کہا۔

''آپ مصروف ہیں تو میں ٹیکسی سے گھر چلی جاتی ہوں۔'' سائرہ کو اسے زحمت دینا اچھا نہیں لگا۔

''نہیں، میں نے آپ کو پہنچانے کی ذمے داری لی ہے اور میں اپنی ذمے داریاں پوری کرتا ہوں۔'' اس نے ایسے لہجے میں کہا کہ سائرہ کچھ نہیں کہہ سکی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ولی کے ساتھ اس کی گاڑی میں گھر جا رہی تھی۔

''توقیر کے انجام کو پہنچنے سے دانش کے قتل کا معاملہ حل ہو گیا ہے لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ آپ کے ہاتھ سے دہشت گردوں کا ایک اہم مہرہ نکل گیا۔ اس کے ذریعے آپ ان کے نیٹ ورک تک پہنچ سکتے تھے۔'' راستے میں اس نے ولی کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''توقیر کو ہلاک ہی اس لیے کروایا گیا ہے۔ پہلے انہوں نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد دیکھا کہ ہمارے پاس آپ سے بھی زیادہ اہم گواہ ہیں تو اپنے ہی مہرے کو پٹوانے کا فیصلہ کر لیا۔ توقیر کے بعد شاید اس کیمرا مین کو بھی ہلاک کر دیا جاتا جس نے توقیر کو نشانہ بنایا لیکن میں نے بہت پھرتی سے کام لیتے ہوئے نیچے بیٹھ کر خطرہ مول لیتے ہوئے اتنے لوگوں میں اس کی ٹانگوں کو نشانہ بنا دیا۔ وہ گولی کھا کر گرا تو میرے آدمیوں نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ امید ہے کہ اس آدمی سے ہمیں کوئی نہ کوئی کلیو مل جائے گا۔ نہ بھی ملے تو ہم آخری سانس تک دہشت گردوں سے جنگ کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور کوئی بھی مشکل اور رکاوٹ ہمارے اس عہد کو توڑ نہیں سکتی۔'' اس کے لہجے میں اب بھی وہی چٹانی عزم تھا جس سے سائرہ ہمیشہ ہی متاثر ہو جاتی تھی۔ وہ بھرپور خلوص سے

بولی۔

''اللہ آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو کامیابی عطا کرے۔ یہ جنگ صرف آپ کی نہیں اس ملک کے ہر فرد کی ہے جسے ہر شخص کو اپنے دائرۂ کار میں رہ کر لڑنا ہے۔ لڑائی صرف ہتھیاروں سے نہیں ہوتی، اس عزم اور حوصلے سے بھی ہوتی ہے جو دشمنوں کو باور کرواتا ہے کہ تم چاہے کچھ بھی کر لو یہ قوم تم سے ڈرنے والی نہیں ہے۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ کاش اس قوم کا ہر فرد آپ ہی کی طرح سوچنے لگے۔'' ولی نے جواباً کہا اور گاڑی روک دی۔ وہ اپنی بلڈنگ کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ سائرہ، ولی کو اللہ حافظ کہتی ہوئی گاڑی سے اُتر گئی۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے آپی! آپ کن مسائل میں الجھ گئی ہیں۔ آپ کو کچھ ہو جاتا تو بچوں کا کیا ہوتا؟'' وہ ولی کی گاڑی سے اتر کر سیدھی طاہرہ خاتون کے گھر گئی تھی کہ بچے وہیں موجود تھے۔ انہیں عدالت میں ہونے والے واقعے کے علاوہ اس سے قبل اس پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں بھی علم ہو چکا تھا لیکن انہوں نے بچوں کے سامنے کوئی بات نہیں کی اور اسے پینے کے لیے اورنج جوس پیش کیا۔ وہ جوس پی ہی رہی تھی کہ اس کے موبائل پر زوہیب کی کال آ گئی۔ میڈیا کی تیز رفتاری کے دور میں ہر خبر نیوز چینلز سے فوراً ہی ہر طرف پھیل جاتی تھی، اس لیے اسلام آباد میں بیٹھے اس کے بھائی کا باخبر ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

''اللہ کا شکر ہے کچھ نہیں ہوا اور اس وقت میں سکون سے اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہوں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں زوہیب کو جواب دیا۔

''آپ سکون سے بیٹھی ہیں لیکن یہاں امی کا بی پی شوٹ کر گیا ہے۔ ان کی وجہ سے مجھے آفس سے گھر آنا پڑا۔'' وہ خاصا خفا لگ رہا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے امی کی، کیا اسپتال میں ہیں؟'' فطری طور پر وہ ماں کی طبیعت کی خرابی کا سن کر گھبرا گئی۔

''اللہ کا شکر ہے کہ گھر پر ہی دوا دینے سے طبیعت سنبھل گئی ہے لیکن وہ آپ کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ لیجیے امی سے بات کریں۔'' زوہیب نے فون امی کو تھما دیا۔ وہ سلام دعا کے بعد انہیں یقین دلاتی رہی کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اسے کچھ نہیں ہوا۔

''تم اپنی ضد چھوڑو اور یہاں سب کے پاس اسلام آباد آ جاؤ، وہاں اکیلی رہ کر تم پتا نہیں کیا کیا اپنی منمانی کرتی رہتی ہو۔ یہاں رہو گی تو کم از کم میں تمہیں روک تو سکوں گی۔'' وہ اس کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''آپ کو کیا ہو گیا ہے امی، میں کوئی ٹین ایجر تو نہیں ہوں۔ اچھی بھلی سمجھ دار، دو بچوں کی ماں ہوں اور صحیح غلط کو جانتی ہوں۔ دانش کے قاتل کو انجام تک پہنچانا کچھ غلط تو نہیں تھا۔ کل کو میں اپنے بچوں کے سامنے سرخرو رہوں گی کہ میں نے ان کے باپ کے قاتل کو انجام تک پہنچانے میں اپنا پورا پورا کردار ادا کیا ہے۔'' وہ رسان سے ماں کو سمجھانے لگی۔

''یہ بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں بیٹا! جو لوگ دن دہاڑے چلتی سڑک اور بھری عدالت میں اتنی دیدہ دلیری سے گولیاں چلا سکتے ہیں وہ کیا نہیں کر سکتے۔ تم اپنے بچوں کا سوچو۔ اپنے باپ کو وہ پہلے ہی کھو چکے ہیں۔ تمہیں اگر کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ تمہیں ایسے لوگوں سے دشمنی پالنی ہی نہیں چاہیے تھی۔ بس تم یہاں میرے پاس آ جاؤ، میں نے سوچ لیا ہے کہ تمہاری دوسری شادی کر دوں گی۔ تم کوئی بوڑھی نہیں ہو گئی ہو۔ تم کسی بھلے آدمی کے ساتھ اس کی حفاظت میں رہو گی تو مجھے بھی چین آ جائے گا ورنہ میں تو سکون سے مر بھی نہیں سکوں گی۔'' وہ پتا نہیں کیا کچھ طے کر چکی تھیں۔ سائرہ کو ان کی باتوں سے دھچکا لگا، وہ دھیرے سے بولی۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں امی، میرے بچے ہیں اور مجھے اب ان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

''میں بچوں کی وجہ سے ہی کہہ رہی ہوں۔ کوئی بھلا آدمی ہوگا تو بچوں کو بھی قبول کر لے گا۔ تم خود تو مرنے پر تلی بیٹھی ہو۔ بچوں کا تمہیں کہاں خیال ہے؟'' وہ اسے بالکل بھی رعایت دینے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''آپ غلط سوچ رہی ہیں امی! مجھے بھی زندگی پیاری ہے لیکن زندگی کی حرص میں، میں حق کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ موت کا کیا ہے وہ تو ان کا نصیب بھی بن جاتی ہے جو کسی جنگ کا حصہ نہیں ہوتے۔ بچوں کے لیے ڈبل روٹی لینے جانے والا باپ بھی بم بلاسٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اتنے برسوں سے ہم اپنے اردگرد کتنی ایسی ناگہانی اموات دیکھ رہے ہیں اور صرف ڈر ڈر کر جینے میں مصروف ہیں حالانکہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ جب تک ہم اپنے گھر میں گھس کر بیٹھ جانے والے ان شرپسند عناصر کو دھکیل کر اپنے گھر سے نہیں نکالیں گے، اپنے گھر کو محفوظ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں یہ لڑائی

لڑائی ہی ہوگی امی۔" وہ انہیں سمجھانے لگی۔

"مجھ سے یہ افلاطونی باتیں مت کرو سائرہ! میں ایک عام عورت ہوں اور اپنی اولاد کی سلامتی کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ اگلی بار تمہیں فون کروں تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے اپنا سامان پیک کرلیا ہے یا نہیں۔" انہوں نے دوٹوک لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔ سائرہ بے بسی سے تاریک ہوجانے والی موبائل کی اسکرین کو تکتی رہ گئی۔

"امی ناراض ہو رہی تھیں۔" وہیں بیٹھی طاہرہ خاتون نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ جواب میں اس نے انہیں پوری گفتگو سے آگاہ کردیا۔ بچے ایک بار پھر اندر کمرے میں کمپیوٹر پر مصروف ہوگئے تھے اس لیے وہ آرام سے گفتگو کرسکتی تھی۔

"تمہاری امی اتنی غلط نہیں ہیں بیٹا! ہمارے ہاں عموماً لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں اور بیٹیوں [illegible] یہ خاص سوچ ہے کہ وہ شادی کرکے اپنے شوہر کے گھر میں رہیں گی تو یہی ان کا سب سے بڑا تحفظ ہے، چاہے شوہر اس بے چاری پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہو۔"

"امی اس وقت بہت ضدی ہو رہی ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کیا کروں۔" وہ واقعی بہت پریشان ہوگئی تھی۔ بھائیوں کے گھر جاکر رہنا اسے کسی صورت قبول نہیں تھا۔

"تمہیں اپنی امی کی شادی والی ضد تو کم از کم مان ہی لینا چاہیے۔"

"خالہ جان آپ بھی......" طاہرہ خاتون کے مسکرا کر دیے گئے مشورے پر اسے حیرت ہوئی۔

"میرے پاس ایک اچھا رشتہ ہے اس لیے کہہ رہی ہوں۔ تم میرے ولی کا ساتھ قبول کرلو سائرہ! اسے تم جیسی سوچ!۔ ہمت رکھنے والی ساتھی ہی کی ضرورت ہے۔ وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہے لیکن اس کی نجی زندگی میں بہت بڑا خلا ہے۔ باہر کی دنیا میں جدوجہد کرکے آنے والے مرد کو گھر میں اگر ایک ہم مزاج اور خیال رکھنے والی بیوی کا ساتھ مل جائے تو اس کی کارکردگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے ولی کے لیے ایسی ہی ساتھی ثابت ہوسکتی ہو۔ ولی کا ساتھ خود تمہیں بھی تحفظ کا احساس دے گا اور تمہیں بچوں کی طرف سے بھی بے فکری رہے گی۔ طلحہ اور زویا آج بھی مجھے عزیز ہیں اور کل بھی ہوں گے۔ رہا ولی تو تم اتنے دنوں سے اسے دیکھ ہی رہی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے کی تربیت میں سب سے زیادہ انسانیت کے احترام کو ترجیح دی ہے اور وہ کم از کم اتنا اچھا انسان تو ہے ہی کہ معصوم بچوں سے عناد رکھنے کے بجائے انہیں محبت اور شفقت سے نوازے۔" طاہرہ خاتون اسے قائل کرنے کے لیے دلائل دے رہی تھیں۔

"لیکن خالہ جان! یہ فیصلہ تو ولی کی مرضی سے ہوگا، آپ اکیلی کیسے......" طاہرہ خاتون کی باتیں اسے ٹھیک لگ رہی تھیں لیکن وہ اس نکتے پر آکر اٹک گئی کہ جانے اس پرپوزل میں ولی کی رضا بھی شامل ہے یا نہیں۔

"میں ولی کی مرضی کے بغیر بات نہیں کررہی۔ میری کل ہی اس سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی۔ وہ تم سے متاثر ہے اور میری اس رائے سے بھی متفق ہے کہ تم اس کے لیے ایک اچھی ساتھی ثابت ہوسکتی ہو۔ اب فیصلہ صرف تمہیں کرنا ہے۔" انہوں نے بال اس کے کورٹ میں پھینک دی اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔ دانش سے اس کی پسند کی شادی تھی اور [illegible] اچھا وقت گزارا تھا لیکن آج کی حقیقت یہ تھی کہ اب دانش اس کی زندگی میں نہیں رہا تھا اور وہ ایک تنہا عورت کی حیثیت سے [illegible] رہی تھی۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں اگر اسے کسی سایہ دار درخت کا گھنا سایہ میسر آرہا تھا تو اسے [illegible] کفران نعمت [illegible] میں میری امی سے بات کرنی ہوگی خالہ جان!" فیصلہ سناتے ہوئے وہ وہی روایتی مشرقی لڑکی بن گئی جو ان معاملات میں کبھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتی۔

"میں ان سے آج ہی بات کروں گی لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"[illegible] کیا؟" ان کی بات نے سائرہ کو تشویش میں مبتلا کیا۔

"میری [illegible] کے بعد تم مجھے خالہ جان نہیں بلکہ امی جان کہا کروگی۔" انہوں نے مسکرا کر کہا تو وہ ہنس دی۔ ایک مطمئن اور آسودہ ہنسی۔ وہ کوئی ٹین ایجر لڑکی نہیں تھی جو یہ سوچتی کہ کوہ قاف کی کہانیوں کی طرح اس کی کہانی کا اختتام بھی شہزادی کے شہزادے کے ساتھ ہنسی خوشی ہر غم سے آزاد رہنے والے جملے پر ہوتا۔ اسے معلوم تھا کہ ولی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اسے بہت سی آزمائشوں کے لیے تیار رہنا ہوگا اور وہ تیار تھی کہ اسے اپنے وطن اور قوم کے لیے آزمائشوں سے گزرنے میں کوئی عار نہیں تھا۔

☆☆☆

Pakistanipoint.com
Waqar
Azeem

آوارہ گرد

قسط:40

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیمونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ ا جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا اصل ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور اس غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیر اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلّا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کلپ ہوجاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کرلیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے

ل می بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا مکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو لی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی قات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف انہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے راں سے حملہ کردیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی رنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو تا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی ہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں گاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے ان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور ؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی ب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر ناتھ مان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر ن میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے ی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید ے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہو ہے۔ داور کو قابو کرکے قیدخانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور نے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی ین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ ا سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے...... ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی ں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے ڈ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام جھلگری کی بیوہ ارم سے ملتا وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر از خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغواء کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو از خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ شاہ نواز کے حواری شکیلہ اور ارم کو بھی پکڑ لاتے ہیں۔ شہزی کو رسن بستہ چھوڑ کر شاہ نواز، شکیلہ کو ساتھ لے کر ہیرے کی میں نکلتا ہے جو شکیلہ نے قبرستان میں کہیں چھپا دیا تھا۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز ا سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں ارش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، عارب کو ساتھ لے یل کو بچانے نکل پڑتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ آواز غراہٹ سے مشابہ تھی......

میں ابھی اس کی سمت کا اندازہ ہی کرتا رہ گیا تھا جبکہ ب فوراً ہی خطرے کی بُو سونگھ کر بولا۔

''ہوشیار! حیوانی شکاریوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔''

اس کا لہجہ لرزیدہ سا تھا۔

''کک...... کس طرف......؟'' میرے منہ سے قدرے ہکلاہٹ آمیز الفاظ برآمد ہوئے۔ میں ہنوز غراہٹ سے مشابہ اس آواز کی طرف دیکھنے کی کوشش کررہا

تھا اور عارب کے بتانے سے پہلے ہی میری متلاشی نظروں نے مذکورہ سمت میں ایک .... بھورے رنگ کے کتے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ہم سے صرف چند فرلانگ کی دوری پر ایک ریتیلی مٹی پر بیٹھا ہماری طرف گھور رہا تھا۔ اس کے خونخوار سا تاثر پیش کرنے والے جبڑوں سے دو نکیلے شکاری دانت جھانک رہے تھے۔ میں نے فوراً گن سیدھی کرلی۔

’’خبردار! ایسی کوئی حرکت مت کرنا۔‘‘ عارب نے سرسراتی آواز میں مجھے متنبہ کیا۔

’’گن نیچے جھکالو......‘‘ میں نے ایسا ہی کیا۔ عارب نے مجھے دائیں جانب سے آگے بڑھنے کو کہا۔

’’یہ رات کے راہی ہیں مگر چوکیداری کے لیے ان میں سے دو تین کُتّے جاگتے رہتے ہیں۔‘‘ اس نے میرے ساتھ آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’یہ بھونک بھونک کر اپنے ساتھیوں کو جگا دے گا۔‘‘

’’مگر اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ ہمارا پیچھا کہاں چھوڑے گا؟‘‘ میں نے کسی خیال کے تحت عارب سے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور آگے چلتا ہوا نسبتاً ایک اونچی ٹیکری کی اوٹ میں آکر رک گیا۔

ہمارے سروں پر سورج مسلسل آگ برسا رہا تھا۔ گرمی اور تپش کی شدت سے میرا دماغ گھومنے لگا تھا۔ پسینہ......ٹپ...... بہہ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک ہو چکا تھا۔ آواز بھی اٹک اٹک کر برآمد ہو رہی تھی۔ سچی بات تھی کہ اس خوفناک جہنم زار بنجر ویرانے میں مجھے پریل چانڈیو کے زندہ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ میں خود کو اب کوسنے پر مجبور ہو رہا تھا کہ میں یہاں آیا ہی کیوں تھا؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ کسی شخص کو رات میں ایک ایسی کھائی میں پھینک دیا جائے جو خونخوار کُتّوں اور لگڑ بھگوں کا مسکن تھی، ایک بے ہوش شخص ان کے خونی پنجوں سے بچ سکتا ہو......؟ بس! ایک خوش امیدی تھی یا پھر اسے ایک سرپھری سی دھن سمجھ لیں کہ میں نے پریل چانڈیو کو تلاش کرنے کی ٹھان لی تھی۔ شاید اس میں سونہڑیں سے کیے گئے وعدے کا دخل تھا اور خود پریل کا میرے ساتھ وہ دوستانہ سلوک بھی جو اس نے میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ میری یہ سرشت نہ تھی کہ ایک بار کوئی میرے ساتھ دوستی کا دم بھرے اور میں کسی آڑے وقت میں اس کی طرف سے منہ موڑ لوں...... بس! شاید یہی وہ عزم تھا جو مجھے اس پُرخطر جگہ پر لے آیا تھا۔

ٹیکری میں آنے کے باعث وہ بھیڑیے سے مشابہ کُتّا ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ عارب بھی میری آنکھوں کے سامنے اوجھل ہو چکا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا شاید وہ اِدھر اُدھر کہیں ہو گیا ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ تب ہی ایک لرزتا ہوا خیال میرے دل میں ابھرا۔ کہیں وہ مجھے یہاں مرنے کے لیے چھوڑ کر خود راہِ فرار تو نہیں اختیار کر گیا تھا؟ یہ سوچتے ہی عارب کی اس دھوکے بازی پر میرا دماغ جو پہلے ہی گرمی کی شدت سے گھوما ہوا تھا، آتش فشاں بن گیا۔ میں ٹیکری سے ہٹا اور اسے آوازیں دینے لگا۔ میں ٹیکری پر چڑھ گیا کہ اسے دیکھ سکوں۔ اچانک ہی میری نظر ایک جانب پڑی اور بے اختیار میرے منہ سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ عارب خان دم دبا کر ایک طرف کو دوڑے جا رہا تھا۔ میں چاہتا تو ادھر سے ہی اس پر گولیاں برسا سکتا تھا مگر میں نے کسی خطرے کے باعث ایسا نہیں کیا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے رگ و پے میں جیسے لرزہ طاری ہو گیا۔ عارب مجھ سے تو بچ کر بھاگ نکلا تھا لیکن اس کُتّے کی نظروں میں آگیا تھا جو ہمیں ایک دوسرے قریبی ٹیلے پر بیٹھا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ بھونکتا اور غراتا ہوا اس کی طرف گولی کی طرح بڑھا تھا۔ ابھی یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا کہ میں نے دیکھا ایک دو اور ٹیلوں کے عقب سے تین چار کُتّے بھی بھونکتے ہوئے اس کی جانب کو لپکے تھے اور آن کی آن میں اس کے سر پر پہنچ گئے۔

عارب خان عبرت ناک موت کے خوف سے بری طرح بوکھلا گیا تھا اور کبھی اِدھر بھاگتا تو کبھی اُدھر...... تب ہی اس کے سامنے سے بھی خونخوار کتوں کا ایک اور غول اس کی طرف لپکا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ مدد کے لیے چیخنے لگا۔ خونخوار کتے اسے بری طرح بھنبھوڑنے لگے۔ میں ٹیکری کی آڑ سے یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا اور میرے پورے جسم میں بھی سرد پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس ویرانے میں مجھے دھوکا دے کر بھاگ جانے کی فاش غلطی کی تھی اور اب اپنے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوا تھا۔ میری پھٹی پھٹی آنکھوں نے دیکھا...... کُتّے عارب خان کو چیر پھاڑنے میں مصروف تھے۔ ایک نے اس کا نرخرہ چبا کر اس زور سے پھاڑ ڈالا کہ سرخ سرخ سی موٹی نالی ادھیڑے ہوئے نرخرے سے نکال کر کھینچ لے گیا تھا۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر میرا پورا وجود جھرجھرا سا گیا تھا۔ عارب خان کی چیخیں معدوم ہو چکی تھیں۔ دیگر کتے بھی اسی طرف آن وارد ہوئے تھے، ان میں لگڑ بھگوں کا غول بھی شامل ہونے لگا تو کُتّے ان سے جا بھڑے۔ اچھی خاصی لڑائی شروع ہو گئی۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ عارب خان نے مجھے اس کھائی کی نشاندہی کر دی تھی جہاں اس نے اپنے ساتھی کی مدد سے اسے دھوکے سے بے ہوش کر کے پھینکا تھا، لہٰذا میں اگلا ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسی طرف کو تیزی سے لپکا۔

میرے ہاتھ میں گن دبی ہوئی تھی اور میں ٹیکریوں کی آڑ لیے ہوئے بالآخر اس کھائی کی طرف آگیا مگر اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ مذکورہ کھائی کے قریب ہی مجھے کسی چھوٹی گاڑی کا ملبا سا نظر آیا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ایک ہائی روف تھی۔ اس کے ناکارہ ٹائر ریت نما مٹی والی زمین میں دھنسے ہوئے تھے، جس کے باعث وہ ایک طرف کو جھکی ہوئی تھی۔ شیشے سلامت تھے۔ مگر اگلے ایک اور پچھلے دونوں ٹائروں کی حالت نہایت خستہ تھی۔ باڈی بھی ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی۔ اس ’’کیری‘‘ نما چھوٹی سی گاڑی کی مجموعی خستہ حالی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کئی روز سے یہاں اس بنجر ویرانے میں پڑی ہوئی تھی یا تو اس کے سوار گاڑی کی خرابی دور نہیں کر پائے تھے اور پیدل ہی کہیں نکل گئے تھے یا پھر ان شکاری کُتّوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ کیونکہ اس کی باڈی پر ہی نہیں بلکہ اس کے بند شیشوں پر بھی گرد و غبار کی موٹی تہ جمی نظر آرہی تھی۔

میں ابھی اس طرف قدم بڑھانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک عقب سے .... مجھے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک کر پلٹا تو جیسے میری روح ہی فنا ہونے لگی۔ میرے پیچھے ایک قریبی ٹیکری پر دو خوفناک جبڑوں والے کتے کھڑے میری طرف دیکھ کر غرغرا رہے تھے۔ ان کی باچھوں سے لمبے نکیلے دانت صاف نظر آرہے تھے اور ان کے تھوتھنے خون آلودہ تھے۔

بدقسمت عارب خان کی ضیافت اُڑانے کے بعد اب یہ میری ضیافت اُڑانے آئے تھے۔ میرے پاس گن تھی۔ میں گولیاں برسا کر دونوں کو ڈھیر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے بعد دیگر کتوں کا غول میرے پیچھے لگ جاتا۔ نجانے کس طرح یہ میری بُو سونگھتے ہوئے یہاں آن دھمکے تھے۔ میں دونوں ہاتھ پھیلائے ان کی جانب تکتا رہا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ دوسرا خالی تھا۔ کُتّے میری جانب بڑی خونخوار نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔

یہ مجھے چھوڑنے کے موڈ میں بالکل بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ ایک شکار کے بخیے ادھیڑنے کے بعد انہیں فوراً ہی میری صورت میں دوسرا شکار میسّر آگیا تھا، یہ بھلا اسے کہاں چھوڑتے؟ میں نے آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب سرکنا شروع کر دیا۔ کتوں نے زور سے غراہٹ بلند کی۔ ان کی زبانیں، نکیلے دانتوں سے باہر کو نکلی لپلپا رہی تھیں اور وہ مجھے بھنبھوڑ ڈالنے کے فل موڈ میں نظر آرہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک دم ایک ساتھ میری طرف دوڑ لگائی۔ میں بھی ان کے خوفناک عزائم کا اندازہ کر کے دوڑ پڑا۔ میرا رخ اسی خستہ حال گاڑی کی طرف تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اور کوئی وہاں ایسی جگہ دکھائی نہیں دی تھی جہاں گھس کر میں اپنی جان بچا سکتا، اگرچہ یہ بھی کچھ ایسی خاص جگہ تو نہ تھی، بس! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی۔ تاہم سوچ رکھا تھا میں نے کہ ضرورت پڑی تو میں.... دونوں کتوں کو گولی مار دینے سے بھی بالکل دریغ نہیں کروں گا۔ پھر چاہے جو ہو دیکھا جاتا۔ غنیمت تھا کچھ کہ دونوں کتے بھونک نہیں رہے تھے، غراتے ہوئے میرے تعاقب میں اندھا دھند دوڑے چلے آرہے تھے، جیسے مجھے چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے بے چین ہوں...... میرا اور ان کا درمیانی فاصلہ لمحہ بہ لمحہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی بھی قریب تھی۔ دونوں کتے بھی میرے قریب پہنچنے لگے تھے۔

بالآخر جیسے ہی میں گاڑی کے قریب پہنچا اور جلدی سے ہانپتے ہوئے ایک دروازہ کھولنے کی سعی چاہی تو دھک سے رہ گیا۔ وہ پھنس کر بند ہو چکا تھا۔ میں زور آزمائی کرتا رہ گیا۔

یہاں مجھے چند قدموں کے فاصلے پر ایک دو انسانی پنجر بھی پڑے دکھائی دیے، جنہیں دیکھ کر میرے رگ و پے میں سرد لہر سی دوڑ گئی۔ پہلا خیال یہی ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں ان کا تعلق اس تباہ حال گاڑی سے تو نہیں تھا؟

ایک خیال آیا کہ گن کا بٹ مار کر شیشہ توڑ ڈالوں اور اندر گھس جاؤں، مگر جلد ہی اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا اور یہ ارادہ ترک کر کے پہلے سر پہ آنے والے خطرے سے نمٹنے کا ارادہ کیا۔ دونوں کتے خوفناک انداز میں غراتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے تھے۔ میں ان کی طرف پلٹا۔

اپنی گن کو میں سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر چکا تھا فوراً ہی سب سے آگے والے ایک کتے پر گولی داغ دی۔ دھماکا ہوا اور کتا اپنے حلق سے عجیب سی آواز نکال کر دھپ سے بھربھری مٹی والی زمین پر گرا اور ختم ہو گیا، اس کے

دوسرے ساتھی نے میدان چھوڑنا بالکل گوارا نہ کیا تو میں نے ایک عدد گولی اسے بھی ٹھونک دی۔ وہ بھی اپنے مردہ ساتھی کے قریب ہی گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے اب گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اپنی گن کا میگزین نکال کر چیک کیا تو پسینے سے تر پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ راؤنڈ کم تھے۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا اگلا ایک اور پچھلے دونوں دروازے تھوڑا اچک کر بالکل سیل ہو چکے تھے۔ اگلے دونوں دروازوں کا بھی یہی حال تھا، زور آزمائی کے باوجود وہ نہیں کھلے۔ میں نے پچھلے دروازے کا رخ کیا۔ اس کی حالت مجھے نسبتاً کچھ بہتر محسوس ہوئی تو میں نے اس پر زور آزمائی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک لاتعداد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھریں...... میں ہولا کر رہ گیا۔ میرے دائیں جانب سے شکاری کتوں کا ایک غول دوڑا چلا آرہا تھا۔ میرے پاس بچنے کا کوئی اور ٹھکانا تھا نہ ہی راستہ، فقط یہی راہ تھی کہ کسی طرح گاڑی کا یہ دروازہ کھل جاتا اور میں اندر جا بیٹھتا۔ میں نے اپنی کوشش تیز کر دی۔ گن میں اتنی گولیاں نہیں تھیں کہ میں ان خونیں شکاری کتوں کو ختم کر سکتا۔

دروازہ ہلنے لگا۔ میرے دل میں امید پیدا ہوئی۔ میں جنونیوں کے انداز میں دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گیا، اس کے ساتھ ہی میرے تصور میں عارب خان کا ادھڑا ہوا جسم اور تپتی دھوپ میں گاڑی کے قریب پڑے انسانی پنجرے گردش کرنے لگے اور کیا بعید تھا کہ میرا بھی انہی جیسا حشر ہونے والا تھا؟ ادھر لحظہ بہ لحظہ کتوں کے بھونکنے اور خونخوار غراہٹوں کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ میرے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ کوئی لمحہ جاتا تھا کہ میں ان کے نرغے میں تھا اور اسی وقت دروازہ کھل گیا۔ بہت ہی قلیل ترین لمحے میں مجھے ایک بات کا ادراک ضرور ہوا تھا کہ دروازہ محض میری اپنی کوشش سے ہی نہیں کھلا تھا، کسی نے اندر سے بھی کچھ زور آزمائی کی تھی، اس پر زیادہ غور کرنے کا وقت کہاں تھا؟ میں غڑاپ سے عین اس وقت گاڑی کے پچھلے حصے سے اندر کودا تھا جب دو تین کتے خوفناک انداز میں مجھ پر بیک وقت جھپٹے تھے، مگر میں تب تک بجلی کی سی پھرتی سے دروازہ بند کر چکا تھا اور وہ بند دروازے سے ٹکرا کر پلٹ کر گرے تھے، مگر اٹھ کر پھر زور زور سے بھونکنے لگے۔ میں نے گرد سے اٹے پڑے شیشوں سے باہر جھانکنے کی کوشش چاہی تو مجھے گاڑی کے گرد خوں خوار کتوں کا پورا غول چکراتا ہوا دکھائی دیا۔ میں اب بالکل محفوظ تھا۔ لہٰذا ان پر لعنت بھیج کر میں نے گاڑی کے اندر جائزہ لیا تو اچانک مجھے ایک زبردست شاک لگا......

☆☆☆

شاید اسی نے اپنے ناتواں اور نحیف و نزار وجود زور لگا کر اندر سے دروازہ کھولنے میں میری مدد کی تھی۔ اس نے کسی طرح اندر سے دھند لگے شیشے کے باوجود مجھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی کے اندر فقط یہی ایک شخص تھا جس کی ہیئت کذائی نہایت خستہ اور ناگفتہ بہ تھی۔ اس کے جسم پر صرف ایک شلوار تھی، وہ بھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اوپری جسم برہنہ تھا اور وہاں خراشیں ابھری ہوئی تھیں، چہرے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ایک جوان اور تگڑا آدمی تھا مگر خستہ حالی اور بھوک پیاس نے اسے جیسے زندہ لاش بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب اس کا چہرہ سامنے آیا تو ایک اور شاک میرا منتظر تھا۔ تب میں نے اسے پہچاننے میں مطلق دیر نہیں لگائی تھی، میں حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات سے اسے تکنے لگا۔

”پپ...... پریل! ی ی...... یہ تم ہو......؟“ میں بے اختیار چلاّ اٹھا اور جلدی سے اسے سنبھالا۔ اس کیری کے پچھلے حصے میں کوئی سیٹ نہیں ہوتی، صرف سامان رکھنے کی تھوڑی سی جگہ ہوتی ہے اور وہ ادھر ہی مڑا تڑا لیٹا ہانپ رہا تھا، خود میں بھی مشکلوں سے یہاں جما ہوا تھا باقی سیٹوں کی حالت درست تھی۔ تاہم کیری کے جھکے ہونے کے سبب ہمیں جم کر سیدھے بیٹھنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

وہ پریل ہی تھا۔ اس کے ہونٹ پیاس کی شدت سے سوکھ کر چھلکا سا نظر آنے لگے تھے۔ وہاں سپید سپید رنگ کی پیڑیاں جم گئی تھیں۔ نجانے یہ کتنے گھنٹوں سے اسی جگہ محبوس ہو کر بھوکا پیاسا پڑا رہا تھا۔

”تت...... تم......“ اس نے بھی شاید مجھے اور میری آواز پہچان لی تھی۔ میں نے اسے سہارا دے کر کیری کی باڈی سے ٹکا کر بٹھا دیا تھا۔

”ہاں، پرو! یہ میں ہوں...... تمہارا قیدی دوست شہزی۔“ میں نے کہا۔ اس کے سوکھے ہونٹ میری اس بات پر مسکرانے کی کوشش میں تھوڑا کھنچے تھے۔

”پپ...... پپ...... پانی ہے تمہارے پاس......؟“ اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

”نہیں دوست! لیکن تم فکر مت کرو...... میں تمہاری تلاش میں ہی نکلا تھا...... ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دینی چاہی۔

”تت...... تمہارا شکریہ...... لل...... لیکن یہ مشکل ہے، تم نے کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال دی میری خاطر......؟ اور...... اور...... سس...... سونہڑیں کیسی ہے؟“

میں نے اسے دھیرے دھیرے ساری بات بتا دی۔ وہ مجھے خاصا زخمی بھی نظر آرہا تھا۔ اس کا پورا جسم خراش زدہ نظر آرہا تھا، کہیں کہیں سے گوشت نچا ہوا بھی نظر آتا تھا، وہ شاید ان شکاری جنگلی کتوں کے خوفناک نرغے سے بال بال بچ کر یہاں آن چھپا تھا۔

باہر کتے بھونک بھونک کر دھیرے دھیرے واپس پلٹنے لگے تھے۔

میری بات سن کر اس کا خستہ حال چہرہ مزید شکست خوردہ سا نظر آنے لگا مگر اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں شعلوں کی گرمی بھی مجھے محسوس ہوئی تھی۔ اسے لائق ماچھی کی غداری اور دھوکے پر یقیناً غصہ آیا تھا مگر وہ خود کو ازحد بے بس بھی محسوس کر رہا تھا تاہم مجھے دیکھنے کے بعد اسے کچھ حوصلہ ہوا تھا، یہی سبب تھا کہ وہ مجھ سے بولا۔

”میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اگر تم نہ آتے تو آج میں نے خود کو ان خونی کتوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہاں بند قبر میں گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر یہی تھا کہ ایک بار ہی موت کو گلے سے لگا لوں......“

میں اس کی بات سن کر کانپ گیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں دوست! ایسا مت کہو...... اللہ مسبّب الاسباب ہے...... مایوسی کفر ہے...... دعا کرو اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”لل...... لیکن ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے؟ یہ پورا علاقہ ان جنگلی کتوں کا مسکن ہے۔“

”تم مجھے یہ بتاؤ...... کہ جب عارب خان نے دھوکے سے تمہیں یہاں بے ہوش کر کے پھینکا تھا تو...... اللہ ہی نے تمہاری مدد کی تھی نا...... کہ تم اپنی جان، بال بال بچا کر یہاں اس گاڑی کے اندر پناہ لینے میں کامیاب ہوئے اس لیے حوصلہ رکھو...... آگے بھی وہی ہماری مدد کرے گا۔“

”آفرین ہے تم پر دوست! تمہارے ساتھ تو میں نے بس ایک ذرا سی بھلائی کی تھی کہ تمہاری جی داری اچھی لگی تھی مجھے...... اور تم اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر میری تلاش میں یہاں چلے آئے۔ سچ پوچھو دوست! میں تو مایوس ہو چکا تھا اپنی زندگی سے۔ ان خونخوار جنگلی کتوں کے چنگل سے نکلنا میرے بس میں نہیں نظر آرہا تھا۔“ پریل نے ممنون بھرے لہجے میں کہا۔ میں مسکرا کر بولا۔

”بھلائی سے بھلائی ہی جنم لیتی ہے میرے دوست! جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مجھے تو اسی رات سے ہی شک ہو چلا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی زبردست دھوکا ہوا ہے، ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تمہیں غائب کر دیا گیا ہے۔ لیکن سونہڑیں کی طرح میرا دل بھی کہتا تھا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو زندہ ہو...... اسی لیے میں نے تمہیں تلاش کرنے کا اپنے دل میں عہد کر رکھا تھا۔ خیر......! تمہیں دھوکے سے یہاں لانے والا ایک سازشی تو اپنے عبرتناک انجام کو پہنچ چکا ہے۔ لیکن اس سازش کا اصل ماسٹر مائنڈ یعنی لائق ماچھی زندہ ہے۔ تمہیں میرے ساتھ ابھی واپس جنگل ڈیرے چلنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے ساتھی دوبارہ سے جی اٹھیں گے اور لائق ماچھی جیسے غدار کی تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ ان کے حوصلے بلند ہو جائیں گے۔ وہ سب تمہارا ہی ساتھ دیں گے۔“

غدار لائق ماچھی کے ذکر پر پریل چانڈیو کے چہرے پر نفرت و غیظ کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”اس ذلیل انسان کو تو میں اپنے ہاتھوں سے عبرتناک انجام تک پہنچاؤں گا لیکن شہزی یار! مجھے اب خود سے زیادہ سونہڑیں کی فکر ہونے لگی ہے۔ تم نے مجھے بتایا کہ وہ بدبخت لانقو...... سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض واپس اس کے باپ کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بہت ہی برا ہو جائے گا۔“ وہ ایک دم بے چین ہو گیا اور ذرا سانس لینے کو رکا اور پھر تھوڑا سا میری جانب جھکا، میں نے فوراً ایک ہاتھ بڑھا کر اسے سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ کمزوری اور بھوک پیاس کے باعث اس کی سانس بات کرتے ہوئے بار بار پھول رہی تھی۔

”شہزی یار! ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ بالکل بھی نہیں...... کیونکہ...... کیونکہ...... مم...... میں...... اس انا کے مارے ہوئے وحشی انسان شاہنواز خان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں...... وہ...... وہ...... اُسے مار ڈالے گا...... جان سے مار ڈالے گا وہ ظالم اُسے......“ یہ کہتے ہی پریل چانڈیو پر ایک عجیب دورہ پڑ گیا۔ وہ ایک دم بہ مشکل تمام اٹھا اور کیری کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا۔ میں اس کی حرکت پر حیران ہو کے اچھل پڑا اور اسے پشت سے پکڑ کر تھام لیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو...... تم؟ کہاں جا رہے ہو؟ باہر موت بکھری ہوئی ہے۔“

''نہیں، شہزی یارا......! چھوڑ دو مجھے...... میں...... میں سونہڑیں کو اس کے باپ کے حوالے نہیں ہونے دوں گا......'' یہ کہتے ہوئے اس نے مقدور بھر زور آزمائی کرنی چاہی مگر میں نے اسے آرام سے تھام کر دوبارہ سیٹ پر بٹھا دیا۔ کیری کے سائڈ سے ٹائرز برسٹ ہونے کے باعث چونکہ وہ ایک طرف کو جھک گئی تھی اسی لیے سیٹ پر سیدھے بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''حوصلہ کرو دوست! ہم یہاں سے جلد ہی نکل جائیں گے۔ کیوں فکر کرتے ہو......؟ مجھے کچھ سوچنے دو ذرا......''

میری بات پر ذرا تھم تو گیا مگر اس کے چہرے پر بے چینی و تشویش کے سائے، لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ اسے کسی طور قرار نہیں آ رہا تھا لیکن ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ خود مجھے بھی اس کی بے قراری اور بے چینی دیکھ کر اس بات پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں واقعی اس کا خدشہ درست تو نہیں تھا؟ یہ شاید ایکشن کا ری ایکشن تھا۔ لیکن ساتھ ہی میں اپنے اس خیال نما خدشے کو رد بھی کرتا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی باپ اپنی اولاد اور وہ بھی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر سکتا ہے......؟

پریل ہانپنے لگا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کیری کا اندر سے تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ باہر سے اس کی حالت جتنی خستہ تھی اتنی اندر سے محسوس نہیں ہوئی۔ ماسوائے کھڑکیوں کے شیشوں کے...... اندر سے تو میں نے ایک... ڈسٹر نما کپڑا ڈھونڈ کر اس کے شیشے صاف کر لیے تھے مگر باہر سے ان پر گرد و غبار چپکا ہوا تھا۔ اسے صاف کرنے کے لیے مجھے کیری سے باہر اترنے کا رسک لینا پڑتا۔ جس کا... فی الوقت میں نے ارادہ ملتوی کر رکھا تھا۔ لیکن یہ کرنا ضروری بھی تھا۔ تاہم میں اس کا انجن چیک کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں اٹھ کر اگلی سیٹ پر آیا۔ اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے گیئر چیک کیا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بہ مشکل ٹک کر بیٹھ گیا۔ ''بہ مشکل'' اس لیے کہ کیری ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی۔ اگر کیری اسٹارٹ ہو جاتی تو میں اسے برسٹ زدہ ٹائروں سے ہی کھینچتا ہوا اس علاقے سے دور لے جاتا یا کوئی اور نسبتاً بہتر صورت اپناتا۔

''میں یہ کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں......'' عقب سے اچانک پریل کی آواز ابھری۔

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اللہ کا نام لے کر اگنیشن سوئچ میں چابی گھمائی......''چززز...... زززز......'' کی آواز ابھرتی رہی مگر انجن بیدار نہ ہوا...... میں دوبارہ کوشش کرنے لگا۔

''اس کی بیٹری بھی ڈاؤن ہے اور انجن میں بھی گڑبڑ ہے۔'' اس نے دوبارہ پیچھے سے ہانک لگائی۔

''یار! مجھے دیکھ تو لینے دو......'' اس کے مسلسل اس طرح بولنے پر میں نے چڑ کر کہا۔ موجودہ صورتِ حال نے مجھے بھی چڑچڑا سا کر ڈالا تھا۔ پریل چانڈیو محسوس کر گیا اور ہولے سے بولا۔

''معاف کرنا یار!''

مجھے اس پر ترس سا آ گیا۔ میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنی گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ وہ بھی ہنس دیا اور اپنا ایک ہاتھ دوستانہ انداز میں میری طرف بڑھایا تو میں نے بھی اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر تالی بجا دی۔

''میں کسی بھی حال میں ناامید نہیں ہوتا...... اللہ پر بھروسا کر کے کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔

''اچھی عادت ہے...... پسند آئی مجھے......'' وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

کیری اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ میں نے پہلے اس کے اگنیشن سوئچ کے تاروں کا گچھا باہر نکال لیا۔ جو اسٹیئرنگ کے نیچے ہی کہیں جڑا ہوا تھا۔ وہ سب ٹھیک تھا۔ اس کے بعد میں اٹھ کر پچھلی سیٹ پر آیا اور انجن چیک کرنے لگا۔ اس میں واقعی خرابی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا اور گرد آلود شیشے سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر گھٹن اور حبس بڑھنے لگا تھا۔ گرمی کا بھی یہی حال تھا۔

میں نے تھوڑے تھوڑے شیشے کھول لیے تھے تاکہ کم از کم آکسیجن ملتی رہے۔ ورنہ تو باہر بھی بادِ سموم ہی چل رہی تھی .... میں ایک ہاتھ باہر نکال کر کسی میلے کپڑے سے شیشے صاف کرنے لگا۔ جنگلی کتے اِدھر اُدھر زمین اور ٹیلوں کی ڈھلوانوں پر بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ یہ سب ہماری کیری سے زیادہ دور نہیں تھے اور اطراف میں ایک گھیرا سا ڈالے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ میں ان کی مکاری دیکھ کر اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ مجھے عارب خان کی بات یاد آ گئی۔ اسی نے ہی کہا تھا کہ جنگلی کتوں کا یہ غول بڑا مکار اور بے رحم ہوتا ہے۔ شکار کو پا کر یہ اسے ہرگز نہیں چھوڑتے۔ میں نے دیکھا تھا کہ کتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس طرف اپنی تھوتھنی اٹھا کر دیکھ لیتے تھے، جدھر ہماری کیری موجود تھی۔

دھوپ خاصی تیز نکلی ہوئی تھی مگر انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وقت گزر رہا تھا، لگتا تھا کہ دن اب دھیرے دھیرے ڈھل رہا ہے۔

معاً ایک کتے کو میں نے بدستور اپنی منحوس تھوتھنی اٹھائے اسی طرف تکتے پایا اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کیری کی طرف بھاگتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ ان بدبختوں کا ایک عجیب سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ کتے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے لپک کر شیشے بند کر دیے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی محض جھری بنانے کی حد تک ہی کھلے ہوئے تھے۔ شیشے صاف ہونے کے بعد اب میں باہر دیکھ سکتا تھا۔ اس ایک کتے کے لپکنے سے باقی خبیث کتے بھی بھونکتے غراتے ہوئے کیری کی طرف لپکے اور پھر وہی منحوس کھیل شروع ہو گیا۔ یعنی وہ کیری کے گرد چکر کاٹنے لگے۔ کئی ایک تو اپنی پچھلی دونوں ٹانگوں پہ کھڑے ہو کے اگلی دونوں ٹانگیں کیری کی باڈی سے ٹکا کر اپنے خوفناک تھوتھنے شیشے کے ساتھ رگڑنے لگے اور خونخوار انداز میں غراتے بھی جاتے۔

میں غصیلے انداز میں انہیں شیشے کے پار سے گھور کے پریل کے سامنے والی سیٹ پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ مردود کتوں کے دھکوں سے کیری بھی ہل رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک بھونکتے اور غراتے رہنے کے بعد یہ غول ''بخ...... بخ'' کرتا ہوا پلٹ گیا۔

میں نے سامنے سیٹ پر بیٹھے پریل کی طرف دیکھا، وہ نڈھال سا ہو رہا تھا۔ بڑی اکتا دینے والی اور اس سے زیادہ مشکل صورتِ حال تھی۔ رفتہ رفتہ دن ڈھلنے لگا۔ پریل پر نیم بے ہوشی سی طاری تھی۔ میں نے اسے اسی طرح ہی رہنے دیا۔ جاگتا تو پھر سونہڑیں کی طرف سے اسے بے چینی ستانے لگتی۔

میں نے شیشے کے پار سے اطراف میں نظریں دوڑائیں...... بنجر ویرانی اور سناٹے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کتے اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ شاید کوئی مدد آ جائے۔ شاید کوئی گاڑی یہاں سے گزرے اور ہم پر اُن کی نگاہ پڑ جائے۔ پتا نہیں یہ قبولیت کی کون سی گھڑی تھی کہ تھوڑی دیر بعد جب شام کا دھندلکا چہار اطراف میں پھیلنے لگا تو اچانک میں ٹھٹکا۔ ایک جانب مجھے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس متحرک نظر آئی۔ میرا دل خوش امیدی کے باعث تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے آہستگی سے اس طرف کا شیشہ ہٹایا اور ایک ہاتھ باہر نکال کر لہرانے لگا۔ اسی وقت کتے بھونکتے ہوئے اس گاڑی کی طرف لپکے۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ کتوں کے غول کو دیکھ کر ڈرائیور نے اس کی رفتار بڑھا دی تھی۔ کتوں کا پورا غول اس کے تعاقب میں دوڑا گیا حتیٰ کہ مجھے گاڑی کی ٹیل لائٹ نظر آنے لگیں۔ بے بسی اور مایوسی کے عالم میں، میں نے کیری کی باڈی پر مُکا جڑ دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں ابھرا اور پھر میں نے پریل کو جھنجوڑ ڈالا......

''پپ...... پریل! اٹھو...... جلدی کرو...... یہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع ہاتھ لگا ہے۔'' وہ پہلے تو اپنے حلق سے نحیف و نزار سی آوازیں خارج کرتا رہا، اس کے بعد...... اس نے نیم وا کر کے آنکھیں کھولیں اور میں نے دوبارہ اسے جھنجوڑا۔ وہ بیدار ہوا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

''کتے کسی گاڑی کے تعاقب میں بھاگے ہیں...... موقع اچھا ہے...... نکل چلو......'' کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ یہ رسک لینے کی ہمت نہ کرتا مگر وہ سونہڑیں کے تازہ ترین اور سنگین معاملے کی وجہ سے میرا ساتھ دینے پر فوراً ہی راضی ہو گیا۔

میں نے کیری کا پچھلا دروازہ کھولا اور باہر جھانکا۔ کوئی کتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کھائی کی طرف بھی سناٹا طاری تھا۔ میں پریل کو سہارا دیتے ہوئے دھڑکتے دل کے ساتھ کیری سے نیچے اترا۔ ان وحشی اور خوں خوار جنگلی کتوں کا خوف مجھے بھی تھا لیکن جستجوئے بقا کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے گن اپنے کاندھے پر اٹکا دی تھی اور اپنے جیسے گرانڈیل پریل کو سہارا دیتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا۔ میرا دل بھی اسی تیزی سے دھڑکے جا رہا تھا۔ ہم اپنی ''پناہ گاہ'' سے دور ہو چکے تھے۔ اگر کتے واپس لوٹ آتے تو ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں بچتا کہ ہم واپس کیری میں داخل ہوتے۔ اب تخت تھا یا تختہ...... والی بات تھی۔

میرے دل سے اس بات کا خدشہ ایک لمحے کے لیے بھی محو نہیں ہوا تھا کہ اگر کتے لوٹ آتے تو ہم دونوں کا کیا حشر ہوتا...... اطراف کا منظر بڑا خشک، بے رحم اور گرم ہو رہا تھا۔ آسمان پر گرم سی شام کی سرخی پھیل رہی تھی۔

ایک جنون سا تھا کہ میرے رگ و پے میں پارے کی مثل دوڑنے لگا تھا اور میں رکے بغیر پریل کو کھینچے ایک طرف لیے جا رہا تھا کہ اچانک میری تھکی ہوئی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ وہ ایک خوفناک سی غراہٹ تھی۔ میں نے شام کی ملگجی سی تاریکی میں اس منحوس آواز کی طرف دیکھا اور اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ دو کتے خوفناک جبڑے پھاڑے

عجیب مکارانہ سے انداز میں میرے عقب میں پہلے تیز تیز اور پھر جب مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو یک دم دوڑ پڑے۔ نجانے یہ اس غول میں شامل ہونے سے کیسے بچ گئے تھے۔ یا پھر ادھر اندھے گڑھے میں پڑے سو رہے تھے کہ ہماری بُو پا کر اس طرف نکل آئے۔

میں نے پریل کو چھوڑا۔ وہ چکرانے کے سے انداز میں خشک بنجر زمین پر ڈھے گیا۔ دونوں کُتّے خوفناک جبڑے پھاڑے گولی کی رفتار سے میری طرف دوڑے چلے آرہے تھے۔ میں نے گن پشت سے لے کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی اور نال کا رخ ان کی طرف کر کے تلے اوپر دو تین فائر جھونک دیے۔ دھماکے ہوئے اور دونوں کتے خاک چاٹنے لگے۔ میں نے گن پھر پشت پر ٹکائی اور جھک کر پریل کو سنبھالا۔ اس کے بعد اسے لیے آگے بڑھنے لگا۔ خدشہ اس بات کا قوی ہوچکا تھا کہ گولیوں کی آواز سن کر خون خوار کتوں کا غول اس طرف کا رخ کرسکتا ہے جبکہ مجھے ابھی تک کوئی ایسی جگہ یا پناہ گاہ دکھائی نہیں دی تھی جسے میں محفوظ خیال کرتا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ مجھے سامنے ایک بڑا سا ٹیلا نظر آیا تھا۔ مجھے امید سی تھی کہ اس کے پار ہمارے لیے کچھ بہتری کا سامان ہوسکتا ہے۔ یہ سوچ کر میرے تھکے ہارے وجود میں جیسے ایک نئی طاقت سی دوڑ گئی۔ پریل کچھ خوف زدہ سا نظر آنے لگا تھا۔ حالانکہ اس کی زندگی ایسے دل اندوز واقعات سے بھری پڑی تھی لیکن اس طرح کی بے بسی کی موت کا تصور اچھے اچھوں کا پتّا آب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے جبکہ خود میرا اپنا بھی یہی حال تھا۔

ایک مقام پر ٹیلے کی ڈھلان چڑھتے ہوئے...... پریل کو سنبھالے سنبھالے میرا ایک پاؤں رپٹ گیا اور میں گر پڑا۔ پریل بھی میرے ہی سہارے تھا، وہ بھی گرا۔ ٹیلا خاصا بلند تھا اور ہم دونوں ہی لڑھکتے ہوئے نشیب میں جانے لگے۔

ٹیلے کی ڈھلان پر جابجا چھدری چھدری جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں...... میں نے ایک کو تھام لیا، وہ پُرخار تھی، تکلیف سے میری کراہ آمیز چیخ نکل گئی۔ ہتھیلی پہ چبھنے والے کانٹوں سے خون رسنے لگا۔ میں نے وہ خارزدہ جھاڑی چھوڑ دی۔ پریل بھی ایک طرف کی جھاڑیوں کے جھنڈ میں اٹک کر رک گیا تھا۔

میں لیٹے لیٹے اس کی جانب کھسکا اور یہی وہ وقت تھا جب ایک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور میرے رگ و پے میں خوف کی پھریری سی دوڑ گئی۔ یہ اَن گنت بھاگتے ہوئے جنگلی کتوں کی آوازیں تھیں۔ وہ شاید مذکورہ گاڑی کا ناکام تعاقب کرنے کے بعد نجانے اب کدھر سے واپس لوٹ رہے تھے۔ تاہم ان کے بھونکنے کی آواز مدّھم سی تھی اور اس سے زیادہ خوف طاری کیے دے رہی تھی۔ کتوں کے نرغے میں پھنس کر موت کے منہ میں جانے کا تصور ہی روح فرسا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے وجود کی ساری طاقت مجتمع کرتے ہوئے ایک بار پھر پریل کو سنبھالا اور اس سے ہانپتی ہوئی آواز بولا۔

"پریل......! اٹھ، وقت بالکل نہیں ہے ہمارے پاس...... کتے واپس لوٹ رہے ہیں، انہوں نے شاید ہماری بُو سونگھ لی ہے۔"

"تت...... تم بھاگ جاؤ دوست! مجھے چھوڑ دو...... اِدھر ہی...... میں اب نہیں چل سکتا۔ سس...... لل...... لیکن سونہڑیں کو کبھی اس کے باپ کے حوالے نہ......"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم پریل! تمہاری خاطر میں نے اپنی جان خطرے میں ڈال دی ہے اور تم کہتے ہو میں تمہیں یہاں ان جنگلی شکاری کتوں کا نوالہ بننے کے لیے چھوڑ دوں...... ہرگز نہیں، اٹھو......" میں نے یہ کہتے ہوئے اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی کچھ ہمت سے کام لیا اور اپنے ڈھتے ہوئے وجود کی طاقت کو مجتمع کرتے ہوئے میرے ساتھ ڈھلان پہ چڑھنے لگا۔

"مجھے...... پورا یقین ہے......" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور ایک نظر عقب میں ڈالی جہاں سے میرا خیال تھا کہ کتوں کا غول ہمارے تعاقب میں دوڑا چلا آرہا تھا۔ "اس ڈھلان کی دوسری طرف...... کوئی نہ کوئی محفوظ پناہ گاہ ہمیں مل جائے گی۔"

پریل بھی اپنی سی کوشش کر رہا تھا میرا ساتھ دینے کی اور میں نے تو اپنا تن من دھن لگا رکھا تھا۔ جیسے ہی ہم ٹیلے کی چوٹی پر پہنچے...... اور میں نے عقب میں دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ ٹیلے سے نیچے تھوڑی دور پھیلے بھربھری مٹی والے میدان میں خونی کتوں کا غول گولی کی رفتار سے ہماری طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عبرت ناک موت کے جاں گسل تصور سے میرا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ موت کو سامنے دیکھ کر میرے اعصاب شل سے ہونے لگے اور ہمت جواب دینے لگی۔ جانے یہ ان منحوس کتوں کا کیسا خوف تھا جو بری طرح میرے اعصاب پر سوار ہوچکا تھا۔

"مم...... مجھے ان کے سامنے پھینک کر بھاگ جاؤ...... یہ میرے ساتھ مصروف ہوجائیں گے اور تمہیں

JBD
جہانگیر بکس 91
نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول
آخری معرکہ -/550
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر
اندھیری رات کے مُسافر -/475
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ورسوائی کی الم ناک داستان
ثقافت کی تلاش -/300
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا
قیصر و کسریٰ -/625
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان
اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی
گمشدہ قافلے -/500
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان
داستانِ مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکتہ الآرا داستان
پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا
یوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان
معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت
خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں
کلیسا اور آگ -/450
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان
قافلۂ حجاز -/599
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان
محمّد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں
پورس کے ہاتھی -/300
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی
انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا
پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز
آخری چٹان -/450
سیّد خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا
سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر
سفید جزیرہ -/325
بحر الکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان
شاہین -/475
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اُردو زبان کا پہلا لغت

سبق آموز کُتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165
حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195
اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140
حکایاتِ رومیؒ -/180
دلچسپ و عجیب حقائق -/170
حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199
دلچسپ و حیرت انگیز باتیں -/150
ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات -/180
بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

جہانگیر بُک ڈپو
022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

بھاگنے کا موقع......'' پریل کی آواز حلق میں دب گئی۔ میں اس کی بات کاٹ کر چیخا۔

''پریل! ہمت کرو...... مجھے ایک محفوظ پناہ گاہ نظر آگئی ہے۔'' یہ کہتے ہی میں اسے اپنے ساتھ کھینچنے لگا۔ کتوں کا غول بدستور دوڑتا ہوا ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ ایک ہیبت ناک اور کریہہ انگیز موت کی صورت میں ٹیلے کی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے دوڑتے نظر آرہے تھے۔ چوٹی پر پہنچتے ہی میں نے پریل کو زور سے دوسری طرف نیچے نشیب میں دھکا دیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہی رگیدتا ہوا نیچے لڑھکتا چلا گیا اور پھر جیسے ہی کتوں کی خونخوار تھوتھنیاں ٹیلے کی چوٹی سے نمودار ہوئیں...... میں اور پریل...... قریب بہتی ایک قدرے چوڑے پاٹ والی نہر کے ریتیلے کراڑے پر آن گرے تھے۔ وہاں سے لڑھکتے ہوئے ہم سیدھے بہتی نہر میں جا گرے۔

گرمی اور تپش کے مارے ہوئے وجود، نہر کے ٹھنڈے پانی کی برودت میں جیسے اچانک ہی جی اٹھے تھے۔

میں نے پریل کو سنبھال لیا تھا اور ہم اب دونوں گویا ایک دوسرے کو تھامے ہوئے نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ بہے چلے جارہے تھے۔ ادھر جنگلی کتے...... نہر کے کنارے کنارے ریتیلے کراڑے پر، ہمارے ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہے تھے۔ میری کوشش یہی تھی کہ ہم کنارے سے دور ہی رہیں۔ کیا خبر کوئی بھوکا کتا جوشِ شکم سیری میں ہم پر وہیں سے ہی چھلانگ لگا لیتا۔ میں نے اپنا ہی نہیں بلکہ پریل کا منہ بھی پانی کی سطح سے اوپر کر رکھا تھا، تاکہ غوطہ نہ لگ سکے۔ ورنہ بہتی نہر میں ایک بار غوطہ کھانے کے بعد برا حال ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہی بوقتِ ضرورت اپنے ہاتھوں پیروں کو بھی متحرک کیے ہوئے تھے۔ تاکہ ڈوبنے سے بھی بچے رہیں۔

''شش...... شہزی!''

اسی وقت مجھے کانوں میں پانی کے شور میں پریل کی ڈوبی ڈوبی سی آواز سنائی دی۔

''ہم بچ گئے شہزی......! ہم بچ گئے......'' وہ کہہ رہا تھا۔ میری طرح اسے بھی خوشی تھی تاہم میں ابھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہم خطرے سے بالکل باہر نکل آئے ہیں کیونکہ ایک تو ہم نہر میں تھے اور دوسرے یہ کہ کتے ابھی تک ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ یہ نہر میں ہی کود پڑتے۔

''ہاں پریل! شاید تم ٹھیک کہتے ہو مگر ہمیں اب بھی ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا ہے......'' میں نے کہا۔

''تم سمجھے نہیں میری بات......'' وہ بولا اور میں حیران سا ہوا۔

''یہ نہر...... جنگل ڈیرے کے قریب سے گزرتی ہے۔'' اس نے اپنی خوشی کی اصل وجہ بتا کر مجھے بھی ایک خوشگوار سی حیرت سے دوچار کر ڈالا۔

''اچھا......! یہ تو اور بھی اچھی بات ہو گئی......'' میں نے بھی خوش ہو کے جواب میں کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب پریل کے وجود میں بھی کوئی انجانی سی طاقت دوڑ گئی تھی۔ اسی سبب ہم نے دوسرے کنارے پر اترنے کے بجائے اسی طرح تیرتے رہنے پر ترجیح دی تھی۔

نہر آگے جا کر قوس کی صورت میں گھنی جھاڑیوں اور آک ... کے موٹے کڑوے پتوں والے گھنے پودوں میں گم ہو رہی تھی۔ جو کنارے پر بہت آگے تک نہر پر جھکے ہوئے تھے۔ تب ہی میں نے محسوس کیا کہ کتوں کے دوڑنے کی رفتار بتدریج آہستہ ہوتی جارہی تھی...... یہاں تک کہ ان کی تعداد میں بھی کمی آنے لگی۔ بیشتر کتے زبان باہر نکالے ہانپ رہے تھے اور رکتے جارہے تھے۔ قوس کی شکل میں خطرہ تھا کہ ہم دونوں کنارے سے جا لگتے اور یہی ہوا...... جیسے ہی ہم نہر کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ موڑ کاٹنے لگے...... ہمارا رخ کنارے کی طرف ہونے لگا۔ گن ہنوز میرے کاندھے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے پریل کو خبردار کر کے اسے چھوڑ دیا اور کنارے کے قریب آتے ہی میری گن میں جتنی بھی گولیاں تھیں وہ میں نے کنارے پر دوڑتے ہوئے باقی ماندہ کتوں پر برسا دیں، وہ سب ڈھیر ہو کر گرنے لگے اور شاید تعداد کی کمی کے باعث وہ بھی پیچھے ہٹنے لگے۔ موڑ کاٹتے ہی میں اور پریل دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن ملے۔ خالی گن میں نے پھینک دی اور خود کو پانی کے بہاؤ کے سپرد کر دیا۔

بہاؤ زیادہ تیز نہ تھا مگر اتنا کم بھی نہ تھا...... موڑ کاٹتے ہی نہر کے دونوں کناروں پر لانبے گھنے پیڑوں کے جھنڈ نمودار ہونے لگے۔ جن کی شاخیں سطحِ آب پر جھکی ہوئی عجیب منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں نے کنارے کی طرف دیکھا، کتے غائب ہو چکے تھے۔

''کیا خیال ہے دوست! اب کنارے کا رخ کیا جائے؟'' میں نے پریل سے پوچھا۔

''ابھی نہیں، میں بتاؤں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

ہم اسی طرح خود کو بہاؤ کے سپرد کیے تیرتے رہے۔ پریل غور سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ایک پُلیا کے نیچے سے ہم گزرے تو پریل نے مجھے دوسرے کنارے پر نکل جانے کا کہہ دیا۔ ہم ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے دوسرے کنارے کے قریب ہونے لگے اور پھر کنارے پر پھیلی ہوئی آبی جھاڑیوں اور پودوں کو دبوچ کے ہم نے اپنی رفتار جام کی اور کنارے پر نکل آئے۔

خشکی پر آتے ہی ہمارے وجود کی تھکن جیسے ایک دم بیدار ہو گئی اور ہم خاصی دیر تک اسی طرح کنارے پر پڑے ہانپتے رہے...... گھنا جنگل دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ ستانے کے بعد ہم ذرا باتیں کرنے کے قابل ہوئے تو پریل نے مجھے بتایا کہ یہ نہر ''گاج ندی'' کہلاتی ہے، جسے مقامی زبان میں ''گاج نئیں'' کہا جاتا ہے اور یہ آگے کئی میل جا کر دریائے سندھ میں جا گرتی ہے۔ یہاں سے جنگل ڈیرا زیادہ دور نہیں تھا۔

''اس صورت میں جبکہ......'' میں نے کسی محتاط خیال کے پیشِ نظر اس سے کہا۔ ''تمہارا غدار نائب لائق ماچھی گروہ کا سرغنہ بن چکا ہے، میرا نہیں خیال کہ وہ ہمارا خوشی سے استقبال کریں گے؟''

پریل چانڈیو میرا اشارہ سمجھ کر تلخ مسکراہٹ سے بولا۔ ''مجھے اس کا اندازہ ہے...... چلو آگے بڑھو۔''

ایک مصیبت سے نجات ملتے ہی اس کے درماندہ وجود میں بھی نئی طاقت دوڑ گئی تھی۔ ہم دونوں اٹھے اور آگے بڑھ گئے۔ اب راستوں کی راہنمائی پریل کر رہا تھا۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ہم دونوں چھپتے چھپاتے جنگل میں راستہ بناتے آگے بڑھ رہے تھے۔ پریل کے مطابق اس کے ساتھی اسے دیکھ کر خوش تو ضرور ہوں گے لیکن جو کسی وجہ سے لائق ماچھی کے ساتھ مل چکے تھے، وہ بھی اپنے پرانے سرغنہ کو دیکھ کر اس سے آن ملیں گے...... ایک بڑی جنگ کا خطرہ پھر بھی موجود تھا مگر پریل کو یقین تھا کہ عبرتناک شکست پھر بھی غدار لائق ماچھی کے حصے میں آئے گی۔ کیونکہ پریل کے وفاداروں کو ابھی تک یہ کھٹک ہو گی کہ آخر ان کا سردار سائیں (پریل) اچانک کہاں غائب ہو گیا لیکن وہ شاید اب اپنی جان کے خوف سے مصلحتاً خاموش تھے۔

تھوڑی دیر بعد پریل کے مطابق جنگل ڈیرے کی حدود شروع ہو چکی تھی۔ اب ہم دونوں محتاط انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ شام کے ملگجے سائے رات کی گہری تاریکی میں مدغم ہو چکے تھے۔ ہم اسی کا حصہ بنے آگے بڑھتے رہے۔ ایک خطرے سے بچ کر تو نکل آئے تھے مگر اب دوسرا خطرہ لٹکتی تلوار بن چکا تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا، پریل مطمئن تھا یا پھر شاید اسے اپنے گروہ کی تازہ صورتِ حالات کا اندازہ نہ تھا جتنا کہ مجھے تھا۔ ہم خالی ہاتھ تھے جبکہ پریل اپنے وفادار ساتھیوں پہ تکیہ کیے ہوئے تھا۔

بہرحال ہم محتاط روی کے ساتھ بدستور آگے بڑھتے رہے۔ فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ آسمان صاف تھا اور دور کہیں اماوس کا چاند ہونے کے باعث جنگل میں کچھ زیادہ ہی تاریکی تھی۔ میں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا اور سانپوں کا بھی ڈر تھا مجھے...... لیکن پریل یوں بڑھا چلا جارہا تھا جیسے اسے سب نظر آرہا ہو...... اب میرے بجائے وہ راہنمائی کر رہا تھا۔ اچانک ایک مقام پر وہ قدرے ٹھٹک کر رکا۔ میں بھی رک گیا۔ وہ جیسے کوئی سن گن لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے بعد مجھ سے سرگوشی میں بولا۔

''ہم منزل کے بہت قریب ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پہرے پر صرف دو افراد تعینات کیے جاتے ہیں، کیونکہ اس طرف کسی خطرے کا عمل دخل کم ہی ہوتا ہے۔''

''کیا تم ان دونوں پہرے داروں سے بھڑ جانے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ میں اس کے پیچھے چلا۔ ابھی ہمیں تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک ایک قہقہے کی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ میں چونک کر رکا مگر پریل مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید پریل کے کانوں نے قہقہے کی آواز نہیں سنی ہو گی، میں ابھی اسے یہ بتانے ہی والا تھا کہ دفعتاً پریل کو میں نے دبک کر رکتے پایا۔ میں بھی رک گیا۔ تب ہی مجھے گہری خاموشی کے دامن میں باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے اسی طرف دیکھا، پریل کی نظریں بھی وہیں جمی ہوئی تھیں۔

''ان دونوں میں سے ایک میرا ساتھی ہے۔'' معاً پریل نے سرسراتی سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

''کیا تم ان پر جھپٹنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''نہیں...... آؤ میرے ساتھ...... لیکن میرے پیچھے ہی رہنا۔'' کہتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے عقب میں قدم بڑھاتا رہا۔

''دل مراد...... ہوشیار......'' اچانک پریل نے ٹھہر کر قدرے بلند آواز میں کہا۔ اس طرف مجھے روشنی سی نظر آئی تھی۔ کمزوری کے باعث اس کی آواز میں ویسا رعب

اور دبدبہ نہ تھا...... لیکن میں نے دیکھا اس کی آواز پر یکلخت دو مسلح آدمی اسی روشنی والی جگہ سے نمودار ہو کر سامنے آگئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ جس کا چمکارا خاصے پھیلاؤ والا تھا۔

''سس...... سردار سائیں......! تت...... تم۔'' ٹارچ والے کے منہ سے مسرت بھرے الفاظ ابھرے۔ شاید یہی دل مراد تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی خاموش تھا، حیرت اس کے چہرے پر بھی طلوع ہوئی تھی مگر اس نے کسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا تھا۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا۔

''کیسے ہو تم دل مراد؟ پہچان لیا مجھے......؟'' پریل اس سے بولا۔ ''لیکن لگتا ہے، شنواری نے مجھے نہیں پہچانا ابھی تک......'' اس نے آخر میں اس کے برابر میں کھڑے دوسرے مسلح آدمی پر نظر ڈال کر کہا تو وہ اچانک جیسے گڑبڑا کر بولا۔

''نن...... نہیں سردار سائیں! بھلا آپ کو میں کیسے نہیں پہچانوں گا......'' تب ہی اچانک دل مراد نے ایک عجیب حرکت کر ڈالی۔ اس نے پلک جھپکتے ہی اپنی گن کی نال شنواری نامی اس آدمی کی کنپٹی سے لگا دی۔

''اپنی گن پھینک دو شنواری! اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو گولی ماردوں گا۔''

شنواری گم صم ہو گیا۔ چونکا میں بھی تھا مگر پریل نے دل مراد سے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''دل مراد! یہ کیا حرکت ہے؟''

''سردار سائیں! یہ اسی غدار لائق ماچھی کا آدمی ہے۔'' دل مراد نے جواب دیا۔

''نہیں دل مراد۔'' پریل بولا۔ ''غدار صرف لائقو ہے، یہ لوگ نہیں...... انہیں ورغلایا گیا ہے اور میں ایسے لوگوں کی غلط فہمی دور کردوں گا۔ گن نیچے کرلو۔''

دل مراد چند ثانئے مخمصے کا شکار رہا اس کے بعد اس نے حکم کی تعمیل کر ڈالی۔ میری نظریں شنواری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ پریل نے شنواری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اب بھی لائق ماچھی کو اپنا سردار سائیں تسلیم کرتے ہو؟'' اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ شنواری اچانک پریل کے قدموں میں گر پڑا۔

''سائیں! مجھے معاف کردو...... ہم لالچ میں آکر اس بدبخت لائقو کے کہنے میں آگئے تھے۔ آپ ہی ہمارے سردار سائیں ہو اور کوئی نہیں۔''

پریل نے شنواری کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر کھڑا کردیا اور بولا۔

''شنواری! میں کسی قسم کا خون خرابا کرنے نہیں آیا ہوں...... ورنہ جانتا ہوں میں کہ اگر اس وقت میں خود کو ظاہر کردوں تو گروہ میں زبردست جنگ پڑنے اور کشت وخون پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اگر لوگ لائق ماچھی کو اپنا سردار سمجھتے ہیں تو بے شک وہ اس کے ساتھ اپنا الگ گروہ بنالیں، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں اس کا قصور بھی معاف کرنے کو تیار ہوں لیکن اس نے میرے دوست شہزی اور سونہڑیں کے ساتھ جو کمینہ پن کیا ہے، اس کا اس مردود کو حساب دینا ہوگا۔''

''بالکل سائیں! آپ برابر بولتے ہو۔'' شنواری بولا۔ ''آپ ابھی ہمارے ساتھ چلیں...... آپ کو دیکھ کر وفاداروں کے حوصلے بلند ہوجائیں گے۔ وہ سخت مایوسی کا شکار ہیں۔ ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ آپ زندہ ہیں لیکن سائیں! کیا تم جانتے ہو کہ سونہڑیں بھاجائی کے ساتھ اس مردود نے کیا حرکت کی ہے؟''

سونہڑیں کے متعلق اس کے کہنے کا انداز اس طرح کا تھا کہ پریل کا چہرہ یک دم فق ہوگیا۔

''اس نے سونہڑیں کے ساتھ کیا کیا ہے؟ جلدی بتاؤ مجھے......؟'' پریل بپھر کر بولا۔

''سس...... سائیں! اس خبیث نے بھاجائی سونہڑیں کو بھاری تاوان کے عوض دوبارہ اس کے باپ زمیندار شاہنواز خان کے حوالے کردیا ہے......'' اس بار دل مراد نے بتایا اور میں نے دیکھا اس انکشاف پر پریل کا چہرہ ایک دم دھواں دھواں ہوگیا۔ اگرچہ خود میرے لیے یہ خبر غیر متوقع نہ تھی، کیونکہ مجھے پیشگی ہی اس بات کا علم تھا کہ لالچی لائقو...... معصوم سونہڑیں کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور میں نے یہ پریل کو بتایا بھی تھا۔

''مم...... میں اب لائقو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا......'' اچانک پریل غیظ وغضب سے بولا۔ ''میں اسے معاف کرنے والا تھا جو اس نے میرے ساتھ کیا، لیکن اس مردود نے میری معصوم سونہڑیں کو چند ٹکوں کے لالچ میں دوبارہ اس کے سنگ دل اور بے رحم باپ کے حوالے کر کے اچھا نہیں کیا۔ سونہڑیں کو شدید خطرہ ہے۔ اس کا ظالم اور انا کا مارا ہوا باپ اپنی شان بچانے کے لیے غریب اور معصوم سونہڑیں کو ہلاک کر ڈالے گا۔'' پریل کو وہی دورہ پڑ گیا۔ ''میں اسی وقت جاؤں گا...... میں اب نہیں رک سکتا۔ یہ گن مجھے دو......'' پریل نے دل مراد سے گن جھپٹ لی۔

میں نے بھی ہتھیار کا تقاضا کیا تو شنواری نے اپنی شلوار کے نیفے سے پستول نکال کر مجھے تھمادیا۔

''میرا خیال ہے کہ سردار سائیں کا ابھی ڈیرے میں جانا مناسب نہ ہوگا۔ پہلے راز داری کے ساتھ......'' دل مراد کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت پریل نے اس کی بات رد کردی اور آگے بڑھ گیا۔ ہم اس کے ساتھ تھے۔

صورتِ حال...... معاملہ فہمی سے ہٹ کر اب دوبارہ جنگ کی نہج پر آگئی تھی۔

●

ڈیرے پر پہنچتے ہی پریل نے اپنی گن کا رخ آسمان کی طرف کر کے ایک عدد ہوائی برسٹ فائر کردیا۔ مقصد اپنی آمد کا اعلان کرنا اور دشمن کو للکارنا تھا۔ اگرچہ ڈیرے میں داخل ہوتے ہی کئی اور لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں اور چہروں سے حیرت ومسرت عیاں تھی، بعض لوگ عجیب سی پریشانی اور الجھن کا بھی شکار تھے۔ کئی ڈاکوؤں نے تو پریل کو زندہ دیکھ کر اس کے حق میں نعرے بازی بھی کر ڈالی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں مجمع لگ گیا اور پریل کے وفاداروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔ اسی وقت لائق ماچھی بھی وہاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نمودار ہوگیا۔ اس خبیث کو دیکھتے ہی پریل کا مارے طیش کے جو حال ہوا سو ہوا تھا خود میرے اپنے وجود میں بھی نفرت وغیظ کی لہریں امڈ پڑی تھیں۔

پل کے پل وہاں گروہ بندی کی لائن سی آپوں آپ کھنچ گئی۔ وہ سب ہتھیار سنبھالے چوکنا کھڑے تھے۔

''ساتھیو! میں کوئی خون خرابا نہیں کرنا چاہتا......'' پریل نے اپنے غدار نائب کو دیکھنے کے باوجود اپنے اندرونی ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کے ٹوٹے اور ریختہ وجود میں جانے کہاں سے اچانک قوت آگئی تھی، شاید جوشِ جذبہ اسی کو کہتے ہیں۔ پریل کا خطاب جاری تھا۔

''مجھے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مروانے کی کوشش کی گئی اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس سازش کا سرخیل اور کوئی نہیں میرا اپنا ہی نائب لائق ماچھی تھا۔ لیکن اللہ سائیں کو میری زندگی ابھی منظور تھی۔ اس نے میرے دوست شہزاد احمد شہزی کو میرا نجات دہندہ بنا کر میرے پاس بھیج دیا اور اسی میرے جاں نثار دوست نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے بچایا۔ جس کی وجہ سے آج میں تم لوگوں کے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔ میں نے اس آستین کے سانپ...... لائق ماچھی کو معاف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور اس بات پر بھی راضی تھا کہ بے شک جو اس کے ساتھ ملنا چاہے مل جائے اور الگ گروہ کی بنیاد ڈال دے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس بدبخت نے میری ایک مقدس امانت، ایک معصوم لڑکی، جس سے میں محبت کرتا تھا اور جو اپنے ظالم باپ وڈیرے شاہنواز خان کی شان وشوکت کو ٹھوکر مار کر میرے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کرچکی تھی، اس غریب کو رقم کے لالچ میں اندھا ہو کر اس بدبخت غدار نے دوبارہ اس ظالم انسان کے حوالے کردیا۔ اب میں فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں...... جو مجھے اب بھی اپنا سردار تسلیم کرتا ہے، وہ میرے دائرے میں آجائے...... اور جو لائق ماچھی کے ساتھ ملنا چاہتا ہے وہ اس کی طرف اپنے قدم بڑھالے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن اس کے بعد لائق ماچھی کو اپنے جرم کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

پریل اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ مجمع میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ میرے لیے یہ عجیب صورتِ حال تھی۔ بالکل ہی عجیب...... میں خود یوں محسوس کررہا تھا جیسے میں کسی آتش فشاں پر کھڑا ہوں اور جس کے اندر سے کسی وقت بھی ایک خوفناک جوالا مکھی پھوٹ پڑے گا۔ تاہم مجھے پریل کی دانش مندی کا بھی اعتراف تھا کہ اس نے یہاں بھی اپنی معاملہ فہمی سے کام لینے کی کوشش چاہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ پریل کو اپنے گروہ میں اب بھی اپنی اہمیت اور حیثیت کا بغیر کسی خوش فہمی کے پورا احساس تھا۔ وہ بڑی چالاکی اور فہم وفراست سے لائق ماچھی جیسے خطرناک دشمن غدار کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ چند ہی لمحے بعد اس کے ثمرات میری آنکھوں کے سامنے تھے۔

ہمارے ساتھ جو اسلحہ بدست ڈاکو شامل ہوئے تھے، ان کی تعداد لائق ماچھی سے کہیں زیادہ تھی۔ جبکہ لائق ماچھی کے ساتھی، تعداد میں آٹے میں نمک کے برابر تھے اور جو تھے وہ بھی الجھن کا شکار ہی معلوم ہوتے تھے۔ پریل نے اپنی بھان دار حکمتِ عملی سے اپنے دشمن کو تنہا کر کے رکھ دیا تھا اور اب اس کے ساتھی جیسے حکم کے منتظر تھے کہ وہ لائق ماچھی جیسے غدار کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ مجھے ایک بار پھر پریل کی زود فہمی اور دانش مندی کا قائل ہونا پڑا۔

''ہم تمہارے ساتھ نہیں چل سکتے...... ہم جانا چاہتے ہیں۔'' معاً خبیث لائقو نے کہا اور میں اس کی شاطرانہ مکاری پر اندر ہی اندر کھول اٹھا مگر بولا کچھ نہیں۔ ابھی یہ معاملہ مکمل طور پر پریل کے سپرد تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے پریل کو پُرطیش عالم میں اس کی طرف قدم بڑھاتے

ہوئے دیکھا اور پریل نے لائق ماچھی کے قریب پہنچ کر اس کا گریبان دبوچ لیا۔

''تجھے پہلے اپنے جرم کا حساب دینا ہوگا...... لائقو! لیکن میں اپنی زبان پر بھی قائم ہوں کہ میں نے اپنا جرم تجھے معاف کر دیا ہے لیکن...... تو نے میری سونہڑیں کے ساتھ جو قبیح اور انتہائی گری ہوئی حرکت کی ہے، اس کا تجھے ابھی حساب چکتا کرنا ہوگا۔''

''نہیں سردار سائیں......!'' اچانک ایک ساتھی ڈاکو نے بہ آواز بلند پریل چانڈیو سے کہا۔ ''اس غدار کمینے کو تمہارا حساب بھی دینا ہوگا...... اس نے تمہاری پیٹھ میں خنجر گھونپنے کی کوشش کی ہے اور ہمیں بھی بزور دھمکی اور زبردستی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، اس کا جرم معمولی نہیں ہے۔ اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔'' اس کی بات پر مجمع میں شور بلند ہوا۔

''غدار کی سزا موت...... غدار کی سزا موت......''

ایسے ہی فیصلہ کن لمحات نے مجھے بھی اس کی جانب قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا اور میں چند قدم اٹھاتا ہوا پریل کے قریب پہنچا اور اس سے کہا۔

''پریل! اس وقت سونہڑیں کا معاملہ سب سے اہم ہے۔ ہمیں اس کے لیے جلد سے جلد کچھ کرنا ہوگا...... ابھی اس معاملے کو اِدھر ہی رہنے دو اور لائق کو قید میں ڈال دیا جائے...... اسے پھر دیکھتے ہیں......''

پریل کو میری یہ تجویز معقول لگی اور اس نے یہی حکم دے ڈالا...... چنانچہ لائق ماچھی اور اس کے چند ساتھیوں کو ایک جھونپڑے میں رسن بستہ کر کے مقید کر دیا گیا۔ پریل کے ساتھیوں کا ارادہ، اپنے سردار سائیں کی واپسی کی خوشی میں جشن منانے کا تھا لیکن پریل نے منع کر دیا اور اسی وقت وڈیرے شاہنواز خان کی حویلی پر ہلا بولنے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔

سونہڑیں کی دستیابی کے علاوہ میں نے پریل سے ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی اس کے قبضے سے آزاد کرانے کا ذکر خاص طور پر کیا تھا جبکہ شکیلہ بھی اسی کے قبضے میں تھی۔ مجھے یہ معلوم تو نہ تھا کہ شکیلہ کو جب زمیندار شاہنواز نے اپنے حواریوں کے ساتھ وہ طلسم نور ہیرا ڈھونڈنے کے لیے پرانے قبرستان کی طرف روانہ کیا تھا تو اس کا ''کھڑتیل'' کیا برآمد ہوا تھا؟ ظاہر تھا کہ وہ بھی شاہنواز کی قید میں ہی ہوگی اب...... ساتھ ہی مجھے فکر و تشویش بھی تھی کہ وہ ہیرا اس خبیث آدمی کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو۔ کبیل دادا اور اول خیر بھی پولیس لاک اَپ میں تھے۔ ان سے متعلق بھی میں نے خاص طور پر پریل سے ذکر کیا تھا۔ پریل نے مسکرا کر مجھے اس بات کی تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اب کیوں فکر کرتا ہے میرے یار شہزی! وڈیرے اور اس کے راتب خور انسپکٹر رجب دین نے تیرے اور تیرے ساتھیوں کے خلاف جو غیر قانونی ہتھکنڈا استعمال کیا ہے میرے لیے وہی ہتھیار استعمال کرنا آسان ہے۔ بس، دیکھتا جا تو......''

پریل نے اپنے چند ڈاکو ساتھیوں کا انتخاب کیا...... مجھے بھی ایک عدد کلاشنکوف تھما دی گئی۔ اس کے بعد ہم سب تیز رفتار گھوڑوں پر شاہنواز خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے۔

جنگل کی حدود سے نکل کر جب ہم شاہنواز خان کے گوٹھ کی حدود میں داخل ہوئے تو پریل نے سب کو رکنے کا اشارہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے دو ساتھی جاسوسوں کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے حویلی روانہ کر دیا۔ ہم سب وہیں موجود رہے۔ گوٹھ کی اس سمت پر کیکر کا گھنا جنگل تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ شاہنواز اتنا نچلا بیٹھے رہنے والا آدمی نہیں ہو سکتا تھا۔ حویلی پر حملے اور بیٹی کے ''اغوا'' اور لائق ماچھی کی غداری کے سبب دوبارہ اپنی بیٹی سونہڑیں کو حاصل کرنے کے بعد وہ بھی محتاط ہو گیا ہوگا۔ تاہم میرے ذہن میں ایک خیال بھی، اس کے مطمئن اور غیر محتاط ہونے کا ضرور ابھرتا تھا کہ لائق ماچھی سے ساز باز (تاوانِ زر کی صورت) کے دوران، ممکن تھا کہ اس نے شاہنواز کو بتایا ہو کہ پریل اب زندہ نہیں رہا تھا۔ میں نے جب اس کا اظہار پریل سے کیا تو وہ زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔

''لائق ماچھی میرے متعلق یہ بات شاہنواز خان کو کبھی نہیں بتا سکتا۔ بلکہ اگر وہ یہ بتانے کی بیوقوفی کرتا تو اس کا دبدبہ کمزور پڑنے لگتا۔ اس نے تو میرا ہی نام استعمال کیا ہوگا...... کیونکہ شاہنواز کے دل و دماغ پر آج بھی میری ہی دہشت طاری ہے۔ لہٰذا لائقو نے یہی بتایا ہوگا کہ میں نے اس کی بیٹی کو تاوان کے لیے ہی اغوا کیا تھا۔'' پریل کی بات پر میں نے پُرغور انداز میں اپنی بھویں اچکا لیں۔

خاصی دیر بعد پریل کے دونوں مذکورہ جاسوس لوٹے تو انہوں نے اطلاع دی کہ شاہنواز خان کی حویلی کے گرد مسلح حواریوں کے علاوہ پولیس کے کچھ اہلکار بھی تعینات کر دیے گئے تھے۔

''پولیس متعلقہ تھانے سے تعلق رکھتی ہے یا شہر سے بلوائی گئی ہے؟'' پریل نے ایک جاسوس ساتھی سے پوچھا۔

''وہاں کھڑی دو پولیس کی گاڑیوں کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ گوٹھ کے تھانے کی ہیں۔'' جاسوس نے جواب دیا۔

''ہوں......'' پریل نے پُرسوچ ہنکارا ابھرا۔ پولیس کے ذکر پر میری پیشانی پر بھی سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ پریل اب بھی حویلی پر چڑھائی کا ہی حکم صادر کرے گا مگر اس نے ساتھیوں کو متعلقہ تھانے پر ہلّا بولنے کا حکم دیا۔ مجھے اس کی حکمتِ عملی کے یکدم بدلنے پر حیرت تو ہوئی لیکن یہاں کے معاملات اور حالات کا مجھ سے کہیں زیادہ پریل ہی ادراک رکھتا تھا اسی لیے میں خاموش رہا۔

چنانچہ رات کی تاریکی میں ہم گھوڑوں کو درمیانی رفتار سے دوڑاتے رہے اور پھر ایک مقام پر پریل نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔

پریل نے جلد ہی میری الجھن رفع کر دی اور بتا دیا کہ تھانے پر دھاوا بولنے کے دو نتائج برآمد ہو سکتے ہیں...... ایک تو یہ کہ وڈیرے کی حویلی پر تعینات پولیس اسی طرف دوڑی چلی آئے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا کہ ہم کبیل دادا اور اول خیر کو چھڑا سکتے تھے۔ اس کی منصوبہ بندی تو لاجواب تھی لیکن...... میں تب بھی مطمئن نہ ہوا تھا، بولا۔

''لیکن کیا اس طرح ایک قانونی عمارت پر حملہ کرنا صورتِ حال کی خطرناکی کو بڑھانے کا سبب نہیں؟ میرا مطلب ہے......'' میں رکا پھر بولا۔

''یار! برا مت منانا...... تمہارا معاملہ اور ہے...... لیکن اس طرح میں اور میرے ساتھی بھی سنگین جرم کی لسٹ میں آ سکتے ہیں۔'' میری بات پر پریل مسکرا کے بولا۔

''تم میرے محسن ہو شہزی! میں بھلا تمہاری بات کا کیوں برا مناؤں گا لیکن میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں...... بے فکر رہو...... ایسا کچھ نہیں ہوگا...... تم اور تمہارے ساتھی اس وقت کسی حقیقی قانون کی زد میں نہیں بلکہ جنگل کے قانون میں پھنسائے گئے ہو...... پھر اس قومی امانت (طلسم نور ہیرا) سے متعلق معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہے جو صرف...... شاہنواز کے لیے ہی نہیں بلکہ خود اس راتب خور انسپکٹر رجب دین کے لیے بھی مصیبت بن سکتا ہے۔ ان پر غداری کا کیس بن جائے گا، اس حقیقت کا انہیں بھی علم ہوگا اسی لیے مجھے یقین ہے کہ تم اور تمہارے ساتھیوں سے متعلق ایسا کوئی ریکارڈ وہاں نہیں رکھا گیا ہوگا اور یہ جو کچھ تم لوگوں کے ساتھ ہوا، وہ بدمعاشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔''

سیدھی سی بات

شادی کے چند ماہ بعد شوہر نے رومان پرور موڈ میں بیوی سے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قدر حسین ہونے کے باوجود بے وقوف کیوں ہو؟''

''کمال ہے کہ یہ سیدھی سی بات گزرے ہوئے مہینوں میں بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی!'' بیوی نے برجستہ جواب دیا۔

''ذرا میں بھی سنوں کہ وہ سیدھی بات کیا ہے؟''

''حُسن میں میرا کوئی کمال نہیں...... اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ہی پیدا کیا تاکہ تم میری طرف متوجہ ہو جاؤ اور مجھ میں ذرا سی سادگی یا بے وقوفی اس لیے رکھ دی تاکہ میں تم جیسے نکمے آدمی سے شادی پر رضامند ہو جاؤں۔''

اسلام آباد سے ہما احمد کا جواب

پریل نے اپنی بات ختم کی تو مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ پریل ایک ڈاکو ہی نہیں بلکہ سمجھدار انسان بھی ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ساتھیوں کے متعلق حالات کا جو تجزیہ کیا تھا، وہ غلط نہ تھا۔ دشمنوں کو بھلا ایک درست بات کو غلط موڑ دینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ مجھے سوچتا پا کر وہ میرے کاندھے کو تھپکتے ہوئے بولا۔

''فکر مت کرو دوست! یہ شاہنواز اور قانون کی وردی پہنے ہوئے رجب دین بھی جرم کی راہ پر گامزن ہیں اور خود سب سے بڑے چور ہیں۔ تم میرے ایک ساتھی کے ساتھ تھانے سے دور ہی رہنا، میں اور میرے باقی ساتھی ہلّا بول کر صرف تمہارے ہی نہیں بلکہ وہاں موجود سارے حوالاتیوں کو آزاد کر دیں گے۔''

''نہیں میرا بھی تمہارے ساتھ چلنا ضروری ہے...... پریل! اپنے ساتھیوں کی رہائی کے سلسلے میں، پیچھے میں بھی نہیں ہٹوں گا۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا اور پھر ہم آگے بڑھ گئے۔

تھانہ زیادہ دور نہ تھا۔ پریل کے کہنے پر اس کے ایک ساتھی نے میرے چہرے پر بھی اجرک کا ڈھاٹا باندھ دیا۔

مجھے یہ سوچ کر دل میں ہنسی آگئی کہ کیا وقت آگیا مجھ پر کہ سندھ کا ڈاکو بھی آج بننا پڑ گیا تھا مجھے۔

گوٹھ کی آبادی سے ہٹ کر ہم کیکر کے جنگل میں آگے بڑھتے ہوئے کھیتوں کھلیانوں کی طرف نکل آئے اور اس کے بعد چند فرلانگ مزید آگے بڑھے تھے کہ ہمیں مدھم سی روشنی میں ذرا ہی دور ایک پیلی سی سالخوردہ عمارت دکھائی دینے لگی...... پتا نہیں یہاں اول خیر اور کبیل دادا بے چارے کن حالوں میں ہوں گے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ انہیں اپنے سے زیادہ میری اور شکیلہ کی فکر کھائے جا رہی ہو گی۔

انسپکٹر رجب دین کے شاید تصور میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے اپنے جس راتب نواز (زمیندار شاہنواز) کی حفاظت کے لیے پورے تھانے کی اچھی خاصی نفری متعین کر رکھی تھی، اس کی ضرورت اسے بھی پڑ سکتی تھی۔

تھانے کے مین گیٹ کے سامنے مختصر سا میدان تھا، دائیں جانب کیلے کے لمبے چوڑے پتوں والے جھاڑے دار کھیتوں کے سلسلے کا آخری سرا ملتا تھا۔ بائیں جانب کیکر کا جنگل اور عقب میں قبرستان کی حدود تھی۔ پریل نے اپنے دستے کے نصف ساتھیوں کو آخرالذکر راستے سے عمارت پر نقب لگا کر پیچھے حملہ کرنے کا حکم دے کر روانہ کر دیا اور خود اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بائیں جانب روانہ ہوگیا۔ میں اس کے ساتھ تھا۔ تاہم پریل نے یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ خون خرابا اور قتل کسی کا نہ ہونے پائے، بلکہ زیادہ سے زیادہ دہشت ناکی پھیلائی جائے اور اشد ضرورت یا خطرے کے پیشِ نظر صرف زخمی کیا جا سکتا تھا۔ تھانے کی عمارت کو بھی صرف اسی حد تک نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے کہ قیدی باہر نکل کر راہِ فرار اختیار کر سکیں......

ان ہدایات کے تھوڑی دیر بعد ہی تھانے پر چڑھائی کر دی گئی۔ پہلا گروپ تھانے کی عقبی دیوار پھاند کر اندر جا کودا اور اس نے اچانک حملہ کر کے ہلّا بول دیا۔ جبکہ ہمارے گروپ نے کیلے کے کھیت کی جانب سے رخ کیا۔

گھوڑے ہم نے تھوڑی دور ہی باندھ دیے تھے اور ہتھیار سنبھالے پتوں کی آڑ لیے عمارت کے دائیں جانب کی دیوار سے چپک کر کھڑے ہو گئے۔ ہمیں اپنے دوسرے گروپ کی کارروائی کا انتظار تھا تاکہ مین گیٹ اور تھانے کے مرکزی راستے پر موجود پولیس اہلکار شور یا ہنگامے کی آواز پر اندر کا رخ کرتے اور وہی ہوا۔ جیسے ہی اندر شور اور ایک دو برسٹ کھڑکنے کی آواز ابھری، ہم نے مین گیٹ سے دھاوا بول دیا۔

ایک چھوٹے سے گوٹھ کا تھانہ کتنا بڑا ہوگا، اس کا اندازہ اس کی عمارت اور نفری کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

پریل کو رجب دین کی تلاش تھی اور مجھے اپنے ساتھیوں کی...... ہمارے سامنے چند پولیس اہلکاروں نے ڈٹ جانے کی کوشش چاہی تھی اور ہم پر انہوں نے گولیاں بھی برسا دیں۔ نتیجے میں ہمارے دو ساتھی زخمی ہو کر گر پڑے، باقی ساتھی اِدھر اُدھر آڑ میں ہونے لگے مگر پریل اور میں نے اپنی کلاشنکوفیں سیدھی کر ڈالیں اور ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ نشانہ ان کی ٹانگیں تھیں مگر شاید کوئی بھولی بھٹکی گولی ایک سپاہی کی گردن میں پیوست ہوگئی۔

یہ پریل کے فائر کیے ہوئے برسٹ کی گولی تھی۔ اس نے اپنے دو ساتھیوں کو پولیس والوں کے ہاتھوں گولی کھا کر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یوں شاید بپھر کر اس نے ان پر اندھا دھند فائرنگ کر ڈالی تھی۔ وہ چاروں چیخیں مارتے ہوئے گرے اور تڑپنے لگے۔

پریل شاید انسپکٹر رجب دین کی تلاش میں مختلف کمروں میں جھانکتا رہا، مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا تو اس نے ایک زخمی پولیس والے سے پوچھ لیا، اس نے بتایا.... وہ اپنے کوارٹر میں تھا۔ پریل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر اسی طرف کو بڑھ گیا جہاں لائن سے پانچ چھ کوارٹرز بنے ہوئے نظر آ رہے تھے جبکہ میں نے حوالات کی طرف کا رخ کیا۔

پریل نے ساتھیوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ میرا حکم مانیں گے مگر مجھے کسی کو حکم دینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ یہ سبھی ایک ''پلانٹڈ'' منصوبہ بندی کے تحت ''مصروفِ کار'' تھے۔ ایک نے حوالات کی طرف دستی بم اچھال دیا جو ساعت شکن دھماکے سے پھٹا...... ہر طرف دھواں اور بارود کی بُو پھیل گئی۔ ہمارا مقصد قتل و غارت نہیں تھا صرف ہراس پھیلانا تھا تاکہ حویلی پر تعینات کی ہوئی دوسری پولیس پارٹی اس طرف متوجہ ہو سکے نیز ہم اپنے ساتھی اول خیر اور کبیل دادا کو بھی پولیس کے چنگل سے چھڑا سکیں اور یہ کام پریل کے ڈاکو ساتھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے جبکہ مجھے اپنے ساتھیوں کی تلاش تھی۔

حوالات کا دروازہ ٹوٹتے ہی قیدیوں کی خاصی تعداد شور مچاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ گھبرا وہ بھی گئے تھے اس ناگہانی افتاد پر...... تاہم اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کی انہوں نے بھی ٹھان رکھی تھی، میں نہایت بے چینی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اول خیر اور کبیل دادا کو تلاش کر رہا تھا مگر وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے، ایک خیال آیا کہ کہیں وہ بھی اس افراتفری اور ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر نکل نہ بھاگے ہوں اور میری ان پر نظر نہ پڑ سکی ہو۔ لیکن حوالات یا مختصر سی جیل میں قیدی ہوتے ہی کتنے ہیں؟ میں نے ایک ایک قیدی اور بھاگتے ہوئے حوالاتی کے چہرے کو غور سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اول خیر یا کبیل دادا مجھے اس ڈھاٹے میں شاید نہیں پہچان پاتے۔

میں پریشان اور بے چین ہو گیا۔ اسی وقت گولی چلی...... اور مجھے اپنی کنپٹی کے بالکل قریب ''جھپک'' سی محسوس ہوئی۔ بس، ایک آدھ انچ کا ہی فاصلہ رہا ہوگا ورنہ میں اگلے جہاں سدھار چکا ہوتا۔ قریب سے گزرتی موت کی اس ہولناک سرگوشی نے میرا دماغ جھنجھنا ڈالا اور میں نے تیزی کے ساتھ جھکائی دے کر پلٹا کھایا تو ایک پولیس مین اپنی رائفل سے مجھے دوسری گولی ٹھونکنے کی تیاری میں تھا۔ وہ ایک کمرے کی دیوار کی آڑ میں تھا، میرے پاس فوری طور پر اس کی دوسری متوقع فائر ہونے والی گولی سے بچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں بھی اس پر جوابی فائر کرتا لیکن ابھی میں بچنے کے لیے متحرک ہوا ہی تھا کہ کوئی بھاگتا ہوا بوکھلایا قیدی، بڑے زور سے مجھ سے ٹکرا گیا۔ وہ کم بخت خاصا بھاری بھرکم اور موٹا تازہ تھا۔ میرا توازن بگڑا اور میرے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ تب ہی مجھے قریب سے دوسری گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا جس میں اسی بھاگتے ہوئے مجھ سے ٹکراتے قیدی کی لرزہ خیز چیخ بھی شامل تھی۔ وہ میرے بجائے اسی پولیس والے کی گولی کا شکار ہو گیا تھا جبکہ میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں جہاں لڑکھڑا کر گرا تھا وہاں وہی قصائی پولیس اہلکار رائفل سنبھالے کھڑا تھا جس نے دو بار مجھ پر گولی چلائی تھی۔ میں اس کے نشانے پر تھا۔ ایک اور بدقسمتی تو یہ ہوئی کہ میری کلاشنکوف بھی ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا پرے جا گری تھی۔

اس نے اپنے شکار کو اتنے قریب اور آسان ''ہدف'' میں دیکھا تو دوبارہ مجھ پر اپنی رائفل سونت لی۔ موت کو اچانک اور غیر یقینی انداز میں اس قدر اپنے قریب پا کر میں خود ایک لمحہ کو دم بہ خود سا رہ گیا اور یہ سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ میرے ساتھ تقدیر نے یہ کیسا مذاق کیا تھا کہ مجھے ایک طرف موت سے بچایا بھی اور دوسری طرف پل کے پل اجلِ بے رحم کے دہانے پر گرا بھی دیا۔ تیسری گولی چلی تھی اور مجھے اسی پولیس اہلکار کی کریہہ انگیز چیخ سنائی دی۔ میں زندہ تھا اور تقدیر کو میں نے غیر مرئی نگاہوں سے مسکراتے دیکھا، تب ہی میں پھرتی کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پریل تھا، جو نجانے وہاں اچانک کب اور کیسے نمودار ہوا تھا کہ اس نے مجھے اس پولیس اہلکار کے نشانے پر دیکھ کر اسے اپنی گن سے نشانہ بنا ڈالا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں......؟'' اس نے میرے قریب آ کر پوچھا۔ ''میں نے اصل کام نمٹا دیا ہے۔ اس رذیل انسپکٹر رجب دین کو دھمکا کر میں نے حویلی سے باقی نفری بلوالی ہے۔ اب اس سے پہلے کہ وہ یہاں پہنچیں، ہمیں حویلی کی طرف چلنا ہوگا۔ اور یہ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟''

میں نے فکر و تشویش سے کہا۔ ''پرو! میں ابھی تک انہیں ڈھونڈ رہا ہوں...... وہ کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں......''

پرو میری بات پر چونکا۔ کچھ سوچا۔ اس کے بعد مجھے چند جملوں میں تسلی دی اور پھر اپنے ساتھیوں کو واپسی کا حکم دیا۔ پھر مجھ سے بولا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' کہہ کر وہ پھرتی سے پلٹا، میں حیران و پریشان اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ مجھے لیے تھانے کے احاطے میں اس جگہ پر آ گیا جہاں لائن سے چند کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک میں جا گھسا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر ایک کمرے میں انسپکٹر رجب دین رسن بستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ وہ کافی خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ پریل نے خوف ناک انداز میں اسے گھورتے ہوئے اس کی پیشانی پر اپنی کلاشنکوف کی نال رکھ دی۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پہ خوف اتر آیا.... وہ گھگیا کر بولا۔

''مم...... مجھے مت مارو...... میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں...... میں نے تمہاری ہر بات مان لی ہے۔''

''بکواس بند کر اپنی......'' پرو چانڈیو حلق کے بل دہاڑا اور پھر اس نے اول خیر اور کبیل دادا کے بارے میں پوچھا تو رجب دین نے میری جانب دیکھا۔ میرا چہرہ اگرچہ اجرک کے ڈھاٹے میں ملفوف تھا لیکن رجب دین کو مجھ پر اس سوال کے بعد شبہ ہونا عین فطری امر تھا۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''مم......''

''خبردار......! جھوٹ مت بولنا......'' پرو دہاڑا۔ ''میں تصدیق کیے بغیر نچلا نہیں بیٹھوں گا۔ یہ بات یاد رکھنا جھوٹ بولنے سے پہلے۔''

پرو کے اس طرح پیشگی ''وارن'' کرنے پر بالآخر انسپکٹر رجب بولا۔ ''وہ...... وہ دونوں اس کے ساتھ والے

کوارٹر میں موجود ہیں......'' یہ بتاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پرو کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹاتے ہوئے میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ میں بے چین تھا۔ پرو پلٹا اور مجھے بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

ابھی اس کوارٹر سے باہر نکلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک باہر فائرنگ کی آواز سنائی دی ساتھ ہی ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں بھی ابھریں...... میں اور پریل یہی سمجھے تھے کہ حویلی والی نفری یہاں آن پہنچی تھی۔ لیکن...... جب ہم نے دروازے سے باہر ذرا جھانکا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... تھانے کے احاطے میں...... اور باہر رینجرز کی وردی میں ملفوف مسلح نوجوان پرو کے واپس لوٹتے ہوئے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے پاس مخصوص اونچے اور چوڑے ٹائروں والی جیپیں تھیں۔ وہ سب جدید ہتھیاروں سے لیس تھے۔

''اینٹی ڈکیت فورس......''

معاً ہی ساتھ کھڑے پرو چانڈیو کو میں نے زیرلب بڑبڑاتے پایا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا تھا۔ میں خود بھی اس نئی صورتِ حال سے پریشان ہوگیا تھا۔ یہ کوئی عام فورس نہ تھی۔ رینجرز کے انتہائی تربیت یافتہ اہلکار تھے۔ پتا نہیں کیسے انہیں اطلاع دی گئی تھی یا پھر یہ لوگ پہلے سے ہی کسی ''آپریشن کلین اَپ'' میں مصروف تھے۔ ان کے اندر مختلف ونگس کام کرتے تھے۔ ان میں قابلِ ذکر ''لاء انفورسمنٹ''، ''پاور'' (جواَب ڈراپ کی جاچکی تھی اور اس ونگ میں، میں خود بھی شامل تھا، بعد میں اول خیر اور شکیلہ بھی)، اینٹی ٹیررسٹ ونگ'' اور اینٹی ڈکیت ٹاسک فورس'' تھیں۔

''شہزی! ہوشیار...... ہمارا اب باہر نکلنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ یہ کوئی عام پولیس فورس نہیں ہے۔''

اب اسے کیا پتا تھا کہ اس سے زیادہ میں یہ حقیقت جانتا تھا۔ میں خود کئی سال پہلے رینجرز کے ایک خصوصی اور خفیہ ونگ ''پاور'' کا ایک تربیت یافتہ ایجنٹ رہ چکا تھا۔ تاہم بولا۔

''او...... اس کا مطلب ہے ہم خطرے میں گھر گئے ہیں...... میرے ساتھیوں کا کیا بنے گا؟ وہ ساتھ والے کوارٹر میں قید ہیں۔'' (بقول انسپکٹر رجب دین کے)

''میرے اپنے ساتھی بھی اس وقت اینٹی ڈکیت فورس کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں، مجھے ان کی مدد کو جانا ہوگا......'' پرو لرزتے لہجے میں بولا۔ ''تم اس کوارٹر کی چھت پر جا کر ساتھ والے کوارٹر میں ٹاپ جاؤ...... مجھے ان سے مقابلہ کرنا ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکلنے لگا مگر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''پرو! میرے یار! تو ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ انتہائی تربیت یافتہ......'' ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ پرو میرا ہاتھ چھڑا کر یہ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''میں اپنے ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑ سکتا......''

میں اپنی جگہ ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ باہر گولیوں کی بھیانک تڑابڑی جاری تھی۔ میں تیزی سے کوارٹر کی چھت پر جا پہنچا۔ مجھے بار بار...... یہ خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر میں یا میرا کوئی ساتھی اینٹی ڈکیت فورس کے ہتھے چڑھ گیا تو ان پر سنگین مقدمہ بھی قائم ہوسکتا تھا اور وہ ہمیں بھی ان ڈاکوؤں کا ساتھی ہی سمجھیں گے جبکہ باقی کی کسر انسپکٹر رجب دین اور وڈیرا شاہنواز پوری کرنے کے لیے کافی ہوتے۔

ان اندیشوں نے مجھے...... سرتاپا لرزہ سا دیا اور میں تیزی کے ساتھ چھت کی دیوار ٹاپ کر دوسرے کوارٹر کی چھت پر چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ مجھ پر باہر کہیں سے ایک برسٹ فائر ہوا...... زندگی باقی تھی کہ بچ گیا۔ وگرنہ تو اس برسٹ نے میرا سر اُڑا دینا تھا۔ گولیوں کی پوری باڑھ کو میں نے اپنے سر کے اوپر سے گزرتے دیکھا تھا جس کی ہولناک آتشیں جھپک بھی مجھے صاف محسوس ہوئی تھی۔ یہ بات خطرے سے کم نہ تھی کہ میں بھی رینجرز فورس کی نظروں میں آگیا تھا۔

دوسرے کوارٹر کی چھت ٹاپ کر تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا...... نیچے آیا اور کھلے صحن میں آکر دیکھا یہاں دو ہی کمرے تھے۔ ایک کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ کمرا خالی تھا جبکہ دوسرے کا بند تھا۔ میں ابھی اسی کمرے کا دروازہ توڑنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اچانک داخلی دروازہ ایک زبردست دھڑاکے سے ٹوٹ کر گرا اور کئی مسلح رینجرز اہلکار اندر گھس آئے۔

''خبردار......! حرکت مت کرنا...... ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔'' ان میں سے ایک نے درشت اور رعب دار آواز میں کہا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے حکم دینے والا ایک دراز قامت اہلکار تھا۔ وہ کیپٹن کی وردی میں ملفوف تھا۔

''گن پھینک کر اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کر لو......''

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کر ڈالی اور ساتھ ہی اپنے چہرے سے اجرک کا ڈھاٹا بھی اتار دیا۔ کیپٹن کا لب ولہجہ پنجابی اردو تھا۔

''کیپٹن آصف صاحب! میں ان ڈاکوؤں کا ساتھی نہیں ہوں اور اندر اس کمرے میں میرے ساتھی......''

''شٹ اَپ......'' کیپٹن آصف نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ اس کے سرخ رنگ کے چیسٹ ٹیگ پر اس کا نام کیپٹن آصف بٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک میری ہی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرہ گورا چٹا اور کلین شیو تھا۔ جسم کی ساخت مناسب تھی۔ قد و قامت بھی ٹھیک ہی تھا۔

مجھے گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ میری جامہ تلاشی بھی لی گئی۔ مجھے بولنے نہیں دیا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ میں ان کے سامنے ابھی اپنی مرضی سے کچھ بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھے ڈاکوؤں کے گروہ کا شاید سرغنہ ہی سمجھے ہوئے تھے۔

کیپٹن آصف نے دو اہلکاروں کو مذکورہ کمرے کا دروازہ بھی کھولنے کا حکم دیا۔ میری دھڑکتی نظریں بھی اس پر جمی ہوئی تھیں...... دروازہ توڑ دیا گیا اور اندر سے کبیل دادا اور اول خیر کو بھی باہر نکالا گیا۔ وہ دونوں مجھے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے۔ ساتھ ہی اس نئی صورتِ حال پر ان کے بشروں سے تشویش آمیز حیرانی بھی مترشح ہونے لگی تھی۔ انہیں بھی بولنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہماری آنکھوں پہ پٹیاں باندھ دی گئیں۔ یہ ہمیں بازوؤں سے پکڑے باہر لے آئے۔ فائرنگ کی گھن گرج معدوم ہوچکی تھی۔ کسی اہلکار کو میں نے مؤدبانہ انداز میں کیپٹن آصف سے یہ کہتے سنا۔

''سر! آپریشن کلیئرڈ...... بہت سے ڈاکوؤں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے۔ کئی پکڑے گئے ہیں۔ ان کا سرغنہ بھی مارا گیا ہے......''

اس آخری بات پر میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، کرب اور تاسف کی ایک لہر سی میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔

''سرغنہ سے تمہاری مراد پریل چانڈیو ہی ہے...... مختیار احمد؟'' مجھے کیپٹن آصف کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔

''یس سر!'' اس کے ماتحت نے مؤدبانہ کہا۔ ''ہم نے ان کے گرفتار شدہ ساتھی سے تصدیق کروالی ہے اور تصویر سے میچ بھی کرلیا ہے۔''

میرے اندر کرب و درد...... کی لہر کسی تیز دھار خنجر کی طرح مجھے چرکے لگائے جا رہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے بدنصیب سونہڑیں کی معصوم صورت گردش کرنے لگی۔

''یہ بھی مجھے اس کا نائب لگتا ہے۔ اس سے بھی تصدیق کروا لینا چاہیے، آگے بڑھو......'' کیپٹن آصف کی آواز ابھری۔

ہم آگے بڑھے۔ چند قدم ان کے سہارے چلنے کے بعد رک گئے۔ میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ جبکہ کبیل دادا اور اول خیر کی آنکھوں میں ہنوز پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ پٹی ہٹتے ہی...... میں نے خود کو رینجرز فورس کی خاصی تعداد کے درمیان پایا۔ ان کے ہاتھوں میں جدید گنیں تھمی تھیں۔ کچھ ڈاکو بھی ان کی گرفت میں تھے۔ یہ تھانے کا وسیع احاطہ تھا۔ وہاں لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ ایک لاش کو دیکھ کر میری روح تک رنجور ہوگئی، اس کے پیٹ پر گولیوں کا پورا مہیب برسٹ فائر کیا گیا تھا، جس کے باعث انتڑیاں باہر کو ابل پڑی تھیں۔ وہ پریل چانڈیو کی لاش تھی...... اس پریل چانڈیو کی جوان رینجرز والوں کی نظروں میں بے شک ایک خطرناک اشتہاری ڈاکو رہا ہوگا، مگر اس کی اصل اور دردناک کتھا سے کوئی نہیں واقف تھا۔ اسے گولیوں کا نشانہ بنانے والوں کے پاس بھلا کب اتنا فالتو وقت ہوگا کہ...... وہ اس سے پوچھتے کہ تمہیں ڈاکو بنانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ ان لوگوں کا، جو شرفا کے بھیس میں اس دوغلے معیار کے سماج میں اس سے زیادہ کریہہ اور خطرناک ڈاکو بنے بیٹھے ہیں...... یا وڈیرے شاہنواز خان کا...... جو ملک کا غدار تھا جس نے ایک قومی امانت چوری کی تھی اور پریل جیسے ایک غریب اور نیک سیرت ہاری کو اپنے روایتی جبر تلے کچل کر ڈاکو بننے پر مجبور کر ڈالا تھا یا پھر قانون کی وردی میں اس راتب خور پولیس انسپکٹر رجب دین کا...... جس کے پاس پریل انصاف مانگنے آیا تھا اور الٹا اسے ہی دھتکار کر نکال دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ پریل ایک غریب ہاری (کسان) کا بیٹا تھا؟

''پہچانو اسے...... کیا یہی تمہارا سرغنہ پریل چانڈیو ہے......؟'' معاً کیپٹن آصف نے مجھے تحکمانہ درشتی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا سرغنہ نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کا کبھی ساتھی رہا ہوں...... کیپٹن آصف صاحب!''

پل کے پل میرے لب و لہجے میں ایک عجیب طرح کا جوش اور دبدبہ امڈ آیا تھا۔

''اے مسٹر! اپنی آواز نیچی اور لہجہ مدھم رکھو...... سمجھے

تم......؟'' کیپٹن آصف نے درشت لہجے میں مجھ سے کہا تو میں...۔ دوبارہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدستور اسی ٹھنڈی ہوئی متانت اور لب و لہجے میں بولا۔

''کیپٹن صاحب! آپ مجھے بولنے کا کوئی موقع دیں گے تو میں کچھ اپنے بارے میں تفصیل بتا پاؤں گا کہ میں......''

''بکواس بند کر اپنی...... اور جو پوچھا گیا ہے اس کا جواب دو صرف......'' اس خرانٹ رینجرز آفیسر نے پھر میری بات کاٹی تو میں نے بھی اسی روانی سے کہا۔

''میں آپ کے سوال جواب دے چکا ہوں۔''

''یہ پریل چانڈیو ہی کی لاش ہے؟''

''ہاں۔''

''کلیئر۔''

اسی وقت دو تین رینجرز اہلکاروں، کچھ پولیس کے آدمیوں کے ساتھ انسپکٹر رجب دین وہاں آگیا اور ہماری طرف دیکھتے ہی وہ کیپٹن آصف سے بولا۔

''یہ تینوں بہت خطرناک مجرم ہیں سر! میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ سخت طیش میں نظر آرہا تھا اور بڑی کھا جانے والی نظروں سے ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''آپ کی بروقت آمد سے...... یہ تینوں بھی گرفت میں آگئے...... یہ بہت اچھا ہوا، اپنے مجرم ساتھیوں کو قانون کی حراست سے چھڑانے کے لیے اس خطرناک مجرم نے صوبائی شہرت یافتہ ڈاکو پرو چانڈیو کی مدد لی تھی اور تھانے میں دھاوا بولنے کا سنگین جرم بھی کیا ہے۔'' اس نے آخر میں میری جانب اشارہ کیا تھا۔ وہ ایک خفیہ ''ایجنڈے'' کے تحت، ہم تینوں کے لیے بار بار ''خطرناک'' کا لفظ بڑی روانی کے ساتھ استعمال کر رہا تھا۔

''او کے......!'' کیپٹن آصف نے کہا۔ ''ہمیں زمیندار شاہنواز صاحب نے پہلے ہی سے بتا رکھا تھا کہ ان کی بیٹی کے اغوا میں بھی انہی کا ہاتھ تھا۔ بہرحال ہمیں کیس سے متعلق مزید بریفنگ درکار ہے۔''

''سر! آپ میرے کوارٹر میں تشریف لائیں...... میں آپ کو کیس سے متعلق ہی نہیں بلکہ مزید سنسنی خیز تفاصیل سے بھی آگاہ کر دوں گا...... تھانے کی حالت تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں......''

مجھے معلوم تھا کہ رجب دین انہیں کیا اور کس قسم کی ''تفصیلی'' بریفنگ دینے والا تھا۔ تاہم میں خاموش رہا تھا۔ کبیل دادا اور اول خیر بہت زیادہ فکرمند اور تشویش زدہ نظر آ رہے تھے۔ خود میں بھی کم پریشان نہ تھا۔

اگلے چند گھنٹوں بعد ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گاڑیوں میں سوار کرا دیا گیا اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

صورتِ حالات ایک دم گمبھیر اور اس سے زیادہ سنگین ہو چکی تھی۔ رینجرز فورس سے جان چھڑانا اتنا آسان نہ تھا اس پہ مستزاد...... پولیس انتظامیہ بھی ہمارے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ خطرناک اور صوبائی شہرت یافتہ بدنام ڈاکوؤں کے گروہ سے الحاق کا الزام اس پر سوا تھا......

اس ساری خوں ریز کشاکشی میں شاہنواز خاں، جو اس کا اصل سبب بنا تھا، مجھے اس کی قسمت بڑی یاور محسوس ہوئی تھی۔ وہ کم بخت اس سارے بکھیڑوں میں بڑے آرام سے نہ صرف دودھ میں بال کی طرح نکل کر صاف بچ نکلا تھا بلکہ معزز اور مظلوم بھی کہلایا جانے والا تھا۔ وہ اب ہر طرح کا گل کھلانے کے لیے آزاد تھا۔ اس کا سب سے بڑا دشمن پرو چانڈیو اینٹی ڈکیت فورس کے ہاتھوں مارا گیا تھا جس کا مجھے جتنا بھی افسوس ہوتا، وہ کم ہی تھا۔ شکیلہ اور ارم اس کے قبضے میں تھیں۔ طلسم نور ہیرے تک اس کی رسائی ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی۔ اس کی بیٹی سونہڑیں اس کے پاس پہنچا دی گئی تھی۔ پرو چانڈیو کے گروہ کا تقریباً قلع قمع ہو چکا تھا اور ہم قانون کی گرفت میں آ چکے تھے۔ کیپٹن آصف کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ صوبائی شہرت یافتہ بدنام زمانہ ڈاکو پریل چانڈیو کی سرکوبی کے لیے اینٹی ڈکیت فورس پہلے ہی سے سرگرم تھی اور یہ معاملہ اس وقت خراب ہوا ہوگا جب اس لالچی لائق ماچھی نے سونہڑیں کے سلسلے میں تاوانِ زر کا مطالبہ وڈیرے شاہنواز خان کے سامنے رکھا تھا۔ شاہنواز کی زیرک دماغی کا تو مجھے پہلے ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کتنا شاطر انسان تھا جس نے ایک خاص مقصد کے تحت ہی لائق ماچھی کو خاموشی سے زرِ تاوان ادا کر کے اسے اندھا کر ڈالا ہوگا اور پھر کسی طرح اس کے خفیہ ٹھکانے کی مخبری بھی کر لی ہو گی۔ سو اس نے ہی رینجرز کو کسی طرح اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہوگا کہ جس خطرناک ڈاکو کی تلاش میں قانون نافذ کرنے والے ادارے پیچھے لگے ہوئے تھے وہ اِدھر ہی کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ وغیرہ......

پیش آمدہ حالات کے مطابق میرے تجزیے کم ہی غلط ثابت ہوئے تھے۔

بہرحال...... کم و بیش آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد گاڑیاں رک گئیں۔ ہمیں نیچے اتارا گیا۔ چند ایک دروازے اور گھومتی راہداریاں پار کرنے کے بعد شاید ہم کسی کمرے میں آگئے تھے۔

اس کے بعد میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ چند ثانیے تو میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے سے لہرانے لگے اس کے بعد میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ کمرا ماسوائے انسانوں کے ہر شے سے عاری ہی نظر آیا۔ یعنی فرنیچر نام کی کوئی شے وہاں نہیں تھی۔ کبیل دادا، اول خیر اور مجھے ایک ساتھ قطار میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کیپٹن آصف دھیمی آواز میں ایک نائب سے کچھ کہنے کے بعد کمرے سے نکل گیا تھا، اس کے ہمراہ چند دیگر اہلکار بھی چلتے بنے تھے۔

اب کمرے میں تین رینجرز اہلکار ہمارے ساتھ موجود تھے۔ ہمارے دونوں ہاتھ پشت کی جانب باندھ رکھے تھے۔ ہمیں آپس میں باتیں کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ وہ تینوں اہلکار خاموش تنے کھڑے تھے، جیسے اپنی ڈیوٹی کا ایک اہم حصہ بنے ہوئے ہوں۔

کمرے میں روشنی تھی۔ ایک روشندان بھی تھا۔ چھت قدرے بلند تھی۔ ایک اندازے کے مطابق رات آدھی سے زائد بیت چکی تھی اور ہمیں یہاں لائے ہوئے مشکل سے بیس پچیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے اس طرف دیکھا۔

پانچ افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں ایک تو کیپٹن آصف ہی تھا۔ دوسرا اس کا بھی کوئی بڑے رینک کا افسر معلوم ہوتا تھا۔ وہ میجر کی مخصوص وردی میں تھا اور میں نے سب سے پہلے اس کے سینے پر لگے ٹیگ میں نام پڑھا۔ میجر وسیم بھٹی اس کا نام تھا۔ اس کی عمر کا مجھے چالیس پینتالیس سال کا اندازہ ہوا تھا۔ چہرہ بارعب تھا۔ جسم خاصا مضبوط اور کسرتی تھا، قد کا بھی میری طرح دراز تھا۔ شانے بھی چوڑے تھے۔ آنکھیں البتہ چھوٹی تھیں۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی مخصوص رینجرز کیپ پہن رکھی تھی۔ اس کے جسم پر بھی کیپٹن آصف کی طرح رینجرز والی مخصوص وردی تھی۔

تیسرا اپنی مخصوص پولیس وردی اور اس کے شولڈرز پر لگے ستاروں سے ڈی ایس پی دکھائی دیتا تھا۔ گویا پولیس انتظامیہ بھی تفتیش کے لیے ان کے ساتھ بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ اس کا نام سجاگو خاں نظر آیا تھا مجھے۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی سی روایتی سخت گیری اور کرختگی مترشح...... تھی۔ یہ قدرے بھاری اور موٹی جسامت کا آدمی تھا۔ عمر چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی لگتی تھی۔ ناک موٹی تھی اور رنگت چہرے کی سیاہ مائل تھی۔ چہرہ جسم کی طرح ہی چربیلا سا نظر آتا تھا جو اس کی موٹی گردن سے ہم آہنگ ہی محسوس ہوتا تھا۔ قد درمیانہ تھا۔ میں نے فقط اسی آدمی کے ہی چہرے کے تاثرات سے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ ہم تینوں کو کچھ زیادہ ہی غصیلی اور برمانی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ باقی دو افراد جو اِن ''افسران'' کے پیچھے تھے، ان میں سے ایک پولیس مین تھا اور دوسرا رینجرز کا آدمی......

ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک بار پھر دروازے سے چند افراد نمودار ہوئے۔ لباس سے یہ کوئی ملازم ٹائپ ہی نظر آتے تھے۔ ان دونوں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو دو کرسیاں تھام رکھی تھیں۔ جو اندر لاکر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بعد وہ تینوں افسران اس پر براجمان ہو گئے۔ چوتھی کرسی خالی تھی۔ اس پر کوئی ڈیوائس رکھ دی گئی تھی۔ یہ ایک آڈیو ریکارڈنگ ایویڈنس تھا۔ جب میں رینجرز میں ایک ''پاور ایجنٹ'' تھا تو ایسے آلات میری نظروں سے گزرے تھے۔

میری فہم و فراست اور عقلِ سلیم بتاتی تھی کہ ہم تینوں کے سلسلے میں کیپٹن آصف نے انہیں ضرور کوئی ایسی بات بتائی ہے جس کی بنا پر ہمیں دیگر مجرموں (ڈاکوؤں) سے الگ کر کے یہاں بند کمرے میں تفتیش کا یوں خاص بندوبست کیا گیا تھا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ انسپکٹر رجب دین نے ہی آخر میں کیپٹن آصف کو ہمارے سلسلے میں کچھ ''خاص'' بتایا ہو...... میں ذہنی طور پر اب ہر قسم کی تفتیش اور حالاتِ دگرگوں کو فیس کرنے کے لیے بالکل پُراعتماد اور تیار تھا۔

''کیا نام ہے تمہارا......؟'' میجر وسیم بھٹی نے میرے چہرے پر اپنی نظریں گاڑھتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا لہجہ بھاری اور رعب دار تھا۔

''شہزاد احمد خان شہزی......'' میں نے جواب دیا۔

''تم کہاں کے رہنے والے ہو......؟''

''پنجاب، ملتان......''

''ڈاکوؤں کے اس خطرناک گروہ، جو پریل عرف پرو...... چانڈیو کے نام سے بدنام صوبائی شہرت رکھتا تھا۔ کیا تعلق تھا تمہارا اس کے ساتھ......؟''

''میں اس کا گروہی ساتھی نہیں تھا مگر میری اس کے ساتھ دوستی کی نہج بھی بہت قلیل عرصے پر محیط رہی تھی۔''

''شکل و صورت اور گفتار سے تم ایک پڑھے لکھے شخص دکھائی دیتے ہو مگر ایک خطرناک سرغنہ ڈاکو سے تمہاری راہ و رسم کس طرح پیدا ہو گئی۔ اپنے بارے میں تفصیل

بتاؤ......"

میں نے اس بھلے مانس میجر کے اس سوال پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے کا موقع فراہم کیا۔ تاہم میں ڈی ایس پی سبھاگو خان کے سلسلے میں شکوک کا شکار تھا لہٰذا میجر وسیم بھٹی سے ریکویسٹ کرنے کے انداز میں بولا۔

"سر! میں کون ہوں کیا ہوں...... یہ میں آپ کو سب سچ سچ بتا دوں گا اور مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ میرا وعدہ ہے کہ میں اس کے ٹھوس شواہد بھی آپ کے سامنے لانے کی کوشش کروں گا...... فقط میری ایک گزارش ہوگی جو پوری کر دی جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا......"

"کیسی گزارش......؟" میجر وسیم نے بہ دستور میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"سر یہ بہت ہی خفیہ اور اہم معاملہ ہے۔ آپ کا چونکہ پاک آرمی سے تعلق ہے...... اسی لیے...... مجھے ڈر ہے کہ مقامی سطح پر اس کے لیک آؤٹ ہونے کا خدشہ رہے گا...... اسے آپ ایک ملٹری سیکریٹ سروس کا راز سمجھ لیں...... یا قومی سلامتی کا معاملہ......"

لفظ "مقامی سطح" کا ادا کرتے ہوئے میں نے اس کے ساتھ بیٹھے ڈی ایس پی سبھاگو خان کی طرف دیکھ کر دانستہ ادا کیا تھا۔ میری بات پر میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے چہروں پہ ایک دم سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ دونوں نے ایک لمحے کے لیے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنی بکواس بند کرو تم......" معاً ہی ڈی ایس پی سبھاگو خان پُرطیش انداز میں بولا۔ "تم ایک ڈاکو ہو...... اور ایک بدنام صوبائی شہرت یافتہ خونی ڈاکو پرو چانڈیو کے قریبی ساتھی بھی...... ہمیں چکر دینے کی کوشش مت کرو......" یہ کہہ کر اس نے اپنے قریب بیٹھے میجر وسیم بھٹی سے کہا۔

"میجر صاحب! اسے آپ ہمارے حوالے کر دیں...... یہ بہت چالاکی سے کام لے رہا ہے۔ ایک سیدھے سادے معاملے کو خوامخواہ...... الجھا کر سیریس بنا رہا ہے، تاکہ آپ کی توجہ ایک خطرناک مسئلے سے ہٹا کر اپنا مقصد حاصل کر سکے۔"

"ڈپٹی صاحب! جس معاملے کا میں ذکر کرنے والا ہوں وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک اور اہم نوعیت کا ہے۔" میں نے اس کی جھڑکی کی پروا کیے بغیر کہا۔ وہ دوبارہ غصیلے لہجے میں مجھ سے مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میجر وسیم نے اسے ٹوکا۔

"ڈی ایس پی صاحب! ہم اتنے پاگل یا بے وقوف نہیں ہیں کہ اس کی باتوں میں آجائیں گے...... یہ جن ٹھوس شواہد کی باتیں کر رہا ہے، وہ اگر ہمیں دکھانے میں ناکام رہا تو اس پر قانون کو جھانسا دینے کا بھی سنگین ترین کیس داخل کر دوں گا میں......"

میں جانتا تھا کہ یہ بات میجر صاحب نے صرف ڈی ایس پی سبھاگو خان کو ہی سنانے کے لیے نہیں کہی تھی بلکہ مجھے بھی درپردہ خبردار کیا تھا۔

"آپ برائے مہربانی تھوڑی دیر کے لیے میرے کمرے میں جا کر تشریف رکھیں...... اگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی جو ملٹری سیکریٹ سروس کے اہم رازوں کا حصہ بنتی ہو تو میں آپ کے گوش وگزار بھی ضرور کروں گا...... بہ صورتِ دیگر میں اسے مکمل طور پر اپنی تحویل میں رکھوں گا......"

میجر وسیم کی بات پر ڈی ایس پی سبھاگو خان نے ناک بھوں تو بہت چڑھائی مگر اسے جاتے ہی بنی تھی۔

"ہاں! مسٹر شہزی! اب بولو......" ڈی ایس پی کے کمرے سے جاتے ہی میجر وسیم میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "لیکن...... ایک بات یاد رکھنا...... اگر تم نے جھوٹ بولا یا کوئی اور چکر چلانے کی کوشش کی تو تمہارا کیس میں عام عدالت سے خصوصی کورٹ میں منتقل کر دوں گا جو ایسے مجرموں کو بہت خطرناک سزائیں دیتا ہے۔"

میں نے میجر وسیم کی بات پر پورے اعتماد کے ساتھ اپنا سر ہلا دیا۔ اس کے بعد پھر میں نے ذرا بھی بس نہ کی، شروع سے آخر تک ساری داستان اسے پوری تفصیل سے سنا ڈالی۔ یہاں تک کہ میجر ریاض باجوہ جو میری تازہ اطلاع کے مطابق کرنل کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کے "پاور" ونگ، وزیر جان سے لے کر چوہدری ممتاز، اسپیکٹرم اور طلسم نور ہیرے سے لے کر...... ہشام پھلگری کی موت اور یہاں تک کے سارے واقعات بلاکم وکاست سنا ڈالے۔ باوصف ان ساری باتوں اور حقائق کے میرا جو اصل اور اہم تعارف تھا، وہ میرا اپنا باپ تھا۔ جس کا ملکی ہیرو اور گمنام سپاہی کا اعتراف سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر بڑی دھوم دھام سے کیا گیا تھا۔ یہی نہیں آج جو بھارت کا خطرناک جاسوس جو وطنِ عزیز میں انارکی پھیلانے کی غرض سے داخل ہوا تھا۔ سندر داس سکینہ...... اسے بھی میں نے ہی گرفت میں لیا تھا۔ اس پر کیس چل رہا ہے......

یہ وہ باتیں تھیں جو بذاتِ خود ایک ٹھوس شواہد کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس لیے... اس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اتنی بڑی باتیں بغیر شواہد کے کبھی نہیں کی جاسکتی تھیں۔

میں نے دیکھا...... میجر وسیم بھٹی اور آصف بٹ کے چہروں پہ سناٹے سے کھل گئے۔ وہ جیسے اپنی کرسیوں پہ بیٹھے بیٹھے کہیں دور کھو گئے تھے۔ لیکن ان کی یک ٹک نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں مرحلہ وار آخر میں سونہڑیں اور پریل کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

"جناب! میری آپ سے پُرزور گزارش ہے......" میں نے ان دونوں ذمّے دار افسران کی طرف دیکھ کر پھر کہا۔

"مجھے اپنی فکر نہیں ہے، لیکن اس قومی امانت کے کھو جانے کا مجھے بے حد قلق ہے جسے حاصل کرنے کے لیے میں نے انڈیا اور انڈیمان کے تاریخی اور ہولناک جزائر کا پُرخطر سفر طے کیا اور اپنی جان جوکھم میں ڈال کر یہاں پہنچا تو زمیندار شاہنواز خان کے چنگل میں پھنس گیا۔ وہ بہت بارسوخ آدمی ہے۔ اس نے متعلقہ تھانے کے انسپکٹر رجب دین کو بھی خرید کر رکھا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس بدبخت نے بریفنگ کی آڑ میں کیپٹن آصف صاحب کو بھی میرے خلاف غلط گائیڈ کیا ہو گا۔ آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اس قومی امانت یعنی طلسم نور ہیرے کے حصول کے سلسلے میں جلد از جلد کچھ کیجیے۔"

"نوجوان......"

اچانک میجر وسیم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا...... اس کی دیکھا دیکھی کیپٹن آصف نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔

"تم اتنی بڑی باتیں جھوٹ نہیں کہہ سکتے...... لیکن اگر یہ سب واقعی سچ ہوا تو میں تمہیں سلیوٹ کروں گا...... میں پہلے اپنے ذرائع سے یہ سب معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں...... تمہاری تصاویر بھی حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور تم نے اپنا ملتان کا جو پتا بتایا ہے جہاں تمہارے ماں باپ رہائش پذیر ہیں، یقیناً ملک کے اس بہادر سپاہی کا ایڈریس بھی وہی ہو گا جسے کچھ عرصہ پہلے قومی دن پر فوجی اعزاز سے نوازا گیا تھا۔"

"جناب! میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ خود بھی مجھ سے اپنے طور پر مطمئن ہو جائیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن...... سر! جو بھی کریں جلد کریں......"

"ڈونٹ وری...... ینگ مین!" میجر وسیم بارعب لہجے میں بولے۔ "ساری باتوں کا تو پتا لگانا ممکن نہ ہو گا، لیکن ان میں سے صرف چند بنیادی باتوں کی سچائی جان لینا بھی تمہاری صداقت کے لیے اتنا ہی ثبوت کافی ہو گا میرے لیے......"

پھر وہ کیپٹن آصف سے مخاطب ہو کر بولے۔

"کیپٹن!"

"سر۔"

"ان تینوں کو وار روم میں لے جا کر بٹھا دو...... اور ان کے ہاتھوں کی بندشیں کھول دینا۔"

"او کے سر...... ! بٹ......"

"یس......؟"

"سر! وہ ڈی ایس پی بہت شور کرے گا......"

"ہم......" کیپٹن آصف کی بات پر وسیم نے پُرسوچ انداز میں اپنے دونوں ہونٹ بھینچ لیے، پھر چند لمحہ بعد اپنے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں خود اسے کسی طرح قائل کرنے کی کوشش کرتا ہوں...... تم پہلے ان تینوں کو وار روم پہنچا دو......"

"رائٹ سر......!" کیپٹن آصف نے مؤدبانہ انداز میں کہا اور پھر میجر وسیم کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا...... کیپٹن آصف ہماری طرف متوجہ ہوا اور پھر وہاں موجود دو رینجرز اہلکاروں سے تحکمانہ کہا۔

"ان تینوں کے ہاتھ کھول دو...... اور میرے ساتھ وار روم پہنچو......"

اس کے اگلے دس منٹ میں ہم ایک اور کمرے میں آ گئے جو نسبتاً بہتر کنڈیشن میں تھا۔ کشادہ بھی تھا اور یہاں فرنیچر بھی رکھا ہوا تھا۔ ہمیں ایک صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ دو رینجرز کے اہلکار وہاں موجود رہے۔ ہمیں کچھ کھانے کو بھی دیا گیا۔ ایک طرف کونے میں خاصی بڑی میز اور اس کے دو طرف تین چار کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر کمپیوٹر اور ٹیلی فون سیٹس رکھے نظر آ رہے تھے۔ اس دوران مجھے اول خیر اور کبیل دادا سے باتیں کرنے کا موقع ملا تو بھی ہم نے ایک دوسرے سے خیر خیریت سے ہی متعلق گفتگو کی، اول خیر اور کبیل دادا نے سب سے پہلے شکیلہ کے بارے میں ہی استفسار کیا تھا۔ طلسم نور ہیرے سے متعلق بھی بات ہوئی اور باقی تفصیل وہ سن چکے تھے۔

ایک گھنٹے بعد کوئی ٹائٹ ٹائپ آدمی اندر داخل ہوا اور بڑے احترام سے مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تشریف لائیں سر......!"

میں اٹھ کھڑا ہوا...... "یہ بھی میرے ساتھ ہوں گے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر

پوچھا۔ میرا اشارہ کیمبل دادا اور اول خیر کی طرف تھا۔

''شیور سر......!'' اس نے ادب سے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی تھی۔

ہم تینوں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایک اور کمرے میں داخل ہوئے اور وہاں ہمیں میجر وسیم اور کیپٹن آصف کے علاوہ دو اور افراد نظر آئے۔ یہ نسبتاً ایک آرام دہ کمرا تھا۔ یہاں صوفے بچھے ہوئے تھے اور فرش پر قالین تھا۔ درمیان میں گلاس ٹاپ بڑی سی ٹیبل رکھی ہوئی تھی۔ جس پر کچھ موبائل فون، ٹیلی فون سیٹ اور کارڈلیس نظر آرہے تھے۔ کونے میں ایک شخص بڑی سی دیوار گیر اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے سر پہ ہیڈ فون چڑھا رکھا تھا۔ اسکرین ایل ای ڈی، جسے شاید کمپیوٹر سے کنکٹ کیا ہوا تھا، کیونکہ اس میں ایک گراف جس پر سرخ رنگ کی ایرو کی متحرک تھی۔ گراف کے بیچ میں کبھی کسی کی پنسل سے بنائی ہوئی تصویر ابھرتی اور پھر اس کی اسکیننگ ہونے لگتی تو اصل چہرہ سامنے آجاتا۔

''بیٹھو......'' میجر وسیم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا چہرہ کسی گہری سوچ میں مستـ[illegible] پیشانی پر سلوٹیں ابھری ہوئی نظر آرہی تھیں۔ [illegible] کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہوگئے۔

چاروں افراد کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگا تھا کہ میرے سلسلے میں انہوں نے انکوائری کروائی ہوگی اور بات ملتان سے ''بیگم ولا'' تک جا پہنچی تھی۔ جبکہ میری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق [illegible] ایک نیا ''فتنہ'' نوشابہ کی صورت میں جنم لے چکا [illegible] فتنے نے پرانے سوئے ہوئے فتنوں کو بھی دوبارہ بیدار کردیا تھا۔ جس میں ایک تو اس کا اپنا باپ چودھری منظور بھی شامل تھا جبکہ اسپیکٹرم کا مقامی چیف وزیر جان پہلے [illegible] درپردہ رہتے ہوئے اس کی پشت پناہی میں مصروف تھا، [illegible] نہیں، نوشابہ اپنے باپ کی سیاسی پارٹی [illegible] پوری طرح سے ''اِن'' اور ''ایکٹو'' ہوچکی تھی، اس پر طرہ [illegible] پارٹی کے اگلے چند ماہ میں ہونے والے عام انتخابات میں جیت کی بھرپور امید بھی کی جارہی تھی۔ عوامی حمایت [illegible] بھرپور حاصل تھی۔

''سنو، مسٹر شہزاد......!'' میجر وسیم نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے گویا ابتدا کی۔ ''میں نے تمہارے بارے میں بعض اہم اور فوری ذرائع سے کچھ باتوں کا پتا چلایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اپنے بارے میں جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ درست ہے، لیکن اب بھی تمہاری ذات میں ابہام موجود ہے، یوں سمجھو بس، تھوڑی سی کسر... رہ گئی ہے۔'' وہ ذرا رکے اور پھر آگے کہنا شروع کیا۔

''تمہارے سلسلے میں جہاں کچھ مثبت باتوں کا علم ہوا ہے وہیں اس سے کہیں زیادہ منفی حقائق بھی سامنے آئے ہیں......''

''منفی حقائق......؟ اور وہ بھی میرے متعلق......؟'' میں نے الجھن آمیز پریشانی تلے میجر وسیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میجر صاحب! کیا میں نے اپنے بارے میں کچھ غلط بیانی سے کام لیا ہے؟ آپ یہ سمجھ رہے ہیں؟''

''بیگم ولا سے تمہارا کیا تعلق بنتا ہے......؟'' اچانک انہوں نے میرے چہرے پر اپنی نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔

''میں تو آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ بیگم ولا...... میری بیوہ بھابی زہرہ بانو کی ملکیت ہے اور میرے ماں باپ وہیں رہتے ہیں......''

''[illegible] ٹاپ جگہ ہے یا کسی خفیہ ہیڈ [illegible]'' میجر وسیم نے میری طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہیڈ کوارٹر......؟ کک...... کیا مطلب......؟ میں [illegible] میجر صاحب؟ کس چیز کا ہیڈ کوارٹر......؟'' میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

''[illegible] دشمن عناصر کے مذموم مقاصد کے لیے یہ جگہ [illegible] لائی جارہی ہے۔''

میجر وسیم نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جیسے انکشاف کیا۔ اگرچہ مجھے بھی زہرہ بانو سے ٹیلی فونک گفتگو پر اس جھوٹے اور کریہہ الزام کا علم ہوچکا تھا۔ لیکن مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ اس الزام کو کیا سچ سمجھا جانے لگا تھا۔ کیوں؟ اور کس بنیاد پر؟ یہی سوال جب میں نے میجر وسیم سے پوچھا تو وہ بولے۔

''ہم اپنے طور پر تصدیق کیے بغیر کسی الزام کو سچ نہیں مانتے۔''

''تو آپ نے بیگم ولا کے سلسلے میں کیا تصدیق کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں...... لیکن ملتان رینجرز کے مطابق کچھ شواہد ایسے علم میں لائے گئے ہیں جن کے مطابق اس الزام کی صداقت پر شبہے کی گنجائش نہیں رہتی۔''

Pakistanipoint
Waqar Azeem

''میجر صاحب! اب برائے کرم یہ بھی بتا دیں کہ وہ الزام ملتان رینجرز کے علم میں لانے والے کون ہیں؟ ہمارے مخالفین......؟''

''ہاں......'' میجر وسیم نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''تو آپ کے خیال میں ہمارے مخالفین کیا ہمارے بارے میں کوئی اچھی رائے بھی رکھتے ہوں گے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں طنز کی کاٹ ابھر آئی تھی۔

''ایسا تو نہیں لیکن......شواہد سے تو یہی لگتا ہے۔''

''جناب! ان شواہد کے بارے میں اور ان کے موجد کا نام بتا سکتے ہیں؟ تاکہ میں ردِالزام کے بارے میں کچھ کہہ سکوں؟''

''شواہد کے سلسلے میں ملتان رینجرز کے اینٹی ٹیررسٹ ونگ کو ایک گمنام کال موصول ہوئی تھی کہ بیگم ولا میں اسی وقت ریڈ کیا جائے تو وہاں کافی تعداد میں غیر قانونی اسلحہ اور کچھ مشتبہ افراد کا پورا مسلح گروہ مل سکتا ہے۔'' میجر وسیم نے جواب دیا۔

''مجھے معلوم ہے بیگم ولا پر ریڈ کیا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تو پھر کیا ملا وہاں سے رینجرز کو......؟''

''اسلحہ ملا تھا اور لوگ بھی...... ایک رہائشی جگہ پر جہاں ایک خاندان اور بچے ہونے چاہیے تھے وہاں...... ان کے بجائے اسلحہ پوش افراد ملے تھے۔ ان میں کئی لوگوں کے پاس غیر قانونی اسلحہ تھا۔''

''کیا ملتان رینجرز کو بیگم ولا میں...... وطنِ عزیز کا وہ جانباز سپاہی نہیں ملا تھا جس نے ملک کی خاطر اپنی جوان حاملہ بیوی اور اپنے ایک چند سال کے بچے کو تقدیر کے حوالے کر دیا اور خود گمنام سپاہی کی حیثیت سے ایک ایسے ملک دشمن جاسوس کے تعاقب میں جا نکلا تھا جو ملک کا ایک اہم راز لے اُڑا تھا...... اور جس نے دشمن ملک میں گھس کر اس جاسوس کو نہ صرف جہنم واصل کیا بلکہ اس کے قبضے سے وہ اہم راز بھی چھین کر ضائع کر دیا تھا۔ وہ راز اگر دشمن ملک کے ہاتھ لگ جاتا تو بنگلہ دیش کی طرح وطنِ عزیز کا ایک اور ٹکڑا بھی ''سہ لخت'' کی صورت الگ ہو جاتا۔ اس پاداش میں تاج دین شاہ جیسے دلیر محب وطن سپاہی کو دشمن ملک میں طویل اور پُرمصائب قید جھیلنی پڑی تھی۔'' یہ کہتے ہوئے میرے وجود کا رُواں رُواں فرطِ جوش تلے کانپنے لگا تھا۔ کمرے میں اے سی ہونے کے باوجود میری پیشانی پر پسینے کے ننھے منے قطرے نمودار ہونے لگے تھے۔

''وہ سب ٹھیک ہے......لیکن وہ لوگ اور غیر قانونی اسلحہ......؟'' میجر وسیم نے استفسار طلب لہجے میں کہا۔

''اسلحہ لائسنس یافتہ تھا، یہ الگ بات تھی کہ کچھ آؤٹ آف ڈیٹ تھا......اس سلسلے میں کچھ سستی ہو گئی ہو گی۔'' میں نے زہرہ بانو سے کی ہوئی اس ضمن میں گفتگو کے تناظر میں کہا۔ ''رہی بات لوگوں کی تو وہ سب زہرہ بانو کے جاں نثار ساتھی ہیں...... ان سب کا بائیو ڈیٹا بیگم ولا میں موجود ہے۔ ان میں کوئی بھی ہسٹری شیٹر اور بری شہرت والا آدمی نہیں مل سکتا...... ایک بات بتائیں...... ملک کے سربرآوردہ لوگ اپنی سیکیورٹی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ وہ تو جہاں رہتے ہیں وہاں کے دوسرے عام لوگوں کے راستے تک راڈ لگا کر بلاک کروا دیتے ہیں۔ کتے، شیر اور اسلحہ بدست آدمیوں کی پوری فوج ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر بیگم ولا میں چند اسلحہ پوش افراد نظر آ گئے تو کون سا ایسا نیا ہو گیا تھا جس کے باعث بیگم ولا میں ریڈ لگا کر ایک ملکی فوجی اعزاز یافتہ اور وطن کے گمنام سپاہی اور کنٹری ہیرو کے ساتھ یوں بے عزتی کی گئی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایسا آدمی ایسی جگہ پر رہنا پسند کرے گا جو ملک دشمن عناصر کی کمین گاہ کہلاتا ہو؟ اب میری ایک آخری بات کا بھی جواب دے ڈالیں میجر صاحب......! آپ نے میرے بارے میں ملتان رینجرز سے حقائق تو معلوم کر لیے کیا آپ نے ان سے پوچھا کہ...... چوہدری ممتاز خان، جسے میجر ریاض باجوہ اور کیپٹن عمران وغیرہ کے ساتھ ایک بڑے ریڈ، جس میں خود میں بھی ایک سابقہ پاور ایجنٹ کے طور پر شامل تھا، ملک دشمن عناصر کے ساتھ سازباز کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا تھا، وہ اب آزاد کیوں ہے......؟''

میری اس آخری بات نے میجر وسیم کو لاجواب سا کر دیا۔ وہ ایک دم خاموش سے ہو گئے تھے، میں اب نمایاں طور پر یہ بات محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے سلسلے میں خاصے مخمصے کا شکار ہو گئے تھے۔

میں نے اس بار نہایت پُرزور اور ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''میجر صاحب! خدا کے لیے...... مجھ پر اگر اب بھی آپ کو شبہ ہے تو ٹھیک ہے، لیکن اس قومی امانت کے سلسلے میں جلدی کچھ کیجیے...... جو میں اور میرے جاں نثار ساتھیوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر حاصل کی تھی، آپ نہیں جانتے وہ صرف ایک ہیرا ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا ایٹم بم بھی ہے جو اگر دوبارہ مخصوص گروہ کے ہاتھ لگ گیا تو دنیا کو تیسری عالمی جنگ سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔ اس کی تفصیل میں آپ کو بتا چکا ہوں۔''

''یہی ثبوت اگر ہمارے ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی نشاندہی تم کر رہے ہو تو......تم اور تمہارے ساتھی ہر الزام سے یکسر بری الذّمہ ہو جائیں گے...... میں تم سے یہی بات آخر میں کہنے والا تھا۔'' میجر وسیم نے کہا اور پھر اسی وقت جیسے وہ متحرک ہو گیا۔ اس نے کیپٹن آصف سے تحکمانہ کہا۔

''اسی وقت ایک دستہ ٹاپ آف کرو...... ہمیں زمیندار شاہنواز خان کی حویلی میں ریڈ کرنا ہے۔''

''سر! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہتا ہوں......'' میں نے فوراً کہا۔

''تم کیا کرو گے؟'' میجر وسیم میری طرف متوجہ ہوا......

''جناب! وہاں میری ایک ساتھی شکیلہ ہی اس کی قید میں نہیں ہے بلکہ شاہنواز خان کی بیٹی سونہڑیں بھی ہے، جسے اپنے باپ کی طرف سے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ وہ بھی آپ کو میری باتوں کی گواہی کے لیے کافی ہو گی......جس سے متعلق تازہ حالات کا ذکر میں آپ سے کر چکا ہوں...... کیونکہ میں ہی انہیں پہچان سکتا ہوں......''

میجر وسیم میری بات سن کر کچھ دیر ہونٹ بھینچے سوچتے بن گئے اس کے بعد انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

پانچ گاڑیاں تیار کر لی گئیں اور اس مشن میں کیپٹن آصف ہی نہیں بلکہ خود اس فورس کے سربراہ میجر وسیم... بھی شامل تھے۔ گاڑیاں آندھی طوفان کے ساتھ شاہنواز خان کے گوٹھ کی جانب روانہ ہو گئیں......

☆☆☆

رات اپنے آخری پہر کے سفر میں تھی۔ رینجرز کی چاروں بھاری بھرکم گاڑیاں لاڑکانہ کے مضافات کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے شاہنواز خان کا گوٹھ لاڑکانہ شہر سے تقریباً ملحقہ تھا۔ صرف چند کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ میں میجر وسیم والی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھا اور میرے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہ تھا، جبکہ کیپٹن آصف دوسری گاڑی میں تھا۔ باقی دو گاڑیوں میں سے ایک ہمارے آگے تھی اور دوسری سب سے پیچھے۔

لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ بعد ہم شاہ گوٹھ میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں اب پولیس کا کوئی پہرا نہ تھا۔ البتہ چند مسلح افراد موجود تھے۔ ان میں دو افراد رینجرز کی گاڑیوں کو دیکھ کر فوراً حویلی کے اندر جا گھسے تھے۔ تب تک گاڑیاں حویلی کے احاطے میں داخل ہو چکی تھیں۔ یہ ریڈ شاید اُن کے لیے غیر متوقع نہ ہو۔ تاہم مسلح حواریوں کے چہروں پہ تشویش اور فکرمندی پائی جاتی تھی۔

ہم سب گاڑیوں سے نیچے اتر آئے تھے۔ احاطے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فولادی پائپوں پر گلوب نصب تھے، جن میں چند ایک ہی بجھے ہوئے تھے، باقی روشن تھے۔ اسی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ حویلی کے بڑے سے مرکزی دروازے پر تین افراد نمودار ہوئے۔ دو تو وہی مسلح آدمی لگتے تھے جنہوں نے ہماری گاڑیوں کو حویلی کے وسیع احاطے میں داخل ہوتے دیکھ کر فوراً اندر کی راہ لی تھی جبکہ تیسرا کوئی دبنگ سا شخص نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سے متجاوز ہی دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ بھاری اور گول تھا، رنگ گندمی، سر کے بال پیشانی سے نصف سے زائد اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ قد کاٹھ دراز قامت تھا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا، ازیں علاوہ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے میری طرف بہت غور سے ایک نظر دیکھا تھا۔

''جی میجر صاحب! خیریت تو ہے...... یہ سب کیا ہے......؟''

اس نے میجر وسیم کا جائزہ لینے کے بعد فوراً گمبھیر سے لہجے میں پوچھا۔ وہ مجھے خاصا زیرک دماغ اور چلتا پرزہ ٹائپ چالاک آدمی لگا تھا۔ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔ اس نے میجر کی وردی اور نام پہلی فرصت میں دیکھ لیا تھا۔

''حویلی کی تلاشی لینا ہے ہم نے اور شاہنواز خان سے بات کرنی ہے۔'' میجر وسیم نے ٹھنڈی ہوئی متانت کے ساتھ اس سے کہا۔

''کیسی تلاشی؟ کیا جرم ہوا ہے یہاں......؟'' مذکورہ شخص نے فوراً پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟ اور اپنی حیثیت واضح کرو......'' میجر وسیم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے رعب دار لہجے میں اس سے کہا۔

''میرا نام صالح جان ہے......'' مذکورہ شخص نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''اور...... میں شاہنواز خان کا ایک قریبی رشتے دار ہوں، ان کی غیر موجودگی میں حویلی وغیرہ کی دیکھ بھال میرے ہی ذمّے ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن......میجر صاحب! آپ کے پاس کوئی تلاشی کا وارنٹ، کوئی اجازت نامہ تو ہوگا......؟''

''ہمیں جو خصوصی اختیارات تفویض کیے گئے ہیں، ہم اسی کے تحت حویلی کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ اب آپ مہربانی کر کے راستہ چھوڑ دیں......'' کہتے ہوئے میجر وسیم نے اس کے جواب کا بھی انتظار نہ کیا اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ صالح جان نامی وہ شخص خاصا برہم نظر آرہا تھا، میں نے اسے اپنا موبائل نکالتے ہوئے دیکھا۔

بہرکیف ہم سب اندر داخل ہو چکے تھے۔ رینجرز کے اہلکاروں نے کیپٹن آصف کی سرکردگی میں اوطاق سمیت پوری حویلی کی تلاشی شروع کر دی تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر حویلی میں سوائے ملازمین کے اور کوئی نہ ملا تھا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ زمیندار شاہنواز خان اپنی فیملی کے ساتھ اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شرکت کے لیے فیملی سمیت جامشورو گیا ہوا تھا۔

بہرطور شکیلہ، ارم اور اس کے دونوں بچوں کو بھی تلاش کیا گیا اور جب ان کے بارے میں پوچھا گیا تو سب نے اس سلسلے میں قطعاً لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہی نہیں جب شاہنواز خان کے دو مقربِ خاص کار پردازوں کوڑا خاں اور بخشل کے بارے میں پوچھا گیا تو ان دونوں کو حواریوں نے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ کیونکہ اگر یہ دونوں بھی مل جاتے، میجر وسیم انہیں گرفتار کر کے تفتیش وغیرہ کے سلسلے میں ساتھ لے جانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ جبکہ وہاں کوئی بھی بخشل اور کوڑا خان کو جیسے جانتا ہی نہ تھا......! میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ''کالی بھیڑیں'' پہلے ہی حرکت میں آچکی تھیں اور جنہوں نے شاہنواز خان کو ایسے کسی خطرے سے پیشگی آگاہ کر ڈالا تھا۔ شاہنواز ایک شاطر اور عیار دماغ آدمی تھا۔ اثر و رسوخ اپنی جگہ لیکن جہاں دیکھتا ''بھاگنے اور چھپنے'' میں عافیت ہے تو وہ یہ کام بھی چالاکی سے کر ڈالتا تھا اور یہی اس نے کیا تھا۔

اس مردود انسان نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے غیاب کے ساتھ ساتھ شکیلہ اور ارم وغیرہ کو بھی غائب کر کے کسی اور خفیہ جگہ منتقل کر دیا ہوگا...... ازیں علاوہ طلسم نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ...... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں...... جبکہ شکیلہ کو...... اس نے ہیرے کی تلاش میں اپنے مسلح حواریوں (کوڑا خان وغیرہ) کے ساتھ روانہ کیا تھا اور خود بھی ان کے ساتھ تھا، پھر کیا ہوا تھا؟ ہیرا اُن کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں، شکیلہ کا انہوں نے خدانخواستہ کیا انجام کیا تھا......؟ اس کے بعد کا مجھے کچھ علم نہ تھا کہ کیا ہوا تھا......؟ کیونکہ پھر پرو جانڈیو نے حویلی میں حملہ کر دیا تھا...... یہی وجہ تھی کہ مجھے شکیلہ کی طرف سے زیادہ فکر و تشویش لاحق تھی، کیونکہ شاہنواز جیسے سفاک اور درندہ صفت آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

بہرطور...... میری رینجرز کے ہاتھوں حوالگی اس کے علم میں لائی جا چکی ہوگی، وہ جانتا تھا کہ میں رینجرز کو کیا کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ان دونوں خاص حواریوں، بخشل اور کوڑا خان کو فوراً غائب ہو جانے کا حکم دیا ہوگا اور خود شادی کے بہانے اپنی بیٹی سونہڑیں کو لیے جامشورو نکل گیا، اگرچہ مجھے اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ جامشورو گیا بھی ہوگا یا محض ایسا ظاہر کیا گیا تھا۔

ملازمین میں بھی مجھے بیشتر نئے لوگ نظر آرہے تھے، چند ایک پرانے غائب تھے۔ ان کے ''غیاب'' میں بھی یہی مقصد کارفرما ہوگا کہ ایسی کسی متوقع صورت میں یہاں حویلی میں اس کی خود ساختہ غیر موجودگی کے دوران کوئی زیرِ تفتیش نہ لایا جاسکے...... ازیں علاوہ وہاں کے ملازمین سے میرے بارے میں بھی میجر وسیم نے دریافت کیا تھا، مگر وہ سب کے سب مجھے پہچاننے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اس دوران صالح جان نے اپنا موبائل میجر وسیم کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''یہ ایم این اے شاہ صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں......''

''سوری! اس وقت میں کسی سے بات نہیں کرسکتا۔'' میجر وسیم نے سنجیدگی کے ساتھ فون سننے سے انکار کر دیا اور وہ اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا۔

لیکن اِدھر میں زمیندار شاہنواز خان کی زیرک دماغی اور مکاری پر...... بےبسی کے ساتھ اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

رینجرز کے لیے اب وہاں کرنے کو کچھ نہ تھا۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد میجر وسیم...... نے جوانوں کو واپسی کا حکم دیا تو میں نے کہا۔

''میجر صاحب! شاہنواز نے زبردست چال چلی ہے، مجھے اس بات کا خدشہ پہلے سے تھا...... وہ ایک اثر و رسوخ والا آدمی......''

''میرا خیال ہے اس مسئلے کو ہیڈ کوارٹر چل کر آرام سے ڈسکس کرلیں گے۔'' انہوں نے میری بات کاٹ دی اور جوانوں کو واپسی کا حکم دیا۔ میں نے غور کیا وہ میری طرف سے ایک بار پھر کسی شک و شبہے کا شکار ہونے لگے تھے۔ مجھے یہ میجر لکیر کا فقیر معلوم ہوا۔ اس کے اندر اپنے تیئں کچھ بوجھنے اور صورتِ حال کی بھل بھلیوں کو سمجھ کر اس سے کچھ اخذ کرنے کی صلاحیت کم ہی تھی یا پھر وہ اسے استعمال کرنے سے اعراض برت رہا تھا، تاہم انہیں بھی کچھ قانونی تقاضوں کا پاس رکھنا ہی پڑتا ہے۔ خاموش میں بھی نہیں ہوا۔ بولا۔

''جناب! صرف چند منٹ مجھے دیں...... میں ذرا اپنے طور پر بھی کوئی کلیو تلاشنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں......''

میری بات سن کر میجر وسیم نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور سپاٹ لہجے میں مجھ سے بولا۔

''صرف دس منٹ......''

''شکریہ جناب!'' میں نے غیر تاثر انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کمرے کی جانب دوبارہ رخ کیا جہاں میری، شاہنواز کے ساتھ گفتگو ہوئی تھی۔ وہاں میرے ساتھ ارم بھی تھی۔ میں اس کمرے میں پہنچا اور غور سے ایک ایک چیز کا جائزہ لینے لگا۔ میرے ساتھ میجر وسیم نے جوانوں کو کر رکھا تھا۔

ادھر صالح جان مجھے تیز سی کڑوی اور برماتی نظروں سے گھورے جارہا تھا۔ میں نے دو ایک کمروں کا خود بھی دوبارہ اچھی طرح جائزہ لیا اس کے بعد مایوس سا ہو کر میجر وسیم کے پاس آیا تو صالح جان، میجر وسیم سے احتجاجاً بولا۔

''میجر صاحب! یہ آدمی تو کوئی سویلین لگتا ہے مجھے، اسے کیا اختیار ہے کہ وہ ایک معزز آدمی کے گھر کی یوں تلاشی لے...... میں اس پر اپنا احتجاج ریکارڈ کروانے کا حق رکھتا ہوں۔''

صالح جان نچلا بیٹھنے والا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ یوں بھی اس نے شروع سے آخر تک...... ہمارے ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کی تھی۔ ظاہر تو ہو چکا تھا کہ شاہنواز خان نے اپنی غیر موجودگی میں خصوصی طور پر حویلی بلایا تھا۔ اگرچہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ یعنی شاہنواز خان سے ٹاکرا ہوتے وقت یہ تھا۔ وہ شاہنواز کے لیے بار بار ''وڈو بھا'' (بڑا بھائی) کے الفاظ استعمال کر رہا تھا جو یقینی طور پر کوئی قریبی شخص ہی کہہ سکتا تھا۔

میجر وسیم نے اس کی طرف گمبھیر نظروں سے دیکھا اور میری جانب خفیف سا اشارہ کرتے ہوئے اس سے جواباً بولے۔

''یہ آدمی بہ طور چشم دید گواہ کے یہاں لایا گیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اسے یہاں قید میں رکھا گیا تھا اور اس کی دو ساتھی لڑکیاں بھی یہاں ابھی تک قید ہیں، ان سب باتوں کی تفصیل تو لمبی ہے، لیکن ابھی اتنا کافی ہے۔''

''بہت خوب میجر صاحب!'' صالح جان طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر کوئی ایرا غیرا آپ کے پاس یہ کہنے آجائے کہ اس حویلی میں مجرا ہوتا ہے تو کیا آپ اس کی بات کا یقین کرلیں گے؟''

''سنو مسٹر......! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا......؟'' میجر وسیم نے اس کی طرف اپنی انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بارعب اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''صالح جان۔''

''ہاں، صالح جان! اپنا لہجہ دھیما اور تمیز کو ملحوظ رکھو...... ہم کسی مصدقہ اطلاع پر ہی ایسی کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔ ہم دوبارہ بھی آسکتے ہیں......''

یہ کہہ کر میجر پلٹا۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ طاری تھی۔ شاہنواز ہمیں چکما دے گیا تھا اور آئندہ بھی یہی روش قائم رکھنے والا تھا۔ میجر وسیم مجھ سے اب کچھ خاص مطمئن نظر نہیں آرہے تھے جبکہ شاہنواز کے سلسلے میں اب کیا کرنا چاہیے تھا اس کا تعین اب خود مجھے ہی کرنا تھا۔ میں اس کے بارے میں اندر ہی اندر بہت غور و خوض کر رہا تھا اور اسی سبب کئی جارحانہ خیالات میرے اندر تیزی سے سر اٹھانے لگے تھے۔

پولیس ہو یا رینجرز یہ اپنی قانونی حدود و قیود کے محتاج تھے، جبکہ شاہنواز جیسے خطرناک اور چالاک مجرم ہوں تو بسا اوقات یہی قیود ان کے لیے راہِ مفر کہلاتی ہے۔ پل کے پل میں نے ایک حتمی فیصلہ کر ڈالا جو ایسے نازک مواقع پر مجھے بارہا کرنا پڑتا تھا۔

میرا یہ فیصلہ جارحانہ ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھا مگر سچائی اور حقائق کو سامنے لانے کا اس کے سوائے مجھے کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تھا۔ حالانکہ اس میں رسک تھا، میری جان بھی جاسکتی تھی، جبکہ اول خیر اور گبیل دادا پہلے ہی ایک طرح سے رینجرز کی تحویل میں ہی تھے۔ میری نظر میں وہ محفوظ تو تھے کہ کم از کم کسی دشمن اور بالخصوص انسپکٹر رجب دین جیسے راتب خورہ کی گرفت سے آزاد تو تھے۔

دوبارہ گاڑیوں میں سوار ہوتے وقت میرے اندر ایک طوفان سا مچلنے لگا اور دانستہ میں نے دوسری گاڑی میں سوار ہونا پسند کیا تھا۔ اس میں ڈرائیور سمیت صرف چار رینجرز کے اہلکار سوار تھے۔ ایک اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر میں، جبکہ دو درمیانی نشست پہ براجمان تھے، میں

نے اپنے لیے سب سے آخری والی سیٹ کا انتخاب کیا تھا اور گاڑی میں سوار ہوتے ہی میں نے سب سے پہلے اس کے عقبی دروازے کا جائزہ لیا تھا۔

مجھے جو کرنا تھا، اس کے لیے میں وقت اور جگہ کا تعین کرنے لگا۔ گاڑیاں کچے میں دوڑ رہی تھیں اور میرا سوچتا ذہن اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ فراٹے بھر رہا تھا۔

گاڑیاں ہچکولے کھا رہی تھیں۔ میں اگلے چند لمحات میں جو خطرناک قدم اٹھانے والا تھا، مجھے احساس تھا کہ میں رینجرز کی تحویل میں ہوں اور یہ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ اینٹی ڈکیت فورس کے یہ اہلکار خصوصی تربیت کے حامل تھے۔ اگرچہ میں نے بھی انہی کے انداز میں تربیت حاصل کر رکھی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ میری تربیت کی خصوصیت ان سے کچھ سوا ہی تھی۔ تاہم میں نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ مجھے کس وقت اور کون سا قدم اٹھانا ہے۔

آخر رات کی گھپ تاریکیوں میں گاڑیاں...... کچے پکے اور اپلے تھپی دیواروں والے گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے پاس سے گزرتی ہوئی کھیتوں کے درمیانی بل کھاتے کچے راستے پر ہولیں تو میں غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے عقبی دروازے کی طرف سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی کھسکنے لگا۔ قسمت بھی شاید میرا ساتھ دے رہی تھی کیونکہ جس گاڑی کے اندر میں سوار تھا، وہ سب سے آخر میں ہوگئی تھی۔ آگے ان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں جبکہ ہماری گاڑی کے عقب میں اندھیرا تھا۔ ماسوائے سرخ ٹیل لائٹ کے۔

کھیتوں کے درمیان بل کھاتے دھول اُڑاتے کچے راستے پر قوس کی صورت میں گاڑیاں گھومتی ہوئیں جب ایک نہر کی پلیا پر چڑھنے لگیں تو مجھے اس کی دوسری طرف کیکر کا گھنا جنگل سا نظر آیا، اور ایک طرف قبرستان تھا۔ پُلیا قدرے اونچائی پر تھی اس لیے وہ سب لوگ سامنے ہی نظریں جمائے ہوئے تھے، میری طرف سے ان کی غافل نظروں کا مطلب یہی تھا کہ میں کوئی قیدی نہیں تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب ہماری گاڑی پُلیا پر چڑھی میں سیٹ سے فرش پر آچکا تھا اور دروازے کو اوپر اٹھاتے ہی میں نے گاڑی کے فرش پر لیٹے لیٹے ہی خود کو لڑھکنی دے کر باہر گرا دیا۔ گاڑی کے ہچکولوں میں ممکن تھا انہیں احساس نہ ہوا۔ اسی قلیل موقع سے فائدے اٹھاتے ہی میں نیچے گرا۔ بھربھری مٹی والی زمین پر گرتے ہی میں لڑھکتا ہوا نہر کے کراڑے پر آگیا۔ پُلیا پر چڑھتی گاڑی کی رفتار یوں بھی کم ہوگئی تھی۔ گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ انہیں زیادہ دیر تک میرے اس ''غیاب'' کا پتا نہیں چلے گا۔ لیکن میں اس تھوڑے سے ہی وقت میں جتنا مجھے ملتا، اپنا کام نمٹا لینا چاہتا تھا کہ ان کی گرفت میں نہ آسکوں......

کراڑے پر گرتے ہی میں اٹھا اور سر ابھار کر دیکھا۔ رینجرز کی گاڑیوں کی ٹیل لائٹیں دور ہوتی نظر آرہی تھیں اور جس وقت میں...... پُلیا پر چڑھتے ہوئے دوسری جانب بنے کیکر کے گھنے جنگل میں داخل ہونے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ رینجرز کی گاڑیاں رک چکی تھیں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ انہیں میرے غیاب کا علم ہو چکا ہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور یکلخت اعصاب تن گئے۔

میں نے جنگل میں دوڑ لگا دی۔ اسی وقت میں نے رینجرز کی گاڑیوں کو ریورس ہو کر پلٹتے دیکھا۔ کیونکہ اب ہیڈ لائٹس کی روشنیاں اسی طرف پڑنے لگی تھیں، میں تاریکی میں دوڑتا چلا گیا...... راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں قبروں پر چل رہا ہوں، مجھے اس کا افسوس تھا۔ ایک پرانی اور دھنسی ہوئی قبر پہ پاؤں پڑا تو میں اندر ہی جا گرا......

☆☆☆

بے اختیار میرے منہ سے چیخ سی نکل گئی۔ ناگوار بُو کا تیز بھبکا میرے چہرے سے ٹکرایا اور ساتھ ہی وہ ہڈیاں بھی جو یقیناً اس مردے کی تھیں جسے دفن ہوئے نجانے کتنا عرصہ بیت چلا ہوگا۔ اس کی روح عالمِ برزخ یا عرشِ بالا کے نجانے کون سے درجے پہ ہوگی، تاہم ایک کالی بھٹ قبر کے اندر خود میں کسی لاش ہی کی طرح سما گیا تھا۔ زندہ حالات میں قبر کا تصور ہی لرزہ دینے کے لیے کافی ہوتا ہے چہ جائیکہ میں تو بہ قائمیِ ہوش وحواس اندر لیٹا تھا۔ چند ثانیے میں اسی طرح دہشت زدہ سا مبہوت حالت میں پڑا رہا، ہوش آیا تو میں نے فوراً سے پیشتر باہر نکلنے کا ارادہ کیا مگر ابھی میں نے اپنا سر قبر سے باہر نکالا ہی تھا کہ ہیڈ لائٹس کی طوفانی روشنیاں چمک اٹھیں ساتھ ہی گاڑیوں کے شور کی آواز بھی سنائی دی۔ تب ہی ایک خیال کلک ہوا۔ یہ قبر، منکر نکیر سے حساب کتاب کیے بغیر میری نجات کا سبب بن سکتی تھی۔ اخروی نہیں تو دنیوی سہی۔ اس خیال سے میں اندر ہی ہنس پڑا۔ میں نے فوراً ہی دوبارہ اپنا سر یوں قبر کے اندر کر لیا جیسے مجھے نیچے سے کسی نے کھینچ لیا ہو اور دو آنکھیں مجھے گھور کر کہہ رہی ہوں۔

''کیوں میاں! حساب کتاب دیے بغیر کدھر جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو......؟''

پھٹی ہوئی اس شکستہ حال قبر کی تہ اور لحد میں کوئی فرق نہ رہا تھا، مٹی جھڑ جھڑ کے سب برابر ہو چلا تھا لیکن میں نے پھنس پھنسا کر...... اپنی جگہ لحد کے اندر بنا ہی ڈالی۔

گاڑیوں کے انجن کی گھررر...... گھررر...... کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں دم بہ خود سا قبر کے اندر پڑا رہا۔ مٹی کی کچر...... کچر...... اور اس کی سوندھ سے مجھے کوفت ہو رہی تھی۔ قبر کے اندر اس طرح لیٹنے کا میرا یہ پہلا ہی تجربہ تھا اور کم بھیانک نہ تھا۔ دفعتاً کچھ روشنیاں لہرائیں۔ باتوں کی بھی آوازیں ابھریں...... میں دم سادھے لیٹا رہا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ ایک ایک قبر کو کھنگالنے کی سوچتے۔ نہ ہی ان کے سان وگمان میں یہ بات ہوسکتی تھی کہ میں یہاں کسی قبر میں بہ حالت زندہ یوں محوِ استراحت ہوسکتا ہوں......

تھوڑی دیر تک یہی سب کچھ چلتا رہا اس کے بعد دوبارہ گاڑیوں کی گھرر...... گھررر...... کی آواز ابھری اور پھر ایکا ایکی سسکیاں لیتا سناٹا طاری ہوگیا۔ ایسی ہی بھیانک اور خوفناک گھڑیوں میں جب میں لحد اور قبر سے باہر نکلنے کی تیاریوں میں تھا مجھے احساس ہوا جیسے میرے جسم پر لاتعداد حشرات الارض رینگنے لگے ہوں...... میری روح تک کانپ گئی۔ کیا کیڑے مکوڑے مجھے مردہ سمجھ کر اسی ڈھانچے جیسا بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، جس کی قبر پر میں نے ناجائز قبضہ جما رکھا تھا؟ اب تو چبھن بھی محسوس ہونے لگی۔ جب لیٹا تھا کیڑے مکوڑے ٹھہرے ہوئے سے تھے، اب جو ہلا جلا تو ان میں بھی لگتا تھا کہ ہلچل مچ گئی ہو، وہ مجھے کاٹنے لگے تھے۔ میں اچھلا اور قبر سے باہر آکر پاگلوں کی طرح اپنا جسم جھاڑنے لگا۔ تب بھی بات بنتی محسوس نہ ہوئی تو میں نے اپنی شرٹ اتار لی اور پھر پتلون بھی، حشرات الارض کی دہشت ایسی مجھ پہ سوار ہوئی کہ میں نے آخر میں زیرِ جامہ تک اتار دیا۔

اگر کوئی مجھے اس حالت میں ناچتے اچھلتے دیکھ لیتا تو کوئی پاگل دیوانہ یا چلّہ کاٹنے والا ہی سمجھتا۔ لیکن وہ کیا جانتا تھا کہ میں یہ رقصِ خوش فہم کسی بنائے نجات کے لیے ہی جھیل رہا تھا۔ اس اچھل کود میں خاصے کیڑے جھڑ گئے۔ باقیوں کو میں نے نوچ نوچ کر اتار دیا۔ کیکر کے قبرستان والے اندھیرے جنگل میں مجھے خود کو کپڑوں سے برہنہ دیکھ کر سخت شرم محسوس ہونے لگی۔ حالانکہ یہاں میرے سوا اور کوئی نہ تھا۔

قبرستان والے اس جنگل میں بلا کا سناٹا طاری تھا۔ دور کبھی کسی آوارہ جانور کے بولنے کی آواز ابھرتی اور پھر وہی دھڑکا دینے والی خاموشی طاری ہوجاتی۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے...... رینجرز والے شاید کہیں اور جگہ پر میری تلاش میں جا چکے تھے۔ ممکن تھا وہ پلٹ کر دوبارہ اسی جگہ آتے۔ میں نے ایک اندازے کے مطابق چلنا شروع کر دیا اور جنگل سے نکل کر نہر کے پاس آگیا۔ یہ شاید کسی قریبی گزرتے ہوئے دریا سے نکلتی تھی۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا کیا تھا مجھے ابھی تک اپنے جسم پر کیڑے مکوڑے چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اس ذرا تصور سے ہی لرز گیا تھا جب حقیقت میں موت گلے لگے گی اور مقدر میرا قبر ہوگی تو اس وقت میں کیڑے کیسے جھاڑوں گا......؟ میں نے دل ہی دل میں سورہ یٰسین شریف اور آیت الکرسی پڑھی، اللہ سبحان تعالیٰ سے اپنے کردہ و ناکردہ گناہوں کی معافی مانگی اور عذابِ قبر سے پناہ مانگتے ہوئے...... نہر میں اتر گیا۔

میں نے ایک بار پھر کپڑے اتار لیے تھے اور نہر کے ٹھنڈے پانی میں نہا کر باہر نکلا، اس کے بعد کپڑے پہنے۔ گردوپیش پر ایک نظر ڈالی اور پُلیا کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

پُلیا پار کر کے میں نے واپسی کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ یہاں گاؤں گوٹھوں میں کھیتوں کی حفاظت وغیرہ کے لیے لوگوں نے کُتّے چھوڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے ان کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیونکہ مجھے دور کہیں کسی کتے کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دی تھیں مگر میں اللہ کا نام لیے واپسی کے سفر پر گامزن رہا۔ میں پہلے سے ہی شاہنواز خان کی حویلی کا راستہ اپنے ذہن میں پکا چکا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی ہو رہی تھی کہ میجر وسیم اور کیپٹن آصف یوں آسانی سے میری ناکام تلاش کے بعد اتنی جلدی چلے کیوں گئے تھے۔

بہرطور یہ میرے لیے غنیمت تھا۔ وہ اب بھلا مجھے کہاں تلاش کر سکتے تھے؟ انہیں شاید تسلی ہوگی کہ میں کہاں جا سکتا تھا۔ کیونکہ میرے دو ساتھی (اول خیر اور کبیل دادا) ان کی تحویل میں تھے۔ انہیں شاید جلد یا بدیر میری رضاکارانہ واپسی کی امید ہوگی۔

میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ مشرق کی سمت اب پو پھٹتی نظر آرہی تھی جو سحرِ صبح کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں تاریک اور کچے راستوں میں آگے بڑھتا رہا۔ کتوں کے ڈر سے میں نے کھیتوں کے بیچ گزرنے سے اجتناب ہی کیا تھا۔ نسبتاً کھلے راستے سے ہوتا ہوا میں آبادی میں داخل ہوگیا۔ دیہی ماحول خواہ پنجاب کا ہو یا سندھ کا، ایک ہی ہوتا ہے۔

یعنی الصباح بیداری...... لوگ باگ جاگنے لگے تھے۔ پیچھے سے ایک سائیکل والا دودھ کے کین کھڑکھڑاتا ہوا، روایتی دستور کے مطابق مجھے سلام کرتا ہوا گزرا......

تقریباً نصف گھنٹا چلتے رہنے کے بعد میں...... شاہنواز خان کی حویلی والے علاقے میں داخل ہو چکا تھا۔ صبح کاذب کی روشنی دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ میں نئی مہم جوئی کے لیے خود کو ذہنی اور جسمانی طور تازہ دم کرنے کے لیے ذرا دیر کو ستانے کے لیے پیپل کے ایک گھنے درخت تلے رک گیا۔

گاؤں رفتہ رفتہ بیدار ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ٹھہری فضا میں مدھریاں ہونے لگی تھی۔ میں پھر چل دیا۔ جلد ہی مجھے شاہنواز خان کی حویلی کا خاکہ نظر آنے لگا۔ میں تھوڑا اور اس کے قریب جا کر رک گیا اور اس کے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ بلند و بالا حویلی کے دو طرفہ تو ہموار سطح تھی، مٹی اور گرد کا میدان سا تھا۔ دائیں جانب...... کماد کے کھیتوں کا سلسلہ دور تک جاتا دکھائی دیا۔ عقب میں...... بھی کھیت ہی نظر آتے تھے۔ صرف سامنے اور بائیں رخ پر مذکورہ میدان تھا۔ مجھے دور ہی سے...... چند ایک مسلح حواریوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں تھوڑا اور آگے بڑھا اور پھر ذرا قریب پہنچ کر میں نے راستہ بدل ڈالا۔

اب میرا رخ بائیں جانب کماو کے کھیتوں کی طرف تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے اصل راستے سے ہٹ کر...... ایک خاصا بڑا چکر کاٹنا پڑا تھا تاکہ میں کسی حواری کی نگاہ میں نہ آسکوں...... اگلے چند منٹوں بعد میں کھیت کے اندر کسی چیتے کی طرح گھات لگائے بیٹھ گیا اور چند لمحے بعد میں نے حویلی کی عقبی سمت سرکنا شروع کر دیا۔

جہاں کماد کا کھیت ختم ہوتا تھا...... وہاں سے حویلی کی پچھلی دیوار صرف دس بارہ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں وہیں سرے پہ دبک گیا اور یونہی گردوپیش کی سن گن لیتا رہا...... ہر طرف خاموشی تھی۔ یہاں کوئی پہرے دار کئی ثانیوں تک نہیں گزرتا دکھائی دیا تو میں...... نے دیوار کا دور سے ہی دبک کر جائزہ لیا۔

میں نے خفیہ طور پر حویلی کے اندر اس وقت تک ڈیرا ڈالنے کا ارادہ کر رکھا تھا جب تک کہ مجھے حقائق کا ادراک نہیں ہو جاتا۔ کیونکہ درپردہ رہتے ہوئے بھی بہت سے ''پردے'' اٹھ جاتے ہیں۔

حویلی کی عقبی دیوار خاصی ''سی پیج'' زدہ نظر آرہ تھی۔ وجہ یہی تھی کہ عمارت کا سارا واٹر اینڈ ڈرینج سسٹم کے پائپوں کا جال اس دیوار پر پھیلے ہوئے ہونے کے باعث پانی رستا رہتا تھا۔ مجھے حویلی کے ایسے دریچوں کی تلاش تھ جس سے میں اندر داخل ہونے کی کوئی راہ ڈھونڈتا۔

اوپری منزل پر تین، چار دریچے دکھائی دے رہ تھے۔ نیچے دو دریچے تھے اور دونوں ہی بند تھے۔ باقی چ ایک دریچوں پر روشن دان کا گمان ہوتا تھا۔ اچانک ہ میری نگاہ دیوار کے آخری سرے پر پڑی، یہ میر سیدھے ہاتھ کی دیوار تھی جو آگے سے گھوم کر حویلی سے ملحق اوطاق کی طرف چلی گئی تھی۔ وہاں مجھے کوئی دروازہ محسوس ہوا۔ اس کا یقین کرنے کے لیے میں کماد کی آڑ لی تھوڑا اور اسی سمت کو سرکنے لگا مگر چند فٹ تک سرکنے کے بع مجھے تھمنا پڑا تھا کیونکہ اس کے بعد کھیت کی حدود ختم ہو رہ تھی۔ مذکورہ سمت کی طرف کچھ مزید قریب آنے پر مجھے و دروازہ ہی لگا تھا لیکن اس کی چوکھٹ جس پر مجھے سر پختہ اینٹیں نظر آرہی تھیں...... اب مجھے دروازہ دیکھنے کے لیے کھیتوں کی آڑ سے باہر نکلنا پڑتا۔

بہرحال کچھ بھی تھا، مجھے یہ رسک تو لینا ہی پڑتا۔ لہٰذ میں نے اللہ کا نام لیا اور پہلے دائیں بائیں دیکھا، کسی ذی نفس کی غیر موجودگی کی تسلی کرتے ہی میں نے اپنے تیزی سے دھڑکتے دل پر قابو پایا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کماد کے کھیتوں سے نکلا اور مذکورہ سمت دوڑا......

قریب پہنچتے ہی میں دیوار سے چپک گیا اور اگلے ہی لمحے میں نے دوبارہ حرکت میں مطلق دیر نہ لگائی تھی۔ وہ سنگل پٹ کا ایک سالخوردہ دروازہ تھا۔ میرا یہ شبہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ اصل چوکھٹ سے وہ تقریباً ڈیڑھ فٹ اندر کی طرف دھنسا ہوا تھا۔ دروازے پر باہر کی جانب سے کنڈی تو نہیں لگی ہوئی تھی تاہم جب میں نے اسے اندر کی طرف ہلکا سا دھکا دیا تو وہ تھوڑا اہلتا ہوا محسوس ہوا مگر کھلا نہیں تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے وجود کو چوکھٹ کے خلا میں سمو دیا تاکہ فوری طور پر کسی کی نظروں میں آنے سے محفوظ رہ سکوں...... اگر ممکنہ طور پر دائیں بائیں کی دیوار سے کوئی اچانک نمودار ہو جاتا تو جب تک وہ بالکل قریب نہ آجاتا، مجھ پر اس کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

تھوڑا اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے دروازے پر ہلکی ہلکی زور آزمائی شروع کر دی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی کوئی جھری سی تلاش کر کے جھانک کر تسلی کر لی تھی کہ کوئی اندر موجود تو نہ تھا، نیز یہ دروازہ کسی اسٹور نما بند کمرے کا تھا یا پھر کوئی عام رہائشی کمرا تھا۔ اگرچہ دروازے کی باہر سے حالت دیکھ کر تو یہی لگا تھا کہ وہ کسی اسٹور کا ہی دروازہ ہو سکتا تھا اور میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔

دروازے پر زور آزمائی کرنے کے دوران مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اندر کی کنڈی ڈھیلی ڈھالی سی ہی تھی مگر باوجود اس کے کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اتنا ضرور ہوا تھا کہ چوکھٹ اور دروازے کے بیچ اتنا ''گیپ'' ضرور پیدا ہو گیا تھا کہ میں نے ایک ہاتھ بہ آسانی اندر داخل کر دیا تو دوسرے ہی لمحے میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا...... کیونکہ میرے ہاتھ کی انگلیوں سے اندرونی کنڈی ٹکرائی تھی۔ ابھی میں اسے اتارنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک ایک آواز پر میں بری طرح چونکا۔

''میرو...... میرو......''

پتا نہیں کون کسے بہ آواز بلند پکار رہا تھا۔ میں اپنا پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہوا کام ادھورا چھوڑ کر یکلخت سیدھا کھڑا ہو گیا۔ آواز میرے دائیں جانب کی دیوار سے آئی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھا اسی طرف کو آرہا ہو۔ ایک بار تو میرے جی میں آئی کنڈی اتار کر اندر گھس جاؤں مگر اب شاید اتنا وقت بھی تو نہیں رہا تھا، کیونکہ میں قریب آتے ہوئے اس شخص کے قدموں کی آواز صاف سن رہا تھا۔ وہ اب کسی بھی وقت چوکھٹ کے خلا کے سامنے سے گزرنے الا تھا...... اور وہی ہوا...... وہ ایک مسلح آدمی تھا اور حویلی کا کوئی پہرے دار ہی نظر آتا تھا۔ وہ ہنوز کسی میرو نامی آدمی کو آوازیں دیتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ اسی وقت وہ اندر کو دھنسی ہوئی چوکھٹ کے سامنے نمودار ہو گیا۔ میں نے جیسے اپنی بے ترتیب پڑتی سانسیں تک روک لیں...... وہ سیدھا دیکھ رہا تھا۔ ایک ذرا سی بھی گردن اگر وہ اس طرف کو موڑ لیتا تو میں روازے کے ساتھ چپکا کھڑا اسے نظر آجاتا......

قسمت یاور رہی میری کہ وہ میرو کو آوازیں دیتا ہوا مرے بالکل دو فٹ کے فاصلے سے گزرتا چلا گیا مگر ٹھیک اس وقت ایک غیر متوقع اور عجیب سی مصیبت گلے آپڑی۔ جس دروازے پر میں زور آزمائی کرنے میں مصروف تھا اس میں اچانک کھڑبڑاہٹ سی ابھری اور میرے اوسان خطا ہو گئے، یہ بات یقینی تھی کہ کوئی اندر سے دروازہ کھول رہا تھا اور کیا پتا اسے کسی بات کا شبہ ہو گیا ہو......

''اڑے او...... جانوری...... ! اِدھر ہوں میں......''

اسی دروازے سے اندر ایک دوسرے آدمی کی صدا ابھری اور مجھے اپنی لبِ بام کامیابی کے ناکام جانے پر افسوس کرنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ اس آدمی نے جو بلاشبہ میرو ہی ہو سکتا تھا، اچانک دروازہ کھول دیا۔

وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا اور میں اُسے...... پل کے پل ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں گھورنے لگے جیسے ایک دوسرے کے لیے کسی دوسری دنیا کے باسیوں کا درجہ اختیار کر گئے ہوں...... ایسی عجیب صورتِ حال میں ہم دونوں ہی جیسے ہپناٹائز ہو گئے تھے...... اس نازک کم سنگین ترین لمحہ کے اندر ہی اندر میں نے بہ سرعت حرکت کی اور اس کی ناک پر اپنے دائیں ہاتھ کے ہتھوڑے جیسا گھونسا رسید کر دیا...... وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کریہہ ناک آواز خارج کرتا ہوا چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا اور پھر گر پڑا...... میں اتنے ہی موقع کو بہت جان کر غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھی اندر سے بند کر دیا۔

یہ تو شکر تھا کہ اس متوقع میرو نامی آدمی نے اپنے ساتھی کو اس وقت پکار کا جواب دیا تھا جب وہ میرے محتاط اندازے کے مطابق کئی قدم آگے جا چکا تھا۔ ورنہ میں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ جاتا۔ یعنی یک نہ شد دو شد والی بات ہو جاتی...... اگرچہ اب بھی پہلے والے اس کے ساتھی کی طرف سے خدشہ بدستور موجود تھا۔

مُکا لگنے کے سبب میرو کا دماغ کئی ثانیوں کے لیے ماؤف ہو چکا تھا۔ اندر کسی روشندان سے آتی روشنی میں، میں نے اندر سیمنٹ بجری کا ریختہ سا پھیلا ہوا دیکھا تھا اور وہاں اناج وغیرہ کی بوریاں بھی بے ترتیب انداز میں رکھی ہوئی نظر آرہی تھیں، میرو مُکا کھا کے انہیں بوریوں پر جا پڑا تھا۔ میں نے ایک فولادی اوزار اٹھا کر زور سے اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

''میرو...... اڑے او...... میرو...... کتھے مرگیایں اوئے......''

باہر سے پھر مجھے اس کے پہلے والے ساتھی کی آواز سنائی دی۔ میں دھک سا رہ گیا۔ اس بار اس نے سندھی سرائیکی میں اپنے ساتھی میرو...... کو پکارا تھا، میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا اور کنڈی بھی چڑھا دی...... کہیں وہ اِدھر کا ہی رخ نہ کر لے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس نے میرو کی جوابی آواز نہیں سنی ہو گی۔ میں دروازے سے لگا کھڑا رہا اور ایک کان دروازے سے چپکا لیا۔ دروازے کے باہر مجھے اس...... آدمی کے قدموں کی

کھچر...... کھچر سنائی دی جو دروازے کے عین قریب آ کر ایک دم تھم گئی۔ میرا دل متوقع خطرے کے باعث تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ مگر دوسرے ہی لمحے دوبارہ جاتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی، مگر جو کچھ ہوا تھا میری پلانڈ منصوبہ بندی کے خلاف ہی ہوا تھا۔ کیونکہ اب میرے پاس کوئی ایسا موقع نہیں بچا تھا کہ میں آرام اور تسلی کے ساتھ یہاں ڈیرا ڈال کر کچھ کرتا۔ میرو کی ڈھنڈیا... پڑ سکتی تھی۔ اس پر مستزاد اس کا ساتھی اسے پہلے سے ہی تلاش بھی کر رہا تھا۔ تاہم میں نے کچھ سوچ کر وہیں کوئی رسی کا ٹکڑا تلاش کر لیا۔ اسٹور میں ایسی اور بھی بہت سی اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے بے ہوش میرو کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیے اور...... اس کے منہ میں بھی ایک کپڑے کا ٹکڑا پھاڑ کر اس کا گولا بنا کے ٹھونس دیا۔ اس کے بعد اسے کونے میں بنے ایک اور سپاٹ سے باتھ روم سائز کے گوشے میں لے جا کر پھینک دیا۔

اسٹور کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے دوران مجھے اس کے کونے میں ایک دروازہ بھڑا ہوا دکھائی دیا، وہاں سے روشنی آ رہی تھی۔ میرو یقیناً اسی دروازے سے ہی اندر داخل ہوا تھا جو بلاشبہ حویلی کے اندر کسی گوشے میں کھلتا تھا۔

ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ میرو کو ہی تختۂ مشق بناتے ہوئے اس کے منہ سے حقیقت اگلوائی جائے مگر اس میں کئی ابہام مجھے محسوس ہوئے تھے۔ وہ بتانے سے انکار کرتا تو مجھے اس کا منہ کھلوانے کے لیے تشدد کرنا پڑتا، جان سے تو میں اسے نہیں مار سکتا تھا، دوسرے یہ کہ وہ واقعی کچھ نہیں جانتا ہو...... کیونکہ اس کا جائزہ لینے کے دوران وہ مجھے کوئی عام سا ہی ملازم ٹائپ اور غیر مسلح آدمی لگا تھا۔ جبکہ میرا اصل ٹارگٹ صالح جان تھا جو زمیندار شاہنواز خان کا مجھے کوئی قریبی دستِ راست لگتا تھا۔ وہ یقیناً ساری حقیقت جانتا ہوگا اور یہ بھی کہ شاہنواز اس وقت کہاں چھپا بیٹھا تھا نیز شکیلہ اور ارم وغیرہ کو اس بدبخت نے کہاں قید کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ طلسمِ نور ہیرے کے بارے میں بھی میں ابھی وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ...... شاہنواز کے ہاتھ لگا تھا یا نہیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے میں نے دل ہی دل میں اللہ سے شکیلہ کے لیے خیر و عافیت کی دعا مانگی۔

صالح جان کو ہدف بنانے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ رینجرز کی ناکام ریڈ کے بعد حویلی میں کیا حالات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ شاہنواز کے سلسلے میں صالح جان نے میجر وسیم سے جھوٹ بولا تھا کہ وہ جامشورو کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے گیا ہوا ہے۔

بہرطور...... میں دبے پاؤں بھڑے ہو دروازے کی طرف بڑھا اور اس کی چوڑی جھری سے اپ ایک آنکھ چپکا دی۔ سامنے ایک راہداری نما راستہ تھا۔ ی زیادہ طویل نہ تھا، بہ مشکل دس، پندرہ گام کے بعد د دائیں جانب گھوم رہا تھا۔ یہاں دائیں بائیں چند کمرو کے دروازے نظر آ رہے تھے جو بند تھے۔ راہ داری میں مدھم سی تاریکی تھی اور وہ سنسان پڑی تھی۔ میں اسٹور نما اس کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری میں آ گیا۔ مجھے دیک لیے جانے کا خدشہ دامن گیر تو تھا ہی تاہم میں نے اس سلسل میں حد درجہ احتیاط برتی ہوئی تھی۔

اچانک میں نے کسی کے زور زور سے باتیں کرن کی آواز سنی...... میں یک دم ٹھٹک کر ایک دیوار گیر چوڑ پلر کی آڑ میں ہو گیا۔

سامنے سے مجھے صالح جان آتا دکھائی دیا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا اور وہ کسی باتیں کرتا ہوا...... ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اپنے شکار کو دیکھتے ہی.... میر رُواں رُواں جوش سے تھرکنے لگا۔ میں نے فوراً اسی کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اندر کی سن گن لی۔ صالح جان کو بدستور کسی سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے پایا۔ میں ابھی پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کسی فیصلے پر اٹکا ہوا تھا کہ اچانک مجھے یوں لگا...... جیسے...... اندر کمرے میں صالح جان موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا ہو...... میں چونکہ دروازے سے کان لگائے ہوئے تھا اسی لیے اندر کی معمولی کھڑبڑاہٹ بھی مجھے صاف سنائی دی تھی جو صالح جان کے اچانک خاموش ہو جانے کے بعد ابھری تھی...... مجھے سخت تعجب ہوا کہ آخر اندر صالح جان کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ موبائل پر کسی سے باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گیا......؟ اور پھر اندر ابھرنے والی وہ عجیب سی آوازیں......؟ آخر کیا معمّا تھا یہ......

اس کے چند لمحے بعد ہی...... میرے لیے حیرت کا ایک اور جھٹکا تیار تھا جب میں نے...... دروازے کی جھری سے اندر جھانکا تھا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آتشِ زن

تنویر ریاض

جھوٹ بولنا نہ کوئی اضطراری غلطی ہے... نہ اتفاقی حادثہ بلکہ یہ کردار کی خاصیت ہوتی ہے۔ جس کی جڑیں گہری بھی ہو سکتی ہیں... جھوٹ کی عادت بدلنے کے لیے اور سچ بولنے کی عادت ڈالنے کے لیے بڑے جتن کرنا پڑتے ہیں... سچ کی عادت پڑجائے تو بہت چین و سکون ملتا ہے... سچ کا سامنا کرنے کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے اگر اسے رد کردیں تو شدید ترین اذیت جھیلنی پڑتی ہے... ایک ایسی ہی دلیر خاتون کی عادتیں... وہ عورتوں کے تحفظ اور ان پر ہونے والے مظالم کے خلاف ڈٹ کے کھڑی تھی... اسے ہر حال میں سچ کا ساتھ نبھانا آتا تھا...

اس آتش پرست کا ماجرا جو عورتوں کا دشمن تھا

پہلی بار اس آتشِ زن کی موجودگی کا اشارہ اس وقت ملا جب وہ 23 جنوری 1969ء کو تھرڈ ورلڈ لبریشن فرنٹ کے احتجاج میں خفیہ طور پر شامل ہوا۔ میری کا اس مظاہرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دس سال پہلے کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے میں پڑھا کرتی تھی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے اسی شہر میں چھوٹی موٹی ملازمت کی اور بالآخر اپنا جم کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے فزیکل ایجوکیشن میں ڈگری حاصل کی تھی اور یہ کاروبار اس کی تعلیمی قابلیت

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 41

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر توت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس
بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو ا
انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے
سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی
پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر
ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل
جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع
سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو
محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی ا
پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ [illegible] کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جا
وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ میجر غوری کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں۔
دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خا
کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جا
اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا۔
سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان
راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے
عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک
لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو
لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتلسی کا آ
کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جو
ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بل
اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجا
امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے ٹ
فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ا
اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہا
کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹر
ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے وا
ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوتلسی کے چ
شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظر
سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکست
شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے
اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شا
جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل
سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار
ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کو
چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ا
تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ
ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈا
اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسما
گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے
شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے او
بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہ
ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ و

لات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ہارو'' پہنچادیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ت ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیمبلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف ہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے وں سے حملہ کردیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی گ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی ہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں ہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے سان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھادھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ل ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور وؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں ل تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی ب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ یمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر ران میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے دمی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ نسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوتلسی کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھوانی انہیں انڈر ورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ل کیمپ بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہ۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو بوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل رجاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی شش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی زمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز ٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز ن جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام ل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے تا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہ۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود دار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ل کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا مان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے ود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے ں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کی حویلی کی تلاشی لیتے ہیں مگر وہاں نہ شاہ نواز ملتا ہے نہ طلسم ہیرا۔ واپسی میں شہزی رینجرز کی تحویل سے فرار ہوجاتا ہے اور چھپتا چھپاتا شاہ نواز کی حویلی پہنچتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بلاشبہ اندر کا منظر میرے لیے چونکا دینے والا تھا۔ وہ کوئی سیاہ گھیر والی شلوار قمیص میں ملفوف تھا اور ہاتھ ں سیاہ پستول تھا۔ اس کی نال کا رخ صالح جان کی طرف ا جو صوفے پر لڑھکا ہوا تھا اور اس کی پیشانی سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی جبکہ اس کا سیل فون نیچے قالین پر گرا نظر آرہا تھا۔ میری نظر پستول بدست پر جمی ہوئی تھی۔

''کون ہوسکتا تھا یہ؟'' میرے سنسناتے ہوئے ذہن میں ایک ہی سوال نے گردش کی۔

"پریل کے گروہ کا کوئی ساتھی؟"

یہ جواب میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ یہ مجھے بعید از قیاس لگا۔ اول تو اس کے گروہ کے کسی ساتھی کا میرے ان معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ پریل بھی اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ یوں میرا اب اس ڈاکو گروہ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ رہا تھا، سونہڑیں اپنے باپ کے پاس پہنچا دی گئی تھی اور وہ اپنی بیٹی اور غالباً گھر والوں سمیت کہیں غائب تھا۔

"تو پھر کون تھا یہ......؟"

ایک ہی خیال سجھائی دیا کہ ضرور یہ صالح جان کا ہی کوئی دشمن ہوگا، مگر اگلے ہی لمحے میرا یہ خیال بھی از خود ہی باطل قرار پایا جب میں نے اس کی آواز سنی۔

"خبردار...... اگر ذرا بھی کوئی غلط حرکت کی تو...... اِدھر ہی ہلاک کر دیے جاؤ گے۔"

یہ شیرنی کی طرح غراتی ہوئی آواز شکیلہ کی تھی۔ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی جواز میرے ذہن میں تیزی سے آئے اور نکل گئے۔

"مجھے صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔" وہ پھر غرائی۔ "قیدیوں کو کہاں رکھا گیا ہے؟" شکیلہ ہلکی آواز مگر غصیلے لہجے میں مخاطب تھی مگر مجھ تک بھی اس کی آواز آ رہی تھی۔ وجہ رہی ہوگی کہ میں اس پر دھیان دیے ہوئے تھا اور دروازے سے لگا کھڑا تھا۔

"قیدیوں" سے اس کی مراد یقیناً مجھ سمیت ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے ہی ہو سکتے تھے۔

"مجھے نہیں پتا...... میں تو خود مہمان ہوں یہاں......" بالآخر صالح جان نے جواب دیا۔ لہجے اور آواز سے ذرا بھی خوف کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا تھا۔

شکیلہ کو ہی نہیں بلکہ مجھے صالح جان کی اس چالاکی پر سخت طیش آیا تھا۔ میں تو خود صالح جان کو اسی مقصد کے لیے چھاپنے آیا تھا مگر شکیلہ خود یہاں آ پہنچی تھی اور جانے اب تک وہ کہاں گھات لگائے چپکی بیٹھی رہی تھی۔ اس کے جسم پر اس کا اپنا لباس نہیں تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا وہ مردانہ شلوار قمیص میں ملفوف تھی جو اس نے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ہی پہنا تھا اور یقیناً کسی سے چھینا ہوا ہی لگتا تھا۔

اب میرا یہاں زیادہ دیر دبکے رہنا مناسب نہ تھا جبکہ شکیلہ بھی ایک طرح سے آزاد ہی تھی اور ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کی بھی ضرورت تھی، لہٰذا میں دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ شکیلہ آہٹ پا کر...... بری طرح چونک کے میری طرف پلٹی اور یہی مجھ سے بھی غل گئی کہ صالح جان نے موقع پا کر بڑی غیر معمولی اور ب پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، صوفے پر پڑے پڑے کے پستول والے ہاتھ پر اپنی ٹانگ چلا دی۔ پستول کے ہاتھ سے نکل کر کمرے کے ایک کونے میں جا پڑا۔

میری اچانک آمد پر صالح یہی سمجھا تھا کہ اس آدمی یا ملازم بے خیالی میں اندر گھس آیا ہے اسی لـ نے میری طرف گردن اور نظر اُٹھا کر دیکھا تھا مگر تب شکیلہ اور بعد میں صالح جان مجھے پہچان چکے تھے۔ جان کے لیے تو یہ صورتِ حال یک نہ شد دو شد والی با جبکہ شکیلہ تو مجھے دیکھ کر مسرت بھرے انداز میں چونک تھی۔

صالح جان نے دوبارہ پھرتی دکھائی اور صوفـ چھلانگ لگا کر ایک دوسرے دروازے کی طرف لپکا۔

"شکیلہ! پکڑو اِسے...... جانے نہ پائے......" چیخا۔ صالح جان کے کامیاب وار کے بعد وہ بھی ا جانب پلٹی تھی، لیکن تب تک صالح جان اندرونی گوشـ کھلنے والے اس دروازے کے قریب جا پہنچا تھا جبکہ ا جانب چھلانگتے ہوئے میں اور شکیلہ دونوں ہی دوسرے سے ٹکرا کر قالین پر گرے تھے۔ مگر اُٹھنے مـ نے کسی تساہل سے کام نہیں لیا تھا۔

صالح جان اس لمحے کو موقع غنیمت جان کر ابـ چلاتا دوڑا تھا، تا کہ حویلی کے ملازمین وغیرہ اس کی طـ متوجہ ہو جاتے۔ میں اور شکیلہ اسی دروازے سے دوسـ گوشے کی طرف نکلے تو صالح جان کو ایک موٹی سی اد عورت سے ٹکرا کر گرتے پایا۔ وہ عورت کوئی ملازمہ لگتی اس نے بوکھلا کر چیخ ماری اور ایک طرف کو لڑھک گئی۔ جان اسے گالیاں دیتا ہوا اٹھا اور اسی وقت میں نے ا چھلانگ لگا دی۔ اس پر گرتے ہی میں اسے رگیدتا ہوا فرش پر لے آیا۔ وہ میرے قابو میں آچکا تھا مگر بدقسمتی گئی تھی کہ اس کم بخت کے شور شرابے سے حویلی میں بھـ دوڑ مچ گئی تھی۔ حویلی میں صرف ملازمین کی فوج ہی نہیـ بلکہ مسلح افراد بھی تھے جو زیادہ تر باہر پہرے پر تھے مگر اندر آنے میں بھلا کتنی دیر لگنی تھی۔ مجھے ایک بات کا چـ تھا، شکیلہ کا گرا ہوا پستول نہیں اُٹھا سکا تھا اور نہ ہی شکیلـ اس طرف کوئی توجہ دی تھی۔ اب اگر شاہنواز خان کـ آدمیوں سے ٹکراؤ ہو جاتا تو صورتِ حال سنگین ہو سکتی کوئی بعید نہ تھا کہ تھانے فون بھی کھڑکا دیا جاتا اور میں

اس بدطینت تھانہ انچارج رجب دین کو کہاں بھولا تھا۔ ا ہنوز زمیندار شاہنواز خان کی پشت پناہی کرنے میں صروف تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں مغلوب صالح جان پر جھپٹا ھا، کمرے میں دو مسلح افراد گنز سیدھی کیے داخل ہوئے ۔ یہ دونوں خاصے قدآور اور تنومند تھے۔ بڑی بڑی وچھیں اور وحشت بھری آنکھوں کو دیکھ کر صاف لگتا تھا کہ ویلی میں اپنے دشمنوں کو اس طرح گھستے پا کر یہ دونوں یرت و جوش میں پاگل ہو رہے تھے۔

”شکیلہ...... !اس طرف ہو جاؤ......“ میں نے چلّا کر ہا۔ شکیلہ اشارہ بھانپ گئی اور میرے عقب میں ہو گئی۔ ب میں اور صالح جان ان دونوں مسلح آدمیوں کی اُٹھی ئی گنوں کی زد میں تھے۔

”خبردار! اپنی بندوقیں پھینک دو...... ورنہ ایک ہی ھٹکے سے اس کی گردن توڑ ڈالوں گا۔“ میں نے غضب ک لہجے میں ان کی طرف گھور کر کہا۔ صالح جان کے حلق ے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہونے لگی تھیں۔ اس نے میری ہنی گرفت سے نکلنے کے لیے اپنے جسم کو حرکت دینے کی شش چاہی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ وہ دونوں اسلحہ پوش بھی ں گرفت کی خطرناکی سے واقف تھے، جس میں محض ایک نڈ کے اندر اندر ایک ذرا جھٹکا دیتے ہی مدِ مقابل کی ردن کا منکا ٹوٹ جاتا ہے۔

”چھوڑ دو اِس کو...... تم بچ کر نہیں جا سکتے۔“ ان میں ے ایک خونخوار غراہٹ سے بولا۔

”میرے سر پہ خون سوار ہے اِس وقت......“ میں پھر یانہ لہجے میں غرایا۔ ”آخری بار کہہ رہا ہوں...... اس کے یہ گیا۔“ کہتے ہوئے میں نے صالح جان کو ہلکا سا جھٹکا ۔ وہ کراہا...... دونوں اسلحہ بدست قہرناک انداز میں اپنے ت پیس کر رہ گئے، اس میں بے بسی کا عنصر غالب تھا۔ ں کے دونوں ہاتھ اکڑے ہوئے تھے اور وہ محض ان کی یوں کو حرکت دے رہا تھا۔

”ہمیں بس یہاں سے نکلنے دیا جائے، ہمارا کوئی لہ نہیں ہے، باہر نکلتے ہی ہم اِسے چھوڑ دیں گے۔“ میں ، انہیں متذبذب پا کر دوبارہ کہا اور پھر صالح جان کی دن سے گرفت ذرا ڈھیلی کی تو اس نے بھی پھنسی پھنسی از میں انہیں میری بات مان لینے کا حکم دیا۔

وہ دونوں اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر ایک طرف گئے۔ میں نے شکیلہ کو اشارہ کیا اور ہولے سے کچھ کہا۔

اس نے تیزی سے پہلے صالح جان کا گرا ہوا پستول اور قالین پر لڑھکا پڑا اسیل فون اُٹھا لیا۔ اس کے بعد ہم کمرے سے نکل گئے۔ میری ہدایت پر شکیلہ نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ راہداری میں چند اور لوگ بھی جمع تھے۔ میں انہیں چلّا چلّا کر راستہ چھوڑنے کا کہتا رہا اور پھر ہم حویلی سے باہر آ گئے۔ ایک جگہ کار کھڑی تھی جو مجھے اسی کی لگی تھی۔

میں نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر صالح جان کی تلاشی لی تو کار کی چابی اس کے پاس سے برآمد ہو گئی۔

میں نے بدستور صالح جان کو ڈھال بنا رکھا تھا اور میری عقابی نظریں تیزی کے ساتھ گرد و پیش میں متحرک تھیں۔ پستول شکیلہ نے تھام رکھا تھا۔ اس نے غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر قبضہ جمایا اور اسے اسٹارٹ کر دیا۔ میں صالح جان کو لیے عقبی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ شکیلہ نے ایک طوفانی جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔

پستول شکیلہ سے میں نے لے لیا تھا۔

”کسی دور ویرانے میں لے چلو اور جب تک میں نہ کہوں، کار مت روکنا۔ بیک ویو پر نظریں ڈالتی رہنا کوئی ہمارے تعاقب میں نہ آ رہا ہو۔“ میں نے شکیلہ سے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا اور اس کے بعد صالح جان کو آزاد چھوڑ دیا۔

وہ چند ثانیے اپنی گردن سہلاتا رہا اور پھر غصے سے بولا۔ ”تمہارا کام ہو گیا ہے...... اب چھوڑ دو مجھے...... ورنہ پچھتاؤ گے بہت......“ میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کے جبڑے پر ایک مکا رسید کر دیا۔ اس کے ہونٹ کا کونا پھٹ گیا اور وہاں سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔ وہ کراہ کے رہ گیا۔

”اپنی زبان بند رکھو اور صرف میرے سوال کا جواب دو...... شاہنواز چوہے کی طرح کہاں چھپا ہوا ہے؟“

”بتایا تو تھا کہ وہ جامشورو گیا ہوا ہے۔“ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں جواب دیا۔ اس کی آنکھوں سے اب بیک وقت، خوف اور پریشانی کی جھلک بھی مترشح ہونے لگی تھی۔

”تمہارا یہ جھوٹ میں رینجرز والوں کے سامنے پہلے بھی سن چکا ہوں...... لیکن اب میں تمہاری زبان سے صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے قہر آلودہ لہجے میں کہا۔

''تم نے شاہنواز سے ٹکّر لے کر اچھا نہیں کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ وہ کیا شے ہے۔'' صالح جان پر ابھی تک شاہنواز کی طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ میں دانت پیس کر بولا۔

''ٹکّر ہم نے نہیں، اس نے ہم سے لی ہے اور یاد رکھنا معمولی لوگ ہم بھی نہیں ہیں۔ تمہارا یہ شاہنواز کوئی بڑی شے ہوتا تو اس طرح چوہے کی طرح چھپنے کے بجائے ہمارے سامنے آتا۔ اب میں صرف سچ سنوں گا، ورنہ مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ...... ہم شاہنواز سے خود ہی نمٹ لیں گے۔'' میں نے آخر میں سفاکی سے کہا اور شکیلہ کو ایک ویران جگہ پر کار روکنے کا کہا۔

ہمارے اطراف میں بنجر ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم آبادیوں سے کافی دور نکل آئے تھے۔ کسی نے ہمارے تعاقب میں آنے کی کوشش نہیں کی تھی یا پھر وہاں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ شاہنواز کی لمبی چوڑی جیپ بھی میں نے وہاں نہیں دیکھی تھی۔

شکیلہ نے کار ایک ٹیکری کے قریب لے جا کر روک دی۔ میں نے دروازہ کھولا اور صالح جان کو گردن سے دبوچ کر باہر نکالا اور زمین بوس کر دیا۔

دن چڑھنے لگا تھا اور گرم ہو رہا تھا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔ فضا میں حبس بھی تھا۔

''بس، صالح جان! اب جھوٹ نہیں چلے گا...... ہمیں صرف اپنی ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچوں کی تلاش ہے...... شاہنواز سے بھی ہمیں کوئی سروکار نہیں ہوگا...... بولو کہاں چھپا بیٹھا ہے وہ...... یا پھر اس ویرانے میں تمہاری لاش چھوڑ کر ہم کوئی اور راستہ دیکھیں۔ میں وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔''

''جامشورو چلے چلو، وہاں تمہاری ملاقات میں......''

اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا، دوسرے ہی لمحے میرا گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ بھربھری مٹی والی زمین پر بری طرح لڑکھڑا کر گرا، میں آگے بڑھا اور اس کی گردن پر اپنا بھاری بوٹ رکھ دیا۔

''بس صالح جان! تم نے جتنا بولنا تھا، بول لیا...... اب چھٹی کرو......''

''شکیلہ! کار کی ڈکی سے کوئی بھاری آہنی شے نکالو...... میں اس کے سر کا کچومر بنانا چاہتا ہوں، گولی میں نہیں مارنا چاہتا، اس طرح اسے موت کی اذیت کا احساس نہیں ہوگا، جلدی کرو، وقت نہیں ہے ہمارے پاس......''

شکیلہ نے ایسا ہی کیا اور پھر ایک بھاری پانا نکا لائی۔ وہ میں نے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑا۔ میرا چہرہ سر ہو رہا تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں میں نے پستول پینٹ کی بیلٹ میں شرٹ کے نیچے اُڑس ا اور پوری قوت سے بھاری پانے کی ضرب صالح جان کے پر رسید کرنا چاہی...... اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گ تھیں۔ وہ تیزی سے تڑپ کر ہٹا تھا۔ بھاری پانے زوردار ضرب زمین پر پڑی تھی۔ میں نے یہ دانستہ حرکت تھی کہ وہ خود کو ضرب سے بچالے...... اور یہی ہوا تھا، م نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ دوبارہ پانے کی ضرب ا کے سر پر رسید کرنا چاہی تو اس نے دونوں ہاتھ آگے دیے۔

''ٹھٹ...... ٹھہرو...... مم...... میں بب...... بتا ہوں......'' وہ گھگیا کر بولا۔

''میں صرف سچ سنوں گا اور یاد رکھنا...... اس تصدیق بھی تم سے ہی کرواؤں گا۔''

''وہ...... وہ اسی گوٹھ میں ہے۔''

''اس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ یہ بتاؤ کہاں چ بیٹھا ہے وہ...... اور کیا ہماری ساتھی لڑکی ارم اور اس دونوں بچے بھی اسی کے قبضے میں ہیں؟''

''ہاں!''

''وہ جگہ یہاں سے کتنی دور ہے۔''

''وہ...... وہ...... میری ہی رہائش گاہ پر ٹھہرا ہے......'' اس نے بتایا اور میں چونک سا گیا۔ یہ خیا میرے ذہن میں آنا چاہیے تھا۔

''وہاں اور کون کون ہے؟'' میں نے کسی خیال تحت پوچھا۔

''شاہنواز اور اس کے گھر والوں کے سوا اور کو نہیں، میرے بچے جامشورو گئے ہوئے ہیں۔''

''ہماری ساتھی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی و اس کے قبضے میں ہیں؟''

''ہاں!''

''وہاں شاہنواز کے ساتھ موجود مسلح حواریوں تعداد بتاؤ۔''

''کوڑا خان اور بخشل کے علاوہ دو اور آدمی ہو ہیں۔''

''ہمم......'' میں نے ایک خیال انگیز ہمکاری خار کی اور ایک بار پھر اسے تہدید کرتے ہوئے بولا۔ ''یاد رکھ

تمہاری اس بات کی تصدیق میں خود کروں گا۔ اگر مجھے اس میں ذرا بھی جھوٹ اور غلط بیانی محسوس ہوئی تو سب سے پہلے تم میرے عتاب کا نشانہ بنوگے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں......" وہ بولا۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو! یہ جنگ خود شاہنواز نے ہم پر مسلط کی ہے اور ہم بھی نہیں چاہتے کہ کسی قسم کا خون خرابا ہو، اگرچہ شاہنواز نے اپنی طرف سے ہمارے خلاف کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی اب تک...... ہم چاہتے تو اب بھی اسے اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں، وہ ہوگا اپنے علاقے کا تیس مار خان...... اگر وہ پھر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور بدستور یہ جنگ ہم پر مسلط رکھی تو پھر ہم بھی دشمنوں کی گردنیں اُڑانا اچھی طرح جانتے ہیں، کیونکہ اب تک ہماری جوابی جنگ صرف اپنے دفاع کی حد تک ہے۔ ہم اسے بڑھانا نہیں چاہتے۔"

میں نے ایک لمحے کی دیر نہ کی اور اس کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ کار بدستور شکیلہ ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ صالح جان کے مطابق اس کی رہائش گاہ ایک وسرے قریبی گوٹھ میں تھی جو یہاں سے پندرہ سولہ کلو یٹر کے فاصلے پر تھا۔

میں نے شکیلہ سے ہیرے کے متعلق پوچھا۔ صالح جان کے بھی کان یقیناً اس سوال پر کھڑے ہوئے تھے۔

شکیلہ نے مختصر الفاظ میں اپنی اس رات والی کتھا سنا الی۔ جس میں میرے لیے سب سے زیادہ پُرطمانیت بات ھی کہ وہ ہیرا شاہنواز کے ہاتھ نہیں آسکا تھا۔ اگرچہ شکیلہ ہیں اس مقام تک لے کر ضرور گئی تھی، مگر وہاں پہنچتے ہی کیلہ نے انہیں ہاتھ دکھا دیا تھا، وہ اسے عام سے لڑکی سمجھنے ی غلطی کر بیٹھے تھے اور شکیلہ نے اسی بات سے فائدہ ٹھاتے ہوئے، ان پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پہلے کوڑا خان ی گن پر قبضہ جمایا، اس کے بعد وہ اسے اور اس کے ایک ر ساتھی کو زخمی کر کے فرار ہوگئی تھی۔ وہ شاہنواز کو بھی نشانہ انا چاہتی تھی مگر وہ رات کی تاریکی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہیں گھات لگا کر غائب ہوگیا۔

بہرطور شکیلہ نے انہیں خوب اچھی طرح سے جُل دیا ا۔ یہی نہیں اس نے ایک اور عقل مندی کا کام بھی کیا تھا۔ س نے طلسم نور ہیرا وہاں سے نکال لیا تھا اور اب وہ اس کے پاس ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے بھی شکیلہ کو مختصراً الفاظ ں کپیل دادا اور اول خیر کے بارے میں بتا دیا۔ صالح ان ہماری باتیں شاید غور سے سن رہا تھا۔ اسے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی ہوگی کہ ہم بھی سوا سیر کا وزن رکھتے تھے۔

نصف گھنٹے کے اندر اندر ہم ایک نسبتاً چھوٹے سے قریبی قصبے میں جا پہنچے۔ ہماری کار کھیتوں کے درمیان بنے کچے دھول اُڑاتے راستے پر دوڑی جا رہی تھی، یہاں سے صالح جان کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔

اس چھوٹے سے دیہاتی قصبے میں داخل ہوتے ہی ہمیں دور نزدیک کسان اپنے کاموں میں مشغول نظر آئے۔ سامنے کھیت پار آبادی تھی اور کچے پکے مکانوں کے سلسلے اور ٹیڑھی میڑھی گلیوں کی بے ترتیب قطاریں دور تک جاتی نظر آرہی تھیں۔ راستہ کھیتوں سے نکل کر اسی طرف جاتا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق شکیلہ کار کو اسی طرف لے جا رہی تھی۔ کھیتوں سے نکلے تو اُپلے تھپی دیواروں کے جھونپڑ نما گھروں کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں داخل ہوگئے، ان کے درمیان سے نکل کر کھلی جگہ پر آگئے، وہاں ایک آٹے کی چکی بنی نظر آئی جس کی چمنی سے "پُگ...... پگ...... پُگ......" کی مخصوص دیہاتی آواز کی 'لے' کے ساتھ دھواں اُٹھ رہا تھا۔

میں کھڑکی سے باہر کوئی مناسب جگہ تاڑنے میں لگا ہوا تھا کہ اچانک صالح جان نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ اس نے اپنے سر کی ٹکر بڑے زور سے میری ناک پہ رسید کی تھی۔ مجھے اس موٹے آدمی سے ایسی پھرتی اور "زور" کی اُمید نہیں تھی۔ ٹکر چونکہ اچانک اور زوردار تھی جس کے باعث میرا دماغ بری طرح جھنجھنا سا گیا اور تکلیف کے مارے میری آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ وہ مجھے لڑائی بھڑائی والا آدمی نظر تو نہیں آتا تھا تاہم نجانے کیا بات تھی کہ اس نے عین آخر میں کس بات سے مجبور ہوکر مجھ پر حملہ کر ڈالا تھا۔ مجھے ٹکر مارنے کے بعد اس نے کار سے اُترنے کی کوشش کرتے ہوئے دروازے کو ٹکر ماری، وہ لاک تھا۔ شکیلہ بوکھلا گئی اور بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی صالح جان کو اس حرکت پر خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دے رہی تھی۔ مجھے بھی ہوش دلانے کی غرض سے پکار رہی تھی۔ میں نے سنبھالا لینے کی غرض سے اپنے سر کو دو تین جھٹکے دیے اور پھر صالح جان کی طرف متوجہ ہوا، جواب دروازہ کھولنے کی کوشش سے مایوس ہوکر کھڑکی کا شیشہ نیچے کر رہا تھا اور میرے دبوچنے تک وہ اپنا آدھا دھڑ کھڑکی سے باہر نکال چکا تھا، مجھے اگر اسے دبوچنے میں ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ کسی طرح سکڑ سمٹ کر خود کو کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ کار کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ کسی

طرح باہر گر جائے اور بھاگنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگ بس، یہاں تک ہی حرکت کر سکتے ہیں کیونکہ باقی ’’حرکت‘‘ ان کے حواریوں کو آتی ہے، صالح اور زمیندار شاہنواز جیسوں کو نہیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بھینس جیسی ’’پھتک‘‘ کو دبوچا اور اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ تڑپا تو میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ وہیں سیٹ پر لمبا پڑ گیا۔

’’روانہ ہوتے وقت ہمیں اسے رسی سے باندھ لینا چاہیے تھا۔‘‘ شکیلہ نے کہا۔

’’گزرے ہوئے پر پچھتانا کیسا...... تم ڈرائیونگ پر اپنا دھیان رکھو۔‘‘ میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اگلی سیٹ پر شکیلہ کے برابر آبیٹھا۔

’’اس طرف موڑ لو گاڑی۔‘‘ میں نے سامنے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ یہ سارا اب میدانی راستہ تھا اور اس طرف نسبتاً کچھ پختہ اور بڑے مکان نظر آرہے تھے۔

’’مگر...... ہمیں صالح جان کے گھر کا راستہ نہیں معلوم......‘‘ شکیلہ نے میری توجہ دلائی۔

’’کوئی پروا نہیں...... تم چلتی رہو اور وہ دیکھ رہی ہو ایک کیکر کا درخت ہے شاید...... اس کی چھاؤں میں کار روک لینا۔‘‘

شکیلہ نے ایسا ہی کیا۔

’’کی چین میں الارم لاک ہے، ڈکی کا بٹن پُش کرو جلدی۔‘‘ میں نے شکیلہ سے کہا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُترا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں صالح جان کے بے ہوش وجود کو ڈکی میں بند کر چکا تھا۔

’’تم اِدھر ہی ٹھہرو...... میں ابھی آتا ہوں......‘‘ شکیلہ سے کہہ کر میں آگے بڑھا، جہاں کچھ ہاری (مزارعے) اجرکوں کے پگڑ باندھے ایک چھتنار پیڑ کے نیچے بیٹھے لسی وغیرہ پی رہے تھے۔ وہاں پہنچ کر میں نے انہیں سلام کیا اور صالح جان کے بارے میں پوچھا۔

’’سائیں...... ! شہری بابو لگتے ہو......‘‘ ایک مدقوق سے ہاری نے کہا پھر سامنے بنے پختہ مکانوں کی ترتیب وار قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

’’وہ دیکھ رہے بابو سائیں...... ! پہلی قطار کا تیسرا مکان...... نیلے رنگ والا جس کا کالا لوہے کا گیٹ ہے، یہی صالح جان کا ہے۔‘‘ یہ بتانے کے بعد وہ اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر سلگانے لگا۔

’’وڈی مہربانی بابا!‘‘ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس کار کی طرف پلٹا۔ مجھے اندازہ تھا کہ صالح جان جیسے آدمی کو اس چھوٹے سے قصبے میں سبھی جانتے ہوں گے۔

وہاں پہنچ کر میں نے شکیلہ کو سرکنے کا اشارہ کیا۔ و ایک دم برابر والی سیٹ پر جا کھسکی۔ اسٹیئرنگ میں نے سنبھال لیا اور کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ لی۔

میں نے مطلوبہ مکان کا رخ کرنے کے بجائے دوسری طرف کار لے گیا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ ان تمام نظر آنے والے پختہ مکانوں کا عقبی حصہ تھا۔ تھوڑا اور دور لے جا کر ایک پرانی سی عمارت نظر آئی۔ کار اس کے پیچھے لے ج کر روک دی۔

’’میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔‘‘ شکیلہ نے فورا کہا۔

’’نہیں، تم اِدھر ہی رہو گی۔ صالح جان کو اگر ہوش آگیا تو وہ اندر سے ڈکی بجانا شروع کر دے گا۔ کوئی قریب سے گزرنے والا سارا کام خراب کر دے گا۔‘‘

’’تو کیا مجھے اسے دوبارہ بے ہوش کرنا پڑے گا؟‘‘

’’ظاہر ہے...... تم جیسے ہی محسوس کرو کہ وہ ہوش میں آگیا ہے تو ڈکی کھول کر ایک پنچ اس کی کنپٹی پر جڑ دینا۔ خیال رہے ہتھ ہولا ہو...... مرنے نہ پائے۔ یہ شاہنواز خان کا کوئی قریبی رشتے دار ہے۔ نیا سیاپا پڑ جائے گا۔‘‘

میں پلٹا اور اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا مطلوبہ مکان کی عقبی دیوار کی طرف بڑھنے لگا۔

گرمی شدید پڑنے لگی تھی۔ دھوپ الگ تپائے دے رہی تھی۔ میرا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ میں تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔

یہاں سارے مکان ایسے تھے کہ ان کے صحن کھلے اور گیٹ بڑے تھے، عقب میں کھڑکیاں نظر آتی تھیں۔ ایک دو روشن دان بھی تھے، مگر وہ ’’آدم گزار‘‘ نہ تھے۔

مکان ایک ساتھ جڑے ہوئے نہ تھے جیسا کہ عموما شہروں میں ہوتے ہیں۔ دیہاتی علاقہ تھا اور زمین بہت تھی۔ ہر مکان کے درمیان ایک گلیارا بنا ہوا تھا، میں ایک ایسے ہی گلیارے میں جا گھسا اور...... وہاں سے مجھے کچھ سیوریج کی لائنیں اُوپر تک جاتی دکھائی دیں۔

یہ مکان ایک منزلہ تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا، کوئی نہ تھا اور پھر ایک پائپ کو پکڑ کر جنگلی بلے کی طرح اُوپر چڑھ گیا۔ صحن کی دیوار کی منڈیر پر پہنچ کر تھوڑا اندر جھانکا۔

صحن میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر رلی پڑی تھی۔ یہ وہی رلی تھی جو میں نے پریل کے جنگل ڈیرے والے جھونپڑے میں بھی دیکھی تھی۔ اس کے متعلق اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ سندھ کا مشہور ''بچھونا'' تھا۔ چارپائی خالی تھی۔ صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کمروں کی دیواروں میں اے سی نظر آرہے تھے۔ ایک سنگی زینہ اُوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔

میدان صاف پاکر میں اندر کود گیا اور کچھ سوچ کر زینے طے کرتا ہوا اُوپر آگیا۔ یہاں ایک لکڑی کا دروازہ تھا جو بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی جھری سے دوسری طرف جھانکا۔ کشادہ سی جگہ پر دو کھری چارپائیاں نظر آئیں۔ یہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ کیا مکان میں کوئی نہ تھا؟ ایک خیال آیا کہ مجھے مین گیٹ کا جائزہ لینا چاہیے تھا کہ کہیں اُس پر تالا وغیرہ تو نہیں لگا ہوا تھا؟ اب تو میں اندر آگیا تھا پلٹنے کا وقت نہ تھا۔

یہاں مجھے دو کمرے نظر آئے، ان کی دیوار پر ایک ہی اے سی لگا ہوا تھا۔ دونوں کے دروازے بند تھے۔ دیہاتی طرز کے کشادہ مکان تھے جن کی طرزِ تعمیر سادہ سی نظر آتی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ آہستگی سے دھکیلا اور دبے پاؤں چلتا ہوا پہلے ایک کمرے کے دروازے کے قریب آکر رکا، اس کے چوبی پٹ سے کان لگا کر اندر کی سن گن لینا چاہی مگر خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف سرکا۔ اس کے اندر مجھے کسی کے سسکنے اور دبی دبی سی آوازیں آتی سنائی دیں، دوسری بات یہ تھی کہ اس کے دروازے پر باہر سے تالا پڑا ہوا تھا۔ یہی دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ کامیابی میرے قریب تھی۔ میں نے اس کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی، اندر نیم تاریکی تھی۔ گویا اس کی کھڑکیاں اور روشن دان تک بند کیے ہوئے تھے۔

اسی مدھم سی روشنی میں مجھے ایک طرف کونے میں حرماں نصیب ارم اور اس کے دونوں معصوم بچے بیٹھے سسکتے ہوئے نظر آگئے۔ جی میں تو آئی کہ اسی وقت انہیں پکار کر تسلی دے ڈالوں مگر ابھی یہ قبل از وقت ہوتا۔ کیونکہ میں کچھ اور ہی حکمتِ عملی تیار کیے بیٹھا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ تیزی سے نیچے آیا اور ابھی میں نے آخری زینہ ہی طے کیا تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی پانی کا گلاس ہاتھ میں تھامے باہر نکلا اور کلی کر کے پچکاری صحن میں ماری۔ میں ایک دم زینے کے نچلے خلا میں جا دبکا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا، نظریں اسی شخص پر جمی ہوئی تھیں اور میں اسے پہچان گیا تھا، جوشِ اُبال سے میرا دماغ گھوم گیا۔ وہ مردود شاہنواز ہی تھا۔

''اڑے او...... بخشل!'' معاً اس نے کھرکھراتی مگر تحکمانہ انداز میں آواز دی، تو ساتھ والے کمرے سے بخشل باہر نکل آیا۔

''حاضر سائیں وڈا......!''

''اڑے! یہ صالح جان فون نہیں اُٹھا رہا ہمارا...... جا... اس کی کھیر کھیریت تو معلوم کر حویلی جا کر......'' شاہنواز نے اس سے تحکمانہ کہا۔ میں سمجھ گیا تھا، صالح جان اس کی کال ریسیو کیوں نہیں کر پا رہا تھا، کرتا بھی کیسے۔ ایک تو وہ کار کی ڈکی میں بے بس پڑا تھا، دوسرے میں نے اس کا سیل فون کسی مقصد کے تحت آف کر رکھا تھا۔

''سائیں بھوتار......! ہوسکتا ہے، موبائل چارج نہ ہو، ویسے صبح تڑکے میں نے یارو کو حویلی روانہ کیا تھا اور اپنے موبائل سے صالح صاحب سے بات کر کے کھیر کھیریت معلوم کر لی تھی۔ رینجرز والے آئے تھے، ان کے ساتھ وہ ...... اُونچا لمبا چھوکرا بھی تھا، پر سائیں وہ بری طرح ناکام ہو کے واپس لوٹ گئے تھے اور کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی، لیکن صالح صاحب کا یہی مشورہ تھا کہ ابھی آج کا دن اور ادھر ہی رہا جائے تو بہتر ہے۔'' بخشل نے گویا ایک ہی سانس میں ساری صراحت بتا دی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے زمیندار شاہنواز ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ کیونکہ بخشل نے دوبارہ کہا۔

''سائیں بھوتار کے لیے ناشتے یا چاں پاڑیں کا بندوبست کیا جائے؟ یا ابھی شغل پاڑیں (شراب نوشی) فرمائیں گے؟''

''اڑے نہیں بابا! خالی پیٹ شغل پاڑیں کا بھلا کیا مزہ آئے گا، ایسا کر اُس چھوکری سے کہو فوراً ہمارے لیے دیسی انڈوں کا آملیٹ اور ایک انڈا قیمہ (خاگینہ) تیار کرے......'' شاہنواز بولا۔ ''اور...... ہاں...... سن!''

''جی سائیں حاضر......!'' بخشل نے دونوں ہاتھ جوڑے۔

''سچے گھی کے پراٹھے بھی بنوا لینا۔ لسی اور دہی کا بھی بندوبست کرے۔''

''برابر سائیں بھوتار...... برابر!''

''یہ اپڑاں کوڑا خان کدھر ہے؟''

''سائیں وڈا! وہ اندر سو رہا ہے۔ رات دیر تک جاگے تھے ہم دونوں۔'' بخشل نے جواب دیا۔

شاہنواز واپس اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ... اپنی بیٹی سونہڑیں کو اس نے کہاں رکھا تھا؟ پتا نہیں یہاں تھی یا کہیں اور جگہ منتقل کر دی گئی تھی۔ تاہم اب اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا تھا مگر دکھی دل سے یہ ضرور سوچتا تھا کہ جب اس بے چاری کو یہ پتا چلے گا کہ اب اس کا محبوب پریل چانڈیو اس دنیا میں نہیں رہا ہے تو اس پر کیا بیتے گی؟

مجھے تسلی ہو گئی تھی کہ شاہنواز اور اس کے دونوں مقربِ خاص یعنی کوڑا خان اور بخشل یہاں سے آج رات تک ہلنے والے نہیں، میں خاموشی سے مگر اسی احتیاط کے ساتھ واپس پلٹ گیا اور تقریباً دوڑتا ہوا...... کار کے پاس آ گیا۔

"لگتا ہے کامیاب لوٹے ہو......" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی شکیلہ معنی خیز انداز میں مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں!" میں نے اس کی برابر والی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر براجمان ہوتے ہی فوراً صالح جان کا سیل ہاتھ میں لیا اور اسے آن کرنے کے بعد ڈی جی رینجرز میجر وسیم بھٹی سے رابطہ کیا۔ ان کا سیل نمبر تو مجھے معلوم نہ تھا البتہ ضلعی ہیڈ کوارٹر کا لینڈ لائن نمبر مجھے پتا تھا۔ کسی اور نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو رینجرز کارپس (corps) ہیڈ کوارٹر......" دوسری جانب سے کہا گیا۔

"جناب! مجھے میجر وسیم بھٹی صاحب سے بات کرنی ہے، فوراً۔" میں نے کہا۔

"اپنا تعارف کرواؤ اور کس سلسلے میں بات کرنی ہے؟" دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

"اِٹس ٹاپ سیکریٹ سر! وقت کم ہے...... مجھ سے بات کرتے ہی وہ مجھے فوراً پہچان جائیں گے کہ میں کون ہوں اور اُن سے کیا کہنا چاہتا ہوں۔"

دوسری جانب چند ثانیے کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی، اس کے بعد اس نے مجھے ہولڈ کرنے کا کہا اور دوسری جانب سے قومی ترانے کی موسیقی سنائی دینے لگی۔ شاید بات کرنے والے نے انٹرلنک کال سسٹم کے ذریعے میجر صاحب سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ چند ہی سیکنڈوں بعد مجھے دوسری جانب سے میجر وسیم صاحب کی بارعب آواز سنائی دی۔

"ہیلو، کون......؟"

"جناب! میجر صاحب! میں بات کر رہا ہوں شش...... شہزاد احمد خان...... شہزی۔" میں نے اپنا بتایا۔ فرطِ جوش سے میرا لہجہ مرتعش تھا۔

"ہمم...... کیا معرکہ انجام دیا ہے اب تم نے......" دوسری جانب سے میجر صاحب کی ایک گمبھیر تا سی ہمکاری کے ساتھ آواز ابھری۔ میں ان کی بات اور بالخصوص لہجے پر قدرے چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔ کچھ معنی خیز سا ہی لہجہ تھا ان کا۔ میں نے سب سے پہلے ان سے اپنے فرار کی معذرت چاہی اور جب اصل بات کی صراحت بتانے لگا تو اُنہوں نے میری بات کاٹ کر فوراً کہا۔

"معذرت کی ضرورت نہیں، جو کام خود کسی سے کروانا چاہتے ہیں وہ اسی طرح ہی کرواتے ہیں......" میں ان کی اس بات پر بری طرح چونکا۔

"تت...... تو کیا سر! آ...... آ...... آپ......"

"سمجھ گئے کافی ہے۔" اُنہوں نے پھر میری بات کاٹی۔ "ایسی باتیں فون پر نہیں کہی جاسکتیں۔ کمال ہے تم خود ایک پاور ایجنٹ رہ چکے ہو، کیا طریقہ کار بھول گئے ہمارا...... لوہے کو لوہے سے کاٹنے کا...... ملک و قوم کے وسیع تر مفادات کے لیے ایسی کڑوی گولیاں ہمیں نگلنی پڑتی ہیں...... یہ بھی مصلحت کا ایک تقاضا ہے۔"

"گریٹ سر!" میں نے مسرت و جوش سے کہا۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ مجھے رینجرز کے قبضے سے اس طرح فرار کے لیے کوئی سزا بھگتنا پڑ جائے گی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے اُس رات رینجرز کی گرفت سے فرار ہونے کا یہ دانستہ موقع فراہم کیا گیا تھا کیونکہ شاید میجر وسیم کو میرے اندر کی تپش کا اندازہ ہو چکا تھا اور شاید یہ بھی کہ میں...... اس مہم کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے کس قدر پُرجوش ہو رہا تھا۔

"اب کام کی باتیں کرلو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" دوسری جانب سے دوبارہ ان کی آواز اُبھری اور میں نے پھر انہیں "کام" کی ساری باتیں بتا دیں۔ اُنہوں نے مجھ سے میری لوکیشن پوچھی اور پھر مجھے کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

مجھے یاد تھا کہ میجر وسیم بھٹی نے مجھ سے کہا۔ اگر وہ طلسم نور ہیرا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو انہیں میری کچھ ایسی باتوں کا بھی یقین آ جاتا جو اُن کے لیے اب تک میری طرف سے شکوک کا سبب بنی ہوئی تھیں اور اب وہ ہیرا میرے پاس (شکیلہ کے پاس) موجود تھا۔

یہ قصہ نمٹنے میں کم و بیش پون گھنٹا لگا تھا۔ رینجرز کی

بھاری تعداد نے صالح جان کے مکان پر ریڈ کیا اور وہاں سے اس بدطینت اور خود کو بڑی ”شے“ سمجھنے والے فرعون صفت وڈیرے شاہنواز خان کو اس کے قریبی ساتھیوں کے ذریعے گرفتار کرلیا۔ ساتھ ہی ارم اور اس کے دونوں بچے بھی بازیاب کرالیے گئے۔ صالح جان کا جھوٹ پکڑا گیا تھا۔ وہ ہوش میں آچکا تھا۔ ان سب کو رینجرز ہیڈ کوارٹر اور وہاں سے اسپیشل انٹروگیشن سیل میں منتقل کر دیا گیا۔

کبیل دادا اور اول خیر میری اس کامیابی پر بے حد خوش تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے یہ ساری مہم بازی اپنے اُوپر ایک خطرناک رسک لے کر ہی ماری تھی۔ میری ذرا سی غلطی مجھے ہی نہیں میرے ساتھیوں کو بھی کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پھنسا سکتی تھی۔

البتہ طلسم نور ہیرے سے متعلق تفصیلی گفت وشنید کے لیے ہم دونوں کی ایک کمرے میں ون ٹو ون سنجیدہ نوعیت کی ایک میٹنگ ہوئی۔

”مسٹر شہزاد! میں اب اس قومی امانت کے سلسلے میں تمہارا آئندہ کا پروگرام جاننا چاہوں گا۔“

”یس سر!“ میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ”میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ جتنی جلد ممکن ہوسکے میں اس اہم اور قومی امانت کی ذمّے داری سے بری الذمہ ہو جاؤں، یہ طلسمِ نور ہیرا ہمارے وطن کی ایک مقدس اور قابلِ فخر امانت ہے۔ کوشش تو میری یہی تھی کہ میں اسے آپ جیسے ہی کسی ذمّے دار، محبِ وطن افسر کے حوالے کر دوں، لیکن اس کے علاوہ میرے کاندھوں یہ ایک اور اہم ذمّے داری بھی عائد ہوتی ہے، اخلاقی فرض سمجھ لیں اسے، اگر وہ بھی آپ کے توسط سے پوری ہو جائے تو میں آپ کا بے حد ممنون رہوں گا۔“ میری بات پر میجر وسیم بولے۔

”ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس ذمّے داری کو جلد سے جلد نمٹا دیا جائے اور طلسمِ نور ہیرے کو بعض حکومتی افسروں کے توسط سے اسے ذمّے داران کے سپرد کر دیا جائے، کیونکہ عنقریب ملک میں ایک بڑی عظیم الشان نوادراتی نمائش لگنے والی ہے، یہ ایک بین الاقوامی سطح کی نمائش ہے جس میں بیرونِ ممالک کے مندوبین، کچھ اعلیٰ افسر اور عالمی مالیاتی فنڈ کے افسران شرکت کرنے والے ہیں۔ یہ نمائش ملک کی ترقی اور اقتصادیات میں نہایت اہم رول ادا کرے گی، ایسے میں طلسمِ نور ہیرے کی نمائش میں موجودگی ...... اس کی اہمیت اور افادیت کو دوچند کر دے گی۔ وہ اس نادر و نایاب ہیرے کو دیکھ کر دنگ رہ جا گے، اس کی شہرت چار دانگ پھیلے گی، ملک کا نام روشن گا۔ اس کی حفاظت کے لیے بین الاقوامی تنظیمیں خطیر دیں گی اور بھی بہت سے فائدے متوقع ہوں گے۔ لیکن ا عظیم کارنامے کا سہرا تمہارے سر ہوگا...... اور یہی نہ ہماری مصدقہ اطلاعات اور معلومات کے مطابق تم نے کا عرصہ پہلے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندرداس سکین بھی گرفتار کروایا تھا۔ جس پر مقدمہ چل رہا ہے اور ا پھانسی کی سزا دی گئی ہے، یہ دو کارنامے تمہارے معمو نوعیت کے نہیں ہیں، لہٰذا تمہیں اس نمائش میں خاص طور شامل ہونا پڑے گا، تاکہ وہاں تمہیں ایک بڑے اور قو اعزاز سے بھی نوازا جائے گا۔“

”سر! یہ میرے لیے ہی نہیں بلکہ ہر محبِ وط پاکستانی کے لیے یقیناً فخر کی بات ہوگی مگر سر جس اعزاز آپ بات کر رہے ہیں، اس کا میں نہیں کوئی اور حق دا ہے۔“ میں خوش تو ہوا تھا مگر اصل بات بھی کی۔

”کیا مطلب؟“ میجر وسیم چونک کر بولے۔

”یس سر!“ میں نے کہا اور پھر انہیں سب سے پہ بشام چھلگری کے بارے میں مختصراً تفصیل سے آگاہ کیا پھ اس کی بیوی ارم اور اس کے دو چھوٹے معصوم بچوں کا ذکر بھ کرتے ہوئے میجر وسیم سے بولا۔

”جناب! مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر آپ حکومت ک طرف سے اس کا کریڈٹ بشام کی بیوہ اور اس کے دونو بچوں کے نام کر دیں، انہیں تحفظ اور مالی مدد کی ضرورت ہے، دونوں بچوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے، ارم کے لیے باعزت اور اچھی نوکری کا بھی بندوبست کر دیا جائے۔ بس یہی میری آپ سے درخواست ہے۔“

میری بات پر میجر وسیم چند ثانیے کسی گہری سوچ می مستغرق رہے، اس کے بعد میرا کاندھا تھپتھپا کے بولے۔

”ویل مسٹر شہزاد! تمہاری اس اخلاقی ہمدردی اور اقدام کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ دیکھا جائے تو اس عظیم قومی امانت کے لیے بلاشبہ بشام نے ہی اپنی جان کی قربانی دی تھی لیکن بعد میں تو تم نے اس مقدس امانت کی اپنی جان سے بھی بڑھ کر حفاظت کی اسے خطرناک بین الاقوامی گروہ اور جنگی جنونی جرنیلوں سے جان پر کھیل کر حاصل کیا۔ نام تو تمہارا بھی آئے گا اور پھر تم ہو بھی وطنِ عزیز کے ایک گمنام سپاہی تاج دین کے بیٹے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن..... مجھے اس کی ضرورت

نہیں، آپ کسی طرح ارم اور اس کے دونوں بچوں کے لیے محفوظ مستقبل کا بندوبست کرادیں، یہی میرے لیے بہت ہو گا۔"

"لوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں، برخوردار! مگر آفرین ہے تم پر کہ تم دوسروں کے لیے جیتے ہو...... انشاء اللہ میں ایسا ہی کروں گا، لیکن میں تمہیں اب رینجرز فورس کا ایک "آنریری" عہدہ تفویض کرانے کا وعدہ کرتا ہوں...... جو تمہیں پاک آرمی کی طرف سے اسپیشل طور پر دیا جائے گا۔"

میجر وسیم کی اس بات میں میرے لیے دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ کیونکہ میرے دشمنوں نے بیگم ولا اور زہرہ بانو کو اس کے ساتھیوں سمیت (جن میں، میں بھی شامل تھا) جھوٹے شواہد کے ذریعے ملتان رینجرز کو ان کے خلاف کر رکھا تھا، اس سلسلے میں یہ آنریری عہدہ جو یقینی طور پر پاور ایجنٹ کے مساوی ہوسکتا تھا، مجھے تفویض کرنا سودمند ثابت ہوسکتا تھا۔

"میں تمہیں خفیہ رینجرز کمانڈو کا عہدہ دینے کی سفارش کروں گا۔" میجر صاحب نے آخر میں کہا تو میں خوشی کے دبے دبے احساس تلے بولا۔

"سر! اگر ایسا ہوگیا تو میں سمجھوں گا کہ مجھے میری اب تک کی محنتوں کا صلہ مل گیا۔ لیکن ابھی اس میں ایک طویل پروسس کی ضرورت ہوگی، تاہم میں آپ سے ایک اسپیشل فیور کی درخواست کروں گا، چونکہ میں اب ملتان جانے کا قصد کیے ہوئے ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہاں کی رینجرز فورس جب مجھ سے کسی قسم کی بازپرس کرے تو میں اپنا کوئی کارڈ کھیل سکوں۔"

"سمجھ گیا......" وہ مسکرا کر بولے پھر مجھے ایک خصوصی ٹ لائن کا نمبر اور کوڈ ازبر کروایا اور بولے۔

"تم فقط یہ کوڈ اور اس نمبر پر ان کے کسی بھی بڑے نسر کو رابطے کے لیے کہہ دینا، وہ تمہیں منٹوں میں تو کیا یکنڈوں کے اندر اندر نہایت عزت و احترام کے ساتھ چھوڑ یں گے۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر!" میں نے خوش ہوکر ہا۔

"ناٹ مینشنڈ! یو آر ڈیزروڈ......" وہ بارعب لہجے ں بولے اور کھڑے ہوکر مجھے سیلیوٹ کیا تو میں نے بھی ں انداز میں ان کے سیلیوٹ کا جواب دے ڈالا۔

ایک بڑی ذمے داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ں خود کو بہت ہلکا پھلکا تصور کرنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم نے پنجاب جانے والی ایک لگژری کوچ پکڑی اور ملتان کے لیے روانہ ہوگئے۔ رخصت ہوتے وقت ہم نے ارم اور اس کے دونوں بچوں سے بھی ملاقات کی۔ میں نے اسے سب بتادیا تھا کہ اب اسے کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ جہاں کہے گی اسے باعزت طریقے سے وہاں پہنچادیا جائے گا اور نہ صرف یہ بلکہ حکومتی سطح پر اس کے لیے بہت کچھ کیا جانے والا تھا۔ خود میجر صاحب نے بھی اسے بیٹی کہہ کر تسلی اور اطمینان دلایا تھا۔ میں نے یہ بھی ارم سے کہا تھا کہ میں تمہارے سلسلے میں میجر وسیم بھٹی صاحب سے ٹیلی فونک رابطے میں رہوں گا اور زندگی رہی تو اپنی پیاری بہن اور دونوں بھانجوں سے ضرور کبھی ملاقات کروں گا۔

☆☆☆

ہم اسی طرح براستہ لاڑکانہ وادو سے پنجاب کی جانب محوِ سفر تھے۔ میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بندے کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور بندے کی ثابت قدمی اور بلند ہمتی کو دیکھتے ہوئے اس کی پوری مدد بھی فرماتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ بندہ خود حیران ہوجاتا ہے، میں خود بھی اس وقت ان تمام حالات پر غور کررہا تھا۔ میرا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا ہوا تھا۔ سیٹ خاصی آرام دہ تھی۔ تھوڑی دیر میں مجھے نیند نے آن لیا۔

صبح جاگا تو ملتان کے قریب تھے اور صبح ہوچکی تھی۔ میں نے دانستہ ایسے ہی وقت کا انتخاب کیا تھا کہ دن میں ہی "بیگم ولا" کا رخ کروں۔ رات میں دشمنوں کا پہرا غیر معمولی ہوتا ہے جبکہ دن میں وہ بات نہیں ہوگی۔ ایک خیال اور اندازہ تھا ورنہ تو ہمیں ہر وقت ہی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

ہم ملتان کینٹ کے قریب اُتر گئے۔ اول خیر کا دل چائے کی چسکی لگانے کو چاہا تھا مگر میں نے منع کردیا۔

"اپنے منہ اور پیٹ کو ذرا سنبھال کر رکھو...... جانتے نہیں ہو کہ یہاں ہمارے کتنے خطرناک، دیدہ و نادیدہ دشمن پھیلے ہوئے ہیں......" شکیلہ نے اسے گھور کر کہا۔ ملتان میں اس وقت سخت گرمی پڑ رہی تھی، ملتان کی خشک گرمیاں ویسے بھی بہت مشہور ہیں۔ اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان کوئی بحث پڑتی، میں نے فوراً ایک ٹیکسی والے کو روکا، ڈرائیور کو بیگم ولا کا پتا بتایا اور اس نے کرایہ...... اس کے بعد ہم چاروں اس میں سوار ہوگئے۔

ایک طویل عرصے بعد میں بیگم ولا میں قدم رکھنے والا تھا۔ میرا ذہن بہت سے احساسات اور خیالات کی آماجگاہ

بنا ہوا تھا۔ اماں جی اور ابا جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ کیسے ہوں گے؟ میرے انتظار میں تو ان کی بوڑھی آنکھیں کس قدر تھک گئی ہوں گی۔ میں ان کا لختِ جگر ان کی اب تک کی رفاقت کی وہ نشانی تھا جس کی خاطر ان دونوں بوڑھوں نے اپنی پُرمصائب زندگی کو بڑا اخراج عطا کیا تھا اور بالآخر میں نے اپنی چھاؤں اور انہوں نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک کو پایا تھا۔ زہرہ بانو تھی، جسے میری ذات میں ہر وقت لئیق شاہ کا ہی پرتو نظر آتا تھا اور وہ ایک بڑے گروہ کی سربراہ ہونے کے باوجود اسی ایک رشتے سے مجھے، اماں جی اور ابا جی کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ بعض رشتے کس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجانے کے باوجود تاعمر قائم رہتے ہیں، نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ نبھائے بھی جاتے ہیں اور زہرہ بانو یہی کر رہی تھی۔ یہی اس کی وہ نرالی ادا تھی جس نے اس کے لیے میرے دل میں ازحد احترام پیدا کر رکھا تھا۔

انہی خیالات میں جب ہم بیگم ولا کی علاقائی حدود میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی میرے دل و دماغ کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ دل تھا کہ بے طرح دھڑکے جارہا تھا۔ اعصابی کیفیات بھی ایک عجیب سے ارتعاش کا شکار تھیں۔

کبیل دادا اور اول خیر، کھڑکی سے بڑی گہری نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ خود میری عقابی نظریں تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔ بہ قول زہرہ بانو کے، ہمارے بہت سے دشمنوں نے اس عمارت کو اپنی کڑی اور خفیہ نگرانی میں لیے رکھا تھا۔ کون آرہا ہے جارہا ہے، وہ سب ان کے علم میں تھا۔ البتہ یہ ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میری آمد کی خبر دشمنوں تک پہنچی تھی یا نہیں، اگر پہنچ جاتی تو ان میں تھرتھلی مچ جانا لازمی ہوتا۔

بیگم ولا کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ہماری ٹیکسی رکی۔ کرایہ وغیرہ ادا کرنے کے دوران میں ہی گیٹ کھل چکا تھا۔ اندر بنے گارڈ کیبن سے دو افراد تیزی سے باہر کو لپکے تھے، ان کے فوراً بعد تین مسلح افراد بھی اندر سے برآمد ہوئے اور ہمارے دائیں بائیں محتاط انداز میں الرٹ کھڑے ہو گئے۔ ان کی نظریں ہمارے بجائے تیزی سے ہمارے گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں اول الذکر دو محافظ ہمارا سامان سنبھال رہے تھے۔

اندر لگے خفیہ کیمروں میں شاید انہوں نے گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکتے اور ہمیں اُترتے دیکھ لیا تھا۔ سب سے پہلے دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ہی گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا اور سامنے ہی مجھے زہرہ بانو کھڑی دکھائی دے گئی، یوں کہ...... جیسے وہ اپنے آپ سے ہی بے گانہ رہ چکی ہو۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے شلوار سوٹ میں ملبوس تھی اور اسی رنگ کے دوپٹے میں اس کا گورا روپ نکھرا ہوا لگتا تھا۔ وہ کچھ کمزور سی نظر آرہی تھی، دل کش سی کشادہ آنکھوں میں جیسے کسی طویل انتظار کا عذاب تڑختے ہوئے آبگینوں کی کرچیوں میں جھلملا رہا تھا۔ گلنار سا چہرہ کسی قدر کِھلا ہوا نظر آتا تھا مگر یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک عرصے سے کملایا ہوا بھی ہے۔ اس کے لبوں کا مدھم مدھم ارتعاش بہ زبانِ خاموشی ایک داستانِ غم کی کئی اَن کہی...... کہانیاں سنا رہا تھا۔ اس نے اپنے شہد رنگ بالوں کو بھی سنوارا ہوا نہ تھا، بے ترتیب سے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی بہت سی لٹیں، مہتابی چہرے پر لہرا رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی حیرت میں ڈوبی اس کی آواز ابھری۔

"شش...... شہزی! کک...... کیا یہ واقعی تم ہو......؟"

میرے ہونٹوں سے بے اختیار سی ایک مسکراہٹ کسی نویدِ سحر کی طرح طلوع ہوئی، جس نے گویا اُداس اور تاریک جھیل پر سویرا کر دیا۔ وہ متلاطم ہوئی، کسی طوفان کی طرح اُمڈی اور میری طرف بڑھی۔ وہ میرے ساتھ لگ گئی اور اپنا سر جیسے میرے کشادہ سینے کے تخت پر رکھ دیا۔ وہ گھٹے گھٹے انداز میں سسک رہی تھی۔ میں نے...... آہستگی سے اسے سنبھالا دیا، ہولے سے اس کا کاندھا تھپکا اور...... بہت دھیرے سے الگ کر کے مسکراتے لہجے میں کہا۔

"دیکھ لو...... زہرہ! سارے ساتھی میرے ساتھ ہیں، تمہارے سامنے ہنستے مسکراتے کھڑے ہیں، یہ سب یقیناً ماں جی اور تمہاری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

یہ کہہ کر میں ایک طرف ہٹ گیا۔ شکیلہ، زہرہ سے لپٹ گئی، اول خیر نے سر جھکا کر زہرہ بانو کو سلام کیا تو زہرہ بھیگی بھیگی سی آنکھوں اور اشک آلودہ لہجے میں بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"اس شیطان کی مجھے زیادہ فکر تھی...... اور...... وہ کون ہے......؟ میں اسے پہچان رہی ہوں...... شاید۔"

اس کا اشارہ میرے عقب میں سر جھکائے کھڑے کبیل دادا کی طرف تھا۔

ہمیں صحیح سلامت، ہنستا مسکراتا اور خوش دیکھ کر زہرہ

بانو بھی اپنا بہت کچھ ایسا بھلائے ہوئے تھی جو اس کا متاعِ جاں بھی تھا اور...... سرمایۂ حیات بھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور بذلہ سنجی کا اظہار کر رہی تھی۔

”سلام بیگم صاحبہ......!“ تب ہی کبیل دادا نے چند قدم آگے اُٹھاتے ہوئے زہرہ بانو کو سلام پیش کیا۔ میں نے دیکھا۔ زہرہ بانو نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کبیل دادا کے اُونچے لامبے کاندھے پر اپنا نرم و نازک ہاتھ رکھ دیا۔ کبیل دادا نے سر اُٹھا کر زہرہ بانو کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ زہرہ اس کے کھردرے اور بھاری چہرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔

”مجھے اور کسی پر اتنا یقین نہیں کم از کم تم پر ضرور تھا کبیل دادا! کہ ہمیشہ کی طرح تم اپنی زندگی کو ساتھیوں کے لیے داؤ پر لگائے رکھو گے اور شہزی سمیت ان سب کو اپنی جاں نثاری اور وفاداری کی ڈور سے باندھ کر ایک دن میرے سامنے لا کھڑا کرو گے، تم نے مجھ سے وعدہ جو کیا تھا۔“

”بیگم صاحبہ! میں نے آج اپنا وعدہ پورا کر دیا...... لیکن کاش! میں اپنے یار! لئیق شاہ کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ اسے بھی اسی ڈور سے باندھے رکھتا، پر وہ جھلّا تو بہت جلدی میں تھا اور میں بھی اس کے لیے کچھ کرنے کا موقع ہی تلاش کرتا رہ گیا۔ یہی ایک ایسا بوجھ ہے، جو ایسے وقت میں مجھے رُلا کر رکھ دیتا ہے کہ کاش! میں اس کے لیے بھی کچھ کر سکتا۔ معافی چاہوں گا سب سے کہ یہ وقت ایسے موضوع کا تو نہیں، پر کیا کروں، یہ نہ بھولنے والا سانحہ بھی ایسے ہی وقت میں یاد آکر دل و جگر کو تڑپا دیتا ہے۔“ کہتے کہتے کبیل دادا کا لہجہ رُندھ گیا، آنکھیں ڈبڈبا سی گئیں۔ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ جیسے میں اول خیر کا یار تھا اسی طرح میرا بڑا بھائی لئیق شاہ مرحوم کبیل دادا کا تھا۔ بھلا وہ کیسے اُسے بھلا سکتا تھا۔

لئیق شاہ کے ذکر نے فضا کو ایک دم ساکت اور مغموم سا کر دیا۔ تب ہی میں نے آہستگی کے ساتھ سب سے کہا۔

”اندر آجاؤ......“

نشست گاہ میں دو ملازم مرد عورت موجود تھے۔ سب وہاں صوفوں پر بیٹھ گئے، میں نے ماں جی اور اباجی کے کمرے کا رخ کیا۔ بڑی عجیب حالت ہو رہی تھی میرے دل و دماغ کی، ایک جذباتی کیفیت تھی، عقیدت و محبت کا ایک طوفان سا اُمڈنے کو مچل رہا تھا، اپنے بوڑھے ماں باپ کا سامنا کرنے پر، ماں جی سے تو میری باتیں ہوتی رہی تھیں، اور ان کا ساتھ بھی رہا تھا، مگر اپنے باپ کو جب میں نے بلیو ٹلسی اور اس کے سربراہ سی جی بھوانی کے چنگل سے چھڑایا تھا تو اس وقت باپ کی یادداشت ایسی نہ تھی کہ وہ مجھے پہچان پاتا، تاہم ڈاکٹروں نے تسلی دی تھی کہ...... اب اپنوں میں وقت گزارنے کے سبب عین ممکن ہے کہ گریجولی (رفتہ رفتہ) وہ اپنی اصل یادداشتوں میں لوٹ آئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں پھر فوراً ہی انڈیمان والے مشن پہ روانہ ہو گیا تھا۔

کمرے میں داخل ہوا جہاں اے سی آن تھا۔ فضا کمرے کی خاصی آرام دہ اور سکون پرور ہو رہی تھی۔ میں نے بہت دھیرے سے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں سامنے کہ ماں جی اور اباجی بڑے سے جہازی سائز کے بیڈ پر نیم دراز سے بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ ان دونوں کی مجھ پر نگاہ پڑی تھی۔ بادیُ النظر میں وہ مجھے کوئی ملازم ہی سمجھے تھے مگر جب میں پوری طرح سے ان کے سامنے آگیا تو ماں تو جیسے ایک ٹک مجھے دیکھتی ہی رہ گئی مگر انہیں شاید پھر بھی یقین نہیں آیا تھا، اُنہوں نے جلدی سے بیڈ سائڈ ٹیبل سے اپنا سیاہ کمانی والا چشمہ اُٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا، تب ہی وہ جیسے ایک دم سکتے میں آگئیں، میرا اور اُن کا سامنا بلاشبہ اچانک اور غیر متوقع ہی تھا۔

”کک...... کون آیا ہے، نویدہ......؟ تُو کسے اتنے غور سے دیکھے جا رہی ہے؟“ یہ اباجی کی آواز تھی، ان کی بینائی زیادہ متاثر تھی۔

”چچ...... چشمہ پہن تا جے......! پھر دیکھ کہ کون آیا ہے!“ ماں جی نے اباجی سے کہا۔ میرے باپ نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی عینک بھی اُٹھا لی مگر وہ پھر بھی مجھے پہچاننے سے قاصر رہے۔

”شہزی پُتر...... اُوراں آ...... وہاں...... کیوں کھڑا ہے...... تُو......“ ماں نے کہا اور بیڈ سے اُترنے لگیں کہ میں انہیں اس زحمت سے بچانے کی خاطر ان کی جانب لپکا اور بیڈ کے قریب آکر ان کے پھیلے ہوئے قدموں کے قریب جا بیٹھا اور ان سے لپٹ گیا۔ ماں جی مجھے خود سے لگا کر رو دی۔ میرا باپ ہنوز ہکا بکا سا تھا، شاید کچھ سمجھ رہا تھا کچھ نہیں۔

ماں کی ممتا بھری چھاؤں تلے آتے ہی جیسے مجھ آبلہ پا آوارہ گرد کو تپتے ریگ زار میں کوئی نخلستان میسر آگیا ہو...... میرے نادیدہ زخموں پر جیسے مرہم رکھ دیا گیا ہو۔

”تُو بتاتی نہیں نویدہ......! کون ہے یہ......؟“ اباجی کی کپکپاتی آواز میرے کانوں سے پھر ٹکرائی۔ کچھ اندازہ

کرنے کی وہ کوشش کررہے تھے۔

میں دھیرے سے ماں سے الگ ہوا اور باپ کی طرف دیکھا...... جو ایک اچھا شوہر ہی نہیں، ایک پُرشفیق باپ ہی نہیں، ملک وقوم کا سچا اور بہادر سپاہی بھی تھا جسے وطنِ عزیز کے ''گمنام سپاہی'' کے اعزاز کا فخر حاصل تھا۔

''اباجی......'' میں نے دھیرے سے انہیں پکارا۔ باپ کے جھریوں زدہ چہرے پر جیسے بہت سی لکیریں کھنچ گئیں۔

''تاجے! یہ ہمارا پُتر...... شہزاد احمد خان ہے۔'' ماں کپکپاتے سے لہجے میں بتانے لگی۔

''بتایا تھا میں نے تجھے اس کے بارے میں...... یہ وہ پُتر ہے ہمارا...... جب تُو ایک برستی طوفانی رات میں اپنے وطن کی پکار پر سرحدی چوکی پر چلا گیا تھا۔ ایک پتر وہ تھا جس نے میری اُنگلی پکڑ رکھی تھی، وہ لئیق شاہ تھا...... اور یہ شہزاد احمد وہ تھا جو دنیا میں آنے والا تھا...... کتنے خوش تھے ہم دونوں...... اس کی متوقع آمد پر...... یاد نہیں، ہم نے تو اس کا نام بھی پہلے سے ہی رکھ ڈالا تھا، ہم دونوں میں لڑائی ہوئی تھی، میں چاہتی تھی لڑکی ہو، تم بیٹا چاہتے تھے، میں نے بیٹی کا نام سوچ رکھا تھا اور تم نے بیٹے کا، آخرکار تم جیت گئے تھے، پر میں تمھیں کیسے تمہاری جیت کی خبر سناتی، تم تو...... دور چلے گئے تھے۔ ہاں! تاجے! یہ وہی اپنا شہزی ہے......! یہی وہ تیرا بہادر گبرو پوت ہے جس نے تجھے دشمنوں کے چنگل سے چھڑایا تھا...... دیکھ لے آج اپنے اس کڑیل جوان پُتر کو......''

ماں یہ سب کہتے ہوئے جانے کیوں سسک پڑی۔ میرا باپ تو جیسے یک ٹک مجھے دیکھتا ہی چلا گیا۔ اپنوں کے قریب رہتے ہوئے...... ان سے ماضی کی باتیں کرتے ہوئے، اس کی یادداشت کافی حد تک شاید بحال ہونے لگی تھی۔ وہ کبھی اپنا چشمہ اُتارتا اور کبھی پہنتا، یہاں تک میں خود ہی اس کے پاس سرک گیا اور لپٹ گیا۔

''اوئے ٹھنڈ پے گئی کلیجے وچ...... شہزی پترے......! واہ میرے مولا!...... یہ کیسا دن دکھا رہا ہے مجھ بڈھے کو...... شکر ہے تیرا میرے مولا! میں تو جوان ہو گیا...... تت...... تُو شہزی پتر ہے ناں......؟'' اباجی کے لہجے میں فخر بھی تھا اور انبساط بھی...... ماضی کے گم گشتہ حوالے بھی تھے اور یادِ رفتگاں کے اُن بچھڑے جذبات کے ریلے بھی جنہوں نے کسی بے رحم طوفان کی صورت ہمیں بچھاڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج برسوں بعد ملے تو جیسے سارے بند ٹوٹ گئے۔ میرا باپ تو جیسے مجھ سے بچوں ہی کی طرح لپٹ گیا۔ وہ بار بار ''میرا پُتر...... میرا پُتر......'' پکارے جا رہا تھا۔ مجھے چوم رہا تھا۔ جب محبت اور شفقت کے ان جذبات کا طوفان تھما تو...... وہ اپنے دونوں بوڑھے ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ لیے اماں جی سے بولا۔

''نویدہ......! دیکھ یہ ہمارے لئیق شاہ سے کتنا ملتا ہے...... کاش! کاش! وہ بھی زندہ ہوتا...... میں دونوں لختِ جگر کو اپنے بازوؤں میں سمولیتا اور پھر سے جوان ہوجاتا۔''

''میں بھی آپ کا بازو ہوں اباجی!'' میں نے بھی رقت بھرے لہجے میں باپ سے کہا۔

''ہاں! شہزی پتر! کیوں نہیں...... تُو تو میرا بازو ہی نہیں، میرا فخر بھی ہے، میرا امان بھی۔''

اسی اثنا میں زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ بھی اندر آگئے۔ وہ سب ابا اور اماں جی کے قریب بیٹھ گئے۔ میں اور زہرہ اباجی کو کبیل دادا، اول خیر اور شکیلہ کے بارے میں بتانے لگے۔ ان کی جاں نثاری اور بے جگر یاری کے قصے بھی سنائے، غرضیکہ وہ سارا دن اسی میں گزر گیا۔ اباجی کو جب یہ معلوم ہوا کہ...۔ انڈیا میں ''را'' کے ایک بڑے اور خطرناک ونگ ''بلیو تلسی'' جسے را نے خاص طور پر پاکستان میں تخریب کاری اور خفیہ سازشوں کے لیے پروان چڑھایا تھا، میں اسے اس کے سربراہ سمیت نیست و نابود کر آیا تھا۔ تو اباجی کا سر فخر سے اُونچا ہوگیا اور بے اختیار اس کے بوڑھے کپکپاتے لبوں سے نکلا تھا۔

''آخر پتر کس کا ہے......''

''بے شک۔''

وہاں موجود سب کے منہ سے بیک وقت برآمد ہوا۔

ہم تھکے ہوئے تھے مگر ماں اور اباجی کے ساتھ دن بھر حتیٰ کہ رات گئے تک ایک چوپال سی ڈالے بیٹھے رہے، کھایا پیا بھی انہی کے پاس بیٹھ کر۔ بزرگوں کی محفل میں ایک عجیب روحانی سکون مل رہا تھا ہم سب کو...... رات کے دو بجے کہیں جاکر سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی اور اگلی صبح دن چڑھے سوتے رہے۔

نہا دھوکر غسل کیا۔ ناشتے کا وقت تو بیت چکا تھا، لہٰذا دوپہر کا کھانا ہی کھایا گیا جو بڑا پُرتکلف تھا۔ زہرہ بانو میری آمد پر بے حد خوش تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہم سے تازہ ترین حالات کے متعلق بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہو۔ اگرچہ ٹیلی فون پر ہماری گفتگو ہوتی رہی تھی، جب میں کراچی میں تھا مگر وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکی تھی، لہٰذا

ممکن تھا کہ تشنگی رہ گئی ہو۔ یوں بھی کچھ نئے پلان، کچھ نئی حکمتِ عملی حالاتِ دوراں کی متقاضی تھی۔

کھانے وغیرہ کے بعد ہم پانچوں ایک دوسرے کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر ہم نے اصل موضوع کی طرف آنے کی غرض سے دانستہ چند ثانیوں کے لیے خاموشی اختیار کی۔ میرا خیال تھا کہ اب زہرہ بانو شابہ اور وزیر جان وغیرہ سے متعلق بات چھیڑے گی مگر جب اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات کا آغاز کیا تو میں حیران ہوئے بِنا نہ رہ سکا۔ وہ نہایت متانت کے ساتھ اور براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

''شہزی! دشمنوں کے ساتھ نبرد آزمائی کا سلسلہ چلتا رہے گا، اسی لیے میں نے ایک حتمی فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت یہاں کے تمام معاملات پسِ پشت ڈال کر ہمیں عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے آنسہ خالدہ تھی تو اور بات تھی مگر اب...... اس کی ایک قریبی ساتھی سوزی کے پچھلے دنوں ٹیلی فونک رابطے کے بعد، کہ اب اس کا بھی کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ عابدہ کی رہائی کے لیے باقاعدہ ایک مربوط حکمتِ عملی تیار کر لینی چاہیے۔''

زہرہ بانو نے اتنا کہا اور خاموش ہوگئی۔ عابدہ کے ذکر نے سب کو مغموم سا کر دیا۔ تاہم سب نے زہرہ بانو کی رائے پر صاد کرتے ہوئے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا جو وہ میرے ساتھ بھی کر چکے تھے۔ اب اس سلسلے میں زہرہ بانو کو بھی سنجیدہ پا کر سب سے پہلے اول خیر نے زہرہ بانو سے کہا۔

''بیگم صاحبہ! آپ نے تو ہمارے منہ کی بات چھین لی، وڈے استاد جی (کبیل دادا)، شکیلہ اور میں نے ابھی تھوڑے دنوں پہلے ہی شہزی کو عابدہ بہن کی رہائی کے بارے میں جلد از جلد کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھانے کے لیے زور دیا تھا، پر اسے تو پہلے یہاں کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اب جبکہ آپ نے خود بھی اس اہم موضوع کو چھیڑا ہے تو ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلے میں بھی کوئی پیش رفت ہو جانی چاہیے۔''

شکیلہ اور کبیل دادا نے بھی زہرہ بانو کی بات کی تائید میں اول خیر کی حمایت کر دی تو زہرہ بانو ایک بار پھر سنجیدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شہزی؟ ممکن ہے سوزی کے فون کے بعد تم نے اس بارے میں کوئی لائحہ عمل تیار کر رکھا

ستمبر 2017ء کا دلفریب شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور مرزا امجد بیگ کا دبنگ انداز

ذرا سی بات
زندگی چھوٹے چھوٹے واقعات کے درمیان کبھی کبھی ذرا سی بات کسی کی بھینٹ بھی لے لیتی ہے۔ آخری صفحات پر **ناہید سلطانہ اختر** کے قلم سے ایک پرفکر داستان
سانحہ
تاریخ اکثر چھوٹے اور بڑے طبقات کی تفریق کیے بغیر صرف بڑے اور منفرد کام کرنے والوں کو اپنے اوراق پر رقم کرتی ہے۔ تاریخی صفحات پر **علی اختر** کی ایک چونکا دینے والی دلنشین تحریر
باغی
مثبت اور منفی رویوں کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی...... خوبصورت پیار کے رشتوں کے درمیان علم بغاوت بلند کرنے والے رویوں کی انوکھی داستان...... ایک یادگار تحفہ
وقت
اکثر لمحات پر لگا کر اڑ جاتے ہیں مگر...... کچھ سوغاتیں بھی مطلوب لوگوں کے دامن میں ڈالتے چلے جاتے ہیں۔ **حسام بٹ** کے قلم کی روانی
اس کے علاوہ
منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، محمد الیاس، ثمر عباس اور ڈاکٹر شیر شاہ سید کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

ہو......؟''

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔

''زہرہ! سچی بات تو یہ ہے کہ میں جب بھی اس بارے میں سوچتا یا غور کرتا ہوں، تو جانے کیوں میرا دماغ میرا ساتھ چھوڑنے لگتا ہے۔ مجھے کوئی راستہ ہی نہیں سجھائی دیتا کہ میں کیا کروں؟ کیسے عابدہ کو امریکا کی خطرناک جیل سے رہائی دلا کر یہاں پاکستان لے آؤں...... مایوسی اور بے بسی حد سے بڑھنے لگتی ہے تو میرا دماغ ماؤف اور دل بجھنے لگتا ہے۔ تب پھر میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟ فقط دیواروں سے ہی سر ٹکرانے کو جی کرتا ہے ... میرا...... بلکہ...... بلکہ میں تو اب خود کو عابدہ کا مجرم سمجھنے لگا ہوں...... کیا کیا ہے میں نے اب تک اس کے لیے، وہ بے چاری میری خاطر، میرے کہنے پر اس حرافہ عارفہ کے ساتھ انسانی ہمدردی کے طور پر امریکا گئی اور وہاں اسی احسان فراموش عارفہ کی وجہ سے دنیا کی بدنام زمانہ ایجنسی سی آئی اے اور باسکل ہولارڈ جیسے بھیڑیا صفت انسان کے چنگل میں جا پھنسی، یہی سوچ سوچ کر میرے ضمیر کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے اور میں بے سکون ہی رہتا ہوں......''

کہتے کہتے میری آواز رُندھ گئی، لب و لہجے میں دکھ سے زیادہ احساسِ ندامت کی کپکپاہٹ عود کر آئی۔

''ٹیک اِٹ ایزی شہزی!'' زہرہ بانو نے کہتے ہوئے دھیرے سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔ میری کرسی اس کے صوفے کے قریب ہی دھری تھی۔

''میرا مقصد تمہیں دکھی کرنا یا تمہارے زخم ہرے کرنا نہیں تھا، میں چاہتی تھی کہ ہم سب کی توجہ اس ایک ہی نقطے پر مرکوز ہو جائے تب ہی ہم کوئی لائحہ عمل طے کر سکتے ہیں اور اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہاری ٹیلی فون پر عابدہ سے متعلق گفتگو، بے قراری اور تشویش کو محسوس کر کے ہی میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اس سلسلے میں، میں ہی کیوں نہ کچھ کرنے کی کوشش کروں......'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ میں نے قدرے چونکتے ہوئے اور کچھ بے قراری سے اس کی طرف دیکھا بلکہ سب کی یک ٹک سی نظریں زہرہ بانو پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک ذرا ثانیے کی خاموشی کے بعد وہ پھر اسی متانت بھرے لہجے میں بولی۔

''پہلے میں اس سلسلے میں ایک امیگریشن ویزا کنسلٹنٹ سے امریکا وزٹ ویزا پروگرام کے بارے میں ڈسکس کرنا چاہتی تھی لیکن جلد ہی مجھے اس حقیقت کا احساس ہوا کہ شہزی سمیت ہمارا امریکا وزٹ ویزا ممکن ہے کہ اول تو مسترد کر دیا جائے گا، کیونکہ آج کل نائن الیون کی وجہ سے امریکی ویزا پالیسی مسلمانوں، بالخصوص پاکستانیوں کے لیے ناممکن حد تک مشکل ہے، دوسری بات میرے ذہن میں یہ آئی تھی کہ اس طرح اگر وزٹ ویزا مل بھی جاتا ہے تو ہماری، بالخصوص شہزی کی اصل شناخت ظاہر ہو جاتی، جبکہ میں اس مہم کو خفیہ رکھنا چاہتی ہوں، لہٰذا میں نے امیگریشن اینڈ ویزا کنسلٹنٹ سے بات کرنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور اس کے متبادل کسی اور راستے پر غور کرنے لگی تو میرے ذہن میں ایک شخص زور آور خان کا نام آیا۔ وہ کسی ریکروٹنگ اینڈ ٹریولنگ ایجنسی سے وابستہ رہ چکا ہے۔ جعلی کام بھی جینوئن طریقے سے کرتا ہے، اس کا پروسس بھی شارٹ ہے، راستوں کی آسانی بھی خود ہی بتاتا ہے۔ بس، شرط یہ ہے کہ اُسے اصل قصہ کچھ بتانا پڑتا ہے، جو وہ راز میں ہی رکھتا ہے، کیونکہ اُسے کسی کے رازوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ ہاں! پیسے وہ منہ مانگے مانگتا ہے، پر اس کے کام میں پرفیکشن ہے۔ اگر تم لوگوں کو یہ تجویز پسند ہے تو مجھے بتا دو میں اس سے رابطہ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کروں گی، بلکہ اُسے اِدھر ہی بلوا لوں گی۔''

زہرہ بانو اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔ سب میری طرف دیکھنے لگے، جبکہ میرے پاس سوچنے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا۔

''اگر ایسا کوئی آدمی ہے جو مجھے ایک بار امریکا پہنچا دے تو پھر کیا مسئلہ ہے۔ آگے میں جانوں اور میرا کام......''

''اوخیر...... کاکے! تُو تو ایک دم دیوانوں جیسی باتیں کرنے لگا......'' اول خیر میری طرف دیکھ کر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ''یہ تو کشتیاں جلا کے آگ کے ایک ایسے سمندر میں کودنے کے مترادف ہوگا جہاں واپسی کا راستہ تو درکنار راستے ہی میں خدانخواستہ ڈوب جانے کا پورا پورا خطرہ موجود رہے گا۔''

''خطرناک کام میں خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہے۔'' زہرہ بانو نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ''اور پھر شہزی اکیلا کب ہوگا؟ ہم سب اس کے ساتھ ہوں گے۔''

''یہ ناممکن ہے، کہ سب ہی اس خطرناک مشن میں کمربستہ ہو جائیں۔'' میں نے فوراً زہرہ بانو کی بات رد کر دی۔ ''ابھی صرف میرے اکیلے کا ہی امریکا جانا مناسب اور نسبتاً زیادہ آسان ہوگا......'' میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھ کر کہا۔

''زہرہ! تم آج ہی زور آور خان کو اِدھر بلوا لو......

اس سے بات تو کر کے دیکھ لیں۔"

"لیکن اس سے بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ ڈیسائڈ کر لینا چاہیے کہ اس سے کتنے آدمیوں کی روانگی کی بات کی جائے؟" زہرہ بولی تو کبیل دادا بولا۔

"بیگم صاحبہ! میرا خیال ہے کہ شہزی صحیح کہہ رہا ہے۔ یہاں بھی تو کسی کو رہنا ہوگا، اسی لیے سب کا جانا مناسب نہ ہو گا اور اس طرح کام بننے میں بھی تاخیر ہو سکتی ہے، صرف میں شہزی کے ساتھ امریکا جاؤں گا۔"

"نہیں کبیل دادا!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر انکار میں سر ہلایا۔ "تمہارا یہاں موجود رہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ بیگم صاحبہ کو تمہاری ضرورت ہوگی، انہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ پھر ماں جی اور اباجی بھی ہیں۔ دشمن گھات میں اور مات دینے کی تاک میں ہیں۔ میرے ساتھ ابھی کوئی نہیں جائے گا۔ میرے اکیلے جانے کے سلسلے کے کام میں تاخیر بھی نہیں ہوگی اور میں آزادی سے اپنا کام بھی کر سکوں گا۔ یہی میرا حتمی فیصلہ ہے۔" اس کے بعد میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا اور اس سے مخاطب ہو کے بولا۔

"زہرہ! میں تمہارا مشکور ہوں کہ تم نے عابدہ اور میرے متعلق اس طرح نیک نیتی اور پورے خلوص کے ساتھ سوچا۔ ایک احسان اور کر دو...... میرا جلد سے جلد امریکا جانے کا بندوبست کر دو...... بس! ایک بار میں امریکا پہنچ جاؤں...... عابدہ کے ساتھ ہی انشاء اللہ لوٹ کے آؤں گا۔" میرے لہجے کا استحکام میری پُرجوش آواز سے مترشح ہوتا تھا مگر میری بات پر سب پریشان ہو گئے۔ تب ہی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔

"شہزی! یہ سرحد پار انڈیا کا معاملہ نہیں ہے کہ ایک پاؤں ادھر پڑا اور اپنے ملک میں آ گئے۔ یہ سات سمندر پار یک اور براعظم جانے کا معاملہ ہے اور ملک بھی کیسا جہاں نہارے خلاف پہلے ہی باسکل ہولارڈ، ٹائیگر ٹیگ (سی آئی ے)، اور اسپیکٹرم اور لولوڈش جیسے خطرناک بین الاقوامی من دانت نکوسے بیٹھے ہیں۔ انہیں پورا یقین ہوگا کہ تم عابدہ لو چھڑانے کے لیے کوئی ایسا قدم ضرور اُٹھاؤ گے...... اس لیے بہتر ہوگا کہ تم کم از کم مجھے اور اول خیر کو اپنے ساتھ ضرور لے جاؤ۔"

"اسی لیے تو میں کہہ رہا ہوں کہ ایسے دور دراز ملک ں، صرف میرا جانا ہی زیادہ محفوظ اور مناسب رہے گا۔ اس رح کی مہمات میں اکثر ساتھی بھی پیروں کی زنجیر بن جایا رتے ہیں، تم سب میری اور عابدہ کی کامیابی کی دعا مانگتے رہنا...... اور بس، یہی میرے لیے تمہاری مدد بہت ہوگی۔" میں نے کہا۔

میرے فیصلے سے سب کے چہرے اُتر سے گئے، بالخصوص اول خیر اُداس ہو گیا بلکہ اس کا منہ بن گیا تھا۔

"چنگی یاریاں نبھایاں تو یارا......! بھلا تیرے بغیر میرا دل یہاں کیسے لگے گا۔ یہ بھی سوچا تو نے...... کاکے!" ایک تنہا موقع پر اس نے مجھ سے گلے شکوے شروع کر دیے اور من بھر کا بوتھا سُجا لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے اسے گلے سے لگایا اور بولا۔ "یار! تو بھی جھلّا ہے بالکل...... سمجھتا نہیں ہے۔ میں اکیلا اس اہم مشن میں بہت ہلکا محسوس کروں گا، اور یہ مشن ہے بھی اسی کا متقاضی، پھر تم سب یہاں ہو گے تو مجھے بھی تسلی رہے گی، اگر خدانخواستہ میں وہاں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو تم سب لوگ ہو ناں، کیا میری مدد نہیں کرو گے......؟"

"او خیر...... کاکے! ابھی تو اتنا سیانا نہیں ہوا ہے کہ یاروں کو بہلا لے......" اول خیر اسی سوجے ہوئے منہ سے بولا۔

"مجھے پتا تھا تم اِدھر ہی ہو گے...... شہزی کی منتیں کرنے کے لیے...... بڑا شوق ہے ناں تمہیں گوریاں دیکھنے کا......"

میں اور اول خیر دونوں ہی اس آواز پر چونکے تھے، پلٹ کر دیکھا تو شکیلہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اول خیر کو اس کی طرف سے "چوٹ" پڑی تو وہ منہ بنا کر بولا۔

"دخل در معقولات کی معذرت کیے بغیر یوں اندر چلے آنا خلافِ آداب ہوتا ہے محترمہ! اور خیر سے تمہیں اخلاقیات تو چھو کر بھی نہیں گزریں...... تو اب کیا کہا جائے۔"

چڑنے کے بجائے شکیلہ نے یوں اپنا منہ ہونٹوں تلے دبایا تھا جیسے ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کی ہو، یہ بھی دوسرے کو چڑانے کا ایک انداز تھا۔ یہی سبب تھا کہ اول خیر کی برہمی کم نہیں ہوئی اور وہ دوبارہ بولا۔

"اور...... یہ آپ کیا فرما رہی ہو کہ میں شہزی کے ساتھ محض امریکا گوریاں دیکھنے جا رہا ہوں...... شرم آتی ہے مجھے تمہاری اس لغو گوئی پر...... اطلاعاً بتا دوں کہ امریکا گوریوں کا نہیں کالیوں کا ملک ہے۔"

"وہاں گوریاں بھی ہیں اور گورے بھی......" شکیلہ فوراً بولی۔

"تمہارے جیسی گوریاں ہوں گی، باہر سے سفید اندر

سے کالی۔‘‘ اول خیر کہاں چپ رہنے والا تھا۔

’’آؤ شکیلہ! بیٹھو....‘‘ میں نے بڑی مشکل سے سنجیدگی کی آڑ میں اپنی ہنسی کو چھپانے کی کوشش چاہی تھی، ورنہ اول خیر ہمیشہ کی طرح شکیلہ کو سر چڑھانے کا الزام میرے سر تھوپ دیتا۔

’’شکریہ شہزی!‘‘ شکیلہ مسکرائی اور ہمارے قریب ایک صوفے پر براجمان ہوگئی۔

’’اب تم ہی اِسے سمجھاؤ، بچوں کی طرح ضد کررہا ہے میرے ساتھ جانے کے لیے۔‘‘ بالآخر میں نے شکیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

’’او خیر...... کاکے! اب ہمارے بارے میں اس کم عقل سے مشورہ لیا جائے گا۔‘‘ اول خیر نے منہ بنایا مگر میں نے دیکھا اس بار شکیلہ بھی ذرا متانت سے بولی۔

’’شہزی! میرا ابھی یہی خیال ہے کہ تمہیں اکیلے نہیں جانا چاہیے۔ کم از کم تم اول خیر اور مجھے ہی اپنے ساتھ رکھ لیتے۔ آخر کو ہم نے بھی تمہارے ساتھ ہی کمانڈو ٹریننگ لے رکھی ہے پھر یہ مشن بھی اہم ہے۔ کیا تمہیں ہماری کارکردگی پر کوئی شبہ ہے؟‘‘

شکیلہ کو یہ بات کرتے دیکھ کر اول خیر کو بھی سنجیدہ ہونا پڑا۔

میری امریکا روانگی سے متعلق میرے جاں نثار ساتھیوں کی سوئیاں ابھی تک اسی بات پر اٹکی ہوئی تھیں کہ مجھے اکیلے اتنے بڑے اور اہم مشن پر امریکا جیسی سرزمین پر قدم نہیں رکھنا چاہیے۔

بڑی بحث کے بعد بالآخر میں انہیں اس وعدے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا کہ...... مجھے جیسے ہی کسی ساتھی اور مدد کی ضرورت پڑے گی، میں سب سے پہلے اول خیر اور شکیلہ کو ہی بلاؤں گا۔ زہرہ بانو کے کان میں یہ بات پڑی تو اس کا پہلا مشورہ یہی تھا کہ وہ زور آور خان سے مزید دو افراد کی متوقع روانگی کے سلسلے میں بھی بات کرے گی۔ میرے ساتھیوں نے دوسرا وعدہ مجھ سے یہ لیا تھا کہ میں مناسب موقع پر اپنی خیریت سے بھی مطلع کرتا رہوں گا۔

دو روز آرام اور اسی بحث میں لگ گئے تھے، جبکہ مجھے یہاں میجر وسیم کی نصیحت کے مطابق رینجرز فورس کے ملتان کروپس (corps) ہیڈ کوارٹر جا کر لیفٹیننٹ کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ یہ میجر ریاض کی جگہ تعینات کیے گئے تھے اور انہی کی سرکردگی میں بیگم ولا میں ریڈ لگایا گیا تھا اور زہرہ بانو سے سختی کے ساتھ ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی تھی، لیکن جب زہرہ بانو نے انہیں اصل حقیقت اور میجر ریاض کے حوالوں کے ساتھ انہیں آگاہ کیا تھا تو ان کی جان چھوٹی تھی۔ نوشابہ کی ایک حد تک انہیں ہمارے خلاف گمراہ کرنے کی سازش تو کامیاب رہی تھی، مگر یہ زیادہ دیر نہ چل سکی تھی۔ تاہم اس نے پریس کانفرنس میں ہمارے بارے میں بہت کچھ غلط کہا تھا۔ اور اخبارات نے بھی اس کی باتوں کو اچھالا تھا۔

یہ اخباری تراشے زہرہ بانو نے ایک رجسٹر میں چسپاں کرکے بہ طور ریکارڈ محفوظ کر رکھے تھے۔ یہ تراشے اور اخبارات، ان پر کالم نویسوں کے تجزیے میرے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے تھے۔ میں اب کہہ سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیسا ’’اسٹینڈ‘‘ لینا تھا۔

امریکا جانے سے پہلے پہلے میں بیگم ولا کو خطرہ پروف بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس کے لیے میں نے دشمنوں کو اسی کے ہر ہتھیار سے جواب دینے کا سوچا۔ اگلے دن ہی بیگم ولا میں ایک پریس کانفرنس کر ڈالی۔

وہاں میں نے علی الاعلان طلسم نور ہیرے کا انکشاف اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کی کوششوں کا بھی ذکر کردیا اور ساتھ ہی اخلاقی طور پر اس کا کریڈٹ مرحوم ہشام چھلکری کے سر کرنے کا بھی باضابطہ طور پر اعلان کیا۔ اس کے بعد میں نے آخر میں چوہدری ممتاز اور بالخصوص نوشابہ کے سابقہ بیانات کے حوالے سے بھی بات کی اور ساتھ ہی دشمنوں اور بالخصوص نوشابہ کو دھمکانے اور بے چین کرنے کی غرض سے اپنے ان عزائم کا بھی ذکر کر ڈالا کہ چوہدری ممتاز خان کسی طور پر بھی رہائی اور ضمانت کا مستحق نہیں۔ اُسے ایک خطرناک بھارتی جاسوس سندرداس سکینہ کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بلکہ قانون نافذ کرنے والے ایک فعال ادارے نے میرے ساتھ اُسے ایک کمبائنڈ آپریشن میں رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا۔ وزیر جان کا بھی ذکر ہوا، میجر ریاض کا بھی بعض مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کر ڈالا۔ تاہم اس میں، میں نے بلیو تلسی اور انڈیمان مہمات کا کوئی ذکر نہ کیا بجز اس کے کہ اشارتی زبان کا ہی سہارا لے کر یہ بتانے کی کوشش ضرور چاہی کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے کس طرح یہ مہم جان پر کھیل کر سر کی تھی۔ اگر نوشابہ...... نے اپنی گزشتہ کانفرنس میں، میرے، زہرہ بانو، بیگم ولا اور میرے باپ کے خلاف ہرزہ سرائی نہ کی ہوتی تو میں کبھی یہ جوابی کانفرنس نہ کرتا مگر اب یہ ضروری ہوگیا تھا۔

بہر کیف میری یہ دھواں دھار پریس کانفرنس خاصی

نتیجہ خیز رہی۔ اس پریس کانفرنس کا فیصلہ میں نے اچانک اور مذکورہ اخباری تراشوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا تھا۔

یوں اب اس کے بعد مجھے کرنل راجہ انور سے بھی ملاقات کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

سب سے پہلا فون میرے پاس خان جی کا آیا تھا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

''برخوردار! میری تو آنکھیں چندھیا گئیں تمہارے انتظار میں...... ابھی ٹی وی پر تمہاری پریس کانفرنس دیکھی تو دل خوش ہو گیا۔ تم نے آتے ہی دشمنوں کے دانت کھٹے کرنا شروع کر دیے۔ تم سے کیسے ملا جائے؟''

وہ خاصے پُرجوش تھے۔ میں نے کہا۔ ''خان صاحب......''

''اُونہہ...... نو خان صاحب! میں تمہیں برخوردار کہہ رہا ہوں تم......'' اُنہوں نے میری بات کاٹی۔ ''صرف انکل کہو......''

''جی انکل! آپ کی محبت ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے کہیں ضروری کام سے منظرنامے سے غائب تھا۔''

''یہ سب جان چکے ہیں، تمہاری پریس کانفرنس میں اس کا ذکر آچکا ہے، مجھے صرف یہ بتاؤ تم سے ملا کب اور کیسے جائے؟''

''میں انشاء اللہ بہت جلد آپ کے پاس خود ہی حاضر ہو جاؤں گا۔''

''وعدہ......؟''

''وعدہ۔''

''جیتے رہو، میں بے چینی سے تمہارا منتظر رہوں گا۔''

چند دنوں بعد بین الاقوامی نمائش میں باضابطہ سرکاری طور پر طلسم نور ہیرے کا ذکر کر دیا گیا۔ یہ نمائش اسلام آباد میں ہوئی تھی اور مجھے خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔

اس کے بعد...... بیگم ولا، بیگم صاحبہ اور میری ملک گیر شہرت نے اسے ملکی احترام کا درجہ عطا کر دیا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ بیگم ولا اور ہماری ایسی ساکھ قائم ہو جائے جس کے بعد کسی کو ہم پر پروپیگنڈا کرنے کی جرأت تک نہ ہو سکے۔

میرے اس عمل سے زہرہ بانو بہت زیادہ مطمئن اور خوش ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس نے میری ذہنی فراست اور چابک دستی کی داد بھی دی۔

''شہزی! تم ایک دم پرفیکٹ آدمی ہو...... کس وقت کیا کرنا اور بعد میں کس کام کو طول دینا ہے، اس میں تو تم گویا ید طولیٰ رکھتے ہو۔'' میں کیا جواب دیتا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

☆☆☆

زورآور خان...... زہرہ بانو کی ایک ہی ٹیلی فونک کال پہ بیگم ولا آ گیا تھا۔

وہ ایک عمر رسیدہ اور چرب زبان آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا اور جسم فربہی مائل تھا۔ منہ میں پان کی گلوری دبی ہوئی تھی، تھیلا نما پتلون اور اسی طرح کی ٹیکنی کلر شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ آدھا سر گنجا تھا اور باقی نصف پر جو بال تھے وہ ازراہِ زحمت ہی نظر آتے تھے۔ یعنی اُڑے اُڑے اور خشک سے۔ اس کی بائیں کلائی پر سنہری گھڑی تھی جو خاصی قیمتی نظر آتی تھی۔ گلے میں طلائی چین تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر تھا، گاڑی کی چابیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔

اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا تھا اور ہم سب ہی وہاں موجود تھے۔ چائے وغیرہ کی ٹرالی درمیان میں سجی تھی اور وہ بسکٹ اور نمکو چبانے کے بعد چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

بظاہر تو مجھے اسے دیکھ کر ایسا ہی نظر آتا تھا کہ خود اس نے مشکل سے ہی کراچی کا سمندر دیکھا ہوگا نجانے دوسروں کو کس طرح اس نے سات سمندر پار لگایا ہوگا۔

زہرہ بانو نے اس دوران میں اسے میری ''ٹرم اینڈ کنڈیشن'' کے طور پر بتا دیا تھا کہ میں نہ تو مستقل طور پر امریکا رہائش اختیار کرنے کے مقصد سے جا رہا تھا نہ ہی گھومنے پھرنے کے لیے...... بس ایک ضروری کام نمٹانا تھا اور کسی کو تلاش کر کے اسے لے کر واپس لوٹنا تھا۔

''ہا...... ہاہا......'' اس نے یہ سب سننے کے بعد اپنے حلق سے ایک بے ہنگم سا قہقہہ اُگلا۔

''سیدھی طرح کہو ناں بیگم صاحبہ! مال کھپانا ہے اور ڈالر جیب میں رکھ کے لوٹ آنا ہے۔''

''تمہارا خیال ہے ہم تمہیں اسمگلر نظر آتے ہیں؟'' زہرہ بانو نے اسے گھورا...... تو وہ ایک دم خفیف سا ہو گیا پھر کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

''آپ تو سنجیدہ ہو گئیں بیگم صاحبہ! میں تو مذاق کر رہا تھا، ویسے کھیپی کو اسمگلر نہیں کہتے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، اب تم ذرا سنجیدہ ہو جاؤ تو کام کی بات کر لی جائے۔'' زہرہ بانو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ وہ خاصا منسوڑ تھا اور زہرہ بانو کا منہ چڑھا بھی۔ نجانے زہرہ بانو نے ایسے اور کتنے عجوبے اپنی پٹاری میں بند کر

رکھے تھے۔

چائے ختم کرنے کے بعد وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے مستفسر ہوا۔ ''کتنے دانے پار لگانے ہیں؟''

''تین۔'' زہرہ بانو نے بتایا اور میں چونکا مگر چپ رہا۔ اول خیر وغیرہ بھی ضرور زہرہ بانو کے اس جواب پر چونکے ہوں گے۔

''لگ جائیں گے۔''

''کام محفوظ اور خفیہ طریقے سے ہونا چاہیے۔''

''یہ کام ہے ہی ایسا کہ اسی طرح کیا جائے۔'' اس نے کہا اور سگریٹ کا ایک اور کش لگا کر چٹکی بجائی۔ وہ سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر پینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

''آدمی کم یا زیادہ بھی ہوسکتے ہیں مگر ویزا کم از کم سال سے چھ ماہ کا ہونا چاہیے۔'' زہرہ بانو نے کہا اور کچھ سمجھ کر میرے حلق سے ایک ہلکی سی ہمکاری خارج ہوئی تھی۔

''سال بہت ہے، چھ ماہ کا ویزا حاصل کرنے میں بہت وقت لگ جائے گا، ترنت کام چاہیے تو تین ماہ......'' وہ ٹھیٹ لین دین والے لہجے میں بولا۔

''تین ماہ تو بہت کم ہیں......'' زہرہ بانو نے قدرے تفکر سے دیکھا۔

''ارے بیگم صاحبہ! تین ماہ کا بھی مل جائے تو ڈھول نفیریاں بجانا۔ کیا سمجھتی ہو، امریکا کا ویزا اور تین ماہ، یہاں تو لوگ کہتے ہیں کہ پندرہ دن کا بھی مل جائے تو بہت ہے، بس ایک بار باہر نکل جائیں، آگے سو بہانے مل جاتے ہیں پاؤں ٹکانے کے......''

''ہم ایسا کچھ نہیں کرنے جارہے ہیں۔'' زہرہ بانو نے کہا۔ ''ہمیں جانا ہے اور اپنا کام نمٹا کر لوٹ آنا ہے اور بس......''

''فی دانہ...... پچیس لاکھ ہوگا، تین آدمی مانو، پچھتر لاکھ، بیچ کا خرچہ بھی تمہارے ذمے...... آدھی رقم ایڈوانس لوں گا، باقی یہاں سے فلائی کرتے ہی......'' وہ فوراً اپنے مقصد کی بات پر آگیا۔

''فی آدمی پچیس لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔'' زہرہ بانو نے کہا۔ ''یہ تو تم اُن لوگوں کا ریٹ بتارہے ہو، جنہوں نے واپس لوٹنا ہی نہیں ہوتا۔''

''لوٹ آؤ یا وہیں رہو، اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔'' وہ سگریٹ دبی مٹھی کا سوٹا بھرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! پھر فی دانہ پانچ لاکھ دے دو اور تینوں کو کنٹینر میں ڈال کر روانہ کردوں گا، پندرہ لاکھ، کام پکا۔''

کنٹینر کے ذکر پر مجھے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔ کیونکہ پرانے اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسی اندوہناک خبر بھی میری نظروں سے گزری تھی کہ ایک ایجنٹ کے ذریعے کچھ لوگ کنٹینر کے ذریعے بیرونِ ملک سپلائی کیے گئے تھے مگر بدقسمتی سے راستے ہی میں حبسِ دم کا شکار ہوکر بڑی بے بسی اور اذیت ناک موت کا شکار ہوگئے تھے۔

''ہرگز نہیں......'' زہرہ بانو نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا۔ ''پیسے تمہیں پورے مل جائیں گے مگر کام پکا ہونا چاہیے...... پلان کیا ہوگا تمہارا......؟''

''اب کی ناں آپ نے سمجھداری والی بات۔'' وہ چہک کر بولا۔ ''آپ سے میری... جمعہ جمعہ آٹھ دن کی واقف کاری تو نہیں ہے ناں...... بیگم صاحبہ! میرے پلان کا بھی آپ کو اندازہ ہے اور کام کا بھی...... بڑے سچل طریقے سے کام کرتا ہوں...... سنو گی تو چہک اُٹھو گی۔ اب بتاؤ، ان میں سے کون سے وہ دانے ہیں، جنہیں پار لگانا ہے تو پھر میں آپ کو اپنا پلان بتاتا ہوں......'' کہتے ہوئے وہ ہماری طرف باری باری گھورنے لگا۔

اس کا لہجہ مجھے ہی نہیں اول خیر وغیرہ کے لیے بھی سخت ذہنی کوفت کا باعث بن رہا تھا، مگر اس کی عادت اور اپنی مجبوری جان کر ہم برداشت کرنے پر مجبور تھے۔

''یہ تینوں ہیں۔'' زہرہ بانو نے شکیلہ، اول خیر اور میری طرف اشارہ کیا۔

وہ ہماری طرف تھوڑی دیر تک گھورتا رہا پھر مسکرا دیا۔ ہم سنجیدہ ہی رہے۔

وہ پھر زہرہ بانو سے مخاطب ہوکر بولا۔

''تو پھر ڈن......؟''

''پلان بتاؤ......؟''

اس نے جواباً ایک لمبی سانس کھینچی، سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔ اس کے بعد بولا۔ ''ان تینوں کا گیٹ اَپ چینج کرنا پڑے گا۔ میرے پاس تین جینوئن افراد کے پاسپورٹ اور ویزے تیار ہیں مگر وہ تینوں بھارتی نژاد ہندو ہیں۔ دو میاں بیوی اور ایک...... فلاپ شدہ اداکار ہوگا۔ وہ تنہا تھائی لینڈ کے راستے نکلے گا، اور ہالی وڈ قسمت آزمائی کے لیے جائے گا۔ چاہے کیسا ہی رول مل جائے۔ جبکہ میاں بیوی دبئی کے راستے روانہ ہوں گے، اپنے ایک عزیز کی اسپانسر شپ پر جو سان ڈیاگو کی ایک ساحلی بستی کے کنارے آباد ہیں۔ اب آپ بتائیں، کیا زیادہ ہیں فی دانہ پچیس لاکھ بیگم صاحبہ؟ بالکل تیار اور سمجھو تو طے شدہ کام ہے۔''

اس کے منصوبے کو چند لفظوں میں سن کر ایک لمحے کو میں خود بھی متحیر رہ گیا۔ آدمی مجھے واقعی چلتا پُرزہ لگا تھا۔

''آج کل کے حالات کا تو آپ سب کو علم ہوگا ہی کہ نائن الیون کے بعد امریکا کو ایک آسیب کھا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی ویزا پالیسی کس قدر مشکل کر دی گئی ہے، مسلم تو ایک طرف، پاکستانی تک کے ذکر پر ہی...... سو طرح کے آبجیکشن لگا کر کیس ریجیکٹ کر دیا جاتا ہے۔ میں نے ان ساری باتوں کو دیکھ کر ہی منصوبہ پلان کیا ہے، یعنی جعل سازی کی آڑ میں جینوئن کام...... اور جینوئن کام بھی کیسا......''

وہ چٹکی بجا کر راکھ جھاڑتے ہوئے آگے بولا۔ ''یہ تینوں مذکورہ افراد مر چکے ہیں، مگر ان کا نہ کوئی ڈیتھ سرٹیفکیٹ ہے نہ ہی کوئی اور ایسی دستاویز یا ثبوت......''

''لیکن...... بھیس بھرنے کا یہ عمل پکڑوا سکتا ہے۔'' میں نے اعتراض اُٹھایا۔ ''اسکیننگ ہوسکتی ہے ہمارے چہروں کی......''

''ارے بھائی! میں کیا تمہارے چہروں پہ...... عورتوں یا بیوٹی پالروں والا میک اَپ کروں گا......'' زور آور خان ہنس کر بولا۔ ''اس کام میں، میں اکیلا نہیں ہوں...... میرے ساتھ ہر قسم کے ایکسپرٹیز کی پوری ٹیم موجود ہے، پورا ٹیم ورک ہوتا ہے ہمارا...... اسی لیے تو یہ کہانی ہزاروں کے بجائے لاکھوں پر ہوتی ہے...... ڈاکٹرز، پلاسٹک سرجن، دیگر ماہرین...... اور بولو...... ہاں! یہ میک اَپ جتنا جاندار ہوگا اُتنا ہی ناپائیدار بھی...... جو سچی بات تھی، میں نے کہہ دی۔''

میں نے بھویں سکیڑ لیں۔ زہرہ بانو نے بھی چونک کر پوچھا۔

''کیا مطلب......؟''

''صاف بات ہے، میک اَپ اپنا کام ایک محدود حد تک کرے گا، اس کے بعد یہ خود ہی صاف ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ ماسک اور فیشل میک اَپ ہوگا۔ سپر فیشل......''

''گویا یہ میک اَپ چند دنوں بعد خود ہی صاف ہو جائے گا؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

''لیکن...... تم اسی شکل اور نام کے ساتھ دوبارہ ریڈی میڈ میک اَپ کر سکتے ہو...... تب تک تم امریکا کی سرزمین میں قدم رکھ چکے ہوگے، پھر کیا پروا ہوگی...... آگے تمہارا مسئلہ ہے...... میرا کام تم تینوں کو وہاں پہنچا دینا ہے۔ اب تم یہ کہو کہ وہاں دال روٹی کا بھی میں ہی بندوبست کروں تو یہ ناممکن ہے۔''

میں اور زہرہ بانو، سوچتی نگاہوں سے ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے۔

ہمیں ایک پُرسوچ سی اُلجھن آمیز سوچ میں نگاہیں ملاتے دیکھ کر زور آور خان ایک قہقہہ لگا کر بولا۔ ''ہر کام میں رسک تو ہوتا ہی ہے، کوئی کام پرفیکٹ نہیں ہوتا دنیا میں، تمہیں چیک کرنے والے بھی پرفیکٹ نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آج کل سخت چیکنگ صرف مسلم اور پاکستانی مسلم کے کھاتے میں ڈالی جارہی ہے، عام لوگ اس سے مبرّا ہیں...... بالخصوص انڈین ہندو...... اور تم تینوں ہندوؤں کے بھیس میں جاؤ گے تمہیں تمہارے جعلی ہندو نام بھی بتا دیے جائیں گے...... بس! اب اس سے زیادہ میں تمہیں مطمئن نہیں کر سکتا، سودا پھینکو اور بات آگے بڑھے......'' وہ آخر میں ٹھیٹ کاروباری لہجے میں بول کر چپ ہوگیا۔

اس کی بات میں کافی وزن تھا۔

''ہم......'' زہرہ بانو نے ایک خیال انگیز سی ہمکاری خارج کی اور اسی انداز میں میری طرف ایک ذرا نگاہ سے دیکھا تھا۔ پھر زور آور خان سے مخاطب ہو کر بولی۔

''تمہیں کب تک فائنل جواب چاہیے؟'' زور آور نے اپنی گولڈن کلر کی رسٹ واچ میں وقت دیکھا اور بولا۔

''ابھی چھ بج رہے ہیں...... یہ شام اور رات کافی ہے سوچنے کے لیے، صبح تک مجھے ڈن کر کے بتا دو...... تاکہ میں کل سے ہی کام کی ابتدا کروں، اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی اس لیے نصف ایڈوانس رقم آپ کے فائنل جواب کے ساتھ مجھے چاہیے......'' اس نے پکّے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے...... کل صبح تک تمہیں فائنل جواب کے ساتھ رقم کا چیک بھی مل جائے گا۔''

''سوری بیگم صاحبہ! چیک نہیں، ڈائریکٹ کیش چلے گا......'' اس نے شہادت کی اُنگلی کو اسی ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن ایک دم اتنی رقم...... بینک والے......'' زہرہ بیگم کچھ کہتے کہتے رک گئی، پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے، منیجر سے میری واقفیت تو ہے، ممکن ہے کام ہو جائے۔''

''کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ دو ایک روز اُوپر نیچے ہو سکتے ہیں۔'' زور آور بولا۔

اس کے بعد وہ رخصت ہوگیا۔

''دی دی...... یہ دونوں کب میرے ساتھ جا رہے

ہیں......؟'' میں نے گویا چھوٹتے ہی زہرہ بانو سے کہا۔ میرے چہرے پر حیرت آمیز پریشانی کے آثار تھے جبکہ شکیلہ اور اول خیر خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے، خود میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ زہرہ بانو...... کیا واقعی...... ان دونوں کو بھی میرے ساتھ روانگی کے لیے تیار کرنا چاہتی تھی یا یونہی اس نے کہہ دیا تھا۔

''شہزی! تمہاری یہی بحث تھی ناں کہ ایک آدمی کا کام نسبتاً آسان اور اس سے زائد کا مشکل ہوسکتا ہے، دیکھ لو......تم تینوں کا کام پکا ہے۔''

''مگر......'' میں نے کہنا چاہا۔

''دیکھو شہزی......'' زہرہ بانو نے فوراً میری بات کاٹ دی۔ ''میں نے اور کپیل دادا نے ہی بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ......اگر تینوں کا کام آسان ہورہا ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں......اول خیر اور شکیلہ تمہارے ٹریننگ پارٹنر بھی رہ چکے ہیں......تم تینوں کمانڈو ایجنٹ ہو......امریکا میں تم عابدہ کا کوئی قانونی یا عدالتی کیس لڑنے نہیں بلکہ فائٹ کرنے جارہے ہو...... وہ بھی عام لوگوں سے نہیں...... سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر ٹیک ٹو'' سے فائٹ لڑنے......کورکوران کی جیل، بین الاقوامی دشمنوں کی کچھار میں گھس کر تمہیں ان سے نبردآزما ہونا بھی پڑے گا۔ تنہا اتنا بڑا رسک غیر دانشمندانہ اقدام ہوگا، جس میں ناکامی کی صورت میں...... عابدہ کی جان اور اس کے تحفظات کو مزید خطرات لاحق ہوجائیں گے......'' وہ ایک ثانیے کے لیے سانس لینے کو رکی پھر دوبارہ بولی۔

''پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ تمہارے جاتے ہی، خاموشی سے اول خیر اور شکیلہ کو بھی بھیج دوں......جس طرح میں نے تمہاری انڈیا والی مہم میں کیا تھا، مگر اس بار بات اور تھی......پلیز......شہزی! یہ ضروری ہے......وہ سیانے کہتے ہیں ناں کہ ایک سے دو بھلے......''

میں نے سر جھکا دیا۔ اول خیر نے خوشی سے نعرہ بلند کیا تھا۔ شکیلہ بھی خوش تھی۔

زہرہ بانو میرا امزاج اور طبیعت کو سمجھنے لگی تھی۔ میں جو کہتا یا جس بات پر اڑ جاتا، وہ بظاہر اثبات میں اپنا سر ہلا کر خاموش ہوجاتی تھی مگر کرتی وہی تھی جو اس کی مرضی اور میرے مفاد میں ہوتا تھا۔ نجانے پھر کیا ہوتا کہ میں بھی انکار نہیں کرپاتا تھا۔

زورآور خان کو صبح تک بتا دیا گیا تو اس نے کچھ طبع شدہ فارم بھجوادیے جنہیں ہم تینوں نے ضروری خانہ پُری کر کے اس کے آدمی کو دے کر روانہ کردیے جو ساتھ لایا تھا۔ اس نے دو سے چار ہفتوں کا وقت مانگا تھا۔ کام تیار ہونے کے باوجود یہ ایک بڑا عرصہ تھا مگر ہم کیا کرسکتے تھے، سوائے انتظار کے۔

اگلے روز میں، شکیلہ اور اول خیر، کرنل ریاض کی رہائش گاہ پہنچے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک دم خوش ہوگئے اور بڑے پُرتپاک انداز میں ملے۔ وہ عام سی گھریلو شلوار قمیص پہنے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ واقعی مکمل طور پر ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں ایک آرام دہ اور خوب صورت نشست گاہ میں بٹھایا، ان کا وہ بیٹا بھی ہم سے ملا تھا جو اَب ماشاء اللہ کافی بڑا ہوگیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا، جسے میں نے دشمنوں کے نرغے سے ایک بڑے پرائیویٹ اسپتال میں حملے کے بعد اپنی جان پہ کھیل کر بچایا تھا۔ ان کی بیگم بھی ہم سے ملیں۔

ریاض صاحب نے سب سے پہلے تو میری پریس کانفرنس اور مجھے ملنے والے ملکی اعزاز کے بارے میں توصیفی کلمات سے نوازا۔ اس کے بعد مجھ سے بھارتی مہم جوئی اور بلیو ٹلسی کے خاتمے وغیرہ کے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں انڈیمان تک سارے سنسنی خیز حالات و واقعات بتا دیے۔ جسے سن کر وہ بہت حیران اور ششدر ہوئے۔

''کاش! شہزی! میں تمہیں پاک آرمی میں کوئی اچھا اور بڑا عہدہ دلوادیتا۔ آرمی میں ایسے عہدے موجود ہیں جو محض اس طرح کی کارکردگی کی بنیاد پر بھی آنریری تفویض کردیے جاتے ہیں۔'' اُنہوں نے کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

''جی ہاں! میری اور میرے ان دونوں ساتھیوں کی پاور ایجنٹ کی حیثیت سے شمولیت اس کی مثال ہے۔'' میرا اشارہ اول خیر اور شکیلہ کی طرف تھا۔

''کاش! یہ ڈراپ نہ ہوتی۔'' اُنہوں نے ایک حسرت زدہ سی سانس خارج کی۔

''مجھے عہدے کا کوئی لالچ نہیں سر!'' میں نے کہا۔ ''میں اب بھی خود کو وطنِ عزیز کا ایک ادنیٰ سپاہی سمجھتا ہوں......''

''آخر ایک گمنام سرفروش سپاہی کے بیٹے جو ہوئے۔'' وہ مسکرا کر بولے۔ ان کے لہجے میں فخر تھا۔ میں بھی مسکرا دیا۔

''سر! آپ سے چوہدری ممتاز کے بارے میں دریافت کرنا تھا۔'' بالآخر میں اصل موضوع کی طرف آتے

ہوئے بولا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے رہائی کیسے مل گئی۔“

”مجھے تم سے اسی سوال کی توقع تھی۔“ وہ خفیف سی مسکراہٹ سے بولے۔

”سر! آپ خود اندازہ لگائیں، ہم سب نے اپنی جانیں جوکھم میں ڈال کر اسے گرفت میں لیا تھا جبکہ وزیر جان کے کامیاب فرار پر مجھے آج بھی افسوس ہوتا ہے۔ تو یہ سب کیسے ہوگیا؟“

”بالکل اسی طرح برخوردار! جیسے پاور جیسے ونگ کو مصلحتاً ختم کرنا پڑا۔“

”میں سمجھا نہیں سر! وہ تو ایک دوسرا معاملہ تھا۔ ہم اسے خفیہ نہ رکھ سکے تھے اور اس ونگ کی بنیاد ہی اسی پر تھی جو قائم نہ رہ پائی اور......“ میں ..... دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ کر فوراً بعد دوبارہ بولا۔ ”......چوہدری ممتاز والا معاملہ اور تھا۔ وہ رنگے ہاتھوں......“

”شہزی!“ ریاض صاحب نے میری بات کاٹی اور میں خاموش ہوکر ان کا چہرہ تکنے لگا۔

”گندی مکھی جب بھی گندگی پر بیٹھتی ہے تو اپنا ایک پَر بچا کے بیٹھتی ہے۔ اسی طرح ممتاز خان جیسے سیاست دان کرتے ہیں، وہ چاہے جتنا بھی گندگی میں لتھڑ جائیں، اپنا ایک پہلو ہمیشہ بچا کر رکھتے ہیں اور وہ ہوتا ہے ان کا دوسرا چہرہ...... جو سامنے ہوتا ہے، ہمارے آگے نہیں، اپنی اس عوام کے آگے جنہیں یہ بے وقوف بناتے ہیں اور پھر انہی کے کاندھوں پر بندوق رکھ کے گولی چلاتے ہیں۔ ان کے سامنے مظلوم بنتے ہیں، دوہائیاں دیتے ہیں، فریادیں کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح ووٹ لینے کے لیے بلند و بانگ دعوے کرتے ہیں، بڑے بڑے ملکی مسائل کو حکومت میں آنے کے بعد ہفتوں میں بلکہ چٹکیوں میں حل کرنے کے سنہری باغ دکھاتے ہیں۔ یہ بے وقوف عوام صرف اتنا سوچ لیا کریں کہ...... چوہدری ممتاز خان جیسے سیاسی اور فصلی بٹیرے، کتنی بار حکومتوں میں آئے، ان کے ذاتی اثاثے کہاں سے کہاں جا پہنچے لیکن ملک کے لیے انہوں نے کیا کیا......؟ ان کے اثاثوں کا گراف تو ہر دور میں اُوپر جاتا رہا مگر ملک کی ترقی کا گراف مسلسل نیچے آتا رہا، کیا کرتے رہے یہ ملک و قوم اور اس کی عوام کے لیے؟ کہ آج عام طبقہ پانی اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں تک سے محروم ہے۔ مگر افسوس کہ یہی لوگ انہیں بچاتے ہیں۔ اپنی عوامی طاقت کو ایک غلط آدمی کے تحفظ اور اسے بچانے کے لیے صرف کرتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے جتنی بھی عدالتیں بن جائیں، احتسابی کمیٹیاں قائم کردی جائیں، تحقیقی اور تفتیشی جوڈیشنل اکیڈمیاں بن جائیں، حد تو یہ کہ انہیں سزا بھی مل جائے مگر اصل احتساب وہی ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے ملک کی لوٹی ہوئی دولت بھی واپس لینی چاہیے۔ بس! سمجھو یہی معاملہ چوہدری ممتاز کے ساتھ روا رکھا گیا...... تاہم اس کی رہائی مشروط اور کچھ قدغنوں پر رکھی گئی ہے کہ وہ اپنی پارٹی سے پندرہ سال تک علیحدہ اور ہر طرح سے غیر فعال رہے گا اور کسی بھی حوالے سے کہیں بھی اس کا نام تک نہیں آئے گا۔“

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوگئے۔ میں نے کہا۔ ”وزیر جان کے سلسلے میں کیا حکمتِ عملی جوڑی گئی تھی؟“

”ایک اشتہاری مجرم کی تلاش......“

”کیا اسے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی؟“

”ہاں! جب تک میں اپنے عہدے پر رہا، میں نے اس کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔ انہی دنوں مجھے کچھ ایسے شواہد ملے تھے کہ وہ ملک سے فرار ہوچکا ہے۔“

”آپ کی ریٹائرمنٹ ایڈمنسٹریشن گراؤنڈ میں کی گئی تھی یا جبری تھی......؟“ میں نے پوچھا۔ وہ میرے سوال پر ہولے سے مسکرا دیے۔

”مجھے تم سے اس سوال کی پوری اُمید تھی۔ بس! جانے دو اس بات کو...... منہ کھلے گا تو بہت کچھ کھل جائے گا۔ یہاں پھر وہی مصلحت کوشی کی بات آجاتی ہے کہ ایسی کڑوی گولیاں نگلنی پڑتی ہے۔“

”لیکن...... میں وزیر جان کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اسپیکٹرم کا ایک زونل چیف ہے۔ مقامی سطح پر وہ اسپیکٹرم کو پھر سے فعال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہی نوشابہ کی پشت پناہی اور اسے ہر طرح سے سپورٹ کر رہا ہے۔ چہرہ بدل گیا ہے، باقی سب وہی چل رہا ہے سر......! مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔“ مجھے ایک دم جوش سا آگیا۔

”میں اب بھی ایک پاور ایجنٹ ہوں...... اور کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر ایسے ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی کرتا رہوں گا...... چاہے پردۂ زنگاری کے پیچھے ہی سہی......“

ریاض صاحب میری طرف معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔

”اب کہاں کا ارادہ ہے؟“ اول خیر نے پوچھا۔ وہ کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔ شکیلہ عقبی سیٹ پر

براجمان تھی۔

''نیلی کوٹھی چلو......'' میں نے کہا۔

''او خیر......'' وہ زیرِلب بولا اور کار آگے بڑھا دی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''کیا ہوا......؟ جاں ورکھنا اور نیلی یاد آ گئے......؟''

''او خیر...... کا کے! بڑا سیانا ہے، بندے کے چہرے کے تاثرات بھانپ لینا خوب جانتا ہے۔'' وہ بولا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کسرِ نفسی سے کہا۔ ''خان جی کا جب بھی ذکر آئے تو یہ دونوں کردار از خود ذہنوں میں آتے رہیں گے۔'' میں نے کہا اور پھر دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میرا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''اول خیر......! گاڑی موڑ لو......'' میرے اچانک یہ کہنے پر وہ ذرا گڑبڑا گیا پھر بولا۔

''او خیر...... کا کے! کیا ہوا......؟ ارادہ بدل لیا خان جی کے ہاں جانے کا......؟''

''فی الحال تم عارفہ کی رہائش گاہ کی طرف چلو......''

''ہم......'' اول خیر کے منہ سے نکلا اور اس نے اسٹیئرنگ موڑ کر راستہ بدل دیا۔

دن خوب چڑھا ہوا اور گرم تھا۔ کار میں اے سی لگا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہماری کار عارفہ کی رہائش گاہ کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اول خیر کو ہدایت کی تھی وہ کار گیٹ کے بالکل قریب لے جا کر روک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا، میرا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ کار رکتے ہی، اندر بنے گارڈ کیبن کے چوکور خانے سے کسی نے کار کو اتنا قریب رکتے دیکھا اور فوراً ماؤزر ہاتھ میں تھامے گیٹ کے بغلی دروازے سے باہر نکلا۔ اس کے فوراً بعد اسی طرح کا دوسرا گن بردار بھی باہر برآمد ہوا۔ دونوں ہٹے کٹے ''دربان'' تھے اور میرے لیے نئے تھے۔

''اوئے...... یہ کیا حرکت ہے؟ گاڑی اتنے قریب گیٹ کے کیوں روک دی ہے......؟ پیچھے کرو......؟'' وہ کوئی بدتمیز سا گارڈ تھا۔ یا پھر اسے کچھ زیادہ ہی ''بااختیار'' رہنے کا حکم ملا ہوا تھا۔

''او خیر......'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اس ناہنجار اور بدتمیز گارڈ سے تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا تم ہر آنے جانے والے مہمان سے اسی طرح پیش آتے ہو؟''

''مہمان گیا بھاڑ میں......'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

''پہلے اپنی گاڑی پیچھے کرو اور پھر کار سے نیچے اُتر کر بات کرو......'' میں نے ایک سرد نظر اس پر ڈالی۔ اس کا دوسرا ساتھی اس کے پیچھے نہایت محتاط انداز میں کھڑا ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل بیرل گن تھی۔

میں نے اول خیر کو کار تھوڑا پیچھے سرکانے کا اشارہ کیا۔ اس نے ریورس گیئر ڈالا اور کار چند گز پیچھے ہو گئی۔

''اور...... پیچھے کرو......'' وہ بدتمیز سا گارڈ پھر کڑک دار لہجے میں بولا۔ میں تب تک بھنائے ہوئے انداز میں کار کا دروازہ کھول کر باہر اُتر آیا اور اس تنومند گارڈ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''بس! اب بہت ہو گیا...... جتنی تمہاری اوقات ہے اُتنا ہی پھیلو...... اندر میرا ایک بھتیجا اور بھتیجی رہتے ہیں پنکی اور دانی، ان سے کہو تمہارا چاچا آیا ہے......''

میرے جارحانہ انداز اور بارعب لہجے نے اُسے تھوڑا خفیف کر دیا پھر چاچا اور بھتیجے کے ذکر پر بھی وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہوا۔ تاہم اس کی اکڑ پھر بھی کم نہ ہوئی۔ وہ بدستور اسی لہجے میں بولا۔

''اپنا تعارف کرواؤ...... پہلے کبھی تمہیں یہاں نہیں دیکھا گیا ہے......''

''بچوں سے کہو تمہارا شہزی انکل آیا ہے...... وہ دونوں بھاگتے ہوئے یہاں آ جائیں گے۔''

''شہزی......؟'' وہ چونکا۔ میرا نام اس طرح زیرِلب دہرانے پر میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات سے ایسا لگا کہ اسے ''شہزی'' سے متعلق پہلے سے ہی کچھ بریفنگ دی جا چکی تھی۔ کیونکہ میری عقابی نگاہوں نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا تھا کہ یہ دونوں روایتی قسم کے خان ٹائپ ڈنڈا بردار چوکیدار نہیں، بلکہ پروفیشنل گارڈز بھی نہ تھے۔ ان سے مجھے ''کارپردازی'' کی بُو آ رہی تھی۔

میری آبزرویشن درست ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ چند قدم پیچھے ہٹے اور اپنے ماؤزر پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولے۔

''شہزاد احمد خان ہو......؟''

''ہاں......!''

''تب پھر اُلٹے پیروں واپس لوٹ جاؤ......'' اس کا

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

بے وقت موت نمبر نئے عنوان
اور نئی تحریروں کے ساتھ

وہ جو بے وقت موت کا شکار ہوئے، جوانی میں ملک عدم کے راہی بنے۔ نامور لوگوں کی روداد اور کہانیاں، جو اپنی مختصر سی زندگی میں یادگار کام کر گئے۔

وہ جس کے نقش قدم سے چراغ جلتے تھے
جلے چراغ تو خود بن گیا دھواں وہ شخص

ناقابلِ فراموش خاص نمبر جسے مجلد کرا کر آپ رکھیں گے۔

بہت جلد قارئین کی خدمت میں

لہجہ پل کے پل جارحانہ ہو گیا۔ تب تک اول خیر بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر چکا تھا۔ وہ میری طرف سے اشارے کا منتظر تھا۔

”کیوں......؟“ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

”ستار! فوراً پولیس کو مطلع کرو......“

ستار نامی اس کا ساتھی...... پلٹا۔

”اس کی ضرورت نہیں......“ میں نے پل کے پل سوچتے ذہن کے ساتھ کہا۔

”چلو......“ میں نے اول خیر کی طرف دیکھا۔ ستار نامی وہ آدمی بھی جاتے جاتے رک کر پلٹا۔

اگلے چند سیکنڈوں میں ہم دوسری شاہراہ پر تھے۔

”او خیر......! کچھ گڑبڑ لگتی ہے کاکے!“ اول خیر نے کہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم بولا۔

”کسی ایزی لوڈ والے کے پاس کار روکو......“ اول خیر نے ایسا ہی کیا۔

پی سی اوز کا رواج آج کل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ ورنہ گلی گلی میں پی سی او نظر آیا کرتے تھے۔ ایزی لوڈ والوں کے پاس یہ سہولت کبھی کبھار دستیاب ہو جاتی تھی۔

مجھے شبہ تھا کہ میں نے چونکہ بیگم ولا کے لینڈ لائن سے فون کیا تھا اسی لیے کسی نے جان بوجھ کر نہیں اُٹھایا جس کا صاف مطلب تھا کہ اندر ان دونوں بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے ”کار پرداز“ مقرر کیے گئے ہوں گے، جنہیں خاص طور پر میرے سلسلے میں ”بریفنگ“ دی گئی ہو گی۔

ایزی لوڈ والے نے مجھے نمبر ملا کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس الگ تھلگ بات کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ بس، وہیں کاؤنٹر پر کھڑے کھڑے بات کرنا ہوتی تھی۔

دوسری طرف رِنگ جا رہی تھی۔ نمبر اجنبی تھا اور یہی میں چاہتا تھا اسی لیے اُمید تھی کہ کال دوسری جانب سے ضرور ریسیو کی جاتی...... تیسری بیل پر مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔

”ہیلو......“ میرا محتاط ذہن اس کی آواز اور لہجے سے کچھ ”اخذ“ کرنے لگا۔

”ہیلو، مجھے دانی سے بات کرنی ہے۔“

مجھے کچھ ٹھیک اندازہ نہ تھا کہ گیٹ پر موجود اُن دونوں گارڈ نما کار پردازوں نے ابھی میرے بارے میں اندر مطلع کیا تھا یا نہیں۔

”آپ کون ہو؟“ دوسری طرف سے اسی خاتون نے پوچھا۔ لہجہ سرد و سپاٹ تھا۔ یہ سب مجھے باہر سے اندر تک کے کار پرداز ایک ہی ”کلیبر“ کے لگے۔ یعنی ہدایت یافتہ۔

”میں ان کا انکل شہزی بول رہا ہوں......“

”شٹ اَپ! آئندہ فون مت کرنا۔“ خاتون نے [illegible] کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میرا دماغ بھنا گیا۔ جی تو چاہا کہ اسی وقت [illegible] عارفہ کی کوٹھی میں جا [illegible] اور گار سمیت اس بدتمیز خاتون کو سبق سکھا دوں۔

”بھائی صاحب! بات کرلی آپ نے......؟“ مجھے اس طرح خالی فون تھامے دیکھ کر دکاندار نے کہا۔

”جی، جی ہاں! شکریہ بھائی!“ میں نے قدرے چونک کر کہا۔ اسے پیسے دیے اور دکان سے نیچے اُترا، اول خیر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”خان جی کے ہاں چلو......“ میں نے اسے فون والی خاتون کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

”او خیر...... کاکے! یہ بھی کوئی لمبی کھیڈ معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”کھیڈ کیا ہو گی اول خیر......!“ میں نے ایک گہری ہمکاری لیتے ہوئے کہا۔

”عارفہ اپنے دونوں بچوں کو کرائے کے ٹٹو کے حوالے کر گئی ہے۔ انہیں سبق سکھانا کون سی معمولی بات ہے۔“

”او خیر...... کاکے! ذرا ہتھ ہولا رکھ...... ایک آئیڈیا ذہن میں آیا ہے میرے......“ وہ پُرخیال سے لہجے میں بولا۔

”بولو......“

”آج خان جی کے ہاں جانے کا پروگرام ملتوی کر دیتے ہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”پہلے اس حرافہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا جائے اور پتا لگایا جائے آخر اندر وہ کون لوگ ہیں جو دونوں بچوں کے سرپرست بنے بیٹھے ہیں؟“

”کیا فرق پڑے گا اِس سے......؟“ میں نے بے پروا انداز میں کہا۔

”ایک بات کہوں شہزی کاکے! مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے۔“ اول خیر کی بات پر ہی نہیں اس کے لہجے نے بھی جانے کیوں مجھے لحہ بھر کو چونکا دیا۔ پتا نہیں اس کے دل میں کیا آئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اول خیر، شکیلہ کی

طرح ہی کبھی کبھی دور کی کوڑی لاتا تھا۔

”تم ایک فضول مہم جوئی میں وقت برباد کرنے کی بات کر رہے ہو اول خیر......!“ پچھلی سیٹ پر کافی دیر سے خاموش بیٹھی شکیلہ نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”یہ کام بعد میں بھی ہوسکتا ہے اور اتنا ضروری بھی نہیں۔ پہلے ہمیں خان جی سے مل لینا چاہیے۔ ممکن ہے نوشابہ وغیرہ سے متعلق کوئی نئی بات سامنے آئے۔“ اس کا مشورہ بھی غلط نہ تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ مجھے اول خیر کی دال میں کالا ہے والی بات نے شبہے میں ڈال دیا تھا۔

”شکیلہ! اول خیر کی بات نے مجھے واقعی ایک بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب پہلے اسی بات کا کھوج لگاتے ہیں۔“

”یہ خیرا تو ہے ہی ایک بے چین روح......“ شکیلہ نے ہنس کر کہا۔ وہ اسے ’خیرا‘ ہی کہتی تھی، اور اول خیر اسے ’نازکی بیگم‘ یعنی نازک بیگم۔

”جی نازکی بیگم! ایک بے چین روح ہوں تو آپ کیا ہیں محترمہ! ایک چڑیل......“

”چڑیل تو خیر میں نہیں ہوں، تم ایک بدروح ضرور دکھائی دیتے ہو۔“ وہ بولی۔

”اول خیر! گاڑی روک دو......“ میں نے فوراً کہا۔ ہم کوٹھی سے دور آگئے تھے۔ یہاں ایک مختصر سا چوراہا تھا۔ میں نے دونوں سے کہا۔

”ایک کام تم دونوں کے سپرد کر رہا ہوں، بہت توجہ اور ہوشیاری سے انجام دینا ہوگا۔ کوٹھی کی خفیہ نگرانی کرو اس وقت تک جب تک کہ کوئی اندر سے گارڈ کے علاوہ برآمد نہ ہو...... اس کی تصویر اتارنا اور اس کا پیچھا کرنا، مزید اس سلسلے میں جو کر سکو کر کے مجھے بیگم ولا آکر رپورٹ دو......“

”مگر تم......؟“ شکیلہ بولی۔

”میں ٹیکسی لے لوں گا اور خان جی سے ملاقات کر کے بیگم ولا پہنچ رہا ہوں......“

”او خیر......!“

کار سے اُترتے ہی مجھے اول خیر کے ہولے سے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے ایک ٹیکسی کروائی اور اسے مین شاہراہ پر آنے کا کہہ کر جیب سے سیل فون نکالا جو زہرہ بانو نے مجھے عارضی استعمال کے لیے دیا تھا۔ میں نے خان جی سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں مل سکتے ہیں؟ شکر تھا کہ وہ اپنی جاگیر کھلاں والی کے بجائے نیلی کوٹھی میں ہی تھے۔ (مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیلی کو طلاق دینے کے بعد اب اس کوٹھی کا اُنہوں نے کیا نام رکھا تھا)

اُنہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم پارٹی اجلاس کے سلسلے میں نیلی کوٹھی میں مقیم ہیں۔

ڈرائیور تب تک ٹیکسی کو مین شاہراہ پر لے آیا تھا۔ تب ہی میں نے اسے ملتان روڈ پر واقع نیلی کوٹھی کے علاقے کا پتا بتایا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔

قریباً نصف گھنٹے بعد ٹیکسی نے مجھے نیلی کوٹھی کے پاس اُتار دیا۔ میں نے کرایہ دے کر اسے فارغ کیا اور دیکھا کہ کوٹھی کی شان ہی بدلی ہوئی تھی۔ جہاں پہلے نیلی کوٹھی کے الفاظ کندہ ہوتے تھے وہاں اب کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ وہاں خان جی کی تصویر کے ساتھ پارٹی بینرز آویزاں نظر آرہے تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ خان جی پوری شدومد کے ساتھ دوبارہ سیاست میں اپنی انٹری دے چکے تھے اور اپنی سیاسی مہم جوئی کا گڑھ اب شاید مستقل طور پر اسی جگہ کو بنا لیا تھا۔ وہاں مسلح گارڈ کے علاوہ پارٹی ورکرز کی بھی چہل پہل دیکھنے میں آرہی تھی۔ عام انتخابات قریب تھے اور اسی لیے یہ سارا جوش نظر آتا تھا۔

لیکن...... اچانک مجھے چونکنا پڑا...... کچھ دوسرے زاویے سے مجھے چند ایک اور بھی پارٹی بینرز لگے دکھائی دیے جن پر دیگر پارٹی عہدے داروں کی بھی تصاویر نظر آتی تھیں، انہی میں مجھے ایک شناسا چہرہ بھی دکھائی دیا تھا اور مجھے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ میں ذرا اور قریب جا کے بہ غور دیکھنے لگا کہ کہیں یہ میری نظروں کا دھوکا نہ ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا جو میں دیکھ رہا تھا، وہ سچ تھا۔

یہ ایک خاتون کا پُرجوش اور دھواں دھار تقریر کرتا ہوا چہرہ تھا۔ میں اس چہرے کو بھلا کیسے فراموش کرسکتا تھا۔ اس چہرے کے ساتھ تو میری بہت تلخ، بھیانک اور جاں گسل یادیں وابستہ تھیں۔ صرف یادیں ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایک اور ...... مظلوم چہرہ بھی وابستہ تھا، اور اصل حوالہ وہی مظلوم چہرہ تھا۔ وہ بدنصیب آسیہ کا تھا۔ جو ہر سے مجھ سے سوال پوچھتا محسوس ہوتا تھا کہ...... ”شہزی! میں ظلم و جبر کی تاریک بھیانک راتوں میں بڑی بیدردی کے ساتھ روندھ دی گئی، مار دی گئی...... اور میرا قاتل چوہدری ممتاز ابھی تک زندہ ہے، اور...... تم بھی زندہ ہو......“ بس! فقط یہی ایک سوال ہوتا اس بدنصیب کے نظر آنے والے چہرے پر۔

جس خاتون کی تصویر میں نے بینر پر دیکھی تھی، وہ آسیہ کی باجی یعنی اس کی بڑی بہن ایڈووکیٹ خانم شاہ کی

تھی۔

''ہمم...... تو گویا اس نے خان جی کی پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ہے۔'' میں دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا۔ جس پر مجھے حیرت تھی اور اتنی ہی اُلجھن بھی کہ خانم شاہ کی تو ماضی میں خان صاحب سے اچھی خاصی مخاصمت چلی آرہی تھی بلکہ وہ تو اس کے آدمیوں کے ہاتھوں شدید زخمی ہو کر اسپتال بھی جا پہنچی تھی۔ اس لڑائی کی وجہ بھی اگرچہ میں ہی تھا جب خانم شاہ اپنے مفاد کی خاطر مجھے پولیس کو رضا کارانہ گرفتاری کے لیے بہ ضد تھی مگر خان جی اور میں نے اس کی تجویز ٹھکرا دی تھی۔ وہ بھی اپنی ہٹ پر قائم تھی اور اس نے دھمکی دے ڈالی تھی وہ پولیس کو بتا دے گی کہ میں خان جی کی رہائش گاہ پر چھپا بیٹھا ہوں جس پر خان جی تپ گئے تھے اور یوں خانم شاہ لڑائی میں زخمی ہو گئی تھی تب بھی میں نے ہی اس کی جان بچائی تھی۔ مگر...... اب اسے خان جی کی پارٹی میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے دیکھ کر مجھے شدید حیرت آمیز اُلجھن ہوئی تھی۔ ایک ہی جواب اس کا میرے ذہن میں آتا تھا کہ کیا...... خانم شاہ اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے...... کسی سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کو محسوس کر رہی تھی؟

مجھے گیٹ پر ہی شناخت کے لیے روک لیا گیا تو میں نے خان جی کے پرسنل نمبر پر اُن سے رابطہ کر کے اپنے بارے میں بتایا تو انہوں نے فوراً ہی اندر سے اپنا کوئی خاص بندہ باہر بھیج دیا۔ اسے دیکھ کر گارڈ فوراً دائیں بائیں ہٹ گئے۔ وہ بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے ملا اور اندر لے گیا۔

ایک طرف پارٹی ورکرز کے لیے کھانے وغیرہ کا بندوبست کیا جا رہا تھا جہاں عارضی چولہے بنا کر دیگیں چڑھا رکھی تھیں۔ مجھے لانے والا ایک دبلا پتلا مگر خاصا پُرجوش سا میری ہی عمر کا ایک گورا چٹا خوبرو نوجوان تھا۔ جس نے مجھے اپنا نام فرید بتایا تھا۔ وہ مجھے اندر ایک آرام دہ کمرے میں لے آیا۔ میں اس کمرے کو پہچانتا تھا، یہ نشست گاہ سے ملحقہ کمرا تھا۔ اس طرف سے مجھے لوگوں کے شور اور باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ خان جی نے مجھے اس کمرے میں کیوں بٹھایا تھا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک درمیانی عمر کا شخص ٹرالی دھکیلے اندر داخل ہوا۔ مجھے صرف چائے کی طلب ہو رہی تھی اسی لیے میں نے اس سے یہی فرمائش کر ڈالی، اس نے چائے بنا کر ایک نفیس کپ میں نہایت احترام کے سا
مجھے تھما دی۔ یہ وہ کمرا تھا جہاں خان جی اپنے خاص مہمانو
سے ہی ملاقات کرتے تھے۔ اسی اثنا میں فرید مسکراتا
داخل ہوا۔

''شہزی صاحب! خان جی ابھی تھوڑی دیر م
تشریف لاتے ہیں، آپ جب تک چائے پییں۔''

''شکریہ۔'' میں نے مختصراً کہا۔ وہ لوٹ گیا۔ چا
ختم کر لی میں نے تو خان جی بھی آگئے۔ میں انہیں دیکھ
ایک دم کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھے پہلے سے خاصے کمزور نظر آر
تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو پھیلائے میر
طرف بڑھے اور میں ان کی طرف...... ایک گرمجوش معانق
ہمارے درمیان ہوا تھا جس کا دورانیہ کئی منٹوں تک رہا تھا
مجھے اپنے ساتھ لگا ان کا وجود ایک جذباتی سے ارتعاش
محسوس ہوتا رہا تھا۔

''کہاں چلے گئے تھے یار...... تم......؟ کتنا انتظار
مجھے تمہارا...... بیٹھو......'' وہ مجھ سے الگ ہو کے میر
دونوں بازوؤں کو تھام کر محبت سے بولے۔ میں جب
بھی اسے اپنے ساتھ اس طرح کے پیار بھرے جوش
انداز میں ملتے دیکھتا تھا تو مجھے اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ و
کبھی ایک جوان بیٹے کا باپ ہوا کرتا تھا۔ شفقت راجہ ک
اندوہناک قتل کے بعد یہ میرا جانی دشمن بن گیا تھا مگر آفری
ہے اس شخص پر کہ اس نے انتقام میں اندھا اور جوش جذبات سے کام لینے کے بجائے ہوش و حواس سے جلد ہی
پتا چلا لیا تھا کہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی، اس کے بیٹے کا قات
میں نہیں بلکہ چوہدری ممتاز اور اس کے حواری تھے۔ تب اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اس وقت کے بعد سے وہ مجھے اپنا ہی سمجھنے لگے تھے۔

''میں نے تمہاری پریس کانفرنس سنی اور دیکھی تھی۔ بہت بڑے کارنامے انجام دے کر آئے ہو تم...... خاص کر طلسم نور ہیرا...... اور نوشابہ اور اس کے باپ چوہدری ممتاز کے خلاف اور اسے دوبارہ سزا تلے لانے کا عزم...... وا
بھئی واہ...... دل خوش کر دیا۔ اُن دونوں باپ بیٹی...کو تو بے چینی کھا گئی ہو گی......''

ان کی بات پر میں مسکرا کر رہ گیا۔

''ارے تم نے کچھ کھایا ہی نہیں......؟'' وہ چونک کر بولے۔

''بس! چائے کا ہی دل چاہا تھا، مجھے ذرا جلدی بھی

ہے، بس! ابھی آپ کو سلام کرنے آیا تھا، پھر کبھی تفصیلی ملاقات ہوگی......“ میں نے رخصت ہونے والے انداز میں کہا تو وہ پریشان سے ہوگئے، بولے۔

”ارے...... رے...... نہیں بھئی، تم اب کچھ روز اِدھر ہی رہو گے...... دیکھ نہیں رہے ہو...... کیسی ہنگامہ خیزی پال رکھی ہے میں نے...... کیسے کیسے لوگ میری پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے لگے ہیں...... سیاست میں یہی ہوتا ہے، کسی کی مخالفت میں کسی کا فائدہ...... سمجھو تو یہی فائدہ ہم اُٹھا رہے ہیں...... ہمیں سپورٹ بھی ہے......“ آخر میں اُنہوں نے مجھے معنی خیز انداز میں آنکھ ماری تھی اور میں تھوڑا چونکے بنا نہ رہ سکا۔ ذہن میں ہنوز خانم شاہ کا نام گردش کررہا تھا۔

”میں تو تمہیں بھی اپنی پارٹی میں ایک بڑا عہدہ دے کر شامل کرنا چاہتا ہوں...... تمہاری انٹری بڑی دبنگ اور دشمنوں کی نیندیں اُڑا دینے کے لیے کافی ہوگی اور اگلے الیکشن میں ہماری جیت یقینی کی ضمانت بھی......“

نجانے کیا بات تھی آج زبیر خان المعروف خان جی مجھے اور ہی روپ میں نظر آرہے تھے۔ آخر انہیں کس کی سپورٹ حاصل ہوگئی تھی؟ یہ اتنے پُراُمید اور پُرجوش کیوں تھے؟ میری اور چوہدری ممتاز بہ شمول اس کی بیٹی نوشابہ کی دشمنی سے یہ کس قسم کا فائدہ اُٹھانے کی سوچ ہوئے تھے؟ میں ایک دم محتاط ہوگیا اور بولا۔

”خان صاحب!“

”اُونہہ...... تو خان صاحب! کتنی بار کہا ہے، مجھے صرف انکل کہو......“ وہ ہنسے۔

”معافی چاہتا ہوں، انکل! میں سیاست بازی سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں، یہ میرے قبیل میں ہے نہ ہی بس میں......“ میں نے جواب دیتے ہوئے فوراً موضوع بدلا اور خانم شاہ کا ذکر کر ڈالا۔ وہ ہنسے۔

”تو تم نے اس کی باہر بینر پر لگی تصویر دیکھ ہی لی...... اس نے حال ہی میں ہماری پارٹی جوائن کی ہے......“

”بہت اچھی بات ہے......“ میں نے کہا۔ ”لیکن...... حیرت ہوئی...... خانم شاہ تو آپ کو اپنے دشمنوں کی قطار میں سمجھتی آرہی تھی اور آپ پر کیس کرنے کی تیاری میں تھی۔“

”اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوگیا تھا۔“

”اچھی بات ہے، خوشی ہوئی یہ سن کر......“ میں نے لے سے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کے موڈ میں نہیں تھے مگر میں پھر کبھی آنے کا وعدہ کرکے لوٹ آیا۔ انہیں حیرت تھی کہ میں ٹیکسی میں آیا تھا۔ دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئے تو انہیں یہ پتا چلا تھا۔

”کمال ہے، کیا زہرہ بیگم کے پاس گاڑیوں کی کمی ہو گئی ہے؟“

”ایسی بات نہیں، انکل!“ میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ کچھ ساتھی تھے، انہیں اچانک کسی ضروری کام سے جانا پڑ گیا، گاڑی وہ لے گئے تھے، میں ٹیکسی میں آگیا۔“

خان جی نے اپنی گاڑی ڈرائیور سمیت مجھے دے دی مگر میں نے معذرت کرلی۔

”کیا بات ہے، بہت غیریت برتنے لگے ہو......“ وہ شکایتی لہجے میں بولے۔ میں مسکرایا اور رسان سے بولا۔

”ایسی بات تو نہیں انکل! دراصل مجھے دو ایک اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔ بلاوجہ فکر رہے گی، ٹیکسی کرا دیں یہی بہت ہے۔“

اُنہوں نے ٹیکسی کروا دی اور ڈبل کرایہ ٹیکسی والے کو دے دیا کہ میں اسے جہاں کہوں وہ مجھے چھوڑ دے۔ میں ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا اور ان سے رخصت ہو کے چلا آیا۔

میری توقع کے خلاف خان جی سے ملاقات بہت مختصر رہی۔ شاید ایک وجہ تو یہی تھی کہ وہ اپنی انتخابی مہم میں مصروف تھے اور میں نے بھی ان کا زیادہ وقت لینا مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہوں نے مجھے کچھ خاص باتیں نہیں بتائی تھیں جن کی میں توقع کیے ہوئے تھا۔ ان کی ناتج میں سب

خالہ

خاتون گود میں بچہ لیے فارمیسی میں آئیں۔ وہ بچّے کا وزن کرنا چاہتی تھیں۔ سیلز مین نے بتایا کہ بچوں کا وزن کرنے کی مشین مرمت کے لیے گئی ہوئی ہے۔ بڑی مشین پر ماں اور بچے کا وزن کرکے اس میں صرف ماں کا وزن گھٹا دیا جائے تو آسانی سے بچے کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

خاتون نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”بے کار ہے...... کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ میں بچے کی ماں نہیں، خالہ ہوں۔“

کراچی سے میمونہ عزیز کا عذر

کچھ وہی تھا جو میں بھی جانتا تھا، جبکہ ایڈووکیٹ خانم شاہ کی ان کی پارٹی میں شمولیت نے مجھے جانے کیوں ایک نامعلوم سی اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ خان جی نے کسی ''سپورٹر'' کا ذکر کیا تھا اور اس بارے میں خود میں بھی تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مجھے یہ بات بری لگی تھی کہ خان جی نے میرے استفسار کے باوجود مجھے اس کا نام بتانے سے گریز کیا تھا۔ وہ آخر اپنے سپورٹر کا نام مجھ سے کیوں مخفی رکھنا چاہتے تھے؟ کم از کم مجھے تو بتا دینا ہی چاہیے تھا جبکہ ہم نے پہلے کبھی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

پتا نہیں اب یہاں کون سی نئی کھچڑی پکنے لگی تھی، میں اپنے ذہن کو زیادہ اُلجھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کس وقت میرا امریکا روانگی کا پروانہ جاری ہونے والا تھا۔ میں کسی نئے پھڈے میں ٹانگ اڑانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کم از کم خان جی کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ میں نے اول خیر اور شکیلہ کے متعلق اندازہ قائم کرنا چاہا کہ انہوں نے اب تک اپنے حصے کا کتنا کام نمٹایا ہوگا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ وہاں سے کوئی خاص پیش رفت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ مجھے انہیں عارفہ کی کوٹھی کے قریب چھوڑے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو عارفہ کی کوٹھی کے علاقے کا نام بتا دیا۔ اس نے رفتار بڑھا دی۔

آدھے گھنٹے بعد میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ ٹیکسی والے کو میں نے روانہ کر دیا اور خود مٹر گشت کے انداز میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے ان دونوں کو کار سمیت چھوڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرانی ہوئی کہ کار سمیت دونوں ہی وہاں سے غائب تھے جس کا صاف مطلب تھا انہوں نے یقیناً عارفہ کی کوٹھی سے کسی مشکوک شخص کو نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ ضرور ان کے تعاقب میں گئے ہوں گے، لہٰذا اب وہ اپنا ''کام'' نمٹانے کے بعد سیدھا بیگم ولا کا ہی رخ کریں گے۔

میرا اب یہاں کھڑے رہنے کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔ میں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار مجھے نظر آئی، اس کا رخ عارفہ کی رہائش کی طرف جانے والے راستے پر ہی تھا جو یہاں سے زیادہ دور نہ تھی۔ اس میں دو افراد سوار تھے۔ میری عقابی نظروں نے فوراً انہیں تاڑنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی ہنڈا سٹی تھی۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اندر شاید اے سی آن تھا۔ ایک تو ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر میں کوئی سوٹ پوش شخص بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بھاری اور چہر پر گھنی مونچھیں تھیں، رنگ سانولا تھا، میرے لیے دونوں کی صورتیں اجنبی تھیں۔ کار ایک موڑ پر غائب ہو چکی تھ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس طرف کو گیا تو میرا اند درست ثابت ہوا۔ کار عارفہ کی کوٹھی کے گیٹ سے اندر دا ہو رہی تھی۔ میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہ گیا کہ یہ دو افراد ک تھے؟ آخر عارفہ کی کوٹھی میں...... اس کی غیر موجودگی میں گل کھلایا جا رہا تھا؟ مجھے نامعلوم سے تجسس نے بے چین دیا اور میں نے سردست بیگم ولا جانے کا ارادہ ملتوی کر د

مجھے جانے کیوں دانی اور پنکی کی فکر لاحق ہونے تھی۔ دانی اور پنکی سے میرا رشتہ بڑا جذباتی تھا۔ وہ دونو بھی مجھ سے ایسا ہی لگاؤ رکھتے تھے۔ جبکہ سرمد بابا (منظور وڑائچ) کے الفاظ بھی مجھے یاد تھے کہ ''شہزی میرے ان دونوں بچوں (پوتے پوتی) کا خیال رکھنا ج تک عارفہ جیسی ناگن اور نوید سانچے والا جیسا سانپ ز ہے یہ انہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں.... اور میں نے سرمد بابا سے وعدہ کیا تھا۔

یہ تو خیر حقیقت ہی تھی کہ عارفہ کبھی اپنے بچوں کا نہیں سوچے گی مگر نوید سانچے والا ایک زہریلا سانپ تھا۔ قول سرمد بابا مرحوم کہ، وہ بدبخت ان کی بیوہ بہو عارف بہکائے ہوئے تھا اور وہ اس کے بہکاوے میں آئی ہو تھی۔ جبکہ تنہائی کی ماری ہوئی عارفہ کی آنکھوں پر جذباتیت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مکار نوید اس کی ا کمزوری سے کھیل رہا تھا۔

کار اندر داخل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اب کیا کروں......؟ بالآخر میرے اندر کی بے چ نے مجھے دھکیلا کہ چاہے کچھ بھی ہو...... اندر جا کر دیک چاہیے کہ یہ سارا معاملہ کیا تھا؟ آخر عارفہ اپنے دونوں ٹی ایجز بچوں کو کن لوگوں کے حوالے کر کے اپنے نئے شوہر ساتھ بیرون ملک ہنی مون کے لیے گئی تھی؟

یہ تہیہ کرنے کے بعد میں ابھی اپنی پیش قدمی کا جائز لے ہی رہا تھا کہ اچانک میں چونکا۔ گیٹ سے وہی کا دوبارہ برآمد ہو رہی تھی۔ اتنی جلدی اس کی واپسی کی مجھ توقع نہ تھی، میں ایک اور بنگلے کی دیوار کے سرے پر کھڑ تھا۔ پوش علاقہ ہونے کے باعث اطراف میں سناٹا پھیلا ہو تھا۔ کار میں وہی ڈرائیور تھا جبکہ اس کے برابر والی سیٹ خالی تھی جہاں میں نے اس سوٹ پوش موچھیل کو براجمان دیکھ تھا۔ البتہ عقبی سیٹ پر میں پنکی کو بیٹھے دیکھ کر بری طرح چونکا۔

’’یہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟‘‘ ایک دم میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں سوالیہ نشان اُبھرا۔ میں بے چین ہو گیا۔ کار مین شاہراہ کی طرف جا رہی تھی، میں راستہ کاٹ کر دوڑا...... اور ایک ٹیکسی والے سے بات کر کے اسے ایک متوقع راستے پر پہنچنے کا کہا۔ وہ حیران اور پریشان ہوا کہ نجانے یہ کیا معاملہ تھا، مگر میں نے اپنا کارڈ شو کر کے اس سے کہہ دیا کہ میں خفیہ پولیس کا مخبر ہوں، وہ بے فکر رہے اسے منہ مانگا کرایہ ملے گا۔ وہ بھی کوئی من موجی سا آدمی تھا، بولا۔

’’او جی...... سیدھا کرایہ ہی مل جائے، یہی بہت ہے۔‘‘ وہ شاید پولیس والوں سے نالاں نظر آتا تھا۔

’’ملے گا...... چلو۔‘‘ میں نے فوراً کہا اور اسی وقت متوقع راستے پر میں نے اسی ہنڈا کار کو نمودار ہوتے دیکھا۔

’’وہ دیکھو، سیاہ ہنڈا...... اسی کا بڑی ہوشیاری سے عاقب کرنا ہے جہاں یہ رکے وہاں ذرا فاصلے سے مجھے بھی تار دینا، پھر تم فارغ......‘‘ میں نے اس سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کار مین روڈ پر آ کر فراٹے بھرنے لگی۔ روڈ میں ریفک بھی تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اس کار کو کھو نہ ے مگر وہ بھی ہوشیار آدمی تھا۔ ہنڈا کا تعاقب کرتا رہا۔ یک دو بار تو کار نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی مگر ڈرائیور نے سے جلد ہی جا لیا تھا۔ یہ سفر کم و بیش پندرہ سے بیس منٹ اری رہا اور جب میں نے دیکھا کہ کار ایک کوچنگ سینٹر کے سامنے رک گئی ہے تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ گویا لی کی کوچنگ کی کلاس تھی۔ میں نے ٹیکسی روکنے کا کہا اور رائیور کا شکریے کے ساتھ کرایہ ادا کر کے اسے چلتا کر دیا۔ ہاں اور بھی گاڑیاں موجود تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا رہا۔ لی کار سے اُتری۔ اس کے کاندھے پر شولڈر بیگ تھا۔ وہ در چلی گئی تو کار حرکت میں آ گئی۔ جب وہ نظروں سے جھل ہو گئی تو میں آگے بڑھا اور کوچنگ سینٹر میں داخل ہو لیا۔ یہ خاصا مہنگا اور مشہور کوچنگ سینٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس ں عمارت بڑی اور جدید اسٹائل کی بنی تھی۔

ایڈمنسٹریشن کے کمرے میں پہنچ کر میں نے سعدیہ سے ملنے کی درخواست کی۔ پہلے تو مجھ سے میرا نام اور پنکی سعدیہ) سے میرا تعلق پوچھا گیا۔ پھر کہا گیا کہ ہم اسے لاع دے دیں گے۔ اگر اس نے آپ کو پہچان لیا تو ٹھیک ہے ورنہ...... آپ جا سکتے ہیں۔

وہ پرنسپل یا منتظم ٹائپ کا کوئی شخص نظر آتا تھا۔ تاہم ں نے آخر میں یہ کہا تھا کہ ابھی تو کلاس ہو رہی ہے، ایک گھنٹے بعد بریک ہو گی تو دیکھا جائے گا۔

مجھے منتظم کا رویہ کچھ روکھا سا محسوس ہوا۔ وہ ایک بھاری جسامت کا عمر رسیدہ شخص تھا۔ کرخت مزاج بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے کمرے سے باہر جانے کا کہا کہ آپ باہر کہیں کھڑے ہو کر انتظار کر لیں۔ مجھے غصہ تو آیا مگر میں پی گیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل کر باہر جانے کے بجائے دائیں جانب بنے کوریڈور کی طرف گھوم گیا، یہاں ٹھنڈے پانی کے واٹر ڈسپنسر رکھے تھے، میں بظاہر پانی پینے کے بہانے اس طرف مڑا تھا مگر مقصد میرا اس کھڑکی کے قریب آنا تھا جو منتظم کے کمرے میں کھلتی تھی۔ جس کا نظارہ میں اندر سے کر چکا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کے رویے نے چونکا دیا تھا۔ کچھ شبہے کی بُو مجھے آئی تھی یا کوئی ایسی کھٹک جاگی تھی کہ یہ مجھے اپنے کمرے سے اس طرح روانہ کرنے کے بعد کیا کرتا ہے؟

’’ہیلو، باہر ایک لمبا چوڑا اور اسمارٹ سا نوجوان کھڑا ملے گا تمہیں...... جس نے سیاہ جینز اور میرون کلر کی چست پینٹ پہن رکھی ہے۔ اس پر نظر رکھنا۔‘‘ میں نے کھڑکی کے قریب سرک کر اس کی باتیں سنیں اور مجھے سانپ سونگھ گیا۔

’’ہاں...... ہاں! ابھی نظر آ جائے گا، ابھی تو میں نے روانہ کیا ہے اسے اپنے کمرے سے......‘‘ منتظم بولا۔ اس کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ کیا۔

’’ہیلو، ہاں، راٹھور صاحب! ابھی ابھی ایک مشکوک سا شخص سعدیہ سے ملنے کے لیے آیا ہے۔ اپنا نام صرف شہزاد ہی بتایا ہے۔ مگر میں نے اسے نہیں ملنے دیا ہے ابھی تک...... جی ٹھیک ہے آپ آ جائیے، مگر خیال رکھیے گا کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہو...... آپ کی ہدایت تھی اسی لیے آپ کو اطلاع کر دی...... ساکھ کا معاملہ ہے یہ...... جی جی! بہت بہت شکریہ...... آپ کی مہربانی ہے۔‘‘

اس کی باچھیں پھیلتی دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کسی راٹھور نامی شخص نے اسے پنکی سے متعلق محتاط کر رکھا تھا اور اس میں یقیناً اس نے انعام کا بھی لالچ رکھا ہو گا۔ گویا میری بھنک کوٹھی سے نکل کر چار دانگ پھیل گئی تھی۔ راٹھور نامی شخص کون ہو سکتا تھا؟ غالباً یہ نوید یا عارفہ کا ہی رکھا ہوا آدمی ہو گا۔ جو دونوں بچوں کی نگرانی پر مامور کیا گیا ہو گا۔ مگر کیوں......؟ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ انہیں یہ قدم اُٹھانا پڑا۔ ایک اور خیال ذہن میں آتا تھا کہ کیا خبر یہ عارفہ کے بجائے صرف سیٹھ نوید سانچے والا کی ہی کارستانی ہو مگر کیوں......؟ اس کیوں کا جواب خاصا اسرار بھرا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے اس راٹھور نامی شخص کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش چاہی، کہیں یہ وہی سوٹ بوٹ اور موچھیل سا شخص تو نہ تھا جسے اسی کار میں، میں نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا؟

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر جلدی سے پانی پینے کے لیے ایک واٹر ڈسپنسر کی طرف بڑھا۔ کیونکہ میں نے وہاں ایک نیلی وردی والے چوکیدار کو دیکھا تھا جو اسی طرف آرہا تھا۔ وہ مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر ایک طرف بڑھ گیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، سمجھ نہیں آرہا تھا مجھے اب کیا کرنا چاہیے، یہاں بھی دال گلتی نظر نہیں آرہی تھی۔ تب ہی میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا اور پلٹ کر تیزی سے زینے چڑھتا چلا گیا، جہاں کلاس روم کے طور پر مستعمل کئی کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں اب ایک ایک کمرے میں کھڑکی کے راستے جھانکنے لگا۔ کلاس ہو رہی تھی۔ میں اسی طرح کسی کی نظروں میں آئے بغیر ایک ایک کلاس میں جھانکتا رہا اور دفعتاً چونکا۔ کھڑکی سے دو بینچیں چھوڑ کر میں نے پنکی کو بیٹھے دیکھ لیا۔ وہ ڈیسک ٹیبل پر جھکی کچھ لکھنے میں محو تھی۔ لیکچر ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار سر اُٹھا کر سامنے دیکھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف منہ لے جا کر ہولے سے اسے آواز دی۔ چند ایک اسٹوڈنٹس نے میری طرف دیکھ کر منہ بنایا۔ پنکی پہلے تو مجھے پہچان ہی نہ سکی۔ پھر جب پہچانی تو اس کا منہ یکلخت حیرت سے کھلا رہ گیا۔ میں نے اسے کلاس روم سے باہر آنے کا اشارہ کیا اور دور ہٹ گیا۔

مجھے جلدی تھی۔ کسی وقت بھی راٹھور نامی وہ آدمی یہاں پہنچنے والا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ انتظامیہ کا کوئی آدمی بھی یہاں نکل آتا۔

شکر ہوا کہ ذرا ہی دیر میں...... پنکی باہر آگئی۔ وہ بے اختیار ''شہزی انکل'' کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

''شہزی انکل آپ کہاں چلے گئے تھے، میں اور دانی بھائی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''ماما! بہت گندی ہیں، اُنہوں نے ہماری ناراضی کے باوجود اس گندے آدمی سے شادی کر لی ہے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔

میں نے اُسے پیار کیا اور دھیرے سے الگ کر کے بولا۔

''پنکی بیٹا! پریشان مت ہونا، اب میں آگیا ہوں ناں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، میں نے تمہارے گھر آنے کی کوشش بھی کی تھی مگر مجھے نہیں آنے دیا گیا۔''

''مجھے معلوم ہے انکل!'' وہ نمناک آنکھوں سے م چہرہ دیکھتے ہوئے بولی۔

''انکل! ماما اور اس گندے آدمی نوید نے ہمار حفاظت کے نام پر بدمعاش لوگوں کو ہماری نگرانی پر رکھا ہے، یہ بات مجھے اور دانی کو بالکل بھی پسند نہیں۔ دانی تو جو ہے وہ ان سے لڑ بھی پڑتا ہے۔ میں اسے سمجھاتی ہوں، م ان کے منہ لگے لیکن شہزی انکل! مجھے ایک بات پر بڑ تشویش ہے۔'' اس نے آخر میں عجیب سے لہجے میں کہا ج پر میں چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

پنکی مجھے کافی سمجھ دار نظر آرہی تھی۔ وہ اب بچپنے لڑکپن...... میں داخل ہو رہی تھی۔ بالکل ایک پیاری سی اور سم دار ٹین ایجر لڑکی کے روپ میں نظر آرہی تھی۔

''شہزی انکل! بھائی تو نہیں البتہ میں ان لوگوں ک باتیں چھپ کر سنتی رہتی ہوں، چاہتی تھی کہ کاش کوئی ہمار مدد کو آجائے...... آپ تو اس برے وقت میں بہت یاد آ تھے ہمیں...... مگر میں نے یہ بات دانی بھیا کو نہیں بتائی ہے کیونکہ وہ غصے والا ہے اور مجھے ڈر ہے کہیں جوش میں منہ کھول دے، اس لیے میں نے یہ بات اپنے تک ہی محدو رکھی تھی۔

''کیسی بات......؟ جلدی بتاؤ مجھے...... وقت کم بے بی!'' میں نے بے چینی سے کہا۔ میں نے دیکھا اس ک معصوم سا چہرہ متفکر اور سراسیمہ سا نظر آنے لگا جیسے وہ یہ بات بتاتے ہوئے بھی خوف زدہ ہو، تاہم اٹک اٹک کر بولی۔

''شہ...... شہزی انکل! وہ...... مم...... ماما کی جان سخت خطرے میں ہے......''

''کیا......؟'' میری دونوں بھویں سکڑ گئیں...... ٹھیک اسی وقت پنکی کے حلق سے دبی دبی چیخ سی خارج ہوگئی، میں چونکا۔ اس کی آنکھوں میں پل کے پل خوف اُتر آیا تھا اور وہ میرے عقب میں نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔

کوریڈور کے سرے پر جہاں زینہ تھا، وہی سوٹ بوٹ والا موچھیل شخص کھڑا ہماری طرف زہرخند نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہمراہ نیلی وردی میں ایک گارڈ بھی کھڑا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت ہماری طرف بڑھے تھے......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

قسط 42

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسے، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد ذلیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

شہزاداحمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ناں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیمبلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ نانا شکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہوجاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کوریلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ غیبی مدد کے طور پر اژدھے کوریلا اور سے جی کوہارا کے رستے میں آجاتے ہیں۔ شہزی، سوشیلا کے ساتھ سے جی کوہارا کی جیپ میں بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِنگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان بھولا ناتھ کے نجی قید خانے ایول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے اور ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کرکے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر ہمیں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر مقامی قبائلیوں کی سرزمین اور ڈارک کیسل ان کے حوالے کرکے ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسمِ نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔

میں نے ذرا بھی پریشانی یا کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا بلکہ اپنے چہرے پہ کھنڈی ہوئی سنجیدگی طاری کیے ان کے قریب آنے کا منتظر رہا...... البتہ میں نے ڈری سہمی پنکی کو ہولے سے کہا تھا۔

''ڈرو نہیں بیٹا! میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' میرے ذہن میں تھوڑی دیر پہلے پنکی کے کہے ہوئے یہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔

''شہ...... شہزی انکل! وہ...... مم...... ماما کی جان سخت

خطرے میں ہے۔''

وہ مچمیل شخص جو بلاشبہ راٹھور تھا، کرخت نظروں سے مجھے گھورتا ہوا گارڈ کے ساتھ تیز تیز قدم اُٹھاتا میرے نزدیک آگیا۔

''کون ہو تم اور اس بچی کو بہلا پھسلا کر کہاں لے جانا چاہتے ہو......؟'' اس نے میرے قریب آکر درشت اور بارعب لہجے میں پوچھا۔ میں اس کے جملوں کی مکاری کو سمجھ گیا تھا۔

''یہی سوال میں تم سے پوچھنا چاہا ہوں گا کہ تم کون ہو اور اس بچی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''شہزی انکل! ان لوگوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں انہیں جانتی ہوں۔'' پنکی نے فوراً عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔ جس پر راٹھور نے اسے غصے سے گھورا بھی تھا مگر پھر فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

تاہم میرے اس طرح پُراعتماد سے جواب دینے پر گارڈ کو جلد ہی احساس ہوگیا کہ یہ معاملہ اغوا وغیرہ کا نہیں ہے، کیونکہ اس مکار راٹھور نے ابتدا میں یہی تاثر دینے کی کوشش چاہی تھی مگر جب گارڈ نے میری پُراعتماد جوابی کارروائی دیکھی تو اسے کچھ احساس ہوا تھا کہ معاملے کی نوعیت کوئی خاندانی جھگڑا ہے۔ لہٰذا فوراً ہم دونوں کے بیچ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ لوگ یہاں آپس میں مت اُلجھیں، بہتر ہوگا کہ ایڈمن صاحب کے آفس چلیں۔''

''چلو، میں تیار ہوں......'' میں نے کہا۔

''بے بی! تم کلاس روم میں جاؤ......'' راٹھور نے پنکی سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''نہیں، یہ بھی ہمارے ساتھ ایڈمن کے آفس میں جائے گی۔'' میں نے راٹھور کی طرف گھور کر سرد لہجے میں کہا۔ اس مکار نے گارڈ کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اس صورتِ حال سے پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے پنکی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''بے بی! یہ تمہارے کیا لگتے ہیں؟''

''یہ میرے انکل ہیں......! لیکن میں انہیں بالکل نہیں جانتی۔'' پنکی نے فوراً گارڈ کو جواب دیا۔ اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ گارڈ نے سر ہلا دیا اور راٹھور بے بسی سے دانت پیسنے لگا۔ وہ گارڈ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر گارڈ نے ہم تینوں کو ہی ایڈمن کے آفس چلنے کا کہہ دیا اور پنکی کو اپنے ساتھ کرلیا۔

ہم ایڈمن کے کمرے میں پہنچے۔ وہ حسبِ سابق اپنے چربیلے وجود کے ساتھ کرسی پر دھنسا بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت اور بعد میں ناگواری کے تاثرات اُبھرے۔ اس نے مجھے نظرانداز کرتے ہوئے راٹھور سے نہایت خوش خلقی سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ مجھے اس کے نظرانداز کیے جانے پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں خود پر قابو پاتے ہوئے زبردستی ایک دوسری کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''یہ شخص نعیمہ سعدیہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ یہاں سے لے جانے کی کوشش کررہا تھا۔'' راٹھور نے دانستہ پنکی کا پورا نام لیتے ہوئے ایڈمن سے میری طرف اشارہ کرکے شکایت کی۔

''یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے، یہ میرے شہزی انکل ہیں اور میں خود بھی ان سے ملنا چاہتی تھی۔'' پنکی نے تڑ سے جواب دیا۔ وہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ ڈرنے اور سہم جانے سے اُلٹا نقصان ہی ہوگا فائدہ نہیں۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ بعض سوالوں کے پنکی خود ہی جواب دے اسی لیے میں اس کے بولنے کے انتظار میں دانستہ تھوڑی دیر کے لیے خاموشی اختیار کرلیا کرتا تھا، لیکن اب میرے بولنے کی باری تھی۔ میں نے ایڈمن کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایڈمن صاحب! میرا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے، آپ نے یقیناً اخبارات اور مختلف ٹی وی چینلز میں میرا نام اور ذکر سنا ہوگا۔ میرا خیال ہے بچی کا میرے بارے میں یہ کہنا کافی ہے۔ اس کی جان خطرے میں ہے اور میں اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

میری بھانپتی ہوئی نظریں ایڈمن کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے میری بات سنی اور بغور پنکی کے چہرے پر بھی ایک نظر ڈالی۔ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے نمایاں طور پر محسوس کیا تھا کہ اب اس کے چہرے پر میرے لیے ناگواری اور کرختگی کے تاثرات کی جگہ اُلجھن آمیز پریشانی نے لے لی ہے۔ کیونکہ اس نے پنکی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''بے بی! اگر یہ تمہارے انکل ہیں تو پھر یہ کیا لگتے ہیں تمہارے......؟'' ایڈمن نے راٹھور کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم تو انہیں بھی انکل کہتی تھیں؟''

''آپ بھول رہے ہیں سر!'' پنکی نے فوراً ایڈمن کے چہرے کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آپ نے کب مجھے ان کو انکل کہتے سنا......؟''

ایڈمن شہود بیگ ذرا جزبز سا ہوا اور پھر اس نے پوچھا۔ ''اگر یہ تمہارے کچھ بھی نہیں لگتے تو پھر تمہاری ممی نے

تمہیں کیوں ان کی سرپرستی میں دے رکھا ہے؟''

''یہ مما کی مجبوری ہے لیکن یہ بات مجھے پسند تھی نہ ہی میرے بھائی خرم دانش کو کہ ہم ایسے لوگوں کی سرپرستی میں ہوں جنہوں نے سرپرستی کے نام پر ہمیں قیدی بنا رکھا ہے۔'' پنکی نے ایڈمن کو پورے اعتماد سے جواب دیتے ہوئے قریب بیٹھے راٹھور کی طرف ناگوار نظروں سے دیکھا۔

''بیٹا! ایسا تمہاری مما نے تمہارے بھلے کے لیے کیا تھا۔ وہ تمہیں چھپے ہوئے دشمنوں سے بچانا چاہتی تھیں۔'' راٹھور نے پنکی کی طرف دیکھتے ہوئے اسے پچکارنے کے انداز میں کہا۔ ''چلو اُٹھو گھر چلتے ہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے ایڈمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بے بی کو لے جاسکتا ہوں ناں بیگ صاحب؟''

میں نے دیکھا شہود بیگ خود اُلجھ سا گیا تھا۔ میرے تعارف اور پنکی کی باتوں نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کے چہرے سے صاف نظر آتا تھا کہ اُسے ''مس گائیڈ'' کیا گیا ہے جبکہ حقیقت کچھ اور نظر آرہی تھی۔

''تم پنکی کو نہیں لے جاسکتے راٹھور......!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ میرے منہ سے اپنا نام سن کر یقیناً چونکا ہوگا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

''میں تم سے مخاطب نہیں ہوں مسٹر شہزاد!'' راٹھور نے میری طرف گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

''چلو...... بے بی!'' راٹھور نے پنکی کا بازو پکڑنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تو میں نے فوراً اس کا بڑھتا ہوا ہاتھ روک دیا۔

''میں نے کہا نا کہ تم اسے نہیں لے جاسکتے...... راٹھور!''

میری بات پر اس کے چہرے کا رنگ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے پھر گردن گھما کر ایڈمن شہود بیگ کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے بیگ صاحب؟ ایک غیر متعلقہ شخص مجھے بے بی کو لے جانے سے روک رہا ہے؟''

شہود بیگ کو یقیناً تصویر کے ایک رخ کا پتا تھا۔ دوسرے کا نہیں، اب جو اس نے یہ دیکھا کہ خود پنکی بھی اس وقت ...... راٹھور کے ساتھ جانے پر آمادہ نظر نہیں آرہی ہے تو وہ اُلجھ گیا پھر راٹھور کی طرف دیکھ کر بولا۔

''دیکھیے راٹھور صاحب! یہ ضرور آپ لوگوں کا کوئی خاندانی معاملہ ہوگا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں...... بہتر ہوگا کہ آپ بے بی کی مما سے میری بات کرادیں......''

ایڈمن کی بات پر راٹھور نے زہرناک نظروں سے اسے گھورا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''پیسے لیتے وقت آپ کو یہ معاملہ کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا بیگ صاحب! اب آپ کو یہ خاندانی معاملہ نظر آرہا ہے؟'' اس کی بات پر شہود بیگ کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر سا ہوا پھر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر بھی راٹھور کے لیے ناگواری کے تاثرات اُبھرے، وہ اس سے تلخ لہجے میں بولا۔

''راٹھور صاحب! غلط بات مت کریں۔ آپ نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ کچھ لوگ بے بی کی جان کے دشمن ہیں اور میں اس کی سیکیورٹی کا خصوصی طور پر خیال کروں اور وہ میں کررہا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ نے میرے ساتھ غلط بیانی کی تھی کہ یہ معاملہ خاندانی ہے مگر مجھے اس میں مجرمانہ بو آرہی ہے۔ کیونکہ مسٹر شہزی! ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ یہ کوئی غلط کام نہیں کرسکتے۔''

جب ایڈمن نے دیکھا کہ اس کی ذات پر راٹھور کیچڑ اُچھال رہا ہے تو اس نے بھی صاف صاف یہ سب کہہ ڈالا جس پر راٹھور بھی بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے ایڈمن سے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے درست اندازہ لگایا ہے، حقیقت یہی ہے کہ یہ لوگ زرخرید گُرگے ہیں۔ بات بہت طویل اور گہری ہے۔ آپ یا تو بے بی کو میرے ساتھ جانے دیں یا پھر...... پولیس کو مطلع کریں، میں ان سے خود بات کرلوں گا۔''

''پولیس کو میں یہاں نہیں بلانا چاہتا۔'' شہود بیگ نے کہا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ راٹھور کی بات نے اس کا صحیح معنوں میں موڈ خراب کر ڈالا تھا۔ ''اس سے ہمارے ادارے کی بدنامی ہوگی۔ بہتر ہوگا کہ آپ دونوں ہی اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرلیں۔''

''بیگ صاحب! مسئلے کا حل تو صاف ہے۔'' راٹھور نے شہود بیگ کی طرف گھور کر کہا۔ ''اب تک بے بی کو کون آپ کے کوچنگ سینٹر پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا ہے؟ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو کیا بے بی پنکی گھر سے باہر نکل سکتی تھی؟''

شہود نے اس کی بات نظرانداز کرکے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر شہزی! آپ بے بی کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟''

''اس کے اپنے گھر...... جہاں اس کا چھوٹا بھائی خرم دانش بھی موجود ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ گویا شہود بیگ کی گلوخلاصی کرڈالی کیونکہ وہ اگلے ہی لمحے راٹھور اور

میری طرف دیکھتے ہوئے طمانیت بھرے لہجے میں بولا۔

’’پھر جھگڑا کس بات کا ہے؟ آپ دونوں ہی بے بی کو لے کر جا سکتے ہو......‘‘

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ میں نے کرسی چھوڑی اور پنکی سے کہا۔ آؤ بیٹا! چلتے ہیں......‘‘ پنکی میرے ساتھ ہو لی۔ میں اسے لیے باہر نکلا۔ راٹھور بے بسی سے اپنے دانت کچکچاتا ہوا کوچنگ سینٹر کی عمارت سے باہر نکلا اور میں پنکی کو لے کر محتاط انداز میں سڑک کے کنارے آیا تو راٹھور نے میرے پیچھے آتے ہوئے کہا۔

’’میری کار کھڑی ہے، تم بے بی کو لے کر کار میں سوار ہو سکتے ہو۔‘‘

اس شاطر آدمی نے شاید مجھے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر تکتے ہوئے یہ بھانپ لیا تھا کہ میرے پاس کار نہیں تھی اور مجھے کسی ٹیکسی کی تلاش تھی۔

’’شکریہ! میں ٹیکسی میں ہی جانا پسند کروں گا اور بے فکر رہو، میں بے بی کو لے کر سیدھا گھر پر ہی پہنچوں گا......‘‘ میں نے کھردرے لہجے میں اس سے کہا۔ اس حقیقت کا اسے بھی شاید ادراک تھا کہ میں بھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا اور اس ’’سچ‘‘ کی وجہ...... یقیناً پنکی کا بھائی دانی ہی تھا۔

جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی اور میں نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور پھر عارفہ کی رہائش گاہ گلشن کالونی چلنے کا کہا۔ ٹیکسی والے نے کرایہ بتایا اور میں پنکی کو لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ کن انکھیوں سے میں نے راٹھور کی طرف بھی دیکھا تھا جو اپنی سیاہ ہنڈا کار کی طرف لپکا تھا۔

’’ٹیکسی ذرا تیز چلانا...... ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔‘‘ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا اور پنکی پسنجر سیٹ پر موجود تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور کی موجودگی کی وجہ سے میں اور پنکی کوئی بات نہ کر سکے تھے۔ ڈرائیور ماہر تھا اور تیزی کا شوقین بھی، اس نے مین روڈ پر آتے ہی ٹیکسی کو طوفانی رفتار سے دوڑانا شروع کر دیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، مجھے راٹھور کی سیاہ کار نظر نہیں آ رہی تھی۔ مجھے دانی کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ میں اول خیر سے بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ بانو نے مجھے جو سیل فون عارضی استعمال کے لیے دیا تھا، بدقسمتی سے اس میں کوئی خرابی ہو گئی تھی تب ہی میں نے عقبی سیٹ پر بیٹھی پنکی سے کہا۔

’’پنکی! تمہارے پاس فون تو ہوگا؟‘‘

’’نہیں شہزی انکل! مما کے حکم کے مطابق ہمیں ان لوگوں نے فون کرنے کی بھی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ صرف گھر پر ہی تھوڑی دیر کے لیے ہمیں سہیلیوں سے بات کرنے کے لیے فون تھما دیا جاتا تھا اور وہ سامنے موجود رہتے تھے۔‘‘ پنکی نے جواب دیا اور میں بے اختیار اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

’’کوئی ضروری بات کرنا ہے تو میرے موبائل سے کر لیں جناب!‘‘ معاً ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ وہ خاصا بھلا مانس معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

’’بڑی مہربانی ہوگی بھائی! واقعی اس وقت کسی سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔‘‘

’’لو جی یہ... مسئلہ ہے تو کر لیں بات....‘‘ اس بھلے مانس انسان نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکالا اور مجھے تھما دیا۔ وہ ایک سستا سا عام سیٹ تھا مگر اس وقت یہ بھی غنیمت لگا۔ میں نے عارفہ کی رہائش گاہ کا نمبر ملایا اور فون پنکی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’اپنے بھائی دانی سے بات کرو۔ اس سے کہنا کہ وہ گھر پر ہی رہے اگر کوئی اسے کہیں ساتھ لے جانے کی کوشش کرے تو کسی کے ساتھ نہ جائے ہم گھر پر ہی آ رہے ہیں۔ ہمارا انتظار کرے۔‘‘

پنکی نے فون مجھ سے لے کر گھر بات کی......

’’ہیلو، جی میں بات کر رہی ہوں...... پنکی! میری دانی بھیا سے کروا دیں۔‘‘ وہ کہنے لگی۔ میں گردن موڑے پنکی کے چہرے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ چند ثانیے دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

’’میں خیریت سے ہی ہوں اور راٹھور بھی گھر پہ آ رہا ہے، میری دانی سے بات کرواؤ......‘‘

’’میں تمیز سے ہی بات کر رہی ہوں محترمہ آصفہ......!‘‘ پنکی غصے میں آ گئی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ دوسری طرف سے وہی عورت بات کر رہی تھی جس نے چند گھنٹے پہلے مجھ سے بھی نہایت سرد لہجے میں عارفہ کی رہائش گاہ پر انٹرکام پہ بات کی تھی۔

پنکی انتظار کرنے لگی۔ ٹیکسی خاصی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی تھی۔ ڈرائیور اس کے باوجود ٹیکسی کو مناسب رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ میں نے باہر اطراف میں بھی نظر ڈالنے کی کوشش چاہی تھی مگر مجھے ہنوز راٹھور کی کار کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

’’ہیلو دانی بھیا۔‘‘ معاً پنکی کی آواز پر میں چونکا۔ اس نے شاید خرم دانش سے بات کرا دی تھی۔ اس نے دانی سے وہی کہا جو میں نے اس سے کہا تھا، اس کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے ڈرائیور کو نہایت شکریے کے ساتھ اس کا سیل فون واپس تھما دیا۔

مجھے اس وقت اول خیر اور شکیلہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ مجھے عارفہ کی رہائش گاہ پر اس وقت کسی بڑے معرکے کی بُو آ رہی تھی۔ نجانے وہ دونوں اچانک کہاں اور کس مہم پر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ موبائل فون بھی ہمارے پاس نہیں تھے۔ ایک طویل عرصہ وطن اور اپنوں سے دوری پر ابھی تک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی بندوبست ہو سکا تھا۔

ٹیکسی جب عارفہ کی رہائش گاہ والے علاقے کے قریب پہنچی تو میں نے فوراً ڈرائیور سے کہہ کر ٹیکسی مطلوبہ سمت کی طرف گھما دی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں میرے خیال کے مطابق اول خیر اور شکیلہ کی کار کو ہونا چاہیے تھا۔ مجھے کچھ اندازہ تو تھا کہ وہ اپنی مہم سے لوٹنے کے بعد اِدھر ہی آ کر ٹھہریں گے۔ مگر اب بھی مجھے وہاں کوئی کار دکھائی نہ دی۔ تب میں نے ڈرائیور سے عارفہ کی رہائش کے سامنے ٹیکسی روکنے کا کہا جو اَب وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ڈرائیور نے میری ہدایت کے مطابق ٹیکسی وہیں لے جا کر روک دی۔

میں یہ نہیں جان سکا تھا کہ راٹھور وہاں پہنچ چکا تھا یا نہیں......؟

میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کیا اور شکریے کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔

میرے اعصاب یکلخت تن گئے تھے۔ مجھے یہاں بھی کسی بڑے ہنگامے کی بُو آ رہی تھی۔ بات میری نہیں تھی۔ مجھے ان دونوں نوعمر بچوں کی فکر تھی کہ میں کسی بھی طرح انہیں یہاں سے نکال لے جانا چاہتا تھا جبکہ پنکی کی ماں یعنی عارفہ کی جان کو کس سے خطرہ ہو سکتا تھا، یہ معما اپنی جگہ موجود تھا، اس کی تفصیل پنکی ہی مجھے بتا سکتی تھی، جبکہ ابھی وہ خود ایک بڑے ’’رسک‘‘ سے دوچار تھی۔

اس بار اُن دونوں ’’کار پرداز‘‘ گارڈ نما مسلح افراد نے میرے ساتھ روکھے پن کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب ہی برتا تھا، شاید انہیں فون پر ہی پہلے سے کوئی خاص قسم کی ہدایت مل چکی تھی۔ تاہم کھنڈی ہوئی سنجیدگی اپنی جگہ جوں کی توں تھی۔

ستار نامی اسی گارڈ نے اپنے ساتھی کے اشارے پر مجھے اندر آنے کا کہا۔ جیسا کہ مذکور ہوا ان سے میری پہلے بھی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔

’’کیا راٹھور صاحب پہنچ چکے ہیں......؟‘‘ میں نے بغلی دروازے سے اندر قدم رکھتے ہوئے ستار سے پوچھا۔ پنکی میرے ساتھ تھی۔

’’پہنچ چکے ہیں۔‘‘ ستار نے اکھڑپن سے جواب دیا۔ ’’اس طرف آؤ۔‘‘

اس نے پختہ روش کی طرف اشارہ کیا۔ ہمارے ساتھ چلتے ہوئے اس نے پنکی کا بازو تھامنے کی کوشش چاہی تھی مگر پنکی نے بڑی ناگواری سے اپنا بازو چھڑا کے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

مجھے راٹھور کے جلدی پہنچ جانے پر خاصی حیرت ہوئی تھی، کیونکہ میں اپنی سی کوشش کے مطابق اس سے پہلے یہاں پہنچنے کی جستجو میں تھا مگر لگتا تھا انہوں نے کوئی شارٹ کٹ راستہ اپنایا تھا یا پھر کوئی ایسا راستہ جہاں ٹریفک نسبتاً کم ہوگا۔ خیر یہ زیادہ اچنبھے کی بھی بات نہیں تھی۔

ایک دیدہ زیب اور بیش قیمت لکڑی کے محرابی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک ہال تھا جو کسی آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں یہاں اب ہر قسم کے حالات کے لیے تیار تھا اور میرے اعصاب کسی بھی ایسی ممکنہ کشمکش کے لیے پوری طرح تیار تھے مگر مجھے نہیں لگتا تھا کہ راٹھور میرے ساتھ ایسی کوئی جرأت کرے گا۔

ستار نامی اس گارڈ نے مجھے ابھی تک بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا مگر وہ اس بار پنکی کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیے بغیر بولا... ’’بے بی! آپ اندر اپنے کمرے میں جاؤ......‘‘

’’یہ کہیں نہیں جائے گی۔‘‘ میں نے اس کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھ کر کہا اور زبردستی ایک صوفے پر دھنس کر بیٹھ گیا۔ پنکی بھی میرے ساتھ اور قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

’’دانی کو بلا لاؤ......‘‘ میں نے ستار کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں نے دوبارہ راٹھور کے بارے میں پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

’’راٹھور صاحب کو آ لینے دو پہلے......‘‘ ستار نے جواب دیا اور وہیں ہمارے قریب ہی تن کر یوں کھڑا ہو گیا جیسے پہرے پر ہو۔ تب ہی پنکی نے کہا۔

’’میں جا کر بھیا کو بلا لاتی ہوں شہزی انکل!‘‘ وہ یہ کہتی ہوئی ایک کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ میں پنکی کو جانے نہیں دینا

چاہتا تھا، مگر اسے روک بھی نہ سکا۔ کن انکھیوں سے میں نے پاس اٹچو بنے کھڑے ستار کے چہرے کا جائزہ لیا۔ پنکی کے اس طرح اندر دوڑ جانے پر اس کی پیشانی پر چند سلوٹیں اُبھری تھیں اور اگلے ہی لمحے وہ اسی جانب بڑھ گیا۔

میں اس وسیع و عریض نشست گاہ میں تنہا بیٹھا رہ گیا۔ دفعتاً ہی اندر شور کی آواز پر میں چونکا۔ وہ نوعمر آوازوں کا شور تھا جس میں بھاری مردانہ آوازیں اور کسی پکی عمر کی عورت کی بھی گرماتی ہوئی آوازیں شامل تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بچے کسی بات پر ضد کر رہے ہوں۔ یک دم میرے کان کھڑے ہوگئے۔

''انکل...... انکل...... ادھر آئیں...... پل......یز......''

اچانک ... پنکی کی چیختی چلّاتی آواز اُبھری، مجھ سے اب نہ رہا گیا، میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ صوفے سے اُٹھا اور آواز کی جانب لپکا تھا کہ اچانک دائیں بائیں جانب سے دو افراد نمودار ہوئے، میں انہیں دیکھ کر رک گیا۔ وہ دونوں میرا راستہ روکے کھڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں سیاہ پسٹل تھے، جن کی لمبی نالوں پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ وہ بڑی جارحانہ نظروں سے ہماری طرف گھورے جا رہے تھے۔ ایکاایکی مجھے خطرے کی بُو محسوس ہوئی تھی۔

''میں کیا مطلب سمجھوں......؟'' میں نے قہرناک نظروں اور گونجیلی آواز میں ان سے کہا۔

''مطلب یہ کہ...... تم اِدھر ہی بیٹھو گے......'' ان میں سے ایک نے کہا۔ اسی وقت دوبارہ چلّانے کی آواز ابھری...... یہ بھی دانی یا پنکی کی ہی آواز تھی، میری بے چینی انتہا کو چھونے لگی تھی اور پھر وہی ہوا جو ایسے مواقع پر میں کیا کرتا ہوں...... پل کے پل جیسے میرے وجود میں پارا دوڑ گیا۔ میری ایک ٹانگ حرکت میں آئی، دائیں جانب والے پستول بدست کو سوچنے کا موقع بھی نہ ملا اور میری لات اپنے سینے پر کھا کے وہ قالین بچھے فرش سے تقریباً چند انچ اُوپر اُچھل کر عقب میں جھولتے ہوئے مکراموں سے ٹکراتا ہوا، ڈائننگ ٹیبل پر جا پڑا۔ دوسرے نے فوراً اپنے پستول کا ٹریگر دبا دیا تھا، ہلکی ''ٹرچ'' سے مشابہ آواز اُبھری تھی۔ مگر اس کا نشانہ خطا گیا۔ کیونکہ مجھے اپنی فوری حرکت پذیری کے بعد اس کی طرف سے بھی ایسی ہی جارحانہ حرکت کی توقع تھی کہ اس نے فقط اپنے پستول کا ٹریگر دبانا تھا اور وہی اس نے کیا بھی تھا، اسی سبب میں نے بیک وقت دو حرکات سے کام لیا تھا۔ پہلے والے کو لات رسید کرتے ہی میں نے اسی تیزی کے ساتھ جھکائی بھی دی تھی۔ خاموش پستول سے داغی ہوئی گولی، شاید آراستہ نشست گاہ کے کسی بیش قیمت بھاری شوپیس کو لگی جس کی چھناکے دار آواز اُبھری تھی۔ جھکائی دیتے ہی میں نے خود کو بائیں کاندھے کے رخ فرش پر گرایا اور سیدھی ٹانگ کو سوئپ کیا۔ دوسرا پستول بدست جو مجھ پر ایک اور گولی چلانے کے لیے پر تول رہا تھا، میری ٹانگ اس کی دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی اور اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔

پہلا والا اُٹھ کر بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے مُشابہ آواز میں مجھ پر چھلانگ لگا کر جھپٹا مگر تب تک میں نے فرش پر لیٹے لیٹے پلٹنی کھائی اور وہ ''بلینک پوائنٹ'' پر گرا۔ میں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ٹانگ رسید کر دی۔ وہ اپنے حلق سے ایک کریہہ انگیز چیخ خارج کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرے نے کچھ غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُٹھ کر مجھ پر ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پھینک ماری، میں بڑے آرام سے ایک طرف کو ہو گیا اور اُچھل کر ٹیبل پر پڑا، حملہ آور میری اس تیزی کو بھانپ نہ سکا اور سوچتا رہ گیا، عقدہ اس پر تب کھلا جب میں پشت کے بل ٹیبل پر پڑا اور میری دونوں لاتیں اس کے منہ پر پڑیں۔ وہ قالین بچھے فرش سے چند انچ اُچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا اور دھپ سے گرا۔ میں ٹیبل پر سے لُڑھکنی لگا کر نیچے اُترا اور دوڑا......

کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ میں جوشِ جنوں میں اسے زوردار دھماکے سے دھکا دیتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ ایک کریہہ چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی تھی جو کسی عورت کی تھی، وہ شاید دروازے کی طرف ہی آ رہی تھی اور اب دروازہ زور سے اس کی پیشانی یا سر پہ ''وج'' گیا تھا جس کے باعث بری طرح زخمی ہو کے گر پڑی تھی۔ وہ خاصی بھاری جسامت کی ایک مردمار عورت تھی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور وہاں سے اب بھل بھل خون بہے چلا جا رہا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے پاس ایک سیاہ نال والا پستول بھی پڑا تھا جو یقیناً اسی کا ہو گا۔ سامنے مجھے خوف زدہ سے دانی اور پنکی ایک دوسرے سے لگے کھڑے نظر آ گئے جبکہ ان کے پاس ہی راٹھور کھڑا دکھائی دیا جو بڑی زہر خند نظروں سے میری جانب گھور رہا تھا۔ اس نے بھی اب پھرتی کے ساتھ پستول نکال لیا تھا۔ اس کی نال کا رخ میری جانب تھا۔

میری نظریں اس کی ٹریگر والی اُنگلی میں ایک ذرا جنبش کو فوراً بھانپ گئی تھیں، ایک دھماکا ہوا اور میں ...... پل کے پل ذرا پہلے ہی اپنی جگہ سے اُچھلا تھا۔ گولی خطا گئی اور میں اس پر جا پڑا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اُلجھے ہوئے ایک صوفے پر جا پڑے جو ہمارے وزن سے اُلٹ

گیا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں اُبھریں۔

راٹھور نے سنبھالا لیتے ہی میرے چہرے پر مُکّا رسید کر دیا۔ میرے رگ و پے میں اس وقت جوشِ جنوں کا ایک آتش فشاں سا دہک رہا تھا جس نے میری درد والی حسیات کو جلا ڈالا تھا۔ یہی سبب تھا کہ میں اس کے مکے کی ضرب کو پی گیا اور اپنے سر کی زوردار ٹکر اس کی ناک پر جڑ دی۔ اس کی ناک کا بانسا اندر کی طرف پچک گیا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔ اسے چھوڑ کر میں اُٹھا اور دروازے پر وہی دونوں بدتمیز گارڈ دکھائی دیے گئے...... مگر یہ دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا کہ دانی اور پنکی وہاں سے غائب تھے۔

''خبردار......! کوئی حرکت مت کرنا، ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔'' ستار نامی گارڈ نے اپنی گن کا رخ میری جانب رکھتے ہوئے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''بچے کہاں ہیں......؟'' میں نے اس کی دہاڑ اور دھمکی سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تو وہ پہلا والا گارڈ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''زیادہ چالاکی کی کوشش مت کرو...... کدھر غائب کر دیا ہے تم نے ان دونوں بچوں کو......؟''

''اُلو کے پٹھو...! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اسی وقت راٹھور کی آواز اُبھری۔ اس نے اپنی زخمی ناک پر رومال رکھا ہوا تھا جو سرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک کرسی کا سہارا پکڑے کھڑا تھا۔

''تم جاؤ...... انہیں ڈھونڈو...... وہ ابھی ابھی بھاگے ہیں...... اور تم ستار! اِدھر ہی رہو......''

اس کے حکم کی دیر تھی کہ پہلا والا تیزی سے پلٹ کر غائب ہو گیا۔ ستار محتاط انداز میں گن میری جانب تانے مزید قریب آ گیا۔

میرا اپنا ذہن بھی تیزی سے یہی بات سوچ رہا تھا۔ پنکی نے اگر واقعی بروقت عقل اور ہوش مندی سے کام لیا تھا تو یقیناً یہ اس کا اچھا عمل تھا۔ بشرطیکہ وہ اپنے بھائی کو لے کر یہاں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو چکی ہو......

''راٹھور صاحب! آپ ٹھیک تو ہیں ناں......؟ کسی کو بلاؤں......؟ آپ کی مرہم پٹی......'' ستار نامی اس گارڈ کی آواز درمیان میں ہی رہ گئی، راٹھور نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم اِدھر ہی ٹھہرو...... اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی مت دینا۔ بدبخت! لگتا ہے یہاں سب کو ڈھیر کر چکا ہے۔ مجھے بچوں کی فکر ہو رہی ہے۔''

''جناب! آپ کو مرہم پٹی کرنے سے پہلے پولیس کو فون کر دینا چاہیے۔'' ستار نے مشورہ دیا۔ میں بظاہر دم بخود سا کھڑا تھا۔ میں چاہتا تو تیسرے درجے کے اس ٹٹو ستار کو بھی پچھاڑنے کی جستجو کر لیتا۔ لیکن پہلے میں دیکھنا چاہتا تھا کہ دانی اور پنکی کہاں غائب ہو گئے تھے۔

''ہرگز نہیں...... پولیس کو اس معاملے کی بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ او...... تم آ گئے بنٹو......! سنبھالو اِسے...... کیا حال کر دیا ہے تمہارا ابھی اس بدبخت نے......''

راٹھور نے دروازے پر لڑکھڑاتے ہوئے اُبھرنے والے اپنے اس ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا جسے میں تھوڑی دیر پہلے دوسرے کمرے میں اس کے ساتھی کے ساتھ ہی ڈھیر کر کے آیا تھا۔ میرے سر پہ اس وقت ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح سے میں پنکی اور دانی کو ان درندوں کے نرغے سے نکال لے جاؤں، کیونکہ جب سے مجھے پنکی نے یہاں کھیلی جانے والی کسی بھیانک سازش کے بارے میں بتایا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ''مما کی جان خطرے میں ہے......'' تو میری سمجھ میں یہی کچھ آتا تھا کہ سیٹھ نوید سانچے والا اتنا بے وقوف ہرگز نہیں ہو سکتا تھا کہ سرمد بابا کی وصیت کے خلاف کوئی قدم اُٹھاتا۔ بقول سرمد بابا کے سیٹھ نوید ایک نودولتیا تھا۔ اس نے اب تک شارٹ کٹ مار کے جو دولت کمائی تھی ان کے ذرائع مشکوک تھے۔ عارفہ کے گرد بھی وہ ایسا ہی جال بُننے میں مصروف تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے سرمد بابا کی وصیت کا خیال کیے بغیر عارفہ سے شادی کر ڈالی تھی اور اسے لے کر ہنی مون پہ بیرونِ ملک نکل گیا تھا اور یہاں اپنے گُرگے چھوڑ گیا تھا، کیوں......؟ اس کیوں کے آگے کے جوابات اب میرے سامنے شاید آشکارا ہونے ہی والے تھے۔

دروازے پر نمودار ہونے والے دشمن کے ساتھی کی حالت گو اب بھی ناگفتہ بہ ہی نظر آتی تھی، تاہم اس کے ایک ہاتھ میں دبے ہوئے خاموش پستول نے اسے کافی زیادہ حوصلہ مند رکھا ہوا تھا۔ ستار گارڈ بھی اس کی ہمت کو سوا کرنے کا باعث تھا۔

''باس! اسے گولی مار دوں......؟'' وہ دروازے سے اندر آتے ہوئے میری جانب سفاکانہ نظروں سے گھورتے ہوئے راٹھور سے بولا۔

''تم یہاں سے فوراً دفع ہو جاؤ...... ایک نمبر کے نکمے اور ناکارہ ہو تم دونوں......'' راٹھور حلق کے بل اپنے ہی ساتھی پر چلّایا۔ ''جاؤ...... وہ دونوں تیری ماں کے جنے...... کہیں

بھاگ گئے ہیں...... تلاش کرو ان دونوں شیطانوں کو...... جو جی بھی گیا ہوا ہے۔“

راٹھور کو اس طرح خود پر گرجتا برستا دیکھ کر وہ واپس پلٹ گیا۔

”اس پر کڑی نظر رکھو...... میں واش روم جا کر مرہم پٹی کا سامان دیکھتا ہوں......“ راٹھور نے ستار سے تحکمانہ کہا اور کراہتا ہوا ایک طرف چلتا بنا۔ میں نے ستار کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے سے ہارے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”میں یہاں کرسی میں بیٹھنا چاہتا ہوں...... تھک چکا ہوں......“ اور پھر میں نے اس کے بولنے کا انتظار کیے بغیر ہی قدم اس کرسی کی طرف بڑھائے جس راہ پر ایک چھوٹی سی پورٹیبل بچھی ہوئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ...... مگر یاد رکھنا! کوئی غلط حرکت......“ اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا کیونکہ اگلے ہی لمحے میں نے کرسی پر براجمان ہونے کے انداز میں اپنی دونوں ٹانگوں کو بیک وقت حرکت دی تھی کیونکہ تب میں اپنی ٹانگیں کرسی کے سامنے رکھی پورٹیبل کے نیچے چوبی رخنے میں اٹکا چکا تھا۔ نتیجے میں وہ گولی کی طرح اُڑتی ہوئی...... سیدھی اسی کے چہرے سے ٹکرائی۔ ضرب معمولی نہ تھی۔ ستار کی آخر تک سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ اس کے ساتھ یہ کیا ”واقعہ“ پیش آ گیا تھا۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی تھی۔ ٹیبل نے اس کی پیشانی پھاڑ ڈالی تھی۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حال سا ہونے لگا۔ میں نے سب سے پہلے اس کے پستول پر قبضہ جمایا اور...... اسی کے دستے سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کے وہیں ساکت و صامت ہو گیا۔ میں پستول ہاتھ میں لیے پلٹا اور کمرے سے باہر نکلا۔

عارفہ کی اس رہائش گاہ کا چپا چپا میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں پنکی...... دانی...... چلاتا ہوا پوری کوٹھی کا طواف کرنے لگا۔ بے شک یہ میری دیوانہ وار حرکت تھی، بچے کھچے دشمن بھی میری طرف متوجہ ہو سکتے تھے، مگر مجھے ان کی کوئی پروا نہ تھی۔

دشمن تقریباً سبھی ڈھیر ہو چکے تھے، مجھے ان سے کوئی خاص خطرہ نہ تھا۔ مجھے یقین تو تھا کہ پنکی اپنے بھائی کو لے کر کسی محفوظ جگہ چھپ گئی ہوگی۔ نیچے سب جگہ تلاشنے کے بعد جب میں اُوپری منزل دیکھنے کے لیے زینے کی طرف لپکا ہی تھا کہ مجھے بالکونی سے پنکی کی آواز سنائی دی۔

”شہزی انکل!“ میں چونکا۔

”نیچے آؤ جلدی......“ میں نے سر اُٹھا کے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں ریلنگ سے اٹکے نیچے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے زینے کی طرف بڑھے تھے۔ تب ہی مجھے ان کے عقب میں ایک سایہ لپکتا دکھائی دیا۔ وہ انہیں جھپٹنے کے لیے بے چین تھا، یہ یقینی طور پر ستار کا وہی ساتھی گارڈ تھا جسے راٹھور نے پنکی اور دانی کی تلاش میں بھیجا تھا۔ میں نے اسی وقت پستول والا ہاتھ سیدھا کیا اور ریلنگ کے درمیان سے اس کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ پستول پر سائلنسر تھا۔ گولی چلی تھی اور میں نے شکار کو چیخ مار کر بالکونی کے چکنے فرش پر لڑھکتے گرتے دیکھا۔ میں نے دانستہ گولی اس کی ٹانگ پر داغی تھی جو اس کی ران میں لگی تھی۔ پنکی اور دانی اپنے عقب میں کسی کی چیخ اور لڑکھڑا کر گرنے کی آواز پر ڈر سے گئے تھے مگر رکے نہیں۔ میں بھی تب تک نصف زینے طے کر چکا تھا اور وہ راستے ہی میں مجھ سے آن ملے، میں انہیں لیے باہر کی جانب لپکا اور پھر نہیں رکا جب تک کہ گیٹ سے باہر نہیں نکل گیا۔ میرے لیے اب سواری کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مین روڈ یہاں سے خاصی دور تھی، کسی ٹیکسی یا رکشا کا یہاں بھی انتظار کیا جا سکتا تھا مگر یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوتا۔ میں نے دوڑ لگا دی۔

باہر رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ بیشتر بنگلوں اور کوٹھیوں کے گیٹ پر نصب دودھیا گلوب روشن تھے۔ بیشتر علاقہ تاریک تھا۔ اچانک مجھے کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس اُڈتی نظر آئیں، یہ میرے دائیں جانب سے اُبھری تھی۔ ایک خیال دشمن کا اور دوسرا خیال اول خیر اور شکیلہ کا ہی میرے ذہن میں آیا تھا۔ میں ایک طرف کسی بنگلے کی دیوار کی آڑ میں ہو کر اس طرف دیکھنے لگا۔ پنکی اور دانی میرے ساتھ تھے، میں نے انہیں اپنے پیچھے کر لیا تھا۔

میری نظریں اسی روشنی پھینکنے والی گاڑی مرکوز تھیں کہ میں ٹھٹکا۔ ساتھ مسرت تلے میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ وہ اول خیر کی کار تھی۔

”یہ میرے ہی ساتھی ہیں آؤ......“ میں نے اُن سے کہا۔ پنکی اور دانی کا سانس پھولا ہوا تھا مگر وہ پھر بھی میرے ساتھ دوبارہ دوڑ پڑے۔ کار ہمارے قریب آ کر رک گئی۔

”او...... خیر......“ مجھے اول خیر کی آواز سنائی دی ساتھ ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے پنکی اور دانی کو کار میں سوار کرایا اور ہانپتی ہوئی آواز میں جلدی سے بولا۔

”اول خیر! تم نیچے اُترو...... شکیلہ تم ڈرائیونگ سیٹ سنبھالو اور ان دونوں بچوں کو بیگم ولا پہنچاؤ......“ وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔

""اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

""شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آگیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جارہا تھا اور اس کے حلق سے ""اوخیر......" برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آگیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

""ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

""جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کردیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلّا چلّا کر...... ""پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کرگیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

""جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

""ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

""سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہوکر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

""یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... ""یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

""کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

""او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ ""پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلّایا تھا۔

""کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

""وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔"

""او...... خیر کا کے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......"

""گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......" میں نے کہا۔

""اوخیر......" وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا سٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دوبار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ...... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

میں ان کے سر پر پہنچ گیا تھا اور میری لات حرکت میں آچکی تھی جو اس خطرناک حملہ آور کے پہلو پر لگی، وہ اول خیر کی آہنی گرفت سے نکل کر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ اول خیر کو میری اس حرکت پر حیرت ہوئی ہوگی، مگر جب اس نے حملہ آور کے ہاتھ سے چمکتے ہوئے پھل والا مہیب چاقو بھی چھوٹ کر گرتے دیکھا تو اپنی بھویں اُچکا کر رہ گیا اور جان گیا کہ وہ حملہ آور کے ایک انتہائی سفاک وار سے بال بال بچا تھا۔

اُدھر حملہ آور نے اُٹھنے میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر میری دوسری لات اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ وہ پھر اُلٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

”کون ہو تم؟ سچ بتاؤ...... ورنہ اِدھر ہی تاریکی میں مارے جاؤ گے۔“ میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اول خیر نے اس کا چاقو قبضے میں کر لیا تھا۔

”تم کون ہو......؟“ اس نے ہانپتے ہوئے اُلٹا سوال داغ ڈالا...... جس پر میرا دماغ بھنا گیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر ڈالا۔ اس کے حلق سے اُوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوگئی۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس بار دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ وہیں لم لیٹ ہوگیا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے کنارے پر ڈال دیا اور اول خیر کے ساتھ اب تقریباً دوڑتا ہوا اس مکان کے پاس آگیا۔ جس کے بارے میں سیٹھ نوید نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر بتایا تھا اور یقیناً حفظِ ماتقدم کے تحت اسی نے ہی ایک آدمی کو باہر گلی میں کہیں پوشیدہ کھڑے ہونے کا حکم دے رکھا تھا کہ آنے والوں پر نگاہ رکھے اور وہ یہی کر رہا تھا کہ اول خیر کے ہتھے چڑھ گیا۔

ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وہ ایک دم کھلا اور اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ڈیل ڈول میں یہ دونوں صحت مند تھے مگر قد و قامت میں مجھ سے دبتے ہوئے، ہمیں عین دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ پل کے پل ہونق سے بن گئے، مگر دوسرے ہی لمحے میں دونوں کے ہاتھ بیک وقت بغلوں کی جانب سرکے، شاید انہوں نے بغلی ہولسٹر چڑھا رکھے تھے۔ ایسے میں اول خیر اور میرا بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آنا یقینی امر تھا اور ہم دونوں ہی ان پر قہر بن کر ٹوٹے۔

انہیں رگیدتے ہوئے ہم اندر صحن میں آگئے۔ دروازہ پیچھے کھلا پڑا رہ گیا۔ اندر روشنی تھی۔ صحن پختہ اور زیادہ کشادہ نہ تھا، جبکہ باہر بچھی ایک چارپائی پر مجھے نوید سانچے والا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا جو اس اکھاڑ پچھاڑ میں یک دم چارپائی سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور اندر ایک کمرے کی طرف بھاگا جس کا دروازہ ذرا ہی بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مدِمقابل کا سر پختہ اینٹوں والے فرش پر بجایا اور اسے بے حرکت پا کر اُٹھ دوڑا۔

نوید ابھی کمرے کے دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ میں اس کے پیچھے، بلکہ سر پہ ملک الموت بنا جا پہنچا۔ تب ہی اندر مجھے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ چارپائی پر عارفہ...... رسن بستہ حالت میں جکڑی لیٹی پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے اسے ہذیانی اور ہسٹریائی دورے پڑتے رہے ہوں اور وہ اپنے آپے میں نہ رہی ہو، اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ بولنے سے بھی قاصر تھی، سرِدست نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی نظر آتی تھی۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں اسے بھی کچھ ہوش آگیا تھا۔ قریب چارپائی پر ایک گن ٹکی تھی، نوید سانچے والا اسے ہی اُٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے اسے دبوچ کر اس کا سر منجی کے ٹھوس چوبی پائے سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور خون بہہ نکلا۔

کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں عارفہ چارپائی میں جکڑ بند پڑی پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہی تھی اور پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ بری طرح تڑپنے لگی، اُچھلنے لگی...... حلق سے اس کے بے معنی سی ”غوں... غاں“ بھی خارج ہونے لگی۔ بے حد قابلِ رحم حالت میں...... مجھے نظر آرہی تھی وہ اس وقت......

اُدھر...... نوید سانچے والا اپنے پھوٹے ہوئے سر کے ساتھ پھر اپنی گن کی طرف لڑھکنے لگا، مگر میں نے اسے پھر پاؤں کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ وہ پرے جا لڑکھڑایا اور دیوار سے جا لگا۔ اسی وقت اول خیر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ اس کی جب نظر چارپائی پر بندھی عارفہ پر پڑی تو بے اختیار اس کے حلق سے ”او خیر......“ برآمد ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف کونے میں دبکے ہوئے زخمی نوید سانچے والے کو بھی دیکھا۔

”اول خیر! باہر والے نمٹا لیے......؟ یا کوئی باقی ہے ابھی......؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”سب نمٹا لیے...... اب یہ بھی نمٹا دو جلدی تو نکل چلیں......“ وہ بولا۔

”کہیں نہیں جانا ہے۔ تم اِسے کھولو، میں جب تک اسے دیکھتا ہوں......“ میں نے گمبھیر لہجے میں اول خیر سے کہا اور وہ مجھے کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا، لیکن میں تب تک نوید کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر وہ کسمسانے لگا۔ میں نے فوراً اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ تب تک اول خیر عارفہ کو جکڑ بندوں سے آزاد کرا چکا تھا۔ اس کا آزاد ہونا تھا کہ اس نے کسی زخمی ناگن کی طرح حلق سے پھنکار جیسی آواز خارج کی، اول خیر کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا، وہ بے چارہ بھی منجی کی پائینتی پہ ٹکا بیٹھا تھا کہ ایک طرف کو جا لڑھکا۔ اس حملے کے لیے وہ کب تیار تھا یا اُسے کب عارفہ سے ایسی توقع ہو سکتی تھی، اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھڑام سے کمرے کے فرش پر آرہا۔ عارفہ زخمی شیرنی کی طرح چارپائی سے چھلانگ مار کر اُتری اور سیدھی نوید سانچے والا پر آپڑی۔ اس نے نوید کے چہرے پر اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے کھرونچے ڈال دیے۔ وہ درد و اذیت سے پہلے ہی نڈھال تھا۔ عارفہ کے تیز نکیلے ناخنوں نے اس کے مکروہ چہرے پر سرخ لکیریں کھینچ ڈالیں...... اس قدر زور لگا کر اور گویا اپنے اندر کی نفرتوں کو لاوے کی صورت اُگلتے ہوئے...... اس نے طاقت کا بھرپور استعمال اپنے تیز اور نکیلے ناخنوں سے کیا تھا کہ نوید کا چہرہ خون کی چھپڑی بن کر رہ گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کا سارا گوشت ہی اُدھیڑ ڈالا ہو۔ مگر عارفہ کا اُبال، طیش اور غضب ناکی پھر بھی کم نہ ہوئی تو اس نے اپنا منہ پھاڑ کر نوید کے گال پر کاٹ ڈالا، اور اس کے چہرے کا گوشت نوچنے لگی دانتوں سے...... اس کی جنونی کیفیات کو دیکھتے ہوئے میں نے عارفہ کو کاندھے سے پکڑ کر نوید سے الگ کیا۔ نوید کی چیخیں اُبل رہی تھیں۔ مگر عارفہ کا جنون، خرد کو کسی آگ کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ میرے زور لگانے پر وہ ہٹی تھی مگر پھر پاگلوں کی طرح غراتی ہوئی نوید پر پل پڑی۔ اس کا منہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

”م...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ذلیل، کمینے کُتے! تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی میں...... تیری خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سب کو بھولا، جھٹلایا چھوڑا مگر تو نے اس کا مجھے کیا صلہ دیا۔ سوائے مجھے اب تک کھلونا بنانے کے...... اور اب میری اور میرے بچوں کی جان بھی لینے کے درپے تھا۔ میں تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی۔“ وہ جوشِ جنوں کے مارے پاگل سی ہوئی جا رہی تھی۔ اس بار اس نے نوید کی گردن پر منہ مارا اور اگر میں نے عارفہ کو بالوں سے پکڑ کر بروقت پرے نہ کھینچ لیا ہوتا تو وہ اس کا نرخرہ اُدھیڑ ہی ڈالتی۔ تب ہی میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ ایک طرف فرش پر پڑی ہانپنے لگی۔ ہانپنے کے دوران اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹ سے مشابہ آوازیں بھی خارج ہونے لگی تھیں۔

کہاں تو وہ نوید کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ اس کی خاطر اس نے اپنے فرشتہ صفت سسر سرمد بابا کی جان لی۔ عابدہ کو اپنے مفاد اور بعد میں نوید کے ہی ایما پر امریکی درندوں کی بھینٹ چڑھایا اور آخر میں اپنے اسی محبوب کی خاطر اپنے دونوں بچوں کو بھی بھلا بیٹھی تھی، لیکن...... جب اسے اپنے محبوب کا اصل اور بھیانک چہرہ نظر آیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ کبھی کبھی محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ محبت ایک طاقتور ...جذبہ سہی، لیکن اگر یہی محبت نفرت کا لبادہ اُوڑھ لے تو پھر وہ محبت جیسے لازوال جذبے پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ غالباً عارفہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

”اِسے سنبھالو اول خیر! میں تب تک کسی سے بات کر لوں......“ میں نے اول خیر سے کہا اور عارفہ کی طرف اشارہ کیا۔

”کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟“ اول خیر نے پوچھا۔

”پولیس اسٹیشن!“ میں نے جواب دیا تو نڈھال پڑے نوید سانچے والا کے کان میں بھی یہ لفظ پڑا۔ وہ جیسے تکلیف بھلا کر بمشکل ایک ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ٹھ...... ٹھہرو......! پ...... پولیس کو مطلع مت کرو، شاید میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میری آج سے دشمنی بھی ختم...... مجھے جانے دو، میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔“

”او...... خیر!“ اس کی بات پر اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا جبکہ میرے چہرے پہ ایک زہرخند مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ تب ہی میرے بجائے اول خیر نے، عارفہ کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے فرش پر بکھرے پڑے نوید سانچے والا سے کہا۔

”اوئے! نودولتیے سیٹھ! تیری یہ دکان داری اپنے شہزی کاکا کے سامنے نہیں چل سکتی۔ شہزی نے اگر یہ کام کرنا ہوتا تو تیری یہ آفر تو ان کے سامنے کوڑیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو اسے پہلے بھی اس کے مقابلے میں جانے کتنی بڑی بڑی اور بار بار ملتی رہی ہیں۔ یہ اگر پیسوں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہوتا تو آج آرام سے کسی محل میں بیٹھا عیش کی زندگی گزار رہا ہوتا۔“

”م...... میں دس کروڑ دینے کو تیار ہوں......“ سیٹھ

نوید ہکلایا۔

’’دس کروڑ جمع دس بھی کر دو تو بھی کم ہیں۔ نوید مردود سیٹھ!‘‘ اول خیر غرایا۔ ’’جانتے نہیں ہو تم کہ شہزی کس کا بیٹا ہے؟ جو نہ جھکنا جانتے ہیں نا بکنا۔‘‘ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

’’کھڑکا دے فون پولیس اسٹیشن۔‘‘

میرے چہرے پہ ہنوز زہر خند مسکراہٹ طاری تھی۔ نوید کا سیل فون میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ’’مجھے اس کی بات سن لینے دو اول خیر......!‘‘ میری بات پر اول خیر کے چہرے پر پہلے تو ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کے بعد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

’’شش...... شہزی! اس کمینے کی کوئی بات مت سننا! فوراً پولیس کو فون کرو۔ مت آنا اس دغاباز کے جھانسے میں......‘‘ عارفہ فوراً چلّا کر بولی تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کاٹ دار طنز سے کہا۔

’’بہت جلدی آپ کو اس دغاباز کی اصلیت کا پتا چلا ہے میڈم! آپ نے تو اس کے ہاتھوں میں کھیل اور کھلونا بن کر اپنے محسنوں کو بھی دغا دے ڈالا، دیکھ لو اب یہ نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے اُن دونوں معصوم بچوں، دانی اور پنکی کی بھی جان لینے کے درپے تھا۔‘‘

میری بات پر عارفہ کے سُتے پڑے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے بچوں کے ذکر پر فکرمندی سے بولی۔

’’پپ...... پنکی اور دانی کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟‘‘

’’وہ بالکل محفوظ ہیں۔ شکر کرو کہ میں نے بروقت اس خبیث کی اس آخری سازش کا وہ تار ڈھونڈ لیا جس میں جکڑ کر یہ تم سمیت پنکی اور دانی کو بھی جکڑ ڈالنا چاہتا تھا۔‘‘

اس کے بعد میں نے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سے پڑے سیٹھ نوید کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ’’کیا کہتے ہو نوید سیٹھ! اس فقیروں والی حالت میں اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟‘‘

’’تت...... تم جو چاہو گے وہی ہوگا...... لل...... لیکن مجھے پپ...... پولیس کے حوالے مت کرو۔‘‘ وہ گڑگڑایا۔

’’تو پھر میری ایک بات کا سچ سچ جواب دو۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میں تیار ہوں۔‘‘

’’لولوش اور وزیر جان کے بارے میں مجھے بتاؤ......‘‘

’’لولوش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ’’نکی تا‘‘ میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے۔‘‘ سیٹھ نوید فرفر بتانے لگا۔ میں نے کہا۔

’’تمہارے لولوش کے ساتھ کس بنیاد پر تعلقات استوار ہوئے تھے؟‘‘ میں نے اگلا سوال کیا۔ اگرچہ مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

’’اڑیسہ کمپنی کے حصص کا حصول، تمہاری موجودہ سرگرمیاں اور...... اور وہ طط...... طلسم نور ہیرا، اس سے متعلق ایک ایک رپورٹ اس تک پہنچانے کے لیے میں اس کا جاسوس بنا ہوا تھا۔‘‘

’’تو اب تک تم نے اسے کیا رپورٹ دی؟‘‘

’’وہی جو میں جانتا تھا۔ تمہاری پاکستان اور ملتان میں انٹری، نوشابہ اور چوہدری ممتاز کے خلاف جوابی پریس کانفرنس اور طلسم نور ہیرے کی حکومت کو حوالگی کے متعلق وہ سب کچھ بتا ڈالا تھا میں نے اسے۔‘‘

’’ہمم......‘‘ میرے حلق سے پُرسوچ ہمکاری خارج ہوئی۔

’’تمہارا لولوش سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟ فون پر یا اور کوئی ذریعہ ہے؟‘‘

’’شہزی! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تمہیں اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔‘‘ عارفہ نے پھر اپنی ٹانگ اڑائی۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور جھڑکا۔

’’تم ابھی اپنی زبان بند رکھو۔ جب وقت آئے گا تو میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔‘‘ وہ خاموش ہو گئی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ اسے اب اپنے بچوں کی فکر ہو رہی تھی۔

’’ہاں! تم جواب دو میری بات کا......‘‘ میں نے نوید کی طرف گھورا۔

’’مجھے میرے بنگلے پر لے چلو...... میں وہاں تمہیں سب سچ سچ بتا دوں گا۔‘‘ وہ بولا۔ اسی وقت اول خیر نے میرے قریب آ کر کان میں سرگوشی کی۔

’’اوئے کاکے! اس کے جھانسے میں مت آنا، یہ اس وقت رنگے ہاتھوں ہماری گرفت میں ہے۔ اپنے بنگلے پر جا کر یہ پتھر کی طرح بھاری پڑ جائے گا۔ جو پوچھنا ہے اِدھر ہی پوچھ لے، پر یہ انٹرویو ہن چھیتی نال مکا لے (جلدی ختم کر لے) اس وقت اس کے سارے گماشتے ہمارے قبضے میں ہیں۔‘‘

سیٹھ نوید کی یہ چالاکی تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔ ’’میرے پاس وقت کم ہے نوید! آخری سوال کا جواب دو......‘‘

وہ اپنے خون آلودہ چہرے کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا بولا۔ ’’میں اب تمہارے سوالوں کے جواب اپنے بنگلے پر ہی دوں گا۔‘‘ وہ جیسے ایک دم اڑ گیا۔

’’اس کے پاس ایک بلیک بیری موبائل ہے اور اسی میں ہی لولوش کا پرسنل نمبر سیو ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ میں پڑا ہے۔‘‘ عارفہ نے فوراً جواب دیا۔

’’اوکے! تم سب جانتی ہو تو پھر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔‘‘ میں دانستہ یہ کہتے ہوئے بظاہر نمبر پنچ کرنے لگا۔ مگر میں یہ نوید کو دکھاوے کے لیے کر رہا تھا۔

’’تت...... تم یہ نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! اگر میں گرفتار ہو گیا تو تمہاری عابدہ بھی نہیں بچے گی۔‘‘ اس مردود نے چلّا کر کہا۔ وہ بے بس تھا اور اب میری کمزوری سے کھیلنے لگا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر میرے اندر ایک اذیت ناک سا چھناکا ضرور ہوا مگر میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

’’وہ اس وقت لولوش کی قید میں نہیں، کورکوران کی جیل میں ہے۔ عارفہ اب میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ذریعے امریکا میں بہ آسانی عابدہ کے حق میں مقدمہ لڑوں گا۔‘‘ میں نے یہ اس کے منہ سے اُگلوانے کے لیے کہا تھا۔ جس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی تھیں جو نوید نے ظاہر ہے کہ عارفہ سے بھی مخفی رکھی ہوں گی۔

’’ہاہا...... ہاہا......‘‘ نوید سانچے والا نے ایک بدمست قہقہہ خارج کیا اور اسی لہجے میں بولا۔ ’’بڑی خوش فہمی ہے تمہیں......‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ میں نے سیل فون اپنے چہرے سے ہٹا کر اس کی طرف چونکنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ یہ میری اداکاری تھی۔

وہ بولا۔ ’’تمہیں شاید نہیں معلوم کہ...... عابدہ کا مقدمہ سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ’’ٹائیگر ٹیگ‘‘ کے سربراہ کے ہاتھ میں ہے۔ باسکل ہولارڈ نام ہے اس کا اور لولوش اس کا لاڈلا داماد ہی نہیں بہت سے اہم منصوبوں میں وہ اس کا دستِ راست بھی ہے۔ کورکوران کی جیل میں صرف باسکل ہولارڈ کا حکم چلتا ہے، اس بھیانک جیل کی لیڈی وارڈن مس لیڈی بوسکی ایک خرانٹ بڈھی چڑیل ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر رہ چکی ہے۔ اُسے باسکل ہولارڈ یا لولوش جیسا کہیں گے وہ وہی کرے گی۔ تم نے طلسم نور ہیرا حکومت

اکتوبر 2017ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی جستجو

یکتارا
آسمان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر ڈالا...... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز
شام شب
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا دلفریب احاطہ
باغی
ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ...... سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان
وقت
دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان کی آہٹ...... **حسام بٹ** کے خیالات کی روانی
اس کے علاوہ
ثمر عباس۔ محمد یاسر اعوان، محمد فاروق انجم، تنویر ریاض۔ محمد الیاس اور اسما قادری کی خوبصورت کہانیاں

پاکستان کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ کیونکہ اس ہیرے کے بدلے وہ تم سے عابدہ کی واپسی کا مطالبہ کرنے والے تھے۔ لیکن خیر! طلسمِ نور ہیرے کا دوبارہ حصول تمہارے لیے کیا مشکل ہے، جسے تم انڈیا کے پُرخطر جنگلاتی اور دلدلی جزیرے سے اُڑا لائے ہو تو پاکستان کیا شے ہے۔“

اس مردود کے منہ سے وطنِ عزیز پاکستان کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سا اُڑ گیا۔ یہ غدارِ وطن تھا جو اپنے منہ سے اعتراف کر چکا تھا کہ وہ ملکی دشمن عناصر کا ایجنٹ بن چکا تھا۔ میں غیظ و غضب سے بپھر کر آگے بڑھا اور اپنے بوٹ تلے اس کی گردن لے کر اس کا چہرہ دیوار سے ٹکا دیا۔

”خبردار! اگر دوبارہ میرے وطن کے لیے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے۔ تم جیسے ضمیر فروش ہی یہاں بیٹھے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! میں اپنے وطن پر ہزاروں عابدائیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر قومی اور ملکی امانت کبھی بھی دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عابدہ بھی کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کی رہائی اور واپسی کے بدلے میں اس کے پیارے وطن کی امانت کا سودا ہو۔ وہ اس کے بدلے میں موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں کس غیور اور سرفروش باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔“

آتشِ لہو رنگ میں یہ الفاظ اس سے کہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے بوٹ ہٹا لیا۔

”تو پھر بھول جاؤ عابدہ کو......“ نوید سانچے والا ہانپتے ہوئے بولا اور اپنی گردن مسلنے لگا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پہلے میرا ارادہ پولیس اسٹیشن فون کرنے کا تھا مگر اب اس مردود کی باتیں سن کر میں نے وہ بدل دیا اور میجر وسیم بھٹی کے دیے ہوئے ہاٹ لائن نمبر پر میں نے فون کر دیا اور مختصر الفاظ میں انہیں سب بتا ڈالا۔ اس مکان کا اتا پتا دینے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ جب نوید کو یہ پتا چلا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے پاک رینجرز کے ایک خصوصی ونگ کے حوالے کرنے والا ہوں تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ غیر نظر آنے لگی، وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلّانے اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا جس میں عابدہ کا حوالہ بھی شامل تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور اول خیر کو اس کتے کا منہ بند کروانے کے لیے خفیف اشارہ کر دیا۔ اس نے عارفہ کو چھوڑا اور نوید سانچے والا کی دھنائی کر ڈالی۔

اگلے ڈیڑھ سے دو گھنٹوں کے اندر اندر نوید سانچے والا اور اس کے تمام ساتھی راٹھور وغیرہ سمیت اس حساس ادارے کی گرفت میں آ چکے تھے۔

اگرچہ اس میں عارفہ کا بھی مشورہ شامل تھا کہ پہلے نوید سانچے والا کے بنگلے پر جا کر وہاں سے اپنا ضروری سامان سمیٹ لیا جائے اور بلیک بیری والا وہ موبائل سیٹ بھی لے لیا جائے جس سے نوید سانچے (اور عارفہ بھی کبھی کبھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی) لولوش سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ ارادہ میرا بھی تھا لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ سیٹھ نوید کا بنگلا سیل کرنے سے پہلے عارفہ نے اپنے چند کاغذات، سامان اور بلیک بیری کا وہ خاص موبائل سیٹ فون قبضے میں کر لیا تھا۔

اس کے بعد میں اور اول خیر عارفہ کو لیے بیگم ولا پہنچے تو اپنے بچوں کو سلامت دیکھتے ہی عارفہ بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

اس کے بعد جب جذبات کا یہ طوفان تھما تو عارفہ میرے قدموں میں گر پڑی، لیکن میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کر دیا۔ اس کا چہرہ اشکِ ندامت و شرمندگی کے باعث بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔

”میں نے خود کو بہت گرا لیا شہزی! کہ اب تو میں اپنا سر اُٹھا کر کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں رہی...... کاش! میں اپنے ہاتھوں سے خود کو زندہ دفن کر ڈالتی۔ میں تو...... میں تو تم سے معافی مانگنے جیسا منہ بھی نہیں رکھتی۔ تم ایک عظیم انسان ہو، تم ہمیشہ ہی میرے ساتھ میری برائیوں کے بدلے میں بھلائی کرتے رہے، جس کا ثبوت تمہارے پاس موجود میرے یہ دو بچے ہیں۔ میں کیسی احسان فراموش نکلی کہ...... تم نے اپنی محبوب ہستی، اور اپنی محبت تک کو انسانی ہمدردی تلے قربان کر ڈالا اور میں نے کیا کیا۔ اپنے ہی محسنوں کی قبر کھودتی رہی۔ میں کیا کہوں اب شہزی کہ میرے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ...... اب تم مجھے اللہ کی خاطر معاف کر بھی ڈالو، جس کا مجھے پورا یقین بھی ہے تو تب بھی شاید ہی میرے دل کو...... میری روح کو سکون نہ مل پائے...... میں اب تا عمر ہی اپنے ضمیر کی قبر میں زندہ ہی دفن رہوں گی۔ لیکن...... پھر بھی...... کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر میں تم سے معافی کی درخواست ضرور کروں گی۔ ہو سکے تو اس بدنصیب اور آنکھوں والی ایک اندھی، ضمیر کی اپاہج اور ملعون عورت کو معاف کر دینا۔“

عارفہ یہ کہہ کر سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔

اس وقت کمرے میں ہم سب ہی موجود تھے۔ زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور...... پنکی، دانی بھی...... کمرے کی فضا میں ایک جذبات انگیز سی رقت گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ سب کی نظریں اب رنجور اور شرمندہ، سر جھکائے کھڑی عارفہ سے ہٹ کر میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری ہمکاری اپنے حلق سے خارج کی اور بالآخر اپنے سیدھے ہاتھ کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے عارفہ سے مخاطب ہوا۔

”عارفہ! انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے اور انسان تو ہے ہی خطا کا پتلا۔ لیکن اصل انسان وہی ہوتا ہے جو ٹھوکر کھا کر نہ صرف سنبھل جائے بلکہ سچی نیت اور دل سے اپنا محاسبہ بھی کر ڈالے تو وہ پھر خطا کار نہیں رہتا۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے بغیر کسی اپنے...... بڑے اور نا قابلِ تلافی نقصان کے خود کو سنبھال لیا۔ آپ آج بھی میرے لیے اس عظیم انسان سرمد بابا کی قابلِ احترام بہو ہیں اور میری بہن بھی۔ معلوم ہے ناں آپ کو کہ سرمد بابا کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا اور یہ بھی پتا ہوگا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بے حسی کے باوجود آپ کی ایک مصیبت پر...... مدد کرنے کے لیے...... اطفال گھر کے ”اولڈ ہاؤس“ سے آپ کے ہاں چلے آئے تھے۔ چھوڑیں اب اِن باتوں کو...... میں نے آپ کو معاف کیا اور اللہ سے بھی میری دست بستہ دعا ہے کہ وہ بھی معاف فرمائے۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر سے ہٹا لیا۔ وہ میرے ان الفاظ پر بری طرح چھلک پڑی اور صوفے پر جا کے گر سی گئی۔ وہ سر جھکائے زار و قطار رو پڑی۔ پنکی اور دانی ”مما“ کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھے تھے۔ خود میں اپنی گردن موڑے دو قدم پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں جا بیٹھا تھا۔ شکیلہ، عارفہ کو سنبھالنے کے لیے بڑھی تھی جبکہ زہرہ بانو میری جانب لپکی اور میرے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ ہولے سے میرے کاندھے پر رکھ کر تھپتھپانے لگی۔ ان کا انداز مجھے حوصلہ دینے کا سا تھا۔ کیونکہ میں خود بھی رنجور تھا۔

ندامتوں اور شرمندگیوں کی زیادتی کے سبب عارفہ سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔

شکیلہ، عارفہ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے اول خیر کو پانی کا ایک گلاس لانے کا اشارہ کیا تھا۔ جو وہ فوراً ہی قریب رکھے جگ سے بھر لایا تھا۔

کمرے کی مغموم سی فضا کچھ دیر بعد سنبھلی تو پنکی کی آواز اُبھری...... وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

”مما! خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی اور یہ سب کچھ شہزی انکل کی وجہ سے ہی ہوا ہے، وہ لوگ تو میری اور دانی بھائی کی جان کے بھی دشمن بن چکے تھے۔“

اس کی بات پر مجھے ... اچانک یاد آیا اور میں نے پنکی کو مخاطب ہو کے کہا۔

”ہاں! پنکی بیٹا! مجھے یاد آیا، تم نے کوچنگ سینٹر میں مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ کیا اس بات کی ہمیں تھوڑی تفصیل بتا سکتی ہو کہ تمہیں کیسے ان ساری حقیقتوں کا پتا چلا تھا؟“

سب پنکی کی طرف دیکھنے لگے، عارفہ نے بھی اب اپنا اشکبار سا چہرہ اُٹھا لیا تھا اور اپنی بیٹی کا چہرہ تکنے لگی۔

”مجھے اور دانی بھائی کو...... وہ آدمی سیٹھ نوید شروع سے ہی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔“ پنکی بتانے لگی۔

”ددو جان (سرمد بابا) کو تو وہ آدمی زہر لگتا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا ہم دونوں بہن بھائیوں سے فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ہم اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ مما ہمیں اس رویے پر ڈانٹتی تھیں۔ مگر ہم نے کوئی پروا نہ کی۔ مما نے جب اس آدمی سے شادی کر لی تو میں اور دانی مما سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے بیرونِ ملک جانے لگے مما نے ہمیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کون سے ملک جا رہے ہیں؟ کبھی تھائی لینڈ کہتے تو کبھی ہانگ کانگ...... خیر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ غصہ تو ہمیں اس وقت مما پر اور زیادہ آیا جب انہوں نے بتایا کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے راٹھور انکل کو چھوڑے جا رہی ہیں۔ ہم نے کوئی توجہ نہ دی، پھر مما اپنے شوہر نوید کے ساتھ چلی گئیں۔

”ہمیں تو راٹھور جیسے آدمی کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے ہمراہ اسی قبیل کے آدمی بھی تھے۔ چار پانچ ہی تھے وہ۔ وہ سب مجھے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ ہماری ان سے روز تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ ہم نے بھی ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہوں نے حفاظت کے نام پر ہمیں قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے۔ جانا ہوتا تو ان کا کوئی آدمی ساتھ ہوتا۔ دانی کو ان پر جلدی غصہ آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے راٹھور اور اس کے کسی آدمی کے ساتھ بدتمیزی کر ڈالی۔ انہوں نے اسے مارا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا مما سے میری بات کرواؤ...... انہوں نے انکار کر دیا

اور مجھے بند کر دیا۔ تب ہی میں نے ان کے دو ساتھیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ نجانے کب ان دونوں شیطانوں سے نجات ملے گی۔ تو دوسرے ساتھی نے کہا۔

’’بہت جلد، سیٹھ صاحب اپنی نئی نویلی بیوی کو ٹھکانے لگانے ہی والا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں شیطانوں کی (ہماری) باری آئے گی۔‘‘

’’میں بس ان کی اتنی ہی بات سن سکی تھی اور میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے ددو جان کی بات یاد آ گئی تھی جب انہوں نے مما سے ناراض ہو کے یہ نصیحت کی تھی کہ نوید تمہیں کسی دن بہت بڑا نقصان پہنچائے گا جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہو گی، وہ ایک سازشی ذہن کا کمینہ اور عیار انسان ہے۔

’’مجھے مما کی فکر ہونے لگی۔ سمجھ گئی تھی میں کہ نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے لیے کسی خاص مقصد کے لیے ہی لے کر گیا ہے..... دانی کو حقیقت تو نہیں بتائی تھی، ایک تو اس وجہ سے کہ کہیں یہ خوف دہ ہو کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے دوسرے یہ غصے اور جوش کا تیکھا ہے، کہیں بول ہی نہ دے ان کے سامنے کہ وہ ہمارے خلاف کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔

پنکی نے اتنا بتا کر تھوڑا توقف کیا اس کے بعد مزید بتانے لگی۔

’’میں نے اکثر مما اور نوید سانچے والا کو ددو جان کی وصیت کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے بھی اس وصیت کا علم ہو چکا تھا۔ مجھے مما اور نوید کی شادی پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اگر نوید سانچے والا...کو مما کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی تو پھر کیوں وہ شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس چالاک انسان نے مما سے یہی کہا تھا کہ اُسے ان کی دولت کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ اب مما کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں مما ان پر زیادہ بھروسا کرنے لگیں اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

وصیت کے مطابق مما کا پاپا (محمود، عارفہ کا سابقہ مرحوم شوہر) کی دولت و جائداد، جو درحقیقت ددو جان ہی کی کمائی ہوئی تھی، جس پر مما کا تصرف ختم ہو گیا، مگر بعد میں مجھے ان کی باتیں سن کر پتا چلا کہ نوید سانچے والا..... شادی سے پہلے ہی مما سے پاور آف اٹارنی حاصل کر چکا تھا۔ مما اب نوید سانچے والا کے لیے ایک بے کار شے ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا دل رکھنے اور اپنی چال کو بغیر کسی ٹکراؤ کے آگے بڑھانے کے لیے مما سے شادی رچائی تھی۔ اب نوید سانچے والا کے لیے ہم دونوں اہم تھے۔

اب اسی سلسلے میں راٹھور اور نوید سانچے والا کی آپس میں ٹیلی فون پر باتیں ہونے لگیں۔ تب ہی مجھ پر ایک اور بات کا بھی انکشاف ہوا کہ......نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے بہانے کسی اور ملک نہیں گیا بلکہ وہ اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ مما کو یرغمال بنائے ہوئے ہے اور اب بہت جلد وہ ہم سے ساری دولت اپنے نام منتقل کروانا چاہتا تھا، بات نہ ماننے کی صورت میں وہ ہمیں مما کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اسی دن سے میں نے فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا، یہ اس سے اگلے دن کا ہی ذکر تھا جب شہزی انکل سے میری ملاقات ہو گئی۔‘‘

پنکی اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ ہم سب دم بہ خود اس کی بات سنتے چلے گئے۔ پنکی نے اپنی بات ختم کی تو عارفہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ اس نے بے اختیار پنکی اور دانی کو ممتا بھرے انداز میں خود سے لگا لیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی...’’میرے بچو! تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ میں واقعی اپنی بے لگام خواہشات کے آگے تمہیں بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ اُس مردود انسان نوید نے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے خلاف میں کچھ سننا ہی گوارا نہیں کرتی تھی جو میری بہت بڑی غلطی تھی۔‘‘

’’مما! آپ پریشان نہ ہوں......اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘ پنکی نے ماں سے کہا۔ ’’آپ بس ہمارے ساتھ رہیں اور خوش رہیں۔ شہزی انکل کا یہ احسان تو ہم ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔‘‘ اس کی بات پر میں نے پنکی سے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

’’بیٹا! اس میں احسان کی کیا بات ہے، کیا تم اور دانی نہیں جانتے کہ میرا تمہارے ددو کے ساتھ کیا رشتہ تھا! اُنہوں نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔‘‘

کچھ لمحات بوجھل سی خاموشی تلے بیت گئے۔ اس کے بعد عارفہ نے بھی اب تک کے اپنے پیش گزار حالات کے بارے میں کم و بیش وہی کچھ بتایا جو پنکی نے جراُت اور ہمت سے معلوم کیا تھا۔ تاہم عارفہ کے مطابق نوید نے اس سے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے پاور آف اٹارنی اپنے نام کروایا تھا اور ایسا اس نے کسی وکیل سے.....مشورہ کر کے کیا تھا۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی تو...... زہرہ نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ عارفہ اور پنکی، دانی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے

مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

’’شہزی! یہ تم نے اچھا کیا کہ عارفہ کو معاف کر دیا۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے، لیکن شہزی! معافی تلافی کے علاوہ بھی عارفہ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا اب بھی اس کی گواہی عابدہ کے حق میں بہتر ہو سکتی ہے؟‘‘

زہرہ بانو کی بات پر میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

’’اب وہ وقت گزر چکا۔ عارفہ کی گواہی کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ عابدہ کو سزا ہو چکی ہے۔ وہ تمام حقائق اور گواہیاں جو عابدہ کو بچا سکتی تھیں وہ سب پسِ پردہ ہو چکیں۔ اب صرف ایک بڑی جنگ کے ذریعے ہی عابدہ کو رہائی دلائی جا سکتی ہے۔‘‘

’’میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ عارفہ اب راہِ راست پر آ چکی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عابدہ کے سلسلے میں اس سے کیا مدد لی جا سکتی ہے؟‘‘ زہرہ بانو نے کہا۔

’’میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتی اس سلسلے میں...... ماسوائے نوید سانچے والا اور لولووش سے متعلق چند باتوں اور رازوں کے۔‘‘

اس دوران کبیل دادا نے شاید زہرہ بانو کے کچھ بولنے کا لمحہ بھر انتظار کیا تھا، اس کی خاموشی پر وہ ذرا کھنکھار کر بولا....’’پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے، سیٹھ نوید بھی بالواسطہ سہی، اسپیکٹرم کا ہی ایک ایجنٹ تھا۔ بالکل ہولارڈ سے نہیں تو اس کے کم از کم اسپیکٹرم کے سربراہ لولووش سے تو ضرور رابطے تھے۔ پھر اس کا وہ خصوصی موبائل سیٹ بھی ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے۔ جس سے وہ لولووش سے رابطے میں رہا ہے۔ لیکن بات وہی ہے۔ جو کرنا ہو گا ہمیں اپنی صوابدید پر کرنا ہو گا۔ سیٹھ نوید اب کام کا نہیں رہا۔ اس کا باب سمجھو یہاں ختم ہوا۔ خود لولووش کے لیے بھی وہ اب اتنی اہمیت کا حامل نہ رہا ہو گا۔ رہی عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی بات تو وہ اب آزاد ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ عارفہ کو ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سہی، عقل آ گئی۔ باقی عابدہ بہن کی رہائی کا پلان وہی رہے گا جو بنایا جا چکا ہے۔‘‘ کبیل دادا اپنی بات کہہ کر خاموش ہو رہا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ کبیل دادا وہ واحد آدمی تھا جو بغیر کسی مبالغہ آرائی اور قیاس آرائی کہ ٹھوس بنیادی دلیل کے ساتھ بات کرنے کا عادی تھا ورنہ خاموش رہتا تھا۔ ہم پھر بھی کچھ اندازوں اور پیش آمدہ حالات پر قیاس آرائیاں قائم کرتے تھے، مگر کبیل دادا ایسا ہرگز نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی بات درست محسوس ہوئی تھی اور کسی حد تک زہرہ بانو بھی اس پر صاد ہی نظر آتی تھی۔

ہم تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی گھر روانگی سے متعلق پلان کرنے لگے۔

دو دن، تینوں ماں، بیٹا اور بیٹی بیگم ولا میں ہی رہے تھے۔ اس کے بعد میں اور اول خیر شکیلہ سمیت انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر واپس ہو لیے۔

عارفہ نے کورٹ میں سیٹھ نوید سے خلع کی درخواست دے دی تھی، جبکہ اس پر مقدمہ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی دائر کر چکی تھی جس میں دھوکا، فراڈ، جعل سازی سے لے کر اس کے بچوں کا اغوا اور خود اس کے اپنے ارادۂ قتل وغیرہ شامل تھا۔

ہم تینوں بیگم ولا پہنچے تو زہرہ بانو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی بولی۔ ’’شہزی! وہ......نوشابہ کا فون آیا تھا......‘‘

’’کیا......؟‘‘ میں بری طرح چونکا۔

’’او......خیر!‘‘ اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

’’کیا کہہ رہی تھی وہ......؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’مجھ سے زیادہ بات نہیں کی اس نے......‘‘ زہرہ بانو بولی۔ ’’کہہ رہی تھی۔ شہزاد احمد خان سے بات کرنی ہے، تمہارا اسیل فون مانگ رہی تھی جو کہ ظاہر ہے، نہیں تھا۔‘‘

’’تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے؟‘‘ شہزی نے کہا۔

’’پوچھا تھا۔ اس نے نہیں بتایا، ویسے بھی اس کی آواز سن کر میرا اپنا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اسے کھری کھری سنا دوں مگر بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔‘‘

’’اچھا کیا تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔‘‘

’’وہ دوبارہ فون کرے گی۔‘‘ زہرہ نے آخر میں بتایا۔

’’لیکن سمجھ نہیں آ رہا...... اس نے فون کیوں کیا اور وہ بھی تم سے بات کرنے کے لیے......؟‘‘

’’کوئی گیدڑ بھبکی دینا ہو گی اور کس لیے کیا ہو گا؟‘‘ اول خیر نے کہا۔

’’یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دھونس جمانا چاہتی ہو......‘‘ شکیلہ نے بھی لقمہ دیا تو اول خیر جیسے اسی کے بولنے کا منتظر تھا۔

اس کی طرف دیکھ کر بظاہر سنجیدگی سے بولا۔

''مثلاً......؟''

شکیلہ کچھ گڑبڑا سی گئی پھر اُلجھ کر بولی۔ ''مثلاً کیا مطلب؟''

''کس قسم کی دھونس......؟''

''دھونس کس قسم کی ہوسکتی ہے؟ کوئی دھمکی شمکی ہی ہو گی۔''

''دھمکی تو سمجھ میں آتی ہے، یہ شمکی کیا ہے؟''

''یہ دھمکی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ جیسے لیکن ویکن...... اور......''

''شکیلہ، وکیلہ۔'' اول خیر نے اس کا جملہ اُچک لیا۔ وہ اُسے گھور کے بولی۔

''نام کے ساتھ اس طرح کے لاحقے وسابقے نہیں آتے...... اب ہم اول خیر کو خیر وشر کہہ دیں...... جو تم اب اس سنجیدہ محفل میں پھیلانے لگے ہو، تو یہ لفظ بالکل بھی نہیں جچے گا، بجز اس کے کہ ہم خیر اور شر کو الگ الگ معنوں میں دیکھیں......''

میں، زہرہ بانو اور کبیل دادا ان دونوں کے ''پیچ'' پڑتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

شکیلہ نے اپنی طرف سے اول خیر پر بڑی بھاری چوٹ ماردی تھی اور وہ اب اپنی بغلیں جھانک رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔

''اچھاجی! آپ تو خاصی اُردو داں ہوگئی ہیں...... نازکی بیگم!''

''اس میں اردودانی والی کیا بات ہے، کم از کم اتنی اردو تو ہر عام و خاص کو آتی ہی ہے۔ شہ مات ملتے ہی دکھانے لگے اپنی اوقات......؟ کتنی بار تم سے کہا میں نے کہ میرا نام مت بگاڑا کرو...... بلکہ کسی کا بھی نہیں بگاڑنا چاہیے، یہ گناہ ہے۔'' وہ اسے گھور کے بولی۔

''ان دونوں کا جلد ہی بندوبست کردینا چاہیے، ورنہ ان کی لڑائی کسی دن بیگم ولا کے پُرسکون ماحول میں مہابھارت چھیڑ دے گی۔'' معاً کبیل دادا نے معنی خیز لہجے میں کہا تو اول خیر نے مجھے آنکھ مار کے کبیل دادا سے کہا۔

''وڈے استاد جی! اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تُسی بھی ہُن پالے لگ ہی جاؤ......'' اس کی بات پر میں نے دیکھا کبیل دادا کچھ گھبرا سا گیا اور چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اول خیر کو چھیڑ کر پچھتایا ہو، جبکہ میں نے زہرہ بانو کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

کبیل دادا کی یہ بھول تھی کہ زہرہ بانو کو اس کے دل کا حال معلوم نہیں جبکہ یہ میں جانتا تھا کہ زہرہ بانو کو کبیل دادا کا حالِ دل بھی معلوم تھا اور بہت کچھ بھی۔ اسی سبب زہرہ بانو کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔ زہرہ بانو کے چہرے پر حیا کی لالی دیکھتے ہی میں نے فوراً اول خیر کی ہاں میں ہاں ملادی۔

''واہ، اول خیر! کبھی کبھی مذاق میں تم بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہو...... سہرا سجانے کے معاملے میں تم اور کبیل دادا دونوں ہی خوش نصیب ہو۔''

''اوخیر...... کاکے! وہ کس طرح......؟'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں میری طرف دیکھ کر گویا جان بوجھ کر وضاحت طلب انداز میں کہا تو میں بھی جیسے موقع محل پاتے ہی یک دم بولا۔

''اس لیے کہ تم دونوں کے رشتے بیگم ولا کی اس چھت کے نیچے موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں پہلے شکیلہ اور پھر آخر میں زہرہ بانو پر اپنی نظریں جمادیں۔

کبیل دادا کسی بچے کی طرح خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے بھی آج اس کے اندر کا برسوں پرانا خوف نکالنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اول خیر کو میں نے ''شہ'' دینے کے لیے آنکھ ماری تو وہ بولا۔

''اوخیر......! یہ ہوئی نا بات...... اب تو مقابلہ جے ہی جے...... عرصہ ہوا بیگم ولا میں ڈھول تاشے اور گج وج ہوئے۔'' پھر وہ حواس باختہ سے کھڑے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔ ''ارے وڈے استاد جی! یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگے؟''

''میں ذرا آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں جارہا ہوں۔'' کبیل دادا نے جب دیکھا کہ میں اور اول خیر اس کے درپے ہونے لگے ہیں تو اس نے وہاں سے کھسکنا چاہا مگر میں نے اس بار سنجیدگی سے اُسے پکارا۔

''کبیل دادا......!'' وہ میری آواز پر چونکا اور میری جانب تکنے لگا۔

''بہت آرام کرلیا تم نے...... اور بہت یک طرفہ عذاب سہہ لیا......'' میری آواز گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ کمرے کی فضا جو کچھ دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ کی نوک جھونک کی وجہ سے چلبلی سی ہورہی تھی، وہ اب ایک گمبھیرتا ماحول میں بدل گئی۔ کبیل دادا کا بھاری کھردرا چہرہ ایک زبردست ارتعاش

تلے نظر آنے لگا جبکہ زہرہ بانو حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ شکیلہ اور اول خیر بھی یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں! کبیل دادا! محبت کی ہے تو خم ٹھونک کر اس کا اظہار بھی کرو ورنہ محبت کرو ہی مت...... اس بھول میں مت رہنا کہ تمہارے حالِ دل سے صرف ہم ہی واقف ہیں بلکہ جسے تم اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے ہو، وہ بھی تمہارے اس مخفی جذبۂ دل سے واقف ہے۔''

میں نے جیسے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔ کبیل دادا کی حالت دیدنی ہورہی تھی۔ اس نے ایک نظر بڑی ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے قریب کھڑی زہرہ بانو پر ڈالی، جو خود میری جانب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اب کبیل دادا کی طرف دیکھ رہی تھی، یہی وہ لمحہ تھا جب زہرہ اور کبیل دادا کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کبیل دادا نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ وہ اس سمے لگتا ہی نہیں تھا کہ اپنی حیثیت میں باوقار، سنجیدہ مزاج اور دبنگ کبیل دادا ہے۔ اس وقت انجانے سے خوف تلے مرجھا کے رہ گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی ...کہ زہرہ بانو کی نگاہیں ہنوز کبیل دادا پر ہی جمی رہ گئی تھیں۔ شرم وحیا کی وہ لالی جیسے پل کے پل بدل کے پرکھنے والی نظر میں اُتر آئی تھی۔ ایسے میں کئی رنگ اس زہرہ نگار کے رخِ مہتاب پر چمکے تھے، جو ریشمی ڈوروں میں اُلجھے ہوئے بھی اور یادِ رفتگاں کی اَن گنت گتھیوں میں لپٹے ہوئے بھی۔ ان میں کشش وپیچ کا عذاب بھی تھا اور رنج والم کا تضاد بھی۔ کچھ رنگ پھیکے تھے اور کچھ اُجلے، مگر اُجلے رنگوں میں بے نام سی بے رونقی بھی تھی تو خوش آئند آرزوؤں کی دھنک بھی......

لمحاتی خاموشی کے بعد میں نے کبیل دادا کی کیفیاتِ دروں و بروں کو معمول پر لانے کی غرض سے اس بار براہِ راست زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے کہا۔

''زہرہ......! ہم نے اب تک کئی محاذوں پر ایک ساتھ شامل رہتے ہوئے دشمنوں سے جنگیں لڑی ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کو جان چکے ہیں۔ ہمیں اپنے کردار واوصاف کے سلسلے میں ایک دوسرے کو تمہید دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی بھی سچائی اور وفاداری کا پیمانہ اب کسی بھی قسم کی کسوٹی پر پرکھنے کا محتاج نہیں رہا ہے۔ اب تو بس آنکھیں بند کر کے اپنے جس ساتھی پر بھی اُنگلی رکھو ایک ہی جواب ملے گا یعنی وفاداری اور جاں نثاری۔ زہرہ! زندگی کی یہ بھاگ دوڑ اور نفسانفسی اپنی جگہ لیکن...... انسان کو راہ میں کچھ ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں جو بے حد ضروری ہوتے ہیں...... ان کے بغیر زندگی کی تھکن زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے...... اگر سچی محبت کرنے والے ایک ساتھی کا ساتھ ہو تو یہ سفر بہ آسانی کٹ جاتا ہے۔ پہاڑ سا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے، گونا گوں حالات کی کشتی اسی بادبان کے سہارے ہی تو طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے ذرا لمحے توقف کیا پھر بولا۔

دشمنِ جاں

وہ قبر سے لپٹا دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''ہائے سرور! تم کیوں مرگئے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا تھی...... میری دنیا لٹ گئی...... میں برباد ہوگیا...... ہائے ہائے، کاش تم نہ مرتے......!''

وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو اس کی حالتِ زار پر ترس آگیا۔ رک کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو بھائی...... ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے...... حوصلے سے کام لو...... مرنے والا کون تھا تمہارا؟''

''میرا تو یہ دشمن نکلا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مشکل سے اس کی قبر تلاش کی ہے...... یہ میری بیوی کا پہلا شوہر تھا۔ یہ نہ مرتا تو میری زندگی برباد نہ ہوتی...... ہائے، سرور! تم کیوں مرگئے؟''

واہ کینٹ سے عمر دراز کا واویلا

''زہرہ! کبیل دادا ایک نیک شریف اور بہت وفادار انسان ہے، یہ جتنا دبنگ ہے، اندر سے اتنا ہی معصوم فطرت بھی۔ فیصلہ تمہارا ذاتی ہے مگر اس میں ہم سب کی خوشی ہے کہ...... اگر تم کبیل دادا کو اپنی زندگی کا ہم سفر اور ساتھی کے طور پر چن لو......''

وقت جیسے ایک دم تھم گیا۔ گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔ سانسوں کی بازگشت جیسے بہ زبان یک خاموشی چیخنے لگیں۔ کبیل دادا کا وہ راز جو اَب تک اس کے دل میں تھا آج میں نے وہ کبیل دادا کی موجودگی میں ہی زہرہ بانو کے سامنے طشت ازبام کردیا تھا۔ آج میں نے کبیل دادا کا وہ خوف جڑ سے کاٹ پھینکا تھا جو کسی حسین ''آسیب'' کی طرح اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ حسین اس لیے کہ وہ اس کی سرمستی میں آپوں آپ ہی مگن رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس کے عذاب میں وہ خود ہی خود ایک عجیب سی لذّت محسوس کر

"اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔" میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا، دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

"شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔"

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آگیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جارہا تھا اور اس کے حلق سے "اوخیر......" برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آگیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

"ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟"

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کردیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......" میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی، ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھاخ پٹاخ کی، پھر چلّا چلّا کر...... "پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔" یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

"جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟"

"ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟"

"سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہوکر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا......" حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... "یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتارہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟"

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

"کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔"

"او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔" وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ "پتا نوٹ کرو......"

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلّایا تھا۔

"کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟" دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

"وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔"

"او...... خیر کا کے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......"

"گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......" میں نے کہا۔

"اوخیر......" وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کر لیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی...... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

''اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔'' میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

''شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔''

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جارہا تھا اور اس کے حلق سے ''اوخیر......'' برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جاکر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگالیا۔

''ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟''

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''ج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کردیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......'' میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلّا چلّا کر...... ''پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔'' یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

''ج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟''

''ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟''

''س...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہوکر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا......'' حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... ''یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتارہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟''

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

''کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہوگیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔''

''او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہوگا۔'' وہ جلدی سے خفیف ہوکے بولا۔ ''پتا نوٹ کرو......''

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلّایا تھا۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟'' دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہوگا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہوگا۔''

''او...... خیر کا کے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''اوخیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آگئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہوسکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آرہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کررہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جاکر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہوگئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کردیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کرسکتا تھا اور بہت پہلے کرلیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ...... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھالیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آرہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جاسکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آرہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگادی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہوسکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑسکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہوگیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

''اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔'' میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

''شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔''

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جا رہا تھا اور اس کے حلق سے ''اوخیر......'' برآمد ہوا!..... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جا کر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟''

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کر دیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......'' میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی، ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا پٹاخ کی، پھر چلّا چلّا کر...... ''پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔'' یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

''جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟''

''ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟''

''سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا......'' حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... ''یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟''

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

''کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہو گیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔''

''او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہو گا۔'' وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ ''پتا نوٹ کرو......''

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتا دیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی سن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلّایا تھا۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟'' دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہو گا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہو گا۔''

''او...... خیر کا کے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آجاؤ......'' میں نے کہا۔

''اوخیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آ گئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا اسٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آ رہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کر رہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جا کر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہو گئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کر دیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا اور بہت پہلے کر لیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ..... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھا لیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آ رہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جا سکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آ رہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہو سکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑ سکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہو گیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

''اس وقت جو میں کہہ رہا ہوں وہی کرو...... وقت نہیں ہے میرے پاس...... جلدی۔'' میں نے اس بار غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔ دونوں نے میرا حکم بجالانے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔

میں اور اول خیر جب جلدی سے واپس کوٹھی کی طرف جانے لگے تو پنکی نے مجھے آواز دی۔

''شہزی انکل! مما کے لیے کچھ کیجیے گا پلیز......! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ان کی جان سخت خطرے میں ہے۔''

میں نے پنکی کو اس سلسلے میں تسلی دی۔ دونوں کو شکیلہ کے ساتھ روانہ کرتے ہی میں نے اول خیر کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور دوبارہ عارفہ کی کوٹھی میں داخل ہوا۔ گیٹ بند کیا اور اندر آ گیا۔ اول خیر حیران پریشان اِدھر اُدھر پڑے راٹھور کے گرگوں کو تکے جا رہا تھا اور اس کے حلق سے ''اوخیر......'' برآمد ہوا...... اول خیر سے ان سب کو رسی سے جکڑ کر باتھ روموں میں پھینکنے کا کہا اور خود ایک طرف کو لپکا۔

مجھے راٹھور کی تلاش تھی، جلد ہی وہ مجھے ایک کمرے میں کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا نظر آ گیا۔ اس کی ناک پر بھدے انداز میں پٹی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی جو اس نے خود ہی واش روم میں جا کر کی تھی۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس نے ریسیور پھینک کر بھاگنا چاہا مگر میں نے ایک ہی جست میں اس کے سر پر پہنچ کر اسے دبوچ لیا اور اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے اسے وہیں ایک بیڈ پر ڈال دیا اور اسٹینڈ پر رکھے ٹیلی فون کے نفیس سیٹ کے کریڈل سے جھولتے ہوئے ریسیور کو تھاما اور اپنے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو، ہیلو...... راٹھور! کیا ہوا......؟ تم اچانک کہاں چلے گئے......؟''

دوسری طرف سے چیختی ہوئی آواز اُبھری۔ میں یہ آواز پہچان کر چونکا۔ یہ نوید سانچے والا تھا۔ کھٹک مجھے اس بات کی ہوئی تھی کہ اس کی وائس ٹون ایسی نہیں تھی جیسی عموماً بیرونِ ممالک کسی سے بات کرتے وقت ہوتی ہے۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ نوید ملک کے اندر ہی تھا، میں نے فوراً سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور چونک پڑا۔ ایریا اور کوڈ نمبر ملتان کا ہی تھا۔ میں نے فوراً بدلی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''جج...... جناب! کوٹھی پر کسی نے حملہ...... کر دیا ہے، اور راٹھور صاحب اس کا شکار...... آہ......'' میں نے جان بوجھ کر اپنے حلق سے کراہ خارج کی' ریسیور چھوڑا اور تھوڑی زوردار آواز میں اُٹھا خ پٹاخ کی، پھر چلا چلا کر...... ''پکڑو شہزی کو جانے نہ پائے، دوڑو ستار اُس کے پیچھے...... وہ مجھے زخمی کر گیا ہے۔'' یہ زور زور سے یہ بولنے کے بعد میں نے پھر ریسیور تھاما اور دانستہ گھٹی گھٹی اور دبی ہوئی آواز میں نوید سانچے والا اسے مخاطب ہوا۔

''جج...... جناب! ہیلو، آ...... آپ لائن پر ہیں......؟''

''ہاں...... ہاں...... میں لائن پر ہی ہوں، بولو......؟ کیا ہوا؟ کس نے حملہ کیا ہے کوٹھی پہ؟ کیا شہزی اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے حملہ......؟ راٹھور کیسا ہے؟ اور تم کون ہو......؟''

''سس...... سر! راٹھور صاحب زخمی ہو کر بے ہوش ہو چکے ہیں، باقیوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے، میڈم کا کچھ پتا نہیں ہے، مگر دونوں بچے میرے قبضے میں ہیں۔ میں انہیں لے کر ایک اسٹور میں چھپا بیٹھا ہوں۔''

''یہ تم نے بہت اچھا کیا......'' حسبِ توقع دوسری جانب سے نوید سانچے والا کی جوشیلی آواز اُبھری...... ''یہی دونوں بچے ہمارے کام کے ہیں۔ تم ایک بہت بڑے انعام کے مستحق ہو...... میں تمہیں ایک جگہ کا پتا بتا رہا ہوں، لیکن...... تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم ہو کون؟''

اپنی بروقت چال پر میرا دل مسرت سے دھڑک اُٹھا تھا مگر اس کم بخت کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً جواب بناتے ہوئے اس سے کہا۔

''کمال ہے سیٹھ صاحب! آپ مجھے نہیں پہچان رہے ہیں، ہم یہاں آپ کی خاطر اپنی جانیں داؤ پر لگائے بیٹھے ہیں کہ دشمنوں سے مار کھا کے ہمارا حال بُرا ہو گیا ہے۔ میں ستار کا ساتھی گارڈ ہوں اور راٹھور صاحب کا آدمی فرید ہوں۔''

''او...... اچھا...... اچھا مجھے یاد نہیں رہا ہو گا۔'' وہ جلدی سے خفیف ہو کے بولا۔ ''پتا نوٹ کرو......''

اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتا دیا جو میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

میں نے ایک قریب دھری میز کو اپنی ایک ٹانگ سے اُلجھا کر زور سے پٹخا کہ اس کی آواز فون پر موجود نوید بھی بن لے، اس آواز کے ساتھ ہی میں بھی زور سے چلایا تھا۔

''کیا ہوا......؟ کیا ہوا......؟'' دوسری طرف سے اس نے گھبرا کر پوچھا تھا مگر میں اپنا کام کر چکا تھا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کے اس کا تار کاٹ دیا۔

اس کے بعد میں پلٹا۔ اول خیر تب تک سب کو رسیوں سے جکڑ کے اور انہیں ایک کمرے میں مقید کر کے میرے پاس آیا تو میں نے اسے اپنا منصوبہ بتایا۔

''وہ رذیل آدمی ضرور وہاں موجود ہو گا اور اس نے یقیناً عارفہ کو بھی یرغمال بنا رکھا ہو گا۔''

''او...... خیر کا کے! یہ تو تُو نے بڑا پالا مارا...... چل جلدی نکل چلیں...... پر یار! گاڑی......''

''گاڑیاں پورچ میں کھڑی ہیں...... آ جاؤ......'' میں نے کہا۔

''اوخیر......'' وہ ہولے سے بولا۔

ہم باہر پورچ میں آ گئے۔ گاڑی کی چابی تلاشنے کا ہمارے پاس وقت نہ تھا، یوں بھی بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کرنا میرا ہی نہیں اول خیر کے بھی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ہماری گاڑی جو درحقیقت وہی سیاہ ہنڈا سٹی تھی، جو راٹھور کی ملکیت تھی۔ اسی کو دوڑانے لگا۔ اسٹیئرنگ پر میں ہی بیٹھا تھا اور اول خیر میری برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

میرے کانوں میں پنکی کے بار بار وہ ہراساں الفاظ گونج رہے تھے جو اس نے دو بار مجھ سے کہے تھے یعنی ان کی ماں (عارفہ) کی جان خطرے میں تھی اور اس کی جان کو کس سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ مجھ سے اور سرمد بابا سے زیادہ بہتر اور کون جان سکتا تھا۔ وہ تو دنیا میں نہیں رہے تھے اور وہی سب سے اچھی طرح اس مردود سیٹھ نوید سانچے والا کی اصلیت اور اس کے گھناؤنے مقصد سے آگاہ تھے۔ میں بھی انہی خطوط پر نوید سانچے والا کا بھیانک چہرہ پہچانے ہوئے تھا۔ عارفہ سے اس کی شادی میری توقع کے خلاف تو نہ تھی مگر سرمد بابا کی وصیت کے باوجود اس کی عارفہ سے اس قدر جلد شادی میں مجھے کسی گہری سازش کی ہی بُو آ رہی تھی۔

موجودہ حالات کی کشاکشی میں مجھے جو کام فرصتِ اولین میں انجام دینا تھا، وہ میں کر رہا تھا۔

سیٹھ سانچے والا زیادہ دیر تک میری چال کے جال میں پھنسا نہیں رہ سکتا تھا اسی لیے یہ کام جلد از جلد نمٹانے کا متقاضی تھا۔ اس نے اپنے جس ٹھکانے کا پتا بتایا تھا، وہ نواں چوک کے ایک مکان کا تھا۔ وہ اسٹریٹ اور مکان نمبر میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر میں طوفانی رفتار سے گاڑی بھگاتا ہوا وہاں پہنچا۔ میں نے کار مطلوبہ گلی کے ذرا نزدیک لے جا کر کھڑی کی اور اس کے بعد میں اور اول خیر نیچے اُتر آئے، ہم تیزی سے آگے بڑھے۔ میرے پاس اپنا پستول تھا جبکہ اول خیر بھی ہتھیار بدست تھا۔ ہم نواں چوک کی مشرقی سمت پر تھے۔ کار ایک جانب کھڑی کر کے ہم دونوں نیچے اُتر آئے اور سیدھا گلی میں داخل ہو گئے۔

گلی تاریک اور سنسان تھی۔ کسی ممکنہ خطرے اور احتیاط کے پیشِ نظر میں نے اول خیر کو خود سے الگ کر دیا اور اسے ہدایت دی کہ وہ ذرا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آتا رہے۔

اس علاقے پر مجھے حیرت ہی ہوئی تھی۔ خاصا پسماندہ علاقہ محسوس ہوتا تھا یہ...... مزدور یا معمولی ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں کے رہائشی معلوم ہوتے تھے۔ ایسے علاقے میں عارفہ کو یرغمال بنا کر رکھنا اور خود بھی وہیں ہونا...... باعث حیرت ہی تھا۔ تاہم اس سے نوید سانچے والا کی اصل اوقات کا پتا چلتا تھا۔ مگر اس نے عارفہ کے ساتھ دماغ بہت عیارانہ اور شاطرانہ استعمال کیا تھا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کر سکتا تھا اور بہت پہلے کر لیتا مگر میں آج تک نوید سانچے والا کی ہر سازش اور چال کو ناکام بناتا چلا آیا تھا، اگرچہ اس میں سرمد بابا کی ...... دوراندیشانہ سوچ اور تجربے کا دخل بھی تھا۔ آخری وار تو سرمد بابا نے اپنے مرنے کے بعد وصیت کی صورت میں نوید سانچے والا پر کیا تھا اور اب جبکہ نوید کو اور کچھ سجھائی نہ دیا تو اس نے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے طور پر یہ انتہائی قدم اُٹھا لیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے عقب میں کچھ کھڑبڑاہٹ کا احساس ہوا، میں یک دم چلتے چلتے رک کر پلٹا اور بری طرح چونک پڑا۔ مجھ سے لگ بھگ پندرہ بیس قدم پیچھے اول خیر آ رہا تھا اور ہم دونوں انتہائی محتاط انداز میں گلی کی دیوار سے لگے ہوئے ہی آگے بڑھ رہے تھے، تاکہ کسی کی اتفاقیہ بھی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے اور اگر پڑ بھی جائے تو ہم پہچانے نہ جا سکیں، لیکن میں نے دیکھا کہ اول خیر کسی کے ساتھ جنگ آزمائی میں مصروف تھا، میرا ماتھا ٹھنکا۔ گویا خطرہ آگے نہیں ہمارے پیچھے بھی دبے پاؤں چلا آ رہا تھا۔ میں نے یک دم پیچھے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اول خیر اپنے حملہ آور کے ساتھ پوری طرح بھڑا ہوا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری آمد کا کسی کو علم ہو سکے۔ قریب پہنچتے پہنچتے ایک موقع پر میں نے اس نامعلوم حملہ آور کو اول خیر کے نرغے میں دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے میں بدک گیا۔ حملہ آور نے چشم زدن میں چاقو نکال لیا تھا۔ اول خیر کی شاید اس پر نگاہ نہ پڑ سکی تھی۔ حملہ آور اس کے نرغے میں اپنی گردن کو چھڑانے کی کوشش میں تھا اور تب ہی مجھے اس کی خطرناک چال کا احساس ہو گیا۔ جیسے ہی اس نے اول خیر پر یہ چھپا ہوا اور اذیت ناک وار کرنا چاہا،

میں ان کے سر پر پہنچ گیا تھا اور میری لات حرکت میں آچکی تھی جو اس خطرناک حملہ آور کے پہلو پر لگی، وہ اول خیر کی آہنی گرفت سے نکل کر زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ اول خیر کو میری اس حرکت پر حیرت ہوئی ہوگی، مگر جب اس نے حملہ آور کے ہاتھ سے چمکتے ہوئے پھل والا مہیب چاقو بھی چھوٹ کر گرتے دیکھا تو اپنی بھویں اُچکا کر رہ گیا اور جان گیا کہ وہ حملہ آور کے ایک انتہائی سفاک وار سے بال بال بچا تھا۔

اُدھر حملہ آور نے اُٹھنے میں غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کرنا چاہا تھا مگر میری دوسری لات اس کی ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ وہ پھر اُلٹ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

''کون ہو تم؟ سچ بتاؤ...... ورنہ اِدھر ہی تاریکی میں مارے جاؤ گے۔'' میں نے غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ اول خیر نے اس کا چاقو قبضے میں کر لیا تھا۔

''تم کون ہو......؟'' اس نے ہانپتے ہوئے اُلٹا سوال داغ ڈالا...... جس پر میرا دماغ بھنا گیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کر ڈالا۔ اس کے حلق سے اُوغ کی کریہہ ناک آواز خارج ہوگئی۔ وہ ہانپنے لگا۔ میں نے اس بار دوسرا گھونسا اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ وہیں لم لیٹ ہوگیا۔ اس کے بے حس و حرکت جسم کو میں نے کنارے پر ڈال دیا اور اول خیر کے ساتھ اب تقریباً دوڑتا ہوا اس مکان کے پاس آگیا۔ جس کے بارے میں سیٹھ نوید نے مجھے اپنا ساتھی سمجھ کر بتایا تھا اور یقیناً حفظِ ماتقدم کے تحت اسی نے ہی ایک آدمی کو باہر گلی میں کہیں پوشیدہ کھڑے ہونے کا حکم دے رکھا تھا کہ آنے والوں پر نگاہ رکھے اور وہ یہی کر رہا تھا کہ اول خیر کے ہتھے چڑھ گیا۔

ہم دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وہ ایک دم کھلا اور اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ڈیل ڈول میں یہ دونوں صحت مند تھے مگر قد و قامت میں مجھ سے دبتے ہوئے، ہمیں عین دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ پل کے پل ہونق سے بن گئے، مگر دوسرے ہی لمحے میں دونوں کے ہاتھ بیک وقت بغلوں کی جانب سر کے، شاید انہوں نے بغلی ہولسٹر چڑھا رکھے تھے۔ ایسے میں اول خیر اور میرا بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آنا یقینی امر تھا اور ہم دونوں ہی ان پر قہر بن کر ٹوٹے۔

انہیں رگیدتے ہوئے ہم اندر صحن میں آگئے۔ دروازہ پیچھے کھلا پڑا رہ گیا۔ اندر روشنی تھی۔ صحن پختہ اور زیادہ کشادہ نہ تھا، جبکہ باہر بچھی ایک چارپائی پر مجھے نوید سانچے والا سگریٹ پیتا ہوا دکھائی دیا جو اس اکھاڑ پچھاڑ میں یک دم چارپائی سے اُچھل کر کھڑا ہوگیا اور اندر ایک کمرے کی طرف بھاگا جس کا دروازہ ذرا ہی بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنے مدِمقابل کا سر پختہ اینٹوں والے فرش پر بجایا اور اسے بے حرکت پا کر اُٹھ دوڑا۔

نوید ابھی کمرے کے دروازے کو دھکا دے کر اندر داخل ہوا ہی تھا کہ میں اس کے پیچھے، بلکہ سر پہ ملک الموت بنا جا پہنچا۔ تب ہی اندر مجھے ایک چونکا دینے والا منظر دکھائی دیا۔ چارپائی پر عارفہ...... رسن بستہ حالت میں جکڑی لیٹی پڑی تھی۔ اس کی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی اور بال یوں بکھرے ہوئے تھے جیسے اسے ہذیانی اور ہسٹریائی دورے پڑتے رہے ہوں اور وہ اپنے آپے میں نہ رہی ہو، اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ بولنے سے بھی قاصر تھی، سرِدست نیم بے ہوشی کی حالت میں ہی نظر آتی تھی۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں اسے بھی کچھ ہوش آگیا تھا۔ قریب چارپائی پر ایک گن ٹکی تھی، نوید سانچے والا اسے ہی اُٹھانے کے لیے لپکا تھا کہ میں نے اسے دبوچ کر اس کا سر منجی کے ٹھوس چوبی پائے سے ٹکرا دیا۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ بلند ہوئی اور خون بہہ نکلا۔

کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا اور اسی روشنی میں عارفہ چارپائی میں جکڑ بند پڑی پھٹی پھٹی وحشت زدہ آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہی تھی اور پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ بری طرح تڑپنے لگی، اُچھلنے لگی...... حلق سے اس کے بے معنی سی ''غوں... غاں'' بھی خارج ہونے لگی۔ بے حد قابلِ رحم حالت میں...... مجھے نظر آرہی تھی وہ اس وقت......

اُدھر...... نوید سانچے والا اپنے پھوٹے ہوئے سر کے ساتھ پھر اپنی گن کی طرف لڑھکنے لگا، مگر میں نے اسے پھر پاؤں کی ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ وہ پرے جا لڑکھڑایا اور دیوار سے جا لگا۔ اسی وقت اول خیر ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔ اس کی جب نظر چارپائی پر بندھی عارفہ پر پڑی تو بے اختیار اس کے حلق سے ''او خیر......'' برآمد ہوا تھا۔ اس نے ایک طرف کونے میں دبکے ہوئے زخمی نوید سانچے والے کو بھی دیکھا۔

''اول خیر! باہر والے نمٹا لیے......؟ یا کوئی باقی ہے ابھی......؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''سب نمٹا لیے...... اب یہ بھی نمٹا دو جلدی تو نکل چلیں......'' وہ بولا۔

''کہیں نہیں جانا ہے۔ تم اِسے کھولو، میں جب تک اسے دیکھتا ہوں......'' میں نے گمبھیر لہجے میں اول خیر سے کہا

اور وہ مجھے کچھ اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا، لیکن میں تب تک نوید کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی تلاشی لینے پر وہ کسمسانے لگا۔ میں نے فوراً اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا۔ تب تک اول خیر عارفہ کو جکڑ بندوں سے آزاد کرا چکا تھا۔ اس کا آزاد ہونا تھا کہ اس نے کسی زخمی ناگن کی طرح حلق سے پھنکار جیسی آواز خارج کی، اول خیر کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا، وہ بے چارہ بھی منجی کی پائینتی پہ بر ٹکا بیٹھا تھا کہ ایک طرف کو جا لڑھکا۔ اس حملے کے لیے وہ کب تیار تھا یا اُسے کب عارفہ سے ایسی توقع ہو سکتی تھی، اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور دھڑام سے کمرے کے فرش پر آرہا۔ عارفہ زخمی شیرنی کی طرح چارپائی سے چھلانگ مار کر اُتری اور سیدھی نوید سانچے والا پر آپڑی۔ اس نے نوید کے چہرے پر اپنے لانبے لانبے ناخنوں سے کھرونچے ڈال دیے۔ وہ درد و اذیت سے پہلے ہی نڈھال تھا۔ عارفہ کے تیز نکیلے ناخنوں نے اس کے مکروہ چہرے پر سرخ لکیریں کھینچ ڈالیں...... اس قدر زور لگا کر اور گویا اپنے اندر کی نفرتوں کو لاوے کی صورت اُگلتے ہوئے...... اس نے طاقت کا بھرپور استعمال اپنے تیز اور نکیلے ناخنوں سے کیا تھا کہ نوید کا چہرہ خون کی چھیچڑی بن کر رہ گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس کے چہرے کا سارا گوشت ہی اُدھیڑ ڈالا ہو۔ مگر عارفہ کا اُبال، طیش اور غضب ناکی پھر بھی کم نہ ہوئی تو اس نے اپنا منہ پھاڑ کر نوید کے گال پر کاٹ ڈالا، اور اس کے چہرے کا گوشت نوچنے لگی دانتوں سے...... اس کی جنونی کیفیات کو دیکھتے ہوئے میں نے عارفہ کو کاندھے سے پکڑ کر نوید سے الگ کیا۔ نوید کی چیخیں اُبل رہی تھیں۔ مگر عارفہ کا جنون، خرد کو کسی آگ کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ میرے زور لگانے پر وہ ہٹی تھی مگر پھر پاگلوں کی طرح غراتی ہوئی نوید پر پل پڑی۔ اس کا منہ خون سے سرخ ہو رہا تھا۔

''مم...... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی ذلیل، کمینے کُتے! تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی میں...... تیری خاطر میں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ سب کو بھولا، جھٹلایا چھوڑا مگر تو نے اس کا مجھے کیا صلہ دیا۔ سوائے مجھے اب تک کھلونا بنانے کے...... اور اب میری اور میرے بچوں کی جان بھی لینے کے درپے تھا۔ میں تیری بوٹیاں کھا جاؤں گی۔'' وہ جوشِ جنوں کے مارے پاگل سی ہوئی جا رہی تھی۔ اس بار اس نے نوید کی گردن پر منہ مارا اور اگر میں نے عارفہ کو بالوں سے پکڑ کر بروقت پرے نہ کھینچ لیا ہوتا تو وہ اس کا نرخرہ اُدھیڑ ہی ڈالتی۔ تب ہی میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور وہ ایک طرف فرش پر پڑی ہانپنے لگی۔ ہانپنے کے دوران اس کے حلق سے عجیب سی غراہٹ سے مُشابہ آوازیں بھی خارج ہونے لگی تھیں۔ کہاں تو وہ نوید کو اپنا سب کچھ سمجھے ہوئے تھی۔ اس کی خاطر اس نے اپنے فرشتہ صفت سسر سرمد بابا کی جان لی۔ عابدہ کو اپنے مفاد اور بعد میں نوید کے ہی ایما پر امریکی درندوں کی بھینٹ چڑھایا اور آخر میں اپنے اسی محبوب کی خاطر اپنے دونوں بچوں کو بھی بھلا بیٹھی تھی، لیکن...... جب اسے اپنے محبوب کا اصل اور بھیانک چہرہ نظر آیا تو وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ کبھی کبھی محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ محبت ایک طاقتور جذبہ سہی، لیکن اگر یہی محبت نفرت کا لبادہ اُوڑھ لے تو پھر وہ محبت جیسے لازوال جذبے پر بھی حاوی ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ غالباً عارفہ کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

''اِسے سنبھالو اول خیر! میں تب تک کسی سے بات کر لوں......'' میں نے اول خیر سے کہا اور عارفہ کی طرف اشارہ کیا۔

''کس سے بات کرنا چاہتے ہو؟'' اول خیر نے پوچھا۔

''پولیس اسٹیشن!'' میں نے جواب دیا تو نڈھال پڑے نوید سانچے والا کے کان میں بھی یہ لفظ پڑا۔ وہ جیسے تکلیف بھلا کر بمشکل ایک ہاتھ اُٹھا کے مجھے روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''ٹھٹھ...... ٹھہرو......! پپ...... پولیس کو مطلع مت کرو، شاید میرا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ میری آج سے دشمنی بھی ختم...... مجھے جانے دو، میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا۔''

''او...... خیر!'' اس کی بات پر اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا جبکہ میرے چہرے پہ ایک زہرخند مسکراہٹ اُبھر آئی تھی۔ تب ہی میرے بجائے اول خیر نے، عارفہ کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے فرش پر بکھرے پڑے نوید سانچے والا سے کہا۔

''اوئے! نو دولتیے سیٹھ! تیری یہ دکان داری اپنے شہزی کاکا کے سامنے نہیں چل سکتی۔ شہزی نے اگر یہ کام کرنا ہوتا تو تیری یہ آفر تو ان کے سامنے کوڑیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو اسے پہلے بھی اس کے مقابلے میں جانے کتنی بڑی بڑی اور بار بار ملتی رہی ہیں۔ یہ اگر پیسوں کے ترازو میں تولا جا سکتا ہوتا تو آج آرام سے کسی محل میں بیٹھا عیش کی زندگی گزار رہا ہوتا۔''

''مم...... میں دس کروڑ دینے کو تیار ہوں......'' سیٹھ

نوید ہکلایا۔

''دس کروڑ جمع دس بھی کر دو تو بھی کم ہیں۔ نوید مردود سیٹھ!'' اول خیر غرایا۔ ''جانتے نہیں ہو تم کہ شہزی کس کا بیٹا ہے؟ جو نہ جھکنا جانتے ہیں نا بکنا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''کھڑکا دے فون پولیس اسٹیشن۔''

میرے چہرے پہ ہنوز زہر خند مسکراہٹ طاری تھی۔ نوید کا سیل فون میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ''مجھے اس کی بات سن لینے دو اول خیر......!'' میری بات پر اول خیر کے چہرے پر پہلے تو ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس کے بعد معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''شش...... شہزی! اس کمینے کی کوئی بات مت سننا! فوراً پولیس کو فون کرو۔ مت آنا اس دغاباز کے جھانسے میں......'' عارفہ فوراً چلا کر بولی تو میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کاٹ دار طنز سے کہا۔

''بہت جلدی آپ کو اس دغاباز کی اصلیت کا پتا چلا ہے میڈم! آپ نے تو اس کے ہاتھوں میں کھیل اور کھلونا بن کر اپنے محسنوں کو بھی دغا دے ڈالا، دیکھ لو اب یہ نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے اُن دونوں معصوم بچوں، دانی اور پنکی کی بھی جان لینے کے درپے تھا۔''

میری بات پر عارفہ کے سُتے پڑے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار نمودار ہوئے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے بچوں کے ذکر پر فکرمندی سے بولی۔

''پپ...... پنکی اور دانی کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟''

''وہ بالکل محفوظ ہیں۔ شکر کرو کہ میں نے بروقت اس خبیث کی اس آخری سازش کا وہ تار ڈھونڈ لیا جس میں جکڑ کر یہ تم سمیت پنکی اور دانی کو بھی جکڑ ڈالنا چاہتا تھا۔''

اس کے بعد میں نے فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے نڈھال سے پڑے سیٹھ نوید کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا کہتے ہو نوید سیٹھ! اس فقیروں والی حالت میں اب تم خود کو کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''تت...... تم جو چاہو گے وہی ہوگا...... لل...... لیکن مجھے پپ...... پولیس کے حوالے مت کرو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''تو پھر میری ایک بات کا سچ سچ جواب دو۔'' میں نے کہا۔

''میں تیار ہوں۔''

''لولوش اور وزیر جان کے بارے میں مجھے بتاؤ......''

''لولوش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ''نکی تا'' میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے۔'' سیٹھ نوید فرفر بتانے لگا۔ میں نے کہا۔

''تمہارے لولوش کے ساتھ کس بنیاد پر تعلقات استوار ہوئے تھے؟'' میں نے اگلا سوال کیا۔ اگرچہ مجھے کچھ اندازہ تو تھا مگر اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔

''اڑیسہ کمپنی کے حصص کا حصول، تمہاری موجودہ سرگرمیاں اور...... اور وہ طط...... طلسم نور ہیرا، اس سے متعلق ایک ایک رپورٹ اس تک پہنچانے کے لیے میں اس کا جاسوس بنا ہوا تھا۔''

''تو اب تک تم نے اسے کیا رپورٹ دی؟''

''وہی جو میں جانتا تھا۔ تمہاری پاکستان اور ملتان میں انٹری، نوشابہ اور چوہدری ممتاز کے خلاف جوابی پریس کانفرنس اور طلسمِ نور ہیرے کی حکومت کو حوالگی کے متعلق وہ سب کچھ بتا ڈالا تھا میں نے اسے۔''

''ہم......'' میرے حلق سے پُرسوچ ہمکاری خارج ہوئی۔

''تمہارا لولوش سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟ فون پر یا اور کوئی ذریعہ ہے؟''

''شہزی! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ تمہیں اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔'' عارفہ نے پھر اپنی ٹانگ اڑائی۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور جھڑکا۔

''تم ابھی اپنی زبان بند رکھو۔ جب وقت آئے گا تو میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔'' وہ خاموش ہوگئی۔ وہ بالکل ٹوٹ چکی تھی۔ اسے اب اپنے بچوں کی فکر ہو رہی تھی۔

''ہاں! تم جواب دو میری بات کا......'' میں نے نوید کی طرف گھورا۔

''مجھے میرے بنگلے پر لے چلو...... میں وہاں تمہیں سب سچ سچ بتا دوں گا۔'' وہ بولا۔ اسی وقت اول خیر نے میرے قریب آکر کان میں سرگوشی کی۔

''اوئے کاکے! اس کے جھانسے میں مت آنا، یہ اس وقت رنگے ہاتھوں ہماری گرفت میں ہے۔ اپنے بنگلے پر جا کر یہ پتھر کی طرح بھاری پڑ جائے گا۔ جو پوچھنا ہے اِدھر ہی پوچھ لے، پر یہ انٹرویو ہن چھیتی نال مکا لے (جلدی ختم کر لے) اس وقت اس کے سارے گماشتے ہمارے قبضے میں ہیں۔''

سیٹھ نوید کی یہ چالاکی تو میں بھی سمجھ گیا تھا۔ ''میرے پاس وقت کم ہے نوید! آخری سوال کا جواب دو......''

وہ اپنے خون آلودہ چہرے کو ہاتھ سے پونچھتا ہوا بولا۔ ''میں اب تمہارے سوالوں کے جواب اپنے بنگلے پر ہی دوں گا۔'' وہ جیسے ایک دم اڑ گیا۔

''اس کے پاس ایک بلیک بیری موبائل ہے اور اسی میں ہی لولوش کا پرسنل نمبر سیو ہے۔ وہ اس کی رہائش گاہ میں پڑا ہے۔'' عارفہ نے فوراً جواب دیا۔

''اوکے! تم سب جانتی ہو تو پھر وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔'' میں دانستہ یہ کہتے ہوئے بظاہر نمبر پنچ کرنے لگا۔ مگر میں یہ نوید کو دکھاوے کے لیے کر رہا تھا۔

''تت...... تم یہ نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو! اگر میں گرفتار ہو گیا تو تمہاری عابدہ بھی نہیں بچے گی۔'' اس مردود نے چلا کر کہا۔ وہ بے بس تھا اور اب میری کمزوری سے کھیلنے لگا تھا۔ عابدہ کے ذکر پر میرے اندر ایک اذیت ناک سا چھناکا ضرور ہوا مگر میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

''وہ اس وقت لولوش کی قید میں نہیں، کورکوران کی جیل میں ہے۔ عارفہ اب میرے ساتھ ہے اور میں اس کے ذریعے امریکا میں بہ آسانی عابدہ کے حق میں مقدمہ لڑوں گا۔'' میں نے یہ اس کے منہ سے اُگلوانے کے لیے کہا تھا۔ جس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا، کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی تھیں جو نوید نے ظاہر ہے کہ عارفہ سے بھی مخفی رکھی ہوں گی۔

''ہاہا...... ہاہا......'' نوید سانچے والا نے ایک بدمست قہقہہ خارج کیا اور اسی لہجے میں بولا۔ ''بڑی خوش فہمی ہے تمہیں......''

''کیا مطلب......؟'' میں نے سیل فون اپنے چہرے سے ہٹا کر اس کی طرف چونکنے کے انداز میں دیکھا تھا۔ یہ میری اداکاری تھی۔

وہ بولا۔ ''تمہیں شاید نہیں معلوم کہ...... عابدہ کا مقدمہ سی آئی اے کے ایک خطرناک ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے سربراہ کے ہاتھ میں ہے۔ باسکل ہولارڈ نام ہے اس کا اور لولوش اس کا لاڈلا داماد ہی نہیں بہت سے اہم منصوبوں میں وہ اس کا دستِ راست بھی ہے۔ کورکوران کی جیل میں صرف باسکل ہولارڈ کا حکم چلتا ہے، اس بھیانک جیل کی لیڈی وارڈن مس لیڈی بو ایک خرانٹ بڈھی چڑیل ہے۔ وہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر رہ چکی ہے۔ اُسے باسکل ہولارڈ یا لولوش جیسا کہیں گے وہ وہی کرے گی۔ تم نے طلسمِ نور ہیرا حکومت

اکتوبر 2017ء کا خوبصورت شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید
خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن
اور
ملک صفدر حیات کی جستجو

یکتارا
آسمان سے ٹوٹے ایک تارے کی روداد جس نے محبت میں خود کو فنا کر ڈالا...... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کے قلم کی پرواز

شام شب
ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے تاریخ کے خاموش اور گمشدہ لمحات کا دلفریب احاطہ

باغی
ایک نڈر اور بے باک انسان کے کارناموں کا اگلا پڑاؤ......
سازشوں کی گرہیں کھولتی ایک خوبصورت داستان

وقت
دھیرے دھیرے گزرنے والے لمحات میں طوفان کی آہٹ...... **حسام بٹ** کے خیالات کی روانی

اس کے علاوہ
ثمر عباس۔ محمد یاسر اعوان، محمد فاروق انجم، تنویر ریاض۔ محمد الیاس اور اسما قادری کی خوبصورت کہانیاں

تان کے حوالے کر کے بہت بڑی غلطی کر ڈالی ہے۔ للہ اس ہیرے کے بدلے وہ تم سے عابدہ کی واپسی کا طالبہ کرنے والے تھے۔ لیکن خیر! طلسم نور ہیرے کا دوبارہ صول تمہارے لیے کیا مشکل ہے، جسے تم انڈیا کے پُرخطر گلاتی اور دلدلی جزیرے سے اُڑا لائے ہو تو پاکستان کیا شے ہے۔’’

اس مردود کے منہ سے وطنِ عزیز پاکستان کے بارے میں ایسے الفاظ سن کر میرا دماغ بھک سا اُڑ گیا۔ یہ غدارِ وطن تھا جو اپنے منہ سے اعتراف کر چکا تھا کہ وہ ملکی دشمن عناصر کا ایجنٹ بن چکا تھا۔ میں غیظ و غضب سے بپھر کر آگے بڑھا اور اپنے بوٹ تلے اس کی گردن لے کر اس کا چہرہ دیوار سے ٹکا دیا۔

‘‘خبردار! اگر دوبارہ میرے وطن کے لیے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے۔ تم جیسے ضمیر فروش ہی یہاں بیٹھے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو! میں اپنے وطن پر ہزاروں عابدائیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں، مگر قومی اور ملکی امانت کبھی بھی دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ عابدہ بھی کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس کی رہائی اور واپسی کے بدلے میں اس کے پیارے وطن کی امانت کا سودا ہو۔ وہ اس کے بدلے میں موت کو گلے لگانا پسند کرے گی۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں کس غیور اور سرفروش باپ کا خون گردش کر رہا ہے۔’’

آتشِ لہورنگ میں یہ الفاظ اس سے کہنے کے بعد میں نے اس کی گردن سے بوٹ ہٹا لیا۔

‘‘تو پھر بھول جاؤ عابدہ کو......’’ نوید سانچے والا ہانپتے ہوئے بولا اور اپنی گردن مسلنے لگا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پہلے میرا ارادہ پولیس اسٹیشن فون کرنے کا تھا مگر اب اس مردود کی باتیں سن کر میں نے وہ بدل دیا اور میجر وسیم بھٹی کے دیے ہوئے ہاٹ لائن نمبر پر میں نے فون کر دیا اور مختصر الفاظ میں انہیں سب بتا ڈالا۔ اس مکان کا اتا پتا دینے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ جب نوید کو یہ پتا چلا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کرنے کے بجائے پاک رینجرز کے ایک خصوصی ونگ کے حوالے کرنے والا ہوں تو اس کی حالت پہلے سے زیادہ غیر نظر آنے لگی، وہ پاگل جنونیوں کی طرح چلّانے اور مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا جس میں عابدہ کا حوالہ بھی شامل تھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور اول خیر کو اس کتے کا منہ بند کروانے کے لیے خفیف اشارہ کر دیا۔ اس نے عارفہ کو چھوڑا اور نوید سانچے والا کی دھنائی کر ڈالی۔

اگلے ڈیڑھ سے دو گھنٹوں کے اندر اندر نوید سانچے والا اور اس کے تمام ساتھی راٹھور وغیرہ سمیت اس حساس ادارے کی گرفت میں آ چکے تھے۔

اگرچہ اس میں عارفہ کا بھی مشورہ شامل تھا کہ پہلے نوید سانچے والا کے بنگلے پر جا کر وہاں سے اپنا ضروری سامان سمیٹ لیا جائے اور بلیک بیری والا وہ موبائل سیٹ بھی لے لیا جائے جس سے نوید سانچے (اور عارفہ بھی کبھی کبھی اس سے بات کر لیا کرتی تھی) لولوش سے رابطہ کرتا تھا۔ یہ ارادہ میرا بھی تھا لہٰذا ہم نے ایسا ہی کیا۔ سیٹھ نوید کا بنگلا سیل کرنے سے پہلے عارفہ نے اپنے چند کاغذات، سامان اور بلیک بیری کا وہ خاص موبائل سیٹ فون قبضے میں کر لیا تھا۔

اس کے بعد میں اور اول خیر عارفہ کو لیے بیگم ولا پہنچے تو اپنے بچوں کو سلامت دیکھتے ہی عارفہ بے اختیار ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

اس کے بعد جب جذبات کا یہ طوفان تھما تو عارفہ میرے قدموں میں گر پڑی، لیکن میں نے اسے بازوؤں سے تھام کر کھڑا کر دیا۔ اس کا چہرہ اشکِ ندامت و شرمندگی کے باعث بری طرح سرخ ہو رہا تھا۔

‘‘میں نے خود کو بہت گرا لیا شہزی! کہ اب تو میں اپنا سر اُٹھا کر کھڑی ہونے کے لائق بھی نہیں رہی...... کاش! میں اپنے ہاتھوں سے خود کو زندہ دفن کر ڈالتی۔ میں تو...... میں تو تم سے معافی مانگنے جیسا منہ بھی نہیں رکھتی۔ تم ایک عظیم انسان ہو، تم ہمیشہ ہی میرے ساتھ میری برائیوں کے بدلے میں بھلائی کرتے رہے، جس کا ثبوت تمہارے پاس موجود میرے یہ دو بچے ہیں۔ میں کیسی احسان فراموش نکلی کہ...... تم نے اپنی محبوب ہستی، اور اپنی محبت تک کو انسانی ہمدردی تلے قربان کر ڈالا اور میں نے کیا کیا۔ اپنے ہی محسنوں کی قبر کھودتی رہی۔ میں کیا کہوں اب شہزی کہ میرے گناہوں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ...... اب تم مجھے اللہ کی خاطر معاف کر بھی ڈالو، جس کا مجھے پورا یقین بھی ہے تو تب بھی شاید ہی میرے دل کو...... میری روح کو سکون نہ مل پائے...... میں اب تا عمر ہی اپنے ضمیر کی قبر میں زندہ ہی دفن رہوں گی۔ لیکن...... پھر بھی...... کچھ بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر میں تم سے معافی کی درخواست ضرور کروں گی۔ ہو سکے تو اس بدنصیب اور آنکھوں والی ایک اندھی، ضمیر کی اپاہج اور ملعون عورت کو معاف کر دینا۔’’

عارفہ یہ کہہ کر سر جھکائے میرے سامنے کھڑی رہی۔

اس وقت کمرے میں ہم سب ہی موجود تھے۔ زہرہ بانو، کبیل دادا، اول خیر، شکیلہ اور...... پنکی، دانی بھی...... کمرے کی فضا میں ایک جذبات انگیز سی رقت گھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ سب کی نظریں اب رنجور اور شرمندہ، سر جھکائے کھڑی عارفہ سے ہٹ کر میری طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک گہری ہنکاری اپنے حلق سے خارج کی اور بالآخر اپنے سیدھے ہاتھ کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے عارفہ سے مخاطب ہوا۔

‘‘عارفہ! انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے اور انسان تو ہے ہی خطا کا پُتلا۔ لیکن اصل انسان وہی ہوتا ہے جو ٹھوکر کھا کر نہ صرف سنبھل جائے بلکہ سچی نیت اور دل سے اپنا محاسبہ بھی کر ڈالے تو وہ پھر خطا کار نہیں رہتا۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم نے بغیر کسی اپنے...... بڑے اور ناقابلِ تلافی نقصان کے خود کو سنبھال لیا۔ آپ آج بھی میرے لیے اس عظیم انسان سرمد بابا کی قابلِ احترام بہو ہیں اور میری بہن بھی۔ معلوم ہے ناں آپ کو کہ سرمد بابا کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا اور یہ بھی پتا ہو گا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی بے حسی کے باوجود آپ کی ایک مصیبت پر...... مدد کرنے کے لیے...... اطفال گھر کے ‘‘اولڈ ہاؤس’’ سے آپ کے ہاں چلے آئے تھے۔ چھوڑیں اب اِن باتوں کو...... میں نے آپ کو معاف کیا اور اللہ سے بھی میری دست بستہ دعا ہے کہ وہ بھی معاف فرمائے۔’’

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ دھیرے سے اس کے سر سے ہٹا لیا۔ وہ میرے ان الفاظ پر بری طرح چھلک پڑی اور صوفے پر جا کے گر سی گئی۔ وہ سر جھکائے زار و قطار رو پڑی۔ پنکی اور دانی ‘‘مما’’ کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھے تھے۔ خود میں اپنی گردن موڑے دو قدم پر رکھی ہوئی ایک کرسی پر گرنے کے انداز میں جا بیٹھا تھا۔ شکیلہ، عارفہ کو سنبھالنے کے لیے بڑھی تھی جبکہ زہرہ بانو میری جانب لپکی اور میرے قریب آ کر اپنا ایک ہاتھ ہولے سے میرے کاندھے پر رکھ کر تھپتھپانے لگی۔ ان کا انداز مجھے حوصلہ دینے کا سا تھا۔ کیونکہ میں خود بھی رنجور تھا۔

ندامتوں اور شرمندگیوں کی زیادتی کے سبب عارفہ سے مزید کچھ نہیں بولا گیا۔

شکیلہ، عارفہ کو سنبھالے ہوئے تھی۔ اس نے اول خیر کو پانی کا ایک گلاس لانے کا اشارہ کیا تھا۔ جو وہ فوراً ہی قریب رکھے جگ سے بھر لایا تھا۔

کمرے کی مغموم سی فضا کچھ دیر بعد سنبھلی تو پنکی کی آواز اُبھری...... وہ اپنی ماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔

‘‘مما! خدا کا شکر ہے کہ آپ کی جان بچ گئی اور یہ سب کچھ شہزی انکل کی وجہ سے ہی ہوا ہے، وہ لوگ تو میری اور دانی بھائی کی جان کے بھی دشمن بن چکے تھے۔’’

اس کی بات پر مجھے ... اچانک یاد آیا اور میں نے پنکی کو مخاطب ہو کے کہا۔

‘‘ہاں! پنکی بیٹا! مجھے یاد آیا، تم نے کوچنگ سینٹر میں مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ کیا اس بات کی ہمیں تھوڑی تفصیل بتا سکتی ہو کہ تمہیں کیسے ان ساری حقیقتوں کا پتا چلا تھا؟’’

سب پنکی کی طرف دیکھنے لگے، عارفہ نے بھی اب اپنا اشکبار سا چہرہ اُٹھا لیا تھا اور اپنی بیٹی کا چہرہ تکنے لگی۔

‘‘مجھے اور دانی بھائی کو...... وہ آدمی سیٹھ نوید شروع سے ہی بالکل بھی پسند نہیں تھا۔’’ پنکی بتانے لگی۔

‘‘ددو جان (سرمد بابا) کو تو وہ آدمی زہر لگتا تھا۔ وہ جب بھی گھر آتا ہم دونوں بہن بھائیوں سے فری ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ہم اسے بالکل بھی لفٹ نہیں کراتے تھے۔ مما ہمیں اس رویّے پر ڈانٹتی تھیں۔ مگر ہم نے کوئی پروا نہ کی۔ مما نے جب اس آدمی سے شادی کر لی تو میں اور دانی مما سے ناراض ہو گئے۔ پھر جب وہ دونوں ہنی مون منانے کے لیے بیرونِ ملک جانے لگے مما نے ہمیں یہ بتانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کون سے ملک جا رہے ہیں؟ کبھی تھائی لینڈ کہتے تو کبھی ہانگ کانگ...... خیر ہمیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ غصہ تو ہمیں اس وقت مما پر اور زیادہ آیا جب انہوں نے بتایا کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے راٹھور انکل کو چھوڑے جا رہی ہیں۔ ہم نے کوئی توجہ نہ دی، پھر مما اپنے شوہر نوید کے ساتھ چلی گئیں۔

‘‘ہمیں تو راٹھور جیسے آدمی کو دیکھ کر ہی خوف آتا تھا۔ اس کے ہمراہ اسی قبیل کے آدمی بھی تھے۔ چار پانچ ہی تھے وہ۔ وہ سب مجھے بدمعاش نظر آ رہے تھے۔ ہماری ان سے روز تُو تُو میں میں ہونے لگی۔ ہم نے بھی ان کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ انہوں نے حفاظت کے نام پر ہمیں قیدی بنا کر رکھ دیا تھا۔ کہیں آنے جانے نہیں دیتے تھے۔ جانا ہوتا تو ان کا کوئی آدمی ساتھ ہوتا۔ دانی کو ان پر جلدی غصہ آ جاتا تھا۔ ایک دن اس نے راٹھور اور اس کے کسی آدمی کے ساتھ بدتمیزی کر ڈالی۔ انہوں نے اسے مارا تو مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے کہا مما سے میری بات کرواؤ...... انہوں نے انکار کر دیا

اور مجھے بند کر دیا۔ تب ہی میں نے ان کے دو ساتھیوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ نجانے کب ان دونوں شیطانوں سے نجات ملے گی۔ تو دوسرے ساتھی نے کہا۔

''بہت جلد، سیٹھ صاحب اپنی نئی نویلی بیوی کو ٹھکانے لگانے ہی والا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں شیطانوں کی (ہماری) باری آئے گی۔''

''میں بس ان کی اتنی ہی بات سن سکی تھی اور میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ مجھے ددوجان کی بات یاد آ گئی تھی جب انہوں نے مما سے ناراض ہو کے یہ نصیحت کی تھی کہ نوید تمہیں کسی دن بہت بڑا نقصان پہنچائے گا جس کی تلافی بھی ممکن نہ ہو گی، وہ ایک سازشی ذہن کا کمینہ اور عیار انسان ہے۔

''مجھے مما کی فکر ہونے لگی۔ سمجھ گئی تھی میں کہ نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے لیے کسی خاص مقصد کے لیے ہی لے کر گیا ہے..... دانی کو حقیقت تو نہیں بتائی تھی، ایک تو اس وجہ سے کہ کہیں یہ خوف دہ ہو کر کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے دوسرے یہ غصے اور جوش کا تیکھا ہے، کہیں بول ہی نہ دے ان کے سامنے کہ وہ ہمارے خلاف کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔

پنکی نے اتنا بتا کر تھوڑا توقف کیا اس کے بعد مزید بتانے لگی۔

''میں نے اکثر مما اور نوید سانچے والا کو ددوجان کی وصیت کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان کی باتوں سے مجھے بھی اس وصیت کا علم ہو چکا تھا۔ مجھے مما اور نوید کی شادی پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ اگر نوید سانچے والا... کو مما کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی تو پھر کیوں وہ شادی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس چالاک انسان نے مما سے یہی کہا تھا کہ اُسے ان کی دولت کی کوئی پروا نہیں ہے، وہ اب مما کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یوں مما ان پر زیادہ بھروسا کرنے لگیں اور دونوں کی شادی ہو گئی۔

وصیت کے مطابق مما کا پاپا (محمود، عارفہ کا سابقہ مرحوم شوہر) کی دولت و جائداد، جو درحقیقت ددوجان ہی کی کمائی ہوئی تھی، جس پر مما کا تصرف ختم ہو گیا، مگر بعد میں مجھے ان کی باتیں سن کر پتا چلا کہ نوید سانچے والا..... شادی سے پہلے ہی مما سے پاور آف اٹارنی حاصل کر چکا تھا۔ مما اب نوید سانچے والا کے لیے ایک بے کار شے ہو چکی تھیں۔ مگر ان کا دل رکھنے اور اپنی چال کو بغیر کسی ٹکراؤ کے آگے بڑھانے کے لیے مما سے شادی رچالی تھی۔ اب نوید سانچے والا کے لیے ہم دونوں اہم تھے۔

اب اسی سلسلے میں راٹھور اور نوید سانچے والا کی آپس میں ٹیلی فون پر باتیں ہونے لگیں۔ تب ہی مجھ پر ایک اور بات کا بھی انکشاف ہوا کہ...... نوید سانچے والا مما کو ہنی مون کے بہانے کسی اور ملک نہیں گیا بلکہ وہ اسی شہر میں موجود ہے۔ وہ مما کو یرغمال بنائے ہوئے ہے اور اب بہت جلد وہ ہم سے ساری دولت اپنے نام منتقل کروانا چاہتا تھا، بات نہ ماننے کی صورت میں وہ ہمیں مما کو جان سے مارنے کی دھمکی دیتا۔ اسی دن سے میں نے فرار ہونے کا منصوبہ بنالیا، یہ اس سے اگلے دن کا ہی ذکر تھا جب شہزی انکل سے میری ملاقات ہو گئی۔''

پنکی اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔ ہم سب دم بہ خود اس کی بات سنتے چلے گئے۔ پنکی نے اپنی بات ختم کی تو عارفہ ایک بار پھر سسک اُٹھی۔ اس نے بے اختیار پنکی اور دانی کو ممتا بھرے انداز میں خود سے لگا لیا اور رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میرے بچو! تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ میں واقعی اپنی بے لگام خواہشات کے آگے تمہیں بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔ اُس مردود انسان نوید نے مجھے اپنا غلام بنا کر رکھ دیا تھا۔ اس کے خلاف میں کچھ سننا ہی گوارا نہیں کرتی تھی جو میری بہت بڑی غلطی تھی۔''

''مما! آپ پریشان نہ ہوں...... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' پنکی نے ماں سے کہا۔ ''آپ بس ہمارے ساتھ رہیں اور خوش رہیں۔ شہزی انکل کا یہ احسان تو ہم ساری زندگی نہیں بھول سکتے۔'' اس کی بات پر میں نے پنکی سے شفقت بھرے انداز میں کہا۔

''بیٹا! اس میں احسان کی کیا بات ہے، کیا تم اور دانی نہیں جانتے کہ میرا تمہارے ددو کے ساتھ کیا رشتہ تھا! اُنہوں نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔''

کچھ لمحات بوجھل سی خاموشی تلے بیت گئے۔ اس کے بعد عارفہ نے بھی اب تک کے اپنے پیش گزار حالات کے بارے میں کم و بیش وہی کچھ بتایا جو پنکی نے جراُت اور ہمت سے معلوم کیا تھا۔ تاہم عارفہ کے مطابق نوید نے اس سے اپنی چکنی چپڑی باتوں کے ذریعے پاور آف اٹارنی اپنے نام کروایا تھا اور ایسا اس نے کسی وکیل سے..... مشورہ کر کے کیا تھا۔

تھوڑی دیر اور بیت چلی تو...... زہرہ نے شکیلہ کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ عارفہ اور پنکی، دانی کو لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد زہرہ بانو نے ہولے سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی! یہ تم نے اچھا کیا کہ عارفہ کو معاف کر دیا۔ یہ تمہارا بڑا پن ہے، لیکن شہزی! معافی تلافی کے علاوہ بھی عارفہ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ کیا اب بھی اس کی گواہی عابدہ کے حق میں بہتر ہو سکتی ہے؟''

زہرہ بانو کی بات پر میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''اب وہ وقت گزر چکا۔ عارفہ کی گواہی کی اب کوئی حیثیت نہیں رہی ہے۔ عابدہ کو سزا ہو چکی ہے۔ وہ تمام حقائق اور گواہیاں جو عابدہ کو بچا سکتی تھیں وہ سب پسِ پردہ ہو چکیں۔ اب صرف ایک بڑی جنگ کے ذریعے ہی عابدہ کو رہائی دلائی جا سکتی ہے۔''

''میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ عارفہ اب راہِ راست پر آ چکی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عابدہ کے سلسلے میں اس سے کیا مدد لی جا سکتی ہے؟'' زہرہ بانو نے کہا۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتی اس سلسلے میں...... ماسوائے نوید سانچے والا اور لولووش سے متعلق چند باتوں اور رازوں کے۔''

اس دوران کبیل دادا نے شاید زہرہ بانو کے کچھ بولنے کا لمحہ بھر انتظار کیا تھا، اس کی خاموشی پر وہ ذرا کھنکھار کر بولا..... ''پہلی بات تو یہ کہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے، سیٹھ نوید بھی بالواسطہ سہی، اسپیکٹرم کا ہی ایک ایجنٹ تھا۔ باسکل ہولارڈ سے نہیں تو اس کے کم از کم اسپیکٹرم کے سربراہ لولووش سے تو ضرور رابطے تھے۔ پھر اس کا وہ خصوصی موبائل سیٹ بھی ہمارے ہاتھ لگ چکا ہے۔ جس سے وہ لولووش سے رابطے میں رہا ہے۔ لیکن بات وہی ہے۔ جو کرنا ہو گا ہمیں اپنی صوابدید پر کرنا ہو گا۔ سیٹھ نوید اب کام کا نہیں رہا۔ اس کا باب سمجھو یہاں ختم ہوا۔ خود لولووش کے لیے بھی وہ اب اتنی اہمیت کا حامل نہ رہا ہو گا۔ رہی عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی بات تو وہ اب آزاد ہیں اور یہ اچھی بات ہے کہ عارفہ کو ٹھوکر کھانے کے بعد ہی سہی، عقل آ گئی۔ باقی عابدہ بہن کی رہائی کا پلان وہی رہے گا جو بنایا جا چکا ہے۔'' کبیل دادا اپنی بات کہہ کر خاموش ہو رہا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ کبیل دادا وہ واحد آدمی تھا جو بغیر کسی مبالغہ آرائی اور قیاس آرائی کے ٹھوس بنیادی دلیل کے ساتھ بات کرنے کا عادی تھا ورنہ خاموش رہتا تھا۔ ہم پھر بھی کچھ اندازوں اور پیش آمدہ حالات پر قیاس آرائیاں قائم کرتے تھے، مگر کبیل دادا ایسا ہرگز نہیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی بات درست محسوس ہوئی تھی اور کسی حد تک زہرہ بانو بھی اس پر صاد ہی نظر آتی تھی۔

ہم تھوڑی دیر مزید گفتگو کے بعد عارفہ اور اس کے دونوں بچوں کی گھر روانگی سے متعلق پلان کرنے لگے۔

دو دن، تینوں ماں، بیٹا اور بیٹی بیگم ولا میں ہی رہے تھے۔ اس کے بعد میں اور اول خیر شکیلہ سمیت انہیں ان کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر واپس ہو لیے۔

عارفہ نے کورٹ میں سیٹھ نوید سے خلع کی درخواست دے دی تھی، جبکہ اس پر مقدمہ اس کی گرفتاری کے فوراً بعد ہی دائر کر چکی تھی جس میں دھوکا، فراڈ، جعل سازی سے لے کر اس کے بچوں کا اغوا اور خود اس کے اپنے ارادۂ قتل وغیرہ شامل تھا۔

ہم تینوں بیگم ولا پہنچے تو زہرہ بانو بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی بولی۔ ''شہزی! وہ...... نوشابہ کا فون آیا تھا......''

''کیا......؟'' میں بری طرح چونکا۔

''او...... خیر!'' اول خیر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ......؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ سے زیادہ بات نہیں کی اس نے......'' زہرہ بانو بولی۔ ''کہہ رہی تھی۔ شہزاد احمد خان سے بات کرنی ہے، تمہارا سیل فون مانگ رہی تھی جو کہ ظاہر ہے، نہیں تھا۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے؟'' شہزی نے کہا۔

''پوچھا تھا۔ اس نے نہیں بتایا، ویسے بھی اس کی آواز سن کر میرا اپنا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ میرا دل تو چاہا تھا کہ اسے کھری کھری سنا دوں مگر بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔''

''اچھا کیا تم نے اس سے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔''

''وہ دوبارہ فون کرے گی۔'' زہرہ نے آخر میں بتایا۔

''لیکن سمجھ نہیں آ رہا...... اس نے فون کیوں کیا اور وہ بھی تم سے بات کرنے کے لیے......؟''

''کوئی گیدڑ بھبکی دینا ہو گی اور کس لیے کیا ہو گا؟'' اول خیر نے کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دھونس جمانا چاہتی ہو......'' شکیلہ نے بھی لقمہ دیا تو اول خیر جیسے اسی کے بولنے کا منتظر تھا۔

اس کی طرف دیکھ کر بظاہر سنجیدگی سے بولا۔

''مثلاً......؟''

شکیلہ کچھ گڑبڑا سی گئی پھر اُلجھ کر بولی۔ ''مثلاً کیا مطلب؟''

''کس قسم کی دھونس......؟''

''دھونس کس قسم کی ہوسکتی ہے؟ کوئی دھمکی شمکی ہی ہو گی۔''

''دھمکی تو سمجھ میں آتی ہے، یہ شمکی کیا ہے؟''

''یہ دھمکی کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ جیسے لیکن ویکن...... اور......''

''شکیلہ، وکیلہ۔'' اول خیر نے اس کا جملہ اُچک لیا۔ وہ اُسے گھور کے بولی۔

''نام کے ساتھ اس طرح کے لاحقے وسابقے نہیں آتے...... اب ہم اول خیر کو خیر وشر کہہ دیں...... جو تم اب اس سنجیدہ محفل میں پھیلانے لگے ہو، تو یہ لفظ بالکل بھی نہیں بچے گا، بجز اس کے کہ ہم خیر اور شر کو الگ الگ معنوں میں دیکھیں......''

میں، زہرہ بانو اور کبیل دادا ان دونوں کے ''پیچ'' پڑتے دیکھ کر مسکرانے لگے۔

شکیلہ نے اپنی طرف سے اول خیر پر بڑی بھاری چوٹ مار دی تھی اور وہ اب اپنی بغلیں جھانک رہا تھا مگر دوسرے ہی لمحے بولا۔

''اچھاجی! آپ تو خاصی اُردو داں ہوگئی ہیں...... نازکی بیگم!''

''اس میں اردو دانی والی کیا بات ہے، کم از کم اتنی اردو تو ہر عام و خاص کو آتی ہی ہے۔ شہ مات ملتے ہی دکھانے لگے اپنی اوقات......؟ کتنی بار تم سے کہا میں نے کہ میرا نام مت بگاڑا کرو...... بلکہ کسی کا بھی نہیں بگاڑنا چاہیے، یہ گناہ ہے۔'' وہ اسے گھور کے بولی۔

''ان دونوں کا جلد ہی بندوبست کر دینا چاہیے، ورنہ ان کی لڑائی کسی دن بیگم ولا کے پُرسکون ماحول میں مہابھارت چھیڑ دے گی۔'' معاً کبیل دادا نے معنی خیز لہجے میں کہا تو اول خیر نے مجھے آنکھ مار کے کبیل دادا سے کہا۔

''وڈے استاد جی! اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ تُسی بھی ہُن پالے لگ ہی جاؤ......'' اس کی بات پر میں نے دیکھا کبیل دادا کچھ گھبرا سا گیا اور چہرے سے یوں ظاہر ہونے لگا جیسے وہ اول خیر کو چھیڑ کر پچھتایا ہو، جبکہ میں نے زہرہ بانو کی طرف دُزدیدہ نظروں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

کبیل دادا کی یہ بھول تھی کہ زہرہ بانو کو اس کے دل کا حال معلوم نہیں جبکہ یہ میں جانتا تھا کہ زہرہ بانو کو کبیل دادا کا حالِ دل بھی معلوم تھا اور بہت کچھ بھی۔ اسی سبب زہرہ بانو کے چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی۔ زہرہ بانو کے چہرے پر حیا کی لالی دیکھتے ہی میں نے فوراً اول خیر کی ہاں میں ہاں ملا دی۔

''واہ، اول خیر! کبھی کبھی مذاق میں تم بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہو...... سہرا سجانے کے معاملے میں تم اور کبیل دادا دونوں ہی خوش نصیب ہو۔''

''اوخیر...... کاکے! وہ کس طرح......؟'' اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں میری طرف دیکھ کر گویا جان بوجھ کر وضاحت طلب انداز میں کہا تو میں بھی جیسے موقع محل پاتے ہی یک دم بولا۔

''اس لیے کہ تم دونوں کے رشتے بیگم ولا کی اس چھت کے نیچے موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے دانستہ معنی خیز انداز میں پہلے شکیلہ اور پھر آخر میں زہرہ بانو پر اپنی نظریں جما دیں۔

کبیل دادا کسی بچّے کی طرح خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے بھی آج اس کے اندر کا برسوں پرانا خوف نکالنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اول خیر کو میں نے ''شہ'' دینے کے لیے آنکھ ماری تو وہ بولا۔

''اوخیر......! یہ ہوئی نا بات...... اب تو مقابلہ جمے ہی جمے...... عرصہ ہوا بیگم ولا میں ڈھول تاشے اور گج وج ہوئے۔'' پھر وہ حواس باختہ سے کھڑے کبیل دادا کی طرف دیکھ کر مصنوعی حیرانی سے بولا۔ ''ارے وڈے استاد جی! یہ تمہارے چہرے پر بارہ کیوں بجنے لگے؟''

''میں ذرا آرام کرنے کے لیے دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔'' کبیل دادا نے جب دیکھا کہ میں اور اول خیر اس کے درپے ہونے لگے ہیں تو اس نے وہاں سے کھسکنا چاہا مگر میں نے اس بار سنجیدگی سے اُسے پکارا۔

''کبیل دادا......!'' وہ میری آواز پر چونکا اور میری جانب تکنے لگا۔

''بہت آرام کر لیا تم نے...... اور بہت یک طرفہ عذاب سہہ لیا......'' میری آواز گمبھیر ہوتی چلی گئی۔ کمرے کی فضا جو کچھ دیر پہلے اول خیر اور شکیلہ کی نوک جھونک کی وجہ سے چلبلی سی ہو رہی تھی، وہ اب ایک گمبھیرتا ماحول میں بدل گئی۔ کبیل دادا کا بھاری کھردرا چہرہ ایک زبردست ارتعاش تلے نظر آنے لگا جبکہ زہرہ بانو حیرت سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ شکیلہ اور اول خیر بھی یک ٹک میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں! کبیل دادا! محبت کی ہے تو خم ٹھونک کر اس کا اظہار بھی کرو ورنہ محبت کرو ہی مت...... اس بھول میں مت رہنا کہ تمہارے حالِ دل سے صرف ہم ہی واقف ہیں بلکہ جسے تم اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے چاہتے ہو، وہ بھی تمہارے اس مخفی جذبۂ دل سے واقف ہے۔''

میں نے جیسے اپنے تئیں ایک انکشاف کیا۔ کبیل دادا کی حالت دیدنی ہو رہی تھی۔ اس نے ایک نظر بڑی ہمت کر کے اور ڈرتے ڈرتے قریب کھڑی زہرہ بانو پر ڈالی، جو خود میری جانب ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اب کبیل دادا کی طرف دیکھ رہی تھی، یہی وہ لمحہ تھا جب زہرہ اور کبیل دادا کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں کبیل دادا نے اپنی نظریں ہٹالیں۔ وہ اس سمے لگتا ہی نہیں تھا کہ اپنی حیثیت میں باوقار، سنجیدہ مزاج اور دبنگ کبیل دادا ہے۔ اس وقت انجانے سے خوف تلے مرجھا کے رہ گیا تھا۔ بڑی عجیب بات تھی...کہ زہرہ بانو کی نگاہیں ہنوز کبیل دادا پر ہی جمی رہ گئی تھیں۔ شرم وحیا کی وہ لالی جیسے پل کے پل بدل کے پرکھنے والی نظر میں اُتر آئی تھی۔ ایسے میں کئی رنگ اس زہرہ نگار کے رخِ مہتاب پر چمکے تھے، جو ریشمی ڈوروں میں اُلجھے ہوئے بھی اور یادِ رفتگاں کی اَن گنت گتھیوں میں لپٹے ہوئے بھی۔ ان میں کشش و پیچ کا عذاب بھی تھا اور رنج والم کا تضاد بھی۔ کچھ رنگ پھیکے تھے اور کچھ اُجلے، مگر اُجلے رنگوں میں بے نام سی بے رونقی بھی تھی تو خوش آئند آرزوؤں کی دھنک بھی......

لمحاتی خاموشی کے بعد میں نے کبیل دادا کی کیفیاتِ دروں و بروں کو معمول پر لانے کی غرض سے اس بار براہِ راست زہرہ بانو سے مخاطب ہو کے کہا۔

''زہرہ......! ہم نے اب تک کئی محاذوں پر ایک ساتھ شامل رہتے ہوئے دشمنوں سے جنگیں لڑی ہیں اور لڑ رہے ہیں۔ ہم اچھی طرح ایک دوسرے کو جان چکے ہیں۔ ہمیں اپنے کردار و اوصاف کے سلسلے میں ایک دوسرے کو تمہید دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم میں سے کسی کی بھی سچائی اور وفاداری کا پیمانہ اب کسی بھی قسم کی کسوٹی پر پرکھنے کا محتاج نہیں رہا ہے۔ اب تو بس آنکھیں بند کر کے اپنے جس ساتھی پر بھی اُنگلی رکھو ایک ہی جواب ملے گا یعنی وفاداری اور جاں نثاری۔ زہرہ! زندگی کی یہ بھاگ دوڑ اور نفسا نفسی اپنی جگہ لیکن...... انسان کو راہ میں کچھ ایسے فیصلے کرنے ہی پڑتے ہیں جو بے حد ضروری ہوتے ہیں...... ان کے بغیر زندگی کی تھکن زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے...... اگر سچی محبت کرنے والے ایک ساتھی کا ساتھ ہو تو یہ سفر بہ آسانی کٹ جاتا ہے۔ پہاڑ سا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے، گونا گوں حالات کی کشتی اسی بادبان کے سہارے ہی تو طوفانوں کا مقابلہ کرتی ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے ذرا لمحے توقف کیا پھر بولا۔

دشمنِ جاں

وہ قبر سے لپٹا دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ ''ہائے سرور! تم کیوں مر گئے...... ابھی تمہاری عمر ہی کیا تھی...... میری دنیا لٹ گئی...... میں برباد ہو گیا...... ہائے ہائے، کاش تم نہ مرتے......!''

وہاں سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو اس کی حالتِ زار پر ترس آ گیا۔ رک کر اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو بھائی...... ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے...... حوصلے سے کام لو...... مرنے والا کون تھا تمہارا؟''

''میرا تو یہ دشمن نکلا۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''مشکل سے اس کی قبر تلاش کی ہے...... یہ میری بیوی کا پہلا شوہر تھا۔ یہ نہ مرتا تو میری زندگی برباد نہ ہوتی...... ہائے، سرور! تم کیوں مر گئے؟''

واہ کینٹ سے عمر دراز کا واویلا

''زہرہ! کبیل دادا ایک نیک شریف اور بہت وفادار انسان ہے، یہ جتنا دبنگ ہے، اندر سے اتنا ہی معصوم فطرت بھی۔ فیصلہ تمہارا ذاتی ہے مگر اس میں ہم سب کی خوشی ہے کہ...... اگر تم کبیل دادا کو اپنی زندگی کا ہم سفر اور ساتھی کے طور پر چن لو......''

وقت جیسے ایک دم تھم گیا۔ گھڑی کی سوئیاں رک گئیں۔ سانسوں کی بازگشت جیسے بہ زبان یک خاموشی چیخنے لگیں۔ کبیل دادا کا وہ راز جو اُب تک اس کے دل میں تھا آج میں نے وہ کبیل دادا کی موجودگی میں ہی زہرہ بانو کے سامنے طشت از بام کر دیا تھا۔ آج میں نے کبیل دادا کا وہ خوف جڑ سے کاٹ پھینکا تھا جو کسی حسین ''آسیب'' کی طرح اس کے اعصاب پر سوار رہتا تھا۔ حسین اس لیے کہ وہ اس کی سرمستی میں آپوں آپ ہی مگن رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس کے عذاب میں وہ خود ہی خود ایک عجیب سی لذّت محسوس کر

ے خوش رہتا تھا۔

کبیل دادا کا چہرہ ہی نہیں اس کا پورا وجود ایک زبردست ارتعاش کی گرفت میں آچکا تھا۔ اور زہرہ بانو...... جیسے یکلخت کسی کڑی آزمائش کی سولی پر جھول کر رہ گئی تھی۔

''یہ ہم سب کی خواہش ہے زہرہ! زندگی کی اس کڑی دھوپ میں آبلہ پا سفر کرتے ہوئے ہم تھک سے گئے ہیں۔ بیگم ولا کے ان در و دیوار... سے جو بے نام سی اُداسی ٹپکتی ہے وہ بھی کہتی محسوس ہوتی ہے کہ انہیں ایک بار پھر شادیانوں اور شادمانیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کو خوشی مل جائے گی گویا بیگم ولا کے یہ در و دیوار خوشیوں سے پیراستہ ہو جائیں گے۔ دیکھنا تم...... کبیل دادا اور تمہارا سنگم یہاں ہر طرف خوشیاں بکھیر دے گا اور تم دونوں کی زندگی میں بھی......'' میں اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

زہرہ بانو چپ کھڑی تھی۔ کبیل دادا تو بت بن گیا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

''میری بات بری تو نہیں لگی زہرہ بانو......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کبیل دادا نے میری طرف دیکھا اور شکایتی لہجے میں بولا۔

''یار، شہزی! یہ تُو نے اچھا نہیں کیا...... تجھے ایسے نازک وقت میں یہ موضوع نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔''

''نازک وقت......! کیسا نازک وقت......؟'' میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم تینوں امریکا روانہ ہونے والے ہو۔ یہاں اور کون ہوگا میرے سوا...... ایسے میں اگر بیگم صاحبہ کو تمہاری یہ بات بری لگ گئی اور اس نے مجھے بیگم ولا چھوڑنے کا حکم دے دیا تو...... کیا ہوگا......؟''

''وڈے استاد جی! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' اول خیر نے مسکرا کر کہا۔ ''آخر کبھی تو یہ بات کہنا ہی تھی ناں بیگم صاحبہ سے...... اپڑیں شہزی کاکا کی ہی نہیں بلکہ میری اور شکیلہ کی بھی یہی خواہش تھی کہ جانے سے پہلے ہم اس عظیم فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔''

''ہاں کبیل دادا! اول خیر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا اس کے قریب آ کر بولا اور اس کے کاندھے کو ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے مزید کہا۔

''دیکھو! آخر تو یہ بات کہنا ہی تھی۔ خود سوچو تم۔ ہم نہیں کہیں گے تو اور کون کرتا پھر بیگم صاحبہ سے یہ بات...... تم گھبراؤ نہیں...... میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں بھی وہاں سے نکلا اور اس کمرے میں آ گیا جہاں زہرہ بانو گئی تھی۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے دبی دبی آواز ابھری۔ ''کون......؟''

''میں ہوں زہرہ......!''

''دروازہ کھلا ہے۔ آجاؤ......''

میں دھیرے سے دروازہ... دھکیل کر اندر آ گیا۔ سامنے ایک کرسی پر زہرہ بانو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا اس کے سامنے والی کرسی کو مزید اس کی جانب سرکا کر بیٹھ گیا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے مدّھم لہجے میں بولا۔

''زہرہ بانو! اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا...... لیکن میرا اللہ جانتا ہے کہ میں نے کسی اور نیت سے نہیں بلکہ سچے دوستانہ جذبے سے یہ بات کہی ہے۔ کبیل دادا کو تم بھی جانتی ہو اور میں تو اسے جانتا ہی ہوں، وہ واقعی تم سے بے حد محبت کرتا ہے، مگر اس بے چارے کی سادگی تو دیکھو کہ اتنے عرصے سے اپنی محبت کو اپنے دل تک ہی محدود کیے بیٹھا ہے۔ کبھی اس کا تمہارے سامنے اظہار نہیں کیا اور کرتا بھی کیسے؟ اس بے چارے کو ڈر تھا کہ کہیں تم ناراض ہو کے اسے خود سے دور نہ کر دو...... وہ بس اسی میں خوش تھا کہ وہ چاہے تمہارا ایک ادنیٰ ساتھی ہی کی صورت سہی، تمہارے قریب تو رہے۔''

زہرہ بانو نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں چونک سا پڑا اس کا چہرہ ہی نہیں آنکھیں بھی متورم اور سرخ ہو رہی تھیں۔ ایک غبار سا تھا جو اشکوں کی صورت میں اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ بہت دھیرے سے سسکنے کے انداز میں وہ بولی۔

''شش...... شہزی! زندگی کے جس دکھ بھرے باب کو میں بند کر چکی تھی، تم نے اسے کیوں کھول دیا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ لئیق شاہ آج بھی میرے دل میں زندہ ہے۔ میں نے خود کو اس کی یادوں کے ساتھ پیوست کر دیا ہے۔ میں اس کی جگہ کسی اور کو کیسے دے سکتی ہوں؟''

''میں سب جانتا ہوں...... اور یہ بھی جانتا ہوں کہ پہلی محبت کو انسان کبھی نہیں بھلا سکتا مگر......''

''محبت بس محبت ہوتی ہے، پہلی یا دوسری نہیں...... اور جس سے کی جاتی ہے اسی تک محدود رہتی ہے۔ اس میں دائمی جدائی یا موت کا کوئی دخل نہیں ہوتا، یہ وہی محبت ہے جو مر کے بھی امر رہتی ہے۔ کیا کبیل دادا یہ سب نہیں جانتا؟ اس کے باوجود...... وہ......''

''میں سب جانتا ہوں بیگم صاحبہ!''

معاً کمرے میں ایک گمبھیر سی آواز اُبھری اور زہرہ بانو سمیت میں نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں کبیل دادا اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کے یوں اندر در آنے پر حیرت بھی ہوئی اور ایک طرح سے خوشی بھی۔ شاید بات اور حقیقت...... کھل جانے کے بعد...... اس کے دل اور دبے ہوئے جذبات کی شورش نے اسے بھی ہمت عطا کر ڈالی تھی جو میں چاہتا بھی تھا، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ کبیل دادا کی طرف سے بھی اعتراف محبت ہونا چاہیے۔

اسے دیکھ کر زہرہ بانو بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں ایک دم کھڑے ہوتے دیکھ کر مجھے ذرا جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ کبیل دادا کی طرف کچھ تیز سی نگاہوں سے گھور رہی تھی پھر اسی لہجے میں اس سے بولی۔

''قریب آؤ......'' انداز تحکمانہ تھا۔ میرا دل کسی انجانے خدشات تلے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کبیل دادا جو کچھ دیر پہلے دبا دبا اور کسی بچے کی طرح ڈرا ڈرا سا نظر آتا تھا اب اس کے انداز اور چہرے سے ایسا کچھ بھی نہیں جھلکتا... دکھائی دے رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے اب وہ بھی دیارِ اُلفت میں خم ٹھونک کر قدم جمانے کا ارادہ کر چکا ہو۔

کبیل دادا، زہرہ بانو کے قریب آ کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''کیا کہا تھا ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے......؟'' زہرہ بانو نے اس کے پُرمتانت چہرے پر اپنی تیز نگاہیں جماتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''یہی...... بیگم صاحبہ! کہ میں سب جانتا ہوں...... آپ کی لئیق شاہ سے محبت کو بھلا مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ لئیق شاہ تو میرا یار بے بدل تھا اور میں اس کا سایہ...... آپ دونوں کے لازم و ملزوم ساتھ کا مجھے بھی اتنا ہی بھروسا تھا جتنا کہ آپ اور لئیق شاہ کو تھا۔ لئیق شاہ کی دائمی جدائی کے دکھ میں صرف آپ ہی نہیں میں بھی بجھ کر رہ گیا تھا۔ مگر ایک حقیقت یہ بھی ہے بیگم صاحبہ! کہ میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ اتنا کہہ کر سر جھکائے خاموش ہو گیا۔ میری دھڑکتی بھانپتی نظریں زہرہ بانو کے چہرے اور اس کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ لینے لگیں۔ میں نے دانستہ دونوں کے بیچ خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور چاہتا میں بھی یہی تھا کہ یہ دونوں ہی بولتے رہیں۔

''یہ کڑی حقیقت جاننے کے باوجود تم پھر بھی ایسا کہہ رہے ہو؟''

''جی ہاں بیگم صاحبہ! میں پھر بھی ایسا کہہ رہا ہوں۔'' کبیل دادا نے سر اُٹھا کے دوبارہ زہرہ بانو کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ آج کبیل دادا تمام تر حوصلے کے ساتھ زہرہ بانو کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے کبیل دادا کا برسوں پرانا چڑھا ہوا وہ خول توڑ ڈالا جس میں وہ کسی معصوم اور ڈرے سہمے بچے کی طرح سکڑا سمٹا بیٹھا تھا، اس کا ڈر ختم ہوا تو خود بخود اس کی جگہ ایک حوصلے اور ہمت نے لے لی تھی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے زہرہ بانو سے کہہ رہا تھا۔

''لیکن...... بیگم صاحبہ! میری اس محبت کا قطعی یہ مقصد نہیں کہ میں آپ کے دل سے خدانخواستہ اپنے یار لئیق شاہ کی محبت کو نکالنا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں، کیونکہ یہ حقیقت میں بھی جانتا ہوں کہ یہ بات ممکن ہی نہیں، بیگم صاحبہ! مجھے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کہ میں آپ کا وفادار اور جاں نثار ساتھی ہوں۔ لیکن کوشش میری یہی رہی ہے، مگر...... ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ بس، میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور یہ میں نہیں جانتا کہ کیوں کرتا ہوں...... شاید دل کے اس جذبے کو اسی لیے ہی بے اختیار کہا جاتا ہے کہ...... بس! یہ ہو جاتا ہے، کیا نہیں جاتا۔''

''یہ تمہارا کیسا جذبہ ہے کہ تم جانتے ہوئے بھی کہ لئیق کبھی بھی میرے دل سے نہیں نکل سکتا اور وہ تو مرنے کے بعد میرے دل میں زندہ ہو گیا ہے، مگر تم......'' زہرہ بانو مرتعش سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے چپ سی ہو گئی تو میں نے فوراً مداخلت کی اور کبیل دادا کی طرف دیکھ کر دھیرے سے کہا۔

''کبیل دادا! تم جاؤ......'' وہ پلٹا اور واپس لوٹ گیا۔

''عجیب پاگل آدمی ہے یہ......'' زہرہ بانو کہتی ہوئی دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی۔ ''یہ سارا تمہارا ہی کیا دھرا ہے......'' اس نے میری طرف دیکھ کر شکوہ کیا۔ میں مسکراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج یہ نازک اور حساس موضوع چھڑا تھا تو میں نے بھی اسے انجام تک پہنچانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

''دیکھو زہرا! اصل میں ہم سب، میں، اول خیر، شکیلہ، اماں اور ابا جی تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبیل دادا کو تم بھی جانتی ہو اور اب میرا خیال ہے ایک مخصوص حوالے سے تم اور بھی اسے اچھی طرح جان گئی ہو۔ اس بے چارے کی ایسی کوئی کوشش نہیں ہے کہ وہ تمہارے دل سے لئیق شاہ کی محبت

کو دور کرنا چاہتا ہے، اس سادہ لوح آدمی نے تو بہ زبانِ خود اس یقینی امر کا اعتراف بھی کرلیا ہے کہ تم لئیق شاہ کی محبت کو کبھی دل سے نہیں نکال سکتیں، لیکن اس بے چارے کی سادگی تو دیکھو وہ چاہتا کیا ہے، صرف تمہیں اور بس......‘‘

’’میں کسی کو جانتے بوجھتے ہوئے اتنے بڑے دھوکے میں نہیں رکھ سکتی شہزی!‘‘ زہرہ بولی۔

’’کبیل دادا تم سے یہ دھوکا بھی کھانے پر رضامند ہے۔‘‘ میں کہا۔

’’یہ اس کا بچکانا پن ہے۔‘‘

’’ہرگز نہیں، وہ ایک سمجھ دار اور زبان کا پکا آدمی ہے۔‘‘ میں نے کہا اور اسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔ ’’دیکھو زہرہ! ہم سب کی مضبوطی اسی میں ہے کہ ہم ساتھ رہتے ہوئے اپنے رشتوں کو اپنی دوستیوں کو باہم مستحکم کریں۔ میرا تو اول خیر اور شکیلہ کا بھی شادی کروانے کا ارادہ ہے۔ زندگی کی بعض تلخ حقیقتوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اور ان سے سمجھوتا کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری۔ ایک عورت ذات کے لیے زندگی کا یہ طویل سفر بغیر ساتھی کے نہیں کٹتا زہرہ! میں خود بھی یہی چاہتا ہوں کہ...... آپ کو ایک اچھا ساتھی مل جائے اور پھر میں مطمئن ہو کے اپنے سفر پر نکل جاؤں...... پلیز زہرہ! مان لو میری بات...... کبیل دادا کے لیے ہاں کردو...... تم دیکھنا تمہیں ایک خوشگوار تبدیلی اور مسرتوں کا احساس ہوگا۔ تم زندگی جینے لگو گی اور زندگی تمہیں۔‘‘

’’مجھے ڈر ہے کہ میں لئیق شاہ کو بھلا دوں گی۔‘‘ اس نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا۔

’’کیا تمہاری محبت اتنی کمزور ہے کہ تم ایسا سوچ رہی ہو۔‘‘

’’یہ ایک ڈر ہے۔‘‘

’’یہ وہم ہے۔‘‘

’’وہم ہی سہی۔‘‘

’’لیکن لئیق شاہ اب دنیا میں نہیں رہا۔‘‘

’’کسی کے دنیا میں نہیں رہنے سے کیا وہ واقعی ختم ہو جاتا ہے؟ تم مسلمان ہو ناں...... کیا آخرت کی ہمیشہ والی زندگی پر یقین نہیں کرتے؟‘‘

’’الحمدللہ...... بالکل رکھتا ہوں۔‘‘

’’میں لئیق شاہ کو اللہ سے مانگ لوں گی۔‘‘

اس کی بات سن کر میں سکتے میں آگیا۔ کیسی عجیب عورت تھی یہ...... اور اس کی محبت اس سے زیادہ عجیب...... تب ہی میں نے کہا۔

’’ٹھیک ہے...... اگر تم یہ بات کرتی ہو تو ایسا تب ہی ممکن ہے جب تمہیں جنت ملے۔‘‘

’’میں دنیا میں رہتے ہوئے دیگر نیک لوگوں کی طرح اس کی کوشش میں مصروف رہوں گی۔‘‘

’’تب پھر تم پر اسلامی اُصولوں اور ان کی پاسداری لازم ہوگی جس میں ایک حکم یہ بھی ہے کہ اگر جو جوان بیوہ ہے اس کی شادی کردی جائے۔ یہی سوچ کر ہی ہاں کردو زہرہ! خدا کے لیے...... کبیل دادا کو اپنا لو...... اور اپنی ریاضت کو دل میں رکھو۔ باقی اُوپر والے کے معاملات اُوپر والے پر چھوڑ دو......‘‘

میں نے اپنی بات مکمل کی تو زہرہ کو میں نے پہلی بار کچھ سوچتے ہوئے پایا۔ اس سے کمرے کی فضا مجھے تھمی تھمی سی محسوس ہونے لگی۔

بالآخر خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد زہرہ بانو نے جیسے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

’’ٹھیک ہے شہزی! اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں میری بھی ایک بات ماننا ہوگی۔‘‘

’’کون سی، بولو......؟‘‘ میں نے اسے رضامند پاکر دبی دبی مسرت تلے اس سے پوچھا۔

’’میری دعا ہے کہ خدا تمہیں اپنے مشن میں کامیاب کرے۔ تم امریکا سے عابدہ کے ساتھ ہی خیریت و سلامتی سے واپس لوٹو، لیکن...... میری ایک شرط ہے کہ یہ سب عابدہ کی واپسی کے بعد ہی ہوگا۔ پھر بیگم ولا میں ایک نہیں، دو نہیں، تین شادیوں کے شادیانے بجیں گے۔ دوسری بات یہ کہ اب اول خیر کی جگہ کبیل دادا تمہارے ساتھ امریکا جائے گا اور اول خیر اِدھر ہی بیگم ولا میں میرے پاس رہے گا۔‘‘

میں ان کی آخری شرط پر ذرا چونکا۔ وہ ایسا کیوں کہہ رہی تھی؟ مگر اس پر مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس ضمن میں ایک ہی بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ ایک عورت کی جس شخص سے شادی کی بات چل نکلی ہو اور اس کی ’’ہاں‘‘ کے بعد اس عورت کی حیا اس ’’مرد‘‘ کو اپنی چھت تلے رکھنے پر آڑے آرہی ہو۔ لہٰذا اس شرط کے پیچھے مجھے زہرہ بانو کا یہی مقصد کارفرما محسوس ہوا تھا۔

’’میں نے تمہیں جواب دے دیا شہزی! اب مجھے اُمید ہے کہ تم میری بھی بات رکھو گے۔‘‘ مجھے کچھ سوچتا پاکر اس نے آخر میں کہا، گویا اس موضوع پر اب وہ مزید کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے
کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

’’آ جاؤ اندر...... دروازہ کھلا ہے۔‘‘ زہرہ بانو نے ذرا اُونچی اور تحکمانہ آواز میں کہا تو ایک ملازم اندر داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ نوشابہ کا فون آیا ہے میرے لیے۔ اس کے ہاتھ میں کارڈلیس دبا ہوا تھا۔ میں چونکا اور ہاتھ بڑھا دیا۔ نوشابہ سے بات کرنے سے پہلے میں نے اس کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اسے دوسرے کمرے میں موجود اول خیر وغیرہ کو بلانے کا کہا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر با اوب واپس لوٹ گیا۔

میں نے اسپیکر آن کر کے ہاتھ ہٹایا اور کارڈلیس کے ماؤتھ پیس پر گمبھیر آواز میں ’’ہیلو‘‘ کہا۔

’’شہزاد احمد خان بات کر رہے ہیں؟‘‘ دوسری جانب سے استفساریہ آواز اُبھری۔ نوشابہ کی آواز کو میں پہچانتا تھا۔

’’جی ہاں! بات کر رہا ہوں۔‘‘ میں نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔

’’شہزاد! مجھے معلوم ہے کہ میرا فون ریکارڈ کیا جا رہا ہو گا...... اور......‘‘ اس نے چالاک بننے کی کوشش چاہی تو میں نے فوراً ہی اس کی بات کاٹ کر کہا۔

’’اگر تمہیں معلوم ہے تو پھر کال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘

’’بہت غصے میں ہو......‘‘ اس کی طنزیہ آواز ابھری۔

’’میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ!‘‘

’’اوہ...... اتنا بہت فالتو وقت جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننے کے بعد تو کم از کم میری بات سننے کے لیے تمہارے پاس وقت تو ہونا چاہیے۔‘‘ اس کی طنزیہ کاٹ دار گفتگو جاری تھی۔ میں نے اسی گمبھیرتا سے جواب دیا۔

’’جس وقت کو تم فالتو اور کہاں کہاں کی خاک چھاننا کہہ رہی ہو، اس کی افادیت کا اعتراف پورے ملک میں ایک بہت بڑے قومی اور فوجی اعزاز کے ساتھ کیا جا چکا ہے...... محترمہ! اور یوں عوامی اور ملکی سطح پر کسی کو محبِ وطن اور کسی کو ’’بنتِ غدار‘‘ کا خطاب بھی مل چکا ہے، جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ اب تک کس نے خاک چھانی اور کس نے ملک و قوم کے لیے اپنا سب کچھ قربان کیا ہے۔‘‘

میری اس معنی خیز جوابی کارروائی نے اس کا منہ توڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ دوسری جانب یک دم خاموشی چھا گئی اور یوں لگا جیسے کوئی غصے سے دانت پیس رہا ہو۔ میں نے اسے مزید جلانے کی خاطر دوبارہ کہا۔

’’اپنا اصل خطابی نام سن کر آپ کہاں چلی گئیں؟ آواز نہیں آ رہی مجھے آپ کی......!‘‘

’’آواز تو میری بہت دور سے بھی تم تک پہنچ جائے گی شہزی!‘‘ اس نے شاید غصے سے دانت پیس کر ہی جواب دیا تھا۔ ’’لیکن...... اتنا یاد رکھنا...... وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے تازہ ہے جب میرے اکلوتے بھائی فرخ نے میری آنکھوں کے سامنے دم توڑا تھا۔‘‘

’’اور...... میری آنکھوں کے سامنے وہ کئی دل دوز مناظر ابھی تک رقصاں ہیں جو تمہارے قصائی باپ کے رہینِ منت ہیں۔ ان میں ایک منظر آسیہ کا بھی ہے، جسے تمہارے باپ نے اپنے زرخرید کتوں کے آگے ڈال دیا تھا۔‘‘

’’تم اس وقت چوہدری ممتاز سے نہیں نوشابہ سے مخاطب ہو۔‘‘

’’چھوڑوں گا تو میں اُسے بھی نہیں اگر تم بھی میدان کھود کر سامنے آنا چاہتی ہو تو کھلی دعوت ہے۔ لیکن تمہارے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ تمہاری عمر گھر بسانے کی ہے، یہ سب تمہیں زیب نہیں دیتا۔‘‘

’’جس نے سینے میں انتقام کی آگ بسا رکھی ہو وہاں اب اور کوئی نہیں بس سکتا۔‘‘

’’تم جن لوگوں کے بل بوتے پر اتنا بھونک رہی ہو وہ سب میرے زیرِ نگیں ہو چکے ہیں۔‘‘

بڑی خوش فہمی ہے تمہیں۔‘‘ وہ استہزائیہ ہنسی کے ساتھ بولی۔ ’’وہ سب پہلے سے اب زیادہ طاقت کے ساتھ تمہارے مقابلے پر آنے والے ہیں۔‘‘

اس بار میں غصے سے دانت پیس کر رہ گیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ چکا تھا۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں نے وزیر جان سے لے کر چوہدری ممتاز تک سب کو ناکوں چنے چبوائے تھے، لیکن یہ دونوں اسپیکٹرم کے مقامی سربراہوں میں سے تھے۔ اسپیکٹرم کی جڑیں انہوں نے مضبوط کر لی تھیں مگر میں نے اپنے ساتھیوں سے مل کر ان کی مقامی قیادت فنا کر ڈالی تھی۔ ان کے بہت سے ساتھی ایجنٹوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور کچھ فرار ہونے اور زیرِ زمین دبکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

فرار ہونے والوں میں وزیر جان بھی شامل تھا جو ہنوز مفرور تھا۔ چوہدری ممتاز گرفت میں آ گیا تھا مگر ضمانت پر رہا ہوا، تاہم اب وہ اپنی جگہ محدود کر دیا گیا تھا اور اس پر بیرونِ ملک تو کیا بیرونِ شہر جانے پر بھی پابندی عائد تھی۔ نوشابہ اب اسپیکٹرم کی اس لنگڑی لولی باقیات کے بل بوتے پر ہی اکڑ رہی تھی۔

’’کھلی دعوت ہے اُن کو...... آ جائیں میرے مقابلے پر...... اس بار میں نے بھی تہیہ کر رکھا ہے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔‘‘ میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

’’اسپیکٹرم ایک آکٹوپس ہے، اس کا ایک ٹینٹکل (Tentacle) توڑو گے تو اس کی جگہ دس اور نکل آئیں گے لیکن اتنا یاد رکھنا شہزی! نوشابہ بھی تمہارے لیے بہت مشکل ثابت ہوگی۔‘‘

’’یہی گیدڑ بھبکیاں سنانے کے لیے تم نے فون کیا تھا؟‘‘

’’تم نے خود ہی بحث شروع کی تھی۔ میں تو تم سے مقصد کی بات کرنا چاہتی تھی۔‘‘ اس کے سفید جھوٹ پر مجھے غصہ تو آیا مگر میں نے تحمل سے کام لیا اور کہا۔

’’تو کرو بات، اب میرے پاس وقت بالکل نہیں رہا۔‘‘

’’میں تم سے ایک اہم معاملے پر ڈیل کرنا چاہتی تھی۔‘‘

’’کیسی ڈیل......؟‘‘ میرا دل کسی خیال کے تحت یکبارگی زور سے دھڑکا۔

’’فون پر نہیں ہو سکتی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’تو پھر بیگم ولا آ جاؤ......‘‘ میں جواب دیا۔

’’میں نہیں آ سکتی، میرے دو آدمی آئیں گے۔‘‘

’’ڈیل کی نوعیت بتا دو تو زیادہ بہتر ہوگا، ہو سکتا ہے تمہیں یہاں اپنے آدمی بھیجنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔‘‘

وہ میرا اشارہ بھانپ کر بولی۔ ’’ڈیل عابدہ سے متعلق ہے۔‘‘

عابدہ کے ذکر پر میرا دل دھڑکنے لگا، کچھ توقف کے بعد میں نے سنبھل کر جواب دیا۔

’’ہم...... ٹھیک ہے، بھیج دو اپنے آدمی لیکن یاد رہے۔ اگر تم عابدہ کو میری کمزوری بنانا چاہتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔‘‘

’’یہ ڈیل، کچھ لو اور دو کے تحت ہوگی۔‘‘

’’عابدہ کے بدلے میں میرے پاس دینے کے لیے ایسا کچھ نہیں ہوگا جس کا تعلق میری اپنی ذات سے ہو۔‘‘

’’بات ہو جانے دو پھر دیکھتے ہیں، کیا کہتے ہو پھر......‘‘ وہ مکاری سے بولی۔

’’بھیج دو۔‘‘

’’کل شام پانچ بجے میرے دو آدمی تمہارے پاس آئیں گے۔‘‘

اس کے بعد چند سیکنڈ تک مزید بات ہوئی اور میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اسپیکر کی وجہ سے مجھے گفتگو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی اور سب کا کم و بیش یہی خیال تھا کہ نوشابہ اسپیکٹرم میں ایک عہدے دار کی حیثیت سے شمولیت حاصل کر چکی تھی اور اب اس کا عابدہ سے متعلق کسی خفیہ ’’ڈیل‘‘ کے بارے میں بات کرنا ظاہر کرتا تھا کہ اس کے پیچھے لولووش یا باسکل ہولارڈ کا ہاتھ تھا۔ اس سلسلے میں زہرہ بانو اور اول خیر کو اعتراض تھا کہ نوشابہ کو آدمی بھیجنے سے منع کر دیا جاتا، جبکہ میرا اور شکیلہ سمیت کبیل دادا کا خیال تھا کہ کم از کم ان کی ڈیل سے متعلق بات سن لی جائے، ممکن تھا کہ ہمیں اس ڈیل کو ’’ڈمی‘‘ کرنے یا چال چلنے کا موقع مل جائے۔

نوشابہ والے موضوع کے اختتام پر زہرہ بانو اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اول خیر اور شکیلہ نے فوراً میرے گرد گھیرا ڈال لیا اور کبیل دادا سے متعلق زہرہ بانو کے عندیے کے بارے میں پوچھا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر انہیں بتا دیا۔

زہرہ بانو کی رضامندی کا سن کر کبیل دادا تو جیسے بت بن کر رہ گیا تھا جبکہ شکیلہ نے خوشی کے مارے ایک نعرہ بلند کیا مگر اب اس مہم میں اول خیر کے بجائے کبیل دادا کی جگہ لینے پر وہ بھی کچھ افسردہ محسوس ہوئی۔ تاہم زہرہ بانو کی کبیل دادا سے نکاح کی رضامندی نے اس افسردگی کو کافی حد تک کم کیا تھا اور اول خیر کو بھی اتنی ہی خوشی ہوئی تھی مگر وہ زہرہ بانو کی شرط کے آگے بجھ کر رہ گیا تھا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

’’اول خیر! اپنے وڈے استاد جی کی اتنی بڑی خوشی کی خاطر تجھے یہ قربانی تو دینا ہی پڑے گی، باقی میرے لیے تو تم دونوں ہی برابر ہو۔‘‘

’’بہت چالاک ہے تُو شہزی کاکے!‘‘ اول خیر میری طرف شکایتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’اپڑیں وڈے استاد جی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔‘‘ اس نے آخر میں اُترے اُترے چہرے کے ساتھ کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ کبیل دادا تو جیسے ہنوز بت بنا کھڑا تھا تب ہی اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

’’او...... خیر، وڈے استاد جی! آپ پر تو لگتا ہے شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ کچھ تو بولو استاد جی؟‘‘

’’میں کیا بولوں یار خیرے! شہزی نے تو مجھ پر آج ایسا احسانِ عظیم کیا ہے کہ دل چاہتا ہے اس کا ماتھا چوم لوں۔‘‘ بالآخر کبیل دادا نے ممنون بھرے لہجے میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے وہ فرطِ جذبات و مسرت سے

میرے گلے سے آن لگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا تھپکا اور کہا۔

”احسان کیسا دادا......؟ یہ تو ہم ساتھیوں کا فرض تھا کہ تیرے دل کی بستی کو آباد دیکھیں۔ آج ہماری یہ خواہش پوری ہوگئی۔“

”اب یہ ساری خوشیاں عابدہ سے نتھی ہو چکی ہیں اور ہمیں پوری توجہ اس اہم ترین مشن پر مرکوز رکھنا ہوگی۔“ شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

ہم تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد آرام کرنے کے لیے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

اگلے دن مقررہ وقت پر نوشابہ کے بھیجے ہوئے دو آدمی بیگم ولا پہنچے۔ گیٹ پر مکمل جامہ تلاشی کے بعد انہیں اندر بھیج دیا گیا۔ انہیں پہلے سے مخصوص کیے گئے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ وہ دشمن کے آدمی سہی، مگر اخلاقاً ملازم نے ان کے سامنے کھانے پینے کے لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی سجا دی تھی۔ مگر ان دونوں نے کسی شے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا اور مجھ سے جلدی ملاقات کا کہا گیا۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ تینوں ساتھی تھے، جبکہ زہرہ بانو کو میں نے وہاں آنے سے منع کر رکھا تھا۔

میں نے ان سے ملنے کے دوران میں بہ غور جائزہ لیا تھا۔ ان میں سے ایک پختہ العمر تھا جبکہ دوسرا درمیانی عمر کا تھا۔ پکی عمر والے کا سر آدھا گنجا تھا، رنگ گورا اور قد درمیانہ تھا۔ درمیانی عمر کا آدمی دراز قامت اور گندی رنگت کا تھا۔ اس کا جسم بھی کسرتی تھا۔ دونوں ہمیں اور بالخصوص مجھے بڑے غور سے دیکھتے ہوئے ملے اور پھر میرے اشارے پر صوفے پر بیٹھ گئے۔

”نوشابہ خود آجاتی تو میرا خیال تھا کہ زیادہ اچھی بات ہوتی۔ خیر......“ کہتے ہوئے میں رکا پھر مستفسر ہوا۔

”کیا بات کرنا چاہتے ہو؟“ میری بات پر وہ ذرا کسمسائے، اس کے بعد پکی عمر والے نے ہولے سے کھنکھار کر گفتگو کی ابتدا کی۔

”ہمیں اُس ڈیل سے متعلق میڈم نوشابہ نے اچھی طرح بریف کر دیا ہے۔ ہم آپ سے دوٹوک بات کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اس ڈیل سے متعلق آپ کے سوالوں اور اُن تحفظات کا جواب دیتے ہوئے قائل بھی کر سکیں .... بہ صورت دیگر آپ کا جو آخری فیصلہ ہوگا، وہ ہم جا کر میڈم نوشابہ کے سامنے رکھ دیں گے۔“

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ اس کی آواز بھاری اور کھردری تھی۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے غیر ضروری باتوں کا جواب نہ دینے اور دوٹوک رویّہ رکھنے والا انتہائی گھاگ شخص دکھائی دیتا تھا، میری نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔

”اس وقت آپ ہماری کمزوری سے واقف ہیں اور ہم آپ کی...... لیکن اگر مشترکہ طور پر ان کمزوریوں کی نوعیت کے بارے میں بات کی جائے تو میرا خیال ہے آپ کی کمزوری کی نوعیت ہمارے مقابلے میں حاوی ہے۔ لہٰذا اس ڈیل سے آپ کو فائدہ اُٹھانے کی زیادہ ضرورت ہے۔“ وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میں اس کی مکاری سمجھ رہا تھا۔ اس نے اصل گفتگو کرنے سے پہلے نفسیاتی طور ایک طرح سے مجھے اپنے دبدبے میں لینے کی کوشش چاہی تھی۔ میں چپ رہا اور بظاہر غور سے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ ایک سانس لے کر دوبارہ بولا۔

”ہماری کمزوری مادیّت ہے اور آپ کی کمزوری کسی کی زندگی۔ فی زمانہ زندگی کو مادیّت پر فوقیت حاصل ہے۔ بس! اب میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔“

یہ کہہ کر اس پختہ العمر آدمی نے کسی ”ڈکٹیشن“ کے مطابق اپنی بات گویا یہیں ختم کرتے ہوئے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ اشارتی زبان میں جو کہنا چاہتا تھا کہہ چکا تھا اور اب مجھے اس کے جواب میں وضاحت پیش کرنا تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دوسرا ساتھی بول اٹھا۔

”عابدہ امریکا کی ایک خطرناک جیل میں مقیّد ہے۔ امریکا کی اس جیل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گوانتانوموبے سے کم خطرناک نہیں، جہاں کا قیدی صرف ایک لاش کی صورت میں ہی باہر آتا ہے۔ طلسم نور ہیرا اور اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کور کوران کی جیل میں موت کی گھڑیاں گننے والے ایک قیدی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔“ درمیانی عمر والا کسرتی بدن کا آدمی مجھ سے یہ کہنے کے بعد چپ ہوا تو اس کا پہلا ساتھی بولا۔

”اب آپ کا کیا جواب ہے؟“

بہت ہی مختصراً اور نپی تلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں نے بھی یہی انداز اپناتے ہوئے جواب میں کہا۔

”پہلی بات یہ کہ...... مادیّت پرست لوگوں کے لیے بھی ان کی کمزوری مال کی صورت میں اُتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ خونی رشتوں اور انسانی قدروں کی پاسداری کرنے والوں کے لیے۔ معیارات مختلف سہی مگر انفرادی طور پر قدر و

قیمت وہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرح ہماری کمزوری کی اہمیت ایک ہی ہے، کسی سے کم یا زیادہ نہیں۔ یعنی تمہارے لیے پیسا عزیز ہے اور ہمارے لیے کسی کی زندگی۔ رہی بات طلسم نور ہیرے کی تو وہ جب تک میرے پاس تھا تو اور بات تھی، مگر اب وہ حکومت کے اختیار اور ریاست کے جائز قبضے میں جا چکا ہے، اس پر میرا یا کسی اور کا حق نہ تھا۔ وہ ملک وقوم کی امانت تھا اور اپنی جگہ پر پہنچ چکا۔ رہی بات اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کی تو وہ میری ملکیت ہی نہیں، ہاں! اس پر میرا ایک تصرف تھا، مگر اب وہ بھی نہیں رہا۔ بجز اس کے کہ میں اس میں سے صرف پندرہ فیصد کا مالک ہوں، وہ بھی اخلاقاً...... یہ لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ یہ مجھے کسی نے منہ بولے بیٹے کی حیثیت سے دیے تھے، مگر میں انہیں قبول نہیں کروں گا۔ وہ جس کی ملکیت ہیں اُسی کے اختیار میں جائیں گے۔“ میں نے بھی ان کی طرح ایک بات ختم کر کے تھوڑا توقف کیا۔ وہ دونوں عجیب سے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ یہ پوچھنا چاہ رہے ہوں کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

”آپ اس طرح ہم سے بلف کریں گے تو یہ ڈیل کیسے ہوگی؟“ آخرالذکر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”میں کوئی بلف نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں وہی کچھ کہہ رہا ہوں جو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ طلسم نور ہیرے کو قومی سطح پر ڈکلیئر کر دیا ہے، جبکہ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں سیٹھ منظور وڑائچ کی وصیت ایک ٹھوس ثبوت کے طور پر موجود ہے۔“

میری بات سن کر وہ دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ تب ہی اول الذکر نے میری طرف دیکھ کر کہا... ”اگر یہ بات ہے تو ڈیل کس بنیاد پر کی جائے......؟“ پہلے والے نے مکاری سے اپنی گوٹ ”اسٹاپ“ سے ہٹا کر میرے خانے پر رکھ دی۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ میں نے بھی اپنے شانے اچکا دیے۔

کمرے میں لمحہ بھر کی خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد پہلے شخص نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے ڈیل، ڈیڈلاک میں چلی گئی۔“

پھر وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تو آخرالذکر نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ ہم جوں کے توں اور بظاہر بے پروا سے بیٹھے رہے۔

”ٹھیک ہے۔“ نصف گنجے سر والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ ”ہم میڈم سے بات کر لیتے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ ان کے پاس اور کوئی دوسرا آپشن ہو۔“

میں جانتا تھا کہ... اول الذکر مجھے اُکسانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا، تاکہ میں خود انہیں کوئی آپشن دوں...... لہٰذا میں نے انہیں موقع دیا اور بولا۔

”میرے پاس ایک آپشن ہے۔“

”کون سا......؟“ دونوں بیک وقت میری طرف دیکھ کر بولے تھے۔ صاف لگتا تھا کہ انہیں اچھی طرح یہ سکھا کر بھیجا گیا تھا کہ اس ڈیل سے متعلق بات کر کے ہی لوٹیں۔

”یہی کہ...... عابدہ کی رہائی سے متعلق اگر بے بی نوشابہ اور اس کے بیک سپورٹر کوئی مدد کر سکتے ہیں تو میں بدلے میں ان کی دشمنی فراموش کردوں گا۔“

میں نے دانستہ نوشابہ کو ”میڈم“ کے بجائے ”بے بی“ اور ”بیک سپورٹر“ کا ”ٹچ“ لگایا تھا۔ میری بات نے ان کے گھمنڈ کا تیا پانچا کر کے رکھ دیا۔ وہ منہ بسور کر مصافحہ کیے بغیر لوٹ گئے۔

اُن کے جانے کے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد نوشابہ کا فون آگیا، جس کا مجھے اندازہ تھا اسی لیے میں نے پہلے ہی سے کبیل دادا کو بریف کر دیا تھا۔ اسی نے فون اُٹھایا۔

”ہیلو...... کبیل دادا بول رہا ہوں۔“ اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔ اسپیکر آن کر دیا تھا۔

”شہزی سے بات کراؤ......“ انداز تحکمانہ تھا مگر کبیل دادا نے بھی بارعب سے لہجے میں کہا۔

”وہ اب آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے، آپ نے جو کہنا ہے مجھ سے کہہ دیں، میں آپ کی بات......“ کبیل دادا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے اسموتھ ٹون کی آواز ابھرنے لگی۔ کبیل دادا نے زہرخند مسکراہٹ سے فون رکھ دیا۔

”او خیر......! بڑی آکڑ ہے اس چھٹانک بھر لڑکی میں......“ اول خیر نے ہولے سے تبصرہ کیا۔

☆☆☆

تین روز بعد زورآور خان آدھمکا۔ وہ ہمارے ویزے اور پاسپورٹ لایا تھا۔ یہ سفری کاغذات ہمارے اصل ناموں سے تھے۔ (اب اول خیر کی جگہ کبیل دادا کا نام شامل کر دیا گیا تھا، جس کے بارے میں زورآور خان کو بتادیا گیا تھا)

مجھے تین روز بعد اپنے اصل نام کے ساتھ تھائی لینڈ ایک ٹورسٹ کی حیثیت سے روانہ ہونا تھا۔ وہاں کا ویزا ایک ماہ کا تھا۔ تھائی لینڈ کے ایک ہوٹل میں میرے دو دنوں کے

قیام کا بندوبست تھا۔ دوسرے روز زورآور خان کا ایک آدمی (ساتھی ایجنٹ) مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا اور میری ایک ہفتے کے اندر اندر وہاں سے امریکا روانگی کا بندوبست کرنا اسی کے ذمّے تھا جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ دو روز بعد ہی دبئی کے لیے اسی طرح اپنے اصل ناموں سے روانہ ہوں گے اور وہاں بھی انہیں زورآور خان کا کوئی آدمی ملے گا جو اُن کے لیے بھی امریکا روانگی کا بندوبست کرے گا۔

تھائی لینڈ اور دبئی کے راستے امریکا روانگی سے متعلق زورآور خان نے کچھ ضروری کاغذات اِدھر ہی تیار کروا لیے تھے بلکہ بقول اس کے وہ پہلے سے تقریباً تیار ہی تھے، جو تھوڑی بہت کمی بیشی، جسے دانستہ رہنے دیا گیا تھا، وہ ان مذکورہ ملکوں میں موجود ہم سے ملنے والے اس کے ساتھی ایجنٹوں نے اپنے طور پر مکمل کرنا تھے۔ مجھے تھائی لینڈ سے جس انڈین نوجوان کے روپ میں روانہ ہونا تھا اس کا نام راجیش کمار تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جس کے بارے میں زورآور خان ہمیں پہلے ہی بریف کر چکا تھا۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، یہ ایک غیر معروف اور فلاپ شدہ بھارتی ایکٹر تھا، جو بعد میں بھارتی فلم انڈسٹری میں ''اسٹنٹ مین'' کے طور پر کام کرنے لگا تھا۔ اس کے جینوئین کاغذات کے مطابق وہ ایک عرصے سے تھائی لینڈ میں مقیم تھا، جہاں وہ حادثاتی طور پر منشیات کے ایک بڑے ریکٹ مافیا کے نرغے میں آکر کراس فائرنگ میں ہلاک ہو گیا تھا۔

اس ہنگامے میں اور بھی کئی لوگ مارے گئے تھے، چند ایک کی شناخت نہ ہو سکی تھی، ان میں ایک راجیش کمار بھی تھا۔ زورآور خان کے ''دو نمبر'' کی آڑ میں ایک نمبر کام کرنے والے آدمی ایسے ''غیر شناخت شدہ'' لاشوں کے سفری کاغذات کو اپنے قبضے میں کرنا خوب جانتے تھے۔ اگرچہ راجیش کمار اور میرے قد کاٹھ میں کوئی خاص فرق نہ تھا تاہم ناک نقشے کے کچھ زاویے واضح طور پر مختلف تھے۔ باقی رنگ اور آنکھیں اور بالوں کے اسٹائل میں کوئی فرق نہ تھا۔ زورآور خان کے کہنے کے مطابق تھائی لینڈ میں مقیم اس کے آدمی ان تفاوت کو دور کرنے میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔

بالکل اسی طرح کبیل دادا اور شکیلہ کے بہروپ میں جو بھارتی جوڑا تھا، وہ ہنی مون منانے کے لیے بھارت سے دبئی آیا تھا۔ وہاں وہ ایک بس کے حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ بس میں آگ لگنے کی وجہ سے کئی مسافروں کی لاشیں جھلس گئی تھیں ان میں چند کی شناخت ممکن نہ ہو سکی تھی۔ مگر زورآور خان کے ''گدھ مار کا'' ساتھی جو اپنے ''کاروبار'' کے سلسلے میں ایسے مواقعوں کی تاڑ میں رہتے تھے، فوراً حرکت میں آجاتے تھے۔

ان دونوں میاں بیوی کے کاغذات بھی ان کے پاس موجود تھے۔ مرد کا نام پریم داس تھا اور بیوی کارتنی دیوی تھا۔

قد و قامت کوئی خاص مسئلہ نہیں ہوتا، لیکن شکل و صورت اور رنگ و روپ کی قریب قریب مماثلت کے اتفاقات پر ہمیں اچنبھا ضرور ہوا تھا۔ ہم نے حیرت سے زورآور خان سے اس سے متعلق سوال پوچھا تھا تو اس نے حسبِ عادت بڑے معنی خیز انداز میں اپنی مٹھی میں دبی سگریٹ کا سوٹا لگا کر کہا۔

''اتفاق کیسا بابا؟ یہ پورا ایک گروہ ہے ایک منظم گروہ...... جن کا کام ہی یہی ہے اور سمجھو تو ایک طرح سے میں بھی یہاں ان کا ایک ایجنٹ ہی ہوں...... ان کے پاس ایسی البموں کی بھرمار ہے۔ جو مطلوبہ دانے قریب قریب مماثلت والے ملتے ہیں، وہ چن لیے جاتے ہیں اور باقی کی تھوڑی بہت کمی بیشی ہمارے ایکسپرٹ پوری کر لیتے ہیں۔ کام مشکل اور رسکی ضرور ہوتا ہے، مگر چل جائے تو فائدہ ہی فائدہ ہوتا ہے۔''

''یعنی ہمارے کام میں بھی رسک ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''بہت کم......'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے بہت تلاش اور سر کھپائی کے بعد ہی یہ تین دانے ایسے تلاش کیے ہیں جو تم تینوں پر بالکل فٹ بیٹھتے ہیں۔''

زہرہ بیگم نے زورآور خان کو معاہدے کے مطابق نصف رقم ادا کر دی۔ ہم کچھ ضروری شاپنگ میں مصروف ہو گئے۔ ہم نے اپنی طرف سے اس سارے معاملے کو خفیہ رکھنے کی اپنی سی پوری کوشش کر رکھی تھی۔ زورآور خان کو بھی اسی بات کی تاکید کر دی تھی، وہ آنے سے پہلے کال کرتا تھا اور بیگم ولا سے ہی دو آدمی اسے لانے اور چھوڑ جانے کے لیے مامور تھے۔

زورآور خان نے ہی ہماری تھائی لینڈ اور دبئی کی ٹکٹوں کا بندوبست کیا تھا۔ پہلے کبیل دادا اور شکیلہ کو روانہ ہونا تھا۔ ان کے دبئی پہنچتے ہی ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں ائرپورٹ پر زورآور خان کا آدمی ملتا جو انہیں اپنے ساتھ لے جاتا، وہاں کبیل دادا اور شکیلہ کو تین دن قیام کرنا تھا۔ ایسا سفری کاغذات اور دیگر لوازمات کی ''باقیات'' پوری کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ گویا کبیل دادا اور شکیلہ سب سے پہلے امریکا کی اس سفری اور کامیاب آزمائش سے گزرتے اور ان دونوں کی دبئی سے بہ خیریت روانگی اور یہ تسلی ہوتے ہی کہ زورآور خان ''ٹھیک'' جا رہا تھا۔ پھر مجھے روانہ ہونا تھا۔

مقررہ دن پہلی روانگی تھی اس لیے اس روز مشن کی کامیابی کے لیے بیگم ولا میں ہی اجتماعی دعا کی تقریب کی گئی جس میں اماں اور ابا جان بھی شریک تھے اور دعا ماں جی نے ہی کروائی تھی۔ ماں نے بڑے دلگیر اور خضوع و خشوع سے اللہ ربُّ العزت کے حضور میرے اس مشن میں کامیابی کی دعا مانگی تھی، جس سے مجھے ایک عجیب سا حوصلہ اور ہمت عطا ہوئی تھی۔ بیگم ولا کی اُوپری منزل کے ایک بڑے ہال میں عصر اور مغرب کی باجماعت نماز بھی ادا کی گئی تھی۔ جس کی امامت اباجی نے ہی کی تھی۔ دعائیہ تقریب بھی وہیں ہوئی تھی۔ ایک دن پہلے قرآن خوانی بھی کی گئی تھی۔

کبیل دادا اور شکیلہ کی فلائٹ شام پانچ بجے کی تھی۔ انہیں ملتان انٹرنیشنل ائرپورٹ سے دبئی کے لیے روانہ ہونا تھا جبکہ مجھے لاہور سے۔ ایسا مصلحتاً کیا گیا تھا۔

ان دونوں کی روانگی کا منظر بھی بڑا جذبات انگیز اور دل گیر سا تھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ کو بظاہر عام انداز میں ہی بیگم ولا سے رخصت کیا گیا تھا یعنی ان دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہ تھا۔ کار میں دونوں اکیلے تھے۔ کبیل دادا اسٹیئرنگ پر تھا جبکہ شکیلہ اس کے برابر میں براجمان تھی۔ لیکن...... ان کی روانگی سے بیس منٹ پہلے ہی ایک اور کار مین چوراہے پر پہلے سے کھڑی تھی جس میں زہرہ بانو کے دو مسلح گارڈ موجود تھے۔ کبیل دادا اور شکیلہ کی کار ائرپورٹ کے لیے بیگم ولا سے روانہ ہوئی تو مذکورہ چوراہے پر کھڑی کار حرکت میں آگئی۔ یہ ان کی حفاظت اور اس خدشے کے پیشِ نظر کیا گیا تھا کہ...... اگر کوئی کبیل دادا اور شکیلہ کی کار کا تعاقب کر رہا ہو تو وہ آخرالذکر دو افراد کی نظروں میں آجائے۔

بہرحال مشن میں روانگی کا یہ پہلا مرحلہ بہ خیر و خوبی نمٹا لیا گیا حتیٰ کہ کبیل دادا اور شکیلہ کی فلائٹ دبئی کی طرف پرواز کر گئی۔ ان کی کار زہرہ بانو کے آدمی ائرپورٹ سے واپس بیگم ولا لے آئے۔

دبئی پہنچتے ہی کبیل دادا نے ہمیں اپنی خیریت کی اطلاع دی اور یہ بھی بتا کر تسلی کر دی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں زورآور خان کے جس آدمی نے ان سے ملنا تھا، وہ بھی مل گیا تھا۔ اب کچھ دن بعد ان کو بھارتی جوڑے کے بھیس میں امریکا روانہ ہونا تھا۔

اصل مرحلہ ابھی باقی تھا۔ بقول اول خیر اور زہرہ بانو کے اگر کبیل دادا اور شکیلہ بہ خیریت دبئی سے امریکا روانہ ہو جاتے ہیں تو سمجھو میرے لیے بھی تھائی لینڈ سے امریکا روانگی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

یہ تین سے چار دن بہت انتظار اور بے چینی میں گزر گئے اور بالآخر زورآور خان کے مذکورہ آدمی نے یہ خوش خبری سنا دی کہ کبیل دادا اور شکیلہ امریکا روانہ ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی روانگی سے ہمیں کافی حوصلہ ملا۔

اس کے اگلے دن کی میری لاہور روانگی کی تیاری تھی۔ بینکاک (تھائی لینڈ) کی پرواز تھائی ائر میں ٹکٹ کنفرم ہو چکی تھی۔

اس اہم مشن میں روانگی کا بالآخر یہ دوسرا مرحلہ بھی آن پہنچا۔ میری یہ روانگی تنہا تھی۔

ملتان سے پہلے تو لاہور کا چار پانچ گھنٹوں کا سفر درپیش

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی....
پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

تھا اس کے لیے مجھے چھ سات گھنٹے پہلے ہی نکلنا تھا۔ اسی سبب میں نے روانگی سے ایک رات پہلے ہی ملتان سے لاہور پہنچنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تاکہ کچھ گھنٹے لاہور کے کسی ہوٹل میں آرام کرنے کے بعد صبح ائرپورٹ پہنچ جاؤں۔ لہٰذا شام سے ہی میں رخصتی کی تیاری باندھنے لگا۔

اماں اور اباجی نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرا اور ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ زہرہ بانو کا چہرہ ستا ہوا تھا، آنکھیں نمناک سی تھیں۔ وہ بار بار اضطراری انداز میں اپنے نرم لبوں پہ زبان پھیرتی اور کچھ کہنے کی کوشش کرتی تھی لیکن شاید الفاظ گلے کی رقت میں ہی گھٹ کر رہ جاتے۔ تب میں نے ہی اس سے کہا۔

''زہرہ! میں جانتا ہوں تم میری کامیابی اور عابدہ کی بہ خیریت واپسی کی تہِ دل کے ساتھ دعاگو ہوگی، لیکن تم کو یہاں اپنا اور ماں جی اور ابوجی کا بھی خیال رکھنا۔ اول خیر یہاں موجود ہے اور دیگر ساتھی بھی۔ میں فون پر بھی رابطے میں رہوں گا۔ اب خان جی سے زیادہ روابط بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں ریاض باجوہ صاحب کا نمبر دے چکا ہوں، ان کی ضرورت پڑے تو اول خیر کو ساتھ رکھ کر ان سے بات کر لینا۔ وہ اول خیر کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔''

پھر یہی کچھ میں نے اول خیر سے بھی کہا۔ اس بے چارے کا چہرہ بھی اُترا ہوا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ میرے ساتھ نہیں جا رہا تھا مگر میری کامیابی کا تہِ دل سے متمنی تھا۔

جب میں روانگی کے لیے قدم بڑھانے لگا تو زہرہ بانو کے تھرکتے لبوں سے بکھرے بکھرے سے الفاظ بمشکل ہی برآمد ہوئے۔

''شش...... شہزی! تم اپنا خیال رکھنا...... میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔ تم ایک خطرناک مشن پر جا رہے ہو۔ لیکن مجھے تسلی اس بات کی ہے یہ جنگ ذاتی جنگ نہیں ہے بلکہ حق کی باطل کے خلاف جنگ ہے اور اس میں اللہ کی مدد ضرور شامل ہوتی ہے۔ کیونکہ عابدہ نے ایک انسان کی زندگی بچانے کے لیے یہ قدم اُٹھایا تھا اور تمہاری طویل جدائی کا صدمہ ہی نہیں اُٹھانا پڑا بلکہ بعد میں اس بے چاری کو ایک گھناؤنی سازش کا نشانہ بنا کر بے گناہ پھنسا دیا گیا۔''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو زہرہ! میرا بھی اسی بات پر ایمان ہے کہ جہاں بھی نیک مقصد تھا وہاں اللہ ربّ العزت نے میری ضرور مدد فرمائی اور وہ آگے بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''ایسا ہی ہوگا۔ انشاءاللہ!''

''او خیر...... کاکے!'' آخر میں اول خیر میرے گلے لگا۔ اس کا لہجہ بھی بوجھل بوجھل سا تھا۔ ''وہ آخر میں اتنا ہی کہہ سکا۔ ''راب راکھا میرے یار......!''

میرے پاس فقط ایک ہلکے سبز رنگ کا کیری (چھوٹا سا سفری ٹرالی بیگ) تھا۔ میں اکیلا ہی کار میں سوار ہوا تھا۔ زہرہ بانو اور اول خیر لاہور تک میرے ساتھ جانا چاہتے تھے، مگر میں نے کسی وجہ سے انہیں منع کر دیا۔ کچھ سیکیورٹی رسک کے پیشِ نظر اور کسی قسم کی اشتباہ انگیزی سے بچنے کے طور پر بھی میں اکیلا ہی روانہ ہونا چاہتا تھا۔ اُن دونوں آدمیوں کو بھی میں نے اپنے پیچھے آنے سے منع کر دیا تھا، دوسرے یہ کہ میں کوئی کار نہیں لے جا رہا تھا بلکہ میرا ارادہ ٹیکسی کار کرانے کا تھا۔

''ملتان سے لاہور کا سفر خاصا طویل ہے۔ مجھے عام آدمیوں کی طرح جانے دو تو زیادہ بہتر ہے، میں لاہور پہنچ کر عام سے ہوٹل میں قیام کروں گا اور اپنی خیریت اور روانگی کی بھی اطلاع کر دوں گا۔'' میں نے زہرہ اور اول خیر کی تسلی کی خاطر کہا۔

لہٰذا اسی پلاننگ کے تحت میں ملتان سے تقریباً سات بجے روانہ ہو گیا اور لگ بھگ دس بجے تک لاہور پہنچ گیا۔ کار والے کو کرایہ ادا کیا اور اپنا کیری سنبھالے قریبی ہوٹل کی راہ لی۔ وہاں پہنچ کر میں نے بیگم ولا اطلاع کر دی۔

اگلے دن صبح سویرے میں نے ہوٹل چھوڑ دیا اور ٹیکسی کر کے ائرپورٹ پہنچ گیا۔

یہ میرا باقاعدہ طور پر بیرونِ ملک پہلا سفر تھا۔ ایک ایسے دیارِ غیر کا رخ کرنا جہاں میں پہلے کبھی نہیں گیا، میرے اندر ایک عجیب سی سنسنی پیدا کرنے کا سبب بن رہا تھا۔ ائرپورٹ کی اندرونی فضا میں قدم رکھتے ہی یکلخت کئی تصورات میرے اندر جاگ اٹھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خیالی ہواؤں کی سنگت میں سرحد پار نجانے کہاں کہاں نکل گیا ہوں۔ گویا ملکوں ملکوں پہنچ گیا ہوں۔ ایک عجیب ہی سحر ہوتا ہے ائرپورٹ کا بھی۔

اپنے وطن اور اپنے لوگوں کی اور بات ہوتی ہے۔ مانوس فضا کا اپناپن فطری اعتماد بخشتا ہے لیکن ایک ایسے شہرِ خرابہ بلکہ میں اسے ملک خرابہ ہی کہوں گا جس کا نام تھائی لینڈ تھا۔ جہاں میں کبھی نہیں گیا تھا مگر اس کے متعلق سن ضرور رکھا تھا لیکن صرف سننے سے کام نہیں چلایا جا سکتا۔ دیکھنا، مشاہدہ اور اس کے ماحول کے گردشِ ایام میں قدم رکھنا اور بات ہوتی ہے۔ پاکستان سے کئی لوگ بیرونِ ملک آتے جاتے ہوں گے۔ ان کے لیے تفریحی اور خوشی کی بات ہوتی ہوگی۔ جو پہلی بار بیرونِ ممالک عازمِ سفر ہوتے ہوں، ان کے بھی جذبات میں صرف اور صرف مسرّت انگیزیاں ہی پرورش پاتی ہوں گی، کیونکہ...... ان کا مطمحِ نگاہ صرف سیر سپاٹا یا کاروباری مصروفیات ہوتا ہے۔ وہ خوشی خوشی جاتے ہیں، انجوائے بھی کرتے ہیں اور اپنا کوئی کام ہو تو وہ بھی خوش اسلوبی سے نمٹا آتے ہیں۔ جبکہ...... میرا معاملہ اور تھا۔ بدقسمتی سے میں اس قسم کی مسرتیں اور خوشیاں کشید کرنے سے قاصر ہی تھا بلکہ اس کے برعکس میرا دل ہی نہیں پورا وجود وسوسہ انگیز اور اندیشناک خیالات کی زد میں تھا۔ کیونکہ میں گھومنے پھرنے کی نیت سے جا رہا تھا نہ ہی کسی کاروباری سلسلے میں کہ چلو اس بہانے باہر کی دنیا بھی دیکھ لی جائے۔ میرا مسئلہ گمبھیر تھا۔ میں ایک جنگ لڑنے جا رہا تھا۔ جنگ بھی کیسی کہ جہاں پہلے ہی سے میرے ازلی دشمن دانت نکوسے مجھے بھنبھوڑ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھے تھے اور جیسے میں خود کو ان کے سامنے پلیٹ میں پیش کرنے جا رہا تھا۔ ٹائیگر فیگ، باسکل ہولارڈ اور لولووش...... میری راہ کے سب سے بڑے کانٹے بلکہ خطرناک پھندے تھے۔

بلاشبہ حالات نے جن ہنگاموں میں اب تک میری پرورش کی تھی، ان کی نوعیت کچھ اور تھی۔ حتیٰ کہ انڈیا اور انڈیمان کے دلدلی اور خطرناک اندھیارے جنگلوں میں ہونے والی میری خوں ریز جنگ کی بھی، مجھے اس نئی جنگ کے مقابلے میں کوئی حیثیت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جس میں خدا نے مجھے سرخرو کیا تھا اور مجھے اپنی یا اپنے کسی عزیز ساتھی کے جانی نقصان سے محفوظ رکھا تھا۔ تب ہی میری سوچوں کا رخ کبل دادا اور شکیلہ کی طرف چلا گیا اور میرا دم گھٹنے لگا۔ میں اس سے آگے سوچنے کا اہل ہی نہیں رہا۔

ائرپورٹ کی فضا میں قدم رکھتے ہی ان آسیبی خیالات سے چھٹکارا پانا میرے لیے دوبھر ہو گیا تو میں نے پلاسٹک گلاس میں اپنے لیے چائے لی اور ایک طرف کھڑا ہو کے اس کی چسکیاں لینے لگا۔

''جو ڈر گیا، وہ مر گیا......''

معاً ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے یونہی چونک کر گردن گھمائی۔ وہ تین کھلنڈرے سے نوجوانوں کا گروپ تھا۔ ان میں ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی، جس نے چست جینز اور اس پر پنک کلر کا ٹائٹ بلاؤز پہن رکھا تھا۔ پینٹ کی بیلٹ سے اس نے ایک چرمی انولپ اٹرس رکھا تھا۔ باقی دو پاکستانی لڑکے تھے۔ لڑکی کے سلسلے میں پتا نہیں کیوں مجھے شبہ تھا کہ وہ ملکی نہیں تھی، شاید اس لیے کہ میں نے حال ہی میں ایک بڑا عرصہ انڈیا میں گزارا تھا، کیونکہ اس کے نقوش مجھے انڈین محسوس ہوئے تھے، بالخصوص اس کی آنکھیں اور ناک نقشہ تو بھارتی خواتین جیسا ہی لگتا تھا، تاہم اس کی سانولی رنگت میں بڑی کشش تھی۔ اس نے اپنے سیاہ بالوں کی چٹیا کر رکھی تھی۔ دونوں لڑکے امیرزادے نظر آتے تھے اور پتا چلتا تھا کہ یہ بھارتی دوشیزہ ان کی کوئی مشترکہ فرینڈ تھی، خاصی خوبصورت اور شوخ و شنگ نظر آتی تھی۔

ممکن تھا وہ کوئی پاکستانی ہندو لڑکی ہو اور یہیں کی رہائشی ہو، جبکہ دوستی اس نے امیرزادوں سے کر رکھی ہو۔ نظر ایسا ہی آتا تھا کہ ان امیرزادوں کے ساتھ اس لڑکی کی خوب گاڑھی جمتی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ سیر سپاٹے کے لیے تھائی لینڈ جا رہے تھے۔ پاکستانی امیرزادوں کے لیے یوں بھی تھائی لینڈ اور بالخصوص بینکاک عیش پرستی کے لیے بہت آسان اور سہل جگہ تھی۔

''جو ڈر گیا، وہ مر گیا۔'' والا جملہ دو لڑکوں میں سے ایک نے ادا کیا تھا۔ لڑکی تو شاید اردو نہیں سمجھتی تھی، مگر شاید لڑکے نے اپنے ساتھی لڑکے کو سنانے کے لیے یہ لفظ کہا تھا۔

وہ شوخیاں اور خوش گپیاں کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ اُن کا یہ پھینکا ہوا جملہ میری سماعتوں میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

''صحیح تو کہہ رہا تھا۔'' میں سر جھٹک کر ہنسا۔ میں ڈر نہیں رہا تھا۔ ڈر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں، ان میں ایک قسم بزدلی اور کم ہمتی کی بھی ہوتی ہے اور ایک کسی کے احترام میں ڈرنا ہوتا ہے۔ جیسے ماں باپ یا بڑا بھائی وغیرہ۔ تیسری قسم اندیشناک وسوسہ ہوتی ہے، جہاں سے بے نام خوف دل میں کسی غبار آلود دھوئیں کی طرح اُٹھتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اللہ کا نام لیا اور ٹائم ہوتے ہی ڈیپارچر کی طرف بڑھ گیا۔

دیواروں اور چھت پر نصب مختلف النوع اسپیکرز سے ہدایات اور اعلانات کی صورت روایتی سی آوازیں گونج رہی تھیں۔

بالآخر امیگریشن ڈیسک سے گزر کر جب میں نے

بورڈنگ سے فراغت پاکر تھائی ائرویز کے 777 بوئنگ کے اندر قدم رکھا تو ایسا ہی لگا جیسے میں بینکاک پہنچ گیا ہوں۔ بڑا پُرسکون اور ایک عجیب دبدبے والا ماحول تھا۔ اکانومی کلاس کی سیٹوں پر اگرچہ ملکی غیر ملکی براجمان تھے، مگر جہاز کا تھائی عملہ مخصوص ٹریڈیشنل یونیفارم میں الگ ہی بہار دکھا رہا تھا۔ فلائٹ اٹینڈنٹ سے لے کر اسٹیورڈ اور بالخصوص نرم و نازک سی دُبلی پتلی ائرہوسٹس پریوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ یہ نیلے رنگ کی صاف ستھری اور نفیس یونیفارم میں ملبوس تھیں،

ایسی ہی ایک اپسرا مثل تھائی ہوسٹس نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ میری سیٹ کی طرف رہنمائی کی اور میں ایک گہری سی سانس خارج کرتا ہوا براجمان ہوگیا۔ میں تھوڑا نروس سا ہوا تھا مگر جلد ہی سنبھل گیا۔ اب میں اپنے اندر ایکا ایکی اعتماد محسوس کرر ہا تھا۔

میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی۔ تین رویہ سیٹوں کے سلسلے میں درمیان کی روِنگڈم تھی، جبکہ دائیں بائیں کھڑکیوں کے ساتھ دو دو سیٹیں تھیں۔ ایسی ہی ایک سیٹ پر میں اپنا قبضہ جما چکا تھا۔ دروازہ لاک ہوتے ہی باوردی عملے کی معمولی سی ہلچل ہوئی، جسے پیشہ ورانہ حرکات و سکنات سے ہی تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ پیجنگ سسٹم پر پرواز اور تحفظ کے بارے میں رسمی اور روایتی سے اعلانات ہونا شروع ہوگئے۔

نو اسموکنگ کے سائن جل چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی سیٹ بیلٹ باندھنے کی ہدایات جاری ہوئیں، جو میری طرح نئے تھے، ان کی مدد خوش الحان و دلکش مسکراہٹوں والی ہوسٹس کررہی تھیں، مگر میں اپنی سیٹ بیلٹ خود ہی باندھ چکا تھا۔

جہاز میں ہلکی سی گھرگھراہٹ پیدا ہونا شروع ہو چکی تھی اور وہ رن وے پر ٹیکسی کرنے لگا تھا۔ ائرپورٹ کے سرے پر موجود کنٹرول ٹاور سے شاید اجازت لینے کے لیے وہ ذرا رکا تھا۔ اس کے بعد اس نے رن وے کا رخ کیا اور اس کی رفتار بتدریج بڑھتی چلی گئی، معمولی جھٹکے محسوس ہو رہے تھے۔ رفتار کی آخری نہج پر پہنچتے ہی جہاز کا اگلا حصہ اُٹھا اور تھوڑی دیر بعد ہی طائرِ لاہوتی کی طرح یہ آہنی پرندہ فضاؤں میں پرواز کرگیا۔

☆☆☆

اس سے لاہور کی فضاؤں سے گہرے سفید بادل اتنے نیچے آئے ہوئے تھے کہ زمین چھوڑنے کے کچھ ہی دیر بعد ہمارا طیارہ ان ہلکی بدلیوں میں سے گزرنے لگا۔

جہاز غیر محسوس انداز میں اپنی مطلوبہ بلندی کی طرف اُٹھتا جارہا تھا۔ بڑھتی ہوئی اس بلندی کا اندازہ نیچے زمین کے مناظر دیکھ کر ہوتا تھا۔ اس کے بعد جب جہاز کا رخ سیدھا ہوا تو عملہ حرکت میں آگیا۔ وہ مشروبات اور دیگر لوازمات کی ٹرے لیے مسافروں کی خدمت میں جُت گئے۔

میرے ساتھ والی نشست خالی تھی۔ یہ ممکن تھا کہ وہ خالی ہی ہو، کیونکہ کوئی وہاں ہوتا تو اب تک براجمان ہو چکا ہوتا۔ میں نے شکر کیا کہ ’چلو اچھا ہوا کھلا ڈلا ہو کے بیٹھوں گا حالانکہ سیٹیں یوں بھی آرام دہ اور کھلی کھلی تھیں۔ تاہم پھر بھی میں نے اس پیاری سی تھائی ہوسٹس سے پوچھ ہی لیا جس نے اخلاقاً قدرے خم ہوتے ہوئے مشروبات سے سجی ٹرے میری طرف بڑھائی تھی۔

’’کیا یہ نشست واقعی خالی ہے؟‘‘ مسکرا کر کہتے ہوئے میں نے اپنے لیے ایک لیمن جوس کا گلاس اُٹھالیا۔ سوال میں نے انگریزی میں ہی کیا تھا۔

’’ہوسکتا ہے......‘‘

’’ہوسکتا ہے۔‘‘ میں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ تب ہی جواب میں اس نے بھی مسکراتے ہوئے انگریزی میں ہی بتایا کہ یہ آدمی اپنے کسی جاننے والے کے ساتھ بیٹھا ہے، اس کی برابر والی سیٹ بھی خالی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ وہیں بیٹھا رہے۔

وہ..... مجھ سے پچھلی سیٹ کے مسافروں کو سرو کرنے لیے سیدھی ہوئی اور قدم بڑھایا ہی تھا کہ بولی۔

’’او...... میرا خیال ہے وہ آرہا ہے۔‘‘ کہہ کر وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی، میں نے آنے والے کو دیکھنا گوارا نہ کیا اور لیمن جوس کے ایک بعد دو گھونٹ بھر کے کھڑکی سے باہر کی فضا دیکھنے لگا۔

تب ہی کوئی میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور ٹھیک اسی وقت میرے کانوں سے ایک بھرائی ہوئی سی آواز ٹکرائی جس پر لمحے بھر کو مجھے کچھ شناسائی کا گمان گزرا تھا۔

’’تھائی لینڈ کا سفر مبارک ہو مسٹر شہزاد احمد خان عرف شہزی......!‘‘

میں نے ٹھٹک کر گردن گھما کے اس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے پورے طیارے میں بھونچال آگیا ہو......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ناکام کامیابی

شاکر لطیف

زندگی بہتے پانی کے مانند ہمیں اِدھر سے اُدھر بہا کے لے جاتی ہے... تقدیر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہے... ہم ان دونوں کے درمیان اسیر ہو کر دہشت ناک آوازیں سنتے ہیں اور صرف اپنے راستے میں کھڑی رکاوٹوں اور دیواروں کو دیکھتے ہیں... ایسے ہی دو بھائیوں کی زندگی کے دردناک اوراق... وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے... اپنی زندگی کو پُرسکون و پُرآسائش بنایا... مگر اچانک ہی ایسی لہر اٹھی کہ زندگی کے خوب صورت پل روٹھ گئے... اور سب کچھ بکھر گیا... وہ چاہتے تھے کہ زندگی لوٹ آئے...

ہار کے جیت جانے والے ناکام کامیاب پرستوں کا پُرلطف ماجرا......

اس وقت صبح کے دس بج چکے تھے۔ اگرچہ یہ سردیوں کا موسم تھا مگر مطلع صاف ہونے کی وجہ سے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا جس کی وجہ سے گراہم اور جارڈن کو بھی اپنے چہروں پر دھوپ کی خوشگوار تمازت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں اپنے گھر کے باہر چھوٹے سے لان میں بیٹھے کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ اُن کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ گراہم اور جارڈن دونوں بھائی تھے اور

آوارہ گرد

قسط 43

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کورئیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا مکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کورئیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی لاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے روں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر اریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر ہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے کرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے اری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں ہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود وہیں لنگڑے کوڑھی کے بھیس میں کبیل دادا اس کے سامنے آجاتا ہے جسے دیکھ کر شہزی حیران رہ جاتا ہے۔ کبیل دادا کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ ممبئی ائیرپورٹ پر بھارتی خفیہ ایجنسی کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بعد ان تینوں کو بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہاں سے سی جی بھجوانی انہیں انڈرورلڈ ڈان ھولاناتھ کے نجی قید خانے ڈیول کیج بھیج دیتا ہے، وہاں کا ایک قیدی بدمعاش داور شکیلہ پر نظر رکھتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت شکیلہ داور کو جھانسے میں لے لیتی ہے ہمارا کام آسان ہوجاتا ہے۔ داور کو قابو کر کے قید خانے سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے کہ اچانک ہی دھماکے ہوتے ہیں اور ہر طرف گیس بھر جاتی ہے اور پھر میں کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آئے تو خود کو زنجیروں میں بندھا پایا۔ ایک بیگار کیمپ تھا، جس کی کمانڈ بلراج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے اص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ فادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں ان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل موٹربوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان ی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہنواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا ا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہنواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے ا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہنواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے الے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہنواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، زی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور ہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے ڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور پنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے اہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہنواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسمِ نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد زی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے لا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے یل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

بھونچال طیارے میں نہیں بلکہ میرے وجود میں آیا تھا۔

آواز کی شناسائی پر غور کرنے سے پہلے ہی میری اس پر قریب...... بہت قریب سے نظر پڑ گئی تھی اور پھر جیسے میرے پورے وجود کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔

چند ثانیے کے لیے تو مجھے اپنی پھیلی ہوئی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اتنے قریب سے میں جس ملعون شخص کا مکروہ چہرہ دیکھ رہا ہوں، وہ وہی تھا یا مجھے گمان گزرا تھا مگر

گمان بھی کیوں کر گزرتا؟ جبکہ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور بڑی طنزیہ کاٹ کے ساتھ مجھے میرے پورے نام کے ساتھ شاید اسی لیے مخاطب کیا تھا کہ میں بھی اسے پہچاننے میں کسی مغالطے میں نہ رہوں۔

پل کے پل میرے جسم کے اندر پھیلی ہوئی اَن گنت شریانوں کے جال کا سارا خون جیسے میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اُبلتا اُچھلتا لہو کھوپڑی کی دیواروں کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ وہ چٹخنے کے قریب ہوگئی۔ میرا جی چاہا کہ میں اسی وقت حلق پھاڑ کے چیخ پڑوں......

''روکو...... روکو طیارہ...... میرے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والا اور میری پوری زندگی کو ایک دھوکا بنا کے رکھ دینے والا یہ منحوس و ملعون آدمی ایک خطرناک مجرم ہے۔ یہ فرار ہو رہا ہے۔''

''کوئی فائدہ نہیں......'' اس منحوس نے تپا دینے والی مسکراہٹ سے دھیمی آواز میں کہا۔ جیسے وہ میرے اندر کی شورش سے واقف ہوگیا ہو۔

''تم......'' بڑے ضبط اور کھولتے ہوئے لاوے پر بمشکل قابو پاتے ہوئے میں اس خبیث سے بس یہی کہہ پایا تھا کہ وہ پھر اسی لہجے اور زہریلی مسکراہٹ سے دوبارہ بولا۔

''آں...... ہاں! کہا نا...... کوئی فائدہ نہیں غصے میں آنے کا۔ تمہارا اپنا ہی نقصان ہوگا۔''

''م...... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' بپھرے ہوئے لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں اپنی سیٹ سے اُٹھنے ہی لگا تھا کہ اس نے میرا بازو دبوچ کے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

''غصہ دکھاؤ گے تو...... یہ لوگ تمہیں فسادی پاگل سمجھ کے الگ سیٹ پر رسیوں سے باندھ کے بٹھا دیں گے۔'' اس نے مابعد اثرات کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اور...... کوئی بعید نہیں کہ بینکاک کے ائرپورٹ سے ہی تمہیں ڈی پورٹ کر دیا جائے۔''

اس کمینے اور خبیث شخص نے میری کمزور رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''تم میرے وطن کے دشمن ہو اور مت بھولو وزیر جان......! کہ طیارہ ابھی پاکستان کی فضاؤں میں ہی ہے......'' میں نے اپنے متزلزل لہجے میں روانی لانے کی پوری کوشش کی۔ ہاں......! وہ ملعون ابن مطعون شخص وزیر جان ہی تھا۔ ایک دھوکا، ایک سراب...... چلتا پھرتا ایٹم بم اور اسپیکٹرم کا مقامی سربراہ، وہ ٹینٹیکل...... جسے میں نے کاٹ تو ڈالا تھا مگر اس کا کٹا ہوا حصہ ابھی تک متحرک تھا۔

ہماری آوازیں دبی دبی اور ہلکے شور میں گھل مل گئی تھیں ہماری باڈی لینگویج پر کوئی غور کرتا تو اور بات تھی۔ تاہم گفتگو اردو میں ہی ہو رہی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب سیٹھ نوید پر میں نے ہاتھ ڈالا تھا اور اسے بے بس کرنے کے بعد اس نے یہ حقیقت میرے سامنے اُگلی تھی کہ لولوش کچھ دنوں پہلے نیویارک میں تھا، اب وہ برمودا کے ایک جزیرے ''نکی تا'' میں اپنے محل میں رہتا ہے جبکہ وزیر جان کو اس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ اب پاکستان میں ہی کہیں موجود ہے، اور وہ خبیث واقعی پاکستان میں ہی کہیں میری کمین گاہ میں چھپا بیٹھا تھا، اب میرے سامنے کسی عفریت کی طرح اچانک نمودار ہوگیا تھا۔

''مگر...... یہ طیارہ پاکستانی نہیں ہے۔'' وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''اور ہاں...... پھر بھی میں تمہیں اس فضول کی زحمت سے بچانے کے لیے اطلاعاً عرض کر دوں کہ تمہارے لگیج میں رکھے ہلکے سبز رنگ کے کیری میں دو عدد سفید پاوڈر کی تھیلیاں، جو کم از کم ٹیلکم یا پرفیوم پاوڈر تو ہرگز نہیں ہے، رکھ دی گئی ہیں۔ نہیں یقین آتا تو اپنا لگیج ٹیگ نمبر ملا لو......'' یہ کہتے ہوئے اس نے نمبر پڑھا۔

میرا ٹیگ نمبر یہی تھا۔ میں سنسنا کر رہ گیا۔ نمبر بتا دینے سے ظاہر کرتا تھا کہ وہ ایسی کوئی ''کارروائی'' پہلے ہی نمٹا چکا ہے۔ نیز پاوڈر کی تھیلیوں سے مراد اس کی کیا ہو سکتی تھی۔

''ہیروئن کی اتنی سی مقدار بھی تمہیں نہ صرف تھائی لینڈ بلکہ تمہارے اپنے ہی ملک کی جیل میں تاعمر سڑنے کے لیے چھوڑ سکتی ہے۔''

''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ فرطِ غیظ تلے میرا وجود کانپنے لگا تھا۔ وہ بدبخت شاید میرے تہدیدی الفاظ میں چھپی تلملا دینے والی بے بسی کو محسوس کر کے محظوظ ہوا تھا۔

''بچوں والی باتیں چھوڑو...... اب بڑے ہو گئے ہو تم......'' اس کے زہریلے طنز نے مجھے بلبلا دیا۔ اس کی حد سے زیادہ خود اعتمادی اور اطمینان صاف ظاہر کرتا تھا کہ ایک مربوط اور منظم حکمتِ عملی سے وہ مجھے اندر ہی اندر کسی ایسے پھندے میں جکڑ چکا تھا جس کی رسی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ کسی بھی وقت اُسے کھینچ کر اس کا گھیرا تنگ کر سکتا تھا۔

''شاباش! اب اچھے بچوں کی طرح...... اپنا جوس ختم کرو تا کہ کول ہو سکو......''

غصے سے میرے ہونٹ ہی نہیں بلکہ منہ اور حلق بھی لک ہونے لگا تھا۔ غیر ارادی طور پر مجھے اس کا کہا ماننا پڑا۔ ایک ہی گھونٹ میں بچا کھچا جوس میں غٹاغٹ پی گیا۔

''ہیلو!'' وزیر جان نے قریب سے گزرتی ایک سبک اندام ہوسٹس کو روکا۔ اس نے ٹرے اُٹھا رکھی تھی، جس پر وہسکی کے چار پانچ پیگ رکھے ہوئے تھے۔

''سر......!'' وہ مترنم سی آواز کے ساتھ ٹرے سمیت رکی تو وزیر جان نے جمی جمی سی مسکراہٹ کے ساتھ مارٹینی کا پیگ اُچک لیا۔

''سر......؟'' وہ میری طرف اپنی کھنچی ہوئی دلکش سیاہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے استفساریہ بولی۔

''نو تھینکس......'' میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور اپنا خالی پیگ نما گلاس اس کی ٹرے پر رکھ دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔

میں غیر محسوس انداز میں گہرے گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے لگا۔ ساتھ ہی وزیر جان کی طرف بھی گھور لیتا۔ اس نے مارٹینی کی چسکی لی اور نیچی آواز میں بولا۔

''یہ طیارہ تقریباً پانچ سے ساڑھے چار گھنٹے بعد بینکاک کے ائرپورٹ پر اُترے گا اور تمہیں کہیں بھی کھسکنے کی ضرورت نہیں...... ورنہ سخت پچھتاؤ گے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' ناچار میں نے گویا صبر کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، فقط میری پیروی کرنی ہے اور بس......''

''تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''کم از کم امریکا تو نہیں......'' وہ بولا اور مارٹینی کا ایک گھونٹ اور اپنے معدے میں منتقل کیا۔

''ہم......'' میرے منہ سے برآمد ہوا۔

''گڈ......!'' اس کے بھی منہ سے نکلا۔

''لیکن دھیان رہے' مجھے وہاں اکیلا سمجھنے کی غلطی مت کرنا۔ یوں بھی بینکاک ائرپورٹ پر تم کم از کم کسی ہنگامے یا فساد کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' وہ مکاری سے بولا۔ ''اس وقت بھی میرے دو ساتھی جہاز میں موجود ہیں۔''

میں ایک بار پھر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ رذیل آدمی میری اس کمزوری سے واقف تھا کہ ایک غیر ملک کی سرزمین پر مجھے کس قدر محتاط ہو کے رہنا تھا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں کیا شے تھا۔ لہٰذا بزدلوں کی طرح اس نے مجھے پہلے ہی ایسی کسی حرکت سے روکنے کی کوشش چاہی تھی۔

یہ حقیقت بھی تھی کہ میں کم از کم بینکاک میں خود کو کسی ہنگامے میں ملوث کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا مگر اب زیادہ فکر اس ایجنٹ کی طرف سے لاحق تھی جو مجھے ائرپورٹ لینے کے لیے آرہا تھا۔ کچھ دنوں بعد امریکا بھی اسی کے ذریعے روانہ ہونا تھا۔

طیارے میں شور مچا کے وزیر جان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا بچکانا فعل کے سوا کچھ نہیں تھا اسی لیے میں نے اس خیال کو ہی رد کر دیا اور آئندہ کے بارے میں غور کرنے لگا۔

اول تو میرا ذہن ابھی تک اسی بات پر قلابازی کھانے میں مصروف تھا کہ وزیر جان نے پاکستان کا رخ کب کیا تھا؟ کیونکہ میری محدود معلومات کے مطابق وہ بیرونِ ملک فرار ہو چکا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ...... میری انڈیمان والی مہم پر روانگی کے بعد آگیا ہو، کیونکہ نوشابہ ''شوشا'' بھی انہی دنوں ہی پوری طرح اُبھر کر سامنے آیا تھا اور ان تمام باتوں سے قطع نظر توجہ طلب امر تو یہ تھا کہ اس بدبخت نے کون سی اوٹ میں اور کب سے مجھے اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا کہ اب کسی بدروح کی طرح اچانک میرے سر پر سوار ہوگیا۔ کیسے اس نے علامہ اقبال ائرپورٹ پر میرے کیری میں ہیروئن کی تھیلیاں رکھی تھیں؟ اور کیا پھر یہ زورآور خان سے بھی واقف ہو چکا تھا؟ نیز کبیل دادا اور شکیلہ پھر کس طرح اس کی نظروں سے بچ نکلے، یا پھر اس مردود نے صرف مجھ پر ہی نظریں مرکوز کر رکھی تھیں؟ ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں اُبھرا تھا کہ کہیں یہ ہیروئن کی ان دو تھیلیوں سے متعلق جھوٹ تو نہیں بول رہا تھا؟ مگر کیا کیا جا سکتا تھا؟ میں اس کی بات نہ مان کر کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا اور وہ بھی ایک غیر ملکی ائرپورٹ پر...... میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس خبیث کی اسی وقت گردن دبوچ ڈالوں۔ سوچنے کی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کے ایجنٹ ملتان میں میری کہاں تک ریکی کر چکے تھے؟ کیا یہ زورآور خان سے بھی واقف تھا یا میری امریکا مہم سے بھی آگاہی حاصل کر چکا تھا؟

''تم نے مجھے بہت زک پہنچائی ہے شہزی! بہت وق کیا ہے...... لیکن اسپیکٹرم کی ایک شاخ کو کاٹ کر اس خوش فہمی میں رہنے کی غلطی کبھی مت کرنا کہ تم نے ہم پر مکمل فتح حاصل کر لی ہے۔'' تھوڑی سی خاموشی کا وقفہ گزرنے کے بعد اس نے کہا۔

''خوش فہمیوں میں مبتلا ہونا بے عمل لوگوں کا کام ہے۔'' میں نے کہا اور اس کے آئندہ کے عزائم جاننے کے

لیے کُریدا...... ”اسپیکٹرم سے مجھے ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہیں ہے۔ وہ میرے وطن سے باہر جہاں بھی اپنا گل کھلاتی رہے، مجھے اس کی پروا نہیں مگر میرے وطن میں وہ اپنی جڑیں مضبوط کرے...... یہ مجھے کبھی گوارا نہیں ہوگا۔“

میں نے شاید اس کی یا بشمول اسپیکٹرم کی ’دُکھتی رگ‘ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اسی سبب وہ خاصے بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کب تک تم یہ کرتے رہو گے، اسپیکٹرم دوبارہ تمہارے ملک میں کونپل کی طرح پھوٹے گی اور ایک تناور درخت بن جائے گی۔“ اس کی یاوہ گوئی پر مجھے بھی واقعی طیش آگیا، میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”اسپیکٹرم کی اس بار بار پھوٹنے والی کونپل کی کمزوری سے میں اچھی طرح آگاہ ہو چکا ہوں...... جس کی آبیاری کی سب سے زیادہ فکر بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کو ہوتی ہے، اس کی سپورٹ کے لیے بلیوتلسی کو خاص مقصد کے لیے را کے بطن سے پیدا کیا گیا اور اپنا ایک خطرناک جاسوس سندر داس سکینہ کو پاکستان داخل کرا دیا مگر تم نے دیکھا، بلیوتلسی کا خاتمہ میں نے اپنے ہاتھوں سے کیا اور اسپیکٹرم کا مقامی طور پر خاتمہ ہوگیا۔“

”اسپیکٹرم کا مقامی طور پر قیام ”را“ والوں کے مفاد میں ہی نہیں بلکہ اب اور بھی کئی ایجنسیوں کا مضبوط ٹاسک بن چکا ہے۔ لہٰذا اس بار تمہیں اسپیکٹرم کی مقامی قیادت سے ہی نہیں، اس کی پشت پناہی میں دن رات کارفرما ان خفیہ بیرونی طاقتوں سے بھی نمٹنا پڑے گا۔ کہاں کہاں تک جاؤ گے؟“ اس نے پُرغرور اور معنی خیز لہجے میں کہا اور میں اس خبیث وطن فروش کی بات پر اندر سے تلملا گیا تھا۔

اسپیکٹرم کو پاکستان میں مضبوطی فراہم کرنے والا ”را“ کا نوزائدہ ونگ ”بلیوتلسی“ تھا۔ میرے ہاتھوں اس کے خاتمے کے بعد ہی ”را“ کے زیرک دماغ مہاویروں نے کیا خبر یہ سوچا ہو کہ پاکستان میں دم توڑتی اسپیکٹرم کے خالی غبارے میں ہوا بھرنے کے لیے صرف وہی (را) کافی نہیں ہو سکتے، اُن عالمی خفیہ ایجنسیوں کا بھی ”اتصال“ لازمی ہوگا جو کسی نہ کسی حوالے یا موقع محل کے مطابق گل کھلاتی رہی تھیں۔ اس میں امریکا اور اسرائیل سرفہرست ہو سکتا تھا۔ ممکن تھا اس کے تار و پود امریکا یا اسرائیل کے کسی خفیہ پیلس میں مشترکہ طور پر جوڑے جا رہے ہوں اور اسی لیے اسپیکٹرم یا وزیر جان میری ”امریکا یاترا“ کی مہم کو سبوتاژ کرنے کی کوشش میں ہو اور وہ مجھے بینکاک ائرپورٹ پر ایک جھوٹے الزام تلے پھنسانا چاہتا ہو۔

بہرکیف انہی باتوں کے تناظر میں فوری طور پر میرے ذہن میں پیش آئندہ حالات کے مطابق جو پہلا سوال اُبھرا تھا، وہ میں نے اس سے کر ڈالا۔

”اچھا سوال ہے۔“ اس نے کہا۔

میرا سوال یہی تھا جو میں نے بے حد سرگوشی کے انداز میں اس سے کیا کہ اگر اس نے کسی طرح میرے کیری بیگ میں ہیروئن کی تھوڑی مقدار رکھ دی تھی تو پھر وہ بینکاک میں کس طرح کسٹم اور امیگریشن میں ہونے والی چیکنگ سے مجھے بچا سکتا تھا۔

”جب میں تمہارے بیگ میں کوئی شے رکھ سکتا ہوں تو ظاہر ہے نکالنا بھی جانتا ہوں گا.....“ بڑی خبیث مسکراہٹ سے اس نے مجھ سے کہا تو میں بولا۔

”بینکاک کے ائرپورٹ میں بھی یہ خطرناک کام کرلو گے؟“

”خواہ دنیا کا کوئی بھی ائرپورٹ ہو۔“ اس کے لہجے میں بے پایاں غرور تھا اور میں ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

سفر خاموشی سے جاری تھا۔ کبھی پیجنگ سسٹم ، طیارے کی فضائی پوزیشن اینڈ لیو اسٹیشن سے متعلق او بلندی کے بارے میں مختصر سا اعلان کر دیا جاتا تھا۔

طیارے نے لاہور ائرپورٹ سے صبح دس بج کر پینتالیس منٹ پر ٹیک آف کیا تھا۔ اعلان میں متوقع بینکاک آمد پانچ گھنٹے بعد اور تھائی ٹائمنگ کے مطابق (جو پاکستان اسٹینڈرڈ ٹائم کے مطابق دو گھنٹے آگے تھا) سات بجے بتا گیا تھا۔

وزیر جان کسی بلا کی طرح میرے سر پر اچانک ہی نازل ہوگیا تھا جس نے مجھے دیگر عوامل کی جانب سوچنے موقع ہی نہ دیا تھا اور میں انہی پریشان کن خیالات میں پھنس کر رہ گیا تھا کہ مجھے بینکاک ائرپورٹ اُتر کر ا مصیبت سے کیسے جان چھڑانی چاہیے۔

بالآخر میں نے وہی کیا جو اس قسم کے نازک او حساس معاملات میں کیا کرتا تھا، یعنی تفکرات اور پریشا کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور وزیر جان کے اس نفسیا دباؤ کو بھی جو اس کم بخت نے مجھ پر ایسے نازک وقت م طاری کر رکھا تھا۔

لہٰذا میں اب سنجیدگی سے وزیر جان سے جا چھڑانے کے بارے میں غور کرنے لگا۔ یہ مردود کسی آسی کی طرح مجھ پر مسلط ہوگیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں یقیناً اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کی کوشش ضرور کرتا، چھوڑنا تو پھر میں اسے اب بھی نہیں چاہتا تھا مگر اس ذلیل نے مجھے پھانسنے کی ایسی خطرناک چال چلی تھی کہ اگر یہ منحوس آسیب اپنی گردن بھی دبوچنے کے لیے میرے آگے پیش کر دیتا تو تب بھی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، وجہ یہی تھی یہ کم بخت میرے بیگ میں ہیروئن جیسا بم نصب کر چکا تھا جس سے اب وہی چھٹکارا دلا سکتا تھا پھر اس کے ساتھی بھی طیارے میں موجود تھے۔ کہاں تھے اور کس سیٹ پر بیٹھے تھے یہ بھی مجھے پتا نہیں تھا۔ اس کے سوا مجھے اب اور کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ میں سردست خود کو وزیر جان کے حوالے کر دیتا۔ مجھے اصل فکر اس شخص کی ہو رہی تھی جس سے میں بینکاک ائرپورٹ پر اُترتے ہی ملتا اور اس کے ساتھ جانا تھا۔ اسی کو میری آگے امریکا روانگی کا بندوبست کرنا تھا۔ میں نے سوچا پہلے اس مصیبت سے چھٹکارا پایا جائے، رہا زور آور خان کا آدمی تو اس سے بعد میں بھی ملا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہی سوچ کر میں آنکھیں موندے خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

انہی سوچوں میں کبھی اُونگھتے کبھی جاگتے سفر کٹ گیا اور سیٹ بیلٹ باندھنے کے اعلان پر میں چونکا۔

تھوڑی دیر بعد جہاز بینکاک ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ میں وزیر جان کے ساتھ طیارے سے اُترا اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ ہر رنگ و نسل کے لوگ وہاں نظر آ رہے تھے۔ وزیر جان منحوس سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ میں نے اس کے ان دو ساتھیوں کو وہاں تلاش کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ دیارِ غیر کی سرزمین اور اس پر مستزاد میرے بیگ میں ہیروئن کی موجودگی مجھے سخت نروس کر رہی تھی۔ ہم ٹرالی پسنجر لاؤنج میں پہنچے۔ وہاں کنوئیر بیلٹ پورٹ کے گرد بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے۔ وزیر جان کے پاس اپنا ہینڈ کیری تھا۔ ممکن تھا باقی لگیج اس کے وہ دونوں ساتھی لینے کے لیے یہاں موجود ہوں جو ہنوز میری نظروں سے اوجھل تھے۔ ان کے چہرے میرے شناسا نہیں تھے اور کیا خبر وہ میرے دائیں بائیں کہیں موجود ہوں۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ کنوئیر بیلٹ پر لدے سامان کی قطار کو متحرک دیکھتا رہا۔ پھر جب میری نظر اپنے ہلکے سبز رنگ والے کیری پر پڑی تو میں نے وہ لپک کر اُٹھا لیا۔ اسی وقت میں نے وزیر جان کی طرف دیکھا۔ اس کی شکل پر انتہا درجے کی مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اچانک نجانے کیا ہوا کہ میری چھٹی حس کسی بھیانک خطرے کا احساس دلانے لگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس رذیل نے مجھے اسی طرح یہاں پھنسانے کا کوئی پھندا تیار کیا ہو۔ یعنی مجھے بظاہر اس مغالطے میں رکھ کر کہ اس نے محض مجھ پر قابو پانے کے لیے ایسا کیا تھا تاکہ میں اس کی بلیک میلنگ سے مجبور ہو کر اس کا کہا مانتا رہوں اور وہ عین وقت پر، یعنی اس کے ساتھی میرے کیری سے ہیروئن کی تھیلیاں نکال لیں گے، جبکہ بات اس کے برخلاف ہو، کسٹم امیگریشن کرواتے وقت وہ تھیلیاں ڈیسک پر برآمد ہو جائیں اور میں دھر لیا جاؤں اور پھر وزیر جان مجھ سے لاتعلقی کا اظہار کر دیتا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے وزیر جان سے اپنے اس خیال کا برملا اظہار کر ڈالا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کے لیے فوراً اپنی تیز اور بھانپتی نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ ایک ایسے رنگ کی جھلک جو کسی چھپی سازش یا شرارت کے کھل جانے کے احتمال پر چہرے سے ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ یہی رنگ میں نے اس کے چہرے پر پل بھر کے لیے محسوس کیا۔

”خاصے محتاط اور بیدار مغز ہو......“ وہ میری بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے ہولے سے بولا۔

”بے فکر رہو، ایسی کوئی بات نہیں، مجھے تم مطلوب ہو، یہاں تمہاری گرفتاری ہرگز نہیں۔“

”میں تم پر بھروسا نہیں کر سکتا۔ اسی وقت میرے سامنے ان تھیلیوں کو نکالو......“

”بے وقوف مت بنو...... وہ پہلے ہی نکالی جا چکی ہیں۔“

ڈیسک قریب آتی جا رہی تھی۔ ابھی وہاں قطار لگی ہوئی تھی۔ وہاں نہایت تیزی سے کام نمٹایا جا رہا تھا۔ میں نے پھر بھی اپنے قدم آہستہ کر دیے تھے، ممکن تھا کہ وہاں اور لوگوں کے درمیان ایسا کچھ نہیں کر سکتا جو یہاں کر سکتا تھا۔ تاہم یہاں مجھے نیلی وردیوں والے چست لباس میں ملفوف سیکیورٹی کے مسلح افراد بھی چاق و چوبند کھڑے نظر آ رہے تھے جو ہر مسافر کو اپنی چست نظروں میں لیے ہوئے تھے۔

”میں اسی وقت اس کی تصدیق کرنا چاہوں گا۔“

”اس وقت تم کھڑے ہو کر یہ کام نہیں کر سکتے۔“ وزیر جان دانت پیسنے کے انداز میں بولا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ تھوڑا پریشان ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے والی فتح اور گھمنڈ کی پُراعتمادی ہوا ہونے لگی تھی۔

''میں واش روم جا رہا ہوں، تم یہیں کھڑے رہو یا ڈیسک پر چلے جاؤ۔''

''اب تم ایسی کوئی حرکت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔'' وہ غرایا۔

''میں ایسا کرنے جا رہا ہوں۔ اگر تم نے چلّانے کی کوشش کی تو تم بھی میرے ساتھ پکڑے جاؤ گے، کیونکہ سیکیورٹی اہلکار تم سے بھی یہ دریافت کریں گے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرے کیری میں ہیروئن موجود ہے۔ کیونکہ پکڑے جانے پر میں یہی کہوں گا کہ تم بھی میرے ساتھی ہو۔''

''میں اُن سے یہی کہوں گا کہ میں نے تمہارے کیری میں مشکوک شے کی جھلک دیکھ لی تھی۔'' اس نے کمزور سی تاویل دی تو میں استہزائیہ انداز میں مسکرا کر بولا۔

''بے شک بول دینا مگر بچو گے تم بھی نہیں۔''

''معاف کیجیے گا آپ لوگوں کو کوئی مسئلہ ہے؟''

معاً ہماری سماعتوں سے ایک پاٹ دار آواز ٹکرائی۔ ہم نے بیک وقت چونکتے ہوئے اس گھٹی ہوئی جسامت اور رعب داب والے گورے چٹے تھائی آفیسر کی طرف دیکھا۔ ہماری گفتگو کے دوران میں وہاں ''اسٹینڈنگ'' پر اس کا اعتراض کرنا بجا تھا۔ کیونکہ وہاں رک کر باتیں کرنا خلاف قانون تھا جہاں سے چیکنگ ڈیسک صرف چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

''نو سر! ہم لوگ موٹیلو کے بارے میں بات کر رہے تھے۔'' وزیر جان نے فوراً مسکرا کر جواب دیا۔ وہ آفیسر مسکرا کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا مگر اب وہ ہم دونوں کو ہی ''واچ'' کر رہا تھا۔

میں نے باتھ روم جانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ وہ بولا۔ ''سنو! اگر مجھے تمہیں اس طرح پھانسنا ہوتا تو میں تمہیں ان تھیلیوں سے متعلق بتاتا ہی کیوں؟''

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور قریبی واش روم کی جانب قدم بڑھا دیے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ آفیسر جس کی نظروں میں ہم آ چکے تھے، اب دوبارہ ہمیں تنبیہہ کرے۔

واش روم میں آ کر میں نے جلدی سے اپنا کیری کھولا اور اس کی تلاشی لینے لگا۔ وہ تھا ہی کتنا بڑا۔ میں نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی، کپڑوں کی تہوں کو الٹ پلٹ دیا اور دوسرے ہی لمحے میرے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ وزیر جان نے مجھے بے وقوف بنا کر بلف کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر میری بروقت حاضر دماغی اور جرأت نے اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا تھا۔ یوں بھی کیا خبر اس کے آدمی نے وہ تھیلیاں نکال دی ہوں، بقول اس کے، اس کے آدمی یہ کام کر چکے تھے۔

احتیاط کے پیش نظر میں نے ایک بار پھر اپنے بیگ کی تلاشی لے ڈالی اور مطمئن ہو کے جیسے ہی باہر نکلا تو اسی آفیسر کو واش کے قریب کھڑے پایا، وہ اب خاصی کھنڈی ہوئی سنجیدہ نظروں سے میری طرف گھور رہا تھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر خفیف سا مسکرایا۔ حسب توقع وزیر جان غائب تھا۔ میں جان گیا کہ وزیر جان نے مجھے واقعی بلف کیا تھا مگر اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

''کلیئر'' ہونے کے بعد میں باہر آ گیا۔ زور آور خان کا آدمی میرے نام کا پوسٹر تھامے کھڑا تھا، میں نے پہلے اس کی طرف دیکھ کر اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ ہلا دیا پھر گرد و پیش پر عقابی نظریں دوڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ میں سمجھا تھا وہ کوئی پاکستانی ہو گا، لیکن وہ ایک عام سے قد و قامت کا تھائی باشندہ تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔

میں نے اس سے بغل گیر ہوتے ہی اس کے کان میں انگریزی میں سرگوشی کی۔

''جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل چلو...... کچھ خطرناک آدمی میرے پیچھے ہیں۔''

میری بات سن کر اس کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا اور پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک چھوٹی سی امپالا میں سوار ہو گیا۔ میں اپنا کیری کار کی عقبی سیٹ پر پھینک کر اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

کار فوراً حرکت میں آ گئی۔ اس کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔

''کون لوگ تھے وہ......؟ کیا پاکستان سے ہی تمہارے پیچھے لگے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''اپنا نام تو بتاؤ دوست......؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔

''میرا نام کاوشی ہے......'' اس نے ایک معروف شارع سے دریا کا پل پار کیا اور پھر جیسے شہری حدود کے ایک ہنگامہ خیز سلسلے کی شروعات ہو گئی۔ شام کی مدھم مدھم تاریکی میں جلتے بجھتے نیون سائن اور سڑک کے دو رُویہ واقع دکانیں اور رہائشی عمارتیں، فٹ پاتھ پر پیدل چلتے لوگ، فضا اجنبی غیر مانوس مگر دلفریب تھی۔ گاڑیوں موٹروں کے علاوہ ایک اور چلتی پھرتی شے مجھے عجیب لگی اور مانوس سی بھی۔ وہ ٹم ''ٹک ٹک'' گاڑی۔ یہ بالکل ایسی تھی جیسے ہمارے ہاں پاکستان میں ''چنگ چی'' رکشا ہوتے ہیں۔ ایسی مماثلت پر مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ البتہ یہ ٹک ٹک ہماری چنگ چی کے مقابلے میں ذرا کھلی ڈلی تھی۔

میں ان مناظر کی رنگینیوں اور دلچسپیوں سے قطع نظر اپنے گرد و پیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ وزیر جان میرے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ پاکستان سے روانہ ہوتے ہی اس کا مجھ سے ڈرامائی انداز میں ٹکراؤ اور اس کے جال میں پکڑے ہوئے وہ اعصاب شکن لمحات نے ہنوز میرا ذہن شل کر رکھا تھا۔ وہ لاؤنج سے اچانک کسی بدروح کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یا اس کے آدمی اب بھی موقع کی تاک میں میرے پیچھے لگے ہوئے ہوں گے۔

ایک محل نما عمارت کے قریب سے گزرتے ہوئے کاوشی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ دو سو سال قدیم عمارت گرینڈ پیلس ہے۔''

''ہم...... واقعی خوب صورت عمارت ہے۔'' میں نے بھی کھڑکی سے اس طلسماتی محل کے دروازوں، دالانوں اور میناروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسی بہانے ....ایک بار پھر میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

''تم کچھ پریشان ہو......؟ شاید پہلی بار آئے ہو یہاں اس لیے......'' کاوشی نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

اس کے سوال پر مجھے حیرت ہوئی۔ کیسا عجیب اور بے فکر آدمی تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے ہی تو میں نے اسے ایک خطرے سے آگاہ کیا تھا یا پھر شاید اس نے میرے وہم پر محمول کیا ہو کہ ایک ایسا اجنبی جس نے پہلی بار دیارِ غیر میں قدم رکھا ہو تو وہ کسی خوف زدہ بچے کی طرح ہر کسی سے ڈرتا ہے۔

سڑک کافی کشادہ تھی۔ ٹریفک بھی کم نہ تھا۔ سرِ شام ہی سڑک پر روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ جا بجا خوبصورت اور رنگین نیون سائن بھی جگمگاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جیسے جیسے ہم شہر کے گرد و نواح میں پہنچے ٹریفک کا ہجوم بھی بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ایک بار پھر معروف سڑک پر پہنچ گئے۔ میں بدستور گرد و پیش میں دیکھتا جا رہا تھا۔ جا بجا کلب، پب، لینہ کلب، دکانیں اور ہوٹلز نظروں سے کسی رنگین و سنگین فلمی مناظر کی طرح گزر رہے تھے۔

''اب ہم اپنی اصل منزل کی جانب بڑھنے والے ہیں۔'' کاوشی نے دھیرے سے کہا۔ اس کی بات سن کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''تو کیا ابھی بیس پچیس منٹ تک ہم فضول میں آوارہ گردی کر رہے تھے؟''

''ہرگز نہیں۔ تمہارے پیچھے جو خطرناک آدمی تھے، انہیں جُل دینے کے لیے......'' اس نے یوں اطمینان سے جواب دیا جیسے مجھے پاکستانی اور تھائی کرنسی کے ریٹ بتا رہا ہو۔

''لل...... لیکن مجھے تو وہ سارے راستے کہیں بھی نظر نہیں آئے؟ تم نے کیسے دیکھ لیا اُسے؟'' مجھے اس کے سفید جھوٹ پر غصہ سا آ گیا۔

''ایک بھاری جسم والا شخص جس نے بزنس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ائرپورٹ سے ہی ہماری امپالا کے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس کے دو ساتھی بھی اس کے ہمراہ تھے، باہر ایک سیاہ مسٹینگ کھڑی تھی انہیں لینے کے لیے۔ اس میں فقط ایک ہی ڈرائیور بیٹھا تھا۔'' اس نے اسی طمانیت سے جواب دیا تو میں حیران رہ گیا۔ اس نے کم از کم وزیر جان کا حُلیہ بالکل صحیح بتایا تھا۔ مجھے اصل حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ میرا جیسا ایک ٹاپ ایجنٹ بھی اس تعاقب کو نہ ٹریس نہیں کر سکا اور اس نے وہ سب بڑے آرام سے دیکھ لیا۔ وہ مجھے متحیّر سا پا کے ہنسی کا ایک ٹھسکا مار کے بولا۔

''ہمارا کام ہی ایسا ہے کہ ہمیں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ تم نہ بھی بتاتے تو بھی میری نظروں نے اس تعاقب کو بھانپ لینا تھا۔ کیونکہ سرکاری اہلکار، ہم جیسوں کی تاک میں رہتے ہیں۔ تمہارے بتانے پر مجھے اور زیادہ محتاط ہونا پڑا...... خیر! بے فکر رہو، میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ اب ہم اپنے پڑاؤ کی طرف جا رہے ہیں۔''

کاوشی سے میں بہت متاثر ہوا تھا۔ حالانکہ وہ ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔ مجھے اس کی حرکات و سکنات سے بالکل بھی نہیں لگا تھا کہ وہ اپنے گرد و پیش (تعاقب) پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

''حیرت ہے...... مجھے، ان مذکورہ افراد کو تو میں نے بھی دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر......''

''نئی جگہ اور اجنبی علاقے میں انسان نروس سا رہتا ہے۔ چُوک ہو جاتی ہے مگر یہ بتاؤ، یہ لوگ تمہارے شناسا تھے یا نیا مسافر جان کے تمہیں اپنے کسی کام کے لیے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

جواباً میں نے ایک گہری ہمکاری خارج کی اور سیٹ سے پشت لگا کے سوچتا بن گیا کہ اسے کیا جواب دوں؟

’’دیکھو دوست......! حقیقت بتانے میں تمہارا ہی فائدہ ہوگا۔ تاکہ میں اپنی احتیاط پسندی کی ڈگری کو تھوڑا مزید ہائی فائی رکھوں۔ کیونکہ ہم ان چند دنوں میں یہاں کسی کی دشمنی کے متحمل نہیں ہو سکتے لیکن مجھے نظر یہی آتا ہے کہ یہ تمہارا کوئی ایسا دشمن ہے جو......‘‘

’’تمہارا خیال ٹھیک ہے کاؤشی......!‘‘ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

’’تم مجھے صرف کاؤ کہہ سکتے ہو۔‘‘ اس نے مسکرا کر کہا۔

’’یہ میرا ایک پرانا دشمن ہے، اور میری بے خبری میں یہ مردود پاکستان سے میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آن پہنچا ہے۔‘‘

’’سمجھ گیا میں...... یہ تمہارا امریکا یاترا والا مشن سبوتاژ کرنا چاہتا ہے۔‘‘ کاؤشی بولا۔

’’بالکل......‘‘ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

’’ہوم م م......‘‘ اس نے پُرسوچ سی ہنکاری بھری اور بولا۔ ’’یہ اچھا نہیں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ ہمارا بنا بنایا کام بگاڑ سکتا ہے۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے خیال انگیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

’’دوست! اس کی تم فکر نہ کرو، یہ یا اس کا کوئی ساتھی ہمارے سامنے آیا بھی تو انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔‘‘ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ’’تم بس میرا کام جتنی جلد ہو سکے، کر ڈالو......‘‘

اس نے جواب میں محض اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دی تھی مگر ٹھیک اسی وقت میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چمکا اور میں نے مضطربانہ انداز میں کہا۔

’’تم ایک کام کر سکتے ہو......؟‘‘

’’بولو......؟‘‘

’’اسی مسٹینگ کو دوبارہ ٹریس کرو...... میں فقط ان کا ٹھکانا دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ہم...... مگر...... یہ ہمارے معاہدے میں شامل نہیں......‘‘

’’پلیز......! دیر مت کرو...... یہ کام بہت ضروری ہے۔ میں تمہیں اس اضافی کام کے ایک ہزار بھات دوں گا۔‘‘

اس نے فوراً اسٹیئرنگ کاٹا اور ایک بائیں ہاتھ والے گلی نما راستے میں گھس گیا۔ یہ ون وے تھا، اس راستے جانے والی ٹریفک رواں تھی۔

’’کوشش کرتا ہوں...... مگر یاد رکھنا اگر تمہاری وجہ سے یہاں کوئی ہنگامہ ہو گیا تو میں تمہارے کام نہیں آسکوں گا اور اپنا راستہ بھی تم سے الگ کرلوں گا۔‘‘ اس نے تنبیہہ کر ڈالی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت ہی تیز ہو گئی تھی۔

وہ خاصا چلتا پُرزہ ثابت ہوا۔ اس نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے ڈرائیونگ کے جوہر دکھائے تھے۔ ایک انڈر پاس میں داخل ہوتے ہی اس نے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

’’میرے محتاط اندازے کے مطابق اُن کی سیاہ مسٹینگ اسٹریٹ سی الیون کی لوئر روڈ پر ہونی چاہیے۔ بصورت دیگر ہمیں اپنی منزل کی راہ لینا ہوگی۔‘‘

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹریفک کا رش تھا مگر وہ رواں تھی۔ ٹریفک کے اصولوں کی خلاف ورزی کا میں نے یہاں ایک ذرا شائبہ تک نہیں دیکھا تھا۔ سرخ یا سبز سگنل تو ایک طرف رہا، یلو لائٹ جو کاشن کی کہلاتی ہے، پہلے تو اسے ہی فالو کیا جاتا تھا مگر میں نے دیکھا کاؤشی نے میری (یا ایک ہزار بھات) کی خاطر کہیں تھوڑی بہت ٹریفک کی خلاف ورزی کر ڈالی تھی۔

’’واؤ...... وہ رہی سیاہ مسٹینگ......‘‘ مذکورہ انڈر پاس سے باہر آتے ہی قوس کی شکل میں اس چار رویہ ہائی وے پر آتے ہی کاؤشی نے نعرہ بلند کیا۔

’’کدھر ہے......؟‘‘ میں نے فوراً پوچھا۔ میرے چہار اطراف ٹریفک کا ازدحام تھا اور گاڑیوں کی تیز لائٹس...... تبھی میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا جو ہماری کار کے آگے چلتے ہوئے ایک ہیوی ٹریلر ٹرک پر جمی ہوئی تھیں۔

’’اسی ٹریلر کے آگے جا رہی ہے وہ سیاہ مسٹینگ......‘‘ اس نے بھی گویا مجھے سامنے گھورتے پا کر کہا۔ مجھے تھوڑی حیرت تو ہوئی کہ اتنے بڑے ٹریلر کے آگے جاتی ہوئی مطلوبہ کار اسے کیسے دکھائی دے گئی؟

’’میں تو اس ٹریلر کے آگے دیکھنے سے قاصر ہوں۔‘‘

’’میں نے اسے ابھی تھوڑی دیر پہلے مسٹینگ کو اوورٹیک کرتے دیکھا تھا مگر اب بھی اس کی جھلک نظر آجائے گی، لو دیکھو......‘‘ اس نے کہتے ہوئے اسٹیئرنگ کو

تھوڑا سا بائیں جانب گھمایا اور میں نے ذرا کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھنا چاہا تو مجھے ٹریلر کے آگے جاتی وہ لمبی سی سنگل ڈور اسپورٹس مستنگ جاتی دکھائی دے گئی۔

"گڈ" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کاؤ......! یہ اب نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے، مگر خیال رہے کہیں ہم ہی اُلٹا ان کی نظروں میں نہ آ جائیں......"

"بے فکر رہو...... وہ ناکام ہو کے لوٹ رہے ہیں۔ ان کے سان گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ جس کار کا یہ لوگ تعاقب کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اب وہی ان کے تعاقب میں ہے۔"

یہ چار رُویہ سڑک آگے جا کر دو رویہ ہو کے ایک اوور ہیڈ برج سے گھوم کر پھر دوسرے انڈر پاس میں داخل ہو گئی۔ وہاں سے سیدھی ہو کر وہ دو رُویہ سڑک دائیں جانب جھلملاتے پانیوں کے متوازی آگے چلی جا رہی تھی۔ یہاں ٹریفک کچھ کم تھا۔

"اوہ...... لگتا ہے ان کی منزل فوکٹ ہے۔" کاؤشی بدستور سامنے نظریں مرکوز رکھے ہوئے بڑبڑایا۔

"فوکٹ شاید کسی علاقے کا نام ہے؟" میرے منہ سے استفساریہ نکلا۔

"ہاں......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "آگے کا علاقہ سنسان ہے، نظروں میں آنے کا خطرہ ہے، میں دوسری سڑک پر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے کار بائیں جانب ایک گلی نما راستے میں موڑ دی۔ آگے سگنل تھا۔ اس نے اپنی امپالا روک دی۔

"وہ کار ہمارے سامنے سے گزرے گی، اپنے مطلوبہ آدمیوں کی تسلی کر لینا۔" کاؤشی نے یہ بات مجھ سے شاید احتیاط کے پیشِ نظر کی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد وہی سیاہ مستنگ سامنے سے گزری اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ کی برابر والی نشست پر وزیر جان کو براجمان دیکھ کر کاؤشی سے دبے دبے جوش سے کہا۔ "کنفرمڈ......"

بتی سبز ہوتے ہی اس نے اپنی امپالا کو بجائے اس کار کے پیچھے لگانے کے سیدھا نکال لے گیا۔

"وہ جس سڑک پر گامزن ہیں، وہ ہل ٹاپ کی طرف جاتی ہے۔ خاصے دولت مند دشمن پال رکھے ہیں تم نے......" کاؤشی بولا۔ میں اس کی بات پر ہولے سے مسکرا کر رہ گیا۔

"تمہیں یہ کیسے پتا چل جاتا ہے کہ ہماری مطلوبہ کار اب کہاں جائے گی اور کہاں سے موڑ کاٹے گی؟" میں بالآخر اپنے ذہن میں کافی دیر سے اُبھرنے والے اس سوال کو نوکِ زباں پر لے آیا۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ کون سی سڑک کہاں اور کس طرف جاتی ہے، مجھے سب پتا ہوتا ہے۔ تاہم اس میں میرے محتاط اندازوں کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ کچھ سڑکیں ایسی ہوتی ہیں جن کی آگے جا کر ایک ہی منزل ہوتی ہے، اگر ان کے درمیان سے کوئی سڑک نکلتی بھی ہے تو زیادہ تر ٹریفک کا رخ کہاں ہوتا ہے، یہ مجھے معلوم ہوتا ہے، پھر بھی اگر مطلوبہ کار اس طرف مڑ جائے تو مجھے اسے دوبارہ پا لینے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی، کیونکہ وہ بھی میرے ذہن میں ہوتی ہے۔ جب میں نے مطلوبہ کار کو جُل دیا اور دوسری سڑک پر آیا تو اُن لوگوں نے اندازے کی بنیاد پر دوسری سڑک پر موڑ کاٹا تھا، میں نے عقب نما آئینے میں انہیں جس سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے دیکھا، وہ آگے جا کر اسی چار رُویہ سڑک میں گم ہو رہی تھی، پھر تمہارے کہنے پر میں نے اسی فور وے روڈ کا رخ کیا۔"

"ہم......" میں نے حلق سے ایک ہنکاری خارج کی۔ "اب تم ایک بار پھر وہی ٹیکنیک استعمال کر رہے ہو۔ کیونکہ وہ کار آگے نکل چکی ہے۔"

"ہاں! اس بات کا تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ کار فوکٹ پیلس جا کر دم لے گی۔" وہ بولا۔ "کیونکہ اس کے بطن سے دو کلومیٹر تک اور کوئی دوسری سڑک نہیں نکلتی۔ تب تک ہم اسے جا لیں گے۔ ایسا میں اسی لیے کر رہا ہوں تاکہ انہیں تعاقب کا شبہ نہ ہو۔"

نصف کلومیٹر بعد کاؤ نے اپنی امپالا ایک تنگ سے راستے سے موڑی اور کھلی سڑک پر آ گیا۔ میں نے سامنے دیکھا۔ مستنگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ سڑک آگے جا کر بتدریج عمودی ہو رہی تھی جیسے ہم کسی پہاڑی پر چڑھ رہے ہوں۔

"وہ تو غائب ہو گئے۔" میں نے پریشانی سے کہا۔ میرے دائیں بائیں عالیشان مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان پر واقعی پیلس کا گمان ہوتا تھا۔ شاید اسی لیے اس علاقے کو فوکٹ پیلس کہا جاتا تھا۔

"یہ ہل ٹاپ ہے...... دائیں بائیں دیکھتے رہو......" اس نے کار کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے کہا۔ تب ہی مجھے اپنے دائیں جانب کھڑی کاروں کی ایک مختصر قطار کے ساتھ ذرا ہٹ کر وہ لہک کھڑی نظر آ گئی......

"روکو...... روکو......" میں نے فوراً کاؤشی سے کہا۔ اس نے بریک لگا دیے۔ یہاں .... بوڑھ کے درختوں کی بہتات تھی۔ ہم ایسے ہی ایک درخت کی آڑ میں تھے۔ علاقہ سنسان تھا اور اُترتی رات کے اندھیرے میں لیمپ پوسٹ کی لائٹس روشن تھیں۔ اسی روشنی میں مجھے سیاہ مستنگ سے وہ چاروں افراد اُترتے دکھائی دیے۔ وزیر جان آگے تھا۔ باقی مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے چل رہے تھے، ان کا رخ ایک کشادہ باغیچے والا پیلس نما مکان تھا جو مدھم سی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تمہارے دشمن خاصے دولت مند ہیں۔" کاؤشی نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ "یہ علاقہ بینکاک کے امرا میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن میں تم سے یہی کہوں گا کہ کم از کم ان سے یہاں بھڑنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس جگہ اور وزیر جان کے اس محل نما مکان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد کاؤشی کو روانہ ہونے کا کہا۔ اس نے کار ریورس کی اور ایک ٹرن لے کر واپس موڑ لی۔

لگ بھگ کوئی نصف پون گھنٹے کے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے جسے عام فہم الفاظ میں "غربا کالونی" کہا جا سکتا تھا۔ بینکاک جیسے جدید لیونگ اسٹائل کے شہر میں جہاں بلند و بالا چمکتی دمکتی رہائشی عمارتیں، لگژری اپارٹمنٹس اور فلیٹس ہوں وہاں اسی علاقے سے ذرا آگے مرغیوں کے دڑبا نما لکڑی کے گھر اور جھونپڑوں کی یہ بستی دیکھ کر مجھے تعجب تو ہوا تھا مگر یہ خیال بھی آیا کہ غربا ایک ایسی قوم ہے جس کا وجود، کہیں کم اور کہیں زیادہ کے ساتھ ہر جگہ ہی ملتا ہے۔ تو پھر حیرت کیسی؟ لیکن مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کاؤشی جیسا آدمی بھی ایسی جگہ رہتا ہے یا پھر یہ کوئی اور معما ہوگا؟

یہ بستی ساحلی محسوس ہوتی تھی۔ کار کی کھڑکی کے راستے اب مرطوب ساحلی ہوا میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ یہاں سڑک کی حالت بھی کچھ خستہ تھی اور دڑبا نما مکانوں کے سامنے سیلن اور پانی سا پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہل پہل یہاں بھی تھی۔ وہی گندے سندے ننگ دھڑنگ بچے، دھجی نما چیتھڑوں میں ملفوف خواتین اور مرد...... مجھے یہاں کا ماحول دیکھ کر ہول آنے لگے۔ زور آور خان کے کہنے کے مطابق میرا دو دن قیام ایک ہوٹل میں تھا مگر شاید موجودہ حالات کے پیشِ نظر کاؤشی مجھے یہاں لانے پر مجبور ہوا تھا۔

~~بالآخر میں نے کاؤشی سے پوچھا۔~~

"تم اس علاقے رہتے ہو ؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی مگر اگلے ہی لمحے اس نے میری طمانیت یہ کہہ کر ہوا کر ڈالی۔ "مگر تمہیں اِدھر ہی رہنا ہو گا۔"

"وہ کیوں......؟"

"بتاتا ہوں......"

کاؤشی نے کار کی رفتار دھیمی کر لی تھی۔ وہ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر کبھی کسی کو دیکھ کے دوستانہ اشارہ کر ڈالتا تھا۔ ایک تنگ سی سلین زدہ گلی میں کار داخل ہوئی اور ایک ایسے ہی دڑبا نما مکان کے دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم نیچے اُتر آئے۔ مکان نسبتاً کشادہ دکھائی دیتا تھا۔ دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ کاؤشی نے اپنی جیب سے چابی نکالنے کے بجائے دروازے کی چوکھٹ کے نیچے کسی خانے میں رکھی، چابی نکالی اور تالا کھولا۔ ہم اندر آ گئے۔

ایک وسیع لاؤنج تھا۔ وہاں مختصر سا پرانا فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک سامنے تھا اور دوسرا دائیں جانب...... اندر سے بہر حال یہ مکان ٹھیک حالت میں اور صاف ستھرا تھا۔

"تم یہاں بیٹھو، میں جب تک تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کو لاتا ہوں۔" کاؤشی یہ کہہ کر سامنے والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں واش روم سے فریش ہو کے نکلا، تب تک وہ میرے لیے کچھ اسنیک اور نوڈلز لے آیا۔ ہلکا پھلکا کھانا تھا، رات میں یہی کافی لگا۔ یہ کھانے کے بعد وہ سلیقے سے کٹے ہوئے امرود لے آیا جو بڑے میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔

"تمہارا کام اسی جگہ نمٹانا پڑے گا۔" وہ بولا۔ "کچن میں ناشتے وغیرہ کا سامان موجود ہے۔ چائے کافی پینی ہو تو بنا لینا۔ میں اب چلوں گا، کل صبح سویرے آ جاؤں گا اور میرے ساتھ کچھ ایکسپرٹ ہوں گے۔ وہ تمہارا معائنہ کریں گے اس کے بعد...... وہ لوٹ جائیں گے، دو روز بعد وہ دوبارہ آئیں گے اور تمہارے چہرے کی تھوڑی بہت لیپا پوتی کریں گے، میں تب تک تمہارے...... راجیش کمار نامی بھارتی نوجوان کے سفری کاغذات چیک کرواتا ہوں۔ کاغذات تو تیار ہیں مگر ان کی مدت گزر چکی ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے رخصت ہونے لگا تو میں نے اسے پاکستان اپنی خیریت کی اطلاع پہنچانے کی بات کی تو اس نے ازراہِ تشفی مجھ سے کہہ دیا کہ میں اس سلسلے

میں کوئی فکر نہ کروں کیونکہ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے بعد زورآور خان کو مطلع کر دے گا۔ مجھے تسلی ہو گئی، کیونکہ زورآور خان تک میری تسلی پہنچ جاتی۔ لیکن میں خود بھی زہرہ بانو سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہتا تھا۔ میں کبیل دادا اور شکیلہ کے سلسلے میں فکرمند تھا کہ جانے ان کی خیریت بھی بیگم ولا پہنچی تھی یا نہیں۔

میں تھکا ہوا تھا اور نیند بھی خوب آرہی تھی، لہٰذا میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ صبح کسی کے دروازہ دھڑ دھڑانے پر میری آنکھ کھلی۔ کاؤشی اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لیے پہنچ گیا تھا۔ ان میں ایک جوان عورت بھی تھی۔ شکل وصورت عام سی تھی اور سنجیدہ مزاج بھی نظر آتی تھی۔ میں انہیں کاؤشی کے ساتھ دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ اپنے ساتھ پروفیشنل لوگوں کو لے آیا تھا۔ ان کے ساتھ کچھ سامان بھی نظر آرہا تھا۔ جو ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔

مختصر سے تعارف اور صاحب سلامت کے بعد ہم صوفوں پر بیٹھ گئے۔

ان تینوں نے مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر میرے چہرے کا بغور معائنہ کیا۔ لڑکی کوئی گرافک اسکینز ایکسپرٹ اور بیوٹیشن تھی۔ دوسرا نوجوان سا شخص اسکیچ ماسٹر تھا۔ تیسرا شخص جو عورت کی طرح خاصی پکی عمر کا تھا، وہ سرجیکل ٹیکنیشن تھا۔ بقول کاؤشی کے وہ یہاں ایک ٹراما سینٹر میں پلاسٹک سرجری کے شعبے میں کام کرتا ہے۔

کاؤشی اور مجھے ان تینوں ایکسپرٹس کی متفقہ رائے کا انتظار تھا۔ بالآخر جب چائے وغیرہ کا دور چلا تو انہوں نے متفقہ طور پر ہم سے یہی کہا کہ کام اتنا مشکل نہیں ہے..... بہ آسانی مجھے راجیش کمار بنایا جا سکتا ہے مگر میک اپ یا پلاسٹک سرجری جس قدر پرفیکٹ ہو گی، اُتنی زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔ رفتہ رفتہ فیس میک اپ ''پیچز'' تو خود ہی ختم ہو جائیں گے، جبکہ سرجیکل اسٹچز جس میں خاص قسم کی ''کیٹ گٹس'' استعمال کیے جائیں گے۔ وہ تو ازخود تحلیل ہو جائیں گے جس کے باعث چہرے کے وہ چند فیشل ایکسپریشن بھی غائب ہو کے ان کے اصل نقوش کو ظاہر کر دیں گے۔

میری اور عابدہ کی امریکا سے واپسی کے سلسلے میں بھی زورآور خان کا یہی گروہ اسی طرح ہمارے کام آتا، یہ بات زورآور خان مجھے اور زہرہ بانو وغیرہ کو بتا چکا تھا۔ جبکہ امریکا پہنچنے اور اپنی اصل شکل وصورت میں ظاہر ہونے کے بعد بہ وقتِ ضرورت میں ریڈی میڈ میک اپ سے کام چلا سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ عابدہ کو دشمنوں کے نادیدہ چنگل اور کورکوران کی جیل سے رہائی دلانے کے بعد اس وقت کے حالات کے مطابق مجھے اور کوئی واپسی کی نسبتاً آسان راہ مل جائے۔ کچھ بھی تھا، میں بس ایک بار امریکا پہنچنا چاہتا تھا، خودکوتن بہ تقدیر تو میں کر ہی چکا تھا۔ آگے اللہ مالک تھا۔

یہ تینوں افراد دو گھنٹے بیٹھ کر چلے گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے تین دنوں کی مہلت لی تھی، اس دوران میں ان کو ہوم ورک کرنا تھا۔ اس کے بعد پریکٹیکلی یہ لوگ فائنل ورک کے لیے مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جاتے۔ تب تک کاؤشی میرے سفری کاغذات مکمل کر لیتا۔

کاؤشی نے مجھے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ میں یہاں سے باہر نہ نکلوں۔ اس نے مجھے ایک سستا سا موبائل سیٹ دے دیا تھا، جس میں صرف اسی کا ہی نمبر سیو تھا۔ اسے بھی مجھے صرف ضرورت کے وقت استعمال کرنا تھا۔

☆☆☆

بینکاک کی اس ساحلی وڑبا کالونی میں میرا یہ دوسرا دن تھا۔ حسبِ معمول کاؤشی کہیں گیا ہوا تھا۔ میں گھر میں اکیلا تھا۔ کوئی کام نہ تھا اسی لیے بوریت کا شکار رہتا تھا۔ مگر میری متنوع مزاجی اور فطرت میں موجود بے چینی اور سیماب کیفیت مجھے کہاں بیٹھنے دیتی۔ میرا ایک اہم اور خطرناک دشمن وزیر جان یہاں موجود تھا۔ پاکستان میں وہ اسپیکٹرم کے ایک مقامی کمانڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔ نوشابہ اسی کی ''شہ'' پر اتنا اکڑ رہی تھی اور وزیر جان اس کی آڑ میں مقامی سطح پر اسپیکٹرم کو ایک بار پھر وہاں فعال کرنا چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ اچھا موقع تھا کہ وزیر جان جیسے ناسور کا اِدھر ہی خاتمہ کر ڈالوں۔ کیونکہ میں وزیر جان کے فوکٹ کے علاقے ہل ٹاپ میں واقع ٹھکانے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ میں اسی دن سے ہی موقع کی تاک میں تھا۔ آج جا کر مجھے کچھ کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے پاس تین دن کی مہلت تھی۔ اس عرصے میں مجھے وزیر جان کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔

میں نے باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ یہاں میرے آزادانہ گھومنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ میرے سفری کاغذات اور میری اصل شناخت سب قانونی تھے لیکن وزیر جان اور اس کے حواریوں کی طرف سے مجھے خطرہ تھا۔

اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے اپنا شیونگ وغیرہ کا سامان باتھ روم کے ایک ریک پر سجا دیا تھا۔ میں [illegible] سے پہلے شیو بنائی۔ مجھے کلین شیو تو ویسے بھی [illegible] راجیش کمار کلین شیو تھا۔ اس سے اتنا تو ضرور ہوتا کہ فوری طور میں وزیر جان اور اس کے آدمیوں کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ شیو کرنے کے بعد میں نے غسل کیا۔ گیزر لگا ہوا تھا، میں نے یہاں بدلتے موسم کی مناسبت سے ہلکے گرم پانی سے غسل کیا۔ اس کے بعد نئے کپڑے پہنے جو سیاہ ٹائٹ جینز اور ہلکے بلیو کلر کی ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ جس میں میرا کسرتی جسم کسی چیتے کی طرح سبک اور تنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایسا صاف ستھرا اور چست لباس جو میرے توانا اور لمبے چوڑے جسم پر سجتا بھی ہو مجھے بہت پسند تھا۔ پیروں میں سیاہ مضبوط بوٹ پہنے، جسم کو ''وارم اَپ'' کرنے کے لیے میں نے ایک کھلے کمرے میں گراؤنڈ بنچ پریس کی۔ یہ تیاری کرنے کے بعد میں نے کچن میں جا کر اپنے لیے ایک اچھی سی کافی بنائی اور اسے پینے کے بعد میں باہر آگیا۔ گھر کو تالا لگا کر چابی اسی طرح چوکھٹ کے ایک خفیہ خلا میں رکھ دی جس طرح کاؤشی کرتا تھا۔

میرے بال قدرتی طور پر ہلکے براؤن تھے۔ رنگ تو سرخ وسپید تھا ہی تاہم کلین شیو ہونے کے بعد میں بھی کوئی ''گورا'' ٹائپ آدمی نظر آرہا تھا۔

فضا میں سیلن کی بُو رچی ہوئی تھی اور ہلکی سردسی ہوا چل رہی تھی۔ میرے پاس جرسی یا ایسا کوئی گرم لباس نہ تھا، مگر اب باہر آیا تو اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تاہم میں نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا تا کہ خون کی گردش جسم کو گرم رکھے۔ موسم خنک تھا اور آسمان پر شاید بادلوں کا بسیرا تھا اسی لیے سرِ شام ہی رات کا گماں ہونے لگا تھا۔

ایک سڑک پر آیا تو ٹک ٹک کی مخصوص جرس نما گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں پڑی، میں لپک کر اس طرف بڑھا تو سامنے سے وہ آتی دکھائی دی۔ میں نے ہاتھ کا اشارہ کیا وہ رک گئی۔ میں اس میں سوار ہو گیا۔ اور لوگ بھی سوار تھے، ایک نگاہ اُنہوں نے مجھ پر ڈالی اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگے۔

ٹک ٹک پر بیٹھ کر میں مین چوراہے پر اُترا اور یہاں سے پیدل ایک فٹ پاتھ پر آگے چل پڑا۔

میں نے کاؤشی سے سرسری طور پر اس علاقے تک جانے کا آسان اور محفوظ راستہ سمجھ لیا تھا تاہم کاؤشی نے اس کے ساتھ ساتھ مجھے تنبیہ بھی کر رکھی تھی کہ میں یہاں کسی غیرقانونی سرگرمی میں خود کو ملوث کرنے سے گریز کروں، بہ صورت دیگر معاملہ ہاتھ سے نکل گیا تو اس کا اور میرا معاہدہ (جو زورآور خان) کے توسط سے ہوا تھا، ختم ہو جائے گا۔

اب انہیں کیا معلوم تھا کہ یہاں آتے ہی میرا ایک اہم دشمن سے ٹکراؤ ہو جائے گا۔ وزیر جان پاکستان ہی سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا مگر اس بدبخت کی یہاں بینکاک میں ہل ٹاپ جیسے علاقے اور فوکٹ پیلس میں اس کی عظیم الشان رہائش گاہ دیکھ کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ اسپیکٹرم ایسے ضمیر فروشوں کو کس قدر نوازتی تھی جس کی مثال وزیر جان میرے سامنے تھا۔ ماضی میں کیا حیثیت تھی اس کی......! کسی مل میں نچلے درجے کا مزدور تھا۔ اس کے بعد میری ماں کو بہلا پھسلا کر شادی کی، اسے دکھ دیے، مجھے باپ کے دھوکے میں رکھا اور ایک اذیت ناک کرب میں مبتلا کیے رہا، جب یہ انکشاف ہوا کہ وہ میرا اصلی باپ تھا ہی نہیں تو میں اللہ کے حضور شکر بجالایا تھا کہ میں ایسے کمینے انسان کا بیٹا تھا ہی نہیں...... پھر کب اور کیسے وہ اسپیکٹرم کے چھپر تلے آیا اور اپنی دنیاوی اور مادی حیثیت کو ضمیر بیچ بیچ پروان چڑھاتا چلا گیا۔

''ہلو......مسٹر......!''

اچانک ایک ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور تھائی لہجے میں کسی نے مجھے پکارا...... میں خیالات سے چونک کر رکا اور گردن گھما کے عقب میں دیکھا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا موٹا سا شخص تھا۔ مقامی باشندہ ہی تھا۔ عمر کا اندازہ چالیس پینتالیس سے متجاوز ہی ہوتا تھا۔

اس نے بھاری قسم کی شرٹ اور نیچے لفافہ نما پینٹ چڑھا رکھی تھی، آنکھیں چندی چندی سی تھیں۔

''یس......؟'' میں نے کہا۔

''آئی ہیوسم بیوٹی فل......چیکس......''

میں سمجھ گیا تھا کہ ''چیکس'' سے مراد اس کی خوبصورت لڑکیاں ہی تھیں۔ تاہم اس خبیث کی بات سن کر میری طبیعت منغض سی ہونے لگی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ تھائی لینڈ بالخصوص بینکاک میں بڑی سستی عیاشیاں تھیں اور اس قسم کے ''سپلائرز'' شکار پھانسنے کے لیے جابجا پھیلے ہوتے تھے بلکہ آبرو باختہ عورتیں بھی کھلے عام ''ماڈل'' بنیں شکار پھانسنے کے لیے گھومتی رہتی تھیں، بالخصوص غیرملکی شکار تو ان کے لیے سہل اور ''مہنگے'' ہوتے تھے۔

''نو تھینکس......'' میں نے کہا اور پلٹ کر آگے بڑھا۔

''ویٹ...... ویٹ...... ہاتورو......ہاتورو......'' وہ بدبخت انگریزی اور تھائی ملا جلا کر بکتا دوڑتا ہوا میرے آگے آگیا اور اپنی پتلون کی جیب سے چند ہوشربا اور کم عمر

حسیناؤں کی تصاویر یں نکال کر میرے چہرے کے سامنے لہرانے لگا۔

”دیز گرلز سولولی اینڈ ویری کو پر یتو...... ویری چیپ پرائس، جست تو ہنڈرید بھات......، آئم شور، یو ول لائک ویم......“ وہ میرے آگے آگے قدموں کو پیچھے بڑھاتے ہوئے جوش سے بولا۔ رکا میں بھی نہیں۔ میرا جی چاہا کہ اس کے چہرے پر ایک عدد گھونسا رسید کر ڈالوں مگر میں اپنی اس خواہش کو بمشکل دباتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ ڈھیٹ تھا، اس نے خاصی دور تک میرا پیچھا کیا۔ اس کم بخت سے جان چھڑانے کے لیے ایک جگہ تو میری نوبت بھاگنے تک کی آگئی تھی۔ میرے آس پاس سے گزرنے والے چند لوگ میری حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہے تھے، چند ایک نے تو قہقہہ بھی لگا دیا۔ اسی وقت جب میں اس بدبخت سے جان چھڑا کر ایک موڑ مڑا تو کسی کے ساتھ ٹکرا گیا۔ نرم اور لطیف سے خوشبو بھرے احساس کے ساتھ ہی میری سماعت سے ایک مترنم سی ہلکی چیخ بھی ٹکرائی تھی اور پھر نہ میں سنبھل پایا نہ وہ...... یوں ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے اُلجھ کر فٹ پاتھ پر گر پڑے۔ اس نے کچھ سامان ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا۔ وہ بھی فٹ پاتھ اور کچھ سڑک کنارے بکھر گیا۔ وہ میرے ساتھ گرتے ہی چیختے ہوئے میرے سینے پر مکے برسانے لگی، مجھے اس کے نرم و نازک ہاتھوں کے مکے کیا اثر کرتے، البتہ خفت آمیز شرمندگی سے میں خجل سا ہو گیا تھا۔ وہ تھائی زبان میں کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ غصے اور خوف کا ملا جلا انداز تھا۔

”او...... میڈم! سو سوری...... ایکسٹریملی سوری! میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتا ہوں۔“

میں نے انگریزی میں اس سے کہا اور جلدی سے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا اور خود بھی سیدھا ہو گیا۔ وہ ایک اُنیس بیس سالہ نرم و نازک اور خوب صورت سی لڑکی تھی۔ اس کے تراشیدہ سے ریشمی بال بکھر گئے تھے اور وہ ان سے بے پروا قدرے خم ہو کے اپنا میرون رنگ اسکرٹ درست کرنے لگی، جبکہ اس کا پلین باڈر والا خاصا چست بلاؤز کچھ اس مختصر سی حادثاتی دھینگا مشتی میں مزید آوارہ سا ہونے لگا تھا۔ اسکرٹ درست کرنے کے بعد اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور پُرکشش تھیں، غصے میں وہ جانے کیوں اور بھی دلنشیں محسوس ہو رہی تھیں۔ سیب جیسے گال سرخ ہو کے مزید شفق رنگ بکھیرنے لگے۔ میں تھوڑا نروس سا ہو گیا تھا اور اسے غصے میں پھنکتا دیکھ کر اپنے عقب میں گردن موڑی تو مجھے وہ موٹا تھائی دلال نظر آیا، وہ بھی ڈھیٹ بنا میرے تعاقب میں اسی طرف مڑا اور ہمیں دیکھ کر ساری صورتِ حال سمجھ گیا پھر حالات خراب پا کر وہ اُلٹے پاؤں وہاں سے کھسک گیا۔

اس تھائی لڑکی کا سامان کچھ زیادہ نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا وہ میں نے جلدی جلدی سمیٹ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے جہاں وہ موٹا تھائی غائب ہوا تھا۔ اس سے پھر معذرتی انداز میں بولا۔

”دراصل مجھے یہ موٹا شخص تنگ کر رہا تھا اور میں اس سے جان چھڑانے کے لیے ہی بھاگ رہا تھا کہ آپ سے ٹکرا گیا۔“

وہ تھائی لڑکی جو ذرا ہی دیر پہلے برہم نظر آ رہی تھی، میری بات سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بھی شاید اس موٹے تھائی کو دیکھ لیا تھا اور بوکھلا کر واپس کھسکتے بھی...... یوں وہ سارا ”معاملہ“ سیکنڈوں میں ہی سمجھ چکی تھی۔ تب ہی وہ اسی انداز میں بولی۔

”اِٹس، او کے۔ یہ لوگ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے کچھ زیادہ ہی پیچھے پڑ جاتے ہیں۔“ اس کی انگریزی بہت رواں اور شستہ تھی۔ اس اعتبار سے وہ مجھے خاصی پڑھی لکھی لگی۔ ”تم انڈین ہو......؟“

اس نے آخر میں اپنے شاپر کو اچھی طرح سنبھالتے ہوئے سوال کیا۔ وہ دیگر تھائی عورتوں کی بہ نسبت سرو قد تھی اور جسم بھی متناسب تھا۔

”نہیں، میں پاکستانی ہوں۔“ میں نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔ ”درحقیقت یہ موٹا آدمی میری جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا، میرے پیچھے لگ گیا تھا اور عجیب و غریب عورتوں کی تصاویر دکھا کر مجھے رجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ مجھے بھاگنا پڑا تو موڑ کاٹتے ہی تم سے ٹکرا گیا۔“ وہ پھر مسکرائی۔

گو وہ خوب صورت تھی مگر اس کی آنکھیں دوآتشہ تھیں۔ اس لیے کہ مجھے اس کی آنکھوں میں نرمی اور لطافت بھری مسکراہٹ کا تاثر جھلکتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ آنکھیں جو ایسا تاثر رکھتی تھیں مجھے بہت بھا جاتی تھیں۔ یہ وہ آنکھیں اور چہرہ تھا جن میں بیک وقت گدازسی مسکراہٹ اور معصومیت کا عنصر بھی غالب تھا اور یہی وہ متاعِ حسن و جمال تھا جس سے قدرت نے عابدہ کو بڑی فراغ دلی سے نواز رکھا تھا۔ وہ تو حسن و جمال میں یکتا تھی مگر اس تھائی لڑکی میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ ایک نظر دیکھتے ہی میں اس کا عابدہ سے موازنہ کر بیٹھا تھا، اگرچہ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ مجھے اس لڑکی میں عابدہ کے حسن کی صرف ایک جھلک کی محض ہلکی سی مماثلت محسوس ہوئی تھی اور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ ہولے سے کھنکھاری...... میں خیالات سے چونکا...... پتا نہیں وہ کیا سمجھی تھی مجھے اس طرح اپنی جانب چند ثانیے تک گھورتا پا کر...... جبکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو میں نے اپنی ”پارسائی“ کا اسے ثبوت دیا تھا۔

”ایک بار پھر میں معذرت خواہ ہوں میڈم! آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا اور ساتھ ہی مسکراتے ہوئے ایک قدم بھی بڑھا دیا مگر دوسرے ہی لمحے ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ گرنے کے قریب ہو گئی اور غیر ارادی طور پر میرے دونوں بازو اسے گرنے سے سنبھالا دینے کے لیے آگے ہوئے اور وہ ان میں سما گئی۔ اس کا نرم و گداز وجود میرے بازوؤں میں بھر گیا اور گلاب سا چہرہ میرے سینے سے یوں ٹک گیا کہ اس کے گھنے تراشیدہ گیسو میرے چہرے پر سیاہ بدلی کی طرح بکھر گئے۔ ایک فرحت آگیں سی نکہت میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور مجھے بے خود سا کرنے لگی۔

اس نے بھی سنبھلنے سے معذوری ظاہر کی اور اسی طرح مجھ سے لگی کراہنے لگی تو مجھے فکر ہوئی......

”کک...... کیا ہوا......؟ شاید تمہیں کوئی چوٹ آگئی ہے۔“ میں نے کہا اور دھیرے سے اسے سنبھالا دیا تو وہ اپنا ایک ہاتھ اپنے دائیں کولہے پر رکھتے ہوئے بولی۔

”گرنے کی وجہ سے شاید میری ہپ کا کوئی مسل ٹِل ہو گیا ہے۔ کیا تم میری چھوٹی سی مدد کر سکتے ہو؟ پلیز۔“

”شیور...... وائے ناٹ......“ میں نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”یہاں سے تھوڑی ہی دور میرا مساج پارلر ہے...... وہاں تک مجھے سہارا دے کر چھوڑ دو......“

”میں ٹیکسی روکتا ہوں اور آپ کو وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

”ٹیکسی کی ضرورت نہیں، میں نے کہا نا...... بس، یہی ایک اسٹریٹ ہے، اس کے اختتام پر ہی میرا چھوٹا سا مساج پالر ہے میں وہیں جا رہی تھی۔“

اسے یہ چوٹ میری وجہ سے لگی تھی، کچھ یوں بھی میرا اخلاقاً فرض بنتا تھا کہ میں اس کی کم از کم اتنی تو مدد کر ہی دوں، لہٰذا سب سے پہلے میں نے اس کے ہاتھ سے شاپرز لیے اور پھر اسے سہارا دیا اور چل پڑا۔

اس مختصر سے دورانیے میں اس نے مجھے اپنا نام سانچی بتایا اور میں نے اپنا...... اور یہ بھی کہ وہ ایک مساج پارلر میں سات گھنٹے کی جاب کرتی تھی، نیز اس کے مساج پارلر میں صرف خواتین ہی آتی تھیں۔ وہ صبح دس بجے پہنچ جاتی تھی اور پانچ بجے اس کی ڈیوٹی آف ہو جاتی تھی۔

بہرکیف اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اسٹریٹ کی یہ دیوار اختتام پذیر ہوئی تو ہم دائیں جانب مڑے۔ بالکل کارنر پر ہی مجھے ایک شیشے والی خاصی بڑی سی دکان نظر آ گئی، جس کی پیشانی پر جلتے بجھتے نیون سائن پر ”لارا مساج پارلر“ انگریزی میں اور اس کے نیچے تھائی زبان میں کچھ ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں یہی کچھ درج تھا۔ اس کے بالمقابل ہی مجھے ایک بڑے ”مال“ کی دومنزلہ عمارت بھی نظر آئی۔ جس پر ”کوچی کاٹنگ شاپنگ مال“ کے نیون سائن جگمگا رہے تھے۔ نیچے تھائی زبان میں بھی شاید یہی کچھ لکھا تھا۔ وہاں لوگوں کی اچھی خاصی آمدورفت دیکھنے میں آ رہی تھی۔ خاصا معروف شاپنگ مال تھا۔

”یہ سمر امانیا کا سب سے بڑا اور مشہور شاپنگ مال ہے۔“ سانچی نے بتایا۔ ”ابھی چند ماہ پہلے ہی اس کا افتتاح شہر کے میئر نے کیا تھا۔“

”ہم...... خاصا بڑا ہے اور لگتا بھی ایسا ہی ہے کہ جلد ہی خوب چل نکلا ہے۔“ میں نے بھی بات سے بات نکالی۔ سانچی نے مزید بتایا۔

”ہاں! اس کی وجہ سے ہمارا یہ مساج پالر بھی پہلے سے زیادہ دوڑنے لگا...... اس عمارت کی دیوار ہمارے پارلر مساج سینٹر کے ساتھ ہی ملی ہوئی ہے۔“ میں نے پارلر کی جانب قدم بڑھا دیا۔

شیشے کے دروازے سلائڈنگ تھے جو بند تھے۔ ان کے درمیان متوازی لکیر پر جہاں اسٹیل کا ہینڈل نظر آ رہا تھا۔ وہاں ”کی لیس“ لوک سسٹم کے روشن نمبروں پر اس نے اپنی مخروطی اُنگلیوں سے کوئی کوڈ ملایا اور گلاس ڈور دائیں بائیں سرک گئے۔ مجھے پہلے حیرت ہوئی، کیونکہ اس نے جو کوڈ ملایا، تو وہ مجھے بھی ازبر ہو گیا تھا۔ مختصر اور آسان سا ہی کوڈ تھا۔ یعنی 9190 لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں نے روشن نمبروں کا رنگ جو پہلے سرخ تھا بعد میں سبز ہو گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس لاک سسٹم میں صرف کوڈ کا ہی نہیں بلکہ فنگر پرنٹ کا بائیومیٹرک سسٹم بھی اٹیچ تھا۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ اس طرح تو کوئی بھی یوں کوڈ ملاتے ہوئے اسے ذہن نشین کر سکتا تھا۔ لیکن فنگر پرنٹ جو پہلے ہی سے اندر ڈیٹا

بیس پر تھے۔ ان سے میچ نہیں ہوتے۔

میں اسے سہارا دیے اندر لے آیا۔ ہمارے عقب میں دروازہ خودکار طریقے سے دوبارہ بند ہوگیا۔ سامنے ہی ایک خوب صورت سی کاؤنٹر ٹیبل کے پیچھے موجود دبلی پتلی سی عورت ہماری طرف بڑھی، اس کے چہرے پر تفکر تھا۔ وہ درمیانی عمر کی تھی۔ اس نے تھائی زبان میں ہی اس سے کچھ پوچھا تھا۔

وہاں میں نے کچھ اور خوب صورت سی تھائی لڑکیاں دیکھیں جو اپنی وضع قطع سے ”مالشی“ نظر آتی تھیں۔ وہ میری طرف پُرشوخ نگاہوں سے دیکھ کر ایک دوسری کو کہنی کا ٹھوکا مار کے کچھ کہتیں اور پارلر کی اس خاموش اور سکون آور فضا میں مترنم قہقہوں کے جلترنگ سے بج اُٹھتے۔ انہی میں سے ایک درمیانی عمر والی عورت نے انہیں تھائی زبان میں ڈانٹا۔

اس دوران عورت اور اس مضروب لڑکی کے درمیان تھائی لفظوں میں کچھ تبادلہ ہوا اور پھر وہ عورت میری طرف دیکھ کر ذرا سا مسکرائی، اس کے بعد سانچی کو سہارا دیے اندر ایک کمرے میں آگئی۔ یہ کمرا مجھے مساج روم ہی نظر آیا تھا۔ کمرا چھوٹا سا تھا، وسط میں ایک مساج کاؤچ رکھا تھا۔ عورت نے سانچی نامی لڑکی کو اس پر پیٹ کے بل لٹا دیا اس کے بعد قریب رکھے ریک پر سے ایک باسکٹ اُٹھالی، اس کے ساتھ بیلٹ لگی ہوئی تھی جو اس نے اپنی پشت کے گرد باندھ لی، اب یہ باسکٹ ”ہینڈفری“ ہوگئی تھی۔ عورت نے باسکٹ کا کیپ اُٹھایا تو اس کے اندر قطار سے لگی ہوئی مختلف آئل کی بوتلوں کے سرے جھانکنے لگے۔ اس کے اندر یقینا بھانت بھانت کے تیل بھرے ہوئے تھے، ان بوتلوں کی خوبی یہ تھی کہ انہیں باسکٹ کے خانوں سے نکالے بغیر ہی ان کا مخصوص ساخت کا پلاسٹک کیپ ہتھیلی سے دبا کر کھولا جاتا تو لوشن یا آئل ہتھیلی پر آجاتا۔

سانچی کو لٹانے کے بعد وہ اس کے کولہے پر سے اسکرٹ ہٹانے لگی تو میں سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی وقت عقب سے عورت کی آواز آئی۔

”تم ذرا باہر ویٹ کرنا...... اوکے......؟“ اس نے انگریزی میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ میں نے سانچی کو یہاں پہنچا کر اپنا کام کر دیا تھا لہٰذا...... میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا۔

”میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا۔ بہتر ہوگا کہ میں اب چلا جاؤں۔“ اس پر وہ عورت تو کچھ نہ بولی، البتہ سانچی نے کاؤچ پر اُلٹے لیٹے لیٹے میری طرف سر گھما کر دیکھا۔ وہ عورت ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ تاکہ سانچی مجھ سے مخاطب ہو سکے۔

وہ بولی۔ ”تمہارا شکریہ! میں تو چاہتی تھی کہ تم سے اور باتیں کی جائیں، لیکن تم کسی ضروری کام سے جا رہے ہو اسی لیے میں روک نہیں سکتی، مگر یہاں دوبارہ آنا۔ مجھے خوشی ہو گی۔“

”اوکے، تھینکس۔“ میں نے مسکرا کے ایک ہاتھ اُٹھا کر اسے بائے کہا اور دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ سامنے دروازہ تھا۔ ایک لڑکی نے اب کاؤنٹر ٹیبل سنبھال لی تھی، دو لڑکیاں جن کے پہلو سے وہی مساج والی باسکٹ بیلٹ جھول رہی تھی، ایک کونے میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں، مجھے دیکھ کر وہ مسکرائیں۔ میں سیدھا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ دھکیلنے کے لیے میں نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور ہینڈل پکڑ کر دھکا دیا تو وہ نہیں کھلا۔ میں نے دو ایک بار ہلکے سے زور لگایا تو ایک دم سلائڈ ہوگیا۔ اسی وقت مجھے لڑکیوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ انہی کی شرارت تھی، کاؤنٹر ٹیبل پر موجود لڑکی نے کوئی بٹن دبایا تھا۔

میں نے ابھی مساج پارلر سے ایک ہی قدم باہر نکالا تھا کہ گولیوں کی زبردست تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا اور اسی طرح واپس اندر پلٹ آیا۔ دروازہ دوبارہ خودکار انداز میں سلائڈ ہوگیا۔ اندر موجود لڑکیاں بھی فائرنگ کی گھن گرج سن کر دہشت زدہ سی ہوگئی تھیں۔ سامنے سڑک پر رواں ٹریفک کی ترتیب بھی بکھرنے لگی اور کئی گاڑیوں کے ٹائروں کے چرچرانے کی آوازیں اُبھریں۔ بہت سے لوگوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ کمروں میں موجود مساج کراتی اور کرتی ہوئیں عورتیں بھی خوف زدہ اور سوالیہ چہروں کے ساتھ گھبرائی ہوئی باہر نکل آئیں، ان میں وہ عورت اور سانچی بھی تھی۔ میں وہیں پریشان سا کھڑا تھا، فائرنگ اور شور کی سمع خراش آوازیں پارلر کے اندر بھی دبی دبی سی سنائی دے رہی تھیں، کیونکہ دروازہ بند تھا۔

”یہ سب کیا اور کہاں ہو رہا ہے......؟“ وہ عورت سراسیمہ انداز میں میری طرف دیکھ کر یوں بولی جیسے میں ہی اس کی وجہ ہوں

”مم...... مجھے تو یہ آوازیں پاس کے شاپنگ مال سے آتی محسوس ہو رہی ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی گھبرائی ہوئی کھڑی سانچی نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت کان پھاڑ دینے والے دھماکے کی آواز اُبھری، پورا پارلر لرز گیا۔ اندر دھواں اور گرد و غبار پھیل گیا۔ شیشے کا دروازہ ٹوٹ کر کانچ اندر اور باہر فٹ پاتھ پر بکھر گیا۔ ایک طرف کھڑی کئی عورتیں اُڑتی ہوئی دائیں بائیں گریں، باقی عورتیں چیخیں مارتی ہوئی باہر دوڑیں۔ مجھے مذکورہ سمت کی پوری ہی دیوار گری ہوئی نظر آئی اور وہاں سے میں نے چار پانچ اسلحہ بدست اور چست لباس میں ملبوس افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے حلق پھاڑ کر ہم سے تھائی زبان میں کچھ کہا تھا، وہاں ہم تینوں سمیت، چند اور لڑکیاں اور خواتین بھی تھیں، وہ فوراً چیختی ہوئی اپنے سروں پر دونوں ہاتھ رکھے زمین پر اکڑوں بیٹھ گئیں۔ ان مسلح درانداز وں نے چہروں پر فل نقاب چڑھا رکھے تھے جہاں سے صرف آنکھوں کانوں، منہ اور ناک کی جگہ خالی رکھی گئی تھی۔

ان کی دھمکی کا مفہوم سمجھتے ہوئے میں نے بھی اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

ان میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا۔ وہ ہمیں جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے اسی دیوار کے سوراخ سے دوسری طرف لے گئے۔ ایک عمر رسیدہ عورت جو مساج کروانے آئی تھی، وہ زیادہ ہی تھڑدلی ثابت ہوئی اور اس نے ان مسلح افراد سے منتیں کرنا شروع کر دیں۔ نقاب پوش بھیڑیئے جیسی غراہٹ سے اسے پرے ہٹنے اور خاموش ہونے کے لیے کہہ رہے تھے، مگر وہ عورت اس قدر خوف زدہ تھی کہ ہسٹریائی انداز میں ان نقاب پوشوں سے روتے چلاتے ہوئے منتیں کرنے لگی تو ایک نے اپنے ماؤزر کی نال کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ عورت اُڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی، اس کے سینے میں بڑا سا سرخ روشندان بن گیا تھا۔ باقی عورتیں اس بربریت پر اس قدر دہشت زدہ ہوگئیں کہ انہوں نے رونا چلانا بند کر دیا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں یہی آرہا تھا کہ یہ کوئی ڈکیتی کی واردات ہے، یہ پورا گروہ اس شاپنگ پلازا کو لوٹنے آیا تھا، لیکن پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر میں نے اپنا یہ خیال رد کر دیا۔

ہمیں مساج پارلر کی اسی ٹوٹی ہوئی دیوار سے اندر شاپنگ سینٹر میں لایا گیا تھا، یہاں کا نقشہ ہی تھرا دینے والا تھا۔ بڑے سے ہال کے چکنے فرش پر چند لاشیں اور ان کے قریب خون پھیلا ہوا تھا۔ اُوپری حصے کی طرف جاتے ہوئے مال کے دو رُویہ سمتوں میں بنے متحرک زینے رکے ہوئے تھے، وہاں بھی لرزہ خیز بربریت کی نشانیاں چند آڑی ترچھی اور ڈھلکتی ہوئی لاشوں کی صورت میں نظر آئیں، کچھ تو لڑھک کر نیچے آن گری تھیں۔ وہاں بھی شاپرز بیگ اور خریداری کا سامان بکھرا ہوا تھا۔ یہ شاپنگ کے لیے آئے ہوئے بدنصیب خریدار مرد عورتوں کی لاشیں تھیں۔ ایسے ہی بہت سے لوگ جن میں مرد عورتیں اور بچے بوڑھے سب ہی شامل تھے، ہال کے وسط میں گن پوائنٹ پر یرغمال بنے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے خوف و دہشت سے سفید ہو رہے تھے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ساتھ دبوچ رکھا تھا۔ ان کے سروں پر چار افراد جدید اسالٹ رائفلیں پکڑے کھڑے تھے۔ یہ چاروں بغیر نقاب کے تھے۔ ان میں ایک کریہہ صورت لمبا تڑنگا کسرتی بدن شخص بھی تھا۔ اس کا چہرہ لمبوترا اور آنکھیں مچی مچی سی تھیں، جبڑوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی اور ہونٹ موٹے تھے۔ اس کے ہاتھ میں جدید مشین پسٹل تھا۔ اس کے چہرے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی درندگی مترشح ہو رہی تھی۔ اس نے نیچے ڈھیلی ڈھالی پتلون اور اُوپر شلوکا نما بغیر آستینوں کی قمیص پہنی تھی، جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ جہاں سے اس کے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ وہ ان لٹیروں کا سرغنہ لگتا تھا، باقی اس کے ساتھ کھڑے بے نقاب تین ساتھی تھے۔ انہوں نے ہیوی اسالٹ تھام رکھی تھیں۔ ان کے ہتھیاروں کی ساخت سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ عام ڈکیتیاں کرنے والے گروہ کے لوگ نہیں ہو سکتے، ورنہ یہ لوگ اتنے دھماکے نہیں مچاتے نہ ہی یوں اطمینان سے کھڑے ہوتے۔ چہرے مہرے سے بھی وہ انتہائی تربیت یافتہ دکھتے تھے۔

ان یرغمال لوگوں میں اب ہم بھی شامل ہو گئے تھے۔ کچھ خون آلودہ لاشیں بھی بکھری ہوئی نظر آرہی تھیں، ان کے شاپنگ بیگز کھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے، ان میں سے اشیاء، کھلونے، کھانے پینے کی چیزیں سب نکل کر ہال کے چکنے فرش پر پھیلی ہوئی تھیں، خون کا تالاب بھی بنا ہوا تھا۔ ان درندوں نے خاصی خون ریزی پھیلائی تھی۔ ایسا ان درندوں نے یقینا باقیوں پر اپنی دہشت طاری کرنے کے لیے کیا تھا۔ لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ہلکی ساخت کے بم دھماکے بھی کیے گئے تھے، ہم شاید اسی لیے لپیٹ میں

آ گئے تھے کہ مساج پارلر کی دیوار ملی ہوئی تھی۔ میں نے مشاہداتی نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ معاملہ ڈکیتی سے کچھ ''اُوپر'' کا تھا۔ کیونکہ ان کے ہاتھوں میں سوائے خطرناک اسلحے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی یہ لوگ ایسی کوئی حرکت کرتے نظر آ رہے تھے، بلکہ یہ آٹھ دس اسلحہ پوش ہم سب کو ایک جگہ پر محبوس کیے ہوئے ملک الموت بنے سروں پر کھڑے تھے۔

مساج پارلر کی وہ عورت اور سانچی میرے دونوں بازو پکڑے چپکی بیٹھی تھیں۔ خوف اور سراسیمگی کے سبب ان کے جسموں کا ارتعاش میں محسوس کر رہا تھا۔ ہم سب فرش پر بیٹھے تھے۔

میرا دل جیسے کانوں اور کنپٹیوں پر دھڑ دھڑا رہا تھا۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ بے کار میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے بے رحم اور خطرناک نظر آ رہے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کا مقصد کیا تھا کہ اچانک باہر پولیس کی متعدد گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی آن پہنچیں مگر یہ لوگ اسی طرح اطمینان سے کھڑے رہے۔ ان کا سرغنہ موبائل پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی کو دھمکا رہا ہو۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور کس سے باتیں کر رہا ہے؟'' میں نے اپنے ساتھ دبکی ہوئی سانچی سے دھیمی سرگوشی میں پوچھا تو وہ بھی کپکپاتی سرگوشی میں بولی۔

''یہ لوگ میئر سے باتیں کر رہے ہیں، ان کے کچھ ساتھی جیل میں قید ہیں اور یہ ان کی رہائی کا مطالبہ کر رہے ہیں اسی لیے ہمیں یرغمال بنا رکھا ہے۔''

''او......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''لل...... لیکن میئر نے ان کا مطالبہ نہیں مانا تو یہ ہمیں ایک ایک کر کے گولی مار دیں گے۔'' اس عورت نے بھی خوف میں ڈوبی سرگوشی کر ڈالی۔ اس خطرناک صورت حال سے وہ کچھ زیادہ ہی خوف زدہ اور حواس باختہ نظر آ رہی تھی، اسی سبب اسے اپنی آواز پر بھی قابو نہ رہا اور یوں اس کی لرزیدہ سی آواز پاس کھڑے ایک دہشت گرد کے کانوں تک جا پہنچی، اس نے خونخوار نظروں سے عورت کی طرف دیکھا اور پھر اپنی گن کو دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتا ہوا وہ ہماری طرف بڑھا۔ قریب آتے ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی بیدردی سے اُسے کھینچ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ سرغنہ موبائل پر باتیں کرنے کے دوران میں اپنے ساتھی دہشت گرد کی طرف دیکھ کر اس بار انگریزی میں چلّایا۔

''اس کُتیا کو چپ کراؤ...... میں بات کر رہا ہوں۔''

دہشت گرد نے عورت کی گردن دبوچ لی۔ میرے وجود میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں اب تک خاموشی سے اچھے وقت کے انتظار میں تھا کہ کسی چکر میں خود کو حادثاتی طور پر بھی ملوث کیے بنا اس اجنبی سرزمین پر سکون سے چند دن گزار سکوں لیکن ظلم و بربریت کا یہ کھیل بھی برداشت کرنا میری فطرت میں شامل نہ تھا۔

دہشت گرد نے اپنے سرغنہ کی درشت تادیب پر عورت کو گردن سے پکڑ کے ایک دوسری جگہ لے جا کر پٹخ دیا۔ وہ مزید دہشت زدہ ہو گئی اور اس پر موت کے خوف سے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا۔ باہر کھڑی پولیس کی گاڑیوں کی چھت پر لگے سرخ اور نیلے ہوٹرز کی گردشی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ وہ پولیس کو قریب پا کر اور انہیں نجات دہندہ جان کر اُٹھ کر دوڑی۔

موت...... یقینی موت کا تصور دل و دماغ میں اپنا غلبہ پا لے تو ایسی ہی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں، وہ بھی شاید اعصابی طور پر کمزور ثابت ہوئی تھی۔ وہ ابھی چند قدم ہی دوڑ پائی تھی ایک گولی چلنے کا سماعت شکن دھماکا ہوا اور عورت کی پیشانی میں سرخ روشندان نمودار ہو گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی چکنے فرش پر گری اور لڑھکتی چلی گئی۔ سرغنہ نے موبائل کان سے لگائے ہوئے اپنے مشین پسٹل سے اس بدنصیب عورت پر گولی چلا دی تھی اور وہ بدستور اسی طرح باتوں میں مشغول رہا جیسے کسی جانور پر گولی چلائی ہو۔ اس بے رحم درندے کی اس کھلی بربریت پر وہاں موجود کئی یرغمالیوں کی مجھے گھٹی گھٹی خوف زدہ سی چیخیں سنائی دیں۔ میرے ساتھ چپکی بیٹھی سانچی بھی بری طرح سہم گئی اور اس نے گھٹے گھٹے انداز میں سسکنا شروع کر دیا۔

''ششش...... کوئی آواز منہ سے مت نکالو......'' میں نے اس کے کان میں ہلکے سے تنبیہی سرگوشی کی۔ ''ان پر خون سوار ہے۔ فکر مت کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔''

اس نے سسکنا بند کر دیا۔

میں نے اب اپنے ذہن سے سارے خدشات و خطرات کو جھٹک دیا اور اس نازک صورت حالات سے نمٹنے اور راہ فرار کے بارے میں غور کرنے لگا۔ میری ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہ تھی اور نہ ہی میں کوئی ''کارنامہ'' انجام دینے کے موڈ میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر ان سب بے گناہ انسانوں کو ان بے رحم درندوں سے اس طرح چھٹکارا دلاؤں کہ کامیابی کی صورت میں میری کسی

بھی قسم کی ذرا شہرت نہ ہونے پائے۔

ان کا سرغنہ فون کر کے فارغ ہوا تھا کہ ایک دم باہر کھڑی پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر چلّانا بند ہو گئے، یہی نہیں وہ مال کے سامنے سے بھی ہٹ کر چند فرلانگ کے فاصلے پر جا کھڑی ہوئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ فون پر دہشت گردوں اور انتظامیہ کے مابین کوئی ''معاملہ داری'' ہوئی تھی مگر صورتِ حال ہنوز مخدوش ہی نظر آتی تھی۔

میرے سامنے مال کے بڑے سے گیٹ کا منظر تھا۔ سرغنہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور پھر ہم یرغمالیوں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالنے کے بعد جیسے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''ہوں ں...... ہمیں انتظامیہ کو اپنا مطالبہ جلد از جلد منوانے کے لیے ہر ایک گھنٹے بعد لاش کی صورت میں ایک تحفہ انہیں دینا ہوگا۔''

چونکہ مال میں ہر رنگ و نسل کے لوگ آئے ہوئے تھے، ان میں سکھ بھی تھے انڈین بھی اور یورپین بھی، شاید اسی لیے سرغنہ انگریزی میں ہی بول رہا تھا۔ تاہم کثرت مقامی تھائی باشندوں کی بھی تھی۔ لہٰذا انگریزی بولنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ ہم بھی ان کے خطرناک عزائم جان کر دہشت زدہ ہو کے بلاچون و چرا ان کا حکم مانتے رہیں۔ اب وہ ایک ایک یرغمالی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس درندے سے کسی یرغمالی کو نظریں ملانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی، وہ اس کی طرف دیکھتا اور وہ اپنا منہ پھیر لیتے۔ تب ہی اس کی نظریں سانچی اور مجھ پر پڑیں۔ سانچی اور میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی نظریں ہمارا طواف کرتی ہوئی دوسری جانب سرک جائیں گی، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پاٹ دار آواز اُبھری۔

''تم...... کھڑے ہو جاؤ......'' یہ مختصر الفاظ اس نے انگریزی میں ہی ادا کیے تھے۔ میرا دل ایک دم دھک سے رہ گیا۔ میں نے ڈرنے کے سے انداز میں دھیرے دھیرے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نظریں میرے ساتھ خوف زدہ بیٹھے ایک یورپین جوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نوجوان مرد عورت تھے، اب پتا نہیں بھائی بہن تھے یا پھر میاں بیوی۔ بیوی خوش شکل تھی، بال سنہری تھے اور چہرہ کتابی، وہ خاصی حسین انگریز عورت تھی۔ وہ سرو قد بھی تھی بلکہ مرد سے اس کا قد ایک دو انچ اُونچا ہی تھا۔ اس نے ٹائٹ پینٹ شرٹ اور کھلے گریبان کی بنیان ٹائپ شرٹ پہن رکھی تھی۔ مرد عام سی شکل و صورت کا مالک تھا اور اس نے بھی پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی۔ تاہم سرغنہ کا مخاطب وہ مرد ہی تھا۔

اُس بے چارے کا چہرہ ہلدی کی طرح پیلا پڑ گیا اور وہ کپکپاتے ہوئے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نن...... نہیں، نخ...... خدا کے لیے نہیں......'' وہ عورت ایک دم اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''مم...... میرے شوہر کو کچھ مت کہو، ہمارے چھوٹے بچے ہیں۔''

وہ بے رحم سرغنہ شاید اس کے شوہر کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتا تھا۔ عورت بھی اپنے شوہر کے ساتھ ہی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اور اس کے آگے ڈھال بن گئی تھی۔

سرغنہ کے بدہئیت ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ اُبھری اور ساتھ ہی میں نے اس کی آنکھوں میں بے رحم چمک کو بھی اُبھرتے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے اُلٹے ہاتھ کا بھاری بھرکم تھپڑ عورت کے چہرے پر اس زور سے جڑ دیا کہ...... وہ چیختی ہوئی دور جا گری۔ اگلے ہی پل اس کا دایاں ہاتھ اُٹھا اور اس میں دبا ہوا پسٹل گرجا۔ پسٹل کو اس نے شاید سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر رکھا تھا۔

گولی چلی اور مرد کی پیشانی توڑتی ہوئی آر پار ہو گئی۔ وہ کھڑے کھڑے کوئی آواز نکالے بغیر لہرایا پھر سانچی اور میرے اُوپر آن گرا۔ اس طرح کہ اس کا خون آلودہ سر میری گود میں آن پڑا تھا اور بے جان کا وجود، فرش پر...... میری نظریں اس بدنصیب کے بے نور مگر کھلی آنکھوں والے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ مجھے اپنے دماغ کی رگوں میں گرم گرم خون کی ٹھوکریں محسوس ہونے لگیں۔ انسان چاہے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، انسانی رشتے کے اعتبار سے اس ظلم پر میرا جی بھر آیا تھا۔ اس کی بیوی جو اَب بیوہ ہو گئی تھی اور خود اس کی بھی زندگی کی کیا ضمانت تھی۔ اس کے فریاد کناں الفاظ میری سماعتوں میں گونجے، جو اس نے درندہ صفت دہشت گرد سرغنہ سے منت کرتے ہوئے کہے تھے۔

''نن...... نہیں، نخ...... خدا کے لیے نہیں...... مم...... میرے شوہر کو کچھ مت کہو، ہمارے چھوٹے بچے ہیں۔''

تبھی میں نے عہد کر لیا کہ اگر اللہ کی رضا اسی میں تھی کہ میں باقی بے گناہ اور معصوم انسانوں کو اس بربریت سے بچانے کی کوشش کروں تو یہ میرا انسانی فرض بنتا ہے جس کا حکم میرے مذہب کا بھی تھا۔

سانچی خوف سے چیخی۔ چند یرغمالیوں میں سے بھی بھرائی ہوئی چیخوں کی آوازیں اُبھری تھیں۔

”اوہو..... نو..... نو.....“ میں نے خوف زدہ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے اس کی لاش کو خود سے پرے دھکیلا اور ساچی سمیت تھوڑا دور جا کھسکا۔

سنہرے بالوں والی عورت..... جو سرغنہ کا تھپڑ کھا کے ذرا دور ایک اور دہشت گرد کے پیروں کے قریب فرش پر جا پڑی تھی، وہ گولی کی آواز اور اپنے شوہر کو گرتا دیکھ کے وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ اس بے چاری کو سکتہ ہو گیا تھا۔ ابھی محض چند لمحے پہلے ہی تو اس کا شوہر جیتا جاگتا اس کے ساتھ کھڑا تھا اور پلک جھپکتے میں موت کی اندھیاری وادیوں میں جا اُترا تھا۔ اسی سنگین گھڑی نے سنہرے بالوں والی عورت کو سکتے میں مبتلا کر دیا تھا، یہ اس کے لیے ایک عذاب ناک اور سنگین گھڑی تھی کہ قیامت تھی جو اس پر..... اس کی آنکھوں کے سامنے ٹوٹی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے ایک صدمے سے بھری اور کپکپاتی ہوئی چیخ ماری اور اُٹھ کر گرتی پڑتی اپنے شوہر کی لاش پر جا گری۔ دوسرے ہی لمحے اسے جانے کیا ہوا کہ وہ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور سرغنہ پر وحشی بلی کی طرح جھپٹی۔ اس نے اپنے نکیلے اور لانبے ناخنوں سے اس کے کریہہ چہرے پر سرخ نشان ڈال دیے۔ سرغنہ نے ایک ہاتھ سے اس کے بال پکڑ لیے اور جھٹکا دے کر خود سے پرے کر دیا مگر چھوڑا نہیں۔ البتہ اپنے ایک قریب کھڑے ساتھی سے تھائی زبان میں کچھ کہا اور پھر عورت کو اس کی طرف دھکیل دیا۔ اس نے عورت کو دبوچا اور اپنا ایک ہاتھ اس کی مخروطی گردن کے گرد کسا اور پھر نجانے اس کے کان میں کیا کہا تھا کہ عورت کا ہسٹریائی پن دم توڑنے لگا اور وہ سہم سی گئی۔ اس کے بعد اسے ایک طرف دھکا دے دیا۔ ایک عمر رسیدہ تھائی عورت نے فوراً اسے سنبھالا اور اپنے ساتھ لگا کر بٹھا دیا۔

میری آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ سرغنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر اُنہوں نے بدنصیب مرد کی لاش کو ڈنڈا ڈولی کر کے اُٹھایا اور مال سے باہر لے جا کر قوس کی صورت بنے قدمچوں سے نیچے سڑک پر لڑھکا دیا۔

سرغنہ پھر فون پر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ یقیناً میئر سے مخاطب تھا اور اسے تحفے کے بارے میں بڑی مکروہ اور سنگدلانہ مسکراہٹ سے بتا رہا تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے کسی اور سے بھی فون پر مخاطب ہو جاتا تھا، تب اس کا لہجہ بدل کر یک دم مؤدبانہ ہو جاتا تھا۔

”گویا اس کا بھی کوئی باس تھا۔“ میرے ذہن میں ابھرا۔

میرا منہ خشک ہو رہا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہونے لگی۔ میں بار بار اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر رہا تھا۔ ان دہشت گردوں سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ کب کس یرغمالی کی بات یا حرکت سے مشتعل ہو کے گولی چلا دیں۔

لاش کی صورت میں موت کے ان ہرکاروں نے پہلا تحفہ بینکاک کی انتظامیہ کو دے دیا تھا۔ اب ایک گھنٹا گزرنے کے بعد وہ اگلے تحفے کے لیے نجانے کس بدنصیب یرغمالی کو موت کا شکار کرنے والے تھے۔ اس اگلی ”باری“ پہ ہر کوئی خوف زدہ تھا کہ کیا خبر اب اس کی باری آ جائے۔ موت ان کے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار تھی۔

وقت ہر لحہ موت کی دستک دیتا دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ اس دوران میں سرغنہ نے اپنے چار ہرکاروں کو کوئی ہدایت دی اور وہ فوراً حرکت میں آئے۔ دو زینے کی طرف بڑھ گئے، باقی دو نے مین گیٹ کا رخ کیا۔ میں دُزدیدہ نظروں سے ان کی تعداد کا درست تعین کر رہا تھا جو مجھے سات کے قریب دکھائی دے رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ اس کے ساتھی ہرکارے سب اِدھر ہی یرغمالیوں کے گرد پہرے پر موجود تھے۔ اب کہیں جا کر سرغنہ نے اپنے چار ساتھیوں سے نجانے کیا کہہ کر انہیں کہاں اور کس لیے روانہ کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہلکی سرگوشی میں ساچی کے کان میں کہا۔

”اس نے اپنے ساتھیوں سے کیا کہہ کر اور کہاں بھیجا ہے؟“

جواباً ساچی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری، سہمی ہوئی نظروں سے اس نے اُس ہرکارے کی طرف دیکھا جو دوسروں کی بہ نسبت..... ذرا ہمارے قریب کھڑا تھا۔ ساچی کو ڈر تھا کہ کہیں وہ پھر ان کی سرگوشیوں کی آواز پر بگڑ نہ جائے۔ بہت ہولے سے بولی۔

”انہیں پولیس کی طرف سے کمانڈو ایکشن کا شبہ ہے اسی لیے ان کے دو آدمی مال کی چھت پر گئے ہیں اور دو باہر گیٹ کی نگرانی کر رہے ہیں۔“

صورت حال کا ادراک ہوتے ہی میرے اندر کا کمانڈو یکلخت بیدار ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ گھنٹا گزرے اور یہ ہرکارے پھر کسی بے گناہ کی جان لیں، مجھے اسی وقت کچھ کرنا تھا۔ اب میرے سامنے سرغنہ سمیت تین ہرکارے تھے۔ میں ابھی کوئی عملی قدم اُٹھانے پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک سرغنہ نے حظ اُٹھانے کے انداز میں اپنے ان دو ہرکاروں سے کہا۔

”خون خرابا ہوتا رہے تو جسم و جان کو تازگی ملتی رہتی ہے، اب یہ خاموشی تو مجھے سخت بورنگ محسوس ہو رہی ہے۔“

انگریزی میں یہ کہنے کے بعد اس نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ”ابھی اگلا ایک گھنٹا گزرنے میں چالیس منٹ باقی ہیں..... تو کیا خیال ہے دوستو! کچھ رقص و سرود کی محفل سج جائے.....؟“

”یس باس! مزہ دوبالا ہو جائے اس سنسنی خیز ایڈونچر کا۔“ ہمارے قریب کھڑے ہرکارے نے اپنے سرغنہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں اپنی باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا تو دوسرے ہرکارے نے بھی اس کی توثیق کر ڈالی۔ سرغنہ ہم یرغمالیوں کی طرف مڑا۔ بہت سے یرغمالی بے چینی سے کسمسا کر رہ گئے۔ میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر سرغنہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں مجھے شیطنت ناچتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ شیطانی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم میں سے کوئی ایسی عورت جو یہاں ہمیں اپنے اس ہاٹ اور سیکسی ڈانس سے محظوظ کرے..... خود ہی اُٹھ کر آ جائے، اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ..... اگر ڈانس اچھا ہوا تو اگلے شکار کی موت کا وقت کچھ آگے سرک سکتا ہے۔ کیونکہ اگلا شکار اب کوئی مرد نہیں بلکہ ایک جوان عورت ہو گی۔ اس طرح ڈانس کا فائدہ اُٹھا کر وہ لڑکی خود کو موت کے اس شکنجے سے بھی بچا سکتی ہے جو ایک خوفناک عفریت کی صورت اپنے اگلے شکار کا منتظر ہے۔ یوں اس کی باری نہیں آئے گی۔“

اتنا کہہ کر وہ انتظار کرنے لگا۔ میں پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے اس سفاک اور درندہ صفت خبیث سرغنہ کی بات سن رہا تھا۔ ”اسٹرپٹیز ڈانس“ انتہائی درجے کا واہیات بھرا ڈانس تھا جو مغرب کے پب اور کلبوں میں آبرو باختہ عورتیں کیا کرتی تھیں۔ جس میں فاحشہ عورت بیہودہ انداز میں ناچتی تھرکتی ہوئی ایک ایک کر کے اپنے جسم سے لباس نوچ پھینکتی تھی۔

ہال میں خاموشی طاری رہی تو سرغنہ کا چہرہ بگڑا اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”ہمم..... اس کا مطلب ہے کہ یہ انتخاب مجھے خود ہی کرنا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ شیطان یرغمالیوں میں سے ایک ایک عورت کو گرسنہ نظروں سے گھورنے لگا۔ ہر عورت اس سے نگاہیں چرانے لگیں، کیونکہ یہ کوئی کلب نہ تھا۔ نہ ہی یہاں کوئی آبرو باختہ عورت شامل تھی۔

اس رذیل کی گندی نظریں بالآخر میرے ساتھ چپکی ساچی پر پڑیں..... اور وہیں جم کر رہ گئیں۔ میرا دل بھی جیسے اسی وقت رک رک کر دھڑکنے لگا۔

”تم..... اِدھر آ جاؤ.....“

سرغنہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کی نال کا رخ اس کی طرف کر کے لہراتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا، ساچی کا کنول سا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ میں اس کے چہرے پر حیا و شرم کی لالی دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ شریف عورت، چاہے کسی ملک کی ہو، شرم اس کا زیور اور حیا اس کا حُسن ہوتی ہے۔

اب تک سب ٹھیک جا رہا تھا لیکن، اب شاید سب کچھ اُلٹ پلٹ ہونے والا تھا۔ میرے اندر کا کمانڈو اب میرے جسم کے رویں رویں کو تھرتھرانے لگا تھا، جوش اور غیظ و غضب کی دبی ہوئی چنگاریاں بھڑکنے لگی تھیں اور اب کسی وقت بھی وہ لاوے کی صورت بہنے اور سب کچھ بھسم کر ڈالنے کے لیے بے چین تھیں۔

”تم نے سنا نہیں..... لڑکی؟ اِدھر آؤ.....“ سرغنہ نے ساچی کو اسی طرح بے حرکت بیٹھے دیکھا تو درشت لہجے میں بولا۔ ساچی نے بمشکل سسکتے ہوئے اس سے لرزیدہ آواز میں کہا۔

”پپ..... پلیز! یہ میں نہیں کر سکتی، مم..... میں ایک شریف لڑکی ہوں.....“

”ہاہا..... ہاہا..... اسٹرپٹیز ڈانس بے باک لڑکی سے زیادہ..... شریف لڑکی کا ہی مجھے پسند ہے۔ ہو سکتا ہے اگلی باری تمہاری آ جائے، موت سے بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ تم ہماری بات مان لو.....“

”میں مرنا پسند کروں گی.....“ ساچی نے بے جگری سے جواب دیا۔ اس کے جواب نے میری مردانگی کو اُدھیڑ ڈالا جبکہ سرغنہ پُرطیش نظروں سے ساچی کو گھورنے لگا۔ وہ جارحانہ انداز میں ساچی کی طرف بڑھا اور میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دل تیزی سے دھڑ دھڑاتا محسوس ہونے لگا، میرے وجود میں جوار بھاٹا ابھرا اور کسی خوابیدہ آتش فشاں کے مانند میرے جسم میں جنبش ابھری۔ تب ہی اچانک ایک تیز نسوانی آواز ہال میں گونجی۔

”میں کروں گی اسٹرپٹیز..... ڈانس۔“

ہم سب سمیت سرغنہ..... کی ہی نہیں بلکہ دیگر یرغمالیوں کی نظر اس آواز کی طرف اُٹھتی چلی گئی۔ یہ وہی سنہرے بالوں والی... عورت تھی جس کے بے گناہ شوہر کو

تھوڑی دیر پہلے ہی بڑی بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔

’’واؤ...... ڈیش گڈ!‘‘ سرغنہ بھوکی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے خوش ہوکر بولا۔ سانچی کی طرف اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میرے وجود کی آتش فشانی تھرتھراہٹ بھی تھم سی گئی۔ سرغنہ اس عورت کی طرف بڑھا اور میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں بلکہ ہال میں موجود سبھی یرغمالیوں کی یک ٹک نگاہیں اسی عورت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

’’کیا مجھے یہ ڈانس اِدھر ہی کرنا ہوگا......؟‘‘ عورت نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میری نظروں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کسی زندہ لاش کی طرح کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ جیسے ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔

’’ہاں! اِدھر ہی کرنا ہوگا۔‘‘ سرغنہ نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کمینے پن سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بُوالہوسی کی چمک نمایاں تھی۔

’’باس......!‘‘ اچانک اس کے ساتھی نے کہا۔ ’’اس کا چہرہ تو پہلے ہی اُترا ہوا اور مایوس کن ہے۔ اس میں وہ چابک دستی کہاں ہوگی؟‘‘

اس کے ساتھی سنہرے بالوں والی عورت کے ڈانس کرنے سے خوش نہ تھے۔ وہ سانچی کو زیادہ پسند کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے۔

’’گدھو! تمہیں اسٹرپٹیز ڈانس کا کیا ذوق ہے۔ یہ ڈانس ایسی ہی عورت پر زیادہ جچے گا جو مایوس، ٹوٹی ہوئی اور اندر سے شکست خوردہ ہو...... ایسی عورت زیادہ قیامت خیزی، تیزی اور دیوانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔‘‘ سرغنہ بولا۔ مجھے وہ خبیث اس میدان کا کوئی زیادہ ہی پرانا پاپی محسوس ہو رہا تھا۔

عورت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی ہوئی ہال کے قدرے وسط میں آگئی اور اپنے جسم کو قدرے خم دے کر دونوں ہاتھ لہراتے ہوئے اُوپر اُٹھالیے۔

کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا کہ یہ بدنصیب عورت ہاری ہوئی تھی یا پھر کوئی کھیل کھیلنا چاہتی تھی۔ اس نے دھیرے دھیرے تھرکنا شروع کیا۔ دیگر عورتوں نے اپنے چہروں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ مردوں نے منہ موڑ لیا تھا۔

ایسے میں سانچی کی باریک آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

’’عورت کی تذلیل کا یہ منظر میں نہیں دیکھ سکتی۔‘‘ تبھی سنہرے بالوں والی عورت نے لہراتے ہوئے اپنے ہاتھ بلاؤز کے بٹن کی طرف، انہیں کھولنے کے لیے بڑھائے تھے، میری جلتی سلگتی نظروں کے سامنے سلوموشن کے انداز میں گزری ہوئی فلم کے مناظر فلش بیک کی طرح چمکے۔ پارلر میں فائرنگ، خون میں لت پت پڑی ہوئی لاشیں، عورت کے شوہر کا بے دردی سے قتل...... اس کے بعد اصل منظر ابھرا...... سب کچھ جیسے مجھے ہنوز سلوموشن میں ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ نجانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے جگایا۔ میں نے اپنی جگہ سے اس وقت حرکت کی جب سرغنہ سمیت اس کے دونوں ساتھی عورت کی طرف متوجہ تھے۔ سانچی کی پھٹی پھٹی نظروں اور تحیر آمیز انداز میں کھلے ہوئے منہ کے قریب سے میں تڑپ کر اُٹھ کے گزرا...... جھکا ہوا وجود میرا سیدھا ہوا...... دونوں بازو آگے کو لپکے...... جو سرغنہ کی گردن دبوچ لینے کے لیے اُٹھے تھے۔ میرا اور اس کا فاصلہ صرف چند قدموں کا رہا ہوگا کہ اسے اپنے عقب میں بڑھتے ہوئے خطرے کی بُو محسوس ہوئی۔ وہ اپنا مشین پسٹل والا ہاتھ اُٹھائے، عقب میں پلٹا، مشین پسٹل کی مہیب نال میرے چہرے کی طرف اُٹھنے لگی جس کے میں بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا اور پھر جیسے ایک دم ہی اُن جاں کش مناظر میں بجلی دوڑ گئی، اُدھر مجھے حملہ کرتے دیکھ کر سرغنہ کے حلق سے پُرغیظ سی دہاڑ سے مُشابہ چیخ ابھری، اِدھر میرے منہ سے بھی جوشِ لہو رنگ تلے غراہٹ...... برآمد ہوئی، مشین پسٹل کی نال عین میرے چہرے پر آئی تھی کہ... میرے آگے کو اُٹھے ہوئے ایک ہاتھ کے پنچ نے اس کے پستول کو دھکیلنے کے سے انداز میں وار کیا مگر تب تک سرغنہ...... نے ٹریگر دبایا، جدید ساختہ اسپیڈلوڈر مشین پسٹل گرجا، گولی چلی اور میری دائیں کنپٹی سے محض چند سوت کے فاصلے سے گزر گئی۔ مجھے اس کی آتشیں ’’جھپک‘‘ چہرے پر نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ اب اس کے بھیانک پسٹل کی نال ’’پوائنٹ بلینک‘‘ پر تھی، مگر تب تک میرے گھونسے کی ضرب سے وہ اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا۔ دوسرا بازو چشم زدن میں حرکت پذیر ہوا اور اس کا تنا ہوا مضبوط گھونسا سرغنہ کے چہرے پر پڑا۔ وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا مگر گرا نہیں......

میں جانتا تھا کہ یہ حرکت مجھے بہت مہنگی پڑ سکتی تھی۔ یہ سب موت کے ہرکارے تھے، ان پر خون سوار تھا۔ میری یہ حرکت، ان کی خوں ریز جبلت کو ہوا دینے کے لیے کافی تھی۔ قریب موجود اس کے دونوں ساتھی بیک وقت حرکت میں آئے اور اپنی ہیوی لوڈر رائفل کا رخ میری جانب موڑا مگر تب تک میں چکنے فرش پر لفٹ ہُک سوئپنگ کرتا، پھسلتا ہوا بیک وقت ان دونوں کی ٹانگوں سے جا ٹکرایا۔ وہ مجھ پر خوں ریز فائرنگ کی حسرت لیے بغیر فضا میں اُچھل کر گرے...... مگر غضب کے تربیت یافتہ ہونے کے سبب وہ خوفناک رائفلیں ان کی گرفت میں دبی رہیں، جن سے انہیں محروم کرنا میرے اس ورانہ وار حملے کا اہم مقصد تھا۔ یہ مقصد ’’فیل‘‘ ہوتے ہی میں نے بس نہیں کی اور فرش پر لیٹے لیٹے پشت کے بل پر ہی اپنی دونوں ٹانگوں کو ہیلی فین (دو پنکھ) کے انداز میں گردش دی۔ نتیجے میں وہ دونوں موت کے ہرکارے جنہوں نے گرتے ہی اُٹھ کھڑے ہونے میں چشم زدن کی تاخیر کی ہوگی، مجھ پر گولیوں کی ہولناک بوچھاڑ کے لیے پر تولے ہوئے تھے۔ ایک بار پھر میری گردش کرتی ٹانگوں کی زد میں آگئے۔ ایک کی ناف کے نچلے اور نازک ترین حصے پر پڑی تھی اور وہ کریہہ انداز میں چیختا ہوا، یرغمالیوں کی طرف جا پڑا جبکہ دوسرے کی رانوں پر ٹانگ لگی، وہ وہیں لہرا کر گرا تو اس کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر میرے قریب آن گری۔ ٹھیک اسی وقت سانچی کی چلاتی ہوئی آواز اُبھری۔

’’بچو......!‘‘

میں گن سنبھالتے ہی پارے کی طرح تھرکا اور ان کے سرغنہ کو دھیان میں لیے ہوئے اس کی طرف پلٹا ہی تھا کہ وہ اُڑتا ہوا فلائنگ کک کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اس کی دونوں ٹانگیں میرے سینے پر پڑیں اور مجھے یوں لگا جیسے میں فضا میں پرواز کر گیا ہوں...... ساتھ ہی مجھے اپنے سینے کی پسلیاں تڑختی ہوئی محسوس ہوئیں، ایسا لگا تھا جیسے میرے سینے کا پنجر کسی نے بھینچ ڈالا ہو۔ میں تقریباً اُڑتا ہوا متحرک زینے کی طرف جا پڑا اور میرے ہاتھ سے گن بھی نکل گئی۔ میرا سر اسکلیٹر کے کسی اسٹیپ سے ٹکرایا تھا اور میرے حلق سے چیخ نکل گئی۔ مجھے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ دیوہیکل سرغنہ ماہر فائٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ایک ہی داؤ نے مجھے جیسے ڈھا کر رکھ دیا۔ میں ایکا ایکی بلینک پوائنٹ سے برننگ پوائنٹ پر آگیا تھا۔ یعنی میں موت کے ان ہرکاروں کی زد میں آگیا تھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے سرغنہ کے ہاتھ میں اپنا مشین پسٹل نظر آنے لگا تھا جبکہ اس کے دونوں ہرکارے بھی اپنی گنز مجھ پر تان چکے تھے۔ ایک کی تو گن میرے ہاتھ آکر نکل چکی تھی۔ وہی اس نے موقع پاتے ہی جھپٹ کر اُٹھالی تھی۔

’’گولی مت چلانا......‘‘ سرغنہ کی دہاڑ گونجی۔ سانچی دوڑتی ہوئی میری طرف لپکی تھی کہ راستے ہی میں سرغنہ نے اسے اُچک لیا۔ وہ چیخی اور اب اس خونی شکرے کے ایک بازو کے شکنجے میں بے بس چڑیا کی طرح پھڑک رہی تھی۔

’’ہاہا...... ہاہا...... تمہارا بوائے فرینڈ تو بہت اسمارٹ نکلا۔ اب تو اسے بہادری کا خوب اچھی طرح مزہ چکھائیں گے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اس اثنا میں اس کے دیگر ساتھی بھی یہاں آگئے، مگر سرغنہ نے پُرغرور انداز میں انہیں واپس اپنی جگہوں پر جا کے کھڑا ہونے کا حکم دے ڈالا تھا۔ گویا میں اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ سرِدست نظر بھی یہی کچھ آرہا تھا۔

میرا سینہ ابھی تک دکھ رہا تھا۔ سر پر لگنے والی چوٹ نے الگ میرا دماغ دکھا رکھا تھا۔ میں سنبھلنے کی کوشش کرتا تو اِدھر اُدھر لڑھک جاتا۔ سرغنہ نے مجھ پر بڑا کاری وار کیا تھا۔ سانچی شاید مجھے سنبھالنے کے لیے لپکی تھی اور یہی اس کی فاش غلطی تھی کہ سرغنہ نے اسے میری ’’گرل فرینڈ‘‘ سے تشبیہ دے ڈالی تھی۔ ممکن تھا وہ پہلے بھی اسے میرے ساتھ دیکھ کر یہی سمجھے ہوں مگر اب انہیں یقین ہوگیا تھا۔

’’تمہاری بہادری تو ایک ہی ہلّے میں ہوا ہوگئی...... آؤ...... ذرا اپنی گرل فرینڈ کو چھو کے تو دکھاؤ......‘‘ سرغنہ نے مجھے طیش دلانے والے انداز میں کہا۔

میرا جلد سے جلد اپنے حواسوں میں آنا ازحد...... ضروری تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے اور سینے کو مسلا۔ بے ترتیب سانسیں بحال ہوئیں تو میں نے کچھ گہرے سانس لیے۔ سنبھل کر اُٹھا اور اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو کے بے خوفی سے بولا۔

’’تم اور تمہارے ساتھی ظلم و بربریت کا جو یہ گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہیں، اس کا انجام کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لڑکی کو چھوڑ دو...... یہ میری گرل فرینڈ نہیں ہے۔‘‘

’’واؤ...... ڈیش گریٹ! کیا خوب صورت ڈائیلاگ بولتے ہو۔ اب ذرا اپنی آنکھوں سے ایک خوب صورت منظر بھی دیکھ لو۔‘‘ سرغنہ نے حظ اُٹھانے کے انداز میں کہا اور اپنے شکنجے میں دبی ہوئی سانچی کا چہرہ اپنے قریب کر کے زبردستی وحشیانہ انداز میں ’’کِس‘‘ لے لی۔ وہ بے بس چڑیا کی طرح تڑپنے اور خود کو اس کے شکرے جیسی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

سانچی سے میرا کسی قسم کا کوئی جذباتی تعلق نہ تھا۔ وہ راہ چلتے مجھ سے ٹکرائی تھی اور بس...... لیکن اندازِ شناسائی کا کوئی تو ایسا پہلو تھا جس نے ہمیں ایک دوسرے کا ہمدرد بنا

دیا تھا۔

موت کے ہرکاروں کے اس وحشی سرغنہ نے سانچی کو قریب تر کرنے کے بعد کہا تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ خبیث اب میرے ''نام'' اور حوالے سے سانچی پر کیا قامت توڑنے والا تھا۔ تب ہی اچانک باہر سے فائرنگ کی گونج سنائی دی اور اسی وقت دو افراد دھپ کی آواز سے نیچے کھلے ہال کے چکنے فرش پر گرے۔ وہ خون میں لت پت تھے۔ سرغنہ اور اس کے دونوں ساتھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لاشوں کو گھورنے لگے۔ کیونکہ وہ انہی کے ساتھیوں کی تھیں۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے مشین پسٹل سے ہوائی فائرنگ کر ڈالی...... اب پتا نہیں ایسا اس نے اپنے دو ساتھیوں کی موت کے جنون اور غصے میں کیا تھا یا پھر اس نے کسی خطرے کی بُو سونگھ لی تھی کہ ہال کی چھت کی جانب فائرنگ کرنے کے اگلے ہی لمحات میں چار افراد جو چست نیلی کمانڈو وردیوں میں ملفوف تھے، ایک رسی کے سہارے نیچے لہرائے اور فضا میں معلق ہو گئے، ان کے جسموں سے خون ٹپکنے لگا جو سرغنہ کے مشین پسٹل کی گولیوں کا ہی شاخسانہ تھا۔ ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ پولیس نے کمانڈو ایکشن لیا تھا اور وہ ان کے چھت پر متعین دو ساتھی ہرکاروں کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد سیلنگ فال کے ذریعے نیچے اُترنے کی راہ تلاش رہے تھے کہ سرغنہ نے خطرے کی بُو اپنے دونوں ساتھیوں کے اُوپر سے نیچے ہال میں گرتے ہی سونگھ لی۔ وہ سب اس طرف متوجہ ہوئے تھے کہ میں مچھلی کی طرح تڑپا۔ اسی وقت مجھ پر گولیوں کی پوری باڑ پڑی، مگر میں تب تک ان غافل لمحوں کی اتنی سی بھی مہلت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسکلیٹر کے نیچے بنے خلا میں چلا گیا۔ گولیوں کی اندھا دُھند بوچھاڑ میرے تعاقب میں جاری رہی...... میرے اردگرد جیسے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میں نہتی حالت میں زیادہ دیر یہاں محبوس نہیں رہ سکوں گا...... اسی لیے میری تیزی سے گردش کرتی نظروں نے...... ایک اور آڑ کو تاڑا اور میں نے بہ سرعت اس جانب لیٹے لیٹے قلابازی کھائی اور ایک بڑے سے سیل کاؤنٹر کی آڑ میں چلا گیا۔

پولیس کا کمانڈو ایکشن...... نجانے کس حد تک پہنچا تھا، اس کا کچھ اندازہ تو یہی ہوتا تھا کہ وہ ناکام رہا ہے، کیونکہ اسی لمحے موت کے ہرکاروں نے اس طرف دستی بم لڑھکا دیے تھے، جن کی جھلک میں نے پاس کی کھڑکی سے دیکھی۔ وہ دستی بم پولیس کی گاڑیوں کے نیچے جا کر بلاسٹ ہوئے تھے اور میں نے دو پولیس گاڑیوں کو توفٹ بال کی طرح فضا میں اُچھلتے دیکھا۔

میرے تعاقب میں ایک ہرکارہ لپکا تھا۔ میں نے جھک کے اس کے پیروں کی جھلک دیکھی اور پیچھے سے رینگ کر اس پر جھپٹا۔ اس نے پلٹ کر گن کا بٹ مجھے مارنے کی کوشش چاہی تھی، مگر میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا، تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے میں نے اس کے پہلو میں مُکاّ جڑ دیا۔ ضرب قریب سے اور خاصی زوردار تھی۔ اس کے حلق سے کریہہ ناک سی چیخ خارج ہوئی، اگلا موقع تاک کر میں نے اس کی ٹھوڑی پر بھی ایک عدد مُکاّ جڑ دیا۔ شاید اس کا کوئی دانت ٹوٹا تھا یا پھر دانتوں تلے اس کی زبان آ گئی تھی۔ وہ ڈھے گیا، میں نے اس کی گن پر جھپٹا مارا اور وہ قبضے میں لیتے ہی اس کے آہنی کندے سے ایک فیصلہ کن وار اس کی کنپٹی پر کیا اور وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

اسی وقت گولی چلی اور ایک چیخ اُبھری، میں دھک سے رہ گیا کہ کہیں اس وحشی سرغنہ نے انتقاماً سانچی کو گولی نہ ماردی ہو۔

''یہ لاش باہر پھینک دو...... تاکہ پولیس کو اپنی مہم جوئی کا سبق ملے۔'' مجھے سرغنہ کی غضب ناک آواز سنائی دی۔

گن قبضے میں آتے ہی میں نے ایک آڑ سے اپنا سر ذرا اُبھارا تھا کہ یہ دیکھ سکوں اس بے رحم نے کس بدنصیب یرغمالی کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا ہے، اسی وقت مجھے کسی سائے کی جھپک دکھائی دی۔ میں چشم زدن میں جھکائی دے گیا۔ یہی وہ وقت جب مجھے سرغنہ کا مشین پسٹل والا ہاتھ لہراتا دکھائی دیا۔ میں اس کی مکاری اور بلا کی چابک دستی پر ایک لمحے کو اش اش کر اُٹھا۔ اس نے مجھے بلف کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ میرا دھیان ہٹا کر اس نے مجھے آڑ سے ابھرنے کا دانستہ موقع دیا تھا کہ وہ مجھے نشانہ بنا سکے۔ محض ایک پل کی تاخیر سے میں اس کے جھانسے میں آ سکتا تھا کہ میں نے اس پر اپنی رائفل کا بٹ رسید کر دیا۔ پسٹل ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں یکدم گن تھامے آڑ سے نمودار ہوا۔ میری گن کی نال سرغنہ کے سینے سے لگ گئی۔ اس کا دوسرا ساتھی ہرکارہ اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ یرغمالی پہلے ہی دہشت زدہ تھے ان سے اور وہ ایک جگہ پر ہی محبوس ہو کے بیٹھ رہنے پر مجبور تھے۔ جبکہ مجھے ایک تازہ لاش دکھائی دی۔ وہ جوان مرد کی تھی جسے ابھی ذرا دیر پہلے پولیس کا تحفہ دینے کے لیے سرغنہ نے ہلاک کیا تھا۔ جبکہ سانچی وہیں خوف زدہ سی کھڑی

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مرگِ ناگہاں نمبر

اس خاص شمارے میں وہ سب کچھ ہے جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں، آپ کو پڑھنا چاہیے۔

ان مشہور و مقبول شخصیات کی روداد جو بے وقت موت کا شکار ہوئے جنہیں عہدِ شباب میں موت اپنے ساتھ لے گئی

جنوری 2018ء کے اس شمارے کو آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہوں گے

سال کا پہلا شمارہ سب سے اہم شمارہ

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

تھی۔

‘‘گن رکھ دو۔’’ میں نے انگریزی میں سرغنہ کے عقب میں گن تانے اس کے ساتھی ہرکارے کی طرف دیکھ کر کہا۔ سرغنہ کا چہرہ مارے غیظ کے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کی خوں خوار نظریں میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر گن سنگل شاٹ پر کی اور فائر کر دیا۔ گولی نے سرغنہ کے کان کی لو اُڑا دی۔ اس کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ برآمد ہوئی اور اس نے خون آلود کان پر ہاتھ رکھ دیا، وہاں سے اب خون کے قطرے بہنے لگے۔ جدید ساخت کی گن کی پل میں ‘‘چال’’ بدلنے اور ٹھیک نشانہ داغنے پر اس کے ساتھی ہرکارے پر ہی نہیں بلکہ سرغنہ پر بھی اس بات کی دہشت بیٹھ گئی کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔

‘‘کک...... کون ہو تم......؟’’ سرغنہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر اب سناٹے اُترے ہوئے تھے۔

‘‘پہلے اپنے ساتھی سے کہو کہ گن پھینک دے۔ ورنہ دوسری گولی کا نشانہ تمہارا سینہ ہوگا۔’’ میں نے غراتے ہوئے سرغنہ سے کہا تو اس نے اپنے ایک ہاتھ کے اشارے سے ساتھی ہرکارے کو گن پھینک دینے کا کہا۔ اس نے فوراً گن فرش پر پھینک دی۔

ہال میں گن گرج کے بعد دھڑکا دینے والا سناٹا طاری ہو گیا۔

‘‘کون ہو تم؟ آرمی سولجر ہو یا ٹروپر......؟’’ سرغنہ سناٹے دار لہجے میں پوچھا۔

‘‘اپنی بکواس بند کرو اور اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر کے منہ دوسری طرف پھیر لو۔’’

‘‘کاسپاکو...... سے دشمنی تمہیں مہنگی پڑے گی۔’’ اس نے دھمکی دی۔ پتا نہیں یہ اس کا نام تھا یا اس کے باس کا، مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ میں نے ایک اور فائر داغ دیا۔ گولی اس کی بائیں ران پر لگی اور وہاں سے خون کا فوارہ بلند ہو گیا۔ ادھر یرغمالیوں میں سے بھی کچھ لوگوں کو جوش آ گیا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس پر جھپٹنے کے لیے لپکے، میرا دھیان اس جانب پلٹا تو سرغنہ نے جو اپنی زخمی ٹانگ پکڑے جھکا ہوا تھا، اس نے پھرتی سے دوسری ٹانگ کی پنڈلی سے بندھی نیام سے چاقو نکال کر میری طرف پھینکنا چاہا تھا کہ میری ٹریگر پر کپکپاتی اُنگلی نے حرکت کی۔ فائر ہوا اور گولی سرغنہ کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔ وہ تیورا کر گرا تو اس کے ساتھ کھڑے ہرکارے نے چیخ بلند کی۔

‘‘تم نے کاسپاکو کے اہم آدمی کو ہلاک کر کے بڑی بھیانک غلطی......’’ اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا، میری چلائی ہوئی گولی نے اس کی زبان بند کر دی...... وہ اپنا دائیں بازو پکڑے پیچھے کی جانب لڑکھڑایا، یرغمالی اس پر ٹوٹ پڑے اور دیگر بھی اُٹھے، کچھ نے باہر کی جانب دوڑ لگائی کہ پولیس کو مطلع کر سکیں۔ وہاں ہلچل مچ گئی۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں کھسک لیتا، لہٰذا میں نے گن پھینک دی اور ایک جانب کو دوڑا۔ عقب سے مجھے ساںچی کی پکار سنائی دی مگر میں کوئی پروا کیے بغیر ایک سنسان راہداری کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے جو کرنا تھا، وہ کر چکا تھا اور اب پولیس کی نظروں میں آئے بغیر میں یہاں سے خاموشی کے ساتھ نکل جانا چاہتا تھا۔ راہداری دور تک ویران تھی۔ اسی وقت مجھے عقب میں بھاری قدموں اور شور کی آواز سنائی دی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید پولیس اندر در آئی تھی۔ میں رکا نہیں مگر مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ جہاں میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکل سکتا کیونکہ یقیناً باہر بھی اس مال کے گرد پولیس کا گھیرا ہو سکتا تھا۔ سرِدست تو میں کسی چور دروازے کی تلاش میں تھا۔ مال کی راہ گزر سے میں کب آشنا تھا؟

اچانک مجھے عقب سے ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔

‘‘مسٹر شہزاد!’’

میں نے رک کر مڑ کے دیکھا اور بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ساںچی تھی اور دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے ہال میں مجھے پکارنے کے بعد میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

‘‘پلیز! ٹھہر جاؤ......’’ اس نے کہتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ بھی کیا۔ میں تو رکا ہوا ہی تھا۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

‘‘تم واپس چلی جاؤ۔ میں پولیس کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا۔’’ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

‘‘مگر کیوں......؟’’ وہ سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ‘‘تم نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اُن خطرناک لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہم سب پر احسان کیا ہے۔ پولیس تو تمہاری مدد کرے گی۔’’

‘‘مگر پولیس اسے تحفظ نہیں دے سکتی......’’ اچانک ایک اور نسوانی آواز اُبھری اور مجھ سمیت ساںچی نے بھی اس طرف دیکھا جہاں ایک قریبی آڑ سے میں نے اس سنہرے بالوں والی عورت کو نمودار ہوتے دیکھا تھا جس کے شوہر کو موت کے ہرکاروں نے بیدردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ بھی...... نجانے کس وقت ساںچی کے پیچھے یہاں تک چلی آئی تھی۔

اسی وقت پولیس اہلکاروں کے بھاری قدموں کی دھمک راہداری میں گونجی۔

‘‘یہاں سے نکل چلو...... کہیں اور بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں اس مسئلے سے متعلق...... آؤ مجھے ایک محفوظ جگہ معلوم ہے۔’’ سنہرے بالوں عورت بولی اور ہمیں اشارہ کرتے ہوئے راہداری کے سرے سے مڑ گئی، ساںچی تو سوچتی رہ گئی مگر میں نے فوراً اس عورت کی تقلید کی۔ میں اس کے پیچھے دوڑتا چلا گیا۔ وہ مجھے مختلف تنگ اور کہیں کھلی گزرگاہوں سے لے کر ایک ایسی جگہ پہنچی جو دوسری منزل پر واقع تھی۔

یہ ایک بڑا سا اسٹور تھا۔ ہم یہاں آ کر رک گئے۔ عورت دروازہ بند کرنے کے لیے بڑھی تو چونک گئی۔ ساںچی بھی دوڑتی ہوئی وہاں آ گئی تھی اور اسے گھورتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ عورت نے اس کے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

‘‘تم اسے یہ کیا پٹی پڑھا رہی ہو......؟’’ ساںچی نے عورت کو بدستور غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔ ‘‘تم نہیں جانتیں کہ اس طرح اس لڑکے کے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔’’ اس کا اشارہ میری جانب تھا۔ عورت جواب میں اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی تو میں نے ساںچی سے کہا۔

‘‘ساںچی! تمہیں میری مجبوری کا علم نہیں ہے۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم واپس لوٹ جاؤ اور ہمارا راستہ کھوٹا مت کرو......’’ میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ مگر ساںچی اس بار بڑے رسان سے بولی۔

‘‘تم تو ہمارے محسن ہو، میں بھلا تمہارا راستہ کیوں کھوٹا کروں گی۔ میں تمہاری بہتری کی بات کر رہی ہوں۔ لیکن تمہاری گواہی تمہارا بیان پولیس کے لیے ضروری ہے۔ وہ ظالم لوگوں کا پورا گروہ ہے۔ ان کے چند افراد کا پولیس کے ہتھے چڑھنا شاید کوئی معنی نہ رکھے مگر تمہاری گواہی......’’

‘‘آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو میری بات......’’ میں نے برہمی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات کاٹی۔ ‘‘میں ایک غیر ملکی ہوں اور یہاں سیر کی غرض سے آیا تھا، نہیں چاہتا کہ میں خود کو یہاں کسی بڑے چکر میں پھنسا دوں۔’’

‘‘لیکن یہ جو تم کر رہے ہو، اس سے تم بڑی مشکلات کا شکار ہو جاؤ گے، دیکھو مسٹر شہزاد! میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم کسی چکر میں نہیں پھنسو گے۔’’ وہ بولی۔

‘‘ہے مس!’’ سنہرے بالوں والی عورت نے اسے ٹوکا۔ ‘‘بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ اور ہمارے بارے میں پولیس کو کچھ مت بتانا۔’’

‘‘یو شٹ اَپ’’ ساںچی نے اسے جھڑک دیا اور گھورتے ہوئے بولی۔ ‘‘تم کیسی عورت ہو؟ وہاں تمہارے شوہر کی لاش پڑی ہے اور تم بجائے اس کی تدفین کرنے کے اس نوجوان کو غلط راہ پر لگا رہی ہو۔’’ عورت کو غصہ آ گیا اور اس نے ہونٹ بھینچ کر اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ ساںچی کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو گیا۔ اس نے شاید اسے تھائی زبان میں کوئی گالی دی اور ایسا ہی جواب دیا یعنی تھپڑ رسید کر دیا۔ دونوں خواتین گتھم گتھا ہو گئیں، میں گھبرا گیا۔ عجیب صورتِ حال ہو گئی تھی۔ بات ساںچی کی بھی غلط نہیں تھی مگر اسے جب میرے بارے میں معلوم ہو جاتا تو وہ وہی کرتی جو سنہرے بالوں والی یورپین عورت کر رہی تھی۔ جی میں تو آئی کہ میں ان دونوں کو لڑتا مرتا چھوڑ کر نکل جاؤں مگر مال کی بھول بھلیوں اور چور راستوں سے واقف نہ تھا جو واقف تھی وہ ساںچی کے ساتھ اُلجھ گئی تھی، بالآخر میں نے بڑی مشکل سے دونوں کو الگ کیا۔ وہ بپھری ہوئی لڑاکا بلیوں کی طرح ہانپنے لگیں۔ میں نے ساںچی سے کہا۔

‘‘دیکھو! مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......’’ پھر سنہرے بالوں والی عورت سے مخاطب ہوا۔ ‘‘مس......!’’

‘‘ہلینا نام ہے میرا......’’ اس نے نام بتایا۔

‘‘ہاں! مس ہلینا! چلو، مجھے محفوظ طریقے سے باہر نکلنا ہے۔’’

‘‘میں پولیس کو بتا دوں گی۔’’ ساںچی چیخی۔ ہلینا پھر اس کی جانب جارحانہ انداز میں بڑھی مگر میں نے اسے روک دیا اور پھر ساںچی کو ایک طرف دھکا دے کر ہم باہر نکلے۔ باہر سے احتیاطاً ہم نے دروازہ بند کر دیا۔

‘‘اس طرف......’’ ہلینا بائیں جانب ایک بند گلی جیسی مختصر اور تنگ سی راہداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ہم نے اس سمت چند قدم ہی اُٹھائے تھے کہ دائیں جانب زینہ نظر آ گیا۔ عقب میں ہمیں اسٹور کے بند دروازے کو دھڑ دھڑانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساںچی ابھی تک مجھے روکے ہوئے تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے تئیں مجھے مزید کسی پریشانی یا مصیبت سے بچانا چاہتی تھی۔ تاہم مجھے اس نوجوان بیوہ ہلینا پر حیرت تھی کہ آخر یہ کیا سمجھ کر میری مدد کر رہی تھی؟ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی کہ میں

نے اس کے شوہر کے قتل کا انتقام موت کے ہرکاروں کے سرغنہ کو ہلاک کر کے لے لیا تھا۔ لیکن پھر اگر ایسا تھا بھی تو اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، پھر یہ کیوں میری مدد کرنا چاہتی تھی؟ کیا اس نے اپنی زیرک دماغی سے میری کسی مجبوری کا خود سے ہی کوئی اندازہ قائم کر لیا تھا؟ پھر بھی میرا ذہن اس کی طرف سے کسی نامعلوم سی کھد بد میں مبتلا تھا۔

میں ان باتوں پر تیزی سے غور کرتا ہوا اس کے پیچھے زینے چڑھنے لگا۔ وہاں سے ہم ایک گودام نما کمرے میں آگئے یہاں گردسری کا ڈھیروں سامان بڑے بڑے ڈبوں اور کھلی حالت میں رکھا ہوا تھا اور بھی بہت کچھ ریختے کی صورت بکھرا ہوا تھا۔ یہاں مجھے ایک بڑا سا مستطیل روشندان نظر آیا وہاں ایک ریک رکھا ہوا تھا۔ اس میں کھانے پینے کی اشیا کے خشک ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ ہلینا نے ریک سے وہ سب ڈبے گرا دیے اور اس ریک پر چڑھ روشندان پر جا پہنچی۔ میں بدستور اس کی تقلید کر رہا تھا۔ اس نے روشندان کا سلائڈ ہونے والا پٹ تیزی سے کھسکایا اور نیچے جھانکا۔ اس کے بعد مجھے اشارہ کیا پھر وہ دوسری جانب کود گئی...... میں نے بھی ایسا ہی کیا اور دوسری جانب تقریباً پانچ فٹ نیچے ایک چھجے پر میں نے ہیلنا کو لٹکے ہوئے پایا۔ وہ بہت غور سے نیچے دیکھ رہی تھی پھر اس نے وہاں سے بھی نیچے چھلانگ لگا دی۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اب ہم ایک تاریک سی تنگ گلی والی سڑک پر کھڑے تھے۔

''تم اِدھر ہی ٹھہرو......'' وہ ہانپتے ہوئے بولی۔ ''میں مال کے مین گیٹ کی طرف جا رہی ہوں، کوشش کرتی ہوں اپنی گاڑی یہاں لے آؤں۔''

''نہیں، وہاں پولیس کی نفری موجود ہے۔ تم...... ایسا نہیں کر پاؤ گی۔'' میں نے کہا۔

''فکر مت کرو...... پولیس اپنے کام میں معروف ہو گی اس وقت...... اگر ناکا بندی ہوئی تو میں ایسے ہی لوٹ آؤں گی۔ ایک کوشش کر لینے دو، بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔'' اس نے کہا اور تیزی سے ایک طرف غائب ہو گئی۔ میں وہیں ویران جگہ پر ایک تاریک کنج کی طرف کھسک کر کھڑا ہو گیا۔ پولیس سائرن اور فائر بریگیڈز، ایمبولینس وغیرہ کے سائرن کی آوازیں یہاں تک آ رہی تھیں۔ میں بے چینی سے ہلینا کی واپسی کا منتظر رہا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ مجھے اس طرف سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں جہاں ہلینا گئی تھی۔ میں ٹھٹک گیا کہیں پولیس کی کوئی گاڑی نہ آ رہی ہو، میں تھوڑا اور تاریکی میں ہو کے دبک گیا۔ چند لمحے بعد ہی میں نے مذکورہ سمت سے ایک نیلی ...اسپورٹس کار کو تیزی سے مڑتے دیکھا۔ بدقسمتی سے اس کے تیز برقی لیمپس کی روشنی مجھ پر ہی پڑی تھی اور میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔ میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ کار میرے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رکی۔

''ہری اَپ! کم آن......!'' مجھے ہلینا کی آواز سنائی دی اور میں چونکا پھر بجلی کی سی تیزی سے کار کی جانب لپکا، اس نے اپنی سائڈ کا دروازہ پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ میں لپک کر بیٹھا اور میرے دروازہ بند کرتے کرتے وہ ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا چکی تھی۔

☆☆☆

ان سخت اعصاب شکن لمحات کے گزر جانے کے بعد جب کچھ سکون کی گھڑیاں نصیب ہوئیں تو مجھے اپنا پورا وجود ہی نہیں بلکہ ذہن بھی تھکا تھکا محسوس ہونے لگا۔ میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا دیا۔ بینکاک کی مصروف شاہراہوں، چمکتے دمکتے بازاروں اور گزرگاہوں پر رات پورے جوبن کے ساتھ اُتری ہوئی تھی۔ ایک موڑ کاٹ کر ہم نہر کے کنارے والی روڈ پر آ گئے۔ دائیں جانب ہمارے ایک موٹیل کی لمبی چوڑی عمارت تھی۔ نہر ہمارے بائیں جانب تھی۔ وہاں چند کشتیاں اور کروزر تیرتی پھر رہی تھیں۔ ایک کروزر پر تو میں نے باقاعدہ کلب کی طرح کی رونقیں تھیں۔ یہ اوپن کروزر تھی اور شاید اسی مقصد کے لیے بنائی گئی تھی کہ ''زمینی کلبوں'' سے ذرا ہٹ کر کچھ نیا کیا جائے۔ چمکتی ہوئی اس خوبصورت نہر کے اُوپر چاند کا سنہرا روپ عجب طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔

''یہ موٹیل کاسپاکو کا ہے......'' مجھے اس عمارت کی طرف گھورتا پا کر ہلینا نے بتایا۔ اس کے شہابی رنگت اور مخروطی اُنگلیوں والے ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے اور نگاہیں سامنے ونڈ اسکرین کے پار۔ اگرچہ اس نے ایک لمحے کے لیے میری طرف دیکھا تھا۔

''کاسپاکو......'' !میں زیرلب بڑبڑایا۔

''ہاں! وہی کاسپاکو...... جس کے بارے میں اس خونی قاتل کا ساتھی تمہیں دھمکا رہا تھا۔

''ہوں ں...... ں ں۔'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں تھوڑا پریشان سا ہو گیا تھا۔

''تم کیسے جانتی ہو اُسے......؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے ایک موڑ کاٹا۔ اب ہم ناریل اور اناس سے بھری تاریک سڑک پر آ گئے تھے۔

بمشکل ایک ڈیڑھ کلومیٹر کی ڈرائیونگ کے بعد مجھے ایک بڑے سے بورڈ پر ''کلیسی روڈ'' لکھا نظر آیا۔

''اس کمینے خبیث کو کون نہیں جانتا......'' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''بینکاک کا ہتّا کہلاتا ہے یہ...... بااَثر اتنا ہے کہ بڑے سے بڑا سرکاری اہلکار بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پایا ہے ابھی تک......'' میں اس کی بات سن کر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''وہ سامنے والی بلڈنگ میں میرا فلیٹ ہے۔'' اس نے جیسے باتوں کا سلسلہ دانستہ موقوف کرنا چاہا، میں سامنے دیکھنے لگا۔ ایک بڑے پروجیکٹ کا وسیع وعریض قطعۂ اراضی تھا۔ وہاں روشنیاں چمک رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر ''ہولی گارڈن'' لکھا ہوا تھا۔ اَن گنت فلیٹوں کی کھڑکیاں اور دروازے نظر آ رہے تھے۔ خاصی کثیرالمنزلہ عمارت تھی۔ اندر آ کر ہلینا نے کار کھڑی کی اور ہم اُترے۔ کئی مرد عورتیں اور بچے بوڑھے مٹرگشت کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ ایک جگہ ٹولی بنائے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ بچے کھیل میں مشغول تھے۔ سائیکلیں اور ''اسکوٹی'' چلا رہے تھے جو پاؤں سے اور بیٹری سے چلتی تھیں۔

ہم ایک لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے اور پھر ایک فلیٹ کا تالا کھول کر اندر آ گئے۔

ہلینا نے ایک بٹن دبایا اور روشنی ہو گئی، سامنے لاؤنج تھا۔ فلیٹ بس ٹھیک ہی تھا، یوں تو سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ضرورت کی ہر شے وہاں نظر آتی تھی مگر چھوٹا تھا۔ دو ہی کمرے مجھے نظر آ رہے تھے، اور درمیان میں یہ مختصر سا لاؤنج تھا۔ ہوادار تھا۔ مال میں یہ اپنے بچوں کا تذکرہ کر چکی تھی مگر وہ مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔

اچانک ہلینا کو کیا ہوا کہ وہ ایک صوفے پر گر گئی اور اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ شاید شوہر کے بغیر خالی فلیٹ کو دیکھ کر اس کا جی بھر آیا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ میرا اپنا ذہن انتشار کی زد میں تھا..... میں وزیر جان سے آخری حساب کرنے کی غرض سے فوکٹ کے علاقے اس کی محل نما رہائش گاہ کی طرف جانے کے لیے کاؤشی کے گھر سے نکلا تھا اور اب کہاں پھنس گیا تھا۔

فلیٹ کے محدود ماحول میں ایک ماتم کناہ سی افسردگی طاری ہو گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو مجھے ایک کونے میں پانی کا جگ اور کانچ کا گلاس نظر آ گیا، میں اُٹھا اور جگ سے گلاس میں پانی اُنڈیل کر ہلینا کے قریب آ گیا، پہلے اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر آہستگی سے رکھا، پھر جب اس نے اشک بار چہرہ اُٹھایا تو میں نے گلاس اسے تھما دیا۔ اس نے چند گھونٹ پانی کے حلق سے اُتارے اور ہولے سے تھینکس کہہ کر گلاس مجھے تھما دیا۔ میں اسے درمیان میں رکھی میز پر رکھنے کے بعد اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ہلینا خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے دھیرے سے کہا۔

''میں تمہارے دکھ کا اندازہ ہی کر سکتا ہوں کہ تمہارے ہنستے بستے گھر پر اچانک کیسی قیامت ٹوٹ پڑی۔ مجھے تمہارے شوہر کے مرنے کا بے حد افسوس ہوا ہے۔'' اس نے سامنے رکھے ٹشو باکس سے ایک ٹشو نکالا اور اپنے آنسو اور منہ پونچھتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں بولی۔

''خالی فلیٹ دیکھ کر دراصل میرا دل بھر آیا تھا۔ جوڈی کے بغیر اب یہ فلیٹ مجھے کھانے کو دوڑے گا۔ اس کی یادیں مجھے کافی دن بے چین رکھیں گی لیکن یہ تو سب میں برداشت کر لوں گی، مگر اپنے دونوں بچوں کو کس ہمت اور حوصلے سے بتاؤں گی ان کے لاڈ پیار اُٹھانے والا باپ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

بولتے بولتے اس کا لہجہ ایک بار پھر رندھ گیا۔ میرے پاس اس بدنصیب عورت کے لیے مزید اظہارِ افسوس کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں خود پریشان تھا۔ اُس نے بھی شاید کچھ ایسا ہی محسوس کر کے فوراً خود کو سنبھال لیا اور اُٹھتے ہوئے بولی۔

''تم اس کمرے میں جاؤ۔ اندر واش روم ہے فریش ہو لو تب تک میں کافی اور کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کافی ہی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے اسے کچھ بنانے کی زحمت سے بچانے کی خاطر کہا جانتا تھا کہ اس بے چاری کو تو اس بڑے صدمے کے بعد کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ رہا ہوگا، مگر وہ میری خاطر ہی کرتی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور پاس بنے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ میں کمرے میں آ گیا۔ سوئچ بورڈ ٹٹول کر میں نے پہلے لائٹ آن کی۔

کمرا بے حد مختصر سا تھا۔ نہ ہی ایسی کوئی اور شے جو بیڈروم کہلانے کے زُمرے میں آتی ہو۔ ہاں! اسے ایک آفس روم ضرور کہا جا سکتا تھا۔ بک شیلف، فائل ریکس، بڑی سی میز، کرسیاں اور اس پر رکھا کمپیوٹر مانیٹر، فون، کاغذوں

اور فائلوں کے انبار اور نجانے کیا کیا، بس دفتری امور کی چیزیں تھیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ دو میاں بیوی اور بچے اتنے مختصر سے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے، اُوپر سے ایک کمرے کو آفس کے لیے مخصوص کرلیا گیا تھا، توکیا فقط ایک ہی بیڈروم استعمال میں رکھا ہوا تھا؟ بچوں سے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ دوسرے کمرے میں سو رہے ہوں شاید۔ بہرحال...... سامنے مجھے باتھ روم کا دروازہ نظر آ گیا اور میں اس طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب میں واپس لاؤنج میں آیا تو میز پر کافی کا صرف ایک .... کپ اور کچھ کیک بسکٹ وغیرہ پلیٹوں پر رکھے ہوئے تھے، مگر وہ خود غائب تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنا چاہا تو اس کی آواز سنائی دی۔

”تم شروع کرو، میں آتی ہوں......“

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا جہاں سے مجھے ہلینا کی آواز آئی تھی، وہ بیڈروم تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر کا نصف منظر روشن اور دید کے سامنے تھا۔ وہاں مجھے ایک بیڈ بچھا نظر آیا جو خالی تھا۔ اس کے سامنے ہی مجھے باتھ روم کا دروازہ ادھ بھڑا ہوا دکھائی دیا، وہیں سے تھوڑا دروازہ کھول کر ہلینا نے مجھے لاؤنج میں آتے دیکھ کر ہانک لگائی تھی۔

میں کافی کی چسکیاں لینے لگا۔ کافی کی تلخی میں ایک عجیب سی کڑواہٹ کا احساس ہوا اور تھکن عنقا ہونے لگی پھر میں نے ایک بسکٹ بھی اُٹھا کر منہ میں داب لیا۔

تھوڑی دیر بعد ہلینا بھی فریش ہو کے آ گئی۔ اس نے پہلے کچن کا رخ کیا اور جب لوٹی تو اس کے ایک ہاتھ میں اپنے لیے گرما گرم کافی کا کپ تھا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اب ہلکے پھلکے گھریلو لباس میں تھی۔ پنک کلر کا ڈھیلا ڈھالا ٹراؤزر تھا اور اس پر کھلی ڈلی، آدھی آستینوں والی ڈارک کلر کی شرٹ تھی۔ ہاتھ منہ دھونے اور اپنے سنہری بالوں کو سلیقے سے سنوار کر آنے کے بعد اب اس کی کچھ صورت نکل آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے سانچی سے متعلق مجھ سے پوچھا کہ وہ میری کیا لگتی تھی...... نیز میرا اس سے کیا رشتہ تھا۔ میں نے اسے وہی کچھ بتا دیا جو سچ تھا کہ اس سے میری وجہِ ملاقات عمومی نوعیت کی قطعاً حادثاتی اور دورانیہ قلیل ترین تھا۔ جو بمشکل بیس منٹ پر ہی محیط تھا۔

”او......“ اس نے میرا یہ جواب سن کر قدرے حیرت بھرے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے۔ ”مگر...... اس کے تاثرات سے تو یہی جھلکتا تھا جیسے وہ تمہیں نجانے کتنے عرصے سے جانتی ہے اور تمہاری کتنی بڑی ہمدرد ہے۔“

”ہاں! بعد کے حالات اور واقعات نے شاید اسے میری کسی بات سے متاثر کیا ہو۔“

”پھر وہ تمہاری بہادری اور دلیری سے متاثر ہوئی ہو گی۔“

”ممکن ہے۔“

”تم کون ہو......؟“ اس نے اچانک مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”میں ایک پاکستانی ہوں اور سیر کی غرض سے یہاں آیا تھا۔“

”تم اب بھی کچھ چھپا رہے ہو۔“ وہ شک بھری نگاہوں سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہارا شکریہ!“ معاً ہی میں نے رخصت چاہنے والے انداز میں کہا۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”اوہ...... تم شاید برا مان گئے۔“ وہ تفکر سے بولی۔ ”میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ تم مجھے اپنے کسی اہم راز سے آگاہ کرو۔ لیکن میری بات سن لو جو میں تم سے کہنا چاہتی ہوں۔ پھر اگر تم جانا چاہو تو تمہاری مرضی۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر اس نے اپنے بارے میں تفصیل سے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔

ہلینا اور اس کا شوہر جوڈی ایچ...... ایک فارماسسٹ تھے اور انہوں نے ایم فل کر رکھا تھا۔ (ابتدا میں مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ...... پھر بھی وہ ایسے کابک نما فلیٹ میں رہتے تھے مگر پوری بات سننے کے بعد مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی)

ان کے دو نوعمر بچے تھے۔ بیٹا بیٹی۔ وہ لندن میں ہی تھے۔ وہاں ان کا اپنا گھر تھا جو مورگیج پر تھا اور خاصا بڑا اور لندن کے مہنگے ترین علاقے میں تھا۔ مورگیج کی قسط ہر مہینے دینا ان کے لیے مشکل ہونے لگا تھا۔ ایک گورنس رکھی ہوئی تھی۔ لندن میں ہی یہ میاں بیوی ایک بڑی ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی میں جاب کرتے تھے۔ اسی دوران کمپنی نے یہاں تھائی لینڈ میں اپنی کمپنی کی برانچ کھولی اور انہیں ٹرانسفر کر دیا، سیلری پیکیج پرکشش تھا اور دیگر مراعات بھی تھیں، یوں مورگیج کی قسطیں بھی بہ آسانی ادا کرنا ان کے لیے سہل ثابت ہونے لگا۔ دونوں یہاں آ گئے۔ مذکورہ کمپنی نے انہیں رہائش کے لیے فوکٹ کے علاقے ہل ٹاپ جیسے ماڈرن اور مہنگے علاقے میں گھر دے رکھا تھا۔ یہ وہیں رہتے تھے۔

کمپنی کے ریسرچرز گروپ گلے کے کینسر کے علاج میں مستعمل ہونے والی ایک دوا لانچ کرنا چاہتے تھے۔ جس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ اس دوا کی تیاری میں ایک خاص قسم کا کیمیکل استعمال ہونا تھا۔ چونکہ اس کیمیکل کا شمار ”نارکوٹیکس“ کی کیٹگری میں آتا تھا۔ اسی لیے اسے ڈرگ اینڈ نارکوٹیکس کنٹرول اتھارٹی کے ایکٹ کے مطابق رجسٹر کرانا ضروری تھا کہ وہ، یعنی مذکورہ فارماسیوٹیکل کمپنی اس Narcotics substance کو بہ غرض علاج (انسانی بھلائی) کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے ایسے کیمیکل کی تیاری اور حصول قانوناً ناممکن بات نہ تھی۔ جبکہ دیگر لوگوں کے لیے اس کیمیکل کا حصول ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے۔ اگر ہوتا بھی ہے تو اس میں دس گناہ اضافی خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

بدقسمتی سے یہ کیمیکل ہیروئن، میری جوانا اور دیگر منشیات میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جس سے ان کی (منشیات کی) افادیت دوچند ہو جاتی ہے اور یہ ڈرگ، منشیات کی مارکیٹ میں بہت مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ ہلینا کے شوہر جوڈی ایچ نے کمپنی کے توسط سے اس کیمیکل کا حصول اور تیاری کے سارے کام مکمل کر لیے تو کچھ پُراسرار لوگوں نے جوڈی سے خفیہ میٹنگ کی اور بھاری رشوت اور مراعات کا لالچ دیتے ہوئے اس کیمیکل کا حصول اور فروخت وغیرہ کے سلسلے میں بات کی۔

لیکن جب جوڈی پر یہ عقدہ کھلا کہ ان پُراسرار لوگوں کا تعلق بہت بڑے منشیات فروشوں کے سینڈیکیٹ سے تھا جن کا سربراہ کاسپاکو نامی ایک تھائی لینڈ کا انڈرورلڈ کنگ ہے۔ جب جوڈی نے ان کی بات ماننے اور ان کی بھاری رشوت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تو وہ خطرناک دھمکیوں پر اُتر آئے۔ جوڈی اور ہلینا نے پولیس سے رابطہ کیا تو اس ”جرم“ کی پاداش میں کاسپاکو کے آدمیوں نے ان کے گھر پر حملہ کیا۔ وہ پانچ افراد تھے اور انہوں نے ان کی ہل ٹاپ والی رہائش گاہ پر حملہ کر کے دونوں میاں بیوی کو زدوکوب کیا اور توڑ پھوڑ کرتے ہوئے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

یہ دونوں میاں بیوی اس علاقے میں شفٹ ہو گئے۔ اگرچہ خطرہ انہیں یہاں بھی تھا، کیونکہ کاسپاکو کے آدمیوں کو بھلا انہیں یہاں تلاشنے میں کیا مشکل پیش آسکتی تھی۔ تاہم فوری طور پر انہیں یہی جگہ مناسب لگی تھی کہ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا اور گھٹی گھٹی آبادی تھی۔ کچھ وقت یہاں سوچنے اور آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دینے کے لیے یہ جگہ انہیں بہتر محسوس ہوئی تھی۔

جوڈی نے اپنی کمپنی کے سربراہ سے اس خطرناک صورتِ حال سے آگاہ کیا تو انہوں نے انٹرپول سے رابطہ کیا۔ جس کے بعد ان لوگوں کی گرفتاری عمل میں لائی گئی جنہوں نے ان کے گھر پر دھاوا بولا تھا۔ وہ سب گرفتار تو کر لیے گئے مگر ان میں سے کسی نے بھی کاسپاکو کا نام تک نہیں لیا۔ لہٰذا اپنے انہی قیدیوں کی رہائی کے لیے کاسپاکو کے دوسرے آدمیوں نے مال پر ہلّا بولا تا کہ عام شہریوں کو یرغمال بنا کے اپنے گرفتار ساتھیوں کو رہائی دلائی جا سکے۔ چنانچہ ابھی یہ سب چکر درمیان میں تھا کہ یہ نئی اور اچانک صورتِ حال پیش آ گئی۔

میرے ایک سوال پر کہ اگر شاپنگ مال میں ہلّا بولنے والے بھی کاسپاکو کے آدمی تھے تو انہوں نے یا جوڈی اور ہلینا نے انہیں پہچانا کیوں نہیں؟ ہلینا نے اس کا بڑا سادہ سا جواب دیا تھا کہ وہ آدمی دوسرے تھے۔ کیونکہ کاسپاکو کے پاس آدمیوں کی کوئی کمی تو نہ تھی۔

”یہی وجہ تھی کہ جب ان کے سرغنہ نے تمہیں دھمکی دیتے ہوئے ”کاسپاکو“ کا نام لیا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکی تھی اور یوں میں تمہاری مدد میں دلچسپی لینے لگی۔“

”لیکن...... اس کے کہنے پر ”اسٹرپیٹیز“ جیسا بیہودہ ڈانس کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئیں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے یہ سوال نکل گیا تو وہ ایک بے تاثر سی مسکراہٹ سے بولی۔

”میں ان کا دل بہلانا چاہتی تھی، تا کہ کوئی موقع تاک کر ان سے اپنے بے گناہ شوہر کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔“ اس ضمن میں بہت سی باتیں اور نصیحتیں میرے ذہن میں اُبھری تھیں مگر اب اس بے کار موضوع کو طول دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہٰذا اس کی ساری جیون کتھا سننے کے بعد میں غور کرنے لگا کہ میں اس پر کس حد تک بھروسا کر سکتا ہوں؟ آخری فیصلہ میرا یہی تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا اور اس سے جان چھڑانے کی کوشش کروں گا۔

”مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب سن کر......“ میں نے

گفتگو کو درمیانی موڑ دیتے ہوئے اس سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔ ”اب تو سب کچھ ہی ختم ہوگیا ہے اور میرا تمہیں نیک مشورہ بھی یہی ہوگا کہ تم...... اپنے شوہر کی تدفین وغیرہ کے بعد واپس لندن چلی جاؤ......“

”میں کاساپو کو سے انتقام لینا چاہتی ہوں اور اس کے لیے مجھے تمہارے جیسے دلیر فائٹر کی ضرورت ہے۔“ وہ بولی۔

میں نے جواباً ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

”میں یہاں کسی سے جھگڑا مول لینے کے لیے نہیں آیا ہوں اور یوں بھی میں عارضی طور پر یہاں ہوں، اب تو مجھے قبل از وقت ہی جانا پڑے گا۔“

”میں تمہیں معاوضہ دوں گی...... منہ مانگا......“

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کی بات کو صرفِ نظر کرتے ہوئے بولا۔ ”میں اب چلوں گا لیکن، میرے مشورے پر غور کرنا، اسی میں ہی تمہاری بھلائی ہے کیونکہ تمہارے بچوں کو اب تمہاری ضرورت ہوگی۔ بائے۔“ میں دروازے کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو......“ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں تمہارے لیے بھاری معاوضے کی پیشکش کے ساتھ تمہاری ہر طرح سے دل بستگی کا بھی خیال کروں گی۔“

ہلینا کی اس عامیانہ بات پر میری طبیعت منغض تو ہو ہی گئی تھی مگر مجھے اس پر بے حد ترس آیا اور افسوس بھی ہوا کہ ایک عورت اپنے مطلب کی برآوری کے لیے اس حد تک بھی خود کو گرا سکتی ہے۔ کیونکہ میں اس کی ”دل بستگی“ کی بات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ انتقام نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے اُمید اسی لیے لگا بیٹھی تھی کہ اس کی نگاہوں نے میرے اندر کے جنگجو انسان کو تاڑ لیا تھا۔

میں دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے رکا اور اس کی جانب مڑا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم نے میرے مزاج اور طبیعت کے بالکل برخلاف ایسی بات کہہ ڈالی کہ اب تو میں یہاں ایک لمحہ بھی رکنا پسند نہیں کروں گا لیکن میں تمہیں پھر بھی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ خاموشی سے واپس لندن چلی جاؤ۔ تم ابھی جوان ہو، پڑھی لکھی ہو اور اچھے عہدے پر فائز ہو۔ رہی انتقام کی بات، تمہارے شوہر کا اصل قاتل میرے ہاتھوں جہنم رسید ہو چکا ہے۔ رہا کاساپو کو تو میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا نہ ہی مجھے ضرورت بھی ہے، لیکن بہرحال وہ ایک بڑا گینگسٹر ہے اور تم اتنے بڑے اور خطرناک ....گروہ سے تنہا نہیں لڑ سکتیں۔“

”سوری! میں اپنے عامیانہ الفاظ واپس لیتی ہوں، میں تمہیں غلط سمجھی تھی۔“ وہ خفیف سی ہو کے بولی۔ ”لیکن...... کاساپو کو نے ہماری زندگی اجیرن کر رکھی تھی...... تت...... تم نہیں جانتے کہ اس خبیث نے میرے ساتھ کیا کیا تھا۔ میں نے تمہیں یہ حقیقت بتانا غیر ضروری سمجھا تھا لیکن اب بتائے دیتی ہوں کہ جس رات اس کے آدمیوں نے ہماری رہائش گاہ پر ہلّا بولا تھا اسی رات وہ مجھے کاساپو کو کے حکم پر کڈنیپ کر کے بھی لے گئے تھے۔ وہاں پہلے کاساپو کو نے مجھے روندا اس کے بعد اس کے حواریوں نے میرا گینگ ریپ کیا۔ پھر مجھے صبح منہ اندھیرے میری... رہائش گاہ کے دروازے پر ادھ موا کر کے پھینک گئے۔ میں جیسے تیسے اندر داخل ہوگئی۔ جوڈی موت و زندگی کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ظالموں نے اسے بہت مارا تھا۔“

وہ اپنی یہ دردناک داستان سنا کے ایک بار پھر رو پڑی۔ مجھے بڑا دکھ ہوا اور پھر میں نے اس کے سامنے اپنا وہی مشورہ دہرا دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے عقب سے اس کے رونے کے سسکنے کی آوازیں آتی رہیں۔

میں نے دروازے کے ہینڈل کی طرف ابھی اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک کال بیل بج اُٹھی۔ میں دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا اور گردن موڑ کر ہلینا کی طرف دیکھا۔ وہ سسکنا چھوڑ کر اسی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے میری سوالیہ نظروں کا مطلب سمجھتے ہی اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ دروازے پر میجک آئی نصب تھی، میں نے اس پر آنکھ چپکا دی، مگر دھند کے سوا کچھ نظر نہ آیا، دفعتاً ہی میری چھٹی حس پھڑکی۔ میجک آئی پر چھائے ہوئے ”فوگ“ پر مجھے شبہے کا احتمال ہوا مگر دوسرے ہی لمحے میری محتاط اور چوکنی ہوئی سماعتوں سے دھمی سی آواز ٹکرائی، اگلے ہی پل میں میرا وجود سنسنا اُٹھا۔

یہ کسی آہنی ہتھیار کے ”چال“ کے بدلنے کی وہ مخصوص آواز تھی جسے پہچانتے ہی میں نے یک دم دائیں جانب جست لگائی۔ ہلینا دروازے کے قریب آچکی تھی۔ اس کی مجھے ہلکے سے کراہنے کی آواز آئی، ایک سماعت شکن برسٹ فائر ہوا، یہ ہیوی گن چلنے کی آواز تھی۔ اُدھر میں کچن کی طرف جا پڑا اور بہ سرعت پلٹا۔ دروازہ ٹوٹ کر ڈھے چکا تھا اور ہلینا کا لہو آلودہ جسم لہراتا ہوا صوفے پر آڑا ترچھا جا پڑا تھا۔ دو فل بلیک ماسک پوش بھاری گنز تھامے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ان دونوں کے مخصوص گیٹ اَپ سے مجھے جانا پہچانا اندازہ ہوا مگر یہ خطرناک گھڑی زیادہ غور کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ دونوں نے اِدھر اُدھر گردن گھماتے ہوئے میری شاید جھلک دیکھ لی تھی، جب میں کچن کی طرف بنی بالکونی کی جانب تیزی سے رینگ گیا تھا کیونکہ اسی پل اس طرف... برسٹ فائر ہوا تھا، تب تک میں بالکونی کی طرف کھلنے والے جالی دار شٹر کو دھکا دے کر ریلنگ سے خود کو نیچے اُتارنے میں مصروف ہو چکا تھا۔ شکر تھا کہ ریلنگ پر گرل نصب نہیں تھی، وہ اوپن تھی، ورنہ یہ ذرا سی کچن کی جگہ میرے لیے چوہا دان بن کر رہ جاتی اور موت بانٹنے والے ہرکارے مجھے پل کے پل چھلنی کر ڈالتے جن کا تعلق مجھے انہی ہرکاروں سے ملتا جلتا ہی محسوس ہوا تھا جنہوں نے مال میں دھاوا بولا تھا۔

میرا دل موت کی دستک دیتا تیزی سے دھڑ دھڑا رہا تھا۔ مجھے اسی پھرتی سے کام لینا تھا جس پھرتی سے وہ خونی دراندازداخل ہوئے تھے۔ ورنہ دروازے سے کچن تک کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔

میری گردشی نظروں نے بلندی کا اندازہ کیا جو خاصی تھی مگر نیچے ہی ایک فلیٹ کی کھڑکی کا مجھے چھجا نظر آیا، فوری طور پر میں نے اسی پر چھلانگ لگا لی۔ دونوں ہرکارے اگر وہی تھے جن کے ”قبیل“ کا مجھے شبہ تھا تو میں اس وقت ٹاپ کرمنلو کی زد میں تھا جو پلک جھپکتے ہی موت بانٹتے تھے۔ چھجے پر گرتے ہی میں نے اُوپر سر اٹھایا تو ایک سیاہ نقاب میں لپٹا چہرہ اپنی گن کی نال سمیت دکھائی دیا۔ وہ اُوپر سے مجھے نشانہ لینے کے لیے پر تول رہا تھا۔ لیکن اس کی راہ میں چھجا تھا۔ اس نے اندھا دھند فائرنگ کر دی۔ میری تیزی سے گردش کرتی نظریں محفوظ مقام یا آڑ تلاش رہی تھیں اور تو کچھ نہیں مجھے اسی چھجے کی جہاں میں ٹکا ہوا تھا، کھڑکی کا بند شیشہ نظر آیا۔ میں اسے توڑتا ہوا جیسے ہی اندر کودا۔ عقب میں چھجے کا بڑا سا ٹکڑا ٹوٹ کر گرا، یہی وہ وقت تھا جب میں نے اسی ہرکارے کو بھی اس پر چھلانگتے دیکھا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر ہی وہیں ٹکے ٹکے...... مجھ پر برسٹ چلا دیا۔ میرے دائیں بائیں فرش پر چنگاریاں اُڑیں اور میں سانپ کی سی تیزی سے لڑھکنیاں کھاتا ہوا، ایک بڑے سے بیڈ کی طرف چلا گیا، مگر جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ یہ کمرا جو سرِدست مجھے کسی اور انسان کے وجود سے یکسر عاری نظر آتا تھا، میرے لیے چوہے دان بن سکتا ہے۔ میرے ذہن نے پل کے پل کھڑکی کے باہر چھجے پر ٹکے ہرکارے کی ”پوزیشن“ کا اندازہ کیا اور قریب دھری ایک قدرے بھاری کرسی اُٹھا کر بڑے زور سے اُچھال دی۔

ہرکارے نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کمرے کا سائز مجھے اس کی نظروں اور گن کی رینج سے دور نہیں کر سکتا، اسی سبب اس نے کمرے میں داخل ہونے کے لیے مجھے اپنی گن سے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ میری چال میں آگیا۔ میری پھینکی ہوئی کرسی خاصی تیزی کے ساتھ اس سے جا ٹکرائی تھی، وہ عقب میں گرتے گرتے بچا تھا کہ...... اس کوشش میں اس کے ہاتھوں سے گن چھوٹ کر نیچے جا رہی۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھلا ہوا ایک پیراٹروپنگ انداز میں قلابازی کھاتا اندر کود پڑا تو میں نے بھی اسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اُچھل کر اس پر جست لگائی، جب تک اس کے قدم کمرے کے فرش پر ٹکتے، میں اسے بری طرح رگید چکا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اس کی وحشیانہ درندگی پر مغلوب الغضب ہو کے میں نے اس کا سر بھی بڑے زور سے دیوار سے ٹکرا دیا تھا۔ ”بچاک“ کی آواز کے ساتھ ہی اس کا سر پھٹ گیا اور وہ وہیں بے حرکت ہو گیا۔ اعصاب شکن لمحات میں میرا اُرواں رُواں مثلِ پارا متحرک رہا تھا۔

یہ فلیٹ شاید خالی تھا، ورنہ اب تک کی ہڑبونگ سے کوئی نہ کوئی سامنے آہی چکا ہوتا۔ مجھے اس کے دوسرے ساتھی ہرکارے کی طرف سے خطرہ تھا۔ اس کے اچانک غیاب پر میں یہی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ دوسری جانب سے مجھے گھیرنے کی کوشش میں کمرے سے ہی پلٹ گیا ہوگا۔ میں نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ ان کی بناوٹ ایک ہی جیسی تھی۔ جیسی اُوپر والے فلیٹ کی تھی۔ اب وہاں ہلینا کی لاش کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کے انجام پر نہایت افسوس تھا۔ کچھ ایسا ہی لگا تھا مجھے کہ یہ لوگ کاساپو کو کے ہی ہرکارے تھے۔ یا تو وہ ہمارے تعاقب میں یہاں تک آئے تھے، یا پھر انہوں نے پہلے ہی سے اس فلیٹ کی ریکی کر رکھی تھی اور دوسری بار حملہ کرنے کی نیت سے آئے تھے۔

ابھی ان سب باتوں پر غور کرنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میں ایک پھندے سے نکلا تو دوسرے میں پھنستا جارہا [illegible]

ٹھیک اسی وقت باہر نیچے مجھے پولیس گاڑیوں کے چیختے ہوئے سائرن کی آوازیں سنائی دیں۔ ایک نئی مصیبت میرے گلے کو آن پڑی تھی۔ میں دروازے کی طرف لپکا۔ کھول کر اسے ذرا باہر جھانکا۔ حسبِ توقع باہر قریب کے فلیٹوں سے نکلے ہوئے لوگوں کا شور مچا ہوا تھا۔ دوسرے ہرکارے کے بارے میں میرا یہی خیال تھا کہ ہلینا کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد وہ لوٹ گیا ہو مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا یہ خیال رد کر دیا۔ وہ اپنے ساتھی کی تلاش میں تو ہوگا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پولیس کی آمد پر کہیں دبک گیا ہو۔ کچھ بھی سہی وہ میرے لیے کسی وقت بھی موت کا پیامبر ثابت ہوسکتا تھا۔

اگر یہ کاسپا کو کے ہی آدمی تھے اور نہیں ہلینا کو قتل کرنے کا ٹاسک ملا ہوا تھا تو...... وہ اپنا کام کر چکے تھے لیکن غور طلب بات یہ تھی کہ آخر ایسا اُنہوں نے کیوں کیا؟ ہلینا اور جوڈی (جب وہ زندہ تھا) ان کو ہلاک کرنا ان کے مفاد میں نہیں ہوسکتا تھا۔ یا پھر... صرف دھمکی کے طور پر صرف ہلینا کو ہی موت کے گھاٹ اُتارنا ان کا مقصد رہا ہو (ابھی انہیں شاید یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ جوڈی بھی مارا جاچکا ہے)

کاسپا کو...... بیک وقت دو محاذوں سے برسرِ پیکار تھا۔ ایک طرف اس نے اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے ایک بڑے شاپنگ مال پر اپنے ساتھیوں کے ذریعے دھاوا بولا تھا اور دوسری جانب اس نے اپنے دو ہرکارے...... ہلینا کے فلیٹ کی جانب روانہ کردیے ہوں جس کی ریکی وہ پہلے کر چکے تھے۔

میں نے اس سارے چکر پر لعنت بھیجی، کیونکہ اب برٹش جوڑے کی ہلاکت کے بعد یہ معاملہ ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ رہا میں...... تو وہ مجھے ہلینا کا کوئی عام دوست وغیرہ سمجھے ہوں۔

میرے لیے اب یہاں سے نکلنا ازبس ضروری ہو چکا تھا۔ میں نے کچھ سوچا اور باہر آ کر عام لوگوں میں گھل مل گیا۔ پولیس اہلکار تیزی سے اُوپر چڑھتے آرہے تھے اور لوگ اسے ہلینا کے فلیٹ کی طرف اشارہ کر کر کے تھائی زبان میں کچھ بتا رہے تھے۔ میں موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے باہر نکل چکا تھا اور ابھی باؤنڈری وال کے اندر ہی تھا، یہاں بھی وسیع احاطے میں لوگ جمع تھے۔ مجھے پولیس کی دو گاڑیاں ... کھڑی نظر آئی تھیں۔ گیٹ پر بھی چند پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک وائرلیس سیٹ پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ تھائی پولیس کی گیٹ پر ناکابندی دیکھ کر میں پریشان سا ہوا تھا، تاہم...... لوگوں کے ہجوم میں گھس کر میں دائیں بائیں نکاسی کا کوئی اور راستہ تاڑتا ہوا باؤنڈری وال کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا دیوار پھلانگ کر باہر نکل ہی آیا اور رات کی سرد تاریکی میں اندھیری گلیوں سے گزرتا مین شاہراہ پر آ گیا۔

مجھے ٹیکسی کی تلاش تھی جو جلد ہی ایک چھوٹے سے بار کے سامنے کھڑی مل گئی۔ میں اس میں سوار ہوگیا اور ڈرائیور کو گلیسی اسٹریٹ چلنے کا کہا۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ میں پچھلی سیٹ پر براجمان تھا اور تھکے تھکے انداز میں میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا دیا مگر آنکھیں کھلی رکھی تھیں۔

میں وزیر جان کو ٹھکانے لگانے کے لیے آج شام گھر سے کاؤشی کے دڑبا نما گھر سے نکلا تھا اور کہاں جا پھنسا تھا۔ انہی پریشان کن خیالات کی رو میں پتا ہی نہ چلا کہ کب ٹیکسی رکی اور ڈرائیور نے مجھے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گلیسی اسٹریٹ آنے کی خبر دی۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اب آگے کس طرف چلنا ہے۔ میں نے منع کر دیا اور کرایہ ادا کر کے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ راستہ تاریک اور سنسان تھا۔ اسٹریٹ لیمپس کی روشنی میں کاؤشی کے گھر کی جانب بڑھتے ہوئے میں.... اِدھر اُدھر محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے.... آگے بڑھتا رہا۔

گھر کے دروازے پر پہنچ کر میں ٹھٹکا۔ دروازے پر تالا نہیں تھا۔ جس کا مطلب تھا کاؤشی آیا ہوا تھا۔ مجھے تھوڑی حیرت ہوئی۔ ممکن تھا وہ مجھ سے کوئی اہم بات کرنے آیا ہو۔ ورنہ تو اس نے دو تین روز بعد آنے کا کہہ رکھا تھا۔ مجھے پریشانی بھی ہوئی کہ وہ مجھے اس طرح رات گئے باہر دیکھ کر ناراض بھی ہوگا۔ مجھے فکر بھی تھی کہ کہیں میری آج کی بھاگم دوڑ اس کے سامنے میڈیا یا اور کسی ذرائع سے آشکارا نہ ہوگئی ہو۔ ایسی صورت میں وہ معاہدہ بھی ختم کرسکتا تھا جس کی تنبیہ وہ پہلے ہی مجھے کر چکا تھا۔

بہرحال...... میں نے دروازے پر دستک دینی چاہی تو وہ کھلا ملا۔ یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میں نہایت محتاط انداز میں اندر قدم رکھے داخل ہوا۔ لاؤنج میں مدھم روشنی تھی۔ وہاں میں نے کسی کو بیٹھے پایا۔ سامنے میز پر وہسکی کی بوتل اور ایک ادھ بھرا پیگ رکھا ہوا تھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی۔ وہ کاؤشی تھا۔ میں آگے بڑھا اور سوئچ بورڈ کی جانب ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کردی۔ اگلے لمحے جیسے میری ریڑھ کی ہڈی میں سیکڑوں چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔ کاؤشی کی آنکھیں پھٹی پھٹی انداز میں کھلی ہوئی تھیں، پشت صوفے سے ٹکی ہونے کے سبب اس کا سر بھی سیدھا ہی ٹکا ہوا تھا یا اس طرح ٹکایا گیا تھا جیسے پہلی نظر میں یہی لگے کہ وہ آرام سے بیٹھا ''شغل'' میں مصروف ہے لیکن قریب اور روشنی میں دیکھنے پر ایک لرزا دینے والا منظر میرا منتظر تھا۔ کاؤشی کے سینے میں عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر دھنسا ہوا تھا۔ ابھی میں سنسناتی گھڑیوں کی زد میں ہی تھا کہ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرے عقب میں کوئی موجود تھا۔ خطرے کا احساس ہونے تک کوئی قیامت سی میرے سر پر ٹوٹی تھی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آخری سین

مہتاب خان

شوبز کی چمکتی دمکتی دنیا کی روشنیاں ہر شخص کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہیں... وہ نوعمر تھی... نادان تھی اور ایک فنکار کی ایسی مداح و پرستار تھی جس کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے... وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ اس کے خوابوں کا دیوتا کیسی بلندی اور کیسی پستی کا شہ سوار ہے...

ہر چال پر عمل کا وقت آتا ہے اور اس نے اپنی چال پر عمل کر ڈالا تھا......

خرم شہزاد ٹی وی ڈراموں کا مشہور ترین اداکار تھا۔ وہ نہ صرف ایک مقبول فنکار تھا بلکہ مانا ہوا مصنف اور کامیاب پروڈیوسر بھی تھا۔ اس کا اپنا شاندار اسٹوڈیو تھا۔ وہ اپنے ڈراموں کی کہانی خود لکھتا اور خود ہی اسے ڈائریکٹ بھی کرتا تھا۔ اس کا لکھا ہوا کوئی ڈراما کبھی ناکام نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے لکھے زیادہ تر ڈراموں میں ہیرو کا کردار خود ہی

آوارہ گرد

قسط نمبر: 44

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی متی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ہوا دلچسپ سلسلہ...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہوجاتے ہیں، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کرلیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی

ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر ئل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد لسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچادیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، زی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو تا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا ہر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی ربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر یتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے مگر سوشیلا کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم بری مسلمانوں کے قتل کا اسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور ملک ایئرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہوش میں آنے پر مجھے سب سے پہلا احساس شدید قسم کی ٹیس کا ہوا تھا، جو میرے سر کے پچھلے حصے سے اُٹھتی محسوس ہوئی تھی، یہی وجہ تھی کہ ہوش آتے ہی میرے حلق سے بے اختیار ایک درد بھری کراہ سی خارج ہوگئی تھی۔

میں نے اپنے بے سدھ .... پڑے جسم کو جنبش دی اور اپنا ایک ہاتھ سر کے زخم پر رکھا تو وہاں مجھے چپچپاہٹ سی محسوس ہوئی، ایک عقدہ یہ بھی کھلا کہ میں رسن بستہ حالت میں نہیں تھا۔

تھوڑی دیر تک تو میرا ذہن ماؤف سا رہا، کچھ سجھائی نہیں دیا کہ میں یہاں اور ایسی حالت میں کیوں تھا؟ لیکن پھر رفتہ رفتہ جب عقل وخرد کا یارا نیم خوابیدہ ذہن کے ساتھ جڑنے لگا تو مجھے سب یاد آتا چلا گیا کہ میں کس طرح تھائی لینڈ آتے ہی بڑے دھواں دھار حالات کا شکار ہوگیا تھا۔ اپنے ازلی دشمن وزیر جان سے ڈرامائی مڈبھیڑ بینکاک کے ایک بڑے اور معروف ترین شاپنگ مال میں خطرناک کرمنلو کے نرغے میں آنا اور کاؤسپا کو نامی ایک بڑے گینگسٹر کے آدمیوں سے خوف ناک ٹکراؤ، سانچی سے ملاقات کا ایک لطیف سا احساس، اور ہلینا کی دکھ بھری کہانی اور اس کا دردناک انجام......لیکن اس سے بھی بڑھ کر میری آنکھوں میں جو لرزہ خیز منظر ثبت ہوکے رہ گیا تھا وہ کاؤشی کی رہائش گاہ میں اس کی مردہ حالت کا تھا اور ابھی میں اس کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے وہاں خطرے کا احساس ہوا جسے بھانپنے تک میں خود نامعلوم قاتل یا حملہ آور کی اپنے سر پہ پڑنے والی شدید ضرب کا شکار ہوکے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوتا چلا گیا.....

سب سے زیادہ فکر و تشویش کی صورتِ حال میرے لیے کاؤشی کا قتل تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر میرا تھائی لینڈ سے آگے امریکا کا سفر کھٹائی میں پڑسکتا تھا...بلکہ پڑ ہی چکا تھا۔ اب یہ یہی ہوسکتا تھا کہ پاکستان ٹیلی فونک رابطہ کرکے زہرہ بانو اور زور آور خان کو ساری صورتِ حالات بتاتا اور وہ کوئی اور تدبیر سوچتے۔ دوسری فکر مجھے اس بات کی ہورہی تھی کہ میرے تھائی لینڈ کے سفری کاغذات کاؤشی کی رہائش گاہ میں پڑے رہ گئے تھے۔ نیز ایک پریشانی مجھے یہ بھی کھائے جارہی تھی کہ کہیں میں مال میں ہونے والی خون ریزی کے سلسلے میں ہونے والی متوقع تفتیش کی لپیٹ میں نہ آجاؤں، اگرچہ کچھ تسلی تو تھی کہ میں چپ چپاتے ہلینا کے ساتھ نکل آیا تھا اور یقینی طور پر ہماری کوئی تصویر سی سی ٹی وی کیمرے میں نہیں آئی ہوگی، کیونکہ کرمنلو نے سب سے پہلے اندھا دھند فائرنگ کے دوران سی سی ٹی وی کیمرے کو ہی نشانہ بنایا تھا۔ الگ بات تھی کہ میرا چونکہ ان دہشت گرد کرمنلو کے ساتھ اچھا خاصا ٹکراؤ ہوا تھا تو عین ممکن تھا کہ وہاں یرغمالیوں سے پوچھ کچھ کے دوران میرا ''خیالی خاکہ'' تیار کرکے پورے بینکاک میں میری تلاش شروع کردی جاتی۔ اگرچہ میں نے ایسا کوئی جرم تو نہیں کیا تھا بلکہ عوامی مفاد میں ایک طرح کا کارنامہ ہی انجام دیا تھا مگر میں اس وقت اپنے بُرے بھلے کی پوزیشن میں تھا ہی کب؟ میں ہیرو یا اور کسی حوالے سے خود کو منظرِ عام پر لانا ہی نہیں چاہتا تھا، البتہ سانچی کی طرف سے میں ذرا تحفظات کا شکار تھا۔

بہرحال...... چند لمحوں میں یہ سب کچھ یاد کرچکنے کے بعد ہی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینے پر میری توجہ مرکوز ہوئی تھی۔

میری نیم باز سی آنکھوں کے سامنے مدھم مدھم سی روشنی ہلکورے لے رہی تھی۔ گرد و پیش کی تاریکی اس ہلکی سی روشنی پر سوار تھی۔ شکر تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔

میں نے سر کو دو تین بار جھٹکے دے کر درد اور بھاری پن سے مقدور بھر نجات حاصل کرنے کی کوشش چاہی تھی اور اس کے بعد میں نے اپنے جسم کو حرکت دی تو احساس ہوا کہ میں کسی سخت جگہ پر پڑا ہوا تھا۔ پہلا احساس فرش کا ہی ہوا تھا لیکن جب میں نے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے اور جسم کو حرکت دی تو نیچے آرہا۔ ہلکے دھڑاکے کی آواز سے میں شاید فرش پر آن گرا تھا اور اسی وقت ''چٹ'' کی ہلکی آواز سے اندھیرے کا پردہ بھی چاک ہوگیا۔

وہ دس بائی بارہ کا کمرا تھا۔ جس کی چھت مخروطی تھی اور گول سا روشندان اس کی ڈھلوانی دیوار پر پیوست نظر آتا تھا۔ روشنی کا مخرج شاید یہی تھا۔ تاہم اب روشنی ہوتے ہی مجھ پر عقدہ کھلا کہ مجھے رسن بستہ کرنے کی ''زحمت'' کیوں نہیں گوارا کی گئی تھی۔

کمرے کے وسط میں فولادی سلاخوں کی دیوار تھی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس نصف گوشہ قید خانے میں فقط میں تھا اور وہ تختہ دار بیڈ جس سے میں لڑھک کر فرش پر گر پڑا تھا جبکہ سلاخوں کی دوسری طرف کھلا ہوا دروازہ تھا اور وہاں مجھے تین افراد نظر آرہے تھے۔ تینوں غیر مسلح تھے۔ دو گماشتہ نما اجنبی اور ایک چہرہ شناسا تھا میرا۔ اسی مکروہ چہرے کو دیکھ کر بے اختیار میرے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس خارج ہو کے رہ گئی تھی۔ وہ ہلکے بلو کلر کے بیش قیمت سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔

''کہاں تک بھاگو گے مجھ سے شہزی!؟'' اس نے سرسراتے لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بھاگ تو تم رہے ہو مجھ سے بزدل انسان! میں تو موت بن کے تمہارے تعاقب میں رہتا ہوں۔'' میں نے اسی سوٹ پوش شخص کو جو بلاشبہ وزیر جان ہی تھا، گھورتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا۔ اس کے چہرے پر سبکی اور تلملاہٹ کے آثار لمحہ بھر کے لیے اُبھرے تھے۔ چندی چندی آنکھوں میں پُرطیش سی چمک لہرائی تھی پھر بھیڑیے کی سی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''نہیں شہزی! اب تمہارے گھمنڈ کی یہ بازی مات کی طرف پلٹنے لگی ہے۔ اب تم مجھ سے بھاگو گے اور میں موت بن کر تمہارا تعاقب کروں گا۔ کیا تم نے اپنے تھائی ساتھی کا حشر نہیں دیکھا؟ میرے ایک اشارے پر وہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ چچ......چچ...... بے چارہ! تمہیں امریکا پہنچانے کا عزم لیے خود ہی دوسری دنیا میں پہنچا دیا گیا۔''

اس کے تاؤ دلانے والے لہجے نے مجھے دروں و بروں کھولا کے رکھ دیا۔ اس بدبخت کا اشارہ کاؤشی کی طرف تھا۔ میں نے اسے خوف ناک نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس ان بزدلانہ حرکتوں کے سوا اور رہ ہی کیا گیا ہے ذلیل آدمی! تم نے ہمیشہ اب تک معصوم، بے گناہ اور کمزور لوگوں کو ہی اپنی بربریت اور سفاکی کا نشانہ بنایا ہے۔ یہی اوقات ہے تمہاری بس......''

''اپنی زبان کو لگام دو شہزی!'' وہ بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ایسا نہ ہو کہ میں وقت سے پہلے تمہارے سلسلے میں کوئی اٹل فیصلہ کر ڈالوں۔''

''وقت کی ڈور صرف میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو تمہارے جیسے شیطانوں کی رسی کو ایک حد تک دراز رکھتا ہے۔ اپنی فکر کرو، کہیں تم زندگی کی یہ چند سانسیں مستعار تو نہیں گزار رہے ہو۔'' میری اس جوابی کارروائی پر اس کے چہرے پر غضبناکی سوا ہوتی نظر آنے لگی۔ آنکھوں سے نفرت و انتقام کے شرارے پھوٹتے محسوس ہوئے۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے، بتدریج اس کی حالت نارمل ہوتی چلی گئی۔ اس نے اپنے حلق سے ایک بدمست سا شیطانی قہقہہ اگلا اور دوسرے ہی لمحے سرسراتے لہجے میں بولا۔

''اگر ماسٹر چیف (لولوش) کا حکم نہ ہوتا تو میں تمہیں بڑی اذیت ناک موت سے دوچار کرتا کہ تم زندگی کے بجائے مجھ سے موت کی بھیک مانگ رہے ہوتے۔''

اس کی یہ بات سُن کر میں بے اختیار دل میں مسکرایا تھا۔ اسے تاؤ دلانے کا میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ اپنے بچے کھچے غرور کے زمین بوس ہوتے پہاڑ اور انا کی بکھری ہوئی ریت کو مٹھی میں سمیٹنے کی ناکام کوشش کے جوش تلے اس نے ایک طرح سے مجھے اس ''تسلی'' سے باخبر کردیا تھا کہ وہ مجھے فوری طور پر کوئی جانی نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھے ہوئے تھا۔ تاہم یہ سوچا جاسکتا تھا کہ مجھے ابھی ہلاک نہ کرنے یا زندہ رکھنے کا اس کے ''ماسٹر چیف'' یعنی لولوش کا مقصد آخر کیا ہوسکتا تھا؟

لہٰذا یہی کچھ وزیر جان کے منہ سے اگلوانے کے لیے میں نے بدستور اسی روش کو اختیار کرتے ہوئے دانستہ اس کا مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اوہ...... پھر تو تمہارا ماسٹر چیف مجھے زندہ رکھ کر بڑی فاش غلطی کررہا ہے۔ کیونکہ میں اس کے کسی کام کا نہیں ہوں...... ہاں! اگر کسی معاملے کی ڈیل کی بات ہو تو اور بات ہے۔''

''تم اب اپنی اوقات بھلا رہے ہو مسٹر شہزی! ڈیل، محکوم دشمنوں سے نہیں کی جاتی۔'' وزیر جان زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تمہاری حیثیت اب ہمارے سامنے کسی بڑے یا ٹکر کے دشمن کی نہیں رہی ہے شہزی! وہ کہتے ہیں ناں کہ پتھر اپنی جگہ پر ہی بھاری ہوتا ہے، اپنی جگہ سے لڑھکتا ہے تو پھر ٹھوکروں پہ رہتا ہے۔ تم بھی اب ہماری ٹھوکروں پہ ہو۔ کیونکہ پاکستان چھوڑ کر تم نے بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔''

''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون غلطی پر ہے۔'' میں نے بھی اسی بے پروائی سے کہا۔ ورنہ تو سچی بات یہی تھی کہ اس بدبخت نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ پاکستان میں جب تک میں اپنے ساتھیوں اور بہی خواہوں کی چھایا میں تھا تو چوہدری ممتاز سمیت وزیر جان اور اسپیکٹرم کی باقیات کو ناکوں چنے چبوا چکا تھا۔ یہاں تک کہ وطنِ عزیز سے اسپیکٹرم کے بخیے تک ادھیڑ ڈالے تھے۔ یہی نہیں پاکستان کے ازلی دشمن ''را'' کے خطرناک اور ذیلی ونگ ''بلیو تلسی'' تک کو بھی نابود کر کے رکھ دیا تھا۔ انڈین خفیہ ایجنسی کا ایک بڑا اور خطرناک جاسوس جسے اسپیکٹرم کی مدد سے پاکستان میں داخل کیا گیا تھا اسے بھی گرفتار کروایا تھا۔

اسپیکٹرم اب وزیر جان کی صورت میں اپنے یہ ''زخم'' کسی خارش زدہ کتے کی طرح اب تک چاٹ رہا تھا۔ اب جبکہ انہیں یہ بھنک پڑی کہ میں عابدہ کو رہائی دلانے کے عزم مصمم تلے اپنے وطن کی سرحدیں عبور کر آیا ہوں تو اسپیکٹرم اعلیٰ قیادت بہ شمول ان کی حلیف جماعتیں ''ٹائیگر ٹیگ''، ''جیوش بزنس کمیونٹی''، ''را'' اور وہ لوگ جن کے وسیع تر

مفادات کی سلامتی کے لیے ''اسپیکٹرم'' کا وجود لازمی جزو بن کے رہ گیا تھا۔ ان میں تھرتھلی مچ گئی تھی۔

پاکستان کی خفیہ ایجنسیوں، آرمی اور کمانڈور کی دھاک یوں بھی پوری دنیا میں تھی۔ یہی سبب تھا اسپیکٹرم نے میرا راستہ روکنے کے لیے اپنے مہرے سرکانا شروع کردیے تھے۔ اس طرح وزیر جان میرا پہلا شکار ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کی ہلاکت اسپیکٹرم پر ضربِ شدید کا اثر رکھ سکتی تھی۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ ان سارے حقائق کی روشنی کے باوصف لولوش مجھ سے کیا چاہتا تھا؟ ایک ہی بات ذہن میں آتی تھی۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا حصول......

''کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی کہ ہم کسی ڈیل کے لیے ہاتھ جوڑ کر تمہارے سامنے دوزانو ہوجائیں گے۔'' وزیر جان زہرخند لہجے میں بولا۔ ''تم اپنے دل میں جو عزم لے کر نکلے ہو وہ بہت جلد تم سمیت خاک میں ملنے والا ہے مگر ماسٹر چیف تو دشمنوں سے بھی کام لینے کا ماسٹر ہے۔''

''تو تم مجھے لولوش کے حوالے کرنا چاہتے ہو......؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ابھی تمہاری اتنی اوقات نہیں ہوئی کہ تمہیں ماسٹر چیف کے سامنے پیش کیا جائے۔'' وزیر جان پُرغرور لہجے میں بولا۔ ''تم سے حساب کتاب کرنے کے لیے میں اور بینکاک کی سرزمین کافی ہے۔''

''کیا چاہتے ہو مجھ سے......؟'' میں نے گفتگو سمیٹنا چاہی۔

''اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ماسٹر چیف کے حوالے کر دو......''

''اوہو...... تو تمہاری اوقات لولوش نے اتنی گرا کر رکھ دی ہے کہ تمہیں اب اس گھٹیا کام پر لگا دیا۔'' میں نے بے پروایانہ انداز میں اور زہریلے طنز سے کہا۔ ''اس کے حصول کے لیے تو تمہارے ماسٹر چیف لولوش کا ایک گماشتہ سیٹھ نوید سانچے والا پہلے سے ہی دھول چاٹ رہا ہے۔'' میں نے دانستہ اس کی حساس ادارے کی حوالگی کا ذکر نہیں کیا تھا۔

''ماسٹر لولوش سات سمندر پار رہتے ہوئے بھی تمہاری ایک ایک کارگزاریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔'' وزیر جان کی شیخیاں جاری تھیں۔ ''پاکستان سے تمہارے اور تمہارے دونوں ساتھیوں، کبیل دادا اور شکیلہ کی امریکا کے لیے نکلنے کی تدبیروں میں مصروف رہنا، زورآور خان کے ذریعے سے بھاری رقوم کے عوض یہ سودا طے ہونے سے لے کر تمہارا تھائی لینڈ اور تمہارے مذکورہ ساتھیوں کا دبئی سے امریکا روانہ ہونے تک سب کچھ ماسٹر لولوش جانتا ہے اور...... یہ بھی کہ تم نے اس کے جاسوس (سیٹھ نوید) کا جو حشر کیا ہے، اس کی سزا تو تمہیں ضرور بھگتنا پڑے گی۔ لیکن اگر تم بغیر کسی چالاکی اور رکاوٹ کے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ماسٹر لولوش کے حوالے کر دو تو سمجھو عابدہ سے لے کر اب تک سارا معاملہ ختم......''

اس کی بات نے مجھے اندر سے ہک دک سا کر کے رکھ دیا۔ کہاں تو میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ یہ ساری کارروائی میں چپ چپاتے کرنے میں مصروف تھا اور بڑی کامیابی سے اپنے اس اہم ترین مشن کو خفیہ رکھتے ہوئے جاری رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ مجھے نوشابہ اور وزیر جان کی طرف سے خدشہ تو تھا کہ ضرور اپنی تیسری آنکھ مجھ پر رکھے ہوئے ہوں گے۔ لیکن تب تک ایسا کوئی واقعہ ہی ظہور پذیر نہ ہوا تھا کہ جس سے پتا چلتا کہ میری یہ کارروائی کس حد تک خفیہ اور کامیاب جارہی تھی؟ تو گویا ان لوگوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی کسی مصلحت کی بنا پر خاموشی اختیار کیے رکھی اور ہمارے نکلنے کا راستہ کھلا رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان سے فلائی کرتے ہی وزیر جان اچانک ایک بھونچال کی صورت میرے سامنے آگیا اور طیارے میں ہم دونوں کی ڈرامائی مڈبھیڑ ہوگئی۔ یہی نہیں بینکاک میں زورآور خان کے ''گروپ'' کے آدمی کاوشی کا سفاکی سے قتل کردیا گیا۔ مجھے اب کبیل دادا اور شکیلہ کی فکر ہوئی۔ تاہم میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''کاوشی کو تم نے ہی قتل کروایا تھا؟''

''صرف کاوشی کو نہیں...... تمہاری اس سلسلے میں مدد کرنے پر پاکستان میں موجود زورآور خان بھی اپنے بھیانک انجام سے دوچار کردیا گیا ہے۔'' وہ سفاکانہ مسکراہٹ سے ایک لرزہ دینے والا انکشاف کرتے ہوئے بولا اور میرے پورے وجود میں جیسے موت کی سی سرد لہر دوڑی گئی۔

''تت...... تو کیا تم نے زورآور خان کو بھی......!'' باوجود کوشش ضبط کے میں اپنے اندر کی ابھرتی ژولیدگی اور بوکھلاہٹ پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

''ہاں......! یہ سب ضروری تھا تاکہ تمہارے آگے جانے کے وہ تمام راستے ...... بند ہوجائیں جن کی راہ ہموار کرنے میں زورآور خان کا گروپ مصروف تھا مگر افسوس کہ ہم سے تھوڑی دیر ہوگئی اور تمہارے دونوں ساتھی (کبیل دادا اور شکیلہ) امریکا روانہ ہونے میں کامیاب رہے لیکن خیر وہ ہمارے لیے خطرناک نہیں ثابت ہوسکتے، امریکا کی سرزمین میں ان دونوں کا شایانِ شان استقبال کرنے لیے ہمارے ساتھی پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ مگر ہمارے لیے تم زیادہ اہم تھے اور تم سے ادھر ہی نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔'' وزیر جان لحہ بہ لحہ یہ لرزہ دینے والے انکشافات کر کے میری وِل پاور کو زبردست دھچکے پہنچا رہا تھا۔ تو گویا میں اب تک اندھیرے میں ہی تھا کہ ''سب ٹھیک'' جارہا تھا۔

''تمہاری ضرور اس معاملے میں اس حرافہ اور دخترِ ابلیس نوشابہ نے مدد کی ہوگی۔ ورنہ تو تم کسی چوہے کی طرح کہیں کونے میں ڈرے چھپے بیٹھے تھے۔'' میں نے اپنی بوکھلاہٹ اور افسردگی کو چھپاتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ بھی طیش میں آنے کے بجائے ہنسا اور شاطرانہ انداز کی معنی خیزی سے بولا۔

''نوشابہ کو بھی تو پالنے والے ہم ہی ہیں۔ اب جوان ہوگئی ہے تو کیا اپنے بڑوں کے کام آنا اس کا فرض نہیں بنتا......؟''

میں بے بسی اور شدید تلملاہٹ کے مارے اپنے ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ بقول اس خبیث وزیر جان کے، زورآور خان پاکستان میں ختم کیا جاچکا تھا۔ یہاں میرا آگے (امریکا) جانے کی راستہ بنانے والے کاوشی کو بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ یوں حکمتِ عملی اور خفیہ طریقے سے مجھے، کبیل دادا اور شکیلہ کو ان رذیلوں نے جیسے بیچ منجدھار میں چھوڑ دیا تھا۔ یقیناً یہ ساری چالیں اس مردود لولوش نے ہی سات سمندر پار سے ہدایات کی صورت میں وزیر جان کے ذریعے چلی تھیں اور وزیر جان نے نوشابہ کو استعمال کیا تھا۔

''چلو، اب چھوڑو ان باتوں کو اور مقصد کی بات کرو، کیا کہتے ہو پھر شیئرز کے سلسلے میں......؟'' اس نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''شیئرز میرے پاس ضرور...... مگر ان پر میرا قانونی اختیار نہیں ہے۔'' بالآخر میں نے مکارانہ مفاہمت سے کام لیتے ہوئے ایک اصولی بات کہی۔

''میں نے کہا ناں...... کہ ماسٹر چیف ہزاروں میل دور رہ کر بھی سب جانتا ہے۔ یہاں تک کے منظور وڑائچ کی وصیت کی وہ کاپی بھی اس کے پاس موجود ہے جس کی رو سے اڑیسہ کمپنی کے پچاس فیصد شیئرز پر کلی طور پر تمہارا ہی اختیار ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہوئی کہ لولوش کو اس سلسلے میں ساری حقیقت کا علم ہے۔'' میں نے چالاکی سے کہا۔

''کیونکہ تب تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ وہ شیئرز اب منظور وڑائچ کے دونوں پوتے پوتیوں کے نام ہوجائیں گے کیونکہ ان کی ماں عارفہ کے سامنے اب نوید سانچے والا کا اصل چہرہ بے نقاب ہوچکا ہے اور وہ راہِ راست پر بھی آچکی ہے۔''

''گیم مت کھیلو شہزی! ہمارے ساتھ......'' وہ غرایا۔ ''شیئرز اب بھی تمہارے اختیار میں ہیں اور تمہیں وہ شیئرز ماسٹر لولوش کے حوالے کرنا ہوں گے۔ بہ صورتِ دیگر تمہاری ایک خوب صورت کمزوری عابدہ کی شکل میں پہلے ہی ہماری .... گرفت میں ہے۔''

عابدہ کے ذکر نے مجھے ملول سا کر دیا۔ مگر اس خنزیر کے منہ سے عابدہ کا نام سن کر میرے رگ و پے میں نفرت و انتقام کی آگ سی دوڑ گئی، تاہم دوسرے ہی لمحے میں خود کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے بظاہر نارمل لہجے میں بولا۔

''مجھے بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو وزیر جان! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ عابدہ اس وقت کن لوگوں کے رحم و کرم پر ہے۔'' میں نے جان بوجھ کر اسے رگیدا۔

''ماتم ہی کرنے کو دل کرتا ہے میرا تمہاری اس ناقص معلومات پر۔'' وہ بولا۔ ''عابدہ جن لوگوں کے قبضے ... میں ہے، ماسٹر لولوش کے ایک اشارے پر وہ اسے کہاں سے کہاں پہنچا دینے کے لیے ہر .... وقت تیار رہتے ہیں۔ اسپیکٹرم ایک آکٹوپس ہے، جس نے نہ صرف دشمنوں کو بلکہ اپنے دو حلیفوں کو بھی ان کے مفادات کی ڈور سے جکڑے رکھا ہے۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اسپیکٹرم سے ٹکر مت لو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ اگر میں اڑیسہ کمپنی کے شیئرز لولوش کے حوالے کردوں گا تو وہ عابدہ کو میرے حوالے کر دے گا؟'' میں نے اس کی لاف گزاف کو صرفِ نظر کرتے ہوئے دانستہ معصومانہ سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں!''

اس کی مکاری پر میں دل میں ہنسا تھا کہ یہ مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھے ہوئے ہے۔ تاہم میں اپنے منہ سے ایسا کوئی اظہار کیے بغیر بولا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میرے لیے اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ شیئرز کے بدلے مجھے عابدہ مل جائے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ یہ سب اس ہاتھ لے اور

اس ہاتھ دے کے تحت کیا جائے۔‘‘

’’تم پھر اپنی اوقات بھول رہے ہو، شہزی!‘‘ وہ غرایا۔ ’’تم اس وقت ہمارے محکوم ہو مفتوح نہیں...... سمجھے تم...... اور جیسا ہم کہیں گے ویسا ہی تمہیں کرنا ہوگا بہ صورتِ دیگر تمہیں اسی قید خانے میں رہتے ہوئے ایسے ایسے مناظر دیکھنا پڑیں گے کہ تمہارا جسم تو کیا روح تک بلبلا اٹھے گی۔‘‘

اس کی تہدید میرے لیے درگزر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ بدبخت مجھے یہاں قید میں رکھتے ہوئے کوئی بھی گل کھلا سکتا تھا۔ لولوڈش کے لیے ہوئے ٹاسک اور سپورٹ تلے وہ پاکستان میں میرے بہی خواہوں کے خلاف کچھ بھی کرسکتا تھا اور ان کے ناپاک عزائم کو جلا بخشنے والی نوشابہ پہلے ہی سے وہاں ایک زخمی ناگن بنی ہوئی تھی۔ تاہم اب میری یہ کوشش تھی کہ وزیر جان اور لولوڈش کو ابھی اپنی حد تک ہی مشغول رہنے دوں تاکہ ان کی گردن تک میرا ہاتھ پہنچ جائے۔ لہٰذا میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس سے کہا۔

’’مجھے سوچنے کا موقع دے سکتے ہو؟‘‘

میری بات پر اس کے چڑھے ہوئے تیور اترنے لگے۔ بولا۔ ’’سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں لیکن ایک پرانے دشمن کا لحاظ کرنا بھی تو معیارِ دشمنی ہے۔ اس لیے صرف آج کی رات...... صبح کا سورج ابھرتے ہی تمہیں صرف ہماری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔‘‘ اس نے مکروہ ہنسی کے ساتھ کہا اور پھر پلٹ گیا۔ عقب میں دروازہ سلائڈ ہوا اور ان تینوں کے نکلتے ہی وہ دوبارہ برابر ہو کے سپاٹ دیوار کا منظر پیش کرنے لگا۔

میں سلاخوں سے ہٹ کر پلٹا اور تختہ دار بیڈ پر تھکے تھکے اور بوجھل ذہن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وزیر جان کی قید میں آنا معمولی خطرناک بات نہ تھی۔ ایک طرح سے اچھا بھی تھا کہ مجھے یہاں رہتے ہوئے کوئی ایسا موقع مل سکتا تھا کہ میں اس موذی کا ادھر ہی خاتمہ کر ڈالتا، اب ازبس ضروری بھی ہوگیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پھر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانے لگا تھا اور وہ نوشابہ کو استعمال کر کے پاکستان میں ایک بار پھر اسپیکٹرم اور ’’را‘‘ والوں کے لیے راہ ہموار کرنے کی ناپاک کوششوں میں تھا تاکہ را والوں کے مفادات کے لیے کام کرسکے۔

اب تک میرے حالاتِ زندگی میں یہی کچھ ہوتا رہا تھا، میں جہاں بھی اور جدھر بھی دشمنوں کے نرغے میں آیا وہاں میں نے مشیتِ ایزدی اور مصلحت تقدیر ہی پائی تھی، لہٰذا میری یہاں بینکاک میں بھی وزیر جان کے پاس تھا کی حیثیت خالی از علت نہ تھی کہ خدا کی شاید یہی مصلحت تھی کہ مجھے اس موذی اور زہریلے ناگ وزیر جان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا موقع مل سکے۔

مجھے کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ بھوک کا تو مجھے کوئی خاص احساس نہیں ہو رہا تھا مگر پیاس ضرور ستا رہی تھی۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ وزیر جان مجھ سے بُری طرح تپا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بیٹھے رہنے کے بعد میں اٹھا اور گرد و پیش کا تفصیلی جائزہ لینے لگا۔ مجھے سب کچھ سپاٹ نظر آرہا تھا۔ در و دیوار اور چھت، ماسوائے ایک روشندان کہ جس سے بلی وغیرہ تو گزر سکتے تھے مگر میرا جیسا لمبا چوڑا آدمی گزرنے سے قاصر تھا۔

ہاں یہ دیکھا ضرور جاسکتا تھا کہ باہر کا منظر اور وقت کیا تھا۔ یہ شاید رات کا کوئی آخری پہر تھا۔

کافی دیر بیت گئی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ اچانک ایک آواز پر میں ٹھٹکا۔ پہلے میں نے اسے اپنا وہم خیال کیا تھا، کیونکہ دروازے کے نام پر صرف ایک سپاٹ دیوار تھی جسے کسی وقت بھی ایک خودکار میکنزم کے ذریعے باہر سے کھولا اور بند کیا جاسکتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت وہی سپاٹ دیوار سرسرائی تھی۔ میں اس وقت تختہ دار بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ دروازہ فوراً کھلا۔ اندر مدھم روشنی ہوئی، میں نے بیڈ پر ٹانگیں جھلائے، بیٹھے بیٹھے سلاخوں کے پار مذکورہ دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں اندھیرے کے بطن میں پھوٹتی ہلکی روشنی میں تین افراد کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وزیر جان دوبارہ اپنے انہی دو ساتھیوں کے ساتھ آیا ہے۔ تاہم اس کی اتنی جلد دوبارہ آمد کی مجھے کم از کم ابھی کوئی توقع نہ تھی۔

’’تو پھر یہ کون تھے؟‘‘ میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا۔ انہوں نے کمرے میں آتے ہی لائٹ بھی نہیں جلائی تھی۔ کیوں؟

کسی انجانے خطرے کے سبب میرا دل کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا اور میں اسی طرح بے حرکت سا بیڈ پر پاؤں جھلائے بیٹھا سامنے تکتا رہا۔ وہ تینوں افراد...... اندر داخل ہوئے مگر ان کے عقب میں، حسب سابق، دروازہ سلائڈ ہو کے بند نہیں ہوا تھا۔ ان تینوں کا انداز بھی مجھے خاصا مشکوک دکھائی دے رہا تھا۔ وہ مجھے بظاہر غیر مسلح ہی دکھائی ابھر رہے تھے۔ وہ تینوں چست لباس میں سیاہ ہیولوں کی صورت ہی نظر آرہے تھے اور فل ماسک میں تھے۔ دبے پاؤں سلاخوں کے قریب آئے اور پھر ایک نے مجھ پر پنسل ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ جو سیدھی میرے چہرے پر پڑی۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کی جانب ہی گھورے جا رہی تھیں۔

’’شی شی ی ی...... کوئی آواز نکالے بغیر ادھر آجاؤ۔‘‘ ان میں سے ایک نے اسرار بھری سرگوشی میں مجھ سے کہا اور میرا ماتھا ٹھنکا۔

’’یہ کیا معاملہ تھا؟ کیا وزیر جان میرے ساتھ کوئی چال چل رہا تھا یا پھر یہاں میرا کوئی نجات دہندہ پیدا ہوگیا تھا جس کی توقع پہلے ہی مجھے ’’صفر‘‘ ہی نظر آئی تھی۔

میں اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا سلاخوں کے قریب آگیا۔

ان میں دو ایک جیسے تھے، جبکہ تیسرا ہلکے قدوقامت کا تھا، اسی کے ہاتھ میں پنسل ٹارچ دبی ہوئی اور مخاطب بھی وہی ہوا تھا مجھ سے، اب بھی وہی بولا۔

’’ہمیں اپنا دوست سمجھو! ہم تمہیں یہاں سے رہائی دلانا چاہتے ہیں۔‘‘ وہ پھر بولا۔ میری پُرغور، خاموش اور بھانپتی ہوئی نظریں ان تینوں کے نقاب میں ڈھکے چہروں کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ ان کی ناک، ہونٹ اور آنکھیں فل سیاہ ماسک کے تنگ سوراخوں سے جھانک رہی تھیں۔ بات ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی میں کی گئی تھی۔

’’کیا تم تیار ہو؟‘‘ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر وہی ہلکے قد والا شخص بولا۔ وہ مجھے کوئی نوجوان سالڑکا دکھائی پڑتا تھا۔

’’کون ہو تم لوگ؟‘‘ میں نے سرِدست کسی خوش فہمی میں پڑے بغیر سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

’’کہا ناں...... ہمیں اپنا دوست سمجھو۔‘‘ وہ بولا۔

’’دوست چہرے نہیں چھپاتے۔‘‘

ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، اس کے بعد باری باری انہوں نے اپنے نقاب نیچے کیے۔ دو میرے لیے اجنبی تھے۔ تیسرے کو دیکھ کر میں ذرا چونکا تھا۔ یہ وہی تھا جسے میں نے وزیر جان کے ساتھ دیکھا تھا۔

’’کیا وزیر جان کوئی نئی چال چل رہا ہے؟‘‘ میں نے سرد مگر نیچی آواز میں کہا۔

’’تم اب وقت ضائع کر رہے ہو......‘‘ ایک نے نقاب دوبارہ سیٹ کرتے ہوئے کہا۔ باقی دونوں نے بھی فوراً اس کی تقلید کی تھی۔ وہ پھر آگے بولا۔ ’’یہاں سے پہلے نکل چلو...... اس کے بعد باہر کہیں آرام سے بیٹھ کر ہم تمہاری ساری تسلی کرا دیں گے۔‘‘ اس بار اس کے ایک ساتھی نے مجھ سے کہا تھا۔ مجھے اس کا لہجہ ذرا کھردرا اور بھاری لگا۔ اس میں رعب کا عنصر...۔ غالب محسوس ہوا تھا جو اس کے کسی خاص ’’قبیل‘‘ سے تعلق کا پتا دیتا تھا۔ میں نے پل کے پل سوچا۔ اگر یہ کوئی چال تھی تو یہی سہی، کم از کم میں یہاں سے تو نکلتا اور پھر چوکنا رہنا پہلی شرط تھی۔

’’ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں...... مگر تسلی والی بات یاد رکھنا۔‘‘

اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پھر تیسرے نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر سلاخ دار دروازے کے کسی رخنے میں ڈال کر بے آواز گھمائی اور دروازہ اندر کی طرف تھوڑا سا کھول کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

میں محتاط انداز میں ان کی ایک ایک حرکات و سکنات پر نگاہ رکھتے ہوئے باہر آگیا۔ ہم دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھے۔ میرا ذہن ان کے بارے میں طرح طرح کے اندازے ہی قائم کرتا رہا کہ یہ کون لوگ ہوسکتے تھے جو .... دیارِ غیر میں میرے ہمدرد اور نجات دہندہ بن کر گویا امدادِ غیبی بن کر اچانک نمودار ہوئے تھے۔

سب سے پہلے ان کا تیسرا نسبتاً دراز قامت ساتھی، سلائڈنگ ڈور سے باہر نکلا، ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہمیں باہر آنے کا اشارہ کیا۔ ذرا ہی دیر بعد ہم تاریک راہداری میں کھڑے تھے۔ دروازہ ہلکی سرسراہٹ سے ’’برابر‘‘ ہوگیا تھا۔ یکلخت ہی نوجوان نظر آنے والے کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھوں میں اب سیاہ رنگ کے پستول آگئے، ان پر سائلنسر چڑھے ہوئے تھے۔ میرے ٹھٹکے ہوئے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی، میں خود بھی ان کی طرف سے نہایت محتاط ہوگیا تھا۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ نوجوان بھی ان کی ہی رہنمائی میں تھا جیسے میں تھا۔

پندرہ، بیس قدم چلنے کے بعد ہم جیسے ہی دائیں جانب مڑے تو ہم سے ایک گام آگے چلنے والے نے اپنے پسٹل کی لبلبی دبا دی۔ اس کی سائلنسر لگی لمبی نال سے شعلہ چمکا اور میں نے کسی کے کراہتے ہوئے راہداری کے چکنے فرش پر گرنے کی آواز ہلکی سی آواز سنی۔ موڑ کاٹا تو میں نے ایک گن بردار کو فرش بوسی کی حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کی

پیشانی پر روشندان بنا ہوا تھا اور وہاں خون کی لکیر چکنے فرش پر پھیلتی جا رہی تھی۔

ہم اس کی لاش کے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو تین مزید خفیہ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم باہر تھے۔

یہ جگہ اس عمارت کے عقبی حصے میں تھی جسے دیکھتے ہی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ یہ وہی شاندار محل نما عمارت تھی جسے میں چند روز پہلے ہی کاؤشی کے ساتھ یہاں آ کر دیکھ چکا تھا، اس وقت میں نے ائرپورٹ سے ہی وزیر جان سمیت اس کے تین آدمیوں کا تعاقب کرتے ہوئے اس رہائش گاہ کا پتا چلایا تھا۔ اس وقت وہ سیاہ رنگ کی مسٹینگ میں سوار تھے جبکہ میں اور کاؤشی امپالا میں۔

یہ وزیر جان کی عالیشان رہائش گاہ تھی، جو ہل ٹاپ میں فوکٹ پیلس کے علاقے میں قائم تھی۔ تو گویا مجھے اسی عمارت کے کسی خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا۔ اس طرف بوہڑ کے درختوں کی بہتات نظر آ رہی تھی۔ آگے جنگلا تھا۔ وہاں میں نے دو بھاری بھرکم اور جھبرے کتوں کو بے سدھ گھاس پر پڑے پایا، یہ کارنامہ یقیناً انہوں نے ہی انجام دیا ہوگا۔

وہاں سے ہم جھکے جھکے اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک سروس روڈ پر آ گئے، یہاں ایک لیمپ پوسٹ کے نیچے کار کھڑی تھی۔ اطراف میں سناٹا تھا۔ کچھ اور رہائشیوں کی بھی کاریں اور گاڑیاں ویران سڑک کے کنارے پارک تھیں۔ ایک کالی بلی قریب سے میاؤں کرتی ہوئی گزری، تو میں نے نوجوان کے ایک ساتھی کو دونوں ہاتھ جوڑ کر تھائی زبان میں زیرِلب کچھ بڑبڑاتے ہوئے دیکھا۔ شاید یہاں کے لوگ بھی کالی بلی کے راستہ کاٹنے کی توہم پرستی میں مبتلا تھے۔ یا ممکن ہے کہ یہ توہم پرستی مغرب کا ہی شاخسانہ رہی ہو۔

ہم کار کی طرف بڑھ گئے۔ نوجوان نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور ایک نظر اپنے اسی ساتھی کے چہرے پر ڈالی جو میرے پیچھے تھا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کوئی اشارہ دیا ہو۔ آگے والا عقبی دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا، گرد و پیش اور بالخصوص ان تینوں سے چوکنا رہنے کی احتیاط اور نوجوان کو مشکوک اشارتی نظروں سے اپنے دوسرے ساتھی کو دیکھنے کے سبب جب میں کار میں جھک کر بیٹھنے لگا تو میں نے کھڑکی کے چڑھے ہوئے سیاہ شیشے سے اپنے عقب والے ماسک مین کا پستول والا ہاتھ اٹھتے دیکھا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے [illegible] ہوئے وجود میں پل کے پل کے پارا دوڑ گیا۔ میں نے اسی طرح جھکے ہوئے انداز میں خود کو اس کی ضرب سے بچانے کے ساتھ ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی کا ''رائٹ ہک'' اس کے پیٹ پر رسید کر دیا۔ یہ ضرب جاں کش ہوتی ہے، وہی ہوا، وہ دھوکے سے مجھ پر وار کرنے کی حسرت لیے ہی حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج کیے چمکتی سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ اندر سوار ہونے والے نے جو یہ دیکھا تو اس نے پھرتی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا - میں نے وحشیانہ غراہٹ سے اسے وہیں دبوچ لیا، جبکہ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے نوجوان نے شاید گھبرا کر یا پھر کچھ اور سوچ کر تیزی کے ساتھ کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

رات کے دم بہ خود سناٹے میں کار کے ٹائر سمع خراش آواز میں چرچرائے، کار نے ڈرفٹ کیا پھر ہلکی سی چیز نگ کے ساتھ بیک ہو کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دبوچے ہوئے شخص نے خود کو چھڑانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے ایک راؤنڈ پنچ اس کی ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔ ضرب ٹیکنیکل اور زوردار تھی۔ اس کا جبڑا اکھل گیا، و وہیں سیٹ پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے اس کی جیب سے سائلنسر لگا پستول نکال لیا اور دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیل دیا پھر اسی پھرتی سے دروازہ بند کر کے پستول کی نال نوجوان کی گردن سے لگا دی۔

''دھوکے بازی کا کھیل ختم ہو گیا۔ رفتار آہستہ کر دو ورنہ گردن میں سوراخ کر دوں گا۔'' میں نے زہریلی آواز میں پھنکارتے ہوئے اس سے کہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری ان چند لمحات کی ''کارگزاری'' کی دھاک میں آ چکا ہوگا اور فوراً ہی میرے حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہو جائے گا مگر میری خوش فہمی ہی ثابت ہوئی۔

اگرچہ میں نے بیک ویو میں اس کے نظر آنے والے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے، وہ خاصا بوکھلایا ہوا تھا، مگر اپنی ہٹ سے باز نہ آیا اور کار کی رفتار بجائے کم روکنے کے اور بڑھا دی، ساتھ ہی بولا۔

''تم مجھے گولی مارنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں یہ تیز رفتار کار الٹ جائے گی اور تم بھی نہیں بچو گے......'' اس کی بات پر میں نے پرطیش انداز میں ا ہونٹ بھینچ لیے اور پستول بیلٹ میں اڑس لی پھر اچک اس کے برابر والی سیٹ پر آ گیا اور ... چاہتا تھا کہ اس کی

مکوں اور گھونسوں سے تواضع کر ڈالوں کہ اس نے تیزی سے اسٹیئرنگ دائیں جانب گھما دیا، نتیجے میں میرا توازن بگڑا اور میں دروازے سے جالگا۔

تب ہی مجھے لات چلانے کا موقع ملا، میرے بوٹ کی ٹھوکر اس کے جبڑے پر پڑی، وہ کراہ آمیز آواز میں چیخا۔ کار کے ٹائر چرچرائے اور اس نے ایک جھٹکے سے بریک لگا دیے۔ کار گول گھوم گئی، مجھے لمحے بھر کو چکر سا آیا اور اسی دوران میں اس نے اپنی جیب سے پستول نکالنے کی کوشش کی تھی کہ میری دوسری لات اس کی گردن پر پڑی۔ وہ پھر چلایا اور پستول والا اس کا ہاتھ بہک گیا۔ پستول چھوٹ کر اس کی گود میں گرا اور وہاں سے لڑھک کر بریکس پائدان میں جا گرا۔ اسے اٹھانے کی اس نے زحمت تک گوارا نہ کی اور وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے مجھ پر پل پڑا۔

اس نے میرے پیٹ میں مکا رسید کرلیا، میں پہلے ہی سانس روک کے اپنا پیٹ سخت کر چکا تھا۔ زیادہ درد کا احساس نہ ہوا، مگر اگلے ہی لمحے اس نے چاقو نکال لیا، وہ اس نے تولتے ہی اس کا چمکتا ہوا پھل میری بائیں ٹانگ کی ران میں پیوست کر دیا۔ درد کی ایک جاں کش لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور ساتھ ہی کراہ آمیز سی چیخ میرے حلق سے خارج ہو گئی، اس نے بے رحمی سے چاقو دوبارہ کھینچا اور چاہتا تھا کہ اس کا خون آلودہ مہیب پھل میرے پیٹ میں گھونپتا، میری دائیں ٹانگ حرکت میں آئی اور بوٹ کی زوردار ضرب اس کے مِعدے پر پڑی۔ اس کی گردن کو زبردست جھٹکا لگا، سر اس کا دروازے سے ٹکرایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا میں نے پھرتی سے بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال کر اس پر گولی چلا دی۔ خاموش پستول سے ”چز ز......“ کی مخصوص آواز نکلی اور گولی اس کے پہلو میں گھس گئی۔ وہ کریہہ ناک چیخ کے ساتھ ڈھے گیا۔ خون آلودہ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کا سر ڈھلک کر اسٹیئرنگ سے جا لگا جس کے باعث ہارن مسلسل سمع خراش آواز میں بجتا چلا گیا میں اپنی زخمی ران اور خود کو سنبھالتے ہوئے سیدھا ہوا اور اس کے بے سدھ وجود کو سیٹ کی پشت گاہ سے لگا دیا۔ ہارن بجنا بند ہوگیا۔

میں بُری طرح ہانپ رہا تھا، میری زخمی ران سے مسلسل خون رسے جا رہا تھا۔ میں نے حواس بحال کرتے ہوئے کار کے اندر ہی بیٹھے بیٹھے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہرسو ویرانی کا راج تھا۔ سڑک دو رویہ تھی اور کسی بڑی مارکیٹ کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ دائیں بائیں بند دکانوں کے شٹر گرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دور کہیں دو ایک آدمیوں کے ہیولے نظر آئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے اسی تھائی نوجوان کی شرٹ کا ٹکڑا پھاڑ کر اپنی زخمی ران پر باندھ دیا تاکہ جریانِ خون کم ہو جائے اور ایک قدرتی پروسس کے تحت بہتا خون جم کر رک جائے۔

اس کے بعد میں نے نوجوان کے زخم کا جائزہ لیا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے پہلو میں کافی اندر تک دھنس گئی تھی۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر جب کار سے باہر اترنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی کراہتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”پپ...... پلیز......! سس...... سانچی کو بچا لو......“

دروازے کے ہینڈل پر میرا ہاتھ ایک دم رک گیا۔ یہی نہیں مجھے ایسا لگا جیسے ان الفاظ نے میرے متحرک وجود کو بھی جامد کر دیا ہو۔ اس نوجوان کے منہ سے سانچی کا نام سن کر میں بے طرح چونکا تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس کی جانب پلٹا اور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی پھیلتی جا رہی تھی اور چہرہ پسینے سے تر ہوا جا رہا تھا۔

”تت...... تم نے کیا کہا ابھی......؟“ مجھے جیسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ میں غیر یقینی انداز میں بولا۔ اس کی طرح میری آواز بھی لڑکھڑا گئی تھی۔

”شش...... شاید مجھ سے ایک بڑی غلطی ہو گئی ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے مگر ڈوبی ڈوبی آواز میں بولا۔

”تت...... مسٹر شش...... شہزاد ہو ناں......؟“

”ہاں! لل...... لیکن تم مجھے کیسے جانتے ہو؟ اور...... اور یہ سانچی...... کیا لگتی ہے تمہاری......؟“

”وہ...... وہ......“ نوجوان یہ کہتے کہتے بے دم ہو گیا۔ اس کا سر پھر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ پیشانی پر ان گنت سلوٹوں کا جال اور آنکھوں ...... میں سوچوں کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ میں اپنی زخمی ران کی تکلیف بھی بھول گیا۔ سانچی کے حوالے سے اس نوجوان کی طرف سے میرا فکرمند ہونا یہی معنی رکھتا تھا کہ سانچی میرے ساتھ مخلص تھی۔ کاوشی کے بعد میرا یہاں دیارِ غیر میں کوئی نہ تھا۔ جس سے میں زیادہ مدد کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا تو کم ازکم تھوڑا بہت تو وہ میرے ضرور کام آ ہی سکتی تھی۔ پھر اس نوجوان کا سانچی کے ساتھ ایسا کیا تعلق تھا اور یہ مجھے کیوں، کہاں اور کس کے کہنے پر لے جا رہا تھا؟ آخر میں اس کا اپنی غلطی کا اظہارِ تاسف مجھے الجھن میں مبتلا کر گیا تھا، وزیر جان کا ساتھی اس کے ساتھ شامل تھا۔

”اے...... ہوش میں آؤ۔“ میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے پانی کی بوتل نظر آئی، میں نے چند گھونٹ خود پیے اور اس منہ پر بھی اس کے چھینٹے مارے۔ وہ کسمسایا اور منہ سے بے ربط آوازیں خارج کرنے لگا۔ میں نے اس کے زخم والی جگہ پر اسی کی شرٹ اتار کر بڑی سی پٹی باندھ دی تھی تاکہ خون کا اخراج کم سے کم ہو، لیکن اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے جب میری مدد کی ضرورت تھی تو اس نے ایسی حرکت کیوں تھی؟ شاید اسی بات کا اسے کوئی پچھتاوا تھا مگر معاملہ کیا تھا اس کا مجھے علم نہ تھا۔ اس کی حالت سنبھل نہیں پا رہی تھی، اس کے چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑتا جا رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں خود کو سنبھالوں یا اسے، یا پھر ان حالات کو سمجھنے کی کوشش کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کہاں جانا چاہیے؟ کون تھا میرا یہاں؟ کاوشی تو مر چکا تھا۔

میں ہونٹ بھینچ کر چند لمحے یہی کچھ سوچتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں کاوشی کی رہائش گاہ کا خیال آیا۔ وہاں فرسٹ ایڈ سے متعلق کچھ نہ کچھ مل سکتا تھا۔ مگر میرا وہاں جانا خطرے سے خالی بھی نہ تھا۔ وہاں کاوشی کو قتل کر دیا گیا تھا، پتا نہیں اب تک اس کی لاش وہاں سے دریافت کر لی گئی تھی یا اسی طرح ہی وہ پڑی تھی؟ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تو آٹھ سے دس گھنٹے بیت ہی چکے تھے۔ اتنی سی دیر میں، میں نہیں سمجھتا تھا کہ کسی اریب قریب کے لوگوں کو پتا چل سکا ہو، یہ الگ بات تھی کہ وزیر جان کے آدمی وہاں میری تلاش میں دوبارہ آ سکتے تھے۔ مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہاں جانا کسی طور بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں قانون کے نرغے میں بھی پھنس سکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ راستے میں بھی پولیس سے میری مڈبھیڑ ہو جاتی۔

میں نے نوجوان کو سہارا دے کر برابر والی سیٹ پر ڈالا۔ خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ میری زخمی ران کا درد بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اتنا سا کام نمٹایا تھا۔ کار میں نے اسٹارٹ کی ہی تھی کہ نوجوان تھوڑا ہوش میں آتے ہوئے بولا۔

”کک...... کار آگے بڑھاؤ......“ میں چونکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا، وہ اس حالت میں بھی بڑی سخت قوتِ ارادی سے کام لے رہا تھا، اسے کچھ ہوش میں دیکھ کر میں نے کہا۔

”دیکھو......! میں خود یہاں تنہا ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں رہا ہے، ہم دونوں زخمی ہیں۔ پہلے کسی محفوظ ٹھکانے......“

”کار...... آگے بڑھاؤ......“ وہ میری بات کاٹ کے گھٹی گھٹی آواز میں بولا اور میں سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا تھا، لہٰذا میں نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔

”اس...... طرف......“ اس نے ہاتھ کے بہکتے ہوئے اشارے سے کہا۔ میں نے کار اسی طرف موڑ لی۔ ”چلتے رہو، رفتار بڑھا دو۔“

میں نے یہی غنیمت جانا اور رفتار ایک دم بڑھا دی۔ رات کے تاریک اور ویران سناٹے میں کار فراٹے بھر رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور نظریں ونڈ اسکرین کے پار چمکتی سڑک پر۔ میں گاہے بہ گاہے اس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا اور یہی دعا مانگے جا رہا تھا کہ کسی محفوظ ٹھکانے تک یہ ہوش میں ہی رہے۔

نصف گھنٹے تک تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد میں اسی کے اشاروں پر کار دوڑاتا ہوا بالآخر ایک رہائشی آبادی میں داخل ہوا۔ بادی النظر میں یہ مکان مجھے کاغذی محسوس ہو رہے تھے۔ لیکن یہ سب اعلیٰ درجے کی عمارتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ شکر تھا کہ نوجوان ہوش میں رہا۔ اگرچہ اس پر بار بار غنودگی کے دورے پڑ رہے تھے۔ کئی ایک جگہوں پر وہ کچھ بتا نہ پاتا اور مجھے کار روکنا پڑ جاتی۔ پھر جب اسے کچھ ہوش آتا تو وہ مجھے گائیڈ کرتا۔

اس نے ایک مکان کے سامنے کار روکنے کا کہا اور بولا کہ یہ اس کی بڑی بہن کا گھر ہے۔ اس کا شوہر ٹرک ڈرائیور تھا۔ دو بچے تھے۔ بہن نرس تھی۔ اس کا نام فرنا تھا۔ مجھے اسے یہی کہنا تھا کہ ہم دونوں دوست ہیں۔

میں نے کار روک دی۔ نوجوان دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں کار سے اترا۔ اردگرد نظر دوڑائی۔ مذکورہ گھر کے سامنے چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ درمیان سے روش گھر کے دروازے تک جاتی تھی جہاں مختصر سے برآمدے میں ہی دروازہ تھا۔ میں نے وہاں جا کر بیل بجا دی۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آس پاس ویرانی تھی۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ دوسری بار کال بیل بجانے پر کسی نے دروازہ کھولا تھا مگر نصف، سیفٹی چین لگی ہوئی تھی۔ ایک چکنا چپٹا اور قدرے بیضوی چہرہ نمودار ہوا۔ آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں،

ناک بھی بیٹھی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ بال سلیقے سے گوندھے ہوئے تھے، فقط چہرے سے ہی اس کے رکھ رکھاؤ اور نفاست کا پتا چلتا تھا۔

''ہے میم! تم فرنا ہو ناں......؟ تمہارا بھائی باہر کار میں زخمی پڑا ہوا ہے، میں خود بھی زخمی ہوں، ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔ عورت کے چہرے کے پر اشتباہ انگیزی کے آثار ابھرے مگر دروازہ اس نے پورا پھر بھی نہیں کھولا تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔

تھوڑی دیر بعد شاید اس نے کسی کھڑکی سے باہر کار کی طرف جھانک کر تصدیق کر لی تھی کہ اس کا بھائی وہاں موجود تھا، شکر رہا کہ میں نے اس کے بھائی کو عقبی سیٹ پر نہیں لٹا رکھا تھا، پھر شاید اسے نظر نہ آتا اور مجھے لمبی چوڑی تفصیل اسے دینے میں وقت ضائع کرنا پڑتا۔

اس نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک درمیانی عمر کی فربہی مائل خاتون تھی۔ اس نے فل اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ سویرے اٹھنے کی عادی تھی اور جاگی ہوئی تھی۔ اسی لیے فریش ہی نظر آرہی تھی۔ میں خود لنگڑا رہا تھا۔ اسے میری حالت کا بھی احساس ہوا۔ اس نے سب سے پہلے مجھے اندر آنے کا کہا اور ایک کمرے میں سہارا دیے لے آئی۔ وہ خاصی مہربان سی خاتون نظر آتی تھی، لیکن چہرہ اس کا سپاٹ ہی تھا۔ جب اس نے مجھے ایک کاؤچ پر لٹایا تو میں نے کہا۔

''میں ٹھیک ہوں، مگر تمہارے بھائی کی حالت زیادہ نازک ہے، پلیز! اس کی فکر کرو۔''

''میں اپنا کام جانتی ہوں۔'' اس نے مختصراً جواب دیا اور پلٹ گئی۔ جانے وہ کہاں غائب ہوگئی تھی۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ پولیس یا کسی ادارے کو فون نہ کر دے، لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے بھائی کی جان بھی داؤ پر تھی اور وہ ہمارے یہاں اس طرح آنے کا مقصد سمجھ ہی چکی ہوگی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کشادہ کمرا تھا ایک بیڈ بھی کونے میں بچھا ہوا تھا۔ اٹیچ باتھ تھا اور کمرا بڑے سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ ایک طرف کارنس پر بدھا کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ کچھ فریم شدہ تصویریں دیوار پر آویزاں تھیں، ان میں دو نوعمر بچوں اور ایک اس کی اپنی اور ایک بھاری بھرکم مرد کی فوٹو تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کمرے میں داخل ہوئی اور میں اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

وہ ایک وہیل چیئر پر اسی زخمی نوجوان کو لیے اندر داخل ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہیل چیئر اس کے پاس کہاں سے آگئی تھی۔ اس کا عقدہ بعد میں کھلا تھا۔ اس نے بھائی کو بیڈ پر لٹایا اور اس کے زخمی پہلو کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کام میں طاق و مشاق معلوم ہوتی تھی۔

''اسے گولی لگی ہے۔'' میں نے بتایا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بہت کم گو معلوم ہوتی تھی اور کام کی پھرتیلی لگتی تھی۔ وہ اٹھ کر چلی گئی اور جب دوبارہ لوٹی تو دو وہیل کی چھوٹی سی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک بڑا سا کینوس بیگ جھول رہا تھا۔ ٹرالی پر آکسیجن سلینڈر رکھا ہوا تھا، اس نے سب سے پہلے نوجوان کے آکسیجن لگائی اور پھر بیگ کھول کر اس نے کچھ دوائیاں نکال لیں۔ ایک چھوٹا باکس بھی نکالا۔ وہ اپنے کام میں جت گئی۔ میں حیرت سے اسے کام کرتے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ذرا سی بھی گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نہ تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے مرہم پٹی کر دی اور پھر بی پی آپریٹس اور اسٹیتھ اسکوپ سے وائٹل چیک کیے، کچھ انجکشن لگائے اس کے بعد ایک ڈرپ بھی لگا دی۔ ٹرالی کے ساتھ ہی ڈرپ اسٹینڈ نتھی تھا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور میری ران کے زخم کا جائزہ لیا۔

''تمہارے بھائی کی حالت اب ٹھیک ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''گولی اندر ہی ہے۔ وہ میرے بس کی بات نہیں۔ باقی فرسٹ ایڈ میں نے دے دی ہے، اب اس کی حالت کچھ بہتر ہے۔'' اس نے سپاٹ سے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اس کا لب و لہجہ عجیب ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ میری مرہم پٹی کرنے میں مشغول ہوگئی۔

''تمہارے بھائی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک اچھی نرس ہو اور کسی اسپتال میں کام کرتی ہو۔'' میں نے بہ غرض سلسلۂ جنبانی کے کہا۔

''کمال ہے میرے بھائی نے تمہیں اپنا نام بھی نہیں بتایا؟ تم اس کے کیسے دوست ہو؟'' وہ بولی۔

''آہ......'' جواب دینے کے بجائے میرے حلق سے کراہ خارج ہوگئی۔ اس نے میری ران کے زخم کے اندر کوئی مرہم لگا دیا تھا۔

''زخم گہرا اور چاقو کا ہے۔ گہرائی تک مرہم بھرنا ضروری تھا۔'' وہ بولی۔

''ہاں! ٹھیک ہے، تم ہی بہتر جانتی ہو، تمہارا شکریہ۔''

''تم انڈین ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پاکستانی ہوں۔''

''میرے بھائی کے دوست کیسے بن گئے؟ کیا تم بھی اس کی طرح کرمنل گروپ سے تعلق رکھتے ہو؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی اور میں اس کی بات پر چونک پڑا۔ گویا یہ خاتون اپنے بھائی کے کرتوتوں سے واقف تھی۔ تب ہی میں نے تھوڑی صاف گوئی سے کام لینا ضروری سمجھا۔ بولا۔

''میں اس سے پہلے تمہارے بھائی کو جانتا تک نہیں، نہ ہی مجھے اس کا نام ... معلوم ہے۔ میں اس کا دوست نہیں ہوں، بس، یوں سمجھو ہم ایک دوسرے سے ہی لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھوں سخت زخمی ہوئے ہیں۔ لیکن میرا ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ میں تو ایک سیاح ہوں۔''

''فینٹاسٹک، اپنی شرافت کی تم نے اچھی اسٹوری سنائی، ویسے تم ایک دوسرے کے مخالف گروپ کے بھی تو ہو سکتے تھے؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار ایک گہری ہنکاری خارج کی اور اس سے خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''تو کیا تم اپنے بھائی کے کرتوتوں سے واقف ہو اور پھر بھی اس کی مدد کرنے کو ہر دم تیار رہتی ہو۔''

''خون کے رشتے پانی کی اس سطح کے مانند ہوتے ہیں جس کے درمیان۔۔۔ ڈنڈا مارو تو سطح ٹوٹنے کے بعد دوبارہ یکجا ہو جاتی ہے۔ کیا تمہارے ملک میں خونی رشتوں سے ذرا ذرا سی باتوں پر قطع تعلق کر دیا جاتا ہے۔'' اس نے مدبرانہ لہجے میں کہا تو مجھے ذرا خفت کا احساس ہوا، بولا۔

''نہیں ایسی تو بات نہیں ہوتی، وہاں بھی خونی رشتوں کی قدر ہوتی ہے۔ مگر... ہر جگہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔''

وہ میری مرہم پٹی کر کے فارغ ہوگئی۔ اس کے بعد میرے بازو میں ایک انجکشن بھر کے ٹیکا بھی لگا دیا۔ یہ شاید اینٹی بایوٹک کا تھا یا پھر پین کلر۔ وہ فارغ ہو کے بولی۔

''تم اس کمرے سے باہر نہیں نکلو گے۔ دوسرے کمرے میں میرا شوہر آرام کر رہا ہے۔ یہ چیئر اسی کی تھی۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ میں اس مہربان خاتون کو دیکھنے لگا۔ اس کی وہیل چیئر والی بات سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کا شوہر شاید دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ البتہ میں نے اسے پانی کا کہہ دیا تھا جو وہ فوراً ہی ایک جگ میں لے آئی تھی، جبکہ گلاس وہیں ایک تپائی پر رکھا تھا۔ وہ دوبارہ چلی گئی۔ اس کا فرسٹ ایڈ کا سامان وہیں پڑا تھا۔

میں پانی پینے کے بعد دراز ہوگیا اور پھر سر گھما کے بیڈ کی طرف دیکھا۔ وہ نوجوان ابھی تک بے ہوش تھا۔ میں سیدھا ہو کے آنکھیں موندے لیٹ گیا۔ نیند کے مارے میرا سر اور آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ ابھی شاید میری آنکھ لگی ہی تھی کہ فرنا نے آکے مجھے جگا دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ٹرے تھی۔ اس میں ناشتے کے مختصر سے برتن تھے۔ وہ اس نے تپائی پر رکھ دی۔

''ناشتا کر لو، پھر سو جانا۔'' وہ ہلکے سے مسکرا کے بولی۔ وہ پہلی بار مسکراتے ہوئی اچھی لگی۔ میں نے کہا۔

''نہیں، میں دراصل سونا نہیں چاہتا ہوں۔ تمہارے بھائی کو ہوش آجائے تو میں اس سے کچھ باتیں کرنے کے بعد اپنا راستہ لوں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے اس کے پلٹنے پر پوچھا۔ ''یہ کب تک ہوش میں آجائے گا؟''

''ایک دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس کے بعد میں اسے اپنے اسپتال لے جانے کی کوشش کروں گی۔ وہاں اس کی سرجری ہونا ضروری ہے۔''

''جہاں تم کام کرتی ہو، اسی اسپتال میں......؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

میں نے سیدھے ہو کے ناشتے کی ٹرے کی طرف دیکھا۔ بریڈ، مکھن، دودھ اور کافی تھی۔ ایک ابلا ہوا انڈا بھی تھا۔ پنیر بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے بریڈ مکھن کھایا اور انڈا، اس کے بعد کافی پینے لگا۔

ناشتا کرنے اور کافی وغیرہ پینے کے بعد میری جان میں جان آئی تھی۔ میرے ذہن کو تازگی ملی تو میں تصویر کے جانے پہچانے رخ کو چھوڑ کر دوسرے رخ سے دیکھنے اور سوچنے لگا تو مجھے احساس ہوا کہ میں اب بھی خطرے میں گھرا ہوا ہوں۔ جب تک اس نوجوان کی سانچی سے متعلق بات واضح نہیں ہو جاتی، میں اس پر کلی طور پر بھروسا نہیں کر

سکتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ میں اس وقت اس کی بہن کے گھر میں تھا جو شادی شدہ تھی اور غالباً دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ نیز یہ نوجوان جس کا نام اس کی بہن فرنا نے مجھے موتو بتایا تھا، مجھ سے آخر کس قسم کی مدد لینا چاہتا تھا، جبکہ وہ خود مجھے شکار کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر میرے ہی ہاتھوں موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔

لہٰذا میں موتو کے ہوش میں آنے اور اس سے وضاحت طلب گفتگو کرنے کے لیے بے چینی سے منتظر تھا۔

میں نے اس دوران دو تین گھنٹوں کی نیند بھی کر لی تو وہ ہوش میں آچکا تھا اور اپنی بہن فرنا سے باتوں میں مصروف تھا۔ وہ ہنوز بیڈ پر دراز تھا اور فرنا اس کے قریب ایک کرسی کھسکائے بیٹھی تھی۔

میں ہولے سے کھنکھارتا ہوا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے اپنا سر بھاری محسوس ہونے لگا۔ تاہم میں نے ان دونوں بہن بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف متوجہ تھے۔ پھر شاید موتو نے اپنی بہن سے کچھ کہا تھا، وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ میں کاؤچ سے اٹھا اور اپنی زخمی ران پر ہاتھ رکھے ہولے سے لنگڑاتا ہوا اس کے قریب دھری اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر تھوڑی دیر پہلے فرنا بیٹھی تھی۔

”شکر ہے تمہاری حالت قدرے بہتر ہو گئی، ورنہ مجھے تمہاری موت کا افسوس ہی ہوتا۔ تمہاری بہن بہت اچھی مہمان نواز اور ایک مہربان خاتون ہے۔“

وہ میری بات پر محض مسکرا کر رہ گیا تو میں نے مزید کہا... ”اب مجھے بتاؤ، یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے؟ تم وزیر جان کے آدمی ہو؟ لیکن مجھے قید سے رہائی کی آڑ میں کہاں لے جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے؟“

”میں وزیر جان کا آدمی نہیں، کاسپاکو کا آدمی ہوں۔“ اس نے جیسے میرے سامنے دھماکا کیا اور میں سُن ہو کر رہ گیا۔ شنید کی حد تک مجھے مال والے اس المناک واقعے میں موت کے ہرکاروں سے نمٹنے کے دوران اس کے ایک ساتھی سے تہدید آمیز الفاظ میں یہ پتا چلا تھا کہ کاسپاکو بینکاک کا ہوّا کہلاتا تھا۔ ایک بڑا انڈرورلڈ ڈان اور گینگسٹر...... میں نے اس روز اس کے سفاک ہرکاروں کے انسانیت سوز مقصد کو نہ صرف سبوتاژ کیا تھا بلکہ انہیں موت کے گھاٹ بھی اتار ڈالا تھا۔ سرغنہ کو بھی میں نے نہیں چھوڑا تھا ہاں البتہ ایک ان کا ساتھی میری چلائی ہوئی گولی سے زخمی ضرور ہوا تھا۔ ممکن تھا اسی نے ... بعد میں کاسپاکو کو میرے بارے میں بتایا ہو، لیکن پھر بھی بھلا اسے میرے بارے میں کیا پتا تھا؟ خیر......! میں سمجھتا تھا کہ میرا معاملہ پردے کے پیچھے ہی رہے گا لیکن اب موتو کے انکشافات نے مجھے تشویش آمیز الجھن میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

”تمہاری اس مہم جوئی کا اسے علم ہو چکا ہے اور تمہارے بارے میں بھی......“ موتو بولا۔ ”تم نے اس روز مال میں ہونے والی خوں ریزی کے دوران کاسپاکو کے چند آدمیوں کے علاوہ اس کے ایک اہم آدمی...... چارلی کو بھی ہلاک کر ڈالا تھا جو اس روز اس منصوبے کی کمانڈ کر رہا تھا۔ مگر ایک آدمی زخمی ہو کر بھاگ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اسی نے ... سب سے پہلے سانچی کے بارے میں کاسپاکو کو آگاہ کیا اور وہ زخمی جانتا تھا کہ تمہارا کسی حوالے سے سانچی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق تھا، بس! پھر کیا تھا۔ کاسپاکو نے تمہارا سراغ لگانے کے لیے سانچی کو اٹھوالیا۔“

”سانچی تمہاری کیا لگتی ہے؟“

”گرل فرینڈ تھی مگر بعد میں یہ حقیقت جان لینے کے بعد کہ میں کرمنلو گروپ سے تعلق رکھتا ہوں، وہ مجھ سے سخت ناراض ہو گئی ...۔“ اس نے مغموم سے لہجے میں جواب دیا۔

”مگر مجھے اب بھی اس سے محبت ہے۔ وہ بھی مجھ سے کرتی ہے لیکن اس کا اصرار یہی تھا کہ میں کاسپاکو جیسے کرمنل کا ساتھ چھوڑ دوں۔ میں نے وعدہ تو کرلیا تھا سانچی سے مگر یہ اتنا آسان نہ تھا۔ کیونکہ کاسپاکو کو چھوڑنا خود کو یقینی موت کے سپرد کرنے کے مترادف ہوتا۔ یہی بات سانچی نہیں سمجھتی تھی۔“

اتنا بتا کر وہ ذرا سانس لینے اور سستانے کو رکا تھا۔ میرے سوچتے ذہن میں دھکڑ پکڑ ہونے لگی تھی۔ اندھیرے میں چھپے سوالوں کے جواب روشنی میں آنے لگے تھے۔

”مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ یہ سب کیا معاملہ تھا۔ تتلی جیسی معصوم اور چڑیا جیسی بے ضرر سانچی کو کاسپاکو جیسے خونخوار بھیڑیے کی گرفت میں دیکھ کر میرے اپنے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ میں نے یہ راز وہاں کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ سانچی میری گرل فرینڈ ہے۔ نہ ہی بتانا ... چاہتا تھا۔ خیر! میں سانچی سے قید خانے میں جا کر کسی بہانے سے ملا اور اس نے مجھے ساری حقیقت بتا ڈالی۔ وہ بے چاری بے حد ہراساں اور خوف زدہ تھی۔

”سانچی کو اور نہ ہی مجھے، تمہارے بارے میں کچھ... علم ... تھا کہ تم کہاں تھے جبکہ کاسپاکو بضد تھا کہ سانچی اپنے بوائے فرینڈ یعنی تمہیں ان سے چھپانا چاہ رہی ہے۔ کیونکہ اس کے زخمی آدمی نے یہی بتایا تھا کہ اس روز مال میں تم اور سانچی ساتھ ساتھ تھے۔ وہ تمہیں سانچی کا بوائے فرینڈ سمجھے ہوئے تھے۔ مجھے بھی یہی غلط فہمی ہوئی تھی کہ کہیں سانچی میرا ساتھ چھوڑ کر تمہاری محبت میں تو نہیں مبتلا ہو گئی تھی، مگر سانچی سے ملنے کے بعد اس نے ساری حقیقت مجھے بتا دی تھی کہ تم سے اس کی محض اتفاقاً ہی ملاقات ہو گئی تھی۔ سانچی اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔“

وہ پھر تھوڑا سانس لینے اور سستانے کو رکا۔ میں ٹک دک ... نظروں سے اس کے چہرے کی طرف تکتے ہوئے، اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ مگر وہ ہانپنے لگا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اسے پتا کیسے چلا کہ میں وزیر جان کی قید میں تھا اور اسے وزیر جان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا، یہ سوال اس کی خاموشی پر میں نے کیا تو وہ کچھ سنبھلنے کے بعد بتانے لگا۔

”یہ میرے اور مجھ سے زیادہ سانچی کے لیے بڑا کڑا وقت تھا... بلکہ میرے لیے تو یہ ایک امتحان تھا۔ مجھے سانچی کو کاسپاکو جیسے بھیڑیے سے بچانا تھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کاسپاکو جیسا وحشی آدمی کبھی بھی معصوم سانچی کی اس بات پر بھروسا نہیں کرے گا کہ وہ واقعی تمہارے متعلق کچھ نہیں جانتی اور بالآخر وہ جلاد صفت انسان سانچی کو پہلے اپنی وحشیانہ فطرت تلے روندے گا اس کے بعد بڑی اذیتیں دے کر مار ڈالے گا۔ سانچی خود بھی نہیں چاہتی تھی کہ تم ان کے ہتھے چڑھو، وہ تمہاری حوالگی کے بدلے میں اپنی آزادی بھی نہیں چاہتی تھی۔ ہاں مسٹر شہزاد......! سانچی ایسی ہی .... نیک نیت اور جذباتی سی لڑکی ہے۔ وہ تمہاری بہادری اور تمہارے مضبوط کردار سے بہت متاثر ہے۔ جو تم نے مال میں کارنامہ انجام دے کر اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر بہت سے معصوم اور بے گناہ انسانوں کو ان درندوں سے بچایا تھا۔ وہ سب تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے بھی پہلی بار سانچی کے بیان پر جھوٹ کا گمان ہوا تھا کہ کیا واقعی سانچی تمہیں بچانے کی خاطر تمہارا پتا نہیں بتا رہی تھی یا پھر وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ تم ہو کہاں......؟ خیر! میں نے اسے یہی تسلی دی تھی کہ میں تمہیں تلاش کر کے ان کے حوالے کرنے کے بجائے، تمہیں (سانچی کو) یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔ لیکن ایسا میں نے سانچی کا محض دل رکھنے کے لیے کہا تھا، کیونکہ یہ اتنا آسان نہ تھا۔ جبکہ میں چاہتا یہ تھا کہ کسی طرح تمہارا سراغ حاصل کرلوں اور اس کے بعد تم پر قابو پا کر کسی اور جگہ قید کرلوں، بعد میں کاسپاکو سے یہی کہوں کہ میں نے بالآخر اس قیدی لڑکی کا منہ کھلوانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، اس نے تمہارا پتا بتا دیا ہے۔ اس کے بعد تمہیں ان کے حوالے کر دیتا۔ رہی بات یہ کہ میں نے تمہارا سراغ کیسے حاصل کیا...... وہ میرے لیے جتنا مشکل تھا بعد میں اتنا ہی آسان ثابت ہوا۔ لوکاس نامی ایک آدمی سے میری دوستی تھی۔ میرے اس پر بہت احسانات تھے۔ میں نے کئی مواقع پر اس کی مدد کی تھی۔ وہ وزیر جان کا ہی آدمی تھا، جبکہ مجھے اس کے بارے میں کوئی علم نہ تھا، مجھے پریشان دیکھ کر اس نے وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ میں ایک مسلم پاکستانی نوجوان جس کا نام شہزاد ہے یعنی تم، اس کی تلاش میں ہوں اور اس کی وجہ سے میری گرل فرینڈ کی عزت اور زندگی دونوں ہی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ تب وہ چونکا اور اس نے مجھے یہ حقیقت بتا دی کہ تم ان کی قید میں ہو۔

لوکاس نے میری مدد کرنے کا وعدہ کرلیا۔ میں نے اسے ایک بڑی رقم کا بھی لالچ دے دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہ رقم اپنے ساتھی کو دے کر اس مشکل اور خطرناک کام کے لیے رضامند کرے گا۔ کیونکہ یہ کام اس کے اکیلے کے کرنے کا نہیں ہے۔ یوں ہم نے تمہیں دھوکے میں رکھتے ہوئے دوست کہہ کر.... وزیر جان کی قید سے رہائی دلوا دی مگر افسوس تم واقعی ہمارے لیے ایک خطرناک کھلاڑی ثابت ہوئے اور سب کچھ الٹ گیا، لیکن مجھے دکھ ہے کہ سانچی کا کیا بنے گا۔ کل تک وہ بھیڑیا صفت کاسپاکو اس معصوم کی عزت اور جان دونوں ہی روند ڈالے گا۔ میری مدد کرو، سانچی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک اچھے کردار کے انسان ہو، انسانیت کا جذبہ اور اس سے ہمدردی تمہارا شیوہ ہے، خدا کے لیے سانچی کو بچالو...... میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا مسٹر شہزی......!“

یہ سب بتاتے ہوئے موتو...... بُری طرح ہانپتے ہوئے رو پڑا۔ میں کرسی پر گنگ اور چپکا بیٹھا رہا۔ میں موتو کی باتوں کے تناظر میں ان عوامل پر غور کرنے پر مجبور تھا کہ میرے مفادات میں کیا بہتر ہوسکتا تھا، کیونکہ دیارِ غیر میں ایسی کسی جذباتی قسم کی سوچ اور سانچی کی مدد کے لیے کوئی قدم اٹھانا میرے لیے بڑے مسائل کھڑے کرسکتا تھا۔ سانچی کی خاطر میں... عابدہ والا مشن کھٹائی میں ڈال سکتا تھا نہ ہی اپنے ساتھیوں سے محروم ہونا چاہتا تھا۔ سانچی تو جمعہ جمعہ آٹھ دن تو کیا صرف ایک شام، یا ایک رات کی شناسا تھی

اور نہ ہی میں کوئی فلمی ہیرو تھا کہ موتو کے آگے سینہ تان کر کہتا کہ ’’لو مسٹر موتو! مجھے اپنی محبوبہ کے بدلے میں کاسپا کو جیسے سفاک گینگسٹر کے سپرد کر دو، مجھے معاف رکھو بھائی موتو……! میں چلا پتلی گلی سے۔‘‘

ہاں! البتہ ’’آن دی اسپاٹ‘‘ اور بات تھی جیسے اس رات مال میں خوں ریزی ہوئی تھی اور میں موت کے ہرکاروں کے نرغے میں جن بے گناہ لوگوں کی مدد کر سکا تھا وہ کی تھی۔ لیکن جانتے بوجھتے ہوئے ’’آبیل مجھے مار‘‘ والی بے وقوفی میں نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم ابھی میری کمزوریاں اپنی جگہ تھیں اسی لیے میں موتو سے یہ سب نہیں کہہ سکتا تھا یوں بھی وہ کون سا دودھ کا دُھلا تھا۔ یہ تو میں نے اس پر قابو پایا تھا تو وہ سچ بولنے اور سانچی کی مدد کی مجھ سے بھیک مانگنے پر مجبور ہوا تھا۔ نہیں جانتا تھا ……کہ اب جبکہ بازی میرے ہاتھ میں تھی تو موتو کی نیت اور دل میں کیا تھا؟

’’کیا سوچنے لگے دوست……؟‘‘ مجھے گمبھیرتا سی سوچ میں مستغرق پا کر موتو نے پوچھا۔

’’آں…… ہاں! کک…… کچھ نہیں، بس! یہی سوچ رہا تھا کہ سانچی کی ہمیں کیسے مدد کرنی چاہیے……؟‘‘ میں نے معاملہ فہمی سے اور دانستہ ’’میں‘‘ کے بجائے ’’ہم‘‘ کا صیغہ استعمال کیا تھا۔

’’میں تو بیڈ سے ہی لگ کے رہ گیا ہوں……فرنا بھی بتا رہی تھی کہ میرے پہلو میں گولی دھنسی ہوئی ہے، مجھے اسپتال لے جانا پڑے گا، کچھ قانونی معاملات درپیش ہوں گے جنہیں فرنا بہ خوبی نمٹا لے گی۔ سرجری کے بعد پندرہ سے بیس روز کا بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا مجھے……‘‘

’’میرا خیال ہے تمہیں اپنی بہن فرنا کی مدد سے ہی پولیس سے مدد لینی چاہیے۔‘‘ میں نے اسے صائب مشورہ دیتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ اُتر سا گیا۔ بولا۔

’’پولیس نے کاسپا کو جیسے مافیائی ڈان کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ہوتی تو بہت پہلے کر چکی ہوتی۔ کیا تم میری مدد نہیں کر سکتے؟ میرے کچھ ساتھی بھی ہوں گے جو تمہارے زیرِ ہدایت رہیں گے۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے دوست! میں خود یہاں بینکاک میں عارضی طور پر مقیم ہوں۔ میرے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والی ہے۔ بلکہ اب ان حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے، ممکن ہے مجھے فوراً واپس اپنے وطن لوٹنا پڑ جائے۔‘‘ میں نے کہا۔ میری بات پر اس کا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا۔ مجھے اس پر ترس بھی آنے لگا۔ تب ہی وہ تلخ ہنسی اور انتہائی مایوسانہ لہجے میں بولا۔

’’کوئی شک نہیں اس میں کہ میں نے تمہیں اپنے مفاد کے لیے تمہارے ایک دشمن کی قید سے رہائی دلائی، مگر یہ بھی تو دیکھو کہ آج تم میری ہی وجہ سے آزاد ہو۔‘‘ اسے جتانے والی سطح پر اترتے دیکھ کر میں نے بھی تلخی سے مسکرا کر کہا۔

’’تمہارا شکریہ…… بے شک تم نے اپنے مفاد کی خاطر ہی یہ حرکت کی تھی اور کاسپا کو تو میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، تم نے میری قبر ہی کھودنے کی کوشش میں اب نہ صرف خود کو بلکہ اپنی گرل فرینڈ سانچی کو بھی پھنسوا دیا۔‘‘

’’مجھے پورا یقین ہے کہ تم پاکستان سے یہاں محض سیاحت کے لیے نہیں آئے ہو، کوئی چکر ہے تمہارا یہاں…… ورنہ وزیر جان بھی ایک مسلم اور تمہارا ہم وطن ہے۔ اس نے کیوں تمہیں یرغمال بنانے کی کوشش کی تھی؟‘‘

وہ اپنے مقصد کی برآری کے لیے بلیک میلنگ پر بھی اتر آیا۔ موتو اپنے تئیں بڑا مکار آدمی تھا اسی لیے میرا اس پر کسی بھی معاملے پر بھروسا کرنے کا جی ہی نہیں چاہ رہا تھا، لہٰذا بے پروانہ انداز کی مسکراہٹ تلے بولا۔

’’چھوڑو ان باتوں کو میں اپنے معاملات جانوں اور تم اپنے…… میں اب یہاں سے جانا چاہوں گا اور تمہیں بھی آخری بار یہی دوستانہ مشورہ دوں گا کہ سانچی جیسے نازک معاملے میں اپنی بہن فرنا اور پولیس سے مدد لے لو، آخر کو تم کاسپا کو کے ساتھی رہے ہو، اس کے بہت سے رازوں سے……‘‘

’’پولیس کے پاس جانے سے پہلے ہی وہ مجھے ختم کرا ڈالے گا۔‘‘ موتو نے میری کاٹ دی۔ میں موضوع قطع کرنے کی غرض سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ’’مسٹر شہزی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے موتو برادر……!‘‘

اچانک ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ جسے سن کر ہم دونوں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں فرنا کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ ہمارے قریب آگئی اور قریب رکھے اپنے فرسٹ ایڈ بیگ کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سے ایک انجکشن بھرا اور اپنے بھائی موتو کے بازو میں لگا دیا۔ اس کے بعد دوسرا ایمپول لیا اور سرنج میں بھرتے ہوئے۔

’’معاف کرنا میں نے تمہاری باتیں سن لی تھیں۔ یہ مشورہ بالکل درست ہے کہ کاسپا کو کے خلاف قانون کا سہارا لینا چاہیے، سانچی اس کے قبضے میں ہے اور موتو اس کے مجرمانہ رازوں سے واقف ہے۔‘‘

مجھے موتو کی بہن فرنا خاصی عقل مند نظر آئی۔ اس نے اپنے بھائی کی حمایت کے مقابلے میں میری بات کو درست تسلیم کیا تھا۔

’’یہ ذرا قمیص اوپر کرو……ایک آخری ٹیکا لگانا ہے۔‘‘ اس نے مجھ سے کہا۔

’’میرا خیال ہے اس کی اب ضرورت تو نہیں رہی۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔

’’ضرورت ہے، پہلے میں نے پین کلر لگایا تھا، فوراً اینٹی بائیوٹک نہیں لگایا جاتا، اب لگا رہی ہوں۔‘‘ اس نے کہا اور میں نے آستین اٹھا کر بازو آگے کر دیا۔

’’آں……نہیں، یہ بازو میں نہیں نس میں لگے گا۔‘‘ اس نے مسکرا کر کہا۔ اس کا وہ سپاٹ پن اچانک غائب ہو گیا تھا۔ یہ تبدیلی میرے لیے عجیب اور اچانک تھی۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

وہ جھک گئی۔ میری نس میں اس نے سوئی گھونپ دی۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے بالکل قریب تر ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے ایک عجیب سی سناٹے دار چمک امڈتے دیکھی۔ ہونٹ بھی اس کے باہم پیوستہ تھے مگر ان میں ہلکی سی اضطراری تھرتھراہٹ تھی، کونے کھنچے ہوئے سے محسوس ہوئے، جو اس کے اندر کی بدطینیتی کو ظاہر کرنے لگے تھے۔ میری طرف یک ٹک تکتی ہوئی اس کی آنکھوں کی چمک میں ہولناک مکاری کی پرچھائیاں لہرانے لگیں اور تب ہی پل کے پل میری چھٹی حس نے کسی مخفی خطرے کا الارم بجایا۔ سرنج کی سوئی میری نس میں گھونپی ہوئی تھی۔ نصف دوا انجیکٹ ہو چکی تھی، باقی آدھی سرنج میں ہی تھی، یہی وہ وقت تھا، جب میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔

اس جھٹکے کی وجہ سے سرنج اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اس کے چہرے پر ایک لمحے کو بوکھلاہٹ اور غصے کے آثار نمودار ہوئے۔ اسی لہجے میں بولی۔ ’’یہ کیا کر رہے ہو……؟ بے وقوف……! سوئی ٹوٹ جاتی تو……؟‘‘

اسی وقت مجھے چکر سا آیا۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑایا۔ موتو کو میں نے اپنی بہن سے تھائی زبان میں کچھ کہتے پایا۔ جبکہ میں لڑکھڑا کر سنبھلنے کی کوشش میں پیچھے پڑے کاؤچ پر جا گرا۔ فرنا جلدی سے فرش سے سرنج اٹھانے کے لیے لپکی۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھ سے دوبارہ کھڑے ہونا محال ہو رہا تھا اور یہی نہیں میری آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے بھی رقصاں ہونے لگے تھے۔ وہ سرنج اٹھا کے پھر میری جانب لپکی۔

اس نے میرا بازو تھام کر نس میں دوبارہ سوئی گھونپنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ موتو کے بیڈ کے پاس جا گری۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے نکاسی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ کاؤچ سے اٹھا، دروازے کی طرف بڑھا مگر میرے پاؤں دوبارہ لڑکھڑا گئے۔

’’تم اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے ہو، تمہیں کاسپا کو کے حوالے ہونا ہی پڑے گا۔ میرے بھائی کی جان……سانچی کو بچانا ہی پڑے گا۔ سمجھے تم……‘‘

فرنا غرائی۔ اس وقت وہ مجھے مہربان خاتون کے بجائے ایک بھیانک چڑیل کے روپ میں نظر آ رہی تھی۔ میری بروقت چھٹی حس نے مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا کہ فرنا کو اپنے بھائی موتو سے کس قدر محبت تھی۔ وہ ہماری باتیں پہلے ہی سن چکی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ موتو نے بھی اسے اب تک کی حقیقت حالات کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ غراتے ہوئے دوبارہ بولی۔

’’تم نے ہی میرے بھائی کو اس حال تک پہنچایا ہے اور اب تمہیں ہی اپنی جان دے کر یہ قربانی دینا ہوگی۔‘‘

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے فرسٹ ایڈ باکس سے قینچی نما کوئی تیز دھار نشتر اٹھا لیا۔ میں نے موتو کے چہرے پر بھی اسی طرح کے بپھرے ہوئے پُرجوش آثار امڈتے دیکھے تھے۔ میں کمرے کے قالین پر گرا ہوا اب سنبھل کر اٹھنے کی کوشش میں تھا کہ وہ ملک الموت بنی ایک بار پھر میرے سر پہ آن کھڑی ہوئی……اور چاہتی تھی کہ وہ نشتر نما قینچی سے مجھ پر وار کرے…… میں نے اپنے الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر جڑ دیا۔ وہ ہسٹریائی چیخ مار کے پیچھے کی جانب الٹ گئی۔

میں بار بار اپنے سر کو جھٹکے دیے جا رہا تھا تا کہ ذہن اور آنکھوں میں اترتی تاریکیوں سے بچ جاؤں اپنی اس کوشش میں کافی حد کامیاب بھی رہا تھا، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ متوقع طور پر خواب آور دوا کی ابھی نصف خوراک ہی میرے بدن میں انجیکٹ ہوئی تھی۔ ورنہ تو میری یہ قوتِ ارادی بھی کام نہ کرتی جس سے میں ابھی کام لینے کی پوری کوشش میں مصروف تھا۔

فرنا کے تھپڑ کھا کے الٹتے ہی میں نے موتو کی غراہٹ

سے مشابہ بڑبڑانے کی آواز سنی۔ میری آنکھوں سے پوری طرح دھند نہیں چھٹی تھی مگر مجھے جتنا نظر آرہا تھا اور جو میں اپنی غیر معمولی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اپنی بقا کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا اس پر عمل پیرا رہتے ہوئے میں نے دروازے کی جانب اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور بالآخر دروازہ دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ چند لوگوں کو میں نے دفتر وغیرہ جانے کے لیے گھروں سے نکلتے دیکھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے مختصر سے باغیچے سے گزرتا ہوا کار تک پہنچا۔ چابی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ میں ان دونوں منحوس اور بدطینت بھائی بہن کے نرغے سے دور نکل جانا چاہتا تھا جو مجھے اپنے مفاد کی خاطر کاسا کو جیسے خطرناک آدمی کے حوالے کرنے کا پختہ ارادہ کر چکے تھے۔ میں کار میں سوار ہونا چاہتا تھا مگر کہاں جاتا؟ اور کیا میں اس حالت میں ڈرائیونگ کر سکتا تھا؟ جبکہ میرے پاس نہ کوئی لائسنس تھا نہ ہی اور کچھ جبکہ میرے تھائی لینڈ تک کے سفری کاغذات کاؤشی کے فلیٹ میں رہ گئے تھے۔ میں بالکل پھنس کے رہ گیا تھا۔ وزیر جان جیسا موذی دشمن میری راہ پہ لگا ہوا تھا۔ بینکاک کا انڈر ورلڈ ڈان کاسا کو، الگ میرے پیچھے دانت نکوسے پڑا ہوا تھا۔ میری امریکا روانگی کا معاملہ سخت کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ کاؤشی کی ہلاکت نے مجھے بینکاک میں بالکل ہی تہی داماں اور خانماں برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ میرے سفری کاغذات داؤ پر لگے ہوئے تھے۔ دیارِ غیر میں یہاں میرا کون مونس و غم خوار تھا جس کے پاس جا کر میں پناہ لیتا۔ اپنے دیس کا کوئی شہر یا علاقہ ہوتا تو اور بات تھی۔ چاہے اجنبی علاقہ ہی کیوں نہ ہوتا، مگر یہاں پردیس میں کون تھا میرا؟ غریب الوطنی کی اس حالت زار میں کون میرا پرسانِ حال ہوتا؟ اگر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا تو جو تھوڑا بہت معاملہ ہاتھ میں تھا وہ بھی نکل جاتا۔ فضول چکروں میں پڑ جاتا اور اصل مقصد سے ہٹ کر رہ جاتا۔ ابھی جو تھوڑا بہت معاملہ تھا وہ میرے ہاتھ میں تو تھا۔ پھر وزیر جان کو بھی میں نے جہنم واصل کرنے کا پختہ عزم کر رکھا تھا۔ مگر ابھی تو میں خود مصیبتوں کا شکار تھا اور مجھے اپنی پڑی ہوئی تھی۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ میں بھی آخر گوشت پوست کا عام سا انسان تھا، رقیق بھرے جذبات نے بے اختیار میری آنکھوں میں نمی سی اتار دی تھی۔ مگر میں اللہ کی رحمت اور مدد سے مایوس ہونے والا کہاں تھا۔ دکھ اور آزردگی کے اس چند لمحاتی سفر کے دوران میں نے اپنا دل مضبوط کیا۔

یہاں زیادہ دیر میرا کھڑے رہنا مناسب نہ تھا، میں آگے بڑھ گیا۔ میں فرنا کی اس منحوس رہائش گاہ سے دور نکل گیا تھا۔ دوا کی آدھی ڈوز نے بھی مجھے نڈھال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ دیکھنے والے مجھے کوئی شرابی ہی سمجھتے۔ زخمی ٹانگ کی وجہ سے میں بدستور لنگڑا کر چل رہا تھا۔ حالت میری ایسی ہی تھی کہ میری ایک ٹانگ برہنہ تھی۔ زخم کی وجہ سے فرنا نے پٹی وغیرہ کرتے وقت پینٹ کا وہ حصہ کاٹ ڈالا تھا، پٹی صاف نظر آرہی تھی۔ بڑی ہی عجیب حالت تھی میری۔ دل چاہ رہا تھا کہ یہاں کسی کے بھی گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر گھس جاؤں اور مدد کی درخواست کر ڈالوں، مگر کون میری مدد کرتا؟ بلکہ میری اس ہیئت کذائی کو دیکھتے ہی مجھے شبہے کی نگاہ سے دیکھا جاتا اور پولیس کو فون کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی جاتی۔ میں بس بے منزل اور بے مقصد لنگڑاتا چلتا رہا۔

گھر سے باہر نکل آنے کے بعد میرا خیال تھا کہ فرنا میرے تعاقب میں آئے گی مگر وہ نہیں آئی۔ شاید میرے اس حالت میں باہر نکل جانے سے وہ بھی مجھ سے کترا گئی تھی۔

”اے مسٹر! تم ٹھیک تو ہو......؟“ اچانک ایک شستہ اردو میں کسی نے عقب سے مجھے پکارا...... میں حیران ہو کے رک کر پلٹا۔ میرے سامنے ایک سانولے رنگ کا دراز قامت انڈین کھڑا تھا، عمر چالیس، پینتالیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ کار میں بیٹھا تھا جو عقب سے رینگتی ہوئی اب میرے ....قریب آکر رک گئی تھی۔ مجھے اس سے مدد کی کچھ امید ہوئی، میں رک گیا اور اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے پیچھے ہاتھ گھما کر دروازہ کھول دیا۔

”میرا خیال ہے تم پہلے کار میں آجاؤ......“

میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار آگے بڑھا دی۔

”انڈین ہو؟“ اس نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے بیک ویو مرر میں مجھے دیکھ کر پوچھا۔

”بنگلہ دیشی......“

”او...... مسلم؟“

”یس۔“

”میں انڈین ہوں۔ میرا نام منوج کمار ہے۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“ اس نے اپنا مختصراً تعارف کروایا۔

”شکریہ! میں ریاض خان ہوں، مجھے بھی تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“ میں نے بھی ونڈ اسکرین کے اوپر لگے مرر میں اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

میں نے دانستہ اسے اپنا نام غلط بتایا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہوں ناں...... تمہاری ٹانگ...... میں نے اسی لیے تمہیں پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لیے کہا تھا تاکہ تم اپنی زخمی ٹانگ پھیلا کر آرام سے بیٹھ سکو۔“ وہ بولا۔ ساتھ ہی اس نے ایک موڑ کاٹا اور مین روڈ پر آگیا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے مختصراً کہا۔ اس کا چہرہ خاصا چوڑا اور بھاری تھا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے عجیب سے تاثرات محسوس کیے تھے۔ بظاہر وہ خوش اخلاق اور نرم دل دکھائی پڑتا تھا۔

”تم شاید کسی مشکل میں ہو......؟“ اس نے بیک ویو میں بدستور بھانپتی ہوئی نظروں سے میرے چہرے کو تکتے ہوئے کہا۔ ”ویسے...... تم پیے ہوئے ہو شاید......؟“

”ہاں دوست! میں واقعی ایک مشکل میں ہوں......“ میں نے ژولیدہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن...... میں پیے ہوئے نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کسی نے مجھے زبردستی نیند کی دوا دے ڈالی تھی۔“

”دوست کہا ہے تو پھر اب کسی بات کی چنتا مت کرو، میرے ساتھ چلو، مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔“

”میں تہِ دل سے مشکور ہوں تمہارا......“

”چلو پھر باقی باتیں گھر چل کر ہوں گی۔ تم آرام سے بیٹھو......“ اس نے کھلے دل سے کہا اور کار کی رفتار مزید بڑھا دی۔ میں پچھلی خالی سیٹ پر زخمی ٹانگ پھیلا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ کار زیادہ قیمتی یا نئے ماڈل کی نہیں تھی۔ بس ٹھیک تھی۔ ہلکے سبز رنگ کی تھی۔ خود اس نے بھی عام سی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں یہی سمجھا تھا کہ وہ جاب پر جانے کے لیے نکلا ہوگا لیکن اب شاید ارادہ بدل کے گھر لوٹ رہا تھا۔

”تم شاید کام پر جا رہے تھے۔ میری وجہ سے تمہیں اب واپس گھر لوٹنا پڑ رہا ہے۔“ میں نے معذرتی انداز میں کہا۔

”نہیں، میں گھر ہی جا رہا تھا۔ میں کوئی کام نہیں کرتا۔“ اس نے جواب دیا۔ پھر سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ ایک مجھے تھمائی اور دوسری اپنے ہونٹوں میں داب لی۔ لائٹر سے سلگانے کے بعد اس نے ہاتھ گھما کر وہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں باقاعدہ سگریٹ تو نہیں پیتا تھا، مگر ذہنی دباؤ کے وقت کبھی کبھار پی لیا کرتا تھا۔ سو لائٹر لے کر میں نے ہونٹوں میں سگریٹ داب کر سلگا لیا۔

سگریٹ کا گہرا کش لینے کے بعد مجھے اپنے اعصاب میں تناؤ اور ذہنی کھنچاؤ میں کچھ کمی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اضطراری انداز میں دو تین کش یکے بعد دیگرے لیے۔ میں نے دیکھا بیک ویو سے وہ میرے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا، مجھے اپنی جانب تکتا پا کر اس نے فوراً نظریں ہٹا کر سامنے ونڈ اسکرین پر جما دیں۔

یہ سفر بہ مشکل نصف گھنٹے تک جاری رہا تھا۔ اس کے بعد ایک عام سی رہائشی کالونی میں کار داخل ہوتے ہی ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے رک گئی۔ اس نے سوئچ آف کیا اور اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ میں نے بھی اپنی طرف کا دروازہ کھولا تو اس بھلے مانس نے مجھے سہارا دے کر نیچے اتار دیا۔ سگریٹ پینے کے بعد میرے دماغ سے شاید نشہ آور دوا کا اثر زائل ہونے لگا تھا۔

وہ مجھے اندر لے آیا۔ یہ گھر بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ کاؤشی کا تھا۔ دو چھوٹے کمرے، ایک گھٹا گھٹا سا لاؤنج اور تیسرا ایک اسٹور نما سا کمرا ساتھ ہی نظر آرہا تھا۔ گھر سارا تلپٹ پڑا ہوا تھا۔ نجانے کیا کیا الا بلا بکھرا ہوا تھا۔ پہلا احساس مجھے یہی ہوا تھا کہ یہاں یہ شخص اکیلا رہتا ہوگا۔

”معاف کرنا، بس میرا گھر ایسا ...ہی ہے، کرائے کا ہے، مجھ اکیلے کے لیے کافی ہے۔“ منوج خفیف سا ہو کے بولا اور مجھے ایک چھوٹے سے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

”میں تمہارے لیے ناشتا تیار کرتا ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں، وہ میں کر چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”چلو، کافی بنا لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور قریب بنے کھلے کچن کی طرف بڑھ گیا۔ میں لاؤنج کا جائزہ لینے لگا۔ ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ دو کرسیاں تھیں، ایک ہی صوفہ بچھا ہوا تھا۔ ساتھ ساتھ دو کمرے تھے۔ وہ بھی اندر سے بکھرے بکھرے نظر آرہے تھے، البتہ وہاں مجھے کچھ عجیب سی چیزوں کی جھلک نظر آرہی تھی۔ فٹ اسکیل، وائٹ چارٹ، پنسلوں کا ہولڈر، جیومیٹریکل کا سامان اور کچھ ایسے آلات جو خاصے کند تھے۔ یعنی ایک بڑی سی ڈرل مشین، اوزاروں کا باکس وغیرہ۔

تھوڑی دیر بعد وہ کافی کے دو مگ اپنے ہاتھ میں اٹھائے آگیا۔ ایک مجھے تھمانے کے بعد خود میرے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا۔

”ہاں! اب تم اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کرو تو بہ خوشی بتا سکتے ہو۔“ وہ گرما گرم کافی کا ایک گھونٹ بھرتے

ہوئے بولا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ غور غور سے میرا چہرہ بھی تکے جاتا تھا۔

میں ہولے سے مسکرایا۔ کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ یہاں آنے تک میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کہنا تھا، لہٰذا محتاط لہجہ اختیار کرتے ہوئے بظاہر عام سے لب و لہجے میں بتانے لگا۔ ’’میں بنگلہ دیش سے اپنی قسمت آزمانے یہاں آیا تھا۔ کسی ایجنٹ کو اپنی جمع پونجی کے پیسے کھلائے تھے کہ وہ مجھے تھائی لینڈ کے راستے امریکا یا کسی اور بڑے ملک پہنچا دے گا، مگر میرے ساتھ شاید دھوکا ہوگیا۔ ایجنٹ نے یہاں آکر مجھے بے دست و پا اور بے یار و مددگار کر کے چھوڑ دیا۔ پھر ایک رات میں منشیات کے مارے ہپیوں کے گروہ میں پھنس گیا۔ لڑائی بھی ہوئی، چاقو میری ران پر لگا، مرہم پٹی بھی ہوئی مگر صبح ہوتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلا تو تم مل گئے۔‘‘

میں اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔ وہ بڑے غور سے میری یہ جھوٹی کتھا سنتا رہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے چہرے پر مسرت آمیز سے جوش بھرے تاثرات مترشح ہونے لگے تھے۔ آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آئی تھی۔

’’بہت دکھ ہوا مجھے تمہاری کہانی سن کر، لیکن شاید ایک طرح سے اچھا بھی ہوا۔‘‘ وہ عجیب سے لہجے اور اسی مسکراہٹ تلے میری جانب دیکھ کر بولا۔

’’کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں......؟‘‘ میں نے دانستہ الجھن آمیز اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کچھ نہیں۔‘‘ وہ سر جھٹک کر بولا۔ ’’دراصل تمہاری کہانی مجھ سے مختلف نہیں ہے، جس طرح تم دیارِ غیر میں اچانک جن مصیبتوں کا شکار ہوگئے ہو، کبھی میں بھی اسی طرح شکار ہوگیا تھا۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے میں نے اپنی ان پریشانیوں پر قابو پالیا، نہ صرف یہ بلکہ بہت جلد میں ایک بڑی کامیابی حاصل کرنے والا ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ مجھے اس کی یہی آخری بات سمجھ نہ آسکی کہ وہ ایک طرف اپنی ’’میرے جیسی‘‘ کہانی پر قابو پاچکا تھا اور اب کوئی بہت بڑی کامیابی بھی حاصل کرنے والا تھا لیکن مجھے اس کی باتوں سے کیا غرض؟ میں تو بس اپنے حوالے سے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص میرے کس حد تک کام آسکتا تھا۔ لہٰذا خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

’’شاید ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، تمہارا شکریہ دوست! لیکن مجھے تمہاری آخری بات سمجھ نہیں آئی، تم کون سی کامیابی کی بات کررہے ہو؟‘‘

میری بات پر وہ اسرار بھرے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ’’میں تمہیں اس کے بارے میں ضرور بتاؤں گا لیکن پہلے میرے ایک سوال کا جواب دو۔ کیا تم واپس اپنے ملک لوٹ جانا چاہتے ہو یا ابھی تک تمہارے سر پر یہی دھن سوار ہے کہ تم اور لوگوں کی طرح اپنی زندگی بنانے کے لیے کسی اچھے اور بڑے ملک کی طرف کوچ کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو دوست! بات تلخ اور کڑوی ضرور ہے مگر فی زمانہ حقیقت یہی ہے کہ بنگلہ دیش، پاکستان اور انڈیا کے سماجی، سیاسی، معاشی اور داخلی مسائل ایسے ہی ہیں کہ ہر سال نجانے کتنے ہی لوگ دوسرے مغربی ملکوں کی طرف امیگریشن کروا چکے ہیں اور کروا رہے ہیں۔ تم اور میں بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ کیا میں نے غلط کہا؟‘‘

اس نے آخر میں تائید طلب لہجے میں مجھ سے استفسار یہ کہا۔ میں کیا جواب دیتا غلط وہ بھی نہیں کہہ رہا تھا لیکن میں اس کی بات سے متفق نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنا ملک اور اپنے وطن کی مٹی کی اور بات ہوتی ہے۔ جو سکون اور آرام اپنے ملک کی فضاؤں میں ہے وہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں کہاں ہے، بس، دور کے ڈھول سہانے والی بات ہے، ورنہ وہاں جانے والے اور وہاں کی نیشنلٹی حاصل کرنے والے لوگوں کا سکون غارت ہے۔ صبح سے رات تک وہ مشینی انداز میں کام کرتے ہیں۔ ایک ہی گھر کے رہنے والے افراد تک کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ دو گھڑی بیٹھ کر بات کرسکیں۔ خیر، میرا یہ موضوع نہیں تھا، میں تو اپنے مطلب کی برآری چاہتا تھا، لہٰذا بولا۔

’’ہاں! تم نے ٹھیک سمجھا۔ جب آگے کا سفر شروع کیا ہے تو واپس کیوں جاؤں؟ میں اب بھی اپنی زندگی بنانے کے لیے کسی بڑے اور ترقی یافتہ ملک کی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ لیکن تم نے جب اپنی ان مشکلات پر قابو پالیا تھا تو پھر تم آگے کیوں نہیں بڑھے ادھر کے ہی کیوں ہو کے رہ گئے؟‘‘ میں نے آخر میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

’’تم نے ٹھیک سوچا ہے، اب ہم کھل کر بات کرسکتے ہیں۔‘‘ وہ بولا، مگر چپ ہو رہا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاشنے کی کوشش میں تھا۔ بالآخر بولا۔

’’دیکھو دوست! باہر کے ممالک میں بھی نوٹ درختوں میں نہیں لگے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے انسان کو مشین بننا پڑتا ہے۔ ایک عمر تمام کرنا پڑتی ہے، تب بھی کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ باقی ماندہ زندگی سکون سے گزرے گی یا پھر اسی طرح ساری عمر خوار...... رہنا پڑے گا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ اگر کسی شارٹ کٹ اور آسان راستے کے عوض یہ زندگی ایک دم پُرآسائش ہوجائے تو اور کیا چاہیے۔‘‘ وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مجھ سے آخر کہنا کیا چاہ رہا تھا؟ اس نے میرے بارے میں سرے سے غلط اندازہ قائم کیا تھا اور اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہ تھا، کیونکہ میں نے ہی اسے غلط بتایا تھا اپنے بارے میں۔ جبکہ مجھے دیکھنا یہ تھا کہ یہ میرے کس کام کا ہوسکتا تھا؟ اس لیے میں خاموشی سے اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

چند ثانیے کے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

’’مجھے پُرآسائش اور آسان زندگی کے لیے جس راستے کی ضرورت تھی وہ مجھے مل تو گیا ہے مگر میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ سب سے پہلے تو مجھے اپنے جیسے دوست کی تلاش تھی، جو میرا خیال ہے تمہاری صورت میں مجھے مل گیا ہے، اس کے بعد مجھے دو پروفیشنل افراد چاہیے ہوں گے، جنہیں مجھے باقاعدہ ’’ہائر‘‘ کرنا پڑے گا۔ جو اس کام کو رازداری سے نمٹائیں اور کامیابی سے بھی......‘‘

’’وہ کون سا کام ہے؟‘‘ بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات میں جبکہ میں بالکل بے دست و پا ہو چکا تھا ایسے میں منوج کمار کا ساتھ میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔ اگر وہ میرے کسی کام آنے والا تھا تو مجھے اس کے کام آنے میں کیا حرج تھا؟

’’کام مشکل ضرور ہے مگر ناممکن نہیں۔ ہم دونوں اس منصوبے میں پارٹنر شپ کی بنیاد پر ہوں گے۔ اس لیے کہ تم میرے ساتھ ہوگے۔ تمہارا سارا خرچہ پانی میرے ذمّے ہوگا۔ حتیٰ کہ کامیابی اور بے تحاشا ملنے والی رقم کے بعد تم جس ملک میں بھی جانا چاہو وہاں تک پہنچانے میں بھی میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ میرا ساتھ دینا چاہتے ہو تو میں تمہیں اس ہم راز اور کام سے آگاہ کردوں......؟‘‘

میں نے محتاط لہجے میں کہا۔ ’’اگر تم مجھے قابلِ بھروسا سمجھتے ہو تو بتادو، رہی بات یہ کہ میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں جس سے مجھے بھی فائدہ پہنچے اور کسی بے گناہ کی جان جانے کا اندیشہ یا کوئی غیر قانونی نہ ہو تو مجھے تم اپنے ساتھ پاؤ گے۔‘‘

’’ویل اِٹ......!‘‘ وہ یک دم چمک کر بولا۔ ’’میری توقع کے عین مطابق تم ایک شریف، نیک نیت اور صاف گو انسان ہو۔ مجھے بھی ایسے ہی ساتھی کی ضرورت تھی۔ بے فکر رہو، اس کام میں نہ کسی کی جان کو خطرہ ہے اور نہ ہی کسی کا نقصان...... ہاں! رہی بات غیر قانونی کی تو...... آسان راستوں کے ذریعے تھوڑا بہت قانون سے ہٹ کر بھی کام کرنا پڑتا ہے اور خطرے کا رسک بھی لینا پڑتا ہے۔ مجھے شاید اب تمہیں ساری بات تفصیل سے بتا دینا چاہیے، لیکن ابھی نہیں...... تم تھوڑا آرام کرلو اور ساتھ ہی ذہنی طور پر خود کو میرا ساتھ دینے پر بھی آمادہ کرلو۔ کوئی جلدی نہیں، ابھی میں ایک ضروری کام سے باہر جارہا ہوں۔ رات کو تفصیل سے میں تمہیں اپنے اس منصوبے سے آگاہ کردوں گا۔ مگر رازداری اولین شرط ہے۔‘‘

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سنجیدہ سا نظر آنے لگا، میں نے کچھ سوچ کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔ اس کا منصوبہ جو بھی تھا، اس میں مجھے دولت والی بات سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے تو بس عارضی طور پر اس کا ساتھ چاہیے تھا رہنے کے لیے۔ اس دوران میں اپنی امریکا روانگی کی کوئی راہ نکالنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ یہیں رہتے ہوئے وزیر جان کو بھی میں نے ٹھکانے لگانا تھا۔ تاہم مجھے ایسی دولت سے کوئی غرض نہ تھی جو چوری اور حرام کی ہو، تاہم مجھے اگر اس بہانے بینکاک میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اگر پاؤں جمانے کا موقع مل رہا تھا میرا تو خیال تھا کہ مجھے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ منصوبے کی کامیابی کے بعد وہ مجھ سمیت انتہائی محفوظ طریقے سے امریکا روانگی کا بھی ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ وہاں بھی وہ میرے ساتھ ہی رکنے کے لیے پُرعزم تھا۔ خیر، تب کی جب دیکھی جاتی، ابھی تو ابتدا تھی اور مجھے بھی فوری طور پر کوئی ٹھکانا مل گیا تھا۔

لہٰذا اس کی بات سُن کر میں نے بھی اپنے چہرے پر مصنوعی جوش، دلچسپی اور مسرتوں کے ڈونگرے سجاتے ہوئے اس سے کہا۔ ’’میں تمہارے اس منصوبے میں پارٹنر شپ کے لیے تیار ہوں۔ جیسا کہ تم نے کہا کہ اس منصوبے کے لیے چند ماہر اور پروفیشنل افراد کی بھی ضرورت پڑسکتی ہے لہٰذا اب تم باقی افراد کو بھی اکٹھا کرلو جو اس منصوبے میں ہمارا ساتھ دے سکیں۔ لیکن یہ کام بہت محتاط ہو کے کرنا پڑے گا تمہیں، میرا مطلب ہے پروفیشنل آدمیوں کی تلاش۔‘‘ میری بات پر وہ بولا۔

''ضرورت مند اور کڑے حالات کے ستائے ہوئے افراد ہمیشہ سے میرا ٹارگٹ رہے ہیں۔ میں ایسوں کو تاڑنے اور تلاشنے کے فن سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔''

''جیسے تم نے مجھے تلاشا......'' میں نے مسکرا کر کہا تو اس نے دوستانہ انداز میں ایک قہقہہ خارج کر دیا، میں بھی ہنس دیا۔

''اچھا اب تم ذرا دیر آرام کرو، میں ایک ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔'' تھوڑی دیر بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''کچن میں ریڈی ٹو ایٹ کھانا پینا سب موجود ہے، بس، گوشت نہیں ہوگا۔ شراب بھی ہے۔ بے دھڑک کچھ بھی کھانا چاہو کھا لینا، میں شام تک ہی لوٹوں گا، ہاں! مجھے واپسی میں ذرا دیر بھی ہو جائے تو پریشان مت ہونا۔'' میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ چلا گیا۔ میں سونے کے لیے لیٹ گیا۔ شام کو جاگا تو کچن کا رخ کیا۔ ڈبے میں مٹر کے ابلے ہوئے دانے پڑے تھے۔ سبزی تھی۔ ابلے ہوئے چاول تھے، بس یہی کچھ فرائیڈ کر کے میں نے پیٹ بھرا اور تھوڑا بہت آئینے کے سامنے جا کر اپنا گیٹ اپ چینج کیا۔ وارڈروب سے اپنے سائز کے کپڑے نکال کر پہنے۔ ایک ہیٹ بھی تھا، وہ بھی میں نے سر پہ لگا دیا۔ پھٹی ہوئی پینٹ اتار دی تھی میں نے۔ اس کے بعد میں مکان کو لاک کر کے باہر آ گیا۔ ایک ڈپلی کیٹ چابی منوج نے مجھے دے رکھی تھی۔

میں نے ٹیکسی روکی اور اسے کاؤشی والے علاقے کا پتا بتا کر چلنے کا کہا۔ ڈرائیور سکھ تھا اور باتونی بھی۔ وہ نجانے کیا کیا ادھر ادھر کی سارے راستے ہانکتا رہا، میں بھی ہوں ہاں کرتا رہا۔ شکر کیا جب میری منزل قریب آ گئی۔

میں نے اسے کرایہ دے کر فارغ کیا۔ میرے پاس پیسے بھی ختم ہونے کو تھے۔ سفری کاغذات کے ساتھ وہ کارڈ اور سلپس وغیرہ بھی اسی کے ساتھ ایک پاؤچ میں رکھے رہ گئے تھے۔ جن کے ذریعے میں یہاں کے کسی بھی بینک سے ویسٹرن یونین منی ٹرانزیکشن کر سکتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے اسی پاؤچ کی تھی۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ کاؤشی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے نظر آ رہے تھے۔ لوگ باگ ادھر ادھر آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ میں نے فلیٹ ہیٹ سر پہ لگائے رکھا تھا اور عام سے کوٹ پینٹ میں ملبوس تھا۔ کاؤشی کے مکان کے قریب پہنچا تو دل بے اختیار مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا، کیونکہ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی پن محسوس نہیں ہوا تھا، تاہم میں رکا نہیں تھا اور آگے نکلتا چلا گیا تھا کہ کہیں وزیر جان کا کوئی آدمی یہاں کہیں آس پاس خفیہ طور پر تعینات نہ کر دیا گیا ہو، ظاہر ہے اب تک وزیر جان کو اس کے تہ خانے والے قید خانے سے میرے فرار ہونے کا پتا چل چکا ہوگا اور اسے پہلا خیال یہی ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے میں اس مکان کا رخ کروں، جہاں گزشتہ شب میری تلاش میں اس کے درندہ صفت آدمیوں نے شب خون مار کے بے چارے کاؤشی کو بیدردی سے ہلاک کر ڈالا تھا اور میری تاک میں وہیں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔

میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر یہی کچھ کیا اور مٹرگشت کے انداز میں ادھر ادھر اطراف میں اچھی طرح کسی مشکوک ذی نفس کی غیر موجودگی کا اپنے تئیں یقین کر لینے کے بعد میں نے مطلوبہ مکان کی طرف قدم بڑھا دیے۔ گھر کی چابی میرے پاس نہیں تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ کاؤشی اسے کہاں رکھتا تھا۔ یہاں عموماً لوگ گھروں کی چابیوں کو اسی طرح ہی رکھتے تھے، پائدان کے نیچے، باہر کسی پودوں یا گلدان کے اندر۔ کاؤشی کو بھی میں نے مکان کے پائدان اور کبھی دروازے کی چوبی چوکھٹ کے اوپر بنے باریک رخنے سے چابی اٹھاتے بارہا دیکھا تھا۔

مجھے اس بات پر ایک سنسنی خیز حیرت ہی ہوتی اگر مکان کے اندر کاؤشی کی لاش اسی طرح ہی پڑی ہوئی ہوتی۔ بہت عجیب ہی لگ رہا تھا مجھے یہ سب۔ اندر کاؤشی کی ایک روز پرانی لاش پڑی تھی۔ پاس پڑوس یا پولیس کو ابھی تک اس کا کچھ علم نہ ہو سکا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ زیادہ دن گزر جانے کے سبب لاش سے بدبو اٹھتی تو اریب قریب کے لوگ باگ اس طرف متوجہ ہوتے۔ ایسے کئی لرزہ خیز واقعات کا دیدہ و شنیدہ ہر کوئی تھا کہ ایک مکان میں قتل ہو جاتا تھا۔ کئی دنوں تک بسا اوقات تو کئی ہفتوں تک کسی کو بھی نہیں پتا چلتا تھا۔ لیکن جب لاش زیادہ پرانی ہو جانے کے باعث بدبو چھوڑنے لگتی تب ہی واقعے کا پتا چلتا۔

بہرطور میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا اور دروازے کے قریب پہنچا۔ جھک کر پائدان الٹ کر دیکھا مگر چابی وہاں نہیں تھی۔ دروازہ بند تھا۔ یہ انٹرلاک ڈور تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چوکھٹ کے رخنے میں انگلیاں ڈالیں تو چابی کو چھوتے ہی میرے اندر مسرت بھری بجلیاں دوڑ گئیں، میں نے پھر دروازہ کھولنے اور اندر داخل ہونے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی میں نے احتیاط کے پیشِ نظر ایک اور دانشمندانہ حرکت کی، آگے بڑھنے کے بجائے پلٹ کر میں نے باہر جھانکا اور ایسا چند سیکنڈ تک کرتا رہا تاکہ اگر کوئی باہر میری نظروں سے چوک بھی گیا ہو تو کہیں چھپا ہوا شخص مجھے اندر داخل ہوتے دیکھتے ہی اس طرف کو ضرور لپکے گا۔ دوسرے ہی لمحے میرے بدن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے دو افراد کو بالکل سامنے والے مکان سے تیر کی طرح نکلتے ہوئے دیکھا، وہ اسی مکان کی طرف تیز تیز قدموں سے بڑھے چلے آ رہے تھے، جس کے اندر میں داخل ہوا تھا۔ مجھے اپنی اس ''احتیاط'' پسندی کے اس قدر جلد نتائج کے برآمد ہونے کا بالکل بھی اندازہ نہ تھا۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے اور مجھے پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ میں نے ایک کام یہ کیا کہ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگائی تھی اور دائیں جانب رکھے فریج کے پیچھے جا چھپا۔ اس طرح کہ میری نظریں دروازے پر جمی رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے کھلا اور دوسرے ہی لمحے دو افراد جن کے ہاتھوں میں اب پستول نظر آنے لگے تھے، الگ الگ ہو کے کمروں کی طرف بڑھے، میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور جست بھری۔ میری ٹانگ ایک کی پشت پر لگی۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی، اس کی شاید ریڑھ کی ہڈی سرک گئی تھی، وہ تقریباً اچھل کر کمرے کے دروازے سے ٹکرایا اور دھڑام سے فرش پر گرا، اس میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی سکت نہیں رہی تھی یہی سبب تھا کہ وہ گرتے ہی کراہنے اور تڑپنے لگا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پرے کہیں جا گرا تھا۔ اس افتاد پر اس کا دوسرا ساتھی پلٹا، تب تک سنبھلتے ہی میری دوسری ٹانگ بھی حرکت میں آ چکی تھی، یہ میری زخمی ٹانگ تھی، اسی سبب اس کی ضرب میں وہ زور نہ تھا، اس کے پیٹ پر پڑی تھی۔ وہ بس تھوڑا سا ہی عقب میں لڑکھڑایا تھا اور تب ہی مجھے اپنی بھیانک غلطی کا احساس ہوا تھا۔ میں اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی زد میں آ چکا تھا۔ میری ٹانگ میں درد کی ٹیس دوبارہ جاگ اٹھی تھی، بس ایک جوش تلے میں نے یہ حرکت کر ڈالی تھی۔ ضرب ''ہلکی'' جانے کے باعث پستول بھی اس کی گرفت سے نہ نکل سکا تھا اور یہی میرے لیے خطرناک ثابت ہوا تھا۔

اس نے فائر کر دیا۔ میں تب تک اس مہیب صورت حال کو بھانپتے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دے گیا تھا۔ گولی خطا گئی تھی، مگر ہر بار ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے فوری تدارک کے طور پر میں نے جھکائی لگاتے ہی خود کو فرش پر گراتے ہی ایک الٹی قلابازی کھائی تھی، جس کے نتیجے میں میری دونوں ٹانگیں اس کے سینے پر پڑی تھیں۔ اس ضرب نے اسے سنبھلنے نہ دیا اور نہ ہی دوسری گولی داغنے کی نوبت آئی۔ وہ میرے تلے اوپر دو حملوں کی زد میں آ گیا تھا۔ پہلا حملہ ہلکا جانے کے باوجود یہ دوسرا حملہ اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا اور وہ بڑے زور سے عقب میں لڑکھڑاتے ہوئے دیوار سے جا ٹکرایا۔ پستول اس کے ہاتھ چھوٹا تو وہ آپوں آپ میرے اوپر آ رہا۔ میں نے لاؤنج کے فرش پر لیٹے لیٹے اسے کیچ کیا اور اس پر تان لیا، لیکن بدقسمتی سے تب تک میری اپنی حالت پتلی ہونے لگی تھی۔ میری زخمی ران کے ٹانکے شاید اس اٹھاخ پٹاخ میں کھل گئے تھے اور اب اس میں سے خون رسنے لگا تھا۔ درد تو جیسے اس طرح دوبارہ جاگ اٹھا تھا کہ پورا وجود ہی ٹیس بن کر رہ گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب میرے اندر کمزوری جنم لینے لگی تھی۔ اب تک جو کیا وہ خود اعتمادی اور ایک جوش تلے ہی کیا تھا۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس آخری وقت میں جبکہ میں زخم کھل جانے اور جریان کے باعث کمزور پڑنے لگا تھا کہ حملہ آور کا پستول میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔

''اپنا چہرہ دوسری طرف کر لو۔'' میں نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ساتھ ہی کن انکھیوں سے قریب ہی بے سدھ پڑے اس کے ساتھی کی طرف بھی دیکھا۔ وہ اب بالکل ہی بے حس و حرکت پڑا نظر آ رہا تھا۔

''خبردار! ذرا بھی حرکت کی تو گولی چلا دوں گا۔'' میں خوف ناک انداز میں غرایا اور پھر نہایت محتاط انداز میں دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑا لنگڑایا بھی تھا۔ وہ پشت کے بل دیوار سے چپکا میری اس کمزوری کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آتشیں ہتھیار میرے ہاتھ میں تنا ہوا دیکھ کر اس میں کسی قسم کی جارحانہ حرکت کرنے کی ہمت نہ ہو پائی تھی۔

میرے جارحانہ تیور دیکھ کر اس نے چار و ناچار ہی سہی، میری ہدایت پر عمل کیا تھا اور پھر جیسے ہی وہ دیوار کی جانب پلٹا، میں نے اچانک ہی پستول کے آہنی دستے سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور وہ لہرا کر گر پڑا۔

دوسرے حملہ آور کو بھی اتنا غیر فعال کرنے کے بعد میں نے چند ثانیے کے لیے ہی سنبھالا لیا تھا۔ میرے پاس اتنا

وقت نہ تھا کہ اس سے پوچھ تاچھ کرتا کہ وہ کون تھا اور کس کا بھیجا ہوا تھا؟ بھلا اس میں کیا شک تھا کہ یہ دونوں وزیر جان کے ہی آدمی ہو سکتے تھے۔ انہیں اندازہ تھا کہ میں دوبارہ یہاں کا رخ کرسکتا تھا۔

بدنصیب کاوَشی کی لاش صوفے سے لڑھک کر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے جلدی کمرے کا رخ کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے ضروری کاغذات تلاشنے لگا۔ مجھے تشویش بھی تھی کہ کہیں وہ اِدھر اُدھر نہ ہو گئے ہوں، شکر تھا کہ وہ مجھے ایک دراز میں پڑے مل گئے۔ میرا کام ختم ہوگیا، میں وہاں سے جانے لگا تو اچانک ایک خیال کے تحت میں نے دل کڑا کر کے کاوَشی کی جیبوں کی تلاشی لے ڈالی۔ دل ''کڑا'' اسی لیے کیا کہ کئی گھنٹے بیت جانے کے باعث اس کی لاش سے بدبو اٹھ سکتی تھی۔ مگر ابھی ایسا کچھ نہیں تھا، یوں تلاشی کے دوران میں نے اپنی سانس روکے رکھی تھی۔

کاوَشی کا سیل فون اور ایک عدد جیبی سائز ڈیجیٹل ڈائری میرے ہاتھ لگی، وہ میں نے کسی خیال کے تحت اپنے پاس رکھ لی۔ اچانک میری نظر فرش پر پڑی۔ وہاں خون کی لکیر سی بنی ہوئی تھی۔ یہ خون میری زخمی ران سے بہہ رہا تھا اور مجھے درد کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ میں نے فوراً واش روم کا رخ کیا۔ میرے پاس زیادہ وقت تو نہیں تھا مگر اس طرح خون بہاتی ٹانگ کے ساتھ میں باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ پتلون کا رنگ ڈارک تھا اسی لیے خون نظر نہیں آرہا تھا، تاہم میرا بوٹ خون سے بھر گیا تھا۔ واش روم میں حسب توقع کیبنٹ میں رکھا فرسٹ ایڈ سے متعلق کچھ نہ کچھ سامان نظر آ ہی گیا اس میں بینڈ تیج بھی رکھی تھی۔ میں نے جیسے تیسے چند منٹوں میں بیلٹ کھول کر پینٹ نیچے سرکائی اور زخم کا جائزہ لے کر اس پر دوا لگا کے پٹی باندھ دی۔ یہ کام نمٹا کر میں واش روم سے نکل آیا پھر دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے جھری سے باہر جھانکا۔

سب کچھ ''ٹھیک'' پا کر میں باہر نکلا اور تیز تیز قدم اٹھاتا، وزدیدہ نظریں اپنے گردوپیش پر ڈالتا ہوا میں نے جیسے ہی پاس کی ایک گلی میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تھا کہ اچانک میری نظر ایک سیاہ رنگ کی مسٹینگ پر پڑی، میں اسے دیکھ کر بری طرح چونکا تھا، یہ وہی سنگل ڈور اسپورٹس کار تھی جسے ائرپورٹ سے آتے ہوئے پہلے کاوَشی اور پھر میں نے دیکھا تھا، اس کے بعد وزیر جان کے ٹھکانے کا پتا چلانے کی غرض سے اور میرے ایما پر کاوَشی نے بڑی مہارت سے اس کا سراغ لگا کر تعاقب کیا تھا۔

''تو کیا وزیر جان ادھر ہی کہیں موجود تھا......؟''

یہ خیال آتے ہی میرے پورے بدن میں جھرجھراہٹ سی دوڑ گئی، میں فوراً ایک طرف کو ہو گیا، میرے سیدھے ہاتھ پر کسی گھر کا بیک یارڈ تھا، وہاں کاٹھ کباڑ کے اور کچھ نہیں تھا۔ جگہیں ویسے ہی تنگ تھیں۔ میں نے سوچا، ممکن ہے کہ اس کار میں وہی دونوں حملہ آور آئے تھے، جنہیں کاوَشی کے گھر میں ہی انٹاغفیل کر چکا تھا۔

اس وقت میرا ذہن تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا اور ایک لائحہ عمل میرے ذہن میں نمو پانے لگا تھا۔ بس جی میں آئی کہ یہ بات کنفرم ہونی چاہیے کہ آیا یہ لوگ وزیر جان کے ہی بھیجے ہوئے آدمی تھے یا کسی اور کے، کیونکہ وزیر جان کے علاوہ تو اور کوئی میرا بینکاک میں دشمن نہ تھا، البتہ گینگسٹر کاسپاکو کی بات الگ تھی۔ اس سے ابھی میرا کسی قسم کا براہِ راست سامنا نہیں ہوا تھا اور میں اس سے کترانے کی کوششوں میں تھا، حتیٰ کہ من موہنی صورت والی سانچی کو بھی میں خاطر میں نہیں لایا تھا۔ پرائے دیس میں پرائی بلا اپنے سر لینے کا میں یوں بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسے میں جبکہ میری امریکا روانگی کا معاملہ بھی کاوَشی کی موت (قتل) کے بعد کھٹائی میں پڑ چکا تھا۔ وزیر جان میرے اس اہم ترین مشن کی تمام راہیں مسدود کرنے کی اپنی سی بھرپور کوششوں میں مصروف کار تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ یقیناً ایک طرح سے اپنی موت کے پروانے پر ہی دستخط کر رہا تھا کیونکہ اس سے تازہ ٹکراؤ اور پاکستان میں نوشابہ کے ذریعے اسپیکٹرم کی مردہ لاش میں نئی روح پھونکنے کے اس کے ناپاک عزائم کے اظہار نے اس کی موت کو اور بھی قریب کر دیا تھا۔ چنانچہ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں وزیر جان کا قضیہ نمٹانے کی آخری کوشش کرنا چاہتا تھا۔

قوی خیال میرا یہی تھا کہ یہ دونوں مذکورہ حملہ آور وزیر جان کے ہی آدمی ہو سکتے تھے، کیونکہ پہلے بھی اسی مردود کے آدمیوں نے ہی کاوَشی کے گھر پر شب خون مارا تھا اور بعد میں مجھے بھی دھوکے سے بے بس کر کے لے گئے تھے۔ ان کے گمان میں یقینی یہ بات آتا کہ میں دوبارہ کسی وقت بھی یہاں کا رخ کرسکتا تھا، انہوں نے ادھر ہی کاوَشی کے گھر کے سامنے اپنا کوئی عارضی ٹھکانا بنالیا ہوگا تاکہ کاوَشی کے گھر پر چوبیس گھنٹے نظر رکھی جاسکے۔

چنانچہ فوری قوتِ فیصلہ کے طور پر میں واپسی کا ارادہ ترک کر کے وہیں ٹھہر گیا۔ اب میری ٹھٹکی ہوئی نظریں گاہے بہ گاہے گردوپیش کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ کاوَشی کے

JBD

جہانگیر بُکس 91

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/550
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مُسافر -/475
اُندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے دلخراش مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت ورسوائی کی المناک داستان

ثقافت کی تلاش -/300
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھناچھن کے ساتھ پامال کیا

قیصر وکسریٰ -/625
ظہورِ اسلام سے قبل عرب وعجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزندانِ اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

اور تلوار ٹوٹ گئی -/550
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستانِ شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ وجلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم واستقلال کی یاد تازہ کردی

گمشدہ قافلے -/500
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری ومکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/300
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دوسو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/450
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

یُوسف بن تاشفین -/500
اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام ومصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں بلند کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

معظم علی -/475
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی وحریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

خاک اور خون -/550
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

کلیسا اور آگ -/450
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

قافلۂ حجاز -/599
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

محمّد بن قاسم -/425
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

پورس کے ہاتھی -/300
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

انسان اور دیوتا -/450
برہمنی سامراج کے ظلم وبربریت کی صدیوں پرانی داستان، جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/300
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

آخری چٹان -/450
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستانِ شجاعت جو تاتاریوں کے سیلِ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

سو سال بعد -/225
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

سفید جزیرہ -/325
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

شاہین -/475
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب وفراز کی کہانی

جہانگیر
اُردو لُغت
(جامع ترین)
ملفوظی طریقے سے تلفظ کے اندراج کے ساتھ اردو زبان کا پہلا لغت

سبق آموز کُتب سلسلہ
دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مُزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰؓ -/165
- اقوالِ آئمہ کرامؒ -/165
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ -/195
- اقوالِ شیخ سعدیؒ -/140
- حکایاتِ رومیؒ -/180
- دلچسپ وعجیب حقائق -/170
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ -/199
- دلچسپ وحیرت انگیز باتیں -/150
- ایمان افروز وسبق آموز سچے واقعات -/180
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات -/165

جہانگیر بُک ڈپو
022-2780128 042-35757086
042-37220879 051-5539609 021-32765086

گھر کے دروازے پر بھی پڑ جاتی تھیں اور میری توقع کے عین کے مطابق تھوڑی ہی دیر بعد میں انہی دونوں حملہ آوروں کا لڑکھڑاتا ہوا وجود نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ پہلے والے کی تو میں نے ایک دو جھٹکوں میں ہی دُرگت بنا ڈالی تھی اسی لیے اس کی حالت کچھ زیادہ ہی پتلی تھی، البتہ دوسرا کچھ بہتر نظر آتا تھا جس کے سر پر میں نے پستول کے دستے سے وار کیا تھا۔ اسی نے اپنے ساتھی کو سہارا دیا ہوا تھا اور دونوں اب اسی طرح گرتے پڑتے ہوئے سڑک پر آئے اور پھر ان کا رخ اس طرف کو ہو گیا جہاں ایک تنگ سی گلی کے سرے پر قدرے تاریکی میں سیاہ مسٹینگ کھڑی تھی۔

انہیں کار کی سمت آتے دیکھ کر میں بیک یارڈ کی اس بوسیدہ سی دیوار کے ذرا اور اندر کی طرف تاریکی میں دُبک گیا۔ وہ دونوں کار کے نزدیک آ کر رکے، میں ان پر حملہ کرنے کی ٹھانے ہوئے تھا۔ دوسرے والے نے جیب سے چابی نکالی تھی، کی چین میں لگے الارمنگ ریموٹ سسٹم کے ذریعے اس نے شاید کوئی بٹن دبایا تھا کیونکہ اگلے ہی لمحے کار سے ایک ہلکی سی میوزیکل آواز ابھری تھی اور ساتھ ہی بیک اور سائیڈ لائٹس نے بھی ایک دو بار جل بجھ کر کار کے لاک کھلنے کا کاشن دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بٹھا دیا۔ میں اب ان پر حملہ کرنے کے لیے اپنی جگہ سے ذرا سرکا تو مجھے اس کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

''گرے! تم ذرا ریلیکس ہو جاؤ، میں ابھی اندر جا کر آتا ہوں۔''

''میری حالت درست نہیں ہے جان، مجھ پر غشی طاری ہو رہی ہے، مجھے فرسٹ ایڈ کی سخت ضرورت ہے۔ جلدی نکل چلو۔ اب ہمارا شکار یہاں دوبارہ نہیں آئے گا۔'' اس کے ساتھی کی آواز اُبھری، میں اپنی جگہ سے ان کی طرف بڑھتا ہوا ذرا رکا تھا۔ گرے نامی اس کا ساتھی بولا۔

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ اب چونکہ دوبارہ ہم یہاں کا رخ نہیں کر سکتے، میں ذرا اندر جا کر کچھ ضروری سامان سمیٹ لوں...... بس، چند منٹ دے دو۔'' جون نے کہا۔

''او کے جاؤ......'' گرے کی بیزار اور چڑچڑی سی آواز اُبھری اور جان تیزی سے اسی مکان کے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں سے میں نے کاوشی کے گھر کی کھڑکی سے انہیں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب مجھے اپنے لائحہ عمل میں تھوڑی ترمیم کرنا پڑی اور نیچے کو جھک کر کار کی ڈکی والی سائڈ پر آ گیا۔ میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا، گرے کی حالت واقعی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ کے برابر والی سیٹ سے اب اپنا سر ٹکا دیا تھا، میں تھوڑا سرکتا ہوا اور آگے آیا تو مجھے اس کی آنکھیں بھی موندی ہوئی نظر آنے لگیں۔ اس کا ساتھی جون مذکورہ مکان کے اندر داخل ہو چکا تھا اور کوئی دم کو باہر آنے والا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ان دونوں پر اس وقت قابو پانا میرے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی مگر اب میں نے انہیں چھیڑنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا کہ اب گرے کا سر ایک طرف کو ڈھلک چکا تھا۔ اس پر شاید غشی کا دورہ غالب تھا۔ میں نے موقع تاک کر آہستگی سے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا (کیونکہ جیسا کہ مذکورہ ہوا کار سنگل ڈور تھی) اس کے بعد سیٹ تھوڑا آگے سرکا کر میں عقبی سیٹ پر چلا گیا اور دروازہ بھی آہستگی سے جہاں تک بند ہو سکتا تھا، بند کیا اور نیچے کو دبک گیا۔ گرے کا سر اسی طرح ڈھلکا ہوا تھا۔ چند ہی منٹوں بعد مجھے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ جان لوٹ آیا تھا۔ اس نے گرے کو دو تین بار پکارا مگر جواب ندارد۔ پھر جان کی مجھے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔

''اوہو...... شاید یہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے کار اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ رات کے سناٹے میں کار کے ٹائر سمع خراش آواز سے چرچرائے تھے اور پھر وہ پستول سے نکلی گولی کی طرح دوڑنے لگی۔ مین شاہراہ پر آتے آتے اس نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا تھا اور میں پیچھے سیٹ کے نیچے دُبکا ہوا تھوڑا گڑبڑا سا گیا تھا۔

کار چلاتے ہوئے جان کے سان و گمان میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ جس ''شکار'' سے مایوس ہو کر اب اپنی ''گھات'' والی جگہ سے واپس لوٹ رہے تھے، وہی شکار انہیں شکار کرنے کے لیے اب پیچھے ان کی گھات میں چھپا .... بیٹھا تھا۔

ان کا چھینا ہوا پستول ہنوز میری پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ کار تیزی سے منزلیں طے کرتی لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے بعد ایک مقام پر پہنچ کر رک گئی۔ میں اسی طرح عقبی سیٹ کے درمیان نیچے دبکا لیٹا رہا۔ جان نے منزل قریب آنے سے محض چند سیکنڈ پہلے وزیر جان سے سیل فون پر رابطہ کر کے اسے اپنی ناکامی اور اب واپسی کی رپورٹ کے ساتھ گرے کی میرے ہاتھوں حالتِ زار کی بھی رپورٹ

دے دی تھی۔ جواب میں اسے وزیر جان کی شاید بے نقط بھی سننا پڑی تھی، کیونکہ جان نے فوراً ہی خوف زدہ سے لہجے میں شرمندگی سموتے ہوئے آئندہ نئے عزم کے ساتھ میری کھوج لگانے کا ''دلاسا'' بھی .... دینے کی کوشش کی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ کار رکتے ہی چند افراد ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف لپکے .... اور انہوں نے سیٹ پر بے ہوش پڑے گرے کو سنبھالا دے کر کار سے نکال لیا... اور دروازہ بند کر دیا ... میں اس دوران میں تھوڑا اور نیچے کو دبک گیا تھا تاکہ ان میں سے کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ان لوگوں کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز کے بعد طاری ہو جانے والی خاموشی کے چند منٹ بعد میں احتیاط کے پیشِ نظر اسی طرح نیچے دبکا پڑا رہا۔ اس کے بعد پہلے ذرا سر اونچا کر کے کھڑکی سے اطراف کا جائزہ لیا۔ کار خالی تھی۔ باہر کا منظر بھانپتے ہی میرا دل یکبارگی مسرت تلے زور سے دھڑکا تھا۔ کیونکہ یہ ایک وسیع کار پورٹیکو تھا۔ جہاں دو تین اور بھی چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں اور یہ مجھے وزیر جان کے ہل ٹاپ والے علاقے ''فوکٹ پیلس'' میں واقع اسی محل نما رہائش گاہ کا حصہ لگتا تھا جہاں میں ایک بار بے ہوشی کی حالت میں یرغمال بنا کے لایا گیا تھا اور پھر ''بندی خانے'' کا قیدی بنا دیا گیا تھا۔ لیکن...... اب میں یہاں آزاد تھا۔ اپنے ازلی اور دشمن دیرینہ کے اتنے قریب خود کو پا کر میرا روم روم جوش سے بھر گیا تھا۔ مگر اس کا یہ بھی مطلب نہیں تھا کہ وہ سینہ لگائے میرا منتظر ہو گا کہ...... ''آؤ شہزی! میرے سینے میں گولی اتار کر اپنے سینے کی برسوں پرانی آگ سرد کر لو......''

میں نہایت آہستگی کے ساتھ اور بغیر کوئی آواز پیدا کیے کار سے نیچے اُترا اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں دیگر کھڑی گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا ایک محتاط انداز سے آگے بڑھنے لگا۔ ایک جگہ میں ذرا ٹھہرا۔ اطراف میں دیکھا۔ رات کافی اُتر آئی تھی۔ سامنے وسیع و عریض لان تھا، کشادہ کمپاؤنڈ وال میں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں سناٹا تھا۔ مرکزی دروازے پر دیدہ زیب عمارتی لکڑی کا کام کیا ہوا تھا اور بڑی خوب صورتی سے محراب بنائی ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی پالتو خونخوار جانور اچانک مجھ پر حملہ نہ کر دے کیونکہ ایسی عظیم الشان رہائش گاہوں پر خطرناک کتوں کی موجودگی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا .... یہاں چونکہ وزیر جان کو اپنے کسی دشمن سے کوئی خطرہ نہ تھا، میرے سلسلے میں بھی وہ شاید ایک زعم آمیز تشفی میں مبتلا ہو گا کہ بھلا میں یہاں تن تنہا اس کا کیا بگاڑ لوں گا۔ جبکہ اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اس کی عظیم الشان رہائش گاہ میں نقب لگا چکا تھا۔ بلکہ اس کے زر خرید کتوں کی ناک کے نیچے سے ہو کر یہاں چلا آیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونکا۔ میں نے دو سوٹ پوش افراد کو ایک طرف سے نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ یقیناً مسلح بھی ہوں گے، تاہم ان کا چوکنا انداز بتاتا تھا کہ وہ پہرے دار ٹائپ کی ہی کوئی شے تھے۔ کیونکہ اب وہ دونوں مین گیٹ کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اگلے ہی لمحے مجھے ان کے اس طرح اچانک نمودار ہو کے گیٹ کے پاس جا کر چوکنا کھڑے ہونے کا مقصد سمجھ آ گیا۔ کیونکہ اسی وقت گیٹ خودکار انداز میں سلائیڈ ہوا تھا اور ایک بھاری بھرکم انٹرکولر ٹائپ کی گاڑی اندر داخل ہوئی اور کار پورچ کی طرف آنے کے بجائے مرکزی دروازے کے سامنے جا رکی۔ وہ دونوں سوٹ پوش گارڈز اس کی جانب لپکے تھے۔ گاڑی کے اگلے پچھلے دروازے یک بیک کھلے اور اس میں سے تین افراد برآمد ہوئے۔ دو خاصے تیم شیم تھے اور ان کا انداز بھی یہی بتاتا تھا کہ وہ کسی کے فرستادہ تھے، جبکہ تیسرا آدمی بھی دراز قامت ہی تھا مگر اس کا جسم کسی بھینسے کی طرح خوب گٹھا ہوا اور گینڈے جیسا مضبوط اور کسا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ سر بالکل گنجا تھا۔ رنگت تانبے کی طرح تھی۔ وہ بہترین تراش کے سوٹ میں ملفوف تھا۔ چہرے سے بڑی خطرناک قسم کی درشتی مترشح ہوتی تھی، آنکھوں کے پپوٹے سوجے سوجے تھے جس کے باعث اس کی آنکھیں ''میچی'' ہوئی لگتی تھیں، بہ ہیتِ مجموعی اس کی شخصیت خاصی رعب داب والی اور کسی مافیائی چیف سے ملتی جلتی دکھائی پڑتی تھی۔ وزیر جان کے بھیجے ہوئے وہ دونوں فرستادہ بڑے ہی مودبانہ انداز میں اس کی طرف تعظیم والے انداز میں بڑھے تھے، مگر اس گینڈے نما شخص نے ان کی طرف صرف اک ابروئے جنبش سے ہی دیکھنا گوارا کیا تھا اس کے بعد وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ ایک فرستادہ تیزی سے اس سے پہلے ہی دوڑ کر دروازے تک پہنچا تھا اور دروازہ کھول دیا تھا۔ گینڈا نما آدمی بڑے کروفر کے ساتھ اندر داخل ہو چکا تھا اور اس کے دونوں گارڈز بھی۔ بعد میں وزیر جان کا ایک آدمی واپس گیٹ کی طرف پلٹ آیا تھا۔ اس مختصر سی ہلچل کے بعد میں عقبی سمت کو پلٹا اور ایک گیلری کو تاک کر میں نسبتاً ایک اونچی چھت والی گاڑی کو تاڑ کر اس پر چڑھا اور گیلری میں آ گیا۔

یہاں گھنے پتوں اور پودوں والی بیلیں اوپر تک چلی گئی

تھیں۔ میں گیلری میں آیا تو سامنے کا منظر واضح تھا۔ ایک ہال اور اس کے دائیں بائیں قدِ آدم گملے ایستادہ نظر آرہے تھے۔ یہ کوئی راہداری تھی جو اس دروازے کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ میں چند ثانیے کے لیے وہیں دُبکا رہا اس کے بعد کسی ممکنہ خطرے یا دیکھ لیے جانے کا خدشہ فرو ہوتے ہی میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ راہداری کے دونوں طرف میں نے جھانکا وہ سنسان پڑی تھی۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔ مختلف کمروں کے دروازے بھی نظر آرہے تھے۔ میں نے متوقع ہال نما کمرے کے دروازے کے قریب آکر ایک کان چپکا کر اندر کی سُن گُن لینا چاہی تھی مگر اتھاہ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو معمولی سا اندر کی طرف دھکیلا تو وہ تھوڑا سا کھلا میں نے پھر احتیاطاً ایک آنکھ جھری سے چپکا دی، اندر مدھم سی روشنی کے سوا کچھ نہ تھا لیکن جیسے ہی میں دروازے کو پورا دھکیل کر اندر داخل ہوا تو اسی وقت میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا...... مجھے یوں لگا جیسے میرے عقب میں کوئی ایک دم نمودار ہوا، کوئی ''جھپک'' سی مجھے محسوس ہوئی تھی اور میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹا تھا، ایک تنومند سا مگر قدرے ٹھگنا شخص مجھ پر ایک بھاری گن کے دستے سے حملہ کرنے والا--- میں نے بروقت جھکائی دیتے ہی اس کے پیٹ میں ٹکر ماردی۔ اس کا وار خالی گیا اور پیٹ میں ضرب کھا کے وہ ہولے سے کراہ...... لیکن اس نے سنبھلنے میں بھی چنداں دیر نہیں لگائی اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کو لٹھ کی طرح گھما کے میرے سر پر مارنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے برق کی طرح پینترا بدل کے یہ وار بھی اس کا خطا کیا اور ساتھ ہی کھڑی ہتھیلی کا وار اس کی گردن پر کیا۔ وار زوردار ثابت ہوا اور اس کے دوررس نتائج بھی ظاہر ہوئے۔ وہ یتورا کر گرا اور ڈھیر ہوگیا۔ اس کی ہنسلی کی ہڈی تڑخ چکی تھی۔ میں نے اس کی گن جھپٹی اور جھک کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر رگِ حساس مسل ڈالی۔

ہلکی ساخت کی یہ مشین گن ایم پی فائیو کی طرح تھی جس کا میگزین لمبا تھا۔ اپنے طاقت ور دشمن کے گھر میں دو ہتھیار میرے قبضے میں آتے ہی میری ہمت کو سوا کر گئے تھے، تاہم مجھے اپنی زخمی ٹانگ کا بھی درد تھا۔ اگرچہ میں نے اس کے کھلے ٹانکوں والے زخم پر پٹی باندھ لی تھی، مگر میں جانتا تھا کہ پراپر بینڈیج کے بغیر یہ زخم رستا رہے گا اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب میری اچانک فرش پر نگاہ پڑی تو میرا چہرہ ایک پریشان کن تشویش تلے ست کر رہ گیا۔

میں اپنے پیچھے خون کی لکیر چھوڑتا چلا آیا تھا۔ حملہ آور یقیناً اسی کی ''رہنمائی'' پر... میرے تعاقب میں یہاں تک چلا آیا تھا اور خطرہ تھا کہ یہ لکیر وزیر جان کے کتوں کو میری دیتی ہوئی یہاں تک کھینچ لاسکتی تھی۔ گویا مجھے ...اب جو کچھ کرنا تھا فوراً ہی کرنا تھا۔ میں گویا اصل وقت سے پہلے ہی ایک خطرناک صورتِ حال کا شکار ہوگیا تھا۔

میں نے تیزی سے ہال کا جائزہ لیا۔ ہال کا ماحول مدھم روشنی میں مدغم تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا۔ ایک دروازے کے قریب پہنچا تو اس کے پار مجھے گونجدار آوازیں آتی سنائی دیں۔ برہمی کا تاثر دیتی یہ گونج مجھے کسی ''پیشگی'' ہنگامے کا پتا دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دروازے پر ایک کان لگا کر دوسری جانب کی سُن گُن لینا چاہی، اس کے بعد اسے بے آواز تھوڑا سا کھول کر جھری بنائی تو سامنے ہی مجھے ایک اور کشادہ اور پُرتزئین و آراستہ کمرے کا تقریباً تین چوتھائی منظر نظر آیا اور میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

نفیس، دیدہ زیب اور شاہانہ طرز کا فرنیچر بچھا ہوا تھا اور وہاں مجھے وہی گینڈا نما شخص صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا۔ اس کی انگلیوں میں کتھئی رنگ کا موٹا سگار تھا۔ دو اس کے دو ساتھی اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ چار افراد دیگر بھی اسی طرح تنے کھڑے نظر آرہے تھے، جو اس کے سامنے والے صوفے پر بڑے کروفر سے براجمان وزیر جان کے ہی آدمی تھے۔ گینڈے نما شخص کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شدید قسم کی برہمی عیاں تھی، جبکہ وزیر جان کے چہرے پر سرد تاثرات تھے۔ ان کے درمیان ..... بڑی سی گلاس ٹاپ ٹیبل پر اعلیٰ درجے کی شمپئین اور آئرلینڈ کی اسکاچ وھسکی کی بوتلیں اور بلوریں پیگ رکھے ہوئے تھے۔ گفتگو کرنے سے پہلے وہ شاید ایک آدھ پیگ لگا چکے تھے۔

''مسٹر وزیر جان! تم جو کچھ بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔'' گینڈے نما شخص نے سگار کا ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز غراہٹ سے مشابہ تھی۔

''میری بذاتِ خود یہاں آمد، معاملے کو ادھر ہی ختم کرنے کے لیے کافی سمجھو۔ میری معلومات کبھی غیر مستند نہیں ہوتیں۔ ہمارا شکار تمہاری قید میں ہے اور اس کے بدلے میں تمہیں منہ مانگی رقم بھی دینے کو تیار ہوں۔ ورنہ یہ کام میں اپنے دوسرے طریقے سے بھی کر سکتا تھا۔ تم اس شہر میں مہمان ہو اسی لیے تم مجھے نہیں جانتے کہ بینکاک میں، میں کس نام سے مشہور ہوں۔'' اس کے لہجے میں دھمکی پوشیدہ تھی۔ وہ فطرتاً انتہا کی حد تک گزر جانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جواب میں وزیر جان نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''مسٹر کاساپو......! اپنا لہجہ درست رکھو، تم مجھے نہ جاننے کی ایک بھیانک غلطی کر رہے ہو، سمجھو تو تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے، تمہارے جیسے کتنے ہی گینگسٹر میری جیب میں رہتے ہیں۔ باقی مجھے بھی تم سے اور تمہارے معاملات سے کوئی غرض نہیں ہے۔ شہزاد نامی وہ نوجوان تم سے پہلے ہمارا شکار ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں پاکستان سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں مگر تمہارے آدمی کی مداخلت سے وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ باقی یہ دھمکیاں اپنی جیب میں سنبھال کر رکھو...... میری چھت کے نیچے ہو اسی لیے تم یہ سب کہنے کے بعد زندہ ہو......'' کہتے ہوئے وزیر جان نے اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ فوراً حرکت میں آیا اور پلٹ گیا، چند ہی سیکنڈوں میں اس کی واپسی ہوئی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں ایک پاؤچ نظر آرہا تھا، جس میں سے اس نے ایک لائٹ براؤن کلر کا پائپ نکالا اور ایک تھیلی سے نفیس قسم کے تمباکو کا گرین مکسچر نکال کر پائپ کے باؤل (bowl) میں بھرکا اور پھر وہ نہایت احترام کے ساتھ وزیر جان کی طرف بڑھا دیا۔ جسے وہ اپنے سنہرے رنگ کے میوزیکل لائٹر سے سلگانے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کاساپو کی تہدید کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا ہو۔

میں ان کی گفتگو سن کر ہولا کر رہ گیا تھا۔ ان کے ''شکار'' سے مراد یقیناً میں ہی تھا اور سامنے بیٹھا ہوا آدمی بنکاک کا وہی خطرناک گینگسٹر کاساپو تھا جو میرے خون کا پیاسا ہو رہا تھا، میرے سلسلے میں اس کی ادھوری معلومات کہ میں ابھی تک وزیر جان کی قید میں تھا، ان کے لیے خطرناک ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی۔ مجھے کس حد تک ان دو ہاتھیوں کی جنگ میں فائدہ پہنچ سکتا تھا، اس کے انتظار میں رہنا فضول ہی ہوتا۔ تھوڑا غور کرنے پر مجھے ادراک ہوا تھا کہ جس طرح موتو نے وزیر جان کے لوکاس نامی آدمی کے ذریعے میرا سراغ لگایا تھا یقیناً اسی طرح کاساپو کے لیے پتا لگانا کیا مشکل تھا، یہ الگ بات تھی کہ اسے تاخیر ہوگئی تھی اور اب وہ وزیر جان کی بات کا یقین کرنے پر تیار نہ تھا۔ کاساپو کو اصرار تھا کہ میں ابھی تک وزیر جان کی قید میں ہی ہوں۔

میں نے دیکھا وزیر جان کی اس بات پر کاساپو کا چہرہ شعلہ بن گیا۔ وہ پُرطیش انداز میں یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور غراتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے۔ تم اب اس شہر میں ہی نہیں، دنیا میں بھی چند دنوں کے مہمان ہو...... اب بھی وقت ہے، قیدی میرے حوالے کر دو، میں یہاں سے چلا گیا تو تمہارے اس محل میں زلزلہ آجائے گا۔''

''شکر کرو اس بات کا کہ زندہ جا رہے ہو۔'' وزیر جان نے اسی اطمینان اور بے پروا... انداز میں پائپ کا کش لگاتے ہوئے کہا مگر اس کی آواز میں اژدھے کی سی خوفناک جھپک تھی۔

کاساپو چند ثانیے کے لیے اسی طرح بپھرا ہوا کھڑا وزیر جان کو خونیں نظروں سے گھورتا رہا اس کے بعد وہ پلٹ کر واپس مڑ گیا۔ دروازے تک پہنچا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا پھر وہ دروازے سے باہر قدم نکالنے کے بجائے حیرت انگیز پھرتی سے پلٹا تو ایک دس ایم ایم کا ٹرپل تھری فال آؤٹ تباہ کن پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پلٹتے ہی وزیر جان پر فائر داغنا چاہا تھا......

مگر شاید اس نے حد درجہ طیش اور خطرناک زعم میں مبتلا ہو کے وزیر جان کو واقعی معمولی آدمی سمجھنے کی غلطی کر ڈالی تھی، نہیں جانتا تھا کاساپو... کہ اس وقت اس کی سانسوں کی رفتار پر بھی، وہاں چوکس کھڑے وزیر جان کے مستعد آدمی نظر رکھے ہوئے تھے، لیکن...... ان چاروں نے کوئی حرکت نہیں کی تھی نہ ہی وزیر جان اپنی جگہ سے ایک انچ ... ہلا تھا۔ میری دم بہ خود سی نظریں تو کیا مجھے تو اپنا دل بھی یک دم ٹھہرا ہوا لگا تھا۔

کاساپو غیظ و غضب کے مارے بلاخیز پھرتی کے ساتھ خطرناک ہتھیار نکالتے ہی وزیر جان کی طرف گھوما ہی تھا کہ اس کے گینڈے جیسے جسم کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔ دس ایم ایم کا ٹرپل تھری فال آؤٹ جیسا خطرناک پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا، اس کا وہ ہاتھ خون آلودہ نظر آنے لگا، دوسرا خون کا ابلتا فوارہ میں نے اس کی دائیں ٹانگ سے اڑتا دیکھا۔ مگر اس سے بھی پہلے میری چست نظروں نے دائیں بائیں سے یک بیک دو بار شعلوں کی ''جھپک'' پھوٹتے ضرور دیکھی تھی۔ میں ایک دم محتاط ہوگیا۔ وزیر جان کے نجانے کتنے اور مسلح آدمی پردوں کے پیچھے سے وزیر جان سمیت کمرے کی ایک ایک شے پر خفیہ طور، بڑی مستعد اور چوکس نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ میرے حساب سے کاساپو خوش قسمت آدمی ثابت ہوا تھا کہ وزیر جان کے خفیہ پردوں کے پیچھے چھپے ہوئے مسلح گماشتوں نے اس کے

پستول والے ہاتھ اور ایک ٹانگ کو نشانہ بنایا تھا، وہ اس کے سر کا بھی نشانہ لے سکتے تھے۔ وزیر جان اپنے قبیل کے آدمیوں سے کم از کم اتنی رعایت تو ضرور کرتا تھا، ورنہ وہ اپنے دشمنوں کو کہاں چھوڑنے والا تھا۔

لیکن اس انکشاف نے مجھے ضرور محتاط کر دیا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وزیر جان کے ”شوٹرز“ اس طرح خفیہ طور پر پردوں کے پیچھے چھپے بیٹھے اس کی حفاظت پر مامور ہوں گے، یہ میرے لیے بھی ایک طرح سے اچھا ہی ہوا تھا۔ چونکہ میں اب ان دونوں چھپے ہوئے شوٹرز کی کمین گاہ سے واقف ہو چکا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میری رگ رگ میں جوشِ جنوں کا ایک طوفان اُمڈ پڑتا ہے اور پکار پکار کر میرے اندر ”آر یا پار“ یا ”ابھی نہیں تو کبھی“ نہیں کی گردان شروع کر دیتا ہے تو میں پھر اپنے آپ میں نہیں رہتا۔ یہی وہ ایک موقع ہوتا ہے جب میں کسی دشمن کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے تیار ہو جاتا ہوں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ حالات کی چند مستعار گھڑیاں اب میرے ہاتھ میں ہیں۔ یہی سبب تھا کہ جب زخمی کاساپوکو اس کے ساتھ آئے ہوئے وہ دو دونوں آدمی سنبھال رہے تھے اور وزیر جان غرور تلے قہقہے لگائے جا رہا تھا تو میں نے اپنے دونوں پستول ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ میں یہاں کے حملہ آور سے چھینی ہوئی ایم پی فائیو کی ہلکی ساخت کی مشین گن اور دوسرے ہاتھ میں کاوشی کے گھر میں حملہ کرنے والے وزیر جان کے دو گماشتوں گرے اور جان کا پسٹل لوگر تھا۔ ادھر جب وزیر جان پُرغرور لہجے میں کاساپوکو سے کچھ کہنے میں مصروف تھا، میں دروازہ پار کر چکا تھا، جب تک یہ لوگ سنبھلتے، میں نے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر اپنے ہتھیاروں سے شعلے اگلنا شروع کر دیے۔ ہولناک گرج کے ساتھ گولیوں کی بوچھاڑ اُمڈی اور دو چیخیں مجھے دونوں طرف کی بالکونیوں سے آتی سنائی دیں، یہی نہیں دو افراد تڑپ کر نیچے بھی لڑھکتے ہوئے آتے دیے۔

نیچے والے جب تک سنبھلتے میں نے کاساپوکو اور اس کے دونوں آدمیوں کو نشانہ بنانے کے بجائے وزیر جان کے چاروں آدمیوں کو، جن کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں رینگ گئے تھے، اپنی شعلے اگلتی گنوں سے نشانہ بنایا۔ وہ مجھ پر ہتھیار اٹھانے کی خواہش تو پوری کر چکے تھے، مگر فائر کرنے کی حسرت دل میں لیے چھلنی ہو کر گرتے چلے گئے۔ وزیر جان کے بدمست قہقہوں کو یک دم بریک لگ گئے۔ کاساپوکو کا چہرہ تھوڑی دیر پہلے نہایت غضب انگیزی کا عکاس نظر آتا تھا وہ اب ایک عجیب سی حیرت کی غمازی کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

”خبردار......! وزیر جان! کوئی حرکت مت کرنا، تمہارا آخری وقت قریب آچکا ہے۔“

میں نے اپنے دل و دماغ کی ساری حسرتوں کو ایک خطرناک جنوں تلے سموتے ہوئے لہجے کی پوری گھن گرج کے ساتھ دہاڑ کر کہا۔ اس کا منہ حیرت و خوف کے باعث کھلا رہ گیا تھا۔ اس میں اتنی جرأت ہی نہ ہو سکی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس بھی ہوتا۔ پائپ اس کے منہ سے لڑھک کر اس کی گود میں گر پڑا تھا۔ وہ میری جنوں خیزی اور وحشت لہو رنگ فطرت سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔

”شش......شہزی......! تت......تم......“ اس کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس کا صوفہ الٹا گیا۔ میں یہ دیکھتا ہی رہ گیا کہ ہوا کیا تھا؟ صوفے والی زمین برابر ہو گئی تھی۔ ناکامی اور احساسِ شکست تلے میرا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا، ادھر کاساپوکو کے دونوں آدمی مجھے نجانے کیا سمجھ کر اپنے سرغنہ کو فوراً کھینچتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

ٹھیک اسی وقت دائیں جانب سے میں نے دو مسلح افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ مجھ پر اپنی گنز کے دہانے کھول چکے تھے۔ گولیوں کی تڑاتڑ کی آواز ابھرتے ہی میں نے بہ سرعت فرش پر سوئپ کیا اور گھسٹتا ہوا ان کی فائرنگ کی زد سے نکلا تو موقع پاتے ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دبے ہتھیاروں کا رخ ان کی جانب کر دیا۔ دونوں نالیں یک بہ یک آتشیں قہقہے اگلتی ہوئی گرجیں، ایک کو میں نے چھلنی ہو کے گرتے دیکھا دوسرے نے بھاگنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ بھی گولیوں کی باڑ کی زد میں آکر کریہہ ناک چیخ خارج کرتے ہوئے گرا۔

وزیر جان میری نظروں سے کسی بدروح کی طرح اچانک غائب ہو گیا تھا اور میں جو اسے جہنم واصل کرنے کی خواہش ...... تلے درانہ وار خود کو ایک خطرناک اور جان لیوا رسک میں ڈال چکا تھا، اب .... تلملا کر رہ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے باہر کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ میرے انگ انگ میں جیسے برقی رو دوڑ گئی۔ میں تیزی سے دوڑتا ہوا باہر نکلا۔ یہ وہی دروازہ تھا جس سے میں اندر داخل ہوا تھا کیونکہ یہی وہ راستہ تھا جو نسبتاً کار پورچ کے نزدیک تھا۔ میں بے تحاشا دوڑتا ہوا پہلے اسی ہال میں پہنچا اور پھر وہاں سے گیلری کی ریلنگ پھلانگ کر سیدھا سیاہ مسٹینگ کی چھت پر گرا۔ کیونکہ چھلانگ لگاتے وقت میں نے وزیر جان کا بھاری بھرکم ہیولا کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے دیکھ لیا تھا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھی، تھوڑی بیک ہوئی اور پھر پھاٹک کی طرف گولی کی طرح آگے کو بڑھی تو میں اس کی چھت پر سے لڑھکتا ہوا پورچ کے کنکریٹ والے پختہ فرش پر آن گرا...... مگر اٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی میں نے، سیاہ مسٹینگ پام اور باڑھ کے درختوں کے درمیان سے گزرتی کنکریٹ کی بل کھاتی روش سے نکلی جا رہی تھی اور اب میں اس کی بیک لائٹ دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہا تھا، لیکن دوسرے ہی لمحے میرے جوشِ جنوں نے مجھے بُری طرح کھدیڑ کر رکھ دیا۔ میں نے پاس کھڑی ایک کار کی ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کی کھڑکی کا شیشہ گن کے دستے سے توڑا اور لاک کھول کر میں نے اگنیشن سوئچ کی طرف دیکھا، چابی لگی ہوئی تھی، نہ بھی لگی ہوتی تو میرے لیے بغیر چابی کے کار اسٹارٹ کرنا معمولی بات ہوتی۔ اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی میں نے کار اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔ پورچ کے فرش پر کار کے ٹائرز زور سے چرچرائے تھے۔ میری کار کے سامنے کاساپوکو کی بھاری بھرکم گاڑی کا پچھلا حصہ آگیا۔ میں اسے ٹکر مارتے ہوئے گیٹ کی طرف آگیا۔ عقب سے میری کار پر کسی نے گولیاں برسائی تھیں مگر میں کار دوڑاتا ہوا سڑک پر آگیا۔ ذرا ہی دور ایک قوس کی صورت میں جاتی ویران اور تاریک سڑک پر مجھے وزیر جان کی سیاہ مسٹینگ کی سرخ بتیاں نظر آگئیں اور تیزی سے دور ہوتی غائب ہونے لگی تھیں کہ میں نے اپنی کار کا ایکسلیریٹر پورا دبا دیا۔ کار کا انجن غرایا اور وہ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے وزیر جان کی سیاہ مسٹینگ کو جالیا۔ میرے اعصاب پوری طرح تنے ہوئے تھے اور سینہ ایک بھڑکتی آگ تلے سلگ رہا تھا۔ رگوں میں لہو اس وقت مثلِ لاوا کے گردش کر رہا تھا۔ ایک ہی دھن اس وقت میرے سر پر سوار تھی کہ موت بن کر وزیر جان کو جالوں......

دونوں کاریں مین شاہراہ پر آگئی تھیں اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ وزیر جان اس وقت اپنے کون سے اگلے ٹھکانے کا رخ کرنا چاہتا تھا یا پھر اس وقت محض مجھ سے پیچھا چھڑانے کی جستجو میں تھا۔

مسٹینگ نے ایک موڑ کاٹا اور انڈر پاس میں جاتی ہوئی ذیلی سڑک پر جا اُتری۔ میں نے بھی اپنی کار کا اسٹیئرنگ موڑا تو ایک جھٹکا لگا اور کار یہ تنگ موڑ کاٹتے ہوئے ایک طرف سے اونچی ہو کر دو پہیوں پر آگئی، لیکن پھر فوراً اس کے چاروں ٹائروں نے سڑک پکڑ لی۔ مجھے ایک جھٹکا لگا مگر اسٹیئرنگ سے میری گرفت کمزور نہ پڑی۔ میری زخمی ٹانگ کا درد پھر جاگنے لگا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ کسی وقت بھی زخم دوبارہ کھل کر جریانِ خون کا باعث بن سکتا تھا۔ لیکن مجھے ابھی کسی زخم کی پروا ہی کب رہی تھی۔

انڈر پاس پورا ایک کلومیٹر تھا اور یہاں دو رویہ سڑک تھی۔ آتی جاتی ٹریفک کا سیلِ رواں تھا۔ شکر تھا کہ کوئی پولیس کار ابھی تعاقب میں نہیں لگی تھی۔ مجھے وزیر جان کو زیادہ موقع نہیں دینا چاہیے تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ بزدلی پر بھی اترنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا، یوں وہ پولیس کی پناہ میں بھی خود کو دے سکتا تھا اور اپنا تعارف کسی ڈان کی حیثیت سے کرانے کے بجائے ایک معتبر بین الاقوامی ادارے (اسپیکٹرم) کے ایک معزز رکن کی حیثیت سے کروا کے میری جان پھنسا کر اپنی چھڑا سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور ایسی ذیلی سڑک نظر آگئی جو اس سڑک کو آگے سے جا کر ”میچ“ کرتی تھی۔ ٹریفک ہونے کے سبب میں سیاہ مسٹینگ کے زیادہ قریب نہیں پہنچ سکا تھا۔ لہٰذا میں نے ایک دم اسٹیئرنگ کاٹا، اس کے لیے مجھے رانگ وے پر آنا پڑا تھا۔ دو ایک گاڑیاں میرے سامنے بھی آگئی تھیں، ان کی تیز ہیڈ لائٹس سے میری آنکھیں بھی چندھیا گئی تھیں، مجھے یقین تھا کہ ان کے سوار مجھے بے نقط سنانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی گاڑیوں کے ہارن کریہہ ناک انداز میں چلائے بھی تھے اور بریک لگانے کے سبب ٹائر بھی چیخے تھے۔ مگر میں کار تیزی سے دوڑاتا ہوا مطلوبہ سڑک پر آگیا۔ اب میرے دائیں جانب ایک وسیع پارک تھا جہاں پام کے درختوں کی بہتات نظر آتی تھی اور اس کے دوسری جانب وہ دو رویہ سڑک تھی جس پر وزیر جان اپنی مسٹینگ کو طوفانی رفتار سے دوڑائے جا رہا تھا۔ میں نے ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کار غرانے لگی۔ جہاں دونوں سڑکوں کا اتصال ہوتا تھا عین اس کے بائیں جانب ہی ایک برج تھا اور اس کے نیچے جھلملاتا پانی اور اس پر تیرتی ہوئی کشتیاں صاف نظر آتی تھیں۔

میں نے جوش تلے اسی مقامِ اتصال پر اپنی کار دائیں جانب سے آتی ہوئی مسٹینگ سے ٹکرا دی، اسی وقت وزیر جان نے بھی شاید دور سے ہی خطرہ بھانپتے ہوئے اپنی مسٹینگ کا اسٹیئرنگ کاٹا تھا اور یوں ہم دونوں ہی کی گاڑیاں بے قابو ہو کر برج کی طرف کو گھوم گئیں اور وہاں سے لہراتی ہوئی برج سے نیچے جھلملاتے پانی میں جا گریں۔

مجھے ایک زوردار چھپاکے کی آواز سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے کوئی غرارے کر رہا ہو۔ کار کے شیشے بند تھے، مگر پانی میں ڈوبنے کے سبب اندر بھی پانی بھر سکتا تھا۔ میں نے دائیں جانب سر گھما کر دیکھا، وزیر جان کی مسٹینگ کی ہیڈ لائٹس پانی کے اندر جلتی ہوئی عجیب ہولناکی کا تاثر دیتی محسوس ہوئیں، ہم

دونوں ہی تہ آب ہو چکے تھے، مگر تہ میں پہنچتے ہی میں نے لات مار کر دروازہ کھولا اور پانی کے اندر تیرتا ہوا وزیر جان کی کار کی طرف بڑھا۔

پانی کے اندر میری اور وزیر جان کی زندگی اور موت کی یہ جنگ مجھے آخری جنگ محسوس ہو رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے آج وہ ہو گا یا میں...... یا پھر دونوں نے ہی ڈوب مرنا تھا۔

وزیر جان بھی اپنی کار کا دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں تھا، لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کی کار میں تیزی سے پانی بھرتا جا رہا تھا۔ مجھے حبسِ دم کی خاصی مشق تھی اور میں آج اسے بروئے کار لاتے ہوئے وزیر جان کی موت کا پیامبر بنا ہوا تھا۔ وہ جس دروازے کا رخ کرتا میں تیر کر اس طرف چلا جاتا اور اس کی کوشش کو ناکام بنا ڈالتا۔ جلد ہی اس نے ہمت ہار دی۔ پانی اس کی کار کے اندر چھت تک سے ٹکرانے لگا۔ وہ اس میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہم دونوں کھڑکی کے شیشے سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ میری آنکھوں میں نفرت اور انتقام تھا تو وزیر جان جو کبھی اپنی ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ بڑی بے لاچارگی اور رحم کی بھیک مانگتا ہوا چہرہ لیے مجھے تکے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ آنکھوں میں رحم کی اپیل تھی۔ میں اسے شیشے کے پار گھور رہا تھا اور نفی میں اپنا سر ہلا رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر مارے جا رہا تھا۔ کبھی اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رہا تھا اور میں بدستور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بار بار نفی میں اپنا سر ہلائے جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بلبلے بن کے چھوٹ رہے تھے۔ اور کچھ ہی دیر میں اس کی روح بھی اسی طرح بلبلا بن کر پرواز کرنے والی تھی۔

بالآخر اس کا دم اکھڑنے لگا۔ اسے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ وہ جان کنی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ خود میرا بھی دم گھٹنے لگا تھا، مگر میں نے سانس روکی ہوئی تھی...... دوسرے ہی لمحے مجھے سطحِ آب پر سانس لینے کے لیے آنا پڑا اور ایک بڑا سانس کھینچ کر میں دوبارہ تیرتا ہوا گہرائی میں اتر گیا۔ نہر زیادہ گہری نہیں تھی۔ میں دوبارہ تیرتا ہوا وزیر جان کی مسٹینگ کے قریب آیا تو دیکھا اس کا ناپاک وجود پانی بھری کار کی چھت سے پشت کے بل لگا ہوا معلق سا نظر آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں نیچے کو جھول رہے تھے۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

میرے ماضی کا ایک خوفناک کریکٹر، ایک چیلنج، ایک قابلِ نفرت انسان، ملک دشمن، دھوکے باز، اسپیکٹرم کا ایک اعلیٰ عہدے دار اور لولووش کا سب سے زیادہ چہیتا اور کارآمد مقرب خاص کارپرداز آج اپنے اس بھیانک انجام کو پہنچ چکا تھا جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ ہل ٹاپ کے ایک شاہانہ پوش علاقے فوکٹ پیلس کے عظیم الشان محل میں فروکش، یوں اپنے عبرت ناک انجام کو بھی پہنچ سکتا تھا۔ پاکستان میں وہ کسی چوہے کی طرح میری تاک میں چھپا بیٹھا تھا اور پھر مجھے بہ آسانی ہلاک کرنے کی آس لیے وہ بھی میرے ساتھ ہی بینکاک آ پہنچا تھا۔ مگر اسے کیا پتا تھا کہ میری نہیں بلکہ اس کی موت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔

اس کی موت کی اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد میں دوبارہ سطحِ آب پر ابھرا تو کنارے پر اور برج کی ریلنگ کے قریب جہاں پول پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں، لوگوں کا ہجوم اور پولیس گاڑیوں کے نیلے پیلے گردشی ہوٹرز سائرن دیتے دکھائی دیے، میں دوبارہ پانی میں ڈبکی لگا گیا اور اندر ہی اندر تیزی سے تیرتا ہوا ایک محتاط اندازے سے کافی دور جا نکلا۔ میں جانتا تھا کہ کسی وقت بھی ہیلی کاپٹر کی ریسکیو پارٹی یہاں اترنے والی تھی۔ اس معاملے میں ان کا متعلقہ عملہ نہایت مستعد ہو جاتا تھا۔ وہ اسے ایک حادثے کا ہی رنگ دیتے۔ میں کافی دور نکل کر ابھرا تھا اور تیرتا ہوا کنارے پر آ کر بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ چند ثانیے میں نے لمبے لمبے سانس لیے اس کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے اردگرد پام کے درخت تھے، ان کے پار مجھے روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہتھیار پانی میں ہی غرق کر دیے تھے۔ میرا پاؤچ جو واٹر پروف تھا میرے پاس محفوظ تھا۔ میں تھکے تھکے انداز سے آگے بڑھا اور ایک اور لمبا چکر کاٹ کر سڑک پر آ گیا۔ مجھے کسی ٹیکسی کا انتظار تھا۔ جلد ہی مجھے ایک ٹیکسی نظر آ گئی۔ میں نے اسے ہاتھ دیا اور منوج کمار کے گھر کا پتا بتا کر عقبی نشست پر براجمان ہو گیا۔ ڈرائیور ایک تھائی خاتون تھی۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ مچھلی کا شکار کرتے ہوئے میں دریا میں جا گرا تھا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

میں ایک مشکل اور اہم ترین مرحلہ، مختصر مگر اعصاب شکن جنگ کے بعد کامیابی سے طے کر آیا تھا۔ وزیر جان کو اس کے عبرتناک انجام سے دوچار کرنے کے بعد میں خود کو کافی ہلکا پھلکا اور طمانیت بھرا محسوس کرنے لگا تھا۔ ایک پہاڑ جیسا بوجھ تھا جو سر سے اتر گیا تھا آج لہٰذا ایک فکر تو سر سے اتر ہی چکی تھی کہ اب پاکستان میں اسپیکٹرم ایک بڑے عرصے تک اپنے کسی ''ٹینٹیکل'' کی داغ بیل ڈالنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ''را'' والے بھی اپنے دیرینہ ناپاک ارادوں کی حسرت لیے ایک طویل انتظار کی آگ میں سلگتے ہوئے اپنے ہی زخم چاٹتے رہیں گے۔ نوشابہ اور چوہدری ممتاز جس کے بل بوتے پر اینڈتے پھر رہے تھے، اب وزیر جان جیسے ناسور کی ہلاکت کے بعد ان کی کمر ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

تاہم ان سب باتوں کے باوصف وزیر جان جیسا موذی مرتے مرتے بھی مجھے ایک بڑی مصیبت میں ڈال گیا تھا، یعنی کاوشی کی ہلاکت۔ اب مجھے اپنا راستہ صاف کرنا تھا، چنانچہ دیکھنا یہ تھا کہ اب منوج کمار میرے کہاں تک کام آ سکتا تھا؟

منوج کمار کے گھر پر مرہم پٹی سے متعلق جو کچھ بھی تھوڑا بہت سامان تھا اس سے میں نے اپنے زخم کی خود ہی پٹی کر دی، لیکن زخم کا جائزہ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ٹانکے کھلنے کی وجہ سے زخم کا منہ نہیں بند ہو رہا تھا۔ شاید منوج کمار سے ہی اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ مدد مل سکے۔ میں نے سوچ کر خود کو تسلی دی۔

وہ ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ میں نے پانی پیا اور ذرا دیر تک بیٹھا پُرسکون ہونے کی کوشش کرتا رہا، اس کے بعد میں نے کاوشی کے سیل فون کا جائزہ لیا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ کی پیڈ لاکڈ تھا اور پانی میں بھیگ جانے کے سبب خراب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کی ڈیجیٹل ڈائری کا جائزہ لیا تو اس کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ تھوڑی دیر اس نے کام کیا اس کے بعد آف ہو گیا۔ مجھے توقع تو تھی کہ اس میں ناموں کے ساتھ مختلف لوگوں کے پتے اور ساتھ میں ٹیلی فون نمبرز درج ہوں گے، مگر میں بھلا کس طرح اپنے مطلوبہ افراد پہچان سکتا تھا؟

میں کاوشی کے ان تینوں ''ایکسپرٹس'' سے رابطہ کرنے کی سوچ رہا تھا جنہیں کاوشی نے خاص طور پر میرے لیے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ تینوں ایک جوان لڑکی لڑکا اور ایک پختہ العمر شخص پر مشتمل کاوشی سے تعلق رکھنے والے گروپ کا ایک ٹاپ پروفیشنل ٹولا تھا۔ انہوں نے میرا تفصیلی جائزہ لیا تھا تا کہ مجھے راجیش کمار جیسی شکل و صورت کا بنایا

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ دسمبر 2017ء
کی جھلکیاں

عمر خیام

ضیا تسنیم بلگرامی کے قلم سے اس شخصیت کا
احوال جسے سائنسی علوم پر دسترس تھا لیکن
دنیا والے اسے شاعر سمجھتے رہے

پرانی ساس

کاشف زبیر کے قلم سے ایک اچھوتا موضوع

کلاچی سے کراچی

محمد اقبال مانڈویا کے جادو اثر
قلم سے تاریخ کراچی

رسم سال نو

وسیم بن اشرف کی دلچسپ تحریر، دنیا بھر
میں سال نو کا استقبال کیسے کیا جاتا ہے

عشق گزیدہ

زویا اعجاز کی ایک دلچسپ مگر انوکھی سچ بیانی
جس میں انتہائی انوکھی سزا تجویز ہوئی تھی

بہت سی سچ بیانیاں دلچسپ
سچے قصے اور تاریخی واقعات

جاسکے۔ چند روز میں ان کو ... اپنا ''کام'' شروع کر دینا تھا کہ درمیان میں اس خبیث اور موذی وزیر جان نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ نیز کاوُشی نے مجھے ایک سستا سا جو سیل فون دے رکھا تھا جس میں صرف اسی کا نمبر سیو تھا وہ بھی کھو چکا تھا۔ مجھے اپنی ایک غلطی کا سختی کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ کاش! میں اس وقت ان تینوں ایکسپرٹس کے کم از کم ناموں سے ہی واقفیت حاصل کر لیتا تو یہ آج ڈائری میرے لیے معاون ثابت ہوتی۔ میں اس کی بیٹری نکال کر اسے خشک کرنے کے بعد استعمال میں لانے کی کوشش تو کر سکتا تھا۔ نیز میں ان کے نام دیکھ کر انہیں کال کر سکتا تھا، تاہم اس بات سے قطع نظر کہ اب ان حالات میں جبکہ کاوُشی بھی ہلاک کیا جا چکا تھا، وہ کس قدر میری مدد کر سکتے تھے؟

اندھیرے میں بھی تیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا کہ میں ڈائری میں درج ہر نمبر پر رابطہ کر سکتا اور ایک ایک سے پوچھتا کہ ''بھائی! کیا آپ ہی وہ تینوں افراد تھے جو اس روز کاوُشی کے ہاں مجھے راجیش کمار کا بہروپ بھرنے کے لیے دیکھنے آئے تھے۔'' یہ ایک بے وقوفانہ عمل ہوتا۔

جھنجلا کر میں نے وہ ڈائری ایک طرف پھینک دی۔ سیل فون بھی میں نے بے دلی سے ایک طرف ڈال دیا اور صوفے کی پشت گاہ سے کمر اور سر لگا کر سوچنے لگا کہ کیا واقعی وزیر جان کی یہ بات درست تھی کہ پاکستان میں زور آور خان کو بھی انہوں نے کاوُشی کی طرح موت کے گھاٹ اتار ڈالا تھا؟ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا، ورنہ وزیر جان کو یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں پھر بھی زہرہ بانو سے کم از کم ایک ٹیلی فونک رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ زور آور خان سمیت مجھے کبیل دادا اور شکیلہ کی بھی خیر خبر لینا تھی۔ وزیر جان کے خاتمے کی بھی خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ لیکن میں بلاوجہ باہر بھی نہیں نکلنا چاہتا تھا۔ البتہ اس سلسلے میں منوج کمار میرے لیے بہترین مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ میں اس کا سیل فون استعمال کر سکتا تھا۔ گھر میں اس کے ٹیلیفون نہیں تھا۔ منوج کمار کا نام ذہن میں آتے ہی میں اس کے بارے میں بھی غور کرنے لگا اور اس سے زیادہ اس کے اس خطرناک منصوبے کے بارے میں بھی جو اس نے اپنی آئندہ زندگی کو خوش حال بنانے کے لیے بنا رکھا تھا۔

اس کا وہ منصوبہ کیا ہوسکتا تھا، یہ ابھی اس نے نہیں بتایا تھا، تاہم اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ کم از کم یہاں بینک روبری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اس کے منصوبے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں تو بس عارضی طور پر پناہ چاہتا تھا۔

بہرطور میں اس کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ منوج کمار ان حالات میں میرے کیا کام آسکتا تھا۔ نیز یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے اسے یہ بتانا پڑتا کہ بینکاک کا ایک بڑا گینگسٹر کاسپا کو میرا دشمن تھا۔ اس صورت میں شاید منوج کمار مجھ سے بدک سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ ابھی اسے کوئی حقیقت سرے سے بتائی ہی نہیں جاتی، یوں بھی وزیر جان کی رہائش گاہ پر اس نے میرا روپ دیکھ لیا تھا، بے شک ابتدا میں وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہوگا مگر وزیر جان کے مجھے تخاطب کرنے کے انداز پر وہ چونکا تو ہوگا۔ بعد میں اس کے سامنے بھی میری حقیقت کھل گئی ہوگی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اب وزیر جان کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد وہ...... مجھ سے دشمنی بھی ترک کر دے، کیونکہ وزیر جان نے اپنی رہائش گاہ میں اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ یہ بھی تھا کہ مجھے اس طرح سامنے دیکھ کر اسے اس کی بات کا یقین آیا ہوگا کہ میں واقعی وزیر جان کی قید میں تھا ہی نہیں۔ تو پھر اب کاسپا کو میرے سلسلے میں کیا قدم اٹھا سکتا تھا؟ مجھے کوئی ایسی خوش فہمی بھی نہیں تھی کہ وہ میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ تاہم مجھے سانچی کے سلسلے میں افسوس ضرور ہو رہا تھا کہ نجانے اس بے چاری کے ساتھ کیا حشر ہوا ہو......؟ خود سانچی اور اس کے بوائے فرینڈ، دونوں نے ہی بے وقوفی سے کام لیا تھا۔ سانچی اس وقت میری بات مان لیتی اور ہلینا اور میرے ساتھ ہی چلی آتی تو دونوں کے لیے بہتر ہوتا یہ۔

میں ایک بڑی جنگ اور اہم ترین مشن کو کامیابی سے سر کرنے کے بعد تھوڑا آرام کرنے کے لیے اندر کمرے میں بیڈ پر جا کے لیٹ گیا۔ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی تھی۔ پتا نہیں میں کتنی دیر سویا تھا کہ یا شاید خود ہی کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ مگر ایسا کچھ نہیں تھا...... مجھے ٹھوکا دے کر جگایا گیا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

رقیب

شاکر لطیف

آگ کے شعلے بھڑک کر بالآخر بجھ ہی جاتے ہیں مگر رقابت... حسد اور پچھتاوُں کے شعلے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دامنِ دل کو سُلگاتے رہتے ہیں... محبت جیسے جذبے سے سرشار ایک مسیحا کی مسیحائی... اس نے اپنے پیشے کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر عداوت... خیانت اور شقاوت کو اولیت دی تھی...

جرم و سزا کے موضوع پر دردناک کہانی کے اسرار......

''آخر مارتھا کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی، کہ اب وہ بیس برس کی ہو چکی ہے۔ اسے اب ایسی بچگانہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ اب بھی مردوں کی طرح بال کٹوا کر رکھتی ہے اور اس کے چلنے کا انداز بھی مردانہ ہے۔ عورت ہونے کے باوجود اسے نسوانیت چھو کر بھی نہیں گزری۔ اس طرح تو اس کی شادی بھی نہیں ہوسکتی۔'' ریمنڈ کی آواز

تیسرا حصہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ترتیب:

ایم۔ طلحہ عامر

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 45

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا، اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، نفیس شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش برنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ پاسکل ہولارڈ، ایک یہودی بڑا اور کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ پاسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فنگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ پاسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڑیسہ کمپنی کے کے سلسلے میں عارف اور سرد بابا کے درمیان چپقلش آخری بیج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا عارفہ کو کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ پاسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس گروں کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ پاسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فنگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فنگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے جہاز راں کمپنی اڑیسہ کے شپمنٹ کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوپارا، شہزی کو ٹائیگر فنگ سے چھین لیتا اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا۔ وہ تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوپارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قید سے جی کوپارا اور اس کے ساتھی مھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوپارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آنا سے گریز مجبوری میں الجھنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا

شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچ کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا اسی اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا ہیکر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بجھے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ یوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ لے میں اب شہزی اور دوشی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو یں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آتے ہیں۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ باپ بیٹی کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور وہ اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم لوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی سے ٹکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل لے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے اریں سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں اب ہوجاتا ہے۔ پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سر پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا نے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں کے والدین اور زہرہ کی لاشیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو ٹھکانے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ مشن پر روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ایئرپورٹ سے شہزی کو اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکمہ دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسیاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ وزیر جان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس وزیر جان کو تہ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ جو کوئی بھی تھا، اس کا چہرہ دکھائی دینے سے قبل، اس کے سائلنسر لگے پستول کی سیاہ نال پہلے مجھے دکھائی دی تھی، بعد میں اس کا چہرہ...... جو بغیر نقاب کے تھا۔

''کوئی حرکت کیے بغیر چپ چاپ اُٹھ کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بولا۔

''حرکت کیے بغیر کیسے اُٹھوں میں؟'' میں نے بظاہر ہونق بن کے کہا۔ کیونکہ ابھی میں اس کے بارے میں کچھ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔

''چالاک بننے کی ضرورت نہیں۔'' وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ نہایت محتاط انداز میں چند قدم پیچھے کو سرک گیا۔ ''جو کہا گیا ہے وہ کرو...... جلدی۔''

میں اُٹھ کر بیڈ پر پاؤں جھلائے بیٹھ رہا۔ جاگنے کے عمل سے گزرنے کے بعد میرے ہوش پوری طرح ٹھکانے آئے تو مجھے اپنی بائیں ٹانگ کے زخم سے ہلکی سی ٹیس اُٹھتی محسوس ہوئی۔ مگر اس سے بڑھ کر مجھے ایک اور جھٹکا لگا تھا۔

وہاں اس کے علاوہ دو اور مسلح افراد کھڑے تھے۔ شاید یہ اس کے ساتھی ہی تھے، ان کے ہاتھوں میں بھی جدید گنز دبی نظر آرہی تھیں لیکن مجھے جو جھٹکا لگا تھا، وہ آخرالذکر ان دونوں آدمیوں کو دیکھ کر لگا تھا، کیونکہ یہ دونوں مختلف حوالوں سے میرے شناسا تھے۔ ''مختلف حوالے'' سے میری مراد یہی تھی کہ میں نے ان دونوں مذکورہ افراد کو مختلف اوقات اور مختلف جگہوں پر الگ الگ دیکھا تھا اور یوں انہیں پہچانتے ہی بے اختیار میرے حلق سے ٹھنڈی سانس خارج ہوگئی تھی۔

آخری الذکر آدمی سے شناسائی میری اسی حد تک تھی کہ وہ جہنم واصل وزیر جان کے پیلس میں کاسپاکو کے ساتھ آئے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک تھا جبکہ دوسرا شناسا آدمی بھی کاسپاکو کا ہی تھا جس سے میری مڈبھیڑ شاپنگ مال میں ہوچکی تھی۔ اس کے دھمکی آمیز وہ الفاظ ہنوز مجھے ازبر تھے جو اس نے اس وقت مجھ سے انتہائی قہرآلودہ انداز میں کہے تھے...... ''تم نے کاسپاکو کے اہم آدمی کو ہلاک کر کے بڑی بھیانک غلطی......''

یہ وہی وقت تھا جب موت کے ہرکاروں کے ایک لیڈر اور کاسپاکو کے ایک اہم آدمی کو میں ہلاک کرچکا تھا۔

''کاسپاکو سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہوتی تو میں اسے وزیر جان کے پیلس میں ہی ختم کرسکتا تھا۔'' انہیں پہچانتے ہی میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ وہ تینوں اب مجھ سے بے حد محتاط نظر آرہے تھے۔ وہ میری خطرناکی سے واقف ہوچکے تھے۔

''چپ چاپ اور بغیر کوئی چالاکی دکھائے حکم کی کرو، یہی تمہارے لیے بہتر ہوگا۔'' پہلا والا ہی مجھ سے مخاطب تھا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں یہی سوال اُبھرا تھا کہ یہ منوج کمار کی رہائش گاہ تک کیسے پہنچ تھے؟ اس کا جواب بھی عیاں تھا۔ جب میں وزیر جان کی کل رہائش گاہ سے کار پورچ سے اس کے تعاقب میں نکلا تھا، اس وقت کاسپاکو بھی اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ بڑی گاڑی میں کوچ کرنے کی تیاری میں تھا اور میری کار کا اگلا بمپر اس کی گاڑی کے پچھلے حصے سے ٹکرایا تھا۔ کیا خبر وہاں سے ہی کاسپاکو نے میرا تعاقب شروع کردیا ہو اور میں تعاقب پر دھیان دینے کی پوزیشن میں بھی کب تھا؟ اس وقت اپنے اہم شکار (وزیر جان) کے تعاقب میں تھا، پھر وہاں سے میرے ٹیکسی میں سوار ہونے تک انہوں نے یہاں تک تعاقب کیا ہوگا اور پھر دوبارہ کیل کانٹوں سے ہوکے لوٹے تھے۔ مقصد مجھے یرغمال بنانے کے سوا اور ہوسکتا تھا۔ پتا نہیں اب ان تینوں نے منوج کمار کا کیا ہوگا؟

میں بظاہر ان کا حکم ماننے کے لیے بیڈ سے کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میری بائیں ٹانگ کا زخم بہت تھا۔

''یہاں ایک اور آدمی بھی تھا۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے مخاطب سے استفساریہ کہا۔ میری مراد کمار سے تھی۔

''اسے ختم کردیا گیا......'' مخاطب نے بڑی سفاکی سے کہا اور میرا دم گھٹنے لگا۔ ان خونی ہرکاروں سے اور توقع کی جاسکتی تھی۔ مجھے ''گریٹ روبری'' کے موجد مختصر کہانی کے عبرت انجام پر افسوس تھا۔ پتا نہیں بے چارے نے اپنی زندگی بنانے کے لیے چوری کا کون سا بڑا منصوبہ بنا ہوئے تھا۔ پتا نہیں بدنصیب منوج کمار مجھ سے کیا کام چاہتا تھا اور اس کے بدلے میری امریکا روانگی کا بھی نے بندوبست سوچ رکھا تھا۔ اب وہ سب سبوتاژ ہوچکا تھا، تقدیر نے ایک بار پھر میری امریکا یاترا کی راہ کاٹ ڈالی تھی۔

''اس بے چارے کا کیا قصور تھا۔ وہ میرا ساتھی نہیں تھا۔'' میں نے اسے ایک بار پھر مخاطب کیا۔

''ہم اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے، نہ ہی تمہیں کا جانی نقصان پہنچانے کا کوئی ارادہ...... رکھتے کن تمہارے اس ساتھی نے ہم پر حملہ کرنے کی بے کوشش کی تھی۔'' اس نے سرد سی متانت سے کہا مگر مجھے لہجے سے دروغ گوئی کی بُو آتی محسوس ہورہی تھی۔

''میں نے کہا نا کہ وہ میرا ساتھی نہیں تھا۔''

''ٹھیک ہے پھر تمہیں اس کی موت کا افسوس نہیں ہونا ہم تمہارا بھی یہی حشر کرسکتے ہیں، بہ شرطیکہ تم نے کوئی دکھانے کی کوشش چاہی تو...... اس لیے اس رعایت دہ اُٹھاؤ۔''

میں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر اس نے مجھے مزید بولنے روک دیا۔

''بس! اب دروازے کی طرف اپنا منہ کر کے ہاتھ پیچھے موڑ لو۔'' اس بار وہ غراتے ہوئے لہجے میں اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے۔ ان پر حملہ کرنے کے...... عوامل پر غور کرنے لگا۔ لیکن حد سے زیادہ محتاط روی آڑے آرہی تھی، یہی سبب تھا جب میں نے اس کے حکم کی تعمیل میں دروازے کی اپنا منہ موڑا تو اس دوران ان تینوں کی ''اسٹینڈنگ ن'' کا اندازہ بھی لگانے کی سعی چاہی تھی۔ جو میرے اچانک حملہ کرنے کے جارحانہ انداز میں مانع ہورہی

کیونکہ یہ تینوں اسلحہ بدست تھے۔ وہ تھوڑا دائیں ہوگیا تھا۔ یوں میں اس کے دونوں اسلحہ پوش وں کے نشانے پر تھا۔ جس وقت میرے دونوں ہاتھوں ائیوں میں آہنی زنجیروں کے کڑے ڈالے جانے لگے میرے ذہن رسا میں ایکشن دکھانے کا منصوبہ آچکا

میں جانتا تھا کہ پہلے والے نے کس مقصد کے تحت پستول پر سائلنسر...... چڑھا رکھا تھا، تاکہ ایسی کسی پر وہ بے آواز مجھ پر فائر کر کے بے بس کرسکے۔ باقی میں سے ہی یقیناً ایک کو اس نے اشارہ کیا تھا۔ اور وہ پشت پر کھڑا میرے اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں ہینڈکف ہا تھا۔ ابھی ایک ہی حلقے میں میرا ہاتھ ڈالا تھا کہ بظاہر خاموش کھڑے وجود میں جیسے بجلی کے پل پارا کر گیا۔ اپنی داہنی ٹانگ پر میں بہ سرعت ہی گھوما اور دائیں بازو کی کہنی کا وار پشت پر کھڑے ہینڈکف ہوئے ہرکارے کے پہلو پر پڑا۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج کر کے جھکا۔

یہ حملہ کرتے ہی میری محتاط گردشی نظروں نے سب سے پہلے اسی ہرکارے کو لیا تھا جس نے خاص مقصد کے لیے اپنے پستول پر سائلنسر چڑھا رکھا تھا۔ زد میں آئے ہرکارے کو میں نے کچھ اس طرح دھکیلنے کے انداز میں نشانہ بنایا تھا کہ میرے بجائے وہ دوسرے ہرکارے کے نشانے پہ آجائے۔ یہ بھانپتے ہی اس نے مجھ پر گولی چلانے کے لیے اپنی اسٹینڈنگ پوزیشن بدلنے کی کوشش چاہی تھی کہ تبھی میں مضروب کو اپنے کندھے کی زوردار ٹھوکر رسید کر کے اس پر اچھال چکا تھا۔

وہ اس سے ٹکرایا اور گرا، تب تک میں نے اس پر لانگ جمپ لی اور اسے رگیدتا ہوا دوسری طرف کی دیوار سے ٹکرایا۔ تیسرے ہرکارے کی طرف سے بھی میں کسی خوش فہمی کا شکار نہ تھا کہ وہ اپنی بغیر سائلنسر لگی گن سے فائر نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی راستہ نہ پاکر وہ اپنی رائفل سے برسٹ فائر کر کے اُبھرنے والی گولیوں کی ''گمن گرج'' کا رسک لینے پر تیار ہو بھی جاتا۔ اسی لیے میں نے سائلنسر لگے پستول والے ہرکارے کو زد میں لیتے ہی اس سے گن جھپٹنے کی کوشش چاہی مگر وہ کم بخت بھی کم تربیت یافتہ نہ تھا۔ اس نے ایک ذرا سا موقع پاتے ہی اسی گن کا دستہ میری پیشانی پر دے مارا۔ شدتِ تکلیف کے باعث میرے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ باقی دونوں سنبھلتے ہی مجھ پر پل پڑے۔

ضربِ شدید کے باعث میرا سر چکرایا ہوا تھا اور یوں میں مار کھا گیا۔ آناً فاناً میرے ہاتھ رسن بستہ کردیے گئے۔ مجھے اُٹھا کر کھڑا کردیا گیا اور لاتوں اور مکوں سے ان تینوں بدبختوں نے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی۔ یہاں تک کہ میں نڈھال ہوگیا۔ اس کے بعد مجھے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا تو میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ایسے ہی وقت میں جبکہ میں پاس کے کمرے کے دروازے کے قریب کھڑا تھا، مجھے وہاں سے فرش پر پڑی بدنصیب منوج کمار کی لاش دکھائی دے گئی۔

یہ لوگ مجھے باہر لے آئے۔ سامنے سیاہ وین کھڑی تھی۔ اس میں سوار ہونے کے بعد یہ لوگ روانہ ہوگئے۔ شام رات میں ڈھل رہی تھی۔ میری آنکھوں پہ انہوں نے پٹی باندھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ شاید اسی لیے کہ میں اجنبی ہی تھا یہاں...... کہاں کہاں اور کون کون سی جگہیں ازبر کرتا۔ یہاں کا تو ایک ایک چپّا میرے لیے اجنبی تھا۔ فوری طور پر گزرے اور دیکھے بھالے علاقوں اور مقامات کی

الگ بات تھی۔

اس وقت بھی مجھے جن راستوں پر لے جایا جا رہا تھا، وہ میرے لیے اجنبی راہیں تھیں۔ چمکتے دمکتے نوئن سائن، جلتے بجھتے دیوزاد بورڈز اور چمکتی ہوئی اسکرینز۔ نہروں کے جھلملاتے کنارے اور وہاں بنے ہوئے پارک پر لوگوں کی آوک جاوک...... مصروف شاہراہیں اور ان پر دوڑتی بھاگتی گاڑیاں......

ایک مقام پر جہاں سے وین کی رفتار کم ہوئی تو وہ موڑ کاٹنے لگی۔ اس کے دائیں جانب مجھے کسی بڑے معبد خانے کی عمارت دکھائی دی۔ جس کی پیشانی پر ''ترمیتر میوزیم'' درج تھا۔ یہ مین سائن میں نے ذہن نشین کر لیا۔ یہاں سے بعد کا اختتامی سفر بمشکل پندرہ بیس منٹ کا ہی رہا تھا اور ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جس کے اطراف میں پام کے درخت اور وسیع و عریض قطع اراضی میں باغیچے پھیلے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان سے گزرتی ایک کنکریٹ کی پختہ روش پر وین رینگنے کی رفتار سے ایک سفید رنگ کی بیش قیمت...... لکڑی کی عمارت کے بڑے سے گیٹ کے سامنے رکی جس کا رنگ سیاہ تھا۔ وین ابھی گیٹ کے قریب ہی تھی کہ دونوں دروازے دائیں بائیں سلائڈ ہو گئے۔ وین رکے بغیر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے ہی مجھے وسیع سوئمنگ پول نظر آیا۔ وہاں روشنی تھی۔ باقی لان میں بھی مدھم سی روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہاں میں نے چار پانچ خوفناک شکاری جبڑوں والے جرمن شیفرڈ کو آزادانہ منڈلاتے ہوئے دیکھا۔ دو دھاری دھار بھاری جسامت کے چیتے بھی مجھے مٹرگشت کرتے دکھائی دیے۔ اصل رہائشی عمارت اندر تھی۔ کچھ مستعد اور مسلح افراد بھی تنے کھڑے نظر آئے تھے۔ ایسے ہی باہر کے گیٹ پر بھی موجود تھے۔

سامنے لمبا چوڑا شطرنج بورڈ جیسی ٹائلوں والا فرش پھیلا ہوا تھا جہاں ایک خوب صورت مگر بھاری بھرکم محرابی دروازہ تھا۔ اس کے دائیں بائیں چنگھاڑتے ہوئے درندوں کے سنگی مجسمے بنے ہوئے تھے۔ یہی گل دان کا بھی کام دے رہے تھے۔ ان پر خوش رنگ پودے اور پھول نظر آ رہے تھے۔

اس مرکزی دروازے سے ہم اندر داخل ہو گئے۔

بینکاک کے ایک خطرناک گینگسٹر کے ٹھکانے پر......

میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیات ہونے لگی تھیں۔ کاساپو جیسے سفاک اور درندہ صفت آدمی سے کسی بھی قسم کی بربریت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بدیس کی اجنبیت ایک الگ سی پریشانی اور دل میں فطری طور پر ایک عدم تحفظ کا سا اُبھارتی ہے۔

ہم ایک بڑے سے شاہانہ طرز کے کمرے میں آ گئے۔ شکر تھا کہ مجھے کسی تہ خانے نما قید خانے یا زنداں کی نذر نہیں کیا تھا جس کا مطلب میری عقل میں یہی آتا تھا کہ کاساپو...... کا ارادہ کم از کم فوری طور پر مجھے نقصان پہنچانے کا نہیں ہے۔ ورنہ مجھے نیند کے عالم میں ہی ان ہرکاروں کا ہلاک کرنا کیا مشکل ہوتا۔

مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں اسی طرح ہی بیٹھ گیا تھا۔ ان تینوں میں سے دو میرے دائیں بائیں عقب میں کھڑے ہو گئے تھے۔ جبکہ تیسرا (سائلنسر پستول والا) میرے سامنے والے ایک خالی صوفے کے قریب خاموش کھڑا ہو گیا۔ میری زیرک اور چست نظروں نے ان کی اس انداز کی مخصوص پوزیشنیں سنبھالنے پر فوراً ہی محسوس کیا تھا کہ کسی کی آمد جلد ہی متوقع ہے پھر ذرا ہی دیر میں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ جب میں نے دائیں جانب کے دروازے سے کاساپو کو ایک وہیل چیئر پر نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ خودکار وہیل چیئر تھی۔ جسے وہ خود ہی ایک ہاتھ سے اس کی ہتھی پر لگے لیور سے چلا رہا تھا۔ تاہم اس کی چیئر کے ہمراہ دو عدد طرح دار تھائی دوشیزائیں بھی تھیں۔ دونوں چست اور مختصر لباس میں تھیں۔

کاساپو جیسے آدمی کو وہیل چیئر پر دیکھ کر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی تھی کیونکہ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی اور دائیں ٹانگ کی بھی یہی حالت تھی۔ وزیر جان کی محل نما رہائش گاہ پر جب اس نے پھرتی سے پلٹ کر...... اپنے خطرناک پسٹل سے وزیر جان پر فائر جھونکنے کی کوشش چاہی تھی تو وزیر جان کے چھپے ہوئے شوٹرز نے دو گولیاں اس پر داغ ڈالی تھیں جو اس کے ایک پستول والے ہاتھ پر اور دوسری دائیں ٹانگ پر لگی تھیں۔ یہ انہی کا زخم تھا۔

وہیل چیئر مذکورہ صوفے کے قریب آ کر رکی۔ دو افراد تیزی سے آگے بڑھے اور کاساپو کو سہارا دے کر صوفے پر بٹھا دیا۔ وہ بہرحال معذور نہیں تھا۔

اب وہ صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے میرے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ میری یک ٹک نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز رہی تھیں۔ ایک آدمی نے، موٹا اور گھٹتی

ک کا سگار اس کے لبوں سے لگا کر لائٹر دکھا دیا۔ وہ دائیں تھ سے دو تین سگار کے طویل کش لگانے کے بعد مجھ سے طب ہو کے بولا۔

''میں آدمی کی قدر جانتا ہوں، اسی لیے تم یہاں پر دہ لائے گئے ہو۔'' اس نے حسبِ سابق پُرغرور لہجے میں لا: ''ایک بات ذہن میں رکھنا، ابھی میں ایسا صرف وچ رہا ہوں۔ تمہارے سلسلے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم ہو کون......؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور کس گینگ سے تعلق رکھتے ہو؟''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔ میں یہاں لانے تک قیاس آرائی کے بل بوتے پر سوچ چکا تھا کہ وہ مجھ سے کیا اور کس قسم کے سوالات کر سکتا ہے۔ میری خطرناکی' کے وہ دو شواہد، جن میں ایک غائبانہ اور دوسرا ظری تھا، سے اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

''میں اسی شخص کے گینگ کا ایک اہم رکن تھا جس سے بات کرنے تم کل آئے تھے۔''

''ہوم...... مم!'' سگار کے سیاہ گاڑھے دھوئیں کے ھے فضا میں چھوڑتے ہوئے اس نے گمبیر انداز کی ایک ہنکاری لی تھی۔

''اس سے منحرف ہونے کی وجہ......؟'' اس نے اگلا وال کیا۔

''دشمنی۔''

''دشمنی کی نوعیت؟''

''میری اب تک کی قربانیوں، وفاداریوں اور جاں ثاری کا بدلہ...... ایک نئے شامل ہونے والے آدمی کو مجھ پر ترجیح دیتا تھا۔'' میں نے اسی انداز میں دروغ گوئی سے کام لیا جس انداز اور ''قبیل'' کا یہ مجھے سمجھے ہوئے تھا۔

''یہ تو دشمنی کی اتنی بڑی وجہ نہیں محسوس ہوتی کہ تم اپنے ہی باس کو ہلاک کر ڈالو......؟'' وہ بولا۔

بلاشبہ کاساپو...... گھاگ آدمی تھا۔ وہ نوعیت تاڑنے کی کوشش کر رہا تھا نیز اسے بھی پتا چل چکا تھا کہ میں وزیر جان کو جہنم واصل کر چکا ہوں، اسی سبب میرا یہ اندازہ بھی درست ہی ثابت ہوا تھا کہ اس نے نوکٹ پیکس، ہل ٹاپ سے میرا تعاقب کیا تھا۔

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے۔'' میں نے کہا اور آگے بولا۔ ''ترجیح دینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس آدمی کی شکایات پر میرے خلاف تنظیمی و تادیبی کارروائیاں بھی کی جاتیں۔ یہاں تک کہ جب اسی نو وارد نے جب میری فیملی پر بُری نظر رکھی تو...... میں خود پر قابو نہ پا سکا اور اس پر ہلّا بول دیا۔ اس کی درگت بنا ڈالی اور باس وزیر جان سے اس کی شکایت بھی کر ڈالی مگر اس نے میرے ہاتھوں بری طرح پٹنے کے بعد باس کو میرے خلاف پوری طرح اُکسا دیا تھا۔ باس نے حسبِ معمول اسی کی سائڈ لی تو میں بددل ہو کے تنظیم سے نکل گیا۔ اس آدمی کو دشمنی نکالنے کا موقع مل گیا اور اس نے میری فیملی کو انتقام کے شعلوں کی نذر کر دیا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ ایسا اس نے باس کی شہ اور مدد کے بل بوتے پر کیا تھا۔ اس نے مجھے بھی تنظیم سے انحراف کرنے پر موت کے گھاٹ اُتارنے کا حکم دے رکھا تھا۔ تب سے میں اپنے سینے میں انتقام کی آگ لیے ہوئے انڈیا سے اس کے پیچھے یہاں تک چلا آیا تھا۔''

میں اچھی خاصی دروغ گوئی سے کام لینے کے بعد چپ ہو رہا اور اس کے چہرے پر اپنی بات کے ردِعمل کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مجھے لامحالہ ہی سہی جس قبیل کا سمجھے ہوئے تھا، میں...... اُسے اسی انداز میں ہی مطمئن کر سکتا تھا۔

وہ اپنے پھولے ہوئے پپوٹوں تلے اُبلی ہوئی آنکھوں سے کسی مینڈک کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد سگار کا ایک طویل کش لیا۔

''میری معلومات کے مطابق تم یہاں اس کی قید میں بھی رہ چکے تھے۔ میرے آدمی موتو کی مداخلت سے تم آزاد ہوئے۔ پھر پتا نہیں تمہارے اور موتو کے درمیان کس طرح کی ٹھن گئی تھی کہ...... تم اس کے نرغے سے بھی فرار ہو گئے۔ تم نے اسے شدید زخمی بھی کر دیا۔ یہ سارا کیا چکر تھا؟''

میں نے یہ حقیقت بلاکم و کاست...... صاف گوئی سے بتا ڈالی کہ اس کی سانچی نامی گرل فرینڈ تمہارے قبضے میں تھی اور موتو اسی لیے مجھے وزیر جان کے ایک آدمی کی مدد سے چھڑا کر تمہارے حوالے کرنا چاہتا تھا۔''

میں جانتا تھا کہ یہ حقیقت بھی اسے معلوم ہوگی، لہٰذا اس معاملے میں جھوٹ بولنا میرا خود کو پھنسانے کے مترادف ہوتا۔

''صحیح...... بالکل صحیح......'' کاساپو معنی خیز انداز میں بولا۔ ''تو گویا اس کا مطلب ہے کہ وہ لڑکی سانچی تمہاری کچھ نہیں لگتی تھی۔''

''ہرگز نہیں، وہ تو اتفاق سے میرے ساتھ اُس روز

شاپنگ مال میں پھنس گئی تھی۔ چونکہ ہم سب یرغمال تھے تو لامحالہ ایک ہی کشتی کے سوار کہلائے تھے۔ ورنہ میرا تو وہاں کسی سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔'' میں نے بہت محتاط انداز میں اُس کی آخری بات کا جواب دیا۔ کیونکہ میری اور کاسپا کو کی دشمنی کی بنیاد اِدھر سے ہی پڑی تھی۔

''صحیح...... بالکل صحیح......'' کاسپا کو ایک بار پھر اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

''وہاں تمہارے ہاتھوں میرا ایک اہم مشن فیل ہوگیا اور ایک اہم آدمی بھی ہلاک ہوا تھا۔'' اس بار وہ سرسراتے لہجے میں کہہ رہا تھا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ کیونکہ گفتگو کی نہج بدل رہی تھی۔ وہ جواب طلب انداز میں یہ بات کہہ کر میرے چہرے پر اپنی سنانٹے دار نظریں مرکوز کیے رہا تو میں نے ہولے سے کھنکھار کر جواب میں کہا۔

''میری تم سے یا تمہارے آدمیوں سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں نے اُس روز وہاں جو کچھ کیا تھا وہ اپنی جان بچانے کے ایک فطری تقاضے کے تحت کیا تھا۔ اس میں کسی دشمنی کا کوئی بھی دخل نہ تھا۔''

''صحیح...... بالکل صحیح......'' کہتے ہوئے وہ پھر اپنا سر دھننے لگا۔

میری انتہائی حساس آبزرویشن...... اس کی باڈی لینگویج اور لب و لہجہ سے پتا چل رہا تھا وہ اب تک میرے سارے سوالات سے مطمئن رہا ہے۔ تبھی اس نے اپنے ان دو آدمیوں، جو میرے صوفے کے عقب میں دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے، ان میں سے ایک کو مخصوص اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور میرے ہاتھوں کے ہینڈ کف کھول دیے۔ میں نصف آزاد ہوگیا۔ دل کچھ مطمئن ہوا، خلاصی ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ پتا نہیں اب بینکاک کا یہ گینگسٹر مجھ سے اور کیا چاہتا تھا۔ مجھے رہا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بھی کہ نہیں لیکن اس کی پہلی بات اس سلسلے میں آڑے آرہی تھی جو اس نے میرے ساتھ اپنی گفتگو کی ابتدا میں کہی تھی۔

''میں آدمی کی قدر جانتا ہوں اسی لیے تم یہاں پر زندہ لائے گئے ہو۔''

اس کے بعد اس نے اپنے پاس کھڑے اسی آدمی کی طرف دیکھا جو مجھ سے مخاطب رہ چکا تھا۔ وہ فوراً ہی نہایت احترام سے اس کی بات سننے کے لیے ذرا سا جھکا۔ پتا نہیں کاسپا کو نے اس سے کیا کہا، وہ فوراً پلٹ گیا۔ ایک دوسرے دروازے تک گیا وہاں اس نے کھڑے ہوکے کسی کو سر اور ہاتھ کے اشارے سے کچھ کہا اور واپس آکر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں کئی ثانیوں کے لیے گمبھیر تا سی خاموشی طاری رہی۔ اس دوران میں کاسپا کو موٹے سگار کے کش لگاتا رہا اور گاڑھے کثیف دھوئیں کے لچھے دار بادلوں کے عقب سے میرے چہرے کو بھی گھورتا رہا۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک اور طرح دار سی حسینہ ایک دروازے سے نمودار ہوئی۔ وہ مختصر اور چست لباس میں تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ عریاں حصے انگاروں کی طرح دہکتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ ایک نفیس قسم کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لارہی تھی۔ اس پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ شراب کی بوتلیں۔ خالی پیگ۔ بھنے گوشت کے پارچے اور نجانے کیا کیا۔

میرا خیال تھا کہ حسینہ ٹرالی کو کاسپا کو کے قریب لاکر چھوڑ دے گی مگر ایسا نہیں ہوا، وہ اسے میرے قریب لے آئی اور ٹھہر گئی۔ میری طرف اس نے ایک دلنشیں مسکراہٹ سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بڑی کشادہ اور سیاہ چمکتی ہوئی تھیں جن میں مجھے ایک عجیب سی بھوک کی چمک محسوس ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو احترام کے انداز میں خفیف سا خم کیا اور پھر واپس لوٹ گئی۔ مطلب یہی تھا کہ یہ سارا کچھ میری ضیافت کے لیے تھا۔

میں کھانے کی ٹرالی کی طرف دیکھنے لگا۔ بھوک مجھے تھی لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک فرنگی ملک میں تھا جہاں کی کافی سے زیادہ چیزیں...... میرے لیے ممنوع ہوسکتی تھیں، شاید میری اس تردد آمیز بے چینی کو کاسپا کو بھانپ گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس کی کھرکھراتی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''بے فکر رہو...... اس میں سوائے شراب کے تمہارے مذہب کی کوئی شے ممنوع نہیں ہے۔ گوشت ذبیح کا ہے، ہرن کے پارچے ہیں۔ بیل گائے کا روسٹ اینڈ فرائڈ قیمہ ہے ڈبل بریڈ کے ساتھ اور بیئر کے دوش بھی نان الکوحل ہیں۔''

وہ رکا پھر بولا۔ ''آرام سے کھاؤ اور جی بھر کر...... مجھے خوشی ہوگی۔ باقی کی اہم باتیں تم سے صبح ہوں گی۔ تمہارے آرام کا بندوبست کیا جاچکا ہے۔''

میں اُس کی بات پر چونکا...... اور کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ سوچ کر چپ ہو رہا۔

وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس لوٹ گیا۔ باقی بھی چلے گئے۔ میں کھانے میں مشغول ہوگیا۔ شراب اور ر کو میں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ باقی سب مزے دار اور ت بخش تھا۔ بڑے عرصے بعد ایسا پُرتکلف کھانا ملا تھا یوں ی میں کھانے پینے کا شوقین تھا...... خوب ڈٹ کر کھایا ر پتا نہیں بعد میں ایسا کھانا نصیب میں ہوگا بھی کہ نہیں۔

حسبِ فطرت کھانا کھاتے ہی مجھ پر گویا ''خمارِ گندم'' ری ہونے لگا، یعنی نیند نے آلیا۔ مجھے شاید کہیں سے خفیہ ر پر ''واچ'' کیا جا رہا تھا، کیونکہ کھانا ختم کرتے ہی...... ی طرح وار حسینہ اندر داخل ہوئی جو میرے لیے ضیافت کا سامان لائی تھی۔

خمارِ گندم صرف نیند نہیں دیتا، ہوش بھی کھوتا ہے۔ ری نیم باز سی نظریں غیر ارادی طور پر اس کے سیاہ رنگ ے منی اسکرٹ سے جھانکتی ہوئی ٹانگوں پر تھیں۔ اس نے ی شستہ انگریزی اور مترنم لہجے میں کہا۔

''آیئے میں آپ کو کمرے تک لیے چلتی ہوں۔''

ں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ٹرالی پر جھکی اور شراب کی بند بوتل کو چھو ے بولی۔ ''او...... آپ نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا؟ ہا کمرے میں شغل کر لینا۔'' کہتے ہوئے اس نے بوتل، یک اور باؤل اُٹھا لیا۔ ایسے میں اس کا گریبان جھکنے کی وجہ ے بڑا حشر ساماں منظر پیش کرنے لگا تھا۔ وہ بڑے گداز حسن کی مالک تھی۔ ایسی توبہ شکن کہ بڑھ کر دبوچ لو۔ یرے وجود میں نیند کے خمار کے باوجود سنسنی دوڑ گئی۔

''نہیں رہنے دو...... پلیز......! میں شراب نہیں تا۔'' میں نے کہا۔

''واٹ......؟'' وہ یوں چونکی جیسے میں نے اُسے زہر ینے کا کہہ ڈالا ہو......''

''انتہائی غیر یقینی...... ٹھیک ہے تم مسلم ہو مگر......''

''مگر میں...... نہیں پیتا۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''او کے...... تشریف لایئے۔'' کہتے ہوئے اس نے و سامان پھر جھک کے ٹرالی پر رکھا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ں دوبارہ اس کا توبہ شکن نظارہ کرنے سے خود کو نہ روک کا۔ بس، دیکھنے کی حد تک ہی سب کچھ تھا، ورنہ میں اس طرت کا انسان کہاں تھا۔ وہ بھی نظر بھٹک جاتی تب......

وہ مجھے ایک دروازے سے گزار کر چکنے فرش والی تی رہداری میں لے آئی۔ وہاں سے ایک کمرے میں لے کر داخل ہوئی۔ کمرا دیکھ کر ہی میں دنگ رہ گیا۔ اس قدر رام دہ اور ضرورت کی ہر شے سے آراستہ تھا کہ نیند آپوں پ غلبہ پانے لگی تھی۔

اس کی دیواریں سفید تھیں۔ دو کھڑکیاں تھیں سلاخ دار...... ایک گول روشندان، چھت اونچی مگر محراب نما ڈھلوانی تھی۔ سائز میں آرام دہ ڈبل بیڈ تھا۔ صوفہ تھا۔ اٹیچ باتھ، واٹر ڈسپنسر اور نجانے کیا کیا۔ فریج تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ ایک کونے میں بارٹینڈر کا وائن کاؤنٹر تھا جس کے شیلف میں بھانت بھانت موٹی، لمبی، مخروطی وہسکی کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔

''یہاں آپ آرام کریں...... کل صبح آپ کو جگا دیا جائے گا۔'' وہ نرم سی مسکراہٹ سے بولی پھر میری طرف مصافحے کے لیے اپنا نرم و نازک ہاتھ بڑھایا۔

''میرا نام...... سون ہے۔'' اس نے شاید لگے ہاتھوں اپنا تعارف بھی کرا دیا۔ میں نے مسکرا کر اس سے مصافحہ کیا تو جیسے میرے پورے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ کس قدر نرم و گداز ہاتھ تھا اس کا...... حرارت سے بھرپور...... نرم گرم سا...... جذبات کو بے اختیار دھکا تا ہوا...... میرا دل تھرانے لگا تو میں نے فوراً اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ کیونکہ اس نے ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں ہنوز دے رکھا تھا۔

میں ''شکریہ'' کہتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھ گیا۔

''باتھ روم میں وارڈ روب ہے۔'' سون ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''وہاں ہر سائز کے دھلے ہوئے سلیپنگ سوٹ موجود ہیں۔ پہلے تم فریش ہوکر آجاؤ، پھر میں بھی اپنا یہ لباس بدل کر نائٹی پہن لیتی ہوں۔ ویسے تمہیں کون سے رنگ کی نائٹی پسند ہے؟''

اس کی بات سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ گویا سارا نشہ ہی اُتر گیا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' میں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے اس طرح بوکھلانے پر ہنسی۔ اس کے سیبوں جیسے گالوں پر ایک گڑھا پڑا۔ سفید دانتوں کی قطار...... بہت بھلی لگی۔ نرم و گداز لب اور زیادہ رسیلے محسوس ہوئے۔

''جی ہاں! باس نے مجھے تمہارے ساتھ رات گزارنے کا حکم دیا ہے۔ تمہاری خاطر مدارت اور ضروریات سے لے کر ہر چیز کا خیال رکھنے کا حکم ملا ہے مجھے۔''

''للل...... لیکن میں تو ایسا کچھ نہیں چاہتا...... تم الگ کمرے میں جا کر سو جاؤ، میں کوئی بچہ نہیں ہوں، جو مجھے ڈر

Poora Pakistan
Raha Hai Bol
Hashmi Ispaghol

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈشوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raho
www.hashmisunna.com HashmiSince1794
Benchmark.pk

Hashmi
Ispaghol

لگے گا۔‘‘ میں نے ذرا لہجے میں…… تلخی سموتے ہوئے کہا۔ تاکہ اس کا دل خراب ہو جائے مگر وہ قتالہ جہاں اور عذاب جاں بدستور ہنس کر بولی۔

’’انجان مت بنو، باتھ روم جاؤ اور چینج کر آؤ، اس کے بعد مجھے جانا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر سون دروازے کی طرف بڑھی اور اس نے وہ بند کر دیا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی طرف تکتا رہ گیا۔

’’جاؤ……!‘‘ وہ دوبارہ میرے قریب آ کر بولی۔ مگر میں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا اور اس بار اس سے تلخ لہجے میں بولا۔

’’اے…… مس! میں اس مزاج کا آدمی نہیں ہوں۔ آپ مہربانی کر کے یہاں تشریف لے جائیں۔‘‘

’’بے وقوف مت بنو!‘‘ سون اس بار سنجیدہ ہو کے بولی۔ ’’یہ باس کا حکم ہے۔ ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا۔ وہ اس میں مجھے خطاوار سمجھے گا اور میری شامت آ جائے گی کہ میں تمہیں پسند نہیں آئی۔ وہ اس میں اپنی ہتک سمجھے گا، پلیز!

تم…… سمجھو بات کو…… باس ایسی ہی عجیب فطرت کا ہے، اُسے یقین ہی نہیں آئے گا کہ تم اور مزاج کے ہو، سارا نزلہ اس کا مجھ پر گرے گا۔ پلیز، میں الگ سو جاؤں گی، مگر مجھے آج کی رات یہاں گزار لینے دو……‘‘ اس کے لہجے میں التجا اُتر آئی تھی، میں بھی ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہ گیا اور شاید اس کی ’’مجبوری‘‘ بھی سمجھ رہا تھا۔

’’ٹھیک ہے۔‘‘ بالآخر میں بولا۔ ’’میں صوفے پر سوؤں گا تم بیڈ پر سو جانا۔‘‘

’’نہیں، میں صوفے پر سوؤں گی، تم بیڈ پر…… جاؤ اب لباس بدل لو، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔‘‘ سون بولی۔

باتھ روم میں داخل ہوا یوں لگا جیسے باتھ روم میں نہیں بلکہ کسی اور کشادہ کمرے میں آ گیا ہوں۔ ایک طرف بڑا سا کشتی نما اور خوش نگاہ باتھ ٹب تھا۔ فینسی اسٹائل کی بیش قیمت اور دیدہ زیب سینیٹری نصب تھی۔ میں نے گرم پانی سے غسل کیا، ہلکا پھلکا لباس پہنا اور نکل آیا، جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے ’’احتیاطاً‘‘ کہہ ڈالا۔

’’نائٹی پہننے کی ضرورت نہیں تمہیں، ڈھنگ کا لباس پہن لینا مناسب ہو گا۔ اسے میری شرط سمجھو۔‘‘

وہ عجیب عجیب سی نگاہوں سے مجھے تکتی ہوئی باتھ روم میں گھس گئی، میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔ میں اس کے نکلنے کا منتظر تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ برآمد ہوئی۔ اس کے بال لمبے تھے، جو بکھر کر شانوں سے بھی نیچے جھول رہے تھے۔ اس نے لمبا سا کوئی فراک پہن لیا تھا۔ گریبان اس کا بھی کشادہ تھا مگر یہ بہرحال نائٹی سے بدرجہ بہتر تھا۔ میں نے اس کے سراپا پر سرسری سی نظر ڈالی اور بیڈ سے اُٹھ کر سونے کے لیے صوفے کی طرف جانے لگا تو وہ مترنم سی آواز میں بولی۔

’’تم بیڈ پر ہی لیٹو، صوفے پر میں سو جاؤں گی، تم پورے نہیں آؤ گے۔ نیند میں خلل پیدا ہو گا۔‘‘ کہتے ہوئے وہ عجیب سی نگاہوں سے میرے لمبے چوڑے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی بات صحیح تھی۔ صوفہ لیٹنے کے لیے نہیں تھا، میں سکڑ سمٹ کر ہی سو سکتا تھا۔ جبکہ وہ پوری آ سکتی تھی۔ میں دوبارہ بیڈ کی طرف پلٹ گیا۔

اس نے بیڈ سے لحاف اُٹھایا اور صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے اس کا موڈ ذرا آف سا لگ رہا تھا۔ نجانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی میرا ذہن اس کے بارے میں کچھ سوچنے پر مجبور ہونے لگا تھا۔ میری پیش رفتہ حیات ہما ہی…… میں جہاں دوست میرے کام آتے رہے تھے وہیں دشمنوں کے ساتھی بھی کسی نہ کسی حوالے سے مجھے مدد دیتے رہے تھے، کیا شک تھا اس میں کہ ایسا میری ذہنی فراست کے بل بوتے پر ہی ہوتا رہا تھا۔ چنانچہ میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ سون کو اگر میں شیشے میں اُتارنے کی کوشش کرتا تو وہ میرے کسی ’’کام‘‘ آ سکتی تھی لیکن دیکھنا یہ تھا کہ یہ کمرا ’’بگڈ‘‘ تھا یا نہیں۔

میں نے بیڈ پر لیٹے لیٹے اس کی طرف پہلو کر کے دیکھا۔ وہ صوفے پر گھٹنے سمیٹے لیٹی تھی اور اس پہلو پر تھی کہ وہ بھی مجھے بیڈ پر لیٹا دیکھ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ملیں تو اس نے ہونٹوں کی ایک باچھ کو تھوڑا سا یوں خم دیا کہ جیسے وہ مجھ سے ناراض ہو۔ اس کی ’’دعوت‘‘ ٹھکرانے پر شاید اس کی کسی انا کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ایسی عورتوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ لہٰذا میں نے مسکرا کر بیڈ پر لیٹے لیٹے اس سے کہا۔

’’ناراض ہو؟‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’دیکھو، تم بہت اچھی لڑکی ہو اور بہت حسین بھی، لیکن…… تمہیں جو حکم تھا، وہ تم کرنے پر مجبور تھیں۔ اس میں تمہارا یا میرا کوئی دوش نہیں……‘‘ میں نے اس کی انا کو جملوں کی جادوگری سے تھپتھپایا کہ اس کے اندر کی عورت کچھ سوچنے پر مجبور ہوتی۔ عورت چاہے کسی دیس کی ہو، کسی زمین کی ہو، یہ بات طے ہے کہ وہ ’’عورت‘‘ ہے اور اُسے صرف خدا نے ہی بنایا اور اس کی فطرت بھی نسوانی اعتبار

سے یکساں، ماحول کے اثرات کی بات الگ ہوتی کہ کوئی انسان کیسے اپنے آپ کو اس میں ڈھالتا ہے۔ سون بھی خدا کی بنائی ہوئی ایک عورت تھی۔ یہاں کے ماحول میں اس نے جو رنگ ڈھنگ اپنایا تھا، وہ الگ بات تھی۔ اس کے اندر کی عورت وہی تھی۔ ایک ''سوفٹ کارنر'' رکھنے والی۔ سوچنے اور سمجھنے والی۔

''میں اچھی یا حسین ہوتی تو تم یوں مجھے نہیں دھتکارتے۔'' بالآخر سون کا شکوہ اس کی نوکِ زباں پر آہی گیا۔

''ہرگز نہیں، میں نے تمہیں بالکل نہیں دھتکارا......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

چال چلنے کے خیال اور سوچ نے میری نیند کسی حد تک بھگا دی تھی۔ آگے بولا۔ ''میں پھر یہی کہوں گا کہ تم تو اس قدر حسین ہو کہ کوئی بھی مرد بہ خوشی تمہیں اپنی بانہوں میں لینا اپنی خوش قسمتی سمجھے گا۔ مگر دیکھو ہر مرد کا ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔ میں دراصل کسی کے ساتھ ''چیٹنگ'' CHEATING (بے ایمانی) نہیں کر سکتا۔ میں کسی میں انوالو ہوں......'' کہتے ہوئے میں نے چالاکی سے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر چھت کی طرف دیکھا۔ مگر میری آنکھوں کے کونے سے مجھے کچھ ایسی جھلک متحرک سی محسوس ہوئی تھی جیسے سون صوفے سے اُٹھ کر بیٹھ گئی ہو۔ میں نے اسی طرح پہلو بدلے ہوئے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ اس کے نرم لبوں پہ اس بار مسکراہٹ تھی۔ جواباً میں بھی پھیکے پھیکے انداز میں مسکرا دیا۔ اگر یہ جملہ میں کسی عام لڑکی یا عورت سے کرتا تو شاید اس کا ردِعمل اس کے برعکس ہوتا، مگر سون جیسی آبرو باختہ عورت کا معاملہ کچھ اور تھا۔ بے شک اس کے پیچھے اس کی کوئی مجبوری ہوتی۔

''میں جانتی ہوں......'' وہ ہولے سے بولی اور میں کچھ چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''مم...... میں سمجھا نہیں؟''

''تمہارے پاس آسکتی ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''شیور...... آجاؤ......'' میں نے جلدی سے کہا اور بیڈ پر اس کے لیے جگہ چھوڑ کر اس کی طرف پہلو کیے ذرا پیچھے کو سرک گیا۔ وہ صوفے سے اُٹھ کر میرے بیڈ کے قریب آئی اور پھر میرے برابر میں بیٹھ گئی۔

''یہاں سر رکھ کر لیٹ جاؤ۔'' میں نے ساتھ کے نرم سے تکیے کو ہاتھ سے تھپتھپایا۔ وہ لیٹ گئی اور اب اپنے ایک ہاتھ کی کہنی بیڈ کے گدے پر ٹکا کر میری جانب پہلو لیے بولی۔

''تمہاری محبوبہ کو میں جانتی ہوں، وہ باس کی قید میں ہے ناں......؟'' اس کی بات پر مجھے ایک جھٹکا لگا، حالانکہ میرے ...... ذہن میں عابدہ کا تصور تھا لیکن اس کی بات نے مجھے کچھ چونکا یا تھا۔ فوراً ہی پھر میرا خیال موتو کی گرل فرینڈ ساچی کی طرف چلا گیا تھا۔ جس کے بارے میں اب تک خیال کچھ ایسا ہی اذیت انگیز تھا کہ پتا نہیں وہ اب تک زندہ بھی تھی کہ نہیں...... تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا...... اگر اسی حوالے سے میری سون کے ساتھ گفتگو آگے بڑھ کر کسی نتیجہ خیز حالات کی طرف بڑھ سکتی تھی تو کیا حرج تھا۔

وہ اگر ساچی کو ہی میری محبوبہ سمجھے ہوئے تھی تو میرا کیا جاتا تھا؟ بر سبیل تذکرہ ہی سہی...... گفتگو آگے بڑھانے اور اسے تھوڑا ''اپنا'' بنانے کو یہ بہت تھا۔ اسی سبب میں نے دانستہ اور فوراً اپنی ''بے چینی'' اور ''دلچسپی'' دکھاتے ہوئے اس سے کہا۔

''تت...... تو...... کک...... کیا تم سس...... ساچی کی بات کر رہی ہو......؟''

''ہاں......!'' اس نے ہولے سے کہا تو میں نے موقع تاک کر اگلا وار کیا۔

''یہ کرا بگنڈ تو نہیں......؟''

''نہیں......''

''سس...... ساچی کیسی ہے؟ مم...... مجھے بتاؤ...... پلیز!'' میں نے ژولیدہ لہجے میں پوچھا تو اس کے چہرے پر ایکا ایکی کچھ متاسفانہ اثرات...... اُبھرے۔ مجھے ساچی کی طرف سے دھڑکا بھی لگا کہیں وہ بے چاری اس سفاک انسان کی قید میں ''کام'' تو نہیں آچکی تھی؟ میری اس کے ساتھ مختصر ملاقات سہی، لیکن جتنی بھی رہی تھی وہ میری حسین یادوں کے ایک قابلِ ذکر باب کی حیثیت تو ضرور اختیار کر گئی تھی۔ وہ جن حالات کا شکار ہوئی تھی، اس میں اس کی اپنی بے وقوفی کا دخل زیادہ تھا۔ سون کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ ساچی درحقیقت میری نہیں بلکہ موتو کی محبوبہ تھی۔ بقول موتو کے وہ اس سے بھی روٹھ گئی تھی کہ وہ ایک گینگسٹر سے تعلق رکھتا تھا۔ جبکہ موتو اب بھی اس سے محبت کرتا تھا اور اس کی خاطر اس نے اپنی جان بھی داؤ پر لگائی تھی۔

''ساچی زندہ ہے...... مگر......'' سون بولتے بولتے رکی۔

''مگر کیا......؟'' میں نے بیقراری دکھائی۔ تاہم اندر سے مجھے بھی اس بے چاری کے لیے پریشانی تھی۔

''وہ زندوں سے بدتر ہے یا پھر حالات سے سمجھوتا کر چکی ہے۔'' سون بولی۔

''تم کھل کر کہہ ڈالو...... پلیز سون! میں تمہارا مشکور رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''باس (کاسپاکو) اسے پہلے جان سے مارنا چاہتا تھا، مگر پھر جیسے کہ اس کی فطرت ہے، وہ ایسے خوب صورت اور نازک اندام شکار کو پہلے روندتا ہے، اس کے بعد بیدردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے، اس نے بھی ساچی کو اپنی ہوس کے پیروں تلے خوب روندا تھا۔ اس کے بعد پتا نہیں کیا ہوا کہ اس نے ساچی کو ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ساچی کے حسن کا جادو شاید کچھ زیادہ ہی باس کے سر چڑھ گیا تھا کہ اس نے ساچی کو اپنی داشتہ بنا لیا۔ ساچی نے بھی شاید حالات اور موقع دیکھتے ہوئے سمجھوتے سے کام لیا اور دیکھا کہ ایک بڑا گینگسٹر اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے تو وہ بھی اسے کیش کرنے لگی اور بالآخر اس نے باس کے دل و دماغ پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اب وہ اس کی گرل فرینڈ کی بھی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔'' سون نے اپنی بات مکمل کی اور میں اس کی طرف دکھ بھری اور غیر یقینی نظروں سے دیکھنے لگا پھر لہجے میں غمناک سی اُداسی سموتے ہوئے بولا۔

''کک...... کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟ ساچی کے ساتھ واقعی ایسا ہوا ہے؟''

''ہاں! مگر تمہیں اس کے لیے فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ اب شاید اپنی اس زندگی سے خوش ہے۔'' سون نے کہا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

سون کا ساچی کے بارے میں یہ سب مجھے بتانا ظاہر کرتا تھا کہ وہ ساچی کے حوالے سے میرے بارے میں چاہے محدود سہی، اتنا ضرور جانتی تھی کہ ساچی کے بارے میں کاسپاکو کو جو غلط فہمی تھی، ابھی تک وہ قائم تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس ''غلط فہمی'' سے میں کیونکر فائدہ اُٹھا سکتا ہوں، سرِدست تو...... اسی باعث میں یہاں کاسپاکو کا قیدی نما مہمان بنا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے اب کیا چاہتا تھا۔ اس نے کل صبح مجھ سے کس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کرنا تھی۔ باقی کے اچھے بُرے حالات کا تعین تب ہی کیا جا سکتا تھا۔ تاہم سون مجھے کیا بتا سکتی تھی، وہ میں اس سے پوچھنے کی کوشش ہی کر سکتا تھا۔

لہٰذا لہجے میں مایوسی سموتے ہوئے بولا۔ ''سون! مجھے معلوم ہے کہ ساچی بہ جبر خوش رہنے پر مجبور ہے۔ لیکن یہ بات مجھے سمجھ میں نہیں آئی کہ کاسپاکو نے اگر اسے زبردستی اپنی داشتہ بنا ہی لیا ہے، دوسرے لفظوں میں اس نے اسے مجھ سے چھین لیا ہے تو میری اور اس کی دشمنی ختم ہو جانی چاہیے تھی، اس نے مجھے کیوں پھر یرغمال بنایا؟'' میں اُسے آہستہ آہستہ اپنے مطلب کی باتوں کی طرف لا رہا تھا۔ وہ ایک گہرا سانس خارج کر کے بولی۔

''پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے تم سے اور ساچی سے ایک ہمدردی سی ہونے لگی ہے۔ شاید دو پیار کرنے والے جدا کر دیے جائیں تو سب کو ہی اس کا دکھ ہوتا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک ذرا توقف کیا اور پھر کہنا شروع ہوئی۔

''رہی بات باس کی تو وہ تب تک تمہارا دشمن نہیں ہے جب تک تم اس کی بات نہیں مان لیتے۔ کیونکہ باس تم سے اور تمہاری دلیری اور چابک دستی سے بہت متاثر ہوا ہے۔''

''وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟'' بالآخر میں نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

وہ کچھ سوچنے کے انداز میں چپ سی رہی۔ ہم دونوں ڈبل بیڈ پر آمنے سامنے اور پہلو بہ پہلو لیٹے ہوئے تھے۔ اس کی طرح میں نے بھی اس سے دھیمے لہجے میں بات کرنے کے لیے...... اپنی ایک کہنی بیڈ پر ٹکا رکھی تھی اور ہاتھ اپنے چہرے پر...... وہ ایک تیار خوان کی طرح میرے بالکل نزدیک تھی۔ اس کی سانسوں کے جواں اور گل بدن وجود سے مدہوش کر دینے والی خوشبوؤں کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس کا کشش انگیز دمکتا ہوا گل نار سا چہرہ میرے قریب...... بہت قریب تھا۔ بلاشبہ وہ ایک حسین مگر ''کڑا'' امتحان بنی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا......؟ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟'' میں نے بدستور اس کے دلکش چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ جو بات کاسپاکو مجھ سے کل کرنا چاہتا تھا وہ میں ابھی جان لوں، تاکہ مجھے سوچنے کا موقع مل جائے اور میں بہ احسن وخوبی اس پر کوئی بہتر فیصلہ کر سکوں......

''آں...... نن...... نہیں، بس اپنا نہیں تمہارے اندر ایسا کیا ہے کہ...... دل خود ہی تم سے تعاون پر مائل ہونے لگتا ہے لیکن مجھے باس سے ڈر بھی لگتا ہے۔ وہ بہت سفاک اور اس سے زیادہ کینہ پرور انسان ہے۔ اگر اسے بھنک بھی پڑ گئی کہ میں نے تمہیں قبل از وقت اس بات سے، جو وہ کل صبح تم سے کرنا چاہتا ہے، آگاہ کر ڈالا ہے تو صرف اتنی سی بات پر وہ مجھے عبرت ناک انجام سے دوچار کر دے گا۔''

''اِلس...... اوکے! میں اتنی سی بات کے لیے تمہیں

کسی امتحان میں نہیں ڈالوں گا، یہ خودغرضی ہوجائے گی۔" میں نے چالاکی سے کہا۔ "میں توصرف...... اتنا چاہتا تھا کہ ابھی میں وہ بات جان لوں تو مجھے صبح تک کوئی مناسب فیصلہ کرنے کا موقع مل جاتا۔ تم صوفے پر چلی جاؤ اور آرام کرو، میں کسی سے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔"

"یہاں ہمارے علاوہ کون ہے جو ہماری باتیں سن رہا ہو......" صوفے پر جانے کا سن کر اس نے آہستگی سے کہا۔ "یہ کمرا بھی بگڈ نہیں...... مگر دیکھو...... کل صبح باس تم سے وہ بات کرے تو اسے ذرا بھی اس بات کا شک نہ پڑنے پائے کہ تم پہلے سے کچھ جانتے تھے۔"

"کیا تم مجھے بتا رہی ہو......؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں! سنو......" وہ بولی۔ "باس تم سے وہی کام لینا چاہتا ہے جو تمہاری وجہ سے خراب ہوا۔ گوانگ مال میں عام لوگوں کو یرغمال بنانا اور خون ریزی پھیلا کر وہ یہاں کی پولیس انتظامیہ کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے ایک اہم آدمی الفاسٹو کو رہا کرنے پر مجبور ہوجائیں مگر تمہاری مداخلت اور دلیری کے سبب نہ صرف باس کا یہ منصوبہ بُری طرح ناکام ہوگیا بلکہ اس کا ایک اہم آدمی رچی سن تمہارے ہاتھوں ہلاک بھی ہوگیا۔"

"توکیا اب مجھے اُسے چھڑانا ہوگا؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر فوراً کہا۔

"نہیں......" سون نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "الفاسٹو اب زندہ نہیں رہا۔" سون کے اس انکشاف پر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

"کیا مطلب......؟"

"اُسے جیل میں ہی ہلاک کردیا گیا ہے۔" سون نے بتایا۔

"کس نے ہلاک کیا اُسے......؟ باس کے دشمنوں نے......؟"

"خود باس نے......"

"کیا......؟"

"ہاں......!" سون نے ایک گہری سانس خارج کی۔ "الفاسٹو کی پولیس قید اس کے لیے روزبروز گلے کا پھندا بنتی جارہی تھی۔ اس نے گوانگ مال سے پہلے بھی اسے چھڑانے کے بہت سے طریقوں پر عمل کیا تھا مگر ناکام رہا۔ یہ آخری طریقہ بھی ناکام ثابت ہوا تو اس نے اسے رہا کرانے کی کوشش ترک کر ڈالی، کیونکہ اب اسے رہا کرانے کے بجائے ہلاک کروانا زیادہ آسان تھا۔"

"او...... کیا اس طرح اس کے باقی ساتھیوں کے دل میں اس کے خلاف بددلی پیدا نہیں ہوسکتی ہے؟" کسی خیال کے تحت میں نے سون کے چہرے کو بہ غور گھور کر کہا۔

"باس کو اس کی پروا کب ہوتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "بس چند ہی اس کے ساتھی ہیں جو سائے کی طرح اس کے اردگرد اور اس کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔"

"لیکن پھر باس مجھ سے اب کونسا کام لینا چاہتا ہے؟" میں اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"وہ کام اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور تمہارے لیے فائدہ مند بھی۔" سون کا لہجہ پُراسرار ہونے لگا۔ مجھے فقط کام جان لینے کی حد تک دلچسپی تھی۔ رہی فائدے کی بات تو کاسپا کو جیسے بگ کریمنل سے بھلا مجھے کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔

"تمہیں حصے داری کی صورت میں ایک بہت بڑی دولت مل سکتی ہے۔" سون نے پھر کہنا شروع کیا۔ "کاسپا کو کا یہ کام تم نے کردیا تو سمجھو تم اس کے گروہ کے نائب کی حیثیت حاصل کرلوگے، باس یوں بھی تم سے بہت متاثر ہے، اس کے دشمن وزیر جان کو ہلاک کرکے تم نے اس کے دل میں کافی جگہ بنالی ہے۔"

"مجھ سے باس کیا کام لینا چاہتا ہے؟"

"گوتم بدھ کا ایک مجسمہ ہے...... جو پورا سونے کا ہے۔"

"اسے چوری کرنا ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں، وہ چوری کیا جاچکا ہے، اسے کہیں پہنچانا ہے۔"

"کہاں......؟"

"امریکا......" سون نے جواب دیا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، میں نے اپنے سینے میں یکایک اُٹھنے والی ہلچل پر بمشکل قابو پاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

"امریکا......؟ مگر کیسے؟"

"جب تم باس کے سامنے ہامی بھردوگے تو وہ تمہیں اس کی تفصیل بھی بتادے گا۔"

"لیکن ایک چوری شدہ شے کو بینکاک سے امریکا پہنچانا بچوں کا کھیل تو نہیں ہوسکتا؟"

"ہاں! لیکن باس کو یقین ہے کہ تم یہ کام خوش اسلوبی سے کرلوگے۔"

"میرے اندر باس نے ایسی کون سی خوبی دیکھ لی ہے جو اس قدر مشکل اور خطرناک کام میرے ذمے سونپنا چاہتا ہے؟ اس کے اور ساتھی بھی تو ہیں۔" میں نے سون سے ایسا دانستہ کہا تھا۔ ورنہ امریکا جانا تو میرے اہم مفادات میں مقصدِ اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن میں اپنی دلچسپی ظاہر کیے بغیر محض معروضی سوالات کرکے عمومی جھجک ظاہر کر رہا تھا۔ ورنہ تو مجھے معلوم تھا کہ میں کاسپا کو جیسے خطرناک گینگسٹر پر اپنی دھاک بٹھا ہی چکا تھا، وہ جیل میں اپنے اس اہم آدمی کو بھی خود ہی ہلاک کروا چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس نے کافی خون ریزی پھیلا رکھی تھی، مسلسل ناکامی کی صورت میں اس نے الفاسٹو کو مروا ہی ڈالا تھا کیونکہ بقول سون کے...... پولیس کی قید میں اس کا زیادہ عرصہ رہنا خود اس کے لیے خطرناک تھا۔

چنانچہ اب وہ اپنی کسی کسوٹی پر مجھے پرکھ چکا تھا اور الفاسٹو کی رہائی پر وقت ضائع کرنے کے بجائے اس کا قصہ ہی پاک کروا چکا تھا، یوں اب میں اسے "کام" کا آدمی نظر آرہا تھا۔

"بالکل بچوں والا سوال پوچھا ہے تم نے......" سون جھلا کر بولی۔ "کیا اب بھی تمہیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تھی؟"

"او...... شاید تم نے صحیح کہا۔" میں خفیف سا ہوکے بولا۔

"اب تم سوچ لو ساری رات پڑی ہے۔" وہ دلنشین انداز میں مسکرائی۔ "لیکن...... اب ساچی کا خیال اپنے دل سے نکال دو......"

"ہم...... یہی کرنے کے علاوہ اور چارہ بھی کیا رہ گیا ہے میرے پاس...... مگر مجھے دکھ رہے گا کہ ساچی کو اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنا چاہیے تھی۔" میں نے مغموم اور مایوس لہجہ اختیار کیا تو وہ گویا اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولی۔

"ساچی سے زیادہ حسین و جمیل لڑکیاں تمہاری قربت کے ایک اشارے کی منتظر ہوں گی۔ ایک ساچی ہی تو نہیں رہ گئی ہے دنیا میں......"

"ہاں...... یہ بات بھی ہے۔" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرنا ضروری سمجھا۔ تب ہی وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

"کیا اب بھی میں تمہارے ساتھ رات نہیں گزار سکتی؟"

اس کی بات پر میں نے چونک کر سون کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مستیوں کے ڈورے سرخ ہونے لگے تھے۔ بھرے بھرے چمکتے گداز لبوں پر دعوت انگیز ارتعاش سا ابھرتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میرے انتہائی نزدیک آگئی تھی۔ میں اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"دل و دماغ پریشان اور جان کا خوف ہو تو کہاں کس محفل میں مزہ آتا ہے۔ میں یہ کام شاید نہیں کر پاؤں گا اور تمہارا باس مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہہ کر میں سیدھے رخ پر ہوکے اپنی پیشانی پہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس کی برہنہ ٹانگ کو میں نے آہستگی سے پرے ہٹا دیا تھا۔

"سردمہر۔" وہ یہ کہہ کر میرے بیڈ سے اُتر گئی۔ اور صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ میں بھی بظاہر سوتا بن گیا مگر آنکھیں موندے اس نئی صورتِ حال پر غور کرنے لگا، پھر نجانے کب میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اگلی صبح سون نے ہی مجھے جگایا تھا۔ وہ ہلکے پنک کلر کی نائٹی میں تھی۔

"جاگ جاؤ...... ٹھیک ایک گھنٹے بعد تمہیں باس کے ساتھ ناشتے کی میز پر موجود ہونا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ میں دوبارہ اس کی طرف نظر ڈالے بغیر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے غسل وغیرہ کرکے اپنے لیے ایک ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پسند کی اور تقریباً گھنٹے بھر بعد باہر نکلا۔ تب تک سون نسبتاً ڈھنگ کے لباس میں آچکی تھی۔

"تمہاری تھکن اور پریشانی یقیناً ختم ہوچکی ہوگی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ وہ میرے قریب آگئی تھی۔ اس کا موڈ اس تھوڑے سے وقت کو بھی "کشید" کرنے کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی گھاگ نگاہوں نے شاید میرے چہرے کی فریش نیس کو دیکھ کر میرے اندر کی طمانیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے بات بنائی اور یکایک فکرمندی سی چہرے پہ سجاتے ہوئے بولا۔

"ابھی کہاں...... پریشانی تو تب ختم ہوگی جب تمہارا باس میری جان چھوڑے گا۔ چلو...... میں نہیں چاہتا اُسے ناشتے کی میز پر میرا انتظار کرنا پڑے۔"

"سنو......! باس کو میرے سلسلے میں مثبت جواب دینا۔" وہ ایک دم سنجیدہ سی ہوکے بولی۔

"اوکے...... ڈونٹ وری......" میں اس کی بات کا

مطلب سمجھ کے بولا۔

تھوڑی دیر بعد میں اور کاسپاکو ناشتے کی میز پر تھے۔ میز مستطیل تھی۔ جس کے ایک سرے پر وہ اور دوسرے سرے کی کرسی پر میں بیٹھا تھا۔ درمیان میں ایک کرسی اور تھی۔ وہاں مجھے ایک میرے جیسا ہی گرانڈیل اور تنومند شخص بیٹھا نظر آیا۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے آٹھ دس سال بڑا ہی نظر آتا تھا۔ بال اس کے ہلکے تھے۔ چہرہ کلین شیو تھا۔ جبڑے سکڑے ہوئے اور ناک تھوڑی لمبی تھی۔ اس کی آنکھوں کے کونے غیر معمولی طور پر کھنچے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ جب میں "گڈ مارننگ" کہتا ہوا اپنی کرسی پر براجمان ہوا تو وہی شخص میری طرف ذرا سی گردن موڑ کر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر اچانک مسکراہٹ سی اُبھری۔ جواب میں، مسکرا کے میں نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔ وہ تھائی باشندہ کہیں سے بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ کورین یا ویت نامی باشندوں کے نقوش لگتے تھے اس کے، لیکن پھر میں نے اپنا یہ خیال بھی رد کر ڈالا، کیونکہ کورین یا ویت نامی اتنے گرانڈیل اور تنومند نہیں ہوتے۔ کچھ امریکی شبہات کی طرف میرا دھیان گیا تو میں اسے رد نہ کر سکا۔

"یہ روڈلف ہے۔ جان روڈلف......" میرے سامنے اور میز کے دوسرے سرے پر براجمان کاسپاکو نے گمبھیر آواز میں اپنے بائیں بازو اور میرے دائیں بازو کی کرسی پر بیٹھے اسی شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارفاً کہا۔

"اور یہ...... ہیں...... مسٹر شہزاد......!" کاسپاکو نے روڈلف سے میرا تعارف کرایا اور میں ذہن پر زور دینے کی کوشش کرنے لگا کہ کاسپاکو کو میرا نام کس طرح معلوم ہو سکتا ہے؟

پہلا خیال سانچی کا ہی آتا تھا۔ ممکن تھا بعد میں کسی اور ذرائع سے بھی پتا چلا ہوا ہے۔

"ناشتا شروع کرو...... بعد میں آرام سے گفتگو ہوتی ہے اور تفصیلی تعارف بھی۔" بالآخر کاسپاکو نے کہا۔

ناشتے میں بھانت بھانت کے لوازمات تھے۔ گھونگھے فرائڈ تھے۔ ایک گول سفید ڈش میں برف کی ٹکڑیوں پر چار پانچ ثابت آکٹوپس رکھے ہوئے تھے۔ ایک دو کے تو ٹینٹیکلز بھی میں نے ہلتے دیکھے تھے۔ اُف یہ وحشی آدمی...... زندہ آکٹوپس کھانے کا عادی تھا۔ مجھے اُبکائی سی آنے لگی۔ میں نے فوراً اس کی طرف سے نظریں ہٹا لیں اور پھر ڈھنگ کی چیزیں اپنی طرف سرکا کر ناشتے میں محو ہو گیا۔ ایک گلاس جوس پیا، ایک بریڈ بٹر کے ساتھ کھائی اس کے بعد...... چائے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

ہماری میز کے گرد چار افراد فدویانہ انداز میں کھڑے تھے۔ ان میں ایک سون بھی تھی۔ کاسپاکو نے ایک زندہ آکٹوپس اُٹھا کے منہ میں لیا اور سارا اندر لے گیا۔ چبانے کے دوران میں اس کی باچھوں سے نجانے کیا بہنے لگا جو اس نے گود میں بچھے سفید رومال (نیپکن) سے پونچھ لیا۔ پھر ایک نظر سون پر ڈالتے ہوئے منہ چلانے کے دوران میں مجھ سے مخاطب ہو کے معنی خیز لہجے میں بولا۔

"سون نے تمہاری رات بھر خوب دل بستگی کی ہو گی؟"

"ہاں......! بہت اچھی اور خدمت گزار لڑکی ثابت ہوئی تھی یہ...... تمہارا شکریہ اسے میرے لیے سرو کرنے کا۔" میں نے سون کی التجا کے مطابق اسے جواب دیا اور کن انکھیوں سے پاس کھڑی سون کی طرف بھی دیکھا۔ اس نے ہولے سے مسکرا کر کاسپاکو کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی۔

"لیکن...... سون! تمہارے چہرے سے تو داستانِ شب کچھ اور ہی کہانی سناتی محسوس ہوتی ہے۔" کاسپاکو نے اچانک عجیب سے لہجے میں کہا تو جانے کیوں مجھے اس کے لہجے سے اسرار بھری سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ سون بھی کچھ گھبرا سی گئی اور میری طرف ایک نگاہ اُٹھا کر دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ جواب دے کر باس کو مطمئن کرو ورنہ میری شامت آئی کہ آئی۔ لہٰذا میں نے فوراً ہی ہولے سے کھنکھار کر ایک نگاہ سون پر مسکراتی ہوئی سی ڈال کے کاسپاکو سے کہا۔

"ایسی بات نہیں۔ میں دراصل تھکا ہوا تھا بہت...... یہ میری دل بستگی کرتی رہی تھی، پھر آرام دہ ماحول میں سوئے ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا اس لیے لیٹتے ہی آنکھ لگ گئی۔"

میری بات پر کاسپاکو نے ایک زبردست قہقہہ اُگلا۔ اس کے مینڈک جیسے منہ سے کچلا ہوا الا بلا نظر آنے لگا جسے دیکھ کر میری طبیعت منغص سی ہونے لگی۔

وہ استفہامیہ انداز میں اپنا سر دھنے لگا اور وہسکی کی گولڈن بوتل کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔

ناشتا ختم ہوا اور ہم تینوں ایک کمرے میں آ گئے۔ اس کی دیواروں پر ہلکا نیلا پینٹ تھا جبکہ چھت پر ایش کلر کا پینٹ کیا گیا تھا۔ فرنیچر بھی اعلیٰ درجے کا بچھا ہوا تھا۔ چھت کے وسط میں بیش قیمت اور دیدہ زیب فانوس جھول رہا تھا اور اس کے نیچے ہم، پیالہ نما آرام دہ صوفوں پر دھنس گئے۔ یہاں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے روڈلف کو بار بار اپنی جانب تکتا محسوس کیا تھا۔ کاسپاکو نے ایک موٹا سا سگار نکال کر سلگایا اور مجھ سے مخاطب ہو کے کھرکھراتے لہجے میں بولا۔

"مسٹر شہزاد! میں وہ سب بھول جاؤں گا جو تم نے میرے ساتھیوں کے ساتھ گوانگ مال میں کیا تھا اور تمہیں بھی بدلے میں بہت سی باتوں کو فراموش کرنا ہوگا۔ کم از کم مساج پارلر والی اس خوب صورت سی لڑکی سانچی کو تو ضرور...... جس کی زندگی تو میں نے بخش دی ہے مگر وہ مجھے اچھی لگی اور میں نے اسے مستقل طور پر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔" یہ سب کہتے ہوئے اس نے بڑی تیز اور بھانپتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ میں نے بھی اسی اطمینان سے جواب دیا۔

"میں پہلے ہی بتا چکا ہوں جناب! مال میں اُس روز جو کچھ ہوا وہ کسی ذاتی دشمنی کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا۔ نہ میں آپ کو پہلے سے جانتا تھا اور نہ ہی آپ مجھے...... وہ سب ایک فطری دفاع کے تحت ہوا تھا۔ رہی اس پارلر والی لڑکی سانچی کی بات تو اس سے میرا تعلق وہی تھا جیسا اس روز مال میں دیگر جانے انجانے لوگوں کا یرغمالیوں کی حیثیت سے آپس میں ہوا تھا۔ کیونکہ میں یہاں اپنے دشمن وزیر جان کے تعاقب میں آیا تھا، عشق لڑانے نہیں......" نپے تلے انداز میں یہ سب بتانے کے بعد میں چپ ہو رہا۔ تاہم مجھے احساس تھا کہ میں نے سانچی کے سلسلے میں سخت دلی سے کام لیا تھا۔ میں اور بھلا کرتا بھی کیا۔ سانچی جو کچھ بھگت رہی تھی، وہ اس کا اپنا کیا ہوا تھا۔ اس نے میرے مشورے پر عمل کرنے بجائے مجھے اپنے مشورے پر بہ زور و اصرار اور ضد کے چلانے کی کوشش چاہی تھی اور اپنا معاملہ خود بگاڑ بیٹھی تھی۔

کاسپاکو نے میری یہ بات بڑے غور اور دھیان سے سنی تھی۔ پھر بولا۔ "تمہاری صاف گوئی مجھے اچھی لگی۔ یوں بھی اتنی حقیقت تو میں بھی اپنے بعض ذرائع سے جان ہی چکا ہوں کہ تم یہاں بینکاک کس مقصد کے تحت آئے تھے اور سانچی تمہاری نہیں بلکہ ہمارے ہی ایک آدمی موتو کی گرل فرینڈ رہ چکی ہے۔ جو اَب ہم سے منحرف ہو چکا ہے۔ خیر......"

تاوان میں چیک بھی چلے گا، اپنا گھر کا پتا اور وارث کا نام بھی لکھ دینا

یہ کہتے ہوئے اس نے جھک کر سامنے دھری ٹیبل پر رکھے ایک ڈیوائس کا بٹن پش کیا۔ ہلکا سا الارم کی شور اُبھرا۔

اس کے چند ہی سیکنڈوں بعد کمرے میں وہی تخاطب شخص وارد ہوا جو اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مجھے یہاں لایا تھا مگر وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہمراہ ایک دبلی پتلی اور نازک اندام سی خوب صورت لڑکی بھی تھی۔ میں اُسے اور وہ مجھے دیکھ کر چونک اُٹھے۔

وہ سانچی تھی......

☆☆☆

سانچی کو میں نے پہلی بار جس روپ میں دیکھا تھا، وہ ایک عام سی لڑکی کا تھا جو عورتوں کے ایک مساج پارلر میں جاب کرتی تھی۔ مگر اب یہاں کاسپاکو جیسے گینگسٹر کے قبضے میں کیا سے کیا بن چکی تھی، مجھے اسے دیکھ کر حیرت سے زیادہ دکھ ہی ہوا تھا۔ وہ جس "گیٹ اَپ" میں تھی، وہ یہاں موجود سون...... سمیت کئی دوسری لڑکیوں سے بالکل بھی مختلف نہ تھا۔ گھٹنوں تک سرخ رنگ کے تنگ اور چست سیلولیس میں...... ملفوف اس کا وہ بدن جو عام لباس میں پاکیزگی کا

مظہر دکھتا تھا اب جیسے شو پیس بنا دیا گیا تھا۔ اس کی دوشیزگی کا وہ پھول جو تر و تازہ محسوس ہوا کرتا تھا، وہ اب مرجھا گیا تھا۔ آنکھوں کی شوخی اور چنچل سی مسکان جو اس کا خاصّہ تھی وہ ویران سی اُداسی کا منظر پیش کر رہی تھی۔ اس نے صرف ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور وہ کئی ثانیوں تک میرے چہرے سے ہٹا نہیں سکی تھی۔ ان آنکھوں میں مجھے نجانے کتنے ہی روکھے پھیکے رنگوں کی خزاں اُمڈتی دکھائی دی تھی۔ میرے لیے ان کے پس منظر میں نفرت اور انتہائی درجے کی بے رخی کی جھلک ڈوبتی ابھرتی نظر آئی تھی۔

”کم آن ڈارلنگ!“ کاسپاکو نے بڑی لگاوٹ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا اور سانچی کے لبوں پر ایکا ایکی دلکش سی مسکان ابھری تھی اور پھر اس نے اپنا مرمریں ہاتھ اس کے کھردرے ہاتھوں میں دے دیا۔ کاسپاکو نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اپنی گود میں اسے کسی نازک سی گڑیا کی طرح بٹھا لیا۔ سانچی کی... کم مائیگی اور اس کی لاچاری و بے چارگی پر مجھے دکھ ہوا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ جبراً یہ سب کرنے پر مجبور تھی۔ اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا۔ جان بچانے کی جو صورت اسے نظر آئی تھی، وہ اس پر بشاشت کر تو لگتی تھی مگر دل سے وہ اپنے اس کم مایہ کردار سے خوش نہ تھی۔ میرے حلق سے بے اختیار ایک دبی دبی سی کراہ نما ہنکاری خارج ہوئی تھی۔

”یہ تتلی اب میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ کاسپاکو کا کوئی لڑکی دل جیت لے، یہ ناممکنات میں سے تھا مگر...... اس حسین گڑیا میں نجانے کیا ایسی بات تھی کہ...... بس! اسے میں اپنے قریب کرنے پر مجبور ہو گیا۔“ کاسپاکو نے کہتے ہوئے گود میں بیٹھی سانچی کا نرم و گداز گال چوم لیا۔ وہ ذرا بھی نہیں کسمسائی تھی۔ کاسپاکو نے اس کی لچکیلی اور پتلی کمر کے گرد اپنا ایک ہاتھ حمائل کر رکھا تھا۔ اس کے بعد سانچی اس کی گود سے اُٹھ کر ساتھ والے صوفے پر جا بیٹھی۔

”اس سے پہلے سون میرے قریب تھی مگر اس سے میرا جلد ہی دل بھر گیا۔ سانچی میں کوئی ایسی بات، ایسی کشش تو ضرور ہے جس نے مجھے ابھی تک اس کا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہر بار یہ مجھے نئی لگتی ہے، چاہے خلوت ہو یا جلوت...... اس کا اپنا ہی ایک رنگ ڈھنگ اور مزہ ہے۔“

کاسپاکو کی لغو بیانی جاری تھی اور ایکا ایکی مجھے لگا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا؟ وہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپنا چاہتا تھا۔ جلاپے کے یا پھر نفرت و انتقام کے مگر میرے چہرے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کاسپاکو بڑا مکار آدمی تھا۔ وہ شاید مجھ سے کوئی اہم کام لینے سے پہلے اپنی کسوٹی پر پرکھنا چاہتا تھا کہ کہیں میں اس کے ساتھ کوئی دشمنی تو نہیں نکالنے کی کوشش کروں گا؟ جب وہ مطمئن ہو گیا تو اس نے سانچی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ صوفے سے اُٹھی اور جھک کر کاسپاکو کو بوسہ دیا اور کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

کاسپاکو کی فاتحانہ اور تاؤ دلانے والی نظریں میرے چہرے پر گڑ گئیں۔ پھر اس نے اپنے آدمی کو بھی وہاں سے جانے کا اشارہ کر دیا اور قریب کے صوفے پر مسلسل خاموش بیٹھے ہوئے روڈلف سے مخاطب ہو کے بولا۔

”مسٹر روڈلف! میرا خیال ہے کہ ہمیں اب مسٹر شہزاد سے اصل گفتگو کا آغاز کر دینا چاہیے۔“

”ضرور...... شیور......“ جان روڈلف نے فوراً جواب دیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ کھنچ گئی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس میں مصنوعی پن کا احساس ہوا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی یا پھر میری چھٹی حس کا شاخسانہ کہ مجھے روڈلف کی شخصیت کچھ پُراسرار سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ کھٹکا دینے والی۔

ایک ہی خیال میرے ذہن طباع میں اُبھرتا تھا کہ روڈلف...... کاسپاکو کا آدمی نہیں تھا، وہ ایک تھرڈ پرسن یا تھرڈ پارٹی تھا۔ وجہ ان سب کی یہی تھی کہ وہ رہ رہ کر میری جانب بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے تک رہا تھا۔ کیوں......؟ مجھے پہلی بار روڈلف کی جانب سے شدید قسم کی نامعلوم سی بے چینی محسوس ہونے لگی۔

”ہم......“ کاسپاکو نے ایک گمبھیر ہنکاری لی اور اب براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔

”مسٹر شہزاد! تمہاری طرف سے ہماری مکمل تسلی ہو گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم ہمارے دوست اور ساتھی بن کے ہمیں کتنا فائدہ پہنچاتے ہو لیکن ہم صرف اس میں اپنا ہی فائدہ نہیں دیکھیں گے، تمہارا بھی اس میں پورا حصہ ہو گا۔ کیا تم ہم سے ایک ایسا سودا کرنے کی پوزیشن میں ہو جس سے تمہیں کم از کم دس ملین ڈالر کا مالی فائدہ حاصل ہو؟“

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا اور اپنی نظریں میرے چہرے پر جما دیں۔ مجھے چونکہ گزشتہ شب ہی سون نے اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اس میں میرا سب سے اہم مقصد شامل تھا، یعنی امریکا روانگی۔ اسی لیے میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ مقصد نہ بھی ہوتا تو بھی مجھے اسے جھانسا دے کر اس کے

چنگل سے نکلنے کے لیے یہی کچھ کرنا پڑتا۔ میں کاسپاکو کی بات پر اپنے چہرے اور لہجے سے وہی کچھ ظاہر کرنا چاہتا تھا جو ایسے میں ایک لالچی انسان فطری طور پر کرتا ہے۔ بہ صورت دیگر...... کاسپاکو کو اس کی ذرا بھی بھنک پڑ جاتی کہ میں اور ہی مزاج اور دماغ کا آدمی ہوں تو وہ مجھے اِدھر گولی مار کے قصہ ہی ختم کر ڈالتا۔ میں نے اپنے چہرے پہ حیرت سموتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اس کے بعد اپنے چہرے سے کچھ ایسے تاثرات ظاہر کیے جو ایسے مواقع پر ایک حریص اور دولت کے لالچی انسان کے چہرے سے مترشح ہونا یقینی تھے۔

”کیوں...... یقین نہیں آیا میری بات پر......؟ دہرا دوں دوبارہ......؟“ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر کاسپاکو اس بار معنی خیز اور پُرغرور مسکراہٹ سے دوبارہ بولا۔

”آں...... ہاں، نن...... نہیں...... میں سمجھ تو رہا ہوں...... وہ وہ...... دس ملین ڈالر کوئی معمولی رقم نہیں۔ اگر یہ سودا ہو جاتا ہے تو یقیناً یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔ مجھے کسی ننگے بھوکے ملک واپس لوٹنے کے بجائے کسی اور اچھے، خوش حال اور بڑے ملک میں ساری عمر عیش و آرام سے زندگی گزارنے کا بہترین موقع مل سکتا ہے جو حقیقتاً میں میری خواہش بھی ہے۔“

میں اس کی توقع کے مطابق وہی کردار ادا کر رہا تھا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

”بہت خوب...... تم دلیر ہی نہیں، عقل مند بھی ہو۔“ کاسپاکو بولا۔ ”دس ملین ڈالر کی رقم واقعی معمولی نہیں ہے۔“ پھر وہ روڈلف کی طرف دیکھنے لگا جو میری طرف بڑے غور غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے مسٹر روڈلف! اصل بات کی طرف آ جانا چاہیے۔“ کاسپاکو نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا جس پر وہ اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے شستہ انگریزی میں بولا۔

”یقیناً...... میرا خیال ہے کہ مسٹر شہزاد اس معاہدے میں اپنی دلچسپی کو واضح طور پر دکھا چکے ہیں۔“

”گڈ۔“ کاسپاکو کے منہ سے نکلا اور پھر براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کر بتانے لگا۔

”مسٹر شہزاد! گوتم بدھ کا ایک نہایت بیش قیمت مجسمہ...... جسے ہم نے حال ہی میں تریپتر کے ایک خفیہ معبد خانے سے چوری کیا ہے، وہ ہم ایک بڑی پارٹی کو فروخت کر چکے ہیں۔ مذکورہ پارٹی نے ضمانتِ خرید کے طور پر ہمیں اصل رقم کا...... دو تہائی ادا کر دیا ہے، باقی رقم رہتی ہے۔ اسی نصف رقم سے پانچ ملین ڈالر تمہیں آن دی اسپاٹ ادا کر دیے جائیں گے، وہ تم رکھ لینا اور باقی کی رقم ویسٹرن یونین بینک کے ذریعے ہمارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی جائے گی۔ اس کے لیے میرے دو آدمی ایک سون اور باؤ...... تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایک خفیہ ٹیم بھی تمہارے تعاقب میں رہے گی۔ تمہیں انہیں چھیڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ صرف تمہارے دفاع اور مدد کے لیے ہو گی۔ وہ کہاں اور کس حالت میں ہو گی۔ یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم اس کے ذمے اصل کام یہی ہو گا کہ وہ اس معاہدے میں کسی قسم کی ذرا بھی بدنیتی یا دھوکے بازی کو بھانپ کر اپنا وہ کام کر گزرے گی جس کا افسوس کرنے کے سوا پھر اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہو گا۔ بُرا مت منانا دوستو! یہ ضروری ہے، کیونکہ یہ کوئی چند ہزار ڈالرز کا سودا نہیں ہے، ملین ڈالرز کا سودا ہے اور ایسے احتیاطی اقدامات اُٹھانا ہمارا حق بنتا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ آپ دونوں کو اس خفیہ ٹیم کے بارے میں آگاہ ہی نہ کیا جائے لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ایسی بدمزہ سوچ بھی کسی کے دل میں کیوں آئے اسی لیے مجھے بتانا پڑا تا کہ باقی کا کام سیدھا اور سہل ثابت ہوتا رہے۔“

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ ایک نئی، سنسنی خیز اور خطرناک مہم کے بارے میں جان کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ روڈلف کاسپاکو کا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ...... اسی پارٹی سے تعلق رکھتا تھا جو امریکی تھی اور یہ اُن کا ایجنٹ تھا۔ یقیناً نصف رقم اسی نے ادا کی ہو گی اپنی پارٹی کی طرف سے اور اب وہ معاہدے کے مطابق اس چوری شدہ قیمتی مجسمے کو لینے آیا تھا جسے بہ حفاظت امریکا پہنچانا کاسپاکو کی ذمے داری تھی اور جو وہ میرے توسط سے پوری کرنا چاہتا تھا۔ کیوں......؟ یہی ایک سوالیہ نشان تھا جو میرے حلق میں آنکڑے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا۔

مجھ میں آخر کاسپاکو نے ایسا کیا دیکھا تھا کہ وہ اپنے آدمیوں کو چھوڑ کر مجھے آگے لگا رہا تھا؟ جبکہ بقول اس کے چند آدمیوں کی خفیہ ٹیم اس مشن کی نگرانی کے لیے بھی اس نے مامور کر رکھی تھی۔ محض اس لیے کہ کہیں میں یا روڈلف کے ساتھی امریکا پہنچ کر کسی قسم کی دھوکے بازی سے کام نہ لیں۔ لیکن باوجود اس کے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے در پردہ کوئی اور پُراسرار چکر کارفرما تھا اور مجھے اسی لیے اس مقصد کے لیے چنا گیا تھا کہ قربانی کا بکرا بنایا جا سکے۔

''اس مجسمے کو بینکاک کے معروف تریمیتر میوزیم سے چرانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔'' کاسپاکو اس کی اہمیت جتاتے ہوئے آگے بولا۔ ''مہینوں کی طویل منصوبہ بندی کی گئی اور بالآخر خطرناک رسک لے کر اسے اس طرح تریمیتر کے معبد سے چوری کیا گیا کہ وہاں کے بھکشوؤں اور پہرے داروں کو اس کے چوری ہونے کی بھنک بھی نہ پڑ سکے۔ فوری طور پر اس مجسمے کی چوری کے بعد فروخت بھی ایک بڑا مرحلہ تھا۔ تب تک مجسمے کی چوری کا شور پورے بینکاک میں ہی نہیں بلکہ تھائی لینڈ میں بچ سکتا تھا۔ بینکاک کا چپّا چپّا چھانا جاتا اسی لیے ہم نے ڈبل گیم کھیلی...... یعنی اپنے ماہرین سے اصل مجسمے جیسا ہی ایک نقلی مجسمہ بھی ہمیں تیار کرانا پڑا۔ اصل چرانے کے بعد ہم نے وہ نقلی مجسمہ اس کی جگہ رکھ دیا۔ تاکہ فوری طور پر اس گریٹ روبری کا کسی کو پتا نہ چل سکے اور جب تک پتا چلے...... اصل مجسمہ امریکا کی سرزمین پر پہنچا دیا جا چکا ہو اور ہم اس کے پیسے بھی وصول کر چکے ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کاسپاکو نے اپنی بات ختم کر ڈالی۔

بلاشبہ اس خبیث نے گریٹ روبری کا ایک بڑا بے داغ منصوبہ بنایا تھا اور ہر طرح سے جامع بھی بلکہ اس سلسلے میں وہ اس چوری شدہ مجسمے کو نصف حد تک فروخت بھی کر چکا تھا اور اب باقی کی رقم کے حصول کے لیے اس نے یہ آخری منصوبہ بنایا تھا۔ میں نے کہا۔

''مجسمے کو امریکا لے جانا معمولی بات نہ ہوگی۔ ضرور اس سلسلے میں بھی آپ نے کوئی ٹھوس لائحہ عمل بنایا ہوگا؟'' میں نے کاسپاکو سے اپنی دانست کے مطابق سوال پوچھا تو وہ سگار کو ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

''یقینا...... کیونکہ یہ ہمارے ہی ذمّے ہے کہ ہم پارٹی کو معاہدے کے مطابق ان کی خریدی ہوئی امانت بہ حفاظت پہنچائیں۔ اس کے لیے ہم روڈلف کو سب بتا چکے ہیں تمہیں ابھی بتائے دیتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ رکا۔ صوفے پر بیٹھا تھوڑا کسمسایا اور دوبارہ بولا۔

''پہلے ہمارا منصوبہ مجسمے کو خفیہ طور پر کسی کارگو ائرلائن کے ذریعے امریکا لے جانے کا تھا مگر اس میں ہائی رسک تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں...... سب کچھ ہاتھ سے نکل جاتا اور مصیبت الگ گلے پڑ جاتی، بھاری نقصان بھی بھگتنا پڑتا۔ ہمیں کوئی اور صورت نظر نہیں آرہی تھی لیکن ہم مشکور ہیں مسٹر روڈلف اور ان کے ساتھیوں کے جنہوں نے خود ہی ہماری یہ مشکل آسان کر دی۔ منصوبہ ان کا تھا اور خرچہ ہمارا...... ہم نے مجسمے کو مرحلہ وار امریکا پہنچانے کا بندوبست کرنے کا ایک مشترکہ پلان بنایا ہے۔

''اگرچہ یہ نسبتاً ایک وقت طلب کام تھا لیکن مقابلتاً محفوظ بھی۔ وقت ہمارے لیے کوئی بڑا ایشو نہیں، اصل مقصد اس بیش قیمت مجسمے کو مذکورہ پارٹی کے حوالے کرنا اور ان سے رقم کی آخری قسط وصول کرنا تھا۔ ایک دوسرے کے رازداں بننے کے بعد اب...... ہم پر بھی یہ ذمّے داری عائد ہوتی تھی کہ یہ سودا کسی صورت میں دونوں پارٹیوں کے لیے خراب نہ ہونے پائے۔ اس صورت میں سب سے پہلے ہمیں بھاری نقصان برداشت کرنا پڑ جائے گا۔ لہٰذا اس کے لیے ہم نے یہ پلان بنایا ہے کہ اس مجسمے کو پہلے سمندری راستے، گلف آف تھائی لینڈ کے نارتھ چینل میں واقع کوماگو کے ایک جزیرے تک کسی فشنگ ٹریلر کے ذریعے پہنچایا جائے گا۔ جہاں ایک طیارہ پہلے سے موجود ہوگا، یہ ایک جیولوجیکل سروے ٹیم کے نام پر چارٹرڈ کیا گیا ہے۔ جو ظاہر ہے جعلی ہے۔ یہ سیسنا طرز کا دو انجنوں والا جہاز ہے جو یہاں بینکاک سی پورٹ کے ساحل سے تقریباً تیس ناٹیکل میل کے فاصلے پر تم لوگوں کا منتظر ہے۔ وہاں تک میں بھی چلوں گا۔ مجسمہ اس میں رکھوانے کے بعد تم لوگ روانہ ہو جاؤ گے۔ جہاز کو پائلٹ ہمارا ہی آدمی پاؤ کرے گا۔ (پاؤ وہی آدمی تھا جو مجھے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یرغمال بنا کے یہاں لایا تھا)

''جہاز تھائی لینڈ کی سرحد پار کرتا ہوا کمبوڈیا اور ویت نام کو عبور کرے گا۔ **ان ممالک** سے فضائی اجازت نامہ حاصل کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد کا سفر قدرے طویل ہوگا، وہاں سے طیارہ مسلسل سمندر کے اوپر پرواز کرتا ہوا فلپائن کی فضائی حدود کو کراس کرنے کے بعد چار سو ناٹیکل میل دور بحرالکاہل کے ایک گمنام جزیرے پر پہنچے گا جس کا ہم نے شناخت کے لیے خودساختہ نام ڈارک آئی لینڈ رکھا ہے۔ یہ طیارہ سیسنا کارنیوال بش، سمندر کی سطح پر بھی اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بہرحال اس ٹاپو نما جزیرے میں تم لوگوں کو کچھ دن رہنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم لوگوں کا امریکا کی جانب سفر شروع ہو جائے گا۔ اس کے بعد کی ذمّے داری **مسٹر روڈلف** کی پارٹی کی ہوگی۔''

کاسپاکو اس مہم کا پورا فریم ورک بتاتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد اس نے پاؤ نامی اسی آدمی سے کچھ کہا۔ وہ ایک رول کیا ہوا **میپ** لے آیا۔ جسے کاسپاکو درمیان میں رکھی گلاس ٹاپ والی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ میپ آپ کی ڈارک آئی لینڈ تک پوری رہنمائی

کرے گا۔''

ذرا دیر بعد کافی کا دور چلا۔ روڈلف شاید پہلے ہی میپ کا جائزہ لے چکا تھا اسی لیے میں ہی اسے بہ غور دیکھنے لگا۔ میپ کسی پروفیشنل آدمی کا ہی بنایا ہوا لگتا تھا۔ امریکا تک پہنچنے کی ایک طویل پلاننگ کی گئی تھی جو بظاہر سیدھی سادی لگتی تھی۔ تاہم میں نے کاسپاکو سے سوال کیا۔

''امریکا تو ہمیں بھی مذکورہ پارٹی تک پہنچنا ہوگا۔ اس کے لیے مخصوص شناختی کاغذات کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟ جبکہ ایسے میں ہمیں وہاں کچھ بینکنگ کا کام بھی نمٹانا پڑے گا۔''

''اچھا سوال ہے مگر قدرے بچکانا بھی۔ خیر، یہ سوال ذہن میں ابھرنا بھی چاہیے۔'' کاسپاکو عجیب سے لہجے میں بے ربط انداز میں بولا۔ ''شناختی کاغذات کا حصول مسٹر روڈلف کی پارٹی کے لیے کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ وہ اس کا بندوبست تمہارے وہاں پہنچتے ہی کر لیں گے۔ یوں بھی تمہیں کون سا اتنا زیادہ عرصہ وہاں رہنا ہوگا۔ بینک کی ایک بڑی اسٹیٹ مینٹ شو کر کے تمہارے کاغذات بنا لیے جائیں گے۔ جو رئیل اور تمہارے ہی نام کے ہوں گے۔''

میں جانتا تھا کہ میرے نام سے ایسے کاغذات کا حصول کس قدر مشکل اور ناممکنات میں سے ہوگا، کیونکہ میرا وہاں کیا معاملہ تھا یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔

''لیکن میں بعض وجوہات کی بنا پر اپنے نام سے وہاں کاغذات نہیں بنوا سکتا نہ کوئی اور...... میں یہ بات پہلے ہی کلیئر کر دینا چاہتا ہوں۔''

''چھوڑو ان فضول چکروں کو۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہاں مسٹر روڈلف کی پارٹی کی تمہیں ہر قسم کی فل سپورٹ حاصل ہوگی۔ تم صرف شوبین ہو گے اور بس...... کوشش یہی ہوگی کہ تم، سون اور پاؤ وغیرہ اسی راستے واپس لوٹ آؤ یا پھر تم آگے کہیں نکل جانا چاہو جہاں امیگریشن کی شرائط آسان ہوں، اس ملک کا رخ تم کر سکتے ہو۔ میرا مشورہ تمہیں سوڈان کا ہی ہوگا۔ وہاں کچھ پالیسیاں نرم ہوں گی اور پھر تمہارے پاس روپوں پیسوں کیا کمی ہوگی۔ بزنس **انویسٹر** کی کسی بھی آسان پالیسی کے ذریعے تم بہت جلد یہ کام کروا لو گے۔''

کاسپاکو کی بات سن کر میں خاموش رہا۔

وقت گزرتا رہا۔ ہمارے درمیان اسی سلسلے میں تقریباً مزید ڈیڑھ دو گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد...... نشست برخاست کر دی گئی۔

گوتم بدھ کے اس چوری شدہ مجسمے کے سلسلے میں جو بعد میں مزید تھوڑی بہت تفصیل مجھے معلوم ہوئی، اس کے مطابق...... یہ مجسمہ...... ڈیڑھ میٹر اونچا اور ڈیڑھ میٹر ہی گولائی میں ایک ایسا مجسمہ تھا جو خالص سونے کا بنا ہوا تھا۔ اس مجسمے کا وزن تقریباً پچیس، تیس ٹن تھا۔ یہ مجسمہ تیرہویں صدی میں بنایا گیا تھا لیکن شمالی حملہ آوروں کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لیے اس پر سیمنٹ کا پلستر کر دیا گیا۔

گزشتہ صدی میں اس مجسمے کو تھائی لینڈ کے دارالحکومت کے ایک ایسے مندر میں منتقل کر دیا گیا جو برسوں سے غیرآباد تھا۔ **1935ء** میں گوتم بدھ کے اس مجسمے کو ایک قدیم مندر میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ **1955ء** میں گوتم بدھ کے اس مجسمے کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی کوشش میں یہ زمین پر گر پڑا، جس کے نتیجے میں اس کا پلستر ایک طرف سے تھوڑا سا اکھڑ گیا۔ اس کے اندر کا سونا چمکتا ہوا نظر آیا تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ مجسمہ پورا کا پورا خالص سونے کا بنا ہوا ہے۔ یہ انکشاف ہوتے ہی مجسمے کو فوراً قومی ملکیت کی حیثیت دے دی گئی اور اسے اہم تھائی نوادرات میں شمار کیا جانے لگا۔

مجسمے سے متعلق یہ ساری تفاصیل کاسپاکو نے اس امریکی جان روڈلف کو بتائی تھی اور پھر اس کے ذریعے یہ مجھے معلوم ہوئی۔ بلاشبہ کاسپاکو نے میرے کاندھوں پہ بھاری ذمّے داری دے دی تھی۔ اس کی مہمان نما قید سے رہائی کا معاملہ میرے لیے ثانوی حیثیت رکھتا تھا مگر اس خطرناک مشن میں میرا اپنا بھی مفاد کارفرما تھا۔ کاؤشی کی ہلاکت اور پاکستان میں زورآور کے قتل کے بعد میری امریکا **یاترا** کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ جبکہ نئے سیٹ اپ کے لیے مجھے یوٹرن کی ضرورت پڑتی۔ اس میں بہت وقت لگتا اور کوئی ضمانت بھی نہ تھی کہ دوسری بار بھی زورآور خان جیسا کوئی قابل اعتبار اور پروفیشنل آدمی ملتا۔ ایسے میں جبکہ کبیل دادا اور شکیلہ امریکا پہنچ چکے تھے، لیکن بقول وزیر جان کہ، انہیں اس کے ساتھیوں یا ٹائیگر ٹیک نے ٹریپ کر لیا ہوگا۔ آنسہ خالدہ کہاں تھی اور عابدہ کس حال میں تھی، کچھ پتا نہ تھا۔ وزیر جان کی ہلاکت کے بعد دشمنوں نے میرے خلاف کون سا نیا لائحہ عمل تیار کیا ہوگا۔ یہ بھی اندھیرے میں تھا۔ اب تک یقینا ان تک وزیر جان کی میرے ہاتھوں ہلاکت کی خبر پہنچ چکی ہوگی اور یہ بھی کہ میں امریکا روانگی کے لیے پاکستان کی سرحدیں عبور کر چکا تھا۔

ایسے میں کاسپاکو کی یہ گوتم بدھ والی خطرناک مہم کو سر

کرنا، میرے اپنے مفاد میں بھی تھا بشرطیکہ اس میں کسی قسم کی چال یا دغابازی کی سازش کارفرما نہ ہو۔ چنانچہ مجھے ہر سے اپنی آنکھیں کھلی رکھنا تھیں اور کان ہر اس ساعت پر چوکس رکھنا تھے جو ذرا سی بھی مشتبہ آہٹ پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔

گلف آف تھائی لینڈ میں واقع کوہانگو جزیرے تک اس مجسمے کو پہنچانے کے لیے ہم سب روانگی کے لیے تیار تھے۔ کاسپاکو کے مطابق اس چوری شدہ مجسمے کو ایک قدیم مندر کے کھنڈرات کے ایک خفیہ تہ خانے میں چھپا کر رکھا گیا تھا۔ اس جگہ کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ برسوں سے ان ویران کھنڈرات کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا تھا۔

ٹھیک شام چھ بجے لیموزین اور کریسیڈا گاڑیاں کاسپاکو کی قلعہ نما رہائش گاہ سے نکل رہی تھیں۔

☆☆☆

لیموزین ہم سے آگے تھی۔ اس میں کاسپاکو، اس کی محبوبہ سانچی، پاؤ اور ڈرائیور سوار تھے۔ ان سے پیچھے کریسیڈا میں، میرے علاوہ سون، گرانڈیل امریکی جان روڈ لف اور کاسپاکو کے دو آدمی براجمان تھے جن میں سے ایک کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ دوسرا اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں کھڑکی کی سائڈ پر عقبی نشست سنبھالے ہوئے تھا، سون درمیان میں تھی اور جان روڈ لف دوسری کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔

ہماری منزل بینکاک کی جنوبی مضافات میں واقع مندر کے کھنڈرات تھے۔ جہاں تک کا فاصلہ تقریباً تیس پینتیس کلومیٹر تھا۔ ابھی ہم مین شاہراہ پر تھے۔

ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ ایک انڈر پاس سے گزر کر ہم جیسے ہی مضافات کی طرف جانے والی لمبی چوڑی دورویہ شاہراہ پر پہنچے تو...... اچانک عقب سے ایک منی کارگو ٹرک ہارن بجاتا ہوا تیزی سے گزرا......

آگے جا کر وہ انڈی کیٹر دیتا...... لیموزین کو بھی کراس کرتا ہوا ہماری لائن پر آگیا۔

"یہ ٹرک ہمارا ہی ہے۔" میرے ساتھ بیٹھی سون نے ہولے سے کہا تو امریکی جان روڈ لف نے مسکرا کے اضافہ کیا۔

"مسٹر شہزاد ٹرک کو دیکھ کر کچھ چوکنا سے نظر آنے لگے تھے۔" وہ شاید میرے چہرے سے گھبراہٹ کی ہلکی سی رمق کو بھی بھانپ گیا تھا۔ تاہم مجھے اس کا میرے بارے میں یہ تبصرہ فضول لگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا، البتہ سون معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔

دس کلومیٹر بعد دونوں کاریں دورویہ سڑک سے دائیں جانب ایک ذیلی سڑک پر آگئیں۔ یہ ون بیلٹ روڈ تھی اور دور دور تک ویران نظر آتی تھی۔ ٹرک بہت آگے جاچکا تھا اور اب اس کی ٹیل لائٹس ہی نظر آرہی تھیں تاہم دونوں گاڑیوں کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ میرا دل کچھ بےچینی سی محسوس کرنے لگا۔

ہمارے دائیں جانب پہاڑی سلسلہ تھا جہاں سورج کی نارنجی پڑتی روشنیاں جیسے سنگلاخ ڈھلانوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ بائیں جانب کہیں کہیں بنجر زمین اور چھدری چھدری گھاس والا میدان تھا۔ پھر اچانک ہی گھنے جنگل کا سلسلہ شروع ہوا جو جلد ہی اختتام پذیر ہوا اور اب اس کی جگہ ٹیلوں ٹبوں نے لے لی تھی۔

ادھر سے ہی آگے جانے والی لیموزین نے بائیں جانب کا انڈیکیٹر دینا شروع کردیا ساتھ ہی اس کی رفتار بھی بتدریج آہستہ ہونے لگی۔ ہماری کار کے ڈرائیور نے بھی کار آہستہ کردی تھی۔ کارگو ٹرک نظر نہیں آرہا تھا، وہ شاید بہت آگے نکل گیا تھا۔ خالی تھا اسی لیے اس کی رفتار خاصی تیز تھی یا پھر اسے دانستہ آگے نکل جانے دیا گیا تھا۔

کار ناپختہ راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ رفتار آہستہ ہی تھی۔ کچھ تنگ موڑ بھی راہ میں تھے۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ کار کے شیشے بند تھے۔

"کیا ہماری روانگی کی ابتدا ہوچکی ہے؟" میں نے سون کی طرف گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں!" اس نے مختصر جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھی اور جان روڈ لف بھی اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے تھا۔ مجھے دونوں کے چہرے کے تاثرات یکساں محسوس ہوئے تھے جیسے وہ مشترکہ طور پر ایک ہی نقطے پر سوچ بچار میں محو ہوں۔

میں گردن گھما کر کھڑکی سے باہر ویرانے میں دیکھنے لگا۔

دونوں گاڑیاں بھی ٹیلوں ٹبوں کے درمیان سے گزرنے لگیں۔ یہاں کوئی کوئی باقاعدہ سڑک نہ تھی۔ بس میدانی سا کھلا راستہ تھا۔ ہماری کار کا ڈرائیور ہم سے آگے جانے والی لیموزین کو فالو کر رہا تھا۔ جلد ہی ٹیلے ٹبوں کا سلسلہ پیچھے رہ گیا اور سامنے ہی مجھے اپنی جانب ذرا دور شام کے دھندلکوں میں کسی عمارت کے کھنڈرات نظر آنے لگے۔ وہی کارگو ٹرک بھی مجھے وہاں کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے گرد

چند لوگوں کے ہیولے بھی متحرک نظر آئے۔ کارگو کا پچھلا دروازہ اُوپر کو اُٹھا ہوا تھا اور وہاں سے ایک تختہ لگا کر کوئی کرین نما شے نیچے اُتاری جارہی تھی۔

کاریں اس کے قریب پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گئیں۔ انجن بند ہوئے اور ہر سو یکلخت دھڑکا دینے والی اسرار بھری خاموشی طاری ہوگئی۔

ہم سب نیچے اُتر آئے۔ فضا مرطوب اور رکی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔ ہم تینوں کاسپاکو کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ کرین نیچے اُتاری جاچکی تھی اور اب اس میں ایک آدمی سوار ہوچکا تھا جو کرین کو کھنڈر کے ایک بڑے سے کھلے مگر منہدم حصے سے اندر لے جارہا تھا، باقی افراد جنہوں نے مخصوص چست ورکرز ٹائپ لباس پہن رکھے تھے، کرین کے ساتھ ساتھ اندر جارہے تھے۔ پاؤ ان کے ہمراہ تھا۔ کاسپاکو کے دو ساتھیوں نے جلدی سے وہاں ہمارے بیٹھنے کے لیے پانچ عدد فولڈنگ چیئرز لگادیں۔ ہم سب ان پر براجمان ہوگئے۔ چار آدمی جن کے گلے میں انفراریڈ دوربینیں جھول رہی تھیں اور ہاتھوں میں گنیں تھیں، وہ دائیں بائیں بکھر کر بہت آگے تک نکل کر تھوڑی دور جا کھڑے ہوئے۔ یہ پہرے پر تھے۔

کاسپاکو نے سگار باکس نکال کر سلگایا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے تفخریہ لہجے میں بولا۔ "اس قیمتی اور نایاب مجسمے کو چھپانے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ آج سے کئی سو سال پہلے یہ ادھر ہی سے دریافت کیا گیا تھا۔" کہتے ہوئے اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔

"آپ کی عقل مندی کی داد دینی پڑتی ہے مسٹر سپاکو! واقعی اس طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاسکتا۔" روڈ لف بولا۔ سون نے بھی اپنے باس کی تعریف میں کم و بیش ایسا ہی جملہ ادا کیا تھا۔ میں جبکہ خاموش رہا۔ میری خاموشی کو کاسپاکو بھانپتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی ہماری اس چال پر؟" اس کی خود پسندی پر میں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"میں شاید ذہنی طور پر ابھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر پا رہا ہوں مسٹر کاسپاکو......! ورنہ تو اس میں کیا شک ہے کہ آپ نے ایک بیش قیمت اور نادر و نایاب چیز کو چھپائے رکھنے کی ایسی جگہ تلاش کی ہے کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی یہ جگہ......"

اسکول، اسکول......وہاں جا کر میرا سارا دن برباد ہوجاتا ہے!

"ہاہا...... ہاہا...... خاصے محتاط مگر بہت مکار آدمی ہو تم......" کاسپاکو نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا تو میں سنجیدگی سے بولا۔

"یہ مکاری نہیں ہے جناب! محتاط پسندی ہے۔ زیادہ بہتر ہوتا کہ...... اس جگہ سے صرف آپ اور آپ کے چند قریبی ساتھی واقف ہوتے مگر یہاں تو میں سب کا مجمع دیکھ رہا ہوں لیکن شکر ہے پھر بھی کہ......" ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ کھنڈرات کے اس کھلے حصے سے پاؤ بدحواسی کے عالم میں دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ اس کے سر پر چرمی بیلٹ کے ساتھ ہیڈ لائٹ بندھی ہوئی تھی۔ وہ چیختا چلاتا ہوا ہمارے قریب آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔

"غضب ہوگیا باس! مجسمہ اپنی جگہ پر نہیں ہے۔"

اس نے جیسے ایٹم بم سے بھی بڑا دھماکا کر ڈالا۔ کاسپاکو کو جیسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا۔ اس ناقابل یقین سی اطلاع پر وہ کرسی سے یوں اُچھل کر کھڑا ہوگیا جیسے...... اسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"کیا بکواس کر رہے ہو پاؤ......؟ یہ کس طرح ہوسکتا

ہے؟“

ہم سب کھڑے ہو گئے تھے۔ میں کاسپاکو کے سامنے یونہی روا روی میں جس شبہے کا تانوی سا اظہار کرنے والا تھا، وہ اتنی جلد حقیقت میں بدل جائے گا، مجھے اس کی رتی برابر بھی اُمید نہ تھی۔ اسی سبب خود میرا بھی وہاں موجود سب کی طرح منہ حیرت و تشویش کے باعث کھل گیا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے قریب کھڑے جان روڈلف کی طرف دیکھا تھا۔ میری یہ حرکت لاشعوری نہیں تھی بلکہ تحت الشعور میں چھپے ایک گمان آمیز تشکیک کے زیرِاثر تھی۔

روڈلف کے چہرے پر مقابلتاً وہ تاثرات اُس تیزی سے نہیں چھلکے تھے جس اسپارکنگ اسپیڈ سے پہلے کاسپاکو اور پھر میرے چہرے سے مترشح ہوئے تھے۔ جبکہ روڈلف کے چہرے پر چونکنے کے تاثرات میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ یوں...... جیسے وہ بناوٹی ہو۔ تب ہی پل کے پل میری مشاق اور بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے سے پھسل کر سون کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کے چہرے پر بھی بلاشبہ پریشانی کے آثار نمایاں تھے لیکن اس کی ماہیت میں کسی دبے دبے خوف کا عنصر غالب تھا۔

چہرہ شناسی میں ”فیشیل ایکسپریشن“ کو اوّلیت حاصل ہے۔ جو میری تربیت کا حصہ تھی۔ جبکہ کاسپاکو کے ساتھ لگی بیٹھی سانچی کے چہرے پر معمولی تاثرات تھے جیسے اُسے ان معاملات تو کیا اپنے آپ سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی ہو۔

کاسپاکو نے تیزی سے قدم اُٹھائے تھے اور اس کے ساتھ ہی ہم نے بھی۔

اندر روشنی کا بندوبست ایک چھوٹا جنریٹر چلا کر کیا گیا تھا۔ ایک تنگ سے کھنڈر نما راستے سے تیز تیز قدموں سے گزرتے ہوئے ہم نسبتاً ایک کھلی جگہ پر پہنچے۔ وہاں کی زمین کھدی ہوئی تھی۔ ایک طرف کرین کھڑی تھی جسے دوسرے راستے سے اندر لایا گیا تھا۔ ہم سب نے گڑھے کے اس سرے پر آ کر نیچے جھانکا۔ اندر بھی لوگ موجود تھے۔ انہوں نے بھی ہیڈ لائٹس پہن رکھی تھیں۔ جس کی روشنی میں اندر کا منظر کسی خفیہ تہ خانے کا سا منظر پیش کرتا تھا۔ وسط میں بہت سی جگہ خالی تھی۔ اندر رسی کی سیڑھیاں جھول رہی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت باہر ساعت شکن دھماکا ہوا۔ کھنڈرات کے در و دیوار لرزنے لگے۔ ہم خود بھی کھڑے کھڑے اپنی جگہوں پہ ہل کر رہ گئے۔ کاسپاکو جو شاید جوشِ غیظ تلے گڑھے کے سرے کے بالکل قریب آن کھڑا ہوا نیچے جھک کر تکنے میں محو تھا، وہ سیدھا اندر جا گرا...... سانچی کے حلق سے چیخ سی اُبھری تھی۔ جبکہ ہم ابھی سنبھلنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ دوسرے دھماکے کی آواز اُبھری جو ہمارے بالکل عقب میں ہوا تھا۔ سانچی ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی اور اس کی زبان پہ میرا نام تھا۔

”ششش...... شہزاد......“ پھر وہ شاید بے ہوش ہو کے گر پڑی تھی۔

اندر بارود کا دھواں سا بھر گیا۔ کئی لوگ کھانسنے لگے۔ مجھے بھی ٹھسکا لگا۔ یکلخت برسٹ چلے...... میں اپنی جان بچانے کی غرض سے دوڑا تھا کہ روڈلف مجھ سے ٹکرایا اور میں گڑھے میں گرتے گرتے بچا۔ صاف لگا تھا مجھے کہ یہ اس کی دانستہ حرکت تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، یہ تصدیق ہوتے ہی کہ میں ابھی باہر ہی تھا تو وہ دوبارہ میری جانب لپکا، اس بار اس کا انداز واضح طور پر جارحانہ تھا۔ میں اسے تاکنے کے لیے تیار تھا کہ اسی وقت آٹھ دس اسلحہ بدست افراد اندر داخل ہوئے۔ وہ تاک تاک کر کاسپاکو کے آدمیوں کا نشانہ لینے لگے۔

یاؤ نے خطرہ بھانپتے ہی پستول نکال لیا تھا مگر اسے استعمال کرنے کا اسے موقع نہ مل سکا، نامعلوم حملہ آور کے ایک ہی برسٹ نے اس کا وجود اُدھیڑ ڈالا۔ سون اپنے کانوں پہ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رکھے چیخنے لگی۔ وہ اکڑوں بیٹھ چکی تھی۔ میں نے پلک جھپکتے ہی محسوس کیا تھا کہ نامعلوم حملہ آور روڈلف اور سون کو اپنی بربریت کا نشانہ بنانے سے کترا رہے تھے۔ ایک نے کوئی بم سا نکال کر اس کی پن دانتوں سے نکالی اور گڑھے کے اندر پھینک دیا۔

اندر دھماکے کے ساتھ ہی لرزہ دینے والی انسانی چیخیں برآمد ہوئیں۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔ اندر کاسپاکو تھا، جانے اس دھماکے کے بعد اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔ ایک نے مجھے اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن تب تک جان روڈلف مجھے گڑھے میں دھکا دینے کے لیے میرے قریب آ چکا تھا اور چونکہ میں اس کی پہلی ”حرکت“ کے بعد اس سے یک دم محتاط ہو گیا تھا۔ اسی لیے جیسے ہی یہ میرے قریب آیا میں نے اسے بڑی چابک دستی کے ساتھ دبوچ لیا۔

مجھ پر برسٹ چلانے والا حملہ آور جہاں کا تہاں رک گیا تھا۔ اس کی گن کا رخ ہنوز میری طرف ہی تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب روڈلف نے یہ نازک اور سنگین لمحہ بھانپنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میں بھانپ گیا کہ وہ کیا نکالنا چاہتا تھا، میں نے اس سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ شے نکال لی جسے ہاتھ میں لینے کی وہ حسرت ہی کرتا رہ گیا۔ وہ ایک تلے اُوپر نال والا خطرناک قسم کا ڈبل بیرل ”آرسنل پسٹل“ تھا۔ ایسے اسلحوں کے استعمال میں تو مجھے یدطولیٰ حاصل تھا۔ جو ہاتھ آتے ہی دشمنوں کے خلاف میری رگوں میں قہر و غضب کی بجلیاں دوڑا دیا کرتا تھا۔

ایک زبردست ایکشن اسالٹ کے تحت میں نے سب سے پہلے اپنے ایک بازو کی آہنی گرفت...... روڈلف کی گردن کے گرد حائل کر کے اسے اپنی ڈھال بنایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل سے ان نامعلوم حملہ آوروں پر یکے بعد دیگرے گولیاں برساتا چلا گیا۔ خطرناک آرسنل مجھ سے زیادہ غضب ناکیاں بکھیرنے لگا۔ اس کی دونوں فولادی سلائیڈز تیزی سے آگے پیچھے حرکت کرنے لگیں۔ اور اس کے انجیکشن پورٹ سے گولیوں کے خول اچھل اچھل کر نیچے گرتے رہے۔ نامعلوم حملہ آور رقص اجل کرتے گرتے چلے گئے، باقی چند نے جان بچانے کی غرض سے دائیں بائیں سرکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں پسپائی اور موت کے ڈر سے وہ لوگ بے دریغ مجھ پر گولیاں نہ برسانا شروع کر دیتے۔ اس صورت میں اگرچہ سب سے پہلے روڈلف ہی جان سے جاتا مگر میں بھی نہیں بچتا لیکن شکر ہوا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

اِدھر روڈلف بدستور میرے بازو کی گرفت سے نکلنے کی کوشش میں تھا کہ اس کا داؤ چل گیا۔ کم وہ بھی نہ تھا۔ اس نے موقع پاتے ہی اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ پر رسید کرنا چاہی تھی کہ میں نے اسے اسی ہاتھ کے شکنجے میں زور سے گھما دیا۔ اس صورت میں اس کی کہنی کی جاں کش ضرب سے تو میں بچ گیا مگر وہ بھی میرے ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا۔ یہ میرے لیے نہایت خطرناک صورتِ حال تھی۔ کھنڈرات کے شکستہ ستونوں کے عقب میں باقی ماندہ چھپے ہوئے حملہ آوروں میں سے کوئی بھی مجھ پر برسٹ فائر کر سکتا تھا۔

اور وہی ہوا۔ روڈلف کی ”ڈھال“ سے محروم ہوتے ہی مجھ پر برسٹ فائر ہوا، میں چونکہ اس سچویشن کی خطرناکی کا پہلے ہی ادراک کر چکا تھا اسی لیے میں نے قلیل ترین لمحات میں پلٹ کر اپنی جگہ بدلنے کی کوشش کی اور ایک طرف جمپ لگائی مگر میرا ایک پاؤں گڑھے کے سرے پر پھسلا، میرا توازن بگڑا، خود کو بارود کی دھوئیں سے اَٹے پڑے گڑھے میں گرنے سے بچانے کی اپنی سی تگ و دو چاہی تھی مگر بے سود...... میں سنبھلتے سنبھلتے بھی بالآخر گڑھے میں جا گرا......

☆☆☆

گڑھے میں گرتے ہی میں نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے خود کو کسی ٹھوس شے کی زد میں آنے سے بچانے کی کوشش جاری رکھی تھی کہ میں دھپ سے کسی نرم شے پر گرا اور مجھے اس ”شے“ کی کراہ بھی سنائی دی۔ میں اسے پہچان گیا، یہ کاسپاکو کا بھاری بھرکم وجود تھا۔ گویا اس بم کے دھماکے کے بعد بھی اس میں زندگی کی رمق موجود تھی۔ جبکہ مجھے دھوئیں اور گرد و غبار کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بارود کی ناگوار بو سے میرا دم گھٹنے لگا۔ شکر تھا کہ گڑھے میں گرنے سے مجھے چوٹ نہیں آئی تھی۔

آرسنل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر قریب ہی گرا تھا مگر میں نے اسے ٹٹولنے اور اُٹھانے میں چنداں دیر نہیں لگائی تھی۔ تاہم میں کاسپاکو کے جسم سے اُتر آیا اور اسے جھنجوڑتے ہوئے ہولے سے پکارا......

”مسٹر کاسپاکو......! تم ٹھیک ہو؟“

وہ حلق سے غوغاں کی آوازیں نکالنے لگا۔ مجھے اس کے جسم اور کپڑوں پر ہلکی سی چپچپاہٹ کا احساس بھی ہوا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ زخمی تھا۔

آتشیں ہتھیاروں کی گھن گرج اور انسانی چیخوں کے شور و شغب کے بعد دل دہلا دینے والا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کاسپاکو کی غوغاں اُونچی ہونے لگی تو میں نے اسے سرگوشی میں مخاطب کر کے کہا۔

”مسٹر کاسپاکو! آواز مت نکالو...... اُوپر دشمن ہماری خون کی بو سونگھ رہے ہیں۔“ وہ میری آواز شاید پہچان گیا تھا، گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

”مم...... میری جیب میں...... پپ...... پستول موجود ہے۔“

”اوکے......“ میں نے ہولے سے کہا۔

اچانک ایک غراتی سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ ”وہ نیچے گر پڑا ہے۔ جلدی نیچے جاؤ۔ اس کا ہلاک ہونا ضروری ہے۔ گڑھے کے سرے کے چاروں طرف کھڑے ہو کر اندھا دھند فائرنگ کر ڈالو......“

یہ آواز سن کر میں لرز اُٹھا۔ یہ آواز اسی خبیث اور دغاباز امریکی جان روڈلف کی تھی۔ اگر ایسا ہو جاتا تو میری اس گڑھے میں کھلی قبر بننا یقینی امر ہوتا۔ میرا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن

سے کام لیا۔ تلے اُوپر نال والا خطرناک آرسنل ہنوز میرے دائیں ہاتھ میں موت بکھیرنے کے لیے متحرک رہا تھا۔ دوسرے ...... ہاتھ سے میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ قریب بے سدھ پڑے کاسپاکو کی جیبوں کی تلاشی لی اور میری توقع کے عین مطابق اس کی جیب سے بھی ایک عدد پستول برآمد ہو گیا۔

دونوں ہتھیاروں کو ہاتھوں میں لیے میں اوپر گڑھے کے سرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور تب ہی مجھے وہاں اسلحہ بدست ملگجے سے ہیولے کھڑے دکھائی دیے۔ میرے ہونٹوں پہ سفاک مسکراہٹ کھیل گئی۔ رگوں میں خون مثلِ پارہ کی طرح گردش کرنے لگا۔ وہ سب غالباً اس زعم میں میرے نشانے پر آگئے تھے کہ ان کا خیال تھا، میں نیچے گر کے بے ہوش ہو گیا ہوں یا بے سدھ......

پھر اس سے پہلے کہ اُوپر سے مجھ پر فائرنگ ہوتی، میرے دونوں پستول والے ہاتھ اُوپر اُٹھتے چلے گئے اور اگلے ہی لمحے وہ...... آتشیں قہقہے اُگلنا شروع ہو گئے۔

میرا نشانہ یہی ملگجے ہیولے تھے۔ دشمنوں کی اس آخری کھیپ کی تعداد بہت محدود تھی۔ اس میں ظاہر ہے میری ہی چابک دستی کا کمال تھا ورنہ یہ لوگ، جو بلاشبہ...... اس امریکی جان روڈلف کے ہی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ میری قبر بھی کھود ہی چکے تھے۔

مجھے ان کی کریہہ انگیز چیخیں سنائی دیں، ان میں دو ایک نیچے بھی گرے...... میں فوراً ان پر چیتے کی طرح جھپٹا اور ایک کی گن قبضے میں کرلی۔

''مسٹر کاسپاکو...... ! ہوش میں رہنے کی کوشش کرو...... میں نے ان نامعلوم دشمنوں کا حملہ ناکام بنا دیا ہے۔ میں ایک شکار کے پیچھے اُوپر جارہا ہوں۔'' یہ کہتے ہی میں گڑھے کے سرے سے جھولتی ہوئی رسی کی طرف بڑھا اور تیزی سے چڑھتا ہوا جیسے ہی سرے پر پہنچا، میری سماعتوں سے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز اُبھری۔

''فرار......''

ایک ہی لفظ میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں اُبھرا تھا اور پھر جیسے یکلخت میرے وجود میں بجلیاں دوڑ گئیں۔ میں اندازہ کرسکتا تھا کہ یہ کون فرار ہونے کی کوشش کرسکتا ہے۔ تاہم پھر بھی میں نے گردشی نظروں سے صرف چند ثانیوں کے لیے اردگرد کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے اطراف میں بکھری ہوئیں لاشوں میں جان روڈلف کی لاش نظر نہیں آئی تھی، ہاں...... البتہ ایک طرف ان میں ساچی ضرور بے سدھ پڑی دکھائی دی تھی، پتا نہیں وہ زندہ تھی یا نہیں، کیونکہ وہ پہلے ہی اس اچانک اُٹھنے والے بربریت زدہ طوفان پر ہسٹریائی چیخیں مار کے غش کھا کر گر پڑی تھی۔ ممکن تھا اسے بے سدھ پا کر کسی نے اسے نشانہ بنانے کوشش نہیں کی ہو، ہاں ایک بات پر میں ٹھٹکا ضرور تھا کہ ان میں مجھے سون نظر نہیں آئی تھی۔

اسی وقت گاڑی کے ٹائر چرچرانے کی آواز اُبھری اور میری ٹانگوں میں جیسے بجلیاں دوڑ گئیں۔ میں نے کاسپاکو کا ملکی ساخت والا پسٹل اور اپنا آرسنل بیلٹ میں اڑس لیا تھا اور...... ہیوی مشین گن ہاتھوں میں تھی، وہی لیے میں کھنڈرات کے بیرونی حصے کی طرف دوڑا۔ مجھے ایک کھنڈر کی آڑ سے ایک بڑی سی وین حرکت کرتی نظر آئی، میں نے تیزی سے ایک منہدم شدہ دیوار پھلانگی اور گھٹنوں کے بل اکڑوں بیٹھ کر میں نے وین کے ٹائروں کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔

شام رات کی تاریکی میں ڈھل چکی تھی۔ اُترتے ہوئے انہی اندھیاروں میں میری گن سے یکلخت شعلوں کی زبان لپلپانے لگی اور اس کے اگلے ہی لمحے یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے۔

ریورس ہو کر ایک دم آگے بڑھتی ہوئی وین ان دھماکوں کے بعد ایک طرف کو جھک گئی اور گول گھومنے لگی۔ میں نے اس کی جانب دوڑ لگا دی۔

اسی وقت میں نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلتے اور اس کے اندر سے جان روڈلف کو ہاتھ میں گن لیے ہوئے اُترتے دیکھا۔ اس نے محض ایک اندازے سے مجھ پر فائر کھول دیا مگر اس کی یہ کوشش بیکار ثابت ہوئی۔ میں نے اس سے پہلے ہی اس کا نشانہ لیتے ہوئے اپنی گن سے ایک برسٹ فائر کر دیا۔ اس کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور گن ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی...... اس کا وہ ہاتھ خون کے لوتھڑے کا منظر پیش کرنے لگا۔ لیکن وہ بھی بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا، یا پھر شاید اسے اپنی یقینی موت صاف نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسی طرح ہی اذیت تلے چیختا ہوا گن اُٹھانے کو لپکا اور اس کا بایاں ہاتھ گن اُٹھانے کے لیے آگے کو اُٹھا ہوا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے بڑے اطمینان سے گن کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور اس کی ایک ٹانگ کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس کی دوبارہ اذیت تلے چیخ اُبھری اور وہ نڈھال ہو کر گر پڑا۔ میں نے اس کی گن لات مار کے پرے تاریکی میں اچھال دی۔

کراچی
ماہنامہ سرگزشت
جنوری 2018ء
مرگِ ناگہاں نمبر
کی جھلکیاں

چاندگرھن
زویا اعجاز کے فسوں گر قلم کا شاہکار، اس ہردل عزیز شاعرہ
کا احوال جس کے اشعار دلوں کی دھڑکن تیز کردیتے ہیں

جاسوسہ
عبداللہ احمد حسن کے کلکِ قلم سے اس دوشیزہ کا زندگی نامہ جس کی رگوں میں دوڑتے خالص پٹھانی خون
نے اسے بہادری کے معراج پر پہنچایا اور حکومتِ برطانیہ اسے ایک بڑا جنگی اعزاز دینے پر مجبور ہوگئی

قاتل باؤنسر
کبیر عباسی کا کرکٹ کے شوقینوں کے لیے انمول تحفہ، اس
کھلاڑی کی داستانِ زیست جس نے کھیل کے میدان میں موت کو گلے لگایا

خودکش
وسیم بن اشرف کی ایک دلپذیر تحریر، اردو کے اس مقبول شاعر
کے حالاتِ زندگی جو مرنے کی آرزو میں خودکشی کی بار بار کوشش کررہا تھا

ننھی کلی
زریں قمر لائی ہیں ایک دل دکھا دینے والی روداد، اس ننھی کلی کی داستان
جس نے نہایت صغیر سنی میں پاکستان کا نام روشن کیا

مرگِ برگ
بشریٰ شوکت کی ایک ایسی سچ بیانی جسے پڑھتے ہوئے آنسو نکل آئیں گے

ان کے علاوہ
طویل داستان **ناسور** مقبول سفرنامہ **شمشال سے تورنٹو** اور بہت سی دلچسپ حالاتِ
زیست، سچ بیانیاں، سچے واقعات دلچسپ قصے، کبھی نہ بھولنے والی سرگزشتیں

ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر محفوظ رکھیں گے کہ ایسے خاص نمبر صرف سرگزشت ہی پیش کرسکتا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

ٹھیک اسی وقت میں نے وین کی ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والے دروازے کو کھلتے دیکھا۔ وہاں سے اُتر کر کوئی تاریک ویرانوں کی طرف دوڑا۔ میں نے فوراً اس کا تعاقب کیا۔ وہ سون تھی۔ انتہائی خوف زدہ اور بدحواس ہو رہی تھی اور شاید اسی سبب اس کا ایک پاؤں بھی دوڑتے ہوئے رپٹ گیا اور وہ گر پڑی۔ میں نے اسے چھاپ لیا اور اس کی گردن دبوچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ اس کا لباس مَسل چکا تھا اور گرد وغبار سے اَٹا پڑا تھا۔ میں نے کسی عقاب کی طرح اسے جھپٹ لیا اور دبوچ کر کھڑا کر دیا۔

”تم اس دغاباز امریکی کے ساتھ کہاں بھاگ رہی تھیں؟ چلو میرے ساتھ۔“ میں غرایا۔

”نن..... نہیں، مجھے جانے دو، میں تمہاری منت کرتی ہوں..... وہ..... وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ہم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ وہ دہشت زدہ لہجے میں ہکلا کے بولی۔

”خاموش رہو، ورنہ تمہاری گردن توڑ ڈالوں گا۔“ میں خونخوار لہجے میں غرایا۔ وہ سہم گئی۔ میں اسے دبوچے واپس پلٹا۔ روڈلف بےسدھ پڑا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا۔ وہ بے ہوش تھا۔ میں اسے گھسیٹتا ہوا کریسیڈا تک لایا اور اس کے بے ہوش زخمی وجود کو کھینچ کر عقبی سیٹ پر ڈال دیا۔ ڈکی میں رسی پڑی تھی۔ اس سے میں نے اس کی مشکیں کس ڈالیں۔

”دد..... دیکھو..... سب مر چکے ہیں۔ ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔“ سون بولی۔

”کہا نا میں نے..... خاموش رہو۔“ میں نے اسے پھر جھڑکا اور پھر اسے دبوچے اندر کھنڈر میں لے آیا۔

”بب..... باس زندہ ہے یا مر گیا؟“ وہ بولی۔

”وہ زندہ ہے اور زخمی حالت میں گڑھے کے اندر پڑا ہے۔ اسے نکالنا ہوگا۔“ میں نے قدرے ہانپتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

”نن..... نہیں، وہ..... وہ مجھے بڑی اذیتیں دے کر ہلاک کرے گا۔ مم..... مجھے جانے دو.....“ وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی اور میری گرفت سے نکلنے کے لیے مچلنے لگی۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے نازک اندام چہرے پر جڑ دیا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں وقت ضائع کیے بغیر اندر گڑھے میں کود گیا۔ اب بارود کی دھواں چھٹ چکا تھا۔ جنریٹر کی روشنی ہو رہی تھی۔ کاساپوکو کو میں نے سہارا دے کر اُٹھایا، وہ خاصا زخمی تو نظر آرہا تھا مگر زندہ تھا اور ہوش میں بھی تھا۔ میں اسے کھینچ کھانچ کر کسی طرح گڑھے سے باہر نکال لایا۔

ساپچی کو ہوش آچکا تھا وہ پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ سب کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ خود ہم بھی تو ایک بھیانک موت کے منہ سے بال بال بچے تھے۔ میں ان سب کو لیے کار میں آگیا۔ بعد میں بے ہوش سون کو بھی اُٹھا لایا۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی اور پھر سب ایک ہی کار میں ٹھنس ٹھسا کر روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

کاساپوکو کی رہائش گاہ پہنچے تو جیسے ہلچل مچ گئی۔ کاساپوکو سمیت سب نے دیکھا تھا کہ میں ہی ان سب کو بچا کے لایا تھا اسی لیے میرا حکم وہ سب بغیر کسی چوں و چراں کے ماننے لگے۔ کاساپوکو کو فوراً طبی امداد کے لیے کسی دوسرے گوشے میں لے جایا گیا تھا، مجھے اسی کے ساتھی سے پتا چلا تھا کہ وہاں ڈاکٹرز سمیت تمام طبی سہولیات موجود تھیں۔

جبکہ روڈلف اور سون کے سلسلے میں، میں نے یہی حکم دیا کہ ان دونوں کو الگ الگ بند کمروں میں قید اور کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔ (روڈلف کو بھی میرے ہی حکم سے طبی امداد دینے کے لیے لے جایا گیا تھا)

کاساپوکو کے ساتھی حیران و پریشان تھے کہ یہ سب ہوا کیا تھا۔ کچھ ادراک تو تھا کہ یہ سب کسی دھوکے بازی کا ہی پیش خیمہ ہوسکتا ہے، لیکن روڈلف اور سون کو قیدی کی حیثیت سے بند کرنے کا حکم، ان کے لیے اچنبھے کا ہی سبب بنا تھا۔

چند گھنٹوں بعد حالات معمول پر آئے۔ میں بھی غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہوگیا۔ کاساپوکو کے آدمی میری ایک ایک ضرورت اور بات کا خیال کر رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے سرغنہ کو زخمی حالت میں میرے ساتھ دیکھا تھا اور یہ بھی کہ میں اس کی جان بچا کے اسے یہاں تک لایا تھا۔

اس کے بعد میں سون سے ملنے اس کے کمرے میں جا پہنچا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ ایک کونے میں سکڑی سمٹی فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں ایک ہی بلب روشن تھا۔ آہٹ پا کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی اور سر اٹھا کر اس نے دیکھا۔ وہ خاصی دہشت زدہ اور سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور وہ کونے میں دیوار سے لگی

بیٹھی تھی۔ اس کا شارٹ اسکرٹ گھٹنوں سے اُونچا ہوگیا تھا۔ میں چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے اس کی طرف دیکھتا رہا، اس کے بعد ہولے سے بولا۔

”سون! میں نے ابھی کاساپوکو اور اس کے کسی آدمی کو تمہاری غداری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔“ میں نے اندھیرے میں مگر بڑا اچا تُلا تیر پھینکا۔ یہی وجہ تھی وہ اس کے چہرے کی مردنی اور پژمردگی لحہ بھر کے لیے حیرت آمیز مسرت کے تاثرات میں بدلی اور وہ کونے کی دیوار سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہوئے کھڑی ہونے لگی تو میں نے قدرے جھک کر آگے بڑھتے ہوئے اس کا مرمریں بازو تھام لیا۔ وہ جلد ہی سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس کی حالت خاصی ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔

”کک..... کیا تم س..... سس..... سچ بول رہے ہو.....؟“

”میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ وقت بچانا چاہتی ہو تو میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا جس طرح تمہیں مجھ سے ہمدردی تھی اسی طرح مجھے بھی تم سے ہمدردی ہے۔ مگر مت بھولنا کہ ایک ذرا جھوٹ بھی بولا تو نقصان تم اُٹھاؤ گی، میں نہیں چاہتا ہوں کہ تم کاساپوکو کی بربریت کا نشانہ بنو، روڈلف ہماری قید میں ہے اور اس سے بھی ہم بہت کچھ اُگلوا لیں گے۔ مگر تم اپنے حصے کا کام کر کے میرے دل میں جگہ بنا لو تاکہ میں تمہیں بچا سکوں۔“ میری نپی تلی گفتگو نے سون کو سسکا کر رکھ دیا۔ اس کی گھنیری پلکیں اشک بار ہوگئیں۔

”کہا نا..... میں نے کہ وقت ضائع مت کرو..... جتنی جلد تم بات ختم کرو گی اُتنا ہی آسانی سے میں تمہارا دفاع کر سکوں گا مگر شرط وہی ہے کہ سچ بولنا ہے۔“

”لل..... لیکن وہ، روڈلف..... میرے بارے میں سب بتا دے گا۔“ اس نے امکانی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو میں اسی اطمینان سے بولا۔

”مت پروا کرو اس کی، وہ کاساپوکو کا ایک انتہائی معتوب مجرم بن چکا ہے، میں کوشش کروں گا کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے کہ وہ تمہارے بارے میں کسی بات کا بھانڈا پھوڑ سکے، اگر ایسا کیا بھی اس نے تو تم میں وہ سچویشن سنبھال لوں گا۔ کاساپوکو مجھ پر اب اندھا بھروسا کرنے لگے گا اور..... اگر تمہارے حقیقت اُگلنے سے..... میں وہ بیش قیمت مجسمہ برآمد کر لوں تو مجھے پورا یقین ہے کہ کاساپوکو..... صرف میرے ہی نام کی مالا جپتا رہے گا۔“

”کک..... کیا خبر تم مجھے بہلا پھسلا کر.....“

”اوکے..... تمہاری مرضی.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور پلٹا تو عقب سے اس کی لرزتی آواز اُبھری۔

”ٹھہ..... ٹھہرو..... پلیز!“

تب تک میں چند قدم بڑھا چکا تھا۔ اس کی آواز سن کر رکا اور وہیں کھڑے کھڑے اس کی جانب پلٹا۔

”میں سب بتانے کو تیار ہوں۔“

”ہاں! تو بتاؤ کہ سب کیا چکر تھا.....؟ تمہیں کیسے روڈلف نے اپنے ساتھ ملا لیا؟ اور وہ مجسمہ کہاں چھپا رکھا ہے؟ مگر یہ سب مجھے مختصر لفظوں میں بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ بتانے لگی۔

”کاساپوکو کے پاس میں اُکتا چکی تھی۔ جب تک اس نے مجھے گروہ میں ایک ”مادام“ کی حیثیت دے رکھی تھی تو سب ٹھیک تھا، لیکن پھر جانے کیا ہوا اس نے گروہ میں میری حیثیت روز بروز ڈی گریڈ کرنا شروع کر دی۔ پھر ساپچی کی آمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ کاساپوکو نے مجھے اپنی خلوتوں سے ہی نہیں بلکہ جلوتوں سے بھی دور کر دیا اور میں فقط اس کے مہمانوں کی راتیں گرم کرنے والی ایک طوائف بن کر رہ گئی، یہی نہیں گروہ کا ہر وہ ادنیٰ سے ادنیٰ فرد جو کبھی مجھ سے بات کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا، مجھے اس کے حوالے کر دیا جاتا۔ میں ٹوٹ کر رہ گئی۔ یا تو ابتدا سے ہی مجھے ایسا ہی رہنے دیا جاتا تو میری انا اور خودی کو اتنا دھچکا نہیں پہنچتا، لیکن ایک بڑے مقام سے بغیر کسی وجہ کے مجھے گرا دینا میرے لیے زیادہ تکلیف کا سبب بنا۔“ وہ اتنا کہہ کر رکی۔ میں بدستور مستفسرانہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف تکتا رہا۔

وہ ذرا ٹھہر کر دوبارہ بتانے لگی۔

”روڈلف بھی کاساپوکو کا مہمان تھا۔ وہ اسی پارٹی کا آدمی تھا جن سے کاساپوکو نے وہ چوری شدہ مجسمہ فروخت کرنے کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ وہ بیعانے کے طور پر چوتھائی رقم لے کر آیا تھا اور اس نے مجسمہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی درخواست کی تھی، جسے کاساپوکو نے بہ خوشی قبول کر لی تھی۔ بدھا کا وہ بیش قیمت مجسمہ اور وہ مقام (کھنڈرات) دیکھنے کے بعد..... اس نے مجھے اپنے ساتھ ملا لیا۔ روڈلف جیسا شاطر آدمی شاید تب تک میری اندرونی کیفیات اور یہاں سے بیزاری کو بھانپ چکا تھا۔ ایک رات جب میں اس کے ساتھ تھی تو اس نے مجھے ایک راز سے آگاہ کر دیا۔ اس نے

بتایا کہ وہ یہ مجسمہ چوری کرنا چاہتا ہے جس کا وہ امریکا سے پہلے ہی ایک مربوط پلان بنا کر لایا ہے۔ نیز اس نے اپنے بارے میں مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ایک بڑے بین الاقوامی نوعیت کے گروہ کی طاقت اس کی پشت پر ہے، وہ آج رات (اس دن کی رات جب کاسپاکو نے روڈلف کو وہ مجسمہ اور جگہ دکھائی تھی) اس کے ساتھی وہ مجسمہ چوری کر چکے ہوں گے کیونکہ وہ انہیں اسی دن ساری انفارمیشن خفیہ طور پر دے چکا تھا۔

”روڈلف نے مجھے مجبور کیا کہ میں کسی طرح کاسپاکو کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالوں تاکہ ایک تو اسی افراتفری میں روڈلف یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا، کیونکہ وہ چوری شدہ مجسمہ اور اس کا جائے مقام دیکھ لیے جانے کے بعد روڈلف پر کاسپاکو نے کڑی نگرانی مقرر کر دی تھی، وہ ایک طرح سے یہاں نظربند تھا جب تک کہ مجسمہ وہاں سے نکال کر امریکا نہ روانہ کر دیا جاتا۔ میں کاسپاکو کو زہر دینے کا کام نہیں کر سکتی تھی۔ یہ میرے لیے ناممکن حد تک مشکل تھا۔ درحقیقت روڈلف کے لیے کاسپاکو کی ہلاکت ضروری تھی، اس کے سوا وہ مجسمہ امریکا نہیں لے جا سکتا تھا، اس صورت میں کاسپاکو ان کے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ یہاں چور کو مور پڑنے والی بات ہو گئی تھی۔ شکار کو ایک دوسرے خطرناک شکاری کے منہ سے نوالہ بنا کے چھیننا تھا۔

”بہرطور میرے انکار کے بعد روڈلف نے یہ گیم کھیلی تھی جو آج ہوا۔ کیونکہ کاسپاکو کے ساتھ آدمی کم تھے لیکن روڈلف کو کیا معلوم تھا کہ ایک تم ہی سب پر بھاری پڑ جاؤ گے۔ اس کا سارا منصوبہ فیل ہو گیا بلکہ وہ خود بھی گرفت میں آ گیا۔“ وہ اتنا بتا کر رکی، میرا ذہن اس کی باتوں پر مسلسل غور کرنے میں مصروف تھا، وہ ذرا سانس لینے کو رکی اور......

پھر آخر میں مجسمے سے متعلق بتانے لگی کہ اسے روڈلف نے آخری وقت تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کے آدمیوں نے مجسمہ چوری کر کے کس مقام پر رکھا تھا۔ لیکن آج جب روڈلف نے اپنے اس خون ریز منصوبے کو آخری شکل دی تو تب ہی اس نے سون کو بتایا تھا کہ وہ لوگ سب کو ہلاک کرنے کے بعد...... فل ٹاپ کے علاقے، فوکٹ پیلس روانہ ہو جائیں گے اور اب بھی یہ پسپائی اختیار کرنے کے بعد یہ دونوں (روڈلف اور سون) فرار ہو کر وہیں جا رہے تھے...... جب سون نے مجھے اس جگہ کا پتا بتایا تو مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ یہ رہائش گاہ وزیر جان کا ٹھکانا تھی...... جہاں گوتم بدھ کے دوسری بار چوری شدہ مجسمے کو ایک خفیہ تہ خانے میں رکھا گیا تھا......

☆☆☆

میرے لیے یہ ایک چونکا دینے والا اور سنسنی خیز انکشاف تھا۔

اسپیکٹرم کے کئی ونگز مختلف اوقات میں بیک وقت اور ہمہ وقت سرگرم رہتے تھے۔ میری معلومات کے مطابق روڈلف یقیناً اسپیکٹرم کے فیلڈ اسکواڈ کو کا کوئی گروپ چیف ہو سکتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ وہی اسکواڈ تھا جس کی فعال رکن اور ورکر...... سوشیلا اور ریشام چھلگری بھی رہ چکے تھے۔ ان کا کام دنیا کے کسی بھی کونے سے نو دریافت شدہ اور بیش قیمت نوادرات کو چوری کر کے...... انہیں اسی ملک کے حوالے کرنا ہوتا تھا، تاکہ اسپیکٹرم کی ”شریفانہ“ ساکھ قائم رہتی اور اس کے لیے دنیا کے ہر ملک سے ”فارن فنڈنگ“ کے راستے کھلے رہتے۔

بڑی زیرک دماغی کے ساتھ میں نے سون کی بتائی ہوئی باتوں کا تجزیہ کر کے یہی حل نکالا تھا کہ عنقریب اسپیکٹرم کو ایک عالمی سطح پر اس کا اصل مکروہ چہرہ بے نقاب کرنے کا خاطر خواہ موقع مل رہا تھا۔ لیکن درمیان میں کاسپاکو کی ٹیڑھ آڑے آئی تھی، اگرچہ کاسپاکو کو ٹھکانے لگانا اب میرے لیے چنداں مشکل نہ تھا لیکن مسئلہ میری امریکا روانگی کا تھا اور یہ راستہ اب کاسپاکو ہی میرے لیے آسان کر سکتا تھا۔ اسی لیے ابھی اس سے دوستی کی فضا کو جاری رکھنے میں میرا اپنا مفاد بھی تھا۔

میں نے اب نئے حالات و موقع محل کے مطابق سون کو کچھ ضروری ہدایات دیں، اسے کچھ سمجھایا اور پھر اس کی آزادی کا حکم دے ڈالا......

کاسپاکو کا ایک خاص کارپرداز جو میرے سارے احکامات بڑی خنداں پیشانی سے بجا لا رہا تھا۔ وہ ڈین چنگ نام کا ایک ٹھگنا آدمی تھا۔ میں نے اس سے یہی کہا تھا کہ مجھے سون کے سلسلے میں جو غلط فہمی ہوئی تھی، وہ اب رفع ہو چکی ہے۔ وہ حیران تو ہوا تاہم اس نے وہی کیا جو میرا حکم تھا۔ یوں بھی وہ کاسپاکو کے پاس تھا اور کاسپاکو نے اسے میری طرف سے یقیناً ”فری ہینڈ“ رہنے کا کہہ رکھا ہوگا۔ میں کاسپاکو پر اپنے ”اعتماد اور“ ”کارکردگی“ کی ایک اور مثال پیش کرنے کے لیے بے چین تھا لہٰذا ڈین چنگ کے ساتھ فوراً اس کے روبرو حاضر ہو گیا۔

وہ گوشہ...... جہاں کاسپاکو کا علاج ہو رہا تھا۔ اس محل نما رہائش گاہ کے عقب میں اُوپری منزل پر تھا۔

کاسپاکو بیڈ پر دراز تھا۔ وہاں ایک نرس موجود تھی۔ ین چنگ میرے ہمراہ تھا۔ اسے ڈرپ لگی ہوئی تھیں اور سم کے کئی حصوں پر پٹیاں اور بینڈیجز بندھی ہوئی تھیں۔ ی جلدی اس کی قدرے بہتر حالت کو دیکھ کر صاف اندازہ وتا تھا کہ یہاں ابتدائی طبی امداد کے سلسلے میں کاسپاکو نے اطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا تھا کہ کاسپاکو اس سلسلے میں خوش قسمت رہا ہو کہ ایک تو وہ دشمنوں کے حملے سے بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس کے زخم زیادہ گہرے یا مہلک نہ ہوں۔ بکہ بروقت اور جدید طبی سہولیات کا فوری حصول بھی اس یں کارفرما ہو سکتا تھا۔

وہ اس وقت بیڈ پر نیم دراز تھا اور اس کے سینے پر اسٹینڈ کے ذریعے ایک ٹرے رکھی ہوئی تھی جس پر فروٹ جوس اور سوپ تھا، وہ سوپ پینے میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھل اُٹھا۔

”کم...... کم آن...... مسٹر شہزادا بہادر اور جاں نثار آدمیوں کے سلسلے میں میرا انتخاب کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوا ہے، میں تمہیں بُلوانے ہی والا تھا۔“ وہ بولا۔

”سب سے پہلے میری مبارک باد قبول کریں مسٹر کاسپاکو!“ میں نے اس کی بات پر دل میں ہنستے ہوئے مگر ظاہر باادب ہو کے اس سے کہا۔

”نئی زندگی مبارک ہو۔ میں ایک اہم اور فوری معاملے کے سلسلے میں خود بھی آپ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔“

”دشمن نے ہمارے خلاف دھوکا دہی کی بڑی زبردست چال چلی ہے۔“ وہ فکرمندی سے بولا۔ ”اس قیمتی مجسمے کی چوری نے زخموں سے زیادہ میری کمر توڑ ڈالی ہے۔ لیکن ان کا آدمی ہماری گرفت میں ہے اور کتیا سون...... اسے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے والا ہوں۔ اس بچ نے دشمنوں سے ساز باز کر کے کاسپاکو کے قہر و غضب کو للکارا ہے۔“

”لیکن...... حقیقت اس کے برعکس ہے مسٹر کاسپاکو......!“ میں نے اچانک کہا اور وہ قدرے چونک کر الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”ہاں! مسٹر کاسپاکو! لیکن ابھی یہ وقت زیادہ تفصیلات میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے پتا چلا لیا ہے کہ وہ مجسمہ اس وقت کہاں اور کس جگہ پر رکھا ہوا ہے۔“

میری اس بات پر حسب توقع کاسپاکو کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ سوپ کا چمچ منہ کی طرف لے جاتے ہوئے اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

یہ لباس ہے دفتر آنے کا

”ک ک...... یہ کیا کہہ رہے ہو......؟ کک...... کیا واقعی تم نے ہمارے چھینے ہوئے نوادلے کا سراغ لگا لیا ہے؟“ وہ غیر یقینی لہجے میں بولا۔

”مسٹر کاسپاکو! اس سے پہلے کے دشمنوں کی بچی کچی تعداد پھر سے یکجائی اختیار کر لے، مجھے اسی وقت نکلنا ہوگا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا اور پھر کاسپاکو نے اسی وقت ڈین چنگ کو مجھ سے ہر طرح کے تعاون کی سختی سے ہدایات کر ڈالی۔

”میری کامیابی کی دعا کیجیے گا مسٹر کاسپاکو!“ بالآخر میں کرسی سے اُٹھتے ہوئے بولا تو اس نے کہا۔

”تمہارا یہ مجھ پر دوسرا بڑا احسان ہوگا۔ میرے جتنے آدمی اپنے ساتھ لے جانا چاہو لے جا سکتے ہو، اور ایک کارگو ٹرک بھی ہوگا۔ اس کے اندر کرین پہلے سے موجود ہوگی۔ مجسمہ اسی کارگو میں لوڈ کرنے کے بعد اسے ادھر ہی لے آنا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے اچانک کہا۔ کاسپاکو سمیت ڈین چنگ بھی میری طرف اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں آگے بولا۔

”گوتم بدھ کا یہ مجسمہ صرف قیمت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ یہاں کی سرزمین کے لوگوں کے لیے مذہبی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہی نہیں اسے بینکاک کی ایک معروف عبادت گاہ کے مندر سے چرایا گیا ہے۔ لہٰذا میں نہیں سمجھتا کہ اس کی چوری زیادہ عرصہ چھپی رہ سکتی ہے۔ بے شک اس

کی جگہ ایک ایسا ہی نقلی مجسمہ وہاں رکھ دیا گیا ہے۔''

''تو تم پھر کیا کرنا چاہتے ہو؟'' کاسپاکو نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''اس مجسمے کو واپس اسی جگہ رکھنا ہوگا۔ یعنی ان کے کھنڈرات میں۔''

''کیا......؟'' کاسپاکو کا منہ کھلا رہ گیا۔

''ہاں! مجھے دشمنوں میں اب اتنا دم نہیں رہا ہوگا کہ...... وہ دوبارہ اسے وہاں سے حاصل کرسکیں۔ نقطہ باریک ہے مگر اسے بڑے دھیان سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کا چیف جان روڈلف ہماری گرفت میں ہے۔ ہاں! اتنا ضرور کیا جاسکتا ہے کہ اس طرف خفیہ طور پر ہم اپنے مسلح آدمیوں کو نگرانی پر مامور کردیں۔''

''لیکن...... دشمن ناکامی کی صورت میں انتقامی طور پر شرارت کرسکتے ہیں۔ وہ مقامی انتظامیہ کو گمنام کال یا کسی اور ذرائع سے اس مجسمے سے متعلق مطلع کرسکتے ہیں۔'' ڈین چنگ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا تو میں نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔

''میں ان عوامل پر بھی غور کرچکا ہوں۔ یہ خدشہ اپنی جگہ سہی، لیکن اس کے ہونے میں صرف دس سے پندرہ فیصد چانسز ہیں۔ مجسمہ کا حصول ان کا بھی ایک اہم مقصد ہے۔ جس کی وہ تین چوتھائی رقم بھی ادا کرچکے ہیں۔ اس میں ان کا اپنا بھی نقصان ہوگا، ان سے بات کی جائے گی، ممکن ہے وہ...... اب شریفانہ سودے بازی پر اُتر آئیں یا پھر جان روڈلف ان کی پارٹی سے تعلق ہی نہ رکھتا ہو یا پھر اس کی نیت میں فتور آگیا ہو۔''

''تمہارا خیال ہے کہ ہمیں مذکورہ پارٹی سے بات کرنی چاہیے۔'' کاسپاکو نے خیال آرائی کی۔

''ہاں! یہ بات آپ کریں گے اور پہلے شکایتاً یہ سب بتانے کے بعد دیکھتے ہیں کہ کیا حقیقت سامنے آتی ہے؟''

''میں سمجھ گیا تمہاری بات...... تم فوراً روانہ ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ دشمن کوئی اور حربہ استعمال کریں۔'' کاسپاکو جلدی سے بولا۔ ''انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ معاملہ خراب ہوگیا ہے وہ جتنے بھی ہوں گے، میرا نہیں خیال کہ ان کی تعداد زیادہ ہوگی۔''

اگلے پندرہ منٹوں کے اندر اندر میں ڈین چنگ اور کاسپاکو کے تقریباً پندرہ مسلح آدمیوں کے ٹولے سمیت مختلف گاڑیوں میں سوار آندھی طوفان کی طرح...... ٹل ٹاپ کی طرف رواں دواں تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب وہاں کی کیا صورتِ حال سکتی تھی؟ تاہم میں نے ابھی کاسپاکو کو یہ حقیقت بتا ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ روڈلف کا تعلق وزیر جان کے سے تھا یا وہ مجسمہ اسی کی رہائش گاہ کے ایک خفیہ تہ خانے رکھا گیا ہے۔

ٹل ٹاپ پہنچتے ہی ہم نے وزیر جان فوکٹ والے ٹھکانے پر خاموش کمانڈو ایکشن کیا۔ وہاں دو تین افراد سے ہمارا ٹکراؤ ہوا بلکہ ٹکراؤ کیا ہوا...... ان تینوں ہتھیار ہی ڈال دیے۔ ڈین چنگ اور اس کے ساتھی موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہتے تھے، لیکن...... میں بلاوجہ کی خون ریزی پھیلانا ضروری نہیں سمجھا۔ ہم سیدھا خفیہ تہ خانے کا رخ کیا۔ یہ وہی تہ خانہ تھا جہاں روز پہلے مجھے یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔

وہاں یہ عظیم الشان گوتم بدھ کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی چند ثانیوں کے لیے مسحور سا ہوگیا۔ مجسمہ تھا، چمکتے ہوئے سونے کا ایک چھوٹا پہاڑ سا نظر آتا تھا۔ وا چھوٹا کارگو ٹرک ہمارے ساتھ تھا۔ آہنی ٹرالی کے ذر کرین اُتاری گئی اور پھر اسے اندر لے جایا گیا۔ تہ خا سے باہر کارگو ٹرک تک اس مجسمے کو نہایت رازداری سے ساتھ لایا گیا اور لوڈ کرنے کے بعد ہم نے وہاں کھنڈرات کا رخ کیا۔

وہاں پہنچتے ہی اسے اسی کھوہ میں ڈال کر اُوپر مٹی کا ڈھیر جمادیا۔ واپس لوٹنے کے بعد ہم نے کاسپاکو کو یہ خبر سنائی تو وہ اس کے فکرمند چہرے پر یکلخت بشاشت دوڑ گئی۔ اس نے اپنے چپٹے چہرے کی باچھیں پھیلا کر دونوں ہاتھ آگے پھیلا دیے۔ وہ بیڈ پر ہنوز نیم دراز تھا اور میں اس کے گلے ملا۔

''مسٹر شہزادا تم نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ میں ساری زندگی تمہارا یہ احسان نہیں بھلا سکتا۔''

''احسان کی کیا بات ہے جناب! جب آپ کا دم بھرا ہے تو اسے نبھانا تو پڑے گا ہی۔'' میں مسکرا کر بولا۔ اس وقت سانچی وہیں قریب ہی اس کے بیڈ کے پائتی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے گاہے بگاہے چبھتی ہوئی نگاہوں سے گھورے جارہی تھی۔

''مسٹر کاسپاکو!'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کی مذکورہ پارٹی سے کوئی بات ہوئی؟''

''ہاں! میں وہی تمہیں بتانے والا تھا۔'' وہ ایک دم بولا۔ ''مسٹر جوشوا سے میری بات ہوئی تھی۔ تمہاری والی

درست تو ثابت ہوئی ہے۔ لیکن...... مجھے اب بھی اس وفابازی کی بو آتی ہے۔ اس نے صاف کہہ ڈالا کہ لف کی نیت میں فتور آگیا ہوگا اس لیے وہ اب تمہارا مجرم اور ہم اس کے ساتھ کچھ بھی سلوک کرسکتے ہیں۔''

''روڈلف کے ساتھ کیا کیا آپ نے......؟'' میں فوراً کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''میں اس کی موت کے احکامات جاری کرنے والا اور سون بھی اس کے ساتھ ہی مرے گی۔'' کاسپاکو ہایت سفاکانہ لہجے میں بولا۔

''نہیں جناب!'' میں نے فوراً اس کی طرف دیکھتے ئے کہا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

''مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے۔''

''شکریہ جناب!'' میں نے بھی جواباً خفیف سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''دراصل میں کسی ی حالات اور ایسے معاملات میں جلد بازی سے کام نہیں لیا کرتا۔ بالخصوص جب ہمارا مجرم ہماری گرفت میں ہو تو اسے ٹھکانے لگانے سے پہلے چند دوسرے عوامل پر غور کرنا...... ری ہوتا ہے۔''

''گڈ...... مجھے تمہاری یہ عادت پسند آئی۔ شاید تمہاری حیران کن کامیابی کا یہی راز ہے کہ تم جلد بازی سے کام نہیں لیتے۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولا۔

''میں روڈلف سے ملنا چاہوں گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''شیور...... ڈین چنگ تمہیں اس خبیث سے ملوا دے گا۔'' وہ بولا۔

''جوشوا سے کسی نئی سودے بازی کی بات ہوئی؟'' یں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری ہریکا یاترا کا یہ معاملہ بھی نہ کھٹائی میں پڑ جائے جو تقریباً پڑ چکا تھا، تاہم مجھے ایک بات کی تسلی تو تھی ہی کہ کاسپاکو اب رے کسی مشورے کو رد نہیں کرسکے گا اور میں اسے سابقہ ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے رضامند کر ہی لوں گا۔

رے استفسار پر وہ بولا۔

''سودے بازی کے سلسلے میں وہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ ک اب بھی اس پر قائم ہیں لیکن ہمیں چوں کہ اب ان سے خطرات تھے اس لیے میں نے سب سے پہلے تو ان کی انہ کے طور پر دی ہوئی رقم کو ہرجانے کی مد پر لوٹانے سے صاف انکار کردیا اور اب نصف بیعانہ دینے کا تقاضا کردیا۔ مجسمہ پہنچانے کی ذمے داری بدستور ہماری ہی ہوگی۔''

کاسپاکو کی اس آخرالذکر بات پر میں نے بے اختیار دل ہی دل میں طمانیت کی سانس لی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے شہزی! کیا روڈلف نے واقعی اپنے ہی آدمیوں سے غداری کی تھی یا پھر جوشوا کی بات جھوٹ ہے......؟'' کاسپاکو نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد مجھ سے پوچھا۔

''سرِدست تو دونوں ہی باتیں ممکن ہوسکتی ہیں۔ میں روڈلف اور سون سے ایک ملاقات کروں گا اور اپنے طور پر ان سے کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

اس کے بعد ایک ذرا توقف کے بعد نہایت محتاط لہجے میں دوبارہ بولا۔

''سون کے سلسلے میں مجھے ایک شبہ ہے کہ وہ کسی غلط فہمی کے تحت نرغے میں آگئی ہے لیکن بہرحال میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے کاسپاکو کی طرف دیکھا تھا۔ میں سون کے سلسلے میں اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنا چاہتا تھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں روڈلف کے سامنے تھا۔ وہ ایک عجیب ساخت کی آہنی کرسی پر رسن بستہ حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کا سر کرسی کی پشت پر ٹکا ہوا تھا اور وہ اُوپر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں چونکہ کسی حد تک روڈلف کی اصلیت بھانپ چکا تھا اسی لیے ابھی میں اس پر ایسا کچھ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کمرے میں میری آہٹ پاکر بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ شاید منصوبے کی بُری طرح ناکامی نے اسے مایوس کرڈالا تھا یا پھر اندر سے توڑ ڈالا تھا۔ بہرطور...... اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے میں تھوڑا سا کھنکھارا بھی تھا۔ پھر بھی اس نے سامنے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی تو میں نے اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔

''مسٹر روڈلف!''

وہ شاید میری ہی آواز پر متوجہ ہوا۔ اس نے اپنا سر سیدھا کیا اور مجھے گھورنے لگا۔ تب ہی میں نے اس کی آنکھوں میں نفرت و غیظ کی لہر اُمڈتی محسوس کی تھی۔

''ہماری جوشوا سے بات ہوئی تھی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اُنہوں نے تم سے قطع تعلق کا اظہار کرڈالا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں ذرا رکا اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگا۔ جہاں مجھے خفیف سے اتار چڑھاؤ کا احساس ہوا تھا۔ میں آگے بولا۔

''اور تم جو بیعانے کی رقم لائے تھے، وہ بھی تمہاری بدعہدی کی وجہ سے ہرجانے اور جرمانے کے طور پر قطع کر لی گئی ہے۔ جوشوا نے تمہارے سلسلے میں مسٹر کاسپاکو سے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ یہ معاملہ ایک فرد کی بدنیتی کا ہے اس لیے اس عظیم سودے کو برقرار رکھا جائے، حتیٰ کہ وہ اب نصف رقم پیشگی دینے کو بھی تیار ہو چکا ہے۔''

''میرے سلسلے میں جوشوا کی آخری ہدایت کیا تھیں؟'' روڈلف نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''یہی کہ...... جو ہم چاہیں تمہارے ساتھ سلوک کریں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''میں تمہاری بات کا یقین نہیں کر سکتا۔'' جانے کیا سوچ کر وہ ایک دم بولا۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔ مجھے اس سے اسی جواب کی توقع تھی۔

''اگر تم یہ سمجھتے ہو تو پھر میں نے یقیناً کاسپاکو کے ان آدمیوں کو روکنے کی سخت غلطی کی جو اس کے حکم پر تمہیں اور سون کو گولی مارنے کے لیے آ رہے تھے۔''

میری اس بات پر روڈلف نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تمہیں بھلا مجھ سے اس قدر ہمدردی کیسے ہو گئی؟''

''اس لیے کہ میں سمجھ رہا ہوں تمہیں یوز کیا گیا ہے اور اب ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا گیا ہے۔'' میں نے لاجواب ہوتے بغیر فوراً کہا۔

''ایسا خیال میرے دل میں جوشوا سے بات کرنے کے بعد آیا تھا۔''

اس کے چہرے پر لمحہ بھر کو تاثر کی رمق ابھری تھی۔ بولا۔ ''اب مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟''

''فقط اتنا کہ...... مجھے حقیقت بتا دو، کیا تم واقعی اسپیکٹرم کے لیے کام کرتے ہو اور مزید یہ کہ تمہاری نیت میں فتور آیا تھا یا اس میں تمہاری تنظیم کے حکم کا دخل تھا؟''

میں نے دانستہ اسپیکٹرم کا ذکر اچانک اور عمومی انداز میں کیا تھا۔ حسب توقع وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

''جب تم ساری بات سمجھ ہی رہے ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ کاسپاکو اسپیکٹرم کی حقیقت نہیں جانتا۔ اس نے وزیر جان سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی، وزیر جان کے لیے سپاکو جیسے گینگسٹر ایک مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔''

''تم نے تو اسے ہلاک کر کے اپنے سینے کی آگ ٹھنڈی کر لی اور کاسپاکو کے دل میں بھی جگہ بنا لی ہے۔ تمہارا امریکا پہنچنے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، کہ عنقریب اسپیکٹرم کی ایک نئی کھیپ تمہیں اور کاسپاکو کو ٹھکانے لگانے کے لیے پہنچنے والی ہے۔'' اس کے لہجے میں اسپیکٹرم کے عہدے داروں والا غرور تھا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرے ''جھانسے'' میں نہیں آیا تھا۔

''اسپیکٹرم کے ہر عہدے دار کو یہی غرور ہوتا ہے۔ وزیر جان کو بھی یہی غرور تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن تم......'' کہتے ہوئے...... دانستہ جملہ اُدھورا چھوڑا اور ایک گہری ہنکاری خارج کر کے واپس لوٹنے لگا تو اس نے مجھے پکارا۔

''رکو مسٹر شہزاد......!'' اس کی آواز سُن کر میں پلٹا۔

''کاسپاکو سے میری جان چھڑا دو میں تمہیں عابدہ کے ایک اہم راز سے آگاہ کر دوں گا جس کا جاننا تمہارے لیے اشد ضروری ہے۔'' اس نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کر دیا۔

عابدہ...... میری زندگی کی ایک اہم حقیقت، میرے ہوش و حواس کا ایک اہم جزو...... میرے وجود کا ہی میرے دل اور روح کا ایک عنصر...... وہ کہاں کس حال میں تھی فی زمانہ میں اس سے نابلد تھا۔ عابدہ کے سلسلے میں جانتا، صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ اسپیکٹرم کا ہی نہیں بلکہ اس ونگ کے ایک ایسے اہم رکن یا عہدے دار کی حیثیت رکھتا تھا جو بالخصوص میرے اور عابدہ کے خلاف ایک کاز مصروفِ عمل تھے۔ یہ سچ تھا کہ میں ہنوز عابدہ سے تازہ کار حالات و ہیت سے واقف نہ تھا اور نہ ہی تب تک آنسہ خالدہ کے سلسلے میں کچھ پتا تھا کہ وہ کہاں اور حال میں تھی۔

روڈلف...... مجھے عابدہ سے متعلق کسی تازہ حالات سے ''اَپ ڈیٹ'' کرنا چاہتا تھا تو اس سے تھوڑی دیر لیے قطع نظر ہو کے سوچتا تو یہ بات واضح ہوتی تھی کہ روڈلف کو بہکانے میں کامیاب رہا تھا جس کا ثبوت یہی تھا کہ وہ مجھ سے ایک طرح اپنی جان بچانے کی بھیک مانگ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''دیکھو روڈلف! عابدہ اور مجھ سے متعلق یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ...... اسے امریکن سی آئی اے بالخصوص باسکل ہولارڈ کے چنگل سے چھڑانے کے لیے ہی امریکا روانگی کے لیے کر

لیکن میں نہیں جانتا کہ اس وقت عابدہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ آیا زندہ بھی ہے یا نہیں۔ تم اگر اس سے متعلق مجھے کوئی معلومات بہم پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہو جو سچ ہو اور اس سے میں کوئی فائدہ بھی اٹھانے کی پوزیشن میں ہوں تو پھر میرا ابھی تم سے یہ وعدہ ہے کہ میں نہ صرف تمہیں کاسپاکو کی سفاکیت سے بچا لوں گا بلکہ...... گوتم بدھ کے بیش قیمت مجسمے کے سلسلے میں بھی تم سے دن مین شو اپ کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ میں وہ چوری شدہ مجسمہ سون کی مدد سے بازیاب کروا چکا ہوں۔ وہ اب دوبارہ کاسپاکو کے قبضے میں آ چکا ہے، جسے میں نے ہل ٹاپ کے پیلس سے جو وزیر جان کی رہائش گاہ تھی، کے خفیہ تہ خانے سے حاصل کیا ہے۔''

میں نے بھی اپنے تئیں اس کی سماعتوں میں دھماکا کر دیا مگر وہ اس کے لیے زیادہ متاثر کن ثابت نہ ہوا۔

''مجھے تمہاری زیرک دماغی اور شاطر مزاجی کا پہلے ہی اندازہ تھا کہ تم سون کو چالاکی سے شیشے میں اُتار لو گے۔''

''بس! اب مقصد کی بات کرو، وقت کم ہے۔ تاکہ ہم ایک دوسرے کے مفادات کے لیے کام کر سکیں۔'' میں نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا تو وہ بولا۔

''حقیقت یہی ہے کہ...... اس میں چیف ماسٹر لولوش کا دخل تھا کہ گوتم بدھ کے مجسمے کو دھوکے سے غصب کیا جائے۔ جوشوا...... اسپیکٹرم کے ''فیلڈ اسکواڈ'' ونگ کا چیف ہے۔ اس کا کام دنیا بھر کے ممالک سے ایسے نوادرات چوری کرنا ہے۔ انہیں مسروقہ قرار دے کر لوٹتا ہے اور اپنی عالمی مارکیٹ اور فنڈنگ میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں وہ نہ صرف ان کی اصل مالیت سے زیادہ دولت...... عالمی فنڈنگ کماتا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا خاموش ہوا اور پھر بولا۔

''اسپیکٹرم کا یہ بھی وتیرہ رہا ہے کہ جہاں اس کے مفادات میں ذرا بھی ضرب پڑتی ہے۔ وہ اپنے کارکنوں اور ساتھیوں کی زندگیاں بچانے کے بجائے انہیں بھی داؤ پر لگانے سے دریغ نہیں کرتا۔ قربانی کے بکرے عموماً نچلی سطح کے کارکنوں کو ہی بنایا جاتا ہے اور اسے خفیہ رکھا جاتا ہے۔ جو کارکن اس سے واقف ہیں وہ اسپیکٹرم سے فرار چاہتے ہیں لیکن کبھی کامیاب نہیں فرار ہو پاتے، انہیں فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اس لیے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ خفیہ سودے بازی کیسے کروں، میرے لیے دونوں طرف ہی موت ہے۔

لباس بے ہودہ اور سستا ہے مگر تم پر بہت سج رہا ہے

روڈلف کی بات نے میرا دل دھڑکا دیا۔ وہ مکمل طور پر میرے ٹرانس میں آ رہا تھا، میں جس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا وہ ہو چکی تھی۔ یعنی اس دغابازی کا اصل کُل اسپیکٹرم کے فیلڈ اسکواڈ جوشوا کا ہی کھلایا ہوا تھا، چہرہ بے نقاب ہونے کے بعد انہوں نے نہ صرف اپنے ساتھی روڈلف کو قربانی کا بکرا بناتے ہوئے یہ کہہ کر اس سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا تھا کہ یہ اس کا اپنا فتورِ نیت تھا۔ بلکہ وہ...... نصف رقم بھی دینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ یوں کاسپاکو کو وہ اپنے ایک ساتھی کی قربانی دے کر بہ آسانی بے وقوف بنا چکے تھے، لیکن میں ان کی یہ چال سمجھ چکا تھا۔ اسی سبب میں نے روڈلف کی کمزوری سے کھیلتے ہوئے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش چاہی تھی جو خاصی کامیاب ثابت ہو رہی تھی۔

میں نے روڈلف سے کہا۔ ''دیکھو روڈلف! گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے اور یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو، میں اسپیکٹرم کے بخیے اُدھیڑ ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔ تم نہیں جانتے شاید کہ اسپیکٹرم کی ایک شاخ جو پاکستان میں ایک پڑوسی دشمن ملک کے دیرینہ مقاصد کے کاز کے لیے کام کر رہی تھی' میں نے اس کا صفایا کر دیا، اسپیکٹرم کے ایک اہم اسٹیشن چیف وزیر جان جو لولوش کا قریبی ساتھی جانا جاتا ہے، اس کا پیچھا کرتا ہوا تھائی لینڈ آن پہنچا اور یہاں اسے عبرت ناک انجام سے دوچار کیا۔ میں تن تنہا اسپیکٹرم جیسی عالمی تنظیم کے خلاف علم بلند کیے ہوئے ہوں۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو میرے پاس اس

تنظیم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے ایک ٹھوس لائحہ عمل تیار ہے۔"

"کیسا لائحہ عمل......؟" وہ ایک دم بولا۔

"وقت آنے پر سب بتا دوں گا۔ لیکن ابھی تمہیں کاسپا کو کے شکنجے سے آزاد کرانا ضروری ہے۔ مجھے پہلے اس سلسلے میں منصوبہ بندی کرنا ہوگی جو میں کرلوں گا۔ تم مجھے عابدہ سے متعلق کچھ بتانے والے تھے؟"

وہ بولا۔ "عابدہ کو کوران کی جیل سے غائب کردیا گیا ہے۔ وہ اب جے بی سی والوں کے قبضے میں ہے۔"

"کیا......؟" میں اُس کے اس انکشاف سے سرتاپا لرز اُٹھا۔

"ہاں! یہ کام ٹائیگر ٹیک کے سی آئی اے چیف باسکل ہولارڈ نے کیا ہے۔"

"مگر کیوں......؟ عابدہ کو جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کے حوالے کیوں کیا ہے؟" میں نے جیسے لرزتے دل سے سوال کیا۔

"اس کا مجھے علم نہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ اسے اپنے کسی خفیہ اور اہم مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔" روڈلف نے جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔

"لیکن تمہیں عابدہ کے بارے میں ان باتوں کا علم کیسے ہوا؟ جبکہ تمہارا اس ونگ سے کوئی تعلق ہی نہیں؟"

"بے شک میں فیلڈ اسکواڈ سے متعلق ہوں لیکن جسمے کے سلسلے میں مجھے بینکاک میں وزیر جان کے قریب رہنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ اسے میں نے ماسٹر چیف (لولوڈش) سے ٹیلی فونک گفتگو کرتے اکثر سنا تھا۔ وہ تمہاری طرف سے ایک بہت بڑی "ٹینشن" رکھے ہوئے تھا اور ماسٹر چیف سے عابدہ کے سلسلے میں یہی کہتا تھا کہ عابدہ اس کے دشمن یعنی تمہاری ایک بڑی کمزوری ہے۔ وہ لاشعوری طور پر تم سے بے حد خوف زدہ رہتا تھا۔ اس سلسلے میں جب ماسٹر چیف نے وزیر جان کو بتایا کہ وہ عابدہ کو مکمل طور پر ٹائیگر ٹیک (باسکل ہولارڈ) کے حوالے کرچکا ہے، لہٰذا اب عابدہ پر ان کا (اسپیکٹرم) کا کوئی تصرف نہیں رہا ہے، تو وزیر جان نے ماسٹر چیف کی اس بات سے سخت اختلاف کیا تھا کہ شکار ہمارا اور اس کا فائدہ دوسرا کیوں اُٹھائے تو مسٹر چیف نے وزیر جان کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے تم سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیز ماسٹر چیف نے اب وزیر جان کو تمہارے قتل کا نہیں بلکہ اغوا کا پلان دے رکھا تھا۔ وہ تم سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز اپنے نام لکھوانا چاہتا تھا" اتنا بتا کر خاموش ہوگیا۔

میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہا۔ وہ پھر بولا۔ "تمہارے ذہن میں ایسا کیا پلان ہے؟"

"تم بس میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرو، باقی مجھ پر [illegible] دو لیکن جیسا میں کہوں اب ویسا ہی تم کو کرنا ہے۔" [illegible] ہوئے میں اسے کچھ ضروری ہدایات دینے لگا۔ وہ میرا [illegible] سن کر ایک دم متحیر سا ہوگیا۔ اس کے چہرے پر تاز [illegible] طاری ہوگئی۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا لیکن [illegible] باتیں سننے کے بعد اس میں ایک دم زندہ رہنے کی [illegible] جاگ پڑی تھی۔ فوراً دل گیر لہجے میں بولا۔

"بائی گاڈ......! میں تمہارا پورا پورا ساتھ دینے [illegible] ہوں مسٹر شہزی! یقین کرو میرا۔ میں ایک حسین اور [illegible] محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بھی ہوں اور چھوٹے [illegible] باپ بھی۔ اپنے مرنے کا مجھے افسوس نہ تھا کیونکہ میں [illegible] بیوی بچوں کے لیے بہت کچھ چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن [illegible] باتوں نے میرے اندر زندہ رہنے کی تمنا جگادی۔ [illegible] بیوی اور بچوں کو دوبارہ دیکھنے کی چاہ نے مجھے مجبور کر [illegible] کہ میں تمہارا پورا ساتھ دوں۔ تمہاری پلاننگ [illegible] پوری طرح مطمئن ہوں اور اس کی کامیابی کے [illegible] دعا گو رہوں گا۔"

میں نے مسکرا کر اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

میں اسپیکٹرم کی قبر کھودنے اور عابدہ کو بچانے [illegible] اپنی امریکا روانگی کا ایک کامیاب مشن تکمیل تک [illegible] والا تھا۔ اب بس کاسپا کو کو...... مطمئن کرنا تھا جو میر [illegible] چنداں مشکل نہ تھا۔ کیونکہ کاسپا کو جیسے جلاد صفت [illegible] میں اپنی مٹھی میں کرچکا تھا۔

میں مطمئن ہوکر واپس پلٹا اور جیسے ہی دروا [illegible] پہنچا تو اچانک ٹھٹک کر رک گیا۔ دروازہ ایک د [illegible] سامنے کاسپا کو وہیل چیئر پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کے دا [illegible] دو مستعد ہرکارے بھی کھڑے مجھے گھورتے محسوس [illegible] تھے، جبکہ کاسپا کو کے ہاتھ میں خوفناک نال والا [illegible] جس کی نال کا رخ میری جانب اُٹھا ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

لمحۂ آخر

شبنم شفیق

سائنس اور عقل دونوں کا سفر ساتھ چلتا ہے... سائنس داں اپنی عقل کی بدولت ہی نت نئی ایجادات کرتے رہتے ہیں... ان سائنسی ایجادات کا تعلق انسان کے مفاد سے جڑا ہوتا ہے... مگر کچھ منفی رجحان کے مالک ...... تخیل پرستوں کے نزدیک ذاتی مفاد زیادہ اہم ہوتا ہے... مجرمانہ ذہنیت کے حامل ایک ایسے ہی شخص کی ذہنی اختراعات کا عملی مظاہرہ...

ایک ہی مشن پر کئی سمتوں سے کام کرنے والوں کی ملی جھگت......

وہ سراپا قیامت تھی تو وہ ایسی قیامت کا قدردان۔ اگرچہ حُسن کی کوئی انتہا نہیں ہوتی لیکن لگ رہا تھا کہ آج حسن بھی اپنی بینائی کھو چکا ہوگا۔ وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی جرأت پر حیران بھی تھا۔ اس کے چار عدد بجتے کتے باڈی گارڈز کی موجودگی میں بھی وہ جس طرح اس کے ساتھ لفٹ میں داخل ہوئی تھی،

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سسپنس اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 46

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلا، اس سے ساتھ تھا۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، شفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری رخ پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نوودلتیا سیٹھ نوید ساتھیے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو تکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں ایک وقت اسپیکٹرم اور بلیو تکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو تکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو تکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو تکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی بن کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرادی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی بازیابی کے لیے سی جی بھوانی کو تاراج کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور وہ اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر ناراتھو انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نامی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید ساتھیے والا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سائیمی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپا کوکا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپا کوکے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپا کو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرالیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپا کو نے شہزی کا انتخاب کیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موت...... یعنی موت کے تصور سے میرا پورا وجود لرز کر رہ گیا۔

اب تک تقدیر نے جہاں میرے کام سنواریں ہیں تو وہیں غیر متوقع طور پر کچھ کام بگڑ بھی گئے ہیں۔ بھانت بھانت کے خطرناک اور ایک سے ایک جفادر دشمن میرے راستوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح دانت نکوسے اچانک آن کھڑے ہوتے تھے۔ کبھی وہ مجھے بچھاڑتے تو کبھی میں انہیں دھول چٹا دیتا۔

دگرگوں حالات سے میرا چولی دامن کا ساتھ ہو چکا تھا۔ لیکن امریکا یاترا کے لیے میری پاکستان سے لے کر یہاں تک کتنی ہی کوششیں تھیں جو بارآور ثابت ہوتے ہوتے بیکار ہوتی چلی گئیں۔ اب جبکہ آخری امید کاسپاکو کے ذریعے کچھ بنتی نظر آئی تو یہ اچانک عجیب تیوروں کے ساتھ پستول ہاتھ میں لیے آن وارد ہوا تھا۔ شاید اس نے ہماری باتیں سن لی تھیں۔

"یہ لو...... تمہارا کام ختم ہو گیا ہے تو اسے گولی مار دو...... یہ اب ہمارے لیے بے کار ثابت ہو چکا ہے۔" تب ہی اچانک اس کی نظر جان روڈلف کے زخمی ہاتھ پر پڑی (میں نے پہلے اس کے زخمی ہاتھ کی ڈریسنگ وغیرہ کرا دی تھی)

"اوہ...... تم نے اس کی مرہم پٹی کروا دی؟ کیا ضرورت تھی اس کی؟ اسے گولی مار دو......"

دفعتاً کاسپاکو میری طرف دیکھ کر ہنسا اور بے اختیار میرے سینے میں اٹکی ہوئی سانس کسی طائرِ آزاد کی طرح جیسے پھڑپھڑاتی ہوئی نکلی۔ ورنہ تو میں یہی سمجھا تھا کہ شاید اب ایک بار پھر میرا کھیل بگڑ گیا ہے۔

"ابھی نہیں باس......!" میں نے جواب میں کاسپاکو کی طرف دیکھ کر پوری تسلی سے مسکرا کر کہا۔ اس کے لیے "باس" میرے منہ سے یونہی... نہیں نکلا تھا...... وہ محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا لگا تمہارا مجھے باس کہنا۔ خیر جیسے تم مناسب سمجھو، میرا ایک مہمان آنے والا ہے، میں یہاں تک اس سے ملنے آیا تھا۔"

پستول اس نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ہرکارے کو تھما دیا۔ "تمہاری بات چیت ختم ہو گئی ہے تو تم بھی آ جاؤ۔" اس کے بعد یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی خودکار وہیل چیئر کے لیور کو گھمایا۔ میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

ہم باہر نکل آئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔

"سون کے سلسلے میں کیا، کیا تم نے؟" اس نے چلتے چلتے پوچھا۔ وہ علاج والے گوشے سے اب یہاں آ چکا تھا۔

"وہ اس سارے معاملے میں بے قصور ہے۔" میں اندر سے ڈرتے ڈرتے مگر محتاط سے لہجے میں بولا۔ میں اس کی چیئر کے متوازی چل رہا تھا۔ ہم ایک چوڑی راہداری سے گزر رہے تھے۔

"تم شراب کو ہاتھ نہیں لگاتے مگر عورتوں کے معاملے ذرا نرم ہو، لگتا ہے سون تمہیں پسند آ گئی ہے۔" کاسپاکو نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔ "ورنہ میرے نزدیک ذرّے سے بھی شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"کچھ ایسی ہی بات سمجھ لیں۔" میں نے ذرا جھینپی جھینپی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ویسے باس! میں نے ان دونوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"کہاں؟"

"میں آپ کو ابھی اس کی پوری تفصیل سے آگاہ کرتا ہوں۔" میں نے جواب میں کہا۔

کچھ منٹوں بعد ہم ایک کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ ڈین چنگ اپنے ایک ساتھی ہرکارے کے ساتھ وہیں الرٹ کھڑا تھا۔ کاسپاکو کو سہارا دے کر چیئر سے آرام دہ صوفے پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ میں اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ سامنے کی گلاس ٹاپ والی میز پر لوازمات سرو کر دیے گئے تھے۔ کاسپاکو شغل کے دوران میں میری طرف تکنے لگا۔ اس کی نظروں کا مطلب بھانپ کر میں نے ہولے سے کھنکھار کر کہا۔

"مجسمے کی امریکا کی جانب ترسیل، اس اہم ترین مہم پر روانگی اور اس کے پسِ پردہ ہونے والے...... بیش قیمت سودے کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی ضرورت کے پیشِ نظر ہی میں نے جان روڈلف کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" اتنا کہہ کر میں لمحہ بھر کو رکا۔

"ہم...... میں سمجھ رہا ہوں۔" کاسپاکو واڈکا کا ایک تلخ گھونٹ معدے میں منتقل کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"جوشوا نے آپ سے جھوٹ بولا ہے کہ روڈلف والا معاملہ محض ایک شخص کی بدبختی پر مبنی ہے، جبکہ یہ ایک پوری سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کیا گیا تھا۔"

"ہم......" کاسپاکو نے ایک اور گھونٹ بھرا۔ اس کا چہرہ اندرونی اُبال سے پھر سرخ ہونے لگا تھا۔ "تو گویا جوشوا اپنی ناکامی کے بعد ہم سے دوبارہ دغابازی کا کھیل کرنا چاہتا ہے۔"

"یقیناً......!" میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"دیکھو شہزی! یہ مہم سراسر تمہاری جان کے رسک پر مبنی ہے اسی لیے میں نے یہاں تک کا معاملہ تمہاری صوابدید پر چھوڑ رکھا ہے۔ تم جیسے بہتر سمجھو۔ لیکن...... جوشوا یہ سب کیوں کر رہا ہے؟"

"اس لیے کہ جوشوا جیسے لوگوں کا کام ہی نوسربازی ہے۔" میں نے کہا۔ "جعل سازی دھوکا، فریب، فراڈ یہی کچھ کرتے ہیں یہ لوگ۔ نصف رقم ہمیں دینے کے باوجود بھی دھوکا ان کے لیے فائدہ مند ہی ثابت ہو گا کیونکہ بقول روڈلف کے جوشوا پہلے ہی سے خفیہ طور پر اور انتہائی رازداری کے ساتھ مہنگے گاہک تلاش کر چکا ہے۔ ان میں ایک عالمی تنظیم "اسپیکٹرم" بھی شامل ہے۔ آخر الذکر گاہک سے انہیں بہت زیادہ رقم ملنے کی اُمید ہے۔ لہٰذا روڈلف کو میں جوشوا سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ یوں بھی یہ ثانوی بات تھی۔ میں نے اسے جوشوا کے متعلق یہ بتایا کہ اس نے اپنے جس بددیانتی کے منصوبے میں اسے استعمال کرنے کی کوشش چاہی اور اب ناکامی کی صورت میں وہ اس سے لاتعلقی کا اظہار کر کے اپنا یہ سودا بچانا چاہ رہا ہے۔ وغیرہ۔"

"گڈ! چال تو تم نے اس کے ساتھ اچھی چلی ہے مگر روڈلف ہمارے کس کام کا ہے اب......؟" کاسپاکو نے پوچھا۔ اس کا سوال میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ میں نے کہا۔

"ہم اب جوشوا سے نہیں بلکہ اس کے گاہکوں سے براہِ راست سودا کریں گے جن سے ہمیں دھوکے کا کوئی خطرہ نہ ہو گا اور جوشوا سے دگنی رقم وہ ہمیں دیں گے۔ ہمارا یہ کام روڈلف آسان کرے گا۔" میں نے جواب دیا۔ کاسپاکو میری جانب غور سے تکتا رہا۔ میں مزید بولا۔

"جان روڈلف، ہمارے لیے جوشوا کے موٹی آسامی والے گاہک "اسپیکٹرم" کو ہمارے لیے ہائی جیک کرے گا۔"

"تمہارا منصوبہ نسبتاً شاندار اور سودمند ہے۔ مسٹر شہزادا!" کاسپاکو نے میری توصیف کی اور بولا۔ "روڈلف کو تو تم نے فٹ کر دیا یہ بتاؤ سون تمہارے اس منصوبے میں کہاں فٹ ہوتی ہے؟"

"وہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ایک حسین عورت کی سنگت...... بعض جگہوں پر خاصی آسانیوں کا سبب بنتی ہے۔" میں نے دانستہ اپنے لہجے اور مسکراہٹ کو معنی خیز بناتے ہوئے کہا۔

"ہوم م م......" کاسپاکو ایک گہری ہنکاری لے کر رہ گیا پھر بولا۔ "ڈین چنگ بھی تمہارے ساتھ ہو گا۔"

"بالکل۔" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "اس مہم میں، ہم چار افراد کافی ہوں گے۔ آپ بس ہماری امریکا روانگی کی مہم کا مکمل اور محفوظ بندوبست کر رکھیں۔"

"وہ سب پہلے ہی طے ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کے جواب میں اطمینان سے اپنا سر ہلا دیا۔

"ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔"

"ہاں! کہو۔"

"میرے کاغذات کے سلسلے میں اب جوشوا سے کوئی مدد کی امید نہیں کی جا سکتی جبکہ بینکنگ کے چند ضروری اُمور نمٹانے میں مجھے وہاں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا کیا، کیا جائے؟"

"نو پرابلم۔" کاسپاکو بولا۔ "میں تمہارے نام سے اپنی بینک اسٹیٹمنٹ شو کر کے فوری طور پر تمہاری انویسٹر کی حیثیت سے ملٹی پرپز ویزا تیار کرواتا ہوں۔ دنیا کے کسی بھی ملک کی ویزا پالیسی 'انویسٹرز' کے سلسلے میں بے حد آسان اور جلد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ...... پیسے کو ہر ملک سلام پیش کرتا ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ اس میں تمہارے اصل کوائف ہی کام کے ہوں گے، جعلی کام نہیں ہو سکتا اس میں۔"

"میرے پاس اپنے اصل کوائف ہی ہیں باس!" میں نے جواب میں کہا۔ "البتہ تھائی لینڈ کا میرے پاس ویزا اب شاید چند دنوں کا ہی رہ گیا ہو۔"

"کوئی پروا نہیں، میں یہاں کا کنگ ہوں۔ کاغذات ٹھیک ہیں تو سمجھو کام ہو گیا۔ تم آگے کا لائحہ عمل تیار رکھو، باقی مجھ پر چھوڑ دو، البتہ اپنے سفری کاغذات میرے حوالے کر دو۔"

میں نے اپنے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔ وہ اس نے تھائی زبان میں ڈین چنگ کے سپرد کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا بھی۔ اس نے فدویانہ انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

ساتھ ہی میں نے کاسپاکو سے اپنے اس خدشے کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ جوشوا یا اس کے ساتھیوں کی طرف سے دوبارہ حملے کا خطرہ بھی موجود ہے لہٰذا اس سلسلے میں وہ ضروری

اقدامات کر کے رکھے۔ اس کے جواب میں کاسپاکو نے بڑے غرور بھرے انداز میں مجھ سے یہی کہا تھا کہ...... میں اس بارے میں بے فکر رہوں...... وہ پہلی بار دھوکے میں ضرور مار کھا گیا تھا مگر اس بار ایسا نہیں ہوگا، اس نے اپنے مسلح آدمیوں کو ہر طرف ہائی الرٹ کر رکھا ہے۔ وغیرہ۔

ایک اور خدشے کے تحت میں نے کاسپاکو سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ...... میرا اصل نام ظاہر نہ ہونے پائے نہ ہی شناخت، کیونکہ جوشوا کا کسی نہ کسی حوالے سے...... وزیرجان سے تعلق رہا ہے۔ اگرچہ دونوں الگ الگ ونگ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔

کاسپاکو نے اس کی بھی حامی بھر لی۔ اس نے میرا نام جون تجویز کیا تھا اور مجھے انڈین نژاد ظاہر کیا تھا۔ اس کی ہدایت اس نے ڈین چنگ کو بھی کر دی تھی کہ وہ مجھے ان کے سامنے ''جون'' کے نام سے ہی پکارے۔

مجھے اب بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ آگے ہر گام پر میرے لیے خطرہ تیار کھڑا تھا۔ روڈلف کتنا میرا حامی بن چکا تھا اور اسپیکٹرم والوں سے کس حد تک متنفر تھا، یہ تو آئندہ کے حالات پر ہی منحصر تھا۔ لیکن جوشوا اور کاسپاکو کے درمیان مجسمے کے سلسلے میں جو سودا طے ہوا تھا، وہ دونوں گروپوں کی کمزوری تھا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ...... اب کسی قسم کی دغابازی اور دھوکے بازی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس صورت میں دونوں کو نقصان پہنچ سکتا تھا بلکہ دیکھا جاتا جوشوا کو زیادہ ہوتا، وہ مجسمے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا بلکہ...... اس کی وہ خطیر رقم بھی ماری جاتی جو اس نے نصف کی صورت کاسپاکو کو ادا کر دی تھی۔ لہٰذا اب دونوں پارٹیوں کا مفاد اسی میں تھا کہ باقی کا نصف سودا بھی خوش اسلوبی سے انجام پذیر ہو جائے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑی تشفی آمیز بات تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب...... ڈین چنگ کو کسی نے آ کر کان میں کچھ کہا جو اس نے اسی طرح ذرا جھک کر کاسپاکو کے کان میں بھی منتقل کر دیا۔ جسے سنتے ہی کاسپاکو نے فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

''میں اب اپنے کمرے میں چلوں گا۔ مجھے پاکستان میں مقیم اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فون پر کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

''ہام...... ٹھیک ہے تم جاؤ۔'' اس نے کہا اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ یہاں جو ٹیلی فون رکھا تھا اس میں ڈائرکٹ ڈائلنگ کی سہولت موجود تھی۔ اب میں بلا دھڑک اپنے ساتھیوں سے باتیں کر سکتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پاکستان میں زہرہ بانو سے رابطہ کیا۔

وہ میری آواز سنتے ہی بولی۔ ''شش...... شہزی! تت...... تم ٹھیک تو ہو ناں......؟ کک...... کہاں سے بول رہے ہو؟''

''سب ٹھیک ہے بانو! اور انشاء اللہ آگے بھی سب ٹھیک ہی ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ، وہاں سب ٹھیک تو ہے ناں، تم، اماں اور بابا کیسے ہیں؟''

''وہ سب ٹھیک ہیں، میں تو تمہارے بارے میں بڑی سخت تشویش میں مبتلا تھی اتنے دن سے...... ابھی تمہاری آواز اور خیریت سنی تو جان میں جان آئی ہے۔''

''اول خیر کیسا ہے؟''

''وہ تو تمہاری طرف سے پریشانی میں باؤلا ہوا جا رہا تھا۔''

''کبیل دادا اور شکیلہ کی امریکا سے کوئی تازہ ترین خیریت کی اطلاع آپ کو موصول ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی وہاں بالکل ٹھیک ہیں، پر تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔'' زہرہ بانو نے جواب دیا۔

''وہ کہاں اور کس کے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''انہوں نے اپنی جگہ بنا لی ہے، وہ چند دن وہاں سکون سے رہے ہیں لیکن شہزی! ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ ٹائیگر فیگ اور اسپیکٹرم کے ٹاپ ایجنٹ...... بھوکے بھیڑیوں کی طرح ان کے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تم ابھی تک کیا بینکاک میں ہی پھنسے ہوئے ہو؟''

مجھے اپنوں کی کسی حد تک خیریت کی اطلاع مل گئی تھی لیکن کبیل دادا اور شکیلہ کے سلسلے میں یہ سن کر مجھے گہری تشویش میں ڈال دیا تھا۔ سی آئی اے کا ونگ ٹائیگر فیگ جو باسکل ہولارڈ کی سرکردگی میں درپردہ جے بی سی کے مفادات کے لیے کام کر رہا تھا، جبکہ جے بی سی یہودی اور اسرائیل کی نو دریافت شدہ ایسی تنظیم تھی جس کا مقصد ہی ایک تھا یعنی یہودی اور گریٹر اسرائیل کے منصوبوں کو فروغ دینے کے ساتھ مسلم امہ میں انتشار اور فلسطین میں اپنے غاصبانہ قبضے کو یقینی بنائے رکھنا تھا اور جو بھی مسلم ریاست یا مملکت ان کے خلاف آواز اٹھائے، اسی ملک کو تخریب کاری اور مختلف حربوں سے انتشار کی زد میں لاتے رہنا تھا۔

یہی سبب تھا کہ مجھے پہلے ہی روز سے عابدہ سے متعلق یہی اندیشناک خیال پریشان کیے جا رہا تھا کہ یہودی لابی عابدہ کو اپنے کسی ناپاک مقاصد میں استعمال کرنے کی کوشش

کر سکتے ہیں۔

بہرحال...... میں نے زہرہ بانو کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ دنوں سے ایک مشکل میں پھنس گیا تھا مگر اب اس سے نکل آیا ہوں۔ میں زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ دعا کرتی رہنا... اپنا اور سب کا خیال رکھنا۔''

''اول خیر سے بات نہیں کرو گے؟''

''بہت جلد سب سے اور تفصیلی بات کروں گا۔'' کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں غسل وغیرہ کر کے تھوڑا فریش ہوا اور جیسے ہی باتھ روم سے باہر آیا تو چونک پڑا۔

☆☆☆

میرے سامنے سانچی کھڑی تھی۔ وہ نسبتاً بہتر نظر آ رہی تھی۔ اس نے مناسب لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے گندھے ہوئے تھے اور ان میں نیلے پیلے دیدہ زیب پھولوں کا ایک چھوٹا سا تاج لگا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ مگر آنکھوں میں وہی شکوے تھے جو ان کہے رہ گئے تھے۔

''تم......!'' میرے منہ سے فقط یہی نکلا۔ ''بیٹھو...... گی؟''

''نہیں، میں تم سے یہ پوچھنے آئی تھی کہ ہمارا پیچھا تم کب چھوڑو گے؟'' اس نے کہا۔ لہجہ اور آواز سرد تھی۔

''سوری! میں سمجھا نہیں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم یہاں سے کب جا رہے ہو، ہمیشہ کے لیے۔'' وہ بولی۔

''بہت جلد...... لیکن...... تمہیں کیا پریشانی ہے میرے یہاں ہونے سے؟'' میں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ ''میں نے تو تمہیں کوئی تکلیف نہیں دے رکھی ہے۔''

''تم نے مجھے جو تکلیف دینا تھی وہ دے چکے ہو، اب بھلا کیا کسر رہ گئی ہے باقی۔''

''میں نے......؟'' میرے لہجے میں حیرت تھی۔

''اتنے انجان مت بنو شہزی!'' وہ تلخ لہجے میں بولی۔

''آج جس ذلت بھرے مقام پر میں کھڑی ہوئی ہوں میں نے ایسی شرمناک زندگی کا کبھی تصور تک نہیں کیا تھا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''میں اس کی وجہ ہرگز نہیں ہوں، تم ایسا سمجھ رہی ہو تو یہ سراسر غلط ہے۔'' میں نے اسی طرح جواب دیا۔

''اس روز تم میری بات مان لیتے تو شاید ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ لیکن میں نے شاید تمہیں نیک مشورہ دے کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی جس کا خمیازہ آج مجھے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم خود بھی ایک کرمنل تھے اور اسی لیے کاسپاکو جیسے گینگسٹر سے تمہاری اچھی نبھ رہی ہے۔''

''وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''رہی بات تمہارا مشورہ نہ ماننے والی تو اگر میں یہ کہوں کہ میرے بجائے تم نے میرا مشورہ نہ مان کے ایک بھیانک غلطی کی تھی۔ تم اس زندگی سے خوش نہیں ہو تو چلی کیوں نہیں جاتیں۔ یہ کہو کہ یہاں کے ٹھاٹ باٹ والی زندگی نے تمہیں......''

''شٹ اَپ۔'' وہ غصے سے سرخ ہوتے ہوئے بولی۔ ''کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی! بہت جلد کاسپاکو سے دوستی تمہیں بھی مہنگی پڑ جائے گی۔'' اس کے لہجے میں دھمکی چھپی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ میری خوامخواہ ہی دشمن بن رہی تھی۔ میں نے اس سے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

''تم نے اپنی بات کہہ دی ہے تو یہاں سے جا سکتی ہو۔'' میں نے اسے دھتکارنا چاہا۔ اس کا چہرہ مزید بگڑ گیا مگر پھر اچانک اسے کیا ہوا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ میں حیران سا رہ گیا۔ سانچی کے اس انداز سے مجھے بے کسی و لاچارگی محسوس ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس پر ترس آیا۔ میں چند ثانیے تو اسی طرح ہکا بکا سا کھڑا رہا، اس کے بعد بولا۔

''سانچی! اپنے حالات کی تم خود ذمے دار ہو۔ اب رونا کیسا؟''

اس نے رونا بند کیا مگر ہولے ہولے سسکنے لگی اور اپنے چہرے سے ہاتھوں کا پیالہ ہٹا کر خلا میں گھورنے لگی پھر اسی انداز میں بولی۔

''شش...... شہزی! شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، مجھے اس روز تمہاری بات مان لینی چاہیے تھی مگر میں نے وہ سب تمہاری بھلائی کی خاطر ہی کیا تھا، اس میں میری نیک نیتی شامل تھی۔ مجھے تم ایک بے ضرر اور معصوم انسان لگے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ، جس نے اس روز نجانے کتنے بے گناہوں کو اپنی جان خطرے میں ڈال کر بچایا تھا۔'' بالآخر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ میں چند قدم اس کی جانب بڑھا اور...... پھر تشفی آمیز انداز میں اپنا ایک ہاتھ اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے ملائمت آمیزی سے بولا۔

''سانچی! اب جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ مگر بہتری کی اُمید ضرور رکھو اور خود کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔''

''میری تو اب یہاں سے روح ہی نکل سکتی ہے، وہ بھی مرنے کے بعد۔ میں نے تو کئی بار خودکشی کا بھی سوچا لیکن شاید میں اتنی بہادر نہیں ہوں۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کی بات سُن کر کہا۔

''دیکھو، یہ کام تمہیں بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ پہلے تم پیروں تک مگر اب تم گلے تک اس دلدل میں پھنس چکی ہو، لہٰذا میرا دوستانہ مشورہ یہی ہے تمہیں کہ اب...... صبر اور حوصلے کے ساتھ اچھے وقت کا انتظار کرو، مجھے یقین ہے ایک دن تم پھر سے اچھے دنوں کی جانب واپس لوٹ جاؤ گی۔''

میری بات سے اس کی کچھ تسلی ہوئی، کچھ نہیں ہوئی تاہم میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''موتو کہاں ہے؟ کیا اس سے تمہاری ملاقات ہوئی ہے؟'' میں نے دیکھا وہ اس بات پر تھوڑا چونکی۔ اس کی آنکھوں کی شام اور گہری ہوگئی۔ چہرے کی دھند بھی کچھ سوا ہوئی پھر اسی لہجے میں بولی۔

''وہ کاساپاکو کے خوف سے کہیں روپوش ہو چکا ہے لیکن مجھ سے اس نے رابطہ کیا تھا۔'' میں اس کی بات پر چونکا۔

''ویسے وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ میرے ساتھ وہ بھی زخمی ہوا تھا بلکہ اس کی حالت زیادہ نازک تھی۔''

مجھے اس کی بات سے تسلی ہوئی تھی کہ وہ سانچی اور موتو اب بھی ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔

''ہاں! وہ کچھ بہتر ہے، اس کی بہن فرنا ایک تربیت یافتہ نرس ہے۔ مجھے موتو نے ساری بات بتا دی تھی۔ تم دونوں ایک ساتھ جھگڑے میں زخمی ہوگئے تھے۔''

''اس نے بے وقوفی کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں رہائی دلا کر......؟'' سانچی کے لہجے میں طنز پوشیدہ تھا مگر میں نے اس کا بُرا منائے بغیر اس کی غلط فہمی دور کرنا چاہی اور بولا۔

''اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ مجھے اپنے کون سے مقصد کی خاطر رہائی دلا رہا تھا؟ بلکہ وہ رہائی کہاں تھی، وہ تو میرا سودا کر رہا تھا۔ مجھے ایک گڑھے سے نکال کر دوسرے گڑھے میں پھینک رہا تھا۔ وہ تو مجھے اچانک شبہ ہوگیا کہ وہ میرے ساتھ کوئی گیم کھیل رہا ہے اسی لیے میں نے ہاتھ ضروری سمجھا تھا۔''

''کچھ بھی سہی، تمہیں وہ فوکٹ پیلس کے تہ خانے سے نکال چکا تھا۔ بعد میں جب تم اس کی بہن فرنا کے گھر میں تھے تو تم اس کا ساتھ دیتے۔''

''میں ایسا ہی کرنا چاہتا تھا مگر دونوں بہن بھائیوں کی نیت میں فتور آگیا تھا، وہ مجھے دھوکے سے بے ہوشی کا ٹیکا لگا کر بے بس کر ڈالنا چاہتے تھے۔ کسی حد تک کامیاب بھی رہے مگر میں اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہا۔'' کہتے ہوئے میں نے ایک پُرغور سی نظر سانچی کے چہرے پر ڈالی اور بھویں سکیڑ کر سوال کیا۔

''میں نے تو سنا تھا کہ تم موتو سے بددل ہو چکی تھیں۔ کیونکہ وہ کاساپاکو جیسے کرمنل گینگسٹر کا ہرکارہ تھا۔ لیکن اب لگتا ہے تمہارا اس کی طرف سے دل صاف ہوگیا ہے۔ چلو، اچھی بات ہے۔ تم دونوں پھر سے ایک ہونے لگے ہو۔'' میری بات پر اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ پھر وہ جیسے یکایک لجاجت آمیز لہجے میں بولی۔

''پلیز! ہماری مدد کرو...... ہم دونوں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں فراموش کریں گے۔''

''بے شک فراموش کر دینا، میں اس کی پروا بھی نہیں کرتا، کیونکہ میں نیکی کر دریا میں ڈال..... کے مصداق ہی کیا کرتا ہوں، انسان تو منافق ہے وہ کسی کو کیا اجر دے گا۔ میں اجر کی توقع اسی واحد ذات پاک سے رکھتا ہوں یعنی اللہ...... انسان تو احسان کھا کے بھی دشمنی پر اُتر آتا ہے، ہمارے پیارے حضرت علیؓ کا قول مبارک ہے جس پر احسان کرو اس کے شر سے بچو۔''

میری بات پر سانچی کے چہرے پر ذرا ندامت اور شرمندگی کے تاثرات اُبھرے تھے۔ میں نے فوراً کہا۔

''میں وہ باتیں بھلا چکا ہوں لیکن خیر...... موتو اگر اس روز بددیانتی دکھانے کے بجائے مجھ سے صحیح مشورہ کرتا تو ہم دونوں مل کر کوئی بہتر صورت نکال لیتے۔ لیکن نہ تم نے میری بات مانی تھی نہ ہی موتو نے۔ اب مجھے بتاؤ بھلا میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟ میں تو خود کاساپاکو کے نرغے میں ہوں۔''

''کاساپاکو تم پر اندھا بھروسا کرنے لگا ہے۔ تم اس کے ساتھی تو نہیں ہو مگر اس کے اہم ترین ساتھی سے بھی آگے کی چیز بن چکے ہو اس کے لیے...... تم اس سے میری سفارش کردو کہ وہ مجھے آزاد کردے اور موتو کی بھی جان بخشی کر دے۔'' سانچی بولی۔

میں نے اپنے قریب...... بالکل قریب کھڑی سانچی کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ مجھے بالکل ایک معصوم سی بچی کی طرح لگی جو کہہ رہی ہو کہ اپنا کھلونا مجھے کھیلنے کو دے دو نا وہ میں تمہیں کھیل کر واپس کردوں گی۔ یا پھر شاید کاساپاکو کے ساتھ اتنی قربت کے باوجود وہ اس کی چنگیزی فطرت سے ابھی تک آگاہ نہیں ہوسکی تھی کہ وہ ہرنی ہو کے ایک خونخوار بھیڑیے سے بھلائی کی توقع رکھے بیٹھی تھی۔ جس کے مزاج میں ہی سفاکی اور بربریت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یوں تو مجھے بھی کاساپاکو سے اپنے لیے کسی التفات کی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ اس میں اس کا اپنا ذاتی اور دیرینہ مفاد کارفرما تھا جو نکل جانے کے بعد وہ میرا بھی جانے کیا حشر کرتا۔

بہرکیف میں پھیکے انداز میں بے اختیار مسکرا دیا۔

''کیا ہوا شہزی......؟'' اس نے پوچھا۔

''تم بالکل بچوں والی باتیں کر رہی ہو سانچی!'' بالآخر میں نے ہولے سے کہا۔ ''کاساپاکو سے کسی بھی قسم کے رحم یا نیکی کی توقع رکھنا بھی موت کے مترادف ہوگا۔ وہ شکار آزاد کرنے کے بجائے شکار مار گرانے کا عادی ہے۔ میرا تمہیں اب بھی وہی مشورہ ہے۔ اچھے وقت کی امید میں یہ برا وقت گزارتی رہو اور موتو کو بھی یہی تلقین کرو۔''

میری بات سُن کر اس کے امید بھرے چہرے پر اوس پڑ گئی۔ پھر وہ پلٹی اور مجھے اس کے ہولے سے سسکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے سے نکلتی چلی گئی۔

سانچی تو چلی گئی مگر مجھے ایک نامعلوم سی تشویش آمیز پریشانی میں ضرور مبتلا کر گئی۔ میں اب تک درست خطوط پر اپنے آئندہ کے ٹھوس لائحہ عمل پر بڑی کامیابی کے ساتھ سرگرم تھا۔ میری امریکا یاترا کے منصوبے متعدد بار بنے اور بگڑے تھے۔ اب ایک آخری جوا کھیلنے کا تقدیر نے مجھے ایک موقع اور دیا تھا جسے میں کسی بھی صورت میں گنوانا نہیں چاہتا تھا اور اب تک اللہ کا کرم تھا کہ سب ٹھیک جا رہا تھا۔ لیکن سانچی سے اس تازہ ملاقات اور بات چیت سے مجھے لگا کہ وہ اب اپنی موجودہ زندگی سے بیزار ہے۔ موتو سے اس کے خفیہ طور پر روابط تھے۔ دونوں اندر ہی اندر جانے کیا منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ مجھ سے ملنے کا مشورہ موتو نے ہی اسے دیا ہوگا۔

مجھے اب ڈر یہ تھا کہ کہیں دونوں عین وقت پر کوئی گل نہ کھلا دیں۔ کوئی ایسی گڑبڑ نہ پیدا کر دیں کہ میری امریکا یاترا والی مہم ایک بار پھر کھٹائی میں پڑ جائے۔ دل کو تسلی بھی تھی کہ بھلا یہ دونوں کیا کرسکتے تھے؟ کاساپاکو اتنا تر نوالہ نہیں تھا کہ ناکام عاشق کے اس جوڑے کی کسی سازش کا بہ آسانی شکار ہو جاتا۔ پھر بھی جانے کیوں سانچی اور موتو کے نئے عزائم جان لینے کے بعد میں مخمصے کا شکار ہو رہا تھا۔ نجانے یہ موتو...... جو پہلے بھی ایک بے وقوفی کر چکا تھا، دوسری بار بھی نہ کر بیٹھے اور اپنی محبوبہ سانچی کو الٹی سیدھی پٹی نہ پڑھا دے۔

اچانک ایک خیال یہ بھی آیا کہ کیوں نا...... میں کاساپاکو کو ان دونوں کے عزائم سے آگاہ کر ڈالوں؟ یا کم از کم اتنا تو اشارتاً کہہ ڈالوں کہ وہ سانچی سے محتاط رہے۔ جس کی مثال اب اس کے لیے کسی زخمی ناگن سے کم نہیں رہی تھی جو اس کی جلوتوں اور خلوتوں میں اس کے پہلو سے لپٹی رہتی تھی۔ مجھے اپنا یہ خیال خودغرضانہ لگا۔ اگر میں ایسا کر ڈالتا تو کاساپاکو سانچی کو کھڑے کھڑے گولی مار دیتا۔

میں نے ان خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور دل ہی دل میں یہی تمنا چاہی کہ سانچی کوئی ایسا ویسا بے وقوفانہ قدم نہ ہی اٹھائے۔

جان روڈلف کو میں شیشے میں اتار چکا تھا۔ ہم جلد سے جلد یہاں سے کوچ کر جانا چاہتے تھے۔ جبکہ میری ضمانت پر ہی کاساپاکو نے جان روڈلف کو بھی ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی اسی شرط پر کہ اگر اس نے پھر کوئی چالاکی یا بدعہدی دکھانے کی کوشش کی تو اسے بلادریغ گولی ماردی جائے۔

☆☆☆

بعد کے یہ چند دن مجھ پر بہت بھاری گزرے۔ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو جانے کا احتمال، انجانے اور وسوسہ انگیز خدشات لگے ہونے کا دھڑکا لگا رہتا تھا مگر شکر تھا کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔

میرے کاغذات بھی بن کر آگئے تھے۔ اب یقیناً منزل تک پہنچنا ناممکن نہیں رہا تھا۔

وہ بینکاک کی ایک خوشبوؤں بھری فضا کی خوشگوار صبح تھی۔ پورے تھائی لینڈ میں اس روز شاید ''فلاور ڈے'' تھا جو بڑے جوش و خروش سے منایا جا رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے تھائی لینڈ کے لوگ مجھے امریکا بڑی تمناؤں اور اچھی یادوں کے ساتھ رخصت کرنے والے ہوں۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ آج ہر کسی نے پھولوں کا بوکیٹ نہیں تو ایک عدد پھول ضرور ہاتھ میں تھام رکھا ہوگا۔ غرضیکہ بچہ، بوڑھا ہر ایک نے اپنے ہاتھ میں ایک عدد پھول سجا رکھا تھا۔

منصوبے کے مطابق ہماری سب سے پہلے روانگی کوماتگو کے جزیرے تک تھی جس کے مطابق ہمیں سہ پہر کو

روانہ ہو جانا تھا۔ تیاریاں مکمل کر لی گئی تھیں۔ سون اور جان روڈلف اندر سے بے حد خوش تھے کہ انہیں آزادی مل رہی تھی۔ دونوں ہی میرے... شکرگزار تھے۔

جان روڈلف کے سلسلے میں مجھے کافی حد تک تسلی تھی کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ کیونکہ میں نے اس کی اس وقت جان بچائی تھی جب اس کے اپنے ساتھی اسے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے موت کے دہانے پر چھوڑ چکے تھے۔ وہ بیوی بچوں والا بھی تھا اور انہیں دیکھنے کی دوبارہ تمنا میں نے ہی اس کے دل میں جگائی تھی۔

اسپیکٹرم کے بیشتر رکن (تربیت یافتہ ایجنٹوں کو چھوڑ کر) لولووش کی انہی غلط پالیسیوں کے سبب ماضی میں بھی اس سے متنفر ہوتے رہے تھے، جن کی مثالیں بھری پڑی تھیں مگر تنظیم نے اپنی روش پھر بھی نہیں بدلی تھی۔ روڈلف بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ اگرچہ اسپیکٹرم کے تربیت یافتہ ایجنٹ گروپ سے تو تعلق نہیں رکھتا تھا مگر سائنٹ ونگ کا ایک فعال رکن ضرور تھا۔

کاساپاکو جیسے سفاک آدمی کے خوفناک پنجوں کی گرفت سے نکلنے کا تصور ہی سون اور بالخصوص روڈلف کے لیے جانفزا تھا۔

ٹھیک تین بجے ہمیں کاساپاکو کی رہائش گاہ سے کوچ کر جانا تھا۔ دو بجے تک میں اور کاساپاکو لنچ وغیرہ سے فارغ ہو گئے۔ چائے کافی کا دور چل رہا تھا۔ سانچی حسبِ سابق اس کے پہلو میں دبکی ہوئی تھی اور میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور نجانے کیوں اس کی طرف... دیکھ کر میرے دل کو ایک عجیب سی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی مجھے دو ایک بار چور سی نگاہوں سے تکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی... یا پھر شاید یہ میرا واہمہ تھا جس کی وجہ اس روز میری اور اس کے درمیان ہونے والی ملاقات تھی۔

ہم جیسے ہی چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے اور روانگی چاہتے تھے کہ اچانک کاساپاکو کے کسی ساتھی نے آ کر اسے کوئی اطلاع دی۔ جسے سن کر کاساپاکو کے چہرے پر اچانک ایک رنگ سا ہو کر گزر گیا اور اس کی بے اختیار کچھ سوچتی ہوئی سی نظریں میری جانب اٹھی تھیں جبکہ میری اس کے قریب کھڑی سانچی پر...... مجھے اس کے حسین چہرے پر ایک لمحے کو زہر سا ٹپکتا محسوس ہوا۔ اس کے ہونٹ میری نظر پڑتے ہی تھوڑے سے بھیدوں بھرے انداز میں وا ہوئے تھے۔ جیسے کہہ رہی ہو...... ''اب بچ کے دکھاؤ۔''

''کیا ہوا باس؟ خیریت تو ہے ناں......؟'' میں نے بالآخر اس اعصاب شکن تجسس کو توڑنا چاہا۔

''سب ٹھیک ہے، پریشانی کی ضرورت نہیں۔ وہ پولیس ڈپارٹمنٹ کا مقامی چیف آیا ہے۔ اس کے پاس سرچ وارنٹ ہے۔ دو گاڑیاں بھی اس کے ہمراہ ہیں۔'' اس نے بتایا اور میں اپنی جگہ سُن ہو کے رہ گیا۔

''تم کیوں پریشان ہو گئے؟ کہا ناں...... ڈونٹ وری......'' وہ میرے چہرے کا شاید بدلتا ہوا رنگ بھانپ کر دوبارہ بولا۔

''پولیس کیوں آئی ہے؟'' میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

''تمہاری تلاش میں......''

''مم...... میری تلاش میں...... لل...... لیکن اسے کیسے معلوم ہوا کہ......'' میری آواز واضح طور پر لڑکھڑانے لگی۔

''اونہوں...... کہا ناں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس اکثر یہاں اپنا وقت ضائع کرنے کے لیے آتی رہتی ہے۔''

''لیکن باس ابھی تو یہاں موجود ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ابھی چند سیکنڈوں میں تم باہر ہو گے۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے کچھ ساتھیوں کو ہدایت کی اور پھر ہمیں اس کی رہائش گاہ کے ایک خفیہ تہ خانے سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ ایک زیرِزمین ٹنل تھی۔ جہاں بچھی ہوئی پٹریوں پر چلنے والی فولادی ٹرالیوں کے ذریعے ہمیں باہر نکالا گیا۔

جس جگہ ہم ابھرے تھے...... وہ ایک بی پورٹ کے قریب واقع ایک نچلے درجے کی کسی کالونی کا کوئی کشادہ سا مکان تھا۔ اس کے تہ خانے میں ٹھہر کر ہم سب باری باری اوپر ایک زنگ آلود سیڑھی کے ذریعے آئے تھے۔ اس مکان میں ایک ہی ہال نما کمرا تھا اور ہم سب اسی میں جمع تھے۔ ڈین چنگ کے ساتھ اور ساتھی ہرکارے بھی تھے جن کی تعداد چار تھی۔ کمانڈ ڈین کے ہی سپرد تھی، تاہم میں بھی اس میں بہ وقتِ ضرورت مداخلت کر سکتا تھا۔ جان روڈلف اور سون کو میری طرح ہی دھڑکا لگا ہوا تھا۔ روڈلف کے ہاتھ پر ہنوز جینڈ تیج ...... بندھی ہوئی تھی۔ ایک پٹی سے اس کا ہاتھ باندھ رکھا تھا جس کی ڈوری اس کے گلے سے جھول رہی تھی۔

ڈین چنگ فون پر مسلسل کسی کے ساتھ محوِ گفتگو تھا اور میری چست نظریں اس کے چہرے کا بار بار طواف کر رہی

تھیں۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہاں ہمیں کتنی دیر رکنا پڑے گا۔ ایک موقع پر جب...... ڈین فون سے فارغ ہوا تو...... میں نے ڈین سے پوچھا۔

''وہاں سب خیریت تو ہے ناں مسٹر ڈین؟'' میری مراد کاساپاکو اور اس کی رہائش گاہ سے متعلق تھی۔

''پولیس چیف سرچ کرنے کے بعد باس کو گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔'' اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا جس پر بالخصوص میرا پریشان ہونا لازمی امر تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''او...... نو...... پھر اب کیا ہو گا؟''

''انتظار کرنا پڑے گا ہمیں......'' وہ بولا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں، وہ لوگ باس کو عمومی نوعیت کی تفتیش کے لیے پولیس اسٹیشن لے گئے ہیں۔''

''تو کیا ہم باس کی واپسی تک ادھر ہی رکے رہیں گے؟'' میں نے ڈین کی طرف دیکھتے ہوئے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن میں مسلسل شائی چن سے رابطے میں ہوں، وہ اس کے ساتھ ہے......'' اس نے کہا اور اسی وقت اس کے فون کی رنگ گونجی۔ اس نے فوراً فون کان سے لگا لیا۔ وہ کچھ سنتا رہا اور تھائی زبان میں کچھ بولتا بھی رہا۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کے تاثرات کا جائزہ لیتی رہیں۔ وہ خاصا بوکھلایا ہوا اور پریشان نظر آ رہا تھا اور دیکھا جاتا تو اس سے کہیں زیادہ میں، جان روڈلف اور سون پریشان تھے۔

''اوکا......'' آخر میں وہ بولا۔ اس کے بعد ہماری طرف دیکھ کر بولا۔

''باس نے ہمارے بارے میں آخری احکامات یہی دیے ہیں کہ ہمیں کو ماتگو کی طرف کوچ کر جانا چاہیے۔''

اس کی بات سن کر میں بے اختیار سکون کی سانس لے کر رہ گیا، روڈلف اور سون نے بھی یقیناً ایسا ہی سانس لیا ہو گا۔

''کیا مجسمہ کو ماتگو پہنچا دیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے پیدل ساحل تک چلنا ہو گا اور جتنی تیزی کے ساتھ چل سکتے ہو چلو، تاخیر کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ ہمیں فرار کرا دیا گیا ہے۔''

''ہمیں سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیونکہ پولیس تو......'' میرا سوال حلق میں رہ گیا کیونکہ تب تک ڈین تیزی سے باہر نکل چکا تھا۔

''اپنے سوال کو ماتگو پہنچ کے پوچھ لینا۔ لگتا ہے کوئی خطرناک بات ہو گئی ہے۔ شہزی! نکلنے کی کرو۔'' روڈلف نے میرے قریب سے تیزی کے ساتھ گزرتے ہوئے کہا اور پھر اس کے پیچھے سون نکلی۔ سب سے آخر میں گومگو والے انداز میں، میں مکان سے باہر نکلا۔

باہر خنک شام پھیلنے لگی تھی۔ ساحلی علاقہ ہونے کے سبب بڑی کاٹ دار یخ بستہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ یہ تو شکر تھا کہ ہم نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمارے دہانے کسی دخانی انجن کی طرح دھوئیں کے بھاپ چھوڑ رہے تھے۔ ہم سب تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے۔

''میرا خیال ہے کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، ڈین کو ہمیں ساری صورتِ حال سے آگاہی دینا چاہیے۔'' سون نے ہمارے ساتھ تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو روڈلف بولا۔

''صورتِ حال ان کی حد تک بگڑی ہے، شکر کرو اس مینڈک کی نسل کاساپاکو نے ہمارا پروگرام جوں کا توں رکھنے کی ہدایت کی ہے۔'' لیکن سون کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے بولی۔

''تم تو پوچھ سکتے ہو ڈین سے، آخر معاملہ کیا ہے؟''

''دیکھا جائے گا۔ ابھی تو چلتے رہو۔'' میں نے کہا۔

ڈین اور اس کے چاروں مسلح ساتھی ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ ہمارے دائیں جانب شہر کی جلتی بجھتی بتیاں نظر آ رہی تھیں اور بائیں جانب گہری تاریکی میں دور کہیں کہیں ستاروں کی طرح ٹمٹماتی روشنیاں تھیں۔ یہ شاید کوئی سمندری حدود تھی۔ سامنے تاریکی تھی اور ہم بل کھاتے ایک پختہ راستے پر تھے۔ جس کے دورویہ پام کے درخت ایستادہ تھے۔ درختوں کے درمیان گھرے...... تاریک راستے پر ہم سب تیز تیز قدموں سے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ لگ بھگ کوئی پندرہ، بیس منٹ تک مسلسل تیز چلنے کے بعد سون تو بے دم ہونے لگی تاہم ہماری منزل بھی آ گئی۔

وہ ایک ساحل تھا جہاں سے موجوں کے شور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہاں ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ڈین اور اس کے چاروں مسلح ساتھی یہاں پہنچ کر رک گئے۔ ہم تینوں بھی ٹھہر گئے اور اپنی پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے لگے۔

''لگتا ہے لانچ جا چکی ہے۔'' ڈین نے سامنے

تاریک اور گہرے پانیوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا ہمارے لیے یہاں پہلے سے کوئی لانچ موجود تھی؟" میں نے ڈین سے سوال کیا۔

"ہاں! اسی کے ذریعے ہمیں... جزیرے تک پہنچنا تھا۔"

"تو پھر وہ ہمیں اپنے ساتھ لیے بنا کیوں چلے گئے؟" روڈلف بولا۔ ڈین نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور پھر اپنے سیل پر کسی سے بات کرنے لگا پھر مجھ سے بولا۔

"مسٹر شہزاد! موجودہ بگڑتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر لانچ کو کوہانگو جزیرے تک پہنچنے کا حکم دیا جا چکا تھا۔ کیونکہ اس میں مجسمہ لدا ہوا تھا اب وہ اسے وہاں اتارنے کے بعد ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچنے والے ہیں۔"

"اچھا! لیکن کیا ہمیں یہاں کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"خطرہ تو ہے۔"

"کس کا؟"

"پولیس کا......"

"کیا مطلب؟ پولیس کو ہمارے بارے میں علم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"علاقے کی پولیس نے چاروں طرف سے ناکا بندی کر رکھی تھی۔ رہائش گاہ کے چاروں طرف تقریباً پچاس کلومیٹر تک......"

"اوہ......" میرے ہونٹ تشویش آمیز انداز میں سکڑ گئے۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آخر پولیس کی اس قدر تیز اور اچانک کارروائی کرنے کی وجہ کیا تھی؟" جان روڈلف نے پوچھا۔ تو ڈین اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب ہی میرے ساتھ کھڑی سون نے مجھے ہولے سے اپنی کہنی کا ٹہوکا مارا، گویا اپنی پہلے والی بات کا وہ اعادہ چاہ رہی تھی۔ جس نے بالآخر مجھے بھی مہمیز کر ڈالا اور میں نے ڈین سے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔

"مسٹر ڈین! کم از کم تمہیں ہم کو تفصیل بتانی چاہیے کہ آخر معاملہ کیا ہے؟ تاکہ ہم بھی اپنی صوابدید پر کوئی فیصلہ کر سکیں۔"

آسمان صاف تھا اور اس کی تاروں بھری روشنی میں ساحلِ سمندر کا پانی جھلملا رہا تھا۔ ڈین نے کہا۔

"مسٹر شہزی! ہمارے خلاف مخبری ہوئی ہے۔"

"مخبری؟ کیسی مخبری؟ اور کس نے کی ہے؟" میں اس کی بات پر ایک دم چونک کر بولا۔ میرا دل اس انکشاف پر بے طرح دھڑکنے لگا۔

"اپنے ہی کسی ساتھی کی شرارت ہے یہ...... مخبری مجسمے کی چوری سے متعلق کی ہے بینکاک کے پولیس ڈپارٹمنٹ کو...... اس میں گوتم بدھ کے اس سونے کے بیش قیمت مجسمے سے متعلق بینکاک کے پولیس ڈپارٹمنٹ کو بتایا دیا گیا ہے، لہٰذا اب ایک طرف اس گمنام کال کی تصدیق کے لیے تریچر کے میوزیم میں خفیہ تفتیش کی جا رہی ہے اور دوسری جانب کاساپاکو کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ گمنام کال میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس گریٹ روبری میں دو غیر ملکی بھی شامل ہیں۔ ایک انڈین شہزاد کمان اور دوسرا امریکی جان روڈلف۔"

اپنا نام سن کر میں دنگ رہ گیا۔ یہ تو شکر تھا کہ مخبری کرنے والا مجھے پاکستانی کے بجائے انڈین سمجھا تھا۔

"لل...... لیکن یہ اتنی بڑی خبر آؤٹ کیسے ہو گئی؟" میں نے کہا۔ تاہم میرے ذہن رسا میں ساپچی اور موتو کے ناموں کی بار بار گردان ہونے لگی۔ ساپچی سے میری تازہ اور مختصر ملاقات میں مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ روپوش موتو کے اب بھی ساپچی کو کاساپاکو کے چنگل سے چھڑانے کے لیے خفیہ رابطے استوار تھے اور کیا بعید تھا کہ اسی نے ہی موتو کو یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ بگاڑ پیدا ہونے کی صورت میں...... ساپچی کی مکتی کی کوئی صورت بن سکے۔

"اس کمینی ساپچی نے یہ سارا کھیل بگاڑا ہے۔" ڈین نے بتایا۔ "وہ اسی وقت سے جانے کہاں غائب ہے جب سے کاساپاکو کو پولیس حراست میں پوچھ گچھ کے لیے لے جا چکی ہے۔"

"باس کو بھی نت نئی بلیاں پالنے کا جو شوق تھا۔ بھگت لے اب یہ سب......" سون نے منہ بسور کے گویا اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔ اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔

"باس کے سلسلے میں تمیز سے بات کرو۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔" ڈین بگڑ کر بولا۔

میں نے فوراً مداخلت کرتے ہوئے ڈین سے کہا۔

"اس طرح تو ہمارا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑ جائے گا؟ پولیس آورڈو کے ان قدیمی کھنڈرات کا بھی رخ کر سکتی ہے۔ جدھر ہم نے اس مجسمے کو دبا رکھا تھا۔"

"کہا نا...... کہ یہی تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہ مجسمہ اب وہاں سے نکال کر بہ حفاظت لانچ میں لوڈ کروا کے جزیرے کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے۔"

"اس صورت میں پولیس یہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا یہاں زیادہ دیر رکنا صحیح نہیں ہوگا۔ پولیس ان کے نشانات کی رہنمائی میں کسی بھی وقت یہاں تک بھی......"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ڈین کا ایک ساتھی ہولے سے چیخا۔

"وہ دیکھو، پولیس کی گاڑیاں آ رہی ہیں ڈین!" ہم سب کو یکلخت سانپ سونگھ گیا۔ سب نے ہی اس کے اشارے کی سمت بیک وقت گردن موڑ کر دیکھا، تین چار گاڑیوں کی سرخ اور نیلی روشنیاں متحرک سی نظر آئیں۔ ان کا رخ اسی جانب تھا۔

"اوہ...... بالآخر پولیس یہاں بھی پہنچ گئی۔" ڈین کے منہ سے نکلا۔ "پوزیشنیں سنبھال لو اور انہیں بھون کر رکھ دو۔"

"یہ بے وقوفی ہم سب کو مہنگی پڑے گی مسٹر ڈین!" میرے بولنے سے پہلے ہی روڈلف نے اسے خبردار کیا۔ "ان حالات میں پولیس سے مقابلہ خود کو مزید خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوگا۔"

"تم خاموش رہو مسٹر!" ڈین نے اسے جھڑکا تو میں نے بھی فوراً ہی روڈلف کی تائید میں اس سے کہا۔

"روڈلف ٹھیک کہہ رہا ہے مسٹر ڈین! ان حالات میں جبکہ باس بھی پولیس کی تفتیشی حراست میں ہے، پولیس سے ہمارا مقابلہ نہ صرف خطرناک ہوگا بلکہ ہمارا منصوبہ بھی فیل ہو جائے گا۔ پولیس اس چھوٹے سے ٹاپو تک بھی پہنچ سکتی ہے جہاں یہ مجسمہ لے جایا گیا ہے۔"

"تو پھر تمہارا کیا خیال ہے کہ ہم یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے خود کو پولیس کے حوالے کر دیں؟" ڈین نے تلخی سے کہا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ ہم کہیں قریب میں گھات لگا کر چھپ تو سکتے ہیں؟" میں بولا۔

"اور اگر اس دوران میں وہ لانچ ہمیں لینے یہاں آن پہنچی تو......؟" ڈین بولا۔

"میرا نہیں خیال کہ لانچ اتنی جلدی لوٹ آئے گی۔ ٹنوں وزنی مجسمہ اس سے ان لوڈ کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ انہیں دیر لگ جائے گی واپسی میں...... تب تک ہو سکتا ہے ہمیں کوئی اور صورت نظر آ جائے۔"

"جلدی سے ایک فیصلہ کر لو، گاڑیاں قریب آتی جا رہی ہیں۔" دفعتاً سون سرسراتی آواز میں بولی۔

"فیصلہ ہو گیا۔" جان روڈلف دوبارہ بولا۔ "ساحل کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے چلو اور کوئی لانچ نظر آ جائے تو اس پر قابض ہو کے ٹاپو تک پہنچا جا سکتا ہے۔"

ہم نے ابھی ایک قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اچانک خاموشی اور ٹھٹھرتی فضا میں ایک پٹاخہ چھوٹا اور چشم زدن میں اردگرد کا ماحول روشنی میں نہا گیا۔

"زمین پر گرا دو خود کو...... انہوں نے سگنل فائر کر ڈالا ہے۔" میں چیخا۔ ہم سب زمین پر گر گئے۔ تاریک آسمان پر چند ثانیے تک رنگ برنگی پھلجڑیاں چھوٹتی رہیں اس کے بعد دوبارہ تاریکی چھا گئی۔

"اسی طرح تیزی سے آگے رینگتے چلے جاؤ۔ جلدی......" میں نے کہا اور سب حرکت میں آ گئے۔ ابھی ہم بہ مشکل چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ پے در پے دو تین پٹاخے فضا میں پھٹے۔ اب تو جیسے ہمیں کئی گز تک سارا پام کا جنگل ہی روشن ہوتا نظر آ گیا، یہی نہیں پولیس کی گاڑیوں کی جھلک بھی نظر آ گئی۔ ہم ابھی پوری طرح سے پہنچنے بھی نہیں پائے تھے کہ یکایک فضا میں برسٹ چلنے کی آواز گونجی۔ میرا دل یکلخت اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ پولیس سے اتنی جلدی ایکشن لینے کی بالکل توقع نہ تھی۔

"خبردار...... کوئی جوابی فائرنگ نہ کرے......" یہ جان روڈلف تھا۔ جو ایسے وقت میں خاصا زیرک دماغ اور بیدار مغز ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بات صحیح تھی کیونکہ پولیس کے چلائے ہوئے برسٹ کی کوئی گولی ہم تک نہیں پہنچی تھی، یہ پولیس نے اندھا فائر کیا تھا تاکہ ہم بوکھلا کر ان پر گولی داغتے اور وہ ہماری لوکیشن ٹریس کر کے ادھر پہنچ جاتے۔

"آگے بڑھتے رہو۔ رکو مت۔" میں نے کہا۔ ہم اسی طرح آگے بڑھتے رہے۔ ڈین کے مسلح چاروں افراد ہم سے آگے تھے۔ ممکن تھا ڈین کے پاس بھی کوئی چھوٹا موٹا پستول ہوتا لیکن میں روڈلف اور سون نہتے تھے۔

ڈین کو بھی شاید پولیس کی چالاکی سمجھ میں آ گئی تھی اور وہ محتاط ہو گیا تھا۔

اچانک ایک اور برسٹ فائر ہوا۔ گولیوں کی پوری باڑھ ہم سے آگے چند قدموں کے فاصلے پر پڑی۔ جس پر ڈین کے ایک مسلح ساتھی نے بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرف اپنی گن کا رخ کر کے فائر کر دیا۔ اس کی یہی حرکت ہم سب کے لیے سم قاتل ثابت ہوئی، کیونکہ اگلے ہی لمحے پولیس کی گاڑیوں نے سائرن بجانا شروع کر دیا اور

ان کے انجنوں کی آوازیں بیدار ہوگئیں۔ وہ سب اسی طرف دوڑتی آرہی تھیں۔

''مزید کوئی فائر مت کرنا...... بھاگو......'' میں نے چلا کر کہا اور پھر ہم سب اٹھ کر دوڑے۔ ہمارے عقب میں پولیس کی گاڑیاں بمع خراش سائرن بجاتی ہوئی چلی آرہی تھیں۔ یہاں پولیس اور ہمارے درمیان زبردست رن پڑ سکتا تھا۔ اسی سے بچنے کے لیے ہم اندھا دھند دوڑ رہے تھے۔

اچانک تلے اوپر دو گولیاں داغی گئیں۔ ہم سے آگے اور ساتھ والے دو مسلح ساتھی حلق سے بھیانک چیخیں خارج کرتے ہوئے گرے۔ میں دنگ رہ گیا اور خود کو فوراً گرا دیا۔

''پولیس انفرا ریڈ اسنائپر استعمال کر رہی ہے۔'' میں چلّایا۔ میں نے گرتے ہی لڑھکتے ہوئے خود کو ان دونوں مسلح آدمیوں کے قریب کرلیا، جو ڈین کے ساتھ تھے۔ روڈلف میری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا اور خاصا ہوشیار ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی کوشش یہی تھی کہ وہ مجھے ''فالو'' کرے۔ یہی وجہ تھی کہ میری حرکت اور آواز سنتے ہی اس نے بھی وہی کیا اور دوسرے ساتھی کی لاش کی گن، بھاگتے بھاگتے اٹھالی۔

ٹھیک اسی وقت دو فائر اور ہوئے ڈین کے باقی دو مسلح ساتھی بھی چیخ مار کر گرے۔

''راستہ بدلو، جلدی ..... ورنہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' میں چیخا اور فوراً دائیں جانب دوڑ لگا دی۔ سون، روڈلف اور ڈین نے میری تقلید کی تھی۔

جلدی ہم سب ایک ایسی جگہ جا پہنچے جو بادی النظر میں جنک یارڈ کا علاقہ نظر آتا تھا، یہاں لاتعداد اسکریپ پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ کچھ چھوٹی بڑی لانچیں بھی لنگر انداز تھیں۔ لوگ بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سب اپنے کاموں میں معروف تھے۔ ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہی میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان ڈین سے کہا۔

''کسی لانچ کا فوری دستیاب ہونا ضروری ہے۔ ہمیں ٹاپو کی طرف نکلنا ہوگا، ورنہ یہ پولیس ہمارے تمام راستے مسدود کردے گی۔''

''آؤ...... اس طرف جلدی۔'' ڈین نے میری بات کی نزاکت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے فوراً اپنی جگہ سے حرکت کی اور ہم اس کے پیچھے ہو لیے۔ شکر تھا کہ پولیس کے ان تباہ کن شوٹرز کے مقابلے میں جلد ہی جائے پناہ مل گئی تھی، ورنہ ایک ایک کرکے ہم سب گولی کا نشانہ بنتے رہتے۔

ڈین ہمیں ایک لانچ کے پاس لے آیا۔ ہم اس میں سوار ہوگئے۔ اس میں دو افراد موجود سگریٹ پی رہے تھے۔ ڈین نے انہیں خبردار کردیا اور حکم صادر کیا کہ ان دونوں کی مشقیں کس کر اسٹور میں پھینک دے۔ خود وہ انجن روم کی طرف چلا گیا۔ میں ریلنگ پر کھڑا اس طرف دیکھنے لگا جہاں...... چار پانچ ہیڈ لائٹس ایک قطار کی صورت میں دکھائی دیں۔ پولیس کی گاڑیاں جنک یارڈ کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی تیزی سے اسی طرف آرہی تھیں۔ مگر ایک مقام پر میں نے انہیں رکتے دیکھا۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، اعصاب تن گئے تھے۔ میرے ہاتھوں میں گن دبی ہوئی تھی۔

بینکاک پولیس کے ساتھ اس معرکہ آرائی کی مجھے بالکل بھی توقع نہ تھی، یہ سب کچھ اچانک ہی ہوا تھا۔ مگر اچانک کہاں ہوا تھا مجھے ایسے کسی خطرے کی پہلے ہی بو محسوس ہوگئی تھی مگر بدقسمتی سے پتا بعد میں چلا کہ یہ گل ساچی اور موتو نے کھلایا تھا، جبکہ اب بقول ڈین چنگ کے وہ غائب تھی۔ دونوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت افراتفری پھیلا دی تھی۔ ہمیں مصیبت میں ڈال کر وہ خود رفوچکر ہوگئی تھی، کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اور موتو ایک ساتھ ہی نکلے ہوں۔ مگر اب جو ہونا تھا، وہ ہوچکا تھا اس پر اب کفِ افسوس ملنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس وقت ہمیں اس مشکل سے نکلنا تھا۔

اچانک میں نے ایک گاڑی کی روشنی کو حرکت کرتے دیکھا۔ وہ نجانے کدھر سے راستہ کاٹ کر قریب آرہی تھی۔ اس کے چیختے سائرن کی آواز بالکل قریب سنائی دینے لگی تھی۔ باقی پولیس اہلکار بھی اپنی پھنسی ہوئی گاڑیوں سے اتر کر اسی طرف آرہے تھے۔

میں نے اپنی گن سیدھی کرلی تھی اور روڈلف میرے ساتھ آن کھڑا ہوا تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے ہلکی ساخت کی مشین گن تھام رکھی تھی جس کا بٹ سینے یا پیٹ پر بہ آسانی جم جاتا تھا اور ایک ہاتھ سے بھی بہ آسانی فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

''فائرنگ داغی جائے؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا اور اسی وقت لانچ میں گھڑگھڑاہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ ڈین اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا کہ لانچ جلد ہی حرکت میں آجائے۔

''نیچے جھک جاؤ۔'' معاً روڈلف چیخا اور میں نے فوراً

اس کی تقلید کی۔ فائر ہوا اور گولی میرے سر سے صرف چند سوت کے فاصلے سے نکل گئی۔ موت کے تصور سے ہی میرا پورا وجود جھنجھنا کر رہ گیا۔

''اسنائپر شوٹر قریب پہنچ چکے ہیں۔'' روڈلف نے کہا اور اپنی گن سیدھی کرکے اس نے لبلبی دبا دی۔ اس کی گن کی نال سے شعلے پھوٹنے لگے۔ میں نے بھی دوسری جانب سے پوزیشن بنالی اور پولیس پر فائر کھول دیا۔ دوبدو فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جنک یارڈ کا یہ حصہ میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔

ڈین نے چابک دستی سے اپنا کام نمٹایا اور لانچ کو کھلے سمندر کی طرف لے گیا۔

جنک یارڈ کے ساحل پر پولیس منہ تکتی رہ گئی۔ ہم دونوں وہیل روم میں آگئے۔ وہاں سون اور ڈین موجود تھے۔

''بال بال بچے ہیں۔'' روڈلف نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''لیکن میرا خیال ہے ہمیں کامانگو کے ٹاپو پہنچتے ہی نکلنا پڑے گا۔ پولیس کسی وقت بھی اسپیڈ وبوٹس کے ذریعے یہاں پہنچ سکتی ہے۔'' میں نے ڈین کی طرف دیکھ کر کہا جس کی متلاشی نظریں اسکرین کے پار تاریک پانیوں کو گھور رہی تھیں۔

''مجھے بھی یہی ہدایت ہے، کمپاس نکالو جلدی، کہیں میں بھٹک نہ جاؤں۔ مجھے اس کا زیادہ تجربہ نہیں ہے۔'' میں اور روڈلف کمپاس تلاشنے لگے تو وہ سون کو مل گیا جسے اس نے فوراً ہی وہیں درمیان میں نصب گول اسٹول پر پھیلا دیا۔ ڈین اس پر جھک کر کچھ دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہیل ایڈجسٹ کرنے لگا۔

''تم تب تک ٹاپو والے ساتھیوں سے رابطہ کرکے موجودہ صورتِ حالات سے تو آگاہ کردو...... تاکہ فوری طور پر ہماری کو مانگو سے روانگی کا بندوبست تیار رکھیں۔'' میں نے ڈین کو صائب مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''اس پر واقعی بہت جلدی عمل ہونا چاہیے۔ بہ صورتِ دیگر پورا کو مانگو کا ٹاپو بینکاک کی پولیس سے بھر جائے گا۔'' روڈلف نے بھی رائے دی۔ ڈین اپنے مخصوص ٹرانسمیٹر پر رابطہ کرنے لگا۔ یہاں اس کا سیل کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ خفیہ ٹرانسمیٹر اس کی واچ میں نصب تھا۔ مگر باوجود کوشش کے اس سے بھی رابطہ نہ ہو پایا تو اس نے لانچ کی رفتار بڑھا دی اور چلا کر ہم سے بولا۔

''وہ لوگ تیار ہی ہوں گے اور بے چینی سے ہمارے منتظر بھی۔''

''لیکن انہیں موجودہ صورتِ حالات سے آگاہی دینا ضروری تھا۔'' اس بار سون بولی۔

''ارے وہ دیکھو ٹاپو کی طرف سے کوئی لانچ آرہی ہے۔'' ڈین چلایا۔ ہم پہلے تو ڈر گئے کہ کہیں پولیس تو نہیں مگر دوسرے ہی لمحے ڈین کو ہم نے خوشی سے نعرہ بلند کرتے دیکھا۔

''ٹھہرے...... یہ ہماری ہی لانچ ہے۔ میں انہیں سگنل دیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے کیبن سے ٹارچ اٹھالی۔ اس کے اندر سرخ اور نیلے سلائیڈنگ شیشے نصب تھے، وہ انہیں تیزی سے جلانے بجھانے اور بدلنے لگا۔ لانچ قریب آگئی۔ اس میں تین افراد سوار تھے۔ وہ ڈین کو پہچان گئے۔ ہم جلدی سے ایک تختے کے ذریعے دوسری لانچ میں آگئے۔ وہ واپس مڑگئی جبکہ پہلی والی لانچ کا رخ بدل کر ہم نے اسے آگے روانہ کردیا۔

ڈین نے ان تینوں کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا، وہ تینوں پریشان ہوگئے۔ ان میں سے ایک خاصی گٹھی ہوئی جسامت والا آدمی ڈین سے کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ لوگ آپس میں تھائی زبان میں باتیں کر رہے تھے۔ لانچ کی رفتار بتدریج بڑھادی گئی تھی۔

''ارے وہ دیکھو روشنیاں......!'' سون ہسٹریائی انداز میں چلّائی۔ ڈین کو اس کی چیخ پر جانے کیوں طیش چڑھ گیا اور اس نے مارے طیش کے اپنے ہونٹ بھینچ کر آگے بڑھتے ہوئے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کردیا۔

''کتیا کی بچی! آہستہ نہیں بول سکتی۔'' چٹاخ کی زوردار آواز سے ڈین کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ نرم و نازک سون کے لیے خاصا زوردار ثابت ہوا۔ وہ ایک درد بھری چیخ مار کر چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گئی اور ریلنگ سے نیچے پانی میں گرتے گرتے بچی۔ یہ تو شکر تھا کہ سوئے اتفاق اس کے قریب میں کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔ ورنہ وہ ایک خوفناک چھپاکے سے پانی میں جاگرتی۔

''الو کا پٹھا!'' روڈلف کو اس کی حرکت پر غصہ آگیا۔ وہ پُرطیش انداز میں اپنے دانت پیستا ہوا ڈین کی جانب بڑھا تھا کہ اس کے تینوں ساتھیوں نے فوراً گنز نکال کر اس کی طرف تان لیں۔ ڈین بڑی خوفناک نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگا اور پھر اس سے پہلے کہ دونوں کے درمیان لڑائی ہوتی، میں نے چلا کر کہا۔

"پولیس ہمارے تعاقب میں آرہی ہے، حملے کے لیے تیار رہو اور لانچ کی رفتار بڑھا دو۔"

سون اپنا مضروب گال سہلانے میں مصروف تھی۔ ہواؤں کے تیز شور کے باعث ہمیں چیخ چیخ کر بولنا پڑ رہا تھا۔

اس کے تینوں ساتھیوں نے گنز تان کر ریلنگ کے پاس پوزیشن لے لی۔ روڈلف کے پاس بھی ہتھیار تھا اور میرے پاس بھی۔ ڈین بھی غیر مسلح نہیں تھا۔ ڈین نے دوسری جانب دیکھنے کے بعد کہا۔

"ٹاپو قریب آگیا ہے۔ اس کا رخ اس طرف کرو جیڈ! جہاں کارنیوال کھڑا ہے۔"

ان تینوں مذکورہ مسلح آدمیوں سے ایک پلٹا اور تیزی سے وہیل کیبن کی طرف بڑھ گیا۔ یہی جیڈ تھا۔ وہ تھائی نہیں تھا اس لیے شاید ڈین نے اس سے انگریزی میں کہا تھا۔

لانچ کا رخ بدلنے لگا۔ ہم ریلنگ پر دھڑکتے دل کے ساتھ موجود تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ پولیس کی اس قدر جلد کیسے پانی تک رسائی ہوگئی؟ میں نے ایک خیال کے تحت ان بڑھتی ہوئی روشنی کی رفتار کا اندازہ لگایا تو ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر یہ پولیس تھی تو اسپیڈ وبولس میں نہیں تھی۔ ہماری طرح کوئی لانچ لے کر تعاقب میں نکلے ہوں گے لیکن ایک خطرہ تھا کہ وہ کوسٹ گارڈ سے رابطہ کر کے انہیں ہمارے پیچھے لگا سکتے تھے۔

اچانک مذکورہ روشنیوں کی طرف سے نیلی سرخ لائٹس بلنک کرنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔

"خبردار! فائر مت کرنا۔" میں نے چلا کر کہا اور ڈین کو ہدایت دی کہ لانچ کی بتیاں ساری گل کردے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

تھوڑی دیر بعد لانچ کی رفتار دھیمی پڑنے لگی اور یہ ایک کیچڑ زدہ ساحل کے قریب لنگر انداز ہوگئی۔ ہم لوگ سب جلدی جلدی چھلانگیں لگا کر نیچے اترے اور میں نے ڈین سے کہا، وہ اپنے تینوں ساتھیوں سے کہیں کہ لانچ میں سوار ہو کے دوسری طرف نکل جائیں تاکہ پولیس بھٹک جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔

ہم لوگ تاریک ٹاپو میں آگئے۔ جیڈ اور اس کے ایک ساتھی کی رہنمائی میں ہم تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یہ ٹاپو زیادہ جنگلاتی نہیں تھا۔ اس کی زمین اونچی نیچی تھی اور جا بجا ٹیلے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کیچڑ زیادہ تھی۔ جس پر ہم کئی بار پھسل کر گرے تھے۔

ایک جگہ ہمیں روشنی نظر آگئی تھی۔ ہم اسی طرف بڑھے۔ آسمان پر تارے غائب ہوگئے تھے، شاید بادل گھر آئے تھے۔ رات جھک آئی تھی۔ اچانک بادلوں کی خوفناک گڑگڑاہٹ ابھری۔ بجلی چمکی اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ موسم خراب ہوگیا تھا۔ ہم لوگ گرتے پڑتے ایک نسبتاً کھلی جگہ پر آگئے۔ سامنے ہی الاؤ روشن تھا مگر بعد میں پتا چلا کہ یہ روشنی کیروسین آئل کی تھی۔ وہاں ایک طیارہ کھڑا تھا۔ یہاں سے ٹاپو کا ساحل نما کنارہ تھوڑی ہی دور تھا۔

وہاں دو افراد ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ڈین نے ان سے کچھ پوچھ گچھ کی، اس کے بعد انہوں نے ہمیں سوار ہونے کا کہا۔ یہ دو انجن والا جہاز تھا۔ جس کے مخصوص فلوٹن اسکو بیک وقت گیلی ریت اور برف کے علاوہ پانی پر بھی بہ آسانی پھسل سکتے تھے۔ ایک بار آسمانی بجلی چمکی تو مجھے اس کی فولادی باڈی پر ایک جیولوجیکل سروے ٹیم کا مخصوص مونوگرام چھپا ہوا نظر آگیا۔

ہم اس میں سوار ہوگئے۔ اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ ہم سب بُری طرح بدک گئے۔ جہاز کو پائلٹ کرنے والے دو افراد جو ڈین کے ساتھ تھے۔ کنٹرول سسٹم سیٹ پر براجمان ہوچکے تھے۔ ہم جہاز کے دروازے پر ہی تھے کہ ہمیں عقب سے فائرنگ کی... آواز سنائی دی تھی۔ جواب میں ہم نے بھی ان ہیولوں پر گولیاں داغ دیں۔ جہاز کی چونچ میں نصب پنکھا تیزی سے حرکت کرنے لگا تھا اور...... اس نے رینگنا شروع کردیا تھا۔ لیکن ڈین کے دو ساتھی جہاز کو دھکا بھی لگا رہے تھے۔ جن کی رفتار چیونٹی سے زیادہ نہ تھی، تب ہی ان میں سے ایک کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔

"نیچے اتر کر مقابلہ کرو......" ڈین چیخا۔ مخاطب ہم ہی تھے۔ میں نے اختلاف کیا۔

"اب ہمارا نیچے اترنا خطرناک ہوگا، ادھر ہی سے جوابی فائرنگ کرتے رہو۔ جہاز رکنا نہیں چاہیے۔"

جہاز رینگتا رہا اور ہم جہاز کے داخلی دروازے کے دائیں بائیں پوزیشنیں لیے نیچے فائرنگ کرتے رہے، پولیس کی تعداد زیادہ نہیں لگتی تھی، مگر زیادہ ہونے میں دیر بھی نہیں لگتی، بشرطیکہ ہم اس ٹاپو سے جلدی پرواز نہ کر جاتے۔

جہاز رینگتا ہوا پانی میں آیا اور تب ہی اس کے انجن بیدار ہوگئے۔ اس نے پانی کی سطح پر دوڑنا شروع کردیا۔ تیز سرد کاٹ دار ہواؤں کے جھکڑ ہمارے چہرے اور جسم سے ٹکرانے لگے۔ ڈین نے دروازہ بند کردیا اور ہم سب سیٹوں پر گر کے بُری طرح ہانپنے لگے۔

"مبارک ہو دوستو! ہم بہ حفاظت کوماگو کے ٹاپو سے پرواز کرچکے ہیں۔" ڈین نے مبارکباد دیتے ہوئے ہمیں خوش خبری سنائی تو روڈلف بولا۔

"کیا ہم خطرے کی حدود سے باہر ہیں؟ میرا مطلب فضائی حدود سے ہے۔"

"فضائی حدود میں بھلا ہمیں کیا خطرہ ہوسکتا ہے؟" وہ غرور سے بولا۔

"پھر تو تمہاری عقل پر ماتم ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔" روڈلف استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "ہم کوئی کار یا رکشا ٹیکسی لے کر نہیں بھاگے ہیں کہ کسی بھی اندھیری گلی میں روپوش ہوجائیں گے۔ یہ ہزاروں ٹنوں وزنی دیو پیکر آہنی پرندہ ہے۔ اس پر مستزاد اس پر بیش قیمت بدھا کا مجسمہ بھی لدا ہوا ہے۔"

"جہاز اس وقت فضاؤں کی بلندیاں طے کررہا ہے۔ موسم بھی خراب ہے جو ہمارے حق میں ہوسکتا ہے۔ ہم سے کوئی رابطے میں نہیں ہے۔ نہ ہی ہمیں اپنے بارے میں کسی کو بتانا پڑے گا۔" ڈین بولا۔

"بتانا بھی پڑے تو کیا ہے۔ ہم اس وقت جیولوجیکل ٹیم کے کارکن ہیں۔" سون نے بھی ڈین کی حمایت میں کہا۔

"ائیرٹریفک کنٹرولر سے پرمیشن لیے بغیر ہمارا فلائی کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے؟" میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

"پرمیشن لی جاچکی ہے۔ اس کی فکر مت کرو۔ اب تم لوگ جہاز کے پچھلے حصے میں چلے جاؤ سب اور مخصوص وردیاں پہن لو جا کر...... جلدی۔" ڈین نے کہا۔ ہم اٹھ کر پچھلے حصے میں آگئے۔ وہاں نیلی اور خاکی وردیاں لٹک رہی تھیں۔ وہ ہم نے پہن لیں۔ اس کے بعد ڈین ہمیں چند ہدایتیں دیتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم سیٹوں پر آکے بیٹھ گئے۔

بڑا سنسنی خیز ایڈونچر تھا ایسا لگتا جیسے کوئی تھرلر وار موی چل رہی ہو اور ہم اس کا حصہ ہوں۔ کھڑکی سے پار آسمان دھواں دھار ہو رہا تھا۔ تیز شراٹے دار بارش ہو رہی تھی اور رہ رہ کر بجلی چمک جاتی تو دور تک برستا ہوا خلا بڑا ہی ہیبت ناک منظر پیش کرتا تھا۔

ڈین کے دو آدمی جہاز پائلٹ کررہے تھے، ان میں ایک جیڈ بھی تھا۔ ان دو کو ملا کر ہم کل چھ افراد تھے۔ باقی ٹاپو میں روپوش کردیے گئے تھے۔

"تھائی ائیرٹریفک کنٹرول ٹاور سے کال آرہی ہے۔" جیڈ نے ڈین کے اسپیکر پر بتایا۔ اس کے چہرے پر ہیڈفون چڑھا ہوا تھا۔

"کال ریسیو کرو اور فریکوئنسی سمیت بتا دو کہ ہمارا تعلق ایک جیولوجیکل سروے ٹیم سے ہے۔" ڈین نے ہدایت دی۔

"بتا دیا ہے...... لیکن وہ ہمیں تھائی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے کی سختی سے ہدایت دے رہے ہیں۔"

"انہیں اجازت نامے کا کوڈ بتا دو...... اور کہہ دو کہ موسم کی خرابی کے باعث سگنل درست ریسیو نہیں ہو رہے ہیں۔"

"یہ بہانہ میں کرچکا ہوں۔" جیڈ نے جواب دیا۔

"کیا ہم ابھی تک تھائی حدود میں ہیں؟"

"گلف آف تھائی لینڈ کے اوپر پرواز کررہے ہیں۔"

"بلندی......؟"

"تین ہزار فٹ۔"

"چار تک لے جاؤ۔"

"پانچ سو سے زیادہ اضافہ نہیں کرسکتا۔"

"او کے جتنی بلندی پر لے جاسکتے ہو، لے جاؤ۔ اور انہیں بلف کرو کہ خرابی درست کی جارہی ہے۔ تب تک ہم ان کی فضائی حدود سے نکل چکے ہوں گے۔"

"او کے سر......!"

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ رکھے تھے پھر میں نے ڈین سے پوچھا۔

"کیا تھائی حکومت کے علم میں آگیا ہے کہ اس جہاز میں گوتم بدھ کا مجسمہ چوری کر کے لے جایا جارہا ہے؟"

"ابھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔" اس نے سرسری سا جواب دیا تو روڈلف نے اس سے دریافت کرنا چاہا۔

"تم نیچے اپنے ساتھیوں سے رابطے میں تو رہو۔ کاسپاکو کی کیا پوزیشن ہے؟ کیونکہ باقی کی آسانی وہی ہمارے لیے پیدا کرسکتا ہے۔"

ڈین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ ڈین کا روڈلف کے ساتھ یہ روکھا رویہ کوئی بھی گل کھلا سکتا تھا۔ میں نے روڈلف کا ہاتھ آہستگی سے دبایا، وہ میرا اشارہ سمجھ کر چپ ہو رہا تو میں نے اس کے کان میں سرگوشی کر ڈالی۔

"ڈین بہتر طریقے سے حالات کو ہینڈل کررہا ہے۔ میرا خیال ہے اسے نیچے سے ہدایات موصول ہو رہی ہیں اور وہ ہم سے شیئر کیے بغیر انہی پر عمل کرتا رہے گا۔ ہم اب

ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ اس لیے صبر سے اچھے وقت کا انتظار کرتے رہو اور ڈین سے الجھنے کی ہرگز کوشش مت کرنا۔"

"اوکے جون......!" روڈلف نے ہولے سے کہا۔ سون اس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے بھی سرگوشی میں میری بات سن لی تھی، لیکن وہ جواب میں روڈلف کی طرح خاموش نہیں رہ سکی آہستہ سے بولی۔

"لیکن...... ڈین کو ہم سے اپنی باتیں شیئر کرنی چاہئیں۔ اگر ہدایات میں تبدیلی کی گئی ہے تو اسے ہم سے مشورہ تو کرہی لینا چاہیے۔"

"ہاں! تمہاری بات صحیح ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "لیکن ابھی ٹھہرو میں موقع نکال کر اس سے بات کرتا ہوں۔"

سفر جاری تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ...... تھائی لینڈ کی ملٹری یا فضائی فورس ہمارے طیارے کے خلاف کہیں اسالٹ ایکشن نہ لے ڈالے، ایسی صورت میں طیارے کی تباہی یقینی تھی۔ جب میں نے ذرا دیر اپنے اس خدشے کا اظہار ڈین سے کیا تو اس نے میری بات قہقہے میں اڑا دی اور بولا۔

"ہم فضائی حدود کے اجازت نامے کا فریکوئنسی کوڈ بتا چکے ہیں۔ ایسا کوئی ایکشن نہیں لیا جاسکتا۔ اس کی حدود سے نکلتے ہی جوشوا پارٹی ہماری مدد کرے گی۔ تاہم موجودہ حالات کے پیشِ نظر پروگرام میں تھوڑی تبدیلی کردی گئی ہے۔"

"کیسی تبدیلی؟" روڈلف نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کمبوڈیا اور ویت نام کی حدود عبور کرنے کے بعد ہمیں کچھ دن جزائر فلپائن میں اسٹے کرنا پڑے گا۔"

"لیکن باس کے مطابق ہمارا اسٹے بحرالکاہل میں واقع ایک فرضی نام والے جزیرے ڈارک آئی لینڈ میں ہونا تھا؟" میں نے اسے یاد دلایا۔

"کہا نا کہ پروگرام میں تبدیلی کردی گئی ہے۔"

"یہ تبدیلی باس کے حکم سے کی گئی ہے؟" اس بار سون نے دریافت کیا۔

"ہاں!" ڈین نے اثبات میں سرہلایا۔

"لیکن باس تو خود پولیس کی گرفت میں ہے۔" میں نے کہا۔

"باس اپنا پلان پیش کرچکا تھا اور جیڈ اسی پر عمل کررہا ہے تاہم باس زیادہ دیر پولیس کی کسٹڈی میں نہیں رہ سکتا۔"

"لیکن آگے ہماری کمانڈ کس کے حوالے ہوگی؟" میں نے سوال کیا۔

"جوشوا پارٹی کو نیا پلان بتا دیا گیا ہے۔ وہ اس حوالے سے ہماری رہنمائی کرے گی۔" ڈین نے جواب دیا۔ پھر بولا۔ "اب مجھے ذرا جیڈ سے بات کرنے دو۔" کہتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے لوکیشن وغیرہ دریافت کرنے لگا۔

میری طرح روڈلف کے ذہن میں بھی ابھی بہت سے سوال گردش کررہے تھے۔ جس کے بارے میں ہم دونوں وقتاً فوقتاً تبادلۂ خیال کررہے تھے۔ ہمارا سفر جاری تھا۔ کافی وقت بیت گیا اور یہ وقت ہم نے کبھی سوتے جاگتے بتایا تھا۔ کافی دیر بعد ڈین نے جوشِ مسرت تلے ہمیں بتایا کہ...... ہم ویت نام کو عبور کرکے ساؤتھ چائنا سی کے اوپر سے فلپائنی جزائر کی حدود میں داخل ہوگئے ہیں اور گومبورا نامی ایک جزیرے کے ساحل پر اترنے والے ہیں۔ اس جزیرے کی جنوب مشرقی حدود سے انڈونیشیا کی آبنائے ملتی ہیں۔ چونکہ یہ عام فضائی روٹ سے ہٹ کر راستہ اختیار کیا گیا تھا اسی لیے ہمیں ساڑھے تین گھنٹے لگ گئے تھے، ورنہ یہ سفر مقررہ فضائی روٹ سے تقریباً تین گھنٹوں پر محیط ہوتا۔ وقت بھی ایک گھنٹے کے فرق سے آگے پیچھے تھا۔

بارش کا شور ختم ہوچکا تھا۔ یہاں مطلع صاف تھا اور سورج کی روشنی پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔

"تھائی حکومت کو اگر اس امر کا یقین ہوگیا کہ...... کوہانگو جزیرے سے فلائی کرنے والے سیسنا کارنیوال بش...... میں ایک ملکی نوادرات کا حامل بیش قیمت مجسمہ چوری کرکے لے جایا جارہا ہے تو...... وہ انٹرپول کے ذریعے ہمارے خلاف کسی بھی خطے میں کارروائی کرسکتے ہیں۔" میں نے اپنے دل و دماغ میں کافی دیر سے پلنے والے ایک خدشے سے ڈین چنگ کو آگاہ کرنا ضروری سمجھا تو وہ مسکرا کر بولا۔

"انہیں ابھی اس کی تصدیق کرنے میں وقت لگے لگا۔ تب تک ہم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

"بچوں والی باتیں مت کرو مسٹر ڈین!" روڈلف نے سرد لہجے میں اس سے کہا۔ اس نے بازو کی پٹی اتار دی تھی اور تھوڑا بہت ہاتھ ہلانے جلانے لگا تھا۔ تاہم بینڈیج جوں کی توں بندھی ہوئی تھی۔

"مسٹر شہزی کے اس خدشے کو ہم نظر انداز کرکے زیادہ دیر احمقوں کی جنت میں نہیں رہ سکتے۔ بین الاقوامی

قوانین بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں اس سلسلے میں مسٹر ڈین......"

میرے خیالات کا یکساں ہونا ایک اچھی علامت تھی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اسے اپنے جس پلان سے پہلے ہی آگاہ کررکھا تھا وہ اس سے ہر طرح مطمئن اور مسرور بھی تھا۔ کیونکہ اس میں اس کی اپنی مکتی بھی نظر آتی تھی۔

فلپائن سے طیارے کے اگلے سفر کے لیے فیول کا بھی بندوبست کرنا تھا اور کاسپا کو اور جیڈ وغیرہ کے مطابق وہاں جوشوا کے دو آدمیوں کو ہمارے ساتھ شامل ہوجانا تھا، فیول کا بندوبست اور آگے روانگی کی ذمّے داری ان کی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ڈین چنگ، جیڈ دونوں کھڑکی سے نیچے دیکھنے لگے۔ جیڈ نیچے کہیں اپنی انگلی کے اشارے سے ڈین سے کچھ کہہ رہا تھا اور وہ بھی اپنی سیٹ سے تھوڑا اٹھ کر کھڑکی سے نیچے تکنے لگا، لامحالہ میں نے بھی اپنی طرف کی کھڑکی سے نیچے دیکھا۔

میں نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ فلپائنی جزائر بڑا دیدہ زیب منظر پیش کررہے تھے۔ حدِ نگاہ نیلے بحرالکاہل کے گہرے نیلگوں پانیوں میں کوئی جزیرہ دل کی شکل تھا اور کوئی پتے اور ٹپکے ہوئے آنسو کی شبیہ کا نظر آتا تھا۔ مختصر آبنائیں انہیں ایک دوسرے سے ملائے ہوئے دکھائی دی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے خوابوں کی کوئی سرزمین تھی جو ہماری منتظر ہو۔ مذکورہ جزیروں کے ساحلوں پر کشتیاں چھوٹے بڑے شپ اور لوگ باگ ... کیڑوں مکوڑوں کی طرح رینگتے دکھائی دے رہے تھے۔

سورج کی نودمیدہ کرنوں کا عکس دور تک جھلملاتے نیلگوں پانیوں میں بڑا شفق رنگ منظر پیش کرتا تھا۔

گومبورا نامی جزیرہ نسبتاً ان سے الگ تھلگ تھا، ایک چھوٹی سی آبی راہ گزر اس سے جڑی ہوئی نظر آتی تھی۔ طیارے نے اس کے اوپر فضا میں ایک چکر لگایا اور پھر نیچے اُترنے لگا۔ ہمیں سیٹ بیلٹس باندھنے کا ہدایات نامہ جاری کیا جاچکا تھا۔

پھر سے ایک نئے دیس اور اجنبی سرزمین پر اُترنے کا جوش اپنی جگہ تھا، مگر فطری خدشات اور متوقع و غیر متوقع حالات کی کشاکشی کا دھڑکا بھی کسی ممکنہ خطرے کی صورت دامن گیر تھا۔ نجانے اس پرائے دیس میں اب کون سے ہنگامے میرے منتظر تھے؟

جلد ہی مجھے جیڈ اور ڈین کے نیچے دیکھنے کا مقصد معلوم ہوگیا۔ جزیرے کے ساحل سے ایک ڈیڑھ کلومیٹر دور کھلے سے میدان میں ایک سرخ رنگ کی چادر والا ٹینٹ سا نصب دکھائی دیا۔ وہاں دو عدد "فور وہیل موٹر بائیک" بھی کھڑی نظر آئیں۔ ایک کا رنگ نیلا اور دوسری کا سرخ تھا۔ ایک لمبی سی جیپ بھی کھڑی تھی۔ چند لوگ بھی کھڑے نظر آرہے تھے۔ جو سر اٹھائے آسمان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ یقیناً ان کی نظریں ہمارے طیارے پر لگی ہوئی تھیں۔

ابھی میں پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر سیٹ پر سیدھا ہوکے بیٹھا ہی تھا کہ ڈین کی مسرت بھری آواز اُبھری۔

"مبارک ہو دوستو! جوشوا کی ٹیم پہنچ گئی ہے۔"

"کہیں تمہارا اشارہ اس سرخ رنگ کے بڑے سے خیمے کی طرف تو نہیں ہے، مسٹر ڈین؟" میں نے کسی خیال کے پیشِ نظر دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ویل! خوب سمجھے، جوشوا کے چار عدد ساتھی ہمارے لیے پہنچ چکے ہیں۔ اب ہمیں کسی قسم کی چنتا کی ضرورت نہیں......"

اس کی بات سنتے ہی اچانک میری کنپٹیاں سنسنانے لگیں۔ یہ اسپیکٹرم کے رکن تھے۔ ان کی کیا حیثیت تھی، آیا یہ تربیت یافتہ تخریب کار ٹائپ ایجنٹ تھے یا پھر محض فیلڈ اسکواڈ سے متعلق عام سے لوگ......؟ نیز ان میں سے کون ایسا ہوسکتا تھا جو مجھے اسپیکٹرم کا دشمن نمبر ایک کے طور پر پہچان سکتا تھا؟ جوشوا......؟ یا کوئی اور...... جسے میرے سلسلے میں پہلے سے کوئی خاص ہدایت دی گئی ہو؟ اگرچہ میں نے اپنی طرف سے پوری رازداری برتنے کی کوشش چاہی تھی پھر بھی محتاط رہنا ضروری تھا۔

"کیا جوشوا بھی آیا ہوا ہے؟" دفعتاً روڈلف نے ڈین سے وہی سوال پوچھ لیا جو میں ابھی کرنے والا تھا۔

"وہ اسکوائر سٹی کے ہوٹل میں مقیم ہے۔" ڈین نے جواب دیا۔

میں روڈلف کے اس سوال کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ جوشوا سے اسے نفرت ہوگئی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ ہم دونوں ہی کی یہاں جوشوا سمیت ڈین سے بھی کوئی بڑی جنگ ہوسکتی تھی۔ درحقیقت میں نے اور روڈلف نے متفقہ طور پر اسپیکٹرم کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے لانے کا عہد کرلیا تھا... ہمیں انٹرپول سے کسی طرح رابطہ کرکے ان کی اس "گریٹ روبری"...... کا منصوبہ ناکام بنانا تھا۔

بہرکیف...... ادھر طیارے نے ایک چکر پورا کرنے

کے بعد سمت کا تعین کیا اور ایک غوطہ لگایا۔ میرا جی الٹنے لگا۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے طیارہ کسی آبی شکاری پرندے کی طرح پانی میں غوطہ لگا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا عین وقت پر طیارے کی بحرالکاہل پر جھکی ہوئی آہنی چونچ اوپر کو اٹھی اور اس نے سطح آب پر ''لینڈ'' کرلیا۔

طیارہ تیزی سے تیرتا پانی کے فوارے اچھالتا ہوا سیدھا ہوا اور جزیرے کے ساحل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی رفتار بھی بتدریج کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ وہ سطح آب پر ''ٹیکسی'' کرتا ہوا ساحل کی طرف مڑا اور پھر اپنے مخصوص فلوٹن اسکو کی بدولت وہ پانی میں تیرتا ہوا ساحل پر آگیا۔

طیارے کا انجن رواں تھا اور چونچ پر نصب پنکھا ہنوز تیزی سے گھوم رہا تھا۔ ساحل پر آتے ہی وہ ریت پر رینگنے لگا اور آہستہ آہستہ ہٹ نما بے خوب صورت خیمے کے قریب پہنچ گیا۔ جہاز سے اُترنے سے پہلے میں نے سب کو اپنے نام کے سلسلے میں محتاط کر دیا تھا کہ جو نام میرا کاسپاکو نے تجویز کیا ہے، وہی چلے گا۔

وہاں چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں ایک جوان عورت تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا گنجا شخص تھا۔ باقی دو جوان مرد تھے۔ انہوں نے موسم کی مناسبت سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔

عورت دلکش خدوخال کی مالک تھی اور دراز قامت تھی۔ وہ ایک ٹھیٹ امریکن نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی ہالی ووڈ کی ایکشن تھرلر فلموں کی اداکارہ ہو، میں اپنی ''خاص'' بھانپتی ہوئی نظروں سے ان چاروں کی چال ڈھال اور انداز و اطوار کا جائزہ لینے لگا۔ ان میں سے مجھے دو تربیت یافتہ ایجنٹ معلوم ہو رہے تھے۔ باقی ادھیڑ عمر اور دوسرا نوجوان عام سے انداز و اطوار کے دکھائی دیتے تھے۔ اول الذکر...... دونوں مرد عورت...... تنے ہوئے جسم اور چست نظریں لیے ہمیں تکے جا رہے تھے۔ ہم سے انہوں مصافحہ بھی کیا تھا باری باری...... میں نے نمایاں طور پر محسوس کیا تھا کہ دونوں مرد عورت نے بالخصوص روڈلف اور مجھ سے ملتے ہوئے کچھ خاص نظروں سے دیکھا تھا۔

گومبورا کے جزیرے پر بڑی غضب کی سردی تھی۔ بلکہ کہیں کہیں برف بھی گری ہوئی نظر آتی تھی، یوں لگتا تھا جیسے گزشتہ شب ٹھیک ٹھاک برف باری ہوئی ہو۔

پھر جیڈ اور ڈین تو اس ادھیڑ عمر شخص اور دوسرے نسبتاً جوان آدمی سے گفتگو کرنے لگے۔ البتہ وہ دونوں ''مشکوک'' مرد عورت فوراً خیمے کے اندر گھس گئے تھے۔

میں نے روڈلف کو وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود سردی کا اثر زائل کرنے کے لیے اپنی ''گرمبی'' کے کالر کھڑے کرتے ہوئے ٹوپ سر پر چڑھا لیا اور دونوں ہاتھ آپس میں ملنے لگا۔ اس کے بعد دستانے چڑھانے لگا اور جسم کو وارم اپ کرنے کے بہانے خیمے کے اس داخلی حصے کی طرف بڑھ گیا جدھر...... میں نے کن انکھیوں سے ان دونوں کو اندر کی جانب کھسکتے دیکھا تھا۔

''ہیلو، ہیلو بروجیٹ کالنگ، یس باس! وہ دونوں ساتھ ہیں...... روڈلف اور شہزی!''

دفعتاً مجھے جوان مرد کی آواز سنائی دی اور میرے کان یکایک کھڑے ہو گئے۔ میں تھوڑا اور اندر کھسک آیا۔ چند ثانیے کے لیے خاموشی چھائی رہی جیسے وہ دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو غور سے سن رہا ہو۔

''او کے باس! روڈلف کو حادثاتی موت کا شکار کر دیا جائے گا۔ شہزی کو کڈنیپ کرنے کے لیے ماسٹر چیف کا وہی حکم ہے...... باقی ڈین سے سودے بازی کی نوعیت جوں کی توں رہے گی۔ ڈارک آئی لینڈ سے انہیں کیش رقم دے کر لوٹا دیا جائے گا۔'' بروجیٹ کی مجھے دوبارہ آواز اُبھری اور میرے اندر چیختے ہوئے سناٹے اُترنے لگے۔

میں نے صرف اپنا نام بدلا تھا، چہرہ نہیں، کیا بعید تھا کہ ان کے ماسٹر چیف لولوش نے میری تصاویر انہیں دکھا رکھی ہو۔ بروجیٹ سمیت کیٹ وغیرہ مجھے پہلے ہی پہچان گئے ہوں۔ اس عورت کا نام کیٹ تھا۔

بہرطور کاسپاکو سے اپنی ''ڈیل'' کو چھیڑے بغیر انہوں نے میرے اور روڈلف کے لیے پہلے ہی سے پلان تیار کر رکھا تھا اور ''ماسٹر چیف'' کے ذکر پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس کا مطلب لولوش سے ہی تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ اس ''کاز'' پر اسپیکٹرم کے دو فیلڈ اسکواڈ مشترکہ طور پر کام کر رہے تھے۔ جبکہ میرا یہ قیاس درست ثابت ہوا تھا کہ دونوں مرد عورت اسپیکٹرم کے اسالٹ ونگ سے تعلق رکھتے تھے اور یہی ونگ اسپیکٹرم کے دیگر اسکواڈ پر بالادست حیثیت کا حامل بھی تھا۔

اسی وقت مجھے اس عورت کی آواز سنائی دی، جب میں نے اس کے ساتھی کو ''اوور اینڈ آل'' کہتے سنا تھا۔

''بروجیٹ! ہمیں یہ کام نہایت محتاط انداز میں اور چابک دستی سے کرنا پڑے گا۔ کیونکہ روڈلف تو نہیں البتہ ہمارا اصل شکار شہزی، ان کا خاص ساتھی ہے۔ اس صورت میں یہ ڈیل متاثر ہو سکتی ہے، کیونکہ اس خدشے کا اظہار جوشوا

بار بار باس اسٹاربک سے کر چکا ہے۔ روڈلف کا تو اتنا نہیں البتہ شہزی کے سلسلے میں ماسٹر چیف ہمیں بار بار احتیاط کے لیے کہہ چکا ہے کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔''

جواب میں بروجیٹ کی آواز ابھری۔ ''اسٹاربک سارے انتظامات کر چکا ہے۔ ڈیواؤ میں اسکوائرسٹی کے ایک ریزورٹ میں بیٹھا وہ جھک نہیں مار رہا۔ ساری پلاننگ وہ تیار کر چکا ہے۔ صرف ہماری طرف سے گرین سگنل دینے کی دیر ہے۔ شہزی کے سلسلے میں اسٹاربک کی بریفنگ اپنی جگہ مگر ماسٹر چیف نے خاص طور پر مجھے بھی اس کے بارے میں یہی ہدایت دی ہے کہ وہ بلا کا چھلاوا صفت، زیرک دماغ اور شاطر آدمی ہے۔ اس کی خطرناکی کو چھیڑے بغیر کام نکالنے کی کوشش کریں گے۔''

اس کی بات سُن کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تیر گئی۔ لولوش کی میرے خلاف یہ بزدلانہ کارروائی میری طرف سے اس کے لاشعور میں چھپے ہوئے خوف کا پتا دیتی محسوس ہوتی تھی۔ شاید اپنے ایک مقرب خاص کارپرداز...... وزیر جان کے میرے ہاتھوں عبرت ناک انجام کے بعد سے وہ...... خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ اب جبکہ میری اَپ ڈیٹ کے مطابق عابدہ بھی اس کے قبضے سے کوسوں دور جا چکی تھی۔

''تو پھر کب تک گرین سگنل دینے کا ارادہ ہے؟'' کیٹ نامی اس کی ساتھی ایجنٹ عورت نے پوچھا۔ دونوں دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ ساتھ ہی مجھے باہر سے بھی ... باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جہاں ڈین ان کے دونوں آدمیوں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ روڈلف اور سون بھی ان کے ساتھ تھے۔

''گرین سگنل میں نہیں جوشوا دے گا اسٹاربک کو...... کیونکہ گوتم بدھ کے مجسمے والا معاملہ ماسٹر چیف کے سامنے زیادہ اہم ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا۔ ڈیواؤ کے ریزورٹ (RESORT) میں دونوں اسکواڈ کے باسز ساتھ ہی موجود ہیں۔''

اسی وقت مجھے باہر موجود لوگوں کے بولنے کی آوازیں قریب آتی سنائی دیں۔

''وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں بروج!'' اچانک اندر سے مجھے عورت کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے ساتھی ایجنٹ بروجیٹ سے مخاطب تھی۔ میرے لیے واپسی کا راستہ نہیں بچا تھا۔ اسی لیے میں دائیں جانب سے آگے بڑھ گیا اور...... عقبی حصے سے ہوتا ہوا باہر کھلی فضا میں آ گیا۔

سانس لینے کے دوران میں میرے منہ سے بھاپ کی صورت میں دھواں خارج ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل چھانے لگے تھے۔ موسم ہنوز سرد اور خشک ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے دھوپ کی روشنی پھیلنے لگی تھی جو اب اچانک غائب ہو گئی تھی۔

''مسٹر شہزی...... !''

اچانک مجھے کسی نے آواز دی۔ یہ ڈین تھا۔ میں پلٹا اور اسی طرف آ گیا۔ مجھے سخت طیش آ رہا تھا کہ منع کرنے کے باوجود ڈین نے مجھے شہزی کے نام سے پکارا تھا۔

''تم سردی میں ادھر کیا کر رہے ہو؟ اندر آ جاؤ۔''

ڈین نے کہا۔ وہ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں سر ہلاتا ہوا ان کے ساتھ ہو لیا۔

ہم اندر آ کر بیٹھ گئے۔ میرے اندر زبردست دھکڑ پکڑ مچی تھی۔ روڈلف کی جان خطرے میں اور خود میں بھی اس سے باہر نہ تھا۔ وہی ہوا تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ اسپیکٹرم واقعی ایک آکٹوپس کا نام تھا۔ اس کے دونوں اسکواڈ کے باس اسٹاربک اور جوشوا قریبی جزیرے ڈیواؤ کے ایک ریزورٹ میں مقیم تھے۔ اسٹاربک کے ذمے مجھے اور روڈلف کو ٹھکانے لگانا تھا جبکہ جوشوا نے ڈین کے ساتھ بدھا کے مجسمے کے سودے کو پار لگانا تھا۔ گویا اسٹاربک کے ساتھی یہ دونوں ایجنٹ کیٹ اور بروجر تھے جبکہ جوشوا کے ساتھی وہ ادھیڑ عمر اور جوان مرد تھا۔ روڈلف کو ٹھکانے لگانے کی ان کی کیا منصوبہ بندی تھی، اس کا مجھے ابھی علم نہ ہو سکا تھا تاہم پتا چل گیا تھا کہ وہ ہم دونوں کے خلاف کیا کرنے والے تھے۔

روڈلف کو ابھی اس خطرے سے آگاہ کرنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا تھا تاہم میں اس کی طرف سے محتاط تھا۔

خیمے کی ایک وسیع نشست گاہ میں ہم تھوڑی دیر تک بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ ادھیڑ عمر آدمی کا نام جوزف اور اس کے ساتھی جوان مرد کا نام گیری معلوم ہوا تھا۔

عورت جس کا نام کیٹ تھا اور بروجر خاموش تھے جبکہ ڈین اور جوزف کے درمیان اسی مجسمے سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ کمرے میں ڈش انٹینا والے ٹی وی کا بھی بندوبست تھا۔ جو اس وقت آن تھا۔ باقی ضروریاتِ زندگی کی ہر شے وہاں موجود تھیں۔

اچانک ہم سب اس وقت چونک پڑے جب ٹی وی پر بریکنگ نیوز میں ہمارے طیارے کی تصاویر دکھائی جانے

لگیں جس میں تھائی حکومت نے فلپائن حکومت سمیت انٹرپول سے درخواست کی تھی کہ تھائی کی فضائی حدود سے ایک سیسنا کاریوال بش طیارہ گزشتہ شب پرواز کر کے گلف آف تھائی لینڈ سے ساؤتھ چائنا سی چینل کے اوپر پرواز کرتا ہوا فلپائنی فضائی حدود میں داخل ہوا ہے۔ ایک اور خاتون خبر سناتے ہوئے بتانے لگی۔

اس طیارے میں بینکاک کے ترتیر میوزیم سے چوری کیا گیا بدھا کا بیش قیمت اور نادر مجسمہ لے جایا گیا ہے۔ ایک امریکی ٹی وی چینل کے مبصر تھائی لینڈ حکومت کو اپنے ''صائب'' مشورے سے آگاہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ تھائی حکومت کو بین الاقوامی معتبر ادارے ''اسپیکٹرم'' سے بھی اس سلسلے میں مدد لینی چاہیے۔ جس کی شہرت اس حوالے سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ...... وہ ایسے چوری شدہ نوادرات کو اس کے جائز اور صحیح مقام تک لانے میں بہترین مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

''اوہ...... تھائی حکومت کا انٹرپول سے رابطہ کرنا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہیں۔'' جوزف متفکر لہجے میں بولا۔ اس کا ساتھی گیری بھی تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ لیکن بروجیٹ اور کیٹ کے بشروں سے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ بظاہر نارمل ہی نظر آرہے تھے۔ البتہ ڈین، جوزف کی طرف دیکھ کر بولا۔

''انٹرپول سے تھائی حکومت کا مدد لینا ہمارے لیے ایک بڑے خطرے کی علامت ہے۔'' پھر جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا اور وہ جوزف کی طرف سے اپنے سوال کے جواب انتظار کیے بغیر میری طرف دیکھ کر مزید بولا۔

''جون! تمہارا خدشہ تو بالکل درست ثابت ہوا۔ کمال ہے تمہیں اس کا کیسے ادراک ہو گیا تھا؟''

ڈین کے اس پرلے درجے کے بے وقوفانہ سوال پر میں اندر سے تلملا کر رہ گیا۔ میرے خیال میں اسے بلاوجہ یہ بات، وہ بھی ان سب کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھی۔ تاہم میں نے فوراً مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ تو عام سی بات ہے۔ حالات جیسے نظر آرہے تھے ان کی رو سے میں نے اندازہ لگایا تھا جو اتفاق سے درست ثابت ہوا۔''

جوزف کے چہرے پر ہنوز گہرے تفکر کے سائے لرزاں تھے، جبکہ بروجیٹ اور کیٹ میری طرف بڑے غور اور تیکھی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ روڈلف کا چہرہ مجھے کچھ سرخ سا نظر آرہا تھا۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی کہ ان چاروں نے روڈلف کے بارے میں ذرا سی بھی شناسائی کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

''اس میں تم لوگوں کی بھی غلطی ہے۔ تمہیں روانہ ہوتے وقت بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ حیرت ہے کاسپا کو اتنا ہی گیا گزرا آدمی ہے کہ...... اس کا کوئی بھی آدمی یوں بہ آسانی اس سے متنفر ہونے کے بعد پولیس کو اس کے خلاف کر سکتا ہے؟'' بروجیٹ نے کہا۔ اس کا لہجہ طنزیہ اور خار کھایا ہوا تھا۔ جوزف نے بھی اس کی بات کی تائید میں اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

میں نے دیکھا اس کی بات پر ڈین نے برا سا منہ بنایا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک روڈلف نے بروجیٹ کو تگڑے جواب سے نواز دیا۔

''نیت میں فتور ہو تو معاملات اسی طرح بگڑنے لگتے ہیں۔ ہمارا پہلے والا منصوبہ بے حد خفیہ اور شان دار تھا۔ لیکن جوشوا کی بدنیتی کے سبب تاخیر اس کی وجہ بنی اور کاسپا کو کے کسی اپنے ہی باغی آدمی میں سے ایک نے تھائی پولیس کو گمنام کال کر کے مجسمے کی چوری سے متعلق آگاہ کر دیا، یہ بات اپنی جگہ درست سہی، لیکن اس معاملے کی خرابی کی اصل وجہ وہی ہے جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔'' سب قدرے چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

اس کی بات پر اچھے بھلے دوستانہ ماحول میں پل کے پل کشیدگی کا سا سناٹا طاری ہو گیا۔ روڈلف اندر سے جلا ہوا تھا اور دل کے پھپھولے پھوڑے بنا نہ رہ سکا۔ مجھے اس کا یوں بولنا ایک لحاظ سے درست بھی لگا، جو فیکٹ تھا وہ اس نے اگل دیا تھا۔

''یوشٹ اَپ۔'' اچانک ہی بروجیٹ نے روڈلف کو غصے سے جھڑک دیا۔

''باس کی شان میں ایسا کہتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''میں نے باس جوشوا کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کی۔'' روڈلف بدستور جلے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔ ''جو حقیقت ہے، وہی بیان کر رہا ہوں میں۔''

''ایسا تمہاری اپنی نیت کی خرابی کے بل بوتے پر ہوا تھا۔'' بروجیٹ بحث پر اتر آیا۔ دونوں ہی اگرچہ اسپیکٹرم کے کارکن تھے۔ مگر دونوں کی اسپیکٹرم میں نوعیت مختلف تھی۔ روڈلف کے فیلڈ اسکواڈ کے مقابلے میں اسالٹ ونگ کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ روڈلف فیلڈ اسکواڈ سے تعلق رکھتا

تھا۔ یوں تو اسپیکٹرم میں اس ونگ کی بھی کوئی معمولی حیثیت نہیں تھی کیونکہ اسپیکٹرم کی ساکھ کو عالمی تناظر میں ''معتبر'' بنائے رکھنا اسی کی ذمے داری تھی اور فضائی حد تک انہیں بھی لڑائی بھڑائی اور اسلحہ وغیرہ کی تربیت ہوتی تھی۔

''میرا اب منہ مت کھلواؤ بروجیٹ!'' روڈلف زخمی لہجے میں بولا۔ تو کیٹ نے درمیان میں مداخلت کرتے ہوئے ثالثی کا کردار ادا کیا۔

''تم دونوں کی آپس کی بحث بے معنی اور فضول ہے۔ نیت جس کی بھی خراب تھی، وہ معاملہ اب خوش اسلوبی سے طے پا چکا، اب آگے کی سوچو۔''

''ہماری یہاں سے اب جلد از جلد روانگی کا بندوبست کر دینا چاہیے۔'' ڈین نے بھی مصلحتاً کسی بحث میں پڑے بغیر کہا تو میں بولا۔

''لیکن اب ہمارا کم از کم جہاز کے ذریعے فلائی کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ ہمیں امریکا روانگی کا کوئی اور بحری بندوبست کرنا ہوگا۔''

''بہتر ہوگا کہ جوشوا اور اسٹاربک کو ادھر بلا لیا جائے۔ ہم سب اس وقت خطرے میں گھر چکے ہیں۔ اور جہاز سے بھی ہمیں پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔'' روڈلف نے بھی مشورہ دیا۔

ڈین نے اس کی بات کی تائید کے انداز میں ہی ان لوگوں سے کہا۔ ''یہی بہتر ہوگا کہ ہم یہاں آپس میں سر جوڑیں وقت ضائع نہ کریں، ان دونوں کو ادھر ہی بلا لیا جائے۔''

وہ چاروں سوچتی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بالآخر جوزف نے بروجیٹ سے کہا۔

''میں تو اپنے باس مسٹر جوشوا سے بات کرنے لگا ہوں، یقیناً یہ خبریں انہوں نے بھی سن لی ہوں گی۔ تم کیا کہتے ہو بروجیٹ؟''

اس کی بات پر بروجیٹ نے کیٹ کی طرف دیکھا۔ میں ان دونوں کی اپنے اور روڈلف کے سلسلے میں فتورِ نیت سے آگاہ ہی تھا کہ اپنے دلوں میں ہم دونوں کے لیے کیا خطرناک منصوبہ چھپائے ہوئے تھے۔ اسی سبب وہ مخمصے کا شکار نظر آنے لگے۔ تب ہی کیٹ نے کہا۔

''میرا خیال ہے پھر ہمیں اسٹاربک سے بات کر لینی چاہیے۔''

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اچانک خیمے کے محدود ماحول میں تیز سی ''بپ...... بپ......'' کی آواز اُبھری اور بروجیٹ نے چونک کر اپنے ہاتھ کی ہتھیلی کو اپنے منہ کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

''اوہو...... شاید باس نے خود ہی رابطہ کر لیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر چند مخصوص الفاظ ادا کیے اور دوسری جانب سے اپنے باس اسٹاربک سے باتیں کرتا رہا اور آخر میں یہی بولا کہ ''یس باس! ہم بھی یہاں اسی سے متعلق باتیں کر رہے تھے۔''

پھر وہ اسی طرح رسٹ واچ اپنے منہ کے قریب کیے ہوئے ہم سے معذرت کر کے اٹھا اور باتیں کرتا ہوا خیمے کے دوسرے بعید ترین گوشے کی طرف چلا گیا۔ میں کن انکھیوں سے اسی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

روڈلف کے چہرے پر بھی کچھ الجھن کے آثار نمودار ہوئے تھے۔ جبکہ کیٹ میری طرف بہ غور تکنے لگی۔ ہم دونوں کے سوائے کسی نے بھی بروجیٹ کے اس طرح واچ ٹرانسمیٹر پر باتیں کرتے کرتے اٹھ کر جانے کو خالی از علت نہیں جانا تھا، میرے ذہن میں تو پہلے ہی سے تھا کہ بروجیٹ اسٹاربک سے میرے اور روڈلف کے سلسلے میں موجودہ حالات میں کوئی نئی ''ہدایت'' یا ''منصوبہ'' لینے کے لیے اس طرح اٹھ کر گیا تھا کہ تنہائی میں وہ اسٹاربک سے اس نوعیت کی گفتگو کر سکے۔

میں بے چین سا ہو گیا۔ ہم بظاہر بروجیٹ کی اس حرکت کو نظر انداز کر کے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر مزید بیتی تو کیٹ نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی اور وہ اٹھ کر اسی طرف بڑھ گئی جہاں اس کا ساتھی بروجیٹ گیا تھا۔ پل کے پل میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ نجانے اب ہمارے بارے میں ان خبیثوں نے کون سا نیا منصوبہ بنا لیا ہوگا؟ اس کا مجھے پتا نہ تھا۔ تاہم کسی متوقع واقعے کو ''حادثے'' کا رنگ دینے والی بات مجھے یاد تھی جو پہلے ہونے والی گفتگو میں بروجیٹ نے اسٹاربک سے کہی تھی۔ اب یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ حادثہ کون سا اور کس نوعیت کا ہوتا۔

''ہمیں ذرا ایکسکیوز کریں، پلیز......!'' میں نے ان لوگوں سے معذرت چاہی اور اچانک روڈلف سے کہا۔

''روڈلف! ذرا میرے ساتھ آنا۔'' وہ حیران حیران سا میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور میں تب تک خیمے کے نکاسی والے دروازے سے باہر آ گیا۔

میں دانستہ خیمے سے آٹھ، دس قدم چلتا ہوا دور آ گیا

تھا۔ روڈلف حیران و پریشان سا چلتا ہوا میرے پیچھے آگیا۔

”خیریت تو ہے شہزی!“ وہ میرے قریب آکر رکتا ہوا بولا۔

”خیریت نہیں ہے روڈلف!“ میں نے منہ سے بھاپ کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔ سردی زوروں کی پڑ رہی تھی۔ یخ بستہ ہوائیں بھی چل رہی تھیں۔

”وہ تو میں بھی دیکھ ہی رہا ہوں کہ خیریت نہیں ہے، جس کا تم پہلے ہی اس کم عقل ڈین سے بار بار اظہار کرتے رہے ہو۔“ روڈلف بولا۔ وہ اب بھی میری بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا سمجھتا بھی کیسے؟ میں نے ابھی تک اسے کچھ بتایا ہی نہیں تھا جس سے وہ لاعلم تھا اور جب میں نے اسے اسٹاربک اور بروجیت سمیت کیٹ کے ہولناک منصوبے سے اسے آگاہ کیا تو روڈلف کا چہرہ دھواں دھواں ہوگیا۔

”مائی گاڈ، مسٹر شہزی! تم تو میری سوچ سے بھی زیادہ چوکنے اور بیدار مغز ہو۔“ ساری کتھا سننے کے بعد وہ حیران سا ہوکر مجھ سے بولا۔

”میری تعریفیں کرنے سے زیادہ بہتر ہوگا کہ ہمیں اپنے منصوبے پر جلد از جلد عمل کرنے کا سوچ لینا چاہیے، قبل اس کے کہ دشمن اپنا وار کر جائے یا انٹرپول یہاں آکر ہمیں بھی دھر لے۔“ میں نے اپنے ہاتھوں کے دستانے درست کرتے ہوئے اس سے کہا اور آگے بولا۔

”سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت میری اپنی عقل بھی کام نہیں کر رہی ہے کہ ایسے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ڈز......ڈز......“

اچانک دو فائر ہوئے۔ میں اور روڈلف باتیں کرتے ہوئے بُری طرح ٹھٹکے......

”ہوشیار......! خیمے کے اندر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔“ روڈلف لرزتے لہجے میں بولا، خود میرے اعصاب ایک دم تن گئے تھے۔ پل کے پل فیصلہ کرنا تھا کہ اندر کیا ہوسکتا تھا۔ صرف چند ثانیوں کے لیے میرے ذہن میں گزشتہ لمحوں کا خاکہ ابھرا اور پھر میں چلّایا۔

”دوڑو روڈلف! خطرہ......!“ کہتے ہی میں ایک سمت کو دوڑا، روڈلف بھی متحرک ہوا۔ ہمارے اردگرد ایک ڈیڑھ کلومیٹر تک سپاٹ گھاس کا میدان تھا۔ اگر ایسے وقت میں خیمے کے اندر سے کوئی مسلح شخص باہر نکل آتا تو بہ آسانی ہم دونوں کو بھی گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا، اسی خطرے کو پیشِ نگاہ رکھتے ہوئے میں نے قریب کھڑی فور وہیل بائیک کی طرف دوڑ لگائی تھی۔

”میرے پیچھے آتے رہو، ورنہ مارے جاؤ گے روڈلف......!“ میں نے روڈلف کو اپنے پیچھے آنے کے بجائے دوسری جانب دوڑتے دیکھ کر کہا تو جیسے اسے میری بات سمجھ آگئی مگر تب تک اسے دیر ہوچکی تھی۔

میں نے دوڑنے کے دوران خیمے کی طرف نظر رکھی تھی، وہاں سے میں نے بروجیت اور کیٹ کو برآمد ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں شاٹ پسٹل نظر آرہے تھے۔ میں تب تک بائیک پر سوار ہوچکا تھا۔ چابی لگی ہوئی تھی۔ مجھے ایسی بائیک کے چلانے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ مگر اس کا سسٹم کم و بیش عام سی بائیک جیسا ہی تھا۔ اگرچہ یہ ”کک“ کے بجائے سیلف اسٹارٹ تھی۔ (کچھ ہیوی بائیکس بھی سیلف اسٹارٹ ہوتی ہیں)

بائیک اسٹارٹ ہوتے ہی میں نے ایکسلیٹر گھما دیا۔ انجن غرایا، بائیک اچھلی۔ اسی وقت گولی چلی، میرے کانوں میں روڈلف کی چیخ ابھری۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں نے ذرا گردن موڑ کر دیکھا، کیٹ مجھ پر گولی چلانے کے لیے پرتول رہی تھی۔ جبکہ بروجیت نے روڈلف کو نشانہ بنایا تھا، مجھے خطرے کا پورا احساس تھا کہ میں اتنے قریب سے کیٹ جیسی گھاگ ایجنٹ کی فائرنگ سے بچ کر نہیں بھاگ سکتا، اسی سبب پل کے پل میں نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ وہی فیصلہ......یعنی جان جانے کے یقینی خطرے میں......آر یا پار......تخت یا تختہ......بائیک غراتی ہوئی اچھلی۔

میں نے پہلے ہی اس کا رخ قریب کھڑی کیٹ کی طرف کر دیا تھا۔ اس کا اگلا حصہ اوپر کو اسی وقت اٹھا تھا جب کیٹ نے بھی مجھ پر گولی داغ دی۔ وہ بائیک کے نچلے حصے میں کہیں لگی، مگر تب تک بائیک غراتی ہوئی کیٹ سے ٹکرائی، وہ اچھل کر پرے جا گری۔ بروجیت بالکل اس کے ساتھ ہی پوزیشن سنبھالنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے اسے بھی زد میں لینے کی کوشش چاہی تو وہ بروقت اچھل کر ایک طرف کو ہوگیا۔ اس نے قدم جماتے ہی مجھ پر پستول سیدھا کیا، مجھے اس کی متوقع حرکت کا اندازہ تھا، اسی سبب میں نے بائیک اسی طرف موڑ دی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ وہ میری بائیک سے ٹکرانے سے پہلے ہی مجھ پر گولی داغ دے گا، یہی وجہ تھی کہ میں نے ایکسلیٹر پورا گھما کر بائیک کی رفتار میں تیزی لاتے ہی اس پر سے اچھل گیا۔

بروجیت کو میری چالاکی اس وقت سمجھ میں آئی جب وہ مجھ پر ”خالی“ فائر کرنے کا شوق پورا کر چکا تھا۔ گولی چلی، مگر میں بائیک چھوڑ چکا تھا اور نیچے گرا، خالی بائیک غراتی ہوئی اس سے ٹکرائی تھی، میں نے اٹھنے میں ذرا بھی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، محل و موقع، مرحلہ وار فاسٹ ایکشن لینے کا تھا۔

بروجیت چند سیکنڈوں کے لیے گیا تھا، تب تک کیٹ سنبھل رہی تھی، میں نے اٹھتے ہی اس پر چھلانگ لگائی، وہ کرولنگ کرتی ہوئی قریب گرے پڑے اپنے پستول کو زمین سے اچکنے کی کوشش میں تھی کہ میں اس پر جا پڑا۔

وہ کسی بلی کی طرح غرا کے تڑپی اور اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا پوری قوت سے میرے پیٹ پر رسید کر دیا۔ اس سے مجھے ایسی ہی پھرتی کی توقع تو تھی لیکن یہ حملہ اس کا غیر معمولی سرعت کا...... مظہر تھا۔ میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ سی نکل گئی۔ گرفت ڈھیلی پڑتے ہی وہ پھر اپنے قریب پڑے پستول کی طرف لپکی۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ لی اور اسے جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے جنگلی بلی کی طرح غراتی ہوئی چیخ نکلی، اسی وقت کوئی مجھ پر وحشیانہ غراہٹ کی طرح پل پڑا۔

یہ بروجیت تھا۔ چاہتا تھا وہ کہ مجھے مکوں اور گھونسوں کی زد میں لیتا۔ کیونکہ اسی وقت اس نے اپنے ہاتھوں پیروں کو مشینوں کی طرح حرکت دینا شروع کر دی تھی، میں نے ایک موقع تاک کر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو جوڑا اور ایک زوردار ڈبل پنچ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ یوں اس کا نہ صرف دایاں جبڑا بُری طرح متاثر ہوگیا بلکہ اس کی گردن کو بھی ایک زبردست جھٹکا لگا۔ جس کے باعث وہ تھوڑی دیر کے لیے بالکل ہی بے سدھ ہوگیا۔

اسی وقت مجھے کیٹ کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”خبردار! اب حرکت مت کرنا...... ورنہ......“ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا پستول لیتے ہوئے مجھے دھمکایا اور اسی وقت میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی جس کے باعث بس! لمحہ بھر کو ہی وہ الجھی تھی کہ اسے عقب سے ایک زبردست دھکا لگا۔ اس نے گولی چلا دی۔ بلاشبہ یہ اس کا غیر ارادی مگر میرے لیے ایک خطرناک عمل ہوسکتا تھا، کیونکہ گولی مجھے بھی لگ سکتی تھی۔ لیکن دھکا لگنے سے فائر ہوا میں کھل گیا۔

میں اس کے عقب میں روڈلف کو لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھتے ہوئے دیکھ چکا تھا اور میرے ہونٹوں پر ابھرنے والی زہریلی مسکراہٹ کی وجہ یہی تھی۔ روڈلف زخمی ہونے کے باوجود محض ہمت اور اپنی قوتِ ارادی کے جذبے تلے یہاں تک کسی طرح کھسک آیا تھا۔

ادھر دھکا لگنے سے کیٹ کے قدم نہ صرف بہک گئے تھے، بلکہ اس اچانک کارروائی سے وہ اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ اسی سبب وہ گری تھی اور میں اس پر جھپٹا تھا۔

سب سے پہلے میں نے اس کا پستول اپنے قبضے میں کیا اور مجبوراً اسے اسی حال میں چھوڑ کر روڈلف کو سنبھالنے کے لیے لپکا جو خود بھی بے سدھ سا ہوکر گر پڑا تھا۔ خیمے کی طرف سے مجھے دو افراد نمودار ہوتے اور یہ سب کارروائی دیکھتے نظر آئے۔ میں نے ان کی طرف دو فائر جھونک دیے۔ وہ ترنت اندر بھاگ گئے۔ ان کا تعلق اسپیکٹرم کے فیلڈ اسکواڈ سے تھا اسی لیے وہ زیادہ دیر میرے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

میں نے زخمی روڈلف کو سنبھالا اور اسے سہارا دیتا ہوا الٹی پڑی بائیک تک لایا۔ اسی دوران میری گردشی نظروں نے کیٹ اور بروجیت کو بیک وقت حرکت کرتے دیکھا۔ وہ قریب پڑے آخری پسٹل کی طرف کھسک رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف تلے اوپر دو فائر جھونک مارے۔ ایک گولی، کیٹ کی ٹانگ پر اور دوسری بروجیت کے بازو پر لگی۔ وہ حلق کے بل چیخے۔ یقیناً اس پسٹل کی مار تباہ کن تھی۔ ضرور ان کی ہڈیاں متاثر ہوئی ہوں گی۔

میں نے جلدی سے بائیک کو سیدھا کیا۔ روڈلف کو سیٹ پر جمایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اگلے چند سیکنڈوں کے اندر میں اسے دوبارہ اسٹارٹ کر کے ایک طوفانی جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔

اس فور وہیل بائیک میں دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ روڈلف کو پہلو میں کہیں گولی لگی تھی۔ وہاں سے بھل بھل خون نکل رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو ناں روڈلف؟“ میں نے پوچھا۔ بائیک کو میں طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا۔

”گولی پہلو کو چیرتی نکل گئی ہے۔ خون بند ہو جائے، ورنہ......“ وہ کراہا۔ بے چارے کا پہلے ہی ایک ہاتھ زخمی تھا اور اب یہ مہلک زخم بھی اسے سہنا پڑ رہا تھا۔

”ویسے تم بہت ریلیبل اور اچھے خاصے فائٹر نکلے۔ تم نے ایسے ہی نہیں کاسپا کو جیسے گینگسٹر کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔“ وہ آخر میں مسکرایا۔

مجھے اس کی زخمی حالت میں بھی یہ زندہ دلانہ مسکراہٹ اچھی لگی تھی مگر میں اس کی طرف سے تشویش کا بھی شکار ہونے لگا تھا، وہ خاصا زخمی نظر آرہا تھا۔

بہرطور...... میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ''خطرے کے زون سے نکل جائیں...... اس کے بعد میں کچھ کرتا ہوں۔''

''ہاں...... ہاں...... ٹھیک ہے۔'' اس نے بہ مشکل کراہتے ہوئے جواب دیا۔

میں بائیک کو ایک مناسب رفتار سے زیادہ نہیں دوڑا پا رہا تھا۔ اس کا ہینڈل لرز رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ مجھے اسے چلانے میں قدرے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر اپنے عقب میں بھی دیکھا تھا۔ سرِدست کوئی ہمارے تعاقب میں نہ تھا۔

میں نے بائیک دو تین کلومیٹر تک دوڑانے کے بعد اطمینان کیا اور پھر ایک نیم جنگلاتی علاقے میں آکر ویران جگہ پر بائیک روک دی۔ کیٹ کا پسٹل میرے پاس تھا۔

میں نے بائیک روکتے ہی زخمی روڈلف کو سنبھال کے نیچے اتارا اور اس کے پہلو کے طرف کی شرٹ کا حصہ پھاڑ کر اس کے زخم کا جائزہ لینے لگا۔ گولی واقعی اس کے پہلو سے ''چھاڑ'' ہو کے کھال کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ شکر تھا کہ اندرونی اعضا میں کوئی گہرا زخم نہیں آیا تھا۔ میں نے فوراً اسی کی شرٹ کا حصہ پھاڑ کر اس پر پٹی سی بنا کر باندھ دی تاکہ جریانِ خون بند ہو سکے۔ اسے سردی لگنا شروع ہو گئی تھی۔ شاید خون بہنے کے باعث ایسا ہو کمزوری سے ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیکٹ اُتار کر اسے پہنا دی۔

''یہ سب کیا ہو گیا دوست؟ کک...... کچھ اندازہ ہے تمہیں؟'' روڈلف نے پوچھا۔ میں نے اردگرد نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کسی بات پر ڈین وغیرہ کی ان سے اَن بن ہو گئی ہو گی۔''

''یہ اَن بن تو ہونا ہی تھی۔'' وہ زخمی ہونے کے باوجود تلخ سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''موجودہ حالات میں ڈین اور ہماری اہمیت ان کی نظروں میں ختم ہو چکی تھی۔

بروجیٹ جب آخری کال اٹینڈ کرنے خیمے کے اندر گیا تھا تو میں اس وقت ہی سمجھ گیا تھا کہ اسے اسٹاربک یا جوشوا کی طرف سے کوئی نئی ہدایت ملی ہو گی۔''

''ہوم...... تم صحیح کہتے ہو۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں تائیداً کہا۔ ''ٹی وی پر چلنے والی خبریں اور انٹرپول کے ہمارے پیچھے لگنے پر ہی یہ نیا فیصلہ صادر ہوا ہو گا۔ ہم ان پر بوجھ بن گئے ہوں گے۔''

''میرا خیال تھا کہ یہ کاسپاکو کی بے وقوفی تھی کہ اس نے مجسمے کی چوری کا راز فاش ہونے کے باوجود اس ڈیل جاری رکھتے ہوئے ہمیں روانہ کر دیا۔'' روڈلف بولا۔

''کاسپاکو بلا کا لالچی اور حریص آدمی ہے۔ وہ اس سودے کو کسی صورت میں بھی ضائع نہیں جانے دینا چاہتا ہو گا۔'' میں نے خیال پیش کیا۔ ''تھائی پولیس کے ہاتھوں مجسمہ برآمد کر لیے جانے کا بھی اسے خوف ہو گا اور اس نے ہمیں فوراً بینکاک سے مجسمے سمیت کوچ کر جانے کا حکم اسی لیے دیا ہو گا کہ کم از کم یہ ڈیل تو اپنے انجام کو پہنچ جائے۔''

''ڈیل تو اب گئی اور وہ مجسمہ بھی مگر اس کے ساتھی بھی لگتا ہے مار دیے گئے ہیں، یعنی ڈین اور جیڈ وغیرہ۔''

''چلو ٹھیک ہے، کچھ بھی سہی تم اور ہم تو بچ گئے اور کاسپاکو سے بھی جان چھوٹی۔'' میں نے مسکرا کر کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ پھر اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

''کیا مطلب؟ کیا تم بھی کاسپاکو سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے؟''

''یقیناً! میں کوئی اس کا زرخرید آدمی نہیں تھا۔ خیر! اب کیا کیا جائے؟''

''اسی وقت سٹی اسکوائر چلو۔ ہم انٹرپول پولیس کو انفارم کر دیں گے۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ یہ قیمتی مجسمہ ان لوگوں کے لیے گرم حلوہ ثابت ہو جائے گا۔ اسپیکٹرم کو امریکی حکام کی طرف سے بڑی سپورٹ حاصل ہے۔ وہ ان کا راستہ خود ہی صاف کر دیں گے۔''

اس کا خدشہ غلط نہ تھا۔ اسپیکٹرم سے منحرف ہونے کے بعد روڈلف کے دل میں بھی ان کے لیے نفرت پروان چڑھنے لگی تھی۔

''شہزی! تمہارا شکریہ، تم نے مجھے ان درندوں سے بچایا ورنہ......'' وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا تو میں نے دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے کہا۔

''دوست بھی کہتے ہو اور شکریہ بھی ادا کرتے ہو، یہ میرا فرض تھا اور تم نے بھی تو زخمی ہونے کے باوجود کیٹ پر عقب سے بروقت حملہ کر دیا تھا، ورنہ تو میں اس خونخوار بلی کی گولی کا نشانہ بن چکا ہوتا۔'' میری بات پر وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا۔ شکر تھا کہ اسے کوئی کاری زخم نہیں پہنچا تھا۔ مجھے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔

''نکل چلو...... اس سے پہلے کہ وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح ہماری خون کی بُو سونگھتے ہوئے ادھر نکل آئیں۔'' روڈلف بولا۔

میں نے اسے سہارا دیا اور بائیک پر بٹھانے لگا تو

بُری طرح چونک گیا۔ بائیک کے پیچھے سے بہت سارے آئل کی دھار بہہ رہی تھی۔

''اوہو...... یہ آئل کیسے لیک ہو گیا؟'' میرے منہ سے بے اختیار تشویش زدہ انداز میں برآمد ہوا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آ گیا کہ...... حملہ کرتے وقت وقت کیٹ نے جب اپنے شارٹ پسٹل سے مجھ پر گولی چلائی تھی تو میں نے گولی سے بچنے کے لیے بائیک کا ایکسیلیٹر گھما دیا تھا جس کے باعث اس کا اگلا حصہ اوپر کو اٹھا تھا اور گولی میرے بجائے اس کے نچلے حصے میں کہیں لگی تھی۔ اسی گولی نے آئل لیک کر ڈالا تھا۔

تاہم پھر بھی میں نے بائیک کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ اسٹارٹ نہ ہو سکی۔ یہ بھی شکر تھا کہ وہ یہاں تک آ گئی تھی۔

''اس کا آئل بہہ چکا ہے۔ ہمیں وقت ضائع کیے بغیر پیدل آگے نکلنا ہو گا۔'' روڈلف بولا۔

میں نے اسے سہارا دیا اور چل پڑے۔ ہم دونوں پیدل ہی آگے بڑھ رہے تھے۔ سرِدست ہمیں اپنی منزل کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس جزیرہ نما سرد علاقے کا کون سا راستہ ایسا تھا جس پر گامزن رہتے ہوئے ہمیں اسکوائر سٹی تک پہنچنے میں آسانی ہوتی۔ اس سے ہم بالکل ہی ناواقف تھے۔ روڈلف کی حالت الگ خراب تھی۔ اسے بہرحال طبی امداد کی ضرورت تھی، ورنہ زخم خراب ہو کے سیپٹک بن سکتا تھا۔ مجھے تو اس کے بازو اور ہاتھ کے زخم بھی کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ کیونکہ بینڈیج خون سے پھر سرخ ہونے لگی تھی۔

میرے امریکا والے مشن میں جان روڈلف کا ساتھ میرے لیے انتہائی اہم ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے ادراک تو تھا کہ وہ اسپیکٹرم ہی نہیں بلکہ لولودش اور عابدہ کے حوالے سے ٹائیگر ٹیک اور باسکل ہولارڈ سمیت جے۔ بی۔ سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کے بارے میں بھی بہت کچھ جان کاری رکھتا ہو گا۔ ابھی مجھے اس سے متعلقہ معاملات کے بارے میں صراحت سے گفتگو کرنے کا موقع بھی کہاں ملا تھا۔

''آہ...... ذرا رک جاؤ...... شہزی! میرا زخم درد کر رہا ہے۔'' اچانک روڈلف نے چلتے چلتے کہا اور میں اسے سنبھالے ہوئے رک گیا۔ ہم دونوں ایک گھنے درخت تلے گھاس پر بیٹھ گئے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم اس جزیرے کی خوب صورتی کا نظارہ کر کے لطف اندوز ضرور ہوتے۔

بادی النظر میں یہ جزیرہ ایک پنجرے کی شکل میں نظر آتا تھا۔ عین درمیان سے ابھرا ہوا جس کے کنارے ڈھلانی جیسے تھے۔ ان پر حدِ نگاہ گھاس کا میدان پھیلا ہوا تھا۔ سرسبز میدان اور گھنے درخت، خوش رنگ پھولوں بھری قدِ آدم جھاڑیاں، کہیں زمین سطح مرتفع تھی اور کہیں ڈھلانی۔ ان کے دامن میں کہیں کہیں سفید اور نیلے رنگ کے چوبی مکانات بڑے بھلے محسوس ہوتے تھے۔ ایک جگہ پر گولف کا میدان بھی نظر آیا۔ آبادی کے آثار بھی نظر آ رہے تھے مگر بہت کم۔

آسمان پر ہنوز گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور ان کا رنگ سرمئی ہونے لگا تھا جس کا واضح مطلب تھا کہ اب تب میں دوبارہ بارش ہونے والی تھی۔ ایسا ہوتا تو ہم دونوں ہی سردی میں اکڑ کر رہ جاتے۔ اسی لیے میری کوشش تھی کہ جلد از جلد کہیں محفوظ پناہ گاہ مل جاتی تو روڈلف کو بھی تھوڑی بہت طبی امداد کی میسر آ سکتی تھی۔

مجھے اپنے دائیں جانب ذرا دور ایک اونچی زمین پر چھوٹا سا مکان نظر آ رہا تھا۔ یہ چوکور مکان تھا جس پر سفید اور نیلا رنگ تھا۔ اس کے آگے چھوٹا میدان اور لکڑی کا جنگلا نظر آتا تھا، جو شاید احاطے کے طور پر مستعمل تھا۔

''روڈلف! میرے دوست...... ذرا ہمت پکڑو، وہ مکان دیکھ رہے ہو، وہاں شاید ہمیں کچھ مدد مل جائے۔''

''چلو! قسمت آزمائی میں کیا حرج ہے۔'' وہ زندہ دلی سے مسکرایا مگر ساتھ ہی تھوڑا کراہ کے بھی رہ گیا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور ہم آگے چل پڑے۔ ابھی ہم مذکورہ مکان سے تیس چالیس گز کے فاصلے پر ہی پہنچے تھے کہ اچانک بادلوں نے گرجنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ پانی کے اس قدر موٹے موٹے قطرے گرنے لگے کہ سر اور چہرے پر چبھنے لگے تھے۔ یوں جیسے اولے پڑ رہے ہوں۔

''ایسی بارش میں تو میرا زخم کھل جائے گا۔ شہزی!'' روڈلف کراہا۔

''فکر نہ کرو...... مکان چند قدموں کے فاصلے پر ہے۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

تراٹے دار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے روڈلف کو سنبھالتے ہوئے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ یہاں تک کے مکان کے چوبی جنگلے والے احاطے کے قریب جا پہنچے۔ لکڑی کا چھوٹا سا پھاٹک بند تھا۔ اسے دھکیل کر ہم جیسے ہی اندر داخل ہوئے تھے کہ اچانک ایک کتا بھونکتا ہوا ہمارے آگے آ گیا۔ ہم رک گئے۔ بارش میں اس کے جسم کے گھنے بال بھیگ کر چپک گئے تھے جنہیں وہ بار بار اپنے جسم کو جھٹکے دے

کر جھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بال اس قدر تھے کہ وہ اس کی پیشانی اور آنکھوں تک کو ڈھانپتے محسوس ہو رہے تھے۔

''یہ پوپی کتا ہے، ڈرو نہیں کاٹتا نہیں ہے۔'' روڈلف نے کہا۔ ''مگر اب حرکت مت کرنا۔ اندر سے کوئی نکل آئے گا۔''

وہی ہوا۔ کتے کے بھونکنے کی آواز سن کر مکان کا پہلے سنگل پٹ والا دروازہ کھلا۔ دھواں دھار بارش کے باعث میں دیکھ نہیں پایا کہ کون تھا۔ مگر جب اس کے بعد جالی دار شٹر ہٹا تو میں نے دیکھا...... ایک چھوٹے قد کی لڑکی برآمد ہوئی۔ عمر بہ مشکل چودہ، پندرہ سال ہوگی۔ اس نے شارٹ نیکر اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ اس برستے سرد موسم میں یہ ایسے لباس میں تھی۔ اس کے بال سرخی مائل تھے اور چہرہ گول تھا۔ بال بوائے کٹ تھے۔ وہ خاصی شوخ نظر آرہی تھی مگر اس کا انداز محتاط تھا۔ وہ پہلے تو دروازے پر ہی کھڑی ہمیں جالی دار شٹر سے دیکھتی رہی۔

اس کے ہاتھ میں ایک کارتوس والی سنگل بیرل بندوق بھی تھمی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ جالی دار شٹر والا دروازہ کھول کر باہر آگئی۔ پوپی بدستور ہم پر بھونکے جا رہا تھا۔ لڑکی نے ابھی اسے جانے کا نہیں کہا تھا۔

''ہے بے بی! ہمیں مدد کی ضرورت ہے۔'' میرے بجائے روڈلف نے اس پیاری سی لڑکی سے کہا۔

اس لڑکی نے بندوق ہم پر تان لی۔ پوپی نے اچانک بھونکنا بند کر دیا۔

''کون ہو تم لوگ......؟'' اس نے شک بھری نظروں سے ہماری طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بے بی! ڈرو نہیں، ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔'' روڈلف اس سے بدستور انگریزی میں بولا۔ لڑکی بھی شستہ اور رواں انگریزی بول رہی تھی۔

''مگر تم نے بتایا نہیں کون ہو تم دونوں......؟ اور یہ تمہیں کیا ہوا ہے؟ یہ تمہارا ساتھی ہے؟'' لڑکی نے سوال کیا۔ وہ کچھ زیادہ ہی محتاط نظر آرہی تھی۔ مگر مہربان بھی نظر آتی تھی۔ تاہم وہ اپنی تسلی کرنا چاہتی تھی۔

''دیکھو بے بی! ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔ ہم سیاح ہیں...... میرا نام جون ہے، یہ میرا ساتھی روڈلف ہے اور ہماری اسٹیمر کو حادثہ پیش آگیا تھا۔ یہ چوٹ اسی وجہ سے لگی ہے میرے ساتھی کو۔ ہمیں بس اس کی مرہم پٹی کا سامان مل جائے، ہم فوراً لوٹ جائیں گے۔'' اس بار میں نے بڑی ملائمت آمیزی سے کہا۔ لڑکی نے ایک نگاہ میرے سراپا پر ڈالی اس کے بعد اس نے کتے سے کچھ کہا، وہ فوراً پلٹ گیا۔ لڑکی نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کر دیا اور خود پلٹ گئی۔

ہم اس کے پیچھے چل پڑے۔ جب دروازے سے اندر داخل ہوئے تو مجھے اس لڑکی کے مختصر لباس پہننے کی وجہ سمجھ آگئی۔ گھر سینٹرلی ہیٹڈ تھا۔ گرم فضا میسر آتے ہی جسم و جاں کو سکون کا احساس ہوا۔ ایک کمرے میں صوفے پر میں نے روڈلف کو بٹھا دیا۔

''تمہارا بہت شکریہ بے بی......!'' میں نے مسکراتے ہوئے لڑکی سے کہا تو وہ بولی۔

''میں بے بی نہیں ہوں، میلا نوسینٹر برگ نام ہے میرا۔'' وہ خاصے دبنگ لہجے میں بولی۔ ''ویسے لوگ مجھے ملی کہتے ہیں۔''

''گڈ......! بہت پیارا نام ہے......'' روڈلف نے تکلیف کے باوجود مسکرا کر کہا۔ ''بالکل...... تمہاری طرح...... تم ایک اچھی لڑکی ہو۔''

''تھینکس۔'' ملی ہولے سے بولی۔

''کوئی فرسٹ ایڈ باکس تو ہوگا گھر میں...... ملی......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر نرمی سے پوچھا۔

''میں لاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کو قریب رکھی ایک کرسی کے ساتھ ٹکایا مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے پھر سے اسے اچک لیا اور کمرے سے نکل گئی۔ ملی کی اس حرکت پر میں اور روڈلف دونوں ہی سر جھٹک کر مسکرائے تھے۔

''خاصی محتاط ہے لڑکی مگر تھوڑی بے وقوف بھی۔'' روڈلف بولا۔ میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

''ہاں! ذرا ڈری ہوئی بھی لگتی ہے۔ شاید یہ گھر میں اکیلی ہے۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا اور اسی طرف کو بڑھا۔ جدھر وہ لڑکی گئی تھی۔ روڈلف نے صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

میں دوسرے کمرے میں آگیا۔ کمرے چھوٹے مگر پُرتزئین تھے۔ یہاں مجھے ایک اور دروازہ دکھائی دیا۔ جو تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ اندر روشنی ہو رہی تھی۔ وہ شاید کوئی چھوٹا سا اسٹور تھا۔ دروازے سے تھوڑے فاصلے پر ایک دیوار سے لڑکی کی بندوق ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ اٹھالی۔

اسی وقت اندر سے ملی برآمد ہوئی، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا باکس تھا۔ وہ یوں اچانک مجھے اور میرے ہاتھ میں اپنی بندوق لیے کھڑا دیکھ کر ڈر گئی اور اس کے ہاتھ سے باکس چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

''سوری! میں نے تمہیں شاید ڈرا دیا۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اس سے کہا اور چند قدم اس کی طرف آیا اور مسکراتے ہوئے بندوق اس کی طرف بڑھا دی۔ جسے اس نے فوراً جھپٹ لی پھر میں نے جھک کر باکس اٹھالیا اور پلٹا۔

کمرے میں واپس آکر میں نے روڈلف کے زخم کی پٹی کرنا شروع کر دی۔ زخمی بازو کی چند ٹیچ ہی ادھڑ کر کے اس کی بھی دوبارہ پٹی کر دی۔ کچھ پین کلرز بھی تھیں۔ قریب فرتیج تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا ملی، پیچھے کھڑی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں بندوق نہیں تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ جواب میں، میں بھی مسکرا دیا۔ اس معصوم سی خوبصورت لڑکی کا ڈر اب نکل چکا تھا اور یہی میں چاہتا تھا۔

''پلیز، پانی کا ایک گلاس مل جائے گا؟''

''شیور۔'' وہ بولی اور پانی کا گلاس بھر لائی۔ روڈلف کو میں نے دو اسپرین کی گولیاں دیں۔ کچھ اینٹی بائیوٹک کیپسول رکھے ہوئے تھے۔ وہ بھی میں نے اسے نگلنے کے لیے دے دیے۔

''دوست! تم تو پورے پورے ڈاکٹر ہو۔'' روڈلف کو کچھ سکون ملا تو وہ ہنس کر بولا۔ میں نے جواب میں محض مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ اب میں کیا اسے بتاتا کہ یہ سب میری کمانڈو ٹریننگ کا حصہ تھا۔ ابھی تو اس نے مجھے مائنر سرجری کرتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ یوں بھی وہ اگر کیٹ اور بروجیٹ کی طرح اسپیکٹرم کے اسالٹ ونگ کا تربیت یافتہ ایجنٹ ہوتا تو شاید یہ سوال نہ پوچھتا مجھ سے۔

''میں آپ دونوں کے لیے کچھ کھانے پینے کے لیے لاتی ہوں۔'' ملی نے ہم سے کہا اور پاس بنے کچن کی طرف چلنے لگی تو میں نے اسے پکارا۔

''ہیلو، بے بی!'' وہ رک گئی اور میری جانب گھومی۔ اس کا منہ بن گیا۔ میں نے کہا۔

''دیکھو، تم ہمارے لیے ایک چھوٹی سی اور گڑیا سی پیاری بچی ہی ہو اور ہم تمہارے انکل ہیں۔ اسی لیے برا مت مناؤ، ہم تمہیں بے بی ہی کہیں گے۔'' اتنا کہہ کر میں نے تھوڑا توقف کیا۔ اب اس کی آنکھوں میں کچھ دلچسپی کی جھلک نظر آئی تھی۔

''آرام سے بیٹھ جاؤ اور ہمیں یہ بتاؤ کہ یہاں اور کون کون رہتا ہے؟ اور وہ لوگ کہاں گئے ہوئے ہیں؟''

میں نے دیکھا کہ میرے اس سوال پر ملی کی خوبصورت آنکھوں میں ایک بار پھر شکوک کے سائے لہرائے تھے۔ مگر پھر فوراً ہی عنقا ہو گئے۔ وہ پورے اعتماد سے جواباً بولی۔

''میری مما اور میرے گرینڈ پا رہتے ہیں میرے ساتھ...... وہ گاڑی میں اسکوائر سٹی گئے ہوئے ہیں۔ سودا وغیرہ لانے کے لیے۔ اب بارش کی وجہ سے شاید انہیں لوٹنے میں کچھ دیر ہو جائے۔''

''اور تمہارے ڈیڈی؟'' اس بار روڈلف نے سوال کیا۔ جس پر ملی خاموش ہو رہی۔ میں نے کچھ بھانپتے ہوئے روڈلف کے سوال کو طرح دے ڈالی اور ملی سے بولا۔

''اوکے بے بی! اٹس گڈ۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے گھر میں فون موجود ہے؟''

''ہاں۔ دوسرے کمرے میں رکھا ہے مگر وہ دو دن سے ڈیڈ پڑا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے سویٹ بے بی! بس تم ہمارے لیے دو کپ کافی بنا لاؤ۔ بہت شکریہ تمہارا۔''

''اوکے مائی سویٹ روڈلف اینڈ جون انکل......!'' وہ بھی مسکرا دی اور کچن کی طرف چلی گئی۔

''بڑی پیاری اور اچھی بچی ہے...... انکر...... مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ ہماری وجہ سے کسی خطرے کا شکار نہ ہو جائیں......'' روڈلف نے اس کے جانے کے بعد ہولے سے بالآخر اسی خدشے کا اظہار کیا تھا جو میرے ذہن میں بھی سر ابھار رہا تھا۔

''یہی میں بھی سوچ رہا تھا روڈلف!'' میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے، کافی کو چھوڑو...... ہم نکل چلتے ہیں یہاں سے......'' روڈلف کسی اندیشناک خیال کے پیشِ نظر سنجیدگی سے بولا۔ ''زخم کی مرہم پٹی ہو گئی یہی بہت ہے۔ اسپیکٹرم والے اپنے مفادات کے لیے بہت بے رحم اور بے حس ہوتے ہیں۔ یہاں آن پہنچے تو ہماری وجہ سے اس چھوٹے سے خوبصورت گھر کو جہنم بنا ڈالیں گے۔''

جان روڈلف...... کا تعلق چونکہ فیلڈ اسکواڈ سے تھا اسی لیے وہ ان سے، بالخصوص بروجیٹ اور کیٹ سے کترا رہا تھا۔ کیونکہ وہ تربیت یافتہ اور جنگجو تھے، خود روڈلف ویسا نہ تھا اور ایسے حالات کا وہ اتنا زیادہ تجربہ نہ رکھتا ہوگا۔ یوں بھی وہ خاصا زخمی بھی تھا۔ لیکن...... میری بات اور تھی۔ میں ان

سے خوف زدہ نہیں تھا، کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان کے خیمے سے بھاگنے کی کوشش نہ کرتا۔ بلکہ اس بات کا کھوج لگانے کی سعی کرتا کہ آخر اندر ایسا ہوا کیا تھا؟ لیکن حالات ایک دم ایسا رخ اختیار کر گئے تھے کہ روڈلف کی زندگی بچانے کے لیے مجھے فرار ہونا پڑا۔ تاہم میں نے روڈلف کو زخمی کرنے کا بدلہ بروجیٹ اور کیٹ کو زخمی کر کے لے لیا تھا۔

میں نے جواب میں ایک گہری سانس لے کر روڈلف سے کہا۔ ''روڈلف! اس تیز اور طوفانی بارش میں ہمارا یوں بے سروسامانی کی حالت میں نکلنا مناسب نہ ہوگا۔ بروجیٹ اور کیٹ کو میں بھی ٹھیک ٹھاک زخمی کر چکا ہوں۔ پھر ہماری آئندہ کی پلاننگ کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے اور مقامی افراد کے تعاون کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ جو میرا خیال ہے کہ یہاں رہتے ہوئے ہمیں مل سکے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے شہزی!'' روڈلف میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''......اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کم تم بھی نہیں ہو، لیکن اس وقت اسپیکٹرم کے دو اسکواڈ اپنے دونوں باس اسٹار بک اور جوشوا سمیت میدان میں اترے ہوئے ہیں۔ کیٹ اور بروجیٹ ابھی زندہ ہیں۔ اسٹار بک بھی کم نہ ہوگا اور جوشوا بھی تربیت یافتہ ہی ہوگا کیونکہ......اسپیکٹرم کے ہر اسکواڈ یا ونگ کو ایک تربیت یافتہ چیف ہی کنٹرول کرتا ہے۔ ان کے پاس اس وقت جدید اسلحہ بھی ہوسکتا ہے جبکہ ہمارے پاس ان سے چھینی ہوئی محض ایک پسٹل ہے۔''

''میں ان ہتھیاروں کو ایک حد تک فوقیت دیتا ہوں دوست!'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میرا سب سے بڑا اور اصل ہتھیار میرا وہ جذبہ ہوتا ہے جسے میں ایمان کا درجہ دیتا ہوں اور وہ ہے باطل کے خلاف حق کی جنگ...... جب میں سربکف ہو جاتا ہوں تو مجھے پورا یقین ہوتا ہے کہ میرا اللہ میری رہنمائی ہی نہیں بلکہ میری مدد بھی فرمائے گا۔ یہی یقین میرا وہ ہتھیار بن جاتا ہے جس کے سامنے پھر...... میرا بڑے سے بڑا دشمن بھی نہیں ٹھہر پاتا۔ تم خاطر جمع رکھو۔ ایسا کچھ ہوا تو میں سنبھال لوں گا۔''

''گریٹ ورڈز شہزی!'' وہ متاثر کن لہجے میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ان باتوں کی سچائی کی جھلک میں دیکھ ہی چکا ہوں۔ وزیر جان کا تم نے جو حشر کیا اور پھر کاسپا کو اور یہاں تک میں تمہیں جس جوانمردی سے لڑتا دیکھ رہا ہوں، میں اسے کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔ آئی لائک یو مائی ڈیئر فرینڈ!'' اس نے دوستانہ انداز میں اپنے ایک ہاتھ کا انگوٹھا مجھے دکھایا۔ میں ہنس دیا۔

باہر بادل گرج رہے تھے اور دھواں دھار بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں گاہے بہ گاہے کھڑکی کے پاس جا کر اردگرد کا جائزہ لے لیا کرتا تھا۔ ہر سو ویرانی کا راج تھا۔ یوں بھی طوفانِ بادوباراں میں ہر سمت دھواں نما دھند کے سوا کچھ دکھائی بھی نہیں پڑتا تھا۔

اتنے میں للی...... ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائے چلی آئی۔ ٹرے میں سینڈوچز، بسکٹ اور کافی کے دو مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ اس نے ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی تپائی پر رکھ دی۔ ٹرے میں پانی کی بوتل اور دو گلاس بھی رکھے نظر آرہے تھے۔

ہم نے للی کا شکریہ ادا کیا اور پہلے ایک ایک گلاس پانی پیا پھر سینڈوچز کی طرف ہاتھ بڑھایا، ساتھ ہی گرما گرم کافی کے گھونٹ بھی بھرنے لگے۔

''واؤ......گریٹ بے بی! کافی اور سینڈوچز تو بہت ہی مزیدار ہیں۔ تم نے بنائے ہیں؟'' میں نے سینڈوچ کا ایک بڑا سا بائٹ اور کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد للی کی طرف دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

''یس انکل روڈلف! یہ میں نے ہی بنایا ہے، مکس ویجی ٹیبل اور چکن میش ڈال کر۔ گرینڈ پا کو بھی میرے ہاتھ کے بنے سینڈوچز بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''ضرور لگتے ہوں گے۔ بھلا اتنی پیاری اور معصوم سی بیٹی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیز کسے نہیں اچھی لگتی ہوگی۔'' روڈلف نے بھی کھلے دل سے کہا۔ میری نظریں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، اس کے معصوم سے چہرے پر بچوں والی مسکراہٹ تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ روڈلف کی بات پر اچانک اس کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم مغموم سا ہو گیا۔

''کیا ہوا سویٹ بے بی؟ تمہیں ہماری کوئی بات بُری لگی؟''

''اوہو...... نو نو...... جون انکل! ایسی بات نہیں ہے......'' وہ ایک دم زبردستی کی مسکراہٹ سے بولی۔ ''وہ بس انکل (روڈلف) کی بیٹی والی بات پر مجھے اپنے پاپا یاد آگئے تھے۔''

''تو پھر تمہارے پاپا کہاں ہیں سویٹی؟'' روڈلف نے اس سے بڑے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ للی ایک آزردہ سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولی۔

''میں اپنے پاپا سے بہت محبت کرتی تھی، وہ بھی مجھے بے حد چاہتے تھے۔ مگر...... مما سے ان کی نہیں بنی...... وہ بے تحاشا شراب پیتے تھے لیکن اس کی وجہ بھی مما ہی ہیں۔''

اچانک باہر ایک آواز پر ہم چونک پڑے۔

''اوہو مما اور گرینڈ پا آگئے۔ میں دیکھتی ہوں، یہ انہی کی گاڑی کی آواز ہے۔'' للی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بولی اور دروازے کی طرف لپکی۔

روڈلف اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بھویں اچکا دیں۔ تھوڑی دیر گزری، کمرے میں للی ایک عمر رسیدہ شخص کا بڑی محبت سے ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی۔ وہ ایک دبلا پتلا درمیانے قدوقامت کا شخص تھا۔ سر اور بھوؤں کے بال سفید تھے۔ کمر بھی سیدھی تھی، ورنہ اتنی عمر......جس کا اندازہ میں نے ستر، اسی سال کے درمیان لگایا تھا۔ وہ سیدھا سا بوڑھا تھا، جسے ''ساٹھا پاٹھا'' کہا جاتا ہے۔ خاصا ایکٹو بھی نظر آتا تھا۔ اس نے سفید شرٹ اور گیلس والی پینٹ پہن رکھی تھی، حیرت کی بات تھی کہ اس نے سردی کی مناسبت سے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کے ہمراہ...... ایک جوان سی عورت تھی۔ وہ کچھ...... فربہی مائل اور چھوٹے قد کی مالک تھی۔ چہرے پر کرختگی اس کی فطرت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی صورت میں للی کی شبہات نظر آتی تھی۔ وہ اس کی ماں ہی تھی۔ اس نے رین کوٹ پہنا ہوا تھا۔ للی شاید انہیں ہمارے بارے میں بتا چکی تھی۔ وہ ہم دونوں کی طرف بڑی شاکی نگاہوں سے گھور رہی تھی جبکہ عمر رسیدہ آدمی جو للی کا ''گرینڈ پا'' ہی تھا، ہمیں الجھی ہوئی نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

''کون ہو تم دونوں؟ اور ایک اکیلی انڈر ایج لڑکی...... گھر میں موجود ہونے کے باوجود تم دونوں نے جرأت کیسے کی یہاں گھسنے کی؟'' وہ عورت تیوریوں پر بل ڈالے ہماری جانب غصے سے گھورتے ہوئے بولی تو للی جلدی سے ماں سے بولی۔

''نو مما! یہ بہت اچھے لوگ ہیں، انہوں نے تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے بلکہ یہ تو مجھے بیٹی......''

''شٹ اَپ!'' ماں نے للی کو بری طرح جھڑک دیا۔

اسی وقت عمر رسیدہ شخص نے عورت سے کچھ کہا اور پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہائے گائیز! آپ دونوں کون ہو؟ اور کیا یہ اچھی بات ہے کہ تم ایک انڈر ایج بچی کے ہوتے ہوئے اس مکان میں داخل ہوئے؟''

روڈلف دانت پیس رہا تھا، اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہا۔ مجھے اس عورت پر ہی نہیں بلکہ اس عمر رسیدہ آدمی پر بھی غصہ آ گیا تھا جو عورت کا باپ اور للی کا گرینڈ پا تھا۔ کیونکہ وہ مجھے پہلے کچھ سمجھدار آدمی لگا تھا مگر شاید بیٹی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اپنے تیور بدل لیے تھے۔

''ہم سب سے پہلے للی کے مشکور ہیں، یہ فرشتہ صفت بچی مشکل وقت میں ہمارے کام آئی لیکن افسوس ہوا کہ آپ لوگوں کی باتوں پر، آپ انڈر ایج کی رٹ لگا کر کیا کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کوئی کرمنلز ہیں؟ جبکہ تمہاری بچی تمہارے سامنے ہے۔ اگر تمہیں اس کے انڈر ایج ہونے کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر اس ویرانے میں اسے اکیلا کیوں چھوڑ کر گئے تھے؟''

میری جوابی لفاظی نے اس اکھڑ مزاج عورت کے کس بل تو کھول ہی دیے تھے، مگر ساتھ ہی اس کے چہرے کی کرختگی اور آنکھوں میں اتری ہوئی درشتی کم نہیں ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں گرینڈ پا کچھ خفت سی محسوس کرنے لگا۔ عورت نے کچھ کہنا چاہا مگر گرینڈ پا ہم سے بول پڑا۔

''اِٹس اوکے! تمہارا کام ہوگیا۔ اب تم دونوں جا سکتے ہو۔''

''نہیں پا......! میں پہلے اپنی جیولری اور کیبنٹ چیک کروں گی، اس کے بعد انہیں جانے دوں گی۔ یہ بچی کو بے وقوف بھی بنا سکتے ہیں۔'' عورت بولی۔ وہ مجھے پرلے درجے کی ایک گھٹیا ذہنیت والی عورت لگی تھی اور انتہا سے زیادہ شکی مزاج...... بھی۔

''یہاں پولیس آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاتی۔'' اس نے آخر میں تہدید بھی کر ڈالی۔

''خاتون! ہم خود پولیس کو فون کرنا چاہتے تھے مگر آپ کا فون ڈیڈ تھا، اب خرابیِ موسم کے باعث شاید سیلولر رابطہ بھی ممکن نہ ہو سکے۔'' اس بار روڈلف سے نہ رہا گیا اور تلخی سے بولا۔ ''لیکن خیر......! آپ پلیز اپنا شک جلد دور کر لیں تاکہ ہم آپ کے اطمینان کر لینے کے بعد یہاں سے چلے جائیں۔''

اچانک میرے کانوں سے ایک مخصوص آواز ٹکرائی۔ جسے پہچان کر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ باہر شوریدہ طوفانِ بادوباراں کے باوجود مجھے یہ آواز سنائی دے گئی تھی، اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ میری سماعتیں باہر کی متوقع اضافی آواز کے لیے غیر معمولی محتاط تھیں۔ دوسرے یہ، دروازہ اور کھڑکیاں بند ہونے کے سبب بارش کا شور کچھ دبا دبا سا ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس کے بیچ کسی گاڑی کے انجن کی گڑگڑاتی آواز مجھے سنائی دے گئی تھی۔

''سب لوگ ادھر ہی رک جاؤ۔ کوئی دروازے پر آنے کی کوشش نہ کرے۔'' میں نے سرسراتی آواز میں کہا اور کیٹ سے چھینا ہوا اشارٹ پسٹل نکال لیا۔ سب کو یک دم سانپ سونگھ گیا۔ میرے ہاتھ میں پسٹل دیکھتے ہی عورت کے حلق سے دبی دبی چیخ خارج ہوئی تھی۔ متوقع خدشے کے پیشِ نظر...... روڈلف کا چہرہ ست کے رہ گیا تھا۔

میں بہ سرعت دروازے کی طرف بڑھا اور سنگل پٹ والے دروازے کے اوپر فریم میں لگے شیشے سے پردہ ذرا سرکا کر باہر جھانکا تو شیشہ دھندلایا ہوا تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کی کنڈی کھولی، مگر سیفٹی چین لگی رہنے دی اور جھری بنا کر جھانکا تو بُری طرح چونک گیا۔ باہر کا منظر میری توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ تاہم میرے چہرے پر تشویش کے آثار ضرور نمودار ہوگئے تھے۔

باہر پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور تین افراد کار سے اترتے نظر آئے۔ اپنے مخصوص بلیو یونیفارم میں وہ پولیس مین ہی لگتے تھے مگر صرف دو، تیسرا آدمی کوئی عام سا مرد تھا۔ اس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور شیو کی بھی یہی حالت تھی۔ پولیس کے دو افراد میں ایک مرد اور عورت تھی۔

میں جیسے ہی پلٹا کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا، وہ وہی غصیلی عورت تھی۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی تھی۔

''سوری میڈم! میں کچھ اور سمجھا تھا۔ اچھا ہوا پولیس آگئی۔ دروازہ کھول کر انہیں اندر بلا لو۔''

اس نے برہم سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔

میں اس کے عقب میں کھڑا رہا۔

''گڈ ایوننگ آفیسرز...... ! آپ بہت اچھے وقت پر آئے لیکن...... میں اس شخص کو اندر نہیں آنے دوں گی۔''

وہ تینوں دروازے پر آکر رک گئے تھے۔ میں نے دیکھا مارتھا نامی وہ تلخ مزاج عورت بار بار اس بڑھے ہوئے بالوں والے شخص کی طرف اپنی انگلی سے نفرت انگیزی سے اشارہ کر رہی تھی۔

گرینڈ پا بھی دروازے پر آگیا تھا اور اس کے ساتھ ملی تھی۔

''پاپا......!'' ملی خوشی سے چلاتی ہوئی دروازے سے باہر دوڑ گئی اور اس لمبے بالوں والے شخص سے جا کر لپٹ گئی، اس آدمی نے بھی بڑی محبت سے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔ مارتھا یہ دیکھ کر آگ بگولا ہوگئی اور ''کم آن ملی......'' کہتی ہوئی باہر کو لپکی پھر ملی کو بڑے غصے سے اس شخص سے الگ کر کے بازو سے پکڑے پلٹی۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اندر آچکے تھے۔ میں نے پسٹل دوبارہ شرٹ کے اندر بیلٹ میں اڑس لیا تھا۔

''آفیسرز......! پہلے ان دونوں کو گرفتار کرلو...... یہ دونوں چور ہیں۔'' مارتھا زہریلے لہجے میں ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے پولیس والوں سے بولی۔

دونوں نے فوراً اپنے ہولسٹرز سے پستول نکال کر ہم پر تان لیا۔ روڈلف اور میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کر دیے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' مرد نے ہم سے درشت لہجے میں کہا۔ دونوں مرد عورت جوان اور خوبرو تھے۔

''ان خاتون کو غلط فہمی ہوئی آفیسرز......! ہم غلط لوگ نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ جھوٹ بول رہا ہے، اس کے پاس پسٹل بھی ہے۔'' مارتھا بدستور ہمارے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھی۔ اس بات پر مجھے تشویش ضرور ہوئی تھی کیونکہ...... ظاہر ہے پسٹل میرے پاس بغیر لائسنس کا تھا۔

ٹھیک اسی وقت باہر ایک سے زائد گاڑیوں کی آوازیں اُبھریں۔ ہم سب چونکے۔ میرا تو یہ آوازیں سن کر رُواں رُواں مرتعش ہوگیا۔

''تم سب ادھر ہی ٹھہرو...... میں دیکھتا ہوں۔'' مرد آفیسر نے کہا اور پستول سمیت دروازے کی طرف پلٹا تو میں نے چلا کر کہا۔

''آفیسر! ٹھہر جاؤ...... مجھے جانے دو......'' کہتے ہوئے میں نے اپنے ہاتھ گرا دیے اور آگے بڑھا مگر لیڈی پولیس نے اپنا سروس ریوالور مجھ پر تانے رکھتے ہوئے رعب دار آواز میں سرزنش کر ڈالی۔

''خبردار......! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔''

میں رک گیا۔ میری نظریں اسی پولیس مین پر جمی ہوئی تھیں جو دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا، وہ ابھی پستول تانے دروازے کے قریب بڑھا ہی تھا کہ اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ساتھ ہی گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ میری جلتی سلگتی نظروں نے اس خوبرو جوان پولیس مین کو بغیر آواز نکالے گرتے ہوئے دیکھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

گربہ شناس

تنویر واسطی

پیار و محبت ... انسیت ہونے کے باوجود لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا تکلیف دہ ہوتا ہے... وہ سب ایک ڈرامے میں کام کررہے تھے... مگر اچانک ہی کرداروں نے حقیقی رنگ اختیار کرنا شروع کردیا...

اپنے مالک کی رمز شناس بلی کا کارنامہ

جو ریڈ کلف نے گرینگ ہال کے ڈائننگ روم میں میز پر سینڈوچ کی ڈش رکھی اور ڈراما کی کاسٹ کو کھانے کے لیے بلا لیا۔ وارڈ روب اور کھانے کا انتظام کرنے والی ملڈرڈ بلوم، آئس ٹی کا مگ لیے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں نے وہ معما حل کرلیا ہے جس کے بارے میں تمہیں بتایا تھا۔''

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible] اور [illegible] ایک [illegible] سلسلہ...

قسط نمبر: 47

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرنگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے حسن بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ پھو استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے اصلی باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر، وسیم ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہا کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیمونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ الیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک [illegible] سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے اصل باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرانے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ ہاسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے۔ ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی الیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام عسکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹکسی کے چندر ناتھ، شیامو اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹکسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹکسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بوزکم کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی سنگینی پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹکسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "گلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا ٹھکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا ٹھکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا ٹھکور کے ہمراہ گلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا ٹھکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا ٹھکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نوفا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گلی منجارینا سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے گلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ مریم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ مریم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کروا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سوہنزیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سوہنزیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوہنزیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی ماں ان کی منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ وزیر بینکاک ایئرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکمہ دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساپچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر جان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو نے شہزی کا انتخاب کیا اور امریکی ایجنٹ روڈولف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

باہر گاڑیوں کا مخصوص شور سنتے ہی میں چوکنا تو پہلے ہی ہو گیا تھا لیکن جیسے ہی دروازے کو ایک دھماکے سے کھلتے اور گولی چلتے اس خوبرو نوجوان پولیس مین کو گرتے دیکھا تو پھر جیسے میری رگوں میں دوڑتا ہوا لہو مثل پارہ کے گردش کرنے لگا اور میں نے اسی تیزی کے ساتھ ہی بیک جمپ لی تھی۔ اگلے لمحے میں دوسرے کمرے کے دروازے کی بالکل چوکھٹ پر جا پڑا۔ ایک اور برسٹ چلا، جبکہ میں حملہ آوروں کے اگلے ہدف کا لامحالہ ادراک پہلے ہی سے رکھے ہوئے تھا۔ اسی سبب میں نے مذکورہ کمرے کی چوکھٹ پر گرتے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ چھلانگ لگائی تھی، ٹھیک اسی جگہ پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی تھی مگر تب تک وہاں سے میں کمرے کے فرش پر تیزی سے لڑھکتا ہوا ایک دیوار کی آڑ لے چکا تھا۔

وسطی کمرے میں جو شاید لاؤنج کے طور پر بھی مستعمل تھا، چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ جوابی فائرنگ بھی سنائی دی تھی۔ میں نے دشمن سے چھینا ہوا اکلوتا پستول نکال لیا اور میری عقابی نظریں تیزی سے گردش کرنے لگیں۔

فرش سے بہ سرعت اُٹھ کر میں کمرے کی اس کھڑکی کے قریب آ گیا جو لاؤنج میں ہی کھلتی تھی، ایک پٹ کی آڑ لیتے ہی مجھے ..... گرینڈپا اور اس کی غصیلی مزاج بیٹی مارتھا کی خون میں لتھڑی لاشیں دکھائی دیں جس پر سے بروجیٹ کو پھلانگتے ہوئے اسی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کے ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی ساتھی ایجنٹ کیٹ کو بھی میں نے دوسری سمت بڑھتے دیکھا۔ اس کی ایک ٹانگ میں لنگ تھا، ان دونوں کو ان کے خیمے نما ہٹ سے فرار ہوتے وقت میں نے ہی زخمی کیا تھا۔

روڈلف کا کیا بنا تھا؟ میں نہیں جانتا تھا۔ شاید وہ بھی بروقت کسی محفوظ گوشے کی پناہ میں دوڑا تھا اور کیٹ اس کے پیچھے لپکی تھی۔ اسی کے عقب میں مجھے دو مزید انہی جیسے چست لباس میں گن بردار دکھائی دیے تھے جو میرے لیے سردست اجنبی تھے۔ یعنی میں نے اس سے پہلے ان دونوں کو ان کے خیمے نما ہٹ میں نہیں دیکھا تھا، ممکن تھا ان کے باس اسٹاربک نے ڈیرے سے روانہ کیے ہوں۔

بروجیٹ پر نظر پڑتے ہی میں نے ایک نیم وا پٹ سے اپنے پستول کی نال نکال کر اس پر گولی چلانے کے لیے ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ نوجوان بولی مین (پولیس مین) اسی کی درندگی کا شکار ہوا تھا۔

میری چلائی ہوئی گولی اسپیکٹرم کے اس خطرناک ایجنٹ کے سر میں لگی تھی۔ وہ آواز نکالے بغیر تیورا کر اسی کمرے کے دروازے کے بالکل قریب گرا تھا جس کے اندر میں موجود تھا۔

پٹ نیم وا ہونے کی وجہ سے میں لاؤنج کا پورا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ تاہم بروجیٹ کو نشانہ بناتے ہی میں نے اس کے دونوں مذکورہ ساتھیوں کو نہایت پھرتی سے اسی کھڑکی کی طرف گنز کی نالوں کا رخ کرتے پایا اور میں نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ یہی وہ وقت تھا جب میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں میں بیک وقت دو خطرناک رائفلوں کے گرجنے کی آواز سنائی دی تھی۔ گولیوں کی اس مہیب بوچھاڑ نے کمرے کی کھڑکی کو چوکھٹ سمیت ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔

خطرناک دشمنوں کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل جاری تھا۔ دروازے سے کھڑکی اور اب کھڑکی سے دروازے کی طرف چھلانگتے ہی میں نے بجائے سامنے کے، نیچے فرش پر خود لڑھک کر دروازے کی چوکھٹ سے لیٹے لیٹے ایک حملہ آور کا نشانہ لے کر فائر داغا۔

میری چلائی ہوئی گولی نے ان دو میں سے ایک کی پیشانی پھاڑ ڈالی تھی۔ یہ پسٹل بہت پاورفل تھا۔ اس کے ساتھ کھڑا ساتھی اپنے ہم رکاب کا... یہ حشر دیکھ کر ایک لمحے کو بوکھلایا تھا اور ادھر ہی وہ مار کھا گیا۔ جب تک سنبھلتا، میں نے ایک اور گولی اس پر داغ دی۔

میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا مگر گولی اس کے بروقت حرکت کرنے سے نشانے پر لگنے کے بجائے اس کے دائیں بازو پر پیوست ہو گئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ خارج ہو گئی۔ مہیب تباہی بکھیرنے والی گن اس کے ہاتھ سے ڈگمگائی تو میں نے تیسرا فائر جھونک مارا۔ یہ گولی اس کے بائیں پہلو میں لگی اور پھر میرے مزید اپنی جگہ لیٹے رہنے کا جواز نہ رہا۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میں نے حرکت کی اور جب تک وہ سنبھلتا، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے ہوئے پسٹل کا ٹھوس فولادی دستہ میں نے اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور اس کی گن میرے ہاتھ میں آ گئی۔

''خبردار...... شہزی! گن پھینک دو...''

معاً ہی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں پلٹا اور بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔ وہ کیٹ تھی اور اس نے جان روڈلف کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ کیٹ کا حسین چہرہ بھی

مجھے بُری طرح کِھلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے تین انتہائی تربیت یافتہ ساتھیوں کے باوصف اُسے خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہیں آئی تھی۔ وہ اس وقت بپھری ہوئی ناگن کے روپ میں نظر آ رہی تھی جو میری ذرا سی غلط حرکت پر کچھ بھی کر ڈالنے کو تیار تھی۔

مجھے روڈلف کی فکر تھی۔ اس کا ساتھ میرے لیے انتہائی اہم تھا۔ میری متوقع امریکا یاترا کے اہم ترین مقاصد کے علاوہ اسپیکٹرم پر کاری ضرب لگانے کے لیے بھی۔ اس حقیقت سے اسٹاربک سمیت جوشوا بھی اچھی طرح سے واقف تھا اسی لیے بہت پہلے ہی سے انہوں نے روڈلف کو ہر قیمت پر ہلاک کر ڈالنے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اب اسپکٹرم کی یہ ''چالاک بلی'' کیٹ، روڈلف کو چارے کے طور پر میرے خلاف استعمال کر رہی تھی۔

''وہ بچی کہاں ہے؟'' میں نے کسی دباؤ میں آئے بغیر کیٹ کے بپھرے ہوئے چہرے پر اپنی نظریں گاڑتے ہوئے خوف ناک لہجے میں پوچھا۔

''اے گن پھینک دو۔'' وہ جنگلی بلی کی طرح وحشیانہ انداز میں غرائی۔ اس کے چڑھے ہوئے تیور بتا رہے تھے کہ وہ روڈلف کو اب بلا تامل شوٹ کر دے گی۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنی نظریں رکھتے ہوئے جھک کر گن فرش پر رکھ دی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ روڈلف کو موت کے منہ میں دیکھ کر میرا دل جیسے رک رک کر دھڑک رہا تھا۔

''اے... یو! باہر آؤ......'' کیٹ نے ذرا گردن موڑ کر غرا کے کہا تو بائیں جانب وہ مجہول سا لمبے بالوں اور بڑھی ہوئی داڑھی والا شخص ڈرتے ڈرتے برآمد ہوا۔

''پاپا...... امت جاؤ...... یہ تمہیں مار ڈالیں گے۔''

مجھے اس آدمی کے عقب سے للی کی کپکپاتی آواز سنائی دی تھی۔

''خاموش رہو تم... بچی!'' کیٹ نے للی کو جھڑکا جو نجانے کس گوشے میں اپنے باپ کے ساتھ محبوس تھی یا کر دی گئی تھی۔

گرینڈپا اور مارتھا بدقسمتی سے شاید اس لیے ان کی بربریت کا شکار ہو گئے تھے کہ وہ سامنے کے رخ پر اور لیڈی پولیس آفیسر کے قریب کھڑے تھے۔ جبکہ وہ مجہول سا آدمی اور اس کی ٹین ایج بیٹی للی ایک طرف کونے میں ڈرے سہمے چھپے کھڑے تھے اس لیے بچ گئے تھے۔

''وہ سامنے میرا ساتھی بے ہوش پڑا ہے، اسے پانی کے چھینٹے کے مار کے ہوش میں لاؤ۔'' کیٹ نے اسے اگلا حکم دیا۔ ''خبردار...... کوئی چالاکی مت کرنا، ورنہ اس بچی کو گولی مار دوں گی۔'' اس نے اپنی گن کی نال روڈلف کی کنپٹی سے ہٹا کر ایک طرف کونے میں سکڑی سہمی کھڑی للی کی طرف کرتے ہوئے اس کے باپ کو دھمکایا۔

میری عقابی نظریں کیٹ کی ایک ایک حرکات و سکنات پر جمی ہوئی تھیں، جیسے کوئی چیتا اپنے مغلوب پڑتے شکار پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو لیکن کیٹ نے بڑی چالاکی دکھائی تھی۔ اس نے روڈلف کی کنپٹی سے گن کی نال ہٹا تو دی تھی مگر اب اس کا رخ اس للی کی طرف تھا۔ میری ذرا سی غلط حرکت کیٹ کو ٹریگر دبانے کے غیر ارادی عمل پر مجبور کر سکتی تھی۔

کیٹ کی حالت اس وقت جلے پاؤں کی بلی جیسی ہو رہی تھی۔ اسے اپنی شکست کا اندازہ نہ تھا کہ وہ اپنے تین مسلح اور تربیت یافتہ ساتھیوں کے ساتھ یہاں ہلا بول کر مجھ پر قابو پانے کی حسرت میں وہ اپنے دو ساتھیوں کی جانیں بھی گنوا بیٹھے گی...... جبکہ چوتھا جاں بلب تھا۔ جلد ہی اس کی بھی تصدیق ہو گئی جب میرے کانوں سے للی کے مجہول سے باپ کی لرزتی آواز ٹکرائی۔ ''یہ ختم ہو چکا ہے۔''

میں نے دیکھا اس اطلاع پر کیٹ کا حسین چہرہ شکست خوردگی کے باعث مسخ ہو کر رہ گیا۔ دوسری نظر میں وہ مجھے رونے والی دکھائی دینے لگی۔ وہ تنہا ہو گئی تھی۔ اس احساس نے اسے اندر سے ضرور تھوڑا دھچکا دیا ہو گا مگر وہ چہرے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہ رہی تھی۔

''مس کیٹ! میرا خیال ہے کہ کھیل ہم دونوں کا ہی ختم ہو چکا ہے۔ بہتر یہی ہو گا کہ...... پولیس وغیرہ کے یہاں آنے سے پہلے ہم معاملات کی بات کر لیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ اُلجھ سی گئی مگر پوری طرح چوکس تھی۔

''وہ قیمتی مجسمہ جہاز پر موجود ہے اور ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ ہمیں اپنی رقم کا لالچ ہے اور بس......'' میں نے داؤ چلنے کی کوشش کی۔

''شٹ اَپ......'' وہ غرائی۔ ''کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں اپنے اسکواڈ کی ٹاپ ایجنٹ ہوں۔ چاہوں تو چند سیکنڈوں میں تم دونوں کو ختم کر کے اس جزیرے سے بہ آسانی نکل جاؤں۔'' خود پسندی کی ماری اس پاگل بلی کے سر سے ابھی تک گھمنڈ نہیں اترا تھا۔ حالانکہ وہ دیکھ چکی تھی کہ اس کے تین ساتھیوں کا کیا حشر ہوا تھا۔

''یقیناً! تم ہو گی ایسی......'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو

میں تمہارے سامنے بے بس ہو چکا ہوں لیکن اس ہتھیار کی وجہ سے نہیں۔'' میں نے اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھنڈر فور رائفل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چالاکی سے کہا اور آگے بولا۔

''بلکہ... تمہارے حسن و شباب کے ہتھیار نے مجھے تمہارا دیوانہ بنا دیا ہے۔''

اس نے اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب کر دیا۔ میری نبضیں دوڑنے لگیں لیکن گن کے بجائے اس کی زبان چلی۔

''اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو میں تمہیں......'' اس کا جملہ اُدھورا رہ گیا۔ اسی وقت تیز سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پہلے تو اس آواز پر بادلوں کے گرجنے کا گمان ہوا مگر جلد ہی عقدہ کھلا کہ یہ ہیلی کاپٹر کی آواز تھی۔ کیٹ کے چہرے پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ خود میں بھی فکرمند سا ہوا اور سنجیدگی سے بولا۔

''یہ پولیس ہے، تھائی حکومت نے مجسمے کی چوری کے سلسلے میں انٹرپول سے مدد لے لی ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ ہم اس وقت دشمن نہیں بلکہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔'' میں نے اس چالاک بلی کو چکر دینے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ جھانسے میں نہیں آئی۔ اس نے اپنے واچ ٹرانسمیٹر پر کسی سے رابطہ کیا۔ ان حالات نے اسے تھوڑا بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ فاتح ہونے کے باوجود وہ مفتوح تھی۔ حالات اس کی گرفت سے باہر تھے۔ جس کا اسے بھی احساس تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس کے سارے ساتھی میرے ہاتھوں جہنم واصل ہو چکے تھے اور اسی لیے وہ مجھ سے زیادہ ہی خار کھائے ہوئے تھی۔

''یس باس! کیٹ کالنگ یو......'' رابطہ ہوتے ہی اس نے ساری صورت حال اپنے باس جو یقیناً اسٹار بک ہی ہو سکتا تھا، مختصراً الفاظ میں بتا ڈالی۔

''او کے...... باس! یہی کرنا پڑے اب... شہزی میرے قبضے میں ہے۔'' اس نے دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد کہا۔ میری عقابی نظریں جو اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔ صاف محسوس ہوا کہ اس رابطے کے بعد معاملہ خاصا اندوہناک ثابت ہونے والا ہے، کیونکہ اس کے منہ سے ادا ہونے والا یہ آخری جملہ...... ''باس! یہی کرنا پڑے گا اب...... شہزی میرے قبضے میں ہے۔''

صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کال کے بعد کوئی آخری اور فیصلہ کن قدم اُٹھا سکتی تھی اور اس کی زد میں روڈلف ہی آنے والا تھا۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہی یکلخت میری نبضیں دوڑنے لگیں۔ میری دھڑکتی نظریں اس کے چہرے پر لمحہ بہ لمحہ اُترتی سفاکیت کو تاڑ رہی تھیں، کیونکہ دوسری جانب اسٹار بک سے ہدایت لینے کے بعد ہی اس کی نظریں ترچھی ہو کے روڈلف کے چہرے پر پڑی تھیں، صرف ایک لمحے کے لیے...... اور یہ اس کا لاشعوری اور غیر ارادی عمل تھا۔

میری چھٹی حس ممکنہ خطرے کو بھانپتے ہی پیش آئند لمحات سے نمٹنے کے لیے مجھے محتاط کر چکی تھی۔ اسی سبب میرا دایاں پاؤں بہت غیر محسوس طریقے سے سرکتا ہوا اس تپائی تک رسائی حاصل کر چکا تھا جس پر دو چھوٹے سنگی شوپیس رکھے ہوئے تھے۔

رابطہ منقطع ہوتے ہی اس نے اپنے ہونٹ فیصلہ کن انداز میں بھینچے تھے اور اپنی گن کا رخ روڈلف کی طرف کیا ہی تھا کہ میری داہنی ٹانگ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی۔ کیٹ کی انگلی گن کی لبلبی پر ذرا متحرک ہوئی تھی۔ اسی وقت میری ٹانگ تپائی کو کیٹ کی طرف اچھال چکی تھی جس کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا تھا۔

میری کوشش تھی کہ تپائی کیٹ کے چہرے سے ٹکرائے مگر تھوڑی سی اندازے کی غلطی سے وہ چہرے کے بجائے اس کے سینے سے ٹکرائی۔ یہ فائدہ ضرور ہوا کہ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی، جسے وہ بہ سرعت دوبارہ سنبھالنے کی کوشش میں تھی، لیکن میں اب اسے کہاں موقع دینے والا تھا۔ تپائی اُچھالنے کے صرف دو ایک لمحے بعد ہی میں بھی اس پر اُچھلا۔

دیکھا دیکھی روڈلف نے بھی جنبش کی تھی۔ اس نے سنبھالا لیتے ہوئے کیٹ کے لات رسید کر دی، جو کیٹ کے پہلو پر لگی تھی۔ ضرب شاید زوردار ثابت ہوئی تھی کہ کیٹ بلبلائی۔ تب تک میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا اور ایک گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔

پے در پے ان حملوں نے اُسے بے دست و پا کر ڈالا۔ میں اور روڈلف اس پر پل پڑے۔ کیٹ نے شاید روڈلف کے زخمی بازو کو پہلے سے ہی تاڑ رکھا تھا اور اس نے اسی پر موقع دیکھ کر مکا رسید کیا۔ روڈلف کے حلق سے کرب ناک چیخ خارج ہوئی۔ کیٹ کا دوسرا ہاتھ میری ناک پر آیا تھا کہ میں نے پھرتی سے اپنے ایک ہاتھ سے اس کا وار روکا اور دوسرے سے اس کے پیٹ پر پنچ دے مارا، وہ چیخ کر چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑائی اور ایک کھانے کی میز کے

کونے سے اس کی پشت ٹکرا گئی۔ وہ لڑکھڑا کر بُری طرح تڑپ کر گری اور پھر نہ اُٹھ سکی۔ اس کے جسم میں جنبش ہو رہی تھی مگر میز کے کونے کی ضرب نے اسے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کر اس کی گن اُچک کر اُٹھالی۔ کیٹ کی حالت ہنوز غیر تھی۔

''تم ٹھیک ہو روڈلف؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنا زخمی بازو سہلا رہا تھا۔ کیٹ نے وہاں خاصی زوردار ضرب لگائی تھی۔ بندھی ہوئی بینڈیج سرخ ہونے لگی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ زخم کھل گیا۔

ادھر اچانک مجھے للی کے رونے سسکنے کی آواز آئی۔ وہ اپنی ماں اور گرینڈ پا کی خون آلودہ لاشوں کے پاس بیٹھی تھی۔ مجھے مارتھا اور اس کے باپ کی اس اندوہناک موت کا بے حد دکھ ہوا تھا جبکہ للی کا باپ خاصی ترش نظروں سے ہماری طرف گھورے جا رہا تھا۔

''کیا تم لوگوں کو خون ریزی پھیلانے کے لیے یہی گھر ملا تھا؟'' وہ میری طرف دیکھ کر برہمی سے بولا۔ ''کون ہو تم لوگ؟'' بھولے سے آدمی میں ایک دم نجانے کہاں سے اتنی جرأت آگئی تھی۔ وہ مجھ سے یہ کہہ کر اپنی بیٹی کو سنبھالنے کے لیے بڑھا۔

میں نے ابھی اس سے کوئی بات نہیں کی اور ہونٹ جبڑے بھینچے باہر کو لپکا۔ موسم کے تیور ایسے تھے کہ سہ پہر میں ہی شام کا گمان ہونے لگتا تھا۔ سردی زوروں کی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر ہنوز کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کے بعد فضا نکھری ستھری نظر آ رہی تھی مگر کہرے کی سی کیفیت ماحول پر طاری تھی۔

میں درحقیقت موسم دیکھنے نہیں بلکہ اس ہیلی کاپٹر کو دیکھنے کے لیے باہر نکلا تھا۔ جنوب کی سمت میں مجھے ایک ہیلی کاپٹر پرواز کرتا ہوا دکھائی دیا تھا مگر وہ دور جا چکا تھا۔ میں نے اطمینان کی گہری سانس لی اور اندر آ گیا۔

خطرے کی کوئی بات نہ پا کر مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی۔

اندر روڈلف اپنی تکلیف بھلائے باپ بیٹی کو تسلیاں دے رہا تھا۔ اچھے بھلے پُرسکون گھرانے میں ہماری وجہ سے خون ریزی پھیل گئی تھی۔ اس بات کا مجھے ہی نہیں، شاید روڈلف کو بھی قلق تھا۔ للی اپنی ماں سے زیادہ اپنے گرینڈ پا کی لاش کے قریب بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اس کا باپ اسے تسلیاں دیتے ہوئے پیار سے پچکارے جا رہا تھا۔

امن و سکون کے حامل اس گھر میں اب لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور یہ بڑا ہولناک منظر تھا۔

''میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' وہ بھولا سا شخص غم و غصے کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

''فون ڈیڈ پڑا ہے۔ ہم خود بھی تھوڑی دیر پہلے ہی پولیس کو ایک خطرے سے آگاہ کرنے والے تھے۔'' میں نے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' اس آدمی نے رُکھائی سے کہا اور فون کی طرف بڑھ گیا۔ للی بھی ہم سے ناراض نظر آ رہی تھی۔

''بڈی! یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' روڈلف نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اس کا مشورہ ماننے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی تھی اور ہم باہر آ گئے۔

باہر کاٹ دار سی یخ بستہ تیز ہوائیں گویا فراٹے بھر رہی تھیں۔ ہم دونوں سردی کے مارے بری طرح ٹھٹھر کر رہ گئے۔

''تم اپنے کھلے زخم کی مرہم پٹی تو کر لیتے؟'' میں نے باہر آ کر روڈلف اس سے کہا۔

''دیر ہو جائے گی۔ ہمیں جلد سے جلد کسی قریبی جگہ پہنچ کر مقامی پولیس کو انفارم کرنا ہوگا۔'' روڈلف بولا۔

''للی کے باپ نے کر تو دیا ہے فون پولیس کو...... وہ یہاں آ کر خود ہی سنبھال لیں گے یہ سب...... اور اس جہاز کو بھی قبضے میں کر لیں گے۔ میں اسٹار بک اور جوشوا کو جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

اسی وقت عقب سے آواز آئی۔ ہم دونوں ہی چونک کر مڑے۔

''ہے...! فون ٹھیک ہو گیا ہے۔ رکو...... کوئی پولیس آفیسر تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' یہ للی کا باپ تھا۔ روڈلف اور میں نے بیک وقت ہی گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں آدھ کھلے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ روڈلف اور میں نے رائے طلب انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں صلح مشورہ کرنے کے بعد دوبارہ اس ''خون آلودہ'' گھر کے اندر آ گئے۔

کچھ سوچ کر میں نے سب سے پہلے کیٹ اور بروجیٹ وغیرہ کے جسموں کی تلاشی لی اور حسب توقع مجھے ان کے پاس سے اسپیکٹرم کے جاری کردہ مخصوص مونوگرام والے جس میں دو ہاتھوں پر دنیا کو اُٹھایا ہوا دکھایا گیا تھا اُوپر ''سیف دی ورلڈ'' درج تھا۔ آئی ڈی کارڈز ملے۔ ایسا میں نے روڈلف کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ یہ اسی کا مشورہ تھا تاکہ پولیس کو ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر دنیا کو بھی اسپیکٹرم

کے کالے کرتوتوں کا پتا چل جائے۔ جو سیف ڈی ورلڈ کی آڑ میں پوری دنیا کو بے وقوف بنائے ہوئے تھی۔ ایک طرف ان سے خطیر رقمیں عالمی فنڈنگ کے نام پر بٹور رہی تھی تو دوسری طرف اس ''نیک نامی'' کی آڑ میں ہر قسم کا کالا دھندا کر رہی تھی جو قانون کی زد میں آتا تھا۔ روڈلف نے مجھے اسپیکٹرم کے ان آئی ڈی کارڈز کی ایک اور اہمیت کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ اس کارڈ کو شو کر کے اسپیکٹرم کے اراکین اور ایجنٹ دنیا میں ہر جگہ خصوصی مراعات کے بھی حامل رہتے تھے۔

لہٰذا وہ کارڈ جس میں ان کی تصاویر بھی چسپاں تھیں میں نے دوبارہ ان لاشوں کے لباس میں ہی رکھ دیے۔

روڈلف نے ہی ریسیور اٹھایا اور بات کی۔ باہم مشورے کے مطابق اس نے مقامی پولیس [illegible] کہ کچھ کرمنلو سینا کارنیوال بش طیارے میں بینکاک سے گوتم بدھا کا مجسمہ چرانے کے بعد یہاں آ پڑے تھے۔ ہم اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلے ہیں، بہتر ہوگا کہ [illegible] تعاقب میں آنے کے بجائے مذکورہ طیارے کو فوراً قبضے میں کرلیا جائے۔ انٹرپول بھی اسی طیارے کی کھوج میں ہے وغیرہ۔

پولیس نے اس کا نام پوچھنا چاہا تھا مگر [illegible] نہیں بتایا تاہم میری ہدایت کے مطابق اس نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ اسپیکٹرم نے یہ مجسمہ بینکاک کے ایک بڑے کرمنل کاسپاکو کے ذریعے چوری کروایا تھا۔ انہی کے ہاتھوں فروخت ہونا تھا جس کے بعد اسپیکٹرم وہ مجسمہ حاصل کر کے اپنی نیک نامی اور عالمی فنڈنگ کے حصول کے لیے اس مجسمے کو چوری شدہ ڈکلیئر کرنے کے بعد اسے باعزت طور پر تھائی لینڈ کے حوالے کردیتی۔ گویا انہی کی چوری کی ہوئی چیز انہیں ہی واپس لوٹا کر اپنے سر پہ نیک نامی کا تاج جانا چاہتی تھی لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے پیسوں کے معاملے میں دونوں مذکورہ پارٹیوں کے درمیان ٹھن گئی۔

یہ سب کہنے کے بعد روڈلف نے فوراً رابطہ منقطع کر دیا اور پلٹا۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ لی کے باپ کے چہرے پر اب برہمی اور ناراضی کی جگہ حیرت اور اُلجھن کے تاثرات تھے۔ روڈلف ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد میری طرف پلٹنے لگا تو اس آدمی نے آواز دی۔

''ہے...... مسٹر......؟''

''روڈلف......''

''کوپر۔'' اس نے بھی اپنا نام بتایا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ روڈلف نے ہاتھ ملا لیا۔

''تم لوگ کون ہو؟ اگر تم نے واقعی ان کرمنلو کا کوئی منصوبہ ناکام بنایا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے۔ تم دونوں شاید کوئی مزدور ہو لیکن فلپنی نہیں لگتے۔'' کوپر نے کہا پھر آخر میں اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''باہر کیا پولیس کے ہیلی کاپٹر ہیں؟''

''نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر تم نے تو رابطہ کرلیا پولیس سے؟ وہ پہنچنے والی ہوگی۔ لہٰذا اب ہمارا یہاں رکنا مناسب نہ ہوگا۔ باقی وہ سب سنبھال لے گی۔''

''بے شک آنے دو، گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود گواہی دوں گا تمہارے حق میں...... گوتم بدھ جیسے مقدس بت کو تم دونوں نے ان چوروں کے ہاتھوں سے بچایا [illegible] ہے۔'' کوپر متاثر زدہ [illegible] لہجے میں بول رہا تھا۔

''یقین کرو میرا...... تم دونوں کے اس کارنامے کو ہم [illegible] کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ ان کرمنلو کی ایک [illegible] زندہ ہے۔ اسے پولیس کے حوالے کردیں گے۔''

[illegible] لینڈ کی طرح فلپائن میں بھی بدھ پرست تھے۔ [illegible] سے متاثر ہونا یقینی تھا۔ تاہم اس کی باتیں معقول تھیں اور ہمارے لیے قابلِ قبول بھی۔ لیکن ہم رک نہیں سکتے تھے۔ میرے بجائے روڈلف نے کوپر سے انہی خیالات کا اظہار کیا جو ہم دونوں کی ہی مشترکہ ترجمانی کرتے تھے۔ اس کے بعد اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ہمیں ابھی اور بھی بہت سے کام انجام دینے ہیں مسٹر کوپر! یہ تو صرف معمولی کارکن ہیں۔ ابھی ان کے اصل لوگ زندہ ہیں۔ انہیں بھی کیفرِ کردار تک پہنچانا ضروری ہے۔ پولیس کے چکروں میں ہم پڑ گئے تو اپنے اصل مقصد سے ہٹ جائیں گے اور مجرم راہِ فرار اختیار کرلیں گے، ہمیں ان کے ٹھکانے معلوم ہیں۔ آپ ہم سے صرف اسی قدر تعاون کریں کہ...... پولیس کو ہمارے بارے میں بالکل بھی کچھ نہ بتائیں نہ ہی ہمارے حلیوں کی تفصیل انہیں دیں۔ ورنہ ہمارے لیے مشکل ہوجائے گی۔ ہمارے خاکے جاری کردیے جائیں گے اور ہم ان مجرموں تک نہیں پہنچ سکیں گے جنہوں نے بینکاک کے ترمیتر میوزیم سے نہ صرف بدھ کا مجسمہ بلکہ اور بھی کئی مقدس و قیمتی نوادرات کی حامل چیزیں چرائی ہیں۔''

روڈلف کا یہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا۔ وہ ایک جوان

Pakistanipoint Waqar Azeem

مرد ہی نہیں بلکہ بلا کا ذہین آدمی بھی تھا۔ اس نے ان کے مذہب کی آڑ لے کر (جو ایسا غلط بھی نہ تھا) اس کے جذبات کو شہ دیتے ہوئے اپنا راستہ کلیئر کیا تھا۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ ہم مشکل میں پڑ سکتے تھے اور لمبی چوڑی تفتیش وغیرہ کے چکروں میں پڑ جاتے، ہماری ڈھنڈیاں پڑ سکتی تھی۔ ٹی وی پر ہمارے خیالی خاکے جاری ہو سکتے تھے اور ہمیں بھی ان بین الاقوامی کرمنلز میں شمار کیا جاتا۔ روڈلف نے لوپر سے یہ بھی کہا کہ پولیس کو وہ صرف ہمارے بارے میں اتنا ہی بتائے کہ ہم تھائی انٹلی جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا مجرموں کا آئندہ مشن بھی ناکام بنانے کی جستجو میں مصروف ہیں...... ہاں! ہمارے خاکے درست بتانے کی ضرورت نہیں، وغیرہ۔

میں نے روڈلف سے کچھ کہا اور اندر آ گئے۔

لی کی رو رو کر ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ گھر میں اس قدر خون ریزی کے باعث بارود اور خون کی بو باس پھیلی ہوئی تھی اور اندر بیٹھنا تو درکنار گھڑی بھر کے لیے ٹھہرنا تک محال ہو رہا تھا۔

ہم نے لی کو محبت بھرے انداز میں تسلیاں دیں اور پیار بھی کیا۔ اس کا باپ بھی اسے پیار کرتے ہوئے سمجھانے اور حوصلہ دینے لگا۔ لی کی سسکیاں کچھ کم ہوئیں۔

اس کے بعد ہم سب دوسرے کمرے میں آ گئے۔ باہر تیز برفیلی سی ہواؤں کا شرائے وار شور سنائی دے رہا تھا۔

میرے اندر آنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم کیٹ کو رسن بستہ کرنا چاہتے تھے۔ پولیس آنے والی تھی۔ لوپر نے ہمیں مختلف کارآمد راستے بھی بتائے۔ اس نے بتایا کہ پہلے یہ گومبورا جزیرہ نما تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بعض جغرافیائی تبدیلیوں اور تغیر و تبدل کے باعث یہ جزیرہ بنتا چلا گیا۔ لہٰذا اس جزیرے میں جو گاڑیاں وغیرہ دیکھنے میں آتی تھیں، وہ کچھ تو پہلے سے ہی یہاں موجود تھیں اور باقی بعد میں یہاں آتی رہیں۔ اس کے لیے ایک بڑا سا بحری بیڑا کرائے پر ہر وقت دستیاب رہتا ہے جبکہ ہمیں اسکوائر سٹی تک پہنچنے کے لیے ایک نیلے رنگ کی مسافر لانچ میں سوار ہونا پڑے گا جو ہمیں گومبورا کے جنوب مشرقی ساحل تک پہنچا دے گی۔

لوپر نے یہ معلومات ہمیں بہم پہنچاتے ہوئے اپنے بارے میں بھی مختصراً یہی بتایا تھا کہ اس کی بیوی مارتھا ایک تیز مزاج غصیلی عورت تھی اور ہر وقت وہ اس پر اپنا حکم چلاتی رہتی تھی۔ اس کا باپ جو لی کا "گرینڈ پا" تھا۔ وہ بھی بیٹی کا پورا پورا ساتھ دیتا تھا۔ دونوں باپ بیٹی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا اور اس کی پیاری بیٹی لی سے بھی دور کر دیا تھا۔

یہ سارے معاملات طے کرنے کے بعد میں اور روڈلف لی کو بھی یہی ہدایات دے کر مکان سے باہر آ گئے۔

لوپر نے ہمیں زادِ راہ کے طور پر کچھ کھانے کے ڈبے اور گرم کپڑے وغیرہ دے دیے تھے۔ ہم دونوں ساحل کی طرف روانہ ہو گئے۔

لوپر کو ہم نے کیٹلاگ کے طور پر بھی استعمال کیا تھا، یعنی اس سے ساری معلومات حاصل کر لی تھیں کہ ہمیں اس جزیرے سے دوسرے جزیرے یا مین سٹی اور اندرونِ شہر کیسے اور کس طریقے سے سفر کرنا پڑے گا۔ وغیرہ۔ میں فلپائن کے انٹرنیشنل ائرپورٹ سے متعلق بھی لوپر سے معلومات لینا چاہتا تھا مگر روڈلف نے مجھے اشارے سے منع کر دیا۔ بعد میں اس نے موقع دیکھ کر سرگوشی میں مجھ سے کہا تھا کہ سارا پروگرام بتانا لوپر کو مناسب نہ ہو گا۔ باقی وہ سب جانتا ہے۔ صرف ایک بار گومبورا سے نکل کر ڈیواؤ پہنچ جائیں، اس کے بعد میں سنبھال لوں گا۔

میں تو ایسے ہوائی سفر اور فلپائن کے دیس سے بالکل ہی نابلد تھا مگر روڈلف کو ان کا تجربہ تھا۔ بہرکیف ہم دونوں لوپر اور اس کی بیٹی لی کی نیک تمناؤں کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

سارا کھیل شاید اسٹاربک یا جوشوا کی وجہ سے بگڑا تھا۔ نجانے ان دونوں مہا ویروں نے مشترکہ طور پر کیا پلان بنایا تھا کہ انہیں اچانک تبدیلی کرنا پڑ گئی تھی یا پھر چونکہ ان کی ابتدا سے ہی نیت خراب تھی اور یہ سب طے شدہ تھا۔ روڈلف کا یہی خیال تھا جبکہ کم و بیش میرا بھی اتنا ہی خیال تھا کہ یہ سب ان کے ماسٹر چیف لولوش کی موجودہ حالات کے مطابق کوئی نئی چال تھی جس سے وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ ایک طرف روڈلف کی ہلاکت، دوسری طرف مجھے قیدی بنانا تیسری جانب گوتم بدھ کے اس بیش قیمت مجسمے کو ہتھیانا تھا۔ بہرطور اب میں نے ساری چال انہی پر اُلٹ دی تھی، نہ صرف یہ بلکہ...... اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق میں نے اسپیکٹرم کا اصل اور مکروہ چہرہ بھی دنیا کے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ اس کا کریڈٹ بلاشبہ روڈلف کو بھی جاتا تھا۔

یوں چکر تو ہم نے بھی کاسپاکو کو خوب دیا تھا اور وہ میرے ہی کہنے پر دوبارہ ان سے (جوشوا سے) نئے سرے

سے سودے بازی پر رضامند ہوا تھا۔ اگر میں بروقت بیدار مغزی اور چابک دستی سے کام نہ لیتا تو لولوش اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا ہوتا مگر اب چت بھی اس کی تھی اور پٹ بھی ......

بہرحال ان تمام باتوں سے قطع نظر اگرچہ فوری طور پر میرا امریکا یاترا والا اہم ترین معاملہ ایک بار پھر کھٹائی میں پڑتا نظر آ رہا تھا لیکن کاسپاکو کو سلام پیش کروں گا جسے میں نے بڑی فن کاری کے ساتھ بے وقوف بنایا تھا اور جس نے اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر مجھے انویسٹر امیگریشن جیسی بھاری بھرکم ذاتی و انفرادی حیثیت عطا کرتے ہوئے ملٹی پل ویزا جاری کرا دیا تھا۔ تاہم اس سلسلے میں روڈلف کا کہنا تھا کہ مجھے اس خوش فہمی میں زیادہ دیر تک رہنے کی ضرورت نہیں۔ جیسے ہی کاسپاکو کو میری بلکہ ہم دونوں کی اصلیت کا علم ہو گا وہ کوئی بھی گڑبڑ کر سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ بینک اسٹیٹمنٹ شو میں جو خطیر رقم اس نے میرے ویسٹرن یونین بینک اکاؤنٹ میں منتقل کی تھی، اس کی واپسی کے لیے اسے کچھ عرصہ تک پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ وکیل اور امیگریشن کنسلٹنٹ سے روابط اور لمبے چوڑے کاغذی پلان میں اسے کافی وقت لگے گا۔ لہٰذا اس تناظر میں روڈلف نے مجھے ایک صائب مشورہ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے بین الاقوامی اکاؤنٹ کو کاسپاکو "منجمد" کرتا ... میں تب تک ذاتی طور پر اتنی ہی رقم کا بندوبست کرتے ہوئے کاسپاکو کو وہ ساری رقم واپس لوٹا دوں یوں اس کا میرے خلاف کوئی بھی ایسا مقدمہ ازخود ہی کالعدم قرار پا جائے گا۔ یوں اکاؤنٹ اور ویزا وغیرہ کی کینسلیشن کا بھی کوئی ڈر نہ ہو گا۔ تاہم روڈلف کی ان ساری باتوں کے باوجود میری اپنی انتہائی کوشش یہی تھی کہ میں کاسپاکو سے تعلقات استوار رہنے دوں۔ اس کے لیے مجھے اپنے ذہن سے کچھ ایسی توجیہات کو بروئے کار لانا تھا جس سے کاسپاکو جیسا درندہ میری دوستی کے جال میں قابو رہتا۔

"لیکن بڈی!" جان روڈلف یہ سب بتاتے ہوئے آخر میں بولا۔ "یہ کام اسی وقت ہی کرنا جب ایسا کوئی متعلقہ بینک تمہیں نوٹس دے... اس کی ایک وجہ ہو گی..."

روڈلف اتنا کہہ کر ذرا رکا۔

ہم اس وقت لوپر کے مکان سے کافی دور آ گئے تھے اور روڈلف نے ایک شٹل روک کر کوچی کو ٹرمنل تھری چلنے کا کہا۔ (فلپائن کے ان جزیروں میں چلنے والی چھوٹی گاڑیوں کو 'کوچی' ہی کہا جاتا تھا۔ اللہ جانے اب یہ انگریزی لفظ کا کوئی شارٹ فارم تھا یا پھر فلپائنی لفظ...... ہم دونوں ہی اس سے نابلد تھے)

شٹل نے ہمیں ٹرمنل تھری اُتار دیا۔ لوپر سے حاصل کردہ معلومات ہمارے بے حد کام آ رہی تھیں۔ یہاں کافی مسافر لانچیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم ڈیواؤ جانے والی ایک لانچ میں سوار ہو گئے۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر لانچ نے ہمیں ڈیواؤ کے ساحل پر اُتار دیا اور وہاں سے دیگر مسافروں کے ساتھ مل کر ہم بھی ایک نسبتاً بڑی شٹل میں سوار ہوئے۔ یہ شاید بڑے علاقے اور بڑے شہر کی وجہ تھی کہ یہاں...... جیپنی چلتی تھیں۔ جسے فلپائن زبان میں "ڈپنی" (Dyipni) کہا جاتا تھا۔ چھوٹے عام جزیروں میں چلنے والی شٹل سے ذرا بڑی تھیں۔ اس کا اگلا حصہ کسی پرانے ماڈل کی جیپ جیسا ہوتا تھا اور پچھلا کسی وین یا منی بس کی طرح ذرا کھلا اور بڑا ہوتا تھا۔ اس پر چمک دار پٹیاں چسپاں ہوتی تھیں۔ اس جیپنی نے دس منٹ میں ہمیں اسکوائر سٹی کے ایک ریسٹورنٹ میں اُتار دیا۔ یہ عام سا ریسٹورنٹ تھا اور وہاں کھانا پینا ساتھ میں "پینا پلاتا" بھی چل رہا تھا۔ چنانچہ اگلے چند لمحوں بعد ہم ریسٹورنٹ میں آرام سے بیٹھے تھے۔ ہم نے اپنے حلیے مکان میں ہی بہتر بنا لیے تھے۔

روڈلف نے لیدر کی براؤن جیکٹ پہن رکھی تھی اور اس سے بازو کی بینڈیج چھپ گئی تھی۔ گلے میں سفید رنگ کا گرم اُونی مفلر تھا۔ جینز کی ٹائٹ پینٹ میں وہ خاصا خوبرو اور اسمارٹ دکھائی دیتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا کہ وہ قد و قامت میں میرے جیسا ہی تھا۔ خود میں نے فل آستین کی گرم شرٹ اور چست سیاہ پینٹ چڑھا رکھی تھی اور اس پر لیدر کی سیاہ جیکٹ تھی۔ روڈلف نے تو اپنے ہلکے براؤن بالوں میں جل بھی لگا رکھا تھا جبکہ میں نے ہیئر لوشن چپڑ رکھا تھا۔ ایک گرم مفلر میں نے بھی گلے کے گرد ڈال رکھا تھا۔

اسکوائر سٹی کے اس ریسٹورنٹ میں کافی خوش فکرے لوگ نظر آتے تھے۔ کئی منچلی لڑکیاں ہماری طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو کہنی مار کے شرارتاً کوئی جملہ کہتیں اور پھر ان کے نقرئی قہقہوں سے ماحول گنگنا اُٹھتا۔ خاصی چہل پہل دیکھنے میں آتی تھی۔

ہم یہاں کچھ کھانے پینے اور تھوڑا بہت وقت بتانے کے لیے آن بیٹھے تھے۔ سوچ بچار اور آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں بھی ہمارے لیے ازبس ضروری تھا کہ ہم کچھ گھڑی سکون سے بیٹھیں۔ بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ روڈلف نے مجھے... میرا مذہب دیکھتے ہوئے حلال کھانے کا ہی

آرڈر دیا تھا۔ جس میں شرمپ ویجیٹیبل ڈش اور فرائیڈ فش تھی۔ رائس کی ڈش بھی تھی۔ فروٹ سلیڈ بھی تھا۔ تاہم میرے لیے کولڈ ڈرنک اور روڈلف نے اپنے لیے ریڈ وائن منگوائی تھی۔

”مثلاً......؟“ میں نے کانٹے سے فش کا ایک قتلہ منہ میں رکھتے ہوئے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس نے ریڈ وائن کا ایک گھونٹ بھرا اور جواباً بولا۔

”تم جب اپنے اکاؤنٹ سے ٹرانزیکشن کرواؤ گے تب ہی ایسی کسی صورتِ حال کا پتا چلے گا۔ اگر مخالف دعوے دار پارٹی کا کلیم قابلِ قبول ہوا تو اکاؤنٹ منجمد کر دیا جائے گا۔ تب ہی تم اپنا جواب تحریری طور پر جمع کرواؤ گے لیکن تب تک تمہیں اپنی تیاری مکمل رکھنا ہو گی......“ اس نے ذرا توقف کیا پھر بولا۔

”جہاں تک میرا تجربہ ہے کہ کاسپاکو ابھی بینک کو کسی قسم کا شکایتی نوٹس نہیں دے سکتا۔ کیونکہ اس نے اپنی دولت اپنی مرضی سے تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کی ہے۔ نہ ہی وہ اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا بھی کر سکتا ہے۔ البتہ کسی وکیل سے مشورہ کر کے وہ کوئی ”شق“ استعمال کرنے کی پوزیشن میں ہوا کہ تمہارا اکاؤنٹ سیل کروا دے تب تمہیں پہلی فرصت میں اس کی وہ تمام رقم لوٹانا ہو گی۔ معاملہ ادھر ہی ختم ہو جائے گا۔“

”ہم......“ میں نے اس کی بات کو بڑے غور سے سن کر ایک پُرسوچ سی ہنکاری بھری۔ پھر اسے وہی کچھ بتا دیا جو میں کاسپاکو جیسے درندہ صفت آدمی کے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔

”کیا......؟“ میری بات پر روڈلف حیرت آمیز پریشانی سے بولا۔ ”کیا تم اب بھی کاسپاکو کو بے وقوف بنانے پر تلے ہوئے ہو؟ وہ اب تمہارے جھانسے میں نہیں آئے گا اور تمہیں یوں بھی اب کاسپاکو سے کیا لینا دینا؟ اس کی کہانی اب ختم سمجھو۔“

”نہیں روڈلف!“ میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا اور آگے بولا۔ ”میں جتنے دن بھی کاسپاکو کے قریب رہا ہوں مجھے اس کے پانی کا اندازہ اچھی طرح ہوتا رہا ہے۔ وہ بینکاک کا ہوا ہی نہیں ایک ہائی پروفائل لیول کا گینگسٹر ہے۔ بے شک اس کا گینگ محدود سہی لیکن اس کے تعلقات اپنے جیسوں انڈر ورلڈز کے ساتھ استوار ہیں۔ اس کی عام سی جھلک میں نے اپنے ان سفری کاغذوں کی تیاری میں بھی دیکھی ہے۔ بینکاک کی سرزمین پر اس نے مجھے الویسٹرز کی بنیاد پر ملٹی پل ویزا جاری کروایا، پھر ویسٹرن یونین اکاؤنٹ میں میری اجارہ داری، یہ سب کچھ اس نے محض اپنی بے بہا دولت کے بل بوتے پر ہی نہیں بلکہ اثر و رسوخ کے طفیل بھی کروایا ہے۔ ایسا اثر رسوخ جو تھائی لینڈ کی سرحدوں سے پار بھی اپنا اثر رکھے ہوئے ہے۔“

”کاسپاکو سے خوف زدہ ہو، بڈی!“ روڈلف نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا اور اس کے غلط تبصرے پر میرے ہونٹوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ عود کر آئی، پھر میں اسی لہجے میں بولا۔

”میں اس سے خوف زدہ ہوتا تو اس کی بغل میں نہیں بیٹھتا۔ میں بھیڑیوں کی کچھار میں گھس کر ان کے خلاف چالیں چلنے کا عادی ہوں مائی ڈیئر روڈلف!“

”لیکن اب تم اسے مزید کیونکر جل دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہو؟“ روڈلف تھوڑا پریشان سا ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

”دشمن کے خلاف دشمن جیسے ہی دانت اور ہتھیار استعمال کرنا چاہیے۔ پہلے مجھے ذرا جوشوا اور اسٹاربک سے نمٹنے دو، ابھی میں اپنی چال اور پلاننگ محفوظ رکھے ہوئے ہوں۔“

روڈلف ایک گہری ہنکاری بھر کے رہ گیا پھر ایک آنکھ میچ کر معنی خیز لہجے میں بولا۔ ”ویسے بڈی! آپس کی بات ہے...... کاسپاکو نے تمہیں بیٹھے بٹھائے اتنی دولت دے دی ہے کہ سمجھو بس تمہاری لاٹری ہی نکل آئی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ اُسے اپنے ان چند لاکھ ڈالرز کی پروا بھی ہو گی لیکن دشمنی کی ایک نئی ابتدا الگ بات ہے۔“

”میں ایسے پیسوں کو حرام سمجھتا ہوں روڈلف!“ میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔ ”میری یہی کوشش ہو گی کہ...... میں اس سے رابطہ کر کے اس کی ساری رقم لوٹا دوں۔ اس نے اپنے طور پر میرا جو کام کیا ہے وہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے، میرے لیے یہی کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں کاسپاکو کو ایک بار پھر چالاکی سے قائل کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”ہوں ں...... بالکل ٹھیک کہا۔“ روڈلف کے منہ سے کوکو کے سے انداز میں برآمد ہوا۔

ریسٹورنٹ میں رونقیں عروج پر تھیں۔ اس میں موسم کا بھی دخل تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جزیرے کے لوگ سرد موسم سے گھبرانے کے بجائے اس سے انجوائے کر رہے تھے۔ خوب جام لنڈھا رہے تھے اور گرما گرم دھواں اور خوشبو اُڑاتے لذیذ کھانوں سے لطف انداز ہو رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔

یہ ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ تھا۔ اسٹو کھلے تھے اور انواع و اقسام کی ڈشز تیار کرنے والے شیف بھی لوگوں کا جوش و خروش دیکھ کر موڈ میں آئے ہوئے تھے۔ گرما گرم ڈشز پر تیل کا چھڑکاؤ کر کے آگ کے گولے اُڑا رہے تھے۔ جس کے باعث ریسٹورنٹ کا ماحول بھی گرم ہو رہا تھا۔ سردی میں نیم عریاں ویٹریس بھی ٹرے اور بڑی بڑی پلیٹیں اُٹھائے تھرکتی پھر رہی تھیں۔ ویٹرز بھی تھے لیکن ایک تتلی سی ویٹریس نے جگہ سنبھالتے ہی تیر کی طرح ہماری میز کا رخ کیا تھا۔ اب وہی ہمیں کافی دیر سے سرو کر رہی تھی اور بار بار ہماری میز پر آ کر ہمیں دلنشیں مسکراہٹ سے نوازتے ہوئے ہماری ضرورت کا پوچھ جاتی تھی۔

روڈلف اس میں دلچسپی لیتا محسوس ہو رہا تھا جبکہ میرا ارادہ تھا کہ میں جلد از جلد کھانا کھا کر روانہ ہوں اور کسی طرح سے پاکستان زہرہ بانو سے رابطہ کر کے رقم کا بندوبست کروں کیونکہ اپنے ”الویسٹرز“ کی بنیاد پر بنے ہوئے ملٹی پل ویزا اور ویسٹرن یونین اکاؤنٹ کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی رقم کا بندوبست کرنا ضروری تھا۔

نیز اس سلسلے میں مجھے عارفہ سے بھی رابطہ کرنا تھا۔ اسٹاربک اور جوشوا کو بھی مجھے ٹھکانے لگانا تھا۔ وزیر جان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بعد لولوش بوکھلایا ہوا تھا۔ میں جوشوا اور بالخصوص اسٹاربک کو ٹھکانے لگانے کے بعد اسے ایک اور ضرب لگانا چاہتا تھا۔

اسپیکٹرم کے ماسٹر چیف لولوش کو میں بتا دینا چاہتا تھا کہ میں اُسے دنیا کے ہر خطے میں ایسی ہی شکست دیتا رہوں گا۔

کھانا ختم ہو چکا تھا ہمارا لیکن روڈلف کا اُٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

”بڈی! ایک بوتل کا اور آرڈر دے دوں؟“ مجھے اس کی بے چارگی پر قابلِ رحم سی ہنسی آ گئی اس لیے کہ وہ جیبوں سے بالکل خالی تھا۔ میرے پاس خاصی رقم تھی۔ ظاہر ہے یہ کاسپاکو کے ہی دیے پیسے تھے جو میں اسے لوٹانے والا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ روڈلف ریڈ وائن کی ایک بوتل اور کیوں منگوانا چاہتا ہے۔

دراصل اس نرم و نازک فلپائنی دوشیزہ کا لہک لہک کر ہمیں ”سرو“ کرنے کا انداز روڈلف کو بھا گیا تھا۔

”بکواس بند کرو۔ میں جانتا ہوں، تم کیوں ایک بوتل منگوانا چاہتے ہو۔ تمہیں وائن سے زیادہ اس کی لہکتی مٹکتی حسینہ کی احتیاج محسوس ہو رہی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے مصنوعی غصے سے کہا۔ دل کی چوری پکڑے جانے پر روڈلف جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے مخصوص لہجے میں بولا۔

”ہے بڈی! سمجھ گئے ہو ناں...... تو اچھے دوستوں کی طرح مان لو میری فرمائش۔ دینے لگا ہوں آرڈر......“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے آنکھ ماری اور اسی حسینہ کو اشارہ کیا جو ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ایک ذرا اشارہ پاتے ہی وہ جیسے کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی ہماری طرف... میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”ہے بے بی! ایک اسکاچ کا کوارٹر لے آؤ۔“ روڈلف نے اسے آرڈر دیا۔

”میں دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا یہ دوست وہسکی کو ہاتھ لگانا تو در کنار بوتل کی جانب دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کر رہا ہے۔“ بالآخر حسینہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے روڈلف سے حیرت بھرے لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف ٹھنڈی ہوئی سنجیدہ نظروں سے دیکھنے لگا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔

”بے بی! تمہیں کوئی اعتراض ہے اس پر......؟“ وہ بوکھلا گئی۔ جلدی سے بولی۔

”او...... نو نو سر! نیور مائنڈ پلیز......! میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔“ پھر وہ روڈلف کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولی۔

”سر! میں ابھی آپ کا آرڈر سرو کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جلدی سے لوٹ گئی۔

”دھت تیرے کی...... سارا مزہ کرکرا کر دیا۔“ روڈلف میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”اس آرڈر کے بعد یہ لائن پر آنے والی تھی۔“

”روڈلف! ایک بات بتاؤ۔“ میں نے اس کی طرف متانت بھری نظروں سے دیکھا۔

”ہوم...... پوچھو۔“

”تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم شادی شدہ ہو اور تمہارے بچے بھی ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یقیناً......“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ بھی کہ تم اُن سے بہت محبت کرتے ہو؟“

”ہاں! مگر ان باتوں کا اس حسینہ سے کیا تعلق؟“ وہ حیران ہو کے میری طرف دیکھنے لگا۔

”کوئی تعلق نہیں......؟“ میں نے اس کی طرف

استفساریہ نظروں سے دیکھا۔ وہ جیسے میرا اشارہ بھانپتے ہوئے بولا۔

"دیکھو دوست! ان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ میں اپنی بیوی سے کتنا عرصہ دور ہوں اور اس سے دوبارہ ملنے کے لیے ہی تو میرے اندر جینے کی اُمنگ اور حوصلہ جاگا تھا۔ ورنہ توکاسپاکو جیسے درندے کے نرغے میں انسان موت کے سوا کیا سوچ سکتا ہے اور اس سے بچ بھی جاتا تو اپنے لوگ مجھے کب زندہ چھوڑنے والے تھے۔ یہ تم ہی تھے جس کی مدد اور حوصلہ دلانے پر میں نے ہمت باندھی اور اپنے بیوی بچوں سے ملنے اور انہیں دوبارہ دیکھنے کی چاہ میرے اندر شدت سے جاگی۔ یہی نہیں تم نے میرے آدمیوں سے بھی میری جان بچائی۔ ورنہ میں توکاسپاکو سے اپنی جان بچانے کے بعد کیٹ اور بروجیٹ کے نرغے میں آہی چکا تھا۔"

"تو پھر اس کا مطلب کیا ہوا کہ تم اپنی بیوی سے چیٹنگ کرو......؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔ "وہ بھی تو تم سے دور ہے۔ اگر وہ بھی یہی کچھ سوچے تو......؟"

میں جانتا تھا کہ میں اس سے ایک تلخ اور نازک بات کہہ رہا تھا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کے میری مخالفت میں بھی اُتر سکتا تھا۔ حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن چکے تھے۔ لیکن صاف اور کھری بات کہنا میری فطرت تھی اور میں اس سے مجبور تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر فوری ردِعمل کے طور پر...... سرخی کی لہر اُمڈی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ...... نرماہٹ نے لے لی۔ خجالت سے ہنس کر بولا۔

"وہ بھی یہی کچھ کر رہی ہوگی۔"

"شٹ اَپ......!" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "بغیر ثبوت کے تمہیں اس کی کردار کشی کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" میری بات پر روڈلف کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر ندامت کی رمق اُبھری جو جلد ہی شرمندگی کی سرخی میں بدلتی چلی گئی۔ وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے بولا۔

"چلو......! اپنا کام نمٹاتے ہیں۔"

"اور جو آرڈر دیا ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟ وہ حسینہ تو تمہارا آرڈر فالو کرنے گئی ہوئی ہے۔" میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مگر اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

"بھاڑ میں جائے وہ اور اس کا آرڈر...... موڈ خراب ہوگیا ہے میرا۔ چلو اُٹھو۔" اس نے جھلا کر کہا اور پھر میں بھی مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ بل پے کیا جا چکا تھا۔ ہم باہر نکل آئے۔ وہ حسینہ ضرور ہمارے اس طرح اُٹھ کر چلے آنے پر حیران ہوئی ہوگی۔

ریسٹورنٹ سے نکل کر ہم اسٹاربک اور جوشوا کے عارضی ٹھکانے کی طرف چل پڑے۔ ہمیں رات کا انتظار تھا اور وہ آچکی تھی۔ وہ دونوں اسکوائر سٹی کے جس شاہانہ ریزورٹ میں مقیم تھے، وہ پام ریزورٹ (Palm Beach Resort) کے نام سے موسوم تھا۔ یہ ساحلِ سمندر کے قریب واقع تھا۔ آبادی سے دور اور الگ تھلگ مقام پر۔ وہاں تک جانے کے لیے ہمیں ایک ایسی گاڑی لی تھی جسے عام فہم میں محدود زمین پر چلنے والی "شٹل" کہا جاتا ہے...... یا یوں کہہ لیں کہ چار پہیوں والی وہ چھوٹی سی گاڑی جو گولف کے میدانوں میں چلا کرتی ہے۔ ریسٹورنٹ میں تو ڈالر چل گئے تھے مگر گاڑی والا ہم سے فلپائنو پیسو (Philippines, Piso) ہی لینے پر بضد تھا۔ تاہم روڈلف کے سمجھانے بجھانے اور یہ لالچ دینے پر کہ ڈالر تمہارے "پیسو" سے زیادہ منافع بخش کرنسی رہے گی جسے تم فلپائن کے کسی بڑے شہر لے جا کر آسانی سے ایک بڑی رقم کی صورت میں حاصل کرسکتے ہو۔

خدا خدا کر کے یہ مسئلہ حل ہوا اور شٹل کے ڈرائیور نے ہمیں اس پام بیچ ریزورٹ کے قریب اُتار دیا۔ میں نے اسے دو ڈالر تھما دیے۔ روڈلف کے حساب سے یہ بھی زیادہ تھے لیکن میں نے پروا نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔

اسکوائر سٹی کے آسمان پر چھائے ہوئے بادل ایک بار پھر دھواں دھار بارش کا پتا دیتے تھے۔

روڈلف میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میرے سامنے پام ریزورٹ کی پانچ منزلہ وسیع و عریض اور قوس کی شکل میں شاندار عمارت کسی فانوس کی طرح جگمگاتی نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے سوئمنگ پول تھا۔ کلب اور پب بھی اس کے وسیع وعریض احاطے میں نظر آتے تھے۔ پانی میں سوئمنگ پول کے کنارے کئی مرد عورتیں تیرتے ہوئے فلوٹنگ بیڈ پر نیم دراز پینے پلانے میں مصروف نظر آتے تھے۔

میں اور روڈلف گیٹ کے قریب کھڑے تھے اور اندر داخلے کے سسٹم کو بغور دیکھ رہے تھے۔

"بڈی! اندر تو انٹرنس کارڈ پنچ سسٹم ہے۔ ہم نہیں جا سکتے۔" روڈلف نے نیچی آواز میں مجھ سے کہا۔ میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ گیٹ پر دو باوردی گارڈز کھڑے تھے اور اندر جانے والے کچھ لوگوں کو میں نے ایک مشین کی سلاٹ میں کارڈ گھماتے ہوئے دیکھا تھا۔

"یہ کارڈ ممبر شپ والوں کے لیے ہوسکتا ہے مگر گیسٹ کے داخلے کا بھی تو کوئی رول ہوگا۔" میں نے کہا۔ روڈلف نے خوبصورت محرابی نیون سائن والے چمکتے دمکتے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھو کیا لکھا ہے، ممبرز آلوڈ اونلی......"

میں نے ان مذکورہ روشن الفاظ کو دیکھا اور سیٹی بجانے کے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ "اس کا مطلب ہے جوشوا اور اسٹاربک کی پہلے سے یہاں ممبر شپ تھی۔"

"نہ بھی ہوتی تو کیا فرق پڑتا؟" روڈلف کندھے اُچکا کر بولا۔ "چند دنوں کے لیے چند ہزار ڈالرز قربان کرنا اسپیکٹرم کے ان دونوں "بڑوں" کے لیے کیا مشکل ہے۔"

"ہم......" میرے منہ سے گومگو کے انداز میں برآمد ہوا۔

"کیا تم اتنی رقم خرچ کرسکتے ہو کہ چند روز کے لیے اس مہنگے ترین ریزورٹ میں قیام پذیر ہوں؟" روڈلف میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔

"ممکن تو ہوسکتا ہے، لیکن یہ ہمارے لیے یوں بھی مناسب نہ ہوگا۔" میں نے کہا۔ "کوئی چور راستہ دیکھنا پڑے گا۔"

"تو پھر اس طرف آجاؤ ذرا جلدی......" روڈلف نے کہا۔ "ایک گارڈ ہمیں اس طرح کھڑے دیکھ کر مشکوک نظروں سے گھور رہا ہے۔ ممکن ہے یہاں خفیہ کیمرے بھی نصب ہوں۔"

وہ ایک طرف کو ہولیا۔ میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ آگے جا کر ہم دونوں شانہ بشانہ چلتے ہوئے مین روڈ پر آگئے اور فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔

"دیکھ رہے ہو ناں بڈی! سکیورٹی کتنی سخت ہے۔" روڈلف نے چلتے چلتے مجھ سے کہا۔ اس کی نظریں پام ریزورٹ کی شاہانہ عمارت کی باؤنڈری وال پر بنی کنکریٹ کے اس کیبن کا جائزہ لے رہی تھیں جہاں مخصوص وردیوں میں تین گن بردار گارڈز موجود تھے۔ ایک اور ایسا ہی دوسرا کیبن ہمیں اس سے پچیس، تیس فٹ کے فاصلے پر بھی نظر آیا تھا۔ بیرونی عمارت کے ساتھ ساتھ پام کے درخت اور نصف قدِآدم گارڈینا کی طویل باڑھ بھی لگی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ گویا پوری عمارت اس میں گھری ہوئی تھی۔

"کچھ خاص سکیورٹی نہیں ہے۔ معمول کی ہی لگتی ہے۔" میں نے بھی جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ظاہر ہے یہ کوئی جیل تو ہے نہیں، لیکن خاطر جمع رکھو...... یہ گارڈز اندر بیٹھے ریزورٹ کے ایک ایک گوشے پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔" روڈلف نے کہا۔

ہم آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ اس کے عقب میں آگئے۔ عقبی حصہ ہونے کے سبب یہاں کچھ سناٹا تھا۔ مین روڈ ہماری پشت سے گھوم کر دوسری جانب مڑ گئی تھی۔ ایک چھوٹی سڑک البتہ گزر رہی تھی جس کا اختتام عمارت کی عقبی دیوار کی بالکل مخالف سمت میں ایک کھلی جگہ پر ہوتا تھا، جو قدرے عمودی اور سطح مرتفع پر تھی۔ وہاں پام کے درختوں کے عقب سے کچھ خوبصورت ہٹ نما اقامت گاہیں نظر آتی تھیں۔ اس طرف کافی تعداد میں گاڑیاں بھی کھڑی تھیں اور وہاں مدھم مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ شاید وہ کوئی چھوٹا سا پوش رہائشی علاقہ تھا۔ اس کے پیچھے سمندر کی موجوں کا شور سا سنائی دیتا تھا۔ چند ایک لانچوں کے بگل کے ہنکارنے کی آواز بھی ہمارے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

جہاں سے مذکورہ سڑک گھوم کر عمودی مقام پر بنی اس رہائشی علاقے کی طرف جاتی تھی۔ اسی مقام سے ایک اور سنگل بیلٹ روڈ نکل کر تاریکی میں غائب ہو رہی تھی۔ میں نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے روڈلف سے کہا۔

"اس طرف چلو......" کہتے ہوئے میں نے قدم بڑھا دیے۔ ہم پیدل چلتے رہے۔ ہمارے سیدھے ہاتھ پر سڑک عمودی رخ پر گھوم گئی تھی لیکن ہم اس کی ذیلی سڑک پر سیدھا آگے ہی چلتے رہے۔ حتیٰ کہ تاریکی میں نکل آئے۔ ابھی ہم اس طرف پندرہ بیس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ ہمیں رکنا پڑا۔

سامنے ٹمٹماتی روشنیاں چمکتی نظر آرہی تھیں۔ سنگل بیلٹ روڈ یہاں سمندر پر اختتام پذیر ہوتی تھی، سامنے لانچیں اور کشتیاں لنگر انداز تھیں۔ روشنیاں ادھر سے ہی آرہی تھیں۔ اب ہمارے بائیں ہاتھ کی طرف ریزورٹ کی شمالی دیوار تھی، وہاں سمندری موجیں اس کی دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔

"کیا اس سخت سردی میں غوطہ خوری کا ارادہ ہے بڈی......؟" روڈلف بولا۔

"یہی کرنا پڑے گا۔ وہاں مجھے سمندر کنارے کسی چوبی پلیٹ فارم کے آثار نظر آرہے ہیں، ہوسکتا ہے وہاں کوئی کشتی دکھائی دے جائے۔" میں نے اس طرف ہی نظریں جمائے رکھتے ہوئے روڈلف سے مزید کہا۔ "دیکھو

وہاں...... غور سے...... ایک دیوار گیر سنگی ریلنگ کا زینہ جا رہا ہے۔ ہمیں اس زینے تک پہنچنا ہوگا۔"

"کک...... کیا؟" روڈلف گھبرا کر بولا۔

ہاں! اس زینے کا اختتام یقیناً کسی چور دروازے پر ہوتا ہوگا۔ وہاں تھوڑی سی کوشش سے ریزورٹ کے اندر گھسنے کا موقع مل سکے۔" میں نے اسی جانب بہ غور نظریں مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

"تجویز تو تمہاری بُری نہیں لگتی، لیکن یہ کیسے پتا چلے کہ ہمارے دونوں شکار وہیں موجود ہیں کہ نہیں۔" روڈلف بولا۔

"فضول سوال پر دھیان مت دو...... آ جاؤ۔" میں نے کہا اور روڈلف "اوکے بڈی!" کہتا ہوا میرے ساتھ آگے بڑھا۔ ہمارے اطراف میں اب تاریکی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ فضا میں سرد و مرطوب ہوا گھلی ہوئی تھی۔ آسمان قدرے صاف لگتا تھا۔ کہیں کہیں تارے ٹمٹماتے نظر آ جاتے تھے۔

ہم سمندر کی طرف تھوڑا اور آگے بڑھے تو آثار واضح ہونے لگے، قریب پہنچے تو میرا اندازہ ہی درست ثابت نہ ہوا بلکہ اُمید بھی بر آتی نظر آ گئی۔ وہاں ایک سیلن زدہ سے چوبی پلیٹ فارم کے ایک تختے کے ساتھ لگی دو تین کشتیاں موجود تھیں۔ ان کی رسیاں پلیٹ فارم کے چوبی تختے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ دو میں سے ایک ڈونگا کشتی تھی۔ ہم نے اسی کا ہی انتخاب کیا اور اس میں سوار ہو گئے۔ روڈلف رسی کھول چکا تھا، یہ چپوؤں سے چلتی تھی اور اندر دو چپو موجود تھے۔

گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ہم عمارت کی شمالی دیوار جس کا کچھ حصہ سمندر میں ڈوبا نظر آ رہا تھا، کی طرف جانے کے بجائے تھوڑا آگے تک تاریک سمندر میں چلے گئے۔ تاکہ اگر کوئی ساحل سے ہماری طرف دیکھ بھی رہا ہو تو وہ کسی شبے کا شکار نہ ہو سکے۔ اس تسلی کے بعد ہم نے تیز تیز چپو چلانے شروع کر دیے اور شمالی دیوار کے قریب پہنچ گئے۔ یہاں سمندر سے آنے والی موجیں ریزورٹ کی شمالی دیوار سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ ہماری ڈونگا کشتی جب دیوار کے بجائے سطح آب سے تھوڑا ہی نیچے کسی سنگی فرش سے ٹکرائی تو ہمیں پتا چلا کہ یہاں پتھریلا پلیٹ فارم بھی بنایا گیا تھا جو سمندر کے اندر ڈوبا ہوا تھا۔

یہاں ایک دو چوبی بانس بھی اُبھرے ہوئے دکھائی دیے۔ میں نے کشتی کی رسی اس کے گرد لپیٹ دی۔ اس کے بعد ہم کشتی چھوڑ کر اس پلیٹ فارم پر اُتر گئے۔ پانی ہمارے گھٹنوں تک آ گیا تھا۔ ہم نے کشتی سے اترنے سے پہلے ہی لانگ بوٹ اُتار کر ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے اور گرم جرابیں بھی اُتار لی تھیں۔ پتلون کے پائنچے بھی اُوپر گھٹنوں تک لپیٹ لیے تھے، مبادا یہ سب گیلے ہو کے ٹھنڈک نہ پیدا کریں اور اندر کسی قسم کے نشان نہ چھوڑیں۔

سنگی زینے پر آتے ہی ہم نے پہلے گیلے پاؤں جھاڑے، اس کے بعد جرابیں اور بوٹ دوبارہ چڑھا لیے۔ پتلون کے پائنچے بھی نیچے کر دیے۔ تاہم پیروں میں ہنوز سیلن کا احساس ہوتا تھا لیکن اس کے مقابلے میں بہرحال کم ہی تھا جب ہم ایسا نہ کرتے اور اسی طرح ہی پانی میں اُتر جاتے۔

یہاں مکمل سناٹا تھا۔

"بڈی! تمہاری ترکیب تو ٹھیک ہے، لیکن اب خدا کرے کہ اُوپر پہنچ کر ہمیں اندر داخلے کے لیے بھی کوئی راستہ مل جائے۔" روڈلف جوش سے بولا۔

"ہو جائے گا کچھ نہ کچھ...... آؤ......" میں نے کہا اور پھر ہم دونوں محتاط روی کے ساتھ سنگی زینے چڑھنے لگے۔ چونکہ عمارت قوس کی صورت میں تھی اسی لیے زینہ بھی اپنی سنگی ریلنگ سمیت گول گھوم رہا تھا۔

زینہ تھوڑا عمودی جا کر سیدھا چلا گیا اور وہاں سے صرف چند ہی قدموں کے فاصلے پر ہی اس کا اختتام بھی ہو گیا اور اسی آخری سرے پر میری دھڑکتی ہوئی نظریں جمی رہ گئیں۔

اُمید بر آ گئی تھی۔ وہاں...... ایک تقریباً چار فٹ قطر کی گولائی میں ایک فٹ گہرائی کے سوراخ کے اندر کی طرف ایک گول سا لکڑی کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس عجیب دروازے کو دیکھ کر ہمیں حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

"یہ دروازہ اندر شاید بیسمنٹ میں یا اس کی پارکنگ میں کھلتا ہوگا اور صفائی وغیرہ یا یہاں سے کچرا نکال کر سمندر میں پھینکنے کے لیے بنایا گیا ہوگا۔" روڈلف نے سرگوشی میں تبصرہ کیا۔ میں نے بھی اس کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ یہاں کسی سیکیورٹی کے انتظام کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی۔ بھلا کون یہاں سے اندر داخل ہونے کی زحمت کرتا اور کرتا بھی تو اپنے خراب حلیے سے اندر آ کے کرتا بھی کیا......؟ کیونکہ یہ کوئی ایسی جنبل ٹائپ کی تو جگہ تھی نہیں۔ ایک اقامتی ہوٹل ہی تھا۔

ہم دونوں نے دروازے کی جانچ شروع کر دی۔

ہمیں یہ دروازہ کسی کاغذی گتے سے زیادہ مضبوط نظر نہ آیا۔ اگرچہ لکڑی کا ہی تھا مگر کافی سالخوردہ ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کی مشترکہ طبع آزمائی کے بعد وہ کھل گیا۔

یہ سرنگ نما راستہ جو ہم نے جھکے جھکے سر کے ساتھ طے کیا بمشکل آٹھ، دس قدموں پر محیط تھا اس کے بعد ہم ایک ایسی نسبتاً کھلی مگر نیچی چھت والی جگہ پر کھڑے تھے، جو خاصے وسیع و عریض ہال سے مشابہ محسوس ہوتی تھی۔ وہاں ذرا ذرا فاصلے سے کئی ستون نظر آ رہے تھے۔ کئی گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف ڈھلانی راستہ نظر آیا۔ روشنی کا انتظام تھا مگر بلب کم ہی روشن تھے۔ جس کے باعث کہیں اندھیرا اور کہیں روشنی تھی۔

ہم محتاط نظروں سے گھورتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ چند قدم چلے تھے کہ ایک بڑی سی روش آگے ڈھلان کی جانب اُترتی دکھائی دی۔ گاڑیاں شاید ادھر سے ہی آتی جاتی تھیں۔ اس سے آگے شاید ریزورٹ کا مین گیٹ تھا اور روڈلف اور میرے خیال کے مطابق وہاں بھی سیکیورٹی کا یہی انتظام ہو سکتا تھا۔ اسی وقت وہاں ایک روشنی اُبھری، ساتھ ہی کسی گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دی۔ ہم جلدی سے ایک کار کے عقب میں ہو گئے۔ میں نے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں ایک زینہ اُوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ شاید اُوپر گراؤنڈ یا فرسٹ فلور کی طرف جاتا ہوگا۔

ہیڈ لائٹس اس لمبی سی کار کی تھیں جس پر جیپ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا۔ وہ ایک قطار میں داخل ہو کر رک گئی۔ میں اور روڈلف اسی جانب تکنے لگے۔ اس کے اندر سے دو افراد بزنس سوٹ میں ملبوس باہر نکلے اور سیدھے زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ ان کی چال میں عجلت پائی جاتی تھی۔ اس طرف سے ہم ان کے چہرے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ ممبر کسٹمر ہی ہو سکتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہم بھی نکلے اور جب آہستہ روی کے ساتھ زینے کی جانب بڑھنے لگے تو روڈلف نے مجھ سے پوچھا۔

"ہمیں اپنا حلیہ بدلنا چاہیے تھا۔ اسٹاربک اور جوشوا ہمیں پہچان سکتے ہیں، بلکہ تمہارے مقابلے میں مجھے تو جلد ہی پہچان جائیں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔ "یہاں اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے۔ تمہارے تو وہ دونوں دیکھے ہوئے ہیں نا...... تم بھی ذرا محتاط رہنا۔ کیا پتا وہ تمہیں پہلے نظر آ جائیں۔"

"وہ دونوں یہاں سیر سپاٹے کی غرض سے نہیں آئے ہیں کہ فنکشن یا پوکر کھیلتے ہوئے نظر آئیں۔ یا کوئی حسینہ بغل میں دبائے کسی کنج میں بیٹھے ہوں۔" روڈلف بولا۔

"وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہی محبوس ہوں گے۔"

"نجانے تازہ صورت حال اُن کے علم میں اب تک آ چکی ہوگی یا نہیں......" میں نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

"اگر ٹی وی میں یہ خبر آ رہی ہوگی تو وہ اب تک باخبر ہو چکے ہوں گے۔" روڈلف نے جواب دیا۔ ہم زینے طے کرنے لگے۔

ہم زینے طے کرنے کے بعد ایک ہال میں آ گئے۔ یہاں کئی زرق برق لباسوں میں ملبوس مرد و عورتوں کی آوک جاوک دکھائی دی۔ مختلف راہداریاں اور کمرے دکھائی دیے۔ ایک ہال بھی نظر آیا۔ وہاں چھت پر بڑا سا فانوس جھول رہا تھا جس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

ہم دونوں نے بھی اب چوروں کا سا انداز ترک کر دیا تھا۔ کیونکہ اب ہم اس شاہانہ اور مہنگے ترین ریزورٹ کے اندر تھے اور...... ظاہر ہے اب عملے کا کوئی فرد ہم سے ممبر شپ کے کارڈ دکھانے کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔ جو یوں بھی ان کے خلاف اُصول اور مہمانوں کی شان کے خلاف ہوگا۔ تاہم احتیاط پھر بھی ضروری تھی۔

میں نے دیکھا روڈلف کی نظریں تیزی سے اردگرد گردش کرنے لگی تھیں۔ وہ شکار تاڑ رہا تھا۔

"کیا خیال ہے! استقبالیہ پر جا کر اُن دونوں کے بارے میں پوچھا جائے؟" میں نے روڈلف سے کہا۔

"میں اسی پر غور کر رہا تھا مگر میرا نہیں خیال کہ وہ دونوں اپنے اصل ناموں سے فروکش ہوں۔" روڈلف بولا۔

"پوچھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے تو دیکھ لیتے ہیں، بہ صورت دیگر کوئی اور طریقہ سوچتے ہیں۔" میں نے کہا۔ روڈلف نے اثبات میں سر کو جنبش دی اور پھر ہم استقبالیہ کی طرف بڑھ گئے۔

ہم گراؤنڈ فلور پر ہی تھے۔ یہاں سے شیشے کی ایک دیوار سے باہر کا جلترنگ منظر صاف نظر آتا تھا۔ سوئمنگ پول، وسیع لان اور کلب وپب اور لوگوں کا جمگھٹا۔

اچانک ایک کھنکتی سی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیا میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں سر......!"

ہم دونوں نے چونک کر اس کی جانب ذرا گردن موڑ

کر دیکھا۔ وہ حیلے ہی کی...... مخصوص وردی میں ملبوس ایک درمیانی عمر مگر پُرکشش سی عورت تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا ڈبل پیس سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا۔ کوٹ پر دائیں جانب سینے پر ایک مونوگرام چسپاں تھا، جس میں پام ریزورٹ کی عمارت کو مائیکرو کر کے دکھایا گیا تھا اور اس کے اوپر قوسِ قزح بنائی گئی تھی۔ یہ تصویری مونوگرام اس کے بے داغ اور مکلف کوٹ سوٹ پر لگا بہت بھلا نظر آتا تھا۔ اس کا چہرہ گول اور گورا چمکتا ہوا سا تھا۔ بال خوب کس کر سلیقے سے گوندھ کے پیچھے کیے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس کی گول اور کشادہ تھیں۔ ان میں ایک خاص قسم کی چمک اُتری ہوئی تھی۔ تاہم اس کے یاقوتی ہونٹوں پہ کاروبارانہ مسکراہٹ ضرور رقصاں تھی۔

"ہم کسی کے گیسٹ ہیں...... ہمیں واقعی مدد کی ضرورت تھی۔ آپ کا پوچھنا بہت اچھا لگا۔" میں نے اس فلپائنی حسینہ کی طرف دیکھ کر خوش اخلاقی سے کہا۔

مقامی لہجے میں گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

"خوش آمدید کہوں گی میں آپ کو......" وہ اسی طرح مسکرا کر مگر اس بار قدرے خم ہو کے بولی۔ "میں یقیناً آپ کی مدد کر سکتی ہوں اگر آپ اپنے میزبان کا نام بتا دیں......"

"مسٹر جوشوا اینڈ اسٹاربک......" میں نے برملا یہ نام اس کے سامنے اُگل دیے۔ ایسے میں روڈلف کے چہرے سے میں بھانپ سکتا تھا کہ وہ...... اندر سے یقیناً حیرت آمیز پریشانی کا شکار ہو گیا ہوگا۔

"اوہ......" اس کے یاقوتی ہونٹ سکڑ گئے جو بے حد سیکس اپیل محسوس ہوئے۔ "ابھی تو تھوڑی دیر پہلے ان کے دو گیسٹ آئے تھے اور مجھے بھی انہوں نے انہی کے بارے میں کہہ رکھا تھا کہ...... وہ ان کا پوچھیں تو انہیں فوراً اوپر ان کے پاس روم نمبر......" وہ اچانک کچھ کہتے کہتے رکی۔ میری نبضیں دوڑنے لگیں۔

"آپ اپنا نام بتا دیں...... میں انہیں انٹرکوم پر بتائے دیتی ہوں۔" وہ کمرا بتاتے بتاتے رکی اور یک دم بات بدل ڈالی۔

"آپ صرف اُن کا کمرا نمبر بتا دیں۔ ہم خود ہی ان سے جا کر مل لیتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ البتہ میری بھانپتی ہوئی نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ہی نہیں بلکہ اس کے خوش اور دمکتے چہرے سے بھی ایک دو لمحے کے لیے شک کے گہرے سائے نمودار ہوئے تھے جس پر اس نے فوراً ہی اپنی روایتی خوش اخلاقی کی تہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

"سوری سر! دراصل مجھے ہوٹل انتظامیہ نے ہی انہیں سرو کرنے کے لیے ذاتی طور پر ہائر کیا ہے، میں اُن کی پہلے سے اجازت کے بغیر......"

"مس......" دفعتاً روڈلف نے مداخلت کرتے ہوئے اس سے ٹھنڈی ہوئی متانت سے استفساریہ کہا۔

"مس علینہ......" اس نے روڈلف کی طرف دیکھ کر اپنی گھنی جھالروں سے ڈھکی ہوئی آنکھیں پٹپٹا کر دیکھتے ہوئے مسکرا کے اپنا نام بتایا۔

"یس مس علینہ! آپ بلاوجہ ہی ہمارا وقت ضائع کر رہی ہیں، جو ہم پہلے ہی انتظامیہ کی پوور ریسپشن کی وجہ سے بہت گنوا چکے ہیں، مجال ہے جو کسی نے ہم سے مخاطب ہونے کی زحمت گوارا کی ہو۔ آدھے گھنٹے بعد آپ کی آواز سنی ہے ہم نے تو آپ اپنا راگ الاپ رہی ہیں خیر......"

وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا اور پھر اِدھر اُدھر تکتے ہوئے بولا۔ "ہمیں کسی سے نہیں ملنا ہے، آپ پہلے ہماری ہیڈ سے بات کروا دیں۔" آخری جملہ روڈلف نے خاصی ناراضگی اور غصے میں ادا کیا تھا۔ میں نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ خاتون خاصی بوکھلاہٹ آمیز پریشانی کا شکار ہونے لگی تھی۔

"آ...... آپ ناراض نہ ہوں... مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ آپ کو یہاں زحمت اُٹھانی پڑی۔ آپ فرسٹ فلور پر چلے جائیں، روم نمبر فورٹی ون میں......"

"اِٹس او کے...... تھینکس......" روڈلف نے کہا اور تیزی سے نقشین اور فینسی اسٹائل کی ریلنگ والے زینے کی طرف بڑھتا چلا گیا اور میں روڈلف کی اس نازک وقت میں ذہانت کا قائل ہوتا اس کے ساتھ ہو لیا۔

"یہ بکواس کر رہی تھی کہ اسے ہوٹل انتظامیہ نے خاص طور پر ان کے لیے ہائر کیا ہے۔" روڈلف نے میرے ساتھ زینے چڑھتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "خصوصی ٹپ پر یہ اپنی خدمات ہی نہیں خود کو بھی بیچ چکی ہوگی اور ہمیں بلف کر رہی تھی کہ اسے ہوٹل انتظامیہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بڈی! ان شاہانہ ہوٹلوں کے ملازمین کی تنخواہ کم ہی رکھی جاتی ہے، کیونکہ یہ لوگ بھاری ٹپ سے بہت کما لیتے ہیں۔"

"اس کا تم نے کیسے اندازہ لگا لیا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"اس طرح کہ وہ ایک دم میرے دباؤ اور دھمکی میں آ گئی تھی۔ بصورت دیگر یہ سچ ہوتا تو وہ اس وقت سیسہ پلائی دیوار کی طرح ہمارے سامنے تنی کھڑی رہتی۔"

"اپنا یہ ذاتی فرض وہ اب بھی نبھا سکتی ہے بلکہ نبھا رہی ہوگی۔" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ ہمیں رخصت کرتے ہی فوراً جوشوا اور اسٹاربک کو فون پر ہمارے بارے میں مطلع کر رہی ہوگی اور میری طرح روڈلف کو بھی اسی خدشے کا اندازہ تھا۔

"مجھے معلوم ہے، اب آگے کی سچویشن تم سنبھالو، میں نے میدان صاف کر دیا ہے۔ یہی ایک راستہ تھا۔"

"ٹھیک ہے، چلو مگر محتاط ہو کر ذرا...... کیونکہ وہ بھی محتاط ہو گئے ہوں گے اور ان کے آنے والے وہ دو مذکورہ افراد بھی۔" میں نے کہا۔ میرا اشارہ علینہ کے بتائے ہوئے ان دو ملاقاتیوں کی طرف تھا جو ہم سے تھوڑی دیر پہلے جوشوا اور اسٹاربک سے ملنے آئے تھے۔

لہٰذا اسی سچویشن کے پیشِ نگاہ میں زینے کے آخری سرے پر پہنچ کر وہیں رک گیا۔ میرا خیال تھا کہ یہی زینہ فرسٹ فلور کے بعد اُوپری منزل کی طرف بھی جا رہا ہوگا تو میں فرسٹ فلور کے بجائے سیکنڈ فلور پر جا کر نیچے کی صورتِ حالات کا جائزہ لیتا، مگر لگتا تھا کہ جانے کس وجہ کے تحت ہر فلور کا الگ الگ زینہ اور دوسرے رخ پر بنایا گیا تھا۔ تاہم آخری سرے پر رک کر میں نے فلور پر ابھی قدم نہیں رکھا تھا اور سب سے پہلے اپنے سامنے والے کمرے پر نگاہ ڈالی۔ جس پر کمرا نمبر 21 درج تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہر فلور پر بیس اقامتی کمرے تھے۔ تو جوشوا وغیرہ کا کمرا...... سب سے آخر میں ہو سکتا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو بڈی؟" روڈلف نے میرے پیچھے رکے رہتے ہوئے ہولے سے پوچھا تو میں نے جواب دیا۔

"ہمارے شکار کا کمرا اس کوریڈور کے سب سے آخر میں ہے اور ہمیں اس کوریڈور کو چھوڑ کر سامنے والے کوریڈور کا رخ کرنا چاہیے۔" میں نے سامنے والے کمرا نمبر 21 کے ساتھ ایک راہداری کی جانب اشارہ کیا اور آگے بڑھا۔ دائیں جانب والے کوریڈور پر نگاہ ڈالتا ہوا میں اس راہداری میں گھس گیا۔

یہ راہداری نسبتاً مختصر تھی کیونکہ یہ اگلی زد کا "شارٹ کٹ" تھا۔ اس کے آخری سرے پر پہنچ کر میں رک گیا اور روڈلف کو عقب میں نظر رکھنے کی ہدایت دی۔ اب اس رخ سے میرے سامنے...... ایک زینہ نیچے جاتا تھا جہاں ہم کھڑے تھے وہاں ہمارے سوا کوئی بھی نہ تھا اور نہ ہی سامنے والے زینے میں۔ البتہ چند ایک اٹکھیلیاں کرتے جوڑے دکھائی دیے تھے، جو آپس میں گلے لپٹے چہلیں کرتے، نیچے اور اُوپر جانے والے زینوں کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے۔

اُدھر سے ہی میں نے ذرا اپنی گردن موڑ کر دائیں جانب جھانکا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ میرا کمروں کی کیلکولیشن والا اندازہ بالکل ٹھیک ثابت ہوا تھا۔ سب سے آخری کمرے کے باہر مجھے دو افراد اس طرح کھڑے نظر آ گئے جو بڑے چوکنا سے انداز میں دائیں بائیں دیکھے جا رہے تھے۔

ان دونوں نے اپنا ایک ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیبوں میں ڈال رکھا تھا جس کا صاف مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں موجود بھرے ہوئے پستولوں کو چھو رہے ہوں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس عورت نے اپنی "اجرتِ خالص" قسم کی ٹپ کا حق ادا کر دیا تھا۔

یکلخت میری رگوں میں خون مثلِ پارہ کے گردش کرنے لگا۔ میں نے روڈلف کو ادھر رکنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ہم تھوڑی دیر تک رکے رہے تب ہی میں نے دیکھا کہ ان دونوں سوٹ پوش افراد نے کسی کی آمد کا بے حاصل انتظار کرنے کے بعد بیک وقت دو مخالف سمتوں میں حرکت کی۔

مجھے ان سے یہی توقع تھی۔ ایک شکار ہماری طرف آ رہا تھا...... میں تھوڑا پیچھے سرک گیا اور روڈلف کو ازحد محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے خود دیوار کے بالکل سرے کے ساتھ پشت لگا کر چپک گیا۔ میں نے گویا اپنی سانسیں تک روک لی تھیں اور اپنی چست نظریں سرے پر جمائے رکھیں۔

مجھے یقین تھا کہ اس طرف آنے والا وہ سوٹ پوش بہت محتاط ہو کے اس طرف کو گھومے گا، میں نے ایک داؤ کھیلنے کے لیے اپنا دایاں ہاتھ پہلے ہی سے بلند کر رکھا تھا۔ وہی ہوا، سوٹ پوش اپنے تئیں بڑی احتیاط کے ساتھ اس راہداری کی طرف گھوما۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک کوٹ کی جیب کے اندر تھا، شاید وقت سے پہلے وہ اس معروف پبلک مقام پر اسلحہ شو کرنے سے بھی احتیاط برتے ہوئے تھا، مگر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں یہاں اس طرح گھات لگائے اس کے بالکل قریب کھڑا ہوں گا...... وہ مڑتے ہی مجھے اپنے اتنے قریب پا کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا تھا۔

صرف ایک لمحے کے لیے...... اس کے بعد اس نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جیب سے ہاتھ نکالنے کی

کوشش چاہی تھی، مگر میں تو اس سے پہلے ہی اپنا ”ہاتھ“ دکھا چکا تھا۔ اسے فوری طور پر چھاپنے کے لیے میرا ایک ہاتھ کا گھونسہ پہلے ہی فضا میں بلند تھا۔ جو اس سوٹ پوش کی جنبش سے پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا۔ اس کے بال میری مٹھی میں تھے اور اگلا لمحہ میرا اس کی گردن کو بالوں سمیت زوردار جھٹکا دینے کا تھا، وہ لہرایا اور اسی دوران اس نے پستول بھی نکال لیا تھا جس پر سائلنسر چڑھا ہوا تھا۔ تب تک اس کی متوقع حرکت پر میرے دوسرے ہاتھ کا پنجہ بھی متحرک ہوا تھا۔ جو اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ تب ہی میں نے اسے زور سے گھما کے اپنے ساتھ والی دیوار پر مارا۔ رہی سہی کسر روڈلف نے اس کی ناف کے نیچے اپنے گھٹنے کی زوردار ضرب رسید کر کے پوری کر دی۔ تب تک اس کا پستول میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔

روڈلف کی ضرب پر وہ ’اُوغ‘ کی آواز حلق سے خارج کر کے دوہرا ہوا۔ میرے دائیں ہاتھ کے شکنجے میں ہنوز اس کا سر دبا ہوا تھا یوں میں نے بھی ڈبل پریشر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنی ٹانگ کا.... گھٹنا اس کی ناک پر زور سے رسید کر دیا۔ وہ تیورا کر گرا اور بے حس وحرکت ہوگیا۔

اگلا .... اہم مرحلہ نہایت پھرتی کے ساتھ نمٹانے کا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس کے بے سدھ وجود کو کھینچ کر زینے اور کوریڈور کے درمیانی خلا میں گھسیڑ دیا۔

”اس طرف .....“ میں نے سرسراتی سرگوشی میں روڈلف کو پہلے والی سمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا دوسرا ساتھی دوسری سمت سے نمودار ہوگا، اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ جلدی..... آؤ۔“ کہتے ہوئے میں نے اپنی سابقہ راہداری کا رخ کیا جہاں ہمارا مطلوبہ کمرا تھا۔

اس طرف کا میدان صاف پاتے ہی، دوسرے سوٹ پوش کو چھوڑ کر ہم نے تیزی سے حرکت کی تھی اور کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اسے ذرا اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ تاہم میری مشاق نظریں راہداری کی اس سمت کا بھی جائزہ لے رہی تھیں جدھر سے مجھے دوسرے سوٹ پوش کے نمودار ہونے کی پوری اُمید تھی۔ اس پر میں نے وقت ضائع کیے بغیر ہی دروازہ اندر سے کھلتا پا کر بہ سرعت حرکت کی تھی اور اگلے ہی لمحے میں اور روڈلف اندر تھے۔

اندر داخلے سے پہلے میں نے ایک ہلکی سی سرگوشی روڈلف کے کان میں کر دی تھی اور اس نے بھی اسی انداز میں اپنا سر اثبات میں ہلایا تھا۔

اندر گھستے ہی میں نے تیز متلاشی نظروں سے دو افراد کو حرکت پذیر ہوتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک بھاری مگر درمیانے قدوقامت اور دوسرا اکہرے بدن کا مالک شخص قدرے طویل قامت کا تھا۔ انہیں بالکل بھی توقع نہ تھی کہ...... ان کے دو مسلح اور چوکنا گرگوں کی موجودگی میں ہم اس قدر آناً فاناً ملک الموت بنے ان کے سر پر جا پہنچیں گے۔ شاید اسی سبب وہ اندر لاؤنج میں صوفوں پر دائیں بائیں بڑے اطمینان سے بیٹھے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی بس، ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے ہونق سے ہو گئے، پھر یقینی موت کی لہر ان کی آنکھوں میں خوف بن کر چمکی۔ میں چاہتا تو چشم زدن میں سائلنسر لگے پستول سے ان دونوں کو واصلِ جہنم کر ڈالتا مگر یوں بلاتصدیق کے اندھادھند خوں ریزی سے میں اجتناب ہی کرتا تھا۔ اگرچہ میری رگوں میں اس وقت خون لاوے کی طرح اُبل رہا تھا۔ کیونکہ اسپیکٹرم کا ہر رکن، بالخصوص اعلیٰ قیادت سے متعلق افراد عابدہ کے مجرم تھے۔ ایسے مجرم جنہوں نے میری عابدہ کو بھیڑیوں کے حوالے کر ڈالا تھا۔ جنہوں نے میرے ملک کو انتشار کی زد میں لانے اور ملک دشمن عناصر ”را“ اور ”بلیو ٹلسی“ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ بھلا میں یہ سب کیسے بھول سکتا تھا۔

”خبردار..... !ذرا بھی جنبش کی تو پلک جھپکتے ہی موت کی وادیوں میں اُتر جاؤ گے۔“

میری آواز اور لہجے کی گھن گرج ہی ان کے لیے موت کا پیام تھی۔ وہ ایک لخت وہیں جامد ہو گئے۔ جانتے تھے کہ ان کا واحد دشمن شہزی انہیں نابود کرنے کے لیے اپنے سر سے کفن باندھے ہوئے۔

”یہی دونوں جوشوا اور اسٹار بک ہیں۔“ روڈلف نے بلاتاخیر میری ہدایات پر عمل کیا تھا۔ جو میں نے دروازہ دھکیلنے سے پہلے ہلکی سرگوشی کی صورت، اس کے کان میں ڈالی تھی۔

میری آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور چہرہ سفاکیت کی تصویر پیش کرنے لگا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بس! ایک ثانیے کے لیے میرے چشمِ تصور میں عابدہ کا مظلوم چہرہ رقصاں ہوا تھا اور اگلے ہی لمحے میرے سائلنسر لگے پستول سے ”خاموش“ شعلہ لپکا۔ ’چز‘ کی آواز اُبھری، اکہرے بدن والے کی دونوں آنکھوں کے درمیان سرخ نشان اُبھرا، وہ اسی طرح صوفے پر بیٹھے بیٹھے پشت گاہ سے ٹک گیا اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیل گئے۔ درمیانے قدوقامت والے نے اپنے متوقع انجام کو بھانپتے ہی زندگی کی آخری کوشش چاہتے ہوئے، جنبش لی تھی اور میرے پستول کی دوسری گولی عین اس کے دل کے مقام پر سرخ روشندان بنا چکی تھی۔

ان دونوں کو ٹھکانے لگا کر میں جب روڈلف کی طرف پلٹا تو چونک گیا۔ اس کا منہ ہونقوں کی طرح کھلا پڑا تھا۔

”تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا؟ اب نکلنے کی کر یہاں سے.....“

”ب..... بڈی! تت..... تم نے ان دونوں کو...... ی ی..... یعنی ج ج..... جوشوا اور اسٹار بک کو ختم کر ڈالا! اوہو......“ اس کے منہ سے عجیب طرح کی منمناتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔

”کیوں؟ تمہیں افسوس ہوا اس بات کا؟“ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

”ہرگز نہیں۔“ اس نے احمقوں کی طرح سر کو دائیں بائیں ہلایا۔ ”تم نہیں جانتے بڈی! یہ دونوں اسپیکٹرم کی اعلیٰ قیادت کے اہم ترین مہرے تھے۔ شرقِ وسطیٰ اور لاطینی امریکا کی اہم ریاستوں میں یہ دونوں اسپیکٹرم کے ایک وسیع نیٹ ورک کو کنٹرول کیے ہوئے تھے۔ یہ تمہارا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے مائی ڈیئر بڈی شہزی خان!“ وہ ابھی تک متحیر تھا۔

اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی۔ میں پہلے ہی اس کی طرف سے چوکنا تھا، کیونکہ میں دوسرے ”سوٹ پوش“ کو نہیں بھولا تھا۔ تاہم کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ کوئی اور ہونے کی صورت میں دروازے پر دستک ہونا لازمی ہوتا۔ میں نے فوراً روڈلف کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے ایک دم دروازے کے دائیں جانب دیوار سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور میں نے سب سے پہلے لبی نال کی جھلک دیکھی، اگلا لمحہ میرے حرکت کرنے کا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی کھڑی ہتھیلی کا وار میرا پستول والے ہاتھ پر پڑا۔ پستول گرا اور دوسری جانب سے روڈلف حرکت میں آگیا۔ اس کا گھونسا نو وارد کے چہرے پر پڑا تھا۔ تب تک میں نے نمودار ہوتے ہی نو وارد کو جھپٹا اور اسے کھینچ کر اندر لے آیا، مگر وہ بجلی کی طرح تڑپا اور اس نے ایک لات روڈلف کے چلا دی جو اس کے پہلو پر لگی اور وہ ایک ہذیانی سی چیخ مار کے پرے جا گرا۔

یہ دوسرے سوٹ پوش کا ساتھی ہی تھا۔ ادھر میری بھی لات چلی جو اس کی پشت پر رسید ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک صوفے پر جا گرا، مگر اس نے اُٹھنے اور سنبھلنے میں بھی مطلق دیر نہ لگائی تھی، جیسے ہی پلٹا، میں اپنے خاموش پستول کی گولی اس کے پہلو میں اُتار چکا تھا۔ اس کے حلق سے اذیت ناک کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور وہ وہیں تڑپتا ہوا قالین پر گرا۔

”نکل چلو......“ میں نے روڈلف سے کہا۔ جو لات کھانے کے بعد سنبھل رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ہم دونوں کوریڈور میں تھے۔ پستول میں نے اپنی جیکٹ کے اندر رکھ لیا اور بظاہر عام سے انداز میں مگر قدرے تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے دوسری جانب کے زینے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

وہاں سے ہم گراؤنڈ فلور پر آئے اور..... اسی راستے سے بیسمنٹ پارکنگ کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہم...... لکاسی والے دروازے سے باہر تھے، جہاں ٹھٹھرا دینے والی ہواؤں کے ساتھ موجوں کی روانی کا شور سنائی دے رہا تھا۔

میں نے پستول سمندر میں پھینکا اور ڈونگا کشتی کی رسی کھولنے لگا۔ بڑی تیزی سے اس میں سوار ہونے کے بعد ہم دونوں کے ہاتھوں میں گویا موٹر فٹ ہوگئی۔ وہ تیزی سے چپو چلانے لگے۔

تاریک ساحل پر آتے ہی ہم اُترے تو میرے کہنے پر روڈلف نے کشتی کو باندھنے کے بجائے کھلا سمندر میں چھوڑ دیا۔ پھر ہم تیزی سے پلٹ کر پام کے جھنڈ کی جانب بڑھ گئے اور وہاں سے مین روڈ پر آگئے۔

مین روڈ پر ایک معروف مارکیٹ چوراہے پر پہنچ کر روڈلف نے مجھے اچانک ٹھہرنے کا کہا۔

”وہ دیکھو بڈی! ہمارا کچا چٹھا میڈیا پر ظاہر ہو رہا ہے۔“ اس نے ایک جانب اشارہ کیا جہاں عام عوام کی دلچسپی کے لیے ایک بڑی سی دیوقامت اسکرین پر ٹی وی چل رہا تھا اور لوگ باگ اس کے گرد جمگھٹا لگائے، سر اُونچا کیے دیکھنے اور سننے میں محو تھے۔

ہم بھی ذرا قریب ہو کر دھڑکتے دل سے اسکرین کو تکنے لگے۔

ایک مقامی چینل پر بڑی دھواں دھار خبریں فوٹیج اور تبصرے دکھائے جا رہے تھے۔ فلپائنی اور انٹرپول پولیس کے اہلکار ایک طیارے کے پاس کھڑے تھے اور ایک چھوٹی کرین کے ذریعے گوتم بدھ کا مجسمہ اُتارا جا رہا تھا۔

لاشیں بھی نظر آرہی تھیں، قریب ایمبولینس اور پولیس گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ طیارہ وہی تھا جس پر ہم سوار تھے۔

ایک مرد اور خاتون اینکر پرسن بڑے دھنادھن انداز میں خبر دے رہے تھے...... ان کی زبان میرے لیے ہی نہیں بلکہ روڈلف کے لیے بھی اجنبی تھی مگر تصاویر اور فوٹیج اجنبی نہیں تھیں ہمارے لیے...... چونکے ہم تب تھے جب ہم نے ٹوپر کو بھی دیکھا۔ اس کی تصویر اسکرین پر ہائی لائٹ کرتے ہوئے اینکر اس کے بارے میں بھی کچھ بتا رہے تھے۔ اسپیکٹرم کا بھی کچا چٹھا کھولا جا رہا تھا کہ کس طرح اس نے دنیا کو اپنی نیک نامی کی آڑ میں بے وقوف بنا کر ان سے پیسے بٹور رہا تھی۔ ایک ایشین مبصر نے تو کھل کر بے لاگ تبصرہ کر ڈالا تھا کہ اسپیکٹرم کو درپردہ امریکا کی سرپرستی حاصل ہے اور وہ خود بھی اس کی بالادستی چاہتا ہے۔ نیز اسپیکٹرم سی آئی اے کے لیے بھی ایک "ٹاؤٹ" کا کام کرتی ہے۔ جس کا مقصد مختلف ملکوں کے خفیہ راز اُڑانا ہوتا ہے۔ وغیرہ۔

اس کے علاوہ ٹوپر نے اپنا وعدہ بھی نبھایا تھا۔ اس نے میرے اور روڈلف کے حلیے پولیس کو غلط بتا کر بھٹکا دیا تھا۔ بعد میں جو خاکے جاری ہوئے وہ بھی اسکرین میں دکھائے جا رہے تھے جو ظاہر میرے اور روڈلف کے چہروں سے بالکل مختلف تھے۔

اس دوران...... امریکا کے ایک مبصر نے جانبدارانہ تبصرہ کرتے ہوئے دفاع کرنے کی لنگڑی لولی کوشش چاہی تھی کہ...... اسپیکٹرم اپنی پیشہ ورانہ کوششوں کے بل بوتے پر اس مجسمے کو بہت پہلے ہی بینکاک کے ایک بڑے گینگسٹر کاسپاکو براڈے کے غاصبانہ قبضے سے بازیاب کرا چکی تھی۔ تاکہ بعد میں وہ اسے تھائی حکومت کے حوالے کر سکے جبکہ کاسپاکو براڈے کو اسپیکٹرم کی ہی کوششوں سے تھائی پولیس کے حوالے کیا جا چکا ہے۔"

اس امریکی تبصرہ نگار اینکر کے اس جھوٹے تجزیے اور خبر پر مجھے ہی نہیں روڈلف کو بھی سخت غصہ آیا۔ ابھی ہم یہ سب دیکھ ہی رہے تھے کہ اسی کا ڈب امریکی اینکر پرسن نے کہا۔

"معزز ناظرین! اب ہم آپ کو اسپیکٹرم جیسی عالمی معتبر تنظیم کے نائب سربراہ مسٹر کالاہان سے بات کرواتے ہیں۔"

میری یک ٹک نظریں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ تب ہی ایک شخص کا چہرہ اسکرین پر ابھرا۔ یہ ایک چوڑے کاندھوں اور مضبوط تن و توش کا مالک شخص تھا۔ مگر اس کی گردن اس قدر مختصر تھی کہ سر جیسے کاندھوں پر رکھا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے وہی جھوٹی بکواس کی جو اس سے پہلے وہ امریکی اینکر پرسن کر چکا تھا اور اسپیکٹرم کی تعریفوں میں رطب اللسان بھی رہا تھا۔

اسپیکٹرم کے نائب کالاہان نے پہلے تو اپنی گھرگھراتی آواز میں اپنی گفتگو کا آغاز حسبِ توقع تنظیم اور اس کے "عظیم" مقاصد پر تعریفوں کے پُل باندھ کر کیا پھر اس کے بعد اس نے وہی کچھ کہا کہ ایک سازش کے تحت اسپیکٹرم کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ اور اس سازش کا اصل کردار......"

یہاں پر میری سانسیں سینے میں اٹکنے لگیں۔ اگر یہ میرا نام لے ڈالتا تو میرے لیے کافی مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔ میں جیسے اب سراپا سماعت بن گیا۔ اگر یہ بدبخت میرا نام لے دیتا تو میرے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔ میرا امریکی ویزا کینسل یا رد بھی ہو سکتا تھا۔ نہ بھی ہوتا تو شبے کی زد میں آ جانا بھی میرے لیے ایک وبال بن جاتا۔ اس وقت ایکا ایکی میں خود کو جیسے اسپیکٹرم کے رحم و کرم پر محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں خود کو بےبس سا محسوس کرنے لگا۔ کالاہان یقیناً لولوش کی اجازت اور اسی کے ایما پر ہی ٹی وی اسکرین پر آیا تھا یا لایا گیا تھا۔

اسی وقت روڈلف نے میرے پہلو میں ہلکی سی چٹکی لی۔ اور سرگوشی میں مجھے اپنا چہرہ مفلر میں ڈھانپنے کا مشورہ دیا اور میں نے فوراً ایسا ہی کیا۔

میرا سینہ جیسے دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

کالاہان کا بیان جاری تھا۔ اس نے میرا نام نہیں لیا تھا۔ مجھے یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے اسپیکٹرم نے مجھ پر یہ ایک "احسانِ عظیم" کیا ہے لیکن اس بدبخت کالاہان نے میرا نام تو نہیں لیا البتہ میرا تعلق غلط طریقے سے عابدہ کے ساتھ جوڑتے ہوئے اسپیکٹرم کے مکروہ کرتوت پر پردہ ڈھانپنے کے لیے زہر اُگلنا شروع کر دیا اور اسکرین پر عابدہ کی تصویر دکھا دی۔ عابدہ کی تصویر دیکھ کر میں بے حال سا ہونے لگا۔ میری سانسیں رکنے لگی تھیں۔ دل جیسے یکلخت دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اس مجسم خنزیر شخص کالاہان نے اپنی غلیظ زبان سے معصوم عابدہ پر یہی الزام لگایا کہ وہ ایک عالمی دہشت گردوں کی ایجنٹ ہے جسے عالمی دہشت گردی کی عدالت

میں مجرم ثابت کیا جا چکا ہے اور اسپیکٹرم کے خلاف سازش میں مصروف ہے (یعنی میں) اس کا ساتھی اور بوائے فرینڈ ہے۔ جو خود بھی ایک دہشت گرد ہے اور اسی نے ہی اسپیکٹرم کے خلاف یہ ساری سازش تیار کی ہے۔ اس کے خلاف خفیہ ادارے حرکت میں آ چکے ہیں۔ وہ جلد ہی گرفت میں ہوگا۔ وغیرہ......"

جب کچھ غیر جانبدار رپورٹرز نے کالاہان کو میرا نام پوچھنے اور اسے عالمی میڈیا پر ظاہر کرنے کا کہا تو اس نے کسی مصلحت کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ ایک اور رپورٹر نے جب کالاہان سے یہ سوال کیا کہ...... وقوعے کی جگہ پر اسپیکٹرم کے کارکنوں کی لاشوں کے ساتھ مجسمہ چوروں کی بھی لاشیں برآمد ہوئی ہیں جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ ان دونوں مذکورہ پارٹیوں کے درمیان کوئی ڈیل ہو رہی تھی تو اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

کالاہان کے پاس اس رپورٹر کے سوال کا جواب وہی تھا، یعنی آئیں بائیں شائیں...... ظاہر یہی ہوتا تھا کہ کوئی بھی اس کی بات پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"کھسک چلو یہاں سے بڈی! اب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہے، جیسا کہ ہم چاہتے تھے۔" روڈلف نے میرے کان میں اچانک سرگوشی کی اور میں نے سر ہلا دیا۔

ہم انسانوں کے جم غفیر سے نکل کر دور چلے آئے۔

ان خبروں کے بعد اب میرے دل سے ہی نہیں بلکہ ذہن سے بھی یہ خوش گمانی فرو ہو چکی تھی کہ اسپیکٹرم یا لولوش...... میری راہ کھوٹی کرنا چاہتے تھے۔ صاف عیاں تھا کہ وہ خود بھی یہی چاہتے تھے کہ میں ان کے سامنے آؤں۔ گویا وہ اپنے شکار کو اپنی کچھار میں آنے کا موقع دینا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی طاقت کا کچھ ایسا ہی غرور اور زعم تھا۔ لیکن میں نے تصویر کا دوسرا رخ بھی جانچنے کی کوشش چاہی۔ کیا خبر اُن کے نزدیک کچھ اور مقصد یا مصلحت ہو......؟ مجھے یوں ظاہر کر کے ان کے اپنے کسی مفاد پر ضرب آتی ہو۔ یا اس کی پشت میں کسی کی "ڈکٹیٹ" شاملِ حال رہی ہو۔ یوں بھی بھلا ان کے پاس میرے بارے میں کوئی ایسی منفی سرگرمیوں کا کون سا ثبوت تھا؟ پھر عابدہ کے حوالے سے میرا منفی تعلق جوڑنے پر انہیں...... میرے بارے میں ثبوت دینا یوں بھی لازمی ہو جاتا کہ کیا میں واقعی عالمی دہشت گردوں سے تعلق رکھتا تھا؟ جس کا جواب نفی میں ہی ہوتا یوں عابدہ کے سلسلے میں دفاع کی راہ ہموار ہو جاتی۔ اسی بات کا انہیں ڈر رہا ہوگا۔ جبکہ کاسپاکو کے بارے میں یہ سن کر کہ وہ اس بار بُری طرح پولیس کے نرغے میں آ چکا ہے اور طویل مقدمے بازی میں مصروف ہے۔

"کیا سوچنے لگے بڈی؟ جلدی کرو...... اس جزیرے سے ہمیں فی الفور نکلنا ہوگا۔" میں نے جیسے خود کلامیہ بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ پام ریزورٹ کی خبر بھی پھیل جائے۔"

"میرا خیال ہے ٹوپر اپنے وعدے پر قائم رہا ہے۔ اس نے پولیس کو سارا کچھ ویسا ہی اور وہی بتایا ہے جیسا کہ اسے ہم نے کہا تھا۔ اس نے ہم پر بہت بھروسا کیا ہے۔" روڈلف میری بات پر دھیان دیے بغیر بولا۔ وہ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔ مطمئن تو کافی حد تک میں بھی تھا۔ روڈلف مجھ...... پر اب زیادہ اعتماد کرنے لگا تھا۔ میرے ہاتھوں اسپیکٹرم کے دو "بڑوں" کی ہلاکت نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس نے بھی اب لگتا ہے اسپیکٹرم کے خلاف میرے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے ہمت اور کمر دونوں ہی کس لی تھیں۔

"بھروسا تو اسے کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اس قدر بیش قیمت اور مذہبی اہمیت کے حامل گوتم بدھ کے مجسمے کو عالمی چوروں کے ہاتھوں میں جانے سے ہم نے بچایا جو تھا۔ اس نے اپنے ذمے دار شہری ہونے کا فرض ادا کیا ہے۔ اب نکلنے کی بات کرو۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ ممکن تھا کہ پام ریزورٹ کے دوسرے تازہ کار واقعے کے بعد پولیس پورے ڈیواؤ میں حرکت میں آ سکتی ہے۔"

"بے فکر رہو، بڈی! یہ گوبھورا کی طرح چھوٹا شہر یا جزیرہ نہیں ہے بلکہ پورا شہر ہے، ایک جزیرہ نما بڑا شہر۔ یہاں ڈومیسٹک پروازیں بھی چلتی ہیں اور سڑک کا راستہ بھی ہے۔" اس نے قدرے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"ہمیں اب جانا کہاں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"منیلا......" اس نے جواب دیا۔ "فلپائن کا کیپٹل ہے، وہاں انٹرنیشنل ائرپورٹ ہے۔ جو "نینوئے اکینو انٹرنیشنل ائرپورٹ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ Davao (ڈیواؤ) سے تینوں راستے منیلا کی طرف جاتے ہیں۔ بائی روڈ، بائی ائر اور سی پورٹ...... تاہم بائی روڈ دس سے بارہ گھنٹے لگ جائیں گے ہمیں، سمندری راستے سے ایک دو گھنٹے بڑھا لو، البتہ ڈومیسٹک پرواز کے ذریعے اگر ہمیں ائربس مل جاتی ہے تو ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم منیلا پہنچ جائیں گے، عام پرواز میں تین گھنٹے کم از کم لگ جائیں گے۔ وہاں سے ہم امریکا کی طرف کسی بھی فلائٹ سے پرواز کر سکتے ہیں۔ جیسے تم کہو۔"

تب ہی میں چونکا۔ وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مجبوراً ذرا آگے ہو کے دیکھ رہا تھا اور جب ہم دونوں کی نظریں آپس میں ملیں تو اس نے شکوک زائل کرنے کے لیے دوبارہ ایک دم پیچھے ہٹنے کے بجائے اسی طرح گردن موڑ کے سامنے دیکھنے لگا۔ پھر پیچھے ہو گیا۔ میں نے نظریں ہٹا لیں اور میری نبضیں دوڑ پڑیں۔ میرا اسّی فیصد شبہ نوّے فیصد ہو چکا تھا۔

میں نے چاہا تھا کہ اپنے ساتھ بیٹھے روڈلف کے کان میں ایک ہلکی سرگوشی انڈیل دوں تاکہ وہ بھی محتاط ہو جائے، لیکن وہ کم بخت ہنوز اپنے معدے میں اسکاچ انڈیلنے میں مصروف تھا۔ کیا خبر وہ میری بات اور نشے کی پنک میں کوئی اونگی بونگی مار دیتا۔ اس لیے میں نے روڈلف کو مطلع کرنے کا ارادہ بدل دیا۔

اب میں اس مشکوک شخص کی طرف بہت احتیاط سے دیکھنا چاہتا تھا جیسی احتیاط وہ میرے سلسلے میں برتتے ہوئے تھا۔ یوں اب میں ترچھی نظروں سے کام لے رہا تھا۔

اچانک میں نے اسے اپنی سیٹ سے اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے کوئی جنبش نہ کی۔ دل کی رفتار البتہ تھوڑی مجھے اپنی تیز ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

وہ نشستوں کے درمیان سے ہوتا ہوا پیچھے جا رہا تھا اور ناچار مجھے اپنی گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھنا پڑا تھا۔ اس کا رخ کیبن کے دروازے کی طرف تھا۔ وہ شاید ٹوائلٹ کی طرف جانا چاہتا تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے اسے لابی والے دروازے کے قریب پہنچ کر ذرا رکتے اور عقب میں گردن موڑتے دیکھا تو اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ میں نے اپنا چہرہ اس کی جانب سے گھما کر سیدھا کر لیا۔

میں نے ایک بار پھر اس کی خالی نشست کے دائیں بائیں بیٹھے افراد کو بغور دیکھا کہ کہیں اس کا کوئی اور ساتھی بھی تو نہیں بیٹھا تھا۔ ایسا کچھ محسوس نہ ہوا تھا مجھے جس سے اس کے ساتھی کا گمان ہوتا۔ اس رو میں باقی تین مسافروں میں ایک جوان عورت بیٹھی کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی، دوسرا ایک چربیلے جسم کا مالک بھاری بھرکم عمر رسیدہ آدمی تھا۔ تیسرا ایک ٹین ایجر لڑکا تھا۔ جو گاہے بگاہے اپنے ساتھ بیٹھی خاتون سے ہنس کر بات کر لیتا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتی تھی۔ وہ شاید اسی کا ہی بچہ تھا۔ یہ میرا خیال تھا۔ میں نے گردن گھما کر پھر کیبن کے دروازے کی طرف دیکھا، وہ مشکوک آدمی جا چکا تھا۔

میں اپنی نشست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں چل دیے......؟“ روڈلف بوجھل سی آواز میں بولا۔

”ٹوائلٹ......“ میں نے مختصراً جواب دیا۔

میں نشستوں کے درمیان والی جگہ پر چلتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا اور اسے کھول کر دوسری طرف آیا۔ یہاں میں نے ایک نوجوان جوڑے کو اٹکھیلیاں کرتے دیکھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک دوسرے کو ہی نہیں بلکہ اوروں کو بھی یہ جتانے میں محو تھے کہ وہ دونوں کس قدر ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ان کی طرف سے نظر ہٹا کر میں ٹوائلٹ کے حصے میں آیا۔

میری متلاشی نظریں اسی مشکوک شخص کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ ایک جینٹس ٹوائلٹ میں ”آکوپائیڈ“ کے ساتھ مرد کا تصویری اشارہ روشن تھا۔ میں اس کے برابر والے ٹوائلٹ میں گھس گیا۔ مگر اس کا دروازہ ٹائٹ بند کرنے کے بجائے تھوڑا کھلا رکھا۔ اسی وقت مجھے برابر والے ٹوائلٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور میں نے اسی شخص کو وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ گیا نہیں تھا، کھڑا رہا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگائی تھی اور وہیں کھڑے ہو کے گہرے گہرے کش لینے لگا۔ میں دروازے کی باریک جھری سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ درمیانے قد کا مالک تھا اور چال ڈھال اور بشرے سے ایک خاص قسم کی چابک دستی مترشح ہوتی تھی۔

اسی وقت ایک اور شخص اس سے آن ملا۔ وہ دراز قامت اور مضبوط تن و توش کا مالک تھا۔ دونوں ہی ایشیائی نظر آتے تھے۔ دراز قامت کا چہرہ قدرے لمبوترا اور آنکھیں کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جو میں نہ سمجھ سکا۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ دونوں نے مختلف سمتوں کی راہ لی۔ یعنی جہاں سے وہ دراز قامت آیا تھا اس کی راہ پر وہ درمیانی قامت والا مشکوک شخص لوٹ گیا جبکہ اول الذکر نے اس کی جگہ لے لی اور وہ کیبن کی طرف بڑھا۔

دونوں نے نشستیں بدل ڈالی تھیں...... کیوں......؟ میرے ذہن میں سوالیہ نشان اُبھرا۔

میرا خیال درست ثابت ہوا۔ ان دونوں نے اپنی اپنی نشستیں بدل ڈالی تھیں۔ اب وہ دراز قامت آدمی پہلے والے شخص کی سیٹ پر براجمان تھا۔ میں نے پیچھے سے اسے ایک نظر دیکھا تھا اور پھر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو چونک پڑا...... روڈلف اپنی جگہ سے غائب تھا۔

☆☆☆

تھوڑا چونکنے کے بعد میں نے اس کے اچانک غیاب پر یہی محمول کیا کہ...... شاید اُسے بھی ٹوائلٹ کی ضرورت پڑی ہو۔ میں اپنی نشست پر براجمان ہو گیا۔ میرا دھیان اسی دراز قامت کی طرف تھا۔ میں اب اس کی طرف دیکھنے سے اعراض ہی برتے ہوئے تھا۔ لیکن ایک موقع پر میں نے بہانے سے کہیں اور دیکھنے کے اُس کی جانب بھی چھچلتی سی نظر ڈالی تھی۔ وہ میری طرف بالکل بھی متوجہ نہ تھا۔

”ہے بڈی!“ اچانک میرے کندھے پر ہاتھ مارتا ہوا روڈلف اپنی نشست پر براجمان ہوا۔

”تم کہاں چلے گئے تھے؟“ میں نے سرسری سے انداز میں اُس سے پوچھا۔

”جہاں تم گئے تھے۔“

”مجھے تو تم وہاں نظر نہیں آئے؟“

”تم اندر ہو گے۔“ اس نے جواب دیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر ہلکی سی سرگوشی میں بولا۔

”اب میری بات دھیان سے سنو! اور ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر مت دیکھنے لگ جانا۔ طیارے میں دو مشکوک افراد موجود ہیں۔“

”اوہو...... !“ اس کے منہ سے برآمد ہوا۔ ”میں پہلے ہی تمہارے اس طرح اچانک اُٹھ جانے پر ٹھٹک گیا تھا جو خالی از علت نہ تھا۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں کیسے ان پر شبہ ہوا؟“ اس نے آخر میں پوچھا۔

”شراب اور عورت سے ہٹ کر تم اپنے گرد و پیش سے بھی چوکنا رہو تو تمہیں بھی خطرے کا احساس ہو سکتا ہے۔“ میں نے ترشی سے کہا۔

”تت...... تو کیا تم نے مجھے اس کے ساتھ دیکھ لیا تھا؟“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ خجل سا نظر آنے لگا۔

”کیا مطلب؟ تم نے جہاز میں بھی کسی کو پھانس لیا تھا؟“ میں نے گھور کر اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ قدرے گڑبڑا کر بولا۔

”اچھا چھوڑو اس بات کو یہ بتاؤ وہ...... کون دو لوگ ہیں اور کہاں بیٹھے ہیں؟“

”تمہاری یہ بے راہ رو عادتیں کہیں ہمیں کسی بڑی مصیبت میں نہ ڈال دیں...... روڈلف۔“ میں نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے بدستور تلخ لہجے میں کہا۔

”او کے باس! سوری، اب بتا بھی چکو۔“ وہ بدستور خجل ہو کے بولا۔

”ہمارے بائیں ہاتھ والی درمیانی رو کی دوسری سیٹ پر بیٹھا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے سب بتا ڈالا۔

”یہ دونوں اسپیکٹرم کے ایجنٹوں کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔“ اس نے خیال ظاہر کیا۔

”میرا اس بارے میں پچاس فیصد خیال بھی نہیں۔“ میں بولا۔

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
چند عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی تھیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس 0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

''کیا.....؟'' روڈلف کا منہ کھل گیا۔ ''تو پھر یہ کون ہو سکتے ہیں؟''

''کہو تو ان سے جا کر پوچھ لوں کہ آپ ہمارے کس دشمن سے تعلق رکھتے ہیں؟''

''خوشی ہوئی تمہاری زندہ دلی پر بڈی! لیکن بتاؤ تمہاری زیرک دماغی کیا کہتی ہے ان کے بارے میں.....؟'' وہ ہولے سے ہنس کر بولا۔

''اس کا ابھی مجھے اندازہ نہیں ہو سکا ہے۔ بس! تم محتاط رہنا۔ اس کا دوسرا ساتھی کچھ زیادہ ہی ہوشیار بن رہا ہے۔ ہماری طرف ایک بار بھی اس نے نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا، شاید اس کے ساتھی نے اسے بتا دیا کہ ہمیں بھی اس پر شبہ ہو گیا ہے، اسی لیے اس نے سیٹیں ایکسچینج کر لی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہوم.....'' اس نے ہنکارا بھرا۔

ٹھیک پچاس منٹ بعد اعلان ہوا کہ کچھ دیر بعد ہم منیلا کے انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ ہم نے سیٹ بیلٹس باندھ لیے۔

منیلا کا ائرپورٹ ماڈرن، خوبصورت اور نہایت دیدہ زیب تھا۔ روڈلف نے مجھے بتایا کہ یہاں غیر ملکی پروازیں آتی رہتی ہیں۔ جن میں اکثریت یورپین اور امریکی مسافروں کی ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر صحیح معنوں میں کسی نیم مغربی ائرپورٹ کا گمان ہوتا تھا۔ میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے مغربی لباس پہنے ہوئے تھے۔ کام کرنے والوں میں اکثریت خواتین کی تھی۔ جو اسمارٹ اور میک اَپ سے آراستہ بالکل مغربی رنگ میں رنگی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ خاصی گہما گہمی تھی مگر ایک پُرسکون سی خوشگواریت کا احساس ہوتا تھا۔

کسٹم کا عملہ بہت چاق چوبند اور تازہ دم نظر آرہا تھا۔ کسٹم سے جلدی چھٹکارا پانے کے بعد ہم... ایک اور کاؤنٹر ٹیبل کی جانب بڑھ گئے۔ میری گردشی نظریں سریع الحرکت کے ساتھ ان دونوں مشکوک افراد کی متلاشی رہی تھیں، مگر وہ دونوں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب تھے، تاہم میں نے اپنی ''کوشش'' جاری رکھی تھی۔

اس کاؤنٹر ٹیبل پر کافی مسافر کھڑے تھے۔ جن میں فلپائنیوں کی اکثریت تھی۔ ہمارے پاس کوئی خاص سامان نہ تھا ماسوائے دو عدد شولڈر بیگ کے۔ وہ کاؤنٹر پر رکھ کر کھولا اور چیک وغیرہ کیا گیا اس کے بعد..... ہمارے سفری کاغذات چیک ہوئے۔ میرا دل نامعلوم اندیشناک خیالات سے بُری طرح دھڑکنے لگا تھا کہ کیا خبر کاساپا کو نے کوئی گُل کھلا دیا ہو، اگرچہ یہ اس قدر فوری ممکن تو نہیں نظر آتا تھا لیکن جب حالات غیر یقینی ہوں تو ایسی سوچیں تشویش زدہ تو رکھتی ہی ہیں۔

بہرکیف..... ایسا کچھ نہ ہوا اور کسٹم کا مرحلہ بہ خیر و خوبی طے ہو گیا۔ یوں ہم بھی دیگر مسافروں کی طرح، جو سامانوں سے بھری ہوئی ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے مسافر لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے، ان میں شامل ہو گئے۔

میرا خیال تھا کہ حسب سابق ائرپورٹ سے باہر نکلتے ہی ایشیائی ملکوں کی طرح ٹیکسی والوں کی یلغار ہو جائے گی۔ کوئی ہمارا بیگ چھینے گا تو کوئی بازو دبوچے گا اور لپٹ ہی جائے گا۔ اس دھینگا مشتی سے نجات کے بعد بھاؤ تاؤ کا مرحلہ آئے گا۔ مگر باہر آکر مجھے حیرت ہوئی، ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ بہت سی ٹیکسیاں ایک لمبی قطار میں کھڑی تھیں اور باری باری آکر مسافروں کو لے جا رہی تھیں۔ کوئی دھکم پیل یا زبردستی نہیں، نہ شور نہ غل غپاڑا۔ بڑی خاموشی سے ایک ٹیکسی رُکتی، مسافر اس میں سوار ہوتے اور پھر اس کی جگہ دوسری ٹیکسی لے لیتی۔ یہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ .. فلپائن بلاشبہ ترقی یافتہ ممالک میں شامل ہو چکا ہے۔

میری متلاشی نظریں کچھ لمحوں کے لیے بھٹکی تھیں مگر ایک بار پھر وہ گردش کرنے لگیں۔ وہ دونوں ہنوز غائب تھے۔ میں اسی میں ہی اُلجھا ہوا تھا کہ روڈلف نے ٹہوکا دیا۔

''لگتا ہے بڈی! تم منیلا آکر اس کے حُسن میں کھو گئے ہو؟''

''یار! تمہیں حُسن کی رنگینیوں کے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا؟'' میں نے اسے گھورا۔ ''میں ان دونوں کو تلاشنے کی کوشش کر رہا ہوں، تم بھی اپنی نظریں رعنائیوں سے ہٹا کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرو۔ مت بھولو کہ اس وقت اسپیکٹرم نے تمہارے ایک طرح سے ڈیتھ وارنٹ جاری کر رکھے ہیں۔'' میری اس طرف توجہ مبذول کروانے پر روڈلف کی آنکھوں سے واقعی خوف جھلکنے لگا۔ اس کا چہرہ ست کر رہ گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اس نے اپنی کیفیت پر قابو پایا اور نہایت سنجیدگی سے بولا۔

''اوکے بڈی!...''

''چلو اب آگے بڑھو اور اپنے گرد و پیش سے از حد محتاط رہو۔ ہم میر کرنے نہیں آئے ہیں۔'' میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے لباساتھ ہی ایک تپا ہوا مختصراً تبصرہ بھی کر ڈالا۔

''تمہارے اس حریص پن پر مجھے کبھی کبھی بے حد حیرت ہوتی ہے۔ تم خود اس سے زیادہ ایک آزاد معاشرت والے ترقی یافتہ ملک سے تعلق رکھتے ہو جہاں ان ساری خرافات کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ پھر بھی تم......؟'' میرا جملہ اُدھورا ہوتے ہوئے بھی مکمل تھا، جس مطلب سمجھتے ہوئے روڈلف مسکرا کے بولا۔

''ایک بات کا جواب دو بڈی! انسان کا کبھی دولت سے پیٹ بھرا ہے......؟ خواہ وہ کتنا ہی امیر کبیر ہو مگر تب بھی اس کی حرص بڑھی ہوئی ہی ہوتی ہے۔ بس! یہ بھی وہی چکر ہے۔ اب یہ بتاؤ چلنا کہاں ہے؟''

''کسی قریبی ائرپورٹ ہوٹل......'' میں نے کہا۔

''بہت مہنگا پڑ جائے گا یہ...... پانچ کونوں والے ہوٹلوں سے کم نہیں ہوتے یہ......''

''تو پھر تم بتا دو کوئی درمیانے درجے کا ہوٹل......''

''چھوڑو..... آگے کہاں جائیں۔ ہم نے اِدھر سے ہی دوبارہ امریکا پرواز کر جانا ہے۔'' وہ سر جھٹک کر بولا۔ ''کاساپا کو کا پیسا زندہ باد.....'' کہتے ہوئے اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ میں بھی ہنستے ہوئے سر جھٹک کر رہ گیا۔ وہ ٹیکسی والے سے بھاؤ تاؤ میں مصروف ہو گیا۔ حالانکہ ائرپورٹ ہوٹل کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب اچانک ایک کار کے ٹائر چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ میں ہی نہیں ٹیکسی ڈرائیور سے جھکے بات کرتا ہوا روڈلف بھی چونک کر سیدھا ہوا۔

وہ ایک لمبی سی سیاہ کار تھی جو ٹیکسی کے بالکل عقب میں رکی تھی۔ کسی فوری ممکنہ خطرے کو بھانپتے ہی میرے جنگجوانہ اعصاب یکلخت تن گئے۔ میری تیز نظروں نے کار سے دو افراد کو اُترتے دیکھا۔ دونوں غیر مسلح تھے اسی لیے میں نے بھی خود کو ذرا جام رکھا۔ ورنہ تو میں ان پر اُچھل پڑنے کا ارادہ کر ہی چکا تھا۔ یہ دونوں وہی مشکوک افراد تھے جنھیں میں طیارے میں دیکھ چکا تھا۔

وہ دونوں قریب آگئے اور دوستانہ مسکراہٹ سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹیکسی والے نے جانے کیا سمجھا کیونکہ اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے اپنی ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا۔

''آپ کی تعریف.....؟'' میں نے ابھی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی جانب نہیں بڑھایا تھا اور میرا دل کسی ممکنہ خطرے کو محسوس کرتے ہوئے تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''ہمیں دوست سمجھو...... کاساپا کو نے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' یہ درمیانے قد کا گنجا آدمی تھا جو طیارے میں سب سے پہلے مجھے مشکوک دکھائی دیا تھا۔ دوسرا اس کا دراز قامت ساتھی روڈلف کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس سے ہاتھ ملا چکا تھا۔

اس کے منہ سے کاساپا کو کا نام سنتے ہی مجھے اپنے وجود میں ایک سنسنی کا احساس ہوا۔ تب ہی کچھ سوچ کر میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اس کا مصافحہ کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ تاہم مجھے یہ سن کر ایک ناخوشگوار سی حیرت بھی ہوئی تھی کہ کاساپا کو پولیس کی گرفت میں تھا۔ ممکن تھا، وہ ضمانت یا پیرول پر رہا کر دیا گیا ہو۔ کوئی معمولی آدمی تو وہ بھی نہیں تھا۔

''کیا باس یہاں آئے ہوئے ہیں......؟''

یہ تسلی ہوتے ہی کہ ان کا تعلق اسپیکٹرم سے نہیں تھا، جواباً میں نے بھی دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ چلو، باقی باتیں وہیں ہوں گی۔'' اس نے گہری متانت سے کہا۔ ہلکی مسکراہٹ اب اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے یکسر غائب ہو چکی تھی۔ روڈلف میری طرف ہی دیکھ رہا تھا جیسے منتظر ہو کہ میں کیا کرتا ہوں۔

میں بلاتردد ان کی کار میں جا بیٹھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور براجمان تھا۔ وہ بھی ان کا ساتھی لگتا تھا۔ دراز قامت اگلی سیٹ پر اور ہم تینوں عقبی سیٹوں پر بیٹھ گئے اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

''ہاں سے میں خود بھی بات کرنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر افسوس مجھے کوئی موقع ہی نہ مل پایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اور..... اس میں ہمارا نہیں، حالات کا قصور تھا۔''

جانے کیا سوچ کر روڈلف نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا تھا۔

کاساپا کو سے متعلق پیش آمدہ حالات میں مجھے بغیر کسی ''گڑبڑ'' کے کیا کرنا تھا، اس کی ''کھچڑی'' میں پہلے ہی سے بنا چکا تھا۔ کیونکہ ابھی میں ان سے لڑائی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ہمارے ساتھ بیٹھے درمیانی جسامت والے نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جانتا تھا کہ ان کے کوٹ کی جیبوں میں بھرے ہوئے پستول موجود ہو سکتے تھے۔ میرا یہ خیال مغالطے پر ہرگز مبنی نہ تھا کہ جب تک میں کسی بھی ایشین کنٹری میں ہوں، کاساپا کو سے نہیں بچ سکوں گا۔ تاہم ایک خوف ضرور تھا کہ کہیں کاساپا کو مجھے میرے سفری کاغذات سے نہ محروم کر دے جو میرے لیے امریکا کے لیے پروانہ

راہداری کا درجہ رکھتے تھے۔

جواب نہ ملنے پر میں بھی سوچتے ہوئے ذہن کے ساتھ بہ ظاہر کار کی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ ایک مقصد راستوں سے شناسائی بھی حاصل کرنا تھا۔

ہماری کار ائرپورٹ سے روانہ ہوکر مختلف کھلی وطویل شاہراہوں اور سبزہ زاروں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ شہری آبادی کی حدود میں داخل ہوتے ہی اس دل فریب مگر شہرِ خرابہ کے خدوخال میری نظروں میں واضح ہونے لگے جس کی ابتدا میں تو...... غریب اور متوسط طبقے کے لوگ روزمرہ کے کاموں میں مصروف دکھائی دیے۔ تاہم ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ یہاں انتہائی غریب یا مفلوک الحال شخص کوئی بھی نہیں نظر آتا تھا۔ یا پھر اس کی وجہ ان کے چہرے اور جسمانی ساخت تھی اور ایک حد تک ان کا لباس بھی۔ کیونکہ صورت وشکلوں سے یہ سبھی صحت مند اور ہشاش بشاش دکھتے تھے۔ جبکہ مدقوق ومریل خال خال ہی تھے۔ عجیب بات ایک یہ بھی مجھے دیکھنے میں آئی کہ یہ سب قد و قامت اور جسامت میں بھی قریب قریب ایک ہی جیسے تھے۔ یعنی متوسط گھٹے ہوئے مضبوط جسم، پستہ قد، گندمی یا پھر زردی مائل سپید رنگت۔ بال سیاہ آنکھیں کالی۔ مرد حضرات قمیص پتلون اور بش شرٹ، گیلس لگی پینٹ پہنے ہوتے اور خواتین نے عموی طور پر اسکرٹ، جینز اور بلاؤز پہنے ہوئے تھے۔ یا پھر مردانہ حلیے میں ہوتیں۔ لمبے بالوں والی کم ہی تھیں۔ البتہ تراشیدہ زلفوں کا یہاں عام رواج نظر آتا تھا۔ شنید تھی کہ یہاں کے مرد وزن بہت محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ایسا نظر بھی آرہا تھا بلکہ مردوں کے مقابلے میں یہاں عورتیں ہی زیادہ کام کرتی ہیں۔

شہری حدود میں پہنچے تو خوش حال منیلا کے آثار مزید نمودار ہوئے۔ سربفلک عمارتیں، کمرشل علاقے، آراستہ و کشادہ سڑکیں، ٹریفک اور زندگی کی چہل پہل گویا... علی الصباح ہی شروع ہوگئی تھیں۔ تھائی لینڈ کی طرح، ان کے شانہ بشانہ جھونپڑیاں اور کچے ٹوٹے بوسیدہ مکانات کا سلسلہ بھی نظر آیا۔ یوں جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگا ہو۔ رہی سہی کسر ان چند "ٹاٹ زدہ" مکانوں کی چمنیوں سے اُٹھنے والی دھوئیں کی لکیروں نے پوری کردی تھی۔ منیلا کا آسمان صاف اور چمک دار تھا۔ خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ایسا شاید گنجلک آبادی اور بلند عمارتوں کی وجہ سے تھا۔

بقول روڈلف کے...... منیلا چار شہروں کا مجموعہ تھا جبکہ سینٹرل سٹی کو "میٹرومنیلا" کہا جاتا ہے۔

میں اپنے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن کے ساتھ یہی سوچ جارہا تھا کہ مجھے کاسپاکو کو کس طرح مطمئن کرنا ہوگا؟ اس نے مجھ پر بھروسا کرکے دو اہم ذمے داریاں بلکہ اپنی دو متاع کل داؤ پر لگا رکھی تھیں۔ ایک تو وہ روپیہ جس کے بل بوتے پر اس نے مجھے ملٹی پل ویزا دلواکر پلک جھپکتے ہی عالمی آوارہ گرد بنا ڈالا تھا۔ دوسرے یہ کہ گوتم بدھ کا مجسمہ ہاتھ سے نکلا چلا گیا تھا۔ لہٰذا اب مجھے کاسپاکو نئے انداز میں چکر دینا تھا جس کے لیے میں سمجھتا تھا کہ حالات غیر موافق نہیں تھے۔ اسی سبب میں بغیر کسی ہچر مچر کے...... ان کے ساتھ چل دیا تھا۔

تقریباً نصف گھنٹے کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ایک سفید رنگ اور نیلی چھتوں والے مکان کے گیٹ کے سامنے جارکی۔ گیٹ کو ریموٹ سسٹم کے ذریعے کار میں بیٹھے بیٹھے ہی ڈرائیور نے کھولا تھا اور پھر کار اندر لاکر وسیع پورچ میں روک دی۔

ہم نیچے اتر آئے۔ وہاں ایک عورت نظر آئی، اندرونی داخلے کا دروازہ اسی نے ہی کھولا تھا۔ اس نے اسکرٹ اور بلاؤز پہن رکھا تھا۔ شکل وصورت عام سی تھی۔ ہم اندر آکر صوفوں پر براجمان ہوگئے۔ یہ نیچی چھت والا خاصا کشادہ کمرا تھا۔ وہ تینوں ہمارے ساتھ ہی اندر آگئے تھے۔ روڈلف کا چہرہ کچھ ستا ہوا تھا۔ وہ شاید کاسپاکو اور اس کے ہرکاروں سے خوف زدہ سا تھا۔ پریشان اور تشویش زدہ تو میں بھی تھا۔ تاہم میری حکمت عملی ایسی تھی کہ مجھے ابھی ان سے بگاڑ پیدا کرنا مناسب نظر نہیں آرہا تھا، جب تک کہ کوئی خطرہ نہ ہوتا۔

اسی وقت درمیانی قامت والے گنجے نے فون ملاکر میری طرف بڑھا دیا۔

"باس سے بات کرو..." مجھے فون تھماتے ہوئے اس نے کہا۔

میں نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے فون لے کر اپنے کان سے لگایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ "ہیلو باس!" کہا تو دوسری جانب سے پہلے تو مجھے سانپ جیسی پھنکاریں سنائی دیتی رہیں، جیسے کاسپاکو مجھ سے مخاطب ہونے کے لیے اپنے طیش پر قابو پانے کی کوشش کررہا ہو۔ اس کے بعد اسی سے مشابہ اس کی غراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

"میں نے زندگی میں آج تک اپنے سوا کسی پر بھی بھروسا نہیں کیا شہزی! لیکن تم وہ واحد آدمی تھے جس پر میں

نے اس قدر اعتماد کیا اور اس کا اتنا ساتھ بھی دیا۔ خدا کرے کہ یہ کوئی دھوکا نہ ہو۔ لیکن اگر ایسا تم نے میرے ساتھ کرنے کا سوچا بھی ہے تو تم نے اپنی زندگی کی بہت بڑی اور آخری غلطی کی ہے۔"

اس کی بات مکمل ہوئی اور مجھے اس کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سنسناتی ہوئی سفاک دھمکی نمایاں طور پر محسوس ہوئی تھی۔ میں نے وجود میں دوڑتی ہلکے ہلکے خوف کی لہروں پر قابو پاتے ہوئے پورے اعتماد اور اطمینان سے اسے جواب دیا۔

"یس باس! آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں بھی بتائے دیتا ہوں کہ میں نے آج تک کسی کے زیرِتسلط کام نہیں کیا۔ نہ ہی کسی کا احسان لینا چاہا ہے۔ آپ ہی وہ واحد آدمی ہیں جسے باس کہتے ہوئے مجھے ماتحتی کا ہی نہیں بلکہ ایک دوستی کا بھی خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر اگر آپ کے دل میں میری طرف سے کوئی بدگمانی یا غلط فہمی پیدا ہونے لگی ہے تو یہ ایک فطری عمل ہے۔" یہاں میں نے ایک لمحہ کے لیے توقف کیا اور پھر آگے بولا۔

"میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن یہاں حالات ہی ایسے ہوگئے تھے کہ اس کا مجھے موقع نہ مل سکا۔"

"مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہوگیا اور کیسے ہوا......؟" دوسری جانب سے اس کی جھنجلاتی ہوئی آواز ابھری۔ "لیکن یاد رکھنا شہزی! تمہاری بات سے میری تسلی ہوگئی تو ٹھیک، ورنہ اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار رہنا۔" اس نے ایک بار پھر دھمکی سے کام لیا تو میں نے بھی تحمل اور مفاہمت کا دامن نہ چھوڑا۔

"صفائی کا موقع دینے کا شکریہ باس! لیکن ایک درخواست آپ سے ضرور کروں گا کہ آپ کو بھی سچائی کھلے دل سے تسلیم کرنا ہوگی تاکہ بگڑے ہوئے کام کو سنوارنے کا موقع مل سکے۔" میں نے دانستہ آخر میں "لولی پاپ" دینا ضروری سمجھا تھا۔

"سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ بگاڑ کی ابتدا یہاں سے نہیں بلکہ بینکاک سے روانگی کے وقت ہی ہوگئی تھی۔ آپ کے کسی باغی ساتھی یا دشمن نے بینکاک کی پولیس کو ایک گمنام فون کرکے چوری شدہ مجسمے کے بارے میں مطلع کردیا گیا تھا۔ ڈین اور جیڈ نے آپ کو بھی اس کی اطلاع دی تھی۔"

"لیکن...... تب تک تم لوگ نہ صرف تھائی لینڈ بلکہ کوماگو کے جزیرے سے نکل جانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔" کاسپاکو نے میری بات کاٹ کر درمیان میں کہا۔

"اور...... گوبورا بھی پہنچ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ڈین کی آخری اطلاعات کے مطابق ڈیل آخری مرحلے میں تھی کہ...... پھر ایک دم اتھاہ خاموشی چھا گئی۔ اب ٹی وی پر خبریں آرہی ہیں...... جس کے مطابق ہمارا سارا منصوبہ پانی بن کر بہہ چکا ہے۔ کیا تم نے لالچ میں آکر مخالف پارٹی سے ساز باز کرلی تھی؟ روڈلف کو تم اسی لیے مجھ سے سفارش کرکے اپنے ساتھ لے کر گئے تھے؟ جواب دو...... مگر تسلی بخش......" کاسپاکو کا غصہ اور جہنم زدہ سا طیش رفتہ رفتہ آسمان کو چھونے لگا۔

اس بار میں نے طمانیت کی سانس لی تھی۔ کیونکہ اس کی ساری باتوں کا جواب میرے پاس تھا۔ "باس! میرا سر آپ کے لیے حاضر ہے۔ کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ میں آپ کو مطمئن کرلوں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ...... اگر میں نے مخالف پارٹی سے کوئی ساز باز کرلی ہوتی تو آج میں یہاں منیلا میں بے سروسامانی کی حالت میں آپ کے آدمیوں کے پاس نہیں ہوتا۔ آپ نے ٹی وی پر خبروں میں یہ تو دیکھ لیا کہ مجسمہ فلپائنی اور انٹرپول پولیس کے قبضے میں جاچکا ہے، لیکن شاید ابھی تک آپ کی نظروں سے یہ خبر نہیں گزری کہ جن لوگوں نے ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی تھی، وہ سب اپنی اعلیٰ قیادت کے ساتھ میرے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتارے جاچکے ہیں۔ ڈیواؤ کے پام ریزورٹ میں جوشوا اور اسٹاربک کی لاشوں کو سمیٹا جارہا ہوگا اور یہی نہیں گوبورا میں بھی ان کے ساتھیوں کے قاتلوں کی پولیس کو تلاش ہے۔"

"ہاں! یہ میں سب سن اور دیکھ چکا ہوں......" دوسری جانب سے کاسپاکو کی پہلی بار کچھ ٹھہری ہوئی آواز اُبھری تھی۔ درحقیقت قسمت نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اس طرح کہ جو کچھ ہوا وہ سب میرے مفاد میں ہوتے ہوئے اس طرح وقوع پذیر ہوا تھا کہ میری پوزیشن ازخود صاف ہوتی چلی گئی تھی۔ کاسپاکو کو بھی اس کا احساس ہوگا کہ معاملہ میری طرف سے نہیں بلکہ دوسری طرف سے بگڑا ہے لیکن وہ...... مجھے پرکھنے کے لیے اندھیرے میں تیر چھوڑ رہا تھا۔

"سارا بگاڑ آپ کے اُس باغی ساتھی موتو کی مخبری کی وجہ سے ہی ہوا تھا باس!" میں نے دل ہی دل میں اُبھرنے والی مسرت کی لہروں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "جس سے

مخالف پارٹی نے فائدہ اُٹھانا چاہا تھا لیکن میں نے ان کا منصوبہ تو ناکام بنا ڈالا، مجسمہ نہیں بچا سکا۔ حالانکہ بڑی مشکلوں سے اپنی جانوں پر کھیل کر ہم کو مانگو جزیرے سے اس طیارے میں وہ مجسمہ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور یہاں گوبورا کے جزیرے تک بھی ہم بہ خیر و عافیت پہنچ گئے تھے مگر جیسے ہی ان کی اعلیٰ قیادت جوشوا اور اسٹاربک کو تمہاری گرفتاری کا علم ہوا ان کی نیت میں پھر فتور جاگا اور انہوں نے ہمارے سامنے ڈین اور جیڈ وغیرہ کو گولی مار کر ہلاک کر ڈالا مگر روڈلف اور میں ان کے مقابلے پر اُتر آئے اور انہیں ہلاک کر ڈالا۔"

"تمہیں پھر اسی طیارے میں فلائی کر جانا چاہیے تھا جس میں مجسمہ لوڈ تھا، ایسا کیوں نہیں کیا تم نے....؟" کاسپاکو نے درشتی سے کہا۔

"یہی ایک راستہ تھا ہمارے پاس باس!" میں نے فوراً کہا۔ "لیکن.... تب تک بینکاک کی پولیس انٹرپول اور فلپائنی پولیس سے رابطہ کر کے ہمارے بارے میں انہیں مطلع کر چکی تھی۔ اور پھر طیارے میں فیول کا بھی مسئلہ تھا۔ پولیس کے ہیلی کاپٹر گوبورا کے آسمان پر پرواز کرتے نظر آئے تو ہم نے وہاں سے فرار کی راہ لی تھی۔"

"پولیس کو کیسے پتا چلا کہ یہ ڈیل گوبورا کے جزیرے میں ہو رہی ہے؟" اس نے اگلا سوال ٹھونکا۔ میں بھی اسے بلا تامل جواب دیتا جا رہا تھا۔ وجہ ظاہر تھی کہ میں جانتا تھا وہ مجھ سے اس قسم کی باز پرس کر سکتا تھا جس کے جوابات میں نے بھی پہلے سے ہی اپنے ذہن میں سوچ رکھے تھے۔ معاملہ اب اُسے مطمئن کرنے کا تھا۔ لہٰذا بہ ترنت بولا۔

"اس کی وجہ وہی ہے جو میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں، یعنی آپ کے ایک باغی ساتھی کی مخبری۔"

"وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"یہ مجھے نہیں معلوم...." میں نے جھوٹ بولا۔ سچ بولتا تو سائچی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے محبوب موتو کے حوالے سے تب تک خطرے میں ہی تھی جب تک کہ وہ کاسپاکو کی رکھیل بنی ہوئی تھی۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی جس کی وہ اب تک سزا بھگتے ہوئے تھی اور میں مزید اس کا کوئی دفاع نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے "غدار" کے نام والی گیند کاسپاکو کی کورٹ میں پھینک دی تھی۔

"ہوں ں....! خبروں میں ٹوپر نامی ایک شخص کے بیان کے مطابق.... آخری ہنگامہ اور قتل و غارت اس کے مکان میں ہوئی تھی۔ جس نے پولیس کو یہی بیان دیا تھا کہ.... اسپیکٹرم نامی کسی عالمی معتبر تنظیم کے کارکنوں سے تمہاری جنگ ہوئی تھی اور اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ مجسمے کو عالمی چوروں کے قبضے میں جانے سے بچانے والے جو آدمی اس نے اپنے بیان میں بتائے تھے، وہ تم دونوں کے علاوہ کون ہو سکتے ہیں۔ یقیناً اس میں تمہاری ہی ہدایت کارفرما ہوگی کہ اس نے پولیس کو تم دونوں کے غلط حلیے بتائے۔ جواب دو۔"

"ہمارے پاس اپنی گلوخلاصی میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا باس!" میں نے پورے اعتماد سے اور تھوڑا سچ کا تڑکا لگا کر جواب دیا۔ "کیونکہ پولیس ہمارے لیے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ اسی لیے مجھے اس مقامی آدمی ٹوپر کی ہمدردی لینے کے لیے یہ جھوٹ بولنا پڑا تھا کہ ہم نے مجسمے کو چوروں کے قبضے میں جانے سے بچایا تھا۔ آپ نے دیکھا کہ میری یہ چال کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ ٹوپر نے پولیس کو ہمارے غلط حلیے بتائے تھے۔"

دوسری جانب سے چند ثانیوں کے لیے پُرسوچ سی خاموشی طاری رہی، یوں لگا جیسے کاسپاکو میرے بارے میں کسی شش و پنج کا شکار ہو گیا ہو۔

اس کے بعد اس کی ایک گہرا ہنکارا لیتی آواز اُبھری۔

"اچھا ٹھیک ہے! تم ایسا کرو۔ سب سے پہلے اپنے سفری کاغذات میرے ان آدمیوں کے حوالے کرو اور ان کے ساتھ پہلی فلائٹ میں بینکاک پہنچو۔" اس نے نیا حکم صادر کرتے ہوئے کہا۔ "میرے آدمی کو فون دو...."

"لل.... لیکن.... باس!" میں نے کچھ کہنا چاہا تو دوسری جانب سے.... کاسپاکو کی پھنکارتی ہوئی آواز اُبھری

"میں کہتا ہوں میرے آدمی کو فون دو...."

میرے وجود میں ایکا ایکی سنسنی کی لہر دوڑتی چلی گئی کیونکہ میں اس کا یہ حکم ماننے سے یکسر قاصر تھا۔ آنے والے لمحات ایک بار پھر کسی خوں ریزی کا پتا دینے لگے تھے۔ کیونکہ ہماری گفتگو کے آخری الفاظ سے.... وہاں موجود کاسپاکو کے تینوں ہرکاروں نے پسٹل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

منہ زور

محمد ذوالقرنین خان

شکم کی آگ بڑی جان لیوا ہوتی ہے... اس کا احساس وہی کر سکتا ہے جس نے بھوک کی تپش جھیلی ہو... بھوک و افلاس کے ہاتھوں اپنے لختِ جگر کا سودا کرنے والوں کی دردناک داستان... صحراؤں میں بگولوں کی طرح بھٹکتے کرداروں کی بغاوت... عداوت اور وحشتیں...

قانون شکن اور قانون کے محافظوں کے درمیان ہونے والی جنگ......

جوائنٹ انویسٹی گیشن ٹیم جس میں ملک کے خفیہ اداروں کے صف اول کے تفتیش کار موجود تھے۔ اس وقت ایک کمرے میں جمع تھے۔ اس وقت زیر بحث وہ تازہ واردات تھی جو ایک دوست ملک کے سامنے شرمندگی کا موجب تھی۔ شکار کی غرض سے صحرا میں ڈیرے ڈالے دوست ملک کے ایک بہت اہم شخص پر حملہ ہوا تھا۔ اس کے ساتھ موجود دس محافظوں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

آوارہ گرد

قسط نمبر: 48

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

UrduGem.com
Urdu Novels, Books and Much More

www.urdugem.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے منتظم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو در حقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، نبیل شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو در حقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی یاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی لی جگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک، شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری حد پر پہنچ جاتی ہے جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نوو دولتیا سیٹھ نوید ساتجے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، در حقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں ایک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوبارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی بوٹ میں بلیو ٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریٹا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی بدترین صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پر فریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوبارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا

تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو مجبور کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریٹا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی متھارد" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو سیتی کا ایک بڑا سمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی متھارد کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جارائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بجھے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے ہوائی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود وہ ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کر سکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ثولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی متھارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی ریپال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی متھارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو ریپال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہنواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہنواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہنواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہنواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کر کے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کر دیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہنواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید ساتجے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے۔ پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسیا کوکا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسیا کو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسیا کو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسیا کو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیت کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.urdugem.com

میری کاسپاکو کے ساتھ فون پر گفتگو کے آخری انداز سے شاید ان تینوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کے باس نے مجھے آخر میں کیا جواب دیا ہوگا! نیز ممکن تھا کہ کاسپاکو نے انہیں بھی اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کر دیا ہو کہ یہ لوگ وہی کریں جن کا انہیں حکم دیا جا چکا تھا۔

صورتِ حال ایک دم مخدوش ہو گئی تھی۔ میں اپنے سفری کاغذات کسی قیمت پر بھی ان کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کاسپاکو اس سلسلے میں میری کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا، جبکہ مجھے آخر تک یہی خوش فہمی رہی تھی کہ میں کاسپاکو کو ایک بار پھر بلف کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

''کاغذات ہمارے حوالے کر دو۔''

ان تینوں پستول بدست ہرکاروں میں سے دراز قامت والے آدمی نے مجھ سے تحکمانہ کہا۔ اس کے لہجے میں درشتی پائی جاتی تھی۔ میری نظریں ان کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ جہاں مجھے جارحانہ عزائم کی جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ روڈولف بھی میرے ساتھ خاموش کھڑا تھا۔

''اوکے...... باس کا اگر یہی حکم ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔'' میں نے شانے اُچکا کر بظاہر بے بسی سے کہا۔ ''لیکن تم لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ ان حالات میں جبکہ میں وہ مجسمہ دوبارہ حاصل کرنے کی منصوبہ بندی پر عمل کرنے والا ہوں، تمہیں باس کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں میری پلاننگ واضح ہے۔ مجسمہ ابھی تک کوہورا کے جزیرے میں ہی طیارے کے اندر پڑا ہے۔ وہ کوئی کھلونا نہیں ہے کہ اسے بہ آسانی پولیس جیب میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جائے گی۔ اس کے لیے کرین کا بندوبست کیا جا رہا ہے، جو ایک کارگو ٹرک اور پھر وہاں سے جزیرے تک کسی لانچ میں رکھ کر پہنچایا جائے گا۔ تب تک ہم......''

''ہمیں چکر دینے کی کوشش مت کرو مسٹر شہزاد!''

دراز قامت آدمی نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ اس کی گھورتی تیز نظریں جیسے میرے پورے وجود کا ایکسرا کر رہی تھیں۔

''اور...... تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ...... اگر ایسا کچھ ہوتا تو تم یہاں منیلا تک کا سفر نہیں کرتے۔ باس نئے سرے سے پلاننگ کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا اب ایک سیکنڈ کا بھی وقت ضائع کیے بغیر وہ کاغذات ہمارے حوالے کر دو اور خود کو بھی۔''

میں سمجھ گیا کہ کاسپاکو نے ذہنی طور پر تسلیم کر لیا تھا کہ وہ گوتم بدھ کے بیش قیمت مجسمے سے محروم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب وہ صرف مجھ سے اپنی وہ خطیر رقم نکلوانا چاہتا تھا جو ملٹی پل ویزا کے لیے اس نے ویسٹرن بینکوں میں داؤ پر لگا رکھی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھے کم از کم زندہ دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔

''اوکے! ایسا ہی ہے تو یہی سہی۔'' میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا اور پھر اپنی پشت اس کی جانب کر کے، تھوڑا اس کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''کاغذات کا پاؤچ میری پشت پر ایک بیلٹ سے بندھا ہوا ہے۔ پلیز! تم تھوڑی زحمت کر لو، کیونکہ میرا وہاں تک ہاتھ نہیں جائے گا۔''

چونکہ میری پشت اس کی طرف تھی اور میں تنہا بھی تھا۔ پھر وہ خود تو آگے نہیں بڑھا البتہ اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُوپر کر دیے تھے۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے میری جیکٹ اور شرٹ اُوپر کر کے پاؤچ اُچک لے گا ایسا صرف نظر ہی نہیں آ رہا تھا بلکہ ایسا تھا بھی۔ تاہم میں نے بھی نصف حد تک اپنی گردن ان کی جانب موڑ کے رکھی تھی، ان تینوں کی جھلک اور حرکات میں محسوس کر سکتا تھا۔ ایسے میں میرا ذہن ان پر اچانک ہلا بولنے کی اکائیاں گن چکا تھا کہ مجھے کس طرح حملہ آور ہونا ہے کہ یہ تینوں بیک وقت اس کی زد میں آ جائیں۔ کیونکہ یہ مسلح تھے۔

جیسے ہی ان کے ایک ساتھی کے ہاتھوں کا لمس میں نے اپنی پشت پر محسوس کیا، میں اپنی جگہ پھرکی کے مانند کھڑے کھڑے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گھوما اور میرے بائیں بازو کا لفٹ ہک اس کے سینے پر زور سے پڑا۔ یہ وار پوری طاقت اور شدت سے کرنے کا متقاضی تھا، کیونکہ میں نے صرف اسے ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے دو مزید ہرکاروں کو بھی نشانہ بنانا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے لفٹ ہک کو پوری طاقت فراہم کرنے کے لیے اپنے دائیں ہاتھ کا زور بھی بائیں ہاتھ کی کلائی پکڑ کے صرف کر ڈالا تھا۔ وار کے نتائج کے پل کے پل میں خاطر خواہ برآمد ہوئے۔

یہ بھرپور ضرب لگتے ہی وہ ہرکارہ اپنی جگہ سے چند انچ اُچھل کر اپنے دونوں ساتھیوں پر جا پڑا۔ میری یہ حرکت ان کے لیے غیر متوقع نہ ہونے کے باوجود کام کر گئی تھی، وجہ اس میں غیر معمولی پھرتی اور اکائیوں کے شمار کا درست ہونا تھا۔ یوں وہ تینوں ہی بیک وقت گرے اور پستولیں بھی ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں۔ اب میں انہیں کہاں چھوڑنے والا تھا۔ سینے پر بھرپور ضرب کھانے والا ہرکارہ تو موقع پر

ی ڈھیر ہو گیا، میں نے البتہ دراز قامت کو دبوچ لیا جبکہ ڈولف نے درمیانی قامت کے گنجے کو۔

دراز قامت نے لیٹے لیٹے مجھے لات رسید کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ بجائے مجھے لگنے کے۔ میرے دونوں ہاتھوں میں آ گئی، جسے دبوچ کر میں اپنی ایک ٹانگ اس کے جسم کے اوپر سے گھوم کر مروڑ ڈالی اور ''کڑاکے'' کی ہلکی آواز کمرے میں اُبھری۔ ساتھ ہی دراز قامت کی لرزہ خیز چیخ بھی...... اذیت کے مارے وہ فرش پر اُلٹا ہو گیا اور پھر میں اپنی جگہ سے اُچھلا تو میری ٹانگیں اس کی گدی پر پڑیں۔ اس کا سر پیشانی سمیت بڑے زور سے پختہ فرش پر لگا اور پٹ گیا۔ وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔

ایسے میں میرے روم روم میں لہو مثلِ پارا گردش کرنے لگتا تھا۔ میں تیزی سے تیسرے شکار کو جھاپنے کے لیے متوجہ ہوا جس کے ساتھ روڈولف نبرد آزما تھا مگر روڈولف کچھ زخمی ہونے کے باعث مدِ مقابل کے سامنے کچھ ''ماٹھا'' پڑتا نظر آ رہا تھا۔ کیونکہ تیسرا شکار اس کی دست بُرد سے نہ صرف بہ آسانی نکل چکا تھا بلکہ روڈولف کے زخمی بازو پر گھونسا رسید کرنے اور اسے خود سے پرے دھکیلنے کے بعد چند ماہ کے بچے کی طرح کرولنگ کرتا ہوا، قریب دھرے پڑے پستول کو اُچکنے کے لیے تیزی سے بڑھ رہا تھا اور پھر جیسے ہی اس کا ایک ہاتھ پستول کے دستے پر پڑا اسے اُٹھانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔

میں اپنی جگہ سے جست لگا کے اس کی پشت پر چڑھا تھا۔ اس کے حلق سے چیخ برآمد ہو گئی۔ کیونکہ میری ایک ٹانگ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر اور دوسری ٹانگ اس کے سر پر پڑی تھی۔ میرے اس ڈبل اسالٹ وار نے اُسے بھی نڈھال کر دیا۔ روڈولف اپنے بازو کا زخم سہلانے میں لگا ہوا تھا۔ یہ دیکھتے ہی وہ اسے بھلا کر حرکت میں آیا اور اس نے میرے تیسرے مضروب شکار کے قریب پڑا پستول اُٹھا لیا۔

اسی وقت وہی عورت کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے اپنا پورا منہ کھول کے چیخ ماری اور پلٹ کر بھاگنے ہی لگی تھی کہ میں نے ایک ہی چھلانگ میں اسے کسی چیتے کی طرح جھپٹ لیا۔ وہ فلپائنی عورت درمیانی عمر کی تھی اور اسے دیکھتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ عام سی عورت تھی اور شاید ملازمہ ٹائپ کی تھی۔

''ہم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے۔'' میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ''یہ تینوں کرمنلز ہیں اور ہمیں گن پوائنٹ پر یہاں لائے تھے۔ تم انگلش سمجھ رہی ہو ناں......؟''

اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے میری طرف تکتے ہوئے اپنے سر کو ہولے سے جنبش دی۔ گویا وہ سمجھ رہی تھی پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''اب تم اپنے بارے میں بتاؤ تم کون ہو؟ ویسے مجھے تم ان کی ساتھی تو نہیں لگتیں؟''

''میں ان کی ملازمہ ہوں، میرا نام لیوی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''تم یہاں کب سے مقیم ہو اور یہ کس کی پراپرٹی ہے؟ اور کون کون یہاں رہتا ہے؟'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اگلا سوال کیا۔

''مجھے یہاں زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ ایک ماہ ہی ہوا ہے۔'' لیوی نے جواب دیا۔ ''میں ان کے لیے گھریلو ملازمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ یہاں صرف ایک ہی شخص رہتا تھا۔'' اس نے فرش پر ڈھیر پڑے اس ہرکارے کی طرف اشارہ کیا جو اُن کی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

''یہی ایک آدمی یہاں رہتا تھا۔''

''ہوم م......'' میں نے ہونٹ بھینچ کر ایک ہنکارا بھرا پھر بولا۔

''اب میری بات غور سے سنو مس لیوی! یا جو بھی تم ہو...... یہ اچھی بات ہے کہ تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ لوگ خطرناک مجرم ہیں۔ میرا تمہیں مشورہ ہے کہ اس واقعے کو ایک بھیانک خواب سمجھ کے بھلا دینا۔ جیسے تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں...... مطلب یہ کہ کسی سے اس کا ذکر بھی مت کرنا۔ ورنہ تم ایک خطرناک عالمی گینگ کی زد میں آجاؤ گی جسے ختم کرنا ان کے لیے ایک مکھی مارنے سے زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ سمجھ رہی ہو ناں میری بات؟''

اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے مزید گہرے ہو گئے۔ اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ تاہم اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک ہاؤس میڈ ہوں۔ کرائے پر گھروں میں کام کرتی ہوں۔ میں اس واقعے کو ہی نہیں بلکہ اس گھر کو بھی بھول جاؤں گی۔''

''گڈ! اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔ باقی یہاں پولیس خود آ کر سب سنبھال لے گی، تم اب جا سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔ اس نے تھوڑی مہلت مانگی، وہ اپنا مختصر سامان سمیٹنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی اجازت دے دی۔ جب وہ مکان سے چلی گئی تو میں اور روڈولف بھی باہر آ گئے۔

لیوی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی قریب کہیں غائب ہو گئی تو روڈولف نے کہا۔

UrduGem.com Urdu Novels, Books and Much More

www.urdugem.com

"بڈی! تم نے اس بے چاری کو اچھا خاصا خوف زدہ کر دیا۔"

"ہاں! یہ ضروری تھا۔ اس کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔" میں نے اردگرد نظریں گھمائیں۔

"اب کیا ارادہ ہے، بڈی؟"

"میری اب کاسپا کو سے پوری طرح ٹھن چکی ہے۔"

"تب پھر میرا مشورہ یہی ہوگا کہ اس کی رقم اس کے حوالے کر دینی چاہیے، ورنہ وہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا رہے گا۔ کم از کم ایک جھگڑا تو نمٹے۔ ورنہ وہ یہی سمجھتا رہے گا کہ ہم نے اسے دھوکا دیا اور اس کی ایک خطیر رقم ہتھیا کر اپنا اُلو بھی سیدھا کر لیا۔"

"میں یہی کرنے لگا ہوں۔ لیکن اس کے لیے ہمیں کسی جگہ بیٹھ کر یہ کام کرنا ہوگا۔ جہاں فون کرنے کی سہولت بھی میسر ہو۔"

"کنگسٹن ہوٹل چلتے ہیں۔ اوپیرا اسٹریٹ میں واقع ہے، ائرپورٹ سے نزدیک بھی ہے۔" روڈلف نے کہا۔

یہاں سے نکلنے سے پہلے روڈلف نے واش روم جا کر کیبنٹ سے فرسٹ ایڈ کا سامان تلاش کیا اور میری مدد سے اس کے بازو کی پٹی کر دی۔ چند منٹوں بعد ہی ہم نکلنے کے لیے تیار تھے۔

ہم نے ٹیکسی کروائی اور مذکورہ ہوٹل پہنچ گئے۔ یہاں آسانی سے ہمیں فرسٹ فلور پر ایک کمرا مل گیا۔ سکون کی کچھ گھڑیاں میسر آئیں تو ہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

روڈلف نے مجھے بتایا تھا کہ وہ تین بار سنگاپور، دو بار تھائی لینڈ ایک بار پہلے بھی فلپائن آ چکا ہے۔ تنظیم ہی کے سلسلے میں جب ڈی کارلو اس کے سربراہ ہوتے تھے تو وہ سری لنکا سے لے کر انڈیا، حتیٰ کہ چین اور تبت تک کا سفر کر چکا ہے جبکہ بیشتر مغربی ممالک بھی وہ جا چکا تھا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ اسپیکٹرم میں اس کا شمار سب سے زیادہ سفر کرنے والے کارکن میں ہوتا تھا۔

وہ اپنے شعبے کا نائب بھی تھا۔ بہت جلد وہ پوری تنظیم یعنی مسٹر ڈی کارلو کا بھی نائب ہونے والا تھا کہ لولوش نے شب خون مارا اور وہ نجانے کیا چکر چلا کر ڈی کارلو کا نائب بن بیٹھا اور اس نے تیزی کے ساتھ تنظیم میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہی مسٹر ڈی کارلو کا حادثاتی انتقال ہو گیا اور لولوش نے اس تنظیم کو "ہائی جیک" کر لیا اور خود اس کا سربراہ بن بیٹھا۔

حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ روڈلف سے میں ابھی تک اس بارے میں تفصیل گفتگو نہیں کر سکا تھا۔ چلتے چلتے ہی یا برسبیل تذکرہ ہی وہ کچھ بتا دیتا تھا، اس نے یہ بھی بتایا کہ لولوش کی ماں افریقہ کے کسی ایسے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی جو جادو ٹونے کرتا تھا۔

خود بھی اس کا تعلق وچ خاندان سے تھا۔ قبیلے کی تباہی کے بعد اس کی ماں برازیل آ گئی تھی اور وہاں برمودا کے ایک غریب محنت کش سے اس نے شادی کر لی اور وہیں لولوش کی پیدائش ہوئی، وہ باپ سے زیادہ ماں کے قریب رہا، اگرچہ اس میں اس کی ماں کا بھی دخل رہا تھا۔ وہاں بھی ... اس کا یہی کام رہا۔

جلد ہی لوگوں میں عقدہ کھلا کہ لولوش کی ماں ایک وچ ڈاکٹر ہے۔ جادو ٹونے کرنے والوں کو ان دنوں جان سے مار دیا جاتا تھا یا پھر شہر سے بے دخل کر دیا جاتا تھا۔ اس کی ماں کے ساتھ بھی یہی ہوا تو وہ اپنے بیٹے (لولوش) کو لے کر برمودا کے ایک جزیرے میں رہنے لگی اور پھر وہیں اس کا انتقال ہوا۔

تب تک لولوش اپنی ماں کے توسط سے ہی برمودا کے ایک جزیرے کا شہزادہ اور بادشاہ کہلانے لگا۔ تب تک اس کی "وچ" ماں وہاں ایک بڑے قبیلے کو اپنے حلقہ اثر میں لے چکی تھی۔

بڑی پُراسرار شخصیت تھی لولوش کی...... بقول روڈلف کے، میں نے صرف اس کا ابھی ایک ہی روپ دیکھا ہے۔ یعنی ایک خطرناک عالمی گینگسٹر، ورنہ وہ اس سے بھی آگے کی "شے" ہے۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے لولوش کا دوسرا روپ کسی جادوگر کا ہے؟" جانے کیوں مجھے روڈلف سے یہ سوال کرتے ہوئے ہنسی سی آ گئی تھی۔ اس نے منہ بنا لیا بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"نہیں یار! یہ میں نے کب کہا مگر آج کے سائنسی اور ترقی یافتہ دور میں ایسی باتوں پر کون یقین کرتا ہے۔"

"کرنے والے کرتے ہیں بڈی!" وہ مدبرانہ لہجے میں بولا۔ "دوسرے ملکوں کی مثال چھوڑو، امریکا میں ہی جانے کتنے وچ خاندان آج بھی موجود ہیں، بے شک خود کو گمنام رکھتے ہیں مگر در پردہ وہ جادو ٹونے اور شیطانی عملیات کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی تو وہاں ایک پُراسرار سوسائٹی بنی ہوئی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ شیطان کے پیروکار ہیں اور لوگ جوق در جوق ان کی اس پُراسرار تنظیم کے ممبر بن رہے ہیں، بعد میں ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کی گئی۔

"پوری دنیا میں اس شیطانی گروہ کی خبریں نشر کی گئی تھیں۔ بظاہر یہ تتر بتر ہو گئے، مگر یہ پھر خفیہ رہتے ہوئے یکجا ہو جاتے ہیں بلکہ اوروں کو بھی اپنا ہم خیال بناتے رہتے ہیں۔ وہ عام لوگوں میں گھلے ملے رہتے ہیں، پتا ہی نہیں لگنے دیتے اپنے بارے میں، بظاہر خوش باش، سلجھے ہوئے مہذب اور پڑھے لکھے دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ حقیقت میں کیا ہیں؟"

"یہ بتاؤ...... تم عابدہ سے متعلق کیا جانتے ہو؟" میں نے جیسے قدرے بیزار ہو کے موضوع بدلا تو روڈلف معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم ان باتوں پر یقین نہیں کرو گے۔" اس نے اس موضوع سے میری بیزاری کو شاید محسوس کر لیا تھا۔

"لیکن بڈی! اگر تم نے لولوش سے دو دو ہاتھ کرنے ہیں ناں...... تو تمہارے لیے اس کا فقط ایک ہی روپ سے آگاہ ہونا مناسب نہیں۔ وہ مردود خبیث، شیطان کا پیروکار ہے۔ اس نے اپنی ماں کا بھی ایک بہت بڑا اور شاندار مقبرہ بنا رکھا ہے برمودا میں، سنا ہے وہ اب بھی اپنی ماں کی روح کے ساتھ ہم کلام رہتا ہے، جو اس کی رہنمائی کرتی ہے، وہ آج بھی اپنے بیشتر پُراسرار قسم کے خفیہ منصوبوں میں مصروف رہتا ہے جس میں سے ایک منصوبہ اس کی ماں کی کوئی وصیت کو بھی پورا کرنا ہے، جس کے بارے میں اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا وصیت ہے؟ خیر...... چھوڑو...... تمہاری گرل فرینڈ عابدہ کے ساتھ اس نے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ میں یک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔

"میں شاید تمہیں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ کسی خاص مقصد کے تحت عابدہ کو باسکل ہولارڈ اور پھر جیل میں ڈالنے کے بعد عابدہ کو یہودیوں کی ایک تنظیم جے۔ بی۔ سی۔ یعنی جیوش بزنس کمیونٹی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ ایسا خفیہ طور پر کیا گیا ہے جبکہ کوکوران کی جیل میں ایک قیدی کی حیثیت سے عابدہ کا سارا ریکارڈ جوں کا توں موجود ہے۔ سنا ہے کہ کوئی لیڈی رپورٹر عابدہ کے لیے جدوجہد میں مصروف تھی، کیونکہ وہ خود بھی ایک مسلم عورت تھی۔ اس نے پتا چلا لیا تھا کہ عابدہ کو کوکوران کی جیل سے پُراسرار طور پر غائب کر دیا گیا ہے۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ اچانک وہ خاتون جس کا نام آفسہ خالدہ تھا، خاموش ہو کے بیٹھ گئی۔"

"وہ خاموش ہو کے نہیں بیٹھی۔" میں نے فوراً اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اُسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت غائب کر دیا گیا ہے۔"

"اوہو...... ! یہی ہونا تھا بالآخر۔" روڈلف کے منہ سے نکلا۔

"یہ بتاؤ، جے۔ بی۔ سی۔ کا سربراہ کون ہے؟"

"سوری بڈی! اس کا مجھے علم نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ "یہ باتیں ہوتی رہیں گی، فکر مت کرو بڈی! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ پہلے موجودہ مسئلے سے جان چھڑاؤ تا کہ امریکا جلد سے جلد روانہ ہوا جائے، ورنہ یہ کم بخت کاسپا کو ہمارا راستہ کھوٹا کرتا رہے گا۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں یہ کم بخت خود ہی اپنی ساری فوج سمیت یہاں نہ آن دھمکے۔ اسے اپنا پیسہ واپس مل جائے گا تو شاید اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے۔"

اس کی بات صحیح تھی۔ ہم نے پہلے روم سروس فون کر کے کچھ کھانے پینے کو منگوایا اس دوران میں نے بھی روڈلف کو ضرورت کی حد تک اپنے اور پاکستان میں موجود اپنے بہی خواہوں، ساتھیوں اور دشمنوں کے بارے میں بھی بتایا نیز اسپیکٹرم کا انڈیا کی خفیہ ایجنسی "را" کے ذیلی ونگ بلیو ٹلسی سے گٹھ جوڑ اور بعد میں میرے ہاتھوں بلیو ٹلسی کی تباہی، جسے سن کر روڈلف ششدر رہ گیا۔

عابدہ کے کیس سے وہ بھی واقف تھا مگر یہ اُسے معلوم نہ تھا کہ اسپیکٹرم نے پاکستان میں بھی وزیر جان اور چوہدری ممتاز وغیرہ کے ذریعے اپنا جال پھیلا رکھا تھا۔ جو بعد میں میرے ہاتھوں ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔

"بڈی! کم تو تم بھی نہیں ہو مگر میرا پھر بھی مشورہ ہوگا کہ لولوش کو کوئی عام آدمی سمجھنے کی غلطی کبھی مت کرنا۔ اس موذی کو ختم کرنا چاہتے ہو تو تمہیں پہلے اس کی جڑیں کھنگالنا ہوں گی۔ اسے کھود کر کاٹنا ہوگا۔ تب ہی تم لولوش کا کچھ بگاڑ سکتے ہو۔" روڈلف نے کہا اور پھر گرما گرم کافی کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے مزید بولا۔

"جب تمہاری گرل فرینڈ عابدہ کا معاملہ امریکا میں منظر عام پر آیا تھا تو عارفہ نامی عورت کا بھی ذکر سنا گیا تھا۔ اگر وہ بقول تمہارے...... راہ راست پر آ گئی ہے تو پھر تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کم از کم تمہیں فنانشل سپورٹ حاصل ہے۔ ایک اور خاتون جس کا تم نے ابھی ذکر کیا، زہرہ بانو...... یہ دو تمہاری بہترین سپورٹر ہیں۔ لیکن

UrduGem.com
Urdu Novels, Books and Much More
www.u ugem.com

English®
Beautify
your skin,
naturally
English
Neem
Soap Bar
100% Natural actives
نیم
الصابون بار
انگلش
facebook.com/snsc

عارفہ کی بات اور ہے، جو بیرونِ ملک کہیں بھی تمہارے قدم جمانے میں تمہاری اچھی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ میرا تو مشورہ ہے کہ تم پہلے زہرہ بانو کے بجائے عارفہ سے ہی رابطہ کرو۔"

میرے بارے میں جاننے کے بعد روڈلف مجھے وہی "صائب" مشورے دے رہا تھا جو میرے ذہن میں بھی تھے۔ اس کی تائید سے مجھے مکمل تشفی ہوتی تھی۔ تاہم کچھ سوچتے ہوئے میں نے مشورہ طلب لہجے میں کہا۔

"لیکن میں اس ہوٹل سے فون نہیں کرنا چاہتا۔ کسی اور مقام سے اگر یہ سہولت حاصل ہو جائے تو کیسا رہے گا......؟"

"ہاں! یہ بات میں بھی سوچ رہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "ایسا کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ذرا فریش ہو کے باہر نکلتے ہیں۔ پھر بتاتا ہوں کہ کہاں چل کر فون کیا جائے۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

منیلا کے بین الاقوامی ائرپورٹ سے نکلتے ہی ہم مصیبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ گویا یہ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی بات ہو گئی تھی۔

ہمیں فریش ہونے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ جبکہ پاکستان فون کرنے کے لیے میں بھی بے چین تھا۔ میرے ساتھی بھی پریشان ہو رہے ہوں گے میری وجہ سے...... اور مجھے کبیل دادا اور شکیلہ کے بارے میں بھی معلوم کرنا تھا۔

دو گھنٹے بعد ہم دونوں کنگسٹن ہوٹل سے نکلے اور سڑک پر آ گئے۔ لنچ ہم نے ہوٹل میں ہی کر لیا تھا، کچھ تکان سی اُتارنے کے بعد ہم باہر نکلے تو منیلا کے آسمان پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ گویا سہ پہر ہو چلی تھی۔

روڈلف اور میں منیلا کی سڑکوں پر سڑگشت کرنے لگے۔ قریبی ویسٹرن یونین برانچ سے ہم نے کچھ پیسے نکلوائے جہاں منی ایکسچینج کی سہولت بھی موجود تھی، چنانچہ ان پیسوں کو فلپائنی "پیسو" میں منتقل کر لیا گیا۔

میرا سارا زور پاکستان فون کرنے پر لگا رہا اور روڈلف کا آوارہ گردی پر۔ حالانکہ وہ یہاں ایک دو بار پہلے بھی آ چکا تھا لیکن بعد میں عقدہ کھلا کہ وہ ایسا کیوں چاہ رہا تھا۔

یہ بھی کہ اس ہوٹل چند گھنٹوں بعد ہی کیوں چھوڑ دیا تھا۔ ہاں! یہ اسی کا مشورہ تھا کہ اب یہاں سے نکل کر کسی اور علاقے کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ اس نے آخر میں کہا۔

"بڈی! کبھی کبھی تم بہت جلد بازی سے کام لیتے ہو۔" ایک سڑک کراس کرنے کے بعد وہ مجھے لیے ایک بس اسٹینڈ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

"میں احتیاط کے لوازمات کو ملحوظ رکھنا چاہتا ہوں، بالخصوص کاسپاکو کے ان تینوں ہرکاروں سے مڈبھیڑ ہونے کے بعد تو ہمیں اپنے سائے سے بھی محتاط ہونا چاہیے۔ کیونکہ مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بدبخت کے آدمی چند چھوٹے بڑے ایشیائی ممالک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یا وہ یہاں تک فوری رسائی رکھتا ہے۔"

"تو اب کدھر جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اس وقت جنوبی علاقے میں ہیں، میں تمہیں شمالی علاقے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ وہاں دیکھنا تمہیں اجنبیت کا احساس قطعاً نہیں ہوگا۔" میں اس کی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا، خفیف سی مسکراہٹ سے مستفسر ہوا۔

"وہاں بھلا میرے کون سے جاننے والے رہتے ہیں؟ جو مجھے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیں گے؟"

"تمہاری مسلم کمیونٹی زیادہ تر وہیں آباد ہیں، بڈی!" اس نے کہا۔

"ارے......! کیا واقعی؟" مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"ہو گئے ناں خوش بڈی!" وہ میری طرف دیکھ کر چہکا۔ "ایسے گھومنے کے مواقع کبھی کبھی ہی ملتے ہیں۔ کام کے ساتھ طعام بھی ضروری ہے (طعام سے اس کی مراد آوارہ گردی کرنا ہی تھا)۔ چلو، وہاں سارے کام آسانی سے ہو جائیں گے اور خطرے کا خدشہ بھی کم ہوگا۔"

مجھے اس کی بات پر صاد کرنا پڑا۔ پھر اسی کی خواہش پر ہم نے بس کا سفر کیا تھا۔ بسوں کے سلسلے میں یہاں بھی وہی معاملہ تھا۔ مسافروں کے لیے سیٹوں سے زیادہ کھڑے ہونے کی جگہ زیادہ کشادہ کر رکھی تھی۔ چھت سے لٹکے ہوئے بے شمار لہراتے ہوئے چرمی بیلٹ اس بات کا ثبوت تھے کہ جنہیں سیٹیں نہیں ملتی تھیں وہ ان کے سہارے لٹک کر (کھڑے ہو کر) سفر کرتے تھے۔ وہ مجھے منیلا کے شمالی حصے میں لے آیا۔

یہاں مسجدوں اور اسی طرح کے چند اسلامی تعلیمی اداروں کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ فلپائن کی زبان اور کلچر اپنی جگہ، جہاں (جنوبی حصے میں) امریکی کلچر چھایا ہوا تھا۔ کلب، بار، موسیقی و رقص و سرود بھی کچھ دیکھنے میں آتا تھا۔ ان کا تعلیمی نظام بھی امریکی تھا۔ اسی

UrduGem.com
Urdu Novels, Books and Much More
www.u ugem.com

طرح امریکی میڈیا کا بھی (جنوبی حصے میں) اثر دیکھنے میں آتا تھا۔

منیلا کی نوجوان نسل امریکی انداز و ڈھنگ میں ”سر گوڈے گوڈے“ تک ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن جہاں...... فلپائن میں مسلمانوں کی اکثریت جنوبی علاقوں میں تھی۔ وہاں البتہ مسلم کلچر اپنے تہذیب و تمدن کا پرچار کامیابی سے کیے ہوئے تھا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ جنوب کے علاقوں میں رہنے والی مسلم کمیونٹی میں مزاحمت کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مغربی کلچر، مذہب اور رواجوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کی ٹھوس اور حقیقت پر مبنی وجہ یہی ہے کہ اسلام بجائے خود ایک طاقتور اور فعال مذہب ہے اور اس کے ماننے والے کسی دوسرے مذہب کے کلچر کو بہت مشکل سے اپناتے ہیں اگر ایسا ہو بھی جاتا ہے تو وہ اس میں سرتاپا غرق نہیں ہو جاتے۔ اسی سبب جنوبی فلپائن، شمالی فلپائن سے بہت مختلف ہے۔

یہاں ہر چیز پر اسلامی تہذیب کے آثار نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسلام کا غلبہ بھی یہاں دیکھنے میں آتا تھا۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں، وہ اپنے عقیدے کے مطابق ہی زندگی بسر کرنے پر زور دیتے ہیں یہاں بھی مجھے یہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

روڈلف کی اس اعلیٰ ظرفی کا میں دل سے معترف ہونے لگا تھا۔ اس نے بھی ہمارے مسلم کلچر کے بہترین اسلاف اور ان کی صاف ستھری تعلیمات کی تعریف ... کی تھی۔ یہی نہیں اس نے اپنے بارے میں ایک انوکھا انکشاف کر کے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی گرینڈ ما (دادی) اسلام سے بے حد متاثر تھی۔

وہ کہتی تھی کہ جیسے ہی میں نے اسلام قبول کیا میرے نفس کی پراگندگی ازخود دھلتی چلی گئی۔ میں جن نفسیاتی اور اپنے مغربی سماج کی خرابیوں کا شکار ہو کر جس بے سکونی کی حالت میں سکون کی متلاشی تھی، وہ مجھے اسلام قبول کرنے سے پہلے ہی اس کے بارے میں جاننے کے دوران ہی دور ہوتی محسوس ہونے لگی۔ میرے لیے روڈلف کی سب سے بڑی حیرت کی بات یہ رہی جب اس نے یہ بتایا کہ اس کا گرینڈ پا (دادا) خود ایک پادری تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے طلاق لے لی تھی بعد میں، ظاہر ہے وجہ اس کی بیوی (روڈلف کی گرینڈ ما) کے مسلم ہونے کی تھی۔

اس وقت میرے باپ کی عمر پندرہ سال تھی۔ عیسائی تعلیم اس نے اپنے باپ سے حاصل کی تھی اور وہ کٹر کیتھولیک کرسچن تھا مگر جذباتی طور سے ماں سے اس کی زیادہ ”اٹیچمنٹ“ تھی، یوں وہ ماں کے ساتھ ہی الگ ہو گیا لیکن باپ کی دی ہوئی تعلیم سے آخر تک منحرف نہیں ہوا۔

جب اس کی شادی ہوئی تو روڈلف کی ماں کو اس کی دادی نے اسلامی تعلیمات دینے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ اپنے شوہر اور پادری سسر کے زیرِ اثر رہی۔ انہی دنوں روڈلف کی پیدائش ہوئی تو دادی نے اسے اسلام کی تعلیم سے روشناس کروانا چاہا اور کافی حد تک روڈلف متاثر بھی ہوا لیکن وہ بھی اپنے کرسچن ماں باپ اور دادا کے زیرِ اثر رہا لیکن اس کے دل میں اپنی دادی کے اسلام سے متعلق بتائے ہوئے وعظ ابھی تک تازہ تھے۔ بدقسمتی سے اس کی دادی کا انہی دنوں انتقال ہو گیا اور روڈلف گھر سے تلاشِ معاش کے لیے نکل گیا۔ یوں اس کا اپنے گھر سے ہی نہیں بلکہ اپنے ماں باپ اور دادا سے بھی رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن اور خوش رہنے لگا۔

پھر اس نے ماریا نامی لڑکی سے شادی کر لی جس سے دو بچے ہوئے اور یوں وہ اپنی گھریلو زندگی میں مگن ہو گیا۔ روڈلف کے بارے میں یہ حقائق جان کر مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی تھی۔

بہرحال یہاں ہم نے دانستہ طور پر ایک عام سے ہوٹل میں رہائش اختیار کی اور وہیں مجھے ٹیلی فون کال کرنے کی سہولت میسر آ گئی۔

میں نے فی الفور سب سے پہلے زہرہ بانو کو فون کھڑکا دیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا...... میں جب بھی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا تو میرا دل جانے انجانے خدشات اور نامعلوم سی بے چینی میں گھرنے لگتا تھا۔ یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے، وہ انسان جو گھر سے دور اور غریب الوطنی کی حالت میں ہو ایسی ہی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے، اس حقیقت سے انکار کوئی نہیں کر سکتا۔

بہت سی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہتی تھیں۔ پاکستان میں میرے دشمن ابھی موجود تھے۔ ان سے وہاں میرے بہی خواہوں کو عمومی نوعیت کے خطرات سہی، کیونکہ ایک تو خود زہرہ بانو بھی کم نہ تھی، پھر وہاں میرا یار بے بدل اول خیر موجود تھا۔ دوسرے یہ کہ میں نے اس وقت اپنے تمام دشمنوں کی توجہ اپنی جانب رکھی ہوئی تھی۔

”خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے...... شہزی! کیا میں واقعی تمھیں سن رہی ہوں ناں؟“ میری آواز سنتے ہی زہرہ بانو کی دوسری جانب سے حیرت میں ڈوبی آواز ابھری۔

”زہرہ بانو! یہ میں ہی ہوں اور تم سب لوگوں کی دعاؤں اور اللہ کے غیر معمولی فضائل کے ساتھ بالکل خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اب سب سے پہلے تم اپنی اور سب کی خیریت سے مجھے فوراً آگاہ کرو اور کمیل دادا اور شکیلہ کی بھی خیریت بتاؤ۔“

”یااللہ تیرا شکر ہے۔“ زہرہ بانو نے ایک بار پھر دعائیہ کلمات کہے اور جذبات سے لبریز لہجے میں بولی۔ ”شہزی! ہم سب بھی اللہ کے فضل سے ٹھیک ہیں۔ کمیل دادا اور شکیلہ بھی خیریت سے ہیں اور تمہاری ہدایت کے عین مطابق وہ امریکا میں خود کو فی الحال محدود کیے ہوئے ہیں مگر وہ تمہارے آنے کے بے چینی سے منتظر ہیں بلکہ حالیہ رابطے کے دوران ان میں کمیل دادا نے اصرار کیا ہے شہزی سے اس کی بات کرواؤ۔“

”مجھے ان کا نمبر دینا میں ان سے بات کر لوں گا اور بتاؤ؟“ میں نے فوراً دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”امریکا سے آنسہ خالدہ یا اس کی دوست سوزی نے کوئی رابطہ کیا؟“

”نہیں، وہاں سے ابھی تک کسی نے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا ہے۔“ اس نے بتایا اور مجھے مایوسی ہوئی۔ ”مگر تم تو اپنے بارے میں بتاؤ کہ کہاں ہو؟ کیا ابھی تک تھائی لینڈ میں ہو؟“

میں نے مختصراً صرف چند ضروری باتیں بتائیں اور رقم کے سلسلے میں بات کی۔ میری بات پر وہ خاموش سی ہو گئی، پھر بولی۔

”اتنی بڑی رقم کا بندوبست ہو تو جائے گا...... مگر...... کچھ وقت لگے گا۔“

یہ بات میرے ذہن میں تھی کہ زہرہ بانو کے لیے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا ناممکن تو شاید نہ ہو مگر وقت طلب کام ضرور ہو گا۔ لہٰذا میں نے فوراً کہا۔ ”موجودہ صورتِ حالات میں مجھے عارفہ سے بھی رابطہ کرنا ہو گا، میرا خیال ہے میں پہلے اس سے بات......“

”شہزی!“ اچانک دوسری جانب سے زہرہ بانو نے میری بات کاٹی۔ ”عارفہ بھی اب تمہارے بارے میں کم فکرمند نہیں رہتی۔ وہ تمہاری خیریت پوچھنے کے لیے اکثر یہاں آتی رہتی ہے، اتفاق سے وہ بھی آئی ہوئی ہے اور تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ بات کراؤں......؟“

”فوراً کراؤ۔“ میں نے کہا۔

تھوڑی دیر گزری تو عارفہ کی آواز ابھری۔ ”شہزی! کیسے ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں، تمہاری خیریت جان کر اور تم سے بات کر کے مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے شہزی!“ وہ مسرت سے لبریز ہو کے بولی۔

”تم نے مجھ سے پھر کوئی رابطہ ہی نہیں کیا؟ تم دیارِ غیر میں کیسے گزارا کر رہے ہو؟ مجھے اس بات کی سخت فکر تھی اور زہرہ بتا رہی ہے تمھیں مجھ سے کوئی بات کرنی ہے، رقم وغیرہ کا مسئلہ ہے تو بتاؤ مجھے ابھی، لیکن میرا خیال ہے کہ زہرہ بہن ابھی تمھیں فوری طور پر رقم دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔“ میں جواب میں بولا اور پھر اسے بھی پیسوں سے متعلق مختصراً آگاہ کر دیا۔

”اس طرف سے تو تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔“ وہ ایک دم جوش سے بولی۔ ”میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ تمھیں کسی بھی وقت ایک خطیر رقم کی ضرورت پڑ سکتی ہے شہزی! بہرحال، ساری باتیں چھوڑ کر مجھے بتاؤ تمھیں کتنی رقم کی ضرورت ہے بلکہ جتنی کی بھی ضرورت ہے بے دھڑک مجھے بتا دو......“ وہ جوش میں کہتی چلی گئی۔ مجھے اس کے جذبے نے بے حد متاثر کیا تھا۔

ایک برا انسان راہِ راست پر آنے کے بعد اچھوں سے بھی اچھا بن جاتا ہے۔ تاہم عارفہ کا معاملہ تھوڑا مختلف اس لیے بھی تھا کہ وہ اپنی ایک غلطی کا ازالہ بھی کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے میں اتنا اہم نہیں بلکہ عابدہ اور اس کی رہائی اہم تھی۔ کیونکہ عابدہ اس کی محسن تھی اور اس کے کام آئی تھی لیکن اپنی اسی محسنہ کے خلاف اس نے ایسا قدم اٹھایا تھا جس کے سبب عابدہ گویا اس نہ ختم ہونے والی خطرناک صورتِ حالات کا شکار ہو کر امریکا میں پھنس چکی تھی۔

لہٰذا اب عارفہ کے راہِ راست پر آنے کے بعد عارفہ کو یہ خلش ہر وقت بے چین کیے رکھتی تھی کہ اس کی قصوروار وہی ہے اور اب اسی کو مدد کرنا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”عارفہ! تمہارے جذبے کو میں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور تمہارا مجھ پر یہ احسان ہو گا کہ......“

”کیسی باتیں کر رہے ہو شہزی؟“ اس نے اچانک میری بات کاٹ دی۔ ”میں پہلے ہی تم سے اس قدر شرمندہ ہوں اور تم مجھے مزید شرمندہ کرنا چاہتے ہو؟ میں بھلا تم پر کیا احسان کر رہی ہوں؟ احسان تو مجھ پر عابدہ اور تم نے کیا ہے۔ عابدہ میری بیماری کے دوران میرے کام آئی اور تم

UrduGem
Urdu Novels, Books and Much More
www.urdugem.com

دونوں نے ایک لمبی جدائی برداشت کی، بلکہ ابھی تک کر رہے ہو۔ لیکن میں نے تم دونوں کی اس بھلائی کے بدلے میں کیا صلہ دیا؟ دھوکا اور فریب...... پھر خود بھی ایک ایسے خبیث شخص کے جال میں پھنس گئی جو میری ہی جان کا دشمن نہیں تھا بلکہ میرے دونوں بچوں کے بھی خون کا پیاسا تھا، تب بھی تم ہی کام آئے تھے شہزی! کیا بھول گئے؟

"سیٹھ نوید جیسے زہریلے سانپ سے تم نے مجھے بچایا۔ یہ سب جاننے کے باوجود کہ میں نے عابدہ اور تمہارے ساتھ کیا کیا، مگر تم نے میری برائی کا جواب بھلائی سے دے کر میرے ضمیر کو بھی جگا دیا۔ نہیں شہزی! نہیں، خدا کے لیے مجھے مزید پستیوں میں مت گرانا، اب سنبھلی ہوں تو سنبھلے ہی رہنے دینا مجھے۔"

یہ کہتے کہتے وہ رو پڑی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت کس قسم کی جذباتی نوعیت سے گزر رہی تھی، برائی کے بدلے میں بھلائی کا جواب ایک بُرے انسان کو راہِ راست پر ہی نہیں لاتا بلکہ عارفہ جیسے انسان کو اندر سے جھنجوڑ بھی ڈالتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میں عارفہ کی محسوس کر رہا تھا۔

"پریشان مت ہو عارفہ! پلیز! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں اور اللہ سے بھی دعا گو ہوں کہ وہ بھی تمہیں معاف کر دے۔"

عارفہ نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "مجھے فوراً اپنے اکاؤنٹ کی تفصیل بھیجو اور امریکا میں اپنے قدم جمانے کے لیے میں خود بھی اڈیسہ شپنگ کمپنی کی ایک ڈائریکٹر کی حیثیت سے سان ڈیاگو پہنچ رہی ہوں۔ وہیں میں نے رہائش کا بندوبست بھی کر لیا ہے۔ وہاں کبیل دادا اور شکیلہ کو محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت ہے۔ اُن کے ویزے کی مدت ختم ہونے والی ہے جو اُن کے لیے کسی وقت بھی مسئلہ بن سکتی ہے۔ ان دونوں کو بھی میری سپورٹ چاہیے ہوگی۔ لہٰذا دیر مت کرو۔"

میں نے عارفہ کو اپنے اکاؤنٹ کی تمام تفصیل دے دیں جو اس نے نوٹ کر لیں۔ میں سب سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن وقت کی کمی اور حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ میری اس مجبوری کو زہرہ وغیرہ بھی سمجھتے تھے۔

اس کے بعد زہرہ بانو مجھ سے مخاطب ہوئی اور میں نے...... چند رخصتی کلمات ادا کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔ اور روڈلف سے کہا کہ...... مجھے ایک فون کاسپاکو کو بھی کرنا ہوگا۔

"اس سے کیا کہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ میں دو ایک روز کے اندر اندر تمہاری ساری رقم لوٹانا چاہتا ہوں۔ تاکہ اس سے ایک طرف کے جھگڑے سے جان چھوٹے۔"

"اس کے اُبال کو کم کرنے کا یہ بھی ایک بہترین طریقہ ہے بڈی!" روڈلف بولا۔

"مجھے اس کے اُبال کی کوئی پروا نہیں ہے۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں بس اس کے پیسوں پر اپنا حق جتانا نہیں چاہتا۔"

"تمہیں اس کا کونٹیکٹ نمبر معلوم ہے؟"

"سیل نمبر بھی اور اس کی اقامت گاہ کا بھی۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی اس موذی سے رابطہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔" روڈلف نے اچانک کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"وہ ہمارے نمبر سے ہماری موجودگی کا پتا لگا سکتا ہے اور کیا خبر اس کے ہرکارے کب ہم پر دوبارہ حملہ آور ہو جائیں۔" مجھے روڈلف کا مشورہ مناسب لگا۔

اس کے بعد ہم کمرے میں آ گئے۔ میں عارفہ کو اپنے اکاؤنٹ کی تفصیل سے آگاہ کر چکا تھا۔ منیلا میں اتنے ہنگاموں کے باوجود میں ہی نہیں میرا نام اور میری شناخت محفوظ رہی تھی۔ آن لائن بینکنگ سسٹم کی سہولیات سے رقم کی منتقلی تک میں منیلا سے کوچ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ جس کا مطلب تھا مجھے ایک یا دو روز کے لیے ابھی منیلا میں ہی رکنا تھا۔

لہٰذا اب ہمارے پاس ہوٹل کے کمرے میں بند ہو کے ٹی وی دیکھنے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔

منیلا میں بین الاقوامی ہوائی اڈا تھا۔ یہاں سے سیدھا امریکا کوچ کرنا کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ٹی وی پر ہم آج کی صورتِ حال سے آگاہ ہونا چاہتے تھے کہ ہمارے ہاتھوں کاسپاکو کے ان تینوں ہرکاروں میں سے کتنے موت کی نیند جا سوئے تھے۔

لیکن ٹی وی پر ایسی کوئی خبریں نہیں آ رہی تھیں، ممکن ہے کہ ابھی تک کسی کو معلوم ہی نہیں ہوا تھا وہاں کیا ہنگامہ ہو چکا تھا۔ لیوی نے بھی یقیناً ابھی تک ہماری ہدایت پر ہی عمل کرتے ہوئے پولیس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ میں نے جس طرح اسے دہشت زدہ کیا تھا اس نے خود کو اس "خطرناک معاملے" سے دور ہی رکھا تھا۔

البتہ جزیرہ گومبورا اور ڈیواؤ کے حوالے سے پرانی

خبروں اور تبصروں کا تسلسل جاری تھا۔ یہاں ایک خبر پر ہم چونکے بنا نہ رہ سکے تھے۔ بظاہر تھائی پولیس اور فلپائنی پولیس سے لے کر انٹرپول تک سب نے مجسمے اور اس کے پس منظر میں ہونے والی خوں ریزی والے معاملات سنبھال لیے تھے، تاہم تحقیق و تفتیش کا سلسلہ جاری تھا اور اس میں اسپیکٹرم اور کاسپاکو کا ذکر بھی آتا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ فلپائنی پولیس کو ان دو نامعلوم افراد کی بھی تلاش تھی جنہوں نے بقول ٹوپر کے بدھ کے اس مجسمے کی چوری کو ناکام بنایا تھا۔

وہ دو "نامعلوم افراد" ظاہر ہے روڈلف اور میرے سوا کوئی نہ تھے۔

"بڈی! یہ تو گڑبڑ والی بات ہے۔" روڈلف یہ خبر سن کر فکرمندی سے بولا۔

"ٹوپر نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ اس نے پولیس کو ہمارے غلط حلیے بتا کر انہیں غلط راہ پر ڈال دیا ہے۔ پولیس ہم تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا مگر وہ نفی میں اپنا سر ہلا کے غیر مطمئن انداز میں بولا۔

"نہیں بڈی! ہمیں زیادہ دیر تک اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ لاازلا...... کیا تمہیں نہیں پتا کہ پولیس اس شخص کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے جو قانون کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم پولیس سے بالکل ہی بے فکر ہو کر بیٹھ رہیں۔" میں نے کہا۔ "محتاط تو ہمیں اپنے سائے سے بھی رہنا ہوگا۔"

"گڈ......!" اس کے منہ سے نکلا۔

رات ہو گئی۔ ہم نے کھانا روم سروس سے کمرے میں منگوا کر زہر مار کیا۔ زہر مار اس لیے کہ ہمارے سر پر جلد سے جلد فلپائن (منیلا) سے کوچ کرنے کی دھن سوار تھی، ٹیلی فونک گفتگو کا بھی کوئی بھروسا نہ تھا۔ گوتم بدھ کے مجسمے سمیت گومبورا کے جزیرے میں ہماری خون ریز معرکہ آرائی اور پھر ڈیواؤ کے لگژری ریسٹورنٹ میں جوشوا اور اسٹاربک کا میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونا پھر منیلا میں کاسپاکو کے ہرکاروں سے تازہ ترین جنگ کسی بھی وقت بڑی مصیبت کا سبب بن سکتی تھی۔ نیز کاسپاکو کے ہاتھ یہاں تک دراز تھے۔

یوں ہماری روانگی تب ہی ممکن تھی جب پاکستان سے میرے ٹریولنگ اور ویسٹرن یونین اکاؤنٹ میں رقم ٹرانسفر ہو جاتی۔ کل تک مجھے اس کی پوری اُمید تھی۔ جبکہ عارفہ اس معاملے میں چلتا پرزہ تھی اور بقول اس کے وہ بھی امریکا روانہ ہونے والی تھی۔

کھانے کے بعد روڈلف نے کہا کہ وہ بھی اپنی بیوی اور بچوں سے بات کرنا چاہتا ہے اور پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ کمرے میں اگرچہ فون کی سہولت تھی، لیکن صرف لوکل کال کی۔ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا لہٰذا لانگ ڈسٹینس کال کے لیے نیچے کاؤنٹر سے ملحقہ ٹیلی فون ایکسچینج بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک الگ سے بوتھ بنایا گیا تھا۔ تاہم آپریٹر کو نمبر بتانا پڑتا تھا۔

میں نے روڈلف کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنے بیوی بچوں سے فون پر ذرا محتاط رہ کر ہی بات کرے، کیونکہ کوئی بعید نہ تھا کہ...... اس گفتگو کو آپریٹر بھی سن رہا ہو۔

روڈلف کو گئے کافی دیر بیت گئی تو میں ذرا فکرمند سا ہوا۔ اسپیکٹرم کے خلاف روڈلف میرے لیے ایک اہم مہرہ تھا۔ جس کے پوری طرح سے کل امریکا پہنچ کر کھلنے والے تھے، کیونکہ وہ ان کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

میں نے ٹی وی کا ریموٹ ایک طرف رکھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ (یہاں ہر کمرے میں ٹی وی یا اے سی نہیں تھا۔ چھوٹے علاقوں کے درمیانے درجے کے ہوٹلز میں یہ چوائس پر لینا پڑتا تھا)

کمرے سے نکل کر میں ہوٹل کی مختصر لابی میں آ گیا۔

وہاں استقبالیہ کاؤنٹر پر اور اس کے بعد اس سے ملحقہ کمرے میں بھی جھانک کر دیکھ لیا بلکہ وہاں موجود ایک تک سک سی فلپائنی لڑکی سے بھی روڈلف کا پوچھ لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ...... روڈلف یہاں آیا ضرور تھا مگر فون کرنے کے بعد وہ لابی میں ہی بیٹھا رہا تھا۔ اس نے کافی منگوا کر پی تھی، پھر تھوڑی دیر بعد ایک خاتون آئی وہ کہیں چلا گیا۔

"کہاں؟ کیا ہوٹل سے باہر یا...... اندر ہی کسی کمرے میں؟" میں نے پوچھا۔

"میں یہاں بیٹھی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس عورت کے ساتھ باہر نکل گیا یا اندر ہی ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

میں دوبارہ استقبالیہ پر آ گیا۔ وہاں بھی ایک خوبصورت سی عورت موجود تھی۔ میں نے روڈلف کا ناک نقشہ بتا کر اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ کسی خاتون...... کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کی بات سن کر میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ایک عام ذہن سے سوچا جا سکتا تھا کہ روڈلف اپنی فطرت کے مطابق کسی حسین خاتون کو دیکھ کر پھسل گیا تھا۔ لیکن ایک

www.u ugem.com

تربیت یافتہ ایجنٹ میرے اس خیال کی نفی کرتا تھا۔

بے شک روڈلف اس فطرت اور مزاج کا آدمی تھا۔ مگر قرائن سے پتا لگتا تھا کہ وہ معاملہ کچھ اور تھا۔ بقول ٹیلی فون آپریٹر کے روڈلف نے فون کرنے کے بعد لابی میں کافی پی تھی۔ اس کے بعد وہ خاتون آئی اور وہ اس کے ساتھ کہیں چلا گیا۔

''تو کیا اس نے اپنے بیوی بچوں کو فون نہیں کیا تھا؟'' میں نے سوچا۔ ''یا پھر اُن سے بات کرنے کے بعد ہی اس نے مذکورہ خاتون کو فون کر کے یہاں بلایا تھا؟ کیوں؟ اگر وہ یہاں کسی عورت کو جانتا تھا تو اس نے مجھے کیوں نہیں یہ بات بتائی تھی؟''

تاہم لگتا یہی تھا کہ وہ یا خاتون، دونوں ہی ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔

میں ہوٹل سے باہر آگیا۔ روشنی اور ٹریفک کے سوا اور کچھ نہ تھا، یا پھر قریب دکانوں اور چھوٹی مارکیٹ کے، دور قریب میں کچھ رہائشی کالونیوں کے مکانات بھی نظر آتے تھے۔ رہائشی اپارٹمنٹس کی ایک کثیر المنزلہ عمارت بھی تھی۔

میں باہر آکر فٹ پاتھ پر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ میرے ذہن پر ایک نئی فکر سوار ہوگئی۔ پتا نہیں اب وہ خوبصورت سی خاتون روڈلف کو بے وقوف بنا کر اپنے ساتھ لے گئی تھی یا پھر گن پوائنٹ پر...... تاہم یہ حقیقت تھی کہ روڈلف پُراسرار طریقے سے غائب ہوگیا تھا یا کر دیا گیا تھا۔ مگر کیوں......؟ اس کا یہاں کون دشمن یا دوست تھا؟ میرے ساتھ یہ سب ہوتا تو دشمنوں کی ایک طویل فہرست سامنے آجاتی، مگر روڈلف کے سلسلے میں یہ صورتِ حال حیرت اور مخمصے میں ڈالنے والی تھی۔

میں بھلا اور کہاں تک اُسے تلاش کرتا؟ منیلا کے راستوں سے میں بھلا کہاں واقف تھا؟ اور اسے کہاں اور کس کے پاس تلاش کرتا؟ سوچا واپس کمرے میں جا کے اس بارے میں کچھ سوچتا ہوں، جب میں واپس اپنے ہوٹل کی جانب پلٹا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ احاطے میں پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ ایک بڑی سی انٹرکولر گاڑی تھی جس پر فلپائنی پولیس کا مونوگرام اور چھت پر چسپاں نیلا لال ہوٹر نظر آتا تھا۔ میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔

کیا یہ ہماری تلاش میں آئی تھی؟'' پہلا خیال میرے ذہن میں یہی اُبھرا تھا تاہم موہوم سا خیال یہ بھی آیا کہ ضروری تو نہیں کہ پولیس ہمارے لیے ہی آئی ہو۔

میں اندر داخل ہوا تو استقبالیہ پر میں نے تین وردی پوش پولیس اہلکاروں کو کھڑے پایا، ان میں دو مرد اور ایک عورت تھی۔ ایک خاصا مضبوط تن و توش کا مالک شخص جو اپنی مخصوص وردی سے باقی دو کا افسر معلوم ہوتا تھا اور پکی عمر کا تھا، استقبالیہ لڑکی سے نہایت ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کچھ پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اُن سے کنی کترا کر اپنے روم کی طرف جانے والی کوریڈور کی طرف بڑھنے لگا اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے اس جانب دیکھا تو میرا دل زور سے دھڑکا۔ وہ لڑکی میری ہی جانب اپنے ہاتھ کی اُنگلی کا اشارہ کرتے ہوئے اس افسر سے کچھ کہہ رہی تھی۔

''اے مسٹر......! جسٹ اے منٹ......'' اچانک میرے کانوں میں اسی آفیسر کی آواز ٹکرائی۔ وہ اشارہ پاتے ہی میری جانب پلٹا تھا اور میں رک گیا۔ پلٹا تو وہ تینوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے میری ہی جانب چلے آرہے تھے۔ ان کی پینٹ کے بیلٹ سے ہولسٹر جھولتے مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ ان کی نیوی بلیو وردیوں پر انگریزی میں فلپائن نیشنل پولیس کے الفاظ کندہ تھے۔

میں اُن کی طرف دانستہ حیرت اور کچھ عمومی انداز کے تفکر سے دیکھنے لگا۔

''ہیلو مسٹر......؟'' آفیسر نے میرے قریب آکر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے استفساریہ کہا۔

''شہزاد......!'' میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنا نام بتا دیا۔

''کیا ہم آپ کے ساتھ کمرے میں چل کر بات کر سکتے ہیں؟'' وہ انگریزی ہی بول رہا تھا۔

''شیور......'' میں نے کہا اور اسی تفکر سے پوچھ بھی لیا۔ ''اِز ایوری تھنگ او کے......؟''

''یہ ہم آپ کو کمرے میں چل کر ہی بتا سکتے ہیں۔'' آفیسر نے کہا۔ وہ بظاہر خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا، مگر اس کی آنکھوں سے مجھے ایک خاص قسم کی تندی اور کرختگی صاف جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں انہیں کمرے میں لے آیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ ان تینوں نے ہی بڑے غور سے کمرے کا جائزہ لیا تھا اور بالخصوص آفیسر کی پیشانی پر میں نے اُلجھن کی ایک سلوٹ گویا رمق کے طور پر نمودار ہوتے دیکھی تھی۔

استقبالیہ پر موجود لڑکی نے جس انداز میں میری جانب اشارہ کیا تھا، اس سے یہی لگا تھا مجھے کہ...... ان تینوں پولیس اہلکاروں کو میری ہی تلاش تھی۔ مگر کیوں......؟ انہیں

میرے بارے میں کیسے علم ہوگیا؟ یہی ایک سوالیہ نشان آنکڑے کی طرح میرے حلق میں اٹکا ہوا تھا۔

''تمہارا دوسرا ساتھی کدھر ہے؟'' آفیسر نے گہری متانت کے ساتھ مجھ سے پوچھا۔

گویا انہیں روڈلف کے بارے میں بھی معلوم تھا۔

''میں اُسے ہی ڈھونڈنے کے لیے ذرا دیر کے لیے ہوٹل سے باہر گیا تھا۔'' میں نے صاف گوئی کی روش اختیار کرتے ہوئے جواب دیا۔ سرِدست ان کے پاس ہمارے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی تصدیق تک میں نے یہی مصلحت رکھنا مناسب سمجھا تھا۔

کمرے میں دو بیڈ کے علاوہ ایک کاؤچ دو کرسیاں ایک ٹیبل موجود تھی۔ میں بیڈ پر جا بیٹھا تھا اور انہیں بھی بیٹھنے کے لیے کہا۔

لڑکی جو صحت مند اور دلکش خدوخال کی مالک تھی، اس نے ٹیبل کے پاس والی کرسی سنبھال لی تھی اور ساتھ ہی اپنے بیلٹ سے جھولتے ایک پرس سے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر اور ایک عدد نوٹ بک جس میں پین اُڑسا ہوا تھا، نکال کر میز کی سطح پر رکھ دیا تھا۔

ٹیپ اس نے آن کر دیا تھا اور نوٹ بک کھول کر قلم سنبھال لیا تھا۔ اس کا ساتھی نوجوان جو اسمارٹ سا تھا اس کے قریب پڑے کاؤچ پر بیٹھا تھا جبکہ پولیس آفیسر بیڈ کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔

پولیس آفیسر نے اپنا بیج دکھایا اور ساتھ ہی تعارف بھی کرا دیا۔ جس کے مطابق وہ خود کیپٹن رانسے تھا، اس کا ماتحت اہلکار سارجنٹ پال جبکہ لڑکی ڈیلا تھی۔

اس کے بعد وہ مجھ سے سوالات کرنے لگا، اس دوران مجھے اندازہ ہوگیا کہ اسے ہمارے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا اور مزید یہ کہ فلپائنی پولیس صرف اسی ہوٹل میں ہی نہیں بلکہ دیگر ہوٹلز میں بھی ایسے غیر ملکیوں کو زیرِ تفتیش لا رہی تھی جنہوں نے تھائی لینڈ سے فلپائن کا سفر کیا تھا۔ ہم تو پرائیویٹ طیارے میں یہاں آئے تھے، مگر بہرحال میرے پاسپورٹ وغیرہ میں تھائی لینڈ کی اسٹیمپ چسپاں تھی۔

اُس نے میرے ان کاغذات کو غور سے دیکھا اور ایک بار پھر سوالوں کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

''دیکھو مسٹر شہزاد......!'' سب سے آخر میں اس نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلنا پڑے گا۔'' میں اس کی بات پر چونکتے ہوئے قدرے پریشانی سے بولا۔

''مگر کیوں آفیسر......؟ میرا خیال ہے میں آپ کو مطمئن کر چکا ہوں؟''

میری بات پر پہلی بار کیپٹن رانسے کے چہرے پر خفیف سی استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری تھی، بولا۔ ''شاید تمہارے علم میں نہیں ہے کہ کچھ روز پہلے ہی ایک گریٹ روبری کی واردات پکڑی گئی ہے۔ جس کا لنک تھائی لینڈ سے جڑتا ہے اور وہ اختتام فلپائن کے جزیرے گومبورا میں ہوا ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔''

میں نے اسے ٹی وی کی طرف نظریں ڈالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اگر میں جھوٹ بولتا یا آنا کانی سے کام لینے کی کوشش کرتا تو یہ گھاگ آفیسر شک میں پڑ سکتا تھا۔ میرا دعویٰ تھا کہ وہ اب بھی مجھ پر صرف روایتی انداز کا شک کر رہا تھا۔

''لیکن...... مجھے ٹی وی یا اخبارات پڑھنے کا زیادہ وقت ہی نہیں ملتا۔''

''اچھی بات ہے۔ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں؟'' اس نے کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے گویا حکم صادر کر دیا تو میں نے کہا۔

''دیکھو کیپٹن! میں ایک بے حد معروف کاروباری شخص ہوں۔'' میں نے اپنے سفری کاغذات کے درج بائیو ڈیٹا کے مطابق اس سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''اور میں یہاں سے امریکا جانے کے لیے ٹرانزٹ میں ہوں۔ میرا بہت وقت ضائع ہو جائے گا۔''

کیپٹن رانسے نے بدستور ایکسرے کرتی نظریں مجھ پر جمائے رکھتے ہوئے عجیب سوچتے ہوئے انداز میں نفی میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ مجھے اس کا یہ رویّہ انتہائی ناگوار لگا۔ وہ بولا۔

''ہمیں دراصل ان دو افراد کی تلاش ہے، جو گومبورا کے اس مکان میں اُس وقت موجود تھے، جب ان کی وجہ سے ہی یہ خوں ریز جنگ چھڑی تھی جس کے نتیجے میں ہمارا ایک ساتھی پولیس ماسٹر سارجنٹ ڈیملاتے ان خطرناک مجرموں کے ہاتھوں بڑی بیدردی سے مارا گیا تھا، جنہوں نے بعد میں اس مکان پر اچانک ہلّا بولا تھا اور سارجنٹ ڈیملاتے کے ہمراہ اس کی ساتھی کارپورل سارجنٹ مس پاؤلا بھی تھی۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا تو یکایک مجھے یوں لگا جیسے میرے دماغ کی نسیں منجمد ہوگئی ہوں اور سانس سینے میں

www.urdugem.com

اٹک کر رہ گئی۔

میرے ہی نہیں بلکہ روڈلف کے دھیان سے بھی وہ لڑکی نکل گئی تھی۔ اس میں یقیناً اُن حالات کا ہی دخل تھا جو اچانک اور بڑی خوں ریزی کے ساتھ پیش آئے تھے۔ کیونکہ بروجیٹ کی درندگی کا شکار ہونے والا وہ بدنصیب پولیس مین اکیلا نہیں تھا۔ ٹوپر تو اس کے ساتھ تھا ہی مگر اس وقت اس کے ہمراہ پولیس وردی میں ایک ساتھی لڑکی بھی تھی۔ اسی نے ہی اس وقت مجھ پر ایک دم اپنا سروس ریوالور تان لیا تھا جب میں اس کے ساتھی کو دروازہ کھولنے سے منع کرتے ہوئے خود آگے بڑھنا چاہ رہا تھا۔

یہ اس کی غلطی تھی۔ اسے مجھے نہیں روکنا چاہیے تھا، جبکہ میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ باہر کون لوگ ہو سکتے ہیں مگر لڑکی کے ساتھی پولیس اہلکار نے آگے بڑھ کر ایک دم ہی دروازہ کھول دیا تھا اور یوں وہ بڑی سفاکی کے ساتھ بروجیٹ کی درندگی کا شکار ہو گیا تھا، لیکن اس کے بعد مجھے فوری طور پر حرکت میں آنا پڑا تھا کیونکہ اسپیکٹرم کے یہ تینوں خطرناک اور خونی ایجنٹ میرے اور روڈلف کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ ہاں! اس وقت ایک خیال میرے ذہن میں اس کے متعلق ضرور اُبھرا تھا، لیکن پھر یہ سوچ کر کہ شاید وہ بھی اس خون ریز جنگ کا شکار ہو گئی ہو، میرے ذہن سے محو ہونے کا سبب بنا تھا۔

مگر اس کا اچانک منظرِ عام سے غائب ہونا ہی اس کا ذہن سے محو ہونا تھا، مگر یہ اتنی بات آج ایک فاش غلطی کی صورت میں میرے سامنے آ گئی تھی جس نے میرے ذہن میں ایسے اَن گنت سوالوں کو جنم دیا تھا جس نے اُلجھا کر رکھ دیا۔

"مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن کیا اس لمبی چوڑی تفتیش کا مجھ سے یا میرے ساتھی سے کوئی تعلق بنتا ہے؟" بالآخر میں نے اپنے اندر کی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے کیپٹن رانسے کی طرف دیکھ کر اسی ناگواری سے کہا۔

"ممکن ہے کہ نہیں بنتا ہو، لیکن ہم بعض قانونی کارروائیوں سے مجبور ہیں اور اب برائے کرم ہمارے ساتھ تعاون کریں اور ہمیں کسی سختی پر مجبور نہ کریں۔"

"میں اس سلسلے میں ہائی کمیشن کو اپنا احتجاج ضرور ریکارڈ کرواؤں گا۔" میں نے دھمکی دی۔ وہ بھی ڈھیٹ تھا، بولا۔

"آپ اس کا حق رکھتے ہیں۔"

میں نے ایک عام آدمی کی طرح جتنا احتجاج کرنا تھا کر لیا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ جانا ہی تھا۔ کسی قسم کا پنگا لینا یوں بھی میرے حق میں بہتر نہ ہوتا، جو اُسے میری جانب سے مزید شکوک و شبہات میں مبتلا کر ڈالتا۔

"ٹھیک ہے آفیسر! لیکن کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ پہلے میرا ساتھی بھی آ جاتا؟" بالآخر میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس سے کہا۔ "مجھے اس کی طرف سے فکر رہے گی کہ وہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟"

"اس کی فکر نہ کرو، خود ہمیں بھی اس کی ضرورت پڑے گی۔" وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "میں یہاں ایک پیغام چھوڑے جا رہا ہوں، وہ آیا تو ہوٹل کی انتظامیہ ہمیں فوراً مطلع کر دے گی۔"

وہ مڑا۔ اس کے دونوں ساتھی اہلکاروں پال اور ڈیلا نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

ہم باہر کھڑی سفید اور نیلے رنگ کی انٹرکولر میں سوار ہو گئے۔ پال نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ کیپٹن رانسے اور ڈیلا میرے دائیں بائیں، عقبی سیٹ پر بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔

میرے ذہن میں مسلسل دھماکے ہو رہے تھے۔ کوکینی کے اچانک ذکر نے میرے اندر کئی سوالات کو جنم دیا تھا۔ میرے جی میں تو آئی کہ اس خرانٹ پولیس آفیسر سے کوکینی کے بارے میں یہ تو پوچھ ہی لوں کہ وہ اب ہے کہاں؟ لیکن میرا یہ سوال اس کے شبہے کو تقویت دینے کا باعث بنتا اسی لیے میں نے خود کو یہ سوال پوچھنے سے باز ہی رکھا۔

کوکینی کے حوالے سے ایک اہم سوال یہ بھی ابھرتا تھا کہ اگر وہ زندہ تھی تو پھر وہ کہاں تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اُسے دانستہ یہاں نہیں لایا گیا ہو اور وہ اس وقت پولیس ہیڈکوارٹر میں موجود ہو؟ تاکہ میری اس کے سامنے "شناخت پریڈ" کرائی جائے؟ ایسی صورت میں تو میرے پولیس کے نرغے سے بچنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتی۔

لیکن پھر اگلا سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر کوکینی زندہ تھی تو پھر اب تک کہاں تھی وہ؟ ٹوپر نے تو چلو ہمارے حلیے پولیس کو غلط بتائے تھے، مگر کوکینی...... کیسے میرے اور روڈلف کے حلیے غلط بتا سکتی تھی؟ پتا نہیں یہ سب کیا چکر تھا، مگر اتنا ضرور تھا کہ کوکینی کی صورت میں ایک بڑی مشکل بلکہ مصیبت میرے گلے پڑنے والی تھی۔

پولیس سے لڑ کر میں اپنی امریکا روانگی کا معاملہ کھٹائی میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا، مگر میں نے جتنا اس بات سے بچنا چاہا

تھا کہ یہاں میرا نام پولیس میں نہ آیا اُتنا ہی میں پھنس گیا تھا۔ مگر اب بھی ایک اُمید تھی کہ کچھ ایسا ہو سکتا تھا جس سے میری گلوخلاصی ہو سکتی تھی مگر کیسے؟

☆☆☆

پریشان کن سوچوں اور اندیشناک وسوسوں سے لبریز یہ سفر نصف گھنٹے بعد ہی ایک بڑی سی عمارت پر اختتام پذیر ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی سی دو منزلہ چوکور عمارت تھی، رنگ اس کا نیلا اور سفید تھا۔ زیادہ تر عمارتی لکڑی اور شیشے لگے نظر آ رہے تھے۔ ایک وسیع و عریض احاطہ تھا۔

قصہ کوتاہ...... میں ان کی سنگت میں ایک بڑے سے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کو عام ملاقاتی یا پوچھ گچھ کا کمرا کہا جا سکتا تھا، مطلب یہ کہ کمرا ایسا کچھ ظاہر نہیں کرتا تھا جہاں کسی عادی یا ہسٹری شیٹر کو لایا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ میرے سلسلے میں ابھی یہاں کی پولیس ابہام کا شکار تھی، تاہم سردست تو ان سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔

مجھے رہ رہ کر کوکینی کا خیال پریشانی اور تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ اگر وہ بھی یہاں تھی اور اسے مجھے پہچاننے کے لیے میرے سامنے لایا جاتا تو...... کیا ہوتا......؟ سب ملیامیٹ ہو جاتا۔ اسی خدشے تلے میرے دل میں بے چینی ہو رہی تھی۔

مجھے پانی کا گلاس پیش کیا گیا اور اس دوران ایک اور افسر بھی وہاں آ گیا۔ یہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ اس نے بھی میرے سامنے کرسی پر براجمان ہونے کے بعد کچھ سوال مجھ سے پوچھے تھے، جن کا لب لباب کم و بیش انہی سوالوں سے متعلق تھا جو کیپٹن رانسے مجھ سے پوچھ چکا تھا۔ وہ ان کا بھی کوئی سینئر افسر دکھائی دیتا تھا۔

"بس! اب ہم آپ کو مزید زحمت نہیں دیں گے۔" بالآخر وہ سینئر افسر آخر میں مجھ سے بولا اور میرے سینے میں اٹکتی ہوئی سانسیں ایک دم رواں ہو گئیں۔

"لیکن...... تھوڑی سی زحمت دیں گے۔ آپ ہمارے ساتھ ایک کمرے میں چلیں۔" اس نے آخر میں یہ کہہ کر مجھے پھر فکر میں مبتلا کر دیا۔ "دراصل ہم کوکینی کے سامنے تمہیں تھوڑی دیر کے لیے پیش کریں گے۔"

اس کی بات سن کر ایک بار پھر میرا دماغ سن ہونے لگا۔ یہی تو وہ آخری اور سنگین ترین مرحلہ تھا جو مجھے ایک نئی مصیبت سے دوچار کرنے والا تھا۔ میں بہرحال ان کے ساتھ چلتا ہوا ایک طویل راہداری سے دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کی پیشانی پر درج "وارڈ روم" دیکھ کر چونک پڑا۔ وارڈ روم سے پتا نہیں یہاں ان کی کیا مراد تھی؟ البتہ اس کمرے کے دروازے پر لگے اسپتالوں والے مخصوص سرخ نشان کو دیکھ کر میں ضرور چونکا تھا۔

ہم اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہی چار بیڈ لگے ہوئے تھے۔ دو خالی تھے۔ ایک پر کوئی مرد لیٹا ہوا تھا، جس کی پیشانی پر بینڈیج بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ سو رہا تھا شاید یا پھر بے ہوش تھا۔ تاہم اس کے برابر والے سفید بستر پر جس لڑکی کو میں نے دیکھا، اس نے مجھے ٹھٹکا دیا۔

میرے بدترین اندیشے درست ثابت ہونے لگے تھے۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کا نام کیپٹن رانسے نے "کوکینی" بتایا تھا اور جو اُس روز اپنے بدنصیب ساتھی پولیس نوجوان کے ہمراہ ٹوپر والے مکان میں آئی تھی۔ مگر میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ اس کی ہیئت کذائی ہی ایسی تھی۔

اگرچہ مجھے یہاں کے ماحول سے ہی اندازہ...... ہو چلا تھا کہ یہاں شاید زخمیوں کو تفتیش وغیرہ کے لیے لایا جاتا تھا اور فرسٹ ایڈ کی بھی سہولت موجود تھی۔ یہاں مجھے ایک نرس اور میل نرس کے سفید گاؤن میں ڈاکٹر بھی نظر آیا تھا۔

کوکینی کی بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کے پاس ہی وہ ڈاکٹر اور نرس موجود تھی جبکہ میل نرس قریب والے بیڈ کے مریض کے وائٹلز لینے میں معروف تھا۔

کوکینی کی حالت مجھے ایسی ہی نظر آ رہی تھی جیسے کوئی مخبوط الحواس مریض ہو جسے اپنے گرد و پیش سے کوئی تعلق نہ رہا ہو...... اس کے بال بکھرے بکھرے اور آنکھیں متورم تھیں۔ چہرہ بھی اس کا کچھ ایسی ہی تفسیر پیش کرتا تھا۔

کیپٹن اور وہ سینئر پولیس آفیسر میرے ہمراہ تھے۔ کیپٹن رانسے نے ڈاکٹر سے فلپائنی زبان میں کچھ کہا اس کے بعد ڈاکٹر اور نرس دوسرے بیڈ والے مریض کی طرف بڑھ گئے۔

مجھے سینئر آفیسر نے کوکینی کے بیڈ کے پیروں کی طرف کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور کیپٹن رانسے نے آگے بڑھ کر کوکینی کو سہارا دیا اور وہ بیڈ پر تکیے کے سہارے اُٹھ بیٹھی تو کیپٹن نے ذرا جھک کر اس کے کان کے قریب کچھ کہا اور میری جانب اشارہ کر دیا۔

کوکینی نیم مردہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اس کے سامنے پائنتی کی طرف کھڑا تھا۔ میرا دل اندر سے تیزی کے ساتھ دھڑ...... دھڑ...... کیے جا رہا تھا۔

یہ میرے لیے بہت نازک اور سنگین گھڑیاں تھیں۔ وہ مجھے پہچان سکتی تھی اور بالکل پہچان سکتی تھی...... جن دو

www.u ugem.com

افراد کی ان فلپائنی پولیس کو تلاش تھی اگرچہ وہ بظاہر کسی جرم میں ملوث نہ تھے لیکن اُصولی طور پر وہ ان کے دائرۂ تفتیش میں تو آسکتے تھے اور پھر آگے جانے کیا ہوتا؟ وہ حالات یقینی طور پر میرے لیے موافق نہیں ہوتے۔

کوکنی کی چپٹت کذائی دیکھ کر مجھے کچھ حوصلہ تو ہوا تھا، اگرچہ کیپٹن رانسے نے مجھے اس کی ''حالت'' کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ ضرور کہا تھا کہ وہ زندہ ہے اور اُن دو مشکوک افراد کو پہچان سکتی ہے۔ یہ اس کی چالاکی تھی، وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اتنے انکشاف پر کیا میں بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں یا نہیں...... شکر تھا کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

کوکنی میری طرف جیسے نیم مردہ آنکھوں سے دیکھتی رہی...... دیکھتی رہی...... اور کیپٹن رانسے، وہ سینئر آفیسر بھی ہم دونوں کی طرف باری باری سر گھما کر ڈرامائی انداز میں تکتے رہے۔

میں نے البتہ اپنے چہرے سے کسی قسم کی گھبراہٹ یا بوکھلاہٹ ظاہر نہیں ہونے دی تھی، اگرچہ اندر کی حالت ابتر تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب کیپٹن رانسے نے ایک بار پھر ذرا جھک کر بیڈ پر بیٹھی کوکنی سے کچھ کہا اور کوکنی نے میری جانب سے نظریں ہٹا کر خالی خالی نگاہوں سے پہلے اپنے گرد اور اس کے بعد کیپٹن رانسے کی طرف دیکھا پھر ایک ہذیانی سی چیخ حلق سے خارج کی اور بیڈ سے اُٹھنے لگی۔ مگر کیپٹن رانسے نے اسے سنبھال لیا اور ڈاکٹر اور نرس بھی اس طرف متوجہ ہوگئے۔

کوکنی کا یہ دورہ مختصر مدت کا ثابت ہوا پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ کیپٹن رانسے اور اُس سینئر آفیسر کے بشروں پر اُلجھن اور مایوسی کے سائے نمودار ہوتے میں نے نمایاں طور پر محسوس کیے تھے۔

''مسٹر شہزاد...... ! ہمیں اب تمہارے ساتھی کی ضرورت پڑے گی۔'' کیپٹن رانسے واپس کمرے میں آکر مجھ سے بولا تو میں بھی اب شیر ہوگیا تھا۔ سخت ناگواری مگر پورے اعتماد سے بولا۔

''آفیسر! آپ نے شناخت پریڈ کروالی میری...... کیا یہ کافی نہیں ہے؟ آپ کیوں میرا وقت ضائع کر رہے ہیں؟ میں جانا چاہتا ہوں، مجھے کئی بزنس میٹنگز میں آن لائن بھی رہنا پڑتا ہے۔''

''آپ کس قسم کا بزنس کرتے ہیں مسٹر شہزاد؟'' اس بار اس کے سینئر آفیسر نے مجھ سے مخاطب ہوکے سوال کیا۔ وہ دونوں میری کرسی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہمارے درمیان ایک مستطیل سی میز تھی۔

''میں ایک جہاز راں کمپنی میں ڈائریکٹر ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور مختصراً اسے اوڈیسہ شپنگ کمپنی کے بارے میں بتادیا۔

''میرا خیال ہے اب مجھے جانے کی اجازت دی جائے۔'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا اور کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں جانتا تھا کہ شناختی پریڈ کے بعد اب ان کے پاس مجھے روکے رکھنے کا کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔

کیپٹن رانسے کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا مگر میں نے دیکھا تھا کہ اس کے سینئر آفیسر نے اسے کوئی اشارہ کیا تھا۔ میں نے اپنی کرسی چھوڑ دی تھی مگر ابھی پلٹا نہیں تھا، یوں وہ دونوں بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور سینئر آفیسر نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''ہم آپ کے تعاون کے مشکور اور اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ ہم آپ کو یہاں لائے تھے اور اب آپ کو ہوٹل تک چھوڑنا بھی ہماری ہی ذمّے داری ہے۔''

میں نے ہولے سے ''تھینکس'' کہہ دیا۔ اب زیادہ اکڑ دکھانا مناسب نہ تھا۔

''میں انہیں چھوڑنے جاؤں گا۔'' کیپٹن رانسے نے کہا، پھر مجھ سے مخاطب ہوکے ٹھنڈی ہوئی متانت سے بولا۔ ''لیکن...... مسٹر شہزاد! آپ کو اپنے ساتھی کی گمشدگی کی رپورٹ پولیس میں درج کروا دینی چاہیے۔ یوں بھی آپ یقیناً اپنے گمشدہ ساتھی کو تلاش کیے بغیر امریکا کا سفر تو کرنا پسند نہیں کریں گے؟''

''یقیناً۔'' میں نے پورے اعتماد اور سنجیدگی سے کہا۔

''میرا خیال ہے میں چند گھنٹے اس کا مزید انتظار کرلیتا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ مجھے سوتا پاکر کہیں نکل گیا ہو اور بعد میں آجائے۔''

''اس صورت میں اُسے کمرے میں کوئی پیغام چھوڑ کر جانا چاہیے تھا۔'' کیپٹن رانسے فوراً کھاگ لہجے میں بولا۔

''ہاں! یہ بات تو ہے۔'' میں نے شانے اُچکا دیے۔

پھر اس نے ایک نمبر مجھے دیا اور ہدایتاً درخواست کی کہ جیسے ہی میرا ساتھی خود آجائے تو انہیں میں اس نمبر پر مطلع کردوں۔

میں جانتا تھا کہ یہ اس نے یونہی ''تکلف'' برتا تھا ورنہ تو وہ خود ہی ہوٹل والوں سے رابطے میں ہوگا اور انہیں بھی سختی سے یہی ہدایت کر رکھی ہوگی۔

اس کے بعد مجھے اسی انٹر کولر میں دوبارہ ہوٹل چھوڑ دیا گیا اور اس بات کی بھی تصدیق کرلی گئی تھی کہ روڈلف ابھی تک نہیں آیا تھا۔ کیپٹن رانسے واپس لوٹ گیا۔

میں کمرے میں آکر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر گرسا گیا۔

اعصاب شکن گھڑیاں سر دست ٹل گئی تھیں۔ مگر اس نے مجھے ذہنی طور پر شل کر کے رکھ دیا تھا۔ پولیس کی نظروں میں آنا بہرحال کسی طرح بھی اچھا نہیں ہوا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس خبیث کیپٹن رانسے نے ابھی تک مجھے کوکنی کے بارے میں بتانے کی زحمت تک گوارا نہیں کی تھی کہ اس کی یہ حالت کیوں ہوئی تھی؟ آخر کیوں؟ یہ دونوں خرانٹ آفیسر اس بات سے کیوں پہلوتہی کر گئے تھے؟ تاکہ میں خود پوچھوں......؟ اور یہ لوگ میرے اندر کا چور پکڑ سکیں؟ اچھا ہی ہوا کہ میں نے بھی اس معاملے میں اپنی کوئی دلچسپی ظاہر نہیں ہونے دی تھی۔

مجھے روڈلف کی طرف سے شدید فکر ستانے لگی تھی۔ نجانے وہ کم بخت کہاں چلا گیا تھا۔ وہ کون خاتون تھی جس کے ساتھ وہ کچے دھاگے سے بندھا چلا گیا تھا؟ جبکہ یہ بات بھی اب پولیس کے علم میں آچکی تھی جس کی وجہ سے مجھے بھی پابند کردیا گیا تھا کہ مجھے چند گھنٹے انتظار کرنے کے بعد بالآخر پولیس کو اس کی گمشدگی کی رپورٹ کروانا تھی۔

اس کے بغیر میری امریکا یاترا بھی مشکل نظر آرہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر استقبالیہ پر اس کے بارے میں پوچھا تھا اور وہاں سے لاعلمی کا اظہار کیا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اب ہوٹل کا اسٹاف مجھے عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ شاید اس کی وجہ پولیس کی معیّت میں میرا جانا اور آنا تھا۔ شاید اسی سبب شریف لوگ پولیس کے سائے سے بھی دور ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

رات ہوگئی۔ میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہا تھا۔ اچانک سائڈ بیڈ ٹیبل پر دھرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں پریشان کن خیالات کے بھنور سے اُبھرا اور ریسیور اُٹھالیا۔

استقبالیہ لڑکی کا فون تھا۔ ''سر! آپ سے کیپٹن رانسے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

ہلکی سی کلک...... کلک کی آوازوں کے بعد دوسری طرف سے کیپٹن رانسے کی آواز اُبھری۔

''یس مسٹر شہزاد؟'' انداز استفساریہ تھا۔

''یس شہزاد اسپیکنگ......'' میں نے جواب دیا

''کیا ہوا آپ کے ساتھی کا......؟ وہ لوٹا؟'' اس نے فوراً ہی سوال ٹھونک دیا۔

''ابھی تک تو نہیں لوٹا۔''

''تو پھر اس صورت میں آپ کو فوراً پولیس ہیڈ کوارٹر آکر اپنے ساتھی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانا چاہیے۔'' اس نے ٹھنڈے ہوئے لہجے میں کہا۔ انداز تحکمانہ تھا۔ میں نے بھی مصلحت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میں ابھی یہی سوچ رہا تھا۔ کیا آپ گاڑی بھیج رہے ہیں یا پھر مجھے خود ہی آنا پڑے گا؟'' میں نے آخر میں پوچھا۔

''میں گاڑی بھیج رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کردیا۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ کیپٹن رانسے میرا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہے۔ اس کی کوشش یہی لگ رہی تھی کہ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے قریب رکھتے ہوئے مجھ سے پوچھ گچھ کا موقع نکالتا رہے۔ مگر میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی آخر کیوں؟ اسے مجھ پر کس بات کا شبہ تھا؟ کیا وہ شناختی پریڈ سے بھی مطمئن نہیں ہوا تھا؟

ممکن تھا کہ وہ روڈلف کی اچانک اور پُراسرار گمشدگی کے باعث اب بھی مجھ پر شک کر رہا ہو...... اور اس سے (روڈلف سے) مطمئن ہونے کے بعد ہی کیپٹن رانسے میری جان چھوڑ دے؟

کاش! میں اُسے روڈلف کے بارے میں کچھ بتاتا ہی نہیں۔ نا ہی اس کی گمشدگی کا اسے پتا بھی چلتا، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے اس بچکانا خیال پر خود ہی ہنسی آگئی۔

وہ جب پہلی بار اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے معلوم کرلیا ہوگا کہ میں اکیلا ہی اس ہوٹل میں فروکش نہیں بلکہ میرے ساتھ ایک ساتھی اور بھی تھا۔ یہ جھوٹ بہرحال کھل جاتا تھا جو کیپٹن رانسے کے لیے مزید شک وشبے کا سبب بنتا۔

میں پولیس کی گاڑی کے انتظار میں تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک پڑا۔ پہلا خیال میرے تھکے ہوئے ذہن میں یہی اُبھرا تھا کہ شاید روڈلف لوٹ آیا ہے۔ پولیس کی گاڑی کا اتنی جلدی آنا بعید از قیاس تھا۔

UrduGem.com Urdu Novels, Books and much More

www.urdugem.com

میں جلدی سے اُٹھا اور آگے بڑھ کر بغیر پوچھے دروازہ کھول دیا اور سامنے کھڑے دو افراد کو دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ ان میں ایک تو روڈلف تھا جبکہ دوسری ایک عورت تھی۔ میرے چونکنے کا سبب یہی تھی۔

☆☆☆

میری یک ٹک سی نظریں اس ٹک سک سی عورت پر جم سی گئی تھیں اور اسی لمحہ میرے ذہن میں ایک جھماکا بھی ہوا تھا، کیونکہ اس عورت کا ناک نقشہ ویسا ہی تھا جو مجھے ہوٹل کی اس آپریٹر خاتون اور بعد میں استقبالیہ لڑکی نے بتایا تھا۔

”سوری بڈی! تمہیں میری وجہ سے تھوڑی پریشانی اُٹھانا پڑی۔“ روڈلف نے خجالت آمیز انداز میں مسکرا کر کہا۔ ”اب اندر بھی آنے دو گے یا اِدھر سے ہی کھڑے کھڑے ٹرخا دو گے۔“

میں نے ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ عورت کی عمر مجھے پچیس اور تیس کے درمیان محسوس ہوئی تھی۔ وہ چہرے مہرے سے عربی النسل لگتی تھی۔ رنگ صاف و شفاف تھا۔ سرو قد تھی اور نہایت ہی دلکش خدوخال کی مالک تھی۔

اس کے بھرے بھرے تراشیدہ ہونٹ قدرتی طور پر سرخی لیے ہوئے تھے اور چہرہ کتابی تھا۔ آہو چشم پر گھنیری سی پلکوں کا جال اور سرمے کی لکیریں جیسے تیر کی طرح کھنچی ہوئی نہایت کشش انگیز معلوم ہوتی تھیں۔ وہ کسی مصری یا ایرانی النسل شہزادی جیسے حسن اور طنطنے کی مالک نظر آتی تھی۔ تاہم اس کی شخصیت پر زیادہ چھاپ مجھے کسی منگولی دوشیزہ کی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا شاخِ گل کے مانند تراشیدہ جسم گویا کسی مصور کے موئے قلم سے نکلا ہوا شاہکار معلوم ہوتا تھا۔ سیاہی مائل گیسوئے دراز کو اس نے بڑے سلیقے سے ایک جدید اسٹائل کے سیاہ اور سفید والے پرنٹڈ اسکارف میں ڈھک رکھا تھا۔ تاہم اس کا گھنا پن بتاتا تھا کہ بال اس کے لمبے تھے۔ نیچے سیاہ رنگ کا عبایا اوڑھ رکھا تھا۔

سچی بات تھی کہ میں اس کے خیرہ کر دینے والے حسن اور رعنائی دیکھ کر ایک لمحہ کو متحیر سا ہو گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے وہ مسلم خاتون لگی تھی۔ لیکن ایک بات ضرور محسوس ہوتی تھی کہ اس کے حسن میں معصومیت کا دخل کم ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہی نہیں غزال آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی چمک اور تیزی محسوس ہوتی تھی۔

”السلام علیکم۔“

میں ابھی روڈلف سے اس کے بارے میں پوچھنے ہی والا تھا کہ اس کی مترنم آواز ابھری۔ اس نے مجھے سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام......“ میں نے جواب دیا۔ وہ میری جانب بڑے غور اور گہری نگاہوں سے تک رہی تھی۔ اس کے تراشیدہ ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکان رقصاں تھی۔

”تم کہاں چلے گئے تھے روڈلف......؟“ اس دیوی کے حسن کا سحر بالآخر میری اس پریشانی نے توڑ ڈالا جس کی وجہ سے میں اب تک پریشان اور متفکر تھا بلکہ پولیس کے چکروں میں پڑ چکا تھا۔ اسی سبب میں نے روڈلف کو لتاڑنے والے انداز میں مخاطب کر کے پوچھا۔

”تمہیں ناراض ہونے کا پورا حق حاصل ہے بڈی!“ وہ اسی طرح بے تکلفی سے مسکرا کر بولا اور پھر اپنے ساتھ کھڑی اس ملکۂ حسن کو قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔

”بات ناراضگی کی نہیں ہے روڈلف! مسلہ ایک اور گمبھیر معاملہ ہو گیا ہے۔“ میں نے بدستور اسی طرح ناراض ناراض سے لہجے میں کہا۔

”اوہو...... خیریت؟ ایسا کیا ہو گیا ہے؟“ وہ تھوڑا پریشان سا ہوا تو میں نے اسے جواب دینے کے بجائے پہلے ایک نظر اس اجنبی عورت کی طرف دیکھا اور پھر روڈلف سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ یہ خاتون کون ہیں؟“

”میں یاسمین خانم ہوں۔“ روڈلف سے پہلے اس عورت نے اپنی کھنکتی آواز میں خود ہی اپنا آپ تعارف کرا دیا۔ اسے صاف اور شستہ اردو بولتے دیکھ کر میں ششدر سا رہ گیا۔ روڈلف بھی میری طرف شرارتی نظروں سے دیکھنے لگا مگر شاید دانستہ چپ رہا۔ یاسمین خانم مزید بولی۔

”میرے بارے میں باقی آپ کو روڈلف تفصیل سے بتا دے گا۔“ کہتے ہوئے وہ خفیف سے انداز میں مسکرائی تو اس کے بائیں رخسار پر ہلکا سا گڑھا پڑا۔

”میں ان کے بارے میں تمہیں سب بتا دوں گا، پریشانی کی کوئی بات نہیں بڈی! لیکن پلیز، تم تو بتاؤ تمہیں یہاں کون سی پریشانی اُٹھانی پڑی ہے؟“ روڈلف نے بالآخر متفکر لہجے میں پوچھا تو میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے ساری بات بتا دی۔

میں نے دیکھا یاسمین خانم ہی نہیں بلکہ روڈلف بھی پریشان ہو گیا۔

”میں تو معاملہ تقریباً ختم کر آیا تھا۔“ میں آگے بولا۔ ”لیکن...... تمہارے اس اچانک اور پُراسرار غیاب نے پولیس کو پھر سے شک میں ڈال دیا ہے اور اب وہ کسی بھی وقت یہاں مجھے لینے کے لیے پہنچنے والی ہے، تاکہ میں ان کے ساتھ جا کر تمہاری گمشدگی کی رپورٹ لکھواؤں۔“

میں نے دیکھا روڈلف کے چہرے پر ایک دم پریشانی اور تشویش کے آثار مزید گہرے ہو گئے تھے۔ گو بات پریشانی ہی کی تھی...... لیکن اچنبھا اس بات پر تھا کہ جس قدر مجھے اس بات کی تسلی تھی کہ کوئینی اگر مجھے نہیں پہچان سکی ہے تو یقیناً اپنی حالت کے پیش نظر وہ روڈلف کو بھی شناختی پریڈ میں نہیں پہچان سکے گی۔ تب پھر روڈلف اس قدر کیوں پریشان اور متفکر ہو گیا تھا؟ لہٰذا جب میں نے اپنے اس خیال کا اظہار اس سے کیا تو وہ بولا۔

”ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن بڈی! تمہارے ذہن سے کوئینی اس لیے محو ہو گئی تھی کہ تمہارا اور اس کا سامنا محض چند منٹوں کا ہی رہا ہو گا، جبکہ میں اس کے ساتھ اس کے بالکل قریب موجود رہا تھا اور نہ صرف یہ بلکہ اسے سنبھالا بھی میں نے ہی تھا۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ مجھے پہچان کر چیخ نہ مار دے۔“

”سنبھالا تھا؟“ میری پیشانی پر پُرسوچ سی سلوٹیں اُبھر آئیں۔ ”کیا مطلب؟ وہ بھی اس روز زخمی ہو گئی تھی؟“

”زخمی تو نہیں ہوئی تھی مگر اپنے ساتھی کی اس بیدردی سے موت پر وہ شدتِ غم کے باعث اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اسے ایک دم سکتہ ہو گیا تھا۔ تم اس وقت بروجیٹ اور کیٹ سے نبرد آزما تھے۔ میں اسے کھینچ کر دوسرے کمرے میں لے گیا تھا اور کچھ دیر اس کے ساتھ رہا تھا، پھر کیٹ نجانے کس طرح اسی کمرے میں دندناتی ہوئی آ گئی۔ کوئینی کی حالت کے پیش نظر اس نے اسے چھوڑ کر مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔“

روڈلف کی بات سن کر میں چونکا۔ مجھے یاد تھا جب ٹوپر کے مکان میں یہ خوں ریزی چھڑی تھی اور میں کیٹ کے باقی دو ساتھی ایجنٹوں سے نبرد آزما تھا تو...... کیٹ کہیں غائب ہو گئی تھی اور بعد میں اسے گن پوائنٹ پر لیے مجھے مزید شوریدہ سری سے روکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”اگر یہ بات ہے تو میرا نہیں خیال کہ کوئینی تمہیں پہچان لے گی روڈلف!“

اچانک کرسی پر بیٹھی اس ملکوتی حسینہ نے بھی اپنے خیال کا اظہار یوں کر ڈالا جیسے وہ ہمارے ساتھ جانے کب سے ہو۔ جبکہ اسے یہاں آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے۔

”مجھے بھی یہی تسلی ہے، لیکن بس! ایک خدشہ ذہن میں سر اُبھار رہا ہے، خدا کرے کہ ایسا نہ ہی ہو اور کوئینی شہزی کی طرح مجھے بھی پہچاننے سے انکار کر دے۔“ روڈلف نے کہا۔ پھر وہ یاسمین خانم سے مخاطب ہو کے بولا۔

”میرا خیال ہے خانم! تم پولیس کے یہاں آنے سے پہلے چلی جاؤ، ورنہ......“

”اس کا اب کوئی فائدہ نہ ہو گا۔“ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھ کے بولی۔ ”ہوٹل کی انتظامیہ کو پولیس نے تم لوگوں کے سلسلے میں پہلے سے ہی الرٹ کر دیا ہو گا کہ کون یہاں تم سے ملنے کے لیے آتا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ پولیس کو مزید کسی شبہے میں ڈالنے کے بجائے انہیں ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے۔“

مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہ خاصی ذہین ثابت ہو رہی تھی مگر ساتھ ہی اس کی شخصیت میرے لیے معمایٔ ہوئی تھی۔

”آخر یہ ہے کون خاتون؟ اس کا تفصیلی تعارف کیوں نہیں کرواتے روڈلف؟“ میں نے جھلا کر روڈلف سے کہا۔ یاسمین خانم ہولے سے مسکرائی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم تینوں ہی ٹھٹکے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ پولیس آ گئی ہے۔“ میں خودکلامیہ انداز میں بڑبڑایا اور بے اختیار میری نظر یاسمین خانم پر پڑی۔ میری پیشانی کی سلوٹوں میں اضافہ ہو گیا۔

”فکر مت کرو، میں اپنے بارے میں بھی پولیس کو مطمئن کر لوں گی۔“ یاسمین خانم میرے چہرے سے پریشانی کو بھانپتے ہوئے فوراً ایک دلنشین مسکراہٹ سے بولی۔ مجھے اس کی ذہانت اور زیرک دماغی کا معترف ہونا پڑا۔

تب ہی میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ کم بخت کیپٹن رانسے خود آیا تھا، اس کے ہمراہ ایک ہی ساتھی تھا۔ دروازے سے ہی اس نے اندر ایک سے زائد افراد کی موجودگی دیکھ لی تھی۔

”میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔“ میں نے اس کی گردشی نظروں کو بھانپتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”میں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میرا ساتھی لوٹ آیا ہے۔ جیسا کہ مجھے اندازہ تھا، وہ کھویا نہیں ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“ کیپٹن رانسے نے ایکسرے کرتی نظروں سے مجھے گھور کر کہا اور اندر قدم رکھ دیا۔ میں

www.urdugem.com

اسے راستہ دے چکا تھا۔

”کیا تم ہی مسٹر روڈلف ہو؟“ کیپٹن رانسے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

”یس! ہی۔“ روڈلف نے مختصراً جواب دیا۔ وہ بھی سنجیدہ تھا۔

”آپ اچانک اور اپنے ساتھی کو بتائے بغیر کہاں غائب ہوگئے تھے؟“ کیپٹن رانسے نے یہ سوال کیا اور ساتھ ہی ایک نگاہ قریب بیٹھی یاسمین خانم پر بھی ڈالی اور پھر اسی پر جم گئی۔

”میرا ساتھی سو رہا تھا، میں اسے بتائے بغیر اپنی گرل فرینڈ یاسمین سے ملنے چلا گیا تھا۔“ روڈلف نے جواب دیا۔

”ہوں ں......“ کیپٹن نے سوچنے کے انداز میں اپنے حلق سے ہنکاری خارج کی اور یاسمین خانم ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفساریہ بولا۔

”شاید تم اسی خاتون کی بات کررہے ہو؟“

”بالکل۔“ روڈلف نے اسے پھر مختصراً جواب دیا۔

کیپٹن رانسے کی نظریں...... یاسمین خانم کے چہرے پر جیسے اٹک کر رہ گئی تھیں، تب ہی میں نے ہولے سے کھنکارتے ہوئے کیپٹن رانسے کو مخاطب کیا۔

”کیپٹن! میرا ساتھی لوٹ آیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے بھی میری طرح جلد فارغ کردیں تاکہ ہم امریکا روانہ ہوسکیں۔“

”مجھے اس خاتون سے بھی کچھ سوالات کرنا ہوں گے۔“

مجھے اس کی بات پر سخت غصہ آگیا مگر میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

”اس خاتون سے بھلا آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ جس سے میں خود بھی ناواقف ہوں؟“

میری بات پر وہ بڑے خبیثانہ انداز میں مسکرایا اور اسی انداز میں بولا۔ ”پھر تو اس بات کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس خاتون کو بھی ضروری پوچھ گچھ میں شامل کیا جائے، کیونکہ یہ تمہارے دوست روڈلف کی گرل فرینڈ ہے، مگر تم اسے جانتے تک نہیں۔“

گھاگ کیپٹن رانسے نے بڑی مکاری سے بال کی کھال نکالی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا اور ہمیں بالآخر گھیر گھار کر پھانسنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔

اس کے عزائم دیکھتے ہوئے دفعتاً میرے ذہن میں ایک چھناکا ہوا۔ ”کیوں......؟“

یہ ایسا کیوں کررہا تھا؟ جبکہ اسے ابھی تک ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا سینئر آفیسر بھی مجھ سے مطمئن ہوگیا تھا تو پھر آخر کیپٹن رانسے کیوں ہمیں مجرم ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا؟ یکایک مجھے کہیں گڑبڑ کی بُو محسوس ہونے لگی۔ ایسی گڑبڑ جو خطرے سے خالی نہ تھی اور اس کے ڈانڈے مجھے کسی اسراریت سے جڑے محسوس ہوتے تھے۔

میں غور سے کیپٹن رانسے کا چہرہ تکنے لگا۔ مجھے اس کی غلافی پپوٹوں والی آنکھوں میں ایک شیطانیت اور مردودیت کی ایک خاص چمک محسوس کی۔ میں ٹھٹک گیا۔ کچھ ایسا تھا ضرور...... جیسے وہ کسی موقع کی تلاش میں ہو۔

”آپ کا کیا نام ہے مس؟“ کیپٹن رانسے نے یاسمین خانم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میرا نام یاسمین خانم ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”چلو مسٹر روڈلف! مجھے اُمید ہے کہ تم وقت ضائع کیے بغیر اور کسی فضول بحث میں پڑنے کے بجائے میرے ساتھ چلو گے اور اپنی اس گرل فرینڈ کو بھی ساتھ لے چلو۔“

”میں بھی ساتھ چلوں گا۔“ میں نے تن کر کہا تو کیپٹن رانسے نے ایک لمحہ کے لیے برماتی نظروں سے میرے چہرے کو گھورا اور پھر دوسرے ہی لمحے عجیب سی مسکراہٹ تلے بولا۔

”یہ میں نے کب کہا کہ تم اِدھر ہی رہو گے، مسٹر شہزاد؟...... تمہیں بھی ساتھ چلنا ہے۔“

مجھے اس کے بولنے کا انداز استہزائیہ محسوس ہوا۔

روڈلف جانے کے موڈ میں نہ تھا۔ نہ ہی اس کی گرل فرینڈ یاسمین خانم، مگر طوعاً و کرہاً انہیں اٹھنا پڑا۔ مجھے روڈلف پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ ایک تو یہ بغیر بتائے پتا نہیں کہاں دفع ہوگیا تھا اور دوسرے اپنے ساتھ پتا نہیں یہ کس عورت کو لے کر یوں اچانک آن دھمکا تھا۔

ایک فکر مجھے یاسمین خانم کی طرف سے بھی ہونے لگی تھی کہ پتا نہیں یہ کون تھی، کیا بلا تھی؟ اور روڈلف کے ساتھ کیوں تھی؟ اگر اس کا کچا چٹھا ایسا کچھ کھلا تو کہیں اس کی وجہ سے میں اور روڈلف بھی نہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں؟

یاسمین خانم ہنوز میرے لیے معمّا بنی ہوئی تھی۔ نجانے کون تھی یہ اور اچانک کس طرح اور کیوں روڈلف سے آن ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ اچانک کیسے اور کیوں کر ”دوستی“ ہوچکی تھی، جبکہ روڈلف بھی اسے جاننے کا دعویٰ کیے ہوئے تھا، یا پھر ایسا اس نے پولیس کے سامنے مصلحتاً کہا تھا اور معاملہ کچھ اور ہو جس کے بارے میں صراحت بیان کرنے کا روڈلف کو موقع نہ ملا ہو۔

بہرکیف میں دوسری بار اور روڈلف اور یاسمین خانم پہلی بار پولیس ہیڈکوارٹر میں تھے۔

ہمیں اسی کمرے میں ہی لایا گیا تھا جہاں اس سے پہلے مجھ سے تفتیش اور پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ کیپٹن رانسے کے ہمراہ تین اہلکار بھی ساتھ آن کھڑے ہوئے۔ انہی میں سے ایک نے اس کے کان میں کچھ کہا تھا، جسے سن کر رانسے چونکا تھا اور پھر... انہیں وہیں چوکس کھڑا رہنے کا حکم دے کر وہ کمرے سے نکل گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے خطرے کی بُو محسوس کی۔ لحہ بہ لمحہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے میرے گرد غیر محسوس سا جال بُنا جارہا ہو اور اب اس کی ڈور کھینچنے کی دیر تھی۔

ہمیں وہاں موجود کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

تھوڑی دیر گزری، کیپٹن رانسے دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر اب فتح مندی کے تاثرات نمایاں تھے۔ مجھے اس پر بُری طرح طیش آرہا تھا۔

”یہ تم اچھا نہیں کررہے ہو کیپٹن رانسے! میں ہائی کمیشن میں شدید قسم کا احتجاج ریکارڈ کرواؤں گا اور تم جانتے ہو کہ اس سے تمہارے ملک کی کتنی سخت بدنامی ہوگی، نہ صرف یہ بلکہ اس کی تمام تر ذمے داری بھی تم پر ہی ہوگی۔“ بالآخر میں ایک دم اُبل پڑا تھا۔ ”تم ہمیں خوامخواہ پریشان کررہے ہو۔“

میری بات سن کر اس کے بدہیئت ہونٹوں پر پہلی بار بڑی زہریلی مسکراہٹ اُبھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔ ”پریشان تو ہم تھے، مگر اب لگتا ہے کہ ہماری پریشانی ختم ہوچکی اور تم لوگوں کی شروع ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا کیپٹن؟“ روڈلف نے منہ کھولا۔ اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور تین افراد اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک تو وہی سینئر پولیس آفیسر تھا، دوسرا کوئی ساتھی اہلکار جبکہ تیسرے شخص کو دیکھ کر...... تو جیسے میرا چہرہ ہی دھواں دھواں ہوگیا۔

☆☆☆

کیا آپ
لبوب مقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوّی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کرکے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

www.urdugem.com

تیسرا آدمی وہی تھا۔ درمیانہ قامت گنجا۔ کاسپاکو کے اُن تینوں ہرکاروں میں سے ایک، جسے میں نے چالاکی سے پہلے پہل تختۂ مشق بنایا تھا۔ ابھی میں اس ''شاک'' سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک اور شاک میرا منتظر تھا۔

ایک لیڈی پولیس جس عورت کو ان کے بعد لے کر اندر داخل ہوئی تھی، وہ لیوی تھی۔ ان کی ایک ماہ کی زرخرید ''میڈ کوگر'' (ملازمہ) جسے میں نے خوف زدہ کر کے اس مکان سے خاموشی کے ساتھ چلتا کر دیا تھا۔ وہ اب ایک وحشت کی علامت کے طور پر میرے سامنے تھی۔

میرے دل کو کیپٹن رانسے کی طرف سے جو کلبلاتی سی بے چینی لگی ہوئی تھی، اس کی وجہ رفتہ رفتہ سامنے آرہی تھی۔

گنجے کے باقی دو ساتھی یعنی دراز قامت اور دوسرا کہاں تھے؟ کیا مر گئے تھے؟ ایسی صورت میں بڑی خطرناک صورتِ حال پیش آنے والی تھی۔

مجھے امید نہ تھی کہ کاسپاکو کے آدمی یوں اچانک پولیس سے مدد لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیونکہ وہ خود مجرم تھے لیکن کوئی بات درمیان میں ایسی تھی جو اُن کے خفیہ گٹھ جوڑ کا پتا دیتی تھی۔

کیپٹن رانسے بھی انسان تھا جس کے ساتھ پیٹ لگا ہوا تھا اور حرص وطمع کا سودا بھی ضرور اس کے سر پر سوار ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کاسپاکو کے اشارے پر ہی یہ سب ہو رہا ہو اور نیز اس نے کیپٹن رانسے کو پیسے کے زور پر خرید لیا ہو۔

بہرطور آگے دیکھنا تھا کہ کیا ہونے والا تھا۔ تاہم یہ بات طے تھی کہ ہم بُری طرح پھنسنے والے تھے یعنی مجھے مار دھاڑ کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔

وہاں کچھ اور کرسیاں لاکر رکھ دی گئیں۔ اس بار سینئر آفیسر کے تیور بھی مجھے کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہے تھے۔ جبکہ کیپٹن رانسے کے چہرے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ آج پورا ڈراما ڈراپ سین کرنے کا تہیہ کیے بیٹھا ہے۔

ایسے میں میرا تیزی سے کام کرتا ہوا ذہن تیاسات کے سہارے گلوخلاصی کے ان سارے عوامل پر غور کرنے میں محو تھا جن سے مکتی ملنا ممکن ہو۔

''مسٹر شہزادا'' کیپٹن رانسے کے بجائے اس سینئر آفیسر نے مجھے گمبھیر لہجے میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہم سب کے میز کے گرد براجمان ہو جانے کے بعد سامنے والی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے برابر میں کیپٹن رانسے کرسی سنبھال چکا تھا۔

''ان دو افراد کو پہچاننے میں تمہیں یقیناً کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ ایم آئی رائٹ......؟ تاکہ میں آگے بڑھوں......؟'' اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے اس نے گنجے اور لیوی کی طرف اشارہ کیا۔ گنجے کا سینہ غیر معمولی طور پر مجھے پھولا پھولا محسوس ہو رہا تھا اور وہ کچھ اکڑا ہوا سا بھی نظر آتا تھا۔ اس نے سہارے کے لیے بینڈ واکر پکڑ رکھا تھا۔ وہ میرے ڈبل اسالٹ وار کی زد میں آیا تھا اور شاید یہ حالت اسی وجہ سے تھی۔

سینئر آفیسر کے اس طرح یقین اور اعتماد بھرے انداز میں مستفسر ہونا بتاتا تھا کہ اسے ''سب معلوم'' ہو چکا ہے، یا بتا دیا گیا ہے۔

میرے اندر ابھی تھوڑی دیر پہلے اَن گنت پریشانیوں اور اندیشوں کی جو لہر اُمڈی ہوئی تھی وہ اب تھمنے لگی تھی اور میں ایک دم پُرسکون نظر آنے لگا تھا۔

''بالکل اچھی طرح سے جانتا ہوں ان دونوں کو میں...... مسٹر......؟''

میں نے جیسے خم ٹھونک کر پورے اعتماد سے اس آفیسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا اور آخر میں استفساریہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ تب ہی میں نے دُزدیدہ نظروں سے اس کے ہمراہ بیٹھے کیپٹن رانسے کے چہرے پر اُلجھن کی شکن کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اسے میرا یہ انداز کھَل گیا تھا شاید...... اس کا خیال تھا کہ میں پریشان ہو کر بوکھلانے لگوں گا۔

''سینئر لیفٹیننٹ بوائڈ ڈکی......'' اس نے عہدے کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔

''یس مسٹر بوائڈ ڈکی!'' میں نے اس بار اسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے گویا اس کے سوال کے جواب میں جملہ مکمل کیا۔ ''میں ہی نہیں بلکہ میرا ساتھی روڈلف بھی...... ان دونوں کو صرف چوبیس گھنٹے کے دورانیے سے زیادہ نہیں جانتے۔ اس سے زیادہ ہماری ان سے کوئی واقفیت نہیں اور نہ ہی کوئی اور معاملہ داری ہمارے اور ان کے بیچ رہی ہے کبھی۔''

''یہ جھوٹ بول رہا ہے؟'' گنجا ہذیانی انداز میں چیخا۔

''جسٹ اے منٹ، اینڈ کیپ کول ڈاؤن پلیز......!'' ... سینئر آفیسر بوائڈ نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تفتیش کا سلسلہ جاری ہے۔''

تب ہی میں نے دیکھا کہ کیپٹن رانسے نے بپھرے ہوئے گنجے کو آنکھ کا خفیف سا اشارہ کیا تھا۔

''تو تمہارے کہنے کا مقصد ہے کہ تمہاری مس لیوی اور مسٹر ایلانو، مسٹر رابرٹ اور مسٹر شیراٹن سے جان کاری کی مدت صرف چوبیس گھنٹے کی رہی ہے؟'' بوائڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوری سر! میں اس نام کے کسی فرد کو نہیں جانتا۔'' میں نے مسکت جواب دے ڈالا۔ سمجھ تو گیا تھا میں کہ یہ کن تین افراد کے نام لے رہا ہے۔

''تو گویا تم اِن کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہو؟'' بوائڈ حیران ہوا۔

''اوہو...... اچھا! تو اِن کے نام یہ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اِٹس او کے۔'' معاً کیپٹن رانسے نے مداخلت کی۔ میں نے دیکھا وہ اب بری طرح خار کھائے ہوئے نظر آرہا تھا۔ ''ان تینوں کے ساتھ اپنی پچھلے چوبیس گھنٹوں کی واقفیت کی کہانی بھی سنا دو۔''

اس شاطر نے شاید تاڑ لیا تھا کہ میں کیا بیان دینے والا ہوں اسی لیے اس نے لفظ ''کہانی'' کو قدرے طنزیہ انداز میں ادا کیا تھا۔ تاہم اسی دوران میں مجھے بھی اس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ لیفٹیننٹ ڈکی قطعاً غیر جانبداری برتے ہوئے تھا۔ اگر ایسا تھا تو یہ میرے لیے ایک خوش آئند بات ہوتی۔

''یس سر!'' میں نے کہا۔ ''جب ہم ٹیلا ائرپورٹ سے اُتر کر ٹیکسی کرانے والے تھے تو...... یہ اچانک وہاں ایک کار میں آن دھمکے تھے اور ہمیں گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے گئے۔ ان کا ارادہ شاید ہمیں لوٹنے یا اغوا کرنے کا تھا۔'' میں نے تھوڑے سچ کے لبادے میں جھوٹ کو شامل کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ''اور وہ ٹیکسی والا جسے ہم نے روکا تھا، یہ صورتِ حال دیکھ کر یا بالفاظ دیگر خطرہ بھانپ کر اپنی ٹیکسی بھگا لے گیا۔''

''آفیسر......! اس ٹیکسی والے کی نمبر پلیٹ مجھے ازبر ہے۔'' اچانک ہی جیسے روڈلف نے ایک دھماکا کر ڈالا۔ میں اسے دھماکا ہی سمجھوں گا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ میرے لیے یہ بات سودمند جبکہ کیپٹن رانسے اور کاسپاکو اور اس کے حواریوں کے لیے غیر موافق تھی۔

روڈلف اگر سچ بول رہا تھا تو مجھے اس کی حاضر دماغی کا دل سے معترف ہونے میں کوئی عار نہ تھا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس فون نمبر: 0301-2454188
سرکولیشن منیجر...... سید منیر حسین 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

www.urdugem.com

''کیا واقعی تم نے اس ٹیکسی والے کی کار کا نمبر نوٹ کیا تھا؟'' سینئر آفیسر بوائڈ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل جناب!'' روڈلف نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کیپٹن رانسے کا چہرہ دھواں دھواں سا ہونے لگا تھا۔ اس نے سخت جرح کے انداز میں روڈلف کو چبھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال داغا۔ ''کیا اس ٹیکسی والے نے ان لوگوں کے ہاتھوں میں پستولیں دیکھی تھیں؟ یا اس نے تم دونوں کو گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے دیکھا تھا؟''

اپنے تئیں اس نے اہم نکتہ نکالا تھا مگر روڈلف کے بولنے سے پہلے میں نے جواب دینے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ کیپٹن رانسے نے ہاتھ کھڑا کر کے مجھے بولنے سے روکنے کا اشارہ کر دیا۔ میں نے احتجاجی نظروں سے بوائڈ کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے روڈلف کو مخاطب کر کے کہا۔

''ٹیکسی والے کا نمبر پلیٹ نوٹ کرواؤ۔''

روڈلف نے نمبر بتا دیا جو نوٹ کر لیا گیا۔ اسی وقت سینئر آفیسر بوائڈ نے ایک اہلکار سے، جس نے روڈلف کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کیا تھا، اس سے کان میں کچھ کہا اور وہ احتراماً سر جھکا کے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

''ہوم م......'' بوائڈ نے ہنکارا بھرا۔ اس کے بعد مجھے اور روڈلف کو باری باری بیانات لکھوانے کا حکم دیا۔ روڈلف میری چالاکی اور اس ڈرامے میں تیار ہونے والے موقف کو سمجھ چکا تھا۔ یوں ہمارا بیان ایک ہی رہا اور ہم اسی پر ڈٹے رہے۔ جبکہ گنجے کا یہ بیان سامنے آیا...... بقول اس کے ہم تھائی لینڈ میں کاسا پاکو سے کسی کاروباری ڈیل کے بہانے سے اسے لاکھوں ڈالر کا ''چونا'' لگا کر نکل بھاگے تھے۔

میں جانتا تھا کہ ان کے پاس پولیس کو یہی بیان دینے کے سوا ہمارے خلاف بولنے کو اور کچھ نہ ہوگا اور وہی ہوا۔ ظاہر ہے وہ انہیں حقیقت تو نہیں بتا سکتے تھے۔ ورنہ خود پہلے پھنستے۔ یوں ترپ کا پتا ایک بار پھر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ تاہم یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیپٹن رانسے کے ساتھ میرے اور روڈلف کے سلسلے میں کوئی خفیہ ساز باز کر چکے ہوں تو اور بات ہے، جس کا مجھے یقین بھی تھا، لیکن موقع یہی ان کے پاس ہوتا کہ ہمیں کسی قانونی پیچیدگی میں پھنسا کر انتقام لے سکیں۔

مثل مشہور ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے خود کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی دولت واپس نہیں لوٹاؤں گا اور یوں عازم سفر ہو جاؤں گا۔ اسی بنا پر یہ مجھے قانون کے شکنجے میں پھنسا لے گا اور اصل مطلب نکالے گا۔ یہ تو اس کے خیالوں خوابوں میں بھی نہ ہوگا کہ میں تو خود اس کا پیسہ لوٹانا چاہتا ہوں۔

لہٰذا میں نے بوائڈ کی طرف دیکھا اور نہایت اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''یہ لوگ اس حد تک بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ ہمارے اور کاسا پاکو کے درمیان بینکاک میں ایک کاروباری ڈیل ہوئی تھی۔ وہ کسی وجہ سے کینسل ہو گئی، لہٰذا میں ان کا پیسا لوٹانے کے لیے بالکل تیار ہوں۔''

یہ والا دوسرا دھماکا میری طرف سے تھا۔ کیپٹن رانسے کچھ دیر پہلے جتنا چالاک اور مکار بن رہا تھا اب ہونق زدہ سا نظر آنے لگا جبکہ گنجا تو جیسے ہک دک ہی ہو کے رہ گیا تھا۔

''تو کیا تم واقعی ان کا پیسا انہیں واپس لوٹانے کے لیے تیار ہو؟'' سینئر آفیسر بوائڈ نے قدرے حیرت اور بُردبار لہجے میں مجھ سے کہا تو میں نے بھی اسی انداز میں اسے جواب دیتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

''یس سر! اور میں جانتا ہوں کہ میں یہ بیان عام جگہ پر نہیں بلکہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ذمے دار افسران کے سامنے دے رہا ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ میری بات سے وہ الجھ کر رہ گیا۔

''تو پھر تم لوگوں کے بیچ میں ہاتھا پائی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جبکہ تم تو ان کا سارا پیسا لوٹانے کے لیے تیار تھے؟''

''بالکل درست، لیکن بہتر ہوتا آفیسر! کہ آپ یہ سوال انہی سے پوچھتے۔'' میں نے بوائڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس بار بوائڈ نے نہایت کرخت نظروں سے گنجے کی طرف دیکھا۔ گنجے کی حالت تو اب ایسی ہو رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، وہ جو کیپٹن رانسے کو دولت کے بل بوتے پر خرید کر میرے ساتھ جو چال چلنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ میں نے انہی پر ہی آلٹ دی تھی۔ وہ اب کیا جواب دیتے؟ تاہم گنجے نے منمناتی سی آواز میں ایک سفید جھوٹ بول کر جان چھڑانے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ بولا۔

''اس نے رقم لوٹانے سے انکار کر دیا تھا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''آفیسر......!'' میں نے براہِ راست بوائڈ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر

میں نے انکار کیا ہوتا تو اب بھی میں انکار کرتا۔ اس سلسلے میں بڑی دلچسپ بات آپ کو میں بتاتا ہوں۔ اس خطیر رقم کی ادائیگی کا ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت تو کجا ایک ذرا سا کاغذ بھی نہیں ہے کہ جس سے پتا چلے انہوں نے مجھے اتنی بڑی رقم کاروباری ڈیل کے سلسلے میں دی تھی، اگرچہ میں نے اس کا مشورہ بھی دیا تھا۔ (یہ میں نے جھوٹ بولا، کیونکہ گفتگو اور صورت حال کی نہج بدل گئی تھی) لیکن باوجود اس کے... سودا کینسل ہونے کے بعد میں وہ ساری رقم انہیں واپس لوٹانے کو تیار ہوں۔''

''تم دونوں کا بیان ہے کہ یہ لوگ تمہیں یرغمال بنانا چاہ رہے تھے؟'' بوائڈ نے چند ثانیے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچنے کے بعد مجھ سے کہا۔ میں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیوں؟ تم ایسا کیوں چاہ رہے تھے؟'' اب کی بار بوائڈ نے روئے سخن گنجے کی طرف موڑ دیا۔ گنجے کی چمکتی چندیا اور تنگ سی پیشانی پر ننھی منی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ جیسے ایک دم بولا۔

''ٹھیک ہے آفیسر! اگر یہ ہمیں رقم لوٹانا چاہتا ہے تو پھر جھگڑا ابھی ختم۔''

میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے لیکن شاید لیفٹیننٹ بوائڈ اب اُسے چھوڑنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

''جھگڑا تو ختم ہو چکا، مگر تم لوگوں نے انہیں یرغمال بنانے کا جرم کیوں کیا؟''

''ہم اس کے لیے معذرت چاہتے ہیں۔'' گنجے نے کہا۔ وہ پوری طرح سے ڈھے چکا تھا۔ کیپٹن رانسے بھی بے بس نظر آ رہا تھا۔ ان کی چال بُری طرح ناکام گئی تھی۔

''اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ ابھی تم اور تمہارے زخمی ساتھی زیرِ حراست رہیں گے۔'' بوائڈ نے اس سے کہا۔ پھر اس نے لیوی سے بیان لیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ ہم تینوں کو صبح تک گیسٹ روم میں رکھنے کا حکم ملا۔ ساتھ ہی گنجے کو بوائڈ نے ہدایت کی کہ وہ اپنے باس کاسا پاکو کو بینکاک سے فیلا آنے کا کہہ دے یا پھر خود ہی رقم کی واپسی کا معاملہ نمٹا لے۔ گنجے نے اس کی آخرالذکر بات سے اتفاق کیا تھا۔ وہ ابھی پولیس کی کسٹڈی میں تھا۔

مجھے، روڈلف اور یاسمین خانم کو گیسٹ روم میں پہنچا دیا گیا۔ یہ فریضہ کیپٹن رانسے اور اس کے دو ساتھی اہلکاروں نے انجام دیا تھا۔ بوائڈ نے ہمارے سفری کاغذات کا بھی جائزہ لیا تھا اور بعد میں وہ ہمیں لوٹا دیے تھے۔

گیسٹ روم پولیس ہیڈ کوارٹر کی چہار دیواری کے اندر ہی بنا ہوا تھا۔ یوں بالفاظِ دیگر ہم بری ہو چکے تھے۔ اگرچہ صبح تک کے لیے ان کی کسٹڈی میں ضرور تھے۔

گیسٹ روم خاصا کشادہ تھا۔ یہاں تین بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ضرورت اور سجاوٹ کی ہر شے سے مزین تھا۔ ایک آرام دہ ٹیبل صوفہ تھا، دو کرسیاں اور ایک کاؤچ۔ دو اٹیچ باتھ روم تھے۔ ایک وارڈ روب اور دو دیوار کیبنٹ تھیں۔ کمرے میں آ کر یاسمین خانم نے حبا اُتار لیا اور اسکارف بھی کھول لیا۔

اس کا خیرہ کن حسن مشرق و مغرب کا ایک دلآویز امتزاج دکھائی دیتا تھا۔ میں حیران رہ گیا تھا یہ دیکھ کر اس نے گرے کلر کی اسکن ٹائٹ جینٹ اور اُوپر اس کے پولو ٹائپ ریگولر (یعنی کھلی ڈلی) فل سلیولیس کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کا گلا قدرے کشادہ اور ڈی کی شکل کا تھا۔ تاہم اس نے کمر بیلٹ باندھ رکھی تھی جو اس کی اسمارٹنیس میں اضافہ ہی کر رہی تھی۔

میرے اندر کے جنگجو انسان کی آنکھ نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ مصری اور عربی ٹائپ کی حسینہ ہاتھ پاؤں چلانا جانتی ہے۔ اس کے پیروں میں حالانکہ اونچی ہیل والے جوتے تھے مگر وہ انہیں ''سنبھالنا'' ہی نہیں بلکہ ''چلانا'' بھی جانتی تھی۔

''جان چھوٹی بڑی! تم بتاؤ...... تمہاری رقم کا کیا بنا؟ تم نے پاکستان بات کی اس سلسلے میں......؟'' سکون سے اپنی نشستوں پر براجمان ہونے کے بعد ہی روڈلف نے مجھ سے پوچھ لیا۔

یاسمین کاؤچ پر کچھ اس انداز دلبری سے بیٹھ گئی تھی کہ وہ بیک وقت نیم دراز سی اور بیٹھی ہوئی بھی معلوم ہوتی تھی، جبکہ اس کی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر ٹکنے کے باعث اس کی کمر کا زاویہ بڑا دلکش اور صنفِ کرخت کے لیے خاصے کشش انگیز خم کی صورت قیامت بکھیرنے لگا۔ روڈلف اور میں نے کرسی سنبھال لی تھی، اس کی کرسی کاؤچ کے قریب جبکہ میری ان دونوں کے سامنے تھی۔

''پہلے تم میرے سوال کا جواب دو اور اس خاتون کے بارے میں مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' میں نے ایک نظر یاسمین پر ڈالتے ہوئے، جو ایک ٹک اور اپنے گلابی سرخ لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے میری جانب تکے جا رہی تھی، روڈلف سے مخاطب ہو کے مستفسر ہوا۔

www.urdugem.com

"آپ کو بتایا تو تھا، میرا نام یاسمین ہے...... پھر خاتون کہہ کر آپ مجھے کیوں بار بار مخاطب کر رہے ہیں؟" روڈلف کے بجائے یاسمین نے اسی انداز میں میری طرف تکتے ہوئے کہا۔

اس کی قدرتی کجراری آنکھوں کی پلکوں کی جھالر میں شکوے کا ایک لطیف سا جگنو چمکا تھا۔ مجھے اس کا انداز دلربانہ سا لگا۔ لیکن میں نے اس کا کوئی اثر لیے بغیر ایک سنجیدہ سی نظر اس پر پھینکی اور روڈلف کو مستفسرانہ نظروں سے گھورنے لگا۔ وہ میرے اس طرح دیکھنے کا مطلب سمجھ گیا تھا، مگر میں نے دیکھا کہ کچھ بے چین سا نظر آنے لگا۔ پھر اس نے مجھے ذرا منتظر رہنے کا انگلی سے خفیف اشارہ کیا اور اُٹھ کر کونے میں دھری ایک چھوٹی سی میز کی طرف بڑھ گیا۔

میں اور یاسمین اسے تکتے رہے۔ وہ میز پر اور پھر اس کی درازوں سے کچھ تلاشنے لگا۔ پھر اسے شاید مطلوبہ شے مل گئی۔ وہ ایک پین اور لیٹر پیڈ تھا۔ وہ پین سنبھال کر جلدی جلدی لیٹر پیڈ پر کچھ لکھنے لگا، پھر ایک نہیں دو صفحات پھاڑ کر اُٹھا، ایک صفحہ اس نے یاسمین کی طرف اور دوسرا مجھے تھما دیا۔ اس نے یاسمین کے لیے بھی کچھ "لکھا" تھا۔

میں سمجھ تو گیا تھا وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، تاہم جب پڑھا تو یقین بھی ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

"یاسمین خانم کے سلسلے میں تجسس اور پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے بڈی! اس کے بارے میں پھر کسی محفوظ وقت میں سب تفصیل سے بتادوں گا، یہ کمرا بگڈ ہو سکتا ہے اور مجھے کیپٹن رانسے کے عزائم ٹھیک نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

میں اس کی بات سے متفق تو تھا مگر میری بے چینی سوا ہو گئی تھی۔ اس نے شاید یاسمین کو بھی یہی کچھ ہدایت لکھ کر دی تھی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ لیے۔ یاسمین بھی روڈلف کا دیا ہوا پرچہ پڑھ رہی تھی اور پھر میں اس کی جانب تکتے ہوئے ذرا چونکا۔ اس نے روڈلف کو کوئی اشارہ کیا تھا۔ روڈلف دوبارہ میز کی جانب بڑھا اور وہاں رکھا ہوا لیٹر پیڈ اور پین لے کر اس کی طرف آیا۔

وہ بھی شاید کچھ لکھ کر کہنا چاہتی تھی۔ اس نے کاغذ لے کر جلدی سے کچھ لکھا اور روڈلف کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے پڑھ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

کمرے میں چند ثانیوں کے لیے گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کے بعد ہم آپس میں عمومی نوعیت کی باتیں کرنے لگے۔ لُب لباب یہی رہا کہ شاید کل تک ٹیکسی ڈرائیور کو بلا کر اس نے آخری بیان لینے کے بعد ہماری جان چھوٹ جاتی۔

رات ہو گئی تھی۔ ہمارے لیے ایک بڑی سی ٹرے میں کچھ کھانے پینے کو بھیجا گیا تھا۔ میرا تو دل نہ چاہا تھا، مگر روڈلف اور یاسمین خانم نے بھی ہاتھ نہ لگایا۔ ٹرے اسی طرح میز پر رکھی رہی۔

ہم سونے کے لیے بستر پر لیٹ گئے۔ وال کلاک رات کے بارہ بجا رہی تھی۔

نیند ہم میں سے کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ بتی ایک ہی جلتی چھوڑ دی گئی تھی۔ ایک گھنٹا مزید گزرا تو دروازے پر آہٹ ہوئی، ہم تینوں ہی چونک گئے۔ تب ہی دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کیپٹن رانسے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ایک ساتھی اہلکار بھی تھا۔

"مجھے پتا تھا تم تینوں جاگ رہے ہو گے۔" وہ ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔ اس کی آواز مدھم تھی۔ لہجے کی مکاری صاف عیاں تھی۔ ہم بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ کیپٹن رانسے نے اپنے ساتھ آنے والے ماتحت اہلکار سے کچھ کہا اور وہ فوراً پلٹ کر دروازے سے باہر چلا گیا اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے لگا تھا کہ وہ یہاں سے گیا نہیں تھا بلکہ باہر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اسے یہی ہدایت ملی تھی۔

اس کے بعد کیپٹن رانسے نے روڈلف کو بھی اشارہ کر دیا کہ وہ قریب آ کر میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھ جائے۔ وہ حیران و پریشان سا اپنے بیڈ سے اُٹھ کر میرے پاس آ کر پاؤں جھلائے بیٹھ گیا۔ یاسمین خانم کو البتہ اس نے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ میں اس کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ پتا نہیں یہ خبیث رات کے اس سمے ہم سے ایسی کیا بات کرنے آیا تھا؟

تھوڑی کرسی مزید ہماری جانب کھسکا کر کیپٹن رانسے بولا۔ "دیکھو، یہ مت سمجھنا کہ تم یہاں سے بچ کر چلے جاؤ گے تو خود کو آزاد سمجھ لو گے۔" اس نے نیچی آواز میں باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "کل صبح کی فلائٹ سے کاساپاکو خود منیلا پہنچ رہا ہے اور اس کے ساتھ خطرناک آدمیوں کا پورا ٹولا بھی ہو گا مگر وہ یہاں نہیں آئے گا۔"

"لیکن کیوں......؟ ہم نے تو اس کی رقم لوٹانے کا

اقرار کر لیا ہے، پھر اس سے ہمارا کس بات کا جھگڑا......؟" روڈلف نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی سی تھی۔

"درمیان میں مت بولو...... پہلے میری بات پوری سن لو۔" کیپٹن رانسے نے گھور کر اسے ٹوک دیا۔

"میں جو بات تم دونوں سے کہنا چاہ رہا ہوں، پہلے اسے غور سے سنو اور سمجھنے کی کوشش بھی کرو، کیونکہ اسی میں تم دونوں کا فائدہ ہے۔"

"آپ بات کریں، ہم سن رہے ہیں کیپٹن!" میں نے اس سے کہا۔

"تم جو رقم لوٹانا چاہتے ہو اس کی کاساپاکو کو بالکل بھی پروا نہیں ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "اسے صرف اپنے شکار کے اس نوالے کی فکر ہے جسے اس کے منہ سے چھین لیا گیا ہے۔" اس نے اشارتی زبان استعمال کی۔ جس کا مطلب میں سمجھ رہا تھا۔

"وہ شکار ابھی تک گومبورا میں ہی انٹرپول اور فلپائنی سٹی پولیس کی کسٹڈی میں ہے لیکن اگلے چند گھنٹوں بعد ہی اسے ایک کارگوشپ پر لانچ کر کے واپس تھائی لینڈ پہنچایا جانے والا ہے۔ کاساپاکو اس کارگوشپ کو ہائی جیک کرنا چاہتا ہے۔" وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میرے اندر شدید قسم کی اُتھل پتھل ہونے لگی۔ یوں میرے ان بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی تھی کہ کیپٹن رانسے خفیہ طور پر کاساپاکو سے ساز باز کر چکا ہے۔ کاساپاکو کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی۔ وہ ہر نسل کی "چمڑی" اور "وردی" والوں کو خریدنے کی پوری سکت رکھتا تھا۔ کاساپاکو کے "شکار" اور چھیننے والے "نوالے" سے اس کی مراد ظاہر ہے وہ منحوس مجسمہ ہی تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو کیپٹن؟" روڈلف نے اچانک حیرت سے آنکھیں اور منہ پھاڑتے ہوئے رانسے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم قانون کی وردی پہن کر ہمیں ایک گریٹ روبری پر اُکسانے آئے ہو؟ کتنے پیسے دیے ہیں تمہیں کاساپاکو نے؟"

"اپنی آواز نیچی رکھو مسٹر!" کیپٹن رانسے اس کی جانب گھور کر بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔ "کاساپاکو سے ی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"لیکن ہم یہ معاملہ ختم کر چکے ہیں۔ پولیس بھی ہم سے مطمئن ہو چکی ہے، ممکن ہو کہ ہم کل صبح تمہاری بھی اس ہیڈ انچارج آفیسر لیفٹیننٹ بوائڈکی سے شکایت کر دیں۔" روڈلف نے اسے دھمکی بھی دے ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی تہدید پر کیپٹن رانسے کے چہرے پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے بجائے ایک زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔

"تم لوگوں کی اطلاع کے لیے بتادوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی...... گھر جاتے ہوئے بوائڈکی کی کار کو حادثہ پیش آ گیا ہے اور وہ جانبر نہیں ہو سکا ہے۔"

یہ سن کر میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ روڈلف کا چہرہ بھی ایک دم سُت کر رہ گیا...... اس کی آنکھوں سے سفاکانہ چمک مترشح ہونے لگی تھی۔ اس افسوسناک خبر پر ہماری زبانیں جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

"اب میں ہی یہاں کا قائم مقام پولیس چیف ہوں۔" وہ بول رہا تھا اور میری سائیں سائیں کرتی سماعتوں میں اس خبیث کا ایک ایک لفظ ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔

"کل ٹیکسی ڈرائیور کو لایا جائے گا اور وہ تمہارے بیان کی نفی کر دے گا اور وہی کچھ بیان دے گا جو میں چاہوں گا۔ تمہارے وہ سارے بیانات بدل دیے گئے ہیں جو تم نے مسٹر بوائڈکی کو دیے تھے۔ کیونکہ کاساپاکو مجھے تم دونوں کی اصلیت پوری تفصیل سے بتا چکا ہے۔ میں نے اگر لمبی تفتیش اور تحقیقات کا دائرہ بڑھا لیا تو تمہاری موجودگی اور مجسمے کی چوری سے لے کر مجرموں سے گٹھ جوڑ کا سارا کچا چٹھا منظرِ عام پر آ جائے گا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے اسی وقت جواب چاہیے۔"

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ صورتِ حال میری سوچ سے بھی زیادہ گمبھیر ہو چکی تھی۔ کہاں تو میں سمجھ رہا تھا کہ اس منحوس کاساپاکو سے اب جان چھوٹ گئی اور پولیس سے بھی...... لیکن کاساپاکو اور اس کا چوری شدہ مجسمہ ایک بار پھر منحوس آسیب کی طرح ہمارے سر پر آن سوار ہوا تھا۔ بوائڈ کو کار کے حادثے میں مروانے کا اہم مقصد ہی یہی تھا کہ ہمارے موافق پڑتے حالات کو غیر یقینی کی فضا میں بدل کر ہمیں بالکل بے بس اور مجبور کر دیا جاتا۔

حالات ایکا ایکی ہی دشمنوں کے حق میں پلٹ گئے تھے اور اس میں بدطینت کیپٹن رانسے کا ہاتھ تھا۔

"ہمیں کیا کرنا ہو گا کیپٹن رانسے؟" بالآخر میں نے بظاہر شکست خوردہ سے لہجے میں کہا تو اس کی سؤر جیسی چھوٹی گول آنکھوں میں ایک دم شاطرانہ چمک اُبھر آئی۔ وہ ہم پر اپنی بالادستی قائم ہونے پر خوش ہو گیا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

"یہ تم نے عقل مندی کی بات کر کے خود کو اور وقت کو بچا لیا۔ مختصراً یہ کہ کاساپاکو صبح کی پہلی فلائٹ سے بینکاک سے یہاں... منیلا پہنچ رہا ہے۔ اس کے ہمراہ کچھ ساتھی بھی ہیں۔

www.urdugem.com

آرنائن اسٹریٹ میں واقع اس کے ٹھکانے پر جہاں تمہارا ان کے تین ساتھیوں سے ٹکراؤ ہوا تھا، وہیں پر تمہاری کاسپاکو سے ملاقات ہوگی، تم نے کاسپاکو کے ساتھیوں کے ساتھ اس کارگوشپ کو ہائی جیک کرنے کا پلان کرنا ہے اور بس......''

اس نے ''بس'' کا لفظ یوں استعمال کیا تھا جیسے ہم نے ٹیلا کے چڑیا گھر سے کوئی بندر نکالنا ہو۔

''اس کے بدلے میں ہمیں کیا ملے گا؟'' میں نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

''قانون اور کاسپاکو کے چنگل سے آزادی...... ہمیشہ کے لیے۔'' وہ بولا۔

''اس صورت میں پہلے میں قانون سے آزادی چاہوں گا۔'' میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے کہا۔ ادراک تو مجھے اس حقیقت کا پہلے ہی ہو چکا تھا کہ کاسپاکو اپنے مجرمانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے، کیپٹن رانسے کے آگے اچھا خاصا ''راتب'' پھینک چکا ہے اور وہ جلد سے جلد یہی چاہے گا کہ یہ معاملہ حل ہو جائے تاکہ وہ کاسپاکو کی ڈھیر ساری دولت سے بعد میں مزے سے عیاشیاں کرے۔ جلدی سے خوش ہو کر بولا۔

''یہ کام کل ہی ہو جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو۔ لہٰذا ابھی تم لوگ چند گھنٹے آرام کرلو، صبح ہوتے ہی تمہیں یہاں سے اسٹریٹ نائن والے مکان میں دوبارہ پہنچا دیا جائے گا۔ میرا کام ختم اور کاسپاکو اور تمہارا کام شروع......''

''ایگریڈ۔'' میں نے کہا۔

''ڈن۔'' اس کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا، تاہم رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

''لیکن...... ایک بات یاد رکھنا، کسی قسم کی چالاکی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے اور کسی بھی ناقابلِ تلافی نقصان کا سبب بھی۔''

''جب کاسپاکو خود ہی میدان میں اُتر آیا ہے تو میرا خیال ہے ایسی بات سوچنا بھی حماقت ہوگی۔''

''گڈ......!'' وہ مطمئن ہو کے چلا گیا۔

''ی ی...... یہ تم کیا کررہے ہو بڈی......؟'' اس کے کمرے سے جاتے ہی روڈلف فکر و تشویش سے سفید پڑتے چہرے کے ساتھ مجھ سے بولا۔ وہ بار بار اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ ''تمہیں پتا ہے یہ کام اب کس قدر خطرناک ہوگا؟ پولیس ہی نہیں، خود کاسپاکو بھی بعد میں ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا، یہ خبیث کیپٹن رانسے چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر کاسپاکو کے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ اسے ہماری کوئی پروا نہیں ہے۔''

میں اسے کوئی جواب دینے کے بجائے اُٹھا اور کاغذ پیڈ اُٹھا کر اس پر لکھا۔

''یہ کمرا بگڈ ہوسکتا ہے، تفصیل بعد میں......''

یہ کاغذ میں نے روڈلف کو تھما دیا اور وہ بُری تلملا کر رہ گیا۔

''تمہارے ذہن میں کوئی پلاننگ تو ہوگی ناں......؟'' اس بار یاسمین خانم نے مجھ سے کہا تو میں نے ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر اپنی اُنگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کردیا۔

روڈلف سر پٹخ کے اپنے بیڈ پر جا بیٹھا۔ میں خود بھی پریشان تھا۔ لیکن میں یہاں سے پہلے ''باعزت'' نکلنا چاہتا تھا۔

چڑنے کے بعد روڈلف اور یاسمین نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، اگرچہ وہ آپس میں تھوڑی دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے، میں جان بوجھ کر ان سے بے نیاز ہو کر اپنے بیڈ پر جا لیٹا سوتا بن گیا، تھوڑی دیر بعد ہی میں نے یاسمین کو کاؤچ پر ہی اور روڈلف کو بیڈ پر گہری نیند سوتے پایا اور آہستگی سے اُٹھا۔

یاسمین کی پینٹ کی جیب سے مجھے اس رُقعے کی جھلک صاف نظر آرہی تھی جو روڈلف نے اسے تھمایا تھا۔ وہ میں نے دبے پاؤں اس کے قریب جا کر نکال لیا اور جب اسے پڑھا تو چونک گیا۔

کمرا بگڈ ہونے کے خدشے سے روڈلف نے مجھے اور یاسمین کو لکھ کر کوئی خاص گفتگو کرنے کے لیے جو کاغذی پیغام رسانی کا مختصر سلسلہ شروع کیا تھا یہ اسی کی کڑی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس نے یاسمین کو اس بارے میں کیا ہدایت کی تھی؟

رقعے میں اس نے یاسمین کو مجھ سے خبردار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ''شہزاد سے محتاط رہنا اور ابھی اسے اپنے بارے میں کچھ بھی مت بتانا۔ یہ ایک تو عورتوں کے معاملے میں بہت ریزرو رہنے والا آدمی ہے، دوسرے یہ کہ...... یہ مشکل سے ہی کسی نئے شخص پر بھروسا کرتا ہے۔''

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ روڈلف نے میرے بارے میں آخر یاسمین کو یہ کیوں ہدایات لکھی تھیں؟ اور کیوں اسے اپنی حقیقت بتانے پر ابھی منع کر رکھا تھا؟ کیا روڈلف مجھ سے کسی قسم کا کوئی خفیہ چکر چلانے کا ارادہ رکھے

ئے تھا؟ یا پھر یاسمین خانم کے ساتھ مل کر مجھ سے غداری ر رہا ہے؟

میں نے یاسمین کا جوابی رُقعہ بھی سوئے ہوئے ڈلف کی جیب سے برآمد کرلیا۔ جس میں یاسمین خانم نے نا یا لکھا تھا۔

''مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف تم سے طلب ہے۔ اس سے جان چھڑاؤ، تاکہ ہم اپنی راہ لے یں۔ ہمارا مشترکہ مفاد اس سے زیادہ اہم ہے۔''

یاسمین کی یہ تحریر پڑھ کر میرے سینے میں ہلچل سی مچ گی۔ میں نے خاموشی سے ان کے ''گفتگو'' والے رُقعے ہیں ان کی جیبوں میں اُڑس دیے اور اپنے بیڈ پر آلیٹا۔ ر میری بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح ہمیں جگا دیا گیا۔ یہ کیپٹن رانسے کا وہی کل والا ت تھا۔ وہ ہمیں لے کر کیپٹن رانسے کے کمرے میں پہنچا۔ انسے نے روانگی کی تیاری کر رکھی تھی۔

پھر جب ہم پولیس کی گاڑی میں سوار ہونے کے ئے ایک لمبی سی سیاہ کار میں سوار ہونے لگے تو روڈلف ے کیپٹن رانسے سے کہا۔

''یاسمین خانم کا اس سارے معاملے میں کوئی قصور یں ہے، اسی لیے اسے جانے دیا جائے۔''

''ہرگز نہیں۔'' کیپٹن نے نفی میں سر ہلا کر صاف ار کردیا اور آگے بولا۔ ''اب یہ معاملہ اور ہو چکا ہے۔ تم ں کو ہی چلنا ہوگا۔''

پیش آئندہ حالات ایک بار پھر خونیں تصادم کی طرف رہ کرتے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔

جیسا کہ مذکور ہوا، ہمیں خفیہ طور پر ہی پولیس ہیڈکوارٹر ایک لمبی سی سیاہ کار میں سوار کروا دیا گیا تھا۔ کیپٹن نسے کو میں نے اپنی شرط ماننے پر مجبور کردیا تھا۔ اس نے ں سے ہمارا ''معاملہ'' صاف کردیا تھا۔

خود بھی وہ کار میں موجود تھا۔ وہ ڈرائیور کی برابر والی ٹ پر جبکہ ہم تینوں عقبی سیٹوں پر براجمان تھے۔ ہمارے مضبوطی کے ساتھ پشت کی سمت باندھ دیے گئے تھے۔

کار پولیس ہیڈکوارٹر سے نکلی اور سڑک پر آتے ہی ے بھرنے لگی۔ کیپٹن رانسے نے جس حد تک ہم سے ن کیا تھا، ہم نے بھی مشروط طریقے سے اس کا کہا مانا حقیقت یہی تھی کہ ہمارے پاس اس کی بات ماننے کے ئی چارہ نہ تھا۔ موجودہ حالات اب بھی غیر یقینی نظر ہے تھے۔ اُدھر کاسپاکو ہمارے انتظار میں تھا اور اِدھر روڈلف اور یاسمین نجانے کون سا پُراسرار چکر چلائے ہوئے تھے؟ میں خود کو ایک بار پھر تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ ہر کوئی اپنے اپنے کاز اور مقصد کے گرد گھوم رہا تھا، کوئی کسی کا ساتھی یا دوست نہ تھا۔ میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا، موقع ملتے ہی اب میں روڈلف کی بھی پروا کیے بغیر سیدھا امریکا سدھار جاؤں گا۔ اب میرا روڈلف سے بھی دل خراب ہونے لگا تھا۔ اگرچہ ابھی تک اس کی طرف سے کسی قسم کے دھوکے فریب یا غداری کے شواہد سامنے نہیں آئے تھے۔

کار سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی اور میرا ذہن اس سے زیادہ سوچ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا۔

ابھی ہمیں پولیس ہیڈکوارٹر سے نکلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک مختصر سی مارکیٹ کی درمیانی سڑک سے گزرتے ہوئے جیسے ہی عین شاہراہ پر آئے تو...... ایک انڈر پاس آگیا، جو آگے جا کر اسّی ڈگری کے زاویے سے دائیں جانب گھوم رہا تھا...... یہ انڈر پاس تقریباً ایک دو کلو میٹر طویل ثابت ہوا۔ اس سے نکلے تو کار مضافات میں نکل آئی، تب ہی میرا ذہن اچانک ٹھٹکا۔ میں نے دیکھا روڈلف بھی رسن بستہ حالت میں کھڑکی سے باہر کے اجنبی مناظر کو دیکھ کر چونکا تھا۔

''تم ہمیں کہاں لے جارہے ہو کیپٹن رانسے؟'' میں نے قدرے بلند آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ راستہ اس مکان تک تو نہیں جاتا جہاں تم ہمیں لے جانا چاہ رہے ہو؟''

''خاموشی سے بیٹھے رہو اور وقت کا انتظار کرو......'' وہ پیچھے گردن موڑے بغیر سرد لہجے میں بولا۔ نجانے کیوں مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ حالات وہ نہیں لگ رہے تھے، جو بتائے گئے تھے۔

''کیپٹن! ہم سے کسی قسم کا دھوکا تمہیں مہنگا پڑ سکتا ہے۔'' روڈلف ہذیانی انداز میں چلایا۔ شاید موت کے انجانے خوف اور پریشان کن تشویش نے اسے پاگل کردیا تھا، جبکہ یاسمین خانم خاموش بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر اتھاہ سناٹے کا راج تھا۔

کار کی رفتار یکلخت تیز ہوگئی تھی یا پھر کردی گئی تھی۔

ایک ویران موڑ کاٹتے ہوئے اچانک عقب سے ایک بھاری بھرکم جیپ ٹائپ گاڑی نے ہماری کار کو اوورٹیک کیا اور اس قدر کلوز کٹ مارا کہ ڈرائیور کا ہاتھ ایک لمحہ کو کار کے اسٹیئرنگ پر بہک گیا۔ نتیجے میں کار بُری طرح ڈگمگا گئی۔ ہمیں جھٹکا لگا۔ کیپٹن رانسے نے اپنے منہ

www.urdugem.com

سے جیپ سواروں کے لیے مغلظات کا طوفان بپا کیا اور ساتھ ہی کھڑکی سے سر اور ہاتھ باہر نکال کر آگے جاتی گاڑی کو انگوٹھا اُلٹا کر کے بھی دکھا دیا، مگر دوسرے ہی لمحے ہماری کار کے ڈرائیور کو یک دم بریک لگانا پڑے۔ کیونکہ وہ گاڑی آگے جا کر ہمارا راستہ روکے ایک دم جام ہو کے کھڑی ہو گئی تھی۔ ہماری کار کو ایک طوفانی جھٹکا لگا۔ اس کے ٹائر پختہ سڑک پر زور سے چرچرائے اور اس زوردار چیزنگ کے دوران ہی کار گھومتی ہوئی سامنے راستہ روکے کھڑی اس گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی اور نشیب کے کچے میں اُتر گئی۔

گرد و غبار کے ایک طوفانی بگولے نے ہماری کار کو اپنے مٹیالے حلقے میں لے لیا۔ ہمیں گھٹن اور کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کیپٹن رانسے نے اپنا سروس ریوالور نکال لیا اور ہلکا جھکتا ہوا کار کا دروازہ کھول کے نیچے اُترا۔ اس کی فوراً تقلید ڈرائیور نے بھی کی تھی...... اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔

ہم تینوں اپنی سیٹوں پر ہک دک سے جمے ہوئے بیٹھے رہ گئے۔ جیسے حواس ایک لمحے کو مختل پڑ گئے ہوں، لیکن میری نظریں کار کی ونڈ اسکرین سے متحرک ہوتی ہوئی پچاس ڈگری کے زاویے سے دائیں جانب کو گھومتی چلی گئیں، جدھر وہ لمبی سی جیپ سڑک کے درمیان کھڑی تھی، اور ہماری کار اس کے متوازی نشیب میں کچے پر اُتری ہوئی تھی۔

گرد و غبار کا طوفان ماند پڑا تو جیسے ایکا ایکی میرے رگ و پے میں موت کی سرسراہٹیں دوڑ گئیں۔ اس بھاری بھرکم جیپ سے تین چار افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے سیاہ چست لباس پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں جدید قسم کی خطرناک گنیں دبی ہوئی تھیں۔

کیپٹن رانسے اور ڈرائیور کو شاید بعد میں حالات کی خطرناکی اور سنگینی کا احساس ہوا تھا مگر تب تک شاید انہیں دیر ہو چکی تھی، پھر بھی وہ جیسے بڑھے تھے اسی طرح ہی خطرہ محسوس کرتے ہی واپس اپنی کار کی آڑ لینے کو پلٹے، حالانکہ ان کے ہاتھوں میں پستولیں دبی ہوئی تھیں، لیکن انہیں شاید فائر کرنے کے بجائے پلٹنے میں ہی اپنی عافیت نظر آئی تھی۔

میری دھڑکتی نظروں کے سامنے جیسے سلوموشن میں یہ منظر پلے ہوا تھا۔ ڈرائیور اور کیپٹن رانسے پلٹ رہے تھے، اسی وقت... اول الذکر ان تینوں مسلح افراد کے ہاتھوں میں دبی ہوئی گنیں یک بیک گرجیں۔ کیپٹن رانسے اور ڈرائی جسم اَن گنت لگنے والی گولیوں سے چھلنی ہو کے خون فوارے اُڑاتے لہراتے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ کی آخری چیخیں بڑی لرزہ خیز تھیں۔

ہم تینوں کو اندر جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ہمارے ہا ہنوز رسن بستہ تھے۔ میں نے زندگی میں خود کو اس قدر بس اور موت کے منہ میں سیدھا جاتے ہوئے پہلے کبھی دیکھا تھا۔

ان تینوں ہرکاروں کی بے دریغ اور لہو رنگ کاررو سے روڈلف اور یاسمین خانم کے چہرے سپید پڑ گئے۔ تم خود میری اپنی بھی کم و بیش یہی حالت تھی۔ وہ تینوں لہو سوداگر یہی خوف ناک کھیل ہمارے ساتھ بھی بہ آسانی کھیل سکتے تھے۔

وہ تینوں خونی ہرکارے اب اپنے آتشیں ہتھیارو کی پیاس بجھانے کے بعد ہماری جانب بڑھے اور گنیں تانے ہوئے قریب آ کر ان میں سے ایک نے کار سے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔

ہم تینوں رسن بستہ حالت میں تھے۔ روڈلف او یاسمین خانم کی تو بولتی بند ہو چکی تھی البتہ میں نے ذرا حو سے کام لیتے ہوئے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا ”ہم دروازہ نہیں کھول سکتے۔ ہمارے ہاتھ بند ہوئے ہیں۔“

تب ہی ایک نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھول اور پیچھے ہٹ گیا۔

ہم باری باری نیچے اُتر آئے۔ روڈلف اور یا خانم کی حالت ہنوز غیر ہو رہی تھی، موت تو مجھے بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ عین اسی وقت...... میری نظریں اسی جیپ کی طرف اُٹھیں۔ اس کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھرکم پاؤں، جس پر بوٹ چڑھا ہوا تھا، دروازے سے با زمین پر پڑا اور پھر دوسرا...... جب میری نظر جیپ اُترنے والے اس بھاری بھرکم شخص پر پڑی تو میں پل پل، ایک ٹک سناٹے میں آ گیا۔

میں اُسے پہچان چکا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

سیاہ رات

ارشد بیگ

راتیں خوب صورت... تاریک ہی نہیں ہوتیں... پُراسرار بھی ہوتی ہیں... بعض گزرتی راتیں یہ احساس اُجاگر کرتی ہیں کہ ان راتوں میں کوئی سحر پوشیدہ ہے... اسرار بھری ان راتوں کی سیاہی میں کئی راز دفن ہوتے ہیں... ایسی ہی ایک رات کا ماجرا... جس کی تاریکی میں کئی انوکھی... اَن دیکھی کہانیاں سوئی ہوئی تھیں...

جرم...... سرکشی اور انسان کی نیت کو عیاں کرتی پراسرار مہماتی کہانی......

زندہ دلانِ شہر لاہور میں ستمبر کی خوب صورت شام کا منظر ہمیشہ دلکش ہوتا ہے۔ جاتی گرمیوں کے دن اور آنے والی خزاں کے موسم سے لطف اندوز ہونے کی خواہش کئی دلوں میں جنم لیتی ہے۔

ہفتے کی اس شام ملازمت پیشہ لوگ اور اکیڈمی میں ٹیوشن پڑھنے والے طالب علم خوشی خوشی گھروں کو لوٹ رہے

www.u ugem.com

www.bookspk.site

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 49

www.bookspk.site

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خداترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فنگ، شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فنگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فنگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فنگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چملگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بےبس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹلسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا

www.bookspk.site

تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بےہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بےہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بےگناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسمِ نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بےہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسمِ نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ سے شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساپچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بےہوش کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کرکے خیلا پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ وہاں کاسپاکو کے ہرکارے اپنی گرفت میں لینے کے لیے موجود تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.bookspk.site

وہ بری قصاب سے جی کوہارا تھا۔

اس خطرناک اور سفاک درندے کا یوں اچانک اور غیر متوقع انداز میں سامنے آنا، بلاشبہ میرے لیے ایک ''شاک'' سے کم نہ تھا۔ اس شاک میں اندیشوں کی تشویش تھی اور نفرت وانتقام کا غیظ وغضب بھی۔

یہ انسان نما درندہ جس سے میری بے آف بنگال کے گہرے پانیوں سے لے کر انڈیمان کے پُرخطر جنگلات اور سنگلاخ ویرانوں میں بڑی خوں ریز جنگ رہی تھی۔ کبھی یہ مجھ پر حاوی رہتا تو کبھی میں اس پر غلبہ حاصل کر لیتا تھا لیکن یہ حقیقت بلکہ ایک طرح کی شکست مجھے تسلیم تھی کہ میں لولووش کے اس خونی ہرکارے سے ابھی تک معصوم بشام چھلگری کا بدلہ نہیں لے سکا تھا۔

ہاں! وہی بشام چھلگری جو محبِ وطن تھا جس نے وطنِ عزیز کی ایک نہایت بیش قیمت امانت طلسمِ نور ہیرے کی خاطر اپنی جان قربان کر ڈالی تھی۔ اسے سے جی کوہارا...... نے بڑی بیدردی کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا تھا۔ تب سے ہی میں نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے بشام چھلگری کی موت کا بدلہ ضرور لوں گا۔

یہ سب پل کے پل میرے ذہن کی اسکرین پر جیسے کسی یادگار منظر کی طرح ''ری وائنڈ'' ہوا اور پھر دوسرے ہی لمحے میرا ''اندر'' پُرسکون ہوتا چلا گیا۔ میرا دشمنِ دیرینہ ایک بار پھر میرے سامنے تھا اور میں اس سے ایک پرانا حساب چکانے کے لیے بے چین تھا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم مجھے بھولے تو نہیں ہو گے شہزی......!''

سے جی کوہارا اچانک ایک بدمست قہقہہ خارج کرتے ہوئے بولا۔ اس کی بھاری آواز میں رعونت اور طاقت کا وہی نشہ تھا۔ وہ بڑی تیز اور چبھتی نظروں سے میری جانب دیکھنے کے بعد ایک اچٹتی سی نگاہ روڈلف پر ڈالتے ہوئے جب یاسمین خانم پر اس کی نظریں پڑیں تو جیسے وہیں جم کر رہ گئیں۔

تب ہی اس کی اَزلی وحشت بھری آنکھوں میں گرسنہ چمک ابھر آئی تھی۔ اس کے بدہیئت موٹے ہونٹ معنی خیز انداز میں لمحہ بھر کو سکڑے تھے۔

میرے اندر ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں اس کی یہاں موجودگی کو سمجھ تو سکتا تھا لیکن...... یوں اچانک اس کا اس طرح حسبِ سابق خوں ریز انداز میں دوبارہ نمودار ہونا، سمجھ سے باہر تو نہ تھا لیکن غیر متوقع ضرور تھا۔

یاسمین خانم کے حسین اور ملکوتی سراپا پر اس کی گہری اور ہوس زدہ نظریں گویا پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ پھر اسے شاید میرا خیال آیا۔ وہ میری ہک دک سی کیفیات سے حظ اٹھانے کے انداز میں جملہ پورا کرتے ہوئے بولا۔

''تمہاری آنکھوں سے جھلکتا ہوا خوف اور رنگ بدلتا چہرہ بتا رہا ہے کہ مجھے یوں اچانک اور غیر متوقع انداز میں دیکھ کر تمہاری سکھ اور چین کی زندگی تمام ہوئی۔''

''کاش! تمہاری زبان مبارک ہوتی کہ مجھے سکھ اور چین نصیب ہوتا۔'' میں نے بھی رسن بستہ ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس لیے کہ مجھے آج تک ان دونوں چیزوں سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ ہاں! تمہیں دیکھ کر دل کو طمانیت اور سکون ضرور ملا ہے کہ انڈیمان میں تمہیں خاک چٹوانے کے بعد اب میں تمہیں یہاں منیلا کی چمکتی سڑکوں پر بھی رگیدوں گا۔ تم سے اب ایک آخری حساب بھی چکتا کر کے رہوں گا، بشام چھلگری کی دردناک موت اور اس کی فریاد ابھی تک میری سماعتوں کو چھلنی کیے ہوئے ہے۔ یہ تب ہی ختم ہوں گی جب میں تمہیں بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتاروں گا۔''

میری بات پر سے جی کوہارا کے چہرے پر غیظ کی سرخی ابھری۔ آنکھوں میں خوں خوار چمک کے ساتھ اس کے جبڑے اس قدر بھنچ گئے کہ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

وہ طیش میں آکر ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ بھی کر سکتا تھا۔ وہ ایسا ہی درندہ تھا لیکن اپنی فطرت سے میں بھی مجبور تھا۔ ایسے خونخوار اور بدترین دشمن کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر میں اپنے جوش کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

''شاید تم وہ سب بھلا بیٹھے ہو جب میں نے تمہارے ننگے، چھلے ہوئے زخموں پر مچھلی جھینگوں والا مصالحہ ڈالا تھا اور تم میرے پیروں میں گرے پڑے تھے۔ اب کون کس کو یہاں خاک چٹواتا ہے، یہ وقت خود بتائے گا۔'' کوہارا نے دانت پیس کر کہا۔

صاف لگتا تھا کہ وہ میری جوابی لفاظی پر اندر سے بری طرح کھول رہا ہے۔ مگر کسی مجبوری کے سبب ضبط سے کام لینے پر مجبور تھا۔

''اور...... شاید تم بھی یہ بھول رہے ہو کوہارا کہ اس کے بعد میں نے تمہاری لگژری یاٹ (yacht) سمیت تمہارے ساتھیوں اور تمہارا کیا حشر کیا تھا۔'' میں نے بھی اسے یاد دلا دیا۔ ''لیکن...... یاد رکھو اس بار تمہارا میرے ہاتھوں بُرا حشر ہونے والا ہے۔'' کوہارا حیرت انگیز طور پر

www.bookspk.site

اپنے طیش پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ میں نے اب بھی محسوس کیا تھا کہ وہ بار بار ہراساں ہرنی کے مانند کھڑی یاسمین خانم کی طرف گھور لیتا ہے۔

''یہ تمہاری ساتھی بہت حسین ہے، بالکل اس انڈین لڑکی سوشیلا...... کی طرح......'' اس نے بحث مباحثے اور لاف وگزاف سے ہٹ کر یاسمین کی طرف دوبارہ ہوسناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

سوشیلا کے ذکر پر میرا دل اسے یاد کر کے تھوڑا رنجور ہوا تھا۔ وہ میری انڈیمان کی پُرخطر مہم کی اچھی ساتھی رہی تھی۔ اب نجانے وہ بے چاری، کہاں اور کس حال میں تھی؟ تاہم ایڈوانی اور بلراج سنگھ کے جہنم واصل ہونے کے بعد مجھے امید تھی کہ وہ جہاں ہو گی خوش اور مطمئن ہی ہو گی۔

''یہ میری ساتھی نہیں ہے۔'' میں نے صاف گوئی کے ساتھ اور یاسمین سے بالکل ہی اجنبیت برتتے ہوئے کہا۔

''اچھا......!'' میری بات پر سے جی کوہارا نے طنزاً اور سوالیہ انداز میں اپنی چنگیزی مارکا بھویں اچکائیں۔ ''تو پھر اگر میں اسے اپنے ساتھ رکھوں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا مالِ غنیمت ہے۔''

یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے ہمراہ مستعد کھڑے اسلحہ پوش ہرکاروں کی طرف دیکھ کر تحکمانہ انداز میں کچھ کہا۔

وہ جیسے یکایک چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے۔ ہمیں دبوچا اور اس بھاری بھرکم جیپ کی طرف گھسیٹنے کے انداز میں لے چلے۔

روڈلف اور یاسمین خانم کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ تاہم مجھے اور سے جی کوہارا...... کو اس طرح جانے پہچانے انداز میں باتیں کرتے پا کر روڈلف کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے تھے۔ ساتھ ہی اس کی یاسمین خانم کے بارے میں آخری بات پر روڈلف اور یاسمین کے چہروں پر تاریکی سی اتر آئی تھی۔

روڈلف شاید پچھتا رہا تھا کہ اس نے اب تک یاسمین کے سلسلے میں مجھے اعتماد میں نہ لے کر بڑی غلطی کی تھی۔

بہرکیف ہم تینوں ہنوز رسن بستہ تھے۔ ہمیں جیپ کی درمیان سیٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ایک ہرکارہ ہماری عقبی سیٹ پر اسٹین گن سنبھالے بیٹھ گیا۔ کوہارا نے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ سنبھالی تھی۔ باقی ہرکارے نیچے ہی تھے۔ پھر میں نے انہیں کیپٹن رانسے اور اس کے ڈرائیور کی خون میں لت پت لاشوں کو سنبھالتے دیکھا۔ وہ انہیں اسی کی کار کی طرف اٹھائے چل دیے۔

میں کھڑکی سے بہ غور ان کی حرکات وسکنات دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اس بدبخت سے جی کوہارا نے طیش و غضب میں آکر اپنے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی یہاں منیلا میں ایک بڑی مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

ایک پولیس آفیسر کا یوں بہیمانہ قتل اور وہ...... جن کے ہم ساتھ تھے، پورے منیلا میں سب سے پہلے ہماری ڈھنڈیاں پڑ سکتی تھی۔

دوسرے ہی لمحے ایک امید افزا خیال بھی یہی کچھ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ کیپٹن رانسے خود ہی اپنی بددیانتی کے باعث اس خفیہ ڈیل کے نتیجے میں ''اندھیروں'' میں مارا گیا تھا جس کے لیے مجھے بلیک میل کر کے زبردستی اس کے لیے تیار کیے ہوئے تھا۔

مجھے یاد تھا کہ کاسپاکو کے ہاتھوں اپنے ضمیر کا سودا کرنے کے بعد پولیس آفیسر کیپٹن رانسے ہمیں چور راستے سے، آرنائن اسٹریٹ پر واقع اسی مکان پر پہنچانا چاہتا تھا جہاں بہ قول اس کے اگلے دن کی فلائٹ سے کاسپاکو بھی بینکاک سے منیلا پہنچنے والا تھا، یوں کیپٹن رانسے اس سے اپنی ''راتب خوری'' کا حق ادا کرتے ہوئے ہمیں اپنی سرکاری گاڑی کے بجائے کسی پرائیویٹ کار میں لے کر نکلا تھا۔

یوں کیپٹن رانسے سے اپنی یہ شرط منوا کر میں نے بلاشبہ دانش مندی کا ثبوت دیا تھا کہ پہلے مجھے پولیس ہیڈ کوارٹر سے پوری طرح بری الذمہ کروایا جائے، کیونکہ سینئر آفیسر بوائڈ نے ہمیں رہا کرنے کا باضابطہ حکم دے دیا تھا۔

اس کے بعد ہی میں اس کی (کیپٹن رانسے کی) بات مان سکتا ہوں۔ اس طرح یہ خفیہ ڈیل خود کیپٹن رانسے کے لیے اندھیروں کی موت مارے جانے کے مترادف ثابت ہوئی تھی۔

مجھے یقین تھا کہ کیپٹن رانسے نے یہ سب مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے کہا تھا تاکہ میں اس کی بات مان لوں۔ اس نے کوئی ردوبدل نہیں کی ہو گی نہ ہی وہ ایسا کر بھی سکتا تھا، کیونکہ سینئر آفیسر بوائڈ...... نے ہماری باضابطہ رہائی پر اپنی ''حادثاتی'' موت سے پہلے ہی عمل درآمد کرا دیا تھا۔

کیونکہ پاؤلا کوئینی کے سامنے میری شناختی پریڈ کرانے کے بعد بوائڈ میری طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا۔ یہ تو شکر تھا کہ پاؤلا کوئینی اپنے ساتھی ایجنٹ سارجنٹ ایملائے کی اندوہناک ہلاکت کے بعد اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی، تاہم ان کا خیال تھا کہ واقعے سے منسلک

مجرم افراد کو وہ پہچانتے ہی چیخ اٹھے گی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا، ورنہ کیپٹن رانسے اتنا بے وقوف نہ تھا کہ ”قیدیوں“ کو یوں پولیس ہیڈکوارٹر سے خفیہ طریقے سے پرائیویٹ گاڑی میں لے کر ایک مجرمانہ ڈیل کے لیے روانہ ہوتا۔ اسی لیے میں نے بھی اس پر زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ کیونکہ میں خود یہی سوچے ہوئے تھا کہ موقع ملتے ہی کیپٹن رانسے کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

بہرحال مجھے تسلی تھی کہ اب جو کچھ ہونے جارہا تھا، وہ سب پسِ پردہ تھا۔ میری کوشش تھی کہ کوہارا جیسی موذی مصیبت سے چھٹکارا پاتے ہی منیلا سے بہ خیر و عافیت فوراً کوچ کر جاؤں۔

لاشوں کو کار کی پچھلی سیٹ پر پھینکنے کے بعد ایک ہرکارہ ہماری جیپ کی طرف بڑھا اور اپنے ساتھی کے ساتھ سوار ہوگیا جبکہ ان کا تیسرا ساتھی کار اسٹارٹ کر کے دور افتادہ بنجر ویرانے کی طرف نکل گیا۔ وہ شاید دونوں لاشوں کو کار سمیت ٹھکانے لگانے گیا تھا۔

جیپ اسٹارٹ تھی۔ ڈرائیور نے کوہارا کے اشارے پر اسے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دیا۔

روڈلف بار بار گردن موڑ کے میرے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ شاید مجھ سے اس نئی مصیبت سے جی کوہارا کے بارے میں پوچھنے کے لیے بے چین تھا، کیونکہ اس نے اب تک میری اور کوہارا کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اسے اور وہ یعنی کوہارا ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہ اس کی وجہ بھی جاننے کے لیے بے قرار ہوگا کہ آخر یہ اچانک کیسے ٹپک پڑا تھا؟

اگرچہ مجھے بھی اسی بات کی حیرت تھی تاہم میں سمجھ سکتا تھا کہ لولوش کا خاص گماشتہ ہونے کے سبب سے جی کوہارا کو لولوش نے اپنے دو ”بڑوں“ اسٹاربک اور جوشوا کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد اسے میدان میں اتارا ہوگا۔ سے جی کوہارا یوں بھی مجھ سے ایک دیرینہ مخاصمت کے حوالے سے میرے لہو کی بُو سونگھتا پھر رہا تھا۔ جزائر انڈیمان کی جاں گسل مہم کے بعد وہ میرے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کے بعد برما کوچ کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

بہرکیف میں ابھی روڈلف کو اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ جبکہ میں خود ابھی اس نئے انداز کی پرانی مصیبت سے چھٹکارا پانے کی فکر میں تھا۔

ہمارا یہ سفر نامعلوم منزل کی جانب خاموشی سے جاری تھا۔ تب میں نے کوہارا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

”کوہارا......! کیا تم میری خاطر برما سے یہاں آئے ہو؟“

کوہارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید مجھ پر خاصا بھنّایا ہوا تھا۔ میں نے چند سیکنڈوں تک اس کے جواب کا انتظار کیا پھر اس بار استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”کمال ہے، تمہارا شکار بندھا بندھایا تمہیں مل گیا اور تم پھر بھی خود کو میرے سامنے بے بس اور مجبور محسوس کر رہے ہو۔“

میرے لفظوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا، اس کے حلق سے غراہٹ سے مشابہ آواز برآمد ہوئی۔ دوسرے ہی لمحے نے اس نے اپنا پستول نکالا اور سیدھے ہاتھ میں پکڑ کر نصف بدن کے پیچھے کی طرف موڑ کر پستول کی نال میری پیشانی پر رکھ دی۔

یاسمین خانم کے حلق سے گُھٹی گُھٹی چیخ سی برآمد ہوئی۔ خود میں بھی سے جی کوہارا کے اس آتش فشانی رویّے پر ایک لمحے کے لیے گنگ سا ہوگیا۔ تاہم میری نظریں اس کے لال بھبو کا چہرے پر جمی رہی تھیں۔ اس کے بدہیئت ہونٹوں کی باچھوں سے شدتِ غیظ تلے رال لکیروں کی صورت بہے نکلی تھی۔ وہ غضب ناک لہجے میں بولا۔

”کاش! ماسٹر لولوش نے مجھے تمہیں دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم دیا ہوتا تو میں تمہیں بہت پہلے ہی موت کے گھاٹ اتار دیتا۔“

”اچھا!“ میں باز نہ آیا۔ ”کیوں اپنی بے بسی اور لاچاری کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے ہو کوہارا......! مت بھولو کہ کئی مواقع پر تم مجھے ہلاک کر ہی چکے تھے، مگر عین وقت پر میں تم پر غلبہ پالیتا تھا۔ ورنہ تم نے مجھے جان سے مارنے کی کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی تھی۔“

میری اس لفظی دھنا دھن پر کوہارا کی آنکھوں میں لحہ بھر کو روایتی سی خوں ناک خونوار ابھری تھی مگر دوسرے ہی لمحے ماند پڑ گئی۔ اس نے معاً اپنے حلق سے ایک قہقہہ اُگلا اور پستول کی نال میری پیشانی سے ہٹا دی، پھر سیدھا ہو کے بیٹھ رہا۔ اس کا قہقہہ مارنے والا انداز بھی سفاکیت سے بھرپور تھا۔

”شہزی! تم میرے واحد دشمن ہو جس کے مقابلے میں مجھے چوہے بلی کے کھیل جیسا لطف آتا ہے اور طیش بھی۔ انڈیمان سے فرار ہونے کے بعد میں تمہارے پیچھے جانا چاہتا تھا۔ تاکہ موقع نکال تمہیں ہلاک کر کے اپنے سینے میں جلتی انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکوں، کیونکہ ماسٹر لولوش نے مجھے اس حد تک تمہارے سلسلے میں فری ہینڈ تو دے رکھا ہے کہ جان پر آجائے تو میں تمہیں بلا دریغ موت کے گھاٹ اتار دوں، مگر افسوس! چیف ماسٹر نے مجھے واپس میانمار (برما) پہنچنے کا حکم دے دیا اور میں ماسٹر کے حکم پر جان دیتا ہوں۔“

”ہوم......“ میں نے اسی طمانیت سے اس کی لاف و گزاف سننے کے بعد اپنے حلق سے آواز برآمد کی۔

”مزہ تو مجھے بھی یہی کھیل کھیلتے ہوئے تمہارے ساتھ آتا ہے کوہارا......! تو پھر تم مجھ سے ”ڈیول“ کیوں نہیں کر لیتے؟ میں ہلاک ہوگیا تو اپنے ماسٹر سے کہہ دینا تمہاری جان پر بن آئی تھی۔ اگرچہ تم ایک ایسا مقابلہ پہلے بھی میرے ساتھ کر چکے ہو جس میں، میں نے تمہیں خاک چٹا دی تھی۔“

میں بدستور اُسے طیش دلاتا رہا۔ اس کے حلق سے دوبارہ بھیڑیے جیسی غراہٹ برآمد ہوئی۔ مگر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

”بہت خوش فہمی ہے تمہیں شہزی! لیکن میں چیف ماسٹر سے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس کا حکم میرے لیے زندگی اور موت کا درجہ رکھتا ہے۔“

”چلو چھوڑو یہ باتیں، وقت بتا دے گا کون کتنے پانی میں ہے۔“ میں نے اپنے مقصد کی بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ”اتنا تو بتا دو نا یار......! یہ تم اچانک میانمار سے یہاں کیسے آن ٹپکے؟ کیا میری وجہ سے......؟“

”ہرگز نہیں......“ اس نے فوراً کہا۔ اس کے لہجے سے رعونت مترشح تھی۔ ”میں بہت پہلے سے ہی یہیں ہوں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم بھی اِدھر ہی اپنی خرمستیاں جاری رکھے ہوئے ہو، مجھے بہت خوشی ہوئی تھی یہ سن کر اور یہ یقین بھی تھا کہ بالآخر چیف ماسٹر...... تمہیں ٹھکانے لگانے کا مشن بھی مجھے ہی سونپے گا کیونکہ تم کسی کے ہاتھ آنے والے کہاں تھے۔ اور یوں میری یہ خواہش پوری ہوئی۔“

میں کہنا چاہتا تھا کہ ”کوہارا! میں تمہارے ہاتھ بھی کہاں آسکا ہوں اب تک......؟“ لیکن میں نے اسے اس قسم کی ”طفلیات“ میں مبتلا رہنے دیا۔ میرا سوال سب سے زیادہ اہم تھا۔ میرا شبہ درست نکلا تھا کہ وہ یہاں منیلا میں کسی اہم مشن پر تھا۔

اسپیکٹرم ایک آکٹوپس کا نام تھا۔ اس کے کارپرداز اس وقت بھی دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے اپنے اپنے مجرمانہ مقاصد کی تکمیل و حصول کے لیے خفیہ طور پر مصروف تھے۔ اسپیکٹرم کی آبیاری کرنے میں سے جی کوہارا بھی لولوش کا ایک اہم مہرہ تھا۔

”چلو، اچھی بات ہے۔“ میں نے چالاکی سے کہا۔ ”یہاں تمہارا مشن بھی یقیناً اہمیت کا ہی حامل ہوگا۔ تبھی تو تم جیسے آدمی کو یہاں بھیجا گیا۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔“ وہ اپنی تعریف پر غرور آمیز فخر سے بولا۔ مغرور لوگوں کی یہی فطرت ہوتی ہے، جب تک ان کے مزاج کے مطابق بات نہ کرو یہ ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتے۔ تعریف پر سینہ پھلا کر آسانی سے بے وقوف بن جاتے ہیں۔ آگے بولا۔

”میں یہاں چیف ماسٹر کے ایک اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ مجھے ایک بڈھے کی تلاش تھی۔“

”او...... بڈھے کی تلاش......؟“ میں نے بھویں اچکائیں۔ ”کیا اب تمہارے کام کرنے کا یہی معیار رہ گیا ہے کوہارا......؟“ میں نے اسے مزید بولنے پر اکسایا۔ ”یا پھر تمہارے ماسٹر چیف نے میرے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد تمہیں اس قسم کے گھٹیا کام کے لائق چھوڑ دیا ہے؟“

میری یہ بات اسے مشتعل کر سکتی تھی۔ لیکن مجبوری تھی۔ وہ پھٹ پڑنے پر مجبور ہوگیا، غرا کے بولا۔

”اب اپنی زبان کو لگام دے دو شہزی! ایسا نہ ہو کہ میں ماسٹر چیف کے اگلے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی تمہیں گولی مار دوں۔“

”او کے یہ بتاؤ اس بڈھے میں ضرور کوئی ایسی اہم بات تو ہوگی جس کے لیے تمہیں اس کی تلاش میں یہاں بھیجا گیا تھا؟“

”میں نے اسے تلاش کر لیا ہے اور وہ اب میری قید میں ہے۔“ اس نے کہا۔

اسی وقت جانے کیا محسوس کرتے ہوئے میں نے غیر ارادی طور پر اپنے ساتھ خاموش سے بیٹھے روڈلف اور یاسمین خانم کی طرف دیکھا تھا۔

ان دونوں کے چہروں پر سناٹے بکھرے ہوئے تھے۔ کوہارا کی آخری بات پر ان دونوں نے کچھ عجیب سے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ میرا اندر کچھ ٹھٹکا تھا۔ اچانک ڈرائیور کی مرتعش سی آواز نے گویا دھماکا کر دیا۔

”باس! شاید کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں آرہی ہے۔“

ان پُراندیش گھڑیوں میں کسی بھی قسم کی کشاکشی کی پوری توقع تھی۔

www.bookspk.site

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

www.bookspk.site

”گاڑی کی رفتار آہستہ کردو۔“ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے برابر والی نشست پر موجود سے جی کوہارا کی آواز ابھری۔

”کوبانگ، ہیتو، کار پر نظر رکھو، خطرہ محسوس ہوتے ہی بے دریغ فائرنگ کر دینا۔“

کوہارا کا دوسرا حکم ہماری عقب کی نشستوں پر براجمان اپنے دونوں ہرکاروں کے لیے تھا۔ اب جانے ان میں کون کوبانگ تھا اور کون ہیتو ......

اسی وقت میری تھکی ہوئی سماعتوں سے خودکار گنوں کی مخصوص آواز سنائی دی۔ روڈلف اور یاسمین خانم کے چہرے بخار کی سی کیفیات سے دوچار نظر آرہے تھے جبکہ میری رگوں میں لہو کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

”ہوشیار! کار قریب آرہی ہے۔“ سے جی کوہارا کی سانپ جیسی پھنکار ابھری۔

دھڑکتے لمحات کی کچھ گھڑیاں اور آگے کو سرکیں تو ڈرائیور کی اس بار خبردار کرتی آواز ابھری۔

چند لمحے بعد ہی وہ کار تیزی سے ہماری جیپ کو کراس کرتی ہوئی نکل گئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

”میرا خیال ہے کوئی پکنک گروپ تھا۔ رفتار بڑھالو۔“ کوہارا کی بڑبڑاہٹ ابھری۔

لیکن میرے اندر کے گھاگ ایجنٹ نے کسی جانے انجانے خطرے کی بُو بھانپ لی تھی۔

مجھے کوہارا کی عقل پر ماتم کرنا پڑا تھا۔ اس کے پاس واقعی دماغ نام کی کوئی شے نہ تھی۔ وہ صرف انسانی لہو کو بیدردی سے بہانا جانتا تھا اور اسی میں ہی اس کی خونی جبلت کو تسکین ملتی تھی۔ دوراندیشانہ سوچ اور حالات کی تجزیہ نگاری شاید اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ورنہ اسے سوچنا چاہیے تھا کہ اس دور افتادہ ویرانے میں ایک کار جو بہ قول ڈرائیور کے جانے کب سے ان کے تعاقب میں لگی ہوئی تھی۔ لیکن ان کی جیپ کی رفتار کم ہوتے ہی وہ کیوں تیزی سے آگے نکل گئی تھی؟ ضرور کار والوں نے ان کے شبہے کو باطل کرنے کے لیے ایسا کیا۔

میں نے ایک بار پھر محسوس کیا تھا کہ روڈلف اور یاسمین بے حد بے چین نظر آرہے تھے۔ پہلے کی نسبت ان کی یہ بے چینی کچھ پُراسرار قسم کی محسوس ہوئی تھی مجھے۔

جیپ کی رفتار پھر بڑھا دی گئی تھی۔ میرے جی میں آئی تھی کہ میں اس موٹے دماغ کے آدمی کوہارا کو یہ مشورہ دوں کہ وہ ان مشکوک کار والوں سے محتاط رہے۔ وہ آگے کہیں گھات لگا کر ہم پر اچانک حملہ کر سکتے تھے مگر میں خاموش رہا۔ مزید ذرا دیر تک سفر جاری رہا اور خیریت گزری۔

یہ اندیشوں بھرا سفر بالآخر ایک ایسی ویران سی جگہ پر ختم ہوا تھا جو آبادی سے دور اور ساحلِ سمندر کے قریب محسوس ہوتا تھا۔ یوں بھی یہ جگہ کسی پُرفضا مقام کا منظر پیش کرتی تھی، لیکن دور قریب میں مجھے کوئی آبادی، مکان یا بلس وغیرہ نظر نہیں آرہے تھے۔ جو ایسے مقامات کا حصہ ہوتے ہیں۔ ماسوائے اس ایک چوبی عمارت کے جو ایک بڑے ہٹ کا ہی منظر پیش کرتی تھی۔ جیپ اس کے قریب ہی رکی تھی۔

وہاں دو مزید مسلح افراد کھڑے دکھائی دیے تھے۔ جیپ کو دیکھتے ہی وہ بڑی مستعدی کے ساتھ لپکے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نے نہایت پھرتی سے سے جی کوہارا کی طرف کا دروازہ کھولا تھا اور نیچے اتر آیا۔

ہمیں بھی گن پوائنٹ پر نیچے اتار لیا گیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم پہلے ہی بے بس تھے۔

یہاں پہنچ کر میں اپنی عقابی نظروں کو تیزی سے گردش دینے لگا۔ میں یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش میں تھا کہ یہاں سے جی کوہارا کے کتنے مزید ہرکارے فروکش تھے۔ سردست ہٹ کے قریب یہی دو مسلح افراد ہی مجھے نظر آئے تھے۔ باقی اندر کتنے تھے، یہ ابھی پتا نہ تھا۔

ہٹ زیادہ بڑا نہ تھا مگر دیدہ زیب تھا اور اس کی بناوٹ بھی خاصی دلکش نظر آتی تھی۔ اس کے اردگرد کا علاقہ تقریباً کافی دور تک میدانی تھا۔ قریب میں پام اور سرو کے درخت نظر آتے تھے۔

اچانک میرے کانوں سے ایک تیز سیٹی جیسی آواز ٹکرائی۔ یہ کسی ٹرین کے انجن کی وسل تھی۔ گویا یہاں قریب کوئی ریلوے ٹریک تھا۔

راستے میں آتے ہوئے مجھے ایک سڑک کے کنارے ایک بورڈ ”کیتھڈرل آف منیلا“ کے نام کا لگا ہوا نظر آیا تھا جس کا مطلب تھا کہ یہاں سے قریب ترین یہی علاقہ پڑتا تھا۔ اپنے نام سے تو مجھے یہ کوئی پتھریلی عمارت یا کوئی چرچ ٹائپ کی چیز محسوس ہوئی تھی، ممکن تھا کہ یہ منیلا کی کوئی مشہور عمارت ہو۔

ہم تینوں کو اندر چلنے کا حکم ملا۔ ہم پر انہیں ہتھیار سیدھے کرنے کی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ ہمارے دونوں ہاتھ ہنوز پشت کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ ہٹ خاصا

کشادہ تھا اور ضرورت و آسائش سے متعلق ہر شے نظر آ رہی تھی۔

"ان دونوں کو ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ۔" کوہارا نے روڈلف اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ کہا۔ "اور...... اس شہزادی کو ساتھ والے کمرے میں لے جاؤ۔ میں جب تک ماسٹر سے بات کرلوں......"

کوہارا نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "اور...... ہاں! گوتم آجائے تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔"

"ہرگز نہیں...... یہ میری ساتھی ہے، میرے ساتھ ہی جائے گی۔" روڈلف نے فوراً غصے سے گھور کر کوہارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو کوہارا کو جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے سنسناتی ہوئی سی تیز اور خونخوار نظروں سے روڈلف کی طرف دیکھا تھا۔

"روڈلف! یہ انسان کی شکل میں ایک خونی درندہ ہے، ابھی چلو اور اس کے منہ مت لگو، بعد میں دیکھ لیں گے۔" میں نے روڈلف کے کان میں سرگوشی کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روڈلف، سے جی کوہارا جیسے ظالم آدمی کی بربریت کی بھینٹ چڑھ جائے۔ روڈلف میرا اچھا دوست تھا اور میرے کام کا بھی آدمی تھا۔ شکر تھا کہ اس نے میری بات مان لی تھی۔

کوہارا کے حکم پر کوبانگ اور ہیتو نامی ہرکارے فوراً ہی جیسے چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آ گئے۔ انہوں نے ہم دونوں کو اپنے آتشیں ہتھیاروں سے ٹھوکا دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ قدم بڑھا دیے۔

کوبانگ اور ہیتو ہمیں لیے ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔

یہ کمرا بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہلکے پھلکے فرنیچر سے آراستہ...... ہم اسی حالت میں ان پر براجمان ہو گئے۔ ہمیں یہاں لانے والے کوبانگ اور ہیتو نے آپس میں کھسر پُسر کی اور کوبانگ نے اپنے سر کو دھیرے سے اثباتی جنبش دی۔ اس کے بعد وہ دونوں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

ہمارے یہاں پہنچتے ہی میں اپنی سماعتیں بہ غور رکھتے ہوئے کوہارا کو اپنے ان دونوں برمی ہرکاروں کو مخاطب کرنے کے دوران ہی میں ان کے بارے میں جان چکا تھا کہ کون کوبانگ تھا اور کون ہیتو۔ یہ دونوں ہی برمی لگتے تھے۔ کوبانگ خاصے ڈیل ڈول کا مالک تھا اور ہیتو بھی کچھ ایسی جسامت رکھتا تھا۔ دونوں کے جسم گٹھے ہوئے مگر قامت درمیانی تھی۔

"تت...... تم اس کو جانتے تھے؟"

کوبانگ اور ہیتو کے کمرے سے نکلتے ہی روڈلف نے یوں سوال داغا جیسے یہ پوچھنے کے لیے جانے کب سے بے چین بیٹھا تھا۔

میں نے جواب دینے کے بجائے بڑی زہرخند نظروں سے روڈلف کو گھورا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔ "میرا اب تم دونوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ سمجھے تم......؟ لہٰذا مجھ سے کوئی سوال مت پوچھو۔"

روڈلف کچھ خفیف سا نظر آنے لگا۔ قدرے شرمساری سے بولا۔ "ہے بڈی! پلیز، ہم سے بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت آنے پر میں تمہیں سب بتانے کا تہیہ کر چکا تھا، لیکن پلیز، فارگاڈ سیک! یاسمین کی مدد کرنے کا کچھ سوچو پہلے......"

"بھاڑ میں جائے وہ......" میں نے بھنّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے اب اس خاتون کے بارے میں جاننے کی کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی ضرورت، سمجھے تم......؟"

"تو پھر تم نے کیوں مجھے منع کیا تھا۔" وہ بھی چڑ گیا۔

"اچھا! کیا بگاڑ لیتے تم اس قسائی کا؟ بولو......؟" میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "تمہاری بات پر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ بس! گولی مارنے کی دیر تھی تمہیں، کیا تم نے دیکھا نہیں، اس نے کیپٹن رانسے اور اس کے ساتھی کا کیا حشر کیا تھا؟"

روڈلف اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ اس کے چہرے سے شدید بے چینی، تشویش اور جھلاہٹ مترشح ہوتی تھی۔

میری نظریں ہنوز اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھیں۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کسی زبردست قسم کی اندرونی کشمکش کا شکار تھا...... پھر اس کے چند سیکنڈوں کے بعد ہی اس کا چہرہ پُرسکون ہوتا چلا گیا، جیسے وہ کوئی تہیہ کر چکا ہو۔

اس نے مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر بولا۔ "سنو، بڈی! یاسمین خانم کو بھی اپنا ساتھی سمجھو تم لیکن خدارا! اس کی مدد کرو۔"

"کس برتے پر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اور یاسمین، اس درندے نما انسان کوہارا کو نہیں پہچانتے مگر اس کے بارے میں جان ضرور گئے ہیں۔" وہ کچھ عجیب سے لہجے میں بولا۔ میں اس کی بات پر اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ روڈلف اور یاسمین، سے جی کوہارا کو پہچانتے نہیں تھے مگر جان گئے تھے۔ کیا مطلب تھا اس کی بات کا؟

"میں کچھ سمجھا نہیں......؟" بالآخر میں نے پوچھ لیا۔

"کوہارا نے تم سے جس بڈھے کی تلاش کا ذکر کیا تھا، وہ یاسمین خانم کا باپ ہے۔"

"اس بڈھے میں ایسی کیا بات ہے؟" میں نے بھویں سکیڑ کے پوچھا۔

"نہیں۔" روڈلف نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہیں پہلے سارا قصہ سنانا پڑے گا۔ پھر ہی تم ساری بات سمجھو گے۔" وہ خودکلامیہ انداز میں بولا۔

"مگر جھوٹ نہیں، صرف سچ سنوں گا میں۔" میں نے اُسے گھورا۔ وہ میری طرف شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

"بڈی! میں نے تم سے کب جھوٹ بولا ہے؟"

"یاسمین خانم کے سلسلے میں تم نے مجھ سے جو کچھ چھپایا، یہ کیا تھا؟"

"چھوڑو بڈی! یہ فضول کی شکایتیں۔" وہ بھی بُرا منانے لگا۔ "یاسمین خانم کا معاملہ تم سے متعلق تھا ہی کب جو میں تمہیں اس کے بارے میں کچھ بتاتا، ہاں! البتہ، اب بات کچھ اور ہے اسی لیے تو تم سے میں نے پوچھا تھا کہ تم اس بے رحم آدمی کوہارا کو جانتے ہو؟"

"یہ لولوش کے قریبی ساتھیوں میں سے ایک ہے۔ میرا اس سے کئی بار خونی ٹاکرا ہو چکا ہے۔" میں نے بھی بالآخر ناراضی کا "باب" ختم کرنے کی غرض سے جواب دیا۔

"اوہ...... تو یہ بات ہے۔" روڈلف کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اب بتاؤ مجھے یہ سب کیا چکر ہے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ ایک گہری سانس لے کر مگر قدرے اُلجھے ہوئے انداز میں بولا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ کہاں سے ابتدا کروں اور......"

"زیادہ تجسّس پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، روڈلف!" میں نے بیزاری سے کہا۔ "یاسمین خانم یا اس بڈھے سے متعلق کوئی بھی کہانی سنانے سے پہلے اتنا خیال ضرور رکھنا کہ اس میں غیر متعلق باتوں یا کسی قسم کی فضولیات کا دخل نہ ہو۔"

"اب تم خاموش رہو بڈی!" روڈلف بھی چڑ کر بولا۔

وہ خفا ہو گیا تھا۔ ناراض تو میں بھی اُس سے تھا۔ خفگی کے اظہار پر میں بھی اسی انداز میں خاموش رہا۔ چند ثانیے بیت گئے۔ ہم دونوں ایک عام سے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھ پشت پر بندھے رہنے کے باعث مجھے کاندھوں میں درد سا محسوس ہونے لگا تھا اور کافی دیر سے اسی حالت میں رہتے ہوئے مجھ پر جھلاہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔

روڈلف کے ایک گہرا اور کھل کر سانس لینے کی ہنکارا نما آواز ابھری اور پھر وہ کچھ کسمسا کر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں کسی اور طرف یونہی تکے جا رہا تھا۔ روڈلف میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور ہاتھوں سے رسن بستہ ہونے کے باوجود ذرا جھک کر آہستگی سے بولا۔

"ہے بڈی! اِدھر دیکھو...... میری طرف۔" میں نے آہستہ آہستہ اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف موڑا۔ اس کے چہرے پر بڑی گہری اور دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

"تم میرے محسن ہی نہیں، میرے ایک اچھے دوست بھی ہو۔ لیکن میری نظروں میں تمہاری سب سے بڑی خوبی تمہاری اچھائی ہے۔ تمہارا نیک عزم ہے۔ میں تم سے دلی طور پر بے حد متاثر ہوں دوست! انسانیت کی راہ تم نے ہی تو مجھے سکھائی ہے۔ میں اسپیکٹرم کا ایک فعال ایجنٹ تھا۔

"اسپیکٹرم کو ہائی جیک کرنے کے بعد لولوش نے تنظیم کو برائی کے راستے پر گامزن کر دیا۔ اس کے لیے اسے پروفیشنل قسم کے بدمعاشوں کی ضرورت تھی۔ مجھے بھی لولوش نے ہی نیومیکسیکو سٹی کے ایک کلب کی انڈر گراؤنڈ بدنامِ زمانہ مجرم تنظیم سے کھینچا تھا۔ میں اس کا نائب سربراہ تھا۔

"لیکن کاسپاکو اور گوتم بدھ کے مجسمے والے معاملے میں جب لولوش نے مجھے اپنے مفاد پر قربان کرنے کا ارادہ کیا تو میرا دل اس سے خراب ہو گیا۔ حالانکہ میں نے اس بدذات شخص کے لیے بڑی قربانیاں دی تھیں۔

"اسی بدبخت کے کہنے پر اپنی تنظیم میں موجود خاص خاص قریبی ساتھیوں کو نکال کر اسپیکٹرم کا حصہ بنایا تھا۔ یہ کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے کہ اسپیکٹرم کو مجرمانہ خطوط میں ڈھالنے میں لولوش کے ساتھ میرا کردار بھی شامل رہا ہے۔

www.bookspk.site

’’لولوش کے اس دھوکے کے بعد کاسپاکو جیسے سفاک انسان کے چنگل میں پھنس کے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا بڈی! اور اپنے بیوی بچوں کو یاد کر کے میں دل ہی دل میں خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔

’’تاہم ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ تنظیم (اسپیکٹرم) کی خاطر مرنے کے بعد میرے بیوی بچوں کو بہت سارو پیہ ملتا، اتنا کہ جو میری زندگی میں بھی انہیں نصیب نہ ہوتا۔ یہ تسلی تو مجھے تھی لیکن جس پُرفریب انداز میں مجھے کاسپاکو کے آگے چارے کے طور پر ڈالا گیا تھا، اس نے میرا لولوش سے دل خراب کر کے رکھ دیا۔ مگر تم نے میرے اندر جینے کی اور مایوسی کے اندھیروں سے نکال کر زندگی کی امنگ جگائی تھی۔ میرے دل میں... بیوی بچوں...... کے پیار اور ان کی یاد، انہیں دوبارہ دیکھنے کی چاہت جگائی تھی۔ تب پھر میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ تمہاری مدد میں سردھڑ کی بازی لگا دوں گا۔‘‘

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو رہا۔ شاید سانس لینے کو رکا تھا۔ میں چپ تھا مگر غور سے اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میرے لیے روڈلف بے حد اہم ساتھی اور مددگار کی حیثیت رکھتا تھا مگر یاسمین خانم والے معاملے میں اس نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ لیکن اب مجھے بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ شاید میں نے اس سے یوں زود رنجی کے اظہار میں جلد بازی سے کام لیا تھا۔

لہٰذا اب میں خاموشی سے اس کی گفتگو سننے پر مجبور تھا۔

تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

’’بڈی! میں اب بھی کہتا ہوں تم سے کہ میں یاسمین خانم کے سلسلے میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا مگر اس کا موقع ہی کب ملا؟ یہ ایسا موضوع نہ تھا کہ میں مختصر الفظوں میں تمہیں بتا کر جان چھڑا لیتا۔ تم خود سوچو! بھلا ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں یاسمین خانم کے بارے میں نہ بتاتا؟ لیکن میں پھر تم سے التجائیہ کہوں گا کہ یاسمین کی مدد کرو۔ ورنہ...... ورنہ...... لولوش کا سپر پاور بننے کا ایک اور جنونی خواب پورا ہو جائے گا اور تمہارا اور اس کا ٹکراؤ بھی سخت مشکل کا شکار ہو سکتا ہے۔

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں اس کی بات پر چونک کر بھویں اچکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

’’ہاں، بڈی! یہ لولوش ایک بلا ہے...... تمہاری اور میری سوچ سے بھی بہت بُرا اور انسانیت کے لیے ایک موذی مرض ہے یہ...... جس کی فطرت میں ہی شیطان اور شیطانیت رچی بسی ہو اس سے کسی قسم کی بھلائی کی توقع رکھنے کے بجائے فوراً اسے موت کے گھاٹ اتار دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

’’کچھ اس لیے بھی میں نے تمہارا آخری حد تک ساتھ دینے کا دل میں پختہ ارادہ باندھ رکھا ہے مگر میرا اب بھی یہی مشورہ ہے کہ یاسمین خانم کے طویل موضوعِ گفتگو میں ابھی وقت برباد کرنے کے بجائے پہلے اس کی اور اپنی فکر کرو اور یاسمین کو بھی میری طرح کا ہی اپنا ساتھی سمجھو۔ میں بہت جلد تمہیں اس کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دوں گا، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔‘‘

’’درحقیقت میں نے تمہاری اور یاسمین خانم کی جیبوں سے وہ رقعے نکال کر پڑھ لیے تھے جس سے میرا دل مزید خراب ہوا تھا۔‘‘ میں نے بالآخر ناراضی کی اصل وجہ اُسے بتا دی۔

’’مجھے معلوم تھا کہ تم یہی کرو گے۔‘‘ روڈلف آہستہ سے بولا۔ ’’تم بھی میری طرح ایک تربیت یافتہ ایجنٹ ہو۔ کھوجی فطرت کے اور تجسّس پسند، اس حوالے سے میں بھی اپنے اندر تھوڑی بہت زود فہمی رکھتا ہوں، مجھے احساس تھا کہ تم ہماری آنکھ لگنے کے بعد وہ رقعے ہماری جیب سے نکال کر ضرور پڑھو گے۔ یہی لکھا تھا یاسمین نے اپنے رقعے میں مجھے کہ ’’جلدی سے تم سے جان چھڑانے کی کوشش کروں۔‘‘ اور میں نے اپنے رقعے میں جواباً یاسمین کو لکھا تھا کہ ’’تمہیں ابھی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے۔‘‘ تو بڈی! اس میں شبہے والی کیا بات ہے؟ یاسمین خانم تمہیں نہیں جانتی۔ جبکہ میں ابھی یاسمین والے معاملے میں تمہیں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ تم اگر نہ بھی پوچھتے تو میں خود تمہیں یاسمین خانم کی اصل حقیقت بتا ڈالتا۔ کیونکہ اس کے بغیر تمہاری امریکا یاترا کی مہم ادھوری ہی رہے گی۔

’’بڈی! سمجھو تو میں تمہاری تقدیر کے اس کرشمے پر حیران اور خوش بھی ہوں کہ کوئی ایسی قدرت ہے جو غیب سے تمہارے ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمہ وقت مصروف ہے۔‘‘

’’یہ سب میرے اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ایسے نیک کاموں کی توفیق عطا فرمائی ہے، یہ خاصیت بھی تو کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔‘‘ میں نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

’’بے شک۔‘‘ روڈلف بھی مسکرا کر بولا۔ ’’میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہوتے تو میں تم سے گلے ملتا۔‘‘

www.bookspk.site

’’یہ کون سی مشکل بات ہے۔ لو آؤ دوست......!‘‘ یہ کہتے میں اس پر جھک گیا اور وہ مجھ پر۔ ہماری گردنیں ملیں، شانے یکجا ہوئے اور پھر ایک دوسرے کے کاندھوں پر سر دھرے ہم ہنس پڑے۔ روڈلف سے میرا دل صاف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

میرے بہی خواہوں اور دوستوں میں اول خیر اور زہرہ بانو وغیرہ سرِفہرست تھے۔ جنہوں نے میرے عظیم مقاصد میں میرے حوصلے اور ہاتھ مضبوط کیے رکھے۔ عارضی طور پر وہ دور ہوئے تو روڈلف جیسا دوست میسّر آ گیا۔

روڈلف کی ’’کیٹیگری‘‘ مختلف تھی۔ وہ عملی طور پر میرے ہاتھ ہی مضبوط نہیں کر رہا تھا بلکہ لولوش کے سلسلے میں میری ہر طرح سے رہنمائی کے لیے بھی کوشاں تھا۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ لولوش کو میں ایک عام آدمی یا محض ایک عالمی گینگسٹر سمجھنے کی غلطی نہ کروں، وہ اس سے ’’آگے‘‘ کی شے تھا اور مجھے اسی کے مطابق اس سے ٹکرانے کے لیے پہلے ہی سے کیل کانٹوں سے لیس ہونا تھا۔

اس سے روڈلف کی مراد یہی تھی کہ میں اس کے بارے میں وہ سب کچھ بھی جان لوں جو میرے لیے ضروری تھا، ورنہ لاعلمی میں لولوش جیسے ’’بھوت‘‘ سے ٹکرانا مجھے ناقابلِ تلافی نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔

اسی کو تو مددِ خدا کہتے ہیں کہ اللہ انسان کی ہمت، حوصلہ اور ثابت قدمی پر اس کی مدد سے پیچھے نہیں ہٹتا، شاید اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ ہمتِ مرداں، مددِ خدا......

میری توجہ اب سے جی کوہارا کے اس چنگل سے نکلنے پر مرکوز ہونے لگی تھی، جو روڈلف بھی چاہتا تھا۔

’’مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی ہے، روڈلف!‘‘ تھوڑی دیر بعد میں متفکر لہجے میں بولا ...... میری زبان سے یاسمین سے متعلق اس تفکر پر روڈلف کے چہرے پر مسرت چمکی تھی، تب بولا۔

’’تھینکس گاڈ! تمہارا دل صاف ہو گیا۔ مجھے خود فکر ہو رہی ہے اس بے چاری کی طرف سے۔ یہ تو شکر کرو کہ کوہارا کو اس حقیقت کا علم نہیں ہوا ابھی تک کہ یاسمین درحقیقت پروفیسر جمشید حمیدی کی ہی بیٹی ہے، ورنہ تو......‘‘ اس نے گہرے متفکر انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں استفساریہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

’’پروفیسر جمشید حمیدی......؟‘‘

’’ہاں! وہی عمر رسیدہ آدمی جسے کوہارا تلاش کر رہا ہے۔‘‘ روڈلف نے بتایا، پھر وہ ایک دم کچھ سوچتا ہوا خاموش ہو گیا اور میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر پُرسوچ لکیروں کا جال سا بن گیا تھا۔ پہلے اس کا چہرہ بجھ سا گیا، اس کے بعد ستے کے رہ گیا۔

’’یہ...... اچانک تمہیں کیا ہوا روڈلف؟ خیریت تو ہے ناں......؟ تم بولتے بولتے اچانک چپ کیوں ہو گئے؟‘‘

’’کوہارا، لولوش کا آدمی ہے۔ اس نے یقیناً کوہارا کو ہمارے پیچھے لگایا ہو گا۔ کوہارا نے کامیابی کے ساتھ اپنا یہاں تک مشن پورا کیا۔ ہم اس کے نرغے میں آ گئے۔ تمہارے ساتھ تو شاید جو کرے سو کرے، لیکن مجھے وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ابھی لولوش سے ہی بات کرنے والا تھا، اسے بتانے والا تھا کہ اس کا شکار اس کے جبڑوں میں ہے۔ لولوش اُسے حکم دے گا۔ روڈلف کو فوراً گولی مار کے ہلاک کر دو۔‘‘

اس نے جیسے پیش آئند اور متوقع مناظر کی سفاک اور عجیب، سوچتی ہوئی آواز میں ڈرامائی تصویر کشی کر ڈالی۔ لیکن اس کی بات کی توجیہہ بھی خارج از امکان نہیں تھی۔ کیونکہ روڈلف بہرحال کاسپاکو کا ہی نہیں لولوش کا بھی شکار تھا۔

اس لیے کہ لولوش کو اب تک کے حالات کا پوری طرح سے علم ہو چکا تھا کہ اس کا اپنا ایک اہم ساتھی ان سے بددل اور متنفر ہونے کے بعد میرے ساتھ مل کر کیا ’’کارنامے‘‘ انجام دے رہا تھا......

اسی سبب لولوش سب سے پہلے اپنے اسی باغی امریکی ایجنٹ (روڈلف) کا پتا صاف کر سکتا تھا۔ روڈلف کا یہ ’’تجزیہ‘‘ موجودہ حالات کے مطابق غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس بارے میں کچھ تبادلہ خیال کرتا اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی، غیر ارادی طور پر ہماری نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔

وہاں سے جی کوہارا اپنے گماشتوں کو بانگ اور ہیتو کے ساتھ کھڑا ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں سفاکیت کا عنصر غالب تھا۔ اسے دیکھ کر بے چارے روڈلف کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔

شاید روڈلف کے بدترین خدشات درست ثابت ہونے والے تھے۔

کوبانگ اور ہیتو حسبِ سابق مسلح تھے۔ کوہارا نے

www.bookspk.site

انہیں مخصوص اشارہ کیا تھا۔ وہ دونوں آگے بڑھے۔ کوہارا دروازے پر ہی کسی گینڈے کی طرح جما کھڑا رہا۔

قریب آ کر کوبانگ نے مجھے دھکا دیا۔ میں صوفے پر گر پڑا۔ روڈلف کو دونوں نے دبوچ کر اٹھالیا۔

''نن...... نہیں...... نہیں......'' وہ دہشت زدہ سی لرزتی آواز میں جیسے کراہ کر بولا۔

''کوہارا......! اسے کہاں لے جارہے ہو؟'' میں نے ذرا سیدھا ہو کر پھیلی ہوئی آنکھوں سے دروازے پر کھڑے کوہارا کی طرف دیکھ کے کہا۔

''موت کے پاس۔ ماسٹر لولوش نے اس غدار باغی کو گولی مار دینے کا حکم دیا ہے۔'' کوہارا نے جیسے حظ اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''نہیں...... نہیں...... مجھے مت مارو...... مم...... میرے بب...... بیوی...... بب...... بچے ہیں۔'' روڈلف گھگیا کر بولا۔

روڈلف کی سے جی کوہارا کے آگے داد فریاد پر اچانک ہی میرے چشم تصور میں وہ منظر گھوم گیا جب اسی شیطان صفت اور درندہ نما سے جی کوہارا نے اپنی یوٹ (yacht) میں مجھے اور بشام چھلگری کو قیدی بنائے رکھا تھا اور اسی طرح بشام چھلگری کو کوہارا کا ایک وحشی ساتھی بھوبک...... گولی مارنے کے لیے کھینچے لیے جارہا تھا اور بشام، روڈلف ہی کی طرح کوہارا سے اپنی جاں بخشی کی فریاد کررہا تھا مگر کوہارا کے حکم پر اس کے وحشی ساتھی بھوبک نے...... بشام کو عرشے پر لے جا کر بڑی بیدردی سے گولی ماردی تھی اور اس کی لاش سمندر میں پھینک دی تھی۔

(اگرچہ بعد میں اس بری وحشی بھوبک کو میں نے بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا اور اس دن سے کوہارا کو جان سے مار ڈالنے کا تہیہ کرلیا تھا)

آج وہی ظلم و بربریت کی خونیں کہانی کوہارا میری آنکھوں کے سامنے پھر دہرانے لگا۔

''نہیں کوہارا......! اسے چھوڑ دو......'' میں نے کوہارا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاہا...... ہاہا......! ابھی تو تمہاری باری بھی آنی ہے۔ ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی ماسٹر تم سے بات کرے گا۔ پہلے اِسے ٹھکانے لگا دوں۔'' کوہارا ایک وحشیانہ قہقہہ اگلتے ہوئے سفاکی سے بولا۔

''مجھے پہلے ماسٹر سے بات کرلینے دو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''ہوسکتا ہے ہم کسی بات پر معاملہ سیٹل ڈاؤن کرلیں۔''

''ہاں...... ہاں ضرور...... لیکن پہلے اسے زندگی کی قید سے آزاد کرنا ہوگا۔ اس کے بعد۔'' چنگیزی فطرت کے حامل کوہارا نے کہا اور پھر کوبانگ اور ہیتو، روڈلف کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔

میرا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ مجھے رہ رہ کر پھر وہ بشام چھلگری والا منظر یاد آنے لگا۔ روڈلف نے جاتے جاتے مجھ پر ایک حسرت زدہ سی نظر ڈالی تھی، ایک آخری نظر...... جیسے کہہ رہا ہو...... ''ہے بڈی! بس، ہمارا اتنا ہی ساتھ تھا، مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا۔ اب مجھے احساس ہورہا تھا کہ کوہارا کو زندہ چھوڑنے کی میں نے اپنی زندگی کی کتنی خطرناک غلطی کی تھی۔ کچھ بھی تھا، مجھے انڈیمان سے کوچ کرنے سے پہلے ایک مشن کے تحت کوہارا کو بھی ٹھکانے لگا دینا چاہیے تھا۔

روڈلف زندگی ہارنے والا تھا اور میں بے بس و لاچار اسے گویا مقتل گاہ میں جاتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

''کوہار......! میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' شدتِ غیظ و غضب تلے میری آواز پھٹ گئی۔ کوہارا میری بے بسی پر قہقہے مارنے لگا۔ وہ ہمیشہ میری ایسی حالت سے حظ اٹھایا کرتا تھا۔ جب میں یا تو اس سے التجا کررہا ہوتا تھا یا پھر بے بسی سے چلّا رہا ہوتا۔

کوہارا ہنوز کمرے میں ہی موجود تھا۔ کوبانگ اور ہیتو، روڈلف کو لے جاچکے تھے۔ اب کسی وقت بھی فائر کی آواز ابھرنے والی تھی اور پھر روڈلف کی زندگی کا چراغ گل ہوجانا تھا۔

وہی ہوا...... گولی چلنے کی آواز ابھری۔ میرے دل کی دھڑکنیں جیسے رک گئیں، غیظ و غضب تلے میرا اندر مثلِ آتش فشاں کھولنے لگا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سامنے کھڑے کوہارا کی بوٹیاں نوچ ڈالوں۔ دفعتاً ایک اور فائر ہوا اور پھر اسی وقت ہلکی ساخت کی مشین گن گرجی۔ میرے ہی نہیں کوہارا کے چہرے کے تاثرات بھی متغیر ہوگئے۔

''یی ی...... یہ کیا ہوا؟'' کوہارا یک دم بدحواسی میں خود کلامیہ بڑبڑایا۔ میں خود حیران تھا۔ میرے اندر کی گھٹن ختم ہونے لگی۔ کوہارا اسی بدحواسی کے ساتھ پلٹا۔ اس نے پلٹتے سمے پستول نکال لیا تھا۔ وہ اس عالم میں کمرے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احتیاط کا دامن مقصود تھا کیونکہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے پھر بھی میں اسی طرح دروازے کی طرف بڑھا۔

www.bookspk.site

فائرنگ اور دھماکے کی آوازیں بڑھتی جارہی تھیں۔ مجھے دروازے کے پار دھواں سا اٹھتا نظر آنے لگا۔ میرا دل یکلخت تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے روڈلف کی فکر ہورہی تھی، اس غریب کا نجانے کیا حشر ہوا تھا؟ آیا وہ زندہ بھی تھا یا پھر...... اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکا۔

ہٹ پر شاید کسی نے حملہ کردیا تھا۔ اچانک میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں خیال ابھرا۔ کہیں یہ وہی کار سوار تو نہیں تھے جن کے تعاقب کا ڈرائیور کو شبہ ہوا تھا اور بعد میں وہ کار ہماری جیپ کو کراس کرکے آگے نکل گئی تھی اور کافی دور جاکر بظاہر نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی؟

اگر ایسا تھا بھی تو وہ کون لوگ ہوسکتے تھے؟ مجھے یہ سوچنے کا تادیر موقع نہ مل سکا۔ کیونکہ اسی وقت دوڑتے قدموں اور چیخنے چلّانے کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

میرے ہاتھ اگر کھلے ہوتے تو میں بھی اس اندھی نار میں کود پڑتا، مگر اب ایسا کرنا خود اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہوتا۔ میں دروازے کی طرف سے فوراً الٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ سرِدست تو میں دروازہ بھی بند کرنے سے قاصر تھا۔

میں کھلے دروازے کے پیچھے ایک دیوار سے لگ کے کھڑا ہوگیا۔ خدشہ مجھے بھی تھا کہ نجانے یہ کون تھے اور شاید میرے بھی دشمن ہوں......

اچانک دروازے کے قریب ہی کوئی دوڑتا ہوا آیا۔ اسی وقت ایک تیز نسوانی مگر جوش میں ڈوبی آواز ابھری اور ساتھ ہی کسی مرد کی کراہتی ہوئی آواز بھی۔ اگلے ہی لمحے میری ہک دک سی نظروں نے دروازے سے ایک شخص کو اندر کمرے کے فرش پر گرتے دیکھا۔ وہ خون میں لت پت تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا، وہ کوہارا کا ساتھی ہیتو تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا، مجھ پر بھی بس ایک لمحے کو اس کی نگاہ پڑی تھی، دوسرے ہی لمحے گولی چلی اور ہیتو ٹھنڈا ہوگیا۔

اسی وقت میں نے یاسمین خانم اور روڈلف کو اندر آتے دیکھا۔ وہ اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''میں اِدھر ہوں۔'' میں نے کہا۔ وہ دونوں ہی بیک وقت چونک کر میری طرف پلٹے۔ روڈلف کو زندہ سلامت دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی تھی۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار نظر آرہے تھے۔ روڈلف کے اب دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ ان دونوں نے مل کر میرے ہاتھ بھی جکڑ بندوں سے آزاد کردیے۔

ہاتھ آزاد ہوتے ہی میرا پورا وجود یوں جوش سے بھر گیا جیسے میں پارا بننے لگا ہوں۔

''یہ حملہ...... کن لوگوں نے کیا؟'' میں اتنا ہی پوچھ سکا تھا کہ روڈلف بولا۔

''بڈی نکل چلو...... جلدی۔'' وہ کہتے ہوئے دروازے سے نکلا۔ یاسمین میرے ساتھ تھی۔ روڈلف آگے، ہم دونوں پیچھے۔

ہم کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگئے۔ یہاں تین چار لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ دو تو میرے لیے اجنبی تھے، ایک کو میں پہچان گیا، یہ کوبانگ کی لاش تھی۔ مجھے کوہارا کی تلاش تھی۔

''کوہارا کدھر گیا؟'' میں نے ہانپتی آواز میں پوچھا۔

''وہ بزدل اپنے ایک آدمی کے ساتھ فرار ہوگیا ہے۔'' روڈلف کے بجائے یاسمین نے جواب دیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور جیسے اسی وقت مجھے کچھ یاد آیا۔

''تم ٹھیک ہو ناں......؟ اس رزیل کوہارا نے تمہارے ساتھ......''

''نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا، میں اس جنگلی سؤر کو فقط بہلائے ہوئے تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ تاہم میرے سوال کا مطلب سمجھ کر اس کے صبیح چہرے پر ہلکی سرخی ابھری تھی۔ جبکہ عنابی لبوں پر خفیف سی مسکان۔ اس کی کھنچی ہوئی کمانوں والی بولتی ہوئی سی آنکھوں میں ایک رنگ سا جھلکا۔

اسی وقت ایک شخص دوڑتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ ایک نوجوان شخص تھا، میری اور روڈلف ہی کی عمر کا ہوگا۔ میں اُسے دیکھ کر چونکا۔

وہ اپنے چہرے مہرے سے انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتا تھا۔ خاصا خوبرو تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے پیشہ ورانہ چابک دستی اور پھرتی دکھائی دی تھی۔ اس کی سانسیں کچھ پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نگاہ لاشوں پر ڈالی۔ چہرے پر تاسف ابھرا۔ شاید ان میں اس کا کوئی ساتھی بھی مردہ پڑا تھا۔ تاہم اس نے کانپتی سی آواز میں بتایا۔

''وہ بھاگ گیا ہے۔'' اس کا لہجہ بھی مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔

''کون......؟ سے جی کوہارا......؟'' روڈلف نے پوچھا۔

www.bookspk.site

www.bookspk.site

''ہاں......! اپنے ایک ساتھی کے ساتھ، اپنی جیپ میں......''

''دفع کرو اُسے...... واپس نکلو' چلو جلدی سے......'' یاسمین بولی۔

''نہیں......'' میں نے اچانک کہا۔ وہ تینوں میرا چہرہ تکنے لگے۔ ''کوہارا کو میں جانتا ہوں اچھی طرح سے...... وہ بھاگنے والا نہیں، گھات لگانے والا درندہ ہے۔''

''مگر...... میں نے اسے خود اپنی آنکھوں سے جیپ میں ساتھی سمیت سوار اور روانہ ہوتے دیکھا ہے۔ میں نے فائر کر کے جیپ کے ٹائر برسٹ کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔'' اس نوجوان نے بتایا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم اس سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ اور یہ حملہ کن لوگوں نے کیا تھا؟''

''بڈی! یہ ہمارے ہی ساتھی تھے، اسی کار میں پیچھا کر رہے تھے۔'' روڈلف نے مجھ سے کہا۔ ''انہیں شبہ ہوا تو یہ اپنی کار آگے نکال لے گئے تھے، یہی تھے وہ جن پر کوہارا کے ڈرائیور کو سب سے پہلے شبہ ہوا تھا۔''

''میرے دو ساتھی مارے گئے ہیں۔ ان کی لاشیں میں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔'' نوجوان بولا۔

''جو کرنا ہے، جلد نمٹا دو۔ پولیس یا اُن کے ساتھی آ گئے تو ہم مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔''

ہم ابھی لاشوں کو سنبھالنے کا تہیہ کر ہی رہے تھے کہ اچانک گولی چلی اور ساتھ ہی روڈلف کی چیخ ابھری، وہ گرا، ہم ٹھٹکے لیکن سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسرا فائر ہوا۔ اس بار مذکورہ نوجوان گرا، تب تک میرے روم روم میں لہو پارا بن کے دوڑنے لگا تھا، پل کے پل میں دو گولیاں چلنے کے بعد میں اُس کے ''مخرج'' کا اندازہ کر چکا تھا۔

میرے الٹے ہاتھ کی لاؤنج والی کھڑکی سے سے جی کوہارا کا مکروہ اور وحشت بھرا چہرہ نظر آیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، مجھ سے پہلے یاسمین خانم نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ بھی شاید مجھ سے ایک دو پل پہلے ہی اس کا اندازہ کر چکی تھی اور کوہارا کو تیسرے فائر کرنے کا موقع دیے بغیر ہی اس نے کھڑکی کی طرف فائر جھونک مارا۔

میں حرکت کرتے کرتے جامد ہو گیا۔ میری دھڑکتی نظروں نے کھڑکی کی چوکھٹ پر گولی لگتے دیکھی اور دوسرے ہی لمحے کوہارا کا چہرہ غائب ہو گیا، مگر دوسرے لمحے کھلے دروازے کی طرف سے فائر ہوا۔ میں وہاں کسی کی جھلک کو بھانپ چکا تھا اور ایڑی کے بل پر گھوم گیا۔ گولی مجھ پر ہی چلائی گئی تھی جس سے میں بال بال بچا تھا مگر میں نے اپنے پھرکی کی طرح گھومتے وجود کو تھمنے نہیں دیا اور گولی خطا جاتے ہی میں نے گھومنے کے زور پر ہی ایک جست لگائی تھی۔

فائر کرنے والا ابھی دوسری گولی داغنے کے لیے پر تول ہی رہا تھا کہ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ دیکھا جاتا تو یہ میرا انتہائی خطرناک اور ''رِسکی'' عمل تھا۔ دوسرا متوقع فائر میری پیشانی یا سینے پر سوراخ کر سکتا تھا۔ یہ بس میرے اندر کی جنوں خیزی تھی جس نے مجھے بپھرا کر رکھ دیا تھا۔

یہ کوہارا نہیں تھا، اس کا وہ ساتھی تھا جس کے ساتھ وہ، بہ قول یاسمین خانم کے فرار ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس کا وہی ساتھی تھا جو جیپ کا ڈرائیور تھا۔ کیونکہ اتنی جلدی کھڑکی سے ہٹ کر کوہارا دروازے پر پہنچ کر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔

میرا ایک ہی پنچ اس کی ناک پر پڑا تھا اور وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کراہتی آواز کے ساتھ پیچھے کو الٹ کر ڈھے چکا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ ہی خون کی سرخی سے بھر گیا تھا۔ اسے بے حس و حرکت پا کر میں وحشت کے انداز میں اس طرف کو گھوما جدھر کھڑکی باہر کو کھلتی تھی، وہاں مجھے کوہارا دکھائی نہ دیا۔

درندہ چھپنے کے بعد مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔ مجھے روڈلف کی بھی فکر و تشویش تھی۔ نجانے وہ گولی لگنے کے بعد زندہ بھی بچا تھا یا نہیں...... میں نے آہستہ آہستہ سر دروازے سے باہر نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ البتہ مجھے تیس چالیس گز کی دوری پر کوہارا کی جیپ کھڑی نظر آ گئی۔ یہ رزیل یقیناً اپنے فرار کا ڈراما رچانے کے بعد دوبارہ اچانک آن دھمکا تھا۔

اسی وقت ہلکی ساخت کی مشین گن کے برسٹ چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں تڑپ کر پلٹا اور دنگ رہ گیا۔

☆☆☆

یاسمین خانم نہتی کھڑی تھی اور کوہارا...... خون خوار چہرہ لیے اس سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سب مشین گن تھی جس کی نال کا رخ یاسمین کی طرف ہی تھا۔ جبکہ یاسمین کا اپنا پستول تھوڑے فاصلے پر پڑا نظر آ رہا تھا۔

نجانے یہ شیطانی درندہ کدھر سے اچانک آن وارد ہوا تھا۔ یہ اسی کا ہٹ تھا اور اس سے زیادہ کون اس کے محل و قوع سے واقف ہو سکتا تھا، تاہم میں نے پل کے پل اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ کسی کمرے کی کھڑکی سے کود کر آ نکلا تھا اور اس نے یاسمین پر گولی چلا دی تھی جو شاید سیدھی اس کے پستول پر لگی تھی، ورنہ یاسمین خانم کا ہاتھ ضرور زخمی ہوتا۔

یہ شکر تھا کہ اس خونخوار بھیڑیئے نے یاسمین کو گولی نہیں ماری تھی۔ یقیناً اس کی کوئی وجہ تھی، وگرنہ کوہارا جیسے وحشی درندے سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے شکار کو زندہ چھوڑ دے۔

''کوہارا......!'' میں وہیں سے ہی دہاڑا۔ ''گولی مت چلانا، میں خود کو تمہارے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم دونوں میرے شکار ہو...... ہاتھ اوپر اٹھالو۔'' کوہارا بھیڑیئے جیسی آواز میں غرا کر بولا۔ میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھا لیے۔

''سنا نہیں تم نے......؟'' کوہارا نے دہاڑ کر یاسمین سے کہا۔ جس نے ابھی تک اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔

''یاسمین! جیسا یہ کہہ رہا ہے فوراً ویسا ہی کرو......'' میں نے جنونی انداز میں چلّا کر یاسمین سے کہا۔ کیونکہ کوہارا کی جنونی سفاکیت کو سب سے زیادہ میں جانتا تھا۔ وہ دوسری بار حکم دینے کے بجائے یاسمین کو برسٹ مار کر چھلنی کر سکتا تھا۔ اب بھی اس سے کوئی بعید نہ تھا۔ کئی ایسے خطرناک مواقع پہ وہ مجھ پر بھی سیدھے برسٹ چلا چکا تھا۔

یاسمین نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر کر لیے تھے۔ میں اپنے ہاتھ بدستور سر سے بلند کیے ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کوہارا نے گرج کر مجھے وہیں جامد ہونے کا کہا۔ میں رک گیا۔

''تم بھی جا کر اس کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ شہزادی! جلدی...... مگر خبردار...... پشت میری جانب مت کرنا۔'' کوہارا نے یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے کہا اور یاسمین نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہاتھ اسی طرح بلند کیے آہستہ آہستہ انداز...... سے میری طرف بڑھنے لگی۔ اس طرف دروازہ ہونے کی وجہ سے ہی شاید کوہارا ہم دونوں کو وہاں یکجا کرنا چاہتا تھا تاکہ اسی طرح گن پوائنٹ پر ہمیں لیے اپنی جیپ تک پہنچ سکے۔

اسی وقت کسی کے کراہنے کی آواز ابھری۔ ہم چونکے۔ ہمارے زخمی ساتھیوں میں سے شاید کوئی ہوش میں آ رہا تھا۔ کوہارا...... جو یاسمین کے قدم بڑھاتے ہی خود بھی ایک قدم آگے بڑھا چکا تھا۔ ایک دم کسی ٹھٹکے ہوئے شکاری درندے کی طرح رک گیا۔

ہم نے دیکھا، کراہنے کی یہ آواز روڈلف کی تھی۔ وہ فرش پر پہلو کے بل پڑے پڑے پلٹنے کی کوشش میں تھا کہ کوہارا نے اپنے ہاتھ میں تھمی ہوئی گن کی نال کا رخ اس کی طرف کر دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ روڈلف کے زندہ ہونے کی لمحہ بھر کی مسرت سینے میں ہی دبی رہ گئی۔ روڈلف بے خبر تھا کہ اس کی یہ معمولی سی جنبش اس کے لیے موت کا پیامبر ثابت ہو رہی تھی۔

''نہیں......'' اچانک یاسمین ہسٹریائی انداز میں چلّائی۔ وہ اپنے بھیانک انجام کی پروا کیے بغیر کوہارا کی طرف لپکی۔ کوہارا کی گن کا رخ روڈلف کی جانب سے گھوم گیا۔ اب وہ اپنی جانب ہسٹریائی انداز میں درانہ وار دوڑتی ہوئی یاسمین کی طرف ہونے لگا۔

میرے لیے یہ نازک اور سنگین گھڑیاں جیسے تھم کر رہ گئیں۔ میں حرکت میں آیا اور یاسمین کے پیچھے لپکا۔ پل کے پل صورتِ حالات خطرناک سے سنگین تر ہو گئی تھی۔

کوہارا کی آنکھوں سے ہی نہیں مکروہ چہرے سے بھی درندگی کی تیز سرخی ابھری۔ میں نے یاسمین کے قریب پہنچتے ہی عقب سے اس کے کالر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش چاہی، تاکہ اسے جلادصفت کوہارا کی مہیب قربت میں جانے سے روک سکوں مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

اسی وقت گولی چلی۔ دھماکا ہوا۔ یاسمین چیخی اور لڑکھڑائی۔ میرا دھڑکتا ہوا دل جیسے رک گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے گویا ایک معجزاتی رنگ دیکھا۔ کوہارا کا وہ ہاتھ خالی ہو کے زخمی ہو چکا تھا۔ گن چھوٹ چکی تھی۔ یاسمین کا پاؤں جوش تلے یا پھر گولی کی آواز سن کر ویسے ہی لڑکھڑا گیا تھا۔ میری طرح شاید وہ بھی یہی سمجھی تھی کہ گولی اسے لگی ہے۔

یہ گولی داغنے والا وہی زخمی نوجوان تھا جسے روڈلف کے بعد کوہارا کے مذکورہ ساتھی نے نشانہ بنایا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بھی ابھی زندہ تھا۔ اسی نے ہی فرش پر لیٹے لیٹے کوہارا کی طرف گولی داغی تھی جو اس کے گن والے ہاتھ پر لگی تھی۔

گن...... کوہارا کے ہاتھ سے نکلتے ہی میری نسوں میں جیسے آتش فشاں پھوٹ پڑنے والا لاوا ابھر گیا۔ میں پھر نہیں رکا اور یاسمین کو سنبھالنے کا ارادہ ترک کرتے ہی کوہارا کو ''چھاپنے'' کے ارادے سے اس کی طرف بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا۔ میں کوہارا کو دبوچنے کا یہ سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس نے جو مجھے یوں جنوں خیزی کی حالت میں اپنی جانب لپکتے دیکھا تو...... میدان اس نے بھی نہیں چھوڑا۔

www.bookspk.site

ادھر زخمی نوجوان میں شاید دوبارہ فائر کرنے کی سکت نہ رہی تھی، وہ ایک ہی گولی چلانے کے بعد دوبارہ نیم بے ہوشی کے عالم میں بے حس وحرکت ہو گیا تھا۔

کوہارا اسی پر لپکا تھا اور ایک آخری کوشش چاہتے ہوئے اس نے اپنی سی تیزی کے ساتھ اس پر جھک کر پستول جھپٹنا چاہا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔ تب ہی میری داہنی لات حرکت میں آئی۔ وہ اس کے پہلو میں لگی۔ اس کے گینڈے جیسے پلے ہوئے جسم کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ ڈولا، سنبھلنے کی کوشش کرتے ہی اس نے جنگلی بھینسے کی طرح ڈکراتے ہوئے اسی طرح جھکے جھکے انداز میں میری جانب گھوم کر اپنے سر کی ٹکر میرے پیٹ میں رسید کر ڈالی۔

بھاری مگر مضبوط جسامت کے باوجود اس نے کمالِ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ میرے حلق سے مارے درد کے کراہ خارج ہو گئی۔ میں چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ گرتے گرتے بچا اور دوبارہ اس پر جھپٹا۔

اس کی انتہائی کوشش فرش پر گرے پستول پر قبضہ جمانے کی تھی۔ یہی کوشش اس نے دوبارہ چاہی۔ اس کا ہاتھ پستول پر پڑ چکا تھا۔ میں ابھی دور تھا۔ پستول کو جھپٹتے ہی وہ دوبارہ سیدھا ہوا، میں ابھی اس کی پہنچ سے دور تھا۔ وہ پستول کی نال کا رخ میری جانب کرنے لگا تھا کہ یاسمین خانم چیختے ہوئے اس پر چھلانگ لگا چکی تھی۔

اس کی یہ دیدہ دلیرانہ حرکت خود اس کے لیے بھی خطرناک اور جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔ یاسمین خانم اس پر خونخوار بلی کی طرح جھپٹی تھی۔ میری نظریں کوہارا کے ہاتھ میں پکڑے پستول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ جس کی نال وہ یاسمین خانم کے پیٹ کی جانب موڑنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے بھی اس پر جست بھری۔

یاسمین نے اپنا ''کام'' یوں نمٹایا کہ اپنے بائیں ہاتھ کو اس کے پستول والے ہاتھ پر رکھ کے اس کا رخ موڑا اور دائیں ہاتھ کی انگلی کا ایک تیز نکیلا ناخن کوہارا کی ایک آنکھ میں گھسیڑ دیا۔ کوہارا کے حلق سے کسی جنگلی بھینسے کی سی ڈکراہٹ ابھری اور اس نے ایک وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ ہی گولی چلا دی۔

فائر خالی گیا تھا۔ یاسمین نے اسی ہاتھ کی ٹھوکر پستول پر رسید کر دی، باعثِ اذیت کوہارا پستول پر اپنی گرفت نہ رکھ سکا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو اس نے یاسمین کو غضب ناک انداز میں بھنبھوڑ ڈالنا چاہا تھا کہ میں نے قریب پہنچتے ہی اس کے پہلو میں اپنی داہنی ٹانگ کے گھٹنے کی زوردار ضرب لگا دی اور ساتھ ہی بائیں ہاتھ کا مکا اس کی کنپٹی پر بھی ''وجا'' دیا۔ وہ لمحہ بھر کو بے حال سا ہوا، تب تک یاسمین نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو اس سے الگ کر لیا۔

کوہارا کی ایک آنکھ یاسمین خانم کے تیز نکیلے ناخن نے اندر ہی پھوڑ ڈالی تھی۔ وہاں سے اب بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہونے لگی۔

مجھ پر جنون سوار تھا، میں اس پر پل پڑا، لاتیں گھونسے اور ٹھوکروں سے اس کی درگت بنا ڈالنا چاہی تھی کہ اس نے... فرار ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

''یاسمین! روڈلف کو سنبھالو......'' میں اس سے یہ کہتا ہوا دیوانہ وار کوہارا کے تعاقب میں لپکا۔ وہ ڈولتا، ڈگمگاتا ہوا دروازے سے باہر جا چکا تھا۔

یاسمین نے شاید پیچھے سے مجھے پکارا تھا مگر میں نہیں رکا، کوہارا میرے سامنے بھاگا جا رہا تھا، اس کا رخ اپنی جیپ کی طرف تھا، میرے سر پر جنون سوار تھا کہ کوہارا کو جلد سے جلد جالوں...... دوڑنے کی رفتار میری بھی کم نہ تھی، وہ جیسے ہی اپنی جیپ کے قریب پہنچا، میں نے اس کے قریب پہنچتے ہی لانگ جمپ لگائی اور میری ایک ٹانگ اس کی پشت پر پڑی، وہ بڑے زور سے جیپ کی فولادی باڈی سے سینے اور پیٹ کے بل ٹکرایا۔ اس قدر کہ اس کے حلق سے بلبلاتی ہوئی چیخ خارج ہو گئی۔

میں نے سخت غیظ آلود انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر ایک ہاتھ سے اس کے بالوں کو پکڑ کر اس کا سر باڈی پر دے مارا، ایک بار، دوسری بار، اس کی پیشانی کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں غراتے ہوئے اپنی دائیں کہنی کی ضرب تاک کر میرے پیٹ پر رسید کر دی۔

یہ وار اس کا میرے لیے زوردار ثابت ہو سکتا تھا، بلکہ کوئی عام آدمی ہوتا تو یہ روح کش ضرب کھاتے ہی بے حال ہو کے گر پڑتا۔ لیکن یہ میری تربیت کا حصہ تھا کہ دوبدو لڑائی کے دوران میں اپنے پیٹ کے عضلات اور پٹھوں کو اکڑا کر سخت کر لیتا تھا، مدِمقابل کو قریب سے دوبدو لڑائی کے دوران کاری وار کرنے کا موقع سب سے پہلے پیٹ پر ہی ضرب لگانے کا ملتا ہے اور مدِمقابل کوہارا جیسا ہو تو اس وار کا پیشگی سدِباب کرنے کی اہمیت وضرورت اور بڑھ جاتی ہے، یہی میں کیے ہوئے تھا، کچھ یہی سبب تھا کہ میں اس کا یہ وار سہہ گیا تھا۔ بس! ایک لمحے کو میں سست پڑا تھا اس کے بعد میرا رائٹ ہک حرکت میں آیا، اس کی ٹھوڑی پر اس زور سے لگا کہ اس کا چہرہ ہی گھوم گیا، تب ہی میں نے اپنے دونوں بازوؤں کا شکنجہ، پیچھے سے اس کی گردن کے گرد کس دیا، اب بس ایک جھٹکا دینے کی دیر تھی۔

www.bookspk.site

یہ بہت خطرناک اور یقینی موت سے ہمکنار کر دینے والا داؤ تھا، جس کا فوری طور پر احساس کرتے ہی کوہارا گینڈے جیسی جسامت رکھنے کے باوجود کسی ماہی بے آب کے مانند تڑپا اور اپنے دونوں پیروں پر دباؤ ڈال کر اس نے جیپ کی باڈی سے ٹکا دیے اور اسی زور پر اپنے مغلوب وجود کو جھٹکا دیا۔ یہ داؤ اس کا چل گیا۔ نتیجے میں ہم دونوں ہی بھربھری مٹی والی زمین پر آ رہے۔

آنکھ پھوٹنے کی اذیت کے باوجود کوہارا کے اندر جیسے کوئی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ نڈھال ہونے کے بجائے غضب ناک بھینسے جیسا ہو رہا تھا اور میرے ہر وار کا مقابلہ کیے جا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زمین پر ہم دونوں کے گرتے ہی وہ بجلی کی طرح تڑپا اور میرے شکنجے کی گرفت سے خود کو نہ صرف نکال لے گیا بلکہ اس نے میرے چہرے پر بھی اپنا ہتھوڑے جیسا مکا رسید کر دیا۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔

اسی وقت گولی چلی۔ میں ٹھٹکا۔ ہٹ کی طرف سے یاسمین پستول ہاتھ میں پکڑے دیوانہ وار دوڑی چلی آ رہی تھی۔ گولی شاید اسی نے ہی چلائی تھی، کوہارا تب تک جیپ کا دروازہ کھول کے اس میں سوار ہو چکا تھا، اس سے پہلے کہ میں اٹھ کر سنبھلتا۔ وہ جیپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا چکا تھا۔

یاسمین میرے قریب پہنچ چکی تھی اور اس نے دیوانہ وار جیپ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ حتیٰ کہ پورا پستول خالی کر دیا۔ جیپ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''تت...... تم ٹھیک تو ہو ناں...... شہزی؟'' اس نے پوچھا۔ وہ ہانپ رہی تھی۔

''رر...... روڈلف...... وہ زندہ ہے؟'' میں نے بھی اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''وہ زندہ ہے مگر زخمی ہے۔ باقی مر چکے۔ ہمیں نکلنا چاہیے۔ پولیس یہاں آ سکتی ہے۔'' وہ بولی۔

''وہ نوجوان......؟''

''وہ بے چارہ آخری سانسوں پر تھا۔ ختم ہو گیا۔'' یاسمین خانم کے لہجے میں گہرا تاسف تھا۔

ہم ہٹ میں آ گئے۔ یہاں عجیب سی ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی کہ جی الٹنے کو ہو رہا تھا۔ یاسمین کے ساتھیوں کی کار موجود تھی۔ روڈلف نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ اس کے چہرے پر نیلاہٹ پھیلنے لگی تھی۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ بائیں پہلو میں گولی کا گہرا زخم نظر آتا تھا۔

یاسمین نے مختصر سے وقت میں جیسے تیسے اس کی پٹی تو کر دی تھی، مگر خون کا جریان بند ہوتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''اس کی حالت تشویش ناک لگتی ہے۔'' میں نے متفکر لہجے میں یاسمین سے کہا۔

''ہاں! اسے گولی لگی ہے۔ وہ اندر ہی ہے۔ زخم بھی گہرا ہے۔ یہ اس کی قوتِ ارادی ہے جو لمحہ بھر کو یہ ہوش میں آیا تھا۔'' یاسمین نے کہا۔ ''لیکن فکر نہ کرو...... نکلنے کی کرو یہاں سے...... پولیس آ گئی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔''

ہم نے روڈلف کو سہارا دیا اور باہر کار تک لے آئے۔ پچھلی سیٹ پر اسے ڈال کر یاسمین خانم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کار اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا لی۔

☆☆☆

سہ پہر کے بعد شام جھک آئی تھی۔ میرا ارادہ کوہارا کے تعاقب میں نکلنے کا تھا مگر روڈلف کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔

یاسمین کار ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اس کے متعلق خاموشی سے سوچے جا رہا تھا۔ خاصی بہادر خاتون تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ مجھے بائیس تیئس سے زیادہ کا نہیں ہوا تھا۔ اس کے شہد رنگ بکھرے بکھرے سے بال اس کے حسنِ قیامت خیز کو مزید دوآتشہ بنائے ہوئے تھے۔ اس نے خاصی بہادری اور جی داری کا مظاہرہ کیا تھا۔

روڈلف سے اس کے بارے میں سیر حاصل ''مذاکرات'' کرنے کے بعد میرا دل یاسمین سے مطمئن ہو گیا تھا اور وہ منظر تو میں بھلائے نہیں پا رہا تھا جب میں کوہارا کے ساتھ دست بستہ تھا اور وہ دیوانہ وار اپنی جان کی پروا کیے بغیر کوہارا جیسے گوریلا سے جا بھڑی تھی۔

ایسا اس نے میری خاطر نہ سہی، روڈلف کی جان بچانے کی غرض سے کیا تھا۔ وہ بھی میرا دوست تھا لیکن روڈلف کے لیے یاسمین کا اس قدر جنونی ہو جانا پتا دیتا تھا کہ روڈلف اس کے لیے بھی خاص اہمیت رکھتا تھا جتنا کہ

www.bookspk.site

میرے لیے...... تب مجھے بھی فوری طور پر حرکت میں آنا پڑا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوصف مجھے ابھی تک یاسمین کی حقیقت کا علم نہ ہوسکا تھا۔ اگرچہ روڈلف اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہ چھپانے کا وعدہ کر چکا تھا لیکن پھر بھی میرے اندر کی تجسس آمیز بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ چکر کوئی گہرا ہی لگتا تھا۔ کوہارا کے منیلا میں خفیہ مشن کا تعلق یاسمین اور روڈلف کے خفیہ گٹھ جوڑ سے لگتا تھا۔

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی میں نے پہلی بار لب کشائی کی۔

''محفوظ ٹھکانے پر......'' یاسمین نے مختصر جواب دیا۔ اس کی نگاہیں بدستور ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اپنے کسی ٹھکانے پر مجو سفر تھی۔ میرے اعصاب شل تھے اور میں خاصی تھکن محسوس کررہا تھا۔

''ہے بڈی! تم ٹھیک تو ہوناں......؟'' اچانک پچھلی سیٹ پر دراز روڈلف کی مخصوص انداز کی آواز ابھری۔ میں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ یاسمین بھی اس کی آواز پر چونکی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کے پہلو پر بندھی ہوئی پٹی سے خون نظر آرہا تھا۔ بے چارے کی اپنی حالت ایسی تھی اور وہ میری خیریت پوچھ رہا تھا۔ میں نے جواباً مسکرا کر کہا۔

''میں تو ٹھیک ہوں، تم کیسا محسوس کررہے ہو؟''

''پیاس لگ رہی ہے۔'' اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ویسے شاید ٹھیک ہی ہوں میں......'' اس کی زندہ دلی قائم تھی۔ میں نے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی ایک لمحہ کے لیے کار کی ونڈ اسکرین سے اپنی نگاہیں ہٹائیں اور بولی۔

''پانی نہیں ہے۔ راستے میں کسی گروسری اسٹور سے بوتلیں لے لیتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں...... سفر جاری رکھو۔ میں برداشت کرلوں گا۔'' روڈلف نے کار روکنے سے منع کردیا۔ اس کی آواز اُکھڑی اُکھڑی سی محسوس ہوتی تھی۔ مجھے پھر تشویش نے آن گھیرا۔ یاسمین نے اپنے ہونٹ بھینچ کر کار کی رفتار مزید تیز کردی۔ روڈلف پھر بے ہوش ہوگیا تھا۔

مزید پندرہ بیس منٹ کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے بعد، میرے محتاط اندازے کے مطابق کار شہر کی گنجان آبادی میں آچکی تھی۔

یہ خاصا مہنگا علاقہ نظر آتا تھا۔ گھنے باغات اور خوبصورت بینگلوز طرز کے مکانات بنے نظر آرہے تھے۔ ایسے ہی ایک مکان کے گیٹ کے سامنے یاسمین نے کار روک دی۔ گیٹ پر کوئی نہیں تھا۔ یاسمین...... خود اتری۔

میں نے دیکھا، گیٹ مقفل تھا...... یاسمین نے جلدی سے کار سے اتر کر اسے کھولا تھا۔ چابی اس کے پاس تھی۔ وہ دوبارہ کار میں بیٹھی اور اندر پورچ میں لاکر روک دی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ یاسمین نے گیٹ بند کیا۔ اس کے بعد ہم پچھلا دروازہ کھول کے روڈلف کو اٹھا کر اندر لے آئے۔ وہ مکمل طور پر بے ہوش ہوچکا تھا۔

یہ ایک کشادہ کمرا تھا اور ضرورت کی ہر شے سے مزین نظر آتا تھا۔ تاہم ایک قسم کا ''بکھراؤ'' ضرور نظر آتا تھا۔ روڈلف کو ہم نے ایک فیملی صوفے پر لٹادیا۔

یاسمین نے مجھے بھی بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب دوبارہ نمودار ہوئی تو میں چونک پڑا۔ اس کے ہمراہ ایک درمیانی عمر کا آدمی بھی تھا۔ قدرے جوان ہی نظر آتا تھا۔ قد و قامت مناسب ہی تھا۔ رنگ گورا تھا۔ خوبرو تھا۔ بال ہلکے تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلکتی تھی، بالخصوص کنپٹیوں کی طرف۔ صحت قابلِ رشک تھی۔ چہرے پر ہلکی داڑھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم والے نظر کا چشمہ تھا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اگر اندر یہ موجود تھا تو باہر گیٹ مقفل کیوں تھا؟ اس کی کوئی خاص وجہ ہی ہوسکتی تھی۔

یاسمین کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

جوان مرد نے سوٹ کوٹ پہن رکھا تھا اور ٹک سک سے خاصا بردبار اور سنجیدہ آدمی نظر آتا تھا۔

''یہ میرا منگیتر ڈاکٹر حماد رضا ہے......''

یاسمین نے مجھ سے اس کا تعارف کروایا اور میں اس سے ملنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''منگیتر'' کے عنوان پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ کیونکہ حماد رضا اور یاسمین خانم کی عمروں میں مجھے کم ازکم پندرہ، بیس سال کا واضح تفاوت نظر آتا تھا۔ حماد پینتیس، چالیس کے پیٹے میں لگتا تھا تو یاسمین بائیس تیئس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ میرے حساب سے ان دونوں کو اب تک شادی شدہ ہوجانا چاہیے تھا۔ بہرکیف...... یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔

''اور...... حماد! یہ ہیں مسٹر شہزاد احمد خان...... تم انہیں نہیں جانتے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں بھی نہیں جانتی تھی، نہ ہی اس سے پہلے ہم کبھی ملے تھے۔ لیکن...... تفصیلی تعارف بعد میں...... پہلے میرا خیال ہے روڈلف کو دیکھ لیا جائے۔''

www.bookspk.site

وہ میرا ابھی مختصر تعارف کراتے ہوئے حماد سے بولی تھی۔ مجھے روڈلف کی فکر تھی اور حیران تھا کہ مستقبل کے یہ دونوں میاں بیوی تعارف میں مصروف ہوگئے تھے۔ یا پھر انہیں تسلی تھی کہ روڈلف کی وہ خاطر خواہ طبی امداد کر گزریں گے۔

تاہم ڈاکٹر حماد اور میں نے ایک دوسرے سے مسکرا کر مصافحہ کیا۔

ڈاکٹر حماد کی مسکراہٹ سنجیدہ اور روایتی طرز کی تھی۔ اس کا ہاتھ بہت نرم اور پوپلا سا محسوس ہوا تھا مجھے۔ چہرے مہرے سے وہ مجھے کچھ پریشان اور الجھا ہوا دکھائی دیا تھا۔ جانے کیوں وہ بار بار یاسمین کی طرف عجیب سی تنبیہ آمیز نظروں سے دیکھ لیتا تھا۔

ان دونوں کے درمیان نامانوس سی زبان میں کچھ مختصراً کھسر پسر ہوتی رہی تھی۔ تاہم مجھ سے وہ شستہ انگریزی میں ہی بات کررہے تھے۔ اس دوران میں نے ڈاکٹر حماد کی تنگ سی پیشانی پر شکنوں کا جال سا بھی بنتے دیکھا تھا۔ شفاف عدسے کے عقب میں اس کی سوچتی ہوئی آنکھوں میں مجھے تشویش کے سائے بھی گہرے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

اس کے بعد روڈلف کو اٹھا کر ہم ایک کمرے میں پہنچے۔ یہاں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ یہ کسی ڈاکٹر کا کلینک معلوم ہوتا تھا۔ دوائیں، چھت سے منسلک۔ لائٹس اور ایک بڑی کنٹوپ نما لائٹ کے عین نیچے بڑی سی آپریشن ٹیبل۔ جس کے سرہانے آکسیجن سلینڈر اور دائیں جانب ایک چھوٹی سی میز پر سرجری سے متعلق اسٹین لیس اسٹیل کے چمکتے لشکارے مارتے آلات، بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ روڈلف کو اسی آپریشن ٹیبل پر لٹادیا گیا تھا۔

ڈاکٹر حماد نے وہیں ایک دیوار سے لگے سنک سے دونوں ہاتھ واش کیے۔ اس کے بعد گلوز چڑھائے اور یاسمین نے سفید گاؤن پہننے میں اس کی مدد کی۔

''شہزی! تم کمرے میں جا کر آرام کرسکتے ہو۔'' یاسمین نے مجھ سے کہا۔ میں واقعی تھکاوٹ سے بہت شل ہو رہا تھا لیکن روڈلف کی حالت کی وجہ سے متذبذب سا کھڑا رہا تو یاسمین ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ ازراہِ تشفی بولی۔

''اس کی فکر نہ کرو، وہ اب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ اب ایک ڈاکٹر فزیشن اور بڑے سرجن کے زیرِ علاج ہے۔''

''زخم گہرا نہیں ہے۔ گولی بھی سطحی ہے۔ ابھی نکال لیتے ہیں۔'' اچانک ڈاکٹر حماد نے کہا۔ اس کی ناک پر [illegible] رنگ کا ماسک چڑھا ہوا تھا اور وہ روڈلف پر جھکا ہوا تھا۔

میں قدرے طمانیت بھری سانس لیے اسی نشست گاہ میں آگیا۔

سچی بات تھی جو اطمینان مجھے پہلے یہاں پہنچ کر ہوا تھا، وہ ایک بار پھر عنقا ہونے لگا تھا۔ جانے کیا بات تھی کہ میں یہاں آکر عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔

کیپٹن رانسے سے لے کر کوہارا تک اور پھر اس موذی سے اچانک غیر متوقع مڈبھیڑ نے میرے اعصاب شل کرڈالے تھے۔ پتا نہیں یاسمین اور اس کے بوڑھے باپ کا کیا چکر تھا جس میں سے جی کوہارا بھی شامل تھا۔

ایک بات پر میں اپنی بھویں سکیڑ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اگر یاسمین کا ادھیڑ عمر منگیتر یہاں موجود تھا تو پھر یاسمین کا وہ بوڑھا باپ کہاں تھا جس کی سے جی کوہارا کو تلاش تھی؟ اسے بھی تو ان کے ساتھ یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کہیں کسی کمرے میں آرام فرمارہے ہوں؟

کیپٹن رانسے کی کوہارا کے ہاتھوں ہلاکت کو میں مکافاتِ عمل ہی سمجھ سکتا تھا۔ جس نے دولت کے لالچ میں اندھا ہوکر اپنے سینئر آفیسر بوائڈ...... کو کار کے حادثے میں مروا دیا اور خود بھی کوہارا کی بربریت کا نشانہ بن گیا۔

کوہارا میرے ہاتھوں ایک بار پھر بڑی بھاری زک اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہوا تھا۔ اس بار تو میں اس کا قضیہ بس، نمٹانے ہی والا تھا، لیکن شاید ابھی اس کی زندگی کے دن باقی تھے۔ تاہم مجھے تسلی تھی وہ میرے مقابلے میں دوبارہ میدان میں اتارا گیا تھا تو دوبارہ اس سے فیصلہ کن ٹکراؤ ممکن تھا۔

مجھے جانے کب نیند نے آلیا اور میری آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ میں شاید اس آرام دہ صوفے پر ہی بیٹھا بیٹھا پشت اور سر ٹکا کر سوگیا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک نرم گرم سے بستر پر پایا۔ تب ہی مجھے اچانک یاد آیا کہ میں تو صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے سوگیا تھا تو...... پھر مجھے یہاں بیڈ تک کون لایا تھا؟

میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا اور بیڈ پر سے اٹھ بیٹھا۔ یہ ایک خوبصورت اور دیدہ زیب سا بیڈ روم تھا۔ نجانے کب تک میں سویا رہا تھا؟ میرے سامنے ہی وال کلاک رات کے دس بجے کا اعلان کررہا تھا۔ گویا میں چار پانچ گھنٹے یا اس سے تھوڑا کم زیادہ...... سویا رہا تھا۔

www.bookspk.site

مجھے بھوک اور پیاس کا احساس ہوا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر نگاہ پڑی تو وہاں کانچ کا جگ اور ایک گلاس دھرا پڑا تھا۔ جگ کو مہین جالی سے ڈھانپا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے گلاس میں پانی انڈیلا اور غٹاغٹ پی گیا۔ ایک اور گلاس بھی اسی طرح خالی کر گیا۔

ہر سُو خاموشی طاری تھی۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا جو بند تھا۔ کمرے میں تین فینسی لائٹیں لگی ہوئی تھیں جن میں ایک ہی بلب جلتا چھوڑ دیا گیا تھا۔

آرام کرنے اور پانی پینے کے بعد مجھے کچھ سکون ملا تھا۔ اچانک مجھے روڈلف کا خیال آیا۔ میں اس کی طرف سے متفکر تھا۔ تسلی بھی تھی کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں اور لوگوں میں تھا، یہی کچھ میرا حال بھی تھا۔ پھر بھی میں اس کی خیر خیریت دریافت کرنے کی غرض سے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا اور...... دروازے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دروازے سے تین چار قدموں کے ہی فاصلے پر تھا کہ اچانک وہ کھلا اور میں ٹھٹک سا گیا۔

سامنے ہی مجھے یاسمین خانم کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آ گیا۔

’’تم جاگ گئے؟‘‘

’’ہاں! لل...... لیکن میں تو باہر صوفے پر سو گیا تھا...... یہاں کیسے آ گیا؟‘‘ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

’’اس میں کیا مشکل ہے؟‘‘ وہ موہنی سی مسکراہٹ اور کھنکتے لہجے میں بولی۔ ’’میں اور حماد تمہیں سوتے میں یہاں اٹھا لائے تھے۔‘‘ اس کی بات پر مجھے شرمندگی سی ہوئی اور میں نے فوراً بات بدلی۔

’’روڈلف کیسا ہے اب؟‘‘

’’وہ بالکل ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے کہا اور قدم بڑھائے۔ میں بھی چند قدم پیچھے سرک گیا۔

اب ہم آمنے سامنے کھڑے تھے۔ اس نے اپنے تراشیدہ ہونٹوں جیسے عنابی رنگ کا دیدہ زیب لباس پہن رکھا تھا۔ لائٹ پرنٹڈ سیلولیس فراک کے نیچے اس نے ٹائٹ سیاہ رنگ کی ٹائٹس پہن رکھی تھی۔ پیروں میں کوٹ شوز تھے۔ بالوں کو سلیقے سے ربن کیا ہوا تھا۔ ہلکے میک اپ میں وہ خاصی حسین اور دلکش نظر آتی تھی۔

’’تمہیں بھوک لگی ہو گی، میں نے کھانا لگا دیا ہے۔ حماد بھی تمہارا انتظار کر رہا ہے کھانے کی میز پر۔‘‘

’’شکریہ، میں ذرا فریش ہو کے آتا ہوں۔ آپ لوگ کھانا شروع کریں۔‘‘ میں نے کہا۔ اس نے بدستور اپنی گہری گہری بولتی مسکراتی نگاہوں سے میری جانب تکتے ہوئے ایک طرف لگی بڑی سی الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مترنم لہجے میں کہا۔

’’اس میں تمہارے سائز کا کوئی نہ کوئی لباس موجود ہو گا۔ وہ پہن لینا۔ سب دھلے ہوئے اور صاف ستھرے کپڑے رکھے ہیں۔‘‘

’’بہت بہتر۔‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔ وہ میری طرف اسی مسکراتی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی واپس پلٹ گئی۔ میں یونہی بھویں اچکاتا ہوا وارڈروب کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں خاصی مشکل سے میرے ناپ کا لباس برآمد ہو سکا تھا۔ کبھی پینٹ تنگ پڑ جاتی تھی تو کبھی شرٹ۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے یہاں ٹھگنے قد یا درمیانی قامت کے ہی افراد مکین رہے ہوں۔ بہرکیف...... بڑی مشکل سے کنٹراسٹ میں ایک پینٹ شرٹ مجھے مل ہی گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ حماد رضا اور یاسمین خانم بھی وہیں موجود تھے۔ بنگلے میں ابھی تک مجھے ان دونوں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

ہم خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

’’روڈلف نے کچھ کھایا پیا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں! وہ کھا چکا ہے۔ اسے میں نے سوپ دیا تھا۔ بہت بہتر ہے اب۔‘‘ یاسمین جواب دیا۔

کھانا خاموشی کی فضا میں ختم ہوا۔ میرا اندر ایک بار پھر دھیرے دھیرے پُرتفکیر سوچوں اور الجھنوں کے باعث بے چین سا ہونے لگا تھا۔ اسی سبب میں ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا تھا۔ حالانکہ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ جاگتے سمے شاید ذہن خالی تھا اسی لیے بھوک کا زیادہ احساس ہوا۔ لیکن بعد میں ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بنتے ہی بھوک کا وہ احساس جاتا رہا تھا جو ٹیبل پر سجے اس پُرتکلف ڈنر کے ساتھ انصاف کرنے پر اکسائے ہوئے تھا۔

’’تم نے کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا مسٹر شہزی؟‘‘ میز سے اٹھتے وقت ہی حماد نے مجھ سے پوچھ لیا۔

’’میں نے کھا لیا، کھانا بہت اچھا تھا۔ میں ذرا روڈلف سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

یاسمین مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ وہاں روڈلف بیڈ پر دراز تھا۔ اس کا اوپری بدن برہنہ تھا۔ نیچے لفافہ سی شلوار تھی۔ بائیں پہلو میں ڈریسنگ ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک بڑے سے تکیے پر سر اور گردن ٹکائے سگریٹ پیتے ہوئے چھت کو گھور رہا تھا۔ وہ کسی سوچ میں مستغرق تھا۔

www.bookspk.site

ہمارے اندر آتے ہی وہ مسکرا دیا۔

’’کیسے ہو دوست؟‘‘ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ میرے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ تھی۔

’’اے ون......‘‘ اس نے بھی مسکراتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دکھاتے ہوئے کہا۔

’’خدا کا شکر ہے، تم ٹھیک ہو گئے۔‘‘ میں نے دعائیہ لہجے میں کہا۔ ’’ہمیں ڈاکٹر حماد کا تہِ دل سے مشکور ہونا چاہیے۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں۔‘‘ اچانک عقب سے حماد کی آواز ابھری۔ وہ بھی ہمارے پیچھے چلا آیا تھا۔ ہم وہاں موجود کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

’’حالات اُلجھتے جا رہے ہیں اور ہمیں فوراً امریکا روانگی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔‘‘ میں نے یاسمین اور اس کے منگیتر ڈاکٹر حماد کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے روڈلف سے کہا۔ میرے لہجے میں گہری تفکیر نمایاں تھی۔

روڈلف کے چہرے پر خاموشی طاری تھی۔ اسے شاید جواب دینے میں تامل تھا۔

’’اس وقت تمہاری امریکا روانگی کے لیے حالات سازگار نہیں ہیں مسٹر شہزی!‘‘ یاسمین نے ہی جواب دیا۔ مجھے اس کے جواب سے کوئی سروکار نہ تھا۔

میں بدستور اسے نظرانداز کرتے ہوئے روڈلف کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اس نے بھی ایک ذرا گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پھر یاسمین کی بات کی تائید میں بولا۔

’’یاسمین ٹھیک کہہ رہی ہے شہزی!‘‘

روڈلف کا جواب مجھے پسند نہیں آیا۔ میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ کسی اور معاملے میں الجھ چکا تھا۔

’’تمہاری مرضی روڈلف! تم اِدھر ہی رہو۔ میں نکلوں گا۔‘‘ میں نے کھڑے ہونے کے لیے اپنے ہاتھ گھٹنوں پر رکھے۔

’’ٹیک اِٹ ایزی مسٹر شہزاد!‘‘ اچانک یاسمین نے سنجیدگی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’روڈلف مجھے تمہارے معاملے سے آگاہ کر چکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سارے معاملات سے زیادہ اہم ہے اور ہم سب تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔‘‘

’’میں معذرت خواہ ہوں مس یاسمین کہ میں شاید آپ کی بات نہیں سمجھ پاؤں گا۔ بہرحال آپ کی یہاں تک عزت افزائی اور تعاون کا میں مشکور رہوں گا۔‘‘

’’شکریہ کیسا مسٹر شہزاد؟‘‘ اس بار حماد نے کہا۔ ’’شکریہ تو ہمیں آپ کا ادا کرنا چاہیے۔ کیونکہ......‘‘ اسی وقت وہ خاموش ہو گیا۔ کیونکہ روڈلف نے اپنا ایک ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

’’یہ تم دونوں کی بات نہیں سمجھے گا۔ مجھے کہنے دو۔‘‘

’’دیکھو بڈی!‘‘ وہ اب براہِ راست مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔ ’’یہ سارے معاملات بھی تمہارے معاملے کی ہی ایک کڑی ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا ناں...... کہ...... لولووش سے ٹکرانے کے لیے...... تمہیں اپنے ساتھ وہ سارے معاملات لے کر چلنا ہوں گے، جو اس سے متعلق ہیں۔‘‘

میں نے فوراً اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ’’تم سے کس نے کہہ دیا کہ میری امریکا روانگی کا مقصد لولووش سے ٹکراؤ ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ میری اس کے ساتھ جنگ جاری ہے، لیکن میں پاکستان سے اسپیکٹرم کا نیٹ ورک ختم کر چکا ہوں۔ لہٰذا اب لولووش سے میری جنگ ثانوی مرحلے میں ہے اور میں امریکا کسی سے جنگ کرنے کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ وہاں میرا مقصد صرف عابدہ کا حصول ہے اور بس......‘‘

’’بڈی! تم کیا سمجھتے ہو...... وہاں عابدہ تمہارا انتظار کر رہی ہے کہ تم امریکا پہنچو اور بڑے آرام سے اس کا ہاتھ تھام کر اگلی فلائٹ سے پاکستان پرواز کر جاؤ۔‘‘ روڈلف کچھ تلخ ہونے لگا، یا پھر حقائق تلخ تھے۔ میں نے بُرا نہیں منایا۔ خاموش رہا۔ حماد اور یاسمین بھی چپ تھے۔

’’بڈی!‘‘ مجھے خاموش پا کر اس بار بڑی رسانیت سے بولا۔ ’’کبھی کبھی تم بچوں جیسی ضد پر آ جاتے ہو، حالانکہ تم دماغ کے ہی نہیں بلکہ ہاتھ پاؤں سے بھی پورے میچورڈ ہو۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بیک وقت ذہن اور ہاتھ پاؤں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن میں نے تمہیں دونوں خوبیوں میں طاق و مشاق پایا ہے۔ شاید یہ تمہارا عابدہ سے محبت کا وہ جذبہ ہے جو تمہیں عجلت اور بے چینی پر اکساتا رہتا ہے اور تم ایک دم بے چین ہو کر جلد بازی پر اتر آتے ہو۔ اب جو بات میں کہہ رہا ہوں وہ پوری سن لو اور سمجھ آ جائے تو پھر آگے کوئی فیصلہ کرو، میں تمہارے ہر فیصلے میں ساتھ ہوں، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔‘‘

وہ اتنا کہہ کر ذرا سانس لینے کو رکا۔ کمرے میں گمبھیر تا سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ تھوڑا سانس لینے کے بعد وہ

www.bookspk.site

بولا۔ ”امریکا میں تمہارا ایک سے ایک جغادری دشمن خونخوار بھیڑیے کے مانند دانت نکوسے تمہارے انتظار میں بیٹھا ہے اور دشمن بھی وہ جنہیں تمہارے عابدہ والے معاملے میں متحد بھی کیے رکھا ہے۔ اب تم خود سوچ لو جب وہ خود تمہارے خلاف اس قدر متحد ہونے پر مجبور ہو چکے ہیں تو تم کیوں تنہا رہو؟

”باسکل ہولارڈ سے لے کر لولووش اور صیہونی تنظیم جیوش بزنس کمیونٹی تک سب ہی عابدہ اور تمہارے معاملے میں ایک طاقت بن چکے ہیں۔ لیکن ان تینوں کو الگ الگ خانوں میں رکھ کے بھی دیکھا جائے تو تمہارا ہر دشمن اپنی جگہ ایک مضبوط اور جامع تنظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔

”باسکل ہولارڈ سی آئی اے کے ایک پورے ونگ ٹائیگر ٹیگ کا چیف ہے۔ جے بی سی کو بھی ایک سے ایک خطرناک اسرائیلی انٹیلی جنس کی پشت پناہی حاصل ہوگی۔ رہا لولووش تو...... وہ ہے ہی اور شے...... اسے تم ان دونوں متذکرہ بالا عناصر کا مجموعہ بھی کہہ سکتے ہو۔ باسکل ہولارڈ اور جے بی سی والوں سے ممکن ہے تم اکیلے یا چند ساتھیوں کی معیّت میں بھڑ سکتے ہو، لیکن لولووش کو نابود کرنے کے لیے تمہیں لولووش تک پہنچنے کے بجائے پہلے اس کی جڑوں تک رسائی حاصل کرنا ہوگی۔

”یہ ایک پورا ٹیم ورک ہے، ان لوگوں کا ٹیم ورک جو اس کی جڑوں تک سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہوں۔ لولووش خود کو ”پرنس آف برمودا“ کہتا ہے تو کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ جانتے ہو ناں بڈی! برمودا کیا ہے؟ اسرار کے پردے میں ڈوبی ہوئی ایک خوفناک سائنس ہے۔ ایک حیرت، ایک جادو...... ہے اور ایک دہشت ناک ٹرائی اینگل ہے۔

”انسان نے کائنات تو تسخیر کر ڈالی، چاند اور مریخ سمیت دیگر گمنام سیاروں تک جا پہنچا لیکن برمودا ٹرائی اینگل کے راز و اسرار...... کو آج تک طشت ازبام نہ کر سکا۔ سنو بڈی! لولووش کے بارے میں جزائر برمودا کے باشندوں کو یہ دعویٰ کرتے سنا گیا ہے کہ ان کا شہزادہ برمودہ ٹرائی اینگل کا ایک دیوتا ہے اور اسی پُراسرار دنیا سے اس کا تعلق ہے۔ وہ اسے دیوتا مانتے ہیں۔ خیر چھوڑو...... لیکن تم کہتے ہو تمہاری جنگ لولووش سے نہیں ہے، جبکہ لولووش تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ عابدہ کا بیڑا غرق کرنے میں اس کا بھی تو پورا ہاتھ ہے۔ دیکھ لو سب سے پہلے وہی تمہارا راستہ کھوٹا کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہے۔ تم نے بھی تو اب تک اسے کم زک نہیں پہنچائی ہے۔

”مائی بڈی! یو آر سو گریٹ...... بٹ...... خدا کے لیے...... باسکل ہولارڈ اور جے بی سی سے ٹکرانا اپنی جگہ مگر لولووش سے ٹکرانے کے لیے تمہیں ذرا مختلف قسم کی ”پچ“ پر کھیلنا پڑے گا۔“

روڈلف...... پُرزور لہجے اور اپنے ایک ایک لفظ اور جملے پر زور دیتے ہوئے مجھ سے یہ سب کہتا رہا۔ میں بھی پورے دھیان اور غور سے اس کی باتیں سنتا رہا، کوئی اور شخص ہوتا تو شاید میں اتنی توجہ سے اس کی باتیں نہیں سنتا۔ مگر یہ روڈلف تھا۔ ایک ایسا آدمی جو لولووش کے بارے میں بہت کچھ بلکہ اندر تک اچھی طرح جانتا تھا۔

مجھے شاید اب اس کی نصیحت آمیز گفتگو کا مطلب... سمجھ آرہا تھا۔ سارا زور اس کی گفتگو کا اسی بات پر تھا کہ صرف روڈلف ہی میرے لیے کافی نہیں، تاہم مجھے اسی جیسے لوگوں کی ایک پوری ٹیم کی ضرورت ہے۔ میں نے سوچا، تو کیا روڈلف کے علاوہ بھی یہاں...... اس بنگلے میں ایسے لوگ موجود تھے جو لولووش کی اصلیت اس کی حقیقت کو جانتے تھے؟ کون تھے وہ؟ یاسمین خانم، اس کا منگیتر یا پھر اس کا گمشدہ باپ......؟

”کیا تم بھول گئے کہ میں نے تم سے لولووش سے متعلق کیا کہا تھا کہ وہ ایک خطرناک عالمی گینگسٹر سے بھی آگے کی ”شے“ ہے۔“ تھوڑے توقف اور مجھے سوچتا پا کے وہ دوبارہ بولا۔

”اور...... تم نے کہا تھا کہ کیا لولووش کا دوسرا روپ کسی جادوگر کا ہے؟“ روڈلف بولتا رہا۔

میرا جواب اثبات میں تھا۔ لولووش ایک شیطانی جادوگر ہی نہیں بلکہ سائنسی بازیگر بھی ہے۔ بظاہر تو اسپیکٹرم کا ہیڈ کوارٹر نیویارک میں ہے، وہاں اس کا نائب کالاہان ہی اسے سنبھالے ہوئے ہے، مگر اسپیکٹرم کا اصل مرکز برمودا کے ایک جزیرے ”آئیوری“ میں ہے، اس کے پاس دنیا کے ہر قسم کے ٹاپ پروفیشنل ایکسپرٹیز کی ٹیمیں موجود ہیں۔ ان میں کرمنلز سے قطع نظر انجینئرز، ڈاکٹرز اور سائنس دانوں اور ماہرِ فلکیات سے لے کر محقق اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے ماہر لسانیات سب ہی موجود ہیں۔ اسپیکٹرم سے انہیں بڑی بڑی تنخواہوں پر ہائر کیا گیا ہے، انہیں اعلیٰ درجے کی مراعات حاصل ہیں۔ اسپیکٹرم مختلف گروہ کا ایک ایسا مجموعہ ہے، ایک اکائی ہے۔ ایک اکیڈمی ہے۔“

www.bookspk.site

”پوچھ سکتا ہوں کہ لولووش...... کے معاملات میں ان دونوں کی کیا حقیقت ہے؟“

میں نے درمیان میں اسے ٹوک دیا۔ میرا اشارہ قریب بیٹھے حماد رضا اور یاسمین خانم کی طرف تھا۔

جانے کیوں مجھے اسپیکٹرم اور لولووش کی... ان ”لوازماتی“ تعریفوں سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ کیونکہ کم و بیش ایسی باتوں کا علم میں بھی رکھتا تھا۔

میرے ٹوکنے پر روڈلف مسکرا کر بولا۔ ”بڈی! میرا مقصد تمہیں اسپیکٹرم اور لولووش سے مرعوب کرنا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ عنقریب تمہارا اور لولووش کا سامنا ہونے والا ہے، تمہارے لیے اس کے متعلق بہت سی باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ اب تم اس کی کچھار میں گھسنے والے ہو۔ جو ایک گھن چکر ہے، حالانکہ میں ڈی کارلو سے لے کر لولووش تک ان کے بہت عرصے.... قریب رہ چکا ہوں، لیکن اب بھی لولووش اور اسپیکٹرم سے متعلق معلومات کو ناکافی سمجھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، اب اصل بات کی طرف آجاؤ۔“ میں اسے دوبارہ ٹوکنے سے باز نہ آیا۔ روڈلف نے تھوڑا منہ بنایا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے یاسمین اور اس کے منگیتر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”ان دونوں کا تو ثانوی سا تعارف کروا ہی چکا ہوں۔ یہ دونوں ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔ حماد رضا تہران کی میڈیکل یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز میں ریسرچ اسکالر ہے۔ وہیں سے اس نے گریجویشن کیا تھا۔ جبکہ یاسمین بھی سائنس گریجویٹ ہے۔ اس کا تعلق زنجان سے ہے۔ یہ پروفیسر جمشید بے کی بیٹی ہے۔ پروفیسر جمشید، زنجان (ایران) میں آرکیالوجی کے ایچ او ڈی (ہیڈ) ہیں۔ مصریات پر اتھارٹی رکھتے ہیں۔

”اسپیکٹرم میں انہیں سابقہ سربراہ مسٹر ڈی کارلو نے ایک بڑے عہدے پر کام کرنے کی آفر کی تھی، جو اس وقت ایک واقعی معتبر ادارہ تھا۔ اس کی آفر، پروفیسر جمشید نے اس شرط کے ساتھ قبول کر لی تھی کہ وہ اپنے ملک کو نہیں چھوڑیں گے اور یہیں رہتے ہوئے اسپیکٹرم کے ”تعمیری“ کاز کے لیے کام کرتے رہیں گے۔

”یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ اسپیکٹرم کے ادارے کی بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی کہ وہ دریافت اور بازیافت کے علاوہ چوری شدہ نوادرات کی تلاش کر کے انہیں اپنے صحیح اور اصل مقام تک پہنچانے کا ذمّے دار تھا۔ اسی لیے اسے بین الاقوامی سطح پر بڑی پذیرائی حاصل تھی اور فنڈنگ بھی اس ادارے کو اسی حساب سے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی ادارے میں ریسرچ کا کام بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا اسپیکٹرم کی ایک برانچ آفس کی بنیاد، حکومتِ ایران کی اجازت کے بعد تہران میں بھی رکھی گئی۔“

اتنا کہہ کر روڈلف ذرا سانس لینے کو رکا اور پھر کہنا شروع کیا۔

”انہی دنوں پروفیسر جمشید بے...... قاہرہ (مصر) یونیورسٹی کے اشتراک سے عمومی نوعیت کے منصوبوں میں ان کے ساتھ مصر میں گمشدہ مقبروں کی تلاش اور کھدائی وغیرہ میں مصروف رہتے تھے، لیکن خاطر خواہ فنڈنگ نہ ہونے کے سبب ان کے بعض منصوبے تعطل کا شکار رہے۔ جس کا انہیں افسوس ہی رہتا تھا مگر اسپیکٹرم میں شمولیت کے بعد ان کے تعاون سے انہوں نے اپنے تاخیر زدہ منصوبوں کو دوبارہ عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا لیکن اسی دوران اسپیکٹرم کے باقاعدگی سے شائع ہونے والے ایک سہ ماہی کیٹلاگ میں ایک مضمون ان کے لیے غیر معمولی دلچسپی کا سبب بنا۔

”یہ مضمون درحقیقت ترجمہ تھا ایک جرمن ٹی وی چینل ”زی ڈی ایف“ کے تحقیقاتی پروگرام کا۔ جس میں جرمن یونیورسٹی آف ٹرائیر کے پروفیسر اور تاریخ داں مسٹر کرسٹوفر شیفر نے اس بات کو رد کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ ملکہ فرعون مصر قلوپطرہ کی موت کو مصری کوبرا نے ڈسا تھا یعنی اس نے اس سانپ کے ذریعے خودکشی کی تھی، جسے انجیر کی ٹوکری میں چھپا کر لایا گیا تھا۔ جبکہ کوبرا سانپ اتنا بڑا ہوتا ہے کہ وہ ٹوکری میں نہیں آسکتا، نیز اس نے اپنی تحقیق اور مانچسٹر یونیورسٹی کے ماہرین کے مطابق بھی قلوپطرہ نے صندل، افیم اور ایک زہریلے پودے تاج الملوک کے آمیزے پر مشتمل ایک دوا کھائی تھی جو اس زمانے میں فوری طور پر ہلاک کر دینے والی جانی پہچانی دوا تھی۔

”اسی طرح ایک فرنچ برقی مضمون کا انگریزی میں ترجمہ تھا جس کے مطابق ملکہ قلوپطرہ جو ہفتم ملکہ بھی کہلاتی تھی، کے ایک عاشق اقتاطوس کا ذکر کیا گیا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ اس کی ایک لونڈی کے عشق میں گرفتار تھا اور وہ لونڈی بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ مگر چونکہ تاریخ کے مطابق قلوپطرہ جو ایک ”جنسی بلی“ تھی، ساتھ ہی ایک ایسی مکڑی کے مثل بھی...... جو اپنے عاشقوں سے دل بھر جانے کے بعد انہیں ہلاک کر دیا کرتی تھی۔ اقتاطوس کو بھی یہی ڈر تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی قلوپطرہ خودکشی کرنے کا ارادہ باندھ چکی اور خودکشی سے پہلے اپنے اسی عاشق کے کہنے پر

www.bookspk.site

قلوپطرہ نے غسل کیا تھا اور گدھ کا تاج سر پر سجایا تھا، جس کے پَر قلوپطرہ کے حسین چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ ایک انگوٹھی تھی جس میں سانپ بنا ہوا تھا، یہ دشمنوں سے حفاظت کے لیے تھی۔ اس کے کسی مخصوص حصے کو دبانے سے سانپ کے پھن میں موجود زہر... جو مدِمقابل کو ڈس لیتا تھا، ایک سنہری بھونرا تھا۔ یہ بھی انگشتری کی صورت میں تھا۔ جس کے پیٹ کو ہلکا سا دبانے پر اس کے پَر تیزی سے حرکت کرتے اور اس کی بھنبھناہٹ...... ایک طرح کا عارضی مسمریزم کا اثر رکھتی تھی، جس کی آواز مدِمقابل کے دماغ کی رگیں سن کر دیا کرتی، یا وہ معمول بن جاتا (عارضی طور پر) یا پھر وہ مر جاتا تھا۔

''یہ سامان درحقیقت اقناطوس نے اپنی محبوبہ زرمانہ کو دیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ قلوپطرہ کی تلاش میں نکلے ہوئے رومی دشمن یہاں تک پہنچ سکتے ہیں اور وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے، اس متوقع حملے کی صورت میں زرمانہ اپنا تحفظ کر سکے، لیکن بدقسمتی سے وہ ہتھیار قلوپطرہ نے زرمانہ سے چھین لیے تھے۔ وہ ان ہتھیاروں کو شاہی سامان سمجھ بیٹھی تھی، جو فرعون مرتے وقت اپنے مقبروں کی زینت بنایا کرتے تھے۔

''ادھر زرمانہ نے بھی انتقاماً ملکہ کو ان کی اصل حقیقت نہیں بتائی تھی۔ اقناطوس اور زرمانہ خود بھی یہی چاہتے تھے، یوں ملکہ کی خودکشی کے بعد دشمنوں کے حملے کے دوران انہی ہتھیاروں سے بچاؤ کرتے ہوئے یہ دونوں عاشق محبوب اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور ''لکسر'' کے مقام پر دریائے نیل کے گھاٹ کے قریب ایک ٹھکانا بنا کر وہاں رہنے لگے۔

''ایک دن اقناطوس اچانک غائب ہو گیا۔ زرمانہ اس کی جدائی میں پاگل سی ہو گئی۔ اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اپنے محبوب کی نشانی سمجھ کر اس نے بیٹی کی پرورش کی۔ اس کا نام اس نے ثمانہ رکھا۔ ثمانہ ابھی گیارہ بارہ سال کی تھی کہ ایک دن اچانک وہ بھی غائب ہو گئی۔ ثمانہ اکیلی رہ گئی۔

''اس کی ماں زرمانہ نے اپنی زندگی میں ہی وہ تینوں ہتھیار اس کے حوالے کر دیے تھے اور ان کا استعمال بھی بتاتے ہوئے کہا تھا کہ یہ اس کے (ناجائز) باپ کے دیے ہوئے ہیں۔ تب اس نے اپنے ان تینوں مذکورہ ہتھیاروں کے بل بوتے پر دھاک بٹھائی تھی اور اپنی چھوٹی سی ریاست میں حکومت کرنے لگی ''لکسر'' کے لوگ اسے ''بنتِ نیل'' کہنے لگے تھے۔

''ساتھ ہی ساتھ ثمانہ اپنی ماں...... کو بھی تلاش کرتی رہتی تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے باپ کی بھی تلاش تھی، حتیٰ کہ ایک دن ثمانہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے چند روز بعد ہی لکسر والوں نے دیکھا کہ کچھ اجنبی قسم کے لوگ کسی اہرام کی تعمیر کر رہے تھے۔ جو پرانے لوگ تھے انہوں نے ان ''پُراسرار معماروں'' میں ایک عورت اور مرد کو بھی دیکھا تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ زرمانہ اور اس کا محبوب اقناطوس تھے۔ وہ ثمانہ کی لاش سے لپٹ کر رو رہے تھے۔ بتایا گیا کہ اقناطوس کا تعلق ایک ''وائٹ گلیکسی'' نام کی کہکشاں کے ایک ہزاروں نوری سال کے کسی دور افتادہ سیارے ''زدٹون'' سے تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خلا سے آ کر مصری معماروں کو یہ عظیم الشان اہرام بنانے میں ان کی مدد کی تھی اور ان کا بیس کیمپ برمودہ ٹرائی اینگل کے کسی جزیرے میں تھا۔ جہاں زمین کے لوگ اور ان کے جہاز بھٹک کر ہمیشہ کے لیے پُراسرار طور پر غائب ہو جاتے تھے۔

یہ بھی کہا گیا کہ اقناطوس کے اچانک غیاب میں ایک مخصوص مدت (ٹائم پیریڈ) کا دخل تھا۔ جس کے بعد وہ ایک خاص تیز رفتار مقناطیسی کشش کے باعث اپنے سیارے ''زدٹون'' کی طرف، ذرات میں تبدیل ہو کر کھینچ لیا گیا تھا۔ یوں ایک مخصوص مدت گزارنے کے بعد اقناطوس نے اپنی محبوبہ کو اپنے سیارے میں بلا لیا۔ اب وہ ایسی ہی ایک مخصوص مدت ٹائم پیریڈ کے گزرنے کے بعد اپنی بیٹی ثمانہ کو بھی بلانا چاہتے تھے۔ لیکن ثمانہ وقت سے پہلے ہی انتقال کر گئی۔ یوں اب وہ اس کا زمین پر اہرام بنانے اپنے ستارہ نشیں ساتھیوں کے ساتھ پھر آئے تھے۔ کیونکہ فرعونی روایت کے مطابق انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا تھا۔ لہٰذا ثمانہ یعنی بنتِ نیل کو اس کے زر و جواہر، قیمتی لباس اور ان تینوں ہتھیاروں کے ساتھ ایک بڑے سے تابوت میں ڈال کر اہرام کے اندر ایک مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔ اس اہرام کا نام ''ڈارک گریٹ پیرامڈ'' رکھا گیا۔ اس نام کی وجہ یہی تھی کہ اس کی مخصوص بناوٹ ایسی تھی جہاں روشنی کا دخل ہی نہیں ہوتا تھا۔ چوروں کی دست بُرد سے بچانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

محققین اہرام اور تواریخ دانوں اور ''ایگزو بایولوجسٹ'' (حیاتیات کی وہ شاخ جس میں زمین کے باہر ذی حیات نامیوں پر ماحول کے اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے) کے مطابق اقناطوس کا تعلق ہماری زمین سے نہیں تھا۔ وہ کسی گمنام سیارے سے بھٹک کر ہماری زمین پر اترا تھا یا یہ ان لوگوں میں شامل تھا، کیونکہ قدیم مصر میں ''خلائی انسان'' کے نظریے کی موجودگی بھی عظیم اہرام اور اُڑن طشتریوں، یوفوز کی نشاندہی کرتی ہے۔ یوں مصر کے اہراموں کی تعمیر میں خلائی انسانوں یا کوئی ایسی غیر مرئی مخلوق کا ہاتھ تھا جن کا تعاون مصری معماروں کے ساتھ رہا تھا۔ وہ خلائی مخلوق جو زمینی انسانوں سے زیادہ ذہین تھی اور سائنس میں بہت آگے بھی، اسی طرح اہرام مصر کی تعمیر کا تعلق بھی کسی نہ کسی حوالے سے برمودہ ٹرائی اینگل سے جڑتا ہے۔

www.bookspk.site

لہٰذا پروفیسر جمشید... کو ثمانہ کی لاش اور اس کے مذکورہ اہرام ''گریٹ ڈارک پیرامڈ'' کی تلاش تھی کیونکہ ان کے مطابق یہ مذکورہ خلائی کے انتہائی طاقتور اور خطرناک ہتھیار تھے جو سولر انرجی (شمسی توانائی) سے چلتے تھے، سانپ کا زہر دراصل زہر نہ تھا وہ ایک انتہائی تیز دولٹ کی برقی رو ہوتی تھی، جو مدِمقابل کو چشم زدن میں ہلاک کر ڈالتی تھی۔

یہ سب اس کے خلائی ہتھیار تھے۔ ایک ہیڈ دائر تھا، یہی گدھ والا۔ جسے پہننے کے بعد بینائی زمین کے اندر ایک سو گز تک دیکھنے کی طاقت رکھتی اسی طرح پانی کے اندر بھی دو سو گز تک دیکھا جا سکتا تھا۔

غیر معمولی طاقتیں حاصل کرنے کے جنون میں مبتلا لولوش نے اسپیکٹرم کے بانی اور سربراہ ڈی کارلو کا قتل کیا، اسپیکٹرم کو ہائی جیک کیا۔ لیکن تنظیم کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے بعد پروفیسر جمشید... نے اسپیکٹرم سے قطع تعلق کر لیا۔ ان کی برانچ بند ہو گئی۔ ایران نے اسپیکٹرم پر اپنے ملک میں پابندی عائد کر دی۔ یہ سب پروفیسر جمشید کے ایما پر ہی کیا گیا تھا۔ کیونکہ اپنے بعض ذرائع سے انہیں لولوش کی اصلیت اور حقیقت کا علم ہو چکا تھا مگر وہ اپنا منصوبہ کسی قیمت پر بھی ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کچھ اسپیکٹرم کی مدد اور کچھ اور اپنی ذاتی کوششوں سے یہ ساری مفصل معلومات اکٹھی کیں اور اپنے ہونہار شاگرد حماد رضا اور بیٹی یاسمین خانم کے ساتھ مصر کی اس پُراسرار مہم پر جانے کا ارادہ کیا۔

حماد اور یاسمین بھی ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے تھے۔ پروفیسر جمشید کو ان کی دوستی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ لڑکا بھی کون، ان کا ہونہار شاگرد تھا، پھر بھلا انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ تاہم ان کی شادی کو انہوں نے اس مہم کی تکمیل کے بعد موخر رکھتے ہوئے ان کی منگنی کر ڈالی تھی۔''

وہ یہ ساری سحر انگیز گفتگو تفصیل سے سنانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اس نے پوری روانی کے ساتھ یاسمین خانم سے متعلق حقیقت بیان کی تھی لیکن اس داستان میں مجھے حقیقت کم اور ''سحر طرازی'' کا جادو زیادہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے غیر تاثری مسکراہٹ سے پہلے قریب بیٹھی یاسمین اور حماد کی طرف دیکھا جو اَب میری جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے بھانپنا چاہ رہے ہوں کہ میں کس قدر اثر پذیر ہوا تھا۔ ظاہر ہے انہیں مایوسی ہی ہوئی تھی۔

''روڈلف! میں اب تک نہیں سمجھ سکا ہوں کہ تم مجھے آخر سمجھانا کیا چاہ رہے ہو؟'' بالآخر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''لولوش کو تم نے شاید کوئی ماورائی طاقتوں والا انسان سمجھ لیا ہے۔ بے شک آج تک میرا لولوش سے سامنا نہیں ہوا ہے لیکن اس کی کافی حد تک حقیقتوں سے میں خود بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ میرا خیال ہی نہیں بلکہ ایک ٹھوس حقیقت بھی ہے کہ لولوش نے دانستہ اپنے ضعیف الاعتقاد قبیلے کے لوگوں کے لیے خود کو کوئی ماورائی شے ثابت کرنے کی کوشش کی ہو اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا ہو۔

''ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے کہ کوئی بھی شخص گروہ میں خود کو ''اوتار'' یا ''اَن داتا'' بنانے کی ایک نفسیاتی بیماری میں مبتلا رہتا ہے۔ لولوش بھی ایسا ہی ایک نفسیاتی مریض ہے۔ وہ کوئی ایسی ہی ماورائی طاقتوں کا حامل شخص ہوتا تو اب تک بار بار میرے ہاتھوں ذلت آمیز اور رسوا کن شکست نہیں کھا رہا ہوتا۔

''میں معذرت خواہ ہوں روڈلف! کہ میں اب یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ روڈلف بڑی چالاکی سے مجھے لولوش سے خوف زدہ کر کے ایک ایسی لاحاصل مہم جوئی میں الجھانا چاہ رہا تھا جو مجھے میرے اپنے اہم مقصد سے کوسوں دور کر ڈالتی لیکن اس کا فائدہ اسے اور اس کے دوستوں (یاسمین وغیرہ) کے حصے میں جاتا۔ دوسری بات یہ بھی طے تھی کہ میرا دل اب بھی یاسمین والے معاملے میں روڈلف سے صاف نہیں ہو سکا تھا۔ وہ پہلے سے ہی ایک ایسے منصوبے کے راستے پر گامزن تھے جس کی منزل میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

''تو کیا تمہیں میری کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے؟ تم سمجھ رہے ہو ہم تمہیں استعمال کرنا چاہ رہے ہیں؟'' روڈلف کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی ایک متاسفانہ سی حیرت مترشح تھی۔

www.bookspk.site

''سوری دوست! مجھے میری منزل کی جانب اکیلے ہی سفر پر جانے دو تو بہتر ہوگا۔ تمہیں تمہاری مہم مبارک ہو۔''

''میرا خیال ہے مسٹر شہزی... کی بات ٹھیک ہے۔'' اچانک ڈاکٹر حماد نے طویل خاموشی کے بعد لب کشائی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے کہ یہ مہم خالصتاً ہماری اپنی ہے۔''

''لیکن...... حماد! ہمیں مسٹر شہزی کو بتانا تو چاہیے کہ ہمارا دشمن مشترکہ ہے۔'' یاسمین نے اچانک کہا اور میرے کھنڈی ہوئی خاموشی لیے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی۔ ''جبکہ ہماری مہم کا مقصد بھی تو لولوش کو ایک طرح کی شکست سے ہی سے دوچار کرنا ہے۔''

مجھے یاسمین کے منہ سے یہ سن کر کچھ حیرت ہوئی تھی، کہاں تو اس نے کیپٹن رانسے کی کسٹڈی میں مختصراً تحریری تبادلے کے دوران اپنے ''رقعے'' میں روڈلف کو میرے بارے میں لکھا تھا کہ...... ''مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف تم سے مطلب ہے۔ اس سے جان چھڑاؤ، تاکہ ہم اپنی راہ لے سکیں۔ ہمارا مشترکہ مفاد اس سے زیادہ اہم ہے۔'' لیکن...... اب وہ مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی۔ شاید وہ کوہارا جیسے خطرناک آدمی کے ساتھ میری خوں ریز اور دلیرانہ جنگ سے متاثر ہوئی تھی۔

''بہرکیف......'' میں نے کہا۔ ''لولوش کے اور بھی بہت دشمن ہوسکتے ہیں اور یقیناً ہوں گے اور...... وہ اپنے اپنے طور پر اس سے نمٹ رہے ہوں گے۔ جبکہ میرا معاملہ اور ہے۔ میں امریکا لولوش سے جنگ کرنے نہیں جارہا ہے، یہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، میرا اپنا ایک مقصد ہے اور میں اسی مقصد پر اپنی ساری توجہ مرکوز رکھنا چاہتا ہوں......

''ہاں! اس درمیان میں اگر کوئی رخنہ انداز ہوتا ہے، تب میں اس کے خلاف حرکت میں آتا ہوں، اس لیے کہ مجھے آگے کے لیے اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے۔ اسی طرح لولوش ہی نہیں جو کوئی بھی میری راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرے گا، میں ایسا ہی کروں گا، ایک اور بات بتائے چلتا ہوں۔'' میں اتنا کہہ کر ذرا رکا۔ پھر ایک گہری سانس لی اور پہلے سے بھی زیادہ مستحکم لہجے میں دوبارہ بولا۔

''مجھے اس ساری کائنات میں صرف ایک ہی ہستی پر کامل بھروسا ہے اور وہ ہے میرا اللہ...... جتنا بڑا نام اتنا ہی بڑا آسرا...... ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے میں ہر مشکل گھڑی میں اسی پاک ذات کو پکارتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں وہی اول و آخر مشکل کشا ہے میرا، اس کے سوا سب ہیچ ہے۔ اب تک اسی نے ہی طاقتور سے طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں مجھے سرخرو فرمایا ہے اور آئندہ بھی وہی میری دست گیری فرمائے گا۔ پورا یقین ہے مجھے اور یہی یقین میرا ایمان بھی......''

''بے شک......'' بے اختیار یاسمین خانم اور حماد رضا کے لبوں سے برآمد ہوا تھا۔

روڈلف نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر میرے چہرے سے ہویدا ہوتے غیر معمولی جوش اور شدتِ عزم کی تندی کو محسوس کرکے اس سے بولا نہیں گیا۔

''مجھے اپنا راستہ الگ بنانا ہوگا۔ میں اب اکیلا ہی امریکا روانہ ہونا چاہتا ہوں لیکن ساتھ ہی روڈلف! میں تمہارا مشکور رہوں گا کہ تمہارا اور میرا ساتھ جس قدر رہا شاندار رہا۔''

میں نے بات ختم کردی لیکن میں نے دیکھا کہ روڈلف کے چہرے پر نہایت کرب اور افسردگی کے تاثرات تھے۔ اس نے عجیب سے انداز کی خاموشی طاری کرلی تھی اپنے چہرے پر۔ تاہم اس کے چہرے کا اُبال اور اتار چڑھاؤ اس کی اندرونی کیفیات کا پتا ضرور دیتے محسوس ہورہے تھے جیسے وہ کسی کشمکش میں ہو۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں اب کسی بحث میں پڑے بغیر مسٹر شہزی کی بہ خیر و عافیت امریکا روانگی کا بندوبست کر دینا چاہیے۔'' اس بار ڈاکٹر حماد رضا نے کہا۔

''تمہارا مشکور ہوں ڈاکٹر حماد!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر ممنون لہجے میں کہا۔ ''تازہ پیش آئند صورتِ حالات میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ میری منیلا سے امریکا روانگی کس حد تک ممکن ہے؟''

''اس کے لیے تمہیں تھوڑے دنوں کے انتظار کی ضرورت ہوگی۔'' یاسمین نے کہا۔

''پولیس میں میری کوئی نومی نیشن نہیں ہے۔ رہا کیپٹن رانسے کی ہلاکت اور ساحل پر واقع اس ہٹ پر کوہارا وغیرہ سے لڑائی کا معاملہ تو میرا نہیں خیال کہ پولیس اس میں ہماری موجودگی کا سراغ پاسکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ بڑی مشکلوں سے میں نے پولیس سے جان چھڑائی تھی، اب یہ مردود کوہارا ابھی یہاں آن پہنچا تھا اور کاسپا کو تو پہلے ہی یہاں پہنچ ہی چکا ہوگا۔ ان دونوں سے اگر میں پھر جنگ میں الجھ جاتا تو میرا امریکا والا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑسکتا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ پھر میں بھی منیلا ہی کی نہیں بلکہ پورے فلپائن کی

www.bookspk.site

پولیس کی زد میں آجاتا۔ میرا نکلنا دشوار تر کردیا جاتا منیلا سے...... کاسپا کو اور کوہارا کی اور بات تھی، وہ دونوں پروفیشنل کرمنلز تھے۔ میرا معاملہ دوسرا تھا۔ میں امریکا تک اپنا معاملہ ''صاف'' اور ''سیدھا'' رکھنا چاہتا تھا۔ کسی بھی قسم کی ''کرمنل نومی نیشن'' میرے کاز کو نقصان پہنچاسکتی تھی۔

''پھر بھی کم از کم ایک دو روز کا انتظار مناسب رہے گا۔'' یاسمین نے کہا تو ڈاکٹر حماد نے مجھ سے پوچھا۔

''تم امریکا کی کون سی ریاست یا شہر پہنچنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''کیلی فورنیا۔'' میں نے جواب دیا۔ ایسے میں عارفہ سے ٹیلی فون پر ہونے والی گفتگو میری سماعتوں میں گونجنے لگی۔

''وہاں تمہارا کوئی اپنا عزیز یا رشتے دار ہے؟''

''ہاں بھی اور نہیں بھی......''

''کیا مطلب......؟''

''میری ایک دور کی عزیزہ ہیں، وہ ابھی پاکستان میں ہی ہیں، البتہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں وہ امریکا آتی جاتی رہتی ہیں۔ وہاں بھی ان کا کاروبار ہے۔ سان ڈیاگو میں ان کی رہائش ہے۔ وہ وہیں ٹھہرتی ہیں۔ وہاں میرے کچھ اور ساتھی مددگار بھی ہیں۔''

''ہم......'' حماد نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد یاسمین نے روڈلف سے پوچھا۔

''روڈلف! تمہارا کیا خیال ہے؟ اب تو مسٹر شہزی نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ ہمارے راستے الگ ہیں؟''

اب ہم تینوں کی نظریں بیڈ پر دراز روڈلف کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر اندرونی کشمکش کا غماز نظر آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ روڈلف اگر چاہے بھی تو میرے ساتھ نہیں جاسکتا۔ اس کی حالت ایسی نہیں ہے کہ سفر کرسکے۔''

میں نے اس کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی کہہ ڈالا۔ درحقیقت میں روڈلف کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کیونکہ میں محسوس کررہا تھا کہ اس کا جھکاؤ.... یاسمین خانم اور ڈاکٹر حماد کی مہم کی طرف زیادہ تھا۔

''ہرگز نہیں......'' اچانک روڈلف نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ دنیا کے آخری کونے کا بھی سفر کرسکتا ہوں بڈی! تم مجھ سے جان نہیں چھڑا سکتے، سمجھے تم......'' اس کے لہجے میں دوستانہ انداز کی برہمی تھی۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا، تمہیں میری اور مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو یار......!'' میں نے چونک کر اور کسی قدر حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان دونوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ان کے ساتھ اپنی مہم کو جاری رہنے دو، جو شاید پہلے سے طے شدہ بھی تھی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔ کیونکہ اندازہ میرا یہی تھا کہ وہ آیا ہی منیلا اسی مقصد کے لیے تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یاسمین اور ڈاکٹر حماد یہیں موجود تھے۔ لیکن اس نے مجھ سے چھپائی تھی یہ بات اور یہی بات ہمارے بیچ وجۂ تنازعہ بنی تھی۔

''تم اب بھی مجھ سے بددل ہو بڈی......!'' اس کے لہجے میں دکھ تھا۔

''ہرگز نہیں میرے یار روڈلف!'' میں نے کھلے دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے اصل ساتھیوں کے ساتھ رہو لیکن مجھے جانے دو، میرا جانا ضروری ہے۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے، اب تمہیں کون روک رہا ہے؟'' وہ بولا۔ ''لیکن میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''تم میری دوستی کی خاطر ایسا کہہ رہے ہو؟'' میں نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''امریکا میرا وطن ہے، میرے بیوی بچے وہاں ہیں، وہ میرے منتظر ہیں، میں...... تو اپنی بیوی ماریا، بیٹے انتھونی اور بیٹی جولی سے فون پر بات بھی کرچکا ہوں، وہ میری آواز سن کر بے حد خوش ہوئے تھے اور بے چینی سے اب میری آمد کے منتظر ہیں۔''

میں خاموش ہوگیا اور دزدیدہ سی نظروں سے ڈاکٹر حماد رضا اور یاسمین کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے بشروں پہ پُرسوچ سی خاموشی کا راج تھا۔

بالآخر حماد کھڑا ہوگیا۔ یاسمین بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ حماد بولا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے، باقی باتیں کل ہوں گی۔ آرام کرنا چاہیے ہمیں اب۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ جاتے وقت یاسمین نے مجھے اسی کمرے میں رات گزارنے کا کہہ دیا تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہی میں چند گھنٹوں کی نیند لے چکا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ہمیں ذرا تنہائی میسر آئی تو روڈلف نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں نیند آرہی ہے بڈی؟''

www.bookspk.site

”نہیں تو، شاید تم سونا چاہتے ہو؟“

”میں تو سویا ہوا ہی ہوں ایک طرح سے۔“ وہ ہنس کر بولا۔”اب میں کیا بات کروں؟ تم نے چیپٹر ہی کلوز کر دیا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک بات کا خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

”ایک بات شاید اب تک کلیئر نہیں ہوئی۔“

”کون سی؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”پروفیسر جمشید بے...... والی، وہ یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا ہے؟“

”وہ یہاں ہے بھی نہیں۔“ روڈلف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”تو پھر کہاں ہے وہ......؟“ میں نے قدرے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”نارتھ ویسٹ اسٹریٹ کے ایک مکان میں...... ہے۔ وہ مکان ایک بنگلہ دیشی مسلمان حفیظ اللہ کا ہے۔ وہ ان کا ایک مہربان میزبان ہے۔“

”اور...... یہ شاندار بنگلا......؟“

”یہ پروفیسر کی ملکیت ہے۔ وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی کسی مصری مہم کے سلسلے میں روانہ ہوتے ہیں تو یہاں چند دن ضرور ٹھہرتے ہیں۔ یہ جگہ انہیں پسند ہے۔“ روڈلف بولا۔

”جب اسپیکٹرم نے انہیں اپنے نئے اسائنمنٹ کے سلسلے میں امریکا بلایا تھا اور مسٹر ڈی کارلو انہیں خاطر خواہ وسائل کے ساتھ یہ مہم ہینڈ اوور کر رہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ شامل تھا، پہلے ہم دونوں مصر گئے تھے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ہمیں بنتِ نیل (ثمانہ) کی ممی ملنا تو درکنار وہ ڈارک گریٹ پیرامڈ کو بھی نہ تلاش سکے تھے۔ کیونکہ مصر میں صرف ایک یہی اہرام نہیں ہے، نجانے کتنے ہیں، لیکن ہماری ناکامی کی وجہ یہی تھی کہ ہمارا ہوم ورک اور اس سلسلے میں تحقیق کمزور ثابت ہوئی تھی، تاہم پھر بھی میں اور پروفیسر جتنے دن قاہرہ میں رہے، تھوڑی بہت معلومات اور عملی کام کرتے رہے تھے۔ مگر لوٹنا ہمیں خالی ہاتھ ہی پڑا تھا۔

”اور...... پھر اسی دوران مسٹر ڈی کارلو کی جگہ اس، شیطان لولوش نے لے لی تو یہ کام التواء کا شکار ہو گیا۔ جمشید بے نے بھی بددل ہو کر اسپیکٹرم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا، مگر درونِ خانہ وہ اپنی جستجو میں لگے رہے، تب میں بھی کافی حد تک نیویارک میں رہتے ہوئے پروفیسر کی مدد اور رہنمائی سے کم یا زیادہ، بنتِ نیل کے گمشدہ مقبرے کی تلاش کے سلسلے میں مضامین اور نقشے وغیرہ اکٹھے کرتا رہا تھا۔

”لیکن اِدھر جمشید بے نے جب سے اسپیکٹرم سے ناتا توڑا ہے اور ”ڈارک گریٹ پیرامڈ“ کا کھوج اور بنتِ نیل یعنی ثمانہ کی ممی کی تلاش کے سلسلے میں لولوش سے ان کی رنجش کا آغاز ہوا ہے تب سے وہ ایران سے یہاں فروکش ہیں۔ ان کی تلاش سے پہلے کی ساری منصوبہ بندی اور تحقیق کا کام پوری یکسوئی کے ساتھ وہ یہاں نمٹا چکے ہیں۔ اب بس روانگی کی دیر تھی۔ اس بار وہ اپنی بیٹی یاسمین اور شاگرد حماد رضا کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ بھی اب ان کے مددگار بن چکے تھے۔ اُدھر لولوش جو انہیں پہلے لالچ اور پھر دھونس دھمکی سے ساتھ ملانے اور قائل کرنے کی کوشش میں ناکام رہا تو انہیں اغوا کرنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔

”ایران میں اپنے ایک سابقہ نمائندے کی مدد سے جو خود بھی ایک کرمنل تھا، جمشید بے کو اغوا کرنے کی کوشش چاہی، کوہارا کو اس نے خاص طور پر ان کے پیچھے برما سے تہران روانہ کیا تھا۔ یوں دو بار پروفیسر پر حملے ہوئے اور انہیں اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی، لیکن...... اس طرح اس مذکورہ مہم کے سلسلے میں جاری تحقیقاتی پروگرام ڈسٹرب ہونے لگا۔ کیونکہ وہ مہم پر جانے سے پہلے اس پر تفصیلی ہوم ورک کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مناسب جانا کہ وہ عارضی طور پر تہران سے یہاں فیلا نکل آئیں، ان کی روانگی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا، مگر جانے کس طرح اس مردود موذی کوہارا کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ کئی دن تہران میں خاک چھاننے کے بعد فیلا آن پہنچا۔“

روڈلف کی بات مکمل ہوئی تھی کہ اچانک...... میں چونکا۔ روڈلف میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا......؟“ اس نے پوچھ لیا۔

”شش...... کوئی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں میں......“ میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہولے سے اور سرسراتے لہجے میں کہا۔

روڈلف کو یکایک چپ سی لگ گئی...... میں اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

---

www.bookspk.site

زندگی بھر کی رفاقتیں اور رشتے اس لیے استوار کیے جاتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دکھوں کا ازالہ کیا جائے... مگر کچھ لوگ رشتوں کا بھرم رکھنا نہیں جانتے... وہ صرف دولت کے پجاری ہوتے ہیں... اس کی اسیری میں زندگی تمام کر دیتے ہیں... دھوکا فریب اور دغا بازی کا ایسا جال جس میں الجھ کے وہ سب گرتے ہی چلے گئے...

دولت کی طاقت اور اس کے پیچھے خوار ہونے والوں کا قصہ......

پیسے کا کھیل

تمکین رضا

”ولسن! اوے ولسن سیلی ناس!“

یہ آواز سُن کر مجھے یوں لگا جیسے بہت سے خشک پتے سیمنٹ کے فرش پر گر رہے ہوں۔ میں نے سڑک پار کرتے ہوئے پکارنے والے کی جانب دیکھا۔ وہ ٹاٹینڈا کے بیرونی احاطے میں ایک پلاسٹک کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں ڈھلوان اور ٹوٹی پھوٹی سڑک ختم ہو رہی تھی۔ وہ تقریباً میری ہی عمر اور جسامت کا تھا [illegible] کے لگ بھگ۔ قد پانچ فٹ چھ انچ اور وزن ایک سو پچاس پاؤنڈ [illegible]۔ مجھے اس کی [illegible]

www.bookspk.site

"نہیں تو، شاید تم سونا چاہتے ہو؟"

"میں تو سویا ہوا ہی ہوں ایک طرح سے۔" وہ ہنس کر بولا۔ "اب میں کیا بات کروں؟ تم نے چیپٹر ہی کلوز کر دیا۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک بات کا خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک بات شاید اب تک کلیئر نہیں ہوئی۔"

"کون سی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"پروفیسر جمشید بے...... والی، وہ یہاں کہیں نظر نہیں آ رہا ہے؟"

"وہ یہاں ہے بھی نہیں۔" روڈلف نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تو پھر کہاں ہے وہ......؟" میں نے قدرے بھویں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"نارتھ ویسٹ اسٹریٹ کے ایک مکان میں...... ہے۔ وہ مکان ایک بنگلہ دیشی مسلمان حفیظ اللہ کا ہے۔ وہ ان کا ایک مہربان میزبان ہے۔"

"اور...... یہ شاندار بنگلا......؟"

"یہ پروفیسر کی ملکیت ہے۔ وہ اکثر یہاں آتے رہتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ اپنی کسی مصری مہم کے سلسلے میں روانہ ہوتے ہیں تو یہاں چند دن ضرور ٹھہرتے ہیں۔ یہ جگہ انہیں پسند ہے۔" روڈلف بولا۔

"جب اسپیکٹرم نے انہیں اپنے نئے اسائنمنٹ کے سلسلے میں امریکا بلایا تھا اور مسٹر ڈی کارلو انہیں خاطر خواہ وسائل کے ساتھ یہ مہم ہینڈ اوور کر رہے تھے تو میں بھی ان کے ساتھ شامل تھا، پہلے ہم دونوں مصر گئے تھے۔ مگر تلاش بسیار کے باوجود ہمیں بنتِ نیل (ثمانہ) کی ممی ملنا تو درکنار وہ ڈارک گریٹ پیرامڈ کو بھی نہ تلاش سکے تھے۔ کیونکہ مصر میں صرف ایک ہی اہرام نہیں ہے، نجانے کتنے ہیں، لیکن ہماری ناکامی کی وجہ یہی تھی کہ ہمارا ہوم ورک اور اس سلسلے میں تحقیق کمزور ثابت ہوئی تھی، تاہم پھر بھی میں اور پروفیسر جتنے دن قاہرہ میں رہے، تھوڑی بہت معلومات اور عملی کام کرتے رہے تھے۔ مگر لوٹنا ہمیں خالی ہاتھ ہی پڑا تھا۔

"اور...... پھر اسی دوران مسٹر ڈی کارلو کی جگہ اس شیطان لولوش نے لے لی تو یہ کام التواء کا شکار ہو گیا۔ جمشید بے نے بھی بددل ہو کر اسپیکٹرم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا، مگر درونِ خانہ وہ اپنی جستجو میں لگے رہے، تب میں بھی کافی حد تک نیویارک میں رہتے ہوئے پروفیسر کی مدد اور رہنمائی سے کم یا زیادہ، بنتِ نیل کے گمشدہ مقبرے کی تلاش کے سلسلے میں مضامین اور نقشے وغیرہ دیکھا کرتا رہا تھا۔

"لیکن ادھر جمشید بے نے جب سے اسپیکٹرم سے ناتا توڑا ہے اور "ڈارک گریٹ پیرامڈ" کا کھوج اور بنتِ نیل یعنی ثمانہ کی ممی کی تلاش کے سلسلے میں لولوش سے ان کی رنجش کا آغاز ہوا ہے تب سے وہ ایران سے یہاں فروکش ہیں۔ ان کی تلاش سے پہلے کی ساری منصوبہ بندی اور تحقیق کا کام پوری یکسوئی کے ساتھ وہ یہاں نمٹا چکے ہیں۔ اب بس روانگی کی دیر تھی۔ اس بار وہ اپنی بیٹی یاسمین اور شاگرد حماد رضا کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے، کیونکہ وہ بھی اب ان کے مددگار بن چکے تھے۔ اُدھر لولوش جو انہیں پہلے لالچ اور پھر دھونس دھمکی سے ساتھ ملانے اور قائل کرنے کی کوشش میں ناکام رہا تو انہیں اغوا کرنے کا آخری حربہ استعمال کیا۔

"ایران میں اپنے ایک سابقہ نمائندے کی مدد سے جو خود بھی ایک کرمنل تھا، جمشید بے کو اغوا کرنے کی کوشش چاہی، کوہارا کو اس نے خاص طور پر ان کے پیچھے براستے تہران روانہ کیا تھا۔ یوں دو بار پروفیسر پر حملے ہوئے اور انہیں اغوا کرنے کی ناکام کوشش کی گئی، لیکن —— اس طرح اس مذکورہ مہم کے سلسلے میں جاری تحقیقاتی پروگرام ڈسٹرب ہونے لگا۔ کیونکہ وہ مہم پر جانے سے پہلے اس پر تفصیلی ہوم ورک کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے مناسب جانا کہ وہ عارضی طور پر تہران سے یہاں فیلا نکل آئیں، ان کی روانگی کو انتہائی خفیہ رکھا گیا تھا، مگر جانے کس طرح اس مردود موذی کوہارا کو اس کی بھنک پڑ گئی۔ وہ کئی دن تہران میں خاک چھاننے کے بعد فیلا آن پہنچا۔"

روڈلف کی بات مکمل ہوئی تھی کہ اچانک...... میں چونکا۔ روڈلف میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا......؟" اس نے پوچھ لیا۔

"شش...... کوئی گڑبڑ محسوس کر رہا ہوں میں......"

میں نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے نہایت ہولے سے اور سرسراتے لہجے میں کہا۔

روڈلف کو گویا یک چپ سی لگ گئی...... میں اپنی جگہ سے آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

چوتھا حصہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ترتیب:

ایم۔ طلحہ عامر

www.bookspk.site

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 50

www.bookspk.site

www.bookspk.site

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازعہ عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہا کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڑیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوبارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری یوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی یوٹ میں بلیوٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھوتک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوبارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈز وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہوگیا تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکا۔ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ، وہ جانتا [illegible] وہاں جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو تارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں [illegible] ساتھیوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا، ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حد شروع ہوچلی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے تاکہ راستوں کا تعین کرسکے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے۔ کیونکہ ہر طرف رینگتے ہوئے کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو نظر آئے۔ یہ سیاہ پہاڑی بچھو تھے جنہیں دیکھ کر شہزی کے اوسان خطا ہوجاتے ہیں۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑ پڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ عارب بتاتا ہے کہ پریل کو بے ہوش کرکے ایک گہرے گڑھے میں ڈال دیا ہے صبح تک جنگلی کتے اس کا کام تمام کردیں گے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کو ایک شناسا آواز نے چونکا دیا۔ یہ وزیر جان تھا۔ اور بینکاک ائرپورٹ پر شہزی کو ہیروئن اسمگلنگ کی دھمکی دے کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ وزیر خان بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا ہے شہزی کار میں اس کا پیچھا کرتا ہے۔ ایک برج پر شہزی، وزیر جان کی کار کو ٹکر مارتا ہے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے کاریں گہرے پانی میں جا گرتی ہیں۔ اس طرح وزیر جان کو تہِ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور روجیٹ کو زخمی کرکے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.bookspk.site

''پستول...... ہے تمہارے پاس بڈی؟'' روڈلف نے مجھے محتاط انداز میں کھڑے ہوتے دیکھ کر ہولے سے پوچھا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے ایک ہاتھ سے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور بغیر آواز پیدا کیے دروازے کی طرف لپکا۔

گڑبڑ کا احساس وہ دبی دبی کچھ آوازیں تھیں جس سے مجھے کسی غیر معمولی پن کی بھنک محسوس ہوئی تھی۔ جیسے کوئی کسی کو زدوکوب کر رہا ہو اور ان آوازوں میں گھبراہٹ بھی شامل تھی۔

میں دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اچانک دروازہ دھڑ سے کھلا اور میں تیزی سے اس کے عقب میں سائڈ کی دیوار سے چپک گیا۔ ایک شخص ہاتھ میں لمبی نال والا پستول لیے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا، یہ سائلنسر تھا۔ اس نے دائیں بائیں محتاط انداز میں دیکھا۔ جب اس کی نظریں سامنے بیڈ پر دراز روڈلف پر پڑیں تو بلا دیر اس نے ٹریگر دبا دیا۔

اس کے سائلنسر لگے پستول سے ہلکی ''چز ز'' کی آواز برآمد ہوئی، میں ابھی اس پستول بدست پر حملہ کرنے کی درست پوزیشن میں نہیں تھا، گولی چلی، نشانہ روڈلف ہی تھا جو خود بھی تھوڑا اُٹھ کر اسی طرف دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً اس نووارد پستول بدست شخص کو دیکھتے ہی بیڈ سے یک دم پلٹ کر خود کو نیچے گرا لیا۔ پستول بدست نے اپنا وار خالی جاتے دیکھ کر روڈلف پر دوبارہ خاموش فائر کرنے کے جوش میں تھوڑا اور اندر سرک آیا تو میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔

میرے دائیں ہاتھ کی مخصوص انداز کی ضرب اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑی اور بائیں ہاتھ کا گھونسا اس کی کنپٹی پر لگا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور وہ حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج کرتے ہوئے چند قدم لڑکھڑا کر گر پڑا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے، اسی حملہ آور کے عقب میں بھی کسی کی جھلک دیکھی...... اس کے ہاتھ میں بھی ایسا ہی سائلنسر لگا پستول تھا۔

''خبردار......! اب کوئی حرکت مت کرنا۔'' اس کے حلق سے وحشیانہ غراہٹ برآمد ہوئی۔ میں اپنی جگہ جامد ہو کر رہ گیا۔

''اپنے دونوں ہاتھ کھڑے کرلو۔'' اس نے تحکمانہ درشتی سے دوسرا حکم صادر کیا۔ تب تک پہلا والا اس کا ساتھی اپنا مضروب سر جھٹکتا ہوا، سنبھلنے کی کوشش میں تھا۔ کنپٹی پر لگنے والے میرے گھونسے نے اسے بری طرح ہلا کر رکھ ڈالا تھا۔

تب ہی اچانک ایک تیسرے شخص کو دیکھ کر میری آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بینکاک کا...... ''ہوا''...... اور تھائی لینڈ کا ایک بڑا ڈان کاسپاکو تھا۔

☆☆☆

وہ اپنے بھینسے جیسی جسامت کے ساتھ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا میری طرف قہر بار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین لیس اسٹیل کا خطرناک پسٹل چمک رہا تھا جس کی نال کا رخ میری جانب ہی تھا۔ اس کی شعلے برساتی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور چربیلا چہرہ غصے اور طیش کے مارے سرخ اور کریہہ انگیز دکھائی دیتا تھا۔

''شہزی! تم نے ذرا بھی حرکت کی تو ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر تمہاری پیشانی میں سوراخ کردوں گا۔'' وہ کسی خونخوار بھینسے کی طرح ہی ڈکرا کے بولا۔ اس کی آواز اور لہجے سے انتقام اور خطرناک عزائم کی بُو آرہی تھی۔

میرے کتنے ہی دشمن تھے جو جگہ جگہ بُوگیر کتوں کی طرح میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے، بلاشبہ ان میں کاسپاکو اور اس کے خونی ہرکارے بھی شامل تھے۔ لیکن خود بہ نفسِ نفیس کاسپاکو کو سامنے دیکھ کر میرے رگ و پے میں لمحہ بھر کو ہی سہی، پھریری سی دوڑ گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید روڈلف کا زخمی حالت میں اس کمرے میں موجود ہونا تھا اور وہ کاسپاکو جیسے سفاک بھیڑیے کا پہلا اور ٹاپ ٹارگیٹڈ شکار بھی تھا۔

''تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میرے دونوں ہاتھ فضا میں بلند ہیں اور میں نہتا بھی ہوں۔''

میں نے بظاہر پُرسکون آواز میں کہا، جبکہ میرے تنے ہوئے وجود میں آمدِ طوفان کا سا ارتعاش طاری تھا۔ میں کسی چوکنے چیتے کی طرح اس بھیڑیے کو پچھاڑنے کی تدبیر پر غور کر رہا تھا۔

''اسی میں تمہاری بہتری ہے۔'' کاسپاکو بھیڑیے سے مُشابہ آواز میں غرا کر بولا۔ ''اسی طرح باہر آجاؤ......'' وہ پھر زہرخند آواز میں تحکمانہ درشتی سے بولا اور میں نے ایسا ہی کیا۔

اس کے دوسرے پستول بدست ہرکارے نے بھی ہنوز مجھے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا جبکہ اس کا پہلا وال مضروب ہرکارہ جو اَب تک خود کو سنبھال چکا تھا، اس نے ا گرا ہوا پستول سنبھالتے ہی روڈلف کو بھی گن پوائنٹ لے لیا تھا، میں نے ذرا گردن موڑ کر اس کی یہ کارگزاری

www.bookspk.site

دیکھی تھی۔

روڈلف بے چارہ اس کے خاموش پسٹل کی چلائی ہوئی گولی سے بچ تو گیا تھا مگر زخمی سے نکل نہیں سکا تھا۔ اس مذکورہ بدبخت ہرکارے نے موقع ملتے ہی اسے بھی میری طرح مغلوب کر ڈالا تھا۔

کمرے سے باہر آکر مجھے اور روڈلف کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ روڈلف زخمی تھا اور اس کے لیے کھڑا ہونا محال تھا اسی لیے...... وہ دیوار کے ساتھ اپنی پشت ٹکائے فرش پر بیٹھ چکا تھا۔ یاسمین خانم کے منگیتر ڈاکٹر حماد نے اس کی مائنر سرجری کر کے گولی نکال لی تھی، اسی لیے روڈلف کا اُوپری بدن برہنہ تھا اور نیچے لفافہ ٹائپ شلوار تھی۔

پہلے والے ہرکارے کی چلائی ہوئی گولی سے بچنے کے لیے وہ اپنے بیڈ سے ایک دم لڑھک کر نیچے فرش پر گر پڑا تھا جس کے باعث اب اس کے زخم پر لگی پٹی سرخ ہونے لگی تھی۔ وہاں سے اب خون رسنے لگا تھا۔

''اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے کاسپاکو......!'' میں نے کہا۔ اشارہ روڈلف کی طرف تھا۔ ''اسے بیڈ پر......''

''شٹ اَپ......'' کاسپاکو ایک گونجدار دہاڑ کے ساتھ بولا اور میری آواز حلق میں ہی دب گئی۔ تب ہی کاسپاکو نے اپنے ایک ہرکارے کو کوئی مخصوص اشارہ کیا تھا، جس نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو خفیف سی اثباتی جنبش دیتے ہوئے اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے سائلنسر لگے پستول کو اس کی طرف بڑھا دیا، جسے کاسپاکو نے اپنے دائیں ہاتھ میں لے لیا...... اپنا خطرناک پسٹل آرسنل وہ اپنے بائیں ہاتھ میں منتقل کر چکا تھا۔

میری دھڑکتی نظریں اس کی ہر حرکت پر مرکوز تھیں اور یکلخت میری کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔ آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

''میں ابھی اسے اس مشکل سے نجات دلائے دیتا ہوں......'' کاسپاکو نہایت سفاکی سے بولا اور ہرکارے سے لیا ہوا پستول دائیں ہاتھ میں تھامتے ہی اس کی لمبی نال کا رخ...... دیوار سے پشت ٹکائے زخمی روڈلف کی طرف کر دیا۔ مارے دہشت کے روڈلف کا منہ کھل گیا، آنکھیں خوف سے پھیل گئیں، یقینی اور صرف ایک پل کے فاصلے پر کھڑی موت کو سر پر دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت بھی زرد پڑ گئی تھی۔

''نن...... نہیں...... کاسپا......'' میرے منہ سے ابھی اتنا ہی برآمد ہو سکا تھا کہ سائلنسر لگے پستول سے یکے بعد دیگرے دو خاموش فائر ہوئے، دو شعلے چمکے اور روڈلف کا سینہ خون سے تر ہو گیا۔

میرے پورے وجود میں کرب کی لہر دوڑ گئی، دل دکھ کے شدید احساس سے بھر گیا اور میں جیسے سب کچھ بھلا کر روڈلف پر جھک گیا۔ پھر اکڑوں بیٹھ کر اسے سنبھالنے لگا اور ساتھ ہی گردن موڑ کر کاسپاکو کی طرف خوف ناک نظروں سے گھور کر پورے جسم و جاں کی طاقت سے اس قدر دہاڑ کر بولا کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔

''کاسپاکو...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا......''

میرا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے نفرت و غیظ کے شعلے پھوٹنے لگے تھے۔ کاسپاکو کے مکروہ چربیلے چہرے پر سفاکانہ مسکراہٹ اور میچی میچی آنکھوں سے کینہ پروری کی چمک ہویدا ہو رہی تھی۔

''شش...... شہزی......!''

روڈلف نے اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ مجھے پکارا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''مم...... ماریا سے ضرور ملنا...... اُسے بتا دینا...... کہ...... مم...... اب......'' اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ موت کا خوفناک سایہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔

میرے چہرے سے کرب انگیزی مترشح تھی، حلق میں رقت سی اُترنے لگی تھی۔

''ورنہ وہ...... بب...... چاری میرا انتظار ہی کرتی......'' وہ جملہ پورا نہ کر پایا اور...... اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے، گردن موڑ کر سامنے کھڑے اس درندہ صفت کاسپاکو کی طرف بڑی خوف ناک نظروں سے دیکھا اور پھر روڈلف کے بے سدھ وجود کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا کاسپاکو......!''

''تمہیں اس کا افسوس نہیں ہونا چاہیے...... یہ تو میرا پرانا شکار تھا اور تم نے اسی کے ساتھ ہی تو مل کر میرے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔'' کاسپاکو بولا۔

''یہ تمہاری غلط فہمی تھی۔''

''ہِس......!'' اس نے وہ پستول دوبارہ اپنے ساتھی کی طرف بڑھاتے ہوئے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

www.bookspk.site

www.bookspk.site

’’اب یہ کہانی ختم کرو...... اور آگے چلو...... ورنہ تمہارا حشر بھی اس سے مختلف نہیں ہوگا۔‘‘

کاسپاکو سے اب بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ میں نے ایک غمزدہ سی نظر مردہ روڈلف پر ڈالی۔ جس کا سر سینے کی جانب جھکا ہوا تھا اور سینے سے اس کے ہنوز بھل بھل خون جاری تھا۔

میرے تصور میں روڈلف کا ہنستا مسکراتا چہرہ اُبھر آیا۔ اس کی زندہ دلی کی باتیں اور مسکراتے جملے میری زخمی سماعتوں میں گونجنے لگے۔ اس کا مخصوص انداز میں مجھے پکارنا۔

’’ہے بڈی......! تم نے ہی تو میرے اندر جینے کی اُمنگ جگائی ہے۔ ورنہ تو میں زندگی سے ہی مایوس ہوگیا تھا۔ میرے دل میں اپنی بیوی ماریا، بیٹے انتھونی اور بیٹی جولی سے ملنے کی چاہت اب اور بھی زور پکڑ گئی ہے۔‘‘

جب ہم بینکاک میں تھے، وہ اکثر اپنی بیوی بچوں کی باتیں کرتا تھا۔

یہی نہیں اس نے میرے ساتھ امریکا پہنچ کر عابدہ کی رہائی وغیرہ کے سلسلے میں میری ہر ممکن مدد کرنے کے عزم کا بھی اظہار کیا تھا۔

درمیان میں یاسمین خانم والے پُراسرار معاملے میں میری اس سے غلط فہمی ہوگئی تھی، جو اس نے فوراً ہی رفع کر دی تھی، یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ اس کے مرنے سے پہلے ہمارے دل صاف ہوگئے تھے، ورنہ میرے دل میں کسک باقی رہتی۔

ایک طرح سے یاسمین خانم والے معاملے میں بھی اس کا مقصد میری مدد کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اسے پتا تھا کہ امریکا میں لولوش جیسا دشمن بے چینی سے میرا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ مجھے اس موذی سے نبرد آزما ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش میں تھا کہ میں کم از کم لولوش کے معاملے میں...... اسے کوئی عام انسان سمجھنے کی غلطی نہ کروں۔

’’کوئی فائدہ نہیں اس کا غم کرنے کا۔ آخری بار کہہ رہا ہوں...... آگے بڑھو......‘‘

میں نے ایک نگاہ اس کے مکروہ چہرے پر ڈالی اور نفرت و غیظ کی ایک لہر سی اپنے اندر اُٹھتی محسوس کی اور ناچار آگے قدم بڑھا دیے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ان رذیلوں نے یاسمین خانم اور اس کے منگیتر حماد کا کیا حشر کیا تھا۔ کیونکہ تھوڑی دیر پہلے ہی وہ دونوں سونے کے لیے جا چکے تھے۔

مجھے جس کمرے میں لایا گیا تھا، وہ نشست گاہ تھی، وہاں روشنی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی مجھے چونکنا پڑا تھا۔ میں نے وہاں صرف یاسمین خانم کو بے ڈھنگے انداز میں نفیس قسم کے آرام دہ صوفوں کے درمیان قالین پر پڑے پایا۔ اس کی پیشانی سے خون رس رہا تھا، میں زخم کے اس نشان کو صحیح طرح نہیں دیکھ پا رہا تھا جس سے مجھے یہ اندازہ ہوتا کہ اسے کوئی معمولی چوٹ لگی تھی یا گولی......

پتا نہیں وہ زندہ تھی یا بے ہوش...... تاہم میری کھوجتی نظروں نے اس کے وجود کو مزید ٹٹولنے کی کوشش چاہی تھی کہ شاید کہیں اور بھی کوئی زخم کا نشان نظر آجاتا۔

ایک اُلجھن مجھے ڈاکٹر حماد کے سلسلے میں بھی ضرور محسوس ہوئی تھی کہ وہ کہاں تھا......؟

وہاں دو ہرکارے اور بھی موجود تھے، جنہیں میں فوراً ہی پہچان گیا تھا۔ یہ اسی کے بینکاک والے ساتھی تھے۔ وہ دونوں کاسپاکو کے مخصوص اشارے پر فوراً ہی حرکت میں آگئے، ایک نے اپنے کوٹ کی جیب سے رسی نکالی اور...... مجھے رسن بستہ کرنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ دوسرے نے مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکے اپنی گن تان لی۔

مجھے تین مسلح ہرکاروں نے گن پوائنٹ کی زد میں لے رکھا تھا جبکہ کاسپاکو نے بھی اپنا خطرناک آرسنل پسٹل مجھ پر تان رکھا تھا۔ یہ لوگ بے حد محتاط نظر آرہے تھے۔ انہوں نے سیاہ اور گرے کلر کے کوٹ سوٹ پہن رکھے تھے، جبکہ کاسپاکو نے اپنے بھینسے جیسے وجود پر بھی ہلکے سبز رنگ کا سوٹ ’’پھنسا‘‘ رکھا تھا۔

ان کا چوتھا ساتھی نائیلون کی ڈوری تھامے میری طرف بڑھا۔ میرے دونوں ہاتھ ہنوز سر سے بلند تھے۔

’’اپنے ہاتھ نیچے کرو......‘‘ اس نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی جانب کر دیے۔ میرا بدستور تیزی سے کام کرتا ہوا ذہن، ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی تدبیر سوچنے میں محو تھا مگر میں محض سوچتا ہی رہ گیا اور وہ مجھے رسن بستہ کر چکا تھا۔

اُس خبیث نے میرے دونوں ہاتھ پشت کی طرف کر کے باندھ دیے تھے۔ پھر یہی کام اس نے قالین پر بے سُدھ پڑی یاسمین خانم کے ساتھ بھی کیا تو مجھے اس کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی کہ وہ زندہ تھی، وہ شاید اسے بھی میری طرح اپنے ساتھ ہی کہیں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔

میرے رسن بستہ ہوتے ہی انہوں نے اپنے پسٹل فوراً جیبوں میں ٹھونس دیے۔

اس کے بعد چوتھے ہرکارے نے مجھے دروازے کی طرف دھکیلا...... ایک نے بے ہوش یاسمین کے وجود کو اپنے کندھے پر اُٹھالیا تھا۔

میں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی معیت دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ایک بڑے سے گیٹ سے گزر کر ہم باہر نکل آئے۔ یہاں دو چمکتی ہوئی کاریں کھڑی تھیں۔ میں نے بغور ان کا جائزہ لیا۔ دونوں ہی مجھے کرائے کی محسوس ہوئی تھیں کیونکہ سائز اور شیپ میں یہ دونوں کاریں ایک جیسی تھیں اور ان کی نمبر پلیٹوں سے بھی کچھ اسی طرح کی مجھے بھنک پڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

بنگلے کے گیٹ کے سنگِ مرمر والے ستونوں پر نصب گلوب روشن تھے۔

یہ سب لوگ پھرتی کے ساتھ دونوں گاڑیوں میں سوار ہوئے۔

میرے دونوں ہاتھ باندھنے کے باوجود یہ مجھ سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے تھے۔

جس کار میں کاسپاکو سوار ہوا تھا۔ اسی میں مجھے سوار کرایا تھا۔ ایک میرے دائیں جانب عقبی نشست پر بیٹھ گیا تھا اور دوسرے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی، کاسپاکو اسی کے برابر والی سیٹ پر ٹھنسا بیٹھا تھا۔ باقی دونوں ہرکارے دوسری... کار میں سوار ہوگئے تھے۔ یاسمین کو انہوں نے اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال دیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد دونوں کاریں اسٹارٹ ہوئیں اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئیں۔

کاسپاکو میری تلاش میں بینکاک سے یہاں منیلا پہنچ چکا تھا، جس کا مجھے پہلے ہی اندازہ تھا، کیونکہ اس سے پہلے بھی میرا اس کے ساتھیوں سے ٹکراؤ ہوچکا تھا، جو مجھے اپنے ساتھ ایک ٹھکانے پر لے گئے تھے اور وہیں مجھے بتایا گیا تھا کہ ان کا باس بھی بینکاک سے یہاں منیلا پہنچنے والا تھا لیکن...... مجھے اس بات کی بالکل بھی توقع نہ تھی کہ وہ اچانک یاسمین کے اس بنگلے پر شب خون مارے گا، بھلا اسے یہاں کا کیسے علم ہوا تھا؟ اور یہ بھی کہ میں بھی اسی بنگلے میں موجود تھا مگر دوسرے ہی لمحے میرے تیزی سے کام کرتے ذہن میں ایک خیال ’’کلک‘‘ ہوا۔

مجھے یاد آیا جب سے جی کو ہارا ہمیں یرغمال بنا کے اپنے ٹھکانے کی طرف جا رہا تھا تو ایک ویرانے میں اس کے ایک ساتھی کو ایک کار پر شبہ ہوا تھا کہ وہ ان کے تعاقب میں تھی۔ کیا خبر وہ کاسپاکو کے ساتھیوں کی ہو...... جو میری تلاش میں منیلا کا کونا کونا چھانتے پھر رہے تھے۔

رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی، سڑک تقریباً ویران ہی نظر آرہی تھی۔ دونوں کاریں ایک دوسرے کے آگے پیچھے سنسان سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھیں۔

مجھے رہ رہ کر روڈلف کی اس طرح اچانک اور غیر متوقع موت پر افسوس ہو رہا تھا اور دل و دماغ بالکل بوجھل سا تھا۔ اعصاب ہنوز میرے تنے ہوئے تھے مگر جان بے جان سی محسوس ہوتی تھی، روڈلف کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

اس کا میرا جتنا بھی ساتھ رہا، وہ بھائیوں جیسا ہی رہا۔ اس کا مجھے بار بار لولوش کی جانب سے محتاط کرنا اور اس سے ٹکراؤ کے لیے مخصوص تیاری کے لیے نصیحتیں کرنے کا پُرفکر انداز یاد آئے جا رہا تھا۔ اس کا سارا زور اسی بات پر ہی ہوتا کہ میں لولوش کو اپنے دوسرے خطرناک دشمنوں کی طرح کمزور نہ سمجھوں نہ ہی اسے لائٹ لینے کی کوشش کروں......

مجھے روڈلف سے بس ایک ہی اختلاف رہتا تھا کہ وہ لولوش کو کوئی ماورائی شخصیت سمجھتا تھا۔ اس کا زور اسی بات پر ہوتا تھا کہ میں بھی اس کے لیے ’’کیل کانٹے‘‘ پہلے سے تیار رکھوں جو اسی انداز کے ہوں...... شاید وہ بے چارہ اسی لیے...... یاسمین والی مہم میں مجھے شریک کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا اور میں نے اسے غلط سمجھا تھا۔

جانے کیا بات تھی کہ اب روڈلف دنیا میں نہ رہا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ اس کی باتیں قابلِ غور ہی نہیں بلکہ لائقِ عمل بھی تھیں۔

نجانے بعض چیزوں کا اثر بعد میں کیوں ہوتا ہے۔ جب کوئی ایسا اچانک اور غیر متوقع واقعہ رونما ہوجائے، تب ہی احساس ہوتا ہے کہ اس سے جو تھا وہ غلط نہ تھا، اسی طرح مجھے روڈلف کی لولوش سے متعلق بتائی گئی باتوں کی اثر پذیری کا احساس اب ہو رہا تھا۔

یوں میرے دشمنوں نے منیلا کو بھی میرے لیے شہرِ خرابہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ کاسپاکو اچانک آن ٹپکا تھا، اگرچہ اس کا ’’ٹپکنا‘‘ غیر متوقع نہ تھا، دوسری طرف سے جی کو ہارا الگ یہاں میری تلاش میں بھوکے بھیڑیے کی طرح سرگرداں تھا۔ پتا نہیں اور کتنے میرے جاں نثار ساتھیوں کا ان کے ہاتھوں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ابھی باقی تھا۔

’’ان لوگوں کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا......؟‘‘

www.bookspk.site

English
تیرا روپ
بہت خوب
English
UBTAN TURMERIC CREAM
SnScares
@SnScare

www.bookspk.site

اچانک کاسپاکو نے مجھ سے سوال کر ڈالا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کن لوگوں کی بات کررہا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، وہ اپنے طور پر اندازہ قائم کرتے ہوئے خود ہی جواب میں بول پڑا۔

’’شاید یہ دونوں مرد عورت تمہارے اور روڈلف کے ساتھی بن چکے تھے اور تم لوگوں نے وہ مجسمہ اُڑانے کا مشترکہ پلان بنا رکھا تھا اور...... انہی لوگوں نے ہی کیپٹن رانسے کو بھی ہلاک کیا تھا مگر دیکھ لو، میرے آدمی سائے کی طرح یہاں بھی تمہارے پیچھے لگے ہوئے تھے اور بالآخر تمہیں چھاپ لیا۔ تمہارے ساتھیوں سمیت......‘‘ اس کے لہجے میں طاقت کا زعم اور غرور صاف عیاں تھا۔

’’مسٹر کاسپاکو......!‘‘ میں نے نہایت... سکون اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’کاش! تم مجھ سے متعلق اپنی تمام قیاس آرائی کو ایک طرف رکھ کے اور بدگمانی کی عینک اُتار کر کچھ حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرو تو کافی حد تک تمہیں صرف سچائی کا ادراک ہوجائے گا۔‘‘

میں نے دانستہ اسے ’’باس‘‘ کہنے کے بجائے اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔

’’کیا مطلب ہے تمہارا......؟‘‘ وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر ہی نہیں گردن پر بھی اس قدر چربی کی تہیں جمی ہوئی تھیں کہ وہ گردن موڑ کر میری طرف عقب میں دیکھنے سے بھی قاصر ہی تھا۔ اسی لیے ونڈ اسکرین کے اُوپر لگے بیک دیو پر ہی مجھ پر نظریں گاڑے بات کررہا تھا۔

میں بھی اسی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

’’بہت آسان لفظوں میں، تمہیں میں نے ایک گہری بات سمجھانے کی کوشش چاہی ہے۔‘‘ میں اسے پھر شیشے میں اُتارنے کی کوشش کررہا تھا۔

’’سمجھ رہا ہوں تمہاری بات میں...... اس فضول بحث کو چھوڑ دو اب...... یہ سب کچھ اس وقت تک تھا جب میرے اور تمہارے درمیان اعتماد کی فضا قائم تھی۔ مگر اب...... تم جو کچھ کرو گے، میری نظروں کے سامنے کرو گے۔‘‘

میں اس خبیث درندے کی بات سن کر بے اختیار ایک گہری ہمکاری خارج کر کے رہ گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ کاسپاکو بار بار میرے جھانسے میں آنے والا نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے بھی موضوع بدلتے ہوئے اس سے سوال کر ڈالا۔

’’تم نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟‘‘ میرا اشارہ یاسمین خانم اور اس... کے منگیتر ڈاکٹر حماد کی طرف تھا۔

’’ہاہا...... ہاہا......‘‘ کاسپاکو نے جواب دینے کے بجائے ایک بے ہنگم سا قہقہہ بلند کیا۔ ’’آخر تمہیں ان کی جانب سے تشویش ہوگئی ناں......، پھر تم کیسے کہہ رہے ہو کہ تمہارا ان سے کوئی تعلق نہیں......؟‘‘ اس نے اپنے تئیں مجھے لاجواب کرنا چاہا تو میں بھی ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

’’دیکھا......! میری بات سچ ثابت ہوئی ناں...... مسٹر کاسپاکو...... تم اپنی طرف سے غلط اندازے قائم کرتے ہو اور خود ہی فیصلہ صادر کر ڈالتے ہو، حالانکہ میں نے تم سے یہ کہا ہی نہیں ہے کہ میرا ان مذکورہ مرد عورت سے تعلق ہی نہیں......‘‘

کاسپاکو کی پیشانی پر میری یہ مدلّل بات کسی گولی طرح ہی لگی تھی۔ وہ خود لاجواب سا ہوکر رہ گیا تھا۔

چند ثانیے سوچتی ہوئی سی خاموشی میں بیت گئے۔ میرا خیال تھا کہ وہ آگے کچھ کہے گا مگر وہ بدستور چپ رہا تو میں نے بھی بولنا مناسب نہیں سمجھا، البتہ مجھے ڈاکٹر حماد اور یاسمین خانم کی طرف سے فکر ہورہی تھی۔ نجانے اس درندہ صفت انسان نے ان لوگوں کے ساتھ کیا حشر کیا ہوگا۔

نصف گھنٹے کی تیز رفتار اور نان اسٹاپ ڈرائیونگ کے بعد ہم مضافاتی علاقے میں داخل ہوگئے۔ مجھے یہاں آکر حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق انہیں اسی مکان کا رخ کرنا تھا جہاں پہلے اس کے ہرکارے مجھے اور روڈلف کو ائرپورٹ سے لے کر.... گئے تھے مگر یہ ان کا کوئی اور ٹھکانا تھا۔ جو شہر کے قدرے مضافات میں تھا۔

کار سے اُترنے اور اس ٹھکانے کے اندر داخل ہونے تک میں نے اطراف اور اس عمارت کا بغور جائزہ لینا ضروری سمجھا تھا۔

یہ بھی کوئی ایسا ہی مکان تھا، جیسا کہ ایسے مضافات میں ہونا چاہیے تھا، لکڑی کا بنا ہوا ایک منزلہ مکان...... ڈھائی تین سو گز سے زیادہ اس کا رقبہ نہ تھا۔ مکان کی عمارت کافی خستہ نظر آتی تھی جس پر نیلا اور زیادہ تر سفید رنگ کیا ہوا تھا۔

کار سے اُترتے ہی پہلے کاسپاکو کا ایک آدمی اندر داخل ہوا تھا۔ کوئی تالا چابی نہ تھا۔ وہ دروازہ کھول کر ایسے ہی اندر داخل ہوگیا تھا اور اس کے بعد اندر باہر روشنی ہوگئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایک بڑے سے کمرے میں

تھے۔ یہاں پر رکھے مختصر فرنیچر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کاسپاکو کا یہ نیا ٹھکانا عارضی تھا۔

یاسمین کو ہوش آچکا تھا۔ اسے بڑی بیدردی کے ساتھ ایک صوفے پر پھینک دیا گیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ سی نظر آرہی تھی، اس کے چہرے پر پہلے تو خوف اور پھر شدید ذہنی کرب کے آثار نظر آرہے تھے، اس کی خوبصورت کشادہ آنکھوں میں مجھے نمی بھی اُتری ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ وحشت زدہ سی نگاہوں سے ان سب کو تکے جارہی تھی اور...... مجھ پر بھی اس کی نگاہ پڑی تھی۔

میں نے خود کو دانستہ ایسے رخ پر کھڑا کرلیا تھا کہ میرے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ کسی ہرکارے کی نظروں میں نہ آسکیں اور نہ ہی وہ میری اس ”کارگزاری“ کو دیکھ سکیں جو میں نے کار میں ان کے ساتھ بیٹھتے ہی شروع کردی تھی۔

ہاں......! میں نے موقع پاتے ہی اپنے ہاتھوں کے جکڑبند کی مضبوطی جانچنے کے لیے انہیں دھیرے دھیرے حرکت دینا شروع کردی تھی۔ نائیلون کی ڈوری جتنی مضبوط ہوتی ہے اُتنی ہی ”پھسلواں“ بھی ہوتی ہے۔ بس، یہی اس میں ایک خرابی ہوتی ہے، بندھے ہوئے ہاتھ اگر کسی کی نظروں میں نہ ہوں تو انہیں مستقل حرکت دیتے رہنے کے سبب ان کی مضبوطی کمزور تو کی جاسکتی ہے مگر کھولی پھر بھی نہیں جاسکتی۔

تاہم اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ایک خاص ٹیکنک کو اپلائی کرتے ہوئے ہاتھوں اور اُنگلیوں کو مسلسل حرکت دینے سے ان کا ”حلقہ“ کشادہ کیا جاسکتا ہے۔ میں اس کوشش میں اسی وقت سے ہی جُت گیا تھا جب مجھے کار میں سوار کرایا گیا تھا۔ اب بھی میری یہی کوشش جاری تھی۔ میرے اندر اس سمے ایک طوفانِ بلاخیز کروٹیں لے رہا تھا اور ایک جوالہ مکھی پھٹ پڑنے کو بے چین تھا۔ روڈلف کا مردہ چہرہ، اس کی بے بسی کی موت جو میری آنکھوں کے سامنے واقع ہوئی تھی، وہ مجھے ایک جنونِ لہورنگی میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ کاسپاکو اس سے یکسر بےخبر تھا۔

ادھر کاسپاکو نے اپنے سوٹ کی جیب سے پستول نکال لیا...... اور اس کا رخ صوفے پر آڑی ترچھی پڑی یاسمین کی طرف کردیا۔

”شہزی......! مجھ سے تمہیں اب دوٹوک بات کرنا ہوگی۔ تم نے اب ذرا بھی جھوٹ بولا تو...... میں اِسے بھی گولی ماردوں گا اور تم جانتے ہو، جو میں کہتا ہوں وہ کرتا بھی ہوں۔“

میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا تھا۔ تیزی سے سوچتے ذہن نے بھانپ لیا تھا کہ...... کاسپاکو اس وقت مجھ پر بُری طرح اُدھار کھائے بیٹھا ہے اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ...... مجھے بھی ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر گولی مار دیتا۔

یوں وہ اپنے دل کی بھڑاس میرے ساتھیوں کو بیدردی سے قتل کرکے نکل رہا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر حماد اور یاسمین خانم سے میرا کوئی ایسا تعلق ابھی قائم نہیں ہوا تھا جس برتے پر میں انہیں اپنا ساتھی کہتا، لیکن بہرحال روڈلف کے وہ ساتھی ضرور تھے۔ وہ زندہ تھا تو اور بات تھی، لیکن اب اس کے مرنے کے بعد...... جانے کیا بات تھی کہ روڈلف کی مجھ سے کہی ہوئی باتوں کو میرا دل اب جھٹلانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

اس نے بہت ہی پُرزور لہجے اور انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ میں انہیں غیراہم مت جانوں، ان کے مشن کی کامیابی لولوش کی ناکامی اور ان کے مشن کی ناکامی، لولوش کی کامیابی ہے۔ مگر میں نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور بدستور اپنی فی الفور امریکا روانگی پر مُصر رہتے ہوئے روڈلف سے بھی صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ...... بےشک چاہے تو یاسمین وغیرہ کے ساتھ ان کے شریکِ مہم رہ سکتا ہے، لیکن بعد میں روڈلف نے میری ضد کے آگے سر جھکا دیا تھا اور...... میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا، وہ بھی میرے ساتھ ہی امریکا جانے پر تیار ہوگیا تھا۔

لیکن اب بات اور تھی، عجیب بات تھی کہ انسان زندہ ہوتا ہے تو اس کی اہمیت اور ہوتی ہے اور مرجاتا ہے تو...... روڈلف مرچکا تھا، مگر اس کی باتیں مجھے اب کھدیڑنے لگی تھیں۔

لہٰذا میں نے بظاہر نہایت پُرسکون نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے کاسپاکو سے کہا۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو......؟“

”میرے منہ سے چھینے ہوئے نوالے کو تم نے اپنے ذاتی لالچ سے گنوادیا، اب اس کے دوبارہ حصول کے سلسلے میں تم نے اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ کون سی نئی پلاننگ بنا رکھی تھی؟“

کاسپاکو کے پستول کی نال کا رخ ہنوز یاسمین خانم کی طرف تھا۔ یہ ایک ایسا خطرناک لمحہ، بلکہ ”ڈیتھ پوائنٹ“ تھا کہ اگر میں کاسپاکو کی سوچ کے برخلاف کچھ کہنے کی کوشش کرتا تو یہ درندہ بلا دیر یاسمین کو شوٹ کردیتا۔ اس وقت کاسپاکو صرف اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق جواب سننے کا متمنی تھا، چاہے اس کا خیال غلط فہمی پر ہی کیوں نہ مبنی ہوتا۔

”تمہاری بات صحیح ہے۔“

بالآخر میں نے کہا۔ حسبِ توقع کاسپاکو کے بدہیئت ہونٹوں پہ مکروہ اور فتح انداز میں مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

”میں جانتا ہوں شہزی! تمہیں اپنا ہر ساتھی عزیز ہے۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے وہ سارے ساتھی عزیز تھے جنہیں تم نے دھوکے سے ہلاک کیا اور کروایا۔ مجھے وہ مجسمہ چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔ اس کے حصول کے لیے اپنا پلان میرے سامنے واضح کرو جو تم پہلے ہی سے بنائے ہوئے ہو۔“ کاسپاکو نے مکاری سے کہا۔

اس نے اپنا پستول اب دوبارہ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا تھا۔ میں نے اندر ہی اندر سکون کی سانس لی۔

”میں وہی کررہا تھا، لیکن تم نے...... کیپٹن رانسے کو درمیان میں ڈال کر معاملہ خراب کردیا۔“

”وہ چیپٹر کلوز کردو اور آگے کی بات کرو، خبردار......! اب کوئی نئی چالاکی چلنے کی کوشش مت کرنا۔ تمہاری یہ خوبصورت ساتھی میرے قبضے میں رہے گی جب تک تم...... میرے منہ سے چھینا ہوا نوالہ مجھے واپس نہیں لوٹا دیتے۔ کیا سمجھے......؟“

”میں نے کب انکار کیا ہے؟“ میں بولا۔ حالات کی مجبوری تھی کہ مجھے اس کی مرضی کے مطابق ہی جوابات دینے تھے جبکہ حقیقت یہی تھی کہ میں خود گوتم بدھ والا معاملہ کلوز کرچکا تھا۔

”یاد رکھنا شہزی! میں اب سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گا اور تمہاری ایک ایک حرکت پر خود نگاہ رکھوں گا۔“

”اچھی بات ہے، میں خود اب اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا ہوں، تمہاری دشمنی مجھے خاصی مہنگی پڑنے لگی ہے۔“ میں نے اس کی فطرت کے مطابق شکست خوردہ لہجہ اختیار کرنا ضروری سمجھا۔

میری توقع کے عین مطابق اس نے...... ایک پُرغرور سا قہقہہ لگایا... اور اسی لہجے میں بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا کہ کاسپاکو تمہیں پاتال میں بھی...... تلاش کرلے گا، نہیں چھوڑے گا تمہیں، اب تمہیں یہ حقیقت سمجھ آگئی ہے......“

”بہت اچھی طرح......“ میں ہولے سے بولا۔

”لیکن...... اس مجسمے کے حصول کے لیے کچھ اور طاقت ور لوگ بھی کوشاں ہیں۔ وہ ہمارے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن رہے ہیں۔ اسی لیے میں اب تک اس کے حصول کے لیے ناکام رہا ہوں۔“ میں نے جھوٹ کی منزلیں مارنا شروع کردیں۔ درحقیقت مجھے اب تک خود بھی پتا نہ تھا کہ وہ مجسمہ ابھی تک فلپائن کے اسی جزیرے میں تھا یا...... واپس تھائی لینڈ روانہ کیا جاچکا تھا۔

ٹھیک اسی وقت شاید اس کے کسی ہرکارے کو مجھ پر کسی ”کارگزاری“ کا شبہ ہوا تھا۔ میں نے بھی فوراً پشت پر بندھے ہاتھوں کی مسلسل اور مخصوص انداز میں حرکات و سکنات کو موقوف کردیا۔

اس خبیث نے آگے بڑھ کر مجھے بازو سے دبوچ کر درمیان میں کھڑا کردیا اور خود میرے عقب میں جاکر کھڑا ہوگیا۔ یوں میرا منصوبہ ہی چوپٹ ہوگیا۔ شکر تھا کہ اس نے میرے ہاتھوں پر بندھی ڈوری کا غور سے جائزہ لینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ورنہ وہ اس کا ”ڈھیلاپن“ فوراً بھانپ لیتا۔

اسی وقت کاسپاکو کی پُرغرور آواز اُبھری۔

”کاسپاکو اپنے سامنے آنے والی ہر دیوار کو گرادینے کی طاقت رکھتا ہے شہزی!“

ایک لمحہ رک کر اس نے دوبارہ کہا۔

”تم نہیں جانتے کہ اس وقت میرا پورا گینگ فلپائن پہنچ چکا ہے۔ کچھ ایجنٹ گومبورا بھی پہنچ چکے ہیں۔“

”گومبورا کی کیا اطلاعات ہیں؟ کیا مجسمہ ابھی تک اسی جزیرے پر موجود ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”تم اتنے انجان تو نہیں ہوسکتے کہ تمہیں معلوم ہی نہ ہو کہ اس وقت مجسمہ کہاں ہے؟“ کاسپاکو نے گھور کر کہا۔ اب میں اس بے وقوف کو کیا بتاتا کہ میں تو اس منحوس مجسمے سے کوسوں دور ہوچکا تھا اور نہ ہی اس کا حصول میرا ابھی مقصد رہا تھا بلکہ میں تو خود چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد اپنے اصل ٹھکانے تک پہنچا دیا جائے، نجانے کیوں ابھی تک ایسا نہیں ہوسکا تھا؟

میں نے بات بناتے ہوئے اسے جواب دیا۔ ”یہاں میرے لیے کچھ ایسے مسائل پیدا ہوگئے تھے جن کے باعث میں ان میں اُلجھا رہا تھا، تم دیکھ ہی رہے ہو اسی لیے میں آج کل ڈیواؤ کے بجائے یہاں منیلا کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔“

”مقصد کے حصول کے لیے اصل ٹارگٹ سے دور رہ

www.bookspk.site

کر ہی اچھی پلاننگ بنتی ہے، شہزی! مجھے اب مزید گولی دینے کی بھول کر بھی کوشش مت کرنا۔'' کاسپاکو زہر خند لہجے میں بولا اور میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ میری طرف سے بہت بددل ہو رہا تھا۔ یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا مگر میں اسے اصل بات باور کرا سکتا تھا نہ ہی اس کا یقین دلا سکتا تھا۔

''پھر بھی بتائے دیتا ہوں......'' اچانک کاسپاکو نے کہا۔ ''تاکہ تم بھی جان لو کہ غافل میں بھی اب تک نہیں بیٹھا ہوا۔''

میں نے اُس کی جانب آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔

''کچھ ٹیکنیکی وجوہات اور ڈاکومینٹیشن کے سبب مجسمہ دوبارہ تھائی لینڈ پہنچانے میں تاخیر رہی تھی مگر اب وہ مکمل ہو چکی ہیں۔ تاہم مجسمہ اب لانچ کے ذریعے گومبورا سے ڈیواؤ لے جایا جا چکا ہے۔ وہاں سے ایک ٹرانسپورٹ طیارے کے ذریعے واپس تھائی لینڈ لے جایا جائے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس طیارے کو ہی ہائی جیک کر کے ''ڈارک آئی لینڈ'' تک پہنچا دیا جائے۔''

میں نے دانستہ متاثر کن انداز میں اپنی بھویں اُچکالیں۔ میں اپنی خفیہ کارگزاری کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے بے چین تھا مگر میرے پیچھے کھڑے اس ہرکارے نے سارا منصوبہ چوپٹ کر کے رکھ دیا تھا۔

تاہم مجھے اتنا تو اندازہ ضرور ہو چلا تھا کہ میں اپنی ابھی تک کی ''کوشش'' میں کافی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں۔ اب بس ذرا غیر محسوس انداز میں ہاتھوں اور اُنگلیوں کو دو تین اور بل دینے کی ضرورت باقی تھی مگر اس خبیث ہرکارے نے میری یہ آخری اور فیصلہ کن کوشش ناکام بنا ڈالی تھی۔

''حیرت ہے، تمہارے پاس اتنے ٹاپ کے پروفیشنل آدمی موجود ہیں، پھر تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو......؟'' میں نے دانستہ ایسا کہا تھا۔ وہ ایک دم مشتعل ہو گیا اور اس نے دوبارہ اپنا خطرناک پسٹل آرسنل نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور اس کی دہری نال کا رخ میری جانب کر کے شعلہ بار لہجے میں بولا۔

''تو پھر ٹھیک ہے...... تمہارا کیا فائدہ...... میں تمہیں گولی مار کر یہ قصہ ہی ختم کیے دیتا ہوں......'' کہتے ہوئے اس نے ٹریگر دبا دیا۔ میرے اوسان ایک دم خطا ہو گئے، دھماکا ہوا، یاسمین کے حلق سے لرزتی ہوئی چیخ بلند ہوئی...... اور میں لڑکھڑایا، پھر اسی انداز میں دانستہ صوفے پر گرتے گرتے ٹک کر بیٹھ گیا۔

کاسپاکو جیسے درندہ صفت انسان سے کسی بھی لمحے کسی بھی قسم کی اچانک درندگی اور خوں ریزی کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اس نے گولی چلائی ضرور تھی مگر اس کا نشانہ میں نہیں تھا، اس نے محض مجھے دہشت زدہ کرنے کے لیے ایک خالی فائر کیا تھا۔ اس کی اس حرکت نے بلاشبہ مجھے چند ثانیوں کے لیے دہلا دیا تھا۔ میں یہ سوچے بنا نہ رہ سکا تھا کہ اگر یہ اس کا ''ٹارگٹ فائر'' ہوتا تو...... میرا بھی روڈلف جیسا حشر ہوتا۔

اس ہرکارے نے جو شاید کسی خاص مقصد کے لیے میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا، مجھے دوبارہ اسی جگہ پر لا کھڑا کرنے کے لیے میری جانب بڑھا تھا مگر کاسپاکو نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ میں نے دل ہی دل میں اطمینان کا سانس لیا۔

خوف و دہشت کا یہ کھیل میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ کاسپاکو پر اس وقت طاقت کا خمار چڑھا ہوا تھا۔ نشہ شراب کا ہو یا طاقت کا...... دونوں ہی صورتوں میں...... آدمی کا خانہ خراب کر سکتا ہے۔ صوفے کی پشت گاہ کی آڑ ملتے ہی میں نے اپنی خفیہ اور غیر محسوس ''کوشش'' ایک بار پھر تیز تر کر دی۔

''زیادہ چالاک بننے کی کوشش تمہیں اب مہنگی پڑ جائے گی شہزی......!'' کاسپاکو نے اس بار خونخوار لہجے میں کہا اور اسی زعم اور جوش میں وہ چند قدم چلتا ہوا میرے قریب آ گیا اور مجھ پر جھک گیا۔

اس کے ہاتھ میں تھما ہوا آرسنل اپنے مہیب دہانوں سمیت میری پیشانی پر آن لگا تھا۔

یاسمین صوفے پر میرے قریب ہی آڑی ترچھی پڑی تھی، اس کے بھی دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، کاسپاکو کے پسٹل کی نال میری پیشانی پر لگے دیکھ کر وہ سراسیمہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''نن...... نہیں...... نخ...... خدا کے لیے...... اسے مت مارو...... تم ہمیں غلط سمجھ رہے ہو۔ ہمارا اس مجسمے...... سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہمیں تو معلوم بھی نہیں ہے کہ......''

''شٹ اَپ...... یو بچ......!'' کاسپاکو غضب ناک انداز میں دہاڑ کر بولا اور اپنے پسٹل کا رخ اس کی جانب کر لیا۔ میرا پورا وجود لرز اُٹھا۔

یاسمین کو اپنے لیے اس قدر متفکر اور تشویش زدہ پا کر میرے دل میں بھی اس کے لیے نرم جذبہ بیدار ہونا ایک فطری امر تھا، وہ نہیں جانتی تھی کہ کس درندے سے وہ رحم کی بھیک مانگ رہی ہے۔ اگرچہ اسے واقعی مجسمے کے سلسلے میں معلوم نہ تھا۔

www.bookspk.site

''تم اس قدر حسین نہ ہوتیں تو میں اُدھر ہی تمہارا بھی ان دونوں جیسا ہی حشر کرتا۔'' کاسپاکو سفاکانہ انداز میں غرا کر بولا۔

''دونوں۔'' اس کی کیا مراد تھی؟ میں چونک پڑا۔ ایک روڈلف اور دوسرا...... اوہ میرے خدا......! کہیں اس خبیث اور بے رحم شخص نے ڈاکٹر حماد کو بھی...... اس سے آگے سوچ کر ہی میں بُری طرح غضب ناک ہو گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب خود پر میرا کنٹرول کرنا محال ہو جاتا ہے۔

اس رذیل کاسپاکو کی...... بیہودہ گوئی جاری تھی۔ اس نے اب جھک کر اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے حسین و گلنار چہرے کو اپنے بدنما اور کھردرے ہاتھ سے دبوچ لیا تھا۔

''حسین اور شباب آور عورتیں میری کمزوری ہیں۔ تمہارا مزہ لوں گا میں...... بہت جلد...... اس کے بعد...... ہاہاہا......'' وہ ایک بار پھر بدمست سا قہقہہ اُگلتا ہوا میری طرف متوجہ ہوا۔ یہی وہ وقت تھا جب میرا پورا وجود مثلِ آتش فشاں بن چکا تھا اور پھٹنے کے قریب بھی...... کیونکہ میں اپنی پیہم کوششوں کے بل بوتے پر اپنا ایک ہاتھ رسی کے کشادہ پڑتے حلقے سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور موقع کی تلاش میں تھا، میری حالت ایسے شیر جیسی ہو رہی تھی جو بپھرا ہوا اور غضب ناک ہو رہا ہو، کسی کو بھی چیر پھاڑنے کے لیے بے چین بھی، اب ایسا شیر آزاد ہو چکا تھا۔ روڈلف کی صورت بار بار میری چشمِ تصور میں آ رہی تھی۔

کاسپاکو جیسے ہی یاسمین سے ہٹ کر پلٹا اور میری طرف بڑھنے کے لیے ایک قدم بڑھایا تو اس وقت میری دونوں ٹانگیں قالین پر پھیلی ہوئی تھیں، میں نے ایک ٹانگ تھوڑا اور آگے سرکا دی، نتیجے میں کاسپاکو اس سے اُلجھا اور اس کا بھاری بھرکم وجود ذرا ڈولا، یوں وہ لڑکھڑایا اور سیدھا میرے اُوپر آ رہا، یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے درندوں کو سدھانے والا رِنگ ماسٹر ایک خونخوار اور پاگل درندے کے پنجرے میں جا پڑا ہو۔

میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ کاسپاکو کو دبوچ لیا اور پہلا وار میرا اس کے ہاتھ سے آرسنل جھپٹنے پر منتج ہوا تھا...... یہ سب کچھ اس قدر پل کے پل ہوا تھا کہ سب لوگ ہک دک رہ گئے تھے۔

اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ کاسپاکو بھاری ڈیل ڈول کے ساتھ میرے ایک بازو کے نرغے میں تھا اور اس کا آرسنل میرے دوسرے بازو کی گرفت میں، جبکہ اس کے بھیانک دہانے کاسپاکو کی کنپٹی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

اس کے ہرکارے تو اس بُری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے تھے کہ جیسے ان کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو یہ سب ہو کیا گیا تھا۔

''خبردار......'' میں بولائی ہوئی آواز میں وحشیانہ غراہٹ سے بولا۔ ''کسی نے بھی اپنی جگہ سے ذرا حرکت کی، میں ایک ہی فائر کر کے اس کا سر اُڑا دوں گا۔''

میرا لہجہ اور میری آواز اس قدر زوردار اور گھن گرج والی تھی کہ جیسے کوئی نقارہ پھٹ گیا ہو۔ غضب ناکی اور طیش کی چنگاریاں جیسے میرے جلتے بلکتے چہرے سے ہی نہیں بلکہ آنکھوں سے بھی مترشح ہو رہی تھیں۔

''تم سب ہتھیار پھینک کر میرے سامنے قطار کی صورت میں کھڑے ہو جاؤ جلدی......'' میں نے اگلا حکم دیا مگر کوئی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

''تم...... بڑی بھیانک غلطی کر رہے ہو...... شہزی! یہ تمہارا حکم ہرگز نہیں مانیں گے......'' کاسپاکو اپنی طاقت کے زعم میں غراتے ہوئے بولا اور اس نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا، تب ہی میری گرفت میں ذرا کسمسایا بھی، میں نے سچویشنز کی نزاکت اور خطرناکی کو بھانپتے ہی، ایک محتاط پوزیشن بنا کر کاسپاکو کو خود سے الگ کر دیا مگر دوسرے ہی ثانیے میں میرے ہاتھ میں تھما ہوا آرسنل زوردار آواز میں گرجا۔

کاسپاکو کی بڑی لرزہ خیز چیخ اُبھری، اسی وقت میں نے آرسنل کا رخ اپنے دائیں جانب کھڑے ہرکارے کی طرف کیا اور آگے پیچھے کے دونوں ٹریگر بیک وقت دبائے۔ تلے اُوپر دو سماعت شکن دھماکے ہوئے اور اس کے ہرکارے کا سر کندھوں سے اُڑ گیا۔ شانوں کے درمیان سے خون کے فوارے اُبلنے لگے، اس کا بے جان وجود ایک لمحے کو کھڑے کھڑے لہرایا اور درمیان میں پڑی گلاس ٹاپ والی میز پر گرا اور وہاں سے لڑھک کر قالین پر آ گرا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے مشکوک حرکت کی تھی۔

''میں آخری بار کہہ رہا ہوں...... جو کہا ہے وہ کرو...... ورنہ......''

میری آواز غیظ و غضب کے مارے کانپ رہی تھی۔

www.bookspk.site

سر پر خون سوار ہوگیا تھا۔ روڈلف مجھے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔

کاسپاکو کی حالت ایسی تھی کہ وہ لڑھک کر اسی میز کا سہارا تھامے قالین پر اپنا زخمی پاؤں پکڑے بری طرح کراہ رہا تھا۔ آرسنل کی طاقت ور گولی نے اس کی موٹی ران کو چیر کر ہڈی توڑ ڈالی تھی۔

کسی پستول میں ایسی طاقت نہیں ہوتی، لیکن آرسنل پسٹل کی بات اور تھی، اگرچہ اس کی گولی زیادہ دور تک نہیں جاتی تھی مگر قریب سے یہ ہلاکت خیزی کا طوفان مچا ڈالتی تھی۔

''اس...... اس...... پر خون...... سوار ہے...... ی ی...... یہ جو کہہ...... رہا...... ہے...... وہ کرو...... ہری......'' بالآخر کاسپاکو نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

باقی تینوں یوں بھی دہشت زدہ ہوگئے تھے۔ ہتھیار پھینک کر ایک قطار میں میرے سامنے ذرا فاصلے سے کھڑے ہوگئے۔

''بول...... کاسپاکو براڈے......! کیا حشر کروں تیرا......؟'' میں بھیانک لہجے میں بولا۔ ''تُو نے روڈلف کو ہلاک کر کے اپنی یقینی موت کو آواز دے ڈالی ہے۔''

''دد...... دیکھو...... یہ شاید میری غلطی تھی کہ میں نے دوسری بار تمہاری راہ میں آنے کی کوشش...... چاہی۔ مجھے اپنے طور پر اپنا مشن پورا کرنا چاہیے تھا، مم...... مجھے معاف کردو......''

کاسپاکو...... میرے آگے رحم کی بھیک مانگنے لگا تھا۔ وزیر جان کے معاملے کے ایک مختصر اور پُرخطر دورانیے میں وہ میری غضب ناکی کے کئی جوہر ملاحظہ کر چکا تھا۔ ایسے گینگسٹر صرف اپنے زرخرید کتوں کے بل پر ہی اکڑتے ہیں، مگر موت...... یقینی موت کی ایک جھلک بھی انہیں نظر آجائے تو یہ بھیگی بلی بن کر رہ جاتے ہیں، کچھ ایسی ہی حالت و کیفیات اس وقت بینکاک کے ہوّا اور تھائی لینڈ کے ڈان کی ہورہی تھی۔

''کاسپاکو...... تو نے روڈلف کو مار کے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردیے ہیں۔'' میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔ اس میں دکھ کی آمیزش شامل تھی۔ روڈلف کی ہلاکت کا سن کر یاسمین کی مجھے زوردار سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ ہنوز رسن بستہ حالت میں تھی، تاہم اب وہ کسی طرح کوشش کر کے سیدھی ہو کے بیٹھ چکی تھی۔

''مم...... مجھے معاف کردو...... میرا وعدہ ہے، آئندہ تمہارے راستے میں آنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تم نے جو کہا...... وہ میں نے کر ڈالا۔ میں اب تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔'' کاسپاکو دھیمی آواز میں بولا۔

''تم تینوں دوسری طرف منہ کر کے اور ہاتھ سر سے بلند کیے کھڑے ہوجاؤ۔ میں اپنی ساتھی کی رسیاں کھولنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کی داد و فریاد کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے ہرکاروں...... کو حکم دیا۔ انہوں نے میرا حکم ماننے میں لمحے کی بھی تاخیر نہ کی۔

میں نے یاسمین کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ...... کسمساتی ہوئی صوفے سے بمشکل اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور میرے قریب پشت کر کے آن کھڑی ہوئی۔

یہ ایک نازک مرحلہ تھا۔ تاہم صورتِ حالات میرے قابو میں تھی۔ میں نے پسٹل اپنے منہ میں دبالیا اور دونوں ہاتھوں سے یاسمین کے جکڑ بند کھولنے لگا۔

کاسپاکو بظاہر ایسا ہی نظر آرہا تھا کہ اپنی زخمی ران پر دونوں ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔ بس، ایک لمحہ کو میری نظر چوکی تھی۔ جب یاسمین کے جکڑ بند کی ایک اُلجھی ہوئی گرہ کو کھولنے کے لیے...... مجھے اس پر ذرا جھکنا پڑا تھا۔

''ہالٹ......!'' اچانک یاسمین چلائی، میں چونکا، اس نے ایک جھٹکا لیا۔ میرے منہ میں دبا پسٹل گرا۔ اس کی ایک ٹانگ حرکت میں آئی، جو کاسپاکو کے ایک ہاتھ پر لگی، جانے کس وقت وہ...... ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف کر چکا تھا اور یاسمین کی اس وقت نگاہ پڑی جب وہ ٹیبل سے سہارا لیے بیٹھے ہوئے انداز میں پلٹ کر فائر کرنا چاہتا تھا۔ یاسمین کے پاؤں کی بروقت ٹھوکر نے پستول اس کے ہاتھ سے اُڑا دیا تھا۔

اِدھر میں جیسے ہی اپنا پسٹل اُٹھانے کو جھکا، اُدھر ان تینوں ہرکاروں نے یاسمین کے چیخنے پر یک بیک پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور پھر شاید مجھے جھکا پا کر وہ کچھ سمجھے، پھر ان تینوں نے ہی بیک وقت ہماری طرف لپک کر پیش قدمی کی تھی۔ ایک نے تو فضا میں اُچھل کر جست بھی لگا ڈالی تھی اور سیدھا یاسمین اور پھر اس سمیت مجھ پر آن پڑا تھا، جبکہ میں ابھی آرسنل اٹھائے...... سیدھا کھڑے ہونے کی کوشش میں تھا کہ ان دونوں کے زور پر دھکا کھانے سے گرا تو نہیں البتہ چند قدم عقب میں لڑکھڑاتا چلا گیا۔

باقی دونوں میں سے ایک نے کاسپاکو کا دوسرا پسٹل جو قریب قالین پر ہی پڑا ہوا تھا۔ اُٹھانے کی کوشش کی۔

میں نے اس پٹی ہوئی کایا کلپ پر اپنے حواس بحال اور توجہ مجتمع رکھتے ہوئے اپنے آرسنل کا فائر اسی پر داغا۔ گولی چلنے کی دھاڑ مچی۔ وہ آخری الذکر ہرکارہ بغیر آواز نکالے وہیں ڈھیر ہوگیا۔

اول الذکر دونوں ہرکاروں نے یاسمین کو دبوچ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے میرے خلاف ڈھال کی طرح آزمانے کی کوشش کرتے، یاسمین ایک کے پیٹ پر گھٹنے کی ضرب لگا چکی تھی، وہ کراہا اور چند قدم پیچھے کو لڑکھڑایا، سنبھلنے کی کوشش میں دوبارہ اس کی جانب لپکا تھا کہ جب تک میں نے بجلی کی سی پھرتی سے دوسرے ہرکارے کو لات رسید کر دی۔ وہ بری طرح لڑکھڑاتا ہوا پہلے والے ساتھی سے ٹکرایا۔

''یاسمین! ہٹ جاؤ آگے سے......'' میں چلایا اور پھر میں نے پے در پے دو فائر کر ڈالے، وہ دونوں ہرکارے بیک وقت کریہہ ناک چیخ مار کے جھکتے چلے گئے۔

ان کی دونوں ٹانگوں کو میں نے نشانہ بنایا تھا۔ یاسمین ہٹ تو گئی تھی، مگر اس کی محتاط نگاہیں شاید ہنوز کاسپاکو پر جمی ہوئی تھیں، جو اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنا دوسرا پستول اُٹھانے کے لیے اپنے زخم کی پروا کیے بغیر اس طرف سرک چکا تھا اور اب اس کے ہاتھ میں وہ پستول آچکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب یاسمین نے اس پر چھلانگ لگائی تھی، بلاشبہ یہ اس کی خطرناک درانہ وار حرکت تھی، بالکل ویسی ہی جیسی وہ سے جی کو ہارا کے ساتھ بھی کر چکی تھی۔

کاسپاکو نے پلٹ کر گولی چلادی، میرا دل دہک سے رہ گیا۔ یاسمین کی لرزہ خیز چیخ اُبھری مگر یوں وہ اپنی ہی جھونک میں...... کاسپاکو کے اُوپر ہی گری تھی، کاسپاکو نے ایک اور فائر داغا، گولی چلی اور یاسمین کی دوبارہ گھٹی گھٹی کراہ خارج ہوئی، میں ہول سا گیا، ایسے میں کاسپاکو پر میں گولی داغنے کی پوزیشن میں نہ تھا، لیکن اس ظالم کو یاسمین خانم پر تیسرا فائر کرنے کا کسی صورت میں بھی موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

یاسمین اب بے سدھ سی اس کے اُوپر پڑی ہوئی تھی اور وہ جلاد صفت اس پر دوبارہ اتنے قریب سے مہلک وار کر سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے فوری طور پر اور تو کچھ نہیں سوجھا، بہ سرعت جھک کر میں نے یاسمین خانم کی ٹانگ پکڑ کر اسے کاسپاکو کے اُوپر سے کھینچ لیا، مجھے اس کا نرم و نازک جسم خون میں لتھڑا ہوا نظر آیا، میرا دل بوجھل ہوگیا۔ کاسپاکو مجھ پر اپنا پستول سیدھا کرنے لگا تھا کہ میں نے آرسنل، جس کی دہری نال کا رخ اسی کی طرف تھا، یک بیک دونوں ٹریگر دبا دیے۔

تلے اُوپر دو بھیانک دھماکے ہوئے اور کاسپاکو براڈے...... کی کہانی پل کے پل اپنے منطقی انجام کو جا پہنچی۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

باقی اس کے تینوں ہرکارے اپنے ڈان باس کا انجام دیکھ کر وہیں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

''گاڑی کی چابی پھینکو...... جلدی......'' میں نے اُن کی طرف دیکھ کر لہورنگ دہاڑ سے کہا تو ایک نے لرزتے لہجے میں بتایا کہ ایک کار کی چابی اسی کی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی ہے۔ میں نے اگلا حکم انہیں...... کامن واش روم میں گھسنے کا دیا۔ وہ لپک کر وہاں جا گھسے اور اندر سے دروازہ یوں ایک دم بند کرلیا جیسے یہی ان کی مکتی کی راہ ہو۔

میں نے یاسمین کو سنبھالا اور اسے اُٹھا کر دیوانہ وار باہر دوڑا۔

ایک کار میں چابی لگی ہوئی تھی، میں نے نیم مردہ سی یاسمین کو کار کی عقبی سیٹ پر ڈالا اور اس کے زخم کا جائزہ لیا۔

اسے ایک گولی شانے پر اور دوسری پیٹ میں لگی تھی۔ وہاں بھی خون کا دھبا نظر آرہا تھا مجھے......

گولی اس کے دائیں شانے پر لگی تھی اور شکر تھا کہ ''چھاؤ'' ہو کر نکل گئی تھی، مگر خون زیادہ بہنے کی وجہ سے اس پر غشی طاری تھی۔

سفاک کاسپاکو نے اس پر قریب سے دو فائر کیے تھے، دوسری گولی کا زخم بھی مجھے جلد ہی نظر آگیا۔ وہ اس کے پیٹ میں پیوست ہوگئی تھی، شاید یہ پہلے والے فائر کی گولی تھی، یہی مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ مجھے تشویش نے گھیر لیا۔

میں نے اسی کے لباس کا ایک کپڑا پھاڑ کر لیر سی بنائی اور پٹی کی صورت اس کے زخم پر باندھ دی تاکہ جریانِ خون کسی حد تک کم سے کم رہے۔ اس کے پیٹ کے زخم کا جائزہ لیا تو وہاں مجھے کوئی سخت سی چیز لگی نظر آئی، مجبوری تھی، اسی لیے...... اس کا پیٹ بھی برہنہ کیا تو چونک پڑا۔ وہاں کوئی چمڑے جیسی سخت شے لپٹی ہوئی تھی، مگر گولی نے اس میں بھی سوراخ کر دیا تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا شاید یہ کوئی بلٹ پروف اندرونی جیکٹ تھی، مگر وہ چمڑے جیسی سخت شے تھی، شاید قریب سے چلائی ہوئی گولی اس کے اندر گھس گئی تھی، تاہم وہ چمڑے کی جیکٹ آہستگی سے کھینچ لینے کے بعد مجھے اس کے پیٹ کا زخم بھی دکھائی دے گیا۔ میں نے اس کے بے سدھ وجود کو تھوڑا پلٹ کر پشت کا جائزہ لیا کہ کہیں پیٹ پر لگنے والی گولی بھی تو آر پار نہیں ہوگئی تھی، مگر مجھے ''ایگزٹ'' کا نشان دکھائی نہ دیا۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ گولی ابھی تک پیٹ کے اندر ہی تھی۔

www.bookspk.site

چند ہی ثانیوں بعد میری کار رات کے سناٹے میں ویران سڑک پر آندھی طوفان کی طرح دوڑے جارہی تھی۔

شکر تھا کہ مجھے یاسمین خانم کی رہائش گاہ تک کا راستہ ازبر تھا۔ یہ میری پرانی عادت تھی، میں کوئی بھی نئی جگہ کی سمت کو اپنے ذہن میں محفوظ ضرور رکھتا تھا، کیا خبر کسی اہم مجبوری کے باعث مجھے دوبارہ اس طرف کا رخ کرنا پڑ جائے، جیسا کہ اب اور اس سے پہلے بھی ہوتا رہا تھا۔

رات گئے سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ میری کار اندھا دھند دوڑی جارہی تھی۔ تاہم مجھے پولیس کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا، اس قدر تیز رفتاری پر کوئی پٹرولنگ گاڑی میرے تعاقب میں لگ سکتی تھی، اور پھر میرے سامنے مسائل کا ایک طوفان سا کھڑا ہوجاتا۔

بیس منٹ کے اندر اندر میں یاسمین کی رہائش گاہ پر پہنچ چکا تھا۔ حالانکہ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ (کاسپاکو کے ساتھ) تو کاسپاکو کے نئے عارضی ٹھکانے پر پہنچتے پہنچتے ہمیں آدھے گھنٹے سے زیادہ کا وقت لگا تھا۔

شکر تھا کہ یہاں اب بھی کوئی گڑبڑ نہیں تھی، سب کچھ ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کچھ دیر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ بنگلے میں اب بھی ویرانی اور خاموشی کا راج تھا۔

میں نے کار اندر پورچ میں کھڑی کی، یاسمین کے بے سدھ وجود کو کندھے پر ڈالا اور اندر کی طرف دوڑا۔

اندر آکر میں نے سیدھا اسی کمرے کا رخ کیا جہاں اس کے منگیتر ڈاکٹر حماد نے روڈلف کا آپریشن کرکے گولی نکالی تھی۔

میں نے یاسمین کو بھی اسی آپریشن ٹیبل پر لٹادیا اور اس زخم والی جگہ کو مزید کشادہ کیا۔ (اس کے زخم پر پٹی بھی میں نے اسی جگہ کے لباس کو پھاڑ کر باندھی تھی)

اس کے پیٹ میں لگنے والی گولی زیادہ...... جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ اسی لیے سب سے پہلے میں نے اسی کا جائزہ لیا۔ یوں قریب سے جائزہ لینے کے بعد مجھے کچھ تسلی ہوئی تھی یہ دیکھ کر...... کہ سیسہ کھال سے تھوڑا ہی اندر تھا۔ اسے کسی نیڈل ہولڈر فارسیپ سے تھوڑی کوشش کے ساتھ نکالا جاسکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور قریب دھری سرجیکل ٹرے سے نیڈل ہولڈر فارسیپ اُٹھا کر ''سپر فیشئیل'' پڑی گولی کھینچ لی۔ خون نکلا اور یاسمین بھی کراہی تھی، تاہم اب وہ کسی حد تک خطرے سے باہر تھی۔

اس کے بعد میں نے اس کے دائیں شانے کا معائنہ کیا۔ اس کا گورا گورا جسم خون میں رنگین ہوا جارہا تھا۔ کپڑے کی لیر کی عارضی پٹی میں نے کھول دی، وہاں قریب سرجیکل ٹیبل پر ٹنکچر، آیوڈین اور دیگر مرہم پٹی کا جملہ سامان پہلے سے موجود تھا، میں نے سب سے پہلے وہاں موجود گلوکوز 25 فیصد والے دو پلاسٹک کے ایمپیول کھول کر یاسمین کے منہ سے لگا کر اسے پلادیے تاکہ خون بہنے سے نقاہت جاتی رہے، حالانکہ یہ ایمپیول انجیکشن یعنی وریدی سرنج کے ذریعے دیے جاتے تھے، مگر ایمرجنسی یا ایسی صورت میں جبکہ سرنج استعمال نہ کیا جاسکتا ہو تو یہ براہِ راست منہ کے راستے پلا بھی دیے جاتے ہیں۔

میں نے ایسا ہی کیا، اور اس کے بعد یاسمین کے زخم کو دھو کر اس میں ''بپ پیک'' بھر دیا۔

کچھ اینٹی بائیوٹک اور پین کلر موجود تھیں وہ بھی میں نے یاسمین کو پیس کر پانی کے گھونٹ کے ساتھ کھلادیں۔ اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے بھی مارے اور اس کی حالت قدرے بہتر ہونے لگی۔

ہوش میں آنے کے بعد اسی نے مجھے باقی ماندہ گائیڈنس دی کہ مجھے مزید کیا کرنا چاہیے تھا۔

ڈریسنگ وغیرہ تو یوں بھی میری تربیت کا حصہ رہا تھا، کسی بھی صورت میں اس طرح کی فرسٹ ایڈ سول ڈیفنس کی ٹریننگ میں بھی دی جاتی تھی۔

میں نے یاسمین کی زندگی بچانے کے لیے جس تیزی کے ساتھ ''ایفرٹس'' لیے تھے۔ اس کے جلد ہی دوررس نتائج برآمد ہونے لگے تھے۔ وہ کافی بہتر ہونے لگی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی یہ ''بہتری'' والی حالت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی، جب تک کہ اسے ''پراپر منیجمنٹ'' نہیں مل جاتی۔

میں نے اسے فریج سے نکال کر مشروبات اور کھانے کی چیزیں بھی دیں اور اس کے اصرار پر خود بھی تھوڑا بہت زہر مار کیا۔

میں نے اسے پیٹ میں لگنے والی گولی کے بارے میں بتادیا تھا۔ وہ چند پھولی ہوئی سی سانسیں خارج کرنے کے بعد بولی۔

''میں اب بہت بہتر ہوں...... فکر کرنے کی ضرورت نہیں...... تمہاری ممنون ہوں میں......'' وہ میری طرف ذرا گردن موڑ کر ہلکی سی مسکراہٹ سے بولی۔ ''میں احتیاط کے پیشِ نظر بھیڑ کی کھال کی جیکٹ اپنی کمر اور پیٹ پر باندھے رکھتی ہوں۔ دور والی گولی تو بالکل اثر نہیں کرتی لیکن...... قریب سے...... بھی یہ زیادہ نقصان سے بچالیتی ہے...... آہ......'' مارے درد کے اس کے منہ سے کراہ سی خارج ہو گئی، مگر دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی۔ میں نے اس کی خیریت چاہی وہ پھر ہولے سے مسکرادی۔

www.bookspk.site

وہ ہنوز آپریشن ٹیبل پر پڑی ہوئی تھی اور میں اس کے قریب ایک کرسی پر سر جھکائے سوچوں میں گم تھا۔ اس کی ہلکی نرم مترنم آواز پر میں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ غور سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے شاید میرے چہرے اور آنکھوں سے غم و اندوہ کی پرچھائیاں بھانپ لی تھیں۔ میں دوسری طرف اپنا رخ بدل کر کھڑا ہوگیا۔

پتا نہیں میں اس سے کیا کہنا چاہتا تھا اور آئندہ کیا کرنا چاہتا تھا، سچی بات یہ تھی کہ...... پیش آمدہ حالات روڈلف کی ہلاکت سمیت بہت ہی اعصاب شکن گزرے تھے۔

''کیا روڈلف بے چارہ بھی اس درندے کی سفاکیت کی بھینٹ چڑھ گیا؟'' معاً عقب سے مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''ہاں!'' میں جواب میں اتنا ہی کہہ پایا۔

''بہت نقصان ہوگیا ہمارا...... روڈلف بہت کام کا آدمی تھا، جاں نثار بھی اور دلیر بھی، اس ظالم درندے نے...... میرے منگیتر کو بھی......'' وہ فرطِ غم سے اپنا جملہ مکمل نہ کرسکی اور سسکیاں لے کر رو پڑی۔

ڈاکٹر حماد کے ذکر پر میں ایک دم اس کی جانب گھوما۔ مجھے خیال ہی نہ رہا تھا کہ اس سے حماد کے بارے میں پوچھتا۔ اگرچہ اب تک مجھے بھی اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ بھی کاسپاکو کی درندگی کی بھینٹ چڑھ چکا ہے اور کاسپاکو کے منہ سے بھی میں نے ایسا کچھ اشارتاً سنا تھا۔ یاسمین خانم کا حسین چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

''سب کچھ...... جیسے ایک لمحے میں ختم ہوگیا...... ایک آندھی تھی، جو سب کچھ اجاڑ چلی۔'' وہ سسکتے ہوئے کہے جارہی تھی، میرے پاس تو اسے تسلی دینے کو الفاظ بھی نہ تھے۔ ایسے میں نقصان برابر کا ہی تو ہوا تھا۔

''ہمیں اب ان ساری باتوں کو بھلانا ہوگا، ورنہ ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے اور اس وقت ہمارا اب ایک جگہ ٹکے رہنا یوں بھی مناسب نہ ہوگا اور تمہیں اب بھی پراپر ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔ ورنہ سیپٹک ہوسکتا ہے اور خون زہریلا ہوجائے گا جو تمہاری زندگی کے لیے جان لیوا ہوسکتا ہے۔'' میں نے متفکر مگر دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔

''مجھے تم اندر کسی کمرے میں لے جاسکتے ہو؟'' اس

گھڑی

گائیڈ نے عمارت کے گرد پھیلے ہوئے کھنڈروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ٹھیک دس بج کر دس منٹ پر خوف ناک زلزلہ آیا اور چاروں طرف کی عمارتیں تباہ ہوگئیں۔

''لیکن یہ عمارت کیسے بچی؟'' خاتون نے حیرت سے سوال کیا۔

''اس کے مینار کی گھڑی بیس منٹ آگے تھی۔'' گائیڈ نے جواب دیا۔

جائے پیدائش

ایک صاحب دوستوں کی محفل میں بڑہانک رہے تھے کہ ''میں شہر کے سب اسپتالوں میں رہ چکا ہوں۔''

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' ایک دوست نے ٹوکا۔ ''کیا تم میٹرنٹی اسپتال میں بھی رہ چکے ہوں؟''

وہ صاحب جھٹ بولے۔ ''کیوں نہیں' میں پیدا ہی وہیں ہوا تھا۔''

(انتخاب، سید افتخار حسین شاہ، مظفر آباد)

مزاج

ایک امریکی، ایک فرانسیسی، ایک چینی اور ایک اسکاٹ لینڈ کا باشندہ اکٹھے بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان چاروں کے گلاسوں میں ایک ایک مکھی گرگئی۔ امریکی نے بیئر گرادی۔ فرانسیسی نے گلاس سے مکھی نکالی اور بیئر پی گیا۔ چینی نے بیئر گرادی اور مکھی کھا گیا۔ اسکاٹ لینڈ کے صاحب نے مکھی نکال کر چینی کے ہاتھ بیچ دی اور بیئر پی گیا۔

سبق

ایک خاتون نے اپنے شرابی شوہر کو سبق سکھانے کے لیے سیاہ رنگ کا شیطانی لباس پہنا۔ منہ پر نقاب اور سر پر سینگ لگا کر گلی کے موڑ پر کھڑی ہوگئی۔ رات کو اس کا شوہر جب نشے میں دھت گلی میں داخل ہوا تو خاتون ایک بھیانک چیخ مار کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شوہر نے خوف زدہ ہونے کے بجائے جھومتے ہوئے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں شیطان ہوں۔'' خاتون نے جواب دیا۔

شوہر نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاتھ ملاؤ یار میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں۔''

(انتخاب، اورنگزیب الٰہی، الشرائع مکہ مکرمہ)

www.bookspk.site

نے جیسے میری بات نظرانداز کر دی۔ اس نے اپنی سسکیوں پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا تھا۔ میں خود بھی اس کمرے کے مخصوص ماحول کی یکسانیت سے بیزار اور بوجھل سا ہو رہا تھا۔

’’شیور۔‘‘ میں نے ہولے سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر اُلجھ سا گیا، وہ میری ’’اُلجھن‘‘ سمجھ کر آہستگی سے بولی۔

’’پلیز! اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو...... مجھے سہارا دے دو، میں چل کر کمرے تک جا سکتی ہوں۔‘‘

’’اٹس او کے...... آجاؤ......‘‘ میں نے کہا۔ وہ کہنیوں کے سہارے ٹیبل سے اُٹھنے لگی، میں نے اسے سہارا دیا، اس نے میرا بازو تھاما اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے اُٹھایا اور پاؤں زمین پر رکھے تو اسے ایک دم چکر سا آ گیا، وہ لہرا کر گرنے لگی تو میں نے فوراً اسے تھام لیا، وہ میرے ساتھ پوری کی پوری لگ گئی۔ اس کی گھنی زلفیں میرے چہرے پر جیسے گھٹاؤں مینہ برسانے لگیں، میں تھوڑا گھبرایا، اسے سنبھالا دیا مگر وہ چل نہیں پا رہی تھی، اس کے شانے کا درد جاگ رہا تھا۔ میں اس کی ضد کے آگے مجبور تھا۔ وہ اپنے محبوب کا آخری دیدار کرنا چاہتی تھی، میں کیا کرتا۔ حالانکہ اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ایک قدم بھی بڑھا سکے، مگر یہ اس کی خوداعتمادی تھی کہ وہ ٹیبل سے بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی، یہ الگ بات تھی کہ زمین پر اپنے پاؤں نہ جما سکی تھی اور میں نے اسے فوراً سنبھال لیا تھا۔

بہرکیف...... میں نے ایک گہری سانس لے کر اسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا، اس نے بھی سہارے کے لیے اپنی مرمریں بانہوں...... کا حصار میری گردن کے گرد حمائل کر دیا۔ اس کا شاخِ گل جیسا گل نشیں بدن میرے مضبوط بازوؤں کے رحم و کرم پر تھا اور مجھے اس کی گدازیت کا احساس کچھ اور سوا ہوتا محسوس ہونے لگا۔

میں اسے اُٹھا کر جب اس کے کمرے میں پہنچا تو پتا چلا وہ اس کی خواب گاہ تھی۔

میں نے اسے آہستگی سے بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ بولی۔

’’پاس کے کمرے میں حماد کی لاش پڑی ہے۔ میری ہمت نہیں پڑ رہی ہے اسے دوبارہ دیکھنے کی...... کیا تم اسے ایک نظر دیکھ سکتے ہو؟‘‘

’’آں...... ہاں! مجھے ایک نہیں دو لاشوں کو دیکھنا ہے۔ شاید آخری بار...... روڈلف کی لاش بھی اس طرف پڑی ہے۔‘‘ میرے لہجے میں غم کی شدت ایک بار پھر اُمڈ آئی تھی۔

’’اگر زحمت نہ ہو تو مجھے بھی ان کا آخری دیدار تو کروا دو......‘‘ یاسمین نے بڑے کرب ناک لہجے میں کہا کہ میرا اپنا دل بھر آیا۔ اس کا دکھ بلاشبہ مجھ سے دوگنا تھا۔ روڈلف تو میرا دوست اور کسی حد تک دستِ راست بھی تھا مگر یاسمین کے لیے ڈاکٹر حماد اس کا منگیتر ہی نہیں بلکہ اس کی محبت بھی تھا۔

’’تمہیں زحمت ہوگی، میں خود چلنے کی کوشش کرتی ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔

’’ن...... نہیں، کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ آؤ......‘‘ میں نے کہا اور اس کی طرف بڑھا۔

اسے پھر اُٹھایا اور پہلے ہم اس طرف آئے جہاں روڈلف مردہ حالت میں اب دیوار سے لگے ہوئے فرش پر پورا لڑھک چکا تھا۔ میرے حلق میں رقت اُترنے لگی اور دل بھاری ہونے لگا۔ یاسمین کو آہستگی سے میں نے اس کے اشارے پر روڈلف کی لاش کے قریب فرش پر ہی بٹھا دیا تھا۔ وہ روڈلف کی لاش کو بڑی کرب انگیز نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

’’اس نے ہمارا بڑا ساتھ دیا تھا۔ بہت دلیر اور باعزم نوجوان تھا یہ...... خدا اس کی مغفرت کرے۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔

’’آمین۔‘‘ میرے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ’’یہ اسلام اور اس کی تعلیمات سے بے حد متاثر بھی تھا، اس کے خاندان کے کچھ لوگ مسلمان...... ہو چکے تھے۔‘‘

’’میں جانتی ہوں، اس کی دادی اور بعد میں اس کی ماں بھی اسلام سے متاثر ہوئی تھی۔ اِسے بھی اسی نے ہی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا تھا۔‘‘ یاسمین نے کہا۔

ہم دونوں نے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کے روڈلف کو خراجِ تحسین پیش کیا اور پھر ہم ڈاکٹر حماد کے کمرے میں آ گئے، وہ فرش پر ہی پڑا ہوا تھا، اس کی پیشانی میں سرخ روشن دان بنا ہوا تھا، جہاں اب ہلکی سی سیاہی نظر آنے لگی تھی۔

اپنی محبت، اپنے منگیتر کی لاش کو دیکھ کر یاسمین کو رونا آ گیا اور وہ بالکل بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس نے رقت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

’’مجھے...... اس کے قریب بٹھا دو فرش پر شہزی! پلیز۔‘‘

میں نے ایسا ہی کیا، وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنے منگیتر کی لاش سے لپٹ گئی اور روتی چلی گئی۔

www.bookspk.site

میں نے بھی چند ثانیے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تاکہ اس کے اندر کا غبار نکل جائے، وہ سارے خس و خاشاک نکل جائیں، جو بعد میں اسے اور زیادہ چبھتے رہتے۔

پھر جب وہ غم و اندوہ کے مارے ہلکان سی ہونے لگی تو میں نے اسے تسلی دی۔ اس نے آخری بار ڈاکٹر حماد کی پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر سسک پڑی، میں اسے اُٹھا کر اس کے کمرے میں آ گیا۔

اسے بیڈ پر لٹا کر میں اس کے قریب والی ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

’’یہ اس قدر سنگ دل اور سفاک شخص کون تھا؟ جو تمہارے خون کا پیاسا ہو رہا تھا؟‘‘ یاسمین نے ذرا سنبھلنے کے بعد مجھ سے پوچھا، اس کا اشارہ جہنم واصل کاسپاکو کی طرف تھا۔

’’میرے کئی دشمن ہیں، اب تمہیں کیا تفصیل بتاؤں......؟ میرا خیال ہے ہمیں اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔‘‘ میں نے تھکے تھکے سے انداز میں جواب دیا۔

’’اچھا ہوا کہ تم نے اُسے (کاسپاکو کو) اسی بے رحمی سے واصلِ جہنم کر ڈالا۔‘‘

’’وہ درندہ اسی لائق تھا۔‘‘ میں نے ہولے سے جواب دیا۔ پھر مقصد کی بات پر آتے ہوئے بولا۔ ’’ہمیں ان دونوں کی لاشوں کے بارے میں سوچنا ہوگا اور اب تو میرا بھی ملیلا سے نکلنا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ تمہیں بھی میں یہی مشورہ دوں گا کہ تم اپنے والد صاحب کے ساتھ واپس تہران (ایران) چلی جاؤ۔‘‘

’’ہرگز نہیں......‘‘ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کے باعزم ہو کر بولی۔ ’’میں اپنے پاپا کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ تم مجھے کسی طرح حفیظ اللہ کے پاس پہنچا دو، باقی میں سب سنبھال لوں گی۔‘‘

مجھے یاد آیا۔ حفیظ اللہ وہی شخص تھا جہاں اس کے باپ جمشید حمیدی نے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ اگرچہ کوہارا نے اس کے بارے میں جھوٹ بولا تھا کہ وہ اس کے قبضے میں ہے۔ یا ممکن ہے رہ چکا ہو اور بعد میں چھڑا لیا گیا ہو۔ میں اس سے متعلق یاسمین سے پہلے بھی پوچھ چکا تھا، اس نے بھی میری بات کی تصدیق کر دی تھی۔

’’ہم بھی عنقریب قاہرہ (مصر) کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔‘‘

’’اچھی بات ہے......‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم اپنا راستہ پکڑو اور میں اپنی منزل کی جانب رخ کرتا ہوں۔‘‘

’’کیا تم...... مصر نہیں چلو گے؟ روڈلف کی نصیحت بھلا دو گے؟ کیا کہا تھا اس نے تم سے، تمہیں یاد نہیں......؟‘‘ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔

’’سب یاد ہے مجھے......‘‘ میں نے بے دلی سے کہا۔ ’’لیکن میں نہیں سمجھتا کہ میری منزل کا راستہ اس طرف کو جاتا ہے، یہ میرے لیے محض وقت کا زیاں کرنے والی بات ہوگی اور کچھ نہیں۔‘‘

میری بات پر یاسمین نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے روک دیا اور بولا۔

’’پلیز! مس یاسمین، مجھے زور نہ دیں۔ میں تمہاری کامیابی کی دعا ضرور کر سکتا ہوں لیکن...... نہیں...... میں اپنی منزل کی طرف جانے والا رستہ نہیں بدل سکتا۔‘‘

’’تمہاری منزل کی طرف جانے والے کئی راستے ہیں مسٹر شہزی!‘‘ یاسمین نے کہا۔ ’’یہ بھی انہی راستوں میں سے ایک اہم راستہ ہے۔‘‘

’’تمہیں کوہارا سے ازحد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔‘‘ میں نے اس کی بات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کہا۔ ’’سے جی کوہارا کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں، کاسپاکو کا روپ تم دیکھ ہی چکی ہو، سمجھو تو...... کوہارا، کاسپاکو کی ٹروکاپی ہے بلکہ بربریت اور بے رحمی میں اس سے دو ہاتھ آگے ہی ہے اور خطرناک بھی اس سے کہیں زیادہ ہے۔

’’وہ یہاں میرے مقابلے میں نہیں آیا ہے لیکن وہ اور اس کے بھیڑیے صفت ساتھی، لہو تک کی بُو سونگھ کر تمہیں اور تمہارے باپ جمشید حمیدی کو ڈھونڈ نکالیں گے، بلکہ میرا تو دوستانہ مشورہ یہی ہے کہ تم دونوں قاہرہ جانے کا ارادہ اور اس عظیم تاریک اہرام کی مہم پر جانے کا پروگرام ملتوی کر کے واپس تہران لوٹ جاؤ...... کوہارا نے تمہاری بُو سونگھ لی ہے۔ میں اس کی فطرت سے واقف ہوں، وہ اب... بُوگیر کتے کی طرح تمہاری اور پروفیسر جمشید کی تلاش میں کونا کونا سونگھ رہا ہوگا۔‘‘

میری بات پر یاسمین نے ایک گہری سانس لی پھر بولی۔ ’’جس طرح تم اپنی مہم کو اُدھورا نہیں چھوڑ سکتے اسی طرح ہم باپ بیٹی بھی اسے پورا کیے بنا پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں، کیونکہ ہمیں اپنی اس خطرناک مہم کی اہمیت کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ میں...... اگر واپس بھی پلٹ جاؤں تو پاپا ہرگز واپسی کا راستہ اختیار نہیں کریں گے، تم دیکھ ہی رہے ہو کہ

www.bookspk.site

اس مقصد کی خاطر انہوں نے خود کو کس قدر چھپا کے رکھا ہوا ہے۔ ان کا خدشہ درست ہی تھا، وہ مجھے اور ڈاکٹر حماد کو بھی یہی نصیحت کرتے تھے کہ...... ہم یہ بنگلا چھوڑ دیں اور ان کے پاس حفیظ اللہ کے مکان میں آجائیں۔‘‘

’’ہوم......‘‘ میں نے ایک خیال انگیز ہنکارا بھرا۔

’’اچھی بات ہے، ہر کسی کو اپنا مشن عزیز ہوتا ہے، تمہیں تمہارا مشن مبارک ہو۔ مگر میں اب یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ مجھے جانا ہوگا۔‘‘

’’اتنی جلدی تو تم امریکا کے لیے پرواز نہیں کر سکتے۔‘‘ یاسمین بولی۔

’’چند روز ہی لگیں گے۔ میں تب تک کسی ہوٹل میں یہ دن گزار لوں گا، مگر تم پلیز ان لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا بندوبست ضرور کر دینا، ورنہ ہمارا منیلا سے نکلنا محال ہو جائے گا۔‘‘

’’ہاں! مجھے پتا ہے کہ اب حالات کس قدر حساس ہو چکے ہیں۔‘‘

’’تمہاری حالت تسلی بخش نہیں ہے اسی لیے میں تمہیں یہاں ایسے نہیں چھوڑ کر جا سکتا۔ کیا کہتی ہو جلدی بتاؤ، تمہیں گاڑی میں ڈال کر حفیظ کے ہاں لے جاؤں یا پھر...... انہیں فون پر مطلع کر دوں؟‘‘ ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔

یاسمین میری طرف بڑی کرب انگیز نگاہوں سے تکنے لگی۔ ’’مجھے فون کرنا ہوگا، یہاں سے میں اس وقت تک نہیں نکل سکتی جب تک حماد اور روڈلف کی لاشوں کو صحیح مقام پر ٹھکانے نہیں لگا دیا جاتا۔‘‘

میں اس کی ’’صحیح مقام‘‘ والی بات کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے اسے فون لا دیا جو کارڈلیس تھا، اور اس کی خواب گاہ میں رکھا ہوا تھا۔ اس نے کچھ دھیمی اور فارسی زبان میں کسی سے جلدی جلدی بات کی اور پھر مجھ سے بولی۔ ’’اب تمہیں میرے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں...... میرے دو ساتھی یہاں پہنچ رہے ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔‘‘

میں مطمئن ہو گیا اور اس سے اجازت چاہی تو اس کی آنکھوں میں اُداسی اور کرب کی پرچھائیں مزید گہری ہو گئی۔

’’ہاتھ نہیں ملاؤ گے......؟‘‘ وہ اچانک عجیب سے لہجے میں بولی اور میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی جانب ہاتھ بڑھا دیا اس نے پُرجوش انداز میں مصافحہ کیا، اس کی کشادہ سیاہ آنکھوں...... میں بڑی حسرت و یاس کے چراغ جل بجھ رہے تھے میں نے آخر میں ازراہِ ہمدردی اس سے ایک بار پھر کہا۔

’’کہو تو میں تمہیں...... حفیظ اللہ کے گھر چھوڑ دوں......؟‘‘

’’نہیں، اس کی ضرورت نہیں...... میں نے فون کر دیا ہے، وہ آتے ہی ہوں گے، یہاں سے زیادہ دور نہیں حفیظ اللہ کا ٹھکانا، لہٰذا میں اب محفوظ ہوں اور تم بھی جہاں جاؤ، اپنا خیال رکھنا۔‘‘

میں ایک بار پھر اس کی طرف دیکھ کر الوداعی انداز میں مسکرایا اور اس کے بنگلے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

میں بنگلے سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور فٹ پاتھ پر بے منزل اور بے مقصد سا پیدل چلنے لگا۔ اس وقت میرے دل و دماغ کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ ایک وقت تھا، روڈلف میرے ساتھ ہوتا تھا۔ ہوٹل ہو، اوپن ریسٹورانٹ ہوں، بار یا پب...... (بار یا پب میں اسی کی ضد پر چلا جاتا تھا، مگر اس کے ساتھ ’’شغل‘‘ نہیں کیا کرتا تھا) پیش آمدہ اور پیش آئندہ حالات پر میں اسی کے ساتھ ہی تبادلہ خیال کرتا تھا۔

کس قدر ناپائدار ہوتی ہے زندگی، سچ ہی کہا کسی نے، پانی کا بلبلہ ہے زندگی۔ ابھی چند گھنٹوں پہلے روڈلف زندہ تھا اور مجھ سے باتیں کر رہا تھا مگر اب وہ دنیا سے گزر چکا تھا۔ مجھے تنہا کر گیا تھا۔

منیلا میں خود کو اب واقعی اس کے بغیر میں تنہا اور اکیلا ہی محسوس کر رہا تھا۔ روڈلف بار بار مجھے یاد آ رہا تھا، حالانکہ میں نے اس کے ساتھ کچھ اتنا زیادہ وقت بھی نہیں بِتایا تھا۔ مگر جتنا بھی بِتایا تھا، وہ شاندار اور بہت یگانگت اور یاری باشی والا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ میرے دل کو اس سے بڑا اسہارا تھا۔

روڈلف نہ بھی ملتا مجھے...... تو اور بات تھی مگر مل کے بچھڑنا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے...... میرے لیے بے انتہا اُداسی کا سبب بنا تھا۔

دن نکل رہا تھا اور سڑکوں پر ٹریفک دھیرے دھیرے رواں دواں ہونے لگی تھی۔ لوگ گھروں، کاٹجز اور فلیٹوں سے نکل کر گھروں اور دکانوں کی طرف نکل رہے تھے۔ کسی کے پاس اپنی سواری تھی، کوئی بس میں لدا ہوا تھا تو کوئی ٹرام میں...... لیکن میں پیدل تھا۔ مجھے کسی دکان یا دفتر نہیں جانا تھا۔

www.bookspk.site

رہائشی بلاک پار کر کے میں نے ایک چوراہا کراس کیا اور وہاں سے ایک مارکیٹ کے آثار دیکھ کر اس طرف مڑ گیا۔ وہاں دکانیں کھلنا شروع ہو گئی تھیں۔

ادھر ہی مجھے ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ نظر آ گیا۔ اس کی دیوار شیشے کی تھی اور اس پر کافی کا ایک بڑا سا کپ، ایک بڑی لمبی بریڈ اور ایک کارٹون کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ میں اس میں داخل ہو گیا۔ وہ شیشے کا سنگل دروازہ تھا۔ یہ شاید یہاں مختصر خریداری کے لیے آنے والوں کو ریسٹ فراہم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

اس قدر صبح میں بھی وہاں مجھے خاصی تعداد میں افراد بیٹھے نظر آئے تھے۔ ایک میز پر دو دو افراد براجمان تھے۔ کچھ نیند کے مارے سست سست سے نظر آ رہے تھے اور کچھ فریش چہرے لیے ہوئے تھے۔

میں ایک میز پر بیٹھا بے مقصد سا انہی پر غور کر رہا تھا۔ میرا دل اُداس تھا اور اردگرد کے ماحول میں دل لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

’’یس سر......!‘‘

اچانک ایک مترنم سی کھنکتی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ ایک درمیانی عمر کی خوبصورت سی ویٹرس تھی۔ اس نے نسبتاً ڈھنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ یعنی سرخ رنگ کی پرنٹڈ فراک اور سفید قمیص تھی، اگرچہ اس کا بھی گریبان قدرے کشادہ تھا مگر عریاں نہیں بہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چہرہ گول اور ناک ستواں تھی، قد درمیانہ تھا، بال سلیقے سے ربن کیے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ میں ایک رنگین سا مینیو کارڈ تھام رکھا تھا جو اس نے میری جانب مسکراتے ہوئے بڑھا دیا۔

یہ چھوٹا سا ہی ریسٹورنٹ تھا اور اسی لیے شاید اس کا مینیو بھی چھوٹا تھا، جس کے ایک طرف موٹے موٹے الفاظ میں...... انڈے، توس اور اسی طرح کی چند چیزوں کی تصاویر ناموں کے ساتھ بنی ہوئی تھیں اور پیچھے کی جانب تین چار اقسام کی کافی اور چائے۔

کافی کا شوقین میں کم ہی تھا۔ مینیو آئٹم چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ اسی وقت آرڈر بھی لینے پر تلی ہوئی تھی۔

میں نے مکھن توس، چائے اور ایک ابلے ہوئے.... انڈے کا آرڈر دے دیا۔

ذرا ہی دیر میں اس نے یہ چیزیں میری میز پر لگا دیں اور کاؤنٹر پر کہنی ٹکا کر جا کھڑی ہوئی۔

میں بے دلی سے ناشتا کرنے میں مصروف ہو گیا اور اسی دوران میری اس پر نگاہ پڑی تو اُسے اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔

مجھے دیکھتے پا کر وہ ہولے سے مسکرائی۔ ایسے میں مجھے روڈلف یاد آ گیا، وہ ہوتا تو ضرور اس ویٹرس سے کچھ ’’نازک‘‘ لمحات کشید کرنے کا سوچتا، میں سر جھٹک کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس کی مسکراہٹ پر کوئی توجہ نہ دی۔

مجھ سے بمشکل ایک توس اور تھوڑا سا انڈا کھایا گیا تھا، چائے میں نے پی لی۔

میرے سامنے دو راستے تھے۔ ٹکٹ لوں اور امریکا کی طرف کوچ کر جاؤں، میرے پاسپورٹ پر امریکا کا تین سال کا ویزا لگا ہوا تھا۔ دوسرا خیال میرا سے جی کوہارا کی طرف جاتا تھا۔ اگر میں اس کے پیچھے پڑ جاتا تو...... ممکن تھا میرا آگے کا سفر تاخیر کا شکار ہو جاتا اور کسی گڑبڑ میں پھنسنے کا بھی خدشہ تھا، ایسی گڑبڑ جو منیلا سے میری ’’باعزت‘‘ روانگی میں رخنہ انداز بھی ہو سکتی تھی۔

پہلے ہی میں یہاں بہت سی گڑبڑ کا شکار رہا تھا، شکر تھا کہ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی، یوں میرے منیلا کے ویزے کی مدت بھی ختم ہونے والا تھی۔

ایک خیال دل میں آیا تھا کہ سے جی کوہارا کو اسی جگہ پر جا کر تلاشنے کی کوشش کروں...... جہاں وہ روڈلف، یاسمین اور مجھے لے کر گیا تھا۔ مگر یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ دوبارہ وہاں مجھے ملتا۔ یہاں اس کے کئی ٹھکانے ہو سکتے تھے۔ وہ مکمل طور پر لولوڈش کی سپورٹ میں تھا۔

کوہارا سے میرا کبھی نہ کبھی سامنا ہو سکتا تھا۔ اگر میں اسی میں اُلجھ جاتا تو میں اصل مقصد سے دور ہو جاتا۔ جس طرح کاسیاکو نے دولت کے بل بوتے پر منیلا کی پولیس کو کیپٹن رانسے کی صورت میں ساتھ ملا لیا تھا۔

کوہارا بھی لولوڈش کے توسط سے یہ سب کر سکتا تھا۔ میرے دشمنوں کی یہ کھلی بزدلی تھی۔ وہ جب مجھ سے منہ کی کھانے لگتے تھے تو اس طرح کی راہ اپناتے تھے۔ کوہارا بھی لولوڈش کے بل بوتے پر یہی سب کر سکتا تھا۔

یہاں میری کون مدد کو آتا؟ لہٰذا میں نے ناشتا کرنے کے مختصر سے دورانیے میں ہی آخری فیصلہ یہی کر لیا کہ پہلے اس علاقے سے نکل کر جنوبی علاقے کی طرف نکل جاؤں جدھر ائرپورٹ تھا۔ ٹکٹ لینے کی کوشش کرتا ہوں، اگر قریب کی کسی بھی فلائٹ میں سیٹ ریزرو ہو جاتی ہے تو ٹھیک... بہ صورتِ دیگر دو یا تین روز کے بعد کی ملتی ہے تو ٹکٹ خرید کر خاموشی سے انتظار میں وہیں کسی چھوٹے سے ہوٹل کے

www.bookspk.site

کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔

یہ فیصلہ کر کے میں ریسٹورنٹ سے نکل آیا اور ایک تیز رفتار بس میں سوار ہو کر جنوبی علاقے میں پہنچ گیا۔

میں گرد و پیش سے بھی بے خبر نہ تھا۔ کاسپاکو کو جہنم واصل کرنے کے بعد میرے سر سے ایک بڑا بوجھ اُتر گیا تھا، اسی نے ہی فیلا میں میرے آگے روڑے اٹکا رکھے تھے۔ لیکن وہ رذیل اپنی موت کی قیمت بھی روڈلف کے قتل کی صورت میں چکا گیا تھا۔ جو میرے لیے بہت بھاری ثابت ہوئی تھی۔

یہاں ایک بکنگ آفس سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ دو دن بعد کی فلائٹ میں سیٹ مل سکتی تھی۔ میں نے ٹکٹ لے لیا اور اپنے پروگرام کے مطابق ائرپورٹ کے قریبی ہوٹل میں ایک چھوٹا اسٹوڈیو روم لے کر اس میں بند ہو کے بیٹھ گیا۔

تیسرے روز رات دس بجے کی میری فلائٹ تھی۔ یہ دو دن میں نے اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہوٹل کے اسی کمرے میں گزار دیے۔

تیسرے روز شام میں ہوٹل سے تیار ہو کر نکلا اور سیدھا ائرپورٹ کا رخ کیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچا اور اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ رکھ دیا۔ آفیسر ایک خاتون تھی۔ اُس نے کچھ رواجی قسم کے سوالات کیے اور اس دوران میرے پاسپورٹ کا بھی بہ غور جائزہ لیتی رہی۔

9/11 کے بعد سے امریکا کی امیگریشن کی شرائط بڑی سخت کر دی گئی تھیں، اسی لیے وہ بالخصوص ایک ایشین پاکستانی کو خوب جانچ رہے تھے۔ جب اسے میرے پاسپورٹ اور ویزے میں کوئی سقم نظر نہ آیا تو اس نے ایک بڑی سی گول اسٹیمپ اُٹھا کر میرے پاسپورٹ پر چسپاں کر دی۔ میں اس کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈیپارچر لاؤنج میں مجھے ایک گھنٹا بیٹھنا پڑا۔ اس کے بعد مطلوبہ فلائٹ کی طرف روانگی کی اناؤنسمنٹ گونجنے لگی۔ دیگر مسافروں کے ساتھ میں بھی اُٹھا اور اپنا شولڈر بیگ اُٹھا کے چل دیا۔

ایک چمکتی دمکتی کوسٹر بس میں سارے مسافر سوار ہوئے اور بس ٹرمنل تھری کی جانب روانہ ہو گئی جہاں امریکن ائرلائنز کا دیوہیکل بوئنگ طیارہ مسافروں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

میرا ٹکٹ کیلی فورنیا کا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں جہاز کے اندر اپنی سیٹ پر براجمان ہو چکا تھا۔

طیارے نے مقررہ وقت پر ٹیک آف کیا اور فضائے بسیط کی جانب اپنی بلند پروازی کا سفر شروع کر دیا۔

میں بالآخر امریکا کی جانب پرواز کر چکا تھا۔ وہ امریکا...... جہاں میری زندگی، میری عابدہ...... جانے کس حال میں اپنی ہر آتی جاتی سانسوں کے ساتھ میری یادیں دل میں بسائے منتظر تھی کہ کوئی ایسا جادو، ایسا معجزہ ہو جائے اور وہ اپنے شہزی کو اپنی صدیوں کی پیاسی نگاہوں کے سامنے دیکھ لے...... میں خود اس کے لیے کس قدر بے چین اور بے قرار بیٹھا تھا بلکہ میں تو اس کی جدائی کے بعد سے ہی ہر لمحہ ایک کرب انگیز تڑپ میں گزارتا رہا تھا اور اب بھی گزار رہا تھا۔ لمبی جدائیوں کے اس کرب ناک دور میں ایک لمحہ ایسا بھی آیا تھا جب میرا دل بالکل ہی مایوس ہی ہو کر رہ گیا تھا کہ...... کیا عابدہ کو میں دوبارہ پا سکوں گا......؟ لیکن پھر مایوسیوں کے یہ اندھیرے اس وقت فنا ہونے لگتے تھے جب میرے اندر پہلی اور آخری محبت کے حصول' اس کے تحفظ اور اسے حالات کے گرداب سے نکالنے کا جذبہ بڑی شدت کے ساتھ بیدار ہونے لگتا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے مجھے آج تک عابدہ کے حصول کے لیے ثابت قدم رکھا تھا۔

طیارہ محوِ پرواز تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کی طرف تھی اور وہاں سے میں تاریک آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ نیچے زمین کی ٹمٹماتی روشنیاں اب معدوم ہو چکی تھیں۔ میں سیٹ کی پشت گاہ سے سر اور کمر ٹکائے آنکھیں موندے ہوئے بظاہر پُرسکون حالت میں تھا۔ میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق اس طیارے کے دو اسٹاپ تھے، پہلا دبئی اور دوسرا مصر......

''ایکسکیوز می سر......!''

معاً ایک مترنم سی آواز پر میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ ایک حسین سی ائرہوسٹس تھی۔ جو ایک ہاتھ سیٹ کی پشت گاہ سے ٹکا کر قدرے جھکی ہوئی میری طرف دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔

''یس......؟'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر استفساریہ کہا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک کاغذی چٹ میری طرف بڑھا دی اور آگے نکل گئی۔

میں اُلجھ سا گیا اور چٹ کھول کر اس پر نظریں جما دیں۔ صرف یک سطری پیغام تھا میرے لیے جسے پڑھ کر...... میرے دل و دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔

www.bookspk.site

''کون تھا یہ......؟ اور کیوں بلا رہا تھا مجھے......؟''

اک سطری پیغام ایک ہی نظر میں پڑھنے کے بعد میں زیرِ لب خود کلامیہ بڑبڑایا جس میں فقط یہی لکھا تھا۔

''شہزی! ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تین میں، آجاؤ۔''

سکون کی چند لمحات کی گھڑیاں غارت ہونے لگی تھیں۔ پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کسی نے مذاق نہ کیا ہو، لیکن نہیں...... امریکی ائرلائنز کے اس طیارے میں میرے ساتھ ایسا مذاق جو میرا نام بھی جانتا ہو، مذاق نہیں ہو سکتا تھا۔

''مجھے اس یک سطری پیغام کو فالو کرنا چاہیے یا نہیں......؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔

جواب ایک ہی تھا کہ سرِدست اسے صرف نظر کر دیا جائے۔

اور...... میں نے ایسا ہی کیا لیکن میرا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اس طیارے میں کوئی کھچڑی پکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہونے والا تھا یا ہونے کی تیاری میں تھا اور جس کا سبب میں ہی تھا۔ میرے دل کو ایک پریشان کن تجسس نے گھیر لیا تھا۔ دل چاہ بھی رہا تھا کہ اُٹھ کر جا کر دیکھوں...... اس شخص سے ملوں...... کون تھا یہ......؟ جو مجھے جانتا تھا اور یہ بھی کہ میں اسی طیارے میں ہوں......

بالآخر یہ تجسس اور پریشان کن اُلجھن اس قدر بڑھ گئی کہ مجھے اپنی سیٹ چھوڑنا ہی پڑی۔

ائرہوسٹس سے میں نے ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تین کی رہنمائی لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس سوئٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ٹاپ فرسٹ کلاس...... کاک پٹ کے ساتھ بنے ہوئے ہوتے تھے۔ یعنی جہاز کے اگلے حصے کی طرف......

دروازے پر ایک جواں مرد فلائٹ اٹینڈنٹ موجود تھا۔ اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے اسے بتا دیا کہ مجھے سوئٹ نمبر تین میں جانا ہے۔ اس نے فوراً اپنی جیب سے ایک ڈیجیٹل ڈائری نکالی اس پر پیشہ ورانہ انداز میں تیزی سے کچھ چیک کیا اور پھر میرا نام پوچھا۔ پھر وہیں لگے ایک انٹرکام پر مطلوبہ سوئٹ میں رابطہ کیا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''سر......! مسٹر شہزاد آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''اوکے سر......! شیور......'' اس نے انٹرکام ریسیور دوبارہ جھلا دیا اور پھر مسکرا کر دروازہ کھول دیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سوئٹ میں کون سفر کر رہا ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے میں نے اس سے پوچھ لیا، حسبِ توقع وہ حیران ہوا اور اسی لہجے میں پوچھا۔

''کیا آپ کو انہوں نے اپنا نام بھی نہیں بتایا؟''

میں نے دانستہ بات آئی گئی کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔ ''جان تو گیا ہوں، یہ میرا کوئی دوست ہوگا، مجھ سے اچانک مل کر سرپرائز دینا چاہتا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس نے ڈیپارچر لاؤنج میں ہی مجھے پہچان لیا ہوگا۔''

''او...... اچھا...... اچھا۔'' وہ بھی سر دھنتے ہوئے خفیف سی ہنسی کے ساتھ بولا، پھر بتایا۔

''یہ سوئٹ پروفیسر جمشید حمیدی کے نام سے ریزروڈ ہے۔''

میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ مجھے اس کی بات پر یقین ہی نہیں آیا تھا۔ میرے چہرے پر اُلجھن کے آثار دیکھ کر اٹینڈنٹ بھی سنجیدہ سا نظر آنے لگا۔ میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اندر داخل ہو گیا۔

بڑا آرام دہ اور پُرسکون ماحول تھا یہاں کا...... ہلکی روشنی تھی اور محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ایسی بہترین آسائش کا حامل اور سکون آور ماحول...... اس وقت زمین سے ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر محوِ پرواز تھا۔

میں نے مطلوبہ سوئٹ کے دروازے پر پہنچ کر ہلکی دستک دی تو اس کا دروازہ لطیف سی سرسراہٹ کے ساتھ وا ہوتا چلا گیا۔ میں نے اندر قدم رکھا اور سامنے نگاہ پڑتے ہی...... میرا پورا وجود سن ہو کر رہ گیا...... اندر ایک ناقابلِ یقین منظر منتظر تھا۔

☆☆☆

وہی لطیف سی سرسراہٹ پھر اُبھری اور میرے عقب میں دروازہ دوبارہ سلائڈ ہو کر بند ہو گیا۔ میری یک ٹک نظریں سامنے ایک آرام دہ اور نفیس قسم کے بیڈ کے دائیں جانب ایک ایزی چیئر پر بیٹھے اس شخص پر جم کر رہ گئی تھیں جو اپنے مکروہ وجود میں ایک بھیانک تعارف کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا تھا۔

اس کی بائیں آنکھ پر سیاہ رنگ کا فلیپ جھول رہا تھا اور اس سے منسلک ایک باریک ڈوری اس کے سر کے گرد بندھی ہوئی تھی۔ یہ یاسمین کے نکیلے ناخن کا رہینِ منت تھا۔ وہ اس وقت کسی بحری قذاق ہی کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔

جبکہ بیڈ پر ایک ستر پچھتر سالہ شخص نیم دراز تھا، اس

www.bookspk.site

نے اپنی پشت ایک تکیے کے ساتھ ٹکا رکھی تھی۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا اور بیمار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی تھوڑی خراشیں سی نظر آ رہی تھیں جو یقیناً سے جی کوہارا بلکہ ”کانا کوہارا“ کی رہینِ منت ہو سکتی تھیں، مجھے اس صاحبِ فراش بوڑھے شخص کی ہیئت کذائی سے صاف لگتا تھا کہ وہ کوہارا کے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا ہے۔

اس کے سر کے بال، گھنی مونچھیں، بھویں اور مُشت بھر کی داڑھی سفید دودھیا نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ قدرے بیضوی تھا۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ صحت قابلِ رشک مگر جسم قدرے چھریرا تھا، نیم دراز ہونے کی حالت میں بھی وہ دراز قامت ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے سر پر سیاہ رنگ کی چپٹی سی ٹوپی تھی۔ آنکھوں پر سیاہ موٹے فریم کا چشمہ تھا۔ جس کے ساتھ ایک سیاہ مہین سی ڈوری منسلک تھی جو اس کے گلے سے جھول رہی تھی۔ اس شخص کے ہونٹ پتلے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا جبہ نما سا لباس پہن رکھا تھا جو بند گلے سے لے کر پیروں تک نظر آ رہا تھا۔

یہ شخص میرے لیے یکسر اجنبی تھا لیکن اس کے بیڈ کے قریب ایزی لاؤنج چیئر پر جو اول الذکر بدہیئت شخص براجمان تھا، وہ میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ وہ سے جی کوہارا...... تھا۔ وہ میری طرف بڑی زہریلی مسکراہٹ سے اپنی اکلوتی آنکھ سے مسلسل...... گھورے جا رہا تھا۔ اس کے مکروہ چہرے کی مسکراہٹ سے غرور جھلکتا صاف عیاں تھا۔

”آؤ...... شہزی! میرے دلیر دشمن...... یہاں بیٹھ جاؤ...... اس طرف......“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور سامنے رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

”دیکھا...... کس طرح آسیبی سائے کی طرح میں جس وقت چاہوں تمہارے سر پر مسلط ہو جاتا ہوں۔“

میرے پورے وجود میں اس وقت ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ ذہن تیزی سے قیاسات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا مگر ان پر غور کرنے کا موقع نہ تھا۔ میں نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی غرض کی ایک گہری سانس لی اور کرسی کی طرف جا کے اس پر بیٹھ گیا۔

کوہارا کی لاؤنج چیئر کے پاس ہی ایک نفیس قسم کی چھوٹی سی ٹیبل تھی جس پر دو پیگ، ایک بوتل وہسکی کی رکھی ہوئی تھی۔ ایک پیگ خالی تھا اور دوسرا آدھا بھرا۔

میرے کرسی پر براجمان ہوتے ہی کوہارا اپنی نشست پر سے اُٹھ بیٹھا اور اس کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، پھر ایک نظر میرے چہرے پر ڈالتے ہوئے ذرا گردن موڑ کر بیڈ پر نیم دراز آخر الذکر شخص پر ڈالی اور پھر میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ اسی کی طرف کر کے بولا۔

”کون ہے یہ......؟“

”میں اسے نہیں جانتا......“ میں نے جواب دیا۔

”یہ وہی بڈھا ہے جس کی تلاش میں ماسٹر نے مجھے برما سے تہران اور پھر منیلا بھیجا تھا۔ پروفیسر جمشید حمیدی......“

اس نے انکشاف کیا اور میں چونک پڑا اور آنکھیں پھاڑے اس شخص کو تکنے لگا۔ کوہارا میری حیرانگی سے حظ اُٹھانے والے انداز میں بڑی مکروہ مسکراہٹ سجائے لمحہ بھر میری طرف دیکھتا رہا۔

اس انکشاف کے بعد کہ یہ بوڑھا شخص پروفیسر جمشید حمیدی تھا، میرا دھیان لامحالہ اس کی لاڈلی بیٹی یاسمین خانم کی طرف چلا گیا۔

کوہارا نے پہلے ہم سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ پروفیسر جمشید حمیدی...... اس کے قبضے میں تھا، لیکن درحقیقت وہ اب اس کی گرفت میں آیا تھا۔ اگرچہ اب بھی مجھے یہ یقین کرنے میں تامل ہی تھا کہ کیا خبر کسی خفیہ باہمی معاہدے کے تحت یہ سب ہو رہا ہو۔ یوں بھی یہ سوئٹ پروفیسر جمشید حمیدی کے نام سے ہی ریزورڈ تھا یا کروایا گیا تھا۔

بہرکیف...... میں نے ایسا کوئی تاثر ظاہر کیے بنا کہ مجھے پروفیسر جمشید حمیدی کے سلسلے میں کوئی فکر و تشویش محسوس ہوئی ہو، عام سے لہجے میں کہا۔

”مجھے یہاں بلانے کا مقصد......؟“

”اوہ...... ویری اسمارٹ۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

مجھے یاسمین کی طرف سے واقعی تشویش سی ہونے لگی تھی کہ نجانے اس کا اس بدبخت قسائی نے کیا حشر کیا ہوگا، مگر میں مصلحتاً ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، یوں میرا یاسمین خانم سے روڈلف کی حد تک ہی ایک تعلق تھا یا پھر تھوڑا بہت اس وجہ سے کہ اس کے باپ پروفیسر جمشید حمیدی کو لولوش اپنے اہم مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا جبکہ خود میرے نزدیک یہ سب سوائے لغویات کے اور کچھ معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں ایک حقیقت پسند انسان تھا، ٹھوس دلائل اور عقلی توجیہات کی کسوٹی پر ہی میں ہر ایسی بات کو ماننے کا قائل تھا جو اپنے اندر زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت بھی سچ رکھتی ہو۔ جبکہ پروفیسر جمشید کی مہم کسی بوڑھے سنکی اور خبطی کے دماغی فتور کے سوا میرے نزدیک اور کوئی حقیقت نہیں تھی۔ تاہم میرے حساب سے یہ بھلا ہی تھا کہ اس نے لولوش جیسے ”کرائم لارڈ“ کو اپنی اس بےمحل مہم میں اُلجھائے رکھا تھا۔

”درپردہ تم ان دونوں باپ بیٹی کو سپورٹ کیے ہوئے ہو اور اب یوں انجان بن رہے ہو جیسے تمہارا ان دونوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے؟“ اچانک کوہارا نے دوبارہ استہزائیہ لہجے میں کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر اسی طنز سے جواب دیا۔

”کوہارا......! تمہارے دماغ میں واقعی عقل نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی ماسوائے خون خرابے کے...... مجھے تو کبھی کبھی تمہارے ماسٹر لولوش پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تم پر اتنا بھروسا کیسے......“

”فضول بکواس نہیں......“ کوہارا نے ایک دم اپنا ایک ہاتھ بلند کر کے مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کر دیا۔

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں شہزی! تم ایک نمبر کے مکار اور چکرباز انسان ہو۔“

”تم خود سوچو، اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو...... اس طیارے میں امریکا جانے کے بجائے مصر جا رہا ہوتا......“ میں نے پھر کہا۔ ”افسوس تم نے میری یہاں طیارے میں موجودگی تو کنفرم کر لی لیکن ٹکٹ کنفرم نہیں کر سکے کہ میری منزل کیلی فورنیا ہے۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں کوہارا کو یہ نہیں بتاتا، لیکن یہ فلائٹ ایسی تھی کہ کچھ چھپانا بےکار ہی تھا، تاہم یہ کہہ سکتا تھا کہ میں دوبارہ پاکستان کے واپسی کے سفر میں ہوں، کیونکہ اس فلائٹ کا فضائی روٹ میانمار .... (برما) سے انڈیا پاکستان اور سعودیہ سے مصر پھر اس کے بعد بحرِ اوقیانوس (شمالی) کے اُوپر سے گزرتے ہوئے کیلی فورنیا (امریکا) تک تھا اور وہی اس کا اینڈنگ پوائنٹ تھا۔

میں...... نہیں جانتا تھا کہ اس مردود کی کون سی منزل ہے، کیونکہ جیسا کہ مذکور ہوا...... اس فلائٹ کے صرف دو ہی اسٹاپ تھے۔ ایک دبئی اور دوسرا مصر...... تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ تو کیا یہ دونوں...... مصر جانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے؟

یہ خیال آتے ہی میرے وجود میں ایک نامعلوم خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی، لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یہ سوچ کر تسلی ہو گئی کہ...... میں اس وقت زمین پر نہیں بلکہ ایک بڑے ملک کی بڑی ائرلائن کے جمبو جیٹ بوئنگ طیارے میں تھا۔ جس کے مسافروں کو منزل تک پہنچانے کی ذمّے داری صرف کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے دو کپتانوں کی ہی نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے لاکھوں کے عملے پر مشتمل افراد کی بھی تھی جو زمین پر بیٹھے اس طیارے کی سمت، رفتار اور منزل کا ہمہ وقت تعین کیے ہوئے بیدار بیٹھے تھے۔ یہاں کوہارا کی اجارہ داری قائم نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی یہ میرے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی بھی کر سکتا تھا، اگرچہ یہی کچھ میرے ساتھ بھی تھا کہ میں کوہارا سے ابھی دو دو ہاتھ نہیں کر سکتا تھا۔

”روٹ اور ٹکٹ کو ٹرانزٹ کرنے میں کیا دیر لگے گی؟ تم کیا سمجھتے تھے کہ اتنی آسانی سے تم اور پروفیسر اور اس کی لاڈلی بیٹی یاسمین...... جس نے مجھے یہ تحفہ دیا......“ کوہارا نے یہ کہتے ہوئے اپنی پھوٹی ہوئی آنکھ کی طرف اشارہ کیا تھا اور میں یاسمین خانم کی طرف سے اندر سے ہول اُٹھا تھا۔ ظاہر سی بات تھی کہ یہ مردود یاسمین کے باپ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا تو یاسمین بھی اسی کی گرفت میں ہو سکتی تھی۔

”ختم کرو یہ بحث کوہارا......!“ میں نے اس موضوع سے پہلوتہی کرتے ہوئے اسے اصل بات کی طرف راغب کرنے کی غرض سے بظاہر بیزاری سے کہا۔

”مجھے بتاؤ...... اس طیارے میں تم کیا چاہتے ہو اور یہ کہ...... اس بے چارے پروفیسر کو تم کہاں لے جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہو؟“

سے جی کوہارا...... نے بڑی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھور کر دیکھا۔ قریب دھری میز پر سے اَدھ بھرا پیگ اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور پیگ ہاتھ ہی میں تھامے ہوئے اس نے ایک ذرا گردن موڑ کر...... بیڈ کی طرف دیکھا۔ جہاں نیم دراز پڑا پروفیسر مجھے بہت غور غور سے تکنے میں محو تھا، پھر وہ مجھ سے بولا۔

”شہزی! میں فقط یہی چاہتا ہوں کہ تم جہاں جا رہے ہو، وہیں تک اپنا سفر جاری رکھو اور میں اپنا...... میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا، میں تم سے امریکا آ کر ہی اب نمٹوں گا۔“

اس کی بات سن کر میں نے بے اختیار اندر ہی اندر سکون کی سانس لی تھی کہ وہ خود ہی میرے راستے سے دست بردار ہو رہا تھا۔

”بس! یہی کہنے کے لیے تم نے مجھے یہاں بلانے کی زحمت دی تھی؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ حیرت

www.bookspk.site

www.bookspk.site

سے پوچھا۔ حسبِ توقع اس کی اکلوتی آنکھ میں فطری خونخواری کی چمک اُبھری۔

''کسی قسم کی چالاکی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے شہزی!'' وہ جیسے اب بھی مطمئن نہ تھا۔ آگے بولا۔ ''اس طیارے...... میں میرے تین آدمی بھی موجود اور......''

یہ کہتے ہوئے اس نے پیگ میں بچا ہوا آخری گھونٹ بھی چڑھا لیا اور قدرے جھک کر ایک ہاتھ سے اپنی لاؤنج چیئر کے نیچے سے ایک گن نکال کر میرے سامنے لہرائی تو میرے اوسان خطا ہونے لگے......

''یہ دیکھ رہے ہو ناں...... گن ہے یہ...... میرے ان تین میں سے ایک کے پاس بھی ایسا ہی ہتھیار ہے اور باقی دو اپنی آستینوں میں زہریلی سوئیاں چھپائے ہوئے ہیں۔ میرے ایک اشارے پر کوئی بھی ایک مسافر دوستانہ انداز میں تمہارے شانے پر ہاتھ رکھے گا اور تمہاری روح اس طیارے سے بھی تیزی کے ساتھ پرواز کر کے آسمان کی وسعتوں کی طرف گم ہو جائے گی۔''

اس بدبخت کے لہجے میں نجانے ایسی کیا بات تھی کہ میرے پورے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔ چند ثانیوں کے لیے کہ مجھے ایک چپ سی کھا گئی۔

''ب...... بیٹا! جو یہ کہہ رہا ہے، وہی کرنا، بہت خطرناک آدمی ہے یہ......'' میں اس کمزور سی لرزتی آواز پر چونکا۔ پہلی بار یہ لب کشائی بیڈ پر نیم دراز پروفیسر جمشید حمیدی نے کی تھی اور اس کا تخاطب میں ہی تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ''بیٹا'' کہنے کا انداز مجھے ایسا بھایا تھا کہ بے اختیار میں نے بھی اپنے دل میں اس کے لیے ایک نرم گوشہ اُبھرتے محسوس کیا۔

''م...... میری ب...... بیٹی یاسمین بھی اسی کے آدمیوں کی قید میں ہے، بیٹا! اس کی جان خطرے میں ہے، میں ایک مسلمان بھائی ایک دکھی باپ کی حیثیت سے تم سے درخواست......'' اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ کیونکہ اسی وقت کوہارا نے خوفناک غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''اسے کیا بتا رہے ہو بڈھے! یہ پہلے ہی سب جانتا ہے اور تم بھی......''

کوہارا کو بڑی شدید قسم کی غلط فہمی ہو گئی تھی اور یہ میرے لیے کسی بھی وقت خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی۔ یہی نہیں مجھے حیرت آمیز تشویش نے بھی آگھیرا تھا، یہ دیکھ کر کہ یہ مردود آتشیں اسلحے کے ساتھ اس مسافر طیارے میں موجود تھا، بلکہ یہی نہیں اس کے تین میں سے ایک ساتھی کے پاس بھی گن تھی اور باقی دو، موت کی نیند سلانے والی سوئیوں کو آستینوں میں چھپائے ہوئے زہریلے سانپوں کی طرح چھپے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ طیارے میں کسی بھی قسم کی کوئی گڑبڑ کر سکتے تھے۔

صاف ظاہر تھا کہ کوہارا، پروفیسر جمشید کو اس طیارے میں یرغمال بنائے مصر کی پراسرار سرزمین کی جانب محوِ پرواز تھا اور...... اس کی بیٹی یاسمین خانم کو یرغمال کر رکھا تھا مگر وہ تھی کہاں......؟ منیلا میں...... یا پھر اسی طیارے میں......؟

یہ سب پل کے پل سوچ کر میرے وجود میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی تھی۔ ''میں اب چلوں گا اپنی سیٹ پر......'' مجھ سے اب مزید وہاں بیٹھا نہ گیا اور یہ کہتے ہوئے میں اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

درحقیقت میں اپنی سیٹ پر جا کر موجودہ مخدوش ہوتی صورتِ حالات کے بارے میں یکسوئی کے ساتھ غور و خوص کرنا چاہتا تھا۔

''تم جا سکتے ہو مگر میری نصیحت یاد رکھنا۔'' کوہارا نے اس بار...... کھڑے ہو کر مجھ سے درشت لہجے میں کہا۔ گن اس نے واپس چیئر کے نیچے رکھ دی تھی۔

''جہاں جا رہے ہو، خاموشی سے وہیں تک کا سفر جاری رہنا چاہیے تمہارا...... مصر میں ہم اُتر جائیں گے مگر میرے دو آدمی تم پر کڑی نگاہ رکھیں گے، تمہیں طیارے سے اترتے دیکھا تو زہریلی سوئی تمہارا مقدر ہو گی۔''

میں نے پلٹتے سے پروفیسر جمشید کی طرف بھی دیکھا تھا۔ اس کی سفید بھنوؤں تلے بوڑھی آنکھوں میں شدید کرب اور التجا آمیز تاثرات مترشح ہو رہے تھے۔

میں پلٹا اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور...... پھر ذرا دیر بعد اپنی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔

☆☆☆

فضائے بسیط کے تاریک اور اسرار بھرے خلائی ویرانوں میں...... ٹنوں وزنی، بوئنگ 777 جمبو جیٹ پانچ سو پچھتر مسافروں کے ساتھ منزل کی جانب محوِ پرواز تھا اور طیارے میں موجود مطمئن و مسرور مسافر نہیں جانتے تھے کہ اس طیارے میں کتنا بڑا اور خطرناک عفریت موجود تھا۔ بظاہر ابھی اس سے طیارے کو کوئی خطرہ تو نہ تھا، لیکن وہ ایک خوابیدہ آتش فشاں ضرور تھا یا یوں کہہ لیں کہ ایک سویا ہوا ڈریگون تھا۔ وہ اگر بپھر جاتا تو ہزاروں فٹ کی بلندی پر محوِ پرواز اس طیارے کی سلامتی یقیناً خطرے میں پڑ جاتی۔

www.bookspk.site

سے جی کوہارا اپنے تین خطرناک اور مسلح ساتھیوں کے ساتھ طیارے میں موجود تھا۔ خود اس کے پاس بھی گن تھی۔ وہ تینوں کون تھے مگر کہاں تھے؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔ بس، انہی مسافروں میں عام لوگوں کی طرح گھلے ملے بیٹھے تھے۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کوہارا سمیت دو افراد خطرناک اسلحہ سمیت اس طیارے میں سوار ہو گئے تھے اور کسی کو پتا ہی نہ چل سکا تھا؟ منیلا کی ائرپورٹ سیکیورٹی کہاں جا سوئی تھی؟ طیارے کا امریکن عملہ جنہیں ایسے معاملات کی سخت ٹریننگ سے گزارا جاتا ہے، ان کی ساری تربیت کی کوہارا اور اس کے ساتھیوں نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ ائرپورٹ میں...... آتشیں اسلحہ تو کیا ایک سوئی بھی طاقت ور اسکیننگ سسٹم میں نظر آ جاتی ہے، تو پھر کس طرح آخر ''کوہارا اینڈ کمپنی'' نے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکی تھی؟

ان سب باتوں میں سر کھپانے سے بچنے کے لیے میرے دماغ نے فقط ایک ہی توجیہہ پیش کی، وہ یہ کہ جب امریکا جیسے ملک میں دو طیارے چوری کر کے پینٹا گون اور ورلڈ ٹریڈ ٹاور سے ٹکرانا ممکن ہو جاتا ہے تو پھر یہ کیا چیز تھی۔

میں نے اگلے مرحلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

میرا ایک دیرینہ شکار طیارے میں موجود تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے رُوبرو بھی ہو گئے تھے، شاید ہم ایک دوسرے کے سامنے بے بس بھی تھے، یعنی ہم سامنا ہونے کے باوصف ایک دوسرے کو فوری طور پر کوئی حملہ کرنے یا نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں تھے، لیکن نہیں...... مجھے کوہارا کو خود سے الگ رکھنا ہو گا، ہاں! میری بہ نسبت وہ مجھ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ضرور تھا، اس کے ایک اسلحہ بدست ساتھی سے قطع نظر...... وہ دو ساتھی جو اپنی آستینوں میں زہریلی سوئی چھپائے ہوئے تھے، میرے لیے موت کا پیغام لا سکتے تھے اور تب ہی یہ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

کیا خبر سے جی کوہارا...... نے اپنے ان دو مذکورہ ساتھیوں کو یہ حکم دے رکھا ہو کہ مجھے اسی طرح خاموشی سے موت کی نیند سُلا دیا جائے...... اس سے کچھ بھی تو بعید نہ تھا۔

اوخدا......! میں کس قدر شدید خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ حالانکہ تھوڑی دیر پہلے مجھ پر نیند غلبہ طاری ہونے لگا تھا، لیکن اب تو مجھے سونے سے بھی موت کا خوف محسوس ہو رہا تھا، کیا پتا چلتا اس رذیل کوہارا کا کوئی ساتھی، اِدھر سے گزرتے ہوئے ایک ذرا ہاتھ میری گردن یا شانے پر رکھتا ہوا چلا جائے اور میں عالمِ خواب میں ہی ملکِ عدم سدھار جاؤں۔

یہ سوچ کر ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں موت کی سرسراہٹیں ہونے لگی تھیں۔

میری چھٹی حس چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ مجھے کوہارا کی اس بات پر کبھی یقین نہیں کرنا چاہیے جو اس نے مجھ سے کہی تھی۔

''شہزی! میں فقط یہی چاہتا ہوں کہ تم جہاں جا رہے ہو، وہیں تک ہی اپنا سفر جاری رکھو اور میں اپنا...... میرا راستہ کھوٹا کرنے کی کوشش مت کرنا، میں تم سے امریکا آ کر ہی اب نمٹوں گا۔''

ایسا ضرور اس نے مجھے مطمئن رکھنے کے لیے کہا ہو گا، ایک خطرناک بلف کر رہا تھا کوہارا...... وہ مجھ سے اِدھر ہی نمٹنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اب تو جیسے میں اپنے سائے سے بھی چوکنا ہو گیا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب اچانک مجھے اپنے ساتھ کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کا خیال آیا۔

''یہ بھی تو کوہارا کا ساتھی ہو سکتا تھا۔'' تب ہی اچانک اس نے بھی ارادتاً یا یونہی میری طرف دیکھا اور اس کا ایک ہاتھ میں نے اُٹھتے دیکھا، وہ میرے شانے پر آ رہا تھا، میں ایک دم اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

وہ پریشان ہو گیا۔ درحقیقت وہ ایک جمائی لے رہا تھا۔ اپنے بدن کی اکڑن دور کرنے کی غرض سے وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے شانوں سے بلند کر رہا تھا۔

چند اور مسافر بھی میری اس نازیبا سی حرکت پر مجھے عجیب سی نظروں سے تکنے لگے تھے۔ میں تھوڑا جھینپ سا گیا۔ میرے ساتھ بیٹھا وہ آدمی، جو درمیانی عمر کا ہی ایک یورپین دکھائی دیتا تھا۔ اپنا سر جھٹک کر ذرا پرے ہو کر بیٹھ گیا۔

مجھے کوہارا کے اسلحہ بدست ساتھیوں سے زیادہ اس کے ''زہر میں بجھے'' ساتھیوں سے زیادہ ڈر تھا، میں...... بلاشبہ ایک ''فوبیا'' جیسی کیفیات کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا خبر وہ کب میری بے خبری سے فائدہ اُٹھا لیں؟

میری آنکھوں سے نیند اب اُچاٹ ہو گئی تھی۔ میرا ذہن اب پہلے سے زیادہ تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا تھا۔

میں نے سب سے پہلے...... اس بات پر غور کیا کہ...... پروفیسر جمشید اور اس کی بیٹی یاسمین خانم کی مدد کرنی چاہیے تھی یا اس معاملے سے ہی صاف چشم پوشی کر جاتا؟

کچھ بھی سہی، پروفیسر جمشید حمیدی...... میرے ازلی دشمنوں کے نرغے میں تھا اور یاسمین خانم بھی ان کے رحم و کرم پر تھی۔ دونوں باپ بیٹی کی بے بسی اور شکست، میرے دشمنوں

www.bookspk.site

کے حق میں جاتی تھی، پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ انسانیت کے ناتے ہی سہی، دونوں باپ بیٹی مسلمان تھے، برادر اسلامی ملک ایران سے ان کا تعلق تھا، تب ہی میری غیرت اور حمیت نے جوش مارا اور…… یک بیک میرے اندر کا جنگجو اور…… غیور شہزی ایک انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

خوف اور ڈر کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے سب سے پہلے…… یاسمین کو طیارے کے اندر تلاشنے کا ارادہ کیا، اگر وہ یہاں کہیں بیٹھی تھی تو یقیناً…… اس کے ہمراہ کوہارا کے ہی ساتھی ہوں گے۔

یہ سوچ کر میں اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ آیا اگر یاسمین بھی ادھر اسی طیارے میں اپنے باپ کی طرح ”یرغمالی“ کی حیثیت سے موجود تھی۔ تو کہاں ہو سکتی تھی؟ اسی اکنامی کلاس میں، جہاں میں بھی موجود تھا یا پھر بزنس اور فرسٹ کلاس کے کسی سوئٹ میں……؟

میں نے اپنی کلاس کا پہلے ایک چکر لگانا ضروری سمجھا۔ میری عقلِ سلیم کو ایک خیال اور بھی سوجھا تھا۔ کوہارا…… سیدھا برما سے منیلا پہنچا تھا، اور اس کے ساتھی بھی یقیناً برمی ہو سکتے تھے، انڈیمان کے جزائر میں…… سون کھلا اور میجر کیم کھلا، ان کے برمی ساتھیوں سے میرا بہت قریب قریب سامنا ہوتا رہا تھا، اسی لیے مجھے زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت برمی باشندے پہچاننے کا تجربہ تو ہو ہی چکا تھا۔ لہٰذا مجھے اُمید تھی کہ کوہارا کے یہاں موجود ان پانچ ساتھیوں میں سے کسی نہ کسی کو تو پہچان ہی لوں گا اور ضرور یاسمین بھی انہی میں سے کسی کے ساتھ بیٹھی ہوگی۔

ایک بات پر حیرت مجھے ہوئی تھی، اگر یاسمین بھی اس طیارے میں سوار تھی تو اب تک میری یا اس کی نظر کیوں نہ ایک دوسرے پر پڑ سکی تھی؟ ہو سکتا تھا کہ ہمیں ایسی کوئی اُمید ہی نہ تھی ملنے کی……؟ میں خود بھی اپنے ہی دھیانوں میں رہا تھا۔

بہرطور…… طیارے کا ماحول بے حد پُرسکون تھا۔ بیشتر مسافر سو رہے تھے اور کچھ اُونگھ رہے تھے، ان میں چند ایسے بھی جوڑے تھے جو آپس میں ہلکی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔

مجھے سیٹوں کے درمیان کسی بھوت کی طرح چکر لگاتے ہوئے دیکھ کر ایک دلکش سی فضائی میزبان میری طرف آئی اور بڑے پیشہ ورانہ اخلاق سے حاجت پوچھی۔

میں نے اسے یہی بتایا کہ میں اپنے کسی دوست کو ڈھونڈ رہا ہوں…… اس نے بھی اسی فلائٹ میں سوار ہونا تھا۔ وہ کچھ مطمئن ہوئی اور کچھ نہیں تاہم دوبارہ اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا اور لوٹ گئی۔

میں دو رُویہ قطار کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہر ایک مسافر کے چہرے کو تکتے جا رہا تھا۔ وہ دلکش سی اسمارٹ نظر آنے والی سرو قد ائر ہوسٹس اپنے کیبن میں جانے کے بجائے ایک طرف کسی خالی نشست پر بیٹھ گئی اور میری طرف بڑے غور غور سے دیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی پروا نہ کی اور اپنے ”کام“ سے لگا رہا۔

اچانک آخری رو کی تین سیٹوں سے پہلے میں ذرا چونکا۔ یہ چار رُویہ سیٹوں کی ایک درمیانی قطار تھی۔

وہ ایک گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی تھا، رنگت ہلکی سانولی تھی۔ اس نے سیٹ کو ذرا ”ایزی“ کر رکھا تھا اور اپنا سر سیٹ سے ٹکایا ہوا تھا۔ آنکھیں موندی ہوئی تھیں۔ اس پر مجھے برمی باشندے کا سو فیصد یقین کی حد تک شبہ ہوا تھا۔ میری گردشی نظروں نے اس کے برابر والی سیٹ پر کسی عورت کو بھی دیکھا، اس کی آنکھوں پر ہلکے سبز رنگ کے ”پیڈ“ چڑھے ہوئے تھے، یہ عموماً مسافر لوگ آنکھوں پہ چڑھا کر بیٹھے بیٹھے گہری نیند سونے کے عادی ہوتے تھے۔ اس نے فل کوٹ پہن رکھا جس کے کالر اس طرح کھڑے کیے گئے تھے کہ اس کا نصف چہرہ چھپ گیا تھا مگر میری تاڑتی نظروں نے فوراً اس میں بھی شناسائی کو بھانپ لیا تھا۔ یہی یاسمین خانم تھی۔ اس کے برابر میں ایک عمر رسیدہ اطالوی جوڑا تھا۔ اول الذکر میرے ”مطلوبہ“ نکلے تھے۔

میں وہیں کھڑا رہا تھا۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ والی رو میں نظر دوڑائی۔ وہاں ایک خوبصورت سی، سرخ و سپید اور خاصی صحت مند غیر ملکی عورت بیٹھی تھی، اس نے ٹائٹ شرٹ اور اسی طرح کی خوب کسی ہوئی جینز کی پینٹ چڑھا رکھی تھی۔ شرٹ بغیر آستین کی تھی اور گلا بھی جس کا بہت کشادہ تھا۔ بال ہلکے سرخی مائل تھے۔ اس نے کانوں میں واک مین لگایا ہوا تھا اور آنکھیں موندے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس کے برابر میں سیٹ خالی تھی۔ میں نے ہولے سے اُسے ٹھوکا دیا تو اس نے فوراً اپنی آنکھیں کھول لیں۔

”آپ کو زحمت نہ ہو تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟“

اس عورت نے جس کی عمر کا اندازہ مجھے تیس بتیس سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اس کے بعد اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور گہری گہری آنکھوں میں معنی خیز چمک اُبھری۔

www.bookspk.site

”شیور……“ اس نے مترنم سی آواز میں کہا اور میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

”ایکسکیوزمی سر……!“ اچانک ایک مدھم سی نسوانی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے دیکھا یہ وہی دلکش سی ائر ہوسٹس تھی، رات اور خوابیدہ ماحول کی وجہ سے وہ بہت ہلکی آواز میں بول رہی تھی۔

”آپ پلیز، اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھیں……“

”لیکن مجھے وہاں بوریت ہو رہی تھی، نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا کسی خوبصورت سے ہم رکاب ساتھی کے ساتھ بیٹھا جائے۔“

میں نے جواب میں دانستہ آخری جملہ مذکورہ خوب صورت مسافر ساتھی عورت کی طرف دیکھ کر ادا کیا تھا۔ میرا تیر نشانے پر لگا، وہ میری طرف دیکھ کر دلنشین انداز میں مسکرائی اور میری حمایت میں ائر ہوسٹس سے بولی۔

”انہیں یہاں بیٹھنے دو مجھے کوئی اعتراض نہیں…… میں خود بھی تنہا بور ہو رہی تھی۔“

ائر ہوسٹس تھوڑی دیر پُرسوچ انداز میں وہاں کھڑی ہماری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد پلٹ گئی۔

”تھینک یو……“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”شہزاد……“ میں نے نام بتایا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ مصافحے کے لیے تھام لیا اور…… دلنشیں مسکراہٹ سے بولی۔

”کیمی……، تم کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے اپنی گہری گہری چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیلی فورنیا……“

”واؤ…… کیسا عجیب اتفاق ہے، میں بھی سی ایف جا رہی ہوں۔“ اس نے خالص امریکی خاتون ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کیلی فورنیا کا شارٹ فارم استعمال کیا تھا۔ ”واؤ“ کہتے ہوئے اس کا نرم و گداز دہانہ بڑے دلکش انداز میں دائرہ بنایا تھا۔

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا اور میں نے اس سے رسمی باتیں شروع کر دیں، ساتھ ہی مذکورہ سیٹ کی طرف بھی دیکھتا رہا۔ میری مشتاق نظریں ان دونوں کو تکے جا رہی تھیں۔ اچانک اس برمی مسافر نے اپنی آنکھیں کھولیں، وجہ اس کے برابر میں بیٹھی عورت تھی جو ہلکے سے کسمسائی تھی۔ یہ وہی عورت تھی جس کے بارے میں مجھے یقین سا تھا کہ وہ یاسمین خانم تھی۔

”آر یو میرڈ……؟“ کیمی نے روایتی سا سوال کیا۔

”نہیں…… اور آپ……؟“

”میں نے شادی کی تھی، سال بھی نہ چل سکی۔ اب اکیلی اور آزاد ہوں۔“ کیمی نے اپنے بارے میں بتایا۔

”اوہو……“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”واٹ ڈیو مین…… اوہو……؟“ وہ حیرت سے بولی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ امریکی خاتون بال کی کھال نکالتی ہیں۔ میں گڑبڑا کر بولا۔

”میرا مطلب تھا، مجھے افسوس ہوا۔“

”کس بات کا……؟“ وہ حیرت سے بولی۔ میں نے دُزدیدہ نظروں سے مطلوبہ سمت کی طرف دیکھا اور مجھے چونکنا پڑا۔ وہ برمی اس عورت کو سہارا دیے اپنے ساتھ کہیں لے جا رہا تھا۔ تب ہی میرے شبہے کی تصدیق ہو گئی جب میں نے…… یاسمین کا چہرہ پوری طرح دیکھ لیا۔ وہ نیم غنودہ سی نظر آ رہی تھی، جیسے نیند، نیم بے ہوشی یا نشے کی سی حالت میں ہو۔ پل کے پل میں معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ وہ کسی نشہ آور ڈرگ کے زیرِ اثر تھی، صاف ظاہر تھا کہ ایسا اس کے ساتھ طیارے میں سوار ہونے کے بعد ہوا ہوگا، ورنہ ایسے مسافر کو بورڈنگ کارڈ ہی ایشو نہیں کیا جاتا۔ تو کیا…… کوہارا نے ان دونوں باپ بیٹی کو طیارے میں سوار ہونے کے بعد یرغمال بنایا تھا؟ میں اُلجھ گیا۔ بات میری سمجھ میں نہ آ سکی۔

”مجھے آپ کی طلاق پر افسوس ہوا۔“ میں نے کیمی سے جان چھڑانے والے انداز میں کہا اور عجلت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ حیران اور کچھ پریشان سی ہو گئی۔ تبھی شاید میں اس کی کسی بات پر فوراً سیٹ چھوڑ رہا تھا، یک دم گڑبڑا کر بولی۔

”لیکن مجھے تو نہیں ہوا…… تم کہاں چلے……؟“

”ٹوائلٹ…… ابھی آیا……“ میں نے کہا اور اس برمی کے پیچھے ہو لیا۔ شکر تھا کہ اس برمی کی ابھی تک مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ کوہارا کے سوئٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے یاسمین کو اپنے دونوں ہاتھوں سے اسی طرح ہی سہارا دے رکھا تھا جیسے یاسمین بیمار ہو یا اُسے چلنے میں کوئی دشواری ہو……

جب وہ دونوں اندر چلے گئے تو میں…… چند سیکنڈ کی دانستہ تاخیر کے بعد یہاں سے گزر کر اس درمیانی خلا میں آ گیا، جدھر واش روم اور ٹوائلٹ بنے ہوئے تھے۔

میں اندر گھس گیا۔ میرے دائیں بائیں ٹوائلٹ کی قطار تھیں۔ کچھ پر ”آکوپائیڈ“ کے الفاظ روشن تھے۔ میں ایک خالی واش روم میں داخل ہو گیا اور وہیں خاموشی سے کھڑا سن گن لیتا رہا۔

www.bookspk.site

میرا خیال تھا یاسمین کو کسی ''حاجت'' کے لیے ہی لایا گیا تھا۔ تب ہی میں چونکا۔

''تم باہر جاؤ، میں تمہاری موجودگی میں کموڈ پر نہیں بیٹھ سکتی۔''

دفعتاً ایک نسوانی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ یہ یاسمین کی آواز تھی، نحیف سی مگر غصیلا پن تھا اس میں...... شاید وہ برمی بھی اس کے ساتھ اندر جا گھسا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، لیکن جلدی باہر آنا، میں دروازے سے لگا کھڑا ہوں۔''

مجھے اس برمی کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے میں تحکمانہ درشتی تھی۔ یاسمین کے مقابلے میں برمی کی انگریزی شکستہ سی تھی۔ پھر دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز ابھری۔ میں نے اپنے ٹوائلٹ کا دروازہ دانستہ پورا بند نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک جھری رہنے دی تھی۔ میں نے اس سے اپنی ایک آنکھ چپکا دی۔

آواز میرے ساتھ والے ٹوائلٹ سے اُبھری تھی، میں نے اسی برمی کو بُرا سا منہ بنائے اندر سے برآمد ہوتے دیکھا، وہ ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

میں ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل آیا، ہم دونوں کی نظریں ملیں۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر چونکتا ہے یا نہیں، کیونکہ کوہارا نے یا تو میری تصویر انہیں دکھا رکھی ہو گی، یا پھر ائرپورٹ میں اس نے اپنے ان مذکورہ تین ساتھیوں کو خفیہ طور پر میری نشاندہی کر دی ہو گی۔

وہی ہوا...... وہ مجھے دیکھتے ہی اس طرح چونکا جیسے اُسے بچھو نے ڈنک لیا ہو۔ میں چونک گیا، وہ متحرک ہوا، میری مشاق نظریں اس کی ایک ایک حرکات وسکنات پر گڑھ کر رہ گئیں۔ اسے میں نے جارحانہ انداز میں اپنی طرف بڑھتے پایا اور ساتھ ہی اس نے اپنا ایک ہاتھ بھی بلند کرتے ہوئے آستین چڑھالی اور ساتھ ہی اپنے اسی ہاتھ کی ہتھیلی کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیا۔ یک بیک میرے ذہن میں جھماکا ہوا، یہ ''ہتھیار بدست'' نہیں بلکہ ''زہر بدست'' تھا۔ کوہارا نے اپنی طاقت کے زعم اور غرور میں آ کر اپنے دو ''زہریلے'' ساتھیوں کے بارے میں پہلے سے مجھے بتا کر غلطی کی تھی۔ (وہ پہلے بھی ایسی غلطیاں کر چکا تھا جو میرے لیے سودمند ثابت ہوتی رہی تھیں۔)

میں نے اس کے بازو کی رسائی سے پہلے ہی اس کے پیٹ پر اس زور سے لات رسید کر دی کہ وہ پیچھے واش روم کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہاں ممکن تھا اور لوگ بھی ہوتے۔ میں بغیر وقت ضائع اور شور کیے اسے جہنم واصل کر دینے کا تہیہ کر چکا تھا اسی لیے فرسٹ کیٹگری کا خطرناک اسالٹ آزمانے کی کوشش میں تھا، اسی سبب اس کے دیوار سے ٹکراتے ہی میں اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس کے قریب پہنچتے ہی، جب وہ سنبھلنے کی کوشش میں تھا، ایک پاورفل ہیمر پنچ اس کی ناک پر رسید کر دیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔

اسی وقت میں نے قریب کے ایک ٹوائلٹ... کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور میں... بہ سرعت تمام...... بے ہوش برمی کو دبوچ کر ساتھ کے ٹوائلٹ میں گھسیٹتا ہوا لے گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

اب میں باقی کا ''کام'' آرام سے نمٹا سکتا تھا، مجھے یاسمین خانم کو بھی ''بچ'' کرنا تھا، کہیں وہ ٹوائلٹ سے نکل کر اپنی سیٹ پر نہ جا بیٹھے۔

میں نے بے ہوش برمی کی گردن کے گرد اپنا ایک بازو حمائل کر کے جھٹکا دیا اور زندگی کی قید سے اُسے آزاد کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اس کی لاش کو نہایت دھیرے دھیرے ٹوائلٹ کے فرش پر دیوار کے ساتھ ٹکا کر بٹھا دیا۔ کہیں کھڑبڑ کی آواز نہ پیدا ہو۔

دروازے کی جھری بنا کر دیکھا، ایک پسنجر بیسن میں ہینڈ واش کرنے میں مصروف تھا، اس دوران میں نے جیب سے رومال نکال کر جہاں جہاں متوقع تھا، میں نے اپنے فنگر پرنٹس صاف کیے...... پھر اس نے ذرا رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر واش روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ اسی طرح میں نے یہاں بھی ممکنہ حد تک یہی عمل دوہرایا۔

ٹھیک اسی وقت یاسمین خانم بھی اپنے ٹوائلٹ سے برآمد ہوئی اور مجھے دیکھتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کی کشادہ حسین آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں...... اور بے اختیار ''شش...... شہزی'' کہتی ہوئی میری جانب بڑھی، اسی وقت واش روم میں کوئی داخل ہوا۔

میں نے چونک کر دیکھا اور بے اختیار ایک پُرسکون سی سانس لے کر رہ گیا، وہ کیمی تھی...... وہ ہمیں دیکھ کر چونکی تھی۔ میں اسے چونکتا پا کر کچھ اُلجھن کا شکار ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یاسمین کی لرزتی ہوئی کراہتی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھ سے خوف زدہ لہجے میں کچھ کہا تھا......

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرانے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

---

www.bookspk.site

لباس کی چوری

جمال دستی

بظاہر معمولی اور غیر اہم نظر آنے والے بالآخر وقت پڑنے پر اپنی موجودگی کر ثابت کر ہی دیتے ہیں... ایک سیدھی سادی ڈریس ڈیزائنر کو پیش آنے والی پیچیدہ صورتِ حال... وہ اپنی محنت کا معاوضہ چاہتی تھی... مگر جواب میں اسے اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا...

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے شریف آدمیوں کی غنڈا گردی

رات میں لاس ویگاس تاریکی کے سمندر میں روشنیوں کے جزیرے کے مانند نظر آ رہا تھا جو سفید، سرخ اور زرد ہیروں کے مانند چمک رہی تھیں۔ جہاز تھوڑی دیر میں ائرپورٹ پر اترنے والا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دھیان اس خصوصی سامان کی طرف چلا گیا جسے یہاں تک پہنچانے کے لیے میری خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ میں نے کبھی کسی معاملے میں خوش قسمت ہونے پر یقین نہیں کیا لیکن جب سمر ینارین نے میری خدمات حاصل کیں کہ میں لاس

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن سے بھرپور ایک دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 51

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام پھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولووش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیو ٹلسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

www.bookspk.site

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چہائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ شہزی، روڈلف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین اسے مل جاتی ہے ...... وہ دونوں شہزی کو مصر لے جانا چاہتے ہیں مگر شہزی راضی نہیں ہوتا۔ وہ ایک بار پھر کوہارا کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ایک طویل ساتھ کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ اب یاسمین کی ذمے داری شہزی کے سر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.bookspk.site

''ی...... ی...... یہ بھی اُن کی...... ساتھی ہے......''

یاسمین کے کراہتے ہوئے نحیف و نزار سے الفاظ میری سماعتوں میں بم کی طرح پھٹے تھے۔ فطری رَدِعمل کے طور پر کیمی کی طرف دیکھتے ہوئے میری آنکھیں لحہ بھر کو حیرت سے پھیل گئیں۔

معاملہ خراب ہونے اور بھانڈا پھوٹ جانے پر کیمی کو میں نے بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کسی خونخوار بلی کی طرح مجھ پر جھپٹا مارنا چاہا۔

خالی ہاتھ اٹھا کر وار کرنے کے اس مخصوص انداز میں مدمقابل کو زہریلی سوئی کی ہلاکت خیزی کا نشانہ بنانے والا...... سے جی کوہارا کا یہ آخری ''زہریلا'' ساتھی تھا۔ (تیسرا مسلح ساتھی ابھی چھپا ہوا تھ،) پہلے والے نے بھی مجھ پر ابتدا میں اسی طرح وار کرنا چاہا تھا اور میری غیر معمولی محتاط روی اور چابک دستی کے سبب موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔

اسی سبب مجھے ایسے ''زہریلے'' ہرکارے سے نمٹنے کا... بخوبی تجربہ تھا جس کا کیمی کو اندازہ تک نہ تھا۔

کیمی نے جیسے ہی مجھ پر یہ زہریلا وار کرنا چاہا، میں نے اپنی ٹانگ کو اس طرح حرکت دی کہ وہ میری جانب بڑھتے ہوئے رخ بدلنے پر مجبور ہو جائے۔ وہی ہوا، میری ٹانگ اس کے پہلو کو مخصوص انداز میں چھوئی تھی اور نتیجے میں کیمی کا نازک بدن میری جانب آتے آتے، کچھ اپنی جھونک میں بھی گھوم سا گیا۔ تب ہی میں نے اندازِ بہ سرعت دوسری حرکت کی، دو قدم آگے بڑھا، کیمی پشت کے بل میرے سینے پر آ لگی، میرے دائیں ہاتھ نے اس کی گردن کے گرد شکنجہ کسا، دوسرے ہاتھ نے اس کی وہ کلائی دبوچ لی، جس میں مبینہ طور پر زہریلی سوئی پوشیدہ تھی۔ تیسرا لحہ کیمی کی روح کا قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کا ثابت ہوا۔

چونکہ اس نے بغیر آستیوں والی چست شرٹ پہن رکھی تھی، مجھے اس کے بائیں ہاتھ میں فقط ایک رسٹ واچ ہی بندھی ہوئی نظر آئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ زہریلی سوئی اس کے اندر کہیں پوشیدہ تھی بھی یا نہیں، تاہم اس کے حملہ کرنے کا انداز ایسا ہی تھا کہ وہ مجھے اس زہریلی سوئی کا نشانہ بنانا چاہتی ہو۔

بہرکیف اس کا بھی میں نے وہی حشر کیا تھا جو اُس کے پہلے والے ''زہریلے ساتھی'' کا کیا تھا۔

کیمی کی گردن کا منکا توڑتے ہی میں اس کی بھی لاش گھسیٹتے ہوئے دوسرے واش روم میں لے گیا۔

وہاں ایک دیوار سے کیمی کی لاش کو ٹکانے کے بعد میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی رسٹ واچ کا جائزہ لیا، وہ بظاہر ایک فینسی اسٹائل کی بریسلیٹ رسٹ واچ تھی۔ جس کا ریپ (Wrap) غیر معمولی طور پر چوڑا تھا۔ اس کے بالکل نیچے سے جہاں ایک بٹن سے باندھا جاتا تھا، وہاں نظر پڑی تو اچانک ایک سرد سی لہر میرے وجود میں دوڑ گئی، وہاں ایک ڈیڑھ سے دو انچ تک کی سوئی باہر کو ابھری ہوئی تھی۔

اسے یقینا حملہ کرتے وقت ایک مخصوص میکنزم کے ذریعے باہر نکال لیا گیا تھا مگر کیسے، میں نے نہایت احتیاط سے اسے کلائی سے کھول کر جائزہ لیا۔

ایسے اسپائی آلات سے میں بھی واقف تھا، جلد ہی مجھے ڈائل کے ساتھ ہی منسلک ایک باریک بٹن دکھائی دے گیا، اسے میں نے پش کیا تو سوئی اندر غائب ہو گئی۔ میں اس کی ٹیکنک سمجھ گیا، ایک مخصوص جھٹکا دینے سے یہ زہریلی سوئی اسی طرح اندر باہر متحرک ہوتی تھی۔

نہایت احتیاط سے میں نے اس کی گھڑی کلائی سے اتاری کہ کہیں اس میں چھپی ہوئی موت کا میں خود ہی بے دھیانی میں نہ شکار ہو جاؤں۔ ایک مخصوص انداز کے کھٹکے سے میں نے سوئی دوبارہ اندر کر دی تھی۔

بلاشبہ یہ ایک فوری طور پر کام آنے والا بڑا کارآمد ہتھیار تھا۔ اگرچہ اس کی حیرت انگیز کارکردگی عارضی سہی، کیونکہ اس میں مجھے کافی دنوں تک زہر ذخیرہ کرنے والی ایسی کوئی جگہ دکھائی نہیں دی تھی۔ ہاں! البتہ بہ غور جائزہ لینے سے یہی پتا لگتا تھا کہ اس کی صرف سوئی زہر میں بجھی ہوئی ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ اپنے لیے بھی بہت رسکی ہتھیار تھا، ذرا سی بے دھیانی یا غلطی، حملے کے دوران ہاتھ یا کلائی کا مڑ جانا، سوئی خود کو بھی چبھ سکتی تھی۔ اس زہریلے ہتھیار کو استعمال کرنے میں اچھی خاصی پریکٹس کا دخل تھا، میں نے کچھ سوچ کر دوبارہ کیمی کی لاش کی کلائی پر گھڑی لپیٹ دی اور تیزی سے باہر نکلا۔

اس سمے میرے جسم کا ایک ایک اعضا ہی نہیں بلکہ...... ذہن بھی تیزی سے متحرک تھا۔ اسی تیزی کے انداز میں سوچتے ہوئے میں نے یاسمین کو دیکھا۔

وہ واش روم کی کونے والی دیوار سے اپنی پشت ٹکائے نڈھال سے انداز میں فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی، اس کی حالت خاصی نازک تھی۔ کاسپا کو والے حملے کے بعد سے وہ بے چاری زخمی بھی تو خاصی ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک ہو ناں...... یاسمین؟'' میں ایک دم اس کی جانب بڑھا۔

www.bookspk.site

''مم...... میں ٹھیک ہوں۔'' وہ ہولے سے کپکپاتی آواز میں بولی۔

''انہوں نے مجھے انجکشن کے ذریعے کسی ڈرگ کی ڈوز دے رکھی ہے۔ اس کا اثر چند گھنٹوں تک رہے گا۔''

''ان کا تیسرا ساتھی کہاں ہے؟ تمہیں پتا ہے؟'' میں نے فوراً کام کی بات پوچھی۔ کیونکہ اس وقت کوئی بھی واش روم میں آسکتا تھا اور میں اس سے پہلے یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

''وہ بھی اِدھر ہی کہیں ہے۔''

''عورت ہے، مرد ہے؟''

''مرد ہے، بس ایک عورت تھی ان تینوں میں۔'' یاسمین نے نحیف سی آواز میں جواب دیا۔

''تم فکر نہ کرو، میں سب سنبھال لوں گا۔ ہمیں اس وقت اسی خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی سیٹوں پر جا کے براجمان ہونا پڑے گا۔''

''مم...... میرے پاپا، ان کی قید میں ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''مجھے معلوم ہے سب...... کہا نا فکر نہ کرو، آؤ...... یہاں زیادہ دیر ٹکے رہنا اچھا نہیں۔'' میری بات پر اس کے پژمردہ سے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزرا اور پھر میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

دروازے سے ایک ذرا باہر جھانک کر میں نے جھولتے ہوئے دبیز پردے کو ہٹایا اور یاسمین کو لیے باہر آ گیا۔

طیارے کا ماحول خوابناک اور نیم تاریک تھا۔ مسافر سو رہے تھے۔ یہ خاموشی اور سناٹا میرے لیے سودمند تھا۔ میں نے یاسمین کو اس کی سیٹ پر بٹھا دیا اور خود پھرتی سے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

سب کچھ ویسا ہی رہا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہی ٹھہرا ٹھہرا، پُرلطف و پُرسکون ماحول اور فضا خواب انگیز...... طیارہ اسی طرح آسمان کی تاریک وسعتوں میں محوِ پرواز تھا لیکن میں جانتا تھا، زیادہ دیر ایسا نہیں چلے گا۔ جلد یا بدیر طیارے کی یہ پُرسکون اور خواب انگیز فضا منتشر ہو جائے گی جب واش روم میں دو لاشوں کا پتا چلے گا۔ اس کے بعد ایک ہراس اور بے چینی سی پھیل جائے گی۔

طیارہ پہلے ہی فضائے بسیط کے ناقابلِ اعتبار خلاؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ ایسے میں طیارے کے اندر دو لاشوں کا پایا جانا کسی خطرناک گڑبڑ کا ہی پتا دے سکتا تھا اور کیا خبر آگے کیا ہونے والا تھا۔

یہ دیگر مسافروں کے تاثرات تھے جبکہ میرے بھی کم و بیش اسی طرح کے خدشات تھے جن کی نوعیت تھوڑی مختلف سہی، کہ اگر ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ میں فروکش سے جی کوہارا...... جیسے درندے کو اپنے دو ساتھیوں کی ہلاکت کا علم ہو گا تو کیسا طوفان بپا ہو سکتا تھا۔ رَدِعمل میں وہ تو کوئی نہ کوئی ایسا فساد کھڑا کر سکتا تھا جس میں طیارے میں موجود مسافروں کی سلامتی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ دوسرا خیال میرا یہ تھا کہ کوہارا اپنی اس شکست کو تسلیم کر کے چپ ہو کر بیٹھ رہے گا۔ لیکن اپنی شکست پر ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھنا اس کا شیوہ نہ تھا۔ وہ کوئی گل ضرور کھلا سکتا تھا اور یوں میرا اس پر نگاہ رکھنا ضروری تھا۔

''تو کیا پھر...... مجھے سے جی کوہارا کو بھی اسی وقت جہنم واصل کر دینا چاہیے؟''

ایک خوف ناک اور سفاک خیال میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں کلبلایا تھا لیکن کیا...... یہ اتنا ہی آسان تھا......؟

اس دوران...... میں یاسمین کی طرف بھی دیکھتا رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی اور کیمی کی سیٹیں اب خالی تھیں۔ ان دونوں کے مسافر (قاہرہ) مصر کی ٹکٹیں کٹوانے کے بعد اب ''اوپر'' کی ٹکٹیں کٹوا چکے تھے۔ دشمنوں سے بغیر کسی رعایت اور سفاکی سے نمٹنے کا چلن مجھے حالات نے سکھا دیا تھا۔

روڈلف کو بھی تو اسی بے رحمی سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس غریب کا خیال آتے ہی میرا اندر اداس ہو گیا، دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔

روڈلف سے مجھے بڑا سہارا تھا۔ اس کے بغیر میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے یہ ایک فطری عمل ہو کہ ایک ساتھی کے ساتھ اس قدر انڈر اسٹینڈنگ ہو چکی ہو اور پھر وہ اچانک بچھڑ جائے، ہمیشہ کے لیے تو اس طرح کی فیلنگس کا ہونا فطری امر ہوتا ہے، مگر اس میں بھی کوئی مبالغہ نہ تھا کہ روڈلف میری امریکا والی مہم میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

ابھی تک یاسمین کے پاس کوہارا کا تیسرا ساتھی نہیں پہنچا تھا۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ میں یاسمین کو اپنے ساتھ بھی رکھ سکتا تھا مگر ایسا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا تھا۔ یاسمین اگرچہ مجھے دیکھ کر خوش تھی۔ اس کے چہرے کی پژمردگی میں اب کمی آنے لگی تھی۔ وہ یوں بھی ایک، بہادر لڑکی تھی لیکن پیش آمدہ، پے درپے خوفناک واقعات نے اسے ضرور نڈھال سا کر دیا تھا۔

اس بے چاری کے لیے سب سے بڑا سانحہ اس کے محبوب منگیتر حماد رضا...... کا بے دردی سے قتل تھا۔ اگرچہ میں نے کاسپا کو کو واصلِ جہنم کر کے نہ صرف اس کے منگیتر کا بلکہ

www.bookspk.site

روڈلف کے قتل کا بھی انتقام لے لیا تھا۔

سفر انہی پُراندیش لحات سے جاری تھا کہ اچانک میں نے یاسمین کی طرف ایک درمیانی مگر خوب گٹھی ہوئی جسامت والے شخص کو بڑھتے دیکھا، وہ اس کی سیٹ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یک لخت تیز ہوگئیں۔

میں آنکھیں سکیڑ کر بہ غور اس طرف تکے جا رہا تھا۔ ابھی وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا، میں نے غور کیا، وہ یاسمین پر جھکا ہوا اس سے کچھ پوچھنے کے سے انداز میں باتیں کر رہا تھا اور اس کا رویّہ بھی خشک اور تحکمانہ سا محسوس ہوتا تھا۔

تب ہی میں نے یاسمین کو نفی میں سر ہلاتے دیکھا، وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا، جس پر اس کا دوسرا ساتھی تھوڑی دیر پہلے براجمان تھا، اب اس کی لاش واش روم میں پڑی تھی۔

وہ یقیناً اُن کا تیسرا ساتھی تھا اور اب یاسمین سے اپنے دوسرے ساتھی کے بارے میں پوچھ رہا تھا، اس کے بعد میں نے اسے اس سیٹ کی طرف بھی اشارہ کر کے یاسمین سے باتیں کرتے دیکھا، جہاں کیمی بیٹھی تھی۔

میں نے دیکھا...... یاسمین نے پھر نفی میں سر ہلایا تھا، مجھے کوہارا کا یہ تیسرا گماشتہ سخت فکرمند نظر آیا۔ وہ یاسمین کے ساتھ بیٹھا اس کے بالکل قریب منہ کیے ہلکے ہلکے لہجے میں ”پوچھ گچھ“ کر رہا تھا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد جب اس کی یاسمین سے یہ پوچھ تاچھ اختتام کو پہنچی تو میں نے اسے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھتے دیکھا، یقینی طور پر یاسمین نے اسے وہی بتایا تھا جس کے بتانے کی ہدایت میں نے اسے کی تھی۔

یاسمین کو سیٹ کی جانب سہارا دے کر لانے کے دوران میں نے اس کے کان میں کہہ دیا تھا کہ اگر ان کا تیسرا ہرکارہ، اس کے پاس آئے، جس کا قوی امکان تھا......تو اسے یہی بتائے کہ وہ دونوں (ہرکارے) واش روم کی طرف گئے تھے، اپنا ہرگز نہ بتائے کہ وہ اسے لے کر گیا تھا۔ (ایک ہرکارہ)۔

تب ہی یکلخت میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیاں دھڑکنیں لگیں۔ وہ تیسرا ہرکارہ اپنی سیٹ سے اٹھا اور واش روم کی طرف بڑھا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔

اب کسی وقت بھی طیارے کے اندر زبردست ہنگامہ کھڑا ہونے والا تھا۔ اس کی نوعیت کچھ بھی ہوسکتی تھی۔

بہرکیف میں نے متوقع پیش آئند، مخدوش حالات سے نمٹنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔

سے جی کوہارا ابھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس طیارے میں موجود تھا، جبکہ اس کا یہ تیسرا ہرکارہ، بقول اسی کے مسلح تھا۔ اس کے پاس گن تھی اور سے جی کوہارا کے پاس تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے گن دیکھی تھی۔

ایک خیال برق رفتاری کے ساتھ میرے ذہن میں آیا تھا کہ اسی وقت عملے کے کسی ذمّے دار شخص کو اس کے بارے میں بتا دوں۔ لیکن ابھی میں سمجھتا تھا کہ یہ قبل از وقت ہوتا، ممکن تھا اپنی اس ”کمزوری“ کے باعث کوہارا...... ایک طرح سے میرے دباؤ میں رہے گا۔ تاہم میں اس نکتے پر پیہم غور کیے جا رہا تھا۔

تیسرے ہرکارے کو واش روم کی طرف بڑھتے دیکھتے ہی میں نے بھی پہلے فوراً اس کے پیچھے جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر خاموشی سے بیٹھا حالات کا منتظر رہا کہ ہوتا کیا ہے......؟

اس وقت طیارے کے تقریباً سب ہی مسافر اونگھ رہے تھے۔ سرِدست کسی کے بھی واش روم جانے کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تاہم اچانک کوئی بھی نیند سے بیدار ہوکر وہاں کا رخ کرسکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں طیارے کی انتظامیہ اور مسافروں کی نظروں میں آجاؤں۔

واش روم میری بیک پر تھا اسی لیے مجھے بار بار پیچھے گردن گھما کر دیکھنا پڑ رہا تھا۔

تیسرا ہرکارہ اپنے دونوں ساتھیوں کی ”تلاش“ میں واش روم میں قدم رکھ چکا تھا اور اسے گئے ہوئے پانچ سے دس منٹ ہوچکے تھے۔

میرا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات اس قیافے سے کوسوں دور تھی کہ اس مذکورہ ہرکارے کو اپنے دونوں ساتھیوں کا سراغ نہ ملا ہوگا۔ میں چشمِ تصور میں اسے پہلے دہشت زدہ اور پھر خار کھائے کُتّے کی طرح غراتے ہوئے دیکھنے لگا، پھر اسے سوچتا ہوا پایا، کوئی بعید نہ تھا کہ وہ وہیں سے ہی اپنے گرو گھنٹال......کو کسی خفیہ ڈیوائس پر رابطہ کر کے یہ ساری صورتِ حال بتا رہا ہو، تب ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

اگر ایسا ہی تھا تو کوہارا میری تلاش میں غضبناک بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا اپنے سوئٹ سے نکلے گا اور علی الاعلان طیارے میں چلا چلا کر بتائے گا کہ ان کا قاتل میرے سوا کوئی نہیں ہوسکتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کیونکہ اس کی کمزوری سے میں بھی واقف ہو چکا تھا۔ تو پھر......اب کیا ہونے جا رہا تھا......؟

یوں ایک ایک لمحہ مجھے ایک صدی کی طرح گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس تیسرے ہرکارے کو گئے ہوئے بیس سے پچیس منٹ ہو چکے تھے۔ تب ہی اچانک میں نے سامنے ٹاپ فرسٹ کلاس کے دروازے سے کوہارا کو برآمد ہوتے دیکھا۔

میرا دل گھٹے گھٹے سینے میں جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا اور میں نے اپنا سر ذرا نیچے کو جھکا لیا، مگر اس طرح کہ اس پر نظر بھی رکھ سکوں۔ اب کیا ہونے والا تھا، اس کا بھید کھلنے لگا تھا۔

میں نے دیکھا وہ خاصا بپھرا ہوا لیکن کچھ پریشان اور بوکھلایا ہوا سا بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میری سیٹ کی طرف ہی لپکے گا لیکن وہ مجھے یکسر نظر انداز کرتا ہوا سیدھا واش روم کی جانب بڑھا تھا۔ میں نے گردن تھوڑی سی موڑی، وہ اندر جا چکا تھا۔ اس سے جیسے میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا۔

جی میں آئی کہ میں بھی واش روم کا رخ کروں......تب ہی اچانک میرے ساتھ بیٹھا ہوا درمیانی عمر کا وہ یورپین آدمی غنودگی سے بیدار ہوا۔ اس کے بعد دو تین جماہیاں منہ پھاڑ کے خارج کیں اور اٹھ کر چل دیا واش روم کی طرف......اس کے برابر کی دوسری سیٹ پر کوئی بوڑھی خاتون بیٹھی آنکھوں پر گدیاں لگائے گہری نیند میں مستغرق تھی۔

اب کیا ہونے لگا تھا......؟ یہ تجسس میرے لیے سخت اعصاب شکن ثابت ہو رہا تھا۔ کیا یہ واش روم کے اندر گھستے ہی شور مچانا شروع کر دے گا؟ یا پھر وہاں اسے ”سب کچھ ٹھیک“ دکھایا جائے گا؟ کچھ تو ہوگا......اس پردہ زنگاری کے پیچھے......

اس آدمی کو گئے ہوئے بھی کچھ منٹ بیت گئے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر اس کے کچھ ہی سیکنڈوں ... بعد میں نے ... اپنے ہم نشیں و ہمرکاب کو واش روم سے برآمد ہوتے دیکھا، اس کی صورت میں مجھے کسی قسم کی حواس باختگی یا خوف نظر نہ آیا۔ وہ اسی طرح سپٹر...... سپٹر چلتا ہوا آیا اور میں فوراً اپنی آنکھیں موند کر سوتا ہوا بن گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر براجمان ہوتے ہی ”ڈھلک“ گیا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی شاید......

اب تک سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا مگر سب ٹھیک نہیں تھا۔ طیارے میں سوار پانچ سو پچھتر مسافروں...... میں سے یہ صرف میں جانتا تھا یا یاسمین، بعد میں کوہارا اور اس کا ہرکارہ......

یکا یک میرے ذہن میں ایک زبردست جھماکا ہوا۔ ہنگامے سے پہلے یہ اسرار بھری خاموشی در پردہ کوئی گل کھلانے والی تھی؟ کیا کوہارا اور اس کا ساتھی...... واش روم سے اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشیں ٹھکانے لگانے کے بندوبست میں مصروف تھے؟ چلو...... ایسا تو ایسا ہی سہی...... میں نے پُرسکون ذہن سے سوچا۔ لیکن وہ دو لاشوں کو کس طرح وہاں سے غائب کرنے والے تھے؟ یہ مجھے دیکھنا تھا۔

کوہارا کی طرف سے کسی شدید ہنگامے کی بھی توقع اپنی جگہ میرے ذہن میں سانپ کی طرح کلبلا رہی تھی۔

کم و بیش نصف گھنٹا بیت چلا اور...... پھر میں نے اُن دونوں کو وہاں سے برآمد ہوتے دیکھا۔ میں فوراً اپنا سر جھکا کر لیٹا ہوا بن گیا۔

چند ہی لمحے گزرے تھے۔ میرے سر پر کسی نے انگلیوں سے ”ٹھونک“ بجایا۔

میں جاگا ہوا تو تھا ہی چونک کر آنکھ کھولی۔ وہ کوہارا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور چہرہ لال بھبوکا تھا۔

”میرے ساتھ آؤ......“

”میں نہیں آسکتا۔“ میں نے رکھائی سے کہا۔ مجھے اس کا یوں حکم دینے کا انداز نہایت ناگوار گزرا تھا۔ ”میں تمہارا زرخرید نہیں ہوں، جاؤ جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھو۔“

آواز میری نیچی تھی، انداز محتاط تھا۔ یہ ہم دونوں کی مجبوری تھی۔ ورنہ مسافر ہماری اس ”سرد جنگ“ کو شبہے کی نگاہ سے دیکھ سکتے تھے۔

میری جوابی کارروائی پر وہ اندر سے بہت بُری طرح تلملا کر رہ گیا۔ وہ چند لمحے مجھے بڑی خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔ ہم دونوں اس وقت طیارے میں ایک دوسرے کے خلاف کھلے بندوں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ جو کرنا تھا، در پردہ ہوتا۔

دراصل...... ہم دونوں کی ”گوٹ“ اس وقت پھنسی ہوئی تھی۔ توازن برابر کا تھا لیکن بادصف اس کے میں سمجھ رہا تھا کہ میری گوٹ باہر نکلنے والی تھی اور کوہارا کی پھنس گئی تھی۔ وہ اب جمشید حمیدی کو زیادہ دیر تک یرغمال بنائے رکھنے کی پوزیشن سے خارج ہو چکا تھا۔ لیکن یہ بات جمشید کو کب معلوم تھی بھلا......؟ وہ تو بے چارہ ابھی تک یہی سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی بیٹی یاسمین خانم ہنوز اس کے خونخوار ساتھیوں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہے جس کے بارے میں کوہارا نے جمشید کو دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر اس نے تعاون نہ کیا تو نہایت خاموشی سے اس کی بیٹی کو موت کی نیند سلا دیا جائے گا۔ لیکن...... اب صورتِ حال اور ہوگئی تھی۔

”ہم......“ وہ اپنے حلق سے ایک غضبناک سی ہمکاری

www.bookspk.site

www.bookspk.site

خارج کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس کی ’’ہم‘‘ میں مجھے ایک تہدید سی چھپی محسوس ہوئی تھی۔ میں نے کوئی پروا نہیں کی۔

سر گھما کر میں نے یاسمین کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔ کوہارا کا ساتھی اسے اپنے ساتھ کہیں لے جانے پر بضد تھا جبکہ کوہارا بزنس کلاس کی جانب بڑھ چکا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور یاسمین خانم کی سیٹ کی جانب لپکا۔ ہنگامے کی شروعات اگرچہ ابھی ایک خاموشی کے پردے میں تھی، تاہم کسی بھی وقت یہ پردہ چاک ہوسکتا تھا۔

’’یہ کہیں نہیں جائے گی۔‘‘ میں نے کوہارا کے ساتھی سے زہریلے مگر دبنگ لہجے میں کہا۔ وہ میری طرف دیکھ کر چونکا۔ ’’اس کا بازو چھوڑ دو...... ورنہ میں تمہارا اور تمہارے باس کوہارا کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں، تم دونوں کے پاس آتشیں ہتھیار ہے۔‘‘

وہ ہک دک رہ گیا اور یاسمین کا بازو چھوڑ کر یوں پیچھے ہٹ گیا جیسے کرنٹ لگا ہوا ہے۔ پھر اس نے بھی بزنس کلاس کا رخ کیا۔ میں یاسمین کے ساتھ والی خالی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

’’اب تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ میں نے یاسمین کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ’’اگلے چند منٹوں میں حالات میرے قابو میں آنے والے ہیں۔‘‘

’’لل...... لیکن، شہزی! میرے پاپا اس درندے کی قید میں ہیں۔ وہ طیش میں آکر انہیں کسی قسم کا جانی نقصان پہنچا سکتا ہے۔‘‘

یاسمین نے خدشہ ظاہر کیا۔ اس کی حالت اور کیفیات اب دھیرے دھیرے بحال ہونے لگی تھی۔

’’اس خدشے پر میں نے غور کیا ہے۔‘‘ میں نے سامنے ٹاپ فرسٹ کلاس کے ڈور کی طرف نظریں جمائے ہوئے اس سے کہا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے کوہارا ایک بپھرے ہوئے درندے کی طرح داخل ہوا تھا۔

’’کوہارا، اب پروفیسر صاحب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ بھی مت سمجھو کہ وہ کوہارا کی قید میں ہیں۔ ہاں! اس کی حراست میں ضرور ہیں، وہ بھی ایک حد تک، اس موذی نے تم دونوں باپ بیٹی کے گرد جو غیر مرئی حصار قائم کر رکھا تھا وہ اب ٹوٹ چکا ہے۔‘‘

میری اس بات سے یاسمین کی کچھ تشفی ہوئی اور کچھ نہیں۔ تاہم وہ بولی۔ ’’لیکن شہزی! کوہارا جیسے خونی آدمی سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ بہرحال ابھی تک پاپا کے سر پر مسلط ہے۔‘‘

’’اس نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا کہا تھا۔‘‘ میں نے بتایا۔ ’’لیکن میں نے اس طرح اس کے تحکمانہ انداز پر اس کے پیچھے غلاموں کی طرح جانا مناسب نہیں سمجھا۔ اب اس کے پاس جانے کا سوچ رہا ہوں۔ تم ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر تمہیں اکیلا دیکھ کر اس کا ساتھی دوبارہ تمہیں ساتھ لے جانے پر مجبور کرے تو ہرگز اس کے ساتھ مت جانا، یہ دونوں اب تمہارے ساتھ کسی بھی قسم کی زبردستی کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے ہیں۔‘‘

میں نے آخر میں اسے تاکید کرنا ضروری خیال کیا تھا۔ تب ہی اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا، میں نے یاسمین سے سوال کیا۔

’’تمہارے سفری کاغذات تو تمہارے پاس ہی ہیں ناں......؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ کر اپنی بھویں سکیڑیں پھر اسی انداز میں بولا۔

’’ہمم! اس کا مطلب ہے، اس نے پوری طرح تمہیں یرغمال بنا رکھا ہے۔‘‘

’’شہزی، انہوں نے ان دونوں لاشوں کا کیا کیا ہوگا؟ مطلب ہے اگر دونوں لاشیں ابھی تک وہیں پڑی ہیں تو پھر کسی وقت بھی کسی مسافر کی نظر میں آسکتی ہیں۔‘‘

’’اس میں تو کوئی شک نہیں...... ایک دم ہراس پھیل جائے گا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تب پھر میرا خیال ہے، ابھی تم اس کے پاس مت جاؤ، یہاں کسی وقت بھی شور مچ سکتا ہے۔ ایسے میں تمہارا اس کے پاس ہونا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔‘‘

اس کی بات میں وزن تھا، میں نے کہا۔ ’’میں اسی لیے خاموش بیٹھا ہوں لیکن مجھے جلد یا بدیر کوہارا سے بات کرنی پڑے گی، وہ جتنا اپنی فطرت میں ایک درندہ صفت انسان ہے اتنا ہی عقل سے پیدل بھی، گھمنڈ میں آکر وہ اپنے راز میرے سامنے عیاں کرنے سے ذرا نہیں چوکتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ... لاشوں کے ساتھ کیا کیا ہے۔‘‘

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ایک زوردار نسوانی چیخ نے طیارے کا خوابناک ماحول درہم برہم کر ڈالا۔ ہم دونوں ہی چونک پڑے تھے۔

☆☆☆

اس چیخ سے طیارے کا سکون تہس نہس ہو گیا تھا۔ اونگھتے اور سوئے ہوئے مسافر ہڑبڑا کر اٹھے۔ یاسمین اور میں

1987ء سے خدمت میں مصروف
LEUCODERMA-VITILIGO
پھلبہری
تمام جلدی بیماریوں کا مؤثر اور بے ضرر علاج
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ایوارڈز ہولڈر
اجمل زیدی
ماہر برص
کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام
ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD
AWARD OF BEST ACHIEVEMENT
AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتہ
مکان نمبر 62، اسٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
فون (051)32331725
موبائل 0300-8566188

لاہور
گلف سینٹر
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

پشاور
ہوٹل امین
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر
قیام
جی ٹی روڈ نزد بشیری چوک
موبائل: 0300-8566188

ملتان
ہوٹل سلور سینڈ
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی
نورجہاں سینٹر
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
زرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

www.bookspk.site

www.bookspk.site

نے بھی چونک کر چیخ کی سمت دیکھا۔ لائٹیں آن ہونے لگیں۔

چیخ مارنے والی ایک درمیانی عمر کی لڑکی تھی۔ وہ غالباً واش روم گئی تھی اور اس نے لاشیں دیکھ لی ہوں گی۔ شاید کوہارا اور اس کا ساتھی لاشوں کو ٹھکانے نہیں لگا سکے تھے اور بھلا لگاتے بھی کیسے؟ مگر پھر یہ اتنی دیر تک اندر کیا کرتے رہے تھے؟

مسافر اس چیخ کا معما جاننے کے لیے اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھنے لگے۔ جہاز کا عملہ بھی حرکت میں آچکا تھا اور مسافروں سے التماس کر رہا تھا کہ وہ پُرسکون رہیں اور اپنی سیٹوں پر براجمان ہو جائیں۔ میں اور یاسمین بھی دکھاوے کے طور پر تھوڑا پریشان ہوئے مگر اپنی سیٹوں پر موجود رہے۔ دیکھنا تھا کہ اب ہوتا کیا ہے؟

ایک اسٹیورڈ کاک پٹ میں جا کے کیپٹن کو بلا لایا تھا، وہ اپنی وردی سے کو پائلٹ نظر آتا تھا۔ اس نے واش روم جا کر صورتِ حال، بہ الفاظ دیگر لاشوں کا جائزہ لیا اور دوبارہ نمودار ہوکر تیز تیز قدموں سے کاک پٹ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ شاید اپنے ساتھی ہوا باز کو اس کی اطلاع دینے گیا تھا۔ دو ائر ہوسٹس بھی کاک پٹ کی طرف بڑھی تھیں۔

ٹوائلٹ میں دو لاشوں کی خبر پھیلتے ہی...... طیارے میں اچھا خاصا ہراس پھیل گیا تھا۔ کچھ جذباتی مسافروں نے طیارے کے عملے سے احتجاج کیا تھا کہ طیارے میں ایک سے زائد قاتل موجود ہیں اور وہ جہاز کو ہائی جیک بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا جہاز کو فوراً کسی ائرپورٹ پر اتار کے پولیس تفتیش کی جائے۔ دیگر مسافر بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

جہاز کا عملہ بدستور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں سمجھانے کی کوشش میں مصروف رہا۔ تھوڑی دیر بعد پائلٹ نے بھی خود واش روم جا کر جائزہ لیا تھا اور پھر اس سلسلے میں فوری اقدامات کرنے کے لیے دوبارہ کاک پٹ کی طرف لپکا تھا۔

اسی وقت اسپیکر سے اعلان کیا گیا۔

اس اعلان کا لُبِ لباب یہی تھا کہ تمام مسافر جہاز کے عملے سے تعاون کریں اور اپنی سیٹوں پر بیٹھ جائیں، موجودہ صورتِ حال کو فیس کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، نیز اس وقت ہم تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہے تھے۔ پانچ گھنٹوں کا سفر بیت چکا تھا اب ڈھائی گھنٹے بعد ہم دبئی انٹرنیشنل ائرپورٹ پر لینڈ کریں گے۔ وہاں انٹرپول پولیس سے رابطہ کیا جارہا ہے۔ امید ہے حالات بہتر ہو جائیں گے، شکریہ۔

اس اعلان کا الٹا اثر ہوا۔ مسافروں میں بے چینی پھیل گئی۔ ایک ادھیڑ عمر کی دبنگ سی یورشین خاتون نے چیخ کر اس اعلان کو طفل تسلی قرار دیتے ہوئے اس بات کا شور مچایا کہ ان ڈھائی گھنٹوں میں وہ قاتل اس جہاز کو کسی کھلونے کی طرح ہائی جیک کر سکتے ہیں، لہٰذا...... اس نے مطالبہ کیا کہ طیارے کو فوراً کسی قریبی ملک کے ائرپورٹ پر ایمرجنسی لینڈنگ کر کے تحقیق کرائی جائے۔ ضرور ان نامعلوم قاتلوں کے پاس اسلحہ بھی ہوگا۔

اس کی بات غلط نہ تھی۔ یوں بھی طیارے کے تمام مسافروں کی سوئی ایک ہی خدشے پر اٹک کر رہ گئی تھی اور وہ تھی، ''ہائی جیکنگ'' نامعلوم قاتل پکڑے جانے کے خوف سے طیارے کے مسافروں کو یرغمال بنا کر فرار کی راہ اختیار کر سکتے تھے۔ اس پر عملے کے ایک سنیئر افسر نے اس عورت کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ وہ ایسے الفاظ منہ سے مت نکالے جو اُن نامعلوم قاتل یا قاتلوں کو کسی قسم کی ''شہ'' دیتے ہوں۔ اس کی بات کی اور مسافروں نے بھی تائید کی تھی مگر بہر حال طیارے میں بے چینی پھیل چکی تھی۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے طیارے کو دبئی سے پہلے نہ کسی ملک میں اتار لیں۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اس وقت ہم انڈیا یا پاکستان کی فضائی حدود سے گزر رہے تھے۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین......!''

اچانک طیارے میں یہ اعلانیہ آواز ابھری۔ بے چین اور پریشان مسافروں کی بھنبھناہٹ یک دم تھم کر رہ گئی۔

اس آواز کو پہچان کر یکلخت جیسے میں سکتے میں آگیا۔ یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔

''طیارے کا کنٹرول ہم نے سنبھال لیا ہے۔ آپ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر آرام سے بیٹھ جائیں۔ عملے کے اراکین کو بھی میں یہی تلقین کرتا ہوں۔ ہمارے خلاف کسی قسم کی بھی غلط حرکت آپ سب کی سلامتی کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ سب ٹھیک رہے گا جب تک آپ کا تعاون رہے گا، میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔''

اس اعلان کے بعد ہی مسافروں کی دبی دبی چیخیں سنائی دیں۔ یاسمین نے سراسیمہ سے انداز میں فقط میرا بازو دھیرے سے پکڑ کر دبایا تھا جبکہ میں خود اس موذی مردود...... سے جی کوہارا کی آواز پہچانتے ہی اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کوہارا کے پاس شاید اپنے بچاؤ کا اور کوئی راستہ نہ رہا تھا۔ میں نے اس کا وہ خطرناک کھیل طیارے میں ہی بگاڑ کر رکھ دیا تھا جو وہ خاموشی کے پردے میں کھیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس یورشین خاتون کا خدشہ درست ثابت ہوا تھا اور میرا بھی...... مجھے کوہارا کے خلاف پہلے ہی کوئی کارروائی کر لینی چاہیے تھی، لیکن ایسا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ یوں میرے لیے بھی کئی خطرات اور پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مجھے بھی اسی کا ساتھی سمجھا جاتا۔ اب جو یہ ''بیچ'' کوہارا نے تیار کی تھی، اس پر میں کھیل سکتا تھا۔

کوہارا کاک پٹ میں جا چکا تھا اور...... ضرور اس نے پائلٹس کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا جبکہ اس کا دوسرا ساتھی...... بھی اندر ہی کہیں موجود اسے کور دیے ہوئے ہوگا یا پھر ممکن تھا اسے کوہارا نے ہی اندر اپنے سوئٹ میں پروفیسر جمشید کے سر پر مسلط کر رکھا ہو۔

مجھے کوہارا کے اس اقدام پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ محض اپنے ایک ساتھی کے بل بوتے پر اتنے بڑے طیارے کو کیسے ہائی جیک کرنے کی جرأت کر سکتا تھا؟

''شش...... شہزی! اب کیا ہوگا؟ اس بدبخت نے وہی کیا جس کا مجھے بھی ڈر تھا۔'' یاسمین نے سرگوشی میں کہا۔

''ابھی خاموش رہو، میں دیکھتا ہوں کہ آگے کیا ہوتا ہے؟''

''مسٹر شہزی......!''

دفعتاً اس مردود کی دوبارہ اسپیکر پر آواز ابھری اور میرا دل یک دم اچھل کر حلق میں آن اٹکا اور اعصاب شل ہونے لگے۔

''تم اپنی سیٹ چھوڑ کر کاک پٹ میں پہنچو...... فوراً......'' کوہارا کی تحکمانہ آواز ابھری اور ڈرے سہمے مسافر حیران و پریشان ہوکے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے جبکہ میں دھڑکتے دل سے اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ میں اس خبیث کے حکم پر تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا یوں مجھ سے شناسائی ظاہر کرنے کا مطلب یہی تھا کہ میں بھی اس کا ساتھی ہوں۔ یہ اس کی مجھے اپنے ساتھ پھنسانے کی سازش بھی ہو سکتی تھی۔

یاسمین نے دوبارہ مجھ سے گھبرا کے سرگوشی میں کہا تھا مگر میں نے اسے پھر خاموش رہنے کی سختی سے تاکید کر ڈالی۔ میرا ذہن اس وقت موجودہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیزی سے تانے بانے بُننے میں مصروف تھا۔ کوہارا اس وقت شکست خوردہ ہو چکا تھا۔ اس بری وحشی نے ایسے میں ایک خطرناک قدم اٹھا لیا تھا۔

اسپیکر پر دوبارہ اس رذیل کی آواز ابھری۔

''شہزی! یہ مت سمجھنا کہ تم بچ جاؤ گے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے دو ساتھیوں کے قاتل تم ہی ہو۔ جن کی لاشیں واش روم سے ملی ہیں۔ میں پھر تمہیں وارن کرتا ہوں کہ اپنی سیٹ چھوڑ کر فوراً کاک پٹ میں پہنچو۔'' یہ اعلان کرتے ہوئے اس خبیث نے نہایت مکاری سے دیگر مسافروں کو بھی میرے خلاف اُکسانے کی خاطر، میرا پورا نام اور سیٹ نمبر بھی بتا دیا۔

ڈرے سہمے مسافر ایک دم اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری سیٹ کی طرف تکنے لگے۔ میرا دل جیسے کنپٹیوں پہ دھڑکنے لگا، میرا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ میں خود کو چور اور مجرم سمجھنے لگا۔ ایک خجالت کا سا شکار ہونے لگا تھا میں......

تب ہی مجھے اپنی سیٹ سے اٹھنا پڑا۔ چند مسافروں کے حلق سے دبی دبی آوازوں کی بھنبھناہٹ خارج ہوئی تھی۔ میں ابھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا، مسافر حیرت اور سراسیمہ سی نظروں سے میری جانب تکنے لگے۔ میں نے کوہارا کی اس چال کا توڑ نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا اِدھر اُدھر مسافروں کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

''یہ آدمی جو اسپیکر پر ہم سے مخاطب ہے ایک خطرناک کریمنل ہے۔ اس کا نام سے جی کوہارا ہے اور یہ ایک برمی باشندہ ہے۔ میں اس کا ساتھی نہیں بلکہ دشمن ہوں۔ تھوڑی دیر پہلے یہ شخص ٹاپ فرسٹ کلاس کے سوئٹ نمبر تھری اے میں موجود تھا جو پروفیسر جمشید کے نام سے ریزروڈ ہے۔ جسے اس نے اپنے ایک مجرمانہ مقصد کے لیے یرغمال بنا رکھا ہے جبکہ اس کی بیٹی کو اس کے انہی دو کریمنل ساتھیوں نے یرغمال بنا رکھا تھا، جن کی لاشیں واش روم سے ملی ہیں۔ ان کے پاس خطرناک ہتھیار تھے۔ اب بھی اس کا ایک ساتھی کوہارا کے ساتھ موجود ہوگا۔ یہ مجھے محض بلیک میل کر رہا ہے۔ آپ نے اس کا اندازِ تخاطب ملاحظہ کر لیا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوں، میں اس خطرناک صورتِ حال پر اور اس کریمنل پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' اتنی تقریر کر کے میں کاک پٹ کی جانب بڑھ گیا۔

فضائی میزبان خواتین، شیشے کے کیبن والی اپنی نشستوں تک محدود تھیں۔ میں کاک پٹ کا دروازہ دھیرے سے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔

سامنے ہی مجھے طیارے کی بڑی سی اسکرین دکھائی دی تھی جس کے پار فضائے بسیط کا تاریک آسمان میرے جیسے نئے نظارہ کرنے والے کے حواسوں پر ایک عجیب سی ہیبت طاری کر رہا تھا۔ اندر دو پائلٹ اپنی سیٹوں پر محبوس ہوکر بیٹھے

www.bookspk.site

www.bookspk.site

ہوئے تھے۔ ان کے سامنے جہازی سائز کا پینل پھیلا ہوا تھا۔ ان گنت ڈائل اور چھوٹی بڑی اسکرینز روشن تھیں۔

کوہارا اور اس کا ساتھی ہاتھوں میں گنز تھامے ان کے سر پر ملک الموت کی طرح مسلط تھے۔

پائلٹ دونوں امریکی نظر آرہے تھے۔ ان دونوں میں ایک اپنی وردی سے کیپٹن نظر آتا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس، پچاس کے ہی لگ بھگ تھی جبکہ اس کا ساتھی پائلٹ نسبتاً جوان نظر آتا تھا۔ اس وقت وہ دونوں دباؤ کی کیفیات میں مبتلا دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ٹانگیں نشستوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ ہاتھ البتہ آزاد رکھے گئے تھے۔ ظاہر ہے پھر وہ طیارے کو کنٹرول کرنے سے قاصر رہتے۔

میں نے کوہارا کی طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھورا، جبکہ اس نے بھی مجھ پر اپنی اکلوتی آنکھ سے زہریلی نظر جما رکھی تھی۔ اس نے کاک پٹ کا ائرٹائٹ دروازہ لاک کر دیا اور زہرخند لہجے میں بولا۔

”تم نے میری نصیحت بھلا کر بڑی بھیانک غلطی کی ہے شہزی! اب اس کا خمیازہ تم سمیت جہاز کے سارے مسافروں کو بھگتنا پڑے گا۔“ اس نے مجھ سے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تو میں بھی اس سے مرعوب ہوئے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”وہ تمہاری نصیحت نہیں بلکہ دھمکی تھی کیونکہ میں اس طیارے میں تمہاری موجودگی کے مجرمانہ مقصد سے آگاہ ہو چکا تھا۔ تم نے بیک وقت دو افراد کو یرغمال بنا رکھا تھا۔“

ہماری گفتگو وہ دونوں پائلٹ بھی غور سے سن رہے تھے۔ ان کے بشروں پر ہنوز پریشانی اور تشویش پائی جاتی تھی۔

”ہا......! اپنی یہ بکواس بند کرو......“ کوہارا طیش میں آکر دہاڑا۔ ”اب جو میں تمہیں حکم دوں گا، اس کی تم نے بلا چون و چرا... تعمیل کرنا ہوگی۔“

”میں تمہارے کسی مجرمانہ مقصد میں تعاون نہیں کر سکتا۔“ میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”لیکن...... یہ سب جو تم کر رہے ہو، وہ تمہارے لیے بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا...... کیا ٹھیک ہے اور کیا نہیں۔“ وہ دہاڑا۔ ”یہاں...... اس جگہ پر خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گن کی نال کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ایک چھوٹی سے اضافی فولڈنگ نشست تھی، جو کاک پٹ کے ایک کونے میں کو پائلٹ کی نشست کے ساتھ جڑی تھی۔

میں خاموشی سے وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو مخصوص اشارہ کیا۔

وہ چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا۔ اس نے اپنی گن ایک طرف ٹکائی اور جیب سے رسی نکال کر میرے دونوں ہاتھ پینل کے ایک فولادی ہک کے ساتھ باندھنے لگا، اس دوران میں کوہارا کی خوفناک نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے گن کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔ اس کے تیور خطرناک دکھائی دیتے تھے۔ وہ اس وقت غیظ اور وحشت میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

لیکن میں جانتا تھا کہ اگر میرے ہاتھ پاؤں رسن بستہ ہو گئے تو پھر کوہارا طیارے میں بڑا کشت و خون مچا ڈالے گا۔ کون اسے روکتا؟ لہٰذا میں بظاہر بےبسی کا انداز ظاہر کرتا رہا۔ پھر جب اس کے ساتھی نے رسی کو ایک ہی بل دینا چاہا تھا کہ میرے وجود میں بجلی بھر گئی۔

میں نے مثل پارہ حرکت کی اور میری ٹانگ اس کے سینے پر پڑی، وہ الٹا اور لڑکھڑا کر کوہارا سے جا ٹکرایا۔ کوہارا کی گن کا رخ بدلا اور اسی سے بوکھلاہٹ یا بدحواسی میں اس نے ٹریگر دبا دیا۔ کاک پٹ کے محدود ماحول میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجی جو طیارے کی دیوہیکل اسکرین پر پڑی۔ اس پر ایک جانب لکیروں کا جال سا بن گیا اور سوراخ بھی ہو گیا۔ جہاں سے تیز طوفانی ہواؤں جیسا عفریت اندر داخل ہوا اور طیارے کا بیلنس آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگا۔ ساتھ ہی کاک پٹ میں ائر پریشر الارم کی مخصوص بپ...... بپ...... ابھرنے لگی۔

طیارے میں موجود مسافر بھی ضرور پریشان اور ہراساں ہو گئے ہوں گے۔ دروازہ ائرٹائٹ تھا اسی لیے مسافروں کے شور شرابے کی آواز نہیں آرہی تھی، پھر ایک اور بپ کی آواز ابھری۔ کاک پٹ کے دروازے کی پیشانی پر لگا سرخ بلب جلنے بجھنے لگا۔ شاید کوئی باہر سے دروازے پر زور آزمائی کر رہا تھا۔

ادھر کوہارا نے سنبھلنے کی کوشش میں ایک ہاتھ سے سیٹ کا سہارا لیا تھا، لیکن میں نے اس پر ہیمر پنچ کا خطرناک داؤ آزماتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ضرب لگائی، یہ میرا وہی داؤ تھا جسے میں ایسے نازک وقت میں استعمال کرتا تھا جب مجھے فوری طور پر مدِمقابل کو پچھاڑنا ہو۔

پھر یوں ہوا کہ جیسے سب کچھ، فوری نتائج جاننے کے لیے ہماری پھیلی ہوئی آنکھوں نے سلوموشن میں یہ منظر دیکھا۔ حتمی نتائج دینے والا یہ ہیمر پنچ......، سے جی کوہارا کی کنپٹی پر لگا، ایک پنجا چھوٹا۔ کوہارا کو جھٹکا لگا، وہ لڑکھڑایا، کاک پٹ کی دیوار سے ٹکرایا، گن اس کے ہاتھ سے چھوٹی، وہ خود بھی گرا، اپنے اس ساتھی کے قریب جو میری ضرب کھا کے گرا تھا اور اب اپنی گن اچکنے کے لیے حرکت پذیر ہو چکا تھا...... ادھر کوہارا گرتے ہی ساکت ہو گیا تھا۔

اس کا ساتھی اپنی گن اٹھانے کے لیے کاک پٹ کے فرش پر کرولنگ کر رہا تھا اور تب تک وہ پہنچ بھی چکا تھا، میرا دھیان اس سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹا تھا کیونکہ کوہارا پر وار کرنے کے فوراً بعد ہی مجھے اس کا بھی ”بندوبست“ کرنا تھا۔

وہ گن ہاتھ میں لیتے ہی میرا نشانہ لینے کی کوشش میں تھا، لیکن کوہارا اس کے قریب ہی گرا تھا اور وہ گن اس کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب سی گئی تھی۔ وہ اسے نکالنے کی تگ و دو میں تھا، میں چیتے کی طرح اس پر جھپٹا۔ میرے ایک ہاتھ کا شکنجہ اس کی گردن پر کس گیا۔

وہ دونوں پائلٹ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے، یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ایک چونکا دینے والا عمل وقوع پذیر ہوا۔ کوہارا کا ساتھی بدستور فرش پر تھا اور اس کی گردن کو کسنے کے لیے مجھے جھکنا پڑا تھا، یوں میرا چہرہ زمین پر پڑے کوہارا کے رُوبرو تھا۔ دفعتاً ہی اس کے بےجان وجود میں حرکت ہوئی۔

اس نے دو تین بار اپنے سر کو جھٹکا دیا اور ہوش میں آنے لگا، اس کا ساتھی بھی تڑپا اور میری توجہ کوہارا پر مرکوز تھی۔ یوں وہ اپنی گردن میرے شکنجے سے چھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر حملہ آور ہوتا، میں نے کوہارا کے سر کی ٹکر مارنا چاہی۔ مگر پل کے پل اس نے حرکت کی اور اس کی ٹانگ میرے پیٹ پر لگی۔ میں پیچھے کو اچھل کر کو پائلٹ کی سیٹ سے ٹکرا کر گرا۔

کوہارا کسی ہولناک درندے کی طرح جیسے دوبارہ نیند سے بیدار ہوا تھا۔ وہ بدبخت میرا خطرناک... داؤ سہہ گیا تھا، کیونکہ وہ گینڈے جیسی جسامت اور بھینسے کی سی طاقت رکھتا تھا۔

گنیں ان کے پاس ہی پڑی تھیں، جنہیں دونوں نے ہی بڑی چابک دستی سے اچک لیا تھا۔

”بس...... شہزی! تمہارا کھیل ختم ہوا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ پر گن تان لی۔ وہ اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو جھٹک رہا تھا، میرے مخصوص گھونسے کے... زیرِاثر وہ اب بھی تھا۔ اس کے ساتھی نے بھی اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب کر رکھا تھا۔

میں بےاختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆☆☆

طیارے کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگ رہے تھے۔ دونوں پائلٹ بڑی مشکلوں سے آسمان کی بلندیوں میں تیرتے ڈولتے اس دیوہیکل آہنی پرندے کو سنبھالے ہوئے تھے۔

کوہارا نے مائک جھپٹا اور مسافروں سے ایک بار پھر مخاطب ہو کے انہیں دھمکیاں دیں کہ وہ اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے رہیں، اگر کوئی اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا ملا، اسے بلا دیر شوٹ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد کاک پٹ کی پیشانی پر جلتا بجھتا بلب اور الارم بند ہو گیا۔

”کیپٹن! طیارے کی اس تڑخی ہوئی ونڈ شیلڈ کا کچھ ایمرجنسی بندوبست کرو...... اس کا تدارک کیسے ہوگا؟“ میں نے کیپٹن سے کہا۔

”اس کا فوری تدارک بےحد ضروری ہے۔“ کیپٹن نے ایک کڑوی سی نظر کوہارا پر ڈالتے ہوئے میری جانب دیکھ کر جواب دیا۔ ”اس کے لیے میری ٹانگوں کا آزاد ہونا ضروری ہے۔“

”کوہارا......! طیارے کی اس ایمرجنسی پر قابو پانا ضروری ہے۔ اس کی رسیاں کھول دو تاکہ یہ اپنا کام نمٹا سکے۔“ میں نے کوہارا کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا بندوبست کر سکتے ہو تم؟ لیکن کوئی چالاکی نہیں ہو گی۔“ کوہارا نے کیپٹن پائلٹ کی طرف دیکھ کر تہدید کی۔

”طیارے کی اسکرین ہائی ایلومینیٹڈ میٹل کی بنی ہوئی ہے۔ یعنی ٹوٹنے کی صورت میں اس کی کرچیاں نہیں بکھرتیں، البتہ زیادہ پریشر سے اس میں سوراخ ہو جاتا ہے۔“ کیپٹن بتانے لگا۔ ”ایمرجنسی طور پر اس کا سدِباب ”پین“ (pane) کی صورت میں کرنا پڑتا ہے۔ میرے پاس ایک سنگل گلاس اسٹیکر پیپر شیٹ موجود ہے۔ وہ اس سوراخ پر چسپاں ... کرنا ہوگی۔“

”جلدی کرو...... پھر۔“ کوہارا نے کہا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کیپٹن کو ...... گن پوائنٹ پر لیتے ہوئے اس کے جکڑ بند کھول دیے۔ اس کے...... بعد کیپٹن نے ایک بٹن پش کیا۔ ایک خانہ شق ہوا اس کے اندر سے اس نے ایک چوڑا سا رول نکالا اور پھر ایک بڑا...... ٹکڑا کاٹ کر ونڈ شیلڈ پر چسپاں کر دیا۔

طوفانی ہوا کی سنسناہٹیں اور دباؤ، شور ایک دم تھم سا گیا۔

www.bookspk.site

www.bookspk.site

اپنا کام نمٹا کر جب وہ اپنی چیئر پر بیٹھا اور کوہارا کے ساتھی نے دوبارہ اس کی ٹانگیں سیٹ کے آہنی پایوں سے باندھ دیں تو وہ قدرے چلا کر بولا۔

''میں طیارے کو زیادہ دیر سنبھالنے سے قاصر ہوں، اسکرین ڈیمج ہو چکی ہے۔ فیول بھی ختم ہونے لگا ہے۔ اسے دبئی ائرپورٹ پر اتارنا ناگزیر ہو گیا ہے۔''

کوہارا نے غصے سے دانت پیس کر اپنی گن کا بٹ اس کی پیشانی پر رسید کر دیا۔ اس کے حلق سے شدتِ تکلیف کے سبب چیخ نکل گئی۔ پیشانی پھٹی اور وہاں سے خون رسنے لگا۔

''اپنی بکواس بند کرو اور جو حکم دیا گیا وہی کرو جلدی......'' کوہارا نے گرج کے کہا۔ اس وقت وہ ایک خطرناک وحشی درندے کے روپ میں نظر آ رہا تھا۔ جسے کسی کی تو کیا اپنی بھی پروانہ ہو۔

پتا نہیں اس بدبخت نے کیپٹن کو کیا حکم دے رکھا تھا۔ کیپٹن سیٹ سے ڈھلک گیا اور کراہتے ہوئے دوبارہ سنبھلا۔ رومال نکال کر اپنی زخمی پیشانی پر رکھتے ہوئے زخم سہلانے لگا۔

''تم پاگل ہو گئے ہو...... کوہارا......! مت بھولو کہ اس طرح تمہاری اپنی جان بھی خطرے میں ہے۔ پائلٹ سب جانتا ہے کہ کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کوہارا سے کہا۔ وہ زہرخندفسی کے ساتھ بولا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں اس بڈھے کیپٹن کی چالاکی نہیں سمجھ رہا؟ یہ اب تک کوڈ ورڈز میں انٹرپول اور ائر ٹریفک کنٹرول والوں کو کمانڈو ایکشن کے لیے اشارہ دے چکا ہوگا۔ میں اس کی چالاکی میں نہیں آنے والا۔ میری جان جاتی ہے تو جائے، مگر میں اپنے ساتھ سارے مسافروں کو لے کر مروں گا، اس لیے جو میں کہہ رہا ہوں، وہی ہونا چاہیے، بس! اب تم سمجھاؤ اس بڈھے کو...... ورنہ اس نے دوبارہ فضول بکواس کی تو اس کا برا حشر کروں گا۔''

میں نے دیکھا کوہارا کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ جو وہ کہہ رہا تھا کر گزرنا بھی جانتا تھا۔ میرا ایک عرصے سے اس سے ٹاکرا رہ چکا تھا، ایسے وقت میں جب خود اس کی اپنی بھی جان پر بنی ہوئی ہو، وہ سب کو اپنے ساتھ لے کر ڈوبتا تھا۔

''تم......'' کوہارا نے مجھ سے یہ کہنے کے بعد اپنے بری ساتھی سے تحکمانہ کہا۔ ''باہر جاؤ اور سب کو اپنی اپنی جگہ محبوس رہنے کی تاکید کرو، جو نخرے کرے بلاضرورت سوال کرے اسے بے دریغ گولی سے اڑا دو......''

''یس باس......!'' وہ کہتے ہوئے پلٹنے لگا۔ کوہارا نے دوبارہ کہا۔

''سنو......'' وہ رک گیا۔

''اس لڑکی یاسمین پر اور اس کے باپ پر بھی نظر رکھو۔ جب تک میں نہ بلاؤں اندر مت آنا اور محتاط رہنا، کسی رعایت سے کام مت لینا۔''

وہ ہرکارہ کاک پٹ کا دروازہ کھول کر محتاط انداز میں باہر نکل گیا۔

اب اندر میں اور کوہارا تھے۔ کوہارا نے مجھے اسی مذکورہ سیٹ پر اس دھمکی کے ساتھ بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اگر اس بار میں نے کوئی ...... غلط حرکت کی تو وہ اندھا دھند گولیوں کی بوچھاڑ کر کے کاک پٹ کو تباہ کر دے گا۔ میں جانتا تھا کہ یہ اس کی دھمکی خالی خولی نہیں تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسا شکست خوردہ اور جنونی ہو رہا تھا کہ ہر صورت آر یا پار کر دیتا۔

''کیپٹن! تم کیا گونگے بہرے ہو گئے ہو......؟'' کوہارا دہاڑا۔

کیپٹن جرأت مند انسان تھا، بولا۔ ''دبئی کی فضائی حدود میں ہم داخل ہو چکے ہیں۔ جیسا تم چاہ رہے ہو، وہ اب ممکن نہیں رہا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے پھر......'' کوہارا سنسناتے لہجے میں بولا۔ ''ایسے ہی رہو۔ میں تو اپنے سر پہ کفن باندھ چکا ہوں۔ میرا عظیم دشمن بھی اِدھر ہی ہے۔ سب میرے ساتھ ہی مرو، سے جی کوہارا کے لیے ایسے سودے گھاٹے کے نہیں ہوتے۔'' یہ کہہ کر وہ جنونی انداز میں قہقہے لگانے لگا۔

''کیپٹن! جو یہ کہہ رہا ہے اس پر عمل کرو......'' میں کیپٹن کی ہٹ دھرمی پر چیخا۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔ تم ایک انسان کی خاطر کئی لوگوں کی جانیں داؤ پر نہیں لگا سکتے۔''

کیپٹن نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا ایک روایتی بلف کھیلنا چاہا تھا۔ جو ناکام گیا تھا۔ لہٰذا اس نے مائیک پر پہلے ''مے ڈے...... مے ڈے......'' دہرایا اور پھر طیارے کی ہائی جیکنگ کا بتایا۔ اس کے بعد فوری طور پر جب اس نے ائر کنٹرول ٹریفک کو فیول کے سلسلے میں جو کہا، اسے سن کر میں بوکھلا سا گیا۔

کوہارا اس وقت واقعی جنونی ہو رہا تھا۔ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر ایک خطرناک مذاق کرنا چاہتا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا؟

''کوہارا......! یہ تم نے کیسا حکم جاری کروایا ہے؟ کیا یہ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسرا طیارہ جو فیول ٹینکر ہو اور وہ دورانِ پرواز ہمارے طیارے میں فیول منتقل کرے؟''

www.bookspk.site

''ہاہا...... ہاہا......! سب ممکن ہے کوہارا کے آگے، تم دیکھتے جاؤ یہ سب کیسے ممکن ہوتا ہے میرے عظیم دشمن......!'' کوہارا نے بدمست قہقہہ بلند کیا۔ پھر غرور سے بولا۔ ''لیکن...... مجھے افسوس ہوا کہ میرا دشمن...... جسے میں عظیم سمجھتا تھا کہ وہ ''اے۔ اے۔ آر'' (A.A.R) کی ٹیکنک سے بھی آگاہ نہیں...... چچ...... چچ...... افسوس۔''

''جانتا ہوں میں اچھی طرح...... اس ٹیکنک کو ''ائر ٹو ائر ری فلنگ'' (air-to-air refueling) کہا جاتا ہے۔'' میں نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا اور کوہارا سمیت وہ دونوں پائلٹ حیرت سے منہ پھاڑے میری طرف تکتے رہ گئے۔

''لیکن یہ بے حد رسکی عمل ہوتا ہے اور اشد ضرورت کے پیشِ نظر ہی اس پر عمل کیا جاتا ہے۔''

''واؤ...... مجھے فخر ہوا تم پر میرے عظیم دشمن......! تم واقعی کوہارا کی دشمنی کے لائق ہو۔'' کوہارا نے ایک اور بدمست قہقہہ حلق سے خارج کیا۔

کوہارا کا مقصد یہی تھا کہ کسی ائرپورٹ پر اترنے کے بجائے دورانِ پرواز ہی ایک دوسرے طیارے کے ذریعے فیول منتقل کیا جائے اور اسے مصر کے ہی ائرپورٹ پر لینڈ کیا جائے۔

کیپٹن کی مائیک پر بحث ہوتی رہی۔ وہ انسانی حقوق کے واسطے دیتے ہوئے پانچ سو سے زائد انسانوں کی زندگیوں کی بھیک مانگ رہا تھا۔ پھر وہ مختلف رابطے بھی کرتا رہا۔ اس میں لگ بھگ ایک گھنٹا بیت گیا۔ وہ وقفے وقفے سے یہ رابطے کیے جا رہا تھا۔

میں نے اس سے پہلے کبھی اپنے دل و دماغ میں اس قدر وحشتوں کی یلغار ہوتے نہیں محسوس کی تھی۔ میں بھی ایک عام سا ہی گوشت پوست کا انسان تھا، ڈر، خوف اور جان کے داؤ پر لگنے کے روایتی خوف کے جذبات میرے اندر جنم لے سکتے تھے۔ موت سے میں نہیں ڈرتا تھا مگر یہ ایک حرام موت تھی۔

ایک پاگل جنونی انسان کی درندگی جس کا نشانہ صرف میں ہی نہیں بنتا بلکہ کئی سو معصوم اور بے گناہ مسافروں کی جانیں بھی داؤ پر لگی ہونے کا معاملہ تھا۔ ان میں معصوم بچے بھی تھے۔ مجھے اس خبیث کوہارا...... نے ایک عجیب سی دھمکی دے کر اپنی سیٹ تک محصور رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''عجیب'' اس لیے کہ میں میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے بھی نہیں تھے مگر میں اس مردود کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے بھی قاصر تھا۔ تاہم یہ بھی درست تھا کہ میری ایسی ''بے بسی'' کی کیفیات عارضی تھیں، ہاں! جب تک طیارے میں ایندھن ''ری فل'' نہیں کر دیا جاتا۔

میں نے دیکھا، کیپٹن کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ وہ اپنی سی ایک گھنٹے سے زائد تگ و دو کے بعد ہمیں گویا یہ مژدۂ جانفزا سنا رہا تھا کہ ایک چھوٹا فاضل طیارہ انسانی ہمدردی کے طور پر پرواز کرنے والا ہے۔

میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔ ایک بوجھ تھا دل و دماغ میں جو اترنے لگا۔ مجھے اب کوہارا کے خلاف کارروائی کرنے کا موقع مل سکتا تھا، مگر اس صورت میں جب طیارے کی خاطر خواہ ایندھن کی ضرورت پوری ہو جاتی۔ اس سے پہلے میں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس میں اس مسافر طیارے کی تباہی کا خدشہ شامل ہوتا۔

کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پر بھی شاطرانہ مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی۔ اس کی چندی چندی سی اکلوتی بری آنکھ میں فاتحانہ چمک عود کر آئی تھی۔

اسی وقت کاک پٹ کے دروازے پر بپ کی مخصوص آواز ابھری۔

''کھولو دروازہ......'' کوہارا نے میری طرف دیکھ کر تحکمانہ انداز میں کہا اور گن کا رخ میری جانب کر لیا۔

میں اسے خوف ناک نظروں سے گھورتا ہوا اٹھا اور لاک گرا کر دروازہ کھول دیا۔

اسی وقت میرے سینے پر خودکار رائفل کی نال آن لگی۔ یہ کوہارا کا وہی ساتھی تھا، جسے اس نے کاک پٹ سے باہر ہدایات دے کر مامور کیا تھا۔

اس نے احتیاط کے پیشِ نظر ہی ایسا کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونک پڑا۔ اس کے ہمراہ یاسمین تھی۔ اس کے حسین چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہاں سکون پھیل گیا۔

ہرکارے نے اسے ٹہوکا دیا اور یاسمین کا پاؤں رپٹا، وہ اندر آتے آتے لڑکھڑائی تو میں نے اسے گرنے سے بچانے کی خاطر اپنے دونوں بازو پھیلائے۔ وہ ان میں سما گئی۔ اس کے ریشمی بال میرے چہرے پر پڑے، وہ میرے سینے سے لگ گئی اور یوں چمٹ گئی جیسے الگ نہ ہونا چاہتی ہو...... میں اسے اسی طرح ہی خود سے لگائے چند قدم پیچھے کو پلٹا۔

''کمبلر! اسے کیوں لائے ہو یہاں......؟'' کوہارا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ تب تک میں نے یاسمین کو دھیرے سے خود سے الگ کر کے اسی

www.bookspk.site

چیئر پر بٹھادیا جس پر تھوڑی دیر پہلے میں بیٹھا تھا۔

''باس! یہ زیادہ شور کررہی تھی۔'' کمبلر نامی ہرکارے نے جواب دیا۔ ''یہاں آنے کی ضد کررہی تھی۔''

''ہمم...... اپنے یار شہزی سے دل لگا بیٹھی ہوگی......'' کوہارا نے خباثت بھرے لہجے میں اس کی اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا...... ٹھیک ہے تم جاؤ...... کسی نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی؟''

''چند مسافر مہم جوئی دکھانے کی کوشش کررہے تھے۔'' کمبلر بتانے لگا۔ ''انہیں خاموش کرنے کے لیے ایک کو گولی مارنا پڑی۔ سب خوف سے ٹھنڈے پڑگئے۔''

''گڈ......! کوئی رعایت مت کرنا۔ تمہارے پاس ہتھیار ہے، ذرا محتاط رہنا اور انہیں دھمکاتے بھی رہو کہ اندر تمہارے ساتھی نے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا ہے، اس کے پاس خطرناک اسلحہ ہی نہیں بلکہ تباہ کن بم بھی ہیں اور سب اطمینان رکھیں کہ بہت جلد کسی بھی ائرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔''

کوہارا نے اسے نئی ہدایت دی۔ کمبلر واپس لوٹ گیا۔ ایک بے گناہ مسافر کی جان جانے کا مجھے بے حد دکھ ہوا اور کوہارا اور اس کے درندہ صفت ساتھی پر طیش بھی آیا۔

اسی وقت کوہارا نے مائیک لیا اور اس میں بولنے لگا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹلمین! میں آپ سے ایک بار پھر مخاطب ہوں، مجھے افسوس ہوا ہے کہ ایک مسافر جان سے چلا گیا۔ لیکن اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو تعاون نہیں کرے گا اسے اسی طرح بیدردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ اب آپ یہ بھی سن لیں اچھی طرح۔ طیارے میں فیول ختم ہوگیا ہے، ہم فوری طور پر کسی بھی ملک کے ائرپورٹ پر اترنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ تاہم پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایک طیارہ فیول لے کر فلائی کرچکا ہے۔ شکریہ۔''

یہ اعلان کرکے کوہارا نے مائیک پائلٹ کو تھمایا اور پھر کیپٹن سے بولا۔ ''رابطہ کرکے فوراً بتاؤ...... وہ فیول ٹینک فاضل طیارہ کہاں تک پہنچا ہے؟''

''قریب آچکا ہے۔ ریڈار میں نظر آرہا ہے۔'' کیپٹن نے روکھے سے لہجے میں جواب دیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کوہارا کو کچا چبا جائے۔

''دیکھو کیپٹن!'' کوہارا نے اسے تہدید کرنے کے انداز میں کہا۔ ''فیول لانے والے طیارے کو میری طرف سے یہ وارننگ دے دینا کہ ایسا نہ ہو فیول ٹینک کی آڑ میں اس فاضل طیارے کے اندر کمانڈو موجود ہوں...... ورنہ میں تمہیں آخری حکم یہی دوں گا کہ اپنے جہاز کو اس سے ٹکرا دو...... سمجھ گئے تم......؟''

کوہارا کی بات پر میری ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ سی دوڑ گئی۔ یاسمین بھی متوحش نظر آنے لگی۔ دونوں پائلٹس کے چہرے بھی سُت کر رہ گئے۔

کوہارا ہماری جانب متوجہ ہوا۔ وہ یاسمین کو بڑی گرسنہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اسے قریب آنے کا اشارہ کیا مگر یاسمین نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ہراساں نگاہوں سے اس کی طرف تکنے لگی۔

''اِدھر آؤ...... میرے پاس......'' غصیلے لہجے میں اس نے یاسمین کو مشتعل نظروں سے گھورتے ہوئے کہا اور اپنی رائفل کی نال کا رخ اس کی طرف کردیا۔

مجھے ڈر تھا کہیں یہ آسیبی جنونی درندہ یاسمین کو گولی نہ مار دے۔

میں نے یاسمین کے کان میں سرگوشی کی اور وہ ایک نگاہ حیرت و بے بسی ڈ میرے چہرے پر ڈالتی ہوئی کپکپاتی ٹانگوں سے اس کی جانب بڑھنے لگی۔

ابھی وہ اس کے ذرا ہی قریب پہنچی تھی کہ کوہارا نے ایک سنسناتی سی غراہٹ سے مشابہ آواز خارج کرکے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی جانب اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے گینڈے جیسے جثے سے جا لگی۔

''آہ...... ایک عرصہ ہوگیا، ایسی نرم گرم رفاقت کا مزہ چکھے ہوئے۔'' وہ کمینگی سے ہنکارا بھرتے ہوئے بولا۔ ''جی چاہتا ہے اسی وقت تمہیں اپنے سوئٹ میں لے جاؤں...... مگر وہاں تمہارے بڈھے باپ نے قبضہ جما رکھا ہے۔ چلو...... جب تک اِدھر ہی دل بہلائے لیتا ہوں......'' کہتے ہوئے اس نے یاسمین کے حسین اور ہراساں چہرے پر اپنا بھاری اور بدہیئت چہرہ جھکایا۔

''کوہارا......!'' میں نے گرجدار آواز میں اس رذیل کو پکارا۔ میری للکار پر اس کا بڑھتا ہوا چہرہ رکا اور اسی طرح جھکے جھکے انداز میں اس نے اپنی اکلوتی آنکھ ترچھی کرکے میری طرف دیکھا۔

''میں تمہیں یہ ذلالت نہیں کرنے دوں گا۔ تمہیں شرم نہیں آتی، ایک بے بس اور مجبور لڑکی کے ساتھ ایسی گندی حرکت کرتے ہوئے۔'' میں بپھر گیا اور ساتھ ہی جوشِ غیظ تلے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

یاسمین روتے ہوئے سسکیاں لینے لگی۔ کوہارا نے اپنی گن کی نال میری طرف کردی اور اس کی موٹی انگلی ٹریگر پر جم گئی۔

''نن...... نہیں...... نخ...... خدا کے لیے اسے مت مارنا۔'' دفعتاً یاسمین اپنا خوف بھلا کر کوہارا کی منت سماجت کرنے لگی۔

''ہمم...... بڑا یارانہ ہے ایک دوسرے سے......'' کوہارا نے اسی طرح خباثت سے مسکرا کر کہا پھر یاسمین سے بولا۔ ''میرے ساتھ بھی حساب کتاب رکھ لے ناں...... پھر، ایرانی شہزادی!''

کہتے ہوئے وہ پھر اس پر جھکا، یاسمین نے غایت درجے کی نفرت تلے اس کے مکروہ چہرے پر تھوک دیا۔ کوہارا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تاہم قہہ...... قہہ...... کرتے ہوئے بولا۔ ''اس تھوک کو میں تیرے گل گلنار چہرے سے ہی صاف کروں گا شہزادی......!''

میرے اندر غبار سا بھرنے لگا۔ طیش اور مارے غیظ کے مٹھیاں کھول اور بھینچنے لگا۔ یاسمین ایک شریف اور پاکیزہ مسلم خاتون تھی، جبکہ کوہارا ایک برمی کافر شیطان اور کئی بے گناہ برمی مسلمانوں کا قاتل بھی تھا۔ اسی سبب میرے اندر اس کے لیے نفرت و غضب کا ایک جوار بھاٹا امنڈا اور میں خود کو نہیں روک سکا...... اس سے پہلے کہ میں حرکت میں آتا، اچانک کیپٹن کی آواز ابھری۔

''طیارہ آگیا ہے۔''

کوہارا...... چونکا۔ اس نے یاسمین کو اپنی شیطانی گرفت سے آزاد کردیا۔ وہ سسکتی ہوئی میری جانب لپکی اور میں نے بے اختیار اپنے دونوں بازو پھیلا کر اسے خود میں سما لیا۔

کیپٹن مائیک پر اس طیارے کو بریفنگ دینے میں مصروف تھا۔ ہم سب کی نظریں اب جہاز کی ونڈ شیلڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے فضائے بسیط کا عجیب اور ہیبت ناک نظارہ تھا۔ حدِ نگاہ پھیلے ہوئے آسمان پر ایک رخ پر تاریکی اور بہت دور سفید لکیر سی نظر آرہی تھی۔ اس لکیر سے متعلق میں نے کسی خدشے کے پیشِ نظر کیپٹن سے دریافت کرنا چاہا، مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ اس وقت خاصا چڑچڑا ہو رہا تھا۔ البتہ اس کے ساتھی کو پائلٹ نے مدھم سے لہجے میں مجھے بتایا تھا کہ جہاز کے پائلٹ کے لیے ایسے عجیب مناظر معمول کی بات ہے، یہ سفید لکیر پو پھٹتی شفق کی ہے۔

طیارے میں ایسے مناظر اکثر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں ایک جانب تاریکی تو دوسرے مقام پر سویرے کی جھلک نظر آرہی ہوتی ہے۔ یہ سب خطِ استوا کی کارستانی ہوتی ہے۔ یعنی جس مقام پر سورج غروب ہو رہا ہوتا ہے اسی مقام کی دوسری جانب وہ طلوع بھی ہو رہا ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی وقت ہمیں طیارے کی اسکرین سے دائیں جانب کچھ جلتی بجھتی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ یہ اسی فاضل طیارے کی تھیں جو ہمارے طیارے کے لیے فیول لوڈ کیے ہوئے تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہمارے متوازی پرواز کرنے لگا۔ یہ مجھے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے زمین پر میں کسی بس میں سوار ہوں اور میرے ساتھ ایک اور بس دوڑ رہی ہو۔ ہزاروں فٹ کی بلند فضا میں ایسا مظاہرہ میرے لیے حیرت سے زیادہ فکر و تشویش کا باعث تھا، کیونکہ جہازوں کے ائرروٹس ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر طے کیے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ سڑک پر دوڑتی ٹریفک کی طرح کوئی دوسرا جہاز سامنے سے کراس کرتا نظر آجائے یا پیچھے سے آگے نکل جائے۔ لیکن یہاں میں یہ جو ہیبت ناک نظارہ دیکھ رہا تھا، وہ کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا تھا، کیا شک تھا کہ ایسا کسی اشد مجبوری کی بنا پر ہی ہوتا تھا۔ اس میں بھی دونوں جہازوں کے پائلٹس کا انتہائی تجربہ کار ہونا ضروری تھا، بالخصوص فاضل طیارے کے پائلٹ کو زیادہ ہی مشاق ہونا پڑتا تھا۔

آسمان پر اب دھیرے دھیرے سویرا اجاگر ہونے لگا تھا۔

فاضل طیارہ ایک مخصوص راہ متعین کرنے کے بعد اب ہمارے طیارے کے متوازی پرواز کررہا تھا۔ یقیناً یہ حیرت ناک اور عجیب منظر طیارے میں بیٹھے دیگر مسافر بھی کھڑکیوں سے دیکھ اور ہول رہے ہوں گے۔

دونوں پائلٹ اپنے کام میں مصروف ہوگئے تھے۔ یہ ایسا موقع تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اور کوہارا ایک دوسرے سے بھی غافل ہوگئے تھے۔ کیونکہ یہ فیول بھرنے کا مرحلہ تھا۔ لڑائی کی صورت میں ہزاروں فٹ کی بلندی پر یہ خطرناک پروگرام متاثر ہوتا اور تباہی یقینی ہوتی۔

اچانک میں نے فاضل طیارے سے ایک ایریل ٹائپ کی شے کو نمودار ہوتے اور فضا میں لہراتے دیکھا۔ اب ہمارا طیارہ ''ریسیور'' تھا۔ یہ ایریل ٹائپ شے...... جو فاضل طیارے سے نمودار ہوئی تھی ایریل ری فلنگ پروب اینڈ ڈروگ کنیکٹنگ سسٹم تھا۔ اس کا آخری سرا...... ریسیور طیارے کے فیول ٹینک کے ایک ایمرجنسی وال ہول سے جسے حوض (hose) کہا جاتا تھا ازخود اٹیچ ہوجاتا تھا، یوں ایک

www.bookspk.site

www.bookspk.site

طیارے سے دوسرے طیارے میں فیول بھرنے لگتا تھا۔ یہ ایک مخصوص میگنیٹک سسٹم کے تحت ریسیور طیارے کے وال سے اٹیچ ہو جاتا تھا۔ اس خطرناک ری فلنگ پروسس کو جلد نمٹایا جاتا تھا۔

یوں ری فلنگ پروسس شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

تاریک آسمان کی ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر یہ خطرناک عمل جاری تھا۔ دونوں آہنی پرندے ایک دوسرے کے متوازی محو پرواز کرتے ہوئے ایک عجیب اور ہولائے دینے والا منظر پیش کر رہے تھے۔ دونوں طرف کے طیاروں کی ذرا سی غلطی خوفناک تباہی کا سبب بن سکتی تھی۔

لیکن ابھی بیس منٹ ہی بیتے ہوں گے کہ اچانک عمر رسیدہ کیپٹن نے فاضل طیارے کے پائلٹ سے مائیک پر بدستور باتیں کرنے کے دوران کوہارا کی طرف گردن موڑ کر کہا۔

”فاضل طیارے کے ایریل کا پروب ہمارے فیول ٹینک کے ڈروگ سے صحیح طور پر اٹیچ نہیں ہوا ہے۔“

”تو پھر......؟“ کوہارا اس کی جانب گھور کر خونخوار لہجے میں غرایا۔

”فاضل طیارے سے...... دو عدد ایکسپرٹ ہمارے طیارے کے فیول ٹینک تک آنا چاہتے ہیں۔“

”ہرگز نہیں......“ کوہارا دہاڑ کر بولا۔ کیپٹن کی بات پر میرے اندر ایک پرتشویش آمیز سی بے چینی نے یکلخت سر اٹھایا تھا۔

”میں ان کی چالاکی سمجھ رہا ہوں، یہ لوگ اس بہانے طیارے کے اندر داخل ہو کر ہمارے خلاف کمانڈو ایکشن کرنا چاہتے ہیں۔“ کوہارا نے کہا۔ اس کا ایسا سوچنا حالات کے عین مطابق ہی تھا۔

”تم غلط سوچ رہے ہو۔“ کیپٹن نے جھلا کر کہا۔ ”یہ کمانڈو نہیں، انجینئرز ہیں یوں بھی وہ ہمارے طیارے میں کیسے داخل ہو سکتے ہیں بھلا؟“ کوہارا کچھ سوچتا ہوا بن گیا۔

”جلدی جواب دو مجھے، انہیں گرین سگنل دوں یا نہیں؟“

”دے دو......“ بالآخر کوہارا نے اجازت دے دی۔

میرے اندر شدید قسم کی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ آسمان کی بلندیوں میں نجانے اب کیسی خوفناک جنگ کی ابتدا ہونے والی تھی، اس کا تصور ہی میرے لیے جاں گسل تھا۔ میں خود بھی ایک کمانڈو تھا، ایسی صورت حالات میں کوہارا جیسے ہائی جیکرز سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہی کچھ تھا تو ایک بڑی مصیبت میری منتظر تھی۔

میں نے دیکھا، فاضل طیارے سے ایک اور رسی لہرائی جس کے سرے پر باسکٹ بندھی ہوئی تھی اور اس میں دو انسانوں کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

ہم سب کی نظریں اس طرف سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ہٹی تھیں، اگرچہ اس دوران میرے پاس کوہارا پر حملہ کرنے کا ایک اچھا موقع تھا لیکن بات وہی تھی کہ ہم سب اس وقت نازک گھڑیوں سے گزر رہے تھے۔ یہ صرف میرا اور یاسمین کا معاملہ نہیں تھا بلکہ طیارے میں سوار پانچ سو سے زائد مسافروں کی زندگیاں داؤ پر لگی تھیں۔ پھر کوہارا جیسے خطرناک درندے پر اتنی جلدی قابو پانا آسان بھی نہ تھا، اس کے لیے وقت درکار ہوتا، جبکہ وہ خود اس وقت ”زندہ بہ دست مردہ“ کے مصداق شکست خوردگی کے عالم میں کوئی بھی خطرناک حرکت کر سکتا تھا۔ یوں میں نے کسی اور نسبتاً محفوظ موقع کے لیے...... خود کو اس ارادے سے باز رکھا تھا۔

باسکٹ لہراتی ہوئی اسی سمت جا رہی تھی جدھر ری فلنگ ایریل اٹیچ تھا۔ اسی وقت کوہارا نے مائیک پر اپنے ساتھی کمبلر کو بلایا۔ وہ کاک پٹ میں داخل ہوا تو کوہارا نے اسے تحکمانہ لہجے میں ساری صورتِ حال سے بریف کرتے ہوئے کہا۔

”طیارے کے دروازے پر کسی کو حرکت کرتا دیکھو تو بے دریغ فائر کر دینا۔ عملے سمیت کوئی بھی مسافر اپنی سیٹ نہیں چھوڑے گا۔“

”آپ بے فکر رہیں باس!“ کمبلر نے کہا۔ ”دو مسافروں کی ہلاکت نے طیارے میں خوف پھیلا دیا ہے لیکن باس! کامیابی اور منزل حاصل کرنے تک کاک پٹ کا قبضہ مت چھوڑنا۔ کیونکہ عملے اور مسافروں میں چند لوگوں کی نیت کو میں بھانپ رہا ہوں۔ شاید مجھے اکیلا پا کر وہ کسی قسم کی مہم جوئی کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔“

”میں ان کی اس کمزوری سے واقف ہوں اچھی طرح کیمبلر......!“ کوہارا نے کہا۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، ان کی سانسیں اٹکی رہیں گی، تم اپنی پوزیشن ایسی رکھنا کہ کوئی تم پر اچانک حملہ نہ کر پائے مگر تم بہ آسانی ان پر گولی چلا سکو۔“

”یس باس! میں نے خود کو کاک پٹ کے قریب ہی رکھا ہے۔ میری پشت پر پائلٹ روم کی دیوار ہے۔“

”گڈ......! سب پر کڑی نگاہ رکھو۔“

”او کے باس......!“ وہ چلا گیا تو...... کوہارا نے مائیک پر ایک بار پھر اعلان کرتے ہوئے مسافروں کو دھمکایا۔

www.bookspk.site

”لیڈیز اینڈ جنٹلمین......! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہمارا مقصد طیارے کو ہائی جیک کرنا یا کسی کی جان کو خطرے میں ڈالنا نہیں ہے۔ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ ہماری منزلِ مقصود قریب ہے اور وہاں اترتے ہی ہم فرار ہو جائیں گے، پھر تم سب آزاد ہو۔ لیکن میرے ساتھی پر کسی نے دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت کی تو...... سب کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ میرے پاس خودکار رائفل ہی نہیں بلکہ طاقتور بم بھی ہیں اور میں نے اس وقت طیارے کے دماغ یعنی کاک پٹ پر اپنا پورا قبضہ جما رکھا ہے۔ مجھے بہرحال دو مسافروں کی ہلاکت کا افسوس ہے۔ شکریہ۔“

کوہارا یہ ساری بکواس کرنے کے بعد میری طرف دیکھ کر تاؤ دلانے والے انداز میں ہنسی سے بولا۔ ”کیوں میرے عظیم دشمن! سب کچھ ٹھیک جا رہا ہے ناں......؟“

”تمہارے آئندہ کے کیا ارادے ہیں؟“ میں نے اس کے جی جلانے والے انداز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاہا...... ہاہا......! بہت خوف زدہ ہو رہے ہو مجھ سے......“

”تم خود اس وقت خوف سے بھیگی بلی بنے ہوئے ہو کوہارا......! میں جانتا ہوں یہ بات......“ جواب میں، میں نے بھی اسے تاؤ دلایا۔ مگر وہ بھی میری طرح اس اندازِ غنیم کو صرف نظر کرتے ہوئے مسکراتا رہا۔

”ایک اور مسئلہ ہو گیا ہے۔“ اچانک کیپٹن نے دوبارہ کہا۔ جیسا مذکور ہوا وہ مسلسل فاضل ٹینکر طیارے کے پائلٹ سے رابطے میں تھا۔ کوہارا سے بولا۔

”اب کیا ہو گیا بڈھے بگلے......!“ کوہارا جھلا کر بولا۔ یہ اس کے اندر کے چھپے ہوئے خوف کا ہی شاخسانہ تھا۔

”ان دونوں میں سے ایک انجینئر طیارے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ باہر سے کوئی اندر داخل نہیں ہو سکتا؟“ کوہارا نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”یہ میرا خیال تھا اور اب بھی میرا یہی خیال ہے۔“ ادھیڑ عمر پائلٹ نے جواب دیا۔ ”لیکن...... وہ لوگ ہی مجھے اس کا طریقہ بتائیں گے، کیونکہ ایسے حالات سے گزرنا ان کی پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ ہے۔“

مجھے کسی گڑبڑ کی بو آ رہی تھی۔ یہ واحد بات تھی جس سے میں کوہارا کے خدشات سے متفق تھا۔ تاہم میں خاموش رہا۔

”مجھ سے ان کی بات کراؤ......“ کوہارا نے غرا کر پائلٹ سے کہا تو اس نے دو ایک لفظ مائیک میں کہنے کے بعد ہیڈ فون سر سے اتار کر کوہارا کی طرف بڑھایا۔

کوہارا نے وہ اپنے سر پر چڑھایا اور اس سے منسلک مائک میں غراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم لوگ اگر کوئی چالاکی چلنا چاہتے ہو تو یاد رکھنا، ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں، لیکن اس کے نتیجے میں سب بھیانک انجام سے دوچار ہو جائیں گے۔ تمہارے دو انجینئرز اگر وہ واقعی کمانڈو نہیں ہیں تو ان سے کہو باہر ہی سے خرابی دور کرنے کی کوشش کریں۔“

پائلٹ نے خود بھی گفتگو سننے کی خاطر اسپیکر وائیڈ کر رکھا تھا، لہٰذا دوسرے طیارے کے پائلٹ کی آواز ابھری۔

”ہم لوگ کمانڈوز نہیں ہیں اور نہ ہی اس کا ذرا سا بھی رسک لینے کا سوچ بھی سکتے ہیں۔ ریسیور طیارے کے ایمرجنسی فیول ٹینک کا والو کسی خرابی کے باعث صرف تیس فیصد فیول لے رہا ہے اور باقی ستر فیصد باہر ضائع ہو رہا ہے۔ ہمارا فقط ایک انجینئر طیارے میں داخل ہو کر یہ خرابی دور کر لے گا۔“

”تیس فیصد کی رفتار سے جس قدر فیول بھر سکتا ہے وہ بھر دو......“ کوہارا نے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ”ہماری منزل زیادہ دور نہیں، قاہرہ ائرپورٹ ہماری آخری منزل ہو گی۔“

”باوجود اس کے یہ ناممکن ہے۔“ فاضل طیارے کے پائلٹ نے کہا۔ ”صرف اتنی مقدار بھری جا سکی ہے کہ تمہارا طیارہ دورانِ پرواز ری فل ہوتا رہے مگر ہمارا فیول ختم ہو جائے گا۔ پھر نہ تمہارے پاس اور نہ ہمارے پاس اتنا وقت ہو گا کہ دوسرا طیارہ آ سکے، تب تک تمہارا طیارہ...... زمین بوس ہو جائے گا۔“

کوہارا سوچ میں پڑ گیا۔ یہ بڑی گمبھیر اور اعصاب شکن گھڑیاں تھیں۔ ہزاروں فٹ کی بلندیوں پر پانچ سو جانوں کے ساتھ جیسے اس صدی کا ایک بھیانک مذاق ہو رہا تھا۔ مجھے اپنا سینہ جکڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، اب کو پائلٹ ہی کے چہرے پر نہیں بلکہ ادھیڑ عمر...... کیپٹن کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور یہ دونوں کوہارا کی طرف سراسیمہ سی ملتجیانہ نظروں سے تکنے لگے تھے۔

”سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ جلدی جواب دو......“

”ٹھیک ہے۔“ بالآخر کوہارا نے اجازت دے دی اور ہیڈ فون سر سے اتار کر پائلٹ کو تھما کر مجھ سے بولا۔ ”شہزی......! تمہیں میرا ایک حکم ماننا ہو گا۔“

”میں تمہارا کوئی حکم نہیں مانوں گا اور نہ ہی تمہارے

www.bookspk.site

ایسے کسی جرم میں شریک بنوں گا، سمجھے تم......؟"

میں نے فوراً غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو اس کی اکلوتی آنکھ میں طیش کی لہر سی اُمڈی اور پھر وہ اسی لہجے میں غراتے ہوئے بولا۔

"نہیں شہزی! تمہاری ضد نہیں چلے گی۔ اس وقت تم سمیت طیارے کا ہر شخص میرا محکوم ہے۔ جو میرا حکم نہیں مانے گا میں اسے بلا تامل گولی مار دوں گا۔ تمہاری پروا بھی نہیں کروں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کر دیا۔ میرا تن بدن مارے غیظ اور طیش کے پھنکنے لگا۔ یاسمین مجھے گن پوائنٹ پر دیکھ کر ایک دم ہراساں ہوگئی اور اپنی نشست سے اٹھ کر میرے سینے سے اپنی پشت کے بل لگ کر کھڑی ہوگئی۔

میں یاسمین کے اس جذبۂ بے اختیاری پر کچھ حیران سا ہوا۔ اس کا مجھ سے چپکا ہوا نرم و نازک وجود خزاں رسیدہ پتے کے مانند کپکپاتا محسوس ہوا۔ یاسمین کا ڈرا سہا روپ میرے لیے نیا تھا۔ بے شک وہ بھی ایک عام سی انسان اور لڑکی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اسے بہت جرأت مند اور ثابت قدم دیکھا تھا۔ یا پھر اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ ہر کوئی اپنے سائے سے بھی خوف زدہ تھا۔

"اس کی بات مان لو اینگری ینگ مین......!" معاً اس ادھیڑ عمر پائلٹ نے مجھ سے کہا۔ "اس پر خون سوار ہے، اپنی زندگی بھی داؤ پر لگائے ہوئے ہے اور ہماری بھی...... یہ کسی کی پروا نہیں کرے گا اس وقت......"

طیارے کے ایک ذمے دار کیپٹن کی بات پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایسا بھی مجھ سے کہہ سکتا تھا؟ یا پھر شاید اسے واقعی میری جوانی پر ترس آگیا تھا۔

"کیا کرنا ہے مجھے......؟" بالآخر میں نے رکھائی سے کہا۔ کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پہ ایک بار پھر تاؤ دلانے والی مکروہ مسکراہٹ ابھری۔

"باہر جا کر میرے ساتھی کی مدد کرو اور...... دیکھو...... اگر تم نے آنے والے آدمی کے ساتھ ذرا بھی کسی قسم کی ساز باز کرنے کی کوشش چاہی تو تمہاری باری بعد میں آئے گی، اس کی پہلے آجائے گی۔" کہتے ہوئے اس نے یاسمین کی طرف اشارہ کیا۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یاسمین نے خود مجھے پابہ زنجیر کر ڈالا تھا۔ تاہم مجھے کوہارا کی اس بات پر حیرت بھی ہوئی تھی کہ وہ مجھ پر یعنی "عظیم دشمن" پر بھروسا کر رہا تھا! کیوں؟ کیا اس میں اس کی کوئی چال تھی یا پھر اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، ممکن تھا اپنی فطری رعونت کے سبب وہ یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں اس کا ان حالات میں کچھ بھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، چہ جائیکہ...... یاسمین اس کی گرفت میں تھی۔

میں بادلِ ناخواستہ کاک پٹ کے دروازے...... کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو......!" وہ یک دم بولا۔ مجھے اس کا تحکمان انداز بُری طرح کھل رہا تھا۔ میں رک کر اس کی جانب گھورنے لگا۔ وہ مائیک پر اپنے ساتھی گیمبلر سے باتیں کرنے لگا پھر مجھے جانے کا اشارہ کر دیا۔

میں دروازہ کھول کر باہر نکلا، میرے سامنے نشستوں کی دہری تہری قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے ہر رنگ و نسل کے مسافر ایک دم مجھے یوں تکنے لگے جیسے میں ہائی جیکرز کا ساتھی ہوں۔

ان کی آنکھوں میں غصہ اور نفرت ہلکورے لے رہی تھی، خوف بھی تھا اور تشویش بھی۔ ایک دو نشستوں پر میں نے کچھ کو روتے سسکتے ہوئے بھی دیکھا، اس طرف خون پھیلا ہوا تھا، ایک سیٹ پر خون آلودہ لاش کو ٹکا کر بٹھا دیا گیا تھا۔ تیسری رو کی پانچویں نشست پر بھی یہی کچھ دیکھنے میں آیا۔

گمبلر مجھے دیکھتے ہی ایک طرف کو ہوگیا تھا۔ اسے کوہارا کی طرف سے ہدایت مل گئی تھی۔ تاہم اس نے مجھ پر اپنی گن تان لی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ یہ سب جاننے کے باوجود یہ لوگ مجھے بھی ظالم اور اس جرم میں برابر کا شریک سمجھ رہے تھے۔

میں نے عملے کے ایک آدمی کو اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ وہ وردی پوش فلائٹ اٹینڈنٹ تھا۔ میری ہی عمر کا نوجوان لڑکا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "ری فلنگ کے سلسلے میں تھوڑی خرابی دور کرنی ہے، اس کے لیے فاضل طیارے سے ایک انجینئر آنا چاہتا ہے۔ اس کی محفوظ صورت کیا ہو سکتی ہے؟"

وہ فوراً پلٹا اور سامنے کے ایک گلاس کیبن سے اپنے چیف اٹینڈنٹ کو بلا لیا۔ یہ ایک پکی عمر کا لمبا چوڑا امریکی تھا اور مجھے بڑی تیکھی نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی نظروں کی پروا کیے بغیر...... اسے یہی کچھ بتایا۔ اس نے بجائے مجھے جواب دینے یا کوئی ہامی بھرنے کے الٹا دھمکانا شروع کر دیا۔

"تم...... تم...... لوگ یہ سب اچھا نہیں کر رہے ہو، یاد رکھو...... یہ امریکی طیارہ ہے اور......" وہ غصے میں بہت بھرا ہوا تھا، اسے اپنے امریکی ہونے کا زعم بھی بہت تھا۔

www.bookspk.site

میں نے اس کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچ لی، میری اس جارحانہ حرکت پر کئی مسافروں کے منہ سے دبی دبی چیخیں خارج ہوگئیں۔ خوف کی کچھ ایسی ہی فضا پورے طیارے میں طاری تھی۔ میں چلا کر اور اس سمیت دیگر لوگوں کو بھی سنانے کے لیے بولا۔

"تم سب لوگ کیا گونگے بہرے اور اندھے ہو......؟ دیکھ نہیں رہے ہو کہ یہ مجھے اور میری ساتھی لڑکی کو بھی یرغمال بنائے ہوئے ہیں۔"

"تم انہیں پہلے سے جانتے تھے، تمہیں طیارے میں سوار ہونے سے پہلے بتانا چاہیے تھا ان کے بارے میں......"

ایک خرانٹ قسم کے جوان مگر موٹے سے مسافر نے مجھے گھورتے ہوئے ذرا ہمت دکھائی تو میں نے چیف فلائٹ اٹینڈنٹ کی گردن چھوڑ کر اس سے خار کھائے لہجے میں کہا۔ وہ سامنے کی سیکنڈ رو میں براجمان تھا۔

"مجھے پتا ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا لیکن یہاں انہیں پہچانتے ہی میں نے ان کی سرکوبی کی ہے، اسی لیے ان کی طاقت اب تقسیم ہو چکی ہے۔ یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے، صرف فرار چاہتے ہیں، اور میں بھی تمہیں یہی تلقین کروں گا کہ ان کے ساتھ تعاون کرو۔"

پھر میں چیف کی طرف متوجہ ہوا...... "اور...... اب تم بھی...... وقت ضائع مت کرو۔" میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

وہ فوراً حرکت میں آیا۔ تب ہی میں نے بہت سے مسافروں کی آنکھوں سے میرے لیے جھلکتا ہوا برہمی اور نفرت کا غبار کم ہوتے دیکھا۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں بھی کرنے لگے۔

بدبخت کوہارا نے اپنے ساتھ مجھے بھی گندہ کر ڈالا تھا۔ یہ خطرناک معاملہ میری امریکا یاترا کی مہم کو سبوتاژ کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس سلسلے میں پہلے ہی امریکی افسران بہت "کانشس" تھے۔ بہرطور شکر تھا کہ یہ سارا کچھ سب کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا اور اب تک میرے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی تھی، میری سچائی کی گواہی اندر کاک پٹ میں بیٹھے وہ دونوں پائلٹس بھی دے سکتے تھے۔

تاہم ابھی یہ سب بہت دور کی باتیں تھیں۔

معاملہ ابھی تک تاریکی اور اُلجھن کے پردے میں تھا کہ اب پردۂ ظلمت سے کیا ظہور میں آتا ہے؟

چیف فلائٹ اٹینڈنٹ اب کسی مائیک پر اندر کاک پٹ سے پل پل کی خبر لے رہا تھا۔ مجھے اندر یاسمین کی بھی فکر ستا رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت طیارے کو ایک جھٹکا لگا۔ کئی خوف زدہ چیخوں کے ساتھ دعائیہ کلمات ابھرے۔

"او...... گاڈ......! او...... گاڈ......!"

میں خود پریشان ہوگیا۔

"ی ی...... کیا ہو رہا ہے......؟ ہمیں بتایا جائے......"

کسی مسافر کی خوف سے کپکپاتی آواز ابھری۔ چند دیگر مسافر بھی اسی طرح چلائے تھے۔

میری پیشانی پر بھی تشویش کی لکیریں گہری ہوگئیں۔ کیا ایسا ایندھن کی کمی کے باعث ہوا تھا۔

اسی وقت طیارے کو دوسرا جھٹکا لگا۔ مسافروں نے چیخیں مار کے رونا شروع کر دیا۔

"کیپٹن سے دریافت کرو مسٹر ہوبرڈ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے چلا کر چیف فلائٹ اٹینڈنٹ سے کہا۔ اس کا نام میں نے اس کی وردی پر بائیں جانب لگے ٹیگ پر پڑھ لیا تھا۔

"میں دروازہ کھولنے کی ہدایات لے رہا ہوں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ اس کا ابھی تک مجھ سے دل صاف نہیں ہوا تھا۔ اس کی اکھڑ مزاجی پر مجھے غصہ آگیا اور میں غصے سے دانت پیستا ہوا اس کی جانب بڑھا اور مائیک اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر کیپٹن سے طیارے کو جھٹکے لگنے کی وجہ دریافت کی۔

کیپٹن نے یہی بتایا کہ ایسا طیارے میں ایندھن کی کمی کے سبب ہو رہا ہے اور مزید یہ اب میں مائیک ...... فوراً ہوبرڈ کو تھما دوں۔

وہ اسے دورانِ پرواز طیارے کا دروازہ کھولنے کی کچھ ہدایات سمجھا رہا تھا۔ میں نے وہ ہوبرڈ کو تھما دیا۔

اسی وقت کوہارا کی اسپیکر میں آواز ابھری۔ وہ کم بخت مجھے مخاطب کرتے ہوئے برہمی سے بکواس کرنے لگا۔

"شہزی! بیچ میں مداخلت مت کرو اور جو تم سے کہا گیا ہے وہی کرو، ورنہ تمہاری ساتھی کی خیر نہیں ہوگی جو میرے قبضے میں ہے۔"

میں غصے سے بھنّا کر رہ گیا۔ کوہارا کی اس دھمکی پر دیگر لوگوں پر اثر پڑنے لگا کہ ان کی طرح میں بھی مجبور اور بے بس تھا، نیز یہ کہ مجھے استعمال کیا جا رہا تھا۔

اس کے بعد ہوبرڈ نے کریو کیبن سے ایک اور شخص کو آواز دے کر ..... بلایا اس کے بعد ایک طرف کو دوڑا، مجھے چونکہ اس کے ساتھ رہنے کی کوہارا مردود نے ہدایت کر

www.bookspk.site

رکھی تھی اسی لیے اس کے پیچھے میں بھی دوڑا۔

وہ ایمرجنسی ایگزٹ ڈور اوپن کرنا چاہتا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم ایک ایسے مختصر سے خلا میں آ گئے جہاں وہ دروازہ نصب تھا۔ اس پر شیشے کی کھڑکی بنی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں ایریل نما رسی کے ساتھ بندھے شخص کو موجود دیکھا۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور اس کی کمر پر کٹ بندھی نظر آتی تھی۔

”تمہارا کیا خیال ہے یہ کوئی کمانڈو ہو سکتا ہے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت ہوبرڈ سے کہا تو وہ طنزیہ مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

”ڈر گئے؟ ہو بھی سکتا ہے یہ کمانڈو ہو، میں تو خود دعا مانگ رہا ہوں کہ ایسا ہو۔“

مجھے اس غبی انسان کے جواب پر غصہ تو بے حد آیا تھا مگر میں ضبط سے کام لیتے ہوئے بولا۔ ”اچھی بات ہے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ...... صرف ایک کمانڈو کیا کر سکتا ہے؟“

”ہائی جیکرز بھی دو تین ہی ہیں۔“ ہوبرڈ بولا۔

”ٹھیک، لیکن انہوں نے طیارے کے حساس اور نازک مقام پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اس پوزیشن میں بھی ہیں کہ شکست کی صورت میں طیارے...... کو مسافروں سمیت تباہ کرنے میں ایک پل کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔“

میرے محتاط اور حقیقت پر مبنی تجزیے نے لمحہ بھر کو اس کے چہرے پر بھی تشویش اور خوف کے سائے لہرا دیے تھے۔

”اگر ایسا ہوا تو تم کس کا ساتھ دو گے؟“

”ظاہر ہے کمانڈو کا......“ میں نے کہا اور پھر ہوبرڈ نے آگے بڑھ کر دروازے کے چند لیورز کو ادھر اُدھر گھمایا اور مجھے ایک طرف ہٹ جانے کو کہا۔ میں سامنے سے ہٹ کر ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دورانِ پرواز طیارے کا ایمرجنسی دروازہ کھولنے کی ٹریننگ تھی۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اسے اپنی کارروائی کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کریو اس کی مدد میں شامل تھا۔

”پاور“ کی تربیت کے دوران میں مجھے بھی ایسے کئی مراحل سے گزارا جاتا رہا تھا۔ جس میں پیراشوٹنگ سے لے کر ”فری فال اسکائی جمپنگ“ بھی شامل تھی۔

لیکن میرے دماغ میں یہی خدشہ بگولے کی طرح چکرانے لگا کہ ایسی صورت میں کیا ہم سب کی سلامتی داؤ پر لگ سکتی ہے؟ یا پھر لامحالہ مجھے بھی اس کمانڈو کی مدد میں شامل ہونا پڑتا؟ ایک خیال یہ بھی ابھرا کہ ایسا سرے سے نہ ہی ہو تو اچھا تھا، فیول کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں خود اپنے طور پر ا مخدوش صورتِ حال سے نمٹنے کی کوشش کرتا۔

آخر میں ہوبرڈ نے ایک اسٹیئرنگ نما ہینڈل گھما ک دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی چیختی چنگھاڑتی ہواؤں کا شور ایک زوردار ائر پریشر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

میں نے دیکھا ہوبرڈ بڑی مہارت کے ساتھ اپنا کام نمٹانے میں مصروف رہا۔ وہ دروازہ پورا کھول کے ایک طرف کو ہٹ گیا تھا۔ تیز ہواؤں کے تھپیڑے اسے بری طرح ہلا رہے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے قریب نصب کسی آہنی راڈ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کریو بھی ہمت اور حوصلے سے کام لے رہا تھا۔ میں نے دیکھا، باہر ملگجے سے مناظر دکھانے والے خلا میں وہ ”باسکٹ سوار“ شخص اپنے ایک ہاتھ سے کچھ اشارہ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اپنے چہرے کے قریب نصب مائیک سے اپنے طیارے کے پائلٹ سے بھی مخاطب تھا۔

ہزاروں فٹ کی بلندی پر باسکٹ کبھی دروازے کے قریب آتی اور پھر دور ہو جاتی تھی۔ باسکٹ سوار ہر بار دروازے کے قریب ہونے پر کوئی عمل دہراتا تھا۔ وہ کوئی حلقہ دار رسی اندر اچھالنے کی کوشش میں تھا، دو تین بار کی کوشش کے بعد ہی وہ رسی، جس کے سرے پر آنکڑے جیسی کوئی شے بھی لہراتی نظر آتی تھی، بالآخر دروازے کے کسی فولادی رخنے سے اٹک گئی اور پھر اس کے بعد وہ شخص اسی رسی کی مدد سے باسکٹ سمیت اندر داخل ہو گیا۔

اس کے اندر داخل ہوتے ہی...... میں نے اپنی عقابی اور بھانپتی ہوئی نظریں اس کی حرکات و سکنات پر جما دیں۔ اس کے انداز و اطوار سے مجھے غیر معمولی چابک دستی اور ایک مخصوص قسم کی محتاط روی کا شائبہ جھلکتا محسوس ہوا جو صرف ایک تربیت یافتہ کمانڈو کے انداز کا ہی ”خاصّہ“ ہوتا ہے۔

وہ بڑے.... مشاق اور غیر معمولی پھرتی سے باسکٹ سے اچھل کر طیارے کے فرش پر اپنے قدم جما چکا تھا۔ کریو اور ہوبرڈ اسے سنبھالنے کو لپکے۔ نو وارد ”ہوا باز“ نے باسکٹ چھوڑ دی اور اس کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی چیختی دہاڑتی ہواؤں کا شور یکلخت تھم گیا۔ میں نے ہوبرڈ کو نو وارد کے کان کے قریب ہوتے اور اسے کچھ کہتے پایا، یوں اس نے کچھ کہتے ہوئے میری جانب بھی آنکھوں سے اشارہ کیا تھا۔

میری چھٹی حس پھڑکی۔ اس شخص نے فوراً اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ میری طرح ہی خاصا

www.bookspk.site

قدآور اور جسیم و جنگجو نظر آتا تھا۔ میں اس کی حرکت پر بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”اس وقت طیارے کو اس کھلونے سے زیادہ ایندھن کی ضرورت ہے، مسٹر!“ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ تاہم میں محتاط بھی تھا۔ کہیں یہ مجھے ہی فوراً گولی کا نشانہ نہ بنا لے۔ میرا ہی نہیں کوہارا کا بھی یہ خدشہ درست نکلا تھا کہ ”ری فیلنگ“ کی آڑ میں کمانڈو ایکشن ہو سکتا تھا۔

”بکواس بند کرو اپنی...... ہاتھ اوپر اٹھالو......“ اس نے مجھ سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ میں نے خاموشی اپنے ہاتھ اٹھا لیے اور اس غبی چیف فلائٹ اٹینڈنٹ کی طرف دیکھا، اسی بے وقوف نے اسے میرے بارے میں غلط بتایا تھا۔ لہٰذا میں گھور کر بولا۔ ”تم اسے غلط راہ دکھا کر اس طیارے کی سلامتی کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ اسے حقیقت کیوں نہیں بتاتے کہ میں ہائی جیکرز کا ساتھی نہیں ہوں اور...... تم، مسٹر کمانڈو......! کیا تم اتنے ہی گھاس چرے ہوئے ہو کہ مجھ نہتے آدمی کو دشمن سمجھ رہے ہو؟“

میری بات پر اس کمانڈو کی آنکھوں میں واضح طور پر اُلجھن سی تیر گئی اور وہ اسی نظروں سے ہوبرڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ کیا چکر ہے؟ صاف کیوں نہیں بتاتے کہ کون ہے یہ؟“

”میں بتاتا ہوں جناب اس کی حقیقت......“ نوجوان کریو نے کہا۔ اس نے اپنے آفیسر کی بھی پروا نہیں کی تھی .... اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی اور ذرا سی غلط فہمی خطرناک دشمن کے حق میں سود مند ہو سکتی تھی .... کریو نے کمانڈو کو مختصراً الفاظ میں اصل حقیقت بتا ڈالی۔

لیکن کمانڈو اتنی جلدی کب اعتبار کرنے والا تھا، اس نے... کریو کو حکم دیا کہ وہ اس کی پشت کے بیگ سے ہتھکڑی نکال کر میرے دونوں ہاتھ باندھ دے۔ جبکہ اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ بدستور میری ہی سمت کر رکھا تھا۔ مجھے سخت غصہ آنے لگا۔ کریو بھی تذبذب کا شکار ہو گیا۔

”تم پرے ہٹو...... میں نکالتا ہوں......“ ہوبرڈ دانت پیس کر بولا اور آگے بڑھا۔ ٹھیک اسی وقت طیارے کو ایک اور جھٹکا لگا۔ وہ کافی جھک گیا، نتیجے میں ہم سب کا ہی توازن بگڑا اور...... ہم اِدھر اُدھر لڑکھڑا کر گرنے لگے۔ مگر میرے لیے طیارے کا یہ دوسرا جھٹکا غیر متوقع نہیں تھا، لہٰذا میں نے بہ سرعت اپنے حواسوں اور خود کو سنبھالا اور کمانڈو پر چیتے کی طرح جھپٹا۔ وہ جب تک سنبھلا میں اسی کا پستول اس پر تان چکا تھا۔

”اب بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ...... اور میری بات کا یقین کرو، میں ان کا ساتھی نہیں ہوں بلکہ ایک عام مسافر ہوں، میری اپنی ساتھی ہائی جیکر سربراہ کے قبضے میں ہے۔“ میں نے اس کمانڈو سے درشت لہجے میں کہا۔

”پہلے طیارے کے فیول کا فوری بندوبست کرو اس کے بعد اس کے خلاف ایکشن کا سوچنا ہے، میرا وعدہ ہے میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ لیکن طیارہ اس کشمکش میں تباہ ہو جائے گا۔ ایندھن ختم ہونے کے قریب ہے اسی لیے یہ بار بار جھٹکے کھا رہا ہے۔“

اس بار کمانڈو ہی نہیں وہ غبی ہوبرڈ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہی کچھ تیزی سے نمٹایا گیا۔ طیارہ لمحہ بہ لمحہ اب نیچے جا رہا تھا۔ مسافروں کی خوف سے جانے کیا حالت ہو رہی ہو گی۔

کمانڈو کو اس قسم کی بھی تربیت تھی۔ اس نے فیول ٹینک والے گوشے میں جا کر جلدی جلدی اپنا کام نمٹایا اور اس کے والو کی خرابی درست کر دی۔ فیول تیزی سے ٹینک میں بھرنے لگا۔ طیارے نے دو ایک اور ہلکے جھٹکے کھائے اور پھر اپنی درست رفتار میں آ گیا۔

”میں اپنے اور ساتھی بھی یہاں اتارنا چاہتا ہوں۔ یہ پستول مجھے دے دو۔“ کمانڈو نے مجھ سے تیز لہجے میں کہا۔

”ابھی یہ خطرناک غلطی بھول کر بھی مت کرنا مسٹر!“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”پستول ابھی میرے ہاتھ میں ہی رہے گا۔ ہائی جیکر سربراہ اس وقت کاک پٹ سے سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ کسی دوسرے آدمی کو اترتے دیکھ لے گا تو میری ساتھی سمیت وہ دو پائلٹس کو بھی گولی کا نشانہ بنا دے گا، وہ بہت پاگل اور جنونی آدمی ہے اور اس سے زیادہ بے رحم بھی......“

مگر وہ دونوں اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہیں ہوئے۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

”ٹھیک ہے پھر تم دونوں اِدھر ہی بند رہو۔“ کہتے ہوئے میں اندرونی دروازے کی جانب الٹے پیروں پلٹا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں، کیا میں بھی......“ ایک دم نوجوان کریو نے مجھ سے کہا۔ اس کا نام بیٹ تھا۔

”آ جاؤ تم......“ میں نے اسے اجازت دی، وہ اپنے افسر کے مقابلے میں زیادہ سمجھ دار معلوم ہوتا تھا۔

”ٹھہرو......!“ اچانک کمانڈو بولا۔ ”ہم بھی تمہارے ساتھ تعاون کے لیے تیار ہیں۔“

”تمہیں اب تک صورتِ حالات کا ادراک ہو جانا

www.bookspk.site

چاہیے تھا۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر برہمی سے کہا۔ وہ دونوں شرمسار اور خجل سے نظر آرہے تھے۔

اس کے بعد ہم سب اندر آ گئے لیکن مسافروں والے کیبن میں آتے ہی میں ایک دم چونک پڑا۔

☆☆☆

کمبلر کی جگہ...... مجھے سے جی کوہارا...... گن ہاتھ میں لیے کھڑا دکھائی دیا تھا۔ اس نے شاید کمبلر کو کاک پٹ میں بھیج دیا تھا اور خود اس کی جگہ لے لی تھی۔ وہ بے حد مکار اور شاطر انسان تھا۔ ایسا اس نے یقیناً یہی دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ نازک مرحلہ (ایندھن بھرنے کا) دیکھے۔

میں نے کمانڈو سے چھینا ہوا پستول پہلے ہی اپنی پشت میں شرٹ کے نیچے بیلٹ میں اُڑس لیا تھا۔

"کام نمٹا لیا گیا شہزی......؟" کوہارا نے میری جانب گھور کر پوچھا۔

"ہاں!" اس کا بار بار...... یوں مخاطب کرنا خجل کر رہا تھا مجھے۔

"یہ وہی انجینئر ہے جو فاضل طیارے سے ایندھن کا مسئلہ حل کرنے آیا تھا؟" کوہارا نے پوچھا۔

"ہاں......" میں نے پھر مختصراً جواب دیا۔

"تو پھر اس کا کام ختم......" کہتے ہوئے اس نے اپنی گن سے بے دریغ فائر جھونک دیا۔ انجینئر (کمانڈو) کے سینے سے خون کا فوارہ ابلا اور وہ سینہ پکڑے تیورا کر سیٹوں سے ٹکراتا ہوا فرش بوس ہو گیا۔ کئی مسافروں کی بیک وقت چیخیں بلند ہوئیں۔ خود میں لحہ بھر کو بت بنا رہ گیا۔ ہوبرڈ اور بیٹ کے چہروں پہ خوف کی پرچھائیاں چسپاں ہو کر رہ گئیں۔

"معاف کرنا دوستو! میں کسی بیرونی آدمی کو یہاں زیادہ دیر ٹکنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا کام ہو گیا۔ اب آپ سب محفوظ ہو، مگر اس وقت تک جب تک کوئی میرے کام میں مداخلت نہیں کرے۔" کوہارا کا بیان جاری تھا۔ اس کی بربریت کا کھلی آنکھوں سے مظاہرہ دیکھ کر مسافروں کو چپ سی لگ گئی تھی۔

"تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو۔" ہوبرڈ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کوہارا نے مجھے آنے کا اشارہ کیا اور میں اپنے سینے میں کوہارا کے لیے غیظ و نفرت کے ہزاروں طوفان چھپائے آگے بڑھا۔

ڈرے سہمے بیٹھے مسافروں کی نشستوں کی درمیانی رو پر چلتا ہوا میں کاک پٹ کے پاس پہنچا تو کوہارا نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رک گیا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس رذیل اور سفاک جنونی درندے کا خون پی جاؤں۔ تاہم...... مجھے ایک اطمینان تھا کہ کمانڈو کا پستول اب میرے پاس تھا جس کا کوہارا اور اس کے ساتھی کو علم بھی نہ تھا۔

کوہارا اندر گیا اور اس کا ساتھی کمبلر باہر نکلا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ میں چاہتا تو اس پر ہلا بول سکتا تھا، مگر اندر یاسمین اب کوہارا کے رحم و کرم پر تھی۔

کمبلر نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور میں کاک پٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

فیول لینے کے بعد طیارہ جیسے اپنے اندر ایک خاموش طوفان چھپائے مطمئن انداز میں محوِ پرواز تھا۔

کوہارا نے یاسمین کو حسبِ سابق میرے حوالے کر دیا، جس پر میں نے اندر ہی اندر گہری اور طمانیت بھری سانس لی تھی۔ میں اب کسی وقت بھی موقع تاک کر کوہارا کی قبر کھودنے والا تھا......

ایک طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد حالات میرے حق میں ہونے لگے تھے۔ لیکن کاک پٹ جیسی نازک اور حسا...... جگہ پر کوہارا پر حملہ انتہائی سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔

"گریٹ......"

کاک پٹ میں سے جی کوہارا کی فاتحانہ آواز ابھری...... وہ اپنی اس قدر کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ اس مردود کو اس قدر مطمئن و مسرور دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا، لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اس رذیل کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

فیول...... کی ایمرجنسی بہ خیر و خوبی ٹل گئی تھی۔ یاسمین کو میں نے اپنی چیئر پر بٹھا دیا تھا۔ خود اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ان لمحات میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کوہارا مجھ سے کچھ بے پروائی سی برتتے ہوئے ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی تھی، یا تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ میں اس پر دوبارہ حملہ کرنے کا رسک لینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، یا پھر وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اپنی فطرت کے مطابق جس بربریت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی دھاک مسافروں سمیت مجھ پر بھی بیٹھ چکی تھی۔

"ہا...... ! مسٹر کیپٹن! اب بولو......! مصر تو پہنچ ہی جائیں گے ناں اب؟" تھوڑی دیر بعد کوہارا نے کیپٹن سے جیسے حظ اٹھانے والے انداز میں پوچھا۔

"ہاں! اب ہم قاہرہ ائرپورٹ آرام سے اتر سکتے ہیں۔" کیپٹن نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

"قاہرہ ائرپورٹ نہیں کیپٹن......!" اچانک کوہارا نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تت...... تو پھر......؟" کیپٹن پریشانی سے ہکلایا۔

"موبارغہ کے مضافات میں ایک کھلا میدان ہے۔ طیارے کو تمہیں وہیں اتارنا ہے۔" کوہارا نے کہا۔

"کک...... کیا؟" کیپٹن بُری طرح ہکلایا۔ "بب...... بھلا وہاں اتنا بڑا طیارہ کس طرح لینڈ کر سکتا ہے؟ وہاں تو سوائے مٹی اور ریت کے میدان کے سوا کچھ نہیں......"

"جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرنا ہے تم کو بڈھے بگلے......! تمہیں تو دورانِ پرواز ایندھن بھرنا بھی ناممکن نظر آ رہا تھا۔" کوہارا نے اپنی گن کی نال اس کی گردن سے لگاتے ہوئے کہا۔

یہی وہ وقت تھا جب میرا دایاں ہاتھ دھیرے دھیرے اپنی پشت کی بیلٹ کی جانب سرکنے لگا۔ یاسمین ہی نہیں کو پائلٹ بھی میری اس حرکت کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ طیارہ اب کیوں ہمارے ساتھ پرواز کر رہا ہے۔ اسے واپس لوٹ جانے حکم دو کیپٹن!" کوہارا چیخا۔ اس کی گھاگ نظریں ونڈ شیلڈ سے پرے ایک جانب اس فاضل طیارے کا جائزہ لینے لگیں۔

کیپٹن نے رابطہ قائم کیا اور پھر کوہارا سے بولا۔ "وہ اپنے ساتھی کی واپسی کے منتظر ہیں۔"

"ان سے کہو دفان ہو جائیں...... ان کا ساتھی مر چکا۔" کوہارا سفاکی سے غرایا۔

"کک...... کیا......؟ تت...... تم نے اُسے مار ڈالا......؟"

"ہاں......! میں بیرونی آدمی پر بھروسا نہیں کرتا۔ کہو ان سے ہماری نظروں سے دفع ہو جائیں۔" وہ دہاڑا۔ کیپٹن نے فوراً مائیک پر اس کے الفاظ دہرا دیے۔ وہ پریشان بھی ہو گیا تھا۔ اس کے چند ثانیوں بعد ہی وہ طیارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس میں یقیناً کمانڈوز سوار تھے، مگر کوہارا نے ان کا "مشن" ناکام بنا ڈالا تھا اور اب یہ پاگل جنونی کوہارا...... نجانے کون سے ایسے ویران مقام پر کیپٹن کو یہ دیوہیکل مسافر طیارہ اتارنے کے لیے دباؤ ڈالے ہوئے تھا۔ صورتِ حال پھر خطرناک ہونے لگی تھی۔

میں نے کسی خیال کے تحت کیپٹن سے پوچھا۔ "اس وقت ہم کس پوزیشن پر کس ملک کی فضائی حدود سے گزر رہے ہیں؟"

اس وقت تک میرا ہاتھ رینگتے رینگتے پتلون کی بیلٹ تک پہنچ گیا تھا اور انگلیاں پستول کے دستے کو چھونے لگی تھیں، ایسے میں میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کوہارا جیسے جنونی عفریت کو مجھ پر ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو وہ پاگلوں کی طرح اندھا دھند مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتا تھا۔ میں اس وقت مکمل رسک لیے ہوئے تھا اور اس کے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا، کیونکہ وہ بدبخت اپنی ضد کا پکا تھا۔ اس نے طیارے کو ایک غیر محفوظ مقام پر اتروانے کا حکم صادر کر دیا تھا جس میں جہاز کی تباہی کے پچاس فیصد سے زیادہ امکانات تھے اور یوں کئی سو مسافروں کی جانیں ہم سمیت داؤ پر لگ سکتی تھیں، نیز جانتا تھا میں کہ کوہارا کو اس کی مرضی سے کوئی بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔ ایسا وہ یقینی طور پر انٹرپول پولیس کے ہاتھوں گرفتاری اور اس کی کمانڈو ایکشن فورس سے بچنے کے لیے کر رہا تھا...... گویا یہ مردود خبیث اپنی جان بچانے کی خاطر سب کی زندگیاں خطرے میں ڈال رہا تھا۔

یہی وہ وقت تک تھا جب...... میرا ہاتھ بالآخر پستول کے دستے پر اپنی گرفت جما چکا تھا اور پھر اس سے پہلے...... کہ میں اسے باہر کھینچ کر کوہارا کو بے بس کرتا...... اچانک کیپٹن کی جوابی گفتگو ابھری۔ وہ کوہارا کی بات کے جواب میں کہہ رہا تھا۔

"ری فیلنگ کی وجہ سے میں راستہ بھٹک رہا ہوں۔ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ بدستور پینل بورڈ پر جھکا ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنے ساتھی پائلٹ کو بھی کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... بڈھے بگلے......؟" کوہارا نے غصے سے دہاڑ کر پوچھا۔

میری پیشانی پر اَن گنت سلوٹیں ابھر آئیں۔ کیونکہ میں راستہ بھٹکنے کا مطلب اچھی طرح جانتا تھا۔ میرا ہاتھ پستول پر ٹکا وہیں رک گیا تھا۔

"میں نے کہا ناں...... میں اپنے فضائی روٹ سے بھٹک گیا ہوں۔ ری فیلنگ کے پروسس کے دوران...... مجھے اپنے طیارے کی ڈائریکشن بدلنا پڑی تھی۔"

"مجھے یہ سبق مت پڑھاؤ......" کوہارا گرجا۔ "تم پائلٹ ہو اور تمہارے لیے یہ معمول کی بات ہے، مجھے چکر دینے کی کوشش چاہی تو یاد رکھنا تمہیں گولی مار کے تمہارے ساتھی پائلٹ کو تمہاری سیٹ پر بٹھا دوں گا۔"

"تم نہیں جانتے کہ اپنے طے شدہ فضائی روٹ سے

www.bookspk.site

www.bookspk.site

ہٹ کر پرواز کرنا کس قدر خطرناک ہوسکتا ہے۔'' کیپٹن بولا۔ ''مخالف سمت سے آنے والا کوئی بھی طیارہ دور سے نقطے کی صورت میں دکھائی دے گا اور ہمیں اپنے جہاز کا رخ بدلنے کا ... موقع ملے بغیر وہ ہم سے ٹکرا جائے گا۔''

کوہارا اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا۔ خود میں بھی ایک بار پھر اسی تشویش کا شکار ہوگیا۔

''تمہاری فائرنگ سے ونڈ شیلڈ کو ہی نہیں بلکہ پینل کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ کمپاس میں خرابی پیدا ہوگئی ہے۔'' کیپٹن کے ان الفاظ نے جیسے میری سماعتوں میں دھماکا کردیا۔

''کسی قریبی ائرٹریفک کنٹرولر سے رابطہ کر کے بھی تم اپنی ڈائریکشن درست کرسکتے ہو۔'' کوہارا نے مشورہ دیا۔

''س......سر......! ریڈار میں ایک اور نقطہ نظر آرہا ہے۔''

اچانک کوپائلٹ کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ میں نے دیکھا کیپٹن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ خود میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔ یاسمین الگ ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

کوہارا نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کیپٹن کی گردن پر اپنی گن کا بٹ رسید کردیا۔ ضرب زوردار ثابت ہوئی اور اس کا اوپری دھڑ پینل پر گرا اور سر وہیں ٹک گیا۔ آنکھیں بند ہوگئیں اور وہ پتا نہیں طیارے کی پرواز سے پہلے ہی ''اوپر'' پرواز کرگیا تھا یا پھر ابھی نیچے ہی طیارے میں تھا کہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں جو کافی دیر سے کوہارا سے کسی مصلحت کی بنا پر اپنے اندر کے ابال پر اب تک قابو پائے ہوئے تھا کوہارا کی اس جنونانہ بلکہ بے وقوفانہ حرکت پر جوار بھاٹے کی طرح پھٹ پڑا اور غایت درجے کی نفرت وغیظ تلے اپنے ہونٹ سکیڑ کے پستول نکال کر اس پر تان لیا۔

سے جی کوہارا کے سان گمان تو کیا اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ ہوسکا ہوگا کہ میرے پاس پستول جیسی کوئی شے بھی ہوسکتی ہے۔

''بس کوہارا......! اب بس......'' میں جوش غضب تاک تلے حلق تک پر زور لگا کر بپھری ہوئی آواز میں اس سے بولا۔ ''اب تم نے ذرا بھی حرکت کی تو اسی وقت جان سے چلے جاؤ گے۔ جہاں تمہارا ہاتھ ہے، وہیں رہنا چاہیے اور گن بھی وہیں پھینک دو۔''

کوہارا کے چہرے پر پہلے حیرت اور پھر تندی کے آثار ابھرے۔ اس کی اکلوتی آنکھ پھٹ کر رہ گئی تھی اور وہاں مجھے سرخ آندھی کا بگولا چکراتا نظر آیا۔ اس کی آنکھ شعلے برسانے لگی۔

میں نے اس کے گن والے ہاتھ پر تاک کر گولی چلا دی۔ جس طرح یہ بات بات پر فوراً گولی چلا کر مدِمقابل پر اپنی دھاک بٹھاتا تھا۔ یہی کچھ میں اب اس کے ساتھ بھی کر چاہتا تھا۔ اسی سبب جب اس نے میرا حکم ماننے میں تامل کیا میں نے گولی چلادی۔

کوہارا کی کراہ سے مشابہ چیخ ابھری اور...... گولی اس کا گن بدست بازو چھید ڈالا۔

''او گاڈ......! خ خ...... خدا کے لیے اپنی لڑائی چھوڑو......ایک جہاز اسی روٹ پر آرہا ہے......''

کوپائلٹ حلق کے بل لرزتی آواز میں بولا۔ میرا دھیان بٹا، ادھر گن اس کے ہاتھ سے چھوٹی۔ وہ سخت جانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کے لیے فرش پر جھکا۔ میں یہی سمجھا وہ اپنی گن اچکنے کے لیے جھکا ہے۔ مجھے سوچ لینا چاہیے تھا کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا تھا کہ...... مجھے خود پر پستول تانے دیکھنے کے باوجود ایسی احمقانہ حرکت کرتا، اسی لیے میں نے پوری تسلی کے ساتھ اس کے دائیں پہلو کا نشانہ باندھا اور ٹھیک اسی وقت اس نے بلف کیا، جھکتے ہی وہ وحشیانہ غراہٹ سے جھکائی دینے کے دوران ہی گھوما۔ گولی چلی نشانہ خطا گیا، مگر کوہارا کا ہدف بے خطا نہ گیا، اپنے بھاری بھرکم وجود کی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اس نے جھکے جھکے انداز میں لات چلا دی۔ نشانہ میں نہیں تھا، کوپائلٹ تھا۔ اس بے چارے کے سینے پر کوہارا کی اس زور سے ٹانگ پڑی کہ وہ حلق کے بل دل دہلا دینے والے انداز میں چیخا، چونکہ اس کی ٹانگیں کرسی سے بندھی ہوئی تھیں، مگر کوہارا جیسے گینڈے کی ٹانگ کی ضرب اس قدر زوردار اور طوفانی انداز کی تھی...... کہ کرسی فرش سے اکھڑ گئی، وہ کرسی سمیت جھٹکے سے اُچھلا اور مجھ سے ٹکرایا۔ میں لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے گیا اور دیوار سے جالگا۔

یاسمین دہشت زدہ انداز میں چلّائی۔

''ششش......شہزی......! ووو......وہ......وہ دیکھو......''

اس نے ونڈ شیلڈ کی جانب اپنے ہاتھ کی انگلی کا اشارہ کیا۔

میری اور کوہارا کی بیک وقت پھٹی پھٹی آنکھیں طیارے کی ونڈ شیلڈ پر پڑیں۔

ہمارے طیارے کی ونڈ اسکرین کے پار جہاں تک ہماری نظر جا سکتی تھی، دیکھا کہ... ایک اور مسافر بردار دیوقامت طیارہ ہمارے طیارے کی سمت طوفانی رفتار سے بڑھا چلا آرہا تھا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

www.bookspk.site

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اُن کی شخصیت میں استقامت اور دبدبہ نمایاں ہوتا ہے... بلکہ ان کی گفتار اور کردار کا لازمی جزو بن جاتا ہے... ایک ایسی پُربہار شخصیت کا ماجرا... وہ شاعر بنے پھر بزبانِ شاعر کلام سنانے کی ذمّے داری بھی نبھانا پڑی... بات یہیں تک نہ ٹھہری بلکہ بڑھتی ہی چلی گئی...

لبوں پر مسکان بکھیر دینے والے ایک کلاکار کی پُرلطف بپتا

کلاکار

تمکین رضا

اُس دن اندازہ ہوا کہ بینک منیجر ہونے سے کہیں اہم کچھ اور بھی ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ میرا رشتہ اسی بنیاد پر لگا تھا کہ میں ایک اچھے بینک میں منیجر تھا۔

روشنی ایک اچھی لڑکی تھی۔ وہ میرے ابو کے دوست کی بیٹی تھی۔ میں شروع ہی سے اسے پسند کرتا تھا پھر قسمت نے بھی ساتھ دیا اور میری اس سے منگنی ہوگئی۔ چھ مہینوں کے بعد ہماری شادی ہونے والی تھی۔

اس دوران میں ہم ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔ میری یہ کہانی اس دن سے شروع ہوتی ہے جب میں نواز کے چکر میں آیا تھا۔ نواز بینک میں میرا ماتحت تھا۔

اس دن بینک میں کام کارش بہت کم تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا کہ اسٹاف کا ایک بندہ نواز کمرے میں داخل ہوا۔

''سر! آپ کو ایک چیز دکھانے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

www.bookspk.site

پانچواں حصہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ترتیب:

ایم۔ طلحہ عامر

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت رہی ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو مردود کے دماغ کا سچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، تجسس اور ایکشن سے بھرپور، سنسنی خیز اور انتہائی دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 52

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک دھندلی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل داوا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل داوا شہزی سے خار کھانے لگا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو نیک شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اجیکٹرم" کا ڈپٹی چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اجیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی تاجر ڈکو مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فنگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے جسے لولووش اپنی شکست سمجھتا ہے۔ ایک تو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا نکوہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا نادہندہ ہے اور دوسری طرف، وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام مجاہد اور غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹیکس کا ایک افسر کرنل سی بی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اجیکٹرم اور بلیوٹیکس کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل داوا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل داوا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈاکٹر خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فنگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے۔ ٹائیگر فنگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز وہاں تھی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوبارا شہزی کو ٹائیگر فنگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک فیکٹری یونٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جعفری سے ہوتی ہے جو کبھی اجیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی بی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی بوٹ میں بلیوٹیکس کے چندر ناتھ، شیام اور گوریلا آتے ہیں۔ دو شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹیکس کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹیکس کے چیف سی بی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا۔ تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن وبھوتی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پرفریبیوں کے باوجود وہ اس بھولی سی بستی میں تھے کہ کوبارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی بی بھوانی تھا۔ یہی اس کی منزل تھی۔ سوہن لال اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لفنگے ٹپ ٹپ کر کے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی بیٹی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹیکس تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹیکس کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی بی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھار رکھا تھا۔ سی بی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

www.PakiBooks.Site

نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل داوا اس کے قبضے میں تھے اور "کالا پانی" "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی بی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں گوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "گل منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی بی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو گینگ کا ایک بڑا گینگسٹر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ گل منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جہاں گئے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بجھے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ دونوں باپ بیٹی بچھوؤں کے شکاری تھے اور ان کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اسی اثنا میں برمی مسلم گروپ کا کمانڈو لا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا لائسنس ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر وہ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گل منجاریوں سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مقاصد کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈورک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مقاصد کے لیے گل منجاریوں سے مل کر جاروا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاروا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہنواز جو پہلے ہی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہنواز خان دھوکے سے کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کروا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل داوا کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہنواز خان اپنا قیدی لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل جانڑیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہیں شاہنواز کی بیٹی سونہیں بھی ساتھ ہوتی جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہیں کو اپنے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیتی فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہنواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت کچھو کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو سانچے والا گرلو یہ کو ٹاٹون کے شکنجے میں دے دیتا ہے۔ پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل داوا اور شکیلہ کے ہمراہ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکمہ دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپا کو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شدید لڑائی کے بعد وزیر جان کو [illegible] کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپا کو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپا کو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرالیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپا کو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈالف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اجیکٹرم کے لوگوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ شہزی، روڈالف کے ساتھ کیٹ اور بروجیٹ کو زخمی کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ روڈالف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ روڈالف کی دوست یاسمین اسے مل جاتی ہے ... وہ دونوں شہزی کو مصر لے جانا چاہتے ہیں مگر شہزی راضی نہیں ہوتا۔ وہ ایک بار پھر تو بارڈ کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈالف مارا جاتا ہے۔ اب یاسمین کی ذمے داری شہزی کے سر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www.PakiBooks.Site

اب شاید کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

بھیانک اور یقینی موت، اٹل تھی۔ بس...... ایک ذرا پلک جھپکنے کی ہی تو دیر تھی۔ اس کے بعد اتھاہ تاریکی اور پھر مکمل فنا۔

ہم سب جیسے پل کے پل ایک دوسرے کی موجودگی کو بھی بھول چکے تھے۔ ہماری پھیلی ہوئی آنکھیں سامنے ونڈ اسکرین پر جمی مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک دوسرے دیوزاد مسافر طیارے کو تک رہی تھیں۔

بقول گزشتہ کو پائلٹ کے فضا میں روٹ سے بھٹک جانے کے بعد دور مخالف سمت سے نظر آتا طیارہ، پہلے نقطے کی شکل میں اور پھر لمحوں میں اتنا قریب آجاتا ہے کہ جہاز کو رخ بدلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔

اور واقعی یہ سڑک نہیں تھی کہ فوری طور پر راستہ بدل لیا جائے۔ لیکن فضا میں ایسا ہونے کا مطلب ایک خوفناک تصادم تھا اور ہم شاید اسی امر کے "ہونے" کے منتظر رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رکھتے تھے۔

میرا تو جیسے دل ہی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ہم سب کی زبانیں گنگ ہوچکی تھیں۔ یہی وہ لمحات ہوتے ہیں جب یقین آتا ہے کہ خدا موجود ہے۔ معجزے بھی وہی پیدا کرتا ہے، چاہے تو موت کی وادیوں میں گرتے ہوؤں کو یکلخت بچالے یا زندگی کی گود میں ہنسی خوشی کھیلتے کو یکایک موت کی آغوش میں دھکیل دے۔

ہمارے طیارے میں پہلے ہی حالات دگرگوں تھے یوں ہم اپنے بچاؤ کا راستہ کھو چکے تھے، لیکن سامنے سے آنے والا طیارہ چونکہ اپنے طے شدہ فضائی روٹ پر تھا، شاید یہی ایک بہانہ تقدیر کو مقصود تھا کہ اس کے پائلٹ نے یقیناً اپنے ریڈار میں پہلے ہی سے ہمارے طیارے کو نقطے کی صورت میں دیکھتے ہی لیتے اور ہمارے بچاؤ کی بھی تدبیر کرنے کی اپنی سی کوشش کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مخالف سمت سے آتا ہوا طیارہ قریب آتے آتے بھی عمودی رخ پر ہونے لگا تھا اور ہمارے گویا سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔

بے اختیار ہمارے سینوں میں اٹکی ہوئی سانسیں طائر قیدی کی طرح پھڑپھڑا کر نکلی تھیں۔ ہم سب موت کے منہ سے بال بال بچے تھے۔ چند ثانیے تو سکتے کی سی کیفیات سے دوچار رہے تھے۔

میں کو پائلٹ کا دھکا لگنے سے ابھی تک کاک پٹ کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پستول میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا تھا۔

حالات سنبھلتے ہی کوہارا نے وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ مجھ پر جست لگا دی۔ میں اس حملے کے لیے تیار تھا۔ فوراً اپنی جگہ چھوڑ دی، کوہارا اپنے گینڈے جیسے جسم کے زور پر دیوار سے ٹکرایا تو میں نے سنبھل کر لات چلا دی، جو اس کی کمر پر لگی۔

وہ کسی وحشی سانڈ کی طرح پلٹا، اور اپنے بھاری جثے کے باوجود اچھلا اور مجھ پر آرہا۔ میں نے اسے اپنے توانا بدن کی طاقت سے سنبھالنے کی کوشش چاہی تھی مگر شاید میرا ایک پاؤں کسی شے سے رپٹا۔ ہم دونوں ہی نیچے گرے۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے طیارہ ڈول رہا ہو یاسمین پھر حلق کے بل چلائی۔ کاک پٹ کے دروازے کی مخصوص بپ بجنے لگی۔ کوئی باہر سے اندر آنا چاہ رہا تھا۔

"جج...... خدا کے لیے لڑائی چھوڑ دو...... اس طیارے کی فکر کرو، ہم ابھی تک سخت خطرے میں ہیں۔"

اس بات نے مجھے ہی نہیں کوہارا کو بھی چونکا دیا۔ ہم دونوں بغیر ایک دوسرے سے دست و گریباں کیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

طیارہ واقعی بری طرح ڈول رہا تھا۔ میرے چہرے پر سوالیہ نشان نے ایک جال سا بُن دیا۔ یہی حالت کوہارا کی تھی۔

دونوں پائلٹ بے سدھ تھے جبکہ کو پائلٹ تو مجھے ختم ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کوہارا کی طوفانی ضرب نے اسے کرسی سمیت اکھاڑ پھینکا تھا اور وہ غریب اب بھی کرسی سے بندھا کاک پٹ کے فرش پر عجیب انداز میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ یاسمین اسے سنبھالنے کی کوشش میں تھی اور ہم سے بھی مخاطب تھی۔

کیپٹن بھی کوہارا کی ایک ضرب کا نشانہ بننے کے بعد چینل پر اپنا سر دیے ہوئے تھا اور اب لڑھک کر گر چکا تھا۔

"کوہارا......! اس وقت ہم سب کی بقا سب سے اہم معاملہ ہے۔ اس کیپٹن کو ہوش میں لاؤ۔" میں نے خوفناک نظروں سے کوہارا کی طرف دیکھ کر کہا۔

یہ بڑے سنسنی خیز اور اعصاب شکن لمحات تھے۔ کاک پٹ کی بپ مسلسل گونج رہی تھی۔

"میرا ساتھی اندر آنا چاہتا ہے۔" کوہارا نے اپنے زخمی بازو کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"اسے باہر ہی رہنے دو اور کیپٹن کو ہوش میں لاؤ۔" میں نے تحکمانہ کہا مگر کوہارا بھی اڑ گیا۔

"ہرگز نہیں، میرا ساتھی اندر آئے گا۔" اس کی ہٹ دھرمی پر میرے اندر کا ابال فزوں تر ہونے لگا۔ ٹھیک اسی

www.PakiBooks.Site

پٹ کے اندر اسپیکر پر کسی اٹینڈنٹ کی گھبرائی ہوئی آواز ابھری۔

"جہاز کی چھت میں سوراخ ہو گیا ہے۔ کچھ کرو......"

یہ شاید کوئی فلائٹ اٹینڈنٹ یا کریو تھا۔ ہم سب کے [illegible] تھے۔

"سوراخ کیسے ہو گیا؟" کوہارا ہونقوں کی طرح میں بڑبڑایا۔ اس کے دماغ میں عقل نام کی کوئی شے نہ سے صرف بے گناہوں کا خون بہانا آتا تھا جبکہ میں سمجھ ہمارے اوپر سے گزرنے والے طیارے کا کوئی نچلا ہوا حصہ ہمارے طیارے کی چھت پر رگڑ کھا کر گزرا ہو ہے اس طیارے کو بھی اسی طرح کی "ایمرجنسی" کی ت حال پیش آگئی ہو۔

یہاں خطرات کی بھرمار تھی۔ ریڈار اور روٹ میپ پر پائلٹ ایک اسکرین دکھا چکا تھا جس پر سرخ لکیروں کا پھیلا ہوا تھا، ادھر ہی کپاس بھی شو کر رہا تھا، مگر اب حصہ اس دھاچوکڑی میں ناکارہ ہو چکا تھا۔

ہمیں اسی طرح ایڈمن کی فضا میں ری فلنگ بھی ایک پھر ایک انوکھا تجربہ تھا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر تا تھا۔ ٹیل کا پرزے تو یہ سب با آسانی ممکن ہو سکتا تھا، کیونکہ ایسی معلق بھی ہو سکتے تھے مگر دو ایک ساتھ تیز رفتار پرواز تے جہازوں میں یہ عمل قریباً مشکل اور "رسکی" ہوتا ہے۔ میں ہوا کے تیز ترین دباؤ کا دخل ہوتا ہے۔ اسی لیے مستعمل ہونے والے ٹیکنیکل لوازمات بھی اسی ساخت مخصوص انداز کے ہوتے تھے۔ یعنی بند جالی دار باسکٹ، کارتی نما اریل جو ہوا کے دباؤ کو بس ایک حد تک ہی تے کرتے ہوئے اس قدر جھول جاتا تھا کہ وہ اونچا ہو کے ے جہاز کے مطلوبہ حصے تک پہنچا رہتا تھا، اگرچہ احتیاط نظر "باسکٹ سوار" پیراشوٹ باندھے ہوتا ہے۔ کوہارا کامیاب ثابت ہوئی تھی۔ اس نے یقیناً یہ عمل دیکھ رکھا تاہم میرے لیے یہ پہلی بار ہوا تھا۔

بہرکیف اس اطلاع نے ہمیں ایک بار پھر ایک ے دہلا دیا۔

"دروازہ کھول دو...... ہمیں باہر جا کر صورتِ حالات کا لینا پڑے گا۔" کوہارا نے چلا کر کہا۔

میں نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے یاسمین کو ب کیا۔ "یاسمین! تم کیپٹن کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو ہ طیارے کا کنٹرول سنبھال سکے۔" اس کے بعد میں ا کی طرف جلتی سلگتی نظروں سے گھور کر مخاطب ہوا۔

"چلو...... صورتِ حال اپنی آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ تاکہ کیپٹن کو آ کر بتا سکیں اس بارے میں......"

میری بات پر کوہارا نے حرکت کی لیکن آگے بڑھنے کی نہیں، اس نے پھرتی سے قریب پڑی اپنی گن اٹھالی۔ میرا دماغ پھر بھنا گیا۔

"کوہارا......! تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ......"

"بکواس بند کرو اپنی......" وہ دہاڑ کر بولا۔ "دروازہ کھولو اور میرے ساتھی کو اندر آنے دو، اور یہاں سے کوئی بھی باہر نہیں جائے گا۔" اس نے گن مجھ پر تان لی تھی۔

اس کی دھمکی پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ پھر اس نے یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ یاسمین اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو گئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور کمہلر گن سمیت اندر داخل ہوا۔

یہاں کا منظر دیکھ کر پہلے تو وہ بری طرح چونکا، اسے یہاں ہونے والی زبردست گڑبڑ کا اندازہ ہوا۔ پھر جب اس نے کوہارا کو ہم پر گن تانے دیکھا تو اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ اس کے بعد اس نے بھی وہی کچھ بتایا جو ہم اسپیکر پر سن چکے تھے۔

"تم نے خود جا کر جائزہ لیا، آخر ہوا کیا ہے؟" کوہارا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب میں کمہلر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"تو پھر جاؤ اور عملے کے کسی آدمی کو ساتھ لے جا کر دیکھو اور آ کر جلدی بتاؤ۔"

جہاز اس بار بری طرح ڈولا۔ ہم سب کے قدم اکھڑ گئے اور ایک دوسرے پر جا گرے۔ ایک لمحہ کو یوں لگا جیسے طیارہ نیچے کی طرف جا رہا ہو۔ یاسمین کی چیخ ابھری۔ میں سنبھالا لیتے ہوئے اٹھا۔ کوہارا بھی اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنی گن اٹھانے کے چکر میں تھا۔ میں نے اس پر لعنت بھیجی اور کوئی پروا کیے بغیر کیپٹن کو ہوش میں لانے کی تگ و دو شروع کر دی۔

کوہارا اپنی گن سنبھال کر خاموش کھڑا رہا۔ کمہلر ہنوز اس کے حکم کا منتظر تھا۔ یاسمین ان کی منت سماجت کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ نوجوان کو پائلٹ مر چکا تھا۔ مجھے اس کی موت کا دکھ تھا۔ وہ کوہارا کی روایتی بربریت کا شکار ہو چکا تھا۔

کیپٹن کو ہوش آیا تو میں نے اسے مختصر ترین لفظوں میں ساری صورتِ حالات سے آگاہ کیا اور طیارہ کنٹرول کرنے کا کہا۔ وہ اپنا سر جھٹکتا ہوا اٹھا اور ایک نفرت انگیز نظر کوہارا پر ڈالی پھر اپنی سیٹ پر آ گیا۔

www.PakiBooks.Site

"طیارے کی چھت میں کوئی بیرونی نقص پیدا ہو گیا ہے، فوراً عملے کے انجینئرز کو مطلع کرو۔" وہ بولا۔

"انہیں اب تک تو پتا چل جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اور وہ حرکت میں بھی آ چکے ہوں گے۔"

"لیکن میرا خرابی کی کنڈیشن سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ میں اسی انداز کے ایفرٹس لے سکوں۔" کیپٹن بولا۔

میری بات صحیح ثابت ہوئی تھی۔

"سن لیا تم نے، مجھے خود جانا پڑے گا۔" میں نے دانت پیس کر کوبارا کی طرف گھور کر کہا۔

"ہاں! مگر یاد رکھنا کوئی چالاکی تمہیں مہنگی بھی پڑ سکتی ہے۔ یہ ایرانی شہزادی میرے قبضے میں ہے، یہ مت بھولنا۔" وہ کمینے پنے سے مسکرا کر بولا۔

"تم دونوں کی لڑائی نے پہلے ہی ہمیں خطرات سے دوچار کر رکھا ہے۔ فار گاڈ سیک، اب چھوڑو یہ سب اور طیارے کو بچانے کی سوچو۔ ہم سب کی جانیں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔" کیپٹن نے چیخ کر کہا۔

میں نے کوبارا کو کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا۔ ہمارے جاتے وقت اس نے اپنے ساتھی کو ہدایت کی تھی کہ عملے کے کسی فرد کو فرسٹ ایڈ کے لیے اندر بھیج دے۔ کمبلر بھی کوبارا کے اشارے پر مسافر کمپارٹمنٹ میں آ گیا اور گن تانے وہیں کھڑا رہا۔ تاہم اس نے کوبارا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے عملے کے ایک فرد کو فرسٹ ایڈ باکس کے ساتھ کاک پٹ میں جانے کا حکم دیا۔

ادھر مسافروں کے چہرے خوف سے پیلے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ یہاں ہواؤں کا دباؤ میں نے محسوس کیا جو طیارے کی اوپری منزل سے آ رہی تھی اور وہاں کے مسافر نیچے آ گئے تھے۔ یہاں کافی رش لگ گیا تھا۔

عملے کے چند ارکین کے ساتھ میں اوپری منزل میں آیا تو دیکھا طیارے کی چھت ایک لمبی سی لکیر کی طرح تھوڑا چٹکی ہوئی تھی۔ یقیناً اوپر سے گزرنے والے طیارے کی کوئی رگڑ لگی تھی۔ اس موٹی اور چوڑی لکیر میں ایک جانب باریک سا سوراخ ہو گیا تھا۔ مجھے صورتِ حال اتنی نازک نہیں لگی البتہ یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ زیادہ دیر تک یہ لکیر باریک نہیں رہے گی۔ ہوا کے مسلسل دباؤ کے باعث یہ ایک بڑے شگاف کی صورت اختیار کر سکتی تھی۔

میں نیچے کاک پٹ میں آ گیا۔ کوبارا، یاسمین کے قریب کھڑا اس سے بے ہودگی اور یاوہ گوئی میں مصروف تھا۔ اس کے زخمی ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

میں نے جلتی نظروں سے کوبارا کو گھورا۔ وہ تاؤ دلا والے انداز میں مسکرایا۔ خطرے میں ہونے کے باوجو بدبخت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس طرح کے دشمن میرے ہمیشہ سے ہی بڑے سخت کوش ثابت ہوئے تھے جو خطر میں بھی مسکراتے ہوں۔

میں نے کیپٹن کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس بھی یہی کہا کہ زیادہ دیر تک ایسا نہیں چلے گا، ہمیں کسی ائرپورٹ پر لینڈ کرنا پڑے گا۔

"بڈھے! موبارغہ کا صحرا اب یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"ہم راستہ بھٹک چکے ہیں۔ کمپاس کام نہیں کر رہا اب صورتِ حال یہ ہے کہ کسی بھی قریبی ملک کے ائرپو سے رابطہ ہوتے ہی ہمیں وہاں لینڈ کر جانا چاہیے۔"

کوبارا کو کیپٹن کی بات پر پھر طیش آ گیا۔ اس غضب ناک انداز میں حلق سے غراہٹ بلند کرتے ہو دوبارہ اس کی کھوپڑی پر اپنی گن کا آہنی کندہ رسید کرنے کوشش چاہی تھی مگر رک گیا۔ وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

"بڈھے! زیادہ چالاکی مت دکھاؤ۔ اس طیارے موبارغہ کے مقام پر ہی اتارنا ہوگا، ورنہ پھر سب اپنی موت انتظار کرو۔"

حقیقت یہ تھی کہ وہ کیپٹن کوبارا کی کوئی بات تسلیم نہیں رہا تھا مگر بعد میں کوبارا ہی کی بات درست ثابت ہوئی اسی باعث کوبارا اب اس کی کسی بات پر یقین کرنے کو تیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں کھڑوسوں کے درمیان پھر بحث چھڑتی، میں نے کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"کیپٹن! تم اس شخص کو نہیں جانتے۔" میرا اشارہ کو کی طرف تھا۔ "یہ تمہاری کوئی بات تسلیم نہیں کرے گا اور اس کی فطرت جانتا ہوں۔ یہ اپنے ساتھ کئی بے گناہو موت کے منہ میں دھکیل سکتا ہے، اس کے لیے یہ کھا سودا نہیں ہے۔ ہم پہلے ہی لڑائی اور بحث میں اپنا وقت بر کے خطرات بڑھا رہے ہیں۔ تم بھی اب اپنی ہٹ دھرمی باز آ جاؤ اور طیارے کو موبارغہ میں ایمرجنسی لینڈنگ کے تیار کرو۔ یہی ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔"

میری بات پر کیپٹن کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آ مجھے لگا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پیشہ ورانہ فرائض کی ایک سی کوشش میں لگا ہوا تھا اور ہمیں بلف کرنے کی سعی مصروفِ کار بھی۔ یوں بھی وہ اب تک کوبارا کے خطرناک اور اس کی ذہنیت کا اندازہ لگا ہی چکا تھا۔ وہ ہولے سے

میں کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی۔

"ہاہا...... ہاہا...... گڈ...... شہزی! تم میرے سب سے ہین اور عقل مند دشمن ہو۔" کوبارا نے اپنی کامیابی پر ست قہقہہ لگایا۔ فتح کی خوشی سے اس کا سرخ ہوتا چہرہ رہ ہو جاتا تھا۔

"کاش! تم زندہ رہو اور میرے مقابلے میں آتے میرے عظیم دشمن۔ بدھا سے میری یہی دعا ہے۔"

میں نے اس کی فضول گوئی کا کوئی جواب نہیں دیا اور ن کی طرف تکتا رہا۔

میرے سمجھانے پر وہ اپنے "کام" میں منہمک ہو چکا

کافی دیر تک وہ ونگ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اس لمحے یوں لگا جیسے طیارہ اپنی سمت بدل رہا ہو۔ اس کا بیلنس ابھی تک آؤٹ تھا مگر کیپٹن اسے سنبھالے ہوئے تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مژدۂ جانفزا سنایا کہ ہم پہنچنے والے ہیں۔

کوبارا نے خوشی اور فتح کے جوش کے ایک نعرہ بلند کیا۔ پھر سے قریب آن کھڑی ہوئی تھی۔ طیارہ اپنی پرواز "ختم پشتم" جاری رکھے ہوئے تھے۔

☆☆☆

طیارے کی جہازی سائز ونڈ اسکرین کے پار شفق رنگ بنے تھے۔ آسمان دھوپ کی شدت سے چمک رہا تھا۔ رخ بدل رہا تھا۔ شکر تھا کہ کیپٹن کو میری بات سمجھ آ گئی وہ اب اپنی ہٹ دھرمی سے باز آ گیا تھا۔

شاید اب تک کی خوں ریزی اور موت کے منہ میں بال بال بچنے کے سبب وہ بھی کسی چالاکی کے بغیر احکامات ماننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"طیارہ بدستور اپنی بلندی گھٹا رہا ہے۔" خاصی دیر کی بعد کاک پٹ کی دھڑکتی فضا میں کیپٹن کی آواز

"لگتا ہے تھوڑی دیر بعد تھروٹل کام کرنا چھوڑ دے چہرہ فق ہو گیا۔ طیارہ مسلسل ایمرجنسی کی حالت میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"کیپٹن! تم خود ہی کوئی فیصلہ کر کے جہاز کو کسی کھلے میں کریش لینڈنگ کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہو؟" مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"میری دسترس میں ایسا کوئی میدان یا مقام نہیں ہے جہاں میں اس طرح کی کوشش کر سکوں۔" کیپٹن نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر فکر و تشویش کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

"ہم اس وقت کس مقام پر ہیں؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔ کوبارا خاموش تھا۔ تاہم ہماری گفتگو کو غور سے سن رہا تھا۔

"بحرۂ احمر کے قریب قریب ہیں۔" کیپٹن نے جواب دیا تو کوبارا نے فوراً کہا۔

"ہم اپنی منزل کے قریب ہیں۔ اسے پار کر کے جنوب مغرب کی سمت اتنی ڈگری کا زاویہ بناؤ اور طیارے کو ایمرجنسی لینڈنگ کی پوزیشن میں لے آؤ۔"

کوبارا کو ایسی ٹیکنیکل اصطلاح میں فضائی روٹ کا اظہار کرتے دیکھ کر سوائے میرے کسی کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیپٹن نے کوئی تاثر نہیں لیا تھا۔ میری سمجھ میں یہی آ سکا کہ کوبارا کا یہ پلان پہلے سے ہی مرتب تھا۔ لہٰذا بحرۂ احمر کا سن کر اسے یہ اصطلاح پہلے سے ازبر تھی یا کرائی گئی تھی۔ یقینی طور پر اسے بریف کیا گیا تھا پہلے سے......

"میں کوشش کرتا ہوں، خدا کرے کہ طیارہ بحرۂ احمر سے بخیریت گزر جائے۔"

"بحیرۂ احمر کوئی اتنا بڑا سمندر نہیں ہے بڈھے بگلے!......" کوبارا ایک بار پھر طیش میں آ گیا۔ "اس کا پاٹ زیادہ بڑا نہیں۔"

کیپٹن نے اسے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ تاہم اس نے فوراً اٹھ کر مسافروں تک یہ اعلان پہنچا دیا کہ وہ سیٹ بیلٹ سمیت پھولی ہوئی حفاظتی جیکٹیں جسموں سے باندھ لیں وغیرہ۔

یہ ہدایات دینے کے بعد اس نے ہم سے بھی یہی کہا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یہاں بیٹھنے کے لیے صرف ایک ہی سیٹ بچی تھی۔ دوسری اکھڑ چکی تھی۔

"میرا خیال ہے ہمیں مسافروں کے کمپارٹمنٹ میں جا کر سیٹیں سنبھالنا ہوں گی۔"

"میں اپنے پاپا کے سوئٹ میں جانا چاہوں گی۔ وہ حفاظتی اقدامات کرنے سے معذور ہیں۔" یاسمین نے اچانک گہرے تفکر سے کہا۔

"کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" کوبارا نے اس کی طرف گھور کر کہا۔ "میں عملے کے کسی آدمی کو ہدایت کر دیتا ہوں، اس بڈھے کھڑوس کی فکر نہ کرو، وہ میرے لیے بھی اہم ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے کیپٹن کو یہ حکم دینے کا کہا اور اسے سونٹ نمبر وغیرہ بتادیا۔

کیپٹن تلخی سے بولا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ عملہ حرکت میں آچکا ہوگا۔ وہ ......"

"شٹ اپ!" کوہارا نے اسے جھڑک دیا۔ "وہ آدمی میرے لیے بہت اہم ہے۔ اس وقت سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے۔" ناچار کیپٹن نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور پھر کوہارا نے اس سے مائیک لے لیا اور خود بھی اپنے ساتھی کسبلر کو حکم دیا کہ وہ یہ کام اپنی نظروں کے سامنے کروائے اور خود بھی وہیں جا کر بیٹھ جائے۔

اس کے بعد وہ کیپٹن سے درشت لہجے میں بولا۔

"کتنی دیر میں کریش لینڈنگ متوقع ہے؟"

"اگلا نصف گھنٹا اہم ہے۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے کیپٹن! مگر یاد رکھنا کسی بھی قسم کی چالاکی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے۔"

"میرے ساتھ کسی ایک کو یہاں رہنا ہوگا۔" کیپٹن نے اچانک کہا۔ "میں اکیلا طیارہ اس طرح لینڈ نہیں کر سکتا۔ اسے سنبھالنے کے لیے مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہوگی۔"

"لیکن ہم تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں کیپٹن؟" میں نے تفکر سے کہا۔ "ہم میں سے کسی کو بھی اس کا تجربہ نہیں ہے۔"

"تجربے کا مطلب تجربے سے ہی نکلتا ہے۔" کیپٹن نے کہا۔ "فقط میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا اور بس۔"

"ٹھیک ہے پھر میں رک جاتا ہوں مگر سیٹ؟" میں نے کہا۔

"یہاں بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ تھراٹل کے اس دوسرے حصے کو مضبوطی سے پکڑ لو۔"

میں اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔ مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی تھی۔ کوہارا میری بے چینی بھانپ کر سحی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"اس شہزادی کی فکر نہ کرو، میں اسے اپنے ساتھ لے جا کر بٹھاؤں گا اور تم یہاں پورے اطمینان سے کیپٹن کی ہدایات پر عمل کرو۔ لیکن یاد رکھنا شہزادی! اگر تم نے اس بڈھے بگلے کے ساتھ کوئی چال چلنے کی کوشش چاہی تو ......" اس نے تہدید آمیز انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور یاسمین کو بازو سے پکڑ کر کاک پٹ سے باہر نکل گیا۔

ادھر میں غصے اور بے بسی کے مارے دانت پیس کر رہ گیا۔ تاہم کیپٹن کی ہدایت پر میں اس کے ساتھ والی ایک نسبتاً چھوٹی اضافی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ [illegible] سیٹ بیلٹ [illegible] تھی وہ میں نے اپنے گرد باندھ لی۔

"میں پہلے تمہیں اس کا ساتھی سمجھا تھا، مگر اب یقین ہو چکا ہے کہ تم اس کے ساتھی نہیں ہو۔" کیپٹن بولا۔

"شکر ہے تمہیں یقین تو آیا۔" میں نے ہلکی مسکر سے کہا۔

"تم نے اس موذی پر قابو پانے کے لیے اپنی تک لڑا دی۔" کیپٹن متاثر کن لہجے میں بولا تو میں نے توجہ ڈولتے طیارے کی طرف مبذول کروائی۔

"یہ بہت مشکل مرحلہ ہے اور میرے لیے کڑا بھی لیکن میں آج ایسے تجربے سے دوسری بار گزر رہا ہوں" وہ بولا۔

"جہاز کا پرائمری کنٹرول اب تمہارے ہاتھ میں لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہاری رہنمائی کر گا۔ لہٰذا جیسے میں کہتا جاؤں وہی کرتے جانا۔ طیارہ اب بلندی اختیار کرنے سے انکاری ہو چکا ہے۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا اور دھڑکتے دل کے سامنے نظریں جما دیں۔ میری نظروں کے سامنے اب فضا بسیط کا پرہیبت منظر تھا۔ کاک پٹ میں یوں ایک سنجیدہ پائلٹ کے ساتھ "کو پائلٹ" کے فرائض انجام دینا میر جیسے "کورے" آدمی کے لیے نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا مگر کیپٹن کے تجربے سے تجربے کا ہی مطلب نکلتا ہے۔ تا اتنا کوئی خاص "ٹیکنیکل" کام نہیں تھا۔ بس اس کی ہدایت مطابق تھراٹل کو کنٹرول کرنا اور بعد کی ہدایات کے اسے مخصوص زاویوں سے آگے پیچھے اور دائیں بائیں کرنا ساتھ ہی ایک بٹن کے بارے میں کیپٹن نے مجھے بتا رکھا کہ جیسے ہی وہ مجھے بولے، میں وہ بٹن دبا دوں۔

طیارہ اب واضح طور پر اپنی بلندیاں گھٹا رہا تھا۔ ہزار ... بیس ہزار ... پندرہ ... دس ... پانچ ...

جہاز کی بڑی سی ونڈ اسکرین کے پار میری نظریں زمین کو چھونے لگی تھیں اور تب ہی میں نے نیچے سرخی مائل دیکھی۔

"یہ کیا ہے کیپٹن؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ریڈسی (بحرۂ احمر) ہے۔ خدا کرے اس پر بخیریت گزر جائیں۔"

"یہ سرخی مائل ..." میرے منہ سے حیرت زدہ شی برآمد ہوا۔

"یہ اپنے دامن میں اُگے ہوئے سرخ نباتات کی وجہ سے [illegible]

ہے۔" کیپٹن نے بتایا۔

جہاز نیچے ہوتا جا رہا تھا۔

"تھراٹل آہستہ آہستہ اوپر کرو اور بلندی بتانے والے نگاہ کر رکھ کر بتاؤ۔" کیپٹن نے کہا۔ وہ بھی اپنے کام وف تھا۔

میں نے تھراٹل کو اس کی ہدایت کے مطابق ذرا اوپر کیا ی بتانے والے آلے کی طرف دیکھا۔

"طیارہ چند فٹ بلند ہو کے دوبارہ پہلے سے زیادہ نیچے ہے۔" میں نے بتایا۔

"ٹھیک ہے، اب تم اپنے بائیں ہاتھ والی یوک اسٹک کے بائیں جانب گھماؤ، وہاں ڈگری بتانے والے ڈائل و، جیسے ہی چالیس کی ڈگری پر سوئی لرزے اسٹک تھمائے رکھو اور جیسے ہی جہاز زمین کی سطح کو چھوئے ی کنٹرول سسٹم کے آٹو پائلٹ کا بٹن دبا دینا۔" میں نے ثبات میں جنبش دی۔

"اور ہاں، جھٹکوں کی صورت میں تمہیں یہ کام فوری طور ہوگا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ خودکلامیہ بڑبڑایا۔ "رے صرف ریڈسی کو ہم خیریت سے عبور کر جائیں۔"

جہاز نے رخ بدلنا شروع کر دیا تھا۔

ساتھ ہی میری نظریں بھی سامنے نیچے زمین کی سطح کو اوپر اٹھتے دیکھ رہی تھیں۔

بحرۂ احمر کا چوڑا پاٹ قریب آتا جا رہا تھا۔ میرا دل سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا۔ جوں جوں نیچے جا رہا تھا، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آہنی دیوزاد مارے قابو سے باہر ہونے لگا ہو۔ ایک پل کے لیے تو یوں لگا جیسے طیارہ بحرۂ احمر کے پانیوں میں ڈوب کر تباہ ہو گا۔

"ک ... کیپٹن! طیارہ نیچے کی طرف چلا جا رہا" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"تم اسٹک کو اس طرف گھما کر تھراٹل پورا اٹھا دو۔" نے ہدایات دی۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ طیارہ پھر بھی مجھے قابو سے باہر لگا، ست ہاتھی کی طرح بس نیچے ہی بیٹھے جا رہا تھا۔ پانی کی یب آتی جا رہی تھی۔ ایسے میں اپنے حواسوں پر قابو پانا ے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ ایک پل کے لیے تو مجھے یوں لگا میں اپنی ساری کوششیں ترک کر کے بے حس و حرکت بیٹھا رہوں گا اور صرف اپنی موت کا انتظار کروں گا۔

"آٹو پائلٹ کا بٹن دباؤ جلدی۔" کیپٹن چیخا۔ میں نے بٹن دبا دیا۔ تب ہی میں نے جہاز کو تھوڑا عمودی اٹھتے محسوس کیا۔ کیپٹن بھی اپنی سی ماہرانہ تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔

طیارے کے اگلے حصے کو میں نے، جو پہلے نیچے کی طرف تھا، تھوڑا اوپر کو اٹھتے دیکھا تھا۔ وہ جیسے بحرۂ احمر کی سطح کو چھوتے ہوئے اوپر اٹھا تھا۔ یہاں مجھے آس پاس کچھ چھوٹے بڑے بحری جہاز دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے یقین تھا۔ اگر اس سے کوئی جہاز سامنے آجاتا تو ہمارا طیارہ بہ آسانی اس کے مستولوں سے ٹکرا جاتا۔

"پرائمری سسٹم کے آٹو پائلٹ کا بٹن دبا دو۔ سسٹم رسپانس دے رہا ہے۔" کیپٹن کی چیختی آواز میری شل ہوتی سماعتوں سے ٹکرائی جبکہ خود میرے ہاتھ تھراٹل اور ٹوائے ٹائپ کی سائڈ اسٹک پر کانپ رہے تھے، تاہم میں نے اپنے مختل پڑتے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے وہی کیا۔

طیارہ اوپر اٹھ رہا تھا، میری نظریں چینل کے جلتے بجھتے ننھے منے بلبوں سے پھسلتی ہوئی بلندی بتانے والے ڈائل پر پڑیں۔ طیارہ صرف ایک ہزار کی بلندی سے بتدریج اوپر اٹھ رہا تھا۔

"ڈیڑھ ہزار ...... دو ہزار ...... ڈھائی ہزار ......"

"ہوشیار ...... ! جہاز کسی وقت بھی نیچے جا سکتا ہے۔" کیپٹن چلایا۔ میرے اعصاب شل ہونے لگے۔ اب مجھے نیچے چھوٹے بڑے مکانات کے خاکے نظر آ رہے تھے۔

نصف سے بھی کم گھنٹے تک یہی صورتِ حال رہی۔ پھر کچھ وقت اسی طرح "اوپر نیچے" ہوتے بیت گیا۔ میں نے دیکھا بلندی پھر گھٹنے لگی تھی۔

"کیپٹن بلندی گھٹ رہی ہے۔"

"اتنی ہی رہنے دو، میں طیارے کو لینڈنگ گیئر میں ڈال چکا ہوں۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں۔ مطلوبہ میدان سامنے ہے۔" وہ بولا۔

میں نے دیکھا۔ دھوپ کی روشنی میں نیچے ریت کا سمندر نظر آیا۔ اس کے ذرات چمک رہے تھے۔ یہ سراب اگرچہ ریت کا میدان تھا، مگر دکھتا ایسے ہی تھا جیسے سمندر ہلکورے لے رہا ہو، ریت کی سطح پر گرم ہوائیں لہریں پیدا کر رہی ہوں۔

"سائیڈ اسٹک سے ہاتھ ہٹا لو اور تھراٹل چھوڑتے جاؤ، جلدی۔ آگے نکل گئے تو آبادی میں جا گھسیں گے۔" تھوڑی دیر بعد کیپٹن نے چیخ کر کہا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ اس وقت طیارے میں بیٹھے

www.PakiBooks.Site

سارے مسافر خوف سے کانپ رہے ہوں گے۔ انہیں خدا یاد آ رہا ہوگا۔ وہ دل ہی دل میں آنکھیں بند کیے دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔

کیپٹن کا ایک ہاتھ کسی اسٹک کو دبوچے ہوئے تھا اور دوسرا ہاتھ انتہائی تیزی کے ساتھ مختلف بٹنوں پر متحرک تھا۔

دفعتاً طیارے کو جھٹکا لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنی سیٹ سے اڑ کر کاک پٹ کی چھت یا کسی دیوار سے جا ٹکراؤں گا۔ طیارہ اٹھا اور پھر جھکا، میری پھیلی ہوئی آنکھوں کے سامنے حدِ نگاہ ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

”مضبوطی سے بیٹھو، فیصلہ کن گھڑیاں...... سر پر ہیں۔“ کیپٹن چیخا۔ میرے حواس ابھی چھوٹتے محسوس ہوتے تو بھی یوں لگتا جیسے بالکل ہی مختل ہو گئے ہوں۔

طیارے کو دوسرا جھٹکا لگا اور پھر تیسرا۔ اب وہ ریت پر پھسلا جا رہا تھا۔ طوفانی جھٹکے ...مجھے اور کیپٹن کو یوں بُری طرح ہلا رہے تھے، جیسے ابھی ہم دونوں اپنی سیٹوں سے اچھل کر ونڈ اسکرین سے جا ٹکرائیں گے۔

اب ہمیں اڑتے ہوئے ریت کے طوفان کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ طیارہ گھومتے جا رہا تھا اور پھر سیدھا ہو جاتا۔ وہ ریت کے سمندر پر رگڑتا، اور پھسلتا جا رہا تھا اور میں کانپتے ہوئے دل سے اس بدمست دیو کے بخیریت رک جانے کی دعائیں مانگتا رہا۔

”کیپٹن! جہاز پھسلا جا رہا ہے۔“ میں چیخا۔

کیپٹن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گویا اب معاملہ تقدیر پر چھوڑا جا چکا تھا۔ طیارہ زمین سے لگ چکا تھا اور اب شاید ہمارا ”کام“ ختم تھا۔ ماسوائے خود کو طوفانی جھٹکوں سے بچانے کے اور یہی ہم کر رہے تھے۔

معاً ایک اور زبردست جھٹکا لگا، میری بیلٹ ٹوٹ گئی، میں کرسی سے اچھلا اور ونڈ اسکرین سے میرا سر ٹکرایا، اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

مجھے نہیں پتا کہ میں کب تک بے ہوش پڑا رہا تھا اور کس حال میں رہا تھا، کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں ہولے ہولے اوپر نیچے ہو رہا تھا، یوں جیسے کسی تختے پر پڑا جھول رہا ہوں۔ ایسی ہی نیم بے ہوشی کی سی حالت میں کسمسایا تو نیچے آ رہا اور دھپ کی آواز سے ریت پر گرا۔ ایک لمحے کو تو میرا دل ہی ہول گیا تھا کہ نجانے کہاں گرنے لگا ہوں۔ شاید اسی باعث میرے حواس، ایک دم تنے ہوئے اعصاب کی وجہ سے جلد ہی بحال ہو گئے۔ دماغ البتہ کچھ لمحے سناٹے کی سی کیفیات میں رہا۔

اس کے بعد سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ کوہاں کی ک پروری اور اس کے کرتوت...... طیارے کی تباہی اور پھر کر لینڈنگ۔ میری سماعتیں بیدار ہوئیں تو جیسے ہر سُو آہ و فغاں سنائی دیتی محسوس ہوئیں۔ دھواں، کہیں شعلے ... اور رونا تھا۔ آہیں تھیں، سسکیاں اور الٹی سی شائیں شائیں کی نامانوس سی آوازیں۔

حواس بحال ہوتے ہی عقل و خرد سے یارانہ ہوا محسوسات جاگے۔ سب سے پہلے بادِ سموم کے تھپیڑوں سے زخمی اور خراش زدہ چہرہ جھلستا ہوا محسوس ہونے لگا۔ خراش زد بدن میں درد جاگا اور سب سے زیادہ درد مجھے اپنی گردن کی داہنی جانب، اسی طرف سر کے ایک حصے میں اور پھر با ٹانگ میں ہوا۔ اس قدر کہ میں ذرا ہلا تو بے اختیار کراہ کر گیا۔

ریت گرم تھی۔ حدِ نگاہ ریگزار گویا اس وقت جہنم زا منظر پیش کر رہا تھا۔ بڑا ہولناک منظر دیکھنے میں اس وقت آ جب میں نے لیٹے لیٹے پہلو کے بل پر ایک ذرا ارد گرد نگا دوڑائی۔

طیارے کا ملبہ، اس کے ٹکڑے اور جانے کیا کیا الا بلا آڑے ترچھے پڑے ہوئے، ایسا لگا جیسے طیارے نے کر لینڈنگ نہیں کی ہو بلکہ فضا میں ہی تباہ ہو کے بکھر گیا تھا اور ا کے ٹکڑے زمین پر پھیل گئے تھے۔ اگرچہ میں نے...... میں نے کیا اس کیپٹن نے اپنی سی پیشہ ورانہ مہارت کو پو طرح بروئے کار لاتے ہوئے طیارے کو تباہی سے بچانے کی ...کوشش جاری ہوگی کہ کم سے کم تباہی کا سامنا ہو اور جانیں بچ جائیں۔

میں نے بمشکل تمام خود کو سیدھا کیا اور ریت پر بیٹھ گیا۔ میں دراصل کسی زیادہ بلندی سے نیچے نہیں گرا تھا بلکہ طیارے کا اگلا حصہ تھا جو ٹوٹا ہوا تھا اور ٹوٹ کر خاصا نیچے کی طرف جھک آیا تھا، میں اس کے آخری سرے پر اٹکا رہ گیا اور نیچے آ رہا تھا۔

میری آنکھیں جب پوری طرح دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اپنے چہار سُو حدِ نگاہ تک ریت اور اس پر بنے چھو بڑے ٹیلے دکھائی دیے۔ گویا یہاں سے وہاں تک ایک سلگتا ریگزار پھیلا ہوا تھا۔

میں نے ملبے کی سمت دیکھا۔ جہاز کا اگلا حصہ ٹوٹ الگ ہو گیا تھا اور کسی قدر ریت میں دھنس چکا تھا۔

البتہ درمیان کا حصہ جو نسبتاً بڑا تھا، اس سے ذرا پر

www.PakiBooks.Site

DEEP CLEANING & EXTRA WHITENING FORMULA
SodaWhite
BAKING SODA TOOTHPASTE
TARTAR CONTROL
Pakistan's Only Baking Soda Toothpaste
دانت سفید چکا چک
facebook.com/snscare

www.PakiBooks.Site

جا گھسا تھا اور اس کے ٹوٹے ہوئے حصے سے سیٹیں اور ان پر آڑے ترچھے لوگ گرے پڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

کچھ اوپر سے نیچے گرم ریت پر گرے ہوئے تھے۔ دم والا حصہ درمیانی حصے سے ٹوٹا ہوا تو نظر آتا تھا مگر الگ نہیں ہوا تھا۔ وہاں بھی یہی حالت تھی۔

"شش...... شہزی......"

اچانک میری سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔ میں چونکا۔ یہ یاسمین کی کراہتی ہوئی آواز تھی۔

میں نے فوراً آواز کی سمت گردن گھمائی۔ میرے اردگرد عجیب سماں تھا، میں نے ایک بار پھر سر کو دو تین بار ہلکے سے جھٹکے دیے، درد بڑھا اور میں کراہا۔

پھر دوبارہ آواز کی سمت دیکھا، اس طرف جہاز کا درمیانی حصہ قدرے ریت میں گڑا ہوا تھا۔

ایک طرف مجھے کیپٹن بھی بے سدھ ریت پر پڑا نظر آیا، کچھ اور لوگ بھی تھے۔ کافی سے زیادہ تو چلتے پھرتے بھی نظر آ رہے تھے، میری متلاشی نظریں تو کوہارا کو بھی تلاش کر رہی تھیں۔

جس طرف سے یاسمین کی آواز آئی تھی، وہاں معمولی سا شور بھی ہو رہا تھا، رونے اور سسکیوں کی آوازیں، کچھ غصیلی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو زدوکوب کیا جا رہا ہو۔ میں چونک سا گیا۔

اس کے بعد میں ہمت کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہوا، گرم ہواؤں کے تھپیڑے اور تیز دھوپ کی تمازت، ریت کے ذروں سے اٹکا ہی ہو کے انی کی طرح جسم اور آنکھوں میں چبھتی محسوس ہوتی تھیں۔

اچانک میں نے ایک دل دہلا دینے والا منظر دیکھا، چند مسافروں نے کوہارا کے ساتھی کمبلر کو دبوچ رکھا تھا اور اسے بری طرح پیٹ رہے تھے، اگرچہ خود ان کی اپنی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، مگر غیظ، جنون اور نفرت کا یہ عالم تھا کہ وہ اسے کچا چبا ڈالنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے، معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے یہی ہولناک منظر میرے لیے کافی تھا۔ وہ اپنا غصہ نکال رہے تھے۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میں بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو مسافروں کا یہ جوان ٹولا میرے ساتھ بھی یہی حشر کرتا، اگرچہ میں پہلے ہی طیارے میں اپنے بارے میں گلوخلاصی کے طور پر کئی تاویلیں اور اپنی کوہارا اینڈ کمپنی سے لاتعلقی کے اظہار کے سلسلے میں مختصر "تقریر" کر چکا تھا۔

کمبلر چونکہ کوہارا کا ساتھی تھا اسی لیے میں نے اسے بچانے کی مطلق ضرورت نہیں سمجھی تھی، البتہ مجھے یاسمین کی چ نے ضرور بے چین کر دیا تھا، میری متلاشی نظریں ریت کے غبار آلود بگولوں اور دھوئیں کے بادلوں میں اسے ہی پا لینے کی کوشش میں تھیں۔

مشتعل ٹولے نے کمبلر کو...... نوچ کھسوٹ کر رکھ د تھا، جو شے بھی ان کے ہاتھ لگی تھی، اس کی ہر ضرب وہ بلا اس تمیز کر وہ کہاں اس کے پڑ رہی تھی، وہ اسے ٹھوکے جا رہے تھے، ایک کچھ زیادہ ہی دل جلے مشتعل اور ادھار کھائے مسا نے تو کوئی سخت سی سلاخ جیسی شے کمبلر کی ایک آنکھ میں گھونپ دی، میں نے کمبلر کے حلق سے شدید اذیت تلے...... دل دہلا دینے والی چیخ پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مگر اس مغضوب الغضب مسافر کا ابھی طیش کہاں کم ہونے والا تھا، اس نے اسی طرح اس کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دی۔

کمبلر کی ہیئت کذائی اب تو کافی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں پھوٹ چکی تھیں۔ بلکہ ڈیلیں پھٹ چکے تھے، ان سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ ناک اور منہ تو بگاڑ دیا گیا تھا، اب اس کا پیٹ پھاڑا جا رہا تھا۔ اسے اذیتیں دے کر ہلاک کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ ورنہ ان کے پاس کمبلر سے چھنی ہوئی گن بھی تھی مگر وہ اسے ویسی ہی اذیتیں دینا چاہتے تھے جیسا کہ اس نے انہیں دے رکھی تھیں۔ تب ہی ایک مشتعل مسافر نے اسی کی گن اٹھا کر اس پر تان لی اور ٹریگر دباتا چلا گیا اور اس وقت تک دباتا چلا گیا جب تک کہ کمبلر کا مضروب وجود خون میں پوری طرح تر نہیں ہو گیا۔ عقدہ کھلا کہ اس مسافر کے ایک قریبی عزیز کو کمبلر نے طیارے میں گولی مار کے بڑی بیدردی سے ہلاک کر دیا تھا۔ جب اس کی گن سے خالی "ٹرچ...... ٹرچ" کی مخصوص آواز آنا شروع ہوئی تو اس کا غصہ کم ہوا۔ اس نے گن ایک طرف پھینک دی۔ مجھے اس کے جوش غضب ناکی اور بے وقوفی پر غصہ آیا۔ یہ گن کام میں لائی جا سکتی تھی، کیونکہ کوہارا کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کب اور کہاں سے کسی خوابیدہ درندے کی طرح بیدار ہو کر سامنے آ جاتا۔

تب ہی یاسمین کی کہیں قریب سے دوبارہ چیخ سنائی دی۔ میں چونکا۔ سمت کا اندازہ لگانے میں مجھے کچھ دیر لگی تھی مگر میرا اندازہ غلط ثابت نہیں ہوا۔

جہاز کے ایک بڑے سے آڑے ترچھے ہوئے حصے کے پیچھے مجھے چار پانچ افراد برآمد ہوتے دکھائی دیے۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ بھی ایسے ہی "دل جلے" مسافروں کا مشتعل ٹولا تھا۔ وہ یاسمین کو بیدردی سے گھسیٹ کر

www.PakiBooks.Site

ای طرف لا رہے تھے جہاں ان کے اور بھی انہی جیسے ساتھی ر کا حشر نشر کیے ہوئے تھے۔

یاسمین کی حالت بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی۔ وہ پہلے ہی حال سی تھی۔ اس کے کپڑے بھی کافی حد تک تار تار نظر آتے تھے۔

یاسمین کو ان درندوں کے نرغے میں دیکھ کر میرا اندر چیخ ون کیسی تھی یاسمین میری......؟ بس ایک ذرا چند دنوں کا تو ہا تھا میرا اور اس کا۔

دیکھا جاتا تو وہ بھی اس روز منقطع ہو گیا تھا جب میں اس کی رہائش گاہ پر چھوڑ کر اسے الوداع کہہ آیا تھا اور کیلی ٹکٹ کٹا کر امریکا روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن تقدیر کو شاید یہی منظور و مقصود تھا کہ میرا اور یاسمین کا سامنا دوبارہ ہوا۔ ے بعد یہ دوسری غیر متوقع ملاقات...... کے بعد کچھ دور مزیوں نے ایک بار پھر ہمیں یکجا کیا تو کچھ لاشعوری طور پر میں یاسمین کے لیے اپنے اندر کچھ ایسے جذبات محسوس نے لگا تھا جسے شاید عام فہم میں مانوس اجنبیت کا نام دیا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب طیارے میں رذیل کوہارا س کی عزت سے کھیلنے کی کوشش چاہی اور میں دیوانہ وار اس پر جھپٹا تھا۔

لہٰذا میں اب یاسمین کا بھی کمبلر جیسا حشر ہوتے نہیں ا تھا۔ پل کے پل ایک جوش کی لہر سی میرے پورے میں سرایت کر گئی اور میں اپنے درد و زخم بھلا کر یاسمین کو ی ٹولے سے بچانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر یہاں جوش سے وش سے کام لینا ضروری تھا۔

میں ایک طرف کو دبک گیا۔

"ہا...... ہا...... لے آؤ اس کو بھی، لیکن پہلے اسے اس ی کا حشر کھلی آنکھوں سے دکھا دو، تاکہ یہ اس تصور سے پ اٹھے کہ اب اس کا بھی برا حشر کیا جانے والا ہے۔"

"نہیں، اسے مارنا نہیں ہوگا، پہلے ہم سب اس کے شی جانوروں جیسا سلوک کریں گے جس طرح اس کے یں نے ہمارے ساتھ کر رکھا تھا۔"

"ہاں! ایسا ہی کرنا چاہیے۔"

"لیکن ان کے باقی دو ساتھی کدھر ہیں؟ وہ سرغنہ اور وہ سب سے لمبا چوڑا جسے شہزی پکارا جا رہا تھا؟"

یاسمین کو دبوچے ہوئے مشتعل ٹولے کی یہ ساری یں میری سماعتوں میں پڑ رہی تھیں۔ یہ کوئی ماہر تو کیا عام ا بدمعاش بھی نہیں تھے۔ میں ان پر قابو پا سکتا تھا۔ مگر میں زیادہ اور اس وقت جوشِ غیظ و جنون سے بھرے ہوئے تھے۔ میں جہاز کے ہی ایک بڑے ملبے کی آڑ لیتا ہوا دوسری جانب سے گھوم کر اس طرف کو چھپتے چھپاتے بڑھنے لگا جہاں یاسمین کو اس مشتعل ٹولے نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ میری راہ میں اور بھی کئی مسافر آئے تھے جو ادھر ادھر گرے پڑے آہیں بھر رہے تھے۔ ایک نے مدد کے لیے میری ٹانگ بھی کھینچنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ چھڑا کر آگے سرک گیا تھا۔ یہاں اب کون کس کی مدد کر سکتا تھا؟ جب تک کہ کہیں اور سے مدد نہ آتی۔ مگر جس کو مدد کی زیادہ ضرورت تھی، اس کی جان اور عزت دونوں خطرے میں تھیں۔ کوہارا ابھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

میں محتاط روی سے چلتا ہوا ان کے سر پر جا پہنچا اور انہیں للکار دیا۔

"اے...... اے...... یہ کیا کر رہے ہو تم ؟ چھوڑ دو اس لڑکی کو۔"

یہ کہتے ہی میں فوراً مشتعل مسافروں کے اس ٹولے کی جانب لپکا جنہوں نے یاسمین کو زدوکوب کر رکھا تھا۔ وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی حالت بھی ابتر ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہروں کی وحشت اور غضب ناکی میں یکلخت اضافہ ہو گیا۔

"یہی ہے ان کا سرغنہ...... پکڑو اسے...... اسی کی وجہ سے ہم برباد ہوئے ہیں۔" ایک مسافر نے بارے طیش کے چلا کر کہا۔ میں سمجھ گیا معاملہ کیا تھا۔ یہ چار پانچ بچے کچے مسافر تھے۔ وہ میری جانب جارحانہ انداز میں لپکے۔

"خبردار...... ! وہیں رک جاؤ۔" میں نے بھی غضب ناک انداز میں چلا کر کہا۔ مگر اس مشتعل ٹولے نے جیسے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ انہوں نے یاسمین کو چھوڑ دیا تھا، مگر دوسرے مشتعل ٹولے نے کمبلر کو بری طرح مار مار کر ادھ موا کر ڈالا تھا۔

مجھے اپنی فکر لاحق ہونے لگی۔ ایک خیال تیزی سے میرے ذہن میں ابھرا تھا کہ...... کیا کوہارا کا بھی انہوں نے یہی حشر کیا تھا۔

وہ ٹولا مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں نے...... چند ایک کو گھونسے لاتیں رسید کر دیں وہ دور جا پڑے۔ کچھ نے میرے زخموں پر گرم ریت مٹھی میں بھر کر پھینک دی، میں درد و اذیت سے چلایا۔ وہ مجھے ابھی تک کوہارا کا ساتھی سمجھے ہوئے تھے۔

یاسمین چیخنے لگی۔ اس کی اپنی حالت بھی ابتر تھی مگر وہ بے چاری مجھے اس مشتعل ٹولے کی مار سے بچانے کے لیے گرتی پڑتی ان کی جانب لپکی تھی۔

www.PakiBooks.Site

"مت مارو اسے ... ہم بے قصور ہیں۔" کہتی ہوئی وہ ان سے جا ٹکرائی۔ دو مسافروں نے اسے دبوچ لیا اور اٹھا کر پرے پھینک دیا۔

اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری۔ کئی لوگ اذیت سے چیخے اور پھر انھیں ریت پر گرتے دیکھا۔

سہا میری تھکی ہوئی نظروں نے ایک طرف گن لیے کھڑے کوبارا کو کھڑے دیکھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر بھی خراشیں نظر آرہی تھیں۔ میری داغی ہوئی گولی سے اس کی ٹانگ میں "لنگ" بھی محسوس ہوتا تھا۔ پھوٹی ہوئی ایک آنکھ کا للیپ اتر کر کہیں گر چکا تھا۔ جہاں سے اب اس کی ایک آنکھ بچی ہوئی کی بڑی مضحکہ خیز نظر آتی تھی۔

"خبردار ...! اب جو کسی نے حرکت کی ... ورنہ سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔" کوبارا حلق کے بل دہاڑا۔ باقی مسافر خوف زدہ ہوگئے اور ادھر ادھر چھپنے لگے۔

"شہزی ...! یاسمین کو سنبھالو ..." اس نے مجھ سے تحکمانہ کہا۔ میں فوراً یاسمین کی جانب لپکا، وہ ریت پر اوندھے منہ پڑی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ان دونوں مشتعل مسافروں نے اسے دور دھکا دیا تھا۔

"یاسمین ...! تت ... تم ٹھیک ہو ناں ...؟" میں اس پر جھکتے ہوئے بولا اور اسے سنبھالنے لگا۔ اس کے گھنے ریشمی بال جو کبھی گھٹاؤں کی سی بہار دکھاتے تھے، اب کسی سوکھے پیڑ کی جٹاؤں کے سے نظر آتے تھے۔ اس کی قدرتی کاجل لیے ہوئی آنکھیں جو مد بھری ہوتی تھیں اب وہاں اجاڑ ویرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے نازک سے نرم ہونٹ سوکھ کر پپڑیاں جمے ہورہے تھے۔

"شہزی! تم جاؤ اور پروفیسر کو ڈھونڈ کر یہاں لے آؤ جلدی۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔" کوبارا نے چیخ کر مجھے حکم دیا۔

"کوبارا ...! اس وقت ہم سب مصیبت میں ہیں اور ..." کوبارا نے ایک دہاڑ مار کے میری بات کاٹ دی اور بولا۔

"باقی سارے جائیں جہنم میں ... مجھے صرف اپنے اور اپنے مقصد سے غرض ہے۔ یوں بھی ہم ان کے درمیان رہے تو یہ ہمارے ساتھ گیلبر جیسا حشر کردیں گے، جاؤ۔"

ناچار مجھے اس بدذات کا حکم ماننا پڑا۔ میں ایک [illegible] انداز سے ... جہاز کے دوسرے حصے کی جانب بڑھا اور اس کے کھلے حصے سے اندر داخل ہوگیا۔ بعض مسافر مجھ سے مدد کی فریاد کر رہے تھے، مجھے ان پر ترس آنے لگا۔ ان میں بچے بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھے۔ میں نے انھیں تسلی دی اور کہا کہ میں خود اس باؤلے جنیگر کوبارا کے نرغے میں ہوں، لیکن فکر مت کرو یہاں بہت جلد امدادی ٹیمیں پہنچ جائیں گی۔

یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔ کریو اور جہاز کا عملہ بھی ابتر حالت میں تھا۔ جہاز کی باڈی اور چھت تہس نہس ہوچکی تھی۔ پتا نہیں وہ بوڑھا پروفیسر جمشید زندہ بھی تھا یا نہیں۔

تاہم میں اندرونی ٹوٹے پھوٹے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں اس کا سوئٹ تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا ادھڑی ہوئی راہداری کے فرش پر جمشید حمیدی اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں فوراً اس کی سمت بڑھا اور اسے سنبھالا۔ اسے بھی سر اور پیشانی میں چوٹیں آئی تھیں۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کی سانسیں بحال دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔

اس کے بعد میں نے اس کے بے سدھ وجود کو اٹھایا اور پلٹا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے سامنے اسی مشتعل مسافروں کے ٹولے کے چار افراد کوریڈور میں راستہ روکے کھڑے تھے جن سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرا ٹاکرا ہوچکا تھا لیکن میں ان کے ساتھ کیپٹن کو دیکھ کر چونک پڑا۔

"ہم معافی چاہتے ہیں لیکن تم ہی وہ واحد آدمی ہو جو ہمیں اس مصیبت سے نکالنے کی تدبیر کر سکتے ہو۔" ان چاروں میں سے ایک نے کہا۔ ان کے تیور مجھے اب کچھ بدلے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"ہاں! مسٹر شہزی! یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔ تم ہی اسے سبق سکھا سکتے ہو، ہم تمہاری مدد کو تیار ہیں۔" کیپٹن نے بھی اسی لہجے میں کہا تو میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"شکر ہے خدا کا کہ تم لوگوں کو عقل آ گئی۔ میں واقعی اب بھی اس موذی کو جہنم رسید کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو کہ اس خبیث نے ... میری ساتھی لڑکی کو نرغے میں لے رکھا ہے، پہلے بھی میں اس کو سبق سکھا چکا ہوں۔ بس! تم لوگ میرا ساتھ دو، میں اب بھی اسے قابو کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ بری طرح پھنس چکا ہے اور اکیلا بھی ہو چکا ہے۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہیں۔" ان چاروں کے علاوہ وہاں قابلِ رحم حالت میں موجود دیگر مسافروں کے ساتھ عملے نے بھی یک زبان ہوکر کہا اور میرا حوصلہ بلند ہونے لگا۔

"ٹھیک ہے پھر آؤ میرے ساتھ اور دیگر ساتھی بھی جو نسبتاً بہتر حالت میں ہیں، اس موذی پر قابو پانے کی کوشش تے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ ہوگئے مگر میں نے انھیں ابھی کوبارا سے دور رہنے کی تاکید کی اور پروفیسر جمشید کو کندھوں پر لادے واپس پلٹا۔

کوبارا نے یاسمین کو دبوچ رکھا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، کی ایک ٹانگ میں میری چلائی ہوئی گولی سے "لنگ" تھا مگر باوجود اس کے وہ تنا کھڑا تھا۔ میرے کندھوں پر فیسر جمشید کو لدا ہوا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ ۔ لیکن میں نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ کوبارا اپنے تھیوں اور اب گیلبر کی ہلاکت کے بعد فکر مند بھی نظر آنے لگا ۔ وجہ یہی تھی کہ وہ اب اکیلا ہوچکا تھا اور جہاں طیارے نے لینڈنگ کی تھی، وہ اس کا "مطلوبہ" مقام بھی نہ تھا۔

"تم اس بڈھے کو اسی طرح اپنے کندھوں پر لادے ، ہم چاروں اسی وقت یہاں سے پیدل کوچ کریں گے۔" بارا نے کہا۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو کوبارا ...!" میں نے تنبیہ کرنا چاہی۔ "نہ تم اس مقام سے واقف ہو نہ ہی ہم۔ لق و دق صحرا میں بھٹک جانے کا مطلب اذیت ناک موت سوا کچھ نہیں۔ ہمیں کم از کم یہاں تباہ شدہ طیارے کی پناہ تو حاصل ہے ناں ...؟ ہوسکتا ہے کسی قافلے کا یہاں گزر ہو تو وہ ہماری مدد کرے۔"

میں نے دانستہ امدادی ٹیم کا ذکر نہیں کیا تھا اس کے نے۔ کیونکہ وہ ایک مجرم تھا اور اس کا چہرہ بے نقاب ہوگیا

امدادی ٹیم کے ذکر پر وہ بدک جاتا۔ کیا خبر اسے بھی اس بات کا خدشہ ہو۔ تاہم میں اسے اسی طرح بہلا سکتا تھا تاکہ اس پر قابو پانے کا کوئی موقع ہاتھ آسکے۔

میں نے دیکھا کوبارا میری بات سن کر کچھ سوچتا بن گیا س نے یاسمین کی پشت سے گن کی نال لگائے رکھے دور خود یک ایک نظر ڈالی۔ لوہا گرم دیکھ کر میں نے مزید

"طیارہ مکمل تباہ نہیں ہوا ہے۔ ابھی اس میں کافی سارا پانی موجود ہے۔ اگر صحرا میں بھٹک گئے تو گرم تپتی ریت یاں رگڑ رگڑ کر مر جائیں گے ہم چاروں۔"

"ہم ... ٹھیک ہے، کچھ سوچتے ہیں۔" بالآخر کوبارا ہا۔ "مگر ہم چاروں جہاز کے اس حصے تک محدود رہیں" اس نے اگلے اور نسبتاً چھوٹے حصے کی طرف اشارہ کر انہ کہا۔

"اور اگر تمہارے سمیت کسی نے ذرا بھی چالاکی چلنے کی کوشش چاہی تو سب سے پہلے یہ ایرانی شہزادی گولیوں کا نشانہ بنے گی۔ میں نے ابھی تک اپنے سر سے کفن نہیں اتارا ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔ تم فکر نہیں کرو اس کی۔" میں نے کہا۔

"زیادہ چالاک کہوڑ بننے کی کوشش مت کرو شہزی!" وہ مجھے اپنی اکلوتی آنکھ کی خونخوار نظر سے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں تمہاری مکاری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کسی بھول میں مت رہنا۔ بس ایک بات میری یاد رکھنا۔ میں ٹریگر دبانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا اور یہ شہزادی میرے ساتھ سائے کی طرح چپکی رہے گی۔"

"کوبارا ...! میں نے اب تک تمہارے خلاف تب ہی مزاحمت کی ہے جب تم سب کو ہلاکت میں ڈالنے لگتے۔ ورنہ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں خود کو ابھی تک تمہارے سامنے بے بس ہی محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے چالاکی چلتے ہوئے اپنے لہجے اور آواز میں بے بسی سمو دی۔

"ہم ... یہی تمہارے لیے اور ان دونوں باپ بیٹیوں کے لیے بہتر ہوگا۔ چلو ...! اب جو میں نے کہا ہے وہی کرو اور سارے مسافروں سے کہہ دو کہ وہ جہاز کے پچھلے حصے تک ہی محدود رہیں۔" اس نے تحکمانہ کہا اور میں نے اس کا پیغام ان تک پہنچا دیا۔

میں مسافروں سے وعدہ کر چکا تھا کہ میں اس موذی کو ختم کر کے رہوں گا۔ اس لیے ابھی میں جیسا کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو سب ... ان سب نے میری ہدایت پر سر ہلا دیے۔ عملے اور کیپٹن سمیت مشتعل افراد کے ٹولے سے تعلق رکھنے والے مسافروں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ کافی سے زیادہ تو پچھلے حصے میں ہی تھے، باقی بھی وہاں سرک گئے۔

لیکن مجھے ان مشتعل مسافروں سے "خیر" کی توقع کم ہی نظر آرہی تھی۔ وہ کوبارا پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ دوران پرواز اور بات تھی۔ سب کو طیارے کی تباہی کا خطرہ تھا۔ کوبارا اور اس کا ساتھی بھی اسلحہ بدست تھے۔ پھر دوران پرواز بھی طیارے میں غیر یقینی صورت حال تھی۔ لیکن اب ... ایسا کچھ نہیں تھا۔ کوبارا تنہا تھا، بے شک اس کے پاس گن تھی۔ مشتعل ٹولا اس کے ساتھی گیلبر کی طرح کوبارا کا بھی حشر نشر کرنے کے لیے بے چین تھا۔

ایسی صورت میں یاسمین اور میرے لیے خطرہ بڑھ سکتا تھا۔ کوبارا بلا دریغ سب سے پہلے ہم دونوں کو ہی گولیوں کا نشانہ بناتا۔ بعد میں اس کا مسافروں کے ہاتھوں جو حشر ہوتا۔

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

جیسا کہ مذکور ہو چکا طیارے کا ملبا... تقریباً نصف حد تک ایک جانب کو جھک کر ریت میں گڑ چکا تھا۔ اسی لیے ہمیں اس پر چڑھنے اترنے میں کچھ آسانی پیش آ رہی تھی۔

میں فکرمند بھی تھا اور ایک حد تک خوش بھی کہ کوہارا جیسا محتاط آدمی میری چالاکی کے پھندے میں آ چکا تھا۔ مجھے اب موقع کی تلاش تھی مگر یہ میری خام خیالی تھی۔

شاطر کوہارا نے بھی شاید اس "خطرے" کو محسوس کر لیا تھا، جس کا اس نے ایسا بندوبست کیا کہ میں خود ششدر رہ گیا۔ اگرچہ یہ ایک انتہائی خطرناک اور سنگین عمل تھا مگر کوہارا جیسے سنگ دل انسان سے یہ بعید رکھنا معمولی سی بات ہوتی۔

اس نے طیارے کے دونوں طرف کے فیول ٹینک (بشمول ایکسٹرا فیول ٹینک) کھول دیے تھے اور فیول ریت پر گرنا شروع ہو گیا تھا۔ لوگ طیارے کے اس بڑے حصے کی ٹوٹی پھوٹی کھڑکیوں سے حیرت و تشویش بھری نظروں سے جھانک کر کوہارا کا یہ مظاہرہ دیکھ رہے تھے۔ تب کوہارا نے انہیں خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"گیم ابھی بھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر میں نے کسی کو بھی طیارے کے اس حصے سے باہر نکلتے دیکھا، میں فیول پر برسٹ چلا دوں گا۔ پھر تم جانتے ہو کہ ہر طرف آگ پھیل جائے گی اور جہاز کا یہ حصہ پل بھر میں جہنم کا نمونہ بن جائے گا۔"

مسافر دہشت زدہ سے ہو گئے۔ میں نے کوہارا سے یہ خطرناک عمل روکنے کا کہا اور اسے سمجھانے کی کوشش چاہی تھی کہ وہ ایسا نہ کرے۔ مسافر اور ہم سب اب بھی اس کا کہا ماننے پر مجبور ہیں۔ اگر خدانخواستہ ذرا سی چنگاری بھی فیول پر پڑی تو آتشی عفریت سب کو نگل جائے گا مگر میرا کوہارا کو سمجھانا عبث ہی ثابت ہوا۔

طیارے کے دیگر مسافر (مشتعل لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا) کپتان اور عملہ مجھ پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ میری مدد کو بھی تیار تھے لیکن مجھے ان سے صرف اسی قدر مدد کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ بپا کریں، باقی کوہارا کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی تھا۔ یاسمین کو اس نے میرے پاؤں کی زنجیر بنا رکھا تھا۔

جب بہت سا فیول ریت پر گر کر طیارے کے اس حصے کے گرد پھیل گیا تو کوہارا نے فیول ٹینک بند کر دیا۔ میں اس کی چالاکی سمجھ گیا، وہ آئندہ بھی مسافروں کو اپنی جگہ تک محدود اور محبوس رکھنے کے لیے یہی عمل وقفے وقفے سے دہرانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، کیونکہ ظاہر ہے باہر گرا ہوا فیول زیادہ دیر تک وہ افادیت نہیں رکھ سکتا تھا جو کوہارا کو حسب ضرورت درکار تھی۔

اس کے بعد ہم چاروں طیارے کے اگلے حصے آئے تو کوہارا نے اگلا حکم صادر کر دیا۔ اس نے یاسمین سے کہ وہ میرے دونوں ہاتھوں کو پشت کی سمت باندھ دے۔ اسے چھوڑ کر اس نے اس کے باپ کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا جسے اب ہوش آ گیا تھا اور وہ بہت تشویش زدہ اور پریشان آ رہا تھا۔

یہ میرے لیے بڑی مشکل صورت حال تھی۔ میں اند ہی اندر اس بدبخت کوہارا کی چالاکی پر تلملا کر رہ گیا۔

کوہارا نے مجھے دوسری جانب منہ کر کے کھڑے ہو کا حکم دیا، میری رگوں میں سنسنی دوڑ گئی۔

میں اس کے خلاف جارحانہ قدم اٹھانے کا سوچنے تھا مگر میں یہ سوچتا ہی رہ گیا، کوہارا جیسے مکار اور شاطر لومڑ مجھے کوئی ذرا سا بھی ایسا موقع نہ دیا کہ میں اس پر اچانک حملے کا منصوبہ بناتا۔ اس بدبخت نے ایک تو اپنے اور میرے درمیان اتنا فاصلہ کر رکھا تھا کہ مجھے اس تک پہنچنے کے لیے ثانیوں کا وقت درکار ہوتا۔ جبکہ ایسی کسی کوشش میں وہ صرف ایک لمحے کے اندر ہی فائر کھول دیتا۔

اس نے اگرچہ پروفیسر جمشید حمیدی کو ہی گن پوائنٹ لے رکھا تھا، جبکہ حقیقت یہی تھی کہ ہم تینوں ہی اس کی گن زد میں تھے۔ کیونکہ ایک طرح سے ہم تینوں ہی اس کے تھے۔ پھر اس کے ہاتھ میں پستول نہیں ایک ایسی گن تھی برسٹ فائر کرتی تھی۔

یاسمین رسی تھامے اور ستے ہوئے چہرے کے میرے قریب آئی تو اس نے شاید میرے بشرے اور آنکھوں سے ... جوش اور غیظ ناکی کی چمک بھانپ لی تھی۔ اس ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ کر مجھے... بزبان خاموشی تسلی رکھنے اشارہ کیا تھا کہ میں ابھی ایسی ویسی کوئی حرکت نہ کروں جو ہم سب کو ہلاکت میں ڈال دیتی۔

میں نے اس کے تاثرات پڑھ کر بے اختیار ایک گہری ہنکاری بھری۔

یاسمین میرے قریب آ گئی۔ اس کی سانسیں شاید تیز چل رہی تھیں۔ اس کا تموج پورے بدن کو مرتعش کیے تھا۔ حتیٰ کہ اس کی بے ترتیب سانسوں کی بازگشت مجھے قریب بالکل قریب سنائی دینے لگی۔

"دشش... شہزی! خدا کے لیے ابھی نہیں۔" اس میرے کان کے بالکل قریب ہو کر سرگوشی کی جواباً میں اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔

www.PakiBooks.Site

میں یاسمین کے ہاتھ تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ ان میں غضب کی کپکپی طاری ہو گی اور یہی نہیں اس کا... پورا وجود اسی طرح لرزہ براندام ہو گا۔ یہ عقدہ بھی اسی وقت کھلا جب اس کے ہاتھ اور انگلیاں میرے دونوں ہاتھوں سے ٹکرائیں۔ وہ بلا کی مرتعش تھیں۔

"یاد رکھنا شہزادی! میں خود آگے بڑھ کر ان جکڑ بندوں کی تصدیق کروں گا۔" اچانک مجھے عقب سے کوہارا کی دھکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ایسا نہ ہو کہ تم کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کرو اور اس کی سزا تمہیں اور تمہارے بڈھے باپ کو بھگتنی پڑ جائے۔"

اس کے ساتھ ہی اس مردود نے تاؤ دلانے والے انداز میں قہقہہ بھی لگا دیا۔

میرے اندر کا جوالا مکھی ایک بار پھر مجھے بے قابو کرنے لگا۔ عجب وقت آن پڑا تھا کہ میں کوہارا پر ابھی تک غلبہ پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ مجھ پر کسی عفریت کی طرح حاوی ہوا جا رہا تھا۔ شاید اس میں کچھ ایسے حالات کا بھی دخل تھا کہ کاش! ایک موقع مجھے مل جاتا اور میں اس مردود کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

"دشش... شہزی! مم... مجھے معاف کر دینا۔" اس کی غم زدہ اور سسکیوں بھری سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی۔

"تم اپنا کام نمٹاؤ جلدی...." میں نے ہولے سے کہا۔

یاسمین نے جیسے تیسے اپنا "کام" نمٹایا اور جب وہ سیدھی ہوئی تو میرے کانوں میں اس کی سسکی ٹکرائی تھی، کیا شک تھا اس میں کہ اس نے یہ کٹھن کام اپنے دل پر جبر و صبر کی بھاری سل رکھ کر نمٹایا تھا۔

اس کے بعد کوہارا نے بھی اپنی تسلی کر لی اور ایک قہقہہ اگلتے ہوئے بولا۔ "واہ... کیا منظر ہے، ایک محبوبہ اپنے محبوب کے ہاتھ خود ہی باندھ کر اسے مذبح خانے بھیج رہی ہے۔" کوہارا کو میرے اور یاسمین کے بارے میں شدید قسم کی غلط فہمی ہو رہی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری طرف سے تو خیر کیا ہوتی خود یاسمین کی طرف سے بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ روزلف کے توسط سے وہ پہلے ہی میرے معاملہ دل سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔

"اب بتا... کیا راز و نیاز کر رہی تھی تو اپنے یار کے ساتھ... بول۔" اچانک کوہارا کی غراتی ہوئی آواز کے ساتھ ہی یاسمین کی کراہ سنائی دی، میں مشتعل انداز میں پلٹا۔ میری لہو رنگ آنکھوں میں کوہارا کا مکروہ چہرہ تھا۔ اس رذیل نے یاسمین کو بالوں سے جکڑ کر اس طرح دبوچ رکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی جا لگی تھی۔

"چھوڑ دو میری پھول سی بچی کو ظالم! خدا سے ڈرو... مولائے کریم تمہیں غرق کرے۔"

مجھے یاسمین کے باپ کی درد بھری آواز سنائی دی۔ وہ اس کے قریب لڑھکنے کے انداز میں آ گیا تھا۔ کوہارا نے بڑی بیدردی سے پروفیسر جمشید حمیدی کو ایک ٹانگ مار کے خود سے پرے دھکیلا۔ یاسمین چیخ رہی تھی۔ میں بے بس تھا۔

کوہارا نے بڑی مکاری سے سارے مسافروں کو ایک جگہ محدود رہنے پر مجبور کر دیا تھا، لیکن میں جانتا تھا کہ اب بات اور تھی۔ جب تک طیارہ آسمان کی وسعتوں پر پرواز کر رہا تھا تو مسافر کچھ کرنے سے قاصر تھے، کیونکہ وہ فضاؤں کے رحم و کرم پر تھے، پھر دہشت بھی ان پر طاری رہتی تھی۔ مگر اب سب زمین پر تھے اور ان کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ پھر کوہارا جیسے مردود آدمی پر بُری طرح ادھار کھائے بھی بیٹھے تھے، وہ اب یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔

اگرچہ بے شک کوہارا نے ایک خطرناک چال چلتے ہوئے انہیں محدود تو کر دیا تھا مگر بات پھر وہی تھی جو اول الذکر تھی۔ تاہم شاطر کوہارا نے بھی اسی خدشے کو محسوس کر رکھا تھا اس لیے اس مردود نے یاسمین کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ مشتعل مسافروں کا ٹولا کوہارا جیسے بے رحم مردود آدمی کا برا حشر کرنے کے ساتھ ساتھ یاسمین کی پروا بھی کرے گا اور یہی تشویش میرے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر کی طرح سرایت کرتی جا رہی تھی۔ کوہارا بلا دریغ یاسمین سمیت زیادہ سے زیادہ چند مسافروں کو ہلاک کر سکتا تھا، اس کے بعد اس کا بھیانک انجام یقینی ہوتا۔

"کوہارا...! میں نے تمہاری ساری باتیں مان لی ہیں۔ اب تم مزید کوئی خون ریزی پھیلانے کی کوشش نہیں کرو گے۔ یاسمین کو چھوڑ دو۔" میں نے کوہارا کو سلگتی نظروں سے گھور کر کہا۔ وہ میری بات پر ہنسا اور بولا۔

"میرا نام سے جی کوہارا ہے... میں ایک اکیلا سب پر بھاری ہوں۔ ماسٹر لولوش کی نادیدہ قوتیں میری دست راست ہیں۔"

"اتنا فردرست کرو کوہارا....." میں نے اس کے چبتے ہوئے مکروہ چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ "اب حالات اور ہیں، مسافر اب تمہارے رحم و کرم پر نہیں رہے، وہ تمہارا خون پینے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں۔ اپنے ساتھی کمسلر کا تم نے دیکھا کیا حشر کیا انہوں نے، وہ تو میری جان کے بھی

www.PakiBooks.Site

دشمن ہو گئے تھے تمہاری وجہ سے۔"

"تو پھر کیا کروں میں شہزی ڈیئر؟" وہ پھر طنزیہ ہنسی سے بولا۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ بدبخت ابھی تک بے حد پُراعتماد نظر آرہا تھا۔ حالانکہ دیکھا جاتا تو وہ خود بھی اپنے سارے ساتھیوں کی میرے ہاتھوں ہلاکت کے بعد تنہا اور غیر محفوظ سا ہو گیا تھا مگر ہنوز وہ اب فقط اپنے اکیلے کے بل بوتے پہ اسی طرح اکڑا تھا۔

مجھے یہ سب سوچ کر خفت ہوئی تھی کہ میں ابھی تک اس حرام زادے پر قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔

"چلو اب اپنی بکواس بند کرو تم۔" وہ درشتی سے بولا اور یاسمین کو چھوڑ کر اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہونا چاہیے، ساتھ ہی مجھے ایک اور بھی بندوبست کرنا ہے۔ تھوڑا فیول اور گرانا ہوگا مجھے۔"

پھر وہ یاسمین کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم میرے ساتھ چلو۔" اس کے بعد اس نے گھوم کر ایک طرف دیوار سے لگے بیٹھے پروفیسر جمشید کی طرف گھور کر دھمکاتے ہوئے کہا۔

"او... بڈھے! یاد رکھنا، میں ابھی اِدھر ہی ہوں، شہزی کے ہاتھ کھولنے یا اور کوئی چالاکی کرنے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں، تمہاری پھول سی پیاری بیٹی ابھی میرے ساتھ ہے۔" کہتے ہوئے اس نے میری جانب بھی معنی خیز نظروں سے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

ایک قیامت خیز طوفان کے گزر چکنے کے بعد کچھ گھڑیاں ہمیں ایسی میسر آئی تھیں کہ کچھ خاموشی اور سکون سا محسوس ہونے لگا تھا۔ سکون اس لیے کہ مجھے امدادی ٹیم کے پہنچنے کی پوری امید تھی۔ یہی امید اس تباہ حال طیارے کے بدنصیب مسافروں کو بھی رہی ہوگی۔

وقت گزرتا رہا۔ تھوڑا بہت جو تھا، وہ ہم نے زہر مار کیا۔ شام سر پر آگئی۔ کوبارا تھوڑی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھلے دروازے ـــ والے حصے کی طرف چلا جاتا تھا، اردگرد ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ واپس پلٹ آتا۔ یکایک مجھے یوں لگا جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ جیسے قیامت کی رہی سہی گھڑیاں بھی زہریلے سنپولوں کی طرح غیر محسوس انداز میں سرکتی ہوئی ہمارے قریب آنے لگی ہوں۔

میں جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا، اس طرف ایک کھڑکی باہر صحرا کا منظر پیش کرتی تھی۔ میں نے دیکھا۔ لق و دق صحرا پر شام کا پُرہیبت منظر بکھرنے لگا تھا۔ آسمان ڈھلتے سورج کی الوداعی کرنوں سے سرخ ہو رہا تھا۔ دور ریتیلے ٹیلوں کے افق پار سورج جیسے دھنسا جا رہا تھا۔ آسمان تاریکی اور کہیں تاریکی کے ملے جلے رنگوں میں عجیب منظر پیش کرتا دکھائی دیا۔ پورا صحرا ایک عجیب سے سناٹے میں مستغرق سا محسوس ہوتا تھا۔

ہم چاروں ایک دوسرے سے فاصلہ رکھے بیٹھے تھے۔ یہ کوبارا کا حکم تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں یاسمین یا پروفیسر جمشید کے میرے ساتھ ساتھ بیٹھنے سے وہ میرے ہاتھوں ...کی رسی نہ کھول ڈالتے۔

میری نظریں گاہے بگاہے اس منحوس سے جی کوبارا کے چہرے کا بھی جائزہ لے رہی تھیں، تاثرات سے مجھے لگا تھا کہ جیسے وہ اندر ہی اندر کوئی آئندہ کی پیش قدمی مرتب کر رہا ہو۔

جب شام ڈھل گئی اور رات نے صحرا پر اپنا خوابیدہ پڑاؤ ڈالا تو ٹھنڈ سی محسوس ہونے لگی۔ صحرا کا مزاج بھی عجیب ہوتا ہے۔ دن میں باپ جیسی شفقت کے جیسا گرم جوش تو رات میں ممتا بھری ماں کی گود کی طرح ٹھنڈا۔ صحرا کے مغربی ٹیلوں سے طباق چاند ابھر کر تاروں کے ٹمٹماتے جھنڈ کے درمیان ضوفشاں ہونے لگا تھا۔ ہر صورت پہ ایک طلسماتی سی چاندنی بکھر گئی تھی۔

"ہم اب چلیں گے۔" اچانک کوبارا نے ایک نیا حکم صادر کر دیا۔

"کیا مطلب؟ ہم کہاں جا سکتے ہیں اس ٹھٹھرتی رات میں...؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر تلخی سے کہا۔

"یہ رات ہی تو ہماری پناہ گاہ ہے۔" کوبارا معنی خیز لہجے میں مسکرا کر بولا۔ "مجھے امید ہے کہ یہاں قریب میں کوئی آبادی مل جائے گی۔ ممکن ہے اونٹ کی سواری بھی۔"

"تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"سوبارغہ۔"

"وہاں جانے کا مقصد؟" میں نے بظاہر بے دلی سے پوچھا۔

"وہی میری اصل منزل ہے۔ جہاں میرے ساتھی پہلے ہی سے میرے منتظر ہیں۔" وہ فخر سے بولا۔ "افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔"

"یہ رابطہ ممکن ہو سکتا ہے۔" میں نے اس کی کمزوری بھانپتے ہی کہا۔

"وہ کیسے؟" اس نے میری طرف قدرے چونک کر دیکھا۔

"کاک پٹ کا جائزہ لینا پڑے گا کہ وہ کس حد تک بچا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کا وائرلیس اینڈ ریڈیو سسٹم درست ہے تو کام بن سکتا ہے۔"

"اوہو..." وہ چونکا۔ "یہ تو تم نے اچھی بات بتائی ہے جو مجھے پہلے ہی سوچ لینی چاہیے تھی۔"

"تمہاری عقل صرف انسانی لہو بہانے تک ہی محدود رہتی ہے۔ فوراً کاک پٹ کا جائزہ لو اور اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلاؤ، ورنہ یہ جلے بھنے بیٹھے مسافر موقع ملتے ہی ہم چاروں کی تکابوٹی کر ڈالیں گے۔"

میں نے دانستہ اسے کچھ ایسا تاثر دیا کہ جیسے میں بھی مسافروں سے ڈرا ہوا اور خوف زدہ ہوں۔ حسبِ توقع میری بات پر اس نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا اور اسی انداز میں بولا۔

"ہا...... ہا...... میرا عظیم دشمن ڈر گیا... ڈرنے کی بات نہیں، یہ صورتِ حال ہی ایسی ہے، تم نے دیکھا نہیں کس قدر یہ لوگ ہم پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ایک ذرا موقع ملنے کی دیر ہے انہیں، کسلر کا کیا حشر کیا انہوں نے۔" میں نے بدستور اپنی "پالیسی" جاری رکھی۔ وہ حظ اٹھانے والے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔

"چچ... چچ... بڑے بُرے پھنسے شہزی تم تو... میں تمہیں ادھر ہی ان کے پاس چھوڑ جاؤں گا... یہ تم سے میرا حساب کتاب کر لیں گے، کسلر بھی ان کے ہاتھوں مر گیا اور اب تم بھی... اس کے بعد... میرا نام اور میری شکل بھی انہیں کسی کو بتانے کے لیے یاد نہیں رہے گی، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ امدادی ٹیمیں کسی وقت بھی یہاں پہنچنے والی ہیں۔"

"مت... تم ایسا نہیں کر سکتے..... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔" میں نے سخت گھبرا اپنے لہجے میں دانستہ خوف سموتے ہوئے کہا، اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ یاسمین سے تحکمانہ درشتی سے بولا۔

"تم مسافروں والے حصے میں جاؤ اور عملے کو کہو کہ چند ضروری سامان بستر وغیرہ صرف دو افراد کے ہاتھ یہاں بھجوا دے فوراً۔"

"اسے وہاں مت بھیجو کوبارا.....!" میں نے پریشان ہو کر کہا۔

کوبارا نے سنسناتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر کہتا رہا۔

"مسافر اسے دبوچ لیں گے، اسے ان سے جان کا خطرہ ہے۔" کوبارا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا اور ادھر میرا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔

نوکر

افسانہ نگار نے نوکر کو کاغذ جلاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔

"کیوں رمضو! میرے کام کے کاغذ تو نہیں جلا دیے؟"

نوکر نے کہا: "حضور۔ احمق نہیں ہوں صرف لکھے ہوئے بیکار کاغذ جلائے ہیں۔ کام کے سادے کاغذ ویسے ہی چھوڑ دیے ہیں۔"

حل طلب

پہلا دوست: "یار آدھی رات کو آنکھ کھل جائے اور گھڑی بند ہو، تو وقت کس طرح معلوم کیا جائے؟"

دوسرا دوست: "یہ کون سی مشکل بات ہے؟ زور زور سے گانا شروع کر دو۔ چند ہی لمحوں میں کسی کی گرجتی برستی آواز سنائی دے گی۔ کیا ہے جی؟ یہ آخر رات کے ڈھائی بجے راگ الاپنے کی کیا تک ہے؟"

جتوئی سے چودھری محمد سرفراز کا مشورہ

دیانت

انگریزوں کی دیانت داری مشہور ہے۔ ایک انگریز اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ ٹرین میں سفر کر رہا تھا۔ راستے میں اچانک وہ اٹھا اور خطرے کی زنجیر کھینچ دی۔ ٹرین فوراً رک گئی۔ گارڈ دوڑا دوڑا آیا اور پوچھا۔

"آپ نے زنجیر کھینچی ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "ہاں۔"

"مگر کیوں؟"

انگریز نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میرا بیٹا اسی لمحے تین سال کا ہو گیا ہے۔ اب مجھ پر واجب ہے کہ اس کے ٹکٹ کے پیسے ادا کر دوں۔"

کراچی سے نہال خرم کی دیانت داری

"میں چلی جاؤں گی شہزی! کوئی مسئلہ نہیں۔" اچانک یاسمین کی بات نے کوبارا ہی کو نہیں بلکہ مجھے بھی چونکا دیا۔ کوبارا کے بدہیئت ہونٹوں پر مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ وہ مجھ سے تضحیک آمیز انداز میں بولا۔

"یہ تم سے زیادہ بہادر ہے۔ ٹھیک ہے جاؤ تم....."

"یاسمین! تم اندر داخل ہونے کی کوشش مت کرنا۔

باہر ہی سے کھڑے ہو کر اس کا حکم پہنچا دینا۔" میں نے اس سے کہا۔ اس نے میری طرف پھیکی سی مسکراہٹ سے دیکھا اور تب ہی مجھے اس کی کشادہ آنکھوں میں ایک عجیب سے تاثر کی جھلک محسوس ہوئی۔ وہ تاثر ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہی ہو ...
"مجھے جانے دو شہزی!"

میں جانتا تھا کہ یاسمین کے دل میں بھی کوہارا کے خلاف نفرت و انتقام کا وہی جوالا مکھی بھڑک رہا تھا جو میرے اندر تھا۔ کوہارا اس کے منگیتر جواد کا قاتل تھا اور یاسمین اسے نہیں بھولی تھی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی؟

یاسمین جہاز کے کھلے حصے سے نیچے اتر گئی۔ کوہارا کو تسلی تھی کہ وہ کہیں نہیں بھاگ سکتی لیکن مجھے اس کی فکر ہو رہی تھی، ایک ہی سوال مجھے پریشان کر رہا تھا کہ "وہ کیا کرنے والی تھی؟" جبکہ اس نے مجھے "کچھ کرنے" سے منع کر دیا تھا۔

"اور سنو...... شہزادی! اس بڈھے کیپٹن کو بھی اپنے ساتھ یہاں لے آنا۔ اس سے فوراً وائرلیس اور ریڈیو سسٹم کی مدد لینا ہے۔" کوہارا نے آخر میں یاسمین سے کہا۔

وہ ایک نگاہ پھر مجھ پر ڈالتے ہوئے جہاز کے حصے سے نیچے اتر گئی اور باہر تاریکی میں غائب ہو گئی۔ باہر صحرا تھا جہاں ہر سو ہو کا عالم طاری تھا۔ یاسمین کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لوگوں نے مقدور بھر کوشش سے کچھ روشنیاں کر رکھی تھیں۔ ہمارے حصے میں بھی چند ایک بتیاں کوہارا نے روشن کر دی تھیں۔

کوہارا یہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا اور اس سے پہلے وہ موبار غنڈا کی کسی علاقے میں موجود اپنے گماشتوں سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر ایک بار اس کے ساتھی یہاں پہنچ جاتے تو یہ بات کوہارا جیسے درندہ صفت کا ہمت و حوصلہ بڑھ جانے کا سبب ہوتا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ طیارے کے اس حصے کو نیچے گرتے ہوئے فیول پر برسٹ چلا کر آگ میں جھونک سکتا تھا۔

اندیشوں بھرا یہ وقت بھاری سِل کی طرح دھیرے دھیرے سرکتا رہا۔ کافی دیر بیت گئی یاسمین یا اور کوئی اس طرف نہیں آیا تو کوہارا کو فکر ہوئی۔

وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کر طیارے کے کھلے حصے والے دروازے کی جانب بڑھا اور باہر جھانکنے لگا۔ تب ہی اس نے رات کے پُرہول سناٹے میں ایک ہوائی برسٹ فائر کیا۔ گولیاں چلنے کی بھیانک تڑتڑاہٹ خاموش صحرا میں ابھری اور اسرار بھرے سکوت میں ہلچل مچ گئی۔

مجھے خدشہ ہوا کہ کہیں کوہارا نے کسی کو بربریت کا نشانہ تو نہیں بنا ڈالا مگر ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے اس نے وہیں کھڑے کھڑے چلا کر کہا۔

"میرے حکم کی تعمیل کرو فوراً...... ورنہ اس بار فیول ٹینک کے قریب پھیلے ہوئے پیٹرول پر برسٹ چلا دوں گا۔"

یہاں وہ طیارے کے دوسرے حصے میں محبوس مسافروں کو یہ دھمکی دینے میں مصروف تھا اور وہاں میری نظریں یونہی کھڑکی سے پار پھیلی ہوئی مدھم سی چاندنی پر پڑیں اور دوسرے ہی لمحے میں بری طرح ٹھٹکا۔

مجھے ریت پر چند سائے رینگتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں کوئی سخت اشیا گویا ہتھیار کے طور پر تھمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بے اختیار میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

جو کام مجھے کرنا چاہیے تھا، وہ کوئی اور کر رہے تھے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی خود کو کوہارا کے سامنے اس قدر بے بس نہیں پایا تھا۔ بلکہ کئی مواقع پر تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے آزاد تھے مگر دونوں ہی مجبور بھی۔

میری نظریں ان متحرک سایوں پر جمی رہیں۔ وہ حرکت کرتے اور تاریکی کی یا کسی آڑ میں غائب ہو جاتے۔ اندازہ کر سکتا تھا میں کہ یہ اسی مشتعل مسافروں کے ٹولے سے تعلق رکھنے والے ہو سکتے تھے۔ ان کی جرات اور عزم اپنی جگہ لیکن مجھے خدشہ تھا کہ اگر یہ ناکام ہو جاتے تو اپنے ساتھ کئی لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیل سکتے تھے۔ کیونکہ کوہارا پر... ناکام حملے کے نتائج کتنے بھیانک نکلا کرتے تھے، یہ مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا!

میں دل ہی میں ان کی "مہم جوئی" کی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگا اور ساتھ ہی جب میں نے ایک غیر ارادی عمل کے تحت اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں پر زور آزمائی کرنا چاہی تو دفعتاً ایک جھماکا میرے ذہن میں ہوا۔

کوہارا...... اپنے کہنے کے مطابق ان بندشوں کی تسلی نہیں کر سکا تھا اس لیے کہ جب اس نے یاسمین کو دبوچنا چاہا تھا تو اس کا باپ پروفیسر جمشید اپنی بیٹی یاسمین کو اس شیطان کی گرفت میں دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا تھا اور اس کی جانب بڑھا تھا۔ جس پر کوہارا نے طیش میں آ کر اس بے چارے بوڑھے شخص کو پرے دھکا دے دیا تھا، یوں آپا دھاپی میں کوہارا یہ تسلی کرنا بھول گیا تھا کہ یاسمین نے میرے ہاتھوں کے جکڑ بند کس قدر "مضبوطی" سے بند کیے تھے۔ یوں اس "آپا دھاپی" میں میرا بھی چند لمحات تک اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ اب جو توجہ دی تو سنسنی کی ایک لہر۔ میرے

www.PakiBooks.Site

ے وجود میں دوڑ گئی۔

"آخر دیکھا تو جانے کہ یاسمین نے کوئی کسر چھوڑی تھی س پر کوہارا کا خوف کچھ زیادہ ہی غالب رہا تھا۔" میرے ن میں ابھرا لیکن جب میں نے یہ کوشش چاہی تو بندشیں ے اسی طرح ہی مضبوط محسوس ہوئیں جیسی کہ ہونی چاہیے یں۔

مایوسی کی لہر سی دل و دماغ میں اٹھنے کے باوجود میں نے فطری ردِعمل کے تحت ذرا مزید "زور آزمائی" کی تو دنگ یا۔ صرف تھوڑی سی کوشش سے مجھے جکڑ بندوں کے حلقے ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ یہی مایوسی کی لہر یکا یک مسرت بدل گئی۔ میں جلد بازی سے میں کام نہیں لینا چاہتا تھا۔

اسی اثنا میں کوہارا چیخنے چلانے کے بعد دوبارہ غصے سے ڑتا ہوا پلٹا۔ میں نے بازوؤں کی حرکات ایک دم روک یں۔ وہ اپنی ستونوں جیسی دونوں ٹانگیں پھیلائے میری طرف ن ناک نظروں سے گھورتا رہا۔ میرے دل کو دھڑکا لگا کہیں س بدبخت کو کچھ یاد تو نہیں آ گیا۔ لہٰذا میں نے اس کا دھیان نے کے لیے جلدی سے کہا۔

"کیا ہوا......؟ تمہارے حکم کی ابھی تک تعمیل نہیں وئی؟"

"تمہاری حرافہ لگتا ہے کسی اور چکر میں ہے۔" وہ ے طیش کے منہ سے جھاگ اڑاتا ہوا غرا کر بولا۔ "میں نے اس سے کہا تھا کہ باہر ہی کھڑے ہو کر میرا یہ حکم پہنچائے۔ یا اندر چلی گئی ہے، کسی سے ساز باز ..." اس کا جملہ منہ ں ہی رہ گیا۔ اسی وقت میں نے اس کے عقب میں دو سائے تیزی سے حرکت کرتے دیکھے۔

وہ شاید اس کے رخ پھیرنے کے ہی منتظر تھے اور کب سے گھات لگائے اسی مقصد کے لیے بیٹھے تھے۔ ایک نے کسی ٹھوس سلاخ دار شے سے کوہارا کے عقب سے اس کے سر کے پچھلے حصے پر زور سے ضرب لگانا چاہی تو شاید جوشِ غیظ تلے یا ڈرے ہوئے کسی انجانے خوف و اندیشے کے سبب اس کا پاؤں رپٹا، یوں وار سر کے بجائے کوہارا کے ایک کندھے پر پڑا۔

میں نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ گینڈے جیسی سامت والے کوہارا پر اس کا بس اسی قدر... اثر ہوا کہ اس نے چوٹ کھا کے پلٹنا چاہا تو دوسرے سائے نے اپنے پہلے ساتھی کی بہ نسبت ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے کوہارا کی پیشانی پر راڈ رسید کر دی۔ کیونکہ تب تک کوہارا ان کی طرف پھرتی سے پلٹ چکا تھا۔

یتیم

ایک دوست نے قمر لبے کی دعوت کی۔ دسترخوان پر بیٹھے تو پیلے شوربے میں تیرتے صرف دو انڈے نظر آئے۔ قمر لبے جل بھن گئے۔ معلوم ہوتا تو ہرگز دعوت قبول نہ کرتے۔ انہوں نے طنزیہ لہجے میں میزبان سے پوچھا۔
"ان انڈوں کے والدین کہاں ہیں؟"
"یہ بے چارے یتیم و یسیر تھے!" میزبان نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

کراچی سے نہال خرم کا تعاون

دوسرے کی راڈ کی ضرب نے بھی بس اس حد تک ہی کام کیا تھا کہ کوہارا کی چوڑی پیشانی پر خون کی لکیر بہا دی تھی۔ اس کے بعد کوہارا کی گن نے آتشی قہقہہ اگلا تھا اور دونوں حملہ آوروں کے جسم چھلنی ہو کر گر پڑے۔ میرا دل دکھ سے بھر گیا۔

"اب میں کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔" وحشیانہ انداز میں غرایا۔ کوہارا کا خون آلود چہرہ اس سے مزید بھیانک اور خونخوار محسوس ہوا۔

اس درندے کے جارحانہ عزم بھانپتے ہی میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب وہ کون سی قیامت ڈھانے والا ہے لیکن...... وہ مجھے اور پروفیسر جمشید کو یہاں اکیلا چھوڑ کر باہر نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا وہ ہماری جانب پلٹا، ایک نگاہ قریب دیوار سے لگے بیٹھے پروفیسر جمشید پر ڈالی اور دوسری مجھ پر۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی اور جس کی نال سے دھوئیں کی لکیر سی فضا میں تحلیل ہوتی نظر آئی۔ میرا دل یکبارگی لرزا تھا، میں اس کے کام کا نہ رہا تھا۔ جو تھے انہیں اس نے زندہ رکھا ہی تھا یعنی پروفیسر اور یاسمین۔

تب ہی کوہارا کے بدہیئت ہونٹوں پر میں نے ایک سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔ "شہزی! تم میرے لیے اب ایک اضافی بوجھ کے سوا کچھ نہیں رہے۔ اپنے عظیم دشمن کو یوں بے بسی کے انداز میں ہلاک کرنے پر مجھے دکھ تو ہو گا مگر مجھے یہ اہم کام بھی سرانجام دینا ہی پڑے گا۔ ماسٹر لولوش کا تو تم خیر بال بھی بیکا نہیں کر سکے سوائے اپنا ہی سر پٹخنے کے...... خیر، مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" بڑے خوں ناک انداز میں یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی دھواں اگلتی گن کی نال کا رخ میری جانب اٹھا دیا۔

میں اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ موت...... یقینی موت...... کی جھلک کیا ہوتی ہے، اس کا مجھے آج احساس ہو رہا تھا۔ خود

www.PakiBooks.Site

میں ہنوز زمین بوس اور بے بس تھا، ایسی بے بسی کی موت کا تو میں نے گمان بھی نہیں کیا تھا۔

تب ہی میں نے کوہارا کی موٹی انگلی کو ٹریگر پر یک دم حرکت کرتے دیکھا۔

☆☆☆

”ٹرچ..... ٹرچ..... ٹرچ.....“ اس مخصوص طرز کی آواز نے جہاں کوہارا کے چہرے کا رنگ پھیکا کر ڈالا تھا وہیں میرے اندر زندگی کی سرتیں جگا دی تھیں۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جتنا بڑا نام اتنا بڑا آسرا..... میں ہنس پڑا اور ہنستا ہی چلا گیا۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالات کی شوریدہ سری میں اچانک کچھ ایسی انہونیاں اور اتفاقات شاید انسان کے دماغ کو بھی کبھی تھوڑا ”خلل زدہ“ کر ہی ڈالتے ہیں۔

”ہاہا ہاہا ..... کوہارا..... ! تمہارا کھیل اب ختم ہو گیا۔“

کوہارا کی حالت پتلی ہونے لگی بلکہ وہ باؤلا سا ہونے لگا تھا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی گن کو دو تین بار الٹا پلٹا اور پھر بے بسی اور طیش تلے اس نے اسے ایک جانب اچھال دیا۔ ایسے میں اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف نمایاں ہونے لگا کہ وہ اپنے تیزی سے کام کرتے ذہن سے کچھ سوچ رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ پدکا۔ اس نے کاک پٹ کا رخ کیا۔

میری پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ وہ ایک دم سے کاک پٹ میں کیا کرنے گھسا تھا؟ اس سوال پر غور کرنے کے بجائے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی بندشوں کو کھولنا ضروری سمجھا۔

یاسمین نے اپنے تئیں کافی ”رعایت“ برتی تھی۔ میں اس سے استفادہ کرنے لگا۔ چند ثانیوں بعد ہی میں نے جب کوہارا کو کاک پٹ سے برآمد ہوتے دیکھا تو چونک پڑا۔ اب مجھے اس کے یوں حرکت میں آنے کا سبب معلوم ہو گیا جو اس کے ایک ہاتھ میں پستول کی صورت نظر آ رہا تھا۔ میرے ہی نہیں شاید کوہارا کے ذہن سے بھی یہ پستول محو ہو گیا تھا۔ جس کا اچانک خیال آنے کی وجہ شاید یہی تھی کہ کوہارا تہی دست ہو گیا تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو کاک پٹ میں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر جا گرا تھا اور اسی پستول سے میں نے کوہارا کا دایاں بازو زخمی کیا تھا۔

اگرچہ یہ بھی اس کے لیے ناکافی تھا کیونکہ اس میں بھی چند ہی گولیاں بچی ہوں گی جبکہ میرے لیے تو اس وقت ایک ہی گولی کافی تھی۔ کوہارا نے اسی لیے شاید فوری طور پر یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر یاسمین کے بغیر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ پروفیسر جمشید کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے کے لیے اس کی بیٹی یاسمین، کوہارا کے لیے ایک ”بفر“ کا کام کرتی تھی۔

میں ایک بار پھر فوری موت کی زد میں تھا۔ کوہارا ... اب پستول ہاتھ میں تھامے اس کی نال کا رخ میری جانب کیے ہوئے تھا۔ میری یک ٹک نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ موت مجھ سے محض چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔

اس کی انگلی ٹریگر پر ایک ذرا جنبش کی دوری پر تھی جبکہ ادھر میں اپنے ہاتھوں کی بندشیں بھی پوری طرح نہ کھول پایا تھا۔

”کوہارا.....!“ اچانک ایک آواز پر ہم دونوں ہی چونک اٹھے اور بیک وقت گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں یاسمین کھڑی تھی۔ اس کے ہمراہ دو آدمی جو عملے کے ہی تھے، ایک وہی کیپٹن تھا۔ اسے یاسمین نے ہی پکارا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں کچھ ہینڈ کیریز تھمے ہوئے تھے جو انہوں نے فرش پر رکھے تھے۔ ان میں ایک میرا بھی تھا۔

”تم نے اگر شہزی کو ہلاک کیا تو میں بھی خودکشی کر لوں گی۔ پھر تم جانتے ہی ہو کہ..... میرا باپ میرے مرنے کے بعد تمہیں کبھی بھی اس خفیہ جزیرے تک نہیں پہنچائے گا جہاں تم جانا چاہتے ہو۔“

یاسمین کی اس دھمکی نے کوہارا جیسے درندہ صفت شخص کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں سی نمودار ہو گئیں اور پھر ایک دم وہ مکروہ انداز میں ہنسا۔

”بہت یارانہ ہے آپس میں تم دونوں کا..... خوب..... شہزی تمہیں مبارک ہو لیکن مجھے اس اہرام تک پہنچنا ہو گا..... ورنہ میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ آخر میں غصے سے غرایا۔ اس کے انداز سے مجھے بے بسی کی جھلک سی محسوس ہونے لگی تھی۔

”لیکن تم کہاں مر گئی تھیں؟“ وہ اسے گھور کر طیش زدہ لہجے میں بولا۔ ”مجھ پر ابھی تھوڑی دیر پہلے دو افراد نے دھوکے سے حملہ کیا تھا۔ میں نے انہیں ہلاک کر دیا ہے۔ اب میں اس کا بدلہ باقی مسافروں سے ضرور لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ انہیں ایک طرف دھکا دیتے ہوئے جنونی انداز میں نکاس کے راستے کی جانب بڑھا۔ میں حلق کے بل چلایا۔

”اس درندے کو روکو..... یہ مسافروں والے حصے کو آگ میں جھونکنے کے لیے جا رہا ہے۔“

www.PakiBooks.Site

کوہارا..... ابھی سامنے ہی تھا۔ کیپٹن یا اس کے دو ساتھیوں کو کوہارا کو روکنے کی جرات نہ ہو سکی لیکن یاسمین نے کوہارا سے ہاتھ جوڑ کر التجا کر ڈالی۔ ”نہیں کوہارا..... خدا کے لیے نہیں۔ یہ بے چارے سب بے گناہ ہیں۔“

”ہٹ جا میرے راستے سے کتیا! یہ سارے تیرے اور شہزی ہی کے کہنے پر ایسا کرتے ہیں، اب انہیں پتا چلنا چاہیے کہ میں کیا شے ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے یاسمین کو ایک طرف دھکا دیا تو میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ مجھے دیکھ کر کوہارا وہیں رک گیا اور مجھ پر پستول تان لیا۔

”تم اب کوئی حرکت نہیں کرو گے۔“ میں رک گیا مگر اسے بھیانک ظلم کرنے سے باز رکھنے کی کوشش میں بولا۔

”دیکھو کوہارا.....! آگ لگنے کی صورت میں مسافروں میں تمہارے خلاف مزید نفرت بڑھے گی۔ سب کا تو آگ میں جل مرنا ممکن نہیں ہو گا، اور جو باقی بچیں گے وہ تمہاری تکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ تمہارے پاس صرف ایک پستول ہے اور اس میں بھی پتا نہیں کتنی گولیاں بچی ہوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اب تم مزید کوئی ابتری پھیلانے کے بجائے اپنے آئندہ کے پروگرام پر عمل کرو۔“

کوہارا کو میری بات میں شاید وزن محسوس ہوا۔ وہ بھناتے ہوئے انداز میں واپس پلٹا۔ اکلوتی نگاہ سے یاسمین اور کیپٹن کی طرف دیکھا، اس کے دونوں ساتھیوں نے سامان اٹھا رکھا تھا۔ اس نے سامان انہیں وہیں رکھنے کا حکم دیا اور عملے کے دو افراد کو واپس اپنے حصے میں جانے کا کہا۔ اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس بار کسی نے مہم جوئی دکھانے کی کوشش چاہی تو صرف ایک گولی طیارے کے اس حصے میں آگ بھڑکانے کے لیے کافی ہو گی۔

کیپٹن کو کوہارا نے کوئی فریکوئنسی یا رابطے کا نمبر بتایا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ کیپٹن بھی ایک جیالا آدمی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے کوہارا کا کہا نہیں مانے گا اور حسب عادت ہیر پھیر سے کام لے گا۔

وہ دونوں کاک پٹ میں مصروف تھے اور یاسمین کو بھی کوہارا نے اپنے ہمراہ رکھا ہوا تھا۔ میں اکیلا تھا اور اب میرے پاس بہت مہلت تھی۔ میں نے تھوڑی مزید زور آزمائی کے بعد اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھول ڈالیں۔

کوہارا کو نہیں معلوم تھا کہ میں آزاد ہو چکا ہوں۔ پستول اس کے پاس تھا اور میں نہتا تھا۔ جلد بازی خطرے کا سبب بن سکتی تھی۔ میں اسی طرح فرش پر بیٹھا رہا۔ مکار کوہارا نے کاک پٹ کا دروازہ دانستہ کھلا رکھا تھا اور وہاں سے گاہے بگاہے وہ

اقوال مس زرین

☆ باس وہ شخص ہے جو اس روز دفتر میں جلدی پہنچتا ہے جب تم اتفاق سے کچھ لیٹ ہو جاتے ہو اور اس روز دیر میں آتا ہے، جب تم حسب معمول وقت مقررہ پر دفتر میں پائے جاتے ہو۔ اور اس روز بالکل ہی نہیں آتا جب تم منے اور منی کی کتابوں کے لیے کچھ رقم ایڈوانس لینا چاہتے ہو۔

☆ شادی اس رسم کا نام ہے جس میں تمہاری ساری جمع پونجی ختم ہو جاتی ہے اور باقی ساری زندگی بیوی کا قرض ادا کرتے گزر جاتی ہے۔

☆ ایک زمانہ تھا جب گناہ کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے جب گناہ کو احساسِ برتری یا احساسِ کمتری کے خوب صورت نام سے معنون کیا جاتا ہے۔

☆ ایک چھوٹے سے کمرے میں بند، اس دیوزاد کتے کا نام امریکا ہے جو پیار سے دُم ہلاتا ہے تو دو چار چاہنے والوں کو کرسی کے نیچے پھینک دیتا ہے۔

☆ لڑکی کی زندگی میں وہ دور بہترین ہوتا ہے جب اس کا عاشق اس کے پاس بیٹھ کر محبت بھرے انداز میں اسے اپنی خوبیاں بتاتا ہے۔

☆ شادی کے بعد کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا گیا جس نے مکمل طور پر اپنا کنٹرول نہ کھو دیا ہو۔

☆ اسے علم ہی نہیں تھا کہ کتنا زبردست حادثہ ہوا ہے اور جب علم ہوا تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اس کی شادی ہو چکی تھی۔

☆ بے چاری فلم ایکٹرس کا شوہر بڑا تبدیلی پسند واقع ہوا ہے۔ ایک مہینہ قبل وہ اس کی پوجا کرتی تھی اور ایک ماہ بعد وہ اس کے منہ پر تھوکنے تک کی روادار نہیں ہے۔

☆ پہلے کوئی کتا کسی انسان کو کاٹ لیتا تھا تو خبر بن جاتی تھی، پھر انسان کتوں کو کاٹنے لگے تو خبریں بننے لگیں۔ اب دونوں کو کاٹا جا رہا ہے لیکن خبر نہیں بن پاتی۔

ورابن کلاں سے مرحا گل کا تعاون

www.PakiBooks.Site

مجھ پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس کا شاید اپنے ساتھیوں سے رابطہ ہو گیا تھا اور وہ کانوں میں ہیڈ فون چڑھائے کسی سے باتیں کرنے میں... مصروف تھا اور میری جانب بھی تکے جا رہا تھا۔

یاسمین اور کیپٹن کو اس نے ایک طرف کھڑا رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ کیپٹن نے شاید سوچا ہو کہ اچھا ہو اس کے ساتھی آجائیں اور اس مصیبت (کوہارا) کو لے کر یہاں سے جلد دفعان ہو جائیں یا پھر وہ بھی اس کی دھونس دھمکی سے مجبور ہو گیا ہو، بہرحال کوہارا کا کام ہو گیا تھا۔ لیکن یہ بات میرے اور یاسمین سمیت اس کے باپ کے حق میں نہیں جاتی تھی۔ مجھے رسن بستہ حالت میں ہونے کے باوجود وہ مجھ پر اپنی نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اگرچہ اب ایسا نہیں تھا، میں اپنے ہاتھوں کے جکڑ بند کھول چکا تھا لیکن اب بھی اسی طرح دونوں ہاتھ پیچھے کیے دیوار سے لگا بیٹھا تھا کہ جیسے وہ بندھے ہوئے ہوں۔

کوہارا کو میں جلتی سلگتی نظروں سے کسی سے جوش بھرے انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب بھی کچھ کرنے سے قاصر رہا تو میرے اندر جھنجلاہٹ اور جوشِ غیظ کا شدید طوفان سا اٹھا۔ مگر میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا رہا اسی طرح، کیونکہ جانتا تھا کہ اب ''گیم'' میرے ہاتھوں میں آنے والی ہے۔

اسی وقت چار افراد کو میں نے کود کر اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کے راڈ اور اسی طرح کی دوسری اشیا تھیں۔ میرا دل انہیں دیکھ کر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کوہارا اندر ایسے رخ پر تھا کہ وہ انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

یہ چاروں مشتعل ٹولے سے تعلق رکھنے والے افراد تھے، مجھے ان پر غصہ آیا۔ حالانکہ میں انہیں سمجھا کر بھی آیا تھا، پھر ان کے دو اور بے گناہ ساتھی اسی طرح کی مہم جوئی میں کوہارا کے ہاتھوں بڑی سفاکی سے ہلاک ہوئے تھے۔ مگر ان کا غیظ اور جوشِ نفرت تھا کہ کم نہیں ہو پا رہا تھا۔ ممکن تھا کہ محلے کے ان دونوں آدمیوں نے کوہارا کی بے بسی کے بارے میں انہیں آگاہ کر دیا ہو...

وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری طرف لپکے۔

''کہاں ہے وہ درندہ......؟'' ایک نے چلا کر پوچھا۔

کوہارا بدکا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ میری نظروں نے ایک بار پھر خوں ریز منظر دیکھا۔ کوہارا نے عقب سے کاک پٹ کے اندر ہی کھڑے کھڑے اپنے پستول سے اس پر گولی چلا دی۔ وہ چیخ مار کے گرا۔

اس کے باقی ساتھیوں کو صورتِ حال اور کوہارا کی ''پوزیشن'' کا اندازہ ہوا۔ وہ اسی طرف جوش میں لپکے۔ کوہارا نے دوسرا فائر داغا۔ ایک اور گرا۔

تو میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی۔ باقی دونوں حملہ آوروں نے جو شے اپنے ہاتھوں میں تھام رکھی تھی وہ اندر اس پر زور سے پھینکی۔ جو کوہارا کے کہیں لگی۔ اس کی ہلکی کراہ برآمد ہوئی۔ ان دونوں کے حوصلے بلند ہوئے۔

مجھے یاسمین کی فکر ہو رہی تھی۔ کاک پٹ کے اندر داخل ہونے کی اور کوئی جگہ نہ تھی۔ دونوں حملہ آور دھڑا دھڑ اندر داخل ہوئے۔ پھر پستول چلنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اور چیخ نے میرا اندر دکھ سے بھر دیا۔ کس طرح سر سے کفن باندھے ہوئے تھے یہ حملہ آور...... جو یقیناً عام سے مسافر ہی تھے مگر اپنی بقا کے لیے انہوں نے جان کی بازی لگا دی تھی اور میں ادھر مصلحتوں میں پڑا رہا تھا جو ظاہر ہے میری مجبوری بھی تھی۔

لیکن ابھی نہیں پھر تو جیسے ایک طوفان بپا ہو گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اور بھی لاتعداد مسافر کسی بدمست جانوروں کے ریوڑ کی طرح اندر داخل ہوئے اور کاک پٹ میں گھس گئے۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ دو ایک نے مجھے بھی دبوچنے کی کوشش چاہی تھی مگر میں اپنا آپ چھڑا گیا تھا۔

ایک ہنگامہ جیسے طوفانِ بدتمیزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا، وہ پوری طرح بپا ہو چکا تھا۔ میں نے چلا کر یاسمین کو آواز دی، وہ اپنے بوڑھے باپ کو سنبھالتی ہوئی گرتی پڑتی باہر آئی اور میں انہیں لے کر مشتعل مسافروں کے ریوڑ کو چیرتا ہوا بڑی مشکلوں سے نیچے اترا۔

ہم نے اپنے ہینڈ کیری اٹھا لیے تھے۔ ان میں ہمارے ضروری کاغذات موجود تھے۔ اگرچہ میں اپنی خود احتیاطی کے تحت ضروری کاغذات وغیرہ کو ایک چمڑی پاؤچ میں بیلٹ کے ذریعے اپنے جسم سے ہی باندھے رکھتا تھا۔

یہاں ہر طرف لوگ پھیل گئے تھے۔ کوہارا کی بے بسی کی داستان محلے کے ان دو افراد کو وہاں سنانے کی دیر تھی اور یہ غدر مچ گیا تھا۔ چند نے اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر کوہارا پر ٹوٹ پڑنے کا موقع بالآخر نکال ہی لیا تھا۔

کوہارا سے واقعی اپنی بے بسی کے اعتراف کا اظہار کر کے غلطی ہوئی تھی۔

میں نے کوہارا پر لعنت بھیج کر کہ وہ ان کے ہاتھوں اپنے گمبلر جیسے ساتھی کے عبرت ناک اور لرزہ خیز انجام سے دوچار ہوتا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا ہے، میں چھپتا چھپاتا یاسمین اور پروفیسر جمشید کے ساتھ اپنی الگ راہ پر ہو

www.PakiBooks.Site

گیا۔

☆☆☆

ایک بڑا بوجھ سر سے اُتر گیا۔ ہم تینوں تاریک صحرا میں کافی دور تک چلتے رہے۔ پھر ایک ٹیلے کے پاس آ کر تھک کے بیٹھ گئے۔ ایسی حالت میں یہ مختصر سا سامان بھی بوجھ محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے یاسمین کو مشورہ دیا کہ اپنے ہینڈ کیری میں سے ضروری کاغذات وغیرہ نکال کر سنبھال لے اور باقی سامان ھر ہی چھوڑ دے، پتا نہیں ہمیں یہاں صحرا میں اور کتنا اور ہاں بھٹکنا پڑے۔ دونوں باپ بیٹی کو میری بات نامناسب یں لگی۔ ان میں سفری کاغذات کے علاوہ بالخصوص پروفیسر شید حیدری کے مرتب کیے ہوئے نقشہ جات بھی تھے۔ ایک چادریں سی بھی یاسمین نے نکال لی تھیں۔ یہ سب انہوں نے ں کر سنبھال لیے اور یوں ہم نے ہینڈ کیریز سے نجات حاصل کر لی۔

اس وقت ہماری سانسیں بُری طرح پھولی ہوئی تھیں۔ فر اب آزاد تھے۔ وہ ہمارے بھی دشمن ہو سکتے تھے۔ چہ زیادہ تر ہم پر اعتماد کرنے لگے تھے۔ تاہم کسی پر بھروسا رے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اب ماحول ہی ہنگامے والا بن گیا تھا۔

رات نصف پہر بیت چکی تھی اور ہم تباہ شدہ طیارے سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ امید یہی تھی کہ مسافروں کا کوئی مشتعل ٹولا یہاں نہیں آ سکتا تھا۔

''اُف میرے خدا...... ! کس قدر بُرے حالات کا ہم ر ہوئے ہیں۔'' یاسمین کی سانسیں بحال ہوئیں تو اس نے پھر اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''پاپا! آپ ٹھیک ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں بیٹا!'' وہ بولے۔ ''شکر کرو خدا کا کہ ن بچ گئی، لیکن اب یہ دعا کرو کہ وہ خونی درندہ عبرت ناک م کو پہنچ جائے اور اس موذی سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے۔''

''وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا ہوگا پاپا!'' یاسمین بولی۔ ''اس نے مزید مسافروں کو بھی جان سے مار ڈالا ہے تو اب وہ کے نرغے سے کہاں بچ سکے گا؟ اس کا تو پستول بھی خالی ہو تھا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہی ہمت یہ سارے لوگ مل پہلے کر لیتے تو.....'' کہتے ہوئے پروفیسر جمشید نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یاسمین نے جواب میں کہا۔

''مسافر تو پاپا اس درندے کی وجہ سے پہلے ہی خوف زدہ تھے، اس رذیل کوہارا نے ان پر اپنی دہشت ہی کچھ ایسی بٹھا رکھی تھی۔ ہمت صرف ان لوگوں نے پکڑی تھی جن کے بھائی اور باپ کو کوہارا کے ساتھی گمبلر نے ہلاک کیا تھا۔ پھر انہوں نے چند دوسروں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ کچھ لوگ ایسا قدم اٹھانے کے لیے انہیں روک رہے تھے اور چند بضد تھے۔ آخر میں طیارے کے اس حصے کو آگ لگانے والی دھمکی نے لٹے پٹے بُرے حال مسافروں کی رہی سہی ہمت بھی توڑ ڈالی، لیکن جو بھرے بیٹھے تھے وہ آخر تک موقع کی تاک میں رہے اور جب محلے کے ان دو آدمیوں نے آ کر کوہارا کی پریشانی اور بے بسی کے علاوہ یہ بتایا کہ وہ اب اپنے ساتھیوں کو یہاں بلانا چاہ رہا ہے تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے، انہیں خوف تھا کہ کہیں ان کے ساتھی انہیں دوبارہ قیدی نہ بنا لیں۔''

''تم نے صحیح کہا یاسمین!'' میں جو ان دونوں باپ بیٹی کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا، اس کی تائید میں بولا۔

''اور یہ بات کسی قدر درست بھی ہے کہ کوہارا کے ساتھیوں کی آمد ہم سب کی موت یا اذیتوں میں مزید اضافہ کر سکتی تھی۔''

''اب یہ باتیں چھوڑو، ظلم کی وہ سیاہ رات سمجھو تمام ہوئی۔'' پروفیسر جمشید ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''خدا کرے کہیں قریب میں کوئی آبادی نظر آ جائے۔''

''صبح ہونے سے پہلے ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔'' یاسمین بولی۔ ''تاریکی اور اندھیرے میں ہم راستہ بھٹک سکتے ہیں۔''

میں نے یاسمین کی بات پر پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔ ''جو مسافر پہلے ہی راستہ بھٹک چکے ہوں وہ بے چارے اور کیا راستہ بھٹکیں گے؟''

''تمہاری بات بھی صحیح ہے نوجوان!'' پروفیسر جمشید پہلی بار مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیں جتنی جلد ہو سکے یہاں سے دور نکل جانا چاہیے۔''

''یہی کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' میں نے فوراً اس کی تائید میں لقمہ دیا۔ ''کوہارا اپنے ساتھیوں کو مطلع کر چکا ہے۔ وہ بہت چالاک اور چابک دست آدمی ہے۔ جانے اس کے ساتھی یہاں سے کتنی دور ہیں۔'' پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا اور میں نے پروفیسر جمشید سے پوچھا۔

''انکل جمشید! آپ تو پہلے بھی مصر آتے جاتے رہے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں سوہارغہ کا علاقہ یہاں سے کتنی دوری پر ہوگا؟ کیونکہ کوہارا اسی مقام پر کیپٹن کو طیارہ لینڈ کرنے کا حکم

www.PakiBooks.Site

دیے ہوئے تھا۔"

میری بات پر پروفیسر جمشید بولا۔ "سوہارقہ درحقیقت قاہرہ کا ایک مضافاتی قصبہ ہے جو اپنے اندر کافی وسیع و عریض رقبہ رکھتا ہے، زیادہ تر خشک اور سخت زمین پر مشتمل ہے۔ کیونکہ یہ دریائے نیل سے بہت دور ہے۔ بے آب و گیاہ صحرا اور بنجر و چٹیل میدان اس کے وہ حصے ہیں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔"

"دوسرے لفظوں میں یہ علاقہ بدنام زمانہ لٹیروں اور صحرائی رہزنوں کی خفیہ کمین گاہوں کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔" یاسمین نے بھی بتایا۔ وہ بھی اپنے باپ اور منگیتر حماد کے ساتھ مصر آتی جاتی رہتی تھی۔

"تو کیا ہم اس وقت مصر کی سرزمین پر ہیں؟" میں نے پوچھا تو یاسمین قدرے حیرت سے میرا چہرہ تکتے ہوئے بولی۔

"کیا تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہو پایا؟"

"یہ بات تو نہیں۔ لیکن میں شاید یہ جاننا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ ہم قاہرہ یا مصر کی کسی بڑی شہری آبادی سے کتنی دوری کے فاصلے پر ہیں؟"

میں نے دیکھا کہ میرے سوال پر یاسمین بھی مستفسرانہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ میری طرح شاید اسے بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

پروفیسر جمشید نے چہار اطراف کا جائزہ لیا تھا۔ پھر انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"جب تک کسی قریبی آبادی پہنچ کر یہ نہیں پتا چلے گا کہ ہم اس وقت کہاں ہیں، یہ بتانا ناممکن ہے۔" تھوڑے توقف سے چند سانسیں لینے کے بعد وہ آسمان کی طرف تکنے لگے۔ شاید ستاروں کی چال دیکھ رہے تھے یا کسی مخصوص سمت کے رخ کو جانچنے کی کوشش میں تھے۔ میں اور یاسمین خاموشی سے ان کی طرف تکتے رہے۔

"میرے محتاط اندازے کے تحت اگر ہم جنوب مشرق کی سمت چلتے رہیں تو کسی آبادی تک زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں پہنچ سکتے ہیں۔"

"اگر وہ آبادی نہ ملی تو ...؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا تھا۔ جس پر پروفیسر جمشید کے بوڑھے چہرے پر میں نے مسکراہٹ کے آثار دیکھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سوال ہی بچکانا تھا۔

وہ بولے۔ "مسٹر شہزی! اُمید پر دنیا قائم ہے۔ آبادی نہیں ملی تو بھٹک جانے کا امکان زیادہ ہوگا۔ تم اور یاسمین بیٹی فیصلہ کر لو، آگے بڑھنا ہے یا ادھر ہی بیٹھ کر امداد غیبی کا منتظر رہنا ہے؟"

"میرا خیال ہے، حرکت میں برکت ہے۔ ہمیں اپنے قدم ضرور آگے بڑھانے چاہئیں۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"شاباش بیٹے! اللہ پر بھروسا رکھنے والے کبھی ناامید نہیں ہوتے، اس نے جہاں ہمیں اتنی مصیبتوں سے بچایا ہے، وہ آگے بھی ہماری رہنمائی فرمائے گا۔"

"بےشک۔" اس بار میرے اور یاسمین کے منہ سے بیک وقت نکلا اور ہم یونہی ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

اس گمنام صحرا میں ہمارا پیدل سفر شروع ہو گیا۔ پروفیسر جمشید کو کبھی میں سہارا دیتا تو کبھی یاسمین۔ ہم کبھی چلتے کبھی رکتے، بدستور آگے بڑھتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ صحرائی ٹیلوں کا سلسلہ بتدریج موقوف ہوتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں نے پروفیسر جمشید کو ایک مقام پر رکتے دیکھا۔

میں اور یاسمین یہی سمجھے شاید وہ تھک گئے ہیں اور تھوڑی دیر سستانے کے لیے رکنا چاہتے ہیں لیکن وہ رک کر ایک بار پھر سر اٹھا کر تاروں بھرے آسمان کی طرف تکنے لگے۔ اس کے بعد ہمیں ایک ہاتھ سے وہیں ٹھہرے رہنے کا کہتے ہوئے پہلے جنوب کی سمت چند قدم گئے، پھر شمال اور اسی طرح باقی دو سمتوں تک وہ چند قدموں تک جھکے جھکے ریت پر ... کچھ دیکھتے رہے۔ پھر ... واپس آ کر ایک گہری سانس لے کر بولے۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہم کسی آبادی کی طرف درست سمت سفر کر رہے ہیں۔"

ان کی بات گویا مژدہ جانفزا ثابت ہوئی۔

"بچو! اب فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں تھوڑا آرام کرنا چاہتا ہوں۔" کہتے ہوئے وہ ایک ٹیلے کی ڈھلان پر پشت رکھے لیٹ گیا۔ میں اور یاسمین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ کسی جوان سال شہزادے کی طرح اپنا چمکتا مکھڑا لیے پورا چاند ستاروں کے جھرمٹ میں ایسا ہی دکھتا تھا جیسے اس کے گرد چاندی جیسے چہروں والی کنیزوں نے گھیراؤ کر رکھا ہو۔ دور دور تک ایک سحر انگیز خاموشی اور رات کا اسرار بھرا سناٹا طاری تھا۔ ہلکی سی خنکی پڑ رہی تھی۔

میں نے دیکھا، یاسمین نے اپنا چہرہ موڑا اور ٹیلے کے دوسری طرف جا کر نیم دراز سی ہو گئی۔ عجیب بے سروسامانی کی حالت میں تھے ہم تینوں۔ یاسمین کا حسن تو کسی کملانے کے

www.PakiBooks.Site

نے پھول کی طرح ہو چلا تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے ں اور پھٹ چکے تھے۔ اس میں کوہارا کے ساتھ دھینگا مشتی ہ بھی دخل تھا اور نامساعد و پُردرد حالات کا بھی ... وہ بہت یوس اور غم زدہ سی نظر آ رہی تھی۔

پتا نہیں پھر کیا ہوا کہ میرے اپنے قدم بھی کشاں کشاں کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ میں اس کے قریب جا کر ریتیلی ڈھلان پر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔ مدھم مدھم سی چاندنی اس کی کشادہ آنکھیں مجھے بھیگی بھیگی سی لگیں۔ ان میں سوؤں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس کے نرم لبوں پر بھیدوں بھری تھرتھراہٹ تھی۔ جیسے کچھ بے ربط الفاظ ادا کرنے کا حوصلہ نا چاہتے ہوں۔

"شہزی... ! زندگی کبھی کبھی اتنی دکھی کیوں ہو جاتی ہے؟" بالآخر اس کے لبوں سے نکلا۔ "ہم... مجھے تو حماد کی ت کا غم کرنے کا بھی وقت نہیں ملا... بس! ایک تسلی ہے کہ اور میرے بابا کا مقصد نیک ہے اور..."

بوجھل بوجھل سے انداز میں وہ اتنا کہہ کر ذرا رکی، ایک رتھما کر میری طرف دیکھا، خود میری نظریں بھی اس کے دہ چہرے پر مرکوز رہیں۔ پھر جیسے اس نے اپنا ادھورا جملہ مکمل کیا۔

"تو... میری دوسری تسلی تم ہو... شہزی... !"

"میں تمہارے دکھ کا اندازہ کر سکتا ہوں یاسمین... !" نے ہولے سے کہا۔ "بےشک ڈاکٹر حماد تمہارے اور پروفیسر صاحب کے اس نیک مشن میں ابتدا سے ہی ساتھ رہے۔ وہ بہت بہادر، باہمت اور ثابت قدم رہے۔"

"حماد کی اس کے علاوہ بھی اور ایک خصوصیت تھی۔" وہ سے نگاہیں ہٹا کر تاروں بھرے آسمان کی روشن وسعتوں طرف تکتے ہوئے بولی۔

"اچھا... ! وہ کیا... ؟" میں نے یونہی ہلکی مسکراہٹ سے پوچھا۔

"وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا تھا۔" اس کے منہ سے

"اور تم... ؟" بے اختیار میرے بھی ہونٹوں سے ہوا پھر مجھے لگا جیسے میں کچھ غلط کہہ گیا ہوں۔ اس پر نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولی۔

"عام طور پر محبت کا جواب محبت ہی ہوتا ہے شہزی! س اس وقت جب معاملہ مرد اور عورت کے درمیان کا انسیت، اپنائیت، محبت کے جزو کہلاتے ہیں، مگر اصل کا جزو صرف محبت ہی ہوتا ہے۔ یعنی پیار۔"

بہت عجیب لہجہ تھا اس کا اور باتیں بھی ایک رخ سے پُرمعنی اور دوسرے رخ پر الجھی الجھی۔

وہ یہ سب کہہ کر آسمان سے نگاہیں ہٹا کر میری جانب دیکھنے لگی۔ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر میرے لبوں پر یونہی مسکراہٹ کھیل گئی۔

"شہزی! زندگی اور حیات کا فرق معلوم ہے تمہیں؟" اس نے بڑے عجیب سے انداز میں پوچھا۔ سوال بھی اس کا کچھ ایسا ہی تھا۔

"شاید نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے کسی خاص "کیفیت" میں مبتلا محسوس ہو رہی تھی۔ میں بھی اسے بولنے کا موقع دے رہا تھا کہ غم خاروخس کے مانند بہہ جانے کا بہانہ تلاش رہے تھے تو ایسا ہی سہی۔

"شہزی! زندگی وہ ہوتی ہے جو ہم گزارتے ہیں جو فانی ہے مگر حیات، زندگی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ وہ امر ہوتی ہے۔ محبت اور اپنائیت کا بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ اپنائیت زندگی ہے اور محبت حیات۔"

وہ جیسے مجھے کسی طلسم میں غلطاں محسوس ہونے لگی۔ حسب سابق اس کی باتوں کا مفہوم آسان بھی تھا اور ایک رخ سے نا سمجھ میں آنے والا بھی۔ مجھے یوں لگا جیسے تاروں بھری چاندنی میں نہائے ہوئے اس صحرا کا طلسم سا اس پر طاری ہونے لگا ہے۔

"ہم... ٹھیک کہا تم نے..." میں نے روا روی میں کہا۔ میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اچانک جیسے اس طلسماتی چاندنی میں نہائے ہوئے صحرا میں کوئی کملایا ہوا گلاب کھل اٹھا ہو۔ وہ میری بات سن کر بے اختیار مسکرا دی۔ مسکراہٹ کی تہ میں جیسے غم کی گھٹن عجیب بہار دکھاتی تھی۔

"شکر ہے، تم مسکرائیں تو۔"

"شہزی! تمہیں میری باتیں سمجھ آ رہی ہیں؟" اس کے عجیب سے انداز تکلم پر میں چونکا۔

"کیا مطلب؟ میں سب سمجھ رہا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں سمجھ رہے۔" بڑے ہی عجیب سے لہجے میں یہ کہتے ہوئے وہ ذرا میرے قریب کھسک آئی اور ڈھلان پر پشت کے بل دراز ہو گئی۔

میں دل میں اس کی آخری بات پر مسکرایا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ میں زہرہ بانو، سوشیلا، چندرکلا، سون اور بلیک کوئین جیسی کتنی ہی عورتوں کی سنگت میں رہا تھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا تھا بلکہ پی رہا تھا اور میں یاسمین کی ساری اور بظاہر الجھی ہوئی باتوں کا مطلب بھی سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں خود ان

www.PakiBooks.Site

جذبات کو ہوا ہی نہیں دینا چاہتا تھا جن سے بے نام تعلقات کا استوار ہونا قرار پاتا ہو۔

میں پہلے ہی جانے کتنے ہی افراد کی دوریوں اور آشنائی کے عذاب ناک لمحوں سے گزر چکا تھا۔ عابدہ کی تو بات الگ تھی، مگر زہرہ بانو اور خاص طور پر سوشیلا مجھے کہاں بھولتی ہیں؟ تاہم مجھے یہ اعتراف تھا کہ عابدہ کے بعد اگر مجھے جس لڑکی نے متاثر کیا تھا تو وہ سوشیلا ہی تھی۔

انڈیمان کے جزیرے میں ہم دونوں کی جن کرب انداز میں دوریاں ہوئی تھیں، وہ کٹھیلے لمحات میں کہاں بھولا تھا۔ یہ زندگی ہے، حیات کا ایک سمندر ہے۔ جہاں کتنے ہی جوار بھاٹے آتے ہیں۔ شکر تھا کہ میرا دامن آلودہ نہیں ہوا تھا۔ دوستی، ساتھ اور سنگت اپنی جگہ اور یوں...... یہی کچھ یہاں ہونے جا رہا تھا۔

اس لیے میں دانستہ انجان بن رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یاسمین بھی ان نرم و نازک ساتھیوں کی طرح میری جدائی کے کرب کو اپنے سینے میں دبائے اپنی آئندہ کی زندگی کو نامعلوم سی غمناکیوں میں بتا دے۔

وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تو میں بھی چپ ہو رہا۔ نرم اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں نے میری آنکھوں کے پپوٹوں کو نیند تلے دبا دیا۔ میں سو گیا۔

☆☆☆

آنکھ ہلکے شور پر کھلی تھی۔

جاگتے سے پہلا احساس کسی کے وجود کی نرماہٹ اور گداز پن کا ہوا تھا، دیکھا تو یاسمین میرے ساتھ لگی بڑی گہری اور پُرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کا سر میرے سینے پر جیسے ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ میرے گرد لپٹا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ سکیڑ کر اس کا گھٹنا میری بائیں ران پر رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی میری نیم غنودہ سی دھندلائی آنکھوں نے کچھ اونچی نیچی قامت کے ہیولے دیکھے جو ہمارے گرد جمع تھے۔ میں نے آہستگی سے پہلے اپنے پہلو پر رکھے ہوئے یاسمین کا گھٹنا ہٹایا، پھر اس کا ہاتھ اور اس کے بعد سر تو وہ جاگ پڑی۔ جیسے اس کا کوئی سپنا ٹوٹ گیا ہو۔ جس میں وہ کھو کر گہری اور پُرسکون نیند سو چکی تھی۔

میں نے اپنی نیم خوابیدہ آنکھوں کو ہاتھوں سے مسلا اور دیکھنے کے کچھ قابل ہوا تو چونکا۔ وہ کھلے ڈلے اور ہلکے سے میلے لباسوں میں ملبوس مقامی باشندے ہی لگتے تھے۔ ان کے ساتھ اونٹ بھی تھے۔ پہلے تو میں سمجھا کہیں یہ کوئی صحرائی لٹیرے تو نہیں تھے؟ مگر ان کی عمومی انداز کی وضع قطع میرے اس خدشے کی نفی کر رہی تھی۔ یاسمین بھی قدرے خوف زدہ سی ہو کر میرے قریب میرے قریب کھسک آئی تھی۔

سپیدۂ سحر دھیرے دھیرے نمودار ہونے لگا تھا۔ اگرچہ اب بھی کھلے آسمان میں کہیں دور قریب چند تارے اپنی ماند پڑتی چمک دار آنکھوں کو جھپک رہے تھے۔ تاہم نورِ سحر چہار اطراف پھیل چکا تھا۔

یہ لوگ تعداد میں زیادہ بھی نہیں تھے۔ چار پانچ ہی ہوں گے۔ تین اونٹ تھے۔ ان پر ہودے کسے ہوئے تھے۔ دو عمر رسیدہ مرد عورت، ایک جوان لڑکی اور لڑکا تھا، لڑکی کی گود میں بچہ تھا، جبکہ آخری مرد درمیانی عمر کا تھا۔ یہ سب دراز قامت اور دبلے پتلے تھے، البتہ درمیانی عمر والا ٹھگنے قد کا اور خوب گٹھی ہوئی جسامت کا آدمی تھا۔ ان کے رنگ کالے تھے۔

اسی وقت ایک آواز ابھری۔ اس آواز نے انہیں مخاطب کر کے کچھ کہا تھا۔ میں اور یاسمین کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ پروفیسر جمشید تھے۔ وہ ہمارے قریب آ گیا۔ وہ ان سے مخاطب تھا۔ لہجہ اور بولی مصری عربی تھا۔ وہ بھی اس سے بات کرنے لگے۔ ماحول دوستانہ محسوس کر کے میں نے اطمینان کی سانس لی تھی کہ یہ لوگ بہرحال لٹیرے وغیرہ نہیں تھے۔

اس کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے اونٹوں کو مخصوص انداز میں "ہشکارے" مارتے ہوئے بٹھا رہے تھے۔ درمیانی عمر والا شخص خاموش کھڑا ہماری طرف عجیب عجیب سی نظروں سے تکے جا رہا تھا، جبکہ باقی شاید ہمارے لیے اونٹوں پر سوار ہونے کا بندوبست کر رہے تھے۔

"یہ لوگ ایک قریبی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں، یہ ہماری مدد کریں گے۔" پروفیسر جمشید نے مسرت بھرے انداز میں بتایا۔

یہ خوشی کی بات تھی کہ ہم اس لق و دق اور بے آب و گیاہ صحرا میں بھٹکنے کے عذاب سے بچ گئے تھے۔ ہم تیار تھے۔ پروفیسر جمشید نے انہیں بتا دیا تھا کہ ہمارا جہاز صحرا میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ ایسا کچھ ہائی جیکروں کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہم لوگ اونٹوں پر سوار ہوئے تو انہوں نے اسے بڑھا دیا۔

آبادی زیادہ دور نہ تھی۔ پروفیسر جمشید کا غیر محتاط سا اندازہ درست ثابت ہوا تھا اور ہم بھٹکنے سے بچ گئے تھے۔

مزید نصف گھنٹے بعد میں ہمیں دور سے کسی نخلستان کے آثار دکھائی دیے۔ وہ کھجور کے جھنڈ تھے۔ کسی نخل امید کی طرح ہمارا مختصر قافلہ جب کھجوروں کے اس جھنڈ کے نزدیک پہنچا تو مٹی اور کہیں پختہ اور نیم پختہ مکانوں کے آثار، گلیاں اور پگڈنڈی نما راستے بھی نظر آنے لگے۔

صبح کے آثار پھیلتے ہی یہاں بھی زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔ ہمیں دیکھ کر لوگ باگ قریب آنے لگے اور حیرت سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔

ہم اونٹوں سے اتر چکے تھے۔ اونٹ ریت پر بیٹھ کر جگالی کرنے میں مصروف تھے۔

وہاں چند اور لوگوں سے انہوں نے بات چیت کی، وہ شاید انہیں ہمارے بارے میں ہی بتا رہے تھے۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بھی ہم سے ہاتھ ملائے۔ وہ ٹھگنا شخص جو ہم سے کسی بھی میزبانی طرز کی گرم جوشی کے اظہار سے کتراتا دکھائی دیتا تھا، جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اپنی فطرت میں کجی اور بغض لیے ہوتے ہیں، میں ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایسے لوگ خود اپنی ذاتی زندگی میں "مضطر" ہوتے ہیں، سکون ان کے دلوں سے ہی نہیں، روح تک سے بھی فرار ہو چکا ہوتا ہے۔

باقی سب لوگ ہم سے بہت اچھی طرح پیش آ رہے تھے۔ ہمیں انہوں نے ایک الگ سے گھر میں پناہ دی، جو زیادہ بڑا تو نہ تھا مگر ان حالات میں یہ بھی کسی نعمت سے کیا کم تھا۔ شاید کسی وجہ سے ایک عرصے سے بند پڑا ہونے کے سبب خاصا بوسیدہ اور گرد آلود ہو رہا تھا۔

بستی کے چند لوگوں نے جیسے تیسے اس کی صفائی کی، جب تک ہمیں کسی اور مکان کے کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں ہمیں کھانے پینے کو جو کچھ دیا گیا تھا، اس میں ٹھنڈا شفاف پانی، بھیڑ کا گوشت، دودھ اور قہوہ پینے کو دیا گیا۔ بھیڑ کا گوشت ہم نے خمیری روٹیوں کے ساتھ کھایا تھا جو تنور میں تازہ لگائی گئی تھیں۔ اسی مکان میں ہمارے نہانے دھونے کا بھی بندوبست تھا۔ ہمیں صاف ستھرا لباس بھی دیا گیا۔ جو عربی اسٹائل کا لمبے چغے جیسا تھا۔ یاسمین خانم بھی نہا دھو کر خاصی نکھری دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے اور گداز شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے بھی عرب خواتین کا لباس پہن لیا تھا، آنکھوں کی شفافیت اور چمک لوٹ آئی تھی۔ تراشیدہ لب پر دوبارہ گلاب کھلنے لگے تھے اور اس پر من موہنی سی مسکراہٹ جیسے ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔ صحرا میں اس کا ملکوتی حسن جیسے نکھر آیا تھا۔

آرام کرنے کے لیے ہمیں اول الذکر مکان میں لایا گیا۔ اس کے دو ہی کچی کوٹھری نما کمرے تھے۔ جن کی چھتیں بہت نیچی تھیں۔ ہر کمرے میں دو روشن دان تھے۔ صحن تنگ تھا۔ ہم تین افراد کے لیے کافی تھا۔

ہماری نیند شاید ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ یوں ہم نے بھوکے اور پیاسے ہونے کے سبب کھا بھی کچھ زیادہ لیا تھا۔ اس لیے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔

گرمی کے احساس پر ہم خود ہی جاگنے پر مجبور ہو گئے۔ تاہم گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ہم بھی اپنے آپ کو کچھ تازہ دم محسوس کرنے لگے تھے۔ حالات دگرگوں کو کچھ ٹھہراؤ نصیب ہوا تو ہم کچھ سوچنے سمجھنے اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے کے قابل ہوئے اور ایک کمرے میں فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ اس پر بستر لگا ہوا تھا۔

"انکل! اب تو آپ کو ان سے بہت کچھ معلوم ہو گیا ہو گا؟" میں نے گفتگو کی ابتدا پروفیسر جمشید کی طرف دیکھتے ہوئے کی تو وہ دھیمے سے مسکراتے ہوئے بولے۔

"بہت اچھی طرح...... ہم قاہرہ سے اس وقت تین سو کلومیٹر کی دوری پر ایک "لہائی" نامی بستی میں موجود ہیں۔"

"اگلی منزل یقیناً ہماری قاہرہ ہو گی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب میں کہا۔

"قاہرہ تو ہمارا پہنچنا یوں بھی ضروری ہے۔ ہمیں وہاں اپنے سفارت خانے سے رابطہ کرنا ہو گا اور سارے حالات سے انہیں آگاہ کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ ہماری مدد کر سکیں۔"

"پھر تو یقیناً ہمیں پولیس وغیرہ کی تفتیش سے بھی گزرنا پڑے گا پاپا؟" یاسمین نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے اپنے باپ سے پوچھا، اس سوال کی وجہ میں سمجھ رہا تھا اسی لیے میں نے بھی پروفیسر کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز رہنے دیں۔ وہ بھی شاید اس کا مطلب سمجھ گئے...... کیونکہ میں نے ان کے بشرے پر ایک پُرمتانت سی تفکر کا تاثر ابھرتے محسوس کیا تھا۔ وہ مجھ پر ایک نظر ڈال کے بولے۔

"قوانین کے مطابق ہمیں ان مراحل سے گزرنا تو پڑے گا، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ تفتیش طویل بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ معاملہ صرف طیارے کی تباہی کا ہی نہیں ہے۔ ہائی جیکنگ کا بھی ہے اور ہائی جیکنگ بھی کیسی جس دوران خوں ریزی کا بازار بھی گرم رہا۔ یہ بھی چھوڑو تو شہزی کے حوالے سے ہمارا معاملہ بھی اس سے زیادہ گمبھیر نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس رذیل کو ہاپا کے حوالے سے ہمارا ہائی جیکرز سے بالواسطہ و بلاواسطہ ساتھی ہونے کا الزام بھی ہو چکا ہے۔"

www.PakiBooks.Site

www.PakiBooks.Site

پروفیسر جمشید کی توجیہہ بھرپور اور ناقابلِ بحث تھی جس کا مجھے بھی اندازہ تھا۔ میری تشویش بڑھنے لگی۔

”لل...... لیکن پاپا! شہزی تو خود کوہارا کے زیرِ عتاب رہا ہے اور ہم بھی تو...... پھر کتنے ہی مسافر ہیں جو اس بات کا ثبوت پیش کرسکتے ہیں۔“ یاسمین نے کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں بیٹی! کہ تفتیش و تحقیق کا یہ عمل جب تک چلتا رہے گا، ہم ایک دائرے میں ہی مقید رہیں گے، غیر معینہ مدت تک...... اور غیر یقینی حالات کی تلوار پھر بھی ہمارے سروں پر لٹکتی رہے گی۔“

”آپ کے خیال میں ہمیں پھر کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے رائے طلب انداز میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ سے بولے۔

”بیٹا! ملامت کھتا، قاہرہ میں اور اس کے علاوہ بھی ایک بین الاقوامی اسکالرز کی حیثیت سے میری اپنی ذاتی پوزیشن اتنی مضبوط ہے کہ میں اپنی اور یاسمین بیٹی کی گلوخلاصی کروا ہی لوں گا لیکن تم...“ وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئے مگر میں اور یاسمین ان کی بات سمجھ چکے تھے۔ یاسمین جلدی سے ایک نگاہ میرے چہرے پر ڈال کر باپ سے بولی۔

”تو کیا پاپا! ہم شہزی کو اکیلا چھوڑ دیں؟“

”ہرگز نہیں بیٹی! خدانخواستہ ایسا میں نے کب کہا؟“ پروفیسر جمشید اس کی طرف پُرشفیق مسکراہٹ سے تکتے ہوئے بولے۔ ”میرا بتانے کا مطلب یہ تھا کہ ان عوامل کو تم ذہن میں رکھو اور فیصلہ کرو کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا خیال ہے کہ ہماری منزلیں ابتدا سے ہی الگ تھیں۔“ بالآخر میں نے کہا۔ اگرچہ میں خود بھی اس نئی اور گمبھیر صورتِ حالات سے پریشان اور متفکر سا ہوگیا تھا۔ ”آپ اور میں الگ ہو جاتے ہیں، میرے حالات میں جانوں، آپ دونوں باپ بیٹی میری وجہ سے اپنی مشکلات میں اضافہ نہ کریں تو بہتر ہوگا۔“ میں نے بغیر کسی بات کا برا منائے اور بالکل صاف دل اور نیک نیتی سے کہا تو یاسمین کے چہرے پر دکھ اور ایک تعلیمیت کے سے تاثرات ابھرے۔ وہ نہایت رسان کے ساتھ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے ہی پروفیسر جمشید نے بڑے حلیم... اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

”نہیں بیٹا! میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ ہم تم سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو تمہاری وجہ سے ہی ہمیں اس درندہ اور جلاد صفت شخص کوہارا سے رہائی نصیب ہوئی ہے، یہ تو جانے کب سے ہماری جان کا دشمن بنا ہوا تھا، اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا تمہیں نے ہی تو ہمیں دلایا ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم نے بھلا یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم اپنی الگ راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہرگز نہیں، اب ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔“

”پاپا نے بالکل ٹھیک کہا ہے شہزی!“ یاسمین بھی فوراً میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”ہم سب ہر آفت اور مشکل میں ساتھ رہیں گے۔ جب تک یہ مصیبت ٹل نہیں جاتی۔“

”میں مشکور ہوں لیکن میرا معاملہ واقعی کچھ اور سطح کا ہے۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ ”میرا جلد سے جلد امریکا پہنچنا بے حد ضروری ہے۔“

”کیسا بھی سہی، مگر ہم تمہارا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ بس! میں نے تو فیصلہ کرلیا ہے کہ اب یہاں پہنچ ہی گئے ہیں تو پہلے اپنا مشن مکمل کریں گے۔ ہم قاہرہ کا رخ کرنے کے بجائے اسی گمنامی میں رہتے ہوئے اپنے مشن کا آغاز کروا لیتے ہیں۔“

یہ سب پروفیسر جمشید نے ایک جذبۂ جوش کے اور حتمی لہجے میں کہا اور پھر مطمئن نظر آنے لگے۔ میں بھی خاموش ہو رہا۔ یاسمین خانم کے عنابی ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

مجھے پروفیسر جمشید کی باتوں نے فکرمند کر دیا تھا کیونکہ ان کا کہنا کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ میری دوبارہ امریکا روانگی ایک بار پھر کٹھنائیوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ میری قاہرہ سے روانگی اب اتنی آسان نظر نہیں آ رہی تھی۔ پتا نہیں کتنے ہی تفتیشی مراحل سے مجھے گزرنا پڑتا۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں کیلی فورنیا روانگی کے لیے اس طیارے میں سوار ہوا تھا جس میں کوہارا بھی سوار تھا۔

”لیکن تم کسی بات کی فکر نہ کرو بیٹا...!“

اچانک شاید مجھے پریشان دیکھ کر پروفیسر جمشید نے کہا۔ میں ان کا چہرہ تکنے لگا۔ ان کے چہرے پر بلا کا اعتماد تھا۔

”تم بے حد آسانی سے اور کسی تفتیشی چکروں میں پڑے بغیر امریکا سدھار جاؤ گے۔ بہت جلد... ہاں! بہت جلد...!“

ان کا لہجہ بے حد پُراسرار تھا جس پر میں ہی نہیں یاسمین بھی قدرے چونک کر اپنے باپ کا چہرہ تکنے لگی۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب ہم سب یک بیک چونکے۔ باہر سے اچانک شور کی آواز سنائی دی تھی۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

سیانا کوا

عمران قریشی

کہانی کار جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسے گوشۂ عافیت کی تلاش ہوتی ہے جہاں سکون و خاموشی کے سوا کچھ نہ ہو... اسے بھی اپنا پسندیدہ مقام مل گیا تھا اور ایسا ساتھی بھی جو دورانِ تحریر اس کے لیے معاون ثابت ہوتا مگر اچانک ہی پُرسکون ماحول میں اس کی ایک عادتِ بد نے زبردست بھونچال بپا کر دیا...

پرانی عداوت...... انتقام اور جرم کی مثلث جسے وقت نے بکھیر دیا......

میں نے جیپ کو قصبے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف موڑ دیا اور ماتھے سے گرتے ہوئے پسینے کو شرٹ کی آستین سے پونچھنے کے بعد ساتھ والی سیٹ پر رکھی ہوئی شراب کی بوتل اٹھا کر چسکیاں لینے لگا۔ گرم کھولتے ہوئے سیال نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے۔ سڑک کے سیدھے ہاتھ کی طرف قصبہ تاسیلی کا بورڈ آویزاں تھا۔ اس کے قریب ہی پولیس ڈپارٹمنٹ کی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے جیپ ریگستانی قصبے کے بازار میں داخل ہوگئی۔ بارڈر کے قریب واقع ہونے کی

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب ہاتھوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... ایسے ہی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن سے بھرپور [illegible] دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 53

www.PakBooks.site

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

شہزادہ احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا۔ یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی۔ شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سردہ بابا سے ہو گئی جس کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ مافیا کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کیلی دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کیلی دادا شہزی سے خار کھانے لگا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحب کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، عتیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اینیگرام" کا ڈپٹی چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اینیگرام کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ سی بی سی (سینٹرل بزنس کمپنی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ بانسل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور سی بی سی کے خفیہ دنیا نے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ بانسل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ بانسل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی اینجلا لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سردہ بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک تو وہ ویسے ہی لالچی ہے، اوڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا تاوث ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹیکس کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اینیگرام اور بلیوٹیکس کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کیلی دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کیلی دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ بانسل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ بانسل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جاذراں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوبارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بیتام جھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اینیگرام کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بیتام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی بوٹ میں بلیوٹیکس کے چندرناتھ، شیام اور گوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹیکس کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں۔ وہاں پہلی بار بلیوٹیکس کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا۔ تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی۔ یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھوبک کو بے بس کر دیتا ہے۔ وہاں سوشیلا، کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل کڑی فرقیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر کوبارا اور چندرناتھ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ ممبئی اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ اس کا منتظر تھا۔ کچھ لفنگے ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈز وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی بیٹی ہے۔ ان کے ساتھ آسانی سے بھڑ کے گروہ میں الجھنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹیکس تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی

سے مقابلے کے بعد بلیوٹیکس کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کیلی دادا اس کے قبضے میں تھے جو کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو تیار کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوئی ٹیلی فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "قلی مجاوہ" پہنچا دیا گیا۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو بستی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ قلی مجاوہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں راستے کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جزائر کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک ایسے علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں سیاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے اور ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ کیم کلا اور اس کی بیٹی سونگ کلا کی تھی۔ وہ باپ بیٹی کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور وہ اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس دوران برمی مسلم گروپ کا مجاہد ولولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا تمغا ملا ہوا ہے تو کیم کلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں قلی مجاورین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی کیمپ کے نگران کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نامی کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مقاصد کے لیے قلی مجاورین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتبار جمانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر پاکستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے بچتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی میجر سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بیتام کی بیوہ اور ماں سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا، ہیرا دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بیتام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بیتام کے قتل اور اس کی بیوہ کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کیلی دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونیہ بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کر کے خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونیہ کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونیہ کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی اٹیک فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ اڈے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ بلوچ صاحب کے ولا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو رہائی دلا کر قانون کے قبضے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کیلی دادا اور شکیلہ کے ساتھ مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو بے آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساکو کے آدمی شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی میوزیم سے چرایا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا ہے۔ اینیگرام کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین اسے مل جاتی ہے۔ وہ ایک بار کوبارا کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور بالآخر ایک طویل معاملے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

www.PakiBooks.Site

''یہ کیسا شور ہے……؟'' یاسمین خانم کے لبوں سے بےاختیار برآمد ہوا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کوٹھری نما کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ یاسمین نے بھی میری تقلید کی۔ پروفیسر جمشید اپنی جگہ بیٹھے ہماری جانب تکتا رہ گیا۔

کھڑکی کا ایک چوبی پٹ پہلے ہی کھلا ہوا تھا، قریب پہنچ کر دوسرا بھی میں نے وا کردیا۔

باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی، ریت اور ہوا کے پُرجوش بگولے فضا میں گردش کررہے تھے اسی لیے وہاں کا منظر غیر واضح نظر آرہا تھا۔ بادِسموم بھی چلنے لگی تھی اور اس کے جھلسا دینے والے تھپیڑے چہروں کو چھو رہے تھے۔

تاہم میں نے دیکھا کہ گھروں، مکانوں اور ان کی مختصر گلیوں کے درمیان چھوٹی سی میدانی زمین پر کچھ لوگ جمع تھے۔ وہ سب مقامی ہی نظر آتے تھے۔ تعداد زیادہ نہ تھی، وہاں دو شتربان بھی تھے۔ میں نے بہت غور سے منظر دیکھنے کی کوشش چاہی مگر ناکام رہا پھر فاصلہ بھی کچھ زیادہ تھا۔

ہم کھڑکی سے پلٹ آئے، یاسمین نے کھڑکی بند کردی تھی۔ کوٹھری میں آکر پروفیسر جمشید نے دریافت کیا کہ یہ کیسا شور تھا۔ یاسمین نے بتادیا کہ بستی کے چند لوگ آپس میں زور زور سے باتیں کررہے تھے۔

ہمارے اب تک کے ایک محتاط اندازے کے مطابق یہ ایک دور افتادہ اور پسماندہ بستی تھی۔ جن کے باشندوں کی گزر بسر بذریعہ مویشی، مرغیاں اور بھیڑیں چرانے پر تھی۔ اس کے نخلستان میں کھیتی باڑی کے بھی کچھ آثار نظر آتے تھے۔

بہرحال ادھر میرا ذہن ابھی تک پروفیسر جمشید کے ان الفاظ پر اٹکا ہوا تھا جو اس نے تھوڑی دیر پہلے ہی مجھ سے کہے تھے۔ جس کے مطابق اس نے مجھے یہ عندیہ دیا تھا کہ میں بہت آسانی کے ساتھ اور کسی مشکل میں پڑے بغیر اپنی منزل کی جانب کوچ کرسکتا ہوں۔

ایسے میں مجھے وہ واقعی ایک جنگی پروفیسر محسوس ہوا تھا جو ایک طرف قاہرہ (مصر) میں میری مشکلات کا اظہار کررہا تھا اور اب دوسری جانب سوئی کے ناکے سے بڑے آرام سے دھاگا نکال رہا تھا۔

لیکن میرے پوچھنے پر اس نے مجھے اس ''آسانی'' کی وجہ نہیں بتائی۔ میں نے بھی ایک جنگی کی ''بڑ'' پر اسے محمول کرکے چپ سادھ لی۔

ہم کافی دیر تک ادھر اُدھر کی گفتگو کرتے رہے۔ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی، ہم ایک بار چونکے۔

''یہ کون آگیا؟'' میرے منہ سے بےاختیار نکلا۔

''میں دیکھتی ہوں۔'' یاسمین کہتے ہوئے اٹھی۔

''میں بھی چلتا ہوں۔'' میں بھی کھڑا ہوگیا۔ ہم دونوں ایک بار پھر کوٹھری سے نکلے اور صحن میں آگئے، دروازے کے قریب پہنچے اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے وہی کرخت صورت ٹھگنا آدمی اور جوان لڑکا کھڑے تھے۔ یہ اسی شتربان ٹولے سے تعلق رکھتے تھے جو ہمیں بیچ صحرا سے اٹھا کر یہاں لائے تھے اور اب ہمارے مہربان میزبان تھے۔ ان کے ہمراہ بستی کے چند اور افراد بھی کھڑے ہماری جانب عجیب سی نظروں سے گھور رہے تھے۔ بالخصوص وہ ٹھگنا آدمی میری طرف گھورتی نظروں سے تکے جارہا تھا۔

یاسمین نے مصری عربی میں ان کی آمد کا سبب دریافت کیا۔

ٹھگنے آدمی نے یاسمین سے کچھ کہا اور یاسمین اُلجھی ہوئی سی ایک نگاہ ان پر ڈالنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوکر بولی۔ ''شہزی! یہ ہم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یہ ہم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان کے ساتھ دوسرے مکان تک چلنا ہوگا۔'' یاسمین نے کہا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ تھا لیکن اُلجھن سی ضرور ہوئی تھی کہ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو یہ لوگ صرف یاسمین اور مجھ سے ہی کرنا چاہتے تھے، وہ بھی کسی دوسری جگہ۔

ہم نے پروفیسر جمشید کو یہ بات بتائی، وہ بھی سوچ میں پڑگئے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی اپنا سر اثبات میں ہلادیا کہ ہمیں ان کی بات سن لینا چاہیے۔

وہ لوگ مجھے اور یاسمین کو ایک نسبتاً بڑے اور کشادہ مکان میں لے گئے۔

یہاں ایک بلند چھت والا بڑا سا کمرا تھا۔ مجھے ایک بےچینی نے آلیا تھا۔ کسی نامعلوم خدشے سے دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور لگتا کچھ ایسا ہی تھا کہ تھوڑی دیر پہلے سنائی دینے والے شور کو میں اور یاسمین نہیں سمجھ پائے تھے اسی میں کچھ اسرار چھپا تھا جو ہماری نظروں سے پوشیدہ رہا تھا۔

یہاں فرش پر کھجور کی بڑی سی چٹائی تھی۔ اس پر بوسیدہ سا قالین بچھا تھا۔ وہ سب تو نیم قوس کی صورت میں بیٹھ گئے، مجھے اور یاسمین کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ٹھگنا مجھے کچھ عجیب سا انسان محسوس ہورہا تھا اور بار بار ہماری طرف کچھ شک بھری نظروں سے تکے جارہا تھا۔

پھر اس نے ہم سے کچھ کہا۔ میں تو نہ سمجھ سکا البتہ یاسمین نے سمجھ کر فوراً اپنی جانب اشارتاً گردن ہلا کر اسے کوئی جواب دیا اور پھر وہ ٹھگنا آدمی یاسمین سے کھردری آواز میں کچھ کہنے لگا، میری نظریں یاسمین کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں، جہاں مجھے پہلے حیرت، پھر یکایک پریشانی کے تاثرات اُبھرتے دکھائی دیے۔ وہ بھی گاہے بہ گاہے اسی کی زبان میں جواب دیتی رہی اور اس کا لہجہ بھی کچھ تلخ سا ہونے لگا تھا۔

مجھے نمایاں طور پر محسوس ہوا تھا کہ اس موٹے ٹھگنے اور نشتری چہرے والے آدمی اور یاسمین کے درمیان کسی بات کی گرما گرم بحث سی چھڑ گئی ہے۔

بالآخر تھوڑی دیر بعد یاسمین نے ایک گہری سانس لی اور اس ٹھگنے جبلی سے کچھ کہا۔

ٹھگنے نے میرے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور اٹھتے ہوئے یاسمین سے کچھ بولا پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی کھڑے ہونے کا کہا۔

ہم سب مکان سے باہر آگئے۔ اس کے بعد بستی کے وہ افراد بہ شمول وہ جوان لڑکا ہمیں چھوڑنے اس مکان تک آئے جہاں ہم فروکش تھے، لیکن یہ میری خام خیالی تھی کہ وہ ہمیں یہاں تک چھوڑنے آئے تھے، کیونکہ جب ہم مکان کے اندر داخل ہوگئے تو اچانک میں نے دروازے کے باہر کنڈی لگنے کی آواز سنی، میں یہ کہتا ہوا کہ ''یہ باہر سے ہمارے مکان کو کنڈی کیوں لگا رہے ہیں؟'' صحن سے ہی بیرونی دروازے کی طرف پلٹنا چاہا مگر یاسمین نے مجھے روک دیا۔

''ٹھہر جاؤ شہزی۔''

میں رک گیا اور اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے یاسمین کی طرف دیکھا۔

''آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ وہ ٹھگنا آدمی تم سے کیا کہہ رہا تھا؟''

''اندر چلو شہزی! پلیز، میں تمہیں سب بتائے دیتی ہوں تفصیل۔ آؤ۔'' وہ یہ کہتے ہوئے کوٹھری کی جانب بڑھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اسی طرح مجھے اندر لے آئی تھی۔

پروفیسر جمشید کمرے کے کونے میں ایک گاؤ تکیے سے پشت لگائے آنکھیں موندیں سو رہے تھے۔ یاسمین نے باپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا اور مجھے لیے دوسری کوٹھری میں آگئی۔

وہاں اس نے جو عقدہ کھولا اور اپنے اور اس موٹے ٹھگنے جبلی آدمی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا لب لباب بیان کیا تو اسے سن کر میں بھونچکاں رہ گیا۔

''کی کی…… یہ کیا بکواس ہے ؟ صرف ایک آدمی کے کہنے پر وہ ہمیں مجرم سمجھ رہے ہیں اور اور یہ بدبخت رذیل کوہارا زندہ کیسے بچ گیا؟ پھر ان کے ہتھے بھی چڑھ گیا؟ اگر ایسا ہوا ہے تو یہ بےحد خطرناک ہوگا۔ تم نے انہیں سمجھایا نہیں کہ……'' میں فرطِ جوش اور اپنی ہی رو میں یاسمین سے یہ سب کہتا چلا گیا۔

''میں نے تو شہزی! تمہارے سامنے ہی اسے بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' یاسمین نے جواب میں کہا۔ ''لیکن سیتانی میری کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔''

''یہ سیتانی اسی موٹے ٹھگنے کا نام ہے؟'' میں نے پوچھا اور یاسمین نے اثبات میں سر ہلادیا۔

قصہ یہ تھا کہ…… سیتانی اور اس کا خاندان، بھتیجا ستان ہمیں اس مکان میں منتقل کرنے کے بعد اپنے کاموں میں مشغول ہوگئے تھے۔ اس کا بڑا بھائی ایک مہربان آدمی ہے، جو اس بستی کا منصرم بھی کہلاتا ہے۔ وہ اسی خاندان کا سربراہ بھی تھا جو ہمیں یہاں لایا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی یہی ٹھگنا سیتانی اور منصرم کا بیٹا ستان بھی ساتھ تھے۔

اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی بستی کے چند اور افراد کو اسی صحرا میں ایک اور زخمی ملا جو بےہوش تھا اور وہ بدبخت کوہارا تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کس قدر خطرناک آدمی ہے۔

کوہارا کی قسمت تھی کہ وہ کسی طرح دل جلے مسافروں کے عتاب سے اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر ریگ زار میں ہماری طرح بھٹک کر اس طرف نکل آیا۔ وہاں اسے اسی بستی کے دو افراد ملے اور وہ اسے ہمارا ساتھی سمجھ کے یہاں اٹھا لائے۔

بقول ان کے کوہارا کی حالت زار اب بھی ناگفتہ بہ تھی۔ تاہم جڑی بوٹیوں کے روایتی طریقوں سے اس کا علاج ہورہا تھا۔ کسی طرح سیتانی اس سے ملا اور کوہارا کو ہمارے بارے میں بھی اس بات کا علم ہوگیا کہ ہم بھی اسی بستی میں فروکش ہیں، مکار اور شاطر دماغ کوہارا نے سیتانی

www.Paki ooks.Site

اور بستی کے لوگوں کو ہم تینوں کے خلاف یہ پٹی پڑھا دی کہ...... ہم ہیکرز ہیں اور جہاز کو ہائی جیک کرنے کے دوران جہاز کریش ہو گیا۔ یوں کوہارا نے خود کو کمانڈو بتایا تھا اور ہمیں خطرناک مجرم۔

سیستانی نے فوراً اپنے بڑے بھائی کو ہمارے بارے میں وہی کچھ بتا دیا جو اس رذیل سے جی کوہارا نے انہیں بتایا تھا۔ یوں ہمیں اس مکان میں ایک طرح سے اب نظر بند کر دیا تھا۔

میں اس مردود کوہارا کی مکاری پر آگ بگولا ہو گیا لیکن اس سے زیادہ طیش مجھے مٹکے موٹے سیستانی پر آ رہا تھا جس نے ہم تین افراد کو چھوڑ کر اس اکیلے کوہارا کی بات پر یقین کر لیا تھا اور ہمیں اسی کے ایما پر یہاں نظر بند بھی کر دیا تھا۔

میں غصے اور طیش میں اس مکان کا دروازہ توڑنے لگا تھا، تب مجھے یاسمین نے سنبھالا دیا اور سمجھایا کہ شاطر دشمن... کا اسی چالاکی سے ہی مقابلہ کرنا ہوگا، اس طرح طیش اور جوش میں آنے سے اس کی ہمارے متعلق ہرزہ سرائی کو تقویت ملے گی۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ذلیل کوہارا مسافروں کے نرغے سے کس طرح بچ کر بھاگ نکلا؟" میں نے آخر میں اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

"وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے شہزی! ایک گینگسٹر دماغ رکھتا ہے وہ۔" یاسمین بولی۔ "وہ ٹولوویش کا دست راست بھی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تم لوگ ایک خطرناک آدمی کو پناہ دیے ہوئے ہو، جو کسی بھی وقت تمہارے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے۔"

"تم نے اس موٹے مٹکے سے کہا نہیں کہ ہمیں اپنے سردار کے سامنے پیش کرو، ہم خود ہی اس سے بات کر لیں گے؟" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

"وہ سب کہہ چکی ہوں میں اس موٹے سیستانی سے۔" یاسمین نے جواب میں کہا۔ "یہ ایک خانہ بدوش لوگ ہیں۔ ان کے سردار ان کے بڑے بوڑھے ہی ہوتے ہیں لیکن آخری فیصلہ ان کا متعرم ہی کرتا ہے اور اسی کے کاندھوں پر قبیلے کے امور کا بوجھ ہوتا ہے، لہٰذا ان کا متعرم بھی سیستانی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ کل تک ہمیں اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کر دے گا۔"

"ہمیں اس سے پہلے ہی یہاں سے نکلنا ہوگا یاسمین!" میں نے اس کی بات کو بڑے دھیان اور غور سے سننے کے بعد اچانک فیصلہ کن لہجے میں کہا تو یاسمین چہرے پر لحہ بھر کو تفکر کے سائے لرزے۔

"مجھے اس موٹے سیستانی پر بالکل بھی بھرو ہے۔ یہ مجھے ابتدا ہی سے بہت کمینہ اور بدمعاش سا معلوم ہوتا رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا خبر کوہارا نے لالچ وغیرہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا ہو۔ یوں ہمارے یہ سب آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا معاملہ نہ ا لے۔"

"اس میں کیا شک ہے کہ منحوس کوہارا کی موجودگی کسی بھی وقت کوئی گل کھلا سکتی ہے۔ شہزی! ا فیصلہ کرو مجھے منظور ہوگا۔" یاسمین نے کہا۔ میں چند سوچتا بن گیا، پھر بولا۔

"ہمیں اب خود ہی اپنی بقا کی خاطر کچھ کرنا ہو سیستانی نے ہمیں یہاں نظر بند کر کے اپنے اندر کی کالک دی ہے۔ لہٰذا اب اس سے یا کسی اور سے بات کرنا اور وقت کا زیاں ہی ہوگا۔ آج رات ہم اس صحرائی بستی کوچ کر جائیں گے۔"

ہم نے بعد میں ان ساری باتوں اور اپنے فیصلے پروفیسر جمشید کو بھی آگاہ کر دیا۔ وہ بھی بہت پریشان تشویش زدہ ہوا۔ حالانکہ یہاں آ کر وہ کیا ہم بھی مطمئن اور خوش ہو گئے تھے لیکن کیا معلوم تھا کہ کہیں کوہارا اور سیستانی جیسے شیطان بھی موجود ضرور ہوتے ہیں

ہمارے بیچ سب سے پہلا سوال یہی اٹھا تھا کہ اب کدھر کا رخ کریں گے؟ قاہرہ سے ہم ابھی ایک غیر اندازے کے مطابق ڈھائی تین سو کلومیٹر دور تھے۔ بقول پروفیسر جمشید کے ہمیں ابھی قاہرہ جانے کی ضرو نہیں ہے۔

ان کی اصل "منزل" کے مطابق ہم صحرائے نو سے صرف ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ اس سے الاقصر اور کرناک نامی دو قصبے تھے۔ یہ دونوں قصبے دریائے نیل کے قریب واقع تھے۔ وہیں لکسر کی ق تاریخی بستی تھی جہاں بعد نیل ثقافت کا گمشدہ مقبرہ گر ڈارک پیرامائڈ موجود تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی کی منز (اور اب شاید میری بھی) یہی تھی۔

جبکہ کوہارا بھی انہی کے ذریعے وہاں تک پہنچا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ میں خود بھی اب ان دونوں بیٹی کی اس پُراسرار مہم میں دلچسپی لینے پر مجبور تھا۔

"اس قدر طویل سفر کے لیے ہمیں سواری اور زا

TIBET
TALCUM POWDER

تبت
ٹالکم پاؤڈر

اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب

TIBET
Classic
Talcum Powder
TIBET
Select
Talcum Powder
TIBET
Luxury

کلاسک سلیکٹ لگژری

تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام مہکے مہکائے

www.PakBooks.Site

کی بھی ضرورت پڑے گی۔ فرار کی اس کوشش میں پہلے ان دونوں اہم چیزوں کا بندوبست کرنا ضروری ہوگا۔" میں نے کہا۔

"وہ ہم یہاں سے کر سکتے ہیں۔" یاسمین نے جیسے تجویز سمجھائی۔ "ہم دونوں مل کر رات کی تاریکی میں کم ازکم دو اونٹوں کا تو بندوبست کر سکتے ہیں، باقی زادِراہ کے لیے... فی الحال یہی کچھ بہت ہوگا جو ہمارے مکان میں موجود ہے۔"

اس کی تجویز بری نہیں تھی۔ اونٹ چوری کرنے اور فرار کی اسکیم پر بیک وقت عمل کرنے کا پروگرام طے کرنے کے بعد ہم اپنی اپنی جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے خاموش بیٹھ گئے۔

میں کوہارا کو جہنم واصل کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی شاید یہ موقع محل کے منافی ہوتا۔ وہ اس وقت ایک بستی میں فروکش تھا پھر اس نے ہمارے خلاف ان لوگوں کو غلط تاثر دے رکھا تھا کہ ہم خطرناک مجرم ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارا سب سے پہلے یہاں سے کوچ کر جانا زیادہ ضروری تھا۔

وقت گزرا...... رات میں کھانا پہنچایا گیا ہمیں جس میں پانی کی دو چھاگلیں بھی تھیں۔ ہم مزید وقت کے آگے سرکنے کا انتظار کرتے رہے۔ ہمارے پاس روشنی کا انتظام، مشعلوں اور سہ رخی شمع دانوں کی صورت میں تھا۔

جب ہر سو سناٹا اور گہرا سکوت چھا گیا تو میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی کی طرف آیا۔ اسے پورا کھولنے کے بجائے ایک ذرا پٹ کو وا کر کے باہر جھانکا۔

بستی خالی اور ویران سی نظر آتی تھی۔ باہر صحرا کی فضا خنک ہو رہی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاند کا سنہری ادھورا دور صحرائی ٹیلوں کے افق کے اوپر جھکا ہوا نظر آتا تھا۔ بستی کے مکانوں اور مختصر گلیوں میں ہُو کا عالم طاری تھا۔

"کیا یہ موقع ٹھیک رہے گا؟" یاسمین نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں! لیکن اس سے پہلے دروازہ کھولنے کی تدبیر کرنا ہوگی۔" میں نے کہا۔ "ان بدبختوں نے ہمارے مکان کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔"

"چھت پر تو چڑھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے؟" یاسمین نے تجویز دی۔

"یہی کرنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

ابھی تک ہلکی آوازوں پر ہم دونوں چونکے۔ میں نے کھڑکی کا ایک پٹ ہنوز وا کر رکھا تھا۔ مجھے سامنے سے تین افراد مکان کی طرف آتے دکھائی دیے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل بھی نظر آئی تھی جبکہ باقی دو نے کھانڈے تھامے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔ جس کی پیلی روشنی کا احاطہ دور تک پھیلا ہوا۔ رائفل بردار شخص سمتان تھا۔ باقی دو اس کے سا تھے۔

"خطرہ!" میرے ذہن میں ابھرا۔ میں نے یاسمین اس کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں ان کی نقل و حرکت دیکھتا ہوں، تم جلدی سے روشنیاں گل کر دو، فقط ایک شمع رہنے دینا۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں تیزی سے طرف لپکا اور دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی چوڑی سی جھری سے آنکھ لگا دی۔

تو ہم چاندنی میں ان تینوں کے ہیولے اسی طرف متحرک تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ نجانے اب یہ کن ارادوں کے ساتھ یہاں آرہے تھے؟ یہ میں نہیں جانتا تھا اگرچہ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار دیکھ کر ان کے جارحانہ عزائم کا اندازہ ہوتا تھا۔

میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اگر انہوں نے ایسی حرکت کی تو میں بھی اب ان سے کوئی رعایت نہیں برتوں گا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ میں بھی دروازے سے نہیں ہٹا تھا۔ میرا خیال تھا وہ اندر آئیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ وہیں باہر ہی موٹے لحاف اوڑھے بیٹھ گئے۔

میں سمجھ گیا کہ انہیں پہرے پر بٹھایا گیا تھا۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔ میں واپس کمرے میں آیا۔ یاسمین متفکر تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ باہر ہمارے مکان کے پہرا بٹھا دیا گیا ہے۔

"اوہ ... اب کیا ہوگا؟ ہم کیسے نکلیں گے؟" متوحش سی ہوگئی۔

"ہم یہیں باہر نکلیں گے۔" میں نے کہا۔ "میں ان کے ساتھ ایک گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد میں نے یاسمین کو اس گیم کا "اسکرپٹ" سمجھایا اور پھر یاسمین اور میں دبے پاؤں صحن میں آگئے۔

میں ایک طرف تاریکی میں چھپ کر مستعد کھڑا گیا۔ یاسمین دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھولنے کوشش میں مصروف ہوگئی۔ حسب توقع باہر سے کسی کرخت آواز میں [illegible] تو یاسمین نے ان سے میری ہدایت کے مطابق [illegible] پریشانی ہوتے ہوئے [illegible] ہے اسے مدد

ہے۔ توقع کے مطابق دروازہ کھلا۔ سب سے پہلے بردار سمتان اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد اس کے کھانڈا بردار ساتھی بھی اس کے عقب میں نمودار

ان کا رخ سامنے کوٹھری کی طرف تھا۔ میں چوکنے تاریکی کی اوٹ سے نکلا اور گربہ قدمی سے سمتان قب میں پہنچ کر ایک زوردار گھونسا اس کی پشت پر رسید۔ اس کے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوئی اور وہ اتا ہوا کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا کر گرا۔ رائفل اس سے چھوٹ گئی۔ جسے یاسمین نے پھرتی سے لپک کر یا۔ باقی دو ساتھی اس اچانک افتاد پر بری طرح ے اور اپنے کھانڈے سنبھالے میری جانب پلٹے، میں یں اتنا موقع کہاں دینے والا تھا۔ میری لات دوسری ت کرنے کے لیے بالکل تیار تھی، جو ایک کے پہلو پر، وہ اپنے کھانڈے سمیت کئی قدم پیچھے کو جا گرا۔ جبکہ ے نے مجھ پر اپنا کھانڈا بجانا چاہا تھا کہ میں نے ت اس کے کھانڈے کو ایک ہاتھ سے جھپٹ کر وہ اس چھین لیا۔

میں کوئی خون خرابہ نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے ں پر اس کا نکیلا سرا آزمانے کے بجائے لٹھ کی طرح ما کر اس کی کنپٹی پر بجا دیا۔ وہ ایک چیخ مار کے گرا اور پھر اٹھ پایا۔ سمتان پر یاسمین نے اس کی رائفل تانے رکھی ی۔ یوں بھی کمر پر پڑنے والی ضرب نے اسے اٹھنے سے رہی کر رکھا تھا جبکہ دوسرا سنبھل کر اٹھا اور اس نے میری جارحانہ انداز میں لپکنا چاہا تھا مگر پھر وہیں ٹھہر گیا۔

اس نے شاید اپنے دونوں ساتھیوں کا حشر دیکھ لیا تھا ر میں نے اسے نہیں چھوڑا اور کھانڈا لہراتا ہوا اس پر پل ۔ وہ عام سا آدمی تھا، اس نے دروازے کی طرف دوڑ... لگا دی مگر اس سے پہلے ہی میں نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا ہنسلی کے قریب ہاتھ رکھ کر اس کی رگ حساس مسل ڈالی، واز نکالے بغیر ڈھیر ہوتا چلا گیا۔

میں یاسمین کی طرف پلٹا اور قدرے ہانپتے ہوئے ن سے کہا۔

"اس سے پوچھو کوہارا کہاں ہے اور اسے کس مکان میں رکھا ہوا ہے؟"

یاسمین نے سوال کیا مگر سمتان نے کوئی جواب نہیں

"یہ جواب نہیں دے رہا ہے، اس کی دھلائی کرنا پڑے گی۔" یاسمین نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ میں نے طیش میں آکر سمتان کی گردن دبوچ لی۔ وہ کمر پر لگنے والی چوٹ سے ابھی تک کراہ رہا تھا۔

"اس بدبخت کو سمجھاؤ کہ کوہارا ایک خطرناک آدمی ہے اور اگر ان لوگوں نے کسی لالچ میں آکر اس کی مدد کرنا چاہی تو وہ کمینہ سب سے پہلے انہیں جان سے مار ڈالے گا۔" میں نے یاسمین سے چلا کر کہا۔ اس نے اسی لہجے میں سمتان کو سمجھایا۔

میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ پھر وہ ہانپتے ہوئے یاسمین کو کچھ بتانے لگا جسے سن کر یاسمین کے چہرے کی رنگت زردی پڑنے لگی۔

"کیا ہوا؟ کیا بتایا اس نے ؟" میں نے یاسمین سے پوچھا۔

"وہ موٹا ٹھگنا سیستانی اور اس کا ایک ساتھی دونوں سہ پہر میں ہی کوہارا کو لے کر اونٹوں پر موبارضہ کی طرف روانہ ہو چکے ہیں۔"

یہ سن کر میں بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ یاسمین نے مزید بتایا کہ میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا تھا، سیستانی کو کوہارا نے بہت سی دولت دینے کا لالچ دیا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ ہمیں قیدی بنا کر اسی جگہ پر رکھے اور اسے موبارضہ اس کے ساتھیوں تک پہنچا دے۔ بعد میں وہ ان کے ساتھ یہاں آتا اور ہمیں ایک بار پھر یرغمال بنا کر شانہ کے گمشدہ مقبرے کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔

میں تو خیر اس کے لیے اس مہم میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسی لیے وہ مجھے بلادریغ ہلاک کر سکتا تھا۔ جس کا ایک جاں گسل مظاہرہ تباہ حال طیارے کے ملبے میں دیکھ چکا تھا جب وہ اپنے پستول سے مجھے زخمی بے بس حالت میں گولی مار کے تقریباً ہلاک کر ہی چکا تھا۔ مگر میری قسمت تھی کہ میں بچ گیا تھا، کیونکہ اس وقت پستول خالی تھا۔

بہرکیف اندر ہی اندر کوہارا بڑی مکاری سے اس ٹھگنے سیستانی کو اپنے ساتھ ملا کر یہ کھچڑی پکا چکا تھا اور ہم بے خبر تھے۔

ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہ تھا۔ یہ بات میں نے یاسمین سے کہی اور اس کے بعد ہم نے تینوں کو دوسری کوٹھری میں لے جا کر بند کر دیا اور باہر سے دروازے کو کنڈی لگا دی۔

انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا، میں پہلے ہی ان کی

www.PakiBooks.Site

سب وقوفانہ حرکت پر بری طرح تلملایا ہوا تھا۔ غصے سے دانت پیستا ہوا میں ان کے کمرے میں پہنچا، کمانڈ اس نے ہاتھ میں پکڑ کر رکھا تھا۔ ایک تو ابھی تک بے ہوش پڑا تھا جبکہ سمانان اور اس کا دوسرا ساتھی مجھے طیش میں دیکھ کر ڈر سے گئے۔

میں نے کمانڈ سے ہی ایک ایک ضرب تھما کر زور سے انھیں رسید کی اور انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔ وہ بستی کے سیدھے سادے لوگ تھے۔ خوف سے دبک کر اور ضرب سہلاتے ہوئے کونے میں جا بیٹھے۔

اگر یہ ہمیں کوہارا کے کہنے پر بدمعاش سمجھے ہوئے تھے تو ٹھیک ہی کیا۔ میں ان کی کوٹھری کے دروازے کو بند کر کے باہر نکلا اور یاسمین کے ساتھ باہر آ گیا۔

باہر ہر سو سناٹا طاری تھا۔ ہم دونوں تاریکی کا حصہ بنے اس طرف بڑھے جہاں سرکنڈوں کے ایک کھلے احاطے میں بہت سے اونٹ بندھے ہوئے تھے۔ دو سدھے اونٹوں کو ہم خاموشی سے دھیرے دھیرے چمکارے دیتے ہوئے اس کھلے باڑے سے باہر نکال لائے اور مکان میں آ کر ہم نے جو کچھ بھی زادِ راہ تھا وہ سب سمیٹ لیا۔

پروفیسر جمشید کو یاسمین نے سنبھالا، وہ اس وقت اپنا ہینڈ کیری کھولے ایک بڑی سی ڈائری نکالے ہوئے تھے۔ پھر اس کے اندر سے ایک تہ کیا ہوا بڑا کاغذ نکالا اور اپنی قمیص کی جیب میں ڈال لیا۔

یاسمین نے انھیں سہارا دیا اور ہم مکان سے باہر آ گئے۔ باہر سے اسے کنڈی لگا دی اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ (اونٹوں کو ریت پر بٹھا کر ہی ہم ان پر سوار ہوئے تھے)

ایک بار پھر خنک صحرائی رات میں ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ ایک اونٹ پر پروفیسر جمشید اور یاسمین سوار تھے۔ باگیں یاسمین نے سنبھال رکھی تھیں۔ ان پر ہودے نہیں تھے، بس کوہان کا ہی سہارا لیے بیٹھے تھے۔

اس وقت رات اپنے درمیانی پہر میں تھی۔ کھلے ریگزار میں آتے ہی خنکی کا احساس بڑھنے لگا۔ شکر تھا کہ ہمارے پاس لحاف تھے وہ ہم نے چادر کی طرح اوڑھ رکھے تھے۔

دونوں اونٹ آگے پیچھے مناسب رفتار سے آگے بڑھے جا رہے تھے۔ راستہ پروفیسر نے سمجھا رکھا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی کا اونٹ آگے تھا، میں ان کے پیچھے تھا۔ شکر تھا کہ پروفیسر کو صحرائے نوبیان تک راستہ معلوم تھا، کوشش یہی تھی کہ ہم جلد از جلد اس راستے سے نوبیان والے راستے پر آ جائیں۔ تاکہ سوبا لوٹتے ہوئے کوہارا اور اس کے ساتھیوں سے مڈبھی نہ رہے۔

یہی وجہ تھی کہ ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سفر جاری رکھا۔ پروفیسر جمشید آسمان پر ٹمٹماتے تا چال دیکھ کر راستہ بنا رہے تھے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، پروفیسر جمشید کو ان صحراؤں کا خوب تجربہ تھا۔ وہ اپنے پروفیشن کے سلسلے یہاں کئی بار آتے جاتے رہے تھے اور اکثر ان کے یاسمین خانم بھی ہوتی تھی۔

مزید نصف گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر نے شل کر کے رکھ دیا اور ہم ایک جگہ ٹھہر گئے۔ دونوں کر ہم ذرا دیر کو ستانے کے لیے وہاں ٹھنڈی خنک پر بیٹھ گئے۔ اب تو دور نزدیک ٹیلوں کے سلسلے بھی ختم چکے تھے۔

پروفیسر نے بتایا کہ ہم اپنی مطلوبہ سمت تک پہنچ تھے۔

”تو کیا اب ہمیں کوہارا اور اس کے ساتھیوں سے خطرہ نہیں رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ مسکرا کر بولے۔

”جب تک وہ مردود زندہ اور یہاں موجود ہے خبیث سے خطرہ تو ہمیں رہے گا لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم طور پر ان کی دست برد سے بچ چکے ہیں۔“

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے خیال کے تحت سنجیدگی سے کہا۔

”کیونکہ راستہ بدلنے کے باوجود بھی، کوہارا جب پہنچے گا تو اسے ہمارے فرار کا علم ہو جائے گا اور وہ ہمار تلاش میں نکل سکتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک، میرے کہنے کا مقصد بھی تھا۔“ پروفیسر جمشید نے کہا۔

”خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن اگر ایسا ہو جاتا ہے تو کوہارا اور اس کے ساتھیوں کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں بالکل بھی نہیں ہیں۔“ یاسمین نے تشویش زدہ لہجے میں کہا میری طرف دیکھ کر، مجھے مخاطب کرتے ہوئے مزید بولی۔

”اور شہزادے... ! کوہارا تو تم پر بُری طرح ادھا کھائے بیٹھا ہے، مجھے اور پاپا کو تو شاید اس خونی درندے سے فوری طور پر جان کا خوف نہیں ہوگا لیکن... وہ تمہار جانی دشمن ہے اور تمہیں دیکھتے ہی وہ...“

ے ہراس اور تشویش کے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی ں اس کی تشویش اور ہراس کی وجہ سمجھ سکتا تھا، ہلکی سی ے بولا۔ ”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں نے دیکھا کہ کوہارا نے دو بار مجھے ہلاک کرنے کی ش کی اور اس سے تو مجھے بھی اپنی موت صاف نظر تھی لیکن ..... خدا کا کرم ہوا اور میں بچ گیا، آگے بھی ال (اللہ) میری مدد فرمائے گا۔“

”ان شاء اللہ!“ پروفیسر جمشید نے زیرِ لب دعائیہ کہا اشارہ دیا۔

ہم نے تھوڑا بہت کھایا پیا اور پھر چل دیے۔

وفیسر جمشید کے مطابق ہماری منزل صبح تک متوقع رطیکہ اب ہم کہیں نہیں رکتے۔ لیکن اونٹ کے کوہان ک کے ہی سفر نے ہماری چولیں ہلا دی تھیں۔ میرا تو دکھنے لگا تھا، یہی حال یاسمین اور پروفیسر کا تھا، یہ صعوبتیں اٹھانے پر مجبور تھے۔ کیونکہ اس لق و دق میں ہم بے سروسامانی کی حالت میں تھے۔

لہٰذا اگر ہم ایسے حالات میں کوہارا اور اس کے ساتھیوں رغے میں آ جاتے تو یہ بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے ہمیں ر اور بھوکے صحرائی بھیڑیوں نے نرغے میں لے لیا ہو۔

تھکن ہماری ٹھیک طرح سے نہیں اتری تھی۔ خود مجھے کے خمار آلود جھٹکے لگ رہے تھے اور میں کئی ایک بار ے گرتے گرتے بچا تھا، یہی حال میں نے یاسمین کا دیکھا تھا۔ مگر اصل تشویش ناک واقعہ اس وقت رونما ہوا میں نے پروفیسر جمشید کو اونٹ سے گرتے دیکھا۔

یاسمین شاید نیند کے خمار میں تھی اسی لیے اسے اپنے ے اونٹ سے گرنے کا پتا نہ چل سکا لیکن میری نظر پڑ اور میں نے چلا کر یاسمین کو رکنے کا کہا۔

میں اپنا اونٹ روک چکا تھا اور اسے بیٹھنے کے لیے دینے لگا۔ اونٹ نے ذرا ضد کی تو میں نے اس کی ن پر ہاتھ مارا، جس پر وہ بڑے بھیانک انداز میں زور ”بلبلایا“..... اور غصے میں اپنی لمبی گردن موڑ کر اپنے سے پُرہیبت جبڑوں سے میرے بازو کو دبوچ لیا۔

میرے لیے اونٹ کی یہ حرکت اچانک اور بالکل غیر قع تھی، اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا اور خود سے پیچھے ریت پھینک دیا اور ایک بار پھر کینہ پرور انداز میں بلبلایا اور ی جانب لپکا۔ وہ مجھے اپنے بڑے بڑے پیروں تلے ل کر رکھ دیتا اگر میں بروقت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ے ایک جانب کو نہ لپکتا۔ پھر نجانے اس جانور کو کیا ہوا کہ وہ ایک طرف کو اندھا دھند دوڑ پڑا۔ اس کا رخ اسی جانب تھا جہاں پروفیسر جمشید ریت پر گرا ہوا تھا اور اب سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پروفیسر جمشید کو سخت خطرے میں دیکھ میرے اوسان خطا ہو گئے اور میں حلق کے بل زور سے چلایا۔ تب تک یاسمین بھی اس طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ وہ خود اس اچانک اور نئی افتاد پر پریشان ہو گئی تھی۔

اپنے باپ کو خطرے میں دیکھ کر اس نے پہلے تو اپنے منہ سے ایک تیز چیخ خارج کی تھی اور پھر اس کے بعد اسے اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، اس نے اپنے اونٹ کی باگ موڑ دی۔ اس کا اونٹ ہولے سے بلبلایا اور رخ بدل کر دوسرے بھاگتے ہوئے اونٹ کے سامنے آ گیا۔

باپ کو کسی بھی طرح بچانے کی یاسمین کی یہ کوشش بڑی خطرناک تھی۔ بدمست اور غصے میں دوڑتا ہوا اونٹ اس کے اونٹ سے ٹکرا گیا۔ دونوں اونٹ ایک دوسرے سے الجھ کر ریت پر گرے۔

مجھے یاسمین کی دلدوز چیخ سنائی دی جو پورے صحرا میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر اس طرف کو دوڑا۔ دونوں اونٹ بدستور چیخ رہے تھے اور پھر انھوں نے ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ جانور تھے ان سے کسی بھی وقت کچھ بھی بعید تھا۔ سو وہ ہوا اور دونوں اونٹ باپ بیٹی کے اوپر سے دوڑتے ہوئے صحرا کی لق و دق تاریکیوں میں گم ہو گئے۔

میں ہانپتا کانپتا دوڑتا ان کے پاس پہنچا تو پروفیسر جمشید کے چہرے کو ریت میں بری طرح دھنسے ہوئے پایا اور اس کے دھڑ کے نیچے یاسمین پڑی بُری طرح کراہ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پروفیسر جمشید کے بے سدھ وجود کو ایک طرف کیا اور یاسمین کو دیکھا، اسے کوئی خاص چوٹ تو نہیں آئی تھی اور وہ ہوش میں بھی تھی لیکن اس کے بوڑھے باپ پروفیسر جمشید کی حالت ایسی ہی تھی جیسے وہ بس آخری گھڑیوں کا مہمان ہو۔ وہ باپ تھا جانے کیسے موقع پر اس نے اپنی بیٹی کے اوپر آ کر اسے بدمست اونٹوں کے پیروں تلے روندے جانے سے بچا لیا تھا۔

”پپ... پروفیسر صاحب! آ..... آپ ٹھیک تو ہیں نا.....؟“ میں ان کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ آخری سانسوں پر تھے اور ان کا جسم درد و کرب سے اینٹھ رہا تھا۔

”پاپا... !“ یاسمین بھی گھسٹتی ہوئی باپ کے پاس آ گئی۔

”بب... بیٹا! مم..... میری سانسیں شاید اسی صحرا

www.PakiBooks.Site

میں تو دا لکھی تھیں۔ خدا کی مرضی یہی تھی، تم دونوں میرا غم نہ کرنا....'' پروفیسر جمشید نے درد بھری آواز میں کہا اور اتنا ہی کہا تھا کہ ان کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔ میرے دل کو گھونسا لگا۔ میں نے پھر انہیں سنبھالا دیا اور تسلی دی۔

''پروفیسر صاحب! آپ ... کو کچھ نہیں ہوگا...''

''میرے پاس وقت کم رہ گیا ہے، بس! میری بات سن لو۔'' وہ اٹکتے ہوئے بمشکل تمام بولے۔ ''کبھی بھی ظالم کے آگے سر مت جھکانا، چاہے وہ تمہیں سپردِ صحرا ہی کیوں نہ کر دے۔ تم..... میری جیب میں اس گمشدہ مقبرے کا نقشہ موجود ہے، تم تو شاید نہیں مگر میری بیٹی اسے سمجھ لے گی۔ خدا تم دونوں کا حامی و ناصر۔'' آخری جملہ ان کے حلق میں اٹک گیا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، زخمی سر ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

''پاپا.....'' یاسمین غم زدہ چیخ کے ساتھ اپنے باپ کی لاش سے لپٹ گئی۔ خود میرے اندر دکھ اور کرب کی ایک لہر سی امڈی تھی، جس نے میرا وجود چھلنی سا کر ڈالا۔ مجھے پروفیسر جمشید کے مرنے کا بے حد دکھ تھا۔ بعض انسانوں کی موت بھی خدا نے کہاں لکھی ہوتی ہے۔ سچ ہی کہا گیا ہے کہ موت کے فرشتے کو اللہ کی طرف سے انسان کی جہاں روح قبض کرنے کا حکم ہوتا ہے وہ وہیں دم دیتا ہے۔ ایک انچ بھی جگہ نہیں بدلی جاتی۔

یاسمین بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ میں نے تھوڑی دیر اسے رونے دیا، جب وہ غم سے ہلکان ہونے لگی تو میں نے ہولے سے اس کے شانے پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف مڑ کر دیکھا، وہ آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

''حوصلہ کرو یاسمین! اللہ کو یہی منظور تھا۔'' اس نے سسکی لی اور اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ وہ اب گھٹے گھٹے انداز میں سسکنے لگی۔

صحرا کی یہ غم گسار، کرب ناک رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ تاریک آسمان کی سیاہی کچھ پھیکی پھیکی سی پڑ رہی تھی۔

''یاسمین!'' میں نے ہولے سے اُسے پکارا۔ اس کا سسکنا تو بند ہو گیا تھا مگر سر اس کا میرے شانے سے ہی لگا رہا تھا، ایک لمحہ مجھے یوں لگا جیسے وہ کھو گئی ہو۔

''اوں ... ہاں!'' وہ جیسے پُرسکون نیند سے بیدار ہوتی آواز میں بولی اور پھر میرے شانے سے سر ہٹا کر میری طرف دیکھا۔ ایسے میں ہم دونوں کے چہرے فقط انگشت برابر کی دوری پر تھے، اس قدر قریب کہ یاسمین کے سرخی لیے ادھ کھلے لب میرے ہونٹوں کو چھونے لگے بس ذرا ایک لمحہ کی محتاج قربت کا ہی تو فاصلہ تھا دھڑکنوں کے درمیاں ... اس کی گرم سانسوں کی بازگشت میں مجھے ایک عجیب طرح کی کشش محسوس ہو گی۔ ایسے ہی لمحوں میں تو جی کرتا ہے کہ سب کچھ بھول پیش گرد کو اور خود کو بھی۔

''پروفیسر صاحب! ایک عظیم انسان تھے۔'' میں ہولے سے کہا۔ ''اپنے نیک مقصد کے لیے انہوں نے جان تک قربان کر دی۔ ظالم کے آگے سر نہیں جھکایا او رسیدہ ہونے کے باوصف صعوبتیں جھیلیں۔ آفرین ہے پر..... اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔''

''آمین۔'' یاسمین کے مرتعش لبوں سے برآمد ہوا

ہم نے پروفیسر صاحب کی لاش کو وہیں ریتیلا گڑھا تلاش کر کے دفنا دیا اور کیا کرتے۔ ہمارے پاس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم خود بے سروسامانی کے عا میں تھے۔ البتہ لاش ہم نے ''امانتاً'' دفنائی تھی۔ کبھی مو ملے تو انہیں کسی آبادی والے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا

پروفیسر جمشید کی لاش دفنانے سے پہلے یاسمین ان کی جیب سے وہ کاغذ نکال لیا تھا۔ وہ ڈارک پیرامڈ تک جانے کا نقشہ اور کچھ ضروری نشاندہی کے علاوہ تحریری پر رہنمائی بھی درج تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں اب آگے بڑھنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ یاسمین نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

ہم پیدل ہی آگے بڑھ گئے۔

صحرا کے اس طویل اور تھکا دینے والے سفر میں اب ہم دور ہو گئے تھے۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ ہمارے پاس اب کچھ بھی تھا، نہ کھانے کو نہ پینے کو۔ تاہم مجھے کیکٹس کا ایک گاڑھا سا پودا نظر آیا۔ میں نے اسے کسی طرح توڑ کر اس کے اندر کا پانی چکھا۔ وہ میٹھا تھا۔ وہ ہم دونوں نے اوک میں بھر کے پیا۔ کچھ تھوہر ایسے ہوتے ہیں جن میں میٹھا پانی موجود ہوتا ہے۔ اللہ کی شان، کہ اس تپتے ریگستانوں میں بھی ریت اور کانٹوں کے بطن میں پانی بہار رکھا تھا۔

اب کی بار آگے بڑھے تو پھر رکے نہیں، چلتے ہی رہے۔ بے شک ہماری رفتار کم تھی لیکن ہم ٹھہرے کہیں نہیں تھے۔

یہ تو شکر تھا کہ ہمارے ضروری کاغذات محفوظ رہے تھے۔ کیونکہ میری ہی ہدایت پر انہوں نے بھی وہ ایک چرمی پاؤچ میں ڈال کر اپنے جسم سے باندھ لیے تھے۔ بدقسمتی ب پروفیسر صاحب تو دنیا میں نہیں رہے تھے مگر یاسمین ے ساتھ تھی۔

ہم ریت پر قدم مارتے چلتے رہے۔ جلد ہی ایک بار ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوتا دکھائی دیا۔ بقول یاسمین ٹیلے یا تو کسی قریب آبادی کا اشارہ کرتے ہیں یہاں پھر نخلستان کا۔

ہم ایک ٹیلے کی ڈھلان پر بیٹھ گئے۔ دور مشرق کی سپیدۂ سحر کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ کچھ ہوئی تو ہم پروفیسر صاحب کا تحریر کردہ نقشہ دیکھنے لگے۔

میں تو نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ لیکن یاسمین بغور اس کا زہ لیتی رہی پھر اس نے کاغذی نقشے پر ایک مقام پر اپنی رکھی اور سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، اس کے پیش نگاہ دوڑائی۔ وہ اپنے باپ کے تجربے سے مستفید نے کا ہنر جانتی تھی۔ چند ثانیوں بعد بولی۔

''ایک محتاط اندازے سے ہم اہرام سے چالیس پینتالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ پیدل سفر ہمیں رات ے پہلے وہاں تک پہنچا دے گا۔''

''اوہو..... ابھی پورے دن کا مزید سفر باقی ہے۔'' ے منہ سے نکلا۔

''ہاں! شکر ہے کہ ہم درست سمت پر گامزن ہیں۔ بھٹکے نہیں ہیں۔''

''تم ساتھ ہو تو راستہ کیسے بھٹک سکتے ہیں بھلا۔'' میں نے دانستہ مسکرا کر کہا۔ اس کے بھی پژمردہ ہونٹوں پہ ہلکی سی کان چمکی۔ شفق گال جو مسافتوں کی صعوبتوں سے پھیکے ے پڑنے لگے تھے۔ ایک گلنار رنگ سا پھوٹا۔ یوں وہ بھی قدرے شوخی سے بولی۔

''اور اگر راستہ بھٹک گئے تو.....؟''

''تو..... اس کی ذمے داری بھی تم پر۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کی دلی کدورت کو رفع کرنے کی غرض سے اس ن ستواں ناک کو چھوا۔

''اور..... تمہاری ذمے داری کیا ہو گی؟''

''تمہاری حفاظت۔'' میں نے کہا اور اس کی کشادہ آنکھوں میں کئی رنگ اُمڈے۔ تب ہی میں نے موضوع بدلا اور فکر آمیز لہجے میں بولا۔

''بس! منزل کی دوری مارے ڈال رہی ہے، زیادہ تشویش کو بارا اور اس کے ساتھیوں کے ٹکراؤ پر ہو رہی ہے۔ اس بے سروسامانی میں ہم ان کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔'' میری بات پر وہ بھی فکرمندی ہو گئی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا اور اس کے بعد ہم آگے بڑھ گئے۔

مشرق میں ابھرتی سپیدی اب سحر سے صبح دم میں بدلنے لگی تھی۔ ہم تیز تیز قدموں سے چلتے رہے۔ ہوا اب بھی خنک تھی، لیکن ہم جانتے تھے زیادہ دیر ایسا نہیں ہو سکتا تھا، سورج کے سر ابھارتے ہی یہی ہوا بادِ سموم میں بدل جائے گی۔ نقشے کا جائزہ لیتے ہوئے یاسمین نے بتایا تھا کہ ایک مقام پر چھوٹے سے نخلستان کی نشاندہی کی گئی ہے، اگر سورج کے سوا نیزے پر آنے سے قبل ہم وہاں پہنچ جاتے تو ہمیں کسی سایہ دار جھنڈ کی چھاؤں میسر آسکتی تھی۔

لیکن ایک نشان پر وہ الجھ گئی تھی۔ بہت دماغ سوزی کے باوجود وہ نشان اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ خود میں نے پہلے تو اس نشان کا سرسری جائزہ لیا تھا۔ اس کے بعد میں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا نخلستان پہنچ کر آرام سے بیٹھ کر میں خود اسے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔

ہم اپنی مقدور بھر کوشش سے تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ پاؤں ریت میں دھنسے جاتے تھے۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری تھی اور مسلسل بڑھتے رہے۔ سورج کا مشرق سے مغرب تک کا سفر شروع ہو گیا تھا۔

ریگ زار تپنے لگا تھا۔ گرم ہواؤں کے تھپیڑے چہرے کو جھلسائے دے رہے تھے۔ بادِ سموم میں ریت کے ذرّے شامل تھے۔ جس کے باعث منہ کے اندر عجیب سی کرکراہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔

یاسمین کے گھنے ریشمی بال ریت میں اَٹ کر بُری طرح الجھے ہو رہے تھے۔ ہمارے چہرے، پلکیں بال ریت سے اٹ گئے تھے۔ ہونٹ تک ریت کے ذرات سے چبھن محسوس کر رہے تھے۔

کئی ایک جگہ پر ان گرم ہواؤں سے دور پرے ریتیلے ٹیلوں پر لہریں بن رہی تھیں۔ یوں جیسے ریت کا نہیں پانی کا سمندر ہو۔ ایک سراب تھا جو ہمیں راستے سے بھٹکانے کے لیے بہتا نظر آ رہا تھا، کیونکہ اسی سراب کے پیچھے انسان بھاگتا ہے اور اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہے، کئی بار تو میں بھی پیاس کی شدت تلے اس طرف کو دوڑنے لگا تھا مگر یاسمین نے مجھے روک دیا۔

سورج اب عین سر پر چمک رہا تھا۔ ہم بُری طرح

www.PakiBooks.Site

پہنچنے لگے تھے۔ گرمائش پیروں سے اب دماغ تک پہنچنے لگی تھی اور ہلکان ہوئے جا رہے تھے ہم۔ سستاتے بھی کہاں اور کیسے؟ حدِ نگاہ تک تو ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

ایک ٹیلے کی ڈھلان پر تھوڑی دیر ہی رکنے کی ہمت کر پائے تھے اور پھر چل پڑے۔ یہ ہماری، بلکہ بالخصوص یاسمین خانم کی ہمت ہی تھی کہ ہم بالآخر اس تپتے ریگ زار میں گرتے پڑتے..... اس نخلستان تک پہنچ ہی گئے جس کی نشاندہی نقشے میں کی گئی تھی۔

کھجور اور ناریل کے درختوں کا برائے نام جھنڈ تھا۔ جو تھے وہ بھی سوکھے پڑے تھے۔ ہماری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

یہ شکر تھا کہ تپتی دھوپ سے تھوڑی دیر کو چھایا فراہم ہو گئی تھی۔ لیکن جب ہم گرتے پڑتے تھوڑا اور آگے بڑھے تو ایک قدرتی جھیل کا بڑا سا ہالہ دکھائی دے گیا۔ اس طرف درخت بھی زیادہ سوکھے نہیں تھے۔

ہم دونوں جھیل کے کنارے پر جا کر گر پڑے۔ خوب سیر ہو کر پانی پیا اور کھجور اور ناریل کے درخت پر میں ہی ذرا سستانے کے بعد چڑھ سکا، سب سے پہلے میں نے ناریل توڑ کر نیچے پھینکے، یاسمین بچوں کی طرح اپنی قمیص کا دامن پھیلائے ناریل چنتی رہی، کچھ اس کی جھولی کے باہر بھی گرے۔

ناریل توڑ کر ہم نے اس سے دوبارہ پیاس بجھائی پھر ناریل کھا کر بھوک بھی مٹائی۔

"شہزی! میرا نہانے کو دل کر رہا ہے، بڑی خوب صورت جگہ ہے۔" یاسمین نے خوش دلی سے کہا۔ خود مجھے بھی تپتے ریگستان میں بنا یہ چھوٹا سا نخلستان کسی لینڈ اسکیپ کا شاہکار نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی بھلا منظر دکھتا تھا۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے صحرا کے درمیان یہ ہرا بھرا نخلستان، یوں جیسے گہرے سمندر کے بیچ کوئی دلکش سبزہ زار جزیرہ ہو۔

"جی تو میرا بھی چاہ رہا ہے نہانے کو، کم بخت ریت کے ذرات لگتا ہے جسم کے اندر تک گھس گئے ہیں اور تیز سے کی انی کی طرح چبھ رہے ہیں۔ لیکن کاغذات اور نقشے والا پاؤچ جسم سے الگ کر کے کنارے پر رکھ دو پہلے، کہیں گیلے ہو کے خراب ہی نہ ہو جائیں۔" میں نے بھی مسکرا کر کہا اور پھر ہم نے ایسا ہی کیا۔

اس کے بعد ہم دونوں کپڑوں سمیت جھیل کے پانی میں کود گئے۔ ہم تھوڑی دیر تک نہاتے رہے۔ یاسمین خوب غوطے لگا رہی تھی۔ اسے شاید تیرنا بھی آتا تھا۔ میں نے بھی انجوائے کیا۔

سورج ہمارے سر پر چمک رہا تھا۔ مگر اب پانی میں اس کی تپش ایک خوشگوار سا احساس دلا رہی تھی۔ نہا کر ہم جھیل سے نکلے اور کنارے پر آ کر ریت پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔

دھوپ اور گرم ہواؤں نے ہمارے کپڑے اور بدن تھوڑی دیر میں خشک کر ڈالے۔ ہم سایہ دار جگہ میں آ کر بیٹھ گئے اور خاموشی سے حدِ نگاہ صحرا کو دیکھتے رہے۔

"میرا خیال ہے سورج ذرا جھک جائے تب ہی آگے بڑھا جائے۔" یاسمین نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ "ورنہ پھر ہمارا حشر برا ہو جائے گا۔"

میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی اور اس کی تائید میں اثبات میں سر ہلایا۔ "یقین نہیں آتا کہ ہم اس قدر تپتے ہوئے ریگستان میں... دن بھر پیدل سفر کرتے رہے۔" پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد مجھے یاد آیا۔

"اب ذرا تم نقشہ نکالو، اس نشان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جو اس نخلستان کے بعد دکھایا گیا ہے۔"

یاسمین نے نقشہ نکالا اور سمجھ میں نہ آنے والے نشان پر انگلی رکھ کے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تم ذرا دیکھو۔"

میں نے نقشہ لیا، اس نے نشان سے اپنی انگلی ہٹائی، میں غور سے دیکھنے لگا۔

"ایک نشان والی منزل پر تو ہم پہنچ چکے ہیں، یعنی یہ نخلستان۔" میں نے کہا۔ "لیکن یہ والا نشان کس بات کی نشاندہی کر رہا ہے؟ باقی منزل تک پہنچانے والے نشان تو سمجھ میں آ رہے ہیں۔"

جہاں نخلستان اور آبادی تھی، وہاں ایک چھوٹے سے کھجور یا ناریل کے پیڑ کی نشاندہی کی گئی تھی، مکان کی نشانی چھتری سے ظاہر کی جا رہی تھی۔ گمشدہ اہرام اور اصل منزل والے نشان ابھی آگے تھے۔ تصویر کشی مختصر اور چھوٹی لکیروں کی صورت میں کی گئی تھی۔ لکسر کے مقام کی نشاندہی سب سے آخر میں کی گئی تھی جو ہماری اصل منزل تھی اور وہ نوبیان کے صحرا... میں واقع تھی۔ یہاں قریب میں دریائے نیل بھی بہتا تھا۔

نقشے میں اگر درخت دکھانا مقصود تھا تو قلم سے فقط ایک لکیر کھینچ کر اس کے اوپر تین چار اس طرح چھتری نما لکیریں کھینچ دی گئی تھیں... کہ وہ درخت نظر آئے، آبادی دکھانے کے لیے تین چار لکیروں کو ملا کر محرابیں سی بنا دی گئی

۔ اصل منزل کی تصویر قدرے بڑی تھی۔ جس پر اہرام ں بنائی گئی تھی۔ لیکن اس نخلستان کے بعد والا نشان سمجھ کے باوجود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"یہ نشان تو میرے پلے بالکل بھی نہیں پڑ رہا ہے۔" میں نے نقشہ تھماتے ہوئے یاسمین کو لوٹا دیا۔ اس نے یہ تھوڑی دیر سر کھپایا مگر سمجھنے سے قاصر ہی رہی۔

ہم دونوں آرام کرنے کے لیے وہیں درختوں کی میں لیٹ گئے۔ کبھی نیند آ جاتی تو کبھی اچانک آنکھ جاتی تھی۔

یک موقع پر میری آنکھ لگی تو اچانک مجھے یاسمین نے رح جھنجھوڑ کر جگایا۔

نیند سے اچانک بیدار ہو کر میں ہڑبڑا سا گیا۔ یاسمین چہرے پر ہراس پھیلا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میرے جھوڑ رہے تھے اور وہ گردن موڑے صحرا کی وسعتوں کی کھے جا رہی تھی۔

"وہ دیکھو... شہزی! وہاں... ریت کے بادل اڑ ہیں، لگتا ہے کوئی قافلہ تیزی سے اسی طرف کو آ رہا" س کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس نے سامنے اشارہ میں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں کون سے شات چل رہے تھے۔

میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا اور میری انی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ اس طرف سے ریت کے لے اٹھ رہے تھے۔ ممکن تھا کہ یہ سمجھا جائے اس طرف ئی صحرائی طوفان امڈا چلا آ رہا ہو، لیکن ایسا نہیں تھا۔ غور سے دیکھنے پر یہ پتا چلتا تھا کہ کوئی مختصر سا قافلہ تیزی سے اسی رف چلا آ رہا ہے۔

"یاسمین! اس طرف آؤ... جلدی۔" میں نے فوراً ی متوقع خدشے تلے اس سے کہا اور بائیں جانب والے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ یہاں قدرتی روئیدگی تھی۔ یہ نصف قدِ آدم جھاڑیاں تھیں۔ یہاں کھجور اور ناریل کے درختوں کی بہتات بھی نظر آتی تھی۔

ایک نسبتاً نیچے جھکے ہوئے درخت پر پہلے میں چڑھا اور پھر ایک موٹے تنے پر ٹک کر میں جھکا اور یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اوپر چڑھنے میں مدد دی۔

ہم تھوڑا اور اوپر کو گھنی شاخوں میں چھپ کر گویا ٹک کے بیٹھ گئے۔

ہم اسی سمت تکنے لگے۔ ریت کے بگولے تب تک قریب آ چکے تھے اور میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹا سا ٹرک تھا۔ جس کے پیچھے واٹر ٹینکر رکھا ہوا تھا۔ اس کے ڈرائیونگ کیبن میں تین افراد بیٹھے تھے۔ ایک ان میں جوان اور خوب رو لڑکی تھی۔ دو مردوں میں سے ایک ادھیڑ عمر کا نظر آتا تھا جبکہ دوسرا جوان تھا۔ صحت دونوں کی قابلِ رشک تھی۔ خوب صورت لڑکی خاصی شوخی اور چلبلے پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

انہیں دیکھ کر ہم دونوں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ گوبارا اور اس کے ساتھیوں کی آمد کا ہمارا خدشہ غلط ثابت ہوا تھا۔

ٹرک دراصل جھیل کے قریب ہی ذرا کنارے پر آ کر رکا تھا۔ لڑکی نے ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے... اپنے تن سے کپڑے اتارنا شروع کر دیے، اور برہنگی کی حالت میں خرمستی کے انداز میں چیختی ہوئی جھیل کے پانی میں کود گئی۔

نوجوان نے بھی اپنا لباس اتار دیا اور وہ بھی پانی میں کود چکا تھا۔ اب دونوں لڑکا لڑکی جھیل کے پانیوں میں "چہلیں" کرنے لگے۔ لڑکی خوشی سے چلائے جا رہی تھی۔ ادھیڑ عمر کا آدمی کنارے پر ہی کھڑا ان کی طرف دیکھ دیکھ کر اپنا سر جھٹکے جیسا جا رہا تھا۔ وہ اسے بھی ہاتھ کے اشارے سے بلا رہے تھے مگر وہ ہاتھ جھٹک کر اپنے ٹرک کے پاس چلا گیا۔

اس نے ڈرائیونگ کیبن سے پانی کا ایک ڈبا نکالا اور جھیل کے کنارے آ کر اس میں پانی بھرا پھر ٹرک کے پاس آ کر اس نے بونٹ اٹھایا اور ریڈی ایٹر میں پانی میں ڈالنے لگا۔

"کیا خیال ہے ان کے ساتھ قسمت آزمانی چاہیے، یا پھر ان کے جانے کا انتظار کیا جائے؟" میں نے یاسمین کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ میرے ساتھ ہی چپکی بیٹھی تھی۔

"ان سے مدد نہ لینا بے وقوفی ہو گی۔" یاسمین نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ "یہ لوگ بے ضرر لگتے ہیں۔ ہماری اتنی مدد تو ضرور کر دیں گے کہ ہمیں ابوسمبل تک پہنچا دیں۔"

مختصر سے باہم مشورے کے بعد... ہم دونوں درخت سے نیچے اتر آئے اور جھیل کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہے ے ے۔"

ہم جھیل کے قریب پہنچے تو اندر پانی میں نہاتے اور چہلیں کرتے ہوئے لڑکی اور لڑکے نے ہمیں دیکھتے ہی شور مچا دیا۔ مقصد شاید اپنے بڑی عمر والے ساتھی کو متوجہ کرنا تھا۔

ان دونوں کے کپڑے، زیر جامہ سمیت جھیل کے کنارے پڑے ہوئے تھے۔ ان کی چیخیں سن کر بڑی عمر

www.PakiBooks.Site

English J
سر نہ کھجائیں..
Healthy ہوجائیں!
English
ANTI-LICE SHAMPOO
English
ANTI-LICE SHAMPOO
HOLOGRAPHIC PRINT اصل کی پہچان
5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات

والا ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا، اس نے شاید ان کی آوازوں کو ”خرمستی“ پر ہی محمول کیا تھا۔

یہ لوگ مجھے یورپین محسوس ہوئے تھے۔ کیونکہ قریب سے دیکھنے پر وہ سرخی مائل سپید گورے دکھائی دیتے تھے۔ تاہم مجھے ان پر جرمن کا شبہ ہوا تھا۔ انہی کی رنگت سرخی مائل تانبے جیسی ہوئی تھی۔ بال بھورے اور سنہرے تھے۔ پکی عمر والے نے گیلس لگی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ سر پہ پی کیپ تھی۔ اس کا لباس کسی مخصوص کمپنی کی وردی کی نشاندہی کر رہا تھا۔

ٹرک کا رنگ نیلا تھا مگر اس پر انگریزی کے بڑے بڑے حروف میں ”ای۔ او۔ سی۔“ درج تھا اور ایک چھوٹا سا کمپنی مونوگرام بھی نظر آتا تھا۔

لڑکے نے جرمن لہجے میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں پکارا۔

”اے... کون ہو تم ... لوگ؟“

تب پکی عمر والا بونٹ سے سر ہٹا کر ہماری طرف گھوما۔ اس دوران لڑکی جھیل سے نکل کر کنارے پر آگئی اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگی۔ اس کا ساتھی لڑکا بھی یہی کرنے لگا۔ یاسمین اور میں نے ان کی طرف سے اپنے منہ پھیر لیے تھے۔ ان کے ہانکنے کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

پکی عمر والا البتہ ہمیں دیکھ کر چونکا تھا۔

”کون ...؟ کون ہو تم ...؟“ اس نے جرمن لہجے میں شکستہ انگریزی بولی۔

”ہم مسافر ہیں، ریت کے طوفان کے سبب اپنے قافلے سے بچھڑ گئے اور یہاں پہنچ گئے۔“ میں نے خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے تعارفاً مزید کہا۔ ”مجھے شہزاد کہتے ہیں۔“

”میں ہیگرڈ ہوں۔“ کہتے ہوئے اس نے بھی مسکراتے انداز میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

”یہ میری ساتھی مس یاسمین ہیں۔“ میں نے یاسمین کا بھی تعارف کرا دیا اور ذرا گردن موڑ کر لڑکا لڑکی کی طرف دیکھا، جو اب جلدی جلدی اپنا لباس پہن چکے تھے اور اسی طرف ہی آ رہے تھے۔

ہیگرڈ میرے ان کی طرف دیکھنے کا مطلب سمجھ گیا اور ان کا بھی تعارف کراتے ہوئے بولا۔

”یہ میرے کولیگ (دفتری ساتھی) ہیں۔ مس ایتا اور بروز دونوں شرارتی ہیں۔ ہم ابوسرا اور... کرناک میں ایجپ شین آئل (مصری تیل) کمپنی کے ایک مشترکہ پراجیک میں ملازم ہیں۔“

ہیگرڈ نے بتایا اور میرا دل خوشی کے مارے بلی اچھل پڑا۔ تب تک وہ دونوں یعنی ایتا اور بروز بھی ہمار قریب آ چکے تھے۔ ہیگرڈ نے ان دونوں کو ہمارے بار میں بتا دیا۔

لڑکی اور لڑکا چالاک دکھتے تھے۔ ایتا نامی لڑکی بولی

”ہمارے ٹرک میں اضافی مسافروں کے بیٹھنے کی تو بالک جگہ نہیں ہے اور...“ اس کے ساتھی لڑکے بروز نے اس ک بات کاٹتے ہوئے تائیداً کہا۔

”اور کمپنی کی طرف سے ہمیں یوں بھی سختی سے اس بات کی ممانعت ہے کہ ہم کسی اجنبی کو ہرگز سرِ راہ لفٹ نہیں دے سکتے۔“

میرا منہ بن گیا اور میں ہیگرڈ کا چہرہ تکنے لگا۔ اس ن بھی اپنے کاندھے اچکا کر معذرتی مسکراہٹ سے کہا۔

”مجبوری ہے۔“

”فائن...“ یاسمین کو جیسے غصہ آ گیا۔ وہ پہلی با مخاطب ہوئی تھی ان سے۔

”چلو شہزی! دفع کرو ان کو۔“ یاسمین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے بھی غصہ تو آیا مگر ضبط کر گیا۔

اس کے بعد میں اور یاسمین قریبی ایک جھنڈ کے قریب بیٹھ گئے۔

”بڑے ہی کمینے قسم کے لوگ ہیں۔“ یاسمین نے چڑ کر ان کے بارے میں تبصرہ کیا۔

”انسانی ہمدردی کا جذبہ تک ان کے دلوں میں نہیں ہے۔“

”دفع کرو... اپنا اپنا ظرف ہے۔ کیوں اپنا خون جلاتی ہو۔“ میں نے کہا۔

ہم دونوں بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ اگر یہ ہمیں ابوسر تک لفٹ دے دیتے تو باقی آگے نوبیان (لکسر) کے سفر کا دوسرا بندوبست ہم بہ آسانی کر سکتے تھے۔

ہیگرڈ کنارے پر چلا گیا۔ پھر کپڑے اتار کر وہ بھی جھیل میں کود گیا۔ بروز ٹرک کے پاس کھڑا ہماری طرف دیکھنے لگا جبکہ ایتا ڈرائیونگ کیبن کی طرف بڑھ گئی اور اس میں سوار ہو کر جب دوبارہ نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں کوئی شے دبی ہوئی تھی۔ وہ کوئی تھیلا سا تھا۔ دونوں اس کے اندر سے نکال کر کچھ کھانے لگے۔ شاید سینڈوچ تھے۔

www.Pal ooks.Site

لینا اور بروز ہماری طرف دیکھ کر ایک دوسرے کو ٹہوکا مار کے ہنس بھی رہے تھے۔ یوں جیسے ہمارا مذاق اڑا رہے ہوں۔

یہ لوگ اگر چاہتے تو ہماری مدد کر سکتے تھے۔ ٹرک کے ڈرائیونگ کیبن میں اتنی گنجائش تھی کہ اس کے اندر میں اور یاسمین سما سکتے تھے۔ کیونکہ اندر ایک برتھ نما سیٹ اضافی تھی۔ وہ شاید انہوں نے باری باری اپنے سونے کے لیے خالی رکھی تھی۔

"میرا خیال ہے میں ان سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" چند ثانیے ہونٹ بھینچے اندر ہی اندر تلملانے کے بعد میں نے یاسمین سے کہا۔ "ہم ڈرائیونگ کیبن میں نہیں تو ٹرک کے گول ٹینکر والی جگہ کے پاس کہیں خلاء میں تو سما سکتے ہیں۔"

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" یاسمین نے مایوسی سے کہا۔

"کہنے میں کیا حرج ہے۔ ورنہ ایسرا اور کرناک کا سفر تو ابھی بہت باقی پڑا ہے۔ خطرہ الگ سر پر منڈلا رہا ہے۔"

یاسمین نے مجھے ان کی منتیں کرنے کی اجازت دے دی۔ میں اٹھا اور ان کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن وہ دونوں خبیث مجھے اپنی جانب آتا دیکھ کر جلدی سے ٹرک میں سوار ہو گئے۔ ان کے اس چھچھور پن پر مجھے سخت طیش آیا۔

میں نے جھنگل کی طرف دیکھا۔ ہیگرڈ اٹھا کر نکل رہا تھا۔ اب زیر جامے پر کپڑے چڑھا رہا تھا۔ میں اس کے قریب جا پہنچا اور اس سے ایک بار پھر مدد کی استدعا چاہی مگر اس نے پھر بھی انکار میں سر ہلا دیا۔ میں اسے "سر پلیز، ہیلپ" کہتا اس کے پیچھے چلتا رہا مگر وہ ٹرک کے پاس پہنچ کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔

میں غصے سے اس قدر زور سے اپنے دانت بھینچ کر رہ گیا کہ میرے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔

"چھوڑو ناں..... دفع کرو ان رذیلوں کو..... کیوں منتیں کرتے ہو ان..... بے حس لوگوں کی۔" اچانک یاسمین بھی عقب میں میرے پیچھے آ کر بولی۔

ٹرک اسٹارٹ ہوا اس کے بعد ریورس ہونے لگا۔ ہم دونوں واپس اپنی جگہ کی طرف بڑھے، وہاں بیٹھنے لگے تو اچانک یاسمین کے منہ سے نکلا۔

"ارے..... یہ ان کو کیا ہو گیا.....؟" وہ اس سمت دیکھ رہی تھی جہاں سے ٹرک روانہ ہوا تھا۔

"کیا ہوا.....؟" میں نے بھی اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس طرف دیکھ کر کہا۔

"ان کا ٹرک کیوں رک گیا ہے؟ کہیں ان کے ضمیر نے انہیں ملامت تو نہیں کر ڈالی۔" یاسمین جل کر بولی۔

"نہیں، کوئی اور وجہ لگتی ہے۔" میں نے بغور مذکورہ سمت دیکھا۔

"شاید ان کے ٹرک میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔"

"اچھا ہوا، ان خبیثوں کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔" یاسمین نے جیسے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

ہیگرڈ ٹرک سے نیچے اتر آیا تھا۔ وہ اب بونٹ کھول کر اس میں خرابی تلاشنے لگا۔

اچانک میری نظر ٹرک کے پار دوسری جانب پڑی تو چونک پڑا۔

"یاسمین! وہ دیکھو، اُس طرف..... ریت کے بگولے۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"اوہ..... شاید کچھ اور لوگ بھی اس طرف آ رہے ہیں۔"

"کون لوگ ہو سکتے ہیں یہ.....؟" میں گومگو کے انداز میں بڑبڑایا۔

"پپ..... پتا نہیں....." یاسمین کی آواز لرزیدہ سی تھی۔ حسبِ توقع خدشات ایک بار پھر ہمارے اندر جونک کی طرح سر ابھارنے لگے۔

"اس طرف آ جاؤ، جلدی۔" میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور جھنڈ کے پیچھے جا چھپے۔

اب یہاں سے ہم مذکورہ سمت دیکھ سکتے تھے۔

ریت کے بگولوں نے جلد ہی موٹر گاڑیوں کی صورت اختیار کر لی۔ وہ دو عدد مخصوص اور چوڑے ٹائروں والی جیپیں تھیں۔ دونوں ٹرک کے دائیں بائیں قریب پہنچ کر رک گئیں۔

اس کے اندر سے تین مسلح افراد اُترے تو میرا اور یاسمین کا دل دھک سے رہ گیا۔

ایک کو تو میں صاف پہچان گیا تھا وہ مردود و ملعون سے جی کوہارا تھا۔ اس کی ایک آنکھ پر ابھی تک پلیپ چڑھا ہوا تھا اور ایک ٹانگ میں لنگ بھی تھا۔ اس کے کہیں کہیں پٹیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ باقی اس کے ساتھی تھے۔

"بالآخر یہ بدبخت لالچی سیتانی کی مدد سے اپنے ساتھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔" میں دانت پیس کر غصے سے بڑبڑایا۔ یاسمین بھی منحوس کوہارا کو دیکھ کر خوف سے پیلی پڑنے لگی۔

اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور لرزتی آواز میں بولی۔

"شش..... شہزی..... اوہ..... وہ آ گیا ہے۔"

"حوصلہ رکھو اور دیکھو ہمت مت ہارنا۔ اللہ ہماری مدد کرنے والا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

کوہارا اور اس کے ساتھی ہیگرڈ سے کچھ پوچھ رہے تھے جس کے جواب میں ہیگرڈ نے اپنا رخ موڑ کر اسی جانب اشارہ کیا جہاں ہم موجود تھے۔

پھر ہماری دھڑکتی نظروں نے دیکھا کوہارا اپنے دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا کر اسی جانب، اپنے ساتھیوں کو بڑھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"شش..... شہزی! خدا کے لیے بھاگ چلو....." یاسمین نے کپکپاتی آواز میں بولی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں..... یاسمین! تم کوہارا سے اس قدر خوف زدہ کیوں ہو؟ ہم بھلا اب کہاں بھاگ کر جا سکتے ہیں؟ ہمیں اس موذی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔" میں نے قدرے حیران ہو کے کہا۔ مجھے لگتا ہی نہ تھا کہ یہ وہی یاسمین تھی جو اس سے پہلے کاسیاکو اور کوہارا سے دیوانہ وار بھڑ گئی تھی۔ یا پھر شاید کوہارا کی کچھ زیادہ ہی دہشت اس پر سوار ہو گئی تھی۔

میری بات سن کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ میں نے دیکھا اب اس کے چہرے پر ایک جوشِ عزم کی تمتماہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے پھر میں بھی مقابلے کے لیے تیار ہوں۔"

"گڈ! یہ ہوئی نا بات..... لیکن ابھی نہیں۔ تم فی الحال تماشا دیکھو، لگتا ہے سے جی کوہارا کی موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہوئی ہے۔"

پھر ہم نے دیکھا کہ کوہارا اور ہیگرڈ کے درمیان کسی بات پر بحث ہونے لگی۔ کوہارا نے کسی بات پر طیش میں آ کے اسے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ ہیگرڈ ریت پر گر پڑا۔ ڈرائیونگ کیبن سے بروز غصے میں چیختا ہوا برآمد ہوا۔ میری تھکی ہوئی نظریں ان پر جم گئی تھیں، کچھ ایسا لگتا تھا کہ کسی بات پر ان کی آپس میں ٹھن چکی ہے۔

بروز کے ہاتھ میں بھی اب پستول نظر آ رہا تھا۔ لیکن وہ جیسے ہی دروازہ کھول کر نیچے اترا کوہارا کے ایک مسلح ساتھی نے اس پر برسٹ فائر کر دیا۔ بروز وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اس کھلی بربریت پر یاسمین کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ سی خارج ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس پر پھر کوہارا کی دہشت طاری ہونے لگی تھی۔

بروز کے گرتے ہی اندر بیٹھی لڑکی لینا کی ہسٹریائی چیخ ابھری اور پھر میں نے اسے دوسری طرف کا دروازہ کھول ٹرک سے چھلانگ لگاتے دیکھا، وہ ریت پر گری اور پھر چیختی چلاتی صحرا کی وسعتوں کی جانب دوڑی۔ لیکن کوہارا کے ایک ساتھی نے دوڑ کر اس کا پیچھا کیا اور اسے کسی ہرنی کی طرح دبوچ کر لے آیا۔

ہیگرڈ اپنے ساتھیوں کا انجام دیکھ کر اسی طرح ریت پر پڑا رہ گیا تھا۔ وہ شاید خوف زدہ ہو گیا تھا اور حتمی طور پر اسے بھی اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ پھر کوہارا کی دہاڑ سنائی دی۔

اس نے اپنے ساتھیوں سے دوبارہ تحکمانہ کچھ کہا تھا۔ اس کے تین ساتھی متحرک تھے۔ اسی طرف لپکے جہاں میں اور یاسمین چھپے بیٹھے تھے۔

"ہوشیار.....!" میں نے یاسمین سے سرسراتی سرگوشی کی اور پھر اسے وہیں محبوس رہنے کی تاکید کر کے اپنی جگہ بدلنے لگا تو اچانک یاسمین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"شش..... شہزی! اپنا خیال رکھنا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور دھیرے سے ہاتھ چھڑا کر ایک طرف کو لپکا۔

میں پہلے والے جھنڈ کے دائیں جانب کی خودرو جھاڑیوں کی آڑ میں چلا گیا تھا اور اب کہنیوں اور سینے کے بل پر تھا۔ کوہارا کے تینوں ساتھی قریب آتے ہی اپنا درمیانی فاصلہ بڑھانے لگے۔

ان کی چالاکی پر میں اندر ہی اندر تلملا گیا۔ اس طرح اگر میں ایک پر قابو پا بھی لیتا تو باقی دونوں کا ہدف مجھے ہی بننا پڑتا، ایسا نہ کرتا تو وہ یاسمین تک پہنچ جاتے۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ صورتِ حال خاصی مخدوش ہو چکی تھی، یہ بدبخت سے جی کوہارا ایک بار پھر ملک الموت کی طرح ہمارے سر پر مسلط ہو گیا تھا۔

تب ہی اچانک میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال ابھرا۔ وہ تینوں لحظہ بہ لحظہ قریب آتے جا رہے تھے۔

ٹرک کی طرف اب کوہارا اور اس کا ایک ساتھی کھڑا تھا۔ اس نے ابھی تک لینا کو دبوچ رکھا تھا اور وہ دونوں اسی طرف ہی تکے جا رہے تھے۔

میں نے دائیں بائیں دیکھا، سیدھے ہاتھ کی جگہ پر سطح زمین کچھ ابھری ہوئی تھی، میں نے ایک چیخ ماری اور پل کے پل اپنی جگہ چھوڑ کر اسی طرف کو رینگ گیا۔

توقع کے عین مطابق تینوں بُری طرح ٹھٹک کر اسی طرف کو متوجہ ہوئے، ایک نے تو برسٹ بھی فائر کر دیا۔ تاہم اب یوں ہوا کہ وہ یاسمین کی طرف جانے والی کمین گاہ سے

www.Paki ooks.Site

ہٹ کر الجھاؤ کا شکار ہوگئے اور مزید قریب آگئے۔

میں کسی چوکنا چیتے کی طرح اپنی جگہ سے اچھلا اور ایک پر جا پڑا اور دوسرے کے لیے میں نے لات چلا دی۔

تیسرا سنبھلا اور گن کا رخ میری جانب کرتے ہی لمحہ کی بھی دیر لگائے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ جس کی مجھے عین توقع تھی اسی سبب میں نے اپنے پہلے والے شکار کو دبوچ رکھا تھا اور خود ایک دم ہٹ کر اسے گولیوں کی بھیانک باڑھ کے سامنے کر دیا۔

اس کا جسم چھلنی ہوگیا، اس کی گن پر قبضہ میری اولین ترجیح تھی...... میں نے دوسری جانب تڑپ کر جگہ بدلتے ہی مخصوص پوزیشن میں آکر اس پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ چیختا ہوا ریت پر گرا اور دوسرے ساتھی...... نے لیٹے لیٹے مجھ پر برسٹ فائر کر دیا۔

میں اس سے لمحہ بھر پہلے ہی بجلی کی طرح تڑپ کر اپنی جگہ چھوڑ کر قریب ایک جڑواں تنوں والے درخت کی آڑ میں ہوگیا جسے میں پہلے ہی نظروں میں لیے ہوئے تھا۔

گولیوں کی بوچھاڑ درخت کے جڑواں تنے پر پڑی اور...... "پھٹ...... پٹ ... تڑتا...... تڑٹ...... پٹا......
چٹ، چٹ......" کی عجیب آوازیں ابھریں۔

آڑ میسر آتے ہی میں نے اس پر فائر کھول دیا۔

میں اپنی بروقت حکمت عملی سے ان تینوں کو جہنم واصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کوہارا کے ایک دم سے تین مسلح ساتھیوں کو ڈھیر کرنے کے بعد...... میرے حوصلے فزوں تر ہو گئے تھے اور میں نے اب کوہارا سے حساب بے باق کرنے کا پکا تہیہ کر لیا تھا۔

اچانک میری نگاہ تیسرے شکار کی ریت میں لتھڑی لاش پر پڑی اور میں بری طرح چونک پڑا۔

وہ چونکہ ہماری "کمین گاہ" کے قریب تھا، اسی لیے یاسمین نے ہمت دکھائی اور رینگتی ہوئی اس کی جانب بڑھ کر اس کی گن پر قبضہ جما لیا تھا۔

میں نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے مسکراتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی کے طور پر انگوٹھا دکھایا اور واپس پلٹ جانے کا بھی اشارہ کر دیا۔

اب میں سامنے جھیل کی طرف کوہارا کو اپنے سر کے بال نوچتے دیکھ رہا تھا۔

وہ اس تڑابڑی کے دوران لنگڑاتا ہوا تھوڑا آگے بڑھ آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے تینوں ساتھیوں کو میں ایک مربوط حکمت عملی سے پل کے پل موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔

وہ ابھی میرے نشانے پر نہیں تھا اور میں اس کے قریب آنے کا بے چینی سے منتظر...... کہ اچانک اسے کیا ہوا کہ وہ واپس پلٹا اور لنگڑاتا ہوا اپنی جیپ کی طرف بڑھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے جیپ کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہوگئی۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے ہیگرڈ کو غائب پایا۔ وہ شاید موقع پاتے ہی ٹرک کے نیچے کہیں رینگ گیا تھا۔ وہ اب کیا گل کھلا سکتا تھا، یہ وقت بتاتا، میں اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر رینگتا ہوا دوبارہ یاسمین کے قریب آ گیا۔

"کوہارا خود۔ اپنی موت کو دعوت دینے کے لیے آ رہا ہے۔" میں نے اس کے قریب آکر ہانپتی ہوئی سرسراتی سرگوشی کی۔

جیپ اسٹارٹ ہوتے ہی ہماری کمین گاہ کی طرف بڑھی۔ لیکن پھر دوسرے ہی لمحے آگے بڑھتی ہوئی جیپ ایک دم رک گئی۔ میری پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

اگلا لمحہ میرے لیے چونکا دینے والا ہی نہیں بلکہ حیران کن بھی ثابت ہوا۔ جیپ اب تیزی سے ریورس ہونے لگی اور دوبارہ اپنی جگہ پر پہنچ کر رک گئی۔

میری پھٹی پھٹی آنکھیں ملعون کوہارا کی اس نئی چال پر نگاہ رکھے ہوئے تھی کہ اس نے جیپ کے اندر بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھی سے بھی کچھ کہا تھا۔

اس نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور دوسری جیپ کی طرف بڑھ گیا اور پھر جب تک میں کوہارا کی اس بزدلانہ حرکت کا مقصد سمجھتا۔ وہ دونوں تیز رفتاری سے جیپ ریورس کرتے ہوئے رکے اور پھر واپسی کے لیے روانہ ہوگئے۔

"شٹ۔" میرے منہ سے شکست خوردہ انداز میں برآمد ہوا۔

"اوہو...... شہزی! یو آر گریٹ! تم نے اتنے بڑے اور خطرناک دشمن کو دُم دبا کے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔" یاسمین خوشی بولی۔

"ہرگز نہیں، مجھ سے بھیانک غلطی ہوگئی۔" میں نے گویا ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "وہ ذلیل سمجھ چکا تھا کہ اس کے ساتھیوں کے ہتھیاروں پر میں قبضہ جما چکا ہوں، نیز وہ خود بھی صرف اپنا ایک ساتھی بچا سکا تھا۔"

یاسمین میری بات کا مطلب سمجھ کے خاموش ہوگئی۔

"کاش! میں اس کی چالاکی سمجھ جاتا اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے کے بجائے اس پر ہلا بول دیتا۔"

"شہزی! اگر یہ بات ہے تو مجھے نہیں لگتا کہ کوہارا اس طرح واپس لوٹ سکتا ہے۔" اچانک یاسمین نے کچھ سوچتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا اتنا بڑا دشمن جس نے اپنے اتنے اہم مقصد کے لیے اس قدر خون خرابا کیا اور اپنی جان بھی کئی بار خطرات میں ڈالی، وہ یوں بے نیل مرام واپس پلٹ جائے گا؟"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کوہارا اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا کہاں ہے۔ وہ دور کہیں چھپ کر کوئی جال بچھانے کی کوشش ضرور کرے گا...... میں اس سلسلے میں محتاط ہوں، آؤ اب ذرا اُدھر کی خبر لیتے ہیں۔"

ہم دونوں چلتے ہوئے ٹرک کے قریب آگئے۔ مجھے حیرت تھی کہ ہیگرڈ ہنوز غائب تھا جبکہ اینا خوف و دہشت کے مارے ڈرائیونگ کیبن میں جا سوار ہوئی تھی اور اس نے دروازے بند کر کے لاک کر دیے تھے۔

وہ شاید ہم سے بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔ ہمارے ہاتھوں میں اب ہتھیار بھی تھے، شاید اسی لیے بھی وہ ڈری ہوئی تھی ہم سے...... اس نے کھڑکی کے شیشے بھی چڑھا دیے تھے اور بدستور ہسٹریائی انداز میں رو رہی اور چیخے بھی جا رہی تھی۔

"بے وقوف لڑکی! دروازہ کھولو۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر ہیگرڈ کہاں ہے؟" میں نے چلا کر اس سے کہا۔ مگر وہ تو ہانی۔ اس پر دورہ پڑا ہوا تھا۔ اپنے ساتھی بروز...... کا حشر دیکھ کر شاید اس کا ذہنی توازن بگڑنے لگا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور پائدان پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھا تو مجھے دوسری طرف کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ میں جلدی سے اتر کر دوسری طرف کے دروازے کے پائدان پر پاؤں رکھ کر چڑھ گیا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول دیا۔ اینا نے اور زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

میں نے غصے سے دانت پیس کر اس کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ خود میرا اپنا دماغ خراب ہو رہا تھا اور یہ فضول کی چیخم دھاڑ مچا کر مزید خراب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

یاسمین بھی اندر آگئی اور میں نے یاسمین سے کہا کہ وہ اسے سنبھالے اور سمجھائے تب تک میں ٹرک کی خرابی دیکھ لوں۔ یاسمین، اینا کو پچکارنے لگی اور اسے اپنے سے لگا کر دلاسا اور حوصلہ دینے لگی۔

میں نیچے اتر آیا۔ ایک نظر اطراف میں ڈالی پھر اریب قریب میں دیکھا۔ ہیگرڈ مجھے پھر بھی نظر نہ آیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کم بخت کہاں چلا گیا تھا؟ کیا اتنا ہی خوف زدہ ہوگیا تھا کہ موقع ملتے ہی پیدل ہی تپتے صحرا میں نکل گیا تھا؟

میں...... بونٹ کی طرف آیا جو ہنوز کھلا ہوا تھا۔ اس پر جھک کر میں اس کی خرابی تلاشنے لگا۔ اسٹارٹنگ وائر کا کلپ اسپارک کر رہا تھا وہ ڈھیلا تھا۔

میں نے وہ نکال کر کلپ پھینک دیا اور تار دوبارہ دانتوں سے چھیل کر ڈائریکٹ پاور کنکشن...... ملا دیا اور وہیں سے چلا کر یاسمین کو کہا کہ وہ ٹرک اسٹارٹ کرے۔

اینا اب پُرسکون ہوگئی تھی۔ یاسمین نے شاید اسے کچھ سمجھا دیا تھا۔ تاہم ڈری ہوئی اب بھی نظر آتی تھی۔

یاسمین نے اگنیشن سوئچ میں لگی چابی گھمائی۔ ٹرک کا انجن دو ایک بار غرایا اور پھر اسٹارٹ ہوگیا۔ میں نے جلدی سے بونٹ بند کیا اور آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

پرانی وضع کا ٹرک تھا۔ جس کی گیئر اسٹک کچھ زیادہ ہی لمبی اور لچکیلی تھی۔ اسے آگے پیچھے گھما کر گیئرز کا اندازہ کیا اور ہلکی ریس دیا کر کلچ چھوڑا تو ٹرک نے ایک جھٹکا کھایا پھر کھانسا اور انجن بند ہوگیا۔ میں نے دوبارہ اسٹارٹ کیا اور اس بار سکون کے ساتھ پیش آیا اور ٹرک آگے بڑھ گیا۔

"ست...... تم لوگ کہاں لے جا رہے ہو مجھے...... ؟" اینا نے ڈرے سہمے لہجے میں کہا۔ وہ میرے اور یاسمین کے بیچ میں بیٹھی تھی۔

"تم اب خاموش بیٹھی رہو لڑکی!" میں نے اسے جھڑک دیا۔ میں پہلے ہی اس پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اگر یہ ہماری پہلے ہی مدد کر دیتے تو حالات یہاں تک خراب نہ ہوتے۔

یاسمین نے مجھے تنبیہی انداز میں کہا۔ "شہزی...... اس لڑکی سے اس طرح بات نہ کرو، یہ بھی ہماری طرح غیر ملکی سہی لیکن یہاں یہ ایک کمپنی کی ملازم ہے۔ ہمارے لیے قانونی پیچیدگی...... کھڑی کر سکتی ہے۔ کیونکہ یہ کہہ رہی ہے کہ وہ دشمن تمہارے تھے، لیکن انہوں نے اس کے ساتھی بروز کو مار ڈالا۔"

یاسمین نے اردو میں بات کی تھی جسے وہ جرمن لڑکی نہ سمجھ سکی۔ میں نے ونڈ اسکرین پر نظریں جمائے رکھی تھیں۔ ٹرک کا انجن غراتا زیادہ رہا تھا مگر دوڑ کم رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ ریت پر اس کے ٹائر دھنسے جا رہے تھے۔ کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا۔

www.Paki oks.Site

تب میں نے پُرسکون انداز اور نرم لہجے میں اینا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو اینا! یہ لوگ صحرائی لٹیرے تھے۔ ہم انہیں جانتے ہیں۔ لیکن تمہارے ساتھی ہیکرز نے پتا نہیں ان سے کیا کہا اور وہ ہماری تلاش میں اس طرف نکل آئے۔''

اینا اتنی بے وقوف نہیں تھی جتنا کہ میں سمجھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک تشویش اور شک کے آثار نمایاں تھے۔ تاہم ہمت کر کے بولی۔

''تم نے ان کے تینوں ساتھیوں کو کیسے اتنی آسانی سے مار ڈالا؟ یہ لوگ پروفیشنل کلرز نظر آتے تھے۔ ورنہ میرے ساتھی بروز کو اس بیدردی سے کیوں ہلاک کرتے، پتا نہیں اب ہیکرز کہاں ہے؟''

''تم جو کچھ سمجھو، لیکن اس وقت خاموش رہو۔'' بالآخر میں نے جھلا کر کہا۔ ''لیکن ...... خبردار! اپنی زبان بند رکھنا۔ یہ لوگ واقعی ایک بڑے گینگ سے تعلق رکھتے ہیں اور ہماری ان سے دشمنی ہے۔ لیکن ... تم نے اگر اپنی زبان کہیں بھی کھولی تو ان کے عتاب کا شکار ہو جاؤ گی اور ہم بھی تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

میری دھمکی پر اس نے فوراً جیسے اپنے ہونٹ سی لیے۔ یاسمین مجھے دیکھنے لگی۔ اس نے اب مجھے متنبہ کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

میں ٹرک چلانے کے دوران اردگرد بھی نظریں دوڑا رہا تھا۔ یاسمین کو بھی میں نے یہی تاکید کر دی تھی۔

ریت پر مجھے جیپوں کے ٹائروں کے نشانات نظر آئے۔ میں نے ٹرک روک دیا۔ میرے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمے ہوئے تھے، وہیں سے میں نے انگلی سے ونڈ اسکرین کی طرف اشارہ کیا اور یاسمین سے پوچھا۔

''کیا تم بتا سکتی ہو کہ...... یہ لوگ کہاں گئے ہوں گے؟ یہ راستہ کس طرف جا رہا ہے؟''

یاسمین نے سیٹ سے تھوڑا اچک کر ونڈ اسکرین سے پار سامنے ریت پر پڑے کوہار اور اس کے ساتھی کی جیپوں کے ٹائروں کے نشانات دیکھے، اس کے بعد نقشہ نکال لیا، وہ تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بولی۔

''یہ راستہ کسی آبادی کی طرف تو نہیں جاتا ہے لیکن ٹھیک طرح سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آگے کہیں نکل گئے ہوں گے، ایک بڑا چکر کاٹ کر یہ لوگ ابیریا کرتک پہنچ سکتے ہیں۔''

''یہ راستہ ایکسپلوریشن کالونی تک جاتا ہے جو یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔'' اچانک اینا بولی۔ میں اور یاسمین اب انگریزی میں ہی باتیں کر رہے تھے اسی لیے وہ بولی۔

''کیا مطلب؟؟ یہاں کوئی آبادی بھی ہے؟ کتنی دور ہے؟'' میں نے اینا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کوئی باقاعدہ آبادی نہیں ہے۔ ہم ادھر ہی رہتے ہیں۔ وہاں مصری اور جرمن آئل کمپنی کا ایک مشترکہ پراجیکٹ ہے، وہاں کے ورکرز اور آفیسرز کی عارضی رہائش کے لیے کالونی سی بنا دی گئی ہے، پلیز تم لوگ مجھے وہاں پہنچا دو۔'' اس نے آخر میں ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور یاسمین سے رہنمائی لے کر موڑ کاٹا پھر راستہ بدل کر اپنی منزل کی جانب گامزن ہو گئے۔

البتہ میں نے بعد میں اینا کو تسلی دی تھی کہ اگر وہ ڈرائیونگ جانتی ہے تو ہمیں اپنی منزل اتارنے کے بعد وہ اپنی راہ لے سکتی ہے۔

وہ چپ ہو گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ ٹینکر نصف حد تک آئل سے بھرا ہوا ہے۔ وہ اسے ان لوڈ کرنے کی غرض سے ابیری لے جا رہے تھے۔

ٹرک مقدور بھر رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میری نظریں سامنے ونڈ اسکرین کے پار ریت کے سمندر پر جمی ہوئی تھیں۔ نقشے میں جو نشان ہمیں سمجھ میں نہیں آیا تھا، وہ مقام قریب آنے والا تھا۔ ریت کے ٹیلے جابجا بکھرے نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں خشک پہاڑیاں بھی نظر آتی تھیں۔ اچانک میں چونکا۔

مجھے تھوڑی دور کوئی شے دکھائی دی تھی۔

''یاسمین! تم دیکھ رہی ہو؟ کیا ہے یہ؟'' میں نے یاسمین کو متوجہ کرنے کی غرض سے کہا۔ وہ آگے جھک کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔

''کوئی چیز الٹی پڑی نظر آتی ہے۔'' یاسمین نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

''ہاں! ایسا ہی ہے، کوئی گاڑی الٹی پڑی ہے۔ مجھے یہ دشمن کی جیپ لگتی ہے۔'' میں نے کہا اور پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''محتاط رہنا شہزی! کہیں یہاں لوگوں کی کوئی چالاکی نہ ہو؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو، میرے ذہن میں بھی یہی خیال ابھرا تھا، بےفکر رہو میں محتاط ہوں۔'' میں نے جواب دیا اور ٹرک کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے یاسمین کو گن پر گرفت رکھنے کی ہدایت بھی کر ڈالی۔ اینا ایک بار پھر سہم گئی۔ لیکن بولی کچھ

دلفریب کہانیوں اور دلنشین سلسلوں سے مرصع ستمبر 2018 کا دل خوش کن شمارہ......

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

شیریں حیدر، رفعت سراج، حیا بخاری کی دلکش سلسلے وار کہانیاں

دردانہ نوشین خان کے زریں خیالات کا مظہر
ایک یادگار متاثر کن منی ناول صفہ کی نئی قسط

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُربصیرت مضمون

حمیدالاضحیٰ کی مناسبت سے نزہت جبین ضیا کا مکمل ناول دل کی بساط پر

شمع ہدایت کے سلسلے میں اختر شجاعت کی تحریر
سخاوت نامور اسکالرز و علمائے دین کی مستند کتابوں سے لی گئی تحقیق کا نچوڑ

پاکیزہ کے مہمان میں ملاقات کیجیے
ماضی و حال کے نامور اداکار فہمید احمد خان،
بیگم فہمید احمد سے...

اسما قادری، ناہید فاطمہ حسنین، نفیسہ سعید کے مشاق قلم کے کرشمے

اس کے علاوہ

پڑھیے ہماری سینئر اور جونیئر رائٹرز کی پُرلطف و دلچسپ تحریریں جن میں ڈاکٹر زاہدہ پروین، سلمیٰ غزل، نظیر فاطمہ، منعم ملک و دیگر شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

www.PakiBooks.Site

نہیں۔

میں اسی سمت نظریں جمائے ٹرک دوڑاتا ہوا قریب پہنچا تو مجھے اس کی قدرے عمودی سمت کے پار ایک اور جیپ بھی کھڑی نظر آگئی۔ میرا دل کنپٹیوں پر دھڑکنے لگا اور اعصاب یک دم تن گئے۔

یہ دونوں گاڑیاں کوہارا اور اس کے آخری بچے ہوئے ساتھی کی تھیں۔ ایک تو الٹی پڑی تھی، جبکہ دوسری ذرا فاصلے پر اپنے پہیوں پر کھڑی تھی لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ دونوں جیپیں خالی تھیں۔

میں نے دیکھا یاسمین ٹرک سے اتر کر ریت پر جھکی کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی، پھر دوڑتی ہوئی میرے قریب آگئی اور اردگرد ہراساں سی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مجھ سے سراسیمہ لہجے میں بولی تو اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔

"شش... شہزی.....! وہ لوگ ادھر ہی کہیں موجود......" ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ برسٹ چلنے کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ میرے پیروں کے بالکل قریب ریت کے بادل اُڑے...... میں ایک دم اچھلا اسالٹ انداز کی بیک جمپ لی۔ دوسری بار مجھے گولیوں کے برسٹ چلنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ ہی ایک کربناک انسانی چیخ ابھری۔

میں اپنی جگہ گر کے سنبھلا تو دیکھا یاسمین پوزیشن لیے گن کا رخ ایک طرف کو کیے ہوئے تھی۔ دوسرا برسٹ اس نے داغا تھا، اس نے بروقت ذہانت اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی جانب جوابی برسٹ داغا تھا جہاں سے مجھے دشمن نے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی، زندگی تھی میری جو بچ گیا تھا میں...... یا پھر شاید مجھے زخمی کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ کوہارا کو یاسمین نے دھمکی دے ڈالی تھی کہ اگر مجھے کچھ ہوا تو وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرے گی۔ باقی کا کھیل وہی تھا، یعنی جو جیتا وہی سکندر......

گن میرے ہاتھوں میں دبی ہوئی تھی۔ یاسمین گن سنبھالے اس طرف کو دوڑی۔ میں نے گردشی نظروں سے اطراف میں دیکھا اور یاسمین کو کور دیا۔

میں الٹی پڑی جیپ کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ اچانک ایک اور برسٹ فائر ہوا اور میں نے ٹرک کو آگ کے کسی گولے کی طرح اڑتے دیکھا۔ تیز سرخی مائل آگ نے ٹرک کو آناً فاناً اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس میں موجود آئل نے آگ پکڑ لی تھی۔

دشمن کی اس بربریت پر میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس کے اندر اپنا جیبی تھی۔ جو اب ظاہر ہے جل کر بھسم ہوچکی ہوگی۔

میں نے غیظ و غضب کے عالم میں اپنے دانت اس قدر زور سے بھینچ لیے کہ جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ یہ کوہارا کی ہی ظالمانہ حرکت ہوسکتی تھی۔ کیونکہ اب وہ ہی اکیلا بچا تھا۔

میں نے پل کے پل گولیوں کی بوچھاڑ کی سمت کا تعین کیا اور ابھی اس سمت دوڑا ہی تھا کہ مجھے یاسمین کی گھٹی گھٹی چیخ کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک گیا اور پھر اسی سمت بڑھا۔

جلد ہی مجھے ایک بھیانک منظر دکھا۔ کوہارا نے یاسمین کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے یاسمین کو دبوچ رکھا تھا۔ ایک مائنگل اس کے کندھے پر جھول رہی تھی۔ یقیناً اس خبیث نے اسی گن سے ٹرک کے آئل سے بھرے ٹینکر پر برسٹ فائر کیا تھا۔

"بس شہزی! اپنا کھیل روک دو......" کوہارا دہاڑ کر بولا۔ یاسمین کو اس نے اپنے ایک بازو سے دبوچ رکھا تھا اور آہستہ آہستہ جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یاسمین خود کو اس مردود کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کوہارا...! کھیل تمہارا ختم ہوچکا ہے۔ وہیں رک جاؤ۔" میں نے غضب آلود لہجے میں اس کی طرف گھور کر کہا۔

جواب میں اس خبیث نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے مجھ پر گولی داغ دی۔

اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھی۔ گولی نے میرے بائیں بازو کو چھید ڈالا۔ میرے حلق سے کراہ خارج ہوگئی اور گن ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ یاسمین نے چیخ ماری۔ میں گن اٹھانے کے لیے جھکا مگر کوہارا نے دوسرا فائر جھونک دیا۔ دوسری گولی...... میری پنڈلی میں پیوست ہوگئی اور میں گر پڑا۔

یاسمین ہذیانی انداز میں چیخنے لگی اور اس نے مجھے پے در پے زخمی ہوتا دیکھا تو اس پر جنون سوار ہوگیا۔ اس نے اپنی جان کی پروا کیے بغیر کہ وہ اس وقت کوہارا جیسے خونی درندے کے قبضے میں تھی...... اسے ہاتھوں اور مکوں سے پیٹنے لگی۔ کوہارا نے گرج کر اس کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کردیا۔

"کتیا! اب اگر تو نے کوئی حرکت کی تو میں ادھر ہی تیرے یار کے سامنے تجھے ذلیل کرڈالوں گا۔"

"ت... ت...... تم نے شہزی پر گولی کیوں چلائی......؟ بے شک مار ڈالو مجھے...... اب...... کوئی پروا نہیں مجھے اپنی زندگی کی۔" وہ جنونانہ لہجے میں کوہارا سے بولی۔ "تم

www.PakiBooks.Site

ے میرے منگیتر کو ہلاک کیا، میرا باپ تمہاری وجہ سے اپنی
ان سے گیا اور اب...... شہزی...... ہرگز نہیں...... تم کچھ بھی کر
ے ساتھ...... وہ زبردست ہونے کے باوجود کوہارا
ے درندے کو للکارنے لگی تھی۔ یاسمین کا یہ روپ میرے لیے
نیا نہیں رہا تھا۔ جہاں مجھے خطرے میں پاتی وہ دیوانہ وار
طرح کی حرکت کرڈالتی تھی۔

میں زخمی ریت پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ میرے بازو اور
نگ سے خون بہے جا رہا تھا اور مجھ پر نقاہت سی طاری ہونے
ی تھی۔ گن مجھ سے اب بھی تھوڑے فاصلے پر پڑی تھی۔
ہارا اس کی بات پر تھوڑا اچھلا۔

"کتیا......! ہوش کر...... تیرے یار شہزی کو میں نے
ب کرنا ہوتا تو پہلی ہی گولی اس کے بھیجے میں اتارتا۔ اب
کی وہ میرے نشانے پر ہے۔" کوہارا تنفر آلود لہجے میں بولا۔
"لیکن تو نے اب بھی ہٹ دھرمی دکھائی تو میں اسے زندہ نہیں
چھوڑوں گا اور تجھے بھی مار ڈالوں گا۔ میری طرف سے اب تم
دونوں جہنم میں جاؤ۔" کوہارا نے بھی جیسے فیصلہ کن لہجے میں
ہا۔

شاید پروفیسر جمشید کی ہلاکت کا سن کر وہ بھی اپنی مہم سے بددل ہو رہا تھا یا پھر یہ اس کا نفسیاتی حربہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کوہارا ایک ذرا توقف کے بعد دوبارہ غیر یقینی انداز میں یاسمین سے بولا۔

"کیا...... وہ بڈھا مر گیا؟ مگر کیسے؟" یاسمین نے مختصراً اسے بتایا۔

میری ڈوبتی ہوئی سماعتوں میں دوبارہ کوہارا کی غراتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ "تب پھر تو بھی میرے کام کی نہیں رہی...... لگتا ہے تم دونوں رومیو جیولیٹ کی موت میرے ہی ہاتھوں اس صحرا میں لکھی تھی۔"

بڑی سفاکی سے یہ کہتے ہوئے اس نے یاسمین کو ایک طرف دھکا دیا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یاسمین شاید حد درجہ مایوسی کا شکار تھی، اس کی وجہ شاید اس پر پے در پے غموں کا ٹوٹتا پہاڑ تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں چونکا۔ یاسمین چلا کر کوہارا سے بولی۔ "تم اگر شہزی کی جان چھوڑ دو تو میں تمہیں اس گمشدہ مقبرے تک لے جاسکتی ہوں۔"

کوہارا کا پستول والا ہاتھ نیچے ہوا۔ اس کے چہرے پر مسرتوں کی چمک ابھری مگر وہ اپنی بھویں سکیڑ کر غیر یقینی سے لہجے میں بولا۔ "یہ تم کیسے کرسکتی ہو؟ اس کا راستہ تو صرف تمہارے بڈھے باپ کو معلوم تھا؟"

"انہوں نے مجھے ایک نقشہ بنا کر سمجھا دیا تھا۔ میں اور شہزی......"

"بس...... یاسمین! اس سے آگے اس خبیث کو کچھ نہ بتانا......" میں بمشکل بہ آواز بلند بولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یاسمین اسے یہ بتاتی کہ میں اب خود بھی اس گمشدہ مقبرے کی تلاش میں دلچسپی رکھتا تھا۔

یاسمین ایک دم چپ ہوگئی۔ کوہارا کی توجہ صرف اپنے حصولِ مقصد پر تھی۔ اسی سبب وہ میرا اشارہ نہ سمجھ سکا اور فوراً یاسمین کو وہ نقشہ دکھانے کا حکم دیا۔

یاسمین نے وہ نقشہ اپنی کمر سے بندھے پاؤچ سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ کوہارا پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ نقشہ غور سے دیکھنے لگا۔

اس دوران میں یاسمین میری طرف دوڑی چلی آئی۔ کوہارا نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں اسے اپنی طرف بلایا۔

"اس کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ اس کی مدد کرو پلیز......!" یاسمین نے کوہارا کو دہائی دی۔

"یہ بہت سخت مٹی کا بنا ہوا ہے...... اتنی آسانی مرنے والا نہیں ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا یہ نقشہ اصلی ہے اور تم اسے سمجھ سکتی ہو؟"

"ہاں! میرے پاپا نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا لیکن شہزی کی جان بخشی کے بغیر میں یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔"

"بڑا پکا یارانہ ہے تم دونوں کے بیچ۔" وہ خباثت سے مسکرا کر بولا۔ "لیکن میں جانتا ہوں تمہیں اس کی وفاداری سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ایرانی شہزادی بلکہ بے وقوف شہزادی...... یہ کسی اور کو دل دیے ہوئے ہے۔"

"اس کی اصل محبت اس وقت کوکوران کے جیل خانے کی ایک تنگ و تاریک اور سیلن زدہ کوٹھری میں اس بے چارے کے انتظار میں اپنی زندگی کی سانسیں گن رہی ہے۔"

عابدہ کے متعلق سے بھی کوہارا کے ان الفاظ نے میرے اندر یکایک کرب و درد کی ایک لہر سرایت کروا دی، جس نے میرے پورے وجود کو بھیر بھیر کر ڈالا۔ میں گہری گہری سانسیں لیے گرم ریت پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ شام دھیرے دھیرے تاریکی میں بدل رہی تھی مگر دن بھر سورج کی تپش میں تپتی ریت ہنوز گرم تھی۔

"میں سب جانتی ہوں کوہارا......!" اچانک یاسمین نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "شہزی سے میری ذاتی دلچسپی کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایک عظیم انسان ہے، اپنے اندر ہے،

انسانوں کا درد رکھنے والا ہے۔ اپنی محبت میں سچا اور دلیر ہے۔ صرف اپنی محبت کے سبب ہی تو اس نے تم سب کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔" کوہارا سے یہ سب کہتے ہوئے یاسمین کا چہرہ جذبات کے سبب سرخ ہو رہا تھا۔

"اوہو... تو یہ بات ہے۔" کوہارا کمینے پن سے ہنس کر بولا۔ "ہاہا... ہاہا... سب سمجھتا ہوں چالاک شہزادی! تو اچھی طرح جانتی ہے کہ عابدہ کا حصول شہزی کے لیے ناممکنات میں سے ہے اور تو اس کی خالی جگہ پُر کرنے کی خواہش اور انتظار میں ہے۔"

میں نے دیکھا کوہارا کی اس بکواس پر یاسمین کا چہرہ پہلے تو سرخ ہوا، اس کے بعد وہ جوشِ غیظ سے تمتمانے لگا۔

"ایسی گھٹیا سوچ اور کمینگی کی باتیں تمہارے جیسا بے ہودہ آدمی ہی سوچ سکتا ہے جس کی نظروں کے سامنے انسانی خون کی کوئی وقعت ہی نہیں، وہ یہ باتیں کیا سمجھے گا؟"

کوہارا بڑی مکاری سے یاسمین کا دماغ میری طرف سے برین واش کر رہا تھا۔ مگر یاسمین کے جواب نے اس کی مکاری کا پول کھول دیا، چنانچہ وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے تحکمانہ درشتی سے بولا۔ "چل اٹھا اپنے یار کو اور جیپ میں لے جا کر ڈال دے، ہم اسی وقت اپنی منزل کی طرف روانہ ہوں گے۔"

یاسمین نے میرے زخموں کا جائزہ لیا۔ بازو میں لگنے والی گولی "چھاؤ" ہو کر نکل گئی تھی، البتہ پنڈلی والی گولی ابھی اندر ہی تھی۔ یاسمین کے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے تھے، لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اب مجھ سے نگاہیں چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوہارا کی فضول گوئی نے شاید اس کے اندر کی عورت کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔

"یاسمین! تم اس کتے کی باتوں کو دل پر مت لو، پلیز!" میں نے اس کی نسائیت کا بھرم رکھنے کی غرض سے کہا۔ "میں اچھی طرح جانتا ہوں اور تم بھی... کہ یہ خبیث کس مقصد کے لیے ہمارے بیچ جان بوجھ کر ایسی گفتگو کر رہا ہے۔ اس کمینے سے ہر قسم کی کمینگی کی توقع رکھی جا سکتی ہے، تم بس میرے زخموں پر کوئی پٹی باندھنے کی کوشش کرو... تاکہ خون بہنا کم سے کم ہو۔"

میری بات نے یاسمین کو ایک دم حوصلہ عطا کیا تھا۔ وہ کوہارا کے حکم کی پروا کیے بغیر مجھے سہارا دے کر اٹھانے لگی اور میں لنگڑاتا ہوا اس کے ساتھ جیپ کی طرف بڑھا۔ دوسری الٹی پڑی جیپ اس سے ذرا ہی فاصلے پر تھی، لیکن یہ دیکھ کر میری سمجھ میں اب تک یہ بات نہ آ سکی تھی کہ آیا کوہارا اور اس کا اصل جہنم ساتھی یہاں ہماری گھات میں ہی بیٹھے تھے تو پھر ان کی ایک جیپ کیسے الٹی پڑی تھی؟ یا پھر ممکن تھا کسی وجہ سے یہ الٹ پڑی ہو اور انہوں نے سوچا ہو کہ ادھر ہی ڈیرا ڈال لیا جائے۔

یاسمین مجھے کوہارا کے قریب سے لے کر جیپ تک آئی اور اندر عقبی سیٹ پر بٹھا دیا۔ میں نے کوہارا کے قریب سے گزرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کسی سوچ سے زیادہ مخمصے کا شکار تھا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اسے اب ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟

یہ حالات کی عجیب انداز میں رونمائی کا ہی شاخسانہ تھا کہ کوئی بھی پروگرام طے شدہ نہیں ہو پا رہا تھا، بس حالات کا دھارا تھا اسی پر بہتے ہوئے فوری پلان اور پیش قدمی کی جا رہی تھی۔

"میری شرٹ پھاڑ کر اس کی پٹی بناؤ۔" میں نے سیٹ پر ٹکتے ہوئے یاسمین سے کہا۔ وہ اب دلجمعی سے اپنا قرض ادا کر رہی تھی اور مجھے اس سے واقعی بہت سہارا ہوا تھا۔

کوہارا... لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جیپ کے پاس آیا اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ایک نظر گردن گھما کر اس نے پیچھے مڑ کر ہماری جانب دیکھا اور یاسمین سے بولا۔

"ابوسرا اور کرناٹک کی سرحد یہ قریب ہیں۔ آبادی سے ہٹ کر منزل تک پہنچنے کا راستہ بتاؤ۔"

اس کا انداز درشت، تحکمانہ اور قدرے جھلایا ہوا تھا۔

اس پر شاید پروفیسر جمشید کی "بے وقت" موت پر چڑچڑاپن سوار تھا۔ یاسمین سے اسے کچھ زیادہ امید نظر نہیں آتی تھی۔

"اس کے زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔ پہلے اس کی پٹی کر دوں پھر راستہ بتاتی ہوں۔" یاسمین نے سنجیدگی مگر قدرے تلخی سے کہا۔ کوہارا کے پاس بے بسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

"جو کرنا ہے جلدی کرو... لیکن یاد رکھنا... مجھے اب شہزی سمیت تم دونوں سے کوئی امید نہیں رہی ہے اور جہاں میں خطرہ محسوس کروں گا، دونوں کو گولی مار دوں گا۔"

یاسمین یا میں نے اس کی تہدید کا کوئی جواب نہ دیا۔ یاسمین نے میری شرٹ... پھاڑ ڈالی تھی اور اپنا کام کرتی رہی۔ اس نے کپڑے کی لیروں سے پٹی بنا کر میرے دونوں زخموں پر باندھ دی۔ جریانِ خون کم ہوا تو وہ اس سے فارغ ہو کے کوہارا سے مخاطب ہو کر بولی۔

"پہلے اپنے کسی ٹھکانے کی طرف چلو جہاں سے شہزی کو فرسٹ ایڈ مل سکے۔"

"ہرگز نہیں!" وہ غرا کر بولا۔ "پہلے مجھے منزل تک پہنچاؤ۔"

"میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی ہوں۔" یاسمین نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "اور... اس گمشدہ مقبرے کو نقشے کے مطابق ہی تلاش کرنا پڑے گا، وہ کوئی ایسی عمارت نہیں ہے کہ دور سے ہی ہمیں بہ آسانی نظر آ جائے۔"

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا ایرانی شہزادی!" کوہارا زہرخند لہجے میں بولا۔ "یہ بات میں بھی جانتا ہوں کہ وہ ایک قدیم اور گمشدہ اہرام ہے اور شبانہ کا مقبرہ اس کے تہہ خانے میں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اپنے یار کے ساتھ کوئی چالاکی کرنا چاہتی ہو تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ شہزی کا زخمی رہنا ہی میرے مفاد میں ہے۔"

"اس بے چارے کی حالت خون بہہ بہہ کر بہت غیر ہو رہی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے یہ۔" کوہارا نے جھلا کر غصے سے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ "جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی ہوگا، اسی لیے تمہارے لیے یہی بہتر ہے جو میں کہہ رہا ہوں ویسا ہی کرو، ورنہ نقشہ میرے حوالے کر دو، میں خود اس میں سرکھپائی کر کے اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا۔"

یاسمین سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے کہا۔ "یاسمین! جیسا یہ کہہ رہا ہے ویسا ہی کرو... میں... ٹھیک ہوں۔"

"نہیں شہزی! کیا کہہ رہے ہو تم...؟ تمہاری حالت نازک ہو رہی ہے۔ تم اس حالت میں اس دشوار گزار منزل تک کیسے چلو گے؟ وہاں ہمارے ساتھ کیا بیتے تم۔"

"نقشہ میرے حوالے کر دو... فوراً، ورنہ میں گولی مار دوں گا تمہیں۔"

یاسمین نے نقشہ نکال کر اس کے حوالے کر دیا اور غصے سے دانت پیس کر بولی۔ "رکھ لو یہ... لیکن نقشہ سمجھنے کے لیے ویسا ہی تکنیکی دماغ بھی ہونا ضروری ہے۔ یہ کوئی سبق نہیں ہے جسے تم بآسانی رٹ لو گے۔ میری تو یہ چیزیں دیکھی بھالی ہیں۔ مگر تمہیں ایک عرصہ لگ جائے گا اسے سمجھنے میں۔"

یاسمین نے بڑی چالاکی سے اسے چکر دینے کی کوشش چاہی تھی۔ لیکن اس کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ نقشے کی مخصوص اصطلاحات اور زاویوں کو وہی جانچ اور سمجھ سکتا تھا جو اس پروفیشن میں رہا ہو اور یاسمین اپنے باپ اور اس کی مصریات وغیرہ کی مہمات میں ایک عرصہ ساتھ رہی تھی۔

کوہارا چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد نقشہ اس سے جھپٹ کر اپنی شرٹ کی جیب میں اڑس لیا اور جیپ کی رفتار بڑھاتا چلا گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" یاسمین نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں گہری تفکر نمایاں تھی۔

"جہنم میں۔" وہ جھلا کر بولا۔ جیپ کی رفتار وہ بڑھاتا جا رہا تھا... مگر ریت کی وجہ سے ریس زیادہ صرف ہو رہی تھی اور رفتار کا حال وہی تھا۔

میں نے یاسمین کا نرم و گداز ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جہاں ہم اس کی بات ماننے پر مجبور تھے وہاں اسے بھی ہمارے ساتھ کمپرومائز کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

جلد ہی جیپ ایک آبادی میں داخل ہو گئی۔ رات جھک آئی تھی اور مجھے اردگرد مکانوں اور عمارتوں کے ہیولے دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ بقول گزشتہ ابوسرا کا یہ علاقہ ایک قصبہ نما شہر ہی کا منظر پیش کرتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کوہارا ہمیں جس ٹھکانے کی طرف لے جا رہا ہوگا، وہاں اس کے اور ساتھی بھی نہ موجود ہوں۔

جیپ ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ یہاں زمین خشک اور سخت تھی۔ مقدور بھر سڑکیں نظر آتی تھیں ورنہ بس کچے اور بل کھاتے راستے ہی تھے۔

اس نے جیپ ایک گلی میں موڑ دی۔ ابھی وہ اس میں داخل ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس نے بریک لگائے اور جیپ کو ایک دم ریورس کر دیا اور پھر ایک طرف کو دوڑا دیا۔ میں پریشان سا ہو گیا کہ نجانے اب کیا آفت ٹوٹ پڑی ہے۔

"کیا ہوا؟" بالآخر یاسمین نے اس سے پوچھا۔

"گلی کے اندر پولیس کی گاڑی کھڑی ہے۔ اب ہم اس قصبے میں نہیں رک سکتے۔" وہ بولا۔

"لیکن... شہزی!"

"بھاڑ میں گیا تمہارا شہزی!"

"ٹھیک ہے پھر ہمیں گولی مار دو اور تم اکیلے اس مہم پر روانہ ہو جاؤ۔" یاسمین نے کہا اور میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ وہ شاید اب سے ہی کوہارا کی مجبوری کا اندازہ لگا چکی تھی۔ حالات نے اسے بھی جی دار بنا دیا تھا۔

کوہارا دانت پیس کر اندر کا غبار نکالنا چاہتا تھا لیکن بے بسی سے غرا کر رہ گیا۔

جیپ آبادی سے نکل رہی تھی اور اب درختوں اور باغات... کے درمیان ہی نیم پختہ سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

www.PakBooks.Site

''آخر بتاتے کیوں نہیں ہو، تم جا کہاں رہے ہو؟'' یاسمین نے پوچھا۔

''خاموش بیٹھی رہو بس۔'' کوہارا گرج کر بولا۔ میں نے پھر یاسمین کا ہاتھ دھیرے سے دبایا۔ کوہارا ہم پر حاوی ہونے کے باوصف جھلایا ہوا اور پریشان تھا۔

جیپ اب ویران علاقے پر رواں تھی۔ یہ سفر ایک گھنٹا جاری رہا تھا۔ اس دوران شاید میں نقاہت کے مارے بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو ایک عجیب اور جھکی جھکی چھت والے کوٹھری نما کمرے میں پایا۔ میں اس جگہ کو اپنے اندازے کے مطابق جھونپڑا کا نام دیتا اگر اس کی دیواریں مٹیالے رنگ کے پتھروں کی نہ ہوتیں۔ کمرے میں کوئی کھڑکی تو کیا کوئی روشن دان تک نہ تھا لیکن حیرت کی بات تھی کہ یہاں کسی گھٹن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

میں زمین پر... ایک کھال نما بستر پر پڑا تھا۔ کمرے میں ہلکی پیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو خشک پتھروں کی دیوار پر لرزتی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔

ہر سو گہرا سکوت طاری تھا۔ ایک عجیب سے سناٹے کا احساس ہوتا تھا، یوں جیسے وقت ٹھہر سا گیا ہو۔ چند ثانیوں کے لیے تو میرا دماغ ماؤف سا ہی رہا تھا لیکن پھر از خود ہی سارے واقعات دل و دماغ میں اپنے پورے سیاق و سباق کے ساتھ بیدار ہوتے چلے گئے اور میں جیسے ایک دم ہڑبڑا سا گیا، یوں میرے منہ سے پہلا لفظ ''یاسمین'' برآمد ہوا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تب ہی مجھے اپنے زخموں کا احساس ہوا۔ دیکھا تو ان پر باقاعدہ پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کوٹھری نما کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ کمرا بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔

میرا اوپری بدن برہنہ تھا۔ گولی دائیں ٹانگ پر دوسری بائیں بازو پر لگی تھی۔ پٹیاں بھی اسی جگہ بندھی ہوئی تھیں۔ دائیں ٹانگ کی پتلون گھٹنے سے نیچے تک کاٹ کر علیحدہ کر دی گئی تھی۔ زخموں میں سکون تھا، یعنی زیادہ درد کا احساس نہیں ہوتا تھا، نہ ہی اب کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میرے منہ کا ذائقہ بھی عجیب کڑوا اور کسیلا معلوم ہوتا تھا، لگتا ایسا تھا جیسے کسی نے دوا گھول کر نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے پلائی ہو۔

طبیعت بہرحال کافی بہتر لگ رہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں یہاں کیسے پہنچا اور میرا محسن کون تھا؟ میں تو جیپ میں تھا، جسے سے جی کوہارا چلا رہا تھا اور یاسمین میرے ساتھ سیٹ پر مجھے سنبھالے بیٹھی تھی۔

''کوئی ہے... بھائی...؟'' میں نے ذرا بلند آواز سے پکارا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے اِدھر اُدھر گردن موڑ کر دیکھا۔ اسی کمرے سے متصل ایک اور کمرے کا دروازہ بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک طاق میں چراغ روشن تھا۔ بادی النظر میں مجھے یہ کسی بستی کا کوئی چھوٹا سا مکان ہی محسوس ہوا۔

مجھے یاسمین کی فکر ستانے لگی۔ کوہارا کی طرف سے یہ تشویش بھی ہو رہی تھی کہ وہ موذی کدھر تھا؟

میں نے چارپائی سے اٹھنے کی کوشش چاہی تھی کہ اچانک مذکورہ دروازے پر کسی کا انسانی سایہ ابھرا۔ میں رک گیا پھر میں نے ایک چھریرے بدن والے ادھیڑ عمر شخص کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس کی صورت قدیم مصری انسانوں جیسی محسوس ہوئی یا پھر شاید یہ ماحول کا اثر تھا۔ چہرہ لمبوترا، رنگت خاکستری اور قد لمبا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور ان میں مجھے تیز سی چمک کا احساس ہوا تھا۔ ناک بھی غیر معمولی طور پر بڑھی ہوئی اور طوطے کی چونچ کی طرح آگے سے مڑی ہوئی تھی۔ گردن اس کی لمبی تھی۔ جبڑے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس نے لمبا سا چغہ نما لباس پہن رکھا تھا اور سر پر خیالے رنگ کا صافہ باندھ رکھا تھا۔

میں نے اسے سلام کیا اور پوچھا وہ کون ہے؟ عربی مصری تو کیا مجھے فارسی بھی نہیں آتی تھی، اسی لیے میں نے اردو میں سوال کیا تھا۔ وہ نہیں سمجھا تو میں نے انگریزی کا سہارا لیا۔ تب بھی اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

تب میں نے بین الاقوامی زبان یعنی اشاروں میں اس سے استفسار کیا کہ ہاتھوں سے اسٹیئرنگ، پھر موٹر گاڑی، ایک ہاتھ میں نے ناک پر رکھ کر انگلی سے اپنی ناک پر دستک دی، یہ یاسمین کی طرف اشارہ تھا۔ اس کے بعد میں نے کوہارا کی صورت کا بھی اشارہ دیا اور سب سے آخر میں فرش اور اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور وہ خود کون ہے وغیرہ؟

شکر تھا کہ وہ اشاروں کی زبان سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھے اسی طرح اشارے سے بتایا کہ وہ دونوں ''مرد و عورت'' گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جا چکے تھے۔ مجھے اس کے اپنے اور اس جگہ کے بارے میں اشارے سمجھ میں نہیں آئے۔ تاہم میں یاسمین کی طرف سے زیادہ فکرمند تھا۔ میرے زخموں سے متعلق اس نے مجھے یہ بتانے کی کوشش چاہی تھی کہ اس نے میری ٹانگ کی گولی نکال دی تھی اور اب میں بہتر تھا، اس نے مجھے دوا بھی

پلا دی تھی۔ وہ ایک اور مٹی کے آبخورے میں کوئی دوا لایا تھا۔ وہ میں نے پی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔

میں پریشان نظر آنے لگا تو اس نے مجھے ایک اشارہ دیا۔ میری سمجھ میں یہی آ سکا کہ میں کسی بات کی فکر نہ کروں اور وہ ابھی واپس آتا ہے اور کسی کو ساتھ لائے گا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ چلا گیا تو میں نے اسی کمرے کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ میرے پاؤں میں لنگ آ چکا تھا۔ تاہم درد میں افاقہ تھا اور کمزوری بھی اتنی زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی، تاہم اس رذیل کوہارا نے مجھے معذور کرنے کی اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

میں نے دوسرے کمرے میں قدم رکھا تو چونک پڑا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا تھا اور ویسا ہی تھا جیسا پہلے والا تھا مگر یہاں ہر طرف عجیب الا بلا چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ شیشے کے مرتبان، دواؤں کی شیشیاں، بڑے بڑے سرخ مٹی کے پیالے اور نجانے کیا کیا۔ دوا گھوٹنے والے ڈنڈا کونڈیاں، یہی کچھ نظر آتا تھا جیسے یہ کوئی یہاں کا حکیم یا جراح ٹائپ کی کوئی چیز تھا اور شاید یہ یہاں اکیلا رہتا تھا۔

دیواروں پر بھی قدیم مصریوں کی تصاویر، اہرام اور حنوط شدہ ممیاں، معلق انسانوں کی شبیہ اور نجانے کیا کیا۔ ایک طرف لکڑی کے سال خوردہ شیلف میں کچھ بوسیدہ جلدوں والی کتابیں بھی رکھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ کتابیں ایک کونے میں دھری تین ٹانگوں والی عجیب وضع کی میز پر بھی بکھری ہوئی تھیں۔ پرانی طرز کے قلم دوات بھی رکھے نظر آئے۔ وہیں ایک سرئی شمعدان رکھی تھی۔ ایک عجیب اور منحوس سی کہن سالی ٹپک رہی تھی ان در و دیواروں سے......

یہ سب دیکھ کر مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ ایک مصری وید کے پاس یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ تاہم کتابوں کی موجودگی اسے عالم بھی ظاہر کرتی تھی۔ لیکن میں ابھی تک یاسمین اور کوہارا کی جانب سے الجھن کا شکار تھا۔ بالخصوص یاسمین خانم پر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ وہ کہاں چلی گئی تھی؟ کیونکہ وہ مجھے اس طرح اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ میں نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ مردود کوہارا اسے زبردستی اپنے ساتھ کہیں لے گیا ہو؟ اور وہ بے چاری میری جان بخشی کے لیے اس کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی ہو؟ یہی قیاس مجھے حقیقت کے قریب لگا تھا۔

اس کمرے میں خارجی دروازہ دکھائی دیا۔ دروازہ کیا تھا ایک سل سی سنگی چوکھٹ پر پڑی نظر آئی تھی۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اسے چھوا اور ہلانے کی کوشش چاہی مگر وہ سل اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں نے اسے دھکا بھی دیا کہ شاید دھکا لگنے سے یہ سل ہٹ جائے۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

میں عجیب مخمصے کا شکار ہو گیا۔ جانے یہ کیا ماجرا تھا۔ میں واپس پلٹا اور ایک بار پھر میز پر رکھی کتابوں اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اچانک میری نظر فرش پر پڑی، جب میں ان مسالوں کو الجھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا جو ایک مٹی کے بڑے بڑے پیالوں میں گندھے ہوئے... رکھے تھے، وہاں ایک تخت نما نشست کے نیچے ایک کاغذ پڑا ہوا تھا۔ میں یہی سمجھا شاید کسی بوسیدہ کتاب کا کوئی ورق نکل کر گر گیا ہو، لیکن غور سے دیکھنے پر وہ کاغذ کسی کتاب کا ورق محسوس نہیں ہوا۔ اس پر کچھ تحریر تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور چونک پڑا۔

اس میں کسی نے جلدی جلدی انگریزی میں کچھ لکھا ہوا تھا اور تحریر کی روشنائی تازہ دکھتی تھی۔ تحریر شکستہ سی تھی مگر پڑھنے میں آ رہی تھی۔

''شہزی! یہ سب میں جلدی میں لکھ رہی ہوں، کوئی بات رہ جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میرے اصرار پر کوہارا نے تمہیں ابوسر کی ایک مضافاتی بستی کے وید کے ہاں چھوڑ دیا ہے، یہاں کا میزبان تمہارے لیے یقیناً ایک مہربان مسیحا ثابت ہو گا۔ وہ تمہارا علاج کرے گا۔ میں کوہارا کے ساتھ منزل کی جانب روانہ ہو رہی ہوں۔ یہی ایک حل تھا تمہاری کوہارا جیسے اژدہے سے جان بچانے کا۔ زندگی رہی تو دوبارہ..''

اس کے بعد عبارت ختم تھی۔ یہ تحریر یاسمین خانم کے علاوہ اور بھلا کس کی ہو سکتی تھی؟ تحریر کے اچانک اور ادھورے اختتام سے لگتا تھا جیسے یاسمین یہ سب چوری چھپے لکھ رہی ہو اور پھر اسے موقع نہ مل سکا تھا اور اس نے یہ پرچا ایسے ہی چھوڑ دیا تھا یا پھر اس سے گر گیا تھا۔ ایک بات یہ بھی میرے سوچتے ذہن میں ابھری تھی کہ یاسمین یہ رقعہ یا پیغام جو اس نے میرے نام ہی لکھا تھا، وہ یہ اس شخص کو بھی تو دے سکتی تھی جو مجھے خود بھی دے سکتا تھا، پھر یہ رقعہ گرا کیسے تھا؟

بہرکیف میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں جانتا تھا کہ یاسمین ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتی تھی کہ خود ہی اکیلی کوہارا جیسے خونی آدمی کے ساتھ اس گمشدہ مقبرے کی تلاش میں نکل جاتی۔ یقیناً اس میں کوہارا کی بلیک میلنگ کا دخل ہو سکتا تھا۔ میری جان چھوڑنے کے عوض ہی یاسمین بالآخر اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئی تھی اور یاسمین نے یہ ایک خطرناک قدم اٹھایا تھا۔ کوہارا اپنے منصوبے کی کامیابی کے

www.PakBooks.Site

بعد یاسمین کو بھلا کب زندہ چھوڑتا۔ یاسمین نے میری زندگی بچانے کی خاطر خود کو خطرے میں ڈال لیا تھا۔ لیکن رودولف کے وہ الفاظ میرے دل و دماغ میں ہنوز گونج رہے تھے کہ اگر سے جی کوہارا اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگیا اور وہ تینوں ہتھیار اس کے قبضے میں آگئے تو میرے لیے امریکا میں بہت سے دشمنوں کے علاوہ صرف ایک لولووشی ہی بہت سی مشکلات کھڑی کرسکتا تھا۔

مجھے بے چینی نے آلیا، لیکن اب میں ان دونوں کو کہاں اور کیسے تلاش کرسکتا تھا؟ نقشہ ان کے پاس تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اگر اس وقت مجھے موقع مل جاتا اور کسی خاطر خواہ سواری کا بھی تو میں کم ازکم صحرائے نوبیان اور لکسر کے علاقے تک پہنچنے کی کوشش کرہی سکتا تھا۔ ثمانہ کا وہ گمشدہ مقبرہ اسی کسی مقام پر تھا۔ ممکن تھا کہ میں یاسمین اور کوہارا سے جاملتا۔ لیکن مسئلہ اس وقت یہ تھا کہ یہاں سے کیسے نکلا جائے؟ میرا محسن اور مہربان میزبان جانے کہاں چلا گیا تھا؟ یہ سوچ کر ایک کوشش اور کرنی چاہیے، میں اسی سنگی پتھر کی جانب بڑھا اور اسے پھر ادھر اُدھر حرکت دینے کی کوشش کرنے لگا کہ کہیں سے یہ ذرا سا مل جائے تو باقی جگہ میں خود ہی بنا لوں۔ مگر وہ تو واقعی پتھر ہی ثابت ہوا اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب میرے ذہن میں ایک خیال آیا، عموماً ایسے دروازوں کے لیور خفیہ رکھے جاتے ہیں اور دیوار کے دائیں یا بائیں جانب ہوتے ہیں۔ یوں میں دروازے کے دائیں بائیں کی دیواروں پر ہاتھ پھیرنے لگا تو اچانک بائیں طرف کی دیوار کے ایک حصے پر مجھے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ میں نے اسے دبایا تو کمرے میں ہلکی گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری، یہ دیکھ کر میرے اندر مسرت کی لہر ابھری تھی کہ پتھر اپنی جگہ سے نصف سے زیادہ سرک چکا تھا مگر یہ کیا ... ؟ سامنے باہر کے راستے کے بجائے ایک زینہ نیچے کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اندر تاریکی تھی۔ کمرے ہی کی مستعار پڑتی پھیکی روشنی میں یہ زینہ دکھائی دیا تھا مگر نیچے کہاں تک جاتا تھا، نظروں سے اوجھل تھا۔

میں جلدی سے پلٹا اور میز سے سلگتی شمع اٹھا کر ہاتھ میں پکڑی اور زینے میں جا اُترا۔

شمع کی روشنی میں مجھے تہ خانے کا فرش نظر آگیا۔ جس کا مطلب تھا کہ زینہ مختصر تھا۔ میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، جانے یہاں کیا اسرار چھپا ہوا تھا؟ کہیں میں کسی اہرام میں تو نہیں پھنس گیا تھا؟ اس خوف ناک خیال نے مجھے ایک لمحے کے لیے اندر سے لرزا سا دیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر کچھ اطمینان بھی ہوا کہ میں کون سا یہاں کسی دشمن کی قید میں ہوں۔

میں آہستہ آہستہ زینے طے کرتے ہوئے بالآخر نیچے اتر گیا۔ میرے پاؤں تہ خانے کے اس سیلن زدہ فرش کو چھونے لگے تھے۔

اندر گھپ تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم کہیں کہیں سے باہر نکلے ہوئے چاند کی کرنیں گمنام رخنوں اور روزنوں سے اندر پڑتی دکھائی دیتی تھیں۔ خدا جانے یہ دراڑیں یا روزن کہاں بنے ہوئے تھے جو نظر نہیں آرہے تھے یا پھر اس اہرام کی "شبیہ" ایسے رخ پر تھی کہ سب طرف بند ہونے کے باوجود یہاں گھٹن یا گرمی کا اتنا احساس نہیں ہورہا تھا۔

میں مشعل کی روشنی میں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ دو ایک قدم آگے بڑھا تھا کہ میں ایک جھکی جھکی محراب کے قریب آگیا، اچانک بائیں جانب سے مجھے روشنی نظر آئی، جبکہ میرے سامنے ایک چھوٹے سے ہال کمرے کا منظر بھی تھا۔ لیکن میں نے آگے بڑھنے کے بجائے پہلے بائیں جانب کا جائزہ اور دو قدموں بعد مجھے یہاں ایک پٹ والے دروازے کا احساس ہوا۔

باہر پھیلی ہوئی چاندنی کی مقدور بھر کرنیں دروازے کی درز سے ہی آرہی تھیں۔ شاید لکڑی کا دروازہ یہی تھا، میں نے ہال کمرے میں جانے کا ارادہ ترک کردیا اور دروازہ پاتے ہی اس پر زور آزمائی کرنے لگا۔ دروازہ موٹی اور مضبوط لکڑی کا تھا مگر وہ شاید باہر سے بند تھا۔ اپنی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد میں نے یونہی اس کی درز سے اپنی ایک آنکھ چپکا کر باہر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے میں بُری طرح چونکا ...

باہر ذرا ہی فاصلے سے ریت پر مجھے وہ جیپ کھڑی نظر آئی تھی جس میں کوہارا، میں اور یاسمین سوار تھے۔ میرے حلق میں یہ سوال آنکڑے کی طرح اٹک کر رہ گیا تھا کہ اگر کوہارا اور یاسمین لکسر کی طرف روانہ نہیں ہوئے تھے تو پھر کہاں تھے وہ دونوں..... کیا وہ دونوں بھی ابھی ادھر ہی تھے؟ اگلا سوال یہ تھا کہ یہاں تھے تو پھر مجھے ابھی تک نظر کیوں نہیں آئے تھے؟

تب ہی اچانک مجھے اس ہال کمرے کا خیال آیا اور جانے کیوں میرا دل کسی بھیانک تصور تلے بُری طرح ٹھٹھرا کر رہ گیا۔

اس ہال میں کچھ تھا ؟

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

جرم کرنے سے پہلے مجرم بہت مطمئن اور ثابت قدم دکھائی ... دیتا ہے... لیکن اعصاب کا اصل امتحان جرم کے ارتکاب کے بعد شروع ہوتا ہے... ایک ایسے ہی مجرم کی کتھا جس نے واردات سے پہلے گردوپیش کی محل وقوع سے متعلق مکمل تسلی کرلی تھی

معمول سے ہٹ کر دکھائی جانے والی حاضر دماغی کا خمیازہ

جھوٹ کا پول

سلیم انور

یخ ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہے تھے لیکن مارتھا نے اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہیں کی۔ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر بے سُدھ اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا آخری پُراسرار ناول تحریر کرچکی تھی۔

میرے پارٹنر بارٹ نے ایک خون آلود پیپر ویٹ کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ "یہی آلۂ قتل لگ رہا ہے۔ خیر اللہ۔"

www.Pak Books.Site

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ہوا ایک دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 54

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

www.urdug

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی ملاقات وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، توفیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیمونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہ شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام چھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹمسی کے چندرناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹمسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹمسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھونک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی ٹھٹک کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو تاراج کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چبائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے زخمی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر بُرد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سوہنڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سوہنڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوہنڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست ڈیکمن کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو سور بانہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے اور طیارہ ریت کے سمندر میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

www. ugem.com

شمع دان...... میرے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی۔ اس کی ٹمٹماتی پیلی روشنی میرے خیالات کی طرح لرزاں تھی۔ میں گویا سرتاپا مرتعش تھا۔ سوچ رہا تھا کہ آخر ہال میں ایسا کیا ہوسکتا تھا جس نے میرے دل کو دہلا کر رکھ دیا تھا؟

میں نے خود سے سوال کیا۔ نیز، اس سوال کے ذہن میں اُبھرنے کی وجہ کیا تھی؟ اس کی نامعلوم سی پُراسراریت یا پھر باہر موجود جیپ جو سے جی کوہارا کے استعمال میں تھی۔

دوسرا یہ کہ یاسمین کے لکھے ہوئے اُدھورے رُقعے کی وہ تحریر جس میں یاسمین نے بتایا تھا کہ وہ میری زندگی اس خونی درندے سے بچانے کی غرض سے اس کے ساتھ جارہی ہے۔ یوں میرے حساب سے اُسے اب تک کوہارا کے ساتھ روانہ ہوجانا چاہیے تھا لیکن باہر تاریک ریگ زار میں کھڑی جیپ بغیر عنوان کے کچھ اور کہانی سنا رہی تھی۔

ایک ہی بات ذہن میں اُبھرتی تھی اور وہ یہ کہ وہ دونوں ابھی کہیں بھی نہیں گئے تھے۔ وہ اسی اہرام نما ٹھکانے میں تھے مگر کہاں؟

میں نے ہال کا ابھی تفصیلی جائزہ کہاں لیا تھا؟ مگر وہاں کا ماحول تو ایسا تھا ہی نہیں کہ کوئی بیٹھا ہوا وہاں دکھائی دیتا؟

یوں میں چند ثانیے وہیں دروازے کے پاس گم صم سا یہی کچھ سوچتا کھڑا رہا کہ مجھے اب ہال کا جائزہ بھی لے لینا چاہیے۔ اس عجیب جگہ کا بس ایک وہی گوشہ ایسا تھا جہاں کا میں نے ابھی تک رخ نہیں کیا تھا۔

میں پلٹا۔ ہر سُو خاموشی اور گہرا سناٹا طاری تھا۔ ہال چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف کا رخ کیا۔

شمع دان کا ہاتھ میں نے بلند اور سامنے کی طرف کر رکھا تھا۔ میں ہال میں قدم رکھ چکا تھا۔ جھکی جھکی مخروطی چھت والے اس ہال میں داخل ہوتے ہی میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہاں مدھم سی روشنی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی شمع دان سے ہال مزید کچھ روشن ہوا تھا۔ اس کا فرش پتھریلا تھا۔ سنگی دیواریں کہیں سے اُبھری ہوئی... اور کہیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ ہال کے خشک اور پتھریلے فرش پر مجھے چار افراد چت اور ساکت لیٹے نظر آئے۔ ان کے ہاتھ سینوں پر تھے، یوں جیسے گہری نیند سو رہے ہوں۔ ان کی ترتیب بے تکی تھی۔ کوئی ایک کونے میں پڑا تھا تو کوئی دوسرے کونے پر، دو افراد ہال کے وسط میں ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔

نجانے یہ کیا اسرار تھا؟ میں نے چند ثانیے رکنے کے بعد چند قدم اور آگے بڑھائے تو ٹھٹکا۔ عقدہ کھلا کہ یہ سوئے ہوئے لوگ نہیں بلکہ حنوط شدہ لاشیں تھیں۔

میرا دھیان لامحالہ اپنے اس عمر رسیدہ مصری میزبان کی طرف چلا گیا، سوچا، یہ اسی کا کوئی روایتی شاخسانہ ہے لیکن جانے کیا بات تھی کہ مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں کوئی ایسی غیر معمولی بات ہے ضرور جس نے مجھے ایک لمحے کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔

بلاشبہ یہ منظر بھی کم خوف ناک تو نہ تھا مگر جغرافیائی اعتبار سے یہ مقام اور علاقہ ایسا تھا کہ لاشوں کو حنوط کرنا کوئی خاص چونکانے والا امر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تو پھر یہاں ایسا کیا تھا جس نے میرے دل کو بُری طرح دھڑکا رکھا تھا؟

میں اور آگے بڑھا۔ سب سے پہلے وسط میں رکھی دونوں لاشوں کے قریب آیا اور اکڑوں بیٹھ کر ان کا جائزہ لینے لگا۔

بڑی مہارت اور صفائی و صناعت کے ساتھ لاشوں کو حنوط کیا گیا تھا کہ جیسے ابھی آنکھیں کھول کر باتیں کرنا شروع کردیں گی۔ اب میں اسے کاری گری کہوں یا پھر ستم ظریفی کہ ان پر لباس سمیت ہی ملمع کاری کردی گئی تھی۔ گویا کپڑے اُتارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں سمجھی گئی تھی۔ لگتا کچھ ایسا ہی تھا جیسے حنوط کا مقصد کچھ اور رہا ہو...... کیا؟ اس کا علم تو کیا اندازہ تک نہیں تھا مجھے۔ یہ کون تھے، میں بھلا کیا جانتا؟

دونوں لاشیں خاصی پرانی محسوس ہوتی تھیں لیکن ان میں بُو نہیں تھی۔ ہاں البتہ ہلکی سی عجیب قسم کی بُو کا احساس ہوتا تھا، یہ شاید کسی کیمیکل وغیرہ کی ہوسکتی تھی۔

ان لاشوں کو دیکھ کر میں نے حیرت سے سوچا کہ کیا آج کے جدید دور میں بھی لوگ فرعون جیسی سوچ پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنی لاشوں کو مومیا دینے کی وصیت کر دیں، کیونکہ فرعونی عقیدے کے مطابق انہیں دوبارہ زندہ ہونا ہوتا ہے۔

مجھے اپنی سوچ پر ہی ہنسی آگئی اور میں نے بے اختیار اپنا سر جھٹکا لیکن آخر یہ کیا اسرار تھا؟

یہ دونوں ممیاں ایک جوان مرد اور عورت کی تھیں۔ میں نے باقی دو لاشوں کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا جو الگ الگ کونوں میں پڑی ہوئی تھیں۔

ابھی میں وہاں سے اُٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک ہال کے اسرار بھرے سناٹے میں ایک ہلکی آواز اُبھری، جیسے کسی نے سانس کھینچنے کی کوشش چاہی ہو۔ میں سرتاپا کانپ گیا۔

پہلا ہی لرزتا خیال دل میں یہی اُبھرا کہ ان لاشوں میں سے کیا کوئی ایک زندہ ممی کی لاش تھی؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ممکن ہے میرا واہمہ ہو۔ ہوسکتا کہ کسی نامعلوم رخنے سے باہر صحرا میں چلتی تیز خنک ہوا کا آوارہ جھونکا در آیا ہو۔

میں سب سے پہلے سیدھے ہاتھ کے کونے میں رکھی لاش کی طرف بڑھا۔ وہ کسی عمر رسیدہ آدمی کی لاش تھی۔ ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ اب تک جن تین لاشوں کا جائزہ لے چکا تھا، وہ سب غیر ملکی نظر آتے تھے۔

یہ بات بھی میرے اس خیال کی نفی کرتی تھی کہ یہاں مقامی لوگوں کی خواہش سے ان کی لاش کو حنوط کیا گیا تھا۔ تو پھر...... یہ سب کیا تھا؟

دفعتاً ایک ہلکی سی کراہ اس اہرام نما چھوٹے سے ہال میں اُبھری۔ میں اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا۔ اب اسے میں اپنا واہمہ نہیں قرار دے سکتا تھا۔

آواز بہت واضح تھی اور میرے بائیں بازو کے کونے کی جانب سے سنائی دی تھی جدھر چوتھی لاش رکھی تھی۔ میں کھڑے کھڑے اس کی جانب گھوم گیا۔ ساکت، خاموش اور تنہا ماحول کی اس محدود فضا میں وہ منظر ایک عام آدمی کے لرزا دینے کے لیے کافی تھا۔

کونے میں ایک چوبی تختے پر پڑی مومیائی لاش نے کروٹ لی یوں جیسے وہ اُٹھنے کی کوشش میں ہو۔ کیونکہ اس کا ایک ہاتھ تخت سے فرش پر آرہا تھا۔ لاش کا چہرہ بھی میری طرف تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میں مصریات کے کسی جادوئی ماحول میں آگیا ہوں۔ ایک ممیائی لاش بھلا کیوں کر حرکت کرسکتی تھی؟

میں نے دل مضبوط کیا اور اس کی جانب بڑھا۔ پیلی اور تھراتی ہوئی مدھم روشنی میں جب میں نے قریب سے اس چوتھی لاش کا چہرہ دیکھا تو بُری طرح چونک گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا اور میں ایک ٹک اس کا چہرہ گھورتا رہ گیا۔

وہ مومیائی لاش اب واضح طور پر حرکت میں تھی، سارے جسم کو تو نہیں، البتہ کچھ حصوں کو وہ حرکت دینے پر قادر معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنے ایک اکڑے ہوئے ہاتھ کی ہتھیلی فرش پر ٹکا دی تھی اور اسی سہارے مقدور بھر اوپری بدن اور گردن کو بھی موڑ کر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ یوں جیسے وہ مجھ سے فریاد کناں ہو۔

اس کے سوکھے اور کڑک سے ہونٹ بہ مشکل متحرک ہوئے اور پھر مجھے اس کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شش...... شش...... شہزی!''

وہ بس اتنا ہی کہہ پایا تھا اور اس نے سانس کھینچنے کی کوشش چاہی تھی۔ صاف لگتا تھا کہ اس کی سانسیں بھی اکھڑ رہی تھیں۔

وہ سے جی کوہارا تھا۔ ایک سفاک اور خونی درندے کے ایسے عبرت ناک انجام کی تو مجھے بھی توقع نہ تھی کہ اُسے ایک زندہ ممی بنا دیا گیا تھا، مگر کیوں......؟ کیا یہ میرے اس پُراسرار میزبان کی حرکت تھی؟ مگر اسے کوہارا سے بھلا کیا دشمنی تھی؟ پھر میں بھی تو ادھر ہی تھا اور جانے کتنی دیر تک بے ہوش اور اس کے رحم و کرم پر تھا، اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟

میں اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔

''یہ سب کس نے کیا ہے تمہارے ساتھ......؟'' میں نے پوچھا۔ وہ مکمل مومیایا ہوا تھا۔ بدن اکڑا ہوا تھا۔ شاید اسے مومیائے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر بیتی تھی۔

وہ اپنے سوکھے اور اکڑے ہوئے ہونٹوں سے بولنے کی کوشش کرنے لگا، حتیٰ کہ وہ اپنی زبان بھی باہر نہیں نکال پا رہا تھا۔ کوہارا جیسے آدمی کا یہ حشر کسی عبرت سے کم نہ تھا، یہ بھی ایک فرعون ہی تو تھا۔

''شش...... شہزی! مم...... مجھے یہاں سے نکالو...... ی ی...... یہ تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس نے تمہارے ساتھ یہ سب کیوں کیا ہے؟ اور یاسمین کہاں ہے؟ تم تو اس کے ساتھ......'' میرا جملہ اس کھٹکے کی آواز سے اُدھورا رہ گیا جو اس دروازے سے آتی محسوس ہوئی تھی جہاں کچھ دیر قبل میں موجود تھا۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر اس طرف دیکھا تو میرا وہی مصری میزبان کھڑا تھا۔

میں اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوہارا کی کپکپاتی کراہیں گونجنے لگیں۔ اس سے خوف اور بے چینی ہویدا ہوتی تھی۔

www.urdugem.com

''یہ...... یہ تم نے اس کے ساتھ کیا کر ڈالا ہے......؟'' میں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ میرا لہجہ قدرے برہم تھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ تہ خانہ نما ہال کی محرابی چوکھٹ پر آسیبی سائے کی طرح کھڑا ہماری جانب گھورتا رہا۔ میں شاید جوش میں اس سے انگریزی میں مخاطب ہو گیا تھا حالانکہ پہلے میں نے اس کے ساتھ اشاروں میں بات کی تھی۔ لہٰذا میں ابھی اس سے اشاروں میں ہی کچھ استفسار کرنے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک کوہارا کی کپکپاتی آواز ابھری۔

''ششش...... شہزی! اس مردود شیطان کو فوراً مار ڈالو...... ی ی...... یہ تمہیں بھی زندہ......'' کوہارا کی آواز سے حد درجہ دہشت اور بے قراری مترشح تھی، بلاشبہ اسے بات کرنے میں دقت کا سامنا ہو رہا تھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کوہارا سے یہ ضرور کہتا کہ تم سے بڑا کون رذیل شیطان ہو سکتا ہے۔

میں نے دیکھا وہ مصری دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا ہوا قریب آیا اور مجھ سے بولا۔

''تمہیں اس کی کیوں فکر ہو رہی ہے؟ یہ تو تمہارا دشمن ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ میں بُری طرح چونک گیا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی سہی مگر انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ جبکہ میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اسے مصری عربی بولنے کے سوا اور کوئی زبان نہیں آتی۔ کیونکہ میں نے اب تک، مختصر سہی مگر اشاروں کی زبان میں ہی بات کی تھی۔ تب مجھے بھی یاد آیا کہ اس کمرے میں مختصر سے چوبی شیلف میں چند اجنبی زبان میں رکھی کتابوں کے علاوہ انگریزی کی بھی چند کتابیں رکھی تھیں۔ یوں مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اسے زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت انگریزی ضرور آتی ہی ہو گی۔

دوسری چونکنے کی وجہ میری یہ تھی کہ اسے کیسے پتا تھا کہ کوہارا میرا دشمن تھا۔ نجانے یہ کیا اسرار تھا۔

''ہاں! یہ ٹھیک ہے، لیکن تم نے اس کا یہ حشر کیوں کیا؟ یہ تمہارا دشمن تو نہیں تھا؟ اور...... اور میری ساتھی یاسمین خانم کہاں ہے؟ وہ تو اس کے ساتھ ہی تھی؟''

میں نے اس بار اپنے لہجے میں برہمی کے بجائے تحمل مزاجی سموتے ہوئے اس سے بات کی تھی۔ کیونکہ ابھی تک میرے اس پُراسرار میزبان نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا بلکہ میرا حیرت انگیز طریقے سے علاج کیا تھا کہ میں خود کو بالکل بھلا چنگا محسوس کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یاسمین کی طرف سے زیادہ تشویش تھی۔

''میرا خیال ہے، حنوط کاری میں تھوڑی کسر اور کمی رہ گئی ہے۔ ورنہ ایسا نہ ہوتا۔'' میری بات کا جواب دینے کے بجائے وہ فرش پر تصویرِ عبرت بنے کوہارا کی طرف دیکھتے ہوئے جیسے خود کلامیہ بڑبڑایا۔ ''یا پھر شاید...... یہ کچھ زیادہ ہی سخت جان واقع ہوا ہے اور اسے قبل از وقت ہوش آگیا، ویسے بھی یہ ابھی مکمل طور پر حنوط کاری کے مرحلے سے نہیں گزرا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کی دو بار مزید ملمع کاری ہونی ہے۔ فنِ حنوط کاری میں یہ ابھی پہلا اور سادہ مرحلہ کہلاتا ہے۔ تیسرا اور آخری مرحلہ طویل المدت ہوتا ہے۔ ابھی یہ صرف بیرونی ملمع کاری ہے۔''

اسے بدستور سنکیوں کی طرح بڑبڑاتے دیکھ کر مجھے غصہ آنے لگا۔ ''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟''

وہ ہنوز کوہارا کو گھور رہا تھا، جو اپنے جسم کو حرکت دینے کی جستجو کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس مصری کو کچا چبا جائے جس نے اسے اس بُری طرح بے بس کر رکھا تھا۔

''مجھے پہلے یہ کام نمٹانا ہو گا۔ پھر میں تم سے بات کروں گا۔'' وہ بولا اور ایک جانب کونے میں جہاں الا بلا سامان رکھا تھا، کی طرف بڑھا۔ میں اپنی جگہ کھڑا اسے اُلجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

میرے قدموں کے قریب پڑے کوہارا نے میری ٹانگ پکڑ لی۔ میں چونکا اور ایک جھٹکے سے اپنی ٹانگ اس کی گرفت سے چھڑا لی جو زیادہ مضبوط نہیں تھی۔

وہ قابلِ رحم حالت میں تھا۔ ''ششش...... شہزی! خ خ...... خدا کے لیے مجھے اس شیطان سے بچاؤ، میں...... میں ایسی عبرت ناک اور بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا۔ یاد رکھو......! یہ تمہارا بھی یہی حشر کرے گا۔''

میں نے اس کی داد و فریاد بڑی بے رحمی کے ساتھ نظر انداز کر دی اور مصری میزبان کی طرف دیکھنے لگا، جو ایک تھیلا نما کوئی شے گھسیٹتا ہوا اس طرف لا رہا تھا۔

اس کے بعد تھیلے سے اس نے ایک لکڑی کا صندوقچہ سا نکالا، اسے فرش پر رکھا اور اس کا ڈھکن اُوپر سے اُٹھایا۔ اندر چھوٹے بڑے خانے نظر آرہے تھے، جو بھانت بھانت محلول اور مسالوں سے بھرے ہوئے تھے۔

اس نے نچلے خانے میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی

شیشی نکالی۔ اس کے اندر ہلکے سبز رنگ کا کوئی محلول بھرا ہوا تھا۔ شیشی نصف تھی۔ اس کا ڈھکن ہٹا کر وہ کوہارا کی طرف متوجہ ہوا اور سفاکی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

''یہ دوا پی لو، تمہاری موت آسان ہو جائے گی۔ ورنہ میں تم جیسے چوروں سے ایسی رعایت کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ منہ کھولو اپنا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ کوہارا کے سر کی طرف بڑھایا اور دوسرا شیشی والا ہاتھ اس کے منہ کی طرف......

کوہارا کے لیے ''چور'' کا لفظ سن کر مجھے کچھ تعجب ہوا مگر میں اس کے اس لفظ پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔

وہ مصری شاید اس کی بے ہوشی کا عمل طویل کرنا چاہتا تھا یا پھر اس پر حنوط کاری کا عمل دہرانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ (یا یوں کہہ لیں کہ جو کمی بیشی تھی، اسے وہ پوری کرنا چاہتا تھا)

اس وقت کوہارا کا چہرہ شدید طیش، بے بسی، خوف اور بے قراری کے ملے جلے تاثرات کا عجیب ملغوبا دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے دبنگ دشمن کی بھیگی بلی جیسی حالت مضحکہ خیز معلوم ہو رہی تھی۔

کوہارا نے اپنے ریختہ مگر اکڑے ہوئے وجود کی مقدور بھر طاقت کو جیسے اپنے ایک ہاتھ میں سموتے ہوئے مصری کا ہاتھ جھٹکا۔ نتیجے میں شیشی تو مصری کے ہاتھ سے نہیں چھوٹی البتہ اس میں سے کچھ دوا اُچھل کر فرش پر ضرور گر پڑی۔

کوہارا نے اسی ہاتھ سے مصری کو بھی دبوچنا چاہا اور اس کے ایک ہاتھ کی کلائی بھی پکڑنے میں کامیاب ہو گیا، مگر میں نے دیکھا کہ اس مصری نے بڑے آرام سے اپنی کلائی اس کی کمزور گرفت سے چھڑا لی۔

کوہارا نے اپنے بے بس وجود میں خون کی گردش بحال کرنے کی غرض سے جھٹکا لیا مگر بے سود، وہ ایک ذرا معمولی سا ہی اپنے جسم کو جنبش دے پایا تھا۔

''ششش...... شہزی!'' اس نے پھر مجھے پکارا۔ اس کے لہجے اور آواز سے حد درجہ لاچارگی اور بے بسی مترشح تھی۔ وہ بڑی عجیب کیفیت کا شکار ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر، تمہاری مرضی۔'' مصری بڑبڑایا۔ ''تم بھوک پیاس سے تڑپ بھی سکو گے اور اپنی موت کو زندہ ممی کی صورت کھلی آنکھوں سے دھیرے دھیرے خود کو دبوچتا پاؤ گے۔''

یہ کہہ کر اس نے شیشی کا ڈھکن دوبارہ لگا دیا اور اسے ایک طرف رکھنے کے بعد چینی کے چھوٹے ڈنڈا کونڈی میں مختلف مسالے نکال کر مکس کرنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ شاید حنوط کاری کا کوئی آمیزہ بنا رہا تھا۔

میں نے کوہارا کی طرف دیکھا۔ مجھے بھی جیسے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل گیا اور میں اکڑوں اس کے قریب بیٹھ کر اس کی بے بسی پر حظ اُٹھانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھ لو کوہارا......! اپنا عبرت ناک انجام، تم ایسی ہی سزا کے مستحق تھے۔ کتنے بے گناہ لوگوں کے خون سے تم نے اپنے سفاک ہاتھ رنگے ہیں۔ اب تم قطرہ قطرہ موت کے زہر کا مزہ چکھو گے، آج مصر کے اہراموں کے پیچھے تمہاری زندگی کا سورج دھیرے دھیرے غروب ہونے لگا ہے۔''

''شہزی! میں تمہارا دشمن ہوں۔'' وہ بولا۔ ''کیا تم بھول گئے کہ میں نے تمہیں عظیم دشمن کا لقب دے رکھا تھا مگر تم تو بزدل دشمن نکلے۔ اگر تمہاری نظروں میں دشمنی کا یہی معیار ہے تو ٹھیک ہے پھر...... میں بھی اس موت کو بہ خوشی گلے لگا لیتا ہوں، اس اطمینان کے ساتھ کہ...... تمہارے ہاتھوں میری ہلاکت نہیں ہوئی۔ اب میں تم سے بالکل بھی رحم اور مدد کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ دور ہٹ جاؤ مجھ سے......'' یہ کہہ کر اس نے اپنی نظریں چھت پر جما دیں۔

پل کے پل جیسے کوہارا کے ان الفاظ نے میرا اندر جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میرے اندر ایک چھناکا ہوا۔ میرے دماغ کی کوئی رگ تھرکی۔ انا نے للکارا۔ شانِ خودی اور رجی داری کو ایک دھچکا لگا۔ وجود میں کوئی چیخا۔

میں گم صم اور ایک ٹک کوہارا کا چہرہ تکتا رہ گیا مگر اس نے اب میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ یہ اس کی شان تھی، اس کی خودی اور انا تھی، وہ اب میری طرف دیکھنے کا روادار نہیں رہا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ پر وہ مصری اپنے ''کام'' میں مگن تھا۔

''ٹھہر جاؤ......'' مخاطب وہی مصری تھا۔ میری آواز اور اشارے پر اس کے مہارت اور تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے ہاتھ ایک دم رک گئے۔

www.urdugem.com

"کیا مطلب……؟"

"مطلب یہ کہ…… تم اس کے ساتھ اب میری اجازت کے بغیر کوئی ایسی حرکت نہیں کروگے جو اس کی جان لے۔" میرا لہجہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔ مصری میزبان مجھے پہلے تو ایک ٹک دیکھتا رہا… پھر وہ بھی ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ہوش میں تو ہو تم؟"

"میں بالکل ہوش میں ہوں۔" میں بدستور اسی لہجے میں بولا۔ "تم ابھی فی الحال اسے اسی حالت میں چھوڑ دو، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ تم مجھے پہلے میری ساتھی لڑکی کے بارے میں بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟"

میرے لہجے سے ہی نہیں بلکہ رویے سے بھی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ "ہوا نے گویا مخالف سمت چلنا شروع کر دیا ہے……"

"ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی لیکن یہ صرف تمہارا ہی دشمن نہیں بلکہ میرا بھی دشمن ہے بلکہ میرا شکار ہے یہ…… بہرحال، آؤ اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سامان وہیں چھوڑا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوہارا اسی طرح لیٹے لیٹے میری طرف دیکھنے لگا۔

"ش…… شہزی! ہوشیار رہنا اس بدبخت سے…… یہ موقع ملتے ہی تم پر بھی وار کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"یہ خطرہ تو مجھے تمہاری طرف سے بھی لگا رہے گا، کوہارا……!" میں نے زہریلے طنز سے جواباً کہا۔

"لیکن تم نے آج دشمن داری کی لاج رکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ تم کوہارا کی دشمنی کے لائق ہو۔" وہ ایک عجیب سے تفاخر سے بولا۔ "شاید تمہاری یہ ادا میرے دل کو بھا جائے اور میں بھی تمہارے ساتھ اپنی دشمنی بھلا دوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ تم ایک سانپ ہو، کوہارا……!" میں نے اس کی باتوں میں آئے بغیر کہا۔ "میں تمہیں جتنا بھی دودھ پلا دوں، تم موقع ملتے ہی سب سے پہلے مجھے ہی ڈسو گے۔"

اس اثنا میں وہ مصری میزبان ہال کے جھکے ہوئے محرابی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ میں بھی فوراً اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ جیسے ہی ہال سے نکلا، اس نے بڑی پھرتی کے ساتھ گھوم کر دائیں ہاتھ کی بیرونی پتھریلی دیوار پر ہاتھ مارا۔ مجھے اس کی حرکت کا پتا چلنے میں چند لمحات کی تاخیر ہوگئی۔

اچانک ایک ہلکی سی گونج نما سرسراہٹ اُبھری، جیسے کوئی سل سرکی ہو، ابھی میں محراب سے دو چار قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ نکاسی والی تنگ چوکھٹ سپاٹ ہوگئی۔ ایک سل نے کسی خفیہ گوشے میں سرک کر وہ حصہ برابر کر دیا تھا۔ میں اندر قید ہوگیا۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا اور میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دروازہ کیا تھا گویا دیوار تھی، ایک پتھریلی سل تھی جسے میں دھکیلنے کی مجنونانہ سی مگر لاحاصل کوشش کرنے لگا۔

"وہ رذیل تمہیں گولی دے گیا شہزی!" اچانک میرے کانوں میں کوہارا کی نحیف سی مایوس آواز ٹکرائی۔ میں اس کی پروا کیے بغیر تھوڑی دیر تک اس بھاری سل پر زور آزمائی کرتا رہا۔ اس کے بعد سر جھٹک کر واپس پلٹ آیا۔

اب میں بھی قید ہو چکا تھا۔

☆☆☆

لمحہ بھر کے لیے میرے دل کو ہول سا آگیا۔ فکر و تشویش سے میرا سینہ گھٹ کر رہ گیا۔ پیشانی پر اَن گنت لکیروں کا جال نمودار ہوا۔

"کر گیا نا وار!" کوہارا کی عقب سے زہریلی آواز اُبھری۔ "اب ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہو چکے ہیں، شہزی!"

میں اس کی بکواس پر توجہ دیے بغیر وہیں کھڑے کچھ سوچتا رہا۔ مجھے سخت پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ جبہ پوش مصری بڑی آسانی سے جل دے گیا تھا۔ میرے تو سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیزی سے قدم اُٹھالے گا کہ مجھے کچھ کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔ وہ کم بخت میری توقعات سے زیادہ زیرک اور پھرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس سے زیادہ مکار بھی۔ پھر شاید میں نے ہی کچھ جلد بازی سے کام لیا تھا۔

"میرا نہیں خیال کہ اب وہ یہاں کبھی آئے گا بھی…… اس وقت تک جب تک ہماری روحیں اس منحوس اہرامی تہ خانے سے پرواز نہیں کر جاتیں۔" کوہارا کا مایوس کن بیان جاری تھا۔

"تم اپنی بکواس بند نہیں کر سکتے؟" میں جھلا کر اس کی طرف گھوما۔ وہ ہلکے سے ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اس سے وہ مجھے اور زیادہ زہر لگا۔

"دیکھ لو، شہزی! سیر کو سوا سیر پڑ گئے۔ ہم دونوں خود کو بڑا جغادری سمجھتے تھے، کس طرح اس کمینے نے ہمیں پل بھر میں زیر کر ڈالا۔"

"ایسا بے خیالی اور دھوکے میں ہوا۔" میں نے شاید جھینپ مٹانے کی غرض سے کہا۔

"جنگ اور محبت میں ہر طرح کے ہتھیار جائز ہیں۔" اس کی حالت قدرے بہتر ہوتی نظر آرہی تھی لیکن وہ اب بھی اپنی جگہ کافی حد تک ساکت تھا، ماسوائے ہونٹ اور جسم کا کچھ حصہ حرکت دینے کے۔

"تم تو سب جانتے ہوگے۔" بالآخر میں نے موضوع بدلا۔ "یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کون ہے یہ بدبخت شخص؟ اور…… اور یاسمین کو اس رذیل نے کہاں غائب کر دیا ہے؟"

"آفرین ہے تم پر……" کوہارا پھیکے پن سے ہنسا۔ "خود مصیبت میں پھنسے ہو اور فکر اس ایرانی شہزادی کی……"

"وہ میری مخلص اور وفادار ساتھی ہے۔"

"مخلص، وفادار…… اونہہ۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولا۔ "تم ان رنگین تتلیوں کو بے شک بے وقوف بنا سکتے ہو شہزی! لیکن مجھے نہیں اس لیے کہ میں نے تمہارے ساتھ ایک طویل عرصہ بتایا ہے۔ عابدہ سے لے کر سوشیلا، پھر میری ہی ساتھی چندرکلا کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملایا، اس کے بعد انڈیمان کی بلیک کوئن اور اب یہ ایرانی حسینہ یاسمین خانم۔" وہ اس یاوہ گوئی کے بعد لمحہ بھر کو رکا پھر بولا۔

"لیکن پھر تمہاری عابدہ کے سلسلے میں یہ ساری تگ و دو دیکھتا ہوں تو عجیب مخمصے کا بھی شکار ہو جاتا ہوں۔ ایک بات بتاؤ شہزی! کیا واقعی تم عابدہ سے سچی محبت کرتے ہو؟"

میں نے کوہارا کی بکواس سننے کے بعد ایک گہری ہنکاری بھری اور اس سے کہا۔

"کوہارا! میرے بارے میں جو تم رائے قائم کر رہے ہو، وہ درحقیقت تمہاری اپنی گندی سوچ اور گھٹیا ذہن کی عکاسی کر رہی ہے، مثل مشہور ہے کہ جو جیسا ہوتا ہے وہ دوسرے کو بھی ویسا ہی سمجھتا ہے۔ پھر بھی انسانوں کے منہ سے سچ بھی خود ہی نکل جاتا ہے، جیسا کہ تم نے آخر میں کہا کہ میں عابدہ کے لیے یہ ساری تگ و دو کر رہا ہوں، رہی بات ان لڑکیوں کی جن کے نام تم نے گنوائے ہیں وہ سب میری محض اچھی اور وفادار ساتھی رہی ہیں۔"

"بُرا مت مانو…… میں درحقیقت کچھ اور سوچ رہا تھا۔" کوہارا نے اچانک لہجہ بدل لیا۔

"سوچتے رہو……" میں نے بے پروائی سے کہا اور ایک طرف کونے میں دیوار سے پشت لگا کر سنگی فرش پر بیٹھ گیا۔

"شہزی! تم واحد انسان ہو جس نے دشمنی کی صورت میں بھی مجھے اس قدر متاثر کیا ہے کہ اگر کسی موقع پر مجھے تمہیں ہلاک کرنا پڑا تو یقین کرو میرا، مجھے اس کا بے حد دکھ ہوگا۔ ایک طرف میرا دل تمہاری دوستی کی طرف مائل ہوتا ہے تو دوسری طرف ماسٹر لولوش کا خیال آجاتا ہے۔ کیونکہ میں موت قبول کر سکتا ہوں مگر اس سے غداری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہوگیا۔

میں اس کی بات پر پہلی بار چونکا تھا لیکن وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ میں اس کے متعلق کوئی مثبت رائے قائم کرتا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ کوہارا جیسے بے حس اور جذبات سے عاری شخص کے منہ سے اس طرح کی گفتگو مجھے اس کا الگ روپ دکھا رہی تھی۔

شاید وقت کی ڈور دراز ہو جائے تو فطری طور پر کچھ انسیت کے جذبات انسان کے اندر از خود پروان چڑھنے لگتے ہیں۔

بہرکیف میں بس اس کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے۔

"شہزی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم میرے راستے سے اور میں تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں؟"

"ہو سکتا ہے۔" میں نے تلخ مسکراہٹ سے کہا۔ "بشرطیکہ کہ تم اپنی کنپٹی پر گولی مار کر جھکڑی سمیت ان تمام بے گناہوں کی اموات کا ازالہ خود کو موت کی سزا دے کر دو، جنہیں تم نے بیدردی سے ہلاک کیا۔"

"میرے راستے میں جو حائل ہوگا، اس کا میں یہی انجام کروں گا۔" اس کی چنگیزی بربریت ایکا ایکی لوٹ آئی۔

"تم غلط راستے پر گامزن ہو کوہارا……!" میں نے کہا۔

"چھوڑ دو یہ باتیں۔ ہم دونوں کے بیچ کبھی نہیں بن سکتی۔" اس نے جھلا کر موضوع بدل دیا۔ "مجھ پر تم نے ایک احسان کر ہی دیا ہے تو اب یہ بھی کر دو کہ میرے جسم سے یہ گندے غلیظ مسالے جھاڑ دو۔ ویسے اب میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا ہوں۔"

"میں تم پر کوئی احسان کر رہا ہوں اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں، ماسوائے تمہیں جلد سے جلد موت کی وادی میں دھکیلنے

urdugem.com THE ONLINE LIBRARY

www.urdugem.com

نے ''میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی اور صاف گوئی سے کہا۔ ''کیونکہ تم جیسے درندے اور خونی قاتل پر احسان کرنے کا مطلب ہی انسانیت پر ظلم ہوگا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا، سے بی کوہارا ..! اب تک میں نے جو موقع تمہیں دیا ہے، وہ محض تمہارے یاوہ گوئی کے جواب میں اور اس برتے پر کہ کہیں تم یہ نہ سمجھنا کہ شہزی نے تمہیں کمزور سمجھ کر زیر کیا۔''

میری بات سن کر کوہارا بولا۔ ''کاش، شہزی! میں اپنے ایک ہاتھ کو اتنا حرکت دے سکتا تو تمہیں سلام کرتا۔ گریٹ شہزی! گریٹ، اسی لیے تو میں تمہیں اپنا عظیم دشمن سمجھتا ہوں۔'' وہ ایک ثانیے رکا پھر بولا۔

''شہزی! پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ اب...... ہم دونوں دشمنوں میں سے کسی ایک کا وقت قریب ہے اور یہ بھی کہ اگر ہم دونوں میں سے کسی ایک کو ہلاک کرنے کا موقع مل گیا تو مرنے کے بعد دل میں کوئی کسک ضرور چھوڑے گا، ایک دوسرے کو ہلاک کر ڈالنے کے دوران میں ہمارے بیچ ایسا کچھ ہوگا ضرور...... جو بالکل انوکھا ہوگا۔''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے کوہارا...... ! شاید یہ ان حالات کا اثر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کم از کم تمہیں ہلاک کر ڈالنے کے بعد میرے دل میں کوئی کسک نہیں اُبھرے گی۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو شہزی! کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔'' وہ بولا۔ ''میں نے آج اپنی زندگی میں پہلی بار ایک بھیانک موت کو اپنے بالکل قریب محسوس کیا تھا۔''

ہمارے درمیان چند سیکنڈوں کی خاموشی کا وقفہ رہا۔

اسرار بھری رات دبے پاؤں بیت رہی تھی۔ کوہارا اپنے جسم کو وارم اَپ کے انداز میں حرکت دیتا رہا۔ ساتھ ہی وہ اب ایک ہاتھ کو اس قدر ہلا جلا رہا تھا کہ اپنے جسم سے حنوط کاری کے مسالوں کو بھی جھاڑ کر پھینک رہا تھا۔

ایکا ایکی مجھے یوں لگا جیسے کوئی درندہ، نیم بے ہوشی کے بعد دوبارہ بیدار ہو رہا ہو۔

میں محتاط ہو گیا۔ ''شہزی! میری ایک مدد اور کر دو ذرا...... تاکہ ہم دونوں مل کر اس مشترکہ کشتی کو پار لگا سکیں۔''

''میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔'' میں نے اس کی خواہش کو صرف نظر کرتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟''

''یہی کہ...... تم تو سب جانتے ہوگے، یہ آخر معاملہ کیا ہے؟ کون ہے یہ بدبخت شخص؟ اور یاسمین کو اس رذیل نے کہاں غائب کر دیا ہے؟''

''تم جب زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے راستے میں بے ہوش ہو گئے تو......'' وہ سنجیدہ لہجے میں بتانے لگا۔

''ہمارے پیچھے ایک پولیس گاڑی لگ گئی تھی۔ پولیس کو جُل دینے کے بعد اس مردود مصری کے ہاں ہم نے پناہ لی۔ وہ تمہیں دیکھنے لگا۔ ہمیں اس نے کچھ پینے کو پیش کیا۔ جس کے بعد میں تو بے ہوش ہو گیا اور یہاں میری آنکھ کھلی...... بس! اب تک یہی ہوا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟ اور اس نے یاسمین کا کیا حشر کیا ہے۔''

اس کے جواب پر مجھے ایک بار پھر یاسمین کی طرف سے گہری تشویش نے گھیر لیا۔

مجھے متفکر اور تشویش زدہ پا کر کوہارا بولا۔ ''میرا خیال ہے یاسمین کے سلسلے میں تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے یقیناً اس کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی ہمارے ساتھ اور سامنے ہوتی۔ وہ ایرانی شہزادی یوں بھی ایک چلتا پرزہ لگتی تھی، میرا خیال ہے وہ اسے جُل دے کر بھاگ نکلی ہوگی۔''

میں نے اس کی رائے کے جواب میں کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا پھر کچھ سوچ کر میں فرش سے اُٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔

میں نے بہرحال مصلحتاً اس کی ''عارضی'' مدد کی ٹھان لی تھی۔ ''لگتا ہے یہ کسی محلول سے ہی اُتریں گی۔ تم اس کا وہ سامنے پڑا تھیلا اُٹھا لاؤ۔'' کوہارا نے کہا۔

میں وہ تھیلا اُٹھا لایا۔ اس کے اندر سے چوبی صندوقچہ برآمد کیا اور اسے کھول کر اس کا سارا سامان مع لوازمات کے فرش پر اُلٹ دیا۔ کچھ ایسے محلول کی شیشیاں بھی برآمد ہوئیں جن پر لیبل چسپاں تھے۔ ایک شیشی پر انگریزی میں ''فورمل ڈی ہائیڈ'' درج تھا۔

اس کے نیچے بریکٹ میں باریک حروف میں اس کی تفصیل درج تھی جس کے مطابق یہ محلول جسم کے اندرونی اعضا کو سڑنے نہیں دیتا تھا۔ گویا یہ حنوط کاری میں کام آنے والا کوئی انجکشن تھا۔ کیونکہ اس کے ساتھ سرنج بھی تھی۔

بہرکیف میں نے اپنی سی کوشش سے کوہارا کی یہ

ساری بیرونی ملمع کاری کو کافی حد تک صاف کیا۔ اس مصری نے بتایا تھا کہ ابھی یہ حنوط کاری پہلے مرحلے میں تھی۔

قصہ مختصر...... کوہارا کی حالت کافی بہتر ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، تھوڑا لڑکھڑایا مگر پھر سیدھا ہو کر اُچھل کود کرنے لگا۔ اس کی ایک آنکھ پر فلیپ لگا ہوا تھا، ایک ٹانگ میں لنگ بھی باقی تھا۔

''میں تمہارا یہ احسان یاد رکھوں گا شہزی!'' وہ کچھ سکون میں آنے کے بعد بولا۔ ''لیکن اس وقت تک جب تمہاری کسی تیسرے آدمی کے ہاتھوں جان خطرے میں نہ ہو لیکن میرے نرغے میں آ گئے تو نہیں بخشوں گا، یاد رہے، یہی اُصول تمہارا بھی رہا ہے۔''

''یہ وقت بتائے گا، اب کام کی بات کرو۔'' میں نے ٹھنڈی ہوئی متانت سے کہا۔ ''یاسمین کے بارے میں پتا لگانا ضروری ہے اور وہ صرف یہی مصری بتا سکتا ہے۔''

''اس ہال کمرے کا ایک بار پھر اچھی طرح جائزہ لینا ہوگا۔'' اس نے جواب میں کہا اور ہم یہی کرنے لگے۔

ہر جگہ کا جائزہ لے لیا مگر مفر کی کوئی راہ ہمیں نہ مل سکی۔

''کم بخت کوئی ایسا کند آلہ یا اوزار بھی نہیں ہے کہ جسے سنگی سل پر آزمایا جا سکتا ہو۔'' کوہارا دانت پیس کر بولا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھما کا ہوا۔ کوہارا نے بھی میرے چہرے سے کچھ ایسا محسوس کر لیا، بولا۔ ''کیا کوئی ترکیب ذہن میں آ رہی ہے؟''

''کوہارا......'' میں چند قدم اس کے قریب آ کر بولا۔ ''تمہیں اردو آتی ہے؟'' وہ میرے سوال پر حیران تو ہوا تاہم جواب میں بولا۔

''آتی تو ہے مگر ہندی انداز کی اور ٹوٹی پھوٹی۔ مگر تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

میں نے اس سے اردو میں کہا۔ ''غور سے سنو میری بات...... ہمیں ڈراما کرنا ہوگا۔ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے کو زخمی بھی کرنا پڑے گا تھوڑا بہت، اس کے بعد نڈھال ہو کر گر پڑیں گے۔ غصے اور طیش میں آ کر شور بھی مچائیں گے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں اور اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' وہ شاید میری اسکیم سمجھ گیا تھا۔ کیونکہ اس کے کانے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

''یہ مصری ضرور کسی خفیہ رخنے سے ہم پر نظر رکھے ہوئے ہوگا۔ اسے معلوم تو ہے ہی کہ ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ہاتھوں زخمی اور بے ہوش پا کر وہ اندر آنے کی کوشش کرے گا تاکہ ہم دونوں پر بے ہوشی کی حالت میں قابو پا سکے۔ بس! اس کے بعد ہم اسے دبوچ لیں گے۔''

ہم نے منصوبے کے مطابق یہی کیا۔ پہلے چلا چلا کر ایک دوسرے کو کوستے رہے، تاکہ وہ مصری اس طرف متوجہ ہو سکے۔ اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔

ہم نے ایک دوسرے کے کپڑے تک پھاڑ ڈالے۔ گھونسے اور مکے مار کے چہرہ بھی زخمی کر لیا۔ کوہارا کے گھونسے نے میرا ہونٹ متورم کر دیا جبکہ میں نے بھی اس کے ساتھ یہی کیا۔ اس کے بعد ہم نڈھال ہو کر گر پڑے۔

ہم غصے میں اپنے حلق سے بلند آوازیں بھی خارج کرتے رہے۔ پھر فرش پر گر پڑے اور کبھی وہ میرے سینے پر چڑھ جاتا کبھی میں اس پر سوار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔

ہم دونوں دیرینہ دشمنوں کے بیچ یہ پہلا اور عجیب موقع تھا کہ ہم مصنوعی انداز کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ اس کے بعد ہم نڈھال ہو کر کراہنے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ اس کے بعد بے سدھ ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئے مگر اس طرح کہ ہمارے چہروں کا رخ اسی سل نما دروازے کی طرف ہی تھا۔ آنکھیں بظاہر بند تھیں مگر ایک جھری سی بنا کر دیکھتے رہے۔

میری اس انوکھی اسکیم کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہو گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہلکی سی سرسراہٹ اُبھری۔ میرا دل فرطِ جوش سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔

میں نے اپنی آنکھ کی جھری سے دیکھا، وہ مصری دروازہ نما سل سرکا کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سی شے تھمی ہوئی تھی۔ یقیناً کوہارا نے بھی اسے اندر داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا، تاہم میں نے اسے تاکید کر رکھی تھی کہ ہم دونوں میں سے اگر کسی ایک کو بھی اس پر حملہ کرنے کا موقع ملا تو ہم دریغ نہیں کریں گے اور کسی قسم کی جلد بازی سے بھی کام نہیں لیا جائے گا۔

ہال میں شمعوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مصری سل ہٹنے کے بعد ہال میں داخل ہوا مگر صرف ایک قدم...... اس

UrduGem.com THE ONLINE LIBRARY

www.urdugem.com

کے بعد وہیں رک گیا۔ اس کے ہاتھ میں جو شے تھمی تھی، میں اسے بھی دیکھ رہا تھا۔ سرِدست میں اس شے کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہ کرسکا۔ ہوسکتا تھا، وہ کوئی ہتھیار ہو مگر کس نوعیت کا؟ یہ نہیں پتا چلا۔

وہ رک کر ہماری جانب ایک ٹک تکتا رہا۔ میں اس کے جلد سے جلد قریب آنے کی دعا مانگنے لگا۔ خدشہ بھی دل میں اُبھرا کہ کہیں ہماری چالاکی کا شبہ ہوتے ہی یہ کم بخت واپس نہ پلٹ جائے۔

تھوڑی دیر وہیں ٹھہرے رہنے کے بعد اس نے ہماری جانب قدم بڑھا دیے۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کچھ قریب آنے پر مجھے اس کے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی شے کو پہچاننے کا موقع ملا۔ وہ کوئی عجیب ساخت کا تیز اور کند فولادی ہتھیار تھا۔ پہلی نظر میں یہ بُغدے کی طرز کا محسوس ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر ہمارے ذرا قریب آکر ٹھہر گیا۔ میں اور کوہارا اسکیم کے مطابق ایک دوسرے سے صرف تین، چار گز کے فاصلے پر اپنے ہاتھ پاؤں پھیلائے بے سُدھ پڑے تھے۔

وہ مصری پھر آگے بڑھا۔ اس نے سب سے پہلے کوہارا کی جانب رخ کیا تھا اور جھک کر اسے دیکھنے لگا۔ گویا اس پر حملہ کرنے کا پہلا موقع کوہارا کو ملنے والا تھا لیکن میری کوشش تھی کہ یہ موقع پہلے مجھے ملتا، کیونکہ کوہارا کی سابقہ حالت کے پیشِ نظر اس کا حملہ چُوک بھی سکتا تھا۔ اس صورت میں مصری کو بھاگنے کا موقع مل جاتا۔ حالانکہ گرتے وقت میں نے خود کو اس رخ پر فرش پر ڈالا تھا کہ مصری اندر داخل ہوتے ہی میری جانب بڑھتا مگر اس نے کوہارا کا انتخاب کیا تھا۔

مجھ سے مصری کا فاصلہ چار پانچ گز کا تھا۔ یوں بھی ہم دونوں دانستہ ایک دوسرے کے قریب قریب پڑے تھے۔

اچانک مصری سیدھا ہوا اور اس نے اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا بُغدا نما ہتھیار فضا میں بلند کیا، وہ کوہارا پر وار کرنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ حرکت میں آیا اور اس نے اپنی ایک ٹانگ اس کی ٹانگوں سے ٹکرادی۔ مصری کا توازن بگڑا۔

یہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں تو اچانک ضرور تھا مگر کوہارا کا وار شاید خاطر خواہ اثر انداز نہیں ہوسکا، پل کے پل وہ مکار مصری ہماری اسکیم سمجھ گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا دیا اور پلٹ کر بھاگا، میرے اوسان خطا ہوگئے۔

کوہارا کو اُٹھنے میں تاخیر کا سامنا ہوا تو وہ حلق کے بل چیخ پڑا۔

’’شہزی! اسے پکڑو......‘‘

میں تو پہلے ہی حرکت میں آچکا تھا اور مچھلی کی طرح تڑپ کر گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل پر دروازے کی طرف بھاگتے مصری کی جانب لپکا اور...... ایک دم کھڑا ہوا تو تب تک وہ مصری محرابی چوکھٹ تک پہنچ چکا تھا۔

میں نے ایک لانگ جمپ لگائی۔ جیسے ہی وہ چوکھٹ پار کرنے لگا، میں اس پر جا پڑا۔ اُسے رگیدتا ہوا پہلے والے کمرے میں لے گیا۔ ہم دونوں ہی گرے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس مصری کے حلق سے دل خراش چیخ کی آواز سنائی دی اور میرے چہرے پر خون کے چھینٹے پڑے۔

میں ایک لمحے کو بوکھلا سا گیا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بُغدا نما ہتھیار کا تیز اور کند پھل اس کی گردن پر پھر چکا تھا۔ وہ اب اُدھڑی ہوئی گردن کے ساتھ میرے نیچے پڑا ہوا ذبح کیے جانور کی طرح تڑپنے لگا اور میرے سنبھلتے اور دیکھتے ہی وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

’’مر گیا یہ ذلیل......!‘‘ کوہارا کی عقب سے آواز اُبھری۔ ’’بہت اچھا ہوا لیکن کاش! اس ذلیل کو میں اپنے ہاتھوں، اذیتیں دے کر ہلاک کرتا۔‘‘

’’بکواس بند کرو اپنی......‘‘ میں کھڑا ہو کر جھلّائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’تم کبھی عقل کی بات بھی سوچتے ہو؟ اب کون ہمیں بتائے گا کہ یہ سارا کیا چکر تھا؟ اور یاسمین کہاں ہے؟‘‘

کوہارا بھی میری بات پر سوچ میں ڈوب گیا۔ وہ چپ رہا۔ میں بھی یک ٹک کھڑا مصری کی خون آلودہ لاش کو بِلا ارادہ تکنے لگا۔

’’کم از کم اس کے کپڑے اور جوتے تو میرے کام آہی جائیں گے، تم بھی کوئی ترکیب آزماؤ۔ تمہارا لباس بھی مضحکہ خیز ہو رہا ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

اس کی بات درست تھی۔ میرا لباس ابتر تھا۔ پتلون کا ایک پائنچہ ٹانگ کی مرہم پٹی کی وجہ سے ران تک کٹا ہوا تھا۔ شرٹ کی بھی کچھ ایسی ہی حالت ہو رہی تھی۔ کوہارا، اس کا لباس اور جوتے اُتارنے میں مصروف ہوگیا۔ میں نے بھی اِدھر اُدھر ڈھونڈ ڈھانڈ کے اضافی لباس اور جوتے دیکھ لیے۔ لباس کیا ہونا تھا، گھٹنوں سے بھی نیچے چغے اور صافے تھے۔ ہم نے وہ پہن لیے۔ البتہ اس کھلے ڈلے لباس میں خود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

چند منٹوں میں اس سے فارغ ہونے کے بعد ہم چند ثانیے گم صم سے کھڑے رہے۔

’’ہمیں اب بہرحال یہاں سے کوچ کرنا ہوگا۔‘‘ بالآخر لمحے بھر کی پُراندیش خاموشی کے بعد کوہارا بولا۔

’’لیکن ہم جائیں گے کہاں؟‘‘ میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’ہماری منزل یاسمین خانم کے دم سے تھی۔ پہلے اسے تلاش کرنا ہوگا۔‘‘

کوہارا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آزادی پاتے ہی وہ جیسے ایک دم مجھ سے لاتعلق ہوگیا تھا اور پلٹا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ اس منحوس ٹھکانے سے باہر کی طرف نکل رہا تھا۔ میں بھی ایک لحہ نہیں ٹھہرا اور اس کے پیچھے باہر آگیا۔

اگرچہ میرا ارادہ مصری کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا لیکن کوہارا نے اس سلسلے میں کوئی دلچسپی لی تھی نہ ہی وہ میری مدد کرتا۔

باہر صحرا میں خنک رات اُتری ہوئی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ایک طرف بستی کے گھروں کی بے ترتیب قطاروں کے ہیولے نظر آتے تو دوسری جانب حدِ نگاہ ریت کا سمندر پھیلا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا کوہارا باہر آتے ہی دائیں بائیں اور اِدھر اُدھر جھک کر کچھ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اس حرکت کا مطلب سمجھ چکا تھا اور اسی لیے میں نے اپنی توجہ اردگرد کا جائزہ لینے پر مرکوز کردی۔

بستی پر سناٹا طاری تھا۔ فضا خنک اور رکی رکی سی محسوس ہوتی تھی۔ چہار سُو عجیب قسم کا مرگ آسا سکوت طاری تھا۔ مکانوں کے بے ترتیب ہیولوں کے درمیان اندھیری گلیاں مردہ اور تنگ بل کھاتے راستے کسی حنوط شدہ لاش کی طرح محسوس ہوتے تھے۔

’’انہیں یہاں سے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں بیتی ہے......‘‘ معاً کوہارا کی خیال انگیز آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

’’تو تم نے ان کے پیروں کے نشانات دیکھ لیے......‘‘ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’کتنے لوگ ہیں؟ کیا یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یاسمین بھی......‘‘

’’ہاں۔‘‘ اس نے میری بات کاٹی۔ ’’صرف دو افراد روانہ ہوئے ہیں۔ ان میں ایک عورت ہے، وہی یاسمین ہوگی۔‘‘

’’کسی عورت کا اندازہ کیسے ہوا تمہیں؟‘‘

’’یاسمین کے پیروں تلے جو جوتے ہیں ان سے...... جبکہ دوسرے شخص کے جوتوں کی بناوٹ ویسی ہی ہے جیسی اس مصری کی تھی۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے اپنے ایک پاؤں سے جوتے کا نشان بنایا۔ جوتا اسی مصری کا ہی تھا، لہٰذا دوسرے مردانہ جوتا کی شیپ اینڈ سائز بھی ویسی ہی پائی گئی۔

’’ہم......‘‘ میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔

’’لہٰذا اب دو ہی باتیں ذہن میں اُترتی ہیں۔‘‘ کوہارا کا بیان جاری تھا۔ ’’ایک تو یہ کہ یاسمین کے ساتھ جانے والا آدمی اسی مصری کا ساتھی ہوسکتا ہے، دوسری بات یہ کہ اس کے ساتھی کے ساتھ جانے میں خود یاسمین کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ میرا خیال ہے اس حرافہ (یاسمین) نے کوئی چکر چلایا ہے۔‘‘

مجھے یہ اعتراف کرنے میں اب کوئی عار نہ تھا کہ کوہارا صرف کشت و خون بہانے کا عادی نہیں بلکہ باریک بین بھی تھا۔ کیونکہ میں اس کی باتوں کو (ماسوائے کسی چکر کے) رد نہیں کرسکا تھا۔

یوں کوہارا اپنے تئیں تازہ کار حالات کا تجزیہ کرتے ہی پاس کھڑی جیپ کی طرف لپکا۔

وہ اس میں سوار ہوگیا۔ میں بھی اس کی جانب بڑھا۔ مجھے اس کی بے رخی بُری طرح کھلنے لگی تھی۔ وہ اب اپنی اوقات پر اُتر آیا تھا۔ کیونکہ اب اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

چابی شاید اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھی۔ وہ جیپ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں جا کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ جیپ کا انجن ہر بار سلف لگانے...... پر کھرکھراتا اور پھر خاموش ہوجاتا۔

جیپ اسٹارٹ کرنے کی دو تین بار ناکام کوشش کے بعد کوہارا نے جھلّا کر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

’’کوئی خرابی ہے یا فیول ختم ہے؟‘‘ میں نے کسی خیال کے تحت اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

’’کوئی خرابی لگتی ہے شاید، فیول کا مسئلہ نہیں ہے۔‘‘ وہ جواب میں یہ کہتے ہوئے اُترا اور بونٹ کی طرف بڑھا۔

www.urdugem.com

پھر ایک لمحے کو رکا اور میری طرف سنجیدہ نظروں سے گھورنے لگا۔

''تم تو ایسے دیکھ رہے ہو جیسے جیپ کی خرابی کا ذمے دار میں ہوں؟'' میں نے کہا۔

''تم اب اپنا راستہ لو شہزی! مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں رہی۔'' اس نے سرد و سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم جیسے بے حس اور رذیل آدمی سے مجھے یہی توقع تھی کوہارا......!'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن اس وقت اس جیپ کی مجھے بھی ضرورت ہے۔ تم چاہو تو اپنا الگ اور پیدل راستہ ناپ سکتے ہو۔''

میری بات پر اس نے خونخوار نظروں سے دیکھا تھا اور غرا کر بولا۔ ''اس جیپ کا مالک میں ہوں۔ تم اپنا پیدل راستہ لو۔ سمجھے......!''

''بالکل نہیں، جب تم اس بات کا اعتراف کر چکے ہو کہ ہم اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں تو اس کشتی پر بھی مشترکہ سواری کریں گے۔'' میں نے کہتے ہوئے جیپ کی طرف اُنگلی کا اشارہ کیا۔ وہ خوفناک انداز میں غراتا ہوا میری جانب بڑھا مگر پھر بہت قریب...... پہنچ کر رک گیا۔

درحقیقت کوہارا، فوری طور پر یاسمین اور مصری کے ساتھی کے تعاقب میں اکیلا نکلنے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ وہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ کیونکہ ہم تو ایک دوسرے کی راہ کھوٹی کرنا چاہتے تھے۔

بہرکیف اس وقت ہم دونوں زخمی تھے۔ اس کی ٹانگ کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی اور خود میری ایک ٹانگ اور بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جبکہ اس اہرام نما سے مکان میں ایک مقامی باشندے کی لاش بھی پڑی تھی۔

بستی اس وقت محوِ خواب تھی اور رات اپنے آخری پہر میں۔ ایسے میں آپس کی لڑائی ہمیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ شاید یہی سب باتیں خبیث کوہارا نے بھی پل بھر میں سوچی تھیں اس لیے وہ میرے خلاف جارحانہ قدم سے ایک دم باز آگیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے اپنے اندر کا تناؤ کم کیا اور بولا۔ ''شہزی! میری اس رعایت کو غنیمت جانو اور میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں تم سے دو دو ہاتھ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ ورنہ ابھی یہاں تمہاری لاش پڑی ہوتی۔ یاسمین کی اچانک گمشدگی کے بعد یہ معاملہ اور بھی گمبھیر ہو چکا ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ......''

''کوہارا......!'' میں نے غرا کر اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے اس کی ڈھٹائی اور نخوت آمیز غرور پر طیش آگیا۔ وہ شاید مجھے اتنا ہی تر نوالہ سمجھے ہوئے تھا۔

''یاسمین کو تو میں ہر ممکن طرح سے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن یہ جیپ اس وقت میری اہم ضرورت بن سکتی ہے اور سنو...... وہ نقشہ بھی تمہیں میرے حوالے کرنا ہوگا، جو تم نے یاسمین سے چھینا تھا۔'' میں نے کہتے ہوئے، ہتھیلی کھول کر اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

میری بات سن کر اس کی اکلوتی آنکھ کی وحشیانہ چمک کچھ اور تیز ہوگئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک ٹھہراؤ سا آیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''دیکھو شہزی! اس وقت ہمارا جلد از جلد اس بستی سے نکل جانا بہتر ہوگا۔ اگر ہم یہاں لڑ پڑے تو اندر اس مکان میں ایک لاش بھی پڑی ہے جس کے قاتل تم ہو۔ پولیس گاڑی یوں بھی نجانے ہماری یا کسی اور کی تلاش میں یہاں گھومتی پھر رہی ہے۔ لہٰذا اس بحث کا نقصان تمہیں ہوگا۔'' اس کی مکاری اور شاطرانہ مزاج میرے لیے نیا نہیں تھا۔

''مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ہاں اس تنازعے کی ایک صورت ہو سکتی ہے کہ دو میں سے ایک چیز میرے حوالے کر دو، پھر معیار کا توازن برابر ہو جائے گا اور ہم ایک دوسرے سے سمجھوتا کرنے کی پوزیشن میں بھی آجائیں گے یا پھر ڈیول لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ، جو جیتا دونوں چیزیں اسی کی ہوئیں۔''

''بہت مکار ہو تم...... شہزی!'' وہ میری طرف گھور کر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

''کیا لوگے؟''

''جیپ یا نقشہ۔''

''نقشہ میں نہیں دوں گا جیپ لے لو۔''

''اس پر ٹاس ہوگا۔''

''ٹاس کے لیے کوائن کا ہونا لازمی ہے۔''

''کوئی بات نہیں، ہاتھوں سے ہو سکتا ہے۔''

''منظور ہے۔''

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے ہوگئے۔ دونوں نے تین بار اپنے ہاتھ جھٹکے، چوتھی بار میں اس کے بائیں ہاتھ کی اُنگلیاں میرے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے مختلف ہوگئیں۔ داؤں جیت گیا۔

اس نے جیپ میرے حوالے کر دی اور خود ہلکا قہقہہ مار کے جیپ کی طرف بڑھا۔ میں اپنی شکست پر اندر ہی اندر تلملا گیا۔

نقشہ میرے لیے ہی نہیں، کوہارا کے لیے بھی ضروری تھا بلکہ اس کے لیے تو کچھ زیادہ ہی ضروری تھا۔ وہ میرے قابو میں رہ سکتا تھا اور میں جیپ کے لیے اس کی مدد بہ آسانی حاصل کر سکتا تھا۔

''اب جیپ کے پاس کیا کرنے جا رہے ہو؟ یہ تو میری ہوئی؟'' میں نے کہا۔

''جیپ تمہیں ہی مبارک ہو شہزی!'' وہ بولا۔ ''میں اس میں سے اپنا کچھ ضروری سامان اُتار لوں۔''

''ہرگز نہیں۔'' میں نے صاف انکار کر دیا اور اس کے قریب جا کر اسے جیپ میں سوار ہونے سے روک دیا۔ 'معاہدے کے مطابق جیپ اب میری ہوئی اور اس میں موجود ساری اشیا بھی۔ تم نے نقشہ جیت لیا اب اپنی راہ لو۔''

اچانک کوہارا نے مجھے اپنے کندھے کی زوردار ٹھوکر رسید کر ڈالی۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ بدبخت کے گینڈے جیسی جسامت کی ٹھوکر نے میرے قدم اکھاڑ دیے اور میں (ریتلی) زمین سے چند انچ اُچھل کر ذرا پرے جا گرا۔ وہ لپک کر جیپ میں سوار ہوا اور نہایت پھرتی کے ساتھ اندر کسی خفیہ خانے سے کوئی شے برآمد کی۔

ادھر میں جب تک سنبھلا، وہ سیاہ رنگ کا ایک پستول مجھ پر تان چکا تھا۔

''شہزی! اب میری نظروں سے دفع ہو جاؤ...... ایسا نہ کہ میں مجبور ہو کے گولی چلا دوں۔''

میں جانتا تھا وہ ایک حد تک گولی چلانے سے کترا رہا تھا۔ گولی کے دھماکے سے بستی کے لوگ جاگ سکتے تھے لیکن میرے زیادہ آڑے آنے پر وہ یہ حرکت بھی کر ڈالتا۔ اس لیے میں نے اس مردود کی اسی رعایت کو ہی کافی جانتے ہوئے بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور ناچار اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیے۔ جس کا مطلب تھا کہ میں نے اپنی ہار اور اس کی بات تسلیم کر لی۔

اس کے بعد میں تیز تیز قدموں سے صحرا میں نکلنے کے بجائے آبادی کی طرف چلا گیا۔

لیکن زیادہ دور نہیں گیا۔ کھجوروں کے ایک جھنڈ کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور کوہارا کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ جیپ کا بونٹ اُٹھائے اس کی خرابی دیکھنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا اور گاہے بگاہے اس طرف بھی سر گھما کر دیکھ لیتا تھا جدھر میں اس کی تاک میں کھڑا تھا۔

وہ میری طرف سے بھی محتاط اور خبردار تھا۔ یقیناً اتنا بے وقوف تو وہ بھی نہ تھا کہ اسے اندازہ نہ ہوتا، میں اور وہ جب تک یہاں موجود ہیں ایک دوسرے پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس نے کوئی چھوٹی سی ٹارچ جلا رکھی تھی۔ اسی کی روشنی میں وہ خرابی تلاش کر رہا تھا۔ میں ابھی اس پر قابو پانے کی کسی تدبیر پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک غیر متوقع طور پر میں نے اسے بونٹ گراتے اور جیپ میں جلدی سے سوار ہوتے دیکھا۔

حالانکہ مجھے اُمید نہ تھی کہ اتنی جلدی وہ خرابی دور کر لے گا۔ میں اگر اس کی طرف دوڑتا بھی تو وہ یقیناً مجھ پر گولی بھی چلا سکتا تھا، کیونکہ اس سے اب یہ توقع رکھنا بے وقوفی ہوتی کہ وہ گولی کے دھماکے کی پروا نہیں کرتا۔ بستی کے لوگ بھی جاگ جاتے اور مجھے دھر لیتے۔ (بشرطیکہ اس کا نشانہ خطا جاتا)

میں غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

وہ ایک بار پھر اس مہم میں مجھ سے ''پہل'' پر تھا اور میں یہاں ہاتھ ملتا رہ گیا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہاں کہیں اونٹ کا کسی گھر یا دروازے کے باہر بندھا ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ میرا ذہن اس نازک وقت میں تیزی سے کام کر رہا تھا۔

میں نے اپنے عقب میں خاموش پڑے گھروں کا رخ کیا اور ایک گلی میں داخل ہوگیا۔ کہیں کوئی قریب آوارہ کتا ہولے سے بھونکا تھا، میں نے راستہ بدل دیا۔

ایک مکان کے باہر مجھے کھجور کے درخت تلے دو اُونٹ نظر آئے، دونوں نے اپنی لمبی گردنیں گھما کر جسم پر لپیٹ رکھی تھیں۔ دوسرا اُونٹ چھوٹا تھا، وہ اس کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔

یہ سوچ کر کہ کہیں بڑے اُونٹ کو لے چلا تو اس کا بچہ بلبلا کے شور نہ مچا دے، اسے چھوڑ کر میں آگے بڑھ گیا۔

اونٹ چوری کرنا آسان بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کسی کی نظر پڑنے کا بھی خدشہ الگ دامن گیر تھا۔ عجیب مشکل

www.urdugem.com

میں پھنسا گیا تھا مجھے یہ کم بخت کوہارا...... موذی اور عذاب جاں بنا ہوا تھا مسلسل یہ مردود میرے لیے...... بلکہ یاسمین کے لیے بھی...... اس کی روانگی یاسمین کی جان کا خطرہ اور اسس رذیل کی کامیابی تھی، جسے سبوتاژ کرنے کی میں کوشش میں لگا ہوا تھا۔

یوں میرے لیے تشویش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ...... یاسمین کی پیش کردہ معلومات کے مطابق ہماری منزل اب زیادہ دور نہیں رہی تھی۔ نوبیان کے صحرا میں تو ہم داخل ہو چکے تھے اور لکسر کا علاقہ یہاں سے بمشکل پچیس تیس کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ کوہارا کو تیز رفتار سواری میسر آ چکی تھی جبکہ میں ابھی پیدل تھا۔

اب میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ موقع ملتے ہی بلا تاخیر اس خبیث خونی درندے کوہارا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی موجودہ حرکت نے میرے دل و دماغ میں اس کے لیے نفرت وانتقام کی چنگاریوں میں اضافہ ہی کیا تھا۔

بالآخر مجھے ایک مختصر سی کچی چہار دیواری کے اندر چند اُونٹ اونگھتے ہوئے نظر آئے۔ یہ کوئی باڑا سا تھا۔ دیواریں تین چار فٹ سے زیادہ بلند نہ تھیں۔ ریتیلے تنگ راستے پر چلتا میں باڑے کے دروازے تک پہنچا۔

وہاں سال خوردہ سا چوبی پھاٹک بنا ہوا تھا جس کا ایک پٹ کہن سالی کا شکار ہو کے چوکھٹ سے اکھڑ کر ریت میں دھنس چکا تھا دوسرا کھلا پڑا تھا۔

میں پھاٹک کے پاس آیا اور اندر جھانکا، قریب ایک مطلب کے اونٹ کو تاڑا...... ''مطلب'' اس لیے کہ ایک تو اس کی قامت درمیانی تھی، دوسرے اس پر مجھے زین وغیرہ پڑی ہوئی نظر آئی تھی، پھر وہ کھڑا ہوا بھی تھا، یعنی نیم غنودہ نہیں تھا۔ شاید اس کے مالک نے کسی باعث زین نہیں اُتاری تھی۔

میں ہلکی ہلکی آواز سے اسے پچکارنے لگا۔ وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ مجھے ڈر لگا کہیں یہ آواز نہ نکالے مگر شکر تھا ایسا نہیں ہوا۔

اونٹ نے اپنا بھدا منہ گھما کر اپنی اُلسائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا ضرور تھا پھر دوسری طرف کر لیا تھا۔ میں دھیرے دھیرے اس کے قریب گیا۔ اس کی لگام پر ہاتھ رکھا اور اسے باڑے سے باہر لے آیا۔

میں اسے لے کر پیدل چند قدم وہاں تک چلا تھا جہاں کوہارا نے قدموں کے نشانات دیکھ کر اپنے سفر کی ابتدا کی تھی۔ اب میرے لیے صرف اس کی جیپ کے ٹائروں کو ہی نگاہ میں رکھنا کافی تھا۔

ایک آسانی تو میسر آ ہی گئی تھی، کیونکہ کوہارا یقیناً یاسمین وغیرہ کے قدموں کے نشانات پر ہی آگے بڑھا تھا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میرا منزل کی جانب سفر ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اُونٹ خوب سیر تھا۔ مست چال سے چلا جا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ''تھپے'' پاؤں ریت پر چلنے کے لیے ہی قدرت نے بنائے تھے۔ اسے کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ میں اونٹ کو دوڑا نہیں سکتا تھا۔

کیونکہ منزل کا پتا نہیں تھا۔ دوسرے مجھے اونٹ بھگانے کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا، بہ صورت دیگر اونٹ صحرا کا ہوائی جہاز بن جاتا اور مجھے ڈر تھا کہ میں اس پر کیا خود پر بھی قابو نہیں پا سکتا، کہیں بدنصیب پروفیسر جمشید کی طرح میں بھی اس کے پیروں تلے نہ روندا جاتا۔

مجھے ریت پر جیپ کے ٹائروں کے نشانات دیکھنے پڑ رہے تھے اس لیے بھی میں نے اونٹ کی رفتار آہستہ کر رکھی تھی۔

سفر جاری تھا۔ مجھے پہلی بار اس سارے معاملے پر کچھ غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ مثلاً اس پُراسرار مگر قسائی فطرت مصری میزان کی ہم سے (کوہارا سے) کیا دشمنی تھی؟ یاسمین کو کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ وہ اگر مصری کے ساتھی کے ساتھ گئی تھی تو کیوں؟ اس کی کیا مجبوری تھی؟ نیز مصری کے اہرامی قید خانے میں باقی لاشیں کن غیرملکیوں کی تھیں؟ کیا انہیں بھی اس خبیث نے زندہ حنوط کرنے کی سزا سے دوچار کیا تھا جیسی وہ کوہارا کو دینا چاہتا تھا۔

''سزا'' سے مجھے یاد آیا کہ وہ مصری میزبان سنکیوں کی طرح یہی بڑبڑا رہا تھا جب وہ کوہارا پر دوبارہ حنوط کاری کا عمل کر رہا تھا، اس نے اسے ''چور'' کہا تھا۔

اب یاسمین سے مل کر (اگر وہ مل جاتی) ..... ہی اس اسرار سے پردہ اُٹھ سکتا تھا۔

میرا سفر سست روی کا شکار تھا۔ دور مشرقی ٹیلوں سے صبح کاذب کی سپیدی دھیرے دھیرے نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اب تک مجھے سفر کرتے ایک یا ڈیڑھ گھنٹا تو بیت چکا تھا۔

میرے بائیں جانب کافی دور سے نظر آتی ٹمٹماتی

1987ء سے خدمت میں مصروف
پھلبہری
LEUCODERMA-VITILIGO
تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ایوارڈز ہولڈر
اجمل زیدی
ماہر برص
کے دورہ پاکستان کا مستقل پروگرام
ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD
AWARD OF BEST ACHIEVEMENT
AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مستقل پتا
مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
[illegible] چوک اسلام آباد
فون (051)32231725
موبائل 0300-8566188

پشاور
کیم فروری تا 11 فروری
کیم جون تا 11 جون
کیم اکتوبر تا 11-اکتوبر
قیام
ہوٹل امین
جی ٹی روڈ نزد [illegible] چوک پشاور
موبائل: 0300-6566188

لاہور
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر
قیام
گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-6566188

کراچی
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر
قیام
[illegible] سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نزد ریلی اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188

ملتان
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
قیام
ہوٹل سلور سینڈ
[illegible]
فون (061) 4518061-62
4582603 (0300-8566188)

UrduGem.com
ONLINE LIBRARY
www.urd gem.com

روشنیاں کسی بھرے پُرے شہر کا پتا دیتی تھیں۔ یاسمین کے مطابق لکسر دریائے نیل کے قدرے پرے تھا اور اس کے دوسرے کنارے پر قاہرہ کا شہر آباد تھا۔

جدید طرزِ رہائش کے سبب قاہرہ دریائے نیل کے کنارے تک آ گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے دوسرے کنارے پر بھی شہری طرز کی آبادیاں، جدید عمارتیں اور مشہور عجائب خانے بن گئے تھے۔ تاہم لکسر اب بھی دور افتادہ ہی کہلاتا تھا۔ وہ وہاں سے کافی دور تھا۔

صحرائے نوبیان غزہ تک چلا گیا تھا اور یہ ایران کے دشتِ لوط کی طرح خاصا طویل اور بے آب و گیاہ ویران صحرا تھا۔

بے آب و گیاہ اس ریگزار میں کہیں کہیں چھوٹے بڑے ٹیلے نظر آنے لگے تھے مگر یہ سلسلہ مختصر تھا، کہیں سوکھے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ تاہم حدِ نگاہ جیسے ریت کی دلدل دکھائی دے رہی تھی۔

دلدل اس لیے کہ کہیں کہیں اونٹ کا پاؤں بہت اندر ریت میں دھنس جاتا تھا۔ اونٹ کے اچانک جھکنے سے مجھے بھی ایک زوردار جھٹکا لگتا اور کئی بار تو میں گرتے گرتے بچا تھا۔

میں جلد سے جلد منزل کے قریب آنے کی دعا مانگتا رہا، تاکہ چلچلاتی دھوپ سے مجھے نجات ملے، کیونکہ اونٹ پر کوئی ہودہ یا کجاوہ نہیں بنا ہوا تھا۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

صبح دم کی سپید روشنی چہار سُو دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ جیپ کے ٹائروں کے نشان چونکہ تازہ تھے۔ اسی لیے کچھ آسانی ہو گئی تھی، لہٰذا میں نے جلد سے جلد منزل تک پہنچنے کے لیے اونٹ کی لگام کو مخصوص انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے اسے ذرا ”للکارا“ تاکہ وہ ذرا دوڑ پڑے۔

اونٹ کی تو جیسے دلی مراد بر آئی، اس نے دوڑ لگا دی، میں گھبرایا لیکن پھر اس کا کوہان پکڑے مضبوطی سے جما رہا۔

یہاں سے ٹائروں کے نشان قوس کی صورت میں دائیں جانب گھوم رہے تھے۔ دفعتاً میں چونکا۔ ایک جانب یہ نشانات دو ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ میں نے نجانے کیا سوچ کر اس طرف سے جانے کے بجائے لمبا چکر کاٹنا چاہا کہ ٹیلوں کے دوسری جانب نشان جاتے نظر آ جائیں گے، اونٹ کو میں نے دوسری راہ پر لگا دیا۔

یہی راستہ میری بدقسمتی ثابت ہوا۔ ایک مقام پر مناسب رفتار سے دوڑتے اونٹ نے زبردست جھٹکا کھایا۔ اس طرف شاید کچھ زیادہ گہرا گڑھا تھا کہ ریت میں اس کا اگلا دایاں پاؤں گھٹنے تک جا دھنسا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور ساتھ ہی زور سے بلبلایا۔ وہ تو خود کو بچا گیا مگر میں اس زوردار اور اچانک جھٹکے سے خود کو نہیں بچا سکا اور نیچے آ رہا۔

میرے حلق سے بلاارادہ چیخ سی خارج ہوئی، ریت پر میں منہ کے بل گرا تھا۔ سنبھلا تو اونٹ یہ جا وہ جا۔ میں ریت پر پڑا ذرا دیر کو یونہی ہانپتا رہا۔ اس کے بعد اُٹھا تو میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔

منہ میں ریت کے ذرات چلے گئے تھے بلکہ نتھنوں میں بھی کچھ ریت گھس گئی تھی۔ ناک میں سرسراہٹیں ہونے لگیں تو میں نے دو چار چھینکیں ماریں۔ سر جھاڑا اور اپنا جبہ بھی۔ اس کے بعد پیدل ہی آگے بڑھا۔

جلد ہی عقدہ کھلا کہ میں شاید منزل کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ کیونکہ ان دونوں مذکورہ ٹیلوں کو پار کرتے ہی مجھے سامنے کسی ”مختصر“ پڑاؤ کے آثار دکھائی دیے۔ مگر وہاں اُوپر گدھ منڈلا رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی، جیپ کے نشانات اسی طرف جا رہے تھے، کیا یہاں کوہارا کے ساتھی فروکش تھے؟ یہی ایک خیال ذہن میں ابھرا لیکن پھر فوراً ہی اپنے اس خدشے کو باطل قرار دے دیا۔ کیونکہ یاسمین بہرحال کوہارا کے ساتھ نہیں تھی، نہ ہی راستے میں کہیں نشانات سے یہ پتا چلتا تھا کہ راستے میں کہیں کوہارا کی کسی سے مڈھ بھیڑ بھی ہوئی تھی، اس کے پاس جیپ تھی اور وہ بہرحال مجھ سے پہلے منزل تک پہنچنے پر قادر تھا۔

پھر یہ پڑاؤ......؟ ایک سوالیہ نشان تھا۔ اسے زائل کرنے کے لیے میں محتاط روی سے بہ غور سامنے نگاہ جمائے بڑھتا رہا۔ کچھ گدھ خیموں کے قریب بھی نظر آئے۔ گدھوں کی موجودی یہاں انسانوں کی غیر موجودگی کا پتا دیتی تھی۔

وہ تین عدد سرخ اور نیلے رنگ کے کینوس خیمے تھے۔ دو بڑے اور ایک چھوٹا۔ (یاد رہے خیموں کی چادریں کبھی بھی سیاہ رنگ کی نہیں رکھی جاتیں، کیونکہ میدانی اور بارانی علاقوں میں خیمہ زن ہونا پڑتا ہے اور بارش اور بجلی کڑکنے کی صورت میں سیاہ رنگ پر آسمانی بجلی جلدی گرتی ہے)

وہاں دھواں اُٹھ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی وہاں کچھ لوگ موجود تھے اور پھر اچانک کہیں روانہ ہو گئے۔ اگرچہ ابھی تک میں نے خیموں کا اندر سے جائزہ نہیں لیا تھا۔

اچانک ایک گدھ چلّایا اور نیچی اُڑان لیتے ہوئے میرے سر سے گزرا۔ میں نے اس کی ٹھونگ سے بچنے کے لیے جھکائی دی۔

پڑاؤ میں سناٹا طاری تھا۔ ہر سُو دل دھڑکا دینے والا گہرا سکوت تھا۔ یہاں میں نے سب سے پہلے ریتیلی زمین کا جائزہ لیا۔ پتا چلتا تھا کہ جیپ یہاں رکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک دو اور گاڑیوں کی یہاں موجودی کے آثار ملے، ان کے ٹائروں کی ساخت اور تھی...... ایک طرف میں نے چوڑے مخصوص ٹائروں والی ”فور وہیل“ بائیک دیکھی۔

میں سوچنے لگا، یہ لوگ کہاں گئے؟ کیا کوہارا سے ان کی شناسائی تھی؟ یا پھر یہاں بھی مصری میزبان کی طرز کا کوئی اور پُراسرار معاملہ تھا؟

میں نے ایک خیمے کا رخ کیا۔ ابھی میں اس کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رکا۔ دو گدھ اندر ایک دوسرے سے اُلجھتے خیمے سے نمودار ہوئے۔ یہ خاصے جسیم گدھ تھے۔ ان کی سرخ سرخ گردنیں لمبی اور بالوں سے عاری تھیں۔ کھوپڑی بھی گنجی تھی۔ ایک گدھ کی چونچ میں کچھ دبا ہوا تھا۔ غور سے دیکھنے پر میں سرتاپا لرز گیا۔

اس گدھ کی مڑی ہوئی چونچ میں ایک عدد انسانی آنکھ کا ڈیلا دبا ہوا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اسے نگل گیا۔ میرے لیے وہ دہشت ناک منظر تھا۔ وہ دونوں گدھ اپنے ڈینا پر پھڑپھڑاتے ہوئے اُڑ گئے۔

میں آگے بڑھا اور خیمے کے اندر گھسا تو کیا دیکھتا ہوں، ایک جوان رعنا عورت نہایت قابلِ رحم حالت میں پڑی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں کے ڈیلے غائب تھے اور وہاں سے خون آلودہ ریشے بند پپوٹوں سے جھانک رہے تھے، پیٹ پھٹا ہوا تھا۔ اس کی جلد کی رنگت صاف اور شفاف رہی ہوگی، مگر اس وقت مردار خور گدھوں نے اسے گرسنہ چونچیں مار مار کر اس کا پیٹ اُدھیڑ ڈالا تھا۔ اس کے شہد رنگ گھنے بال زمین پر پھیلے ہوئے تھے، تاہم اس کی پیشانی پر سرخ روشن دان بھی بنا نظر آیا، صاف پتا لگتا تھا کہ اسے پیشانی میں گولی مار کے ہلاک کیا گیا تھا۔ عورت غیر ملکی لگتی تھی۔

اندر سے انتہائی ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔ میرا جی اُلٹ گیا اور میں اُلٹے پیروں باہر نکل آیا۔ مجھے قے آ گئی۔

میں نے اپنے حواس بحال کیے اور اسی طرح دوسرے نسبتاً چھوٹے خیمے کی جانب بڑھا تو وہاں ایک بوڑھے کی لاش ملی۔ اسے بھی گولی ماری گئی تھی۔ اس ننگی اور ظالمانہ بربریت پر میں ہول کر رہ گیا۔ کوہارا کے سوا یہ چنگیزیت اور کون کر سکتا تھا۔ میں نے نفرت اور غیظ آلود انداز میں ہونٹ سکیڑ کر سوچا۔

پھر جب میں تیسرے خیمے کا جائزہ لینے پہنچا تو چونک کر وہیں رک گیا۔ اندر سے کوئی زخمی حالت میں کہنیوں اور گھٹنوں کے بل پر باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی دو عدد مردار خور گدھ پھدک پھدک کر اسے ٹھونگے مارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

”پپ...... پانی......“ وہ بمشکل کراہ کے بولا۔ یہ بھی غیر ملکی تھا اور اس کا لہجہ مجھے امریکی لگا تھا۔ یہ درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ میں اِدھر اُدھر دوڑا مگر کچھ نہ ملا۔

”پانی تو نہیں ہے، یہاں تو لگتا ہے کچھ بھی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ تم کون ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”یہ یہ ظلم کس نے کیا تم لوگوں پر......؟“

اس کی سانسیں اُکھڑ رہی تھیں۔ پانی نہ ملنے کا سن کر اس پر حد درجہ مایوسی طاری ہو گئی۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ شاید اس کا منہ حلق تک سوکھ گیا تھا اور پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں تیزی سے پلٹا۔ فور وہیل بائیک کے قریب آیا۔ شکر تھا کہ مجھے سواری میسر آ گئی تھی لیکن جب میں نے بائیک پر سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کیا تو مایوسی ہوئی۔ فیول ٹینک چیک کیا تو وہ خالی تھا۔ میں نے جھلا کر اس کے سینگ نما اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔

پھر اچانک ایک خیال ذہن میں اُبھرا۔ اس طرح کی گاڑیاں رکھنے اور یہاں دور دراز کے علاقوں کا رخ کرنے والے افراد اپنے ہمراہ اضافی فیول رکھتے ہوں گے۔

میں نے ایک بار پھر ان کے پڑاؤ اور خیموں کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کی ٹھانی۔

گدھوں نے لاشوں سے ضیافت اُڑانا شروع کر دی تھی۔ میں انہیں کب تک بھگاتا۔ بھوک اور مردار شکار نے انہیں دلیر بنا دیا تھا۔ اب تو ان کی تعداد بھی زیادہ ہونے لگی تھی۔ مجھے اپنا ڈر ہوا کہیں یہ مجھ پر ہی نہ ہلّا بول دیں۔

میں نے اس بار اچھی طرح سے ایک ایک خیمے میں گھس کر جائزہ لیا۔ لیکن کچھ بھی نہ ملا۔ جب مایوس ہو کر پڑاؤ کو خیرآباد کہنے لگا تو اچانک میری نظر بجھے ہوئے الاؤ کے

www.urdugem.com

قریب ایک تین چار لیٹر کے ڈبے پر پڑی۔ میں فوراً اس کی طرف لپکا۔ اسے اُٹھا کر ڈھکنا کھولا اور سونگھا تو دل میں مسرت کی لہر اُٹھی۔ یہ فیول تھا۔ اسے شاید آگ وغیرہ جلانے کے لیے رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے تھوڑی سی مایوسی ہوئی کہ اس میں بھی بمشکل دو لیٹر ہی فیول تھا۔

بہرطور یہی غنیمت جان کر میں اسے اُٹھائے بائیک کی طرف آیا اور اس کے ٹینک میں باقی ماندہ فیول اُنڈیل دیا۔ بائیک اس مرتبہ دو تین بار کی کوشش میں اسٹارٹ ہو گئی۔ میں وہاں سے روانہ ہوگیا۔

ریت پر کوہارا کی جیپ کے ٹائروں کے علاوہ بھی دوسری گاڑی کے ٹائروں کے نشانات تھے۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا چکر تھا؟ اگر ان غیر ملکیوں کے پڑاؤ پر کوہارا نے شب خون مارا تھا تو کیوں؟

اگر ان کا ٹکراؤ اتفاقی تھا تو کوہارا کو اپنی منزل کی جانب سفر جاری رکھنا چاہیے تھا۔ آخری سوال میرے ذہن میں یاسمین اور اس آدمی کے بارے میں اُبھرا تھا جو اس کے ہمراہ تھا۔ وہ کہاں تھے؟

یہ نشانات میری رہنمائی کر رہے تھے اور میں درست سمت میں گامزن تھا۔

فور وہیل بائیک کے موٹے چوڑے ٹائر ریت میں بغیر کسی دشواری کے رواں تھے۔ مزید نصف پون گھنٹے کے بعد میں ایسے علاقے میں داخل ہوا جو مجھے ”منزل“ پر پہنچنے کا پتا دیتے تھے۔

یہاں کی ویرانی کچھ ایسی تھی کہ لگتا تھا جیسے عرصے سے یہاں کوئی انسانی آبادی تو کجا کسی نے قدم بھی نہیں رکھا ہوگا۔ چند پرانے اہرام بھی نظر آرہے تھے مگر ان کی ہیئت میں کسی روایتی قسم کی پُراسراریت مفقود تھی، لگتا ایسا ہی تھا مہم جو، طالع آزما اور ان چوروں کے ٹولے...... جو ایسے دور افتادہ اہراموں میں گھس کر فرعونی دولت اور نوادرات ہتھیانے آتے تھے، ان اہراموں کے برسوں پرانے رازوں کو بے نقاب کر چکے تھے۔

دن نکل آیا تھا۔ سورج ابھی سوا نیزے تک نہیں پہنچا تھا مگر ابھی سے ہی اس کی تمازت چہرہ اور بدن جھلسائے دیتی تھی۔

پروفیسر جمشید اور یاسمین کے ہمراہ رہتے ہوئے مجھے بھی یہاں تک کی منزل کا اندازہ ہو چکا تھا لیکن یہ کوئی زیادہ اہم بات بھی نہیں تھی، اصل منزل ابھی تک نظروں سے اوجھل تھی۔

اچانک بائیک نے جھٹکے لینا شروع کر دیے۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ فیول ختم ہونے لگا تھا۔ بالآخر بائیک کا انجن تھوڑا مزید کھانسنے کے بعد بند ہوگیا۔ بائیک رک گئی۔ میں اُتر آیا اور گردوپیش کا جائزہ لینے لگا۔

عجب ویرانی کا راج تھا چاروں طرف۔ کسی علاقے یا گم گشتہ بستی کے آثار ان چھوٹے بڑے اُدھڑے پچکے اہراموں، ٹیلوں اور سوکھے درختوں سے لگایا جاسکتا تھا۔ کہیں کہیں مجھے کسی قدیم عمارتوں کے کھنڈرات بھی نظر آرہے تھے۔

ایک مقام پر میں نے دیکھا، جیپ کے ٹائروں کے نشانات ٹھہر گئے تھے۔ جبکہ دوسری گاڑی کے نشان جو نسبتاً بڑی تھی، لگ بھگ پندرہ بیس گز آگے جا کر ایک ٹیلے کی اُوٹ میں غائب ہو رہے تھے۔

یہاں یہ لوگ تھوڑی دیر کے لیے رکے تھے۔ کوہارا کی جیپ میں شاید پھر کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی، اس کے بعد یہ لوگ دوسری مذکورہ گاڑی میں آگے بڑھے تھے تو پھر کوہارا کی جیپ کیوں نہیں نظر آرہی تھی؟ اسے تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟ یہ ایک سوال مجھے اُلجھن میں ڈال رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر جھک کر غور سے ریت پر ان نشانوں کو دیکھا تو عقدہ یہ کھلا کہ ٹائروں کے نشانات خاصے گڈمڈ ہو کر اسی ٹیلے کی آڑ میں غائب ہو رہے تھے۔ کیا جیپ کو دھکا لگایا گیا تھا یا پھر ”ٹوچین“ کیا گیا تھا؟

میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ پھر جیسے ہی ٹیلے کی آڑ میں گیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے ریتیلی ڈھلان پر جیپ ایک جانب کو جھکی ہوئی کھڑی نظر آگئی۔ وہ خالی تھی۔ میں لپک کر آگے بڑھا۔ ایک بار پھر مجھے زبردست جھٹکا لگا۔

دوسری گاڑی کھنڈرات کے قریب کھڑی تھی۔ یہ بھی جیپ ٹائپ بڑی گاڑی تھی، جس کا بیک ڈور بھی تھا۔ یہ ایک سائڈ سے جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ پتا چلا اس کا ایک ٹائر فلیٹ ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی ذی نفس نہیں نظر آتا تھا۔ میں نے کھنڈرات کی طرف دیکھا۔ اس کی ”شیپ“ ایسی نہیں تھی کہ اس پر کسی اہرام کا گمان ہوتا۔

میں چند ثانیے سوچتا رہ گیا۔ کھنڈرات میرے سامنے

تھے۔ یہاں زمین ریتیلی ہونے کے ساتھ کہیں کہیں سے سخت اور کھردری تھی۔ مجھے ایک سے زائد قدموں کے نشانات نظر آئے۔ بادِ سموم چلنا شروع ہوگئی تھی۔ نشان تازہ تھے اسی لیے صاف دکھائی دیتے تھے، ورنہ تو ہواؤں اور ریت پھیلنے سے یہ زیادہ دیر قائم نہیں رہتے اسی لیے میں نے ان کی تلاش کی کوشش تیز کر دی۔

کھنڈرات کے اندر آیا تو اس کے سال خوردہ اور منہدم در و دیوار سے عجیب سی کہنہ سالی ٹپکتی نظر آئی۔ یہ ویران تھا۔ قدموں کے نشانات اندر بھی گڈمڈ دکھائی دیے۔ اس کے بعد عقبی گوشے سے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سے دوسری طرف نکل گئے تھے۔ میں بھی یہاں سے دوسری طرف نکل آیا۔

تب ہی میں نے ایک بڑا ہیبت ناک منظر دیکھا۔ میرے سامنے تین اہرام تنے کھڑے تھے۔ قدیم مصری معماروں کی دست صناعی پیش کرتے نوبیان کے سینے پر شان سے تنے کھڑے نظر آئے۔ وہیں میں نے ایک خیمہ لگا دیکھا۔ چند لوگوں کی جھلک بھی دکھائی دی تھی۔

قربِ منزل کے جوش تلے میرا دل ہی نہیں جسم کا رُواں رُواں بھی مرتعش ہوگیا۔ میں وہیں ایک ٹیلے کی ڈھلان پر زمینی آڑ لے کر دبک گیا۔

یہ تینوں اہرام ایک دوسرے سے تقریباً پچیس اور تیس گز کے فاصلے پر تھے، ان کی بھی حالت ویسی ہی تھی جیسی کہ میں پہلے دیکھتا آرہا تھا، دو تو چھوٹے تھے اور بُری طرح اُدھڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ فرعونی دولت کے ہوس کار چور گروہوں نے ان کی خوبصورتی اور عظمت گہنا کر رکھ دی تھی۔

حالانکہ تاریخ میں یہ شواہد موجود تھے کہ ان اہراموں کو تعمیر کرنے کے بعد فرعنوں نے ان کے نکاسی کے راستے بند کر دیے تھے یا اس قدر خفیہ رکھے تھے کہ جو صرف ان کو ہی معلوم تھے۔ یعنی ایک بار جو اندر داخل ہوتا تو وہ اس کی اسرار بھری بھول بھلیوں میں کھو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج کے چوروں نے ان کی یہ ”کاری گری“ پاش پاش کر ڈالی تھی۔

تیسرا اہرام نسبتاً زیادہ اُدھڑا ہوا اور امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں مسمار شدہ بھی نظر آتا تھا۔

ایک ہی بات کا میرے ذہن نے اندازہ لگایا تھا کہ ثمانہ کا گمشدہ مقبرہ ”ڈارک گریڈ پیرامڈ“ انہی تینوں اہراموں کے کسی خفیہ تہ خانوں میں ہوسکتا تھا۔

شاید اسی لیے ان لوگوں نے یہاں اپنا ڈیرا ڈال دیا تھا اور تلاش کا کام شروع کر دیا تھا۔

میرے تو حوصلے بلند تھے۔ یہاں پہنچتے ہی میرے دل و دماغ میں [illegible] ان تینوں عجیب اور انوکھے مگر خطرناک ہتھیاروں کا تصور تازہ ہونے لگا جو شاید ثمانہ کے گمشدہ مقبرے میں اس کی ممی کے ساتھ مدفون تھے۔

بقول پروفیسر جمشید مرحوم کے ان ہتھیاروں کا ملنا ثابت کرتا ہے کہ دورِ فراعنہ اور ان عظیم الشان اہراموں کی تعمیر میں خلائی معماروں کا بھی کسی نہ کسی حوالے سے تعلق رہا تھا۔ سو تبھی کوہارا ان تینوں ہتھیاروں کو قبضہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش میں تھا تاکہ اپنے ”رینٹ منٹر“ لولوش کی خدمت میں پیش کر کے اسے ناقابلِ شکست بنا دے۔

لولوش جیسے خبیث اور شیطان صفت انسان کی طاقت کو دوچند کرنے کا بیڑا کوہارا نے اُٹھایا تھا تو میں نے بھی اب قسم کھا رکھی تھی کہ اسے اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ حالانکہ جب روڈالف نے (اور بعد میں یاسمین نے) مجھے ثمانہ سے متعلق جو صراحت بتائی تھی، اس وقت میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اور کچھ حالات کے تھپیڑوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا تو میں اسی کو قدرت کی ایک حکمت اور مشیت ایزدی ...... سمجھ کر اس مہم میں کود پڑا تھا۔

پس...... منزل سامنے تھی مگر نتیجہ ابھی آنکھوں سے اوجھل تھا۔

لب بام ان ساری باتوں کا تازہ ہونا ایک فطری عمل تھا جو چند ثانیوں کے دوران ہوا اور میرے اندر ایک نئے جوش و جستجو کو جنم دینے لگا۔

میں نے ٹیلے کی ڈھلانی آڑ پر لیٹے لیٹے چند گہری سانسیں لے کر اپنی طاقت کو مجتمع کیا، اس کے بعد دائیں جانب کو سرکا۔

اس طرف سوکھے درختوں کا جھنڈ تھا اور کچھ سوکھی جھاڑیوں کا مختصر سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

میں کسی صحرائی چھپکلے کے مانند ریت پر رینگتا ہوا ان کے خیمے کے قریب کھڑی گاڑی کی آڑ کے نزدیک پہنچ کر اپنی سانسیں بحال کرنے لگا۔ ریت گرم ہونے لگی تھی اور مجھے یہاں تک کا فاصلہ سینے اور کہنیوں کے بل پر بہت جانفشانی سے طے کرنا پڑا تھا۔

میری نظروں کے سامنے اب اس خیمے اور اطراف کا

UrduGem.com
THE ONLINE LIBRARY
www.urdugem.com

منظر واضح تھا۔ وہاں دو افراد بیٹھے دکھائی دیے تھے۔ ان میں ایک جبہ پوش تھا جو مصری ہی لگتا تھا۔ وہ خاصا گرانڈیل اور تنومند جسامت کا تھا جبکہ دوسرا ایک دبلا پتلا غیر ملکی تھا۔ اس نے نیکر اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کوئی ہتھیار ان کے آس پاس رکھا نظر نہیں آتا تھا۔ میں اُٹھا اور سیدھا ان کے پاس جا پہنچا۔

وہ دونوں ایک اجنبی کو اس طرح اچانک اپنے سامنے پاکر چونک گئے تھے۔ میں نے مصری کے چہرے کا جائزہ لیا تو چونکے بنا نہ رہ سکا۔

اس کے چہرے پر مجھے شناسائی کی جھلک محسوس ہوئی تھی اور تب ہی میری آنکھوں میں چمک اُبھری۔

حالانکہ وہ میرا شناسا نہیں تھا لیکن باوجود اس کے مجھے اس کا چہرہ شناسا اس لیے محسوس ہوا تھا کہ اس کی شبیہ اس مصری میزبان سے کافی ملتی جلتی تھی۔ پل کے پل مجھے یہ سمجھنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ یہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ یاسمین گزشتہ رات پُراسرار حالات میں روانہ کردی گئی تھی۔

وہ مصری مجھے دیکھتے ہی کچھ ایسے ہی انداز میں چونکا تھا اور گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دوسرا غیر ملکی میری طرف دیکھ کر حیرانی سے بولا۔

”اے مسٹر! تم کون ہو؟“ اس کا لہجہ امریکی تھا۔ یہ مجھے انہی کا ہی ساتھی محسوس ہوا تھا جن کے پڑاؤ کو میں عبرت ناک حالت میں دیکھ کر آرہا تھا۔ الجھنیں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔

میں نے جواب میں رکھائی سے کہا۔ ”میں اپنی ایک ساتھی خاتون کی تلاش میں ہوں۔ راستے میں مجھے ایک پڑاؤ ملا تھا۔ کیا تمہارا تعلق انہی لوگوں سے تھا؟“

پڑاؤ کے حوالے پر وہ بُری طرح چونکا اور اس نے قریب کھڑے اس مصری کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا جس کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں ہنوز میرے چہرے کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔

”تمہاری ساتھی کا نام یاسمین تو نہیں؟“ بالآخر اس نے کہا۔

”بالکل یہی نام ہے اس کا، کہاں ہے وہ اور یہ سب کیا چکر ہے؟“ میں اس کی طرف دیکھ سنجیدگی سے بولا تو اس بار اس مصری نے دبلے پتلے امریکی کی طرف کچھ ناگواری نظروں سے گھور کر جیسے اسے سرزنش کی۔

”تم چپ رہو مسٹر ریلے! مجھے بات کرنے دو۔“ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا پھر میری جانب متوجہ ہوکر بولا۔

”پہلے تم میری بات کا جواب دو۔ مسٹر! میرے بھائی فس کو تم نے کیوں قتل کیا؟“

اس کی بات پر میں بُری طرح چونکا۔ تو یہ اس مصری کا بھائی تھا اور اس کا نام ہی شاید خس تھا۔ اس کے سوال میں ہی مجھے کئی جواب ازخود مل گئے۔ کوہارا بدبخت نے حقیقت کو چھپاتے ہوئے جھوٹ سچ سے کام لیتے ہوئے اسے میرے خلاف ورغلایا تھا، مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر کوہارا نے پھر اسے کس طرح رام کرلیا تھا؟

کیونکہ یہ بھی تو اسی کے بھائی کی قید میں تھا۔ یا پھر اس وقت تک معاملہ کچھ اور رہا تھا دونوں کے درمیان؟ لہٰذا میں نے بھی چالاکی سے کام لیا بولا۔

”کون خس؟ کون تمہارا بھائی؟ میں کیا جانوں کہ تم کون ہو......؟ میں تمہیں جانتا تک نہیں اور تم ایک قتل کا الزام میرے سر تھوپنے کی کوشش کررہے ہو؟“

”زیادہ چالاک مت بنو۔“ وہ غرایا۔ ”مجھے تمہارے اس موٹے ساتھی کوہارا نے سب بتا دیا ہے۔“

میں تھوڑی دیر خاموش رہا اور اس کی ڈھٹائی پر دل ہی دل میں تلملانے لگا پھر طنزیہ کاٹ سے بولا۔

”تم اتنے انجان تو نہیں ہو جتنا بننے کی کوشش کررہے ہو جبکہ تم مجھے پہچان بھی چکے ہو کہ میں کون ہوں اور اس شخص کو بھی جس کا ابھی تم نے نام کوہارا بتایا۔ تمہارے بھائی خس (مصری میزبان) نے کوہارا کو زندہ ممی میں تبدیل کردیا تھا، تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ وہ کس طرح تمہارے بھائی خس کی قید سے نکلا؟“

میری بات پر وہ جبہ پوش مصری تھوڑا الجھا سا ہوا مگر پھر اسی اکھڑپن اور ڈھٹائی سے بولا۔ ”میرے بھائی خس کو ان لوگوں سے نفرت ہے جو یہاں مصر کی سرزمین پر چوری کی نیت سے داخل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم ”طلموس“ کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اہراموں کو چوروں کی دست بُرد سے بچانا ہمارا فرض چلا آرہا ہے۔“

”سنو میری بات غور سے......“ میں نے اس بار کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور پھر مختصر الفاظ میں اسے اصل حقیقت سے بھی آگاہ کردیا۔

”یہ تھا اصل سچ...... اب تمہیں اگر پھر بھی میری باتوں پر یقین نہیں آرہا ہے تو پھر اپنا راستہ ناپو کیونکہ میں تمہاری اور تمہارے بھائی فس کی اصلیت بھی جان چکا ہوں۔“ میں نے اصل حقائق کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دیا تھا تاکہ اسے اپنی صورت بھی دکھائی دے جائے۔

”اور...... تم!“ میں نے آخر میں اس نیکر پہنے امریکی سے مخاطب ہوکر کہا۔

”میری بات اور اس کی اصل حقیقت سمجھ سکتے ہو۔ مسٹر ریلے! وہ یہ کہ...... کوہارا نامی جس آدمی کے ساتھ تم یا تمہارے ساتھی ہیں وہ ایک خونی اور بے رحم انسان ہے۔ تم کیوں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے ہو اور وہ کہاں ہے اس وقت؟“

”یہ تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہے مسٹر شہزادا!“ وہ مصری پھر اکھڑپن سے بولا۔ مجھے اس کی دوبارہ مداخلت پر طیش آگیا تاہم میں چونکا بھی کہ اسے میرا نام بھی معلوم ہوچکا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ریلے نے اسی مصری کو اس بار سخت برہمی سے کہا۔

”تم اب خاموش رہو اور مجھے بات کرنے دو۔“ پھر جب وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا تو اس کا لہجہ دوستانہ تھا۔

”مسٹر شہزادا! تمہاری باتیں بالکل درست ہیں۔“ پھر اس نے ایک لمحہ رک کر اس مصری کی طرف تلخ نظروں سے دیکھا اور مزید کہا۔

”یہ تمہیں اصل حقیقت کیا بتائے گا، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ......“ اس کی بات درمیان میں رہ گئی، یہی وہ وقت تھا جب خس کا گرانڈیل بھائی حرکت میں آیا اور اس نے دبلے پتلے ریلے کو گردن سے دبوچ لیا۔ دوسری حرکت میں نے کی تھی اور اس گرانڈیل مصری پر چیتے کی طرح جھپٹا تھا۔ اس نے مجھ پر لات چلانے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا اس کے پیٹ پر رسید کردیا۔ یہ ضرب خاصی شدید تھی۔ مصری کے حلق سے زخمی اونٹ جیسی بلبلاتی آواز خارج ہوئی اور اس نے ریلے کی گردن چھوڑ دی۔

وہ اپنا دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے جھکا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اسی طرح جھکے ہوئے میرے پیٹ پر اپنے سر کی ٹکر رسید کردی۔ میں چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا اور گر پڑا۔ مصری خونخوار انداز میں غراتا ہوا دوبارہ مجھ پر جھپٹا اور چاہتا تھا کہ میرے سینے پر سوار ہوجائے کہ میں زمین پر لیٹے لیٹے تڑپا اور اپنی جگہ چھوڑ دی، وہ اس خالی جگہ پر سینے کے بل گرا اور اس کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی۔ میں نے تڑپ کر اس پر جھپٹا مارا اور پشت پر سوار ہوگیا۔ میں چاہتا تو ایک جھٹکے سے اس کی گردن کا منکا توڑ سکتا تھا مگر میں بلاوجہ خون خرابے کا قائل نہ تھا۔ میں نے البتہ اس کی گدی پر کراٹے کی طرز کا بھرپور وار کرکے اسے ساکت کردیا۔

دبلا پتلا امریکی آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ہانپتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا اور ریلے سے بولا۔

”ہاں! مجھے بتاؤ یہ سب کیا چکر ہے؟ لگتا ہے تم کچھ حقیقت جانتے ہو؟“

”میں بہت کچھ جانتا ہوں اور تم ہی وہ انسان ہو جو یقیناً ہماری مدد کرسکتے ہو۔“ وہ ایک دبے دبے جوش مسرت تلے بولا۔

”وہ خونی درندہ جس کا نام کوہارا لیا جارہا ہے۔ اس نے میرے ساتھیوں سے ساز باز کررکھی ہے۔ وہ سب اس اہرام کے اندر داخل ہوچکے ہیں۔“ اس نے اپنے عقب میں سینہ تانے کھڑے اہرام کی جانب اشارہ کیا۔

”کیا یہی ڈارک گرینڈ پیرامڈ ہے، جس کے کسی خفیہ تہ خانے میں ثمانہ کا صدیوں پرانا گمشدہ مقبرہ موجود ہے؟“ میں نے پوچھا تو ریلے کا چہرہ ایک بار پھر حیرت کی تفسیر پیش کرنے لگا۔ اسی لہجے میں بولا۔

”مائی گاڈ! تم تو سب جانتے ہو! وہ لڑکی یاسمین یقیناً تمہاری ساتھی ہوگی۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا ہے...... یہی وہ پیرامڈ ہے جس کی تلاش میں ہم یہاں تک پہنچے ہیں۔“

”تم لوگ کون ہو اور کوہارا کے ساتھ اندر کون کون گیا ہے؟“

جواب میں وہ اپنے سوکھے پڑتے ہونٹوں پر بار بار زبان پھیرنے لگا۔ وہ مجھے ایک دم پُرجوش سا نظر آنے لگا تھا۔ بولا۔

”میں تمہیں سب بتادوں گا، آؤ یہاں بیٹھو۔ لیکن پہلے اس موذی کا بندوبست کرنا ہوگا۔“ اس نے گرانڈیل مصری کی جانب اشارہ کیا جو زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔

”اگر اسے ہوش آگیا تو یہ مصیبت پیدا کردے گا۔ میرے پاس رسی ہے۔“ وہ بولا۔ ”آؤ میرے ساتھ......“ کہتے ہوئے وہ خیمے کے اندر مڑا، کیونکہ ہم سرے پر ہی

UrduGem.com THE ONLINE LIBRARY

www.urdugem.com

کھڑے تھے۔ میں بھی اس کے پیچھے اندر آ گیا۔

سوائے چند ضروری اشیا کے اور کوئی قابل ذکر شے دکھائی نہیں دی تھی، لہٰذا دوسری پارٹی سے متعلق مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجرمانہ طرز کی نہیں ہو سکتی تھی۔

اس نے ایک طرف کونے میں رکھے عمومی ساز و سامان میں سے ایک مضبوط سی ڈوری نکالی اور پھر ہم دونوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

میں جلد از جلد اس اہرام کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ اندر کوہارا ابھی موجود تھا اور یاسمین بھی۔ یوں اس کی جان کو سخت خطرہ تھا۔ کوہارا اس کے لیے کسی وقت بھی ملک الموت بن سکتا تھا۔ لیکن حقائق جانے بغیر میرا ہر قدم اندھی کھائی پر بھی پڑ سکتا تھا۔

''مسٹر ریلے! اندر میری ساتھی کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ لہٰذا مجھے جلد سے جلد حقائق سے آگاہ کر دیں کہ اندر کتنے لوگ موجود ہیں اور میں انہیں کہاں اور کیسے تلاش کر سکتا ہوں۔''

''تم اندر یوں بھی نہیں جا سکتے مسٹر شہزادا!'' ریلے ...... دھوپ سے بچ کر خیمے کے ایک کونے میں بچھے کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر جا بیٹھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مجھے پیاس لگی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے ایک چھاگل سی تھمائی تھی۔ اس میں بھی پانی بس چند گھونٹ ہی تھا، میں نے بس اپنا منہ اور حلق ہی تر کیا تھا اور اسے واپس لوٹا دی۔

''اندر خطرناک بھول بھلیاں ہیں۔ بے شمار گڑھے ہیں اور تیزابی نوعیت کا رساؤ ہے۔ کسی کی رہنمائی کے بغیر تمہارا اندر جانا اپنی موت کو آواز دینے کے مترادف ہو گا۔''

''لیکن پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو گا؟ اندر اگر میری ساتھی کے علاوہ تمہارا بھی کوئی ساتھی موجود ہے تو کوہارا اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ اپنا مطلب پورا ہوتے ہی وہ ذلیل کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' میرے لہجے میں پریشانی اور تشویش تھی۔

''اندر میرے دو ساتھی ہیں۔ ایک پروفیسر ڈین گروبن اور دوسرے ڈاکٹر ہیراللہ، وہ ایک اناٹومسٹ (Anatomist) اور فزیالوجسٹ ہیں جبکہ پروفیسر ڈین گروبن ماہر فلکیات اور آرکیالوجسٹ ہیں۔'' وہ بتانے لگا اور میں پورے دھیان سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

''میں ڈاکٹر ہیراللہ کا اسسٹنٹ ہوں۔ ہمارے تین ساتھی اور تھے جن میں ایک عورت بھی تھی، لیزا، وہ پروفیسر ڈین گروبن کی اسسٹنٹ تھی، ہم ایک امریکی تحقیقاتی ادارے ڈسکور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک عرصے سے جرمن اور دیگر مغربی ٹی وی چینل سے ثمانہ کی ممی سے متعلق خبریں اور تحقیقی رپورٹس نشر کی جا رہی تھیں۔ جس نے ایک بار پھر طالع آزماؤں کو مصر کا رخ کرنے پر مجبور کیا۔ لہٰذا ثمانہ کے مقبرے کی تلاش میں ہم اپنی ٹیم کے ساتھ پچھلے ایک ہفتے سے قاہرہ کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے، ہمارا طیارہ چارٹرڈ تھا اور ادارے نے ہی ہمیں یہ سہولت مہیا کی تھی۔ وہ قاہرہ کے ائرپورٹ شٹل پر موجود ہے۔ یہ دورہ مکمل طور مصری حکومت سے اجازت نامہ حاصل کر کے کیا گیا۔ نوبیان کے صحرا تک قاہرہ سے کرائے کی گاڑیاں حاصل کی گئیں اور نوبیان تک کا سفر انہی گاڑیوں کے ذریعے کیا گیا۔''

وہ ایک ثانیے کے لیے ٹھہرا، میں ہونٹ بھینچے اس کی بات غور سے سنتا رہا۔ ابھی تک اس کے منہ سے میرے مطلب یا دلچسپی کی کوئی بات برآمد نہیں ہوئی تھی۔

''پھر اس کے بعد......'' وہ آگے بتانے لگا۔

''گزشتہ شب جب ہم سونے کی تیاری میں مصروف تھے۔ دو اجنبی افراد نے ہمارے پڑاؤ کا رخ کیا۔ اس میں ایک تو مقامی باشندہ تھا دوسری ایک خوبصورت خاتون تھیں۔ اسی کا نام یاسمین تھا اور اس کے ساتھی مصری کا ہاموس...... وہ یہی بدبخت ہے۔'' اس نے قریب بے ہوش اور رسن بستہ حالت میں پڑے خمس کے بھائی کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاموس شاید تمہاری ساتھی یاسمین کو اس کی مرضی کے بغیر لکسر کی جانب ہی لے جا رہا تھا۔ یا پھر ان دونوں کے درمیان پہلے سے ہی کوئی معاہدہ طے پایا ہوا تھا، باتوں کے دوران جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ ایران کے ایک مشہور اسکالر پروفیسر جمشید حمیدی کی بیٹی ہے تو ڈاکٹر ہیراللہ اور پروفیسر ڈین گروبن بہت متاثر ہوئے کیونکہ وہ دونوں بھی پروفیسر جمشید سے واقف تھے۔

''محترمہ یاسمین نے ہمیں حقیقت بتائی کہ اس کا ایک پاکستانی ساتھی شہزاد احمد خان...... ابوسر کی کسی بستی میں سخت زخمی حالت میں موجود ہے اور وہ اس کی حفاظت اور شفایابی کے لیے خمس کی بات ماننے پر مجبور ہوئی ہے۔ خمس کی حقیقت سے یاسمین نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ خود کو طلطوس کی قدیم نسل سے بتاتا ہے۔ اسے لوگوں سے سخت نفرت ہے جو تحقیق اور مہم جوئی کی آڑ میں یہاں (مصر) آ کر اہراموں کی کھدائی کرتے اور اسے نقصان پہنچاتے ہیں، وہ انہیں چور سمجھتا ہے جو ان اہراموں سے قیمتی نوادرات اور دولت چرا کر لے جاتے ہیں۔ اس نے ایسے لوگوں کو سزا دینے کے لیے ہی اپنا ایک اہرام نما مقبرہ بنا رکھا ہے اور جو اس کے نرغے میں پھنستا ہے، وہ انہیں سزا کے طور پر زندہ مومیا دیا کرتا ہے۔ لیکن جب ہم نے اسے یہ بتایا کہ ہمیں کسی دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے بلکہ ہم واقعی ثمانہ نام کی ایک ممی کے گمشدہ مقبرے کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جسے لکسر کے لوگوں نے بنتِ نیل کا خطاب دے رکھا تھا۔

''تب اس کی بات پر خمس چونکا، کیونکہ وہ خود بھی ثمانہ کی ممی کو بازیاب کرنا چاہتا تھا کیونکہ ثمانہ کی روایتی کہانی وہاں کے عام باشندوں کے لیے محض فسانہ طرازی سہی لیکن طلطوس کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ اسے حقیقت ہی سمجھتے تھے۔ وہ اسے دیوی کا درجہ دیتے تھے۔ یہ روایت طلطوس نسل میں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ وہ اس کے نام کا باقاعدہ چرچا کرتے ہوئے اسے چاند کی دیوی...... ''ہاموس'' کا نام دینا چاہتا تھا۔ اسی نام سے وہ لکسر میں ایک مندر بھی تعمیر کرانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ مگر اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ اس کی دریافت کے بعد اس کی ممی کو کہیں نہیں لے جانے دیں گے، یاسمین نے اسے تسلی دی کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے وہ تو بس اپنے مرحوم باپ کی یہ خواہش پوری کرنا چاہتی ہے کہ ثمانہ کی ممی کی دریافت و بازیافت کا سہرا ان کے سر رہے۔ خمس اس سے مطمئن بھی ہوا اور خوش بھی کہ یاسمین ان کی ''دیوی'' کا کھوج لگانے آئی تھی، البتہ یاسمین نے کوہارا کے متعلق اسے بتا دیا تھا کہ وہ ان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ایک خطرناک عالمی مجرم کا دستِ راست ہے اسی کے ایما پر ثمانہ کی ممی مدفن نوادراتی خزانوں کو چرانے کی نیت سے آیا ہے۔

''لہٰذا خمس نے کوہارا کو کوئی دوا پلا کر بے ہوش کر دیا اور اس کے ساتھی یعنی یاسمین کے ساتھی تمہارا اس نے ذبح کیا۔ خمس نے البتہ اپنے چھوٹے بھائی ہاموس کو یاسمین کے ساتھ لکسر کی جانب ایک اونٹ پر روانہ کر دیا۔

''اب خدا جانے یاسمین کا اصل مقصد کیا تھا، مگر بہرحال یہ مہم ڈین گروبن ڈاکٹر ہیراللہ کو مشترکہ محسوس ہوئی، کیونکہ ہم خود بھی گزشتہ پندرہ روز سے یہاں ڈارک گریڈ ہیراللہ کی تلاش میں خاک چھانتے پھر رہے تھے۔ بہرحال اب ایک مسئلہ پیدا ضرور ہوا کہ...... وہ دونوں ثمانہ کی لاش پر تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ آیا کیا واقعی ان مفروضات میں کوئی حقیقت بھی تھی یا نہیں کہ ثمانہ کا باپ درحقیقت ایک خلائی انسان تھا؟

''اس تحقیقاتی پارٹی کا سربراہ ایک امریکی ماہر فلکیات پروفیسر ڈین گروبن تھا، جس کی شکاگو میں ایک بڑی رصدگاہ تھی۔ اس کے مطابق وائٹ گلیکسی مریخ کے قریب ترین تھی اور سیارہ ''زوٹون'' بھی اجرامِ فلکی کی رو سے اسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ جس طرح مریخ میں زندگی کے آثار دیکھے گئے تھے اسی طرح زوٹون میں بھی ہو سکتے تھے۔ وہ ثمانہ کی ممی پر تحقیق کرنا چاہتا تھے۔ اسے معلوم تھا کہ مبینہ طور پر ثمانہ کا باپ ایک خلائی انسان تھا۔ اس نے اپنے ساتھ ایک فرنچ پروفیسر ڈاکٹر ہیراللہ کو بھی ملایا ہوا تھا جو میڈیکل بیالوجسٹ تھا۔ اناٹومی اور فزیولوجی میں پی ایچ ڈی بھی تھا۔ وہ ثمانہ کی ممی (لاش) پر یہ تحقیق کر کے اس امر کا یقین کرنا چاہتے تھے کہ آیا اگر واقعی ثمانہ کا باپ ایک خلائی انسان ''وائٹ گلیکسی'' سے تعلق رکھنے والے سیارہ زوٹون'' سے تعلق رکھتا تھا تو یقیناً ثمانہ کی ممی کے توسط سے حاصل ہونے والے ڈی این اے سے اس کی نشانیاں ملیں گی۔ اس طرح سیارہ زوٹون کی بھی تلاش ممکن ہو سکے گی۔

''مگر اب یہاں مسئلہ ہاموس کا پیدا ہوتا تھا کہ اسے کس طرح رام کیا جائے؟ ابھی یہ سب سوچ بچار جاری تھی کہ کوہارا بھی وہاں آن ٹپکا۔ تب تک ہاموس کو یاسمین سمیت ان سب پر شبہ ہو چکا تھا کہ یہاں کھچڑی اور پکنے لگی ہے۔ اس نے یاسمین کو سختی کے ساتھ انہیں چھوڑ کر روانہ ہونے کا کہا، مگر یاسمین اسے بہلائے ہوئے تھی اور تسلیاں دے رہی تھی کہ اس مہم میں جتنے ماہرین ساتھ ہوں اتنا ہی بہتر ہو گا۔ اسی دوران کوہارا وہاں آن ٹپکا...... اس کی جیپ کا فیول ختم تھا اور اسے مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن جیسے ہی وہ وہاں مدد کے لیے پہنچا تو ہاموس اسے پہچان گیا اور یاسمین بھی اسے دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئی۔

''کوہارا بہت مکار تھا۔ اس نے یہی بتایا کہ ثمانہ کے گمشدہ مقبرے کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہونا چاہیے، جبکہ یہ دونوں یاسمین اور ہاموس اس کے مددگار تھے جو اسے دھوکا دے کر منزل کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ البتہ کوہارا کو یہاں دیکھ کر یاسمین کو تمہارے بارے میں

www.urdugem.com

تشویش اور فکر ہوئی۔ کوہارا نے اسے تسلی دینی چاہی مگر وہ اس پر بھروسا کرنے پر تیار نہ تھی۔ ہاموس اور یاسمین سمیت ہم سب نے کوہارا کو دھتکار دیا اور اس کی مدد کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

''کوہارا بظاہر تو لوٹ گیا مگر پھر اس نے بے خبری میں اچانک ہم پر وار کر دیا۔ ہمارے ساتھی مارے گئے، اس کے بعد وہ یاسمین کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کرنے لگا تو اس نے کہا کہ وہ ڈاکٹر ہیر اللہ اور پروفیسر ذین کو بھی ساتھ رکھے گی۔ اس مہم میں اس تجربہ کار پارٹی کا ساتھ ہونا لازمی ہے۔ انہیں صرف ثمانہ کی ممی سے مطلب ہے جبکہ کوہارا کا ثمانہ کے مقبرے سے دلچسپی کا تعلق محض وہاں مدفن خزانے سے تھا۔''

ریلے ایک بار پھر سانس لینے کو رکا۔ میں جانتا تھا کہ کوہارا کا مقصد کیا تھا۔ اسے خزانے وغیرہ سے تو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ اس کا مقصد ان ہتھیاروں سے تھا جن کے حصول کے لیے اس مردود نے اب تک کشت و خون کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

ریلے آگے بتانے لگا۔ ''ہاموس اور کوہارا کی آپس میں نہیں بن رہی تھی۔ ان کے بیچ وجہ تنازعہ کیا تھا، یہ کسی کو نہیں معلوم تھا اور ہم سے چھپایا بھی جا رہا تھا۔ (یہ وجہ صرف ہمیں معلوم تھی)

''کوہارا نے ہاموس کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش چاہی تھی، مگر وہ بچ گیا۔ تاہم پھر ایک ہی مفاد ہونے کے سبب اور کچھ یاسمین کے سمجھانے بجھانے سے بظاہر معاملہ رفع دفع ہو گیا، کیونکہ اب سب کی منزل ایک ہی تھی اور آپس کی لڑائی کی صورت میں ان سب کی محنت اور مہم ناکامی سے دوچار ہو سکتی تھی پھر کسی کے ہاتھ کچھ نہ آتا۔

''ہاموس اس وقت شاید مصلحتاً خاموش تو ہو گیا تھا مگر اس کے دل میں کچھ اور ہی کھچڑی پک رہی تھی۔ بہرحال اب یہ سب لوگ یہاں پہنچ چکے تھے اور ڈارک گریٹ پیرامڈ کے اندر قسمت آزمائی میں مصروف تھے۔ مجھے اور ہاموس کو یہاں موجود رہنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ لیکن ہاموس بضد تھا کہ وہ بھی ان کے ہمراہ اندر جائے گا۔ ابھی ہم دونوں میں یہی بحث ہو رہی تھی کہ تم آ گئے۔''

ریلے اپنی بات بتا کر خاموش ہو گیا۔ تب میں نے بھی اسے جلدی جلدی ہاموس، اس کے بھائی خمس اور کوہارا سے متعلق اسے بتا دیا، وہ بے حد حیران ہوا اور تشویش زدہ بھی..... پھر ایک طرف کونے میں بے سدھ رن بتہ پڑے ہاموس کی طرف دیکھ کر مجھ سے تشویش سے بولا۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا مسٹر شہزاد کہ تم آ گئے۔ ورنہ ہاموس سے مجھے یہاں جان کا خطرہ تھا۔''

''مگر اس سے زیادہ بڑا خطرہ کوہارا کی صورت میں اندر ابھی موجود ہے۔ ہمیں اندر جانا ہوگا۔'' میں نے جوشیلے لہجے میں کہا اور ریلے نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ پھر وہ خیمے سے کچھ مختصر سا ضروری سامان وغیرہ سمیٹنے لگا اور میں جب تک اس پُرہیبت اہرام کا قریب سے جائزہ لینے لگا۔

مٹیالے رنگ کے اس اہرام کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ہمارے علاوہ بھی کئی مہم جو پارٹیاں یہاں آ چکی تھیں۔ کیونکہ اہرام کی مخروطی در و دیواریں امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چوروں اور دیگر لوگوں کی دست برد کے باعث چھوٹے بڑے رخنوں اور آدم گزار سوراخوں سے اٹی پڑی تھیں۔

ذرا دیر بعد ریلے ایک چھوٹا سا تھیلا سنبھالے میرے قریب آ کر بولا۔ ''مسٹر شہزی! میں تیار ہوں، اندر کافی تاریکی ہو سکتی ہے، ایک ٹارچ آپ بھی پکڑ لیں۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک درمیانے سائز کی ٹارچ مجھے تھما دی۔ اس کے بعد ہم ایک بڑے سے سوراخ سے اس عظیم اہرام کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

میں نے جیسے ہی اس عظیم اہرام کے اندر قدم رکھا تو اچانک میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہونے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے وقت نے مجھے ہزاروں سال پیچھے دھکیل دیا ہو۔ قلوپطرہ اور دورِ فراعنہ کا جاہ و حشم، ساحری جادوگروں کی اسراریت، فرعون بادشاہوں اور ان کی ملکاؤں کے شاہانہ و پُرہیبت دربار......

ابھی ہم اہرام کے ابتدائی گوشے میں کھڑے تھے۔ یہاں سے باہر کی روشنی مختلف روزنوں اور سوراخوں سے اندر داخل ہو رہی تھی — اسی لیے اندرونی منظر میری آنکھوں کے سامنے روشن تھا۔

مجھے بوسیدہ دیواروں پر عجیب و غریب اشکال اور رسم الخط میں کچھ تحریریں بھی نظر آئیں۔ ایک دیوار پر قطار در قطار چھوٹی سائز کی تصویریں بنائی گئی تھیں۔ ریلے نے بتایا کہ یہ بھی ایک قدیم اور تصویری مصری زبان ہے۔

اس کے بعد ہم ان راستوں پر آگے بڑھنے لگے جن کے مطابق بقول ریلے کے ہمارے ساتھیوں نے اندر جانے سے پیچھے اپنی کچھ نشانیاں چھوڑ رکھی تھیں تاکہ واپسی میں انہیں کوئی دشواری نہ ہو اور ہم انہی نشانیوں کی مدد سے ان کے تعاقب میں آگے بڑھنے لگے۔ یوں بھی عموماً مہم جو پارٹیاں ایسا ہی کرتی تھیں، تاکہ اہراموں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے انہوں نے عام سا سفید پاؤڈر اور چونے کا استعمال کر رکھا تھا۔

ہم انہی کی نشانی پر آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے اطراف میں اُدھڑے ہوئے سنگی مجسمے اور کہیں مکڑی کے جالے تنے ہوئے تھے۔ زمین کھردری اور پتھریلی تھی۔ دائیں بائیں منہدم دیواریں اور کہیں بڑے سوراخ تھے۔ ہمیں ان میں سے بھی گزرنا پڑتا تھا۔ یوں ہم جیسے جیسے بعید زین گوشے میں جا رہے تھے تاریکی بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ ایک مقام پر مسٹر ریلے نے ٹارچ روشن کر دی اور میں نے بھی کیا۔

جلد ہی ہمیں احساس ہوا کہ ہم اب نیچے کی طرف جانے لگے ہیں، یہ تصور کرتے ہی ہمارا سفر اس پُرہیبت اہرام کے تہ خانے کی طرف جاری تھا، مجھے وجود میں ہلکی سی کپکپی کا احساس ہوا تھا۔

اچانک ایک دیوار پر میری ٹارچ کا ہالہ پڑا۔ دو پُرہیبت مجسمے مجھے گھورتے دکھائی دیے۔ یوں جیسے ہمیں اپنی صدیوں پرانی عمل داری میں داخل ہوتا پا کر برہم ہوں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ والوں نے اس کے قریب انگریزی میں ان دونوں مجسموں سے متعلق تحریر لکھ چھوڑی تھی۔ میں رک کر اسے پڑھنے لگا۔

''یہ پتھریلے تابوت ہیں، سیاحوں کی دلچسپی کے لیے ان میں سے ممیاں نکال کر سجائی گئی ہیں۔ راعموسا سی اور اس کی محبوبہ کپکاش۔'' یہ پڑھ کر ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم اب نیچے کی طرف سفر کر رہے تھے اور ہمارے اطراف میں گھور تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی غنیمت تھی ورنہ تو اس غضب کی کالی بھٹ تاریکی کے باعث ہم کسی گڑھے میں بھی جا گرتے۔ یہاں آس پاس گڑھے بھی تھے جن کی دیواروں سے نکیلے پتھر نکلے ہوئے تھے۔

ہمیں کچھ گھٹن اور آکسیجن کی کمی کا احساس ہونے لگا۔ سفید چونے کے نشان ہماری رہنمائی کر رہے تھے۔

''اور کتنا آگے جانا ہوگا، مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' ریلے نے ایک جگہ پتھریلی دیوار سے ٹیک کر مرتعش سے لہجے میں کہا۔ ''پپ... پتا نہیں کیوں سردی سی لگ... رہی ہے اب......''

وہ خوف زدہ سا ہو رہا تھا، حقیقت یہ تھی کہ خود میرے دل میں بھی ہول سے اُٹھ رہے تھے۔ کسی اہرام کے اندر اور پھر اس کے تہ خانوں میں اُترنے کا یہ میرا بھی پہلا تجربہ تھا۔ اس کی یہ بات بھی درست تھی کہ یہاں ایک عجیب سی ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔ یہاں آواز بھی گونج رہی تھی اور ایک عجیب سا ''ایکو ساؤنڈ'' پیدا کرتی محسوس ہوتی تھی۔

مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ دبلا پتلا مسٹر ریلے اتنا بزدل ثابت ہوگا۔ تاہم میں ابھی اس سے حوصلے کے چند الفاظ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ایک تیز چیخ اُبھری۔ ریلے لرز گیا اور میرے ساتھ چپک گیا۔ خود میں بھی دہل سا گیا تھا۔

''یہ یہ...... چیخ...... کس کی تھی؟'' ریلے کانپتی آواز میں بولا۔ وہ بالکل ہی بودا ثابت ہو رہا تھا، بھلا میں کیا جانتا۔ میں نے چیخ کی سمت روشنی پھینکنے کی کوشش چاہی تھی کہ اسی وقت پھڑ پھڑاہٹ کی آواز اُبھری..... ایک غیر معمولی جسامت کی بڑی سی چمگادڑ میرے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے یک دم جھکائی دی۔ وہ کہیں تاریکی کے بطن میں غائب ہو گئی۔

''یہ یہ..... چیخ یقیناً کسی بدروح کی ہوگی، اور یہ چمگادڑ کے روپ میں......''

''خاموش......'' میں نے اسے چپ کرا دیا۔ ''حوصلہ کرو ریلے! تم تو ایک ڈاکٹر کے اسسٹنٹ ہو، جو خود بھی یہاں کہیں موجود ہے۔ دلیر بنو، چلو آگے بڑھو، بدروح کا کوئی تصور نہیں۔''

میں نے اسے سمجھایا۔ اسے حوصلہ ہوا لیکن میں ابھی تک اس چیخ پر اُلجھا ہوا تھا۔ چیخ کے آہنگ سے میں ابھی تک یہ اندازہ نہیں لگا پایا تھا کہ وہ مرد کی تھی یا عورت کی۔

ہم پھر آگے بڑھنے لگے۔ جلد ہی ہمارے قدم ایسی کھردری اور ناہموار زمین سے لگے جس سے اندازہ ہوا کہ یہ کسی ہال کا فرش ہو۔ میں یہاں ٹھہر گیا اور اطراف میں روشنی پھینکی۔

یہ کچھ کھلی جگہ تھی، مگر یہاں بھی وہی متروکہ نقش و نگار کندہ نظر آئے۔ کچھ فحش قسم کی تصاویر یں بھی کندہ تھیں۔

جس میں فرعونی بادشاہوں کو اپنے حرم کی عورتوں اور کنیزوں سے بوس وکنار اور اسی طرح کی اٹکھیلیاں کرتے دکھایا گیا تھا۔ شاہانہ لباس میں ایک ملکہ بھی دکھائی گئی جو دو کالے غلاموں کے ساتھ ”مشغول“ تھی۔ کچھ عجیب الخلقت جانوروں کی بھی تصاویر نظر آئیں۔

ہم سفید چونے اور پاؤڈر کی نشانی پر آگے بڑھے، لیکن ابھی ایک قدم ہی اُٹھایا تھا کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے لمبا سا سانس کھینچا ہو... میں ٹھٹک کر رکا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

”کک... کیا پھر کچھ ہوا؟“ ریلے خوف سے منمنایا۔

میری توجہ آواز کی طرف تھی۔ میں ابھی اس کی سمت جانچنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک...... دوسری لمبی سانس اُبھری اور ساتھ ہی کوئی کراہا۔ میں نے ایک دم دائیں جانب گردن گھمائی اور ٹارچ کی روشنی بھی اس طرف پھینکی۔ منظر روشن ہوگیا، جس نے مجھے بُری طرح چونکا دیا۔

وہاں ایک ادی پڑی گرد آلودہ ٹوٹی دیوار سے پشت کے بل لگا کوئی زمین پر لڑھکا ہوا تھا۔ میں تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

ریلے میرے پیچھے تھا۔ وہ ایک فل شرٹ، ٹائی اور پتلون میں ملبوس کوئی پکی عمر کا غیر ملکی شخص تھا۔

”ڈاکٹر ہیر اللہ مکینزی......“ میرے عقب سے ریلے کی پکار اُبھری۔ میں اس کے قریب پہنچ کر اسے سنبھالنے لگا، وہ زخمی تھا۔ اس کی پیشانی سے خون رِس رہا تھا۔ کچھ خراشیں اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھیں۔ کپڑے مسک چکے تھے اور کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے نظر آتے تھے۔

”پپ...... پانی......“ اس کے خشک پڑتے ہونٹوں نے بمشکل یہ لفظ اُگلا تھا۔ میں نے ریلے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر ہیر اللہ اس کا باس تھا اسی لیے ریلے ہی اسے دیکھنے اور سنبھالنے لگا۔ اس نے اپنے تھیلے سے پانی کی بوتل برآمد کی اور ڈاکٹر ہیر اللہ کے منہ سے لگا دی۔ چند گھونٹ پانی پینے کے بعد ہیر اللہ کچھ بولنے اور دیکھنے کے قابل ہوا تو اس نے نیم وا آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔

”ڈاک! آر یو او کے......؟“ ریلے نے پوچھا۔ ڈاکٹر نے اثبات میں دھیرے سے اپنے سر کو جنبش دی پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے بعد اپنے اسسٹنٹ سے ہلکی آواز میں کچھ کہا، اسسٹنٹ نے ہی اسے کچھ بتایا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ متوحش سا ہوگیا اور بائیں جانب اشارہ کرنے لگا جہاں گھور تاریکی کا راج تھا۔

”اس طرف... وہ اس طرف کو گئے ہیں۔“ ڈاکٹر ہیر اللہ کراہتے ہوئے کہا۔

”تم اِدھر ہی ان کے پاس ٹھہرو، میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔“ میں نے ریلے کی طرف دیکھ کر کہا اور ٹارچ کی روشنی پھینکتا ہوا اس طرف بڑھا۔ تو اچانک میرا پاؤں رپٹا، میں نے سنبھلنے کی کوشش چاہی تھی کہ میرا توازن مزید بگڑتا چلا گیا۔

وجہ اس کی یہ تھی کہ میرے پیروں تلے زمین کھسکتی چلی گئی تھی، وہ شاید کوئی ڈھلانی تنگ راستہ تھا، ٹارچ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اور میں بھی گرا تو میرا سر کسی سخت چھت نما منڈیر سے ٹکرایا تھا، میرے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی، میں گر پڑا تھا اور اب ایک تنگ سے راستے پر سیدھا گھستا چلا گیا، مجھے یہ کوئی سرنگ نما ڈھلانی راستہ لگا تھا۔

ٹارچ میرے آگے آگے لڑھکتی جارہی تھی، اور تقریباً کوئی پندرہ بیس فٹ لڑھکنے کے بعد میں کسی سخت چبے نما پتھریلے پتھر سے ٹکراتا ہوا نیچے خلا میں جاگرا۔ شکر تھا کہ اس کی بلندی زیادہ نہیں تھی۔

یوں میں نے کچھ بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو سر کے بل گرانے سے محفوظ رکھا اور پہلو کے بل سخت مگر مٹی سے اٹی ہوئی پتھریلی زمین پر گرا تھا۔ کچھ چوٹ تو آئی مگر یہ قابلِ برداشت تھی۔

لیکن جیسے ہی میں سنبھلا تو دنگ رہ گیا...... تین افراد بڑے ڈرامائی سے انداز میں مجھے وہاں کھڑے دکھائی دیے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی ٹارچیں تھیں۔ میں انہیں دیکھ کر چونکا۔

ان میں دو میرے شناسا چہرے تھے تیسرا اجنبی تھا۔ وہ دراز قامت اور پکی عمر کا کوئی غیر ملکی تھا اور میرے محتاط اندازے کے مطابق یہی امریکی پروفیسر ماہر فلکیات اور آرکیالوجسٹ ڈین گروبن تھا۔ وہ میری طرف حیرت سے آنکھیں اور منہ...... پھاڑے یوں دیکھ رہا تھا جیسے میں آسمان سے ٹپکی ہوئی کوئی خلائی مخلوق ہوں، اسے ابھی حقیقت کا کوئی ادراک نہ تھا۔ لہٰذا اس کی یہ کیفیات بجا تھی۔

باقی دو چہرے کوہارا اور یاسمین تھے۔ ان کے وسط ہی کسی شکستہ چبوترے کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ وہاں ایک بڑا سا ہنڈا روشن تھا۔ اس کے دائیں بائیں مجھے تنگ اور اندھیری گزرگاہیں بھی دکھائی دی تھیں۔ جو نجانے اندر در مزید کتنے تہ خانوں اور اہرام کی بھول بھلیوں میں جاکر ختم ہوئی تھیں۔

ادھر...... یاسمین مجھے دیکھتے ہی میری جانب ”شہزی“ کہتے ہوئے لپکی تھی جبکہ کوہارا کا چہرہ مجھے یہاں دیکھ کر بُری طرح بھنا کر رہ گیا تھا۔

”تم مجھ پر ایک آسیبی جن کی طرح سوار ہوگئے ہو شہزی! آج میں تم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ اس نے غرا کر کہا۔ اس کے لہجے سے ازحد جھلاہٹ اور غیظ مترشح ہوتا تھا۔ ایک وقت تھا اس نے ہمیں دق کر رکھا تھا اور اب میں اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کے پڑا ہوا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان ابتدا سے ہی یہی ہوتا چلا آیا تھا۔ کبھی میں سیر ہوتا تو کبھی وہ سوا سیر، کبھی وہ مجھے زیر کرڈالتا تو کبھی میں......

اب اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس نے گولی چلا دی۔ تہ خانے میں گولی چلنے کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ مگر اس کے تملائے ہوئے پرطیش تیوروں کو بھانپتے ہی میں نے یاسمین کو خود سے پرے دھکا دے دیا تھا اور خود بھی دوسری جانب جا پڑا تھا۔ کوہارا کا نشانہ خطا گیا، مگر اس نے میری جانب دوبارہ پستول کی نال کا رخ کیا تو اسی وقت چھت سے کنکر اور پتھروں کی بارش ہوگئی۔

بدبخت کوہارا نے جھلا کر پھر بھی ایک اندھا فائر کر ہی ڈالا، میں چونکہ اب بھی اس کے نشانے پر ہی تھا اسی لیے میں نے ایک اور جست...... بھری اور جگہ چھوڑ دی۔

تہ خانے کی چھت سے مٹی اور گرد و غبار کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ گھٹن بڑھنے لگی تھی۔

”بائی گاڈ! مسٹر کوہارا......! فارگاڈ سیک...... فائرنگ بند کرو ورنہ یہاں ہم سب ملبے کے ڈھیر تلے زندہ دفن ہو جائیں گے۔ تم معاہدے کی خلاف ورزی کررہے ہو۔“

پروفیسر ڈین کی چلاتی ہوئی آواز اُبھری۔ نجانے کوہارا کا ان کے ساتھ کیا معاہدہ تھا؟ اور پروفیسر ڈین کی سادگی ہی تھی کہ اس نے کوہارا جیسے بدخصلت اور عہد شکن کے ساتھ نجانے کیا معاہدہ طے کر رکھا تھا۔ بھلا کوہارا جیسے زیرک اور شاطر آدمی کو اس کی کب پروا ہوتی۔

کوہارا نے یوں بھی فائرنگ بند کر دی تھی۔ ہمیں کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میری اور کوہارا کی جنگ آخری مرحلے پر تھی اور وہ باز آنے والا شخص نہ تھا اسی لیے میں اپنے حواسوں کو بحال رکھتے ہوئے تہ خانے کی سال خوردہ اور پتھریلی دیوار کے سہارے اس کی جانب بڑھتا رہا۔ میں نے اپنی کھانسی بھی دبا رکھی تھی۔ لیکن اس سے مجھے شدید گھٹن کا احساس ہوا، میں کھانسنے لگا۔ شاطر کوہارا کو کچھ شبہ ہوا تھا اسی لیے اس نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔

ٹارچوں کی روشنیاں گرد و غبار کے ضیالے بگولوں کو کرسٹل بال کی طرح روشن کیے ہوئے تھیں مگر دکھائی پھر بھی کچھ نہیں دے رہا تھا، کوہارا والی جگہ پر میں پہنچا، اسے خالی پایا۔

دفعتاً مجھے یاسمین کی چیخ سنائی دی۔

”شہزی! جہاں بھی ہو رک جاؤ۔ تمہاری ایرانی شہزادی کا حسین پہلو میرے پستول کی زد میں ہے۔“ کوہارا کی غراتی ہوئی خونخوار آواز پر میں چند ثانیوں کے لیے سکتے کا شکار ہوگیا اور تب ہی اچانک میرے تیزی سے کام کرتے ہوئے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے ایک خیال اُبھرا۔

سے جی کوہارا نے بھی میرے جیسی ہی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ وہ گرد و غبار کے ”پردے“ کا فائدہ اُٹھا کر یاسمین کی جانب جا گھسا تھا لیکن شاید کوہارا یہ بھول گیا تھا کہ یاسمین جس رخ پر کھڑی تھی، وہ میرے ذہن کے خانے میں بھی محفوظ تھا۔

میں نے اسی جانب پیش قدمی کی اور گرد کے بادل چھٹنے سے پہلے ہی میں نے کوہارا کو جا کر دبوچ لیا۔ اگرچہ یہ بڑا خطرناک اور رسکی تھا۔ ورنہ وحشت کوہارا بدک سکتا تھا اور اسی عالم میں ٹریگر بھی دبا دیتا، مگر اس بے وقوف نے اپنے زعم میں یہ بتا ڈالا تھا کہ اس کے پستول کی نال یاسمین کے پہلو سے لگی ہوئی تھی اسی لیے میں نے کوہارا کے قریب جا کر اسے کچھ ایسے انداز میں ”چھاپا“ تھا کہ اس نے بدک کر ٹریگر تو دبا دیا تھا اور گولی بھی چلی تھی مگر یاسمین کے نہیں لگی۔

میں نے دراصل کوہارا کے زوردار کندھے کی ٹھوکر رسید کی تھی اور بیک وقت میرا ایک ہاتھ یاسمین کی کمر کے گرد حمائل بھی ہوا تھا۔ جس سبب وہ کوہارا کی گرفت سے نکل کر ایک طرف ہوگئی تھی۔ تاہم اگلے چند لمحوں میں وہ میرے ساتھ آن لگی، اس کے گداز جسم کا لمس مجھے کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزتا محسوس ہوا، وہ سخت خوف زدگی کا شکار تھی۔ کیونکہ کوہارا کا مقصد شاید اب پورا ہو چکا تھا اور وہ

urdugem.com THE ONLINE LIBRARY

www.urdugem.com

سب کو ہلاک کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

تیسری گولی کے چلنے کے ساتھ ہی ایک انسانی چیخ اہرام کے تہ خانے میں ابھری تھی، میں دھک سے رہ گیا۔ رذیل کوہارا کی تیسری گولی نے شاید پروفیسر ڈین کو چاٹ لیا تھا۔ کوہارا کا یہی وتیرہ تھا، جو اس پر بھروسا کرتا وہ سب سے پہلے اسی کی ہلاکت کا سبب بنتا تھا۔

تہ خانے میں پتھروں اور گرد و غبار کی بارش ہوتی رہی۔ میں یاسمین کو خود سے لگائے ایک طرف اندازے کی بنیاد پر کھسکتا جا رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اس وقت کوہارا کے سر پر خون سوار تھا۔

”سب چلے جاؤ یہاں سے...... نکل جاؤ...... ہاہا...... ہاہا...... مجھے میری منزل مل چکی ہے اور اب میں کسی کو یہاں برداشت نہیں کروں گا۔ جو میرے سامنے آئے گا، اسے ہلاک کر ڈالوں گا۔“

وہ پاگل ہو گیا تھا شاید، کامیابی کے قریب اس نے اپنے قدم محسوس کر لیے تھے لیکن مجھے ابھی تک ایسا کچھ نظر نہیں آیا تھا۔

میں یاسمین کو لیے دیواروں کو چھوتا ہوا اس میں کوئی ایسا خلا یا راستہ تلاشتا رہا کہ مجھے کسی طرح یہاں سے عارضی طور پر ہی سہی نکل جانے کا موقع مل جائے اور پھر ایسا ہی ہوا۔

ایک خلا میں میرے ہاتھ جھول گئے اور میں یاسمین کو لیے اسی طرف کو مڑ گیا۔ کافی آگے جا کر سنگی دیوار آ گئی، ہم دونوں اس کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ یاسمین میرے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جگہ بہت تنگ تھی۔

ہم دونوں کے جسم گویا باہم چسپاں ہو گئے تھے۔ ہماری سانسیں تک ایک دوسرے میں شامل ہو رہی تھیں۔ یاسمین کے سینے کا زیر و بم مجھے صاف محسوس ہوتا تھا۔

”کیا ممی دریافت کر لی گئی ہے؟“ میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”ہاں...... اگر تم۔“

”موت سر پر کھڑی ہے صرف میرے سوالوں کے جواب دو۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”ممی کا ٹھکانا کدھر تھا؟“

”اسی جگہ جہاں ہم کھڑے تھے۔ اس کے درمیان جو شکستہ چبوترا تھا اس کے اندر تقریباً چھ فٹ کی گہرائی میں پتھر کا وہ تابوت موجود تھا جس کے اندر ثمانہ کی ممی......“ یاسمین کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ کیونکہ پروفیسر ڈین گروبن مدد کے لیے چلا رہا تھا۔

”مائی گاڈ! میری مدد کرو...... یہ...... درندہ مجھے...... مار ڈالے......“ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ پھر یوں گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگیں اس کی......، جیسے وہ عالم نزاع میں ہو۔

میں مخمصے کا شکار ہو گیا۔

”شش...... شہزی! اس بے چارے بوڑھے کی مدد کرو...... خدا کے لیے...... وہ بہت قابل انسان ہے۔“

میں یاسمین سے الگ ہوا اور دوبارہ متروکہ ہال کی جانب کھسکا۔ یاسمین بھی شاید میرے پیچھے دیوار سے لگی کھسکتی چلی آ رہی تھی۔ میں سرے پر پہنچا، دھول مٹی اور گرد و غبار چھٹنے لگا تھا۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ کوہارا کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ اپنی جسمانی طاقت کھپانے کے بجائے... پستول کی ایک گولی خرچ کر سکتا تھا۔

یہ اندازہ لگاتے ہی میں اس طرف کو لپکا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ کوہارا پروفیسر ڈین کا گلا دبوچے جا رہا تھا۔ وہاں ریلے اور ڈاکٹر ہیر اللہ بھی آ چکے تھے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہاں ”ٹپک“ پڑے تھے۔ کیونکہ ان کے کپڑے بھی دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے، ریلے کوہارا کی سمت بڑھا تھا مگر اس کی ایک ہی لات نے دبلے پتلے پچی سے ریلے کو دور پھینک دیا تھا۔

کوہارا، پروفیسر ڈین کی گردن دبوچے جا رہا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے جوشِ غیظ تلے اس کی جانب جست لگائی اور سیدھا کوہارا پر جا پڑا۔ وہ بلبلا کر الگ ہو گیا۔ مگر گرتے ہی سنبھلا اور زخمی بھیڑیے کی طرح مجھ پر اچھل کر پڑا۔

اس نے قریب آتے ہی میرے پہلو میں اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا رسید کر دیا۔ یہ کسی عام آدمی کا وار نہیں تھا گینڈے جیسی جسامت کے حامل کوہارا کے مضبوط اور آہنی گھٹنے کا وار تھا، اذیت کی ایک لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں اپنے حلق سے بے اختیار ابھرنے والی کراہ آمیز چیخ کو نہ روک سکا، ایک سائڈ سے پہلو پر ہاتھ رکھ کے جھک سا گیا، کوہارا نے مجھے ایک ہی ہلے میں ڈھتے دیکھا تو اس کا بھی جیسے جوشِ غیظ سوا ہو گیا، اس نے مجھے سنبھلنے بھی نہ دیا اور مجھے ایک زبردست ٹھوکر رسید کر دی۔ میں زمین سے چند انچ اچھل کر سیدھا وسط میں واقع شکستہ چبوترے پر جا پڑا۔ لیکن یہ کیا، چبوترے پر گرتے ہی میں لڑھکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔ کوئی چھ سات فٹ کی گہرائی میں پہنچ کر میں کسی سخت شے پر گرا۔

یہاں گھپ تاریکی تھی لیکن میرے سر کے اوپر بدنما سا خلا کا سرا تھا۔ میں اس اچانک افتاد پر ذرا دہل سا گیا۔ اوپر ملگجی سی روشنی تھرک رہی تھی، وہ اس ہنڈے کی تھی جس کا ذکر اول کر چکا تھا۔

تب ہی میں نے یاسمین کی چیخ کی آواز سنی، یوں لگا جیسے کوئی اسے زد و کوب کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ کوہارا کے علاوہ کون بدبخت ہو سکتا تھا۔ یاسمین کو خطرے میں محسوس کر کے میرا دل یک دم تشویش آمیز بے چینی کا شکار ہو گیا۔

میں کھڑا ہوا تو میرے پاؤں اس سخت سی پتھریلی شے میں دھنسنے لگے، جلد ہی عقدہ کھلا کہ وہ کوئی پتھریلا تابوت تھا اور اس کا ڈھکن...... امتدادِ زمانہ کے سبب بھربھرا گیا تھا۔ میں سنبھلا، اس وقت میرے سر پر کوہارا سوار تھا۔ میں نے پیروں کو نسبتاً مضبوط سی جگہ پر اٹکایا اور دونوں ہاتھوں سے کھردری دیوار کا سہارا لیا ہی تھا کہ اوپر جا سکوں، اچانک یاسمین کی اس بار... کراہتی ہوئی آواز ابھری جو بہت قریب سے آئی تھی، ساتھ ہی کوئی خونخوار انداز میں غرایا بھی تھا۔

میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور میرے دل کی دھڑکنیں سوا ہو گئیں۔ سرے پر یاسمین کا گلنار چہرہ جھکا ہوا تھا اور کوہارا نے اسے گردن سے دبوچ کر نیچے کی طرف جھکا رکھا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ پُرغیظ انداز میں چیخا۔ ”شہزی! باہر نکل آؤ، ورنہ تمہاری اس محبوبہ نمبر دو کا ٹینٹوا دبا دوں گا۔“

میں تو یوں بھی باہر ہی آ رہا تھا لیکن نجانے کیوں میں کچھ ٹھٹک سا گیا۔ ایسا کیا تھا یہاں جو یہ مجھے نکلنے پر زور دے رہا تھا؟

ٹھیک اسی وقت عقب سے شاید کوہارا پر کسی نے سخت شے سے وار کیا۔ اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی، وار کرنے والے کا خیال تھا کہ وہ ڈھے جائے گا، مگر اسے کیا معلوم تھا کہ یہ خبیث شیطان اپنے اندر شیطان جیسی طاقت رکھتا تھا۔ چوٹ سہنے کے لیے اس نے شاید لمحہ بھر کے لیے اپنے جسم کے مضروب حصے کو سہلایا تھا۔ اس کے بعد وحشیانہ غراہٹ سے اس پر پلٹ کر پل پڑا تھا۔ ایک درد بھری چیخ ابھری تھی، جسے میں پہچان گیا، تختہ بننے والا یہ...... ریلے تھا۔ ادھر یاسمین نے بھی عین ایسے ہی لمحات میں بے جگری کا مظاہرہ کیا جو اس کا طرہ تھا، نجانے کیسے کوہارا کی گرفت سے خود کو چھڑایا تھا اور اندر کود پڑی۔ یہی نہیں اس نے بیدار مغزی کا ایک اور مظاہرہ بھی کیا تھا۔ چبوترے پر رکھا ہنڈا بھی اس نے اچک لیا تھا۔

یاسمین خانم پکے ہوئے پھل کی طرح سیدھی میری گود میں آن گری تھی۔ ہنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے لگا مگر میں نے دونوں کو ہی گرنے سے بچا لیا تھا۔

”شہزی! سنبھلو...... ادھر...... یہاں......“ وہ بے ربط سے الفاظ میں بولی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے خوف پر ایک عجیب طرح کے جوش نے غلبہ پا لیا تھا۔ اس نے مجھے جلدی سے ایک طرف ہونے کا کہا اور خود متروکہ تابوت کے ڈھکن کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”مم...... میری مدد کرو شہزی! ی ی...... یہی ثمانہ کا تابوت ہے، جلدی کرو۔“ اس نے ہانپتے ہوئے فرطِ جوش سے کہا اور مجھے اپنے وجود میں ایکا ایکی سنسنی کا احساس ہوا...... پھر تو جیسے میرا اپنے جسم کا بھی رُواں رُواں جوش سے مرتعش ہونے لگا۔

ہم نے مل کر پتھر کے اس بوسیدہ تابوت کا ڈھکنا گویا ٹکڑوں کی شکل میں علیحدہ کیا۔ ہنڈے کی وجہ سے اندر خاصی روشنی پھیل گئی تھی۔ لیکن ابھی ہم تابوت کے اندر کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ اچانک اوپر تہ خانے کے متروکہ ہال میں ریلے کی لرزا دینے والی آواز ابھری۔ یہ اس کی آخری چیخ سے مشابہ محسوس ہوئی تھی۔

”شہزی...... فار گاڈ سیک! ہمیں اس خونی درندے سے بچاؤ۔“ یہ پروفیسر ڈین کی آواز تھی۔

سے جی کوہارا کے خلاف نفرت کی ایک شدید لہر میرے پورے وجود میں سرایت کر گئی اور میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اس گڑھے سے نکل کر چبوترے پر آ گیا۔ تب ہی میری آنکھوں نے ایک بے رحم منظر دیکھا۔

سے جی کوہارا کسی دیو کی طرح، بے چارے دبلے پتلے ریلے کی گردن مروڑے جا رہا تھا یہاں تک اس نے اس کی گردن پوری گھما کے دوبارہ سامنے کر ڈالی تھی۔ یہ بڑی اذیت ناک موت تھی۔ ایک اور بے گناہ اور کمزور شخص کو کوہارا جیسے درندے کو سفاکی کے ساتھ ایک معصوم انسان کا قتل کرتے دیکھ کر میں پھر جیسے اپنے آپے میں نہیں رہا۔ اس بدبخت نے بے چارے کو اس وار کرنے کی بڑی بھیانک سزا دی تھی اور دیکھا جاتا تو ریلے نے اپنی بساط بھر طاقت اور ہمت کے بل بوتے پر ہماری ایک طرح سے مدد ہی کرنی چاہی تھی۔

دوسری طرف ڈاکٹر ہیر اللہ اور پروفیسر ڈین اس کھلی بربریت پر خوف سے لرز گئے تھے اور کوہارا کو ایسی دہشت زدہ

UrduGem.com THE ONLINE LIBRARY

www.urdugem.com

نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی خوفناک عفریت ہو، یوں بھی اس میں کیا شک تھا۔

''کوہارا......!''

میں نفرت اور غضب سے اس قدر حلق پر زور دے کر دہاڑا تھا کہ ایک لمحہ کے لیے میں نے کوہارا...... کے پُرغیظ چہرے پر بھی تھرتھراہٹ محسوس کی...... وہ ریلے کی گردن مڑی لاش کو پھینک کر میری جانب پلٹا اور تب تک میں چبوترے سے اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔

میری جست کسی شکاری اور خونخوار چیتے سے کم نہ تھی۔ میں کوہارا سے ٹکرایا اور اپنے کسرتی بدن کی طاقت کے بل بوتے پر اسے لیے زمین پر آرہا۔

سنبھلتے ہی میں نے اسے اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر کھڑا کر دیا اور ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر جڑ دیا۔ کوہارا...... کے دہن سے خون چھلکا اور وہ کراہتا ہوا چند قدموں تک لڑکھڑاتا چلا گیا۔ میرے زوردار پنچ سے اس کے جبڑے کا اندرونی حصہ جو ''سوفٹ ٹشو'' کہلاتا ہے۔ دانتوں تلے پھٹ چکا تھا، دو تین دانتوں کو میں نے خون کی پھوار کے ساتھ اُگلتے بھی دیکھا۔ میں رکا نہیں، میرا غیظ فزوں تر تھا۔ اُچھل کر میں نے ایک لات اس کے سینے پر بھی جڑ دی۔ وہ اپنے گرانڈیل وجود کے باعث اُچھلا تو نہیں البتہ دوبارہ چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑاتا ہوا پتھریلی دیوار سے پشت کے بل جا ٹکرایا۔

خون آلودہ اس کا چہرہ وحشت کی تصویر پیش کر رہا تھا، میں پھر اس پر جھپٹا تو اس نے گینڈے جیسی جسامت کے باوصف پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے اپنے کندھے کی ٹھوکر رسید کر دی۔ مجھے جھٹکا لگا لیکن سنبھلنے میں دیر میں نے بھی نہیں لگائی تھی۔

موقع پاتے ہی میں نے اس سے کوئی ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ جانچا اور ایک ٹانگ کی ایڑی کے بل گھوم گیا۔ رائٹ کک سے اس کے مضروب جبڑے کو دوبارہ نشانہ بنایا۔ وہ اُدھڑ کر رہ گیا۔ اس کے حلق سے پہلی بار میں نے سخت اذیت ناک چیخ کی آواز سنی تھی، لیکن یہاں مجھ سے ایک فاش غلطی ہو گئی جس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا۔

گولی لگنے کی وجہ سے میری جس ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اس کا زخم نہ صرف ہرا ہو گیا بلکہ اس میں سے بھل بھل خون بھی جاری ہو گیا۔ یہی نہیں تکلیف کے باعث میں کھڑا بھی نہ ہو پایا اور لڑکھڑا گیا، گرنے سے بچانے کے لیے مجھے ڈاکٹر ہیر اللہ نے یک دم آگے بڑھ کر سہارا دیا۔ وہ مجھ سے ذرا قریب ہی کھڑا تھا۔

''کیپ اِٹ اَپ ینگ مین......'' وہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے جوش بولا۔

جبکہ اِدھر کوہارا ابھی زمین بوس ہو چکا تھا اور بھربھرائی ہوئی پتھریلی زمین پر لیٹا خون تھوکنے لگا، اس کا جبڑا اُبری طرح کٹ پھٹ کر سرخ لوتھڑے کی طرح لٹکنے لگا تھا۔

مجھے بھی گرتا پا کر اس خبیث کی ہمت کو سہارا ہوا تھا اور وہ اپنا لوتھڑا نما زخمی جبڑا سہلاتا سنبھالتا ہوا بہ وقت تمام اُٹھ کھڑا ہوا اور وحشیانہ غراہٹ کے ساتھ میری جانب لپکا۔ پروفیسر ڈین نے فوراً آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکنا چاہا تھا کہ کوہارا نے اسے اپنے ایک ہی ہاتھ سے پرے دھکا دے دیا اور کسی جنگلی ارنے بھینسے کی طرح مجھ سے ٹکرایا۔

مجھے ڈاکٹر ہیر اللہ نے سہارا دے رکھا تھا مگر وہ بھی مجھے سنبھال نہ پایا، نتیجے میں ہم دونوں ہی گرے تو کوہارا مجھ پر چڑھ دوڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تڑپ کر اس کی گینڈے جیسی موٹی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں کس لی اور اپنے وجود کی پوری قوت صرف کرتے ہوئے اس کی گردن پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا، یہاں بھی وہی مسئلہ پیدا ہوا کہ میرا یہ بازو بھی زخمی تھا مگر آج میں نے کوہارا کا دم باہر نکالنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا، وہ میری آہنی گرفت سے اپنی گردن چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا اور اپنے گرانڈیل جسم کو جھٹکے دے رہا تھا، یوں لگا مجھے جیسے کوئی مگرمچھ میری گرفت میں تھا۔

اِدھر میرے زخمی بازو کی طاقت باعث تکلیف کے کم ہونے لگی، لیکن جوش اس درد پر غالب رہا، کوہارا کا چہرہ سرخ ہوتا چلا گیا، دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں اُبلنے کے قریب ہو گئیں اور پھر جب میں نے دیکھا کہ شکنجہ خاطر خواہ دباؤ حاصل کر چکا تو میں نے اپنے وجود کی گویا ساری طاقت بازو میں مجتمع کرتے ہوئے ایک جھٹکا دیا۔ کڑک کی آواز اُبھری اور...... کوہارا...... کا سر ڈھلک گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایک تیز چیخ کی آواز اُبھری تھی۔ یہ بنتِ نیل ثمانہ کے مقبرے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

UrduGem.com THE ONLINE LIBRARY

سانپ

سرور اکرام

مشکل گھڑی ہر آن نہیں رہتی... اگرچہ یہ کٹھن گھڑی انسان کے قدم اکھاڑ دیتی ہے... اور وہ ان سمتوں کا رخ کر لیتا ہے جو اُن دگرگوں حالات سے زیادہ دہشت ناک ہوتی ہیں مگر افسوس کہ اس کا ادراک اس وقت ہوتا ہے جب پُلوں کے نیچے سے پانی گزر چکا ہوتا ہے... ایسے ہی افراد کی عکاس تحریر... جن کی زندگی کے حالات نے انہیں غلط راستوں کا راہی بنا دیا...

ایک اور دریا کا سامنا تھا...... میں ایک دریا کے پار اترا تو......

عنایا نے جب اس لڑکی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔

عنایا اس وقت شہر کے ایک شاندار شاپنگ مال کے ایک شوکیس کے سامنے کھڑی ان... میں رکھے ہوئے ملبوسات دیکھ رہی تھی۔ اس شوکیس میں بہت قیمتی ملبوسات تھے۔ ایسے کہ عنایا صرف انہیں دیکھ سکتی تھی۔ خریدنے کی استطاعت نہیں تھی اس میں۔

اس کا دفتر اسی روڈ پر ایک چھوٹی سی بلڈنگ میں تھا۔

وہ لوگ ایم بی اے اور سی اے کرنے والوں کی کوچنگ

www.urdugem.com

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کی جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارہ کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکتہ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کی گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا رہنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ لیے سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... تجسس... سسپنس اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

قسط نمبر: 55

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا [illegible] خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی [illegible] وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جہاں خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں اسے چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا۔ زہرہ بانو، بھتیجی شاہ نازا ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل تھا، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ چلتے چلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسکیکرم" کا ذیلی چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ غیر ملکی تنظیم کے سربراہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسکیکرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ جے پی سی (جیوش پرنس کمیٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ ہاسکل ہوارڈ، ایک یہودی نژاد و کٹر مسلم دشمن اور جے پی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ ہاسکل ہوارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہاسکل ہوارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ [illegible] کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ایک [illegible] کے سلسلے میں ایک [illegible] لولووش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو کسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسکیکرم اور بلیو کسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ ہاسکل ہوارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی [illegible] عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ ہاسکل ہوارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کر رہا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی [illegible] کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست ہے جی کو بارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک گھوڑی بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام [illegible] سے ہوتی ہے جو کبھی اسکیکرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں سونے جو درد سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ہے جی کو بارا کی بوٹ میں بلیو کسی کے چند لوگ [illegible] آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو کسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو کسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت واضح ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یہاں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس ہندر واس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، انتہا پسند [illegible] کو مار اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے وکیل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پریشانیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر [illegible] چندر ناتھ حوالے کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا جو ان کی منزل تھی۔ سو کہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر ان کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک دیپا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ شہزی کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر دی۔ دیپا اس کی شکر گزار تھی۔ اسی اثنا میں دیپا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ [illegible] ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، دیپا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ دیپا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو کسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر ہندوؤں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو کسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک [illegible] کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

[illegible] شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی [illegible] جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھگوانی کو تاراج کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ [illegible] کو ویپا فون پر بتاتی ہے کہ قیدیوں کو "کالی سنجانہ" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا [illegible] میں سی جی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناتا شکور سے ہوتی ہے جو کشتی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناتا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو [illegible] شہزی، سوشیلا اور ناتا شکور کے ہمراہ کالی سنجانہ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناتا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چاندی [illegible] جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو جہنم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر جابر کی وجہ سے ناتا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس [illegible] اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ [illegible] چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک [illegible] بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ [illegible] پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش [illegible] ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ کیم کلا اور اس کی بیٹی سونگ کلا کی تھی۔ وہ باپ بیٹی کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور [illegible] کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک [illegible] ظاہر کر کے باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نور اللہ ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کلا کو [illegible] برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نور اللہ یہاں کے ساحل کا رخ کرتا [illegible] سے ٹکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بدل کر ان میں شامل ہو جاتا [illegible] ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص [illegible] کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ [illegible] سے قبیلے کے سردار کو مار کر پورے قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیکھ کر اس کے بہروپ [illegible] اور وہ چالاکی سے [illegible] کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی [illegible] سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل [illegible] میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے [illegible] پاکستان پہنچ [illegible] ملتان جانے سے پہلے [illegible] کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار [illegible] حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی [illegible] کی آمد پر شاہ نواز خان [illegible] قتل اور ہشام کی بیوہ ارم کے اغوا کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی [illegible] لے جاتا ہے۔ [illegible] خطرناک ڈاکو [illegible] پر حملہ آور ہوتا ہے۔ [illegible] شاہ نواز کی بیٹی [illegible] بھی ساتھ ہوتی [illegible] کی مجبوری ہے۔ جاتے جاتے [illegible] شہزی کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ [illegible] لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے [illegible] کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے [illegible] لائق ماچھی کے ساتھی حارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی [illegible] کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ [illegible] شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور [illegible] کو چھڑوانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے [illegible] کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں [illegible] اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی [illegible] کی حویلی میں چھپ جاتے ہیں۔ شہزی [illegible] کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ [illegible] شہزی پر اعتماد [illegible] بھارتی فوج کے ساتھ [illegible] کے خفیہ ذریعے [illegible] طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس [illegible] کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت [illegible] کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی [illegible] والدین اور زہرہ [illegible] منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ [illegible] عابدہ کی قید میں ہے۔ [illegible] پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے [illegible] امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی اور وزیر جان کو [illegible] کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو [illegible] بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو [illegible] کے بعد وزیر جان کو بے قابو کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو [illegible] کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا [illegible] اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسکیکرم کے [illegible] سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور [illegible] آخر ایک ہوٹل [illegible] ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست [illegible] کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ مگر [illegible] شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتے ہیں اور طیارے کو [illegible] کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر [illegible] ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے۔ طیارہ [illegible] اور طیارہ ریت کے سمندر میں دھنستا چلا جاتا ہے [illegible] اور گرد و غبار کا طوفان دکھتا ہے تو ہوش [illegible] آتے ہیں اور آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوتی تھیں۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

چیخ...... کی آواز یاسمین خانم کی تھی جبکہ میں اس وقت کوہارا کو جہنم واصل کرنے کے بعد اپنے اندر ایک گہری طمانیت اور سکون محسوس کررہا تھا۔ اس چیخ پر دوبارہ میرے اعصاب یکلخت تن گئے اور میں کوہارا کی لاش کو چھوڑ کر اُٹھا، ساتھ ہی میں نے ڈاکٹر ہیر اللہ اور پروفیسر ڈین گرومن کو بھی حرکت میں آتے دیکھا۔ میری طرح ان کا رخ بھی ثمانہ کے مقبرے والے چبوترے کی طرف تھا۔

پروفیسر ڈین عمر رسیدہ ہونے کے باوجود بڑی قوتِ ارادی اور ہمت سے کام لے رہا تھا۔ اس پر مستزاد وہ زخمی بھی تھا، جیسا کہ ظاہر ہوچکا تھا کہ کوہارا کی چلائی ہوئی گولی نے اس کے کسی نازک مقام کو نہیں چھیدا تھا۔

گولی اس کے دائیں بازو کے گوشت کو چھیدتی ہوئی گزر گئی تھی۔ نازک حالت اس کی تب ہوتی جب ولیم کو بڑی بیدردی سے ہلاک کرنے کے بعد کوہارا ڈین کا بھی اسی طرح گلا دبا کر یا گردن کو جھٹکا دے کر منکا توڑنے والا ظالمانہ عمل کرتا، مگر عین وقت پر میں نے کوہارا پر یہی داؤ آزماتے ہوئے اسے واصلِ جہنم کرڈالا تھا۔

چبوترے کی طرف میں نے جست بھری اور وہ بھی اسی طرف کو لپکے تھے۔

اندر یاسمین خوف زدہ سی ایک طرف کو سمٹی ہوئی تھی۔ ایک سیاہ کوبرا ناگ خوفناک پھن کاڑھے اس کی طرف پھنکاریں اُگل رہا تھا۔

یاسمین کو اتنا ادراک تھا کہ حرکت کرنے کی صورت میں سانپ لپک کر اسے ڈس سکتا ہے، یہی وجہ تھی وہ اپنی جگہ جامد و ساکت رہی، تاہم اُوپر سامنے کے رخ پر اس نے قدرے سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا۔

میں نے اپنے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے اسی طرح بےحس و حرکت رہنے کا اشارہ دیا۔

حقیقت یہ تھی کہ میرا دماغ اس اچانک مصیبت پر ماؤف سا ہوگیا تھا۔ میں نہتا تھا، میری ٹانگ کا زخم بھی جاگا ہوا تھا۔ یاسمین موت کے دہانے پر کھڑی تھی۔

اس کوبرا سانپ نے جیسے مجھے اور یاسمین کو ہپناٹائز کردیا تھا۔ سانپ ثمانہ کے پتھریلے تابوت پر کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

یاسمین کے لیے اس موذی نے مفر کی کوئی راہ نہیں چھوڑی تھی۔ بادی النظر میں یہی نظر آرہا تھا کہ جیسے ہم سانپ کے جنبش کے منتظر ہوں اور خود اس پر حملہ کرنے سے قاصر ہوں۔

اچانک سانپ نے زور کی پھنکار ماری، یاسمین کے حلق سے خوف زدہ سسکاری خارج ہوئی۔ یاسمین اور سانپ کی آنکھیں گویا ایک دوسرے پر جمی رہ گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کے ٹرانس میں آئے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

تب ہی سانپ نے اپنا پھن سکیڑا اور پتھریلے تابوت پر لٹکایا اور...... اس کے ایک رخنے سے اندر کی جانب رینگ گیا۔ میں نے ہی نہیں یاسمین نے بھی یقیناً سکون کی سانس لی ہوگی۔

”اوپر آنے کی کوشش کرو۔“ میں نے آہستگی سے یاسمین کو مخاطب کیا اور قدرے جھک کر اپنا ایک ہاتھ ثمانہ کی اس سنگی قبر کے اندر بڑھایا۔

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اسے اُوپر کھینچنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائی۔ مقبرے سے نکلتے ہی وہ میرے ساتھ لپٹ کر یوں گہرے گہرے سانس لینے لگی جیسے طویل مسافتیں طے کرکے آئی ہو۔ سانپ نے اسے واقعی دہشت میں مبتلا کردیا تھا۔

ہم چبوترے سے نیچے اُتر آئے تو ڈاکٹر ہیر اللہ، پروفیسر ڈین کو سہارا دیے اسی طرف آرہا تھا۔ وہ کوہارا کی لاش کے پاس کھڑے شاید اس کی موت کی تسلی کرنے میں معروف ہوگئے تھے۔

”کیا ہوا؟ یہ چیخ کس کی تھی؟“ ڈاکٹر ہیر اللہ نے پوچھا۔ میں نے اسے بتادیا کہ اندر سانپ تھا۔

”ینگ مین! تم بہت بہادر ہو۔ ہمارے اس عظیم مشن کو اس مردود کوہارا نے سبوتاژ کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔“ پروفیسر ڈین مجھ سے بولا۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر اسے ثمانہ کی برسوں پرانی ممی سے کیا سروکار ہوسکتا ہے؟ یہ تو مجرمانہ ذہنیت کا آدمی معلوم ہوتا تھا؟؟“

”آپ کی بات صحیح ہے۔“ میں نے جواب میں جلدی سے کہا اور کن انکھیوں سے یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت اب کافی سنبھل گئی تھی۔ ظاہر ہے اب انہیں کیا معلوم تھا کہ کوہارا ثمانہ کے تابوت میں رکھے ان پُراسرار ہتھیاروں کو اپنے قبضے میں لینا چاہتا تھا جن کے حصول کے لیے وہ نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہوا یہاں پہنچا تھا لیکن میں ان دونوں کو یہ حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں آخری کام بھی جلدی ختم کر کے چل دینا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور مصیبت ہمیں آن دبوچے۔“ ڈاکٹر ہیر اللہ نے مقصد کی بات کی۔

”یقیناً۔“ میں نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”لیکن ذرا محتاط رہ کر، کیونکہ ثمانہ کی قبر کے اندر ایک خطرناک سانپ موجود ہے۔ ہوسکتا ہے اندر اور سانپ بھی ہوں۔“

ایک لمحے توقف سے میں نے کہا۔ ”آپ دونوں اِدھر ہی موجود رہیں۔ میں اور یاسمین دوبارہ مقبرے میں اُتر کے ثمانہ کی ممی کو باہر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔“

ایسا میں نے دانستہ کہا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان بوڑھوں کو ثمانہ کے سرہانے رکھے ہتھیاروں کا علم ہو۔

ہم دونوں ایک بار پھر روشنی کے ہنڈے تھامے بہت ط کے ساتھ ثمانہ کے مقبرے میں اُتر گئے۔

میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بڈھے بھی چبوترے پر کھڑے ہوئے تھے اور قدرے جھک کر نیچے دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔

”خاصے سنکی بڈھے ہیں۔“ میں ہولے سے بڑبڑایا۔ یاسمین کے دھول سے اَٹے چہرے پر ایسے میں بھی مسکراہٹ سی آئی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ثمانہ کے سرہانے ہزاروں سال پرانی تاریخ کے وہ تین ہتھیار موجود تھے بھی یا نہیں۔

بہرطور...... ہم دونوں ایک بار پھر ممی کے پتھریلے تابوت کے سنگی اور سالخوردہ ڈھکن کے ٹکڑوں کو دھیرے دھیرے ہٹانے لگے۔ ان پر برسوں کی گرد اور مٹی کی موٹی سی پاؤڈر نما تہ جمی ہوئی تھی۔ ایک ٹکڑے کو بھی ہلاتے تو وہ تہ غبار کی صورت میں اُٹھتی۔

مقبرہ چبوترے سے کوئی چار پانچ فٹ کی گہرائی میں تھا اور اندر سے کئی تنگ و تاریک راستے مختلف بھول بھلیوں میں جاتے دکھائی دیتے تھے۔ یعنی آگے اور بھی اونچی نیچی گہرائیاں تھیں۔

ہم ممی کا تابوت پوری طرح کھول چکے تھے۔ ثمانہ کی ممی کی پہچان کے لیے اس کے باپ پروفیسر جمشید جمیدی نے اپنی بیٹی یاسمین کو جو نشانیاں بتائی تھیں، وہ ان کی تسلی کرچکی تھی۔ کیونکہ ضروری نہیں تھا کہ یہاں صرف ثمانہ ہی کی ممی ہوتی، اور بھی ممیاں نظر آسکتی تھیں۔

اب دھول اور گرد کے علاوہ ایک عجیب سی ناگوار بو بھی ہمارے نتھنوں سے ٹکرارہی تھی۔ ممی اکڑی ہوئی تھی۔ ابھی کوئی تمیز نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ مرد کی ممی تھی یا عورت کی۔ ہزاروں برس قدیم ممی کو دیکھ کر میرے دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت ہونے لگی۔

اس کا بھی کوئی وقت ہوگا جب یہ زندگی کی بہاروں سے لبریز ہنستی کھیلتی رہی ہوگی۔ دنیا کو اس نے کن کن خوب صورت رنگوں میں دیکھا ہوگا۔ اُف...... وقت کس قدر ظالم ہوتا ہے۔ اب یہ برسوں سے اہراموں کے کھنڈر زدہ تہ خانوں میں باہر کی روشنیوں سے دور...... بےحس و حرکت پڑی تھی۔

ہم نے سب سے پہلے ممی کے سرہانے کو جانچنے کی کوشش چاہی اور ممی کو وہاں سے تھوڑا اُوپر اُٹھایا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا، یاسمین کی بھی یقیناً ایسی ہی حالت ہوگی۔

ممی کے سر اور کندھوں کے نیچے سے جگہ تھوڑی اُبھری ہوئی محسوس ہوتی تھی جبکہ نیچے کمر اور ٹانگوں وغیرہ کی طرف کا حصہ قدرے ”نیچا“ تھا۔ گویا اس کے سنگی تابوت کی شیپ ہی ایسی بنائی گئی تھی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے تابوت بنانے والے نے دانستہ ممی کے سرہانے کی جانب کوئی خلا بنایا تھا۔

ہم دونوں ممی کو باہر نکالنے کی تگ و دو میں تھے۔ ایسے میں ہمیں پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ کی مدد کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے بھی یہ محسوس کرلیا تھا اور ہماری مدد کو جھک آئے تھے۔

ثمانہ کی ممی کا وزن زیادہ نہ تھا لیکن اسے چھوتے اور تھامتے ہوئے میرا ”اندر“ ضرور بوجھل اور بھاری ہونے لگا تھا۔

بالآخر ممی کو ہم باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ دونوں بوڑھے تو ممی کو پا کر ایک دوسرے کو مسرت بھرے انداز میں مبارکباد دینے میں مصروف ہوگئے، انہوں نے اپنا مقصد پالیا تھا جبکہ میں اور یاسمین ہنوز کوشاں تھے۔

تابوت کے سرہانے کو کھنگالنے کے دوران میں سب سے پہلے یاسمین کے ہاتھ سے قدرے گہرائی میں کوئی سخت شے ٹکرائی تھی۔

”شش...... شہزی! اِدھر...... کک...... کچھ رکھا ہے۔“ یاسمین نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا۔ میں نے بھی وہ حصہ چھوا۔

تابوت کی پتھریلی تہ ابھی نیچے تھی۔ اس پر کھالوں کی کوئی تہ در تہ چڑھی ہوئی تھی۔ کھالیں بھی کیا تھیں بس پرتیں ہی تھیں۔ انہیں پرے کیا اور اندر میری اُنگلیاں کسی سخت شے سے ٹکرائیں۔ جانے کس خیال کے تحت میں نے فوراً اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

”کیا ہوا؟“ یاسمین نے سرگوشی کی۔ ایک لمحے کو میرے دل میں یہ خدشہ اُبھرا تھا کہ نجانے بےدھیانی میں میرا ہاتھ کسی ایسی ویسی شے کو نہ چھو جائے جو میرے لیے

Visit https://reading.caretofun et for more novels and digests

مہلک ثابت ہو۔ کیونکہ قلوپطرہ اور اخناطوں سے متعلق مجھے ان خطرناک ہتھیاروں کا علم تھا۔

"میری انگلیوں نے کسی سخت شے کو چھوا تھا۔" میں نے ہولے سے جواب میں کہا۔

"تم دونوں اب اندر کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" اچانک اوپر سے آواز آئی۔ یہ ڈاکٹر ہیر اللہ تھا۔ "یہاں کوئی خزانہ نہیں رکھا۔ اوپر آجاؤ، ہمارا مقصد پورا ہو چکا۔ اب واپسی کی تیاری پکڑو۔"

ہم نے کوئی جواب نہ دیا اور پھر تگ و دو میں لگ گئے۔ میں نے یاسمین کو یہیں اس مقام پر روشنی مرکوز رکھنے کی ہدایت کی اور بہت احتیاط کے ساتھ الا بلا ہٹانے لگا تو اس کے نیچے سے مجھے وہ سخت سی شے نظر آگئی۔

جائزہ لینے پر عقدہ کھلا کہ وہ کسی برسوں پرانے ایک چھوٹے سے صندوقچے نما ڈبے کی فولادی تہ تھی۔ جس کی سطح بھربھری ہوئی تھی۔ اس پر کچھ لپٹا ہوا پڑا تھا، وہ احتیاط سے میں نے باہر نکالا اور سل پر پھیلا دیا۔

کھال نما کپڑے پر دو چیزیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہم نے بہت احتیاط اور دھیرے سے کھولا اور پھونک مار مار کر مٹی اڑائی تو یاسمین کے حلق سے سسکاری نکل گئی، خود میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔

ہم دونوں کی دم بخود نظروں کے سامنے عظیم فراعنہ مصر کے برسوں پرانے وہ ہتھیار یعنی نوادر کی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ روڈلف نے غلط نہیں کہا تھا۔

ہیڈ دائر تو بالکل تباہ ہو چکا تھا۔ وہ ٹکڑوں کی صورت میں نظر آرہا تھا لیکن انگوٹھی اور سنہری بھونرا چمکتا اور درست حالت میں دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے انگوٹھی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو واضح طور پر میرا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ میں جو خود کو بے حد مضبوط اعصاب کا مالک خیال کرتا تھا، ان دونوں اشیا، بالخصوص انگوٹھی کو چھوتے ہوئے میرا وجود تک مرتعش تھا، اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ روڈلف نے مجھے انگوٹھی کی ہلاکت خیزی کے بارے میں بتا رکھا تھا۔

بقول روڈلف کے..... یہ کوئی ماورائی ہتھیار نہیں تھے، کسی ایسے سیارے کی مخلوق..... کے ایجاد کردہ تھے جو یقینی طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی میں ہم سے کہیں آگے تھے۔

یاسمین بھونرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ میں انگوٹھی کو اب ہاتھ میں پکڑ کر دیکھنے لگا۔ اس پر ایک قرمزی رنگ کا مٹر کے دانے کے برابر نگینہ جڑا ہوا تھا۔

یہ یقیناً اس کے سولر سینسر کے طور پر کام کرتا ہوگا۔ انگوٹھی کی شیپ سانپ کے ننھے پھن سے مشابہ تھی جس کی لپلپاتی زبان میں کھوکھلا پن تھا، روڈلف نے مجھے ان ہتھیاروں کے استعمال کے بارے میں بتایا تھا۔

اس کے ایک مخصوص گوشے پر ہلکا دباؤ ڈالنے سے پھن کسی قسم کا زہر نہیں چھوڑتا تھا، بقول روڈلف کے اس کے اندر سے انوکھی اثرات رکھنے والی ایسی شعاعوں کا اخراج ہوتا تھا جو مدمقابل کے جسم میں دوڑتے خون کو یکلخت منجمد کر کے پل کے پل اُسے موت سے ہمکنار کر دیتی تھی۔

ہم دونوں متحیر نگاہوں سے ان دونوں انوکھے مگر انتہائی مہلک ہتھیاروں کا جائزہ لینے میں محو تھے۔ پھر میں نے سنہری بھونرے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سے سیاہ بھونرے کی شکل کا ہی تھا لیکن سنہرا تھا۔ اس کے دونوں پروں پر ہلکے سیاہی مائل سنہرے سے تھے۔ وہ [illegible] جتنی ابھری ہوئی آنکھیں تھیں۔

ان دونوں ننھے اور مہلک ہتھیاروں کا اچھی طرح جائزہ لینے اور روڈلف کے مطابق، ان کے میکنزم سمجھنے اور چلانے کے بعد مطمئن ہو کے میں نے انگوٹھی اپنے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہن لی جبکہ بھونرے کو پہلے میں نے اسی پاؤچ میں سنبھال کر رکھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر کہ اسے سولر انرجی کی ضرورت پڑ سکتی تھی، میں نے اسے پاؤچ میں رکھنے کے بجائے جیب میں ڈال لیا۔

میں یقین سے ابھی تک نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کارآمد بھی تھے یا نہیں؟ لیکن مجبوری یہ کہ ان کی آزمائش بھی کسی زندہ انسان پر ہی کرنا پڑتی جو سردست میں نہیں کر سکتا تھا۔

بہرکیف..... یاسمین پُرجوش تھی اور میں متحیر.....

کیونکہ یاسمین کا خیال تھا کہ ان خلائی ہتھیاروں کی موجودگی بتاتی تھی کہ ثمانہ کا باپ اخناطوں واقعی ایک خلائی انسان تھا۔

اس کے بعد میں اور یاسمین مقبرے سے باہر آگئے۔ ممی کو سنبھالے ہوئے ہم لوگ ڈارک گریٹ پیرامڈ سے باہر آئے تو شام اہراموں پر اپنی زرد اور اداسی کی چادر پھیلانے لگی تھی۔

ہاموس ابھی تک خیمے کے اندر مقید، رسّی بستہ حالت میں پڑا تھا۔ اسے وہیں چھوڑ کر ہم نے گاڑیوں کا جائزہ لیا۔ ان میں ایک گاڑی قابلِ استعمال تھی جو اُن کی ہی تھی جیسا کہ مذکور ہو چکا اس کی باڈی پر امریکی تحقیقی ادارے "ڈسکوری" کا مونوگرام چسپاں تھا۔

ہم سب اس میں سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

صحرائے نوبیان میں اب کی بار ہمارا یہ واپسی کا سفر قاہرہ شہر کی جانب بہ خیر و عافیت تمام ہوا۔ پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ثمانہ کی ممی کی دریافت کے بعد بے حد پُرجوش اور خوش نظر آرہے تھے۔ وہ اس کی دریافت کا سہرا اپنے سر لینا چاہتے تھے۔ اس پر مجھے اور یاسمین کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

تاہم میری اور کسی حد تک اپنی بھی مدد اور خیر خواہی کے سلسلے میں یاسمین نے ان سے مدد کی مشروط درخواست کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم دونوں بھی ان کے ساتھ ثمانہ کے تحقیقی مشن میں شامل رہیں گے۔

"شامل رہیں گے نہیں بلکہ تم دونوں شامل ہو۔" پروفیسر ڈین نے پُرزور لہجے میں کہا۔ اس پر ڈاکٹر ہیر اللہ نے بھی اسی جوشِ مسرت سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل! کیونکہ مس یاسمین تو خود بھی ایک بڑے اور قابل شخص پروفیسر جمشید کی بیٹی ہیں اور ان کے ساتھ کئی مہمات میں شامل رہ چکی ہیں۔ ثمانہ پر تو تم دونوں باپ بیٹی نے بھی کافی تحقیق کی تھی اور اب بھی اسی مقصد سے تم باپ بیٹی نے ایران سے یہاں تک کا سفر کیا تھا۔"

"جی ہاں!" یاسمین نے اثبات میں اپنا سر ہلایا تھا۔

ہم لوگ ان کی مونوگرام والی لمبی سی جیپ میں سوار تھے۔ سب سے آخری نشست پر ثمانہ کی ممی کو لٹایا ہوا تھا۔ درمیانی سیٹوں پر یاسمین اور میں براجمان تھے۔ ڈاکٹر ہیر اللہ نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا ہوا تھا جبکہ پروفیسر ڈین ان کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھے۔

جیپ صحرائی ٹیلوں کے درمیان بنے بل کھاتے راستے پر مناسب رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ جھٹ پٹا ہونے لگا تھا۔

اس دوران میں ہمارے بیچ اسی قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ یاسمین نے بڑی ذہانت اور ہوشیاری سے انہیں اعتماد میں [illegible] اور میرا معاملہ ان سے اس انداز میں ڈسکس کیا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ امریکا لے جانے پر رضامند ہو گئے۔ باقی تو پھر لاوارث امریکی مسافر بردار جہاز..... سے متعلق یاسمین نے ایسی کہانی کا نقشہ کھینچا تھا کہ گویا ہمارا ایک ایسی جرائم پیشہ تنظیم کا گروہ تھا جو نوادرات کی چوریاں کرتا تھا وغیرہ۔

یوں یاسمین خانم نے انہیں ذرا بھی دیا تھا کہ ثمانہ کی ممی والے قصے کو راز میں ہی رکھا جائے اور اپنی رازداری سے قاہرہ سے امریکا کی جانب جلد سے جلد کوچ کر جانا چاہیے۔ کیونکہ ڈین اور ہیر اللہ کی زبانی ہمیں یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ یہ لوگ امریکا سے اپنی ٹیم کے ساتھ کمپنی کے ہی ایک خصوصی چارٹرڈ جیٹ طیارے میں آئے تھے جو قاہرہ کے ائیرپورٹ کے ٹرمنل پر کھڑا تھا۔

شکر تھا کہ انہیں کوہارا یا کسی اور کی زبانی ان خلائی ہتھیاروں کا علم نہیں تھا جو اب میرے قبضے میں تھے۔ یاسمین سے وہ دونوں ثمانہ کی تحقیق وغیرہ کے سلسلے میں مدد اور رہنمائی کے متمنی تھے۔

میرا معاملہ چونکہ اور نوعیت کا تھا اس لیے یاسمین نے ان کے سامنے مجھے اپنا صرف ایک ہیلپر یا ساتھی کے طور پر ہی "ڈکلیئر" کیا تھا۔

یاسمین ان دونوں سے اسی طرح کی گفتگو میں مصروف رہی اور ساتھ ساتھ مجھ سے بھی باتیں کرتی جاتی تھی جو عمومی نوعیت ہی کی ہوتیں۔ لیکن مقصد ان کا، بالخصوص پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ کو یہی جتانا تھا کہ وہ پہلے بھی اس طرح کے تحقیقاتی مشن میں یہاں آچکی تھی اور بہت سی معلومات رکھتی تھی، یوں بھی وہ ایک ماہر مصریات کی بیٹی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ ڈین اور ہیر اللہ اس سے بے حد متاثر نظر آرہے تھے۔ یاسمین نے ان پر مزید اپنا رعب جھاڑتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ ثمانہ، اس کی ماں اور بالخصوص باپ اخناطوں کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی تھی، یوں بھی کافی حد تک اس کی بات غلط بھی نہ تھی۔ چنانچہ اب ڈین اور ہیر اللہ، یاسمین سے بے حد متاثر ہو چکے تھے اور اسے ثمانہ سے متعلق اپنی آئندہ کی تحقیق میں شامل رکھنے کا پکا تہیہ کر چکے تھے، یہی وہ چاہتی بھی تھی، اپنے لیے نہیں بلکہ میرے لیے.....

آفرین ہے اس عورت پر جو میرے ذاتی اور اہم ترین "کاز" کے سلسلے میں کس قدر مخلص تھی مگر کیوں.....؟" اس میں اس کے کسی اخلاقی جذبے کا دخل تھا یا بات کچھ اور تھی؟

بہرکیف..... ہم جیسے جیسے شہر کے قریب بڑھتے جاتے، ایسے میں کچھ اور وادیوں کے آثار بھی دیکھنے میں آتے تھے۔ ان میں ایک وادی کے بارے میں یاسمین نے مجھے بتایا تھا کہ یہ "ویلی آف کنگز....." کہلاتی تھی، یعنی بادشاہوں کی وادی..... وجہ اس کی یہ بتائی کہ قریب قریب سبھی فرعونوں نے اس جگہ کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر پسند کیا تھا اور یہاں بہت کچھ تعمیر کرایا تھا، لیکن دریائے نیل کے مغربی کنارے پر بھی ایک "ملکاؤں کی وادی" ہے۔

"بادشاہوں کی وادی کی وجہ بات تو سمجھ آگئی ینگ لیڈی!" پروفیسر ڈین نے، جو ڈاکٹر ہیر اللہ سمیت یاسمین کی بات بڑے غور اور انہماک سے سن رہا تھا، مسکراتے ہوئے

Visit https://reading.caretofu et for more novels and digests

درمیان میں یاسمین کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن...... یہ ملکاؤں کی وادی کی وجوہات کیا تھیں؟"

یاسمین نے سنجیدہ اور بردبارانہ لہجے میں اسے بتایا...... "وجوہات اس کی بعض حوالوں سے یہی سامنے آتی ہیں کہ اس وادی میں ملکہ ہت شیپسو کا ایک مندر موجود ہے۔ یوں قدیم مصر کی تاریخ میں وہ واحد "خاتون فرعون" تھی۔"

شام کے ایسے ہی اچھوتے سے پن میں سفر جاری تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ شہر کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنی حالت کو بہتر کرنے کے لیے ایک آبادی والے علاقے میں رک کر منہ ہاتھ دھوئے اور اپنی حالت قدرے بہتر بنائی۔ باقی مرہم پٹی وغیرہ کا سامان گاڑی میں موجود تھا جس میں ڈاکٹر ہیرالڈ کا بھی میڈیکل باکس رکھا تھا۔

یہ سارا کچھ ایک گھنٹے میں نمٹا کر ہم ایک بار پھر روانہ ہو گئے۔

چند سڑکوں سے گزر کر ہم ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر آ گئے۔

سڑکوں کی روشنیاں ابھی جل چکی تھیں۔ وہ بے حد بھلی لگ رہی تھیں۔ جیپ نے ایک موڑ کاٹا اور ایک انتہائی حسین منظر ہماری کھلی آنکھوں کے سامنے تھا۔

سڑک قدرے بل کھاتی ہوئی ایک کشادہ پل کی بلندی کی طرف جارہی تھی اور درمیان میں دریائے نیل بہہ رہا تھا۔ اس جگہ دریا کا پاٹ خوب چوڑا تھا اور یہاں دریائے نیل کا حسن اُجاگر ہو رہا تھا۔

سڑکوں اور آس پاس کی عمارتوں کی جگمگاتی ہوئی روشنیوں نے عجیب رومانی سماں پیدا کر دیا تھا۔ پس منظر میں آسمان پر شفق پھوٹی نظر آتی تھی۔ قاہرہ کا حسن و جمال پوری آب و تاب کے ساتھ نگاہوں کے سامنے تھا۔

سفر کے اسی دوران میں یاسمین بتانے لگی۔ "قاہرہ میں دریائے نیل کو عبور کرنے کے لیے چھ پل ہیں، اس پل کو اکتوبر برج اور یہ سب سے خوب صورت پل ہے۔"

یہ حقیقت بھی کہ ہم سب ہی جیسے پیش آمدہ حالات کی کشاکشی کو بھلا کر دم بخود سے بیٹھے اس افسانوی منظر کو دیکھ رہے تھے۔ کم از کم مجھے تو آج اندازہ ہوا تھا کہ آخر قاہرہ کی ساری دنیا میں اتنی دھوم کیوں ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی تاریخی یادگاروں، قدیم محلات، عظیم الشان مساجد اور شاندار گرجا گھروں سے قطع نظر قاہرہ بذات خود ایک متنوع اور دل میں اتر جانے والا شہر ہے۔

اہرام کی تو خیر بات ہی الگ تھی مگر ایک سچ یہ بھی تھا کہ یہ قاہرہ کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کی حدود کے باہر واقع ہے۔

بقول شاعر...... ابھی تو جہاں اور بھی ہیں...... کے مصداق جب ہماری جیپ پوری طرح قاہرہ شہر میں داخل ہوئی تو پھر بھی نہ سفر ختم ہوا نہ یاسمین کی قاہرہ سے متعلق تقریر، تعریف، وہ ان دونوں امریکی اور فرنچ سائنٹسٹ پر اپنی علمیت اور قابلیت کا رعب بدستور جھاڑے جارہی تھی۔

لہٰذا ہم اس وقت قاہرہ شہر کی سب سے بڑی، لمبی اور مشہور سڑک "شارع الاہرام" پر آئے تو تجارتی مراکز، سربہ فلک اور رہائشی فیشن ایبل عمارتوں کو دیکھ کر میں بھی دنگ رہ گیا تھا لیکن جب اسی سڑک پر ایک نائٹ کلب کے آثار نظر آئے تو پروفیسر ڈین گروین نے برملا کہا۔

"اوہ...... شارع الاہرام کی اس سڑک کے حصے کو میں بڑے آرام سے نیویارک کے [illegible] سے مشابہت دے سکتا ہوں۔"

کوئی شبہ بھی نہ تھا اس میں...... کہ قاہرہ کا حسن [illegible] سے تعلق رکھتا تھا۔ سڑکیں، دکانیں، عمارتیں، سبھی روشنی سے جگمگاتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ قطار در قطار نائٹ کلب موجود تھے۔ ان کی جلتی بجھتی اور جگمگاتی ہوئی رنگ برنگی روشنیاں ایک عجیب سماں پیدا کیے ہوئے تھیں۔

فٹ پاتھوں پر کافی رش تھا۔ ہر قسم کے عرب وہاں چلتے پھرتے نظر آرہے تھے۔ شاید سیاحوں کا سیزن تھا۔

مغربی لباس والے بھی نظر آرہے تھے اور مشرقی لباس والے بھی۔ فیشن ایبل اسکرٹ میں ملبوس خواتین، لمبے چغوں میں لپٹی ہوئی خواتین، زیادہ تعداد غریب غربا کی تھی۔

بعض خواتین خوش وضع بھی تھیں مگر یہ محسوس کیا کہ دبلی پتلی عورتیں برائے نام تھیں۔ میں انہیں بغور گھور رہا تھا، جلد ہی میں اس بات کی تصدیق کر چکا تھا کہ یہاں کی خواتین، لڑکیاں عموماً گداز جسم ہوتی ہیں۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے لڑکپن سے جوانی کی منزل تک پہنچتے ہی موٹاپے کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ اب خدا جانے یہ آب و ہوا کا اثر تھا یا خوراک کا۔

ایسے موقع پر یاسمین خانم کو میں نے پروفیسر ڈین سے یہ کہتے سنا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"پروفیسر! تم نے یہ تشبیہ تو دی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں نیویارک کی طرح جرائم پیشہ لوگوں کا وجود نہیں ہے۔ حالانکہ یورپ اور امریکا کے شہروں میں ایسے علاقے

مجرموں کے اڈے بن جاتے ہیں۔"

یہ دونوں سائنٹسٹ یاسمین کی اس بات پر تفہیمی انداز میں سروں کو دھیرے دھیرے جنبش دینے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ہم ایسے ہی ایک علاقے کے ہوٹل [illegible]۔ یہ ہوٹل ائرپورٹ کے قریب تھا۔ خدا جانے یہاں تک ان دونوں بزرگوں نے یاسمین سے کیا کہا تھا کیونکہ میں تو باہر کا حسن دیکھنے میں محو تھا (شاید مسلسل آوارہ گردی سے میری بھی عادتیں خراب ہونے لگی تھیں) کہ وہ دونوں تو جیپ سے اتر گئے مگر ہمیں وہیں بیٹھے رہنے کا کہہ گئے۔

"یہ کیا چکر ہے؟ ہمیں کیوں نہیں اترنے کا کہا گیا؟" جیپ سے اترتے ہی میں نے یاسمین سے قدرے [illegible] پوچھا تو وہ مسکرا کر جواب میں بولی۔

"تمہارا دھیان کہاں تھا مسٹر شہزی؟"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟" میں نے اسے گھورا۔

"یہ دونوں ہوٹل چھوڑ کر اسی وقت ائرپورٹ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہیں، کیونکہ میں نے انہیں ڈرا دیا ہے۔ یہ دونوں سنکی بڈھے ممانہ کی ممی کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سنکی ہو رہے تھے۔"

"او...... کیا یہ دونوں ڈر گئے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ اتنی جلدی ممکن ہے اور آسان بھی؟" میں نے کہا۔

"بچے اور بوڑھے ایک ہی تو ہوتے ہیں۔" مصائب و آلام اور کوہ پارہ جیسی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے بعد وہ بھی شاید اب حالات سے حظ اٹھانے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ میں اسے یوں مسکراتے اور چہکتے دیکھ کر بڑے مصنوعی غصے سے گھورنے لگا۔ وہ ہنس دی اور اسی لہجے میں مزید گویا ہوئی۔

"مصیبتوں کے دن لد چکے مسٹر شہزی! اب کوچ کی تیاری کرو۔ تمہارے پاس دنیا کے عجیب اور طاقت ور ترین ملک کا ویزا موجود ہے، دیکھنا اب، تم امریکا جیسے جادو بھرے ملک میں اپنے جیسے شیخوں کو کس طرح خاک چٹاتے ہو، روڈ ٹف کو اب [illegible] رہو گے۔"

"اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرمائے لیکن یہ سب اتنی جلدی کیسے ہوگا؟" میری سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"سب ممکن ہو جائے گا۔" وہ بدستور اسی طمانیت سے بولی۔ "اس ہوٹل میں ان کے کمرے پہلے ہی سے ریزرو تھے۔ لہٰذا اپنے کمرے میں جا کر سب سے پہلے ڈاکٹر ہیرالڈ پروفیسر ڈین کی مرہم پٹی کریں گے، پھر دونوں اپنا سامان سمیٹیں گے اور ہوٹل چھوڑ کر باہر نکل آئیں گے۔ ائرپورٹ کے ٹرمینل فور میں ان کا چارٹرڈ اسپیشل جیٹ طیارہ موجود ہے، اس کا کسٹم ہال مخصوص ہے۔

"وہیں سے ہم دونوں کی امیگریشن تیار کی جائے گی۔ تمہارے پاس تو یوں بھی ملٹی پل ویزا، ایک خطیر رقم کی بینک اسٹیٹمنٹ کے علاوہ مختلف ممالک کے ویزا اسٹیمپ لگی ہیں۔

"باقی جو تھوڑا بہت معاملہ خراب بھی ہوا تو یہ دونوں کھرانٹ بڈھے کب کام آئیں گے؟ یہ امریکی ادارے سے وابستہ ہیں اور امریکیوں نے بھی اس وقت ان ممالک پر اپنی چودھراہٹ قائم کیے ہوئے ہے، انہیں روکنے کی کوئی جرأت نہیں کرے گا۔"

یاسمین نے روانگی کا عجیب ہی نقشہ کھینچا تھا جو میرے لیے بہرحال خیر تسلی بخش تھا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے اچانک اس سے سوال کر ڈالا۔ "کیا تم بھی امریکا جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"تم جو جارہے ہو۔" وہ میری آنکھوں میں اپنی غزال چشم کو جیسے تیر کی طرح پیوست کرتے ہوئے بولی۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔ خانم!" بے اختیار میرے منہ سے "خانم" نکل گیا جس نے یاسمین کے چہرے کو گلنار سا بنا دیا۔

"کاش! تم مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارو۔ تمہارے منہ سے مجھے یہ نام پکارنا بے حد اچھا لگتا ہے۔" یہ سب کہتے ہوئے میری نظریں اس کے شاداب سے چہرے پر بدستور جمی رہی تھیں۔ اس کے شفق رنگ گال دہکنے لگے تھے۔

میرا اندر جب انفعال و خجل کا شکار ہونے لگا تو میں نے منہ بسور کر چہرہ دوسری جانب گھما لیا۔

"ناراض کیوں ہوتے ہو شہزی؟ میں تمہاری خاطر تھوڑی جارہی ہوں۔ اپنے مرحوم والد کا مشن پورا کرنے جارہی ہوں۔" وہ ایک دم متانت سے بولی۔

"لہٰذا اب میں تمہارے ساتھ نہیں بلکہ تم میرے ساتھ جارہے ہو۔ ممانہ کی ممی پر تحقیق کی ابتدا میرے پاپا نے کی تھی۔ اس کا اختتام بھی میں ڈین اور ہیرالڈ کے ساتھ مل کر کروں گی، میں نے انہیں یہ سب بتا دیا ہے۔ وہ بھی خوش اور مطمئن ہیں۔"

"اچھی بات ہے۔" میں نے ہولے سے کہا۔

پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ کو اپنے کمروں میں گئے ایک گھنٹا بیت چکا تھا۔ انہوں نے یاسمین کو اس بات کی کڑی

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

تاکہ پھر کی تھی ہم دونوں جیپ سے بالکل بھی نہ اُتریں اور نہ ہی ہوٹل میں ان کے پیچھے داخل ہونے کی کوشش کریں۔

"ویسے میرا ارادہ تو یہی تھا کہ تمہارے ساتھ رہتی۔ تمہارے مشن میں مددگار بن کر لیکن تم...... نجانے کیوں یہ پسند ہی نہیں کرتے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے کہا۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہ اُترا اُترا اور مایوس سا نظر آرہا تھا۔ انسان کا دل، جذبات بھی عجیب ہی رنگ رکھتے ہیں۔ ذرا دیر کا کسی کا ساتھ اس قدر مانوسیت میں کیوں بدل جاتا ہے کہ جی چاہے وہ ہمیشہ ساتھ رہے، کبھی نہ جدا ہونے کے لیے...... یہ انسان کی اپنی حساسیت کی فطرت پہ منحصر ہی ہوتی ہے۔

یاسمین خانم میرے لیے ایسے ہی جذبات رکھے ہوئے تھی، وہ اگر میرے اندر جھانکتی تو اسے بھی میرے دل میں بھی کچھ نظر آجاتا۔

حالانکہ میرے پاس دوستوں کی کیا کمی تھی؟ زہرہ بانو سے لے کر اول خیر اور شکیل دادا، شکیلہ یہ سارے اس کمی کو پوری کرنے کے لیے کافی تھے۔ لیکن عابدہ کا خلا ایک اسی کمی کی صورت میں تھا کہ...... ہر خوشی اور مسرت کے باوجود میرا دل اداس ہی تھا۔

یہ سب سوچتے سوچتے...... میری آنکھیں شاید نم آلود ہوگئی تھیں۔

"او میرے خدا...... ! کہاں پہنچ گئے تم...... شہزی!"

یاسمین یک بیک میرے خاموش چہرے اور آنکھوں کو تر محسوس کرتے ہی ایک دم آہ بھرے انداز میں بولی اور اس قدر رقیق سی ہوگئی کہ اس نے بے اختیار اپنا ایک مرمریں بازو میری گردن کے گرد حائل کردیا۔ اور اسی مخمور و مجبور سے لہجے میں دوبارہ بولی۔

"مجھے معاف کردینا میں نے شاید تمہیں ہرٹ کردیا۔ پلیز شہزی! میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تم مجھ سے خار کھاتے ہو، میں جانتی ہوں تم نہیں چاہتے کہ میں کسی مشکل کا شکار ہوں۔ جبکہ خود میں یہ چاہتی ہوں کہ امریکا میں عابدہ کے سلسلے میں بھی مجھ سے تمہارے لیے جو کچھ ممکن ہوسکے، وہ میں کروں...... کوئی ایک ٹھکانا کوئی ایک راستہ اس شہر خرابا امریکا میں تو ہونا ہی چاہیے کہ جہاں انسان کو سکون کی چند گھڑیاں میسر آسکیں۔"

"بات عجیب ضرور ہے مگر سمجھ میں آجاتی ہے تو میں غلط نہیں ہوں، ان دونوں بڈھوں کی دلچسپی اور کمزوری سے میں اچھی طرح واقف ہوچکی ہوں۔ جب تک میں یا تم ان کے ساتھ ہیں، حالات ہمارے فیور میں رہیں گے۔"

"میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں۔" بالآخر میں نے بمشکل اندرونی کیفیات پر قابو پاتے ہوئے ہولے سے کہا۔ "اور...... میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم میری ہی وجہ سے یہ سب کررہی ہو۔ بس! مجھے میرے دوست ساتھی یاد آگئے تھے جو میرے لیے کس قدر پریشان ہورہے ہوں گے۔ جبکہ میرے دو ساتھی شکیل دادا اور شکیلہ جانے کتنے دنوں سے سان ڈیاگو میں بے چینی سے میرے منتظر بیٹھے ہیں۔"

"اور...... عابدہ...... ؟ کیا وہ تمہیں یاد نہیں آرہی ہے؟" وہ ہولے سے دل لبھانے والے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں......" ایک گھٹی گھٹی سی جگر پاش ہنکاری میرے حلق سے خارج ہوئی تھی۔ "اس کی کیا بات ہے۔ وہ تو ہر وقت میرے اندر...... میری رگوں میں، میری روح میں موجود رہتی ہے۔ یہ ساری تگ و دو یہ جستجو یہ دن رات کو ایک کرنا سب اسی کی خاطر تو ہے۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" یاسمین بولی۔

اسی وقت ہمیں اپنی اس جذباتیت بھری گفتگو کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔ کیونکہ پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ ہوٹل کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے، ان کے ہمراہ دو باوردی ویٹر بھی تھے جنہوں نے سامان اُٹھا رکھا تھا۔

لیکن جیپ سے ذرا ہی فاصلے پر انہوں نے انہیں اُجرت وغیرہ دے کر وہیں سے چلتا کردیا اور خود باقی سامان اُٹھائے جیپ کے پاس آگئے۔

ذرا دیر بعد جیپ ایک بار پھر رواں ہوچکی تھی۔ ائرپورٹ چونکہ قریب ہی تھا۔ ہماری جیپ دوسرے گیٹ سے اندر داخل ہوچکی تھی۔

ہوٹل سے ائرپورٹ تک کے مختصر دورانیے کے فاصلے پر وہ مجھے اور یاسمین کو چند ضروری ہدایات دے چکے تھے۔ رات گہری ہوچکی تھی۔ ائرپورٹ کی بتیاں روشن تھیں۔ مطلوبہ ٹرمینل کے پاس جیپ رک گئی جہاں چند وردی پوش کسٹم اینڈ امیگریشن اہلکار کھڑے نظر آرہے۔

وہاں سفید رنگ کا ایک تیکھی ونگوں والا جیٹ طیارہ کھڑا نظر آرہا تھا جس پر بھی "ڈسکور" کا دنیا والا گول مخصوص مونوگرام بنا تھا۔ طیارے کا عقبی حصہ کسی بڑے گیراج کی طرح کھلا ہوا تھا۔

صاف لگتا تھا کہ دونوں بڈھوں نے ہوٹل سے ہی شاید فون کے ذریعے اپنی قاہرہ انٹرنیشنل ائرپورٹ سے روانگی کا بندوبست کررکھا تھا۔

یاسمین نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے اپنے دو پائلٹ موجود تھے جو طیارے کی مستقل رکھوالی پر متعین تھے۔ ٹرمینل کے ایک جانب کسٹم اینڈ امیگریشن ہال بنا ہوا تھا جو پرائیویٹ طیاروں کی آؤٹ جارک کی چیکنگ کے لیے مخصوص تھا۔ باری باری ہم اندر گئے۔

یاسمین اور میں نے ایک بات خصوصی طور پر محسوس کی عملہ پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ کو بے حد عزت و نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اسی سبب مجھے اور یاسمین کو پوری ہم دونوں کے سلسلے میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہو عملے کی طرف سے خدشات اپنی جگہ موجود تھے۔

جب میری اور یاسمین کی باری آئی تو ہم دونوں کے ساتھ کاؤنٹر کی جانب بڑھے۔ وہاں افراد موجود تھے۔ ایک عورت بھی تھی ان میں۔ ڈاکٹر ہیر اللہ کی وجہ سے انہوں نے بڑے احترام عزت کے ساتھ ہم سے ہمارے کاغذات مانگے۔ ہم نے تھما دیے۔

مرد نے تو ہمارے متعلقہ سفری کاغذات پر سرسری نظر ڈالی تھی لیکن جب اس نے اپنی ساتھی کو بھی چیکنگ کے لیے کاغذات تھمائے تو وہ اسے بغور دیکھنے لگی۔ جانے کیوں انجانے خدشات کے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اس دوران کن انکھیوں سے پاس کھڑی یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کی بھی اُلجھی اُلجھی سی نگاہیں بھی کسٹم پر بھی کچھ جم سی جاتی تھیں۔

متعلقہ عملے کی وہ خاتون ہمارے کاغذات کو کھولے غور سے اس کے معائنے میں مصروف تھی اور کبھی وہ کر ہم دونوں کے چہروں پر بھی ایک بدگمانی سی نگاہ ڈال۔

وقت میری آتی جاتی سانسیں جیسے یک لخت حلق گئیں جب میں نے اسے ایک گہری سانس لیتے کاغذات اپنے ساتھی مرد کی طرف بڑھاتے اور اس کہتے دیکھا۔

وہ مرد بھی دوبارہ ہمارے کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے قریب رکھا ہوا فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کرنے لگی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا، پہلو خدشہ بھی اُبھرا تھا یہ پولیس کو تو کال کر کے رہی تھی؟

تاہم اس کا انداز نہایت شائستہ تھا۔ واضح تھا کہ وہ اپنے کسی بڑے آفیسر سے مخاطب تھی۔ ہم سے ذرا فاصلے پر پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ بھی ہمارے منتظر کھڑے تھے۔ انہوں نے...... جو معاملے کو خراب ہوتا دیکھا تو آگے بڑھے۔

عورت تو فون پر ہی بات کرتی رہی۔ جبکہ وہ دونوں عملے کے آدمی سے کچھ پوچھنے لگے۔

"یا جینی تفکر......" اچانک...... وہ مصری عورت ہم سے مخاطب ہو کے بولی۔

"سوری تو سے...... ہمیں عربی نہیں آتی۔" میرے بجائے یاسمین نے یکدم ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ تو وہ مصری خاتون انگریزی میں مخاطب ہو کر بولی۔

"میں نے اپنے آفیسر حیان سے رابطہ کیا ہے وہ یہاں پہنچ رہے ہیں۔ آپ دونوں کے کاغذات کی تصدیق وہی کریں گے۔"

"کیوں؟ کوئی مسئلہ ہے؟ یہ تو میرے ساتھ ہی تھے؟" پروفیسر نے کہا۔ "میرے ٹیم ممبر ہیں یہ...... ادھر ہی پہلے سے مقیم تھے۔"

"آپ کی بات اپنی جگہ، لیکن ایک بات کی تصدیق نہیں ہو پارہی ہے، اسے آفیسر حیان ہی کریں گے۔" مصری بولی۔

"کیسی تصدیق؟ کیا ہمارے ہوتے ہوئے بھی کسی تصدیق کی ضرورت ہے؟" اس بار ڈاکٹر ہیر اللہ نے بارعب لہجے میں خاتون سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بلاوجہ ہمارا وقت ضائع کرنے والی بات ہے یہ، ہمیں اپنی ایجنسی سے رابطہ کرنا پڑے گا۔ ہم کوئی پہلی بار تو نہیں آتے ہیں یہاں؟"

اسی وقت ایک کار کی ہیڈلائٹس ہم پر پڑیں۔ ہال کے دروازے کے سامنے باہر ایک مخصوص رنگ اور ہوٹرز کی کار رکی۔ اس کے اندر سے دو افراد اُترے۔ ہم ان کی طرف دیکھنے لگے۔

ان میں ایک لمبا تڑنگا عربی تھا جس کے بدن پر مخصوص نشانات والی وردی اور شولڈر بیجز اسے عملے کا کوئی بڑا آفیسر ظاہر کررہے تھے۔ دوسرا اس کا کوئی ساتھی تھا۔ وہ اس کا کوئی ماتحت ساتھی ہی دکھتا تھا۔

وہ اندر آیا۔ اس نے پروفیسر اور ڈاکٹر کو دیکھ کر بڑی خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے اس سے کچھ کہا تھا مگر آفیسر انہیں محض دلاسا دینے والے انداز میں سر ہلاتا ہوا کاؤنٹر پر موجود اپنے ان دونوں ماتحت افراد کی طرف بڑھ گیا۔

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

ایک نظر اس نے یاسمین اور مجھ پر بھی ڈالی تھی اور تھوڑی دیر پہلے ڈین اور ہیراللہ کی طرف سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے والا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

اس نے خاتون سے ہمارے کاغذات لیے۔ انہیں ایک نظر دیکھا اور قریب بنے ایک چھوٹے سے چیمبر نما کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

خدا جانے کیا معاملہ تھا، لیکن صاف نظر آتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے، یعنی یاسمین اور مجھ پر کسی قسم کا انہیں شبہ ہو چکا تھا۔ اگر ایسا تھا تو ایک بڑی اور طویل مشکل کے لیے ہمیں تیار ہو جانا چاہیے تھا۔

تھوڑی دیر گزر گئی، کاؤنٹر پر رکھا بزر بجا۔ خاتون نے فوراً کال ریسیو کی اور پھر "رائٹ سر" کہتے ہوئے ریسیور رکھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے مذکورہ چیمبر روم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آفیسر آپ کو اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس کھینچی اور یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا اور کمرے کے پاس پہنچ کر دروازے پر ہولے سے دستک دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

وہ آفیسر ایک بڑی سی میز کے پیچھے بڑے ٹھسے کے ساتھ کرسی پر براجمان تھا اور میری جانب ہی گھور رہا تھا۔ میرے اور یاسمین کے کاغذات اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔

اس نے مجھے اپنے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ اس دوران میرا ذہن بہت تیزی سے کام کرنا شروع کر چکا تھا۔ ایک عجیب و غریب خیال تو جیسے بار بار لپک لپک کر ذہن میں اُبھرتا تھا کہ کسی ایسی ویسی مشکل گھڑی میں مجھے کون سا قدم اُٹھانا ہوگا۔

"مجھے افسوس ہے مسٹر شہزاد! تم اور تمہاری ساتھی یاسمین خانم کو ایک اہم نوعیت کی تفتیش میں شامل ہونا پڑے گا۔" آفیسر نے گمبھیر لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آسان لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ تم امریکا نہیں جا سکتے۔"

"ول...... لیکن کیوں؟ آفیسر؟ کیسی تفتیش؟" میں نے کہا۔ اس نے وہی امریکی جہاز والی کریش لینڈنگ اور اس کی جزوی تباہی وغیرہ کے بارے میں مختصر بتا دیا نیز ایسی اور بھی باتوں کا ذکر کیا جس کی بنا پر وہ اگر ثابت ہو جاتیں تو مجھے اور یاسمین کو یہاں کی جیل بھی بھگتنا پڑ جاتی۔

"آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے آفیسر!" میں نے بالآخر اپنے تیزی سے سوچتے دماغ میں ایک عجیب حربہ [illegible] کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو ایک اور ٹھوس ثبوت دکھاتا ہوں جسے [illegible] کر آپ یقیناً مطمئن ہو جائیں گے۔"

"کیسا ثبوت؟" وہ قدرے اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ تو میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ ننھا سا سنہری بھونرا نکال کر اپنے ہاتھ [illegible] پکڑ لیا۔

وہ اس قدر منفرد اور جداگانہ خوب صورتی اور کشش [illegible] حامل تھا کہ دیکھنے والے کی قدرتی طور ہی آنکھیں پھیل جایا کرتی تھیں۔

وہ میں نے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے اس کے سنہرے پروں پر اپنی انگلی کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

بلاشبہ یہ میرا ایک ایسا دیوانہ پن ہی تھا جیسے میں اندھیرے میں کوئی تیر چلا رہا ہوں۔

بھونرے کا آپریٹنگ سسٹم جس قدر مختصر تھا اسی قدر [illegible] تقاضوں کا بھی حامل تھا ورنہ اس کا اثر مدِمقابل پر ہی نہیں الٹا مجھ پر بھی ہو سکتا تھا، اس کے لیے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بھونرے کو تھام کر اس کے منہ والا حصہ آفیسر کی [illegible] کرتے ہوئے خود سے اس کا فاصلہ کم از کم ڈیڑھ فٹ کی دوری پر جبکہ آفیسر کے بالکل نزدیک کر کے اپنی انگلی سے اس کے پروں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

آفیسر حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہوئے خود اپنا چہرہ بھی اس کے کافی حد تک نزدیک کیے ہوئے تھا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ گویا لمحے کے ہزارویں حصے میں کوئی حیرتوں بھرا اور انوکھا واقعہ رونما ہونے والا تھا۔

"می می...... یہ کیا ہے؟"

"نوادر ہے جناب! آپ کے لیے تحفہ۔" میں نے کہا۔ نظریں میری بھونرے کے پروں پر تھیں، ان میں ہلکا سا ارتعاش تھرکتا محسوس ہوا تھا مجھے......

"یہ...... یہ ضرور...... تم نے کسی اہرام سے چوری......" آفیسر کے منہ سے ابھی اتنا ہی برآمد ہوا تھا کہ اسے ایک دم چپ لگ گئی اور یہی وہ وقت تھا جب مختصر سے اس کمرے میں ہلکی سی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

میری جیسے سانسیں رک گئیں۔ آفیسر کا چہرہ پہلے متغیر ہوا اس کے بعد یک دم سپاٹ ہو گیا۔ یوں جیسے وہ "معمول" بن گیا ہو۔ جبکہ خود اس بھنبھناہٹ کو سن کر میرے اپنے دماغ کی رگیں بھی جھنجھناتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں، بقول

[illegible] کے یہ ہتھیار خود گزیدہ بھی ہو سکتے تھے، یعنی عدم احتیاط کے پیشِ نظر ان کی ہلاکت خیزی استعمال کرنے والے کو بھی نقصان پہنچا سکتی تھی۔ اسی سبب اس میں فاصلے اور [illegible] خاص خیال رکھنا پڑتا تھا۔

میں نے دوبارہ انگلی کو پروں پر ہلکا سا "پش" کیا اور بھنبھناہٹ کی آواز یکلخت ختم ہو گئی۔

میں نے دھڑکتی نظروں سے سامنے بیٹھے آفیسر کے [illegible] کو دیکھا۔ وہ میری جانب ہی تکے جا رہا تھا۔

"آفیسر! میرے اور میری ساتھی یاسمین کے کاغذات [illegible] اپروڈ کرنے کا حکم دو۔" میں نے اس سے [illegible] انداز میں کہا اور اسی وقت اس نے میز پر قریب [illegible] بزر کا ریسیور اُٹھایا اور کاؤنٹر...... پر موجود اپنے دونوں [illegible] کو اندر آنے کا حکم دیا۔

ذرا ہی دیر میں وہ اندر داخل ہوئے۔

"ان کے کاغذات اپروڈ کر کے انہیں جانے دو۔" آفیسر نے ان سے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پہلے وہ دونوں حیران ہوئے لیکن پھر "اوکے سر!" کہتے ہوئے فوراً پلٹ گئے۔

میں ان کے پیچھے آ گیا۔ کاؤنٹر پر آ کر انہوں نے میرے اور یاسمین خانم کے پاسپورٹس پر بڑی سی مہر لگا دی۔ پھر ہم طیارے کی طرف بڑھے۔ پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر [illegible] اس اچانک کایا کلپ پر متحیر تھے لیکن وہ یہی سمجھے تھے کہ ان کی وجہ سے معاملہ رفع دفع کر دیا گیا ہوگا، کیونکہ [illegible] ان کے چہروں پر زعم آمیز مسکراہٹ بھی پیدا ہونے لگی تھی۔

تاہم فی الحال وہاں سے جلد از جلد رفو چکر ہونے کی ٹھانی۔

طیارہ اندر سے خاصا کشادہ اور آرام دہ تھا۔ ضرورت [illegible] شے موجود تھی۔

یاسمین تو یہی سمجھی تھی کہ میں نے اندر آفیسر کے ساتھ کیا [illegible] کھلایا ہوگا۔ خود میری اپنی حالت مسرت و انوکھے پن کے [illegible] جذبات سے دیدنی ہو رہی تھی۔

[illegible] ہتھیار کام کر گئے تھے۔ یقیناً انگوٹھی بھی اپنے وقت پر اسی طرح خاطر خواہ نتائج دے سکتی تھی۔

جیپ کو طیارے کے پچھلے حصے سے اندر داخل کر دیا گیا تھا۔ [illegible] کی ممی اس کے اندر موجود تھی۔

طیارے نے ٹیکسی کی اور رن وے پر آ گیا۔ اس کے [illegible] ٹاور سے آخری ہدایت پاتے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔

پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیراللہ تو ہوٹل سے تھوڑا بہت منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو کر اور لباس تبدیل کر آئے تھے لیکن میری اور یاسمین کی حالت لباس وغیرہ کے معاملے میں خاصی ابتر تھی۔

طیارے میں ہر چیز موجود تھی۔ کچھ ڈین اور ہیراللہ کے سامانوں میں بھی ایسے لباس تھے جو ہمارے کام آ سکتے تھے۔

وارڈ روب میں بھی کپڑے ٹنگے ہوئے تھے، میں نے اور یاسمین نے اچھے اپنے سائز کے لباس کا انتخاب کر ہی لیا تھا، وہ کوئی بوتیک تو تھا نہیں کہ ہمیں ٹھیک ٹھاک اور اپنے ہی سائز کا لباس ملتا تاہم گزارے لائق جو ملا، وہ بُرا نہیں تھا۔ وارڈ روب کے نچلے ریک میں جوتے بھی تھے۔

باری باری واش روم جا کر ہم نہا دھو کر اور نیا لباس پہن کے خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگے، لیکن تھکان اور نیند کا غلبہ اپنی جگہ جوں کا توں رہا، بلکہ غسل وغیرہ کے بعد تو اور بھی زیادہ ستانے لگا تھا، مگر پیش آمدہ حالات ہی ایسے تھے کہ ان سب کا ہوش ہی کسے رہا تھا۔

میرے حصے میں سیاہ ٹائٹ جینز کی پتلون اور ڈارک میرون کلر کی شرٹ تھی۔ جوتوں میں جوگرز کا انتخاب کیا تھا میں نے۔ یاسمین نے بھی کوئی ہلکے گرے کلر کی چست پتلون اور اس پر کھلی ڈلی فل آستینوں والی شرٹ چڑھا لی تھی، پیروں میں اس نے بھی جوگرز ہی "فٹ" کر لیے تھے۔

یوں ان سب تیاریوں کے بعد میں اور یاسمین آرام دہ سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ ہم دونوں ہی اس قدر متحیر و مبہوت تھے کہ کوئی بات ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔

طیارہ امریکا کی جانب پرواز کر چکا تھا۔

☆☆☆

"شش...... شہزی! کیا واقعی......؟" یاسمین نے بظاہر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اردو میں سرگوشی کی۔

"ہاں! خود میں حیران ہوں۔" میں نے بھی جواب میں ہولے سے کہا۔

"ناقابلِ یقین۔"

"مجھے بھی یقین کرنے کے لیے تھوڑا وقت درکار ہے۔ کاش! روڈلف زندہ ہوتا میں اس کا ماتھا چوم لیتا۔ وہ مرتے مرتے ایک بڑا احسان کر گیا ہے مجھ پر۔" میں نے تاثر انگیز لہجے میں کہا۔

"جبکہ تم اس کی بات پر بھروسا کرنے پر بالکل بھی

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

تیار نہیں تھے۔" یاسمین بولی۔

"آہ..... روڈلف! اللہ اس کی مغفرت کرے۔"

"آمین۔"

طیارے میں چھ نشستیں اور دو بیڈ تھے۔ ایک بڑی صوفہ نما نشست بھی تھی۔ پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ اسی پر براجمان تھے۔ ان کے سامنے نصف قوس کی صورت میں میز تھی۔

پروفیسر ڈین ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "گائز! سیلف سروس کرنا پڑے گی۔ جو کھانا پینا ہے فریج سے نکال لو۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یاسمین اور میں نے اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔

"ہمیں اپنے ساتھیوں کی موت کا بے حد دکھ ہے لیکن ہماری مہم کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔ اس کا کریڈٹ یقیناً ہم اپنے مرحوم ساتھیوں کو ہی دیں گے۔" ڈاکٹر ہیر اللہ نے کہا۔

"یقیناً، اس میں کوئی شک نہیں۔" یاسمین اور میں نے کم و بیش ایک قسم کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

فریج کے اندر ڈبا بند خوراکیں، جوس وغیرہ تھے۔ قریب ہی وائن کیبنٹ سے انہوں نے اپنے لیے وسکی نکالی تھی۔ ہمیں بھی پیشکش کی گئی تھی لیکن ہم نے انکار کر دیا۔

ہم اب اپنی نشستوں پر دوبارہ براجمان ہو چکے تھے۔ دیوار پر ایل ای ڈی بھی نصب تھی۔ اس میں کوئی پروگرام چل رہا تھا۔

ڈین اور ہیر اللہ ممی سے متعلق ہی گفتگو کرتے رہے اور یاسمین سے اس کے متعلق اور بھی وہ سب کچھ پوچھنے لگے جس پر پروفیسر جمشید اپنے ایک تحقیقی لائیو ٹی وی [illegible] میں اظہار کر چکا تھا۔

میں خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر کا نظارہ کرنے میں محو تھا۔ جہاں تاریکی کے سوا اب کچھ نہیں نظر آتا تھا۔ میرے اندر ان گنت سوچوں کا جال بنا ہوا تھا۔ انگوٹھی اور بھوترا میرے پاس تھے۔ ان کی افادیت کا "نظارہ" میں کر چکا تھا۔

ان کی موجودگی میرے حوصلوں کو بلند کیے ہوئے تھی۔ امریکا میں میرے بہت دشمن تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ..... انہیں میری وہاں آمد کا علم تھا بھی یا نہیں۔ اتنے بے خبر تو خیر وہ بھی نہیں بیٹھے ہوں گے۔ ایک مسرت بھی تھی کہ جلد سے جلد میں عابدہ کو اب ان کے نرغے سے چھڑا لاؤں گا، لیکن دل سے سوچ کر محسوس بھی ہوتا تھا کہ وہ بے چاری نجانے کس حال میں ہوگی؟

امریکا میں ایک طرف میرے دشمن دانت [illegible] تھے تو دوسری جانب میرے خیر خواہ بھی بے چینی سے [illegible] تھے۔ لیکن میں اب تک نہ پاکستان میں ان سے رابطہ کر [illegible] نہ ہی امریکا میں۔

کبیل دادا اور شکیلہ بھی میرے انتظار میں نجانے کس حال میں تھے، جبکہ عارفہ وہاں پہنچ چکی تھی۔ آسیہ خالہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ شکاگو پہنچتے ہی سب سے پہلے پاکستان زہرہ بانو سے رابطہ کروں گا اور ان سے کبیل دادا [illegible] شکیلہ..... وغیرہ کے بارے میں ان کا اتا پتا اور ان کی [illegible] ڈیاگو..... میں موجودہ پوزیشن کے بارے میں تفصیل سے پوچھوں گا۔

ہم تھکے ہوئے تھے لہٰذا سونے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ میں تو صوفے پر ہی سو گیا۔ یاسمین بھی خالی نشستوں پر بیڈ بنا کر لیٹ گئی جبکہ وہ دونوں بڑے بیڈ پر جا کر لیٹ گئے تھے۔

ان کے مطابق قاہرہ سے شکاگو تک تیرہ سے پندرہ گھنٹے کا سفر تھا۔ ہمارا پرائیویٹ اور دو انجنوں والا جیٹ طیارہ تھا۔ اسی لیے بمشکل پندرہ گھنٹے لگ سکتے تھے۔ جبکہ ہم قاہرہ انٹرنیشنل ائرپورٹ سے رات بارہ بجے روانہ ہوئے تھے اور مصری وقت شکاگو سے سات گھنٹے پہلے تھا۔

تھکے ہوئے تھے، لیٹتے ہی سو گئے۔

پائلٹ کے ساتھی نے ہی ہمیں جگایا تھا۔ واش روم جا کر فریش ہوئے اس کے بعد یاسمین نے سینڈوچ اور کافی وغیرہ تیار کی۔ ڈین اور ہیر اللہ بھی کھانے پینے اور کام کے معاملے میں خاصے ایکٹو تھے۔

میں کھڑکی کی طرف آ کر بیٹھ گیا۔ پائلٹ کے مطابق ہمارا طیارہ بحر اوقیانوس کی آخری حدود میں تھا اور اب امریکا عظیم کی راجدھانی میں داخل ہونے والا تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ داخل ہو چکا تھا۔ میری منزل کیلی فورنیا تھی۔ جبکہ ان کی منزل شکاگو۔

ہمارا "اسٹے" بہرحال شکاگو میں ہی تھا۔ یہ ایک مجبوری تھی۔ اس میں یاسمین کا بھی مشورہ شامل تھا کہ میرا چند روز شکاگو میں قیام کرنا مناسب ہوتا، کیونکہ وہاں رہتے ہوئے میں اپنے بہی خواہوں سے ٹیلی فونک رابطے میں رہتے ہوئے پورے سکون کے ساتھ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا۔ یوں بھی کسی دشمن کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ

[illegible] یا سان ڈیاگو کے بجائے شکاگو کا بھی رخ کر [illegible]

تاہم میں یاسمین کی اس بات سے متفق نہیں تھا کہ [illegible] بالکل ہولا رڈ سمیت میرے دیگر دشمن اس بات [illegible] ہوں کہ میں امریکا میں قدم رکھ چکا ہوں۔ انہیں [illegible] ایک بات کی خبر پہنچتی رہتی ہوگی۔

[illegible] بالخصوص ہولا رڈ سمیت "ٹائیگر ٹیپ" اور لولوش [illegible] بیکرم" کو چھیڑنے کی ضرورت نہ تھی، مگر یہ لوگ [illegible] کو چھوڑنے اور اس پر عرصہ حیات تنگ کرنے میں [illegible] تھے، اسی لیے میں نے راہ کھوٹی ہونے پر انہیں [illegible] کی قسم کھا رکھی تھی۔

اب جبکہ امریکا میں رہتے ہوئے وہ میری قانونی جنگ ہوتی [illegible] ذاتی، اس کا فیصلہ وقت کو کرنا تھا، تاہم [illegible] کیا جا چکا تھا کہ آخر الذکر دشمن اتنی آسانی سے میری [illegible] کامیابی سے سرنگوں ہونے دیں گے۔

میرا اولین اور آخری مقصد صرف اور صرف عابدہ کو ان کے شکنجے سے چھڑا کر کبیل دادا اور شکیلہ سمیت بخیریت وطن واپس لوٹ جانا تھا اور بس۔

میں نے کھڑکی سے پار دیکھا تو عجیب اور انوکھا منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

سورج غروب [illegible] مائل روشنی میں جہاز وائٹ [illegible] دھوئیں کی لکیروں (جو کنڈینسیشن ٹریل یا کونٹریل کہلاتی [illegible]) نے ایسا سماں باندھ رکھا تھا جیسے پوشیدہ آتش بازی کے شعلوں [illegible] کے منظر ہوتے ہیں۔

جھیل مشی گن کے کنارے پر واقع..... شکاگو جہاں [illegible] ڈرے کا آغاز ہوا اور پولیس کے ہاتھوں شہید ہونے [illegible] مزدوروں کے ذکر کے [illegible] شہر کا تذکرہ ادھورا لگتا [illegible] گرٹ کے اعلانیہ کے مطابق ہم اس کے "اوہیر" نامی [illegible]رٹ پر دو تین گھنٹوں بعد ہی لینڈ کرنے والے تھے۔

مجھے اور یاسمین کو بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے کھڑکی [illegible] باہر کا نظارہ کرتے دیکھ کر پروفیسر ڈین گرمجوشی کی نجانے [illegible] کھڑکی کہ وہ امریکا کے گن گاتے ہوئے اوقات [illegible] پر اتر آیا۔

تعریفی لہجے میں اس نے بتایا کہ شکاگو کے اوہیر [illegible]ورٹ کو دنیا کے چند بڑے اور معروف ترین ہوائی اڈوں [illegible] کیا جاتا ہے جو کئی میلوں میں پھیلا ہوا ہے اور بلا مبالغہ [illegible] وقت میں سیکڑوں جہاز اس کی فضا اور زمین پر موجود [illegible] نظر آتے ہیں۔

اس پر یاسمین اور میں نے ایک دوسرے کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھا اور میں نے مصلحتاً پروفیسر ڈین کی طرف دیکھتے ہوئے ظاہری متاثر کن انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی مگر یاسمین سے اردو میں استہزائیہ لہجے میں ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "اگر مشرق وسطیٰ اور عرب ممالک، امریکا کا یہ "تیل پانی" بند کر دیں تو امریکا کے یہ جدید ترین اور بین الاقوامی ہوائی مستقر کھنڈرات کا منظر پیش کرنے لگیں، یہی نہیں امریکا..... کی پوری معیشت ہی ڈھے جائے گی اور امریکا خود بھی۔"

یاسمین بھی اس حقیقت کا ادراک رکھتی تھی اسی لیے اس نے بھی میرے اس مضبوط جغرافیائی تجزیے پر دھیرے سے مسکرا کر صاد کیا تھا۔

کچھ گھنٹوں بعد یہ سفر بھی تمام ہوا اور ہم بالآخر شکاگو کے "اوہیر" ائرپورٹ پر لینڈ کر گئے۔

وہاں "ڈسکور" سے متعلق پانچ چھ افراد پر مشتمل ٹیم ہمارے استقبال کے لیے پہلے ہی موجود تھی۔ لاؤنج سے انکلوژر تک پہنچے تو الیکٹرانک میڈیا سے متعلق رپورٹرز اور اینکر پرسن کا پورا جتھا وہاں آن دھمکا..... ٹھکا ٹھک ہمارے چہروں پر فلش پڑنا شروع ہوئی۔

میں اور یاسمین اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے۔ یہ بہت خطرناک صورت حال تھی۔ میرے دشمن کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے لیے میرا موجودہ ٹھکانا تلاش کرنا کیا مشکل ہوتا۔

ثانیہ کی ممی کی دریافت کا معاملہ بس ایک حد تک ہی خفیہ رکھنے کی کوشش کی گئی تھی..... پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیر اللہ تو بڑے فخر و انبساط کے ساتھ ڈھیروں سارے مائیکس کے آگے منہ لگا کر اپنی کامیابی اور اس پرخطر مہم کے بارے میں بتاتے چلے جا رہے تھے جبکہ میں اور یاسمین ان سے منہ چھپانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

دفعتاً..... اسی [illegible] میں کوئی مجھ سے ٹکرایا اور میرے جھولتے ہوئے ہاتھ میں کوئی شے تھمانے لگا۔ میں ٹھٹکا۔ وہ ایک جوان اور دلکش سی عورت تھی، جو مقامی ہی محسوس ہوئی تھی مجھے۔

پل کے پل ہی میری ایکسرے کرتی نظروں نے اسے تاڑ لیا تھا کہ وہ..... انہی رپورٹرز کے جتھے سے تعلق رکھتی تھی۔

"مسٹر شہزی! میں سوزی ہوں۔ مجھ سے اس ایڈریس پر فوراً ملاقات کرو، دیر نہیں ہونی چاہیے۔"

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to Millions of Our Readers, World Wide Through

63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

غیر ارادی طور پر اس کی تھمائی ہوئی پرچی میں نے اپنی مٹھی میں جکڑ لی لیکن میرے دماغ میں ہتھوڑے برسنا شروع ہو گئے تھے۔

”سوزی...... سوزی...... سوزی......“

میں یاد کرنے کے لیے اپنے ذہن پر زور لگاتا رہا اور اسے ایک طرف کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

وہ لوگوں کے ہجوم سے نکل کر تیز تیز قدموں سے ایک گیٹ کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی اور پھر دفعتاً ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا۔ یاسمین کو بھی کچھ شبہ ہوا۔

”کیا کہہ رہی تھی یہ لڑکی تم سے؟“ اس نے پوچھ لیا۔

”مجھے اس کے پیچھے جانا ہوگا۔ تم میری فکر مت کرنا خانم! میں جہاں کہیں بھی ہوں گا تم سے جلد رابطہ کروں گا، تمہارا اس وقت ڈین اور ہیرالڈ کے ساتھ جانا ضروری ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے اپنے سفری کاغذات کا وہ پاؤچ بھی کسی احتیاط کے پیش نظر، جلدی سے اسے تھما دیا۔

”یہ سنبھال کر رکھنا، میں بعد میں تم سے لے لوں گا۔“

وہ کچھ کہتے کہتے رہ گئی اور میں یہ کہہ کر اسے ہکا بکا چھوڑ کے ایک دم آگے بڑھ گیا۔ حالانکہ اس کا ایڈریس ایک کارڈ کی صورت میں میری مٹھی میں تڑا مڑا پھنسا ہوا تھا مگر پھر بھی میں اس کے پیچھے چل پڑا۔

جلد ہی میں نے اسے گیٹ سے باہر پارکنگ لاٹ پر کھڑی ایک کار کی جانب بڑھتے دیکھ لیا اور اس کی جانب لپکا۔

”ہے مس سوزی!“ قریب جا کر میں نے عقب سے ہولے سے پکارا۔ وہ بُری طرح چونک کر میری جانب پلٹی۔ اس کی خوبصورت سی آنکھوں میں حیرت اور پریشانی کی ملی جلی جھلک اُبھری......

”میں ابھی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں، کیونکہ میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔“ میں نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔

وہ چند ثانیے کے لیے کچھ سوچتی بن گئی۔ اس کے بعد اس نے صرف اثبات میں ہی اپنا سر ہلانے پر اکتفا کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر اس میں جا بیٹھی۔

میں بھی فوراً دوسری جانب سے تیزی کے ساتھ لپکا اور اس کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گیا، میری طرف کا دروازہ وہ کھول چکی تھی۔ اس نے کوئی بات کیے بغیر کار آگے بڑھا دی۔

شکاگو کا موسم معتدل تھا۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید بادلوں کی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔

امریکا کا رقبہ اور اراضی جس قدر وسیع ہے اسی قدر یہاں آپ کو کم لوگ ملیں گے۔ لوگوں کا تھوڑا بہت مجمع آپ کو صرف مخصوص جگہوں پر ہی نظر آئے گا۔ فٹ پاتھ یا ادھر اُدھر سرگشت کرتے لوگ خال خال ہی نظر آ رہے تھے۔

”تم آنسہ خالدہ کی فرینڈ ہو نا......“ کار کی رفتار بڑھاتے ہی اور ایک شاہراہ پر پہنچنے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہاں!“ اس نے سامنے ونڈ اسکرین سے نگاہیں ہٹائے بغیر جواب میں کہا۔ وہ خاصی سنجیدہ اور کسی حد تک گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔

”پاکستان زہرہ بانو کو تم نے ہی فون کیا تھا نا...... آنسہ خالدہ کے کہنے پر......! کہ وہ خود کہیں غائب ہو گئی اور......“

”جب مجھے پہچان ہی گئے ہو تو کیوں فضول باتوں میں وقت ضائع کر رہے ہو۔“ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے جھلا کر کہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میرے اس اچانک ساتھ پر خوش نہ تھی۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لینے کی کوشش سی چاہی، اس پر کچھ کچھ امریکی ہونے کا شائبہ تھا لیکن اس کے چہرے کے تیکھے تیکھے نقوش میں مخصوص قسم کا گداز پایا جاتا تھا، جلد کی رنگت صاف اور ملائم تھی۔

وہ کہیں سے عربی اور یونان کا ملا جلا نمونہ لگتی تھی تو کسی رخ سے امریکی، لہجہ اس کا بوجھل سا مگر آواز میں دلربائیت تھا۔ اس کا چہرہ قدرے گول مگر کچھ بیضوی تھا۔ بال گھنے تھے، مگر اسے ربن کیا ہوا تھا۔ اس نے ہلکے گہرے کلر کا شارٹ اسکرٹ پہنا ہوا تھا۔ شرٹ وائٹ لوز گریبان خاصا کشادہ تھا، جسمانی لحاظ سے وہ خاصی متناسب الاعضا تھی۔ قد درمیانہ تھا۔

میرا ہی نہیں بلکہ میرے ساتھیوں کا بھی سوزی سے آنسہ خالدہ کے حوالے سے غائبانہ تعارف ہو چکا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب میں کیپٹن داؤد، ادل شیر اور شکیلہ کے ساتھ انڈیمان کی پُرخطر مہم کے بعد انڈیا سے کراچی پہنچا تھا اور بہ غرض خیر خیریت میں نے لاہور بیگم داؤد کو فون کھڑکا دیا تھا۔ پھر زہرہ بانو سے ہی مجھے سوزی کے فون کے بارے میں بتایا تھا جس کے مطابق آنسہ خالدہ کی گمشدگی اور میرے بارے میں دریافت کرنا تھا۔ نیز سوزی نے زہرہ بانو سے میرے بارے میں بھی پوچھا تھا۔

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

اس نے خود کو آنسہ خالدہ کی ساتھی بتایا تھا اور ہم بھی لاعلم...... یہی سمجھتے رہے تھے کہ سوزی یقیناً آنسہ خالدہ کی گہری ”رازداں“ دوست رہی ہوگی اسی لیے...... اسے ساری باتوں کا علم تھا۔

لیکن باوصف اس کے نجانے یہ میری غیر معمولی بڑھی ہوئی چھٹی حس کا شاخسانہ تھا یا حد سے زیادہ احتیاط پسندی کہ مجھے سوزی کو قریب سے اور اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر کسی گہری گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

سوزی نے گردن گھما کر میری جانب دیکھا اور پھر سامنے سڑک پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔

”تم بہت جلد باز ہو، جب میں نے تمہیں اپنا ایڈریس دے ہی دیا تھا تو اتنی جلدی کس بات کی تھی؟“

میں اب اس کی ایک ایک حرکات و سکنات سمیت اس کے لہجے اور انداز گفتگو کو آبزرو کرنے کی...... کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس کی بات کچھ عجیب لگی۔ تاہم ہلکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

”جلد بازی تو دور کی بات ہے، یہاں میرا ایک ذرا بھی کوئی جان پہچان کا فرد مجھ سے یوں اچانک ٹکرا...... جائے تو میں اس سے ملنے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”بہت خراب عادت ہے۔“ اس نے مختصراً تبصرہ کیا۔

”بالآخر تم امریکا پہنچ گئے۔“

”ہاں!“ میرا جواب مختصر تھا اور میرے اندر غور اور سوچ و بچار کا جال بُننا شروع ہو چکا تھا۔ میرے ذہن کا کمپیوٹر عقل کی کسوٹی پر بہت سے قیاسات اور ”خدشے“ اندازے مرتب کرنے لگا تھا۔

”ہم اب کہاں جا رہے ہیں؟“ بالآخر میں نے پوچھا۔

”جانا تو کہیں اور تھا...... لیکن اب تمہاری وجہ سے مجھے کسی اور جگہ کا رخ کرنا پڑ رہا ہے۔“

”ملنا تو مجھے ویسے بھی تھا تم سے، کیا ہوا جو ابھی تمہارے ساتھ چل پڑا۔ میرا خیال ہے تم کوئی اہم اطلاع دینا چاہتی تھیں مجھے۔“

”تمہارے یہاں قدم قدم پر دشمن موجود ہیں۔“ وہ بولی۔

”اس کا تو مجھے بھی علم ہے۔“ میں نے بے پروا انداز میں اپنے کندھے اُچکائے۔ اس نے پھر ایک ذرا گردن گھما کر میری جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے کچھ عجیب سے تاثرات مترشح ہوتے محسوس ہوئے۔

”تمہیں کیسے علم ہوا کہ میں شکاگو کے او ہیر ائرپورٹ پر اُترنے والا ہوں؟“

میرے سوال پر وہ کچھ گھبرائی مگر جلد ہی اس نے اپنے چہرے کے تاثرات پر قابو پالیا۔ بولی۔ ”تم اتنے بدھو تو نہیں ہو سکتے جو ایسا احمقانہ سوال کر رہے ہو۔“

”یعنی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”دشمن تمہاری تھائی لینڈ والی مہمات سے لے کر مصر اور پھر وہاں سے امریکا تک کی روانگی سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان کا مجھے اندازہ ہے، لیکن میں نے تمہاری بات کی ہے۔ تمہیں کیسے علم ہوا کہ میں......“

”مجھے ایسا کچھ نہیں معلوم تھا۔ میں تو دوسرے رپورٹرز کی طرح اپنی پیشہ ورانہ ڈیوٹی دینے وہاں پہنچی تھی لیکن تمہیں دیکھتے ہی......“ کہتے کہتے وہ اچانک چپ ہوگئی، یوں جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی جانے لگی ہو، میں بھی ایک دم بدک گیا۔

پل کے پل مجھے اپنے گرد خطرے کی بو محسوس ہونے لگی۔ وہ گھبرا گئی۔ میں نے فوراً انگوٹھی والا ہاتھ اس کی بظاہر خوب صورت صراحی دار گردن کے قریب کرلیا اور زہریلے لہجے میں سرسراتے ہوئے بولا۔

”جس وقت تم یکی موت کے دہانے پر ہو...... میری انگلی متحرک ہوگی اور پھر اس انگوٹھی سے نکلی ہوئی آتشیں شعاع تمہیں پل بھر میں موت کی نیند سلا دے گی۔“

”ہم...... کی کی...... کیا...... کیا کہہ رہے ہو تم؟“ اس کے حلق سے خوف زدہ سے بے ربط الفاظ خارج ہوئے اور میری بھانپتی ہوئی نظروں نے تاڑ لیا کہ وہ ناکام اور خوف زدہ ہو جانے والی لڑکی کی اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

”تم نے آج تک میری شکل نہیں دیکھی تھی، نہ ہی میں نے تمہاری، پھر مجھے شہزی کی حیثیت سے کیسے پہچان گئیں؟“ میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

”تمہیں بڑی خطرناک غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر......؟“ وہ اس بار بڑے تحمل سے بولی۔ لگتا تھا کہ وہ خود کو اب پُراعتماد اور پُرسکون رکھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہی تھی بلکہ ہلکی اور طمانیت بخش مسکراہٹ سے بھی کام لینے لگی تھی۔

”آنسہ خالدہ کے ساتھ تم اسکائپ پر چیٹنگ کرتے رہے ہو؟“

”لیکن میں نے کبھی بھی اپنی آئی ڈی پر تصویر نہیں لگائی تھی نا شیئر کی تھی۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”اُفوہ...... کتنے شکی مزاج ہو تم۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں اور تم مجھ پر ہی شک کیے جا رہے ہو؟ اس کی کوئی ٹھوس وجہ بھی ہے تمہارے پاس؟“

”میری چھٹی حس میری رہنمائی کرتی ہے۔“ میں نے کہا اور اس کی گردن سے ہاتھ ہٹا لیا۔

”ہو سکتا ہے مجھے تم پر واقعی بلاوجہ کا شبہ ہوا ہو، لیکن یہ بتاؤ...... آنسہ خالدہ اور عابدہ کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟ اور مجھے بلانے کا تمہارا مقصد کیا تھا؟“

سوزی ہولے سے گردن موڑ کر میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ جواب میں، میں بھی مسکرا دیا۔

”یہی کچھ پوری تفصیل سے بتانے کے لیے میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔“

میں خاموش ہو رہا۔ تاہم اس کی جانب سے محتاط تھا۔ یہ سچ تھا کہ مجھے اس پر کچھ شبہ ہوا تھا لیکن اس کی کوئی ٹھوس وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، بس دل میں ایک خیال اُبھرا تھا اس کے بارے میں۔

ایک فلائی اوور اور دو انڈر پاس سے گزرنے کے بعد ہم ایک رہائشی طرز کے علاقے میں آ گئے۔

”یہ علاقہ ریکیٹ کہلاتا ہے۔ قطعہ ایونیو پائیس کمرشل اسٹریٹ...... “ وہ بولی۔ جیسے مجھ پر اپنا اعتماد جتانا چاہ رہی ہو۔ میں خاموش رہا۔ ”میں ادھر ہی رہتی ہوں۔“

”ہم......“ میرے منہ سے فقط یہی برآمد ہوا تھا، البتہ میری نظریں تیزی سے اطراف میں گردش کر رہی تھیں۔

ایک بلڈنگ سے ہم اندر داخل ہو گئے۔ کار کو پارکنگ میں روک کر ہم نیچے اُتر آئے۔ میں اس کے ساتھ آگے بڑھا۔ زینے طے کرتے ہوئے ہم دوسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے چابیاں نکالیں اور قفل کھول کر اندر داخل ہو گئی، میں بھی اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔

اپارٹمنٹ خاصا کشادہ اور رویل ڈیکوریٹڈ نظر آتا تھا۔

”تم یہاں آرام اور سکون سے کچھ عرصے کے لیے رہ سکتے ہو۔“ اس نے ایک تھکی تھکی سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا اور اس کے بعد دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

لیکن جیسے ہی وہ اپنے جوتے بے پروا انداز میں اِدھر اُدھر پھینک کر ایک کمرے میں داخل ہوئی میں فوراً صوفے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

بالکل ہی غیر متوقع انداز میں سوزی محض چند ہی سیکنڈ میں دوبارہ نمودار ہوئی تھی اور اب اس کے ہاتھ میں سیاہ پستول نظر آ رہا تھا۔ اس کی لمبی نال سے اندازہ لگانے میں مجھے مطلق دیر نہ لگی تھی کہ اس پر سائلنسر چڑھا تھا۔

سوزی کی پوری توقع تھی کہ میں صوفے پر بڑے آرام سے پھیلا ہوا بیٹھا ہوں گا، لیکن...... وہاں سے وہ مجھے غائب پا کر بلا خیز پھرتی کے ساتھ چند قدم یوں آگے بڑھی جیسے اسے یقین ہو کہ میں اس وقت کسی طرف سے اس پر گھات لگائے کھڑا ہو سکتا ہوں۔

اس کا یہ محتاط انداز اسے عام عورت ثابت نہیں کرتا تھا مگر میں بھی کوئی نیا شکاری نہ تھا۔

اس کے سنبھلنے اور مجھ پر وار کرنے سے پہلے ہی میں نے کھڑی ہتھیلی کا وار سب سے پہلے اس کے ”خاموش“ پستول والے ہاتھ پر کیا۔ وہ کراہنے والے انداز میں چیخی اور حیرت انگیز طور پر اس نے اپنی تکلیف پر قابو پاتے ہوئے لیفٹ ہک میرے جبڑے پر رسید کر دیا۔

یہ وار میرے لیے غیر متوقع نہ سہی لیکن اچانک ضرور تھا۔

میرا دماغ لمحہ بھر کو جھنجلا گیا۔ سنبھلا تو اس نے یکلخت اپنی ایک ٹانگ کی ایڑی پر پھرکی کی طرح نصف چکر کاٹا، میں ہوش جانے دیتا تو یقیناً اس کا یہ وار میرے لیے کاری ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کے بظاہر عام نظر آنے والے سینڈل کی ”ٹو“ میں ایک تیز دھار آنے کی چمکتی ہوئی جھلک محسوس ہوئی تھی، وہ میرے جسم کے کسی بھی حصے میں چبھ جاتا تو بڑا ”عالم چرکا“ لگ جاتا۔

جبڑے پر پڑنے والی ضرب کے باوجود میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ جھکائی دی...... مگر میں نے اسی پر موقوف رہنے کی بے وقوفی نہیں کی تھی۔

جھکائی دیتے ہی میں نے اس پر وار بھی کیا تھا، میری دائیں ٹانگ اس کے بائیں پہلو پر اس زور سے پڑی تھی کہ وہ چیخ مار کے صوفے پر جا پڑی اور اسی سمیت دوسری جانب اُلٹ گئی۔

یہ ضرب اس کے لیے کاری ثابت ہوئی تھی، وہ درد کی شدت سے کراہنے لگی لیکن دیکھا جاتا تو پھر بھی وہ سخت جان ہی ثابت ہوئی تھی، ورنہ اب تک بے ہوش ہو چکی ہوتی، یہ بات یقینی ہو چکی تھی کہ وہ کوئی تربیت یافتہ ”شے“ تھی اور اس ”شے“ کا تعلق کن لوگوں سے تھا، ابھی یہ جاننا باقی تھا۔

میں نے چیتے کی طرح اس کی جانب لپک کر اسے دبوچ لیا اور سب سے پہلے اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

اسے ایک خنجر سے، جو اس کی پشت پر پہلو کے قریب بندھا ہوا تھا دوسرے اس کے دونوں سینڈلز سے محروم کر دیا، جن کے تلے میں تیز دھار آلہ فٹ تھا۔

وہ چند لمحوں میں ہی اپنی تکلیف پر قابو پانے کے بعد پھر میری گرفت میں تڑپی تو میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے بلی جیسی وحشیانہ غراہٹ ابھری۔ وہ اب تک بڑی فنکاری کے ساتھ "عام" نظر آنے والی لڑکی کے روپ میں خود کو ظاہر کیے ہوئے تھی۔

"اب بس! زیادہ حرکت کرو گی تو جان سے چلی جاؤ گی۔" میں نے بھی بھیڑیے جیسی غراہٹ سے کہا۔ "تم فون پر بے وقوف بنا سکتی ہو، لیکن حقیقی ملاقات میں نہیں، تمہارا پول کھل چکا اب راہِ راست پر آجاؤ۔ یاد رکھو، میرا نام شہزی ہے اور میں تم سب کی سانپوں والی سیڑھیاں توڑتا ہوا امریکا میں قدم رکھ چکا ہوں۔"

میرے لہجے کی کھن گرج نے پہلی بار اس کی دلکش آنکھوں اور چہرے پر خوف کی لہریں دوڑا دی تھیں لیکن دوسرے ہی لمحے ان تاثرات میں نفرت کی چمک بھی ابھری تھی۔ وہ اسی لہجے میں بولی۔

"تمہاری موت ہی تمہیں یہاں کھینچ لائی ہے شہزی!!"

میں نے ہونٹ بھینچ کر اسے صوفے پر پٹخا۔ وہ کراہی۔ پہلو والی ضرب سے وہ ابھی تک نڈھال تھی، مزید براں میرے خطرناک تیوروں نے اس کی رہی سہی ہمت بھی فرو کر ڈالی تھی۔

"یہ فیصلہ وقت کرے گا، مجھے تم سے صرف دو سوالوں کے جواب چاہئیں، پہلا یہ کہ تم کن لوگوں سے تعلق رکھتی ہو؟ دوسرا سوال کہ آنسہ خالدہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

وہ جواب دینے کے بجائے گہرے سانس لیتی رہی۔ مجھے اس پر نائیٹر ٹیک کا شک ہوا تھا، یہ کوئی سی آئی اے کی ایجنٹ تھی، کیونکہ ان کا طریقۂ کار ایسا ہی ہوتا ہے، یہ عام لوگوں میں گھل مل کر جڑیں کترتے ہیں۔ ایک خدشہ میرا اس پراسرار اسرائیلی خفیہ ایجنسی کی طرف سے بھی ابھرا تھا اور..... تب ہی میرے ذہن میں اس کا مخصوص ناک نقشہ دیکھتے ہی کھٹک پیدا ہوئی تھی۔ وہ یہودی ایجنٹ بھی ہو سکتی تھی۔

"جواب دو۔" میں نے اسے صوفے پر گرا دیا۔ وہ اپنا نرم و گداز جسم بار بار میرے ساتھ مس کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریشہ خطمی کا اظہار کروں اور وہ میری پوری حوصلہ افزائی کرتے پھر اچانک دوبارہ مجھ پر وار کر ڈالے۔ یہ انداز دنیا کی دو ہی بدنام زمانہ سیکریٹ ایجنسیوں کی حسین و جمیل خواتین کا ہوتا تھا۔ ایک "را" اور دوسرا اسرائیلی خفیہ ایجنسی کا۔

"پپ..... پانی؟" وہ پھر ایکٹنگ پر اتر آئی۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ پھر اس کی نازک گردن کو اپنے ایک ہاتھ کے شکنجے میں دبوچ کر اس کا متورم چہرہ اپنی خوفناک نظروں کے سامنے کرتے ہوئے غرا کے بولا۔

"میں سر سے کفن باندھے ہوئے ہوں۔ مجھے میرے سوالوں کے جواب مل ہی جائیں گے، لیکن میں تمہیں بڑی جان کنی کے عالم میں موت کے گھاٹ اُتاروں گا کہ پولیس اور ایف بی آئی والے بھی اسے ایک عام گھریلو عورت کی حادثاتی موت سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ کیا سمجھیں؟"

میرا انداز دو ٹوک اور کھرا تھا۔ اس کے حسین چہرے پر لمحہ بھر کو حقیقی خوف کی رمق جھلکی تھی۔ پھر اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولی۔

"آنسہ خالدہ سے میرا ایک بوائے فرینڈ کے سلسلے میں جھگڑا چل رہا تھا، اسی رقابت کی وجہ سے....."

وہ مجھے بے وقوف بنانے کے لیے فضول بکواس کرتی جا رہی تھی اور میری متلاشی نظریں کسی کپڑے کے ٹکڑے کو تلاشنے لگیں، جلد ہی مجھے ایک سینٹر ٹیبل کے نیچے سے وہ رکھا نظر آ گیا۔

میں نے وہ لپک کر اٹھا لیا۔ اس کی فضول گوئی جاری تھی، لیکن میری بے توجہی بھی اسے اُلجھانے لگی۔

میں نے اس کا منہ کھلوا کر کپڑے کا گولا پورا اندر ٹھونس دیا۔

"تمہارا خیال ہے میں تمہاری بے تُکی بکواس پر بہل جاؤں گا۔" بڑے ہی لہورنگ لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں نے اس پر تشدد شروع کر دیا۔

عورتوں پر ہاتھ اٹھانا میں اچھا نہیں سمجھتا لیکن جب معاملہ ایسا ہی خطرناک اور..... حساس ہو تو رحم میں بھی نہیں کرتا تھا۔

سامنے ہی ایک تپائی پر مجھے سگریٹ لائٹر پڑا نظر آ چکا تھا، میں نے ایک سگریٹ سلگائی۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں برآمد ہوئیں، لیکن میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور سگریٹ کا جلتا ہوا "ہُکل" (سرا) اس کے شفاف اور گورے چٹے گال پر رکھ دیا۔

وہ ماہیٔ بے آب کی طرح میری گرفت میں تڑپی، لیکن میرا ایک ہی ہاتھ کا شکنجہ اس کے لیے کافی تھا۔ میں نے سگریٹ کا کش لے کر اس کے ہُکل کو مزید تپایا اور پھر اس کے گال پر پہلے والے نشان کے نیچے لگا دیا۔

اس بار میں نے دانستہ سگریٹ کا سرا دیر تک اس کے نرم و نازک گال پر رکھا رہنے دیا تھا۔ اس بار گوشت جلنے کی ہلکی سی بُو ابھری تھی۔ اس بار تو جیسے سوزی کے کم تن وجود میں کھنچے جھٹکے پڑنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا تھا۔

"آں..... ہاں..... ہاں..... ابھی تو ابتدا ہے۔" میں نے سفاکی سے اور جیسے حظ اُٹھانے والے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو ایک گال داغا ہے، پھر دوسرے کی باری آئے گی اس کے بعد ایک آنکھ کا ڈیلا بھی بھسم کر دوں گا تمہارا..... تاکہ لوگ تمہیں ایک حسینہ نہیں بلکہ بار برین کے زمانے کی کوئی بھیانک چڑیل سمجھیں۔"

کہتے ہوئے میں نے ایش جھاڑی اور تیسری بار دانستہ ذرا طویل کش لیا، سرا پورا سلگ اٹھا۔ پھر میں اس کے دوسرے گال کو تختۂ مشق بنانے لگا تو وہ میری گرفت میں بُری طرح تڑپنے لگی۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے بھنچی بھنچی آوازیں بھی برآمد ہوئیں۔

ایک حسین و جمیل عورت ہی کیا بلکہ عام شکل و صورت والی لڑکی کے لیے بھی اپنا چہرہ بدنما داغ دار بنانا کس قدر سوہانِ روح ہوتا تھا، اس روایتی امر واقعہ سے بھی واقف تھے۔

"او..... او..... اوکے!" میرے منہ سے طنزیہ برآمد ہوا۔ "تم شاید اب سچ اُگلنا چاہتی ہو۔"

وہ چھپٹی چھپٹی آنکھوں سے اپنی بھری بھری پلکیں جلدی جلدی جھپکنے کے ساتھ چہرے کو بھی اثبات میں جنبش دینے لگی۔

"لیکن دھیان رہے کہ میں دشمنوں کو ایک ذرا بھی موقع دینے کا قائل نہیں ہوں۔" میں نے اسے تہدید کی۔ "لہٰذا..... تم اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میرے ساتھ اب سچ بولنا، دوبارہ فضول چلنے کی کوشش چاہی تو اسی طرح بغیر دھمکائے شروع ہو جاؤں گا۔"

اس کے بعد میں نے اس کے منہ سے کپڑے کا گولا نکال دیا۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ اس کا جھلسا ہوا گال ہلکا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ وہ اسے سہلاتی تو تکلیف سے چیخ نکل جاتی اس کی۔

"بس! یہ ایکٹنگ بعد میں کر لینا۔ پہلے مطلب کی بات پر آ جاؤ۔ کون ہو تم؟" میں نے درشتی سے کہا۔

"م..... میں سوزی، سچ..... جے بی سی سے تعلق رکھتی ہوں۔"

"تمہاری مراد جیوش بزنس کمیونٹی سے ہے؟"

"ہاں..... آہ.....!" وہ کراہی۔ "پلیز! اب تھوڑا سا مرہم لگا دو کہیں داغ گہرا....."

"اداکاری نہیں.....!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "بولتی رہو۔ تم ان کی ایجنٹ ہو؟"

"ایجنٹ تو نہیں ہوں..... لیکن ان کے لیے کام کرتی ہوں۔"

"ایک رپورٹر کے روپ میں....."

"ہاں!"

"لڑائی بھڑائی سے تو تم خاصی تربیت یافتہ لگتی ہو؟"

"ہاں! یہ میں نے انہی کے کہنے پر....."

"اگلا سوال۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آنسہ خالدہ کو کہاں غائب کیا ہے؟"

"وہ..... وہ مجھے مار ڈالیں گے۔" وہ خوف سے لرزی۔

"ممکن ہے، لیکن ان کی موت سے زیادہ بری میں تمہیں موت دوں گا اس میں تمہیں صرف موت میں ہی پناہ نظر آئے گی۔ جواب دو اور ساری تفصیل بتاؤ۔ آنسہ خالدہ کے حوالے سے تم نے کیسے بات کی تھی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہ تو نیویارک یا کیلی فورنیا میں تھی۔"

"میں فقط اتنا جانتی ہوں کہ مجھے خالدہ کو ٹریپ کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ انہی کے کہنے پر میں نے خالدہ کو دھوکے سے ان کے حوالے کر دیا تھا اور....."

"کن کے حوالے کر دیا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹی۔ وہ بڑی مکار تھی۔ میں بھی جانتا تھا کہ وہ گہرائی میں جانے سے کترا رہی تھی۔ تاہم مجھے بھی ابھی فوری طور پر صرف مقصد کی ہی باتوں کا پتا لگانا تھا۔

"ج..... جے بی سی کے حوالے....." اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا تو میرے لبوں پر بھی..... بے اختیار یہ سوال آ گیا۔

"عابدہ کو بھی کیلی فورنیا کی پریزن اسٹیٹ کور گورداس سے خفیہ طور پر نکال کر جے بی سی کے حوالے کر دیا گیا ہے؟"

عابدہ کے ذکر پر سوزی کا چہرہ اچانک متغیر سا ہو گیا۔ ایکا ایکی مجھے اس کی حرکات و سکنات میں شبہ محسوس ہونے لگا، یوں جیسے وہ میرے چنگل سے اسی وقت راہِ فرار ہونے کا موقع تلاش رہی ہو۔ مگر میں بھی اس کی طرف سے مکمل محتاط تھا۔ لہٰذا اس بار پھر سفاکانہ درشتی سے بولا۔

"میں تمہارے جواب میں بولنے کا زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں بہت ساری باتوں کا

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

علم ہے۔ سوچ سوچ کر بولو گی تو مجھے شبہ ہوگا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ جواب دو۔"

"ع..... ع..... عابدہ کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں معلوم، مجھے صرف آنسہ خالدہ کا ٹاسک دیا گیا تھا۔"

مجھے اندازہ تھا کہ وہ میرے کئی اہم سوالوں سے کترا جائے گی، اور بہت سی باتوں سے مجھے لاعلم ہی رکھے گی۔ لیکن میرے پاس بھی زیادہ وقت نہ تھا، لہٰذا میں اس سے وہی سوال پوچھ سکتا تھا جن کے بارے میں مجھے خود بھی اندازہ تھا اور فوری طور پر مجھے انہی کے جواب درکار تھے۔ آنسہ خالدہ کا ہی کھوج لگ جاتا تو یہی میرے لیے بہت تھا اسی لیے میں نے سارا زور اسی بات پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اس کے بارے میں بتاؤ پھر وہ کہاں ہے؟"

سوزی جواب میں بولی۔ "خالدہ کے ساتھ ساتھی رپورٹر کی حیثیت سے رہتے ہوئے میں نے اسے ٹریپ کیا اور جے بی سی کے ایک ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔"

"ایجنٹ کا نام اور پتا۔"

"میں نے بتایا نا کہ میں ان کی ایجنٹ نہیں صرف عمومی نوعیت کے کام کرتی ہوں۔" سوزی نے جواب دیا۔ "خالدہ اس وقت کیلی فورنیا سے نیویارک پہنچی تھی اور میں نے اس کے ساتھ ایک ساتھی رپورٹر کی حیثیت سے راہ و رسم بڑھائے اور اس کی ایک ایک خبر جے بی سی کو دیتی رہی۔ بالآخر انہی کے کہنے پر میں نے ایک دن خالدہ کو ٹریپ کر کے ان کے ایجنٹ کے حوالے کر دیا اور انہی کے ایما پر پاکستان تمہارے پاس بھی بھیجا ہوں کو اس کی بھرپور [illegible] کر مطلع بھی کر دیا تاکہ وہ لوگ تم سمیت مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے مسلسل مجھ سے رابطے میں رہیں، لیکن ایسا نہ ہو سکا، کیونکہ میں ایک جگہ سے اور بار بار نمبر بدل کر بات نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی انہوں نے کبھی مجھے اپنے یا تمہارے کسی راز یا لائحہ عمل کے بارے میں بتایا۔"

"تو گویا تم اس پہلے والے فون کے بعد بھی زہرہ بانو سے رابطے میں رہیں؟"

"ہاں!"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ سوزی نے صرف وہی کچھ اگلا تھا جس کا مجھے بھی اندازہ تھا۔ لہٰذا میں نے اس پر کچھ باور کراتے ہوئے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"دیکھو سوزی! مجھے آنسہ خالدہ کی اشد ضرورت ہے۔ وہ ہماری امریکا میں بے حد اہم ساتھی تھی۔ تمہاری وجہ سے وہ ان کے ہتھے چڑھ گئی اور میں نہیں جانتا اور نہ تم کہ وہ بے چاری اب زندہ بھی ہے یا نہیں۔ تم پر یہ فرض بنتا ہے جس طرح تم نے اسے پھنسوایا اسی طرح اسے چھڑانے کے لیے بھی مجھ سے تعاون کرتے ہوئے خود کو موت کی سزا سے بچالو۔"

یہ کہتے ہوئے میں دوبارہ کپڑے کا گولا بنانے لگا اور اسے منہ میں ٹھونسنے کا کہا۔ وہ دہشت زدہ ہوگئی۔

"ک..... کیا کرنا چاہتے ہو تم؟ م..... میں نے تمہیں سارے سوالوں کے صحیح جوابات دے تو دیے تھے۔"

"ہاں! میں تمہیں چھوڑ دیتا اگر تمہاری وجہ سے خالدہ جے بی سی جیسے سفاک بھیڑیوں کے ٹولے میں نہ پھنستی۔ تم نے جرم تو کیا ہے، ناقابلِ معافی جرم۔ فکر نہ کرو، میں اتنا کرتا ہوں کہ تمہیں بغیر کوئی تکلیف دیے خاموشی سے موت کی نیند سلا دیتا ہوں۔" پھر میں نے اسے پچکارا۔

"چلو، شاباش! اب اپنا منہ کھولو، پتا ہے تمہیں [illegible] کر مارنے میں مجھے آسانی [illegible]"

"نن..... خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" وہ گھگیانے لگی۔ "م..... میری عمر تو ابھی صرف بائیس تیئیس سال [illegible] ہے۔"

"[illegible] خالدہ کے سلسلے میں میری مدد کرتیں تو میں ضرور تمہاری جان بخشی کر دیتا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"منہ کھولو۔"

"م..... میں تمہاری اس سلسلے میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔" یقینی موت کے خوف سے وہ ایک دم بولی۔

اسی وقت مجھے اس سنہری بھونرے کا خیال آیا۔ بات حقیقت ہی تھی کہ ابھی مجھے ان انوکھے اور کارآمد ہتھیاروں کی "عادت" ہی کہاں پڑی تھی، تاہم باوصف اس کے میری آئندہ بھی کوشش ہوتی کہ مجھے ان کی "[illegible]" (استعمال) کم ہی کرنی پڑے، جہاں دماغ اور زورِ بازو سے کام چلتا، سرِدست وہی مناسب رہتا، لیکن مجبوری اور اشد ضرورت کی اور بات تھی۔

بہرطور..... ابھی میں نے اس کے استعمال کی ٹھانی کہ میں اس کے ذریعے اسے ٹرانس میں لے کر کچھ اگلوانے کی کوشش کرتا، لیکن تاہم ابھی میرے علم یا تجربے میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس بھونرے کی بھنبھناہٹ کا مدِمقابل پر کہاں تک اثر ہوتا؟ کیونکہ میرے خیال میں، کیا خبر اس "نوعیت" کے ٹرانس میں آنے یا سحر زدہ ہونے کی کیفیات کچھ اور ہوتی ہوں؟ کہ جو آپ کا صرف معمول بن جاتا ہے، یعنی جو آپ اسے حکم دیں گے وہ مانتا چلا جاتا ہے، کسی کیفیت میں وہ اپنا آپ بھول جاتا ہے اور دوسرا کوئی اسے کہاں یاد رہتا ہوگا۔ تاہم میں نے پھر بھی ایک موجود "سہولت" سے کام لینا ضروری خیال کیا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ بھونرا نکال لیا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"غور سے دیکھو اسے..... شاید تمہیں اس میں کچھ نظر آجائے۔" کہتے ہوئے میں نے سنہری بھونرے کو اس کے چہرے کے بالکل نزدیک کر دیا اور ساتھ ہی انگلی سے اس کے پروں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ پروں کی ہلکی ہلکی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

"ی..... ی..... یہ کیا ہے؟" اس نے سوال کیا۔ میں [illegible] رہا۔ تب ہی میں نے اسے جھولتے دیکھا۔ ایک دو [illegible] بعد اس نے اپنے ہاتھ اپنی کنپٹیوں پر رکھ دیے اور اس کے بعد وہ پُرسکون ہوگئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اب ٹرانس میں آچکی تھی۔ میں نے کسی عامل کی طرح اس سے سوال کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا.....؟"

"ڈیلا لائٹ۔" اس نے کسی معمول کی طرح جواب دیا۔ میرا دل یکبارگی کامیابی کی مسرت سے دھڑکا۔

"یہی تمہارا اصلی نام ہے؟"

"ہاں۔"

"سوزی نام اختیار کرنے کی وجہ؟"

مجھے اس سے سوالات کرنے میں دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

"مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ آئندہ یہی نام ہوگا۔"

"اصل میں تم ہو کون اور کن کے لیے کام کرتی ہو؟" میں نے اس کے سپاٹ مگر کھوئے کھوئے چہرے پر بدستور اپنی نظریں گاڑے رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ خاموش رہی۔ میں نے اپنا سوال دہرایا۔ مگر بے سود..... میں نے خود دوسرے انداز میں آزما کر یہ تسلی کرنی چاہی کہ آیا یہ ابھی تک میرے ٹرانس میں بھی یا نہیں، میں نے اسے حکم دیا کہ وہ چند قدم پیچھے ہٹ جائے اور دوبارہ میری طرف بڑھے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں ایک گہری سانس [illegible] رہ گیا۔

وہ ٹرانس میں تو تھی لیکن اپنے یا کسی اور کے بارے میں زیادہ گہرائی تک کچھ بتانے سے قاصر تھی۔

میں نے بھونرا جیب میں رکھ لیا اور صوفے پر تھکے تھکے سے انداز میں بیٹھ گیا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ اپنے سر کو زور زور سے جھٹکے دینے لگی اور پھر جیسے ہی اس نے مجھے صوفے پر بیٹھے اور خود کو آزاد پایا، وہ ایک دم دروازے کی طرف لپکی۔ میں اس کی اس حرکت کے لیے تیار تھا، بہ سرعت میں نے صوفے سے حرکت کی اور اسے راستے میں ہی دبوچ لیا۔

"مجھے آنسہ خالدہ چاہیے زندہ....." میں نے مٹھی میں اس کے بال جکڑ کر چہرہ اپنے قریب کرتے ہوئے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ "اگر وہ زندہ نہیں ہے تو....."

اس کا حسین چہرہ میرے منہ کے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اس کی تیز تیز چلتی سانسوں کی گرمائش میرے چہرے پر پڑنے لگی اور ابھی میں اپنا جملہ بھی پورا نہ کر پایا تھا کہ اس نے میرے ہونٹوں پہ اپنے نرم و گداز ہونٹ رکھ دیے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ہکا بکا سا رہ گیا۔

یہ حرکت ہی میرے لیے عجیب و غریب تھی۔ جنگ و جدال کی اور بات تھی لیکن محبت کے اس انداز و رنگ میں ایک مرد کی وہی حالت ہوتی ہے جیسی کہ میری ہوئی تھی۔ مجھے یہ کہنے میں باک نہ تھا کہ سوزی نے میرا بڑا بھرپور..... بوسہ لیا تھا اور کچھ طویل بھی۔ میں نے سنبھلتے ہی اسے پرے دھکا دیا۔ وہ "تھو..... تھو....." کرنے لگی۔ جیسے اپنے منہ سے کوئی ناپسندیدہ چیز باہر نکال پھینکنا چاہ رہی ہو۔ بڑی عجیب حرکتیں کر رہی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میرا سر چکرانے لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا۔

میں نے سر کو دو تین بار جھٹکے دینے چاہے کہ شاید اس طرح ہی یہ دماغی تکدر دور ہو جائے، لیکن بے سود میری دھندلی آنکھوں نے اس یہودن ایجنٹ کے چہرے پر زہری ناگن جیسی مسکراہٹ رقصاں ہوتے دیکھی تھی، یوں میں نے ایک آخری کوشش میں چند قدم آگے بھی بڑھنا چاہا تھا کہ اس مکار ناگن کو جھپٹ لوں لیکن دوسرے ہی لمحے، میں لڑکھڑا کر گرا، کیونکہ میرے پیروں میں بھی کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

دوبارہ ہوش آیا تو ذہن سے تکدر چھٹتے ہی مجھے اردگرد کا ماحول جانا پہچانا لگا۔ لیکن اب وہاں..... صرف سوزی (ڈیلا لائٹ) ہی نہیں تین اور افراد بھی چوکس کھڑے نظر آئے۔

وہ تینوں چست لباس میں ملبوس تھے، چہروں سے ان کے بے رحمی اور غنڈہ پن ہویدا تھا..... وہ کلین شیو تھے۔ ان کا فاصلہ مجھ سے چھ سات..... فٹ پر تھا۔ ایک تو میرے بالکل قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی بوتل تھی۔

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

مجھے ہوش میں لانے کا سبب شاید یہی شخص بنا تھا، کیونکہ میں نے اپنے چہرے پر گیلا پن محسوس کیا تھا۔ باقی دونوں میں سے ایک کسی سے سیل فون پر بات کرنے میں مصروف تھا، تاہم اس کا رخ میری ہی جانب تھا۔ وہ فون پر باتیں کرنے کے دوران میں میری جانب تکے جا رہا تھا۔

تیسرا شخص، اس بڑے سے صوفے کے پاس ہی چوکس انداز میں کھڑا تھا جس پر سوزی نیم دراز تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں میں نے سگریٹ داغے تھے، روئی کے پھائے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سر کے نیچے تکیے کے طور پر کشن رکھا ہوا تھا۔ مجھے وہ کچھ نیم غنودہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ تیسرا شخص جو سوزی کے صوفے کے قریب کھڑا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہاتھ میں کوئی شے پکڑے اسے چہرے کے قریب کیے اس کا بڑے غور سے جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ میں نے ذرا اپنی آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو چونک پڑا۔ وہ وہی سنہرا بھونرا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب غیر ارادی میری نظر...... اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر پڑی تو بے اختیار میں نے سکون کی سانس لی، سانپ والی وہ انگوٹھی انگلی میں موجود تھی۔ اس پر انہوں نے شاید کوئی توجہ نہ دی تھی یا پھر ابھی ان کی نظر نہیں پڑی تھی۔

بھونرا انہوں نے بے ہوشی میں میری تلاشی کے دوران ہی نکالا ہوگا جبکہ اپنے سفری کاغذات وغیرہ جو یہاں امریکا میں میری قانونی پوزیشن مضبوط بنائے ہوئے تھے وہ میں پہلے ہی اسی ''احتیاط'' کے پیشِ نظر اوہیر ائرپورٹ پر یاسمین کے سپرد کر آیا تھا۔

میں رسن بستہ حالت میں پڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک سوزی نے میرے ساتھ کیا کھیل کھیلا تھا کہ میں اچھا بھلا ایک دم ہی دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر رہ گیا تھا۔ اس پر مجھے چند سیکنڈوں کا ہی غور کرنا پڑا تھا۔ اس یہودن ایجنٹ نے اپنے منہ میں کوئی ایسا کیپسول دبا رکھا تھا جیسے اس طرح کے ایجنٹ اپنی داڑھ کے قریب سریع الاثر زہر سائنائڈ کا زہریلا کیپسول دبائے رکھتے ہیں اور بہ وقتِ ضرورت اسے نگل کر خودکشی کر لیتے ہیں۔

سوزی نے بھی یقیناً ایسا ہی کوئی کیپسول اپنی داڑھ کے قریب چھپا رکھا ہوگا جس میں فوراً بے ہوش کر دینے والا سفوف شامل تھا۔ وہ اس نے میرا بوسہ لینے کے دوران کمالِ ہوشیاری سے چبا کر اس کا رس میرے منہ میں چھوڑ دیا تھا اور خود اس کے اثرات سے بچنے کے لیے...... ''تھو...... تھو'' کر کے اُگل دیا تھا۔ میں چونکہ اس سے بے خبر تھا اسی لیے وہ رس میرے منہ میں پہلے سے موجود لعاب میں شامل ہو کر معدے میں اُتر گیا۔ ہوسکتا ہے بعد میں اس کے اثرات سوزی پر بھی کچھ نہ کچھ پڑے ہوں اور شاید اب وہ اسی وجہ سے نیم بے ہوشی، یا نیم غنودہ سی حالت میں صوفے پر لیٹی پڑی تھی، لیکن میں بہرحال بے خبری میں مار کھا گیا تھا۔

بعد میں سوزی نے فون کر کے اپنے ان ساتھیوں کو بلا لیا تھا۔ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق میرے کون سے دشمنوں کے گروپ سے ہوسکتا تھا، تاہم ابھی میں ان کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

''ہوش آ گیا تمہیں...... مسٹر شہزی!''

ایک گمبھیر سی آواز نے مجھے پُرسوچ خیالات کے بھنور سے نکالا...... یہ وہی آدمی تھا جو اپنے سیل فون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔

''تم دیکھ ہی ر[illegible] بے پروائی سے اپنے شانے اُچکائے۔

''کوئی اور موقع ہوتا تو ہم تمہیں امریکا عظیم کی سرزمین پر خوش آمدید کہتے۔'' وہ چبا کر کھانے انداز میں طنزیہ بولا۔ ''لیکن سب، تم ہماری دشمنی کا طوق اپنی گردن پر لٹکائے یہاں آئے ہو اسی لیے مبارکباد کے حق دار نہیں ٹھہرتے۔''

''میں نے کب کہا کہ مجھے ایسا کوئی شوق بھی ہے؟'' میں نے پورے اطمینان سے ترکی بہ ترکی اسے جواب دیا۔ ساتھ میں کن انکھیوں سے اس تیسرے شخص کی جانب دیکھ لیا تھا جو ہنوز وہ ہلاکت خیز سنہری بھونرا ہاتھ میں لیے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھا اور اب وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔

اس کی یہ حرکت اسے کسی بھی وقت ''دماغی مسئلے'' سے دوچار کر سکتی تھی اور اگلے ہی لمحے وہی ہوا۔

اس نے شاید اپنی انگلی سے بالآخر بھونرے کے پروں کو چھو ہی لیا۔ کیونکہ اسی وقت میری متوجہ اور پُرغور سماعتوں میں بھونرے کے پروں کی بھنبھناہٹیں سنائی دینے لگیں۔ بھونرے کے ہلکے پَر...... متحرک ہو گئے تھے۔

وہ شخص لمحہ بھر میں ہی بری طرح چلانے والے انداز میں چند قدم پیچھے لڑکھڑایا اور بھونرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

''اے...... شٹ! تمہیں کیا ہوا؟ مجھ سے مخاطب ہونے والا اپنے ساتھی سے چونک کر بولا۔

نیچے قالین پر بھونرا پڑا تھا اور اس کے پر بدستور حرکت کر رہے تھے، لیکن کوئی اس پر ابھی توجہ نہیں دیے ہوئے تھا،

ماسوائے میرے......

بھونرے کے پروں کی زد میں آنے والا وہ آدمی ایک دم گم صم سا ہو گیا تھا۔

ان دونوں نے کسی جانے انجانے خطرے کی بُو سونگھتے ہی اپنے لباس سے سائلنسر لگے پستول نکال لیے تھے۔ وہ دونوں ایک دم میری طرف سے چوکتے بھی نظر آ رہے تھے اور...... اپنے ساتھی کی ایک دم عجیب پڑتی حالت پر پریشان اور بوکھلا بھی گئے۔

ان کی آنکھوں میں بلا کی اُلجھن عود کر آئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا تھا؟ اور اس کے ساتھی کو [illegible] کھڑے اس طرح غش کیوں آ گیا تھا۔ یوں وہ میری [illegible] سے بھی مخمصے کا شکار تھے، کیونکہ میں تو پہلے ہی ان کے ''رحم و کرم'' پر بظاہر بے بس سا فرش پر بچھے قالین پر پڑا تھا۔

''مجھے [illegible] ہے شاید مرگی کا کوئی دورہ پڑا ہے۔''

[illegible] گرج پڑا۔ ''اسے جوتے میں سرخ مرچ ڈال کر سنگھاؤ، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیا......؟'' دوسرا پستول بدست مضحکہ خیز انداز میں چونک کر بولا۔

''درست کہہ رہا ہوں میں...... ہمارے ہاں، چھوٹے گاؤں دیہاتوں میں مرگی والوں کا اسی طرح ہی علاج کیا جاتا ہے۔'' کہتے ہوئے میری نظریں قالین پر گرے ہوئے سنہری بھونرے پر پڑتی رہیں۔

''مگر یہ مرگی کی نشانیاں ہرگز نہیں ہیں۔'' پہلے والا جھلا کر بولا۔

ابھی تک کسی کا دھیان اس بھونرے کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ [illegible] زد میں آیا ہوا وہ آدمی یا یہودی ایجنٹ...... قالین پر اسی بھونرے کے قریب ہی گرا تھا بلکہ اب اسے ایک بھیانک اور عبرت ناک موت سے کوئی مشکل سے ہی بچا سکتا تھا، کیونکہ یہ ہولناک حقیقت میں ہی جانتا تھا کہ جب تک بھونرے کے پَر گردش کرتے رہیں گے، اس کے قریب پڑے اس یہودی ایجنٹ کے دماغ کی نسیں جھنجھنا کر پھٹنے کے قریب ہو جائیں گی اور وہی ہوا۔

اسے برین ہیمرج ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دونوں کانوں اور ناک سے خون کی لکیریں بہہ نکلیں، اس پر بھی جھٹکے پڑنے لگے، حتیٰ کہ اس کی آنکھیں تک متورم ہو کر سرخ ہو گئیں اور دونوں آئی بالز (ڈیلے) حلقوں سے باہر اُبل پڑے۔

وہ دونوں اپنے ساتھی کی اس ہیئت کذائی پر خوف زدہ سے نظر آنے لگے اور تب ہی پہلے والا آدمی مارے غیظ و غضب کے پستول اپنے ہاتھ میں تولتا ہوا میری جانب لپکا۔

اسے یوں جارحانہ انداز میں اپنی طرف آتے دیکھ کر...... میں محتاط ہو گیا۔ میرے قریب آتے ہی اس نے قدرے جھک کر اپنی پستول کی نال میری کنپٹی سے لگا دی اور غرا کر بولا۔

''سچ سچ بتاؤ...... میرے ساتھی کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟ ورنہ ابھی گولی مار دوں گا۔''

''م...... میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے؟'' میں ایک دم بھولا بن گیا اور خوف زدہ نظر آنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ اس کا دوسرا ساتھی جو اپنے تیسرے ساتھی کی بھیانک پڑتی لاش پر جھکا ہوا تھا، اس کی نظر قریب قالین پر گرے سنہری بھونرے پر پڑی اور اسے...... اس نے لپک کر اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔

اس کی بھی شاید موت ہی آئی تھی، لیکن وہ ہوشیار ثابت ہوا اور بھونرے کا شکار ہونے سے پہلے ہی کچھ ابتدائی اثرات محسوس کرتے ہوئے اس نے بھونرے کو نیچے قالین پر پھینک دیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نال کا رخ اس کی جانب کر دیا۔

یکایک میرا دل اُچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ وہ بھونرے کو گولی مار کے اس کے ٹکڑے کر دینا چاہتا تھا یا الفاظِ دیگر اسے ''بیکار'' کر دینا چاہتا تھا کہ میں فوراً حرکت میں آ گیا۔

پہلا والا ساتھی ایسے میں اپنے دوسرے ساتھی کو دھیان میں رکھے ہوئے تھا کہ میں نے لیٹے لیٹے اپنی ٹانگ کو حرکت دی۔ وہ اس کے پہلو پر لگی، میری انتہائی کوشش یہی تھی کہ ضرب زوردار ہو، یہی ہوا۔ لات کھاتے ہی وہ لڑکھڑا کر اپنے دوسرے ساتھی پر جا پڑا، اس نے ٹریگر دبا دیا تھا، خاموش پستول نے اپنے آتشیں بطن سے شعلہ اُگلا اور وہ ایک چیخ مار کے قالین پر گرا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ اب بھونرے کو نشانہ بنانے کے بجائے اپنے ساتھی کو گولی مارنے کا سارا طیش اور غضب دوسری گولی کی صورت میں مجھ پر اُتارتا، میں نے قالین پر مثلِ پارا کی سی حرکت کی، اس نے دوسری گولی مجھ پر داغی...... جو اس سے آدھا سیکنڈ پہلے ہی میرے وہ جگہ چھوڑنے کے سبب مجھے لگنے کے بجائے فرش میں دھنس گئی، اس نے سنبھل کر دوبارہ مجھے نشانہ بنانا چاہا تھا لیکن تب تک

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہوا اس کے اتنا قریب تو آ ہی چکا تھا کہ اپنی ٹانگوں سے اسے "سوئپ" کروں اور یہی میں نے کیا۔ نتیجے میں وہ قالین سے چند انچ اچھلا اور نیچے آ رہا، میرے قریب گرا تو اس کا سر میرے سامنے تھا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے کنپٹیوں پر تالی بجا دی۔

ایک چٹاخا سا چھوٹا اور وہ موقع پر ہی بے دست و پا ہو گیا۔

میں فوراً بھونرے کی طرف متوجہ ہوا اور بے اختیار میرے حلق سے طمانیت بھری سانس خارج ہو گئی۔

ایک خودکار میکینزم کے تحت اس کے پروں کی گردش تھم چکی تھی۔ میں نے تیزی سے اس نایاب ہتھیار کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اور صوفے پر غنودہ سی پڑی سوزی کی طرف متوجہ ہوا۔

میں ہونٹ بھینچے ابھی اس کے متعلق سوچ رہا تھا کہ...... اچانک باہر پولیس سائرن کی گونج سنائی دی۔ میں بُری طرح ٹھٹک گیا۔

☆☆☆

مجھے پریشانی نے گھیر لیا۔ پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آیا کہ پولیس کیسے ایک دم آ گئی۔ اندازہ تو تھا کہ ان ممالک کی پولیس غیر معمولی طور پر متحرک اور فعال ہوتی ہے، لیکن یہ بات مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یہاں کے ہنگاموں کی بھنک کیسے ملی؟ سائلنسر لگے پستولوں کی وجہ سے گولیاں چلنے کی آوازیں بھی نہیں ابھری تھیں، رہی بات اٹھا پٹخ کی تو اس کا اندازہ میں پہلے ہی لگا چکا تھا کہ یہ آوازیں بھی باہر تک نہیں گئی ہوں گی۔

کیونکہ ایک تو سردی کے باعث اپارٹمنٹ کی کھڑکیاں بند تھیں، دوسرے ان پر دبیز پردے پڑے ہوئے تھے، کسی ...... برابر والے نے کان لگا کر سن گن لینے کی کوشش چاہی ہو تو اور بات تھی۔

بہرطور...... میں جلدی سے لپک کر کھڑکی کی طرف گیا۔ پردہ سرکایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ ایک پٹ کا ہک ہٹا کر اسے تھوڑا وا کیا تو بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

وہ فائر بریگیڈ کی گاڑی تھی، شاید کسی اپارٹمنٹ میں آگ لگ گئی تھی جس کا دھواں بھی کہیں اٹھتا ہوا نظر آ رہا تھا، نیچے لوگوں کا شور مچا ہوا تھا۔

میں پلٹا اور ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ سوزی کو ہوش آ گیا تھا، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"تم نے مجھ پر چالاکی سے جو وار کیا تھا وہ تم پر ہی اُلٹ پڑا۔" میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور استہزائیہ انداز میں اس سے بولا۔

"کی ی...... یہ کیسے ممکن ہے، مم...... میں نے تو بروقت انہیں فون کر کے......" وہ بے اختیار بولے جا رہی تھی پھر شاید اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو گئی، لیکن میں چونکہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا لہٰذا اس کا جملۂ معترضہ میں نے پورا کر دیا۔

"انہیں بلا لیا تھا...... ہے ناں؟ پھر یوں ہوا کہ بے ہوشی کی دوا نے تم پر بھی تھوڑا بہت اثر کیا لیکن اس سے پہلے تم اپنے ساتھیوں کو فون پر مطلع کر چکی تھیں، وہ بلا دیر یہاں آن پہنچے اور پھر انہوں نے تمہیں بھی سنبھالا، لیکن مجھے نہ سنبھال سکے اور آپس میں ہی [illegible] ڈھیر ہو گئے۔"

اسے ابھی تک میری [illegible] یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ قالین پر آڑے ترچھے پڑے، اپنے تینوں ساتھیوں کی طرف تکے جا رہی تھی۔

"اب تمہاری باری ہے۔" میں ایک دم غرایا اور اس کی طرف [illegible] نے اٹھ کر دروازے کی جانب لپکنے کی کوشش چاہی تھی کہ...... میں نے راہ میں ہی اسے دبوچ لیا اور اس کی گردن دبانے لگا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ چہرہ سرخ ہونے لگا۔ میں نے اس کی پتلی پڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے جھنجلا کر اسے کہا۔

"اب میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔"

"نن...... پپ...... پلیز......!" وہ گھٹی گھٹی آواز میں گھگیائی۔ "تت...... تم جو پوچھنا چاہو گے میں اب سچ بتاؤں گی۔"

"اب میرے پاس تم سے پوچھنے کا وقت ہی نہیں رہا۔ بائی۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ تیورا کر گری۔

اس کے بعد میں قالین پر ڈھیر پڑے اس کے ساتھیوں کی جانب بڑھا اور جلدی جلدی ان کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ ان کی جیبوں میں سے کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں ملی، یہ دو وہ افراد تھے جو خود گزیدگی کا شکار ہو کے دنیا سے کوچ کر گئے تھے، البتہ جس کی کنپٹیوں پہ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پیٹ کر دنیا و مافیہا سے بیگانہ کر دیا تھا اس کے جیبی پرس سے میں نے اس کا نام پتا نکال کر اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اس کے بعد میں نے کسی کپڑے سے جلدی جلدی وہاں ممکنہ جگہوں پر موجود اپنے فنگر پرنٹس صاف کیے اور نہایت ہوشیاری اور محتاط روی کے ساتھ اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔

لگے ہاتھوں میں نے ان کی جیبوں میں "ڈاکا" بھی مار لیا تھا۔ مجھے فی الحال پیسوں کی اشد ضرورت تھی، وہ میں نے اپنے پاس رکھ لیے۔

اگرچہ عارفہ اور کاسپاکو سے ملی ہوئی ایک خطیر رقم میرے ویسٹرن یونین بینک اکاؤنٹ میں موجود تھی جو میں کہیں بھی کسی بھی وقت نکلوا سکتا تھا لیکن ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی، یہ کام میں آرام اور احتیاط سے کرتا۔

باؤنڈری وال سے باہر آتے ہی میں نے سڑک کا رخ کیا اور فٹ پاتھ پر مناسب رفتار سے پیدل چلنے لگا۔

پروفیسر ڈین وغیرہ سے گفتگو کے دوران میں ان کی شکاگو میں رہائش گاہ کے ایڈریس سے میں واقف تھا۔

میری جیب میں نوٹ موجود تھے۔ میں نے ایک کیب کی طرف بڑھ کر ڈرائیور کو ڈاکٹر ڈین کی رہائش گاہ کا پتا بتا کر عقبی سیٹ پر آ بیٹھا۔ کیب روانہ ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد کیب ایک رہائشی طرز کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہ جھیل مشی گن کے قریب کا خاصا پُرفضا علاقہ تھا۔

ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ امریکا اراضی اور رقبے کے لحاظ سے جتنا بڑا تھا، اتنے لوگ نظر نہیں آتے تھے۔ صرف مخصوص مقامات کے سوا، وہاں بھی اتنے نہیں کہ کھوے سے کھوا چھلنے کی مثال دی جا سکے۔ جس طرح ہمارے ہاں فٹ پاتھ پر گلیوں میں، ادھر اُدھر لوگوں کے جمگھٹے، آوک جاوک...... بائیکس، رکشوں کی بھرمار رہتی تھی، یہاں ایسا کچھ بھی دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ ایک سکون اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا، خال خال ہی لوگ ادھر اُدھر آتے جاتے نظر آتے تھے۔

کیب نے مجھے بتائے ہوئے پتے کے مطلوبہ گھر کے سامنے اُتار دیا۔ میں نے اسے کرایہ دے کر فارغ کیا۔ دائیں بائیں قطار سے خوب صورت اور دیدہ زیب گھر سجے ہوئے تھے، یہ سب اعلیٰ درجے کی عمارتی لکڑیوں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے بیک یارڈ تھے، سامنے کے رخ پر باغیچے اور احاطے میں گیراج، جس کا ایک اندرونی دروازہ اندر گھر میں بھی کھلتا تھا، کیونکہ میں نے راستے میں ایک ایسے ہی گھر کے گیٹ سے ملحقہ گیراج دیکھا تھا۔ اندر کوئی اپنی گاڑی کا بونٹ اٹھائے ہوئے تھا اور ان کے ایک دو بچے گیراج کے عقبی دروازے سے، جو گھر کے اندر کھلتا تھا، وہاں سے آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

یہاں ترتیب سے ولا یونٹ ہوم بنے ہوئے تھے، کہیں بھی ایسی کوئی تجاوزات دیکھنے میں نہیں آتی تھی جس سے علاقے میں "بدنمائی" یا بھدا پن ظاہر ہوتا ہو، یہ ان کی اجتماعی سوچ کی عکاسی تھی۔ کہیں بھی ایسا کچھ نہ تھا کہ کسی مکان کا اوپری حصہ نچلے گیٹ سے اس قدر باہر تک نکلا ہوتا کہ سڑک کو چھو رہا ہوتا، نہ ہی کوئی دائیں بائیں کا کمرا...... آگے کو آیا ہوتا۔ سب کچھ ایک ترتیب اور تہذیب کے ساتھ ایک ہی لکیر پر نظر آتا تھا۔ ان سب چیزوں کو آبزرو کرتے ہوئے میں نے اپنا سر جھٹک کر ایک گہری سانس خارج کی اور کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک ٹین ایجر لڑکی برآمد ہوئی۔ اس نے ٹائٹ جینز اور سلیولیس چست شرٹ پہن رکھی تھی، بالوں کی اس نے پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر شوخ انداز سے مسکرائی۔

"یس انکل؟" اس نے بڑے اخلاق سے مسکرا کر پوچھا۔

"میں پروفیسر ڈین سے ملنے آیا ہوں۔ وہ گھر پر ہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"گرینڈ پا یہاں کم ہی ہوتے ہیں۔ زیادہ تر وہ اپنی سیرگاہ "اسکائی ہوکی" میں ہی ملتے ہیں۔"

اسی وقت دروازے کے نیٹ ڈور سے مجھے ایک پُرکشش سی خاتون دکھائی دی۔

"ہے ایلی! کون ہے؟" وہ خاتون یہ کہتی ہوئی باہر آ گئی۔ اس نے گھٹنوں تک نیکر پہن رکھی تھی، پیروں میں عام سی سلیپر تھی۔ اس نے بھی کھلے گلے کی سلیولیس پہن رکھی تھی۔

"ماما! یہ گرینڈ پا سے ملنا چاہتے ہیں۔" لڑکی نے گردن گھما کر عورت سے کہا۔ دونوں ماں بیٹیاں تھیں۔ وہ خاتون قریب آ گئی اور میری طرف بغور تکتے ہوئے بولی۔

"آپ کون ہیں؟ میرے پاپا سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" عورت نے پوچھا۔

"میں آج ہی ان کے ہمراہ مصر سے یہاں شکاگو آیا تھا۔" میں نے خاتون سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ "میری ساتھی بھی ان کے ساتھ تھی۔"

"او...... آئی سی، تم یاسمین کی بات کر رہے ہو؟" وہ خاتون ہولے سے مسکرائی۔

"جی بالکل۔" میں نے سر کو قدرے خم کرتے ہوئے شائستہ لہجے میں کہا۔ "ان کے ہمراہ ڈاکٹر ہیرالڈ بھی تھے۔"

Visit https://reading.caretofun.net for more novels and digests

"وہ یہاں آئے تھے، ایک دو گھنٹے بعد وہ سب اسکائی ویلی چلے گئے۔ ان کا زیادہ وقت وہیں گزرتا ہے۔ کیا تم نے اسکائی ویلی نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"زیادہ دور نہیں ہے۔ کنگ رن کا علاقہ یہاں چلتے پھرتے کوئی بھی تمہیں بتا سکتا ہے۔ پندرہ بیس کلومیٹر کا ہی فاصلہ ہوگا۔ بس بھی تمہیں اسی سڑک سے اس طرف جاتی مل جائے گی۔"

اب کی بار مجھے اس کا انداز ایسا ہی لگا جیسے مجھ سے جلد از جلد جان چھڑانا چاہ رہی ہو۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پلٹنے لگا تو اس نے پکارا۔

"یہ آپ کا نام.....؟"

"شہزاد۔"

"ہمم..... ایک کپ کافی پینا چاہو تو ویلکم....."

"تھینک یو لیڈی!" میں نے ہاتھ ہلا دیا اور فٹ پاتھ پر آگیا۔

یہاں بس اسٹاپ کا بورڈ نظر آیا۔ دو تین اور بھی افراد بس کے انتظار میں کھڑے تھے، ایک عمر رسیدہ پول سے لگا کوئی اخبار کھولے پڑھ رہا تھا۔ ایک مرد تھا، اس کے ساتھ کوئی عورت تھی۔ میں نے مرد سے پوچھ لیا تھا کہ کنگ رن کی طرف جاتے والی بس ادھر سے ہی ملے گی۔

تھوڑی دیر میں بس آگئی۔ نہایت صاف ستھری اور سیٹ بائی سیٹ مسافروں سے بھری ہوئی، کوئی دھکم پیل نہیں تھی اور جس ترتیب سے اسٹاپ پر قطار میں کھڑے تھے، اسی ترتیب سے باری باری بس میں سوار ہونے لگے۔ جب میری باری آئی تو بس کا دروازہ خودکار انداز میں سلائڈ ہوگیا، میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

بس میں یقیناً مزید کوئی سیٹ خالی نہیں تھی۔

تنگ آکر میں نے پھر کیب کو ہاتھ ہلا دیا۔ اس نے مجھے پندرہ بیس منٹ میں کنگ رن اور وہاں سے اسکائی ویلی پہنچا دیا۔

پروفیسر ڈینا کی رصدگاہ دیکھ کر میں ایک لمحے کو بھونچکا سا رہ گیا۔

جھیل کے کنارے پر واقع ایک چبوترے پر وہ کوئی قدیم طرزِ تعمیر کا نمونہ دکھتی تھی۔

آس پاس چند اور بھی رہائشی مکان یا ہٹس اور دو تین ہوٹل اور ریسٹورنٹ نظر آتے تھے۔ ایک کلب بھی دکھائی دے رہا تھا۔ لوگ باگ کم ہی نظر آتے تھے۔ تاہم سڑک کے پار مکانوں، گھروں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ سربفلک عمارتیں بھی تھیں۔ شام میں یقیناً یہاں اچھا خاصا لوگوں کا رش ہوجاتا ہوگا۔

دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تیرتے نظر آرہے۔

اسکائی ویلی کی عمارت کی طرف ایک سنگل بلیک روڈ جارہی تھی۔ بقول جیب ڈرائیور کے یہ پرائیویٹ روڈ تھی۔ جب ہم اس کے قریب پہنچے تو وہاں ایک گیٹ لگا ہوا تھا، جو بند تھا۔ قریب ایک بورڈ زمین میں گڑھا ہوا تھا۔ جہاں بڑے بڑے الفاظ میں پرائیویٹ پراپرٹی لکھا ہوا تھا اور اس کے نیچے "نوٹریس پاس" بھی درج تھا۔ اس پرائیویٹ روڈ سے اسکائی ویلی کی عمارت تک فاصلہ اگرچہ واکنگ ڈسٹینس کا ہی تھا لیکن میں تھکا ہوا تھا اور میرا اس وقت اتنی دور پیدل چلنے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ یوں عمارت پیچھے تو نیچے چبوترے پر ہونے کی وجہ سے [illegible] تھی۔

جب میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اتر کر گیٹ کھول کے کیب اندر لے جائے تو اس نے انکار کر دیا اور نہایت تہذیب سے بولا۔

"سوری سر! یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا..... آپ خود ہی اتر کر گیٹ تک جائیں وہاں انٹرکام نصب ہوگا۔ لینڈ لارڈ یا اندر کسی سے بات کرلیں۔ دروازہ کھل گیا تو میں مجھے اندر جانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"او کے، میں دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا اور دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

گیٹ پر ایک بورڈ نصب تھا جو بند تھا۔ میں نے اس کا ڈھکنا کھولا، اندر انٹرکام نظر آیا۔ میں نے اس کا ریسیور ہک سے اٹھا کر کان سے لگالیا، کوئی بٹن نہیں تھا، خودکار نظام کے تحت بیل کی آواز دوسری طرف جارہی تھی۔ کسی نے اٹھایا اور ہیلو کہا۔

آواز نسوانی تھی۔ کسی جوان عورت ہی کی تھی۔ میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ مجھے ہولڈ کرنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسی عورت کی آواز ابھری اور اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ دوسری جانب سے اسموتھ ٹون کی آواز آنے لگی جس کا مطلب تھا دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا ہے۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

اس وقت نصف شب سے زیادہ بیت چکی تھی جب جرم کے خلاف مہم چلانے والے رپورٹر جیک بینٹ کے بٹلر نے مجھے اور میرے پارٹنر لیری کو رپورٹر کی رہائش گاہ کے دروازے پر خوش آمدید کہا۔

"مجھے صحیح صحیح بتاؤ کہ تم نے پولیس کو آدھی رات گزرنے کے بعد کیوں طلب کیا ہے؟" میں نے بٹلر سے پوچھا۔

"آج میری نائٹ آف تھی۔" بٹلر نے بتایا۔ "چھٹی پر جانے سے پہلے مسٹر بینٹ نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں رات کو واپس آجاؤں تو اس کی خلوت گاہ کے دروازے پر دستک دے دوں تاکہ اسے پتا چل جائے کہ میں گھر لوٹ آیا ہوں۔"

"اور پھر؟"

"میں کچھ دیر قبل ہی گھر لوٹا ہوں۔ میں نے گھر آتے ہی یہ نوٹ کی کہ مسٹر بینٹ کی خلوت گاہ کے دروازے کے نیچے کوئی روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں لیکن جب میں نے ان کی خواب گاہ کو چیک کیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھے اور ان کے بستر کی چادر بھی شکن آلود نہیں تھی۔"

"کیا یہ ایک غیر معمولی بات تھی؟"

"جی ہاں، اس لیے کہ جب مسٹر بینٹ یہ کہتے تھے کہ وہ رات گئے تک کام کریں گے تو وہ رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔ اگر وہ کہیں باہر چلے جاتے تو وہ ہال وے کی میز پر میرے لیے کوئی تحریر شدہ پیغام چھوڑ دیا کرتے تھے۔"

"تم کیا چاہتے ہو کہ ہم کیا کریں؟" میں نے بٹلر سے پوچھا۔

"میرے پاس مسٹر بینٹ کی خلوت گاہ کی چابی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں جب ان کے ذاتی کمرے میں داخل ہوں تو آپ لوگ بھی میرے ہمراہ ہوں۔"

"کیوں؟"

"مسٹر بینٹ کا ایک سخت اُصول ہے۔ کسی کو بھی ان کی خلوت گاہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے..... حتیٰ کہ مجھے بھی نہیں۔ میں ان کے لیے پریشان اور فکرمند ہوں اور چاہتا ہوں کہ جب میں اندر کمرے میں جاؤں تو پولیس ڈپارٹمنٹ سے بھی کوئی میرے ساتھ ہو۔"

میں نے یہ سُن کر شانے اچکا دیے۔ پھر لیری اور میں بٹلر کے پیچھے پیچھے اس کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے جو ہمارے بائیں جانب واقع تھا۔

بٹلر نے کمرے کے دروازے کے تالے میں چابی گھمائی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ کمرا مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"تم یہیں باہر ٹھہرو۔" میں نے بٹلر سے کہا۔ "لیری تم میرے ساتھ اندر چلو مگر ذرا دھیان سے۔"

ہم کرائم رپورٹر کی خلوت گاہ میں داخل ہوگئے۔ لیری نے

قانون کے دائرے میں رہنے والے آلۂ کار کا اختتام.....

سراغ رساں ذہن عام آدمی کے ذہن سے نہیں سوچتا... اس کی سوچیں... اندازے اور زاویۂ نگاہ ہمیشہ بلند ترین چوٹی پر محوِ پرواز رہتا ہے... جرم اور مجرم کو دبیز تہوں سے نکالنے کے لیے مسلسل متحرک و مستعد رہتا ہے... زیرِ نظر کیس بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہے... جرم کنندہ کی معمولی سی بے احتیاطی نے بازی کو پلٹ دیا...

آلۂ کار

ساحر انور

Visit https://rea net for more novels and digests

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنائونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 56

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔

ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیمونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹلسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹلسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹلسی کے چندرناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔

وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹلسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔

ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور حوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹلسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹلسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ”انڈیمان“ پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ”کلی منجارو“ پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چھائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد ٹولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو مورباغہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہاں شہزی سے دوبدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"پروفیسر ڈین کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو نہیں جانتے۔ اگر ملنا ہے تو شکاگو یونیورسٹی آکر پہلے ان سے وقت لیں۔"

یہ وہ الفاظ تھے جو اس عورت نے بڑی بے رخی سے ادا کرتے ہی کال منقطع کر دی تھی۔ وہ شاید کوئی ملازمہ تھی یا پھر پروفیسر ڈین کی اسسٹنٹ بھی ہو سکتی تھی۔ میں اس کی بات سن کر حیران و پریشان رہ گیا۔ ایک لمحہ تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ یہ کہہ کیا رہی ہے؟ تاہم ظاہر تھا کہ اسے پروفیسر ڈین نے ہی ایسا کہنے کو کہا ہوگا۔ کہیں پروفیسر ڈین کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ وہ بھلا اتنی جلدی مجھے کیسے بھول بیٹھا؟ جبکہ میری ساتھی یاسمین خانم اس کے ساتھ تھی۔

میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس بار میں نے سوچا کہ یاسمین کا حوالہ دے کر ہی بات کر کے دیکھتا ہوں، لہٰذا یہ سوچ کر میں نے دوبارہ انٹرکام کا ریسیور اُٹھا کر کان سے لگایا تو چونک پڑا۔ اب اس میں سے مجھے ٹون کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ گویا یہ بالکل ہی ڈیڈ ہو گیا ہو۔

میں چند ثانیے کے لیے وہیں کھڑا سوچتا رہا تو کیب ڈرائیور کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"سر! پلیز، اگر کہیں اور نہیں جانا ہے تو مجھے فارغ کر دیں؟"

میں نے اسے کرایہ دیا اور شکریے کے ساتھ اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جواب میں وہ بھی شکریہ کہہ کر چلتا بنا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور چہار اطراف کا جائزہ لیا۔ اب میں حیرت اور مخمصے کی کیفیات سے نکل آیا تھا اور اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

دراصل میں کچھ سمجھ بھی نہیں پارہا تھا کہ آخر یہ معما کیا تھا؟ پروفیسر ڈین اتنی جلدی مجھے کیوں بھول گیا تھا؟ ایک روایتی لطیفے کے مطابق کیا واقعی وہ مجھے بھول گیا تھا یا پھر یہ اس کی کوئی دانستہ حرکت تھی؟

میں نے گیٹ کے اردگرد دیکھا۔ دونوں جانب آہنی تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے گیٹ پھلانگنے کا ارادہ کیا اور آگے قدم بڑھایا۔ گیٹ پر چڑھنا مشکل نہ تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد میں دوسری جانب پھلانگ چکا تھا۔

اب میرے سامنے والی روش عمودی ہو کر پروفیسر ڈین کی رصدگاہ تک جارہی تھی۔ میں اس پر چلنے لگا لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ اچانک مجھے ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ کوئی تیز سی الارم جیسی آوازیں گونجنے لگیں۔

میں قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ایک سے زائد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اسی طرح تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ ابھی گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے دو جسیم کتّے غراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر جھپٹتے میں گیٹ پھلانگ کر باہر جاچکا تھا۔

وہ دونوں گیٹ پر رک گئے اور اپنے بھیانک جبڑوں سے نکیلے شکاری دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بُری طرح غرانے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔

ہار ماننے والا میں بھی نہیں تھا۔ میں نے راستہ بدلا اور...... تقریباً دوڑتا ہوا ایک طویل چکر کاٹ کر چند گھروں کے بیک یارڈز سے گزرتا ہوا دوبارہ اسکائی ویلی کی عمارت کے قریب آیا تو بے بسی کے ساتھ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

اس طرف بھی لوہے کی باڑھ نصب تھی۔ میں چند ثانیے وہیں کھڑے ہانپتا رہا۔ ایک جارحانہ خیال دل میں آیا بھی کہ ایک بار پھر باڑھ پھلانگ جاؤں اور ان دونوں کتوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مار ڈالوں مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

دفعتاً ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کوندا۔ میں فوراً واپس پلٹا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سڑک پر آگیا جہاں سے مجھے کوئی بس یا کیب ملنے کی اُمید ہو سکتی تھی۔ اس بار بس مل گئی اور خالی نشست بھی، میں اس میں سوار ہو کر دوبارہ اسی علاقے میں اُترا جہاں پروفیسر ڈین کی بیٹی اور پوتی سے ملا تھا۔

میں نے کال بیل بجائی۔ اس بار بھی وہی خوبصورت سی ٹین ایجر لڑکی ایلی برآمد ہوئی۔ وہ اپنی سابقہ پوشاک میں ہی تھی یعنی ٹائٹ جینز اور سلیولیس چست شرٹ، بالوں کی اس نے پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ مجھے دوبارہ دیکھ کر اس بار شوخی سے مسکرائی نہیں بلکہ اس کی جگہ حیرت نے لے لی، اسی لہجے میں مستفسر ہوئی۔

"ارے انکل! آپ......؟ کیا آپ اسکائی ویلی نہیں گئے؟"

"گیا تھا۔" میں نے مختصر جواب دیا پھر سوال کیا۔

"کیا تمہاری مما سے مل سکتا ہوں؟"

"شیور انکل! اندر آجائیں پلیز۔" ایلی نے کہتے ہوئے اندر آنے کا راستہ دیا اور میں اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ پلٹ کر "مما...... مما......" کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ البتہ مجھے اس نے ایک لاؤنج میں ہی ایک صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہی خوبصورت سی مگر نیکر پوش خاتون اس کے ساتھ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی میں احتراماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ جب میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ بھی اُلجھ گئی۔

"میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں، مسٹر شہزاد......؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اسے میرا نام یاد تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں سے خود انہیں فون کر کے میری اُن سے بات کرادیں۔ ہوسکتا ہے مجھ سے بات کر کے انہیں یاد آجائے؟"

میری بات سن کر اس کی نگاہوں میں شک کے سائے لہرائے۔ وہ اسی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"حیرت ہے۔ پا نے تمہیں نہیں پہچانا، جبکہ بقول تمہارے وہ آج ہی مصر سے شکاگو پہنچے ہیں۔ تم اور تمہاری ساتھی بھی ان کے ساتھ تھی؟"

"پا" سے اس کی مراد پاپا ہی تھی۔ امریکی بہت شاٹ لینگوئج استعمال کرتے ہیں۔

"بالکل......" میں نے فوراً کہا۔ "میں خود اس بات پر حیران ہوں۔"

"اوکے" وہ ذرا سوچنے کے بعد بولی۔ "آپ بیٹھیں، میں فون کرتی ہوں۔" پھر اس نے اپنی بیٹی ایلی سے کہا۔

"بے بی! میرا ہینڈی لے کر آؤ ذرا......" (یہاں لوگ سیل فون کو "ہینڈی" کہتے تھے)

ہم دونوں آمنے سامنے والی نشستوں پر براجمان ہوگئے۔ وہ میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے نگاہیں ملائیں اور ہولے سے مسکرادیا پھر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس نے رسمی اور ابتدائی کلمات کے تبادلے کے دوران اپنا نام اینا بتایا تھا۔

"تم پا کے اسٹوڈنٹ ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "میں ان کی فیلڈ ریسرچ مہم میں ساتھ تھا۔"

اس دوران ایلی نے ایک سیل فون اپنی مام کو تھمادیا۔ وہ نمبر پنچ کرنے لگی۔

"یس، ہیلو پا! اٹس می......" کہتے ہوئے اس نے میرے بارے میں اپنے "پا" کو بتادیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"یس، پا! وہ اِدھر ہی موجود ہے، گھر پر۔" عورت نے سیل فون پر باپ کو بتایا۔ پھر دوسری جانب کی گفتگو سنتی رہی۔ میں نے اس سے استدعا کی کہ مجھے بات کرنے دے مگر اس نے دوسرے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مانع رکھا۔ میں ٹھہر گیا۔

اب میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔ دوسری جانب کی گفتگو بڑے غور سے سنی جارہی تھی۔ میرے دل میں کھلبلی سی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اینا نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فون کان سے ہٹایا اور مجھ سے مخاطب ہوکے بولی۔

"مسٹر شہزاد! پا نے یہ سب جان بوجھ کر آپ کے ساتھ کیا تھا۔"

اس عجیب انکشاف پر میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ "کیا مطلب؟" وہ خود بھی اب مطمئن سی نظر آرہی تھی۔ جواب میں بولی۔

"ہاں! اس لیے کہ...... وہ خود نہیں چاہتے تھے کہ تم وہاں آکر ان سے ملو۔"

"اگر ایسی بات تھی تو وہ یہاں سے اپنی لیب میں جانے سے پہلے تمہیں پہلے ہی میرے سلسلے میں کوئی پیغام تو دے کر ہی جاتے؟" میں نے ذہن میں اُبھرنے والے ایک محتاط خیال کے تحت پوچھا۔

"تم غالباً ائرپورٹ سے اچانک غائب ہوگئے تھے؟" اینا بولی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ وہ آگے بولی۔

"اسی لیے ہوسکتا ہے کہ...... انہیں اندازہ نہ رہا ہو کہ تم یہاں کا رخ کرسکتے ہو۔"

"اور بھلا میں کہاں جاسکتا تھا؟" میں نے کہا۔ "پروفیسر ڈین نے مجھے اپنی رہائش گاہ پتا بتا رکھا تھا اور تھوڑا بہت آئیڈیا اپنی رصدگاہ...... کا بھی دیا تھا، مگر میں نے صرف ان کی اس جگہ کا پتا ہی ذہن نشین کرنا ضروری سمجھا

تھا۔''

''بہرحال! اب وہ کہہ رہے تھے کہ تم اِدھر ہی رہو اور وہ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ممکن ہے رات تک آجائیں۔''

''اور میری ساتھی یاسمین......؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ مجھے ایسے غیر یقینی حالات میں یاسمین کی فکر ستانے لگی تھی۔

''ان کے بارے میں تو ابھی پا، نے کچھ نہیں بتایا مجھے یا پھر کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو۔'' وہ کچھ ایسے انداز میں بولی کہ مجھے لگا، وہ کچھ چھپانا چاہ رہی تھی۔

میں نے ذہن میں اچانک اُبھرنے والے ایک سوال کے تحت اس سے پوچھا۔

''ایک بات بتائیں؟''

''یس شیور......'' وہ توجہ طلب نگاہوں سے میری جانب تکتے ہوئے بولی۔

''جب پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ ائرپورٹ سے سیدھے یہاں پہنچے تھے تو کیا یاسمین بھی ان کے ساتھ تھیں؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا تو میرا ذہن کھٹکا۔ تیکھے لہجے میں اگلا سوال داغا۔

''تو پھر آپ کو میری ساتھی یاسمین کا کیسے علم ہوا؟ جبکہ بقول آپ کے وہ یہاں آئی بھی نہیں۔''

''اس کا ذکر پا نے کیا تھا مجھ سے کہ وہ اچانک کسی کے ساتھ جا چکی ہے۔ اس کا ساتھی، یعنی تمہارے بارے میں بھی اسی طرح کا ذکر ہوا تھا پا، اور ڈاک ہیرالڈ کے درمیان۔'' اس نے فوراً جواب میں کہا۔

''پھر وہ دونوں زیادہ دیر یہاں بیٹھے بھی نہیں۔ مجھے کچھ باتوں سے آگاہ کر کے اسکائی ویلی چل دیے۔''

میں پھر اُلجھ گیا اور پہلے سے زیادہ پریشان بھی۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا کہ یاسمین بھی میری طرح راستے میں کسی فوری مجبوری کے پیشِ نظر ان سے الگ ہوگئی تھی۔ یوں مجھے اب ایک نئی فکر و تشویش نے گھیر لیا اور لامحالہ میرے ذہن میں یہی خیال اُبھرا کہ اس کا مطلب ہے کہ یاسمین بھی (نقلی) سوزی کی طرح کسی ایسے ہی دشمن کا شکار ہوگئی تھی؟

''بہتر ہوتا کہ آپ میری پروفیسر صاحب سے بات کروا دیتیں۔'' بالآخر میں نے اینا سے کہا۔

''وہ جلدی میں تھے اور بے حد مصروف......'' اینا نے جواز گڑھا۔

''ہمم......'' میرے حلق سے گومگو سے انداز میں ہنکاری نکلی۔

''تم بیٹھو آرام سے، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ ڈرنک کرتے ہو؟'' اینا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔

''تھینکس'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف ایک گلاس پانی پلا دو۔'' میں نے کہا۔

وہ چلی گئی لیکن ساتھ ہی میں نے جب اسے پلٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاتے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنی بیٹی ایلی کو کوئی ہلکا سا اشارہ کیا ہو۔ کیونکہ اس نے بھی اسی وقت اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور ایک دم ہی اس نے میری جانب ایک عجیب سی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی نشست چھوڑ دی۔

میرا ''اندر'' بُری طرح کھٹکا پھر ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی اور ان دونوں ماں بیٹی کے عقب میں لپکا۔

میں نے دیکھا کہ...... اینا دوسرے کمرے میں جاتے ہی فوراً اپنی بیٹی ایلی کو کھینچتی ہوئی کونے میں لے گئی اور جھک کر اس سے جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میری چھٹی حس کسی پُراسرار گڑبڑ کا ہی نہیں بلکہ خطرے کا بھی احساس دلا رہی تھی۔

اپنے مرحوم دوست روڈلف کی نصیحت مجھے یاد تھی کہ ''بڈی......! امریکا میں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا......'' اور میں یہی کر رہا تھا۔ اسی سبب یہاں قدم رکھتے ہی سوزی کے شر سے بال بال بچا تھا اور اب...... یہ پروفیسر ڈین.... فی الوقت تو میں واقعی اپنے ''سایوں'' سے ہی نبرد آزما تھا۔

میں نے دیکھا ایلی ماں کی بات سنتے ہی خوف زدہ سی نظر آنے لگی اور بھاگ کر زینے طے کرتی ہوئی اُوپری منزل میں چلی گئی۔ میں دوبارہ اسی پھرتی سے پلٹا اور اپنی نشست پر آن بیٹھا۔ اینا دوبارہ مسکراتے ہوئے نمودار ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''پروفیسر ڈین، اندازاً کتنی دیر تک یہاں پہنچ جائیں گے؟''

''رات تک تو آ ہی جائیں گے۔''

میں نے وقت دیکھا۔ ابھی رات میں کئی گھنٹے باقی

تھے۔ میں نے ایک بار پھر اینا پر سنجیدہ سی نظریں گاڑ دیں اور بولا۔ ''ابھی تو رات ہونے میں کافی وقت پڑا ہے۔ میں تب تک بے چین اور پریشان ہی رہوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ جب وہ میری ساتھی کو اپنی رصدگاہ لے جا چکے ہیں تو مجھے وہاں آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟''

''یہ تو وہی آکر بتا سکتے ہیں......'' اینا نے جواب دیا۔ اس بار وہ میرے ساتھ بیٹھی نہیں تھی۔ وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ذرا کچن کا کام ختم کرلوں۔'' کہتے ہوئے وہ پلٹی تو میں نے فوراً اسے پکارا اور اپنی سیٹ چھوڑ دی۔

وہ میری جانب مڑی۔ مجھے اپنے قریب آتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف اور گھبراہٹ کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس سے کہا۔

''میرا خیال ہے مجھے اب دوبارہ اسکائی ویلی کا رخ کرنا چاہیے اور اس بار تم بھی میرے ساتھ چلوگی۔''

''م...... میں......؟'' وہ بوکھلا سی گئی۔ ''لل...... لیکن کیوں؟''

''اس لیے کہ مجھے پروفیسر ڈین کی نیت پر شبہ سا ہو رہا ہے۔ وہ میرے اور میری ساتھی یاسمین کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کر رہے ہیں۔ میں اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیکن تمہیں تو پا، نے اسی گھر میں انتظار کرنے کو کہا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ بھلا تمہیں اپنے گھر میں کیوں......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ''انہیں معلوم ہے کہ میں ان کے گھر کے سوا کسی اور جگہ کا رخ نہیں کرسکتا۔ وہ...... یہاں پولیس کے ساتھ بھی آسکتے ہیں۔''

''تو کیا تم کوئی کرمنل ہو؟'' اینا خود کو اب کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔

''میں کوئی کرمنل ہوتا تو تمہارے پا، مجھے یہاں لے کر نہیں آتے۔ وہ خود کرمنل گینگ کے نرغے میں پھنس چکے تھے اپنے ساتھیوں سمیت۔ میں نے ہی اُن کی جان ان سے چھڑائی تھی۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے، میں آپ کی مشکور ہوں۔'' وہ بولی۔ ''آپ پلیز پا کا تھوڑا انتظار کرلیں۔''

''ہرگز نہیں، تم اسی وقت میرے ساتھ چل رہی ہو۔ گاڑی تو تمہارے پاس ہوگی۔ ایلی کو بتا جاؤ کہ ہم ابھی تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔'' میں حتمی لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر کے لیے سوچنے لگی، پھر بولی۔ ''میرا خیال ہے مجھے اس سلسلے میں پا، سے فون پر پہلے بات کرلینی چاہیے۔''

''بے شک لیکن ہو سکے تو میری بھی بات کروا دو اور فون میرے سامنے کرو۔'' میں نے حکم صادر کیا۔ اس نے یہی کیا۔

یہ سب کچھ کھڑے کھڑے ہونے لگا۔ اینا نے فون کان سے لگایا ہوا تھا۔ نمبر پنچ کرچکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں رابطہ ہوا تو اس نے میری بے چینی کے متعلق پروفیسر ڈین کو آگاہ کردیا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد شاید دوسری جانب سے ڈین نے اسے مجھ سے بات کرانے کا کہا تھا اور یوں اینا نے فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو...... بات کرو۔''

میں نے ابھی اس کے ہاتھ سے فون لیا ہی تھا کہ اچانک کال بیل بجی۔ ہم دونوں ہی چونک پڑے۔ فون میرے ہاتھ میں تھمارہ گیا، اینا بہرحال دروازے کی جانب بڑھی، میں نے فون ابھی اپنے کان سے نہیں لگایا تھا۔ کال بیل بجنے پر میرے دل کو بے چینی لگ گئی۔

میں اسی طرح فون ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہونے والی دو جوان خواتین میں سے ایک کو پہچان کر میں بُری طرح چونکا۔

☆☆☆

وہ یاسمین تھی...... جبکہ دوسری عورت میرے لیے غیر شناسا تھی۔ یاسمین کو دیکھتے ہی میں بے اختیار اس کی جانب لپکا۔ وہ بھی مجھے یہاں دیکھ کر حیران اور خوش ہوئی تھی۔

''شہزی!'' وہ بھی میری طرف لپکی۔ ڈین سے بات کرنے کا اب کوئی جواز نہیں بچا تھا۔ لہٰذا فون میں نے دوبارہ اینا کو تھما دیا۔

ہم دونوں کی شناسائی پر وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی۔ ایک طرف کونے میں جاکر وہ باپ سے بات کرنے لگی۔

''شکر ہے خدا کا...... تم صحیح سلامت ہو۔'' یاسمین گہرا اور طمانیت بھرا سانس لے کر بولی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے کسی خطرے کا پہلے سے علم ہو۔

''مجھے یہ سارا چکر سمجھ نہیں آرہا......'' میں نے قدرے جھلا کر کہا۔ ''تم تو پروفیسر ڈین کے ساتھ تھیں؟ اور یہ خاتون کون ہے؟''

''میرا نام سوزی ہے۔'' اس عورت نے بتایا اور میرا

دماغ ایک بار پھر بھک سے اُڑ گیا۔

”مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ یاسمین نے مجھے سنبھالا دیا۔ اس کے ساتھ جو جوان سی لڑکی تھی، وہ خاصی پُرکشش اور سرو قد تھی۔

ذرا دیر بعد اینا بھی باپ سے بات کرنے کے بعد ہمارے قریب آ گئی۔

یاسمین نے مجھے پریشان دیکھ کر تسلی دی، پھر اینا نے ہم سب کو بیٹھنے کا کہا۔

یاسمین نے اصرار کیا کہ پہلے میں اپنے بارے میں بتاؤں کہ ائرپورٹ پر اُترنے کے بعد کون مجھ سے ٹکرایا تھا اور بعد میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟

جب میں نے اسے مختصراً الفاظ میں بتا دیا تو......

یاسمین نے معنی خیز نگاہوں سے اپنے ساتھ بیٹھی سوزی نام کی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے دلکش چہرے پر، جو کچھ دیر قبل یاسمین کی زبانی ”شہزی“ کے تعارف پر مسکراہٹ تھی، اب نقلی سوزی کے ذکر اور بعد کے حالات میری زبانی سننے کے بعد وہ پریشان اور متفکر سی نظر آنے لگی۔

”اس کا مطلب ہے دشمنوں کو تمہاری آمد کا علم ہو چکا ہے؟“

”سمجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے ہمارے بارے میں علم ہوا؟“ یاسمین اُلجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

یہی سوال میرے اندر بھی پل رہا تھا جو میں نے سوزی سے پوچھا کہ آخر اُسے ہماری آمد کا کیسے علم ہوا؟ جبکہ میری معلومات کے مطابق آنسہ خالدہ کیلی فورنیا اور پھر نیویارک میں تھی۔

”شہزی! تمہارے دشمن تمہاری سوچ سے بھی زیادہ طاقتور اور بااثر ہیں۔ ان کا نیٹ ورک بے حد وسیع ہے۔ اس وقت ان کی تمام تر توجہ تم پر مرکوز ہے۔ یہاں تک آنے میں جن لوگوں نے یقینی طور پر تمہارا راستہ روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ یا اُن کے ساتھی ہر وقت ان سے رابطے میں رہے ہوں گے جو انہیں تم سے متعلق پل پل کی خبریں پہنچاتے رہے ہیں۔“

وہ چند ثانیوں کے لیے سانس لینے کو رکی۔ مجھے یاد آیا کہ ایسا سب کچھ جہنم واصل کوہارا اور اس کے نوبیان کے صحرا میں موجود ساتھیوں کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہوگا۔

”لیکن تمہیں کیسے علم ہوا؟“ میں نے اس کے لمحہ بھر کے توقف پر سوال کر ڈالا۔

”میں خود اپنی ساتھی آنسہ خالدہ کی مسلسل تلاش میں تھی اور یوں میں نے بھی ان کے کچھ ساتھیوں کو ٹریس کر رکھا ہے اور انہی کی مسلسل ریکی کرتے ہوئے میں نے بہت سی باتوں کا پتا چلایا تھا۔“ سوزی جواب میں بولی۔

”لیکن ان میں ایک لڑکی ڈیلالائیٹ بھی تھی (نقلی سوزی) مگر اس نے اُلٹا مجھے ٹریس کر لیا اور مجھ سے بہت کچھ اُگلوا لیا۔ تب ہی اس نے نقلی سوزی بن کر تمہیں پھنسانا چاہا تھا۔ میں تو اس کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی، مگر مجھے تم دونوں کی فکر تھی۔ یعنی تمہاری اور یاسمین کی۔“

”اصل سوزی یہی ہے شہزی ڈیئر!“ بالآخر یاسمین نے کہا اور پھر اس نے بتایا کہ...... ہم دونوں کے ساتھ تقریباً ایک ہی طرح کے واقعات پیش آئے تھے لیکن بعد کے حالات کے مطابق ایک واضح فرق تھا کہ میرے ساتھ ٹکرانے والی ”سوزی“ نقلی تھی مگر یاسمین سے ملنے والی سوزی اصل تھی جو آنسہ خالدہ کی کولیگ اور ساتھی تھی۔

یاسمین نے بتایا کہ میں جیسے ہی ائرپورٹ پر اس سے جدا ہوا اور اس کے بعد وہ اور پروفیسر ڈین صحافیوں وغیرہ سے جان چھڑا کر ٹیکسی میں بیٹھنے لگے تو...... ایک جوان عورت یاسمین سے ملی اور اس سے میرے بارے میں دریافت کیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون عورت تھی جس کی امریکا میں مجھ سے واقفیت تھی؟ تاہم اس کا خیال شکیلہ وغیرہ کی طرف بھی گیا تھا۔ جیسا کہ اسے معلوم تھا کہ میرے دو پاکستانی جاں نثار ساتھی بہت پہلے سے ہی امریکا میں موجود تھے۔

لیکن جب اس نے اپنا نام سوزی بتایا اور میرے بارے میں پوچھا تو یاسمین نے اسے یہی بتایا کہ وہ بھی کسی ایسی ہی خاتون کے کہنے پر اس کے پیچھے گیا ہے۔

بہرحال (اصل) سوزی یاسمین کو اپنے ساتھ لے گئی۔ یاسمین کے دل میں شکوک وشبہات اُبھرے تھے مگر سوزی نے کچھ ایسی باتیں اس سے کہیں کہ اسے اس پر یقین آ گیا اور یوں وہ بھی پروفیسر ڈین سے جلد ملنے کا کہہ کر اس کے ہمراہ چلی گئی۔

چونکہ میں نے ائرپورٹ پر یاسمین سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ میں اِس سے جلد پروفیسر ڈین کی رہائش گاہ پر

ملوں گا اسی لیے وہ بعد میں سوزی کے ساتھ ادھر آئی تو میں بھی اس کی توقع کے مطابق ادھر ہی تھا۔

شکاگو قدم رکھتے ہی پیش آمدہ حالات جس قدر تیزی سے اُلجھے تھے، وہ اب اسی تیزی کے ساتھ گویا پرت در پرت واضح ہوتے چلے گئے۔

''مس سوزی! تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ کیا یہ جگہ وہ باتیں کرنے کے لیے مناسب ہوگی؟'' میں نے دبے دبے جوش تلے اس سے پوچھا۔

اس نے ایک نگاہ حیران پریشان سی بیٹھی اینا پر... ڈالی اور اسے متذبذب پا کر میں اُٹھ کھڑا ہوا اور...... اینا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

''اینا تمہارا شکریہ اور تمہاری بے بی کا بھی...... ہم دوبارہ اچھے دوستوں کی طرح ملیں گے۔ معافی چاہوں گا کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر مجھے آپ پر اور پروفیسر ڈین پر شبہ ہونے لگا تھا۔''

میں نے اس سے معذرت خواہانہ رویّہ اپناتے ہوئے کہا اور بات جاری رکھی۔ ''دراصل میں اور میری ساتھی کچھ ایسے حالات کا شکار رہے ہیں کہ ہمیں محتاط رہنا پڑتا ہے۔ باقی باتیں آپ کو یقیناً پروفیسر ڈین بتا دیں گے۔''

''کوئی بات نہیں اِٹس او کے......'' وہ بھی پورے خلوص سے مسکرا کر بولی۔

''لیکن ایک اُلجھن مجھے رہے گی کہ آخر پروفیسر ڈین نے میرے ساتھ ایسا پُراسرار رویّہ کیوں اختیار کیا؟ جس سے میں ان کی جانب سے ہی نہیں بلکہ آپ کی طرف سے بھی مشکوک ہو گیا۔''

وہ جواب میں ایک طمانیت بھری سی مسکراہٹ سے بولی۔ ''مسٹر شہزی! دراصل تم دونوں کے ائرپورٹ سے باری باری پُراسرار طور پر غائب ہو جانے سے پروفیسر ڈین ڈر سے گئے تھے کہ نجانے یہاں تم دونوں کے پیچھے کون لوگ لگ چکے ہیں، وہ بھی کچھ بتانے کے لیے رات کو آنے والے تھے۔ ورنہ وہ ہفتوں یہاں کا رخ نہیں کرتے اور ان کا زیادہ تر وقت اپنی رصدگاہ میں ہی گزرتا ہے۔ اسی باعث میں اور میری بیٹی ایلی بھی پریشان ہو گئے اور کوئی بات نہ تھی۔''

''ہم......'' میں نے کہا۔

اس کے ذرا دیر بعد ہم تینوں وہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

سوزی کی کار تھی۔ وہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ یاسمین اس کے برابر والی سیٹ پر اور میں عقبی سیٹ پر براجمان تھا اور سارے راستے سوزی سے باتوں میں مصروف رہا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سوزی سے ایک ہی لمحے میں سب کچھ سن لوں۔ میرے سامنے وہ سب اُگل دے جنہیں سننے کے بعد عابدہ کے جلد حصول کی راہ آسان ہوتی چلی جائے۔

''میں بہت سی باتیں یاسمین کو بتا چکی ہوں......'' وہ اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ اور نگاہیں ونڈ اسکرین کے پار سڑک پر جمائے ہوئے بولی۔

''باقی باتیں اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کرتے ہیں، یہ بہت اچھا ہوا کہ تم آ گئے شہزی! آنسہ خالدہ نے مجھے تمہارے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے کہ تم کس قدر ثابت قدم، دلیر اور باہمت ہو...... حقیقت یہی تھی کہ آنسہ خالدہ کے بعد میں خود کو اکیلی سمجھنے لگی تھی۔ اب تم آ گئے ہو تو میرے بھی حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ میں بہت کچھ جانتی ہوں، لیکن اکیلی تھی زیادہ ہاتھ پاؤں مارنے سے گریز کر رہی تھی۔''

''میرے یہاں دو ساتھی اور بھی ہیں۔'' میں نے اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر کہا۔ ''لیکن تمہارے حوصلے کی بھی داد دینا چاہیے، مجھ سے زیادہ دلیر اور باہمت تو تم اور آنسہ خالدہ ہیں۔ بلکہ آنسہ خالدہ کی اس سلسلے میں قربانیاں تو میرے لیے بہت زیادہ ہیں۔ میں تو ساری زندگی بھی اس نیک، حوصلہ مند اور بہادر خاتون کا احسان نہیں اُتار سکتا۔ لہٰذا مس سوزی! میں آپ سے پہلے بھی کہوں گا کہ ہمیں سب سے پہلے آنسہ خالدہ کی بازیابی کے لیے قدم اُٹھانا چاہیے۔''

ہم اسی طرح کی گفتگو میں سفر کرتے ہوئے ایک ایسی کثیر المنزلہ بلڈنگ کے سامنے پہنچ گئے جہاں کبوتروں کے... کابک کی طرح فلیٹس بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

پارکنگ ایریا میں کار روکنے کے بعد ہم تینوں کار سے نیچے اُتر آئے۔

اس کے بعد لفٹ کے ذریعے ہم ساتویں منزل کے ایک فلیٹ میں داخل ہوئے۔

فلیٹ کشادہ تو کیا زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ اسے سنگل روم اور مختصر سے لاؤنج والا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کہہ سکتے تھے۔ ہم لاؤنج میں ہی بیٹھ گئے۔

''ایسے چھوٹے فلیٹ عارضی اور کم ترین مدت کے

لیے کرائے پر بہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔'' سوزی ہمیں بیٹھنے کا کہہ کر قریب رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

''آپ میں سے کوئی ڈرنک کرتا ہے؟'' اس نے آخر میں مہمان نوازی کے طور پر پوچھا۔ جواب میں ہم دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ کافی بنانے لگی تاہم اس نے اپنے لیے ..... اسکاچ وہسکی کا ایک پیگ بنا لیا تھا۔

ہم نے اسے کافی کے تکلف سے منع کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ نہ مانی۔

ذرا دیر میں کافی تیار ہو گئی۔ میں اور یاسمین کافی پینے لگے، وہ اپنا شغل کرنے لگی۔

میں اس دوران سوزی کا پورا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ مجھے امریکن تو کہیں سے بھی نہیں نظر آتی تھی۔ امریکن عورتوں جیسا اس میں کوئی تیکھا پن نہیں تھا، وہ مجھے برطانوی لگی تھی۔ انہی جیسے گاڑھے نقوش، بھرا بھرا بدن، گوری چٹی رنگت اور گہری سبز آنکھوں کے علاوہ بوائے کٹ بال تھے، جن کا رنگ ہلکا سنہری مائل تھا۔ قد بھی اس کا درمیانہ تھا۔ وہ قبول صورت تھی۔

''یہ فلیٹ بھی میں نے قلیل مدت کے لیے کرائے پر لیا تھا، ورنہ میری مستقل رہائش کیلی فورنیا میں ہے۔'' سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے وہ آگے بولی۔ ''تمہاری وجہ سے ہی مجھے شکاگو آنا پڑا اور اب ہم آج ہی کیلی فورنیا واپس جائیں گے۔''

''تم آج تک آنسہ خالدہ کی بازیابی کے سلسلے میں کیا کر پائی ہو؟ میرا مطلب ہے کچھ پتا چلا ہے اُس کا؟'' میں نے کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ سوزی جواب میں بولی۔

''جب عابدہ کو، کورکوران جیل بھیجا گیا تو آنسہ خالدہ نے ایک بین الاقوامی مبصر اور سینئر رپورٹر کی حیثیت سے کورکوران جیل کا دورہ کیا۔ مقصد عابدہ سے ملاقات کرنا ہی تھا لیکن اسے عابدہ سے ملنے نہیں دیا گیا، اس کے لیے خصوصی پاس کی ضرورت تھی جو کیلی فورنیا کے میئر سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس نے فوراً میئر سے اس خصوصی پاس کے حصول کے لیے ملاقات کی کوشش کی تو اس میں بھی اسے کئی دن لگ گئے، وجہ میئر کی عدم دستیابی تھی۔ جب وہ ملا تو اس نے بڑی ردّ و کد کے بعد آنسہ خالدہ کو پاس جاری کر دیا۔

آنسہ خالدہ نے دوبارہ کورکوران جیل کا رخ کیا مگر وہاں کی لیڈی چیف وارڈن نے آنسہ خالدہ کو پھر بھی عابدہ سے نہیں ملنے دیا۔ آنسہ خالدہ اور لیڈی چیف وارڈن کے بیچ تلخ کلامی ہو گئی، لیکن بعد میں آنسہ خالدہ نے اپنے خفیہ ذرائع سے پتا چلانے کی کوشش کی تو اسے شُبہ ہوا، عابدہ جیل سے ہی غائب کر دی گئی ہے۔''

''اس میں تو شبہے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' میں نے فوراً جبڑے بھینچ کر کہا۔ ''میئر سے پاس جاری ہونے کے باوجود بھی اگر وارڈن نے آنسہ خالدہ کو عابدہ سے ملنے نہیں دیا تھا تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ عابدہ جیل سے ہی غائب کر دی گئی ہو گی۔''

''بالکل صحیح......!'' یاسمین نے میری تائید میں کہا۔

''لیکن حیرت تو مجھے اس بات پر ہو رہی ہے کہ آپ نے یا آپ کے اخباری ادارے نے کم از کم آنسہ خالدہ کی تلاش کے سلسلے میں تو کوئی قدم اُٹھایا ہوتا؟'' میں نے سوزی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔

''میں تلاش کرتی رہی ہوں لیکن بدقسمتی سے ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔ ڈیلی گلوبل والے، جن کے لیے ہم دونوں ہی رپورٹنگ کرتے ہیں، وہ بھی اس کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کر پائے ہیں، ماسوائے خبریں دینے کے تاہم عملی طور پر بھی وہ کچھ نہ کچھ کوشش کر رہے ہیں۔ جن میں، میں بھی شامل ہوں۔''

''مجھ پر نقلی سوزی کے ذریعے حملہ کرنے والے جے بی سی کے ایجنٹ تھے۔'' میں نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''جس کا مطلب ہے کہ جے بی سی والے یہاں سرگرم ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں انہوں نے ہی آنسہ خالدہ کو اغوا کر لیا ہو؟''

''یہ ممکن ہے۔'' سوزی بولی۔ ''لیکن آنسہ خالدہ سے میری آخری ملاقات ہوئی تو اس کا کہنا تھا کہ یہ حرکت ٹائیگر ٹیگ کے چیف باسکل ہولارڈ کی ہو سکتی ہے، کیونکہ یہی شخص عابدہ کو پھانسنے کے لیے ابتدا سے ہی سرگرم رہا ہے۔ لہٰذا خود مجھے اپنا بھی ڈر لگا رہتا تھا لیکن میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ مجھ سے زیادہ آنسہ خالدہ، عابدہ والے نازک معاملے میں ''ان ٹچ'' رہی تھی۔ جبکہ مجھے میرے ادارے نے آنسہ خالدہ کی تلاش کا فریضہ سونپ رکھا ہے، شاید اسی لیے میں بھی اب تک بچی ہوئی ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بھی ابھی تک خالدہ کا

کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے؟'' اس بار یاسمین نے سوال کیا۔

''یہ میری بدقسمتی ہے مگر میں نے صدقِ دل کے ساتھ اس کی تلاش میں کسی بھی کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔'' سوزی نے جواب میں کہا۔ مجھے اب سوزی سے مایوسی ہونے لگی، ورنہ تو میں سمجھا تھا کہ وہ مجھے نہ صرف آنسہ خالدہ بلکہ عابدہ کے سلسلے میں بھی کوئی کلیو دے گی۔

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کے خالی کپ میز پر رکھا اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم سے ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''ایسی بات نہیں......'' وہ ہاتھ میں پکڑے بلوریں پیگ کو اپنی مخروطی اُنگلیوں میں گھماتے ہوئے بولی۔ ''میں کم از کم اتنا تو کر پائی ہوں کہ یہ بات اب پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ عابدہ اس وقت واقعی کورکوران کی جیل میں موجود نہیں ہے۔'' اس کا انداز انکشاف کرنے والا تھا لیکن میرے چہرے سے یہ سن کر جوش کی ایک ذرا رمق بھی نہیں اُبھری تھی۔ وہ آگے بتانے لگی۔

''اس یقین کی ایک ٹھوس وجہ ہے، عابدہ ہی کی بیرک سے ایک ادھیڑ عمر عورت کو آزادی ملی تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کی تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ عابدہ کو وارڈن نے ہی بے ہوش کر کے بیرک سے نکال کر کسی کے حوالے کیا تھا۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا اور وہ سوتی بنی نہ صرف یہ ساری کارروائی دیکھتی رہی تھی بلکہ اسے لیڈی وارڈن کی ایک اپنی ساتھی عورت سے اس قسم کی باتیں بھی سننے کو ملی تھیں جس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ عابدہ کو سی آئی اے کے اسی ونگ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اب میرے ذہن میں ایک ہی لائحہ عمل آتا ہے کہ اگر ہم اس لیڈی وارڈن کو قابو کر کے اس کے منہ سے حقیقت اُگلوائیں تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں سوزی کے چہرے پر نظر ڈالی اور سوال کیا۔ ''اس لیڈی وارڈن کے بارے میں تمہارے پاس کوئی معلومات؟''

''اس کا نام مسز بلنسفورڈ ہے، مادام کلر کے نام سے مشہور ہے۔'' سوزی نے بتایا۔ ''عمر اس کی پینتالیس سال ہے، صورت سے ہی خرانٹ اور مردمار عورت ہے۔ قدآور بہت ہی ظالم اور ایک وحشی عورت ہے۔ یوں تو اس کی رہائش جیل کی چہاردیواری کے اندر ہی ہے۔ لیکن فرینسو کے علاقے میں اس کی ذاتی رہائش گاہ بھی ہے۔ وہاں وہ اپنی ایک جوان بیٹی ارینا کے ساتھ رہتی ہے۔ داماد بھی ساتھ رہتا ہے۔ خود اس کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ ہفتے کی رات وہ اپنی فرینسو والی رہائش گاہ پر جاتی ہے۔ اتوار کا دن وہ اپنی بیٹی اور داماد جیمز کے ساتھ گزارتی ہے، پھر پیر کی صبح سرکاری گاڑی میں کورکوران کا رخ کرتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے اگر ہم اسے اس کی فرینسو والی رہائش گاہ پر چھاپ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے سوزی کی طرف دیکھا۔

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''لیکن یہ کام تم اور تمہارے ساتھی کریں گے، میرا کام انفارمیشن دینا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مادام کلر سے نہ صرف عابدہ کا بلکہ آنسہ خالدہ کا بھی پتا لگ جائے گا۔''

''ہم......'' میں نے خیال انگیز سی ہنکاری بھری۔ اس کے بعد میں نے اس سے فون کرنے کی سہولت مانگی۔ جو اس نے فوراً مہیا کر دی۔

میں نے دھڑکتے دل سے زہرہ بانو سے بات کرنے کے لیے بیگم ولا کا لینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب سے ٹون جا رہی تھی، لیکن کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ہونٹ دانتوں تلے چبائے اور پھر زہرہ بانو کے سیل نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف جانے والی تیسری بیل پر کسی نے کال ریسیو کی تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں اپنے ہمدردوں اور غمگساروں سے باتیں کرنے، ان کی خیریت پوچھنے اور اپنی خیریت سے مطلع کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور مجھ پر ہمیشہ اسی طرح کی جذباتی سی کیفیات طاری ہو جاتی تھیں۔

''ہیلو......'' دوسری جانب سے زہرہ بانو کے بجائے ایک مردانہ آواز سنائی دی، دوری کی وجہ سے مجھے آواز شناخت کرنے کے لیے پوری توجہ صرف کرنی پڑی تھی اور پھر چند لمحے بعد ہی میرا پورا وجود جذبات تلے مرتعش ہو گیا۔

یہ آواز اول خیر کی تھی۔

''ہیلو...... اول خیر......! ی ی...... یہ میں ہوں شہزی......!'' میں نے اپنی اندرونی مرتعش سی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ دوسری جانب سے اول خیر کو جیسے چند ثانیوں کے لیے چپ سی کھا گئی، پھر اس کی بھی دل گیر سی کپکپاتی ہوئی آواز اُبھری۔

''شش...... شہزی......! ی ی...... تُو بول رہا ہے......؟ او خیر...... کاکے! [illegible] کدھر رہ گیا ہے تُو؟

کہاں کھو گیا ہے تو، کک...... کیسا ہے تُو ٹھیک ہے، بتا......؟‘‘ وہ بے ربط سے انداز میں اور رندھے ہوئے سے لہجے میں بولتا چلا گیا۔

ایک عرصے بعد اس یار بے بدل کے منہ سے ’’اوخیر...... کاکے!‘‘ سنا تو میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔

’’میں...... ٹھیک ہوں، بالکل خیریت سے بھی......‘‘ میں نے گلے میں اُترنے والی غمناک سی رقت کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’یہ بتا، ماں جی اور ابا جی کیسے ہیں؟ اور...... اور بیگم صاحبہ...... کیسی ہیں؟ یہ تو ان کا نمبر تھا، وہ کہاں ہیں؟‘‘

’’ہولے ہولے کاکے......! ذرا ساہ تے لین دے مینوں...... دسناواں۔ (ذرا سانس تو لینے دے مجھے، بتاتا ہوں)۔ وہ بولا۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا اور آواز شکستہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ جانے کیوں میرے دل کو ایک متوحش سی بے چینی لگ گئی تھی۔

’’نہیں اول خیر! مجھے ابھی بتا، کیا بات ہے؟ میرا دل بے چین سا ہو رہا ہے۔‘‘

’’یار......! سب ٹھیک ہیں‘‘ بالآخر اس کی آواز اُبھری۔ ’’بس! یہ سُسری نوشابہ نے اپنے باپ کی جگہ لے لی ہے۔ بیگم صاحبہ پر کیس پہ کیس کیے جارہی ہے۔‘‘

’’اوہ...... کیا مطلب؟ کس قسم کے کیس......؟‘‘ میں نے بھویں سکیڑیں۔

’’وہی پرانا سیاپا، نئے پنڈ والی زمین اور جائداد کا......‘‘ وہ بولا۔ ’’جسے ہتھیانے کا ذمہ اب چوہدری ممتاز کے علاوہ اس کی دھی نوشابہ نے لے رکھا ہے۔ یہی نہیں وہاں کی فیکٹریاں، فلور ملز اور ایک عدد سالونٹ پلانٹ......، نوشابہ، بیگم صاحبہ پر اپنے باپ سے زیادہ بپھری ہوئی ہے۔ اس نے بیگم صاحبہ کی نئے پنڈ والی جائداد وغیرہ پر کورٹ سے اِسٹے لے لیا ہے، جس میں اس کمینی نے الزام لگایا ہے کہ...... کہ......‘‘ اول خیر اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔ ’’یار کاکے! اِب تجھے کیا بتاؤں...... ایک نمبر کی بدمعاش اور بدذات کڑی ہے یہ نوشابہ بھی......‘‘

’’مجھے بتاؤ اول خیر......! اس نے بیگم صاحبہ کے خلاف کیا الزامات لگائے ہیں؟‘‘ میں نے پُرزور لہجے میں پوچھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر پھر بتانے لگا۔

’’اس کمینی نوشابہ نے کورٹ میں بیان دیا ہے کہ بیگم صاحبہ کی ماں ستارہ بیگم، اس کے دادا یعنی نوشابہ کے دادا...... چوہدری الف خان کی دوسری منکوحہ نہیں بلکہ ان کی رکھیل تھی۔ یوں نئے پنڈ کی جائداد جو ستارہ بیگم کو حصے میں دی گئی، وہ ہتھیائی گئی ہے۔ یہی نہیں وہ اپنے بھائی فرخ قتل کیس میں تیری اور میری ضمانتیں بھی منسوخ کروانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ تجھ پر تو وہ بُری طرح اُدھار کھائے بیٹھی ہے۔ بہت عذاب میں ہماری جان ڈال رکھی ہے اس بھتنی نے...... ہاں......! وہ ہمارے لیے بھتنی ہی ثابت ہو رہی ہے۔‘‘ اس نے لحہ بھر کو توقف کیا تو میں نے بے اختیار پوچھا۔

’’بیگم صاحبہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟‘‘

’’وہ اسپتال میں ہیں۔‘‘ اول خیر نے کہا۔

’’کیا......؟‘‘ میں جیسے چیخ پڑا۔

’’ہاں یار، کاکے......! تو تو جانتا ہی ہے کہ بیگم صاحبہ کے دل کو پہلے ہی ایک روگ نے ادھ موا کر رکھا ہے، اتنا عرصہ گزر چکنے کے باوجود وہ ویسا ہی تازہ ہے، اُوپر اس نوشابہ والے گھناؤنے الزام نے ان کا دل اور بھی کمزور کر ڈالا اور انہیں دل کا دورہ پڑ گیا۔‘‘

’’اوہ میرے خدا......!‘‘ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ’’اب کیسی ہیں وہ؟‘‘

’’قدرے بہتر ہیں لیکن بیماری کی حالت میں اس بے چاری کو مقدمے بازیاں بھی بھگتنا پڑ رہی ہیں اور بیماریاں بھی......‘‘ وہ بولا۔

’’یار کاکے......! تُو بھی جب سے گیا ہے نا...... بیگم صاحبہ کا تو لگتا ہے جیسے حوصلہ بھی جواب دینے لگا ہے۔ وہ پہلے ہی تیری جدائی اور تیری فکر میں ہلکان رہنے لگی تھیں، کاکے......! اس میں کیا شک ہے کہ وہ آج بھی تجھے لئیق شاہ ہی کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ لئیق شاہ اسے نہیں بھولتا کاکے...... نہیں بھولتا وہ......‘‘ اول خیر کا لہجہ رُندھ سا گیا۔

زہرہ بانو کی حالت کا سن کر میں اپنا دل بُری طرح مسوس کر رہ گیا۔

’’آفرین ہے اپڑیں بیگم صاحبہ پر، یار کاکے......!‘‘ وہ کچھ ٹھہر کر پھر بولا۔ ’’وہ مجھ سے یہی کہتی ہیں اب بھی کہ اگر شہزی کا فون آئے تو اسے یہاں کے حالات کے بارے میں کچھ مت بتانا اور نہ میری بیماری کا...... ورنہ وہ اپنی عابدہ والی مہم اُدھوری چھوڑ کر نہ لوٹ آئے۔‘‘

’’کبیل دادا اور شکیلہ سے رابطہ رہتا ہے؟‘‘ میں نے

اپنے دل میں ابھرنے والی کسک کو دباتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں!''

''اب مجھے ان کا کونٹیکٹ نمبر دے دو، کیونکہ میں امریکا پہنچ چکا ہوں اور بیگم صاحبہ کو بھی تسلی دے دینا کہ میں بہت جلد اب عابدہ کو لے کر پاکستان لوٹوں گا۔ انشاء اللہ۔''

''او خیر...... کاکے! یہ تو بڑی خوش خبری سنا دی تُو نے...... کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ تت...... تُو امریکا پہنچ چکا ہے؟'' وہ جیسے ایک دم اشکِ غموں سے دھلے ہوئے لہجے میں خوشی سے چہک کر بولا۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں اول خیر!''

''پر یار...... اپنا خیال بھی رکھنا اور......''

''اول خیر! مجھے اس وقت کبیل دادا یا شکیلہ کا نمبر دے دو، اب میرا تم سب سے فون پر رابطہ رہے گا۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اول خیر نے فوراً جواب میں بتایا کہ ان دونوں کا کوئی ایک مستقل نمبر نہیں ہے۔ وہ کہیں سے بھی موقع ملتا ہے بات کرلیا کرتے تھے۔ البتہ اگر میں عارفہ سے بات کرلوں تو کبیل دادا اور شکیلہ سے بھی میری بات ہو جائے گی۔ اس ضمن میں اول خیر نے مجھے مزید یہ بتایا کہ عارفہ کا فون ہر روز ہی آتا ہے۔ وہ میرے بارے میں پوچھتی ہے، کبیل دادا اور شکیلہ کا اس سے رابطہ ہو چکا ہے۔ اڈیسہ جہاز راں کمپنی میں ہی عارفہ کی مدد سے وہ دونوں ملاحوں کے بہروپ میں ہیں۔

مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی تھی کہ کبیل دادا اور شکیلہ کو عارفہ کی صورت، سان ڈیاگو میں اچھی پناہ اور پروٹیکشن مل چکی تھی۔

میں نے عارفہ کا نمبر بھی لے لیا۔ یہ سیل نمبر تو نہیں تھا، اس کے سان ڈیاگو والے آفس کا لینڈ لائن نمبر تھا۔

میں ان سے فوری رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ جب میں اول خیر کو خدا حافظ کہنے لگا تو اس نے آخر میں مجھے...... چوہدری زبیر خان کے بارے میں بھی بتایا۔

''اوئے کاکے! وہ تو مرد کا بچہ ہے۔ جب سے تُو گیا ہے، کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب اس نے بیگم ولا فون کر کے تیری اور بیگم صاحبہ کی خیریت نہ پوچھی ہو۔ لیکن جب سے اسے باپ بیٹی (چوہدری ممتاز اور نوشابہ) کی اوچھی حرکتوں کا پتا چلا ہے، زبیر خان نے خود بیگم ولا آ کر ہمیں حوصلہ دیا ہے۔ انہیں بھی اچھی طرح اس بات کا احساس ہے کہ تیرے پاکستان سے باہر جانے کے بعد بیگم صاحبہ خود کو اکیلی محسوس کر رہی ہیں۔ اس مرد کے بچے نے جو واقعی بوڑھا شیر ہے۔ ہر طرح سے اپنی مدد اور ساتھ دینے کا نہ صرف وعدہ کیا بلکہ وہ ہمارے ساتھ ہے۔''

''مجھے ان کا نمبر بھی دینا، وقت ملا تو میں ان سے بھی بات کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد رابطہ منقطع کیا اور سوزی کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

''یہ میری مجبوری ہے کہ سرِدست میرے پاس کوئی سیل فون اور کوئی کنکشن نہیں ہے...... لیکن میں تمہارا بیلنس پیڈ......''

''نو نو...... مسٹر شہزی! کیسی باتیں کر رہے ہو۔'' سوزی ایک دم میری بات کاٹ کر دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میرا پری پیڈ اکاؤنٹ ہے، تم جہاں چاہے باتیں کر سکتے ہو۔''

''شکریہ! بس، ایک کال اور کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''یس، شیور...... بے فکر ہو کے کرو......'' وہ کھلے دل سے بولی۔ میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔

میں ...... اب دھڑکتے دل سے عارفہ کے سان ڈیاگو والے آفس کا نمبر پنچ کرنے لگا۔

دوسری طرف بیل جا رہی تھی۔ پھر کسی خاتون نے کال ریسیو کی۔ بولی۔

''ہیلو...... اڈیسہ کمپنی سان ڈیاگو......''

یہ عارفہ کی آواز نہیں تھی اور بولنے کے پروفیشنل انداز سے وہ مجھے استقبالیہ گرل لگ رہی تھی۔

''مجھے مس عارفہ سے بات کرنی ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے ہولڈ کرنے کا کہا اور پھر دوسری جانب سے ہلکی موسیقی کی آواز سنائی دینے لگی۔ دوسرے ہی لمحے کلک کی آواز اُبھری اور، ہیلو، کہا گیا۔

''مس عارفہ؟'' میں نے اس کی آواز پہچانتے ہی دبے دبے جوش سے کہا۔

''او مائی گاڈ...... !شش...... شہزی......؟'' دوسری جانب سے عارفہ کی متحیرانہ آواز اُبھری۔

''ہاں، یہ میں ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تت...... تم...... کک...... کہاں سے بول رہے ہو؟''

''شکاگو سے۔''

''اوہ...... فوراً سان ڈیاگو پہنچو، کہو تو میں اسی وقت تمہاری ٹکٹ کنفرم...... کروادوں؟''

''بہت مہربانی ہوگی آپ کی......'' میں نے کہا۔

''فضول باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ...... تم خیریت سے تو ہوناں......؟''

''جی ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کبیل دادا اور شکیلہ سے بھی بات کرنا تھی اگر ہو سکے تو......''

''ان کی فکر مت کرو۔'' وہ میری بات کاٹ کر ایک دم بولی۔ ''وہ میرے ساتھ ہی ہیں اور بالکل محفوظ ہیں، ہم سب کو تمہارا بے چینی سے انتظار تھا۔ بس، آج ہی پہنچو، شکاگو سے سان ڈیاگو صرف چار یا ساڑھے چار گھنٹے کی پرواز ہوگی۔''

''فوراً جواب دو شہزی! میں رابطہ منقطع کرنے لگی ہوں؟'' وہ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر دوبارہ بے چینی سے بولی۔

''رائٹ! میں منتظر ہوں۔'' بالآخر میں نے کہا۔

''گڈ!'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ عارفہ میری آواز اور یہ سن کر میں امریکا پہنچ چکا تھا، ایک دم جذباتی سی ہوگئی تھی۔

''تو کیا تم کیلی فورنیا نہیں جا رہے؟'' سوزی نے حیرت اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ابھی نہیں، مجھے پہلے اپنے ساتھیوں سے ملنا ہے جو سان ڈیاگو میں میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے دو ساتھی میرے ہیلپنگ ہینڈ میں ہیں۔ میں ان سمیت ہی اگلی فلائٹ سے کیلیفورنیا پہنچوں گا، باقی کورکوران کی لیڈی چیف وارڈن کے لیے ہمارا لائحہ عمل وہی رہے گا جو میں نے تمہارے ساتھ ترتیب دیا۔''

سوزی کی تسلی ہوگئی۔

اس کے بعد میں یاسمین خانم کی طرف متوجہ ہوا، اس کا چہرہ اُداس سا نظر آنے لگا تھا۔

''تمہارا اپنے بارے میں وہی پروگرام ہے جو تم پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ کے طیارے میں بتا چکی ہو؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں ان کی اسسٹنٹ کے طور پر ثمانہ کی ممی کے تحقیقاتی پروگرام میں شامل رہوں گی...... اس طرح مجھے ایک ٹھکانا میسر آجائے گا، نجانے اب تم سے کب ملاقات ہو پائے......'' اس کا گلنار سا چہرہ اُداس ہوگیا۔ میں نے مسکرا کر ملائمت آمیز لہجے میں کہا۔

''یاسمین! تم ہمیشہ میری اچھی ساتھی اور دوست رہو گی...... میں تمہیں خوشی سے الگ نہیں کر رہا ہوں خود سے بلکہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہارا مشن اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میرے مشن کی نوعیت کچھ اور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان صعوبتوں کا حصہ بنو...... خدا کا شکر ہے کہ تمہیں پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ جیسی قابل ہستیوں کی سرپرستی میسر آگئی ہے......'' پھر چند لمحہ توقف کے بعد میں نے بڑی محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بھی اپنا اداس سا چہرہ اٹھا کر اپنی گھنیری پلکوں کی چھاؤں تلے میری طرف دیکھنے لگی۔

''ہم ملتے رہیں گے یاسمین!'' آخر میں فقط اتنا ہی میں نے کہا تھا کہ اس کی کشادہ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

''ارے...... ! تم تو رو پڑیں یاسمین...... !'' میں نے پسیجے ہوئے دل سے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے تھام لیا۔ وہ میرے قریب ہوگئی۔ یوں جیسے جدا ہونے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ بھینچ لینا چاہتی ہو۔ جیسے میری قربت کی شبیہہ کو اپنے بدن کے روئیں روئیں میں ثبت کر دینا چاہتی ہو۔

''شش...... شہزی! میں تمہیں نہیں بھلا سکتی، لیکن میں تمہارے لیے ہر لمحہ دعا گو رہوں گی۔'' وہ غم سے چور لہجے میں بولی۔ ''تم وعدہ کرو، جب بھی موقع ملا، مجھ سے دوبارہ ملو گے...... دوستی اور اُنسیت کا یہ رابطہ کبھی نہیں توڑو گے۔''

''ہرگز نہیں...... میں نے کہا نا...... میں تمہیں ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح یاد رکھوں گا۔'' میں نے فوراً جواب دیا۔ ''وعدہ ہے میرا تم سے کہ رابطے میں بھی رہوں گا، اور جب بھی موقع ملا تم سے ضرور ملوں گا۔''

یاسمین خانم نے اپنا سر جھکا لیا۔

باقی کام جلدی سے نمٹائے گئے۔ سوزی کیلی فورنیا روانہ ہوگئی، یاسمین کو میں نے وہیں چھوڑا اور خود بکنگ آفس کا رخ کیا۔

میری ٹکٹ اور سیٹ کنفرمڈ ہو چکی تھی۔ ڈومیسٹک پرواز تھی۔ رات نو بجے میں شکاگو سے سان ڈیاگو کی طرف پرواز کر چکا تھا۔

☆☆☆

ایک بج کر چالیس منٹ پر ہمارے طیارے نے سان ڈیاگو ائرپورٹ لینڈ کیا تو عارفہ ایک لمبی سی سیاہ کار میں مجھے لینے پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ کبیل دادا اور شکیلہ بھی تھے۔ اتنے عرصے بعد اپنے پرانے اور جاں نثار ساتھیوں کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میرا رُواں رُواں فرطِ جذبات تلے مرتعش ہو رہا تھا۔

پہلے تو میں انہیں پہچان ہی نہ پایا تھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ چست لباسوں اور جیکٹس میں خاصے اسمارٹ اور ہینڈسم نظر آ رہے تھے۔ عارفہ نے بھی سرد موسم کی مناسبت سے فر کا کوٹ چڑھا رکھا تھا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے گلے مل کر تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کے کندھوں پر محبت، پیار اور شفقت سے تھپکیاں دیتے رہے۔ اس کے بعد اسی کار میں ہم ائرپورٹ سے روانہ ہو گئے۔

سان ڈیاگو ریاست کیلی فورنیا کا ایک خوبصورت اور ساحلی شہر تھا جو سمندر کے کنارے آباد تھا۔ کار عارفہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہم سب باتوں میں مشغول رہے۔

سان ڈیاگو کی سڑکیں چمک رہی تھیں، بلڈنگیں، دکان، پب اور رنگ رنگیلے کلبوں کے نیون سائن سان ڈیاگو کی اس رات کو حسین اور خوابوں کی شب بنائے ہوئے تھے۔

ایک جگہ میں نے بہت سے لوگوں کا میلہ لگا دیکھا، جو عجیب و غریب روپ دھارے ہوئے تھے، کوئی اسپائیڈرمین بنا ہوا تھا، کوئی آئرن مین اور کوئی سائنس فکشن فلم کا ہیرو۔ یہ ایسے لباس میں خود کو سُپر ہیروز سمجھ رہے تھے۔ عارفہ نے ہی بتایا کہ آج کل سان ڈیاگو میں سالانہ میلے کامک کون (comic con) کی بہار آئی ہوئی ہے۔ جس میں لوگ اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگرامز سائنس فکشن، فلم اور کامک بکس کے کرداروں کا روپ دھارے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ وہاں خوب ہلا گلا مچا ہوا تھا۔

نصف گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت لگا اور کار اب ساحلِ سمندر کے کنارے سڑک پر آ گئی۔ چھوٹے بڑے جہاز لنگر انداز تھے، کبھی کسی کا بگل سنائی دے جاتا تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوابیدہ ڈولفن جاگی ہو۔

سمندر اور ساحل پر بڑا دلکش منظر تھا۔ روشنیاں، بحری جہاز چھوٹی بڑی لانچیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ کئی اسٹال، دکانیں، بیچ وویو ٹائپ کے ریسٹورنٹ اور کلب یہاں بھی نظر آئے تھے۔

یہاں سے مزید دو تین کلومیٹر بعد کار ایک بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ اس بلڈنگ پر بیک وقت کاروباری اور رہائشی عمارت کا گمان ہوتا تھا۔

بعد میں عارفہ سے ہی پتا چلا کہ یہاں اکثریت انہی لوگوں کی تھی جو جہاز رانی کے کاروبار سے منسلک تھے۔ اسی عمارت میں ان کے دفاتر اور رہائش ہوتی تھی۔

عارفہ ہمیں ایک کشادہ اور لگژری اپارٹمنٹ میں لے آئی۔ ہم لاؤنج میں ہی رکھے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ ہم سب بڑے اشتیاق اور محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو مسکرا مسکرا کر دیکھے جا رہے تھے۔

بہت سی باتوں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے بھی اب تک کے بیتے ہوئے واقعات تفصیل سے بیان کر دیے، یاسمین خانم کے بارے میں بھی غائبانہ طور بتایا اور یہ بھی کہ میری منیلا اور پھر مصر سے یہاں تک کی کٹھن مہم میں اس کا ساتھ کس قدر مددگار رہا۔ پھر شکاگو میں قدم رکھتے ہی نقلی سوزی سے لے کر اصلی سوزی تک کا ذکر، اس کے بعد آنسہ خالدہ کی بازیابی اور عابدہ کی رہائی تک کی گفتگو میں آئندہ کا لائحہ عمل بھی زیرِ بحث لایا گیا۔ کبیل دادا اور شکیلہ کو میں نے اپنے اس منصوبے سے متفق پایا۔

اس کے بعد پاکستان میں بیگم صاحبہ اور بے چارے اول خیر کی پریشانیوں اور نوشابہ کی چیرہ دستیوں کے متعلق بھی باتیں ہوتی رہیں، یوں آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ عابدہ کی مہم کو جلد سے جلد نمٹایا جائے تاکہ فوراً پاکستان کا رخ کیا جائے اور نوشابہ اور چوہدری ممتاز کو اب آخری سبق سکھا ہی دیا جائے۔

”میں تو تم لوگوں کی کامیابیوں کی جی جان سے دعائیں کرتی رہوں گی۔“ آخر میں عارفہ نے کہا پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔

”میں کھانا لگاتی ہوں، شہزی! تم غسل وغیرہ کر لو، وارڈروب میں کپڑے رکھے ہیں۔“

”باجی! آپ بیٹھیں، میں کھانے کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔“ شکیلہ نے اُٹھتے ہوئے کہا تو عارفہ پُرشفیق انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”تم تو میری ہیلپر ہو ہی، آ جاؤ شاباش......“ وہ دونوں خواتین مسکراتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

مصر والی مہم کے دوران پیش آنے والے واقعات

میں روڈلف کی نشاندہی کی مدد کے بل بوتے پر شمانہ کے مقبرے سے دو انوکھے ہتھیار سنہری بھونرا اور اسنیک رنگ (سانپ والی انگوٹھی) کے متعلق میں نے عارفہ کو بتانا ضروری خیال نہیں کیا البتہ کبیل دادا اور شکیلہ کو ان کے متعلق ضرور بتا دیا اور ان کا ”نظارہ“ بھی کرا دیا تھا۔ حسبِ توقع وہ دونوں ہی اس عجیب اور انوکھے ہتھیاروں کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔

تاہم ساتھ ہی میں نے ان کی خطرناکی کے بارے میں بھی بتا دیا کہ ذرا سی غلطی کے سبب یہ اپنے لیے بھی مہلک بن سکتے تھے، لہٰذا ان کے استعمال میں ہمیشہ غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆

ساحلِ سمندر کے کنارے اس لگژری اپارٹمنٹ میں وہ رات بڑی دلفریب اور پرسکون گزری تھی۔ میں اور کبیل دادا ایک ہی کمرے میں سوئے تھے جبکہ عارفہ اور شکیلہ نے بھی اسی طرح دوسرے کمرے میں رات گزاری تھی، اگرچہ ہم چاروں رات گئے تک ساتھ ہی ایک کمرے میں بیٹھے باتیں بھی کرتے رہے تھے جبکہ عارفہ سونے کے لیے جلد ہی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔

بہرکیف ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب کافی کا دور چلا تو ہم ایک بنیادی حکمتِ عملی تیار کر چکے تھے۔ جس کے مطابق ہم نے سان ڈیاگو یا عارفہ کی جگہ کو اپنا مستقل ٹھکانا نہیں بنانا تھا۔ اس کے لیے کیلی فورنیا میں ہی کسی تیسرے درجے کے علاقے میں اپنی مستقل سکونت اختیار کرنا تھی۔ البتہ ضرورتاً ہمارا عارفہ سے بھی رابطہ رہے گا۔

تیسرے درجے کی سکونت پذیری کا انتظام پہلے ہی سے کبیل دادا اور شکیلہ نے کر رکھا تھا۔ وہ کیلی فورنیا کا ہی ایک ساحلی علاقہ تھا۔ جو وہاں عرفِ عام میں لیبر کالونی کہلاتی تھی جہاں غریب مزدور وغیرہ جو پورٹ پر نچلے درجے کا کام کرتے تھے، ٹین کے ڈبوں نما گھروں اور کنٹینرز وغیرہ میں رہتے تھے۔

کبیل دادا اور شکیلہ جب پہلی بار یہاں پہنچے تھے تو انہوں نے اولاً وہیں کچھ روز کے لیے رہائش اختیار کی تھی۔ ایسی سستی جگہ پر رہائش ہماری درحقیقت ایک ”مجبوری“ بھی تھی۔

سوزی سے ہمارا رابطہ ہو چکا تھا۔ وہ جس کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی، وہ بھی وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس کا علاقہ کنگ ایونیو کہلاتا تھا۔

ہم سہ پہر کی فلائٹ سے کیلیفورنیا پہنچ گئے۔ میں نے بینک سے امریکن ڈالرز ضرورت کے مطابق کچھ کرنسی نکلوالی تھی۔

جب لیبر کالونی پہنچے تو یہاں مجھے تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ نظر آئے۔ وہ ایک چھوٹا سا کنٹینر تھا جس کے دو داخلی دروازے تھے۔ یہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔

سوزی کو بھی ہم نے اِدھر ہی بلا لیا تھا۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سردی پڑ رہی تھی۔ تاہم کیلیفورنیا واحد اسٹیٹ ہے جہاں موسم کراچی جیسا ہی معتدل رہتا ہے۔ یعنی گرمی ہو یا سردی، بس ایک حد تک پڑتی تھی، اس میں کوئی شدت نہیں ہوتی تھی۔

کنٹینر کی فضا گرم تھی۔ اسی کے اندر دو پورشن بنائے گئے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ کچن تھا۔ یہاں کی ساحلی آبادی بھی کافی گنجلک تھی۔ کبیل دادا نے البتہ بتایا تھا کہ کبھی کبھار پولیس یہاں اچانک چھاپے مارا کرتی ہے۔ جب انہیں منشیات یا کسی جرائم پیشہ آدمی کی موجودگی کی کوئی خبر ملتی ہے۔

بہرحال ہمیں اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لیے یہ جگہ نسبتاً محفوظ اور قدرے پُرسکون محسوس ہوئی تھی۔

عارفہ نے ایک کام کر دیا تھا کہ ہمیں دو عدد سیل فون نمبرز کے ساتھ دلوا دیے تھے۔ ایک میں نے رکھ لیا تھا اور دوسرا کبیل دادا کے پاس تھا۔

سوزی نے ہمیں مسز بینسفورڈ کے ہفتے بھر کے معمولات سے آگاہ کر دیا تھا۔

رات نو بجے ہم چاروں اپنے رہائشی کنٹینر سے نکلے اور...... ایک بس کے ذریعے فرینسو کے علاقے میں جا پہنچے۔

موسم کی مناسبت سے ہم نے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کر لی تھی۔ میں نے ٹائٹ پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی اور اس پر لیدر کی گرم جیکٹ تھی۔ کبیل دادا نے وائٹ شرٹ پر گیلس والی ہلکی براؤن رنگ کی قدرے بگی اسٹائل کی پتلون پہن رکھی تھی۔ اس بار بال میں نے اپنے قدرے بڑے رکھ چھوڑے تھے۔ انہیں بکھرنے سے بچانے کے لیے میں نے جیل لگا رکھا تھا۔ باریک مونچھیں رکھنا میں نے چھوڑ دی تھیں۔ چہرہ کلین شیو کر لیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، میرا اور کبیل دادا کا قد و قامت ایک ہی تھا، تاہم اس کا جسم مجھ سے اُنیس بیس کے فرق سے کسرتی تھا۔

کبیل دادا نے اپنے چہرے پر ہلکی داڑھی رکھ چھوڑی تھی اور مونچھیں بھی تھیں۔ شکیلہ نے بھی مشن کی مناسبت سے جینز کی ٹائٹ پینٹ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ اُوپر سیاہی مائل براؤن جیکٹ تھی۔ ہمارے پیروں میں بوٹ تھے۔ احتیاط کے پیشِ نظر چہروں کی شناخت کو مخفی رکھنے کے لیے کبیل دادا اور میں نے مفلر لپیٹ لیے تھے، شکیلہ نے ایک اونی گرم ٹوپی پہن لی تھی۔ وہ بھی خاصی خوبرو اور پُرکشش امریکی حسینہ دکھ رہی تھی۔

میں نے یونہی اسے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''شکیلہ! اگر اس وقت تمہیں اول خیر دیکھ لے تو سو جان سے عاشق ہو جائے تم پر۔''

''سو جان کیا شہزی؟ وہ تو پہلے ہی اس پر ہزار جان سے فدا ہے۔'' شکیلہ کے بجائے کبیل دادا نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ شکیلہ تھوڑا جھینپ سی گئی مگر پھر سر جھٹک کر ہنستے ہوئے اول خیر کی نقل اُتاری۔

''او خیر......''

''ایک نشانی تو یہ محترمہ بھی اس کی زبانی کلامی ساتھ لے ہی آئی ہیں۔'' کبیل دادا نے پھر چٹکلا چھوڑا اور ہم ہنس دیے اور آگے بڑھتے رہے۔

جب ہم کیلی فورنیا کی شاہراہ سے متصل مارکیٹ، دکانوں اور پب وغیرہ کے پاس گزر رہے تھے تو بالکل ہی کسی کھلنڈرے اور بے فکر دوستوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو دیگر امریکیوں کی طرح ''سٹر ڈے نائٹ اسپیشل'' منانے کے لیے سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کر رہے ہوں۔

لہٰذا خود کو ایسا ہی ظاہر کرنے کے لیے ہم آپس میں پُرشوخ سی اٹکھیلیاں بھی کیے جا رہے تھے۔ ایک پب میں بھی ہم گھس گئے، وہاں میں نے تو کچھ نہیں پیا البتہ کبیل دادا نے ایک بلیک لیبل کے دو پیگ اور شکیلہ نے ایک پیگ بلیو لیبل کا چڑھا لیا۔

''اس کبیل دادا نے تمہاری عادتیں بھی یہاں آکر خراب کر ڈالی ہیں شکیلہ؟'' میں نے پب سے باہر آکر شکیلہ کو گھورا۔

''میں نے کب کی ہیں، اس کی عادتیں تو پہلے سے ہی خراب ہیں۔'' کبیل دادا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔

''مستقل نہیں پیتی میں شہزی!'' شکیلہ بولی۔ ''مجبوری میں پینی پڑ جاتی ہے۔''

''یہاں تو ایسی کوئی خاص مجبوری نہیں تھی؟ میں نے بھی تو صرف کولڈ ڈرنک پی۔'' میں نے کہا۔

''اس بحث کو چھوڑو، ہم مطلوبہ علاقے میں داخل ہو چکے ہیں شہزی!'' کبیل دادا نے میرے قریب سرگوشی کی۔ اب پتا نہیں وہ شکیلہ کا دفاع کر رہا تھا یا کچھ اور، لیکن حقیقت یہی تھی کہ ہم اس فٹ پاتھ پر قدم رکھ چکے تھے جس کی سڑک مسز بینسفورڈ ....کی رہائش گاہ تک جاتی تھی۔

یہاں دائیں بائیں روشن پارک تھے۔ دکانیں تھیں اور دو کلب نظر آئے تھے، چند ایک برگر اسٹورز اور فٹ پاتھ سائڈ اوپن ائر ریسٹورنٹ تھے۔

آخرالذکر ریسٹورنٹ مسز بینسفورڈ کی رہائش گاہ سے چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ یہی سڑک آگے جا کر بائیں جانب کو مڑ جاتی تھی۔ اسی کے کارنر پر ایک منزلہ وہ شاندار مکان تھا جس کا سیاہ رنگ کا بڑا سا گیٹ، مذکورہ ریسٹورنٹ کے ایک آخری گوشے پر بیٹھ کر صاف نظر آتا تھا۔

ہم تینوں اسی طرف کی میز کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔ پہلے اونچی آوازوں میں باتیں اور قہقہے لگاتے رہے، اس کے بعد ایک نیم عریاں سی ویٹرس نے آرڈر لیا اور ذرا ہی دیر بعد ہماری میز پر ہمبرگر اور دو بیئر اور ایک کولڈ ڈرنک سرو کر کے مٹکتی ہوئی چلی گئی۔

ہم کھانے پینے کے بہانے تھوڑا میز پر جھکے ہی تھے کہ اچانک شکیلہ نے سرسراتی سرگوشی میں مجھ سے کہا۔

''خبردار، شہزی! چونکنا مت...... اسی طرح نارمل رہتے ہوئے کسی بہانے اپنے بائیں جانب والی میز پر ذرا نظر ڈالنا...... مجھے دو افراد مشکوک دکھائی دیے ہیں۔''

یہ کہتے ہی اس نے یونہی ایک گرم جوش سا قہقہہ لگا کر اپنے قریب بیٹھے کبیل دادا کے گلے میں اپنا ایک بازو حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا، یوں جیسے اسے ''کس'' کرنا چاہ رہی ہو، لیکن میں ادراک کر سکتا تھا کہ اصل میں وہ اس کے کان میں بھی یہی کچھ بڑبڑا رہی ہو گی۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس میں کیا شک تھا کہ میرے امریکا میں قدم رکھتے ہی جے بی سی والے حرکت میں آچکے تھے اور سوزی کی صورت میں خاک بھی چاٹ چکے تھے۔

میں نے کبیل و شکیلہ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ایسا ہی کیا اور...... ہمبرگر کا ایک بائٹ لینے کے دوران کولڈ

ڈرنک کا کین جان بوجھ کر اس طرح کھولا کہ اس کے اندر کا مشروب گیس کے دباؤ سے اُچھلا اور میں بچنے کی غرض سے بدک کر کھڑا ہو کر ذرا پلٹا۔ تب ہی کن انکھیوں سے میں نے مذکورہ سمت کی جانب نظر بھی ڈال لی۔

ایک ہی پل میں مجھے اس طرف کی میز اور دو کرسیوں پر دو افراد سیاہ رنگ کے اوورکوٹ میں ملبوس بیٹھے ڈرنک کرتے دکھائی دیے۔ ایک تو ان میں مناسب قدوقامت کا تھا، اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا، جبکہ دوسرا چوڑے شانوں والا اور قدرے دراز قامت محسوس ہوتا تھا، اس کا ہیٹ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔

میں اسی طرح ہنستا، لہراتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا لیکن میری کنپٹیوں پر جیسے ہتھوڑے برسنا شروع ہو گئے تھے۔ وجہ یہی تھی کہ اس کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہو رہا تھا اور چند ثانیے ذہن پر زور دیتے ہوئے مجھے یاد آگیا کہ یہ کون تھا۔

”کیا ہوا شہزی؟ تم ان دونوں کو دیکھ کر کچھ نروس سے نظر آنے لگے ہو؟ کیا تم نے فوری طور پر کوئی خطرہ محسوس کیا ہے؟“ کبیل دادا نے ہنسنے کے انداز میں اسی طرح اپنی باچھیں پھیلائے رکھی تھیں۔ ساتھ ہی وہ شکیلہ سے بھی خواہ مخواہ ہی اٹکھیلیاں کر رہا تھا، مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ ہے۔

”خطرہ ہی سمجھو...... ان میں سے ایک کو میں پہچان چکا ہوں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ انداز بظاہر میرا ایسا ہی تھا جیسے میں خوش گپیاں کر رہا ہوں مگر اس کے لبادے میں ہم تینوں کی سنجیدہ گفتگو جاری تھی۔

”اوہ...... یہ تو پھر خاصی سنسنی خیز صورت حال ہے، کون ہیں یہ......؟“ کبیل دادا نے سوال کیا۔

”شکیلہ! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ان پر کب شبہ ہوا؟“ میں نے کبیل دادا کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے شکیلہ سے پوچھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جب ہم پب سے نکلے تھے، میں نے ان دونوں کو بھی وہاں دیکھا تھا۔“ وہ بتانے لگی۔ ”پہلے تو میں یہی سمجھی کہ وہ عام مردوں کی طرح مجھے تاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن جب وہ ہم تینوں کو ایک خاص انداز سے باری باری گھورنے لگے تو مجھے شبہ ہوا، تاہم جب ہم باہر نکلے اور یہاں آکر بیٹھے تو یہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔“

”ہم......“

کبیل دادا کے مقابلے میں شکیلہ ایسے عوامل پر اگر غیر معمولی نظر رکھتی تھی تو یہ اس کی تربیت کا حصہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح پاور کی سابقہ ایجنٹ تھی۔ جبکہ کبیل دادا کا معاملہ اور سہی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ایسی باتوں کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ بس، ذرا یہ کھیل زیرک دماغی اور پل پل محتاط روی کا تھا، دیکھا جاتا تو میں بھی چُوک گیا تھا مگر شکیلہ نے انہیں تاڑ لیا تھا۔

”تم پہچان گئے ہو انہیں شہزی؟ کیا واقعی؟“ کبیل دادا نے ہولے سے متحیرانہ سرگوشی کی۔

”کہیں یہ جے بی سی کے ایجنٹ تو نہیں ہیں جن سے تمہارا شکاگو میں ٹاکرا ہوا تھا؟“ شکیلہ بھی مستفسر ہوئی۔

”نہیں، یہ ٹائیگر فیگ کے ایجنٹ ہیں۔“ میں نے جواب میں ہولے سے بتایا اور آگے بولا۔ ”ان میں سے جو قدرے چوڑے شانوں والا ہے، میرا اس سے پاکستان میں ٹاکرا ہو چکا ہے، یہ ان دنوں کی بات ہے جب آنسہ خالدہ نے مجھے فون کر کے خبردار کیا تھا کہ ٹائیگر فیگ کے چیف باسکل ہولارڈ نے اپنے دو ایجنٹ خفیہ طور پر مجھے چھاپنے کے لیے پاکستان روانہ کیے ہیں۔ یہ دونوں مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں کبھی کامیاب ہو چکے تھے، اس وقت اول خیر بھی میرے ساتھ تھا مگر انہوں نے اسے پستول کا دستہ رسید کر کے بے ہوش کر دیا تھا اور مجھے بھی بعد میں دھوکے سے بے بس کر دیا تھا مگر چونکہ ان دنوں لولووش نے اپنے قریبی ساتھی سے جی کو ہارا کو میدان میں اُتارا ہوا تھا اور اس نے ان کے منہ سے شکار یعنی مجھے چھین لیا تھا پھر میں اس کی لگژری یاٹ میں انڈیا، برما اور انڈیمان جا پہنچا تھا۔ ان کے ایک ساتھی کو کوہارا نے ہلاک کر دیا تھا، یہ بچ گیا تھا۔“

”اوہ......“ شکیلہ کے ہونٹ دلکش انداز میں دائرے کی شکل اختیار کر گئے۔

”لیکن کیا اس چوڑے شانوں والے نے تمہیں یا ہمیں پہچان لیا ہے؟“ کبیل دادا بولا۔

”ہاں! کم از کم مجھے تو ضرور ہی پہچان لیا ہوگا۔ سی آئی اے کا یہ ونگ ٹائیگر فیگ چال ڈھال سے شناخت کرنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔“ میں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔

”کرنا کیا ہے اب ان کا، مقابلہ یا رفو چکر......؟“

شکیلہ بولی۔

’’ان دونوں کا خاتمہ......‘‘ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

’’لیکن ہم ان میں سے کسی ایک کو بے بس کر کے عابدہ یا آنسہ خالدہ کے متعلق تو پوچھ ہی سکتے ہیں۔‘‘ کبیل دادا نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

’’دادا! یہ دونوں گلی کے چلتے پھرے لونڈے لپاڑے نہیں ہیں۔‘‘ میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’سی آئی اے کے انتہائی ایڈوانس ونگ ٹائیگر ٹیگ کے ٹاپ ایجنٹ ہیں۔ انہیں قابو کرنے سے زیادہ ہلاک کرنا آسان ہوگا، قابو میں آبھی آجائیں تو یہ زبان نہیں کھولیں گے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے پہلا والا ہی پروگرام صحیح رہے گا۔‘‘ شکیلہ بولی۔

’’بالکل۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یوں بھی چیف وارڈن مسز بینسفورڈ سے ہی ہمیں ساری معلومات مل سکتی ہیں۔‘‘

’’اب انہیں ڈاج دینے یا فنا کے گھاٹ اُتارنے کی سوچو۔‘‘ کبیل دادا نے کہتے ہوئے بیئر کی بوتل کا آخری گھونٹ لیا جو معدے میں منتقل کرنے کے بجائے اس نے جانے کیا سوچ کر غرارے کرتے ہوئے اُگل دیا۔

’’موج مستی شروع......‘‘ میں نے بھی کاشن دیا اور اپنی کرسی چھوڑ دی۔ شکیلہ نے بدمست قہقہہ لگایا اور کبیل دادا سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے کھینچا، وہ ڈولنے لگی۔

ادھر ہمیں کرسیوں سے اُٹھتا دیکھ کر...... ویٹرس بل لیے دوڑی آئی اور میں نے چند ڈالر نکال کر اس کی پلیٹ پر رکھ دیے اور ہوائی بوسہ اس کی جانب اُچھالا تو وہ فوراً گلے کا ہار بننے کے لیے مسکراتی ہوئی بڑھی۔ وہ گویا میرے ہوائی بوسے کی لینڈنگ چاہتی تھی۔

ہم تینوں اسی طرح خرمستیاں کرتے ہوئے ایک جانب کو بڑھ گئے لیکن ٹائیگر ٹیگ کے ان دونوں مذکورہ ایجنٹوں کی طرف سے بھی محتاط تھے۔

آگے سڑک ویران تھی۔ ایک راستہ پیدل چلنے والے افراد کے لیے یا جو چھوٹی موٹی سواری یعنی سائیکل یا بائیک پر سواروں کے لیے تھا، ایک ٹین ایجر لڑکی کو، جس نے بہت ہی شارٹ نیکر پہن رکھی تھی۔ ایک اسکوٹی پر جاتے دیکھا۔

ہم دانستہ مزید سنسان جگہ پر آگئے، یہ کسی پارک کا بیرونی حصہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری ہدایت پر کبیل دادا دائیں جانب کی باغیچے والی باڑ کی طرف غائب ہوگیا جبکہ میں اور شکیلہ بائیں طرف کسی گیس عمارت کی اندھیری آڑ میں آگئے۔

ہم تینوں اپنی پوری تیاری کر کے نکلے تھے۔ یوں متوقع جھڑپ کی بُو سونگھتے ہی ہم نے جلدی سے اپنے ہاتھوں میں سیاہ دستانے چڑھا لیے۔

یہاں کہیں کہیں لوہے کے پول پر گلوب روشن تھے۔ لوگوں کی آوک جاوک کم ہی نظر آتی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

دفعتاً میں نے اسی سمت کی طرف جہاں سے ہم الگ ہوئے تھے، دو سائے طویل ہوتے دیکھے، اس کے بعد وہ دونوں نظر آگئے۔ ٹائیگر ٹیگ کے یہ دونوں ایجنٹ ہیٹ اور اوورکوٹ میں ملبوس دور سے ہی آتے دکھائی دے گئے۔

میں نے آنکھیں سکیڑ کر بہ غور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا تو ٹھٹک گیا۔ ان دونوں کے سیدھے ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیبوں کے اندر تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اگر ہم تینوں بروقت گھات نہ لگا چکے ہوتے تو انہوں ہم پر دھاوا بول دینا تھا لیکن اب باری ہماری تھی۔

وہ دونوں ہمیں تلاش کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے اسی طرف چلے آرہے تھے۔ ہمیں چھاپنے کی انہیں اس قدر جلدی تھی کہ فوراً ہی انہوں نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں سے باہر نکال لیے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ پستول چمک رہے تھے، جن کی لمبی نالیں بتاتی تھیں کہ انہیں بے آواز موت پھیلانے کے لیے تیار رکھا گیا ہے۔

میں نے ان کی پوزیشن کا اندازہ کیا، شکیلہ کو ہدایت دی۔ پھر جیسے ہی وہ ہماری طرف بڑھتے ہوئے تاریکی کا حصہ بنے، میں اور شکیلہ بجلی بن کر ان پر ٹوٹے۔

شکیلہ نے حرکت میں آتے ہی بجلی کی سی بھرتی کے ساتھ اپنے شکار پر بیک یک وقت ڈبل اسالٹ پاور داؤ آزمایا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے مدِمقابل کے پستول والے ہاتھ سے ٹکرایا تھا اور دوسرے ہاتھ کا بخ اس کی گدی پر رسید کر دیا تھا۔ اس اچانک حملے پر وہ بوکھلایا، لڑکھڑایا اور جب تک سنبھلا، اس کا پستول شکیلہ کے ہاتھ میں کھیلتا نظر آیا۔

ادھر میں نے...... اپنے مدِمقابل پر دھاوا بولتے ہی اس کے پستول کو قبضہ میں لینا چاہا تھا کہ وہ اچانک گرتے گرتے سنبھلا، پستول اس کے ہاتھ سے نکلا، میں نے کیچ کرنے کی سعی چاہی تو اس کی ایک لات نے میرے دائیں

پہلو پر رسائی حاصل کی، میں لڑکھڑا کر گرا، سنبھلا تو وہ تب تک اپنے سڑک پر گرے ہوئے پستول پر دوبارہ قبضہ جما چکا تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس نے اس کی نال کا رخ بھی میری جانب کر لیا، ٹھیک اسی وقت کسی اندھیرے گوشے سے کبیل دادا نے اس پر چھلانگ لگائی تھی مگر اس سے ذرا ہی دیر پہلے گویا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں، مدِمقابل کا ہاتھ زخمی ہوا اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

یہ شکیلہ کے پستول کا شاخسانہ تھا جو اس نے اپنے شکار سے جھپٹا تھا۔ ورنہ جب تک کبیل دادا دوسرے حملہ آور کو چھاپتا وہ مجھے اپنے خاموش پستول کی گولی سے نشانہ بنا چکا ہوتا۔

چشم زدن میں ہم نے ٹائیگر ٹیک کے ان دونوں گھاگ ایجنٹوں کو بے بس کر دیا تھا۔

ایسے مقاصد کے لیے ہم نے تیاری کر رکھی تھی۔ لہٰذا کبیل دادا اور شکیلہ نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ ان کے منہ پر اسکاچ ٹیپ چپکا دیں۔ ہم انہیں گھسیٹتے ہوئے ایک کونے میں لے گئے۔ یہ عام پبلک پارک کا بالکل بعید ترین گوشہ تھا۔

''میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔'' اس کے بعد بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے... میں اس چوڑے شانوں والے شخص سے خونخوار غراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوا۔ شکیلہ اور کبیل دادا دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ان کا دھیان میرے بجائے اطراف پر تھا، یہ میری ہدایت تھی۔

میں ان دونوں پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے غیر شناسا آدمی کو میں نے سرِدست نظر میں رکھا تھا۔ جبکہ مخاطب میں اسی آدمی سے تھا جس سے ایک بار میرا مختصر سہی لیکن پاکستان میں ٹاکرا ہو چکا تھا۔

''لہٰذا تم بھی مجھے پہچان چکے ہو گے۔ مجھے عابدہ سمیت آنسہ خالدہ کا پتا چاہیے۔'' کہتے ہوئے میں نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر چپکی ہوئی ٹیپ ہٹائی جبکہ دوسرا سرا چپکا رہنے دیا۔

''تت...... تم مارے جاؤ گے...... نہیں بچو گے زندہ ہمارے ہاتھوں۔'' بولنے کے قابل ہوتے ہی اس نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہمم...... اس کا مطلب ہے مجھے اپنے پہلے والے ہی طریقہ کار پر عمل کرتے رہنا چاہیے، تم دونوں تو خواہ مخواہ ہی راستے میں اُلجھ گئے میرے ساتھ۔''

بات غلط نہیں تھی میری لیکن نفسیاتی وار ضروری تھا۔

ان سے چھینا ہوا ایک پستول میں نے اپنے ہاتھ میں ہنوز تھامے رکھا تھا، جبکہ دوسرا شکیلہ کے پاس تھا۔

اسی پستول کی نال میں نے اس کے ساتھ پڑے ہوئے ساتھی کی پیشانی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ''چزز'' کی آواز اُبھری، اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی پیشانی سے سرخ روشندان کسی چھوٹی گاڑی کی بیک لائٹ کی طرح چمکنے لگا۔ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اُس کی......

''ٹائیگر ٹیک...... اور جے بی سی...... کے ہر آدمی کا میں چشم زدن میں یہی انجام کروں گا، کیونکہ ان دونوں سے تعلق رکھنے والے میرے سامنے ناقابلِ معافی درندے ہیں، خونی درندے...... کیونکہ عابدہ کے خلاف سب سے پہلے اور بعد میں بھی انہی دونوں نے جال پھیلایا تھا۔ باقی اسپیکٹرم کے تو میں کافی بخیے اُدھیڑ چکا ہوں...... وہ بھی میرا ٹارگٹ ہیں۔''

میں نے زہریلے اور سفاک لہجے میں اس آدمی سے کہا۔ ان تینوں کے نام گنوانے کا میرا ایک مقصد تھا۔

اسے مجھ سے شاید اس قدر تیزی کی توقع نہ تھی۔ اسی سبب چند ثانیوں کے لیے اس کا منہ کھلا رہ گیا مگر حقیقت یہ بھی تھی کہ خوف یا ڈر کا ایک شائبہ تک اس کے چہرے یا آنکھوں سے ہویدا نہ ہوا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

''عابدہ کو تم بھول ہی جاؤ اور اپنی اس ساری جستجو اور کشمکش کے زیاں پر ماتم کرو۔ باقی رہے تم، تو زندگی کے بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہارے پاس مسٹر شہزی!''

اس کی بے خوف اور پُراعتماد انداز نے مجھ پر طیش آمیز سی جھلاہٹ طاری کر دی، حالانکہ مجھے پہلے ہی سے اندازہ تھا کہ یہ آسانی سے زبان کھولنے والے نہیں ہیں اور میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس کے ساتھ متشددانہ حربے آزماتا۔

لہٰذا میں نے پُرغیظ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور پستول کی لمبی نال اس کی پیشانی پر لگا دی۔ ابھی میری اُنگلی ٹریگر پر متحرک ہونے کے لیے بے چین تھی کہ وہ بولا۔

''ٹھہرو......''

میری اُنگلی ٹریگر پر رک گئی۔ سامنے اور بالکل نگلنے کو تیار کھڑی، یقینی موت کی اپنی دہشت ہوتی ہے۔ چاہے کوئی کتنا ہی پھنے خان ہو، اتنی فوری اور جلد موت کو قبول نہیں کرتا۔

‘‘کچھ بتانا چاہتے ہو؟ لیکن بات میرے مطلب کی ہونا چاہیے۔’’ میں نے موت کی سی سرسراتی آواز میں پوچھا۔

‘‘ہاں! تمہارے مطلب کی ہے لیکن میری جان بخشی کا تمہیں سوچنا پڑے گا۔’’ وہ بولا۔

‘‘یہ بات کی افادیت اور اس کی صداقت پر انحصار کرتا ہے، جبکہ میرے لیے ان دونوں باتوں میں زیادہ اہم صداقت ہے مگر افسوس کہ اسے جانچنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں۔ مجھے ابھی اس سے زیادہ اہم کام نمٹانے ہیں، اسی لیے بائے...... فار ایور......’’ کہتے ہوئے میں نے پھر ٹریگر پر اُنگلی رکھ دی۔

‘‘مم...... میں تمہیں خود...... عابدہ کے پاس لے چلوں گا۔’’ وہ ایک دم بولا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ پسینے میں نہا گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے تھے۔

ٹائیگر ٹیگ جیسے خرانٹ اور گھاگ ایجنٹوں کو میرے نزدیک زیر کرنا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ ان کے منہ سے کچھ اُگلوانا زیادہ مشکل تھا۔

‘‘عابدہ تک رسائی اور اس کی رہائی کے لیے میں پہلے ہی سے ایک مضبوط فریم ورک تیار کر چکا ہوں...... اس لیے مجھے کسی کی باتوں میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔’’

‘‘لیکن میں خود تمہیں اس تک پہنچاؤں گا۔’’ وہ اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

‘‘عابدہ کسی ریسٹورنٹ میں میری منتظر نہیں ہوگی۔’’ میں نے کہا۔ ‘‘میں جانتا ہوں اس وقت وہ ٹائیگر ٹیگ یا جے بی سی والوں کے کسی ٹارچر سیل یا خفیہ قید خانے میں موجود میرے ہی لیے دعائیں مانگ رہی ہوگی کہ میں ایسی خطرناک جگہ کا رخ نہ کروں جس میں میری جان جانے کا اندیشہ ہو۔ تم یقیناً سچ بول رہے ہوگے، تم مجھے وہاں تک پہنچا بھی دو گے مگر وہاں موجود سخت پہرے کو توڑ کر اپنی جان جوکھم میں ڈال کر اسے دشمنوں کے چنگل سے چھڑانا ہوگا۔ پھر تمہارا اتنا سا احسان کیوں لوں میں؟’’

‘‘تمہیں یہ تو نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کن لوگوں کی قید میں ہے؟’’ وہ کھگیانے کے سے انداز میں بولا۔

‘‘وہ جے بی سی والوں کی قید میں ہے اور اسے تمہارے باپ باسکل ہولارڈ نے ہی کسی خاص مقصد کے لیے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ان کے حوالے کیا۔ کیونکہ وہ خود بھی ایک کٹر یہودی اور مسلم دشمن درندہ نما انسان ہے۔’’ میں نے اسے جواب دیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے شاید میرے ‘‘ہوم ورک’’ کا اندازہ نہ تھا۔ اس کے منہ کو اب گھن گھنی لگ گئی۔

میں اپنی سوجھ بوجھ اور حالات کے مطابق ان کا تجزیہ رکھتے ہوئے جو ہوا میں تیر چھوڑ رہا تھا، وہ ٹھیک نشانے پر ہی لگ رہے تھے۔ اسے یوں سوچتا پا کر میرے عابدہ سے متعلق قیافے درست محسوس ہوئے لہٰذا بولا۔

‘‘ہاں! ایک کام کر سکتے ہو، مجھے آنسہ خالدہ کے بارے میں بتاؤ، اسے یرغمال بنا کے کہاں رکھا گیا ہے؟’’

‘‘مم...... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔’’ وہ گلا صاف کرنے کے انداز میں پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

‘‘اوکے...... یہی میرے لیے ایک کام کی بات تھی، اب بائی...... بائی۔’’ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ اس کی پیشانی پر نال رکھ دی۔

‘‘ٹھٹ...... ٹھہرو...... بتاتا ہوں۔’’ اس نے فوراً کہا۔

‘‘وقت ضائع نہیں کرو، بولتے چلو مگر سچ بولنا، ذرا سا بھی مجھے تمہاری بات کی صداقت پر شبہ ہوا تو میں ٹریگر دبا دوں گا۔’’ میں نے بے رحمی سے کہتے ہوئے ایک بار پھر ٹریگر پر اُنگلی رکھ دی اور پستول کی نال اس بار اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں کے درمیان قدرے اُوپر پیشانی سے چپکائے رکھی۔

‘‘سیون ڈے پارک ایونیو، اسٹریٹ تھرٹی تھری، سن لیک کے پاس ایک تکونی سی رہائشی عمارت ہے۔ سامنے سینٹ لوکا کا گرجا ہے، سیکنڈ فلور پر اس کی رہائش ہے۔’’

‘‘اپارٹمنٹ کا کوئی نمبر وغیرہ؟’’

‘‘ڈپلیکس اور کاٹیج ٹائپ فلیٹ ہیں۔ ہر فلور پر ایک ہی ڈپلیکس ہے۔’’

اس نے فرفر بتایا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ موت سامنے ہو اور دلیلیں واضح...... تو عقل ماؤف ہونے لگتی ہے۔ میری ٹھوس دلیلیں اور واضح تاویلوں نے اسے اب کسی قسم کی چال بازی سے مانع رکھا تھا۔

‘‘وہاں کون لوگ ہیں؟ اور ان کا تعلق کس تنظیم سے ہے؟’’ میں نے سوال کیا۔

‘‘اس کا نام اسٹاری ہے، وہ کورکوران جیل کا ڈپٹی

وارڈن ہے۔ وہ رہائشی عمارت اسی کی ملکیت ہے۔"

"لیڈی چیف وارڈن مسز بینسفورڈ کا اس میں کوئی رول؟" میں نے پوچھا۔ اس کی.... آنکھیں ایک بار پھر سکڑ کر پھیلیں۔ بولا۔ "عابدہ کے سلسلے میں ان دونوں کے درمیان نہیں بنتی تھی۔"

"وجہ......؟"

"استاری اس بات کے حق میں نہیں تھا جو مسز بینسفورڈ چاہتی تھی۔"

"پھر؟"

"استاری کو آخر مجبور ہونا پڑا۔" اس نے بتایا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

"ہم......" میرے منہ سے سرسراتے انداز میں برآمد ہوا۔ پستول کی نال میں نے اس کی پیشانی سے ہٹا دی۔ میں اس پر کچھ اور آزمانا چاہتا تھا۔ پستول کی نال ہٹتے ہی اس کی آنکھوں میں اُمید وبیم کی لہر چمکی۔ میں نے پستول بائیں ہاتھ میں تھاما اور دائیں ہاتھ سے اس کی گردن سہلانے لگا۔

"ی ی......کیا کر رہے ہو......؟" وہ اٹکتی آواز میں بولا اور دوسرے ہی لمحے اس کا منہ کھل گیا۔ اس کے ہونٹ ہی نہیں بلکہ چہرہ بھی پل بھر میں نیلا پڑ گیا۔ میری اُنگلی کی زہریلے سانپ والی انگوٹھی کے ننھے سانپ نے اس کی گردن پر ڈس لیا تھا۔ وہ سچ بولتے بولتے جھوٹ پر آمادہ ہو گیا تھا۔

کبیل دادا اور شکیلہ میرے منتظر تھے۔ "کیا ہوا......؟ اس نے کچھ بتایا؟"

شکیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں! مگر آدھا سچ اور آدھا جھوٹ، باقی کا سچ یہ حرام زادی مسز بینسفورڈ اُگلے گی، ٹارگٹ کی طرف بڑھو۔" میری آواز جوشِ غیظ سے مرتعش تھی۔ میں نے استاری سے متعلق انہیں بتایا تو ان کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے ڈرا دھمکا کر چپ رہنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔

"میرا خیال ہے مسز بینسفورڈ کے بجائے ہمیں استاری کے گھر کا رخ کرنا چاہیے۔" کبیل دادا نے مشورہ دیا۔

"اس کی بھی باری آئے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اصل حقائق کا تب بھی مسز بینسفورڈ کو ہی علم ہوگا۔"

ٹائیگر فیک کے ان دونوں۔ ایجنٹوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد ہم اسی سڑک پر آگئے جو مسز بینسفورڈ کی رہائش گاہ تک جاتی تھی۔ سوزی کے مطابق لیڈی چیف وارڈن اپنی ذاتی رہائش گاہ تک آنے کے لیے سرکاری گاڑی استعمال نہیں کرتی تھی بلکہ اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ ہی ان کی گاڑی میں گھر آتی تھی۔

"ٹائم دس سے تجاوز کر چکا ہے۔ وہ لوگ تو نائٹ منانے گھر سے نکل چکے ہوں گے۔" کبیل دادا اپنی رسٹ واچ پر ایک نظر ڈال کے بولا۔

"یہ ممکن ہے۔" میں نے کہتے ہوئے ہونٹ بھینچے۔ "لیکن قیافے کے بجائے ہمیں آنکھوں دیکھی تصدیق کرنا ہوگی۔

سٹرڈے نائٹ کی وجہ سے سڑکوں پر اب لوگوں اور گاڑیوں کی روانی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو چلا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ ہمارا ٹارگیٹڈ پرسن ویک اینڈ کی رات منانے گھر والوں کے ساتھ نکل چکا ہوگا۔ اس صورت میں میرا ارادہ یہ مہم ملتوی کر کے سن لیک کی طرف نکلنے کا تھا۔ ان کے ہتھیار ہم نے وہیں پھینک دیے تھے۔ ہم آگے بڑھے۔

دائیں بائیں درختوں اور آرائشی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں نے شکیلہ کو گیٹ کی طرف جا کر جائزہ لے کے پلٹنے کی ہدایت کی، جبکہ خود میں اور کبیل دادا گیٹ سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر گھات لگائے موجود رہے۔ ساتھ ہی میں نے بھی مکان کا دور سے ہی جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی مگر کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

شکیلہ نے ترنت کام نمٹایا تھا، وہ واپس آئی اور بولی۔ "گیٹ پر کوئی نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اندر کوئی موجود ہے۔"

"اگر تم نے اندر کسی کمرے سے روشنی چمکتی دیکھی ہے تو یہ ضروری بھی نہیں کوئی اندر موجود بھی ہو۔" کبیل دادا بولا۔ میں سوچ میں تھا پھر بولا۔

"کیا تم نے اندر پورچ میں جھانکنے کی کوشش کی تھی؟ میرا مطلب ہے کوئی گاڑی وغیرہ کھڑی تھی؟"

"ایک ٹوروین ٹائپ کی گاڑی کھڑی تھی۔ جس کے پیچھے چھوٹا سا ٹریلر جڑا تھا اور کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔" شکیلہ نے جواب میں کہا۔

"بات پھر بھی واضح نہیں ہوئی۔" کبیل دادا بولا۔ "ممکن ہے ان تینوں میں سے کوئی ایک نہ جا سکا ہو اور ایک رہ گیا ہو۔ اب وہ ہمارا مطلوبہ شکار ہوگا یا کوئی اور...... کیا خبر......"

کبیل دادا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے سوچا اگر مطلوبہ شکار اندر ہوا تو یہ بات نہایت سودمند ثابت ہوگی۔ لہٰذا یہی طے پایا کہ اب اندر نقب لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

پہرے وغیرہ کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ گن مین یا گیٹ کیپر کا یہاں کوئی ایسا رواج نہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا سیکیورٹی الارم سسٹم ہی کسی گن بردار محافظ سے زیادہ اثرانگیز ہوتا تھا۔ کسی بھی مشکوک شخص کے اندر داخل ہوتے ہی ایک دم اور بیک وقت دو جگہوں پر الارم بجتے تھے۔ ایک گھر کے مالک کو جگانے اور ہوشیار کرنے کے لیے جبکہ دوسرا الارم قریبی پولیس سینٹر میں بجتا تھا، پھر چشم زدن میں پولیس کی گاڑیاں ٹریکنگ کی مدد سے متاثرہ گھر تک پہنچ جاتی تھیں۔

ایسے سیکیورٹی الارم کو ناکارہ کرنا مجھے آتا تو تھا لیکن بہرحال اس ٹیکنک میں مکمل عبور حاصل نہ تھا۔ کیونکہ الارمنگ سسٹم کی ورائٹیز ہر بار جدت کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں۔

ہم نے رہائشی عمارت کی مشرقی دیوار کا رخ کیا۔ اس طرف پارک کا عقبی اور قدرے بعید ترین گوشہ پڑتا تھا اور وہاں تاریکی بھی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم نے چند ثانیے رک کر پہلے اطراف کی سن گن لی اور اس کے بعد میں نے دیوار کا جائزہ لیا۔ وہ زیادہ اُونچی نہیں تھی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک آلہ نکالا اور مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا پھر اسے بلند کر کے ایک بٹن پش کیا۔ میرے ہاتھ میں دبی ہوئی گول سی شے سے ہلکی سرسراہٹ کی آواز بلند ہوئی اور ایک تار اس آلے سے برآمد ہوئی اور سانپ کی طرح لہراتی ہوئی دیوار پر جا پڑی اور وہیں اٹک گئی۔ میں نے پہلے ذرا کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا۔ اب میرے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ میں نے ایک اور بٹن دبایا پھر ذرا اُچھلا۔ ''چررر'' کی آواز ابھری، میرے ہاتھوں میں دبے ہوئے آلے کی طاقتور موٹر چل پڑی۔ میرے دونوں پاؤں دیوار پر ٹک گئے، نہ صرف یہ بلکہ میں گویا دیوار پر چلنے لگا۔ خودکار وائیر مجھے اوپر کھینچنے لگی اور میں دیوار کی منڈیر پر جا پہنچا۔

میں نے دوسری جانب کا محتاط نظروں سے جائزہ لیا اور پھر اسی وقت کہیں قریب سے کتے کے غرانے کی آواز اُبھری۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کوئی شے اس کی جانب پھینکی۔ وہ بھونکا اور...... گری ہوئی شے کی جانب لپکا۔ اپنی حیوانی جبلت کے مطابق اس نے اس شے کو جبڑوں میں لینے سے پہلے سونگھا اور اگلے ہی لمحے وہیں لسبا لیٹ گیا۔

میں نے پلٹ کر نیچے کبیل دادا اور شکیلہ کو اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد دوسری طرف کود گیا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم تینوں اندر تھے۔ ہمارے دائیں جانب لان تھا۔ بائیں جانب پیچھے بیک یارڈ کی طرف جاتا ہوا راستہ، جبکہ سامنے ذیلی دیوار اور اس پر نصب دیدہ زیب گلاس ڈور...... اس پر وہ الارم نصب تھا۔ میں نے شکیلہ کو مین گیٹ کی اندرونی سمت سے اس پر بڑھنے اور وہاں نگاہ رکھنے کی تاکید کی اور کبیل دادا کو پورچ میں کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹریلر کو چیک کرنے کا کہا۔ خود میں نہایت محتاط روی کے ساتھ گلاس ڈور کی جانب بڑھ گیا۔

قریب پہنچ کر میں نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک چرمی پاؤچ نکالا، اس کے اندر مختصر سا الیکٹرانک ٹول رکھا تھا۔ ایک چھوٹی ڈائمو اور بیٹری تھی۔ اس مختصر مگر بہت ہی حساس نوعیت کے ٹول کی مدد سے میں نے پینل باکس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

تسلی ہو گئی تب بھی میرا دل اس خدشے تلے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کھولتے وقت کہیں الام بجانا نہ شروع کر دے، لہٰذا دھڑکتے دل سے میں نے اسے اوپن کیا تو شکر رہا کہ ہر سُو اسی طرح خاموشی طاری رہی۔

گلاس ڈور کو آہستگی سے اندر کی جانب دھکا دے کر میں نے کبیل دادا کو ''سب ٹھیک ہے'' کا انگوٹھا دکھایا اور اسے وہیں پہرے پر کھڑے رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کے بعد شکیلہ کو قریب بلا لیا۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہال تھا جو شاید نشست گاہ کے طور پر بھی مستعمل رہتا تھا، وہاں فرنیچر تھا اور ہلکے پاور کا بلب روشن تھا۔ اس طرف سے گزر کر ہم راہداری میں آ گئے۔

قریب کے ایک دو کمروں میں تسلی کرنے کے بعد ہم زینے کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ وہ اُوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ وہاں دو اور کمرے دکھائی دیے۔ ایک کو خالی پا کر ہم دوسرے کی جانب بڑھے تو دروازے کے نیچے سے زیرو پاور بلب کی روشنی آتی دکھائی دی۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کبیل دادا کا اندازہ

درست ثابت ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک کسی وجہ سے گھر پر ہی رہ گیا تھا اور زیادہ امکان اپنے شکار کا ہی تھا۔

میں نے دروازے کو آہستگی سے اندر دھکا دیا اور وہ کھلتا چلا گیا۔ مدھم سی روشنی میں مجھے فقط یہی نظر آ سکا تھا کہ بیڈ پر کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہوا ہے۔ میں نے سوئچ بورڈ دیکھ کر بٹن آن کیا۔

چٹ کی ہلکی آواز سے کمرے میں روشنی ہوگئی۔ لیکن سامنے نگاہ پڑتے ہی میں بُری طرح چونک پڑا نہ صرف میں بلکہ شکیلہ جیسی مضبوط دل گردے کی مالک لڑکی بھی سامنے کا ناقابلِ یقین منظر دیکھ کر اپنے منہ سے اُبلنے والی ہلکی سی سسکاری کو نہ روک پائی۔

ٹھیک اسی وقت ہمارے عقب میں دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ اُبھری۔ ہم دونوں نہایت پھرتی سے اس طرف گھومے تھے۔

☆☆☆

وہ کمیل دادا تھا، اس کے چہرے پر جوش کی سی کیفیات مترشح تھی۔

"تم......؟ خیریت؟" میں نے ہلکی سرگوشی میں پوچھا۔

"خیریت نہیں ہے۔" وہ بولا۔ "چار مشکوک افراد کو میں نے مختلف سمتوں سے اس مکان کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ ٹائیگر ٹیگ کے ہی کُتے محسوس ہوتے ہیں۔"

چند لمحے تھمتے ہی جب اس کی ... نظر سامنے بیڈ پر پڑی تو وہ بھی چونک کر بے اختیار بولا۔

"اوہ...... کیا اتنی جلدی اپنا کام نمٹا لیا تم دونوں نے؟"

"ہم نے نہیں کسی اور نے نمٹا لیا ہے شاید۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔ کمیل دادا کی نظریں ہنوز بیڈ پر جمی ہوئی تھیں جہاں کورکوران کی لیڈی چیف وارڈن مسز بینسفورڈ ایسی حالت میں دھری پڑی تھی کہ اس کے سینے پر عین دل کے مقام پر دستے تک خنجر دھنسا ہوا تھا اور خون بہہ بہہ کر بیڈ سمیت نصف اوڑھے ہوئے لحاف تک کو رنگین کر گیا تھا۔

ہمارا شکار سوزی کے بتائے ہوئے حلیے پر پورا اُترتا تھا۔ یوں شبہے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

"اس کا تو قصہ تمام ہوا، اب ان کُتوں سے نمٹنے کی تیاری کرو۔" کمیل دادا مجھے اور شکیلہ کو گم صم سا پا کر بولا۔

"تصادم کیے بغیر نکلنے کی کرو......" میں غرایا۔ "ہم کمرے سے نکلے۔

زیادہ سوچنے اور اچانک بدلتے ہوئے حالات پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔ ٹائیگر ٹیگ کے کُتے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

راہداری سے گھوم کر ہم تینوں محتاط روی سے عقبی سمت کی طرف بڑھنے لگے جہاں میرے اندازے کے مطابق بیک یارڈ میں کھلنے والا کوئی نہ کوئی دروازہ موجود ہو سکتا تھا۔

ایک چھوٹے سے خالی کمرے سے گزرتے ہی ہم نے بیک یارڈ میں قدم رکھ دیا۔ اس کی دیوار ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ یہاں سے فوری طور پر نکلنے کا یہ اچھا موقع تھا لیکن ابھی ہم نے اس طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے ایک سائے کی جھلک دیکھی، وہ ایک دیوار کی آڑ سے اچانک ہی اُبھرا تھا اور...... پل بھر میں اس کے ایک ہاتھ میں چمکتا ہوا پستول نظر آیا۔

کمیل دادا اور شکیلہ اس چھپی ہوئی آفت سے غافل تھے۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے ان دونوں کو دائیں بائیں دھکا دیا۔ اسی وقت میں نے خاموش فضا دوبار "چزز...... چزز......" کی آواز سنی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا لیکن اپنے کسی ساتھی کی کوئی کراہ وغیرہ نہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور پھر میں نے ایک جست بھری۔ اس طرح کہ میں اس کے بالکل قریب جا پڑا، اگرچہ اس نے مجھ پر بھی اپنے خاموش پستول سے گولی داغنے کی کوشش چاہی تھی۔

مجھے چشم زدن میں اپنے قریب پا کر وہ صرف لمحہ بھر کو بوکھلایا اور دوسرے لمحہ میرا اس کے چہرے پر پڑنے والا ہیمر پنچ تھا۔ اس کے حلق سے اوغ کی آواز برآمد ہوئی اور وہ زمین سے چند انچ اُوپر اچھل کر اسی دیوار سے ٹکرا کر گرا تھا جسے پھلانگنے کا ہم ارادہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی تصدیق کرنا ضروری نہ سمجھا تھا کہ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ کیونکہ ہیمر پنچ استعمال کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

"فوراً نکل چلو۔" میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم نے اسی طرح "خودکار" انداز میں دیوار پھاندی اور دوسری طرف جا پڑے۔

پھر ہم رکے نہیں اور تیزی سے دوڑتے ہوئے مین شاہراہ پر آ گئے۔ پھر ایک جگہ رکے اور اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرنے لگے۔

"یہ کس کا شاخسانہ ہو سکتا ہے اور کیوں؟" شکیلہ سے

رہا نہ گیا۔

”کم بخت قاتل نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کتنا رسک لے کر ہم شکار کو چھاپنے کے لیے پہنچے تھے۔“ کبیل دادا بھی سخت جھلایا ہوا تھا۔

”ایسے واقعات رونما ہوتے رہیں گے یارو! جو ہماری توقعات کے خلاف ہوں گے۔“ میں نے اطمینان سے کہا اور پھر اس کی توجیہہ بھی ساتھ بیان کر ڈالی۔

”اس لیے کہ دشمنوں کو میری یہاں آمد و موجودگی کا علم ہو چکا ہے اور وہ ایک مربوط منصوبے اور عقلی قیافوں سے بھانپتے جا رہے ہیں کہ میں عابدہ کی تلاش کے سلسلے میں سب سے پہلے کن لوگوں کو تختۂ مشق بناؤں گا، وہ انہیں ختم کرتے جا رہے ہیں۔“

”کم از کم یہ کام ٹائیگر ٹیگ نہیں کر سکتے۔“ شکیلہ نے فوراً ہی پُرغور انداز میں کہا۔

”بالکل درست۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”یہ کام جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کا ہے۔ یہودی لابی کا یہ نقاب پوش سوداگران گروپ اپنے مفادات کی خاطر اپنے خیر خواہوں اور دوستوں کو بھی سُولی پر چڑھانے کی پروا نہیں کرتا۔ انہوں نے مسز بیلسفورڈ سے کام نکلوایا اور پھر میری آمد کا سنتے ہی انہوں نے اسے ختم کر ڈالا۔ یوں عابدہ کا جیل سے پُراسرار طور پر غیاب ایک بار پھر معما بن گیا۔“

”لیکن ٹائیگر ٹیگ کے ایجنٹوں کی اس قدر جلد اور غیر متوقع آمد کا کیا جواز بنتا ہے؟“ کبیل دادا نے اُلجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”جن دو ایجنٹوں کو ہم گھاٹ لگا کر جہنم واصل کر چکے ہیں، یقیناً وہ ان سے رابطے میں ہوں گے۔“ میں نے ایک محتاط اندازے سے کہا۔ ”سٹر ڈے نائٹ، مسز بیلسفورڈ کی ذاتی رہائش گاہ کے علاقے میں ہمارا منڈلانا، انہیں باور کرانے کے لے کافی تھا کہ ہم یہاں کیا گل کھلانے آئے تھے۔“

”ایسے تو پھر آنسہ خالدہ کی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق ہے، کیونکہ وہ اب تک عابدہ کے متعلق بہت کچھ جان کاری حاصل کر چکی ہے؟“ شکیلہ نے خدشہ ظاہر کیا اور میں نے ایک گہری سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے ہلکے مغموم سے لہجے میں کہا۔

”آنسہ خالدہ صرف عابدہ ہی کے متعلق نہیں بلکہ نائن الیون والے واقعے کے متعلق بھی بہت سے حقائق کا پتا لگا چکی ہے۔ وہ ٹائیگر ٹیگ سے زیادہ جے بی سی والوں کے لیے اہم ہوگی، خدا کرے وہ بہادر اور باہمت لبنانی خاتون زندہ ہو۔ یا پھر نجانے کس حال میں ہو...... بہرحال شکیلہ! تمہارا خدشہ غلط نہیں ہے۔“

”ضروری نہیں کہ خالدہ اگر ان کی قید میں ہے تو وہ اسے اتنی جلدی ہلاک بھی کر ڈالیں۔“ کبیل دادا بولا۔ ”لیکن دل میں اس بہادر خاتون کے لیے یہ اذیت ناک خیال ضرور اُبھرتا ہے کہ وہ اگر خونی یہودی درندوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے تو بڑے جاں گسل لمحات سے گزر رہی ہوگی۔“

”اسٹاری کے بارے میں کیا خیال ہے اب......؟“ شکیلہ نے معاملہ آگے بڑھانے کی غرض سے سوال کیا۔

”رکنا نہیں ہے شکیلہ......!“ میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ”جس رفتار اور تیزی کے ساتھ دشمن ہماری راہ کھوٹی کرنے میں ہم سے ایک قدم آگے چل رہے ہیں، ہمیں ان کی رفتار کو پکڑنا اور ان سے آگے نکلنا ہے۔ چلو۔“

ایک ٹیکسی کے ذریعے ہم سیون ڈے پارک ایونیو کے علاقے میں پہنچے، وہاں ہم نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔

اسٹریٹ تھرٹی تھری، سن لیک کی جانب ہم پیدل ہی چل پڑے۔ ابتدا میں اسے تلاش کرنے کی تھوڑی بہت دشواری ہوئی، لیکن یہ مسئلہ ہفتے کی رات کو انجوائے کرنے والے خوش حال لڑکے لڑکیوں کے ٹولے نے حل کر دیا۔ ان سے پوچھتے ہوئے بالآخر ہم ایک ایسی تکونی رہائشی عمارت کے پاس پہنچ گئے جس کے سامنے سینٹ لوکا کا گرجا تھا۔

وہ ایک ”ڈپلیکس“ ٹائپ کی رہائشی عمارت تھی، ہم اس کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ اُوپر جاتے ہوئے زینے پر دوسرے فلور پر اسٹاری کا وہ رہائشی پورشن تھا۔

ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے پر میجک آئی نصب تھی۔ میں نے منہ آگے آکر اس پر بھاپ چھوڑی، اس کے بعد جیب سے ماسٹر کی طرز کی چابی نکال کر قفل میں گھمائی، ذرا سی کوشش کے بعد دروازہ کھل گیا۔ ہم تینوں غڑاپ سے اندر داخل ہوئے۔

ہم نے خود کو قدرے کشادہ لاؤنج میں پایا، وہاں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پھر دفعتاً ہی ایک کمرے سے جہاں روشنی کی کرنیں نمودار ہوتی دکھائی دیں، اُدھر سے کسی مرد اور عورت کی ”چہلیں“ کرتی آوازیں آ رہی تھیں۔

شکیلہ اور کبیل دادا نے معنی خیز اور مسکراتی سی نگاہوں

سے میری طرف دیکھا، مگر میں نے کوئی تاثر نہیں دیا اور کبیل اور شکیلہ سے کہا کہ وہ دونوں اچھی طرح سے جائزہ لے کر تسلی کرلیں کہ ان دونوں کے سوا اور کوئی یہاں موجود تو نہیں ہے۔

میں اول الذکر کمرے کے دروازے کے سامنے ہی محتاط انداز میں کھڑا رہا۔

دروازہ پورا بند نہیں تھا۔ یوں صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے سوا اس پورشن میں اور کوئی تھا بھی نہیں، لیکن میں حفظِ ماتقدم کو پھر بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

چند منٹوں بعد ہی دونوں نے آکر اس کی تصدیق کر ڈالی۔ اس کے بعد میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور بیک وقت ہم تینوں نے کمرے میں دھاوا بولا۔ میں نے دروازے کو لات رسید کی تھی پھر ہم تینوں دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ سامنے بیڈ پر مجھے کسی عجیب مخلوق کے پہلو بہ پہلو ایک حسین عورت دیکھ کر چنداں حیرت نہ ہوئی۔ پیسے کے بل بوتے پر عمر رسیدہ مرد کے ساتھ سولہ سالہ جوان حسین لڑکی بھلا کیا معنی رکھتی ہے۔ تاہم میری آنکھوں کے سامنے اس حسین اور لمبے بالوں والی جوان عورت کے ساتھ جو مرد تھا، وہ اتنی زیادہ عمر کا تو تھا البتہ اس کا وجود ہی مضحکہ خیز نظر آتا تھا۔

وہ سیاہ رنگت کا مالک تھا۔ جسے کالا امریکی کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ جسم موٹا تھا اور سر اس مناسبت سے ہوتا تو بھی چل جاتا مگر سر اتنا چھوٹا تھا کہ لگتا جیسے تربوز کے اُوپر خوبانی رکھی ہو۔ تاہم اس کے موٹاپے کو کسی حد تک کسرتی بھی کہا جا سکتا تھا۔ ڈیل ڈول کا وہ مضبوط نظر آتا تھا۔ بس سر والا معاملہ ہی اسے پہلی نظر میں مضحکہ خیز بنائے ہوئے تھا۔

عورت نے ایک چیخ مار کے چادر اُوپر کھینچ لی جبکہ عجیب الخلقت موٹے کو مادر زاد برہنہ دیکھ کر شکیلہ نے منہ پھیرلیا۔

اس نے اپنے اُوپر چادر لینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔ وہ البتہ بیڈ پر یک دم اُٹھ بیٹھا تھا اور خونخوار نظروں سے ہمیں گھورتے ہوئے بولا۔

”کون ہو تم......؟ اور اس طرح اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے کی تم نے......؟“

اس کی دلیری کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم تینوں نہتے تھے۔

”کپڑے پہن لو اسٹاری......! پھر آرام سے بات

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

[illegible]

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

[illegible]

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

[illegible] 1200 [illegible]

امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

[illegible] 9,000 [illegible]

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

[illegible]

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

[illegible] 0301-2454188
[illegible] 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

کرتے ہیں۔'' میں نے اندازے سے اسے اپنا مطلوبہ آدمی سمجھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میرے یعنی ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر اسے چونکنا چاہیے تھا مگر اس کے چہرے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہ ہوا۔ اسی طمطراق سے بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''شٹ اَپ! میرے کمرے سے اسی وقت باہر نکل جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مڑ کر تکیے کے نیچے اپنا ہاتھ بڑھانا چاہا تھا کہ میں کسی چیتے کی طرح اُچھل کر اس پر جھپٹا۔ عورت نے ایک اور چیخ اپنے منہ سے برآمد کی اور چادر سمیت بیڈ سے اُٹھ کر کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس اچانک اُفتاد پر بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔

میں نے کالے موٹے کے سر کو دبوچ لیا اور یہی میری غلطی تھی۔ وہ میرے شکنجے میں آتو گیا تھا مگر اس نے میرے بازو کی مضبوط گرفت سے نکلنے میں ... زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ کسی شارک مچھلی کی طرح تڑپا اور مجھے خود سے پرے دھکا دیا۔ اس کے انداز سے ریسلر کا سا پھرتیلا پن اور طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔

دھکا لگنے سے میں بیڈ سے نیچے تو نہیں البتہ اس پر سے ذرا اچھل کر قدرے پائنتی کی طرف ضرور جا لڑھکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر تکیے کے نیچے سے کوئی اسلحہ نکالنے کی کوشش چاہی تھی لیکن میری ٹانگ حرکت میں آئی اور وہ بڑے ڈول ڈیل کے ہونے کے باوصف بیڈ سے نیچے جا لڑھکا تھا، یہ شاید میری دوسری غلطی تھی، کیونکہ اس اثنا میں وہ تکیے کے نیچے سے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔

شکیلہ تو شاید اس معاملے کو ''سہل'' سمجھ کر ہنوز دیوار کی جانب منہ کیے کھڑی تھی البتہ کبیل دادا شاید ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کالا پہلوان نما استاری میری جانب اپنے پستول کا رخ کرتا، کبیل دادا اس کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دیکھتے ہی اس پر جا پڑا تھا۔ اس کی ٹانگ سب سے پہلے استاری کے پستول والے ہاتھ پر پڑی تھی۔ وہ ہاتھ سے نکلا اور...... استاری کی موٹے ستون جیسی ٹانگ حرکت میں آئی۔ کبیل دادا کو میں نے کراہتے ہوئے پرے گرتے پا کر اپنی جگہ سے جست بھری۔

استاری نے ٹھیک ٹھاک پولیس ٹریننگ لے رکھی تھی، وہ مجھے حرکت میں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے ہٹا۔ جب تک میں اس کی مکاری کو سمجھتا... اس نے ایک ''نازک'' موقع سے، جو شاید اس نے پہلے ہی شکیلہ کو دیکھ کر بھانپ لیا تھا، فائدہ اُٹھاتے ہوئے شکیلہ پر جھپٹا مارا۔

اُدھر باعث شرم سے منہ موڑے کھڑی شکیلہ نے مادر زاد برہنہ بھینسے جیسے آدمی کو خود سے لپٹے دیکھا تو اس کے حلق سے ایسی کپکپا دینے والی چیخ برآمد ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے میں اور کبیل دادا کے دل بھی دھک سے رہ گئے، یوں جیسے شکیلہ کسی توپ کے گولے کا شکار ہوگئی ہو۔

کم بخت استاری کو جتنا ہم تر نوالہ سمجھے ہوئے تھے، وہ ہماری توقع کے برخلاف اُتنا ہی ہمیں دق کیے دے رہے تھا۔

استاری، شکیلہ کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا، لیکن اس نے جب شکیلہ کی گردن دبوچنے اور ہمیں بے بس کرنے کے لیے اپنے ایک بازو کی گرفت اس کے گرد کسنے کی کوشش چاہی تو شکیلہ کو ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے بالآخر حرکت میں آنا پڑا اور اس نے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب استاری کے نازک مقام پر بڑے زور سے رسید کر ڈالی۔ استاری کے حلق سے بیل جیسی ڈکراہٹ اُبھری اور وہ جھک گیا۔ شکیلہ گویا اس پر اپنا غصہ اُتارنے پر تلی بیٹھی تھی۔ اسی پر بس نہ کیا اور اسے خود سے پرے دھکیل کر اس کی ''پشتک'' پر بھی ایک زوردار لات رسید کر دی۔ وہ تھوڑا لڑکھڑایا اور شکیلہ جھرجھرائے ہوئے انداز میں اس سے دور ہٹ گئی۔

تب ہی میں اور کبیل دادا بیک وقت حرکت میں آئے اور اسے دبوچ لیا۔

شکیلہ نے عورت کو قابو کیا جو اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسک رہی تھی۔ وہ اب شکیلہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی فرار کی کوشش ترک کر کے جلدی جلدی اپنا لباس پہننے لگی۔

استاری کو ہم نے صرف اس کا سلیپنگ گاؤن پہنانے پر اکتفا کیا تھا۔

''تت...... تم لوگوں کو جرأت کیسے ہوئی میاں بیوی کے کمرے میں داخل ہونے کی؟'' وہ بے بس ہونے کے باوجود غرایا۔

''میاں بیوی؟'' میں نے سوالیہ اور اُلجھی ہوئی نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔

''اوہ...... سوری مسٹر استاری......! ہم اپنی اس غلطی

پر شرمسار ہیں۔'' میں نے فوراً مفاہمانہ روش اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''تم میرا نام جانتے ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔'' اس کا دبنگ لہجہ برقرار تھا۔

''ہم جانتے ہیں۔ تم کیلی فورنیا کی سب سے بڑی جیل کورکوران کے ڈپٹی چیف وارڈن ہو۔'' میں نے سابقہ لہجے میں ہی اسے جواب دیا۔ ''ہم آپ سے کسی قسم کی کوئی غلط حرکت کرنے نہیں آئے تھے مگر......''

''غلط حرکت......؟'' وہ مجھے زہرخند نظروں سے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اور پھر صحیح حرکت کسے کہتے ہیں؟''

''ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہمارا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں، بس! چند ضروری سوالوں کے جوابات درکار ہیں آپ سے۔''

''میں تمہارے کسی بھی سوالوں کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ''بہتر یہی ہوگا کہ خاموشی کے ساتھ تم تینوں یہاں سے نکل جاؤ۔''

وہ ہم تینوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

''تمہاری تو ایسی کم تیسی......''

''آئی ڈونٹ کیئر......'' (مجھے پروا نہیں) وہ نخوت سے بولا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے برداشت کا پیمانہ لبریز ہوا۔ میرا ایک گھونسا اس کے جبڑے پر پڑا۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی کراہتی آواز خارج کرتے ہوئے بیڈ پر الٹ گیا۔

وہ عورت جو مبینہ طور پر اس کی بیوی تھی۔ مجھ سے رو رو کر التجا کرنے لگی کہ میں اس کے شوہر پر تشدد نہ کروں۔ میں نے اس کی التجا کی کوئی پروا نہ کی اور اسٹاری کو گردن سے دبوچ کر اپنے قریب کیا اور غرا کے ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''اسٹاری......! غور سے سن لو کہ میں کون ہوں، اگر نام جانتے ہو تو سنو...... میں شہزاد احمد خان شہزی ہوں اور اپنے سر پر کفن باندھ کر پاکستان سے یہاں امریکا میں قدم رکھ چکا ہوں...... مجھے عابدہ کا پتا چاہیے...... اسے کہاں غائب کیا گیا ہے؟''

ایک لمحے میں اسٹاری کی ساری اکڑفوں اور غیظ و غضب فرو ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں نا قابلِ یقین تاثرات لیے پھیل چکی تھیں۔ منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

''اگر مجھے تم نے عابدہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا تو یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں نشانِ عبرت بنا دوں گا تاکہ کورکوران جیل حکام کو اندازہ ہو سکے کہ قانون کی آڑ میں وہ کن لوگوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں، سمجھے تم......؟''

اسٹاری کئی ثانیے تک مذکورہ کیفیات کا شکار رہا۔ غصہ اور افسرانہ نخوت تو جیسے اس کی ہوا ہو چکی تھی لیکن اب حیرت اور نا قابلِ یقین تاثرات کی جگہ ایک گہری سوچ کا جال سا بنتا ہوا اس کی میچی میچی آنکھوں سے مترشح ہونے لگا تھا۔ حسبِ توقع وہ عابدہ کے حوالے سے میرے نام اور مجھ سے غائبانہ طور واقف تھا۔

''میں تمہارے سارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔'' بالآخر اس نے بڑے عجیب اور گہرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن یاد رکھو، اسٹاری کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ سمجھنا کہ میں تمہارے ڈر سے ایسا کہنے پر مجبور ہوا ہوں، کیونکہ میں ذاتی طور پر خود بھی مس عابدہ سے متعلق چند باتوں سے اختلافات رکھتا تھا۔''

اس کی بات، آواز اور لہجے میں کچھ ایسا تاثر محسوس ہوا تھا کہ جس نے میرے اندر کا غبار بھی دھو ڈالا۔

''تھینک یو مسٹر اسٹاری!'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''میں بھی اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اسی سلسلے میں تمہارے اور لیڈی چیف وارڈن مسز ہینسفورڈ کے درمیان بڑے دھواں دھار اختلافات رہے ہیں۔'' میں نے ٹائیگر فیگ کے جہنم واصل ایجنٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اسے جواب دیا۔ وہ اب مجھ سے مزید مطمئن نظر آنے لگا۔ میں بولتا رہا۔

''اسی لیے کوشش میری یہی تھی کہ تم سے دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوتی، لیکن مجھے پوری طرح اس صورتِ حال کا علم نہ تھا، تاہم پھر بھی میں اپنے تئیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔''

اس سے یہ کہنے کے بعد میں نے شکیلہ کو اشارہ کیا۔ اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔ میں نے عورت سے بھی معذرت کی۔ اسے کچھ تسلی ہونے لگی اور اس کی سراسیمگی میں کچھ کمی آئی۔

چند منٹوں بعد لگتا ہی نہ تھا کہ وہاں کسی قسم کی اُودھم مچی ہو۔ شکیلہ کی لگائی ہوئی ضرب کے تھوڑی دیر بعد اسٹاری کی حالت بھی کافی سنبھل گئی تھی۔

ہم لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ اس کی بیوی بھی

اب اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی مجھے یوں آرام سے دوستانہ ماحول میں بٹھا کر عابدہ کے متعلق بتانے والا تھا۔ تقدیر شاید مجھ پر ایک بار پھر مہربان ہونے لگی تھی۔

''مسٹر شہزاد!'' اسٹاری نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ میں دھڑکتے دل اور بے چین نظروں سے اس کی طرف تکے جا رہا تھا۔

''مس عابدہ کو ایک خطرناک اور اہم قیدی کی حیثیت سے یہاں لایا گیا تھا۔ اسے نائن الیون کے واقعے کے ذمّے داران کے ساتھی کے الزام تلے سزا ہوئی تھی۔ دہشت گردی کی عدالت میں اسے پہلے سزائے موت سنائی گئی تھی لیکن پھر نجانے کیوں وہ عمر قید میں بدل دی گئی۔ اگرچہ اس کی وجہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہو گئی تھی۔

اُسے ایک الگ تھلگ کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ وہاں اس کے سوا اور کوئی دوسری قیدی عورت نہیں تھی۔ مجھے صرف ایک دو بار ہی عابدہ سے ملنے، اسے دیکھنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ وہ سلاخ دار دروازے کے ساتھ لگی کھوئی کھوئی کھڑی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا اور اسے دیکھا تو میرے دل کو ہی نہیں بلکہ میرے ضمیر کو بھی ایک جھٹکا سا لگا۔

مسٹر شہزاد......! میری عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہے، میں پہلے آرمی میں جاسوس تھا۔ وہاں سے مجھے پولیس ڈپارٹمنٹ میں سارجنٹ کے طور بھرتی کیا گیا تھا۔ پھر میری کارکردگی کی بِنا پر مجھے اسپیشل پولیس ونگ میں ترقی دے کر بھیج دیا گیا۔ وہاں سے کورکوران جیل میں نائب چیف وارڈن کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ یوں مجھے یہ نوکری کرتے ہوئے پچیس سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اتنے طویل عرصے سے اس نوکری کی صحرا گردی میں مجھے ہر قسم کے خطرناک، خونی اور ایک سے ایک جگادری مجرموں سے سابقہ پڑتا رہا۔

وہ مجھے کہیں سے بھی کسی بھی طرح سے ایک دہشت گرد تو...... کجا...... ایسی دہشت گرد جس کا تعلق نائن الیون والے واقعے کے ذمّے داروں سے جوڑا گیا ہو، کہیں سے بھی محسوس نہیں ہوئی بلکہ دہشت گردوں کی ساتھی تو دور کی بات ہے، وہ تو مجھے عام معمولی مجرم بھی نہیں لگی۔ معصوم صورت، انجان، گھبرائی ہوئی حتیٰ کہ بے گناہوں کی سی سراسیمگی اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی فقط اتنا کہا تھا۔ ''میں بے گناہ ہوں۔ مظلوم ہوں اور مجھے پھنسایا گیا ہے۔''

وہ ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بول رہی تھی تاہم اپنا.... مافی الضمیر سمجھا سکتی تھی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس وقت میں اس سے سرسری ملاقات کرنے کی غرض سے گیا تھا، میرے پاس زیادہ وقت بھی نہ تھا، لہٰذا جب میں اس سے کچھ کہے بغیر واپس پلٹنے لگا تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ...... مجھے نماز پڑھنا ہے۔ چونکہ یہاں ایسے مسلم قیدی بھی تھے جو نماز پڑھتے تھے۔ میں نے اسے مصلا، تسبیح اور قرآن شریف دلوایا اور بتا بھی دیا کہ وہ اپنے قید خانے میں کس رخ پر نماز پڑھ سکتی ہے، نیز یہاں ایک مصری مسلم قیدی اذان بھی دیا کرتا تھا۔''

اسٹاری اتنا بتا کر چند ثانیے کے لیے ٹھہرا۔ عابدہ سے متعلق اس کی زبانی یہ سب سنتے ہوئے میری ہی نہیں شکیلہ کی آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی، اس کی تو عابدہ بچپن کی سہیلی تھی۔ کبیل دادا کے چہرے پر بھی سنجیدگی طاری تھی۔ میرے گلے میں رقت بھرنے لگی تھی۔ میں اسٹاری کے آگے بولنے کا نہایت بے قراری سے منتظر تھا، ایسے میں مجھے محسوس ہوا کہ اسٹاری کا لہجہ بھی عابدہ کے ذکر پر متاسفانہ سا ہونے لگا تھا۔

''میں نے دو دن بعد عابدہ سے پھر ملاقات کی اور ذاتی دلچسپی کے طور پر پورا ایک گھنٹا اس کے پاس رک کر ساری بپتا سنی۔

سچی بات یہی تھی مسٹر شہزی! کہ میں اس کی قانون کے دائرے میں ہی رہتے ہوئے مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے اپنے اس وکیل کا پتا دیا جو اس کا کیس لڑ رہا تھا۔ اسی وکیل کے توسط سے ہی میں آنسہ خالدہ سے بھی ملا۔ وہ میرے مثبت خیالات سے متاثر ہوئی تھی۔ تاہم میرا رویّہ اب بھی درمیانہ ہی تھا اور میں نے آنسہ خالدہ سمیت عابدہ کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے کسی ایسی بات کی توقع ہرگز نہ رکھیں کہ میں ان کی مدد میں کسی قسم کی قانون شکنی سے کام لوں گا۔ البتہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے جو مدد ہو سکی، انسانیت کے ناتے وہ ضرور کرتا رہوں گا۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں۔

درحقیقت نائن الیون کے واقعات کے بعد جنہوں

نے دنیا کی واحد سُپر پاور کی چولیں تک ہلا دیں...... بے گناہوں کا قتل خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہی ہوتا ہو، ناقابلِ معافی ہے، یہ بات دنیا کا ہر مہذب انسان تسلیم کرتا ہے۔''

''بے شک......'' میں نے تائید کی اور آگے بولا۔

''بلکہ اسلام تو ہے ہی سلامتی کا راستہ۔ دنیا کا کوئی بھی مذہب اپنے پیروکاروں کو ہرگز ایسے گھناؤنے قتلِ عام کا حکم نہیں دیتا۔ لیکن میں کشمیر اور فلسطین میں ہونے والے انسانیت سوز مظالم کے حوالے سے یہ ضرور کہوں گا کہ انسانی تاریخ ایسے بے شمار المیوں سے بھری پڑی ہے۔''

میں یہ کہہ کر چپ ہوا کہ وہ اپنی بات جلد ختم کر سکے۔

اس نے بھی میری بات کی تائید وحمایت میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور اسی تناظر میں کہنا شروع ہوا۔

''دو اغوا شدہ طیارے صرف اٹھارہ منٹ کے وقفوں سے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے دونوں ٹاوروں سے الگ الگ ٹکرائے اور دونوں ہی ٹاورز زمین بوس ہو گئے۔ اس کے فوراً بعد امریکا کی دانست میں اس کے محفوظ ترین مقام ''پینٹاگون'' سے ایک طیارہ ٹکرایا اور دھماکوں کے ساتھ عمارت کو آگ لگ گئی۔

اس عظیم سانحے پر نہ صرف امریکی طبقہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی طرف سے، بلکہ عالمی سطح پر بھی جلد ہی کچھ ایسی باتیں منظرِ عام پر آنے لگیں کہ نائن الیون کا سانحہ کیا نہیں بلکہ کروایا گیا تھا۔ لیکن امریکی عوام کے لیے یہ موضوع اس قدر حساس، نازک اور ٹیڑھی بنا دیا گیا تھا کہ کوئی کھل کر اور آزادی سے اس کے بارے میں اظہار کرنے سے بھی گھبراتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ امریکی میڈیا سمیت بعض عالمی مبصرین کی رائے اس عظیم سانحے کے بارے میں عام ہونے لگی کہ جن دبے دبے خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس میں مبالغہ آمیزی نہیں بلکہ بعض ضمیر پرستوں کی خفیہ تحقیق اور اصل حقائق کی تلاش وجستجو کرنے والے سرپھرے افراد کی محنت کا نچوڑ ہے۔ یاد رہے کہ ان سرپھروں میں وہ لبنانی خاتون صحافی اور بین الاقوامی تجزیہ نگار آنسہ خالدہ بھی شامل ہے۔

''یہ سانحہ کیا نہیں بلکہ کروایا گیا ہے۔'' اس جملے نے گویا ایک تحریک کا کام کیا۔ پھر تو اس نے اس قدر زور پکڑا کہ...... امریکی عوام کے بعض مکاتبِ فکر اس کا پس منظر جاننے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اس جملے کی سچائی میں جو پہلی دلیل مشہور ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ...... اس اندوہناک واقعے کے فوراً بعد ہی امریکی اداروں کا زور ہر ممکنہ طریقے سے اسی بات پر لگا رہا کہ یہ ایک انتہا پسند اور مذہبی جنونی مسلم ٹولے کا کام ہے۔ ایک ایجنڈے کے تحت عالمی سطح پر مسلمانوں کو دیگر اقوام کی نظروں میں نہ صرف دہشت گرد ظاہر کرنا تھا، بلکہ ان کا تشخص ہر ایک کی نگاہ میں مشکوک اور قابلِ نفرین بھی بنانا تھا۔ جب طبقہ فکر کے ایک حلقے نے ذرا ہمت اور جرأت سے کام لے کر امریکی اداروں سے یہ کہا کہ دنیا کو صرف تصویر کا ایک ہی رخ کیوں دکھایا جا رہا ہے؟ تحقیق اور دہشت گردوں کی تلاش صرف بیرونی طور پر کیوں کی جا رہی ہے؟ ''اندر'' کا کھوج کیوں نہیں لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ اس جھینپ کو مٹانے کے لیے طوعاً وکرہاً ایک بیرونی تحقیقاتی ٹیم جو ایک وفد کی صورت امریکا آنے کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ مل کر جو مقامی ٹیم تشکیل دی گئی، امریکی صدر نے اس آخرالذکر ٹیم میں بعض عوامی مکتبہ فکر کے نمائندوں کو بھی شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر انہیں شامل نہیں کیا گیا، یوں یہاں بھی وہ شبہات تقویت پکڑنے لگے کہ دال میں اندر ہی کچھ کالا ہے۔

اس کے بعد آنسہ خالدہ کی اس تحقیقاتی رپورٹ نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا کہ یہ کام اسرائیل اور امریکی نژاد، بالخصوص اس یہودی لابی کا ہے جو امریکا کی مشینری تک میں گھسی بیٹھی ہے۔ اس ضمن میں خالدہ کی دلیل یہ تھی کہ نائن الیون کے واقعے کی تحقیق اگر اب بھی غیر جانبداری سے کی جائے تو اس عظیم سانحے والے دن ایک چونکا دینے والا انکشاف بھی سامنے آتا کہ...... اُس روز ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں کوئی بھی یہودی موجود نہیں تھا۔ یہی نہیں اس روز یہودی معیشت کار اور امریکا کی چوٹی کے یہودی تاجروں کی ایک بہت بڑی کاروباری میٹنگ بھی طے تھی، جسے فوراً کینسل کر دیا گیا تھا۔

خالدہ کی ان باتوں کی تصدیق اس وقت ہونے لگی جب کچھ دیگر ''باخبر'' حلقوں نے یہ بتایا کہ وہ اس ''میمو'' (Memo) پر غور کر رہے تھے جو آج سے ٹھیک چار ماہ پہلے سی آئی اے کے اندرونی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی امریکا کے خلاف ایک خطرناک خفیہ آپریشن کا منصوبہ بنا رہی ہے تاکہ دنیا بھر کی خصوصاً امریکی اور یورپی میڈیا کی نظریں اسرائیل کے فلسطین پر وحشیانہ مظالم سے ہٹا کر فلسطینیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کی جا سکے اور اس وقتی نفرت کا فائدہ اُٹھا کر اسرائیلی فوج کو بے گناہ فلسطینیوں کے ایسے کھلے قتلِ عام کا

رنگا رنگ سلسلوں اور سبق آموز تحریروں کی حدت سے بھرا سال 2018ء کا آخری شمارہ

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

نامور مصنفہ
غزالہ فرخ
بنیں ہماری بزم کی مہمان

شیریں حیدر کے مسلسل ناول **امرت** کا دلکش اختتام

رفعت سراج کا قسط وار ناول **پہ کہاں بچیں کہ دل ہے** اپنی منزلِ مقصود سے چند قدم کے فاصلے پر

اسما قادری کے قلم سے نکلی تلخ حقائق سے بھرپور کہانی **بلا عنوان** جسے آپ قارئین عنوان دیں گے

حیا بخاری اور **دُردانہ نوشین** کی کہانیاں...... ایک نئے موڑ پر

عورت کہانی میں پڑھیے...... **فرحین اظفر** کی ایک اور چشم کشا کاوش...... **ع عورت د دیر**

اخلاقی و روحانی بیماری
حسد کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی
میں **اختر شجاعت** کی بہترین تحقیق

نفیسہ سعید کی دل سوز تحریر...... **گواہ رہنا**

اس کے علاوہ

سکینہ فرخ، ایمل رضا، ریحانہ آفتاب، فرح بھٹو، صادیہ احمد،
سائرہ مشال و دیگر مشاق لکھاریوں کے پُرکشش افسانے۔

اس کے ساتھ ساتھ مثبت معلومات و تفریحی عناصر سے پُر مزیدار مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

موقع مل سکے جس کا گھناؤنا خواب وہ ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔

''مسٹر شہزی! ضمیر اور جذبۂ انسانیت کسی ایک مذہب کی میراث نہیں ہے۔'' وہ پھر کہنا شروع ہوا۔ ''امریکی عوام بھی اس سے مبرّا نہیں ہیں۔ بہت سے مکاتبِ فکر آپ کو یہاں ملیں گے جو خود بھی امریکی مشینری اور اس کے اہم عہدوں پر گھسے بیٹھے اسرائیلی اور امریکی یہودیوں سے سخت نالاں ہیں۔ بہر حال امریکا نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایسے لوگوں کو دہشت گردی کے نام پر گرفتار کرنا شروع کر دیا جن کا اس واقعے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی عابدہ بھی ہے۔''

وہ رکا۔ عابدہ کا موضوع آتے ہی میرے اعصاب تن گئے۔ تاہم اس نے اب تک کی جو اجمالی تصویر پیش کی تھی، وہ بلاشبہ حقائق کے لحاظ سے متاثر کن ہی نہیں میرے جیسے آدمی کی معلومات کے لیے سودمند بھی تھیں۔ اگرچہ یہ سب خالدہ کی ذاتی کاوشوں اور اپنی جان کو مشکل میں ڈال کر حاصل کردہ تھیں۔

''عابدہ کو جواز بنا کر اس سے بالخصوص عالمی متعصب میڈیا کے سامنے اپنی مرضی کے بیانات دلوانے کے لیے جیوش لابی نے سی آئی اے میں موجود اپنی سورس ''ٹائیگر ٹیگ'' کے امریکی نژاد یہودی چیف باسکل ہولارڈ سے رابطہ کیا اور عابدہ کو کورکوران جیل سے خاموشی کے ساتھ غائب کرانے کے لیے کہا۔

ٹائیگر ٹیگ کا چیف باسکل ہولارڈ خود چل کر لیڈی وارڈن مسز بینسفورڈ سے ملا، معاملات یا یوں کہہ لیں کہ ''ڈیل'' پہلے سے طے شدہ تھی۔

مسز بینسفورڈ نے عابدہ پر باسکل ہولارڈ کے کہنے پر ہی جیل میں مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے، جبکہ میں اسے منع کیا کرتا تھا۔ میں چونکہ اس کا ماتحت تھا، زیادہ نہیں بول سکتا تھا مگر میرا ضمیر بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ ایک حقیقت کو جانتے ہوئے بھی میں غلط روش اختیار کروں، ورنہ دیگر باضمیر امریکی فوجیوں اور افسروں کی طرح میں بھی خودکشی کر چکا ہوتا۔

ایک دن عابدہ کو جیل سے غائب کر دیا گیا، میں جانتا تھا یہ کس کی حرکت تھی۔ میں نے کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر اپنی افسر مسز بینسفورڈ کو صاف دھمکی دے دی کہ میں قانون کی اس چہار دیواری کے اندر یہ غیر قانونی اور انسانیت سوز حرکت برداشت نہیں کروں گا۔ لہٰذا عابدہ کو دو دنوں کے اندر میں کورکوران جیل کے اندر دیکھوں بہ صورت دیگر میں حقائق عوام و خواص کے سامنے لے آؤں گا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ اسی رات کو میرے گھر پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں میری محبوب بیوی اور پیاری بیٹی قتل کر دیے گئے اور مجھے اس دھمکی کے ساتھ زندہ چھوڑ دیا گیا کہ میں اپنا منہ بند رکھوں ورنہ رسوائی کے ساتھ اذیت ناک موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ یوں تو میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کس کے لیے میں زندہ رہتا۔ مگر مجھے ان سے انتقام لینا تھا، اپنی بیوی اور بیٹی کا۔ مجھے زندہ رہنا تھا۔ سو میں نے ہامی بھر لی اور بہ ظاہر اپنی زبان کو تالا لگا لیا مگر موقع کا منتظر تھا جو اَب...... شاید تمہاری صورت میں مجھے مل رہا ہے مسٹر شہزی......''

وہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد خاموش ہو رہا۔ اس کا چہرہ غم اور انتقام و غیظ کے ملے جلے تاثرات سے سرخ ہوا جا رہا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور اس باضمیر شخص کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اسٹاری! ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میں ان کی موت بن کر یہاں آیا ہوں۔''

اسٹاری نے ایک دم سر اُٹھا کر میری جانب دیکھا پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ ہم دونوں دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کا کاندھا تھپتھپانے لگے۔

اچانک سیل فون کی بیل گنگنائی۔ بیڈ سائڈ ٹیبل سے جھک کر اسٹاری نے فون اُٹھا کر کان سے لگایا اور دوسری جانب سے کچھ سنتا رہا۔

مجھ سمیت کبیل دادا اور شکیلہ کی یک ٹک سی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے دیکھا دوسری جانب کی گفتگو سنتے ہی اُس کے چہرے کے تاثرات متغیر ہوتے چلے گئے اور بات پوری سننے کے بعد اس نے میری جانب گھورتے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں نے کہا تھا نا شہزی! کہ میری مدد قانون کے دائرے میں ہو گی، قانون شکنی کر کے نہیں۔ تم نے قانون کو کیوں ہاتھ میں لیا؟''

اس کی بات سن کر میں ہک دک سا رہ گیا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 57

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا اور پھیلتا ایک سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک دھندلی سی جھلک یاد تھی۔ باپ سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو، کنیز شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسٹیکرم" کا ذیلی چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ دیگر ذرائع کے پیچھے دراصل ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور ہوائی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسٹیکرم کا سربراہ لولووش شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش برادرز کمیٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر لنک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ الماس کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری حد پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی شکست سمجھتا ہے، ایک تو لولووش کا سلسلہ ہے اور دوسرا شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ناوٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا بھی خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر اور غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹیکسی کا ایک افسر کرنل سی ڈی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں ایک وقت اسٹیکرم اور بلیو ٹیکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ بیرسٹر خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر لنک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرتا ہے۔ شہزی ان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ ٹائیگر لنک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی الماس کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوبارا شہزی کو ٹائیگر لنک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام سے ہوتی ہے جو کبھی اسٹیکرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موہن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولووش اور سی ڈی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوبارا کی بوٹ میں بلیو ٹیکسی کے چند ارکان، ہشام اور کوبارا آتے ہیں۔ وہ شہزی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں۔ وہاں پہلی بار بلیو ٹیکسی کے چیف سی ڈی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے۔ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت اکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا۔ تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بدمعاش، سے جی کوبارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے۔ وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل کٹھنائیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوبارا اور چند ساتھی حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی ڈی بھگوانی تھا۔ دہلی ان کی منزل تھی۔ سوہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ وہ لڑکی اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈز وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی ڈی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی ڈی بھگوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر بتا نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی ٹھٹک سا جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی ڈی بھگوانی کو تیار کرتا ہے۔ بھگوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اسی اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "گل شاہو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی ڈی بھگوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناشکور سے ہوتی ہے، جو کہ کمی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناشکور کے ہمراہ گل شاہو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جہاں جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بجھے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے جنگلیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس علاقے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو غار میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلائی کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلائی کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے جھوٹی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نو لا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو برما کے مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے۔ پھر نارتھ انڈمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گل شاہو کے قبیلے سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی رتپال داس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مقاصد کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ معاملات کے لیے گل شاہو سے مل کر یہاں قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو رتپال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے بچتے ہوئے سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ مریم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز پہلے ہی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی پر شاہ نواز خان ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ مریم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ درج کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل جانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سوہنی بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لالق لاڑکانہ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرکے خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سوہنی کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لالق کے ساتھی خان کو قابو کرلیتا ہے۔ پریل کو بچانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوہنی کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا ہے مگر رینجرز کی ایلیٹ فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت ملتان کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی ماں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، لولووش کی قید میں ہے۔ عارفہ کو گرفتار کرکے قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے۔ بظاہر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ہمراہ مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹکراؤ وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہوتا ہے۔ دو بدو لڑائی کے بعد وزیر جان کو ٹھکانے لگا کر اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے بس کرکے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرالیا گیا تھا اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اس کام کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈالف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا ہے تاکہ اسٹیکرم کے لوگوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ روڈالف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈالف مارا جاتا ہے۔ روڈالف کی دوست کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوبارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کرلیتا ہے اور طیارے کو صومالیہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے جہاں شہزی سے دو بدو لڑائی میں کوبارا جہنم واصل ہوجاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ایئرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

استاری ... کے الفاظ ہی نہیں، اس کے لہجے نے بھی مجھے حیران و پریشان کر دیا۔ اچھا بھلا دوستانہ ماحول اور ہم آہنگی والی فضا محض ایک آنے والی فون کال سے منتشر ہو گئی تھی۔۔۔ کیوں......؟

تب ہی ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں چمکا......ابھی میں نے اسے مسز ہیلسفورڈ کی پُراسرار ہلاکت اور ٹائیگر لیک وغیرہ سے اپنے چند گھنٹے پہلے ہونے والے ٹکراؤ سے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ ممکن تھا کہ استاری کو کسی ذریعے سے فون پر مطلع کیا گیا ہو کہ کورکوران جیل کی لیڈی چیف وارڈن مسز ہیلسفورڈ المعروف مادام ٹکر ہلاک کر دی گئی ہے۔

لہٰذا اب لامحالہ استاری اس کی موت کی خبر سن کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اس کے افسر کی ہلاکت میں ہمارا ہی ہاتھ ہے۔

بات کی تہ تک پہنچنے کے باوجود میں نے انجان بنتے ہوئے دانستہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں؟ ہم نے ایسی کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی......؟“

اس نے بدستور اسی طرح برہمی سے میری طرف گھورتے ہوئے اپنا سیل فون دوبارہ قدرے جھک کر سائڈ ٹیبل پر رکھا اور پھر سیدھا ہو کر چند قدم میری جانب بڑھا۔

”جھوٹ بولو گے تو ہمارے دوستانہ تعلقات شدید طور پر متاثر ہوں گے، مسز ہیلسفورڈ سے لاکھ میرے اختلاف سہی لیکن جہاں قانون کی بات ہو گی، وہاں میں دوستوں کے ساتھ بھی رعایت نہیں کروں گا۔“

”اوہو......! تم شاید مسز ہیلسفورڈ کی ہلاکت کی بات کر رہے ہو؟“ بالآخر میں نے کہا۔

”ہلاکت نہیں قتل...... ایک پولیس افسر کا قتل...... ایک بھیانک جرم ہے۔“ وہ تیز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

”تمہارے پاس آنے سے پہلے میرا اسی کی رہائش گاہ پر جانے ارادہ تھا۔“ میں نے بھی نہایت سنجیدگی سے کہا......”لیکن...... یہاں کا ماحول غیر متوقع طور پر ایسا بن گیا کہ میرے کچھ بتانے سے پہلے ہی تمہاری فون کال آ گئی۔“

اس کے بعد میں نے اسے جے بی سی سمیت ٹائیگر لیک سے ٹاکرے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ مزید اسے یہ بھی بتا دیا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کی رہائش گاہ پر نقب لگا چکا تھا ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کسی نے اسے ہلاک کر ڈالا تھا، اسی لیے ہم نے تمہاری طرف کا رخ کیا۔

یہ سن کر استاری کے مضحکہ خیز سر والے چھوٹے سے چہرے پر برہمی کے بجائے الجھن آمیز سوچوں کا جال سا تن گیا۔

”دیکھو مسٹر استاری...... تم ایک ضمیر پرست پولیس افسر ہو۔“ اس بار شکیلہ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”اس بارے میں تمہاری سوچ بھی ایک قابل لحاظ عمل ہے۔ عابدہ کے ساتھ غلط ہوا اور ہو رہا ہے۔ ہماری جنگ صرف ان بے ضمیر لوگوں کے ساتھ ہے جو حقائق کی سولی اپنے گلے سے اتار کر دوسرے کے سر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا مسٹر استاری! سچ اور حق کا راستہ روکنے والے ہماری راہ کھوٹی کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً آتے رہیں گے اور ہمیں بھی انہیں منہ توڑ جواب دیتے ہوئے مقابلہ کرنا پڑے گا۔“

”اور...... یہ بات بھی مت بھولنا استاری!“ میں نے بھی گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے صرف اپنے ذاتی مفادات کے لیے تمہاری محبوب بیوی اور معصوم بیٹی کو بھی ہلاک کر ڈالا۔ تمہیں اس کا اب تک بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس سارے خطرناک کھیل کے پیچھے صرف اور صرف جیوش لابی ہے، چاہے وہ جے بی سی کے روپ میں ہو یا پھر ٹائیگر لیک ہو۔“

”اسپیکٹرم بھی......“ کمیل دادا نے پہلی بار لب کشائی کی۔

”یقیناً۔“ میرے اور شکیلہ کے منہ سے تائیدی لفظ برآمد ہوا۔

”میں تم لوگوں کی بات سمجھ رہا ہوں۔“ بالآخر استاری نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ امریکی شہری اور عام آدمی اس خطرناک کھیل کی زد میں نہیں آنا چاہیے۔“

”گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے مسٹر استاری! کسی بڑے اور عظیم نیک مقصد میں ایسے لوگ زد میں آ ہی جاتے ہیں جن کا اس کھیل سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہوتا۔“ کمیل دادا نے مدبرانہ لہجے میں استاری سے کہا۔ تاہم پھر میں نے بھی اس سے کہا۔

”جے بی سی کے ایجنٹ نے ہمیں تمہارے متعلق کچھ سوچ کر ہی بتایا تھا کہ تم اس معاملے کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو۔ اسی لیے ہم نے یہاں کا رخ کیا تھا مگر

یہاں تم سے ملاقات کے بعد اندازہ ہوا کہ تمہاری سوچ ان سے یکسر مختلف ہے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ یہاں بھی ایک باشعور طبقہ موجود ہے جو غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتا ہے۔“

”اچھے بُرے سب جگہ ہوتے ہیں، پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں...... خیر!“ استاری بولا۔ ”نرگس یہاں موجود ہے۔ میں ذرا جا کر صورتِ حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ اس کے بعد ہی عابدہ کی تلاش سے متعلق کوئی مشترکہ لائحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ تم لوگ میری واپسی کا یہیں پر انتظار کرو۔“

استاری یہ کہہ کر ہماری صورتیں دیکھنے لگا جیسے وہ ہمارے اثباتی جواب کا منتظر ہو جبکہ کمیل دادا اور شکیلہ کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”مجھے تمہاری بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن کیا تم اتنی تسلی دے سکتے ہو مجھے کہ عابدہ کے متعلق ہماری مدد کر سکو کہ وہ اس وقت کہاں اور کن لوگوں کی گرفت میں ہو سکتی ہے؟“

”ضرور......“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اسی لیے تو ابھی میں نے کہا کہ میری واپسی کا انتظار کرو...... میں ذرا چیف وارڈن والے معاملے میں ضابطے کی کارروائی سے جان چھڑا کر لوٹ آؤں۔ جب تک نرگس تمہاری خدمت کے لیے یہاں موجود ہے۔“ پھر ذرا ٹھہر کر دوبارہ بولا۔

”بلکہ ایسا کرنا تم لوگ آرام کر لینا، مجھے لوٹنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکا تو صبح ہی تازہ دم ہو کر گفتگو کی جائے۔“

نرگس سے اس کی مراد وہی جوان اور خوبرو لڑکی تھی۔

”اوکے مسٹر استاری! ہم پھر ادھر ہی تمہارا انتظار کرتے ہیں۔“

استاری تھوڑی دیر بعد وردی پہنے، سروس ریوالور کا ہولسٹر لگائے رخصت ہو گیا۔

نرگس سے ہمیں پتا چلا کہ استاری نے حال ہی میں اس سے شادی کی تھی۔ وہ خود ایک معمولی سی ویٹریس تھی۔ اس کی ڈیوٹی جس بار کاؤنٹر میں تھی وہاں اکثر استاری آیا جایا کرتا تھا۔ جب اس کی بیوی اور بیٹی کو قتل کیا گیا تو وہ وہیں آ کر جام پہ جام لنڈھاتا اور اپنا غم غلط کیا کرتا تھا۔ نرگس کو اس پر ترس آتا تھا۔ بقول اس کے کئی بار یوں بھی ہوا کہ زیادہ پی جانے کی صورت میں نرگس ہی کو اسے سنبھالنا پڑا تھا۔ پھر غم زدہ استاری، نرگس سے اپنا دکھ شیئر کرنے لگا۔ اس کے بعد دونوں میں انڈراسٹینڈنگ بڑھی۔ نرگس کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا، سوائے ایک بوائے فرینڈ کے، اس نے بھی اسے دغا دے دیا۔ اس کے بعد اس نے استاری سے شادی کر لی۔ اب وہ ”ورکنگ لیڈی“ کے بجائے مکمل طور پر ایک ”ہاؤس وائف“ تھی۔

نرگس کی اچھی میزبانی سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ ایک اچھی ساتھی بھی ہو گی۔ تاہم وہ عام سی لڑکی تھی۔ تھوڑی ڈرپوک بھی۔ شاید اس میں اس کی کم عمری کا بھی دخل ہو۔

اس نے مجھے اچھی سی کافی پلائی تھی جبکہ کمیل دادا اور شکیلہ نے اس کے ساتھ وہسکی شیئر کی۔

ہم تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، اس کے بعد نرگس ہمیں شب بخیر کہہ کر اپنے بیڈ روم میں چلی گئی اور ہم جاگتے رہے، مقصد ہمارا یہی تھا کہ شاید استاری جلد لوٹ آئے مگر رات کافی بیت جانے اور کچھ نیند کے بوجھل پن کے سبب ہم بھی لیٹ گئے۔

☆☆☆

اگلے دن صبح دس بجے ہم جاگ اٹھے۔ نرگس سے معلوم ہوا کہ استاری صبح پانچ بجے آ گیا تھا۔

ہم غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہو گئے۔ نرگس نے بتایا کہ استاری ناشتے کی میز پر ہمارے منتظر ہیں۔ یہ اعلان کرنے کے بعد وہ ایک کھڑکی کی طرف گئی اور اس کا پردہ سرکا دیا۔ وہاں سے تازہ دھوپ کی کرنیں اندر در آئیں۔

یہی وہ وقت تھا جب بالکل غیر ارادی طور پر ہی میری نظر کھلی کھڑکی پر پڑی۔ سامنے واقع مذکورہ...... دوسری منزل کی کھڑکی پر مجھے ایک سیاہ اور سفید اسکارف میں ملبوس عورت کھڑی دکھائی دی۔ وہ شاید کوئی ”نن“ (راہبہ) تھی۔ وہ ایک ٹک اسی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اس کی جس بات نے چونکایا تھا، وہ اس کا ایک دم کھڑکی سے ہٹ جانا تھا۔ یوں جیسے چوروں کا سا انداز ہوتا ہے۔ میں اندر سے کھٹکا۔

”باہر کا نظارہ بعد میں کر لینا شیزی! بھوک لگ رہی ہے، آ جاؤ پہلے ناشتا کر لیں۔“ اچانک کمیل دادا نے مسکرا کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے کھڑکی کی طرف گھورتا دیکھ لیا تھا۔

”تم دونوں چلو میں ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کمیل دادا اور شکیلہ سے کہا۔ وہ نرگس کے ساتھ چلے گئے۔

اس کے بعد میں چند قدم اور سرکا اور کھڑکی کا ایک

پٹ ذرا سا بھیڑا۔

وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ دونوں عمارتوں کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ میں اب کھڑے ہوئے ایک پٹ کی آڑ سے اسے بغور دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے کے نقوش خاصے تیکھے تھے۔ چہرہ سرخی مائل گورا تھا۔ ایک بات نے مجھے تھوڑا چونکایا تھا۔ اس کے چہرے پر روایتی راہباؤں والا ٹھہراؤ پن اور خاموش سی بے نام اداسی والے وہ تاثرات قطعاً محسوس نہیں ہوئے جو ایک راہبہ کا خاصہ ہوتا ہے، بلکہ اس کی جگہ اس کے چہرے اور آنکھوں کی تیزی میں کھوج کی سی کیفیت تھی۔ جیسے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یکدم ہی میں کھڑکی کے سامنے آ گیا اور وہ مجھے دیکھتے ہی وہ فوراً کھڑکی سے غائب ہو گئی۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی اور میں کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گیا۔

ناشتے کی میز پر ہم اکٹھے ہوئے۔ اس کے بعد کافی پی گئی اور الگ سے نشست جمائی گئی۔ ٹریسی اپنے گھریلو امور میں مشغول ہو گئی، جبکہ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے۔ استاری نے سگریٹ سلگائی اور ایک گہرا کش لے کر بولا۔ "مسز ہنسفورڈ سے ملاقات کے لیے آنے والے جن تین رکنی افراد کو دیکھا کرتا تھا، وہ میرے لیے یکسر اجنبی تھے، لیکن ایک ایسا آدمی میری نظروں میں اسی لیے اٹک گیا جو بعد میں بھی اکیلا یا پھر بھی ایک ساتھی کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ میری نظروں میں اس کے اٹک جانے کی ایک اور وجہ بھی تھی کہ ...... وہ خاصا مغرور اور غصیلے مزاج کا آدمی تھا۔ میں نے اسے مسز ہنسفورڈ سے تیز کلامی کرتے بھی سنا تھا۔ اس آدمی کے بارے میں مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی شے ہے، ورنہ مادام کلر کا لقب پانے والی مسز ہنسفورڈ کے سامنے کوئی بھی اونچی آواز میں بات کرنے کی جرات نہیں کر سکتا ہے۔ وہ تو اپنے افسروں کے سامنے بھی منہ پھٹ مشہور تھی۔ اس کی وجہ اس کی وہ دس سالہ کارکردگی تھی جو اس نے کورکوران جیسی خطرناک جیل میں انجام دیتے ہوئے بڑے بڑے نامی گرامی مجرموں کو نکیل ڈال رکھی تھی۔

کیونکہ اس سے پہلے جو چیف وارڈن تھی، وہ ان ڈھیٹ اور اڑیل قیدیوں کی خوش گوئی، روز کی آپس میں لڑائیوں اور ہنگاموں سے سخت عاجز آ کر اپنا تبادلہ کہیں اور کروا چکی تھی، حالانکہ اس کے کریڈٹ میں بھی ایسا بہت کچھ تھا جس کی بنا پر اسے کورکوران جیسی بدنام زمانہ جیل بھیجا گیا تھا۔

پھر اس کے بعد مسز ہنسفورڈ کو بھیجا گیا اور اس نے آتے ہی تمام قیدیوں کو ایسی نکیل ڈالی کہ وہ اس کے نام سے خوف زدہ رہنے لگے۔ کورکوران جیل کی ساری بدنامی دُھل گئی اور مادام کلر کی ہر جگہ واہ واہ ہونے لگی۔ خیر یہ تو برسبیل تذکرہ رہا۔"

استاری اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا، میری نظریں اس کے خوبانی جیسے سروالے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ آگے بولا۔

"میں بتا رہا تھا کہ جو لوگ عابدہ کو خفیہ طور پر جیل سے لے جانے کے لیے مسز ہنسفورڈ کو رضامند کرنے یا اس سے ساز باز کرنے کے لیے آتے تھے، ان میں سے ایک آدمی سے میرا بعد میں اچانک سامنا ہوا تھا جو میری نظروں میں اٹکا رہا تھا۔ اس اکھڑ مزاج آدمی کا نام گون برگ ہے۔ یہ اپنے دو رکنی وفد کو لیڈ کرتا تھا۔"

"تمہیں اس ساری حقیقت کا کیسے علم ہوا تھا مسٹر استاری؟" شکیلہ نے سوال کیا۔ "میرا مطلب ہے گون برگ وغیرہ اور عابدہ سے متعلق؟ کیونکہ بقول تمہارے، یہ سب تم سے خفیہ رکھا جا رہا تھا؟"

"خفیہ صرف اس حد تک تھا کہ ابھی انہوں نے عابدہ سے متعلق رازدارانہ طور پر مسز ہنسفورڈ تک ہی معاملات رکھے تھے۔ ظاہر ہے یہ معاملہ ایسا تھا کہ میری بھی اپنی حیثیت کورکوران میں کم نہیں تھی۔" وہ جواب میں بولا اور آگے بتانے لگا۔

"مسز ہنسفورڈ کو ان لوگوں نے خطیر رقم دینے کا لالچ دیا تھا۔ ممکن ہے دھمکیاں بھی دی ہوں۔ ویسے رشوت اور بدعنوانی کے معاملات میں مسز ہنسفورڈ کم نہیں تھی۔ ان کی مسز ہنسفورڈ کی رہائش گاہ میں بھی خفیہ میٹنگز وغیرہ ہوتی رہتی تھیں۔ جب لامحالہ یہ بات میرے علم میں آئی اور میں نے رخنہ اندازی کی تو گون برگ نے مجھے بھی پیسوں کا لالچ دیا، میں نے ان کی پیشکش ٹھکرا دی۔ نتیجے میں ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا، وہ میں تم لوگوں کو بتا چکا ہوں۔"

"تم گون برگ کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں!" وہ بولا۔ "اس دن کے بعد سے ہی میں اس ٹوہ میں تھا کہ کم از کم میں انہیں پہچاننے کی استطاعت حاصل کر لوں کہ آخر یہ لوگ ہیں کون؟ جبکہ مبینہ طور پر یہ لوگ خود کو ایک حساس ادارے کے رکن بتاتے تھے۔ ادھر

میں ان کے بارے میں کھوجنے کی کوشش میں تھا کہ اچانک ایک کلب میں مجھے گون برگ دکھائی دے گیا۔ میں اس کے پیچھے لگ گیا اور جلد ہی میں نے ان لوگوں کی حقیقت جان لی۔

یہ لوگ درحقیقت مشترکہ طور پر جیوش بزنس کمیونٹی اور سی آئی اے کے ایک ایڈوانس گروپ ٹائیگر لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ سی آئی اے کا یہ ونگ (ٹائیگر لیگ) دراصل اندرون خانہ یہودیوں اور اسرائیل کے عظیم تر خفیہ مفادات کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس لیے کہ ان کا سربراہ بھی جس کا نام باسکل ہولارڈ ہے، ایک امریکی نژاد یہودی ہے۔"

استاری اتنا بتا کر خاموش ہوا پھر اس نے کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے پُرغور لہجے میں مزید کہنا شروع کیا۔

"میں نے ان کا معاملہ بگاڑا تو گون برگ نے مجھے لالچ دیا اور دھمکی بھی مگر میں نے مسز ہنسفورڈ کے برعکس ان کی پیشکش ٹھکرا دی اور دھمکی کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کے چند روز بعد...... ہی میرے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ میری بیوی اور بیٹی کو ہلاک کرنے والا ماسٹر مائنڈ گون برگ ہی ہے۔ میں اس کے پیچھے لگا اور اس کی حقیقت جانی تو صدمے کا شکار ہو گیا، کیونکہ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ ایک لمبا کھیل ہے، اگر میں ان کے پیچھے لگا تو یہ میرا بھی میری بیوی اور بیٹی جیسا حشر کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ یہ دھمکی بھی مجھے انہوں نے دے رکھی تھی لیکن جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ بیوی اور بیٹی کے مرنے کے بعد مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی اور اب بھلا میں ان کی راہ کیوں سیدھی کرتا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ انہیں اب انتقامی طور پر ہی سہی عابدہ کے سلسلے میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا، مگر پھر میں نے سوچا کہ اس طرح تو میں بھی ہلاک کر دیا جاؤں گا، یہ اپنا کام پھر بھی کر جائیں گے۔ تو کیوں نا کوئی اور چال چلی جائے۔ لہٰذا میں نے بظاہر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔

عابدہ غائب کر دی گئی۔ میں ان کی کھوج میں لگ گیا لیکن جیسے ہی مجھے ان کی حقیقت کا علم ہوا میں اپنا دل مسوس کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ تو واقعی امریکا کے حساس ادارے سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار کے اسے ملکی مفاد کا نام دیتے تھے۔ حالانکہ مفاد اس میں صرف اسرائیل اور یہودیوں کا کارفرما ہوتا تھا۔

پھر بھی میں نے گون برگ کا ٹھکانا، اس کے رابطے، کہاں آتا جاتا ہے، سب جانچ لیا۔ یہ ایسا آدمی ہے، جو ٹائیگر لیگ کے سربراہ باسکل ہولارڈ پر بھی حکم چلانے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ باسکل ہولارڈ کو ٹائیگر لیگ کا سربراہ بنانے میں جے بی سی کا ہی ہاتھ ہے اور وہ انہی کے مفادات کے لیے کام کرتا ہے، جبکہ خود گون برگ جے بی سی کے سربراہ کا نائب ہے اور جے بی کمیونٹی میں اسے نمبر دو کی حیثیت حاصل ہے۔"

وہ اتنی تفصیل بتا کر چپ ہوا تو میں خاموش نہیں رہ سکا۔ "ہم م م ...... اس کا مطلب ہے گون برگ اب ہمارا اصل ٹارگٹ ہوا جو آنسہ خالدہ اور عابدہ کے بارے میں مجھے ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہے۔"

"بالکل" استاری بولا۔

"مجھے ابھی اس کا پتا اور اس کے ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ جہاں اس کے معمولات گزرتے ہیں۔" میں نے فوراً کہا۔ عابدہ کی بازیابی کے سلسلے میں اصل آدمی کا پتا چلتے ہی میرا رُواں رُواں متحرک ہو گیا تھا۔

"ریلیکس ...... مسٹر شہزی! ریلیکس ......" استاری بولا اور ٹریسی کو آواز دی، پھر کھیل داوا اور شکیلہ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کون سی پیو گے تم دونوں ...... ؟"

اتنے میں ٹریسی آ گئی۔

"مالٹ وہسکی ......" کھیل داوا نے کہا۔

"اور ...... برنچ واٹر بھی، کیوبس کے ساتھ ......"

شکیلہ نے بھی گرہ لگائی۔

"اور ...... مسٹر شہزی! آپ کیا لیں گے؟" ٹریسی نے ہلکی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔

"زحمت نہ ہو تو پتا والا دو ایک کپ ......" میں نے کہا۔ (پتا والا ایک قسم کی چائے تھی) وہ چلی گئی۔

کچھ ثانیوں کے لیے گفتگو میں وقفہ آیا تو میرے ذہن میں پھر وہی گرجا کی کھڑکی والی جوان اور حسین راہبہ گھوم گئی۔

"جب تک تم اس کے ٹھکانے تک پہنچنے کی کوشش کرو گے، وہ تمہارے سر پر پہنچ جائے گا۔" اچانک استاری نے میری طرف دیکھ کر کہا اور میں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اس نے اپنی حفاظت اور اپنی ریکی کرنے والوں کے پیچھے درجنوں آدمی چھوڑ رکھے ہیں جو سب کے سب تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں، ان میں کوئی تمہیں بارٹینڈر کے روپ میں ملے گا تو کوئی حسین ویٹرس کے روپ میں۔ حتیٰ

کے کسی فٹ پاتھ یا چوراہے پر کھڑا خاموشی سے گٹار بجاتا ہوا بیگر (فقیر) بھی ..... جیسے انہیں یہ بھنک پڑے گی کہ تم کون برگ کا پیچھا کر رہے ہو، وہ محتاط ہو جائیں گے۔"

"میرا خیال اس طرح کے رسک تو ہمیں لینا ہی پڑیں گے۔" شکیلہ نے بہ ظاہر عام سے لہجے میں کہا مگر میں اس کے چہرے کے تاثرات اور لب و لہجے میں بھی خفیف سی لرزش کو محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ یہی بات بتاتی تھی کہ خود میں بھی کون برگ کی اس قدر محتاط پسندی پر اندر سے پریشان سا ہوا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ استاری، کون برگ کو کوئی ہوا بنا کر پیش کر رہا تھا مگر وہ اس کا زخم کھایا ہوا تھا اور اسے جانتا تھا۔

"تم پھر کیسے بچے رہے؟" اچانک جانے کس خیال کے تحت کمیل دادا نے استاری سے کہا۔ "تم بھی تو کون برگ کی ریکی کرتے رہے۔ جبھی تو اس کے مختلف ٹھکانوں سے واقفیت حاصل ہوئی ہے تمہیں؟"

کمیل دادا کا سوال برمحل تھا لیکن میں نے دیکھا استاری کے چہرے پر اسرار بھری مسکراہٹ عود کر آئی تھی جس کی تہ میں تلخی کا شائبہ محسوس ہوا۔ وہ اسی لہجے میں بولا۔

"اسی لیے تو یہ سب تم سے کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ اس بدبخت نے ایک دن اچانک میرے روبرو آ کر جارحانہ انداز میں اپنی اور میری ناک سے ناک ملا کر بڑے زہریلے لہجے میں دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے دوبارہ اس کی ریکی کرنے کی ذرا سی بھی حماقت کی تو..... لمحے کی بھی دیر کیے بغیر میری ذات ماضی کا حصہ بن جائے گی۔"

استاری کے اس جواب کے بعد ایک دم کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں نرگس آ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بڑی سی ٹرے تھی۔ وہ اس نے بیچ میں رکھی تپائی پر رکھ دی۔ اپنے شوہر کے لیے وہ شمپین کا پیگ بنا لائی تھی جو اس نے اسے تھما دیا۔ کمیل دادا اپنے اور شکیلہ کے لیے مالٹ وہسکی کے پیگ بنانے لگا۔ میں نے کپ اٹھا لیا۔

استاری نے ایک گھونٹ بھرا اور اسی وقت اس کا سیل گنگنایا۔

"پلیز ڈارلنگ!" اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے نرگس سے کہا۔

"شیور۔" وہ مسکرائی اور سیل اٹھا کر اسے تھما دیا۔

"ہیلو۔" اس نے سیل اپنے کان سے لگاتے ہوئے گمبھیر آواز میں کہا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ ست کر رہ گیا۔ ہم تینوں کی نظریں اس کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

میں نے دیکھا، اس کے چہرے کی ساری گمبھیرتا دوسری جانب سے ہونے والی ایک ذرا سی آواز پر فرو ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ خوف اور تشویش نے لے لی۔ اس کا چہرہ بھی یکایک پسینے سے تر ہو گیا، چھوٹی چھوٹی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

یہی نہیں اس کے ایک ہاتھ میں تھما ہوا شمپین کا بلوریں پیگ بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا، تپائی سے ٹکرایا اور چھناکے سے ٹوٹ کر کرچیوں کی صورت قالین پر بکھر گیا۔

"نن... نہیں... وہ... وہ... میری بیوی سے کچھ رشتے دار ہیں۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر کون!" اس نے جواب میں کپکپاتے جملے ادا کیے اور اس کے منہ سے کون... سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اعصاب اس قدر تن گئے کہ جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ شکیلہ کی آنکھیں مزید کشادگی کا منظر پیش کرنے لگیں جبکہ کمیل دادا کے چہرے پر یکایک سناٹا طاری ہو گیا۔

"نن... نہیں تو، مسٹر کون! ام... میں تو بالکل ٹھیک ہوں، وگگ..... کچھ نہیں تو تا۔ آ..... آپ ایسا کریں آ کر تصدیق کر لیں۔" استاری کی حالت بدستور پتلی ہو رہی تھی۔ کہاں تو میں اسے ایک دبنگ افسر سمجھے ہوئے تھا مگر کون برگ سے بات کرتے ہوئے وہ ایک دم بھیگی بلی نظر آنے لگا۔ یوں جیسے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔

اس کے جواب پر میں نے یہ اندازہ ٹھیک لگایا تھا کہ دوسری جانب کون برگ نہ صرف اس کی حالت غیر سے بلکہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرنے والے شیشے کے گلاس کے ٹوٹنے کی آواز بھی سن چکا تھا۔

دوسری جانب سے شاید آخری بار اس سے کچھ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا گیا اور استاری ... نے سیل فون تپائی پر رکھا اور اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہمیں خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا، پھر کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اسی طرح دوسری کھڑکی کی طرف گیا اور پردہ ذرا سا ہٹا کر جھانکا۔ اس کے بعد واپس ہماری جانب بڑھا۔

اس دوران میں میرا دل ایک خیال سے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گرجا کی کھڑکی والی جوان راہبہ کا چہرہ ایک بار پھر میری نظروں کے سامنے گردش کرنے لگا تھا۔

وہ بُری طرح بوکھلایا ہوا اور حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔ "اس کم بخت نے تو میری رہائش کا بھی ریکی کر رکھی ہے۔ اس کے آدمیوں نے اسے بتا یا ہے کہ چند افراد یہاں موجود ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مسٹر استاری؟" میں نے کہا۔ "مگر تمہیں اتنا حواس باختہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ کون کو کچھ نہیں معلوم کہ یہاں تمہارے اور تمہاری بیوی کے علاوہ اور کوئی لوگ بھی موجود ہیں، لیکن تم نے اس کے خوف میں یہ بتا ڈالا کہ اس کے کارکنوں کی رپورٹ درست ہے۔"

میری بات سن کر استاری کا منہ کھل گیا۔

"تت... تمہیں بھلا اس بات کا کیسے اندازہ ہوا؟"

"شاید تم پر کون برگ کا کچھ زیادہ ہی خوف سوار ہے مسٹر استاری!" میں نے کہا۔ ان حالات میں میرا یوں طمانیت بھرا انداز استاری کو ہی نہیں بلکہ کمیل دادا اور شکیلہ کو بھی چونکا گیا تھا۔

"ہاں! وہ ایسا ہی قسائی نما ایک شیطانی گھوسٹ ہے۔" استاری قدرے جھلا کر بولا۔ "لیکن میں خوف زدہ نہیں ہوں، میں اُسے مار کے مرنا چاہتا ہوں۔"

"مایوسی کی باتیں مت کرو استاری!" میں نے اس کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے کہا۔ "تم اس سے انتقام بھی لو گے اور زندہ بھی رہو گے۔ اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کون برگ کو کیسے یہ پتا چلا کہ یہاں تمہارے اور نرگس کے علاوہ اور کون لوگ ہیں۔ سب میرے ساتھ آؤ۔"

کہتے ہوئے میں اس کمرے میں آ گیا اور سامنے والی کھڑکی دکھائی۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا اور کھڑکی بند تھی۔

"تمہارے اس ڈپلیکس کی بہت پہلے سے نگرانی کی جاتی رہی ہے۔" میں نے اس کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے استاری سے کہا۔ "جیسا کہ تم نے ابھی بتایا کہ کون کے جاسوس کیڑوں مکوڑوں کی طرح دیواروں سے چپکے ہوئے ریکی کرتے ہیں، ابھی ناشتے سے پہلے سامنے گرجا والی کھڑکی پر میں نے ایک جوان اور حسین راہبہ کو مشکوک انداز میں اس طرف گردن جھکا جھکا کر دیکھتے پایا تھا۔"

میں نے کھڑکی بند کر دی اور ان کی طرف گھوما۔

"اب مجھے یہ بتاؤ کون برگ نے تمہیں کیا جواب دیا ہے؟" ابھی میں نے اس سے اتنا ہی پوچھا تھا کہ اچانک بیل بجی۔ ہم سب چونک گئے۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہولے سے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پھر استاری کی طرف دیکھ کر سوال دہرایا۔

"وہ..... وہ..... اپنا کوئی آدمی یہاں بھیجنے کا کہہ رہا

کیا آپ
لبوب مقوی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے۔ اعصابی کمزوری دور کرنے۔ ندامت سے نجات، مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے۔ کستوری، عنبر، زعفران جیسے قیمتی اجزاء سے تیار ہونے والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ یعنی ایک انتہائی خاص مرکب خدارا۔۔۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مقوی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے اور خاص لمحات کو خوشگوار بنانے کیلئے۔ اعصابی قوت دینے والی لبوب مقوی اعصاب۔ آج ہی صرف ٹیلیفون کر کے بذریعہ ڈاک VP وی پی منگوالیں۔

المسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک کریں

تھا، شش...... شاید وہی آیا ہے۔" استاری بولا۔

"اوکے۔ تم جاؤ اور دروازہ کھولو، ہم سب اسی طرح آرام سے لاؤنج میں بیٹھتے ہیں جیسے تھوڑی دیر پہلے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ٹریسی تم بھی آؤ، ڈرو نہیں، معاملہ خراب ہوا تو میں اور میرے ساتھی سنبھال لیں گے۔"

ہم سب لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ استاری دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے سب کو نارمل نظر آتے رہنے کی تاکید کرتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

"دیکھو! یہاں کوئی خون خرابا نہ ہونے دینا، جو کچھ ہو وہ ہونے دینا، مجھ پر بھروسا رکھو میں بعد میں صورت حال سنبھال لوں گا۔"

میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ کر اپنے شانے اچکا دیے اور کمیل دادا اور شکیلہ کو آنکھ کا مخصوص اشارہ کر دیا۔ پھر ہم بیٹھ گئے۔ میں دانستہ کرسی کو ایسے رخ پر کر کے بیٹھ گیا تھا کہ دروازے پر بھی نگاہ رکھ سکوں۔

استاری نے دروازہ کھولا۔ میں اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بظاہر کھلنڈرے انداز میں پھیل کر بیٹھ گیا اور استاری کی چھوڑی ہوئی خالی کرسی پر اپنی ایک ٹانگ مخصوص انداز میں رکھ لی۔ تاکہ بوقتِ ضرورت اسے ٹانگ کے ہی زور پر اچھال سکوں۔ ساتھ ہی میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی انگشتری میں پہنی ہوئی سانپ والی انگوٹھی کو یونہی چھیڑا اور جیب میں رکھے سنہری بھونرے کی موجودگی کا اطمینان کیا۔

میرے یہ دونوں خلائی ہتھیار اپنی پیاس بجھانے کے لیے تیار تھے۔

کمیل دادا اور شکیلہ کی نظریں دروازے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

"جب تک میں کوئی حرکت نہ کروں، تم دونوں اسی طرح کُول ہو کے بیٹھے رہنا۔" میں نے ان دونوں سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔ ٹریسی کو میں نے آنکھ کے اشارے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

یکایک ماحول میں کھنچاؤ اور سنسنی کی سی فضا طاری ہو گئی۔

استاری نے دروازہ کھولا اور اس نے جیسے اندر در آنے والے کو فوراً ہی چند قدم پیچھے ہٹ کر راستہ دیا، اگلے ہی لمحے ایک شخص غڑاپ سے اندر داخل ہوا۔ اس نے کوٹ پتلون اور سر پر ہیٹ پہن رکھا تھا۔ وہ ایک دراز قامت اور قدرے چوڑے شانوں والا آدمی تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے چابک دستی اور نہایت محتاط پسندی ہویدا تھی۔

ہم تینوں اس کی طرف گردن گھما کر بناوٹی حیرت سے تکنے لگے۔ اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف رینگ گیا۔ میری سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر جیسے نسیں تک دھڑکنے لگیں۔

وہ اسی طرح کھڑا ایک ٹک ہم تینوں کو گھورنے لگا اور ہم بھی اسی طرح اس کی طرف اجنبی سی حیرت سے تکتے رہے۔ اس کا کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف رینگتا ہوا ہاتھ وہیں ٹھہر چکا تھا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس کا انداز تحکمانہ تھا۔

"بروجر! گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک ذمے دار ادارے کے افسر ہیں، میری طرح انہیں شبہ ہوا کہ کچھ لوگ یہاں ..."

"یو شٹ یور ہول ..." اس آدمی نے استاری کو جھڑک کر چپ کرا دیا اور ماؤتھ (منہ) کی جگہ "ہول" کا لفظ حقارت کے اظہار میں استعمال کیا۔

استاری نے میری طرف دیکھ کر جو کہنے کی کوشش چاہی تھی، میں اس کا اشارہ بھانپتے ہی اس نوارد سے بولا۔

"میں بروجر ہوں اور اپنی کزن ٹریسی سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا۔

"اور یہ کون ہیں دونوں ...؟" اس آدمی نے بارعب آواز میں پوچھا۔ اس کا اشارہ کمیل دادا اور شکیلہ کی طرف تھا۔

"یہ میرے دوست ہیں، مسٹر پاشا اور وہ خاتون ان کی گرل فرینڈ ہیں، مس لیلیٰ۔" میں نے ہموار آواز میں کہا۔

میں نے دانستہ کمیل دادا اور شکیلہ کو غیر ملکی ظاہر کیا تھا۔ ایک تو وہ دونوں لگتے بھی ایشیائی مسلم تھے جبکہ میرا معاملہ اور تھا۔ مگر وہ سوٹ پوش میرے لہجے کو بھی تاڑ کر چبھتی ہوئی آواز میں بولا۔

"لہجے سے تو تم بھی غیر ملکی لگتے ہو؟"

"میں لندن میں پیدا ہوا، پھر تھوڑا عرصہ یہاں رہا۔" میں نے جیسے اس کے سامنے سبق رٹنا شروع کر دیا۔ "ٹریسی کی شادی کے بعد میں نوکری وغیرہ کے سلسلے میں دوبارہ لندن چلا گیا۔ وہاں نوکری کی مگر تنخواہ کی مد میں ٹیکس اس قدر زیادہ دینے کرنا پڑتا تھا کہ ایک دوست کے مشورے سے دیگر گوروں کی طرح مڈل ایسٹ چلا گیا، وہاں تنخواہ زیادہ تھی اور ٹیکس نہ ہونے کے برابر اس کے بعد ..."

"بکواس بند کرو اپنی اور تینوں اپنے ہاتھ کھڑے کر کے دیوار کی طرف منہ کر لو۔"

وہ میری تقریر پر چڑتا ہوا بولا اور خوفناک نال والا پستول نکال لیا۔ میں نے بھویں سکیڑ کر اس کے پستول کا جائزہ لیا۔ وہ اسے ٹویوزی تھا۔ ایک خطرناک پستول اس کی نال لمبی تھی بلکہ سائلنسر لگا کر لمبی کی گئی تھی۔ وہ اس نے ایک طرف ہم تینوں پر تان لی پھر دوسرے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنے کوٹ کا کالر چھو کر منہ قریب کیا اور جلدی سے شارٹ لینگویج میں کچھ کہا۔

اس کے چند ہی لمحوں بعد کمرے میں مزید دو افراد آ گئے۔ ان دونوں کو دیکھ کر یقیناً میں ہی نہیں وہاں موجود سب ہی چونکے تھے کیونکہ وہ مرد و عورت تھے۔ مرد کسی چرچ کے "پادری" والے لباس میں تھا جبکہ اس کے ساتھ کھڑی خوبصورت سی عورت نے سر سے پاؤں تک راہباؤں والا چغا اوڑھ رکھا تھا۔

ایک جھٹکے سے اپنے دونوں ہاتھوں کو مخصوص حرکت دے کر دونوں نے ہی اپنے اپنے لبادے اتار کر نیچے گرا دیے۔

ان کے اندر سے اب دو چست و چالاک افراد نمایاں تھے۔ عورت کو دیکھ کر میں پہلے ہی ایک سرد سی سانس بھر کر رہ گیا تھا۔ یہ وہی گرجا کی کھڑکی والی "نن" تھی۔

"مسی! پہلے اس لڑکی کی تلاشی لو۔" ایک نے تحکمانہ انداز میں اپنی راہبہ والی ساتھی سے کہا۔ وہ آگے بڑھی اور شکیلہ کو پیچھے سے دبوچ کر ایک طرف لے گئی اور اس کی جامہ تلاشی لے ڈالی۔ پھر دراز قامت ساتھی کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس آدمی پر کون کا شبہ ہوا تھا، میں الجھ سا گیا۔

"اوکے ...!" اس نے کہا اور دوسرے ساتھی سے تحکمانہ بولا۔

"روبڈ! اس گرانڈیل آدمی کی تلاشی لو۔" اس کا اشارہ کمیل دادا کی طرف تھا پھر کمیل دادا نے بھی اپنی تلاشی دے دی۔

"ہمم ..." دراز قامت نے ہنکاری بھری اور یوزی کی نال سے میری طرف اشارہ کیا تو وہ آدمی اب کمیل دادا کو چھوڑ کر میری جانب بڑھا۔

میری تلاشی کے دوران وہ سنہری بھونرا اس کے ہاتھ لگنا یقینی امر تھا۔ پھر کیا ہونے والا تھا ......؟ یہ ہر گزرتے لمحات کی اسرار بھری سرگوشی کہہ رہی تھی کہ اب وہی کچھ ہونے والا تھا جس کی منت استاری نے مجھ سے کر رکھی تھی۔

لیکن میرا دھیان اس چوڑے شانوں والے یوزی تھامے شخص کی طرف بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ کون برگ ہی تو نہیں؟ جبکہ استاری یقیناً اسے جانتا ہوگا مگر .... وہ اس کے بارے میں مجھے ابھی بتا نہ سکا تھا۔

وہی ہوا ... میری تلاشی لینے کے دوران وہ بھونرا اس کے ہاتھ لگ گیا۔ وہ اس نے اپنی انگلیوں میں پکڑ کر اپنے چہرے کے قریب کیا اور آنکھیں سکیڑ کر بغور دیکھنے لگا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ اگر اس کی کسی انگلی نے بھونرے کے بائیں پر کو چھو لیا اور وہ ذرا سا بھی "پش" ہو گیا تو وہ کس قدر بھیانک اور اذیت ناک موت کا شکار ہو سکتا۔

"یہ کیا شے ہے؟" اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

"یہ ......" میں نے کہتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ چھونے کے انداز میں بھونرے کی طرف بڑھایا تو اس نے جھڑک کر مجھے حرکت کرنے سے روک دیا۔

"یہ میری گرل فرینڈ کی نشانی ہے۔"

"کیا ہے روبڈ؟" معاً یوزی والے نے بلند آواز سے اپنے ساتھی کو پکارا۔

"پتا نہیں کیا شے ہے یہ۔" روبڈ نے بظاہر بے ضرر مگر دنیا کے خطرناک ترین ہتھیاروں میں شمار ہونے والے اس عجیب اور انوکھے ہتھیار کو چند قدم آگے بڑھ کر اسے تھما دیا۔ مجھے بدستور دیوار کی جانب منہ کیے کھڑے رہنے کا حکم ملا۔

اب شاید وہ یوزی والا ... اس سنہری بھونرے کو اپنے ہاتھ میں لیے دیکھ رہا تھا اور میری کنپٹیاں سنسناتی رہیں۔ میرا منہ بدستور دیوار کی طرف تھا۔

اچانک مجھے روبڈ کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کک ...... کیا ہوا تمہیں ...؟" اس نے شاید یوزی والے کو مخاطب کیا تھا۔

"اوہ ...... مائی گاڈ! ...... وولف! تمہیں یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہ متوحش سی آواز ان کی ساتھی مسی کی تھی اور وولف شاید وہی یوزی والا تھا اور ان کی متحیرانہ آوازوں نے پل کے پل مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ وولف کی کسی انگلی نے بھنورے کے بائیں پر کو نہ صرف چھو لیا تھا بلکہ اسے نادانستگی میں ہلکا سا دبا بھی دیا تھا۔

میں پلٹا اور ایک متوقع منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یوزی والا وولف ... ہنوز وہ بھونرا اپنے ایک ہاتھ میں پکڑے، اسے اپنے چہرے اور آنکھوں کے قریب کیے ایک

مرحبا اسپغول
SINCE 1975
ISPAGHOL
MARHABA ISPAGHOL
MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.
/marhabalaboratories.pk | UAN: 111-182-182 | www.marhaba.com.pk

تک تکتے رہنے پر مجبور ہو چکا تھا اور اس کی آنکھیں پھیل چکی تھیں۔

بھونرے کے پر برق رفتاری سے متحرک ہو چکے تھے۔ اس کی مہیب بھنبھناہٹیں ووف..... کی دماغی نسوں اور غیر مرئی دوڑتی رو کو اپنے مسمرائزڈ پاور سے جھنجوڑنے لگی تھیں، آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں، اس کے دونوں ساتھی روبڈ اور مسی خود اس اچانک اور عجیب و غریب صورتِ حال سے بوکھلائے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پھر یوزی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گری اس کے بعد بھونرا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر وہ خود اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبائے فرش پہ ڈھیر ہو گیا۔

روبڈ اور مسی اسے سنبھالنے کی کوشش میں تھے۔ استاری کا منہ حیرت کے شدید ترین تاثرات سے کھلا ہوا تھا۔

اسی وقت روبڈ پھرتی کے ساتھ میری جانب متوجہ ہوا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے کوٹ کے اندر بڑھا، عین یہی حرکت گویا خطرہ محسوس کرتے ہی مسی نے بھی کرنی چاہی تھی کہ پھر مجھ سمیت کھیل دادا اور شکیلہ کو بھی حرکت میں آنا پڑا۔

شکیلہ نے اپنی جگہ سے اچھل کر مسی پر کسی وحشی جنگلی بلی کی طرح جھپٹا مارا تھا اور اسے کوئی ہتھیار نکالنے کا موقع دیے بغیر اس سمیت زمین بوس ہوتی چلی گئی۔ کھیل دادا اور میں نے بیک وقت روبڈ کو ایک ہی جست میں جا دبوچا اور پستول نکالتے اور باہر آتے آتے وہ روبڈ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اسی وقت میری سماعتوں نے مسی کی گھٹی گھٹی مگر اذیت ناک چیخ سنی، بالکل ایسی ہی چیخ جو ہوش و حواس سے بیگانہ ہونے سے صرف ایک ثانیے کے لیے حلق سے اُبلتی ہے۔

ادھر میں نے اپنے دائیں ہاتھ کا ایک عدد پنچ روبڈ کی ناک پر رسید کر کے اسے کھیل دادا کے لیے کمزور کر کے چھوڑا اور خود جھک کر، ووف کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گرے ہوئے بھونرے کو اُچک لیا۔

ووف... شاید اس مہلک بھونرے کی زد میں آ چکا تھا بلکہ "شکار" ہو چکا تھا۔ بھونرے کی ننھی سی آنکھوں مگر قدرے ابھرواں آنکھوں سے مترشح ہونے والی اُن دیکھی مہلک لہروں نے ووف کی دماغی نسیں چٹخا ڈالی تھیں۔ اب اس کے منہ، کان اور ناک سے خون کی لکیریں بہہ نکلی تھیں۔

اسی وقت کھیل دادا نے شاید کوئی داؤ آزمایا تھا اور روبڈ مجھ سے آن ٹکرایا۔ اگلا لمحہ میرے دائیں بازو کے حرکت میں آنے کا تھا، میں نے اسے دبوچا اور انگوٹھی اس کی گردن سے لگا کر مخصوص حرکت دی۔ اس پر نگینے کی جگہ لگے ہوئے سانپ کے پھن نے مہلک شعاعوں سے ڈس لیا۔ روبڈ کا جسم پل کے پل بے حس و حرکت ہو گیا۔

ادھر مسی شکیلہ کے قابو میں نہیں آ رہی تھی، حالانکہ اس کی ہیئت کذائی بتا رہی تھی کہ شکیلہ نے اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ اگرچہ شکیلہ بھی نڈھال سی ہو رہی تھی اور اس کے نچلے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ شاید یہ مسی کے پاؤں کی کسی ضرب کا شاخسانہ تھا۔

پھر ایک موقع پر جب میں نے کھیل دادا کو شکیلہ کی مدد کے لیے اشارہ کیا تو اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ وہ مسی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اس نے شکیلہ کو موقع پاتے ہی ایک ٹھوکر رسید کی کہ وہ کھیل دادا سے جا ٹکرائی، وہ اسے سنبھالتے سنبھالتے رہ گیا جبکہ مسی نے راہِ فرار اختیار کی اور لومڑی کی طرح دروازے کی جانب جست بھری۔

مسی کی یہ ایسی بہ سرعت حرکت تھی کہ میں بھی اسے دروازے کی طرف گویا ہوا کی رفتار سے جاتے دیکھتا رہ گیا۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب ہلکی "چرز" کی آواز ابھری اور مسی کے حلق سے برآمد ہونے والی آخری چیخ بڑی کرب ناک تھی۔ گولی اس کی گردن میں شہ رگ کو چیر گئی تھی۔ وہ کسی چھپکلی کی طرح چت سے گری اور ٹھنڈی پڑ گئی۔

استاری کے ایک ہاتھ میں پستول نظر آ رہا تھا۔ اس کی نال سے دھوئیں کی لکیر لہراتی دکھائی دی۔ اس نے موقع پاتے ہی ووف کے سائلنسر لگے پستول سے مسی کو گولی مار دی تھی۔

"میں یہ سب نہیں چاہتا تھا مگر افسوس....." وہ بوجھل پن سے بولا اور ایک کھڑکی کی جانب بڑھا، وہاں سے اس نے ذرا سا پردہ ہٹا کر نیچے کہیں جھانکا اور پھر بولا۔

"ان کی لاشوں کو اب خفیہ طور پر ٹھکانے لگانا ہوگا۔ لیکن..." اس نے اپنی بات قطع کرتے ہوئے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مسٹر شہزی! یہ اس ووف کے ساتھ تم نے کیا کیا تھا؟" اسے ابھی یاد آیا تھا مگر میں اسے بھونرے والی کارستانی بتانا نہیں چاہتا تھا، کندھے اچکا کر انجان پن کے بولا۔

"میں کیا جانوں؟ شاید اسے دل کا دورہ پڑا ہو۔"

"نہیں، وہ تمہاری جیب سے برآمد ہونے والی کوئی شے غور سے دیکھ رہا تھا، تب ہی اس کی یہ حالت ہوئی تھی اور ... اور یہ روینڈ بھی بالکل عجیب ہی طریقے سے تمہارے ہاتھوں مرا۔"

"ہاں! وہ تو اس کا ساتھی رویڈ بھی دیکھ رہا تھا جس نے وہ شے میری جیب سے برآمد کی تھی، اسے تو کچھ نہیں ہوا تھا؟ مگر بعد میں، میں نے اس کی رگ حساس مسل ڈالی تھی۔" میں نے تاویل دی۔ وہ الجھ گیا۔ اسی موقع پر کھیل دادا نے بات آئی گئی کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"مسٹر استاری! ہمیں بلا دیر اپنا کام نمٹانا ہوگا۔" اس کی بات پر وہ اپنی الجھن سے چونکا اور بولا۔

"آں ... ہاں! میں گاڑی نکالتا ہوں۔ تمہارا کوئی ایک ساتھی میرے ہمراہ چلے گا، یہاں دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک جھیل ہے، ان لاشوں کو وہیں پھینکنا ہوگا۔"

"کھیل دادا! تم اس کے ساتھ جاؤ۔ ہم ادھر ہی رکتے ہیں۔" میں نے کھیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

استاری کی بیوی ٹرلیسی ہراساں نظر آرہی تھی، مگر استاری نے اسے تھوڑا جھڑکتے ہوئے حوصلہ دیا اور اس سے کچھ کہا، وہ قریب کے کمرے میں چلی گئی۔

"ذرا کمزور دل کی مالک ہے، سہم گئی ہے بے چاری!" استاری نے قدرے خجالت سے کہا۔

"میری کوشش تھی کہ ان میں سے کوئی ایک زندہ رہتا۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"اس کا کیا فائدہ تھا؟ وہ بعد میں ہمارے لیے مصیبت بن سکتا تھا۔" استاری نے کہا۔

"ہم اس سے عابدہ وغیرہ کے متعلق کچھ اگلوانے کی کوشش کرتے۔"

"ان میں سے کوئی بھی تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔" استاری بولا۔ "میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ عابدہ اور آنسہ خالدہ کے متعلق صرف ایک ہی شخص حقیقت اگل سکتا ہے اور وہ ہے گون برگ ......"

"ہم ......" میرے منہ سے پُرسوچ انداز میں برآمد ہوا۔ "مگر وہ ہمیں کہاں ملے گا؟" میں نے آخر میں اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ویسے تم اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتا تو رہے تھے کہ یہ مصیبت نازل ہوگئی؟"

"ریلیکس!" وہ بولا۔ یہ شاید اس کا تکیہ کلام تھا پھر قالین پر بے ڈھنگے انداز میں پڑی ان لاشوں کو تکتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔

"انہیں رات میں ہی ٹھکانے لگانا ہوگا لیکن ...... تب تک کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تفکر آمیز انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کسی کو کیا معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔ "ابھی انہیں کم از کم یہاں سے کسی اور کمرے میں تو پھینک دیا جائے۔" میں نے مشورہ دیا۔ وہ میری جانب غور کرنے کے انداز میں دیکھنے لگا اور میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے اس نے اثبات میں ہی اپنے سر کو جنبش دی۔

اس کے بعد ہم تینوں نے اس کی مدد کی اور لاشوں کو اسٹور نما کمرے میں ڈال دیا۔

استاری نے ٹرلیسی کو آواز دے کر اسے مشروب لانے کا کہا اور ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا۔

"مسٹر استاری! میں اور شکیلہ گون برگ کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ کھیل دادا ادھر ہی تمہارے ساتھ رکے گا۔"

"نہیں۔" اس نے شاید کچھ نیا منصوبہ سوچنے کے انداز میں خیال انگیز لہجے میں کہا۔

"تم میں سے اب کوئی بھی یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میں تمہیں گون برگ کے اہم ٹھکانے کا پتا بتا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ تم مجھے اپنا پتا بتاؤ کہ تم سے کہاں اور کب ملا جا سکتا ہے؟"

"لیکن لاشیں ......؟" کھیل دادا نے اس سے سوالیہ انداز میں کہا۔

"وہ میں خود ہی رات کے کسی درمیانے پہر جھیل میں جا کر پھینک آؤں گا، ممکن ہے انہیں مجھے ...... سمندر کے کسی خلیجی حصے میں ہی غرق کرنا پڑے۔" اس نے کہا اور بات جاری رکھتے ہوئے مزید بولا۔ "کیونکہ جھیل سے لاشیں برآمد ہونے کا خطرہ ہوگا۔"

"تمہاری بات ٹھیک ہے مگر استاری! یہ کام تم اکیلے کر لو گے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کر لوں گا۔" اس نے اعتماد سے جواب دیا۔ اتنے میں ٹرلیسی ٹرے اٹھا لائی۔ انہوں نے ایک ایک پیگ چڑھا کرتے ہوئے اعصاب شکن لمحات کی کشاکشی کو کم کیا۔ میں کھڑکی کی طرف چلا گیا۔

میں نے ذرا باہر جھانکا تو نیچے سب کچھ معمول کے مطابق رواں دواں نظر آیا، مطمئن ہو کر میں واپس ان کی جانب پلٹا۔

استاری نے گون برگ کے کم و بیش تین ایسے ٹھکانوں کی نشان دہی کر ڈالی جہاں اس کی موجودگی متوقع ہو سکتی تھی۔

"ایک تو ریڈ یارنا نامی کیسینو تھا، جو اس کے بھائی ڈیوڈ کی ملکیت تھا۔ دوسرا ٹھکانا اس کا "سی برڈ" نامی ایک لگژری لانچ تھی جہاں وہ عموماً اپنی ایک اطالوی گرل فرینڈ ہیلنا کے ساتھ ویک اینڈ گزارتا تھا۔ تیسرا ٹھکانا وہ تھا جو اس کا "رین بسیرا" کہلاتا تھا۔

"یہ فرزنو کے ویسٹ میں ساحلِ سمندر کے کنارے ایک قدرے اونچی پہاڑی پر واقع ہے۔"

یہ بتاتے ہوئے وہ ذرا رکا تو میں جوش سے بولا۔

"ہمیں پہلے اسی جگہ سے دیکھنا ہوگا۔ کیونکہ یہ اس کی رہائش گاہ ہے۔"

"وہ یہاں کم ہی ملتا ہے۔" استاری بولا۔ "میں جب اپنی بیوی اور بیٹی کے ظالمانہ قتل پر اس سے انتقام لینے کے لیے پاگل ہو رہا تھا تو سب سے پہلے میں نے اس کی اسی رہائش گاہ کا رخ کیا تھا مگر وہ وہاں نہ ملا، جبکہ وہ مجھے اپنے اولی الذکر دونوں ہی ٹھکانوں پر زیادہ نظر آیا تھا مگر افسوس میں اس کے خلاف کوئی خفیہ کارروائی نہ کر پایا، وہ بے حد خطرناک اور چلاک صفت آدمی ثابت ہوا بلکہ جیسا کہ میں نے بتایا، الٹا اس نے مجھے ٹریس کر لیا اور پھر خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے کر چھوڑ دیا۔"

"ہم ......" میں نے ہونٹ بھینچ لیے لیکن اپنی جگہ میرا یہ فیصلہ اٹل رہا کہ سی بی سی کے اس اہم ایجنٹ گون برگ کو میں سب سے پہلے اس کے پہاڑی ٹھکانے پر ہی تلاشنے کی کوشش کروں گا۔

اس کے بعد ہم نے اپنا ذرا حلیہ درست کیا اور حسبِ سابق ایسا ہی لباس زیب تن کیا جس سبب ہمیں فوری طور پر کوئی پہچان نہ سکے۔ یہ سب ہمیں ٹرلیسی کی راہنمائی میں ایک لمبے چوڑے وارڈروب سے دستیاب ہو چکا تھا۔

مسی اور روینڈ کے ساتھ مقابلے کے دوران کھیل دادا اور شکیلہ کو خراشیں آئی تھیں، ان پر مرہم اور سوفٹ جیل لگا کر ان کے سوزشی" تاثرات" کو سرجیکل پلاسٹر شیٹ سے مخفی کرنے کی سعی کی تھی۔

کھانا کھانے کا کوئی موڈ نہیں ہو رہا تھا مگر استاری نے زبردستی ہمیں چپے جیسے کچھ فاسٹ فوڈ ٹائپ کی شے اوون میں گرم کروا کر کھلا دی تھی۔

اس کے بعد استاری نے ہمیں گون برگ کی مختلف پوز میں کچھ تصاویر دکھائیں۔ میں اس کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میرے تصور میں گون برگ جس قدر سفاک اور ظالمانہ مزاج کا آدمی تھا، شکل و صورت بھی اس کی نہایت کرخت اور مکروہ ہوگی مگر اس کے برعکس وہ ایک خوبرو اور جوان شخص نظر آتا تھا۔ صحت بھی اس کی قابلِ رشک تھی اور قد و قامت کا بھی وہ دراز تھا۔ بال ہلکے کرلی اور چھوٹے تھے۔ رنگ گورا اور آنکھیں ہلکی سبز نظر آتی تھیں۔

دو ایک تصویریں اس کی گرل فرینڈ کی بھی تھیں جو اس کے ساتھ تقریباً چپک کر کھڑی تھی۔ وہ خاصی سبک رو اور پُرکشش لڑکی تھی۔

میں نے احتیاطاً ان میں سے دو تین تصاویر ... جو کافی کلوز اپ تھیں، اپنی جیب میں رکھ لیں۔

پھر طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق ہم تینوں استاری کے ہاں سے روانہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

کیلی فورنیا واحد امریکی ریاست ہے جہاں کا موسم معتدل رہتا ہے۔ زیادہ تر امریکی باشندے اسی ریاست میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے، یہاں لیونگ اسٹائل بھی بہترین تھا۔ اسی مناسبت سے یہاں کی ٹیکس شرح بھی دیگر امریکی ریاستوں سے زیادہ تھی۔

بہرکیف ... آج کل یہاں سردی کا موسم تھا مگر سردست بارش اور برف باری کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

کھیل دادا نے پینٹ شرٹ پر ایک لمبا رین کوٹ ڈال لیا تھا جو اس کے دراز اور قدرے کسرتی بدن پر بڑا بھلا محسوس ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد سر پہ ہیٹ تھا جو اسے کوئی پرائیویٹ ڈیٹیکٹو ظاہر کرتا تھا۔ شکیلہ نے یورپی طرز کی بالکل اسکن ٹائٹ اونی لیگنگ پر کھلے گلے والی سلیولیس اور اس پر گولڈن کلر کا سمور پہن لیا تھا۔ بالوں کا رنگ اس نے سنہری اور لینس لگا کر آنکھوں کا رنگ نیلا کر لیا تھا۔ وہ خاصی حسین اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ جبکہ میں نے موٹی سیاہ جینز پر ڈارک بلیو ہاف آستین کی شرٹ اور اوپر اس کے زرد رنگ جیکٹ چڑھا لی تھی۔ ہاتھوں میں دستانے پہن لیے تھے۔ بہت محتاط انداز میں مگر ... بہ ظاہر کھلنڈرے پن کے ساتھ ہم استاری کے ہاں سے روانہ ہوئے اور باہر نکلتے ہی ہم نے کیب کر والی۔

سہ پہر سے کچھ آگے کا وقت ہو چلا تھا، سردی اور آسمان پر چھائے ہوئے کالے بادلوں کی وجہ سے ...... تاریکی کا گمان ہوتا تھا۔ سڑکیں صاف اور روشن تھیں۔

ہم فریسنو کے ویسٹ میں اترے اور ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ یہاں تو جیسے ہر طرف میلہ لگا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ ویک اینڈ نہ تھا ...... مگر ساحل پر ایک جشن کا سا سماں بندھا ہوا تھا، جلد ہی عقدہ کھل گیا کہ یہ کسی شادی کی پارٹی کی تقریب تھی۔ ساحل پر روشنیوں کا سیلاب امڈا پڑا تھا۔ اس سرد موسم میں شادی کی یہ تقریب جو کسی ہوٹل یا ہال میں منعقد ہونی چاہیے تھی، یہاں ساحل کی سرد مرطوب سمندری ہواؤں میں منائی جا رہی تھی۔

اس تقریب پر شادی کا گماں یوں ہوا کہ خوش نما اور دیدہ زیب سفید براق لباس میں دلہن اور سیاہ کوٹ سوٹ میں اس کا دولھا ساتھ ساتھ کھڑے مہمانوں سے ملتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

”حیرت کی بات ہے، ایسی سخت سردی میں ساحل کے کنارے شادی کی پارٹی؟“ کھبیل دادا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”یہ امریکی ہیں، ان کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی ہے۔“ شکیلہ نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

”یہ لوگ بس انجوائے کرتے ہیں، ہماری طرح موسموں کا خیال نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”ایسے میں یہ لوگ شراب اور کباب دونوں کے مزے لیتے ہیں۔“

ہم ذرا رک کر اس طرف دیکھنے لگے۔ سب مہمان سوٹ بوٹ میں ملبوس نظر آ رہے تھے، ان میں بچے بھی تھے، انہوں نے گرم کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ عورتیں اور بوڑھے بھی تھے۔ جگہ جگہ آگ کے اسٹینڈ اپ آتش دان، بھڑکتے چولھے اور باربی کیو کے اسٹینڈ پر شعلوں اور چنگاریوں میں ... بھنتے گوشت کے پارچے ... کباب اور بھانت بھانت کی بوتلوں کے کریٹ، سب ہی کچھ نظر آ رہا تھا۔

ایک طرف قدرے کھلی جگہ پر گاڑیاں بھی قطار میں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں دور و قریب کچھ لانچیں اور بحری جہاز بھی لنگر انداز تھے۔

ہم اس سے توجہ ہٹا کر اس راستے پر ہولیے جو اسٹاری کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق گون برگ کی رہائش گاہ تک جاتا تھا، مگر ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ اچانک ہمیں اپنے عقب میں کسی گاڑی کی تیز ”چیزنگ“ کی آواز سنائی دی۔

ہم تینوں ٹھٹک کر رکے اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک شاندار سی چمچماتی کار خاصی تیز رفتاری سے کوئی موڑ کاٹ کر ہماری طرف لپک رہی تھی۔

میری عقابی نظروں نے اس میں صرف دو افراد کو بیٹھے دیکھا تھا، ایک ڈرائیونگ سیٹ پر مرد اور دوسری پر ایک جوان عورت۔ ... دونوں کسی بات پر منہ پھاڑے ہنس رہے تھے اور انہیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ہم ان کی تیز رفتار کار کی زد میں آسکتے تھے۔

انہیں شاید معلوم تھا کہ جب تک وہ ہمارے قریب پہنچیں گے، ہم ایک دم ہٹ جائیں گے اور ایسا ہوا بھی۔

کار ہمارے قریب سے ”زن“ کی آواز کے ساتھ گزرتی چلی گئی اور پھر یک دم اس کے ٹائر چرچرائے۔ وہ دوسری اور دائیں جانب اس راستے پر مڑ گئی جہاں ہمارے اندازے کے مطابق شادی کی تقریب ہو رہی تھی۔

”عجیب باسٹرڈ لوگ تھے، راہ چلنے والوں کا خیال ہی نہیں کرتے۔ ڈیول...!“ کھبیل دادا غصے سے بڑبڑایا۔ شکیلہ کا بھی منہ بنا ہوا تھا لیکن... میرے چہرے پر سناٹے اترے ہوئے تھے اور میں یک ٹک اسی کار کو گھورے جا رہا تھا جو اب اسی جگہ پر جا رکی تھی جہاں اور بھی گاڑیاں ایک ترتیب سے کھڑی تھیں۔

”تمہیں کیوں سانپ سونگھ گیا شہزی؟“ اچانک کھبیل دادا نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”اس ست بے تکے جوڑے پر اپنا خون جلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔“ شکیلہ نے بھی مسکرا کر مجھ سے کہا۔

”اتنا ہی غصہ آ رہا ہے تو کیا خیال ہے، ابھی چل کر ان دونوں کو دیکھ لیتے ہیں۔“ کھبیل دادا نے جارحانہ انداز میں کہا۔

”یہ تو اب کرنا ہی پڑے گا...“ میں نے بدستور اس جانب گھورتے ہوئے دانت پیس کر کہا تو شکیلہ کے منہ سے حیرت کے عالم میں نکلا۔

”کیا واقعی؟“

”ہاں! اس لیے کہ شاید تم دونوں نے صرف خود کو کار کی ٹکر سے بچانے کی کوشش کی تھی اور دیکھنے سے قاصر رہے کہ اس میں ہمارا شکار موجود تھا۔“ میں نے جیسے سنسناتے لہجے میں کہا اور ان دونوں کے منہ حیرت سے کھل گئے۔

”کک... کیا کہہ رہے ہو تم شہزی؟“ کھبیل دادا نے بھی اسی سمت دیکھتے ہوئے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔ ”تمہارا مطلب ہے اس کار میں گون برگ موجود تھا؟“

”ہاں!“

”تم نے کیسے اتنی جلدی پہچان لیا شہزی؟ ابھی تو اس کا ہم سے سامنا ہی نہیں ہوا ہے؟“ شکیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

رفوگر... آپریشن تو روز ہوتے ہیں...
آج پھٹی ہوئی پتلون بھی سی لی جائے!

”یہ سوال اگر کھبیل دادا مجھ سے کرتا تو اور بات تھی لیکن افسوس شکیلہ تم ایک پاور ایجنٹ ہونے کے ناتے اپنی نگاہ کی تیزی کو محدود رکھتی ہو۔“ میں نے اس سے کہا۔

میری اس بات پر شکیلہ کچھ خفیف سی نظر آنے لگی البتہ کھبیل دادا مجھ سے بولا۔

”کیوں اس بے چاری کو ڈانٹ رہے ہو یار شہزی؟ محض چند تصاویر کے سہارے اور اتنی تیزی سے کوئی صحیح طرح کیسے کسی کو پہچان سکتا ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس کے سر پر کوئی سوار ہو تو اسے ہر روپ میں وہی نظر آتا ہے۔“

”اس میں غلطی کے امکان کو میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کھبیل دادا...!“ میں نے کہا۔ ”لیکن... حقیقت یہی ہے کہ میں اس کی اطالوی گرل فرینڈ ہیلنا کو بھی پہچان رہا ہوں۔“

”او میرے خدا...“ اچانک شکیلہ کے منہ سے نکلا۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو شہزی! تم غلطی پر نہیں ہو سکتے، پھر یہی ہمارا شکار ہوگا۔“

”اتنی جلد اور وہ بھی اتفاقیہ سامنا ہو جائے گا، حیرت ہے مجھے۔“ کھبیل دادا بولا۔ ”لیکن اگر ایسا ہے تو یہ بھی یاد رکھنا شہزی! گون برگ ہمیں نہیں تو تمہیں تو پہچان سکتا ہے۔“

”مجھے بھی اس خدشے کا احتمال ہے۔“ میں نے کہا۔

اس کی بات میں رد نہیں کر سکتا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہوا، یہ ممکن تھا کہ گون برگ مجھے شہزاد احمد خان شہزی کی حیثیت سے پہچان سکتا تھا۔ کیونکہ اب تک میرے دشمنوں نے میری تصویر اپنے خاص خاص عہدے داروں اور گرگوں میں خفیہ طور پر تقسیم کر دی ہوگی۔ اس پر مستزاد دشمنوں کو میری امریکا آمد کا علم بھی ہو چکا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ان کے پاس میری پرانی تصویر ہو سکتی تھی۔ جس میں میرے چہرے پر مونچھیں اور ہلکی داڑھی تھی۔ تھائی لینڈ اور منیلا کے سفر سے مصر تک کے بعد میں بالکل کلین شیو ہو گیا تھا۔ بال بھی میرے گھنے، بڑے اور کرلی ٹائپ تھے، جنہیں میں نے بدل کر بالکل چھوٹے اور سولجر کٹ اسٹائل میں ترشوا لیے تھے، یوں حقیقی نگاہ اور تصویر کے حوالے سے دیکھا جاتا تو میری شبیہ کافی بدل گئی تھی۔ یعنی فوری پہچانے میں نہیں آسکتی تھی۔

مٹھی بھر یہودیوں نے اس وقت پوری دنیا کے امن کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ اسناری کی باتوں سے اس امر کی بھی تصدیق ہوتی تھی کہ یہودی تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود آکٹوپس کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور امریکی حکام ان کے فرمان کے تابع رہتے تھے، اس قدر کہ انہیں کلیدی عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔ امریکا میں جتنی بھی فارماسیوٹیکل کمپنیاں تھیں، ان کے مالکان یہودی تھے جو اُن دواؤں میں ایک مارفین اور ایفیڈرین کی قسم کا عنصر شامل کرتے تھے جن سے امریکی ایک نشے کی سی کیفیات سے دوچار رہتے تھے، بالخصوص وہ جو کسی طویل بیماری کی وجہ سے ایسی ادویات کا استعمال جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

"اب یہ بتاؤ کہ پھر اس تقریب میں کیا بن بلائے مہمانوں کی طرح شریک ہونا پڑے گا؟" بالآخر کبیل دادا بولا۔

"وہ دیکھو۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔ جہاں گاڑیاں پارک تھیں، اسی طرف ایک اور بڑے سے ہارڈ بورڈ کی دیوار سی بنی ہوئی تھی، وہاں کچھ باوردی ویٹرز آتے جاتے نظر آئے۔ ان میں ویٹرس بھی تھیں۔

"کیا ہے وہاں؟" کبیل دادا بولا۔ "وہاں تو خدمت گاروں کے ٹولے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا۔"

"یہی ہمارے کام آئیں گے۔" میں نے کہا۔ "ہم ان میں سے دو مرد اور ایک عورت کو تنہا قفیل کریں گے اور ان کا روپ دھار لیں گے۔" میں نے راہ سجھائی۔

"غلط" کبیل دادا نے میری تجویز سے اختلاف کیا۔ "اس میں پکڑے جانے کے امکانات روشن ہیں، کیونکہ ان بیروں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں نظر آرہی کہ ہم تینوں کو ان کے ساتھی نہ پہچان سکیں۔ اتنی آسانی سے ہاتھ آئے ایک اہم شکار کے لیے یہ منصوبہ بندی ناقص رہے گی، وہ بھڑک جائے گا اور دوا ویلا الگ مچے گا۔"

"میرا خیال ہے شہزی! دادا ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شکیلہ نے اس کی تائید کی۔ میں بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔

"میرا خیال ہے ادھر ہی کہیں قریب میں بیٹھ کر وقت گزارا جائے، بڑے شکار کے لیے طویل اور صبر آزما انتظار پہلی شرط ہوتی ہے۔" کبیل دادا نے اپنا مشورہ دیا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ ہم اس تقریب کے اختتام کا انتظار کریں اور یہ بھی کہ کون برگ کب یہاں سے رخصت ہوکر کہاں جاتا ہے پھر اس کے تعاقب میں لگ جائیں؟" میں نے کبیل دادا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہی بہتر رہے گا۔"

میں نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی اور بولا۔ "جانتے ہو اس میں کتنا وقت برباد ہوجائے گا؟ ابھی چار بج رہے ہیں۔ یہ فنکشن تقریباً رات گئے تک جاری رہے گا۔"

"چلو فرض کرو یہ بھی کرلیا جائے مگر کبیل دادا! ہمارے پاس اپنی کوئی گاڑی بھی تو نہیں ہے۔ کیب کروانے میں بھی وقت لگ سکتا ہے۔" شکیلہ بولی۔

ان دونوں کی باتوں نے مجھے اُلجھا دیا۔ تب میں نے سوچا کہ یہ ایک ہی آدمی کا کام ہے، میں خود کسی طرح اس "ویڈنگ پارٹی" میں جا گھسوں اور اپنے شکار کو کسی طرح پھانس کر یہاں تک لے آؤں مگر یہ میں محض سوچ رہا تھا۔ ایسا کرنا کتنا آسان ہوسکتا تھا، اس بارے مجھے کوئی اپنی کامیابی کا بھی اندازہ نہ تھا۔

ہم تھوڑا اور آگے بڑھے۔ پارٹی کی رونقیں عروج پر تھیں۔ ڈانس بھی ہو رہا تھا اور موسیقی بھی گونج رہی تھی، جام بھی لنڈھائے جا رہے تھے۔ مجھے ایک چمکتا ہوا بورڈ دکھائی دیا۔ جس میں دولہا دلہن کا نام اور ان کی شادی کی تاریخ درج تھی۔

"مسٹر اینڈ مسز جورسن کلاینڈ۔" یہ نام ازخود میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا۔ تاہم میں کوئی ایسی راہ نکالنے کی سوچ رہا تھا کہ اس تقریب میں آخر کس طرح "گھسا" جائے۔

لہٰذا ابھی میں انہی خطوط پر غور کررہا تھا کہ اچانک دھماکا ہوا۔ ہم تینوں چونک گئے۔ ساحل کی جانب کسی نے فلش فائر کیا تھا جو اونچائی میں جا کر پھٹا تو ہر سو پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں۔

ہم نے بے اختیار اپنے سر جھٹک کر گہری سانس خارج کی، وہاں تالیوں اور خوشیوں بھرے قہقہوں کا شور بھی ابھرا۔

میں نے ایک گہری سانس لی، ابھی ہم سے کوئی ٹھیک فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ اچانک ایک اور دھماکا ہوا۔ ہم نے سرسری انداز میں پھر اس طرف دیکھا، وہاں ایک دم شور مچ گیا۔ پہلے ہمیں بھی یہی گمان ہوا کہ یہ بھی شاید اس رنگارنگ تقریب کا کوئی حصہ ہے لیکن جلد ہی عقدہ کھلا کہ اب کہ ایسا نہیں تھا، لوگ اب وہاں افراتفری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

ابھی ہم حیرت سے یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور دھماکا ہوا اور میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

"یہ تو گولیاں چل رہی ہیں۔" میں نے کہا۔ تب ہی میں نے دو افراد کو گرتے دیکھا اور چند مرد اور عورتوں کو روتے ہوئے ان گرے ہوئے افراد کی طرف لپکتے دیکھا، ایک شخص بھاگ رہا تھا اور کچھ سرپھرے جوان اسے پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

پھر اچانک ہی اور گولی چلی، ہماری ہک دک نظروں نے اس پستول بدست کو ساحلی ریت پر گرتے دیکھا، اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے لوگ ایک دم رک گئے۔ جس نے اس پستول بدست کو گولی ماری تھی وہ ان کے درمیان سے نمودار ہوا تھا جو گرے ہوئے دو افراد کے گرد جمع تھے۔

میرے اور وہاں تفریح کے لیے آئے ہوئے دیگر لوگ اس طرف کو لپکے تھے۔

"آؤ، ان میں رلنے ملنے کا یہ بہترین موقع ہے۔" میں نے کہا اور ہم بھی محض تماشیوں کی طرح ان کے بیچ شامل ہوگئے اور میری نظریں تیزی سے گردوپیش کا جائزہ لینے لگیں۔

صاف لگتا تھا کہ کسی بات پر بدمزگی ہونے کے سبب کسی نے مشتعل ہوکر گولی چلا دی تھی۔ جس نے گولی چلائی تھی، اسے بھی گولی مار دی گئی تھی۔

ہر طرف ایک چیخ و پکار مچ گئی تھی اور بچے رونے لگے تھے، وہ خوف زدہ ہوکر اپنی ماؤں سے جا لپٹے تھے۔ چند کمزوردل کی خواتین تو بے ہوش ہی ہوگئی تھیں۔

ہم اس طرف لپکے جہاں چند غصیلے لوگ اب اس آدمی کے ساتھ دست و گریباں ہونے کی کوشش کررہے تھے جس نے جوابی فائرنگ کی تھی۔

ہم قریب پہنچے تو یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ لوگ جس آدمی سے گرما گرمی کررہے تھے، وہ میرا شکار ..... یعنی کون برگ..... تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھما ہوا تھا اور وہی پستول اب اس نے ان پر تان لیا تھا۔

"خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا، ورنہ گولی مار دوں گا۔" کون برگ وحشیانہ برہمی سے بولا۔

مجھے اس کی وہ اطالوی حسینہ گرل فرینڈ نظر نہیں آرہی تھی، وہ نجانے کہاں غائب تھی۔ ادھر میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میں اب بھی اسے تصویر کے حوالے سے پہچان رہا تھا اور وہ وہی تھا۔

پل کے پل میرے ذہن میں خیال ابھرا، اس سے بہترین موقع مجھے اور نہیں مل سکتا تھا۔ تقدیر نے گویا مجھے آپ ہی شکار پر ہاتھ ڈالنے کا سنہری موقع دے دیا تھا۔

اس کی طرف بڑھنے والے لوگ اس کا جارحانہ انداز دیکھ کر ایک دم رک گئے تھے۔ تب ہی میں نے اس پر جست بھری۔ وہاں کسی کو بھی کسی سے بھی ایسی کارروائی کی بالکل توقع نہ تھی اور شاید نہ ہی کون برگ کو بھی ہوسکتی تھی کہ وہاں ایک عام سی تقریب میں کوئی ایسی "ٹیکنیکل" حرکت بھی کرسکتا ہے۔

اسی وقت کوئی عورت چیخی، میں کون برگ پر گرا، میرے ہاتھ کا ایک مخصوص وار اس کے پستول پر پڑا، وہ چھوٹا اور کون برگ کو میں لیتا ہوا ریت پر گرا۔ اس نے گرتے ہی میرے پیٹ پر گھٹنا رسید کردیا۔

مجھے اس سے اسی پھرتی کی توقع تھی، میں اس درد کو اس جوشِ غیظ کی آگ میں پگھلا کر پی گیا کہ یہی وہ شخص تھا جو مجھے عابدہ اور آنسہ خالدہ کے پُراسرار "غیاب" کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ اسی سبب میں نے اس پر حملہ کرکے اپنا جسم اکڑا لیا تھا۔ ضرب کی شدت قدرے کم ہوئی تھی۔

میں نے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کردیا۔ اس کے بھی جسم میں گویا پارا دوڑ رہا تھا، اس نے بہ سرعت اپنے دونوں گھٹنے سکیڑ کر اپنی ٹانگوں کے زور پر پیٹ پر جمانے مجھے خود سے اچھالنے کی کوشش چاہی مگر اس کے روایتی داؤ سے میں خود کو اس طرح بچا گیا کہ یک دم تڑپ کر اپنے جسم کو کچھ یوں خم دیا کہ کافی حد تک اس کی ٹانگوں کا زور ہوا میں صرف ہوگیا اور میری ایک لات نصف دائرے میں گھومی، میرے مضبوط بوٹ کی ٹو اس کی کنپٹی پر پڑی۔

پہلی بار میں نے اس کے حلق سے برآمد ہوتی چیخ کی آواز سنی۔ ایسے وقت میں کبیل دادا اور شکیلہ "تماشائی" بن جاتے تھے، اس میں میری ہی ہدایت کارفرما تھی۔

یہ میری لڑائی کا اصول تھا کہ اگر میں حریفِ مقابل پر حاوی ... ہونے کی کوشش میں ہوتا تو میرا کوئی ساتھی درمیان میں کود کر صورتِ حال کو میرے بجائے حریفِ مقابل کے حق میں کر سکتا تھا، ماسوائے مجھے خطرے میں نہ دیکھتے۔

لیکن ہوا اس کے الٹ ..... میرے ساتھی تو نہیں البتہ وہ جوشیلے جوان مرد یہ دیکھ کر کہ ایک ہی آدمی حملہ آور سے نبردآزما ہے، جوشِ غیرت میں وہ بھی کود پڑے اور یہاں میرا معاملہ بگڑنے لگا۔

کون برگ کو اب تک اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ اس کے حریفِ مقابل بھی اس کی ٹکر کا آدمی ہے، اس پر یقیناً وہ حیران بھی ہوا ہوگا، کیونکہ یہاں تقریب کے شرکا سب عام افراد

تھے۔ اُن سے میری جیسی فائٹنگ کی امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

گون برگ نے بیچ میں کودنے والے ایک جوان مرد کو چارہ بنالیا۔ اگرچہ میرے بوٹ کی ٹو نے اس کی کنپٹی چٹخا دی تھی مگر وہ کم بخت غضب کی قوت برداشت رکھتا تھا۔ اس اذیت کو پیتے ہی اس نے سنبھالا لیا اور اول الذکر شخص کو دبوچ کر میری طرف اچھال دیا، تب اس کے دیگر شرکا ساتھی مرد بھی میرے آڑے آگئے، یوں گون برگ نے راہِ فرار کا راستہ اختیار کیا اور وہ ایک کو مجھ پر دھکیل کر اٹھ دوڑا۔

''اس کے پیچھے دوڑو ....'' میں کھیل دادا اور شکیلہ کی جانب دیکھ کر چلایا۔ وہ حرکت میں آگئے۔

ساحل پر اب ہماری ''دوڑ کی'' لگ گئی۔ گون برگ دیوانوں کی طرح دوڑے جارہا تھا اور ہم اس کے پیچھے تھے، میں تو پہلے ہی اس سے نبرد آزمائی کے دوران ذرا تھکا تھکا سا تھا، اسی لیے میرے دوڑنے کی رفتار میں وہ تیزی نہ تھی لیکن کھیل دادا اور شکیلہ گون برگ کے تعاقب میں مجھ سے آگے نکل گئے۔

ایک موقع پر کھیل دادا نے ہی اسے چھاپ لیا۔ اس نے اس کے قریب پہنچتے ہی اس پر جست لگادی تھی۔ دونوں گرے۔ عقب سے شکیلہ نے بھی رہی سہی کسر پوری کردی۔ میں بھی ہانپتا کانپتا قریب پہنچ گیا۔

تب تک کھیل دادا اور شکیلہ اسے اپنا قفیل کر چکے تھے۔ اس بھاگا دوڑی میں ہم پارکنگ تک آن پہنچے تھے۔

میں نے انہیں شکار کو سنبھالے رکھنے کا کہا اور ایک کار کے دروازے کے ساتھ فنکاری کرتے ہوئے اسے کھولا تو اس کا الارم بج اٹھا۔ میں نے کوئی پروا نہ کی اور انہیں اشارہ کیا۔ وہ دونوں بے سدھ گون برگ کو دبوچے کار کی پچھلی سیٹ پر جا بیٹھے۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اس کے اسٹیئرنگ کے نیچے وائرنگ فنکل کے ساتھ لمحہ بھر کی چھیڑ چھاڑ کی تو کار کا انجن بیدار ہوگیا۔

کار اسٹارٹ ہونے کی دیر تھی اور ہمارے شکار سمیت وہاں سے رفوچکر ہونے کی۔

فرنسو کے علاقے سے ابھی ہم بہ مشکل اپنے ٹھکانے والے راستے پر ہی تھے کہ اچانک عقب سے پولیس سائرن کی آواز گونجتی سنائی دی۔

''شہزی! پولیس کار پیچھے لگ چکے ہیں۔ یہ ہمیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے۔'' شکیلہ نے عقب سے مجھے خبردار کیا۔ میں نے رفتار بڑھادی۔ تاہم شکیلہ کی بات غلط نہ تھی۔ ٹریس ہوتے ہی اور بھی نجانے کتنی پولیس گاڑیاں ہمارے تعاقب میں لگ سکتی تھیں۔ شکار تو آسانی سے ہاتھ آگیا تھا مگر اب سنبھالا نہیں جارہا تھا۔

میں نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور کار کو ایک سروس روڈ میں اتار کر ایک گلی میں گھس گیا۔ عقب میں چیختی چلاتی ہوئی پولیس کار بھی کسی غراتی آوازوں میں چیز تک کرتی ڈولتی گلی میں داخل ہوگئی۔

اس قدر جلد ان کے قریب آجانے پر بلاشبہ مجھے حیران ہی ہونا چاہیے تھا۔ میں نے سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے کہ جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ بیک ویو میں پولیس کار سرخ نیلی گردشی بتیاں گھماتی دوڑتی نظر آرہی تھی۔

میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ گلی سے میں ایک اور سڑک پر نکل آیا اور اپنی کار کی کھڑکیوں سے میں نے دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا تو بائیں جانب مجھے یہی سڑک دائیں سمت مڑ کر مین روڈ پر جاتی دکھائی دی، جہاں ہیوی ٹریفک تھا۔

ابھی میں اس طرف اسٹیئرنگ کاٹ ہی رہا تھا کہ پیچھے پولیس کار نے ٹکر ماردی۔ ہماری کار کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ بائیں جانب مڑتے مڑتے گول گھوم گئی۔

میرا اسٹیئرنگ سے لگتے لگتے بچا تھا اور شکیلہ تو بے چاری اس زوردار جھٹکے کے بل پر پچھلی سیٹ سے اگلی سیٹ پر نصف حد تک الٹ آئی، اس کے حلق سے غیر ارادی طور پر چیخ بھی خارج ہوگئی تھی جبکہ کھیل دادا نے اپنے ڈیل ڈول اور ہوشیاری کے ساتھ خود کو سیٹ پر کنٹرول کررکھا تھا۔

پولیس کار سے فائر ہوا۔ ہماری کار کا عقبی شیشہ ٹوٹنے کی آواز ابھری، مجھ سمیت کھیل دادا گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی نیچے جھک گئے مگر بدقسمتی سے شکیلہ اس کی زد میں آگئی، اس لیے کہ وہ اچھل کر اگلی سیٹ کی پشت کا وہ نصف دھڑ تک آئی تھی اور اسے ہنوز سنبھلنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ گولی اسے کہیں لگی اور اس کے حلق سے اٹھنے والی چیخ نے میرے اوسان خطا کردیے۔ اپنی ساتھی کی تکلیف نے میرے اندر غیظ آلود جنون سا بھر دیا۔

''کھیل! شکیلہ کو سنبھالو ....'' میں چلایا۔ اور دوسری گولی چلی تو میں نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط رکھتے ہوئے بریک لگاتے ہی ریورس گیئر ڈالا اور ایکسلیریٹر دبادیا۔ کار کے پہیے چرچرائے اور وہ تیزی کے ساتھ پولیس کار سے ٹکرائی۔

اب اسے بھونا بھی پڑے گا
5
6

دوسری گولی نے میری کار کی ونڈ شیلڈ اُڑا دی تھی۔ بیک ویو میں مجھے ایک تنومند پولیس والا کھڑکی سے باہر سر اور ہاتھ نکالے میری کار کا بدستور نشانہ باندھے ہوئے تھا، اب اس کی کوشش ٹائر پر گولی چلانے کی تھی، لیکن ادھر ہماری گاڑی کے پچھلے بمپر کے ان کی کار کی باڈی سے ٹکرانے پر وہ مڑ گئی اور میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گیئر بدل کر ایک طوفانی انداز کا یوٹرن لیا تو اچانک ایک پُرشور بھونپو بجنے کی آواز ابھری۔ جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے دہلا دیا۔

ایک ہیوی ٹریلر ٹرک مست ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا سامنے سے نمودار ہوا، پولیس کار میرے پیچھے تھی، دائیں جانب چیختی چلاتی دوسری گاڑیاں تھیں جن کا میں نے راستہ روک رکھا تھا۔ بائیں جانب یہ ہیوی ٹریلر نجانے کہاں سے اچانک ہی نمودار ہوگیا تھا۔ مجھے فوری فیصلہ کرنا تھا۔

''نیچے جھک جاؤ اور شکیلہ کو بھی نیچے کرلو۔'' میں چلایا اور اسٹیئرنگ گھما کر کار کو سیدھے رخ پر کرلیا۔ پولیس کار سے اب کوئی فائر نہیں ہوا، شاید وہ بھی سمجھ رہے تھے کہ میں اب ٹریلر سے ٹکرانے ہی والا ہوں اور بادی النظر میں یہی کچھ نظر بھی آرہا تھا۔

میری کار نے ڈرائفٹنگ کی اور پھر طوفانی رفتار سے ٹریلر سے ٹکرائی، میں ... تب تک نیچے سر کر چکا تھا، کار کو ایک جھٹکا لگا، رفتار بڑھ جانے کا موقع چونکہ مجھے نہیں مل سکا تھا اسی لیے میری اس ''ٹرک'' میں تھوڑی کسر باقی رہ گئی۔

کار کی چھت ٹوٹ گئی تھی، تاہم میں کار سڑک سے خاصے اوپر تک اٹھے ہوئے ٹریلر کے نیچے سے پوری طرح نہیں نکال پایا اور اس کے دیوہیکل ٹائروں سے کار گھس گئی۔ میری آنکھیں پھیل گئیں، کھیل دادا نے بھی یقیناً یہ مرگ آسا منظر دیکھا ہوگا اور جان گیا تھا کہ اب ہم سب کار سمیت ٹریلر کے دیوہیکل ڈبل ٹائروں تلے کچل کر اذیت ناک موت سے ہمکنار ہونے ہی والے تھے، اسی سبب میں نے اس کے منہ سے دعائیہ برآمد ہوتی آواز سنی۔

''او ... میرے خدا ...!''

پولیس کار بھی رک گئی تھی۔ وہ بھی شاید یہ منظر دیکھنے کو بے تاب تھے۔

کٹھن اور آخری لمحات میں کوئی ایک پل ایسا چھپا ہوتا ہے جہاں امید کی آخری کرن موجود ہوتی ہے، میں نے اسی لمحاتی لو کی مدھم ہوتی روشنی میں بقا کی سعی کو مرنے نہیں دیا۔

ٹریلر چونکہ تب تک کافی حد تک اپنی رفتار آہستہ کرچکا تھا مگر رکا نہیں تھا، اس کے ڈرائیور نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ رکے گا نہیں، کیونکہ اس صورت میں زیادہ نقصان کا احتمال ہوتا اور وہ آس پاس کے کسی اوپن ایئر ریسٹورنٹس میں گھس جائے گا یا فٹ پاتھ پر چڑھ کر الٹ جائے گا، چونکہ کار

والے مجرم تھے، جن کے تعاقب میں پولیس لگی ہوئی تھی، انہیں ہلاک کرنا جائز تھا۔

یوں وہ نہیں رکا اور اس نے رفتار بڑھا دی۔ میری کار اس کے ٹائروں سے ٹکرائی، اگلا بونٹ زد میں آتے آتے رہ گیا اور میں نے کار کو ہلکی بریک لگا کر اسٹیئرنگ اسی رخ پر گھمایا جس رخ پر ٹریلر گامزن تھا اور میری کار اس کے "لیول" میں آگئی۔

میری کار ٹریلر کے پیچھے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھی لیکن میں جانتا تھا کہ یہ چند لمحاتی موقع تھا اگر میں ٹریلر کے پیچھے سے جلد ہی اپنی چھت اڑی ہوئی کار نہیں نکال لیتا تو ایک جاں گسل حادثہ یقینی تھا۔

پولیس والے یقیناً ہک دک رہ گئے ہوں گے، اول تو ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہوگا کہ یہ میں کر کیا رہا تھا۔ وہ یقیناً تصور میں سین کونری یا راجر مور جیسی بونڈ زیرو زیرو سیون کی کسی مووی کو حقیقت میں دیکھ کر سکتے میں آگئے ہوں گے۔

چونکہ ہماری کار کی چھت اُڑی ہوئی تھی اور ہمارے سروں پر ٹریلر کے نچلے حصے کی کھڑکتی ہوئی ساری مشینری دماغ کو بری طرح جھنجھنائے دے رہی تھی۔ ٹریلر کے دائیں بائیں گاڑیاں آتی جاتی نظر آرہی تھیں۔ یقیناً کسی نے بھی یہ حیران کن مگر جان لیوا اور خطرناک منظر دیکھا ہوگا تو اپنی کار سنبھالے رکھنا اس کے لیے مشکل ہوگیا ہوگا۔

ابھی میں کار کو جلد سے جلد ٹریلر کے پیچھے سے نکالنے کا موقع تاک ہی رہا تھا کہ اسی وقت ٹریلر نے دائیں جانب موڑ کاٹا اور میں نے بائیں جانب یہ بہت بہتر ہوا۔ یہ سچ ہی ہے، ہمت مرداں مدد خدا میں اپنے اندر کی امید اور بقا کی جستجو سے مایوس نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں کے ان جاں گسل لمحات نے میرے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔

"حیرت انگیز ...... شہزی! اپنی زندگی کے حیرت انگیز لمحات سے گزرا ہوں میں آج ..." کمیل دادا کی تحیر آمیز آواز ابھری۔

"شکیلہ کیسی ہے دادا ...؟" میں نے اسٹیئرنگ پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے پوچھا۔

"شکر ہے گولی نازک مقام پر نہیں لگی، اس کے بائیں بازو کے آر پار ہوگئی ہے۔" اس نے جیسے مجھے مژدۂ جانفزا سنایا۔

"م ..... میں ٹھیک ہوں شہزی! میری فکر نہ کرو، تم نے تو آج اتنی خطرناک ڈرائیونگ کر کے مجھے بھی حیرت میں ڈال دیا۔" یہ شکیلہ کی آواز تھی۔ بھرائی ہوئی مگر آزار۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ بے چاری بھی شاید پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھتی رہی تھی۔

میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرا ذہن مسلسل سوچنے میں لگا ہوا تھا۔ کار کی چھت غائب تھی، ہماری اپنی حالت عجیب مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔

مجھ سے راستوں کا بھی کوئی تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ اجنبی جگہ، پرایا دیس کے مصداق میں چند ایک جانے پہچانے راستے بھی بھٹک گیا۔

پولیس کار کو میں لامحالہ طور پر ڈاج دینے میں کامیاب رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہاں کی پولیس اور ٹریفک پولیس نیٹ ورک کس قدر فعال اور جدید خطوط پر منظم کیا گیا تھا، آٹو ٹریکنگ کی مدد سے ..... وہ ہمیں چھاپنے کی کوشش کر سکتی تھی۔

ایسا ایک مشورہ کمیل دادا نے بھی یہی سوچ کر مجھے دیا تھا کہ اس کار سے اب جلد از جلد پیچھا چھڑانا لازمی تھا۔

"لیکن میں راستہ بھول رہا ہوں میری راہنمائی کرو۔" میں نے کہا۔ کمیل دادا، شکیلہ کے زخمی بازو پر کسی کپڑے کی پٹی باندھ چکا تھا تاکہ کم سے کم جریانِ خون ہو۔ کمیل دادا میری راہنمائی کرتا گیا۔

"جب تک منزل پر نہیں پہنچ جاتے، ہم کار کو نہیں چھوڑ سکتے کمیل! جبکہ ایسے میں شکیلہ زخمی ہے اور ایک اہم شکار بھی ساتھ ہے ہمارے۔"

"چلتے رہو....." کمیل دادا نے فوراً جواب میں کہا۔ "اس کم بخت کو بھی ہوش آرہا ہے، منزل پر تم سب اتر جانا، میں فوراً کار سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے کہیں دور لے جا کر چھوڑ کے لوٹ آؤں گا دوبارہ۔"

مجھے اس کی تجویز اچھی لگی۔

کون برگ نے ہوش میں آتے ہی تیزی سے مچلنا شروع کر دیا مگر کمیل دادا کے ہتھوڑے نما ہاتھ کے ایک ہی وار نے اسے پھر دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا۔

"دھیان رہے دادا! یہ مرے نہیں۔" میں نے کسی خدشے سے متنبہ کیا۔

"بہت سخت جان ہے یہ ذلیل!" وہ بولا۔ "بے فکر رہو۔ اتنی جلدی مرنے والا نہیں خبیث!"

مزید نصف گھنٹے بعد ہم اپنے رہائشی کنٹینر پر پہنچ گئے۔ شکیلہ نے زخمی ہونے کے باوجود خود کو سنبھالے رکھا تھا اور مقدور بھر وہ ہمارا ساتھ بھی دے رہی تھی۔

حتا میں نے کار ایک جگہ روکی، اس نے اتر کر دروازہ کھولا پھر میں اور کمیل دادا بے ہوش کون برگ کو اندر کنٹینر میں لے آئے۔

کمیل دادا کو میں نے فوراً روانہ کر دیا اور اس تاکید کے ساتھ کہ وہ اپنا خیال رکھے اور کسی بھی تعاقب یا مشکوک آدمی کا دھیان واپسی کے وقت بھی رکھے۔

وہ چلا گیا۔

کون برگ کی جامع تلاشی لینے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس کا سیل فون آف کر دیا۔ اگرچہ اسے آف کرنے میں بھی کوڈ درکار تھا اس لیے میں نے اس کی بیٹری نکال کر اسے بیکار بنا دیا تھا، خدشہ اغلب تھا کہ اس کا سیل فون لوکیشن پر ہوا اور اس کا کوئی ساتھی اس کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جائے۔

اس کے بعد میں نے شکیلہ کے بازو کے زخم کا جائزہ لیا۔ شکر تھا کہ ہڈی فریکچر ہونے سے محفوظ رہی تھی اور گولی بھی آر پار ہوگئی تھی۔

میں نے اس میں مرہم بھر دیا اور پٹی کر دی۔ کچھ پین کلر تھیں وہ بھی میں نے اسے دے دی۔ اس کی حالت کچھ اور سنبھلی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ گرم دودھ پی لے۔

وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

میں کون برگ کے پاس سے برآمد ہونے والی ایک ایک اشیا کا بغور جائزہ لینے لگا۔

اس میں اس کے سیل فون کے علاوہ والٹ، جس میں رقم تھی اور کچھ کاغذات اور کریڈٹ کارڈز وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ رومال اور ووڈکا کی چپٹی بوتل تھی۔

میں نے کارڈز کا جائزہ لیا اور اس کا آئی ڈی کارڈ دیکھا۔ اس میں اس کا نام وہی لکھا تھا۔ گویا میری عقابی نظروں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ یہ کون برگ ہی تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ساحل پر شادی کی اس پارٹی میں آخر اس کے ساتھ ہوا کیا تھا کہ اس کی گرل فرینڈ ماری گئی اور خود اس نے ایک قتل بھی کر ڈالا؟ پتا نہیں یہ اس کا اپنا کون سا ذاتی گورکھ دھندا تھا؟ خیر! مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، اگر تقدیر نے میرے مشن کے ایک اہم مرحلے کا قضیہ یوں شارٹ کٹ میں ہونا لکھا تھا تو مجھے اس بات کی خوشی ہی تھی، اگرچہ بعد میں یہی آسان معاملہ اچانک پولیس کے کود پڑنے پر کافی سنگین صورت بھی اختیار کر گیا تھا اور ہم سب اس تگ و دو میں اس بھاری ٹریلر کے نیچے کچلتے کچلتے بھی بچے تھے۔

شکیلہ نے گرماگرم کافی تیار کر لی تھی۔

"ارے! تم نے کیوں زحمت کر ڈالی۔ زخمی ہو تم! میں بنا لیتا۔" میں نے اس سے کہا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"میں پاور ایجنٹ ہوں شہزی!" وہ جواب میں ہلکی مسکراہٹ لیے بولی۔ "ایسے چھوٹے موٹے زخم کھا کر تمہارا کیا خیال ہے کہ میں چارپائی پکڑ لوں۔ لو پیو۔ اور اس مردود کا جلد ست کھلوانے کی کوشش کرو تاکہ ... ہم عابدہ کے لیے کچھ پیش رفت کر سکیں۔"

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے کافی کا مگ لیا اور کنٹینر کے فرش پر رسن بستہ حالت میں آڑے ترچھے پڑے کون برگ کو گھورتے ہوئے کافی کے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ اب ایک بار پھر رفتہ رفتہ کسمسا رہا تھا۔

اس کی کنپٹی مضروب نظر آرہی تھی اور وہاں سے تھوڑا بہت بہتا ہوا خون قدرتی طبی عمل کے تحت خشک ہو کر پپڑی سی جمانے لگا تھا۔

میں نے قریب تپائی پر رکھے کانچ کے ادھ بھرے پانی کے جگ کو ایک ہاتھ سے اٹھا کر بے سدھ پڑے کون برگ کے چہرے پر انڈیل دیا۔ اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور کسمسانے لگا، ساتھ ہی اپنے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بندوں سے آزاد ہونے کے لیے جھٹکے کھانے لگا۔

"ہوش میں آجاؤ کون برگ! ابھی تمہارے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے کہا اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے ڈرامائی انداز میں اس پر ذرا جھک گیا۔ کافی کا مگ ہنوز میرے ایک ہاتھ میں تھما ہوا تھا۔

اس نے میری آواز پر یک دم مچلنا موقوف کر دیا اور ایک ٹک میری طرف اور کبھی شکیلہ کو گھورنے لگا۔ اس حوالے سے تو وہ ہمیں پہچان ہی گیا تھا کہ ہم وہی تھے جنہوں نے شادی والی پارٹی میں اسے دبوچا تھا مگر یہ ابھی اندازہ نہیں ہو پایا تھا کہ وہ مجھے "شہزی" کے حوالے سے پہچانتا تھا یا نہیں۔

"م ..... میں ..... ڈنشا ... کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، نہیں جانتے تم میں کون ہوں۔ کیا ہوں۔ اس نے ..... اس نے بیٹا کو قتل کر کے اپنے خاندان کی موت پر دستک دے دی ہے۔"

میں اس کی بات پر چونکا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ہمیں شادی کی پارٹی کے "حملہ آوروں" کی حیثیت سے تو پہچان گیا تھا مگر مجھے "شہزی" کی حیثیت سے ابھی نہیں پہچان پایا تھا۔ گویا اس کا دھیان اور طرف تھا اگرچہ میں نے

بھی اپنا بہروپ کسی قدر بدلے ہوئے رکھنے کی کوشش چاہی تھی، تاہم کسی بھی وقت پہچان لیے جانے کا احتمال اپنی جگہ موجود تھا۔

بہرکیف ..... ایسے ہی دشمنوں کی غفلت اور "کم علمی" سے میں فائدہ اٹھانے کا موقع فوراً "چھو" لیتا تھا۔ اس کی یقیناً کسی "ڈنشا" نامی آدمی کے ساتھ کوئی دشمنی چلی آرہی تھی۔

لہٰذا میں نے اسے دھوکے میں ہی رکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے پہلے اسے دکھانے کی خاطر ایک الجھی ہوئی نظر قریب کھڑی شکیلہ کے چہرے پر ڈالی اور پھر کون برگ کی طرف دیکھ کر قدرے چونکتے ہوئے انداز میں بولا۔

"کیا مطلب؟ کیا تم بھی.....؟" میں نے دانستہ فقط اتنا کہہ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ "ہم تو تمہیں ڈنشا کا آدمی سمجھے تھے؟" میں نے آخر میں چالاکی سے کہا۔

حسب توقع وہ الجھ گیا اور اسی لہجے میں مستفسر ہوا۔

"کیا مطلب، تم بھی ...؟"

"یعنی تم بھی ہماری طرح ڈنشا کے ڈسے ہوئے ہو؟"

میری بات پر اسے ایک جھٹکا لگا، بولا۔

"تو کیا تم لوگ اس کے ساتھی نہیں ہو؟"

"ہرگز نہیں۔ ہم تو بیروٹ وسکی کے آدمی ہیں۔ اسی نے ہمیں خفیہ اطلاع دی تھی کہ ڈنشا آج مسٹر اینڈ مسز یورون کلائیڈ کی شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے گا۔ اس نے اپنے کسی دشمن کو نشانہ بنانا ہے، وہ دشمن شاید تم تھے۔"

مذکورہ شادی کی تقریب اس چمکتے دمکتے بورڈ پر دیدہ زیب نیون سائن کے الفاظ مجھے ذہن نشین تھے۔ جس میں دولہا دلہن کا نام لکھا تھا۔ یوں میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

"یہ بیروٹ وسکی کون ہے؟ میں نے اس کا نام پہلی بار سنا ہے اور تمہیں میرا نام کیسے پتا چلا؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اور یہ تم نے مجھے اس طرح پھر باندھا ہوا کیوں ہے؟ کھولو مجھے میرا جسم درد کر رہا ہے۔"

"ڈنشا کا دشمن نمبر ایک....." میں نے اس کے دوسرے سوال کو نظرانداز کر دیا۔ پھر اس کا آئی ڈی کارڈ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا دیا۔

"بھاڑ میں جائے چلو اب کھولو مجھے۔" کون برگ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

مجھے اس کے غرور پر حیرانی ہوئی۔ اسے اپنی قوت کا کس قدر گھمنڈ تھا کہ وہ اس حالت میں بھی تحکمانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

"ہمارا ٹارگٹ ڈنشا تھا اور ڈنشا کے شکار تم ..... لیکن یہ تمہاری گرل فرینڈ ہلینا کیوں ماری گئی؟"

"وہ کراس فائرنگ میں ماری گئی، نشانہ میں ہی تھا۔ ایک اور بھی بے گناہ مارا گیا۔"

"ہم ....." میرے منہ سے نکلا اور یہ سارا جال پھیلانے کے بعد اس کے "تار" کھینچنے کا موقع تلاشنے لگا تو اس نے ایک بار پھر غصے سے کہا۔

"میں کہتا ہوں میرے ہاتھ پاؤں کھولو۔ اب میں تم سے کوئی دوسری بات نہیں کرسکتا۔ تمہاری ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے، اب یہ غلط فہمی ختم ہو چکی۔"

میں اس کی بات پر دل ہی دل میں ہنسا۔ اسے اگر میری حقیقت معلوم ہو جاتی تو اس کے چودہ طبق روشن ہو جانے تھے۔

"اوہو..... سوری .....!" کہتے ہوئے میں نے فوراً اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ مرہم پٹی کا سامان موجود تھا، میں نے دانستہ شکیلہ کو آنکھ کا خفیف اشارہ کر دیا تھا، وہ اب تک میرے پہلے ہی "ڈائیلاگ" کا مطلب سمجھ چکی تھی کہ میں اپنے "شکار" کے ساتھ کیا گیم کھیل رہا تھا۔

اس نے دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ کون برگ کی خراشوں پر دھیرے دھیرے مرہم لگانا شروع کر دیا، جب وہ فارغ ہوئی تو میں نے کہا۔

"ڈارلنگ! ہمارے مہمان کو ڈرنک پیش کرو، ابھی تو میں نے ان سے ڈنشا کے بارے میں اور بھی باتیں کرنی ہیں۔" وہ اسی طرح مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

"ڈنشا سے متعلق اور کیا باتیں جانتے ہو تم؟" اس نے ایک کرسی پر پشت ٹکا کر بیٹھتے ہوئے میری جانب گھور کے پوچھا۔

میں نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنے بچھائے ہوئے جال کا ایک تار کھینچتے ہوئے پہلا ٹرپ پتا پھینکا۔

"شاید تم جانتے ہو کہ ڈنشا کیسی فطرت کا مالک ہے، ایک نمبر کا دھوکے باز، لالچی اور اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دوستوں کی پیٹھ میں خنجر بھونکنے والا آدمی ہے۔"

میں دانستہ اتنا کہہ کر رکا، ساتھ ہی کن انکھیوں سے

ماہنامہ
سرگزشت
کا ایک اور
معرکۃ الآرا خاص شمارہ

خودساز نمبر

ان شخصیات کے کھٹے میٹھے تجربات
جن کی جگمگاتی زندگی میں بھی اندھیرا ہی اندھیرا تھا

ان افراد کی سبق بھری سرگزشت
جن کے لیے زندگی بھی سزا تھی، فاقے ان کا مقدر تھے

ان معروف شخصیات کا احوال
جنہوں نے اپنی زندگی خود تعمیر کی، زندگی کی مشکلات کو زور بازو سے پرے دھکیلا اور آج لاکھوں کروڑوں میں کھیل رہے ہیں

بہت جلد یہ خاص شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

ایک ایسا شمارہ جسے آپ اپنی لائبریری میں محفوظ رکھیں گے
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی مختص کرالیں

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بھانپنے کی کوشش چاہی کہ آیا اس پر میری ان فرضی باتوں پر کتنا اثر ہو رہا ہے؟ حالانکہ ڈنشا فرضی کردار نہیں تھا، اور میں اس سے ملا تو کجا اس کا نام تک پہلے نہیں سنا تھا۔ یہ تو کون برگ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا اور یوں میرے ذہن کو ایک نیا گل کھلانے کا موقع ملا تھا۔

ہاں! البتہ پیروٹ دسکی میرا تخلیق کردہ ایک فرضی کردار ضرور تھا جو میں نے ڈنشا کے حوالے سے تراشا تھا۔ چال بے حد گہری تھی اور خطرناک بھی، لیکن کون برگ جیسوں کے ساتھ عموماً ایسی ہی "زگ زیگ" انداز کی چالیں کارگر رہتی ہیں۔

بہرکیف...... میں نے دیکھا کہ وہ میری بات غور سے سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں ذرا ٹھہر کے آگے کہنا شروع ہوا۔

"تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ڈنشا اور پیروٹ دسکی آپس میں بھی دوست تھے۔ ابھی حال ہی کی بات ہے، ڈنشا سے ہماری دشمنی کی ابتدا ہوئی، ایک ایشیائی غیر ملکی نے جو تھائی لینڈ کے راستے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ امریکا وارد ہوا تھا، میں پیروٹ دسکی کا نائب ہوں، ہمارا دھندا ابھی ڈنشا سے ملتا جلتا ہی ہے (ایسا میں نے اس تاپنے کی بنیاد پر کہا تھا کہ ڈنشا بھی کوئی انڈر گراؤنڈ کرمنل یا گینگسٹر ہی ہو سکتا تھا جس کی کون برگ کے ساتھ مبینہ طور پر دشمنی چلی آرہی تھی)۔"

"تم کسی غیر ملکی کے بارے میں بتا رہے تھے؟" اس نے بھویں سکیڑ کر مجھے یاد دلایا۔ اس سے اس کی دلچسپی کا مجھے اندازہ ہوا اور میں نے اپنے ترکش سے تیر نکالنے شروع کر دیے۔

"وہ غیر ملکی درحقیقت ایک پاکستانی تھا۔ وہ یہاں اپنی عابدہ نامی کسی ساتھی لڑکی کو ڈھونڈنے آیا تھا۔ اس کے لیے اس نے ہماری خدمات لیں۔"

"اس غیر ملکی کا نام کیا تھا؟" اس نے جلدی سے بے چینی کے ساتھ پہلو بدل کر سوال کیا۔

"شہزاد احمد خان شہزی۔ وہ پاکستانی ہے۔" میں نے دھڑکتے دل سے اپنا نام بتایا، گویا اس کی کمزور رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک دوسرے کو ڈاج دینے کی یہ نازک اور سنگین صورت حالات اب فیصلہ کن موڑ پر آ چکی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھرتے تاڑ لیے تھے جیسے وہ پہلے ہی اس امر کا اندازہ لگا چکا ہو کہ وہ "غیر ملکی" جس نے مبینہ طور پر پیروٹ دسکی سے ڈیل کر لی تھی، وہ کون کے علم میں تھا۔

میں نے اسے بُری طرح چونکتے محسوس کیا۔ پھر میری طرف تکتے ہوئے اس نے اگلا سوال کیا۔

"کیا تم مجھے اس پاکستانی غیر ملکی کے ٹھکانے کا پتا بتا سکتے ہو؟"

"میرا سوال اب بھی وہیں ہے دوست!" میں نے معنی خیز مسکراہٹ سے کہا۔" میں جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر جان بوجھ کر سانس لینے کو رکا۔ میں نے محسوس کیا کون برگ کی اب بھویں ہی نہیں اس کی آنکھیں بھی سکڑنے لگی تھیں، میری طرف اور میری بات کو بڑے دھیان سے سننے کے انداز میں اس کی گردن نے بھی ہلکا جھٹکا کھایا تھا۔

میں بہ خوبی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ "موضوع" اس کے لیے کس قدر "ٹچی" تھا۔

اسی وقت کنٹینر کا دروازہ بجا۔ میری گفتگو فیصلہ کن موڑ پر تھی اور ایسے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا، یا کون برگ مجھ پر حملہ کر دیتا یا پھر میری بات سنتا رہتا، آخرالذکر بات کا زیادہ امکان تھا اور وہی ہوا۔

دستک کی اس بے ہنگم سی آواز پر ہم سب ہی چونکے تھے، شاید کھیل دادا اپنا "کام" نمٹا کر لوٹ آیا تھا۔ میں نے اپنی بات قطع کرتے ہوئے شکیلہ کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز کا ایک مخفی اشارہ بھی کر دیا کہ وہ کھیل دادا کو تازہ صورت حالات سے "بریف" کر ڈالے۔

"یہ کون آیا ہے؟" کون برگ نے اپنی محویت سے قدرے چونک کر مجھ سے پوچھا۔

"ڈونٹ وری اباؤٹ اِٹ...... میرا ہی ساتھی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" میں نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔

"اس غیر ملکی کو اپنی ساتھی عابدہ ہی کی نہیں بلکہ ایک خاتون رپورٹر آنسہ خالدہ کی بھی تلاش تھی جو ایک لبنانی عورت تھی۔ باس نے مجھے یہ کام سونپا، یہ ہمارے لیے ایک مشکل کام تھا۔ مگر ڈنشا نے اسے پیروٹ دسکی کے ساتھ کرنے کی ڈیل ففٹی پرسنٹ پر کر ڈالی۔" میں نے دانستہ ابھی لمبی چھلانگ مارنے سے احتراز برتا تھا، ابھی آنسہ خالدہ کے بارے میں بھی پتا چل جاتا تو بھی کافی کامیابی کے نزدیک پہنچا جا سکتا تھا۔ کیونکہ آنسہ خالدہ اور بعد میں سوزی والی آخرالذکر اطلاع کے مطابق آنسہ خالدہ نہ صرف عابدہ کے کورکوران جنگل کے پُراسرار راز سے پردہ ہٹا چکی تھی بلکہ

عابدہ کہاں اور کن لوگوں کی گرفت میں تھی، یہ بھی اسے معلوم ہو چکا تھا۔

"تو کیا اس حرام زادے! ڈنشا کو ان دونوں عورتوں کا پتا چلا؟" کون نے اچانک سوال کیا۔ میں نے بھانپتی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئی تھیں اور گردن اکڑ گئی تھی، پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا تھا۔

"اسے کچھ پتا نہ تھا۔" میں نے کہنا شروع کیا۔ "اس نے صرف مدد کی ہامی بھری تھی اس لیے کہ اس کا انڈر گراؤنڈ مافیا گینگ بہت وسیع تھا۔ پھر اس نے عابدہ کا تو نہیں البتہ آنسہ خالدہ کا پتا چلا لیا۔ کیونکہ وہ سب جانتی تھی۔"

یہاں میں رکا۔ کون برگ کی آنکھیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ چہرے پر ایک جوش کی سرخی کے علاوہ اس کی آنکھوں سے عجیب سی الجھن بھی نمایاں تھی۔ حسب توقع میرے لمحہ بھر کو ٹھہرنے پر وہ ایک بے چین... سی پریشانی سے بولا۔

"تت تو کیا انہوں نے آنسہ خالدہ کو برآمد کر لیا؟"

"ہاں!" میں نے مختصراً کہا۔

خالدہ سے متعلق میری دروغ گوئی فوری طور پر یہ ظاہر کر سکتی تھی کہ آیا وہ بے چاری ابھی زندہ بھی تھی یا نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کون برگ میرا جھوٹ پکڑ سکتا تھا اور میرے لیے یہ اذیت ناک انکشاف کرتا کہ خدانخواستہ آنسہ خالدہ کو بے بی سی یا ٹائیگر ٹیک کے بھیڑیوں نے ہلاک کر ڈالا ہے۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، وہ چپ رہا۔ میرے بولنے کا منتظر تھا۔ شاید وہ وضاحت سننے سے پہلے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔

لہٰذا جب اس نے ایسا کوئی انکشاف نہ کیا تو میں نے کہا۔ "آنسہ خالدہ کو بہ قول ۔ ڈنشا کے اس نے بازیاب تو کرا لیا اور اس کے ذریعے عابدہ کا بھی پتا لگا لیکن وہ جن لوگوں کے حوالے تھی، ان سے مقابلہ ہمارے گروہ کے لیے ناممکن تھا، ڈنشا نے ہم سے ڈیل کی وہ یہ کام کر سکتا ہے، بشرطیکہ اسے ایڈوانس کے طور پر ڈیل کی نصف ادائیگی کر دی جائے، باس پیروٹ نے وہ اسے کر دی، لیکن جلد ہی پتا چلا کہ آنسہ خالدہ کو نہیں اس نے درحقیقت اپنے ہی گروہ کی کسی ساتھی لڑکی کو آنسہ خالدہ بنا کر پیش کیا تھا، جسے ہم پہچان گئے کہ یہ ہماری مطلوبہ تھی ہی نہیں اور مزید یہ کہ ڈنشا کا ڈھول ہی جھوٹ نکلا۔ اس پر ڈنشا نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ بھی دھوکا کھا گیا ہے اور ڈیل میں قطع نقصان ہے، یوں وہ نصف رقم ہم سے کھا کر بیٹھ گیا۔"

یہ سارا سفید جھوٹ بڑی صفائی سے بتانے کے بعد میں خاموش ہو گیا لیکن میں اپنی چال کے مطابق اس کی "سوئی" جہاں اٹکانا چاہتا تھا، وہ مقصد میرا پورا ہو چکا تھا۔ یعنی غیر ملکی "شہزی" اور اس کے ساتھی۔

ادھر میرے مخصوص اشارے پر شکیلہ، کھیل دادا کو دوسرے رہائشی گوشے میں لے گئی تھی، تاہم مجھے معلوم تھا ان دونوں نے ہم پر نظر ضرور رکھی ہوئی تا کہ کسی "گڑبڑ" کی صورت میں وہ دونوں فوراً میری مدد کو کود سکیں۔

میری بات سن کر کون برگ کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ جس کا ایک طرف تو واضح مطلب یہ تھا کہ وہ میری باتوں میں آ رہا تھا اور دوسرا مطلب لامحالہ یہی ہو سکتا تھا کہ آنسہ خالدہ کے سلسلے میں اسے اس بات کی پوری تسلی تھی کہ وہ انہی کی گرفت میں تھی یوں میری جھوٹی بات از خود ہی ثابت ہوئی تھی کہ ڈنشا نے ہمیں دھوکا دیا تھا۔

دراصل بعض حالات اور موقع محل ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں جھوٹ یا آدھا سچ بولا جائے تو اس کے تیر ٹھیک ٹھیک نشانے پر بیٹھتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہی کچھ میرے اور کون برگ کے بیچ ہو رہا تھا۔

تاہم ابھی تک کون برگ نے آنسہ خالدہ کے بارے میں خود سے کچھ نہیں بتایا تھا۔ ابھی میری منزل اندھیرے میں تھی۔

"لیکن جلد ہی صرف مجھے اس حقیقت کا علم ہو گیا کہ ڈنشا ہمارے ساتھ ڈبل کراس کر رہا تھا۔" میں نے اسے ٹٹولنے کی غرض سے کہا۔

"اس نے آنسہ خالدہ کو بازیاب کروا لیا ہے اور ہمارا نصف حصہ کھانے کے بعد اب وہ شہزی کے ساتھ خفیہ ڈیلنگ کرنا چاہتا ہے لیکن ہم نے اسے شہزی اور اس کے ساتھیوں سے ابھی نہیں ملوایا ہے۔ یہ صرف میرے اور باس پیروٹ دسکی کے علم میں ہے اور ان کا خفیہ ٹھکانا بھی ہمیں پتا ہے لہٰذا ڈنشا نے مجھے لالچ دے کر ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے کہ اگر میں یہ خفیہ ڈیل... اس سے کروا دوں تو وہ مجھے پانچ لاکھ امریکن ڈالر دے گا۔"

"تم نے پھر کیا فیصلہ کیا؟" کون برگ نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جیسے سانس روک کر

یہ پوچھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک اس کے مطلب کی بات جاری رہے گی، وہ دھیان میں لگا رہے گا۔ میں نے جواب میں کہا۔

''سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں کہ ڈنشا کی ایک میٹنگ شہزی اور ان کے ساتھیوں سے کروا ہی دوں۔ یہ غداری تو ہو گی، لیکن مجھے پروا نہیں، پیسا تو مل جائے گا نا مجھے بہت سارا۔'' میں نے خود کو لالچی ظاہر کیا۔

''ڈنشا کی بات ہرگز مت ماننا۔'' وہ ایک دم جوش سے بولا۔ ''وہ تم سے جھوٹ بول رہا ہے، کیونکہ آنسہ خالدہ اس کے قبضے میں نہیں ہے۔'' بالآخر وہ کھلنے لگا۔ ''شہزی'' اس کے لیے بہت ''ٹچی'' موضوع تھا۔

''تمہیں اس قدر کیونکر یقین ہے؟ بھلا تمہارا ان سے کیا لینا دینا؟'' میں نے ''معصومانہ'' سی حیرت سے کہا۔

''اس بات کو چھوڑو۔'' وہ ایک ہاتھ اور اپنا سر ایک ساتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ اپنے مطلب کی بات پر آتے ہی وہ پُرجوش اور بے چین سا ہو گیا تھا۔ ''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ ڈنشا کے بجائے یہ ڈیل تم مجھ سے کرلو اور میں تمہیں اس سے زیادہ رقم دوں گا تم شہزی اور اس کے ساتھیوں کے ٹھکانے اور رابطے کے بارے میں مجھے بتا دو تاکہ میں خود ان سے آنسہ خالدہ کے سلسلے میں ڈیل کرلوں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

اس کی بات سن کر میرا دل اندر یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اب بھی واضح نہیں ہو پایا تھا کہ آنسہ خالدہ زندہ بھی ہے یا نہیں، تاہم میں اب تک اسے جتنا کھوجنے میں کامیاب رہا تھا، اتنا تو مجھے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ابھی ان جنونیوں کی خوفناک بربریت کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

لہٰذا میں نے اسے اپنی چال میں پھنسانے کا جو ''گراؤنڈ'' بنایا تھا، اس کے تل پر بولا۔ ''ٹھیک ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تمہیں اس پاکستانی غیر ملکی شہزی سے کیا دلچسپی ہے۔ اگر تم مجھے ڈنشا سے زیادہ معاوضہ دینا چاہتے ہو تو یہ ڈیل میں تم سے کر لیتا ہوں، ڈنشا پر تو یوں بھی مجھے کوئی بھروسا نہیں رہا لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم مجھ سے کوئی دھوکا نہیں کر رہے ہو؟''

''میں تمہارے اطمینان کے لیے ابھی فی الحال عابدہ کا تو نہیں البتہ آنسہ خالدہ کا دیدار تمہیں کروا دوں گا اور بولو؟''

میرا دل خوشی سے بلیوں اچھل پڑا، ابھی میرے لیے یہی کافی تھا لہٰذا میں اس مسرت کو دباتے ہوئے دکھاوے کی حیرت سے بولا۔

''کیا واقعی؟''

''ہاں! چاہو تو ابھی چلو میرے ساتھ۔''

''اچھا! اگر تم میری یہ تسلی کرا دو تو میں بھی تمہیں اسی وقت شہزی اور ان کے ساتھیوں سے ڈیل کروا دیتا ہوں اور تم سے اپنا انعام لے کر چلتا بنوں گا۔''

''کھڑے ہو جاؤ پھر۔'' اس نے ایک دم اپنی جگہ چھوڑ دی۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔

میں نے اس کا مختصر ذاتی سامان اسے لوٹا دیا۔

''میں اپنے ساتھیوں کو بتا کر آتا ہوں، پھر تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ذرا جلدی۔ آج ہی یہ معاملہ نمٹانا ہے۔''

میں نے دوسرے کمرے میں آکر کھیل داد اور شکیلہ سے صرف چند سیکنڈوں کی ملاقات کی۔ وہ دونوں دروازے سے کان لگائے کھڑے تھے۔ اُن کے چہرے جوشِ مسرت سے تمتما رہے تھے۔

''تم نے تو کمال کر دیا شہزی...!'' دونوں ہی دھیمی سرگوشی میں بیک وقت بولے۔

''شش...'' میں نے ان دونوں کو گھورتے ہوئے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جوشِ مسرت میں وہ بھلا بیٹھے تھے کہ دوسری طرف کس قدر خطرناک دشمن موجود تھا۔

میں نے انہیں جلدی سے اپنے محتاط تعاقب کی ہدایت کی اور پھر دوسرے گوشے میں آکر گون برگ کے ساتھ باہر نکل گیا۔

ایسا نہیں تھا کہ مجھے اپنی کامیابی کا یقین نہیں آرہا تھا، مجھے یقین تھا اس لیے کہ یہ چال اپنے بروقت حالات اور موقع محل میں چلی گئی تھی جس کا ''منظرنامہ'' ازخود تیار ہو چکا تھا اسی لیے گون برگ جیسے گھاگ شخص کو بھی کسی چالاکی یا چال کا شبہ اور شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔

ہم دونوں نے مین شاہراہ پر آکر کیب کروائی اور نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

پیش آمدہ اور متوقع حالات کی کشاکش کا میں تصور بخوبی کر سکتا تھا۔ وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ گون برگ مجھے ''ڈیلی'' ہی سمجھ کے سہی، ''شہزی'' وغیرہ کے بارے میں اگلوانے کے لیے دھوکے سے یرغمال بنا سکتا تھا یا پھر واقعی آنسہ خالدہ کو جیتا جاگتا مجھے دکھا کر میرے ساتھ ''معاملہ داری'' کی بات کرتا۔

کیب نامعلوم منزل کی جانب گامزن تھی اور میں گاہے بگاہے عقبی منظر پیش کرنے والے مرر میں یہ دیکھنے کی تسلی کرتا کہ کھیل داد اور شکیلہ کس ہوشیاری سے ہمارے تعاقب میں تھے؟

کیلی فورنیا کی سڑکوں پر شفقی رات اتری ہوئی تھی۔ نیون سائن بورڈ تو سرِشام ہی جگمگانا شروع کر دیتے۔ ٹریفک معمول کے مطابق رواں تھی۔

گون برگ میرے مقابل ہی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔

عابدہ کی جستجو و تلاش میں یہ میری طویل و کٹھن مسافتیں تھیں جن کی منزل ایک مگر راستے ہزار تھے جو نامعلوم سی مگر میرے ہی بنائے ہوئے تھے، انہی میں ایک اپنے ذہن رسا سے بنائے ہوئے راستے پر میں گامزن تھا۔

اگر گون برگ کو اصل حقیقت معلوم ہو جاتی کہ وہ کسی ''ڈیلی'' کو نہیں بلکہ ایسے شخص کو اس کی منزل کے نشان تک لے جا رہا ہے، تو وہ مجھے اس طرح آرام سے کیب میں لے جانے کے بجائے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر یا ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ کر کے ہی لے جاتا، منزل کی طرف نہیں کسی ٹارچر سیل میں۔

لیکن اس سے اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی۔ میں نے اس کی کمزور رگ کو ایسے موقع محل پر چھیڑا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی محدود ہو کر مجھ سے جلد از جلد ''شہزی'' کے حصول تک رہ کر ختم ہو گئی تھی۔ چاہے بعد میں وہ مجھے یعنی ڈیلی کو دھوکے سے ہلاک کر دیتا۔

سارے راستے میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن اجنبیت کی اپنی چند مروجہ مشکلات ہوتی ہیں، یہ ماقبل تو نیا شہر خراب بلکہ ملک خراب بھلا میں پہلے کب دیکھا تھا" بہرکیف جتنا کچھ یاد رکھ سکا، وہ کرتا رہا، لیکن میں ابھی تک ٹریفک کے اس رواں ہجوم میں کسی کیب وغیرہ میں تعاقب میں کھیل داد اور شکیلہ کی جھلک تک نہ دیکھ پایا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے نگاہ میں نہ رکھ رہے ہوں، مگر میں انہیں تلاشنے سے شاید قاصر رہا تھا کہ گون برگ جیسا آدمی میرے ہمرکاب تھا۔

کیب مضافات میں آگئی، یہاں آبنوسی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اگرچہ آبادی کے آثار دیدہ زیب اور قیمتی لکڑیوں کے کاٹیج نما مکانوں کی صورت میں یہاں بھی نظر آرہے تھے، تاہم شہر کی نسبت یہاں زیادہ تر سناٹے کا ق

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
[illegible]
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
[illegible] 0301-2454188
[illegible] 0333-3285269
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 35804200-35804300

راج تھا۔

ایسے ہی وقت میں گون برگ نے اپنے سیل فون پر کسی سے بات کی۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں اور مختصراً الفاظ استعمال کر رہا تھا۔ سردی کے سبب کار کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی کار کے محدود ماحول میں گونج کی سی فضا طاری تھی، ڈرائیور بھی کوئی من چلے مزاج کا آدمی تھا اس نے اسٹیریو ڈیک پر کوئی ہلکی موسیقی لگا رکھی تھی اور سیل پر بات کرتے ہوئے گون برگ نے بھی اسے ٹوکنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی کہ وہ اسے بند کرنے کا کہتا۔ شاید وہ خود بھی یہی چاہتا تھا، کہ کوئی اس کی فون پر ہونے والی گفتگو نہ سن سکے۔ اس نے اضافی آوازوں کی "مداخلت" سے بچنے کے لیے اپنا ایک ہاتھ دوسرے کان پر رکھ دیا تھا۔

ادھر میں خود یہ اندازہ کر کے کہ منزل قریب تھی، وہ شاید اپنے ساتھیوں کو کوئی ہدایت دے رہا تھا، یہ بڑا رسک لیا تھا میں نے۔ لیکن چال میری بالکل سیدھی تھی۔ گڑبڑ کا امکان بس اتنا ہی تھا کہ گون برگ مجھ سے دھوکا.. کرتا جس کی مجھے پوری امید بھی تھی، یعنی اس بات کا قوی امکان تھا کہ اس کے اندر بھی کھچڑی پک رہی ہو کہ وہ مجھے شہزی کی حیثیت سے نہ سہی مگر "ڈیلی" کی حیثیت سے ہی کیا خبر یہ ارادہ رکھے ہوئے ہو کہ مجھ سے ڈیل کیے بنا دھوکے سے یرغمال بنا کر "شہزی" وغیرہ کے بارے میں اگلوانے کی کوشش کرتا اور تشدد کی راہ سے بھی نہیں چوکتا۔ ہر زاویے سے حالات اس وقت غیر یقینی ہی سے تھے۔

کوئی دو ایک کلومیٹر چھوٹی بڑی خاکستری پہاڑیوں کے اس سلسلے میں سفر کے بعد گون برگ نے جس مقام پر کیب رکنے کا حکم دیا تھا، اسے دیکھ کر مجھے سخت اچنبھا ہوا تھا۔ اس لیے کہ میری توقع کے برخلاف ہم کسی ویران مقام پر تھے۔

کیب رک گئی۔ گون برگ نے مجھے اترنے کا کہا۔ میں محتاط انداز میں نیچے اتر آیا۔ اس نے کیب ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے چلتا کر دیا۔ میں نے ذہنی طور پر خود کو اب ہر طرح کے ممکنہ خطرے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔ یہ احساس میرے جوش اور کوہ شکن حوصلوں کو تقویت بخش رہا تھا کہ میں آنسہ خالدہ کی بازیابی کے لیے ایک کامیاب پیش رفت کر چکا ہوں اور اب بس! کچھ ہی دیر میں، آنسہ خالدہ سے پہلی بار میرا آمنا سامنا ہونے والا ہے۔

ایک خدشہ تھا کہ آنسہ خالدہ مجھے پہچان سکتی تھی۔ کیونکہ میں اس کے ساتھ کمپیوٹر پر ویڈیو چیٹنگ کر چکا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اسے اشارہ کر سکتا تھا یا پھر وہ خود بھی بات کی تہ تک پہنچ سکتی تھی۔

لیکن اس وقت میرے دل کو بے چینی سی لگ گئی جب گون برگ مجھے ایک بالکل ویران اور اندھیرے مقام میں لے کر اترا تھا۔

"کیا یہاں ہم غلطی سے اتر گئے ہیں؟" بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔

"ہم بالکل صحیح جگہ اترے ہیں۔" گون نے جواب دیا۔ نجانے کیوں مجھے اس کا لہجہ خاصا گمبھیر محسوس ہوا۔ اس کا جواب مبہم سا تھا۔

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ سامنے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک کار ہمارے قریب آن رکی۔ اس کے اندر سے دو افراد برآمد ہوئے۔ ان کی حرکات و سکنات سے مخصوص قسم کی چابک دستی جھلکتی تھی۔

دونوں نے مودبانہ انداز میں آگے بڑھ کر گون برگ، جھک کر تعظیم پیش کی اور میری جانب محض ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

اس کے بعد ایک نے کار کا اگلا دروازہ کھولا۔ گون برگ اس میں سوار ہو گیا۔ دوسرا پھرتی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ والے دروازے کی طرف لپکا، پہلے والے نے مجھے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کے کار میں سوار ہونے کا اشارہ کیا اور میرے سوار ہوتے ہی خود بھی براجمان ہو گیا۔ کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ آنے والے غیر یقینی حالات کو محسوس کرتے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا تھا اسی لیے میں خاموش تھا۔ اس نے فون کر کے اپنے آدمیوں کو یہاں بلا لیا تھا وہ شاید ضرورتاً ہی محتاط رہنے کا قائل تھا۔

چند فرلانگ کی ڈرائیو کے بعد کار دائیں جانب ایک تنگ سی مگر پختہ سڑک کی جانب مڑ چکی تھی۔

میرے خیال کے مطابق کھیل دادا اور شکیلہ پیچھے یا دور کہیں رہ گئے تھے۔ یوں بھی وہ اس ویران سڑک پر خود کو نظروں سے مخفی ہی رکھنا چاہتے ہوں گے، اس طرح تعاقب کا راز افشاں ہو سکتا تھا اور بنا بنایا سارا کھیل بھی بگڑنے کا اندیشہ تھا۔

مذکورہ سڑک پر مڑتے ہی وہ کسی پہاڑی پر عمودی جاتی محسوس ہوئی اور کار بھی اسی سمت پر مناسب رفتار سے دوڑتی چلی گئی۔

اب ہمارے دائیں بائیں تاریک سا بنجر ویرانہ اور پہنکر سے سرمئی ہیولے تھے، جو شاید قدرتی جھاڑ جھنکاڑ اور منڈ سے خشک درختوں کے ہیولے ہو سکتے تھے۔

اسی پہاڑی کی چوٹی پر وہ ایک شاندار عمارت تھی۔ جو قبے اور حجم کے لحاظ سے کم از کم پانچ سو یارڈ تک تو محیط دکھائی تی تھی۔ وہاں روشنی تھی۔ عمارت کی چھت پر شاید ہیلی پیڈ بھی یا گیا تھا کیونکہ وہاں مجھے کسی چاپر کا اگلا حصہ اور پنکھوں کی جھلک نظر آئی تھی۔ ایک دو گاڑیاں بھی باہر گیٹ کے موجود تھیں۔ وہاں دو گن مین سے آدمی چست لباس پہنے مستعد کھڑے تھے۔ فضا میں عجیب سی خاموشی گھلی ہوئی تھی اور تاریک آسمان پر محاق کا چاند دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ کالے بادلوں کی آوارہ ولیاں تاروں کے جھرمٹ کی ضوفشانی کو پوری طرح چھپانے سے قاصر نظر آتی تھیں۔

کار اسی گیٹ کے قریب جا رکی تھی مگر کار اور اس میں سوار کو پہچان کر ان دونوں اسلحہ پوش محافظوں نے کوئی حرکت نہ کی تھی۔ وہ اسی طرح مستعد اور چوکس کھڑے، گاہے بگاہے گرد و پیش پر نگاہ ڈالے ہوئے تھے۔

گیٹ خاص قسم کی دھات سے بنا ہوا تھا اور اس کی بناوٹ میں نفاست تھی۔ وہ خودکار انداز میں دائیں جانب سلائڈ ہوتا چلا گیا۔

ہم چاروں اندر داخل ہو گئے۔ گون برگ آگے تھا اور اس کے ہمراہ ایک آدمی جبکہ دوسرا میرے ساتھ تھا اور ہم ان کے عقب میں چلتے ہوئے ایک پختہ روش سے عمارت کے مرکزی دروازے پر پہنچے۔

میں بہ ظاہر دزدیدہ مگر غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے سے مجھے دائیں بائیں فینسی پینٹنگ اور سنگ مرمر کے قدمچوں والے زینے ذرا بل کھاتے ہوئے اوپری منزل کی طرف جاتے نظر آئے تھے۔

ہم .... شاہ بلوط کے ایک موٹے مگر دیدہ زیب دروازے سے ہوتے ہوئے، جو گون برگ کے قریب پہنچتے ہی خودکار انداز میں کھلتا چلا گیا تھا، اندر داخل ہو گئے۔

یہ ایک بڑا ہال تھا۔ فرش پر دبیز قالین اور نہایت بیش قیمت اشیا اور آرائش جدیدیت سے آراستہ و پیراستہ یہ ایک آرام دہ اور پرتعیش نشست گاہ تھی۔ جس کی چھت قدرے بلند تھی اور اس پر پانچ دیدہ زیب فانوس جھول رہے تھے، درمیان والا فانوس مقابلتاً بڑا تھا۔ باقی چار اس کے دائیں بائیں چھت کے کونوں کے قریب ایک مناسب فاصلے پر تھے۔

فرنیچر قیمتی اور آرام دہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آنسہ خالدہ کو ایسی جگہ پر یرغمال بنا کر رکھا گیا ہوگا؟ میرے ذہن میں تو کسی سیلن زدہ سی بوسیدہ جگہ کا تصور تھا۔

"کیا واقعی آنسہ خالدہ یہاں موجود تھی؟" میرے ذہن میں ابھرا۔

مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا کہا گیا۔ گون میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ دو تین افراد مودبانہ انداز میں اس کے قریب آن کھڑے ہوئے۔ ایک کو اس نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے چہرے کے آگے جھکا۔ گون برگ نے اس کے کان میں کچھ کہا۔

اچانک ہی ماحول کچھ ایسا لگا جیسے ابھی کچھ ہونے والا ہو۔ وہ آدمی اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے سیدھا ہوا اور اپنے ساتھ ایک اور کو بھی آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک کونے والے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

گون برگ میری جانب گھورے جا رہا تھا پھر بولا۔

"آنسہ خالدہ کو تم دیکھتے ہی پہچان تو لو گے نا؟"

"بالکل۔" میں نے یقینی لہجے میں جواب دیا لیکن اندر میرے اب زبردست دھکڑ پکڑ مچی ہوئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر بعد آنسہ خالدہ کو میرے سامنے پیش کیا جانے والا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی کیا حالت ہو سکتی تھی؟ اس کی دلی و ذہنی کیفیات کا مدوجزر اپنی جگہ لیکن خدشہ مجھے یہی دامن گیر تھا کہ کہیں وہ جوش مسرت و حیرت کے اظہار تلے کوئی بےوقوفی نہ کر جائے، اگرچہ وہ خود ایک ذہین اور دلیر مجاہدہ تھی۔ ممکن تھا کہ اس بےچاری کو ان فتریہ نسلی یہودیوں نے کچھ زیادہ ہی ٹارچرائزڈ کیا ہو اور وہ ایسی مرگ آسا کی سی کیفیات میں مبتلا ہو کہ اس بات کا دھیان ہی نہ رہے اور وہ مجھے پہچان کر بے اختیار حسرت و یاس تلے پکار بیٹھے۔

"تم کچھ سوچ رہے ہو؟"

اچانک گون برگ کی آواز نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میرا انداز بھی بےدھیانی میں ایسا ہی چونکنے والا تھا کہ جیسے میری کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

"ہاں! میں دراصل یہ سوچ رہا تھا کہ ایسی شاندار جگہ پر تو تم نے اپنے قیدی کو بڑے ٹھاٹ باٹ سے رکھا ہوگا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے بدستور یوں اپنی جانب گھورتے رہنے سے ادراک ہوتا تھا کہ وہ میرے جواب سے کچھ خاص مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"ہم م م م......" اس نے گمبھیر سی ہنکاری بھری۔ میری بےچینی کچھ سوا ہوئی۔

اچانک ایک آدمی باہر سے اندر داخل ہوا۔ یہ اُن دونوں میں سے نہیں تھا جو گون برگ کے حکم پر کونے والے دروازے کے اندر داخل ہوئے تھے بلکہ یہ ان میں سے ایک تھا جو باہر دو اسلحہ پوش مستعدی کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس نے ایک عجیب سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر قدرے جھک کر اس نے گون برگ کے کان میں کچھ کہا۔ میری نظریں بھی ان دونوں کا جائزہ لینے میں محو تھیں۔ اس آدمی کی نظروں میں جانے ایسا کیا تاثر تھا میں نے محسوس کیا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے ایک نئی اور نامعلوم سی بےچینی میں مبتلا کردیا۔

میں نے دیکھا، اس آدمی کی بات سن کر گون برگ نے میری جانب استہزائیہ مسکراہٹ اور قدرے سنسناتی نظروں سے گھورا تھا پھر اپنے ایک ہاتھ کا اسے مخصوص اشارہ کیا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔

"تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا تھا مسٹر ڈینی؟" اس گن مین کے دوبارہ دروازے کی جانب پلٹتے ہی گون برگ نے مجھ سے بڑی زہریلی سرسراہٹ تلے کہا اور میرا اندر بُری طرح کھٹک گیا۔ پہلا چور خیال جو میرے ذہن میں ابھرا تھا، وہ یہی تھا کہ میرا شاید بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا، وہ اسی لہجے میں دوبارہ بولا۔ "میرا نام گون برگ ہے جانتے ہو ناں؟ میں جہاں جاتا ہوں یا جہاں سے لوٹتا ہوں وہاں میرے ساتھی بھوتوں کے سائے کی طرح ہر طرف سے مجھے گھیرے ہوئے ہوتے ہیں۔"

یہی وہ وقت تھا جب اس نشست گاہ نما ہال کا دروازہ کھلا اور میں سامنے کا منظر دیکھتے ہی تقریباً اچھل پڑا اور میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

چار مسلح افراد کھیل دادا اور شکیلہ کو بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے اندر لے کر آئے اور ہمارے سامنے انہیں فرش پر گون برگ کے قدموں کے قریب ڈال دیا۔

میری پھٹی پھٹی نظریں ان دونوں پر ہی رہ گئی تھیں جو لہولہان اور بے سدھ سے فرش پر آڑے ترچھے پڑے تھے۔ پھر ایسے ہی وقت میں میرے کانوں میں دستاری کے الفاظ گونجنے لگے جو اس نے مجھ سے اس مردود گون برگ کے متعلق کہے تھے۔

شہزی... ! اس نے اپنی حفاظت اپنی ریکی کرنے والوں کے پیچھے درجنوں آدمی چھوڑ رکھے ہیں جو سب کے سب تربیت یافتہ ایجنٹ ہیں، ان میں کوئی تمہیں بارٹینڈر کے روپ میں ملے گا تو کوئی حسین ویٹریس کے روپ میں۔ حتیٰ کہ کسی فٹ پاتھ یا چوراہے پر کھڑا خاموشی سے گزارا کرتا ہوا گداگر (فقیر) بھی۔ جیسے ہی انہیں یہ بھنک پڑے گی کہ تم گون برگ کا پوچھتے پھر رہے ہو وہ فعال ہوجائیں گے۔"

"جی جی... یہ سب کیا ہے مسٹر گون برگ؟" میں یک دم طیش کے مارے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ تسلی ہوئی تھی مجھے کہ معاملہ کچھ اور تھا کہ ابھی میرا "بھانڈا" نہیں پھوٹا تھا۔

"بیٹھ جاؤ آرام سے ڈینی!" گون برگ کا لہجہ موت کی طرح سرد تھا۔ اس کے آدمیوں نے اپنے ہتھیاروں کا رخ میری جانب کردیا تھا۔

میں اس کی جانب غصے سے گھورتا ہوا دوبارہ بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری اس حرکت کو کیا نام دوں؟ جو تم نے کی ہے؟" وہ پھر موت جیسی سفاکانہ سرسراہٹ سے بولا۔ مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنے ہی آدمی پیچھے لگا دیے؟"

"اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں تھا مسٹر گون!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

صورتِ حالات کسی اور حوالے سے ایک دم سنگین اور نازک تر ہوگئی تھی۔

"ایسا میں نے اپنے تحفظ کی خاطر کیا تھا۔ کیونکہ ہوسکتا تھا کہ تم مجھے اپنے ٹھکانے پر لاکر کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتے تھے۔" میں نے ایک روایتی سا عذر پیش کرتے ہوئے اس سے کہا۔

"اچھا لگا مجھے تمہارا یہ جواب..." وہ سنگین سی مسکراہٹ تلے بولا اور پھر اسی وقت کونے والا دروازہ کھلا۔

میری تشویش زدہ سی نظریں ہنوز قالین پر بکھرے ہوئے انداز میں زخمی اور نیم بے ہوش پڑے کھیل دادا اور شکیلہ پر جمی ہوئی تھیں اور ان کی حیثیت کذائی دیکھ کر میرا اندر جلنے لگا تھا کہ اچانک گون برگ کی گونج دار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"وہ دیکھو ڈینی! آنسہ خالدہ تمہارے سامنے ہے... شاید تمہیں مجھ سے ڈیل کرنے کی تسلی ہوجانی چاہیے۔"

میں نے اس کی بات سن کر اپنی گردن مذکورہ سمت گھمائی اور سامنے کا منظر دیکھتے ہی میرا چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ ایک چپ کی سی کیفیت، منحوس چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی جیسے میرے چہرے پر آن چپکی تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

غلط فہمی

اعتزاز سلیم وصلی

زندگی میں ایسے لمحے اپنی جھلک ضرور دکھلاتے ہیں جنہیں فیصلے کی گھڑی کی سند حاصل ہوجاتی ہے... ایک ایسے ہی شخص کا قصۂ عبرت جس کا کوئی دشمن نہ تھا... اور غمگسار بھی کوئی نہ تھا... وہ اپنی کشتی کا خود ہی نگہبان تھا... لہریں جو ڈولتی اس کشتی کو غرق بھی کرسکتا تھا اور ساحل تک لے جانے کی قوت بھی رکھتا تھا... اس کے باوجود کشمکش... ٹکراؤ... ہیجان... فراموش نہ کردینے والے احساسات نے اسے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کردیا... ایسا ہتھیار جو صرف ایک بار استعمال ہوتا ہے مگر اسے ساری زندگی ڈھونا پڑتا ہے۔

نظریۂ زندگی کی جنگ میں الجھی ہم جوئی سے بھرپور [illegible]

اس کی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ صبح پانچ، چھ بجے سونا، رات کے اندھیرے میں اٹھنا، کوئی گاہک تلاش کرکے بنگلے پر لانا... گاہکوں کی خدمت کرنا۔ انہیں "مال" کی خصوصیات بتانا۔ صبح واپس چھوڑ کر دوبارہ سو جانا۔ وہ ہمیشہ خدا سے شکوہ کرتا رہتا۔ "یا خدا، اس زندگی سے اچھا تھا کہ تو مجھے لڑکی ہی بنا دیتا، کم از کم اس بنگلے میں تو عزت ہوتی میری۔" اور یہ سچ تھا۔ وہ بدقسمت تھا جو ایسے گھر میں پیدا ہوا جہاں لڑکے کا کوئی کام نہ تھا۔ یہاں صرف

ategory: Download THis Book Pdf

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

محبت، نفرت، [illegible] گالگ، معرکہ شناسی اور انتقام آشرم ، صب ہی اپنے اپنے طلب کے مطابق بہت مہنگے بکتے ہیں۔ بحالی حالی میں لیکن جب مایوس کے بعد مکمل بکتی نہیں والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ [illegible] جاتا ہے۔ ۔ مجرم ہوئے پال ہے قلیسا کے نام پہ رہنموں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے۔ ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے۔ ۔ استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابلِ نفرت ہے۔ اسے بھی وقت اور حالات کی رفتار نے ایک علاقے [illegible] کی راہ میں پہنچا دیا تھا۔ سسکتا رہا مگر کچھ بس ، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہر حال مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا ۔ ۔ وہ اپنی چالیں چلتے رہے، وہ اپنی گھات لگا کر ان کی شیطانی [illegible] رہا۔ یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس نے جانا کہ [illegible] ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا۔ اپنی راہیں الگ [illegible] کو حالات جتا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کی کھیل میں راج کا حوالہ دیکھنے والوں سے تو ... بہت خوش [illegible] وہ بہ جنون سے اُبھرا نظر آنے والوں کو مسرور کرنے کا سامان محفوظ پیدا کیا ہے۔ چلیں [illegible] رنگ کی سنسنی خیزی اور [illegible] داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے۔

[illegible]

قسط نمبر 58

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہری نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک دھندلی سی جھلک یاد تھی۔ باپ ہوتے ہوئے ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک بدترین شکل تھی جہاں بڈھے سے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی ماہ رخ بھی تھی۔ شہری کو اس سے محبت ہو گئی۔ شہری کی دوستی وہاں ایک بڈھے سے ہو گئی [illegible] جس کی حقیقت جان کر شہری کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بڈھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے بگڑے بچے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر [illegible] لگتا ہے۔ شہری کا ایک دوست [illegible] چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ [illegible] استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ [illegible] ممتاز خان کی سگی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمایئے

میں ابھی ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تو میرا سر چکرا سا گیا اور پھیلی ہوئی آنکھیں بجھی بجھی سی محسوس کر رہی تھیں۔ دل یوں بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی اس کی دھڑکنیں بھی میرے بدن سے دھڑکنوں کی طرح باہر ہو جائیں گی۔

"ہا ہا ہا" اچانک ملعون اور بدذات گرین برگ کے قہقہے نے میرے دماغ کی نسوں تک کو جھنجوڑ ڈالا۔ میں قدرے چونک کر تیزی سے اس کیفیت سے نکل آیا اور دوبارہ کرب ناک انداز میں گرین برگ کی طرف دیکھا۔

اس خبیث نے جام کا ایک اور بڑا گھونٹ بھرا۔ اس کا بلکا قہقہہ اس کے کریہہ چہرے اور جبڑوں سے نکلے دانتوں کی سفاک مسکراہٹ مجھے بُری طرح تڑپا گئی۔

میرے وجود میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش ابھری کہ میں لپک کر اپنے سامنے صوفے پر پُرغرور انداز میں پھیلے بیٹھے اس کریہہ بھیڑیے پر جھپٹ پڑوں اور اسے چیر پھاڑ ڈالوں۔

بس یہ میں ہی جانتا تھا کہ میں نے کس طرح اپنے اندر کے جنون کو قابو کر رکھا تھا۔ کیونکہ اس وقت معاملہ صرف آنسہ خالدہ کا ہی نہیں، کیپٹل ولیم اور شفیقہ کا بھی تھا جو نیم بے ہوشی کی حالت میں بے سدھ پڑے تھے۔

میری ادنیٰ سی بھی جنبش یا حرکت پر گرین برگ کے چوکس کھڑے ساتھی، انھیں پہلے اپنی گولیوں کی زد میں لے سکتے تھے۔

اس خیال کے ساتھ کہ کہیں گرین برگ کو میری اندرونی اذیت کا احساس نہ ہو جائے، میں نے اپنی اس کیفیت کو قدرے چھپاتے ہوئے اور پیشانی پر شکنیں ڈالتے ہوئے گرین برگ سے کہا۔

"مسٹر گرین برگ! اس کی حالت تو اس قدر خراب اور غیر شناخت سی ہو رہی ہے کہ..."

"تمھیں اجازت ہے۔" وہ گھمنڈی لہجے میں میری بات کاٹ کر بولا۔ "اطمینان سے قریب جاؤ اور اچھی طرح پہچان لو، بہتر ہے کہ پہچان سکو۔"

اس کی اجازت ملتے ہی میں نے فوراً صوفے سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر اس خیال سے کہ میری اس قدر عجلت آمیز پھرتی اور بے تکلفی پر اس شیطان گرین برگ کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے۔

میں چند ثانیے کے لیے دانستہ سوچ میں ڈوبا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اپنی اذیت اور کرب کو جو دل و دماغ پر بے پناہ جبر کر کے اٹھا اور اس طرف بڑھا۔

مجھے اس وقت پل کی اذیت لگی اور قوت ارادی کا سہارا تھا کہ میرے قدموں میں کپکپاہٹ کا شائبہ بھی نہ محسوس ہو جبکہ میرے اعصاب شل ہو رہے تھے اور دماغ کالے طوفانوں کی مانند آندھیوں جیسی غضب ناک شکل بھی ہو گئی۔

میرے سامنے صرف چند قدموں کے فاصلے پر وہ اکیلی چیئر پر موجود تھی اور جو اس کی اکیلی کمزوری بنے ہوئے لائے تھے۔ دونوں جیتا جاگتا اصل کے لیکن یہ فاصلہ دو قالی ہاتھ تھے۔

اکیلی چیئر پر جو بھی موجود تھا، بس وہ اس اعتبار سے وہ آنسہ خالدہ ہی تھی جیسا کہ اس کا نام لے کر گرین برگ نے مجھے اس کی طرف دیکھنے کو کہا تھا۔ ورنہ اس کی جو حالت تھی، وہ کم از کم قابلِ شناخت زمرے میں نہیں آسکتی تھی۔

آنسہ خالدہ... ایک بہادر انتہائی نڈر خاتون... وہ ایک عورت... جس نے مادر وطن جیسے وطن کو امریکا میں رہتے ہوئے بہادری اور جرأت مندانہ حب الوطنی کے ساتھ بچا کر ان لوگوں کے منہ پر رسید کیا تھا جو امریکا کے اس عظیم سانحے کا مسلمانوں کے سر تھوپنے کے لیے کوشاں تھے۔ صرف یہ بلکہ جو ایسے معاملے میں بھی اس نے بے جگری دکھائی تھی۔

آج وہ جس حال میں میرے سامنے پیش کی گئی تھی وہ... ایسا ہی تھا جیسے کوئی زندہ لاش کی شکل ہو۔

وہ محض ایک میلے سے رنگ کے چغے نما لباس میں ملبوس تھی۔ ایسا چغہ جو بغیر آستینوں کا تھا جس کا گریبان قدرے نیچے تک تھا اور جو بمشکل گھٹنوں تک۔

تشدد کی جو انتہائی حد ہو سکتی تھی، وہ میں اکیلی چیئر پر ڈھلکی سی بیٹھی آنسہ خالدہ کی صورت میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا سر سینے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ کوئی لعاب یا رال کی پتلی لکیر کی صورت میں اس کے منہ سے بہہ رہی تھی۔ بال بکھرے سے تھے۔ بے شمار نشانوں، باچھوں، گالوں اور آنکھیں اس قدر متورم نظر آرہی تھیں کہ ان پر پڑے نیلے نشانوں کی سرخی سیاہی میں بدل چکی تھی۔ دونوں ٹانگیں، اکیلی چیئر کے پائیدانوں پر سیدھی نہیں بلکہ ٹیڑھے میڑھے انداز میں گری پڑی تھیں۔ دونوں ہاتھ اور بازو قدرے جھولتے ہوئے تھے لگتا تھا کہ وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔ جسم نحیف و نزار تھا جیسے کچھ سنبھالنے کی بھی سکت نہ رہی تھی اور اس کی گردن کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی بھی لمحے ڈھلک سکتی ہے۔

ہول۔

میرے قریب آنے تک قطار کے دائیں بائیں کھڑے ایک نے اس زندہ لاش کا سر گھنگھریالے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اٹھایا تھا اور چہرہ میرے سامنے ہو گیا۔

میرا جگر کٹنے اور دل کٹا جا رہا تھا۔ چہرے کی حالت جسم سے بھی بدتر نظر آ رہی تھی۔ دونوں گال جن پر کبھی شوخ رنگوں کی بہاریں کھلتی ہوں گی اب وہاں سوکھے زخموں کے گڑھے پڑے تھے۔ ناک کا بانسہ ٹوٹا ہوا اور ایک نتھنا ادھڑا ہوا تھا۔ ہونٹ پچکے ہوئے اور ان کی باچھیں ادھڑی ہوئی تھیں۔ [illegible] سے [illegible] پڑی تھیں۔ گہرے خون رنگ کچھ جو گند سے سیاہ پڑا تھا، جو رہ رہ کر سوجے ہوئے ہونٹوں سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کے جسم کے اندر بھی کچا زخم دینے کی کسی رعایت سے کام نہ لیا گیا ہو۔ اس کھانے کا مطلب تھا کہ بدنصیب آنسہ خالدہ کی زبان بھی اس غیر انسانی اور بہیمانہ تشدد کے باعث کٹ گئی ہے۔ اس نازک معصوم شاہزادی کے اقبال کو جس طرح حرامی مشق بنایا گیا تھا، اسی سبب وہ صرف ڈھانچا سی نظر آتی تھی۔

وہ خالدہ ہی تھی۔ ہاں! میں اسے اس قدر زخمی حالت میں بھی پہچان گیا تھا۔ بے شک آج تک میں اس سے نہیں ملا تھا۔ لیکن اس کے کٹے پھٹے لہجے کی آواز سنی تھی اور اس کی حرارت بھی محسوس کی تھی جب وہ مجھے ایک کمرے سے جوش کے ساتھ ویڈیو لنک میں اپنے بینک کا راز، عابدہ سے متعلق بتا رہی تھی تو میں نے اس کا شاداب چہرہ اور روشن آنکھوں کی گہرائیوں میں پنہاں وہ جذبہ بھی محسوس کیا تھا جو وہ اسلام اور پاکستان کے مسلمانوں کے لیے رکھتی تھی۔

اس کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر میں سمجھ سکتا تھا کہ اس دلیر، باحیا اور باوقار عورت نے ان بھیڑیوں کے آگے کبھی سر نہیں جھکایا ہوگا۔

میں نے اپنے اندر ابھرتی کرب کی اور تڑپتی لہروں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے جھک کر اسے پہچاننے کی آخری تصدیق چاہی تھی مگر یہ وہی آنسہ خالدہ ہی تو تھی۔ کون بوگ کو میں اس کی موت جیسی کم سزا پر اکتفا کرنے والا نہیں۔ اسے ایسا بنا دوں کہ وہ نشانِ عبرت بن جائے اور اسے میرے ہاتھوں صرف موت میں ہی پناہ نظر آ رہی ہو کہ وہ اپنی زندگی کے بجائے مجھ سے موت ہی کی بھیک مانگ رہا ہے۔

ہاں! وہ آنسہ خالدہ ہی تھی۔

پل بھر کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں ہاتھ میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہو رہی ہو۔ ہاں! مجھے ایسا ہی لگا، وہ ہاتھ میرے اسلحے کے انتظار میں میری پیٹی تک آ کے نیچے ہتھیار ڈھونڈ رہا تھا۔

گویا بڑی مشکل سے میں نے اپنے اس جذبے کو دبا کے رکھا تھا۔ صرف یہی آسرا تھا کہ خالدہ کو اس دردناک حالت میں دیکھ کر میں نے قسم کھائی تھی کہ صرف کون بوگ ہی نہیں پوری [illegible] کو میں اب نیست و نابود کیے بغیر یہاں سے تبھی نکلوں گا جب عابدہ کا بھی کچھ سراغ لگا لوں۔

عابدہ کا خیال آتے ہی میرے اندر شدت سے کچھ کٹا تھا۔ کیا ان ذلیل لوگوں کے حواریوں نے اپنے ناپاک مقاصد کی برآری کے لیے میری معصوم عابدہ کا بھی یہی حشر کیا ہوگا؟ اس تصور سے ہی میں پوری کی پوری جان سے لرز اٹھا تھا۔

''میرا خیال ہے کافی ہے اتنا۔ بس ابھی آجاؤ مسٹر ڈیلی...'' مجھے عقب سے کون بوگ کی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً اپنی کیفیات پر قابو پایا اور چہرے کی سرخی کو پریشانی اور تشویش بھرے انداز میں بدل کر پلٹا۔ میرے ذہن نے پل کے پل وہاں موجود افراد کی پوزیشن اور تعداد کا شمار کر لیا تھا۔

وہ سب کل ملا کر پانچ سے چھ تھے، جو وہ اس کے اشارے سے بدنصیب آنسہ خالدہ کی ڈھیلی پڑی لاش کھینچے جس کمرے سے آئے تھے وہیں دوبارہ غائب ہو گئے۔

میں کون بوگ کے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسی انداز میں بولا۔

''میں یقین کیسے کرتا کہ تمہاری آنسہ خالدہ اس حالت میں قبول بھی کرے گی، تم اس سے کس طرح اس کی واپسی کی اپیل کرو گے جبکہ اسے تو تم نے زندہ لاش کی شکل کر رکھی ہے۔''

میں نے اپنے دل میں اٹھنے والی درد کی لہر کو دباتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

وہ غور سے میرے چہرے کو گھور رہا تھا۔ میری بھی کوشش یہی تھی کہ اسے میرے اندرونی ابال اور جذبات کی سی کیفیات کا اندازہ نہ ہونے پائے لیکن میری آتش فشاں کی طرح کھولتی نگاہیں لیکن غضب ناکی کا اظہار چہرے سے نہ ہو یہ بہت مشکل ہی تھا اسی لیے میں نے اس کیفیت کو کیفیت کا ہی دباؤ دے رہا تھا جس سے مجھے آسانی ہوئی کہ اس کی جگہ پریشانی اور تشویش کے تاثرات کا پرتو چہرے پر پھیلانا آسان ثابت ہوا تھا۔ یوں کون بوگ بھی یہی سمجھے ہوئے تھا کہ مجھے ''ڈیلی'' کی جانب سے ہی فکر لاحق ہے۔

"تمہاری تو تسلی ہو گئی ہے نا؟" گران برگ نے طویل خاموشی کے بعد مجھ سے کھوکھلی سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں، میری تسلی تو ہو گئی ہے لیکن..." کچھ سوچتے ہوئے میں نے قالین پر سیدھے پڑے کمیل دادا اور عقیل کی جانب دیکھا۔

"یہ میرے ساتھیوں کے ساتھ تمہارے آدمیوں نے جو کیا، میں اسے درگزر کرتا ہوں اس لیے اب مہربانی کر کے تم بھی ان کی مرہم پٹی کروانے کا بندوبست کرو تاکہ بات آگے بڑھائی جائے۔"

میری بات سن کر گران برگ کے چہرے پر ایک سفاکی کا تاثر ابھرا، ایک مکروہ سی مسکراہٹ ابھری، پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک ہاتھ اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور میرے جسم کا رواں رواں جیسے تن گیا۔

اس کے ہاتھ میں جو پستول تھا، وہ اپنی ساخت کے باوجود ایک انتہائی طاقتور ہتھیار تھا جو میرے پسندیدہ پستول ٹارس سے ملتا جلتا تھا۔ ٹارس جیسے لمبی نال والا میگزین پستول تھا جسے میں نے پچھلے کئی معرکوں میں کئی مواقع پر جان سے کھیل جانے کے دوران آزمایا تھا۔

گران برگ کے ہاتھ میں نظر آنے والا جو پستول تھا وہ ٹھیک پستول ٹارس کی طرح لمبی نال والا تو نہ تھا بلکہ اس کا میگزین بھی چھوٹا تھا، یہ کوبرا کولٹ تھا۔

اپنے پسندیدہ ہتھیار کو دیکھتے ہی میری آنکھوں میں چمک ابھری لیکن اس وقت میں چونک گیا جب اس نے اس کی نال کا رخ قالین پر ہم دونوں کے درمیان پڑے کمیل دادا اور عقیل کی طرف کر دیا۔ ایک لمحے کو میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

"یہ یہ... کیا کر رہے ہو مسٹر گران؟"

"کچھ نہیں..." وہ بڑے اطمینان سے اپنے کولٹ کوبرا کی نال کو تکتے ہوئے بولا۔ "میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی زبان کھول دو اور اپنے ان دونوں ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اگرچہ مجھے روز اول سے ہی ایسی دغابازی کی توقع تھی مگر اس قدر جلد یہ اپنی کریہہ اصلیت پر اتر آئے گا، اس کا تصور کم ہی تھا مجھے۔

"دھوکا؟" میں نے اس کی طرف تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"آواز نیچی رکھو مسٹر ذیشان! تم نہیں جانتے کہ اس وقت کہاں اور کس کے سامنے بیٹھے ہو۔ اس وقت مجھے اس میرا گل پاکستانی کا ٹھکانا بتاؤ۔"

"وہ اپنے ٹھکانے بدلتا رہتا ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے، بقول اس کے اسے جان کے خطرات درپیش ہیں۔" میں نے جواب میں کہا اور اپنی بات پر برقرار رہا۔

"تو پھر میرا کام کیسے ہوگا؟" وہ بدستور پستول سے کھیلتے ہوئے بولا۔ کبھی وہ اس کی نال کا رخ کمیل دادا اور عقیل کی جانب موڑ لیتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہیں یہ سفاک انسان ان پر گولی ہی نہ چلا دے۔

میں نے اس بار ذرا غور سے ان دونوں کو دیکھا اور یکایک میرے جسم میں جوش کی ایک لہر سی سرایت کرتی چلی گئی۔

کمیل دادا اور عقیل کی کراہوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان میں وہ حقیقت کا "درد" نہیں تھا جو ہونا چاہیے۔ یہ ممکن تھا کہ اس میں میری اپنے ساتھیوں سے متعلق حد سے بڑھی ہوئی ہم آہنگی کی خوش فہمی شامل ہوتی۔

وہ دونوں یقیناً میرے اور گران برگ کے درمیان ہونے والے مکالمے سن رہے تھے اور میری طرف سے کسی جارحانہ پیش قدمی اور عمل کے بھی منتظر تھے۔

"وہ خود مجھ سے رابطہ کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو کیا پریشانی ہے، تم خود بھی تو اس سے فون پر بات کر سکتے ہو۔"

"وہ مجھ سے مختلف نمبرز پر رابطے کرتا ہے اور وہ سارے نمبر کسی پبلک بوتھ کے ہوتے ہیں۔"

"ہمم..." اس نے گہری سانس لی۔ "ملتے کہاں ہو تم ان لوگوں سے؟"

"کبھی کبھی ہماری رہائش گاہ پر اور کبھی وہ کوئی جگہ بتاتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہونہہ... تمہاری رہائش گاہ..." گران اہانت بھرے انداز میں بولا۔ "وہ گھٹیا کنٹینرز، اسے تم رہائش گاہ کہتے ہو۔"

"وہ ہمارا عارضی ٹھکانا ہے۔ خود میں ڈیفنس کے علاقے میں رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ میں نے کسی احتیاط کے پیش نظر فرضی طور کے بجائے دوسرے اور قریبی علاقوں کے نام ازبر کر رکھے تھے۔

"مسٹر ذیشان! یہ کیسی بات ہے کہ میرا دل تمہاری طرف سے کسی شک میں مبتلا ہو رہا ہے، یعنی تم وہ نہیں ہو جو نظر آنے کی کوشش کر رہے ہو، کوئی ایسی بات ہے تم میں جو مجھے بار بار اندر سے کسی تشویشناک قسم کے شبہے میں مبتلا کر

دی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور لیاری کی جانب منہ کیے کھڑا ہو گیا۔

اس کی بات پر میری کنپٹیوں کی نسیں تک یکلخت تیز تیز دھڑکتی محسوس ہونے لگیں۔ کیا وہ مجھے شہری کی حیثیت سے پہچان چکا تھا؟ یا مجھ پر ایسا کوئی شک ہو گیا تھا؟ گرن برگ آفیسر آل بے پی سی کے نائب سربراہ کی حیثیت رکھتا تھا اور میرے "فرنٹ لائن" دشمنوں کی فہرست میں شامل وہ سب جنھیں رُو بہ رُو مجھ سے سامنا ہونے کا موقع مل چکا تھا، وہ میری اور ممکنہ طور پر میرے قریبی ساتھیوں کو تصویری حوالے سے تو پہچان ہی سکتے تھے، اگرچہ اس میں تھوڑے غور اور دھیان کی ضرورت ہوتی ہے۔

یوں بھی ہم تینوں نے یعنی مجھ سمیت کمیل داوا اور شکیلہ نے اپنے چہروں پر ہلکے انداز کے ریڈی میڈ میک اپ کر رکھے تھے۔ جن میں ہیئر اسٹائل، آنکھوں کے لینس اور مجھ امریکی لب و لہجہ بھی شامل تھی۔

تاہم حرکات و سکنات کی شناخت دگرگوں بات تھی۔ یعنی اس سے مراد باڈی لینگویج تھی۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میری کم از کم نصف گھنٹے کی کوئی ویڈیو کلپ ان کے پاس ہوتی۔

میں نہیں سمجھتا تھا کہ ان لوگوں نے میری شناخت کے لیے اس قدر اہتمام کرنے کی زحمت گوارا کی ہوگی۔ شاید ان کے تصور میں بھی نہ تھا کہ میں امریکا کا بھی رخ کر سکتا ہوں۔ بعد کی بات اور تھی۔

چنانچہ گرن برگ کو اس قسم کے شکوک میں مبتلا ہوتے محسوس کرتے ہی میں نے اس کا دھیان بٹانے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا ہو کے برہمی ظاہر کرنے کے انداز میں اس سے کہا۔

"مسٹر برگ! اب یہ الٹی سیدھی باتیں چھوڑ دو ڈیل کی بات کرو اور یہ کھلونا اپنی جیب میں رکھ لو..."

میرے اُسے تاؤ دلانے کا ایک مقصد تھا کہ وہ جس انداز سے میرے متعلق سوچنے لگا تھا، اس سے بھٹک جائے۔ میری آواز پر وہ تیزی سے یوں میری جانب گھوما جیسے مجھ پر گولی چلا دے گا۔

پستول کی نال کا رخ میری جانب تھا۔ گرن کا چہرہ سرخ تھا۔ آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے۔ میں اسی طرح اس کے سامنے تنا کھڑا رہا۔

"تم نے شاید میری بات کو مذاق میں لیا ہے۔" اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔ "گرن برگ نام ہے میرا اور ... قیمت سمجھو ان گھڑیوں کو جو میں تمہیں اور تمہارے ان دونوں بے چارے ساتھیوں کو دے چکا ہوں۔ جن میں تم سانسیں لے رہے ہو۔"

اس مغرور بدمعاش کی بات نے میری آنکھوں کے سامنے ایک بار پھر کالی آندھیوں کی یلغار کروا دی تھی۔ عابدہ اور آنسہ خالدہ کے حوالے سے پہلے ہی میں اس پر بُری طرح بپھرا ہوا تھا۔

"گرن! تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے بہ ظاہر لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"بیٹھ جاؤ ... اور اب دوبارہ میری اجازت کے بغیر ہلنا بھی مت ... ورنہ تمہارا ایک ساتھی گیا۔" کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بہت عجیب تھیلے، گویا کولٹ کی نال کا رخ کمیل داوا کی طرف کر دیا۔

"کی کی — یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اچانک کمیل داوا بول پڑے۔ شکیلہ بھی کسمسا کر اٹھ کر بیٹھنے کی سعی کرنے لگی۔

"خبردار۔ جیسے ہو اور جہاں ہو ویسے ہی رہو۔" گرن نے انھیں تحکمانہ انداز میں خبردار کر دیا۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا ہے جس کا مجھے پہلے ہی خدشہ تھا۔" میں نے دانستہ کمیل داوا کی طرف دیکھ کر [illegible] کرنے کے انداز میں کہا۔

"[illegible] — [illegible] —" گرن برگ کا [illegible] گونجا۔

میں نے دانستہ "سوئی" اس طرف اٹکا دی تھی تا کہ گرن برگ کا دھیان کسی اور طرف نہ جانے پائے کیوں کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے جس شک کا اظہار کیا تھا، میں [illegible] اس سارے معاملے میں کوئی گڑبڑی محسوس ہو رہی تھی۔

تب میں نے خفگی سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

"مسٹر گرن! سمجھو، اس معاملے کو اگر اب بھی تم [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

گرلیا۔

میری تیزی سے گردش کرتی متلاشی نظروں نے اس کی مشکوک حرکت کو پل کے پل ہی میں بھانپ لیا تھا۔ وہ شکیلہ پر ہلا بولنے کے لیے پر تول رہا تھا۔

شکیلہ نے بڑی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی جان کو براہ راست سخت خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اگر فوری طور پر میں نہ حرکت کرتا جس کی بلاشبہ وہ بھی توقع کیے ہوئے تھی، تو یقینی طور پر وہ گون برگ کے کسی بچے ساتھی یا خود گون برگ کا ہی کسی ...... سنگین حرکت کی زد میں آسکتی تھی۔

''مسٹر گون! جس طرح پستول تھامے ہوئے ہو اسی طرح اسے نیچے گرا دو۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا۔

اس سے گون برگ کا چہرہ کریہہ ناک حد تک بگڑ چکا تھا۔ آنکھوں سے غیظ و غضب کے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ہماری بوٹیاں نوچ ڈالے۔ جن کے آگے وہ اپنی طاقت اور گھمنڈ کی بڑکیں لگا رہا تھا وہ سارا غرور ایک ذرا سی قیدی لڑکی نے پل بھر میں خاک میں ملا دیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی شکست قبول نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے میرے حکم کی کوئی تعمیل نہیں کی اور اس کے برعکس وہ خوف ناک آواز میں غرا کر بولا۔

''اپنا عبرت ناک انجام اپنے ہاتھوں میں لے کر تم اپنی زندگی کی بڑی بھیانک غلطی کر رہے ہو، مسٹر لیجی!''

اسی لمحے دھماکا ہوا۔ میرے پستول کی نال سے دوسرا شعلہ لپکا اور گون برگ کے حلق سے کربناک چیخ سی ابھری۔ اس کا کوبرا کولٹ تھاما ہوا ہاتھ کلائی کے پاس سے بری طرح ادھڑ کر رہ گیا اور وہ کمیل دادا کے پاس جا پڑا۔

کمیل دادا نے اسے اپنی ہی کوشش کے ساتھ لپک کے اُچک لیا۔ ٹھیک اسی وقت لائٹ آف ہو گئی۔ ایک دم ہاتھ کو ہاتھ تک سجھائی نہ دینے والا اندھیرا چھا گیا۔

شاید اس کے کسی بیرونی ساتھی نے خطرہ بھانپتے ہی مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ جانتا تھا کہ ایسا صرف چند لمحوں کے لیے کیا گیا ہے تاکہ گون برگ کو گن پوائنٹ سے نکل بھاگنے کا موقع مل جائے، کیونکہ دوبارہ لائٹ آن کیے جانے پر ممکن تھا ہم خود دشمنوں کے نشانے پر ہوتے۔

اچانک بجلی جلی اس خطرناک اور سنگین تر صورت حال کا ادراک کرتے ہی میں نے تیکھی آواز میں شکیلہ سے کہا۔

''کمیل دادا کا ہاتھ تھام کر سنبھالو اسے اور تم میرا ہاتھ پکڑو، جلدی!''

''لل... لیکن گون...'' شکیلہ نے متفکرانہ کہنا چاہا۔

''وہ بھاگ چکا ہے اور اس سے پہلے کہ دوسری بار لائٹ آن ہوتے ہی ہم یہاں فل گٹ ہتھیار بدست دشمنوں کے نرغے میں ہوں، لہٰذا جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔'' میں نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

شکیلہ نے فوراً ہی میری بات کا ادراک کیا تھا۔

شکیلہ نے جیسے ہی مجھے سرگوشی میں بتایا کہ وہ کمیل دادا کا ہاتھ تھام چکی ہے، میں نے شکیلہ کا ہاتھ پکڑتے ہی پہلے سے تاڑے ہوئے رستے کی جانب ایک قلانچ اندازے سے پیش قدمی کر ڈالی۔

میرا رخ اسی دروازے کی سمت تھا جدھر سے تھوڑی دیر پہلے آنسہ خالدہ کو دیوار کے پیچھے وہیل چیئر پر ڈال کر لایا گیا تھا۔

میں نے جیسے ہی اس دروازے کو ٹٹولنے کے انداز میں بڑھتے ہوئے ہاتھ سے چھوا اور دوسرے ہی لمحے اسے ایک لات رسید کر ڈالی۔

دروازہ بلاشبہ مضبوط لکڑی کا تھا، پھر کوئی اسٹارٹ لیے بغیر اتنے قریب سے مارے لات رسید کرنے سے بھی نہ کھلتا، اگر اندر سے اسے مقفل کر دیا جاتا۔ مگر شکر تھا کہ وہ اندر سے مقفل نہ تھا۔

ہم تینوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اندر گھس گئے۔ کمرا تاریک تھا اور چھوٹا بھی، شاید یہ کوئی کوریڈور تھا۔ خیال اس لیے تھا کہ وہاں گون برگ کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ لیکن آنسہ شاہدہ کی وہیل چیئر ایک کونے میں ضرور دکھائی دی تھی اور خود بھی جیسے اس پر دھری پڑی تھی۔

اس بیمار اور لاچار چیئر خاتون کو دیکھ کر یکلخت میرے اندر کا ترحم سا ابھرنے لگا۔ یہاں ہلکی زرد بلب کی روشنی تھی۔ میں نے نہایت پھرتی کے ساتھ کمیل دادا سے گون برگ سے چھینا ہوا کولٹ کوبرا پستول لے لیا اور اسے اپنے نیفے میں اڑس لیا۔

کمیل دادا کولٹ کوبرا اور آٹومیٹک جیسے جدید ہتھیار

استعمال کرنے میں کمال رکھتا تھا۔ اس لیے کہ اسے اپنے ہتھیار، اس کی کوئی ٹریننگ نہیں تھی۔ شکیلہ کی بات کے علاوہ بھی البتہ پھر سے ہاتھ میں اپنے ہتھیار، کھلونوں کی طرح تھامے رکھتے تھے۔ ان کا تھامنا بھی یہی ہوتا تھا، وہ ہتھیار جس قدر جدید اور انتہائی ٹھوس ہے گا، اس کے دوررس اور بھاری نتائج کے لیے اس کا استعمال بھی باکمال کیا جاتا ہے۔

میں نے گردن گھما کر ان سے ایک ہی لمحے میں دوسرا دروازہ تاڑ لیا تھا، وہ سنگل پٹ کا تھا اور آنسہ خالدہ کی ایزی چیئر کے عقب میں نظر آرہا تھا۔

موجودہ حالات کی خطرناکی کہاں تھی اور نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کپل دادا نے بھی قدرے سنبھالا لینے کی کوشش کی تھی۔

شکیلہ ایک خوب صورت عورت تھی، نجانے کیا سوچ کر سیاہ لباس کے خبیث بھوتوں نے اس پرانی روایت کی بھی کہاں پرواہ داری کا دم رکھا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ ان دونوں کو موت کے منہ تک پہنچا دیا گیا ہو گر تاہم ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ ماسوائے کپل دادا کے یہ عورت (شکیلہ) کسی کرمنل گینگ کی آلہ کار نہیں بلکہ ایک ماہر پروفیشنل ایجنٹ ہے۔

بہرحال میں نے شکیلہ کو فوراً آنسہ خالدہ کی وہیل چیئر سنبھالنے کی ہدایت کی اور لپک کر آگے بڑھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے اندر سے چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بے آوازی اس کی چٹخنی کھولی اور اس کا پٹ ذرا سا کھسکا کر دوسری جانب جھانکا تو ایک طویل راہداری دکھائی دی۔ میں نے شکیلہ اور کپل دادا کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسی دروازے کو کھول کے باہر نکل آیا۔

اسی وقت متعدد چیختی ہوئی آوازوں کا شور بڑھنے لگا۔

”جلدی… جلدی…“ میں نے جوش سے تھرتھراتے دل سے ساتھ ساتھیوں سے کہا اور پستول سنبھالے سیدھا دوڑتا چلا گیا۔ شکیلہ، آنسہ خالدہ کو وہیل چیئر سمیت دھکیلتے ہوئے دوڑی۔ اس کے عقب میں کپل دادا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں پستول تھام رکھا تھا اور اسے دوڑنے میں مشکل پیش آرہی تھی مگر سخت جان آدمی تھا، اس نے کسی قسم کے تساہل کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ دوڑتے ہوئے عقب میں بھی اس دروازے پر گردن موڑ کر دیکھ لیتا تھا جس کمرے سے ہم آنسہ خالدہ کو لے کر نکلے تھے۔

چند ہی قدموں بعد راہداری دائیں جانب گھوم رہی تھی، میں نے عقب میں ہاتھ کے اشارے سے شکیلہ وغیرہ کو رکنے کو اشارہ کیا۔ اس کے بعد موڑ کے سرے پر رک کر مذکورہ حصہ دیکھا۔

وہاں بھی میری کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ وہاں سے بھی تین چار مسلح افراد کو خطرناک آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ اسی جانب لپکتے دیکھا۔ ان میں گرین برگ بھی تھا۔ اس نے خطرناک قسم کی اسالٹ رائفل پکڑ رکھی تھی۔ اس کا چہرہ عقب تھا۔ کے ہدایت کرتے معلوم ہو رہا تھا، حالانکہ اس کی ایک کلائی کو میں بری گولی مار کے ادھیڑ چکا تھا مگر وہاں اب سول کی پٹی نظر آرہی تھی جو انگلی تک تھی یہ اندر کسی عمارتی فرسٹ ایڈ کے طور پر ترتیب کر دی جاتی ہے۔

عجلت گن اس نے ایک اسٹریپ کے ذریعے اپنی گردن سے گزار کے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھی تھی۔ یہ سنگل آرم گن تھی اور اسے بآسانی ایک ہاتھ سے بھی چلایا جا سکتا تھا۔

میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔ میں نے راہداری کے سرے کی دیوار سے ذرا ابھر کر گولیوں کی جھنگ برسادی اور تنے اوپر تلے ٹریگر دباتا چلا گیا۔ اس کے ساتھی بری طرح چیخیں مار کے گرے جبکہ خود گرین برگ اور باقی ماندہ ساتھیوں نے فوراً دیوار کے ساتھ چپک کے مجھ پر ہتھیاروں کے منہ کھول دیے۔

میں نے دانستہ گرین برگ کا نشانہ نہیں لیا تھا۔ میرے ذہن میں جو چل رہا تھا، میں اسی کے مطابق عمل کر رہا تھا۔

”شکیلہ! تم یہاں سے ہلنا بھی مت اور دونوں کا دھیان…“ میں نے متوقع گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے پلٹ کر شکیلہ سے کہا۔ ”ان پر وقفے وقفے سے جوابی فائرنگ کرتے رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ کہتے ہی میں…… بگولے کی طرح پلٹا اور تیر کی طرح دروازے کی جانب واپس لپکا۔

آنسہ خالدہ والے کمرے سے آندھی کی طرح گزرتا ہوا میں دوبارہ دروازہ کھول کر اسی کمرے میں آ گیا جہاں ہماری اور گرین برگ کی نشست بھی ہوئی تھی۔

میرے اندازے کے عین مطابق اب وہاں گردش کر رہی گئی تھی۔

میری منصوبہ بندی کے مطابق اب یہاں مجھے کوئی نظر نہیں آرہا تھا جبکہ میں پہلے ہی اسی نیت سے دشمنوں کی توجہ ڈائیورٹ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

یوں میں اپنے دائیں ہاتھ میں کوبرا کولٹ لہراتا ہوا

بیرونی دروازے کی جانب لپکا۔

اندازہ ہو چلا تھا کہ اس کے ساتھی اب محدود تعداد میں بچے ہوں گے، اگرچہ کوئی بعید نہ تھا کہ... گون برگ خراب ہوتی صورتِ حالات کے پیشِ نظر کمک منگوا لے۔ لہٰذا میں اس مرحلے کو جلد سے جلد طے کرنے کا خواہش مند تھا۔

مجھے کچھ کچھ اس کے محلِ وقوع کا اندازہ ہو چلا تھا اسی لیے میں نے بیرونی دروازے کو پھر بھی کسی جلد بازی کے بغیر محتاط انداز میں عبور کیا اور پورچ کی طرف سے مجھے ایک گیلری سی اندر جاتی دکھائی دی۔

میں دوسری راہداری میں جنگ و جدال کی فضا چھوڑ آیا تھا، سب کا زور اسی طرف مرکوز تھا، اسی لیے میں نے تیزی سے حرکت کی اور یوں بیرونی راہ گزر سے ہوتا ہوا میں گیلری میں اور وہاں سے اسی راہداری کے اسٹارٹنگ وے سے اندر داخل ہو گیا کیونکہ اسی طرف وقفے وقفے سے فائرنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

جیسے ہی میں مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچا تو یہ دیکھ کر میری پیشانی پر تشویش کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ گون برگ اور اس کے باقی ماندہ ساتھی فائرنگ کرتے، اس کمرے کے دروازے تک جارحانہ پیش قدمی کرتے ہوئے پہنچ چکے تھے بلکہ اب کسی دم بھی اندر دھاوا بولنے والے تھے۔

میں... کسی جلد بازی سے کام لیے بغیر نہایت ہوشیاری سے راہداری کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ان کی جانب بڑھنے لگا اور یہی وہ وقت تھا جب میں ان پر فائرنگ کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ گون برگ کے ایک ساتھی نے مذکورہ کمرے کے دروازے کو فائرنگ کی بوچھاڑ میں لیتے ہوئے ایک زوردار لات رسید کر ڈالی۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ شکیلہ اور کھبیل دادا کو پسپائی ہو رہی تھی۔ دروازہ توڑتے ہی گون برگ کا ایک اور ساتھی بشمول پہلے ساتھی کے لپک کر اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے کہ ادھر میں ان پہ جھپٹا اور پے در پے دو ہی فائر جھونک سکا۔ ایک کو میں نے چیخ مار کے الٹتے ہوئے دیکھا تھا جو راہداری کے فرش پر دروازے کے سامنے ڈھیر ہو گیا تھا جبکہ دوسرا بھی چیخا ضرور تھا مگر وہ باہر کے بجائے اندر ہی جا گرا تھا۔

مجھے تسلی تھی کہ اس زخمی کو اندر شکیلہ یا کھبیل دادا نے "سنبھال" لیا ہوگا، جبکہ گون برگ میری اس حکمتِ عملی پر اس بری طرح بوکھلا اور جھلا گیا تھا کہ اس نے راہداری کی دیوار کے ساتھ پشت لگا کر پلٹتے ہی یوزی کا برسٹ اڑا کر دیا۔

مجھے اس حرکت کی توقع تھی، پیچھے ہٹنے والا اب میں بھی نہ تھا کیونکہ اس اہم مرحلے کی کامیابی بس مجھے اب چند ہی گام پر نظر آ رہی تھی۔

میں نے خود کو اس سے محض چند ثانیے قبل ہی فرش پر گرا لیا تھا۔ یوزی کے سبب دہانے سے گولیوں کی باڑھ راہداری کی دیواروں سے اور فرش سے ٹکراتی ہوئی میری جانب لپکی تھی۔ ایک بھولی بھٹکی گولی "شاں کیاں" کی تیز اور سنسناتی آواز کے ساتھ میری داہنی کنپٹی سے گزرتی چلی گئی۔ زندگی تھی جو بچ گیا، ورنہ گیا تھا۔

اسی لیے جب میں گون برگ کو زخمی کرنے کی نیت سے اس پر گولی چلا رہا تھا، کمرے کے اندر سے ایک فائر ہوا، گون برگ کی تیز چیخ ابھری۔

میں دھک سے رہ گیا اور پھر پاگلوں کی طرح راہداری میں دوڑتا ہوا پھر اسی کمرے کے دروازے کے قریب جا پہنچا جدھر میرے ساتھی وغیرہ موجود تھے۔

وہاں کا منظر دیکھ کر میں پہلے تو دھک سے رہ گیا۔ کھبیل دادا فرش پر گرا ہوا بے سدھ پڑا تھا، اس کے قریب دو دشمنوں کی خون آلود لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ آنسہ خالدہ کی وہیل چیئر الٹی پڑی تھی اور وہ خود بھی ایک جانب ڈھیر تھی۔

شکیلہ کے ایک بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی بھی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔

مجھے اگر مزید یہاں پہنچنے یا گون برگ اور اس کے ساتھیوں پر قابو پانے میں دیر ہو جاتی تو یہاں معاملہ تمام تھا۔

اب مجھے سمجھ میں آئی تھی کہ شکیلہ کیوں گون برگ پر گولی چلانے پر مجبور ہوئی تھی۔

"شش... شکیلا! تم ٹھیک ہو نا...؟" میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"او... شکر ہے خدا کا کہ تم آ گئے۔" شکیلہ مجھے دیکھتے ہی سکون کی ایک گہری سی سانس لے کر بولی۔ "یہ لوگ حملہ کرتے ہوئے قریب آ پہنچے تھے۔ کھبیل دادا کا خون شاید زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس پر کچھ زیادہ ہی نقاہت طاری ہو گئی۔ ان بدبختوں نے اسے زدوکوب بھی زیادہ کیا تھا، بڑی مشکل سے میں نے اس خطرناک صورتِ حال پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ [illegible] ہے ناں... اور یہ آنسہ خالدہ...؟"

کہتے ہوئے میں ان کی جانب بڑھا۔ کمیل دادا نیم بے ہوش سا تھا۔ اس کا پستول بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر پڑا تھا۔

آنسہ خالدہ کی حالت ویسے ہی غیر تھی۔ وہ فرش پر بھی اسی طرح ہی فالج زدہ انداز میں گری پڑی تھی جس طرح وہ چیئر پر تھی۔

"تم ان دونوں کو ذرا سنبھالو۔ میرا خیال ہے اب نشہ چڑے گا۔ دشمن مارے گئے ہیں سب" کہتے ہوئے میں واپس گون برگ کی طرف آیا۔

وہ راہداری کی دیوار اور فرش پر الٹا ہوا پڑا تھا۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر خون بہہ رہا تھا۔

میں نے اس کی شہ رگ پر اپنے ہاتھ کی چار انگلیاں رکھیں۔ وہ خاموش ہو چکا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں اپنے اس مشن کے سو فیصد اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہا تھا۔

اس کے بعد ہم ایک لمحے کے لیے بھی نہ رکے۔ شکیلہ کی حالت قدرے بہتر تھی۔ ہم دونوں نے مل کر پہلے آنسہ خالدہ کو وہیل چیئر پر ڈالا۔ پھر کمیل دادا کو میں نے اپنے کندھے پر اٹھایا۔

ہم عقبی دروازے سے باہر پورچ میں آگئے۔ یہاں ایک [illegible] گاڑی موجود تھی۔

آنسہ خالدہ کو ہم نے وہیل چیئر سے ہٹا کر عقب میں سوار کرایا۔ پھر کمیل دادا کو بھی ایک خالی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہیل چیئر وہیں پھینک دی۔

اس کے بعد میں اور شکیلہ فرنٹ سیٹ پر آبیٹھے۔

اسٹیئرنگ میں نے ہی سنبھالا تھا۔ چابیاں مجھے ونڈ اسکرین کے شیڈ پر حسب توقع رکھی مل گئیں۔ نہ بھی ہوتیں تو بغیر چابی کے انجن آن کرنا میرے لیے چنداں مشکل بات نہ تھی۔

اگلے ہی لمحے ہماری گاڑی جہنم واصل گون برگ کے اس ٹھکانے کا بڑا سا گیٹ توڑتی ہوئی آندھی طوفان کی رفتار کے ساتھ دوڑی جارہی تھی۔

☆☆☆

"شکیلہ! تمہارے بازو سے خون بہہ رہا ہے۔ تم ٹھیک ہو؟" میں نے اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھوں کی گرفت رکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ میری نظریں گاڑی کی ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی بیک ویو پر بھی ایک نظر ڈال لیتا تھا، کہیں کوئی تعاقب میں تو نہیں آرہا۔

"گولی لگی تھی۔ میں ٹھیک ہوں شہزی!" [illegible] شکیلہ کی ہانپتی ہوئی سی آواز ابھری۔

"گون برگ کا مرنا ہمارے لیے اچھا نہیں ہوا۔ میں نے اس سے بہت کچھ اگلوا کر اور انجام سوچ رکھا تھا۔" کہتے ہوئے میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں جانتی ہوں۔" شکیلہ جواب میں بولی۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی خفت تھی۔ "کمیل دادا کو گولی لگنے اور ان کے وہیل چیئر سے لڑکھڑا کر گرنے پر میں بدحواس اور تشویش کا شکار ہوگئی تھی، یوں انھیں ہماری طرف پیش قدمی کا موقع۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹی۔ کیونکہ کچھ اندازہ میرا بھی تھا۔

"تم خود کو سنبھالو اور ذرا کمیل دادا اور خالدہ کو دیکھو ان کی حالت کیسی ہے؟"

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ جلد ہی ہم اپنی ساحلی کالونی والی جگہ پر پہنچ گئے۔

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ چیدہ سحر کے جھلکنے سے آسمان پر ٹمٹماتے تارے عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ساحل کی جانب لانچوں اور مستولوں کے انبار سے بکھرے نظر آتے تھے۔

ہمارے رہائشی کنٹینر پر ویرانی کا راج تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد میں نے شکیلہ کی مدد سے کمیل دادا اور خالدہ کو اندر منتقل کیا۔

میں چونکہ یہاں امریکا میں اپنی زندگی کے ایک اہم ترین مشن پر تھا اسی لیے کنٹینر میں، میں نے ہر شے کا بندوبست اضافی طور پر کر رکھا تھا۔ اس میں سب سے زیادہ فوقیت فرسٹ ایڈ کو تھی۔

سب سے پہلے شکیلہ اور میں نے کمیل دادا کے زخموں کا معائنہ کیا، شکر تھا کہ گولی نے کوئی زیادہ گہرا زخم نہیں لگایا تھا، وہ صرف گوشت کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی، یہی حال شکیلہ کا بھی تھا۔

آنسہ خالدہ کے زخموں کا معاملہ کچھ اور تھا اسی لیے اس کے لیے بھی سردست جو ہو سکا، وہ کر دیا گیا۔

گھنٹے تک کنٹینر میں یہی کچھ ہی کرتا رہا۔

"سنو شکیلہ!" یہ سارا کچھ کافی حد تک نمٹانے کے بعد میں نے شکیلہ کو مخاطب کیا۔ وہ مستفسرانہ نگاہوں سے میرا چہرہ تکنے لگی۔

"تم یہاں بہت زیادہ محتاط ہو کر رہنا۔ میں گاڑی کو

کہیں دور جا کر غرق کر کے واپس لوٹتا ہوں۔ اس کا یہاں موجود ہونا ہمارے ٹھکانے کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

شکیلہ نے میری بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور کوشش کرنا کہ میرے لوٹنے تک کبیل دادا پوری طرح ہوش میں آجائے، دوسری بات یہ یاد رکھنا کہ ابھی کسی کو بھی کوئی فون مت کرنا نہ ہی کال ریسیو کرنا خواہ اپنا ہی کوئی ہو۔ گون برگ کے مرنے اور آنسہ خالدہ کے غیاب کے بعد سے جے پی سی سیٹ ٹائیگر ٹیک حرکت میں آجائے گی۔"

شکیلہ نے تفہیمی انداز میں اپنے سر کو جنبش دی۔

اسے یہ تاکید کرنے کے بعد میں باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

درحقیقت اپنے دشمنوں کے خلاف عملی طور پر میرا پہلا قدم اٹھ چکا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بہت سی باتیں ذہن میں غلط ملط ہونے لگی تھیں۔ کئی راستے سامنے نظر آتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دھندلے کچھ واضح۔

جے پی سی کا نائب اور اسٹاری کی بیوی بچی کا قاتل ملعون گون برگ جہنم واصل ہو چکا تھا۔ آنسہ خالدہ زندہ لاش کی شکل ہی سہی ہمارے پاس آچکی تھی۔

بلاشبہ آنسہ خالدہ، عابدہ سے متعلق ہی نہیں بلکہ جے پی سی کے مکروہ منصوبوں سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھی۔

اس وقت ذہن بہت دور تک سوچنے کے قابل تھا لیکن میں پہلے اس گاڑی سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ اس کے لیے میں نے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی اور بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ایک نسبتاً ایسی جگہ پر پہنچا جہاں قدرے ویرانی تھی۔ کیونکہ سیدھے ہاتھ گودام ہوتے ہیں۔ لوگوں کی چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔

آگے ایک موڑ تھا اور اس طرف مونگیا کی چٹانیں تھیں، جہاں سرکش موجیں سر پٹخ رہی تھیں۔ میں نے گاڑی یہاں روک دی۔

یہاں رکنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ساحل سے ایک لکڑی کا خاصا چوڑا پلیٹ فارم بھی سمندر میں تقریباً تیس چالیس فٹ تک جاتا نظر آیا تھا۔

میں نے اس کی اسپیڈ بڑھائی اور دروازہ کھول کر فوراً نیچے اتر گیا۔ اگرچہ ایکسیلیٹر پر سے پیر ہٹتے ہی گاڑی کی رفتار میں کمی واقع ہوئی تھی لیکن فاصلہ کم اور میدان تنگ ہونے کے سبب کام ہوگیا۔

گاڑی آگے بڑھتے ہوئے پہلے سامنے سے جھکی، اس کے دائیں جانب کے ٹائر پلیٹ فارم کے کناروں سے اترے، وہ جھکی اور پھر الٹ کر پانی میں ایک زوردار چھپاکے سے جاگری اور آہستہ آہستہ ڈوبتی رہی مگر میں جلدی سے پلٹ آیا۔

میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ حالانکہ مجھ پر تھکاوٹ غالب تھی مگر جوش و جذبہ اور قوتِ ارادی تھی جس نے مجھے تھکنے نہیں دیا۔

میں پھر بھی اطراف میں نظریں دوڑاتا رہا۔

جب میں پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اپنے رہائشی کنٹینر پر پہنچا تو شکیلہ، کبیل دادا کو کوئی سوپ پلا رہی تھی۔ آنسہ خالدہ کو اس نے دوسرے کمرے میں لٹا رکھا تھا۔ کبیل دادا کی حالت اب کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ تاہم چہرے پر نقاہت سی نظر آرہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرایا۔ میں نے بھی مسکرا کر اس کی خیریت پوچھی۔ پھر آنسہ خالدہ کے بارے میں شکیلہ سے استفسار کیا۔

"بس، شہزی! کیا بتاؤں، بے چاری فقط سانسیں لے رہی ہے۔" شکیلہ نے تاسف بھرے دل سے جواب میں کہا اور میرے دل کو گھونسا لگا، میرے ہونٹ متاسفانہ انداز میں بھنچ گئے تھے۔

"شہزی! گون برگ کو نہیں مرنا چاہیے تھا۔ کاش! مجھے گولی نہیں لگی ہوتی۔ حالانکہ میں نے زخمی ہونے کے باوجود محض اپنی قوتِ ارادی کے بل پر خود کو سنبھالے رکھا تھا مگر..." کہتے ہوئے کبیل دادا نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

"حالات عین وقت پر سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔" میں نے اس کی خفت مٹانے کی غرض سے کہا۔ "اس لیے اس میں نہ تمہارا کوئی قصور ہے نہ ہی شکیلہ کا لیکن اب ہمیں آنسہ خالدہ کے بارے میں سوچنا ہوگا، اس کا پہلے بھرپور علاج ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہی یہ کچھ بات کرنے اور بتانے کے قابل ہوسکتی ہے۔"

"ہمم... ابھی بھی کوئی آسان مرحلہ نہیں ہے، کیونکہ

اب تو اس بے چاری کی جان کو اور زیادہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے، جبکہ خالدہ کو فوری طور پر اسپتال منتقل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں رہا۔" کھیل دادا پُرخیال لہجے میں بولا۔

"مگر نہیں، پتا نہیں کتنا عرصہ خالدہ کو اسپتال کے بیڈ پر رہنا ہے اور لڑکی سکینہ بیل ورسک والی صورتِ حالات میں سروائیو بھی کیسے کرے گی؟" شکیلہ کے لہجے میں بھی تشویش تھی۔

"خدا کرے کہ اس کا کوئی فوری طور پر حل نکل آئے، اس بے چاری کی حالت بھی خطرے میں ہی تھی ہے۔" میں نے پُرفکر انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر بولا۔ "آؤ ذرا اس کا تھوڑا سا جائزہ تو کر لیں۔"

ہم کمرے میں آ گئے۔ ایک کونے میں رکھے بیڈ پر خالدہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے نحیف و نزار سے وجود میں اب بھی ہلکی ہلکی کپکپی طاری تھی۔

شکیلہ نے ایک کام میری غیر موجودگی میں نمٹایا تھا۔ اس کا چیلا سا اتار کر اپنا کوئی کھلا ڈھلا سا لباس پہنا دیا تھا۔

میں بڑے ہی کرب کا ایک پہاڑ سا جیسے دل پر لیے چند قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور قدرے جھک کر اسے دیکھا۔ حقیقت تھی یہ کہ اس کی ناگفتہ بہ حالت مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

پہلے کی بہ نسبت اس بار مجھے اسے ذرا قریب اور غور سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ اسی لیے میں چہرے پر کرب کے آثار لیے اور اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے اب اس کا ایک ایک حصہ دیکھ رہا تھا۔

ایسی کون سی جگہ نہیں تھی جو اس کی مجھے سالم نظر آتی ہو۔ چہرہ، بال، گردن، سینہ، بازو، کاندھے، ہاتھ اور پیٹ سے نیچے ٹانگیں، غرضیکہ کوئی ایسا حصہ نظر نہیں آتا تھا جہاں پر کوئی تشدد کا نشان نظر نہ آتا ہو۔

میں جیسے جیسے اس بدنصیب خاتون کی حالت تنزلی اور جانب بزار دیکھتا تھا، میرے اندر دکھ اور غم کے ساتھ قہر و غضب کا ایک جوار بھاٹا بھی کروٹیں لیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اپنی غیظ آلود کیفیات پر مجھے قابو پانا مشکل ہو رہا تھا جس کا اظہار میں اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بار بار بھینچ کر کھول بند کرنے لگا۔

"بہن۔۔۔ خالدہ۔۔۔" میں نے اس پر قدرے جھک کر ہولے سے آواز دی۔ "کیا تم مجھے سن رہی ہو؟"

جواب تو وہ بے چاری کیا دیتی، مگر اس کے اپنے رہی تھی۔ وجود کی ایک جنبش تک سے بھی مجھے کوئی رسپانس نہیں ملا۔ نیم مردہ سی پڑی رہی۔

میں نے اپنے حلق میں اترتی ہوئی رقت پر قابو پاتے ہوئے اپنا دل مضبوط کیا۔ اس کے بعد اپنا ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھایا۔ میں اب دل کی کاٹ کے بعد اس کے چھونے کی حس کو چیک کرنا چاہتا تھا۔

اس کا ہاتھ چھوا تو جیسے میں سر تا پا لرز گیا۔ وہ برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ میرا دل و جگر پھٹنے لگے۔ اپنی محسن کو۔۔۔ ایک ایسی محسن کو جو دلیری اور جرأت مندی کی جیتی جاگتی تصویر تھی، جو ایثار و قربانی کا پیکر تھی، جس کا مجھ سے۔۔۔ عابدہ سے بظاہر کوئی رشتہ نہ تھا لیکن اس کا ہمارے ساتھ جو تعلق تھا، وہ صرف سچائی اور انسانیت کی بنیاد پر تھا۔

میرا دل بھر آیا۔ میں سر جھکائے ایک دم پلٹ گیا۔ مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ میں خود کو بڑا مضبوط دل رکھنے کا دعوے دار تو نہ تھا، گوشت پوست کا انسان ہی تھا، کتنے ہی جفا کار دشمنوں کو پچھاڑا تھا اور ان سے زک بھی ہوا تھا مگر میری آنکھوں سے بڑی سے بڑی تکلیف و اذیت پر آنسو تک نہیں نکلے تھے، مگر آج میں ان بہتے اشکوں پر بند نہیں باندھ سکا اور کمرے سے نکل آیا۔

شدتِ غم سے مجھ میں کھڑے رہنے کی سکت بھی نہیں رہی۔ میں گرنے کے انداز میں ایک کرسی پر سر جھکائے بیٹھ گیا۔

چند ہی لمحات بیتے، مجھے اپنے کاندھے پر کسی کے ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ میں نے دھیرے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ شکیلہ تھی اور اس کے ساتھ کھیل دادا ایک دیوار کا سہارا لیے کھڑا تھا۔

"یار دادا۔۔۔ بے شک میں نے اپنی زندگی میں دوستی کے رشتے کو خون کے رشتوں سے کم نہیں پایا۔ جن میں اول نمبر پر تم اور شکیلہ میرے بے جگر سے دوست رہے اور اب تک ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔ مجھے سوچنا پڑ رہا ہے یار۔۔۔ دادا! کیا کوئی ایسا بھی دوست اور ہمدرد ہوتا ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھا میری دادرسی صرف انسانیت اور سچائی کی بنیاد پر کر رہا ہو۔۔۔ یہاں تک کہ اپنا آپ بھی اس نیک جذبے کے تحت قربان کر ڈالے؟ جس سے میں پہلے کبھی ملا بھی نہیں، محض ٹیلی فون تک رابطہ رہا ہو۔۔۔ آج جس قابلِ رحم حالت میں ہے، صرف عابدہ اور میری وجہ سے ہے۔"

"یہ اس نیک اور ہمدرد عورت کی کیسی سچائی ہے جو مجھے بری طرح تڑپا رہی ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ میں

اس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ یار! دنیا میں آج میں نے زیادہ تر سچائی کا چہرہ مسخ کرنے اور غیر کوشش میں ہدایت والوں کو دیکھا ہے۔ بگاڑ پیدا کرنے والوں کو دیکھا، بنانے والے کم دیکھے۔ اس قدر کہ اس نیک خاتون خالدہ کی طرح بھلائی جان پر بھی کھیل جائیں۔ ہم انسانوں کو تو بس ایک غلط فہمی اور کچی سنائی افواہ طرازی کی ایک ذرا تیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر ہم بغیر سوچے سمجھے "بھک" سے وحشی کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ مفاد کسی کا کچھ ہوتا ہے تو جھونک کر کوئی اور کود جاتا ہے اس آگ میں ہمارے اندر آنسہ خالدہ جیسی عورت کی طرح وحشتیں کیوں نہیں ہیں؟ ایک غلط فہمی کی چنگاری بھڑکائی جاتی ہے اور پھر تماشا دیکھا جاتا ہے۔ یا... میں بھی دیوانے کی بڑ جیسی باتیں لے کر بیٹھ گیا۔"

آخر میں یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا سر جھٹکا۔ کمیل دادا اور شکیلہ سے یہ کہتے کہتے میرا لہجہ بھرّا سا گیا۔

"حوصلہ رکھو شہزی!" کمیل دادا نے میری طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جو لوگ سانچ پر آنچ نہیں آنے دیتے، وہ اصلی اور نیک ہوتے ہیں۔ یہ نیک اور بہادر خاتون آنسہ خالدہ بھی اصلی عورت ہے۔ نیکی بے مثال قربانی پہچان ہے اس کی۔ یار شہزی! تم بھی تو خیریت کا احساس ہے، یہ باتیں یاد ہے؟ تجھے، نجم صاحب (زیرو ہال) کے گروپ میں وہ سب سے بڑا اور سخت ترین مخالف میں ہوا تھا تیرا۔ پھر تو نے لفظوں اور دلیلوں سے نہیں اپنے رویے سے ثابت کر دکھایا کہ دوستی کیا ہوتی ہے۔"

"شہزی! کمیل دادا ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شکیلہ نے بھی مغموم سی دھیمی آواز میں کھوئے سے کہا۔ "آنسہ خالدہ کو اس کی قربانی کا اجر ہم کیا دے سکتے ہیں جو اللہ رب العزت نے اس کے نیک عمل کا رکھا ہوگا۔ لیکن تم حوصلہ مت ہارو ہم آنسہ خالدہ کی صحت یابی کے لیے کچھ سوچ لیتے ہیں۔ یہ امریکا ہے۔ دنیا کی جدید طبی سہولیات یہاں میسر ہوتی ہوں گی۔ رہا سکیورٹی کا مسئلہ تو اس پر سوچ بچار کر کے کوئی حل نکالا جا سکتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ کمیل دادا اور شکیلہ کی باتوں نے مجھے کچھ حوصلہ بخشا تھا۔

کچھ لمحات اور بیت گئے۔ بروقت آرام ضروری تھا، ہم سو گئے۔ دن چڑھے جاگے۔

شکیلہ نے جیسے تیسے کھانا تیار کیا اور ہم نے کسی نہ کسی طرح اور زہر مار کیا پھر کافی کے مگ لے کے سر جوڑ کے بیٹھ گئے۔

"میرا خیال ہے اس سلسلے میں اسٹاری سے زیادہ بہتر مشورہ اور کوئی نہیں دے سکتا ہمیں۔" شکیلہ نے تجویز پیش کی۔

"میڈم عارفہ کو بھی ہمیں نہیں بھولنا چاہیے۔" کمیل دادا نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہاں امریکا میں وہی ہماری بہترین خفیہ سورس اور سپورٹر ہے۔"

"ٹھیک ہے یار! عارفہ کو ابھی پس منظر میں ہی رہنے دو۔" میں نے کہا۔ "وہ اب تک ہمارے لیے جو کر رہی ہے اور کرنے والی ہے وہی بہت ہے۔ اسے ابھی ہم کسی نئے خانے میں فٹ نہیں کر سکتے۔ البتہ اسٹاری کی بات اور ہے۔"

"ایک شخصیت کو ہم بھول رہے ہیں۔" شکیلہ نے اچانک کہا تو کمیل دادا اور میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"سوزی...!" شکیلہ دبے دبے جوش سے بولی۔ "اس لیے کہ آنسہ خالدہ کی یہ دفتری ساتھی ہی نہیں بلکہ وہ بھی اسی اخباری ادارے سے منسلک ہے جس میں خالدہ کام کرتی رہی، بلکہ کوئی بعید نہیں اس کا ادارہ اپنی بہترین اور دلیر کارکن کے لیے مثبت قدم اٹھانے میں ہماری مدد بھی کرے۔"

"زبردست...!" کمیل دادا ایک دم جوش مسرت سے بولا۔ "ہمیں فوراً مس سوزی سے رابطہ کرنا چاہیے۔"

"تجویز بری نہیں۔" میں نے شکیلہ کی بات پر قدرے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "سوزی اس بارے میں کوئی مشورہ یا مدد تو دے سکتی ہے لیکن میرا نہیں خیال کہ اس کا ادارہ کسی قسم کی مدد کرے۔"

"وہ کیوں شہزی؟" شکیلہ نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ "اپنی بہادر اور اہم لیڈی رپورٹر کا سراغ ملنے پر تو انہیں بے حد خوشی ہوگی۔"

میرے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ عود کر آئی۔ اسی لہجے میں بولا۔ "ایسے حالات میں ان کا میڈیا بھی کینچلی بدل لیتا ہے۔ ان مٹھی بھر یہودیوں نے پوری امریکی مشینری یرغمال بنا رکھی ہے تو یہ بھلا میڈیا ان کے لیے کس کھیت کی مولی ہے۔ لیکن یوں بھی ان کے لیے جو کارکن زندہ اور صحت مند ہے وہی کام کا ہے باقیوں کو منظر سے معطل کر کے پھینک دیتے ہیں۔ یہاں بھی دشمن ٹولے کے لیے آنسہ خالدہ ایک ہاٹ ایشو ہے۔ اسے خفیہ طریقے سے ہی مجبور کرنا

پڑے گا، کیونکہ آنسہ خالدہ ہمارے لیے کس قدر اہم ہے یہ ہم ہی جانتے ہیں اور دشمن بھی۔ اسی لیے وہ اس ایشو سے ہر ممکن طریقے سے جان چھڑانے کے لیے کوشاں ہو جائیں گے، کوئی بعید نہیں اس وقت پورے اسرائیل سمیت تل ابیب اور یہاں سے جے بی سی اور ٹائیگر لیگ کا سکون غارت ہو گیا ہو۔"

میری صراحت پر وہ دونوں تفہیمی انداز میں اپنے سروں کو جنبش دینے لگے۔

"لیکن خیر! تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے شکیلہ!" میں نے آخر میں ایک پُرسوچ سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہا۔ "سوزی یوں سمجھو آنسہ خالدہ کا ایک طرح سے پارٹ لو ہے۔ اسے بھی یہ نہیں معلوم کہ اس کی ہونہار کولیگ اب ہمارے پاس ہے...۔ اسے پتا چلنا چاہیے۔ اس کا مشورہ بھی۔ جو صائب الرائے ہو سکتا ہے۔"

"لیکن شہزی! تم نے تو کسی سے بھی ٹیلی فونک رابطے کی سختی سے ممانعت کر رکھی ہے۔ پھر استاری یا سوزی سے کیسے رابطہ ہو؟" شکیلہ نے مجھے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اس وقت جے بی سی اور ٹائیگر لیگ کی صفوں میں تھرتھلی مچی ہوئی ہو گی، کوئی بعید نہیں مشکوک علاقوں کی کالز ٹریس کی جا رہی ہوں۔ احتیاط ضروری ہے۔" میں نے جواب میں کہا۔ "لیکن سوزی اور استاری سے بالمشافہ ہی جا کر ملا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، کیونکہ سوزی بیکرز فیلڈ میں رہتی ہے۔ جبکہ استاری تو ادھر ہی فریسنو میں ہے۔ البتہ بیکرز فیلڈ یہاں سے تقریباً ایک سو اسی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بائے روڈ ہم جا سکتے ہیں۔" پھر کچھ دیر ٹھہر کر میں نے گومگو کے انداز میں ہولے سے بڑبڑایا تھا۔

"حالانکہ سوزی کو تو ہم نے یہاں فریسنو بلوایا بھی تھا، پتا نہیں وہ اب تک کیوں نہیں یہاں آئی؟"

یہ سب کہتے ہوئے اچانک ہی میرے ذہن خانے میں ایک جھماکا ہوا۔ کبیل دادا کی گہری نظروں نے میرے چہرے کا تاثر تاڑ لیا، فوراً مستفسر ہوا۔

"کیا ہوا شہزی؟ کیا کچھ اور بھی یاد آ گیا؟" اس کے بشرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ڈاکٹر عبداللہ اور پروفیسر ڈین۔" اس کے استفسار پر میرے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"اوہ۔" کبیل دادا نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ میں نے کہا۔

"یہ دونوں حضرات بھی میری اس نازک معاملے میں خاطر خواہ طریقے سے ضرور مدد کر سکتے ہیں۔" بالآخر میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

ان دونوں معتبر ہستیوں کے نام ذہن میں آتے ہی لامحالہ یاسمین خانم کا بھی نام دل میں اجاگر ہو گیا تھا۔ جیسا کہ ذکر ہوا، میں نے کبیل دادا اور شکیلہ سمیت عارفہ کو بھی ان کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ تبھی شکیلہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"لیکن یہ دونوں تو ڈاکر میں رہتے ہیں۔"

"اگر ان کے ذریعے اتنا اہم کام آسان ہو رہا ہے تو ڈاکر جانے میں بھلا کیا قباحت ہے۔" کبیل دادا نے لقمہ دیا۔

"سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ پہلے کس سے مدد لی جائے اور کس سے ابھی اس اہم اور حساس معاملے کو مصلحتاً مخفی رکھا جائے۔" میں الجھا سا گیا۔ "راستے بہت دکھائی دے رہے ہیں مگر منزل ابھی دھندلی ہے۔"

"تم سب سے پہلے استاری کے علم میں شب گزشتہ والے واقعات لے آؤ۔ یہ اصولی طور پر بھی بہتر ہی رہے گا۔" شکیلہ بولی۔ "اس کے بعد سوزی سے بھی ملا جا سکتا ہے۔"

"ان دونوں سے یہ سب گوش گزار کرنے کے بعد ہی پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر عبداللہ سے مدد لینے کا سوچا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے بھی حامی بھری۔ پھر میں نہیں رکا۔ تاہم میں نے شکیلہ اور کبیل دادا کو وہیں رہائشی کنٹینر میں آنسہ خالدہ کے پاس چھوڑا اور خود نکل کھڑا ہوا۔

کوٹ بیلٹ سے چپکا ہوا میرا محبوب ہتھیار کوبرا کولٹ میرے پاس تھا۔ اس میں ابھی کئی راؤنڈ باقی تھے۔ فاضل راؤنڈ کا بندوبست میں کسی آرمز اسٹور سے کر سکتا تھا مگر ابھی اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ بہرحال میرا ذہن نہیں تھا۔

امریکا میں عارفہ نے بھی غیر معمولی چابک دستی اور ہوشیاری سے میری پوزیشن مضبوط بنائی تھی۔

انٹرسیا جہاز راں کمپنی میں میرے چالیس سے تیس فیصد شیئرز کے حوالے سے میرا ایک بین الاقوامی اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا جس میں میری خطیر رقم پہلے ہی سے موجود تھی میرے نام پر جبکہ مذکورہ جہاز راں کمپنی سے حاصل ہونے والی تیس سے چالیس فیصد آمدنی کی رقم بھی سیدھی جا رہی تھی، یوں گویا مجھے رقم وغیرہ کے سلسلے میں کوئی دقت

نہیں سکی تھی۔

ریڈی میڈ میک اَپ کے ساتھ میں اپنے رہائشی کنٹینر سے نکلا اور ٹیکسی کروانے کے بجائے میں نے ٹرام کو ترجیح دی۔

سیون اے پارک ایونیو، اسٹریٹ تھرٹی تھری، سن لیک کے پاس ایک چھوٹی سی رہائشی عمارت ہے۔ سامنے سینٹ لوکا کا گرجا ہے، سیکنڈ فلور پر اس کی رہائش ہے۔

ایک گھنٹے بعد میں اپنے مطلوبہ اسٹاپ پر اتر گیا۔ وہاں سے سن لیک کا علاقہ سیدھے ہاتھ پر ذرا دیر کی پیدل مسافت پر تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی میں سن لیک کے صاف ستھرے علاقے میں تھا۔

مجھے دور سے ہی وہ چھوٹی رہائشی عمارت دکھائی دے گئی تھی جس کے دوسرے فلور پر اسٹاری کی رہائش تھی۔

میں نے دانستہ وہاں کا رخ نہیں کیا اور اس کے سامنے نظر آنے والے سینٹ لوکا چرچ کی طرف بڑھنے لگا۔

کچھ سوچ کر میں یونہی سرگشت کے انداز میں چرچ کی عمارت کا ایک چکر لگانے کے بعد ایک قریبی ریک پر لگے ہوئے اخبارات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پھر جیب سے میں نے دس سینٹ کا ایک ڈائم نکالا اور سلاٹ میں ڈال کر ریک سے تازہ اخبار کھینچ لیا۔

چند اور لوگ بھی وہاں موجود اسی طرح اخبار دیکھ رہے تھے کوئی اہم خبر تھی اسی لیے لوگ بے تابی اور انہماک سے وہیں کھڑے کھڑے پڑھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں نے گہری دلچسپی والے انداز میں اخبار لیا تھا کہ تھوڑا ادھر اُدھر تانکا جھانکی کا موقع دیتا رہے۔

خبر شہ سرخیوں میں لگی تھی لیکن اس میں امریکی عوام الناس کے لیے تو دلچسپی کا عنصر غالب تھا مگر میرے لیے نہیں کیونکہ وہ عنقریب امریکا میں ہونے والے جنرل الیکشن سے متعلق تھی۔

اس وقت میں بھی انہی چند افراد کے ساتھ کھڑا شامل رہا۔ کچھ لوگ ایک دوسرے سے الیکشن سے متعلق تبصرے بھی کر رہے تھے۔

[illegible] میں چونکا۔ میری نظر نرسی پہ پڑی۔ اس کے [illegible] کی بینگ باسکٹ اور ایک شاپر تھا جس میں [illegible] کا سودا سلف تھا۔ وہ بھی اخبار لینے آئی تھی اور اب [illegible] پڑھنے کے بجائے اس نے گول کر کے شاپر میں ٹھونس [illegible]

نرسی مجھے نہیں پہچان سکی تھی۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ اسٹاری اس وقت [illegible] پر ہوگا اور اس کی یہ نوعمر حسین بیوی تنہا تھی۔ اس نے اپنے سڈول جسم پہ ٹائٹ جینز اور اندر کوئی شرٹ تھی۔ اس کے اوپر گرم اونی سوئیٹر تھا۔ بالوں میں سونے جو کر رکھے تھے اور وہ خاصی اسمارٹ نظر آ رہی تھی۔

وہ شاید کچھ جلدی میں تھی۔ اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پہ یونہی خفیف سی مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ گلی اور چند قدموں کے فاصلے پر واقع ڈپلکس بلڈنگ کی جانب بڑھی تو میں نے دیکھا کہ میرے بہت قریب سے ایک جسیم شحیم سا آدمی جس نے اوور کوٹ اور سر پہ ہیٹ لگا رکھا تھا، گزرا۔ وہ شاید عجلت میں تھا اسی لیے میرے عقب سے گزرتا ہوا اس کا کندھا تھوڑا مجھ سے ٹکرایا بھی تھا مگر اس نے مجھ سے کسی قسم کی معذرت کرنا بھی گوارا نہ کیا، حالانکہ یہاں اکثریت کا یہی دستور تھا، سوری یا پھر تھینکس۔“

وہ شخص تنومند ہونے کے علاوہ دراز قامت اور چوڑے شانوں والا تھا۔ اس کے کوٹ کے کالر کھڑے تھے۔

میں اس پر توجہ نہ دیتا اگر میں اسے بلڈنگ کے دروازے سے اندر داخل ہوتے نہ دیکھتا، جہاں سے نرسی اندر گئی تھی۔ میرے دل کو اچانک کھٹک ہوئی اور میں بھی اسی طرف کو بڑھ گیا۔

وہ اندر زینے طے کرتا ہوا غائب ہو چکا تھا۔ میرے قدموں میں بھی تیزی آ گئی اور... اندر پہنچتے ہی میں نے اسے دائیں جانب زینے کے ساتھ گھومتے دیکھا اور ٹھہرا میں بھی نہیں۔

وہ جیسے ہی گھوم کر اوپر گیا۔ میں اس کے سابقہ مقام پہ جا کر ٹھہر گیا۔

یہاں سے میں دبک کر زینے کی ریلنگ کی آڑ سے دوسرے فلور کو نصف حد تک دیکھ سکتا تھا جہاں مجھے نرسی ایک کمرے کے دروازے پہ چابی گھماتی ہوئی نظر آئی۔ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی چوڑے شانوں والا دراز قامت آدمی بھی اسی تیزی کے ساتھ کھلے دروازے کے قریب پہنچا اور میں نے دھڑکتے دل سے دیکھا کہ اس نے ایک ہاتھ بلند کر کے دروازے کو بند ہونے سے روک دیا اور غڑاپ سے اندر داخل ہو گیا۔

پل کے پل میرے اندر ہلچل سی مچ گئی۔ میں ہونٹ بھینچے سوچتا رہ گیا۔ اس شخص کی حرکت مشکوک تھی۔ وہ کسی بُری نیت سے ہی اس طرح اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے یقیناً اندر داخل ہوتے ہی نرسی سے کوئی ایسی حرکت کی تھی کہ وہ

شاید دروازے تک ہی رہ گئی تھی۔

میں نے بھی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور عقب میں دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنی جیب سے مخصوص طرز کی ''ایمرجنسی'' ٹارچ (پین ٹارچ کی شکل کی تھی) اور ادھر ادھر دیکھنے اور کسی کی طرف سے غیر موجودگی کی تسلی کرنے کے بعد لاک میں آہستگی سے گھمائی۔ لاک سے آواز نکلا اور میں نے آہستگی کے ساتھ دروازہ اندر کی طرف دھکیلا، چونکہ یہ گھر میرا دیکھا بھالا تھا، اس کا اندرونی نقشہ میرے ذہن میں تھا اس لیے بے آواز میں اندر داخل ہو گیا۔

لاؤنج میں روشنی کی مقدار بہت کم تھی۔ کمرا خالی تھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے عقب میں آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کر چکا تھا۔ مجھے راہداری والے بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں روشنی دکھائی دی جس کا دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ میں کچھ قدم تیزی سے بڑھا اور دروازے کے قریب جا کر تھوڑا سا اندر جھانکا۔

لڑکی پریشان چہرے کے ساتھ کھڑی تھی۔ سب سامان قالین پر پڑا تھا اور ٹوٹا پھوٹا بکھرا ہوا بھی نظر آ رہا تھا۔ چوڑے شانوں والا خوب صورت شخص کی میز کی جانب بیٹھا تھا۔ وہ ایک کرسی پر براجمان تھا اور بظاہر پرسکون نظر آ رہا تھا۔

اس نے میرے یہاں پہنچنے تک سامنے لڑکی سے کہا تھا کہ اب اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے پستول نکال کر اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔ لڑکی گھبرائی اور سراسیمگی سی اس کے ہاتھ میں پکڑے پستول پر تھی، واقعی کمال ہی ہو گیا تھا۔

''تمہیں تسلی ہو گئی؟ میرے کام سے تو شاید تم واقف ہو گی لیکن پھر بھی میں نے اپنا تعارف کرانا ضروری سمجھا تھا۔ اب تم اس سے بچ جاؤ گی کہ میرے سوالوں کے درست جواب دے سکو۔'' وہ شخص اس سے بولا۔ اس کی آواز میں کھردرا پن اور لہجے میں بڑی سنجیدگی تھی۔

یہ شخص کون تھا اور اس نے ابھی میرے یہاں پہنچنے تک اپنے بارے میں لڑکی سے کیا کہا تھا؟

''لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہو سکتا تھا کہ آپ ستاری سے...'' لڑکی نے اٹکتے ہوئے لہجے میں اس سے کہنا چاہا تو بیسٹ والے شخص نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں اس سے بھی بات کر لوں گا لیکن پہلے تم سے سوالات پوچھنا ضروری ہیں کیونکہ ان کے بیانات کا تمام میرے شکوک و شبہات کو تقریباً پہنچا چکی تھی۔ اب وہ جانتا ہے کہ تم... اس کا آخری قدم کرنا قتل لیے ہوئے اور نقصان تھا۔'' لڑکی گھبرائی ہوئی سی قریب دھری کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے چہرے سے محسوس کر سکتا تھا کہ وہ خاصی پریشان اور تشویش زدہ ہو چکی ہے۔

اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص کون ہو سکتا تھا؟ اس کے بارے میں فوری طور پر کچھ اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاید اس لیے بھی میں زیادہ سوچ بچار کی کوشش نہ کی کہ ابھی زیادہ دیر میں تو پتا لگ ہی جاتا ہے کہ یہ بھی کون ہے بلا؟

وہ کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے، دونوں ٹانگیں قدرے پھیلانے کے انداز میں قالین پر رکھے ہوئے تھا۔ جس اس کا لانگ کوٹ بھی تھوڑا سا نیچے کو جھول رہا تھا۔

اس کا چہرہ عقب سے جھکے ہوئے انداز میں نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی کافی حد تک اس کے سر کی ٹوپی کے پیچھے میں چھپ گیا تھا۔ ہونٹوں کے آدھے کنارے ظاہر ہوتے تھے۔ تاہم اب اس نے کوٹ کے کالر قدرے نیچے کر دیے تھے۔

اس آدمی نے اپنے لانگ کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک سگار نکالا۔ اس کا کنارا توڑ کر اسے ہونٹوں پر رکھا اور لائٹر سے سلگا لیا۔ ایک گہرا کش لینے کے بعد اس نے دھواں اپنے ہونٹوں سے مرغولوں کی صورت میں اس طرح چھوڑا کہ وہ چھلوں کی صورت ایک قطار سی بنا کر گول گھومتے ہوئے سامنے، چند ہی قدموں کے فاصلے پر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سراپے پر سے گزرنے کے لیے ڈھیلے محسوس ہوتے۔

''میں چاہتا تو تمہیں اپنے سیکرٹ ایجنٹ کی مدد سے ساری باتیں پیش کر سکتا تھا مگر میرے کام کرنے کا انداز تھوڑا مختلف ہے۔ افسوس جب میں خود کسی کام کو کرنے کے لیے نکلتا ہوں تو میرا انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ آخری فیصلہ صرف میرا ہی ہوتا ہے جو میں آن دی اسپاٹ کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہوں۔''

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میرے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ مجھے یہ آدمی اپنی باتوں اور وضع قطع سے کوئی خاص ہی شخصیت لگا تھا۔

وہ کچھ لمحے ٹھہرنے کے بعد دوبارہ لڑکی سے مخاطب ہو کے بولا۔

''میں تمہیں زیادہ بولنے اور تفصیل میں جانے کی زحمت نہیں دوں گا کیونکہ میں حقیقت جان چکا ہوں اور تم نے

مجھے صرف ایک لفظ میں اپنا جواب چاہیے۔ اب میں پہلا سوال تم سے کروں گا۔"

وہ ٹھہر گیا۔ اس کے بعد سوال داغا۔

"یہ ایک روز پہلے شام کے وقت کا ذکر ہے [illegible] اسی اپارٹمنٹ کا ہے۔ یہاں تم، تمہارا شوہر انصاری اور جو بوڑھا فرد جس میں ایک بوڑھا سا کرسی میں تھی اور صحت مند جسم کی مالک لڑکی موجود تھے۔ یاد ہے؟ آخر الذکر تین افراد ابھی تک یہاں تمہارے لیے لیکن اس کے تھوڑی دیر بعد تین افراد اور اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ تمہارے شوہر انصاری سے ان دونوں مرد اور لڑکی کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے تھے۔ اس کے بعد ان سے کا ایک دم اچانک کیا ہو جاتا ہے۔ کیا آئی رات؟ لہٰذا اب اس کا جواب ہاں یا ناں میں دو، پھر آگے چلتے ہیں۔"

انتہائی سنسنی پھیلاتے ہوئے لہجے میں اس اوورکوٹ اور ہیٹ والے نے یہ کہتے ہوئے خاموشی اختیار کرلی۔

اس کا سوال سنتے ہی میرے اندر ایک جھماکا ہوا۔ کیا شک تھا اس میں کہ یہ پُراسرار اور گمبھیر سا شخص ہم تینوں اور اس روز یہاں سے پولیس کے ادارے والے تین افراد، وہ [illegible] اور [illegible] کی بات پوچھ رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ کیا یہاں کا کوئی ساتھی تھا یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور شخصیت؟ میں نے کان لگا رکھے تھے۔

لڑکی الجھن اس سوال پر حلق میں آنے والی کسی شے کو نگلنے کے انداز میں بولی۔

"کیا... ہاں!"

"بہتر!" اوورکوٹ والا آدمی خوشی کے اظہار پر تحسین لہجے میں لڑکی سے بولا۔ "اور اب تین کا [illegible] اب تم بتاؤ گی یا میری زبان سے سنو گی؟ دیکھو میرے اگلے سوال پر تمہیں اسی طرح جواب دینا ہوگا سوچ سمجھ کر۔"

اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز، رعونت اور ایک قسم کے بالادست ہونے کا انداز تھا ہی تھا لیکن... [illegible] شاید وہ بھی [illegible] محسوس ہوتا تھا۔

"وہ... وہ ہم... میرے شوہر... اور..."

"آں... ہاں... ہاں!" اچانک ہیٹ والے شخص نے اسے درمیان میں ٹوک دیا۔

"جھوٹ نہیں۔ چلو، میں ساتھ دیتا ہوں لیکن اس کے بعد تمہارے پاس جھوٹ بولنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔"

کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ اوورکوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور جب باہر نکالا تو میرے وجود میں ہلکی سی سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس کے ہاتھ میں اب ایک سیاہ رنگ کا پستول دبا ہوا تھا جس کی لمبی نال سائلنسر کا شائبہ دیتی تھی۔ وہ اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔

پستول دیکھتے ہی لڑکی کے چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں گہری ہوگئیں۔ وہ بے چاری ایک عام سی گھریلو خاتون تھی۔

"ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" ہیٹ والا شخص بولا۔ "لیکن جیسا کہ میں نے کہا کہ میں آن دی اسپاٹ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کم از کم تمہارے ساتھ مجھے ایسا کوئی غلط فیصلہ نہ کرنا پڑے۔ جیسا کہ میں نے تمہارے شوہر انصاری کی ساتھ بیوی اور بچی کے لیے جاری کرنا پڑا تھا اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارا بھی وہی حشر ہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ رکا۔ لڑکی پر اب واضح طور پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ ادھر میں اس شخص کی بات آخری بات پر بُری طرح چونکا۔ انصاری کی ساتھ لیکن بد نصیب بیوی اور بچی کے انجام سے متعلق اس کی زبانی سن کر میرے پورے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔

وہ آگے کہہ رہا تھا۔ "وہ تینوں تمہارے، مجھے دراصل دور کی بات ہے تم نے ہی نہیں بلکہ تمہارے شوہر نے انہیں خود اس روز پہلی بار دیکھا تھا۔ بتائے دیتا ہوں، ان میں ایک جو دراز قامت اور مضبوط سا کسرتی جسم کا مالک نوجوان لڑکا تھا، [illegible] خان شیرازی ہے۔ دوسرا پستہ قد اور [illegible] شخص جو میرے قدرے کم ہی ہے، سانولی رنگت والا [illegible] تیسری ان کی ایک خوب صورت ساتھی لڑکی شگفتہ ہے۔

"یہ تینوں پاکستان سے امریکا اپنی ایک ساتھی ماجدہ کی رہائی کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں اور تمہارا شوہر انصاری ان کی ادھر مدد کر رہا تھا۔ اس قدر کہ میرے تینوں ساتھیوں کو ان کے ہاتھوں ہلاک کروا کے ان کی لاشیں تک غائب کرانے میں اس انصاری کا بھی ہاتھ تھا۔" وہ رکا پھر بولا۔

"تمہیں [illegible] وہ میں بعد میں دیکھ لوں گا۔ آخری بات یہ کہ مجھے ان تینوں کے ٹھکانے کے بارے میں تم مجھے بتاؤ گی کہ وہ یہاں سے چلے گئے؟ کب یہاں آئے تھے اور [illegible] کر

[illegible] گئی۔

اس نے اپنی بات ختم کی [illegible] کی گفتگو رک گئی۔ [illegible] ایک تپائی پر رکھا تھا۔ لڑکی فون کی گھنٹی پر [illegible] اسے مجھ نے اٹھا لیا تھا۔ اس نے اس طرف دیکھا لیکن [illegible] نے اس طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

”[illegible] کہ کل تمہیں تمہارے [illegible] کے بارے میں اطلاع دی جا رہی ہے۔“ [illegible] لہجے میں یہ کہا اور لڑکی کے حلق سے [illegible] خارج ہو کر [illegible] ہو کر رہ گیا۔

[illegible]

[illegible] کی۔

[illegible] تھا [illegible] ہے۔

اس کی باتوں سے [illegible] تھی۔ [illegible] تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] آواز میں [illegible]

[illegible] تھا۔

[illegible] سے [illegible] سے آسان [illegible] دیا۔

فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی پھر بند ہو گئی۔ [illegible] فون کی [illegible] لگنے لگی۔ [illegible] اس نے اس طرف [illegible] تھی۔

”[illegible] ان گھنٹیوں کو [illegible] سوال کا جواب [illegible] میں داخل ہو گیا۔

[illegible] کے حلق سے [illegible] خارج ہوئی [illegible] کے ہی طرح آرام سے [illegible] اپنی گردن [illegible]

ROY WILLIAMS
1
2

[illegible]

[illegible] کی گردن سے جا لگی۔

”[illegible] گردن میں [illegible] کی طرف [illegible] اس نے [illegible] کے لیے [illegible] کی [illegible] لگے [illegible] جو اس کی [illegible] ہو گئی۔ [illegible] کے [illegible] گیا۔

اپنا [illegible] اس کے ہاتھ میں تھا [illegible]

ابھی مجھ پر گولی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا اسی لیے مجھے اس نے دھکا دیا۔ گرد وہ کوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے بمشکل اپنا توازن ایڑیوں کے بل پر سنبھال لیا۔

ہیٹ والا مجھ پر لپکا اور اپنے گھٹنے کی ضرب میرے پیٹ پر رسید کرنا چاہی، میں نے تکلیف کے باوجود خود کو بچایا اور ایک گھونسا اس کے چہرے پر رسید کیا۔ اس نے جھک کر چہرہ بچانے کی کوشش چاہی، ضرب ٹھیک سے نہ لگی اس کی پیشانی پر لگی، اسے کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے اپنے پستول والا ہاتھ بلند کیا۔ میں نے جلد کرسی کے پیچھے سے سرک کر دھکیل کر الٹا سا پیچھے دھکیل دیا۔ جس کرسی پر وہ تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا اسی پر گرا اور الٹ گیا۔ پستول اس کا بھی چھوٹ گیا۔ میں نے اچھل کر اس پر چھلانگ لگادی۔

ہم دونوں فرش پر ہی لپٹے لپٹے ایک دوسرے کے دست و گریباں ہو گئے۔ بلاشبہ وہ طاقت کا ایک پہاڑ تھا۔ لیکن اس کے جسم کا کسرتی بھاری پن اس کی چستی پھرتی کے آگے کمزور ابھی ثابت نہیں ہوا تھا۔

اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کروٹ بدلی اور مجھے خود سے علیحدہ کر دیا، میں ایک دیوار سے ٹکرایا۔ لڑکی نشانہ بننے تک سہما ہو گیا تھا، وہ اسی وقت ہسٹریائی کی طرح ملی جلی دروازے کی طرف دوڑی، دروازہ میں تھکے چڑھے فرش پر ہیٹ والے نے (جو اب اس کے سر پر نہیں رہا تھا) اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا سر کرسی سے ٹکرایا۔ وہ چیخ آور ہوتے فرش پر گر کر ڈھیر ہو گئی۔

وہ پھرتی سے اٹھا، ادھر میں بھی دیوار سے ٹیک کے ساتھ کھڑا ہوا۔ اب ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ میں اس پر لپکنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ اس نے دونوں ہاتھ سامنے کر کے مجھے جارحانہ پیش قدمی سے روک دیا۔

جانے کیا ہوا کہ تھیر اورونا   میں بھی اس کے اشارے پر رک گیا۔

”ٹھہرو۔۔۔! ہم دونوں تھک چکے ہیں، یار میں نے بھی نہیں مانی ہے۔ اگر ہم بیٹھ کر گفتگو کر لیں تو زیادہ بہتر ہوگا مسٹر شہزی   ۔“ اس شخص نے کہا۔

میں نے جلتی سلگتی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ گول چہرہ تھا اس کا۔ سر آگے سے نصف گنجا تھا۔ آنکھیں پھیلی پھیلی مگر ذہین تھیں۔ گھنی سرخی مائل مونچھیں۔ ہونٹ پتلے تھے لیکن اس کے چہرے سے ایک ایسا تاثر ا

تھا جس میں ہلکا سا اعتماد محسوس ہوتا تھا۔ ان پیچ پر بھی کچھ سے نکلنے کی بہتر صورت حالات سے نکلنے کی قدرت رکھتا ہو۔

”کون ہو تم   ؟ کے جی بی کی لگتے ہو یا پھر سی آئی اے؟“

اپنا نام اس کے ہونٹوں سے سن کر میں نے بھی اس کی شناخت کے حوالے سے پوچھا۔

اس کے بھاری گول چہرے پر ہلکا سا تاثر ابھرا تھا۔ پتلے ہونٹوں پر بھی سفاکی کا تاثر لیے ایک ہی مسکراہٹ تھی۔ اسی انداز میں بولا۔

”تم شاید نا جانتے ہو مجھے جس طرح میں تمہیں جانتا ہوں مسٹر شہزی   ۔“

میری مستفسرانہ نظریں بدستور اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ساتھ ہی مجھے لڑکی کی طرف سے بھی تشویش لاحق تھی لیکن یہ صورت حال ایسی تھی۔ نہیں کہ اسے دیکھا جائے۔

”ہیرالڈ   کہتے ہیں مجھے   بالکل ہیرالڈ   چیف آف بلیک ونگ   ۔“ اس نے ایک ایک لفظ قدرے وقفے سے ادا کرتے ہوئے کہا۔

میں بری طرح سنسنا کر رہ گیا۔ اگرچہ مجھے اس خبیث سے ہی خبیث بالکل ہیرالڈ سے ٹکراؤ کی امید تھی تاہم یوں اچانک اور اس عجیب انداز میں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے اس قدر روبرو ہو جائیں گے، یہ توقع بہرحال کم ہی تھی۔

اپنے مکروہ اور گھناؤنے مقاصد کے لیے عابدہ جیسی ایک سیدھی سادی اور معصوم لڑکی کو اس قدر خطرناک شکنجے اور کن کن مصیبتوں اور مصائب و آلام کے جال میں پھنسانے والا بالکل مردود و ملعون شخص یہی تو تھا۔

یہ حقیقت تھی کہ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیات ہوتی جارہی تھیں۔ کبھی اندر ایک دم جنون ابھار سالاوے کی طرح ابلنے کو بے قرار ہو جاتا تو ایک انوکھی عجیب سی جذباتی کیفیت بھی غالب آنے لگتی کہ میں چاہے بالکل ہیرالڈ ہی کیوں کہ میری جان جاں معصوم عابدہ اسی خبیث مردود کے شکنجے میں تھی، یوں دل ایک لمحے کو یہ بھی چاہا کہ ابھی اسی مردود ملعون کے قدموں میں گر جاؤں، اس کے پاؤں پکڑوں اور اس کی منت سماجت کرنے لگ جاؤں کہ وہ عابدہ کو میرے حوالے کر دے۔ وہ بے گناہ ہے، اسے پھنسایا گیا ہے۔ اسے کسی مکروہ اور گھناؤنی سازش میں پھنسایا گیا ہے۔ وہ بے چاری تو کلی کی طرح معصوم اور پھول کی طرح نازک ہے۔ اس غریب اور نادار نے تو اپنے دشمن تک کی بھی ایسے حالات نہ دیکھے ہیں

کے جو اسے ہزاروں میل دور دیارِ غیر اور یکسر اجنبی ماحول میں دیکھنا اور بھٹکنا پڑ رہے ہیں اور دہائی! ایسا ہو چلا تھا کہ کوئی لمحہ گزرتا تھا کہ میں اس مردود انسان کے قدموں میں گر جاتا مگر... یک لخت اپنی اس جوار بھاٹا کی سی جذباتی کیفیات پر قابو پا لیا۔

"جھٹکا تو ضرور لگا ہوگا میرا نام سن کر تمہیں مسٹر شہزی! بالکل اسی طرح جیسے مجھے بھی زبردست دھچکا پہنچا تھا جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم اپنے دو فرنچ ساتھیوں کونٹل وارا اور شکیلہ کے ساتھ یہاں نہ صرف وارد ہو چکے ہو بلکہ جیگر سمیت جے بی سی کے ٹاپ ایجنٹوں کو خاک چٹا چکے ہو۔"

ایک لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"کون برگ جے بی سی کا ایک ایسا ہونہار اور ٹاپ تربیت یافتہ ایجنٹ تھا جس سے خود میں بھی خائف رہتا تھا۔ لیکن جے بی سی سمیت ہمارے لیے بھی اس کی خدمات لائقِ احترام رہی ہیں اور میرے خائف رہنے کی وجہ یہی تھی کہ میں اس کی عزت کرتا تھا اور وہ مجھے بے حد پیارا تھا۔"

"جس طرح تم جے بی سی کے پیارے ہو۔" میں نے بھی یہ الفاظ چبا کے ادا کیے۔

"ایگزیکٹلی۔" وہ بولا۔

"تم نے بھی تو استاری کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہولارڈ!" میں نے کہا۔ "پہلے اس کی بیوی اور بیٹی کو تم نے اپنے ظلم کا نشانہ بنایا اور اب اس بے چارے کو بھی۔۔"

"اس فضول بحث میں پڑ گئے تو ہمارے بیچ کوئی معاملہ طے نہیں ہو پائے گا مسٹر شہزی۔ !" وہ میری بات کاٹ کر سرد لہجے میں بولا۔

"ہولارڈ۔۔۔! جھگڑا ختم کرو۔۔۔ عابدہ کو میرے حوالے کردو۔ ورنہ جے بی سی سمیت ٹائیگر فنگ کے یہاں پہنچنے تک ادھیڑے بغیر واپس نہیں جاؤں گا میں۔۔"

اچانک میں نے جوشِ غیظ سے کہا۔ عابدہ کا نام زبان سے آتے ہی میری شعلہ فشاں نظریں تیر کی طرح جیسے ہولارڈ کے چہرے پر پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

"بات کر لیتے ہیں اس پر بھی۔" ہولارڈ نے مکاری کہا۔

"اسی وقت بات ہوگی۔" میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"یہ اندازہ ہو گیا مجھے کہ تم عابدہ کے لیے سلسلے میں کس قدر جذباتی ہو۔ یہ اچھی بات ہے، ہونا چاہیے۔ آخر کو کچھ ہے تمہاری۔ اطمینان رکھو میں خود اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں رکھنے کو تیار ہوں، اسی وقت تم سے وعدہ کرتا ہوں میں۔ لو۔۔۔ بڑھاؤ ہاتھ۔ یقین نہ آئے تو۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

بات اچنبھے کی تھی مگر میں ذرا بھی نہیں چونکا تھا نہ ہی مجھ پر۔۔۔ اس کی مکاری اور چال بازی کا اور کوئی اثر ہوا۔ اسی لہجے میں بولا۔

"میں دشمنوں سے ہاتھ نہیں ملایا کرتا۔ کوئی نئی چال چلنے سے پہلے سوچ لینا کہ سانپ اور سیڑھی کا خطرناک کھیل کھیلتے ہوئے یہاں تمہاری گردن تک آ پہنچا ہوں۔"

اس نے میری بات سن کر ایک نظر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا جو اس نے مصافحے کے لیے میری جانب بڑھا رکھا تھا اور کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ واپس گرا دیا۔ بولا۔

"مسٹر شہزی! ہمارے بیچ دوستانہ ماحول کے بغیر مفاہمانہ گفتگو نہیں ہو سکتی۔"

"ہونہہ۔۔۔ دوستانہ ماحول۔۔۔!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"عابدہ کو زندہ اور صحیح حالت میں دیکھنے کے لیے ہمارے بیچ صرف ایک ہی رشتہ قائم رہے گا اور وہ ہے دشمنی۔ کیونکہ آنسہ خالدہ کا تم لوگوں نے جو حشر کیا ہے، اس کا بھی قرض چکاؤں گا میں بالکل ہولارڈ۔۔۔!"

"اوہ۔۔۔ تمہیں اس کا ضرور دکھ ہونا چاہیے۔" ہولارڈ مکاری سے بولا۔

اچانک ایک بیپ کی آواز ابھری۔ میں چونکا۔ ہولارڈ نے اپنا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب کی طرف بڑھانا چاہا تو میں نے یکدم کہا۔

"تم کوئی حرکت نہیں کرو گے ہولارڈ۔۔۔ ورنہ مجھے حرکت میں آنا پڑ جائے گا۔" میرے کہنے کا انداز جارحانہ تھا۔

"ایزی مین!" ہولارڈ نے کہا۔ البتہ اس کا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔ آگے بولا۔ "اگر میں اس بیپ کا جواب نہیں دوں گا تو میرے ساتھی یہاں پتا کرنے آ جائیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری اس اہم نوعیت کی گفتگو کے دوران کوئی خلل ہو حتیٰ کہ میرے اپنے ساتھی بھی—"

"میں ان حالات میں تم پر بھروسا نہیں کر سکتا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اس کے لیے مجھے اپنا پستول اٹھانا ہوگا۔"

"اٹھا لو، لیکن پہلے ذرا میرا بھی اٹھا لینا۔" اس نے کہا۔

میں نے لپک کر اپنا کوبرا کولٹ اٹھا لیا اور اس کا نال بھی گھما دیا۔ اس کا سائلنسر لگا پستول دینے کے بجائے وہ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا جبکہ اپنا کوبرا کولٹ میں نے اپنی بیلٹ میں اڑس لیا۔

"اب تم اپنے ساتھیوں کو جواب دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ نال کا رخ اس کی جانب تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی باچھیں کھجائیں اور کندھے اچکا کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں ہر لمحہ اس رذیل شخص سے محتاط تھا۔

"ایزی... !" اس نے اسی ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "میرا پستول نہیں دینا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ مت بھولو کہ میرے کم از کم دو ساتھی اس بلڈنگ کے گرد موجود ہیں۔"

"ہوتے رہیں، تم کام کی بات کرو۔" میں نے مرعوب ہوئے بغیر بے پروا انداز میں کہا۔

"او کے..." اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکال لیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سائلنسر لگے پستول کی نال کا رخ اسی کی جانب تھا جو کہ اصل میں اسی کا تھا۔

میں نے دیکھا اس کا ہاتھ جس طرح کوٹ کی کسی اندرونی جیب میں گیا تھا اسی طرح خالی باہر آ گیا۔

"وہ سب باہر ہی الرٹ ہیں۔ اب اندر نہیں آ سکتے۔ میں نے اپنی جیب میں رکھے ایک خفیہ ٹرانسمیٹر ڈیوائس کے ذریعے انہیں اشارہ کر دیا ہے۔" وہ بولا۔

"یہ اشارہ کچھ بھی ہو، میں تمہارے جھانسے میں نہیں آؤں گا، ادھر جو بھی آیا، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایزی... مین! ایزی!" اس نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم بہت سی باتوں سے اب تک پردہ اٹھا چکے ہو اور آخرہ تمہارا کیا منصوبہ ہے، میں اس سے بھی واقف ہوں۔ سوال یہ ہے کہ تمہیں صرف عابدہ کے حصول سے دلچسپی ہے اور ہمیں اپنے مقصد سے تو بات ختم ہو جانی چاہیے اور لڑائی بھی... لیکن اس کا مطلب یہ مت سمجھنا کہ ہم تم سے ڈر گئے ہیں، بات فقط اتنی ہے کہ اگر کچھ لو کچھ دو کی تکنیک سے مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو پھر کیا مسئلہ ہے؟"

"کیا چاہتے ہو تم...؟" بالآخر میں نے سوچتے ہوئے الجھن سے کہا۔ میری برمائی نظریں بدستور اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔

"ایسا کرو، پہلے اسے دیکھ لو..." باسکل ہولانڈ نے ایک طرف کرسی سے لگ کر قالین پر بے سدھ... پڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اب بے ہوشی سے نیم بے ہوشی کی طرف لوٹ رہی تھی، یوں ہولے ہولے کراہنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔

"میں آرام سے بیٹھ کر سگار پیتا ہوں۔ تم جب تک اطمینان سے اسے فرسٹ ایڈ دے لو۔"

میں اس کی بات سن کر چند ثانیے کے لیے الجھ سا گیا۔ جانتا تو وہ بھی تھا اور میں بھی کہ ہم اس وقت ایک دوسرے کے روبرو صرف دو انسان نہیں کھڑے ہیں بلکہ چلتے سلگتے آتش فشاں ہیں، تاہم ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اس وقت ہم ایک دوسرے کا کچھ بھی بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ لڑائی ہو چکی تھی، مکالمے جاری تھے، موضوع مفاہمت کا رخ اختیار کیے ہوئے تھے، اگرچہ ماحول ایک سرد جنگ کا سا تھا۔

باسکل ہولانڈ یہ کہہ کر اور مجھے سوچتا ہوا چھوڑ کر کرسی پر براجمان ہو گیا۔ پھر جیب سے ایک سگار نکال کر سلگا لیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اسے سنبھالا اور اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کے ہوش میں لایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔

ہوش میں آتے ہی وہ پھر خوف زدہ ہو گئی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں جلدی جلدی جتنا کچھ سمجھا سکتا تھا، وہ سمجھا دیا، اس کے حواس ذرا ٹھکانے آئے تاہم وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھے ہوئے باسکل ہولانڈ سے ابھی تک خائف نظر آ رہی تھی۔

اس نے مجھ سے کہا کہ وہ واش روم جا کر اپنی مرہم پٹی خود ہی کر سکتی ہے۔ وہاں کوئی ایسی کیبنٹ تھی جس میں دوا وغیرہ موجود ہوں گی۔ لیکن میرے نزدیک وہ ایسی حالت میں نہیں تھی کہ خود واش روم تک جا کر یہ سب کر سکتی، کیونکہ اس کی پیشانی پہ بھی خاصی چوٹ آئی ہوئی تھی اور اس کی حالت بھی نڈھال سی نظر آتی تھی۔ آنکھوں سے بدحواسی کے آثار مترشح تھے۔

لہٰذا میں نے اس کی بات نہ مانی اور اسے سہارا دے کر واش روم میں لے آیا۔ اس طرح کہ میری محتاط نظریں لاؤنج میں بیٹھے کرسی پہ ہولانڈ پہ بھی مرکوز رہی تھیں۔

عابدہ کے معاملے سے باسکل ہولانڈ میرا پہلا اور اہم ترین شکار تھا، وہ نجانے اب میرے ساتھ کون سی چال چلنے والا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔ تاہم مجھے اب تک کی اس کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ ممکن ہے میری اب تک کی سبقت۔ بلکہ کامیاب مہمات نے اسے مجھ سے کسی قسم کی

مداخلت پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے خوش فہمی تھی کہ ایک [illegible] جیت کیا کم تھی کہ مفت میں جان سے لے کر سکتی کہ [illegible] سے چالی کی اور ٹائیگر لیگ کے بیشتر ایجنٹ میرے اور میرے چالباز ساتھیوں کے ہاتھوں جہنم واصل ہوئے، پھر دشمنوں کی تازہ ترین وار گن برگ کی صورت میں سامنے تھا اور اس کی قید ظلم سے نجات ۔ لہٰذا ممکن تھا ٹائیگر لیگ کا چیف اب مجھ سے چال چل گیا۔ اس حد تک تو مجھے ہوا تھا کہ اس طرح کا ماحول پیدا ہونے پر آمادۂ گفتگو ہو گیا ہے۔

واش روم میں آتے ہی لڑکی بری طرح سسک کر رو پڑی۔۔۔ میں خود ستاری کی موت پر دکھی ہو رہا تھا۔ میں نے حوصلہ دینے کے انداز میں لڑکی کا شانہ ہولے سے تھپتھپایا۔

”تم میں نے اکلوتا ستاری کے منہ سے اس کے بارے میں کافی کچھ سنا ہے مسٹر شیزی!“ لڑکی نے بالآخر خود کو قابو کرتے ہوئے جھجکتے ہوئے مجھ سے آہستگی سے کہا۔ ”یہ بہت ہی سخت اور عیار شخص ہے۔ پلیز ۔ اس سے کسی طرح جان چھڑاؤ۔“

میں نے لڑکی سے اردو ہی میں کہا۔ ”تم فکر نہ کرو، مجھے بھی اس نائل اور مکار آدمی کے بارے میں اچھی خاصی معلومات ہیں۔ وہ اس وقت میرے زیرِ نگرانی ہے لیکن مجھے یقین ہے، اس کے اور ساتھی بھی آس پاس کہیں موجود ہیں۔ میں تمہاری مرہم پٹی کرنے کے بعد اس کے پاس جا کر بیٹھتا ہوں، وہ شاید مجھ سے مفاہمت پر مجبور ہو گیا ہے۔“

”وہ ایک نمبر کا دھوکے باز اور شاطر آدمی ہے۔“ لڑکی سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

”بے فکر رہو تم، میں اس کے جھانسے میں نہیں آؤں گا۔“ میں نے زہریلی مسکراہٹ سے کہا۔ ”تمہاری مرہم پٹی“

”نہیں، میں خود کر لوں گی، تم جا کر اس سے جان چھڑاؤ یا پھر خدا کے لیے مجھے یہاں سے لے کر نکلنے کی کوشش کرو، مجھے تو اب اس آدمی سے وحشت ہونے لگی ہے۔“

”ٹیک اٹ ایزی۔“ میں نے پھر تسلی آمیز ملائمت سے کہا۔ ”تم مرہم پٹی کے بعد خبردار کسی اور دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ جب تک یہ یہاں موجود ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ باہر اس کے ساتھی ضرور گھات میں ہوں گے۔ میں معاملہ سنبھالتا ہوں۔ تم اپنی مرہم پٹی کرنے کے بعد کمرے میں چلی جانا۔“ یہ کہتے ہوئے میں واش روم سے نکل آیا۔

بالکل ہولاولا اسی طرح اطمینان سے کرسی پر بیٹھا [illegible] پر مونچھیں پھیلائے ہوئے سگار کے کش لگا رہا تھا۔

”میں عابدہ کی رہائی سے کم پر تم سے کوئی بات نہیں کر سکتا مسٹر ہولاولا!“ میں نے اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آف کورس! مجھے منظور ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”ہم خود نہیں چاہتے کہ مزید کوئی خون خرابا ہو، پہلا ہی ہمارے بڑی نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔“

”اب کام کی بات ہو جائے تو بہتر رہے گا۔“ میں نے [illegible] سے کہا۔

وہ کھینچی ہنسی سے ہنسا اور بولا۔ ”سن رکھا ہے میں نے تمہارے بارے میں بہت دلیر تو ہو مگر سمجھداری بھی کم نہیں ہو۔ خیر! اہم کی بات یہ ہے کہ تم میرے ساتھ چلو، میں تمہیں عابدہ کے روبرو پیش کروں گا، تم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر لو، پھر اس کے بعد [illegible] چلاؤ، ساتھ رہو سب بھول کر، کوئی مداخلت نہیں۔“

وہ کہتا جا رہا تھا اور میرے حواس و دماغ کی حالت عجیب غریب ہوتی جا رہی تھی۔ شاید اس کی یہ باتیں سن کر میرے حواس و دماغ کی پھر وہی جذباتی کیفیات ہونے لگیں جو اس سے تعارف ہوتے ہی تصادم کی وجہ پہلے ہی پیدا ہوئی تھی، مگر میں نے خود کو سنبھالا، سوچا کہ جب یہ شاطر آدمی اگر کسی وجہ کے تحت مجھ سے اس انداز میں گفتگو کرنے میں آمادہ ہوا ہے تو مجھے بھی اور اسی پالیسی کے مطابق قدم اٹھانا چاہیے۔ بولا۔

”ہولاولا! اگر تم واقعی مفاہمت کی راہ پر آنا چاہتے ہو تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن ابھی ہمارے درمیان حالات غیر یقینی ہیں۔ اس قدر کہ ہمیں ایک دوسرے سے اس وقت بھی ایک انجانے خوف کے ساتھ جان کا خطرہ ہے۔ تم جس آسانی سے عابدہ کو میرے روبرو پیش کرنے کا کہہ رہے ہو، میں اسے تمہاری کوئی چال پر محمول کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ جبکہ میرا مسئلہ عابدہ کے روبرو پیش ہونا نہیں ہے بلکہ اس کی یہاں سے باضابطہ رہائی بھی مجھے منظور ہے۔“

”کریکٹ ....“ ہولاولا نے ایک کش لگاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کرتا۔ کیونکہ اس وقت جتنا تمہیں مجھ سے خطرہ ہے، اسی طرح میں بھی تم سے خائف ہوں۔ بات یہ ہے کہ ابھی عابدہ کی رہائی سے متعلق میں نے تم سے کوئی بات نہیں کی ہے صرف تمہیں یہ کہا تھا کہ دوسرے کے روبرو پیش کرنے کا کہہ رہا ہوں۔ اصل معاملے کی حد تک تم نہیں اترے ہو، یہ میں نے بتایا۔ ۔ یہ تمہیں

لب تک۔''

''چلو اب مطلب کی بات کریں، کیا چاہتے ہو تم...؟'' بالآخر میں ماحول اور گفتگو کی سنجیدگی کو دور کرنے کی غرض سے اور اپنے اندر کی جذباتیت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس سے دوٹوک گفتگو پر اتر آیا۔

اس نے میری جانب دیکھتے ہوئے سگار کا ایک اور گہرا کش لیا اور بولا۔ ''اس وقت شدت سے وہسکی کی طلب ہو رہی ہے۔ ٹریسی تو بے چاری زخمی ہو گئی، کیا تم...'' اس نے میری بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی ذاتی طلب سے متعلق کہا تو میں بہت کچھ کرنا سوچ بن گیا۔

اسٹاری اور سیل وارادا وغیرہ یہیں مشغل کرتے تھے، اسی لیے مجھے واش کیبنٹ کا پتا تھا۔ میں اٹھا اور وہاں سے جا کر ایک نظر میں نے واش روم میں ٹریسی پر ڈالی۔ وہ اپنی مرہم پٹی میں مصروف تھی۔ تاہم جب میں اپنی کرسی سے اٹھا تو وہ میری ہدایت کے مطابق واش روم سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ رکی، جھک کر ایک نگاہ وسیع لاؤنج میں ڈالی اور الجھی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے ہولارڈ کا اشارہ عقب میں کرتے ہوئے بوتل پینے کے انداز میں وہسکی کی جانب کیا۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گئی اور ایک جانب واش کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں وہسکی کی بوتل اور اپنے لیے ایک نان الکوحل بیئر کا کین لیے ہولارڈ کی طرف آ گیا۔

''اوہ... بیئر؟'' اس نے میری جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں! میں وہسکی نہیں پیتا۔'' میں نے کھلتی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔

''واؤ... بلیک لیبل... یہ میرا پسندیدہ برانڈ ہے، لیکن تم شاید واقعی وہسکی نہیں پیتے۔ ورنہ آئس کیوب اور سوڈا ضرور نکال لاتے۔ خیر! میں خالص بھی پی لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے وہسکی کی طرف ہاتھ بڑھا لیا۔

لیکن ذرا ہی دیر بعد میں چونکا۔ ٹریسی برف کی ڈلیوں کا ایک باؤل، سوڈا کی بوتل اور دو بلوریں پیگ اٹھائے ہوئے لاؤنج میں آ گئی۔

اسے دیکھ کر ہولارڈ کے چہرے پر حقیقی خوشی کی حیرت کے تاثرات ابھرے تھے اور باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی، مگر اصل حیرت کا جھٹکا تو مجھے ٹریسی کو ایک دم یوں دیکھ کر لگا تھا۔

اب اس کے چہرے پر ایک ذرا بھی دکھ اور خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کا لباس اگرچہ تھوڑا سا مسکا ہوا تھا، جسے اس نے درست کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی تھی۔ ہاں! البتہ ہلکا پھلکا میک اپ کچھ یوں کیا ہوا تھا جیسے عجلت میں کچھ کیا گیا ہو۔

ٹریسی کا چہرہ بھی سپاٹ تھا اور اس میں ٹھہراؤ کے آثار نمایاں تھے۔

اس نے لوازمات سمیت اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چیزیں میز پر رکھیں اور پھر ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

میری یک ٹک کھٹکتی سی نظریں بدستور اس پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس نے اپنی کرسی ہولارڈ کے قدرے نزدیک ہی کھسکائی تھی۔ وہ اپنے اور ہولارڈ کے لیے جام تیار کر رہی تھی۔ ہولارڈ بھی اس کے چہرے کو بغور کھوجنے والے انداز سے دیکھ رہا تھا، جیسے کچھ بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر اس کے ہونٹوں پر ہنوز معنی خیز مسکراہٹ جیسے چپکی ہوئی تھی۔

''او... تھینک یو ٹریسی...!'' ہولارڈ نے اس خوش دلی سے اس کا شکریہ ادا کیا تھا جب ٹریسی نے اس کی جانب جام بڑھایا اور پھر دونوں نے ''چیئرز'' بھی کر ڈالا۔

میں ٹریسی کے اس اچانک اسرار بھرے انداز سے کچھ الجھن کا شکار ہو گیا۔

جانے کیوں وہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ کہاں تو وہ اس سے اس قدر خوف زدہ ہو رہی تھی اور اب...

میرا تجربہ کہتا تھا کہ بسا اوقات زیادہ خوف یا زیادہ آلام انسان کو نڈر بنا دیتے ہیں۔ کوئی کمزور انسان اپنی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے تھک جائے تو وہ کچھ اس طرح کے فیصلے اچانک صادر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''تم عابدہ سے متعلق بات کر رہے تھے؟'' میں نے ٹریسی سے اپنا دھیان ہٹا کر ہولارڈ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ٹھہرو مسٹر شیرازی!'' اچانک ٹریسی نے درمیان میں مجھے ٹوکا۔ میں آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف تکنے لگا۔ اس کا مجھے مخاطب کرنے کا انداز عجیب سا تھا۔ ہولارڈ بھی اس کی اور میری جانب کچھ اس انداز میں [illegible] کو بھانپنے کی کوشش کر رہا ہو، بات [illegible]

ہو۔" وہ بولی۔

"شیور۔" ہولارڈ کے منہ سے جیسے بے اختیار نکلا۔

نرگس اب تک جام کا دوسرا گھونٹ بھر چکی تھی۔ وہ چند ثانیوں تک میز کی سطح پر اپنی نگاہیں جمائے کچھ سوچتی سی بیٹھی رہی پھر بولی۔

"مسٹر ہولارڈ۔۔۔ میں اب تھک چکی ہوں، مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ اسٹاری سے شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس کے ساتھ شادی شدہ زندگی کے ایام گزارتے ہوئے مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ اس کے اندر مصلحت اور منافقانہ سوچ کی کمی ہے۔ اس کا رویہ بھی غیر لچکدار تھا، لیکن اگر وہ تھوڑی لچک سے کام لیتا تو شاید اس کی زندگی آسان گزرتی، خیر، بے شک وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، چاہے ضرورتاً یا مجبوراً سہی، کیونکہ وہ بیوی اور بچی کے اچانک مرنے کے بعد وہ خود تنہا اور بے حد کمی محسوس کرنے لگا تھا۔ میں جس بار میں ویٹریس کے طور پر کام کرتی تھی وہاں وہ اکثر آیا کرتا تھا۔ میں زیادہ لمبی بات نہیں کرنا چاہتی مسٹر ہولارڈ۔۔۔! کہنے کا مقصد یہ کہ میں تمہاری مشکور رہوں گی اور تم سے درخواست کروں گی، میرا ان معاملات سے نہ پہلے کوئی تعلق تھا اور نہ اب ہے۔ کیا تم مجھے۔۔۔ اس سارے گھن چکر سے نہیں نکال سکتے؟"

"ہاہا۔۔۔ ہاہا۔۔۔! یہ اچانک تم کون سا راگ الاپنے لگیں مس نرگس!" ہولارڈ نے ایک برجستہ سا قہقہہ لگا کر اس سے کہا۔ لہجہ قدرے طنزیہ تھا۔ میری سوچتی نظریں نرگس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں ابھی تک اس کی یوں بدلتی کایا کلپ پر کوئی توجیہ تک سوچنے سے قاصر رہا تھا، ماسوائے اس کے کہ اس کا یہ اچانک بدلا رویہ ایک فطری عمل تھا۔

"میں نے تمہاری باتیں سن رہی تھیں، جو تم مسٹر شہزی کے ساتھ کر رہے تھے۔" وہ اس کے قہقہے کا کوئی اثر لیے بغیر متانت سے بولی۔

"بے بی! جام پیش کرنے کا شکریہ۔۔۔ تم اب ایسا کرو اندر کمرے میں چلی جاؤ اور جیسے زندگی گزارنا چاہتی ہو گزارتی رہو۔ میں تمہاری بات سمجھ چکا ہوں۔" ہولارڈ نے اس بار کچھ۔۔ [illegible] سنجیدگی سے کہا۔

"ڈال۔۔۔ لیکن، میں۔۔۔" نرگس نے کہنا چاہا مگر ہولارڈ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پلیز۔۔۔ بے بی! تم جاؤ، مجھے مسٹر شہزی سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔۔۔ اور ہاں! اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لینا۔۔۔ ذرا جلدی۔"

نرگس پھر خاموش اور پریشان سی نظر آنے لگی۔ اس نے پہلی بار میری طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں نے بھی اب کے اس کی جانب سے اپنی نظریں پھیر لیں۔ وہ مچل گئی۔

"پگلی ہے ڈارلنگ۔۔۔ لیکن یہ ایک نمبر کی چالاک اور مطلب پرست ہوتی ہیں، فائدہ اٹھانے تک اور جب مصیبت پڑتی ہے تو سب کو بھول جاتی ہیں۔" ہولارڈ نے نرگس پر ہولے سے تبصرہ کیا۔

"ہاں! تو ہمارے درمیان ایک اہم ایشو پر بات ہو رہی تھی۔ مسٹر شہزی!"

ہولارڈ نے جام کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے عابدہ کو دیکھنا ہے تو میرے ساتھ ابھی چلو۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے تم بھی تڑپ رہے ہو گے جس طرح وہ تمہارے لیے تڑپ رہی ہے۔ تم دونوں کے دلوں کی بے قراری کا میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں۔ مگر یاد رکھنا! کہ عابدہ سے تمہیں ملوانے کا میرا مقصد محض اتنا ہی ہوگا کہ تاکہ تمہارے دل و دماغ کو تسلی ہو جائے، اس کے بعد ہی میں تم سے ایک اہم اپیل کروں گا۔ تب ہی تم کوئی ایک فیصلہ کر سکتے ہو کہ دوستی یا پھر جنگ۔ میرا وعدہ ہے کہ اگر بدقسمتی سے ہمارے بیچ پھر بھی کوئی معاہدہ کامیابی سے طے نہیں پایا تو تم اسی طرح ہی بخیریت رخصت کر دیے جاؤ گے، لیکن۔۔۔ عابدہ کے بغیر۔۔۔ ہاں! اگر ہماری بات چیت کا نتیجہ کامیاب نکلا تو عابدہ تمہارے ساتھ ہوگی نہ صرف یہاں بلکہ پاکستان تک۔۔۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے، اب کوئی بات نہیں ہوگی، ہاں یا نہیں میں جواب دو، کیا کہتے ہو؟"

بالکل ہولارڈ نے یہ سب کہنے کے بعد جام کا آخری گھونٹ بھر کے خالی پیگ میز پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔

عشق کرنے والے سر پھرے ہوتے ہیں، دریا ہو یا پھر محبوب کی تڑپ میں خود کو مٹا ڈالتے ہیں۔ میرے اندر بھی ایک تڑپ ابھری تھی، پوری شدت کے ساتھ عابدہ کے دیدار کے لیے کہ ابھی اس خبیث کے ساتھ چلا چلوں۔۔۔ کچھ نہ سوچوں، کسی اور کو دل میں جگہ نہ دوں، کسی انجام کی پرواہ نہ کروں۔ اتنے عرصے بعد عابدہ کا دیدار ہونے والا تھا۔ ایک زور آور سی خواہش تھی کہ اڑ کر پہنچوں، ایک نظر، بس ایک نظر عابدہ کے روبرو ہو جاؤں اور نظر بھر کے اسے دیکھ لوں۔۔۔ صرف ایک بار۔ لیکن کیا یہ جذباتیت سرپھری نہیں کہلائے گی؟ کیا اس سے میری اور عابدہ کی جان کا مسئلہ پیدا نہیں ہو سکتا؟ عشق کیا ہے ہم دونوں نے۔۔۔ محبت کی ہے

ایک دوسرے سے   عابدہ اور میں نے   اور پھر کتنی ہی دیر گزر گئے ہم ایک دوسرے سے لپٹ کر

دوسرا خیال ذہن میں آیا۔ زندگی اور موت صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ مجھے ہولارڈ کی بات مان لینی چاہیے۔ اس کے ساتھ چلے جانا چاہیے۔ شاید دشمنوں کی شکست اور عابدہ کی بحالی میں یہی مشیت ایزدی شامل ہو۔ اللہ نے مجھے آج یہاں تک کامیابی عطا کی ہے تو وہ آگے بھی میری دست گیری کرے گا اور ضرور کرے گا۔ اس انداز سے سوچنے اور ایک فیصلہ کرنے کے بعد میرا اندر ایک دم مطمئن ہو گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''میں تیار ہوں۔''

''گڈ! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' ہولارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اب برائے مہربانی میرا پستول مجھے واپس کر دو۔'' کہتے ہوئے اس نے میری جانب ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے اس کا سائلنسر لگا پستول اس کے حوالے کر دیا۔

''تھینکس۔'' اس نے وہ لیتے ہوئے مسکرا کر کہا اور ہم دونوں ڈیکس سے باہر آ گئے۔

سہ پہر ہو چلی تھی۔ وقت یاد تھا۔ باہر آنے کے بعد ہولارڈ کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے ساتھ اور عقب میں تھا۔ اس نے اپنا پستول کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا تھا۔ فضا سرد تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے اوورکوٹ کے کالر کھڑے کر دیے تھے اور ہیٹ بھی لگا رکھا تھا۔

اس نے اپنا دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلی سے کوٹ کے کالر کو کھینچا اور منہ قریب کر کے کچھ کہا۔ وہاں شاید کوئی ننھی جدید کالر کا خفیہ ''بٹن'' نما ٹرانسمیٹر نصب تھا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک سیاہ کار تیزی سے ایک قریبی موڑ سے نمودار ہوئی اور ہمارے قریب آ کر ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کے ٹائر چرچرائے تھے۔ میری نبضیں تک دھڑکنے لگیں۔

کار کا رنگ سیاہ تھا اور اس کے اندر تین افراد براجمان تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک شخص تھا اور اس کے برابر والی نشست خالی تھی۔ جبکہ پچھلی نشستوں پر دو افراد براجمان تھے۔ انہی میں سے ایک اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر اتر آیا۔ اس کے انداز میں مستعدی اور تعظیم تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر ڈرائیور کے برابر والی نشست کا دروازہ کھول دیا تھا اور ہولارڈ آگے بڑھا اور مجھے اس نے پچھلی نشست کا اشارہ کیا تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ پچھلی نشست پر جا بیٹھا اور وہ آدمی بھی میرے ساتھ براجمان ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

بسا اوقات زندگی میں ایسے موڑ بھی آتے ہیں کہ انسان خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ زندگی کی بساط میں کبھی نہ کبھی یہ رنگ بھی لایا جاتا ہے۔ اللہ کے بھروسے پر کسی ایک عمل کے لیے انسان اندھی کھائی میں بھی چھلانگ لگا دیتا ہے، یعنی یہاں بھی میرے ساتھ بھی صورت حالات تھی۔

مجھے عابدہ کے پاس لے جایا جا رہا تھا اور میں اپنے دل کی گہرائیوں سے خدا سے یہی دعا کیے جا رہا تھا کہ یہ دیا اظہار وہ شر ہو جیسا میں کون بزرگ کے ٹھکانے پر جلیب آلنس خالد و کا کر چکا تھا۔

تاہم ایک طرف عابدہ سے ملنے اسے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے تصور سے ہی میرا رواں رواں بھی مسرت سے پھولے نہیں سماتا تھا اور دوسری طرف اندیشناک وسوسوں اور متوقع خطرات کی ایک خاموش سی طوفانی گھن گرج بھی میرے اندر مچی ہوئی تھی۔ گویا میں ایک ہلچل کی سی کیفیات سے دوچار تھا کہ آگے کیا ہونے والا تھا؟

کار ٹریفک سے بھری ہوئی سڑک پر رواں دواں تھی۔ میں ان دونوں آدمیوں کے درمیان بیٹھا تھا۔ سفر اندیشناک لمحوں کی دہشت انگیز دھمک رہا، جیسے بھاری سل کی طرح گزر رہا تھا۔ ہر آنے والے لمحات کی سنسنی تیزی میں اپنے دل و دماغ میں ہی نہیں بلکہ... آتی جاتی سانسوں کی بازگشت میں بھی محسوس کر رہا تھا۔

عنقریب   عابدہ... کی رونمائی۔ اس کا دیدار... کوئی معمولی لمحات نہ تھے۔

بس! انہی ایسے وقت میں میرے دل کے کسی بعید ترین نہاں گوشے میں سوال ابھرا کہ... جب عابدہ مجھے یوں ایک دم اپنے سامنے دیکھے گی تو اس کی کیا حالت ہوگی؟ اور خود میری بھی تو... تو... کیا اس کے لبوں سے برآمد ہونے والا پہلا لفظ شکریہ ہوگا یا کوئی شکوہ؟

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرضی صحبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

قسط نمبر: 59

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناونے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... [illegible]

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، کیش شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پہلے پہلے سب دشمن [illegible] ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ [illegible] کا زول چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن ان دشمنوں کو سیاسی [illegible] حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن جاتا ہے [illegible] جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ [illegible] کی فورس ٹائیگر لیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور لولوش کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک لودولتیا سیٹھ نوید ساتھے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ [illegible] نقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی [illegible] ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر لیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر لیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر لیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک [illegible] بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹمسی کے چندر ناتھ، ہشام اور [illegible] آتے ہیں۔ اور شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹمسی کے چیف سی جی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے۔ کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو [illegible] چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

Digitized by Google

https://www.urdutubes.com/

ہو نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ ہو جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کوریئلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی متجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی متجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جنگل کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے زخمی ہونے کی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر تولا انڈمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے جہاں کلی متجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بدل کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ [illegible] کے لیے کلی متجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے جہنم رسید کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ [illegible] کوسٹ گارڈز [illegible] اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا جاگیردار شاہ نواز [illegible] کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے [illegible] رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ [illegible] اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز [illegible] بھی ساتھ ہوتی ہے جو [illegible] کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لاتی [illegible] آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو نشانہ بنا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سوہنی کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لاتی [illegible] کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوہنی کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید ساتھے والا کی قید میں ہے۔ عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سالیپی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپا کو کا آدمی تھا۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپا کو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپا کو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپا کو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو صورینامہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے یہاں شہزی سے دوبدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز [illegible] کو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کار...... مختلف سڑکوں پر فراٹے بھرتی ہوئی لگ بھگ نصف گھنٹے بعد ایک ایسی جگہ پہنچی جہاں خال خال ہی چھوٹی بڑی رہائشی عمارتیں نظر آتی تھیں۔ زیادہ تر کاٹیج نما تھیں۔ مجھے یہ علاقہ فرینسو کے شمال مضافات کا محسوس ہوا تھا۔

دورانِ سفر خاموشی رہی تھی۔ ایک گمبھیر سی خاموشی...... جیسے نجانے اب کون سا نیا آسیب وقوع پذیر ہونے والا ہو۔ عابدہ کی محبت اور اس کی لمبی جدائی سے شل ہو کر گویا میں نے اندھی نار میں کود جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ خود کو جیسے تن بہ تقدیر کر ڈالا تھا۔

کار کی رفتار آہستہ ہو گئی۔ ڈرائیور نے اسٹیئرنگ کاٹا اور دائیں جانب کی ایک ذیلی سڑک پر کار اُتار دی۔ رفتار دھیمی ہی تھی۔ شاید مطلوبہ عمارت قریب تھی اور ایسا ہی ہوا۔

کار ایک رہائشی کاٹیج کے گیٹ پر رُک گئی اور میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ گو میرے تصور میں آبادی سے دور ایسا ہی علاقہ تھا مگر یہ عمارت......؟ جو ایک عام سی ہی تھی۔ ایک سرمائی یا گرمائی تعطیلات گزارنے والے چھوٹے کاٹیج جیسی۔ جو ایک فیملی کے لیے کافی ہوتا ہے۔

یہ ضرور ان کا کوئی عارضی ٹھکانا ہو سکتا تھا۔ اس میں زیادہ حیران کر دینے والی بات نہ تھی لیکن مجھے جس بات نے اُلجھن میں ڈالا تھا، وہ یہ تھی کہ عابدہ کو بھلا ایسی عام سی جگہ پر کیوں کر رکھا ہو گا؟ کہیں یہ خبیث یہودی میرے ساتھ کسی قسم کا دھوکا تو نہیں کر رہا تھا؟ یہی خدشہ مجھے بے چین و بے قرار کر رہا تھا۔

کار سے اُترتے وقت میں نے باسکل ہولارڈ کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش چاہی تو میرے اندر اچانک ایک کھٹک سی ہوئی تھی۔

ہولارڈ کا چہرہ اتھاہ سوچ میں مستغرق محسوس ہوا۔ یوں جیسے وہ کسی یکایک کسی نامعلوم سے مخمصے کا شکار ہو گیا ہو۔ کیوں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ خاصا خوش اخلاق اور مکارانہ فروتنی کا مظاہرہ کیے ہوئے تھا اور مجھ سے پُراُمید بھی تھا لیکن یہاں آ کر اچانک اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ گہری سوچوں کے دباؤ میں مبتلا نظر آنے لگا تھا۔

میں محسوس کر سکتا تھا کہ یہ تاثرات کسی بھی طور بناوٹی نہیں تھے، اس کی تہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور تھی۔

ہم اندر آ گئے اور کھلے سے لاؤنج میں بچھے مختصر سے فرنیچر پر براجمان ہو گئے۔

باسکل ہولارڈ کی عمر کا میں نے پچاس، پچپن کے درمیان اندازہ لگایا مگر وہ اپنی قابلِ رشک صحت اور مخصوص تربیت کے اعتبار سے کچھ زیادہ عمر رسیدہ نظر نہیں آتا تھا۔

بے شک اس کا جسم تحیم شحیم تھا مگر مضبوط اور ورزشی محسوس ہوتا تھا۔ شانے چوڑے تھے اور قامت دراز تھی، چہرہ البتہ کہیں کہیں سے جھریوں کی زد میں آتا دکھائی دیتا تھا۔ آنکھیں میچی میچی اور غلافی سی تھیں جو اس کی کثرتِ مے نوشی کی غمازی کرتی تھیں۔ گردن کے پاس بھی چربی کی تہ تھی۔

اس کے تینوں ساتھیوں میں سے ایک تو باہر ہی رہا تھا جبکہ دو اس کے ہمراہ تھے، باقی تمام وہ نشستوں پر صرف میں اور ہولارڈ آمنے سامنے براجمان تھے جبکہ وہ دونوں مستعد اور مودبانہ سے ہولارڈ کے عقب میں کھڑے رہے۔ ان کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

ہولارڈ جیب سے سگار نکال کر سُلگانے لگا تو عابدہ کے سلسلے میں میری بے چینی فزوں ہونے لگی۔ وہ بے اختیار میں اس سے مستفسر ہوا۔

’’مسٹر ہولارڈ! کیا عابدہ کو یہاں رکھا گیا ہے؟ کہاں ہے وہ......؟‘‘ کہتے ہوئے میں نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

’’ایزی مین...... ایزی!‘‘ وہ اپنے مخصوص [illegible]

[illegible] سُلگانے کے بعد ایک گہرا کش لگایا اور میرے [illegible] یوں بہ غور دیکھنے لگا جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

’’تمہارا یہ پُراسرار رویّہ میری سمجھ سے [illegible] ہولارڈ؟‘‘ میں نے ذرا [illegible] سے [illegible] میں دوبارہ اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’یاد رکھو...... اگر تم نے اپنے دل میں کسی قسم کے دغا اور فریب [illegible] کوشش [illegible]‘‘

’’اس کا مطلب ہے تم [illegible] ہماری وہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی جو عابدہ کے [illegible] میں [illegible] تم سے تھی۔‘‘ اچانک ہولارڈ نے میری بات کاٹ کر [illegible] لہجے میں کہا۔

’’میں سمجھا نہیں؟‘‘ میں اس کی بات پر چونکا۔

’’ہمیں یقین کی حد تک شبہ تھا کہ عابدہ تمہارے یا تمہارے کسی ساتھی کے قبضے میں ہے لیکن تمہاری بے چینی، تشویش اور یوں عابدہ سے ملنے کے لیے ہمارے ساتھ، ہمارے بھروسے، ہمارے رحم و کرم پر چلے آنا، ہمارے اس یقینی شبہے کی نفی کر رہا ہے۔‘‘

[illegible] باسکل ہولارڈ کی بات پر اس بری طرح چونکا [illegible] کیا کہ ایک دم جوشِ غیظ تلے اپنی نشست سے اُٹھ [illegible] وہ اسی سوچوں کے پندار میں اُلجھا ہوا سا سگار کا کش [illegible]

اس کے دونوں آدمی مجھے یوں اُٹھتا دیکھ کر تن گئے [illegible] دونوں کے ہاتھ بیک وقت اپنے کوٹ کی اندرونی جیبوں کی طرف رینگ گئے اور وہیں تک محدود رہے، یہ گویا ایک طرح کی خاموش تہدید تھی مجھے کہ میں کوئی ایسی ویسی حرکت [illegible] جو گڑبڑ کا سبب بنے۔

’’[illegible] شہزادے! اور میری بات ذرا غور سے سنو۔‘‘ [illegible] گمبھیر آواز میں کہا۔ وہ میرے یوں اُٹھنے سے [illegible] ہلا تھا۔

’’اپنا وعدہ نبھاؤ اور مجھے عابدہ کے رُوبرو پیش کرو۔‘‘ [illegible] کھڑے کھڑے کہا۔

[illegible] دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھنا بھی میں نے [illegible] جیسے وہ میرے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتے [illegible]

[illegible] ہے کہ عابدہ ہمارے قبضے میں تھی مگر وہ اب [illegible]

[illegible] مطلب ہے تمہارا؟‘‘ میں نے گومگو سے لہجے [illegible]

[illegible] آرام سے بیٹھ جاؤ، بتاتا ہوں۔‘‘ وہ [illegible] کیفیت میں دوبارہ اپنی نشست پر [illegible]

[illegible] جھاڑتے ہوئے بولا۔ [illegible] پہلے عابدہ ہماری کسٹڈی سے غائب کر [illegible] تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر ہی [illegible] تم بھی اپنی محبوبہ کی تلاش میں یہاں قدم [illegible] اب تمہارا گویا کچے دھاگے سے بندھے [illegible] اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ خود تم بھی اس [illegible] سے لاعلم ہو کہ عابدہ...... نامعلوم افراد کے ہتھے [illegible]

[illegible] دماغ جھنجھنا گیا۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیات [illegible] بھی جی چاہا کہ اس خبیث یہودی کی گردن [illegible] نجانے اب کون سی نئی چال چلنے کی کوشش کر رہا [illegible]

[illegible] میں نے بھی موقع محل کی نزاکت اور حالات کا ادراک کرتے ہوئے ضبط سے کام لیا اور سوال کیا۔

’’عابدہ کو تم لوگوں نے کہاں رکھا ہوا تھا؟‘‘

’’نیویارک میں...... جہاں ہمارا اصل ٹھکانا ہے۔‘‘ وہ جواب میں بولا۔ ’’اس کے بعد جب ہمیں معلوم ہوا کہ تم امریکا میں قدم رکھ چکے ہو تو ہم اسے دو ایک روز میں تل ابیب لے جانے والے تھے کہ اچانک وہ غائب کر دی گئی۔‘‘

’’جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، تمہارے آدمیوں نے عابدہ کو کورکوران کی جیل سے خفیہ طور پر نکلوا کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور اس میں لیڈی جیل وارڈن مسز بینسفورڈ...... نے تمہاری مدد کی تھی۔‘‘

’’ہاں! یہ درست ہے۔‘‘ وہ خباثت سے مسکرا کر بولا۔ مجھے پھر اس پر تاؤ آنے لگا۔ لیکن صورتِ حال کی گمبھیرتا ہی ایسی تھی کہ میں اپنے اندر کے آتش فشانی اُبال پر قابو پانے پر مجبور تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ’’میں جانتا تھا تمہارے علم میں یہ ساری باتیں آ چکی ہوں، جیسا کہ تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ آنسہ خالدہ جے بی سی والوں کے چنگل میں تھی اور انہوں نے اس کے ساتھ گون برگ کے ذریعے کیا حشر کیا تھا، یہ بھی ممکن ہے کہ ڈینی کے نام سے تم یا تمہارے کسی ساتھی نے جے بی سی والوں کو چکما دیا ہو، لیکن خیر، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے، ان کا معاملہ وہ جانیں۔‘‘

وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر تھما اور میں اس عیار شخص کی مکارانہ پر اندر ہی اندر کھولنے لگا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا، وہ اس وقت بھی ایک امریکی افسر کا بہروپ بدلے ہوئے تھا اور جے بی سی ہی نہیں بلکہ پورے اسرائیل کے خفیہ اور وسیع تر کالے مفادات اور مقاصد کے لیے عمل پیرا تھا۔

’’ہمارا مقصد عابدہ سے صرف اسی قدر تھا کہ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے بارے میں ہمیں بتائے، کہیں وہ امریکا میں نائن الیون جیسے اور کسی ایسے سانحے کی منصوبہ بندی میں مصروفِ کار نہ ہوں۔ ایک فرض شناس امریکی افسر کی حیثیت سے اور قانوناً عام عوام کے مفاد میں، ہمیں ایسے اقدام پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔‘‘

مجھے اس کے لب و لہجے اور باتوں سے منافقت کی بُو آنے لگی۔ میرا اندر نفرت سے بھر گیا اور یہی سبب تھا کہ میں نے بھی زہریلے انداز میں کہا۔

’’ہُنہ، فرض شناس افسر...... اور عوام کا مفاد...... یہ

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

قصے کہانیاں تم امریکی اداروں کو بے وقوف بنانے کے لیے محفوظ رکھو ہولارڈ! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میری معصوم عابدہ کو سی آئی اے یا کسی اور دوسرے دار امریکی ادارے کے افسران نے نہیں بلکہ صرف جے بی سی والوں نے اسرائیل اور اپنی قوم کے مفادات میں استعمال کرنا چاہا تھا۔"

میری بات پر ہولارڈ کے جسم کو ایک خفیف سا جھٹکا لگا تھا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے وجود کے اس ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے گیند اپنے کورٹ سے نکالنے کی کوشش چاہی، بولا۔

"یہ سارا گند اس لبنانی رپورٹر آنسہ خالدہ کا پھیلایا ہوا ہے۔ جبکہ ہمارا ارادہ محض ایک ذرا سی تفتیش کے بعد عابدہ کے ساتھ قانونی تقاضے پورے کرنا تھا۔"

"قانونی تقاضے......" میں نے استہزائیہ کہا۔ "کیا اس کے لیے ایک جیل وارڈن کو بھاری رشوت کی پیشکش کی جاتی ہے؟ حکم نہ ماننے والوں کے بیوی بچوں کو دھمکایا جاتا ہے؟ کورکوران جیل کے نائب وارڈن اسٹاری کا کیا حشر کیا تھا تم لوگوں نے؟ کیا یہ سب قانون اور عام عوامی مفاد کے زمرے میں آتا ہے مسٹر باسکل ہولارڈ......؟"

ہولارڈ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا لیکن فوراً ہی اس نے سنبھالا لیا اور لاجواب ہونے کے بعد موضوع بدلتے ہوئے مکاری سے مسکرا کے بولا۔

"اگر تم اس طرح کی فضول بحث میں پڑ گئے تو معاملات مزید اُلجھ جائیں گے شہزی! اس وقت عابدہ کے بارے میں ہمیں سوچنا ہے کہ وہ کہاں ہے؟ اور کن نامعلوم لوگوں کی گرفت میں جا چکی ہے۔"

مجھے اسی کی توقع تھی کہ ہولارڈ سچائی سے گریزاں رہے گا۔ تاہم اس میں کوئی شک نہ تھا کہ گون برگ کے میرے ساتھ ٹاکرے اور آنسہ خالدہ کی وہاں سے بازیابی اس کے علم میں لائی جا چکی تھی۔ رہی بات یہ کہ وہ اس میں مجھے ملوث سمجھ رہا تھا (جو ظاہر ہے ایک حقیقت بھی تھی) لیکن یہ بات یقیناً اس نے اپنے ذاتی قیاس کی بنیاد پر ہی گھڑنے کی کوشش چاہی تھی کہ اس میں میرا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا، حالانکہ گون برگ سمیت اس کے کسی بچے کھچے ساتھی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ وہ میں اور میرے ہی ساتھی تھے۔

کیونکہ گون برگ اور میرے درمیان جو معاملہ طے پایا جانا تھا وہ میں اس سے اپنی اصل شناخت کے بجائے ایک گینگسٹر پیروٹ وہسکی کے کارندے ڈینی کی حیثیت سے کر رہا تھا اور یوں جس نے بھی ہولارڈ کو بہ سرعت گون برگ کے جہنم واصل ہونے کی اطلاع پہنچائی تھی، اس نے بھی میرے بجائے ڈینی کا ہی نام لیا ہوگا۔ ہولارڈ نے محض اپنے قیاسات کی بنیاد پر سمجھ لیا تھا کہ وہ میرے اور میرے ساتھیوں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

البتہ میرے فرضی کردار ڈینی اور پیروٹ وہسکی کا ذکر اس کے علم میں لایا جا سکتا تھا۔ میں نے کہا۔

"اسپیکٹرم کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہشت......! وہ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ ہاتھ جھٹک کر پورے یقین سے بولا۔

"اس لیے کہ اسپیکٹرم [illegible] زبردست حلیف اور کیوں نہ ہو، اس کا سربراہ لولووش [illegible] تمہارا [illegible] ہے۔"

"ہمم...... خاصی جان کاری رکھتے ہو تم۔" [illegible] لہجہ معنی خیز تھا۔

"تم بھی بہت بھروسا کرتے ہو اس پر، شاید [illegible] کہ وہ بھی تمہاری طرح میرا دشمن نمبر ون ہے۔ لیکن مسٹر ہولارڈ! مفادات اور طاقت کے کھیل میں اس طرح [illegible] اخلاقیات کو رد کرنے میں ایسے لوگ زیادہ دیر [illegible] لگاتے۔"

[illegible] ہمارے منہ سے نوالہ چھینا ہے؟" وہ بھویں سکیڑ [illegible] طرف دیکھتے ہوئے بولا تو عابدہ کو "نوالہ" کہنے پر میرا اندر [illegible] بھنا گیا۔ تب میں ضبط سے کام نہ لے سکا اور برہمی [illegible] بولا۔

"ہولارڈ! عابدہ ایک انسان ہے، وہ کسی کا شکار [illegible] اسے نوالہ کہنے والے جلد ہی خود تر نوالہ ہو جائیں گے۔"

میری تلخ اور ترش گوئی پر ہولارڈ کے چہرے پر لمحہ بھر تندی کی لہر ابھری لیکن دوسرے ہی لمحے اس [illegible] پرانا تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے ہاتھ کے اشارے [illegible] کہا۔

"ایزی مین......! ایزی...... جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تم سے صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہارا خیال غلط ہے کہ لولووش ایسی حرکت کر سکتا ہے۔"

"وہ ایسا ہی آدمی ہے جو یہ حرکت کر سکتا ہے ہولارڈ!" میں نے اس کے لب و لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر کہا۔ "کیونکہ اس کے اور تمہارے خفیہ گٹھ جوڑ اوروں کی نظروں سے پوشیدہ سہی مگر مجھ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔"

"محض ایک سماجی بندھن اور رشتے داری کو تم [illegible] کا نام کیسے دے سکتے ہو شہزی؟" اس کی مکاری قابل دید تھی۔ میں نے بھی بدستور استہزائیہ لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"لونہہ! یہ تم امریکی عوام اور دنیا کو بے وقوف بنانا مسٹر ہولارڈ! میں تمہارے جھانسے میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی میں اس بات پر بھروسا کرنے پر تیار ہوں کہ بہ قول تمہارے عابدہ کو کسی نے تمہاری گرفت سے چھینا ہے۔"

آخری جملہ میں نے اس شاطر اور گھاگ آدمی پر [illegible] دباؤ ڈالنے کے لیے ادا کیا تھا۔

[illegible] چہ میں بھی اس کی بات کی صداقت پر یقین نہ کرنے کا جواز نہیں رکھتا تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اس ڈرامائی انداز میں میرا امتحان نہ لیتا، اس نے مجھے [illegible] اور خود بھی اسی کسوٹی پر اُترتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا [illegible] عابدہ کے سلسلے میں کوئی اور پارٹی یا نامعلوم لوگ اسے [illegible] گئے تھے۔

[illegible] خالد اسے پہلا شبہ میرے ساتھیوں اور مجھ پر [illegible] جو اب ظاہر ہے رفع ہو چکا تھا۔

"لیکن میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔" وہ بولا۔

"اچھا! [illegible] تو کیا [illegible] معصوم [illegible] اور [illegible] اپنے جال میں کیوں پھنسایا تھا؟"

[illegible] کچھ بدلی بدلی تھی، میری بات پر اس کے بھاری [illegible] پر ایک بدلی سی اُبھری تھی کہ...... اچانک بپ کی [illegible] اس نے حسب سابق اپنے لانگ کوٹ کے [illegible] پکڑا اور منہ اس کے قریب کر لیا۔

اس کے کالر میں غالباً بٹن کی صورت میں کوئی [illegible] لگا تھا۔ ٹرانسمیٹر میں کوئی اہم اطلاع دی جا رہی [illegible] آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

[illegible] کر ایک کونے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ [illegible] سینے میں ہلچل سی پیدا ہوئی اور سنسنی کا [illegible] ہونے لگا، جیسے ابھی کوئی دھماکا ہونے والا تھا۔

"پتا چل گیا...... عابدہ کو کن لوگوں نے ہم سے چھڑایا [illegible] لیکن مجھے اس کا یقین کرنے میں شدید تامل ہے۔"

وہ عجیب سے لہجے میں بولا اور دوبارہ اپنی نشست پر [illegible] ہو گیا۔ میں اُلجھی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ تکتا [illegible] شدید ذہنی خلفشار اور پریشانی میں مبتلا دکھائی دینے [illegible]

"کیا تم پیروٹ وہسکی یا ڈینی نام کے آدمیوں سے واقف ہو؟" ہولارڈ نے اچانک مجھ سے سوال کیا اور میں یک دم محتاط ہو گیا۔ میرا ذہن پھر قلابازیاں کھانے لگا۔ کیا ہولارڈ کو گون برگ سے متعلق تفصیلات ابھی پتا چلی تھیں؟ اور یہ بھی کہ اس میں میرے فرضی کردار ڈینی اور پیروٹ وہسکی کا دخل ہے۔ اگر ایسا تھا تو ایسا ہی سہی۔ میرا مقصد تو ہولارڈ کو اول و آخر ڈاج میں رکھنا تھا۔

بہرکیف...... ایک ذرا سوچنے کے سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، یہ دونوں نام میرے لیے نئے ہیں، کون ہیں یہ لوگ؟"

"میں خود نہیں جانتا اُن کے بارے میں......" وہ اُلجھن آمیز پریشانی سے بولا۔ میں دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اس کی پریشانی سے حظ اٹھانے لگا۔

"لیکن تم تو بڑے دعوے سے کہہ رہے تھے کہ اس میں میرا ہاتھ ہے؟" میں نے دانستہ ایک مصلحت کے تحت اس پر طنز کیا تو وہ اپنی میچی میچی مکار آنکھوں سے میری جانب گھور کر بولا۔

"مجھے اب بھی تم پر شبہ ہے مسٹر شہزی! [illegible] بھولو کہ یہاں جو کچھ بھی جے بی سی یا ٹائیگر فیک کے خلاف محاذ آرائی ہوگی، وہ میں بلا کم و کاست تمہارے کھاتے میں ہی ڈالوں گا۔"

میں اس کی بات پر اندر سے ذرا گڑبڑا گیا [illegible] فکر مند بھی ہوا کہ بات پوری نہ کھلی ہو۔ کیونکہ یہ حقیقت ہی تھی کہ میں نے ہی تو ڈینی کے روپ میں گون برگ سے آنسہ خالدہ اور عابدہ کے متعلق ڈیل کرنا چاہی تھی۔

تاہم میں نے اس کی بات ہنسی میں اُڑائی اور کہا۔ "تمہیں واقعی شہزی فوبیا ہو گیا ہے مسٹر ہولارڈ! ویسے ہوا کیا ہے؟ کیا کیا ہے ان لوگوں نے......؟" بالآخر میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"کوئی مافیائی گینگ ہے۔ پیروٹ وہسکی اس کا سربراہ ہے۔ اپنے کسی ڈینی نام کے آدمی کو اس نے میرے ایک اہم آدمی گون برگ کے ٹھکانے پر بھیجا تھا۔ وہاں ان کے درمیان نجانے کس بات پر کوئی خفیہ ڈیل ہونا تھی کہ ایک دم سب گڑبڑ ہو گیا۔ میرا اہم ترین آدمی گون برگ، ڈینی اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

"اور تمہیں اس کا شبہ مجھ پر ہوا تھا؟"

"لامحالہ......!" اس نے کاندھے اُچکائے۔ میرے قیاس کی تصدیق ہو گئی اور میں اندر سے خاصا مطمئن ہو گیا۔

"اوہ...... تم لوگوں کے لیے یہ معمولی سی بات ہے۔"

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

ں نے دانستہ بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''جس ادارے سے ہمارا اور ٹائیگر لیگ کا تعلق ہے، ان کے ساتھ انڈر ورلڈ مافیا سے چپقلش عام سی بات ہے۔''

''ہمارا ونگ ٹائیگر لیگ، سی آئی اے سے تعلق رکھتا ہے۔'' باسکل ہولارڈ وضاحتی لہجے میں بولا۔ ''جبکہ انڈر ورلڈ فیا وغیرہ کو سنبھالنا ایف بی آئی اور سینٹرل پولیس کا کام ہے۔''

میں دل میں ہنسا۔ جی چاہا کہ کہہ دوں کہ ان سے بڑا فیا اور انڈر ورلڈ اور کون ہو سکتا ہے۔ تاہم بولا۔ ''تمہارے ساتھی...... کیا نام بتایا تم نے......؟'' میں نے دانستہ اپنے سابقہ ڈرامے میں دم بھرنے کے لیے تجاہلِ عارفانہ سے نام لیتے ہوئے جملہ اُدھورا چھوڑا۔

''گون برگ......''

''ہاں! گون برگ کی ان کے ساتھ کس قسم کی خفیہ یل ہو رہی تھی؟''

''یہ تو نہیں معلوم ہو سکا ہے اب تک۔'' اس نے کہا ور میں نے اندر ہی اندر بے اختیار طمانیت بھری سانس یا۔

''لیکن وہ...... وہاں موجود ہماری ایک اہم مجرم یدی عورت کو چھڑا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے ہیں ور ہمارے آدمی بھی کافی تعداد میں مارے گئے ہیں۔''

''قیدی عورت؟'' میں نے دانستہ اُلجھن آمیز تشویش کا اظہار کیا۔ ''کک...... کہیں عابدہ تو نہیں تھی وہ......؟''

باسکل ہولارڈ نفی میں سر ہلاتا ہوا ایک بار پھر اپنی شست سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اس وقت سخت ذہنی دباؤ اور تشویش و پریشانی کا شکار نظر آ رہا تھا۔

حالات کچھ ایسی نہج پر تھے کہ مجھے اس کی بالکل بھی مید نہ تھی، یعنی...... ٹائیگر لیگ جیسے دبنگ سربراہ باسکل ہولارڈ اور میرے اور عابدہ کے عظیم ترین دشمن نمبر ایک سے یری یوں بظاہر دوستانہ ماحول میں ''بیٹھک'' بھی ہو سکتی ہے، ورنہ تو میں اس کے ساتھ ایک پُرخطر اور دھواں دھار جنگ کی توقع رکھے بیٹھا تھا۔

تاہم اب بھی کچھ پتا نہ تھا۔ کس وقت اور کب مارے بیچ بات بگڑ جائے اور ہم ایک دوسرے پر ہلّا بول یں۔

وہ اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے ٹہلتا رہا۔ میں نے بے چینی دکھاتے ہوئے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو وہ ایک دم رک کر بڑے غور سے میرا چہرہ تکنے لگا۔ جیسے کچھ ''اخذ'' کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر ایک دم بولا۔

''نہیں، وہ عابدہ نہیں تھی...... کوئی اور عورت تھی۔''

میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ ملعون اس دلیر خاتون آنسہ خالدہ کا نام لینے سے کترا رہا تھا۔ میں نے بھی زور نہیں دیا، بھلا دیتا بھی کیوں، مجھے تو پتا ہی تھی ساری حقیقت......

''تم عابدہ سے متعلق بات کر رہے تھے۔'' میں نے اسے پھر کُریدا۔

''ہاں!......'' وہ بولا۔ پھر ایک دم خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنے پتلے پتلے ہونٹ بھینچ لیے۔

میری جانب اس نے صرف ایک لمحے کے لیے دیکھا ...اور پھر اپنے قریب کھڑے دو ساتھیوں کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے معذرتی انداز میں کہا۔

''ایک منٹ! میں ذرا اپنے ساتھیوں کو حملہ آوروں کے متعلق کچھ ہدایت دے دوں......'' کہتے ہوئے وہ پھر اپنے کوٹ کا کالر چٹکی میں دبائے ہوئے کونے کی طرف بڑھ گیا اور میری نظریں بدستور اس کے تعاقب میں رہیں، پھر یہی وہ وقت تھا جب یکایک مجھے ایک [illegible]

اب پتا نہیں یہ میری چھٹی حس کی کارستانی تھی یا پھر غیر معمولی محتاط طبیعت کا شاخسانہ اور تجربیت کا حاصل کہ میں نے باسکل ہولارڈ کے ہونٹوں میں خفیف سی ''اشارتی'' جنبش بھانپ لی تھی۔

اسی سبب جب ہولارڈ مجھے ''ایکسکیوز'' کر کے اپنے کوٹ کا کالر چٹکی میں دبائے کونے کی جانب بڑھا تو میری غیر ارادی مگر عقابی نظریں انہی دو افراد پر تھیں، جن کے دونوں ہاتھ ہنوز کوٹ کی اندرونی جیبوں میں چھپے ہوئے تھے۔

وہ تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے اور لامحالہ اس سے زیادہ سرعت کا مظاہرہ مجھے کرنا پڑا تھا اور بروقت بھی......

ان دونوں مذکورہ افراد کے ہاتھوں میں پستولوں کی چمک اُبھری اور وہ مجھے اس کے نشانے پر رکھتے، میں اپنی نشست سے اُچھل کر دائیں جانب لڑھکا اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ میں نے اپنی بیلٹ میں اُڑسا ہوا کوبرا کولٹ نکال لیا۔ اگلے ہی لمحے میرا پسندیدہ ہتھیار ہتھیلی پر تھرکنے لگا۔

ہولارڈ کے دونوں ساتھی ایجنٹوں نے اپنے پستول کی

نالوں کا رخ میری جانب تو موڑ لیا مگر فائر کا ایک ذرا لمحاتی موقع مجھے مل گیا۔

ٹریگر پر میری اُنگلی متحرک ہوئی اور کوبرا کولٹ گرجا۔ شعلہ لپکا اور ایک ایجنٹ سینے پر گولی لیے چیختا ہوا گرا، دوسرے نے فائر کیا، تب تک میں اس پر بھی دوسری گولی داغ چکا تھا اور بیک وقت ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کی گولی سے بچنے کے لیے اپنی جگہ بھی بدلی۔

میں بائیں جانب ایک دروازے کی چوکھٹ کے عقب میں لڑھکتا چلا گیا تو جو پہلے ہی میری نگاہ میں تھا اور س کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کچن ہی ہو سکتا تھا، جبکہ دوسرا ایجنٹ ایک فینسی اسٹائل کے ستون کی آڑ میں چلا گیا۔

ہوا ہولارڈ، اس کا خیال تھا کہ میرے لیے صرف اس کی ایک جنبش اَبرو ہی کافی ہوگی اور میں اس کے دونوں زرخرید ساتھی ایجنٹوں کے ہاتھوں چشم زدن میں ڈھیر ہو جاؤں گا، گولیاں چلنے کی آوازوں سے اس نے بغیر میری طرف دیکھے اندازہ بھی لگا لیا ہوگا کہ میں ان کی زد میں آ چکا ہوں گا لیکن جیسے ہی اس نے اپنے ایک ساتھی کو چیخ مار کے گرتے اور دوسرے کو نکاسی والے دروازے کی چوکھٹ کی [illegible] سائلنسر لگا [illegible] کی آڑ [illegible] پستول نکال کر مال پر [illegible] ش چلا گیا۔

اس کا خیال تھا کہ یہ سب پلک جھپکتے میں ہو جائے گا، اُدھر وہ بدبخت میرے نشانے پر تھا، میں اس پر صرف ایک گولی چلا سکتا تھا۔ لیکن میں نے کچھ سوچ کر ایسا نہیں کیا اور میری توجہ بدستور اس کے دوسرے ساتھی ایجنٹ کی جانب ہی رہی۔

وہ دروازے کی آڑ سے مجھ پر یکے بعد دیگرے گولیاں داغے جا رہا تھا اور مجھے اس بوچھاڑ میں ایک بھی فائر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

یوں اس کے مسلسل فائر کرنے سے کچن کی چوکھٹ کے چیتھڑے اُڑنے لگے۔

میں اپنی بے بسی پر ہاتھ نہیں مل سکتا تھا، کیونکہ اس وقت میرے مقابلے میں ٹائیگر لیگ کا چیف خود مقابلے میں تھا جو کوئی معمولی چیز نہیں تھا۔

میری تیزی سے گردش کرتی نظروں نے کچن کی کھڑکی کو تاڑ لیا، جو ادھ کھلی تھی اور میں نے اس کی جانب سرکنے میں محض چند پل کی دیر لگائی اور وہاں سے، بغیر اسے مزید وا کیے، اپنا ذرا سر اُبھار کر دیکھا اور اپنے مطلوبہ شکار کی پوزیشن کا اندازہ کیا، وہ تابڑ توڑ گولیاں برسانے کے بعد پیراٹروپنگ کے انداز میں قلابازیاں اور چھلانگیں مارتا کچن کی اُدھڑی ہوئی چوکھٹ کے قریب پہنچا، شاید اس کی مسلسل فائرنگ کرنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ مجھے ایک جگہ محبوس کرنے پر مجبور کر دے اور پھر خود فیصلہ کن حرکت کرتے ہوئے مجھ پر اگلا اور نتیجہ خیز وار کرے لیکن مجھے اس سے پہلے ہی اس کا موقع مل چکا تھا۔

میں نے ادھ کھلی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر اپنے کوبرا کولٹ کی نال کا رخ اس کی جانب کیا اور گولی چلا دی۔ اس کے حلق سے کریہہ ناک چیخ خارج ہوئی اور وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کوبرا کولٹ کی گولی نے اس کی پیشانی پھاڑ ڈالی تھی۔

باسکل ہولارڈ نے میری موجودہ پوزیشن کا اندازہ کرتے ہی مجھ پر اپنے پستول سے، چڑ...... چڑ...... اُوپر تلے دو فائر کیے...... میں جھک گیا۔ ادھ کھلی کھڑکی کا ایک پٹ اُڑ گیا۔

شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسی کھڑکی سے دوبارہ اس پر جوابی فائر داغوں گا مگر یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ دو فائر کرنے کے بعد وہ تیسرے فائر کا منتظر ہو سکتا تھا۔

میں نے اُلٹی چال چلی اور پلٹ کر کچن کے دروازے کی جانب لوٹ لگائی۔ سامنے مجھے اس کے دوسرے ساتھی کی خون آلود لاش دکھائی دی۔

یہاں پر میں نے کھڑے ہونے کی غلطی کے بجائے کچن کے فرش پر لیٹے لیٹے ہی ذرا سرک کر سر باہر نکالا اور مجھے ہولارڈ پستول ہاتھ میں لیے محتاط قدموں سے کچن کی کھڑکی کی جانب بڑھتا ہوا دکھائی دے گیا۔

میں نے بے حد آہستگی کے ساتھ کوبرا کولٹ والا ہاتھ سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ شعلہ لپکا اور گولی ہولارڈ کے پستول والے ہاتھ میں لگی۔ وہ اُچھلا اور چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑایا، ہاتھ اس کا زخمی ہو چکا تھا اور پستول سے محروم بھی۔

خود کو نہتا دیکھ کر اس مکار آدمی نے راہِ فرار کا راستہ اختیار کیا، اس لیے کہ وہ جانتا تھا میں ابھی اسے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

اسے بھاگتا دیکھ کر میں اُٹھا اور وحشیانہ غراہٹیں حلق سے خارج کرتا ہوا اس کی جانب لپکا۔ ہم دونوں کا بیچ سے

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

باہر نکل آئے۔ بھاگم دوڑ کے درمیان...... پستول میں نے دوبارہ اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اُڑس لیا تھا تاکہ اس کا آسانی سے پیچھا کر سکوں اور چھاپ لوں لیکن یہ دیکھ میں حیران رہ گیا کہ وہ...... اپنے بھاری مگر تومند بدن کے باعث بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔

وہ کاٹیج کی درمیانی رو سے ہوتا ہوا...... پائن کے درختوں سے گھرے ہوئے ایک خاصے وسیع قطعۂ اراضی میں گم ہو گیا۔

ہولارڈ اس قدر جلد مجھے جُل دے جائے گا، مجھے اس کی ذرا بھی توقع نہ تھی لیکن میں نے بھی تہیہ کر رکھا تھا کہ اسے پکڑے بغیر یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں، لہٰذا میں اسے ڈھونڈتا رہا اور خاصا اندر تک نکل آیا۔

اسی وقت مجھے عقب میں کسی گاڑی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں بُری طرح چونکا۔

پہلے تو یہی سمجھا کہ کسی اور کی گاڑی ہوگی لیکن ٹھٹکے ہوئے ذہن میں یہ خدشہ بھی اُبھرا کہیں وہی مردود چھلاوا صفت ہولارڈ ہی تو نہیں جو اپنی کار میں فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہو؟

یہ خیال آتے ہی میں طوفانی بگولے کی طرح پلٹا اور...... اسی وقت میرے سر پر اچانک کوئی قیامت ٹوٹی...... میں شاید مغالطے میں مار کھا گیا تھا میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

☆☆☆

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو مجھے بالکل مدھم اور لطیف سی گونج کا احساس ہوا، اگرچہ میرے حواس بہت آہستہ آہستہ بیدار ہوئے تھے اور مجھے اپنے گرد ہلکی نیلگوں روشنیاں دکھائی دی تھیں۔

میں ایک صوفہ کم بیڈ پر رسن بستہ حالت میں پڑا تھا اور دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے، ٹانگوں میں بھی جکڑ بند محسوس کر کے میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

سر پر ہلکی سے سوزشی درد کا احساس ہوا اور آنکھوں کے سامنے کالے دھبے ناچتے رہے جو حواسوں کے بیدار ہونے کے ساتھ ساتھ کالے بادلوں کی طرح چھٹتے چلے گئے۔

پوری طرح دیکھنے کے قابل ہوا تو بری طرح چونک پڑا۔ پہلا منظر جو میری آنکھوں کے سامنے اُبھرا تھا، وہ کسی طیارے کا لگژری سوئٹ تھا کیونکہ سوئٹ کی مخصوص کھڑکیوں کی ساخت اور ان کے پار مجھے نیلگوں آسمان کی پہنائیاں نظر آئیں جو سہ پہر کے بعد کی اُترنے والی نارنجی سی شام میں ڈھلتی دکھائی دے رہی تھیں۔

فضائے بسیط کے اسی منظر کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا تھا کہ میں کسی طیارے میں ہی محوِ سفر ہوں۔

میرے سامنے ایک میز نصب تھی اور اس کے گرد بچھی ہوئی تین کرسیوں پر تین ہی افراد خاصے چست لباس میں براجمان تھے۔

ان کی دائیں جانب چھوٹا سا صوفہ ٹائپ کی نشست تھی جو خالی تھی۔ یہ تینوں میرے لیے اجنبی تھے۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ایک فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور درمیانی دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں اپنا سر جھٹکنے لگا اور اپنے سر کی چوٹ دبانے کی خواہش اُبھری مگر میں بندھے ہوئے ہاتھ ہونے کے باعث اسے عملی جامہ پہنانے سے قاصر تھا۔

میں یہ سوچ سکتا تھا کہ کیا میں ہولارڈ کی گرفت میں آچکا تھا؟ یا کسی اور نے یہ معرکہ سرانجام دیا تھا؟ کیونکہ اگر میں ہولارڈ کی گرفت میں ہوتا تو وہ مجھے کہاں زندہ چھوڑنے والا تھا، اس لیے تو اس نے یہ یقین ہونے کے بعد کہ عابدہ کو میں نے نہیں کسی اور نے اس سے چھینا تھا، اس نے کاٹیج میں موجود اپنے دونوں مسلح ساتھیوں کو اپنی آنکھ کی خفیف جنبش سے [illegible]

https://www.urdutubes.com/

مجھے خلائی ہتھیاروں کی بھی فکر تھی، جو بظاہر سادہ سی ہیئت رکھتے تھے، قلوپطرہ کے کوبرا سانپ والی انگوٹھی میری انگشتری میں موجود تھی اور غیر مرئی لہروں والے جوڑے کی موجودگی بھی محسوس کر کے میں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

لہٰذا اگر ہولارڈ نے ہی پائن کے جھنڈ میں دھوکے سے عقب میں مجھ پر وار کیا تھا تو وہ مجھے اسی طرح بے ہوشی کی حالت میں ہلاک کر سکتا تھا، تو پھر مجھے کہیں نامعلوم مقام پر لے جانے کے لیے اس لگژری...... طیارے کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

وہ آدمی جلد ہی لوٹا تو اس کے ہمراہ باسکل ہولارڈ تھا۔ اسے دیکھ کر بے اختیار میرے حلق سے ایک سرد سی ہنکاری خارج ہو گئی اور میں چونکا بھی تھا کہ میرا یہ خدشہ غلط ثابت ہوا تھا کہ میں شاید کسی اور کی قید میں تھا۔ لیکن مجھے حیرانی بھی ہوئی تھی کہ اگر میں اس خبیث کی گرفت میں آچکا تھا تو زندہ کیونکر تھا؟ کیا یہ پھر کوئی میرے ساتھ چکر چلانے والا تھا؟ ساتھ ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو چلا تھا کہ ڈومیسٹک پرواز کا یہ طیارہ ذاتی یا چارٹرڈ ہو سکتا تھا۔

ایک بات اور میرے ذہن میں اُبھری تھی کہ میرے

Digitized by Google

اس طرح اندھیرے میں مار کھانے کی وجہ یہی تھی کہ میں ایک کار کے انجن کے اسٹارٹ ہونے پر چونکا تھا اور یہی سمجھا تھا کہ ہولارڈ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے؟ تو پھر وہ کون تھا جس نے کار اسٹارٹ کی تھی؟ شاید وہ کسی اور عام آدمی کا شاخسانہ تھا، تاہم میں مغالطے میں آکر بہرحال اب ہولارڈ سے دھوکا کھا چکا تھا۔

میں نے اس کی طرف نفرت بھری نظروں سے گھورا تھا۔ ہولارڈ کے چہرے کی مسکراہٹ بھی بڑی...... زہریلی تھی۔ پچکی پچکی اور غلافی پپوٹوں سے ڈھکی آنکھوں میں نفرت اور سفاکی جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔

اس نے ایک استہزائیہ سی نظر مجھ پر ڈالی اور پھر صوفے والی نشست پر دھم سے گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اس کی اندر آمد پر اس کے تینوں ساتھی مودبانہ سے نظر آنے لگے تھے۔

"بہت شارپ ہو تم شہزی! جیسا تمہارے بارے میں سن رکھا تھا تمہیں ویسا ہی پایا...... لیکن افسوس کہ تمہارا مقابلہ یہاں کسی تیسرے درجے کے گینگسٹر سے نہیں بلکہ ایک ٹاپ پروفیشنل ادارے کے ہائی پروفائل ایجنٹوں سے ہے۔"

[illegible] کے بعد ذرا ٹھہرا تو [illegible]

"ہولارڈ! اس بزدلی اور وعدہ خلافی کو میں اور کیا نام دوں۔ [illegible] جو تمہیں اور تمہارے اس ٹاپ پروفیشنل ادارے کو تیسرے درجے کے گینگسٹرز سے بھی گیا گزرا ثابت کرتی ہے۔ کیا تمہارا ذمے دار ادارہ تمہیں اس ماورائے قانون حرکت کی اجازت دیتا ہے؟"

دشمن کے منہ سے ایسے الفاظ باسکل ہولارڈ جیسے گھمنڈی یہودی کی مغرور انا پر ضرب بلاشبہ کاری ثابت ہوئے کیونکہ دوسرے ہی لمحے ہولارڈ کی آنکھوں میں ایک آگ سی اُترتی محسوس ہونے لگی۔

یہی حالت اس کے چپٹے سے چہرے کا ہوا۔ میری جوابی کارروائی پر وہ بیک وقت اپنے دانت، ہونٹ اور دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں تک بھینچنے لگا۔

اسی جلتی اُبلتی کیفیات تلے وہ عالمِ طیش میں اُٹھا اور میرے قریب آکر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے شکنجے میں میری گردن دبوچ لی، چند ثانیوں کے لیے مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا، یہی نہیں اس مردود نے مجھے اسی طرح گردن سے دبوچے ہوئے...... صوفہ کم بیڈ سے نیچے گھسیٹ لیا اور فرش پر لڑھکانے کے بعد مجھ پر گھونسوں اور لاتوں کی بارش کر ڈالی۔

وہ مردود کسی جنگلی بھینسے کی طرح طاقت ور اور خونخوار فطرت کا ثابت ہو رہا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت باؤلے کتے جیسی بھی ہو رہی تھی۔

کئی نازک جگہوں پر جب اس کے ہتھوڑے جیسے گھونسے اور مضبوط بوٹوں کی ٹوؤں نے میری خبر لی تو بے اختیار میرے حلق سے بھی کراہ نما چیخیں برآمد ہونے لگیں۔

اس تشدد سے میرا نچلا ہونٹ پھٹ گیا۔ چہرے پر خراشیں اُبھر آئیں اور ناک سے بھی خون اُبل پڑا۔

"ذلیل! کتے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا، تُو نے جرأت کیسے کی یہ کہنے کی؟ میں تجھے خالدہ اور عابدہ کی طرح نشانِ عبرت بنا دوں گا۔" وہ خبیث باؤلے کتے کی طرح ہانپتا ہوا یہ کہتا چلا گیا اور جسمانی تکالیف کے باوجود اس کی ناپاک زبان سے خالدہ اور عابدہ کو نشانِ عبرت بنانے کا سنتے ہی میرا دماغ مثلِ آتش فشاں پھٹ پڑا، غیظ و غضب کا ایک لاوا تھا جو مجھے آپے سے باہر ہونے کے لیے میرے پورے وجود کو مرتعش کیے ہوئے تھا، کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا کہ جس کا محبوب ایک طویل عرصے سے بچھڑا ہوا ہو اور پھر کوئی اسے اس سے اچانک ملنے کی نوید سنا دے لیکن عین وقت پر معاملہ اور نکل آئے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھ رہا ہو اور پھر اس کی آنکھ کھل جائے تو دل کس قدر بوجھل اور خراب سا ہونے لگتا ہے، یہ عین میرے دل و دماغ کی بھی یہی کیفیات تھیں۔

باسکل ہولارڈ مجھے یہی کہہ کر لایا تھا مگر وہاں عابدہ کے بجائے اور کوئی اور ہی معاملہ نکل آیا۔ اگرچہ اس میں ایک طرح سے ہولارڈ کی بدنیتی کا دخل نہ تھا، وہ شخص مجھے عابدہ کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں جانچنا چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ چلتا ہوں یا نہیں، ظاہر ہے اگر عابدہ، ان کے خیال کے مطابق میرے پاس ہوتی تو میں اس کے ساتھ یوں اندھی نار میں کیوں کود پڑتا؟ اس سے وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ عابدہ میرے پاس نہیں تھی اور کوئی تیسرا آدمی "ہاتھ" دکھا گیا تھا۔

بہرحال میں ریچھ نما ہولارڈ کے تابڑ توڑ گھونسوں اور لاتوں سے رسن بستہ وجود کو مضروب کرواتا رہا یہاں تک کہ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے سنبھالا تھا کہیں اس طیش میں مغلوب الغضب ہو کر اس کی اپنی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔

دوبارہ میرے چہرے پر...... ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس اُنڈیل کر ہوش میں لایا گیا۔ دیکھا تو وہ ریچھ نما وحشی درندہ ہولارڈ اپنی صوفہ کم نشست گاہ پر براجمان، ابھی تک ہانپ سا رہا تھا۔

اس کے تینوں ساتھی بالکل مستعد تھے۔ دو تو اس کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے، تیسرا میرے بیڈ کے پاس پانی کا جگ لیے کھڑا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں کانچ کا خالی گلاس تھا۔

مجھے ہوش میں آتا اور کراہتا پا کر وہ پلٹا اور دونوں چیزیں میز پر رکھنے کے بعد اس نے بھی اپنی کرسی سنبھال لی۔

میرے وجود کا ایک ایک حصہ پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اس بدبخت نے عابدہ کے ساتھ کیا حشر کیا ہوگا؟ جس نے گون برگ کے ہاتھوں آنسہ خالدہ کو زندہ لاش بنا دیا، وہ میرا ابھی یہی حشر کر سکتا تھا اسی لیے میں نے اس بار ذرا مصلحت اور ضبط سے کام لیتے ہوئے ذہن کو بروئے کار لاتے ہوئے خود کو سنبھالا۔

''سنو شہزی!'' وہ بولا۔ ''میں اس تصدیق کے بعد کہ عابدہ واقعی تمہارے قبضے میں نہیں ہے، تمہیں اُدھر کاٹیج میں ہی ہلاک کر دینے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا، لیکن تم آسیبی چھلاوے کی طرح بچ نکلے، بڑی خطرناک زود حسی اور قوتِ ارادی کے مالک ہو تم...... نجانے کیسے تمہیں عین وقت پر اس کا ادراک ہو گیا اور تم ہمارے لیے آسیبی چھلاوا... بن گئے...... خیر......'' وہ اتنا کہہ کر رکا اور جیب سے سگار باکس نکال کر ایک کا انتخاب کیا، اس کا سرا توڑا اور لائٹر سے سلگا لیا مگر کش لیے بغیر گویا جملہ مکمل کرتے ہوئے جلدی سے بولا۔

''لیکن اب میرا ارادہ بدل گیا ہے۔'' یہ کہنے کے بعد اس نے ایک لمبا کش لیا۔ میرا تو جوڑ جوڑ ٹوٹا ہوا تھا۔ سانسیں ہنوز چڑھی ہوئی تھیں۔ میں اپنے مضروب وجود کے [illegible] زدہ حصوں کو سہلانے [illegible] تھا۔ بھلا اب اس منحوس سے کیا کہتا۔

وہ آگے بولا۔ ''دیکھو...... ممکن ہے مجھے پتا چل جائے کہ تمہاری محبوبہ عابدہ کو کون لوگ اٹھا لے گئے ہیں؟ وہ لازماً تمہارے اور عابدہ کے حریف تو نہیں ہو سکتے، پھر میں انہیں تمہارے یرغمال بنائے جانے کی اطلاع دوں گا اور اپنا شکار واپس حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔'' اس نے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

''ہم...... میں سخت تکلیف میں ہوں، برائے مہربانی...... مجھے کم از کم اپنی چوٹیں ہی سہلانے دو، بہت ادھ موا ہو رہا ہوں۔'' میں نے جیسے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ایسا میں نے دانستہ کہا تھا۔ بے شک چوٹیں مجھے آئی تھیں مگر ایسی نہ تھیں کہ وہ ناقابلِ برداشت ہوتیں یا مجھے واقعی بہت زیادہ نڈھال کر ڈالتیں، ایسا میں نے ہولارڈ کو خود مجھ سے بے پروا ہونے کے لیے کہا تھا کہ جیسے میں کام کا ہی نہ رہا ہوں، تاہم اب میری ناک اور پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون رسنا بھی بند ہو چکا تھا۔

''ہاہا...... ہاہا...... تم چوٹیں کیا سہلاؤ گے، اب قبر میں ہی جا کر اپنا پورا جسم سہلانا۔'' وہ خبیث بدمست سے قہقہے کے بعد بولا۔ ''کیونکہ میں صرف ایک یا دو دن انتظار کروں گا، مجھے یقین ہے کہ میں اپنے گم شدہ شکار کا کھوج لگا لوں گا اور ان کا بھی جنہوں نے میرے منہ سے یہ نوالہ چھیننے کی کوشش کی ہے۔''

اس ملعون اور مردود کا عابدہ کو بار بار ''نوالہ'' اور ''شکار'' کہنا مجھے سخت ذہنی اذیت سے دوچار کر رہا تھا مگر اب یہ وقت جوش دکھانے کا بھی نہ تھا، جبکہ وہ ذلیل مجھے زندہ رہنے [illegible] کر چکا تھا۔

''تت...... تو پھر مجھے تم اب کہاں لے جا رہے [illegible]

اس نے ایک کش لگایا اور بولا۔ ''[illegible] تمہارا نیویارک میں انتظار کر رہا تھا، کیونکہ عابدہ کو بھی اُدھر ہی غائب کیا گیا ہے، پھر میرے جاسوسوں نے مجھے اطلاع دی کہ تم شکاگو میں ہو اور وہاں سے کیلی فورنیا آ چکے ہو اور اب اسٹاری سے پینگیں بڑھا رہے ہو۔ تم نے یہاں آتے ہی میرے بہت سے اہم ساتھی مار ڈالے ہیں شہزی! اس لیے معافی کا خیال بھی ذہن سے نکال [illegible] بلکہ مقصد ملا تم سے سود وصول کرنے کا بھی [illegible] ہوں۔ اس کے لیے میں نے عابدہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا مقصد تمہاری اس سادہ لوح مگر ہٹیلی محبوبہ نے پورا نہیں ہونے دیا، اب وہ مجھے مل جائے تو تمہیں دیکھ کر اور تمہاری جان بخشی کے عوض شاید مان جائے، نہیں...... شاید نہیں......'' وہ عجیب سنکیوں کی طرح اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''یقیناً مان جائے گی۔'' اس نے راکھ جھاڑی اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔

سوئٹ کی دیوار میں ایک خوب صورت سی

Digitized by Google
https://www.urdutubes.com/

91 جہانگیر بکس

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

- آخری معرکہ 550/-
- اندھیری رات کے مسافر
- [illegible] 475/-
- ثقافت کی تلاش 300/-
- [illegible] 625/-
- اور تلوار ٹوٹ گئی 550/-
- گمشدہ قافلے 500/-
- داستانِ مجاہد 300/-
- پردیسی درخت 450/-
- یوسف بن تاشفین 500/-
- معظم علی 475/-
- خاک اور خون 550/-
- کلیسا اور آگ 450/-
- قافلۂ حجاز 599/-
- محمد بن قاسم 425/-
- پورس کے ہاتھی 300/-
- انسان اور دیوتا 450/-
- پاکستان سے دیارِ حرم تک 300/-
- آخری چٹان 450/-
- سو سال بعد 225/-
- سفید جزیرہ 325/-
- شاہین 475/-

سبق آموز کتب سلسلہ
دو رنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین

- اقوالِ حضرت علی المرتضیٰ 165/-
- اقوالِ آئمہ کرامؒ 165/-
- حکایاتِ گلستانِ سعدیؒ 195/-
- اقوالِ شیخ سعدیؒ 140/-
- حکایاتِ رومیؒ 180/-
- دلچسپ و عجیب حقائق 170/-
- حکایاتِ بوستانِ سعدیؒ 199/-
- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں 150/-
- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات 180/-
- بڑے لوگوں کے روشن واقعات 165/-

جہانگیر اردو لغت
(جامع ترین)

جہانگیر بک ڈپو
022-2780128
042-37220879
042-35757086
051-5539609

کیبنٹ تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھ گیا۔ ذرا دیر بعد وہ چاروں شراب سے دل بہلا رہے تھے۔

میں بیڈ پر اسی طرح بندھا پڑا تھا اور دانستہ خود کو ہولارڈ کے ہاتھوں پٹنے کے بعد نڈھال اور ناتواں ظاہر کر رہا تھا۔ جیسے میرے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میں رفتہ رفتہ جذبۂ جنون اور اپنی غیر معمولی قوت برداشت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مشکل سے چھٹکارا پانے کے لیے غور کرنے لگا۔

میں نے اپنے حلق سے کچھ ایسی آوازیں بھی خارج کرنا شروع کر دی تھیں جیسے میری جان نکلی جا رہی ہو۔

ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ عابدہ کو ان وحشی بھیڑیوں کی قید سے بھلا لولوش کے سوا اور کون نکال کر لے جا سکتا ہے۔

معاً کسی سیل فون کی میوزیکل بیل گنگنائی۔ میں بیڈ پر ایک کروٹ پر گویا پڑا تھا، وہیں سے میں نے دیکھا، ہولارڈ کی چیئر کے ساتھ ہی ایک مختصر اور دیدہ زیب سا ریک بنا ہوا تھا، وہیں لیپ ٹاپ بھی رکھا تھا اور ساتھ میں سیل فون کا ایک چھوٹا سا اسٹینڈ بھی تھا، سیٹ اسی میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ نکال کر ہولارڈ نے اپنے کان سے لگا کر 'ہیلو' کہا۔

میں نے اس کی گفتگو پر دھیان دیا لیکن بظاہر جسم کو یونہی وقفے وقفے سے اِدھر اُدھر حرکت بھی دیتا رہا تا کہ ان کا دھیان بٹ سکے، جبکہ حقیقت یہی تھی کہ میں اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھولنے کی تگ و دو میں بھی مصروف تھا۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے دانستہ اپنی پشت دیوار کی جانب کر رکھی تھی تا کہ وہ لوگ میرے رسن بستہ ہاتھوں کی جنبش کو نہ تاڑ سکیں۔

"اوہ...... مائی لولی ڈاٹر...... انجیلا! کیسی ہو، کہاں ہو؟" ہولارڈ کا لب و لہجہ یکا یک ایک باپ کی طرح پُرشفیق ہو گیا۔ جبکہ میں اندر سے بُری طرح کھٹک گیا۔

"انجیلا...... لولوش...... انجیلا......" اس نام کے ساتھ از خود اس ملعون اور اسپیکٹرم کے سربراہ لولوش کا نام بھی میرے ذہن میں کسی آسیبی چمگادڑ کی طرح گردش کرنے لگا۔ لولوش اس کا داماد تھا۔

مجھے یاد تھا جب میں پاکستان میں تھا اور عابدہ کی امریکن انٹیلی جنس ادارے میں حوالگی کے بعد اول خیر اور میں یہی پروگرام بنائے ہوئے تھے کہ کسی طرح انجیلا پر ہاتھ ڈالا جائے تو بدلے میں عابدہ کی برآمدگی ممکن ہو سکتی تھی، یہ اس وقت کی بات تھی جب میرا اسپیکٹرم کے ساتھ ٹھیک ٹھاک قسم کا محاذ جہنم واصل سے جی کو ہارا...... کے ساتھ ایڈیمان کے جزائر میں گرم تھا اور ان دنوں لولوش برازیل میانمار (برما) میں اپنی بیوی انجیلا کے ساتھ عارضی طور پر مقیم تھا۔

لیکن وہاں حالات ان دنوں اس قدر پُرخطر اور جاں گسل رہے تھے کہ ہمیں اپنے اس منصوبے پر عمل کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا تھا۔ اب...... انجیلا کے تذکرے پر میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا مگر میں نے اپنے چہرے کے جوشیلے تاثرات چھپائے رکھے تھے، ہولارڈ کے تینوں مستعد ساتھی ایجنٹ تھوڑے تھوڑے وقفے سے [illegible] جانب گھورتے جاتے تھے۔

"یس مائی سوئٹ ہارٹ! میں نیو یارک پہنچ [illegible] ایک ضروری کام سے مجھے یکلخت فوری [illegible] پڑا تھا۔ [illegible] بھی میں اپنے لوٹا طیارے میں [illegible] یاد ہے نا ڈارلنگ یہ وہی طیارہ ہے لوٹا...... جس میں، تمہیں میں نے رخصت [illegible] تھا۔"

باسکل ہولارڈ کی گفتگو اپنی بیٹی سے جاری تھی اور میں نے اس پر کان لگا رکھے تھے لیکن اب بھی میں نے [illegible] دیر بعد کراہتے رہنا اور بے چینی اور درد کا تاثر ابھارتا [illegible] پشت پر بندھے اپنے ہاتھوں کو [illegible] میں جنبش دیے جا رہا تھا مگر ابھی تک میں رسی کی ایک [illegible] بھی ڈھیلا نہ کر سکا تھا، تاہم میری کوشش جاری تھی۔

"مائی لولی ڈاٹر! اس وقت ہمارا [illegible] پانچ سو [illegible] کی ایوریج اسپیڈ پر گامزن ہے، چار سے پانچ [illegible] نیو یارک پہنچنے میں لگ ہی جائیں گے۔" ہولارڈ [illegible] کہہ رہا تھا۔

"تم ایسا کرو اسٹار والا پہنچ جاؤ، فریش ہو جاؤ [illegible] سنو ہیلگا سے دور ہی رہنا، معلوم ہی ہے نا...... اس کی [illegible] تمہیں...... یس مائی ڈاٹر، گڈ! ہاں سنو ذرا! لولوش بھی تمہارے ساتھ ہے؟"

اس نے آخر میں پوچھا تو میری سماعتوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔

دوسری جانب سے اس کی بیٹی انجیلا نے کوئی جواب دیا تھا جس پر ہولارڈ بولا۔

"او...... چلو خیر! کوئی بات نہیں، تم تو آ رہی ہو یہی بہت ہے، ویسے اگر وہ جادوگر کی اولاد بھی ساتھ ہوتا تو میرے پاس اس کے لیے ایک

Digitized by Google

https://www.urdutubes.com/

سرپرائز تھا......" یہ کہتے ہوئے باسکل ہولارڈ نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔

"بس ہے کوئی، تمہارے کام کی بات نہیں ہے، کیا کہا؟ تمہارے پاس بھی میرے لیے کوئی خبر ہے؟ او کے، ہاں! میں ائرپورٹ پر اُترتے ہی پہلے اپنے ہیڈکوارٹر جاؤں گا...... تم میرا انتظار مت کرنا، تم بھی تھکی ہوگی اسی لیے آرام کر لینا، میں رات دیر سے آیا تو تمہارے کمرے میں آ کر تمہیں بوسہ دے دوں گا، پھر صبح کو گپ شپ ہوگی باپ بیٹی کی...... او کے ڈارلنگ!؟ کیا......؟ کیا کہا......؟ او...... مائی [illegible] ہے؟ تمہارا لہجہ اس قدر بوجھل کیوں ہو رہا [illegible] کیا بات [illegible] طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمہاری؟ او...... ہو جاتا ہے [illegible] ابھی تمہاری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے؟ صرف چند سال [illegible] میاں بیوی میں چھوٹی موٹی باتیں ہو جاتی ہیں، میں سمجھا لوں گا اس شیطان کو، تم چھوڑ دو [illegible] اچھا ٹھیک ہے [illegible] سویٹ ڈاٹر [illegible] وہ تمہاری ہی پسند تھا، [illegible] او کے مائی ڈاٹر! میں جانتا ہوں کہ وہ میرا فرسٹ [illegible] ساتھی تھا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ تم......"

اس نے فوراً اپنی ہی بات کاٹ دی اور میری جانب دیکھا پھر فون پر بیٹی سے بولا۔ "خیر...... صبح تفصیل سے بات کر لیں گے۔" یہ کہنے کے بعد ہولارڈ نے رابطہ [illegible] وہیں اسٹینڈ پر رکھ دیا۔

[illegible] وہ اپنے [illegible] کی طرف دیکھا، وہ [illegible] اس کے چہرے پر کچھ فکرمند سا نظر آ رہا تھا، پھر ایک [illegible] کے بعد وہ کچھ سوچنے کے دوران بار بار گھونٹ بھرنے [illegible] جیسے کسی بات کو اہمیت بھی دیتا اور پھر سر کو یوں جھٹکا کہ جیسے اسے غیر اہم قرار دے ڈالا، انداز ایسا ہی تھا۔

[illegible] گھنٹوں کے درمیان طیارے نے پانچ سے چھ [illegible] نیو یارک کے جانے کون سے ائرپورٹ پر لینڈ کیا تھا، کیونکہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔

[illegible] اندھیاروں میں مجھے طیارے سے اُتار کر کسی گاڑی میں بٹھایا گیا اور وہ روانہ ہو گئی۔

ٹریفک کا پُرہنگم شور اور دیگر ایسی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائی تھیں پھر خاموشی چھا گئی تھی، کار کے شیشے بند تھے۔

کار کا سفر نصف گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد کار نے میرے محتاط اندازے کے مطابق دو تین موڑ کاٹے تھے اور پھر کار رکی، چند سیکنڈوں بعد پھر آگے بڑھی اور رک گئی۔ (شاید گیٹ سے اندر داخل ہو گئی تھی)۔

دروازے کھلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میرے ہاتھوں کی رسیاں جوں کی توں بندھی رہیں، میں پیہم کوشش کے باوجود اس کی ایک گرہ کو بھی ڈھیلی کرنے میں ناکام رہا تھا، کم بختوں نے بہت ہی "ٹیکنیکل" انداز میں باندھ رکھی تھیں، اس میں کچھ موقع کا بھی دخل تھا، کیونکہ انہوں نے مجھے اکیلا نہیں کیا تھا کہ میں کھل کر اپنی "کوشش" میں کامیابی حاصل کرتا۔

شاید اب موقع ملتا لیکن میرا دھیان باپ بیٹی کی گفتگو میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ انجیلا کا اپنے شوہر لولوش کے ساتھ کچھ چپقلش کا آغاز ہونے لگا تھا، اب پتا نہیں یہ میاں بیوی کی آپس میں روایتی چپقلش تھی یا پھر سنجیدہ نوعیت کی، اس کا ابھی بہرحال مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو پایا تھا۔

میرے پیروں کی رسیاں کھول دی گئی تھیں اور مجھے دو افراد نے بازوؤں سے دبوچ رکھا تھا۔ کار سے اُترنے کے بعد وہی مجھے کسی عمارت کے اندر لے کر بڑھے جو مبینہ طور پر ٹائیگر فیک کا ہیڈکوارٹر تھا۔

میں نے اپنے نڈھال ہونے کی "اداکاری" کو یہاں بھی جاری رکھا تھا تا کہ مجھے کمزور سمجھ کر ان کی غیر معمولی "مستعدی" میں کمی آتی رہے۔

شاید مجھے کسی کمرے میں لایا گیا تھا۔ شکر تھا کہ یہاں دوبارہ میری ٹانگوں میں رسی نہیں باندھی گئی تھی البتہ میری آنکھوں سے پٹی اُتار دی گئی۔

چند لمحے تک تو میری آنکھوں کے سامنے کالے دھبے رقص کرتے رہے۔ ان کے بعد ان میں بتدریج کمی آتی گئی۔ میں نے جائزہ لیا۔

وہ ایک آٹھ بائی دس کا کمرا تھا اور وہاں میرے علاوہ صرف یہی دو افراد تھے۔ باسکل ہولارڈ وہاں موجود نہ تھا۔ وہ دونوں مجھے فرش پر پھینک کر چلے گئے اور دروازہ باہر سے بند کر گئے۔

میں چند ثانیے تک اسی طرح ننگے فرش پر پڑا رہا۔ اس کے بعد تھوڑا لڑھکتا اور دانستہ کراہتا ہوا دیوار تک گیا اور اس کے ساتھ پشت لگا کر اسی کے سہارے بیٹھ رہا۔

یہ چونکہ مبینہ طور پر ٹائیگر فیک کا ہیڈکوارٹر تھا، نیو یارک کے کسی علاقے میں تھا، کہاں؟ یہ ابھی میں نہیں جان سکا تھا۔ دوسری بات میرے ذہن میں یہ بھی تھی کہ یہاں سے کسی خفیہ کیمرے کے ذریعے میری نقل و حرکت کو

دیکھا جا سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے سرِدست ایسی کوئی مشکوک حرکات و سکنات سے اجتناب ہی برتنے کا فیصلہ کیا تھا۔

کمرے میں میرے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ماسوائے چھت کے قریب ایک چھوٹے سے سوراخ نما روشن دان کے جہاں سے مجھے تاریکی کے ظلمت بھرے بطن سے روشنی کی ہلکی کرنیں سی پھوٹتی دکھائی دیتی تھیں۔

کمرے کی چھت بھی بہ مشکل چھ یا سات فٹ ہوگی، یہاں مزید کوئی جائزہ لینے والی شے نہ تھی اسی لیے میں نے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں کی غیر محسوس انداز میں گرہیں کھولنے کی کوششیں تیز کر دیں۔

میری پشت چونکہ دیوار کے ساتھ تھی اور میں نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اگر کسی خفیہ کیمرے کی دیوار گیر آنکھ مجھے دیکھ بھی رہی تھی تو میری اس کوشش کو بھی دیکھ سکتی تھی۔

میں اپنے ''کام'' میں جتا رہا اور ساتھ ہی ذہن کو بھی کام میں لاتا رہا۔

ٹائیگر فیک کے ہیڈ کوارٹر میں میرا قید ہو جانا معمولی بات نہ تھی۔ یہاں میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انسانیت سوز تشدد یا پھر بے بسی کی موت...... لیکن بہ قول ہولارڈ کے وہ ابھی عابدہ کا کھوج لگانے اور ان لوگوں کو میرے حوالے سے بلیک میل کر کے کسی ڈیل کا منتظر تھا اور ظاہر ہے کہ یہ عرصہ زیادہ طویل نہیں ہو سکتا تھا۔

باسکل ہولارڈ جیسے درندہ صفت یہودی افسر سے مجھے ہر طرح کی بربریت کی توقع تھی۔

ہولارڈ کی طرح یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ٹائیگر فیک جیسے لوگوں کے چنگل سے عابدہ کو چھینا تھا، یہ بات میرے لیے بھی تشویش کا سبب تھی کہ کیا اغواکنندہ کا تعلق میرے کسی چھپے ہوئے بہی خواہ سے ہو سکتا تھا اس کا جواب نفی میں تھا۔

اگر ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے رابطہ ضرور کرتا اور بھلا ایسا میرا اجری اور بہادر خیر خواہ کون ہو سکتا......؟

آنسہ خالدہ خود زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی، بے چارے بدنصیب استاری کو اس خونی درندے ہولارڈ نے مار ڈالا تھا۔ سوزی ایسی کوئی طاقت نہیں رکھتی تھی کہ وہ ٹائیگر فیک جیسے خونخوار بھیڑیوں کی کچھار سے عابدہ کو نکال لانے کا کارنامہ انجام دے سکتی اور اگر اس نے ایسا کیا بھی ہوتا تو...... پہلی فرصت میں مجھ سے رابطہ کرتی۔ کیونکہ فرینسو اور بیکرز فیلڈ میں فاصلہ ہی کتنا تھا؟

رہے کبیل دادا اور شکیلہ، تو وہ دونوں بے چارے بندرگاہ کے اس رہائشی کنٹینر میں میرے منتظر ہوں گے اور میرے اب تک نہ لوٹنے پر پریشانی کا بھی شکار ہو سکتے تھے۔

تو پھر لولوش کے علاوہ بھلا اور کون ایسا بہادر ہو سکتا ہے جو باسکل ہولارڈ، ٹائیگر فیک اور جے بی سی سے ٹکر لے سکتا؟ لیکن یہاں یہ اڑچن ذہن میں اُبھرتی تھی کہ ٹائیگر فیک اور اسپیکٹرم دونوں ایک دوسرے کے دستِ راست ہی نہیں بلکہ ایک زبردست حلیف بھی تھے۔

یوں اگر لولوش کو بھی اس خانے سے نکال دیا جائے تو اور کوئی نام میرے ذہن میں نہیں آتا تھا۔

میں زیادہ دماغ سوزی نہیں [illegible] جتنا [illegible] اتنا ہی الجھتا تھا۔ ایک تسلی تو بہرحال تھی [illegible] سے [illegible] تھی [illegible] وہ بے چاری کن حالوں میں تھی اور [illegible] مسلسل مصائب سے اب تک گزری ہوگی، اس کا [illegible] صرف ایک تکلیف دہ اندازہ ہی لگا سکتا تھا، زیادہ سوچتا بھی [illegible] جاتا اور خود کو ذہنی اذیت سے بچانے کے لیے میں نے اپنی ساری توجہ اپنے ہاتھوں کے جکڑ بند کھولنے پر مرکوز کر دی۔

رات گئے تک میں اسی کوشش میں لگا رہا، حتیٰ کہ میری کلائیاں ایک دوسرے سے رگڑ رگڑ کر اور انگلیاں تک چھلنے لگیں مگر کم بختی کی [illegible] بیچاری اور [illegible] غالب آنے لگی [illegible] اس پر سوا تھی۔ غنودگی سے میری آنکھیں بھی بوجھل ہو رہی تھیں۔ میں پہلے دیوار کے سہارے نیم دراز ہوا، پھر جانے کب لڑھک کر فرش پر گول مول ہو کر سو گیا۔

☆☆☆

پانی کے زوردار چھینٹوں سے میں جیسے ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھا۔ نیند کا خمار ہنوز ذہن پر غالب رہا۔ کچھ دیر میں وہ رفع ہوا تو سامنے دو مسلح افراد کو کھڑے دیکھا۔ ایک کے ہاتھ میں گن اور دوسرے کے ہاتھ میں پانی کا خالی جگ تھا، جو اس نے مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ایک جانب کونے میں رکھ دیا۔

دوسرے نے تحکمانہ درشتی سے مجھے کھڑے ہونے اور ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر اور چوکنا کھڑے تھے۔ جیسے میں کوئی بھوت ہوں، حالانکہ میرے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، میں دیوار کے سہارے اپنا رسن بستہ وجود رگڑتا ہوا بہ مشکل اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر ان کے ساتھ چل دیا۔

میں ان دونوں کے درمیان چلتا ہوا کمرے سے نکل کر ایک قدرے چوڑی راہداری میں آ گیا۔ دائیں بائیں چند ایک کمرے اور کچھ زینے دکھائی دیے تھے۔ درمیان میں چند قدموں کے بعد ایک ہال نما کھلا پورشن بھی نظر آیا تھا، وہاں میزیں اور کرسیوں پر کچھ لوگ براجمان کمپیوٹرز اور مانیٹرز پر جھکے کام میں مشغول رہے، کسی نے بھی ہماری طرف دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔

یہاں چھت خاصی بلند تھی۔ یہاں سے ایک چکردار زینے سے ہم اُوپر فلور میں آ گئے۔

دن اور وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ تاہم ہال میں لگے ایک [illegible] سے گھڑیال نما وال کلاک میں وقت دیکھنے کی کوشش [illegible] چاہی تھی جہاں چھوٹی سوئی چھ کے ہندسے پر تھی۔ یقیناً یہ صبح کے چھ بجے کا وقت ہو سکتا تھا۔ اگر مجھے باسکل ہولارڈ کے روبرو پیش کیا جا رہا تھا تو وہ مجھ سے رات بھی مل سکتا تھا، ممکن تھا اس کی بیٹی انجیلا نے گھر آنے کی ضد کی ہو [illegible] وہ اس کی بات مان جائے یوں وہ رات اپنے گھر گزار کے صبح ہی یہاں ہیڈ کوارٹر میں آن دھمکا ہو۔

جلد ہی ہم اُوپری فلور کے ایک بڑے سے کمرے میں آ گئے۔

یہ کمرا نسبتاً بہتر اور آرام دہ دکھائی دیتا تھا۔ یہاں صاف ستھرا فرنیچر رکھا تھا۔ ایک کونے میں صوفہ کم بیڈ اور مخمل [illegible] ان میں [illegible] بڑی سی [illegible] ٹاپ والی میز کے سامنے اپنی پشت ٹکائے سگار پی رہا تھا۔

مجھے اس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے چہرے کو گھورنے والے انداز میں دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس نے ایک کش لیا اور راکھ سامنے میز پر رکھی سنگِ مرمر کی خوب صورت سی ایش ٹرے میں جھاڑی اور بولا۔

''معافی چاہوں گا شہزی! تمہیں مجبوراً ایک ایسے کمرے میں رکھا گیا جو بہرحال تمہارے شایانِ شان نہیں تھا۔ مجھے بعد میں اپنے سخت اور جارحانہ رویے پر بھی افسوس ہوا جو میں نے طیارے میں تم سے روا رکھا، لیکن تم نے مجھے غصہ دلا دیا تھا میں تو تم سے دوستانہ ماحول میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔'' وہ مکار اتنا کہہ کر چند ثانیوں کے لیے رکا۔ میں نے بھی مصلحتاً اسے کوئی سخت جواب دینے سے گریز کیا۔ وہ آگے بولا۔

''درحقیقت مجھے رات ہی میں تم سے کچھ باتیں کرنی تھیں، لیکن میری بیٹی انجیلا کی ضد تھی کہ میں ہیڈ کوارٹر سے اسی وقت گھر پہنچوں، وہ بہت ضدی ہے، میں جانتا تھا کہ وہ رات بھر نہیں سوئے گی جب تک مجھ سے بات نہ کر لے۔''

وہ اتنا کہہ کر رکا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ خلافِ معمول اس کا لہجہ بہت دھیما اور ہموار تھا لیکن میں اس کی کسی مکاری میں آنے والا نہیں تھا تاہم میں اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا لیکن اسی وقت ایک پری جمال حسینہ ایک نفیس قسم کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

اس نے گہرے سرخ رنگ کا منی اسکرٹ اور اسی رنگ کا کھلے گریبان والا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ رنگت اس کی گوری اور شفاف تھی۔ بال سلیقے سے بنا رکھے تھے، قد دراز تھا، گھٹنوں سے اُوپر اس کے ٹائٹ اسکرٹ کے نیچے شفاف چمکتی جلد کی پنڈلیاں خاصی سبک نظر آتی تھیں۔

اس نے دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے میری جانب دیکھا اور ٹرالی کو سائڈ میں روک کر کھڑی ہوگئی۔

ٹرالی میں لوازمات آوارہ کے علاوہ کچھ کھانے پینے کی اشیا رکھی تھیں۔ ان میں کافی کا فلاسک، بریڈ مکھن، سنکے ہوئے توس، شہد اور اُبلے ہوئے انڈے رکھے تھے۔ کچھ اور بھی رکھا تھا جو میں نہ سمجھ سکا، وہ کیا بلا تھی۔

''میرا خیال ہے تم کچھ کھا پی لو اس کے بعد میں تم سے ضروری باتیں کروں گا۔'' باسکل ہولارڈ مجھ سے بولا اور لڑکی کی طرف دیکھ کر کوئی اشارہ کیا تو مسکراتے لہجے میں مجھ سے بولی۔

''مسٹر شہزی! آپ کیا لینا پسند کریں گے؟''

مجھے پیاس بھی لگی ہوئی تھی اور بھوک بھی...... مگر میرا کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اگر میں کچھ کھانے کی ہامی بھر لوں تو ممکن ہے مجھے اپنے دونوں ہاتھ کھلوانے کا موقع مل جائے اور یہی میرے لیے بہت تھا۔

''شکریہ! بھوک تو مجھے لگی ہے اور پیاس بھی...... لیکن میرے ہاتھ......''

''اس کی فکر نہ کرو...... مس ہیلی اپنے کام کی ماہر ہے۔'' باسکل ہولارڈ نے کہا اور میں بے بسی سے اپنے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ وہ پھر ہیلی سے مخاطب ہو کر بولا۔

''مسٹر شہزی کو پہلے پانی پلاؤ اس کے بعد اسے ناشتا کروا دو۔ ہم باتیں بھی کرتے جائیں گے۔ لیکن شہزی وہسکی نہیں پیتا، میرے لیے البتہ ایک پیگ تیار کر دینا۔'' کہتے ہوئے اس نے قریب مستعد کھڑے اپنے دونوں مسلح آدمیوں میں سے ایک کی طرف دیکھا، وہ اس کی نظروں کا

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

مطلب سمجھتے ہی فوراً چابی بھرے کھلونے کی طرح حرکت میں آیا اور اس کے لیے ایک گلاس میں شراب اُنڈیلنے لگا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ یہ خبیث اور متعصب یہودی کیوں بار بار کیچلیاں بدل رہا تھا؟ اس کے ساتھ میرے پہلے ہی ٹاکرے سے عجیب حالات رہے تھے۔ کبھی ہم دست و گریبان ہو جاتے تو کبھی دوستانہ ماحول پیدا ہونے لگتا۔ لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ ہولارڈ کسی مشکل میں گرفتار ہے، جو اسے کبھی میری طرف مکارانہ روش پر مجبور کرتی ہو تو کبھی تشدد پر......

غرضیکہ اس کی کیفیات مجھے بوکھلائی ہوئی سی نظر آتی تھیں اور میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ میں اس سے کیونکر فائدہ اُٹھا سکتا ہوں؟ یہ ابھی وقت کی دہلیز پر ایک امتحان کے پتھر کی طرح رکھا تھا۔

ہیلی نام کی اس نازک اندام حسینہ نے پانی کا گلاس بھرا اور میرے منہ سے لگایا۔ اس دوران عیار ہولارڈ بہ غور میری حرکات و سکنات پر اپنی توجہ مرکوز رکھے ہوئے تھا۔

میرے لیے یہ بڑا کوفت کا مقام ہوتا تھا جب مجھے اپنے کسی بڑے چالاک اور شاطر دشمن کو بلف کرنا ہوتا تھا تو مجھے مجبوراً سہی، اپنی فطرت کے منافی انداز و اطوار اختیار کرنا پڑتا، لہٰذا...... طوعاً و کرہاً میں نے ہنوز دل موہ لینے والی مسکراہٹ اپنے نرم و گداز ہونٹوں پر سجائے ہوئے ہیلی کو ''شوقین'' سی نظروں سے گھورا اور اپنا منہ آگے کر لیا۔ اس نے مجھے اپنے نازک ہاتھوں سے پانی پلایا اور نغمہ بکھیرتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آپ پہلے کیا لینا پسند کریں گے مسٹر شہزی؟''

''دو عدد اُبلے ہوئے انڈے کھلا دو، پھر مکھن لگا توس اور اس کے بعد کافی......'' میں نے بھی اس کی طرف دانستہ مخمور سی نظروں سے گھورتے ہوئے مسکرا کر کہا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور ناشتا کرانے لگی۔

باسکل ہولارڈ اس دوران میں وہسکی کے دو تین گھونٹ بھر چکا تھا۔

اِدھر میرا ناشتا شروع ہوا اُدھر اس نے گفتگو کی ابتدا کر دی۔

''شہزی! سچ مانو تو میں نے ابھی تک تم سے ایک بات بھی جھوٹ نہیں کہی ہے۔ جب عابدہ میرے پاس تھی اور مجھے پتا چلا کہ تم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ امریکا میں قدم رکھ چکے ہو تو میں نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ تمہارے سامنے کسی قسم کی لڑائی والا محاذ کھڑا نہیں کروں گا بلکہ مذاکرات کی میز پر تمہارے ساتھ یہ گمبھیر معاملہ حل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں منہ چلائے جا رہا تھا اور ہیلی میرے منہ میں اُبلے ہوئے انڈے کے ٹکڑے چمچ سے ڈال رہی تھی۔ پھر اس نے ایک توس پر مکھن لگایا اور اسے ٹشو پیپر سے ایک سرے سے پکڑا اور میرے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس دوران میں نے دانستہ شوخ حرکت کرنا ضروری سمجھا اور اس کی مخروطی نرم اُنگلیوں کو اپنا ہونٹ اور زبان لگا دی۔ اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور نہ ہی اس حرکت کا برا منایا۔

''لیکن......'' ہولارڈ نے اپنا بیان جاری رکھا۔ ''بدقسمتی سے عابدہ کو اس دوران میں ہم سے کوئی اور لے اُڑا۔''

''کیا ابھی تک تمہیں ان نامعلوم [illegible] کا سراغ نہیں ملا؟'' میں نے اچانک درمیان میں سوال کیا۔

''ابھی تو نہیں ملا ہے لیکن...... میں اب تمہارے اس خدشے کو رد بھی نہیں کر سکتا۔''

''کیسا خدشہ؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''یہی کہ یہ حرکت اسپیکٹرم کے سربراہ اور میرے داماد لولوش کی ہو سکتی [illegible] نکلا۔ ''اب بھلا اچانک میرے خدشے کو رد نہ کرنے کی وجہ سامنے آگئی؟''

''کوئی خاص وجہ تو سامنے نہیں آئی ہے لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے کہ مجھ سے ٹکر لینے کی جرأت کرنے [illegible] صرف ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے اور وہ ہے لولوش [illegible] نے بتایا اور میرے بھٹکے ہوئے سوچتے ذہن میں ایک [illegible] چھوٹا۔ میں چپ رہا اور اس کی سنتا رہا۔ تاہم میرا دل [illegible] سے بے طرح دھڑکتا رہا۔ ہولارڈ ایک نمبر کا عیار [illegible] انسان تھا۔ اس کے لہجے اور چہرے کے [illegible] پریشان کن تاثرات سے مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ [illegible] حقیقت کا علم ہو چکا ہے کہ یہ حرکت لولوش نے کی [illegible] اسے یہ بات کسی غیر متوقع ذریعے سے معلوم ہوئی ہو [illegible] ٹائیگر فیگ کے چنگل سے ہولارڈ کا شکار چھیننے کی جرأت [illegible] صرف اور صرف اسپیکٹرم والوں نے کی ہے۔ گویا [illegible] معاملے میں یہ دو بڑے ہاتھی جہاں ایک دوسرے [illegible] زبردست حلیف بنے تھے اور اب یہی معاملہ [illegible]

ہاتھیوں کے بیچ ایک بدترین جنگ کا آغاز تھا لیکن اب دیکھنا یہ تھا کہ... ہولارڈ مجھ سے کیا چاہنے والا تھا؟ میں اس کی گرفت میں تھا اور اس سفاک آدمی سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ وہ میرا قصۂ حیات اِدھر ہی ختم کر سکتا تھا مگر کسی مجبوری نے اسے روک رکھا تھا۔ مجھے بھی اب جلد از جلد اس کی خطرناک اور سنگین ترین گرفت سے خود کو آزاد کروانا تھا۔

وہ تھوڑا رک کر میرے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، جبکہ میں اب ہیلی کے نرم نازک ہاتھوں سے کافی کے سپ بھرنے میں مگن تھا۔

''تو اس کا مطلب ہے تمہیں اس بات کا پتا چل چکا ہے کہ تمہارے منہ سے شکار چھیننے کی جرأت کرنے والا لولوش ہی ہے۔''

''ہاں!'' بالآخر میں نے اس شاطر کو سچ اُگلوانے پر مجبور کر ہی دیا۔

''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ حرکت اسپیکٹرم کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔''

''[illegible] شہزی!'' ہولارڈ بولا۔ ''مجھے تمہارا جملہ [illegible] ہے کہ طاقت اور مفادات کے کھیل میں انسان بڑے سے بڑے اخلاقی درس بھول جایا کرتا ہے۔''

''چلو، یہ طے ہوا۔ اب بتاؤ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' [illegible] اسے ایک آنکھ بھی مار دی۔

''میں عابدہ کی واپسی کے لیے تمہیں استعمال کرنے کا سوچ رہا ہوں۔''

''مجھے......؟'' میرے لہجے میں بناوٹی حیرت تھی۔

''ہاں! تمہیں۔'' کہتے ہوئے وہ اپنی نشست سے [illegible] پھر چند قدم سامنے کی دیوار کی جانب بڑھائے پھر گھوم کر میری جانب پلٹا۔

''مگر تم شاید نہیں جانتے کہ لولوش کو تمہاری کس قدر شدت سے تلاش ہے۔'' اس کی بات پر میرے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ قصہ میری سمجھ میں آنے لگا تھا مگر ابھی بھی اس کے بہت سے گوشے مخفی تھے مگر میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا۔

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

''لیکن...... مجھے ہے......'' اس نے کہا۔

''تمہیں......؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں......!'' کہتا ہوا وہ دوبارہ چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا اپنی نشست کے قریب آ گیا مگر بیٹھا نہیں۔

''میں دراصل لولوش سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں، عابدہ کو حاصل کرنے کے بدلے میں......''

''یعنی تم مجھے اس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنے وجود کی سنسنی پر قابو پاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہارے ذہن میں اس سوال کا اُبھرنا ایک فطری بات ہے لیکن ہے اس کے برعکس۔'' وہ بولا۔ مجھے اس کے لہجے سے عیاری کی بُو آتی محسوس ہوئی۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور اپنے لیے ایک اور پیگ تیار کرنے لگا۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میرے اور ٹائیگر فیگ کے مابین اس قدر گمبھیر اور پیچیدہ صورتِ حال آن کھڑی ہوئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بدترین دشمن ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے تعاون کرنے کی نہج پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

''تم چاہتے کیا ہو آخر؟ کیا تمہاری یہ اطلاع کنفرم ہے کہ عابدہ کو اسپیکٹرم والوں نے ہی تم لوگوں سے چھینا ہے؟''

''ہاں!'' اس نے اعتراف کیا۔

''کمال ہے، تم خود ایک بڑی طاقت رکھتے ہو، بیک وقت جے بی سی اور ٹائیگر فیگ کے حمایت یافتہ ہو۔ دو اداروں کے بہترین لڑاکا اور ٹاپ ایجنٹس تمہارے ایک اشارے پر امریکا کو کھنگال ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور تم...... صرف ایک لولوش...... سے گھبرا گئے؟'' میں نے اپنے لہجے میں استہزائیہ سی حیرت سموتے ہوئے کہا۔

میری بات پر باسکل ہولارڈ کے چہرے پر تُندی کی ایک لہر سی اُبھری تھی، وہ اب کافی ٹھہرے ٹھہرے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ پھر تسلی کے ساتھ اس نے اپنے دوسرے پیگ سے ایک گھونٹ بھرا اور بولا۔

''شہزی! بعض معاملات میں اسپیکٹرم کو جے بی سی اور ٹائیگر فیگ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اسے امریکی سرپرستی حاصل ہے بلکہ وہ عالمی سطح پر بھی اپنی ایک ساکھ رکھتے ہیں۔ ہمارا معاملہ اور ہے، جبکہ اسپیکٹرم نے خود کو ایک عالمی خدائی فوجدار کی حیثیت سے ڈکلیئر کر رکھا ہے۔ کئی بڑے طاقتور ممالک کے خفیہ مفادات میں بھی وہ ان کے لیے آزمودہ ہے۔''

''لیکن تمہیں ان کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اپنے گھاگ کمانڈو ایجنٹس کے ذریعے خفیہ آپریشن کر ڈالو اور عابدہ کو اس کی گرفت سے چھڑوالو......''

میری بات پر ہولارڈ کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا اور وہ ایسی نظروں سے میری جانب چند ثانیے تکتا رہ گیا پھر اسے جانے کیا ہوا کہ ایک قہقہہ اس کے حلق سے بلند ہوا۔

''یہ یقین نہیں آتا کہ یہ تم مجھ سے کہہ رہے ہو؟'' وہ بولا۔

''اس لیے کہ تم مجھ سے جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے فوراً کہا۔

''عابدہ کے سلسلے میں اتنی بڑی بات کہہ سکتا ہوں میں؟'' وہ معنوی حیرت سے بولا۔ ''عابدہ اگر میرے پاس ہوتی تو تم بھی اب تک یہاں زندہ نہیں بیٹھے ہوتے۔'' اس نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میں سمجھتا تھا کہ یہ حقیقت ہے لیکن مجھے محتاط رہتے ہوئے دیکھنا یہ تھا کہ آخر عابدہ کے معاملے میں یہ چالاک شخص مجھ سے ایسا کیا چاہتا تھا کیا میرے ہی ذریعے عابدہ کی بازیابی یا پھر لولوش سے اپنی کسی نئی اچانک ابھرنے والی چپقلش؟ ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں تیزی سے ابھرا تھا۔ ہولارڈ، لولوش سے اندرونی طور خائف تھا۔ وہ خود کو یا اپنی تنظیم کے کسی آدمی کو عابدہ کی بازیابی کی مہم میں شامل نہیں رکھنا چاہتا تھا یا پھر خود در پردہ اس مہم میں شامل رہتا اور مجھے آگے رکھتا، تاکہ کامیابی کی صورت میں وہ میرے ذریعے سے عابدہ کو بھی حاصل کرلے اور یہ ''مہم'' بھی میرے سر تھوپ دے۔

''تم لولوش سے اس سلسلے میں مذاکرات کیوں نہیں کرلیتے؟ آخر کو تم اس کے سسر ہو؟'' کچھ سوچ کر میں نے پھر اس کی کمزور رگ کو چھیڑا۔

''میں ایسا نہیں کرسکتا۔ کم ازکم لولوش کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر بولا۔ ''حتیٰ کہ میں تو اس پر یہ بات بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا کہ عابدہ کو ہمارے قبضے سے چھڑا کر لے جانے میں اسپیکٹرم یا لولوش کا ہاتھ ہے۔ میں بے خبر رہتے ہوئے، اس کے خلاف خفیہ کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے آگے رکھ کر اور میرے کاندھے پر بندوق چلا کر......'' میں نے وضاحت کی۔

''یقیناً، کیا تم اپنی محبوبہ کو اس جادوگر کے چنگل سے آزاد نہیں کرانا چاہتے؟'' وہ مکاری سے بھویں اچکا کر مسکراتے ہوئے بولا اور میں...... ایک گہری ہنکاری بھر کے کہا۔

''ہولارڈ! یہ بات چھوڑو اور مجھے بتاؤ کہ اس معاملے میں تم مجھ پر اتنا بھروسا کیوں کرنے لگے؟ جبکہ تم جانتے ہو اچھی طرح کہ عابدہ کو لولوش کے چنگل سے چھڑانے کے بعد کیا میں یہاں کا رخ کروں گا؟''

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔'' وہ سر ہلا کر بولا۔ ''عابدہ جیسے ہی تمہارے ہاتھ آئے گی تم پہلی فرصت میں اسے لے کر پاکستان کوچ کرنے کی کوشش کرو گے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تم میری مدد کے بغیر عابدہ کو کہیں بھی نہیں لے جاسکتے، پاکستان تو دور کی بات ہے۔ ہمارے ایجنٹوں کا جال پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ صرف ایک گولی انہیں خرچ کرنا پڑے گی، تم پر نہیں، عابدہ پر......''

ہولارڈ کی فطری سفاکیت اس کی زبان پر آگئی اور میرا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہوگیا اور میں شعلہ نشاں نظروں سے ہولارڈ کو گھورتا رہ گیا۔

''ایزی مین...... ایزی۔'' وہ یک دم میری جلتی سلگتی کیفیات کو بھانپ کر بولا۔ ''اگر تم میری تھوڑی سی مدد کردو گے تو کیا ہوجائے گا؟ پھر تم بڑے آرام سے اپنی عابدہ کو لے کر پاکستان روانہ ہوجانا۔ میں خود تم دونوں کی [illegible] عالمی عدالتوں سے [illegible] ختم کروا دوں گا، ورنہ تم جانتے ہو کہ ایسے معاملات کتنے پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ملکوں کے درمیان عالمی مجرموں کی حوالگی کے سلسلے میں جنگیں چھڑ جایا کرتی ہیں ایسے میں...... اس لیے تمہارا صرف عابدہ کو یہاں سے لے جانا کافی نہ ہوگا بلکہ اس پر دائر کیس سے بھی جان چھڑانا ضروری ہے۔''

وہ بڑی مکاری سے مجھے ایک اور مسئلے میں الجھانے کی کوشش کررہا تھا مگر میں کہاں ایسی باتوں کو خاطر میں لانے والا تھا۔ میں اسے جواب دے سکتا تھا کہ عابدہ جیسی سادہ لوح اور معصوم فطرت کو مجرم بنانے والے یہ چالاک اور عیار بھیڑیا نما لوگ اپنے کالے مفادات کی خاطر اور مذموم مقاصد کی برآوری کے لیے خود ہر طرح کے غیر قانونی اور کالے قانون کو حرکت میں لاسکتے ہیں اس وقت ان کا قانون کہاں ہوتا ہے؟

لیکن میں یہ سب ابھی نہیں کہہ سکتا تھا، میں...... دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر ہولارڈ کی کون سی گوٹ میرے پاس پھنسی ہوئی اور وہ مجھے اپنے کن پوشیدہ مقاصد کے لیے استعمال کرنا

چاہتا ہے۔

''تم خاموش ہوگئے؟'' ہولارڈ نے اچانک پوچھا۔

''ہاں! میں شاید بدقسمتی سے ابھی تک تمہارا اصل مقصد جاننے سے قاصر ہوں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''جب میں نے تمہیں اب تک اپنا مقصد بتایا ہی نہیں تو کیسے جان سکتے ہو؟'' وہ مکارانہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''لیکن میرا خیال تھا کہ تم اب تک اندازہ لگا چکے ہوگے۔ خیر! میں بتائے دیتا ہوں۔ بہت سادہ سی بات ہے۔ تمہیں عابدہ کو لولوش کے چنگل سے چھڑانا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ میں بھی لولوش یا اسپیکٹرم سے بہرحال تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتا لہٰذا انہوں نے جس طرح خفیہ کارروائی کی ہے بعینہٖ ہم بھی یہی راستہ اختیار کریں گے، جبکہ لولوش کو اس بات سے بھی یکسر بےخبر رکھیں گے کہ ہمیں جیسے کچھ پتا ہی نہیں۔''

''لولوش، اس وقت کہاں ہے؟ اسپیکٹرم کا ہیڈکوارٹر یا کہ کسی خطے میں موجود ہے، نیز عابدہ کو انہوں نے کہاں رکھا ہوگا، اس بارے میں میری معلومات صفر ہیں۔''

''یہی تو وہ پیچ ہے جس پر ہم دونوں مل کر مدمقابل کے خلاف راؤنڈ طے کریں گے، مسٹر شہزی!'' ہولارڈ بولا۔ ''ساری معلومات میں دوں گا، آگے بڑھنے والے قدم [illegible] دوں گا۔ کوشش تمہاری ہوگی اور [illegible] گا۔''

''اگر ایسا ہے تو مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ویری گڈ......!'' ہولارڈ ایک دم خوش اور مطمئن ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تب ہی اس نے اپنے ایک آدمی کو مخصوص اشارہ کیا، اور اس نے فوراً آگے بڑھ کر میرے دونوں ہاتھ آزاد کردیے۔ میرا دل اندر سے مارے خوشی کے بلیوں اچھلنے لگا۔

مفادات کی خاطر ہی سہی، میری اب تک کی زندگی میں یہ ہوتا آیا ہے کہ دشمن دوست بن جاتے تھے اور دوست دشمن، ہولارڈ بھی میرا بدترین دشمن تھا بلکہ ہے۔ اگر اس نے میری جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا تو میں نے بھی مصلحتاً ایک ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا تھا۔

میرے ہاتھ آزاد ہوتے ہی میری کیفیات یوں ہونے لگیں جیسے کسی بھوکے شیر کو ایک دم پنجرے سے آزادی مل گئی ہو۔

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ مارچ 2019ء
کی جھلکیاں

محسن اردو
وہ غیر مسلم تھا لیکن اس کا حکم تھا اسلامی کتب چھاپنے سے پہلے تمام مزدور وضو کرلیں۔ طباعت کی دنیا میں انقلاب برپا کردینے والے کا زندگی نامہ۔

شہنشاہ جذبات
فلمی دنیا کے ایک تابندہ ستارے کی داستان جہد مسلسل

اتفاق
لوگ جسے بدقسمتی سمجھتے ہیں وہی ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے

کالا جادو
یورپ میں کالا جادو کس طرح مقبول ہوا، دلچسپ معلومات

کرب آشنائی
وہ سفید خون والے رشتے داروں میں گھری ہوئی تھی

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے اور تاریخی حقائق۔
ایسی تحریریں جو سرگزشت کی پہچان ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود
گرویدہ ہوجائیں گے۔

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

میں تو عابدہ کے دشمن نمبر ایک ہولارڈ کو اسی وقت جہنم واصل کرنے کے لیے بے چین ہو گیا، اگر معاملہ عابدہ کی بازیابی کا نہ اٹک گیا ہوتا۔

اب باسکل ہولارڈ اور میرے درمیان ایک دوستانہ فضا قائم ہو چکی تھی۔

ایک سوال میرے ذہن میں بار بار اُبھر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا جواب ہولارڈ نے مجھے بھی دیا تھا کہ لولودش نے مجھے جھکانے کی خاطر ایسا قدم اُٹھایا تھا، وجہ ظاہر تھی کہ اسپیکٹرم کو سب سے زیادہ میں نے ہی نقصان پہنچایا تھا۔ ان کے اہم ترین مگر مذموم مقاصد سے لے کر ان کی اعلیٰ قیادت کا خاتمہ سمیت اسپیکٹرم کی عالمی ساکھ بھی متاثر ہوئی تھی۔

ایک لحاظ سے لولودش بھی عابدہ کا مجرم تھا۔ کیونکہ ابتدا میں لولودش نے باسکل ہولارڈ کے ہی کہنے پر میرا راستہ کھوٹا کرنے اور مجھے جانی نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں اور اب بھی مصروف تھا۔ مگر اسے ہر بار میرے ہاتھوں ہزیمت ہی اُٹھانی پڑی تھی۔

ہولارڈ نے مجھے چند گھنٹے آرام کرنے کا مشورہ دیا اور اس کے بعد ہی مل بیٹھ کر آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے کا کہا۔

وہی دونوں آدمی مجھے لیے ایک دوسرے کمرے میں پہنچے، اس کمرے کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔ یہ نسبتاً شاندار اور آرام دہ کمرا تھا اور کشادہ بھی۔ ہر آسائش یہاں موجود تھی۔

خدمت کے لیے وہ طرح دار حسینہ میرے سامنے خندہ پیشانی کے ساتھ موجود تھی۔ اس کی خوبصورت کشادہ آنکھیں اس سے مخموری ہو رہی تھیں۔

میں نے بھی جواب میں اس کی طرف معنی خیز مسکراہٹ سے... گھورنا ضروری سمجھا تھا۔

"مسٹر شہزی! اگر آپ کی نیند پوری نہیں ہوئی تو آپ آرام کر سکتے ہیں۔ یہاں آپ کے سائز کے کپڑے بھی موجود ہیں اور ضرورت کی ہر شے بھی، پھر بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ والی بیل بجا دیجیے گا، میں حاضر ہو جاؤں گی۔"

وہ مترنم لہجے میں بولی۔ اس کی نگاہوں میں مجھے کچھ ایسا تاثر محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میری مردانہ وجاہت سے بُری طرح متاثر ہو، اس کا انداز میرے سامنے بچھے جانے کا تھا کہ بس اک "اشارے" کی دیر تھی اور وہ اپنا سب کچھ مجھ پر وار دینے کو تیار ہو۔ میرے اندر کے "اسپائی ایجنٹ" نے فوراً اس کی یہ چال بھانپ لی تھی۔

خوب صورت اور حسین لڑکیوں کا استعمال خفیہ انٹلی جنس کا سنگین اور ایک خطرناک ہتھیار ہوا کرتا ہے۔ اس میں "را" اور اسرائیلی سیکرٹ ایجنسی "موساد" کا نام قابلِ ذکر رہا ہے۔ سی آئی اے یا ٹائیگر ٹیک میں ایسا کچھ نہیں سنا گیا تھا، لہٰذا ہیلی پر مجھے جے بی سی کی ایجنٹ کا ہی شبہ ہوا تھا۔

یہ سوچتے ہی میرے ذہنِ رسا میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ ایک خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں کلک ہوا۔ مجھے اس سے حد درجے محتاط رہنے کی ضرورت تھی، لہٰذا میں نے اپنی پہلے والی دل پھینک سی روش برقرار رکھی اور جہازی سائز کے نرم و گرم بیڈ پر تھکے تھکے انداز میں گرتے ہوئے ہیلی سے کہا۔

"مس ہیلی! یہ تو میرے لیے ایک نعمت سے بڑھ کر نہیں، پھر اس آرام اور عیش بھرے... ماحول میں تمہارا ساتھ...... اور کیا چاہیے۔"

میں نے دیکھا ہیلی کے حسین چہرے پر یک دم چونکنے انداز کے تاثرات کی ایک تیز سی رمق اُبھری اور غائب بھی ہو گئی۔ اس نے بظاہر دل لُبھانے والے انداز میں شگفتگی سے کہا، لیکن درحقیقت اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"حیرت ہے، تم حسن کے اتنے شائق ہو مگر شراب کو تو بالکل ہاتھ نہیں لگاتے؟"

"میں پہلے پیتا تھا۔" میں نے بات بنائی اور بیڈ پر نیم دراز [illegible] ساتھ میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا۔ وہ جیسے [illegible] دھاگے سے بندھی بیڈ کی طرف کھنچی چلی آئی۔

اس نے بھی میرے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا تھا۔

اس نے جیسے ہی اپنا نرم و گداز ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا، میں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ پکے ہوئے پھل کی طرح میرے اُوپر آن گری۔ میرا دایاں ہاتھ اس کا مرمریں بدن سہلاتے ہوئے جب اس کی پشت سے دائیں پہلو اور پھر نیچے کو سرکنے لگا تو حسبِ توقع مجھے وہاں کوئی سخت سی شے محسوس ہوئی تھی، میں نے بھی اپنے ہاتھ کے "سفر" کو واپسی کی جانب گامزن کرتے ہوئے اس کی پشت پر کر لیا اور اسی دوران اس کے عنابی اور گداز لبوں کا بوسہ بھی لے لیا۔

عورتوں کے معاملے میں میرا تجربہ ایسا ہی تھا جیسے کسی مالی کو اپنے آم کے باغ کا پورا علم ہوتا ہے کہ کون سے پیڑ کو کب اور کس کے ساتھ "قلم" لگاتا ہے۔ ایک مرد کا دوسرے مرد سے معاملہ اور ہوتا ہے، لیکن جہاں صنفِ مخالف کی بات آجائے تو اس میں ایک لطیف انداز کی گنجائش ضرور رہتی ہے، نفسیاتی دباؤ کا ایک باریک اور اَن دیکھا کچا دھاگا اجنبی عورت اور مرد کے درمیان بندھا رہتا ہے۔ یہی وہ دھاگا ہوتا ہے جسے وقت پر کھینچنا یا توڑنے والا دو طرح سے وار کرتا ہے، یا اسے بے وقوف بناتا یا پھر اس پر اپنا اعتماد بٹھا لیتا ہے، لیکن یہاں معاملہ اعتماد قائم کرنے سے زیادہ "بے وقوف" بنانے کا تھا اور وہ بھی ایسی عورت کو جو تربیت یافتہ ہو اور اس کے ذمے کوئی اہم ٹاسک سپرد کیا گیا ہو، کیونکہ یہی کچھ "کھیل" ہیلی بھی میرے ساتھ کھیل سکتی تھی، اب دیکھنا یہ تھا کون کس کو بلف کرتا ہے جبکہ ہیلی کو میں صرف اسی صورت میں.... بلف کر سکتا تھا جب میں اس کے روایتی ہتھیاروں کے جال میں پھنسنے لگتا۔

مجھے شبہ تھا کہ ہیلی کا ٹائیگر ٹیک سے کوئی تعلق نہ تھا، [illegible] جے بی سی کی ایک منجھی ہوئی ایجنٹ تھی۔ اسرائیلی خفیہ ایجنسیوں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے، وہ اپنا آدمی "اپنوں" میں بھی گھسا کر رکھتے ہیں۔ ہیلی بھی مجھے ایک ایسی ہی "گھس بیٹھی" ایجنٹ معلوم ہوتی تھی۔ میری بصری "آبزرویشن" اور "مانیٹرنگ" نے سگنل دیا تھا۔

[illegible] تھی، کیونکہ [illegible] ہیلی اندر داخل ہوئی تھی اور مجھے ناشتا کروا رہی تھی تو اسی دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ باسکل ہولارڈ کا ہیلی کے ساتھ تحکمانہ رویے سے زیادہ "دوستانہ" قسم کا رویہ تھا۔

بہرکیف چند سیکنڈوں کی محض اٹکھیلیاں کرنے کے بعد جب وہ پوری طرح خودسپردگی کی سطح پر پہنچنے لگی تو میں نے گھبرانے کی اداکاری شروع کر دی اور اپنے چہرے پر انجانے اندیشوں کا خوف سمالیا۔

"کیا ہوا ہنی...؟" اس نے خمار آلود لہجے میں پوچھا۔

"کک... کچھ نہیں، بس...... بس وہ ایک بے چینی سی دل کو اچانک ہو رہی ہے۔"

"کیسی بے چینی؟" ہیلی نے اپنے بھرے بھرے گداز ہونٹوں کو سیکس اپیل انداز میں وا کیا۔ اس کے دلکش لبوں کے درمیان موتیوں جیسے سفید دانتوں کی جھلک دلکش انداز میں دکھائی دی۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ ضرورت پڑنے پر میں ہیلی کے خلاف اپنے وہ دونوں خلائی ہتھیار استعمال کرنے میں ذرا بھی تامل سے کام نہیں لوں گا۔

"سوچ رہا ہوں کہیں ہولارڈ میرے ساتھ کوئی چال تو چلنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے؟" میں نے اُلجھ کر کہا۔ وہ مترنم سی آواز کے ساتھ ہنسی۔

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے شہزی ڈارلنگ! یہ تمہارا محض وہم اور فطری خوف ہے۔ مسٹر ہولارڈ! ڈیل اور وعدے کے پکے ہیں، ان سے ڈرنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔"

اس کے جواب پر میں سوچتا بن گیا لیکن سوچ میں یہ رہا تھا کہ کیا اس پر اسی وقت قابو پا کر ہولارڈ کو جہنم واصل کرنے اور یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی جائے یا پھر ابھی مزید مناسب موقع کا انتظار کیا جائے۔

کیونکہ عابدہ کی بازیابی کا معاملہ پھر بھی اٹکا ہوا تھا، کیا خبر اس ڈیل کے نتیجے میں، میں ہولارڈ کو بلف کرنے میں کامیابی حاصل کر لوں جبکہ اب تو ٹائیگر ٹیک اور اسپیکٹرم کے بیچ بھی ایک سرد جنگ سی ٹھن چکی تھی۔

لیکن یہ بات بھی طے تھی کہ اسپیکٹرم سے ٹائیگر ٹیک یا ہولارڈ کترا رہا تھا۔ جے بی سی واحد تنظیم تھی جو اسپیکٹرم سے ٹکر لے سکتی تھی۔

کبھی ذہن میں یہ شبہ اُبھرتا کہ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ باسکل ہولارڈ کے ذاتی معاملات یا اس پر نگاہ رکھنے کے لیے جے بی سی نے خصوصی طور پر ہیلی کو ایک جاسوسہ کے طور پر ہولارڈ کے سر پر مسلط کر رکھا ہو؟ کیونکہ اسرائیلی انٹلی جنس بہرحال یہودیوں کی مداخلت سے نالاں رہتے تھے۔

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ہیلی نے اپنی مرمریں باہیں میرے گلے میں حائل کر دیں اور اپنے نرم ہونٹ میری جانب بڑھائے تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا..... میں اور ہیلی بیڈ پر سے یوں اُچھلے جیسے بیڈ پر کسی نے بچھو پھینک دیے ہوں۔

دروازے پر ٹائیگر ٹیک کے وہی دو مسلح افراد خودکار گنیں تانے کھڑے تھے۔ میرے لیے تو خیر یہ سب غیر متوقع تھا مگر یہ دیکھ کر تو ہیلی کا حسین چہرہ ایک دم فق ہو کر رہ گیا تھا اور وہ دونوں ٹائیگر ٹیک کے مسلح کارپرداز اسی کی جانب اپنی گنوں کا رخ کیے بڑی خوں ناک نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔

میرا دل ایک گہری تشویش تلے تیزی سے دھڑکنے لگا، اعصاب یکلخت تن گئے۔ میں ابھی اسی مخمصے کا شکار تھا کہ یہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے کہ اچانک ہیلی، جو اب تک نیم برہنہ سی تھی، مثلِ پارا بن گئی، اس نے اپنے ادھ کھلے اسکرٹ کو جیسے

نوچ کر پھینکا، میری پھیلی ہوئی آنکھیں، غیر ارادی طور پر اس کی سبک رورانوں پر جم گئیں، وہاں اس کی باریک اور سرخ سی "پینٹی" پر دائیں بائیں دو چھوٹے ٹوٹولیڈیز پسٹل اٹکے ہوئے تھے، اس نے تیزی سے اُلٹی قلابازی کھائی۔ میں اس سارے پُراسرار چکر پر لمحہ بھر کو ہونق سا بن کر رہ گیا تھا۔

"شہزی! نیچے لیٹ جاؤ جلدی......"

اچانک ٹائیگر فیک کے ان تینوں کارپردازوں میں سے ایک حلق کے بل چلّایا۔ پھر تو جیسے میرے جسم میں پارا دوڑ گیا۔

ادھر میں نے بیڈ سے فرش پر ان کی جانب جست بھری اُدھر...... ہیلی نے قلابازی لگانے کے دوران ہی بڑے "میکینکل" انداز میں ان پر بیک وقت دو فائر جھونک مارے...... جبکہ بعین ایسے ہی پُرخطر لمحات میں ٹائیگر فیک کے ایک کارپرداز نے ہیلی پر برسٹ فائر کیا۔ بیڈ دیکھتے ہی دیکھتے چھلنی ہوگیا اور اس میں سے ان گنت باریک روئیں ادھر اُدھر کو نکلے اور کمرے کی محدود فضا میں معلق سے نظر آنے لگے۔ ساتھ ہی مجھے ایک کارپرداز کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ وہ شاید ہیلی کے چلائے ہوئے پستولوں کی کسی گولی کی زد میں آگیا تھا۔

میں نے دیکھا ہیلی تو جیسے بجلی بنی ہوئی تھی، اس نے الٹی جست لگاتے ہی، خود کو پہلے گولیوں کی زد سے بچایا اور پھر ایک بڑے فینسی شوکیس کی آڑ لیتے ہی لیٹے لیٹے اس نے دوبارہ برسٹ فائر کرنے والے پر تلے اُوپر گولیاں داغیں، اس کے سینے سے خون کا فوارہ اُبلا اور وہ گن سمیت گرا۔

"شہزی! فوراً ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کرو اور میرے ساتھ آؤ جلدی۔" اچانک میری گم صُم سی سماعتوں میں ہیلی کی آواز ٹکرائی اور میں شدید قسم کے مخمصے میں مبتلا ہو گیا۔ اسی وقت باہر راہداری میں شور کے ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آوازیں اُبھریں۔

"شہزی! وقت کم ہے، جلدی......" ہیلی کی جوش سے مرتعش آواز دوبارہ ٹکرائی اور میں بہ سرعت حرکت میں آیا۔ ٹائیگر فیک کے دونوں ایجنٹوں کی لاشوں کے پاس سے میں نے ان کی گنیں اُچک لیں اور اُدھر ہیلی نے کیچ کے انداز میں ہاتھ بڑھایا تو میں نے ایک اس کی طرف اُچھال دی اور چلّا کر بولا۔

"یہ سب کیا ہے ہیلی؟ میں سمجھ نہیں پار رہا ہوں۔"

"شہزی! مجھے اپنا ساتھی سمجھو اور ابھی وقت نہیں ہے، یہاں سے نکلو۔" وہ بولی اور اس نے ایک کونے والے دروازے کو لات رسید کی، وہ کھلتا چلا گیا۔

"لل...... لیکن میں ہولارڈ کے ساتھ......" میرے الفاظ منہ میں رہ گئے، وہ پھر چلا کر بولی۔

"میں عابدہ کی ساتھی ہوں، مجھے یہ بتانا پڑ گیا، کرا بگڑ ہے، اب ہم دونوں کی جانیں خطرے میں ہیں، بھاگو۔" اس کا یہ کہنا تھا کہ میرا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

اس کی "ساتھی" والی بات پر چونکے بنا نہ رہ سکا...... یہ میرے لیے ایک نئی اور سنسنی خیز سچویشن تھی۔

اسی وقت کمرے میں کوئی تین چار مسلح افراد داخل ہوئے۔ میری گن کا رخ چند سیکنڈ پہلے ہی [illegible] دروازے کی طرف ہو چکا تھا۔ لیکن مجھ سے پہلے ہیلی نے برسٹ فائر کیا۔ چند ایک چلا کر ڈھیر ہوئے باقی دائیں بائیں لڑھک گئے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور چھلانگ لگائی۔

ہم دونوں اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے سے باہر کو لپکے تو ایک ہال سے کمرے میں آگئے۔ وہاں سے ہیلی دیوار کے ساتھ لگی چھپی ہوئی ایک زینے کی طرف بڑھنے لگی، میں اس کے پیچھے تھا۔ وہ مختصر باس میں تھی۔ وہ فقط اپنے پنسل ہیل والے سینڈل ہی پہن سکی تھی۔ [illegible] بعد میں کھلا اور ایسا کھلا کہ میں انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ میں جو اسے اب تک ٹائیگر فیک کے تعلق سے آزاد اور جے بی سی کی ایجنٹ سمجھے ہوئے تھا، اب اسی کی زبانی عقدہ کھلتے ہی کہ وہ عابدہ کی ساتھی تھی، میری نظروں میں اب پل کے پل اس کی اہمیت آنسہ خالدہ اور سوزی جیسی ہو گئی تھی۔

ابھی اس نازک صورتِ حالات میں ان باتوں پر مزید غور کرنے کا وقت نہ تھا۔

ہم زینے، تیزی سے چڑھتے چلے گئے۔ لگتا تھا ہیلی یہاں ایک ایک گوشے سے واقف تھی۔

وہاں ایک گیلری تھی اور ساتھ ہی ایک اور طویل بالکونی۔ اسی جگہ پر گولیوں کی بھیانک تڑاتڑ اُبھری، ہیلی جھکائی دے کر گری اور میں نے بھی یہی کیا۔ بچنے کے لیے کیا ایسا اس نے گولیوں کی بوچھاڑ سے پھیلتے ہوئے ایک تنہا تھا، ہم دونوں چکنے ماربل کے فرش پر چت لیٹ گئے، کھلی جگہ پر لڑھکے ہی تھے کہ اچانک تین مسلح افراد نے ہم پر بیک جست بھری، ایک نے ہیلی

گویا وہ چاہتا تھا کہ وہ فرش پر پشت کے بل لیٹے لیٹے پھرکی کی طرح گھومی اور اس کی رانوں تک برہنہ ٹانگ کسی کھنچی ہوئی کمان کی طرح پنکھے کی صورت گھومی، تب اس کی سینڈل کی پنسل ہیل مدِمقابل کی کنپٹی پر پڑی، اس کے حلق سے دل ہلا دینے والی کربناک چیخ اُبھری۔

پنسل ہیل نصف تک اس کی کنپٹی میں پیوست ہو چکی تھی، ادھر میں نے اپنے مدِمقابل کو فرش پر لیٹے لیٹے اپنی دونوں ٹانگوں کے "لیگ لاک" میں پھنسایا اور گھما کر ایک جانب اس زور سے اُچھالا کہ وہ بالکونی کی ریلنگ سے ٹکرایا اور چیختا ہوا نیچے جا رہا۔

تیسرا وہ بدحواسی سے دست بردار ہونے کی کوشش میں اپنی گن کی نال تولتا ہی رہ گیا اور ہیلی کسی برق کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ مجھے وہ مارشل آرٹ کی ماہر معلوم ہوتی تھی۔ اور تیسرے حملہ آور نے اس پر برسٹ فائر کیا اُدھر وہ فضا [illegible] گولیوں کی پوری باڑ بالکونی کی فولادی ریلنگ [illegible] چنگاریوں کی آبشار چھوڑتی ہوئی ادھر اُدھر اُچٹتی [illegible] ہیلی برقِ آسماں کی طرح اس پر کڑکی۔ وہ بھی گویا [illegible] لیے ہوئے تھا، اس نے فلائنگ کک سے بچنے کی [illegible] چاہی تھی اور کافی حد تک ہیلی کے اس مہلک وار سے خود کو بچا بھی گیا مگر [illegible]

[illegible] اس کے قریب فرش پر پورے قد سے گری تھی کہ تیسرے حملہ آور نے ایک کے برہنہ مرمریں کاندھے پر [illegible] کی ضرب لگانے کی کوشش چاہی، ہیلی نے [illegible] دی مگر اس کی برہنہ ٹانگ کی ڈوری حملہ آور کے ہاتھ [illegible] لاک ہو گئی تھی اور کھینچتی چلی گئی۔ ہیلی کے حلق سے گھبرائی ہوئی چیخ خارج ہوئی، وہ قدرے بوکھلا گئی۔

تب تک میں اس "نازک" موقع پر لڑھکنی لگا کر تیسرے حملہ آور کے پیچھے سے طلوع ہوا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کو لٹھ کی طرح گھما کر اس کے سر کے پچھلے حصے پر رسید کیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہوگیا۔

اسی اثناء میں زینے بھاری بوٹوں کی دھمک سے گونجنے لگے۔

"اس طرف...... جلدی......" ہیلی اپنا لباس درست کرتے ہوئے بولی۔

میں اب اسی کے کہنے پر عمل پیرا تھا۔ وہ بالکونی سے متصل اسی کمرے کے دروازے کی جانب بڑھی تھی جہاں سے چند لمحوں پہلے ہی وہ تین مسلح حملہ آور برآمد ہوئے تھے۔

وہاں سے ہم ایک اندھیرے گوشے میں غروب ہو گئے، مجھے تو ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ ہیلی کو راستوں کا اندازہ تھا، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں اندھے کی طرح راہ پاتا گرتا پڑتا اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ ایک اور زینہ طے کرتی ہوئی نیچے آگئی۔ یہاں قدرے روشنی تھی اگرچہ مدھم تھی، نظر آتا تھا کہ یہ اس عمارت کی بیسمنٹ کا کوئی حصہ تھا۔ مگر یہاں چند ہی گاڑیاں کھڑی نظر آتی تھیں، درمیان میں بیشتر جگہ خالی تھی۔

اچانک بیسمنٹ کے اس وسیع ہال کی فضا میں مخصوص سیٹی کی آواز اُبھری۔

"ٹیئر بم...... ہوشیار......" مجھ سے پہلے ہیلی نے آواز کو پہچان لی اور جلد ہی ہمیں ایک طرف دو کنستر سے پھینکے ہوئے ٹیئر بم لڑھکتے دکھائی دیے۔ وہ آناً فاناً گاڑھا گاڑھا دھواں چھوڑنے لگے۔

میں پریشان ہو گیا، جانتا تھا میں کہ یہ ٹیئر گیس کس تیزی کے ساتھ پھیلنے والی تھی۔ ایسے میں ہیلی نے ایک کیری ٹائپ گاڑی کے دروازے کا شیشہ توڑا اور اندر ہاتھ ڈال کر دروازہ کھول لیا۔ میں اس کا مطلب بھانپتے ہی دوسرا دروازہ کھول کر جانب سے جب تک ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں براجمان ہوا اسٹیئرنگ سنبھال چکی تھی، اگلے ہی لمحے اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گیئر بدل کر ایکسلریٹر دباتی چلی گئی۔ نیلے رنگ کی کیری کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے حرکت میں آئی۔

"جو بھی نظر آئے بھون ڈالو......" ہیلی نے غرا کر مجھ سے کہا اور میں گن تھام کر محتاط ہوگیا۔

اسی وقت عقب سے گولیوں کی بوچھاڑ اُبھری۔ کیری کو کورڈ پارکنگ فلور پر زگ زیگ انداز میں گھماتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح مختلف موڑ کاٹتی دوڑاتی چلی اور آخر ایک خطرناک سلوپ پر لے آئی اور سامنے گیٹ تھا۔

"مضبوطی سے بیٹھنا شہزی۔" اس نے اتنا کہا تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ ہیلی نے بھی ایک ہاتھ کو حرکت میں لا کر یہی کیا۔

کیری گیٹ سے ایک تباہ کن دھماکے کے ساتھ ٹکرائی، دروازہ ٹوٹا اور اگلے ہی لمحے گاڑی ایک وسیع رو[illegible] پر دوڑنے لگی۔

چند ثانیوں بعد ہی وہ ایک ذیلی سڑک پر دوڑ ر

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

تھی۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کیری آندھی طوفان کی طرح دوڑتی رہی۔

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا اور کہا۔

''تین گاڑیاں تعاقب میں آرہی ہیں۔''

''تم پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ، یہ لوگ آسانی سے ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

ہیلی نے کہا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا، اس نے مجھے یہ ہدایت دیتے ہوئے اپنی گن بھی ایک ہاتھ میں پکڑ کر اسے مخصوص جھٹکا دیا اور گود میں رکھ لی۔ گویا بوقتِ ضرورت، ڈرائیونگ کے دوران بھی وہ اسے کام میں لانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

اسی وقت کیری کو ہیلی نے ایک خطرناک ٹرن دیا۔ موڑ کاٹنے کے دوران کیری ایک سائڈ سے اُٹھ گئی، میں پچھلی سیٹ پر لڑھکتے ہوئے بچا، یوں لگا جیسے ابھی وہ اُلٹ جاتی کہ ہیلی نے بڑی مہارت سے اسے بچایا اور اسٹیئرنگ ایکسپرٹیز کی طرح اسے جب تک سنبھالا تو وہ موڑ کاٹ چکی تھی۔

اب بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ ہیلی نیم برہنہ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھی تھی اور میں بالکل پچھلی سیٹ پر تھا۔

ٹائیگر لیگ کے ایجنٹ دو تیز رفتار اسپورٹس کار اور ایک بڑی سی وین میں ہمارے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

میں نے گن کا فولادی کندا شیشے پر رسید کرکے اسکرین توڑ ڈالی اور ابھی اپنی گن کی نال مطلوبہ پوزیشن میں لانے ہی لگا تھا کہ ان گاڑیوں میں سے جو اگلی کار تھی، سواروں نے ہم پر گولیاں داغنا شروع کردیں۔

اس سڑک پر لوگوں کی آوک جاوک نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں نیچے جھکا اور ہیلی نے عقب سے فائرنگ کی آواز سنتے ہی کیری کو دائیں بائیں لہرانا شروع کردیا۔

چند گولیاں کیری کی باڈی پر زناٹے کی آواز سے ٹکرائی تھیں۔

میرے پاس بھی انہی سے چھینی ہوئی بہترین اسالٹ رائفل تھی، لہٰذا میں نے بھی ذرا سنبھل کر محتاط انداز میں تاک کے ایک برسٹ فائر کیا۔

میرا نشانہ اگلی کار تھی، میں نے اس کی ونڈ اسکرین ایک دھماکے سے کرچیوں میں بدلتے دیکھی اور شاید ڈرائیور کو بھی کوئی گولی لگی تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے کار لہرائی اور کسی کھلونے کی طرح اُلٹ پلٹ ہوتی ہوئی دائیں جانب کے پائن کے جھنڈ میں جا پڑی۔

اس کے عقب سے کار اور وین نمودار ہوئی، یوں کہ دونوں ایک ساتھ متوازی دوڑ رہی تھیں۔ کار... کی دونوں کھڑکیوں سے مجھے آتشیں ہتھیاروں کی جھلک نظر آئی اور اسی طرح وین کی چھت پر مجھے ایک شخص سینے تک باہر نکلا ہوا دکھائی دیا، یکلخت میری رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔

اس کے پاس راؤنڈ ڈ (گول) میگزین والی مشین گن تھی۔ جس کی نچلی نال سے راکٹ بھی فائر کیا جاتا تھا۔

''واؤ......! لگتا ہے تم نے دشمن کی ایک گاڑی اُڑادی ہے۔'' ہیلی کی مسرت بھری آواز اُبھری۔

''ہم اب بھی خطرناک صورتِ حال سے دوچار ہیں، دشمن راکٹ فائر کرنے والا ہے۔''

میں نے ہانپتی سی آواز میں [illegible] اس کی [illegible] کرتے ہوئے کہا تو بے اختیار اس نے پھر [illegible] لیے [illegible] انداز میں منہ سے اُگلا۔

''او مائی گاڈ......!''

ایسے میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بجائے اب تسلسل سے ''تڑا تڑی'' اُبھری، کیونکہ دشمن ایک کیری پر گولیاں برسائے جا رہا تھا۔

یہ وین کی چھت والے کی کارستانی تھی جس [illegible] راکٹ مشین گن سنبھالی ہوئی تھی۔ ہیلی نے اسی وقت [illegible] اسٹیئرنگ دائیں جانب کاٹا، گاڑی اُلٹتے [illegible] [illegible] کاٹتے ہی رفتار بھی بڑھاتی چلی گئی۔

یہ علاقہ رہائشی تھا، جس کے ایک جانب [illegible] چھوٹے بڑے مکانوں کی قطاریں تھیں [illegible] درمیان میں، پچیس فٹ کا فاصلہ تھا، [illegible] پام کے درختوں کا سلسلہ تھا اور ان کے پار بھی [illegible] کاٹیجز کی جھلک نظر آرہی تھی۔

میں نے اس بار بیک اسکرین کے بجائے [illegible] طلوع ہوکر ایک برسٹ فائر کیا۔ نشانہ اس بار وہ وین [illegible] کی چھت پر دشمن ایک خطرناک آتشیں ہتھیار [illegible] ہوئے تھا اور وہ کسی بھی وقت ہم پر راکٹ [illegible] گولیوں کی بوچھاڑ پر وین کے ڈرائیور نے [illegible] وقت اس کی چھت سے دشمن نے راکٹ فائر کردیا، [illegible] دھواں کی لکیر عقب میں چھوڑتا ہوا ہماری کیری کی جانب لپکا۔

''راکٹ......!'' میں ہیلی سے چلا کر اتنا ہی [illegible]

اس نے اسٹیئرنگ کاٹا، ایک زبردست [illegible]

[illegible] کی آواز سے آتشیں راکٹ کو میں نے اپنی پچھلی [illegible] کے سامنے سے...... کھڑکی کے بالکل قریب، [illegible] دیکھا، وہ آگے جاکر پائن کے ایک درخت سے [illegible] ساعت شکن دھماکے سے پھٹا۔

کیری دائیں جانب پام کے مختصر جنگل میں اُتر گئی اور [illegible] ہچکولے کھانے لگی۔ مجھے خود کو سنبھالنا دشوار ہونے [illegible] میں نے چلا کر ہیلی کو ہدایت کی کہ گاڑی کو سڑک پر لے [illegible] اور اسی وقت میں نے ایک برسٹ فائر کردیا۔ میرا [illegible] ایک بار پھر خطا گیا۔

ہیلی گاڑی کو دوبارہ سڑک پر تو نہ لاسکی البتہ جنگل کے [illegible] سے راستے پر ہولی اور رفتار بھی بڑھا [illegible] راستہ قدرے ہموار تھا، میں نے دوبارہ پوزیشن [illegible] وقت تعاقب میں آتی ہوئی کار ہمارے [illegible] وین دائیں جانب سے اوورٹیک کی [illegible] کرنے لگی۔

دشمن کی [illegible] کو بتدریج قریب آتے دیکھ کر [illegible] چلا دیا، لیکن اسی وقت ہم پر بھی بیک [illegible] میں نیچے جھک گیا۔ کئی گولیاں گاڑی کی [illegible] تب ہی مجھے ہیلی کی چیخ سنائی دی اور کیری [illegible] میرے اوسان خطا [illegible]

[illegible] ہو؟'' میں نے بوکھلا کر اسے [illegible] مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا، میں [illegible] سیٹ کی جانب پلٹا ہی تھا کہ کیری [illegible] مجھے یوں لگا جیسے پوری دنیا گھوم گئی ہو، میں بھی [illegible] کہیں ایک جگہ تھی، تو میں نے اپنے [illegible] مجھے چوٹیں تو آئی تھیں مگر وہ قابل [illegible] میں نے اپنے سر کو گاڑی کی باڈی [illegible] کوشش کی تھی۔

[illegible] اُلٹ چکی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر ہیلی پھنس [illegible] تھی کہ میں نے گن سنبھالی اور اسے [illegible] ہیلی کو سنبھالنے میں وقت ضایع [illegible] ٹوٹی ہوئی عقبی اسکرین کے پار دیکھا، [illegible] فاصلے پر رک گئی تھیں اور ان میں سے پانچ [illegible] اُتر کے دائیں بائیں پوزیشنیں باندھنے میں [illegible] میں نے ان پر برسٹ چلا دیا، دشمن کچھ [illegible] میں نے ہیلی کو سنبھالتے ہوئے اسے لیٹے لیٹے [illegible] اس کے سر اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا، مجھے

تشویش لاحق ہوگئی کہیں گولی اس کے سر میں تو نہیں پیوست ہوگئی تھی؟ لیکن جلد ہی میں نے اس کے بائیں بازو سے خون اُبلتا ہوا دیکھ کر سکھ کی سانس لی تھی۔

گولی کے نشان کی ''انٹرنس'' اور ''ایگزٹ'' دیکھ کر ہی میں بھانپ گیا تھا کہ وہ بازو کا گوشت چیرتی ہوئی آرپار ہوگئی تھی۔

نیم برہنہ ہونے کے باعث اسے سنبھالتے ہوئے میرے ہاتھ اس کے چکنے...... بدن پر پھسلے جا رہے تھے، یوں مجھے دقت ہونے لگی، وہ بھی کچھ ہوش میں آنے لگی تھی۔ میں نے اس کی گن بھی اُٹھالی تھی۔

''ہیلی! ہوش میں آؤ، ہم خطرے میں گھرے ہوئے ہیں۔'' میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس نے بھی صورتِ حال کی نزاکت کو بھانپ لیا اور خود کو فوراً سنبھالا۔

میں نے گن اسے تھمائی ہی تھی کہ ایک تواتر کے ساتھ فائرنگ شروع ہوگئی۔ نشانہ ہماری کیری تھی۔ اس کے فوراً بعد ایک راکٹ بھی فائر کیا گیا۔ کیری ایک دھماکے سے تباہ ہوگئی اور آناً فاناً شعلوں میں گھر گئی۔

شکر تھا کہ میں تب تک ہیلی کو سنبھالتا ہوا پام کے جھنڈ میں داخل ہوچکا تھا۔

ہیلی اپنے قدموں پر کھڑی ہوگئی تھی مگر لڑکھڑاہٹ غالب تھی۔ وہ زخمی بھی تھی، مگر اس نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری تھی، حیرت انگیز قوتِ ارادی سے کام لیتے ہوئے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سورج چھپا ہوا تھا۔ باغیچہ نما سایہ جنگل اسی لیے تاریکی کا منظر پیش کرتا تھا، اسی تاریکی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے۔

میں جوابی فائرنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دشمن ہمیں کیری سے اُترتا ہوا نہیں دیکھ پائے تھے، وہ [illegible] کیری سے یہی اندازہ لگا چکے تھے کہ ہم [illegible] جل گئے تھے۔ لیکن یہ میری خام خیالی تھی، کیونکہ اسی وقت...... مجھے عقب میں گاڑیوں کے انجن کی آواز اُبھرتی سنائی دی۔

''ہیلی! ہمیں تیز چلنا ہوگا...... ورنہ دشمن سر پر پہنچ جائیں گے۔'' میں نے اس سے کہا۔

''میں دوڑ سکتی ہوں، چلو......'' اس نے کہا اور واقعی وہ دوڑ پڑی۔ میں بھی اس کا ہاتھ پکڑے دوڑتا رہا، ایسا زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا اسی لیے میں ایک مٹی کے تودہ نما

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

چبوترے کو دیکھتے ہی اس کی آڑ میں ہیلی کو لے آیا۔

یہاں ہم دونوں نے گنز سنبھال کر پوزیشن لے لی۔

میں نے عقابی نظروں سے عقب میں دیکھا جہاں جنگل کے بیچوں بیچ ناپختہ مگر قدرے ہموار راستہ جاتا تھا، وہاں میں نے دشمنوں کی نقل و حرکت دیکھی۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچا اور وہیں دبک کر رہ گیا۔

"تم ٹھیک ہوناں......؟" میں نے ہیلی سے سرگوشی میں پوچھا، مجھے اس کے بازو سے مسلسل بہتے ہوئے خون پر تشویش ہو رہی تھی۔ ہم سخت مشکل میں پھنسے ہوئے تھے، گاڑی تباہ ہوگئی تھی اور نجانے کیسے دشمنوں کو پتا چل چکا تھا کہ ہم گاڑی سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوچکے تھے۔

"ہم...... ٹھیک ہوں۔" ہیلی نے بہ مشکل کہا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ خون کے بہنے سے اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی اور وہ سخت مضمحل بھی نظر آرہی تھی۔

"نہیں، تم ٹھیک نہیں ہو۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور اپنی شرٹ پھاڑ کر میں نے اس کے بازو پر جلدی جلدی پٹی باندھ دی۔ اسی وقت اندھیارے سے جنگل میں تیز روشنی چمکی۔

میں بُری طرح چونکا۔

"دشمن قریب آگئے ہیں شہزی! تم ایسا کرو...... بھاگ جاؤ میں دشمنوں کو روکتی ہوں۔" ہیلی نے مجھ سے کہا اور میں اس کی بات پر بُری طرح تڑپ کر چونکا اور اس کا مضروب مگر حسین چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ کیا لگتی تھی یہ میری؟ ابھی کتنی ہی دیر ہوئی تھی مجھے اس سے ملے ہوئے؟ محض چند گھنٹے......

"ہرگز نہیں...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو، ہیلی؟" میں نے کہا۔ "تم میری خاطر جان پر کھیلو گی اور میں تمہیں یہاں ٹائیگر ٹیگ جیسے خونخوار درندوں کے سپرد کر جاؤں؟ میں نے ان کی آنکھوں میں تمہارے خلاف نفرت کی جو آگ دیکھی تھی، وہ ابھی تک میں بھلا نہیں سکا ہوں۔ حالانکہ میں تمہیں جانتا بھی نہیں کہ تم کون ہو؟ اگرچہ میں تمہیں بھی ان کا ساتھی سمجھا تھا۔"

اسی وقت روشنیاں قریب آتی چلی گئیں۔ ہماری باتوں کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔ میں نے...... دیکھا، دونوں گاڑیاں اسی چبوترے کی جانب چلی آرہی تھیں۔ اس چبوترے کو تفریحی اور اردگرد کا نظارہ کرنے والوں کے لیے بنایا گیا تھا، اگرچہ اس وقت وہاں کوئی نہ تھا اور یہاں ابھی چہار دیواری کھڑی کرنے کا کام بھی اُدھورا پڑا نظر آتا تھا۔

"تم مجھے جان جاؤ گے مگر میں تمہیں غائبانہ جانتی ہوں، بعد میں تفصیل بتا دوں گی۔" وہ اس حالت میں بھی ہلکی سی نرم مسکراہٹ سے بولی۔

"تم جے بی سی کی ایجنٹ تو نہیں ہو، جنہوں نے تمہیں ٹائیگر ٹیگ یا باسکل ہولارڈ کے معاملات پر نظر رکھنے کی ہدایت کر رکھی ہو؟" میں سوال کیا۔

"اگر میں جے بی سی کی ایجنٹ ہوتی تو وہ...... ایسی جرأت کرنے کا تصور بھی نہ کرتے میرے ساتھ۔" اس نے جواب دیا اور میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

اسی وقت مجھے گاڑیوں کے رکنے اور ان کے دھڑادھڑ دروازے کھلنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے چبوترے کی ڈھلانی سطح سے ذرا سر اُبھار کر دیکھا۔ وہ سب گاڑیوں سے اُتر رہے تھے اور چبوترے کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ہوشیار......! وہ چبوترے کو گھیرے میں لے رہے ہیں، لڑائی ناگزیر ہے۔" میں نے جوش تلے مرتعش آواز میں کہا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" ہیلی نے بڑے حوصلے [illegible] کہا [illegible] ی اور خود اس طرف کو رینگ گیا جدھر ان کے بیچ بیٹھے وہ راکٹ مشین گن والا شخص نظر آیا تھا۔

گولیوں کی دھنا دھن اور کار [illegible] کی آوازوں پہ پولیس بھی اس طرف متوجہ ہوگئی تھی کیونکہ اسی وقت پولیس کی گاڑیاں بھی سائرن بجاتی ہوئی اسی جنگل کا رخ کر چکی تھیں۔

معاملہ مزید خراب ہونے کے اندیشے تلے...... میں نے جنگ کا ارادہ ملتوی کیا اور چبوترے کے قرب و جوار میں نظریں دوڑائیں تو اچانک مجھے [illegible] ذرا فاصلے پر ایک کنواں نما گڑھا سا دکھائی دیا، جسے دیکھتے ہی میرے اندر ایک خیال سوجھا۔

میں تیزی سے پلٹا اور ہیلی کی طرف آیا۔ وقت اب بالکل نہ تھا، میں ہیلی سے کچھ کہے بنا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا مزید ڈھلان چڑھتا ہوا، اسی کنواں نما گڑھے تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ نکاسیِ آب وغیرہ کے لیے کسی گٹر سے منسلک کیا گیا تھا۔

میں ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہیلی کو لیے اس کے اندر اُتر گیا لیکن زیادہ گہرائی میں اُترنے کے بجائے میں نے ہیلی سے کہا۔

"تم ادھر ہی ٹھہرو، میں ذرا اُوپر جا کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں، پولیس اور ان کے درمیان کیا معاملات طے پا رہے ہیں۔"

یہ کہہ کر میں دوبارہ طلوع ہوا اور ڈھلانی زمین پر لیٹے لیٹے اس طرف دیکھا، وہاں چند وردی پوش پولیس والوں سے ٹائیگر ٹیگ اپنے "ادارے" کے آئی ڈی کارڈ شو کرتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں تیزی سے واپس پلٹا اور ہیلی کے پاس آگیا۔

"پولیس کیا کر رہی ہے؟" ہیلی نے پوچھا۔ پولیس کی آمد پر وہ بھی کچھ تشویش زدہ نظر آرہی تھی۔

"وہ دونوں آپس میں کوئی معاملہ طے کرنے میں مصروف ہیں۔" میں نے جواب میں کہا اور نیچے نگاہ ڈالی۔ "ہمیں یہاں سے نیچے مزید اُترنا پڑے گا، ضرور کوئی نہ کوئی راستہ کسی قریبی مین ہول یا گٹر وغیرہ میں کھلتا ہوگا۔"

"یہ کرنا پڑے گا، ورنہ ہم ٹائیگر ٹیگ اور پولیس کے درمیان بُری طرح پھنس جائیں گے۔" ہیلی نے بھی اپنی زیرک دماغی سے مخدوش پڑتے حالات کے مطابق مشورہ [illegible]

میں نے فوراً اس کے مشورے پر صاد کرتے ہوئے ہیلی کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے کی جانب پیش قدمی شروع کردی۔

ہم جیسے جیسے نیچے گہرائی میں اُتر رہے تھے، ویسے ہی جگہ تنگ ہوتی جا رہی تھی، حتیٰ کہ نوبت یہاں تک آگئی کہ صرف ایک ہی فرد کے گزرنے کی گنجائش رہ گئی، یوں میں نے خود کو آگے رکھا اور ہیلی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹن بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ رک کر میں نے ہیلی سے پوچھا۔

"یہاں کے سیوریج سسٹم کی بناوٹ کا مجھے اندازہ نہیں، تمہارا کیا خیال ہے ہیلی؟ یہ سرنگ نما راستہ کتنا طویل ہوگا؟ کہیں آگے جا کر یہ بند تو نہیں ہوگا؟"

ہیلی نے جواب میں کہا۔ "یہ اس مختصر سے جنگل نما باغیچے کے جنوب مغرب میں ایک سڑک کے کنارے فٹ پاتھ قریب تک جا سکتا ہے، لیکن بند نہیں ہوگا، البتہ فولادی جالی راہ میں آجائے تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

"وہ کوئی مسئلہ نہیں، اسے توڑا جا سکتا ہے۔" میں نے مطمئن ہو کے کہا اور احتیاطاً پوچھا۔

"تم ٹھیک تو ہونا......؟"

"ہاں، بس تھوڑی کمزوری ہو رہی ہے اور گھٹن بھی لیکن چلتے رہو۔ ہمیں اس گندی سرنگ سے بہت جلد باہر نکلنا ہوگا۔"

ہم اسی طرح گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل کرولنگ کے انداز میں آگے بڑھتے رہے۔ کئی جگہ موڑ بھی آئے۔ گندا پانی بہہ رہا تھا اور بدبو سے دماغ کی نسیں تک پھٹی جا رہی تھیں۔ جان پر بنی ہوئی تھی اسی لیے یہ تعفن، بہ خوشی برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔

ہمیں سردی بھی لگ رہی تھی، ہیلی کو کمزوری اور برہنگی کے سبب زیادہ سردی لگ رہی تھی وہ تو بے چاری تھوڑی دیر بعد ہی...... کانپنے لگی تھی، میں نے اسے اپنی شرٹ اور جیکٹ پہنا دی تھی۔ تب اسے کچھ سکون ہوا تھا۔ البتہ اب خود میرا اوپری جسم برہنہ ہوگیا تھا، میں نے اس کی پروا نہ کی، کیونکہ ہیلی کی حالت زیادہ خراب تھی۔

آخر وہی ہوا، لگ بھگ بیس گز تک اسی طرح آگے بڑھتے رہنے کے بعد ایک گول آدم گزار سوراخ حائل ہوگیا جس پر آہنی جالی لگی ہوئی تھی۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور ہیلی کو اس جالی کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی رک گئی تھی۔

میں نے گندی اور سیلن زدہ سی زنگ آلودہ جالی کی مضبوطی کا اندازہ لگایا، وہ خاصی سختی سے نصب کی گئی تھی۔

"اسے فائر کر کے توڑنا پڑے گا۔" میں نے رائے طلب لہجے میں ہیلی سے کہا۔

"توڑ ڈالو، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے ہمارے پاس۔" اس نے کہا۔

ہم تھوڑا پیچھے کو سرک گئے۔ میں نے لیٹے لیٹے گن کو سنگل شاٹ پر کیا اور اسی وقت ہیلی کی لرزہ دینے والی چیخ اُبھری۔ میں بری طرح ٹھٹک گیا اور جالی پر فائر کرتے کرتے رہ گیا۔ اندھیرا ہونے کے سبب ہم ایک دوسرے کو دیکھنے سے قاصر تھے۔

"کیا ہوا ہیلی؟" میں نے اسے پکارا۔

"چچ...... چوہا تھا شاید......"

اسی وقت میرے بدن پر کوئی بڑی سی شے تیزی سے رینگتی اور "چُرچُر" کی مخصوص آواز کے ساتھ نکل بھاگتی چلی گئی۔

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

بے اختیار میں ہنس دیا۔ وہ کوئی چوہا ہی تھا۔

میں نے ہیلی کو ہوشیار کیا کہ میں جالی پر فائر کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد میں نے نال کا رخ جالی کی طرف کر کے ایک فائر داغا، دھماکا ہوا اور مجھے اپنے کان ہی نہیں دماغ بھی سُن ہوتا محسوس ہوا، وجہ یہی تھی کہ وہ بہت قریب کا نشانہ تھا۔ پھر جگہ بھی تنگ اور فضا محدود، لمحہ بھر کے وقفے سے میں نے دوسرا فائر داغا۔

اس بات کا احتمال تھا کہ گولی اُچٹ کر ہمیں بھی لگ سکتی تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوا، ایک تو میرا اندازہ درست تھا، دوسرے ہم جس طرف... چند فٹ پیچھے سرک گئے تھے، وہ جگہ ذرا عمودی تھی۔

میں آگے بڑھا اور چھو کر جالی کو دیکھا وہ ایک جانب سے اُدھڑ چکی تھی۔

میں نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اسے مزید اُدھیڑ کر گزرنے کی جگہ بنائی اور آگے کو رینگ گیا۔

دوسری جانب آتے ہی ہم چند فٹ مزید اور سرکے ہوں گے کہ روشنی کی کرنیں نظر آنے لگیں اور آکسیجن اور ہوا کا احساس ہوا۔ میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ ہم نکاسی والے راستے پر پہنچ گئے تھے۔

زیرِ زمین سیوریج لائن کی تنگ اور سیلن زدہ سی بدبودار سرنگ میں ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا، یہاں تک کہ اعصاب شل ہونے لگے تھے اور دماغ تک ماؤف ہوا جاتا تھا۔ روشنی دیکھنے کے بعد ہماری ہمت سوا ہونے لگی، لیکن ہیلی کی حالت تو زیادہ ناگفتہ بہ ہو رہی تھی، زخمی ہونے کے ساتھ بہت سا خون بہنے کے سبب اس بے چاری پر شدید کمزوری بھی طاری تھی۔ کئی بار اس پر غشی کے دورے بھی پڑے اور وہ وہیں رک جاتی اور نڈھال سی ہو کے پڑی رہتی۔ میں ہی اسے سنبھالتا اور اس کا نیم مردہ سا چہرہ تھپک تھپک کر ہوش میں لاتا۔

بلاشبہ ہیلی نے بڑا معرکہ سر کیا تھا، یوں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہ تھا کہ میں بھی اگر ٹائیگر ٹیگ کے چنگل سے نکلا تھا تو اس کی وجہ ہیلی ہی تھی۔ لیکن ابھی تک میں اس کی طرف سے اُلجھن اور کچھ نامعلوم قسم کے شکوک وشبہات کا شکار تھا۔

ہیلی کون تھی؟ اس کا تعلق کن لوگوں سے تھا اور یہ میری ساتھی ہونے کا کس حوالے سے دعویٰ کر رہی تھی، ابھی اس نے یہ مجھے نہیں بتایا تھا، یہ بات طے تھی کہ وہ کسی خاص اور [illegible]تھنک" پر ٹائیگر ٹیگ کے ہیڈکوارٹر تک کامیابی سے رسائی حاصل کیے ہوئے تھی اور میں بھی ہیلی کو انہی کا ساتھی سمجھے ہوئے تھا، ہولارڈ کا اسے میری خدمات میں پیش کرنے کا مقصد بھی میں یہی سمجھے ہوئے تھا کہ وہ مجھے اپنی حسین زُلفوں کے جال میں پھنسانے کی کوشش کرے گی اور ان کے کسی مخفی ومذموم مقاصد میں کام آئے گی، یوں میں بھی ان کی چال کو سمجھنے کی سعی میں، دیدہ و دانستہ خود کو اس کی مرمریں بانہوں اور حسین زُلفوں کا قیدی بنائے ہوئے تھا کہ اچانک سارا معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا۔

میری دشمن میری ساتھی بن گئی تھی، مگر کیسے اور کیوں؟

یہ ابھی اسراریت کے پردے میں تھا۔ اس وقت میں خود ایسے حالات کی زد میں تھا کہ اس کا صرف میرا ساتھی ہونے کا دعویٰ کرنا ہی میرے لیے کافی ثابت ہوا تھا۔

اب ہم دونوں ایک ساتھ ایک محاذ پر تھے۔ میں خود اس سے حقیقت سننے کے لیے بے تاب تھا کہ وہ آخر کس حوالے سے میرا ساتھی ہونے کی دعوے دار تھی؟

بہرکیف...... ہم دونوں آگے ہی آگے سرکتے رہے یہاں تک کہ ہم نسبتاً کھلی سی جگہ پر آ گئے، یہ ایسی ہی جگہ تھی جیسے کسی کنویں کا فرش...... یہاں ایک لوہے کی سیڑھیاں تھیں جو اوپر تک جاتی نظر آ رہی تھیں، وہاں تک سہ گول سوراخ تھا۔ وہ بند تھا۔ یہاں پانی بھی کافی تھا گندے پانی میں گھٹنوں [illegible] بے چاری کانپنے لگی تھی۔ نقاہت کی وجہ سے اسے سردی بھی زیادہ لگ رہی تھی۔ بہرحال، اب منزل قریب تھی، اب اُوپر پہنچ کر کیا ہونے والا تھا؟ اس سے ہم بے خبر تھے۔

میں نے ہیلی کو حوصلہ دیا اور مژدہ سنایا کہ ہم منزل کے قریب ہیں اور وہ ذرا اب ہمت پکڑے۔ سردی کے سبب اس کی سانسیں بھی بُری طرح پھول رہی تھیں۔

میں نے ایک ہاتھ سے اسے سنبھالا اور پھر خود کو بھی لوہے کی سیڑھی پر ایک قدم رکھتے ہوئے ہیلی سمیت اس پر قدم جمایا پھر اُوپر اُٹھنے لگا۔

مین ہول کا ڈھکن کھولنے میں مجھے تھوڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ ہیلی کو بھی میں نے ایک ہاتھ سے سنبھالا ہوا تھا۔

ایک موقع پر میں نے ہیلی سے کہا کہ وہ تھوڑا مزید ہمت سے کام لے اور سیڑھی کو مضبوطی سے تھامے رکھے تاکہ میں ڈھکن اُوپر کی طرف دھکیل سکوں، اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ کراہنے لگی، میں نے پھر بھی اپنے جسم کے زور پر اسے سہارا دینے کی کوشش برقرار رکھی تھی۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی تھی۔

میں نے گن پھینک دی تھی، اب اس کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا تھا۔

خود کو سیڑھی پر کسی طرح، ہیلی سمیت ٹکا کر میں نے ڈھکن کو دونوں ہاتھوں سے کھولنے کی زور آزمائی شروع کر دی، ذرا ہی دیر میں کامیاب ہو گیا اور سرد مگر تازہ ہوا کا جھونکا چہرے سے ٹکراتے ہی میرے متحمل سے وجود میں جیسے نئی طاقت بھر گئی، پھر بھی میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ذرا ڈھکن ہٹا کر پہلے مقدور بھر کوشش سے بیرونی فضا کا جائزہ لیا۔

مین ہول کسی کھلی اور سنسان جگہ پر تھا، قریب کبھی کسی گزرتی گاڑی کی آواز سنائی دے جاتی تھی، پھر خاموشی چھا جاتی۔ کچھ رہائشی مکانوں کی جھلک نظر آئی تھی۔

ہم فٹ پاتھ کے قریب سے ہی باہر نکلے تھے اور میں تیزی سے ہیلی کو لیے ایک نسبتاً کھلی جگہ پر پہنچا، جہاں باغیچہ سا بنا ہوا تھا اور وہاں پانی کا نلکا بھی لگا ہوا تھا، جس کے ساتھ ربڑ کا پائپ منسلک تھا۔

ہم نے صاف پانی سے پہلے اپنے جسم کی گندگی اچھی طرح دھوئی اور پھر اس کے بعد میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ [illegible] آ رہی تھی، [illegible] یہاں سے وہ پام کے درختوں اور باغ نما جنگل وہ حصہ نظر آ رہا تھا، جہاں سے ہم سیوریج لائن کے ذریعے نکلے تھے۔ اب ہم ایک پختہ سڑک کے پار تھے۔

"دشمن اور پولیس اب بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔" میں نے ہیلی سے کہا۔ "ہمیں یہاں سے جلد رفوچکر ہونا پڑے گا۔ لیکن افسوس کہ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں اور میرا یہاں کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ اگر ہم کسی ہوٹل......"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "کسی ٹیکسی کو روکنے کی کوشش کرو۔"

"لیکن تمہیں کسی ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت ہوگی؟" میں نے کہا۔

"نہیں، میرا یہاں ٹھکانا موجود ہے، وہاں پہنچ کر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بس، جلدی سے کوئی ٹیکسی......"

اچانک وہ کہتے کہتے رکی، اس کی نگاہ سامنے پڑی تھی اور وہ ہراساں نظر آنے لگی۔

"او مائی گاڈ! یہ وہی لوگ ہیں اسی طرف آ رہے ہیں، نکلو شہزی!" کہتے ہوئے اس نے مذکورہ ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

اس طرف سے وہی وین دو پولیس کاروں کے جلو میں نمودار ہو رہی تھی اور ان کا رخ اسی طرف تھا۔ کار ان کی نجانے کدھر غائب تھی۔

میں پھر ایک لمحہ بھی نہ رکا اور ہیلی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تیزی سے پلٹا اور دوڑتا چلا گیا۔

دوسری جانب ایک اور سڑک تھی، وہاں پہنچا تو ایک بس کھڑی نظر آئی۔ وہ کوئی اسٹاپ تھا۔ چند مسافر اتر چڑھ رہے تھے، جب تک ہم اس کے قریب پہنچے، اس کے دروازے خودکار انداز میں سلائڈ ہو کر بند ہو گئے۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے، جلد ہی مجھے ایک کیب نظر آ گئی، اس کے ڈرائیور نے بھی شاید ہمیں دیکھ لیا تھا، وہ ہمارے ہی قریب آ کر رکی۔ لیکن جب اس نے کھڑکی سے سر نکال کر ہماری اور بالخصوص ہیلی کی ہیئت کذائی دیکھی تو وہ گڑبڑا سا گیا۔

"کیا ہوا ہے، یہ تمہاری حالت کیسی ہو رہی ہے؟" ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے اُلٹا ہم سے سوال کر ڈالا۔

ہیلی زخمی تھی اور کم و بیش میری بھی یہی حالت تھی۔

"ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ایسا ہوا ہے، میری ساتھی کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔" میں نے اس سے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"چلو، پھر میں تمہیں کسی اسپتال پہنچا دوں۔" اس بھلے مانس ڈرائیور نے فوراً کہا۔

"نن...... نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، تم ہمیں سینٹرل سٹی لے چلو، جنک روڈ اسٹریٹ نائن اے......" اس بار ہیلی نے اس کیب ڈرائیور سے کہا اور اس دوران میں جلدی سے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولا اور ہیلی کو سوار کرانے لگا۔

"آر یو او کے مس......؟" ہمارے سوار ہوتے ہی روایتی شہری کا فرض نبھاتے ہوئے ڈرائیور نے ہیلی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"کہیں تم نے شراب کے نشے میں آ کر اپنی گرل فرینڈ پر تشدد تو نہیں کیا ہے؟" اس نے ہیلی کو مخاطب کرنے کے بعد فوراً ہی مجھ سے بھی سوال کر ڈالا۔ اس کے لہجے اور آنکھوں میں تشکیک اُبھر آئی تھی۔

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، آئم او کے...... گاڑی آگے بڑھاؤ۔"

"یو شیور......؟" ڈرائیور نے کہا اور مجھے اس پر غصہ

آنے لگا مگر ہیلی جواب میں اس بار اپنے سر کو ہی اثباتی جنبش دے پائی اور نڈھال سی ہو کر اس نے سیٹ کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی لیکن وہ اب بھی بیک ویو میں بار بار ہمیں تکے جا رہا تھا۔ مجھے اس سے کوفت ہونے لگی، سمجھ گیا تھا میں کہ جب تک میں اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دوں گا۔ یہ چپکا نہیں بیٹھے گا، کیونکہ ٹیکسی آگے بڑھاتے ہی اس نے پھر مجھ سے سوال پوچھا۔

''آخر تم دونوں کے ساتھ ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا ہے؟''

''تم اپنا منہ بند نہیں کر سکتے؟ ہم پہلے ہی پریشان اور مصیبت میں ہیں...... آہ......''

میرے بجائے ہیلی نے بالآخر برہمی سے ڈرائیور کو جواب دیا، وہ کراہی بھی تھی۔ شاید اس کے کہیں درد ... اُٹھا تھا۔ ڈرائیور اس کے سخت جواب سے گڑبڑا سا گیا۔

''تم اب اپنے کام سے کام رکھو اور خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔''

''میں نے اس طرف پولیس بھی دیکھی تھی، وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی شاید۔'' ڈرائیور بھی ڈھیٹ تھا۔ چپ بیٹھنا شاید اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

''ہاں تو......'' اس بار میں نے اسے گھورا...... پھر حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''دیکھو، مسٹر! میری گرل فرینڈ کے ساتھ ایک شرابی ٹولے نے بدتمیزی کی تھی، اب آگے تم خود سمجھ جاؤ اور خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔''

میرا یہ جوابی وار کارگر ثابت ہوا، وہ اب مطمئن ہو کے سامنے متوجہ ہو گیا۔

یہ سفر خاصا طویل ثابت ہوا، کیونکہ پورے ایک گھنٹے کے بعد کیب نے ہمیں مطلوبہ مقام پر اُتار دیا۔

ہیلی کے پاس تو کرایہ دینے کے لیے کوئی رقم نہیں تھی، البتہ میں نے ایسے حالات اور مقاصد کے لیے اپنی پینٹ میں کچھ خفیہ جیبیں بنا رکھی تھیں۔ یہی حال شرٹ کا تھا، جو اب ہیلی نے پہن رکھی تھی۔

میں نے کرایہ نکال کر اسے فارغ کر دیا۔ ہیلی پر اب زیادہ جلدی جلدی غشی اور نیم بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔

ہم جہاں اُترے تھے، یہ کسی مارکیٹ کا حصہ تھا، جس کے سامنے اسٹال اور دکانیں نظر آ رہی تھیں، عقب میں بڑی سی سربہ فلک رہائشی عمارت تھی۔ یہاں لوگ بھی زیادہ نظر آ رہے تھے اور ہماری ''حالت'' کے پیش نظر عجیب عجیب نظروں سے تکتے جاتے تھے۔

میں نے ہیلی کو سہارا دے رکھا تھا اور وہی مجھے راستہ بھی سجھا رہی تھی۔ ہم مارکیٹ کے اندرونی گوشے نکلنے والے راستے پر چلتے ہوئے عقب میں آ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہم اسی رہائشی بلڈنگ کے قریب تھے، میرا خیال تھا کہ ہیلی کا ٹھکانا یا اپارٹمنٹ وغیرہ اسی عمارت میں ہوگا مگر وہ وہاں سے بھی ہوتی ہوئی مجھے مزید کئی قدم دور لے آئی۔

یہ علاقہ بھی بلڈنگ کے پیچھے تھا۔ مزید آگے بڑھے تو ایک بڑا سا کیسینو دکھائی دیا، جو بظاہر ویران پڑا ہوا تھا۔ اس کے بڑے سے دروازے کی پیشانی پر نیون سائن [illegible] تھا جو اب دن کی روشنی میں بجھا ہوا تھا مگر اس پر کندہ ''ہاٹ لائٹ کیسینو'' کے رنگین الفاظ پڑھے جا سکتے تھے۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب ہیلی نے مجھے اس کے دروازے کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

میرے دل میں لامحالہ کسی انجانی کھٹک کا احساس ہوا، وہی نامعلوم سی بے چینی جو مجھے ابھی تک ہیلی کی جانب سے [illegible] ہوئی تھی۔ ہیلی کا کسی کیسینو نما ٹھکانے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا یہ ایک نئی اُلجھن میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

[illegible] میں اس کے پیچھے [illegible] گیٹ کے قریب جا پہنچا۔

یقیناً یہ رنگین و سنگین ہاٹ لائٹ کیسینو رات میں پوری آب و تاب سے جگمگاتا ہوگا۔ یہاں کئی حسین و جمیل ویٹرس شام اور رات گئے تک لچکیلی کمر کو تھرکاتی، گاہکوں، جواریوں اور شرابیوں کے درمیان ٹرے تھامے رنگین تتلیوں کی طرح اُڑتی پھرتی ہوں گی۔ اس کی شبینہ رونقیں اپنے عروج پر ہوتی ہوں گی۔

میں ہیلی کو لیے گیٹ کی جانب بڑھا جو بند تھا۔ اس میں کہیں بھی مجھے کسی کال بیل کا کوئی بٹن تک نظر نہیں آیا تھا۔ دروازے پر دستک دی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

میں نے ہیلی سے کچھ پوچھنا چاہا تو ایک دم چونک پڑا......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

میں نے ایک نظر باہر کے منظر پر ڈالی اور سرد آہ بھری۔ باہر زندگی معمول کے مطابق تھی۔ تیز رفتار اور ہجوم مگر مجھے اتنی ہی تنہا محسوس ہوئی جتنی میں اپنے کمرے میں موجود واحد جاندار شے کی صورت تنہا تھی۔ سب کچھ کتنا بدل گیا ہے۔ کتنے سال گزر گئے ہیں۔ یا شاید صدیاں...... لب شمار بھی مشکل تھا مگر میں یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وقت تیزی سے بدلا ہے۔ اس بدلاؤ کے سارے اثرات میں نے اپنی روح پر محسوس کیے تھے۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ روح کچھ بھی نہیں ہے مگر پھر بھی مجھے یہ محسوس ہوتی ہے۔ میری اس بات پر سب دوست ہنستے ہیں سوائے میرا کے۔ روح کا خیال مجھے میرا نے ہی دیا۔ قدیم مذاہب پر اعتقاد رکھتی ہے۔ ہمیشہ ان کے متعلق بات کرتی رہتی ہے۔ ہر بار اس کے پاس بتانے کے لیے کچھ نیا ہوتا ہے۔ وہ ان سب پر یقین بھی کرتی ہے۔ اب شاید میں بھی یقین کرنے لگی ہوں۔ مجھے بھی لگتا ہے کہ روح ہے اور میری روح بہت اُداس ہے۔ شاید اسی کی اداسی میرے وجود پر بھی طاری رہتی ہے۔

زندگی گزارنے کے لیے مثالی معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے... ایسا معاشرہ جہاں انصاف ہو... امن ہو... اور ہر انسان کو اپنے مساوی حقوق دستیاب ہوں... اور یہ اسی صورت ممکن ہوتا ہے اگر اکثریت ان برائیوں سے آگاہی رکھتی ہو... ایسے ہی ذہنوں کی کارفرمائی... جو ایک مثالی سلطنت کے متلاشی تھے... ان کے نزدیک ہر جگہ... ان کی حکمرانی اور حکومت ہو... بالآخر وہ ایک ایسی مثالی سلطنت کے بانی بن گئے... جہاں ہر شخص کے لیے [illegible]... پُرآسائش زندگی کا حصول ممکن تھا... سب کچھ [illegible] ہونے کے باوجود کوئی ایسی چیز تھی جو اُن کے اندر کلبلانے لگی تھی... انہیں بغاوت پر اکسا رہی تھی...

...رت کے قانون سے ٹکرانے کے نتیجے میں رونما ہونے والے حوادث

یومِ سیاہ

غزالہ یاسمین

https://www.urdutubes.com/

Digitized by Google

آوارہ گرد

قسط نمبر: 60

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

صحن کلیسا، سوہی کاگ، مغرب شمالی [illegible] میں ابھی ابھی علاقہ کے مطابق بہت [illegible] حالات میں لیکن [illegible] کی بات سکتی مگر یہ نہیں [illegible] کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ [illegible] جاتا ہے [illegible] پال پر کلیسا کی نام نہاد راہبوں کو جیسے کھلونے الزامات میں [illegible] ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... ایسے ہی وقت اور حالات کی [illegible] ایک نوجوان کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ ابھی چالیں چلنے [illegible] گھات لگا کر ان کو بے چارگی [illegible] یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... پھر [illegible] طاقت کے گھمنڈ میں راہب کا [illegible] نظر آیے والوں کو [illegible] رنگ بدلتی [illegible] رنگ کی [illegible] داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نیلی [illegible] اکیلی نہ ہوتی تھی ہمارا ساتھی کی ذات [illegible] حوالے کر دی گئی ہے تو کر دیا۔ میں نے اسے [illegible] سے [illegible] کر لی ہو لی۔

نیلی [illegible] نیلی [illegible] میں نے [illegible] کے کمرے [illegible] ایک شخص کا [illegible] گیا۔ [illegible] تھا [illegible] تھا۔ [illegible] ساتھی تھے۔ نیلی کو میرے ساتھ اس وقت میں دیکھا تو [illegible] کے تھے۔

کئی [illegible] سمجھتے ہوئے میں نے [illegible] رنگت [illegible] تھی۔

[illegible] جیسے [illegible] تھا۔ اس نے [illegible] کے لیے [illegible] پڑ گئے۔

"[illegible] کیا ہوا ہے" اس کو [illegible] ہو گی۔

"[illegible] ضرورت ہے" میں نے کہا۔

"[illegible]" اس نے تشویش [illegible] میں کہتے ہوئے اپنے [illegible] مجھے [illegible] نظروں سے [illegible] پھر آنکھوں [illegible] اس کی آنکھوں میں [illegible] گئی۔ اس نے فوراً نیلی کو سہارا لیا اور مجھے بھی [illegible] آنے کا کہہ کر پلٹ گیا۔

ایک [illegible] میں آ کر اس نے [illegible] دروازہ [illegible] اور نیلی کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے آگے چلا گیا۔

میں اس کے پیچھے تھا۔ اندر [illegible] بھی [illegible] تاریکی تھی۔ [illegible] ایک جانب مجھے ایک 12 سالہ [illegible] نظر آیا۔ وہاں [illegible] پر بیٹھے [illegible] نظر آ رہے تھے مگر اس وقت وہ [illegible] تھا۔

[illegible] نیلی [illegible] میں چلا گیا۔

کافی آگے جا کر وہ ایک دروازے [illegible] داخل ہوا تو [illegible] ایک [illegible] رہا تھا۔

اس [illegible] سے ہم [illegible] گئے۔ وہاں [illegible] لوگ جن میں [illegible] سب [illegible] تھے [illegible] ہم پر نظر پڑتے ہی وہاں [illegible] نیلی کو [illegible] اس کی زبان پر صرف

ایک [illegible] تھا۔

[illegible] مجھے [illegible]

[illegible] آنکھوں نے مجھے [illegible] ہے کی [illegible] میں مصروف تھی جس کی [illegible] مجھے [illegible] میں لے جا کر [illegible] کر دیا۔

یہاں [illegible] نام [illegible] تھا۔ میں اس [illegible] گیا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ مجھے تسلی تھی کہ اس کی [illegible] تھی [illegible] اس کے لیے مجھے [illegible] تک انتظار کرنا [illegible] میرے پاس وقت کم تھا۔ میں جلد سے جلد نیلی کی [illegible] سے [illegible] حاصل کرنا چاہتا تھا۔

میرا ذہن ایک بار پھر نیلی میں الجھ گیا۔ ایک حقیقت تو ان چند گھنٹوں میں اس کی ذات سے متعلق میرے سامنے آ گئی تھی کہ [illegible] میں سچی تھی [illegible] ساتھی تھی اور [illegible] کے اور "[illegible]" اس کے مفادات کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالے ہوئے تھی۔ پھر [illegible] اس کی موت کا [illegible] دیا۔

جو وہ ایجنٹ ہمارے کمرے میں اچانک موت کا [illegible] کر گھس آئے تھے اور انہوں نے مجھے [illegible] جانے [illegible] کیونکہ ان کا [illegible] میں نہیں بلکہ نیلی ہی تھی۔ گویا وہ [illegible] میرے لیے نہیں تھا۔

پھر جب میں اور نیلی گولیوں کی گھن گرج سے بچتے بچاتے فرار ہوئے تو ایک نازک موقع پر نیلی نے مجھے [illegible] بھاگ جانے کا بھی کہا تھا اور خود [illegible] میں آنے والے دشمنوں سے نمٹنے کا عزم ظاہر کرنے لگی۔ یعنی اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں تھی، وہ صرف مجھے بچانا چاہتی تھی۔

[illegible] جاں نثار دوستوں اور ساتھیوں کے معاملے میں اب تک صرف میں ہی خود کو خوش نصیب سمجھتا آیا تھا، لیکن اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس معاملے [illegible] میں صرف میں ہی نہیں بلکہ [illegible] بھی [illegible] کم خوش قسمت نہیں تھی۔ آخر [illegible] میں [illegible] پھر [illegible] اور اب نیلی

آخر خالد اور سوزی کی شخصیت میرے سامنے روز اول سے ہی عیاں تھی مگر بیلا کی ذات ابھی تک میری نظروں میں پراسرار بنی ہوئی تھی۔ بلاشبہ بیلا اپنی لڑائی میں لائق و مشاق نظر آئی تھی مجھے۔ اس نے جس طرح کمرے میں اچانک گھس آنے والے نائٹ کلب کے ایجنٹوں سے خود کو بچایا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی کوئی کم تربیت یافتہ لڑکی نہیں تھی۔

یہ بات طے تھی کہ بیلا کو ضرور میرے اور عابدہ کے "معاملۂ دل" کے بارے میں پوری طرح علم تھا لیکن باوصف اس کے اگر وہ میرے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی تو اس میں بالکل میری ہی طرح اس کی مجبوری تھی۔ کیونکہ میں نے اس کی زبان سے سنا تھا کہ وہ کھرا "بکڑ" تھا۔

وہ نائٹ کلب کی ایجنٹ بنی ہوئی تھی یا پھر اس نے بے بی کی ایجنٹ کا بہروپ بھر رکھا تھا اور یہ کام اسی کے مفادات کے لیے مصروف کار تھی۔ پھر بھی یہ سب کیا چکر تھا؟ اور وہ کیا اسرار تھے جس کی بنا پر اس نے یہ خطرناک قدم اٹھایا تھا۔ اس راز سے تو وہ خود ہی پردہ اٹھا سکتی تھی۔

اب اس بات کا تب کیسینو میں بیلا "مادام" کہلاتی تھی اور وہاں موجود لوگوں نے اس کی بہت گرمجوشی دیکھتے ہوئے جس خوش دلی کا اظہار کیا تھا اور جس احترام سے اسے مخاطب کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں "باس" کی کوئی منظور نظر تھی۔

مجھے ابھی کمرے میں ایک گھنٹا ہی ہوا تھا کہ دروازہ کھلا اور وردی کا ایک اجنبی نمودار ہوا۔

"چلو، باس نے بلایا ہے۔" اس نے میری طرف کرخت نظروں سے گھورتے ہوئے تحکمانہ کہا۔

"باس" کے نام پر میں چونکا تھا۔ تاہم چپ چاپ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے بازو سے دبوچ لیا۔

ان کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر نہیں تھا۔ مگر ان کی سوالی شکل پر ماتم ہی کرنے کو جی چاہتا تھا کہ یہ لوگ مجھے ہی اپنی "مادام" کی اس حالت کا ذمہ دار سمجھے ہوئے تھے۔

"بیلا کیسی ہے اب؟" میں نے ایک راہداری میں چلتے ہوئے اس سے پوچھا جو گول گھوم رہا تھا اور اپنے جثے کے مطابق ہجوم زیادہ رہا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت ہی اکھڑ مزاج اور کرخت طبیعت کا آدمی لگتا تھا۔

میں نے بھی اس سے دوبارہ کوئی سوال کرنا مناسب ہی نہ جانا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا ہوا ایک کمرے میں پہنچا۔

یہ کمرا شاہانہ انداز کا اور خاصا کشادہ تھا۔ بیش قیمت فرنیچر۔ دیواروں پر ہیجان انگیز نیم عریاں ناچتی گاتی عورتوں کی تصویریں۔ صوفہ سیٹ درمیان میں بچھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں دھری ایک بھاری بھرکم اونچی پشت کی ریوالونگ چیئر پر ایک چوڑے شانوں والا دبنگ سا شخص براجمان نظر آیا۔

اس کا چہرہ چینی النسل شبیہ لیے ہوئے تھا۔ اس طرح جبڑوں کی ہڈیاں خاصی ابھری ہوئی تھیں۔ آنکھیں چھوٹی جن کے کونے دائیں بائیں سے کھنچے ہوئے نظر آتے تھے۔ بال کریو کٹ تھے اور الٹی ہوئی مونچھیں چک رہی تھیں۔ ناک سیدھی اور اونچی تھی۔ بائیں گال پر زخم کا ایک قدرے چوڑا سا نشان تھا۔ رنگت کا وہ سفید فام تھا۔

وہ چند ثانیوں تک تو مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لیا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے سامنے والی تین کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

میں خاموشی سے براجمان ہو گیا۔

اس نے ہاتھ ہی کے اشارے سے ساتھ آنے والے شخص کو چلے جانے کا کہا۔ وہ چلا گیا۔

"تم کون ہو؟"

اچانک کمرے کے خاموش ماحول میں اس کی کھردری مگر قدرے بھاری آواز ابھری۔ اس نے میری طرف خاصی چبھتی ہوئی نظروں سے گھورا۔

"میں شہزاد احمد خان۔" میں نے دانستہ اپنا ادھورا نام بتایا۔

"انڈین ہو؟"

"نہیں۔"

"کون سے ملک سے تعلق رکھتے ہو؟"

"پاکستان سے"

"امریکا آنے کا مقصد؟"

"اپنی ایک ساتھی عابدہ کو رہائی دلانے کے مقصد سے آیا تھا۔" میں نے اس کے بظاہر سپاٹ سے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے کہا تو پل بھر کو اس کے سرد مہر نظر آنے والے چہرے اور چبھتی ہوئی آنکھوں سے چونکنے کے تاثرات ہویدا ہوئے مگر صرف چند لمحوں کے لیے، اس کا چہرہ پھر سرد و سپاٹ کی غمازی کرنے لگا۔

"ہمم... تو تم شہزاد احمد خان شہری ہو؟"

میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر اس کا خوشبودار دھواں فضا میں اگلا اور سامنے پڑی ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی۔ پھر سامنے پڑا ہوا ریڈ پیگ اٹھا کر منہ سے لگالیا۔

"جیلی کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" ایک گھونٹ بھر کے اس نے پوچھا۔ "لیکن یاد رکھنا جھوٹ میرے سامنے اس طرح کھل جاتا ہے، جس طرح یہاں کلب میں ڈانس کرتے ہوئے ایک عورت اپنے لباس سے چند منٹوں میں آزاد ہو جاتی ہے۔"

مجھے اس کے بولنے کا انداز انتہائی کریہہ محسوس ہوا تھا۔ میں نے ایک گہری ہنکاری بھری اور اسے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنا دیا۔

"سب جھوٹ اور بکواس ہے یہ" وہ اچانک کرسی پر سیدھا ہو کر تند لہجے میں بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ جیلی کی حالت اور میرا اس کا یہاں لانا یہ سب جھوٹ ہے؟" میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور اس کے انداز و تخاطب سے مرعوب ہوئے بغیر خشک لہجے میں کہا۔

میری جانچتی نظروں نے اسے ایک تیسرے درجے کے کلب اونر اور ایک گھٹیا گینگسٹر سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

"جیلی کی بات نہیں کر رہا ہوں میں مسٹر [illegible]"

"شہزاد" میں نے پھر اپنا نام دہرایا۔

"جو کوئی بھی ہو تم" وہ نخوت سے بولا۔ "میں تمہاری ساتھی عابدہ اور تمہاری بات کر رہا ہوں۔"

اس تھرڈ کلاس آدمی کے منہ سے عابدہ کا ذکر کرنا بھی مجھے معیوب لگا تھا۔ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ جیسے وہ بھی جیلی کی طرح میرے اور عابدہ کے متعلق پہلے سے بہت کچھ جانتا تھا۔

میرا سوچتا ذہن ایک بار پھر الجھن کا شکار ہونے لگا۔

اگر یہ جھوٹ ہے اس قدر [illegible] تھا تو جیلی یہاں کہاں [illegible] ہو رہی تھی؟ میں نے کہا۔

"خود میں بھی جیلی سے پہلی بار ہی ملا ہوں۔ مجھے کچھ میں بھی جاننا چاہتا ہوں کہ آخر یہ سارا ماجرا کیا ہے؟ جیلی میری ساتھی عابدہ کو کیسے جانتی ہے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر شاید میز کے دائیں جانب نصب کوئی بٹن پش کیا تھا اس لیے -- باہر کہیں بیل گئی تھی۔ ذرا دیر بعد وہی سانڈ اندر داخل ہوا۔

"بلیک بل اسے باہر کا راستہ دکھاؤ" تحکمانہ رعونت سے اس نے کہا۔ بلیک بل نامی وہ سانڈ میری جانب بڑھا اور میرا بازو دبوچ لیا۔

میں اب تک بہت برداشت سے کام لے رہا تھا لیکن جب اس بلیک بل نے میرا بازو دبوچا تو اسی وقت میرا دایاں ہاتھ حرکت میں آیا۔ دوسرے ہی لمحے کمرے میں اس کالے سانڈ کے منہ سے کراہنے کی آواز بلند ہوئی۔

میرے ہاتھ کا بھاری گھونسا اس کی عین ناک کے بانسے پر پڑا تھا۔ وہ کئی قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ ابھی وہ جب تک سنبھلتا، میری ایک ٹانگ کراس فلائنگ کی صورت فضا میں قوس بناتی ہوئی اس کے سینے پر اس زور سے پڑی کہ وہ اچھل کر دروازے سے ٹکرایا اور باہر جا پڑا۔

"باس" پھیلی ہوئی آنکھوں سے پہلے تو یہ منظر دیکھتا رہ گیا، پھر اس نے حرکت کی اور نہایت پھرتی کے ساتھ میز کی دراز سے کچھ نکالنے لگا۔ میں نے وہیں سے جست بھری اور میز پر آکر پھسلا اور میری دونوں لاتیں اس کے سینے پر پڑیں۔ وہ بھاری بھرکم کرسی سمیت پیچھے کو الٹ گیا۔

اس کا ہاتھ شاید دراز میں رکھے پستول کے دستے پر جم چکا تھا مگر گرفت کمزور رہی۔ نتیجتاً وہ جب گرا تو پستول بھی اس کا چھوٹ کر فرش پر لڑھک گیا، جسے میں نے بغیر لمحہ ضائع کیے میز سے اترتے ہی اچک لیا۔

"بس اب تم اپنی اوقات پر آجاؤ ورنہ گولی مار کے بھیجا باہر نکال دوں گا۔" میں نے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے کہا۔ اس کے پستول کی سیاہ نال کا رخ میں نے اسی جانب کر رکھا تھا۔

"یو بلڈی باسٹرڈ راسکل!" وہ طیش و غضب سے اس زور سے غرایا کہ اس کی باچھوں سے جھاگ سا بہہ نکلا، چہرہ سرخ نظر آنے لگا۔

وہ "گن پوائنٹ" کی پروا کیے بغیر سنبھل کر پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا، تو میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی اور اسے اٹھا کر میز پر دے مارا۔

اسے شاید تسلی تھی کہ میں اسے گولی کا نشانہ نہیں بنا سکتا، یا پھر اسے اپنے "اڈے" میں موجودگی کا زیادہ ہی زعم تھا، اس نے ایک وحشیانہ غراہٹ حلق سے خارج کرتے ہوئے اپنے دائیں بازو کی کہنی میرے پہلو میں رسید کر دی۔ بے اختیار میرے حلق سے ہلکی سی کراہنے کی آواز ابھری

تھی، لیکن میں اس درد کو پی گیا۔

اس دوران میں گو سب کا سب کھلے دروازے پر بھی نظر ڈال لیتا تھا۔ کیونکہ ایک شکاری میرا راں بھی پڑا تھا، اور اس وقت جب میں اس پر وار کرنے کے لیے پر تول رہا تھا، میں نے راں جیک ہل نامی سانڈ کو پستول ہاتھ میں لیے خون آلودہ چہرے کے ساتھ دوبارہ نمودار ہوتے پایا۔

اس کی حالت بپھرے ہوئے جنگلی بھینسے جیسی ہو رہی تھی، جیسے بل فائٹنگ میں بہت "رف" کیا جا رہا ہو۔ اس نے مجھ پر فائر جھونک مارا۔ میں اس سے پہلے ہی نیچے جھک چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے میں نے پاس کو دبوچ لیا اور اسے ادھ موا کر کے گرا دیا۔

جیک ہل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے کچا ہی چبا ڈالے، تاہم اتنا تو اس حال میں بھی نہ تھا۔ وہ بے بسی سے تلملا رہا تھا۔

"میرے راستے سے ہٹ جاؤ اور مسٹر جیکی کو لے کر یہاں پہنچو۔" میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں جیک ہل سے کہا۔

جیک ہل نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں خود کشمکش و پیچ کا شکار ہو گیا۔ پاس کو میں کوئی نہیں مار سکتا تھا۔ جیکی کا ٹھکانا میں دیکھ چکا تھا۔ دوبارہ یہاں آ سکتا تھا۔ اگر جیکی نے مادھو کا ذکر نہ کیا ہوتا تو اور بات تھی، میں اس کی پروا بھی نہ کرتا اور نکل جاتا۔ تاہم اب حالات اور تھے۔ اس وقت میں کتنا نکل جانا چاہتا تھا یہاں سے۔

"اوکے... میرے راستے سے ہٹ جاؤ، میں جانا چاہتا ہوں۔" بالآخر میں نے کہا۔

"تم جاؤ جیک ہل... اور اپنی ناک کی پٹی کراؤ جا کر۔" پاس نے اس سے تحکمانہ کہا۔ وہ ابھی تک میرے بازو کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔

جیک ہل چند سیکنڈز تک مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا رہا، اس کے بعد پلٹ گیا۔

"تمہیں میرے ساتھ باہر تک چلنا ہو گا۔" میں نے پاس سے کہا۔ "یاد رکھو، اگر کسی نے میرے راستے میں آنے کی کوشش کی تو میں تمہیں بلا دریغ گولی ماروں گا۔"

"تم کہیں نہیں جا سکتے ہو۔" پاس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ "مجھے چھوڑ دو اور آرام سے بیٹھ جاؤ، جیکی سے تمہاری ملاقات کرا دی جائے گی۔"

"ہرگز نہیں، جیکی سے اب میں نہیں ملنا چاہتا۔" میں نے وحشت سے لہجے میں کہا۔ "تم دشمنی پر اتر آئے ہو اور مجھے نقصان پہنچا سکتے ہو۔"

"میں اس کے لیے تم سے سوری کرتا ہوں مسٹر شیرا..." پاس نے لہجے کو ہموار بنانے کی کوشش کی تھی۔

"مجھے تمہارا سوری کرنا قبول نہیں۔" میں اپنی بات پر اڑا رہا۔

"لیکن تم جیکی سے ملے بغیر نہیں جاؤ گے۔" وہ بھی جیسے اڑ گیا۔ "اگر تم اس طرح چلے گئے تو میری شامت آ جائے گی۔"

میں اس کے یوں کہنے پر چونکا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ ڈینگ سا پاس جیکی کا شوہر ہو اور وہ بیوی سے ڈرتا ہو۔

"تو ٹھیک ہے پھر۔" میں نے کچھ بات بنتے دیکھ کر حفظ ما تقدم یہ اختیار کرنا ضروری سمجھا اور بولا۔ "پہلے جیکی کو یہاں پیش کرو۔"

"وہ ہوش میں آ چکی ہے لیکن بہتر ہو گا کہ اس سے جا کر مل لو۔ اس کے زخمی بازو کی پٹی کر دی گئی ہے۔" وہ بولا۔

"تم گن پوائنٹ پر میرے ساتھ چلو گے۔" میں نے شرط پیش کر دی۔

"اس طرح نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ اسے معلوم ہو تمہارے ساتھ یہاں کیا ہوا ہے۔"

"اوہ... اگر یہ بات تھی تو پھر تم آخر یہ یاری کیوں دکھا رہے تھے؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ میں اس کی اور جیکی کی "معاملہ داری" سمجھ گیا تھا۔

"میں کہہ رہا ہوں نا، مجھے معاف کر دو، یہ میری غلطی تھی۔ میں تمہیں غلط سمجھا تھا۔" مجھے اس کے لہجے سے مکاری کی بو آئی۔

"ہرگز نہیں، مجھے جیکی کو بتانا پڑے گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

"تب پھر تمہارا یہاں سے زندہ جانا ہی دشوار ہو گا۔"

وہ پھر اپنی اوقات پر آ گیا۔ میں نے اپنے بازو کا شکنجہ تنگ کیا۔ اس کے حلق سے کراہ خارج ہوئی۔

"تمیز سے بات کرو مسٹر پاس اور نہ تمہارا حشر بھی بل ڈاگ کی طرح کر دوں گا۔" میں نے دھمکی دی۔ میں نے اس کے کتے کا نام پکارا۔

"چلو پھر۔"

میں اسے گن پوائنٹ پر لے کر باہر آ گیا۔ راستہ صاف پا کر میں نے اسے چھوڑ دیا اور اس کے پستول سے

[illegible]

ٹھیک ہے، آپ ہوٹل جا سکتی ہیں۔ آپ لوگ [illegible]
آپ بھی [illegible] ہے۔

کے چند سوالوں بعد [illegible] اور پھر وہ اپنی [illegible] سے نکلی، ہاتھ میں ایک شاپر بھی [illegible] بھی تھا۔

اس کے بعد میں کسی سپر مارکیٹ [illegible] چلا گیا۔ وہاں میں نے [illegible] کافی [illegible] وہاں سے [illegible] ایک [illegible] کر میں نے [illegible] سب سے آہستہ [illegible] جا رہا ہو۔

میں نے اپنی [illegible] تھا کہ مجھے [illegible] کی [illegible] لیکن تو [illegible] کے [illegible] کی طرف سے [illegible] تھا۔ [illegible] کے سامنے [illegible] سے آئے تھے [illegible] مجھے اب یہاں [illegible] کا [illegible] جیکٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے۔

اب مجھے شام کا انتظار کرنا تھا کیونکہ [illegible] کی روشنیاں شروع ہو جاتی تھیں۔ اسی [illegible] میں اصل کی۔

یہ سارا وقت [illegible] گھوم پھر کر گزارنا مناسب نہ تھا۔ ٹیکسی یا سب وے [illegible] کا کوئی اہلکار میری راہ پر لگ سکتا تھا۔ یہ بہت کم امکان تھے لیکن میں نے کوئی [illegible] ہوٹل [illegible] تو [illegible] وہ میری [illegible] احتیاط [illegible] قد و قامت سے مجھے پہچان سکتے تھے، اگر چہ [illegible] میری طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔

مجھے بھوک محسوس ہوئی تو میں ایک [illegible] میں داخل ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنے لیے کھانے کا آرڈر دیا۔

کسی طرح دو گھنٹے میں نے وہاں گزار دیے۔ [illegible] کی سردی بڑھ رہی تھی۔ پھر سے [illegible] میں باہر [illegible]

میں نے ایک [illegible] جیکٹ خریدی جس کے کالر [illegible] سے [illegible] تھے کہ میں [illegible] سے نصف حد تک اپنا چہرہ چھپا سکتا تھا۔

کھانا [illegible] کے [illegible] میں ایک [illegible] مارکیٹ میں آ گیا۔ یہاں [illegible] ہوٹل [illegible] تھا۔ [illegible] ایک مصروف اسٹریٹ کے کنارے [illegible] میں

[illegible] ہو گیا۔ [illegible] تھا [illegible] کہیں کی [illegible] سے [illegible] تھیں [illegible] سے بھی [illegible] ہو رہے تھے۔

ایک [illegible] کر میں اس طرف چلا [illegible] ہوٹل کے قریب تھی [illegible] دیکھا جا سکتا تھا۔ [illegible] آ [illegible] تھے [illegible] لیا۔

میں [illegible] کیسینو کے [illegible] قریب [illegible] جاتا تھا۔ یہاں [illegible] میں نے اس کی [illegible] معلومات حاصل کر لی تھیں۔ [illegible] کا [illegible] تھا [illegible] سٹریٹ میں [illegible] تھا۔

”[illegible]“

ایک [illegible] کاؤنٹر [illegible] میری [illegible] سے [illegible] میں کاؤنٹر کے پیچھے [illegible] ہاتھ [illegible] اس کی طرف [illegible]

وہ ایک [illegible] کی خوب صورت [illegible] تھی۔ [illegible] اس نے [illegible] تک [illegible] مجھے [illegible] سے [illegible] اس کے [illegible] تھا [illegible] اس کے علاوہ [illegible] جالی دار [illegible] تھیں۔ [illegible] کوئی [illegible] تھا۔

میں نے اسے [illegible] کافی کا آرڈر [illegible] سگریٹ [illegible] نکال [illegible] چلی گئی۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ ایک [illegible] میں نے [illegible] کے لیے [illegible] تھا۔

[illegible] خاصا خوب صورت [illegible] ایک [illegible] آدھی [illegible] پر [illegible] تھے [illegible]

اب [illegible] بھی [illegible] گئی تھی۔ میں سگریٹ کے کش [illegible] کے ساتھ کافی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ [illegible] کافی ختم کر چکا تھا اور [illegible] سگریٹ [illegible]

ویٹرس آئی اور میں نے ایک ڈالر کا نوٹ اس کی [illegible] پر رکھ [illegible] ”کیپ دی چینج“ کہا [illegible] چلی گئی۔

میں سگریٹ [illegible] وقت گزاری کرتا رہا [illegible]

تھی۔ اس کی اسٹریٹ پارہ نازل ہوئی اور جب اس نے پوچھا کہ اب میں کچھ کہوں تو میں کچھ کہہ کر گیا کہ وہ مجھے بھگانا چاہ رہی تھی۔

"نو تھینکس۔" میں نے اس سے کہا۔ "آؤ اب میرا سوال" کہ بھاگ جانے کا مطلب کچھ گڑبڑ ہو گیا۔

"ایکسکیوز می سر؟" مجھے کرسی سے اٹھتا پا کر وہ ایک دم بولی۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ وہ میری طرف دیکھ کر دل آویز انداز میں مسکرائی۔ "آئی ایم سوری۔ آپ تھوڑا وقت گزارنا چاہتے ہیں؟" اس نے کہا۔

"آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ میں محض ایک کافی کے کپ پر آپ کی محفل برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہوں۔" میں کچھ اخلاقاً مسکرایا۔

"میرا ابھی آف ہونے کا ٹائم ہونے والا ہے۔ وہ سامنے بلڈنگ دیکھ رہے ہیں آپ؟" اس نے جھک کر کھڑکی کے شیشے سے باہر سڑک پار ایک رہائشی بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا تو اس کا کشادہ گریبان میرے بالکل قریب اور کشادہ ہو گیا۔

میں نے اس کے کھلے گریبان پر پڑتی اپنی بے اختیاری نظروں کو جلدی سے ہٹایا اور قدرے بوکھلائے ہوئے انداز میں اس کے اشارے کی سمت کھڑکی سے باہر دیکھا۔

"جی... جی ہاں۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

"آپ وہاں میرے ساتھ چل کر وقت گزار سکتے ہیں۔ میں یقیناً ایک اچھی میزبان ہی نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے اچھی ساتھی بھی ثابت ہو سکتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر مجھے افسوس ہوا کیسی حسین اور معصوم صورت و شکل کی مالک تھی اور اس کا کام... میں ایک سرد آہ بھر کے رہ گیا اور پھر اس سے پہلے کہ اسے "ناں" کرتا اچانک بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک خیال میرے ذہن میں کلک ہوا۔

"کیوں نہیں، اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ خوش ہو گئی اور پلٹ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں کافی شاپ سے نکل کر سڑک پار کر رہے تھے۔ اس نے یونیفارم اتار کے اصل ڈریس پہن لیا تھا اور اس میں بھی وہ کافی پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

اس کی عمر کا اندازہ مجھے بمشکل بیس اکیس سے زیادہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام ازولی بتایا تھا۔

ہم لوگ لایعنی سی گفتگو کرتے ہوئے اس بلڈنگ میں داخل ہوئے اور لفٹ کے ذریعے پانچویں فلور کے ایک اپارٹمنٹ میں آ گئے۔ اپارٹمنٹ زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن دو چھوٹے کمرے اور ایک لاؤنج تھا اور دوسری ایک طرف کچن بنا ہوا تھا۔ ایک صوفہ اور چند کرسیاں ایک میز کی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔

"کمرے میں آ جاؤ ڈیئر۔" اس نے مخمور لہجے میں کہا۔

"میں ذرا تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تو وہ تھوڑا چونکی۔ پھر اٹھلا کر بولی۔

"باتیں بیڈروم میں بھی ہو سکتی ہیں... کم آن پلیز۔"

"نہیں، ادھر آؤ۔" میں نے اس بار گمبھیر سنجیدگی سے کہا تو وہ کچھ الجھن میں پڑ گئی تاہم قریب آ کر وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ وہ حیران سی ہو گئی تاہم اس نے نوٹ لے لیے۔

"یہاں قریب ہی ڈاؤن اسٹریٹ پر ایک ہائی لائٹ نامی کیسینو ہے۔ بتا سکتی ہو اس کا مالک کون ہے؟"

مجھے یقین تھا کہ اسے کچھ نہ کچھ اس کے بارے میں معلوم ہو گا۔ کیونکہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور جگہ بھی ایسی تھی کہ ایک کافی شاپ کی خوبصورت سی ویٹرس کو اس کے بارے میں ضرور معلوم ہو گا۔ توقع تو میری پوری ہوئی تھی، لیکن میں نے دیکھا کہ وہ ایک دم کچھ گھبرا سی گئی۔

"تت... تم اس کیسینو کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس کے انداز سے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ غیر معمولی جانتی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اپنی مسکراہٹ کو کچھ گہرا بناتے ہوئے کہا۔

"وہاں ایک لڑکی ہے، بہت حسین، ایلی نام ہے اس کا... مجھے پسند ہے۔"

"لل... کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔ "بھول کر بھی اب اس کا دوبارہ نام مت لینا اور اس کا خیال بھی اپنے دل سے نکال دو۔"

"کیوں؟ ایسا کیا ہے اس میں؟ کوئی خطرے کی بات ہے؟" میں نے بھولپن کا مظاہرہ کر کے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"کہیں تم ایلا کے قاتل گروپ کے آدمی تو نہیں ہو؟"

اگر ایسا ہے تو فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ میں ان خطرناک گینگسٹرز کی مخالفت نہیں مول لے سکتی، میں ایک غریب ہی—"

"ڈنشا۔۔۔ کیا نام بتایا ابھی تم نے؟" میں نے یک دم چونک کر پوچھا۔ میں ڈنشا کے نام پر بری طرح چونکا تھا۔

یہ نام میں نے جہنم واصل ہے پی سی کے بھیدی ایجنٹ گون برگ کے منہ سے سنا تھا۔ جب میں اسے ایک زخمی گینگسٹر جیروٹ ڈیکی کے بارے میں بے وقوف بنا رہا تھا۔

یہ ڈنشا۔۔۔ وہی تھا جس نے اس رات ساحل سمندر پر ایک شادی کی تقریب میں گون برگ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور نتیجے میں اس کی گرل فرینڈ ماری گئی تھی، جبکہ میں، شکیلہ اور کپیل دادا وہیں اسے بچانے کے لیے آئے تھے۔

"ڈنشا ہی اس ہاٹ لائٹ کیسینو کا مالک ہے اور وہ نیلی کا بوائے فرینڈ ہے، یہاں چکر لگتا ہے اس کا۔۔۔" ڈولی نے بتایا۔

"ہمم۔۔۔" میں پرغور انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ مذکورہ کیسینو میں میرا جس دبنگ آدمی سے ٹکراؤ ہوا تھا وہ ڈنشا ہی تھا۔ پھر بھی تسلی کے لیے میں نے ڈولی کو جب اس کا ناک نقشہ بتایا تو وہی نکلا۔

میں نے بناوٹی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اوہ۔۔۔ اس کا مطلب ہے کہ میں نے غلط جگہ اور غلط لڑکی کا انتخاب کرلیا ہے۔" کہتے ہوئے میں مایوس نظر آنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

میری "کیفیت" پر مسکرائی۔۔۔ اور بولی۔ "کیا تمہاری اور کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

"چھوڑو اس بات کو۔۔۔" میں نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ نیلی خود کون ہے؟ کیا ہے؟ کیا تم اس کے حالات زندگی کے بارے میں جانتی ہو؟"

میری بات پر اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر فکر کے سائے امڈ آئے اور بولی۔ "تم آخر نیلی کو بھول کیوں نہیں جاتے؟ وہ ایک خطرناک آدمی کی گرل فرینڈ ہے۔"

"پلیز تھوڑا بہت تو بتا دو نا۔۔۔" میں نے ملتجی انداز میں کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالے، وہ فوراً مجھے روکتے ہوئے بولی۔

"رہنے دو، مجھے زیادہ کا لالچ نہیں، تم ایک اچھے آدمی ہو مگر معصوم اور سادہ مزاج۔۔۔ میں تمہیں نیلی کے بارے میں سب بتائے دیتی ہوں۔ میں ذرا ڈرنک لے آؤں۔۔۔" وہ کہتی ہوئی اٹھ گئی۔

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ڈنشا، نیلی، عابدہ۔۔۔ کیا عابدہ کا تعلق صرف نیلی سے تھا؟ یا وہ بچا تھا مگر ڈنشا کیوں اس قدر نفرت کرتا تھا؟ یہ سب آخر کیا چکر تھا؟ نیلی اور عابدہ ایک دوسرے کو کس قدر چاہنے لگے تھے کہ عابدہ کی خاطر اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔ ان دونوں کے "تعلق" پراسرار کا ایک دبیز پردہ حائل تھا جسے میں اپنے قیاسات کے بل بوتے پر بھی چاک نہیں کر پا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرنک کے دو گلاس لے آئی۔

"تھینک یو۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ وہ حیران ہوگئی۔ کچھ کہنا چاہا مگر میں بے تکلفی سے بول پڑا۔

"تم مجھے نیلی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ پلیز۔۔۔" میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس نے ایک گھونٹ بھرا۔۔۔ پھر بتانے لگی۔ "نیلی کے بارے میں، میں بھی تھوڑا اتنا ہی جانتی ہوں جو میں نے سرسری طور پر دوسروں کی زبانی اب تک سنا ہے۔ نیلی کا ایک بھائی بھی تھا، کورنگ۔۔۔ وہ ڈنشا کا پارٹنر تھا۔ کیسینو میں دونوں کی برابر کی حصے داری تھی۔ اسی توسط سے نیلی کی بھی ان کے ساتھ شمولیت تھی کلب میں۔۔۔ یہ لوگ منشیات، جوا اور اسمگلنگ کا دھندا کرتے ہیں۔

مخالف گروہوں کے ساتھ بھی ان کی چپقلش چلتی رہتی ہے۔ نیلی درحقیقت ایک فائٹنگ کلب چلاتی ہے۔ کورنگ کی دشمنی میں اس کا کلب تباہ و برباد کردیا گیا تو نیلی انتقام لینے کی غرض سے ڈنشا اور اپنے بھائی کورنگ کے گروہ میں پوری طرح شامل ہوگئی اور آخرکار انتقام لے کر چھوڑا، بہت قتل و غارت ہوئی، بدقسمتی سے اس میں نیلی کا بھائی کورنگ مارا گیا، خود نیلی گرفتار ہوگئی، ڈنشا نے دوستی نبھائی اور نیلی کو دولت اور اپنے ذاتی اثرورسوخ سے جیل سے آزاد کروالیا۔ اس کے بعد نیلی اور ڈنشا ایک دوسرے کا دم بھرنے لگے۔ بس اتنی سی کہانی ہے نیلی کی۔"

ڈولی نے اپنی بات مکمل کی، وہ اب تک اپنا گلاس خالی کرچکی تھی اور پھر دوسرے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھا لیا۔

"کیا تم بتا سکتی ہو کہ نیلی کو جب گرفتار کیا گیا تھا تو وہ کون سی جیل میں منتقل کردی گئی تھی؟"

میں نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔ نیلی سے متعلق جان کاری نے میرے ذہن کی دو پرتیں کافی حد تک کھول

دی تھی جس پر اب تک اسرار کی دبیز تہ چڑھی ہوئی تھی۔

میرے سوال پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بلاشبہ ڈولی سے مجھے بہت سی مفید باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ تیلی سے متعلق بھی اور ڈنشا کے بارے میں بھی۔ اگر ڈنشا کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اس نے ایک ایسے آدمی کے ساتھ ویسی حرکت کی تھی جس نے اس کے سب سے بڑے دشمن گون برگ کو ٹھکانے لگا دیا تھا تو وہ یقیناً میرے پیروں پر گر کے معافی مانگنے لگ جاتا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ گون برگ نے اس کی ناک میں کس قدر دم کر رکھا تھا اور اسے کتنا نقصان پہنچایا تھا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ مس ڈولی۔" میں نے اس سے مسکرا کر کہا۔ جواب میں وہ بھی مسکرائی تھی مگر اب اس میں پہلے جیسا اشتیاق اور جوش نہ رہا تھا۔ شاید چاہ رہی ہو کہ میں اب جلد سے جلد یہاں سے چلا جاؤں۔

میں نے ڈائننگ کی دیوار پر لگے وال کلاک میں وقت دیکھا۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ "اس کیسینو کی رونقیں کس وقت عروج پر ہوتی ہیں؟" میں نے ڈولی سے پوچھا۔

"اچھا تو اب تک ہو چکی ہو گی۔" اس نے اپنی مرمریں کلائی پر بندھی قیمتی اور نازک سی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن عروج تو دس بجے کے بعد ہی ہوتا ہے، آج یوں بھی ویک اینڈ ہے زیادہ رونق ہو گی۔" ایک لمحہ توقف کے بعد اس نے کہا۔

"یار ڈکسن، تمہیں اگر وہاں جانا ہے تو اکیلے مت جانا، میرا مطلب ہے، کوئی لڑکی ہونی چاہیے تمہارے ساتھ کیونکہ گیٹ پر کھڑے ڈنشا کے آدمی تم پر شک کر سکتے ہیں۔ اکیلے آدمیوں کی وہ خاص جانچ کرتے ہیں، کہیں کوئی پولیس وغیرہ کا آدمی یا مخالف پارٹی کا جاسوس نہ گھس آئے۔"

"تو پھر تم ساتھ چلو میرے، اس طرح میرا کام بھی آسان ہو جائے گا۔" میں نے فوراً ڈولی سے کہا مگر اس نے میری بات سنتے ہی جیسے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ہرگز نہیں، میں نے کہا نا میں اس چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہتی، ویسے کسی لڑکی کا بندوبست کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے، تم خاصے ہینڈسم ہو، جیب میں رقم بھی ہو گی۔ کوئی بھی تمہیں مل جائے گی، بس اسے اصل بات مت بتانا اور وقت گزاری کا اسے کہہ دینا۔ وہ تمہیں پیسے پانے کے لالچ میں کافی وقت دے دے گی۔"

"ہمم" میں نے ہونٹ بھینچے۔

"لیکن پلیز، اور ہاں اگر تم جاؤ تو میرے بارے بالکل ذکر بھی نہ کرنا۔" وہ قدرے متوحش سے لہجے میں بولی۔ "میں ان لوگوں سے دور ہی رہنا چاہتی ہوں۔ تمہارا ان سے کیا لینا دینا ہے، ڈرتی ہوں کہیں میں خواہ مخواہ کسی چکر میں نہ پھنس جاؤں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات مسٹر ؟"

"ڈکسن!" میں نے غلط نام بتایا۔

"کیونکہ میں تمہارے بھلے کی ہی بات کر رہی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "دیکھو، تم کسی بات کی کوئی فکر نہ کرو، میرا کسی مافیا یا انڈر ورلڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے، میں صرف تیلی کی ذات میں دلچسپی لے رہا تھا۔ یہاں سے جانے کے بعد بھی یوں سمجھو کہ ہم ملے ہی نہیں تھے اور نہ ہی میں یہاں آیا تھا، کلیئر ؟"

"ٹھیک ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ایک ریکویسٹ کروں گا۔ کیا تم مجھے یہاں مزید دو تین گھنٹے رہنے کی اجازت دے سکتی ہو؟" کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے مزید چند ڈالر کے نوٹ نکال لیے۔ وہ منع کرتی رہی مگر میں نے اسے تھما دیے۔

وہ اپنا گلاس ختم کر چکی تھی۔ بولی۔ "میں تمہیں کافی بنا دیتی ہوں اس کے بعد میں ذرا شاور لوں گی۔ تم آرام سے بیٹھے رہو۔"

میں نے مسکرا کر اس کی بات پر سر کو اثباتی جنبش دی اور خاموشی سے کافی پینے لگا۔

☆☆☆

ٹھیک دس بجے میں ڈولی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ سے نکلا اور پھر بلڈنگ کے گیٹ سے باہر آیا۔

رات کی چمک دمک شروع ہو چکی تھی۔ میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا تیز تیز قدموں سے ہاٹ لائٹ کیسینو کی طرف بڑھنے لگا۔ اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھتے ہوئے میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

یہ خود کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی اور آج تک میں نے اس کے سوا کوئی کامیابی بھی تو حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن ایک بات ضرور تھی کہ ڈولی سے ملنے کے بعد ڈنشا اور تیلی کے متعلق کافی حد تک آگاہی حاصل ہو چکی تھی مجھے۔

ڈنشا سے میں ڈرتا نہیں تھا۔ بے شک میری اس سے اور اس کے ساتھ جیسے آدمی سے مارا ماری ہو چکی تھی۔ لیکن تب اگر ڈنشا میری بات پر یقین کر لیتا کہ اس کے دشمنِ عظیم گون

جبکہ اگر میں نے ہی بلاک کیا ہے تو اس کے خیالات اور جذبات میرے لیے کھلے ہوئے ہوتے۔ بہرحال یہ اصل کی بات تھی۔

ڈولی کے اس مشورے پر عمل کیا۔ میں نے ضروری خیال نہیں کیا تھا کہ مجھے ہاٹ لائٹ کیسینو میں داخلے کے لیے احتیاط کے پیش نظر ہی سہی، کسی لڑکی کا سہارا بھی لینا چاہیے تھی۔

میں ہاٹ لائٹ کیسینو پہنچا تو میری جیسے آنکھیں ہی چندھیا گئیں۔ اس قدر رونق، لوگوں کا رش، جن میں بوڑھے مرد بھی شامل تھے، نوجوان مرد و عورتوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ لیکن یہ سب ایک نظم و ضبط کے تحت چل رہا تھا۔ ایک چوکھٹے کے پیچھے بیٹھا موٹا تازہ شخص پیسے لے کر ٹکٹ دے رہا تھا اور لوگ ٹکٹ لے کر اسی دروازے کی جانب بڑھ جاتے تھے جہاں سے آج دن میں ہیتھم بے ہوش ٹیلی کو لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ لوگ لائن میں لگے ہوئے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔

کچھ اور بھی کسرتی جسم والے افراد لوگوں کی نگرانی کے لیے کھڑے تھے۔ اگر کوئی دنگا فساد ہوتا تو شاید وہی سنبھالتے تھے۔ لائن میں لگتے ہی میں نے جانچ لیا تھا کہ مجھے کس طرح ٹکٹ خریدنا ہے۔ مختلف نوعیت کی تفریحات کے ٹکٹ بک رہے تھے۔ میں نے عمومی نوعیت کا ہی ٹکٹ لیا تھا۔

ٹکٹ لے کر میں دھڑکتے دل سے دروازے کی جانب بڑھا تو یک لخت جیسے میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہاں دو تنومند افراد کھڑے ٹکٹ وصول کر رہے تھے۔ ان میں بلیک بل تھا۔ اس کی ناک پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرہ متورم ہو رہا تھا۔ ایک ایک شخص کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا بس یہی کام تھا شاید، کیونکہ اس کا دوسرا ساتھی صرف ٹکٹ لینے پر مامور تھا۔ ڈولی کی بات درست ثابت ہوئی تھی، یہاں چند ایک ہی اکیلے دکیلے نظر آ رہے تھے اور ان کی باقاعدہ جامہ تلاشی لی جا رہی تھی۔ جو "کپلز" کی صورت میں تھے، انہیں جانے دیا جا رہا تھا۔

میری باری بھی آ گئی۔ میں نے چہرے پہ جاہلانہ انداز کے تاثرات طاری کر لیے اور دانستہ "کیٹ کالنگ" کرتے ہوئے ٹکٹ بڑھا دیا۔ پھر سیٹیاں مارتا ہوا آگے بڑھا تو بلیک بل نے اپنا مضبوط بازو میری راہ میں حائل کر دیا۔

"وہاٹس رانگ؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر خالصتاً امریکی لہجے میں کہا۔

"تم اکیلے ہو؟ کوئی ساتھی نہیں؟" اس نے گمبھیر لہجے میں سوال کیا۔

"میری ساتھی نہیں بلکہ ساتھیاں پہلے ہی سے اندر موجود ہیں۔ باہر مجھے انہیں جوائن کرنے میں ذرا دیر ہو گئی۔" میں نے آنکھ مار کے کھلنڈرے انداز میں کہا۔

اس نے گھور کر ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا اور پھر بازو میرے آگے سے ہٹا دیا۔ میں ایک بدمست سا قہقہہ خارج کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

حسب توقع اندر وہی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ شور و غل، رنگین لائٹیں۔ طوفانِ بدتمیزی اور تیز ڈھول بجاتی موسیقی

یہاں بھی میں نے متلاشی نظروں سے ان لوگوں کو تاڑ لیا تھا جو بالخصوص آنے والوں کے چہروں کو غور غور سے گھور رہے تھے۔

مختلف فلورز تھے اور اسی مناسبت سے اسٹیج بنے ہوئے تھے۔ ایک گول چبوترے پر نصب اسٹیل راڈ سے چمٹی گوری اور کالی لڑکیاں ہیجان انگیز رقص میں مصروف تھیں اور تماشائی ان کے مختصر لباس کی ڈوریوں میں نوٹ پھنسا رہے تھے اور داد و تحسین بلند کرتے جا رہے تھے۔

میں نے وہاں سے نظریں پھیر لیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ٹیلی کا کیسے پتا چلا جائے؟ کسی سے پوچھتا تو وہ بدک جاتا، کیا خبر ڈنشا نے اپنے عملے کے سارے آدمیوں مرد عورت سے کہہ رکھا ہو کہ کوئی بھی ٹیلی سے متعلق ان سے پوچھے تو انہیں فوراً مطلع کر دے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ڈنشا مجھے ٹیلی سے کیوں دور رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ ہوش میں آنے کے بعد ٹیلی نے ضرور میرا پوچھا ہو گا، ڈنشا کے لیے بہانہ بنانا کیا مشکل ہو سکتا تھا، اس نے کہہ دیا ہو گا ٹیلی سے کہ میں اپنی مرضی سے چلا گیا وغیرہ۔

میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ٹیلی، اپنی حالت کے پیش نظر کسی کمرے میں ہی ہو گی۔ میں وہاں تک پہنچنا چاہتا تھا مگر کیسے؟ اس کی تدبیر میں سوچ رہا تھا۔

ایک مصیبت اور تھی، یہاں شراب اور بیئر کے علاوہ اور کچھ بھی پینے کو نہیں تھا۔ مجبوراً میرے ہاتھ میں وائن یا وسکی کا ایک گلاس ہونا لازمی تھا۔

ہر جگہ اپنی انٹری کرانا بھی ضروری تھا۔ صرف گھومنا

بھی مناسب نہ تھا۔ اس طرح میں وہاں موجود ڈانا کے کسی کارندے کی نظروں میں آ سکتا تھا پھر اکیلا بھی تو تھا۔

"ہائے ہینڈسم! تم اکیلے ہو؟"

اچانک ایک مترنم سی آواز میرے کان کے اس قدر قریب سے ابھری کہ شور و غل کے باوجود میں نے سن لی۔ شاید اس لیے بھی کہ بولنے والی نے میرے کان کے بالکل قریب اپنا دہن لا کر یہ الفاظ ادا کیے تھے۔

میں اس کی جانب پلٹا۔ وہ ایک سانولی سی تیز طرار کوئی شکاری قسم کی جوان لڑکی نظر آئی تھی جو شاید یہاں اکیلے مردوں کو پھانستی تھی۔

اس کے لباس کی تفصیل میں جانا فضول ہی تھا۔ اس کی انگلیوں میں لمبا سا ایک ہولڈر لگا سگریٹ دبا ہوا تھا اور وہ "بھرا" ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس کے دھوئیں کی بو سے مجھے بھی اندازہ ہوا تھا۔

اس کے نقوش جاذب نظر تھے اور جسم بھی متناسب تھا۔

"یقیناً۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرنا ضروری سمجھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"تو پھر جینی کوئن آپ کے ساتھ ہے۔" وہ میرے ساتھ لگتے ہوئے مسکرائی۔ میں نے اس کا نام پوچھا، اس نے بھی نام بتایا۔ میں نے اس کے ساتھ تھوڑا ہلا گلا مچایا اور دل پر جبر کر کے بے تکلفانہ باتیں کرنا بھی ضروری سمجھا۔

اس کو جو مشروبات پینی تھی وہ بھی اسے پلائی، خود بھی گلاس صرف تماشے کی حد تک ہاتھ میں رکھا اور اس کی نظریں بچا کر ادھر ادھر چھلکانے کے انداز سے گراتا رہا۔ محض دکھاوے کی خاطر منہ بھی لگایا۔

دوران گفتگو میں نے اس سے پوچھ لیا کہ وہ کہاں رہتی ہے؟ ڈانا اور اس کی گرل فرینڈ کے متعلق کیا جانتی ہے تو اس نے کھلکھلا کر اور لاابالی سی ہنسی کے ساتھ بتایا کہ وہ ان دونوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہے بلکہ وہ اس کلب میں اسٹرپٹیز ڈانسر کی جاب بھی کرتی ہے۔

میں نے اس سے جینی سے ملنے کی بات کی۔

"یہ کون سی مشکل بات ہے، ابھی چلو۔" جینی کوئن ڈانسنگ فلور پر میرے ساتھ تھرکتے ہوئے بولی۔

"لیکن میں اس سے ذرا تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔ یہاں اس کیسینو میں اس کا ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے تو وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ہی ہے، یہاں آتی ہے تو ادھر ہی موجود ہوتی ہے۔" اس نے جواب میں کہا۔ پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"جینا کہیں کیوں نظر نہیں آ رہی؟ شاید آئی نہیں ہے آج۔"

میں نے اس کی بات پر ذرا سوچا پھر بولا۔ "ہو سکتا ہے اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ کیا تم اس کے اپارٹمنٹ کا پتا بتا سکتی ہو؟"

اس نے جو پتا بتایا وہ وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔ میں نے احتیاط کے پیش نظر اس سے کہا۔

"اگر یہاں اس کی تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ موجود ہے تو تب ہی اس کے اپارٹمنٹ جا کر ملا جا سکتا ہے۔" وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔

"تم یہاں رکو، میں ابھی آئی۔" پھر وہ ایک طرف گم ہو گئی۔ میں حیران سا کھڑا رہ گیا۔ اس نے اتنی جلدی دکھائی تھی کہ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔

مجھے خدشہ بھی تھا کہیں جلد بازی یا بے وقوفی میں ڈانا کے آدمیوں کو شبہ نہ ہونے لگے؟ میں اسے احتیاط کا مشورہ دینا چاہتا تھا مگر اس کی تیزی کے آگے موقع ہی نہ مل سکا۔ جانے کیوں پہلی بار مجھے بے کلی سی محسوس ہونے لگی۔

ابھی ذرا دیر بعد جینی کوئن جس تیزی سے گئی تھی اسی تیزی سے واپس بھی پلٹ آئی۔

"وہ اپنے اپارٹمنٹ میں ہے اور واقعی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ہاں، ویسے تمہیں اس سے کس سلسلے میں بات کرنی تھی؟"

اس کا سوال حسب توقع تھا۔ ظاہر ہے اس کا جواب بھی میں نے پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا۔

"میں اس کے ساتھ کچھ کھیلنا چاہتا تھا۔" میں نے جان بوجھ کر شرارتی انداز میں کہا۔

"اور... سمجھ گئی، وہ تاش کی ماہر ہے اور پوکر بھی زبردست کھیلتی ہے اور بڑی بڑی رقمیں لگاتی ہے۔" جینی کوئن بولی۔

میں نے فوراً اس کی بات سے راہ پائی اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

"ہاں! وہ مجھ سے بڑی رقمیں جیت چکی ہے، میں چاہتا ہوں اس سے دوبارہ کھیلوں۔ اس بار میں پوری تیاری کے ساتھ ہوں۔"

"جوئے میں یہی ہوتا ہے۔" وہ بولی۔ "انسان ضد اور جیتنے کی دھن میں کھیلتا ہے اور ہارتا جاتا ہے، خیر... میں پھر بھی مشورہ دوں گی کہ محتاط رہنا، وہ تاش کی بھی ماہر

ہے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اگلے نصف گھنٹے بعد میں اس سے اور کیسینو سے جان چھڑا کر باہر نکل رہا تھا۔

میرا کام ہو چکا تھا۔ میں مطلوبہ پتے پر اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔

کیب نے مجھے آدھے گھنٹے میں وہاں اتار دیا جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ یعنی مطلوبہ اپارٹمنٹ سے ایک اسٹریٹ پیچھے اتارا تھا۔ اسے کرایہ دے کر میں نے فارغ کیا اور خود گرد و پیش پر نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

اس بات کا احتمال تھا کہ نیلی کے اپارٹمنٹ میں اب تک کوئی آدمی اور پہرا موجود ہو سکتا تھا اس لیے میں اس طرف بڑھتے ہوئے احتیاط برت رہا تھا۔

رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے اندر نیلی سے ملنے کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں جلد سے جلد اس سے مل کے عابدہ کے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عابدہ کے اندرونی معاملات کی اسے بھی کافی حد تک آگاہی تھی۔

اگر نیلی، عابدہ کی واقعی قریبی ساتھی تھی تو یہ بھولی حسینہ بھی عابدہ کے لیے ایک دوسری "آستین کا سانپ" ثابت ہو سکتی تھی۔

اگلے چند منٹوں بعد میں نیلی کے اپارٹمنٹ پر دستک دے رہا تھا۔ دروازے پر مجھے آئی لینس لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس بھیس میں شاید نیلی مجھے نہ پہچان سکے لیکن یہ کوئی بڑا ایشو نہ تھا۔

دوسری بار کال بیل بجانے پر دروازہ کھلا۔ میرا دل کچھ زور سے دھڑکا۔ دروازے پر سیفٹی چین لگی ہوئی تھی۔ صرف اس قدر ہی اندر سے دروازہ کھولا گیا تھا کہ کسی سے مخاطب ہوا جا سکے۔

ایک حسین چہرے کی جھلک نظر آئی۔ اس چہرے کی آنکھیں نیلی تھیں اور بال سنہرے۔

"آپ کون؟" اس اجنبی لڑکی نے پوچھا۔

"مجھے نیلی سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا نام شہزاد ہے۔" میں نے فوراً کہا۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ سامنے نیلی کھڑی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر مسرت آمیز حیرت کے اثرات ابھر آئے تھے۔

یوں اب وہ کافی کمزور نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندر کچھ تبدیلی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اور الجھن کے آثار ابھرے لیکن میں نے اپنی اصل آواز میں اسے مخاطب کیا تو اس نے فوراً مجھے اندر کر لیا اور دروازہ بند کر دیا۔

اس کے ہمراہ وہی نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والی لڑکی کھڑی تھی جو اس سے پہلے دروازے پر نمودار ہوئی تھی۔

"تم نے اپنا اچھا حلیہ بدل رکھا ہے۔" وہ مجھے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں لے آئی۔

اپارٹمنٹ خاصا کشادہ اور لگژری محسوس ہوتا تھا۔ لیکن کہیں کہیں سے کچھ بے ترتیب بھی نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس میں کوئی کمی محسوس ہوتی تھی۔ فرنیچر بھی بے ترتیب تھا اور سجاوٹ کے لحاظ سے بھی کسی کنجوسی سے کام لیا گیا تھا۔

میں نے نقلی داڑھی مونچھیں اتار لیں۔ اب میں اصل روپ میں تھا۔

"لیکن تم اچانک کہاں چلے گئے تھے اور کیوں؟"

کہتے ہوئے اس نے ایک نفیس اور آرام دہ صوفے پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے کوئی جواب دینے سے پہلے اس کی خیریت پوچھی اس کے بعد اسے سب بتا دیا کہ بات لائٹ کیسینو میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور اس کے گماشتے بلیک فل نے کیا سلوک کیا تھا اور یہ بھی کہ جواب میں پھر میں نے کیا کیا تھا وغیرہ۔

میری زبانی یہ سب سننے کے بعد اس کی ہلکی کشادہ آنکھوں میں پہلے تو رحم کی جھلک ابھری پھر وہ فوراً ایک عجیب سی الجھن میں تبدیل ہو گئی۔

میں نے اسے کسی اور ہی خیال میں الجھے محسوس کیا تو بولا۔

"نیلی پلیز، میں اپنی ساتھی عابدہ کے لیے بہت بے چین اور پریشان ہوں۔ اب مجھے تم فوراً یہ سب حقیقت بتا دو کہ تم عابدہ کے متعلق اور کیا کیا جانتی ہو؟ اور تم خود کون ہو؟ کیا ہو؟"

میری بات پر اپنے خیالات سے نکلی اور قدرے چونک کر میری جانب متوجہ ہوئی۔ اس کے نرم گداز لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

"مسز شوری۔ میں تمہاری دلی بے چینی اور بے قراری کا اندازہ کر سکتی ہوں۔ یہ تو ایک لمبی کہانی ہے لیکن کوشش کروں گی کہ مختصر ترین الفاظ میں تمہیں بتا دوں۔" وہ اتنا کہہ کے دو پل کی ادھر چپ ہو گئی، شاید مناسب الفاظ یا انداز پہ غور کرتی رہی۔

اس مختصر سے دورانیے کے درمیان، میں نے اسے اتنا بتایا کہ کسی ڈرل نامی ایک مقامی کافی شاپ کی ویٹرس نے مجھے اس کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔ لہٰذا نیکی نے وہیں سے آگے دھیرے دھیرے بتانا شروع کیا جب وہ کسی مخالف گروہ کی دشمنی میں اپنا نائٹ کلب گنوانے اور بعد میں اس سے انتقام لینے کے بعد اپنے بھائی کو بھی بچانے کے لیے کورٹ پہنچی اور جیل جا پہنچی تھی۔ وہ جیل کورکوران کی۔

"میری وہیں عابدہ سے ملاقات ہوئی تھی۔" اس نے وہاں سے آگے بتانا شروع کر دیا۔

"کورکوران کی لیڈی جیل وارڈن مسز جیفرسن ایک قصاب نما عورت تھی۔ وہ قیدی عورتوں پہ بے حد ظلم کرتی تھی۔ بالخصوص ایسے قیدیوں پر جن پہ بغاوت یا اقدام قتل کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ یا پھر ایسی قیدی عورتیں جن کا تعلق بین الاقوامی دہشت گردوں سے ہوتا تھا۔

اس عورت نے مجھ پہ بے حد ظلم ڈھائے تھے۔ نشے کا انجکشن لگوائی تھی مجھے۔ ہم قیدیوں میں اس عورت نے اپنی جاسوس چھوڑ رکھی تھی، وہ بھی بظاہر ایک قیدی کے ہی روپ میں ہم میں موجود رہتی تھی۔ ہم جو منصوبے بناتے یا ہنگامہ آرائی کرنے کی کوئی اسکیم سوچتے، وہ فوراً آشکارا ہو جاتی تھی۔

خیر۔ عابدہ کے ساتھ بھی بڑا ظلم ڈھایا تھا اس رذیل جیل وارڈن نے۔ میں قیدی عورتوں میں ایک دبنگ عورت مشہور ہو گئی تھی۔ کیونکہ میں لڑائی بھڑائی میں ماہر تھی۔ بہت دنگا فساد کرتی تھی، لیکن عابدہ سے میری گاڑھی چھننے لگی تھی۔ یہی بات تھی کہ وہ بے چاری تو مجھے صورت سے ہی معصوم اور بے گناہ دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اس کا دل بھی بڑا معصوم اور ہمدرد صفات تھا۔ میری اس سے دوستی کی ابتداء اس وقت ہوئی جب پہلی بار کورکوران جیل میں لا کر پھینکا گیا تو میری حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ بے ہوشی اور منشیات کے انجکشن لگا لگا کر مجھے بالکل بے سدھ کر دیا جاتا تھا۔

وہاں عابدہ میری دلداری کیا کرتی تھی۔ جیل والوں کی لیے [illegible]

ایسی ہی قیدی کی جاسوس عورت سے ایسے اپنی ساتھی بھی بناتی تھی۔ ایسی قیدیوں کو یا انجکشن لگا دیے جاتے تھے۔

عابدہ نے نجانے کس طرح کوئی چکر چلا کر دو ٹیکے ضائع کرنا شروع کر دیے۔ اس دوران میں پوری طرح جب ہوش میں آنے کے قابل ہوئی تو عابدہ نے مجھے جیل وارڈن کی اس سازش سے آگاہ کر دیا۔

میں نے یہ چالاکی کی کہ بدستور مدہوشی کی ایکٹنگ کرتی رہی اور پھر ایک دن اس جاسوس قیدی عورت کی وہ دھنائی کی کہ اسے ملٹری بیرک سے اٹھا کر لے جانا پڑا۔

کورکوران جیل کیلی فورنیا کی ایک بڑی جیل کہلاتی ہے جہاں خطرناک قیدیوں کو رکھا جاتا ہے اسی مناسبت سے یہاں مختلف صحافی اور انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والے اور رپورٹرز وغیرہ اکثر "سرپرائز وزٹ" پر آتے رہتے تھے۔

میں نے جیل وارڈن مسز جیفرسن کی ساری بدمعاشی کی داستان انہیں سنا دی اور وہ انجکشن بھی دکھا دیے جو عابدہ نے چھپا دیے تھے۔

نجانے بعد میں کیسے اس ظالم عورت مسز جیفرسن نے انہیں مطمئن تو کر لیا لیکن میری اور عابدہ کی شامت آ گئی۔ عابدہ کو کسی نامعلوم لوگوں کے حوالے کیا جانے والا تھا اور میری موت کا سامان کرنے کی خفیہ منصوبہ بندی کی جانے والی تھی۔

سب سے پہلے مجھے راستے سے ہٹانے کی سازش تیار کی جانے لگی۔ مجھے کھانے میں زہر دیا گیا جس کا عابدہ کو علم ہو گیا تھا، کیونکہ ان دنوں اس کی ڈیوٹی کچن میں ہی لگائی گئی تھی۔

اس سازش کو ناکام بنا دیا گیا۔ میں عابدہ کے اس احسان کو آج تک نہیں بھلا پائی ہوں مسز شوری!"

نیکی اتنا کہہ کر تھوڑا رکی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ مغموم سا ہونے لگا تھا۔ توقف کے بعد وہ بولی۔

"جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا کہ اس دوران عابدہ کو کسی نامعلوم لوگوں کے حوالے کرنے کی سازش کا پتا چلا ہو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میری ضمانت ہو گئی۔ عابدہ نے پہلے کیا چکر چلا کر مجھے چھڑوایا اور جیل سے رہائی ملنے والی تھی مجھے اپنی دوست عابدہ کی فکر ستانے لگی۔ عابدہ سے میں اس بات کا ذکر کیا تو اس نے مجھ سے یہی کہا کہ مجھے یہ جیل والی زندگی کو ہی نہیں بلکہ اپنے ان دوستوں کو بھی بھول جا [illegible]

میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے میری جان بچائی تھی اور وہ میری محسن بھی ہے۔

وکٹا نے اسے چھڑانے کا مجھ سے سرسری سا وعدہ تو کرلیا مگر اس سلسلے میں کوئی خاص دلچسپی نہ دکھائی۔ تاہم وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ میرے بے حد اصرار پر اس نے ماجدہ کے بارے میں پہلے اس کو [illegible] پتا چلایا اور مجھ سے کہا کہ وہ کسی ملک کی قیدی ہے جس کے کسی بڑے آدمی سے تعلقات ہیں [illegible] میں انہیں بچانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے [illegible] کہ ماجدہ کا معاملہ [illegible] ہے [illegible] کسی مصیبت میں پھنس گئے [illegible] تو [illegible] میری خاطر ماجدہ کی رہائی کے لیے کوشش [illegible]

ایک [illegible] اس کے پیچھے [illegible] کہ ماجدہ [illegible] ڈھونڈ [illegible] کر [illegible]“

”[illegible]؟“ میں نے [illegible] پوچھا۔

کسی [illegible] کے تحت [illegible]

”کون [illegible]“ نکی نے بتایا [illegible] میں [illegible] جب میں نے اسے بتایا کہ [illegible] لڑکی کو [illegible] کر [illegible] بچاؤ [illegible] معصوم ماجدہ [illegible] کسی [illegible] میں پھنسا کر اپنا کوئی مذموم مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ خاموش ہو گئی۔ تاہم ساری [illegible] میں اس لیے آسانی سے [illegible] جب میں نے بھی نکی کو ماجدہ اور اپنے متعلق [illegible] سے [illegible] ٹنگ [illegible] کے بارے میں [illegible] بتایا۔

نکی نے پھر [illegible] کوششیں شروع کر دیں ماجدہ کو بازیاب کرانے کے لیے۔ اس میں اس کی ڈانسنگ کلب کی لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ جن میں ایک [illegible] سے [illegible] اور نکی [illegible] کی بھی شامل تھی۔ اس کا نام مجھے [illegible] معلوم ہوا تھا۔

[illegible] وکٹا کے مقابلے میں نکی اور اس کی ڈانسنگ کلب کی لڑکیاں زیادہ [illegible] اور [illegible] ہوئیں۔ انہوں نے ماجدہ کا کھوج لگا لیا کہ وہ [illegible] کے پاس [illegible] کے قبضے میں ہے [illegible] کی حمایت حاصل ہے۔ [illegible] پر خود بھی [illegible] ہیں۔ اپنے [illegible] ”[illegible]“ [illegible] کا [illegible] نکی نے اسے [illegible] کر [illegible] کے [illegible] حاصل کر لی۔ [illegible] کہ جب تک ماجدہ [illegible] کے [illegible] سے

[illegible] کر چکا تھا۔

اس نے اسے بتایا کہ ماجدہ کا ایک ساتھی [illegible] امریکا میں قدم رکھ چکا ہے، نکی کو اب میرا ہی انتظار تھا۔ [illegible] جب وہاں پہنچا [illegible] نکی نے میری مدد کی۔

ہمارے درمیان یہ ساری گفتگو تقریباً کوئی دو گھنٹوں تک جاری رہی۔ اس دوران [illegible] میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ کھانے پینے کا سامان لا رہی تھی۔

[illegible] ماجدہ کی تلاش کے سلسلے میں نکی کی چار [illegible] اس کے ساتھ شامل تھیں۔ انہوں نے سب اپنے ڈانسنگ کلب کی [illegible] کر لی تھی۔ اگرچہ اس کا نام [illegible] گیا تھا۔

نکی نے مجھے صاف لفظوں میں [illegible] کر دیا تھا [illegible] ماجدہ والے معاملے میں [illegible] سے [illegible] تھا۔ ماجدہ اس کے گرم [illegible] اس کے ایک اہم [illegible] کی [illegible] کون [illegible] کر رہا ہے وہ میرا [illegible] کہ [illegible] نکی [illegible] کہ وہ [illegible] کی [illegible] تھی۔

مجھے [illegible] کی اس [illegible] پر [illegible] کر میں نے [illegible]

”[illegible]؟“

نکی نے کہا۔ ”[illegible] کیسے [illegible] لیکن مجھے [illegible] ہے کہ [illegible] کی [illegible] میری کسی بھی [illegible] ایک کر دیں گے [illegible] کے لیے کہ [illegible] کسی طرح [illegible] ماجدہ کی رہائی کے حصول کے [illegible] ہو گی۔“

”[illegible] ٹھیک ہے [illegible]“ میں نے اس کی تائید کی۔

”تمہیں [illegible] کی ضرورت ہے ماجدہ کے [illegible] اس معاملے میں بہت [illegible]“ [illegible] ایک [illegible] کی [illegible] بات [illegible] کر [illegible] کی کوئی [illegible] ہیں۔“ میں نے اپنی بات ختم کی [illegible] کر [illegible] کی۔

ہم [illegible] ماجدہ [illegible] کے لیے [illegible] اس کا [illegible] کر [illegible]

[illegible] نکی [illegible] کہا۔

[illegible]

کمانڈو کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" نیل نے [illegible] اور باپ سے کچھ [illegible] آگے بڑھ [illegible]۔

[illegible] میرا اور جیک لی کا سامنا ہوا ہو گا" [illegible] کے [illegible] لڑنے کے ساتھ ہی میں نے نیل کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"[illegible] اب تم میرے ساتھ اور سامنے ہو۔" اس نے تسلی دی۔

[illegible] کے ساتھ جیک لی [illegible] ہوا۔ [illegible] ابھی تک [illegible] ہوئی تھی۔ [illegible] "جیک" کہتے ہیں۔

مجھے [illegible] کی [illegible] پڑ گئے۔ [illegible] سے [illegible] نکل گئی اور آنکھوں میں [illegible] کے تاثرات ابھر آئے۔ حالانکہ [illegible] کہ نیل [illegible] ہوتی تو وہ مجھ پر [illegible] کے [illegible]۔ تاہم وہ مجھ پر [illegible] تھا۔

[illegible] کی [illegible] اس نے کراہت سے ملتی آواز میں نیل سے کہا۔

"اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" نیل نے کھنڈی ہوئی تیکھی سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ بتاؤ، کس لیے آئے ہو؟"

"اس نے مجھے یہاں بھیجا تھا۔ یہ بتانے کے لیے، جاوا بہت [illegible] ہے اگر تم نے بچنے کی کوشش کی تو اس سے بڑی [illegible]۔"

"میں نے پیغام سن لیا، اب تم جا سکتے ہو۔" نیل نے سرد سی آواز میں کہا۔ "ویسے وہ یہ بات فون پر بھی کہہ سکتا تھا۔" نیل کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ "پھر اس سے کہنا میں [illegible] سے میں باقاعدہ خود پہنچ کی بات کروں گی کہ اس نے مجھ سے یہ جھوٹ کیوں بولا تھا کہ شیزی اپنی مرضی سے چلا گیا تھا۔"

"اس نے وہاں جاوا کا ہنگامہ کھڑا کیا تھا، جاوا دام!" جیک لی کے اس سفید جھوٹ پر میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بہت ڈھٹائی سے جھوٹ بولتے ہو تم اور وہ بھی میرے سامنے [illegible] ہنگامے کی ابتدا تو تم نے اور تمہارے ان پالے کتوں نے کی تھی۔ حالانکہ میں آ نیل کو جس حالت میں لے کر یہاں پہنچا تھا۔"

[illegible]

زر دست لہجے میں بولا۔

"بہت [illegible]" جیمز لی [illegible] ہو گیا۔ پھر اس سے بچ کر [illegible] کے اندر [illegible] نے [illegible] کی داخلت کرنے سے جیک لی سے کہا۔

"تم خاموش رہو نیل! میں ہر حال میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ یہ کس کی طرف سے حملہ ہوا۔ میں شیزی کی پوزیشن میں تھی اور ان بدمعاشوں کا سامنا [illegible] تم لوگوں کے ساتھ رہ کر [illegible] کے حوالے سے شیزی کی حفاظت [illegible]۔"

جیک لی، نیل کی بات کا [illegible] کر کے [illegible]۔ گویا اس نے ایک طرح [illegible] سے [illegible] اپنے [illegible] ہی سے خود کو الگ کر لیا۔

"تمہاری تسلی ہو گئی، اب تم جا [illegible]" [illegible] نیل نے [illegible] کے [illegible] سے [illegible] کیا۔

"[illegible] کے یہاں سے چلے جانے [illegible]"

"کہ تم یہاں [illegible] ہو؟" نیل نے [illegible] سے [illegible] کہ [illegible] کے لیے گرفتار ہونے کی ضرورت نہیں [illegible] جیک لی اب تمہاری طرف آگیا [illegible] پیچھے [illegible]" [illegible] آخر میں [illegible] نیل مجھ سے کہا۔ پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں [illegible] کے پیچھے رہتے ہوئے بھی [illegible] کا کھوج لگانے میں ناکام رہی۔"

"لیکن مجھے یقین کی حد تک اندازہ ہے کہ [illegible] لوگوں نے [illegible] کی گرفت سے نکال کر [illegible] ہے۔" میں نے [illegible] کرنے کے انداز میں کہا تو نیل نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

"کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"[illegible] اور [illegible] کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں بھلا۔"

"تمہاری [illegible] کی [illegible] میرا [illegible] تھا۔" وہ بولی۔ "لیکن ان کا کھوج کہاں [illegible] ہے؟"

[illegible]

'' اسٹاروالا؟'' نیلی نے استفسار کیا۔

'' ہاں! اسٹاروالا ٹم گلبرٹ کی وائف رہ چکی ہے۔ دوبار اس کی [illegible] انجیلا کا [illegible] ہے۔ وہ اپنے شوہر لوئیس سے بچھڑ گئی ہے۔'' میں نے کہا اور [illegible] ٹی وی سے میں آتے ہوئے جو [illegible] اور انجیلا کی گفتگو کے بارے میں بتا دیا۔

'' لیکن کیا ضروری ہے کہ انجیلا کو ماجدہ کے بارے میں علم ہو؟'' نیلی نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

'' انجیلا کو اپنے شوہر لوئیس کے ہر [illegible] کا علم ہوتا ہے۔'' میں نے کچھ سوچ کے کہا۔ '' انجیلا اگر نہیں بھی جانتی ہو تو ہم اس سے لوئیس کے بارے میں کوشش کر سکتے ہیں کہ وہ کس وقت اور کہاں سے [illegible] ملتا ہے۔''

'' ٹھیک ہے [illegible]'' نیلی بولی۔ '' اس کا مطلب ہے انجیلا کو کسی ہوٹل بلانا پڑے گا؟''

اگر ضرورت پڑی تو میں اسے اغوا بھی کر لوں گا [illegible] کیونکہ مجھے لگتا ایسا ہی ہے کہ انجیلا اور لوئیس کے درمیان کسی قسم کی چپقلش ہوگئی ہے۔''

'' میاں بیوی کے درمیان تھوڑی بہت کشیدگی تو ہر جگہ ہی ہو جاتی ہے۔'' نیلی بولی۔ '' میرا بھی خیال ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کے درمیان چپقلش ہی [illegible] ہو کر وہ ایک دوسرے سے [illegible] ہوں گے۔''

'' لیکن یہ کوئی ضروری بھی بات نہیں کہ [illegible] پاس ہو سکتے ہیں۔ لیکن آپ تو [illegible] ہونے والی گفتگو سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انجیلا کی اپنے شوہر کے ساتھ ہونے والی چپقلش معمولی نوعیت کی نہیں ہے۔''

'' پھر بھی وہ اپنے شوہر کے خلاف [illegible] بتانے سے گریز کرے گی جس میں اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو۔'' نیلی نے کہا۔

'' ہم انجیلا کو ایسا کوئی تاثر ہی نہیں دیں گے کہ وہ یہ سمجھے۔'' میں نے کہا۔ '' پھر بھی ان حالات میں انجیلا سے ملنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی باتوں سے پتا [illegible] لوئیس کے موجودہ ٹھکانے کا بھی پتا چل سکتا ہے۔ اگرچہ اینگلرم کا صدر دفتر [illegible] ہے مگر وہاں اس کے جاسوس ہمارے پیچھے پڑ سکتے ہیں اور ہمارا سراغ لگا سکتے ہیں۔ جبکہ ماجدہ کو [illegible] تب تک۔''

میں نے کہا۔ اس رات کی گفتگو نے میری پریشانی اور فکرمندی میں اضافہ کا سبب بن رہی تھی۔ [illegible] نیلی نے کسی [illegible] بولی۔

'' اینگلرم کے صدر دفتر کی عمارت سے جہاں تم جانا چاہتے ہو [illegible] لوئیس کے اصل ٹھکانے کا علم ہے۔ میرا مطلب ہے جہاں وہ رہتا ہے؟''

'' [illegible] کے گرد [illegible] میں اس کی حیثیت کا [illegible] ہے۔ وہ وہاں کا ہیڈ کوارٹر [illegible]'' میں نے [illegible] سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اسے بتایا۔

'' ہمم'' نیلی کے منہ سے [illegible] سوچ کے انداز میں آواز نکلی۔ '' تمہیں انجیلا کو [illegible] پڑے گا۔''

'' لیکن اسٹاروالا کہاں رہتی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔

'' ایک حد تک [illegible] میں اس کا پتا لگا لوں گی۔'' نیلی نے کہا اور [illegible] ساتھ آنے کا کہہ [illegible] چھوڑ کر ایک کمرے میں چلی گئی۔

میں اسی کمرے میں صوفے پر [illegible] اور [illegible] سا بیٹھ گیا۔

مجھے اب تک کی ساری [illegible] جالی [illegible] میں اب اس [illegible] تھا کہ [illegible] والا معاملہ درمیان میں [illegible] کیونکہ اس سوال میری [illegible] تھا سے '' [illegible] '' کا سوال کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ پہلے [illegible] اس کے [illegible] لوئیس کی [illegible] جب [illegible] اپنے [illegible] سے [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] کی گرفت سے [illegible] اینگلرم کے [illegible] تھے۔

[illegible] لوئیس تک [illegible] آسانی رسائی [illegible] سکتا تھا اور [illegible] لوئیس کا اصل ٹھکانا کہاں تھا [illegible]

[illegible] میں نیلی والے معاملے نے مجھ [illegible] کی [illegible] میرا خیال تھا کہ اس سے مجھے ماجدہ کے بارے میں [illegible] کچھ [illegible] معلومات ملیں گی لیکن وہ بھی اس حد تک تھیں جس تک میں خود بھی

استاد کی ذخیرے سے نکال کر پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔

اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ کیا خبر تھی کہ اسی کی مدد سے حامد کا سراغ لگانا میرے نصیب میں لکھا ہو۔ مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ مجھے ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہتا۔ سمجھا کہ اس نے [illegible] والے اپنے حارث لگانے پر مجھ سے ساتھ کرنا چاہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کے کام کا نہیں، بالآخر اس نے اپنے ساتھیوں کو خصوصی اشارہ کر کے مجھے ابھی ختم کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے مجھے بچا لیا تھا۔

تھانے سے بھی حیثیت [illegible] کیونکہ میں نے اپنے ذاتی ذرائع سے [illegible] اور [illegible] انجلی کا [illegible] سے [illegible] ہوا۔

آدھے گھنٹے بعد انجلی اور ماریا دوسرے کمرے سے نکل کر میرے پاس آ گئیں۔ میں نے بے تابانہ نظروں سے انجلی کے چہرے کو دیکھا... کسی اندرونی خوشی کے تحت اس کا چہرہ گلستان ہوا۔

"استاد ولا کا پتا لگ گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی لوکیشن اور موجودہ اونر کا بھی۔" وہ مجھ سے اسی خوشی کے ساتھ بولی۔ یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

"ہمیں ابھی نکلنا ہوگا۔" وہ تیار تھی۔ میں نے کہا۔

"نہیں انجلی! تمہارا ایک ہاتھ زخمی ہے۔ میں خود یہ کام نمٹا دیتا ہوں۔"

میری بات سن کر انجلی نے صاف انکار کر دیا اور بولی۔ "میرے بازو کا زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں اور تم کسی سے جنگ کرنے نہیں جا رہے۔ ایک عام سی لڑکی کو چھڑانا ہے اور تھوڑی دیر اسے یرغمال بنا کے چھوڑ دینا ہے۔ تم یہاں اجنبی ہو، میرا ساتھ تمہارے لیے ضروری ہے۔ چلو! اب یہاں دیر کرنا مناسب نہیں۔"

اس نے ماریا کو وہیں رہنے کی تاکید کے علاوہ دوا وغیرہ سے متعلق کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ایک پستول اس نے رکھ لیا تھا جبکہ ایک جرمن والتھر میرے سپرد کر دیا۔

اگلے چند منٹوں بعد ہم اپارٹمنٹ سے نکل رہے تھے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ہم دونوں نے ریڈی میڈ میک اپ کر لیا تھا جس کی سہولت انجلی کے لگژری اپارٹمنٹ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

انجلی کی کار تھی۔ ہم اس میں سوار تھے۔ کار وہی چلا رہی تھی۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

رات شاید اپنے آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ سب

[illegible] انجلی کے [illegible] نے انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ بھی [illegible] سے رکھی تھی، جس میں "گوگل ارتھ" جیسا [illegible] تھا۔ مگر وہ ویب سائٹ نیپال کی [illegible] کی عمارت اور گھر وغیرہ کے بارے میں مکمل معلومات بھی فراہم کرتی تھی کہ اس سے متعلق [illegible] معلومات [illegible] چلی گئی۔

استاد ولا نام کی اس بڑی [illegible] عمارتوں کا ایک ایریا بتایا گیا تھا جس میں [illegible] سب تھے۔ تاہم ایک ہی [illegible] عمارت اس نام سے منسوب تھی۔ ہم اسی عمارت کی طرف چل پڑے۔

رات نے اپنی آخری [illegible] کر لی [illegible] کی [illegible] ویسٹ ہل کے جنوب مشرق میں واقع تھا۔ [illegible] نصف گھنٹے کی تیز ڈرائیو کے بعد ہم اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچ گئے۔

جہاں ہم نے ایک مناسب جگہ پر کار کھڑی کی اور نیچے اتر آئے۔ یہ ایک پارک کا ایک پوش علاقہ لگتا تھا۔ جہاں بڑے خوب صورت اور عالی شان مکانات تھے۔ جن کی طرز تعمیر میں [illegible] لکڑی کا استعمال کیا گیا تھا۔ بہت صاف ستھرا اور الگ تھلگ سا پُرسکون علاقہ تھا۔ یہ [illegible] کی [illegible] سمت میں بنا ہوا تھا۔ اس سے آگے [illegible] کا ساحلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

ہمارے اطراف میں کہیں تاریکی بھی تھی اور کچھ روشنی بھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ [illegible] بھی کہیں کہیں روشن تھیں۔ ہم دونوں خود کو تاریکی کی آڑ لیے اپنے مطلوبہ ٹارگٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔

جہاں ہم نے اپنی کار چھوڑی تھی، استاد ولا کی عمارت وہاں ایک گلی آگے تھی اور وہاں سے دو طرفہ کشادہ مکانوں کی قطاریں شروع ہو جاتی تھیں۔

یہاں مجھے کسی [illegible] "چوکیداری" کا انتظام کہیں بھی نظر نہیں آیا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان پُرتعیش اور دیدہ زیب مکانوں کے اندر یقیناً خودکار الارم سسٹم نصب تھا کہ کسی بھی دروازے یا کھڑکی کو چھوا بھی جاتا تو ہم ان کی [illegible] بھی [illegible] کے دوران [illegible] نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر ایسا کرتے تو ایک الارم گھر کے اندر اور دوسرا کسی قریبی پولیس اسٹیشن میں بجنا شروع ہو جاتا اور پھر چند منٹوں میں یہاں صرف پولیس کی گاڑیاں ہی نظر آتیں لیکن جہاں "چور" [illegible] ہوتا ہے تو وہاں "مور" [illegible] ہے۔

میرے پاس تو نہیں البتہ انجلی کے پاس اس کا توڑ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں نے نیلی [illegible] صاحب [illegible] آگے [illegible] ۔ نیلی میرے عقب میں [illegible] اندر [illegible] رہی تھی۔ میں اس [illegible] کے قریب پہنچا تو نیلی آگے آگئی۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”اس کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس [illegible] ہے۔“

”اسی کمرے کے [illegible]“

نیلی نے جواب میں [illegible] کہا۔ میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ آگے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

”[illegible] خدا کے لیے [illegible]“

[illegible]

[illegible]

کو میرے پیچھے غار میں آگئی تھی۔

"ملکہ شہزادی! وہ دیکھو، خواب گاہ کی طرف..."

اس کی آواز میں نجانے کیا خوف سا در آیا تھا کہ ایک لمحے کے لیے میرا دل بھی لرز سا گیا۔

جیسے ہی میں نے خواب گاہ کی جانب نظریں گھما کر دیکھا تھا، وہاں کوئی چیز بڑی سرعت کے ساتھ حرکت کرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس پُراسرار روشنی کو دیکھ کر حال ہی میں انجلا نے بھی دہشت زدہ ہو کر اپنے حلق سے ایک [illegible] چیخ خارج کی تھی۔

ایک عجیب سا پُراسرار ماحول طاری ہو گیا تھا۔ ایک سنسنی سی پھیل گئی تھی۔

"تم یہیں ٹھہرو... میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے دل مضبوط کیا اور تیزی سے اس جانب لپکا... وہ بھی گھبرائی ہوئی تھی اور [illegible] سے [illegible] جانے سے گریزاں تھی۔

انجلا کو اس کے حوالے کر کے میں [illegible] دروازے سے [illegible] بیڈروم میں آ گیا۔ [illegible] میرے ہاتھ میں تھی۔

کیا دیکھتا ہوں کمرے میں ایک مرتعش سی روشنی کا ہالہ تھا اور [illegible] وہاں سے [illegible] حرکت ہو رہی تھی۔

میں وہیں ٹھٹکا ہوا کر آنکھیں سکیڑ کر سامنے غور کرنے لگا۔

میرا ذہن میرا ساتھ [illegible] اور یہ پُراسرار روشنی کی [illegible] کرنے کے لیے [illegible] ہو گیا تھا۔ [illegible] آ رہا تھا [illegible] نہیں۔

اس دوران انجلا بھی ہمت کر کے ایک ہاتھ سے [illegible] سنبھالے اور [illegible] انجلا کو سہارا دیے اس کے بیڈروم میں لے آئی تھی اور دوسرے ہاتھ میں اس نے بھی میری طرح پسٹل نکال لیا تھا۔

اچانک وہ روشنی ایک جگہ تھم گئی۔ اس نے اب ایک [illegible] جیسی لمبی چوڑی شبیہ بنالی تھی۔ جب ہی میں نے اس کے درمیان ایک انسانی ہیولے کو دھیرے دھیرے [illegible] شکلوں میں ڈھلتے اور پھر انہیں ایک ساتھ [illegible] دیکھا۔

چند ثانیوں بعد ان شکلوں کے اس مجموعے نے ایک انسانی شکل اختیار کر لی۔ اس قدر واضح کہ اس کی شکل [illegible] جسم کی رنگت [illegible] کہ اس کے چہرے کے تاثرات تک بھی بالکل صاف دکھائی دینے لگے۔

وہ ایک مرد تھا۔ جو عجیب سے لباس میں ملبوس نظر آ رہا تھا۔

یہ آدمی صورت شکل کی حد تک [illegible] اجنبی ہی تھا۔ مگر میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ [illegible] خاص شخصیت ضرور تھی جو ایک نئی سائنس "[illegible]" کے ذریعے یہاں مجسم [illegible] کے سامنے [illegible] کھڑی تھی لیکن درحقیقت وہ موجود نہیں تھی۔ بلکہ [illegible] کا عکس تھا۔ یہ [illegible] "ہولوگرام" کہلاتی تھی۔

تاہم یہ انسانی شبیہ [illegible] اس وقت [illegible] اصل اور جسمانی شخصیت کے ساتھ میری نظروں کے سامنے تھا۔

میں غور سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ [illegible] تھا کہ اس [illegible] کی شخصیت بڑی [illegible] لگتی تھی، جیسے کئی شخصیات کا مجموعہ [illegible] لمبا [illegible] تھا۔ [illegible] اس کی عمر [illegible] کا بیشتر حصہ [illegible] دیکھ [illegible] گزارا ہو۔

اس کے سر کے بال [illegible] اور [illegible] سے بالکل [illegible] تھے۔ اس کا چہرہ [illegible] سا تھا۔ آنکھوں سے [illegible] کھینچے ہوئے تھے۔ [illegible] عجیب انداز سے [illegible] محسوس ہوتی تھی۔ [illegible] آنکھوں میں اس کی تیزی [illegible] چمک [illegible] ہو رہی تھی۔

جیسا کہ ذکر ہوا، وہ [illegible] مرد تھا۔ چہرے کے تاثرات کی وجہ سے [illegible] مختلف روپ میں نظر آتا تھا۔ [illegible] اصل حالت کی صورت میں [illegible] اور [illegible] کوئی [illegible] معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] ایک [illegible] نظر آتا تھا۔

لیکن میں [illegible] خوف اور [illegible] اس کی سائنسی "جادوگری" سے مرعوب ہوئے بغیر اس کے چہرے کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔

جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ اس کے چہرے کے تاثرات [illegible] سے [illegible] ہونے لگے تھے۔ وہ بھی میری جانب دیکھنے لگا تو [illegible] میرے ساتھ [illegible] کھڑی [illegible] لگا۔

"کون ہو تم [illegible]؟ [illegible] میری بیوی کے بیڈروم [illegible]"

میں [illegible]

اچانک چلتے ہوئے کمرے کے سناٹے میں اس کی گمبھیر آواز ابھری اور پل بھر کے لیے مجھے یہ آواز شناسا محسوس ہوئی۔

میں نے کہا ’’ہمیں‘‘ [illegible] کیں مجھے یہ یاد آگیا کہ [illegible] لولوش کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

لولوش کا نام ذہن میں ابھرتے ہی میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سنسناہٹ اترتی چلی گئی، جس کو پہلی بار [illegible] ہوگیا۔ ذہن میں چھپے اس کے تحت خیال [illegible] لگے۔ جیسے میں [illegible] اور پاکستان کی لولوش کی پُراسرار شخصیت کی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کرنے لگیں۔

جاوا ہی میں مجھے معلوم ہوسکا تھا، جب پاکستان میں جنم [illegible] بیان سے مجھے اس کی شیطانی قوت پر بات کرائی گئی تھی۔

میں نے فوراً اپنی کیفیات پر قابو پالیا تھا۔ لولوش نے اگر میری کوئی کمزوری دیکھ لی تو اس وقت وہ مجھے [illegible] تھا کیونکہ میں جس [illegible] ہوتے تھے۔

’’تعاقب کیوں نہیں دیتے تم۔ [illegible] کون ہو تو [illegible] میں نے [illegible] میری [illegible] کے قریب دم سے قبل جاؤ۔‘‘ وہ اس [illegible] مسکراہٹ سے بولا۔

وہ کم بخت مجھے ہی تیز نگاہوں سے تک رہا تھا۔ اپنے دشمن عظیم لولوش کو سامنے موجود پاکر [illegible] کے قریب ہی [illegible] نظروں کے سامنے [illegible] میرے [illegible] کی تسکین تک [illegible] اٹھیں۔ میری [illegible] عابدہ [illegible] انسان کی گرفت میں تھی۔

اچانک کمرے میں کوئی آگیا تھا۔ وہ لولوش سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہوگئی، اس نے پھر اسٹریچر سے [illegible] شروع کر دیا۔

’’تم [illegible] مجھے اس کمرے میں لے جاؤ، میں اس جادوگر کا سامنا نہیں کرسکتی، یہ شیطان ہے۔ لے جاؤ یہاں سے لے جاؤ مجھے۔‘‘

’’شٹ اپ!‘‘ میں حلق کے بل [illegible] اس سے [illegible]۔ وہ میرے [illegible] سے اپنا دامن [illegible] اور میری جھڑک پر ایک دم گم سم ہوکر چپ ہوگئی۔ [illegible] لولوش روشنی کے [illegible] حصار میں [illegible] میری جانب اب تیز نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اس نے [illegible] اس کمرے میں کوئی ایسی [illegible] پہلے ہی سے [illegible] کی تھی جس سے اس کا [illegible] رابطہ جہاں

تک نکلتی ہوئی پاتا۔ بلکہ وہ ہنس کر [illegible] اور کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا۔

اس نے شاید میری آواز پہچان لی تھی لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی میں نے اس کا جواب [illegible] کر کہا۔

’’لولوش [illegible] عابدہ کہاں ہے؟‘‘

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں ایک دم سکون سا طاری ہوگیا، جس کی وجہ میں آسودگی انتقام اور [illegible] کی ایک تسکین بخش سی محسوس ہوتی تھی۔

’’واہ [illegible] کرنیٹ [illegible] میں تمہیں سلام پیش کرتا ہوں میرے عظیم دشمن [illegible] آج تم نے میرے سامنے آکر مجھے ایک بہت بڑا خراج تحسین پیش کیا ہے۔‘‘ وہ ایک پُرغرور مسرت کے عالم میں بولا۔

’’میں تیرے جیسے شیطان ابن شیطان پر لعنت بھیجتا ہوں لولوش!‘‘ میں جوش غیظ سے غرا کر بولا۔ ’’میرے سوال کا جواب دو لولوش! عابدہ کہاں ہے؟‘‘

میری تند جذباتی گھن گرج سے اس کے چہرے کے تاثرات [illegible] رنگ بدلتا رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ شیطانی سی مسکراہٹ سے بولا۔

’’عابدہ کو بھول جاؤ اور اب خود کو بھی۔‘‘ اس کے کھردرے سے لہجے میں چھپی سفاکی اور سرد مہری کے ساتھ خباثت کی بھی جھلک محسوس ہوئی۔

’’تم نے مجھے بہت زک پہنچائی ہے [illegible] آسانی [illegible] تم ایک عابدہ کی [illegible] ہے؟‘‘ اس کے لہجے میں [illegible] اور انتقام کی آگ [illegible] رہی تھی۔

’’عابدہ میرے لیے کیا حیثیت رکھتی ہے، یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔‘‘ میں نے اسی جوش سے کہا۔ ’’رہی بات تمہاری اور میری جنگ کی تو وہ تم نے خود ہی چھیڑ رکھی ہے۔ تمہارے لیے بہتر ہوگا کہ میری ان دو شرطوں کے ساتھ اس جنگ کو ختم کر دو۔ پہلی یہ کہ عابدہ کو میرے حوالے کرو، دوسری شرط یہ ہے کہ پھر کبھی اپنا [illegible] میرے ملک میں پھیلانے کی مذموم کوشش مت کرنا۔‘‘

’’ہاہا [illegible] ہاہا [illegible]‘‘ اس نے اپنے حلق سے ایک بھرپور سا شیطانی قہقہا لگایا اور ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کی تالی بجائی۔

’’واہ وا بہت خوب تمہاری بہادری کی۔ لولوش کو تم للکار [illegible] سمجھ نہیں پاتے میں کون ہوں؟ [illegible] آسمان [illegible] ایک

"دو بے جان کو ہلاک کر کے تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے ملک سے میرا نیٹ ورک ختم ہو چکا؟ کمال ہے؟" اس کا طنزیہ لہجہ زہر آلود ہو رہا تھا۔

بلاشبہ مجھے اس کی آخر الذکر بات پہ حیرت تھی۔ بھلا چوہدری ممتاز اور اس کی ٹیم کو شاید میں کیسے بھول سکتا تھا۔

لیکن اس وقت عابدہ اس رذیل شیطان کی گرفت میں تھی۔ میری کمزور رگ پہ اس ملعون نے ہاتھ رکھا ہوا تھا، ورنہ میں اسے لفظوں میں ہی ایسی مار دیتا کہ وہ بلبلا اٹھتا مگر مجھے اب اسے لفظوں کی نہیں اپنے ہاتھوں کی مار دینا تھی۔

لہٰذا بعض ایسے نازک مواقع پہ کسی دشمن کے آگے ایک حد تک جھک بھی جایا کرتا تھا، یہ میری ڈپلومیٹک پالیسی کا حصہ بھی تھا اور بزدل دشمن کو زیر کرنے کا اصول بھی کیونکہ بہادر آدمی بڑی شدت کی ایک بزدل دشمن کا وار عارضی طور پہ جھیل جایا کرتا ہے، اگر خدانخواستہ عابدہ پہ اس شیطان کا کوئی وار چل جاتا تو یہ میرا ایک ناقابل تلافی نقصان ہو جاتا، لولورش کو تو میں یوں بھی زندہ نہیں چھوڑنا تھا۔

لہٰذا میں نے اس بار کوئی سخت جملہ کہنے کے بجائے، حسب سابق مصالحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو لولورش! تم جو کوئی بھی ہو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ عابدہ کو میرے حوالے کر دو، میں خاموشی سے واپس اپنے ملک لوٹ جاؤں گا۔"

"بہت خوش فہم ہی نہیں بلکہ خوش گمان بھی ہو شہزی تم..." وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا، ہاں! عابدہ میرے ہی پاس ہے۔" اس نے بتایا اور میرے اندر ایک تلاطم سا اٹھا۔

اب تک عابدہ سے متعلق اس کی موجودگی، قیاسات پہ قائم تھی جو بہرحال بالقوت تھے اور بعد میں درست بھی ثابت ہوتے رہے۔ لیکن اب لولورش کی زبان سے اس کی تصدیق ہونے کے بعد کہ عابدہ اس کے پاس ہی ہے، مجھے ایک طرح کی دلی طمانیت بھی محسوس ہوئی تھی اور ایک عجیب سے جوش کا جوار بھاٹا بھی میرے سینے سے اٹھنے کو بے چین ہونے لگا۔ میں نے اسے اکسانے کی غرض سے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ تم نے اپنے ہی حلقوں اور خیر خواہوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ کر ان کے قبضے سے عابدہ کو چھینا ہے مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے بعد میں جب انہیں اپنے ذرائع سے یہ معلوم ہوا کہ عابدہ تم..."

"وہ اب بھی میرے ساتھی اور دوست ہیں..." لولورش نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا تو میں اس کی بات پہ چونکے بنا نہ رہ سکا۔

"تمہیں ضرور یہ سن کر شاک پہنچا ہوگا شہزی! لیکن میں نے اپنے ہی خیر خواہوں کو اب اعتماد میں لیتے ہوئے یہ بتا دیا ہے کہ عابدہ اب بھی انہی کا شکار ہے۔ میرا تو عابدہ کو اپنے پاس رکھنے کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے تمہارا حصول۔"

"میں تیار ہوں... لولورش! بتاؤ کہاں ہو تم؟ میں تو خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔" میں نے دھڑکتے دل سے فوراً کہا۔

"اوہ... بہت بہادر ہو۔" لولورش قہقہہ لگا کر بولا۔ "سلام پیش کرتا ہوں تمہارے عشق کو۔ لیکن کیا تمہیں اتنا ہی یقین ہے کہ میرے پاس، میری سلطنت میں آنے کے بعد تم دوبارہ بآسانی نکل پاؤ گے یا زندہ بچ سکو گے؟"

میں اس کے غرور پہ اپنے دل میں ہنس ہی سکتا تھا۔ کیونکہ میرا اس بات پہ ایمان واثق تھا کہ زندگی اور موت صرف میرے اللہ کے اختیار میں تھی۔ میں نے اسے اکسانا مناسب نہیں سمجھا، بولا۔

"اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ مجھے پتا ٹھکانا بتاؤ۔"

"برمودا آجاؤ... یہ پارک سے صرف دو گھنٹے کا سفر ہے۔" اس نے بھی بتا دیا۔ "یہاں میں تمہارا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔"

"برمودا تو کئی ٹاپوؤں کا مجموعہ ہے۔ وہاں تمہارا اصل ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔ جواب میں وہ زہرخندی مسکراہٹ سے بولا۔

"بہت شاطر بنتے ہو لیکن خیال رہے کہیں زیادہ چالاکی گلے نہ پڑ جائے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے دانستہ انجان بن کر کہا۔ اگرچہ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

"میں نے اتنی مشکل بات بھی نہیں کی ہے کہ تمہارے جیسا ذہین آدمی بھی نہ سمجھ سکے۔"

"میں یہی تو سمجھا تھا کہ تم مجھ سے خوفزدہ ہو رہے ہو اسی لیے برمودا میں اپنا اصلی ٹھکانا بتانے سے کترا رہے ہو لیکن ممکن ہے شاید میری سوچ ہی غلط ہو۔"

"بالکل غلط ہے۔" اس نے کہا۔ "تم برمودا کے

[illegible] آ [illegible] گے [illegible] کے ساتھ [illegible] گے۔"

[illegible] میں نے [illegible] اور پھر [illegible] ایک [illegible] جذبات کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میرے [illegible] کہیں [illegible] ہے [illegible] کو [illegible] میں [illegible] کے سامنے [illegible]

[illegible] ایک [illegible] آس [illegible] ایک [illegible] بیٹھی [illegible]

اس نے کہا اور ایک [illegible] روشنی کا [illegible] غائب ہو گیا۔ میرے عقل کی [illegible] ہوتے ہوئے [illegible] بے قرار [illegible] کر سکتا تھا۔

[illegible] کیفیات [illegible]

[illegible] کے بچاؤ کے لیے [illegible] میری جانب [illegible] گے جا رہی تھی۔

لیکن اب تو میرے اندر "[illegible]" کی [illegible] تھی اس لیے وہ میری ہر کیفیات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے میرے لیے ہمدردی اور افسوس کے جذبات [illegible] سے ظاہر [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] جا رہی تھی۔

[illegible] ایک [illegible] جہاں [illegible] کے [illegible] میرا دل [illegible]

اگر [illegible] کو [illegible] دیکھ کر [illegible] میں [illegible] کے [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] میری سانسیں رک گئیں۔ دل [illegible] کے [illegible] کو [illegible] آس پاس [illegible] میری [illegible] بے تابی کے ساتھ [illegible]

یہ [illegible] تھا۔ بہت صاف اور واضح تھا۔ [illegible] کا ایک ایک نقش، اس کی آنکھیں، [illegible] بال، [illegible] اس کا [illegible] گلاب رنگ، ملائم اور [illegible] سب کچھ [illegible] ایسا ہی تھا [illegible] سب کچھ ویسا ہی تھا سب سے [illegible] میرے دل میں بے اختیار [illegible] حالات سے گزرنے کے بعد [illegible] کے ساتھ [illegible]

[illegible]

کہیں دور سے آ رہی ہے۔ ساتھ ہی بے تابانہ وار میں اس کی جانب بھی بڑھا تھا۔

"   وہیں رک جاؤ شہزی!"

اچانک لولوش نے اپنے اسٹینڈنگ لالٹ باکس سے مجھے روکا۔ میں رک گیا۔

"آگے بڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں، ورنہ پھر تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جائے گا اور سوائے نقشوں کے کچھ دکھائی نہیں دے سکے گا۔"

میں رک گیا۔

عابدہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے جام سا کھلا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ یک دم تابناک تھا۔ مگر وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس سے قبل اس کا چہرہ تو اداس دکھائی دیتا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ جیسے پورے دل و جان سے کھل اٹھی تھی۔ اس کے اداس والے شام لیے چہرے پر جیسے یکایک شادمانیوں کی ساعت اتر آئی تھی۔

"یہ میری بات کا اعتبار نہیں کر رہی تھی۔" لولوش نے کہا تھا۔ "کہ   میں تم سے اس کی یوں ملاقات کروا سکتا ہوں۔ ویسے اس بے چاری کا بھی قصور نہیں۔ اس کے ساتھ دھوکے بھی تو بہت ہوئے ہیں۔"

لولوش کیا کہے جا رہا تھا۔ میرا اس کی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔ میں تو بس اپنی جان جاناں عابدہ کی صورت میں ہی ڈوبا ہوا تھا اور وہ بھی۔ اس کے دل و دماغ کی بھی وہی کیفیات تھیں جو میری تھیں۔ حیرت و استعجاب نے جب ایک عجیب کا روپ دھارا تو ہم کے مسرت سے چہرے پر یکلخت مسرتوں کے دیپ جل جاتے۔ "شہزی — کی کی   یہ تم ہی ہو!" شکوہ بھری کیفیت لہجے میں لاتے ان الفاظ میں کیا کچھ نہیں تھا۔ ایک لمبی جدائی کا درد، یادوں کی کسک، تنہائی کے ساعتوں کا کرب، کچھ شکوے بھی اور دل آزار سے جذبوں کی کسک بھی — بے تابیوں کا تو کوئی عالم ہی نہ تھا۔ گویا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ بھی دوڑ کے آئے اور مجھ سے لپٹ جائے۔

"ہاں، ہاں — یہ میں ہی ہوں، تم فکر مت کرو، میں آ گیا ہوں اور بہت جلد تمہارے پاس" میرے یہ الفاظ ادھورے رہ گئے۔ میں کہتے کہتے رہ گیا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے وہاں ایک دھماکا سا ہوا اور عابدہ کا ہیولا غائب ہو گیا۔

میری سب تمنائیں تر ہو گئیں۔ میں نے لولوش کی طرف دیکھا۔ "کی بی   یہ کیا تماشا ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟"

"سوری شہزی   سوری! بھئی میں تم دونوں کو زیادہ دیر جدائی کے کرب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ تمہاری تسلی ہو گئی، اسے کافی سمجھو۔" لولوش متانت سے بولا۔

"لیکن   لیکن میں نے تو ابھی عابدہ سے باتیں"

"بعد میں باتیں بھی کر لینا، رستے کھلے ہی ملا لینا"

اس نے ہنس کے میری بات کاٹی۔ صاف لگتا تھا وہ بے بی عابدہ کی اس کیفیات سے لطف اٹھا رہا تھا۔ یوں جیسے اس کے کسی انتقامی جذبے کو بڑی تقویت مل رہی تھی۔ میں بے بسی سے ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"تم مجھے اتنا ستا رہے ہو شہزی؟" میں نے اسے پکار دیا۔ اس کے پتلے سے ہونٹوں پر کمینی سی مسکراہٹ ابھری۔

"یہ میں اپنے ان دو آدمیوں کی وجہ سے کر رہا تھا جو تمہیں لے کر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔" وہ بولا۔ "برمودا انٹرنیشنل ائرپورٹ پر اترتے ہی وہ تمہیں مل جائیں گے۔ اگر تم نے ان کے ساتھ تعاون کیا تو وہ تمہیں میرے پاس پہنچا دیں گے۔ آئی تھنک   عابدہ کے پاس   اور سنو، ابھی تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔"

"ہرگز نہیں   " اچانک ایک تیز نسوانی آواز ابھری جس نے مجھ سمیت لولوش کو بھی چونکا دیا۔

یہ انجیلا تھی۔ بجلی کی طرح میری نگاہ گھومی، وہ سب بہت غور اور اپنے ہوش و حواس کے ساتھ سن اور دیکھ رہی تھی۔

"شہزی! اس کی باتوں میں مت آنا   یہ دل کے چاند اور فریبی ہے، اس سے زیادہ ایک خطرناک انسان بھی۔" وہ جیسے غصے سے چیخ کر بولی۔ اس دوران اسے میرا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اپنا نام اس کے منہ سے سن کر مجھے عجیب سی خوشی کا احساس ہوا تھا۔

وہ چند قدم اٹھا کے بجلی کے سہارے کے میرے قریب آ گئی تھی۔ میں بدستور حیرت کے اظہار کے طور پر اس کی جانب دیکھتا اور کبھی لولوش کی طرف۔ گویا اس کے لولوش کے ردعمل کا منتظر تھا۔

"گڈ لک! کیا ہو گیا ہے تمہیں   ؟" اچانک لولوش نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟ لیکن تم شاید شہزی کو نہیں جانتی ہو۔ یہ بہت خطرناک آدمی ہے اور ایک دشمن ایجنٹ ہے، تمہارے ڈیڈی   اور بھائی کے حساب

اندر سے اس کی حالت بری تھی۔"

"کیسے بچ گئی ہوں کہ یہ کتنا خطرناک ہے وہ تمہیں [illegible]

تک [illegible]" انجیلا اس سے بولی۔ "میں نے تمہارے ساتھ ایک وقت گزارا ہے۔ تم ایک شیطان ہو۔" اس نے گویا نفرت کا اظہار کیا۔

کہ وہ میری طرف [illegible] سے حتمی جملہ اور قید کر کے رکھنے کے بعد بولی۔

"مسٹر تھورن! ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے اس کی باتوں میں [illegible] تمہیں [illegible] تمہاری گرل فرینڈ [illegible]"

میں نے بھی [illegible] سے کام لیا [illegible] لیکن مجھے [illegible] والی [illegible] کے [illegible] کوئی [illegible] سے انجیلا [illegible] کی [illegible] میں [illegible] کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔"

"ٹھیک ہے [illegible] تمہیں [illegible] میرا [illegible] کہا تھا۔" وہ [illegible] خاموش ہو گئی، مجھے اس کا اس طرح [illegible] خاموشی اختیار کرنا کوئی [illegible] اشارہ لگا۔

"[illegible] تم [illegible] سے [illegible] ہو۔" [illegible] نے اپنی [illegible] انجیلا سے کہا۔ "تم بھی [illegible] کیا [illegible] اور کس قدر طاقت [illegible] لیکن میں [illegible] سے صرف [illegible] کرنا چاہتا ہوں۔ [illegible] تم کیوں اس طرح اچانک مجھ سے جدا ہو گئی ہو؟"

انجیلا نے کوئی جواب نہ دیا وہ خاموشی سے جا کر اپنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"مسٹر تھورن! [illegible] یہاں [illegible] حالات ہے۔ تم بتاؤ کیا ارادہ ہے تمہارا؟"

"میں آج [illegible] کی [illegible] سے [illegible] کے لیے [illegible] ہوں۔" میں نے [illegible] جواب دیا۔

"[illegible] میں تمہارا منتظر ہوں۔ میں تمہیں [illegible] دیکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔ [illegible]"

اتنا کہہ کر [illegible] ایک [illegible] کے ساتھ غائب ہو گیا۔

"[illegible] ایک رات کے لیے [illegible] چاہیے۔" اچانک نبیل نے کہا۔ [illegible] کر سکتا ہے۔"

میں نبیل کے اس [illegible] کو [illegible] نہیں کر سکا تھا لیکن میں انجیلا کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک وہ بیڈ سے کھڑی ہو گئی۔

"تم دونوں کو پاپا سے [illegible] کی طرف [illegible] لگی۔ پہلے مجھے سوال صاف بتاؤ کہ تم دونوں یہاں کیسے آگئے تھے؟"

نبیل نے میری طرف دیکھا اور میں نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے [illegible] اسے سچ بتا دیا۔

"ٹھیک ہے [illegible] تمہاری گرل فرینڈ یہ خیال [illegible] ہے کہ تم مجھے [illegible] کرلو [illegible] تم سے بہت محبت کرتا ہے [illegible] تمہارے آگے [illegible] رہے گا۔"

میں اور نبیل چونک کر اس کا چہرہ تکنے لگے۔

"کیا [illegible] تم کیا کہہ رہی ہو [illegible] انجیلا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میرا ارادہ اب بدل چکا ہے۔ کیونکہ تم خود اس شیطان آدمی سے جدا ہو گئی ہو۔"

"تم نہیں جانتے مسٹر تھورن! میں اس شیطان کے بہت سے رازوں سے واقف ہوں۔"

"لیکن یہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔" نبیل نے اس سے کہا۔

"ہاں! میں اس شیطان کی بری طرح سے گرفت میں ہوں۔ یہاں رہتے ہوئے بھی [illegible] مجھے [illegible] آہ [illegible] آہ۔"

انجیلا نے اتنا کہا اور اپنا سر پکڑ کر ایک بار پھر [illegible] میں چیخنے لگی۔ میں اور نبیل گھبرا کے [illegible] سنبھالنے لگے [illegible] جب تک ہم اسے [illegible] وہ ایک دم [illegible] کی جانب دوڑی [illegible] پر گر پڑی۔

"آہ [illegible] آہ [illegible] میرے [illegible] کی [illegible] پھٹ جائیں گی [illegible] آہ۔"

دوسرے ہی لمحے ہم نے دیکھا انجیلا [illegible] کی ناک کے نتھنوں سے بھی خون جاری ہو گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت نیلی پڑنے لگی اور اس کا چہرہ ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

میری اور نبیل کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل گئیں۔ ٹھیک اسی وقت باہر کسی گاڑی کے ٹائروں کے زور سے چرچرانے کی آواز ابھری۔

ہوس رشتوں کی خود غرضی اور [illegible] بن جانے والے [illegible] کی [illegible] محبت میں [illegible] والے [illegible] کی [illegible] سرگزشت کی مزید [illegible] آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر 51

مندر، کلیسا، مسجد، گاؤں، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنی اپنی عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... معصوم چہرے والے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک اصلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، وہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا۔ اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے مرد... بہت برتر ہوتا ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو سروں کے تاج کا مجبور بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں چونک گیا۔ انجیلا کی پشت کی طرف بیلی کے منہ سے بھی گھٹی گھٹی سی چیخ ابھری لیکن میرے کان باہر اچانک ابھرنے والی جانوروں کی چیخ و پکار کی آواز پر ایک دم کھڑے ہو گئے تھے۔

میری رگوں میں خون کی گردش یک لخت تیز ہو گئی تھی۔ میں نے فوراً بیلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم اسے سنبھالو۔ میں ذرا باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہی میں اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا۔ میں مرکزی دروازے کے قریب پہنچا تو ٹھٹک گیا۔ دروازے کھلے ہوئے تھے اور تیز سرد ہوا اندر آ رہی تھی، کھڑکیوں کے شیشے بھی کھلے ہوئے تھے۔

میں دوڑتا ہوا زینے طے کرتا ہوا اوپری منزل پر پہنچا۔ یہاں ایک ہی ہال سا کمرا، ایک کھلا ٹیرس تھا۔ میں باہر کھلنے والی کھڑکی کی جانب لپکا اور وہاں سے باہر نگاہ ڈالی تو سیاہ رنگ کی اسٹیشن ویگن کھڑی دکھائی دی۔ اس کے اندر سے آٹھ دس مسلح افراد جو سر سے پاؤں تک سیاہ چست لباس میں ملبوس تھے، تیزی سے گیٹ کی جانب لپک رہے تھے۔

[illegible] میرے کمرے سے نکلتے ہوئے ذہن میں ابھرا۔ چونکہ میرا ان [illegible] سے ٹکراؤ ہو چکا تھا اسی لیے میں ان کی باڈی لینگویج کو بھی پہچان سکتا تھا۔

لولووش بہت مکار، شاطر اور دغا باز ثابت ہوا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ اس نے مجھے باتوں میں الجھائے رکھتے ہوئے یہاں پیچھے اپنے آدمیوں کو روانہ کر دیا تھا۔ حالانکہ ہو سکتا ہے [illegible] کے ذریعے اس نے مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے دی تھی لیکن پیچھے وہ جنگ کرنا چاہتا تھا میرے ساتھ..

تیزی سے سوچتے ہوئے مجھے لولووش کی کارستانی کا سبب معلوم ہو گیا۔ انجیلا اس کی بدنامی کر رہی تھی لیکن اس وقت وہ بہرحال اس کی ایک کمزوری ثابت ہو رہی تھی کیونکہ میں بھی یہاں موجود تھا اور وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ اس کی بیٹی جو ایک طرف سے اس کی مخالف بھی تھی، میرے ساتھ ہو چکی تھی، لہٰذا اس نے اپنے ساتھیوں کو جو جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے، تیار رہنے کا حکم دے دیا تاکہ ایک طرف وہ انجیلا کو قابو کر سکیں اور دوسری طرف میں بھی ان کی گرفت میں آ جاؤں۔

گویا جولیا اس وقت لولووش کی گرفت میں تھی اور انجیلا میری گرفت میں تو نہیں البتہ اس بزدلی کے باعث بعید وہ از خود لولووش کے خلاف میرے ہاتھ مضبوط کر سکتی تھی۔

میں جس تیزی سے آیا تھا اسی سرعت سے واپس پلٹ گیا۔ نیچے آ کر میں نے جب انجیلا کے کمرے کا رخ کیا تو بیلی سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے ہلکی کراہ خارج ہوئی، پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور میں نے اس سے کچھ کہے بنا اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا اور زینے کی جانب بڑھا ہی تھا کہ مجھے کھلنے والے اور باغیچے میں کھلنے والی کھڑکی کے شیشے سے تین چار مسلح نقاب پوش تیزی سے حرکت کرتے نظر آئے۔

میں جانتا تھا کہ کیا کرنا ہے اور فی الحال بے ہوش انجیلا (جانے وہ اب زندہ بھی تھی یا نہیں) کو اس کے حال پر چھوڑ کر میں پلٹا اور دوسری جانب سے بڑھا اور بیلی کا ہاتھ چھوڑ کر خود کو نیچے فرش پر اس زور سے گرایا کہ میں نیچے لیٹے لیٹے اسکڈ کرتا ہوا زینے کے قریب جا پہنچا۔ بیلی ذہین تھی، اس نے بھی یہی ترکیب آزمائی۔

اسی وقت دھماکے سے مرکزی دروازہ کھلا لیکن تب تک میں اور بیلی زینے چڑھ چکے تھے۔

بالکونی کی ریلنگ سے چھپ کر میں نے ان کی تعداد جانچی تو میری پیشانی پر سلوٹیں بکھر گئیں، وہ چار تھے، باقی یقیناً کسی اور طرف سے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں اس دوران بیلی کو ان سے باخبر کر چکا تھا اور ابھی میرے پاس انجیلا کا "حال احوال" معلوم کرنے کا وقت نہ تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب میں بیلی کے ساتھ چھپنے کی کوشش میں تھا کہ دائیں جانب کی بالکونی والی کھڑکی کے شیشے کے پار میں نے تین افراد کو دیکھا، ان کی بھی نظریں ہم پر پڑ چکی تھیں اور وہ ہمیں نشانے پر لے چکے تھے۔

دوسرے ہی لمحے گولیوں کی جیسے تڑتڑاہٹ ابھری۔ شیشے دھماکے سے ٹوٹے اور ان کی کرچیاں لاؤنج کے نچلے فرش پر پھیلتی چلی گئیں۔ تب تک میں اور بیلی چھپتے انداز میں لیکن نہایت تیزی کے ساتھ ہال کمرے کی طرف

ایسے نازک اور خطرناک لمحات میں میرا ذہن تیزی سے کام کرتا تھا۔ ہال کا جائزہ لیتے وقت میں نے اس میں ایک سنگل پٹ والا دروازہ دیکھا تھا۔ میں شش و پنج کا شکار تھا کہ وہاں کا رخ کروں یا نہیں، کیونکہ وہ کمرا یا دروازہ ہمارے لیے بند گلی بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

ایک بار پھر دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آوازیں ابھریں۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ کر پیش قدمی کر چکا تھا۔

ہال کمرے کا دروازہ تو کھلا پڑا تھا جو کچھ دیر پہلے میں نے ہی کھولا تھا۔ میں اینجل کو لیے اندر گھس گیا۔ وہ ایک سنگل ڈور ہے لیکن ہم اندر داخل ہو کر دروازے کو لاک کر چکے تھے۔

"ٹائیگر ٹیک کے ایجنٹ لگتے ہیں۔" اینجل نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں اس وقت ہال کا جائزہ لینے کے بعد اسی سنگل پٹ والے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تمہاری سوچ سے بھی زیادہ خطرناک لوگ ہیں یہ۔" میں نے جواب دیا اور تب تک میں اس دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

ایک دھماکا ہمارے عقب میں ہوا اور دوسرے دھماکے سے دروازے کے پرخچے اڑ گئے۔ اس کی باقیات ادھر ادھر جیسے آلائشوں کی صورت میں بکھر گئیں۔

ادھر ہم دونوں نو گز سنگل پٹ والے دروازے کے اندر داخل ہو گئے اور پھر میری آنکھوں میں مسرت کی لہریں اُمڈ آئیں۔ میرا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا تھا۔

سامنے زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا۔ اندر گھستے ہی میں نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا اور اینجل کو لیتا ہوا زینے چڑھتا چلا گیا۔ زینہ تنگ اور چکردار تھا۔ چھت تک جانے کے لیے اسے بجائے کسی [illegible] کر بنایا گیا تھا اور اس وقت ہم اس سے استفادہ اٹھا رہے تھے۔

چھت پہ آتے ہی مجھے ہر طرف تاریک جانے کا دہانہ نظر آیا۔ میں اینجل کو لیے ایک طرف جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا ایک منڈیر کی آڑ میں آ گیا اور نیچے جھانکا۔

نامعلوم حملہ آوروں کی سیاہ اسٹیشن ویگن کھڑی نظر آ رہی تھی۔ میں دوسری جانب گھوما۔ اسپائی آلات میں میرے پاس نقب لگانے والا خودکار رسی والا گیئر آلہ موجود تھا۔ وہ میں نے نکال لیا اور پہلے نسبتاً ایک کم گہرائی دیکھ کر اینجل کو نیچے اتارا اور اس کے بعد میں بھی نیچے اتر آیا۔ مجھے اوپر بڑے زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔

وہ لوگ شاید دروازہ توڑ کر ابھی چھت پر پہنچے تھے۔ ادھر میرے پاؤں زمین کو چھوتے، ادھر اینجل نے اپنے پستول سے تک کر اوپر دو تین فائر جھونک دیے اور پہلے ہی لمحے میں میری سماعتوں میں ایک سے زائد افراد کی کربناک چیخیں ابھریں اور ایک کے بعد ایک دو جسم دھپا دھپ کی آواز سے نیچے گرے۔

یہی وہ وقت تھا جب اوپر سے ہم پر بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔

مجھے اور اینجل کو اسی بات کا اندیشہ تھا۔ اسی لیے نہایت بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ قلابازیاں لگا کر تاریک گوشے کی جانب سرک گئے۔

تین چار سائے ہمیں حرکت کرتے نظر آئے اور پھر اینجل اور میں نے ان پر فائر داغے۔ رات کے دم بخود سناٹے میں دو افراد کی چیخیں ابھریں اور وہ زمین بوس ہوتے نظر آئے۔ فائرنگ کرتے ہی ہم نے اپنی جگہ بدل لی تھی، کیونکہ [illegible] کے تیسرے ساتھی نے تاک کر اسی سمت برسٹ فائر کیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب سوچ لیے ہی میں اور اینجل پچھلے والے شکاری کی لاشوں کے پاس سے ان کی گن اٹھا کر ایک طرف کو لپکے۔

باہر بھی کئی بندے موجود تھے، ہم گن کا صفایا کر چکے تھے۔ اب میں گھات لگا کر اس طرف آن دبکا تھا جدھر ان کی سیاہ اسٹیشن ویگن کھڑی تھی۔

"انکل کو کیا ہوا؟" میں نے سامنے اور گیٹ پر نظریں جمائے رکھتے ہوئے سرگوشی میں اینجل سے استفسار کیا۔

"وہ شاید مر چکا ہے۔ اس پر پہلے ہی بھرپور حملہ ہوا تھا۔" اینجل نے جواب دیا۔

"کیا تم نے اس کی نبض چیک کی تھی؟ یا کوئی معائنہ؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"انکل زندہ ہے۔ لوورش نے کسی ساتھی کی مدد سے اسے زبردستی طور پر اس مرتبہ بھی بے ہوش کر کے منظر سے ہٹا دیا ہو گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انکل ہمارے ساتھ ہو۔"

"تو... تو کیا یہ لوورش کے ساتھی ہیں؟"

"ہاں انکل کو اسی کا پتا چلا تھا لوورش سے نہیں۔"

"میرا خیال ہے سوچ اچھا ہے، ہمیں نکل جانا

چاہیے۔" نکی نے کہا۔

"بس، سوچ تو سب آئے گا۔ تم تماشا دیکھتی جاؤ۔" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا اور اسی وقت گیٹ کھلا۔ میں نے اپنی آنکھیں سکیڑ کر اس طرف دیکھا اور میرے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اکرم کے چار افراد میں سے دو نے انجیلا کو اٹھایا ہوا تھا جو ابھی تک اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔ وہ اسے لیے تیزی سے اسٹیشن ویگن کی طرف بڑھ رہے تھے۔

میں جانتا تھا وہ یہ بزدلانہ حرکت کر سکتے تھے۔ جانتے تھے وہ کہ میرے ساتھیوں میں انجیلا کا منہ بھی دیکھا جا سکتا تھا اور [illegible] نے انہیں صرف انجیلا تک حرکت محسوس کرنے کا حکم دے رکھا ہوگا۔

اسی وقت میں نے نکی کو اشارہ کیا اور اپنی گن سیدھی کر لی۔ فضا میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور وہ چیختے ہوئے گرے جن دو نے انجیلا کو اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے ان کی ٹانگوں پر گولیاں برسائی تھیں۔ وہ دونوں چیختے ہوئے گرے اور میں چیتے کی طرح اپنی گن لہراتے اٹھا اور ان کی جانب لپکا۔ نکی میرے عقب میں تھی۔

انجیلا زمین پر بے سدھ پڑی تھی۔ خطرے کو اپنی جانب بڑھتے دیکھتے ہی وہ دونوں اپنی تکلیف بھول کر بڑی تیزی سے حرکت میں آئے اور قریب پڑی اپنی گنوں کی طرف لپکے۔ لیکن میں تب تک کسی موت کی طرح ان کے سر پر پہنچ چکا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے تکتے رہ گئے۔

"نکی! انجیلا کو اٹھاؤ۔" میں چیخا۔ نکی حرکت میں آئی۔ میں نے ان دونوں زخمیوں کی گن سے ان کے ہتھیاروں کو لات سے پرے کر کے دور دھکیل دیا تھا۔

اس کے بعد میں ویگن کی جانب بڑھا۔ جب تک چابی اگنیشن میں لگی ہوئی تھی۔

ٹھیک اسی وقت پولیس سائرن کی آواز ابھری۔ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

میں نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور نکی بھی انجیلا کو سنبھالے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کے سوار ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے میں ویگن کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا چکا تھا۔

شکر تھا کہ پولیس کی نظروں میں ہم نہیں آئے تھے۔ نیویارک کی سڑکوں پر اس وقت ویرانی کا راج تھا۔ یہ ممکن تھا کہ کوئی گشتی پولیس کار ہی تعاقب میں لگ گئی تھی اسی لیے میں نے ویگن کی رفتار ہلکی کر دی۔ یہ نکی کا مشورہ تھا۔

"ہمم... میرا خیال ہے کہ یہ درست ہے۔" مجھے عقب سے نکی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"ویگن میں ضرور فرسٹ ایڈ باکس رکھا ہوگا۔ تلاش کرو اور جو کر سکتی ہو کرو۔ اسے ہوش میں لاؤ۔" میں نے نکی کو ہدایت دی۔

ویران سڑک تھی اور تیز رفتاری کے سبب ہم ایک آدھ گھنٹے میں نکی کے اپارٹمنٹ پر پہنچ چکے تھے۔

وہاں پہنچ کر میں نے نکی سے کہا وہ اسی وقت انجیلا کو اندر لے جائے اور میں تب تک اس ویگن سے چھٹکارا پا کے آتا ہوں۔ وہ اب ہمارے لیے کسی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ وہ میری بات کا مطلب سمجھ گئی اور نہایت تیزی سے متحرک ہوئی۔

اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی لوٹ آیا۔ ویگن میں نے بہت دور کسی ویران سی جگہ پر کھڑی کی اور اس پر سے اپنے اور نکی کے ہاتھوں کے نشان صاف کرنے کے بعد پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑا۔

نکی کی [illegible] اور سنہرے بالوں والی ماریا سو رہی تھی، جب نکی بے ہوش انجیلا کو لے کر اندر داخل ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کی آنکھیں نیند کے باعث بوجھل ہوئی نظر آتی تھیں۔

اعصابی کشیدگی دور کرنے کے لیے نکی نے اپنے لیے ایک جام بنایا اور میرے لیے کافی۔

انجیلا کو اندر کمرے میں لٹا دیا گیا تھا اور میں نے اس کا مکمل معائنہ کیا تھا۔ نکی نے اس کی ناک اور کانوں سے بہتے ہوئے خون کو صاف کر دیا تھا اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے کوئی دوا دے دی تھی۔

مجھے انجیلا کی حالت اب پہلے سے کافی بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے زیروبم سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہتر تھی۔ تاہم ماریا کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا تھا۔

نکی نے اپنا جام تھامتے ہوئے میری جانب کافی کا مگ بڑھایا۔

"شکریہ۔" میں نے اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ لیا تھا۔

"تو اس [illegible] نے مجھے [illegible] پر ہی میرا انتظار کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔" میں گرم کافی کا ایک

گھونٹ بھر کے میں نے تھکے سے انداز میں کہا۔

"لک... کون؟ کس نے...؟ لولوشی؟" ٹیلی کی کمانوں پر حیرت آمیز جنبش ہوئی۔

"ہاں! اسی کے پیچھے لوگ دوڑ رہے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے ایکنگرام؟"

"ہاں!"

"دراصل وہ اداسی... لیکن تم نے کیسے اُن کے بارے میں اندازہ لگایا؟" ٹیلی نے سوال کیا۔ وہ اب تک ہنسی کے بعد چار گھونٹ اپنے حصے سے بھی حلق میں اتار چکی تھی۔

"فضول سوال ہے۔" میں نے سر جھٹکا۔ "تم یہ بتاؤ۔ انجیلا کو کیا بیماری تھی، کس قسم کا دورہ پڑتا تھا؟"

"میرا خیال ہے لولوشی ہی کی کوئی کارستانی ہوگی۔" وہ اپنے کہے پر یقین کے ساتھ بولی۔

"یقیناً!" میں نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی اور بولا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی ایسی چپ جسم کی صورت میں نصب کر رکھی ہو جس سے لولوشی اسے کسی بھی وقت ایسے ہی عذاب میں مبتلا کر سکتا ہو۔"

"اوہ..." ٹیلی کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

"میں بھی تو کہوں، یہ شاید یہی بیچ کا حملہ ہوا تھا۔" وہ آگے بولی۔ "لیکن سمجھ میں نہیں آتا وہ کیسے اس کا دشمن ہوئی؟ وہ کیوں عذاب میں مبتلا ہوگی؟"

میں نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لولوشی نے اپنا بیوی کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ اس طرح تو وہ براہ راست اس کے باپ ہائیکل سے ٹکر لے رہا ہے۔"

"لولوشی اور ایکنگرام کی عمر کا کیا کہنا، جتنی تشریحات تم کر چکے ہو، اس سے تو یہی لگتا ہے کہ لولوشی کو اس کی کوئی پروا نہیں۔"

"ہاں! وہ ایسا ہی دیوانہ صفت ہے۔ لوگ طاقت اور اپنی مختلف کے گھمنڈ میں جنگلوں رہنے والا ایک مغرور انسان نما شیطان ہے۔"

"لیکن اس کے انداز سے تو صاف جھلکتا تھا کہ وہ اپنی بیوی انجیلا سے بہت محبت بھی کرتا ہے، پھر کیوں؟" ٹیلی کی آنکھوں میں الجھن تیر گئی۔

"یہی بات مجھے بھی کھٹکے جا رہی ہے۔" میں نے کہا۔ "مگر لولوشی جیسے بیمار شیطان سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اپنے مفادات کی خاطر وہ اپنے ہم نوا لوگوں کو بھی اذیت ناک موت سے دوچار کر سکتا ہے۔"

اسی وقت دروازے میں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں چونکا، ٹیلی نے گلاس میز پر رکھا اور مجھے اپنی جگہ بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اٹھی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گئی، پھر ایک گہری سانس خارج کر کے اپنی نشست کی طرف لوٹ آئی۔

"لاشا آیا ہے۔" اس نے مجھے بتایا اور میں چونکا۔

"کیا کوئی گڑبڑ ہے؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"گڑبڑ کیا ہو سکتی ہے۔ تم خاموش رہنا، میں خود اس سے بات کرتی ہوں۔" وہ بولی۔ "بلکہ تمہیں آرام کرنا ہے تو ساتھ والے کمرے میں جا سکتے ہو۔"

"نہیں، مجھے کچھ ضروری باتوں کا ذکر کرنا تھا لیکن لاشا۔"

"اوکے! میں اسے جلد فارغ کرنے کی کوشش کروں گی۔ تم اس سے الجھنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ آ گیا ہی تو ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ڈور بیل بجی اور ٹیلی نے دروازہ کھول دیا۔ لاشا تیزی سے کچھ کہتا ہوا اندر داخل ہوا اور پھر مجھے وہاں بیٹھا دیکھ کر اس کی زبان کو جیسے بریک لگ گئے۔

"یہ ابھی تک یہیں ہے؟" لاشا کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت شارک اسکن کے کوٹ سوٹ میں تھا اور خاصا ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔

میں نے اس پر سرسری سی نگاہ ڈالی اور کافی کے آخری چند گھونٹ بھی ختم کر کے کپ سامنے تپائی پر رکھ دیا۔

"اسے چھوڑو، تم اپنی کہو، کیسے آنا ہوا؟" ٹیلی نے ہلکے لہجے میں پوچھا۔

"ٹیلی! تم بھی ضرور کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والی ہو اور ساتھ میں مجھے بھی۔ تم نہیں جانتیں کہ اس کے پیچھے کیسے کیسے بااختیار لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ میں اتنے طاقت ور قسم کے لوگوں کی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" لاشا بولا۔ اس کے لہجے سے جھنجھلاہٹ نمایاں تھی۔ "بڑی مشکلوں سے تو میں نے ایک مصیبت سے چھٹکارا پایا ہے۔"

"کون سی مصیبت؟" ٹیلی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ انداز مجھے ٹیلی کا ایسا ہی لگا جیسے اس نے جان بوجھ کر اسے بہکانے کے لیے ایسا کہا ہو۔

"وہی گون برگ۔" لاشا چبے ہوئے لہجے سے بولا۔

"مگر کس نے تمہاری اس سے جان چھڑائی تھی؟" ٹیلی

نے کسی قدر اضطراب میں پوچھا اور ساتھ ہی شریر نگاہوں سے میری جانب بھی دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''تھوڑی بہت گڑبڑ ہوئی ہے میری جان۔ کسی اپنے جیسے سوا سیر سے ٹکر لی ہوگی اس نے۔ میں تو اس بدبخت کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔''

''شہری نے ہی اسے جہنم واصل کیا تھا، مائی ڈیئر ڈنٹا۔'' نیلی نے جیسے انکشاف کیا۔ ڈنٹا کا منہ کھلا رہ گیا اور وہ میری طرف دیکھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا۔

''نہیں، نہیں... گون برگ اس کے بس کا کہاں ہو سکتا تھا۔'' وہ بولا۔

تب نیلی نے اسے وہ سب بتا دیا جو میں اس سے کہہ چکا تھا۔ پھر تو جیسے ڈنٹا کے چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا، اس کا انداز و لہجہ بھی بدل گیا۔

وہ پہلے تو چند ثانیے میری جانب حیران حیران سی نظروں سے تکتا رہا، پھر جانے اسے کیا ہوا کہ وہ ایک دم اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے میری طرف لپکا۔ گر میں اسی طرح اپنی کرسی پر بیٹھا رہا۔ البتہ مصافحے کے لیے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی جانب اپنا ایک ہاتھ ضرور بڑھا دیا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا اور اسے چومتا چلا گیا۔ اس کے بعد گرمجوشی جتلانے کے انداز میں گویا کہ دل سے تعظیم پیش کرتے ہوئے بولا۔

''او مائی گاڈ! گویا آپ ہی ڈنٹا پر اتنا بڑا احسان عظیم کرنے والے آپ ہی ہیں۔ آر... گریٹ ماسٹر! میں معذرت خواہ ہوں اور دل کی گہرائیوں سے اپنے کیے کی معافی مانگتا ہوں۔ میں اس پر سزا کے لیے بھی تیار ہوں۔ میں تمہارے قدموں میں بچھ جاتا ہوں۔'' کہتے ہوئے وہ واقعی گڑگڑا کر میرے قدموں پر بیٹھ گیا۔

نیلی ہنسنے لگی، میں ڈنٹا کی اس بدلتی ہوئی حالت اور ''کیفیت'' پر کچھ بوکھلا سا گیا۔

بہتر یہی تھا ڈنٹا کے سوٹ کوٹ اور بوٹ میں اس کو واپس کرسی پر بیٹھا دیکھ کر عجیب مضحکہ خیز محسوس ہوا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اس سے اب میزبانی قسم کی دوستانہ عقیدت بھی ظاہر ہوتی تھی۔ باقی چیزوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانوں کو تھام کر اٹھایا اور پھر اسے اپنے برابر والی نشست پر بیٹھنے کا کہا۔ وہ شرمندہ، شرمندہ سا اٹھ کر کھڑا ہوا اور میرے ساتھ والی تو نہیں البتہ نیلی کے بازو والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ڈنٹا جس قدر میرے اور عابدہ کے لیے اپنے دل و دماغ میں بدترین بدنیتی رکھتا تھا، اس کا یوں اب راہِ راست پر آ جانا میرے لیے بہرحال اچنبھے کی بات تھا۔

بہرحال اب نیلی بھی خوش نظر آرہی تھی اور دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں نے پہلے ایک جام اس کی روایتی طریقے کے مطابق ایک دوسرے کو ''چیئرز'' کیا۔

اس کے بعد میں نے اپنی زبانی بھی اسے گون برگ اور اپنے ٹکراؤ کی داستان سنا ڈالی۔

وہ مزید مرعوب ہوا... ہو گیا، پھر میرے خاموش ہونے پر متاثر کن لہجے میں بولا۔ ''مسٹر شہری! تمہیں شاید ابھی تک میرے بارے میں اندازہ نہیں ہوا۔ اب تم سے کیا چھپانا جب تمہیں گریٹ ماسٹر کا لقب دے ہی دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انڈرورلڈ کی دنیا میں جن چند بڑے لوگوں کے نام آتے ہیں، ان میں میرا نام بھی شمار کے پانچ نمایاں ناموں میں ہوتا ہے، لیکن گون برگ کا میں بال بھی بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ الٹا اس نے مجھے اس قدر زچ کر کے رکھ دیا تھا کہ مجھے اس سے جان چھڑانی مشکل نظر آنے لگی تھی۔ یوں سمجھو جیسے اب میرا تیا پانچہ اس کے ہاتھوں ہونے ہی والا تھا کہ تمہارے ہاتھوں اس کا عبرتناک انجام ہوا۔ جب میں نے اس کے مرنے کی خبر سنی تو مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا تھا۔

''مجھ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیات طاری ہونے لگی تھیں۔ میں نے تو اس موذی کی موت پر تین روز تک اپنے کلب میں باقاعدہ جشن منایا تھا۔ مجھے گون برگ کی ہلاکت کی اصل وجوہات کا علم ہوا کہ وہ اسرائیلی خفیہ ایجنسی شن بیٹ کا نائب سربراہ تھا۔ یا شیخ شہری! تم ایک بڑی جنگ کرنے یہاں آئے ہو، میری ایک سچے دوست کی طرح دعا ہے کہ خدا تمہیں کامیاب کرے۔''

''آمین۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اسی وقت سیل فون کی گنگناتی ٹون ابھری۔ یہ ڈنٹا کا سیل تھا۔ اس نے کال ریسیو کی اور کسی کو اندر آنے کا حکم دیا۔

''ایک کلائنٹ کو میں نے باہر کار میں بٹھا رکھا تھا۔ وہ آرہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

نیلی ڈنٹا کے لیے جام تیار کرنے لگی اور دوسرا جام اپنے لیے بنایا۔

دونوں ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ مجھے اس کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ وہ بار بار باتوں کے دوران ایک دوسرے کے ساتھ انگلیاں بھی کرتے جاتے تھے۔ مجھے ان کی حرکت سے الجھن محسوس ہونے لگی۔

دانش بھی اور نیلی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ذرا ہی دیر بعد بلیک بل کسی بھاری بھرکم ریچھ کی طرح جھومتا جھامتا اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے باس ذنشا کو میرے ساتھ یوں اطمینان سے بیٹھے دیکھا تو چونک پڑا۔ اس کے چہرے کے تیور بگڑ گئے۔ وہ ترش لہجے میں بولا۔ "باس! ابھی تو کہا تھا کہ کیمپ ہے۔" وہ مجھے غلط نام سے پکارنے لگا تو ذنشا نے مداخلت کی۔

"شٹ اپ!"

بلیک بل کی زبان جیسے ایک دم تالو سے جا لگی۔

"تم یا گریٹ ماسٹر مسٹر شیرازی سے معافی مانگو۔" ذنشا نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور بلیک بل کے چڑھے ہوئے تیور یک لخت ڈھیلے پڑ گئے۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور اپنا سر میرے آگے جھکا دیا۔

"اٹس او کے۔" میں نے ہولے سے کہا۔

"کالو کو کال کرو اور بلیک بل! مسٹر شیرازی کو تم اب اسی آنکھ سے دیکھو گے جس آنکھ سے مجھے دیکھتے ہو اور یہ بات ابھی اسی وقت اپنے ساتھیوں کو بتا دو۔ یہ کسی بھی کلب میں آئے جائے کوئی روک ٹوک نہ ہو گی جو مطلب سے وہ کام ہو وہ مجھ سے پوچھے بغیر فراہم کرنا تمہاری ذمے داری ہو گی۔" ذنشا نے اسے حکم دیا۔

"باس کے پاس ایسا ہی ہو گا۔" بلیک بل بدستور اسی طرح سر جھکائے بولا۔

"باہر گاڑی میں میرا انتظار کرو، میں آ رہا ہوں ابھی۔" ذنشا نے اسے دوسرا حکم دیا۔ وہ چلا گیا۔

ذنشا کے آنے سے پہلے میرے اور نیلی کے درمیان جس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی، اس پر دوبارہ شروع ہو گئی اور اب ذنشا بھی اس کے اظہار خیال میں شامل ہو گیا۔ ذنشا کو نیلی نے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

"ایکسٹریم حرکت نہیں آ چکی ہے لیکن استاد ولاش ان کا مقصد تمہیں ہلاک کرنا نہیں بلکہ اغوا کر کے لے جانا ہی ہو سکتا ہے۔" ذنشا نے کہا۔

ذنشا کا یہ کہنا مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے منہ کی بات چھین لی ہو۔ میں نے فوراً ہی اس کی بات پر اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ میں اپنے دشمن کو ہی نہیں بلکہ اس کی فطرت کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ ولاش اس وقت مجھ پر بُری طرح ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ وہ منصب کا لالچی، پرست اور متعصب المزاج شخص ہے، بلکہ ایک شیطان ہے۔ اس کا مقصد یہی ہو گا کہ مجھے اغوا کرنے کے بعد اپنی عابدہ حالی میں لے جا کر مجھے بھی انہی ہی ذہنی اذیتوں سے دوچار کرے جن سے میں اب تک اسے دوچار کرتا آیا ہوں۔"

عابدہ کو بھی اس نے یرغمال بنا لیا اور تیمور لنگ سے اسی مقصد کے لیے چھینا ہے، اس نے ان سے تعلقات خراب ہونے کی بھی پروا نہ کی۔"

"اگر یہی ایک بات ہے۔"

نیلی کچھ سوچوں سے بولی۔ "وہ تمہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے عابدہ کو تختۂ مشق بنا کر دیکھے گا کہ تم کتنے ٹوٹے ہوئے فرد اور شکستہ ہو۔ انا کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔ اس صورت میں ہمیں فوراً ہی عابدہ کا تعین کرنا پڑے گا۔ عابدہ کے لیے میرا دل اب زیادہ تشویش کا شکار ہونے لگا ہے۔ شیرازی! وہ اس وقت تمہارے بہت ہی خطرناک دشمن کے رحم و کرم پر ہے۔"

نیلی کی بات غلط نہیں تھی۔ اس امر کی تصدیق ہو چکی تھی کہ عابدہ بدقسمتی سے ولاش کی گرفت میں جا چکی تھی، میری تشویش آمیز بے قراری عروج پر پہنچ چکی تھی۔

"شیرازی کو اکیلے ہرگز باہر کے سر پر نکلنا چاہیے۔" ذنشا نے کہا۔ "اس خطرناک کام میں مجھے بھی اپنے ساتھ سمجھو اور پورے کیس کا توں سے نکل کر کے جانا پڑے گا۔"

ذنشا کے اس اظہار اعانت نے مجھے بے حد متاثر کیا اور میں اسی لیے تشکر بولا۔ "تمہارے اس خلوص کا میں دل سے مشکور ہوں ذنشا! لیکن میرے اپنے ساتھی بھی ہیں جو ابھی سان ڈیاگو میں مقیم ہیں۔ میں انہیں آج ہی فون کر کے نیویارک بلوا لوں گا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن میں اور بلیک بل تمہارے ساتھ ہوں گے، نیلی بھی ہمارے ساتھ ہے۔ تم اپنے ان دونوں ساتھیوں (کمیل دادا اور شکیلہ) کو بھی بلوا لو، باقی کیل کانٹوں کا میں بندوبست کر دوں گا، بلکہ میں ایک ہیلی کاپٹر کا بھی بندوبست کر لوں گا، ہمارا اس طرح جانا زیادہ بہتر

ہوگا۔" انشا نے حتمی لہجے میں کہا۔ جیلی... اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"انشا! مجھے خوشی ہوئی کہ شیری کی طرف سے تمہارا دل صاف ہوگیا۔ تم واقعی ایک بہت اچھے انسان ہو۔"

"جیلی! ڈارلنگ! آئی لو یو..." انشا بھی اس کا بوسہ لیتے ہوئے محبت پاش لہجے میں بولا۔

"بس! اب آج کل میں برمودا روانگی کی تیاری کرو اور اس مہم کو مکمل طرح خفیہ رکھنا ہوگا۔"

اس کے بعد جیلی اور میں نے انجیلا کی خبر لی۔ وہ دوسرے کمرے میں ماریا کے سپرد تھی۔ انشا کو وہاں سے رخصت کرنے کے بعد جیلی اور میں نے انجیلا کے کمرے کا رخ کیا۔

وہ ہوش میں آچکی تھی اور اب اس کی طبیعت بھی کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ وہ خاصی متوحش اور ہراساں سی نظر آرہی تھی لیکن پھر جیلی اور مجھے اپنے قریب پا کر اس کے خوب صورت چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔

اس مختصر سے وقت میں ماریا اسے جوس اور سوپ وغیرہ دے چکی تھی۔ شاید یہ اس کی خدمت کا مرہونِ منت تھا کہ اس کی حالت بہت بہتر تھی۔

"م... میں کہاں ہوں؟" اس نے نحیف سی آواز میں پوچھا۔ [illegible] اور خوف کی کیفیات کے سبب اس کے چہرے کی رنگت پیلی سی پڑ گئی تھی۔

"تم بالکل محفوظ جگہ پر ہو۔" جیلی نے نرمی سے کہا۔

"م... میں اسٹاروولا میں تو نہیں ہوں نا؟"

"نہیں۔" اس بار میں نے جواب میں کہا۔ "تم اس وقت میری ساتھی جیلی کے ایک اپارٹمنٹ میں ہو۔"

"وہ... وہ شیطان دوبارہ تو نظر نہیں آیا؟" انجیلا کا اپنے شوہر کو "شیطان" کے لقب سے نوازنا خالی از علت نہ تھا۔

"وہ دوبارہ نظر نہیں آیا لیکن تمہاری حالت اچانک بگڑ گئی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا تمہیں؟ کیا اس سے پہلے بھی تمہیں ایسا خطرناک دورہ پڑ چکا تھا؟" میں نے کسی خیال کے تحت اس سے سوال کیا۔

میرا سوال سن کر وہ کچھ خاموش سی ہوگئی۔ جیسے اندر ہی اندر کہیں دور پہنچ گئی ہو۔ وہ کہیں کھو گئی تھی پھر ایک دم اپنے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں تھام لیں۔

میں ذرا ٹھٹکا، پھر کوئی ایسا ہی دورہ پڑنے والا ہے۔ جیلی کے چہرے پر بھی سلوٹیں پڑ گئیں۔

"اوہ... [illegible] کیا پھر وہی منحوس [illegible] مجھ پہ جھپٹا تھا؟" اچانک انجیلا جیسے خواب میں چونک کر بولی۔ "وہ اس کا احمق... خبیث وہ، بس... مجھے زیادہ یاد کرنے دو..." وہ پھر سوچ میں مستغرق ہوگئی اور میں اب غور سے اپنی آنکھیں سکیڑے اس کے چہرے اور اس کی کیفیات کا جائزہ لینے اور اپنے تئیں کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔

وہ ابھی تک ٹخنوں کی سیاہ جالی دار نائٹی میں ملبوس تھی جس کے پار اس کا گورا سبک تمام بدن [illegible] ہو رہا تھا۔ سیاہ گھنے بال اس کے مرمریں، گداز شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

لیٹے میں بھی وہ "حسن بے پروا" کی شاہکار تصویر بنی نظر آتی تھی۔ حسن ہو اور خود سے بے خبر بھی ہو تو اس کی جانب نجانے کیوں بے اختیار دل کھنچا جاتا ہے۔

مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو چلا تھا کہ انجیلا کے ساتھ کیا ہو سکتا تھا یا ہو کیا رہا تھا لیکن ابھی میں پہلے اس کے بولنے کا منتظر رہا تھا۔ ساتھ ہی میری سماعتوں میں پایکن اور بالخصوص وولف کی لولوش سے متعلق وہ گفتگو بھی گونجنے لگی تھی جو وہ اکثر مجھ سے کرتے رہتے تھے۔

یہی کہ لولوش جیسے شیطانی قوتوں کے حامل شخص سے مقابلہ کرنے کے لیے مجھے جن جدید اور کرشماتی خصوصیات کے حامل ہتھیاروں کی ضرورت تھی، ان کے حصول کے لیے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی مصر کے بے آب و گیاہ اور تپتے ریگستانوں کا کٹھن سفر کرنا پڑا تھا اور مجھے ایک گمنام اہرام "الازک پیرامڈ" تک بھی رسائی حاصل کرنا پڑی تھی، [illegible] انڈیانا جونز کی طرح یہ مہم بھی بڑی خطرناک اور پُرمصائب تھی۔

ان تین ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار "ہیڈ وائز" جو مردود اور واصلِ جہنم [illegible] کے ساتھ مارا ماری میں ضائع چلا گیا تھا، تاہم ابھی دو ہتھیار احتیاط اور ذہانت کے سبب حفاظت سے باہر ہی نکل آیا تھا یا پھر ایسا ہی رکھا تھا۔

خیر، اب ان میں سے دو الو کے ہتھیار، [illegible] اور [illegible] سانپ والی انگوٹھی اب بھی میرے پاس تھے۔ میں اب تک ان سے زیادہ تو نہیں لیکن کافی حد تک ضرور خاطر خواہ کام لے چکا تھا اور میں صرف اشد ضرورت کے تحت ہی انہیں بروئے کار لاتا تھا۔

یہ سب باتیں پل کے پل سوچنے کے بعد مجھے لگا کہ لولوش چونکہ ایک شعبدہ گر آدمی تھا اور انجیلا کی اس

یہ کتاب PK Library.com سے

ڈاؤنلوڈ کی گئی ہے

Click here to visit

www.pklibrary.com

کیفیات میں اسی کا ہی ہاتھ ہو سکتا تھا۔

"ہاں... ہاں اسم... مجھے سب یاد آ گیا۔" انجیلا ایک دم بولی۔

وہ جیسے اب پوری طرح اپنے حواسوں میں آ گئی تھی۔ اس نے پانی مانگا۔ نیلی نے ماریا کو اشارہ کیا۔ وہ پانی کا گلاس لے آئی۔

"ٹھیرو! ایک منٹ مل جائے گا؟" انجیلا نے پانی کا گلاس ایک ہی سانس میں ختم کر کے نیلی سے کہا۔ ذرا دیر بعد وہ گئی اسے چیک کر دیا۔

وہ جام غٹاغٹ چڑھانے کے بعد انجیلا کا اعصابی تناؤ اور ذہنی دباؤ بہت حد تک ختم ہو گیا۔ میں کسی اُلجھن میں تھا۔ ایک خیال کے تحت بولا۔ "انجیلا! کیا تم اب اپنے شوہر لولوش سے دوبارہ۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ ایک دم میری بات کاٹ کر نفرت انگیز لہجے میں بولی۔ "میں اس کمینے پاگل شیطان نفس کو اب طلاق دے دوں گی۔ میں تو ایک لمحہ بھی اس کے ساتھ نہیں گزار سکتی لیکن۔۔"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں نے پُرغور نظروں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں اپنے شوہر کے نفرت کے جذبات میں یکلخت خوف کا عنصر بھی غالب ہونے لگا۔

"بولو... بولو، انجیلا! تم رک کیوں گئیں؟" نیلی نے اسے کریدا۔

"وہ... لیکن اس رذیل انسان نے شاید مجھ پر کوئی کالا عمل کر رکھا ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ اب انجانے خوف سے کپکپاتا محسوس ہوا۔

"بکواس کی باتیں ہیں یہ۔" نیلی نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ ایسی سوسائٹیز بھی موجود ہیں جو ایسے شیطانی عملیات میں ملکہ رکھتی ہیں۔ لیکن وہ محض ایک دھوکے اور فراڈ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

"تو پھر وہ کیوں جب چاہتا ہے میرے دماغ کو سُن کر دیتا ہے اور مجھے ذہنی طور پر اس قدر مفلوج اور مغلوب کر دیتا ہے کہ میں... کیا تم نے اس کی جھلک ابھی نہیں دیکھی تھی؟ میری حالت کیسی ہو گئی تھی۔" انجیلا نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"سنو انجیلا!" اس بار میں اس سے براہ راست مخاطب ہو کر سنجیدگی سے بولا اور انجیلا ہی نہیں نیلی بھی میری جانب تکنے لگی۔

"تمہیں کیسے اور کب اس بات کا علم ہوا کہ تمہاری یہ حالت تمہارے شوہر لولوش ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی وہ ہی یہ حرکت تمہارے ساتھ کرتا ہے؟"

"میرا خیال ہے مجھے اب اس خبیث لولوش کے خوف کے پس منظر سے تمہیں آگاہ کرنا چاہیے۔" انجیلا سوچتے ہوئے بولی۔ میں اور نیلی اس کی جانب تکتے رہے۔

بالآخر اس نے ایک گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"چونکہ یہ بھی اس کا کوئی جادو تھا جو اس نے مجھ پر کیا کہ میں اچھی بھلی، راجس سے پیار کرتی کرتی اس خبیث کی محبت کے جال میں جا پھنسی۔ حالانکہ راجس ایک وجیہ، بلند قامت اور خوبرو انسان تھا۔ وہ جاب کرتا تھا۔ مجھ سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔ شاید مجھے اسی کی سزا ملی کہ میں نے اس کے ساتھ بے وفائی کر ڈالی۔ لیکن باوجود اس کے بے چارے راجس کو اس سے بھی زیادہ بھیانک سزا یہ ملی کہ وہ ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس کے لیے سزا کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ اب مجھے معلوم ہے کہ یہ بھی اسی لولوش کی حرکت تھی۔ اسی نے حادثے کا ڈراما رچا کر راجس کو جان سے مار ڈالا۔ کیونکہ راجس یہ جانتے ہوئے کہ میں اسے دھوکا دے چکی ہوں۔ وہ میری بے وفائی پر بار بار یہی کہتا تھا کہ تمہیں کسی نے بہکا دیا ہے۔ کوئی تم سے فریب کر رہا ہے۔ میں اس آدمی کا کھوج لگاؤں گا اور تمہاری محبت سے اتنی آسانی کے ساتھ دستبردار نہیں ہوں گا۔ وہ بے چارہ بہت جذباتی شخص تھا۔ ایک بار تو رو ہی پڑا تھا میرے قدموں پر بھی گر پڑا تھا۔ ہائے... کس قدر چاہنے والا سچا عاشق ملا تھا مجھے راجس کی صورت میں... لیکن میں نے... میں نے..." انجیلا کا لہجہ رندھ گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس نے خود کو سنبھالا لیا پھر کہنا شروع ہوئی۔

"لولوش کی شخصیت بڑی سحر انگیز تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ بھی مجھ سے کم محبت نہیں کرتا تھا۔ میرے ڈیڈی (پاسکل جولابا) نے میری تئیسویں برتھ ڈے کی تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ ڈیڈی کے قریبی دوستوں میں ایک یہ شیطان بھی شامل تھا، اور لوگ بھی تھے۔ راجس بھی شریک ہوا تھا۔ وہ بے حد اچھا اور نفیس لباس پہن کر آیا تھا اور میرے لیے بے حد خوبصورت برتھ ڈے گفٹ لایا تھا۔ ڈیڈی بھی اسے میرے ہونے والے شوہر کی حیثیت سے پسند کرتے تھے۔ راجس کو دیکھ کر بے اختیار میرے دل میں خواہش ابھری تھی کہ کاش! اس تقریب میں ڈیڈی ہماری

مشکل کا بھی اعلان کر دیتے۔ جب میں نے والس کے بچکی لے کر یہ بات بتائی تو وہ اس بات سے متفق ہوا کہ ہم نے پہلے کیوں نہیں سوچا تھا۔ ہم دونوں کا والہانہ پن روپ تھا اور جاننے والے جان گئے تھے کہ میرے اور والس کے درمیان کس قسم کا رشتہ پنپ رہا تھا۔

بس ... پھر نہ جانے کیا ہوا کہ بیچ میں شیطان لولووش اچانک ہمارے درمیان آ گیا۔ وہ مجھ سے ملنے جلنے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک موقع پر والس کو واش روم جانے کی حاجت پڑ گئی۔ میں ایڈی کے قریب چلی گئی۔ وہاں لولووش بھی کھڑا تھا۔

وہ شاید جانے کب سے موقع کا منتظر تھا۔ ڈیڈی کو اس نے اس سے میرا تعارف کرایا اور پھر اس طلسمیت میں جانے کیسی شیطانی کشش تھی کہ میں اس کی باتوں کے سحر میں گرفتار ہو گئی اور پھر ہم دونوں جام ہاتھوں میں . تھامے ہوئے ٹیرس پر آ گئے۔ وہاں کا منظر مجھے آج بھی آپ خوب ناک سا محسوس ہونے لگا۔ چونکہ یہ لولووش کی طلسماتی شخصیت کا اثر تھا کہ مجھے اس بات کا ہوش بھی نہ رہا کہ والس مجھے بے چینی سے تلاش کر رہا ہوگا۔

بالآخر والس مجھے ڈھونڈتا ہوا ٹیرس پر آ گیا اور پھر میں نے والس کی باہوں میں بانہیں ڈال کر لولووش کو ہاتھ سے بائی کیا تو اس کے ہونٹوں پر عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں طلسماتی سی برقی لہریں دوڑ رہی تھی۔

میں اس روز کھوئی کھوئی سی رہی۔ والس نے بھی میری اس اچانک تبدیلی کو محسوس کیا تھا مگر میں اسے کچھ نہ بتا سکی۔ طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنائے رہی۔

بس ... اسی روز کے بعد سے مجھ پر لولووش کا ان دیکھا جادو چل گیا۔ اس میں بلا کی مردانہ کشش تھی۔ وہ تھا بھی ایک بھرپور مردانہ وجاہت کا حامل۔ وہ ایک سحر تھا ایک جادو تھا۔ میں اس کی باتوں کی قربت کی اسیر رہنے لگی۔ دیوانی ہو گئی اس کی یہاں تک کہ مجھے والس سے بھی کوئی دلچسپی نہ رہی۔ لولووش سے میری ایک دو ملاقاتیں کیا ہوئیں کہ میں نے اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا۔ ایڈی کو بھی کوئی اعتراض نہ تھا لیکن انہوں نے صرف اشاروں کنایوں میں ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ میں ایک بار اور غور کر لوں۔

لولووش سے شادی کے بعد کیا بات ہی اور تھی۔ دنیا کی کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ مجھے لے کر نہیں گیا۔ ہماری زندگی بہت خوشیوں بھری گزر رہی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ جب مجھے اس کے ساتھ اس کے مختلف ٹھکانوں پر رہنے کا موقع ملا تو اس کا اصل کریہہ چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ ایک جگہ ایک گینگسٹر، کرمنل تھا۔ جس کا ایڈی مجھے بھی اشاروں کنایوں میں بتاتے رہے تھے، لیکن میری ہی عقل ماری گئی تھی یا اس کے شیطانی سحر کا اثر تھا۔ مجھے اس کی بھی پروا نہ کی۔ لیکن جب میں نے اسے بڑے ایسے کالے عملیات کرتے پایا اور بے گناہ انسانوں کو اس آگ میں جھونکتے دیکھا تو مجھے اس سے نفرت ہونے لگی۔

بڑی ہی عجیب بات تھی میرے لیے ... جب میرے اندر اس کے لیے نفرت کا جذبہ بیدار ہوا تو میرے دل و دماغ سے اسی روز اس کی سحر انگیز طلسماتی شخصیت کا بت بھی پاش پاش ہو گیا۔"

انجیلا اتنا بتا کر سانس لینے کو رکی۔

میں اور ٹیلی بڑی دلچسپی کے ساتھ اس کی باتیں سن رہے تھے۔ بالخصوص میرے لیے لولووش کے متعلق انجیلا کی زبانی یہ جان کاری زیادہ اہم تھی۔ کیونکہ انجیلا ہی وہ ہستی تھی جو لولووش کی ایک حقیقی بیوی کی حیثیت سے اس کے ساتھ رہی تھی۔ اس سے زیادہ بھلا اور کون لولووش کے بارے میں مجھے آگاہ کر سکتا تھا۔

تھوڑا توقف ہونے کے بعد انجیلا نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میرا تعلق [illegible] سے ہے [illegible] شیطان [illegible] کے ایک گمنام جزیرے "ہوگ بے" میں اپنی ایک اسٹیٹ قائم کیے ہوئے ہے وہی اس کا ٹھکانا ہے۔ یہ جزیرہ کرسٹل اینڈ فینٹسی کیوز Crystal and Fantasy (Caves) کہلاتا ہے۔ جہاں زیر زمین غار ہیں۔ انہی کے درمیان سے ایک راستہ شور روڈ جنوبی ساحل تک لے جاتی ہے اور وہاں سے ہوگ بے کی طرف کسی تیز رفتار بوٹ یا اسٹیمر کے ذریعے جایا جاتا ہے۔ لولووش نے اپنی ہوگ بے اسٹیٹ میں ہر قسم کے لوگ رکھے ہوئے ہیں، وہاں کا سارا سسٹم بھی [illegible] ہے۔ سائنسدان، ڈاکٹرز اور دنیا کے ٹاپ پروفیشنل افراد کی پوری ٹیم وہاں موجود رہتی ہے۔ بڑی لیبارٹری ہے، سائنسی تجربے ہوتے ہیں، ریسرچ سینٹر ایک [illegible] اور نیا لے کیا گیا کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لولووش بظاہر [illegible] برس کا ہے لیکن درحقیقت [illegible] ایک زمانے سے وہ ایک [illegible] نظر آتا ہے جس کے پاس [illegible] ایک [illegible] دوسری نظر سے دیکھو تو ایک جادوگر ... تیری نگاہ میں [illegible] اور سحر [illegible]۔ اف کیا کیا بتاؤں۔

میں ان کے ساتھ ڈاکٹر براؤن بیک بھی جاتی رہی ہوں۔ اس کی قبر بھی وہیں ہے، جہاں ایک پہاڑی اس کی ملکیت ہے۔ وہاں اس نے ایک تاریک گھنے جنگل میں مجھے اپنی ماں کی قبر بھی دکھائی تھی۔ بقول اس کے، اس کی ماں کی روح آج بھی اس کی رہنمائی کرتی ہے، اس کی طاقت بڑھانے کے لیے دعا کرتی ہے جسے وہ روحانی علم کا درجہ دیتا ہے۔ آج کل وہ مصر سے برآمد ہونے والی ایک نودریافت ممی پر ریسرچ کر رہا ہے۔“

وہ اتنا بتا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر رہ گئی۔ میں اور جیکی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

”تم ٹھیک تو ہو نا؟“ جیکی نے شاید اس ڈر سے اس سے پوچھا کہ کہیں پھر اس پر کوئی دورہ پڑنے والا ہو۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ انجیلا نے ایک گہری سانس لی۔ میں نے بےقراری سے پوچھا۔

”میری ساتھی عابدہ کے بارے میں تو تم جان ہی چکی ہو، یہ بتاؤ اس خبیث نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟ کیونکہ ہم لوگ لولوش کی سرکوبی اور عابدہ کو اس کی شیطانی گرفت سے چھڑانے کے لیے عنقریب مصر روانہ ہونے والے ہیں۔“

میری بات سن کر انجیلا نے ایک دم سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ پھر بولی۔ ”ہاں، عابدہ اسی شیطان کی قید میں ہے اور اس نے اسے اپنی اسٹیٹ میں ہی یرغمال بنا رکھا ہے۔ اگر تم نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی، کیونکہ میری رہنمائی تم لوگوں کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔“

اس کی بات غلط نہیں تھی لیکن میں اس کی اچانک بدلتی کیفیات پر فکرمند تھا اور پھر اسے یاد دلانے کے انداز میں ایک بار پھر بولا۔ ”سنو! میں نے تم سے تمہاری اس کیفیات کے متعلق پوچھا تھا، کیونکہ تم ہی بہتر طور پر بتا سکتی ہو کہ کون سی شکل وہ دیکھتا ہوا لولوش تمہیں آخر کس قوت کے بل بوتے پر اس قدر مغلوب کر کے رکھ دیتا ہے کہ تم مرنے کے قریب ہونے لگتی ہو؟“

”ایسا کئی بار ہو چکا ہے میرے ساتھ۔“ انجیلا جواب میں تلخی سے بولی۔ ”جب سے میرے تعلقات اپنے شوہر لولوش سے خراب رہنے لگے تھے، اس خبیث نے مجھے پہلے مسمریزم کے ذریعے اپنا معمول بنانا چاہا تو بھی ناکامی آنے پر مجھ پر ہسٹریائی دورے پڑنے لگے۔ میں اسے چھوڑ کر جینے کے لیے اپنے ڈیڈی کے پاس نیویارک واپس لوٹ آنا چاہتی تھی لیکن وہ مجھے بھی آنے نہ دیتا تھا۔ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور بالآخر میں نے بابا کی چاہت ہوتے اس کے ہر برے کام میں اس کا ساتھ دینے کا جھوٹا وعدہ کر لیا۔

پھر جب میں ڈیڈی سے ملنے کے بہانے نیویارک روانہ ہونے لگی تو لولوش نے مجھے بڑی شاطرانہ محبت کے ساتھ الگ لے جا کر انداز میں یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں وہاں جا کر کوئی ایسی ویسی حرکت کی یا اپنے ڈیڈی کو عابدہ کے بارے میں بتایا کہ وہ اس کے قبضے میں ہے تو پھر میں تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے وہاں عذاب میں مبتلا کر دوں گا۔

میں لوٹ تو آئی اور ڈیڈی کو بھی عابدہ کے متعلق بتا دیا۔ وہ خود آج کل اس کی اچانک گمشدگی کے بارے میں پریشان رہتے تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں کہ میں ڈیڈی ہی کی لاڈلی بیٹی نہیں ہوں بلکہ اپنے شوہر کی بھی چہیتی بیوی ہوں۔ ان کے کسی بھی قسم کے معاملات مجھ سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔

پھر میں نے آ کر ڈیڈی کو بتا دیا کہ وہ جس پاکستانی نیوی لڑکی کی وجہ سے پریشان تھے، وہ آپ ہی کے داماد اور ایک بڑے حلیف، لولوش کے قبضے میں ہے۔“ وہ چند ثانیے کے لیے تھمی۔

میرے سامنے اپنے باپ کے حوالے سے عابدہ کا ذکر کرتے ہوئے انجیلا کے چہرے اور آنکھوں سے شرمندگی کا بھی اظہار ہونے لگا، پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے اسی لہجے میں بولی۔

”مسٹر شوزی! میں آپ سے معافی مانگتی ہوں بالخصوص اپنے ڈیڈی کی طرف سے۔ لولوش نے مجھے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بات بتائی تھی کہ عابدہ کو میرے ڈیڈی اور [illegible] والے کسی گہری سازش کا شکار بنانا چاہتے ہیں، عابدہ اور تمہارے حوالے سے انھیں [illegible] سامنے لانے کے [illegible] ان کا ساتھی قرار دلوا کر عدالتی [illegible] اپنے منہ پر ہی [illegible] کالک پوچھ سکے۔ یہ کالک ایک بہادر صحافی خاتون [illegible] نے ان کے چہروں پر پہلے ہی لیپ دی تھی۔ اس سلسلے میں [illegible] بی بی سی نیوز چینل [illegible] اس کی بڑی سپورٹ کرتی ہے۔

مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اب بات اور ہے۔“ انجیلا نے آخری الفاظ ٹھہر کر ادا کیے تو میں نے کہا۔

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے انجیلا! تم نے میرے اور عابدہ کے حق میں زبانی طور پر جو موقف اختیار کیا ہے وہ انسانیت کے جذبے کے مطابق ہے۔ خدا کرے تم اس پر قائم بھی رہو۔ حقیقت تمہیں معلوم ہو ہی چکی ہے، اگر تم واقعی صدق نیت سے میری اور عابدہ کی مدد کرنا چاہتی ہو تو میں تہِ دل سے تمہارا مشکور رہوں گا، نہیں تو تم میری طرف سے آزاد ہو۔ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

جانے کیوں میرا دل انجیلا سے یہ سب کہتے ہوئے اداس سا ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انجیلا میرے دشمن کی بیٹی بھی تھی اور ایک دشمن کی بیوی بھی۔ میں چاہتا تو اسے اغوا کر لیتا یا یرغمال بنا کر بالکل ہولارڈ اور لولوش کے سامنے عابدہ کی رہائی کا مطالبہ رکھ سکتا تھا، لیکن ایسی گھٹیا حرکت کرنا میرا وتیرہ نہیں تھا۔ انجیلا مجھ سے متاثر نظر آ رہی تھی، جب سے نیلی نے اسے دھیرے دھیرے اور مختصر ترین الفاظ میں عابدہ اور میرے متعلق بتایا تھا۔

انجیلا بے شک ایک یہودی النسل عورت تھی لیکن اس کی سوچ اپنی قوم کے برعکس مختلف تھی۔ نیلی جانسن کی طرح اس کا دل بھی کسی کی مظلومیت پر تڑپ اٹھتا تھا۔

وہ اس وقت بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی جبکہ میں اور نیلی اس کے سامنے ایک کاؤچ پر براجمان تھے۔

انجیلا نے میری بات سنی اور پھر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیلی نے اسے سہارا دینا چاہا کہ کہیں وہ چکرا کر گر نہ پڑے، لیکن انجیلا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی اور بولی۔

"مسٹر شہزی! تمہاری دیانت داری اور اخلاق کے اس اعلیٰ نمونے نے جہاں مجھے بے حد متاثر کیا ہے وہیں میری قوم کے سر بھی شرم اور ندامت سے جھکا دیے تھے۔ تمہارے سامنے اس وقت انجیلا نہیں بلکہ ایک طرف تمہارے دشمن کی بیٹی کھڑی ہے تو دوسری جانب ایسے ہی ایک بدترین دشمن کی بیوی بھی۔ تم اگر چاہتے تو مجھے بھی عابدہ کی طرح یرغمال بنا کر اپنے مطالبات ان کے سامنے رکھ سکتے تھے، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ ایک آدمی کی بہادری کی دلیل ہے۔ دیکھا جائے تو تمہارے دونوں ہی دشمن طاقتور ہیں، لیکن ان کی حرکتیں بزدلانہ ہیں۔ لہٰذا اب یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ میں اس مشن میں تمہارے ساتھ رہوں اور خود تمہاری راہنمائی کروں۔"

یہ سب کہتے ہوئے انجیلا کا چہرہ جوش سے تمتمانے لگا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا اور اسے دھیرے سے سہارا دے کر بیڈ پر دوبارہ بٹھا دیا۔ پھر بولا۔

"انجیلا! میں تمہارے بارے میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور یہ بھی کہ تمہارے احساسات اور جذبات میں انسانیت کی شمع فروزاں ہیں، جس کا ثبوت بھی ہے کہ تم نے عابدہ اور میرے معاملے کو غیر جانبداری سے سمجھنے کی کوشش چاہی اور سچ اور غلط کا درست اندازہ لگایا، نہ صرف یہ بلکہ صدق دل سے میری مدد کے لیے عزم کا اظہار کر کے تم نے یقیناً ایک اچھے انسان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔" میں اتنا کہہ کر رکا تھا اور دوبارہ نیلی کے قریب نشست پر براجمان ہو گیا پھر کچھ سوچتے ہوئے اس سے دوبارہ مخاطب ہوا۔

"انجیلا! ہمیں شاید واقعی تمہاری مدد کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تمہاری ان کیفیات کے بارے میں سراغ لگانا چاہیے کہ لولوش تمہیں آخر کس طرح دماغی طور پر مفلوج کر کے اپنے مطلب میں چلا کرتا ہے؟ کیونکہ تمہاری یہ کیفیات ہمارے حق میں خطرناک ہوں گی۔"

میں ذرا رکا، انجیلا سوچنے کے انداز میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں نے پھر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک بات آئی ہے۔" میری بات پر انجیلا ہی نہیں نیلی بھی چونک کر میرا چہرہ تکنے لگی۔

"تم سے میں ایک سوال پوچھنا چاہوں گا، لیکن ذرا سوچ کر بتانا کہ لولوش اس سے پہلے تمہیں کتنی بار اور کہاں اس طرح دماغی ٹارچر کر چکا ہے؟"

"ایسا تیسری بار کیا ہے اس مردود نے میرے ساتھ۔" انجیلا نے جواب میں کہا۔ "شاید وہ بھی اب سمجھ چکا ہے کہ اس کی اصلیت میری نگاہوں میں آشکار ہونے اور یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ میں اب اس کے ساتھ خوش نہیں ہوں تو اس نے مجھے قابو میں کرنے کے لیے یہ شیطانی کھیل کھیلا۔ کچھ عرصہ پہلے جب میری اس سے پہلی بار گرما گرم بحث چھڑی اور میں باغی ہو کے بروکلین سے لی پارک اسٹریٹ آ گئی اور لولوش کے بلانے پر بھی نہ گئی تو اس نے مجھے پہلی بار دماغی ٹارچر دیا۔ میں خوف زدہ ہو گئی اور ڈیڈی سے بھی اس بات کا ذکر نہ کیا، کیونکہ ان کے منع کرنے کے باوجود میں نے پالس جیسے اچھے انسان کو چھوڑ کر اس شیطان سے شادی کر لی تھی، لہٰذا اپنے معاملے کو خود ہی نمٹانے کی

کوشش میں، میں ناکام گئی، مگر لولووش سے دوری میرے لیے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کی باں نے کچھ... اور پوچھا پھر اب تیسری بار ایسا ہوا تو اب دونوں میں سے بھی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے اس سوال میں اس کی بات کاٹی۔ کیونکہ میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک سوال میرے ذہن میں سے یہ تھا۔

"اب خوب غور کر کے بتاؤ کہ ان دونوں جگہوں کے علاوہ بھی تمہیں اس دماغ میں کچھ درد ہوتا ہے؟ میرا مطلب ہے یقیناً تمہارے دماغ میں لولووش نے ایک یا دو چپ لگوائی ہوں گی۔ دوسری بار اسٹار والا [illegible] میں [illegible] کیا تیسری کی بھی کوئی ایسا ہوا؟"

"بالکل نہیں۔" انجیلا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور تب میرے اندر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ میں لولووش کی اس جادوئی شعبدہ گری کو بھانپ گیا تھا اور اب میری مسکراہٹ سے بولا۔

"اب تمہیں یہ دونوں کی بھی نہیں چاہئیں گے۔"

"کیا... کیا مطلب؟" انجیلا نے حیرت آمیز مسرت سے کہا۔

"ہاں، بشرطیکہ تم اب آ کر ان دونوں جگہوں کو صاف نہیں کرو۔ ایک اسٹار والا اور دوسرا لولووش کی دانش گاہ۔"

"میں سمجھ گئی تم نے کس بنا پر بالکل درست اندازہ لگایا ہے شہزادی!" نیلی جو خاموشی اور توجہ سے ہماری اور انجیلا کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی، ایک دم جوش سے مسکرا کے بولی۔ جبکہ انجیلا ابھی تک الجھن میں ہی تھی۔

"گڈ۔" میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "چلو، اب تم خود ہی انجیلا کے سامنے میرے اس ٹھیک ٹھیک قیاس کی وضاحت بھی کرو۔"

نیلی جواب میں کہنے لگی۔ "جیسا کہ لولووش سے متعلق ہمیں علم ہے کہ اس کے [illegible] کے پاس پیشہ ورانہ [illegible] کی ایک جدید تکنیک ہے جس سے اس نے ایک [illegible] کوئی ایسا اسٹار والا اور [illegible] جگہ پر نصب کر دی ہو جس کا انجیلا کے دماغ سے تعلق رہتا ہے۔"

"کس صورت میں؟" میں نے نیلی کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یہ تو سوچنے کی بات ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔ "لیکن ہو سکتا ہے اس میں بھی کوئی جدید سائنسی طریقہ کار ہو۔"

"ایک چپ کی صورت میں پہلے ہی سے انجیلا کے دماغ میں لولووش نے نصب کروا دی ہوگی۔" میں نے نیلی کی بات کاٹ کر اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

"ایگزیکٹلی، یہی مطلب تھا میرے کہنے کا بھی۔" نیلی ایک دم چہک کر بولی۔ انجیلا کا چہرہ ایک بار پھر خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"انجیلا! تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اب۔ وہ چپ تمہارے دماغ میں آپریشن کر کے نصب کر دی گئی ہے، وہ تمہیں تب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک کہ تم ان دونوں مذکورہ جگہوں کا رخ نہیں کرتیں۔"

"بالکل... لیکن مجھے کیوں نہیں اس بات کا پتا چل سکا کہ کسی نے میرے دماغ کا آپریشن کر کے یہ منحوس چپ نصب کر دی ہے؟" انجیلا نے الجھن آمیز پریشانی سے کہا۔

"لولووش جیسے شاطر آدمی کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔" میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ "تمہیں بے ہوشی کی دوا دے کر انہوں نے یہ کام خفیہ طور پر نمٹا لیا ہوگا۔"

"ہمم... بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔" نیلی نے تائید میں کہا۔

"بالکل... لیکن میں اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" انجیلا پریشان سے لہجے میں بولی۔

"وہ بھی ہو جائے گا لیکن اتنی جلدی نہیں۔ تم ہمارے ساتھ رہو، ہم عنقریب لولووش کی سرکوبی کے لیے یہاں سے روانہ ہونے والے ہیں۔" میں نے کہا تو نیلی نے اچانک مجھ سے کہا۔

"شہزادی! تم نے ایک بات پر غور نہیں کیا۔"

"کیسی بات؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انجیلا اگر ہمارے ساتھ جاتی ہے تو لولووش کے علم میں یہ بات آ جائے گی کسی طرح کہ انجیلا بھی اس مہم میں ساتھ ہے تو وہاں موجود ڈیوائس کے ذریعے وہ انجیلا کے دماغ تک رسائی حاصل کر کے اسے انتہائی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

نیلی کی بات سن کر میں نے پرغور انداز میں اپنا ہونٹ چبایا۔ "ہوں... تم نے واقعی ایک اہم نکتہ

اُٹھایا۔ اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔''

''ٹھیک ہے اکرم، ہم انجیلا کو یہاں ماریا کے پاس چھوڑ دیتے ہیں اور خود یروشلم روانہ ہو جاتے ہیں۔''

''لیکن میرا کیا ہوگا؟ میں کب تک اس منحوس جگہ چھپ کے رہوں گی؟'' انجیلا ایک دم پریشانی سے بولی تو میں نے اس سے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

''تم اس کی فکر مت کرو اور ہم پر بھروسا رکھو۔ پہلے ہم اس موڑ کا فیصلہ کر لیں۔ جیسے تمہارے والد سے ملنا کوئی خاص مشکل نہیں ہوگا، اس کے بارے میں بعد میں بھی سوچ سکیں گے، ہم پر بھروسا رکھو انجیلا!''

''مجھے تم لوگوں پر پورا بھروسا ہے۔'' اس نے قدرے شائستگی سے کہا۔ ''لیکن میں خود بھی یہ چاہتی تھی کہ میں بھی ساتھ چلوں، تاکہ میری مدد بھی شامل رہے۔''

''ہم تم سے فون پر رابطے میں رہیں گے۔'' لیلی نے اس سے کہا۔ ''کچھ پوچھنا مقصود ہوا تو تمہیں کال کر لیں گے لیکن میرا نہیں خیال کہ ایسا کوئی موقع آئے، کیونکہ تم ہمیں پہلے ہی بہت کچھ بتا چکی ہو اور ہم نے بھی اپنے ذرائع سے لولوش کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کر رکھی ہیں۔''

ہم اپنے پروگرام کو حتمی شکل دینے میں مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ماریا نے بھی یہاں سے جانے کے بعد کل رات پرسوں کی طرف روانگی کے حتمی پروگرام کے بارے میں گفتگو کی اور بتایا تھا۔ کمیل والا اور شکیلہ بھی کل صبح تک سامان لا کر پارک کر کے پہنچ جانے والے تھے۔ میں نے انہیں تیلی کی رہائش گاہ کا پتا بتا دیا تھا۔

☆☆☆

دنیا کے اس پُراسرار خطے کی جانب ہماری یہ پیش قدمی پچھلی سابقہ مہمات سے زیادہ سنسنی خیز اور خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

حالات اس نہج پر آ پہنچے تھے کہ میں اب مزید بیکار وقت ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں دوسری کسی معاملات میں الجھتا ہی رہ جاتا۔ یوں بھی اب میرا ذہن سوائے ماجدہ کے کوئی اور بات سوچ نہیں رہا تھا۔

ماجدہ کا کھوج لگ چکا تھا اور میں اس کے حصول کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے اور یروشلم کے اس دجال لولوش کا ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کرنے کا عزم صمیم کر چکا تھا۔

دو دنوں کے اندر ہم نے سفر کی تیاری کو نمٹایا۔ عارف کو فون کر کے میں نے اپنا بیگ پارک والا چالو ٹرسٹ کروایا اور کمیل والا اور شکیلہ کو بھی وقت ضائع کیے بغیر ممکنہ دستیاب فلائٹ سے لبنان کے لیے روانہ ہو گئے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا کہ چند دن پہلے ہی عارف کے ذریعے کمیل والا اور شکیلہ کو اپنی خیریت سے مطلع کر چکا تھا اور ساتھ ہی ہر قسم کے خدشات آگاہ حالات سے فوری طور پر نمٹنے کے لیے ''الرٹ'' رہنے کی بھی تاکید کر چکا تھا۔

وہ دونوں بے چارے تو جیسے بے کلی سے منتظر تھے۔ میری کال ملتے ہی وہ تیلی کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ گئے۔ ادھر انیلا ایک عدد ٹیلی کا بندوبست کر چکا تھا۔

لہٰذا یوں اگلے ایک روز بعد رات کو بیروت روانگی کا پروگرام حتمی شکل پا چکا تھا۔

انجیلا اپنی خیریت کی اطلاع اپنے باپ ہولاما کو دینا چاہتی تھی مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ کہیں لولوش تک یہاں ہمارے بارے میں علم ہو جائے۔ پھر انجیلا کا اصرار تھا کہ اب اس نئی صورتِ حالات کے بعد اس کا باپ میرا دوست اور لولوش کا دشمن ہو جائے گا۔

میں دل میں انجیلا کے اس بھولپن پر سوچتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''انجیلا! تمہارے ڈیڈی خاصے اسرائیل کاز کے لیے سرگرم رہنے والے آدمی ہیں اور اس کاز میں وہ ظلم، دیوانگی، ناانصافی، دہشت، دھوکا اور فریب غرضیکہ وہ سب کچھ کر جا سکتے ہیں جو ان کے مشن کے آڑے آتا ہے۔ ان کی نظروں میں انسانی جذبات کوئی حیثیت نہیں رکھتے، وہ بھی اپنی تنظیم اور گریٹر اسرائیل کے ایک جنونی نعرے میں غرق رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اپنی بیٹی کی محبت میں مجبور ہو کر اپنی تنظیم کے کاز سے غداری کر لیں لیکن اوپر والے انہیں موت کی نیند سلا دیں گے۔ اس بات کا ادراک یقیناً تمہارے ہولاما کو بھی ہوگا۔ اس لیے اگر تم خود ان کے پاس جانا چاہتی ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں، یہ تو میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ...''

''میں سمجھ گئی تمہاری بات۔'' انجیلا میری بات کاٹ کر بولی۔ ''اپنے باپ کے ساتھ میں نے ایک عرصہ گزارا ہے۔ تم نے جو کچھ ان سے اور ان کی تنظیم سے متعلق کہا، وہ درست ہیں اور مجھے اپنی قوم کے لوگوں پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ ان سب باتوں کے باوجود خود کو کس طرح مظلوم سمجھتے اور کہتے ہیں۔ فلسطین میں اسرائیل بے گناہ لوگوں پر جو ظلم ڈھا رہا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے اور اب ماجدہ کے سلسلے میں وہ کچھ ہی عرصہ میں کر بیٹھے ہیں اور

میرے خاندان کی صورت میں وہ تجربہ کیے جیسا ہوا ہے۔ اس طرف تمہارے پیچھے کا رونا ہے۔ یہ انتہائی ظلم اور ناانصافی ہے تم پر۔ عابدہ بے گناہ ہے۔‘‘

’’پچھتاوے اس قبیل سے ہے شکیل!‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’تم اپنا [illegible] ساجد کی قسمیں [illegible] بات کا بھی ادراک ہے کہ اسرائیل اسی کی بنیاد پر [illegible] ملک کے لیے عابدہ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ [illegible] کی طلب کیپٹل [illegible] اور [illegible] جا رہے ہیں اور معصوم رنگ ہے۔ اس کی رپورٹ نے پوری دنیا میں نائن الیون والے واقعے کے حوالے سے تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس لیے اسرائیل نے اپنے بچاؤ کے لیے ایک ملک ہونے کے لیے جعلی اور [illegible] ثبوت میں ابھارا ہے جس کا تعلق کسی سے عابدہ کی ہے۔‘‘

’’مگر کچھ تو کی ہے یہ بات سے عابدہ تک۔‘‘ انجیلا نے سنجیدگی سے کہا۔

’’ٹھیک ہے، میرا خیال ہے شکیل بھائی سے صرف یہ کہہ دیتی ہوں کہ میں جہاں بھی ہوں، خیریت سے ہوں لیکن ابھی وہ بات کی بات نہیں۔‘‘

’’تم اپنے بھائی سے کچھ بھی نہیں کہو گی اور آرام سے یہاں رہتے ہوئے وقت گزارو گی۔ جب تک ہم تمہیں [illegible] کی کامیاب ہو جائیں اور لوورش سے تمہاری نجات کے لیے حتمی کوشش جانے کی نوبت نہیں آتی۔‘‘

میں نے اس کی بات کاٹ کر سنجیدگی سے کہا تو شکیل نے بھی اس کی تائید ایک اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’تم اس معاملے میں بھی سست رہو کہ لوورش تمہیں ایک طلاق دے کر تم اس سے نجات کے لیے [illegible] ڈالو گی۔ اب تک تم نے اس کی [illegible] سے تمہاری جان چھوڑ دے گا؟‘‘

’’تم ٹھیک کہتی ہو شکیل۔‘‘ [illegible] اب اس حقیقت کا اندازہ ہونے لگا ہے۔‘‘ انجیلا نے بالآخر ہماری بات پر صاد کرتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے، جیسا تم کہو گے میں اسی طرح کروں گی۔‘‘ کہتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

اگلے دن [illegible] شکیل اور انجیلا، [illegible] کی رہائش گاہ پہنچ گئے۔ وہ دونوں [illegible] انداز میں ملے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے ہوں [illegible] ان [illegible] میں تو کر [illegible] اور جہاں تک [illegible]

کے ملنے کا اعلان ایسا ہی ہوتا ہے۔ مجھے آنکھوں کے سامنے صحیح سلامت دیکھنے کے بعد ہی شکیل اور انجیلا کی تسلی ہوئی تھی۔

شکیل اور انجیلا بھی ان سے ملے۔ میں نے ان سب کو آپس میں متعارف کروایا اور [illegible] سے آگاہ بھی کیا۔ عابدہ کے متعلق بھی کہ ان کی اس بات کی جہاں تک بھی ہوئی تھی کہ میں ان کا بہت [illegible] باتیں بھی کر چکا تھا۔ یہ تو ان دونوں ہی کے عابدہ کے لیے [illegible] دیکھ کر مجھ سے باتیں کر کے [illegible] حوصلہ ہو گیا اور اس میں کوئی شک بھی نہ تھا [illegible] ہو گا۔

عابدہ کو اس بات کا علم ہونے ہی کہ میں [illegible] تک پاکستان سے امریکا پہنچ چکا تھا۔ بڑی تسلی ہوئی ہو گی لیکن ساجد تو اب اپنے لیے نہیں بلکہ میرے لیے زیادہ فکرمند تھی۔ ظاہر ہے فیصلہ کن لمحات اب ہمارے سامنے تھے۔

تقدیر نے میرے اور عابدہ کے بیچ کیا کھیل کھیلا تھا [illegible] سب سامنے آنے والا تھا مگر کیسے؟ یہ ابھی وقت کے ہاتھ میں تھا۔

شکیل دادا نے انجیلا سے متعلق ساری تفصیل سننے کے بعد مجھے علیحدگی میں وہی مشورہ دیا تھا جس کا خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا مگر میں نے اسے رد کر دیا تھا۔ شکیل دادا کے اس منصوبے کی انجیلا نے بھی تائید کی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ہم لوورش کے قبضے سے عابدہ کو انجیلا کے ذریعے با آسانی چھڑا سکتے تھے لیکن میں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں ایسا چاہوں بھی تو اب ایسا نہیں کر سکتا، حالانکہ بالکل ابتدا میں جب میں پاکستان میں تھا اور عابدہ بنگلہ دیش وغیرہ کی قید میں جانے سے پہلے لوورش کی گرفت میں تھی تو [illegible] نے مجھے یہی منصوبہ بتایا تھا جب اس وقت ہماری معلومات کے مطابق لوورش اپنی بیوی انجیلا کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس وقت ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

اب صورت حالات اور تھی۔ اگر انجیلا کا دل لوورش سے خراب ہو چکا تھا تو لوورش بھی انجیلا کو انتقام کا نشانہ بنانے پر تلا بیٹھا تھا۔

تاہم اگلے [illegible] ہم سب تیار تھے۔ مقررہ وقت پر شکیل اور [illegible] آ گئے۔ وہ دونوں ایک [illegible] لے گئے۔

ان دونوں سے بھی کیمل دادا اور شکیلہ کو متعارف کروایا گیا، جو کہ پہلے ہی غائبانہ طور پر ہو چکا تھا۔

اسٹیشن ویگن کے اندر ہر طرح کا سبھی اسلحہ موجود تھا۔ جوک سب پر چڑھائی کا پلان ہم سارا دن بڑی سی گول میز کے گرد بیٹھ کر تیار کرتے رہے تھے۔

یہی نہیں ہم نے برمودا کی طرف پرواز کرنے اور وہاں "مارگٹ" تک پہنچنے کے لیے فضائی روٹ بھی منتخب کر لیا تھا۔ ائر ٹریفک کنٹرولر سے مقررہ پرواز کی پرمیشن لینے کا کام ذنشا نے بڑی ہوشیاری سے نمٹا دیا تھا۔ ہمارے گروپ کو اس نے ٹورسٹ گروپ ظاہر کیا تھا۔

اسٹیشن ویگن میں ایک ڈرائیور پہلے ہی سے موجود تھا۔ رات کے ٹھیک دس بجے ہم نیلی کے اپارٹمنٹ سے نکلے اور ویگن میں بیٹھ کر نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

پروگرام کے مطابق انجیلا کو نیلی ہی کی رہائش گاہ پر رہنا تھا اور ماریا اس کے ساتھ تھی۔

نیویارک کی سڑکیں اور فلک بوس عمارتیں، کلب اور پب اس وقت روشنیوں کی طرف دمک رہے تھے۔ ان کے بیچ راستہ بناتی ہوئی ہماری ویگن پہلے نصف گھنٹے تو نارمل رفتار سے دوڑتی رہی پھر ایک قوس کی صورت میں سڑکوں کے جال کے بیچ سے ایک اور ہائی وے کی ذیلی سڑک پر آ گئے جو مضافات کی طرف جاتی تھی، ڈرائیور نے ویگن کی رفتار یکلخت بڑھا دی۔

ویگن میں ہم سب خاموش بیٹھے تھے۔ میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات تھیں۔ تشویش بھی اپنی جگہ لیکن گرم جوش ولولوں کا ایک جوش بھی ابھار پانے کی طرح اندر سے اٹھ رہا تھا۔ مارگٹ جہاں حتمی تھی، میں اس جزیرے کا قصد کیے ہوئے تھا۔ وقت بتا رہا تھا کہ آنے والے لمحات خوفناک اور ہولناک جنگ کی صورت میرے منتظر تھے۔

چمکتے دمکتے میرون ٹاؤن اور سربفلک عمارتوں اور روشن سڑکوں کا شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ ویگن چلتی رہی تھی۔ دائیں بائیں کنارے کے میدان اور جنگل سے نظر آتے تھے۔ وہاں اندھیرا نہیں تھا، آسمان پر دمکتے چاند کے گرد ہالہ کا جھرمٹ تھا۔ اسی روشنی میں گھاس اور جنگلاتی میدانوں میں کہیں کہیں لکڑی کے شکاری کیبن اور رہائشی کوٹھے نظر آ رہے تھے۔

ایسے ہی ایک بڑے سے گیراج اور تیز ڈھلوان چھت والے کاٹیج کے قریب ویگن جا کر رک گئی۔

ذنشا نے سبھی کو نیچے اترنے کو کہا اور خود بھی اپنی طرف کا دروازہ کھول کے اتر آیا۔ ویگن کا انجن بند ہو گیا۔ پُراسرار تاریک سناٹے کا راج تھا۔ فضا میں تیز ہوا سرگرداں تھی۔ موسم سرد ہونے لگا تھا۔ ہم نے گرم کپڑوں سے بدن ڈھکے تھے۔

پھر ذنشا ہی کے ایما پر ہم کاٹیج کے اندر آ گئے، جس کا دروازہ ذنشا نے ہی کھولا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھے وہاں کوئی بجلی کا بلب نظر آیا نہ ہی ٹیبل لیمپ۔

اندر ایک کشادہ کمرے میں آ کر ہم مختلف نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ بلیک بل اور ڈرائیور نے مل کر اسلحہ ویگن سے اتارا اور اندر لے آئے۔ اسلحہ ایک بڑے سے سوٹ کیس میں تھا۔ انہوں نے ہمارے سامنے فرش پر رکھ دیا پھر بلیک بل نے سوٹ کیس کھول دیا۔

میں بڑے اشتیاق کے ساتھ فرش پر پڑے اسلحے کو گھورے جا رہا تھا۔ ان میں چھوٹے بڑے کل ملا کر گیارہ ہتھیار تھے۔ بڑی گنوں میں صرف تین تھیں، جن میں دو اسنائپر اور ایک راؤنڈ ڈوم اسالٹ مشین گن تھی۔ چاقو، راؤنڈز کے ڈبے، چند ہینڈ گرینیڈ، پستولوں میں والتھر، ڈوگر، کوبرا کولٹ کے علاوہ دو کٹے اور چار نال والا آرسنل شامل تھے۔

کوبرا کولٹ اور آرسنل دیکھ کر میری آنکھیں ایک دم چمک اٹھی تھیں۔ کیمل دادا اور شکیلہ مجھے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے، وہ جانتے تھے کہ پرانے وقت سے یہ دو ہتھیار مجھے کس قدر محبوب تھے۔ نجانے کیا بات تھی میں بڑی گن سے زیادہ چھوٹے ہتھیاروں کو پسند کرتا تھا۔ دیکھنا اب یہ تھا کہ ذنشا کس کو کون سا ہتھیار تھماتا ہے۔

"دوستو! اب ہم ایک ایک گرما گرم کافی کے کپ پینے کے بعد یہاں سے برمودا روانہ ہو جائیں گے۔ ان ہتھیاروں کی پسند تمہارے سپرد کرتی ہوں میں۔" ذنشا نے گویا اعلان کرنے کے انداز میں کہا۔ پھر سب سے پہلے مجھے دعوت دی۔ میں نے جھپٹ کر آرسنل اور کوبرا کولٹ اچک لیے، دونوں کو اپنی لیدر کی جیکٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ پھر کیمل دادا آگے بڑھا اور اس نے راؤنڈ ڈوم اسالٹ مشین گن اٹھائی۔ شکیلہ نے اسنائپر پسند کیا اور ساتھ ہی ایک عدد والتھر اچک لیا۔ بلیک بل نے اسنائپر اور ڈوگر اٹھا لیا۔ اور ذنشا نے مشین گن اور ایک گرینیڈ ہی لیا۔ کیمل دادا نے بھی ایک گرینیڈ سنبھال لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ نیلی اور ذنشا کے پاس پہلے ہی سے ہتھیار موجود تھے، جو زیر جامہ ہوتے تھے، ان میں ایک راکٹ پسٹل تھا، جو نیلی کے قبضے میں تھا۔

وہ گرجا بھی ایک ایک تقسیم ہو رہے۔ تاہم اور بکر ین بھی سنبھال لیے گئے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ سرنگ کس قابل ہو چکا ہے۔ کیونکہ ہر ایک سطح میں اب کچھ نہیں بچا تھا مگر انشا نے آگے جا کر سرنگ میں کے ایک خفیہ خانے سے کچھ اسپائی آلات کا تھیلا بھی برآمد کیا اور اسے اوپر الٹ دیا۔ ان میں نقب لگانے والا اوزار بھی تھا۔ اسی طرح اوزار بھی برآمد کیے گئے۔

نقب لگانے والے اوزار کو دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ یہ کمال کی چیز تھی۔ ایک حیرت انگیز ایجاد تھی۔ یہ بظاہر پستول نما آلہ تھا جس میں ایک مخصوص اور مضبوط پلاسٹک کا دھاگا ہوتا تھا جو ایک بڑے پتھر کا وزن سنبھالنے کی طاقت رکھتا تھا۔ دھاگے میں پلاسٹک کا ایک [illegible] ہوتا تھا۔ [illegible] اوپر کی بلندی پر پہنچ جاتا تھا۔ نیچے اترنے کے لیے اس میں ایک چرخی ہوتی تھی جس میں لپٹے ہوئے دھاگے کے سہارے آسانی سے نیچے اترا جا سکتا تھا۔ جبکہ خود کار کلاش اور اس کے دیگر [illegible] کا پلر میں پہلے ہی سے موجود تھے۔

ایک دو بیگ جن میں ہم نے پشت پر باندھ لیے تھے، کہ ضروری سامان ان میں بھی موجود تھا۔

اس دوران رات ختم ہو گئی تو ہم روانگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ ہم جس دروازے سے کاٹیج میں داخل ہوئے تھے اسی دروازے سے باہر نکلیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔

اس کمرے سے ملحق ایک اور کمرے کا دروازہ تھا۔ یہ کافی اندرونی کمرہ تھا مگر اس کے بعد ایک اور دروازے سے ہم باہر نکل کر تنگ سی راہداری میں آ گئے۔ اس کے اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ وہ کھول کر ہم باہر نکلے تو [illegible] سامنے ہی گول [illegible] پر ایک [illegible] نظر آ گیا۔ ہم چھ تھے۔ ساتواں [illegible] کا ڈرائیور تھا۔ وہ [illegible] کو پائلٹ بھی کرتا تھا۔ منصوبہ بندی کے مطابق اسے [illegible] چھوڑ کر پلٹ آنا تھا۔

ہم [illegible] میں سوار ہو گئے۔ [illegible] کے [illegible] حرکت میں آ گئے، جب [illegible] ایک جھٹکے سے وہ فضا میں اٹھ گیا اور پھر ایک جانب کو پرواز کر گیا۔

[illegible] فضاؤں میں [illegible] حویلی کی جانب کا رخ تھا۔ ہم سب آپس میں کم ہی باتیں کرتے اور کبھی خاموش ہو جاتے۔

جانے کیوں انشا کی طرف سے ایک بار مجھے بے چینی سی ہونے لگی۔ مجھے مشن سے متعلق اس کی سب تیاریاں کچھ "اضافی" سی لگ رہی تھیں۔ کل ایسی چیزیں تھیں، جن کا اس مشن سے کوئی تعلق [illegible] اور پھر ایک [illegible] کا لباس اور [illegible]۔ حقیقت یہ تھی کہ پھر اس طرح چھاتا بردار کی طرح اترنے کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔ ہم عام سیاحوں کے بھیس میں اور ضروری [illegible] ایک [illegible] اسپائی آلات کے ساتھ ہوٹل کے سامنے پر اترتے اور اس کے بعد عام آدمیوں کی طرح مکمل [illegible] کر اپنے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ لیکن بہر حال میں خاموش ہی رہا تھا۔ مشن سے پہلے اور اس کے متعلق بات کرتی انشا نے اسی مناسبت سے یہ سب تیاری کی ہو۔

بہرحال مجھے لگتا ایسا ہی تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور کہیں اس کا کوئی تعلق ہے۔

[illegible] کا پتر بے [illegible] پسند نہیں کرتا تھا۔ [illegible] جس سے ہوٹل [illegible] کے متعلق ہوتے تھے جیسے چھاتا بردار کی طرح نیچے اتر جاتا تھا اور پھر [illegible] سے واپس پلٹ جاتا۔

[illegible] تربیت کے دوران [illegible] "[illegible]" کا کورس کر رکھا تھا۔ [illegible] کا [illegible] کے لیے میں نے اسے اپنے ساتھ ہی منتخب کیا تھا۔ [illegible] کے ماہر تھے۔

[illegible] کا یہ اصول تھا کہ اسے [illegible] طریقے سے بند رکھا جاتا ہے تاکہ بوقت "[illegible]" سے آسانی نکل سکے ورنہ اس سے [illegible] ہو سکتی تھی۔ انشا نے بتایا تھا کہ اس کے سارے [illegible] کا [illegible] تھے، یعنی بوقت ضرورت ان کی مخصوص [illegible] میں اس کی رفتار مناسب رکھی جا سکتی تھی اور اسے حسب منشا [illegible] جا سکتا تھا۔

نیچے [illegible] جہاں اب ستاروں کی طرح روشنی نظر آنے لگی تھیں۔ [illegible] کے [illegible] پانیوں میں سمندری جہاز اور کشتیاں بلندی سے یوں نظر آتی تھیں جیسے [illegible] تیر رہی ہوں۔

یہ سفر [illegible] گھنٹوں تک اسی طرح کے [illegible] سے پیش کرتا رہا۔ اس کے بعد [illegible] چھانے لگی۔ [illegible] نے [illegible]

ہماری انتہائی بلندی پر جو ہوا ساری تھی۔ اب [illegible] کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ہم اندازے کے مطابق ہم اب سطح سمندر سے کئی ہزار [illegible] تھے۔

مشکل سے انتہائی بلندی تک پہنچ میں ایک مرحلہ ایسا تھا کہ گائیڈ [illegible] اس سے چند روز پہلے ہی پائلٹ نے کسی [illegible] لے کے لیے "[illegible]" کر رہا تھا۔

کمیل پیراشوٹ باندھ چکے تھے۔ عمیر اور سہیل اپنی [illegible] کے لیے ہم اگلی تیاری [illegible] کے اور پائلٹ کے [illegible] کے منتظر ہے۔

اگلے چند سیکنڈوں بعد ہی اس نے عمیر کا اشارہ کر دیا۔

سب سے پہلے میں اللہ کا نام لے کر کودا اور کمیل [illegible] بھی میرے ساتھ کودا تھا۔ کمانڈر گیڈوپی کی ایک تصویری [illegible] کے ذریعے کمیل [illegible] میرے ساتھ ہی تھا۔ پھر بھی میں نے کمیل [illegible] کو چند خاص ہدایت دے رکھی تھیں۔

☆☆☆

واحدی [illegible] اور سرد [illegible] ہواؤں کے تھپیڑوں نے میرا استقبال کیا تھا۔ میں تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ کسی بھی [illegible] کا پتا مجھے ایک طرف تو مل رہا تھا دوسری طرف کمیل [illegible] کا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔ یہ اس کے لیے پہلا تجربہ تھا۔ ہم دونوں بہت تیزی سے [illegible] لے رہا تھا۔ اس کی ڈور میرے ساتھ منسلک تھی۔

ایک مقررہ وقت کے بعد میں نے [illegible] کھینچا تو مجھے ایک جھٹکا لگا اور پھر جیسے گرتے ہوا میں ایک دم تیرنے لگا۔ میرا پیراشوٹ کھل چکا تھا۔ میں نے کمیل [illegible] کی طرف دیکھنے کی کوشش چاہی۔ وہ جانے فضا میں کہاں [illegible] کہاں کھو چکا تھا۔ لیکن جلدی مجھے اس کا ابھرتا ہوا [illegible] دکھائی دے گیا۔ اس کا بھی پیراشوٹ درست کھلا تھا۔

فضا میں "تیرنے" کا یہ عمل ایک اندازے کے مطابق کچھ منٹوں تک جاری رہا اور اس کے بعد نیچے جنگل کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں نے کمانڈر گیڈوپی کی ہدایتوں کے [illegible] حرکت دینا شروع کر دیا۔

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں کسی جنگل سے قریب کھلے میدان میں گرا اور گرتے ہی میں نے فوراً سنبھالا اور جلدی جلدی اپنا پیراشوٹ لپیٹنا شروع کر دیا۔

[illegible] کے پہلے سے طے شدہ اندازے کے مطابق ہم [illegible] کے نشیبی [illegible] "[illegible]" کے ساحل کے قریب ہی گرے تھے۔ یہاں ہم کو تھوڑی دیر بعد ہم سب [illegible] ایک [illegible] کے ساتھ کور کر رہے تھے۔

اس کے [illegible] ایک [illegible] اور اپنی [illegible] سے [illegible] حاصل کر رہے تھے۔

اس کام کا انتظام [illegible] جنگلی ماہرین کی رہنمائی [illegible] کے [illegible] کے بعد [illegible] ایک واحد [illegible] کی اطلاع سے [illegible] تھا۔ حالانکہ وہ میرے [illegible] کے حوالے سے [illegible] تھا۔ اگر وہ [illegible] ساتھ دیتا بھی [illegible] کی محبت اور اس کے [illegible] ساتھ دے رہا ہوں [illegible] تھا۔ میں کسی کا [illegible] احسان لینا [illegible] نہیں کرتا تھا۔ لیکن کون [illegible] کی حقیقت کھلنے [illegible] میرا [illegible] متفق ہو گیا تھا۔ [illegible] اس نے بھی صدق دل سے میری مدد کی [illegible] اس طرح ساتھ [illegible] لیکن [illegible] کہ اس ساری [illegible] کے [illegible] معلوم [illegible] شروع کر دیا تھا۔ ... [illegible] ہم سے متعلق کی [illegible] کر دیا تھا [illegible] سب [illegible] ہے۔

ہماری [illegible] تھوڑی دیر بعد ہم سب ایک جگہ اکٹھے ہو کر اب قریب [illegible] لگے۔ [illegible] نے [illegible] کے ذریعے بتایا کہ ہم [illegible] سے کچھ دور تھے۔ [illegible] ہم اس وقت موجود تھے، اس کا ساحل [illegible] کے ساحل سے زیادہ دور نہ تھا۔

اس کے لیے خود [illegible] کے ذریعے ہی جانے کا پلان تھا۔ [illegible] کے ساحل سے [illegible] کے ساحل تک جلدی پہنچنے کے لیے ایک [illegible] کا [illegible] تھا۔ جو [illegible] میں ایک [illegible] سے [illegible] ایک [illegible] آگے [illegible] تھا۔ اس [illegible] کے [illegible] نصب تھے۔ دونوں طرف سے [illegible] اپنے ہاتھوں سے اس [illegible] کو مضبوطی سے پکڑ لیتے تھے۔ اس طرح [illegible] کی [illegible] اور [illegible] کے [illegible] کو پکڑ لیتے۔ [illegible] کے اندر پہلے ہی سے ایک [illegible] تھا [illegible] اور [illegible] حرکت میں آ جاتا۔

ہم نے [illegible] کا [illegible] پہلا [illegible] کا [illegible] جیسا کوئی [illegible]۔

ہم پانی میں اتر گئے۔ میں نے دائیں جانب سے تار پیڈو کا ہینڈل دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا جبکہ واشی نے بائیں جانب کے کنڈوں کو دبوچ لیا۔ میری ٹانگوں کو [illegible] اور اس کی ٹانگوں کو فلپیز نے جکڑ لیا تھا، اسی طرح کیلی اور بیک اپ بھی [illegible] کے متبادل تھے۔

بیک اپ چونکہ سب سے پیچھے تھا، اس لیے تار پیڈو کا بٹن دبانا اسی کی ذمے داری تھی۔ ہماری طرف سے "سبز نشان" کا کاشن ملتے ہی اس نے بٹن دبا دیا۔ پانی کے اندر ہلکا سا شور ہوا، سلینڈر حرکت میں آیا اور پھر اپنے پیچھے پانی کے بلبلے، جھاگ کی صورت میں چھوڑتا ہوا ایک جھٹکے سے آگے بڑھا۔

اب ہم پانی کے اندر محوِ سفر تھے۔

ہم سطح سے کچھ نیچے جا رہے تھے۔ سلینڈر کی رفتار بہت مناسب تھی۔ ہم پانی کی سطح سے بمشکل دو گز نیچے ہی تھے۔ ہمارے چہروں پر آکسیجن ماسک کے علاوہ آنکھوں میں نظر آنے والے نائٹ ویژن گلاسز تھے جن کے سبب ہم پانی کے اندر بھی تھوڑے فاصلے تک دیکھ سکتے تھے۔ میں نے مضبوطی سے ہینڈل پکڑ رکھا تھا اور نظریں ماسک کے شیشے سے سامنے اور دائیں بائیں جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک میں ٹھٹکا۔ میں نے سامنے دائیں جانب فاصلے پر ایک بھاگتے ہوئے سائے کو دیکھا۔ پہلے میں نے سمجھا کہ شاید کسی آبی جانور کی حرکت ہوگی، لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سایہ تیزی سے متحرک ہوا اور ہماری جانب بڑھنے لگا۔ مجھے واضح ہوتے ہی میرا دل لرز گیا۔ وہ "جاز" ٹائپ کی بڑی شارک تھی۔

یہاں مشکل یہ تھی کہ پانی کے اندر بات چیت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، اول تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی لیکن بوقت ضرورت ہم اشاروں میں ایک دوسرے سے مخاطب ہو سکتے تھے۔ یہاں ایک مشکل اور بھی تھی کہ ہم اشاروں سے بھی مشکل ہی ایسا کر پاتے، کیونکہ ہمارے دونوں ہاتھ "زیرِ عمل" تھے۔ لیکن میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ ہینڈل پر سے ہٹایا تو دوسرے ہاتھ میں مجھے [illegible] کے دباؤ کا احساس ہونے لگا۔ میرا ارادہ اپنی پشت میں اڑسے ہوئے خنجر کو نکالنے کا تھا۔ لیکن شدید دباؤ محسوس کرتے ہی میں نے اپنی یہ کوشش ترک کردی اور دوبارہ ہینڈل کو تھام لیا۔

مجھے ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ میرے علاوہ بھی کسی اور ساتھی کی اس شارک پر نظر پڑی تھی یا نہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ شارک قریب آگئی۔ اب تو یقیناً باقی ساتھیوں نے بھی پوری طرح بھانپ لیا ہوگا کہ شارک حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار نظر آرہی تھی۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا جہاں نوکیلے دانتوں کی دہری قطار ہولناک منظر کی صورت نظر آرہی تھی، وہ ہمیں ہڑپ کرنے کو تیار لگ رہی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا، سلینڈر کے ہینڈل کو حرکت دی، اس کا رخ دوسری جانب گھوما۔ شارک ہمارے پیچھے لگی۔ یہ مشکل تھوڑی ہی دیر جاری رہی تھی کہ اچانک ہی مجھ پر ایک چونکا دینے والا انکشاف ہوا۔

شارک کی صورت میں [illegible] آبی جانور پر مجھے اور ہی شبہ ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہمیں آسانی سے ترنوالہ بنانے کے باوجود ہم پر حملہ نہیں کر رہی تھی بلکہ ہمارے متوازی تیرتی رہی۔ لگ یوں رہا تھا جیسے ہمیں "اسکین" کر رہی ہو۔ کیونکہ وہ کبھی ہمارے دائیں جانب آجاتی اور کبھی دوسری جانب گھوم جاتی، پھر دوبارہ ہمارے متوازی پانی کی گہرائی میں [illegible] تیسری جانب سے ساتھ ساتھ چلتی رہتی۔

یہاں تک بھی اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ ایک سوچ پر میں نے دانت بھینچ کر سر جھٹکا۔ فوراً خیال آیا تو بُری طرح ٹھٹکا۔ وہ آبی جانور شکل کا کوئی [illegible] تھا کیونکہ کسی کسی وقت [illegible] آنکھیں کسی بلب کی طرح جلتی بجھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کی جلد کی رنگت بھی گوشت پوست کے جانور کی جلد جیسی رکھی گئی تھی، لیکن اس میں چمک کچھ محسوس ہوتی تھی۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟" میں نے الجھ کر سوچتے ذہن سے غور کیا اور [illegible] ایک جھماکا ہوا۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ لوزون ہی کا کھڑا کیا شارک شکل کے روپ میں کوئی ایسا روبوٹ ہو جو اپنے جزیرے کی آبی حدود کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہو؟ یقیناً ایسا ہی تھا۔ لہٰذا اب کوئی بعید نہ تھا کہ اس آبی روبوٹ کے اندر نصب ہوئے خصوصی [illegible] اور وائرلیس کمپیوٹر سسٹم کے ذریعے لوزون کو ہماری آمد کا علم ہو چکا ہو۔

اگر ایسا ہی تھا تو یہ یقیناً تشویش کی صورت حال تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میرے کسی ساتھی کو ابھی تک اس شارک کی "اصلیت" کا علم ہوا بھی تھا یا وہ ابھی تک اسے اصلی شارک سمجھے ہوئے تھے، مگر اتنا ضرور ہوا کہ جلد ہی ہم پانی کی سطح سے ابھر کر ساحل پر آگئے۔ قریب پہنچتے ہی

کسی میٹیور کو چھوڑ رہا تھا… اب ایک مخصوص مدت تک ایوا ہیڈ میں تفریح کرنے کے بعد یوں بھی ہمارے لیے بیکار ہو گیا تھا۔

ساحل پر آتے ہی سب نے چاروں اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ میں نے دیکھا کہ میرے ساتھیوں کے چہرے فق اور آنکھیں وحشت سے ہو رہی تھیں۔ میں چونکہ مختصر الفاظ میں انہیں متوقع خطرے سے آگاہ کر سکتا تھا اور ان کی صورت میں پہلے ہی ایک جانب سب کو تیزی سے حرکت پذیر ہونے کا اشارہ دیا۔

رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ انجیلا نے زبردست عقل مندی سے کام لیا تھا۔ اس نے ہوک بے کے اسی ساحل کا انتخاب کیا تھا، جہاں عام پبلک کے لیے رہائشی کاٹیج وغیرہ بنے ہوئے تھے۔

انجیلا کے مطابق ہوک بے دیوہ سوا کے دیگر جزیروں کی طرح کا ہی ایک خوب صورت اور پرفضا جزیرہ تھا۔ لوگ یہاں تفریحات کے لیے آیا کرتے تھے اور عام لوگ بھی یہاں مستقل رہائش رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ جزیرہ ولووش نے خرید رکھا تھا، لیکن یہاں کی حکومت نے ولووش کو اس شرط پر ہی اسے بیچا تھا کہ وہ عام لوگوں اور سیاحوں کی تفریح کے لیے یہاں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں لگائے گا۔ اس کی مد میں ہماری ٹیکس بھی وہ پابندی سے جمع کرواتا رہے گا۔ البتہ جزیرے سے ہونے والی آمدنی کا سارا اختیار ولووش کا ہی تھا۔ البتہ حکومت کی جانب سے یہاں پولیس اسٹیشن بھی قائم کیا گیا تھا۔

ولووش کی اپنی اسٹیٹ، جو کہ جزیرے کے جنوب مشرقی حصے میں تھی، وہ کافی وسیع قطعہ اراضی پر پھیلی ہوئی تھی۔ بہ قول انجیلا کے، وہ "کیپ سلیٹ" کے نام سے موسوم تھی۔ باقی جزیرے پر اس کے آدمی عام لوگوں اور سیاحوں کے بہروپ میں گھومتے رہتے تھے۔ جہاں کسی کو مشکوک سمجھتے، وہ اس کی ٹوہ لیا کرتے۔ جب تک کہ وہ شک کے دائرے سے خارج نہیں ہو جاتا، لیکن اگر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو اسے خاموشی سے موت کی نیند سلا دیا جاتا۔ اگر کبھی مشتبہ شخص حکومت یا کسی ایسے ہی ادارے کا کوئی ایجنٹ ہوتا تو اس سے چوکنا رہنے کی کوشش کرتے۔ تاکہ وہ مطمئن ہو کر جزیرے سے خود ہی نکل جائے۔ بصورت دیگر اسے حادثاتی موت سے بھی ہمکنار کر دیا جاتا تھا، یا پھر اس کی شکایت کروا دی جاتی۔ اگرچہ ایسا کم ہی ہوتا۔

ہم سب بھی ساحل سے ہٹ کر جہاں پام کا جھنڈ تھا، اس طرف کو رک گئے۔ گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد بیک مل نے لرزیدہ آواز میں کہا۔

"اس خوفناک شارک سے تو ہم بال بال ہی بچے، ورنہ تو اس نے ہم میں سے کسی کو ہڑپ کرنے کی تیاری کر رکھی تھی۔"

"وہ ضرور ایسا کرتی۔" میں نے کہا۔ "بشرطیکہ اصلی ہوتی۔"

میرے اس انکشاف پر ڈانا اور گیبل دادا کی [illegible] گھوم گئیں۔ گیبل دادا نے تو نہیں البتہ ڈانا ضرور مجھ سے الجھ کر بولا۔

"کیا مطلب؟"

میں نے اسے بتا دیا۔ وہ حیران رہ گیا۔ بیک مل اور گیبل دادا کی بھی یہی حالت ہوئی۔ ان کے منہ کھلے رہ گئے۔

"مجھے بھی یہی شبہ تھا۔" شاید تو رابرٹ بولا۔ انجیلا نے اسی انداز میں کہا۔ "وہ مجھے مصنوعی انداز میں حرکت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اصل شبہ مجھے تب ہوا جب وہ ہمارے بالکل قریب آ جاتی اور ہم میں سے بغیر کسی کو نقصان پہنچائے پلٹ جاتی اور پھر تھوڑی دیر تیرنے لگتی۔"

"پھر تو اس کا مطلب ہے کہ ہماری ساری تیاری اور محنت رائیگاں گئی۔" ڈانا نے مایوسی سے کہا۔

"تیاری رائیگاں نہیں گئی مسٹر ڈانا! لیکن ہاں، ہمارے اس اہم مشن کو خفیہ رکھنے کی محنت ضرور اکارت چلی گئی۔" میں نے کہا۔ "لولووش کو اب تک ہمارے بارے میں سب پتا چل چکا ہوگا۔"

"اوہ… تو پھر ہم یہاں کیا کر رہے ہیں! ہمیں فوراً یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اس کے آدمی یہاں پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائیں گے۔" گیبل دادا بولا۔

"ہم یہی کر رہے ہیں۔" میں نے دھیرے سے کہا تو ڈانا نے گیبل دادا کی تسلی کے لیے کہا۔

"میں نے ایک ہوٹل "گیسٹ ویو" میں پہلے ہی سے دو کمرے کرائے پر لے رکھے تھے۔ آن لائن بکنگ کروائی تھی۔"

مجھے ڈانا کی اس بات پر ایک بار پھر جھٹکا لگا۔ اگر سب کچھ پلان تھا تو پھر ہم نے یہ سارا کھڑاگ کس لیے کیا تھا؟ میں ایک دم پھر الجھ گیا۔ لیکن اس بار میں نے اس خدشے کو اپنے ذہن سے جھٹکنے نہیں دیا، دل میں کھٹکا ضرور تھا، وہ آگے بتا رہا تھا۔

"میں نے ریڈی میڈ میک اپ کا بندوبست کر رکھا ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم دو کی ٹولیوں میں بٹ کر لارونش کی "نیو اسٹیٹ" والی ریاست میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہاں کوئی خفیہ کیمپ کو ڈھونڈنا ضروری ہوگا ہمارا۔"

"اگر یہی کچھ کرنا تھا تو پھر اتنا بڑا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت تھی تمہیں مسٹر ڈنشا؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم عام سیاحوں کے بھیس میں بھی یہاں آسکتے تھے اور سیدھا تمہارے پیچھے سے یہ جزیرہ گزرتے ہوئے ہوٹل گیٹ وے کا رخ کرتے؟" کہتے ہوئے میری جانچتی ہوئی مشکوک نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔ میں نے دیکھا تھا کہ نیلی بھی ذرا الجھن میں مبتلا تھی۔ البتہ جیک بل مطمئن نظر آرہا تھا۔ جبکہ ڈنشا میرے اس سوال پر تھوڑا سا گڑبڑایا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے وہ ہنس کر بولا۔

"یہ سانپ اور سیڑھی کا کھیل کھیلنا ضروری تھا مسٹر شہزادی! ایک تو ابھی ابھی نیلی اور تمہیں بتایا تو تھا کہ یہاں ہر جگہ لارونش کے آدمی پھیلے ہوئے ہیں جو ہوٹل ہے میں آنے والے ہر سیاح پر کڑی نگاہ رکھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ..."

"نظروں میں تو ہم اب بھی آجائیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"اب والی بات اور ہوگی۔" وہ اس بار سنجیدگی سے بولا۔ "ہم لارونش کے آدمیوں کی نگاہوں میں کیا کسی کی بھی نظروں سے بچ کر ہی آئے ہیں اور یہاں سے رات کی تاریکی میں سیدھا ہوٹل گیٹ وے کا رخ کریں گے۔"

اس کی بات کسی رخ سے درست بھی معلوم ہوئی اور کچھ الجھن کا سبب بھی بنی رہی۔ میں نے پہلے کے لیے یہی سوچا کہ ایسے سوالات میں کرتا ہوں۔ نیلی معصوم اور انجان بن کر خود کو حالات کے سپرد کر دوں لیکن اپنی خاد بڑی حتیٰ نظریں رکھوں۔ اگر میں ڈنشا سے اس سلسلے میں زیادہ بحث کرتا تو ممکن تھا وہ اندر سے کھٹکا ہو جاتا۔ اگر اس کی نیت میں کسی قسم کی بدنیتی ہوگی بھی تو آشکار ہو سکے گی اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔ بہتر یہی تھا کہ اس کی کسی بھی بات کو جس میں آنے والی چال کی بو آتی کا سوچ دیا جائے لیکن اندر سے ٹٹولا رہا جائے۔ سو یہی میں نے کیا۔ پھر دانستہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی تائید میں بولا۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا مسٹر ڈنشا! لارونش جیسے مکار آدمی کو ٹالنے کی تمہاری یہ چال واقعی قابل داد ہے۔"

وہ بھی ہنسنے لگا لیکن میں نے دیکھا کہ حسب سابق میرے سوال اٹھانے پر نیلی بھی کچھ الجھی الجھی دکھائی دے رہی تھی۔ کھیل داوا اور شکیلہ کے چہرے سپاٹ تھے۔ جانتا تھا میں کہ وہ کچھ بچے تھے، میں نے اندرونِ خانہ کسی پُراسراری گڑبڑ کو بھانپ لیا ہے۔

"اور اس روبوٹ شارک مچھلی کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" یہ قدرے چبھتا ہوا سوال نیلی نے ڈنشا سے کیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے نیلی، ڈنشا کی چالاکی سے میرے عدم اطمینان کو بھانپ گئی ہے۔

"سوری! اگر ایسا ہے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟" ڈنشا بڑی تسلی سے اس سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسی لیے تو کہا ہے کہ اب ہم دو دو افراد کی ٹولیوں میں بٹ جائیں گے تاکہ ہماری انفرادی شخصیت بھی کسی قسم کے شبہے کے دائرے میں نہ آسکے، کیونکہ ہم ابھی اپنا اصل بہروپ بدلنے والے ہیں۔"

"گیٹ وے ہوٹل کس طرف ہے؟" بالآخر پل بھر کی خاموشی کے بعد میں نے سوالیہ نظروں سے ڈنشا کی طرف دیکھا۔

"زیادہ دور نہیں، ابھی چلتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ پہلے اپنے حلیے درست کر لیے جائیں اور جن کے لیے میں نے جو بہروپ سوچ رکھا ہے، وہ بھر لیں۔"

ہم سب نے اس کی بات پر صاد کیا۔

نصف گھنٹے بعد ہم آگے بڑھ چکے تھے۔ اب اس طرف روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔

ڈنشا نے اشارے سے ہمیں بتا دیا کہ سامنے تیس چالیس قدم چلنے کے بعد جو تین، چار ہی منزلہ مختلف ناموں سے موسوم ہوٹل نظر آئیں گے لیکن ہمیں صرف گیٹ وے ہوٹل کا ہی رخ کرنا ہوگا۔ لہٰذا اب ہم دو الگ الگ ٹولیوں میں بٹنے والے بلکہ اجنبی سمتوں کی جانب بڑھ رہے تھے۔

ڈنشا نے جب ہم چار افراد کے گروپ کو دو ٹولیوں میں تقسیم کیا تو میرا ماتھا ایک بار پھر ٹھنکا، لیکن میں نیلی کے فیصلے سے باہر نکلنے کا منتظر تھا۔ لہٰذا بدستور اس پُراسرار معاملے پر اب بغیر کسی بحث کے چپ ہی سادھے رکھی۔

ڈنشا نے ہمیں ٹولیوں میں ویسے ہی بالکل ہی تقسیم کر ڈالا تھا۔ میری ٹولی میں کھیل داوا اور شکیلہ تھے جبکہ دوسری ٹولی میں ڈنشا اور اس کے ہمراہ جیک بل اور نیلی تھے۔

نیلی ہم سے جدا ہونے کے کچھ بے چین سی دکھائی دے رہی تھی مگر یہ ڈنشا کا فیصلہ تھا اور اب تک وہی ہمیں راستہ بتا رہا

تھا اسی لیے وہ ابھی چپ رہی۔

ذیشان، شکیل اور جیک جل کے ساتھ دوسری جانب کی جھاڑیوں تک غائب ہو گیا جبکہ ہم چٹانوں کے آگے بڑھ گئے۔

"یہ امریکی گورنمنٹ، کوئی گیم کھیل رہا ہے ہمارے ساتھ..." پاپا تو سامنے روشنیوں کی جانب بڑھتے ہوئے اور ذیشان اندھیرے کے غائب ہوتے ہی کھیل والا نے مجھ سے دھیمی مگر جذباتی آواز میں کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، آگے بڑھتا رہا۔ تب شکیلہ بولی۔ "میرا خیال ہے شہزادی اور تم بالا جب ہمارے ذیشان پر شک کر رہے ہو۔ چلو، وہ دل سے نہ سہی، لیکن بہرحال وہ اپنی حقیقی گرل فرینڈ بیلی کی وجہ سے یہ سب صدق نیت سے کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے اب تک اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہے کہ پاشا، بیلی کی محسن ہے اور وہ پاشا کی مدد کرنے کی قسم کھا چکی ہے۔ اس طرح ذیشان بھی مدد کر کے بیلی کی نگاہوں میں اپنے نمبر بڑھا رہا ہے۔"

میں پھر بھی خاموشی اختیار کیے رہا۔ اب کھیل والا اور شکیلہ دونوں ذیشان کی نیک نیتی اور جذبے پر ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے لگے۔

کھیل والا میری اندرونی کیفیت بھانپ گیا اور شکیلہ ذیشان کے جذبات دہرانے لگی۔ آخر میں [illegible] کہ شکیلہ نے مجھے کھیل والا کو بھی [illegible] لاجواب کر دیا۔

"اگر ذیشان کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو وہ ہمیں بڑی آسانی سے عام مسافروں کے بھیس میں یہاں لا کر لوکل لوگوں کے ہاتھوں پکڑوا سکتا تھا، [illegible] اس کے لیے یہ کام [illegible] کا گشت ہی [illegible] پایا تھا۔"

میں شکیلہ کی اس بات پر بادل نخواستہ لاجواب ہو گیا لیکن گیٹ والے کے [illegible] سے [illegible] اس بات کی بھی توجیہ آ گئی۔ میں نے اپنا جواب محفوظ رکھا اور ہوٹل کی خوب صورت اور بلند عمارت سمیت گرد و پیش کا بھی جائزہ لیا۔

ابھی میں گیٹ والے میں داخل نہیں ہوا تھا اور یوں گرد و پیش کا جائزہ لینے کے دوران ہی مجھے دائیں جانب دور سے [illegible] جھاڑیوں کے قطعے پر ایک ہیولا ہوٹل کی [illegible] دکھائی دیا۔ میں گیٹ والے میں جانے کے بجائے اسی طرف کو بڑھ گیا۔

کھیل والا اور شکیلہ میری اس حرکت پر [illegible] حیران مگر [illegible] ہوئے خاموشی سے میرے ساتھ چل رہے تھے۔ یہ ایک [illegible] سے [illegible] کم [illegible] کا [illegible]

تھا۔ اس کی عمارت بھی زیادہ بڑی نہ تھی اور نہ بلند۔ مشکل دو منزلہ تھا۔ گیٹ دستے کی طرح یہ کوئی "ماسٹر" ہوٹل بھی نہ تھا۔

یہیں وہ دوسرا [illegible] دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے تیزی سے کچھ سوچا۔ اس کے اطراف میں گھاس والی کھلی جگہ تھی اور باقی سارا ساحلی علاقہ [illegible] اور پھول دار عمارتیں اور [illegible] نظر آتے تھے۔ ایک کلب کی دکھائی دیا۔ جس کی بتی بجھی پیشانی پر "اورنج کلب" کے الفاظ نمایاں تھے۔ یہ علاقہ ساحل سے نزدیک تھا جہاں ایک طرف مختصر سا چٹانی سلسلہ بھی پھیلا ہوا تھا۔ اورنج کلب کی عمارت چٹانوں کے قریب واقع نظر آئی، جس کے چاروں طرف لیموں اور نارنگی کے پودے پھیلے ہوئے تھے۔ اس عمارت کے بائیں طرف دور تک کی چٹانوں میں چھوٹے چھوٹے کاٹیج بنے ہوئے تھے، جا بجا بتی روشن تھی۔ جن کے دونوں طرف نارنگی کے پودے ایستادہ تھے۔ شاید یہاں [illegible] کی وجہ سے اسے اورنج کلب کا نام دیا گیا تھا۔

میں یہاں سے بھی چلا اور ہوٹل کی عقبی دیوار کی جانب آ گیا۔ وہاں خاصی تاریکی تھی۔ میں نے فوراً کھیل والا اور شکیلہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کھیل والا، تم اور شکیلہ فوراً ایک حسینہ جوڑے کا بھیس بھرو، جلدی، وقت کم ہے۔" انہوں نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا اور اپنی کمر سے [illegible] اتاری اور "کام" میں جت گئے۔

میں نے بھی اپنا حلیہ بدل لیا۔ میری [illegible] میں نے [illegible] بالوں سے [illegible] میں بالکل [illegible] ہو گیا۔ [illegible] چہرے اس [illegible] کی جلد میں ایک [illegible] آنکھیں بھی کالی سے نیلی کر لیں۔ [illegible] اور ہم اس بہروپ سے بالکل [illegible] ذیشان کے کہنے پر [illegible] اب وہی [illegible] کھیل والا اور شکیلہ بھی حسینہ جوڑے کے [illegible] تھے، [illegible] ہوٹل کی [illegible]

[illegible]
اس کی [illegible] ہو گئے

احتیاطاً [illegible] ◀

ہمارے بچے بیگ کا ڈی [illegible] سے وہ کھلی ہوئی تھی۔ اس نے غصے سے شرٹ اور [illegible] تو خاصا بے [illegible] ہو گیا تھا۔

میں نے [illegible] رنگ کی [illegible] پہن لی [illegible] جاگ [illegible] سے ہماری طرف دیکھا۔

اس کے بعد علیحدہ [illegible] ہو گئی اور [illegible] طرف [illegible] کی۔

ہم نے ایک [illegible] اور دوسرا [illegible] کرا لیا [illegible] کوشش میں [illegible] تاکہ دوسری [illegible] جہاں سے میں گیٹ [illegible] کر سکوں۔ احتیاط کی وجہ [illegible] نے اس [illegible] کی [illegible] تو میں نے [illegible] کی طرح [illegible] کہ یہاں سے [illegible] میرے "سم اور پاپا" کو [illegible] ("سم اور پاپا" کھیل والا اور شکیلہ بنے ہوئے تھے)

ثنا "کن پلیز" کرتے ہوئے تو ہم اس میں آ گئے۔ میں اپنے کمرے [illegible] بعد میں کھیل والا اور شکیلہ کے کمرے میں آ گیا۔

کمرے بس ایسے ہی تھے جس طرح کہ ایسے [illegible] ہوٹل کے ہونے چاہیے تھے، لیکن [illegible] ثابت ہو گئے تھے۔

"ہمارے منصوبے کے [illegible] اور [illegible] آدمی ہو [illegible] کھیل والا تو [illegible] سے ہوا تو میں نے [illegible] ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"یہاں ہم [illegible] آئے ہیں۔ کھیل والا تم [illegible] کی کھڑکی کے پاس چلے جاؤ اور اس وقت تک وہاں سے مت ہٹنا جب تک میں نہ کہوں اور تم شکیلہ اس طرف [illegible] والی کھڑکی کی طرف چلی جاؤ۔" میں نے [illegible] کے عقب والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں سے تم [illegible] ہوٹل کے داخلی گیٹ پر [illegible] کوئی مشکوک [illegible] حرکت دیکھو تو [illegible] کر دینا۔ میں بھی [illegible] اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔"

دونوں نے [illegible] ہاتھ [illegible] اشارہ کرتے ہوئے ایک آنکھ مار کے کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آتے ہی میں نے [illegible] اس طرف کی کھڑکی سنبھال لی اور اس کے [illegible] سے [illegible] کے [illegible] آئی [illegible] جیب سے نکال کر [illegible] آنکھ پر لگا لی۔

پھر [illegible] کے [illegible] وقت [illegible] تو میرے ہونٹوں [illegible] مسکراہٹ [illegible] کیونکہ ثنا نے اپنے [illegible] کے مطابق ہوٹل گیٹ [illegible] تک [illegible] نہیں کیا تھا۔ [illegible] اس نے [illegible] ہونے کی [illegible] میں نے بھی [illegible] نہیں کیا تھا۔

اب ہوٹل گیٹ [illegible] میں کیا ہونے والا تھا، وہ اگر [illegible] تو میں [illegible] کی [illegible] کرتا۔ ایک گھنٹا گزر [illegible] گیا۔ ہم [illegible] اور [illegible] دم بعد [illegible] آنکھیں کھول دیں۔

[illegible] کے آسمان [illegible] کی [illegible] سفیدی پھیلنے لگی تھی [illegible] تک سب [illegible] تو میں نے کھیل والا اور شکیلہ کو [illegible] کرنے کی ہدایت کر دی اور خود [illegible] گیا۔ آرام ہم سب کے لیے ضروری تھا۔

میں مطمئن تھا کہ اب [illegible] کوئی خطرہ [illegible] تھا۔ میری آنکھ لگ گئی۔

جب [illegible] کھڑکی سے تیز دھوپ کی کرن اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں نے وقت دیکھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ پورے سات گھنٹے کی نیند کرنے کے بعد میں خود کو [illegible] بشاش محسوس کرنے لگا۔ میں نے دوسرے کمرے میں جا کر کھیل والا اور شکیلہ کو بھی جگا دیا اور خود اپنے کمرے میں آ کر غسل وغیرہ کیا۔

ہم تینوں ۱۲ [illegible] ہو گئے۔ شکیلہ [illegible] تھی۔ کیونکہ [illegible] رات تک [illegible] بہت [illegible] آ رہا تھا، [illegible] (ثنا نے تو اپنے کہنے کے برعکس ہوٹل گیٹ [illegible] نہیں کیا تھا تو اسے میری بات سے اتفاق کرنا پڑ رہا تھا۔

ہم کھانے [illegible] ہوٹل سے باہر آ گئے۔

[illegible] کے [illegible] نظر آ رہے تھے۔ سیاح، مقامی لوگ اور [illegible] کے کھانے پینے کی اشیا [illegible] ریسٹورنٹ کھل چکے تھے۔

میں نے داخلی گیٹ [illegible] کے قریب والے ایک [illegible] ریسٹورنٹ کا رخ کیا اور وہاں ہم تینوں بیٹھ گئے۔ ریسٹورنٹ کی [illegible] اور [illegible] بیٹھنے والوں

نگاہوں کو سرو کرنے میں مصروف تھیں، ہماری طرف بھی ایک خوب صورت سی ویٹرس آ گئی۔ اس نے جلد صاف ستھرا لائٹ کیا اور مگر مقامی لوگوں کی طرح ٹانے کی طرح جھک گئی۔ شاید یہاں میری موجودگی کے سبب ایسا تھا۔ یہاں کانے بھی سجاؤ کر رہے تھی۔

میں نے اسے فرائی، اسنیکس اور سینڈوچ وغیرہ لانے کا آرڈر دیا۔ وہ پلٹنے لگی تو کمیل دادا نے ویٹرس کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ میں نے بےاختیار ایک طویل سانس لے کر دیکھا۔ مجھے پتا تھا وہ کیا کرنے والا تھا۔ ویٹرس اس کے قریب جا کر رک گئی اور کمیل دادا نے اس سے کچھ کہا اور ساتھ ہی میری جانب بھی اشارہ کیا۔ وہ مسکرائی اور پھر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دے کر چل دی۔

کمیل دادا نے ویٹرس کو اپنے اور شیلی کے لیے "اسپیشل" آرڈر نوٹ کروا دیا تھا۔

میں گردوپیش پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ زندگی پوری طرح بیدار تھی۔ سیاح، مقامی لوگ سب انجوائے کر رہے تھے۔ زیادہ گہما گہمی آبادی ہی کی تھی۔

اسی دوران جب میں گیٹ وے ہوٹل کی طرف دیکھ رہا تھا تو اچانک چونک پڑا۔ ایک ٹیکسی ٹاور گیٹ وے کے سامنے رکی اور اس میں سے اترنے والے دو افراد کو دیکھ کر میں چونکا تھا۔ وہ ذکا اور بلیک بل تھے۔ لیکن ان کے ساتھ دو اور افراد بھی تھے جو میرے لیے اجنبی تھے مگر وہ مقامی نہیں لگتے تھے۔

انھوں نے ٹیکسی والے کو فارغ کیا پھر گیٹ وے کے سامنے کھڑے رہے۔ میری متجسس نظریں ان کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے دیکھا ذکا ان دونوں اجنبی آدمیوں سے کچھ کہہ رہا تھا پھر اس نے اسی ریسٹورنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے اثبات میں اپنے سر ہلائے اور پھر اسی طرف کو بڑھنے لگے۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

انھیں یہاں بھیجنے کے بعد ذکا اور بلیک بل گیٹ وے کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ لیکن شیلی کہاں تھی؟ یہ سوال آکٹوپس کی طرح میرے ذہن میں اتر گیا۔

وہ اندر غائب ہو گئے اور یہ دونوں اجنبی ریسٹورنٹ میں آ کر ہم سے کچھ فاصلہ چھوڑ کر ایک میز کے گرد بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

کمیل دادا اور شیلی بھی مجھے ایک دم خاموش اور کچھ کر پائے تو صورت حالات کا اندازہ لگا چکے تھے۔

"میں اس طرف کی میز پر جا رہا ہوں، ویٹرس آرڈر لے کر آئے تو میرے اسنیکس اور سینڈوچ وغیرہ ادھر ہی بھجوا دینا۔ تم دونوں یہیں بیٹھے رہو گے۔"

یہ کہتے ہی میں نے کرسی چھوڑ دی اور اس خالی میز کی طرف بڑھ گیا جو ان دونوں اجنبیوں کے قریب اور پشت کی جانب تھی۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ذکا کے یہ دو آدمی کون تھے اور یہاں انھیں لانے کا کیا مقصد تھا۔ حال میں کالا تو مجھے پہلے ہی نظر آ گیا تھا مگر اب آگے کا ذکا کون سا نیا سراغ لگا رہا تھا، یہ مجھے دیکھنا تھا۔ جبکہ شیلی بھی غائب تھی۔

میں نے دیکھا، ویٹرس، کمیل دادا اور شیلی کی میز پر آرڈر لے آئی تھی اور اب سرو کرنے میں مصروف تھی۔ اسی دوران کمیل دادا نے اس سے کچھ کہا اور ویٹرس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلا کر اسے اشارہ کر دیا۔ وہ میرے لیے ایک ٹرے اٹھا کر اسی میز کی جانب بڑھی اور پھر قریب آ کر اس نے رکھ دی۔

"یہ دونوں آپ کے کیا لگتی ہیں؟" ویٹرس نے پوچھا۔

"ہاں، اگر وہ میری گرل فرینڈ کو پسند نہیں کرتے اسی لیے میں یہاں آ بیٹھا۔" میں نے جواز پیش کیا۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میں اس کی حرکت کو نظرانداز کر کے بولا۔ "وہ ابھی یہاں پہنچنے والی ہے۔" وہ چلی گئی۔

میں کھانے لگا اور ساتھ ہی ان دونوں افراد کی باتوں پر کان لگا دیے لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ وہ آپس میں کوئی بات تک نہیں کر رہے تھے۔ بالکل خاموش بیٹھے تھے اور گیٹ وے کی جانب یوں تکے جا رہے تھے... جیسے ذکا اور بلیک بل کی واپسی کا بےکلی سے انتظار ہو۔

میں بھی سینڈوچ اور کافی سے شغل کرتا رہا اور کان لگائے رکھے مگر کمبختوں نے کچھ بول کر ہی نہیں دیا۔ تاہم میں نے کن انکھیوں سے ان دونوں کا جائزہ لیا تھا۔ دونوں امریکی ہی معلوم ہوتے تھے۔ ایک چھریرے بدن کا اور قدرے دراز قامت تھا اور دوسرا درمیانی قامت کا تھا۔

میں جانتا تھا کہ ذکا اور بلیک بل جلد ہی گیٹ وے سے برآمد ہوں گے کیونکہ وہاں شیلی نہیں تھی اور ایسا ہی ہوا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ میں ایک دم محتاط ہو گیا اور

کھانے میں مشغول ہو رہا۔

مجھے تسلی تھی کہ ڈنٹا اور بلیک گل ہمیں پہچاننے سے قاصر ہی رہیں گے۔

ڈنٹا اور بلیک گل نے ان دونوں مذکورہ اجنبی افراد کے ساتھ کرسیاں سنبھال لی تھیں۔

میں نے کن انکھیوں سے ڈنٹا کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا فکرمند اور پریشان تھا۔ اس کی وجہ میں جانتا تھا۔

اب میری دھوکی حاسّتیں ان پر مرکوز تھیں اور بظاہر میں کھانے میں مشغول رہا۔ انہوں نے اپنے لیے وہسکی کا آرڈر دیا تھا۔

"کیا ہوا مسٹر ڈنٹا! تم ایک دم پریشان نظر آنے لگے ہو؟ شکار کہاں گئے؟" ایک اجنبی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کے "شکار" والے الفاظ پر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے ایسی کوئی بات نہیں، شکار تھوڑا ہی ہاتھ سے، وہ شاید کہیں اور نکل گئے ہیں مگر بے فکر رہو مسٹر ہوپر! انھیں مجھ پر پورا بھروسا ہے، وہ مل جائیں گے۔" ڈنٹا نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ کام کی بات کرلی جائے۔" پھر تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوسرے اجنبی کو مخاطب کر کے کہا۔

"جیکسن! تم اس جہاز کے متعلق بتا رہے تھے؟"

"پچھلے ہفتے ہی اس جہاز کو غرق ہوئے چالیس برس گزر چکے ہیں۔" جیکسن نامی وہ دوسرا اجنبی جواب میں بولا۔ "اور... اس دوران سمندری لہریں اس کے ڈھانچے کو کہیں سے کہیں لے گئی ہوں گی۔ اگر ہم لانگ کارڈ کو ساتھ لے آتے تو اس سے ہمیں کافی مدد مل سکتی تھی۔"

ان کی باتیں سن کر میری پیشانی پر الجھن آمیز سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ نجانے یہ کیا معاملہ تھا؟ غیر متعلق سی لیکن چونکہ اس میں ڈنٹا شامل تھا اسی لیے میرا اس سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔

مجھے ڈنٹا کی آواز سنائی دی۔ وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

"اگر سینڈرز کا ڈھانچا آس پاس ہی کہیں موجود ہے تو میں کسی لانگ کارڈ کی مدد کے بغیر بھی اسے تلاش کر سکتا ہوں۔ اگر لانگ کارڈ سے مدد لی گئی تو وہ ہمارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ کیا خبر وہ انعام کے لالچ میں لولوش کو ہی اس کی اطلاع دے دے، کیونکہ حکومت تو اسے کوئی انعام نہیں دے گی سوائے ایک عدد شاباشی کے۔"

"تم واقعی ہی بے وقوفوں والی باتیں کر رہے ہو۔" پہلے والے چھریرے بدن کے مالک اجنبی نے درمیان میں کہا۔ "اس جزیرے کا مالک لولوش ہے۔ اس کے آدمی ہر جگہ موجود ہیں۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہوگا، خفیہ ہی کرنا ہوگا۔ اگر لولوش کے علم میں یہ بات آ گئی تو وہ ہم سب کا بیڑا غرق کر دے گا۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا، پھر ڈنٹا کو مخاطب کرتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"تم تو کہہ رہے تھے کہ میں لولوش کے ساتھ ایک بہت اہم ڈیل کرنے والا ہوں اور اس کے انعام کے طور پر میں یہاں اورنج کلب کا مالک بن جاؤں گا، پھر ہم سکون کے ساتھ اپنی خفیہ کارروائی انجام دیتے رہیں گے۔"

اس دوسرے اجنبی کی بات پر میرے کان ایک دم کھڑے ہو گئے اور میری رگوں میں خون کی گردش بھی یکلخت تیز ہو گئی۔

"ہاں! میری اصل پلاننگ یہی تھی۔" ڈنٹا کی آواز سنائی دی۔ "میں نے تمہارے باس روجرز کو سب بتا کر تسلی دے دی تھی۔"

"باس بھی اپنے مزید دو ساتھیوں کے ساتھ کینیڈا سے آج شام کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہے ہیں۔" ہوپر نے کہا۔ "پھر ہمارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔"

"لیکن بات پھر وہی ہے۔ جب تک وہ تینوں شکار نہیں ملیں گے، ہماری ڈیل نامکمل رہے گی۔" جیکسن نے ڈنٹا کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

"کہا نا، تم فکر مت کرو۔" ڈنٹا بولا۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ کا تاثر تھا۔ "وہ تینوں کہیں ہوں گے، جیسے ہی مجھے نظر آئے، میں انہیں دھوکے سے بے ہوش کر کے تمہارے کاٹج میں یرغمال بنا لوں گا، پھر میں آرام سے لولوش سے ڈیل کر لوں گا۔"

"لولوش کے کسی آدمی سے تم نے ابھی تک کوئی رابطہ کیا بھی ہے یا ابھی کرنا ہے؟" ہوپر نے سوال کیا۔

"آج شام کا وقت دیا ہے اسی اورنج کلب میں۔ وہ لولوش کا نائب کالا پان ہے۔"

ڈنٹا کے یہ آخری الفاظ میری دھوکی حاسّتوں سے ٹکرائے تھے اور میرے دماغ میں ایک ہی تکرار ہونے لگی۔

"کالا پان... کالا پان... کالا پان۔"

خونی رشتوں کی خود غرضی اور بے رحم بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں [illegible] پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 62

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن سے ابھرتا ہوا دلچسپ سلسلہ...

کالاہان وہی نامراد یہودی تھا جس نے عالمی نشریاتی رابطے کے ذریعے پاکستان، میرے اور عابدہ کے خلاف جی بھر کے ہرزہ سرائی کی تھی۔

یہ اس وقت کی بات تھی جب میں فلپائن میں تھا۔ میں نے اس کی ناپاک سؤر جیسی صورت بھی ٹیلی ویژن پر دیکھی تھی لیکن ایک اور برادر مسلم ملک کے صحافی اور میزبان نے اسے منہ توڑ جواب سے بھی اچھی طرح نوازا تھا۔

یہ ملعون اسپیکٹرم کا نمبر دو اور لولوش کا نائب تھا۔ اس بدذات کی آمد کا سنتے ہی میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

گویا لولوش کا ایک اور اہم ''کارپرداز'' میرے ہاتھوں جہنم واصل ہونے والا تھا۔ کالاہان کے لیے تو میں پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ اس خبیث نے جس طرح وطنِ عزیز پاکستان اور عابدہ کے خلاف زہر اُگلا تھا، وہ الفاظ ہنوز میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔

''لیکن تم اسے اپنے ان دونوں شکار کے بارے میں کیسے مطمئن کرو گے؟'' اچانک مجھے جیکسن کی آواز سنائی دی۔ میں زیادہ نہ سوچ سکا اور ایک بار پھر ان کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جیکسن نے ڈنشا سے ایک اہم سوال پوچھا تھا۔

''اسے مطمئن کرنا میرا کام ہے۔'' ڈنشا ان سے کہہ رہا تھا۔

''ہم چاہ رہے تھے کہ ہمارے باس کی بھی مسٹر کالاہان سے میٹنگ ہوجائے۔'' ہوپر نے درمیان میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ڈنشا نے سر ہلایا اور اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ''آپ مجھے چند گھنٹے دیں۔ ابھی شام ہونے میں کافی وقت ہے۔ میں اس سے پہلے ان تینوں کو تلاش کرلوں گا، کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ایسا کرلوں گا۔ وہ میرے ہی ساتھ یہاں آئے ہیں اور میری چال ایسی ہے کہ وہ پوری طرح نرغے میں آچکے ہیں۔''

''اب ہمیں اجازت ہے؟'' جیکسن نے پوچھا اور ڈنشا نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

اس کے بعد وہ دونوں ڈنشا اور بلیک مل سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔

''سمجھ میں نہیں آتا، آخر وہ تینوں کم بخت یوں اچانک کہاں غائب ہوگئے ہیں؟'' ہوپر اور جیکسن کے رخصت ہوتے ہی ڈنشا خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ اس کے لہجے کی پریشان کن جھلاہٹ مجھے صاف محسوس ہوئی تھی۔

''کہیں ایسا تو نہیں باس! کہ انہیں ہوٹل گیٹ وے میں کوئی کمرا ہی نہ ملا ہو؟'' بلیک مل نے کہا تو ڈنشا نے اس کی طرف گھور کر دیکھا اور اسی لہجے میں بولا۔

''تمہارے جثے کی طرح تمہارا دماغ بھی موٹا ہے۔ گدھے نااہل! میں نے ان تینوں کے کمرے پہلے ہی سے ریزرو کروا رکھے تھے اور اس کا انہیں علم تھا۔''

بلیک مل بھی اپنی نسل کا ڈھیٹ آدمی تھا، خفیف ہونے کے بجائے ایک اور رائے دیتے ہوئے بولا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہاں انہوں نے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس کیا ہو اور وہ پلٹ گئے ہوں؟''

''اب کی نا تم نے عقل کی بات۔'' ڈنشا بولا۔ ''اسی بات کے امکانات پر میں غور کر رہا ہوں لیکن انہیں مجھ سے تو کسی طور رابطہ کرنا چاہیے تھا۔'' یہ کہتے ہوئے ڈنشا کچھ سوچنے لگا اور پھر اچانک بولا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں ہم پر کسی قسم کا شبہ ہوگیا ہو؟''

''اگر ایسا ہے بھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شبہے کی وجہ آخر کیا ہوسکتی ہے؟''

''مجھے تو کوئی وجہ نہیں نظر آتی باس!'' بلیک مل نے نفی میں سر ہلایا اور آگے بولا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں اریب قریب کے ہوٹلز میں جا کر ان تینوں کے بارے میں پتا کر لینا چاہیے۔''

''ہاں! لیکن ہم ہوٹل گیٹ وے کو ایک بار پھر کھنگالنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' کہتے ہوئے ڈنشا نے کرسی چھوڑ دی، بلیک مل ایک دم چابی بھرے بھالو کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے انہیں ہوٹل گیٹ وے کی طرف جاتے دیکھا تو میرے ہونٹوں پر از خود زہریلی مسکراہٹ عود کر آئی۔

اس کے بعد میں بھی اُٹھ کر اپنے ''موم اور پا'' (کمیل دادا اور شکیلہ) کی میز پر آ بیٹھا۔

اچانک یونہی میری نگاہ اسی خوب صورت ویٹرس پر پڑی۔ وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ تب ہی میں اس کے یوں اپنی طرف دیکھنے کا مقصد جان گیا اور مایوسانہ انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص اشارہ کردیا۔

میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ مجھے اپنی گرل فرینڈ کا انتظار تھا لیکن وہ باوجود اتنے انتظار کے بعد نہیں آئی۔

اپنی میز پر کمیل دادا اور شکیلہ شغل میں مصروف تھے۔ وہ مجھ سے بے اعتنائی برتتے رہے۔

میں بھی گویا ان سے بے پروائی برتتے رہا، کوئی بعید نہ تھا کہ یہاں قریبی ٹھکانوں میں لولوش کا کوئی جاسوس ہم پر ''چوری'' نگاہ رکھے ہوئے ہو۔

میں نے بظاہر عام سے انداز میں کمیل دادا اور شکیلہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کردیا۔

''ڈنشا کا فریب تو عیاں ہوگیا۔ میرا خیال ہے اب اسے موت کے گھاٹ اُتار دینا چاہیے۔'' کمیل دادا نے مشورہ دیا۔

''لیکن یہ سینڈرز نامی جہاز کا کیا معاملہ ہے؟'' شکیلہ کا فطری تجسس جاگا۔ ''کہیں اس کا تعلق لولوش کے کسی خاص اور خفیہ مشن سے تو نہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے شکیلہ کی بات پر نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ معاملہ خالصتاً ڈنشا کی ذات سے متعلق محسوس ہوتا ہے مجھے۔ اس کی تو وہ لوگ لولوش یا اس کے کسی آدمی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتے ہیں، کیونکہ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تھی، مجھے لگتا ہے کہ ڈنشا کچھ لوگوں کی مدد سے کسی ایسے سینڈرز نامی بحری جہاز کی کھوج میں ہے، جو اس کے لیے دولت کا سبب بنا ہو۔''

''تب پھر سیدھی سی بات ہے۔'' کمیل دادا بولا۔ ''یہ کسی گمشدہ خزانے کا معاملہ ہوگا۔ خزانے کی تلاش سے متعلق ایک روایتی کہانی۔''

''واؤ..... کیا زبردست ایڈونچر ہوگا۔'' شکیلہ نے چٹخارا لیا۔ ''میں بچپن میں خزانے کی تلاش والی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتی تھی، آج اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں گی۔''

''بچپن میں ٹارزن کی کہانیاں بھی ہوتی تھیں۔'' میں نے دانت پیس کر مصنوعی لہجے سے شکیلہ کی طرف گھورا۔ وہ جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کمیل دادا ہولے سے ٹھٹھا مار کے ہنسا۔

''ہمیں سینڈرز سے کیا لینا دینا۔ یہ بتاؤ شہزی! ڈنشا نے ہمارے ساتھ تو فریب کرنے کی ہمت کر ہی ڈالی ہے لیکن اس نے نیلی کا کیا؟ وہ کہاں ہے؟''

''اسے ٹھکانے لگانا یا کہیں غائب کردینا ڈنشا جیسے آدمی کے لیے کیا مشکل ہوگا۔'' شکیلہ نے کہا۔

''تمہاری آخری الذکر بات غور طلب ہے۔'' میں نے سوچتے ذہن سے کہا۔ ''نیلی کو وہ ٹھکانے تو نہیں لگا سکتا، عارضی طور پر غائب ضرور کروا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے اچھی طرح کہ وہ جو کچھ ہمارے خلاف کررہا ہے، نیلی کو وہ تنہا پسند نہیں ہوگا۔''

''لیکن پھر بھی ڈنشا کو نیلی کے سامنے جواب دہ تو ہونا ہی پڑے گا؟'' شکیلہ بولی۔

''ڈنشا جیسے مکار اور دھوکے باز کے لیے اغوا کا ڈراما رچانا اور ہمیں دشمنوں کی نظر کی کہانی گھڑنا کیا مشکل ہوگا۔'' کمیل دادا نے کہا۔

''یقیناً۔'' میرے منہ سے نکلا اور اس دوران میری نظریں بار بار گیٹ وے ہوٹل کی طرف جانے والے راستے کی طرف اُٹھتی رہیں۔

ڈنشا اور بلیک مل ابھی پلٹے نہیں تھے، وہ ایک بار پھر ہمارے بارے میں ہوٹل گیٹ وے میں پوچھ گچھ کرنے گیا تھا۔ اس کے بعد ان کا ارادہ اریب قریب کے دیگر ہوٹلز میں بھی ہماری تلاش کا تھا۔

''تم دونوں یہاں بیٹھو، میں جاتا ہوں، اگر مجھے لوٹنے میں دیر ہوجائے تو اپنے ہوٹل چلے جانا۔''

''کیا تم اکیلے؟'' شکیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

☆☆☆

میں ابھی ہوٹل گیٹ وے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر رکا۔

میں نے ڈنشا اور بلیک مل کو ہوٹل کے باہر چند لوگوں سے باتیں کرتے پایا۔ میں اسٹال کے قریب جا رکا اور فریش جوس پینے لگا۔ میری نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں۔

جلد ہی مجھے احساس ہوگیا کہ میں ڈنشا پر فضول میں اپنا وقت برباد کررہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے نیلی کا خیال آگیا، پھر میں خود کو نہ روک سکا۔ اسے تلاش کرنا ضروری تھا۔ ساتھ ہی ایک اور بات بھی میرے ذہن میں آئی تھی کہ اگر ڈنشا کی اصلیت میرے سامنے بے نقاب ہوجاتی ہے (جو تقریباً ہو ہی چکی تھی) تو کیا میں اس سے یہاں، لولوش کی اسٹیٹ میں کسی قسم کی جنگ کا متحمل ہوسکتا تھا؟ کیونکہ وہ میری کمزوری سے واقف تھا، دشمنی کی صورت میں وہ بدبخت دوست کو دشمن بنانے کی چالبازی کی راہ اپناتے ہوئے میرے خلاف یہاں لولوش کے ہاتھ مضبوط کرسکتا تھا۔

جیسا کہ اس کا اپنا بھی کوئی خفیہ مفاد اس کے ساتھ وابستہ تھا، ڈنشا بہرحال میرے لیے ایک اضافی دشمن کی صورت اختیار کرنے والا تھا اور دشمن کو میں تب تک معاف

نہیں کرتا تھا جب تک کہ وہ میرے گلے کو نہ آجاتا۔

ڈنشا اور بلیک بل اسی طرح آس پاس کے ہوٹلز اور مختلف لوگوں کو ہمارے حلیے بتا بتا کر کھوج لگانے کی کوشش کرتے رہے لیکن انہیں ناکامی ہوئی، میں عام راہ گیر کے بہروپ میں بدستور ان کے پیچھے لگا رہا حتیٰ کہ انہوں نے ایک سنگل ڈور والی ٹیکسی کار کروائی اور نامعلوم منزل کی جانب رخ کیا۔

مجھے یقین تھا کہ یہ ضرور اب یہاں اپنے اصل ٹھکانے کی طرف جا رہے تھے، میں بھی ان کے پیچھے لگا رہا۔

مجھے ایسی کوئی چھوٹی ٹیکسی کار تو نہ مل سکی البتہ ایک تھری سیٹر ضرور مل گئی۔ میں اس میں سوار ہو گیا اور ان کے تعاقب میں ہو لیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ان کی کار گنجان آبادی سے نکل کر ایک جنگلاتی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں بھی سیاحوں اور مقامی لوگوں کی تعداد نظر آتی تھی، تاہم نسبتاً کم ہی تھی۔ کہیں کہیں سرکیپ اور چند بس نظر آتے تھے۔

ساحل سے قدرے نزدیک ہونے کے سبب فضا مرطوب اور سرد محسوس ہوتی تھی۔ یہاں میں نے تھری وہیل موٹر سائیکلیں بھی چلتے دیکھیں، یہ سیاحوں کو جزیرے کی سیر کروانے کے لیے ہوتی تھیں۔ اسی طرح چھوٹی بڑی موٹر بوٹس بھی تھیں۔

پام کے جھنڈ کے درمیان گھرے ہوئے ایک خوب صورت سے چوبی کاٹیج کے سامنے ان کی ٹیکسی کار رکی اور وہ دونوں نیچے اترے۔ بلیک بل نے کرایہ دیا اور پھر وہ دونوں کاٹیج کے مختصر مگر دیدہ زیب احاطے کے گیٹ کی جانب بڑھے۔

اندر داخل ہونے کے بعد انہوں نے مرکزی دروازے کا رخ کیا تھا۔ تب تک میں بھی تھری سیٹر سے اتر کے دائیں جانب بڑھ گیا تھا اور ایک بڑا سا چکر کاٹ کر کاٹیج کی عقبی سمت پر آ گیا۔

یہاں جنگلی درختوں اور خودرو جھاڑیوں کی بہتات نظر آتی تھی۔ وہاں سے میں نے محتاط انداز میں جھکے جھکے کاٹیج کی عمارت کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

یہاں پام کے جھنڈ نے کاٹیج کو تین اطراف سے گھیرے رکھا تھا۔ یہ کاٹیج ایک منزلہ تھا۔

میں کسی شکاری کی طرح جھاڑیوں میں گھس گیا اور اس کے ذرا سی دیر بعد کاٹیج کی عقبی دیوار کے ساتھ جا چپکا۔ یہاں میں نے اندر داخل ہونے کے لیے کوئی کھڑکی یا چور دروازہ ٹٹولنے کے لیے متلاشی نظروں سے جائزہ لیا تو ایک بڑی کھڑکی مجھے دکھائی دے گئی مگر وہ بند تھی۔

سنگل پٹ کا ایک بند دروازہ بھی نظر آیا، لیکن ان میں زور آزمائی کی مجھے کوئی گنجائش نظر نہ آسکی۔ کھڑکی میں تو اس لیے نہیں کہ وہ بند تھی اور اس کے گلاسز بھی ٹھوس تھے، اگر میں اسے تختۂ مشق بنانے کی کوشش کرتا تو اندر موجود کوئی بھی چونک سکتا تھا جبکہ مجھے باہر سے اندر کا منظر دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔

لہٰذا میں یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ رہا سنگل پٹ کا وہ چور دروازہ تو وہ دروازہ مجھے عجیب ہی لگا۔ اس کے باہر کی طرف نہ کوئی تالا تھا نہ کنڈی وغیرہ، وہ بالکل سپاٹ تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے... اور وہ جگہ چھوڑ دی۔ گربہ قدمی سے دیوار کے ساتھ ہی چپکے ہوئے تھوڑا اور آگے بڑھا تو مجھے کارنر پر اوپری منزل میں ایک چھوٹی سی بالکونی نکلی دکھائی۔

میری آنکھوں میں یکبارگی کامیابی کی چمک ابھری۔

یہ بالکونی میرے ”کام“ کی تھی۔ میرے پاس نقب لگانے کی اسپائنڈر پستول تھا۔ میں نے ایک ذرا گردوپیش پر نگاہ ڈالی اور اس کے بعد اسپائنڈر نکال کر اس کی نال کا رخ بالکونی کی ریلنگ کی جانب کر دیا اور ٹریگر دبا دیا۔

ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی اس کی نال سے ریشم جیسی باریک دھاگا نما تار نکلی اور اوپر بالکونی کی ریلنگ میں جا اٹکی۔ اس کے بعد میں نے ایک اور چھوٹا بٹن دبایا اور اوپر اٹھتا چلا گیا۔

چند ہی سیکنڈوں بعد میں بالکونی میں تھا۔ اسپائنڈر پستول جیب میں رکھا اور فوراً ایک کونے میں جا دبکا۔

پیش قدمی سے پہلے اردگرد کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ یہ بالکونی شاید بارش کے دنوں میں بیٹھے جنگل کا نظارہ کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ مجھے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا، میں آگے بڑھا۔ دروازے کو ہلکا سا اندر دھکیلا تو وہ کھلا ہوا تھا، اس کی جھری بنا کر اندر جھانکا۔ تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

میں نہایت آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

ایک جگہ مجھے روشنی کی ہلکی کرن دکھائی دی، وہاں سے باتوں کی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں اسی طرف کو بڑھا اور ایک دیوار سے لگے ہوئے روشنی کی کرن کا اندازہ کرتے ہوئے اس کے قریب پہنچا تو ٹھٹک کر رک گیا۔

یہ کسی کمرے کا دروازہ تھا جو بند نہ تھا بلکہ تھوڑا سا بھڑا ہوا تھا، میں نے ایک آنکھ چپکا کر اندر جھانکا تو یکلخت میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

یہ عام سا چھوٹا کمرا تھا۔ اندر چار افراد ایک بیڈ کے قریب کھڑے تھے۔ ان چاروں میں سے دو افراد تو مجھے مقامی محسوس ہوئے، یہ اندازہ مجھے ان کے چہروں کی مخصوص بناوٹ اور تانبے جیسی جلدی رنگت سے ہوا تھا۔ باقی دو، ڈنشا اور بلیک بل تھے۔

جس بیڈ کے گرد وہ کھڑے تھے، اس پر جو عورت بے سدھ سے انداز میں پڑی تھی، اسے پہچاننے میں مجھے چنداں دشواری نہیں ہوئی تھی۔

وہ نیلی تھی۔

☆☆☆

”دالکن! اسے کسی قسم کا کوئی شبہ تو نہیں ہوا...؟“ ڈنشا نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ اشارہ نیلی کی طرف تھا۔

”بالکل نہیں باس! لیکن......“ دالکن نامی وہ مقامی کہتے کہتے رکا تو ڈنشا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن کیا؟“

”باس! تھوڑا ڈراما کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔“ مقامی آدمی کے ساتھی نے کہا۔ ”ورنہ ممکن ہے اسے ہم پر کچھ شبہ ہونے لگے گا۔“

”ہمم....“ ڈنشا نے ایک پُرسوچ سی ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں خود بھی اسی سلسلے میں غور کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے آج ہی ایک دن ایکٹ پلے کر لیتے ہیں۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”اور تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا؟“

”بس! ذرا ہوش میں آنے کے بعد شور بہت مچاتی ہے۔ اسے مارفین کا انجکشن لگانا پڑتا ہے۔“ پہلے والے مقامی آدمی نے کہا۔

”خیال رہے زیادہ ڈوز نہ دینا۔“ ڈنشا نے تاکید کی۔

”ڈونٹ وری باس! ہلکی ڈوز ہی دی جاتی ہے۔“

”ابھی کب تک ہوش میں آ جائے گی؟“

”آنے والی ہے۔“

ڈنشا ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ایسا کرو، اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ لگائے رکھو، مارفین دینا بند کر دو اور سنو! زیادہ اس کے ساتھ بدتمیزی مت کرنا۔ جانتے ہو کیا لگتی ہے یہ میری؟“

”بہت اچھی طرح جانتا ہوں باس! ہمیں معلوم...... یہ آپ کی کیا لگتی ہے۔“ دالکن نامی آدمی نے مؤدبانہ کہا۔

”لیکن ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے یہ سب ضروری ہوتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، مگر زیادہ نہ ہو۔“

”اسے کتنے دن یہاں یرغمال بنائے رکھنا ہوگا؟“ پہلے والے نے سوال کیا۔

”ابھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ویسے تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟ تم دونوں کو تو ڈیلی ویجز پر معاوضہ مل رہا ہے؟“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے باس! میں نے یونہی پوچھ لیا تھا۔“

”او کے! ڈراما شروع کیا جائے؟“ ڈنشا نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ دالکن نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔

تعریف

ایک آدمی اپنے ایک دوست سے شکایت کر رہا تھا کہ اس کی بیوی اس سے ہمیشہ ناراض رہتی ہے۔ دوست نے اسے مشورہ دیا کہ عورت کتنی خفا کیوں نہ ہو تعریف سے خوش ہو جاتی ہے۔ آج شام کے کھانے پر اس کے پکائے ہوئے سالن کی تعریف کر دینا۔

چنانچہ اس آدمی نے شام کو پہلا نوالا منہ میں لیتے ہی کہا۔ ”آہاہا... بیگم مزہ آ گیا۔ کیا غضب کا سالن پکایا ہے آج۔“

بیوی کھانا چھوڑ کر رونے بیٹھ گئی اور لگی واہی تباہی بکنے۔ خاوند نے وجہ پوچھی تو بیوی نے منہ بسور کر کہا۔ ”تم نے میری کسی چیز کی بھی تعریف نہیں کی۔“

”تمہارے سالن کی تعریف تو کی ہے۔“ خاوند نے گڑبڑا کے کہا۔

بیوی جھلا کے بولی۔ ”یہ تو میں نے ہوٹل سے منگوایا ہے۔“

چکوال سے نجیب الرحمن کی شکل

”اور ہاں ایک بات کا خاص خیال رکھنا...“ ڈنشا کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا۔ آگے بولا۔ ”اسے معمولی لڑکی مت سمجھنا، یہ ایک فائٹر کلب چلاتی ہے۔ اسی لیے میں نے تم لوگوں کو خاص طور پر یہ تاکید کر رکھی ہے کہ اسے مارفین کی ہلکی ڈوز دیے رکھو اور اس کے ہاتھوں پیروں کی رسیاں بھی صرف فطری ضرورت کے وقت ہی کھولنا۔“

ڈنشا کی اس ”خاص“ ہدایت پر والکن اور جون نے بیک وقت اپنے سر اثبات میں ہلا دیے تھے۔

بڑی دلچسپ صورت حال تھی لیکن میرا اس سے آگاہ ہونا ضروری تھا۔ اسی دوران مجھے والکن کے دوسرے ساتھی کا نام، جون معلوم ہوا تھا۔

ان مذکورہ دو مقامی غنڈوں سے مدد لینا ڈنشا کی مجبوری تھی، ورنہ اس کے پاس بھلا ایسے آدمیوں کی کیا کمی تھی۔ لہٰذا مجبوری یہ تھی کہ ہیلی، ڈنشا کے بیشتر آدمیوں کو پہچانتی تھی۔

ڈنشا اور بلیک مل دروازے کی طرف آنے لگے۔ میں جلدی سے وہاں سے ہٹ گیا اور لاؤنج میں ایک بڑے سے ڈیوائیڈر کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈرامے کا لب لباب یوں رہا۔ ہیلی کو ہوش میں لایا گیا تو والکن اور جون افراتفری اور پریشانی کے عالم میں ایک دوسرے سے ہم کلام تھے۔ مقصد، ہیلی کو یہ تاثر دینا تھا کہ ڈنشا کے آدمی اسے چھڑانے کے لیے یہاں ہلا بول چکے ہیں، باہر موجود بلیک مل اور ڈنشا نے شور مچایا، کچھ کھڑبڑاہٹ کی آوازیں پیدا کیں، والکن پستول ہاتھ میں لیے دروازے سے نکلا۔

ایک دو فائر ہوئے، والکن خود کو مصنوعی انداز میں زخمی کر کے ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا پھر جون سے بولا کہ وہ ”انہیں“ بھگانے پر مجبور کر چکا ہے، اب چونکہ یہ کاٹیج ہیلی کے ساتھیوں کی نظروں میں آ چکا ہے اسی لیے بدلنا ہو گا۔ لیکن جون نے اس کی بات نہ مانی اور اپنے سیل فون سے مصنوعی کال ڈنشا کو کر ڈالی پھر نہایت طیش زدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اسے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دینے لگا۔ ساتھ ہی اس نے جرمانے کے طور پر ہیلی کی رہائی کے بدلے میں تاوان کی رقم بھی بڑھا دی۔

ازیں علاوہ ڈرامے کو حقیقت کا ”تڑکا“ لگانے کے لیے ہیلی کی بھی ڈنشا سے بات کروا دی اور ڈنشا نے وہی کہا جو ایسے مواقع پر کوئی اپنی محبوبہ کو تسلی کے روایتی بول سے نوازتا ہے۔

بہرکیف، یہ ڈراما مکمل کرنے کے بعد ڈنشا اور بلیک ایک دوسرے کمرے میں آ کر خاموشی سے بیٹھ گئے۔

ان کے وہاں براجمان ہوتے ہی والکن اور جون بھی وہاں آ گئے۔ ہیلی دوسرے کمرے میں بند تھی، وہ ہوش میں آ چکی تھی اور رسن بستہ حالت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ منہ پر اس کے اگر اسکاچ ٹیپ نہ ہوتی تو وہ چیخ چیخ کر سارا کاٹیج سر پر اٹھا لیتی۔ وہ خوف زدہ بھی تھی اور طیش زدہ بھی نظر آ رہی تھی۔

ادھر دوسرے کمرے میں ڈنشا والکن کے سپرد ایک بڑا سا لفافہ سپرد کرتے ہوئے توصیفی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”گڈ! تم دونوں بہت اچھا جا رہے ہو۔ یہ تمہارا آج کا معاوضہ ہے۔“

وہ دونوں ان سے رخصت ہو کے نکلے، میں ان سے پہلے ہی باہر آ چکا تھا۔

دن نکل آیا تھا اور مجھ پر نیند اور تکان غالب آتی جا رہی تھی، لیکن میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں یہاں پر ڈنشا کا ٹھکانا دیکھنا چاہتا تھا، تاکہ بوقت ضرورت اس خبیث اور دھوکے باز سے اچھی طرح نمٹ سکوں۔

انہوں نے ٹیکسی کی اور میں بھی پہلے ہی سے تیار تھا۔ لہٰذا مجھے بھی جلد ہی ایک تھری سیٹر مل گیا۔ اسے چلانے والی ایک حسین عورت تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اس ٹیکسی کا تعاقب کرنے کا کہا۔

وہ ذرا الجھ سی گئی اور مشکوک نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی تشفی کی خاطر اسی طرح دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔

”فکر مت کرو، تمہیں کچھ نہیں ہو گا، یہ ایک معمولی سا مسئلہ ہے۔“ وہ نہیں مانی اور تھری سیٹر آگے دوڑا گئی۔ میں اپنے ہونٹ بھینچے رہ گیا۔ یہاں شاید اس قسم کے معاملات کی کچھ زیادہ ہی سختی تھی۔ مجھے جلدی تھی۔

اچانک مجھے ایک بائیک کھڑی دکھائی دی۔ میں اس کی جانب لپکا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس کی سوئچ وائرنگ کے ساتھ میں نے تھوڑی سی چھیڑ چھاڑ کی اور اسے کک ماری تو وہ اسٹارٹ ہو گئی۔

جب میں نے گیئر ڈال کر بائیک آگے بڑھائی تو عقب سے مجھے کسی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آتی رہیں مگر میں بائیک دوڑاتا رہا۔ وہ یقیناً اس بائیک کا مالک ہو سکتا تھا، مگر میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ میں پیچھے مڑ کر اس کی

طرف دیکھتا۔

بائیک کو میں دوڑاتا رہا، جلد ہی مجھے ان کی ٹیکسی نظر آ گئی، میں بدستور اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یہ جزیرہ تھا کوئی بڑا شہر نہیں اور نجانے ایسے کتنے ہی اور بھی جزیرے اردگرد سمندر میں ابھرے ہوئے تھے۔

میں بڑی ہوشیاری سے ان کی ٹیکسی کا تعاقب کرتا رہا، حتیٰ کہ چند منٹوں بعد وہ اپنی منزل تک پہنچ گئے۔

منزل کیا تھی، آبادی سے دور جنوب مشرقی ساحل کے قریب ایک ہٹ کی بوسیدہ سی عمارت تھی۔

ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر انہوں نے روانہ کیا اور خود ہٹ کی جانب بڑھ گئے۔

میں اپنی بائیک ایک درخت کے قریب لے گیا اور پھر اس کے تنے کی آڑ میں بائیک سمیت کھڑا ہو گیا۔ درخت گھنا تھا۔ اس کی شاخیں کافی نیچے تک جھکی ہوئی تھیں۔

اس کی آڑ سے میں ان دونوں کو اس بوسیدہ سے ہٹ میں داخل ہوتے دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر گزری، ایک گاڑی ہٹ کے احاطے میں نمودار ہوئی۔ یہ ایک بغیر ہڈ والی جیپ تھی۔

اس کے گیٹ سے باہر آتے ہی ایک اور گاڑی بھی نظر آئی، یہ ایک کار تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی ہوئی نامعلوم منزل کی جانب بڑھ گئیں۔

کار میں مجھے ڈنشا اور بلیک مل بیٹھے نظر آ گئے تھے اور عقبی سیٹ پر دو آدمی تھے۔ یہ آدمی مجھے جانے پہچانے لگے تھے، جو ڈنشا کے نائٹ کلب یا اس کے گینگ سے تعلق رکھتے تھے۔

”تو گویا ڈنشا نے یہاں اپنے گرگوں کے ساتھ عارضی سکونت اختیار کر رکھی تھی۔“ میں نے سوچا۔ ”لیکن کیوں؟ کیا وہ یہاں اپنی ہی کسی خفیہ مہم پر آیا تھا اور ہمیں بے وقوف بنا رہا تھا کہ وہ عابدہ کی رہائی کے مشن میں ہمارے ساتھ شامل ہے۔“

کچھ اندازہ تو ہوتا تھا کہ یہ سمندر میں کسی برسوں پرانے ڈوبے ہوئے ”میٹڈز“ نامی جہاز کی کھوج میں تھے۔ ایک دوسرا گروہ بھی اس مہم میں ان کا ”پارٹنر“ تھا اور یہ لوگ یہاں لولووش کی خوشنودی حاصل کرنے اور بظاہر کسی اور بچ کلب کی ملکیت حاصل کرنے کے بعد کاروبار کی آڑ میں اپنی اس خفیہ اور پُراسرار مہم کا آغاز کریں گے، گویا یہ مجھے ”شکار“ کی صورت میں لولووش جیسے نائب کالاہان کے سپرد کرنے کے بعد ہی ایسا کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔

جیسا کہ مجھے ڈنشا اور والکن وغیرہ کی باتیں سن کر اندازہ ہوا تھا۔

یوں ڈنشا ہمارے ساتھ ڈبل چال چل رہا تھا۔ ڈنشا کی اس خودغرضی اور دھوکا دہی پر مجھے غصہ تو بہت آ رہا تھا لیکن ہیلی کا ”بوائے فرینڈ“ ہونے کے سبب میں اسے ابھی اس جرم کی سزا دینے سے قاصر ہی تھا، ہیلی کو یرغمال بنانے کا مقصد بھی سمجھ میں آنے والی بات تھی، وہ نہیں چاہتی کہ ڈنشا اپنے ذاتی مفاد کی خاطر مجھے اور میرے ساتھیوں کو لولووش کے حوالے کرنے کی کوشش کرتا۔ اسی لیے ڈنشا نے ہیلی کے ”اغوا“ والا ڈراما رچا کر اسے منظر عام سے ہٹا دیا تھا، تاکہ وہ اپنا ”کام“ نمٹا دے اور بعد میں ہیلی کو ہمارے بارے میں یہی بتائے کہ ہم لولووش کے ہتھے چڑھ چکے ہیں یا نجانے کہاں چلے گئے، وغیرہ۔

یہی سب سوچتا ہوا میں ہونٹ بھینچے انہیں جاتا دیکھتا رہا، پھر کچھ سوچ کر میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور ہٹ کے قریب آ گیا۔

ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ میرا انداز عام سے انسانوں کا سا تھا، بظاہر یونہی ادھر ادھر سرسری سی نگاہ ڈالتا ہوا میں ہٹ کا بھی جائزہ لیتا رہا، حتیٰ کہ میں قریب پہنچ کر بائیک سے اتر گیا۔ اسے سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور گیٹ کی جانب بڑھا۔

میں چاروں طرف نظر ڈالتا ہوا چل رہا تھا۔ مجھے تسلی تھی کہ میں اپنے اصلی روپ میں نہیں تھا۔ یوں اگر ڈنشا کے نائٹ کلب سے تعلق رکھنے والا کوئی گماشتہ مجھے دیکھ بھی لیتا تو نہیں پہچان سکتا تھا۔

جب میں ہٹ کا جائزہ لے کے یہ تسلی کر چکا کہ اب وہاں اندر یا باہر کوئی نہ تھا تو میں اس کے اندر داخل ہو گیا۔

میرے پاس اپنی ایک ماسٹر کی موجود تھی۔ اندر بھی کوئی نہیں تھا، ہٹ خاصا کشادہ تھا، اس میں تین کمرے نظر آئے، دو تو رہائشی تھے اور اس میں عام انداز کا فرنیچر تھا جیسے کوئی عارضی طور پر فروکش ہو۔

تیسرا کمرا اور لاؤنج۔۔۔ نجانے کیا کیا الا بلا اشیا سے اٹا پڑا تھا۔ ان میں خوردونوش کا سامان، آکسیجن سلنڈر اور اسی طرح کی اور بھی بہت سی اشیا موجود تھیں، اندازہ ہوتا تھا جیسے کچھ لوگ کسی مہم کے سلسلے میں، اپنے سازوسامان کے ساتھ یہاں فروکش تھے۔

گویا اپنی مہم کے سلسلے میں ڈنشا اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں موجود تھا، جبکہ ”پارٹنر“ گروہ کسی اور مقام پر اسی

طرح کی رہائش پذیر اختیار کیے ہوئے ہوگا۔

میں نے ان کی مہم پر لعنت بھیجی اور وہاں سے اسی بائیک پر واپس ہوٹل پہنچا۔

بائیک چوری کی تھی اسی لیے وہ میں نے دور کہیں چھوڑ دی تھی جبکہ ہوٹل میں کمیل دادا اور شکیلہ میرے منتظر تھے، نیند اور تھکن سے ان بے چاروں کی بھی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں مختصراً یہ سب بتایا اور چند گھنٹے آرام کرنے کی ہدایت دی۔

دوپہر تک ہم جاگے۔ کچھ کھایا پیا اور ٹیکسی کروا کے اس کاٹیج کا رخ کیا جہاں ہیلی کو ڈنشا نے "یرغمال" بنا رکھا تھا۔

ہم تینوں جدید ہتھیاروں اور اسپائی آلات سے لیس رہتے تھے، یہ ہماری مجبوری تھی، اس لیے نہیں کہ ہیلی کو آزاد کرانے کے لیے ہمیں والکن اور جون سے مقابلہ کرنا تھا، وہ دونوں تو تیسرے درجے کے مقامی غنڈے تھے، ان کے لیے تو ایک شکیلہ یا صرف کمیل دادا ہی کافی ہوتا، ہمیں خطرہ دیگر خطرناک دشمنوں سے تھا۔ اگرچہ ہم دوبارہ "سوم پا" اور "سیجے" نوجوان کے بھیس میں ہوتے اور دشمن ہمیں پہچاننے سے قاصر رہتے، لیکن اسپیکٹرم سے زیادہ مجھے ٹائیگر ٹیک اور جے بی سی کے کھاگ ایجنٹوں سے خطرہ تھا، وہ محض حرکات و سکنات سے ہی اپنا شکار پہچاننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

اگرچہ اسپیکٹرم، ان دونوں تنظیموں سے زیادہ خطرناک تھی مگر کچھ باتوں میں ٹائیگر ٹیک اور جے بی سی کو بہرحال اس پر فوقیت حاصل تھی۔

میں سمجھتا تھا کہ اب ہیلی اور ڈنشا کے درمیان دوری کی ایک ایسی خلیج حائل ہونے والی تھی جو شاید اب کبھی نہیں پاٹی جا سکتی تھی ظاہر ہے ہیلی کو جب میری زبانی ڈنشا کی اس "کارگزاری" کا پتا چلتا تو وہ اسے کہاں معاف کرتی۔ کیونکہ اس نے نہ صرف مجھے اور میرے ساتھیوں کو بلکہ ہیلی کو بھی اپنے مفاد کی سولی پر لٹکا دیا تھا، کیونکہ ڈنشا نے جو خطرناک ڈراما کھیلا تھا، اس میں ہیلی کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔

ہم مطلوبہ کاٹیج پہنچے اور اس سے قریباً کوئی بیس پچیس قدموں کے فاصلے پر ٹیکسی رکوا دی۔ ڈرائیور کو ایک نوٹ تھمایا اور اسے رخصت کر دیا۔

اب ہم کاٹیج کی جانب بڑھنے لگے۔ برمودا کے آسمان پر دن کا سورج بڑی تب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ زیادہ تر لوگوں نے شارٹس اور بنیان ٹائپ کے مختصر لباس پہن رکھے تھے۔

ہم کاٹیج کے نزدیک پہنچ گئے۔ میرا ارادہ ڈائریکٹ ایکشن لینے کا تھا اور ایک ہی ہلّے میں والکن اور جون کو بغیر کسی خون خرابے کے بے دست و پا کرنے کے بعد ہیلی کو اپنے ساتھ لے جانا تھا۔

ہم تینوں کاٹیج کے دروازے پر پہنچے، میں نے دستک دی اور تیار تھا کہ اِدھر دروازہ کھلے اور اُدھر میں دروازہ کھولنے والے کو اندر رگیدتا ہوا چلا جاؤں، لیکن دستک کے جواب میں کاٹیج کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ سے...... کھلتا چلا گیا۔

یکایک میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور میں پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔ "سوم اور پا" کے بھیس میں کمیل دادا اور شکیلہ بھی یک دم چونکے تھے۔

میں نے انہیں مخصوص اشارہ کیا اور یکلخت اپنی شرٹ کے نیچے پشت کی جانب ہاتھ ڈال کر بیلٹ میں اُڑسا ہوا کوبرا کولٹ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور نہایت محتاط روی کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

شکیلہ اور کمیل دادا کے ہاتھوں میں بھی چھوٹے مگر خطرناک آتشیں ہتھیار نظر آنے لگے۔

اندر داخل ہوئے تو ایک عجیب اور چیختا ہوا منظر ہمارا منتظر تھا، جسے دیکھتے ہی ہم تینوں لمحہ بھر کے لیے گنگ سے ہو کر رہ گئے۔

لاؤنج میں جون کی خون آلود لاش پڑی تھی۔ جس کمرے میں ہیلی کو "یرغمال" بنا رکھا تھا اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور خالی کمرا ہمارا منہ چڑا رہا تھا مگر نہیں...... وہ خالی کہاں تھا، اندر بھی...... لہو کے مختصر تالاب میں ایک لاش پڑی تھی۔

یہ والکن کی لاش تھی، جبکہ ہیلی غائب تھی۔

"کیا یہاں واقعی کوئی حقیقی خونی ڈراما کھیلا گیا ہے؟" شکیلہ کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

میں نے سرِدست کوئی جواب نہیں دیا، میرے اعصاب یکلخت تن گئے تھے اور تیزی سے سوچتے ذہن میں ایک ہی خیال کی گردان ہو رہی تھی کہ "آخر یہاں ہوا کیا تھا؟"

میں نے سارے کاٹیج کی اچھی طرح تلاشی لے ڈالی۔

"لگتا ہے یہاں تو زبردست مارا ماری ہوئی ہے۔"

کمیل دادا جیسے خودکلامیہ بڑبڑایا۔

"لیکن جو کچھ ہوا ہے، بڑی خاموشی کے ساتھ ہوا ہے۔" شکیلہ نے لقمہ دیا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کیا کس نے ہے؟ اور ہیلی کو اب کون لے اُڑا ہے اور جو بھی اسے لے اُڑا ہے، وہ یقینی طور پر ڈراما تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔" میں نے سوچتے ذہن سے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا چاہیے۔" کمیل دادا حسبِ سابق سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "ورنہ پولیس آ گئی تو بلاوجہ کی مصیبت گلے پڑ جائے گی۔"

"ہاں! باقی باتیں باہر جا کر سوچتے ہیں۔" شکیلہ نے بھی اس کی تائید میں کہا۔

پھر ہم تینوں نے کاٹیج سے نکلتے ہوئے بڑی احتیاط برتی کہ کسی کی نظروں میں نہ آ سکیں، لیکن ایسا کم ہی ممکن تھا۔ ویسے تو ہمیں تسلی تھی کہ ہم بہروپ بدلے ہوئے ہیں لیکن فنگر پرنٹس ہم نے اپنے مٹا دیے تھے۔

باہر آ کر ہم نے پہلے تو ایک نسبتاً ویران کنج کا رخ کیا۔ شکیلہ کے حوالے ایک کٹ کر رکھی تھی۔ اسی میں سے ہی ہم نے ریڈی میڈ میک اَپ کیا اور اب میں ضعیف بن گیا جبکہ شکیلہ اور کمیل دادا جوانوں کے روپ میں تھے۔

یہاں سے نکل کر ہم ایک ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ کافی کا آرڈر دیا گیا۔ اہم نوعیت کی گفتگو میں، میں نے کمیل دادا اور شکیلہ پر "پینے" کی پابندی لگا رکھی تھی، لیکن پھر بھی کمیل دادا نے بیئر کے دو ٹن منگوا ہی لیے۔ ایک اپنے لیے اور ایک شکیلہ کے لیے، میری کافی آ گئی اور ان کی بیئر۔

"یہ حرکت ڈنشا بھی کر سکتا ہے۔" شکیلہ بیئر کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔

"وہ یہ نہیں کر سکتا۔" کمیل دادا نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

"کمیل دادا کا خیال صحیح ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔ "یہ کام مجھے اسپیکٹرم کا ہی لگتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے ان میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور اس کا سبب بھی ہم ہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" کمیل دادا اُلجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے میرا چہرہ تکنے لگا۔

"کالاہان کو آج ڈنشا سے اہم میٹنگ کرنا تھی، ہمارے سلسلے میں۔" میں نے ہوپر اور جیکسن کی گفتگو کا حوالہ دیا۔

"تو تمہارا خیال ہے کہ ڈنشا ان کا شکار یعنی ہمیں ان کے حوالے کرنے میں ناکام رہا اور انتقامی کارروائی کے نتیجے میں اسپیکٹرم والوں نے کسی طرح اس کاٹیج کا سراغ لگایا اور پھر والکن اور جون کو خاموشی سے ہلاک کرنے کے بعد ہیلی کو لے اُڑے؟ وہ تو ہیلی کو بھی ہلاک کر سکتے تھے، لیکن مجھے یہ کسی اور کا ہی ہاتھ لگتا ہے۔ لولوش اتنا کم عقل نہیں ہو سکتا کہ جو اس کے اہم مفادات کے لیے کام کرے وہ اسے ہی نشانہ بنائے۔ وہ بھی اتنی سی بات پر۔"

"تمہاری بات میں وزن ہے دادا!" میں نے پُرغور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو پھر میری بات ٹھیک ہو سکتی ہے۔" شکیلہ بولی۔

"یہ حرکت ڈنشا ہی کی ہوگی۔ اس کی یا تو کسی بات پر جون اور والکن سے اَن بن ہو گئی ہوگی، انہوں نے بھانڈا پھوڑنے کے لیے ڈنشا کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور ڈنشا نے دونوں کو ہلاک کر ڈالا۔"

"اس صورت میں ڈنشا کا پھر بھی پول کھلنے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا بھی تو ڈنشا ان دونوں کو کاٹیج کے اندر نہیں بلکہ باہر ٹھکانے لگاتا۔" میرے بجائے کمیل دادا بولا۔

"باوجود اس کے مجھے نہیں لگتا کہ یہ ڈنشا کی حرکت ہو سکتی ہے، خواہ کتنی ہی مجبوری... کیوں نہ ہو۔" میں نے بھی خیال ظاہر کیا۔

"لولوش کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اندھیرے کی بلا ہے۔ ایک پُراسرار بلا، کس وقت کیا کر بیٹھے، اس کا کچھ نہیں پتا چلتا۔ ایسا کچھ اسی نے... کیا ضرور ہے مگر کس وجہ کے تحت اس کا نہیں پتا چل رہا نہ ہی کوئی قیاس لگایا جا رہا ہے۔" میں نے آخر میں اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اس سارے چکر پر اب لعنت بھیجو......" بالآخر کمیل دادا بولا۔ "ہم اپنا مشن نمٹاتے ہیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں اس اہم اور ذاتی نوعیت کی مہم میں ہیلی اور ڈنشا کی موجودگی کو ہی مناسب خیال نہیں کر رہا تھا۔"

میں نے کمیل دادا کی بات پر کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں جانا تاہم بولا۔ "میں آج شام کو ہی کالاہان کو جہنم واصل کرنا چاہتا ہوں۔" کمیل دادا اور شکیلہ یک بیک میری طرف تکنے لگے۔

"کیا یہ ضروری ہے؟" کمیل دادا نے مختصراً پوچھا۔

"ہاں! کالاہان، لولوش کا بازو ہے اور اسپیکٹرم کا نیٹ ورک پھیلانے کا ایک بڑا ذریعہ بھی۔" میں نے ٹھنڈی

ہوئی متانت سے کہا۔ ”میں عابدہ کو یرغمال بنانے کی پاداش میں اس خبیث شیطان کو ایک اور بڑا زخم دینا چاہتا ہوں۔“

”تم نے جیکسن اور ہوپر کی زبانی بتایا تو تھا کہ کالا ہان آج شام میں ڈنشا کے ساتھ ملاقات کرے گا، میرا خیال ہے یہ ملاقات ڈنشا کے اسی بوسیدہ سے کاٹیج میں ہی ہو سکتی ہے۔“ شکیلہ نے جیسے یاد دلایا۔

”ہاں! سینڈرز نامی کسی ڈوبے جہاز کی تلاش کے سلسلے میں یہ اہم میٹنگ، وہ اپنی کیبن کاٹیج میں ہی کرسکتا ہے۔ کیونکہ کالا ہان ابھی ڈنشا کو اپنے ٹھکانے کی جھلک تک بھی دکھانے کا روادار نہیں ......“ میں بولا۔

سہ پہر اب سنہری شام میں ڈھلنے لگی تھی۔ جزیرے کے آسمان کے کنارے، ڈوبتی سورج کی کرنوں سے تانبے کی طرح چمکنے لگے تھے۔ ہم تینوں دوبارہ اس کے ٹھکانے پر پہنچے۔ ہم نے وہی ”موم پا“ اور ”گنجے“ والا بہروپ بھر رکھا تھا۔ فی الوقت یہی حلیہ ہمیں کارآمد محسوس ہوا تھا۔

ہم ہٹ کے قریب پہنچے تو وہاں ہمیں ایک جشن کا سا سماں دکھائی دیا۔ یہ لوگ مقامی تھے اور باقی سیاح جو اُن کی طرف بڑے اشتیاق سے دیکھ رہے تھے اور کئی سیاح اپنے سیل فونز پر ان کی موویز بنا رہے تھے۔ یہ مقامی لوگ وہ تھے جو یہاں کے قدیم باشندے تھے۔ ان کی وضع قطع کسی جنگلی قبائل کے لوگوں کی سی ہو رہی تھی۔ وہ نیم برہنہ تھے اور ایک بڑا سا الاؤ روشن کیے اس کے گرد بے ہنگم سا رقص کرنے میں مصروف تھے۔ وہ بڑے بڑے اسٹینڈ اپ ڈھول پر تھاپ بجاتے ناچ رہے تھے اور کچھ نامعلوم زبان میں گا بھی رہے تھے۔

میں نے ایک نظر قریب ہٹ پر ڈالی، تو چونک پڑا۔ وہاں باہر احاطے کے ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی کار کھڑی تھی، ایک چھوٹی سی سرخ رنگ کی گاڑی بھی اس کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ اول الذکر کار کے پاس دو سوٹ پوش افراد چوکس کھڑے تھے۔ یوں جیسے انہیں یہاں ”متعین“ رہنے کی تاکید کی گئی ہو۔

میں نے دانستہ ہٹ کے بجائے اس مجمع کی طرف رخ کیا اور عام سیاحوں کی طرح بہ ظاہر بڑی دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگا۔ کھیل دادا اور شکیلہ بھی میری تقلید کیے ہوئے تھے۔

میں نے البتہ انہیں اس لمبی سی چمچماتی سیاہ کار کے بارے میں اشارہ کر دیا تھا کہ شاید ہمارا ”شکار“ اندر ڈنشا کے ساتھ اہم میٹنگ میں مصروف ہو سکتا ہے۔

وہاں موجود چوکس کھڑے، دو سوٹ پوش افراد بھی اسی طرف گھورے جا رہے تھے، صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ بھی اس مجمع کی طرف سے کسی بے چینی کا شکار نظر آتے تھے۔ میں نے ان کی طرف سے بھی کھیل دادا اور شکیلہ کو محتاط رہنے کی تاکید کر دی تھی۔

ابھی میں وہاں مجمع میں کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ کس طرح ہٹ کی طرف پیش قدمی کی جائے کہ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ چونکہ یہ مجمع کے شور سے ذرا ہی دور واقع ہٹ سے اُبھرا تھا، اسی لیے ڈھول دھمکوں میں اس کی آواز صاف سنائی دے گئی۔

مجمع کو یک دم جیسے سانپ سونگھ گیا اور وہ سب اپنا تماشا چھوڑ کر ہٹ کی جانب تکنے لگے، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اندر کچھ ہوا تھا۔

میں نے ہٹ کی جانب دیکھا تو انہی مذکورہ دونوں سوٹ پوش چوکس کھڑے افراد کو اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے تیزی سے ہٹ کے مرکزی دروازے کی طرف جاتے دیکھا۔

دفعتاً تلے اوپر دو برسٹ چلے اور میری دھڑکتی نظروں نے ان دونوں سوٹ پوش افراد کو لڑکھڑا کر گرتے دیکھا۔ پھر تو جیسے مجمع میں بھی بھگدڑ اور چیخ و پکار مچ گئی، میری رگوں میں بھی خون کی گردش یکلخت تیز ہو گئی۔

میں بھی اس بھگدڑ سے فائدہ اُٹھاتا ہوا ہٹ کی جانب دوڑا، کھیل دادا اور شکیلہ میرے پیچھے تھے، موم پا کے بھیس میں دو ضعیف افراد کی اس قدر چوکسی اور پھرتی نے یقیناً وہاں موجود کسی نہ کسی کو حیرت میں ضرور مبتلا کیا ہوگا۔

اچانک ہٹ کی جنوبی طرف کی دیوار سے میں نے دو آدمیوں کو شیشہ توڑتے ہوئے باہر کودتے دیکھا، وہ ڈنشا اور بلیک بل تھے ...... میں ٹھٹک کر رکا اور ساتھیوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا۔

ڈنشا اور بلیک بل کے ہاتھوں میں گنز تھیں اور ان کے عقب میں کھڑکی سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں، مگر وہ بھی جوابی فائرنگ کرتے ہوئے جنگل کی جانب دوڑ پڑے۔

ہم فوراً ہی ایک درخت کی آڑ میں ہو گئے جب میں نے مزید دو مسلح افراد کو کھڑکی سے جمپ مار کے باہر کودتے دیکھا۔ پھر مرکزی دروازے سے میں نے ایک چوڑے شانے اور بھاری جبڑوں والے گینڈے نما شخص کو نمودار ہوتے دیکھا، اس کے ہاتھ میں مشین پسٹل دبا ہوا تھا اور اس کے ہمراہ ایک اور بھی مسلح آدمی تھا۔

میں نے آنکھیں سکیڑ کر اول الذکر آدمی کو دیکھا تو میری آنکھوں کے سامنے جیسے سرخ چادر سی تن گئی۔

وہ کالا ہان تھا ...

وہ اپنے ساتھی کے ساتھ لمبی سی سیاہ کار کی جانب بڑھا اور اسی وقت کھڑکی سے بعد میں کودنے والے آدمیوں کو چیخ کر اپنی طرف بلایا۔

وہ شاید اسی کے ساتھی، باقی دو باہر موجود جو مارے جا چکے تھے، وہ یقیناً ڈنشا اور بلیک بل کی گولیوں کا نشانہ بنے ہوں گے۔

”لگتا ہے اندر ان میں اچانک کسی بات پر ٹھن گئی ہے۔“ شکیلہ نے سرگوشی کی۔

یہی وہ وقت تھا جب کالا ہان اپنے تینوں مسلح ساتھیوں کے ساتھ لمبی سی چمچماتی کار میں سوار ہوا تھا۔ اگلے ہی لمحے کار تیزی سے حرکت میں آئی اور اس کے ٹائر زور سے چرچرائے، وہ آندھی طوفان کی طرح اس جنگل کی طرف بڑھنے لگی جہاں ذرا دیر پہلے ڈنشا اور بلیک بل بھاگے تھے۔

میں نے بھی اپنی جگہ سے بجلی کی سی تیزی سے حرکت کی اور اس چھوٹی سی سرخ کار کی طرف دوڑ لگا دی جو وہاں موجود تھی۔

کھیل دادا اور شکیلہ میرے پیچھے دوڑے آ رہے تھے، میں نے کار کا دروازہ کھولا اور جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ چابی اگنیشن سوئچ میں موجود تھی۔ یقیناً یہ سرخ کار ڈنشا کی ہی ہو سکتی تھی لیکن انہیں استعمال کرنے کا موقع نہیں تھا۔ تب تک وہ باہر آتے ہوئے کالا ہان اور اس کے تینوں ساتھیوں کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے تھے۔

بہرکیف کار میں سوار ہوتے ہی میں نے کار ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

میرا رخ بھی جنگل کی طرف تھا۔ وہاں تاریکی اُتری ہوئی تھی۔

مجھے جلد ہی کالا ہان کی کار کی بیک لائٹس دکھائی دے گئیں اور میں نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دی۔ ساتھ ہی میری گردشی نظریں اطراف کا بھی جائزہ لیتی جا رہی تھیں، تب ہی میں نے پل کے پل ایک محتاط اندازہ قائم کیا اور ایک دم کار کا اسٹیئرنگ دائیں جانب موڑ دیا۔

میں دوسرے راستے سے ...... کالا ہان کی کار کا راستہ روکنا چاہتا تھا۔ وہ ڈنشا اور بلیک بل کو ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اُتار سکتے تھے جبکہ ڈنشا کی موت ابھی میرے مفاد میں نہیں تھی۔

اس وقت میرا اہم شکار یہ مردود کالا ہان ہی تھا۔

اپنی کار کا رخ دوسری جانب موڑتے ہی مجھے ہیڈ لائٹس جلانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں نے وہ آن کر دی۔

کھیل دادا میرے برابر کی سیٹ پر براجمان تھا جبکہ شکیلہ عقبی سیٹ پر چوکس بیٹھی تھی۔ میں نے ان دونوں کو اسلحہ ہاتھ میں لینے کا کہہ دیا تھا۔

جنگل زیادہ طویل نہ تھا، ایک بڑا چکر کاٹ کر میں کالا ہان والی کار کے راستے پر آ گیا۔ میرا رُواں رُواں اس وقت جوش سے مرتعش ہو رہا تھا۔

”دشمن کی کار نظر آتے ہی اندھا دھند گولیاں برسا دینا۔“ میں نے دونوں کو ہدایت دی۔

جلد ہی سامنے سے مجھے ہیڈ لائٹس کی روشنیاں نظر آ گئیں جو تیزی سے قریب آتی جا رہی تھیں۔ میرا دل جیسے اب رک رک کر دھڑکنے لگا۔ گویا آر یا پار والی صورت حال تھی۔ میں جانتا تھا کہ کالا ہان کو میری کار کو جانچنے میں تھوڑا وقت درکار ہوگا اور میں اسی مہلت سے فائدہ اُٹھانے کا سوچ چکا تھا۔

دونوں گاڑیاں آمنے سامنے ہو گئیں، سیاہ کار نے ہارن بجایا، تاکہ میں اس کے راستے سے ہٹ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا، لیکن جیسے ہی سیاہ کار قریب آئی، میں نے ایک دم اسٹیئرنگ دائیں جانب موڑا، میری کار کا اگلا حصہ کالا ہان کی کار کے درمیانی حصے سے ٹکرایا۔

کار کو زبردست جھٹکا لگا، لیکن میرے اور ساتھیوں کے لیے یہ غیر متوقع نہ تھا، اسی لیے ہم تینوں اس زبردست جھٹکے کے بعد سنبھلے رہے، مگر کالا ہان کی کار جھٹکے کے دباؤ میں آ گئی اور اس کا ڈرائیور اسے نہ سنبھال سکا۔ وہ ایک درخت کے ساتھ جا ٹکرائی۔ ایک دھماکا ہوا اور میں نے اپنی کار کا رخ اس طرف کر کے بریک لگا دیے، تاکہ روشنی پڑتی رہے۔

اس کے بعد ہم تینوں گن بدست نیچے اُترے ہی تھے کہ ہم پر اس کار سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

مجھے ان سے اس قدر پھرتی کی توقع ہرگز نہ تھی۔ تاہم پھر بھی میری بھانپتی ہوئی نظروں نے دیکھا تھا کہ ڈرائیور کا سر اسٹیئرنگ سے لگا ہوا تھا اور وہ بے حس و حرکت تھا، جبکہ عقب میں سوار کالا ہان کے دونوں ساتھیوں نے اندر سے

نشستیں باندھ کر ہم پر برسٹ فائر کر ڈالے تھے، ہم اس حملے کے لیے پہلے سے ہی ہوشیار تھے، لہٰذا گولیوں کی آواز سننے سے پہلے ہی میں نے چلا کر کمیل دادا اور شکیلہ کو نیچے تر جانے کا کہا تھا۔

گولیوں کے دہاڑتے ہوئے چمکتے شعلے ہمارے سروں کے اُوپر سے گزرے اور پھر ہم نے دشمنوں کو مزید فائر کرنے کا موقع نہ دیا، گھاس بھری زمین پر لیٹے لیٹے ہی ہم نے اپنی گنز سیدھی کر ڈالیں اور ٹریگر دبا دیے۔

نشانہ وہ دونوں ہی تھے، جبکہ میں نے کالاہان کو نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی جو اگلی سیٹ پر پھنسا بیٹھا تھا، گولی اسے لگی تھی، کیونکہ میں نے اسے جھٹکا کھاتے دیکھا تھا، وہ... تڑپنے لگا، اور اس نے ہاتھ بڑھا کر مشین پسٹل سے جوابی فائر کر ڈالے، میں نے تیزی سے لڑھکنی لگا کر جگہ بدلی اور... کمیل دادا اور شکیلہ بھی فائرنگ کرتے ہی یہ عمل کر چکے تھے۔

اس دوران میں کالاہان اپنی طرف کا دروازہ کھولنے کی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا اور تیزی سے باہر کو لپکا۔

اس نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ فوراً ہی بھاگنے کے بجائے کار کی آڑ لے لی تھی اور پھر اندھا دھند اس نے اپنی مشین پسٹل دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

عقبی سیٹ پر موجود اس کے دونوں ساتھی کمیل دادا اور شکیلہ کی فائرنگ سے جہنم واصل ہو چکے تھے۔

''فائرنگ روک کر آخری شکار کو گھیرنے کی کوشش کرو.....'' میں نے کمیل دادا اور شکیلہ سے چلا کر کہا۔

کالاہان تک بھی میری آواز پہنچ چکی تھی۔ یہی میں بھی چاہتا تھا یوں وہ میرے پھانسے میں آ گیا اور اس نے پیچھے کی جانب دوڑ لگا دی، یوں بھی اب اس کے ساتھیوں کے واصل جہنم ہونے کے بعد اور کوئی آپشن نہیں بچا تھا۔ تاہم میری بلا تک دبی رہی۔

کمیل دادا اور شکیلہ نے میری ہدایت کے مطابق دو مختلف جگہوں سے پیش قدمی کی تھی جبکہ میں دائیں جانب کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا دوڑتا رہا۔ پھر جیسے ہی وہ مجھے میری ہی کار کی قدرے دور تک پڑتی روشنی میں... بھاگتا نظر آیا۔ میں نے تاک کر نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

کوبرا کولٹ گرجا اور کالاہان کے چوڑے شانوں اور بھاری جثے کو میں نے گرتے دیکھا۔ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔

گولی اس کی پشت پر لگی تھی اور دوسری جانب پیٹ سے آر پار ہو گئی تھی۔

''خس کم جہاں پاک...'' میرے منہ سے نکلا۔ تب تک کمیل دادا اور شکیلہ بھی ہانپتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

کالاہان کی موت کی تسلی اور تصدیق کرنے کے بعد ہم واپس کار کی طرف پلٹے۔

نجانے کیا بات تھی کہ لولووش کے کسی بھی اہم آدمی کو میں جب بھی ـــــ اسی طرح کتے کی موت مارتا تھا میرے اندر کو بڑی تسکین ملتی تھی۔ وزیر جان، بے جی کو مارا، گون برگ اور اب... کالاہان کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں بہت مطمئن و مسرور سا محسوس کرنے لگا تھا خود کو...

''وہ دشمن ابھی تک ہمارے آزاد ہیں شہزی!'' شکیلہ قدرے ہانپتے ہوئے بولی۔

ہم سب کار میں سوار ہو چکے تھے۔

''تمہاری مراد اگر ڈنشا اور بلیک سے ہے تو ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور کار اسٹارٹ کی مگر گیئر نہیں ڈالا۔

''ان کی طرف سے اتنی بے فکری اچھی بات نہیں شہزی!'' کمیل دادا ابھی سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''مجھے اس کا اندازہ ہے۔'' میں نے کار کی اسکرین پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت بھی جنگل میں کہیں آس پاس چھپے یہ سب حیرت اور اُلجھن کے ملے جلے تاثرات سے دیکھ رہے ہوں، لیکن ڈنشا کی اوقات اور اہمیت اب ختم ہو چکی ہے، وہ خود عنقریب ایک بار پھر ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنے والا ہے۔''

''تب پھر اب ہمیں اپنے اصل مشن کی طرف توجہ مرکوز کر دینی چاہیے۔'' بالآخر شکیلہ بولی تو میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے اس کی تائید میں فوراً مقصد کی بات کر ڈالی۔

''ٹھیک ہے، انجیلا سے حاصل کردہ معلومات مجھے ذہن نشین ہیں۔ ہوگ بے... کا محل وقوع اور اس طرف جانے کا راستہ ہمیں معلوم ہے۔ ہم سیاحوں کے بھیس میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور یہ راستہ جزیرہ کرشل اینڈ فینکس کیز کی طرف سے جاتا ہے۔ جہاں زیرزمین غار ہیں۔ انہی کے درمیان سے ہی وہ اپن شور روڈ جنوبی ساحل تک لے جاتی ہے اور وہاں سے ہوگ بے کی طرف کسی تیز رفتار بوٹ یا اسٹیمر کے ذریعے جایا جاتا ہے۔''

''یاد رہے کہ لولووش کا اپنا سارا ذاتی نظام زمین دوز ہے۔ اس کے ٹھکانے تک رسائی معمولی بات نہ ہوگی۔'' شکیلہ نے بھی انجیلا ہی کی باتوں کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''ہمم...'' میں نے ہونٹ بھینچے۔ ''تیاری پکڑو، ابھی نکلنا ہوگا ہمیں...'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

☆☆☆

ہم ساحل پر پہنچے۔ وہاں ایک مسافر لانچ موجود تھی۔ لانچ کیا تھی ایک اچھی خاصی بس تھی۔ اس کی ''شیپ'' کسی بس کی طرح ہی تھی، جس کی چھت پر بھی لوگ موجود تھے، مگر اس طرح نہیں کہ ایک دوسرے کے اوپر ٹھونسے ہوئے ہوں، بلکہ چھت پر بھی مسافروں کے بیٹھنے کا باقاعدہ بندوبست کیا گیا تھا۔ اس طرح کہ وہ ایک چلتا پھرتا اوپن ریسٹورنٹ ہی لگتا تھا، جہاں ترتیب کے ساتھ میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اوپر شفاف ٹاپ کلاس تھا۔

نجانے کیا سوچ کر میں نے اوپر ہی جا کر بیٹھنے کا ارادہ کیا اور لانچ میں سوار ہو گیا۔ لانچ شاید روانہ ہونے والی تھی۔ کیونکہ ہمارے جیٹی کے قریب پہنچنے تک وہ دو بار وسل دے چکی تھی۔ اس کے پیچھے دیو ہیکل پروپیلر لگا ہوا تھا، اس کے کونے میں پیچھے دائیں بائیں پانی کے بلبلے اُبھر رہے تھے۔

ہم لانچ میں داخل ہوئے اور ایک چکردار زینے سے اُوپر پہنچے۔ ریلنگ کے ساتھ والی ایک میز پر جا کر ہم نے تین کرسیاں سنبھال لیں۔ ابھی اور بھی لوگ سوار ہو رہے تھے۔ میں اوپن ٹاپ پر بیٹھا حدِ نگاہ پھیلے بیکراں سمندر پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد جیٹی کی طرف دیکھنے لگا تو ایک دم چونک پڑا۔

ہماری لانچ سے دوسری والی برتھ پر ایک اور بحری جہاز لنگر انداز تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹر بوٹ لگی ہوئی۔ اس میں تین افراد سوار ہو رہے تھے۔ دو مرد ایک عورت اور میرے چونکنے کی وجہ وہ عورت ہی تھی۔ میں اسے بہت اچھی طرح پہچان رہا تھا۔ وہ بیلی تھی۔

☆☆☆

''میرے ساتھ آؤ جلدی...'' میں نے دونوں سے کہا اور یک دم سیٹ چھوڑ دی۔ ہم تیزی سے نیچے اُترے، پھر باہر چوبی پلیٹ فارم پر آ گئے۔

مذکورہ موٹر بوٹ پر وہ دونوں افراد بیلی کو لیے سوار ہو رہے تھے اور بیلی کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ وہ ان کے ''ٹریپ'' میں تھی۔

ہم چوبی فرش پر دوڑتے ہوئے بوٹ کی جانب لپکے، ان دونوں میں سے ایک موٹر بوٹ کے اسٹارٹنگ سسٹم سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا کہ ہم اس کے سر پر جا پہنچے۔

اسے ہمارے جارحانہ انداز پر شبہ ہو گیا اور اس نے فوراً پستول نکال لیا اور ہماری طرف تان لیا۔ یہی وہ وقت تھا جب بیلی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور اس نے اس کے پستول والے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ پستول آدمی کے ہاتھ سے چھوٹ کر سمندر میں تو نہیں گرا البتہ بوٹ کے فرش پر کہیں جا گرا۔

غالباً بیلی نے بھی یہ سب دیکھ لیا تھا، وہ ہمیں پہچان تو نہیں پائی تھی یا پھر خود کو ان نامعلوم افراد کے نرغے سے بچانے کے لیے اس نے ایک فطری سی کوشش ضرور چاہی تھی۔

اس آدمی نے بیلی کی جرأت پر طیش میں آ کر اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور پستول تلاشنے لگا، لیکن تب تک میں طوفانی انداز میں دوڑتا ہوا قریب پہنچا اور چند فٹ پہلے ہی ایک جست بھری۔

میں کسی شکاری عقاب کی طرح اُڑتا ہوا اس آدمی پر گرا جو موٹر بوٹ کے فرش پر پستول تلاشنے کی کوشش میں تھا۔ میں جیسے ہی اس سمت گرا، ایک فائر کی آواز سنائی دی۔ چلنے والی گولی بوٹ کی ریلنگ پر کہیں لگی اور سنسناتی ہوئی آواز ابھری۔

شاید اس کے ساتھی نے یہ گولی مجھ پر چلائی تھی۔ میں جس پر گرا اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی میں نے اس کی ناک پر ایک زوردار گھونسا رسید کر ڈالا اور تب ہی بیلی کو جانے کیسے وہ گرا ہوا پستول نظر آ گیا جو اس نے پھرتی سے جھک کر اُٹھا لیا۔

ایک اور گولی چلی۔ میں سمجھا یہ بیلی نے چلائی تھی، مجھے خدشہ ہوا کہ وہ مجھے نہ پہچاننے کی وجہ سے دشمن نہ سمجھ بیٹھی ہو، لیکن گولی اس نے نہیں بلکہ آدمی کے دوسرے ساتھی نے چلائی تھی۔ ایک بار پھر میں اس کی گولی سے بال بال بچا تھا۔

تب ہی میں نے دیکھا کہ کمیل دادا اور شکیلہ تیزی سے دوڑتے ہوئے دوسری جانب سے بوٹ پر چھلانگیں مار چکے تھے۔

بیلی قدرے حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہوگا کہ یہ کون لوگ ہیں جو یوں اچانک خدائی فوجدار بن کر اس کی مدد کے لیے کود پڑے تھے۔

"نیلی.....! یہ میں ہوں، شہزی اور وہ میرے ساتھی ہیں، ہوشیار......" میں نے فوراً ہی نیلی کی اُلجھن دور کر ڈالی اور پھر تو جیسے نیلی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئی اور نشانہ لے کر اس نے نامعلوم دشمن کے دوسرے ساتھی پر گولی چلا دی۔ وہ ابھی اسی اُلجھن میں مبتلا تھا کہ آیا وہ مجھ پر دوبارہ فائر کرے یا کھیل دادا اور شکیلہ کو نشانہ بنائے، نیلی کی چلائی ہوئی گولی اسے چاٹ چکی تھی۔

"بوٹ چلاؤ شکیلہ! جلدی" میں چیخا۔

شکیلہ نے فوراً بوٹ اسٹارٹ کر دی اور اسے گہرے پانیوں کی طرف لے گئی۔

میں نے ساحل کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا وہاں بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ بہت آگے سمندر میں آنے کے بعد میری ہدایت پر بوٹ کو موجودہ جگہ سے ذرا دور کسی اور نسبتاً ویران ساحل سے لگا دیا گیا۔

ہم چاروں اُتر آئے اور بوٹ کو رسی سے باندھ دیا گیا۔ یہاں لوگ کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ ہم چاروں ساحل پر آ گئے۔

نیلی کی حالت بہت نڈھال سی ہو رہی تھی، کچھ نشے کا بھی اثر لگتا تھا جو اسے ڈنشا کی ہدایت پر والکن اور جون ہلکی ڈوز میں دیا کرتے تھے۔

اس دوران میں کھیل دادا پانی وغیرہ لے آیا اور شکیلہ کو ناریل مل گیا۔ اس میں اسٹرا لگی ہوئی تھی۔ یہ سب نیلی کو پینے کے لیے دیا گیا تو اس کی حالت کچھ سنبھلی۔ وہ ہلکے کریم کلر کے ہاف اسکرٹ اور اسی رنگ کے بلاؤز میں تھی۔ مارفین کی وجہ سے اس کی آنکھیں نشیلی سی ہو رہی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اعصابی کشیدگی کی وجہ سے وہ ذرا بدحواس سی بھی نظر آتی تھی لیکن اب کافی سنبھلنے لگی تھی۔

بھیس بدلنا ہماری مجبوری تھی۔ وہ میں نے نیلی کو بتا دیا تھا۔

"یہ کون لوگ تھے اور تمہیں کہاں لے جا رہے تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"میں انہیں نہیں جانتی۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے یہ سب، میں خود سمجھنے سے قاصر ہوں۔" وہ بتانے لگی۔ "جب انہوں نے اچانک اس کاٹیج پر حملہ کیا تو میں یہی سمجھی تھی کہ ڈنشا کے ساتھی ہوں گے لیکن پھر جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ بھی ایسا ہی کوئی معاملہ تھا، یہ لوگ مجھے یرغمال بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔"

میں نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر دھیرے دھیرے اُسے سب بتا دیا۔

اپنے بوائے فرینڈ (ڈنشا) کی یہ دھوکا دہی اور خود اس کے ساتھ بیتا راستے کی رُوداد سن کر نیلی چند لمحے کے لیے پہلے گم صم سی ہو گئی، پھر اس کے خوب صورت سے چہرے پر گہرے دُکھ کی پرچھائیں اُبھری، لیکن جب بولی تو اس کی آواز اور لہجہ زخمی ناگن کی طرح پھنکارنے لگا۔

"ڈنشا واقعی بڑا کمینہ نکلا۔ تمہارے ساتھ تو اس نے بُرا کیا ہی ہے لیکن اس خبیث نے مجھے بھی اپنے مفاد کی سولی پر چڑھا دیا۔ میں تو سمجھی تھی کہ گون برگ والی حقیقت جاننے کے بعد اس کا دل تم سے صاف ہو چکا ہے مگر یہ میری بھول تھی۔"

"میرا خیال ہے، وہ تمہارے ساتھ بہرحال سچا ہے۔" میں نے نیلی سے کہا۔

درحقیقت میں نہیں چاہتا تھا کہ ان دونوں کے دلوں میں کوئی بال آئے۔ ڈنشا کی وجہ سے نہیں بلکہ میں نے یہ نیلی کی وجہ سے کہا تھا کیونکہ وہ بھی اس سے محبت کرتی تھی۔ ڈنشا تو اس کا دیوانہ تھا۔ نیلی میری اور عابدہ کی محسن تھی۔

"ڈنشا نے جو کچھ کیا، میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کیا ہے، جبکہ تمہارے ساتھ تو اس نے محض ایک ڈراما کیا تھا۔ تاکہ تمہیں جان نہ جلنے پائے۔"

"نہیں، اس نے مجھے بھی تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی ہے۔" نیلی نے تلخ لہجے میں کہا۔ "محبت کو اس نے مذاق سمجھا اور اس پر دولت اور لالچ کو ترجیح دی۔"

میں نے دیکھا اس کا حسین چہرہ گہرے دُکھ کی غمازی کرنے لگا۔ آنکھوں میں نمناکی اور ایک جھلاہٹ آمیز برہمی کے ملے جلے تاثرات ہلکورے لینے لگے۔

اس کے تاثرات مجھے یہ باور کرانے کے لیے کافی تھے کہ اسے ڈنشا کی اس قبیح حرکت سے بے حد صدمہ پہنچا ہے۔ کسی سے بےلوث محبت کی ایک یہ بھی نشانی ہوتی ہے کہ محبوب سے کوئی دلی رنج پہنچے تو انسان خواہ اندر سے کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، وہ اندر سے ٹوٹ سا جاتا ہے۔

نیلی کے لیے یہ مثال اسی لیے بجتی تھی کہ وہ کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ ایک حوصلہ مند اور دلیر بلکہ ایک جنگجو قسم کی عورت تھی۔ مضبوط اعصاب کی مالک تھی وہ، لیکن محبت کے آبگینے پر ایک ذرا پڑتے بال نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

ایسے میں، میں نے اس کا غم دروبھاں کم کرنے کی کوشش میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"نیلی! انسان لالچ میں ایسا قدم اُٹھا لیتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ڈنشا تم سے بہرحال سچی محبت کرتا ہے اب بھی، میں تمہیں وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ یہ محض اس نے لالچ کی وجہ سے تمہارے ساتھ ایک ڈراما....."

"شہزی.....!" اچانک نیلی نے میری بات کاٹی۔ "تم ڈنشا کی وکالت مت کرو، وہ تم سے مخلص نہیں ہے اور نہ ہی تمہارے معاملات سے۔"

"اس کی مجھے بھی پروا نہیں ہے نیلی.....!" میں نے بھی درمیان میں اس سے کہا۔ "میں جو بات تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں، وہ سمجھو۔ ڈنشا تم سے اور تم ڈنشا سے مخلص رہو، میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم دونوں کے تعلقات کے بیچ کسی قسم کی دراڑ پڑے۔"

"دراڑ..... اونہہ....." نیلی نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "وہ مجھ سے بھی مخلص نہیں رہا اب..... مسٹر شہزی! لالچ کی خاطر اس نے اپنی محبت کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ مجھے تو اب اس سے نفرت ہو گئی ہے۔ اسے سوچنا تو چاہیے تھا کہ تم میری محسنہ عابدہ کے بھی کچھ لگتے ہو۔ میرا ہی مان رکھ لیتا۔ جب اتنا بھی وہ نہیں کر سکا بلکہ اُلٹا اس نے تمہیں اور حتیٰ کہ مجھے بھی ہلاکت میں ڈال دیا تو میرا بھی اب اس سے تعلق ختم ہوا۔"

ایک ذرا توقف کے بعد وہ دوبارہ مجھ سے بولی۔ "دیکھو شہزی! تم اب ڈنشا اور میرے اس سے تعلق کی پروا مت کرو۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ڈنشا کا اصل روپ سامنے آ گیا، ورنہ وہ..... ہمیں کسی اہم اور عین وقت پر یہ دھوکا دیتا تو ہم دہرے نقصان کا شکار ہو سکتے تھے۔ اسے بھول جاؤ اب! میں بھی بھول جاؤں گی اس نامراد کو۔ بلکہ میں اس سے ابھی سے ہی قطع تعلق کرتی ہوں۔"

"ہم ہوگ بے کے لیے کرسٹل اینڈ فینٹسی آئی لینڈ کی طرف جا رہے تھے۔" اچانک کھیل دادا نے گویا ہمیں یاد دلایا۔

"ابھی روانہ ہوتے ہیں، چلو میں تیار ہوں۔" میرے بجائے نیلی نے فوراً جواب دیا۔

"نہیں نیلی! تم ٹھیک نہیں ہو، مارفین کے انجکشن نے تمہیں....."

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" نیلی نے میری بات کاٹ دی۔ "تم لوگوں کے پاس کوئی اضافی ہتھیار ہے تو مجھے دے دو پلیز....."

میں نے شکیلہ کی طرف دیکھا، اس نے میری نظروں کا اشارہ بھانپتے ہی اپنے لباس سے ایک لوگر اور کچھ فالتو راؤنڈ اسے تھما دیے۔ آتشیں ہتھیار کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں مخصوص چمک اُبھری۔

ہم اسی موٹر بوٹ میں برمودا کے مشہور ترین تفریحی جزیرے کرسٹل اینڈ فینٹسی کیوز نامی آئی لینڈ کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہم ابھی تک یہ اندازہ قائم نہیں کر سکے تھے کہ وہ کون لوگ تھے جو نیلی کو جون اور والکن کی گرفت سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ تاہم اس قصے پر ہم نے لعنت بھیج دی تھی اور آگے بڑھ گئے تھے۔

نصف گھنٹے بعد ہم مذکورہ آئی لینڈ کے ساحل پر اُتر رہے تھے۔ بقول نیلی کے یہاں دوسرے جزیروں کی... بہ نسبت لولوش کے جاسوس زیادہ گردش میں رہتے تھے اسی لیے ہمیں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت تھی۔

یہ آئی لینڈ ہمیں واقعی دوسرے جزیروں کی بہ نسبت پُررونق نظر آیا۔ شام رات میں بدلنے لگی تھی۔ نیون سائن، روشنیاں، ٹریفک اور عمارتیں بھی کچھ ایسا ہی تھا جو بڑے شہروں کا خاصہ ہوتا ہے۔

"میں تو سمجھی تھی کہ یہ جزیرے جنگلوں، ندی، نالوں اور ویران ساحلوں پر مشتمل ہوں گے جہاں جنگلی اور وحشی قبائل آباد ہوتے ہیں، بالکل کسی ایڈونچرز کہانیوں ناولوں کی طرح..... لیکن یہاں آ کر تو ایسا ہی لگا جیسے ہم نیویارک یا شکاگو سے نکل کر ایسے ہی گنجان آباد کسی بڑے شہر میں آ گئے ہوں۔" شکیلہ نے منہ بنا کر کہا۔

میں اس کی مہم جو فطرت کو سمجھتا تھا، ہولے سے مسکرایا اور کچھ کہنا چاہا تو نیلی اس سے بول پڑی۔

"جس قسم کے جزیروں کا تم منظرنامہ پیش کر رہی ہو شکیلہ ڈیئر! وہ گمنام اور آباد ساحلوں سے دور دراز کے جزیرے کہلاتے ہیں۔ یہ برمودا ہے۔ بحرِ اوقیانوس میں واقع ایک پُراسرار خطہ..... لیکن یہاں کا کوئی بھی جزیرہ غیر آباد نہیں ہے بلکہ یہ سیاحوں اور سیلانی طبع لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔ یہ جانا پہچانا سمندری خطہ ہے۔ رہی بات اسراریت اور ایڈونچر کی تو یہ بھی کسی دور دراز کے گمنام جزیروں سے کم نہیں جو نقشے میں بھی موجود نہیں ہیں۔ کیا تم نے برمودا ٹرائی اینگل نہیں سن رکھا؟ یعنی شیطانی تکون..... کتنے ہی بحری اور ہوائی جہاز اپنے کئی کئی سو مسافروں سمیت غائب ہوتے رہے جن کا آج تک سراغ نہ مل سکا۔ جہاں قطب نما کی سوئی تک جام ہو جاتی ہے، اس کے باوجود لوگ یہاں کا رخ کرتے اور یہاں رہنے آباد ہونے کو ترجیح دیتے

ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں کھیل داد بھی مسکرایا، شکیلہ تو ہنس پڑی۔ بولی۔

"بیلی سسٹر! میں تو یونہی مذاق کر رہی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی ایک روایتی اسراریت کی بنا پر برمودا بھی کسی سے کم نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے شکیلہ کو یہاں کسی ایلین کی تلاش ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایسے میں مجھے اپنا یار بے بدل اول خیر یاد آنے لگا، وہ اگر یہاں ہوتا تو شکیلہ کی ایسی خواہش کا بڑا کرارا جواب دیتا۔

"ہاں! ایلین سے مجھے یاد آیا۔" بیلی سنجیدگی سے بولی۔ "کچھ روز پہلے سننے میں آرہا تھا کہ سیاحوں کا ایک گروپ لولوش کے جزیرے ہوگ بے کی باضابطہ اجازت کے ساتھ اس کی سیر کو نکلا تھا۔ وہاں اس گروپ نے کسی ایلین کو دیکھا تھا۔ وہ خوف زدہ ہو گئے۔ ایک مہینے کی سیر کا پروگرام منسوخ کر کے سیاحوں کا یہ گروپ اگلے دن ہی واپسی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ ایک واقعہ نہیں ہے، ایسے اور بھی کئی واقعات دیکھنے میں آتے رہے ہیں، اگرچہ مختلف صورت میں لیکن نوعیت ان کی ایک ہی رہی ہے۔ اس سے متعلق زیادہ تر لوگوں کا یہی خیال ہے کہ یہ ساری اس شیطانی تکون (برمودا ٹرائی اینگل) کی کارستانی ہے۔ صرف چند لوگ اس سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ سب ایک سوچے سمجھے ڈرامے کے تحت کیا جاتا ہے، تاکہ لوگ یہاں کا رخ کرنے سے کترانے لگیں، یہی طبقہ برمودا ٹرائی اینگل سے متعلق بھی ان پُراسرار واقعات کو تسلیم نہیں کرتا۔ ان کے مطابق کئی سال پہلے یہاں برطانیہ اور امریکی فوجی اڈے قائم کیے گئے تھے، لہٰذا دوسرے لوگوں کو یہاں کا رخ کرنے سے روکنے کے لیے اس شیطانی تکون سے متعلق ایسی من گھڑت کہانیاں منسوب کرلی گئیں، ہوسکتا ہے اسی طرح جزیرہ ہوگ بے میں بھی کوئی ایسی خفیہ نقل وحرکت ہو سکتی ہے جسے وہاں کے لوگ دوسروں کی نظروں میں لانے سے گریزاں ہوں۔"

بیلی کی بات ہم سب نے بڑے غور سے سنی تھی۔ مجھے اس کی آخرالذکر بات سے پورا اتفاق تھا۔ دنیا میں آج تک میں نے ایسا کوئی اسرار نہیں دیکھا تھا جو ماورائے عقل کہلاتا ہو، من گھڑت پُراسرار قصے کہانیوں کی اور بات تھی، وہ کوئی بھی گھڑ سکتا تھا اور پھر روایت میں کیا دیر لگتی تھی۔

"تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے بیلی!" میں نے کہا۔ "لولوش ہوگ بے میں اپنی زمین دوز سلطنت قائم کیے بیٹھا ہے اور باہر کی دنیا کو اس کا علم نہیں ہے، نہ ہی وہ کسی کو اس کا پتا لگنے... دیتا ہے، لیکن امریکی حکومت... سے ایک معاہدے کے تحت وہ اس جزیرے پر کسی کو آنے جانے سے منع نہیں کرسکتا تو اپنی عمل داری میں کسی کی "قانونی" دراندازی کو روکنے کے لیے وہ "اسراریت" کا حربہ استعمال کرتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے اسے روڈلف اور یاسمین کی لولوش کے متعلق بتائی ہوئی باتوں کا ذکر بھی کردیا تو بیلی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ان باتوں کی روشنی میں وہی لوگ اس کے متعلق کچھ کہہ سکتے ہیں جو اس قسم کی پُراسراریت اور محیرالعقول واقعات سے گزرے ہوں۔ میں یا تم ابھی کیا کہہ سکتے ہیں بھلا......؟"

"ہم... " میں نے ہونٹ بھینچ کر سر کو اثباتی جنبش دی۔

اس کے بعد ہم چاروں ایک ٹیکسی میں سوار ہوکر ان غاروں کی طرف نکل گئے، جہاں زیرِزمین غار تھے۔

ظاہر ہے ہم ان غاروں کی سیر کرنے نہیں جا رہے تھے، ہمارا ارادہ وہاں سے مذکورہ ایئن شور روڈ پر جانے کا تھا تاکہ اس طرف کے قریبی ساحل سے ہم کسی بوٹ یا اسٹیمر کے ذریعے ہوگ بے تک پہنچنے کا کچھ بندوبست کرتے۔

سیدھا وہاں کا رخ بھی ہم کر سکتے تھے لیکن احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ ہم ایک ساحل پر اتر کر سیر کیے بغیر ہی سیدھا دوسرے ساحل کا رخ کرتے تو یہاں مختلف بھیس میں چھپے ہوئے لولوش کے جاسوسوں کی نظروں میں آسکتے تھے۔ اسی لیے ہم عام سیاحوں کا سا ہی انداز اپنائے ہوئے تھے۔

زیرِزمین غاروں کی دنیا میں اور لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اچانک ایک آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔

"بیلی......! مائی ڈارلنگ......!" ہم سب نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ ڈنشا تھا اور اس کے ہمراہ بلیک... وہ یہاں کیسے پہنچے، یہ بعد کا قصہ تھا لیکن اس وقت بیلی کے چہرے پر اسے دیکھتے ہی نفرت انگیز تاثرات اُبھر آئے تھے۔

ڈنشا ہم سے چند قدموں کے فاصلے پر دیگر سیاحوں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ بےتابانہ انداز میں اس کی طرف لپکا اور بیلی کے قریب آتے ہی اس نے اُسے بےاختیار محبت بھرے انداز میں گلے لگانا چاہا تھا مگر بیلی نے اسے بری طرح خود سے پرے جھٹک دیا۔

"ہم... میں نے تمہیں کہاں کہاں تلاش کیا...... لل...... لیکن، مجھے تمہاری ناراضی کا پورا احساس ہے مائی سویٹ ہارٹ!"

وہ بڑی مکاری سے ہانپتے ہوئے بولا۔ "میں تمہاری حفاظت نہ کرسکا اور...... اور نامعلوم غنڈوں نے تمہیں اغوا کرلیا۔ اور... اور تم لوگ......" وہ بدستور فریب کاری پر اُترا ہوا تھا اور میری جانب تکتے ہوئے شاکی لہجے میں بولا۔

"یہ... یہ سب تم لوگوں کی وجہ سے ہوا ہے، تم لوگ اچانک کدھر چلے گئے تھے؟ جبکہ میں نے تمہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ تم سب کو گرانٹ ہوٹل میں ہی قیام کرنا ہے۔"

اس کی مکاری پر میں اندر سے اش اش کر اُٹھا۔ دلچسپ صورت حال تو یہ تھی کہ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں یا بیلی اس کی اصلیت اور اس کے کھیلے ہوئے ناکام ڈرامے سے واقف نہیں ہیں۔

"اسٹوپڈ... ڈنشا!" بیلی نے غصے سے تقریباً چلا کر کہا۔ اس کی آواز پر وہاں موجود دیگر لوگ بھی ہماری طرف عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔ بیلی کے جھڑکنے پر ڈنشا یک دم بھیگی بلی بن گیا۔ میں نے دیکھا بیلی کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں سے نفرت اور غیظ کی چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ اسی لہجے میں ڈنشا سے بولی۔

"مجھے سب معلوم ہو چکا ہے، یہ کس کی کارستانی تھی۔ تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ تم اس طرح اپنے خفیہ ذاتی مقاصد کی خاطر ہمارے ہی دشمنوں سے ساز باز کر کے خود سمیت ہم سب کو بھی ہلاکت میں ڈال دو گے؟" بیلی کا لہجہ بپھرا ہوا تھا۔

ڈنشا نے جب یہ سنا تو اس کی حالت مزید پتلی ہو گئی۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ کبھی چور نظروں سے بیلی کی طرف دیکھتا تو کبھی میری طرف۔ مگر ڈھٹائی دکھانے سے باز پھر بھی نہ آیا، پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔

"کک...... کیا مطلب؟ سویٹ ہارٹ؟ میں سمجھا نہیں؟"

"اب زیادہ مکار اور انجان بننے کی کوشش مت کرو۔" بیلی نے تلخی سے کہا اور پھر اسے مختصر ترین لفظوں میں بتادیا کہ اس نے کیا گل کھلایا تھا اور کس طرح بیلی موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچی تھی۔

اب تو ڈنشا کی ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کھڑے بلیک مل کی حالت بھی ایسی ہو گئی جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

میں نے البتہ اس شام کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نہ ہی یہ بتایا کہ کالا بان سے ہم نے مقابلہ کیا تھا۔

بہرحال یہ سب سننے کے بعد ڈنشا فوراً ہی بیلی کے قدموں میں گر کر معافیاں مانگنے لگا۔

"مائی سویٹ ہارٹ! مجھے معاف کردو، میں واقعی لالچ میں آگیا تھا۔ لیکن یقین کرو ایسا میں نے بہت سی دولت کمانے کے لیے کیا تھا، تاکہ ہماری آئندہ کی زندگی بہت سکون اور عیش و آرام سے گزرے، تم دیکھ ہی رہی ہو کہ میرا کاروبار کتنا مندا جارہا ہے۔ کلب بھی بس نام کو ہی چل رہا ہے۔"

"فوراً میرے قدموں سے اُٹھ جاؤ اور مجھ سے ذرا دور ہو کے بات کرو۔" بیلی نے انتہائی بےرخی اور ناگواری سے کہا۔ اس کا طیش کم نہیں ہوا تھا، جبکہ میں خاموش تھا۔

"نہیں ڈارلنگ! جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی، میں تمہارے قدموں سے نہیں اُٹھوں گا، یو نو ڈیٹ، میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صرف ایک بار، فار گاڈ سیک! صرف ایک بار معاف کردو مجھے، میں ساری عمر تمہارا اور تمہارے اس دوست مسٹر شہزی کا غلام بنا رہوں گا۔" ڈنشا گڑگڑانے لگا۔ بیلی کے چہرے سے کوفت کے آثار مترشح ہونے لگے، وہ اب اس کے جھانسے میں آنے کو بالکل بھی تیار نظر نہیں آرہی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم مجھے معاف کرو یا نہ کرو، لیکن پلیز اس وقت میری بات مان لو اور مجھے خود سے دور مت کرو۔" وہ منت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے احساس ہو گیا ہے کہ مجھ سے ایک بڑی ہی بھیانک غلطی ہو گئی اور اب میں ہی نہیں بلکہ ہم سب ایک سنگین خطرے سے دوچار ہیں۔ میں نے لالچ اور بےوقوفی میں آکر ان لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔ میری وجہ سے ہم سب کو جو نقصان ہوا ہے اب اس کا ازالہ بھی میں ہی کرسکتا ہوں۔"

بیلی نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ نجانے اس کی بات سنی بھی تھی کہ نہیں، لیکن میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

بالآخر مجھے ہی بولنا پڑا۔

"ڈنشا! ایک بات سنو..." بیلی کے قدموں میں

جھکا ہوا ڈنشا فوراً ہی میری طرف اپنی گردن موڑ کر لجاجت بھرے انداز میں بولا۔

"پلیز، مسز شہزی! تم ہی سمجھاؤ، میں تم سے بھی معافی مانگنے کو اور تمہارے قدموں میں اپنی ناک رگڑنے کو تیار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، تم پہلے کھڑے ہو جاؤ اور ذرا نارمل ہو کے بات کرو۔" میں نے ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ وہ نیلی کی طرف تکتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہارا ان لوگوں سے کس بات پر جھگڑا ہوا تھا؟ نیلی کو اس کاٹیج سے لے جانے والے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تمہارے کرائے کے مقامی بدمعاشوں جون اور ڈاکن کو بھی بیدردی سے ہلاک کر دیا تھا۔"

"میں سب بتائے دیتا ہوں۔ لیکن اس وقت ہم یہاں بھی خطرے میں ہیں، ان خبیثوں نے میرے ساتھ بھی دھوکا کیا ہے۔ بہتر ہے کہیں محفوظ مقام پر چل کر......"

"شہزی! تم آخر ڈنشا سے اب کیا بات کرنا چاہتی ہو؟" اچانک نیلی نے کہا۔ وہ بیزار سی نظر آرہی تھی۔ "میں اب ایک منٹ کے لیے بھی اس کا یہاں وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ اب میرے اور اس کے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہو چکے۔"

اس کا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن محسوس ہوا۔ ڈنشا اس کی بات پر دوبارہ ڈھنے لگا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور پھر اس سے پہلے کہ وہ نیلی کے سامنے پھر گڑگڑانا شروع کرتا میں نے کہا۔

"نیلی! پلیز، جسٹ اے منٹ...... اس وقت مسئلہ واقعی ڈنشا کو معاف کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے۔ اس نے جو غلطی کر ڈالی ہے، اس کا خمیازہ بھی ہمیں بھگتنا پڑ جائے گا، اگر یہ ہم سے دور ہوا تو...... کیونکہ اسے سب پتا ہے کہ ان حالات سے کیسے نکلا جاسکتا ہے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ ان لوگوں کی نشاندہی تو ضرور ہی کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، تب تک پھر یہ مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش مت کرے اور تم سے ہی بات کرے۔" بڑی بے رخی سے یہ کہتے ہوئے نیلی نے اپنا منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

میں نے کن انکھیوں سے ڈنشا کی طرف دیکھا۔ اس کے اُترے اُترے چہرے پر بڑے کرب کے آثار اُبھرے۔

مجھے احساس ہونے لگا کہ وہ واقعی نیلی سے بے حد محبت کرتا تھا مگر لالچ اور بیوقوفی میں آکر وہ بڑی ناقابلِ تلافی غلطی کا بھی ارتکاب کر بیٹھا تھا۔

میں نے کہا۔ "ڈنشا! اب تمہیں ایسا ہی کرنا ہوگا جیسا نیلی نے کہا ہے، فی الحال اسے ہی کافی سمجھو......"

"ہم...... مجھے منظور ہے۔" وہ جھٹ بولا۔

باتوں میں ہم اردگرد سے بےخبر ہو گئے تھے۔ رات بڑھتی جا رہی تھی اور دیگر لوگ بھی آہستہ آہستہ واپس لوٹ رہے تھے۔ ہم باتیں کرتے ہوئے زیرِ زمین غاروں کے اندر آچکے تھے اور یہاں ان کی چھتوں سے نکلی نکیلی چٹانیں جھولتی نظر آرہی تھیں، روشنی کا بندوبست تو کیا گیا تھا مگر اب وہ سیاحوں سے خالی ہوتا جا رہا تھا۔ گائیڈ وہاں موجود تھے، ...... ایسے ہی دو گائیڈ ہماری جانب لپکے۔ ادب سے ہمیں جھک کر سلام کیا۔

"میرا خیال ہے آپ لوگوں نے ابھی لینٹکس غاروں کا وہ حصہ نہیں دیکھا جو یہاں کا اصل عجوبہ ہے......" ایک گائیڈ نے ہم سے نہایت اخلاق کے ساتھ کہا۔ ہم بھی مسکراتے چہروں کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ویسے ہمارا موڈ واپسی کا ہی تھا تاہم انکار نہ کر سکے اور ان کے ساتھ چل دیے۔

دونوں گائیڈ خاصے تنومند اور دراز قامت تھے۔ انہوں نے اپنے جسموں پر مخصوص وردیاں چڑھا رکھی تھیں تاکہ لوگ انہیں پہچان کر ان کی مدد حاصل کر سکیں۔

وہ ہمیں غاروں کے اندر بل کھاتے گوشوں کی طرف لے کر چل دیے۔

شکیلہ بہت متحیر سی نظر آرہی تھی اور حیران حیران نگاہوں سے اس چھپے ہوئے عجوبے کو دیکھ رہی تھی۔ کم و بیش کھیل دادا بھی ان غاروں کے سحر میں کھویا ہوا سا نظر آتا تھا، میری آنکھوں میں بھی دلچسپی تھی لیکن نیلی کچھ بے چین سی نظر آرہی تھی۔

یوں بھی میرا ایک مقصد ان راستوں کو جانچنا تھا جہاں این شور نامی روڈ جنوبی ساحل تک لے جاتی تھی، ہمارا ارادہ اسی راستے سے مذکورہ ساحل تک پہنچنے کا تھا۔

لہٰذا ایک موقع پر میں نے ایک گائیڈ سے کہا۔

"بہت دلچسپ ہے یہ سب کچھ...... مسٹر......؟" میں نے آخر میں دانستہ استفساریہ انداز میں اپنا جملہ اُدھورا چھوڑا تو وہ فوراً اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے بولا۔

"خادم کو جارج کہتے ہیں اور یہ میرا ساتھی مسٹر بروک ہے۔" اس نے اپنا اور اپنے ساتھی گائیڈ کا بھی

تعارف کرادیا۔

"اوکے مسٹر جارج اینڈ بروک......" میں نے کہا۔ "ہم نے یہاں غاروں کی سیر تو کر لی ہے، تم ہمیں این شور روڈ تک پہنچا سکتے ہو؟ وہاں سے سنا ہے کہ جو روڈ ساحل کی طرف جاتی ہے، وہاں کا قدرتی منظر بڑا ہی دلفریب ہے۔ ہم وہ دیکھنا چاہتے ہیں پھر ہم اپنی راہ لیں گے۔"

"شیور...... شیور، وائے ناٹ گائیز! کم آن......" بروک نے مجھ سے کہا پھر اس نے ایک نسبتاً تنگ سے دہانے والے غار کی طرف اشارہ کیا۔ ہم گائیڈ کی اس جوڑی کی رہنمائی میں اسی طرف کو بڑھ گئے۔

اس غار کی سطح مجھے نیچی سی محسوس ہوئی۔ ہم بمشکل ایک دوسرے کا اور کبھی اس کی کھردری سی دیواروں کا سہارا لیے ہوئے آگے بلکہ نیچے اُترنے لگے۔

"یہ غار تو نیچے کہیں جا رہا ہے۔" شکیلہ سے رہا نہ گیا۔ "کہیں یہ غار ہمیں سمندر میں تہ غرق کر ڈالے۔" اس کی بات سن کر جارج عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولا۔

"نہیں مادام! ایسا نہیں ہے، درحقیقت یہ واحد غار ہے جو ایک مخصوص حد تک گہرائی میں اُتر کر آپ کو اسی سمت میں پہنچا دے گا جہاں آپ لوگ جانا چاہتے ہیں۔"

میں اُلجھ سا گیا۔ کھیل دادا ان دونوں کو بڑے غور غور سے دیکھ رہا تھا۔ نیلی کی بھی یہی حالت تھی جبکہ شکیلہ خاصی پریشان سی دکھائی دینے لگی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جارج کی بات سے مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

پھر ایک جگہ میں رک گیا اور اپنے دیگر ساتھیوں کو بھی رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں اطراف میں نظریں دوڑانے لگا اور میرے ساتھی بھی یہاں کا جائزہ لینے لگے۔

یہاں کافی سیلن اور گھٹن تھی۔ غار کی سطح پر کئی جگہوں پر پانی کھڑا تھا۔ پہلے وہ ہمارے ٹخنوں تک آرہا تھا اور اب بتدریج گھٹنوں تک آنے لگا تھا۔ ازیں علاوہ یہاں دیواروں کی ایک بھول بھلیاں سی بھی دکھائی دینے لگی تھی۔ چھت بھی کافی نیچی ہو گئی تھی، اس قدر کہ ہمیں اب اپنا سر جھکا کر چلنا پڑ رہا تھا۔

"آگے بڑھتے رہو مسٹر! منزل اب بس قریب ہی ہے۔" یہ جارج تھا۔ ہمیں تذبذب میں مبتلا پا کر وہ بولا۔ "آپ گھبرایئے نہیں ہم آپ لوگوں کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں۔"

"مسٹر بروک! یہ پانی تو گہرا ہوتا جا رہا ہے؟" اس بار نیلی نے ان سے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ تھوڑا اور آگے بڑھے تو ہم ڈوب جائیں گے۔"

"ہم تمہیں یہاں ڈبونے کے لیے ہی تو لائے ہیں مادام!" یک دم جارج نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور بجلی کی سی پھرتی سے اس نے اپنے لباس سے پستول نکال لیا لیکن اسی وقت ایک فائر ہوا۔ جارج کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر پانی میں گر گیا، اس کا ساتھی بروک بھی اپنی گن نکال رہا تھا کہ یک بیک ایک اور فائر ہوا اور گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ بھی ایک کریہہ ناک چیخ کے ساتھ پانی میں گرا، لیکن اس کا ساتھی جس کا ایک ہاتھ زخمی ہو گیا تھا، اس نے چلا کر اجنبی زبان میں کچھ کہا تھا۔

ادھر نیلی اور ڈنشا وغیرہ اس اچانک اُفتاد پر چند ثانیوں کے لیے بوکھلا گئے اور سچی بات تھی کہ میں خود بھی اس قدر ٹھنڈے مزاج کا آدمی بھی لمحہ بھر کو بدحواسی کا شکار ہو گیا۔

میں نے دیکھا کھیل دادا کے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک پستول چمک رہا تھا اور اس کی نال سے دھوئیں کی لکیر بلند ہو رہی تھی۔

کھیل دادا نجانے کب سے ان کی حرکات و سکنات کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاید اس کی نظریں بھی ان پر جمی ہوئی تھیں، اسی سبب جیسے ہی جارج نے پھرتی دکھانے کی کوشش چاہی تھی، کھیل دادا اس سے زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے پستول والے ہاتھ کو نشانہ بنا چکا تھا۔

وہ بھاگا تو کھیل دادا نے بڑی سفاکی سے اس کی پشت پر گولی مار دی۔ وہ بڑی لرزہ خیز چیخ کے ساتھ ایک چھپاکے سے پانی میں گرا اور اس کی لاش اُلٹی ہو کر غار کے پانی پر تیرنے لگی۔

ابھی میں کھیل دادا سے یہ کہنے والا تھا کہ اسے جارج کو ہلاک نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ میں اس کے منہ سے کچھ اُگلوانے کا سوچ رہا تھا کہ اچانک شکیلہ چلائی۔

"دشمن...... نیچے لیٹ جاؤ" اس کے یہ کہنے کے بعد ہی غار میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری اور پانی کی سطح سے ٹکرانے والی گولیاں پانی کو اُچھالنے لگیں۔

تب ہی ہم سب یکلخت سطح نظر آنے لگے۔ ہم لیٹ نہیں سکتے تھے، البتہ غاروں کی دیواروں کی آڑ میں چلے گئے۔ چھپے ہوئے حملہ آور نظر نہیں آئے تھے، لیکن ہم نے فائرنگ کی آواز سے سمت کا اندازہ کرتے ہی جوابی برسٹ داغے۔

گائیڈ یقیناً انہی حملہ آوروں کے ساتھی تھے جو دھوکے

سے ہمیں یہاں گھیر لائے تھے۔

میری گردشی نظریں چہار اطراف کا بڑی تیزی کے ساتھ طواف کرنے لگیں اور پھر جلد ہی مجھے دو مسلح افراد کی جھلک دکھائی دے گئی۔ اسے میں نیلی اور کھیل دادا کی خوش قسمتی ہی سمجھوں گا کیونکہ وہ دونوں انہی کو نشانہ بنانے کے لیے پر تولے ہوئے تھے کہ میرے تلے اوپر نال والے مہیب آرسل نے دو شعلہ دار قہقہے اُگلے۔ وہ دونوں ہی کریہہ انگیز چیخیں مارتے ہوئے چھپاکے سے پانی میں گرے۔ مجھے اگر انہیں تاڑ لینے میں چند سیکنڈوں کی دیر ہو جاتی تو نیلی اور کھیل دادا ان کی بربریت کا شکار ہو سکتے تھے۔

اسی وقت شاید شکیلہ کو کوئی شکار دکھائی دیا تھا، کیونکہ اس کی گن نے ایک برسٹ اُگلا۔ مزید دو حملہ آوروں کے پانی میں چھپاکے سے گرنے کی آواز ابھری۔

"واپس چلو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ ہم جدھر سے آئے تھے، اسی طرف کو لوٹنے لگے، لیکن جلد ہی ہم پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ ہم بھٹک گئے ہیں۔ غاروں کی بھول بھلیوں نے ہمیں گم کر دیا تھا۔

ہم سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ حملہ آور ختم ہو چکے تھے یا ابھی ان کا کوئی ایک آدھ ساتھی باقی بچا کہ نہیں، ہم ان سے محتاط تھے۔

"کوئی واپسی کے راستے کا تعین کر سکتا ہے؟" ظاہر ہے یہ سوال میں نیلی اور ڈنشا سے ہی پوچھ سکتا تھا۔ ڈنشا تو جواب دینے سے قاصر رہا البتہ نیلی ہونٹ بھینچے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔

"واپسی کا راستہ تو مشکل ہے، ورنہ اس کوشش میں ہم مزید بھٹک جائیں گے، ہاں البتہ ہم آگے ضرور بڑھ سکتے ہیں، وہاں جزیرے کا ویران ساحل ہوگا۔"

"کیا وہ این شوررووڈ کا ساحل تو نہیں؟" میں نے نیلی سے پوچھا۔

"نہیں، مگر اس کے قریب کا علاقہ ضرور پڑ سکتا ہے۔" وہ بولی۔ "اس کی تلاش اس منحوس جگہ سے زیادہ آسان... ہوگی۔"

"نکلو پھر فوراً..." میں نے کہا۔

"یہ حملہ آور کون ہو سکتے تھے؟ کیا وہاں بھی ان سے ٹکراؤ ممکن ہے؟" ڈنشا بولا۔ نیلی نے اس کی طرف کوئی توجہ دی۔ مجھے اس کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ تاہم میں نے ہی جواب میں کہا۔

"یہ لولاوش کے سوا اور کون ہو سکتے ہیں۔"

"ان بدبختوں کی ایسی کی تیسی..." ڈنشا غار کھائے لہجے میں بولا۔

میں اب اس کی اپیکیزم سے جلن کا اندازہ کر سکتا تھا، کیونکہ انہوں نے اسے دھوکا دیا تھا اور نیلی کی طرف سے اس کا دل بھی خراب کرنے کا سبب بنے تھے، اب بھلا ڈنشا انہیں کیوں کر معاف کر سکتا تھا۔ باقی سیلڈز نامی برسوں پرانے غرقاب بحری جہاز سے متعلق کیا کہانی اور کیا منصوبے تھے وہ ابھی ہمیں ڈنشا سے پوچھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔

ہم محتاط انداز میں ان "اندھے" غاروں میں راستہ تلاش کرتے آگے بڑھتے رہے۔ پہلے کہیں نہ کہیں سے روشنی اندر پڑ رہی تھی، مگر اب تاریکی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ اسی لیے ہم نے ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔ ہم بدستور نیلی کی رہنمائی میں آگے بڑھتے رہے۔ نیلی غضب کی ذہین اور زود فہم ثابت ہو رہی تھی اور میں ذہین لوگوں کی قدر کرتا تھا۔ وہ محض ایک محتاط اندازے اور اپنی کسی حاصل کردہ مقدور بھر معلومات کے مطابق متوقع منزل کی جانب ہمیں لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، یہ عجیب و غریب راہ گزر تنگ ہوتی جا رہی تھی اور آکسیجن کی بھی کمی ہو رہی تھی۔ سیلن اس قدر بڑھ رہی تھی کہ سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ کبھی سردی اور کبھی حبس اور گرمی کا سا گماں ہو رہا تھا، ایک موقع پر بلیک ٹل کی حالت دمے کے مریض کی سی ہونے لگی، وہ اپنا سینہ پکڑ کے وہیں لڑھک گیا اور زور زور سے ہانپنے لگا، یوں کہ جیسے اسے سانس لینے میں بہت زیادہ وقت ہو رہی ہو۔

نیلی نے تو اس کی پروا نہ کی البتہ ڈنشا اور میں نے ہی اسے سنبھالا دیا۔

شکیلہ نے کہا۔ "میرا خیال ہے یہاں تھوڑی دیر کے لیے سستا لینا چاہیے اور آگے راستے کا بھی ایک بار پھر تعین کیا جائے۔"

میں نے محسوس کیا کہ بلیک ٹل کی ہیئت کذائی نے اسے اندر سے کھٹکا دیا تھا۔ نیلی نے شکیلہ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"شکیلہ! میرا خیال ہے تمہاری ہمت جواب دے رہی ہے۔ بلیک ٹل کی حالت بے شک اس ماحول کی وجہ سے خراب ہوئی لیکن اس میں اس کے اپنے ہاتھی جیسے جثے کا بھی دخل ہے۔ زیادہ اوور ویٹ آدمی اس گھٹے ہوئے ماحول میں اس قسم کی حالت سے گزر سکتا ہے، مگر یہ عارضی کیفیت ہے۔"

"تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھی ہو۔" شکیلہ نے کہا۔ "میرا مطلب تھا کہ کیا ہم درست سمت پر جا رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں آگے جا کر ہم کسی جگہ پھنس نہ جائیں۔"

نیلی نے اس کی طرف دیکھا۔ بولی۔ "شکیلہ! میرے پاس کوئی جادوی چھڑی نہیں ہے جسے میں ہلاؤں اور مجھے راستہ دکھائی دیتا رہے۔ کیا تم میں سے کسی کو آگے کے راستے کا تھوڑا بہت بھی اندازہ ہے؟ یقین ہے مجھے کہ بالکل نہیں ہو گا، لیکن صرف مجھے ہے اور جتنا ہے اسی قدر ہی اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر سکتی ہوں۔"

نیلی شاید شکیلہ کے سوالوں سے تنگ ہونے لگی تھی۔ تب ہی میں نے نیلی کی حمایت میں شکیلہ سے کہا۔

"نیلی ٹھیک کہہ رہی ہے شکیلہ! ہمارے پاس اتنی سی اُمید کے سہارے آگے بڑھتے رہنے کے سوا اور کوئی آپشن رہا بھی نہیں ہے اب... واپسی کے راستے کا ہم میں سے کسی کو بھی ایک ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہے، لیکن کم از کم منزل کی جانب بڑھنے کی ایک ذرا روشنی نظر آ رہی ہے تو اس کی رہنمائی میں آگے بڑھنے میں کیا مضائقہ ہے۔"

شکیلہ نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔

ہم تھوڑا سستانے کے بعد ایک بار پھر آگے بڑھنے لگے۔ ہمیں دشمنوں کا بھی دھڑکا لگا ہوا تھا، مگر یہ جگہ ہی اتنی تنگ اور گھٹی گھٹی تھی کہ اب قریب کوئی بھی گوشہ ہماری متلاشی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن پھر بھی ہم اپنے گرد و پیش بلکہ پیچھے پیچھے سے محتاط تھے۔

کہیں سنگلاخ رخنے تھے تو کہیں ایسے سوراخ جن کے اندر لیٹ کر ہمیں وہ جگہ پار کرنا پڑتی۔ کسی جگہ اندھیری دراڑیں تھیں۔ لینٹس کیوز کی جگہ اب مجھے یہ خوف ناک سوریاں ہی محسوس ہوتی تھیں۔

نیلی سب سے آگے تھی، اس کے بعد میں تھا۔ ڈنشا نے اگرچہ اس کے پیچھے ہونے کی کوشش چاہی تھی مگر نیلی نے اسے انتہائی ناگواری سے دور کر دیا تھا۔

ایک مقام پر سستانے کے لیے ہم رک گئے۔ بلیک ٹل کی حالت اب کچھ بہتر تھی، لیکن اب بھی وہ پوری طرح ٹھیک نہیں تھا۔ سانس پھولنے کی وجہ سے اس کا سیاہ چہرہ سرخ سا ہو کر عجیب مضحکہ خیز صورت پیش کرتا تھا، سانسیں اکھڑنے کے سبب... اس کی موٹی بیل جیسی گردن کی رگیں پھولی ہوئی عجیب نظر آتی تھیں۔ دوسرے نمبر پر کھیل دادا بھی ایسی ہی کیفیات کا شکار نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس نے شاید قوتِ ارادی کے بل بوتے پر خود کو سنبھالے رکھا تھا، شکیلہ اور میں نسبتاً بہتر حالت میں تھے اور نیلی کو دیکھ کر تو لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ ایسی کسی بیزار کیفیات کا ذرا سا بھی شکار ہو۔

گویا تھوڑا کم یا زیادہ ہم سست روی اور نڈھال پن کا شکار تھے، آکسیجن کی کمی میں سانسیں اُکھڑنا الگ پریشانی تھی۔ یوں ہم زیادہ دیر رک بھی نہیں پا رہے تھے، ایک عجیب سی حبس دم کی سی کیفیات میں مبتلا تھے.....

ذرا دیر سستانے کے بعد جب ہماری بالکل "آخیر" ہونے لگی تو اچانک نیلی چلائی۔

"منزل مل گئی... دوستو! جلدی آگے بڑھو۔"

نیلی کے منہ سے برآمد ہونے والے ان الفاظ نے جیسے ہمارے ڈھتے وجود میں ایک نئی طاقت اور جوش بھر دیا۔ ہم پھڑک سے گئے۔

مجھے اب شوریدہ سر موجوں کا ایک ہموار سا شور سنائی دینے لگا اور اندر روشنی بھی آنے لگی۔ غاروں کی زمین کا پانی اب جھاگ جھاگ سا محسوس ہونے لگا تھا۔ ہوا کی بھی فراوانی محسوس ہونے لگی۔ آکسیجن کی کمی پوری ہونے نے سونے پر سہاگا کا کام کیا۔ ہمارے اندر تیزی آ گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم سب ایک تنگ سے موری نما غار سے ایک ایک کر کے باہر نکل رہے تھے اور لمبی لمبی جنگلی گھاس پر اندھے منہ پڑ کر گہرے گہرے سانس لینے لگے۔ تازہ ہوا اور کھلی فضا میں آتے ہی ہم سب پر ہی غشی طاری ہونے لگی۔ جسے جہاں جگہ ملی وہ وہیں پڑ کر ڈھیر سا ہو گیا۔ نیلی بھی ایک طرف بے سدھ ہو کر لیٹ گئی تھی۔ مجھے مدھم چاندنی میں چمکتا ہوا آسمان نظر آیا۔ ٹمٹماتے تارے اور سانس لیتا ہوا سا جنگل دکھائی دیا۔ موجوں کے شور کے علاوہ سرد اور مرطوب ہواؤں کے جھونکے محسوس ہونے لگے۔ میری آنکھوں میں نیند سی سمانے لگی اور حواس شاید ساتھ چھوڑنے لگے تھے کہ بند ہوتی آنکھوں نے مدھم چاندنی میں کچھ انسانی ہیولوں کی جھلک دیکھی تھی کہ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو مجھے چلانے اور کراہنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں ہڑبڑا سا گیا اور متحرک ہونے پر احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ ایک عجیب سا سماں نظر آیا۔ جس میں ہم سب قیدی بنے ہوئے تھے۔ یہ کون تھے اور کن لوگوں نے ہمارے ساتھ ایسا کیا تھا، کچھ نہیں پتا

چلتا تھا، باسوائے اس کے کہ ہم سب رسن بستہ حالت میں ایک سرکنڈوں کے خاصے بڑے جھونپڑے کے باہر وسیع احاطے میں نصف گر بے ترتیب سے دائرے میں پڑے ہوئے تھے۔

بادی النظر میں گویا جنگل میں منگل کا سا سماں لگا تھا یعنی..... ایک جگہ الاؤ روشن تھا اور کہیں گیسولین لالٹینیں روشن تھیں۔ قریب میں دو گاڑیاں، جن میں ایک لمبی سی بند جیپ اور ایک پک اپ سی چھوٹی وین کھڑی نظر آرہی تھی۔ ہماری نظروں کے سامنے تقریباً کوئی چھ سات کے قریب افراد چست لباس میں موجود تھے، ان میں چند مسلح بھی تھے۔ دو جوان، حسین اور خوب صورت لڑکیاں بھی تھیں۔ دو افراد نے ڈنشا کو بیدردی سے دبوچ رکھا تھا اور دوسرا اس پر چمڑے کا کوڑا برسا رہا تھا۔ ڈنشا کی قمیص پھٹ کر چیتھڑوں کی صورت میں نظر آتی تھی اور اس کے اُوپری جسم پر اَن گنت سرخ لکیریں اور ایسے ہی رستے ہوئے اور بھی زخموں کے نشانات تھے۔ جن دو افراد نے ڈنشا کی یہ دُرگت بنا رکھی تھی، انھیں پہچان کر مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔

یہ دونوں وہی افراد تھے جن کی باتیں میں نے اورینج کلب کے قریب واقع ایک چھوٹے سے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں سنی تھیں اور جو ڈنشا کے ساتھ بیٹھے کسی سینڈرز نامی ڈوبے جہاز کے سلسلے میں رازدارانہ گفتگو کر رہے تھے، ان کے نام، جو انہوں نے آپس میں باتیں کرتے ہوئے ایک دوسرے کے لیے تھے وہ جیکسن اور ہوپر تھے، اس وقت بھی دونوں اسے زد و کوب کیے ہوئے تھے۔

لہٰذا انھیں دیکھ کر میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید اب میں ڈنشا کی تحقیر محسوس نہیں کر رہا تھا مگر مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی فکر ضرور ہونے لگی تھی۔

میں اب ہوپر اور جیکسن کے علاوہ باقی چار پانچ افراد کا بھی جائزہ لینے لگا۔ ان میں دو لڑکیوں کو چھوڑ کر باقی تین افراد کو بغور دیکھنے لگا۔ ان میں ایک تو اپنی بھاری بھرکم وضع قطع سے ان کا باس ہی معلوم ہوتا تھا جس کے کاندھے چوڑے اور چہرہ بھاری تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے ہی رعب و دبدبہ جھلکتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وائن کی بوتل تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کا سوٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ باقی دو ہاتھوں میں گن تھامے اس کے قریب موجود تھے۔ وہ تینوں کھڑے تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی اس کے قریب ہی منڈلا رہی تھیں۔

بہرکیف ..... مجھے یہ دیکھ کر اتنی تسلی تو ہوئی تھی کہ ہم اسپیکٹرم یا لولوش کے خونی بھیڑیوں کی قید میں نہیں تھے۔ جبکہ یہ لوگ وہی ہو سکتے تھے جو سینڈرز نامی کسی غرق شدہ جہاز کی کھوج میں تھے۔ ان سے ڈنشا کی کسی بات پر اَن بن ہو گئی تھی اور ڈنشا نے اس کی تفصیل ہمیں بتانا تھی۔

ہمیں ہوش میں آتا دیکھ کر ..... وہ باس ٹائپ آدمی ہماری جانب متوجہ ہوا تھا۔

"اے مسٹر! تم لوگ کون ہو اور ہمیں کیوں اس طرح باندھ رکھا ہے؟"

میں نے بالآخر تیزی سے سوچتے ذہن سے اسی باس ٹائپ آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے قدرے اُونچی آواز میں کہا۔ مقصد میرے پہل کرنے کا یہی تھا کہ اگر میں کوئی چالاکی کھیلنا چاہتا تو میرے ساتھی بھی میرے ہم آواز ہوتے۔

وہ باس ٹائپ آدمی چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا ہوا میری جانب بڑھا۔ میں پشت کے بل بندھا ہوا گھاس بھری زمین پر پڑا اس کی طرف تکے جا رہا تھا۔

وہ میرے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگا، شاید وہ یہ دیکھنا یا محسوس کرنا چاہتا تھا کہ ہم لوگ ڈنشا کے کیا لگتے تھے نیز وہ ہمیں کتنا "عزیز" تھا؟

"ہم..... تم لوگ کون ہو اور اس آدمی ڈنشا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"کوئی تعلق نہیں ہے۔" میں نے ذہن میں اُبھرنے والے ایک فوری خیال کے تحت اسے جواب دیا۔

"ہاہاہا ..... بہت چالاک بنتے ہو تم....." وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولا پھر آخری گھونٹ بھرنے کے بعد بوتل قریب کھڑی حسینہ کی طرف اچھال دی جسے اس نے فوراً ہی بڑی مہارت سے کیچ کر لیا۔

"شاید تم سچ اور اپنی حقیقت میری زبانی سننا چاہتے ہو۔" وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ "تم سب اس فراڈیے کے ساتھی ہو۔" اس کا اشارہ ڈنشا کی طرف تھا۔ "یہ ہمیں جُل دینے کے بعد خود ہی سارا مال ہڑپنے کے چکر میں تھا، لیکن اب اس نے خود سمیت تم سب کو ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔"

"مجھے تمہاری بات کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا ہے۔" میں نے اسی اعتماد کے ساتھ اس سے کہا۔ لیکن اندر سے میں ڈر گیا تھا کہ کم بخت ڈنشا کے گناہوں کی سزا ہمیں ملنے والی تھی۔ آگے بولا۔

"ہم سیاح ہیں اور جزیرے کے مشہور غاروں کی سیر کرتے ہوئے یہاں آن نکلے تھے۔ میرے ساتھ صرف وہ دو افراد ہیں۔" کہتے ہوئے میں نے شکیلہ اور کمیل دادا کی طرف اشارہ کیا۔ "تم دیکھ سکتے ہو کہ ہم تینوں ایک ہی ملک کے باشندے ہیں، جبکہ وہ تینوں امریکی ہیں۔" میرا آخری اشارہ بیلی، بلیک مل اور ڈنشا کی طرف تھا۔ میری اس چالاکی پر باس کے ماتھے پر شکن سی اُبھری۔ بلیک مل مجھے تکیلی نظروں سے گھورنے لگا۔ بیلی خاموش تھی، ڈنشا کی اپنی دُرگت بنی ہوئی تھی۔

"ہو سکتا ہے تم سچ کہہ رہے ہو۔" باس نے کہا۔ پھر جیکسن اور ہوپر سے کہا کہ وہ ڈنشا کو اس کی طرف لے آئیں۔

دونوں نے باس کے حکم کی فوری تعمیل کی تھی۔ وہ ڈنشا کو بیدردی سے کھینچتے ہوئے اس کے قریب لے آئے۔ اس کے بھی دونوں ہاتھ پشت کی جانب بندھے ہوئے تھے۔ حالت اس کی نہایت خستہ ہو رہی تھی۔ جیکسن اور ہوپر نے اسے باس کے قدموں کے قریب لا پھینکا تو باس نے اپنے دائیں پاؤں کا بوٹ اس کے جبڑے پر دھر لیا۔

مجھے اپنے دل میں کرب کا احساس ہوا۔ کچھ بھی سہی ڈنشا بہرحال بیلی کا محبوب اور بیلی اس کی محبوبہ تھی، جبکہ بیلی کا اب مجھ سے عابدہ کے حوالے سے ایک تعلق قائم ہو چکا تھا لہٰذا اب اس کا نقصان میرا نقصان تھا۔ لیکن جو "گیم" میں کھیلنا چاہتا تھا وہ دل اور اعصاب کو مضبوط کر کے کھیلنا تھا۔ جب ہی غیر ارادی طور پر میری نظریں بیلی کی جانب اُٹھ گئیں۔

ڈنشا کی قابلِ رحم حالت نے بیلی کے اندر کا بھی چھپا ہوا درد جگا ڈالا تھا، میرے لیے اس کا اتنا احساس ہی کافی تھا۔

"اگر تم لوگ ان سے جدا ہو تو اسے تم لوگوں کی کیوں فکر ستا رہی ہے۔"

باس نے میری جانب گھورتے ہوئے ایک ایک لفظ یوں چبا کر کہا جیسے میرا یا ڈنشا کا نرخرا اپنے دانتوں تلے بھنبھوڑ رہا ہو۔

باس بہت عیار تھا۔ اس نے مجھے لاجواب سا کر کے رکھ دیا، لیکن ابھی میری "زنبیل" میں کھیلنے کے لیے بہت سی گیندیں تھیں، ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں شاید یہ معاملہ سمجھ میں نہ آئے۔ یہ بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"سینڈرز نامی جہاز تک رسائی۔" باس نے کہا۔

"ڈنشا!..... تم نے ہمیں ابھی تک اس معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔" میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اور اس کا تمہیں ابھی تک کچھ فائدہ بھی نہیں ہوا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انہیں وہ بتا دو جو تم سے پوچھنا چاہتے ہیں۔ یوں ہم سب کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی ہیں۔" میں نے سیدھی لکیر کو پیٹا تو حسبِ توقع باس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ اپنی جزوی سی فتح پر مسرور نظر آنے لگا۔

"میں..... میں سب بتانے کو تیار ہوں۔" بالآخر ڈنشا نے ہانپتے ہوئے اور اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں کہا۔ "لل..... لیکن ریگٹ مجھے پہلے تم لوگوں کی زندگیوں کی ضمانت دے۔"

"اس کی بات غلط نہیں ہے مسٹر ریگٹ!" میں نے ڈنشا کی زبانی یہ سن کر اس انداز سے کہا کہ باس ٹائپ اس آدمی کا نام ہی ریگٹ ہو سکتا تھا۔

"ضمانت تو ملے گی۔" ریگٹ بولا۔ "لیکن ..... صرف اس صورت میں جب یہ ہمیں سینڈرز نامی جہاز کے مقامِ غرقاب کی نشاندہی کرے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں۔" ڈنشا نے اس سے ملتجیانہ آواز میں کہا۔ "تم ان سب کو چھوڑ دو، میں ابھی اور اسی وقت تم لوگوں کو اس تک لے جانے کو تیار ہوں جدھر اس جہاز کا ملبا موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم ہمیں لے چلو، باقی یہ لوگ اِدھر ہی میرے ساتھیوں کے پاس موجود رہیں گے۔ میرا ابھی یہ وعدہ ہے کہ جب تک تم ہم سے تعاون کرو گے انھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

اس کی بات پر ڈنشا متذبذب نظر آنے لگا۔

"ٹھیک ہے، ہمیں تمہاری یہ شرط منظور ہے۔" بالآخر ڈنشا کے بجائے میں نے ہی ہامی بھری۔ دیگر ساتھی خاموش تھے، انہوں نے کلی طور پر حالات کو میری صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

پتا نہیں یہ کیا کٹھن چکر تھا، لیکن بہرحال گلے پڑ گیا تھا اور اس سے چھٹکارا تو پانا ہی تھا۔

ڈنشا نے حیرت سے میری جانب دیکھا تھا اور میں نے دل ہی دل میں یہ دعا کرتے ہوئے کہ ڈنشا میری بات مان لے، اسے آنکھ کا ایک خفیف اشارہ کر دیا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ معاملہ بظاہر خیر و خوبی سے طے پا گیا تھا مگر آگے کیا ہونے والا تھا، اس سے متعلق میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی تھی۔

ڈنشا پریشان تھا۔ باقی ساتھی میری بات پر مطمئن نظر آ رہے تھے، جبکہ میں نے ان کی شرط پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

"ویل..... لیکن..... اگر انہوں نے تم لوگوں کے ساتھ کوئی دھوکا کیا تو.....؟" ڈنشا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ بولتے وقت اس کے منہ سے کراہ بھی نکل جاتی تھی۔

"مجھے یقین ہے کہ ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا۔" میں نے لہجے میں اعتماد سموتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی دانستہ ایک نظر قریب کھڑے ریگٹ پر ڈالی تھی۔

وہ اب میری طرف مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے سگار باکس نکال رہا تھا۔ پھر جب تک وہ سگار کا انتخاب کرتا رہا، میں نے بظاہر ڈنشا کو سمجھانے والے انداز میں مزید کہا۔

"ڈنشا! ہماری بہرحال ان لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور اس بات کو یہ بھی سمجھتے اور جانتے ہیں۔ ان کا مقصد پورا ہو جائے گا، جس کے بارے میں ہمیں تو بالکل بھی علم نہیں ہے اور نہ ہی ہمیں دلچسپی..... ہے، تو پھر ہم سے بھلا ان کا کیا واسطہ رہے گا، اسی لیے تم بے فکر ہو کے ان لوگوں کا مطالبہ مان لو اور ہماری سمیت اپنی بھی جان کی خلاصی کرواؤ۔"

"ویل..... ویل..... ینگ مین! ویل....." ریگٹ نے میری بات پر اچانک توصیفی انداز میں دو تین بار تالی پیٹتے ہوئے کہا۔

وہ سگار باکس دوبارہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ چکا تھا۔ خالی سگار اس کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ پھر ایک حسینہ نے لائٹر جلایا اور دلنشین انداز میں اس کے قریب آ گئی۔

ریگٹ نے سگار اپنے ہونٹوں میں دبا لیا۔ سگار سلگانے اور ایک گہرا کش لے کر گاڑھا اور کثیف دھواں فضا میں اُگلنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔

"یہ ینگ مین تم سے زیادہ عقل مند ہے، ڈنشا! اس نے ابھی جو کچھ کہا ہے، وہ بالکل ٹھیک ہی کہا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کر دیا۔ وہ سب حرکت میں آئے اور آناً فاناً ہمارے ہاتھوں پیروں کے جکڑ بند آزاد ہو چکے تھے۔

میں دل ہی دل میں اپنی کامیاب حکمتِ عملی پر نازاں نہیں تو خوش اور مطمئن ضرور ہوا۔

"تھینک یو مسٹر ریگٹ!" میں نے تشکر بھرے انداز میں اس سے کہا۔ "ہم بھی آپ کے ساتھ پورا پورا تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

لائن

"میں فلم لائن میں بُری طرح ناکام ہو چکا ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟"
"تمہارے لیے تو ایک ہی لائن رہ گئی ہے۔"
"کون سی لائن؟"
"ریلوے لائن!"

عشق

علامہ اقبال سے سوال کیا گیا۔ "عشق کی انتہا کیا ہے؟"
جواب ملا۔ "حیرت۔"
سوال کیا گیا۔ "عشق کی انتہا کیا ہے؟"
فرمایا۔ "عشق لا انتہا ہے، عشق کی کوئی انتہا نہیں۔"
سوال کرنے والے نے کہا۔ "مگر آپ نے تو لکھا ہے
تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں۔"
اس پر علامہ نے مسکرا کر فرمایا۔ "دوسرا مصرع بھی تو پڑھیے، جس میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا گیا ہے کہ
میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔"

اوکاڑہ سے سعدیہ کا انتخاب

"لیکن اسے اصل بات کا علم نہیں ہے۔" ڈنشا بے بسی سے بولا۔ "تم لوگ آخر میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو؟" وہ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ یوں جیسے ابھی اپنے سر کے بال نوچنا شروع کر دے گا۔

لہٰذا اس بار میں بھی اس کی صورت اور بات پر غور کرنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

وہ واقعی ایک نامعلوم سی مگر بہت ہی پیچیدہ قسم کی اُلجھن کا شکار محسوس ہو رہا تھا مجھے۔ تاہم میں نے اسے مزید کھولنے کے لیے کہا۔

"مسٹر ڈنشا! ہمیں ضرورت بھی نہیں ہے، تم نے دیکھا کہ مسٹر ریگٹ نے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔ لہٰذا اب ہم تمہیں مشورہ دیں گے کہ....."

میری بات حلق میں ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت ڈنشا اپنے سر کے بال نوچتا ہوا گھٹنوں تلے زمین پر بیٹھ گیا اور پاگلوں کی طرح چلاتے ہوئے بولا۔

"تم آخر یہ ماننے کو تیار کیوں نہیں ہو کہ ہم سب کی زندگیاں اس وقت سخت خطرے سے دوچار ہیں، اس لیے کہ لولوش کو سب علم ہو چکا ہے۔ ہماری ڈوبے جہاز والی مہم کی کھوج سمیت اور بیچ کلب کی خریداری تک....."

ریگٹ کے لیے نہ سہی لیکن میرے لیے یہ چونکا دینے والا انکشاف تھا، کیونکہ میں ہوپر اور جیکسن (جو درحقیقت ریگٹ کے ہی ساتھی تھے) کی ڈنشا کے ساتھ دو رازدارانہ گفتگو سن چکا تھا۔ اب اس کا یہ انکشاف کرنا مجھے لامحالہ باور کرا گیا کہ اس کاٹیج میں والٹن اور جارج کی لاشیں پائی جانا، نیلی کا غیاب، پھر اس کی بازیابی کے لیے ہمارا اُن اجنبیوں کے ساتھ مارا ماری، اس کے بعد بیچ میں ڈنشا اور کالاہان کے درمیان معرکہ آرائی، وغیرہ.....

لیکن میرے نزدیک اصل سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ سب ہوا کیونکر؟ یہ سارا معاملہ بگڑا کیسے۔

"یہ تو تم جھوٹ بول رہے ہو۔" ریگٹ نے ڈنشا کی بات ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر میں نے یا شاید ڈنشا نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ ریگٹ فوری طور پر جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ بات مان بھی لی جائے تو..... ہمیں بھی اس کی پروا نہیں ہے۔ آخر لولوش کس کھیت کی مولی ہے؟ ہم نہیں جانتے اور نہ ہی ہمیں یہ جاننے کی ضرورت بھی ہے۔"

لولوش جیسے موذی شیطان کے متعلق ریگٹ کے یہ خیالات جانتے مجھے اس پر ماتم کرنے کو جی چاہا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ڈنشا کا بھی یہی حال تھا لیکن نیلی کی سنگت اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جیسے ہی اسے لولوش کو غائبانہ سہی، جاننے کا موقع ملا تو ڈنشا کے بھی ہوش ٹھکانے آ گئے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ ریگٹ اور اس کا گروہ میرے کسی کام آ سکتا تھا یا نہیں..... یہاں دشمن کے دشمن کو دوست بنانے والی پالیسی پر میرا پورا یقین تھا مگر بات یہ تھی کہ ریگٹ کتنی طاقت رکھتا تھا؟ تاہم میرا سابقہ پُرآلام و پُرمصائب حالات کا تجربہ بتاتا تھا کہ دشمن کا دشمن، اصل دشمن سے خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اگر اسے دوست بنا کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں تو کہیں نہ کہیں کھوٹا سکہ بھی چل جانے کے مصداق وہ کام آ جاتا ہے۔

میں یہی کرنے والا تھا، لہٰذا میں نے ڈنشا کو خاموش کروا دیا۔ نیلی اور میرے دیگر ساتھی جو میرے اقدامات پر مکمل بھروسا اور اعتماد رکھتے تھے، خاموشی سے میری حمایت جاری رکھے ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے مسٹر ریگٹ! یہاں آپ تھوڑی سی غلطی پر ہو۔" میں نے اسے ٹوکنا ضروری سمجھا۔ اس کے بھاری جبڑوں والے چہرے پر ایک ذرا بھی برہمی کے آثار نہیں اُبھرے تھے، وجہ یہی تھی کہ ہم ایک دوسرے کی باتوں کو رد نہیں کر رہے تھے۔

"ویل..... ! میں وہ غلطی جاننا چاہوں گا، کیونکہ تم غلط نہیں ہو سکتے۔" ریگٹ فراخ دلی سے بولا۔

"بات صرف اتنی سی ہے مسٹر ریگٹ! کہ لولوش ایک جدی پشتی نواب زادہ ہے۔ اس کے اطوار بھی ویسے ہی ہیں۔ سارا کچھ اس نے عیاشیوں میں اُڑا دیا اور جب مال و دولت اس کے پاس سے ختم ہونے لگا تو اسے فکر ہوئی کہ یہی وتیرہ رہا تو ایک دن وہ سڑکوں پر آ جائے گا، کیونکہ اب وہ آرام و آسائش بھری زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ ایک دن بھی وہ غربت کی زندگی بتانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک ایسے بین الاقوامی ادارے کی بنیاد ڈالی جو بظاہر تو گمشدہ نوادرات کی تلاش اور اسے صحیح مقام تک پہنچانے کا عزم رکھتی تھی اور یوں اسے دنیا بھر کے ملکوں سے فنڈنگ بھی ہوتی تھی، مگر پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسے کچھ برائیوں کا بھی چسکا پڑ گیا یہاں تک کہ اس نے اسی معتبر ادارے کی پیشانی پر دھبا لگا دیا۔ وہ اس کی آڑ میں غیر قانونی کاروبار کرنے لگا اور مہینوں سالوں میں نہیں بلکہ دنوں میں دنیا کے امیر کبیر لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ ہوگ بے تاج اس کا اپنا ایک Z ہے وہ۔ اپنی آرمی ہے اور اپنے آدمی۔ ایک بڑا لینڈ لارڈ ہی نہیں بلکہ لارڈ مافیا بھی ہے۔

ڈنشا کی بات اگر اس تناظر میں دیکھی جائے تو یہ ایسی غلط بات بھی نہیں، میرے یہ سب کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر آپ کو وہ سینڈز تا ای ڈوبے جہاز کی کھوج درکار ہے تو لولوش جیسے خطرے کو نظرانداز کرنا غیر دانشمندانہ عمل ہوگا۔ سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے خود بھی ابھی تک نہیں پتا چل سکا ہے کہ آخر اس برسوں پرانے ڈوبے بحری جہاز میں ایسا

کیا ہے جس نے آپ سب کا سکون حرام کر رکھا ہے؟"

میں نے اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی۔ ریگٹ بڑے دھیان اور غور سے میری باتیں سنتا رہا۔ سگار اس کے، کثرتِ تمباکو نوشی کے سبب کالے پڑے بدہیئت ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ یہ مجھے اس کے سوچنے کا ایک انداز محسوس ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ہلکے ہلکے قدم مارتا ہوا میرے بالکل قریب آن کھڑا ہوا اور ایک ہاتھ سے اپنے ہونٹوں سے سگار نکال کر انگلیوں میں دبایا پھر دوسرے ہاتھ سے میرا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"ویل جنٹلمین! تم کافی سمجھدار آدمی ہو۔ مجھے اب تمہاری باتوں سے متفق ہونا پڑے گا۔" کہتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے رُکا پھر گہری متانت سے آگے کہنے لگا۔

"پلاننگ تو ہماری اچھی تھی، لیکن نجانے کہاں گڑبڑ ہو گئی کہ لولوش کے آدمیوں کو ہم پر شبہ ہو گیا۔ ڈنشا ہمیں یہی بتاتا تھا کہ تم یعنی لولوش کے "شکار" کہیں اچانک غائب ہو گئے ہو۔ ہم یہی سمجھتے رہے کہ ڈنشا ہمیں بلف کر رہا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں یعنی تم لوگوں کے ساتھ مل کر ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہے یا پھر لولوش سے سازباز کرنے کا خواہاں ہے۔ اب تمہاری زبانی یہ معلوم ہوا کہ ہٹ اور کاٹیج پر حملہ کرنے والے لولوش کے ساتھی تھے، جو نیلی کو یرغمال بنا کر ساتھ لے جانا چاہتے تھے تاکہ ڈنشا کو جھکایا جا سکے۔"

"ایگزیکٹلی یہی بات تھی۔" میں نے کہا۔ "تمہارا شکریہ کہ تمہیں ان ساری باتوں کا اندازہ ہو گیا۔ مجھے بھی یقین کی حد تک شبہ تھا، لیکن جب ہٹ پر کالاہان کا حملہ ہوا تو کالاہان میرے ہاتھوں مارا گیا۔"

"ہاں! میرے جاسوس ساتھی بدستور ڈنشا کی ریکی کر رہے تھے، ہم یہی سمجھے تھے کہ وہ ان سے خفیہ سازباز میں مصروف ہے۔" ریگٹ نے سر ہلایا۔

"اوکے! اب تو ساری باتیں کلیئر ہو گئیں، مسٹر ریگٹ! میں اب بھی یہی چاہتا ہوں کہ سینڈرز والی مہم کو ہم مشترکہ طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور برابری کی سطح پر اس سے سبکدوش ہوں۔" ڈنشا نے اس سے کہا تو ریگٹ مکارانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

"نہیں مسٹر ڈنشا! اب صورتِ حال اور ہو چکی ہے۔ غلطی تمہاری بھی ہے، تم اس مہم کو خفیہ نہیں رکھ سکے اور لولوش کو پتا چل گیا۔ وہ ہماری راہ میں روڑے اٹکائے گا جبکہ تم پر ہمارا اب اعتماد نہیں رہا کہ کیا خبر اور کس وقت تم لولوش سے سازباز کر لو۔ لہٰذا تم اب صرف ہماری رہنمائی کرو گے اور پھر یہاں سے رفوچکر ہو جاؤ گے۔"

میں نے دیکھا کہ ریگٹ کی اس بددیانتی پر... ڈنشا کا چہرہ مارے طیش اور غضب کے سرخ ہو گیا۔ تب ہی میں ہاتھ کھڑا کر کے ریگٹ سے کہا۔

"میرا خیال ہے یہ تم لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے، تم آپس میں اسے سیٹل ڈاؤن کرو، بہتر ہو گا ہمیں اب جانے کی اجازت دی جائے۔"

"اوکے مائی فرینڈز! تم لوگ آزاد ہو اور جہاں چاہو جا سکتے ہو۔" ریگٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ نجانے کیوں مجھے اس کے بدہیئت ہونٹوں کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سی کمینگی محسوس ہوئی، اس کی آنکھوں سے بھی عیاری اور ایک انداز کا دوغلاپن چھلکتا محسوس ہونے لگا۔

"اوکے تمہارا شکریہ! ہمارے ہتھیار ہمیں لوٹا دیے جائیں تو ممنون ہوں گے ہم......"

"ہرگز نہیں۔" ریگٹ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "ان ہتھیاروں کی تم لوگوں کے پاس موجودگی ہمیں شبہے میں مبتلا رکھے گی کہ تم ہمارے خلاف کسی بھی وقت اور کوئی بھی کارروائی کر سکتے ہو۔ یہاں کی پولیس ان واقعات کی وجہ سے حرکت میں آ چکی ہے اور اسی لیے میں نہیں چاہتا کہ مزید کوئی خون خرابا ہو۔ اس وقت کو غنیمت جان کر یہاں سے نکل جاؤ۔" اس کے لہجے میں دھمکی پوشیدہ تھی۔

میرے اندر کا اُبال باہر آنے لگا۔ میں نے ضبط سے کام لیا اور کاندھے اُچکا کر خشک مسکراہٹ سے بولا۔

"اوکے، جیسے تمہاری مرضی۔"

مجھے اپنے محبوب ہتھیاروں کے چھن جانے پر شدید قلق ہو رہا تھا لیکن سرِدست میرے لیے اتنا ہی کافی تھا۔

بہرطور میں نے اُوپری دل اور روایتی انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں سے کھسک جانے کا اشارہ کر کے خود بھی قدم آگے بڑھا دیے۔

"اپنے سائے سے بھی ہر وقت محتاط رہو۔" ذرا دور نکل آنے کے بعد میں نے سرسراتی آواز میں ساتھیوں سے کہا۔ "ریگٹ کسی وقت بھی اس جنگل کو ہمارا قبرستان بنا سکتا ہے۔"

ساتھیوں سے یہ الفاظ کہتے ہوئے خود میں بھی ایک لمحے کو جھرجھرا کر رہ گیا تھا۔ ہم نہتے تھے۔ ریگٹ کو صرف اپنا مفاد عزیز تھا۔

"اس کا شبہ تو مجھے بھی ہے۔" نیلی نے کہا۔ "ورنہ وہ اس طرح آسانی سے ہمیں کیوں جانے دیتا، لیکن بے چارے ڈنشا کی جان کو سخت خطرہ ہے۔" نیلی کی بات پر میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ افسردہ سا لگا۔ کچھ بھی تھی، وہ ڈنشا اس کا بوائے فرینڈ تھا۔ اس کا محبوب تھا... اُسے موت کے منہ میں دیکھ کر نیلی کے دل کا تڑپ جانا عین عشق کی ٹیپیکل تھی۔

انسانیت کے ناتے اگرچہ میرے دل میں بھی ڈنشا کے لیے رحم کا جذبہ اُبھرا تھا، لیکن اس نے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ جو قبیح حرکت کی تو وہ کدورت میرے دل سے اس کے لیے ابھی تک نہیں نکل پائی تھی۔ اپنے لیے میں شاید اسے معاف کر سکتا تھا اور وہ بھی نیلی کی خاطر، لیکن میرے ساتھیوں کی زندگیوں کا سودا کرنے پر میں اسے ہرگز معاف نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے پھر بھی نیلی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "سنو! اس وقت ڈنشا سے زیادہ ہم خطرے میں ہیں۔ ڈنشا کی زندگی ابھی ان کے لیے ایک اہم ضرورت کا درجہ رکھتی ہے جبکہ ہم سے ریگٹ کو خطرہ لاحق رہے گا اسی لیے ابھی فوری طور پر ہمیں اپنی جان کا خطرہ ہے۔"

ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے کہا...... "نیلی! تم فکر مت کرو، تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ڈنشا کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلا جاؤں گا، ہرگز نہیں۔ بس! ذرا ابھی محتاط رہو اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کرتے جاؤ سب۔" نیلی میری بات سن کر مطمئن ہو گئی۔

شکیلہ کے ذہن میں سوال اُبھرا تھا، بولی۔ "شہزی! بھلا ریگٹ ہم سے کیوں کوئی ایسی ویسی حرکت کرے گا؟ وہ تو خود پولیس سے گھبرایا ہوا نظر آتا ہے اور بقول اس کے وہ خون خرابے سے بچنا چاہتا ہے۔ رہا سوال ہمیں موت کے گھاٹ اُتارنے کا تو وہ یہ کام اس وقت بھی کر سکتا تھا جب ہم اس کی قید میں تھے۔"

"میرا بھی شکیلہ جیسا خیال ہے۔" کمیل دادا بولا۔

"یقین سے میں بھی ایسا ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔" میں بولا۔ "لیکن ریگٹ کی بدنیتی عیاں ہو چکی ہے۔ سینڈرز کا سراغ ڈنشا نے لگایا تھا، مدد کے لیے اس نے ریگٹ سے کہا، اب اُصولاً دونوں ایک دوسرے کے پارٹنر تھے، مگر ریگٹ نے یونہی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ مقصد سینڈرز نامی ڈوبے جہاز پر بلاشرکتِ غیرے اپنی اجارہ داری قائم کرنا تھا۔"

"آخر اس مصیبت مارے سینڈرز میں ایسا کون سا خزانہ چھپا ہوا ہے؟" شکیلہ جھلا کر بولی۔ "نیلی! تمہیں تو ڈنشا نے بتایا ہی ہو گا؟" وہ نیلی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

ہم یونہی باتیں کرتے ہوئے کافی آگے نکل آئے تھے، سامنے ہمارے ایک چوڑی نہر کا پاٹ تھا۔

"میرا خیال ہے ہمیں واپس پلٹ کر ریگٹ پر ہلا بولنا چاہیے۔" بلیک کمل جو اتنی دیر سے جانے کس خاموشی میں مستغرق تھا ایک دم رک کر بولا۔ ہم بھی رک گئے۔

ہمارے چہار اطراف میں گہری خاموشی اور تاریکی کا راج تھا۔ اگرچہ چاندنی میں مقدور بھر اریب قریب کا ماحول دکھائی دیتا تھا، اسی میں نہر کی سطح کا پُرسکون بہتا پانی بھی عجیب منظر پیش کرتا تھا۔

"یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔" کمیل دادا نے بھی بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔

"تم غلط سوچ رہے ہو۔" اچانک ایک شناسا اور گمبھیر سی آواز اُبھری۔ ہم سب چونک کر اس طرف کو مڑ کر تکنے لگے۔ تب ہی ہمارے چہرے فق ہو گئے۔ سامنے ریگٹ گن لیے کھڑا تھا۔ اس کے دیگر ساتھی، جن میں ہوپ، جیکسن اور وہی دو حسیناؤں کے علاوہ ان کے دو اور ساتھی بھی مسلح انداز میں ہم پر گن تانے کھڑے تھے۔

میرے ساتھیوں کے چہرے فق ہو گئے تھے، حقیقت یہی تھی کہ خود مجھے بھی اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ بچنے کی کوئی گنجائش تھی بھی نہیں۔

"ریگٹ! یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر قدرے تیز سے لہجے میں کہا۔

"یہ وہی حرکت ہے ینگ مین! جو میں اپنے ٹھکانے پر نہیں کر سکتا تھا۔" وہ زہریلی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "میں اپنے ٹھکانے پر خون خرابا نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن یہ جگہ اس کام کے لیے آئیڈیل ہے۔ سامنے نہر بہہ رہی ہے، جو تم سب کی لاشیں بھی بہا لے جائے گی۔ گڈبائی ٹائیگرز۔" کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے بائی بائی کا اشارہ کیا پھر وہ ہاتھ بھی اپنی گن پر جما کر اپنے ساتھیوں کو مخصوص اشارہ کر دیا۔

اسی وقت ویران جنگل میں...... گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اُبھری تھی۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط :63

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ہوئے والیوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابل نفرت ہے... ایسے ہی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں ناچ کا جواب سیکھنے والوں سے مرلو... بہت موثر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو صبر وہ نے سماج کا محور بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، ملے رنگ کی سنسنی خیز اور نگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... بھٹی کی آوارہ گردی میں ایسے ہی بے شمار دلچسپ سلسلے...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزور احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی۔ شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر درپردہ جرائم پیشہ عناصر کا مکمل دخل تھا۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری امتیاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل داد ا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل داد ا شہزی سے خار کھانے لگا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ یتیم صاحب کے حریف، چوہدری امتیاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا۔ زہرہ بانو یتیم شاہ کی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ بیٹھے بیٹھے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وہ جان چکا ہے جو اس کا سوتیلا باپ ہے۔ اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسکیکرم" کا زونل چیف تھا جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ ریٹائرڈ فورسز کے میجر پاشا ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لہٰذا ان سے نمٹنے کے لیے شہزی کو انفرادی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاشا کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسکیکرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ بی جی (جیوش پولیس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور بی جی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر فیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ الیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری مرحلے پر پہنچ جاتی ہے۔ جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ الیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹارگٹ ہے اور دوسری طرف عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام مجاہد اور غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھگوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں ایک وقت اسکیکرم اور بلیو ٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل داد ا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل داد ا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک الماس خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہ شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے قبضے میں آجاتا ہے۔ ٹائیگر فیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز رانی کمپنی الیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کو مارا، شہزی کو ٹائیگر فیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک کوٹھری نما جیل میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی ہشام جھکڑی سے ہوتی ہے جو کبھی اسکیکرم کا ایک معمر انجینئر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں سونے جو دوسرے برآمد ہونے والے طلسم نوسیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی جی بھگوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کو مارا کی بوٹ میں بلیو ٹمسی کے چند ماتحت ہشام اور کو دیکھا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹمسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں۔ وہاں پہلی بار بلیو ٹمسی کے چیف سی جی بھگوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا۔ تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی۔ یوں بھگوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس کا بری قصاب سے جی کو مارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے۔ وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مشکل ترین گھڑیوں کے باوجود وہ اس جھولی سی بستی میں تھے کہ کچھ چور ساتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھگوانی تھا۔ یہی ان کی منزل تھی۔ سوہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ دوسرا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی بیٹی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے والا معاملہ تھا۔ شہزی ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹمسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھگوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بڑے سے کارڈ پر مارا ہوا تھا۔ سی جی بھگوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مارگلہ سکا کر شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور تکیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی دنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے بی بی جوالی کو تیار کرتا ہے۔ جوالی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اسی اثنا میں گر ریلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کالی منہاوڑ'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں شہزی کی جوالی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو جیجی کا ایک بڑا سمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کالی منہاوڑ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جہازی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے ہوائی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور لڑکی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں صرف کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ اضطراری طور پر دوڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر نیم کلا اور اس کی بیٹی سونگ کلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور وہ اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ٹھاکر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں بری مسلم گروپ کا ٹھاکر ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب معلوم ہوتا ہے کہ نیم کلا کو بے گناہ اور مظلوم پوری مسلم [illegible] ہے تو وہ نیم کلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر نیم کلا انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کالی منہاوڑ [illegible] ہے۔ شہزی ان کے ایک ساتھی کو وہاں قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ [illegible] جنرل کے ایلچی ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور [illegible] کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کئی جنگجو [illegible] سردار کو مار کر پورے جزیرے کو غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیکھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ [illegible] اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے [illegible] کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں وہ دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے بچتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی ابیرو یا لو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ادم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہنواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں [illegible] نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہنواز خان ادم کے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ ادم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کراتا ہے۔ پولیس مقبول خیر اور تکیل دادا کو گرفتار کر کے لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہنواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہنواز کی بیٹی سونمبری بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لالق مانجھی لالچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونمبری کو دولت کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لالق مانجھی کے ساتھی عاقب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونمبری کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہنواز کے خفیہ اڈے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس جرم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت ملتان کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ حافظ [illegible] کی قید میں ہے۔ حافظ کو رہائی دلا کر وہ [illegible] کو ترن سے [illegible] میں دے دیتا ہے۔ پھر زہرہ کے [illegible] اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں حافظ کی رہائی کے لیے تکیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا [illegible] سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی [illegible] کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سابلی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاساکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر [illegible] جان سے ٹکرا ہو جاتا ہے۔ تاریخی لڑائی کے بعد [illegible] جان کو [illegible] کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ [illegible] جان کے خاتمے کے بعد کاساکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی [illegible] میوزیم سے چرا لیا گیا تھا اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اس کے لیے کاساکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈالف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ [illegible] کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈالف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈالف مارا جاتا ہے۔ روڈالف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ گوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو [illegible] کے صحرا میں اتارا جاتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے جہاں شہزی سے دوبدو لڑائی میں گوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز [illegible] ایئرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

موت... کی عجب ہی ایسی نرالی ہوتی ہے۔

کبھی جھلک دکھا کر لوٹ جاتی ہے اور کبھی غیر متوقع انداز میں آن دبوچتی ہے۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ بڑے بڑے حوادث اور پُرخطر حالات کی گود میں اٹکی رہنے والی زندگی کب اور کس وقت اچانک ایک ذرا سی جنبش کی زد میں آکر یکسر موت کی زد میں آجائے۔

بھلا ہمارے سان گمان میں بھی یہ ہو سکتا تھا کہ ہم ریگن جیسے تیسرے درجے کے ایک طالع آزما مجرم گروہ کے ہاتھوں یوں اچانک اور بے بسی کی حالت میں مارے جائیں گے؟

ریگن اور اس کے ساتھیوں کی گولو کے آتشیں قہقہے اگلنے سے شاید ایک، آدھ پل ہی سنسنانہ خیال میرے ذہن میں ابھرا ہوگا کہ پھر وہ ہوگیا جس کی مجھے تو کیا شاید ان لوگوں کو بھی توقع نہ ہوگی۔

گولیاں کس نے کس پر چلائی تھیں اور مرنا کس نے تھا، ہوگیا اس کے برعکس۔

ریگن اور اس کے ساتوں ساتھی، جنہوں نے ہم پر گولیاں برسانا تھیں، خود کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آکر چیختے چلاتے گرنے لگے۔

”زمین پر لیٹ جاؤ۔“ میں چلایا۔ ساتھیوں نے فوراً تقلید کی اور...... اسی وقت جب یہ ”رقصِ اجل“ کا بھیانک کھیل ختم ہوا تو ایک کڑک دار تحکمانہ سی آواز ابھری۔

”خبردار...! تم میں سے کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔“

میں جو اس موقع کو غنیمت جان کر خود کو گراتے ہی ”ویڈزون“ سے رینگ کر کھسکنے کے چکروں میں تھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی یہی تلقین کرنے والا تھا کہ اس آواز پر وہیں جام ہوگیا۔

گولیوں کی سمع خراش دھڑدھڑاہٹ کے بعد ماحول پر اعصاب شکن جمود طاری ہوگیا تھا۔ خاموشی تک منحوس معلوم ہوتی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اگلی باری ہماری بھی آسکتی تھی، لیکن اس سے ان نامعلوم حملہ آوروں کا حکم ماننا مجبوری تھی۔

ہم سب اٹھ کھڑے ہوگئے اور ہماری نظر جیسے ہی ان پر پڑی تو ہمارے چہرے ہست کررہ گئے۔

وہ سب کوئی آٹھ دس کی تعداد میں ہوں گے اور ان کے جسموں پر پولیس کی مخصوص وردی تھی۔ ان سب کے ہاتھوں میں جدید اسلحہ دبا ہوا تھا۔ ان میں دو نوجوان پولیس لڑکیاں بھی تھیں اور پولیس کی چست یونیفارم میں وہ خاصی خوب رو اور اسمارٹ نظر آتی تھیں۔

ان میں ایک بھاری بھرکم جسامت کے حامل شخص کی اضافی ”اسٹارز“ والی وردی اسے آفیسر ظاہر کرتی تھی... ایک سرخ اور سفید رنگت... کا دبنگ سا شخص نظر آتا تھا۔ خاصا قدآور اور کسرتی جسم کا مالک...... تھا۔ اس کا آدھا سر بالوں سے عاری تھا اور وہاں سے گنج صاف دکھائی دے رہا تھا... بی پیچھے کی طرف کے بالوں اس نے لمبے چھوڑ کر ایک چوٹی سی بنائی تھی جو اس کی پشت پر اسی طرح جھول رہی تھی جیسے گھوڑے کی دُم ہو۔

چہرے مہرے سے وہ خاصا سخت گیر ہی نہیں بلکہ بے رحم بھی نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ ناک موٹی اور عجیب انداز میں آگے سے ذرا مڑی ہوئی تھی۔ جسم پر ہاتھوں اور گردن کے قریب تک بال ہی بال تھے، اس پر ایک بالوں بھرے ”جھبرے“ آدمی کا گمان ہوتا تھا۔

مجھے اس کی عمر کا اندازہ پچاس، پچپن کے درمیان ہی ہوا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اپنی پلٹن میں صرف وہی غیر مسلح تھا، ماسوائے ایک بڑے سے ڈنڈے کے جو اس کے دائیں ہاتھ میں متحرک رہا تھا۔ اس کی شکل اور انداز و اطوار دیکھتے ہی لگتا تھا جیسے یہ فوری ایکشن لینے کا عادی ہو۔

کچھ بھی تھا، پولیس کی جانب سے ایسا اچانک ”ایکشن“ ماورائے قانون اور حقوقِ انسانیت کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا تھا۔

ایک بات اور میں نے نوٹ کی تھی، ان کے یونیفارم میلے اور مسکے ہوئے لگتے تھے۔

”تم سب کھڑے ہو جاؤ اور سیدھی لائن بنا لو جلدی...... ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے، ورنہ تم سب کا بھی حشر ان سے مختلف نہ ہوگا۔“ وہ گرجتی آواز میں تحکمانہ بولا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔

ہم نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور اس کے اگلے حکم کے مطابق اپنے دونوں ہاتھ بھی کھڑے کر دیے۔ منہ دوسری جانب گھما لیے۔

ایک بار پھر پُرشور دھڑکتی ہوئی خاموشی طاری ہوگئی تھی، ماحول پر۔ میرا دل بھی تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب تنے ہوئے تھے۔ سانسوں کا تموج آپوں آپ بڑھنے لگا تھا۔

نجانے اب ہمارے ساتھ کیا ہونے والا تھا، یہ نفسا

بھی غیر یقینی اور خطرناک سی محسوس ہوتی تھی۔ ایسے میں اچانک وہی دو اسمارٹ اور خوبرو سی لڑکیاں جو پولیس کی ڈارک بلیو پینٹ اور ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ میں ملبوس تھیں، ہماری جانب بڑھیں۔

ان دونوں نے بڑی مہارت اور تیزی کے ساتھ ہماری جامہ تلاشی لی۔ اس کے بعد ہمیں ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔

"آفیسر...... ہمارا...... ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔" بالآخر میں نے ہمت کر کے بن مانس نما پولیس آفیسر سے کہا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا میرے شانے سے ٹچ کر دیا۔ ایک خطرناک اسپارک چمکا اور مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا۔ بے اختیار میرے حلق سے اذیت بھری چیخ خارج ہوگئی۔

ایک تیز شاک کی لہر تھی جیسے میرے پورے وجود میں اترتی چلی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے میں اپنا توازن بھی برقرار نہ رکھ سکا اور چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑاتا چلا گیا۔ میرا دماغ تک جھنجھنا کر رہ گیا تھا۔

جہاں اس نے مجھے شاک دیا تھا وہاں مجھے اپنی قمیص ہی نہیں کھال جلنے کی بو بھی۔۔۔ محسوس ہوئی تھی۔ اب میں نے جانا تھا کہ وہ ڈنڈا کوئی عام شے نہ تھا۔ وہ ایک الیکٹرک راڈ تھا۔ جس میں یقیناً کوئی طاقت ور بیٹری نصب کی گئی تھی۔

ایسے بجلی کے جھٹکے دینے والے ڈنڈے میں نے امریکی پولیس والوں کے ہاتھوں میں اکثر دیکھے تھے۔

"اب اپنی زبان کو تالو سے چپکائے رکھنا جب تک کہ میں تم سے خود کچھ نہ پوچھوں، سمجھ گئے؟"

وہ خرانٹ امریکی آفیسر میرے قریب آکر جتاتے ہوئے لہجے میں بولا تو مجھے اس کے لہجے میں غراتی ہوئی خونخواری صاف محسوس ہوئی تھی۔ میں نے ہانپتے ہوئے اس کی جانب دیکھا اور ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے دی۔ میں نے اس کی شرٹ پر لگے اس کے نام کے ٹیگ پر نظر ڈالی، جس پر ڈپٹی شیرف ڈسمنڈ ویرٹ درج تھا۔

ہمیں ایک قطار کی صورت ایک طرف کھڑے رہنے کا حکم دے دیا گیا۔

ایک دوسرے سے سرگوشی میں بھی بات کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی ہمیں۔ اس کے بعد ہمارے دونوں ہاتھوں کو پشت کی جانب کر کے ہتھکڑی لگا دی گئی۔

اب ہم اپنی کھلی آنکھوں سے انہیں جو کچھ کرتا دیکھ رہے تھے وہ ایک عام فرد کی حیثیت سے بھی ہمارے لیے سخت اچنبھے کا ہی باعث تھا۔

ریگٹ اور اس کے ساتھیوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا عمل بڑا سفاکانہ تھا۔ ان کے جسموں سے پتھر باندھ کر انہیں قریب بہتی نہر کے سپرد کر دیا تھا۔ نہ کوئی ریکارڈ نہ کوئی تفتیش کے لیے "کرائم سین" کا کنٹرول۔ کسی شے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

یہ سب ہم اپنی حیرت سے پھٹی آنکھوں سے تک رہے تھے۔ مجھے تشویش تھی کہ کیا یہ پولیس آفیسر یہاں سیاہ و سفید کا مالک تھا؟ اپنا ماورائے قانون جرم چھپانے کے لیے وہ اس پر یوں پردہ ڈالنے کا عادی تھا تب یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کر سکتا تھا۔

"تم لوگوں کو میرے اس عمل سے یقیناً حیرت ہو رہی ہوگی۔"

اس کام سے نمٹنے کے بعد ڈپٹی شیرف ڈسمنڈ ہماری جانب گھوم کر عجیب سے لہجے میں بولا۔

"اس کا جواب میں تم لوگوں کو ضرور دوں گا لیکن اپنے ٹھکانے پر چل کر۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں کو کوئی مخصوص اشارہ کیا اور پھر وہ سب چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت میں آگئے۔

میرا خیال تھا کہ اسے اپنے "ٹھکانے" کے بجائے "آفس" کا نام لینا چاہیے تھا۔

صاف بات تھی کہ مجھے اس کی طرف سے ایک تشویش ناک سی شمہ بد لگی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا تھا؟ اسے کیسے ان ساری باتوں کا پتا چلا ہوگا؟ اور پھر یوں ایک دم فاسٹ ایکشن پولیس تب ہی لیتی ہے جب مجرموں کی طرف سے حملے کی توقع ہو یا کوئی "پولیس مقابلہ" ہو۔ وہ ریگٹ اور اس کے ساتھیوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا اور خبرداری کا اشارہ بھی دے سکتا تھا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اسے ڈر ہو کہ اس کے خبردار کرتا یا للکارنے سے پہلے ہی ریگٹ اور اس کے ساتھی ہم پر گولیوں کی بارش کر ڈالتے۔ کچھ بھی تھا، یہ بات ہضم نہیں ہوتی تھی کہ اتنی تیز کارروائی کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

یہ سب سوچتے ہوئے میرا دھیان ڈنشا اور ریگٹ کے

اور ساتھیوں کی طرف بھی گیا تھا۔ نجانے وہ کہاں ہو سکتے تھے؟ کیا وہ ان کی نظروں میں آئے بھی تھے یا پھر وہ کوئی خطرہ بھانپ کر ادھر ادھر رفوچکر ہو گئے تھے۔ رانٹ کا کیا بنا تھا؟

یہ سب وہ سوالات تھے جن کے جواب مجھے جلد از جلد چاہیے تھے۔ لیکن یہ پاگل سا پولیس شیرف مجھے بولنے کا موقع ہی کب دے رہا تھا۔

بہرکیف... ہم چند قدم پیدل چلتے رہے، اس کے بعد دو گاڑیاں ہمیں ایک گھنے درختوں کے جھنڈ کی طرف کھڑی نظر آ گئیں۔ ان میں ایک وین اور دوسری کار تھی۔ وین پر جلی حروف میں پریزن وین لکھا تھا۔

کار میں شیرف ڈسمنڈو دو عدد ساتھیوں کے ساتھ سوار ہو گیا جبکہ ہمیں اپنے باقی ساتھیوں کے ساتھ پریزن وین میں سوار کرا دیا گیا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ وین بالکل بند تھی۔ اس میں سوائے چار پانچ انچ کے چوکور سوراخ کے کوئی روزن نہ تھا، اسی سوراخ سے کبھی کبھار کوئی پولیس مین جھانک کر ایک مستعار سی نظر اندر ڈال لیتا تھا۔

میرا اشارہ ملاحظہ کرنے کے بعد میرے ساتھی خاموش تھے۔ لیکن میری طرح یقیناً ان کے اندر بھی تشویش کی ایک نامعلوم سی کھچڑی پک رہی تھی۔ پولیس کے ہتھے ہمارا چڑھنا ایک تو یوں بھی ہمارے مشن کے سراسر خلاف جاتا تھا، پھر ایسے سخت گیر اور بے رحم پولیس آفیسر کی گرفت میں جانا جو ماورائے قانون اپنی وردی استعمال کرنے کا عادی لگتا تھا اور بھی زیادہ فکر و پریشانی کی بات تھی۔

بہرحال... اب ہمارے پاس ماسوائے خاموشی اور تن بہ تقدیر ہونے کے کوئی چارہ نہ تھا، یہی کیا کم شکر تھا کہ ہم دغاباز ریکس اور اس کے سفاک ساتھیوں کے ہاتھوں فوری موت سے بچ گئے تھے، کیونکہ اگر یہ پولیس پارٹی عین وقت پر نہ آتی تو ہم سب گئے تھے۔

جنگل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہی چھدرا ہونے لگا اور کچھ رہائشی کاٹیج اور بنگلہ ٹائپ رہائشی عمارتیں نظر آنے لگیں جو ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر بنی ہوئی تھیں۔ لوگ خال خال ہی نظر آ رہے تھے، حیرت تھی کہ دیگر جزائر کے مقابلے میں یہاں آبادی کم ہی دیکھنے میں آئی تھی۔ ایک ہی سڑک تھی، یا پھر دو ایک مزید ذیلی سڑکیں دائیں بائیں مڑتی نظر آئی تھیں۔

میں حیران ہوا کہ اتنی کم آبادی والے جزیرے میں پولیس نے اپنا "ٹھکانا" یا جسے ہیڈکوارٹر یا پولیس اسٹیشن کہنا زیادہ مناسب تھا، بنایا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے ذیلی شیرف ڈسمنڈو کی عمل داری میں دیگر جزائر بھی آتے ہوں، کیونکہ ان میں چند جزیرے تو ساتھ ہی ملے ہوئے تھے۔

ایک بات پر میں ٹھٹکا تھا کہ آخر کیا بات تھی کہ شیرف ڈسمنڈو نے اسی جزیرے کو ترجیح دی تھی جہاں سے ہوگ بے کا جزیرہ ملحق تھا۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟

ایک خوامخواہ ہی کھد بد میں ڈالنے والی میری اس سوچ میں بظاہر کوئی ایسی بات تو نہ تھی، مگر لگتا ایسا ہی تھا کہ یہ حرکت شیرف ڈسمنڈو کی دانستہ نہیں ہو سکتی تھی۔

کیا ایسا لولووش کے ایما پر ہوا تھا؟ کیا لولووش خود یہی چاہتا تھا کہ اسے پولیس کی سرپرستی ذرا "قریب" سے حاصل رہے۔ اگر ایسا تھا تو پھر کوئی بھی ہمیں لولووش کی قید میں جانے سے اب نہیں روک سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس خطرناک اور پُراندیش خیال نے میری فکر و تشویش کو فزوں تر کر دیا تھا۔

اگر ایسا تھا جس کے آثار کچھ کچھ...... نظر آ رہے تھے، تو یہ ایک ایسی ہی بات تھی کہ ہم ایک چوہے دان میں پھنس کر یا کسی ڈربے میں سجا کر لولووش کو عنقریب پیش کیے جانے والے تھے۔

لگ بھگ کوئی دس پندرہ منٹ کی مزید سست رو ڈرائیونگ کے بعد ہماری وین ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دروازہ کھولا گیا اور ہمیں نیچے اتارا گیا۔

بند وین سے باہر آتے ہی میری گردشی نظروں نے قرب و جوار کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ایک نیم میدانی سے قطعہ اراضی پر گول شکل کی وہ مختصر سی نیلی اور سفید عمارت ایسی ہی نظر آتی تھی جیسے پرانے وقتوں کا کوئی سرائے خانہ ہو بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ یہ سرائے ہی ہو، بعد میں اسے پولیس ڈپارٹمنٹ کے حوالے کر دیا گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی یہ کسی اور کام میں مستعمل رہ چکی ہو۔

میرے تصور میں اس ونگ سے پولیس آفیسر کے "ٹھکانے" کا تصور کوئی جدید طرز کی چمکتی دمکتی سی عمارت تھی۔ جہاں وسیع و عریض میدان میں کہیں تھانہ بھی ہوتا اور کچھ گاڑیاں بھی کھڑی رہتیں۔ خاردار باڑ، سخت سکیورٹی اور وہی کچھ جو ایسے ادارے کا خاصہ ہوتا ہو۔ لیکن یہ تو مجھے بھوت نما عمارت نظر آتی تھی۔ جگہ جگہ پلستر اکھڑا

تھا۔ درمیان میں بے مصرف اور بے ڈھنگا سا بے وجہ گنبد، دخانی انجن والے ریل کی پرانی طرز والی بوگیوں جیسی کھڑکیاں۔ ان میں بیشتر ٹوٹی ہوئی تھیں جنہیں ٹین کی چادر یا چوبی شیٹوں سے کیلیں ٹھونک کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا تھا۔ یوں کھڑکیوں کا تناسب بس اسی قدر تھا کہ جنہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا تھا۔

چھت کا حال بھی ایسا ہی تھا۔ شکستہ منڈیریں، وہاں بھی کہیں کہیں برساتی گھاس اگی ہوئی تھی۔ احاطہ نام کو نہیں تھا اور سامنے مرکزی دروازہ تھا۔

اندر کا ماحول بھی باہر کی طرح شکستہ تھا۔ تنگ سی راہداری تھی جہاں روشنی مدھم تھی۔ چند کمروں کے سنگل پٹ والے دروازے نظر آتے تھے۔ ہمیں کمرے میں لاکر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ یہ کمرا نسبتاً بڑا اور کچھ بہتر حالت میں دکھائی دیتا تھا بلکہ یہ کمرا شیرف ڈسمنڈ کا ہی تھا۔ دروازے کے سامنے ایک بڑی سی میز لگی ہوئی تھی جہاں ایک ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ مزید عمومی استعمال کی چند اور دفتری اشیا بھی اسی طرح سجی ہوئی تھیں۔

اے سی لگا ہوا تھا۔ روشنی بھی ٹھیک تھی۔ فرنیچر کے نام پر میز اور بھاری بھرکم کرسی کے علاوہ بائیں جانب کی دیوار سے ایک کاؤچ رکھا تھا۔ دو کرسیاں سامنے تھیں۔

کمرا صاف تھا۔ شیرف نے اپنی کرسی سنبھالی۔ اندر اس کے ساتھ صرف دو پولیس مین داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید کمرے سے باہر ہی اپنی جگہیں سنبھال لی تھیں۔

شیرف نے اپنی کرسی سنبھالی، ایک سگریٹ سلگایا اور گہرا کش لینے کے بعد ہمارے چہروں کو باری باری تکنے کے دوران گمبھیر سی دھمکاتی آواز میں بولا۔

"یہ میرا آفس ہے، امریکی حکومت نے مجھے یہاں کا انچارج بنایا ہے لیکن میں اسے اپنا ٹھکانا اس لیے کہتا ہوں، کہ یہاں صرف میرا حکم چلتا ہے۔ کسی اوپر کے حکم نامے کے بغیر یہاں جو مجرم لائے جاتے ہیں، وہ ایک نمبر کے چھٹے ہوئے بدمعاش ہی نہیں بلکہ پولیس کو دھمکیاں دینے والے بھی آتے ہیں۔ میں ایک سیکنڈ میں یہاں ان کی اکڑفوں ہوا کر دیا کرتا ہوں۔ کس طرح دیکھو یوں"

ڈرامائی انداز میں یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک سیاہ نال والا پستول نکالا اور شکیلہ کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ کمرے کے محدود ماحول میں گولی چلنے کے دھماکے اور شکیلہ کی چیخ نے میرا دل دہلا کر رکھ دیا۔

مجھ سمیت ہم سب کی نظریں شکیلہ کی جانب اٹھتی چلی گئیں۔ اسے زندہ دیکھ کر میرے اندر طمانیت سی بھر گئی تھی، مگر میرے اعصاب جیسے یکلخت سن ہو کر رہ گئے تھے۔

شیرف ڈسمنڈ کی یہ حرکت اس قدر خطرناک اور سفاکانہ تھی کہ کسی کا بھی دل خوف سے جکڑا جاسکتا تھا۔

ڈسمنڈ کی چلائی ہوئی گولی شکیلہ کے سر سے صرف ایک دو انچ اوپر دیوار میں پیوست ہو گئی تھی۔ بے چاری خود شکیلہ بری طرح دہشت زدہ نظر آنے لگی تھی۔ تاہم وہ اب خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے گھورتی ہوئی نظر سامنے میز پر دونوں ٹانگیں رکھے، اطمینان سے سگریٹ پیتے ہوئے شیرف پر ڈالی۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول ہنوز حرکت کر رہا تھا جس کی نال سے دھوئیں کی لکیری بلند ہو رہی تھی۔ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنی چندیا سے کھیل رہا تھا۔

اب یہ شیرف سفاک ہی نہیں پاگل اور جنونی بھی لگا تھا۔

"آں... آں .... میری اجازت کے بغیر کوئی نہ بولے۔" اس نے اچانک پستول کی نال کا رخ جیکی کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

وہ شاید اس سے کچھ کہنے لگی تھی مگر ڈسمنڈ نے اس کے ہونٹوں کی جنبش سے اندازہ لگاتے ہی کہہ ڈالا تھا۔ جبکہ مجھ سمیت جیکی، جولا اور شکیلہ خاموش ہی تھے، شاید میری طرح وہ بھی خاموشی سے اس پاگل جنونی آفیسر کی "سائیکی" کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جیکی کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا۔

اس نے اپنی نصف جلی سگریٹ کو میز پر پڑی ایش ٹرے میں مسلا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ پستول ہنوز اس کے ہاتھ میں ہی حرکت کر رہا تھا۔

"ہاں! تو میں کہہ رہا تھا کہ مجرموں سے نمٹنے کا میرا طریقہ کار ذرا مختلف ہے بلکہ میرے بعض ناقدین کے نزدیک پاگلانہ بھی ہے۔ لیکن یہ لوگ مجرموں کی نفسیات سے اتنی واقفیت نہیں رکھتے جتنی کہ میں رکھتا ہوں اور میں اسی طرح سب سے پہلے ان کی نفسیاتی رگ کو ہٹ کرتا ہوں۔ خیر....."

وہ کہتا ہوا رکا اور اب ہمارے بالکل سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ اب باری باری ہم سب کے چہرے غور غور سے دیکھنے لگا۔ پھر جیکی اور شکیلہ کی جانب بڑھا۔ جیکی کو دیکھ کر اس نے حریصانہ انداز میں آنکھ ماری۔ جیکی نے منہ بنا کر

چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔

میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا، کیونکہ اب وہ شکیلہ کی سمت گھوم گیا تھا اور اس کی جانب گویا اپنی آنکھوں کے ذریعے باہر نکال کر دیکھنے لگا۔ پھر پستول کی نال سے اس کے گھنے ریشمی بالوں کو چھوا۔

"سوری۔۔۔! میں نے تمہیں ڈرا دیا تھا۔" وہ بولا۔

اس کی مراد شاید اسی فائر سے تھی جو اس نے شکیلہ کے سر سے اوپر دیوار پر داغا تھا۔ وہ اب اسے قدرے جھک کر بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس پر جھک کر گھورنے لگا۔ اس کا بدنما چہرہ شکیلہ کے چہرے کے بالکل قریب ہوگیا تھا، اس قدر قریب کہ بے اختیار شکیلہ کو اپنا چہرہ دوسری جانب موڑنا پڑ گیا تھا۔

"ہائی گاڈ! تم واقعی بہت حسین ہو۔ بالکل الگ ہی نوعیت کا حسن ہے تمہارا۔" وہ عجیب بوالہوسی سے بولا۔ "میری تینتیس سالہ پولیس لائف میں یہ تجربہ مجھے بڑا اچھا لگا کہ بعض بڑے بڑے خطرناک مجرموں کی ساتھی لڑکیاں خوب صورت اور غیر معمولی حسن کی مالک ہوتی ہیں۔ اس میں تم بھی شامل ہو۔" اس نے سیدھے کھڑے ہوکر ذرا سر گھمایا اور بجلی کی جانب دیکھا۔

"ہم مجرم نہیں ہیں آفیسر۔۔۔!" بالآخر شکیلہ نے اس سے بہت دھیرے سے کہا۔

ایسے ہی لمحات میں مجھے ڈر ہوا کہیں یہ سنکی سا آفیسر پھر نہ جھٹکے سے اکھڑ جائے، لیکن شکر رہا کہ ایسا کچھ ہوتا نہیں نظر آیا۔

اس کے برعکس ڈسمنڈ نے ایسی بات کہہ ڈالی کہ میں خود حیران ہوگیا۔ وہ شکیلہ کی بات پر اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں اس کا فیصلہ جلد کر دوں گا کہ تم کون ہو، کیا ہو؟ اور تمہارا اس سارے معاملے میں کیا اور کتنا قصور ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ گھوما اور وہاں موجود اپنے دو ساتھیوں سے کچھ کہا۔

میں نے دیکھا سوائے میرے سب کو وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ میرا دل ایک انجانے خدشے تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔

اسے مجھ سے کوئی بات کرنا تھی اور اب تک یہ مجھے یوں نظر انداز کیے ہوئے تھا جیسے میں اس کے لیے ایک عام آدمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا اور اب یہ صورت حال تھی کہ اس نے میرے سارے ساتھیوں کو بھجوا دیا تھا اور مجھے یہاں روک لیا تھا۔

میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اس نے بدستور اسی طرح کھڑے کھڑے مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور دھیرے سے سر کو اثباتی جنبش دیتا ہوا دوبارہ اپنی چیئر پر جا بیٹھا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھ لیں۔ پستول بھی میز پر ڈال دیا۔

اس کے بعد سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ کا انتخاب کیا اور اسے ہونٹوں تلے داب کر لائیٹر دکھایا۔

ایک گہرا کش لے کر دھواں فضا میں اگلا اور پھر گاڑھے کثیف مرغولوں کے عقب سے اس کی کھرکھراتی سی آواز ابھری۔

"لولوش کے ساتھ تمہارا کب سے معاملہ چل رہا ہے؟"

اس کا سوال سنتے ہی میں یکدم سناٹے میں آگیا۔ یوں لگا جیسے میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہوگئی ہو۔ اس کا لولوش سے متعلق پوچھنا خالی از علت نہ تھا، جو اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ اس کا لولوش سے کوئی خفیہ گٹھ جوڑ ضرور ہے۔

لہٰذا میں نے بھی تھیلے سے بلی کو جلد از جلد برآمد کرنے کے لیے بغیر کسی آناکانی کے صاف کہہ ڈالا۔

"لولوش سے میرا معاملہ زیادہ پرانا بھی نہیں اور کچھ اٹکایا بھی نہیں۔"

میرے اس "ڈپلومیٹک" جواب پر ڈسمنڈ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہم۔۔۔۔! نوعیت تو تمہاری اس سے دشمنی کی کچھ زیادہ ہی چپقلش بھی ممکن ہے مگر تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے اس کی شہ رگ تک پہنچنے کے لیے جس طرح دلیری اور ذہنی فراست، کامیاب حکمت عملی سے کام لیا ہے، وہ لائق ستائش ہے۔"

کہتے ہوئے اس نے تالی بجا ڈالی۔ میں اب ایک عجیب سے مخمصے کا شکار ہوگیا۔ کہاں تو مجھے اس پر شبہ ہو رہا تھا کہ وہ لولوش کی کسی طرف داری کی کوشش کرے گا لیکن یہاں تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ معاملہ وہ نہ تھا جو میں سمجھے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بتاؤ کہ ریکٹ جیسے کرمنل آدمی کے چنگل میں تم کیونکر پھنس گئے؟ وہ تو کسی برسوں پرانے ڈوبے جہاز کا ملبا تلاشنے کے لیے پاگل ہوا جا رہا تھا، تمہارا یہ مشن کون سا تھا؟" ڈسمنڈ نے اگلا سوال داغ ڈالا۔

اب تو مجھے صاف محسوس ہونے لگا تھا کہ معاملہ یقینی طور پر کچھ اور تھا جس سے میرے دل کو کافی حد تک تسلی ہونے لگی کہ...... یہاں ہمارے ساتھ روایتی پولیس والا سلوک نہیں ہوسکتا۔

میں نے اس کے سوالوں اور اس کے پس منظر کو اپنے تئیں بھانپتے ہوئے اسے ابتدا سے لے کر اب تک کی ساری حقیقت بتا ڈالی۔

”ہم...... تمہاری بات لگتی تو ایک کہانی ہی ہے بشرطیکہ مجھے بھی اس کا علم نہ ہوتا۔“ اس نے عجیب اسراری لہجے میں کہا اور مجھے چونکا دیا۔ وہ پہلے ہی سے یہ سب جانتا تھا، اب بھلا اس کا لولووش کے ساتھی ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا تھا۔

بالآخر میں نے کہا۔ ”کیا تم لولووش کے مفادات کے لیے کام کرتے ہو؟“

میں جانتا تھا کہ میرا یہ سوال فضول ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی تھا۔ وہ بھلا مجھے میرے اس سوال کا کیا جواب دے سکتا تھا سوائے اثبات میں جواب دینے کے۔

لیکن میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اگر ایسا کچھ تھا بھی تو وہ جلد اور ادھر ہی ظاہر ہو جاتا تاکہ میں اپنے طریقے پر چلنے کی حکمت عملی تیار کر لیتا۔

”ہاہا...... ہاہا......“ شیرف ڈسمنڈ اپنے حلق سے ایک بے ہنگم قہقہہ خارج کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار اس نے اپنی میز کی سطح سے پستول نہیں بلکہ وہی الیکٹرک شاک دینے والا ڈنڈا اٹھا لیا۔ مجھے ڈر ہوا کہیں یہ بدبخت پھر مجھے اس اذیت ناک بجلی کے جھٹکے سے دوچار نہ کر دے جبکہ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی بندھی ہوئی تھیں اور وہ بھی پشت کی جانب لیکن میرے دونوں پاؤں تو آزاد تھے۔

تب ہی میں نے بھی اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب اس نے ایسا کیا تو میں اس پر اپنی ٹانگیں آزما ڈالوں گا اور اسے بے بس کرنے کی کوشش کروں گا، کیونکہ مجھے اب پورا یقین ہو چکا تھا کہ وہ میرے رذیل ترین دشمن لولووش کا ایک ”ٹاؤٹ“ ہی تھا۔

وہ میرے قریب آ گیا۔ میرے اعصاب تن گئے اور رُواں رُواں جوش سے پھڑکنے لگا۔ وہ مجھ سے صرف چند قدموں کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں بھی اس کے مزید قریب آنے کا منتظر رہا۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا۔ مجھے ”ہِٹ“ کرنے کے لیے ابھی اسے مزید دو تین قدم اور اٹھانے کی ضرورت تھی۔ میں مایوس ہونے لگا۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔

اب میں سوائے اس کے بولنے کے منتظر رہنے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

”تم نے اپنی طرف سے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے مگر میری طرف سے اندازہ بالکل غلط ہے بلکہ اس کے الٹ ہے۔“

اس نے کہا اور مجھے یوں لگا جیسے یہ کم بخت سنکی اور بالکل جنونی پولیس آفیسر مجھے بھی اپنے جیسا کر دے گا۔ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں فقط اتنا ہی کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ — لولووش پر جس قدر تم خار کھائے بیٹھے ہو اسی قدر میں بھی اس پر بھنا بیٹھا ہوں۔“

”کیا...... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس نے بھلا تمہارا کیا بگاڑا ہوگا؟ تم تو خود ایک بااختیار پولیس آفیسر ہو۔“

مجھے اس کی بات پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ یہ کسی مقصد کے تحت مجھے جُل دینے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر میرے آگے کوئی چارہ ڈالنے کی کوشش میں تھا، جیسا کہ میں اکثر اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔

”وہ تو میں ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اسی لیے تو اس حرام خور لولووش کی ناک کے نیچے بیٹھا اس کے سینے پر مونگ دل رہا ہوں۔“ اس نے اپنی بات مکمل کی۔

مجھے اب بھی اس کی بات پر ایک فیصدی یقین نہیں تھا۔ لگ ایسا ہی رہا تھا جیسے یہ کوئی چال چلنے کی کوشش کر رہا ہو اور مجھے استعمال کرنے کی غرض سے یہ سب کہہ رہا ہو۔ اسی لیے میں نے بھی اپنا پرانا دفاعی ہتھیار آزماتے ہوئے فی الحال اس کی ہاں میں ہاں ملانا یا اس کی بات کا یقین کرنا ضروری سمجھا، کیونکہ ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک پولیس آفیسر اگر لولووش کا دشمن تھا تو وہ اتنا بااختیار یا دلیر کیسے ہوسکتا تھا کہ لولووش جیسے درندہ صفت اور عادی بدمعاش کے سامنے اس کی کچھار کے قریب کیسے ٹکا بیٹھا رہ سکتا تھا؟ بھلا لولووش کے لیے اسے ختم کروانا کیا مشکل ہوتا۔

لہٰذا میں نے ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ ہم دونوں مل کر اپنے مشترکہ دشمن کی بآسانی کھٹیا کھڑی کر سکتے ہیں۔“

”میں نہیں صرف تم......“ وہ اچانک اسرار بھرے لہجے میں اور میری جانب اپنی انگلی کو فضا میں ٹھوکتے ہوئے

بولا۔ ''صرف تم اس کی کٹھ پتلی بن کر رہوگے جنگ میں تمہیں مکمل سپورٹ کروں گا۔''

مجھے اس کی بات پر اس بار ایک الگ ہی قسم کا جھٹکا لگا۔ میرے غیر یقینی اور نامعلوم خدشات گھٹنے لگے۔ میری سوچوں کے دائرے تیسری سمت پھیلنا شروع ہو گئے۔

''کیا یہ مکار اور عیار شخص خود کو سات پردوں میں رکھتے ہوئے میرے کاندھے پر بندوق رکھ کے چلانا چاہتا ہے؟'' میرے سوچتے ذہن میں خیال ابھرا۔

''شاید میں آپ کی بات سمجھ نہیں رہا۔''

''بہت آسان بات کی ہے میں نے۔'' وہ بولا۔ ''یہ تمہارے اور میرے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوگا۔ جس کی رُو سے تم مجھے ظاہر کیے بغیر اس کی جادو نگری میں داخل ہو گے، وہاں تک میں تمہیں پہنچاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تم اس کے کس قدر خون کے پیاسے ہو رہے ہو۔''

''ہم اسی طرف جا رہے تھے، لیکن کم بخت اس ریکٹ نے ہمارا راستہ کھوٹا کر ڈالا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مجھے اب اس کا انداز تحکمانہ یا کڑک دار محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ اس کی جگہ وہ دوستانہ ہو گیا تھا۔

تاہم مکمل طور پر میں اب بھی اس پر بھروسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب تک کہ اصل تصویر میرے سامنے نہیں آجاتی۔ احتیاط کا تقاضا یہی تھا، اس لیے کہ میں اپنی اہم ترین منزل کے ...... قریب ہی تھا۔

''تب میرا خیال ہے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان ہتھکڑیوں سے ہی نہیں بلکہ اس عمارت سے بھی آزاد ہو جانا چاہیے۔'' میں نے دانستہ مسکرا کر کہا۔ وہ میری جانب سوچتی ہوئی نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

''ہم ...... ٹھیک کہتے ہو تم ......'' وہ کہتے ہوئے اپنی چیئر کی طرف بڑھ گیا اور اس بار ذرا انسانوں کے انداز میں اس پر براجمان ہو کر بولا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

یہ اگر مہربان تقدیر کی طرف سے میری اور میرے ساتھیوں کے لیے ایک غیبی مدد تھی تو مجھے بھی اس سے مستفید ہونا چاہیے تھا۔

''لیکن ...... افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا، کیونکہ میری بھی ایک مجبوری ہے جسے تم اسے محکمہ جاتی کمزوری کہہ سکتے ہو۔''

''کیا مطلب ہے؟'' میں نے [illegible] الجھی ہوئی سوالیہ نظروں سے [illegible]

''آسان سی بات ہے کہ میں اپنے کاز کو خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ جواب میں بولا۔ ''اور ...... ابھی تک میں نے کسی کو یہ بھنک بھی نہیں پڑنے دی ہے کہ میں امریکا کی رنگینیوں، آرام و آسائش اور اپنے بیوی بچوں سے دور اس ویران سے جزیرے میں صرف اپنے فرائض منصبی کے لیے نہیں بلکہ لولوش کا تابوت تیار کرنے آیا ہوں۔''

میں اب اس کی باتوں پر ہی غور نہیں کر رہا تھا بلکہ اس کے لہجے، آواز اور اس کے چہرے کے تاثرات کو بھی بھانپے جا رہا تھا کہ وہ کتنا سچ بول رہا تھا اور کتنی ''رنگ آمیزی'' کر رہا تھا۔

مجھے اس کا جواب اثبات میں ملا تھا کہ وہ جو کچھ ...... کہہ رہا تھا، جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کی شعلہ فشاں تندی، چہرے کی سرخی اور لہجے میں دبی ہوئی لفظوں کی تپش سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں آتشِ انتقام کس قدر بھڑک رہی تھی۔

مگر کیوں ......؟ اس کی بھلا لولوش سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ نیز وہ اس سے وہ اپنا کوئی انتقام لینے کا کیا حل سوچے ہوئے تھا، کیا وہ صرف میرے ہی انتظار میں تھا؟ اور اسے کیسے پتا چلا؟ کہ میں یہاں صرف اور صرف لولوش کی سرکوبی کے لیے آیا تھا؟

''ساری باتیں اپنی جگہ ......'' بالآخر میں نے کہا۔ ''کیا تم لولوش سے اپنی دشمنی کی وجہ بتا سکتے ہو؟'' میں نے اپنے تئیں اس سے بڑا اہم سوال پوچھا۔

''ہاں، کیونکہ میں یہ سب بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔''

''تب پھر اس کا بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ تم مجھے اور میرے ساتھیوں کو آزاد کر دو، ہم سب دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر گفتگو کر سکتے ہیں۔'' میں نے لوہا گرم دیکھ کر فوراً مطلب کی بات کر ڈالی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ وہ میری بات ضرور مان لے گا لیکن میں نے دیکھا کہ وہ یہ سن کر بڑی مکارانہ نفی کے ساتھ نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر اسی انداز میں بدستور نفی میں ہی اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا۔

''میں صرف تمہیں آزاد کروں گا لیکن وہ درحقیقت آزادی نہیں ہوگی بلکہ ایک معاہدہ ہوگا۔ تمہیں ہر قیمت پر لولوش کو جہنم واصل کرنا ہوگا اور اس کی اسٹیٹ کو تباہ و برباد کر کے رکھ دینا ہوگا۔''

''میں بھی کچھ تو کرنے آیا ہوں۔'' میں نے جلدی

Protected with trial version of Visual Watermark. Full version doesn't put this mark.

سے کہا۔ "مگر تم میرے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو تو یہ بھی ضرور جانتے ہوگے کہ۔۔۔ میری لولوش کے ساتھ دشمنی کی وجہ کیا ہے۔"

"تمہاری اس سے کوئی بھی دشمنی نہیں ہے، ماسوائے [illegible] کے اور وہ ہے تمہاری گرل فرینڈ عابدہ۔۔۔" اس بار مجھے اس کی بات پر حیرت نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے جس کے منصوبے ہی "پلانٹڈ" ہوں تو وہ ساری جان کاری ضرور رکھتا ہے۔

"ہاں! مجھے اس سے بھلا کب انکار ہے۔" میں نے کہا۔

"انکار کر بھی نہیں سکتے تم۔" وہ بولا۔ "عابدہ سے متعلق تمہاری حقیقت اتنی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اب تو ایک عام امریکی بھی جان چکا ہے کہ عابدہ نامی دہشت گرد کا ایک بوائے فرینڈ بھی ہے جس کا نام شہزاد احمد خان عرف شہزی ہے۔ وہ عنقریب اپنی گرل فرینڈ کی رہائی کے لیے کوئی نہ کوئی کوشش ضرور کرے گا بلکہ اب تو تمہاری امریکا آمد کے بارے میں یہ باتیں مشہور ہونے لگی ہیں کہ تم کسی دوسرے بھیس یا طریقے سے امریکا میں قدم بھی رکھ چکے ہو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہیں اتنی آسانی سے امریکا میں داخل ہونے دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں لیکن تم اپنی ذہانت اور فطانت سے یہاں آن پہنچے۔ تب ہی میں حرکت میں آگیا اور جب سے یہاں منتظر بیٹھا تھا تمہارا۔"

"اچھی بات ہے لیکن اس اہم مہم میں میرے ساتھیوں کا میرے ساتھ ہونا ازبس ضروری ہوگا، کیونکہ وہ سب پروفیشنل ہی نہیں بلکہ ان میں چند ایک ایسے بھی ہیں جو لولوش کے خفیہ ٹھکانوں اور اس کے متعلق بہت سی ایسی باتوں سے واقفیت بھی رکھتے ہیں جو میرے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔" میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بحث کی کوئی گنجائش نہیں اب۔" اس کا پرانا روپ جیسے دوبارہ لوٹ آیا۔ "تمہارے ساتھیوں سے زیادہ میرے ساتھی تمہاری اس مہم میں مدد کریں گے اور میں یہاں تمہارے قیدی ساتھیوں کی پہرے داری کروں گا۔"

دودھ کی رکھوالی سانپ کرے گا۔ یہ الفاظ از خود ہی میرے اندر ابھرے تھے مگر میں انہیں زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔

"ایسا کیوں؟"

"اس لیے کہ ہو سکتا ہے تم [illegible] بجائے صرف اپنی محبوبہ عابدہ کو ہی لے اڑو، کیونکہ تمہاری لولوش کے ساتھ دشمنی کی وجہ تو عابدہ ہے۔۔۔"

وہ عجیب انداز میں رک کر بولا۔ "ویسے بھی اسپیکٹرم کا پاکستان میں نیٹ ورک ختم کر چکے ہو اب تم، یہ بلکہ آئندہ ایسے خطرے کے امکانات بھی نہیں ہیں کہ اسپیکٹرم کو دوبارہ وہاں اپنی جڑیں مضبوط کرنے اور پاؤں جمانے میں بھی شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے تمہارا اب اسپیکٹرم اور لولوش سے کوئی لینا دینا نہیں رہ جاتا۔ نیز وہ۔۔۔ اس وقت بھی تمہاری اولین ترجیح یہی ہے کہ تم اپنی محبوبہ عابدہ کو اس کی قید سے رہائی دلا کر اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤ، لولوش جائے بھاڑ میں۔۔۔" کہتے ہوئے وہ رکا اور میری جانب بھویں اچکا کر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"کیوں! میں نے کچھ ایسا غلط تو نہیں کہہ دیا ہے تم سے۔۔۔؟"

"تم نے کچھ بھی غلط نہیں کہا ہے شیرف۔۔۔" میں نے جواباً بظاہر بڑے سکون سے کہا۔

حقیقت یہی تھی کہ اس کی میرے سلسلے میں معلومات اس قدر مستند اور مضبوط تھیں کہ میرے لیے انکار کرنا ممکن نہ رہا تھا، ورنہ تو ڈسمنڈ میرے اور میرے ساتھیوں کے بارے میں اس سے زیادہ سخت فیصلہ صادر کر سکتا تھا۔ جبکہ حالات ایسے تھے کہ میں ابھی اس کی ناراضگی مول لینے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"گڈ! تم نے اعتراف کر کے میرا دل جیت لیا۔ اس کا مطلب ہے اب تک ہمارے بیچ معاملات خیر و خوبی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"لیکن شیرف! اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ میں لولوش کو بالکل ہی نظرانداز کر دوں گا۔" بالآخر میں نے پینترا بدلا۔ "عابدہ کو وہ آسانی سے میرے حوالے نہیں کرے گا لہٰذا سو فیصد امکان اسی بات کا ہے کہ مجھے اسے ہلاک کرنا ہی پڑے گا۔"

"یہ بات بھی ٹھیک ہے۔" شیرف ڈسمنڈ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں ایک فیصدی بھی رسک نہیں لے سکتا۔ مجھے لولوش کی لاش درکار ہے اور بس۔۔۔"

اس کی بات سے مجھے صاف محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ لولوش پر تپا بیٹھا تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ میرا مقصد

صرف عابدہ کو اس کے چنگل سے رہائی دلانا تھا اور موقع ملتے ہی مجھے پاکستان روانہ ہونا تھا۔ میری بلا سے لوئوش اور ایگزم جائے بھاڑ میں۔

میں نے سوال کیا۔ "مجھے تم اپنی لوئوش سے دشمنی کی وجہ بتا سکتے ہو؟"

"وہ تو سب ہے۔" ڈسمنڈو نے کہا۔

"مطلب؟"

"ایسا مردود نے [illegible] جس جزیرے پر قبضہ جما رکھا ہے وہ درحقیقت میرے آباؤ اجداد کی ملکیت تھا۔" وہ بتانے لگا۔ "زمین و جائداد کے معاملے میں بہت بچی ہوں میں جب اور وہ بھی ایسی ملکیت جو میرے پرکھوں کی ہو۔ آلایان قبیلے کا جزیرہ سوسا میں بڑا نام تھا۔ وہ بہت عزت، شرافت اور امن سے رہا کرتے تھے، محنت کش اور دوست نواز تھے لیکن اس بدبخت نے ان کی زمین پر قبضہ جمانے کے لیے اس خاندان کے افراد کو کیا بچے کیا بوڑھے اور عورتوں کو چن چن کر ہلاک کر ڈالا۔

یہ برموڈا کی تاریخ کا ایک بڑا اسکینڈل تھا۔ ایسی بھیانک قتل و غارت گری ہوئی تھی کہ سب لرز گئے تھے۔ میں ان دنوں پولیس میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ آلایان قبیلے کا میں ہی وہ واحد فرد تھا جسے نیویارک جا کر پولیس ڈپارٹمنٹ کی نوکری کا شوق چرایا تھا۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گیا۔

میں پہلی بار اس کی داستان سننے پر مجبور ہو گیا تھا۔

بولا۔ "حیرت ہے، اتنی بڑی قتل و غارت ہو گئی اور پولیس اور دیگر قانونی اداروں نے اس کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا؟ کوئی تفتیش کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی؟ امریکی پولیس تو ایک ہی قتل پر بال کی کھال نکال دیتی ہے، یہاں تو خاندان کے خاندان بے دردی سے قتل کر دیے گئے؟"

میں نے یہ کہتے ہوئے محسوس کیا کہ شیرف ڈسمنڈو کے چہرے پر کرب، بے بسی اور مایوسی کے سائے امڈ آئے۔ لیکن ان تاثرات میں جو سب سے زیادہ حاوی عنصر تھا، وہ ایک عجیب قسم کے دبے دبے خوف کا بھی محسوس ہوا۔ میری بے تکی سی نظریں اس کے تغیر دیتے تاثرات کو بھانپنے پر لگی رہیں۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اٹھا اور میرے قریب آ گیا۔ چند سیکنڈ غور سے میرے چہرے کو تکتا رہا اس کے بعد دروازے کو بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ سیلن زدہ سے اس کمرے میں یک لخت مجھے ایک اسراریت کا احساس ہونے لگا۔

وہ پھر میری طرف بڑھا۔ مجھے بازو سے پکڑا اور پھر اپنی سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔ میں اسی طرح پشت پر بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھ گیا اور ایک عجیب سی حیرت کے ساتھ اس کی جانب تکتا رہا۔ نجانے اب وہ مزید کیا انکشاف کرنے والا تھا؟

اس کے بعد وہ اپنی چیئر پر براجمان ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کیس کھولا۔

"سگریٹ پیو گے؟" اس نے پوچھا۔

"جی تو چاہ رہا ہے، مگر میرے ہاتھ..." میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کم از کم اتنی ساری گفتگو کے بعد اب تو اس بدبخت کو میرے ہاتھ آزاد کر دینے چاہیے تھے۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ایک سگریٹ نکالی، ذرا جھک کر وہ اس نے میرے ہونٹوں میں دبا دی۔ دوسری اپنے لیے نکالی اس کے بعد لائٹر جلا کر میری سگریٹ سلگا دی۔

"ابھی اسی طرح رہو...... یہ میری مجبوری ہے۔" کہتے ہوئے اس نے اپنی سگریٹ کو بھی لائٹر دکھا دیا۔

میں نے ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کو دانتوں تلے لیتے ہوئے ایک گہرا کش لیا۔ بیک وقت ناک اور منہ سے دھواں اگلا۔ سگریٹ اعلیٰ درجے کا تھا۔ طلب بھی تھی۔ ایک ہی کش نے مزہ دے دیا۔ وہ چپ رہا۔ سیلن زدہ سے اس کمرے میں ایک عجیب اور اسراریت بھری سی خاموشی طاری رہی۔ جب میری سگریٹ کا "گل" طویل ہونے لگا تو ڈسمنڈو نے ایک ہاتھ سے سگریٹ میرے ہونٹوں سے نکالی اور ایش ٹرے میں اس کی راکھ جھاڑ دی اور دوبارہ میرے ہونٹوں میں لگا دی۔ میں پھر وقفے وقفے سے دانتوں اور ہونٹوں کے کش لینے لگا۔

"ہوئی تھی تفتیش، پولیس کارروائی، کرائم سین...... ملاحظہ کیا گیا۔ وہ سب کچھ جو ایسے میں ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔

"پھر؟" میں سگریٹ کو زبان اور ہونٹوں کے سہارے ایک باچھ میں لے جاتے ہوئے بولا تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔

"اس ساری تفتیش اور کارروائی کا نتیجہ بڑا بھیانک نکالا گیا۔" وہ بتانے لگا۔

"آلایان قبیلے کے آبادی والے علاقے ایک عرصے

سے کسی خونخوار درندوں کا شکار ہو رہے تھے لیکن ایسے درندے جنھیں پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا، کیونکہ یہ کوئی جنگلی جانور یا عام درندے، یعنی شیر، چیتا، ریچھ وغیرہ نہیں تھے بلکہ ان کی ہیئت ہی کچھ اور تھی، جنھیں عام فہم میں "مونسٹر" (Monster) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ زمین پر ان کے قدموں کے نشان بھی کسی عام روایتی درندوں سے مختلف تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ کسی نے ان درندوں کو دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ بس ایک ہی حملہ کرتے اور آس پاس موجود ہر ذی نفس کو پل کے پل چیر پھاڑ اور نوچ ڈالتے تھے۔ اسی لیے کوئی اس عجیب اور پُراسرار درندے کے بارے میں پتا نہیں پایا لیکن......"

اتنا کہہ کر وہ رکا۔ اپنی ختم ہوتی سگریٹ ایش ٹرے میں مسلی پھر میرے ہونٹوں سے بھی سگریٹ نکال کر بجھا دی۔

میں ایک ٹک اس کی جانب تکتا رہا۔ یہاں تک کہ آخر کے کش بھی لینا بھول رہا تھا اور اس کے آگے بولنے کا منتظر رہا۔

"میں بھی اس تفتیش میں شامل ہونا چاہتا تھا مگر جونیئر ہونے کے سبب میں شامل نہ ہو سکا۔ سمجھ تو میں گیا تھا کہ کسی گہری اور عجیب سازش کے تحت ہی یہ سب کیا گیا تھا اسی لیے میں خود کو بچانے کی کوشش کرتا رہا، اگرچہ میں ہوگ بے میں نہیں تھا۔

پھر کچھ روز بعد میں اپنے طور پر چھٹیاں لے کر ایک عام سیاح کے بھیس میں یہاں پہنچا تو اس وقت تک ہوگ بے کو "موت کا جزیرہ" قرار دیا جا چکا تھا اور وہاں جانے پر سخت پابندی لگا دی گئی تھی، کئی لوگوں میں تو یہ شیطانی جزیرہ بھی مشہور ہونے لگا تھا جہاں شیطان کے بیٹے کی حکمرانی تھی، وغیرہ لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا کہ ایسا کچھ ہوا ہے۔ معاملہ ضرور کوئی اور تھا۔

بہرطور— کسی طرح وہاں چوری چھپے پہنچ ہی گیا، کیونکہ میں ہر قیمت پر اس بھیانک راز سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا اس لیے کہ مجھے لگتا تھا کہ یہاں جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تھا۔ یہ بالکل اسی طرح تھا جیسے شیطانی تکون برمودا ٹرائی اینگل کو کسی خاص خفیہ مقصد کے تحت ایک "ہوا" بنایا گیا ہے۔

تمھیں حیرت ہوگی کہ میں سات دن رہا، مجھے کچھ بھی نظر آیا، نہ کوئی انسان نہ کوئی وحشی شیطانی درندہ۔ میں واپس آگیا۔ سوچ سوچ کر میں پاگل ہو رہا تھا کہ آخر ہوگ بے کے باسیوں کے ساتھ ہی کیا تھا؟

پھر اچانک خبر آئی کہ "آفت زدہ" ہوگ بے کو ایک بڑے مالی ادارے "اسپیکٹرم" کے روح رواں لولوش کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر دیا گیا ہے۔

مجھے شک ہوا۔ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ان دنوں میں سیکرٹ کرائم برانچ میں تھا۔ پھر میری ترقی ہوگئی اور اس کے بعد میں نے دانستہ اپنا تبادلہ یہاں کروا لیا مگر لولوش سے دوری رہی، تاہم اپنے طور پر میں نے اس کے خلاف ریکی شروع کر رکھی تھی۔

میں چاہتا تو آلا یان قبیلے کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوگ بے جزیرے پر "کلیم" داخل کروا سکتا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اس قبیلے سے تعلق کے سارے دستاویزی ثبوت موجود تھے۔ میں جان گیا تھا کہ ایک بھیانک سازش کے تحت آلا یان قبیلے کے ایک ایک فرد کو چن چن کر قتل کیا گیا ہے تو بھلا میں ایک اکیلا کیا حیثیت رکھتا تھا۔"

وہ اس قدر اپنی رام کہانی سنا کر چپ ہو گیا پھر دوبارہ ایک سگریٹ سلگا لی۔ مجھے بھی پیش کش کی مگر میں نے انکار کر دیا۔

"تم نے اپنے طور پر کیا پتا چلایا ہے؟ لولوش نے آلا یان قبیلے کے لوگوں کو ایسے کون سے مونسٹر ٹائپ درندے کے ذریعے ہلاک کیا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کچھ خاص نہیں ماسوائے اس کے جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔" وہ جواب میں بولا۔

"لیکن یہ مونسٹر والی بات پر میں یقین نہیں کر سکتا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ایسا کوئی پالتو درندہ اس کا ہوگا جس کے ذریعے اس نے ہوگ بے کی آبادی کو آدم خور درندے کے نام پر ختم کر ڈالا یا انھیں خوف زدہ کر کے وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔"

"تمہارا خیال غلط نہیں ہے۔" اس نے تائید کی۔ "لیکن کچھ ایسا ہے ضرور، کوئی ایسا خطرناک یا خوفناک جانور اس کے قبضے میں ہے جسے اس نے اپنے جزیرے کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا ہے یا پھر وہ اسے اپنے کسی خاص دشمن کے لیے آزماتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے موضوع لپیٹنے کی غرض سے کہا۔ "اب تمہارا اس بارے میں کیا لائحہ عمل ہے؟"

میں یہ سارا معاملہ سمجھ چکا تھا۔ ڈپٹی شیرف ونسڈر واقعی مجھ سے زیادہ لولوش کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا جس

پنے ہوگ بے کا جزیرہ ہتھیانے کے لیے آلا یان قبیل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا اپنے کسی پالتو درندے سے صفایا کروایا اور بچوں کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ جزیرہ آفت زدہ قرار پاتے ہی لولووش نے اسے خرید لیا۔ لیکن ڈسمنڈ کو کسی طرح اس سازش کا پتا چل گیا مگر... اب وہ لولووش کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر لولووش سے انتقام لینے کی آگ میں جل بھن رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی خاندانی اور پرکھوں کی ملکیت ''جزیرہ ہوگ بے'' کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا، جانتا تھا کہ جب تک لولووش زندہ ہے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔

بہرکیف... میرے سوال پر شیرف ڈسمنڈ بولا۔

''یہی کہ تم میرے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ہوگ بے کا رخ کرو گے۔ میں اس سلسلے میں تمہیں مکمل بریفنگ دوں گا۔ ہوگ بے کا نقشہ، جہاں لولووش کا محل ہے، اس کی ذاتی آرمی ہے اور لیبارٹریز ہیں، دنیا کے ٹاپ پروفیشنلز کی پوری کھیپ جس عمارت میں مستقل رہتے ہوئے وہ ہر وقت اس کے مفادات کے لیے نت نئی ایجادات میں مگن رہتی ہیں، وہ ساری معلومات تمہیں باقاعدہ ایک پروجیکٹر کے ذریعے بتاؤں گا بھی اور دکھاؤں گا بھی۔ یوں سمجھو اس کی شہ رگ تک پہنچنے کے لیے میں نے یہ ساری معلومات اپنی جان پر کھیل کر حاصل کی ہیں۔''

''جب تم نے اتنا کچھ کر لیا تھا تو لولووش کے سینے میں بھی ایک عدد گولی اتار ہی دیتے۔'' میں نے ہلکے طنز سے کہا۔ کیونکہ مجھے اس کی بات بالکل پسند نہیں آئی تھی کہ میرے سارے ساتھی تب تک اس کے قبضے میں رہیں گے۔

''اب یہ بچوں والی باتیں چھوڑ دو۔'' وہ بھی تلخی آمیز برہمی سے بولا۔ ''میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ تمہارے سارے ساتھی بظاہر قیدیوں کی صورت میں لیکن یہاں بالکل آرام سے رہیں گے، انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ان کی موجودگی صرف اس بات کی ضمانت ہوگی کہ تم وہی کرو گے جو میں نے کہا ہے۔''

''تم سمجھتے ہو کہ ایسی صورت میں، میں اپنا اور تمہارا یہ اہم مشترکہ مشن کامیابی سے مکمل کر پاؤں گا؟'' میں نے اس کی رگ کو چھیڑنے کی کوشش چاہی تھی۔

''کیا مطلب؟'' وہ سوالیہ نظروں سے میری جانب تکنے لگا۔

''ظاہر ہے مجھے اپنے ساتھیوں کی فکر لاحق رہے گی، یوں میرا دھیان بٹا رہے گا۔ پھر میرے ساتھی سب اس مشن میں بہترین مددگار رہیں۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ذرا سمجھنے کی کوشش کرو شیرف ڈسمنڈ! اس طرح ہماری طاقت بٹ جائے گی اور......''

''میرے یہ پانچوں ساتھی بھی کم نہیں ہیں کسی سے...... مجھے انہی پر بھروسا ہے، لیکن تم پر نہیں۔'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے گھور کر کہا۔ ''لہٰذا یہی پانچوں ساتھی تمہارے ساتھ اس مشن پر جائیں گے اور میں یہاں ان کی حفاظت کروں گا۔''

مجھے اس کی نیت ٹھیک نظر نہیں آرہی تھی۔ ''اگر میں انکار کر دوں تو......؟''

میری بات پر اس کی آنکھوں اور چہرے پر یک دم سختی کی لہر سی ابھری۔ اس کا ہاتھ بے اختیار میز پر رکھے الیکٹرک شاک دینے والے ڈنڈے کی طرف چلا گیا۔

''میں تم پر اور تمہارے ساتھیوں پر خطرناک الزامات لگا کر ساری عمر کے لیے جیل میں سڑنے کے لیے چھوڑ دوں گا۔'' وہ یک دم بھیڑیے جیسی غراہٹ سے بولا۔

''مت بھولو کہ میں یہاں سیاہ سفید کا مالک ہوں اور میرے ساتھ جو پولیس ٹیم یہاں موجود ہے، وہ بھی میری ہم خیال ہے۔ جیسا میں چاہتا ہوں ویسا ہی ہوتا ہے یہاں۔ کیا تم میرا احسان بھی نہیں چکاؤ گے جب ریکٹ اور اس کے مسلح ساتھی تم سب کو ہلاک کرنے کا پورا بندوبست کر چکے تھے؟''

''میں اس کے لیے تمہارا تہِ دل سے مشکور ہوں... مگر......''

''اگر مگر کچھ نہیں......'' اس نے ایک بار پھر میری بات کاٹی۔ ''اب بھی جیسا میں چاہوں گا ویسا ہی ہوگا۔ سوچ لو آج کا دن تمہیں دیتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے بیل بجا کر دو باوردی مین بلائے اور مجھے ان کے حوالے کر دیا۔

وہ مجھے ایک سیلن زدہ تنگ و تاریک سی کوٹھری میں ڈال کر لوٹ گئے۔ اندر ڈالنے سے پہلے میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔

یہاں میرے سارے ساتھی موجود تھے اور مجھے دیکھتے ہی ان کی جیسے جان میں جان آ گئی تھی۔

میں اس وقت خود کو جسمانی سے زیادہ شدید اعصابی طور پر تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ کھیل داد اور شکیلہ سمیت بیلی نے مجھ سے بولنے کی، کچھ پوچھنے کی کوشش چاہی تھی مگر میں نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ذرا دیر کے لیے خاموش رہنے کا کہا اور خود بینچ پر جا کر لیٹ گیا۔

مجھے سوچنا بھی نہ پڑ رہا تھا اور بظاہر آنکھیں موندے لیٹا بھی رہا۔ اسی طرح میں نے تقریباً کوئی نصف گھنٹہ [illegible] کی کیفیت میں گزارا تو کافی بہتر محسوس کیا۔

تب پھر میں نے اپنے ساتھیوں کو اس ساری گفتگو سے آگاہ کر دیا جو میرے اور اس شیرف ڈسمنڈ کے درمیان ہوئی تھی۔

وہ سب ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سے ہو کر رہ گئے۔

"تم اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دو۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اچانک بیلی نے کہا۔ "یہ اپنے ایک [illegible] مقصد کے لیے جہاں اپنی مرضی [illegible] جانے ہو [illegible] اس میں اتنا دم ہے کہ کن الزامات سے لڑے گا۔"

"میرے [illegible] سے ایسے جانے دے گا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"وہ ہمارے ساتھ [illegible] تک رہے گا۔ اسے مدد کی ضرورت ہے ہماری۔ ہم سب کی [illegible] کے بغیر اس کی بات ہرگز مت ماننا شہری!" بیلی تو جیسے [illegible] پڑی تھی۔

"تم دونوں کیوں خاموش ہو؟ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے خاموشی سے بیٹھے ہوئے داؤد اور شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پہلے داؤد بولا۔

"میرا خیال ہے بیلی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کیونکہ تم نے شیرف ڈسمنڈ سے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس کے مطابق تو یہی آتا ہے کہ ڈسمنڈ مجبور اور ضرورت مند ہے ہمارا۔ اسے ہم سے دوستانہ ماحول کے سوا اور کوئی گفتگو زیب نہیں دے گی۔"

"لیکن میرا خیال اس بارے میں مختلف ہے۔" اچانک شکیلہ بھی پُرسوچ خاموشی سے بول پڑی۔ ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"مجھے نہیں لگتا کہ ڈسمنڈ کے اندر عقل اور انسانوں والی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ وہ ایک روایتی سخت گیر اور کافی حد تک ایک پاگل جنونی سا پولیس آفیسر لگتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے انکار پر وہ ہمیں تختۂ مشق بنانا شروع کر دے اور پھر ہم ہی اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جائیں۔"

"تم کیا مار کھانے سے ڈرتی ہو پیاری گڑیا؟" ایسے حالات میں بھی بیلی نے اپنے نرم و گداز ہونٹوں پر مسکان بھرتے ہوئے شکیلہ سے کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہیں شکیلہ اس کی بات کا برا ہی نہ منا لے لیکن شکر ہوا کہ وہ بھی اسی زندہ دلی سے مسکرا کر بولی۔

"لیکن یہ بات مجھے [illegible] ہوئی تو وہ [illegible] پڑے گی۔ میں اس سے [illegible] یہ کہ جنونی ہم پر اپنی دہشت بٹھانے کے لیے ہم میں سے کسی کو گولی نہ مار دے۔ کیا تم [illegible] ساتھیوں کا انجام بھول گئے۔ [illegible] ہلاک کر دیا اور یہ تمہیں بھی [illegible] ہے۔ یہاں قتل کرنے سے بھی اس سے [illegible]"

"ہمیں [illegible] کے خیال سے [illegible]" اس سلسلے میں میں نے بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیا تھا۔

"تم لوگ اپنی اپنی کہے جا رہے ہو۔ کیا تمہیں ڈونا کی بھی فکر ہے، وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟" جیک جو کافی دیر سے خاموش اور ایک طرف شاید تنہا بیٹھا تھا، اچانک تیز لہجے میں بول پڑا۔ بیلی کا وہ بھی احترام کرتا تھا لیکن پرانا ساتھی بہرحال وہ ڈونا کا ہی تھا۔

ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تب ہی بیلی نے ناگواری سے اسے جواب دیا۔

"ہم اس کے لیے بھلا ان حالات میں کیا کر سکتے ہیں؟"

"کر سکتے ہیں۔ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ شیرف ڈسمنڈ کی بات مان لی جائے اور اسے دوست بنا لیا جائے۔" وہ بولا۔ "اس طرح شہری! اس کو تلاش [illegible] ڈونا کی [illegible] سے جان چھڑانے کے لیے اسے سوچنا ہے۔"

[illegible] جیک کا ایسا شخص تھا جسے ڈونا کی زیادہ فکر ہو رہی تھی۔ وجہ یہی تھی کہ وہ اس کا قریبی اور جاں نثار ساتھی تھا۔

"ہم تو اپنا [illegible] بچے تھے۔" میں نے اس کا دل صاف کرنے کی [illegible] کہا۔ "لیکن تم نے خود دیکھا کہ ابھی ہم ایک جگہ [illegible] ان کے ساتھیوں پر دھاوا بولنے کا منصوبہ بنا ہی رہے تھے کہ [illegible] کے سے اچانک ہمارے سر پر آن کھڑے ہوئے۔ [illegible] ہتھیار وہ پہلے ہی ہم سے چھین چکے تھے۔"

"اب بھی تقریباً وہی صورت حال ہے۔" جیک کل جیسے میری بات کو خاطر میں لانے بغیر بولا۔ "شیرف ہم سے تعاون کرنے پر مجبور ہو چکا ہے اور"

"دیکھو، ہم اس سے تعاون کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔" میں نے بھی اس کی بات کاٹتے ہوئے رسانیت سے کہا۔ "اور ایک بات [illegible] والا معاملہ الگ تھا اور

شیرف واسطہ وہ مجھ سے واضح لگ رہا ہے۔"

"تم پھر بھی کہو۔ شیرف سے یاری نبھانے کے دوران اس کا نام تو سب کو معلوم ہو رہی ہیں۔" بلیک بل منہ کو سکڑا۔ مجھے اس پر ہنسی آنے لگا۔ اسی لیے میں بولا۔

"بلیک بل! اکڑ رہا ہے تم ابھی اپنا سب سنبھالے رکھو۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اور اس کی مجھے بھی فکر ہے۔ وہ بھی صرف میری نیکی کی وجہ سے، ورنہ تم اور تمہارے باس نے جو کسی قسم کی حرکت کی تھی، اس کے بعد تمہارا اور ہمارا تعلق ختم ہی ہو چکا تھا۔"

"[illegible] زبان کو لگام دو۔" بلیک بل جھٹکے سے اکڑ کے [illegible] کھیل والا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور اس پر شاید [illegible] تھا ایک زوردار گھونسا بلیک بل کے چہرے پر [illegible] اور [illegible] لگا ہوتا تو شاید بھیجے جیسے بلیک بل کا اندر [illegible] جیسے ہاتھوں ہتھوڑوں والے کھیل والا کا وہی فرزند گھونسا تھا جس نے بلیک بل کو چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑانے پر مجبور کر دیا۔ وہ دیوار سے جا ٹکرا، دوسرے ہی پل سنبھلا اور [illegible] اور پہلی جاتے کھیلے اور نکل نے درمیان میں آنے [illegible] کی کوشش نے ان دونوں کو انگلی کے اشارے سے [illegible]

بلیک بل، کھیل والا کے پیچھے لگے پڑ گیا اور اس بات چالاکی سے کھیل والا نے خود کو اس کی ضرب سے بچاتے ہوئے جس اطمینان سے اپنے دونوں ہاتھ میں دبوچ لیا اور اسے ٹانگ کے زور پر گھما دیا۔

بلیک بل کی حالت وحشی بھینسے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اس نے بھینسے کی طرح ڈکراتا ہوا پلٹا اور پھر کھیل والا پر جھپٹا، کھیل نے خود کو ایک دم کرنج کے بل جھکا دیا اور بلیک بل کا وجود اس کی پشت پر آ پڑا۔ کھیل نے اسے اسی کے زور پر دور اچھال دیا۔

مجھے اعتراف تھا کہ کھیل والا نے غیر معمولی طاقت کا مظاہرہ کیا تھا، کیونکہ بلیک بل جیسے بھاری بھرکم جثے والے کو اپنی کمر پر لاد کر پھینک دینا معمولی بات نہیں تھی۔

"کوئی ہاتھ نہیں ہوگا بل۔ اب نہیں تم ناک پھاڑ دے گا۔" اچانک نکل نے چلا کر بلیک بل سے کہا۔ وہ اب کھیل والا اور بلیک بل کے درمیان آ گئی تھی۔ "اب اگر تم نے کوئی جارحانہ حرکت کی تو ہم تم سے تعلق توڑ دیں گے۔" نکل نے پیچھے اس کے چڑھے ہوئے تیوروں کو دیکھ کر تنبیہ کر ڈالی۔

بلیک بل وہیں رک گیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے غیظ و غضب کے شعلے برآمد ہو رہے تھے۔

حالانکہ اگر نکل درمیان میں نہ آتی تو وہ کھیل والا پر دوبارہ پلٹ پڑنے کی کوشش کرتا۔

اسی دوران، شور اور گھڑکی چڑی کی آوازیں سن کر دو پولیس مین آ گئے۔ میں نے انھیں تسلی دی اور وہ واپس چلے گئے۔

وہ رات بیت گئی۔ اگلے دن صبح مجھے پھر شیرف واسطہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس بار ہتھکڑیاں لگا کر اس کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔

بہرکیف۔۔۔ میں رات تک اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر چکا تھا کہ مجھے واسطہ کو کیا جواب دینا ہے۔

"ہاں! مسٹر شہزی! کیا فیصلہ کیا تم نے؟" واسطہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرے فیصلے کو سننے کا منتظر ہو۔

وہ اسی طمطراق کے ساتھ اپنی بھاری بھرکم چیئر پر براجمان تھا۔ مجھے اس کے سامنے لا کھڑا کیا گیا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ کوئی بات کرنے سے پہلے مجھے بیٹھنے کے لیے کہے گا اور میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں بھی کھلوانے کا حکم جاری کرے گا مگر یہ میری خوش فہمی ہی رہی۔

اس سے مجھے اس کی سخت نفرت کا اندازہ ہوا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے تحمل سے اور چالاکی سے کام لینا تھا۔ میرا کام [illegible] آسان ہو سکتا تھا، مجھے اس کا بھی اندازہ کرنا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"[illegible] مجھے تمہاری بات سے انکار نہیں ہے۔ کیونکہ میں نے رات اپنے ساتھیوں سے اس بارے میں صلاح مشورہ بھی کیا تھا۔ میرے ساتھیوں کو کچھ تحفظات تھے۔"

"کیسے تحفظات؟" اس نے ایک دم سے مجھے بھویں اچکا کر دیکھا۔

"میرے چار ساتھیوں میں سے [illegible] بات کے متفق نظر آئے تھے جو تم نے مجھ سے کی تھی، جبکہ باقی دو ساتھی انکاری ہیں، انھیں دھوکے کا شبہ ہوتا ہے۔"

"تم کیا کہتے ہو؟" واسطہ نے اسی طرح سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنے اول الذکر دو ساتھیوں سے متفق ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میری بات تسلیم کرنے کے ووٹ زیادہ ہو گئے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "جو

وہ ساتھی تمہارے میری بات سے متفق نہیں ہیں، ان کے نام بتاؤ تاکہ میں انہیں یہاں لا کر مطمئن کر سکوں۔" اس نے کہا۔

میں نے ٹیلی اور بلیک بل کے نام بتا دیے۔ واسطو نے ان دونوں کو اپنے پاس طلب کر لیا۔ ان دونوں کو بھی [illegible] یہاں لا کر یہاں لایا گیا تھا۔

ٹیلی اور بلیک بل کو میرے دائیں جانب چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا کر دیا۔ خود وہ اپنی چیئر پر بیٹھا ان دونوں کو [illegible] اس کے بعد اس نے اپنی میز کی دراز سے پستول نکال [illegible] دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اس کا رخ ان کی جانب [illegible] کے اوپر دو فائر کر ڈالے۔

ایک گولی بلیک بل کی پیشانی میں پیوست ہو گئی اور وہ تیورا کر گرا، میری [illegible] رک گئیں، دوسری گولی ٹیلی کے سینے میں لگی اور وہ بھی دم توڑتے [illegible] بلیک بل کی لاش پر گر پڑی۔

"ٹی ٹی... یہ کیا کر ڈالا تم نے؟" مجھے جیسے اچانک ہوش آیا اور میں اس قدر زور سے [illegible] کہ میری آواز تک پھٹ گئی۔ صدمے اور دکھ سے میرا اندر بھر گیا۔ مجھ سے کھڑا ہونا دوبھر ہو گیا۔ میں غم اور کرب کے شدید احساس کے ڈھیر سے جھکا اور پہلے [illegible] دونوں گھٹنے فرش پر ٹکے اس کے بعد میں جیسے دکھ سے نڈھال سا ہو کر دیوار کے سہارے فرش پر [illegible] بیٹھ گیا اور ایک ٹک غمزدہ آنکھوں سے ٹیلی کی بل پر پڑی لاش کو دیکھتا رہ گیا۔

مجھے ٹیلی کے یوں مرنے کا بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ اس قسائی نما جنونی پاگل شیرف واسطو کی اس گھٹیا حرکت نے جیسے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کر ڈالی تھی۔

ٹیلی میرے لیے کوئی معمولی شخصیت نہیں رہی تھی، وہ مجھے ٹائیگر ٹیک کے سربراہ ہاسکل ہولارا کے چنگل سے چھڑانے کا سبب بنی تھی، یہاں تک بھی اس نے میرا ساتھ دیا تھا اور [illegible] رتی کی [illegible] آ کر بھی اس نے اس کا دم بھر رکھا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ٹیلی کو میں یوں چشم زدن میں مرتا دیکھوں گا۔ وہ میری عابدہ کی بھی محسن اور دوست تھی۔ ٹیلی ایک جذبے کے تحت عابدہ کی رہائی کے سلسلے میں میرے ساتھ مخلص ہو چکی تھی۔ وہ بے غرض تھی، میں اس کی جانی قربانی کو بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

"سوری، مسٹر شہزاد! میرے پاس تمہارے ان دونوں ساتھیوں کو اس طرح سمجھانے کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا۔" وہ یوں [illegible] انداز میں بولا جیسے اس ظالم آدمی نے دو انسانوں کو نہیں بلکہ دو جانوروں کو ہلاک کر ڈالا ہو۔

"مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ تمہیں ان کے مرنے کا دکھ ہوا ہے، لیکن مجبوری تھی میری۔۔۔" وہ حسب عادت پھر سے اسی انداز میں بولے جا رہا تھا اور میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس بے رحم اور بے حس انسان کو بھی اسی وقت بھنبھوڑ کر رکھ دوں۔ "میری مجبوری" اس کا گویا تکیہ کلام تھا۔

"لیکن تمہیں اس کا فائدہ ہو گا، تم اپنے ان ساتھیوں کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتے، جو تمہارے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ اب تم سمیت تمہارے باقی جو دو ساتھی ہیں۔۔۔ وہ تم سے، مجھ سے متفق ہیں؟ وہی تمہارے لیے سودمند ہیں، ورنہ کہو تو۔۔۔" اس نے دانستہ سفاکانہ انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا اور میں [illegible] یکسر ہول اٹھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ خدا کے لیے انہیں کچھ مت کہنا، ہم۔۔۔ ہم تمہاری بات سے متفق ہیں، ہمیں کوئی اختلاف نہیں۔"

میں کیل، داؤد اور شکیلہ کا ایسا انجام ہرگز نہیں چاہ سکتا تھا جو اس رذیل انسان نے ٹیلی اور بلیک بل کا کیا تھا۔ میں [illegible] ان دونوں کے نام کیوں لیے تھے!

"[illegible]۔۔۔ گڈ۔۔۔!" کہتے ہوئے اس جنونی پولیس آفیسر نے پستول [illegible] میز کی دراز میں رکھ دیا۔ میں اسی طرح فرش پر بیٹھا رہا، پھر جب ذرا تاؤ میں آیا تو اس سے بولا۔

"تمہیں بہرحال اتنی [illegible] بہیمیت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں ان دونوں کو [illegible]۔"

اس نے میری بات شاید [illegible] اور بیل بجا کر دو افراد کو اندر بلوایا، پھر اس نے [illegible] طرف دیکھتے ہوئے ٹیلی اور بلیک بل کی زمین پر [illegible] پڑی لاشوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

لاشیں ٹھکانے لگا دی گئیں۔ آخر میں واسطو نے مجھے دو پولیس مین کے حوالے کر دیا۔

میں سمجھا وہ مجھے لے کر اسی کوٹھری میں آئیں گے جہاں اب صرف کیل، داؤد اور شکیلہ رہ گئے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ ایک الگ کوٹھری نہیں بلکہ ایک کمرا نما تھا۔ نسبتاً بہتر وہ جیل کا کمرا نہیں لگتا تھا۔ اسے ایک چھوٹا سا بیڈ روم کہہ سکتے تھے۔

ڈسمنڈ نے مجھے یہاں بھجوانے سے پہلے بتادیا تھا کہ آج رات مجھے اس کے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ہوگسے کی مہم پر روانہ ہوجانا تھا۔ میرے لیے اب صورت حالات واضح ہوگئی تھی۔ مجھے ڈسمنڈ سے اب کسی طور پر بھی "خیر" کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ایک جلاد صفت سفاک انسان تھا، جو [illegible] نے اسے پاگل، جنونی اور [illegible] والا تھا۔ میری اور اس کی اب تک کی ملاقات اور باتوں سے بھی میں نے نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کے ارادوں سے جو بھی واقف ہوجاتا یا کردیا جاتا، وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتا تھا۔ خواہ [illegible] ہی کیوں نہ ہوتی۔

[illegible] اور اس کے ساتھیوں کا معاملہ اور تھا، لیکن اب مجھے یہ [illegible] کر رہی تھی کہ شکیلہ نے اپنے گروپ کے ساتھ یہاں [illegible] کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ کیونکہ ڈسمنڈ اپنے مفادات سے [illegible] "بچی" تھا کہ وہ کسی کو بھی اپنی مشن رازداری میں برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ممکن تھا کہ اس کی [illegible] بم سے بھی وہ واقف ہوتا۔

میرے نزدیک اب سب سے زیادہ [illegible] بات یہ تھی کہ کمیل دادا اور شکیلہ کی جان سخت خطرے میں تھی۔ ڈسمنڈ جیسے جلاد سے اب کچھ بھی بعید ہوسکتا تھا۔ خیر وہ مجھے چالاکی سے اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ہوگسے والی مہم پر روانہ کرنے کے بعد [illegible] کمیل دادا اور شکیلہ کو بھی بیدردی سے قتل کرڈالتا اور بعد میں مجھے بھی نہ چھوڑتا۔

پہلے بات اور تھی لیکن اب مجھے اصل ڈسمنڈ کی حیوانی جبلت کا اندازہ ہوتے ہی میں نے الٹا اسی پر شب خون مارنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

☆☆☆

رات کو میری مہم کا آغاز باضابطہ طور پر عمل میں لایا گیا۔ میں نے یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں سے ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ وہ تو میں بھی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر ایسا ہی ہوگا، لیکن میں کمیل دادا اور شکیلہ کی طرف سے نہایت بے چینی کا شکار تھا۔ یہ مردود ڈسمنڈ تو میرے لیے ایک خطرناک آسیب بن کر رہ گیا تھا۔

پہلے اور بات تھی، میں کسی حد تک شیرف ڈسمنڈ کی بات مان بھی لیتا، لیکن اب نیل اور بلیک مل کی عبرت ناک موت کے بعد معاملہ اور ہوگیا تھا۔ ڈسمنڈ ایک درندہ صفت انسان تھا۔ میں کمیل دادا اور شکیلہ کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

ڈسمنڈ اگر میرے ساتھ دوستانہ رویہ رکھتا تو اور بات تھی۔ میرے ساتھیوں کو بھی ملا کر اس ہوگسے والے مشن کو جاری رکھتا، تب بھی میں اس سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا، کیونکہ یہ تو مشترکہ مشن کی صورت ہوتا اور اس میں کافی آسانیاں بھی پیدا ہوجاتیں، لیکن ڈسمنڈ نے دھونس دھاندلی سے کام چلانے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ میرے دو ساتھیوں (نیلی) کو بھی قتل کر ڈالا تھا، تینوں کی جانیں بھی خطرے میں تھیں۔ بھلا ایسی حالت میں یہ کیسے ممکن ہوتا کہ میں ڈسمنڈ کی بات مانتا۔

میرے دونوں ہاتھ آزاد ہوئے تو مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی بھوکا شیر تھا اور اسے پنجرے میں بند کر رکھا تھا۔ اب جیسے آزاد ہوتے ہی میں چیر پھاڑ ڈالنے کے لیے بے چین تھا۔

میں یہاں کی "گنتی" تو پہلے ہی کر چکا تھا۔ کل ملا کر یہاں سات آٹھ سے زیادہ کا عملہ نہیں تھا۔ سنگین تو یہ تھا کہ میرے محبوب ہتھیار گن کٹ اور جہنم واصل ریکٹ نے ہم سے ہتھیا لیے تھے۔

مگر میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے، سردست میرے لیے یہی بہت تھا۔ میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ یہاں [illegible] ہونے سے پہلے میرا ارادہ یہی تھا کہ ڈسمنڈ سے [illegible] اصرار کروں کہ وہ مجھے روانگی سے پہلے میرے دونوں ساتھیوں سے ملاقات کرنے دے، لیکن مجھے اس جنونی اور "سائیکو" [illegible] لگا کہیں یہ پھر طیش سے پاگل ہوکر ان دونوں کو [illegible] لے۔ میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"سو مسٹر شہزادہ!"

اس مخصوص عمارت سے [illegible] روانگی سے قبل شیرف ڈسمنڈ نے مجھے مخاطب [illegible] کہا تھا۔ "مجھے امید تو پوری ہے کہ تم [illegible] اس مشن پر رکھو گے۔ یہ پانچوں" اس مردود نے میرے سامنے کھڑے جدید ہتھیاروں سے لیس پانچ پولیس مین کی طرف اشارہ کیا، جن کے جسموں پر اب پولیس کی وردی کے بجائے سیاہ رنگ کے چست لباس نظر آرہے تھے۔ ان کی پشت پر اسلحہ کی کٹیں بھی لدی ہوئی تھیں۔ (ایک ایسی ہی کٹ مجھے بھی دی گئی تھی۔ جس میں رسی، دستی بموں، فاضل راؤنڈز کے علاوہ دیگر ضرورت کی چھوٹی موٹی اشیا بھی تھیں اور ایک برقی آلہ بھی تھا جس سے ہم سب ایک دوسرے

[illegible]

jaanshayari.com

بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ لہٰذا میں بہ ظاہر خاموش بیٹھا رہا، البتہ ان کا دھیان بٹانے اور اپنی ٹیم میں "دلچسپی" کو ظاہر کرنے کی غرض سے میں گاہے بہ گاہے اپنے ساتھ بیٹھے پولیس مین سے بات کر لیتا تھا۔ میں نے اسے اپنا نائب مقرر کر لیا تھا۔ اس کا نام جوش تھا۔ لڑکی جسے میں نے ٹارگٹ کرنا تھا اس کا نام نشا تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور دلکش لڑکی تھی۔ اگر کوئی موقع ایسا ہوتا جب مجھے اس کی جان لینا پڑتی تو یقیناً مجھے بے حد دکھ ہوتا۔ نجانے کیا بات تھی کہ مجھے اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایک نامعلوم سی معصومیت جھلکتی محسوس ہوتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے حیرت بھی تھی کہ پولیس جیسے خشک ورکنگ ڈپارٹمنٹ میں یہ کیسے "فٹ" تھی؟

سفر جاری تھا اور میں کسی "محتاط" موقع کا منتظر تھا، قدرت نے یہ موقع جیسے مجھے پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دیا۔ ہوا یوں کہ ابھی ہم این شور روڈ کے آغاز میں ہی تھے کہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے اچانک وین کا ایک ٹائر کسی کنارے ابھرے ہوئے نکیلے پتھر پر چڑھ گیا، ڈرائیور اس کے رخ کا درست اندازہ نہ کر سکا اور وین کو پہلے ایک زبردست جھٹکا لگا پھر وہ ایک سائڈ سے اٹھی۔ ڈرائیور نے اسے الٹنے سے بچانے کے لیے اپنی ساری مہارت کو توانائی سمیت خرچ کر ڈالا مگر ہونی ہو کر رہی، یوں بھی وین کیری ٹائپ کی تھی اور کیپسول کی طرح تھی، الٹ گئی۔ میرے اندازے کے مطابق اس نے دو تین پلٹیاں کھائی تھیں۔ چند ایک کی چیخیں بلند ہوتی میں نے سنی تھیں۔

اگرچہ یہ ایک اچانک افتاد تھی، لیکن میں چونکہ پہلے ہی کسی "موقع" کا منتظر بیٹھا تھا اس لیے خود کو کسی زیادہ چوٹ سے بچانے کے لیے میں نے حتی الامکان کوشش چاہی تھی۔

وین دو تین پلٹیاں کھاتی ہوئی ہمارے دائیں کنارے بہتی نہر میں جا پڑی۔

شکر تھا کہ ایک تو میں ہوش میں تھا اور دوسرے وین نہر کے کنارے ہی نصف حد تک ڈوب گئی تھی۔

ہم سب اندر الٹ پلٹ گئے تھے اور ایک دوسرے پر آ رہے، اس دوران جیسے ہی وین کا یہ "طوفان" تھما تو میں نے دیکھا کہ تین پولیس مین بے ہوشی کے عالم میں وین میں نصف حد تک بھر آنے والے پانی کے ایک مختصر تالاب میں غرقاب تھے۔ ان تینوں کے سر پانی کے اندر تھے۔

میں نے سب سے پہلے اپنے حواس مجتمع کیے۔ خود مجھے بھی کچھ چوٹیں آئی تھیں، ان میں سر کی چوٹ زیادہ میرے لیے تکلیف دہ ہو رہی تھی۔ حالانکہ میں نے خود کو کسی شدید چوٹ سے بچانے کی ترجیحی کوشش پوری کی تھی، ممکن تھا بصورتِ دیگر اس سے زیادہ چوٹ آتی۔

باوجود کوشش کے میرا سر اندر سیٹ کے کسی سخت یا ٹھوس سریے سے ٹکرا ہی گیا تھا۔ ایک لمحے کو تو میرا دماغ ہی جھنجھنا گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکا دیا اور خود کو فوراً سنبھال لیا۔ وہ لڑکی جو میرا اصل ٹارگٹ تھی، ایک جانب درمیانی سیٹ کی پشت گاہ پر اوندھی پڑی تھی۔ پانچواں ساتھی جو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ البتہ ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ میرا اپنا دھڑ الٹی پڑی وین کے اندر در آنے والے پانی میں نصف ڈوبا ہوا تھا۔ شکر تھا کہ یہ میرا سر نہیں بلکہ نچلا دھڑ تھا۔

ہڈیوں اور بازوؤں میں لگنے والی دیگر چوٹوں کے سبب میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، لیکن میرے اندر ایک شور سا مچا ہوا تھا، یہی وقت ہے—— یہی وقت ہے……

میں نے اس پر توجہ مرکوز کی اور ڈرائیور پر لپک کر اچھلا اور اس کا سر زور سے اسٹیئرنگ پہ دے مارا۔ اس کے حلق سے بھیانک چیخ نکلی اور سر وہیں ٹک گیا۔ اس کی ناک اور منہ سے کھل کھل خون بہنا شروع ہو گیا۔

اسے چھوڑ کر میں لڑکی کی جانب متوجہ ہوا اور اسے بہ مشکل نکال کر نصف ڈوبی وین اور پانی سے باہر نکالا پھر کنارے پر آ گیا۔

لڑکی کو میں نے نہر کے کنارے اگی ہوئی گھاس پہ لٹایا اور خود ایک بار پھر نہر کے پانی میں اتر گیا اور وین کے اندر جا کر دو عدد بیگز نکال لایا۔ وین اب آہستہ آہستہ نیچے کی جانب کھسک رہی تھی۔ وہ ڈوب رہی تھی اور کسی بھی وقت گہرے پانی میں جا کر تہ آب ہونے والی تھی۔

میرے تیزی سے سوچتے ذہن میں اچانک ایک خیال بجلی کی تیزی سے کوندا۔

میں اب نیم بے ہوش سی نشا کے قریب گھاس پہ تھکے تھکے انداز میں لیٹا تھا۔

جنگل رات اپنے جوبن پر تھی۔ آسمان صاف اور تاروں کی روشنی سے منور نظر آتا تھا۔ ہلکی ہلکی مرطوب سی ہوا سبک خرام تھی۔ نہر کے کنارے گھومتی ہوئی سڑک ویران اور آسیب زدہ سی نظر آتی تھی۔ یہ این شور روڈ کا منظر تھا، وہی روڈ جس پر تھوڑی دیر پہلے ہم گامزن تھے۔

میں نے نشا کی حالت کا جائزہ لیا۔ وہ اتنی زیادہ زخمی نہ تھی، مگر پیشانی میں شاید اسے کچھ گہری چوٹ آئی تھی جس

سبب وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھی۔ میں نے اسے چھوا اور اس کے کالر کو دیکھا۔ وہ مجھے ایک ڈبل اسٹرچ سا محسوس ہوا اور وہ اس قدر مضبوطی سے لگا تھا کہ اس ہلچل میں وہ اِدھر اُدھر نہ ہو سکا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے ایسا ہی رہنے دیا، پھر اسے ہوش میں لایا تو وہ جیسے نیند سے بیدار ہو گئی۔ ذرا کراہی اور پھر جس طرح شکرا، چڑیا کو دبوچ لیتا ہے میں نے اسی طرح اسے دبوچ لیا۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ برآمد ہونے لگی جو فوراً ہی جنگلی بلی کی غراہٹوں میں بدل گئی اور وہ پروفیشنل انداز میں خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے اس کی نازک سی صراحی دار گردن دبوچ لی۔

''کہانی اُلٹ گئی ہے مس نشا! اب اگر تم نے ذرا سی بھی حرکت کی تو گردن دبا دوں گا۔'' میں نے بھی جنگلی بلے کی طرح غرا کر کہا۔

اس کے خوب صورت چہرے پر درشتی کی لہر ابھری۔ اس نے تڑپنے کی کوشش میں کوئی جارحانہ حرکت کرنی چاہی تھی کہ میں نے اس کی گردن پر دباؤ بڑھا دیا، اس کا دم گھٹنے لگا اور چہرہ متورم سا ہو گیا۔ اس کی سانس بند ہو گئی، گلے کی نسیں پھولنے لگیں، آنکھیں باہر آنے لگیں۔ صرف چند سیکنڈوں تک میں نے اسے یونہی جاں کنی کی سی حالت میں رکھا اور پھر دباؤ ہٹا دیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے اور ہانپنے لگی۔

''میرے پاس وقت کم ہے۔'' میں دوبارہ خونخوار غراہٹ سے بولا۔ ''اب اگر تم نے آئیں بائیں شائیں کی تو میں تمہیں کوئی موقع دیے بغیر ہلاک کر کے پلٹ جاؤں گا۔''

اس کی سانسیں ذرا بحال ہوئیں لیکن بولنے کی سکت نہ رہی تھی، اثبات میں سر ہلا کر اس نے اقرار کر لیا تھا۔

میں نے اسے مزید مہلت دی اور اپنی کِٹ سے پانی کی بوتل اور گلوکوز کا ساشے نکال کر اس میں ڈالا اور اسے پینے کو دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھلی چنگی ہو چکی تھی اور بولنے کے قابل بھی۔ نشا کا ''ٹھیک'' حالت میں ہونا ضروری تھا، تاکہ یہ اپنے کالر والے خفیہ ٹرانسمیٹر پر شیرف ڈسٹڈو کو اسی طرح ''اوکے'' کی رپورٹ دیتی رہے۔ یہ بات میں نے اسے سمجھا دی۔

نشا پر اب میری خاطر خواہ دہشت طاری ہو چکی تھی۔ وہ میرا لہجہ اور میرا حکم ماننے پر مجبور ہو گئی تھی۔

یوں اس نے میرے حکم کے مطابق ڈسٹڈو کو ''اوکے'' کی رپورٹ دے دی۔

میں نے اسے لیا اور واپسی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ جنگل کی یہ رات اپنے جوبن پر تھی۔ اس وقت نشا پر میری ساری توجہ مرکوز تھی۔ میں اسے پہلے ہی تنہا کر چکا تھا اور میں اس سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ بھی بہرحال ایک تربیت یافتہ لیڈی پولیس تھی۔ بے شک میری بات اور تھی لیکن یہ موقع اس قدر حساس اور نازک تھا کہ میری ایک لمحے کی بھی غفلت کبیل دادا اور شکیلہ کو اس جنونی اور سائیکی پولیس آفیسر کے ہاتھوں بے رحمانہ موت سے ہمکنار کر سکتی تھی۔

اس مقصد کے لیے میں نے اپنے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول تھام رکھا تھا۔

ہمارا واپسی کا سفر پیدل تھا۔ مجھے اب بھی تشویش تھی کہ نجانے کبیل دادا اور شکیلہ زندہ بھی تھے یا نہیں۔ میں ان کی زندگی کی دعائیں ہی مانگ سکتا تھا۔

نشا کے بعد کا مرحلہ اس سے زیادہ نازک اور خطرناک تھا اور وہ تھا ڈسٹڈو اور اس کے باقی بچے ہوئے دو ساتھی۔ وہاں بھی مجھے نہایت محتاط ہو کر اس کے خلاف کارروائی عمل میں لانا تھی۔

شکر تھا کہ واپسی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا، تاہم پیدل چلنے کے حساب سے کچھ طویل ضرور تھا۔ احتیاط کے پیشِ نظر میں نے نشا کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے تھے، اگر کہیں اسے پھر ڈسٹڈو سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو میں اس کا ایک ہاتھ کھول دیتا۔

کبھی رکتے اور کبھی چلتے ہوئے بالآخر ہم پولیس اسٹیشن کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔

اب یہ فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ ڈسٹڈو کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کی موت بن کر اس کے کتنے قریب پہنچ چکا تھا، کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اس کے پانچوں ساتھیوں کے ہمراہ ہوگ سے پہنچ چکا ہوں.... (میری ہدایت کے مطابق نشا نے ایسا ہی اس سے کہا تھا)

میں نے پوزیشن سنبھالی، اُدھر نشا آخری بار ڈسٹڈو سے چند منٹ پہلے ہی بات کر چکی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق اب اس نے کم از کم آدھ پون گھنٹے بعد ہی رابطہ کرنا تھا۔ میں یہاں تک پہنچ ہی چکا تھا لہٰذا اتنا اب زیادہ دیر تک خطرہ پالنا مجھے نامناسب ہی لگا۔

ایک موقع پاتے ہی میں نے نشا کی رگِ حساس مسل دی۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ اسے یونہی چھوڑ کر میں نے

کی سمت کی جس سمت کی جانب وہ تعاقب شروع کر دی۔

اس طرف میں نے ایک سیاہ دروازہ دیکھا تھا وہ ہر قیمت پر نظر آ رہا تھا مگر یہاں تک آیا جا سکتا تھا۔ اس وقت وہاں مجھے یہ صورت حال میرے حق میں جا رہی تھی۔

شکیلہ ڈسوزا کے سر پر دو سپاہیوں کے سر پر موجود تھے [illegible] مقتول ڈاکو تھا اس نے [illegible] جو [illegible] ٹیپ کی "ٹوکے" والی [illegible] ہو گئی۔

[illegible] نفرت سے [illegible] میری سوچ [illegible] میرے پاس تھا۔ میں نے [illegible] ہی [illegible] کر ڈالی۔

وہ طرف [illegible] تھا۔ خاموشی اور سناٹا چھایا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

میں [illegible] کے قریب آیا اور اسے آہستگی سے [illegible] کر دیا۔ میں نے پُرسکون انداز میں [illegible] کی سمت دیکھا۔ پھر [illegible] لیکن [illegible] کر ڈالا۔

میں نے [illegible] پر ایک نگاہ ڈالی پھر اسی ساتھ چلتا ہوا مین گیٹ کی طرف بڑھنے۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پولیس اسٹیشن جیسی جگہ پر کوئی پہرے دار موجود نہ تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔

ایک تو یہاں پولیس کی نفری صرف تین افراد پر مشتمل تھی۔ ایک ڈسوزا اور باقی اس کے دو ساتھی جن میں ایک لڑکی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس جگہ کو پولیس اسٹیشن نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو محض ایک دکھاوا تھا، اصل میں یہ [illegible] عمارت تو ڈسوزا کا ٹھکانا تھی اور وہ اپنے [illegible] مقصد کے لیے یہاں نوکری کے بہانے تعینات نہیں بلکہ فرار تھا۔

ممکن تھا کہ اس نے باری باری کسی نہ کسی کی ڈیوٹی لگا رکھی ہو لیکن اس وقت اس کے پاس ایک کوئی نفری نہ تھی۔

میں اس موقع کو غنیمت جان سکتا تھا، لہٰذا عمارت کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عمارت کے باہر معقول [illegible] روشنی کا بندوبست تھا لیکن میں نے اندھیرے کا حصہ [illegible] محسوس کیا۔

مین گیٹ پر پہنچا تو اچانک اندر سے چیخوں کی آواز سنی۔ یہ نسوانی آوازیں تھیں اور جسے سنتے ہی میرا دل اچھل

"شکیلہ" میرے ذہن میں ابھرا۔ میری رگوں میں غیظ و غضب کے مارے جیسے لاوا دوڑنے لگا۔ وہ کمرہ انسپکٹر ڈسوزا [illegible] شکیلہ کے ساتھ کیا کر سکتا تھا۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔

میں نے اپنے [illegible] آتشیں [illegible] پر [illegible] کی طرف [illegible] دروازہ [illegible] چڑھا [illegible] اور اندر داخل ہو گیا۔

اندر قدم رکھا تو جو منظر تھا [illegible] وہاں کا منظر دیکھتے ہی میں بجلی کی طرح چونکا۔ وہ منظر میری توقع کے بالکل خلاف تھا [illegible] ایک لمحے کو تو جیسے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

☆☆☆

فرش پر ڈسوزا کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ قریب اس کے دو ساتھی پولیس مین بھی (جن میں ایک لڑکی بھی تھی) اسی حالت میں پڑے تھے۔ ان کی لاشیں بھی خون آلود ہو رہی تھیں، جبکہ شکیلہ دیوار کے ایک طرف [illegible] بہت حالت میں [illegible] پڑا تھا [illegible] کراہ رہا تھا۔

بڑا خوف ناک اور لرزا دینے والا منظر تھا میری آنکھوں کے سامنے ۔۔۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی [illegible] ہوئی [illegible] گئی ہو۔

[illegible] کی صورت میں [illegible] کے سروں پر کھڑے [illegible] دو [illegible] افراد میرے شناسا تھے۔ ان میں ایک ڈاکو تھا [illegible] کے ساتھی [illegible] لیکن ۔۔۔ وہ اس کے ساتھی [illegible] کے باقی ماندہ دو ساتھی تھے، جنہیں ڈاکو کی [illegible] کے [illegible] چھوڑ کر وہ ہمارے تعاقب میں آئے تھے [illegible] کی [illegible] بربریت کا شکار ہو گئے تھے۔

ہاں! یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ [illegible] کا [illegible] تھا تو پھر ریگت کے ساتھی کیوں اس سے [illegible] ممکن تھا وقت اور حالات کی کی بدلتی چال نے [illegible] کے مفادات یکساں کروا دیے ہوں۔

اب صورت حال یوں تھی کہ ڈاکو اور ایک ساتھی شکیلہ کے ساتھ زبردستی دست درازی کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور تیسرا ساتھی شکیل والا کو زدوکوب کر رہا تھا۔

شکیلہ ان کے قابو میں آنے والی کہاں تھی، لیکن اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کی حالت قابلِ رحم ہو رہی تھی اور نہایت خستہ بھی، وہ بھاری بھرکم [illegible] اس کی قمیص

Jaanshayari.com

[illegible] بچکے تھے۔ بے چاری [illegible] کی بھی [illegible] حالت ہو رہی تھی اور وہ اب صرف زیر جامے میں کھڑی تھی۔ اسی دوران اس کا ساتھی اب اسی جانب اپنا ایک ہاتھ بڑھا رہا ہے [illegible] وقت تھا جب میں [illegible]

یہ سب کچھ اس دوران اور اندر داخل ہوتے ہی [illegible] جیسے ایک سانپ سا بن گیا۔ شکیلہ کے ساتھ زیادتی میں مصروف اشتا اور اس کے ساتھی نے [illegible] تیسرا ساتھی [illegible] تھا۔ اس نے میری جانب اپنے پستول کی نال کا رخ گھمایا [illegible] ہاتھ میں پکڑے پستول نے دھماکے سے [illegible]

[illegible] کے ساتھ اپنے سینے میں [illegible] کے تمام [illegible] اشتا اور اس کا ساتھی [illegible] چھوڑ کر فرش سے ایک [illegible] میں ہاتھ [illegible] نے دوسری گولی اشتا پر چلا دی جو پیٹ میں لگی اور وہ [illegible] فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کا ساتھی جان بچانے کو دوڑا [illegible] تیسری گولی نے اس کا تعاقب کیا اور وہ اپنی پشت [illegible] گرا اور تڑپنے لگا۔

شکیلہ کی حالت زار دیکھ کر خود میری کیفیات اس وقت مارے غیظ و غضب کے لبریز ہو رہی تھی۔ میں نے چوتھی گولی چلا دی اور اس نے تڑپنا موقوف کر دیا۔

میں نے پستول ایک طرف پھینکا اور [illegible] دیتے ہوئے ان کے رہائشی کمروں کی جانب بڑھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہاں کوئی نہ کوئی لباس رکھا ہوگا۔ ایسا ہی ہوا۔ وہاں مردانہ زنانہ پولیس وردیوں کے علاوہ عام لباس بھی موجود تھے۔

ایک زنانہ پینٹ شرٹ لے کر میں شکیلہ کی جانب لپکا، اس کی ہتھکڑیاں کھولیں اور پھر شرمائی لجائی شکیلہ کو نیا لباس دے کر ایک کمرے میں بھیج دیا۔

اس کے بعد میں کمیل دادا کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ میں نے کمیل دادا کے زخموں اور شکیلہ کی خراشوں کی بھی مرہم پٹی کر ڈالی۔

تھوڑی دیر بعد ہم سکون کے ساتھ بیٹھے کھانے پینے میں مشغول تھے۔ ان کے رہائشی کمروں میں سب کچھ موجود تھا۔

اُن سے مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] یہ سارا آخر معاملہ کیا [illegible]

تھا۔

جب [illegible] کی نیت [illegible] کے ساتھ [illegible] تو تب میں [illegible] کی نیت سے اسی وقت روانہ ہو گیا تھا۔

اشتا ان کے [illegible] ٹھکانے پر [illegible] شریف [illegible] کے بعد [illegible] گئی اور [illegible] ٹھکانے پر [illegible] تو ان کے [illegible] بچ گئی۔

دونوں ساتھی [illegible] کو اپنے ٹھکانے پر چھوڑ کر [illegible] اور [illegible] کی تلاش میں نکلے۔

ایک [illegible] کی [illegible] جب انھوں نے [illegible] کر شریف [illegible] کے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کی [illegible] کے [illegible] گئے، پھر [illegible] ان کے قبضے میں [illegible] "ٹھکانا" (پولیس اسٹیشن) دیکھنے کے بعد یہ دونوں اپنے ٹھکانے پر آ گئے۔

وہاں [illegible] ایک مجبوری کے تحت ساری کہانی بیان کر دی۔ لہٰذا اس [illegible] میں [illegible] ان دونوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور [illegible] اب صرف [illegible] رہ گئے ہیں۔ [illegible] اب اس کا ساتھ دیں۔ یوں [illegible] ایک [illegible]

[illegible] جب وہاں پہنچے تو انھیں سوائے دو افراد اور ایک [illegible] ایک [illegible] اور کمیل دادا بھی نظر آ گئے۔ [illegible] کو انھوں نے [illegible] بربریت اور جنونی فطرت کے بارے میں بتا دیا [illegible] کی گرل فرینڈ نیلی اور اس کے [illegible] کو بے دردی سے ہلاک کر ڈالا ہے۔

اپنی گرل فرینڈ نیلی اور [illegible] کی ہلاکت نے [illegible] کو [illegible] اس سے [illegible] کر دیا۔

میرے حوالے سے [illegible] پہنچے ہی [illegible] کمیل دادا اور شکیلہ کو [illegible] اپنا [illegible] میں [illegible] وہ اسکواڈ اور اس کے دونوں پولیس [illegible] ساتھیوں کو ہلاک کر بیٹھا۔

اس کے بعد [illegible] اور شکیلہ کو قید خانے [illegible]

ہمارے قریب ہو لے۔ اس نے [illegible] گھور کر دیکھا اور وہ ناگواری سے بولا۔ "ہمم...... تفریح...... یا پھر کسی قسم کی جاسوسی کے لیے جا رہے ہو؟"

اس دوران میں میرے تیزی سے کام کرتے ذہن نے اب تک اس سوالات جواب گفتگو سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ ایسا کیوں کیا جا رہا تھا اور کیبن پر بیٹھا ہوا یہ ٹکٹ فروش دراصل کوئی کاروباری آدمی نہیں بلکہ لولوش کا ہی کوئی ایسا آدمی تھا جسے یہاں متعین کیا گیا تھا تاکہ وہ ہر آنے جانے والوں کی مکمل تسلی کر لے اور کوئی بعید نہ تھا کہ میرے ہوگ بے کی جانب روانہ ہوتے ہی وہ ہمارے جزیرے میں قدم رکھنے سے پہلے ہمارے بارے میں وہاں کسی ساتھی کو اطلاع بھی کر دے۔ نیز مجھے معلوم تھا کہ بے شک ہوگ بے پر لولوش کی حکومت تھی لیکن امریکی حکومت نے لولوش کو اس بات کا بھی پابند کیا تھا کہ وہ کسی سیاح کو اپنے جزیرے کی سیر کرنے سے روک نہیں سکتا۔

لہٰذا میں نے اس کی بات پر نوجوانوں والے روایتی جوش اور غصے سے کہا۔ "اے مسٹر! آخر تم ہو کون؟ ٹکٹ بیچ رہے ہو یا کوئی اور معاملہ ہے؟ کیا میں امریکی حکومت کے کسی اعلیٰ آفیسر سے شکایت کر دوں؟ جن کے حکم نامے کے مطابق تم کسی بھی سیاح کو وہاں جانے سے روک نہیں سکتے؟ یہ ایک معاہدہ ہے جس کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔"

میری دھمکی نے اس کے ایک لمحے میں ہی کس بل نکال دیے۔ جلدی سے کیفیت بدل کر مکاری سے ہنستے ہوئے بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ درحقیقت یہ ایک پرائیویٹ جزیرہ ہے۔ اسی لیے اس کی سیکیورٹی ذرا سخت ہے۔ خیر...... اپنا نام بتانا پسند کرو گے؟"

"جیمس۔" میں نے غلط نام بتایا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے مانیٹر پر اسے ٹائپ کیا۔ پھر پوچھا۔

"تمہارے ان دونوں ساتھیوں کے نام؟ جو تمہارے ساتھ ہیں؟"

"وہ میرے ساتھی نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"اوہو...... تو پھر کون ہیں وہ؟ ابھی تم نے کہا تھا کہ......"

"وہ میرے موم پا ہیں۔" میں نے شرارتی سے لہجے میں کہا۔

"[illegible] اوکے۔" وہ اپنا سر ہلانے لگا۔ [illegible]

ایک لڑکی [illegible] جہاں سے یہ بات کہ جاتے ہی ہوگ بے کے سلسلے میں سب سے پہلے [illegible] [illegible] کروں گا، پھر تمہاری باری آئے گی۔"

"ارے...... رے...... رے، رکو...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ ایک دم پریشان ہو کے چلایا اور میں ایک بار پھر جاتے جاتے اس کی جانب پلٹا۔ اس نے جلدی سے تین ٹکٹ کاٹ کر مجھے تھما دیے۔ پھر جب میں اسے پے کرنے لگا تو اس نے انکار کر دیا اور اس قدر اخلاق سے بولا جیسے وہ اسی پر ہی ختم ہے۔

"آپ لوگ چونکہ پہلی بار یہاں آئے ہو اس لیے یہ ٹرپ مفت کرو۔"

میرا خوشی کا اظہار کرنا ضروری تھا، میں نے باچھیں پھیلا دیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ چونکہ ہوگ بے کی طرف کم ہی سیاح جاتے ہیں اسی لیے وہاں ایک ہی لانچ چلتی ہے۔ لہٰذا اس نے میری رہنمائی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مجھے اپنے موم پا سمیت برتھ نمبر نو پر جا کر ہوگ بے کی لانچ کا انتظار کرنا ہوگا۔

"ہوگ بے کی طرف جانے والے کی بڑی زبردست ریکی کی جا رہی ہے اور کڑی پوچھ گچھ بھی۔" میں نے کھیل دادا اور شکیلہ کے قریب آ کر کہا۔

پھر انہیں برتھ نمبر نو کی جانب بڑھنے کا کہا۔

"ہمم...... اس کا مطلب ہے پھر وہ ایک ہی لانچ ہو گی اور اس میں بھی لولوش کے جاسوس ہی ہو سکتے ہیں۔" شکیلہ نے زود فہمی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"تم ٹھیک سمجھیں۔" میں نے اس کی تائید میں کہا۔ "اس طرف تو میرا دھیان بھی نہیں گیا تھا۔"

"تب پھر کیا ہمیں ان کے ساتھ ہوگ بے جانا چاہیے؟" کھیل دادا گمبھیر لہجے میں بولا۔

"ہاں دادا! اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

ہم برتھ نمبر نو والی ایک جیٹی کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں چوبی بنچیں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے کھیل دادا اور شکیلہ کو اس پر بیٹھنے کا اشارہ کر دیا اور خود کھڑا ہو کر لاابالی سی حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ کیبن نمبر پانچ والا آدمی ہم پر گہری نظریں رکھے ہوئے ہوگا اور ہماری ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا ہوگا۔ اسی سبب میں عمر رسیدہ موم پا سے ذرا ہٹ کر اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا لاابالی نوجوان ہی خود کو ظاہر کر رہا تھا۔

[illegible]

jaanshayari.com

Protected with free version of Watermarkly. Full version doesn't put this mark.

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 64

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور آستانہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو اُن کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آئے دشمنوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

[illegible]

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

[illegible]

[illegible]

"کوکھوگا — نام ہے اس کا۔" اس نے مجھے ایک عجیب سا نام بتایا۔

"ارے..... روڈی! تم کیا باتیں کر رہے ہو اس سے.....؟"

دفعتاً بینچوں کے درمیان کھڑے اس کے ساتھی نے ہانک لگائی اور وہ میری طرف آنے لگا۔ میں یک دم محتاط ہو گیا اور اپنے مخاطب کو طلسمی مجوزے کے ٹرانس سے نکال دیا۔

اسی دوران میں نے کن انکھیوں سے موم اور پا کی طرف دیکھا، جو بہ ظاہر سمندر کا نظارہ کرنے میں محو تھے لیکن میں جانتا تھا کہ ان کی ساری توجہ میری طرف تھی، کسی بھی خطرے کی صورت میں وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آنے کے لیے تیار تھے۔

گویا مجھ سے جو مخاطب تھا، اس کا نام روڈی تھا، ٹرانس سے نکلتے ہی اس نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکا دیا۔

"کیا ہوا روڈی؟ تم سر کیوں جھٹک رہے ہو؟" اس نے قریب آتے ہوئے مشکوک انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، شاید چکر سا آ گیا تھا۔" روڈی نامی اس کے ساتھی نے جواب میں کہا۔

"کوئی مسئلہ ہے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔" روڈی نے کہا۔

میں نے دیکھا وہ بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ رہا تھا، جیسے کچھ سوچتے ہوئے الجھ رہا ہو۔

"اے مسٹر—! کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" دوسرے نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے استفساریہ کہا۔

"جیمس" میں نے اپنا وہی نام بتایا جو پہلے ٹکٹ لیتے ہوئے بتایا تھا۔

"ہاں! تم اپنے موم پا کے پاس جا کر بیٹھو، شاباش!" اس نے مجھے یوں پچکارا جیسے میں کوئی بچہ تھا۔

میں منہ بناتا ہوا موم پا کی طرف چلا گیا۔

"اس کم بخت نے آ کر سارا کھیل ہی بگاڑ دیا۔" میں نے قریب جا کر گیبل دادا اور شکیلہ سے سرگوشی میں کہا۔

"ہم دیکھ رہے تھے تم اسے ٹرانس میں لیے ہوئے کچھ پوچھ رہے تھے۔" شکیلہ نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں!" کہتے ہوئے میں نے انھیں بتا دیا کہ میں روڈی سے کیا پوچھنے کی جستجو میں تھا۔

"کوتھوگا.....؟ یہ کس بلا کا نام ہے؟" گیبل دادا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں، وہ اس کی تفصیل بتانے والا تھا کہ اس کے ساتھی نے آ کر خلل ڈال دیا۔" میں نے دانت پیس کر کہا اور ان دونوں کی جانب دیکھا۔

وہ اب بھی اپنے ساتھی روڈی سے کچھ پوچھنے کے انداز میں مخاطب تھا اور بار بار ہماری طرف بھی تکے جا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں ان پر اٹیک کر دینا چاہیے۔" شکیلہ بولی۔

"یہی کرنا پڑے گا لیکن ابھی نہیں۔"

میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

لولوڈش کی کمین گاہ جزیرہ ہوگ بے کی طرف ہمارا سفر جاری تھا۔

دن نکل آیا تھا لیکن سورج بادلوں کی اوٹ میں کہیں چھپا ہوا تھا، بادلوں کا رنگ بھی تبدیل ہونے لگا تھا، وہ سفید سے سیاہ پڑنے لگے تھے، خدا کی قدرت بھی، انہیں سیاہ و سفید کا مالک بنا رکھا تھا۔

سمندری ہواؤں میں بارش کی باس رچنے لگی تھی۔ موم پا کھڑے تھے، میں نے انہیں بیٹھنے کا کہہ دیا تھا کہ ان تیز ہواؤں میں بوڑھے یوں بھی زیادہ دیر کھڑے نہیں رہ سکتے تھے، ان تینوں کو شک ہو سکتا تھا، خود میں بھی زیادہ دیر موم پا کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، بھلا لاابالی سے نوجوان کب بوڑھوں کو اتنی لفٹ کراتے ہیں۔

اسی لیے میں اپنا منصوبہ ان سے شیئر کرنے کے بعد ان سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ان کی جانب بڑھ گیا۔ دوسرا ساتھی ہنوز روڈی کے ساتھ کھڑا تھا۔ ان دونوں میں سے ایک اب سگریٹ کے کش لگا رہا تھا جبکہ دوسرا یعنی روڈی اپنی جیب سے شراب کی ایک چھوٹی اور چپٹی بوتل نکالے اس کے گھونٹ بھر رہا تھا۔

"کتنا سفر رہ گیا ہے باقی؟" میں نے ان کے قریب آ کر کہا۔ مجھے پہلے والا کچھ زیادہ تنگ مزاج اور محتاط نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواب میں اپنے ایک ہاتھ سے جنوب مغربی سمت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ دیکھ رہے ہو کالا دھبا—"

میں نے اس کے اشارے کی سمت دیکھا جہاں مجھے حدِ نگاہ پھیلے ہوئے سمندر کے درمیان ایک سیاہ رنگ کا اور قدرے لمبوترا سا دھبا دکھائی دیا۔

"یہی ہوگ بے ہے، ایک گھنٹا مزید لگ جائے گا

پہنچے میں۔''

''ہم......'' میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''روڈی بتا رہا تھا کہ تم ماسٹر لولوڈش کے لیے کوئی انوکھا اور قیمتی تحفہ لے جا رہے تھے؟'' اس نے اچانک دریافت کیا۔ میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہوگئیں۔

اس کم بخت روڈی کو ٹرانس میں آنے سے پہلے میری بات یاد رہی تھی۔

''ہاں۔'' میں نے فوراً مگر مختصراً جواب دیا۔

''کیا ہے وہ؟ مجھے دکھاؤ۔'' کہتے ہوئے اس نے میرے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کردیں۔

''نہیں، یہ بالکل انوکھی چیز ہے، جو صرف میں مسٹر لولوڈش کو ہی دکھاؤں گا۔''

''ایک بات دھیان میں رکھنا۔'' اس نے اچانک عجیب لہجے میں کہا۔

''ماسٹر لولوڈش اپنے سلسلے میں 'مسٹر' کہلوانے کا قائل نہیں ہے، وہ ماسٹر کہلوانا زیادہ پسند کرتا ہے۔''

''اچھی بات ہے میں آئندہ اس کا خیال رکھوں گا۔''

''لیکن تمہیں وہ شے پہلے کسی کو دکھانا ہوگی، اس کے بغیر تمہیں ماسٹر سے ملنے ہی نہیں دیا جائے گا۔''

''تب کی تب دیکھی جائے گی۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے بھی اس کی پروا نہیں۔''

''ہے، جون اینڈ روڈی...... ادھر آؤ......'' اچانک پائلٹ کیبن کی کھڑکی سے ان کے ادھیڑ عمر ساتھی نے انہیں پکارا۔ وہ دونوں اس طرف بڑھ گئے۔

بحر اوقیانوس کے سمندروں میں یہ سفر جاری رہا۔ میں روڈی سے کوتھوگا نامی اس عجیب اور خوفناک مخلوق کے بارے میں مکمل طور پر دریافت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

لگ بھگ کوئی نصف پون گھنٹے بعد وہ کالا دھبا ایک خوب صورت جزیرے کی صورت نظر آنے لگا۔ اس کے ساحل پر پام اور ناریل کے درختوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں۔

ہوگی جے واقعی برمودا تکون کے دیگر جزائر سے الگ تھلگ واقع تھا بلکہ ارد گرد نظر آنے والے جزائر کے آثار سے بالکل کونے میں واقع دکھائی دیتا تھا۔

مزید قریب آنے کے بعد میں نے کھیل دادا اور شکیلہ کو اشارے سے گرین سگنل دے دیا۔

میرے ذہن میں جو ''بی پلان'' تھا، وہ میں نے ان دونوں کے گوش گزار کردیا تھا۔

لہٰذا میں اپنی جگہ سے پلٹا اور...... ڈرائیونگ کیبن کی طرف آگیا۔ یوں کھیل دادا اور شکیلہ بھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے کے انداز میں اس کے قریب آنے لگے۔

کیبن کے قریب آکر میں دانستہ قدرے جھک کر کھڑکی کے اندر جھانکنے لگا۔ اندر وہ تینوں بیٹھے کافی پینے میں مصروف تھے۔

جون کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے وہیں سے ہانک لگا دی۔

''اے کیا کام ہے تمہیں......؟''

''کیا مہمانوں کو کافی پلانا منع ہے؟'' میں نے کھلنڈرے پن سے مسکرا کر کہا۔

''اندر آجاؤ۔'' اس نے کہا۔ میں اندر چلا گیا۔ وہیل پر بیٹھا ادھیڑ عمر کپتان مجھے ناگوار نظروں سے تکے جا رہا تھا۔

جون اور روڈی کے ساتھ وہ شاید کسی اہم موضوع پر بات کر رہا تھا۔ میرا یوں در آنا اسے بُرا لگا تھا۔

''شکریہ دوستو! ایک کپ پلیز۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ مگ تھامو اور باہر کا راستہ لو۔'' ادھیڑ کپتان نے الیکٹرک کیتل کے ساتھ رکھے کافی کے ادھ بھرے مگ کو میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر رکھا۔

''یار ناراض کیوں ہوتے ہو۔'' کہتے ہوئے میں نے اس کی گردن میں گدی کے پاس طلسمی انگوٹھی کے سانپ کا پھن لگا دیا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے۔

سریع الاثر زہر نے اسے وہیں لڑھکا دیا۔

''ای ی...... یہ اسے کیا ہوگیا؟'' روڈی چلّایا۔ جون نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پستول نکال کر مجھ پر تان لیا۔

''کیا کیا ہے تم نے اس کے ساتھ؟ بتاؤ ورنہ تمہیں گولی......'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اسی وقت باہر سے کھیل دادا نے شکاری خنجر کھڑکی کے راستے اندر اچھالا تھا۔ جو جون کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ وہ تڑپ کر گرا اور ٹھنڈا ہوگیا۔

''ت...... تم......'' روڈی کی آنکھیں پھٹی چلی گئیں اور اس نے بھی جون والی حرکت کرنی چاہی تھی کہ میں کسی چیتے کی طرح اس پر جھپٹا اور اسے بھی پل بھر میں بے بس کر

دیا۔

گیبل دادا اور شکیلہ بھی اندر کود پڑے تھے۔

"مِنی کی...... یہ تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو؟" روڈی نے تہدیدی انداز میں ہماری طرف گھور کر کہا۔

"یہ بات تم خالصتاً ہماری ذمے داری پر چھوڑ دو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا بُرا۔" میں نے جیسے اس کی بے بسی پر حظ اٹھانے کے انداز میں کہا۔

"منزل قریب آ رہی ہے، پارٹنر!" اچانک گیبل دادا نے کھڑکی سے باہر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا۔

ہمیں ایک دوسرے کو اصل نام سے نہیں پکارنا تھا اسی لیے اس نے پارٹنر کا لفظ استعمال کیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر طلسمی بھونرا نکالا اور اسے اس کی آنکھوں اور چہرے کے قریب کرتے ہوئے ڈرامائی لہجے میں بولا۔

"ہاں! تو تم بھول گئے کہ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ تحفہ میں تمہارے ماسٹر لولوش کے لیے لایا ہوں۔"

روڈی مجھے خوف زدہ سی نظروں سے دیکھنے لگا اور بھونرے نے اپنے پر بھنبھنانے شروع کر دیے۔

وہ جیسے ہی ٹرانس میں آیا۔ میں نے اس سے کہا۔

"میری ایک بات غور سے سنو — کیا کہہ رہا ہوں میں؟" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں! میں سن رہا ہوں تمہاری بات۔ ....." وہ تنویمی انداز میں بولا۔

اس جادوئی ہتھیار کی یہ سب سے بڑی خرابی تھی بلکہ ایک کمزوری تھی کہ اسے تابع شخص کے سامنے اسی طرح بھنبھناتے ہوئے سامنے رکھنا پڑتا تھا اور اس کا دورانیہ زیادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بصورت دیگر یا تو زیر تسلط کو برین ہیمرج ہو جاتا یا خود اس خطرناک طلسمی بھونرے کو استعمال کرنے والا بھی اس کی زد میں آ سکتا تھا۔

لہٰذا میں ایک مختصر دورانیے تک ہی اسے استعمال کرنے پر مجبور تھا۔

"جزیرے کا کوئی ایسا ساحل بتاؤ جو ماسٹر لولوش کے ٹھکانے کے قریب ہو؟"

"اس کے لیے لانچ کو ابھی سے نوے ڈگری کے زاویے پر شمال مغربی سمت بڑھانا ہوگا۔" اس نے میکانکی انداز میں جواب دیا۔

"وہیل تمہارے سامنے ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ لانچ کو نوے ڈگری کے زاویے پر شمال مغربی سمت موڑ دو۔"

اس نے فوراً ایسا ہی کیا۔ لانچ ایک طرف کو دھیرے دھیرے گھومنے لگی۔ اندر ایک دوربین لٹک رہی تھی۔ دیوار سے وہ میں نے اتار کر کھڑکی کے اندر سے ہی اپنی آنکھوں سے لگالی۔

ہونگ سے بے کا ساحل صاف نظر آ رہا تھا اور وہاں کچھ لوگ متحرک محسوس ہوئے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ ساحل رخ بدلنے لگا اور سبز سبز سی پہاڑیاں دکھائی دینے لگیں۔

جیسے جیسے لانچ اپنا رخ بدل رہی تھی، جزیرے کا رخ بھی بتدریج بدلتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پچھلے دو مناظر نظروں سے اوجھل ہو گئے اور گھنا جنگل نظر آنے لگا۔ وہ جنگل اس قدر گھنا تھا کہ ساحل تک چلا آیا تھا۔ ریت کی صرف ایک پٹی سی دکھائی دیتی تھی جہاں آتی جاتی موجیں سر پٹخ رہی تھیں۔

"کیا اب ہم طے شدہ لائن پر ہیں؟" میں نے روڈی سے پوچھا۔

"جی ہاں! ہم اب مطلوب سمت کی جانب بڑھ رہے ہیں ---- اور ---- میرا سر ----"

جواب دینے کے بعد ہی اس کا سر چکرانے لگا۔ میں نے گھبرا کر جلدی سے بھونرے کے پیٹ والے حصے کو انگلی کی پور سے پُش کیا، اس کے مہیب پر بھنبھنانا بند ہو گئے، لیکن روڈی کا کام شاید تمام ہو چکا تھا، کیونکہ اگلے ہی لمحے اس کی ناک اور کانوں سے خون جاری ہو گیا۔ وہ گر پڑا۔

میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ بھونرا دوبارہ چرمی کیس میں رکھا اور ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگالی۔

"ہم منزل کے قریب ہیں۔ غوطہ خوری کی تیاری کرو اور چوکنا رہو۔"

میں نے لانچ کا انجن بند کر کے لنگر ڈال دیا۔

ٹھیک اسی وقت میرے سر پر ایک تیز کڑاکے کی آواز ابھری اور میں ہی نہیں گیبل دادا اور شکیلہ بھی اپنی نشست سنبھالتے ہوئے بُری طرح چونکے۔

یہ بادل اور آسمانی بجلی کی کڑک تھی اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بھرے بھرے آسمان پر اس قدر کالی گھٹائیں امڈ آئی تھیں کہ ہر سو تاریکی کا گمان ہونے لگا تھا۔ بپھرے بپھرے اور حد نگاہ پھیلے ہوئے سمندر میں بارش کا سماں عجیب ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔

"... کام جاری رکھو......" بادو یاراں کے شہر میں، میں نے تقریباً چلا کر کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم غوطہ خوری کے لباس میں نظر آرہے تھے۔ ہتھیار ہم نے واٹر پروف کٹس میں سنبھال لیے تھے۔

اس کے بعد ہم نے بیک وقت لانچ سے سمندر میں چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

پانی یخ بستہ تھا۔ اس کی شدت نے ہمارے جسموں کو ٹھٹھرا کر رکھ دیا لیکن دوسرے ہی لمحے ہم نے اپنے ہاتھوں پیروں کو تیزی کے ساتھ حرکت دینا شروع کر دی۔

ہم اب سمندر کے اندر ہی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے اور ٹھنڈے پانی کے سبب رگوں میں دوڑتے لہو کو بھی کافی حد تک گرم رکھے ہوئے تھے۔

ایک مقررہ اندازے کے بعد جہاں پانی کچھ اتھلا اور نیچے مونگیا کی جھاڑیوں کا سلسلہ محسوس ہوا تو ہم اوپر کی سطح پر آگئے۔

بادلوں اور بجلی کی گرج چمک جاری تھی۔ دن میں بھی چمکتی ہوئی بجلی کی لہریں صاف نظر آتی تھیں۔

ہم ساحل کے قریب پہنچ چکے تھے اور اب تیزی کے ساتھ قریب ہی میں ٹانگیں چلاتے ہوئے بالآخر ریت پر آکر ڈھیر ہوگئے۔

مسلسل تیرتے رہنے کے سبب ہم تھک کر چور ہو چکے تھے لہٰذا اوندھے منہ پڑے لمبی لمبی سانسیں لیتے رہے۔ یہ عمل پانچ سے دس منٹوں تک جاری رہا۔ اس کے بعد ہم اٹھ کر آگے بڑھے۔

سامنے ہی جنگل برسات میں شرابور ہوتا یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے دھلنے اور نکھرنے کے عمل سے گزر رہا ہو وہاں برستی بارش میں دھواں دھار سا منظر عجیب محسوس ہو رہا تھا۔

ذرا دیر سستانے اور اپنی بے ترتیب سانسیں بحال کرنے کے بعد ہم اپنے اصل گیٹ اپ میں آگئے۔

ہمارا گویا اب لولوش کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر پوری تیاری کے بعد ہم چاق و چوبند نظر آنے لگے۔

گرد و پیش کی سن گن لینے کے بعد ہم نے جنگل کا رخ کیا تو قریب پہنچ ہی جانے کیا ہوا کہ اچانک میرا دل کسی خوفناک خیال کے باعث بری طرح زور سے دھڑکا اور

ادارہ خبرت

[illegible]

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

2019

[illegible]

کنواری لڑکی سے تاریخ رقم کرنے والی دوشیزہ کی حالات زیست۔ **زرین قمر** کی تحریر

[illegible]

فاقوں بھری زندگی سے ادب تک پہنچنے والے کی داستان۔ **تنویر ریاض** کی تحریر

[illegible]

اس نے خدمت خلق کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ **منظر امام** کی دلچسپ تحقیق

[illegible]

دلچسپ پیرائے میں نوعمر لڑکوں کی ایک ٹولی کے سفر کا احوال **ندیم اقبال** کے قلم کا شاہکار

[illegible]

قیام پاکستان کے وقت کچھ انوکھے واقعات بھی رونما ہوئے تھے۔ ایک بالکل الگ انداز کی سچ بیانی

[illegible]

نامور قلم کاروں کی اور بہت سارے سچے واقعات۔ دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی قصے۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

بھیگے، اسراریت سی بکھیرتے جنگل کی طرف بڑھتے بڑھتے میرے قدم ایک دم رک گئے۔

"کوتھوگا۔۔۔" یہ لفظ اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔

"کیا ہوا شہزی؟ رک کیوں گئے؟" شکیلہ نے قدرے چونک کر مجھ سے پوچھا۔ وہ دونوں بھی رک گئے تھے۔

"ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

"وہ تو ہم پہلے ہی سے ہیں۔" کمیل دادا نے کہا۔

"نہیں، میں کسی اور خطرے کی بات کر رہا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے انہیں روڈی سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق بتایا۔

شکیلہ سن سی ہو کر رہ گئی تھی، جبکہ کمیل دادا بولا۔

"یہ اس خبیث لولوتش کا کوئی پالتو درندہ، چیتا یا شیر وغیرہ ہوگا جس کا نام دہشت پھیلانے کے لیے اس نے کوتھوگا رکھ دیا ہوگا۔"

"مگر یہ کوئی عام درندہ نہیں ہو سکتا دادا......!" میں نے جیسے گم صم سے لہجے میں کہا۔ یوں جیسے میں کوتھوگا کے ٹرانس میں آ گیا ہوں۔

"اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ کوئی ایسی خطرناک شے ہے جس کا مقابلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔"

"کیا ہو گیا ہے یار تمہیں شہزی؟" کمیل دادا اچانک مسکرا کر بولا۔ "ابھی ہمارا اس جانور سے سامنا ہوا نہیں اور تم ابھی سے ہی......"

"نہیں دادا......!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ایسی بات نہیں ہے، لولوتش کبھی بھی غیر ضروری شے پالنے کا قائل نہیں ہو سکتا۔ جس مونسٹر درندے نے بستی کی بستیاں اجاڑ دی ہوں وہ کوئی عام یا معمولی درندہ نہیں ہو سکتا۔"

"ہم اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" کمیل دادا بڑے جوش سے بولا۔

"میرا خیال ہے شہزی ہمیں کچھ اور سمجھانا چاہتا ہے۔" اچانک شکیلہ نے جیسے میرے دل کی آواز پر لبیک کہا۔

"شہزی! کیا واقعی ایسا کچھ ہے؟" تب ہی شکیلہ نے کمیل دادا سے یہ کہتے ہوئے مجھ سے بھی پوچھ لیا۔

"تم ٹھیک سمجھی ہو شکیلہ!" بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی۔

حقیقت یہی تھی کہ مجھے بھی ایک لمحے کے لیے یوں لگا تھا جیسے میں اس جانور کی دہشت کے زیر اثر آ گیا ہوں۔ دراصل میں نے اس کے بارے میں جو سن رکھا تھا، وہ اتنا ہی دہشت زدہ کر دینے والا تھا مگر میں نے اس مفروضے پر یقین نہیں کیا تھا۔ روڈی کی زبانی جب وہ ٹرانس میں تھا تو اس نے بھی اس خوفناک درندے کی تصدیق کر ڈالی تھی اور کوئی آدمی مکمل تنویم کے زیر اثر ہو تو وہ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔ اس لیے کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہوتا۔ جو کچھ کہہ رہا ہوتا ہے وہی اس کے دل اور ذہن میں بھی ہوتا ہے۔ یعنی وہ کچھ چھپا نہیں سکتا۔

میں نے کہا۔ "میں اچانک فکرمند اس لیے ہو گیا تھا کہ اگر خدانخواستہ اس درندے کے ساتھ ہمارا سامنا ہو بھی جاتا ہے تو ہم اس سے کیا عام ہتھیاروں سے مقابلہ کر پائیں گے؟ ضرور اور لوگوں نے بھی جو اس کی اب تک بھینٹ چڑھ چکے ہیں، انہوں نے بھی تو آتشیں ہتھیاروں کی مدد سے اسے ہلاک کرنے کی کوشش کی ہوگی؟"

"میرا خیال ہے تمہیں روڈی سے یہ بھی پوچھ لینا چاہیے تھا کہ آخر اس درندے کو پھر کس طرح قابو کیا جاتا ہے؟" کمیل دادا نے کہا۔

"ہاں! میں یہی معلوم کرنے لگا تھا مگر اسی وقت روڈی کے ایک جون نامی ساتھی نے مداخلت کر دی اور مجھے روڈی کو ٹرانس میں سے نکالنا پڑا تھا پھر مجھے موقع نہیں ملا۔" میں نے جواب میں کہا۔

"چلو اب آگے بڑھو، دیکھا جائے گا۔" شکیلہ نے کہا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم لولوتش کی کمین گاہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ عابدہ اس کی قید میں تھی، اس بے چاری کے تو سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں ہزاروں میل دور سے پُرآلام مصائب کی مسافتیں پاٹنے کے بعد یہاں تک آن پہنچا تھا۔

بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی بلکہ اب بتدریج طوفانی صورت اختیار کرنے لگی تھی، اس میں تیزی آتی جا رہی تھی اور بجلی بھی بڑے خوفناک انداز میں کڑک رہی تھی۔ دن میں کالے بادلوں کے سبب تاریکی اور رات کا گمان ہوتا تھا۔ اس طوفانِ باد و باراں نے ہمیں بھی مجبور کر کے رکھ دیا تھا۔

اگرچہ یہ ہمارے مشن کے لیے قدرے بہتر ماحول اور موسم تھا مگر اس میں خطرناک پہلو یہ بھی تھا کہ ہم اس

ملاقات سے پوری طرح آشنائی نہیں رکھتے تھے۔ یہاں کھائی تھی اور کہاں گڑھا، نجانے کس مقام پر کوئی بوبی ٹریپ ..... ہمارا منتظر ہوتا۔

لولوش کی اسٹیٹ میں تو ہم قدم رکھ چکے تھے، بقول کھیل داوا کے بھی یہ معمولی بات نہ تھی، لہٰذا اب ہمیں جلد بازی سے گریز ہی کرنا چاہیے تھا۔

ہم ساحل سے ذرا ہٹ کر جنگل کے ایک گوشے میں چھپے بیٹھے تھے۔ بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی اور متفقہ طور پر یہی طے پایا گیا تھا کہ اس طوفان باد و باراں کے تھمنے کے بعد ہی کسی قسم کی پیش قدمی کی جانی چاہیے تھی۔

ہمارے پاس خشک خوراک کی صورت میں جو بھی زادِ راہ تھا، وہ نکال کر ہم پیٹ کی آگ بجھانے لگے۔ ہم گرد و پیش پر بھی نگاہ رکھے ہوئے تھے، اس بات کا احتمال تھا کہ رونی اور جون وغیرہ کے سلسلے میں دشمن ہماری جانب سے خبردار ہو سکتے تھے، اگرچہ ہم نے ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا جس سے ہماری نشاندہی ہوتی، تاہم جیٹی پر موجود ٹکٹ گھر میں متعین لولوش کے بہروپیے جاسوس اس بات کی اطلاع پہلے ہی ہوگ بے تک پہنچا چکے ہوں گے کہ دو بوڑھے اور ایک گنجا نوجوان ہوگ بے کی سیر کو روانہ ہوئے تھے۔ ان کی لانچ ہوگ بے کے ساحل تک نہیں پہنچ سکی تھی تو ان کی ڈھنڈیا پڑ سکتی تھی۔

ہم آپس میں مشن سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ وقت گزرتا گیا۔ ہمارے پاس ریڈیم ڈائل والی رسٹ واچز تھیں، وقت اب سہ پہر سے شام کا ہونے لگا تھا۔ بارش کا زور بھی سہ پہر کے بعد ہی کہیں جاکے ٹوٹنا شروع ہوا تھا لیکن اب بھی ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور کبھی کبھار آسمان پر بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بتا دیتی تھی کہ کالی گھٹاؤں کا عمل ہنوز جاری ہے۔

اب ہر سو تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ طوفانی بارش کے تھمتے ہی یہاں ایک دم بخود سا سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ کہیں قریب ہی کسی گیلی شاخ یا بھیگے پتوں سے پانی کے قطرے جمع شدہ پانی میں گرتے تو عجیب سے جلترنگ کی سی آواز ابھرتی۔

بارش اب بالکل رک چکی تھی۔ بھیگا بھیگا جنگل بھی اب جیسے ہولے ہولے سانس لیتا محسوس ہو رہا تھا، ہمیں اپنے سانسوں کی بازگشت تک صاف سنائی دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔'' بھیگے بھیگے ماحول کے اسرار بھرے اور دل دھڑکا دینے والے دم بہ خود سکوت میں کھیل داوا کی ہلکی سرگوشی سے مشابہ آواز ابھری۔

اس کے ذرا ہی دیر بعد ہم تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم چونکہ اب اپنے اصل روپ میں تھے اسی لیے آتشیں ہتھیار اب ہمارے ہاتھوں میں کھیلنے لگے تھے۔

میں آگے تھا، درمیان میں شکیلہ اور آخر میں کھیل داوا۔ اسی ترتیب سے ہم بڑے چوکنا انداز میں آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ رات گہری ہو رہی تھی اور ہم محض ایک اندازے کے مطابق آگے بڑھ رہے تھے۔

ابھی ہم بہ مشکل پچیس تیس قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ یکایک مجھے سامنے کے رخ پر روشنی دکھائی دی، زیادہ غور پہ معلوم ہوا کہ وہاں کوئی الاؤ روشن تھا۔

''یہ روشنی کیسی ہے؟'' کھیل داوا نے سرگوشی میں کہا۔

''کچھ لوگ آگ دہکائے اس کے گرد جمع ہیں۔'' شکیلہ نے بھی دبی آواز میں کہا۔

''ہاں! کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ آؤ.....'' میں ہولے سے بولا اور اس طرف قدم بڑھا دیے۔

لگ بھگ کوئی پندرہ سولہ فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر ہم رک گئے اور سامنے کا منظر اب واضح نظر آنے لگا تھا۔

ایک بڑے سے الاؤ کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ عورتیں اپنے دراز بالوں کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھیں جو لمبے جبے کے گھونگھٹ سے نکل کر ان کے کاندھوں پر جھول رہے تھے۔

ان سب نے زرد رنگ کے ڈھیلے ڈھالے چغے پہن رکھے تھے۔ ان کی آنکھیں الاؤ پر جمی ہوئی تھیں جس کی روشنی میں ان کے چہرے بھی انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔

ایک دراز قامت ضعیف شخص ان کے درمیان موجود تھا، اس کی سفید داڑھی سینے تک جھول رہی تھی۔ گلے میں ان گنت مالائیں لٹکی ہوئی تھیں، وہ ان سب سے الگ تھلگ الاؤ کے ذرا قریب کھڑا تھا اور..... آنکھیں موندے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جاتا۔ ہم تینوں بڑے غور سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

ضعیف آدمی نے لمبا سا ڈنڈا پکڑ رکھا تھا جس پر کچھ مالائیں اور کوڑیاں جھول رہی تھیں۔ ایک پیتل کا گھنٹا بھی لگا ہوا تھا۔ جسے وہ ڈنڈا زمین پر مار کر کبھی کبھی بجا لیتا تھا۔

تب ہی اچانک اس نے گھنی سفید بھوؤں سے ڈھکی ہوئی اپنی آنکھیں کھولیں اور بآواز بلند اجنبی زبان میں کچھ

کہا اور لوگوں کے مجمع میں سے ایک کی جانب انگلی سے اشارہ کر دیا۔ جس کی جانب اشارہ کیا تھا، وہ شخص زور سے چیخا اور دیکھتے ہوئے الاؤ کے قریب آ گیا۔ وہ اب اپنا سر پیٹ پیٹ کر ”کوتھوگا...... کوتھوگا......“ کہے جا رہا تھا۔

اس نام پر ہم تینوں چونکے بغیر نہ رہ سکے کیونکہ کوتھوگا کا لفظ ہمارے لیے اب اجنبی نہیں رہا تھا، اگرچہ ابھی تک ہم اس کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے۔

اس کے بعد وہ الاؤ کے کنارے لیٹ گیا اور پھر جیسے اس ضعیف اور لمبی سفید داڑھی والے نے بلند آواز میں کچھ بولنا شروع کر دیا، باقی سب لوگ بھی اس سے ہم آواز ہونے لگے۔

یہ عمل بہ مشکل دو چار منٹ ہی جاری ہوگا کہ اچانک ان کے عقب میں واقع اندھیرے جنگل میں ایک ڈراؤنی سی چنگھاڑ سے مشابہ دہاڑ سنائی دی۔ یہ آواز اس قدر خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی کہ ایک لمحے کو تو میں بھی بری طرح ہل کر رہ گیا بلکہ شکیلہ کی کپکپاتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

”کی کی... یہ خوفناک آواز تم نے سنی......؟“

”ہاں!“ میں نے جیسے گم صم سی کیفیت سے جواب دیا۔

”کیا یہ اسی درندے کی آواز تو نہیں......؟ کیا نام تھا......؟“ کھیل دادا جیسے آدمی کی آواز بھی مجھے مرتعش سی لگی۔

”کوتھوگا......“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

اسی وقت پھر چنگھاڑ دوبارہ سنائی دی اور وہ سب گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور دونوں ہاتھوں کو بلند کر لیا۔

الاؤ کے قریب لیٹے ہوئے شخص نے بھی اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب کر لیے۔ وہ پشت کے بل زمین پر لیٹا تھا۔ ضعیف آدمی جو کوئی عامل کامل ٹائپ کی شے دکھتا تھا، اب اور زور زور سے کچھ پڑھ رہا تھا، پھر بوڑھے نے اپنے چغے میں ہاتھ ڈالا، جب ہاتھ باہر نکلا تو اس نے ایک بھونپو سا چیز رکھا تھا، جسے نرسنگا کہہ سکتے تھے، وہ اس نے اپنے پوپلے منہ سے لگایا اور اسے زور سے بجا دیا۔

نرسنگا بجنے کی یہ آواز تاریک جنگل کے سناٹے میں دور تک پھیلتی چلی گئی اور بڑا ہی عجیب اور اسرار بھرا تاثر پیدا کرنے لگی۔

اچانک میرے نتھنوں سے ایک انتہائی ناگوار سی حیوانی بو ٹکرائی۔

”یہ کیسی گندی بو ہے؟“ سعا شکیلہ بولی۔

”مجھے بھی آ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ اسی جانور کی بو ہے......“ کھیل دادا بولا۔

”ارے وہ...... وہ دیکھو...... ان کے پیچھے جنگل کی طرف......“

میں اور شکیلہ اس طرف تکنے لگے۔ مجمع اور الاؤ کے دوسری جانب جہاں تاریک جنگل ایک خوفناک سائے کی طرح دکھائی دیتا تھا، اس طرف آسمان کی تاروں بھری روشنی میں...... ہمیں کوئی عجیب سی شے متحرک دکھائی دی۔ وہ عجیب ہی انداز میں حرکت کر رہی تھی، کبھی ایک جگہ رک جاتی اور پھر بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت کرتی، یوں جیسے اپنے گرد و پیش سے چوکنی ہو۔

میں آنکھیں سکیڑ سکیڑ کر بہ غور اس کا حجم اور شبیہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یقیناً شکیلہ اور کھیل دادا بھی اسے غور سے جانچنے میں مصروف تھے۔

وہ عجیب مخلوق، جس کی حرکات و سکنات چاہے کسی جنگلی جانور جیسی ہی تھی لیکن وہ جیسے جیسے قریب آ رہی تھی، اس کی ہیئت واضح ہو رہی تھی۔

الاؤ کے قدرے قریب آنے کے بعد وہ ٹھہر گئی اور بے اختیار شکیلہ ہی کے حلق سے ابھرتی ہوئی ہلکی سی کراہتی آواز برآمد ہوئی۔

”او میرے...... خدا یہ کیا بلا ہے......؟“

”حیرت انگیز...... اس سے زیادہ خطرناک۔“ کھیل دادا بھی زیر لب بڑبڑایا۔

میں نے دیکھا وہ حیوانی مخلوق جانور ٹائپ کی تو ضرور تھی لیکن اسے کسی ایک جانور سے تشبیہ دینا مشکل تھا۔ وہ کہیں سے گوریلا دکھائی دیتا تو جسم اس کا گینڈے جیسا لگتا، پچھلے دو پیر گوریلے جیسے تھے اور اگلے دو چیتے کے پنجے جیسے نظر آتے، گردن قدرے لمبی تھی تو چہرہ اس کا انتہائی کریہہ تھا، منہ کھولتا تو غار سا معلوم ہوتا اور اس میں سے جھانکتے ہوئے دو شکاری دانت اس کی باچھوں سے باہر نکلتے محسوس ہوتے اور اندر بھی بڑے تیز اور نکیلے دانتوں کی قطار تھی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ اس کے لبوتڑے تھوتھنے نما منہ کو میں کوئی نام دینے سے قاصر ہی رہا، سوائے یہ کہنے کے کہ وہ کسی خوفناک درندے کا ہی منہ تھا۔

وہ کبھی رینگنے کے انداز میں چلتا تو کبھی دو پیروں پر کھڑا ہو جاتا۔ ایک بار تو اس نے لمبی جست بھری اور اچھل کر الاؤ کے قریب کھڑے مجمع کے پاس آن کھڑا ہوا۔

اس کی جسامت لگ بھگ کوئی بارہ سے پندرہ فٹ لگتی

تھی، اس کی چال میں دھیما پن نہیں تھا، البتہ وہ جام ہو جاتا اور ایک دم حرکت کر کے چشم زدن میں دوسری جگہ پہنچ جاتا۔ یہی "کوتھوگا" تھا۔

ہم تینوں یہ پراسرار بھرا منظر خاموشی سے اور یک ٹک دیکھ رہے تھے۔

کوتھوگا...... نے الاؤ کے قریب پشت کے بل لیٹے ہوئے آدمی کو دیکھا اور ایک جست مار کے اس کے سینے پر جا سوار ہوا۔

دوسرے ہی لمحے ہم نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا، کوتھوگا نے اپنا خوفناک تھوتھنا لیٹے ہوئے آدمی کی گردن کی جانب بڑھایا اور اگلے ہی لمحے ایک جھٹکا دیا اور گردن اس کی سر سمیت ادھیڑ ڈالی......

مجمع میں لوگوں کا شور مزید بڑھ گیا۔ وہ کوتھوگا کو بار بار جھک کر کورنش بجا لا رہے تھے۔ جیسے وہ ان کا کوئی دیوتا ہو۔ ضعیف آدمی بھی یہی حرکتیں کر رہا تھا اور اس کی یہ حرکت تقلیدی تھی، یعنی دوسرے لوگ اسے دیکھ کر ہی ایسا کر رہے تھے۔

ادھر ہماری پھیلی ہوئی نظروں کے سامنے کوتھوگا نے اس بدنصیب آدمی کی کھوپڑی کو اپنے غار جیسے منہ میں تیز دانتوں تلے دبایا اور وہ اس طرح چٹاری جیسے اخروٹ توڑا جاتا ہے۔ شکیلہ کی تو بے اختیار چیخ ہی نکل گئی۔

میری یک ٹک نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں، جو یہ ہولناک منظر دیکھ رہی تھیں کہ...... کھوپڑی کو دانتوں تلے چٹخانے کے بعد اس نے اپنی سانپ جیسی دوشاخہ زبان کچھ اس طور لپلپائی کہ اس نے چٹخی ہوئی کھوپڑی کے اندر سے دماغ کا کوئی الجھا سا حصہ نکال کر نگل لیا۔

اس کے بعد اس نے لمبی جست لی اور دوبارہ چنگھاڑتا ہوا تاریک جنگل کی طرف دوڑ گیا۔

اس کے بعد سر بریدہ لاش کو اٹھا کر اس سلگتے ہوئے الاؤ میں ڈال دیا گیا اور پھر سب لوگ باری باری وہاں سے جانے لگے۔

ہم نے دیکھا، الاؤ اب سرد پڑنے لگا تھا...... سب لوگ جا چکے تھے ماسوائے ایک جثہ پوش کے...... وہ کوئی عورت تھی، جو اب الاؤ کے قریب ڈھنے کے انداز میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ رو رہی تھی۔ یقینی طور پر سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ بدنصیب شخص جس نے رضاکارانہ طور پر اپنی قربانی کوتھوگا کو دی تھی، وہ اس کی عزیز یا بیوی بھی ہو سکتی تھی...... ابھی وہ سر جھکائے بیٹھی بین کر رہی تھی کہ...... اچانک ایک سایہ اس کے عقب سے ابھرا۔

ہم ٹھٹک گئے۔ نجانے وہ کون تھا اور نجانے کس نیت سے اس بے خبر عورت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"ہمیں اسے بچانا چاہیے۔" اچانک کیمبل دادا نے سرگوشی میں کہا۔

"ٹھہرو دادا...... !" میں نے اسے روکا۔

کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک گٹھی ہوئی جسامت اور درمیانے قد کا ایک کڑیل نوجوان تھا۔ اس نے عام سا لباس پہن رکھا تھا وہ اس عورت کے عقب میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

پھر اس نے عورت کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ دیا۔ عورت نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد وہ یوں بدک کر اٹھ کھڑی ہوئی جیسے اسے نوجوان کی آمد پر خوف نے آن لیا ہو۔

"تت...... تم...... گورڈی! یہاں کیوں آئے...... جچ...... چلے جاؤ یہاں سے...... ایسا نہ ہو...... ایسا نہ ہو کہ...... شانیکا تمہیں دیکھ لے اور...... اور پھر......"

اس عورت نے نوجوان سے کہا اور میں چونک گیا۔ کیونکہ وہ بڑی شستہ امریکن انگریزی بول رہی تھی۔

"ہنہ...... ! آئی ہیٹ دیم آل...... (میں ان سب سے نفرت کرتا ہوں ماں......!)"

"خبردار...... ! سن آف سیٹن (son of satan) ناراض ہو جائے گا۔" (شیطان کا بیٹا ناراض ہو جائے گا)

"بے شک ہو جائے مدر! یہ خونی کھیل اب بند ہو جانا چاہیے۔" نوجوان نے فیصلے جوش سے کہا اور پھر جانے کیا ہوا وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ یہ دونوں ماں بیٹے تھے اور مرنے والا عورت کا شوہر اور اس نوجوان لڑکے کا باپ تھا۔ لڑکا ان ساری خرافات کا سخت مخالف تھا، بلکہ ایسا سوچنے کو بھی گناہ سمجھتا تھا۔

"اگر تو اس شیطانی ٹولے سے خوش ہے تو پھر روتی کیوں ہے؟ چل واپس گھر چل نا میرے ساتھ......" نوجوان غمزدہ سی آواز میں اپنی ماں سے کہہ رہا تھا۔

"جیکس کے مرنے کا مجھے دکھ تو ہوگا ہی ناں...... کیا تم نہیں جانتے گورڈی! کہ جیکس تم سے اور مجھ سے کتنا پیار کرتا تھا۔ ہے ناں......؟" اس کی ماں بدستور غم سے نڈھال ہو رہی تھی، اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا، عورت کی عمر کا اندازہ چالیس پینتالیس کے قریب ہوتا تھا۔ یوں اس کا بیٹا گورڈی

بھی راستے جا رہا تھا، لیکن ساتھ ہی اس کے چہرے سے انتہائی نفرت اور بیزاری بھی ہویدا تھی۔ اس کی آواز دکھ سے بوجھل ضرور تھی مگر اس میں سرکشی کی جھلک بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"چلو مدر!" گورڈی نے کہا اور پھر دونوں ماں بیٹا ایک طرف کو چل دیے۔

"ہمیں ان کے پیچھے جانا چاہیے۔" میں نے سرگوشی کی۔ کھیل دادا اور شکیلہ نے اثبات میں اپنے سر ہلائے۔

ہم بھی تاریکی میں خاموشی سے انتہائی احتیاط اور دکھیارے ماں بیٹے کے تعاقب میں چل پڑے۔

یہ پیدل سفر تھوڑی دیر جاری رہا۔ آسمان خوب برسنے کے بعد اب صاف ہو گیا تھا، آسمان پر سجے تارے اپنی ضوفشانی بکھیر رہے تھے، چاند شاید محاق پر تھا اور وہ دور کہیں جھکا ہوا تھا۔ چاروں اطراف دل دھڑکا دینے والا سکوت طاری تھا۔ گویا پتا کھڑکا اور دل دھڑکا والی صورت حال تھی۔ جھاڑوں تلے [illegible] بھی آواز پیدا کرتی محسوس ہوتی۔

وہ دونوں ماں بیٹے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ جنگل یہاں چھدرا سا ہو گیا تھا اور وہاں دور قریب میں ٹیلے سے نظر آنے لگے تھے۔ ایسے ہی ایک ٹیلے کی ڈھلان کے پاس جنگلی گھاس اور پھوس کی چوکور جھونپڑی نما کوٹھڑی دکھائی دی تھی، اسے بانسوں کے ذریعے ٹکایا گیا تھا، وہ دونوں اس کے دروازے کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔

"گورڈی! مجھے اب واپس جانا چاہیے۔" مدر نے بیٹے سے کہا۔

انہیں رکتا دیکھ کر ہم بھی رک گئے مگر ان سے اتنا فاصلہ ضرور رکھا تھا کہ ان دونوں کی باتیں ہمیں سنائی دیتی رہیں۔

"مدر! کیا تم اب میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں؟" گورڈی نے اپنی ماں سے سوال کیا۔ "اب تمہارے پاس وہاں رہنے کو کیا رہا ہے؟"

"میں اپنے قبیلے کو نہیں چھوڑ سکتی۔" مدر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور میں یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ مدر کے لہجے اور آواز سے کسی دکھ کا شائبہ تک نہیں جھلکتا تھا۔

"میں تمہیں بھی یہی کہوں گی گورڈی! کہ تم بھی واپس۔"

"نہیں مدر! ہرگز نہیں....." گورڈی نے سرگوشی میں بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔ اپنی ماں کے برعکس اس کا لہجہ بدستور ترش سا تھا۔

"وہ لوگ بھولے بھالے ہیں، وہ دھوکا کھا رہے ہیں مگر..... یہ سب ایک ڈراما ہے، ایک سنگین ڈراما۔ ہماری جانوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہمیں ایندھن بنایا جا رہا ہے۔ یہ تو [illegible] امادرا کی وجہ سے یہاں آ گیا ورنہ کبھی بھی یہاں کا رخ نہ کرتا۔ لوکہارٹ اور لولووش..... درحقیقت....."

"بس کرو..... گورڈی! تم پر سن آف سیٹن کا عتاب نازل ہو جائے گا۔" مدر نے برہمی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں جا رہی ہوں مگر تمہاری محبت اور میری ممتا مجھے تم سے کبھی دور نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ کر جانے لگی تو گورڈی نے پکارا۔

"مدر.....!"

وہ رک گئی۔

"اگر اگلی بار میری باری آ گئی تو پھر تم کیا کرو گی؟" گورڈی نے پوچھا۔ مدر نے ایک جھٹکے سے گردن گھما کر بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر سسکی لی پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی جنگل کی تاریکی میں مدغم ہو گئی۔

گورڈی ماں کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ سر جھکائے اپنی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

"یہ تو کوئی بڑا ہی پُراسرار چکر معلوم ہوتا ہے۔" شکیلہ نے دھیمی اور متحیر آواز میں تبصرہ کیا۔

"ہمیں گورڈی سے ملنا چاہیے۔" کھیل دادا نے وہی کہا جو میں سوچ رہا تھا۔

"ہاں! میں بھی یہی سوچ رہا تھا، آگے بڑھو....." کہتے ہوئے میں نے قدم بڑھا دیے۔

جھونپڑی کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ہمیں اندر سے اس کے غم و غصے سے بڑبڑانے کی آوازیں سنائی دیں مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ کھیل دادا اور شکیلہ نے بھی فوراً میری تقلید کی تھی۔

نوجوان گورڈی ایک دم چونکا پھر اس نے پھرتی کے ساتھ اپنے لباس سے شاید کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش چاہی تھی کہ کھیل دادا نے اسے جھپٹ لیا۔ گورڈی خوف زدہ سا ہو گیا لیکن پھر دوسرے ہی لمحے بولا۔

"تم لوگ کون ہو؟ کوئی چور یا ڈاکو.....؟"

"ہم تمہارے دوست ہیں مسٹر گورڈی!" میں نے اس کے سامنے قریب آ کر ہولے سے مسکرا کر کہا۔ "بشرطیکہ تم بھی ہمیں اپنا دوست سمجھو....."

"مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"اس سارے پُراسرار چکر کی تفصیل اور بھی بہت

"کچھ....." میں نے کہا۔

جھونپڑی کے اندر ایک مشعل روشن تھی، اسے پھوس کی دیوار سے ٹکایا ہوا تھا۔ دو تین اضافی مشعلیں بھی زمین پر رکھی تھیں۔ میں نے قریب سے اس نوجوان کا بہ غور جائزہ لیا تو وہ مجھے اپنا ہم عمر ہی لگا۔ قد درمیانہ تھا، جسامت گٹھی ہوئی تھی۔ شکل و صورت کا خوبرو تھا، تاہم اس کے چہرے کے نقوش دیکھ کر لگتا تھا، وہ جنوبی امریکا کے کسی دور دراز علاقے سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ہمارے ملک میں مختلف صوبوں کے باشندے اپنی بعض مخصوص وضع قطع، بول چال اور لہجے سے ذرا مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے نقوش میں بھی تفاوت ہوتا۔ یوں شہر اور دیہات کے فرق سے بھی الگ ہوتے۔

"اگر تم حکومت کے خفیہ اہلکار ہو تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی، لیکن....." وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ اب وہ کافی طمانیت اور ایک عجیب طرح کی پُرامید سی خوشی محسوس کرتا نظر آنے لگا تھا۔

"لیکن کیا؟" میں نے یونہی اس کا مطمع نظر جاننا چاہا۔

"تم لوگ یہاں تک کیسے آگئے؟ اور پھر زندہ بھی ہو۔ لوکہارٹ تو بڑا ظالم اور چالاک ہوشیار آدمی ہے۔ بغیر جانچ کیے وہ کسی کو یہاں پاؤں بھی نہیں رکھنے دیتا۔"

"لگتا ہے تم لوکہارٹ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو یا پھر ڈرے ہوئے۔" میں نے اسی مسکراہٹ سے کہا اور ساتھ ہی کبیل دادا کو مخصوص اشارہ بھی کر دیا۔ اس نے گورڈی کو چھوڑ دیا مگر اس کے قریب سے ہٹا نہیں اور چوکس کھڑا رہا۔

"ویسے یہ لوکہارٹ کیا لولوش کا کوئی خاص گماشتہ ہے؟" میں نے آخر میں سوال کیا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "خاص آدمی بھی اور اس کا تعلق کوموکا قبیلے سے ہے۔"

"اوہ....." میرے ہونٹ دائرے کی صورت میں سکڑ گئے۔

"وہ اس منحوس جزیرے اور لولوش کے مفادات کی نگرانی کرتا ہے۔"

"ہم....." میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"مجھے لگتا ہے کہ تمہیں امریکی حکومت نے ان دونوں شیطانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا ہے۔" گورڈی اب بہ غور ہماری گوریلا قسم کی وضع قطع کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن افسوس کی بات ہے کہ صرف تم تین ان دونوں کا کیا بگاڑ لو گے؟ بلکہ لولوش تو کیا تم لوکہارٹ کا بھی بال بیکا نہیں کر سکتے۔ امریکی حکومت کو ان دونوں کی سرکوبی کے لیے پوری آرمی فورس بھیجنا چاہیے تھی۔"

"کیا ہم آرام سے بیٹھ کر یہاں گفتگو کر سکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے یہاں کسی قسم کا کوئی خطرہ تو نہیں؟" میں نے اچانک اس سے پوچھا تو اس کے چہرے پر ایک تلخ اور افسردہ سی مسکراہٹ ابھری، پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"میں تو خود یہاں اپنے سر پر کفن باندھے بیٹھا ہوں۔ معذرت کے ساتھ تم لوگوں نے اگر یہاں جتنا بھی وقت بتانا ہے اپنے رسک پر گزارو۔"

"مجھے تمہاری صاف گوئی اچھی لگی مسٹر گورڈی!" میں نے خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

"مجھے صرف گورڈی کہو، میں مسٹر کہلوانا پسند نہیں کرتا۔" وہ درد کے لہجے میں بولا۔

فرش پر گھاس اور تنکوں کا ہی فراش سا بنا کر بچھا دیا گیا تھا۔ اس پر کچھ کپڑوں کی دھجیاں جوڑ کر بچھونے سے بنا دیے گئے تھے، ہم اسی پر بیٹھ گئے۔

گورڈی کو قریب سے دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے، اس کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر مجھے اپنا یہ اندازہ درست معلوم ہوتا تھا کہ وہ امریکی تو ہے لیکن اس کا تعلق جنوبی امریکا کے کسی دور دراز خطے سے تھا، وہ عام جدید امریکی باشندوں سے مختلف نظر آرہا تھا۔

"دیکھو گورڈی! اگر تم ہم سے کچھ نہ چھپانے کا وعدہ کرو تو ہم بھی تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دیں گے، کیونکہ مجھے لگتا ہے تمہارا اور ہمارا راستہ ایک ہی ہے اور منزل بھی۔ ہم ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ یہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔" کہتے ہوئے میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ہم نے تھوڑی دیر پہلے والی ان دونوں ماں بیٹے کی گفتگو سن لی ہے اور الاؤ کے گرد ہونے والے اس خونی ڈرامے کو بھی دیکھ چکے ہیں۔

میری بات سن کر گورڈی نے قدرے چونک کر میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر اس نے اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کی اور پورے دھیان سے ہم تینوں کے چہروں پر باری باری ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔

"تم لوگوں کے برعکس میرا یہاں کوئی خاص مشن نہیں ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ ایلونورا میری محبت ہے، میری بدقسمتی یہ ہے کہ وہ بھی ان شیطانوں کے ٹولے سے جا ملی ہے، میں

ایسے ان کے چنگل سے نکالنے کے لیے آیا ہوں مگر میری بدقسمتی یہ ہے کہ اب تک اپنی ماں کو قائل کر سکا ہوں نہ ہی ایلوپرا کو۔"

"لیکن یہاں تو لولوڈش کی حکومت ہے، شیطانوں کے ٹولے کا یہاں کیا کام؟" میں نے سوال کیا۔ "اور پھر ان کا مقصد کیا ہے؟ یہ کیسے لوگوں کو ورغلاتے ہیں؟"

"اس کے لیے مجھے ذرا تفصیل میں جانا پڑے گا۔"

"ہم سننے کو تیار ہیں۔" میں نے فوراً ایک جوش کی سی کیفیت سے گزرتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ لولوڈش سے مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اس کی اصلیت کی جانکاری رکھنا بھی ضروری ہے۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا۔" گورڈی تائیدی انداز میں اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے بولا پھر میرے پہلے سوال کے جواب میں دھیرے دھیرے اس نے صراحت سے بتانا شروع کیا۔

"یہ ساری سازش لولوڈش کی ہے۔ لولوڈش ہماری طرح برازیل کا..... باشندہ ہے اور وہیں پیدا ہوا۔ اس کی ماں کوتھوگا قبیلے کی روحانی پیشوا تھی۔ لیکن درحقیقت وہ ایک لیڈی وچ ڈاکٹر تھی۔ اس کا نام لوشپالی تھا۔ شیطان کی پجارن...... لہٰذا جیسے ہی اس کی حقیقت کا علم عام لوگوں کو ہوا، انہوں نے اسے بُری طرح رسوا کیا اور قریب تھا کہ اسے پتھروں اور نیزوں کی بارش کر کے مار ہی ڈالتے کہ وہ اپنے بارہ سالہ اکلوتے بیٹے کے ساتھ اپنی اور اس کی جان بچا کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئی اور ---- ایک کوتھوگا نامی قبیلے میں پناہ لی۔

کوتھوگا قبیلہ ایک وحشی اور غیر متمدن قوم تھی لیکن لوشپالی نے اپنی روایتی چلتر کاری اور چرب زبانی سے انہیں ایسا شیشے میں اتارا کہ وہ اس کا دم بھرنے لگے۔ یوں رفتہ رفتہ اس نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اسے اپنی دیوی ماننے لگے۔

کوتھوگا قبیلے کا رابطہ بیرونی دنیا سے کٹا ہوا تھا۔ وہ کسی کو اپنی راجدھانی میں داخل ہونے دیتے تھے نہ ہی انہیں زندہ چھوڑتے تھے، جو ان کے علاقے میں بھولے بھٹکے سے بھی داخل ہوتا تھا۔ یہ وحشی اور جنگلی قبیلہ برازیل کے ان گھنے جنگلوں تک پھیلا ہوا تھا جو ہنوز بیرونی دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا۔

لوشپالی کالے جادو کی ماہر تھی۔ اسے اپنے منتر جنتر کے لیے ایسے ہی لوگوں اور زمین کی ضرورت تھی جو اس کی اصلیت جاننے کے بعد اسے دھتکار نہ سکیں، جب اس نے دیکھ لیا کہ وہ کوتھوگا اب پوری طرح اس کے زیرِاثر ہو چکے ہیں تو اس نے انہیں بتا دیا کہ وہ دراصل شیطان کی پیروکار ہے اور وہ دنیا میں اس کے ماننے والوں کی تعداد بڑھانا چاہتی ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی ساحرہ تھی۔ اس نے اور بھی بہت سے علوم پر دسترس حاصل کر رکھی تھی۔

یوں لوشپالی اپنے بیٹے لولوڈش کی پرورش بھی انہی خطوط پر کرنے لگی۔

کچھ عرصہ ہوا بیرونی دنیا سے ایک تحقیقاتی ٹیم ان کے علاقے میں وارد ہوئی اور وہ ان کے ہتھے چڑھ گئے۔ انہیں لوشپالی کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ لوشپالی ایک چلتر باز عورت تھی اور پڑھی لکھی بھی، اسے معلوم ہوا کہ یہ پانچ افراد پر مشتمل ایک تحقیقاتی ٹیم ہے، اور یہاں پائے جانے والے ایک خاص قسم کے "فنگس" پر ریسرچ کرنے آئی ہے، جو ایک مخصوص قسم کے پودے میں پایا جاتا ہے۔

اس ٹیم میں ایک مائکروبیالوجسٹ، ایک میڈیکل ڈاکٹر اور تیسرا الرجی کا ماہر شامل تھا، باقی دو ان کے اسسٹنٹ تھے۔

ان کی زبانی لوشپالی کو معلوم ہوا کہ جس فنگس اور پودے کی تلاش میں یہ مذکورہ پانچ افراد یہاں آئے تھے، انہیں اسی فنگس کی تلاش تھی۔ یہ ایک خطرناک پیراسائٹک جرثومے سے متاثرہ فنگس تھا جو کسی جانور پر تو نہیں البتہ کسی انسان کے کھانے پر بڑے مہلک اثرات مرتب کرتا تھا، یہ فنگس انسانی دماغ میں موجود ہائپوتھیلمس میں کچھ ایسے اثرات مرتب کرنے کا سبب بنتا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک مونسٹر ٹائپ کا کریچر (creacher) بنا دیتے تھے، کیونکہ انسانی دماغ میں واقع ہائپوتھیلمس ہارمون ریلیز کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ فنگس اس میں کچھ ایسی تبدیلیاں قائم کرتا ہے جس سے وہ عام انسان ایک بلا ایک طاقت ور عفریت بن جاتا ہے۔ یہ تحقیق آج سے کئی سال پہلے ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر آتن برگل کی تھی جس نے اسے اپنی ایک کتاب میں محفوظ کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے ڈاکٹر آتن برگل زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور اس کی عملی تحقیقات پایۂ تکمیل کو تو کیا اس کی شروعات بھی نہ کر سکی، یوں یہ اس کی لکھی ہوئی کتاب میں ہی محفوظ رہ گئی، پھر جنگ چھڑ گئی اور اس کتاب کے بھی نایاب نسخے جنگ کی نذر ہو گئے، فقط اس کی ایک کاپی بچی تھی جو اس ٹیم کے ایک ڈاکٹر مائکروبیالوجسٹ کے ہاتھ لگی تھی، وہ بھی نہایت بوسیدہ

حالت میں۔

بہرکیف لوشپالی کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے بڑی مکاری سے ان کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا بلکہ اس وعدے کے ساتھ انہیں یہاں تحقیق کی اجازت دے دی گئی کہ وہ اس دوران بیرونی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں کریں گے اور کام مکمل ہوتے ہی واپسی کی راہ لیں گے۔۔۔ نیز وہ بھی ان کے ساتھ اس کام میں شامل رہے گی۔

وہ اس کا حکم ماننے پر مجبور ہو گئے۔ کام شروع کر دیا گیا۔ تجربے کے طور پر جب اس مخلوق کو لوشپالی کے ایما پر ہی کوتھوکا قبیلے کے ایک آدمی پر آزمایا گیا تو وہ واقعی ایک ڈراؤنا اور طاقتور عفریت کے روپ میں ظاہر ہو گیا۔ اس کی خوراک انسان کا دماغ ہی مخصوص تھا۔ اس سلسلے میں ایک ہدایت اور بھی اہم تھی جس کے مطابق اس مخصوص پودے کا اثر صرف کوتھوکا قبیلے اور نسل سے تعلق رکھنے والے باشندوں پر ہوتا تھا اسی لیے اس عفریت کا نام بھی اسی سے موسوم کیا جانے لگا۔

لوشپالی نے اسی عفریت کے ذریعے اس تحقیقاتی ٹیم کے سارے لوگوں کو مروا دیا تاکہ یہ بات بیرونی دنیا تک نہ پہنچ سکے اور وہ کتاب بھی اس نے غائب کروا لی۔

لوشپالی نے کوتھوکا قبیلے اور ان کی سرزمین کے حوالے سے اس عفریت کا نام بھی اسی قبیلے یعنی "کوتھوکا" سے موسوم کر ڈالا۔ یوں اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ کوتھوکا عفریت یعنی مونسٹر درحقیقت شیطان کا بیٹا ہے جو اُن کی بقا اور انہیں دشمنوں سے بچانے کے لیے بھیجا گیا ہے اور اسے خوش رکھنے کے لیے ایک خاص رات کی عبادت میں کسی ایک انسان کے دماغ کو اسے کھانے کی اجازت دی جائے گی۔ وہ رضاکارانہ اپنی قربانی پیش کرے گا۔ وغیرہ۔

اب صرف وہی اس بھیانک راز سے واقفیت رکھتی تھی۔ لوشپالی دراصل اپنے ان دشمن قبیلوں سے انتقام لینا چاہتی تھی جنہوں نے اسے اور اس کے بیٹے کو دھتکارنے اور ہلاک کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ اس نے ایک سے زائد کوتھوکا تیار کر لیے اور انہیں دشمن قبیلے کی طرف چھوڑ دیا۔ کوتھوکا کے اس مختصر گروہ نے بستیوں کی بستیاں ملیامیٹ کر کے رکھ دیں۔ کچھ کوتھوکا زندہ رہ بھی گئے۔

بہرحال لوشپالی کا انتقام تو پورا ہو گیا۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ لوشپالی نے اپنے بیٹے لولوش کی بھی پرورش اسی انداز میں کی اور وہ بھی یہ سب کچھ سیکھتا رہا۔ اس کے بعد حالات بدلنے لگے۔ لوشپالی اپنی طبعی موت مر گئی۔ اس دوران کچھ بیرونی دنیا کے لوگوں کا عمل دخل تیزی سے بڑھنے لگا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ لولوش یہاں سے اکتا گیا تھا وہ کچھ اور کرنا چاہتا تھا۔

اس نے کوتھوکا قبیلے اور ان کی سرزمین چھوڑ دی۔ وہ کچھ اور بنتا چلا گیا۔ بہت سا وقت بیت چلا، اس دوران کوتھوکا قبیلے کا نام بھی معدوم ہونے لگا کیونکہ وہاں اب متمدن دنیا نے قدم جمانے شروع کر دیے تھے اور یوں رفتہ رفتہ کوتھوکا قبیلہ بھی جدید اور تہذیبی دنیا کے حصار میں جکڑتا چلا گیا۔ اگرچہ اب بھی اس کی حیثیت ایک مرتے علاقے کی سی تھی۔

لولوش نے ہوگ بے کے جزیرے پر پہنچنے اور یہاں اپنا مستقل ٹھکانا بنانے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ آلا یان فیملی کی اس کے ساتھ جنگ تھی۔ لولوش کے مقابلے میں آلا یان فیملی کو اس جزیرے کے مالکانہ حقوق حاصل تھے اور ان کی قانونی پوزیشن نہایت مضبوط تھی اور ان کا لولوش بھی کچھ بگاڑنے سے قاصر تھا۔

لولوش کے شیطانی دماغ نے یہیں سے اس فارمولے پر عمل کرنے کا منصوبہ بنایا اور لوکہارٹ جس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ وہ کوتھوکا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے اس نے لوکہارٹ کو برازیل روانہ کر دیا، وہاں کوتھوکا قبیلہ پر متمدن اور جدید تہذیب سے آراستہ دنیا کا اثر تو غالب آنے لگا تھا مگر معیشت کے لحاظ سے وہ اب بھی بہت پیچھے تھے۔ وہاں غربت اور کسمپرسی تھی۔ اگرچہ وہ جدید تعلیم و جستجو کے تحت اپنی اس غربت پر قابو پانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

لوکہارٹ نے وہاں رہتے ہوئے اُن میں پڑھے لکھے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے منصوبے پر کام شروع کر دیا، وہ یہ سب لولوش کے کہنے پر ہی ایک خفیہ ایجنٹ کے طور پر کر رہا تھا۔

اس نے وہاں سب سے پہلے ایک بڑے عہدے کا روپ دھارا اور چند ہی دنوں میں اس کا اثر و رسوخ بڑھا تو لوگوں پر اپنا اثر جمانے لگا، اس نے ایک پراسرار سوسائٹی بنائی اور اس کے دائرے میں لوگوں کو داخل کرتے ہوئے بتانے لگا کہ وہ اپنی اصل شناخت نہ بھولیں، کیونکہ وہ ایک عظیم قوم کوتھوکا سے تعلق رکھتے تھے جو شیطان کے بیٹے کی نسل سے تعلق رکھتی ہے اور شیطان کا کوتھوکا قبیلے سے یہ وعدہ ہے اگر وہ اس کی پیروی کریں گے تو وہ پوری دنیا کو ان کے قدموں میں جھکا دے گا، شیطان کے بیٹے کی اطاعت میں ہی ان کی عظیم

کامیابی اور مشکلات کے حل کا راز تھا۔

لوگ اس کی باتوں میں آنے لگے، مخالفتیں بھی ہوئیں، لیکن لوکہارٹ لولوش کے دیے ہوئے اس ٹاسک کی کامیابی میں لگا رہا۔

یوں جب وہ دیکھتا کہ جو لوگ اس کے مضبوط پیروکار بن چکے ہیں، انہیں اس نے کوتھوگا مونسٹر بنا کر لولوش کے ٹھکانے ہوگ بے کی طرف روانہ کر دیا۔

جیسا کہ مذکور ہوا لولوش اس وقت ہوگ بے میں اپنی راجدھانی قائم کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور سردست وہاں وہ بہ ظاہر ایک عام آدمی کے بہروپ میں اپنے حواریوں کے ساتھ سکونت پذیر تھا۔

اس نے کوتھوگا کو قابو کرنے کا علم اپنی ماں سے دیکھ رکھا تھا اسی لیے وہ بڑی آسانی سے انہیں ہوگ بے میں واقع آلایان نامی ایک بڑی رائل فیملی اور چند دیگر وہاں بسنے والوں کے خلاف آزمانے لگا۔

رفتہ رفتہ ہوگ بے کوتھوگا کی دہشت اور غارت گری سے خالی ہونے لگا، حتیٰ کہ امریکی حکومت نے اس جزیرے کو آفت زدہ قرار دے دیا، یہی وہ وقت تھا جب لولوش حرکت میں آیا اور اس جزیرے کی باضابطہ ذمے داری اپنے سر لے لی، جو اس کا مقصد بھی تھا۔

جب لولوش کا ہوگ بے میں پوری طرح تسلط قائم ہو گیا تو اس نے ہوگ بے میں اپنی راجدھانی کو طول دینے کے لیے ایک اور ڈراما کھیلا اور اس نے کوتھوگا نسل سے تعلق رکھنے والوں کو یہاں آباد کرنا شروع کر دیا۔ (جس میں لوکہارٹ کا پورا پورا ساتھ شامل تھا)۔ ایک کوشش اس نے یہ بھی کی تھی کہ اس خطرناک ٹنگس والے پودے کو بھی یہاں منتقل کرنا چاہا تھا مگر وہ اسی زمین اور ماحول میں ہی پروان چڑھتا تھا جہاں وہ برسا برس سے اپنی افزائش کیے ہوئے تھا۔ تاہم اپنے سابقہ تجربے اور موروثی علم کے ذریعے اس نے بوقت ضرورت کسی کو یہاں کوتھوگا مونسٹر میں تبدیل کرنا ہوتا تو وہ وہاں سے اس پودے کو بطور ان کی خوراک کے یہاں منگوا لیتا جسے چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر استعمال کرنا ہوتا تھا ورنہ اپنے پلانٹ کنگ ڈم سے الگ ہوتے ہی ان کی تاثیر ختم ہو جاتی۔

اس طرح لوکہارٹ نے میرے خاندان کے لوگوں پر بھی شب خون مارا، کچھ لوگ شامل ہوئے کچھ نہیں، ان میں، میں بھی شامل تھا، میں نے انہیں رد کر دیا تھا لیکن بدبخت لوکہارٹ نے میری محبوبہ، میری ماں اور میرے باپ کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا۔“

☆☆☆

کوتھوگا نسل سے تعلق رکھنے والا وہ نوجوان گورڈی یہ سب بتانے کے بعد چپ ہو رہا۔ ہم تینوں جیسے مبہوت ہو کر اس کی یہ پُراسرار داستان سنتے رہے۔ جھونپڑی میں ایکا ایکی گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں ہم چاروں کے سائے جھونپڑی کی دیوار پر لرزاں عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نے ایک لمبی سانس کھینچی اور گورڈی سے پوچھا۔

”کوتھوگا مونسٹر کو ہلاک کیسے کیا جاتا ہے؟“

”یہ کوئی ماورائی مخلوق نہیں ہے، یوں سمجھو ایک پیراسائٹ جرثومے سے وجود میں آیا ہے۔“ گورڈی جواب میں بتانے لگا۔

”یہ بھی ہلاک ہوتا ہے مگر شرط یہی ہے کہ کوئی پکا نشانے باز اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے پر کسی ہارڈ ویپن سے وار کرے یا گولی داغے۔“

”اسے یہ لوگ قابو میں کیسے رکھتے ہیں؟ کیا یہ کوتھوگا قربانی کے لیے پیش کیے ہوئے انسان کا مغز کھا کے دوسروں پر حملہ تو نہیں کرتے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

”انہیں سدھانے کا ہنر صرف لولوش کو آتا ہے یا پھر لوکہارٹ کو۔“

”گویا ان دونوں میں سے کوئی اس مونسٹر کو کسی پر بھی حملے کا اشارہ کر دیں تو وہ حرکت میں آ جاتے ہیں؟“

”ہاں۔“

”ہمم —“ میں نے ہونٹ بھینچے پھر پوچھا۔ ”تم اب کیا چاہتے ہو؟“ میں نے اس کا عندیہ لینا چاہا۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

”میں بھلا اس کے سوا اور کیا چاہوں گا کہ میری بدنصیب ماں اور ایلونورا اس شیطانی چنگل سے نجات حاصل کر لیں اور اپنی سرزمین کی طرف لوٹ جائیں جہاں زندگی بدل چکی ہے۔ جہاں خوشیاں ہیں اور دنیا بھر کی راحت ہے۔“

”یہ تب ہی ممکن ہوگا جب سب سے بڑے شیطان لولوش کا خاتمہ ہو جائے۔“ میں نے کہا۔

”میرا بس چلے تو میں اس بہروپیے کا خون پی جاؤں۔“ گورڈی دانت پیس کر بولا۔

”ہم بھی یہی کچھ کرنے آئے ہیں یہاں۔ اس

شیطان نے بہتوں کی زندگیاں عذاب میں ڈال رکھی ہیں اور......"

یہ بتاتے ہوئے میں نے اسے عابدہ کے متعلق بھی مختصر بتادیا، زیادہ تفصیل میں تو نہیں گیا تھا۔ یہی بتایا کہ اس نے اپنے اسے کسی گھناؤنے مقصد کے تحت یرغمال بنا رکھا ہے۔

وہ حیران ہوا، پھر بولا۔ "تم لوگوں کا تعلق کون سے ملک سے ہے؟ کم از کم تم لوگ مجھے یورپین یا امریکی تو بالکل بھی نہیں دکھائی دیتے۔ ہاں! ایشین کا شائبہ لگتا ہے۔"

"یہی سمجھ لو۔ ہم کافی عرصے سے امریکا میں ہی مقیم ہیں۔" میں نے تھوڑا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور تب شکیلہ نے شاید مقصد کی بات کو آگے بڑھانے کی غرض سے پہلی بار اس سے مخاطب ہو کے سوال کیا۔

"کیا تم ولووش یا اس کے خاص گماشتے لوکہارٹ کے سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟ ہم ان دونوں کو جہنم واصل کرنا چاہتے ہیں۔"

شکیلہ کی بات سن کر گورڈی نے ایک سوچتی ہوئی نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور پھر اسی انداز میں بولا۔ "اس مردود لولووش کے بارے میں تو یہی سنا ہے کہ وہ اسی جزیرے میں واقع اپنے محل میں رہتا ہے۔ اس کے نیچے ایک خفیہ تہ خانہ ہے اور اس کا حجم اس سے بھی بڑا ہے جتنا کے اوپر زمین پر...... وہاں اس کی اپنی دنیا آباد ہے۔ ایک شیطانی دنیا...... کہا جاتا ہے کہ اس تہ خانے سے بھی ایک خفیہ راستہ اندر ایک خودساختہ بنائے کے ذریعے سمندر میں اس شیطانی تکون (برمودا ٹرائی اینگل) سے "لنک" کیا گیا ہے۔ مجھے اس کے بارے میں تجسس ہوا تھا جس کا میں نے اپنے طور پر پتا چلایا تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ اس شیطانی تکون کی گہرائیوں میں میتھین گیس کی بڑی تباہ کن لہریں گردش کرتی ہیں جن میں غضب کی مقناطیسیت پائی جاتی ہے، تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے یہ سب خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"کیا؟ واقعی؟" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "لیکن کیسے؟ تم تو یہاں چھپے بیٹھے ہو؟"

برمودا ٹرائی اینگل سے متعلق یہ اہم معلومات میرے لیے حیران کن تھیں۔

کیونکہ اس سے متعلق عام روایت یہی تھی کہ وہاں جہاز اور شپس پُراسرار طور پر غائب ہوتے رہے ہیں جن کا آج تک کوئی سراغ نہیں مل سکا۔

ایسے خطرناک علاقے سے لولووش کا ایک زیرآب مصنوعی آبنائے سے لنک ملانا واقعی حیران کن تو تھا ہی لیکن ساتھ ساتھ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی تھی کہ یہ کٹرپرانسل لولووش کیا شے بن چکا تھا۔

گورڈی نے میرے پوچھنے پر ایک تلخ سی مسکراہٹ سے بتایا۔

"ایلورا اور ولی کے قریب رہنے کے لیے مجھے بھی ان کے دھوکے میں آنا پڑا، میں اب بھی یہی کرتا ہوں۔ صرف میری ماں اور ایلورا کو پتا ہے کہ میں ان کے ساتھ شامل تو رہتا ہوں لیکن میرا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔"

"لیکن یہ لوگ رضا کارانہ قربانی بھی تو دیتے ہیں۔" اس بار کپیل داوا نے اس سے پوچھا۔

"ہم نے دیکھا تھا کہ اس پُراسرار سوسائٹی کے مجمع میں سے ایک نے کوتھوکا کو اپنے دماغ کی خوراک کھلانے کے لیے خود کو قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا۔ لہٰذا تمہیں ڈر نہیں لگتا تھا کہ تمہاری باری بھی آسکتی ہے۔ وہ بڈھا ساحر......"

"وہی تو لوکہارٹ تھا۔" اس نے ایک دم کہا اور مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔

"اس قدر بوڑھا اور ضعیف شخص......؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"وہ دیکھنے میں ایسا لگتا ہے، اندر اس کے جسم میں کسی بھینسے سے کم طاقت نہیں ہے۔ خیال رہے، کبھی اس سے سامنا ہو تو اسے کمزور اور بوڑھا سمجھ کے مار نہ کھا جانا۔" گورڈی نے بتایا۔

اس کا یہ انکشاف میرے لیے ہی نہیں بلکہ کپیل داوا اور شکیلہ کے لیے بھی چونکا دینے والا تھا۔

"خیر، اب یہ بتاؤ کہ ہمارے لیے تمہارا کیا مشورہ ہو سکتا ہے؟" بالآخر میں مقصد کی بات کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "اور...... مزید یہ کہ تم ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میرا مشورہ یہی ہے کہ...... تمہیں میرے ساتھ ملنا ہوگا۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"بس! تو پھر ٹھیک ہے...... تم تینوں میرے ساتھ کوتھوکا قبیلے کے لوگوں کا بھیس بھر کے ان کے ساتھ رہنا۔ جب بھی نئے لوگ لائے جاتے ہیں تو انہیں مرعوب کرنے کے لیے لولووش کی جادوگری کی سیر کرائی جاتی ہے۔ تاکہ ان میں یہ بات جڑ پکڑ لے اور اپنے عقیدے میں یہ...... مزید

راسخ ہو جائیں کہ شیطان کے بیٹے کی اطاعت میں ہی ان سب کا بھلا ہے جو ایک نہ ایک دن ان سب کو ایسی لازوال قوتوں سے مالا مال کر دے گا جس کے بعد پوری دنیا میں عظیم کیتھوکا کی حکمرانی ہوگی۔"

"وہ نئے لوگ کیا ہم ہوں گے؟" شکیلہ نے کسی خیال کے تحت سوال کیا۔

"نہیں، تمہیں تو میں ظاہر بھی نہیں ہونے دوں گا۔" گورڈی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نئے لوگ آچکے ہیں، میں تم تینوں کو انہی میں شامل کر دوں گا اور اسی رات کے آخری پہر میں انہیں سیر کروائی جائے گی، قربانی کی رات بھی یہی ہوگی۔ اسی دن یہ لولوش اپنی جادوگری کی سیر کرواتا ہے جسے...... شبِ نظارہ کا نام دیا جاتا ہے اور اس کی کمین گاہ میں گھسنے کا یہ سنہری موقع ہے۔

گورڈی نے کہا اور کامیابی کے احساس تلے میری آنکھیں ایک دم چمکنے لگیں، میں جوشِ مسرت سے پھولا نہیں سمایا تھا کہ میں نے بے قراری سے کہا۔

"ہم تیار ہیں اور بس اب چلنے کی تیاری کرو گورڈی!"

"ان میں شامل ہونا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" گورڈی نے جیسے میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ان میں اگر ایک سوئی بھی شامل ہو جائے تو انہیں فوراً پتا چل جاتا ہے۔"

"تو پھر تم کیسے ان میں شامل ہو جاتے ہو؟ بے شک تمہاری بات اور ہے لیکن ...... تم ان سے الگ بھی ہو جاتے ہو، کیا انہیں اس بات کا پتا نہیں چلتا؟" کمیل دادا نے پوچھا۔

"ہاں! تم نے ٹھیک کہا، میری بات واقعی اور ہے، اس لیے کہ میں انہی میں سے ہی ہوں۔ الگ ہو بھی جاتا ہوں تو بھی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی اس بات کا بھی کہ میں ان کے عقائد تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ یہ حقیقت صرف میری ماں اور اطلوزا ہی جانتی ہیں، وہ کبھی بھی لوکہارٹ سے میرے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتیں لیکن تم لوگوں کی بات اور ہے۔"

"ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔" میں نے موضوع ختم کرنے کی غرض سے کہا۔ "لیکن اب ظاہر ہے تم ہی کوئی طریقہ بتاؤ گے۔"

"وہی بتانے لگا ہوں۔" گورڈی نے ایک ذرا توقف سے کہا۔

"تم لوگ ابھی اِدھر ہی ٹھہرے رہو..... تم لوگوں کی خاطر مجھے آج رات انہی کے ساتھ رہنا ہوگا بلکہ ماں اور اطلوزا کے ساتھ تھوڑا ڈراما بھی کرنا پڑے گا۔"

"ڈراما؟ کیسا ڈراما؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں! مجھے اُن کے سامنے اعتراف کرنا پڑے گا کہ میں آج تک غلطی پر تھا اور ہم سب شیطان کے بیٹے کی اولاد ہیں۔"

"لاحول ولا......" بے اختیار کمیل دادا کے منہ سے برآمد ہوا۔

"یہ تمہارا دوست عربی ہے؟" گورڈی نے اس کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا۔ شکیلہ زیرِ لب مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

میں نے بھی اپنی ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی توجہ اول الذکر موضوع کی طرف موڑ دی۔

"تم بتا رہے تھے کہ ہمیں ان میں کس طرح شامل کرو گے۔"

"اس کے لیے بھی مجھے یہی ڈراما کرنا پڑے گا کہ یہ لوگ سیاح ہیں اور شیطان کے بیٹے والے عقیدے سے متاثر ہو کر اس پُراسرار سوسائٹی میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق بھی جنوبی امریکا کے اسی برازیلین علاقے سے ہے جہاں کو قدیم قبیلہ کیتھوکا بستا آیا ہے۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟ اور کہیں تم بھی ہماری وجہ سے کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جاؤ۔"

"کسی بڑے مقصد کے حصول کے لیے رسک بھی اتنے ہی بڑے لینے پڑتے ہیں۔ کیا تم ڈرتے ہو؟"

"ایسی بات نہیں، ہم تو خود سروں پر کفن باندھ کر اور اپنا جانیں جوکھم میں ڈال کر یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر اب آگے کی بھی تیاری باندھے رکھو۔ پیچھے مت ہٹنا، ایسا عارضی طور پر ہی چل سکتا ہے، لیکن مجھے پوری امید ہے کہ تمہیں اتنی مہلت ضرور مل جائے گی کہ تم اصل شیطان لولوش کی کچھار کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

"تو آج رات تم چلے جاؤ گے اور کل صبح تک ہمیں

تمہارا انتظار کرنا پڑے گا؟" شکیلہ نے سوال کیا۔

"ہاں!" گورڈی نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔

"ہم تیار ہیں۔" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ گورڈی کل شام تک آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔

ہم بانس اور پھوس کے اس جھونپڑ میں اکیلے رہ گئے۔ تھکن سے ہمارا ابھی بُرا حال ہو رہا تھا۔

گورڈی کی بتائی ہوئی باتوں کے مطابق سرِدست ہمیں یہاں کوئی خطرہ تو نہ تھا تاہم احتیاط ضروری تھی۔

"پتا نہیں کیوں اس نوجوان کی باتیں مجھے محض دل کا بہلاوا لگتی ہیں۔" کمیل دادا بولا۔

ہم گورڈی کی ہدایت کے مطابق اس کے رخصت ہوتے ہی مشعل کی روشنی ذرا دھیمی کرکے بچھونوں پر دراز ہو گئے تھے۔

کمیل کا چہرہ سوچتا ہوا اور اُلجھا اُلجھا سا محسوس ہوا تھا۔ جب میں نے ہولے سے سرگوشی میں اس کا سبب پوچھا تو اس نے یہ کہا تھا۔

"تمہارے ایسا سمجھنے کی ایک وجہ ہے دادا.....!" میں نے بھی دبی آواز میں کہا۔ "اس لیے کہ ہمیں خوش قسمتی اور تقدیر کی یاوری سے اپنے ایک بڑے دشمن کی ناک کے نیچے پہنچنے کا نسبتاً آسان اور شارٹ کٹ ملا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات کوئی مشکل اور ناممکن ہونے والا کام کا آسان راستہ مل جائے تو ایسے ہی واہمے آتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے ایک معمولی سی چیونٹی کو اتنے بڑے ہاتھی کے دماغ میں گھسنے کے لیے اس کی سونڈ کا راستہ مل جاتا ہے۔"

"خدا کرے تمہاری یہ توجیہہ سچ ثابت ہو۔" شکیلہ نے کہا۔ وہ بھی ہولے سے بولی۔

اس کے بعد ہم تھوڑی دیر مزید باتیں کرنے کے بعد سو گئے۔

☆☆☆

اگلی صبح ہمیں بیدار کرنے والا گورڈی ہی تھا، وہ ہمارے لیے کھانے پینے کی اشیا ساتھ لایا تھا۔ پہلے تو آنکھ کھلتے ہی ہم اسے دیکھ کر چونک گئے تھے، کیونکہ وہ عام لباس کے بجائے اسی شیطانی سوسائٹی (پُراسرار سوسائٹی) کے زرد رنگ کے دراز جبے میں تھا۔ ہم یہی سمجھے کہ... کوتھوکا کا کوئی فرد ادھر آن نکلا ہے۔

"تم شاید مجھے اس لباس میں دیکھ کر ڈر گئے۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں! کچھ ایسی ہی بات تھی۔" میں نے بھی خفیف سی مسکراہٹ سے کہا۔

"خیر، گھبرانے کی بات نہیں، تم لوگوں نے یقیناً کافی دیر سے کچھ نہیں کھایا ہوگا، لو کھاؤ پیو، پھر شام کو ان کے ہاں ایک خاص رسم ہے، اس میں شامل ہونے کا بہانہ خوب ہمارے ہاتھ لگا ہے۔" وہ بولا۔

وہ کھانے میں چیز، براؤن بریڈ، مکھن اور بھنے ہوئے گوشت کے کچھ..... پیس تھے۔ کافی بھی تھی اور دو عدد وہسکی کی بوتلیں بھی تھیں۔ جن پر کمیل دادا اور شکیلہ کی نظریں پڑتے ہی وہ دونوں ہی مچل اٹھے، جبکہ میں منہ بنائے انہیں گھورنے لگا۔

ہم یہ سب کھا چکے تو وہ تینوں وہسکی سے..... شغل کرنے لگے۔ آرام کرنے اور پیٹ بھرنے کے بعد ہم خود کو ایک دم تازہ دم اور پُرجوش محسوس کرنے لگے تھے۔

گورڈی نے بتایا کہ وہ ہمارا راستہ بنا چکا تھا۔ اس کی ماں اور ایلورا اس کے "ڈرامے" کو حقیقت جان کر بے حد خوش ہوئی تھیں۔

اس نے یہی بتایا تھا انہیں کہ وہ..... درحقیقت ان تین سیاحوں (یعنی ہم) سے بے حد متاثر ہوا تھا، جو اس پُراسرار سوسائٹی کا حصہ بننے کے لیے برازیل سے یہاں تک پہنچے تھے۔ وہ سب درحقیقت اپنی آنکھوں سے یہ سارا کرشمہ دیکھنا چاہتے تھے۔ جو انہوں نے رات میں دیکھ لیا تھا اور اس شیطان کے بیٹے (کوتھوکا) کو بھی..... لہٰذا ماں اور ایلورا نے گورڈی کو راہِ راست پر آتا دیکھ کر لوکہارٹ سے اس کی سفارش اور ان تین سیاحوں کے بھی اس میں شامل ہونے کی سفارش کر ڈالی۔

لوکہارٹ کا کیا جاتا تھا، گورڈی کو تو وہ جانتا ہی تھا اور اس کی ماں اور باپ جیمس کو بھی جس نے گزشتہ روز اپنے مغز کی قربانی دی تھی۔ لہٰذا اس نے فوراً اجازت دے ڈالی۔

ہم شام گہری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر وقتِ مقررہ پر ہم تینوں بھیس بدل کر گورڈی کے ساتھ جنگل میں اس مقام کی طرف روانہ ہو گئے جہاں ان کی رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔

لوکہارٹ وہاں نہیں تھا۔ آج کی رات بقول گورڈی کے شبِ نکارہ تھی۔

وہ مقام یہاں سے بہ مشکل تیس چالیس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ شام گہری ہو چلی تھی اور جنگل میں جیسے رات اتری ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

ہم گورڈی کے ساتھ پیدل چلتے رہے تھے اور پھر

وہاں سے ایک نیم پہاڑی سلسلہ شروع ہوا جو درحقیقت سخت اور خشک پتھروں کے قدرتی ٹیلے ہی نظر آتے تھے، ان کے اطراف میں قدِآدم جنگلی گھاس، بانس اور کھپریل بچھے ہوئے دکھائی دیے۔

ہم گورڈی کی راہنمائی میں چلتے ہوئے ایک قدرے کھلے میدان تک پہنچ گئے۔

کیا دیکھتے ہیں وہاں بھی ایک بڑا سا الاؤ روشن تھا جس کے گرد بچے بوڑھے بہت سے لوگ جمع تھے، وہ عمر رسیدہ اور لمبی داڑھی والا آدمی نظر نہیں آیا، گورڈی نے ہمیں جلدی سے ان میں شامل ہونے کا اشارہ کیا۔

وہ سب بہ آواز بلند اجنبی زبان میں ہم آواز کچھ پڑھنے میں محو تھے، ان کے دائیں جانب دو تین بڑے بڑے کھپریل کی چھتوں والے جھونپڑے تھے، وہاں سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

ہم چاروں ان میں شامل تو ہو گئے تھے مگر علاوہ گورڈی کے میں، کنیل، دادا اور شکیلہ ان کی طرح وہ زبان نہیں بول پا رہے تھے جس میں یہ کوئی بھجن نما جاپ الاپ رہے تھے۔

میں نے ٹھوکا مار کے گورڈی سے اس کے متعلق کہا تو اس نے ہمیں بھی وہ چند اور مختصر الفاظ سکھا دیے کہ بس یہی پانچ چھ جملے بہ آواز بلند بولتے رہو، باقی عام زبان عام فہم ہی استعمال ہوتی۔

اجنبی زبان کے وہ پانچ چھ جملے تھے تو مشکل لیکن ہماری زبانوں پر چڑھ ہی گئے۔ وہی ہم بھی بہ آواز بلند دہراتے رہے۔ ان الفاظ کا کیا مطلب تھا یہ ہم جانتے تھے اور نہ ہی ہمیں جاننے کی کوئی ضرورت تھی۔

دیکھتے میں انہی جھونپڑوں میں ایک کے اندر سے وہی بوڑھا اور لمبی داڑھی والا شخص برآمد ہوا جس کے بارے میں گورڈی ہمیں بتا چکا تھا کہ وہ لوکہارٹ تھا۔ اس کے ہمراہ دو غلام قسم کے آدمی بھی تھے۔ وہ اس کے دائیں بائیں ساتھ چل رہے تھے۔

عمر رسیدہ لوکہارٹ قریب آ کر اجنبی زبان میں مجمع کو مخاطب کر کے کچھ کہتا رہا۔ انداز اس کا خطیبانہ تھا۔

سب لوگ اس کے الفاظ پر اپنا اپنا سر دھننے لگے، لاچار ہم بھی یہی کرتے رہے۔

”یہ ہمیں بتا رہا ہے کہ گزشتہ شب کی قربانی کے بعد آسمانوں پہ موجود شیطان کا بیٹا ہم سے بے حد خوش ہوا ہے۔“ گورڈی نے نہایت دھیرے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”اور...... اسی کے انعام کے سلسلے میں اس نے نوید سنائی ہے کہ ہمیں آج ہی کی راجدھانی کا شب نظارہ کروایا جائے، جس کے لیے ہم سب تیار ہیں۔“

میرا دل کامیابی کے جوش سے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ بوڑھے لوکہارٹ کی تقریر ختم ہوئی اور اس کے ذرا ہی دیر بعد روانگی کا حکم ملا، مجمع اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

یہ پیدل سفر تھا اور ہماری تعداد تیس سے چالیس کے قریب ہی معلوم ہوتی تھی۔ بقول گورڈی کے ان میں آج نئے لوگ بھی شامل ہوئے تھے۔

شب نظارہ کے لیے ان لوگوں میں عجیب سا جوش اور مسرت پائی جاتی تھی۔ ان میں کئی لوگوں نے مشعلیں تھامی ہوئی تھیں۔

یہ پیادہ مسافت لگ بھگ کوئی پندرہ بیس منٹ جاری رہی اس کے بعد میں نے دیکھا کہ ہم...... ایک نسبتاً بڑے ٹیلے کو پار کر کے جیسے ہی دوسری جانب آئے تو میں دنگ رہ گیا۔

میرے سامنے ایک وسیع و عریض قطعہ اراضی پر بڑی ہی عظیم الشان عمارت استادہ تھی۔ یہ ایک منزلہ تھی اور اس کے گرد چست لباس پہنے ہوئے ان گنت مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔ گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ وہاں کافی روشنی تھی...... آس پاس خاردار تاروں کی باڑھ تنی ہوئی بھی نظر آتی تھی، اس مقام یا عمارت کو دیکھ کر میرا دل بے اختیار سا ہونے لگا۔ کیونکہ یہاں عابدہ موجود تھی۔ یہ میرے لیے ہی نہیں عابدہ کے لیے بھی فیصلہ کن گھڑیاں تھیں۔

عمارت کے عقب میں... سبز رنگ کی پہاڑی چوٹیاں نظر آ رہی تھیں اور اس طرف سے موجوں کے شور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، یہ غالباً ساحل سے قریب کا علاقہ تھا اور نظر آنے والی سوکھیاں کی چٹانیں ہی لگتی تھیں۔

میں نے بھی دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ چاہے جان داؤ پر لگ جائے خواہ لولوش سمیت اس کی یہ پوری شیطانی اسٹیٹ کو ہی تباہ و برباد کیوں نہ کرنا پڑ جائے، میں ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔

منزل کے قریب پہنچ کر میرے اندر کا جوش مزید سوا ہونے لگا تھا، حوصلوں کے بادبان اور بلند ہونے لگے تھے۔ دنیا کے سفاک ترین دشمنوں اور انسان نما بھیڑیوں کی کچھار میں...... ان کے قریب ترین پہنچنے کے بعد بھی میرے دل میں کسی قسم کا کوئی ڈر یا خوف ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں پیدا

ہوا تھا کہ اکثر ایسے حالات میں چاہے کوئی کتنا ہی دلیر یا بہادر ہو جب فیصلہ کن لمحات اور حالات سامنے آتے ہیں تو دل و دماغ میں موت کا خوف بھی طاری ہوتا ہے، چاہے یہ احساس لمحاتی ہی کیوں نہ ہو۔

ہمیں ایک بار پھر کھڑے ہونے کا حکم ملا اور عمارت کے سامنے خاردار باڑھ کے قریب کھڑے ہوگئے۔

مجمع نے اب زیرلب بڑبڑانا شروع کردیا لیکن یہ سلسلہ تھوڑی دیر چلا کیونکہ بوڑھے لوکہارٹ نے ہاتھ بلند کر کے سب کو خاموش کروا دیا تھا۔

میرا چہرہ بظاہر لمبے چوڑے ہیٹ کے گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا لیکن میں اپنی تیز عقابی نظروں کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیتا جارہا تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ... کی تھی کہ چوکس کھڑے مسلح افراد گرد و پیش کے علاوہ، مجمع میں شامل لوگوں کو بڑی تیز تیز نظروں سے گھورے جارہے تھے۔

خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا تھا بلکہ موت منڈلا رہی تھی۔ ہم پر ایک ذرا سا بھی شبہ ہمیں یقینی موت سے ہمکنار کرسکتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کیا کہ جس نے پُرآلام اور اس قدر مصائب کے بعد یہاں تک ہمیں پہنچایا تھا، وہ آگے بھی یقیناً ہماری مدد فرمائے گا۔

اچانک ہی مجھے بہت دھیمی سرگوشی سنائی دی۔

یہ گورڈی تھا، جو میرے دائیں جانب اور میرے بہت قریب ہو کے کھڑا تھا، یہی حال کیسل دادا اور شکیلہ کا بھی تھا، وہ میرے بائیں جانب بالترتیب کھڑے تھے۔

"کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔"

میں چونکا۔ میرا دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ "کیسی گڑبڑ؟ مجھے تو کچھ ایسا محسوس نہیں ہوتا۔"

"ابھی خاموش رہو مگر ہوشیار رہو۔"

"کیا کہہ رہا ہے یہ؟"

میرے دائیں جانب کھڑے کیسل دادا نے بھی یہ ہلکی سی کھسر پھسر سن لی تھی شاید۔ میں نے بھی کچھ جھکے سے دہرا دیا۔

سب کے سر جھکے ہوئے تھے، لوکہارٹ... چند مسلح لوگوں سے مخاطب تھا۔

میں نے ذرا سر اٹھا کر اس طرف دیکھا، ہمارے آگے تین قطاریں تھیں۔ ہم سب سے آخر میں تھے۔

"سر جھکائے رکھو... فول!" گورڈی نے جیسے مجھے

اگست 2019
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید

پس پردہ
دو مختلف معاشروں کے ملاپ اور پیش آنے والے مسائل کے درمیان دلچسپ معرکہ آرائی... آخری صفحات پر **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے ایک طویل کہانی
آخری خلش
گمشدہ تاریخی گوشوں پر ایک گہری نظر — ابتدائی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم کا جادو
رنگ آسماں
محبت کے دلگداز لمحات اور دشمنوں کے شرانگیز واقعات کے مابین دلچسپ معرکہ آرائی۔ **اے آر راجپوت** کے خیالات کی روانی
وقت
وقت کی بے وقت راگنی اور کبھی بروقت کارروائی کے درمیان زندگی کے نشیب و فراز کی دلچسپ داستان **حسام بٹ** کے قلم سے
اہل قلم کار: ناہید سلطانہ اختر، تنویر ریاض، شاہ زین، رضوان، نادیہ نور، ڈاکٹر شیر شاہ سید اور عبدل جی کی خوب صورت تحریریں

بھٹکنے سے ڈپٹا۔

اسی وقت کسی نے عقب سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میری تو جیسے روح ہی فنا ہو گئی۔

ایک تسلی تو تھی کہ ہم تینوں ہی بھیس بدلے ہوئے تھے لیکن بہرحال یہ تحفظ فوری مگر عارضی طور پر بچاؤ کا ذریعہ تھا۔

مجھے گورذی کی نصیحت یاد تھی اور کچھ میں نے اپنی عقل سلیم سے بھی کام لیا اور ذرا بھی نہ چونکا نہ ہی کوئی حرکت کی، بالکل ایسا ہی رہا جیسے مکمل دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو چکا ہوں۔

عقب سے میرے کندھے پر بھاری ہاتھ رکھنے والے نے صرف چند سیکنڈوں تک ہاتھ دھرے رکھا اور میری طرف سے کوئی حرکت نہ پا کر اس نے وہ اٹھا لیا، لیکن تب تک میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

مجھے اس حرکت کی سمجھ تو نہ آئی مگر میرے وجدان نے مجھے یہ ضرور باور کرایا تھا کہ میں کسی بڑے خطرے سے بال بال بچا ہوں، لیکن پھر دل کو تسلی نہیں ہوئی، گورذی سے سرگوشی کیے بنا نہ رہ سکا۔

"کسی نے پیچھے سے میرے کندھے میں ہاتھ رکھا تھا۔"

"تم نے کوئی حرکت تو نہیں کی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میں اسی طرح جما کھڑا رہا تھا اپنی جگہ جس طرح اور تھے۔"

"شکر! تمہاری یہی عقل مندی تمہیں ایک بڑے خطرے سے بچا گئی، کیونکہ ضرور عقب سے کسی گارڈ کو تم پر کسی قسم کا شبہ ہوا ہو گا، اس نے تمہیں آزمایا تھا۔ اگر تم حرکت کرتے تو دھر لیے جاتے اس لیے کہ مجمع میں شامل لوگ اپنی دھن میں مست رہتے ہیں۔"

اس کی بات سن کر میں نے دل میں بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا۔

اس کے بعد لوکپارٹ کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے کچھ کہا تھا جس کا مخاطب مجمع ہی تھا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں یہی سمجھا تھا ہمیں شاید آگے بڑھنے کا اشارہ ملا ہے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ سر دست کچھ بھی نہ ہوا۔ کوئی آگے نہ بڑھا تھا جبکہ میرا دل شدت سے بے قرار تھا کہ اس کڑے امتحان سے بھی گزر جاؤں اور اندر داخل ہونے کا پروانہ راہداری جلد سے جلد مل جائے۔

ذرا تھمی ہوئی فضا میں عجیب... منحوس سا تردد بھری دبی آواز ابھری تو ایک لمحے کے لیے میرا دل بھی دہل سا گیا۔

اسی بڑے لوکپارٹ نے نرسنگا بجایا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ اسی خونی مونسٹر...... کوتھوگا کو بلانا چاہتا تھا۔ مگر کیوں......؟ یہاں اس منحوس مونسٹر کے بلانے کی آخر کیا وجہ تھی؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ تاہم میں اس منحوس جانور کو اس طرح اچانک بلائے جانے پر کچھ ڈر سا گیا تھا، اسی وقت مجمع کے لوگوں نے دھیرے دھیرے اپنا سر اٹھانا شروع کیا، ہم نے بھی اس کی تقلید کی اور خدا کا شکر ہی ہوا کہ ہمیں سامنے دیکھنے کی توفیق بخشی گئی تھی اس بڈھے لوکپارٹ سمیت، ورنہ سر جھکائے جھکائے...... میری تو گردن ہی دکھنے لگی تھی۔

لوکپارٹ اب نرسنگا بجانے کے بعد اجنبی آواز میں کچھ بولے بھی جا رہا تھا، اس کے بعد مجمع میں تحریک پیدا ہوئی، میرا دل خوشی سے دھڑکا۔ اندر کی طرف پیش قدمی کی ابتدا ہوئی اور...... ہم نے مجمع کے ساتھ اپنے قدم بھی آگے بڑھا دیے۔

عمارت کے احاطے میں داخلے کے لیے ایک دیوہیکل لکڑی کا پھاٹک تھا۔ ہم اس کے اندر داخل ہونے لگے۔ ہم نے گورذی کی ہدایت کے مطابق وہی انداز اپنائے رکھا تھا جو دوسرے لوگ اختیار کیے ہوئے تھے۔

احاطے کے گیٹ کے دائیں بائیں بھی مسلح افراد چوکس کھڑے تھے۔ وہ ہنوز ایک ایک کو کڑی نظروں سے گھورے جاتے تھے۔ مجھے ایک بار پھر نامعلوم خطرات سر پر منڈلاتے نظر آنے لگے۔

سب لوگ سر جھکائے آگے بڑھے جا رہے تھے۔ ہم تینوں بھی بدستور ان کی تقلید کرتے رہے۔ گورذی کا تو کوئی مسئلہ نہ تھا اسے سب معلوم تھا کہ اسے کس وقت کیا کرنا تھا اور وہی بے چارہ ہماری راہنمائی کر رہا تھا۔

احاطے کے اندر داخل ہوتے ہی عمارت کا بڑا سا ساگوان کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اندر کے منظر کی جھلک روشنی کے سیلاب میں نہائی ہوئی تھی اور اندر سے وہ ایک بڑے ہال کا منظر پیش کرتا تھا، سنگ سیاہ کے لگ بھگ کوئی آٹھ دس قدمچے بنے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے اسی رنگ کا چکنا چپٹا ہوا فرش تھا۔ یہ فرش قوس کی صورت میں عمارت کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور یوں عمارت ایک چبوترے پر بنی ہوئی نظر آتی تھی۔

ہمیں گیٹ کے باہر سیڑھیوں کے قریب اسی بڑے سے فرش پر روک دیا گیا۔

شاید ہمیں بڑی خاموشی اور غیر محسوس طریقے سے کسی "چیکنگ" یا "اسپاٹ چیکنگ" سے گزارا جا رہا تھا، کیونکہ ہمیں یہاں اور احاطے کے باہر کھڑے کرنے کا انداز ایسا ہی تھا،

جلد ہی عقدہ کھلا کہ کیسی بات تھی۔

یہاں میں نے دیکھا کہ جبہ پوش مجمع (ہم سمیت) اب اپنے گھونگھٹ بھرے سروں کو اونچا کر چکا تھا، یوں کسی سے مجھے سامنے دیکھنے کا موقع ملا تو میرا خون خشک ہونے لگا۔

گیٹ کے چوکھٹے پر "واک تھرو میٹل ڈیٹیکٹرز"…… نصب تھا اور وہاں سے ایک ایک کو گزارا جا رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے گورڈی؟" میں نے ساتھ کھڑے گورڈی سے ہلکی سرگوشی میں کہا۔

"دیکھ تو رہے ہو چیکنگ ہو رہی ہے۔" وہ بولا۔ اس کا لہجہ بھی کچھ فکرمند سا محسوس ہوا مجھے۔

"فکر مت کرو، ہتھیار تو تمہارے پاس کوئی بھی نہیں ہے نا……؟"

"نہیں۔"

"بس، پھر ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن چہرے……؟"

"نہیں، صرف مشتبہ ہتھیاروں کی تلاشی کے لیے ہے یہ سب……" اس نے بتایا اور مجھے کچھ تسلی ہوئی۔

ہم آخری قطار میں کھڑے تھے۔ اس میں چھ سات افراد تھے۔ اگلی قطاروں میں سے ایک ایک کر کے لوگوں نے اندر جانا شروع کر دیا تھا۔ میرا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ کھیل دادا اور شکیلہ کو بھی میں نے ہوشیار رہنے کی تلقین کر دی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد ہماری قطار کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد گورڈی آگے بڑھ گیا پھر وہ بھی اندر چلا گیا۔

میری باری آ گئی اور میں اپنے دل کی تیز دھڑکنوں پر قابو پائے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میری چال ڈھال کا انداز بھی دوسرے عام لوگوں کی طرح رہے، کیونکہ وہاں موجود مسلح گارڈز ایک ایک شخص کو بڑے غور سے گھور رہے تھے۔

میں قوتِ ارادی اور خود اعتمادی سے کام لیتے ہوئے خود کو واک تھرو گیٹ کے پاس لے گیا اور پھر وہاں سے جیسے ہی گزرنے لگا اس وقت…… میرا دل ہی جانتا ہے کہ میری کیا حالت تھی، اگر تیز بیپ بج جاتی اور میں دھر لیا جاتا تو یہاں کی صورتِ حال خطرناک اور بدترین حد تک بگڑ جاتی۔ پھر آر یا پار والی بات ہوتی لیکن شاید تقدیر نے میری مدد کی ٹھان رکھی تھی۔

میں بالکل خیریت سے گزر گیا۔ میں نے طمانیت بھری سانس لی، پھر کھبیل دادا اور شکیلہ بھی بخیر و عافیت اس عمل سے گزرے۔ اس کے بعد مزید تین چار افراد کی باری آ گئی۔ ہم تب تک اب، مرد قطار بنا کر کھڑے ہو چکے تھے اور میں غیر محسوس انداز میں اندر کا جائزہ لینے لگا۔

ہال کی چھت بلند تھی۔ شیشوں اور آبنوسی لکڑیوں کا استعمال کثرت سے نظر آ رہا تھا۔ جا بجا نصب فانوس کی روشنی سے اندر کی دنیا میں جیسے دن نکلا ہوا تھا۔

یہاں اندر قدم رکھتے ہی میرے دل میں بڑی شدت کے ساتھ ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ عابدہ کی خوشبو میں محسوس کر سکتا تھا۔ وہ یہیں کہیں ہوگی۔ جانے کہاں وہ بے چاری ام النصیب میری منتظر بھی ہوگی یا بالکل مایوس ہو چکی ہوگی، کیا اسے معلوم ہوگا کہ میں کتنی صعوبتیں جھیل کر یہاں تک پہنچ چکا تھا۔ کیا اسے علم ہوگا کہ میں اس کی خاطر کتنی تکلیف سے گزر رہا ہوں…… اور جدائی میں تڑپ رہا ہوں اور اب اس کی تلاش، اس کے حصول کے لیے میں نے اپنا سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ کیا اسے پتا ہوگا کہ میں اس کی طرف سے ایک پل کے لیے چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانتا ہوا اور اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمنوں کو راہی ملکِ عدم کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ کیا وہ جانتی ہوگی کہ اطفال گھر کا وہ سیدھا سادہ شہزی حالات اور کڑی دھوپ کی مسافتوں کی بھٹی میں پک کر کس قدر کندن بن چکا ہوگا کہ اسے سوائے اپنے حصولِ عشق کے کسی کا یارا نہ رہا تھا، حتیٰ کہ اپنا بھی نہیں…… لیکن…… نہیں…… وہ سب جانتی ہوگی۔ جذبۂ دل اتنا تو اپنے اندر جذب رکھتا ہی ہوگا، ادراک تو اسے بھی ہوگا کہ سچی محبت کبھی نہیں مرتی، بھلا کیسے مرے! اسے تو قدرتی دوام حاصل ہوتا ہے، وہ فنا ہو کر بھی فانی ہو جاتی ہے۔ بھلا ایسا جذبہ مر سکتا ہے؟ جانتی ہوگی وہ سب، میرے جفادر دشمن اس کی منتظر سماعتوں میں طاغوتی قہقہوں کے ساتھ طنزیہ لفظوں کا سیسہ انڈیلتے ہی ہوں گے کہ میں اس کی تلاش میں کس قدر مارا مارا، جنگل، صحرا، ویرانہ پھر رہا تھا۔ قریہ قریہ ناپ رہا تھا اور لمبی جدائی کے اس زہر گھونٹ کے پیالے میں جرعہ جرعہ پی رہا تھا۔ کیسے ہو سکتا تھا ایسا کہ وہ…… یہ سب نہیں جانتی ہوگی…… کیا خبر میرے دل کی طرح اس کے دل میں بھی وہ شرارہ لپکا ہوگا جس نے اسے باور کرایا ہو کہ میں یہاں آ چکا ہوں……

متوقع قرب اور دیدارِ یار کی امید نے میرے اندر اس قدر شدت کی تڑپ پیدا کر دی تھی کہ میرے دماغ کی دو رگیں بے اختیار پھڑکنا شروع ہو گئی جو مجھے کسی بھی نتیجے کی پروا کیے بغیر فقط حصولِ مقصد کو جلد سے جلد پانے کے لیے اکساتی اور پھر میری آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن جاتی، پھر مجھے کچھ نظر نہیں آتا، میں آگ میں کود پڑتا تھا۔

اس وقت بھی بڑی شدت سے میرے اندر یہ خواہش کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح ابھری تھی۔ میرا جی چاہا اسی وقت یہاں موجود کسی گارڈ کی گن جھپٹ لوں اور سب کو گولیوں سے بھون کر عابدہ کی تلاش میں اس منحوس عمارت کا چپا چپا چھان ماروں۔

لیکن نہیں...... یہ جوش ہر جگہ کام کا نہیں ہوتا ورنہ انسان کو کام کا نہیں رہنے دیتا۔ انگارے رکھنے کی جگہ اور ہوتی ہے اور برف کی سل رکھنے کی اور...... ورنہ تو جوش کے جو سلگتے فولادی جذبات، کبھی کبھی آب آہن تاب میں بجھ کر رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا تھا کہ مکار اور شاطر دشمنوں کے ساتھ ہوش سے بیگانہ ہو جاؤں۔

لوکہارٹ کی گونج دار آواز نے مجھے ہوش و خرد کی دنیا میں پہنچایا تو گورڈی نے مجھے ہلکا سا ٹہوکا دیا۔

"آگے بڑھو...... کہاں کھو گئے؟ ہوتا کام بگڑ جائے گا تمہاری ذرا سی بھی مشکوک حرکت سے......"

لوکہارٹ نے مجمع کو آگے قدم بڑھانے کا حکم دیا تھا۔ ہم قدم بڑھانے لگے۔

ایک طویل راہداری سے گزرتے ہوئے میں وہاں بنے ایک ایک کمرے کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا اور میرے دل و دماغ کی کیفیات بہت عجیب ہو رہی تھیں۔

میرا جی چاہتا تھا کہ ہر کمرے کا دروازہ توڑ ڈالوں، مجنوں کی طرح "عابدہ...... عابدہ......" کہتا اس عمارت کے گوشے گوشے تک کو چھان ڈالوں...... یارِ گم گشتہ کی نظارۂ دید طلب اور بےتابی حد سے بڑھتی جا رہی تھی۔ منزلِ دیرینہ قریب ہو تو انسان جوش میں ایسا ہی قدم اٹھانے کی چاہ کرتا ہے، لیکن یہ میرا دل ہی جانتا تھا کہ میں نے...... کیسے خود کو اپنے دل اور آتش جوش کو سنبھالے رکھا تھا۔

شیطان کی آنت کی طرح اس طویل راہداری کا اختتام...... ایک اور ہال پر ہوا تھا جو پہلے والے ہال سے نسبتاً چھوٹا تھا۔

یہاں سب کو ایک ہی قطار میں اور نصف دائرے کی صورت کھڑا کر دیا گیا۔ اب سب ہی ایک قطار میں کھڑے تھے اور ہمارے سامنے لوکہارٹ کھڑا تھا۔ یہاں بس مختصر سا ہی فرنیچر نظر آتا تھا۔ ہم سب ہال کے وسط میں کھڑے تھے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں یہاں سے "سلپ" ہونے کی کوشش کروں اور عابدہ کا کھوج لگاؤں، لیکن ابھی شاید یہ قبل از وقت ہوتا۔ یوں میں بھی ذرا اس شب نظارہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ چند مسلح گارڈ یہاں بھی کھڑے تھے۔

لوکہارٹ نے پھر اجنبی زبان میں خطاب کرنا شروع کر دیا، شکر رہا کہ یہ خطاب چند الفاظ پر مشتمل تھا۔ ہم اب اس پوزیشن میں کھڑے تھے کہ ایک ایک فرد لوکہارٹ...... کی نظروں کے سامنے تھا۔ ایسے میں گورڈی اب مجھ سے سرگوشی میں بھی مخاطب نہیں ہو سکتا تھا اور شاید اس بات کا دھیان اس نے بھی رکھتے ہوئے...... مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

اسی وقت لوکہارٹ الٹے پاؤں مڑا اور...... عقب میں نظر آتے ایک چھوٹے گیٹ نما دروازے سے اندر داخل ہوا اور پھر اسی طرح "سنگل رو" (ایک قطار) کی صورت میں ہم بھی اسی طرف بڑھے۔

میں یہی سمجھا تھا کہ اندر بھی کوئی کمرا ہوگا مگر ایسا نہیں تھا، یہاں بھی ایک راہداری نما راستہ تھا مگر وہ سیدھا نہیں بلکہ سلوپ کی صورت میں نیچے جا رہا تھا۔ یعنی یہ ڈھلوانی سی راہ گزر تھی۔

دائیں بائیں دیواروں کے ساتھ ایک اسٹیل کی راڈ لگائی گئی تھی جس سے ایک ہاتھ کا سہارا لے کر نیچے اترا جا رہا تھا۔

گورڈی میرے آگے تھا اور میرے پیچھے کیلی واڈا اور شکیلہ تھے۔ گورڈی اب بھی مجھ سے مخاطب نہیں ہو سکتا تھا، البتہ میرے پیچھے ہوتا تو اور بات تھی۔

پندرہ بیس قدم چلے تھے کہ یہ ڈھلوانی سطح سیدھی ہو کر ایک فرش سا بن گئی، ہم رک گئے اور جگہ تنگ ہونے کے سبب گنڈ مڈ سے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اب ہم ایک دوسرے سے مخاطب ہو سکتے تھے بلکہ مجمع میں چند لوگوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کھسر پھسر بھی کی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اب شاید گورڈی مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کرے گا مگر وہ پھر بھی خاموش رہا۔

اچانک اس گوشے کی محدود فضا میں ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز ابھری۔ ہمارے سامنے کی ایک دیوار سلائیڈ ہوئی تھی۔ سامنے کا منظر ایسا ہی تھا جیسے بڑا سا آدم گزار گول پائپ ہو...... وہاں ایک دھات کی پٹری بچھی ہوئی تھی...... وہ بھی ڈھلوان کی صورت میں اندر کہیں نیچے کی طرف اتر رہی تھی۔

دفعتاً سرنگ نما اس راہ گزر میں ہلکی سی الیکٹرانک گونج کی آواز سنائی دینے لگی اور اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ شیشے کی لمبی سی ٹیوب نیچے کہیں سے اچانک نمودار ہوئی اور...... سرے پر آ کر رک گئی۔ گونج ابھی تک ہو رہی تھی۔ ٹیوب کا شیشہ اس قدر صاف اور شفاف تھا کہ اندر لگی ایک ایک نشست کی دو دو قطاریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یعنی صرف دائیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی وذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔

لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفیکیشن ضروری۔

- اردو کتب / عمران سیریز یاسٹڈی کی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈ ن سے وٹس ایپ پر بذریعہ ج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤاماز

اللہ تبارک تعالی ہم سب کا حامی وناصر ہو

بائیں ایک ایک نشست پر دو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور اسی طرح دو نشستوں کی جوڑی آگے تک چلی گئی تھی۔ یہ ایک کیپسول نما لمبی ٹیوب تھی۔ پٹڑی پر اس کے وہیل نہیں تھے بلکہ ایک الیکٹرک راڈ نصب تھی جو پٹڑی سے صرف نصف انچ اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور برقی لہروں سے یہ ٹیوب اپنا سفر طے کرتی تھی۔

بجلی سے چلنے والی اس ٹیوب کے دونوں گیٹ مخالف سمت سے خودکار انداز میں سلائڈ ہوئے۔ ہم سب اس میں سوار ہونے لگے، جب لوکہارٹ سمیت ہم سب سوار ہو گئے تو ہمارے پیچھے دونوں شیشے کے دروازے اسی طرح خودکار انداز میں سلائیڈ ہو کر لاکڈ ہو گئے۔ ہمارے ہاتھوں پیروں میں خودکار بیلٹ لپٹ گئے، گویا ہم ٹائٹ ہو گئے۔

برق کی سی تیز سنسناتی گونج ابھری اور ٹیوب ایک ہلکے لطیف سے جھٹکے کے ساتھ حرکت میں آ گئی۔

ٹیوب میں ایک خاص بات تھی کہ اس میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ یہ بالکل بند تھی۔ آکسیجن کا بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے آبدوز ہوتی ہے۔ وہ درمیانی رفتار سے سرنگ نما اس راستے میں دوڑی جا رہی تھی۔

سرنگ نما اس راستے کے میگنیٹک ٹریک پر یہ ٹیوب پہلے تو سیدھی دوڑتی رہی اس کے بعد وہ بتدریج نیچے کی طرف جھکنے لگی، اب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ زمین کے اندر جا رہی ہو۔

ہم شیشوں سے دائیں بائیں اور چھت سے باہر کا نظارہ بآسانی کر سکتے تھے۔

لگ بھگ کوئی آٹھ دس کلومیٹر سفر کے بعد سرنگ کی دیواریں بھی شفاف اور ٹرانسپیرنٹ ہو گئیں، گویا ٹیوب کی طرح یہ بھی شیشے کی بنی ہوں۔ اب ایک عجیب اور انوکھا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہمارے اردگرد گہرا نیلا پانی تھا اور اس میں تیرتی ہوئیں چھوٹی بڑی آبی مخلوق...... گہری سبز نیل گھاس، مونگیا کی چٹانیں، آبی پودے، غرضیکہ وہ سب کچھ جو ایک آبی دنیا میں ہوتا ہے۔ گویا جیسے ہم کسی ایکوریم کے اندر آ گئے ہوں۔ پانی کے بنتے پھوٹتے بلبلے بھی جیسے ہمارے ساتھ محوِ سفر محسوس ہوتے تھے۔

چند رنگین مچھلیوں اور دریائی گھوڑوں کے ایک جتھے کو ہم نے ساتھ ساتھ سفر کرتے بھی دیکھا اور پھر وہ شاید ہماری ٹیوب کو کسی ”بڑی مچھلی“ پر محمول کر کے دائیں بائیں ہٹ گئے اور دور کے دور چلے گئے۔ بڑا ہی دلفریب منظر اور نظارہ تھا۔

یہ ٹھوس اور مضبوط شیشے کی سرنگ گویا سمندر کے اندر اتر گئی تھی...... ہمیں آگے اور پیچھے کا منظر بھی صاف نظر آ رہا تھا اور یہ شیشے کی سرنگ بھی جو ایک پائپ کی طرح بل کھاتی دور تک گہرے نیلے پانیوں کے اندر چلی جا رہی تھی اور اس کے اندر ہماری ٹیوب گامزن تھی۔

یہ سارے مناظر یقیناً ٹیوب میں سوار دیگر مسافروں کے لیے نئے نہیں بلکہ خود میرے اور فیل وادا کے علاوہ میگیلر کے لیے بھی حیرت کا ہی باعث تھے۔ ہم دونوں بھی آنکھیں پھاڑے دائیں بائیں گردن موڑ موڑ کر گہرائی میں ان آبی مناظر کو تکے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ٹیوب کی رفتار دھیمی پڑنے لگی، آبی نباتات اور ان کے اردگرد تیرتی بھانت بھانت کی مچھلیاں اور دیگر مخلوق دور ہونے لگیں، ایک میدان سا تیرتی حالت میں نظر آنے لگا۔ تب ہی میں نے ایک چونکا دینے والا منظر دیکھا۔ آس پاس اور فاصلے سے ہوائی اور بحری جہازوں کے ٹوٹے ملبے پڑے نظر آنے لگے۔ ان کی ٹوٹی پھوٹی فولادی باڈی زنگ آلود ہو چکی تھی جس کی سطح پر ہری ہری کائی کی موٹی تہ چڑھی نظر آ رہی تھی۔

ایک لمحے کو میں کانپ کر رہ گیا اور بے اختیار میں نے سوچا کیا ہم برمودا ٹرائی اینگل کی حدود میں تھے؟ لیکن کیسے......؟ کیا لولوش کی سائنس اس قدر ترقی کر چکی تھی کہ وہ یہاں تک بغیر کسی ”روایتی“ خطرے کے اپنی دسترس اور اجارہ داری قائم کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

کیا لولوش جیسا شیطان کوئی دجال تھا......؟ جس نے یہاں اس شیطانی تکون میں اپنی حکمرانی قائم کر رکھی تھی؟

دائیں بائیں چھوٹے بڑے ٹیلوں کے نظارے بھی دکھائی دینے لگے۔ پھر ایک موڑ پہ ٹیوب بائیں جانب گھومی۔ مجھے ایک عجیب ساخت کی عمارت کا دھندلا اور پانی میں لہراتا عکس نظر آیا۔ وہاں میں نے اسی ٹیوب کی طرح تین چار چھوٹی بڑی ٹیوب کی شکل کی گاڑیاں دیکھیں۔

ہماری ٹیوب کی رفتار دھیمی پڑنے لگی، حتیٰ کہ وہ عمارت کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

ہم سب مسافر اپنی گردنیں اونچی کر کے اس طرف دیکھنے لگے۔ مذکورہ ٹیوب کے قریب قریب ہمیں چند غوطہ خور بھی اِدھر اُدھر منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ یقیناً لولوش کے حواری ہی ہو سکتے تھے۔

ہماری ٹیوب اس عمارت کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر چکی تھی۔ چند ہی سیکنڈ بیتے تھے کہ دروازہ کھلا اور......

ٹیوب پھر حرکت میں آگئی۔ وہ دھیرے دھیرے تیرتی ہوئی دروازے سے اندر جارہی تھی۔

اندر بھی پانی تھا۔ یہاں کچھ تاریکی سی نظر آتی تھی۔ ٹیوب ایک جگہ رک گئی۔ پھر اس کا رخ بدلنے لگا، یوں لگا جیسے انجن شنٹنگ کررہا ہو۔ تب ہی اچانک ٹیوب کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور وہ بالکل ساکت ہوگئی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہمارے عقب میں ہلکی سی خودکار سرسراہٹ ابھری۔ دروازے سلائڈ ہوچکے تھے اور ہمیں اترنے کا حکم ملا۔ میں اس آواز کو پہچان رہا تھا، یہ لوکہارٹ کی آواز تھی۔

ہم سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ عقدہ کھلا کہ ٹیوب کا عقبی دروازے والا حصہ عمارت سے اٹیچ کیا جاچکا تھا۔

ہم باری باری اترنے لگے۔ ٹیوب سے اترتے ہی ایک تین فٹ قطر کا گول دروازہ تھا، اس کے اندر سے گزر کر ہم ایک بڑے سے تکونی چھت والے کمرے میں جمع ہوچکے تھے۔ اس ڈھلوانی سی تکون چھت کے پار سمندری پانی کا نظارہ ہوتا تھا۔

اس تکونی اور ڈھلوانی چھت والے کمرے میں قدرے خاموشی تھی، لیکن آبی دباؤ کی ہلکی ہلکی گونج بڑا عجیب سا تاثر پیش کرتی محسوس ہورہی تھی۔ کبھی غرغراہٹ جیسی آواز ابھرتی تو کبھی یوں جیسے یکے بعد دیگرے بلبلے بن اور پھٹ رہے ہوں۔

"تم لوگ بے حد خوش قسمت ہو کہ "سن آف سیٹن" کے نمائندے ماسٹر لولوش کی اس زیرِ زمین آبی جادوگری کا حیرت انگیز نظارہ کررہے ہو۔"

اچانک بوڑھے لوکہارٹ کی گونج دار آواز ابھری۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی۔

"بہت جلد عظیم ماسٹر لولوش "سن آف سیٹن" کا پیغام تم تک پہنچانے والے ہیں۔ اس کی اطاعت میں ہی تمہاری نجات ہے اور بقا بھی...... بہت جلد عظیم لولوش کی حکمرانی پوری دنیا میں ہوگی۔ تم کوتھوکا کی نسل سے تعلق رکھنے والی ایک عظیم قوم بننے جارہے ہو۔ تمہیں پوری تیاری کے ساتھ یہاں سے باہر کی دنیا میں بھیجا جائے گا اور وہاں تم نے یہ پیغام لوگوں تک پہنچانا ہوگا اور انہیں بھی اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ چلو، اب عظیم ماسٹر لولوش کا دیدار تمہیں کروایا جائے گا۔"

اس کی بکواس ختم ہوئی اور ہمیں آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ ایک موقع پر یہاں گوورڈی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے خبردار کیا اور سختی سے یہ تاکید کی تھی کہ اب ایک دوسرے سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ میں نے بھی کچھ کھیل دادا تک، اور اس نے شکیلہ تک پیغام پہنچادیا۔

ہلکی سی گونج کی اضافی آواز ابھری اور ہمارے ایک طرف سے دیوار شق ہوگئی۔ سامنے راہداری تھی۔ لوکہارٹ اس میں داخل ہوگیا اور ہم سب نے بھی اس کی تقلید کر ڈالی۔

جب سب لوگ راہداری میں داخل ہوگئے تو عقب میں خودکار دروازے کے سلائڈ ہونے کی مخصوص سرسراہٹ ابھری تھی۔

یہاں سے ہم ایک مخروطی چھت والے بڑے سے ہال میں پہنچے...... یہاں ایک بار پھر ہم تین ... قطار میں منقسم ہوچکے تھے، جبکہ ہم چاروں آخری قطار میں تھے۔

ہمارے اردگرد مختلف پینلو بورڈ، الیکٹرانک مشینریز، سوئچز اور سپر کمپیوٹرز دیوار کے ساتھ ساتھ نصب دکھائی دیے، اس کے قریب گھومنے والی کرسیوں پر مختلف مرد و عورت مخصوص چست لباس میں بیٹھے اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے، کسی نے ہماری طرف ایک ذرا توجہ تو کیا نگاہ تک ڈالنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

یہاں پھر ہمیں ایک قطار میں کھڑے ہونے کا حکم ملا اور...... پھر ہمیں ایک سپاٹ سی دیوار کی جانب منہ کرکے کھڑا کردیا گیا۔

دفعتاً یہ دیوار شق ہوئی اور...... پھر اندر سے ایک فرش کھسکتا ہوا باہر آنے لگا۔

یہ فرش گول تھا اور اس کے وسط میں میز تھی۔ سامنے کے رخ پر فقط ایک بڑی سی اونچی پشت گاہ والی کرسی۔ اس پر کوئی براجمان تھا۔ وہ ابھی تاریکی میں تھا۔ فرش خودکار انداز میں بہت دھیرے دھیرے آگے کی طرف کھسکتا آرہا تھا۔

میری دھڑکتی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ بھاری بھرکم اور اونچی سی کرسی پر کوئی بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔

پھر فرش سمیت یہ میز اور کرسی شق زدہ دیوار سے جب باہر آچکے تو عقب میں دیوار ہلکی آواز کے ساتھ برابر ہوگئی۔

کرسی پر براجمان شخص...... اب ہمیں صاف نظر آرہا تھا۔ میری یک ٹک نظریں اس کے چہرے پر جم سی گئی تھیں۔ یہی وہ وقت تھا جب میرے دماغ کی کوئی رگ بری طرح پھڑکنے لگی اور مجھے خود پر قابو پانا محال نظر آنے لگا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط 65:

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...:

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ہوا دلچسپ سلسلہ...

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ناؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوتمسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوتمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنالیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوتمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوتمسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوتمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کرڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوتمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوتمسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ سہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھجوانی مدد کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہوجاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا گیمبلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہوچکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کردیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کرکے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کردیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہوجاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور وہ اسے ان بچھوؤں سے بچالیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کرکے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد تولا ان پر حملہ کردیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کردیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہوجاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال اس کو قابو کرلیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہوجاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کرکے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کرچکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرادیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمیل دادا کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کرلے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آکر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کرلیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کرلیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچالانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کردیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کرکے طلسم نور ہیرا برآمد کرلیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کرکے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کرکے پکڑ کرلے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہوجاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرالیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہوجاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کرلیتا ہے اور طیارے کو مور بانہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے یہاں شہزی سے دو بدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہوجاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

عابدہ...... کے مجرم کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھا تو میرے دل و دماغ میں وحشت کا طوفان امڈ پڑا۔ میں نے نہ جانے کس طرح خود پر قابو پایا۔

میری تند و تیز نظریں ایک پل کے لیے بھی اس پر سے نہیں ہٹی تھیں۔

گول فرش کے وسط میں انسانی گردے کی شکل کی سیاہ میز تھی اور اس کے عقب میں اونچی پشت گاہ والی کرسی پر... ایک ایسا شخص براجمان تھا جو مبینہ طور پر لولوش کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں اب اپنے اندر کی اتھل پتھل پر قابو پانے کے بعد اس کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکات و سکنات، آواز، الفاظ اور اس کا مقصد کیا تھا، ان سب پر...... نیز گرد و پیش کا بھی کہ اگر میں اس جدید دور کے شیطان پر فوری طور پر ہلا بول کر اسے واصل جہنم کر ڈالوں تو کیا یہ ممکن ہو پائے گا؟

یقیناً...... میرا دل گواہی دے رہا تھا۔ کبھی کسی بڑے اور طاقت ور دشمن کے خلاف مہربان تقدیر اس طرح کے سنہری مواقع عطا کر دیا کرتی ہے۔

ظاہر ہے میں اسے اپنی اب تک کی ایک بڑی کامیابی ہی تصور کر سکتا تھا کہ میں لولوش جیسے سفاک، طاقت ور اور بے پناہ وسائل رکھنے والے دشمن سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں اس کی موت بنا اس کے سامنے کھڑا ہوں۔

زہریلی انگوٹھی اور خاموش موت بکھیرنے والا بھونرا میرے پاس تھے۔ یہ دونوں ہتھیار تب ہی لولوش پر آزمائے جاسکتے تھے جب... لولوش مجھے اپنے قریب آنے کا کوئی موقع دیتا۔

جلد ہی میرا دل مارے خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ لوکہارٹ نے بہ آواز بلند ہم سب سے کہا تھا کہ عظیم لولوش کے سامنے رکوع کے بل جھک کر اس کی شان اور عظمت کے اعتراف میں اس کی قدم بوسی کرنے کے لیے ایک ایک فرد آگے بڑھے۔

اس دوران میں لولوش، جو ایک سیاہ چغے میں ملبوس تھا، اس کا سر اور چہرہ اب صاف نظر آتا تھا۔ میری نظریں... بغور اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کا چہرہ کسی ڈریکولا کے چہرے کی طرح لمبوترا اور مخروطی سا تھا، آنکھیں میچی میچی سی تھیں لیکن اس کے کونے کھنچے ہوئے تھے، یوں جیسے کوئی خلائی مخلوق ہو۔ رنگت سفید تھی۔ ناک کسی گدھ کی چونچ کی طرح نکلی ہوئی لگتی تھی۔ سیاہ جبّے کے کالر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ بال بہت چھوٹے تھے اور کٹی ہوئی گھاس کی طرح ان کی نوکیں ابھری ہوئی تھیں۔

سب سے پہلی والی قطار میں سے ایک شخص اپنا سر جھکائے آگے بڑھا۔ لولوش کے قریب پہنچ کر وہ نہایت احترام کے ساتھ کورنش بجا لایا۔ اس کے بعد اس نے عقیدت بھرے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا ایک ہاتھ تھاما، آنکھوں سے لگایا اور اسے بوسہ دے کر الٹے قدموں پلٹا اور واپس قطار میں آکر اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔

اسی طرح دوسرا اور پھر باری باری سب آگے بڑھتے اور واپس اپنی جگہ پر پلٹتے رہے۔

یہ سب دیکھ کر مجھے خود کو سنبھالنا انتہائی دشوار ثابت ہورہا تھا۔ ایسی اچانک ملنے والی فتح و کامرانی کی مسرتیں سنبھالے بھی تو نہیں سنبھلتیں۔ تقدیر نے کس قدر شان دار موقع دیا تھا مجھے اس شیطان کو زیر کرنے کا۔

بے اختیار میرے دل سے یاسمین اور بالخصوص روڈلف مرحوم کے لیے دعائیں نکلنے لگیں۔ انھی کے طفیل مجھے یہ دو شاندار ہتھیار ملے تھے جنھیں آج اپنے ازلی دشمن پر آزمانے کا نادر و سنہرا موقع ملا تھا مجھے......

میری باری آنے والی تھی۔

گورڈی نے اب ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے سے تو کجا سر اِدھر اُدھر کرنے اور گردنیں ہلانے تک سے منع کر رکھا تھا اور ہم اسی کی ہدایت پر عمل کر رہے تھے۔

میری باری آگئی۔ میرا دل گویا کسی تیز رفتار چلتی خودکار مشین کی طرح دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ یوں میں اپنے دل پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے آگے بڑھا۔

میرے قدموں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ میں گول فرش کے قریب پہنچا، اس کے ساتھ تین چار قدمچے جوڑے گئے تھے، وہ میں چڑھتا ہوا گول اسٹیج نما فرش پر پہنچا۔

لولوش کی جانب ایک قدم بڑھایا، میں جیسے جیسے اس خبیث شیطان کے قریب ہورہا تھا، میرا دل بھی رک رک کر دھڑکنے لگا تھا، بالآخر میں اس کے قریب جا پہنچا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ دیگر لوگوں نے اسے کس طرح ''خراجِ عقیدت'' پیش کیا تھا۔ اس کے بالکل قریب پہنچ کر میں بھی ایسا ہی کرنے لگا۔ اس کے سامنے تھوڑا جھکا، بہ ظاہر قدم بوسی کے لیے اس کے پاؤں چھونے لگا تو وہ مجھے کسی سیاہ شے میں ملفوف محسوس ہوئے...... میں شش و پنج میں پڑ گیا، میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔

یہاں مجھے اپنی زہریلی انگوٹھی آزمانے کے لیے دو مواقع مل سکتے تھے، پہلا اس وقت جب میں قدرے جھک کر اس کی قدم بوسی کرنے لگتا۔ اس وقت میں انگوٹھی میں چھپے ننھے سانپ کے پھن کو نکال کر اس کے پاؤں کو ڈس سکتا تھا۔ دوسرا موقع اس وقت ملتا، جب میں اس کے دونوں ہاتھوں کو بوسہ دینے کے لیے تھامتا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ کون سا موقع بارآور ثابت ہونے والا تھا۔

میں نے اس کے پیروں والا موقع چھوڑا اور اس کے ہاتھوں کو چھوا تو یکلخت میرا دل مسرت تلے زور سے دھڑکا۔ وہ کلائیوں کی طرف سے برہنہ تھے۔ میں نے انہیں بہ ظاہر ''عقیدت'' سے تھام لیا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے مخصوص اور فوری ''ٹرک'' کے ساتھ اپنی انگشتری سے اس کی کلائی کو چھوتے ہوئے اپنا ''کام'' کر ڈالا۔

اس کے فوراً بعد ہی میں واپس پلٹ آیا۔

قطار در قطار کھڑے مجمع میں شامل ہوتے ہی میں نے پلٹ کر اسٹیج کی طرف دیکھا۔ لولوش اسی طرح کرسی پر تنا بیٹھا تھا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس دوران ایک اور شخص اس کی جانب بڑھا تھا۔

میں اندر ہی اندر حیرت میں مبتلا رہا اور سوچنے لگا کہ کیا اس موذی کو زہر نے بھی اثر نہیں کیا تھا؟

میں نے دھڑکتی نظروں سے دیکھا کہ میرے بعد والا شخص اس کی قدم بوسی وغیرہ کے لیے ابھی اس سے دو تین قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک لولوش پر تشنج کا دورہ پڑنے لگا، وہ کرسی سے نیچے گرا۔ مجمع میں شور مچ گیا۔ اس کی جانب بڑھنے والا شخص گھبرا کر وہیں رک گیا۔

لوکہارٹ گھبرا کر گول فرش کی جانب لپکا تاکہ لولوش کو سنبھال سکے اور ساتھ ہی اس نے اپنے جبّے سے نرسنگا نکال کر بجایا...... آناً فاناً کئی چست لباس میں ملبوس مسلح افراد وہاں آن وارد ہوئے...... ساتھ ہی اس نے مجمع کو اپنی جگہ کھڑے رہنے کی تاکید بھی کر ڈالی۔

ہم سب پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھے جارہے تھے میں منتظر تھا کہ کب لوکہارٹ یا اس کے ساتھی، اس موذی شیطان کے مرنے کی خبر سناتے ہیں۔

ایسا ہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ... جب کسی فرعون، نمرود یا کسی شیطان صفت جیسے انسان کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہے تو اس کا غرور توڑنے کے لیے اسے اسی طرح اچانک اور غیر یقینی انداز میں انجام تک پہنچاتا ہے کہ وہ اس کے تصور میں بھی نہیں ہوتا۔

وہاں مسلح گارڈ نے فوراً کسی ڈیوائس پر بات کی، وہ چلّا چلّا کر ڈاکٹرز کو فوراً پہنچانے کا حکم صادر کر رہا تھا۔ لوکہارٹ اسے کچھ ہدایات بھی دیے جارہا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میری سماعتیں اس موذی کی موت کی خبر سننے کی بے چینی سے منتظر تھیں۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ سفید کپڑوں میں ملبوس آٹھ دس افراد مختلف طبی لوازمات کے ساتھ وہاں آن وارد ہوئے اور لولوش کو وہیں فرش پر لٹا کر اس کے طبی معائنے میں مصروف ہوگئے۔

''کیا تم نے کچھ کیا تھا؟'' اچانک مجھے کان میں گورڈی کی آواز سنائی دی۔

''ابھی چپ رہو۔'' میں نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو تم نے یوں سمجھو ہم سمیت پوری انسانیت پر احسانِ عظیم کیا ہے۔'' وہ خوشی کے دبے دبے احساس تلے بولا۔

''تمہارے خیال میں مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے اس سے سرگوشی میں پوچھا۔

''جس طرح دوسرے حیران پریشان کھڑے ہیں، اسی طرح کھڑے رہو۔ اِدھر اُدھر جانے یا کھسکنے کی بھیانک غلطی بھی مت کرنا۔'' وہ بولا۔

''ہم......'' میں نے ہولے سے اثباتی اشارہ دیا۔

''ویسے کیا بتا سکتے ہو کہ تم نے ایسا کون سا سریع الاثر حربہ استعمال کیا ہے؟'' اس نے دریافت کرنا چاہا۔

''میرے پاس ایک زہر میں بجھی انگوٹھی تھی، میں نے......''

''بس! سمجھ گیا۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''اب دعا کرو، یہ زندہ نہیں بچ پائے۔ کیونکہ اس کے پاس بھی چوٹی کے ڈاکٹرز اور سائنس دان موجود ہیں۔'' وہ بولا۔

مجھے اب یہی فکر ستانے لگی کہ کہیں اس خبیث موذی کو بچا نہ لیا جائے۔

اگرچہ آج تک میں نے جس پر بھی اس انگوٹھی میں چھپے زہریلے سانپ کے ننھے منے پھن کو آزمایا تھا، وہ زندہ تو نہیں بچا تھا لیکن اس صورت میں کہ اسے فوری طبی امداد کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ جبکہ یہاں لولوش کے پاس دنیا کی ہر جدید طبی سہولیات موجود تھیں، ممکن تھا ڈاکٹرز کسی ''اینٹی ڈوٹ'' کے ذریعے لولوش کی نیم مردہ زندگی بچانے کی کوشش کرتے۔

کبیل دادا اور شکیلہ تو میری کارستانی کب کے سمجھے

ہوئے تھے۔ انہوں نے میرے ساتھ اس بارے میں تھوڑی کھسر پُسر بھی کی تھی۔

’’میرا خیال ہے ابھی تک یہی سمجھا جارہا ہے کہ لولوش کو دل کا دورہ پڑا ہے، بشرطیکہ...... لولوش کے ہاتھ کی کلائی کے نشان پر کسی کی نظر نہ پڑے۔‘‘ گورڈی غور کرنے کے انداز میں بولا۔

’’نہیں، وہ نشان بہت باریک ہوتا ہے اور نہ ہی خون کی لکیر بنتی ہے، کسی مچھر کے ڈنک کی طرح ہی اس کے چھن میں باریک کھوکھلی جیسی سوئی ہوتی ہے مگر چہرے اور جسم کی بدلتی ہوئی رنگت سے زہر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

اسی وقت میں نے دیکھا کہ لولوش کے بے سدھ وجود کو ایک بڑے سے اسٹریچر پر ڈال کر وہاں سے لے جایا جانے لگا، پھر لوکہارٹ نے چست لباس والے مسلح افراد میں سے ایک آدمی سے جو اپنے گروپ کو لیڈ کر رہا تھا، کچھ ہدایت دینے والے انداز میں کہا اور ساتھ ہی مجمع کی جانب اشارہ بھی کیا۔

پھر وہ ڈاکٹرز کی ٹیم کے پیچھے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

اس کے بعد مسلح افراد کا گروپ لیڈر ہماری جانب بڑھا۔ وہ ایک چوڑے شانوں اور دراز قد کا تنومند سا شخص تھا۔

اس نے نہایت ہی کرخت اور تحکمانہ انداز میں ہم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ’’ماسٹر لولوش کی اچانک طبیعت بگڑ گئی ہے۔ ڈاکٹر ان کا معائنہ کر رہے ہیں۔ آپ سب لوگ مجھے فالو کریں اور اسی نظم و ضبط کا مظاہرہ کرتے رہیں جیسا لوکہارٹ کے ساتھ کر رہے تھے۔‘‘

مجمع سے ایک فرد نے سوال کیا۔

’’ماسٹر لولوش کو یہ اچانک کیا ہوگیا تھا؟ کیا کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے؟‘‘

’’ماسٹر لولوش پر عظیم سن آف سیتن کی خاص مہربانیاں اور ناقابلِ تسخیر طاقتیں ہیں۔ بے فکر رہو، انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ طبیعت خرابی ایک معمولی بات ہے۔ سب میرے پیچھے آجاؤ۔‘‘

اس نے کہا۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر اور اس کی باتوں پر لعنت بھیجتے ہوئے استہزائیہ انداز میں سوچا۔

’’ہونہہ......! مہربانیاں اور عظیم طاقتیں...... کس طرح یہ ان لوگوں کو بہلا رہا ہے۔ حالانکہ مجھے پورا یقین تھا اور نظر بھی آرہا تھا کہ لولوش کی ایک دم بگڑتی ہوئی حالت پر لوکہارٹ سمیت وہاں سب ہی مسلح گارڈز اور ڈاکٹرز کی ٹیم سے متعلق افراد بھی تشویش میں مبتلا نظر آرہے تھے۔

ہم اس گروپ لیڈر کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کے پیچھے ہولیے۔ وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہمراہ پانچ چھ ساتھی اور بھی تھے، جو مسلح تھے۔

ہمیں ایک ہال میں لایا گیا اور یہاں سب کو فرش پر بیٹھ جانے کا حکم دیا گیا۔

اس کے بعد گروپ لیڈر کی تحکمانہ آواز ابھری۔ ’’تم سب لوگ یہاں بیٹھ کر لوکہارٹ کے اگلے حکم کا انتظار کرو گے۔ کوئی بھی یہاں سے ہلنے کی کوشش نہیں کرے گا جب تک کہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہیں ہوجاتا۔‘‘

اس کے بعد وہ وہاں موجود اپنے چار ساتھیوں کو کچھ ہدایت دے کر چلا گیا۔

اب چار مسلح افراد ہمارے سروں پر مسلط کر دیے گئے تھے، ان میں کھسر پسر ہونے لگی۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا اختیار سب کو دیا گیا تھا۔ سب اپنے اپنے طور پر لولوش کی خرابیٔ طبیعت سے متعلق سرگوشیوں میں مگن تھے۔

مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ کیا میں نے واقعی اپنے اتنے بڑے دشمن پر پلک جھپکتے ہی غلبہ پالیا تھا؟ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے میں نے بڑی تگ و دو کی تھی۔ مصائب و آلام سہتا، کچھ پیاروں کی دائمی جدائی کے غم جھیلتا اور پُرخطر راستے، طویل مسافتوں کی منزلیں مارتا ہوا اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا، ممکن تھا تقدیر کو مجھ پر ترس آگیا ہو کہ اس نے میری یہ آخری منزل کی کٹھنائیوں کو کم کر ڈالا ہو۔

کیا واقعی ایسا تھا؟ کیا واقعی لولوش جیسا موذی شیطان، اسپیکٹرم جیسی چہاردانگ اور امریکی اسرائیلی اکابرین کی حمایت یافتہ تنظیم کا بگ چیف، برمودا کا بادشاہ کہلانے والا اور برازیل کا جادوگر اس قدر آسانی سے میرے ہاتھوں موت کے دہانے تک جاپہنچا تھا؟ اب بس اس کی موت کی خبر آنے والی تھی؟ اس کے بعد عابدہ کا حصول...... میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اس کے بعد میری واپسی کا سفر شروع ہوتا۔

یوں مجمع میں شامل دیگر لوگوں کی طرح ہم چاروں کو بھی آپس میں تبادلہ خیال کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

کبیل دادا بولا۔ ’’میرا خیال ہے ہمیں لولوش کی جانب سے کوئی ’’خوش خبری‘‘ ملنے تک یہاں موجود نہیں رہنا چاہیے۔‘‘

1987ء سے خدمت میں مصروف
پھلبہری
LEUCODERMA-VITILIGO
تمام جلدی بیماریوں کا مؤثر اور بے ضرر علاج
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی ہربلسٹ کے صاحبزادے اقدس زیدی
کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام
ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD
AWARD OF BEST ACHIEVEMENT
AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد
مستقل پتہ
9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری
مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1 [illegible]
فون (051)2331725
موبائل 0300-8566188

لاہور
گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188
قیام
14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

پشاور
[illegible]
جی ٹی روڈ نزد [illegible] چوک، پشاور شہر
موبائل: 0300-8566188
قیام
یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

ملتان
[illegible]
[illegible] ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)
قیام
28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

کراچی
[illegible] سینٹر
آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم سی بی
موبائل 0300-8566188
قیام
13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

"ہاں! دادا ٹھیک کہہ رہا ہے۔" شکیلہ نے بھی اس کی تائید میں تبصرہ کرتے ہوئے مجھ سے ہلکی سرگوشی میں کہا۔ "کیا خبر لوکہارٹ کو تم پر شبہ ہوا ہو کہ مجمع میں سے ایک "فرد" کے ملنے کے بعد لولوڈش کی طبیعت ایک دم بگڑی ہو۔"

"تم دونوں کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔" گورڈی نے ہولے سے کہا۔ "ایسا ممکن ہے کہ اس سلسلے میں مجمع کے ہی لوگوں سے انکوائری کرائی جائے۔ لیکن بے فکر رہو، ایسا ہوا بھی تو کچھ بھی ثابت نہ ہوسکے گا۔ اس کے برعکس اگر تم نے اِدھر اُدھر کہیں کھسکنے کی کوشش چاہی تو ان کا شبہ تم پر یقین میں بدل جائے گا۔"

گورڈی کا مشورہ اپنی جگہ لیکن ہم تینوں پہلے ہی آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ہمیں اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ اس وقت دشمنوں کو اپنی پڑی ہوئی تھی اور سب کی توجہ اپنے "بگ باس" پر مرکوز تھی۔ اس دوران ہم عابدہ کو تلاش کر سکتے تھے۔

اس پر کبیل دادا نے ایک خدشے کا اظہار کیا۔ "ہم اس وقت لولوڈش کے اصل ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ اسی لیے عابدہ کا یہاں موجود ہونا ضروری نہیں۔" اس کی تائید میں شکیلہ نے بھی یہی کہا۔

"شہزی! ان میں افراتفری پھیلانے کا یہ سنہری موقع اپنی جگہ لیکن ہم اس وقت اس کی جادونگری میں موجود ہیں، جو یقیناً ایک خودکار سسٹم کے تحت ہے۔ ہم یہاں ٹیکنیکلی طور پر بےبس ہوسکتے ہیں۔"

"لیکن جب ہم یہاں آئے ہیں تو عابدہ کی یہاں موجودگی یا غیر موجودگی کا پتا کیے بغیر لوٹنا غیر دانشمندی ہی ہوگی۔" میں نے...... نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیں یہاں سے اسی ٹیوب کے ذریعے ہی ہوگ بے کی جانب لوٹنا پڑے گا لیکن اگر ہوگ بے میں لولوڈش کے محل میں عابدہ نہ ملی تو دوبارہ ہمارا یہاں آنا مشکل ہوگا، میرا دل کہہ رہا ہے کہ عابدہ کو اس خبیث نے اسی جگہ کہیں چھپا رکھا ہے۔"

کبیل دادا اور شکیلہ میری بات پر لاجواب ہوکر چپ ہوگئے۔ گویا میری بات پر متفق ہوں۔

ابھی ہم تینوں اسی سوچ بچار کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک دو جبّہ پوش خواتین ہمارے قریب آئیں۔ یہ ایلنورا تھی۔ میں نے کبیل دادا اور شکیلہ کو خاموش اور محتاط رہنے کا اشارہ کیا۔

گورڈی کی مدر اور ایلنورا، گورڈی کے قریب آگئیں۔ میں، کبیل اور شکیلہ، گورڈی ہی کی ہدایت پر اس واقعے کے بعد اس سے ذرا پرے ہوکر کھڑے ہوگئے اور الگ الگ ہی تھے، لیکن ایک دوسرے کو "فالو" کر رہے تھے۔

ادھر ایلنورا اور مدر کو گورڈی کے قریب آتا دیکھ کر میں غیر محسوس انداز میں ان کے قریب چلا گیا۔ چونکہ مجمع سا تھا، پھر ہم سب جبّے میں تھے، کوئی کسی کو ابھی فوری طور پر پہچاننے سے قاصر تھا۔

"گورڈی! تم نے جن تین نئے افراد کی ہماری سوسائٹی میں شامل ہونے کی سفارش کروائی تھی، وہ کہاں ہیں؟"

یہ گورڈی کی مدر نے اپنے بیٹے سے پوچھا تھا۔ اس کے استفسار پر میرا دل کسی بدترین خدشے کے سبب تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔

"وہ ادھر ہی ہیں مدر! خیریت تو ہے؟ آپ اچانک ان کے بارے میں کیوں پوچھنے لگیں؟" گورڈی کو میں نے اپنی ماں سے یہ کہتے سنا۔

"ہمیں شبہ ہے کہ یہ شرارت انہی میں سے کسی کی تھی۔" اس بار ایلنورا کی سرگوشی نما آواز میں نے سنی۔ میں اسے دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی مگر دراز قامت خوب صورت سی پُرکشش لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت مجھے مجمع میں شامل یہ سبھی لوگ شیطان کے پیروکاروں کے روپ میں ہی نظر آرہے تھے، گورڈی ان میں شامل نہ تھا۔

"میں سمجھا نہیں کہ یہ تم دونوں کیا کہہ رہی ہو؟" گورڈی جیسے انجان سا بن کر دونوں سے بولا۔

"گورڈی! میں عظیم سن آف سیتن کی خاطر اپنا شوہر قربان کرچکی ہوں تو یاد رکھو، اپنا بیٹا بھی قربان کرنے میں دیر نہیں کروں گی۔" مدر نے بیٹے کو تہدید کی۔ "مجھے بتاؤ وہ تینوں کہاں ہیں؟"

"اوہو مدر! ابھی ہم سب اِدھر ہی ہیں۔" گورڈی نے ماں کو سمجھانے کی غرض سے کہا۔ "کیوں ان کا دل خراب کرو گی، اور تم کیا سمجھتی ہو کہ ہمیں اس اہم واقعے کے بعد بغیر تفتیش کے اسی طرح جانے دیا جائے گا، ہرگز نہیں۔"

بےچارے گورڈی نے اپنے تئیں ہماری وکالت کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر ان دونوں خواتین کو ہم پر شبہ ہو چکا تھا اور یہ ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔

"ٹھیک ہے، پھر دیکھتے ہیں، آؤ ایلنو......!" مدر نے

کہا اور جوان لڑکی کو لیے اپنی جگہ چلی گئی، میں نے دیکھا وہ مڑ مڑ کر گورڈی کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی۔

گورڈی فوراً ہمیں ڈھونڈتا ہوا قریب آگیا۔

"مدر اور ایلنورا کو تم تینوں پر شبہ ہوگیا ہے۔ وہ اب ضرور کوئی مشکل پیدا کریں گی۔ تم تینوں اب کسی طرح یہاں سے غائب ہونے کی کوشش کرو، ورنہ تمہاری وجہ سے میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ یوں بھی ہم تینوں "حرکت" میں آنے کا ارادہ کر ہی چکے تھے۔ ہم نے ا[illegible] بات پر صاد کیا اور پھر قطار کے آخری سرے پر [illegible]ے۔ میں ان چاروں مسلح اف[illegible] پوزیشن کا بغور جائزہ لینے لگا جو ہم پر "مسلط" کیے [illegible] تھے۔

ان چاروں [illegible] سے دو افراد دروازے کے قریب چوکس کھڑے تھے، باقی دو مجمع کے گرد گشت کر رہے تھے۔ میں کبیل دا[illegible] اور شکیلہ کو لائن آف ایکشن سمجھا چکا تھا اور خود غیر محسوس [illegible]نداز میں اس طرف کو کھسک گیا جہاں ایک پہرے [illegible]ار ذرا دیر کے لیے کھڑا رہ گیا تھا۔

ہم چونکہ فرش پر بیٹھے تھے اسی لیے پہرے دار کے پاؤں میرے نزدیک تھے۔ میں نے اپنے دائیں ہاتھ کو جبّے کے نیچے سے حرکت دی، اس کے پاؤں کا جائزہ لیا، اس نے بوٹ پہن رکھے تھے، شکر تھا کہ وہ لانگ بوٹ نہیں تھے، اس کی پنڈلی برہنہ تھی۔

میں نے اس کی پنڈلی کو ہلکے سے چھوا، اسے احساس نہ ہوسکا لیکن جب ہوا تب تک میرے ہاتھ کی انگوٹھی کے نگ سے برآمد ہونے والے پھن نے اپنا کام کر دکھایا۔

وہ ہلکی سی سسکاری خارج کر کے میرے قریب گرا اور ماہیِ بےآب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کا دوسرا ساتھی جو مجمع کے دوسرے سرے پر کھڑا تھا، چونکا۔

اس نے اپنے حلق سے آواز نکالی، دروازے کے دائیں بائیں کھڑے اس کے باقی دو ساتھی بھی چونک اٹھے۔ مجمع میں شور ابھرا۔ فیصلہ کن گھڑیاں سر پہ تھیں، فاسٹ ایکشن کی ابتدا جیسے کسی ایکشن تھرلر مووی کی طرح سلوموشن میں ہوتی محسوس ہوئی۔

اپنے شکار کے گرتے ہی، میں نے اس کی گن پر قبضہ جمایا۔ یہ جدید سپر اسالٹ گن تھی۔

اِدھر میں نے گن قبضے میں لی، اُدھر کبیل دادا جو میری ہدایت پر دوسرے پہرے دار کے قریب سرک گیا تھا، اسے چونکتے اور پہلے والے کو گرتے دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ میں نے ایکشن کا "بٹن" دبا دیا ہے، اس نے اچھل کر اس پر جھپٹا مارا۔ وہ گرا، ادھر دروازے پر موجود پہرے داروں نے اپنی گنز اس پر سیدھی کیں لیکن تب تک میں ان پر چھینی ہوئی گن سے برسٹ فائر کر چکا تھا۔

ہم تینوں نے جبّے اتار پھینکے تھے۔ ہال میں گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی ان دونوں کی کریہہ [illegible]وں کی آوازیں بھی ابھریں۔

"دروازے کی طرف دوڑو۔" میں کھڑے ہوکر چلایا۔

مجمع میں شور ابھرا۔ کبیل دادا نے ہوائی فائر کر کے انہیں ڈرایا اور ہم دروازے کی جانب دوڑے۔ شکیلہ نے بھی دروازے سے نکلتے ہوئے ایک پہرے دار کی لاش کے قریب سے گن اٹھالی تھی۔

باہر نکلتے ہی اس نے ہال کا دروازہ بند کر دیا۔

ہم ایک تنگ سی راہداری میں کھڑے تھے۔ اسی وقت تیز سیٹی کی مسلسل گونجتی آواز سنائی دینے لگی اور ساتھ ہی راہداری کی دیواریں کسی نیون سائن کی سرخ، نیلی اور پیلی روشنی میں جلنے بجھنے لگیں۔

شاید ان کا کوئی خطرے کا الارمنگ سسٹم خودکار انداز میں آن ہو چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب ہمیں عقب سے دوڑتے قدموں کی گونج سنائی دی۔

"رکنا نہیں، دوڑتے رہو۔" میں نے چلا کر کہا۔

راہداری میں ہونے والے الارمنگ شور کی سمع خراش آوازیں ہنوز گونج رہی تھیں۔ آگے راہداری دائیں جانب گھوم رہی تھی، میں بھی محتاط انداز میں اس طرف کو گھوما تو ٹھٹک کر رکا۔

وہ زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا، لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد میں اس پر چھلانگ لگا کر چڑھا، میرے عقب میں کبیل دادا اور شکیلہ نے بھی اس کی تقلید کی۔

ہم تیزی سے زینہ چڑھتے چلے گئے جو نیم گردشی تھا اور زیادہ طویل ثابت نہ ہوا۔

اس کے اختتام پر ہمارے قدم ایک ایسے چکنے فرش پر ٹکے تھے جو ٹرانسپیرنٹ تھا۔ یعنی ان کے نیچے سے سارا منظر واضح تھا اور وہاں میں نے نیچے فرش کے آر پار ایک بڑا سا ہال دیکھا جہاں کئی افراد ایسے کپڑوں میں ملبوس دکھائی دیے جن پر کسی مخصوص وردی کا گماں ہوتا تھا۔

یہ کمرا شاید ساؤنڈ پروف تھا یا پھر کوئی اور بات تھی کہ وہ اس شور شرابے کے باوجود اپنے کاموں میں مگن دکھائی

دے رہے تھے۔

یہ ہال کسی لیبارٹری کا ہی منظر پیش کرتا تھا۔ ایک ذرا ٹھہر کر میں نے اس کا جائزہ لینا ضروری سمجھا اور جلد ہی مجھے وہاں رکھی اشیا اور نصب آلات سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی طبی لیبارٹری نہیں بلکہ کوئی سائنٹیفک لیب تھی۔

میں آگے بڑھا اور پھر ذرا رک کر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اسی وقت عقب سے دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب آ گئیں، میں نے لمحہ بھر میں گرد و پیش کا جائزہ لیا۔

یہ بھی ایک ہال ہی تھا، اس کی پیشانی پر میں نے ''مین لیب'' اور نیچے بریکٹ میں ''زیرو ونگ'' لکھا دیکھا۔ یہاں بھی ہر طرف عجیب و غریب مشینوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا جن پر جلتے بجھتے بلبوں اور ڈائلوں پر اَن گنت سوئیاں تھرک رہی تھیں۔

یہاں مختلف ستون بھی بنے ہوئے تھے۔ ہم ان کی آڑ میں ہو گئے۔ فقط ایک شخص یہاں ایک اسٹول نما کرسی پر بیٹھا تھا جو اس ہڑبونگ اور ہماری آمد کے بعد اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ نے اسے نشانہ بنانے کی کوشش چاہی تھی، لیکن میں نے انہیں روک دیا، میں چاہتا تو ان سارے جلتے بجھتے پینلو پر گولیاں برسا کر انہیں تباہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن اس سے.... شارٹ سرکٹ یا آگ لگنے سے یہاں کسی قسم کی تباہی بھی پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ میں عابدہ کو تلاش کرنے سے پہلے یہاں ابھی ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے عابدہ کی جان کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

ہماری نظریں زینے کے آخری سرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہاں سے ہم نے تقریباً کوئی آٹھ دس مسلح افراد برآمد ہوتے دیکھے، ان کے جسموں پر چست لباس تھے اور وہ پوری طرح چوکس نظر آ رہے تھے۔

''فائر......'' میں اِک عجیب جوش تلے چیخا۔ نجانے کیا بات تھی کہ مجھ پر ایک عجیب سا جوشِ جنوں طاری ہو گیا تھا شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ جگہ مجھے عابدہ کا قید خانہ محسوس ہوتی تھی۔ میں اسے تباہ و برباد کر ڈالنا چاہتا تھا بلکہ ہر وہ جگہ ہر وہ مقام جہاں اسے قید و بند کی اذیت ناکیوں سے گزارا گیا ہو گا، میں ان عذاب ناک گھڑیوں اور جاں گسل ساعتوں کا تصور کر سکتا تھا جو میرے اور عابدہ کے دشمنوں نے موت سے بڑھ کر ہمارے لیے اذیت ناک بنا دیا تھا، میں انہیں بتا دینا چاہتا تھا کہ عابدہ کو ان رذیل دشمنوں نے جتلائے غم و اندوہ میں کر کے کتنے بڑے طوفان کو آواز دے ڈالی تھی۔

میرے اندر کا وہ روایتی اور جنگجو شہزی فوراً ہی انگڑائی لے کر کسی خوابیدہ آتش فشاں کی طرح بیدار ہو گیا تھا جو ایسی فیصلہ کن گھڑیوں میں اس کا وتیرہ ہوا کرتا تھا۔

میری تیز آواز سنتے ہی کبیل دادا اور شکیلہ کی گنو کے آتشیں دہانے مہیب آوازوں سے دہاڑنے لگے۔

حملہ آوروں میں سے تین چار کربہ انگیز چیخیں خارج کرتے ہوئے زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ باقی جان بچانے کے لیے پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ شاید انہیں پتا نہیں تھا کہ ہمارے ہاتھوں میں بھی خطرناک تباہی پھیلانے والا اسلحہ لگ چکا تھا۔

انہیں فرش پر گرتا چھوڑ، میں نے بھی اپنی گن سے برسٹ فائر کیے اور ایک سے زائد افراد کے چیخنے کی آوازیں ابھریں۔

''آگے بڑھو، اس طرف......'' میں نے چلا کر کہا اور جنوبی گوشے کی جانب لپکا جہاں مجھے دوسری جانب نکلنے کا ایک بغیر دروازے کا محرابی دیوار والا کھلا راستہ دکھائی دے گیا تھا۔

ہم دوڑتے ہوئے اس طرف پہنچے۔ میں نے لپک کر دوسری جانب دیکھا۔ وہاں بھی مختلف راستوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ میری پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

عابدہ کو میں کہاں تلاشتا؟ کمرے، راہداریاں اینڈ ہالز...... غرضیکہ ایک جال سا پھیلا ہوا تھا ہمارے ارد گرد۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوا تھا، قدرت خود ہی مجھے موقع دے رہی تھی۔

اچانک ایک جگہ پر ہم ایک روبوٹک آواز پر ٹھٹک کر رکے اور غور سے اسے سننے لگے۔

''میگنٹک ریز سسٹم ایکٹیویٹ...... آپریشن ونگ الرٹ......'' یہ خودکار سی آتی ہوئی آواز مجھے انتہائی منحوس محسوس ہوئی۔

ٹھیک اسی وقت جب ہم ایک بار پھر پیش قدمی کرنے والے تھے کہ اچانک اسپیکر میں ایک جانی پہچانی اور چیختی ہوئی آواز گونجی۔

''ڈاکٹر مارک! میگنٹک ریز سسٹم فوراً ڈی ایکٹیویٹ کرو...... دشمن فائرنگ کر رہے ہیں، ورنہ سب کچھ تباہ ہو جائے گا۔''

یہ آواز لوکہارٹ کی تھی۔ اس کی آواز پہچان کر ایسے موقع پر بھی میرے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی لیکن، دوسری ہدایت کا سنتے ہی جیسے مجھے سکتہ سا ہو گیا۔

لوکہارٹ اب کسی 'راکسول' نامی شخص کو پکار کے نئی ہدایت دے رہا تھا۔

''اپنے ساتھیوں کو بیک آؤٹ کرو اور فال ڈاؤن گیٹ اوپن کر دو...... دو کوتھوگا، زیرو ونگ کی جانب چھوڑ دو۔''

''سر! اس طرف وہ لوگ موجود ہیں...... جنہیں شب نظارہ کے لیے جزیرے سے لایا گیا تھا۔'' راکسول کی آواز ابھری۔ اسپیکر میں بھی مجھے اس کی آواز کپکپاتی محسوس ہوئی۔ اس کا اشارہ وہی لوگ تھے جن میں گورڈی، اس کی محبوبہ اور مدر شال تھے۔

''بکواس بند کرو، جہنم میں جائیں یہ سب......'' لوکہارٹ کی جھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''تم نہیں جانتے کہ اس وقت ماسٹر لولوش کا سب سے خطرناک ترین دشمن شہزی انہی لوگوں کے ذریعے یہاں گھسا چلا آیا ہے اور اس نے ماسٹر کو پلک جھپکتے ہی موت کے منہ میں پہنچا دیا ہے۔''

''اوکے...... سر! میں گیٹ فال ڈاؤن اوپن کر رہا ہوں لیکن قیدی......؟''

''میں اسے اور ماسٹر لولوش کو مین ونگ سے لے کر نکل کر رہا ہوں۔'' لوکہارٹ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''راکسول! یاد رکھنا، اس وقت ''ڈیپ سی لیب'' کے مین آفیسر انچارج تم ہو، میں ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔ میں یہاں نہیں ہوں گا اسی لیے تم سب فوراً شیشے کے باکس تک محدود ہو جاؤ۔ دشمن کا صفایا ہوتے ہی ان بے قابو کوتھوگاز کو وائٹ الٹرا اسکیننگ کے ذریعے لاغر کر دینا، بعد میں آ کر میں دیکھ لوں گا۔ ڈوائٹ...... ہری اَپ......''

''اوکے سر!'' راکسول کی آواز ابھری۔

''ہاہا...... ہاہا......! شہزی! تم یقیناً مجھے سن رہے ہو گے۔ اب اپنا انجام دیکھ لینا۔ کاش! میں دیر تک تم سے مخاطب ہو سکتا مگر اب یہ میری حسرت ہی رہے گی، کیونکہ کوتھوگاز دنیا کے سب سے خطرناک ترین مونسٹرز ہیں اور انسان ان کی سب سے مرغوب غذا ہیں۔ چ چ...... تم اپنی عابدہ کا نظارہ کرتے کرتے رہ گئے۔ افسوس، لبِ بام کامیابی تمہیں صرف چھو کر گزر گئی...... بائے......!''

اس منحوس کی آواز معدوم ہو گئی۔ ماحول میں یکلخت اعصابی سناٹا طاری ہو گیا۔ میں جیسے گم صم سا رہ گیا۔ کبیل دادا اور شکیلہ کے چہروں پر صحیح معنوں میں ہوائیاں اڑتی محسوس ہونے لگیں۔

ہم ان آوازوں کو سنتے ہی اپنی جگہ پر ساکت و جامد ہو کر رہ گئے۔

یہی وہ وقت تھا جب نہایت کربہ انداز کی چنگھاڑ سنائی دی۔ ہمارے دل دہل گئے۔ ابھی ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ دوسری کربہ انگیز چنگھاڑ سنائی دی۔

''شش...... شہزی!'' میرے کانوں سے شکیلہ کی ہلکی لرزتی ہوئی آواز ٹکرائی، جبکہ خود میرا اندر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ لوکہارٹ کا کسی قیدی کو لولوش سمیت جزیرے کی طرف لوٹ جانے کی تیاری کا بتانا اور مجھے دھمکانا، یہ سب الفاظ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔

ایک راستہ کھلتا تھا تو دوسرا بند ہوتا۔ کھلتے بند ہوتے راستے ہی شاید اوزندگی کا نام ہے۔

''مت گھبراؤ، اللہ کی مدد ہمارے ساتھ ہے جس نے یہاں تک ہماری مدد اور دست گیری فرمائی ہے، وہی آگے بھی ہماری رہنمائی فرمائے گا۔''

میں نے جیسے ایک جذبۂ جنوں کے انداز میں یہ کہا تھا اور شاید بے اختیار ہی کبیل دادا کے منہ سے یہ برآمد ہوا۔

''انشاءاللہ، ضرور......''

میں نے دیکھا شکیلہ نے بھی حوصلہ پکڑا تھا، اسی سبب وہ فوراً ایک جوش تلے بولتی چلی گئی۔

''لوکہارٹ کی بات پر غور کرنا چاہیے۔ ہم اس وقت ڈیپ سی لیب میں موجود ہیں۔ لوکہارٹ، بیمار لولوش اور قیدی کو لے کر اسی ٹیوب کے ذریعے واپس ہوگ بے جزیرے کی طرف لوٹ رہا ہے۔ قیدی یقینی طور پر عابدہ ہے۔

ڈیپ سی لیب ایک نازک مقام ہے جہاں یہ ہم سے کسی آتشیں جنگ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے اپنے گن بردار ساتھیوں کو کسی شیشے کے مضبوط باکسز میں محبوس ہونے کا حکم جاری کیا گیا ہے، وہ خود کوتھوگا کا شکار نہ ہو جائیں اور کوتھوگاز کو ہم پر چھوڑا جا رہا ہے۔

کامیابی کی صورت میں یہ لوگ کسی وائٹ الٹرا اسکیننگ کے ذریعے انہیں لاغر کر کے واپس ان کے پنجروں میں پہنچا دیں گے۔ گویا کوتھوگاز سے نبرد آزما ہونے کے بجائے ہمیں اس سسٹم تک رسائی حاصل کرنا ہو گی جو یقیناً راکسول نامی یہاں کے مین انچارج کے کنٹرول میں ہے۔''

''ایگزیکٹلی!'' میں نے فوراً کہا۔

اسی وقت دھما دھم کی گونج دار اور دل دہلا دینے والی آوازیں ابھریں ور اس کے ذرا دیر بعد ہی ایک بلبلاتا ہوا

انسانی شور ابھرا۔

”ہمیں ان معصوم انسانوں کو ان خونخوار مونسٹرز سے بچانا ہوگا، ورنہ اس کے بعد ہماری باری آئے گی۔“ میں نے کہا۔

”عبث ہے۔“ کبیل دادا بولا۔ ”اپنی جانیں بچانے اور یہاں سے نکلنے کی فکر کرو، ہم اس وقت سمندر کی گہرائیوں میں محبوس ہیں۔ اگر لوکہارٹ اس ٹیوب میں فرار ہوگیا تو......“

”نہیں دادا ......!“ میں نے فوراً اختلاف کیا۔ ”ہمیں گورڈی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”ہم تیار ہیں پھر۔“ کبیل دادا نے سر تسلیم خم کردیا۔

دشمنوں کے سامنے آنے کا اب ہمیں خطرہ نہیں رہا تھا اگرچہ ان سے زیادہ خطرناک اور مہیب دشمن ہمارے پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے، کوتھوگا شاید اب ان بدنصیبوں کو اپنی خوراک بنانے میں مگن تھے۔

ہم دوڑتے ہوئے اسی ونگ کے سرے پر پہنچے تو ٹھٹک کر رہ گئے۔

اس ہال کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور...... ایک لرزہ خیز منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔

وہی ڈراؤنی شکلوں اور بھیانک ہیئت والے دو جانور وہاں موجود انسانوں کی یوں تکابوٹی کرنے میں مصروف تھے جیسے وہ کوئی موم کے گڈے گڑیاں تھے، دو کوتھوگا اپنے خوفناک جبڑوں اور تیز نکیلے دانتوں تلے ان کی ہڈیاں اور گوشت یوں چبا رہے تھے جیسے گاجر مولی ہو۔ ان کے ”چبائے“ جانے کی کچ کچا کچ...... انسانی ہوش وحواس اُڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ ان کے غار جیسے دہن اور تھوتھنے انسانی خون سے بھرے ہوئے تھے اور وہاں سے خون ناحق ارزاں قطروں کی صورت ٹپک رہا تھا۔ اپنے جثے کو سکیڑے کوہان نکالے، انسانوں کے گوشت سے شکم سیری کرتے یہ دونوں کوتھوگاز مجھے کوئی جہنمی بلائیں محسوس ہو رہے تھے۔

کوتھوگا انہیں بُری طرح توڑ مروڑنے کے بعد ان کی کھوپڑیوں کو کسی اخروٹ کے مانند اپنے منہ میں لیتے اور دانتوں سے توڑ ڈالتے اور پھر ان کی لپلپاتی ہوئی دوشاخہ زبان ان کے مغز کا مخصوص حصہ (ہائپوتھیلمس) سٹک لیتی۔ باقی بچے کھچے بدنصیب کوتھوگاز قبیلے کے لوگ بری طرح دہشت زدہ نظر آرہے تھے اور جان بچانے کی غرض سے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔

میں اس رات کا ایسا ہی ایک بھیانک منظر ابھی تک نہیں بھول پایا تھا، جب یہی بے وقوف لوگ اپنی مرضی سے اپنی قربانی کوتھوگا کو پیش کر رہے تھے، لیکن اب چونکہ شاید لوکہارٹ کی چیختی ہوئی اعلانیہ آواز انہوں نے بھی سن لی تھی اور یہ بھانڈا پھوٹتے ہی کہ کوتھوگا یا سن آف سیتن محض اپنی نفری قوت بڑھانے کا ایک بہانہ تھا، وہ بدنصیب لوگ ان مونسٹرز کی خوراک بننے سے بچنے کی خاطر نکل بھاگنے کی کوشش میں تھے۔

گورڈی کی بات مجھے یاد تھی۔ اس نے ایک سوال کے جواب میں ہمیں بتایا تھا کہ یہ جہنمی بلائیں...... بھی ہلاک ہوسکتی ہیں لیکن اس میں ایک شرط بھی تھی اگر کوئی پکا نشانے باز اس کی کھوپڑی کے پچھلے حصے پر کسی ہارڈ ویپن (سخت شے) سے وار کرے یا گولی داغے تو ان کا خاتمہ ممکن ہے، مگر سوال تو یہ پیدا ہوتا تھا کہ اتنا موقع یہ بھاری بھرکم اور خوفناک مونسٹر دیتے؟

سب سے پہلے میں نے اندر قدم رکھا اور میرے بعد کبیل دادا اور شکیلہ داخل ہوئے، ہمیں دیکھتے ہی باقی ماندہ لوگ ہمیں مسلح دیکھ کر امید بھری اور رحم طلب نظروں سے...... تکنے لگے، چند تو ہماری جانب لپکے بھی تھے، ان لوگوں نے اب اپنے اوپر سے جبّے اتار پھینکے تھے۔

میں گورڈی اور ایلنورا کو پہچان گیا تھا۔ وہ میری جانب لپکے، ان کی مدر کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ اور اس کے دیگر بچے کھچے ساتھی میری جانب لپکے، گورڈی انہیں چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ یہ ہمیں ان بلاؤں سے نجات دلانے آئے ہیں۔

اسی لمحے ایک کوتھوگا، اپنے کسی ”شکار“ کا دماغ سٹکنے کے بعد اپنا تھوتھنا اٹھا کر ہماری جانب تکنے لگا۔ اس کے غار جیسے مہیب دہانے سے رال اور خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں، اندر سے اس کی خون آلودہ دوشاخہ زبان باچھوں سے باہر تک لپلپا رہی تھی۔

وہ واقعی میں دنیا کی ایک غلیظ ترین جہنمی بلا کی صورت نظر آرہا تھا۔

اچانک کوتھوگا نے ایک دل دہلا دینے والی چنگھاڑ ماری، میں نے اپنی گن کا رخ اس کی جانب کردیا۔

”اس کے سر کو نشانہ بناؤ...... ورنہ گولیاں ضائع ہو جائیں......“

گورڈی نے ابھی ہم سے اتنا ہی کہا تھا کہ......کوتھوگا نے ایک پھدکا لگایا...... اور چشم زدن میں وہ اس کی محبوبہ ایلنورا کے سر پر جا پہنچا۔ ایلنورا کو مارے دہشت کے جیسے سکتہ ہوگیا، وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں، بس پھیلی پھیلی آنکھوں سے کوتھوگا کو تکتی رہ گئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں خوف اور ایک عجیب مسمریزم کی سی کیفیات جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔

”نہیں......“ گورڈی مجنونانہ انداز میں چیخ مار کے اسے بچانے کے لیے دوڑا، کوتھوگا نے اپنے نکیلے ناخنوں والا پنجہ ایلنورا کو جھپٹنے کے لیے اٹھایا اور اِدھر ہماری گنز بیک وقت گرجیں...... گولیوں کی بھیانک تڑا بڑی ابھری اور...... کوتھوگا نے اپنا بدہیئت تھوتھنا اٹھا کر زبردست چنگھاڑ ماری۔ اسے ایک جھٹکا لگا، تب تک گورڈی، ایک ٹک سکتے میں کھڑی ایلنورا سے ٹکرایا اور اسے خود سے لپٹاتا ہوا دور جا پڑا۔

کوتھوگا غرا کر ہماری جانب متوجہ ہوگیا، نہ صرف وہ...... بلکہ...... اس کا دوسرا ساتھی بھی جو ابھی تک ایک اُدھڑے ہوئے انسانی خون آلود وجود کے اوپر سوار تھا۔

ہماری ان پر برسائی ہوئی گولیوں نے کوئی اثر نہیں کیا تھا، ماسوائے انہیں طیش دلا کر توجہ دوسری جانب مبذول کرنے کے......

دوسرے کوتھوگا نے وہیں سے ہی ایک دہشت ناک چنگھاڑ مارتے ہوئے ہم پر جست بھری۔ میں اور شکیلہ تو دائیں بائیں ہٹ گئے مگر...... کبیل دادا دوسرے کوتھوگا کی زد میں آگیا۔

کبیل دادا کو اس خوف ناک عفریت کے شکنجے میں دیکھتے ہی شکیلہ کے حلق سے چیخ نکل گئی......

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہ تھا کہ کبیل دادا مجھ سے زیادہ اعصابی قوت کا مالک تھا۔ شکیلہ کی تو چیخ نکلی تھی مگر مجھے تو جیسے سکتہ ہوگیا تھا، بہ قول گورڈی کے، ایک بار جو کوتھوگا کے ہتھے چڑھ جاتا وہ یا تو جان سے جاتا تھا یا پھر بُری طرح اُدھڑ جاتا تھا۔

”دادا کو بچاؤ شہزی! کیا ہوگیا ہے تمہیں......؟“ شکیلہ کی اس چیختی آواز نے میرے اندر جیسے ایک جوش کو طوفان میں بدلنے جیسا عمل کیا اور پھر مجھے پتا نہ چلا کہ وہ کون سی درانہ وار قوت تھی جس نے مجھے بے جگرا کردیا اور میں نے کوتھوگا پر چھلانگ لگادی۔

کوتھوگا نے اپنے دونوں پنجوں سے گرانڈیل کبیل دادا کو دبوچ رکھا تھا اور وہ اس کی گرفت میں تڑپ رہا تھا، کوتھوگا کا غار جیسا منہ کبیل دادا کی گردن کے قریب ہونے لگا تھا، پھر اس سے پہلے کہ اس کے نکیلے پنجے اور دانت، کبیل دادا کے وجود کو اُدھیڑ ڈالتے میں کوتھوگا کے جھکے جھکے کاندھوں پر سوار ہوگیا اور اس کی گردن کے عقب سے اپنی گن کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر اس کے کھلے جبڑوں تلے دے ڈالا اور اپنے کسرتی جسم کی پوری قوت کو صرف کرتے ہوئے زور لگانے لگا، کوتھوگا کے لیے یہ ایک معمولی مزاحمت ثابت ہوئی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ جب اس نے غراتی ہوئی چنگھاڑ مار کے مجھے ایک طوفانی جھٹکا دیا تو اس دوران کبیل دادا اس کی گرفت سے نکل چکا تھا، میں البتہ اس کے جھٹکا دینے کے زور پر تقریباً فضا میں اچھلا اور...... دیوار سے ٹکرا کر زمیں بوس ہوگیا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا وجود چٹخ گیا ہو۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا، حواس مختل سے ہونے لگے، میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکا تو کچھ ہوش آیا۔

پہلے والا کوتھوگا اپنے ساتھی کی جانب متوجہ ہوا اور مجھے اچھالنے اور گرانے کے بعد وہ بھی میری جانب دہاڑتا ہوا لپکا۔ گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ذرا فاصلے پر جاگری تھی۔

ان سنگین لمحات میں میرے جسم کا رُواں رُواں، بال بال تنا ہوا تھا۔

ادھر شکیلہ نے پہلے والے کوتھوگا پر برسٹ فائر کردیا۔ گولیاں اس کے بدہیئت جسم سے ٹکرائیں اور نجانے کہاں گم ہوگئیں، اس نے ایک زوردار چنگھاڑ ماری اور اس کی جانب لپکا۔

کبیل دادا فرش پر گرا تھا اور اس کا جسم کچھ زخمی دکھائی دیتا تھا، ادھر پہلے والے کوتھوگا نے گولیاں سہنے کے بعد شکیلہ پر جست بھری اور چشم زدن میں اس کے قریب جا پڑا، شکیلہ نے ایک چیخ ماری اور......خود کو کوتھوگا کے بے رحم پنجوں سے بچانے کے لیے فرش پر گرادیا لیکن یہ اس کے بچاؤ کی محض ایک عارضی اور لمحاتی کوشش ثابت ہوئی تھی، کیونکہ اسی وقت کوتھوگا خوفناک غراہٹ کے ساتھ اس پر جھپٹا تھا۔

”دادا! شکیلہ کو بچاؤ......“ میں حلق کے بل چیخا۔ جبکہ کبیل دادا میری جانب بڑھنے والے کوتھوگا کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کی تگ ودو میں تھا کہ میری چلاتی آواز پر وہ پلٹا۔ اس نے پہلے والے کوتھوگا پر وہیں سے جست لگادی۔

ہم ان درندوں سے بس اسی قدر مقابلہ کر پا رہے تھے کہ ان کی توجہ کبھی ایک جانب اور کبھی دوسری جانب مبذول کراتے، یوں درمیان میں جو موقع ملتا اس سے فائدہ

اٹھانے کی بس اسی قدر مہلت ملتی تھی کہ ہم ان کے قریب چلے جاتے اور دور بھی ہو جاتے۔

گویا ہم ان دو جہنمی بلاؤں پر کسی بھی قسم کا کاری وار کرنے سے قاصر تھے۔ میں جانتا تھا کہ ایسا زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا تھا، ہم ان کے نرغے میں ایک بار آجاتے تو وہ ہمیں چیر پھاڑ ڈالتے، لہٰذا ان پر سوچ سمجھ کر فیصلہ کن وار کرنا ضروری تھا۔

یوں اس دوران ہمیں تو نہیں البتہ دیگر ان بدنصیب بچے کھچے لوگوں کو راہِ فرار کا موقع ضرور مل گیا تھا۔ وہ سب ہال سے نکل بھاگے تھے، باسوائے...... دو افراد کے...... جن میں ایک تو گورڈی تھا اور دوسری ایلنورا...... وہ دونوں بے چارے ایک کونے میں ڈرے سہمے سمٹے ہماری جانب تک رہے تھے۔

”ان کے سر پر حملہ کرو۔“ گورڈی معاً ہی ایک عجیب جوش سے چیخا تھا۔

ہمیں اس کی ہدایت یاد تھی مگر ہم بھی تو موقع کے منتظر تھے۔

میری جانب بڑھنے والا دوسرا کوتھوگا دہاڑتا ہوا میری... جانب پھدکا تو میں اس سے پہلے ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس طرف جا پڑا جہاں میری گن فرش پر گری پڑی تھی لیکن کوتھوگا بھی کم چالاک ثابت نہ ہوا تھا، اسے پتا چل چکا تھا کہ اس کے مقابلے میں کمزور انسان سہی، لیکن... انہیں چالاکی اور داؤ پیچ سے بچنے کے لیے کوشاں ضرور تھے، یوں میرے جگہ چھوڑتے ہی کوتھوگا نے بھی اپنے بھاری بھرکم جثے کے باوصف، اس قدر پھرتی کے ساتھ درمیان میں ہی راستہ بدل کر مجھے آن لیا۔

اگلا لمحہ میرے لیے دنیا کا دہشت ناک ترین ثابت ہوا کیونکہ کوتھوگا میرے اوپر آچکا تھا اور میرے سینے پر سوار مجھے اُدھیڑ ڈالنے کے لیے تیار تھا کہ اس دوران پلک جھپکتے ہی ہاتھ میں آئی ہوئی گن کو میں تب تک سیدھا کر چکا تھا، انگلی ٹریگر پر تھی اور اس کی نال میں نے کوتھوگا کے غار جیسے دہانے میں گھسیڑ کر لبلبی دبا دی۔

ایک فل برسٹ فائر ہوا اور کوتھوگا کے غار جیسے کھلے منہ کے پار مجھے سوراخ نظر آنے لگا، وہاں خون اور دیگر عجیب لجلجاتے مادّے کے چیتھڑے اُڑتے دکھائی دیے اور ساتھ ہی اس منحوس مونسٹر کی دل دہلا... دینے والی چنگھاڑ ابھری۔

اس کا خون آلود اور بدہیئت تھوتھنا میرے چہرے کے اوپر آن گرا۔ اُف...... اس سے برآمد ہونے والے بدبو کے بھبکے اس قدر ناگوار اور غلاظت سے بھرپور تھے کہ اسی نے میرا دماغ جھنجوڑ ڈالا، اس قدر کہ وہ ماؤف ہونے کے قریب محسوس ہونے لگا۔

کوتھوگا میرے اوپر گرا ابھی تک لمبے لمبے سانس لے رہا تھا اور مجھے اس درندے کے اس طرح ہانپنے کی سنسناہٹیں بھی یوں محسوس ہو رہی تھیں جیسے وہ ابھی اچانک نیند سے جاگ پڑے گا۔ وہ اس قدر بھاری بھرکم تھا کہ بڑی مشکلوں سے میں نے اس کے بے سدھ جثے کو ایک طرف دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اُدھر کمیل دادا شکیلہ کو دوسرے کوتھوگا سے بچانے کے لیے لپکا تھا اور اس کی کھوپڑی پر ایک برسٹ فائر کر دیا۔ کوتھوگا کو ایک جھٹکا لگا، وہ رک کر زوردار انداز میں چنگھاڑا، شکیلہ کو موقع ملا اور گھسٹتی ہوئی اس کی پہنچ سے دور ہو گئی۔

گورڈی اور ایلنورا نے ہمت کی، وہ ہال کے وسط میں جھومتے جھامتے کوتھوگا کے دائیں بائیں ہو کر اسے ہلا شیری دینے لگے، کمیل نے انہیں چیخ کر دور ہو جانے کا کہا، لیکن تب تک کوتھوگا نے گورڈی پر جھپٹا مارا، اور اس کے شانے کا گوشت نوچ ڈالا، وہ چیختا ہوا دور جا گرا......

”سب نیچے بیٹھ جاؤ فوراً......“ اسی وقت میں چلّایا۔

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کیا۔

اس وقت میں جس پوزیشن پر کھڑا تھا، وہ دوسرے کوتھوگا کے سر کا پچھلا حصہ نشانے پر لاتا تھا، میں نے تاک کر لبلبی دبا دی۔ برسٹ فائر ہوا اور کوتھوگا گھٹی گھٹی غراہٹوں کے ساتھ نیچے گرا۔

ادھر ایلنورا چیختی ہوئی زخمی پڑے گورڈی کی جانب لپکی۔ دوسرے کوتھوگا کو جہنم واصل کرنے کے بعد میں پہلے والے کوتھوگا کی جانب بڑھا۔ وہ ابھی تک سانس لے رہا تھا۔ اس کے سر کا پچھلا حصہ نصف حد تک اڑ چکا تھا اور وہاں سے لجلجاتے ہوئے خون آلودہ ریشے نکلے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہ فرش پر پہلو کے بل پڑا تھا۔

میں نے نفرت اور غیظ تلے ہونٹ بھینچ کر گن کو سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کیا اور نال اس کے اُدھڑے ہوئے دماغ کے پچھلے حصے میں رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔

گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور کوتھوگا کو ایک آخری جھٹکا لگا پھر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

دونوں کوتھوگاز ہلاک ہو چکے تھے۔ ہم گورڈی کی

fb/Mybookshelf.pk

جانب متوجہ ہوئے۔ اس کا دایاں کندھا کوتھوگا کے بے رحم پنجے نے ادھیڑ ڈالا تھا۔ وہاں سے خون رِسے جا رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ ایلنورا نے اس کا سر اپنی گود میں لے رکھا تھا اور...... وہ روئے جا رہی تھی۔

میں نے جھک کر اس کے زخم کا جائزہ لیا، پھر شکیلہ سے کہا کہ وہ یہاں موجود کسی لاش کے لباس کی دھجیاں پھاڑ کر لے آئے۔ اس نے فوراً یہ کام انجام دیا اور --- میں نے گورڈی کے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ دی، اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم جریانِ خون کم ہو گیا تھا۔

”کمیل دادا! تم ٹھیک ہونا......؟“ میں نے اس کی خیریت پوچھی اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی بے چارہ زخمی تھا، ایک کوتھوگا نے اسے اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں، فکر کی ضرورت نہیں۔“ وہ جی داری... سے بولا۔ ”تھوڑا ہڈیوں میں درد ہو رہا ہے، معمولی ہے ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں سے ہمیں نکلنا ہو گا۔“

”تم لوگ اب کہیں بھی نہیں جا سکتے۔“ اچانک ایک تیز اور پُرطیش نسوانی آواز ابھری۔ ہم چونک کر مڑے تو ہمیں جیسے...... سانپ نے سونگھ لیا۔

دروازے پر مدر کھڑی تھی، اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ ابھی تک سیاہ لمبے جبّے میں ملبوس تھی، البتہ سر سے اس نے اس کا گھونگھٹ گرا رکھا تھا۔ اس کا چہرہ نفرت اور غیظ تلے سرخ ہو رہا تھا۔

”تم...... تم لوگوں نے...... سن آف سیتن کے بیٹوں کو ہلاک کر ڈالا...... میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ اس نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

”مدر! یہ کیا کر رہی ہو تم......؟ ہوش میں آؤ۔“ اسی وقت ایلنورا چیخی اور اٹھ کر مدر کے سامنے، گویا ہماری ڈھال بن کے کھڑی ہو گئی۔ ”وہ سب جھوٹ تھا اور ایک خوفناک ڈراما تھا۔ تم نے دیکھا نہیں کہ آخر میں کس طرح لوکہارٹ نے ہم سب کو ان خوفناک بلاؤں کے حوالے کر دیا تھا۔“

”ایسا اس نے ہمارے سن آف سیتن کو دشمنوں سے بچانے کے لیے کیا تھا۔“ مدر نے برہمی سے جواب دیا۔

میرا اس کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔ تب میں نے ایلنورا کو آگے سے ہٹاتے ہوئے اس جاہل عورت سے کہا۔

”ہوش کے ناخن لو مدر! یہ تمہارا کیسا سن آف سیتن ہے جو...... تمہاری جانوں کی حفاظت کرنے کے بجائے اپنی جان کے تحفظ کے لیے تم لوگوں کی جان لیتا ہے؟ شیطان کو زوال ہے، ہمیشہ کے لیے...... اسی لیے اب بھی وقت ہے مدر! اپنی سوچ بدلو، ایک ایسا انسان تم لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے جس نے تم لوگوں کے خون پر اپنی راجدھانی قائم کر رکھی ہے۔ حق کے بجائے تم لوگوں کو وہ باطل کی کھائی میں گرانا چاہتا ہے، کیا تم نے نہیں دیکھا ابھی، لوکہارٹ نے کیا کہا تھا؟ سب کو جہنم میں جھونک دو، غور کرو...... انہیں صرف اپنی جان عزیز تھی۔ وقت پڑنے پر تمہاری مدد کرنے کے بجائے اس نے کیا حشر کیا ان کا۔“

”تم مجھے نہیں بہکا سکتے دشمن!“ مدر نے شعلہ اُگلتی آنکھوں سے میری جانب گھورتے ہوئے کہا۔

”مدر!“ ایلنورا چیخی۔ ”ہوش کرو، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے، یہ ہمارا دشمن نہیں ہے، دشمن... وہ ہے جس نے تم سمیت ہم سب کو...... بہکا رکھا تھا۔“

یہی وہ وقت تھا جب میں نے شکیلہ کو مارشل آرٹ کا داؤ کھیلتے دیکھا، وہ اپنی جگہ سے اچھلی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مدر سے ٹکرائی تھی، وہ اسے لیے دروازے سے باہر کوریڈور کی طرف جا گری تھی۔ میں بھی اس طرف کو دوڑا، شکیلہ سنبھلی، مدر کے ہاتھ سے گن چھوٹ کر دور جا گری تھی جسے میں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

مدر دوڑتی ہوئی دور چلی گئی۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں فائر داغنے کا ارادہ کیا تھا کہ ایلنورا نے مجھے روک دیا۔

ٹھیک اسی وقت وہی روبوٹک آواز ابھری۔

”الٹرا ایکس وائٹ ریز ایکٹیویٹ...... الٹرا ایکس وائٹ ریز ایکٹیویٹ......“

ہم سب چونک پڑے۔

”جلدی یہاں سے نکلو، یہ نادیدہ شعاعیں ہمیں ناکارہ اور مفلوج کر دیں گی۔“ ایلنورا نے خبردار کیا۔

زخمی گورڈی کو میرے اشارے پر کمیل دادا نے اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ وہ بے چارہ شدید تکلیف میں تھا، ایلنورا اس کی حالت زار پر روئے جا رہی تھی۔ شکیلہ اسے تسلیاں دے رہی تھی۔ گورڈی کبھی کراہتا ہوا ہوش میں آجاتا اور پھر تکلیف سے بے ہوش ہو جاتا۔

”کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اِن اَن دیکھی شعاعوں سے محفوظ رہ سکیں؟“ میں نے کوریڈور میں بھاگتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”میں اسی طرف ہی لے جا رہی ہوں، لیکن یہ مدر ہمارے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہے، تمہیں اسے

ہلاک کر دینا چاہیے تھا۔" ایلنورا نے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

میں نے اس پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا اور بولا۔ "ہمیں لوکہارٹ کا راستہ روکنا تھا۔ وہ میری ایک دوست عابدہ کو......"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے میری بات کاٹی۔ "گورڈی نے مجھے بتا دیا تھا۔ محفوظ مقام پر پہنچ کر بات کرتے ہیں۔"

وہ ہمیں ایک ایسی جگہ لے آئی جہاں سے پانی کے شدید دباؤ کی گونج نما آوازیں آرہی تھیں۔ یہاں نمی کا احساس تھا اور سردی بھی زیادہ تھی۔

"اس طرف شعاعیں نہیں آسکتیں۔" یہاں پہنچ کر ایلنورا نے کانپتے ہوئے کہا۔ اسے سردی لگنے لگی تھی۔ ٹھنڈ تو ہمیں بھی لگ رہی تھی، مگر ہم نے پہلے ہی موسم کی مناسبت سے موٹے اور گرم کپڑے پہن رکھے تھے۔

"کیا تم پہلے بھی یہاں آچکی ہو؟" میں نے کسی خیال کے تحت ایلنورا سے سوال کیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بولی۔

"جب لوکہارٹ ماسٹر لولوش کے ایماء پر کسی کی قربانی کے لیے کہہ دیا کرتا تھا تو قربانی کی رات سے پہلے جسے "شبِ قرباں" کہا جاتا ہے، ان کے خاندان کے سارے افراد کو یہاں ڈیپ لیب میں بلواتا تھا۔ اُس شب میرے ہمراہ گورڈی بھی تھا، گورڈی تو خیر یہ سب پسند نہیں کرتا تھا مگر وہ تجسس کے ہاتھوں یہ دیکھنے کے لیے چلا آیا تھا کہ وہ کیسے قربانی کے لیے چنتے ہیں؟ قرعہ فال انکل جیمس یعنی گورڈی کے باپ کے نام نکلا تھا۔"

"اف...... اس دور میں بھی یہ جہالت ہے؟" شکیلہ نے تبصرہ کیا۔

"ایسی جہالت اس وقت تک چلتی رہے گی جب تک حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔" کبیل دادا نے مدبرانہ تبصرہ کیا۔

"اس کا مطلب ہے تم اور بھی بہت کچھ جانتی ہوگی؟"

"ہاں! بہت کچھ، کاش! وقت ہوتا۔" وہ بولی۔ "کیونکہ تجسس پسندی میری فطرت کا حصہ ہے، اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے نت نئے جہاں دیکھنا ان کی تلاش میری ہوبی ہے۔ لیکن افسوس میرا اتنا پڑھنا لکھنا کام نہ آیا اور میں محض سنسنی خیزی کے سبب ان شیطانوں کی آلہ کار بن گئی۔ ہمیں ایک ہفتہ یہاں رکھا گیا تھا اور لوکہارٹ نے ہم پر امپریشن ڈالنے کے لیے یہاں کا چپّا چپّا دکھایا تھا، وہ سب کچھ، جو یہاں ہو رہا ہے اور کن خفیہ مقاصد کے تحت ہو رہا ہے، یہ دنیا دکھا کر وہ درحقیقت ہمیں مرعوب کرنا چاہتے تھے۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے، دشمنوں کو اب تک پتا چل چکا ہوگا کہ ہم نے ان کے دو کوتھوگاز کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ میں عابدہ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہم یہاں سے نکلنے کی کریں گے۔" میں نے کہا۔

"نادیدہ شعاعیں اب پھیل چکی ہیں۔ ہم یہاں سے اب ہل بھی نہیں سکتے، ورنہ ان کی زد میں آکر مفلوج و ناکارہ ہو کر بے بس ہو جائیں گے اور ان کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔" ایلنورا نے بتایا۔

میں فکرمند ہو گیا۔ میری تشویش کو بھانپتے ہوئے وہ ازراہِ تشفی بولی۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، لوکہارٹ یہاں سے سیدھا جزیرے کا ہی رخ کرے گا، ہم وہاں جا سکتے ہیں۔"

"لیکن کیسے جائیں گے؟" شکیلہ نے پوچھا اور آگے بولی۔ "کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم یہاں ایک میگ نیٹک پٹری پر چلنے والی ٹیوب میں آئے تھے اور وہ اسی ٹیوب میں واپس لوٹنے والا ہے؟"

"یہاں ایک سے زائد کیپسول آبدوزیں موجود ہیں، ہم ان میں واپسی کا سفر بہ آسانی کر سکتے ہیں۔" ایلنورا بولی۔

"کیپسول آبدوزیں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"ہاں! یہ ایک چھوٹی سائز کی کشتیاں ہیں جو پانی کے اندر کسی آبدوز کی طرح حرکت کرتی ہیں۔"

"لیکن پھر بھی اب یہاں ایک ہی جگہ محبوس ہو کر بیٹھے رہنا ہمارے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ گورڈی کی بھی حالت تم دیکھ رہی ہو۔"

"کیا کرنا چاہتے ہو تم؟" ایلنورا نے میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں یہ سارا سسٹم تباہ کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے لیے تمہیں کمانڈنگ ونگ میں گھسنا ہوگا۔" ایلنورا کی بات پر میری آنکھوں میں ایک دم چمک ابھری

اور جلدی سے بولا۔

"وہ کس طرف ہے؟"

ایلنورا نے اوپر اور پھر دائیں بائیں دیکھا۔ پھر چند قدم دائیں جانب بڑھی اور اچانک ایک سہمی ہوئی چیخ کے ساتھ پلٹی اور گر پڑی۔

ہم بُری طرح ٹھٹکے اور شکیلہ بے اختیار اس کی جانب بڑھی تھی کہ وہ بھی کراہ آمیز چیخ کے ساتھ آدھے راستے پلٹی تھی کہ ایلنورا کے اوپر آن گری۔ کبیل دادا بھی اسی رواروی میں ان کی جانب قدم اٹھا ہی رہا تھا کہ میں نے اسے کاندھے سے پکڑ کر پیچھے کر دیا۔

"خبردار! اس طرف ایکس وائٹ ریز رقصاں ہیں۔"

کبیل دادا سے یہ کہتے ہوئے میری پھٹی پھٹی نظریں چکنے فرش پر گری پڑی ایلنورا اور شکیلہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں گھسٹ گھسٹ کر ہماری طرف بڑھ رہی تھیں اور بالآخر جب میں نے دیکھا کہ وہ اَن دیکھی شعاعوں کے نظر نہ آنے والے حصار کے اندر آچکی ہیں تو کبیل دادا اور میں نے انہیں کھینچ لیا۔

"ہائے...... میری ایک ٹانگ بے کار ہو گئی ہے۔" شکیلہ چیخ پڑی۔ ایلنورا کی بھی یہی حالت ہو رہی تھی۔

"کبیل دادا! تم شکیلہ کی ٹانگ مسلو، جلدی۔" یہ کہتے ہی میں نے ایلنورا کی ٹانگ کا جائزہ لیا، وہ ہنوز جبّے میں تھی اور جب میں نے اس کا جبّہ ٹانگوں سے ذرا اوپر کیا تو وہ برہنہ ہو گئی۔

مجبوری تھی، میں نے اس کی ران تک برہنہ ٹانگ کو تیزی سے مساج کرنا شروع کر دیا اور اس وقت تک کرتا رہا جب تک کہ اس کی ٹانگ سرخ نہ ہو گئی۔ یہی ہدایت میں نے شکیلہ کے سلسلے میں کبیل دادا کو بھی کی تھی۔

"پاور ایجنٹ" کی ٹریننگ کے دوران مجھے عملی طور پر ایک بار اس مرحلے سے گزرنا پڑا تھا، کہ جزوی طور پر اَن دیکھی شعاعوں کی زد میں آنے والے جسم کے حصے کو اگر فوراً اور بروقت مساج کرنا شروع کر دیا جائے حتیٰ کہ جلد کی رنگت سرخ ہو جائے، تو اس کے بداثرات سے بچا جا سکتا ہے۔

ایلنورا غلطی سے شاید اُن اَن دیکھی شعاعوں کے نظر نہ آنے والے حصار کے دائرے میں چلی گئی تھی اور نا سمجھی یا جلد بازی میں شکیلہ بھی بے چاری اسے بچانے کے لیے دوڑ پڑی اور وہ بھی زد میں آگئی۔

شکر ہوا کہ میری تربیت اور حاضر دماغی کام آگئی، ورنہ ان دونوں کی ٹانگیں ان قاتل ریز کی وجہ سے زندگی بھر کے لیے مفلوج بھی ہو سکتی تھیں۔

"ہمیں لاجسٹک سیل کی طرف موو کرنا پڑے گا۔" حالت سنبھلنے کے بعد ایلنورا نے کہا۔ شکیلہ اور وہ میری ہدایت پر کھڑی ہو گئی تھیں، کچھ دیر انہیں اپنی ٹانگیں سن ہوتی محسوس ہوئی تھیں لیکن اب وہ انہیں خود بھی بار بار حرکت دیتے ہوئے "وارم اَپ" کر رہی تھیں۔

"لاجسٹک سیل جسے ویئر روم کہا جاتا ہے، میں ہمیں انفراریڈ گلاسز کے علاوہ فرسٹ ایڈ اور گیس ماسک بھی مل سکتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی وار روم بھی ہے اور آپریشن ونگ بھی، جہاں ڈاکٹر مارک اور لیب انچارج راکسول موجود ہیں۔"

"ہم انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" میں نے دانت بھینچ کر کہا۔ "ویسے ان کے ذمے کیا کام ہوتے ہیں؟"

"ڈاکٹر مارک میتھین گیس کنٹرولر ہے۔ یہاں اس نے ایک پلانٹ نصب کر رکھا ہے۔ وہ ہمہ وقت یہاں اپنی ٹیم کے ساتھ اس پر کام کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ برمودا ٹرائی اینگل کی تہ میں موجود میتھین گیس کی مقدار اور اس کی افزودگی پر کام کر رہے ہیں، تاکہ وہ برمودا کے اس برسوں چھپے اسرار کو دستِ قدرت سے نکال کر اپنے تصرف میں کر سکیں۔ اس کے لیے انہوں نے یہاں ایک میگا پلانٹ لگا رکھا ہے۔ ڈاکٹر مارک اس پروگرام کا انچارج ہے۔" ایلنورا اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔

"ہم......" میں نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے، ہم پہلے لاجسٹک سیل کی طرف پیش قدمی کرنے کی کوشش کریں گے۔" میں پھر دوبارہ ایلنورا کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا اس سلسلے میں تم کوئی مدد کر سکتی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔ "مجھے افسوس ہے، میں سوائے یہاں کی تھوڑی بہت معلومات دینے کے عملی طور پر تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہوں۔"

میری پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں مگر کبیل دادا اُسے بھانپتے ہوئے مجھ سے حوصلہ افزا انداز میں مخاطب ہو کر بولا۔

"فکر کی ضرورت نہیں شہزی! مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ زیادہ دیر تک ان نادیدہ لہروں کا جال پھیلائے رکھیں گے، وہ ضرور ہماری تلاش میں نکلیں گے، اس کے لیے ان لہروں

کے جال کو سمیٹنا ان کی مجبوری بن جائے گی۔ تب ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ ایلنورا نے ہمیں کافی اہم معلومات دی ہیں۔ ہم لاجسٹک سیل میں داخل ہو کر ضروری آلات پر قبضہ جمائیں گے اور پھر......"

"تب تک لوکہارٹ یا لولووش، اگر وہ زندہ بچا، ہوگ بے سے کمک یہاں پہنچا دیں گے۔" شکیلہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"تم دونوں کی بات غلط نہیں ہے۔" ایلنورا ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اس صورتِ حالات میں دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک کسی خفیہ وائنڈ اسپیکر پر ایک گمبھیر سی آواز ابھری۔ تخاطب میں ہی تھا۔

"مسٹر شہزی! ہم جان چکے ہیں کہ تم اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ یہاں موجود ہو۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ تم یہاں تک پہنچ گئے نہ صرف یہ بلکہ ماسٹر لولووش کو بھی تم نے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ لیکن یاد رکھنا! تم اب بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ بہتری اسی میں ہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم جہاں بھی ہو بہ آوازِ بلند مجھ سے مخاطب ہو سکتے ہو۔"

آواز آنا بند ہو گئی۔ میرے ہونٹوں پر بے اختیار زہریلی مسکراہٹ کھنچ گئی۔ یہ مسکراہٹ تب ہی میرے ہونٹوں پر کھیلتی تھی جب میں کسی دشمن کو بے بس یا چالاکی چلتے ہوئے دیکھتا تھا۔

خفیہ وائنڈ اسپیکرز میں گونجتی اس آواز کو میں پہچان گیا تھا، یہ لیب انچارج راکسول کی آواز تھی، جب وہ لوکہارٹ سے مخاطب تھا تو میں نے اس کی آواز سن رکھی تھی۔

کبیل دادا نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ میں ہونٹ بھینچ کر کچھ سوچتا رہا۔

اسی اثنا میں راکسول کی دوبارہ آواز ابھری۔

"بہت مہلت مل گئی۔ اب تم لوگ زندہ نہیں بچ سکتے۔" ہلکی سیٹی کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ جس کا مطلب تھا اسپیکر آف ہو چکا تھا۔

"اسے داؤ آزمانے دو، ہم اس کا جواب دینے کے لیے تیار ہیں۔" شکیلہ بولی۔

"اسلحے کی کیا پوزیشن ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارے پاس تین گنز ہیں۔ ایک اضافی بھی ہے۔" کبیل دادا بتانے لگا۔ "میری گن کا میگزین تو نصف سے زیادہ خالی ہو چکا ہوگا، یقیناً تمہاری بھی یہی صورتِ حال ہوگی، البتہ شکیلہ کی گن میں کافی سے زیادہ راؤنڈز ہوں گے۔"

"ہم......" میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

اس کے بعد میں اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ دیکھنا یہ تھا کہ راکسول ہمارے ساتھ اب کون سا ہتھکنڈا استعمال کرتا ہے۔

اچانک میری نظر دائیں جانب ایک مثلث شکل کے گوشے پر پڑی، میں ذرا محتاط انداز میں اس طرف بڑھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس رخ پر وہ قاتل ریز کا دائرہ احاطہ نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے ایک ذرا پاؤں آگے بڑھایا اور پھر جیسے ہی وہاں پہنچا مجھے اس طرف دیوار پر ایک گول سا ڈھکن نما فولادی دروازہ سا نظر آیا جس پر کنڈا نصب تھا۔

میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ میں نے احتیاط سے اس کنڈے کو چھوا اور اشارے سے اپنے باقی ساتھیوں کو بھی اس طرف بلا لیا۔

"اس کنڈے پر زور آزمائی کرنا ہوگی۔ یہ کوئی پائپ لگتا ہے۔" میں نے کہا اور زور آزمائی شروع کر دی، کبیل دادا میری مدد کر رہا تھا۔ ہم دو گرانڈیل انسانوں کی مجتمع قوت بھی اس ڈھکن نما فولادی دروازے کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

"ٹھہرو! اس پر گن آزماتے ہیں۔" شکیلہ نے ہم سے کہا۔

ہم دونوں دائیں بائیں ہو گئے اور شکیلہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے گن سنبھالے تیار کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی گن کو سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کر چکی تھی۔

گولی چلنے کا دھماکا ہوا...... مگر بے سود...... کوئی فرق نہ پڑا۔ گولی اُچٹ کر چھت پر پیوست ہو گئی۔

"برسٹ فائر کرو۔" میں نے کہا۔ شکیلہ نے پھر ایسا ہی کیا۔

ہم سب گولیوں کے اُچٹنے سے بچنے کی خاطر ایک طرف کونے میں جا دبکے تھے۔ یہ ایک رسک ہی تھا، محدود گوشے میں گولیوں کی پوری باڑ کسی فولادی شے سے ٹکرا کر پلٹ کے الٹا ہمیں بھی زخمی کر سکتی تھی۔

ہم زمین پر لیٹ گئے اور شکیلہ نے بھی مخصوص ٹرک کے ساتھ برسٹ فائر کیا۔

اگلے ہی لمحے ہمارے چہروں پہ بشاشت دوڑ گئی۔ ڈھکن نما دروازہ ٹیڑھا میڑھا ہو کر کھل گیا۔ ہم لپک کر اٹھے اور اس طرف بڑھے۔

میرا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا، وہ ایک موٹا اور تقریباً تین فٹ قطر کا پائپ تھا۔ ہم باری باری اس میں جا گھسے۔

اس کے بعد سینے اور کہنیوں کے بل پر آگے بڑھتے چلے گئے۔

چند فٹ اسی طرح آگے بڑھے تو یہ بائیں جانب گھومنے لگا، ہم بھی اسی طرف مڑ گئے۔

میں سب سے آگے تھا، میرے پیچھے شکیلہ، پھر ایلنورا اور سب سے آخر میں کبیل دادا تھا۔

مزید چند فٹ آگے بڑھے تو میری آنکھوں کی چمک گہری ہو گئی۔ سامنے جالی دکھائی دی۔ جالی کے پار روشنی نظر آتی تھی۔

میری پیش قدمی تیز ہو گئی اور چند لمحے بعد میں جالی سے اپنا چہرہ چپکائے دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔

یہ ایک کمرا تھا جو خالی تھا۔ اس کے اندر مجھے بھانت بھانت کی اشیا ایک ترتیب سے رکھی نظر آنے لگیں۔ ان میں گیس ماسک دیکھ کر میرے ذہن میں لاجسٹک سیل کا لفظ ابھرا تھا۔

میں نے جالی پر زور آزمائی شروع کر دی مگر بے سود، وہ ایک مضبوط فولادی جالی تھی۔

"کیا ہوا شہزی......؟ یہ جالی نہیں ٹوٹ رہی؟" پیچھے سے مجھے شکیلہ کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔

"میں کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں، راؤنڈ چلے کرنا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"نہیں، ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "میں کوشش کر رہا ہوں۔"

میں نے گن سنبھالی اور اس کے کندے سے جالی پر ضربیں رسید کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ چند ضربات کے بعد جالی ٹیڑھی ہونا شروع ہو گئی۔ میری ہمت سوا ہوئی اور میں نے اپنی کوشش تیز کر دی۔

محدود جگہ ہونے کے باوجود میں اپنی کوشش میں مصروف رہا، یہاں تک کہ اس مشقت سے میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ میرے بازو شل ہو گئے۔ جالی البتہ اکھڑنے کے قریب ہو گئی مگر میرے ہاتھوں میں دم نہ رہا۔

میں نے ایک اور ترکیب آزماتے ہوئے اپنے جسم کو سکیڑا اور شکیلہ کو تھوڑا پیچھے سرکنے کا کہا۔ اس کے بعد میں اپنی دوسری پوزیشن میں تھا، یوں اب میرا چہرہ اور سر شکیلہ کی جانب ہو گیا اور ٹانگیں جالی کی طرف۔

میں نے اب اپنی دونوں ٹانگوں کی ضربات جالی پر آزمانا شروع کر دیں۔ چند ضربات کے بعد ہی جالی اکھڑ کر اندر جا گری۔

میں نے لمحہ بھر کی بھی دیر نہ لگائی اور کھسکتا ہوا خود بھی دوسری جانب جا گرا۔

کمرے کے فرش پر کودتے ہی میری ہمت سوا ہونے لگی اور میں اپنے اندر... پھر سے ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگا۔

میرے دیگر ساتھی بھی اسی طرح کمرے کے اندر کود آئے۔

کمرے کا تفصیلی جائزہ لیا تو یہاں ہمیں بہ قول ایلنورا کے ایک ایک شے کام کی نظر آئی۔ حتیٰ کہ یہاں کٹس بھی تھیں اور غوطہ خوری کا لباس سمیت انفراریڈ گلاسز، گیس ماسک، ابتدائی امداد کے باکسز، غرضیکہ وہ سب کچھ جو کسی ایسی مہم جوئی میں مستعمل ہو سکتی تھیں۔

البتہ اسلحہ نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دی۔ سردست اس کی ہمیں ضرورت بھی نہیں تھی۔

ہم نے سب سے پہلے زخمی گورڈی کی مرہم پٹی شروع کر دی۔ یہ فریضہ میں اور شکیلہ انجام دینے لگے، کبیل دادا کو میں نے دروازے کی جانب کھڑا کر دیا تھا۔ دروازے پر چوکور شیشہ تھا جس کے پار کوریڈور کا اختتام نظر آتا تھا، یعنی آگے دیوار تھی، گویا یہ کمرا انتہائی سرے پر واقع تھا۔ درمیانی حصے میں ایک اور کمرے کا دروازہ نظر آتا تھا۔ ایلنورا کے مطابق مین ونگ اور وار روم اسی کوریڈور کے عقبی سمت میں ہو سکتے تھے۔

ہم... ابھی گورڈی کی مرہم پٹی وغیرہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اچانک دوڑتے قدموں کی آوازیں ابھریں۔ کبیل دادا نے ہمیں ہوشیار کیا۔

"پانچ چھ کے قریب کچھ مسلح افراد اسی طرف آ رہے ہیں۔"

"بھون ڈالو گولیوں سے---" میں نے چلّا کر کہا لیکن دوسرے ہی لمحے کبیل دادا نے بتایا کہ وہ سب آگے نکلتے چلے گئے ہیں۔

"میرا خیال ہے وہ ہماری ہی تلاش میں نکلے ہیں جس کا مطلب ہے کہ انہوں قاتل ریز کا سلسلہ موقوف کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہمیں اب فوراً اور فیصلہ کن پیش قدمی کرنا ہوگی۔"

ماسوائے ایلنورا کے سب نے صاد کیا، وہ بولی۔

''میرا خیال ہے کہ تم تینوں جاؤ، میری دعا ہے خدا تمہیں اس شیطان کے مقابلے میں کامیابی نصیب فرمائے۔ میں یہاں گورڈی کے پاس ہوں، اس نے میری محبت میں اپنی جان خطرے میں ڈالی ہے، میں اسے مزید تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ رندھ گیا۔ اس کی بات پر میرا دل پسیجنے لگا۔ کبیل دادا کا چہرہ سپاٹ تھا البتہ شکیلہ مغموم سی نظر آنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''ایلن! میرا خیال ہے گورڈی کی حالت اب بہتر ہو جائے گی، یہاں تم دونوں کا موجود رہنا خطرے سے خالی نہیں، دشمن یہاں آ گئے تو وہ تم دونوں کو دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''یہاں چھپے بیٹھے رہنے کی جگہ ہے، وہ دیکھو......'' کہتے ہوئے اس نے اس کمرے کے جنوبی گوشے کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔ میں نے اس طرف دیکھا۔

''اس طرف ایک اور چھوٹا کمرا ہے، کوئی خطرہ محسوس کرتے ہی میں گورڈی کو لے کر وہاں جا چھپوں گی۔''

''ہم......'' میرے منہ سے برآمد ہوا۔ میں نے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔

کبیل دادا فطرتاً غیر جذباتی سا آدمی تھا۔ وہ تحمل کرنا اور آگے بڑھنا جانتا تھا، حقیقت پسندی کی آنکھ سے ہر معاملے کو پرکھتا، جانچتا اور اس پر عمل کر ڈالتا تھا۔

شکیلہ البتہ ایلن کے فیصلے سے متفق نہیں تھی، میں خود شش و پنج میں تھا۔

''تت......تم دونوں وقت ضائع کر رہے ہو۔'' ایلن بولی۔

اس کا لہجہ افسردگی کے سبب اب بھی لڑکھڑایا ہوا سا تھا۔ ''گورڈی کی حالت اب بھی نیم بے ہوشی کی سی ہے۔ خدا کرے اسے جلد ہوش آ جائے، ویسے مجھے امید ہے، یہ اب بہتر ہو جائے گا۔ لیکن تم تینوں کے ساتھ ہم قدم نہیں ملا سکتے، الٹا ہم کہیں تم لوگوں کے پیروں کی زنجیر ہی نہ بن جائیں۔''

کبیل دادا نے دروازہ کھول دیا اور کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے بولا۔ ''شہزی! وقت بالکل نہیں ہے، یہ موقع بھی چلا گیا تو مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔''

میں اور شکیلہ ان دونوں کو سلامتی کی دعائیں دیتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئے۔

''تم بہت پتھر دل ہو دادا!'' کوریڈور میں آتے ہی شکیلہ نے کبیل سے شکوہ کیا۔

''انسان کو اپنے کیے کی سزا خود ہی بھگتنا چاہیے۔'' کبیل دادا بُرا منائے بغیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''ایلن اور گورڈی کے معاملات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ ہم جتنی ان کی مدد کر سکتے تھے کر چکے، خدائی فوجدار بنتے رہے تو اپنے اصل مشن کے مقصد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ قسمت بار بار ایسے موقع نہیں دیتی۔''

کبیل دادا کی بات جتنی بھی کڑوی سہی، میں اس سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔

ہم آگے بڑھ گئے۔ کبیل نے بتایا کہ وہ لوگ اسی کمرے سے نکلے تھے، میں نے چھپ کر دروازے کے اوپر لگے چوکور شیشے سے اندر دیکھا تو یک دم چونک پڑا۔

وہاں کچھ افراد مستعدی کے ساتھ اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیے۔ ان میں سے کچھ مخصوص یونیفارم پہنے ہوئے تھے اور چند چست سیاہ لباسوں میں بھی تھے، یہ مسلح تھے۔

یونیفارم پہنے لوگوں میں ایک عمر رسیدہ مگر قابلِ رشک صحت کا مالک ایک سرخ و سپید رنگت کا آدمی بھی نظر آیا۔ اس نے بھی بے داغ سفید یونیفارم زیب تن کر رکھی تھی اور وہ ایک بڑے سے پینل کے پاس کھڑا، اسٹول پر اس کے سامنے بیٹھے شخص کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

ایلن کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق مجھے یہ گیٹ اَپ ڈاکٹر مارک کا ہی محسوس ہوا۔ میں نے کبیل دادا اور شکیلہ کو حملے کا سگنل دیا اور پھر چند قدم پیچھے ہٹ کر ہم نے بیک وقت دروازے پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ میں دروازہ ایک دھماکے سے ٹوٹ کر گرا اور اندر موجود سب لوگ ایک دم چونک کر پلٹے۔ سرِدست ہمارا نشانہ مسلح افراد تھے، باقی یونیفارم والے ہمیں دیکھتے ہی اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، مسلح افراد نے اپنی گنز سیدھی کیں مگر میں انہیں اب کہاں موقع دینے والا تھا۔

ہماری گنز آتشیں قہقہے اُگلنے کے لیے پہلے ہی بے تاب تھیں۔ ان کے قہقہے بلند ہوتے چلے گئے اور وہ سب گولیوں سے چھلنی ہو کر فرش پر گرنے لگے۔

اچانک میری گن ٹرچ کی مخصوص آواز نکالنے کے بعد خاموش ہو گئی۔ یہی حال کبیل دادا کی گن کا بھی ہوا۔ جس شخص پر شبہ تھا ڈاکٹر مارک کا، وہ دوڑ کر ایک پینل کی طرف لپکا۔ شکیلہ نے اس کی ٹانگوں پر فائر جھونک مارا۔ اس کی گن میں ابھی راؤنڈز باقی تھے، ڈاکٹر مارک چیخ مار کے گرا۔

میں اور کبیل دادا اس کے سر پہ پہنچ گئے۔ باقی لوگوں کو کہیں چھپنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی، یونیفارم میں ملبوس یہ لوگ ''عملے'' کے تھے، اگرچہ اس گھناؤنے جرم میں یہ لوگ بھی برابر کے شریک تھے، مگر میں نے انہیں ابھی ہلاک کرنا مناسب نہیں سمجھا البتہ انہیں اس دھمکی کے ساتھ زمین پر سینے کے بل لیٹ جانے کا حکم ضرور صادر کر دیا، بصورت دیگر ان کا بھی وہی حشر کیا جاتا۔ یہ دھمکی کام کر گئی۔ یوں وہ پہلے ہی ہمارے نفسیاتی دباؤ میں تھے۔

میں اور کبیل دادا ڈاکٹر مارک کو سنبھالنے لگے، شکیلہ نے اس کی دونوں ٹانگیں گولیوں سے چھلنی کر کے بے کار کر دی تھیں، وہ اسی حشر کے لائق تھا۔

''ڈاکٹر مارک! تم زندہ نہیں بچو گے، بہتر ہے ہمیں لوکہارٹ کے بارے میں بتاؤ وہ کہاں ہے؟'' میں نے غرا کر اس سے کہا۔

''آہ......مم......میری ٹانگیں......'' وہ جواب دینے کے بجائے تکلیف سے کراہنے لگا۔

اسی وقت برسٹ چلنے کی آواز ابھری، میں اور کبیل دادا بُری طرح بدکے، پھر شکیلہ کی گن سے دھوئیں کی لکیر بلند ہوتے دیکھ کر بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے۔

اس نے کسی کو چالاکی کرتے دیکھ کر نشانہ بنایا تھا، وہ چوکس کھڑی گرد و پیش پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔

''ابھی تو تمہاری ٹانگیں بے کار ہوئی ہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جسم بھی ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو جائے۔'' میں نے طیش بھرے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو، اس وقت میرے سر پر خون سوار ہے، آخری موقع دے رہا ہوں، لوکہارٹ، قیدی عابدہ کے ساتھ کہاں موجود ہے؟''

''وہ......وہ......اُسے لے کر جزیرے کی طرف جا چکا ہے۔ لل......لیکن اب تم لوگ بھی نہیں بچو گے، وہ بہت جلد آندھی طوفان کی طرح لوٹے گا۔'' ڈاکٹر مارک نے ایسی حالت میں بھی ہمیں دھمکی کا تڑکا لگانا ضروری سمجھا تھا۔ میں اس کی بات پر فکرمند ہو گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

لوکہارٹ لولوش اور عابدہ کو لے کر ہوگ بے کی جانب نکل چکا تھا اور ابھی کسی بھی وقت وہ وہاں سے ایک نئی کمک کے ساتھ یہاں پہنچنے والا تھا۔

میں نے ایک غلطی نتیجے پر پہنچتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ساتھ ہی میں نے ڈاکٹر مارک کا ٹینٹوا بھی دبا دیا۔ وہ یہاں لولوش کے ایک شیطانی منصوبے کی آب

بہترین تحریریں، لاجواب مواد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ ستمبر 2019ء
کی جھلکیاں

صاحب علم
ڈاکٹر ساجد امجد کی تلاش،
معروف عالم دین کی سوانح حیات

لیمپ والی
ناصر ملک کے قلم سے
مشہور تیماردار کا زندگی نامہ

کامریڈ لکھاری
نسرین اختر نینا کا تحفہ،
صاحب طرز ادیب کا عکس زندگی

سدابہار فنکار
انور فرہاد کا شہکار، نامور
اداکار کی سرگزشت

سفر پہلا پہلا
ندیم اقبال کی دلچسپ سفر
کہانی، پہلی محبت کے عشق کی روداد

دستک
محمد لطیف کی حب الوطنی
سے بھری سچی بیانی

اور بہت کچھ علاوہ

بہت سی سچی بپتائیں، سچے قصے، سچی داستانیں۔ علم و ادب
اور معلومات حاصل کرنے کے شوقینوں کی مدارات۔

یاری میں مصروف تھا۔ اس کی ہلاکت لولودش کا ایک بڑا نقصان تھی۔

یہ کام نمٹانے کے بعد میں اٹھا اور...... مسلح افراد کی لاشوں سے گنیں اٹھالیں۔ اس کے بعد وہاں جتنے بھی پینلو تھے، ان پر اندھا دھند گولیاں برسانے لگا۔ وہ سب تباہ ہونے لگے اور کمرے میں زبردست الیکٹرک شاک اور اسپارکنگ ہونے لگی۔ بلب جلنے بجھنے لگے۔ دھواں اٹھنے لگا۔ لوگ چلا چلا کر مجھے ایسا کرنے سے روکتے رہے، مگر یہ سننے کے بعد کہ اب عابدہ یہاں نہیں تھی، میں لولودش کے برمودہ میں قائم گہرے پانیوں کے نیچے اور شیطانی تکون کے اندر اس جادو نگری کو برباد کر ڈالنا چاہتا تھا تاکہ اسے اور اس کے رفقائے خاص کو پتا چل سکے کہ انہوں نے معصوم عابدہ کو اپنے ذاتی مفادات کی غرض سے قیدی بنا کر کتنا بڑا جرم کیا تھا اور اپنی بربادیوں کو آواز دی تھی۔

یہ تباہی مچانے کے بعد ہم کمرے سے نکل آئے۔ میرا رخ اب آپریشن روم کی طرف تھا، ایلن نے مجھے بتا رکھا تھا کہ وار روم کے ساتھ ہی قدرے عقب میں آپریشن روم اور مین ونگ تھے۔

میرے ایسے اندھا دھند اور غیظ و انتقام تلے ہونے والے اقدامات کے دوران کبیل دادا بھی خاموش ہی رہتا تھا۔ ورنہ ایسے میں وہ مجھے ٹوکتا ضرور تھا۔

میں جانتا تھا کہ اب دشمنوں سے کون سی زبان میں نمٹنا تھا مجھے، مہربان تقدیر کا یارا ہے اور قسمت بھی ساتھ دے رہی ہو تو میں جوشِ جنوں خیزی کے عالم میں ہر وہ قدم اٹھاتا چلا جاتا تھا جس سے مجھے تسکین ملتی ہو۔

میں آپریشن روم کی جانب بڑھا تو اس کی راہداری میں قدم رکھتے ہی اچانک ہمارے ہاتھوں کو عجیب سے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے۔ ہمارے ہاتھوں سے گنز نکل کر چھت کی جانب جا چپکی تھیں۔ ہم ٹھٹک کر رک گئے گویا ہونقوں کی طرح بیک وقت ہم تینوں اپنے سر اٹھائے چھت کو گھورنے لگے تھے کہ ہمارے ساتھ یہ اچانک ہوا کیا تھا؟

"میگنیٹک فیلڈ کام کر رہی ہے یہاں۔" اچانک شکیلہ چیخ کر بولی۔ "آگے بڑھو شہزی!"

مجھے کچھ یارا ہوا اور اب ہم خالی ہاتھ ہی آپریشن روم کی جانب بڑھے۔ ابھی اس کے دروازے کے قریب پہنچے ہی تھے کہ وہ دھڑ سے کھلا اور...... اس کے اندر سے ایک بغیر چھت والی مشینری ٹائپ کوئی شے برآمد ہوئی۔ اس کے اندر چار افراد براجمان تھے۔

"الیکٹرک کار......" میرے ذہن میں ابھرا۔ وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے برآمد ہوئی اور بائیں جانب کو مڑ کر دوڑنے لگی۔

ہم نے اس کا پیچھا کیا مگر پھر رک کر آپریشن روم میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اندر کوئی بھی نہ تھا۔

البتہ ایک دوسری بغیر چھت والی الیکٹرک کار ہمیں دکھائی دے گئی۔ مجھے یہاں یہ دیکھ کر ایک حیرت آمیز خوشی ہوئی تھی کہ وار روم کی تباہی کے بعد یہ آپریشن روم بھی کسی کام کا نہ رہا تھا، کیونکہ اس کی اسکرین اور اسپیشل کمپیوٹرز کے مانیٹرز بھی تاریک پڑے تھے۔

کمرے کی لائٹس بھی مدھم پڑنے لگی تھیں، ایک عجیب قسم کے شور کی گونج سی سنائی دینے لگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ ڈیپ سی لیب تباہ ہونے والی ہو۔

ہم نے بلا تاخیر الیکٹرک کار کی جانب پیش قدمی کی، پھر میں اور شکیلہ کم و بیش پانچ دس منٹ تک اس کا میکنزم سمجھنے کی کوشش کرتے رہے اس کے بعد اس میں سوار ہو گئے۔ اس میں پانچ افراد کے سمانے کی گنجائش تھی۔

"ہمیں اس کار میں ان کے تعاقب میں جانا ہوگا...... مجھے لگتا ہے کہ ان میں سے ایک شخص راکسول ہوگا۔" کبیل دادا نے کہا مگر میں نے اس کا مشورہ رد کر دیا۔

"نہیں، ہمیں لاجسٹک سیل کا رخ کرنا ہے، وہاں گورڈی اور ایلن موجود ہیں۔ ان دونوں کو ہماری اور ہمیں ان کی مدد کی ضرورت ہے۔"

کار میں سوار ہوتے ہی میں نے اس کی موٹر مشین کو آپریٹ کرنا شروع کر دیا۔

کار حرکت میں آگئی۔ یہ اسٹیئرنگ وہیل والی کار نہیں تھی۔ کمپیوٹر سسٹم پر چلتی تھی۔ اس کا میکنزم سمجھنے کے دوران ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ یہ کار ہمارے لیے کس قدر کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ اسٹیئرنگ کی جگہ ایک اسکرین تھی اور اس کے نیچے چھوٹا سا پینل جل بجھ رہا تھا۔ اسی میں کچھ سسٹم بٹن تھے۔ یہ پروگرامنگ کے تحت چلتی اور منزل پر از خود پہنچا دیتی تھی۔

میں نے لاجسٹک سیل پنچ کیا اور گرین بٹن دبا دیا۔ کار نے فوراً لاجسٹک سیل میں پہنچا دیا اور اس کے دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔

میں نے کبیل دادا اور شکیلہ کو کار کے اندر چوکس بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود اندر داخل ہوا تو...... بُری طرح ٹھٹک گیا......

☆☆☆

اندر کا منظر بڑا لرزہ خیز تھا۔ گورڈی اور ایلن کی لاشیں پڑی نظر آئیں۔ ان دونوں کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے اور شاید اپنا آخری وقت دیکھتے ہی وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔ ان کی لاشیں باہم پیوست تھیں۔ میرا دل ان کی حالتِ زار پر اندر سے کڑھنے لگا۔ یقیناً یہ انہی چند مسلح لوگوں کا شاخسانہ ہو سکتا تھا جنہیں تھوڑی دیر پہلے ہم آپریشن ونگ سے نکلتے اور پیچھے کی جانب بھاگتے دیکھ چکے تھے۔

میں ان دونوں بدنصیبوں پر افسوس کرتا ہوا واپس پلٹا اور...... کوریڈور میں آگیا، وہاں کار موجود تھی، میں اس میں سوار ہو گیا۔

کبیل دادا اور شکیلہ کو جب ان کے افسوسناک انجام کا علم ہوا تو کبیل دادا محض اپنا سر جھٹک کر رہ گیا جبکہ شکیلہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"کوئی فائدہ نہیں، جلدی سے گیٹ آؤٹ پر پروگرامنگ فیڈ کرو اور نکلو اس منحوس جگہ سے......" کبیل دادا نے مجھ سے کہا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور کار ایک بار پھر حرکت میں آگئی۔

وہ مختلف راہداریوں سے گزرنے لگی، خود ہی موڑ کاٹتی اور ریورس ہوتی پھر آگے بڑھنے لگتی۔

ایک مقام پر جب ہم ایک ہال سے گزرنے لگے تو...... وہ ایک سپاٹ دیوار کے سامنے جا کر رک گئی۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ یہاں ایسی کیا بات ہے؟ کیا ہم منزل تک پہنچ گئے ہیں؟

لیکن دوسرے ہی لمحے وہاں سے ایک دیوار شق ہوئی اور ایک سرنگ نظر آگئی۔ کار پھر حرکت میں آئی اور سرنگ میں داخل ہو گئی۔

یہاں ایک گونج کی سی فضا طاری تھی۔ یہ شاید اوپر یا اِدھر اُدھر کہیں پانی کے دباؤ کے سبب تھی۔ اچانک دھماکے ہونے لگے، سرنگ کی زمین تھرتھرانے لگی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" شکیلہ چونک کر بولی۔

"یہ شہزی کا ہی شاخسانہ ہے۔" کبیل دادا فوراً ان دھماکوں کی آوازیں سمجھتے ہوئے بولا۔ "وار روم میں شہزی نے جو سسٹم تباہ کیا تھا، یہ اس کے مابعد اثرات ہیں۔"

"آفٹر شاکس۔" شکیلہ مسکرائی۔

میں خاموش رہا۔ کھلی چھت والی الیکٹرک کار ایک تنگ سی سرنگ میں داخل ہو گئی مگر اس کے سرے پر پہنچ کر رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ سرنگ کے اندر فولادی ٹریک بچھا ہوا تھا۔ کار کے پینل سے مختلف الارم بجنے لگے۔

میں اسکرین پر دیکھنے لگا کہ نجانے اب کیا کرنا ہو؟ لیکن میں نے دیکھا وہاں خود ہی پروگرامنگ ہو رہی تھی اور چند ہی ثانیوں بعد کار ٹریک پر آگئی، اس کے ساتھ ہی اسے ہلکا جھٹکا لگا۔

اگلے ہی لمحے وہ حرکت میں آئی اور آگے بڑھنے لگی۔

"اوہ...... اس کے ٹائروں کی جگہ اب آئرن میگنیٹک راڈ نکل آئے ہیں۔ ہوشیار...... ہم مین ونگ میں پہنچنے والے ہیں۔" میں نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی اچانک ہماری سیٹوں کے بیلٹ کلپ خودکار انداز میں ہماری کلائیوں سے لپٹ گئے اور سینے پر بھی سیٹ کے ساتھ بیلٹ کھنچ گئی۔

عقدہ کھلا کہ سرنگ کا یہ ٹریک فرش، سائڈ کی دیواروں حتیٰ کہ چھت تک بھی جاتا تھا۔ گویا سرنگ میں بنا یہ ٹریک گھومتا ہوا اپنا سفر کرتا تھا۔

ابھی ہم نے لگ بھگ کوئی دس پندرہ گز کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک سرنگ لرزنے لگی۔ پھر ابھی ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ اچانک سرنگ کی دیواریں تڑخنے لگیں اور پھر ان میں دراڑیں پڑنے لگیں، ابھی اس مصیبت کی ابتدا ہی ہوئی تھی کہ ایک اور ہولناک آفت آن پڑی۔

پانی کا زبردست ریلا اندر کو اٹھا، کار کا ٹریک زائل ہوتے ہی وہ الٹ گئی۔ صورتِ حال اب یوں تھی کہ وہ اوندھی پڑی تھی اور ہم اس کے نیچے بندھے دبے پڑے تھے، جبکہ ہمارے اوپر پانی کا ریلا بڑھتا جا رہا تھا۔

ہم بے بس تھے، خودکار انداز میں رسن بستہ ہو کر ہم کیا کر سکتے تھے، میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا...... یہ بڑی بھیانک صورتِ حال تھی۔

ہم تینوں اپنی موت آپ مر سکتے تھے۔ پانی اور آگ کی موت یوں بھی بڑی ہولناک اور اذیت ناک تصور کی جاتی ہے۔

"شہزی! ہم ڈوب رہے ہیں۔" شکیلہ کی لرزتی آواز ابھری۔

"حوصلہ رکھو اور اللہ پر بھروسا کرو، اپنی اپنی کوشش کرو، میں بھی کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ میں نے زور زور سے خودکار ریٹنر بندوں کو جھٹکے دینا شروع کر دیے۔ الیکٹرک کار کا سسٹم منقطع یا اس میں پانی کے سبب خرابی پیدا ہونے سے خراب ہو چکا تھا۔

مجھے اپنے دائیں بازو کی ریٹنر بند ڈھیلی ہوتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی کوششیں تیز کر دیں۔

ہم تینوں میں سے کوئی ایک بھی آزاد ہو جاتا تو وہ باقیوں کو اس عذاب سے آزاد کر سکتا تھا۔

ادھر سرنگ پانی سے بھرنے لگی تھی، اندھیرا ابھی پھیل گیا تھا، لائٹس آف تھیں۔ اب کوئی الارم یا سیٹیاں بجنے کی سمع خراش آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

پانی کی سطح تیزی سے بلند ہوتی جا رہی تھی، بھلا جگہ ہی کتنی تھی، ذرا ہی دیر بعد میں ہم ڈوب چکے تھے اور وہ بھی رسن بستہ حالت میں......

یہ بڑی جان لیوا صورتِ حال تھی۔ گویا بے موت مر جانے جیسی...... میں ابھی اپنے ایک ہاتھ کی کلائی کے جکڑ بند کھولنے کی آخری کوشش میں تھا کہ کبیل دادا اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا اور اس نے میری جانب ہاتھ بڑھائے تو میں نے پانی کے اندر سے ہی نفی میں سر ہلا کر اسے شکیلہ کی مدد کرنے کا اشارہ کر دیا، کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بے چاری خاصی پریشان اور متوحش ہو رہی تھی۔

اس کے منہ سے کبھی کبھی بلبلا...... چھوٹ جانے کی آواز آ جاتی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے وہ میرا ہلتا ہوا سر تو نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میری باڈی لینگویج نے اسے سمجھا دیا تھا۔

اِدھر میرا بھی جکڑ بند کھل گیا اور میں بھی کبیل دادا کے ساتھ شکیلہ کی مدد میں شامل ہو گیا۔

مجھے اور شکیلہ کو تو حبسِ دم کی تربیت تھی، یقیناً کبیل دادا بھی اس میں مہارت رکھتا ہو گا۔ ہم پانی کے اندر سرنگ میں تیزی سے تیرتے چلے گئے، ایک خوش بختی رہی تھی کہ پانی کا بہاؤ ہمیں خود ہی لیے جا رہا تھا۔

اپنی گنز ہم نے پہلے ہی کندھوں سے لٹکا دی تھیں۔

جلد ہی ہم ایک ایسے ہال کمرے میں تیرتے ہوئے آ گئے...... جو خاصا وسیع تھا۔ یہاں اور لوگ بھی ڈوبنے ابھرنے کے عمل سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک تیز گونج سنائی دی۔

پانی کے اندر اس کی گونج کسی ہیبت ناکی سے کم نہیں محسوس ہوتی تھی۔

اس کے ساتھ ہی روشنی ہونے لگی اور پانی کا تیزی سے نکاس ہونا شروع ہو گیا۔ سطح بتدریج گھٹنے لگی یہاں تک کہ...... ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں پہلے سے موجود دیگر لوگ بھی۔

وہ سب ہماری طرح پانی سے شرابور تھے۔ ان کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں تھی اور ان میں کوئی بھی سردست مسلح نظر نہیں آتا تھا، البتہ ان کے جسموں پر بھیگی ہوئی یونیفارم نظر آتی تھی۔

یہ عملے کے لوگ تھے اور انہی میں، میں نے ایک چھریرے جسم کے مالک آدمی کو دیکھا، اس نے ہاتھ میں کوئی ڈبا نما سی شے تھام رکھی تھی اور وہ اسے منہ کے قریب کیے کوئی ہدایات جاری کر رہا تھا......

ابھی ہم پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ وہ سب ہراساں اور افراتفری کا شکار نظر آ رہے تھے، کیونکہ میں نے پانی کی سطح گھٹتے محسوس کرتے ہی شکیلہ اور کبیل دادا کو ایک بڑے سے پِلّر کی آڑ میں ہونے کی ہدایت کر دی تھی۔

گنز البتہ ہم نے کاندھوں سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لی تھیں۔

پانی اب بھی چکنے فرش پر پھیلا ہوا تھا، چھریرے اور لمبی جسامت کا ادھیڑ عمر آدمی ڈبا نما شے میں کسی خودکار جنریٹر کی کارکردگی کے علاوہ...... کسی کو یہ بھی ہدایت دے رہا تھا کہ کیپسول آبدوزیں بھیجی جائیں، ڈیپ سی لیب تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے...... ورنہ کوئی زندہ نہیں بچے گا، وغیرہ۔

یہی وہ وقت تھا جب...... ایک گونجتی ہوئی انسانی آواز ابھری۔

”مسٹر راکسول! سارا نظام درہم برہم ہو گیا ہے، اپنے ساتھیوں کی پوری ٹیم کو لے کر بفر روم پہنچو، جلدی...... وہاں آبدوزیں تیار ہیں۔“ یہ آواز بار بار آتی رہی۔ میں چونک اٹھا۔

گویا یہ شخص ڈیپ سی لیب کا انچارج راکسول تھا۔

کبیل دادا اور شکیلہ بھی سن چکے تھے اور انہوں نے راکسول پر گنز سیدھی کر لی تھیں۔ ان کی یونیفارم کا رنگ اور تھا۔ یہ جہنم واصل ڈاکٹر مارک کی ٹیم سے نہیں تھے۔

”بھول کر بھی یہ غلطی مت کرنا ابھی۔“ میں نے انہیں روکتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”اس طرح انہیں ہماری بھی یہاں موجودگی کا پتا چل جائے گا اور پھر ہمارا نکلنا مشکل ہو سکتا ہے۔“

ذرا ہی دیر بعد انہیں کوریڈور نمبر فور پر آنے کا کہا گیا اور ساتھ ہی انہیں محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہوئے یہ بھی کہا گیا کہ...... ”شہزی اور اس کے دو ساتھیوں نے ڈاکٹر مارک اور ہمارے دیگر ساتھیوں کو ہلاک کر ڈالا ہے۔ تم احتیاط رکھنا۔ ڈاکٹر مارک کی ہلاکت کے بعد میگا پلانٹ جام ہو گیا ہے اور کچھ اور دیر بعد ایک تباہ کن پریشر سے وہ بلاسٹ ہونے والا ہے، میتھین گیس پھیلتے ہی سب لوگ تہِ آب ہو کر ہمیشہ کے لیے اس میں دفن ہو جائیں گے، جلدی کرو۔“

اس اعلان نے ہمیں پریشان کر دیا۔ ادھر راکسول اپنی ٹیم کے ساتھ کمرے سے نکلنے لگا۔ بہت احتیاط سے ہم بھی ان کے نکلتے ہی حرکت میں آ گئے۔

یہ سب لوگ ایک بل کھاتی راہداری سے تیز تیز قدموں کے ساتھ گزر رہے تھے، اسی سبب عقب میں یہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں پائے۔

ان کے تعاقب میں محتاط روی سے چلتے ہوئے ہم دائیں جانب مڑے تو وہاں ذرا رک کر میں نے ایک دیوار کی آڑ سے دیکھا، ایک دیوار شق ہو گئی تھی، وہ سب اس کے اندر داخل ہو رہے تھے۔

”جلدی آؤ، دوڑو......“ میں نے کہا اور بھاگا۔ کبیل دادا اور شکیلہ میرے پیچھے تھے۔ وہاں ابھی آخری دو آدمی اندر داخل ہونے کے لیے باقی بچے تھے کہ ہم ان کے سر پر جا پہنچے اور انہیں دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

سامنے نیچی چھت والا ایک آٹھ بائی دس کا کمرا تھا، وہ سب اس چھوٹے سے کمرے میں اکٹھے کھڑے تھے، بائیں جانب دروازہ کھلا ہوا تھا اور پہلے سے اندر موجود افراد اب وہاں سے دوسری جانب قدم دھرنے میں مصروف تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ ڈر گئے، کیونکہ ہم مسلح تھے پھر ہماری دہشت پہلے ہی طاری ہو چکی تھی۔

وہ سب اِدھر اُدھر ہو گئے، ہم انہیں دھکے دیتے ہوئے آخرالذکر دروازے سے دوسری جانب پہنچے تو وہاں چار گول کیپسول نما کشتیاں ایک فولادی ٹریک پر ٹکی دکھائی دیں۔ ان کے اوپر کا نصف خول خودکار میکنزم کے تحت سرکا ہوا تھا اور وہاں چار افراد براجمان نظر آ رہے تھے، انہی میں مجھے راکسول بھی بیٹھا دکھائی دے گیا۔

میں نے وہیں سے جست بھری لیکن میرے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی خول سرک گیا اور اب کیپسول ”نصف“ کے بجائے مکمل گولائی میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے نیچے ٹریک میں جہاں اس کے وہیل کی جگہ لینڈنگ اسکڈ تھے، دھیرے دھیرے پھسلنا شروع ہو گئے۔ میں کیپسول آبدوز (بند کشتی) کے اوپر لپٹ گیا۔

وہ حرکت میں آ چکی تھی، سرنگ گھومتی ہوئی سی تھی، وہ گھومی اور...... اور میں نیچے جا پڑا۔

وہاں شور مچ گیا۔ کبیل دادا اور شکیلہ مجھے سنبھالنے کو لپکے، میں تب تک کھڑا ہو چکا تھا۔ میرا وار خالی چلا گیا تھا، میں بروقت راکسول کو گرفت میں نہ لے سکا تھا۔

اسی وقت ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ بجلی کا ایک ایسا زبردست شاک نمودار ہوا جیسے کوئی فلش یا فلڈ لائٹ لمحے بھر کو آن ہوئی ہو، جیسے آسمانی بجلی آن گری ہو کہ ہر طرف چکا چوند پھیل گئی، آنکھیں خیرہ ہو کے نابینا محسوس ہونے لگیں۔

باقی بچے کھچے لوگوں نے دل دہلا دینے والے انداز میں شوروغوغا مچانا شروع کر دیا۔ فرش پر لرزا طاری ہو گیا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے دجالی شیطان لولوش کی شیطانی نگون کی منحوس گہرائیوں میں واقع یہ جادونگری تباہ ہونے والی تھی۔

”شہزی! دوسری آبدوز کی جانب دوڑو......“ کبیل دادا چلّایا۔ میں نے پہلی بار کبیل دادا کو اس قدر فکرمند اور پریشان دیکھا تھا۔ حالانکہ ہم ساتھ ساتھ ہی تھے، وہ جیسے خبردار کرنا چاہتا تھا کہ اگر ہمیں ایک لمحے کی بھی دیر ہوئی تو اس تباہی کی نذر ہم بھی ہو جائیں گے اور یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔ لہٰذا ہم تیزی سے حرکت میں آئے اور پھر ایک دوسری کیپسول آبدوز کی جانب پیش قدمی کی۔ چند ثانیے بعد ہی ہم اس میں سوار ہو چکے تھے۔

یہ سب کسی طے شدہ پروگرامنگ کے تحت آپریٹ کر دی گئی، اسی کے سبب ہمارے سوار ہوتے ہی چھت کا گول خول برابر ہو گیا اور وہ حرکت میں آ گئی۔

ذرا ہی دیر بعد ہم اسی ٹرانسپیرنٹ سرنگ میں ایک بار پھر گامزن تھے، جس میں چند روز پہلے ایک شیشے کی ٹیوب میں بیٹھ کر آئے تھے، اب واپسی کا سفر تھا۔

ہم نے سر گھما کر عقب میں دیکھا، وہاں پانی سرخ انگارا بنا ہوا سا نظر آتا تھا۔ بڑی زبردست اچھالیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کیپسول آبدوز کو بار بار جھٹکا لگ رہا تھا، یوں جیسے وہ رکنے لگی ہو اور جیسے کوئی پیچھے کی جانب کھینچ رہا ہو۔

راکسول کی کیپسول ہم سے آگے محوِ سفر تھی۔ اس کی کوئی اسپیڈ بڑھائی یا گھٹائی نہیں جا سکتی تھی۔

یہ عجیب مسئلہ تھا...... گویا ہم یوں خودکار انداز میں اپنے دشمن کی گود میں جا گرتے۔ ہمارے آگے ونڈ اسکرین تھی۔ اردگرد پانی یا آبی مخلوق، لیکن ان میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی، وہ اپنے مقرر کردہ مقام اور جگہ سے ہٹنے کی تگ و دو میں نظر آتی تھیں۔

اچانک ہماری کیپسول آبدوز کو ایک زبردست جھٹکا لگا، وہ رکنے لگی بلکہ ایک مقام پر تو تقریباً ٹھہر ہی گئی، جبکہ میری متلاشی نظریں اپنے سے آگے جانے والی کیپسول آبدوز پر جمی ہوئی تھیں جس میں راکسول اپنے چند قریبی حواریوں کے ساتھ موجود تھا۔

جھٹکے اس کی آبدوز (بند کشتی) کو بھی لگ رہے تھے، ایک مقام پر وہ بھی رک گئی کہ اچانک اس کے نچلے سائلنسر سے سرخی مائل روشنی کا اخراج ہوتا دکھائی دیا۔

''ٹربو پاور۔'' میرے ذہن رسا میں ایک دم ابھرا۔ ضرور ہماری آبدوز میں بھی یہ سسٹم موجود ہوگا، میں نے اسکرین اور پینل کا جائزہ لیا تو ٹربو پاور کا بٹن نظر آ گیا۔

میں نے اسے پش کردیا۔ ہماری رکی ہوئی کیپسول آبدوز کو ایک طوفانی سا جھٹکا لگا اور وہ ایک دم غرغر کرتی آگے بڑھی۔

کبیل دادا اور شکیلہ بار بار گردن پیچھے موڑ کر تکے جاتے تھے۔ میں نے بھی دیکھا تھا، ڈیپ سی لیب اور ان کا میگا پلانٹ تباہ ہو چکا تھا۔ وار روم اور آپریشن ونگ میں میگا پلانٹ کا کوئی خطرناک لنک پائپ گزرتا تھا، اس پر میری اندھا دھند فائرنگ سے سسٹم جام ہو گیا تھا اور وہی پلانٹ ایک دم پریشر بنانے کا موجب بن گیا تھا، پھر مختلف کنٹرول پینل جنہوں نے پانی کے دباؤ کو کنٹرول کر رکھا تھا، وہ بھی آتش زدگی کا شکار ہو کر ناکارہ اور برباد ہو گئے تھے۔

میں بدستور اسکرین کا جائزہ لیتا جا رہا تھا، اس میں پانی کی گہرائی اور اوپری سطح کا گراف اور ایک چھوٹا ریڈار بھی تھا۔ میں نے اسکرین کے نیچے پینل کے بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس کی پروگرامنگ میں ردّوبدل ممکن تھی۔

میں نے اسے آٹو کے آپشن سے ہٹا کر اس کے پروگرامنگ سسٹم کا بغور جائزہ لیا۔ اسے ڈیلیٹ کرنے کے لیے پاس ورڈ کی ضرورت تھی، جبکہ ایک اور آپشن کے تحت بھی اسے ختم کیا جا سکتا تھا۔

تھوڑی کوشش کے بعد ہی میں آبدوز کو مینوئل پر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ٹربو پاور ایک محدود وقت کے لیے آن ہوئی تھی اور اب کچھ دیر تک پاور کا ''اجتماع'' ہونے کے بعد ہی وہ عمل میں لایا جا سکتا تھا لیکن مجھے ابھی اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

آبدوز ٹرائی اینگل کی حدود سے نکل گئی تو میں نے اس کی رفتار بڑھا دی۔ ہم سے آگے جانے والی آبدوز...... اپنے پیچھے پانی کے بلبلوں کا جھگٹا چھوڑے آگے بڑھی جا رہی تھی۔ اس کا رخ بدل رہا تھا، اور اب وہ اوپر کی جانب تیرتی جا رہی تھی۔

رفتار بڑھاتے ہی میں اس کے قریب پہنچنے لگا تو میں نے کبیل دادا اور شکیلہ کو چوکس رہنے کی ہدایت کردی۔

اس کے بعد جیسے ہی دونوں آبدوزیں پانی کی سطح پر ابھریں تو میں نے سروں کے اوپر سے خول کھسکا دیا۔

ہم ایک ساتھ اپنی گنز لیے سیٹوں پر ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اوپر سطح سمندر میں خوب دن چمک رہا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ سامنے مجھے جزیرہ ہوگ بے کا ساحل نظر آنے لگا۔ وہ تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا۔

''فائر......'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی بیک وقت ہماری گنز گرجی تھیں۔ گولیوں کی تڑابڑی کی سمع خراش آوازیں ابھریں اور ہم سے کوئی لگ بھگ پندرہ بیس گز کے فاصلے پر تیرتی ہوئی راکسول کی آبدوز میں اَن گنت سوراخ بن گئے، ہم نے فائرنگ کا سلسلہ موقوف کردیا۔

راکسول کی آبدوز ایک بار پھر ڈوبنے لگی لیکن میں جانتا تھا کہ اب کیا ہونے والا ہے اور وہی ہوا۔

ایک سماعت شکن دھماکے سے وہ کیپسول آبدوز پھٹی اور اس میں آگ بھڑک اٹھی۔

''وہ دیکھو...... کوئی بوٹ ہماری جانب بڑھ رہی ہے۔'' اچانک شکیلہ نے چلّا کر ایک جانب سمندر میں اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ کبیل دادا اور میں نے بیک وقت اس طرف گردن موڑ کر دیکھا، یہ مذکورہ جزیرے کا شمال مغربی حصے کا ساحل تھا، اسی طرف سے...... ایک بڑی سی بوٹ خاصی تیز رفتاری کے ساتھ جیسے اڑی چلی آ رہی تھی۔

راکسول نے یقیناً ہمیں اپنے تعاقب میں آتا دیکھ کر خطرہ بھانپتے ہی جزیرے والوں سے کسی طرح لاسلکی رابطہ کیا ہوگا لیکن اسے اب دیر ہو چکی تھی۔

یقیناً موٹر بوٹ والوں نے راکسول کی آبدوز تباہ ہوتے دیکھ لیا تھا اور بھانپ لیا تھا کہ یہ دوسری آبدوز یعنی ہماری ہی کارستانی ہو سکتی ہے۔

انہوں نے وہیں سے ہی ہم پر ایک راکٹ فائر کر ڈالا۔ اپنی ٹیل سے گاڑھے اور کثیف دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا راکٹ ہماری جانب بڑھا چلا آ رہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں چلّایا اور دوسرے ہی لمحے میں نے ایک لیور کھینچ کر خول اوپر سے برابر کردیا، اس کے بعد آبدوز کو گہرائی میں لے جانے والا لیور دبایا، مگر شاید اب ہمیں بھی دیر ہو چکی تھی۔

ایک لرزہ خیز دھماکا ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم جلتے سلگتے انگاروں سے بھر گیا ہو۔

اسی دوران میں کبیل دادا اور شکیلہ کی بھی اذیت ناک چیخیں سنائی دی تھیں۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا تھا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

ادھوری عورت

منظر امام

بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کو سمجھتے ہیں... خاص طور پر محبت کے جذبے کو... کچھ لوگ واقعی میں محبت کے دشمن ہوتے ہیں... ان سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ دو محبت کرنے والے چاہت و الفت کے باغیچے میں سکون و آشتی سے یک جاں رہیں... ایک ایسی ہی دل گداز کہانی... جس میں اچانک ہی ایک عفریت آگیا تھا...

کہانی لکھنے اور اس کے رموز سے آگاہ کرتی ادھوری کہانی......

وہ ایک مختلف خاتون تھیں۔ نوجوان سی، نازک...... خوبصورت۔ سب ان سے پیار کیا کرتے تھے۔ وہ ہماری لٹریچر کی ٹیچر تھیں۔ اردو ادب پڑھایا کرتیں۔ بولنے کا انداز بھی بہت زبردست تھا۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ پڑھاتے وقت صرف نصاب تک نہیں رہتی تھیں۔ بلکہ دنیا بھر کے واقعات بھی سنایا کرتیں۔ جن سے ان کے لیکچر میں جان پڑ جاتی تھی۔

ان کا نام جویریہ تھا۔

قسط :66

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مقدس کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کی دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کھیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کھیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحب کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا۔ زہرہ بانو، جنگی شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ چلتے چلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا ڈپٹی چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ جے پی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے جنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے پی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیک شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ ہاسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری حد پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ ایک تو وہ [illegible] سانچے والا کو وہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاکرا ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹیکسی کا ایک افسر کرنل سی بی بھوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹیکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کھیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کھیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ ہاسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کو کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مصر اور یورو آفیسر خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ ہاسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیک کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ ٹائیگر ٹیک کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڑیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کو ہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیک سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام محلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ ہشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولوش اور سی بی بھوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کو ہارا کی بوٹ میں بلیو ٹیکسی کے چند ساتھی، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹیکسی کے چیف سی بی بھوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا۔ تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کو ہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل مجبوریوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوپارو اور چند ساتھی حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی بی بھوانی تھا۔ جس ان کی منزل تھی۔ سوہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو ٹیکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو ٹیکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی بی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی بی بھوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا کہ اسے

باہر نکلتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے شکنجے میں تھے اور کالا پانی "انڈمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی ٹھٹک رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی بی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "گل مہجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک طراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی بی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناتا شکور سے ہوتی ہے، جو بستی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناتا شکور، شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناتا شکور کے ہمراہ گل مہجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناتا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جزائر کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہر بجھے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناتا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ باپ بیٹی کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے۔ پھر [illegible] انڈمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں گل مہجار دین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب طراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے گل مہجار دین سے مل کر جاروا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاروا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور طراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت طراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچ کر زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوی ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوی ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سوہنیریں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ہاشمی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سوہنیریں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ہاشمی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوہنیریں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا ہے مگر رینجرز کی اسپیشل ٹاسک فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر نسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ میجر نسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ تو یہ سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر لولوش کو لا لونا کے قبضے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سائچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے جو کاساپوکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے وہ اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاساپوکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاساپوکو شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور مقامی سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاساپوکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈالف کے ساتھ امریکا روانہ ہوتا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈالف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈالف مارا جاتا ہے۔ روڈالف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو صومالیہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے جہاں شہزی سے دو بدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ہوش میں آنے کی منزل زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی تھی۔

جزیرے کی طرف آنے والی دشمنوں کی موٹر بوٹ سے جو راکٹ فائر ہوا تھا، اس نے ہماری چھوٹی سی آبدوز کو تباہ کر ڈالا تھا۔ ہم بھی زخمی ہو گئے تھے۔

اگرچہ میں نے خول برابر کر دیا تھا، ورنہ تو نجانے ہم زندہ بھی بچتے یا نہیں مگر دشمن کے فائر کیے ہوئے راکٹ نے ہماری آبدوز کو خاصا نقصان پہنچایا تھا بلکہ وہ تباہ ہی ہو گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں اس کے جلتے سلگتے ٹکڑے ہمیں زخمی کر گئے تھے۔

اگرچہ بعد میں فوراً ہی پانی کے منہ اور ناک میں جانے سے ہمیں ہوش آ گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ ہماری بے ہوشی واجبی سی تھی، یا پھر حواس مختل ہوئے تھے، ورنہ تو پانی ایسا ظالم ہے کہ گہری بے ہوشی میں بھی اپنی جگہ بناتا ہوا منہ اور ناک کے ذریعے پھیپھڑوں میں جا گھستا ہے۔

ہوش میں آتے ہی مجھے اپنے زخموں میں ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئی تھیں اور ساتھ ہی میں نے پانی کی مخصوص گھٹن کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ میں پانی کے اندر ہی تھا اور اس کی ہیبت ناک ''بڑبڑاہٹ'' گونجتی سنائی دی۔

میں نے پانی کے دھندلکوں میں دو انسانی وجود اپنے بالکل قریب ہی متحرک دیکھے تب مجھے پتا چلا کہ کسی اور نے میرے وجود کو سنبھالا دیا ہوا ہے اور تیزی سے سطحِ آب کی طرف لیے جا رہا ہے۔

ہم تینوں نے ایک ساتھ ہی اپنے سر پانی کی سطح سے ابھارے تھے اور یک بیک ایک بڑا گہرا کھانستا ہوا سانس لیا تھا۔

جلد ہی قریب دشمنوں کی موٹر بوٹ دکھائی دے گئی، ہماری چھوٹی کشتی کے بھی کچھ ٹکڑے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے نظر آئے۔

''شہزی! ہوش میں ہو نا تم......؟'' کمیل دادا نے مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز کچھ کراہتی ہوئی تھی، مجھے اس کی پیشانی سے خون بہتا ہوا نظر آیا۔ کم و بیش یہی حال شکیلہ کا اور میرا بھی تھا۔

''دشمن ہماری طرف آ رہا ہے۔ پانی میں غوطہ لگاؤ جلدی......'' میں نے جواب میں یہی کہا۔ وہ دونوں بھی میری طرح اپنے حواسوں پر قابو پا چکے تھے۔

ہم نے ڈبکی لگائی ہی تھی کہ فائرنگ ہوئی، کمیل دادا نے ہمیں اپنی پیروی میں ایک جانب تیرتے ہوئے اشارہ کیا۔ بلبلوں اور پانی کے دھندلکوں میں مجھے اس کا ایک ہاتھ مخصوص انداز میں حرکت کرتا نظر آ گیا تھا۔

اس نے شاید پانی کی سطح پر اندر ڈبکی لگانے سے پہلے کچھ دیکھا تھا۔ میں اور شکیلہ تیزی سے اس کی تقلید میں تیرتے چلے گئے۔

دفعتاً مجھے لگا جیسے میری بائیں ران میں کوئی گرم انگارا سلاخ اتار دی گئی ہو، پانی کے اندر چیخنا یا کراہ لینا تک محال تھا مگر میں بھی انسان تھا، اس اچانک اذیت پر غیر ارادی طور پر میرا منہ چیخنے اور کراہنے کے لیے کھلا ہی تھا کہ بہت سا پانی منہ میں چلا گیا، میرا دم گھٹنے لگا، دہری اذیت نے مجھے مزید نڈھال کر دیا۔

دشمن کے فائر کیے گئے برسٹ سے شاید کوئی بھولی بھٹکی گولی میرے آن لگی تھی۔ میرا تیرنا موقوف ہوا اور میں گہرائیوں میں جانے لگا تو شکیلہ جو میرے پیچھے تیرتی آ رہی تھی۔ میری حالت بھانپتے ہی وہ میری جانب بڑھی تھی اور پھر بس مجھے اتنا ہی ہوش رہا تھا کہ اس نے میرے پانی کے اندر ڈوبتے وجود کو تھامنے اور سنبھالا دینے کی کوشش کرنی چاہی تھی۔

پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا......

☆☆☆

آنکھ کھلنے پر مجھے کھانسی کا ٹھسکا لگا تھا اور بہت سا پانی میرے منہ سے نکلا۔ تب ہی میں نے کمیل دادا کو خود پر جھکے پایا، اس نے یقیناً ''ماؤتھ ٹو ماؤتھ'' بریدنگ (عملِ تنفس) کے ذریعے اور شکیلہ نے میرے سینے اور پیٹ پر دباؤ ڈال کر یہ فرسٹ ایڈ کا عمل کیا تھا۔

جب میں کچھ ہوش و حواس میں آیا تو ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ سہ پہر سے تھوڑا آگے کا وقت ہو چلا تھا۔ فضا کا ماحول مجھے ملگجا سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے خود کو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ میں پڑے پایا تھا۔

''خدا کا شکر ہے شہزی! تمہیں ہوش آ گیا۔'' شکیلہ کی بے اختیار مسرت بھری آواز سنائی دی۔ میں نے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اب گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ دفعتاً میری کوئی تکلیف بھی جاگ پڑی اور ایک بار پھر میں کراہ کر رہ گیا۔

شکیلہ اب میری ران کے زخم کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمیل دادا نے اپنی شرٹ پھاڑ کر اس کی پٹی بنائی اور زخم پر لپیٹ دی۔

''اسی تکلیف کے سبب میں بے حال ہوا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''بے اختیار چیخنے کے لیے میں نے منہ کھول دیا تھا اور پانی......'' میں جملہ مکمل کیے بغیر ہانپ کر رہ گیا۔ تب ہی کمیل دادا بولا۔

''یہ تو شکیلہ کی تم پر نگاہ پڑ گئی تھی، اس نے تمہیں زیرِ آب ہوتے ہی بھانپ لیا تھا کہ تم کسی مشکل سے دوچار ہو، ورنہ تو میں تیرتا ہوا آگے ہی نکل گیا تھا۔''

''ہم کہاں ہیں؟''

''ہوگا یہ کے کسی ویران ساحل پر......'' وہ بولا۔

''مگر دشمن تو ہمارے تعاقب میں تھے؟''

''ہم انہیں جُل دینے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ وہ آگے کہیں نکل گئے ہیں، اپنی موٹر بوٹ سمیت......''

''اوہ......'' میرے منہ سے بے اختیار کچھ طمانیت بھری سانس خارج ہوئی پھر مجھے اپنے زخم کی فکر لاحق ہوئی۔ میں نے شکیلہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے زخم کی نوعیت کے بارے میں پوچھا۔

''گولی اندر ہی ہے مگر شکر ہے کہ زیادہ گہرائی میں نہیں گئی۔ چاقو گرم کر کے نکالی جا سکتی ہے۔'' شکیلہ نے یوں کہا جیسے کوئی ماہر سرجن ہو۔

''ویسے یہ کمیل دادا کی چابک دستی اور بیدار مغزی کا ہی کمال ہے کہ اس نے ٹھیک وقت پر پانی کے اندر درست مقام کا اندازہ لگا لیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر کمیل دادا کی طرف توصیفی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

''ہاں! میں خود بھی حیران ہوا تھا۔'' میں نے بھی اس کی تائید کی۔ ''کمیل دادا کو اس نازک وقت میں ایسا کیا نظر آ گیا تھا۔''

اپنی تعریف سے بے نیاز کمیل دادا اطراف کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے عام سے انداز میں بولا۔

''کوئی زیادہ بڑی بات نہیں...... جس وقت دشمنوں کی موٹر بوٹ تعاقب میں تھی، اس وقت تم دونوں کی توجہ شاید متعاقب دشمنوں کی بوٹ کی طرف تھی جبکہ مجھے جزیرے کے ایک ساحل کی طرف سے آتی ہوئی پٹی سی سیاہ لکیر کی صورت میں نظر آئی تھی۔ جس وقت راکٹ ہماری کشتی کو لگا، میں پٹی کی ڈائریکشن ذہن میں رکھ چکا تھا۔ تاہم پانی کے اندر معاملہ کچھ اور تھا، تب بھی میں نے ایک خطرناک رسک لیتے ہوئے اپنا سر لمحہ بھر کے لیے اسی ڈائریکشن کی طے شدہ سمت کو دیکھنے کے لیے ابھارا تھا، دشمنوں کی فائرنگ سے پہلے ہی میں پانی کے اندر دوبارہ غوطہ لگا چکا تھا۔''

''اِکسی لینٹ دادا......!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اب یہاں سے نکلنے کی کرو۔ تم چل سکتے ہو نا؟'' کمیل دادا نے پوچھا۔

''کوشش کرتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں نے کھڑا ہونا چاہا، شکیلہ نے مجھے سہارا دیا۔ کمیل دادا دوبارہ گرد و پیش کا جائزہ لینے میں محو ہو گیا۔

ران میں گولی لگنے کے سبب میں لڑکھڑا کر اور سہارے کے ساتھ ہی چل پاتا۔ مجھے اس نازک اور فیصلہ کن گھڑیوں میں اپنے اس طرح زخمی ہو کر معذور بن جانے کا شدید قلق ہو رہا تھا۔

بہرکیف میں نے اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر بغیر سہارے کے چلنا چاہا تھا بس ایک ڈر تھا کہ لبِ بام ڈھے نہ جاؤں، میں نے بغیر سہارے کے قدم اٹھانے کی کوشش چاہی تھی کہ گرنے لگا، شکیلہ نے فوراً مجھے سنبھالا دیا۔ میرا چہرہ مایوسی سے بھر گیا۔ شکیلہ نے میرے چہرے کے تاثرات تاڑ لیے، وہ حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

''نہیں شہزی! ہمت مت ہارنا۔ حوصلہ رکھو۔ کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر میں خود گولی نکالوں گی، ایک شکاری خنجر میری پنڈلی سے بندھا ہوا ہے۔''

''اور ایک عدد لائٹر اور ماچس میرے پاس ہے۔'' درمیان میں دادا نے لقمہ دیا۔

''تب پھر یقیناً تمہارے پاس سگریٹ بھی ہو گی۔'' شکیلہ ازراہِ تفنن بولی۔ میں مسکرایا۔

''وہ بھی ہے میرے پاس... آدھا پیکٹ۔'' کمیل دادا گویا برجستہ بولا۔

''اوہ......کیا واقعی؟ یا مذاق کر رہے ہو......؟''

''دشمنوں کی لاشوں سے ہتھیار کھوتے (اٹھاتے) وقت ایک کی جیب سے سگریٹ کی ڈبی بھی جھانک رہی تھی اور لائٹر بھی، مالِ غنیمت میں اسے بھی میں نے حلال جان کر اچک لیا۔'' کہتے ہوئے اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال لی۔

ہم تینوں نے کمیل دادا کی دا [illegible] داد کے ساتھ اس میں سے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگے۔

میں تو کبھی کبھار ہی پیتا ہوں مگر کمیل دادا اور شکیلہ رسیا لگ رہے تھے۔

یہاں تھوڑا استانے کے بعد ہم پھر آگے بڑھ گئے۔ ایک اور نسبتاً زیادہ محفوظ مقام پر آ کر ہم ٹھہر گئے۔ اس بار

کچھ حالت سنبھلتے ہی میں نے خود ہی اپنے زخم کا جائزہ لیا تب تک شکیلہ اپنے شکاری چاقو کی نوک لائٹر پر گرم کر چکی تھی۔

’’تیار ہو شہزی؟‘‘ اچھی طرح گرم کرنے کے بعد اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

’’ہاں!‘‘ کہتے ہوئے میں نے اپنے منہ میں کپڑے کا کوئی ٹکڑا ٹھونس لیا، کھیل دادا نے مجھے تھام لیا تھا۔ شکیلہ نے چاقو میرے زخم میں گھونپ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری جان نکل گئی ہو، دماغ میں تکلیف کی ضرب کسی ہتھوڑے کی طرح لگی تھی اور درد جیسے پھٹنے کے قریب ہو گیا تھا۔ شکر تھا کہ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، ورنہ میری چیخ یقیناً لولوش (بشرطیکہ کے زندہ تھا) یا لوکہارٹ تک تو ضرور پہنچ جاتی تھی۔

آج مجھے درد اور چیخ کا تعلق معلوم ہوا تھا کہ چیخ کس قدر درد کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ کیونکہ میری چیخ گھٹنے سے مجھے اور زیادہ اذیت کا احساس ہوا تھا۔

مجھے اپنا چہرہ ہی نہیں بلکہ پورا جسم تک پسینے میں شرابور محسوس ہونے لگا۔

شکیلہ نے گولی نکال لی تھی۔

’’شکر ہے خدا کا، نکل گئی . . . زیادہ اندر ہوتی تو یہ کام مشکل ہو جاتا.....‘‘ ذرا ہی دیر بعد اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

’’اس پر پٹی باندھ دو جلدی اب..... خون بہے جا رہا ہے۔‘‘ کھیل دادا نے کہا۔

’’میں وہی کرنے لگی ہوں۔‘‘ وہ بولی اور پھر میرے زخم پر کپڑے ہی کی دھجی سے پٹی بنا کر باندھ دی۔

’’خدا کرے یہ بدذات شیطان لولوش مر گیا ہو۔‘‘ شکیلہ نے تبصرہ کیا۔

’’اس میں بھلا کیا شک ہے کہ اس مردود کو موت کے گھاٹ اتارنے کا جو سنہری موقع اپنے شہزی کو ملا تھا، وہ اس نے ضائع نہیں کیا۔‘‘ کھیل دادا، شکیلہ کے تبصرے کے جواب میں بولا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

’’شہزی! اس انگوٹھی والے ہتھیار کی ہلاکت خیزی سے تم ہی اچھی طرح واقف ہو، کیا سمجھتے ہو، لولوش زندہ ہوگا اب تک.....؟‘‘

’’اس ہتھیار کو لولوش پر آزمانے کے بعد میں..... خود بھی اسی پر غور کر رہا ہوں۔‘‘ میں نے کچھ گہری سانسیں لینے کے بعد کہا۔ ’’اور اب تک میں نے اس انگوٹھی سے جتنے بھی شکار کیے ہیں، انہیں کہیں لے جانے کا تو کیا سنبھالا دینے کا بھی موقع نہ ملا تھا۔ وہ فوراً ہی ہلاک ہو گئے تھے۔‘‘

’’تو پھر تم کیا سمجھتے ہو شہزی؟ کیا وہ منحوس اب بھی زندہ بچا ہوگا؟‘‘ شکیلہ نے پوچھا۔

’’انگوٹھی کا مہلک ہتھیار لولوش پر آزمانے کے بعد مجھے اس بات کی پوری توقع تھی کہ وہ اب زندہ نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے پُرغور سے انداز میں کہا۔ ’’لیکن..... اس وقت میں اپنی قطار میں جا کر بہ غور یہ سب دیکھ رہا تھا جب لولوش کے گرتے ہی لوکہارٹ اسے سنبھالا دے رہا تھا تو لولوش کی حالت خطرے میں ہی تھی مگر اس کے منہ یا ناک سے خون بہتے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ اس انگوٹھی کے زہر کو آزمانے کے بعد ہی ناک اور منہ سے خون لکیر کی صورت میں بہنا شروع کر دیتا تھا۔ یہی اصل زہر کی تاثیر ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہیں اس بدبخت نے کوئی خاص قسم کا ’’اینٹی ڈوٹس‘‘ پہلے ہی سے لے رکھا ہوگا۔‘‘

’’یا پھر .....‘‘ اچانک درمیان میں کھیل دادا اسرار بھرے لہجے میں بولا۔ ’’میں بتا دوں.....؟‘‘

اس کی ڈرامائی سی بات پر میں اور شکیلہ چونک کر اس کی طرف تکنے لگے۔

کھیل دادا بہت کم مسکراتا تھا، لیکن جب مسکراتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی گہری بات کہنے والا تھا۔ بولا۔

’’لولوش جیسا آدمی زہر خوردہ ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کی نشے کی شدت اس قدر بڑھ جاتی ہے تو وہ خود کو زہریلے بچھو یا سانپ سے ڈسوانا شروع کر دیتے ہیں۔‘‘

’’اہم .....‘‘ میں نے غور کرنے والے انداز میں ایک ہنکاری بھری۔ ’’اس نشے کی ابتدا مغرب اور ایشیا میں انڈیا/راجستھان سے ہوئی ہے۔‘‘

’’اگر ایسا ہے بھی تو مجھے نہیں لگتا کہ لولوش مرا ہوگا تو بھلا چنگا بھی نہیں ہوگا۔‘‘ شکیلہ نے نجانے کس خیال سے یہ کہا تھا کہ میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اس نے روا روی میں سہی مگر بات پتے کی کہی تھی جو عقل تسلیم کر رہی تھی۔

’’تمہارا خیال ہے حقیقت کے بے حد قریب ہے شکیلہ!‘‘ میں نے اس سے توصیفی لہجے میں کہا اور کھیل دادا کی بھی تعریف میں کہا۔ ’’اور..... دادا! تم نے جو تاویل دی ہے، اسے بھی جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لولوش جو ان کا نمبر ماسٹر ہے، وہ بستر علالت یا مرگ پر ہے، ان لوگوں کو اپنی پڑ چکی ہے۔ ہمیں اب جلد سے جلد اس اہم مشن کے آخری حصے کو نمٹا دینا چاہیے، کہیں تساہل یا زیادہ لمبی

انتباہ

ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ’’آفیشل پیج‘‘ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تا کہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اور کہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کر کے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کر رہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کر دیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

PREVENTION OF ELECTRONIC CRIMES ACT 2016

اور

COPYRIGHT ORDINANCE 1962/2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

چوڑی منصوبہ بندی ہم سے کوئی بڑا اخراج نہ وصول کرلے۔''

مجھے ایک دم جوش چڑھ گیا تھا، ساتھ ایک تشویشناک خیال نے مجھے فکرمند اور پریشان بھی کردیا تھا، بقول گورڈی کے لوکہارٹ بھی کم سفاک اور بے رحم نہ تھا۔ اس سے بڑھ کر وہ خبط الحواس شخص تھا۔ ایسے میں اگر لولوش کو کچھ ہوجاتا تو وہ اس کا انتقام عابدہ سے لینے کی کوشش کرسکتا تھا۔

''کیا ہوا شہزی؟ تم ایک دم پریشان سے نظر آنے لگے؟ خیریت ہے؟'' معاً شکیلہ، جو شاید مجھے سوچتا پاکر میری ہی جانب دیکھ رہی تھی، ایسے تاثرات بھانپتے ہی مستفسر ہوئی۔

میں نے انہیں اپنی پریشانی کا سبب بتادیا۔ وہ بھی فکرمند ہوگئے۔

''رات ذرا مزید گہری ہونے دو...... ہم......'' کھیل دادا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ٹھٹکی ہوئی خاموش سی فضا میں ایک عجیب سی آواز ابھری۔ وہ بولتے بولتے رک گیا، ہم تینوں اس آواز پر چونک گئے، یہ لاسلکی قسم کا شور تھا، جیسے اسپیکر یا مائیک میں گفتگو کرنے سے پہلے ابھرتا ہے۔

''مسٹر شہزی! میں ماسٹر لولوش کا ایک ادنیٰ خادم لوکہارٹ تم سے مخاطب ہوں۔''

یکلخت ہم تینوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ یہ آواز مجھے کسی آسیبی چمگادڑ کی طرح فضا میں گھمبیریاں بھرتی محسوس ہوئی۔ ہم جہاں کے تہاں رہ گئے۔

''مجھے معلوم ہے تم جزیرہ ہوگ بے کے کسی اندھے گوشے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھپے بیٹھے ہو...... اگر میں چاہوں تو تمہیں تمہارے ساتھیوں سمیت وہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہوں لیکن مجھے یہ زحمت گوارا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس لیے کہ...... میں تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔''

اتنا کہنے کے بعد خاموشی چھاگئی۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ کھیل دادا کے چہرے پر ایک سپاٹ سی سنجیدگی کھنڈ آئی تھی۔ ہم تینوں سراپا سماعت بنے ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے۔

ذرا ہی دیر بعد ہی دوبارہ لاسلکی شور ابھرا اور اسی کے درمیان آواز گونجنے لگی تو شور ختم ہوگیا۔ لوکہارٹ کہہ رہا تھا۔

''تم نے جس ہوشیاری کے ساتھ ماسٹر لولوش کو...... دنیا کے ایک خطرناک زہریلے ہتھیار سے موت کے منہ تک پہنچایا ہے، اس ہتھیار سے ہم واقف ہیں، یہ مصر میں ڈارک گرینڈ پیرامائڈ میں مدفن ایک، شمانہ نامی ممی کے کوفن (تابوت) سے تم نے حاصل کیا ہے جس کے حصول کے لیے ہمارا بھی ایک اہم آدمی سے جی کوہارا تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔ ہم تم سے صرف یہ کہتے ہیں کہ...... وہ زہریلا ہتھیار ہمیں درکار ہے، ہمارے ماہر ریسرچر اس کے زہر کی مدد سے اینٹی ڈوٹ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ جسے ماسٹر پر آزمایا جائے گا اور اس کی زندگی بچ جائے گی، وقت کم ہے، اُمید ہے تم سمجھداری کا مظاہرہ کروگے۔ کیونکہ تمہیں بھی یہ حقیقت معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری گرل فرینڈ عابدہ ہمارے قبضے میں ہے۔

یاد رکھو، مسٹر شہزی......! اگر ماسٹر لولوش کو کچھ ہوگیا تو تم تو خیر نہیں بچو گے لیکن میں پہلی فرصت میں عابدہ کو بیدردی سے ہلاک کرڈالوں گا۔ کسی مہم جوئی سے پہلے سوچ لینا یہ وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوگا۔ میں خود بھی اپنے چند آدمیوں کے ساتھ تمہاری تلاش میں نکل رہا ہوں، مگر ڈیل کی صورت ہم لڑائی میں پہل نہیں کریں گے اور نہ تم کروگے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگیوں کی ضمانت بھی درکار ہوگی۔ اسی لیے میں خود آکر تم سے روبرو یہ معاملہ طے کرنا چاہتا ہوں۔ حملے کی صورت میں پھر جنگ کے لیے تیار رہنا۔ مت بھولنا کہ تم اس وقت ماسٹر لولوش کی اسٹیٹ میں موجود ہو اور تم پر قابو پانا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں، لیکن ہم صرف وقت بچانا چاہتے ہیں، لڑائی میں وقت ضائع ہوگا اور ہم دونوں کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ اوکے اینڈ آل......''

تیز سی لاسلکی گونج ابھری اور آواز کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ہمیں ایک پُرغور سی چپ لگ گئی مگر میرا دل اس مردود لوکہارٹ کی بات اور اس میں چھپی دھمکی پر دہل کر رہ گیا تھا۔ عابدہ بہرحال ان کے قبضے میں تھی اور لولوش واصلِ جہنم ہونے والا تھا، جبکہ لوکہارٹ...... انتقام کے لیے اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ واقعی وہ اس صورت میں جلاد ثابت ہوسکتا تھا۔

''ہوشیار باشد......! یہ دغابازی کررہا ہے ہمارے ساتھ......'' ذرا دیر کی پُرغور خاموشی کے بعد کھیل دادا نے سرسراتی آواز میں کہا۔

''سو فیصد یہی بات ہے۔'' شکیلہ بھی اس کی تائید میں ایک دم بولی۔ مجھے چپ سی لگی ہوئی تھی پھر دادا نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہزی! اب بالکل بھی سوچنے کا وقت نہیں رہا ہے۔''

''کیا تمہیں لوکہارٹ کی بات پر غور نہیں کرنا چاہیے؟'' میں نے یوں کہا جیسے میرے اندر کوئی اور بول رہا ہو۔ میں ابھی تک ایک بے چین سی تشویش تلے گم صم سا ہوکر رہ گیا تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو شہزی؟'' شکیلہ میری طرف دیکھ کر بول پڑی۔ ''کیا تمہیں لوکہارٹ کی بدنیتی کا اندازہ نہیں ہو پایا؟ وہ گیم کھیل رہا ہے۔''

''ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے شہزی! لیکن لوکہارٹ چالاکی چل......'' کھیل دادا نے کہنا چاہا تو میں نے ایک دم اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔

''میں سب سمجھ رہا ہوں۔ ایک زمانہ بیت چکا میرا ان وحشی دشمنوں سے لڑتے ہوئے۔ لوکہارٹ کو ذرا اپنی کمین گاہ سے باہر نکلنے دو۔ جبکہ ہم لولوش کے ٹھکانے تک اپنی پیش قدمی جاری رکھیں گے۔''

میری بات پر وہ دونوں مطمئن ہوگئے۔ وہ شاید سمجھے تھے کہ میں جواب میں لوکہارٹ سے کونسی گیم کھیلنا چاہ رہا تھا۔

ہم آگے بڑھے۔ شکیلہ نے ہنوز مجھے سہارا دیا ہوا تھا۔ ہم نہتے تھے۔ دشمنوں کی لاشوں سے جو ہتھیار ملے تھے، وہ کام آچکے تھے اور اب خالی لوہے کے سوا ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔

جنگل بہت گھنا تھا مگر زیادہ طویل محسوس نہیں ہوتا تھا۔ رات کی تاریکی اب چہار اطراف میں پھیل چکی تھی۔

چلتے چلتے میں کوشش کرتا تھا کہ شکیلہ کے سہارے کے بغیر آگے بڑھ سکوں...... چونکہ ہڈی زد میں نہیں آئی تھی، اس لیے میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ تاہم زخم اور درد تھا۔

ان فیصلہ کن گھڑیوں میں میرا یوں زخمی ہونا ٹھیک نہیں تھا لیکن میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور نہ ہی یہ کام مجھے آتا تھا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ جنگل کا سلسلہ جلد ہی اختتام پذیر ہوا اور اس کی جگہ گھاس کے میدان نے لے لی۔ ہم آگے بڑھتے رہے۔

اس بدنصیب جوڑے گورڈی اور ایلونورا سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق جزیرے کے وسطی شمالی سمت میں لولوش کا ایک بڑا کیسل نما ٹھکانا تھا۔ جس کا زمین دوز واسطہ جزیرے کے سمندر سے بھی تھا۔ اس کیسل کو گولڈ گوسٹ مینشن کا نام دیا گیا تھا۔

ہم تیزی سے اسی سمت میں بڑھتے رہے۔ گھاس کا میدان ختم ہوا تو پہاڑی نما ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ابھی ہم بہ مشکل چند فرلانگ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئے۔

ہمیں سامنے ایک مچان سی بنی نظر آئی۔ وہاں ہلکی روشنی تھی اور...... مچان کسی درخت پر نہیں بلکہ سیمنٹ کے چار پلرز پر زمین سے تقریباً پندرہ سولہ فٹ بلندی پر تھی۔ اس کے نیچے ایک کھپریل کا کاٹیج نظر آرہا تھا، جو بادی النظر میں کسی چوکی کا ہی نقشہ پیش کررہا تھا۔

ہم چھپتے چھپاتے وہاں تک جا پہنچے تو ہمیں وہاں ایک بغیر ہڈ کے جیپ کھڑی نظر آئی، جس کے قریب چست لباس میں ملبوس تین چار ہتھیار بند افراد نظر آرہے تھے۔ ان کے لباس سے مخصوص قسم کی وردیوں کا ہی گمان ہوتا تھا۔ ان میں سے ایک جیپ کے قریب کھڑا اس کے وائرلیس سیٹ پر کسی سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ یہ ایک ٹھگنے سے قد کاٹھ مگر گٹھی ہوئی مضبوط جسامت کا آدمی تھا۔ اس کی وردی زیادہ رعب دار معلوم ہوتی تھی۔

اس طرف تو آدم جھاڑیاں تھیں۔ مگر یہ سلسلہ مختصر تھا۔ میں نے کچھ سوچ کر کھیل دادا اور شکیلہ کو وہیں رکے رہنے کا اشارہ کیا اور خود پیٹ اور کہنیوں کے بل پر ان کے قریب جا پہنچا۔

یہاں میں بلاشبہ ایک سنگین خطرے کی زد میں تھا۔ میری موجودگی کا ذرا سا بھی شبہ ہونے پر وہ...... مجھے گولیوں سے بھون کر رکھ دیتے اور یہی ان کا اولین مقصد بھی تھا، کیونکہ لوکہارٹ نے واقعی مجھے مکاری سے بلف کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ وہ ڈیل کی آڑ میں مجھے اپنے روبرو کرنا چاہتا تھا اور پھر مجھے اس نے اتنا ہی ''بھولا کا'' سمجھا ہوا تھا کہ میں اس کی چال میں آجاؤں گا، کیونکہ میں تو خود اس وقت خونخوار بھیڑیوں کی کچھار میں تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کوئی بات کرنے کے بجائے چیر پھاڑ ڈالنے کی کوشش کرتے......

میں نے اس ٹھگنے آدمی کی آواز پر اپنے کان لگا دیے۔ وہ کسی سے کوئی ہدایت لے رہا تھا اور اپنی رپورٹ پیش کررہا تھا۔

''یس، فادر! میں گروپ تھری کو پوائنٹ سیون کی جانب روانہ کرچکا ہوں جبکہ نو اور فور، نارتھ اور ویسٹ کی طرف جاچکے ہیں۔ میں خود......'' یہ بتاتے ہوئے وہ اچانک رکا۔ کیونکہ شاید دوسری جانب سے اسے کچھ کہا گیا تھا۔

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس کی باتوں پر کان لگائے جھاڑی زدہ زمین سے لگا لیٹا ہوا تھا۔

''فادر'' کے ذکر پر میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ لوکہارٹ سے ہی مخاطب تھا۔

''یس فادر! میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ پوائنٹ ون پر موجود ہوں اور آپ سے ہدایت کا منتظر بھی...... اوہ...... میرا نہیں خیال کہ وہ لوگ پوائنٹ بلیک کا رخ کر پائیں گے، گولڈ کاسٹ مینشن میں داخل ہونا اتنا آسان نہیں کہ...... او...... سس...... سوری فادر!...... سوری......!'' وہ کہتے ہوئے اچانک گڑبڑایا۔ شاید کسی بات پر اسے دوسری جانب سے لوکہارٹ نے بُری طرح جھاڑا تھا۔ وہ بات مجھے کھٹک گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ ''پوائنٹ بلیک'' کوئی ایسا مقام تھا جہاں سے کسی گولڈ کوسٹ مینشن میں داخل ہونے کا امکان پایا جا سکتا تھا۔ انہیں ہم سے کسی بات کا زیادہ خطرہ تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''اوکے فادر! میں پھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پوائنٹ بلیک کی طرف ہی پہرا لگوا دیتا ہوں۔ باقی راستے ان کے لیے خطرناک پھندا ہی ثابت ہو سکتے ہیں سوائے پوائنٹ بلیک کے...... آپ نے بالکل درست کہا۔''

اس مفید معلومات پر میرے کان کھڑے ہو چکے تھے۔ میں مزید وقت ضائع کیے بغیر پلٹا۔ ساتھیوں کے پاس آکر یہ بتایا تو ان کے چہرے بھی جوش کامیابی سے سرخ ہو گئے۔

''اس کا مطلب ہے دیگر راستوں سے ہم جاتے تو بے خبری میں مارے جاتے؟'' شکیلہ ہونٹ سکیڑ کر بولی۔

''اور اب پوائنٹ بلیک ہی ہمارے لیے زیادہ سودمند رہے گا، جہاں یہ لوگ جا رہے ہیں مگر ہم جائیں گے کیسے......؟'' کمیل دادا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ہمیں جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہ روانہ ہو گئی۔

میں جانتا تھا کہ نئی ہدایت کے مطابق...... یہ لوگ پوائنٹ بلیک کی طرف ہی نکلے ہیں جہاں انہیں ہمارے ''درانداز'' ہونے کا زیادہ خطرہ تھا۔

''ہم ان کا تعاقب کیسے کریں اب؟'' شکیلہ بولی۔

''ٹائر کے نشانات ہماری رہنمائی کریں گے۔'' کمیل دادا گمبھیر لہجے میں بولا۔

گاڑی میں چار افراد روانہ ہوئے تھے۔ باقی دو مسلح افراد ویسٹ کی مچان میں ہی تھے۔

''لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک اور کام نمٹانا ہوگا۔'' کمیل دادا نے جیسے اپنی بات مکمل کی۔

''کیسا کام؟''

''ہم نہتے ہیں۔ مچان کی طرف دیکھو، وہاں دو مسلح دشمن موجود ہیں۔ یقیناً اندر اسلحہ بھی ہوگا۔ اس کے بغیر ہمارا پوائنٹ بلیک کی جانب جانا بے وقوفی ہوگی۔''

کمیل دادا نے ایک اہم بات سمجھائی تھی۔ ہم نے مچان پر گوریلا کارروائی کرنے کا مصمم ارادہ باندھ لیا۔

''یہ کام بہت ہی خاموشی اور بغیر کسی شور کے انجام دینا ہوگا۔'' میں نے جارحانہ پیش قدمی سے پہلے انہیں سمجھایا۔ ''یہاں ہونے والی گڑبڑ دشمنوں کو ہماری طرف سے خبردار کر سکتی ہے۔''

میری ہدایت پر کمیل دادا اور شکیلہ نے اپنے سر اثبات میں ہلا دیے۔

پھر ہم دو مختلف سمتوں میں نہایت گربہ قدمی کے ساتھ آگے بڑھے اور ان پر دو طرف سے یک بیک ہلا بول دیا۔

کمیل دادا نے ایک منصوبے کے مطابق ایک ہی ہلے میں اپنے شکار کو بچھاڑ دیا جبکہ شکیلہ اور میں نے اپنے شکار پر جھپٹتے ہی اسے بے بس کر دیا۔ کمیل دادا تو اپنے شکار کی گردن توڑ چکا تھا جبکہ ہمارا شکار صرف بے ہوش ہوا تھا، اسے رسیوں سے جکڑ کر ہم نے وہیں چھوڑا اور ان کے ہتھیار قبضے میں کر کے آگے بڑھ گئے۔

ہم تینوں دوسری جانب سے گھوم کر اسی سمت کی طرف تیزی سے بڑھے جہاں سے ان کی جیپ روانہ ہوئی تھی۔

کمیل دادا کا خیال سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ گھاس اور جھاڑی زدہ زمین پر پھیلی مٹی پر جیپ کے مخصوص چوڑے ٹائروں کے نشانات دور تک چلے گئے تھے۔

مہربان تقدیر بدستور میرا ساتھ دے رہی تھی۔ لولوڈش کی اصل کمین گاہ (جو عابدہ کا قید خانہ بھی تھی) کی طرف جانے والا وہ راستہ جو دیگر راستوں کی بہ نسبت زیادہ آسان اور کم خطرناک تھا، اس کی ہمیں بھنک پڑ گئی تھی، اگرچہ اس میں کافی حد تک میری بیدار مغزی کا بھی دخل تھا، کیونکہ اگر میں اپنی جان پر رسک لے کر ان کی مچان کے قریب نہ جاتا اور یہ نہ بھانپ پاتا کہ وہ شخص ضرور کسی سے اہم گفتگو کے دوران رپورٹنگ میں مصروف ہے تو ہمیں کیا پتا چلتا؟

یوں دیگر خطرناک راستوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بجائے ہمیں درست سمت کا پتا چل چکا تھا۔

جزیرے کی یہ رات اپنے پورے جوبن پر تھی۔ آسمان صاف تھا اور روشن تارے ٹکے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ یہ پورے چاند کی رات محسوس ہوتی تھی، جس کی روشنی چہار اطراف ماحول پر ایک طلسماتی اثر طاری کیے ہوئے تھی۔

گاڑی اگرچہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی لیکن اس کے انجن کی مخصوص ''گھوں...... گھوں'' بہ غور سننے پر ہماری سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ابھی قریب ہی تھی اور جس راستے پر گامزن تھی، وہ کچھ دشوار گزار تھا مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کی آواز آنا بند ہو گئی۔

جس کا مطلب تھا کہ وہ رفتار بڑھا کر آگے جا چکی ہے۔ ہم بدستور دشمنوں کی جیپ کے ٹائروں کے نشانات پر محتاط انداز میں آگے بڑھتے رہے۔

یہ سمت یا راستہ بلاشبہ پیدل چلنے والوں کے لیے تو اتنا مشکل نہ تھا البتہ ایک گاڑی کے لیے دشوار گزار ضرور تھا۔

تھوڑی دیر اور چلے ہوں گے کہ ہمیں جیپ کے دور نکل جانے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ یہاں راستہ نسبتاً کھلا اور کچھ میدانی ہو چلا تھا۔ البتہ اب ہمارے دائیں بائیں جنگل جھاڑیاں اور چھتنار پیڑوں کی بہتات بدستور موجود تھی۔

ہم آگے بڑھتے رہے۔ اس راستے کو ہم نے لگ بھگ کوئی نصف گھنٹے کے اندر پاٹ ڈالا تو سامنے طباق چاند کی روشنی میں پہاڑیوں کی سیلی سیلی چوٹیاں نظر آئیں اور ساتھ ہی ایک مخصوص آواز کانوں سے ٹکرائی جو موجوں کی روانی اور اس کے مدھر شور سے مشابہ تھی۔

''ہم منزل کے قریب پہنچنے والے ہیں۔'' دفعتاً ان آوازوں کو سنتے ہی میں نے سرسراتی سرگوشی میں ساتھیوں کو مطلع کیا اور یہ کہنے کے ساتھ ہی میں رک گیا۔ نیچے جھک کر غور سے میں نے ٹائروں کے نشانات دیکھے، وہ دائیں جانب گھوم کر چٹانوں کی طرف چلے گئے تھے اور وہاں سے ایک آگے کو نکلے ہوئے ٹیلے کے نیچے سے دوسری جانب گھوم کر غائب ہو رہے تھے۔

ہم اسی سمت کو بڑھے اور پہلے سے زیادہ چوکنا ہو گئے۔ دوسری جانب سے ابھرتے ہوئے میں نے کسی بھی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، لیکن جب میں نے ذرا سا سر ابھار کر سامنے دیکھا تو یکلخت جیسے رگوں میں لہو کی گردش تیز تر ہو گئی۔

سامنے ساحلِ سمندر کے قریب ہی چٹانی چبوترے کے اوپر سیاہ اور قرمزی پتھروں کے عجیب امتزاج سے بنی بڑی سی قلعہ نما عمارت تھی۔ یہاں پہاڑیوں کا سلسلہ موقوف ہوتا تھا جس کے سبب دو تین پہاڑیوں کا اجتماع سا بنا نظر آتا تھا اور اسی پر یہ عمارت تعمیر کی گئی تھی، جو بلاشبہ لولوڈش کی کمین گاہ ''گولڈ کوسٹ مینشن'' ہی تھی۔

عمارت کی دیواریں سیلن زدہ اور نم آلود فضا کے سبب گیلی گیلی اور چمکتی سی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کا رقبہ ایک اندازے کے مطابق ہزار یارڈز سے کم کا نہیں لگتا تھا جبکہ سیکیورٹی کا نظام سخت نظر آتا تھا۔ میں بہ غور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں دو بڑی گاڑیاں اور ایک جیپ کھڑی نظر آئیں۔ جیپ تو وہی تھی جس کے تعاقب میں ہم یہاں تک پہنچے تھے۔

ان چاروں کے علاوہ پانچ چھ اور بھی مسلح افراد وہاں چوکس کھڑے تھے مگر اس وقت وہ...... جیپ والے مخصوص شخص کے سامنے مؤدبانہ انداز میں کھڑے اس کی ہدایات پر اپنے سر کو جنبش دے رہے تھے۔ کچھ گارڈز بھی مستعد انداز میں پہرا دیتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے کمیل دادا اور شکیلہ کو بھی موقع دیا کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ لیں۔ منزل قریب دیکھ کر ان کے چہروں پر بھی جوش کی سرخی چمکی تھی، جبکہ میں خود ابھی تک گہری نظروں سے گولڈ کوسٹ مینشن کے اطراف اور اس کے سیکیورٹی نظام کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی برقی باڑھ بذاتِ خود سادہ تاروں کے، دو باڑھوں کے درمیان واقع تھی۔ یعنی پہلے سادہ تاروں کی ایک باڑھ اس کے بعد پھر برقی تاروں کی باڑھ۔ سادہ تاروں کی باڑھ حادثات کو روکنے کے لیے لگائی گئی تھی۔ ہر دس فٹ کے بعد ایک تختی لگی تھی۔ جس کے ذریعے لوگوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ درمیانی باڑھ میں برقی رو دوڑ رہی ہے جو خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ غالباً ان سیاحوں کے لیے تھی جو باضابطہ طور پر جزیرے کی سیر کرنے کے لیے آتے ہوں گے اور اس احتمال کے پیشِ نظر کہ کوئی یہاں کا رخ کرے تو جھولتی تختیوں پر درج یہ ''ہدایات'' پڑھ لے۔

اسی طرح یہاں وردی پوش گارڈز اور ٹھاٹھیں مارتے سمندر کے علاوہ ایک اور چیز بھی تھی۔

گورڈی اور ایلورا کے مطابق، مینشن کے گرد الٹراسونک شعاعوں کا ایک غیر مرئی پردہ بھی کھنچا ہوا تھا۔ اس کا انتظام کچھ یوں تھا کہ چار گوشوں میں سے ہر ایک پر بارہ

فٹ اونچا کھمبا نصب تھا، جو ہمیں نظر آ رہے تھے۔ ان کھمبوں سے دونوں جانب الٹراسونک شعاعیں اپنے قریبی کھمبوں کی جانب پھینکی جاتی تھیں اور ہر کھمبا یہ کام کرتا تھا۔

گویا مینشن کے گرد غیر مرئی شعاعوں کا ایک حصار کھینچ دیا گیا تھا۔ اگر کوئی بھی فرد اس حصار سے گزرنے کی کوشش کرتا تو پورے مینشن میں ایک شور قیامت مچ جاتا۔ یہ ایک طرح کا الارم تھا سائرن کی طرح...... جس کے نتیجے میں مینشن کے اندر ہر فرد کو اس مداخلت کا علم ہو جاتا۔

یوں ہر کھمبے کے ساتھ دن رات گارڈز پہرا دیتے رہتے تھے۔ مجھے سمندر کی طرف قائم چوکیاں بھی نظر آ رہی تھیں جہاں پہرے دار دوربین گلے میں لٹکائے موجود تھے۔

ہم تینوں نے مینشن کے اطراف کا نہایت چابک دستی سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس دہری تہری چٹانی چبوترے میں یہ واقع تھا، اس کا ایک حصہ کائی کی خلیج میں واقع تھا۔ یہ سارے انتظامات اتنے زیادہ تھے کہ ایک لمحے کے لیے تو ہم بھی حیران اور پریشان سے رہ گئے کہ ہم ان سب سے بحفاظت کیسے گزریں گے؟ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ میری آنکھوں میں ایک مخصوص سوچ کی چمک ابھر آئی۔ حسب سابق میری عقل سلیم (کامن سینس) نے مجھے غیر مرئی انداز میں ایک ”ٹہوکا“ دیا تھا۔ میں ابھی اس پر غور کر رہا تھا کہ شکیلہ نے سرگوشی میں غصیلا سا تبصرہ کیا۔

”یہ کم بخت لولووش نے اپنے ٹھکانے کو اس قدر مضبوط بنا رکھا ہے جیسے وہ مینشن میں نہیں بلکہ اپنے کسی جنگی قلعے میں محصور ہے۔“ جواب میں کمیل دادا نے مسکرا کر کہا۔

”یہ لاشعور میں چھپے خوف اور بزدلی کو ظاہر کرتا ہے۔“

”اور ایک طرح سے... کمزوری کو بھی۔“ میں نے بھی اسی انداز میں لقمہ دینا ضروری سمجھا۔

”تم دونوں تو نفسیاتی تجزیے میں لگ گئے، اب اندر کیسے داخل ہوا جائے؟“ شکیلہ کچھ چڑ سی گئی۔ مشکل کو دیکھ کر اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔ میں اور کمیل دادا مسکرا دیے۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔ کمیل دادا بھی شاید شکیلہ کی حالت پر موڈ میں آ گیا۔ حالانکہ یہ وتیرہ اس کا نہیں اول نمبر کا تھا۔

”کمال ہے شکیلہ! تم نے تو شہزی کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے۔ تم اتنی جلدی پریشان ہو گئیں؟“

”یہ بات نہیں دادا...!“ شکیلہ نے برا منائے بغیر جھینپی ہوئی مسکراہٹ سے کہا۔ ”دراصل مجھے اندر پہنچنے کی جلدی ہے۔ موجودہ حالات اور لوکھارٹ کی تازہ دھمکی نے مجھے عابدہ کی طرف سے زیادہ فکرمند کر دیا ہے۔“

”شکیلہ کی اس بات سے تو میں بھی ایگری کرتا ہوں دادا...!“ میں نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔ کمیل دادا نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے گویا موضوع کا اختتام کیا اور فوراً ہی یاد دلایا۔

”ہم اس بحث میں بھول رہے ہیں کہ ہمارے پاس پوائنٹ بلینک کا راستہ موجود ہے......“

”میں بھولا نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پوائنٹ بلینک کا راستہ سو فیصدی وہی ہو سکتا ہے جس کے بارے میں کوڈ ورڈز کہنے کی ضرورت کو سمجھا گیا ہے۔“

”کوڈ ورڈ......! کیا مطلب......؟“ شکیلہ نے یک دم میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا... کمیل دادا کی نظریں بھی میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”گولڈ کاسٹ مینشن کا بوٹ ہاؤس...“ میرے منہ سے سرسراتے الفاظ پھسلے۔

”اوہ......تحسین کرو شہزی!“ شکیلہ ایک دم جوش سے بولی۔ ”میرے ذہن میں اس عمارت کو دیکھتے ہی یہ خیال ابھرا تھا کہ اگر مینشن کے زمینی رابطے میں گاڑیاں یہاں موجود تھیں تو یقیناً سمندری رابطے اور سفر کے لیے بھی یہاں ایک عدد بوٹ ہاؤس ضرور ہونا چاہیے تھا۔“ شکیلہ نے بھی فوراً ہی میری بات کی تہ کو چھو لیا۔ کمیل دادا نے بھویں اچکا لیں۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

”یہ بات غور کرنے کے قابل ہے۔“

”غور ہو چکا دادا...! اس طرف آؤ۔“ میں نے کہا۔ میرا رُواں رُواں جوش سے مرتعش ہو رہا تھا۔ اس کامیابی میں اپنی ٹانگ کی تکلیف بھی بھول گیا۔

ہم رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اور خاردار باڑھ، کھمبوں سے پرے پرے ہوتے، کائی کی اس خلیج کے قریب جا پہنچے جہاں سے مینشن کے پچھلے حصے کا نصف دکھائی دیتا تھا۔ یہاں نسبتاً کم روشنی تھی۔ اس طرف ہمیں ایک چوبی پلیٹ فارم نظر آیا جو سمندر کے اندر تک تقریباً ایک میل تک چلا گیا تھا۔ یہاں میں نے ایک تیز رفتار موٹر بوٹ دیکھی جس نے میرے خیال کی تصدیق کر دی تھی۔

چوبی پلیٹ فارم پر بھی ہمیں چار پانچ مسلح افراد گشت کرتے دکھائی دیے۔

”وہ دیکھو......“ میں نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ”یہی ہے وہ پوائنٹ بلینک......“

”یعنی گولڈ کوسٹ مینشن کا بوٹ ہاؤس......“ شکیلہ نے لقمہ دیا۔

”ہاں!“

”ارے وہ دیکھو۔“ معاً کمیل دادا نے بھی اسی جانب اشارے سے کہا۔ ”اس طرف تو گویا موٹر بوٹ گیراج ہے۔“

میری اور شکیلہ کی نظریں اسی سمت تھیں جہاں چوبی پلیٹ فارم مینشن کے اندر ختم ہوتا تھا، وہاں سے ہمیں ایک اور موٹر بوٹ نمودار ہوتی نظر آئی۔

”گڈ! یہی وہ گیراج ہے جس کے ذریعے ہم نے اس مینشن کے اندر داخل ہونا ہے۔“ میں نے جوشیلی آواز میں کہا۔

”لیکن ہمارے سامنے کائی کی موٹی تہ پھیلی ہوئی ہے۔ غور کرو اس پر ذرا......“ کمیل دادا نے متفکر لہجے میں کہا۔ ”کائی کی یہ چادر ہمارے لیے موت کی دلدل بھی ثابت ہو سکتی ہے۔“

”ہم......“ میں نے ہونٹ بھینچے پھر بولا۔ ”شاید اسی کائی کی موجودگی کو دیکھتے ہوئے یہاں سیکیورٹی کا انتظام کچھ زیادہ سخت دیکھنے میں نہیں آتا۔“

”اور...... اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی ہو گی۔“ شکیلہ نے بھی اظہار خیال کیا۔

”مگر ہمیں اسی راستے کی اشد ضرورت ہے۔“ کمیل دادا بولا۔

”آؤ، دوستو! یہاں خطرہ کم ہے، پہلے اچھی طرح اس طرف آس پاس کا جائزہ لے لیں پھر اللہ کا نام لے کر کائی کی دلدل اور پانی میں اترنے کا کوئی لائحہ عمل سوچتے ہیں۔“ بالآخر میں نے ایک گہری ہنکاری بھرتے ہوئے کہا۔ کمیل دادا گمبھیر لہجے میں بولا۔

”میں اس کا حل سوچ چکا ہوں، مگر کام رسکی ہو گا۔“

”رسک لیے بغیر کامیابی ناممکنات میں سے ہوتی ہے دادا! تم بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اگر ہمیں پانی میں اترنے کا کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تو مجبوراً کائی کی اس خطرناک دلدل میں اترنا ہی پڑے گا، اس کا ایک ہی طریقہ میری سمجھ میں آتا ہے کہ ہمیں کائی میں تیرنے کے بجائے اندر ڈبکی لگانی چاہیے۔“

”تم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہو کہ تمہارے خیال میں کائی کے نیچے پانی ہو گا؟“ میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا۔

”ہاں!“

”یہ ضروری نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کائی زدہ حصے میں ایسے آبی پودوں کا ایک جال سا بھی پھیلا ہوتا ہے جسے ماہر اور مخصوص غوطہ خوروں کی زبان میں ”Plant Algae“ کہا جاتا ہے۔ یہ انسان کے گرد لپٹ کر اسے پانی کے اندر ہی بے بس کر دیتا ہے۔ اس صورت میں آدمی پانی کے اندر ہی گھٹ کر مر جاتا ہے۔“

”میں سمجھ رہی ہوں۔“ شکیلہ نے پُرسوچ سی سنجیدگی سے کہا۔ ”ایسا گہرائی میں جانے سے ہو گا لیکن ہم......“

”میں جان چکا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو اور میں اسی طرف آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”خشکی کے راستے مینشن کے اندر جانے میں کئی رکاوٹیں ہیں لیکن سمندر کی طرف سے صرف دو رکاوٹوں کو پار کرنا ہو گا۔ ایک تو وہ گارڈز جو دوربین سے نگرانی کرتے تھے اور دوسرے الٹراسونک شعاعیں، مگر الٹراسونک شعاعوں کا پردہ صرف سطح زمین تک تھا۔ اگر ہم پانی کے اندر سے تیر کر گیراج بوٹ میں داخل ہوں تو الٹراسونک شعاعیں ہمارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح اگر رات کے وقت اندر ہی اندر تیر کر وہاں کا رخ کریں تو دوربین والے گارڈز بھی ہمیں نہیں دیکھ سکتے۔“

”یہ ترکیب بہترین ہے، بس ذرا یہ احتیاط ہو کہ ہم کائی کے اندر گہرائی میں نہ جائیں۔“ شکیلہ بولی۔

”اس کا طریقہ میں بتاتا ہوں......“ کمیل دادا بولا۔ میں اور شکیلہ مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”اس کے لیے ہمیں پہلے جھاڑیوں میں سے کھوکھلی ڈنڈیاں توڑنی پڑیں گی۔“

”اب یہاں ایسی جھاڑیاں کہاں ڈھونڈی جائیں؟“ شکیلہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تو میں روا روی میں کہہ گیا۔“ کمیل دادا نے سر جھٹک کر کہا۔ ”یہ ہمیں ذرا سی محنت کے بعد کسی بھی عام جھاڑیوں سے مل سکتی ہیں۔“

”بالکل صحیح کہا تم نے۔“ میرے منہ سے بے اختیار

برآمد ہوا۔

ہم نے ایسا ہی کیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد تین کھوکھلی نلکیاں ہم اپنے منہ میں دبائے کائی میں اترے، پہلے تھوڑا اچھوکر۔ اس کے بعد ہاتھ اور بازو سے کائی کے اندر کے پانی کی سطح کا جائزہ لیا پھر ایک ساتھ ہی اس میں اتر گئے۔

کائی کی دلدل میں اترتے ہی ہم نے کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ پہلے اِدھر اُدھر بے مقصد تیرتے رہے پھر جب محسوس کیا کہ اب ہم اسی طرح اوپری سطح میں تیر کر اور سرکنڈوں کی کھوکھلیاں منہ میں داب کے، اپنے ٹارگٹ تک پہنچ سکتے ہیں تو میں نے ٹارگٹ کی جانب پیش قدمی کا اشارہ دے دیا۔

ہم تینوں نے اللہ کا نام لیا اور رخ اپنا گولڈ کوسٹ مینشن کے گیراج بوٹ کی جانب کرلیا۔

شکر تھا کہ جہاں سے ہم نے پیش قدمی کی تھی، یہ وہ مقام تھا جو "بلیک پوائنٹ" یعنی گولڈ کوسٹ مینشن کا بوٹ گیراج سے غیر معمولی طور پر نسبتاً زیادہ نزدیک تھا۔

ہم جیسے ہی کائی کی دلدل میں ڈوبے، بڑی ہی تیز اور ناگوار سی بو نے ہمارے دماغ کو ہلا ڈالا۔ مشن اہم تھا اور جذبہ بھی، ان آخری لمحات میں ہم نے ان کی پروا کیے بغیر اپنی عملی حکمت عملی جاری رکھی۔

میں آگے تھا، میرے ساتھ شکیلہ دائیں جانب تھی، جبکہ کھیل دادا ہمارے عقب میں یعنی ٹانگوں کی طرف تھا۔

میری ٹانگ زخمی تھی اور پانی کے اندر وہ بھی کائی زدہ پانی کے اندر، اس کا زخم کھلنے کے ڈر سے شکیلہ نے میرے زخم پر احتیاطاً ایک اور پٹی باندھ دی تھی۔ تاکہ گندہ پانی لگنے سے وہ خراب نہ ہو۔

ہم کامیابی کے ساتھ تیرتے رہے اور ایک اندازے کے مطابق ابھی ہم نے بہ مشکل دس پندرہ منٹ کا ہی فاصلہ اندر ہی اندر طے کیا ہوگا کہ اچانک میں نے شکیلہ کا ہاتھ اپنے بدن کو چھوتے محسوس کیا، یوں جیسے وہ مجھے روکنا چاہ رہی ہو، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس نے مجھے واقعی میں کوئی اشارہ کیا تھا اور مشکل یہ بھی تھی کہ ہم اپنی آنکھیں نہیں کھول سکتے تھے، بغیر ماسک کے یہ کٹھن کام تھا، مگر مجھے یہ کرنا پڑا اور پانی کے دھندلکوں میں، میں نے شکیلہ کے وجود کو کہیں الجھتے پایا۔

آنکھیں کھولنے سے ان میں گدلے سے پانی پڑنے پر جلن محسوس ہوئی مگر معاملہ ایک ساتھی کی جان کا تھا۔ میں اس تکلیف کی پروا کیے بغیر پانی کے اندر ہی ڈبکی لگائی اور شکیلہ کے قریب پہنچا تو دنگ رہ گیا۔

اس کی ٹانگوں کو کائی کے پودوں نے جکڑا ہوا تھا۔ وہ الٹ پلٹ رہی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اس کے منہ سے کھوکھلی نکل گئی ہوگی۔

یوں شکیلہ کی مدد کی صورت میں مجھے بھی پانی کے اندر گہرائی تک جانا پڑتا اور سانس لینے کا مسئلہ میرے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ حبسِ دم کی مشق ہم تینوں کو تھی۔

میں نے غوطہ لگایا اور شکیلہ کی ٹانگوں سے الجھی ہوئی کائی زدہ آبی پودوں سے زور آزمائی میں لگ گیا۔

کھیل دادا کو بھی شبہ ہوا تھا کہ ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوئی ہے لہٰذا وہ بھی مدد کو آگیا تھا۔

بڑی مشکلوں سے شکیلہ کی جان چھڑائی اور ہم اپنی سابقہ پوزیشن میں آگئے۔

اس مہم جوئی کو پایۂ تکمیل تک لانے کے لیے ہمیں پانچ سے دس منٹ اور لگے، اس کے بعد ہم بڑی کامیابی کے ساتھ گولڈکاسٹ مینشن کے بوٹ گیراج تک پہنچ ہی گئے۔

یہاں اندر کی جانب دو مزید بوٹس لنگر انداز تھیں۔

گیراج کا رقبہ کافی بڑا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ یہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی اور مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم ایک جگہ کونے میں دبک کر تھوڑی دیر تک گرد و پیش کی سن گن لیتے رہے کہ کہیں سے کوئی گارڈ یا پہرے دار ادھر متوجہ ہوا ہو۔

ہم اپنی اس مشکل ترین مگر حیرت انگیز طور پر کامیابی پر خود بھی مسرور ہوئے بنا نہ رہ سکے۔ ہماری اپنی جسمانی حالت ابتر ہو رہی تھی۔ وہ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے کائی زدہ جسموں کو مل مل کر سدھاری اور...... قدرے بہتری میں آنے کے بعد ہم نے اپنے دشمن سے کھوئے ہوئے ہتھیاروں کا جائزہ لیا، جو یقینی طور پر واٹر پروف تھے۔ ان کی چالیں درست کیں۔

بلاشبہ اب ہم اپنے بھیڑیا نما دشمنوں کی کچھار میں دراندازہو چکے تھے اور حالات کا تقاضا تھا کہ ہمیں اپنی اس آخری، دیرینہ اور اہم ترین مہم کی ابتدا گوریلا کارروائی سے کرنا تھی۔

ہم تینوں نے ذرا دیر تک بوٹ گیراج کا جائزہ لیا تھا۔ اس میں ایک دروازہ اندر عمارت کے کسی گوشے میں کھلتا محسوس ہوتا تھا، جبکہ . . . مین دروازہ سمندر کی جانب پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا۔

میں اب بہ غور ان دو موٹر بوٹس کا جائزہ لے رہا تھا جو میرے سامنے دائیں بائیں لنگر انداز تھیں۔

"لگ رہا ہے تم ابھی سے ہی اپنے دل میں یہ منصوبہ سوچنے لگے ہو کہ واپسی کے لیے ان میں سے کون سی بوٹ سودمند رہے گی؟" کھیل دادا نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"ہاں، تم نے ٹھیک سمجھا دادا!" میں نے خفیف مسکراہٹ سے کہا اور پھر شکیلہ کو بڑے گیٹ پر ہی محتاط کھڑے رہنے کی ہدایت کی اس کے بعد کھیل دادا کو مخصوص اشارہ کر دیا۔

میں گیراج کے اندرونی دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ بوٹ ہاؤس کا رقبہ خاصا بڑا تھا اور اس کے بیرونی گیٹ سے دائیں بائیں تقریباً آٹھ فٹ کی کنکریٹ کی دیواریں ایک کلومیٹر تک جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ جس کا ہم پہلے ہی جائزہ لے چکے تھے۔

ایک قیاس کے مطابق گولڈ کوسٹ مینشن کی اصل عمارت اسی کے عقب میں تھی۔

یہاں آکر مجھے احساس ہوا تھا کہ لوکہارٹ اس "بلیک پوائنٹ" کے لیے کیوں فکرمند تھا، مگر وہ ٹھگنا آفیسر اس کی ہدایت کو شاید ابھی تک خاطر میں نہیں لایا تھا، کیونکہ ابھی تک دیکھنے میں تو یہی آرہا تھا کہ اس نے یہاں کی سکیورٹی کے لیے کوئی "آرڈرز" جاری نہیں کیا۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یا تو وہ ٹھگنا آفیسر کچھ زیادہ ہی ہٹ دھرم تھا یا پھر اس بات پر بزعم تھا کہ بھلا اتنے سخت سکیورٹی کے انتظامات میں یہاں کون "پر" مار سکتا ہے۔ رہا یہ بلیک پوائنٹ تو یہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، جبکہ ہم یہ سوال پیدا کر چکے تھے اور اب لوکہارٹ کو اسی کو جواب دینا تھا، شاید اپنی جان کی صورت میں، کیونکہ جب لوکہارٹ کو معلوم ہوگا کہ ہم نے اسی جگہ سے مینشن میں گھس کر گوریلا کارروائی کی ہے تو وہ اپنے اس ٹھگنے آفیسر کی سب سے پہلے گردن دبوچے گا جس نے اس کی کڑی ہدایت کو "ہلکا" لینے کی کوشش کی تھی۔

دروازے پر طبع آزمائی کرنے سے پہلے میں نے اس کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ فولادی چادر کا مضبوط اور بالکل سپاٹ دروازہ تھا، ایک آہنی کنڈا ضرور نصب تھا اور وہ زنگ آلود بھی تھا۔

اس میں جھری بھی بہت باریک تھی، جس پر میں نے آنکھ لگا کر دوسری جانب دیکھنا بھی چاہا مگر کچھ دکھائی نہ پڑا تو میں نے دروازے کے ساتھ قدرے چپک کر اپنا ایک کان لگا دیا کہ دوسری جانب سے کوئی سن گن لے سکوں، مگر اس طرف بھی سپاٹ خاموشی کے سوا کچھ نہ تھا۔

میں ایک گہری سانس خارج کر کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے قریب میں کھڑا کھیل دادا مجھے یہ سب کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ تب میں نے دروازے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے کی کوشش کی، وہ تھوڑا کراہ، ہلا مگر کھل کے نہ دیا۔

"دوسری جانب سے بند ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ بوٹ ہاؤس مینشن کے بعید ترین گوشے میں بنا ہوا ہے۔" اچانک کھیل دادا نے جیسے میری حرکات اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں! یہی بات ہے۔" میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ پھر اسی لہجے میں آگے بولا۔ "مگر یہ دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہو رہا، اس پر کوئی بھاری اوزار آزمانا پڑے گا۔"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ شکیلہ نے نیچی نیچی آواز میں ہمیں پکارا۔ ہم دونوں قدرے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں قریب آنے کا کہا۔

ٹانگ کے زخم کی وجہ سے میں تو نہیں البتہ دادا جلد ہی اس کے قریب جا پہنچا اور وہ شکیلہ کے ہاتھ کے اشارے کی جانب تکنے لگا، تب تک میں اپنی زخمی ٹانگ کے سہارے ان کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں ایک بوٹ تیز رفتاری کے ساتھ بوٹ گیراج کی طرف آرہی تھی۔

میرے دل کی دھڑکنیں یکلخت تیز ہو گئیں۔ ہم نے فوراً اپنے ہتھیار سونت لیے۔

"کہیں انہیں ہماری یہاں آمد کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟" شکیلہ کے منہ سے برآمد ہوا۔

"ممکن ہے۔" کھیل دادا بولا۔ "لیکن...... یہ وہی ٹھگنا آفیسر بھی ہو سکتا ہے جسے ہم نے لوکہارٹ سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔"

"ہم...... وہ اب اپنا فرض نبھانے آرہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا ہمیں ان سے مقابلہ کرنا پڑے گا......؟" شکیلہ نے تشویش زدہ لہجے میں کہا۔

"الگ الگ سمتوں میں چھپ جاؤ......" میں نے کہا۔ ہم بیک وقت حرکت میں آئے اور گیراج کے اندر موجود بوٹس کی آڑ میں ہو گئے۔ میرے کان کھڑے تھے۔

موٹر بوٹ کی آواز بتدریج قریب آتی جارہی تھی، گیراج میں ہم نے ایسی کوئی اپنی نشانی نہیں چھوڑی تھی جس سے ہماری یہاں موجودگی کا پتا چلتا۔ بہرحال کوشش ہماری یہی تھی۔

اسی وقت بوٹ گیراج کے قریب آکر لنگر انداز ہو گئی۔ میں نے بوٹ کی آڑ سے ذرا سر ابھار کر گیٹ کی طرف جھانکا۔

کمیل دادا کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی چار افراد تھے جنہیں ہم نے ٹھگنے آفیسر کے ساتھ مچان سے روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ آفیسر اب چلا چلا کر اپنے ساتھیوں کو کچھ اس انداز میں ہدایات دے رہا تھا جیسے اسے کسی خطرے کا احساس ہوگیا ہو۔

میں نے ان کی حرکات سے اندازہ لگانے کی کوشش چاہی تھی کہ کہیں یہ لوگ گیراج کی تلاشی لینے کا تو ارادہ نہیں رکھتے؟ مگر فکر رہا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی، وہ صرف پہرا دینے آئے تھے۔

وہ سب لوگ گیراج کے گیٹ سے اندر آگئے۔ ایک طائرانہ سی نظریں ادھر اُدھر ڈالی تھیں۔ پھر مطمئن ہو کے سمندر کی جانب دیکھنے لگے، اسی دوران میں نے دیکھا وہی ٹھگنا آفیسر کسی خفیہ ٹرانسمیٹر پر لوکہارٹ سے مخاطب ہو رہا تھا۔

"یس فادر! سیرانو اسپیکنگ، یہاں جلینگ پوائنٹ میں کوئی خطرہ نہیں...... آگے کیا حکم ہے؟"

گویا اس ٹھگنے کماشتے کا نام سیرانو تھا۔

"یس فادر! آئم شیور......" وہ لوکہارٹ کو بڑے فخر کے ساتھ تسلیاں دے رہا تھا اور میں دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا مگر ان کی موجودگی سے ہماری پیش قدمی جام ہوسکتی تھی۔

لوکہارٹ سے بات کرنے کے بعد سیرانو اپنے چاروں ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔

"تم میں سے دو افراد...... جم اور کرافورڈ ادھر ہی چوکس رہ کر پہرے پر موجود رہو گے، جب تک میں کوئی نئی ہدایت نہ دوں۔"

مذکورہ ناموں والے دونوں آدمیوں نے اپنے سر کو فوراً اثباتی جنبش دی تھی۔

"اور تم......" سیرانو باقی دو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آلسن اینڈ جیک...... میرے ساتھ چلو گے، ہم ویسٹ ہارف نمبر سکس پر موجود رہیں گے۔"

چنانچہ ذرا ہی دیر بعد سیرانو، آلسن اور جیک نامی اپنے باقی دو ساتھیوں کے ساتھ اسی بوٹ پر روانہ ہو گیا۔

میرے اندازے کے مطابق جس علاقے کا اس نے نام لیا تھا، وہ بوٹ گیراج کے اریب قریب کا ہی ہوگا۔

ان تینوں کے جانے کے بعد...... جم اور کرافورڈ وہیں کھڑے رہے گئے۔ ہم تینوں گویا ان کی موت بنے اپنی اپنی جگہوں پر چھپے بیٹھے تھے۔

اب ایک ایک لمحہ اندیشناک ساعتوں کی دھمک دیتا محسوس ہونے لگا۔ ان پر ہلا بولنا آسان نہ تھا۔ ذرا سی بھی غیر مستعدی اس مختصر جگہ پر خطرے کا بگل بجانے کے مترادف ہوتی۔

کمیل دادا نے میرے قریب آکے کان میں سرگوشی کی تھی ان پر دھاوا بولنے کی لیکن میں نے سر کے اشارے سے منع کر دیا۔

شکیلہ بھی چوکنا نظر آرہی تھی۔ میں ابھی ان نازک لمحات میں کسی قسم کی جلد بازی سے گریزاں تھا۔ تاہم یہ بھی تھا کہ وقت کے انتظار میں یہ سنہری موقع بھی گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس وقت گولڈ کوسٹ مینشن والوں کو لولوواش کی حالتِ زار کی وجہ سے اپنی پڑی ہوئی تھی۔

ایسے میں میرے کمانڈو ایکشن کے جلد اور مفید نتائج حاصل ہو سکتے تھے، پھر ان نازک اور سنگین تر حالات میں عابدہ کی جان بھی سخت خطرے میں تھی، لوکہارٹ کی دھمکی کو میں خالی خولی نہیں لے سکتا تھا۔ خدانخواستہ عابدہ کو کچھ ہو جاتا تو میرے لیے یہ غم عمر بھر کا روگ بن جاتا اور ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی......

چنانچہ میں نے ان پر اب مزید وقت ضائع کیے بغیر ہلا بولنے کا ارادہ کر لیا اور ساتھ ہی کمیل دادا اور شکیلہ کو بھی ایک مخصوص اشارہ کر دیا۔ یوں میں نے شکاری نظروں سے ان دونوں کا جائزہ لیا۔

جم سگریٹ سلگائے ہوئے تھا اور اس کا ساتھی کرافورڈ اپنی وردی کی قمیص سے شراب کی چھوٹی چپٹی بوتل نکال کے گھونٹ بھرنے میں مصروف تھا۔

اچانک میں نے جم کو کرافورڈ سے کہتے سنا۔

"اسے بڈی! اس دروازے کو بجاؤ......" اس نے گیراج کے اس دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو مینشن کے کسی اندرونی گوشے میں کھلتا تھا۔

"ہے، ڈوڈ! اس میں ایسا کیا ہے؟" کرافورڈ جواب میں ہنس کر بولا۔ ساتھ ہی چپٹی بوتل سے ایک گھونٹ بھرا۔

"یہ جادو کی دروازہ ہے۔" جم معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"ہے بڈی! تم بجاؤ تو سہی...... سرپرائز ہے یہ...... لیکن ذرا زور سے بجانا، تاکہ اندر دور تک آواز سنی جا سکے۔" جم بولا۔

"اچھا......! دیکھتے ہیں......" کرافورڈ نے اپنا سر دھنا اور مذکورہ دروازے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میرے اندر عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔ شکیلہ نے میری جانب دیکھ کر سوالیہ انداز میں اپنی بھویں اچکائی تھیں، جبکہ کمیل دادا اپنے ہونٹ بھینچے ہوئے کرافورڈ کو دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

ہم موٹر بوٹس کی آڑ میں دبکے بیٹھے اس کو تکے جا رہے تھے، یوں جیسے وہ دروازے کے قریب جا کر "کھل جا سم سم" کہنے والا ہو۔

ہم نے دیکھا اس نے اپنے ساتھی جم کی ہدایت پر اپنی گن کندھے سے اتاری اور اس کے ٹھوس آہنی دستے سے دروازے کو دو تین بار زور سے بجایا۔

ہماری دھڑکتی نظریں اب دروازے پر جم گئیں، کہ دیکھیں کیا ظہور میں آتا ہے۔

جم نے کرافورڈ کو اشارہ کیا کہ وہ اب واپس آجائے۔ یہ موقع ان دونوں پر ہلا بولنے کے لیے بہترین تھا لیکن وہ دروازہ بجا چکا تھا اسی لیے ہمارے پاس بھی اب انتظار کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا، ہاں، یہ فائدہ ضرور ہو سکتا تھا ہمیں کہ کسی بہانے ہی سہی دروازہ تو کھلتا، لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ اس سے برآمد کیا ہونے والا تھا جس کے بارے میں جم جانتا تھا وہ کیا تھا......؟

جلد ہی دروازے میں کھٹر پٹر کی آواز ابھری۔ بالکل ایسی ہی جیسے کوئی دوسری جانب سے دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا ہو اور ایسا ہی ہوا، ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دروازہ کھلا اور اس میں سے جو کچھ بھی برآمد ہوا، اسے دیکھ کر میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

اندر سے ایک حسین و جمیل لڑکی برآمد ہوئی تھی، جسے دیکھ کر کرافورڈ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... اس کا منہ جیسے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جبکہ اس کے ساتھی جم کے ہونٹوں پر کچھ ایسی مسکراہٹ رچ گئی تھی جیسے اسے معلوم ہو کہ اندر سے کیا برآمد ہونے والا تھا۔

"ہیلو، سوئٹی......!" کرافورڈ نے نہایت مسرت بھرے انداز میں یہ کہتے ہوئے اس کی جانب اپنا ایک ہاتھ بڑھا دیا۔ جس پر حسینہ نے بھی دل نشیں مسکان کے ساتھ اس کا بڑھا ہوا ہاتھ اپنے نازک اور مرمریں ہاتھ میں تھام لیا۔

"ہائی ریٹا! ہم بور ہو رہے تھے۔ تمہیں اسی لیے زحمت دی۔" جم نے دور سے ہی ہاتھ ہلا کر ریٹا نامی اس حسینہ سے کہا۔

ریٹا بمشکل بائیس، تئیس سالہ جوان اور سیمیں بدن کی مالک تھی۔ اس کے بال سیاہ تھے اور آنکھوں اور بھوؤں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا۔

اس نے بڑا دلکش لباس زیبِ تن کر رکھا تھا جو اس کے ابھرے ہوئے قیامت خیز جسمانی خطوط کو چھپانے کے بجائے ابھار رہا تھا۔

کرافورڈ نے بوالہوسی کی انتہا کرتے ہوئے ریٹا کو نہایت بے قراری کے ساتھ اپنی جانب کھینچ بھی لیا تھا۔

"آں...... آرام سے...... کیوں ندیدے پن کا مظاہرہ کرتے ہو کرافورڈ......!" جم نے اسے تادیب کی۔ "مت بھولو کہ ہم یہاں ڈیوٹی پر ہیں۔"

"اوہ...... ہو، دور ہٹو...... مرواؤ گے مجھے اس بڈھے طوطے کے ہاتھوں......" اس کی بات سنتے ہی ریٹا نامی حسینہ نے کرافورڈ کو خود سے دور دھکیل دیا اور خوف زدہ انداز میں دروازے کی جانب لپکی تھی کہ جم نے اسے پکارا۔

"رکو...... رکو...... ریٹا ڈارلنگ!" وہ رک گئی۔ جم اس کی جانب بڑھا۔ اسے پیار سے تھاما اور بولا۔

"ہماری یہاں کوئی اتنی خاص ڈیوٹی نہیں ہے۔ دشمنوں کی یہاں آمد کا امکان تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہم بالکل ریلیکس ہیں، سوچا تمہارے ساتھ...... ذرا اچھا وقت گزر جائے گا۔ آؤنا...... بیٹھو......"

بات سمجھ میں آچکی تھی۔ جم کو یہاں کی پوری معلومات تھی۔ بوٹ گیراج میں وہ پہلے بھی شاید اسی مقصد کی خاطر رہ چکا تھا اور اس طرح کی دل بستگیوں کے سامان سے واقف تھا جیسے اب...... کرافورڈ بھی واقف ہو چکا تھا۔ گویا اس دروازے کے پار ایسی ہی حسیناؤں کی رہائش تھی۔

وہ دونوں ریٹا میں "مشغول" ہو گئے اور ادھر میں نے کمیل دادا اور شکیلہ کو گرین سگنل دے دیا۔

بس پھر کیا تھا، ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر ہم تینوں ان پر ٹوٹ پڑے۔

میں نے اپنے شکار جم کو نشانہ بنایا اور زخمی ٹانگ کے باوجود پھرتی سے کام لیتے ہوئے اس پر اپنی گن کا بٹ آزما ڈالا جو اس کی گدی پر پڑا، وہ تو اس وقت کرافورڈ کے ساتھ ریٹا کی مرمریں گردن کے گرد بازو ڈالے ہوئے تھا۔ ضرب

پڑتے ہی وہ آواز نکالے بغیر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

ادھر ریتا نے چیخنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ شکیلہ شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی اور پل کے پل اسے بے بس کر کے رکھ دیا۔

کھیل دادا کرافورڈ کو چھاپ چکا تھا لیکن نجانے کس طرح وہ اس کے شکنجے سے پھسل کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا اور... چیختا ہوا گیراج کے مین گیٹ کی طرف لڑھکتا ہوا بڑھا۔

چونکہ وہ کھیل دادا کے وار سے گر چکا تھا مگر کچھ زیادہ ہی سخت جان بھی ثابت ہوا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور چہرہ خون آلود تھا، لیکن جان بچانے کا جذبہ شاید کچھ زیادہ ہی غالب آ چکا تھا، وہ گیٹ تک پہنچا، ادھر میں نے بھی حرکت کی تھی مگر کھیل دادا اپنے شکار کو چھوٹ کر جاتا دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور وہیں سے... اس نے جست بھر کر مین گیٹ پر اسے جالیا۔ پھر اس کے سر پر اپنے دائیں پاؤں کی زوردار ضرب رسید کر دی، وہ گیراج کے پختہ فرش سے ٹکرایا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

ریتا کو شکیلہ نے دبوچ رکھا تھا۔ میں اور دادا چند لمحے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے رہے...... اس کے بعد میں نے کھیل دادا کو گیٹ پر چوکس کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود اندر قدم بڑھائے، جہاں ایک کونے میں شکیلہ، ڈری سہمی ریتا کو پکڑے کھڑی تھی۔

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اندرونی کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے مدھم سی روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں آگے بڑھا اور دوسری طرف اچھی طرح جھانک کر تسلی کی کہیں کوئی اور بھی تو موجود نہ ہو۔

پھر میں نے دروازہ آہستگی کے ساتھ بند کر دیا اور ریتا کی طرف متوجہ ہوا۔

کھیل دادا گیٹ پر چوکسی پہرا دے رہا تھا۔ شکیلہ نے ریتا کو دبوچ رکھا تھا۔ میں ریتا کو غصیلی اور خونخوار نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

"مس ریتا! ہماری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن جان جاؤ اب...... کہ میں موت کی دوسری علامت شہزی ہوں......"

"ہم...... میں جان گئی ہوں۔" ریتا نے سہمی ہوئی خوف زدہ نگاہوں سے میرے سرخ انگارا بنتے چہرے کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر یہ بھی جان لو کہ........ کو میرے سوالوں کے، بغیر جھوٹ بولے درست جوابات دینے ہیں، مجھے ذرا بھی شبہ ہوا کہ تم چالاکی سے کام لے رہی ہو تو میں تمہیں کسی بھاری شے کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینک دوں گا، یہاں شارک مچھلیاں اور مگرمچھ خاصی تعداد میں دیکھ چکا ہوں، جو تمہارے اس حسین اور دلکش بدن کو منٹوں میں چٹ کر جائیں گے۔"

اس نے پھر خوف زدہ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"شاباش!" میں نے توصیف کرنا ضروری جانا پھر نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تم مجھے جان ہی گئی ہو تو پھر میرے اس مقصد سے بھی واقف ہو گی کہ میں یہاں اپنی جان خطروں میں ڈالتا ہوا کیوں آیا ہوں؟"

وہ اسی طرح تکتی رہی۔

"لوکہارٹ جسے تم لوگ قادر کہتے ہو، وہ کسی کا بھی دوست یا ہمدرد نہیں ہے، لولووش کی طرح اسے بھی غلام پالنے کا شوق ہے، جو ناکارہ ہو جاتے ہیں تو انہیں مار ڈالتا ہے۔ اسی لیے اس کی خاطر اپنی جان دینا ضائع کرنے کے مترادف ہے اور گناہ بھی۔" میں نے اپنے روایتی اور مخصوص انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش میں ایک ذرا لمحے کو تھما اور اصل بات کی طرف آیا۔

"عابدہ نام کی لڑکی تک میری رہنمائی تمہیں کرنا ہو گی۔ قبول ہے تمہیں؟" کہتے ہوئے میں نے اس کی سہمی ہوئی آنکھوں میں اپنی نظریں گاڑ دیں۔ وہ سمجھ تو گئی تھی مگر لگتا تھا کہ میری شہرت بھی یہاں ہوگ بے تک ہی نہیں بلکہ اس مینشن تک بھی پہنچ چکی تھی۔

"ہم...... میں صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ عابدہ نامی ایک غیر ملکی مسلم لڑکی کو ماسٹر لولووش نے یہاں کافی عرصے سے قید کر رکھا ہے۔ لیکن وہ یہاں کہاں اور کس گوشے میں موجود ہے، اس کا تو میرے ساتھیوں کو بھی علم نہیں۔"

"ساتھیوں...؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں! ہم آٹھ دس لڑکیوں پر مشتمل تین گروپس سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی طرح حسین و جمیل اور خوبصورت...... ماسٹر اور ان کے قریبی حواریوں جن میں سائنسٹ، انجینئرز اور دیگر ایسے بڑے لوگ شامل ہیں جو یہاں ہمہ وقت لولووش کے لیے کام میں مگن اور اس کے لیے نت نئی ایجادات میں مشغول رہتے ہیں، حسین لڑکیوں کا یہ گروپ ان کی دل بستگی کا سامان کرنے پر مامور رہتا ہے۔"

"ان میں کسی بھی لڑکی کو نہیں معلوم کہ عابدہ کو کہاں اور کس کمرے میں مقید رکھا ہوا ہے؟" کھیل دادا نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟" شکیلہ نے غصے سے کہا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" ریتا نے جواب دیا۔

"میں نے سن رکھا ہے کہ اس مینشن کے اندر زمین دوز گوشہ بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ریتا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "جتنی بھی لیبارٹریز اور خطرناک ہتھیار ہیں وہ اسی گوشے میں موجود ہیں۔"

"ہم... اندر اس وقت مسلح افراد کی نفری کتنی ہے؟"

"پہلے پندرہ سے بیس تھی لیکن اب تمہارے خطرے کو دیکھتے ہوئے یہ نفری بڑھا کر تیس سے چالیس کر دی گئی ہے۔"

"اندر ایسا کون سا آدمی ہو سکتا ہے جسے قابو کر کے ہم عابدہ کے بارے میں جان سکیں اسے کہاں اور مینشن کے کس گوشے میں رکھا ہے؟" میں نے اگلا سوال داغا۔ درحقیقت میں کوئی ہلا بولنے سے پہلے... عابدہ کو برآمد کرنا چاہتا تھا۔

"قادر لوکہارٹ کے سوا اور کون ایسا شخص ہو سکتا ہے۔" ریتا بولی۔

"کیا مطلب؟ کیا صرف لوکہارٹ ہی جانتا ہے کہ عابدہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس کی بات پر مجھے ایک نئی تشویش نے گھیر لیا تھا۔ لوکہارٹ جیسا زخم خوردہ کتا مر جاتا مگر وہ مجھے عابدہ کے بارے میں کبھی نہ بتاتا۔

"دوسرا صرف ماسٹر لولووش ہی ہے، لیکن اسے میڈیکل گروپ کے شعبۂ آئزولیشن میں رکھا گیا ہے۔ وہ شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے۔" ریتا بولی۔

کم بخت لولووش قریب المرگ ہونے کے بعد بھی میرے لیے ایک بڑی مصیبت کھڑی کرنے والا تھا۔ لوکہارٹ... اس کا مرید تھا۔ میں جانتا تھا اگر اس دوران اس خبیث لولووش کو کچھ ہو گیا تو لوکہارٹ...... عابدہ کو ہلاک کرنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگائے گا۔

بڑی عجیب اور سنگین صورتِ حال تھی۔ بظاہر کامیابی لبِ بام ہی محسوس ہوتی تھی مگر درپردہ اس میں بہت سی خطرناک پیچیدگیاں بھی تھیں۔ حرام زادے لولووش نے عابدہ کے قید خانے کے بارے میں سوائے لوکہارٹ کے اور کسی کو بھی نہیں بتایا تھا، لولووش لاشعوری طور پر مجھ سے خوف زدہ تھا۔

پہلے تو نہیں لیکن اب تک وہ بھی میری مہم جوئی سے اندازہ لگا چکا تھا کہ عابدہ کا حصول میرے لیے کس قدر اہم تھا جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔

اس نے بھی ایسے حالات کا تصور شعوری طور پر کر لیا ہوگا کہ جب اس کی بھی میرے ہاتھوں جان پر بن آئی (جیسا کہ آ بھی گئی تھی) تو وہ عابدہ کی زندگی یا رہائی سے متعلق میرے ساتھ کوئی سودا کر سکے، یہی وجہ تھی کہ...... لوکہارٹ نے ہوگ بے کے جنگل میں ایک خفیہ وائڈ اسپیکر کے ذریعے مجھ سے "معاملہ داری" کرنے کی کوشش چاہی تھی۔

اگرچہ میں اس کے لہجے اور باتوں سے اس کی بدنیتی کی بو سونگھ ہی چکا تھا۔

گویا جیسے جیسے لولووش موت کی وادی کے قریب جا رہا تھا توں توں عابدہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑنے لگی تھی۔۔ میں یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح لولووش کے جہنم واصل ہونے سے پہلے پہلے عابدہ کو برآمد کر لوں۔

"تم ہمارا کیا ساتھ دے سکتی ہو؟" مجھے ذرا دیر کے لیے خاموش اور سوچتا پا کر کھیل دادا نے ریتا سے سوال کیا۔

"ہم...... میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" ریتا کسی سی صورت بنا کر بولی۔ "مجھے تو تم لوگوں کے ساتھ دیکھتے ہی وہ گولی مار دیں گے...... لل...... لیکن ہاں! رینا تمہاری مدد کر سکتی ہے۔"

"رینا؟ یہ کون ہے؟" میں نے اس کی بات سن کر چونک کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ میرے بہت قریب ہے، تمہاری طرح ایشیائی ہے اور انڈین ہے۔ وہ یہاں ناخوش ہے۔ آزادی چاہتی ہے۔ اس بے چاری کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری مدد کر سکتی ہے۔"

"اس کے نہ خوش ہونے کی کوئی خاص وجہ؟ یہاں تو ہر کوئی اپنی مرضی اور خوشی سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! رینا بھی پہلے خوش تھی، وہ فار ایسٹ میں اسپیکٹرم کی عہدے دار بھی رہ چکی ہے۔ پھر کسی وجہ سے ماسٹر

لولوڈش نے اسے بلا لیا۔ لولوڈش کو ایشیائی اور بالخصوص انڈین حسن بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔" وہ کچھ صراحت سے بتانے لگی۔

"ایک اہم رپورٹ کے سلسلے میں جب وہ یہاں آئی تو لولوڈش نے اسے مستقل طور یہاں اپنے پاس رکھ لیا۔ پہلے پہل تو ریتا بھی خوش تھی۔"

"تم کسی ٹریجڈی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔" کمیل دادا نے درمیان میں اسے یاد دلایا۔

"میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ ریتا کا ایک بوائے فرینڈ تھا۔ وہ بیمار ہو گیا تھا۔ ریتا کو اس کے بارے میں غلط اطلاع ملی کہ وہ ہانگ کانگ کے ایک اسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ ریتا مایوس ہو گئی۔ اب اسی بوائے فرینڈ کے بارے میں کسی ذرائع سے ریتا کو حال ہی میں معلوم ہوا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کا نام ہریش کمار ہے۔ اس نے خود بھی ریتا کے بارے میں معلوم کیا تھا کہ وہ اب کہاں ہے۔ اس نے رابطہ بھی کر لیا۔ ریتا رو پڑی تھی۔ وہ بے چین ہو گئی۔ یوں وہ خوش بھی تھی اور غم زدہ بھی۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ موقع ملتے ہی اس جزیرے سے فرار ہو جائے گی۔ اب لولوڈش کی حالتِ زار پر وہ بھی خوش ہے۔ یہ ہے اس کی مختصر کہانی......" ریتا اتنا بتا کر چپ ہو رہی۔

میں نے مشورہ کرنے کے انداز میں کمیل دادا اور شکیلہ کی طرف دیکھا، پھر بولا۔

"کیا خیال ہے، ریتا کو آزمایا جائے؟"

"یقیناً، وہ ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔" شکیلہ نے فوراً جواب میں کہا۔ میں کمیل دادا کے بولنے کا منتظر رہا، بالآخر اس نے کہا۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ...... ریتا کو پہلے یہاں بلا کر اعتماد میں لیا جائے، یا پھر خود ہی اس سے اندر جا کر ملنے کی کوشش کی جائے؟"

"یہ تو ریتا پر منحصر ہے۔" شکیلہ بولی۔

"کمیل دادا کی دوسری بات مناسب ہے۔ ریتا ہمارے ساتھ رہے گی۔"

میں نے فوراً ساتھیوں سے پیش قدمی کا کہہ دیا اور سب سے پہلے خود آگے بڑھا۔

ریتا سے میں نے اس دروازے کے دوسری جانب کا محلِ وقوع پوچھ لیا تھا۔

اس دروازے کے بعد ایک اور اسٹور نما ہال تھا جہاں بوٹ کے مختلف پارٹس، اوزار اور اسی طرح کا دیگر سامان پھیلا ہوا تھا، وہاں سے کونے والے دروازے سے ایک راہداری اندر کی طرف جاتی تھی۔

ریتا کا اقامتی گوشہ اسی طرف تھا۔ ریتا کے مشورے کے مطابق، ریتا کو پہلے مذکورہ جگہ پر ہی دیکھنا تھا۔ یوں اس نے کہہ رکھا تھا کہ ریتا کی مستقل ڈیوٹی آبزرویشن ونگ میں لولوڈش کے پاس لگی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ دو اور ساتھی لڑکیاں بھی ہیں۔ باقی دیگر لوگ جن میں ڈاکٹرز کی ٹیم اور نرسنگ اسٹاف بھی موجود رہتے ہیں۔

ہم راہداری میں آ گئے۔ ریتا کو میں نے اپنے ساتھ ہی لگا رکھا تھا اور اسے یہ دھمکی دے رکھی تھی کہ اگر مجھے اس پر ذرا سا بھی چالاکی کا شبہ ہوا تو میں اسے ایک لمحے کے اندر اندر موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔

اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اسے اپنی جان پیاری ہے اور دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی جان چکی ہے کہ لولوڈش کا آخری وقت آ چکا ہے اور اب یہاں سب ختم ہونے والا ہے۔ وغیرہ۔

میں اس بات کو اس کی چالاکی یا بچوں والی بات پر محمول کر سکتا تھا، مگر جب اس نے اس بارے میں ایک ٹھوس دلیل دی تھی مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔

بقول ریتا کہ ریتا اسے ہر وہ بات بتاتی تھی جو اسے لولوڈش کی قربت اور لوکہارٹ سے بعض ضروری امور سے متعلق گفتگو کے دوران معلوم ہوتی رہتی تھی۔

یوں ریتا نے ایک نیا اور چونکا دینے والا انکشاف بھی کیا تھا کہ...... ٹائیگر ٹیک کے چیف ہاسکل ہولارڈ...... جو درحقیقت اور درونِ خانہ جے بی سی (جیوش بزنس کمپنی) کے خفیہ اور وسیع تر مفادات کے لیے ہی کام کرتا ہے، اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی انجیلا کی وجہ سے وہ لولوڈش کا دشمن بن چکا ہے اور اس کی غیر ضروری مداخلتوں کی شکایات پر ہی آئی اے کو بھی اس سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے، یوں عنقریب وہ بھی جزیرہ ہوگ بے پر اٹیک کرنے کے خفیہ پلان پر عمل کرنے کا سوچ رہے ہیں، یہی نہیں ہوگ بے کے اصل مالکان کیلی، آلا یان...... بھی کیلی فورنیا کی ایک عدالت میں لولوڈش کے خلاف اپنا جزیرہ واپس لینے کے لیے کیس دائر کر چکی ہے۔

مزید برآں...... لولوڈش کو ٹائیگر ٹیک کے سربراہ کی طرف سے ایک الٹی میٹم بھی مل چکا ہے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے خود کو...... جلد از جلد ان کے حوالے کر

دے جس پر لولوڈش نے اعلانِ جنگ کا عندیہ دے ڈالا تھا۔

یہ ایک اہم انکشاف ہی نہیں اہم خبر بھی تھی، ریتا نے بھی بتایا تھا کہ اس صورت میں یہاں کے کئی لوگ ڈرے ہوئے بھی ہیں۔ جنگ کی صورت میں انہیں ہی سب سے زیادہ جانی نقصان ہونے کا اندیشہ ہے۔

ریتا جس طرح ہماری رہنمائی اور مدد کر رہی تھی، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ...... یہاں پر رکھیلوں کے انداز کی لڑکیاں ناخوش تھیں اور اسی طرح وہ لوگ جو عمومی خدمات میں تعینات تھے، وہ ڈرے ہوئے تھے اندر سے...... یہ ٹھیک ہے کہ بسا اوقات ایسے ہی لوگ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

راہداری زیادہ طویل نہیں تھی، شکر رہا کہ یہاں ابھی تک ہمارا کسی دشمن سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب ریتا نے رہداری اختتام پر یہ بتایا کہ اب ہمیں محتاط اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ہم اب مینشن کے وسط میں پہنچنے والے ہیں اور کسی بھی مسلح گروپ کے آدمی سے ہماری مڈبھیڑ ہو سکتی ہے تو میں نے...... کمیل دادا اور شکیلہ کو بھی محتاط رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

ہم ایک کمرے میں آ گئے جو خالی تھا۔ ریتا نے بتایا کہ یہ ریتا کا اقامتی گوشہ ہے مگر لگتا یہی ہے کہ اس کی واقعی مستقل ڈیوٹی آبزرویشن میں ہی لگا دی گئی ہے۔

"لوکہارٹ کہاں مل سکتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"آبزرویشن روم میں ہوگا۔" ریتا نے جواب میں کہا۔

"وہاں تک تم مجھے لے چلو گی۔ میرے باقی ساتھی ادھر ہی موجود رہیں گے۔" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا تو کمیل دادا اور شکیلہ چونک کر میرا چہرہ تکنے لگے۔ میں ان سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تم دونوں ادھر ہی موجود رہو گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ریتا یہاں کا رخ کرے تو...... تم اسے قابو کر کے اعتماد میں لینے کی کوشش کرنا۔"

"وہ ان کے اعتماد میں ہرگز نہیں آنے والی۔ وہ مزید خوف زدہ ہو جائے گی، جب تک کہ میں ساتھ نہ ہوں۔" ریتا نے اچانک درمیان میں کہا۔ میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور بولا۔

"ہمم...... یہ بات بھی ٹھیک ہے۔"

"میرا تو خیال ہے کہ آسانی پیدا کرنے کے لیے ہمیں ریتا پر اعتبار کرنا پڑے گا۔" کمیل دادا نے رائے دیتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا؟" میں نے سوالیہ نظروں سے کمیل دادا کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم تینوں ادھر موجود رہتے ہیں۔ ریتا کو بھیج کر کسی بہانے ریتا کو یہاں بلوا لیتے ہیں۔"

"اگر ریتا نے ہمیں دھوکا دے دیا تو......؟" شکیلہ نے ایک نگاہ قریب کھڑی ریتا کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دادا سے کہا۔

"تو کیا...... اس کا احتمال سو فیصد رہے گا ہی......" کمیل دادا بے پروا انداز میں بولا۔ "ہم تو پہلے ہی سر سے کفن باندھے ہوئے ہیں۔ محتاط تو ہر لمحہ ہی رہنا پڑے گا ہمیں۔ ہتھیار ہمارے پاس بھی ہیں۔ اس کی چالاکی کا شبہ ہوتے ہی ہم فوری طور پر ایکشن لیں گے۔ پھر ریتا بھی سامنے آئی تو...... یہ جانتی نہیں ہے پھر......"

کہتے ہوئے آخر میں کمیل دادا نے تہدیدی نظروں سے ریتا کی طرف دیکھا تھا۔ جواب میں وہ بڑے تحمل اور دوستانہ سی مسکراہٹ سے بولی۔

"میرے پاس اپنی وفاداری پیش کرنے کا بظاہر کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لیکن جو حالات نظر آ رہے ہیں، وہ تم لوگوں کے سامنے بھی ہیں۔ جب کسی کرتا دھرتا کو بسترِ مرگ پر دیکھا جاتا ہے تو حوصلے ویسے ہی جواب دینے لگتے ہیں۔ جنگی چڑھائی کی پہلے ہی یہاں خوف کی فضا قائم ہے۔ میرے جیسے بہت سے افراد بھی جنگ کے خلاف ہیں۔ میں اور ریتا تو خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایسی صورتِ حال میں ہمیں ... صرف اور صرف اپنی بقا کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی، آگے آپ لوگوں کی مرضی، ویسے مسٹر کمیل کا مشورہ غلط نہیں ہے۔"

وقت کم تھا، کسی بھی وقت یہاں ایک خوف ناک معرکہ آرائی کی فضا قائم ہونے والی تھی۔

میں نے فوراً ہی اس کی بات پر صاد کیا اور اسے ریتا کو لینے کے لیے کمرے سے رخصت کر دیا۔

☆ ☆ ☆

ریتا کو گئے ہوئے پورے گنے ہوئے سیکنڈوں اور منٹوں کے مطابق پندرہ سے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ ریتا پر اتنی جلدی بھروسا کرنا بظاہر بے وقوفی ہی نظر آتی تھی۔ وہ ہمارے خلاف کچھ بھی کر سکتی تھی۔ لیکن میں اپنی زندگی میں پہلے بھی ایسے جوئے کھیلتا رہا ہوں، اب یہ اتفاق ہوتا تھا یا پھر

میری خوش قسمتی کہ زیادہ تر مجھے فتح ہی نصیب ہوتی تھی۔ لیکن نہیں..... اس میں صرف اتفاق یا خوش قسمتی کا بھی دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ..... حالات کا تجزیہ، گہرے مشاہدے اور قوتِ فیصلہ بھی ہوتا تھا۔

ہم ریتا کے جانے کے بعد بھی نچلے یا ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے تھے بلکہ کمرے کے دروازے کی تھوڑی سی جھری بنا کر باہر کی صورت حالات کا جائزہ بھی لے لیتے تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اگر ریتا ہم سے غداری کر لیتی ہے تو دشمن ہم پر چالاکی اور ہوشیاری سے ہلا بول سکتے تھے۔

مزید دس پندرہ منٹ بیت گئے، اس بار جب شکیلہ نے محتاط انداز میں جھری سے باہر جھانکا تو چونک کر پلٹی۔

میں اور کھیل دادا اسے یوں پلٹتے دیکھ کر چونکے۔ وہ ہمارے قریب آکر فرطِ جوش سے بولی۔

"وہ آرہی ہے مگر اکیلی ہے۔"

"ہم....." میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ ذرا ہی دیر بعد ریتا اندر آگئی۔ ہم سوالیہ نظروں سے اس کی جانب تکنے لگے۔ اس نے خود کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کر رکھی تھی، مگر محسوس ہوتا تھا کہ اندر سے وہ پُرجوش ہے۔

"کیا ہوا؟ رینا تمہارے ساتھ نہیں آئی.....؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں آسکی..... لیکن آئے گی ضرور..." اس نے بتایا۔ "وہ ذرا پھنسی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے فارغ ہو کے آئی ہے۔"

"کیا تم نے اسے ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "صرف یہی کہ میں اس سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں جو تمہارے فائدے کے لیے ہی ہے مگر ہے ذرا رازداری کی بات..... وہ بے چاری بھی شاید اس کے بوائے فرینڈ ہریش کمار نے اس کے لیے کوئی خفیہ پیغام بھیجا ہے، مگر میں نے بتا دیا اسے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر اس سے ملتی جلتی ضرور ہے۔"

"اندازاً کتنی دیر میں آجائے گی وہ یہاں.....؟" کھیل دادا نے دریافت کیا۔

"مجھے تو کہہ رہی تھی کہ وہ زیادہ دیر نہیں لگائے گی....." اس نے کھیل دادا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب میں کہا۔

رینا کو آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔ وہ شاید تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر جلدی آگئی تھی۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ہم تین اجنبیوں کو دیکھ کر بُری طرح چونکی۔ پھر اس نے قدرے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے پاس کھڑی ریتا کی طرف دیکھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے رینا ڈیئر! یہ لوگ تمہارے نجات دہندہ ہیں۔" ریتا نے اس کی کیفیات کو محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

میں نے غور سے رینا کا جائزہ لیا۔

وہ ایک پکی انڈین ہندو لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ سانولی شکل و صورت کے باوجود وہ بڑی پُرکشش تھی۔ ہندو عورتوں جیسے تیکھے نقوش اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک اور گہرائی و گیرائی صاف مترشح نظر آتی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ لباس بھی ریتا کی ہی طرح مختصر اور میکسی ٹائپ تھا۔ جسمانی خطوط میں بھی وہ ریتا سے آگے ہی تھی۔ اپنی فطرت کے عین مطابق، ہولووش کا انتخاب غلط نہ تھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ریتا؟ میں بالکل بھی نہیں سمجھ رہی ہوں۔" وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ وہ بار بار ہماری جانب بھی تکے جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں شکوک و شبہات کے دریا بہنے لگے تھے۔ اس نے ہمارے ہاتھوں میں جدید ہتھیار دیکھ لیے تھے۔

پھر اچانک اسے نجانے کیا دورہ پڑا، وہ جواب کا انتظار کیے بغیر ہی پلٹی اور دروازے کی طرف بھاگی۔ میں جو اس کی حرکت کو پہلے ہی بھانپ کر تیار بیٹھا تھا، چیتے جیسی پھرتی کے ساتھ حرکت میں آیا اور اسے دروازے پر پہنچنے سے پہلے ہی چھاپ لیا۔

میں نے اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ اس کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ ریتا بھی پریشان اور متوحش سی نظر آنے لگی، وہ میرا جارحانہ انداز دیکھتے ہی ہیجانی لہجے میں بولی۔

"پپ..... پلیز! اسے کچھ مت کہنا۔ یہ میری بہت پیاری دوست ہے۔"

"اگر یہ دوبارہ ایسی ویسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کرے تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔" میں نے کہا تو ریتا چند قدم میرے قریب آئی اور رینا سے بولی۔

"پلیز رینا! فرائے تو انڈر اسٹینڈ، یہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔ میں ان سے بات کر چکی ہوں۔" پھر وہ مجھ سے بولی۔

"تم پلیز! اسے چھوڑ دو۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں اور ساری بات تفصیل سے بتائے دیتی ہوں۔"

میں نے اس کے کہنے پر رینا کو چھوڑ دیا مگر چوکنا رہا۔ ریتا اسے خود سے لگائے سہارا دیے ایک کونے میں لے گئی، وہ ابھی تک سہمی ہوئی سی نگاہوں سے ہماری جانب تکے جا رہی تھی۔ ریتا اسے سمجھانے میں لگی ہوئی تھی اور میرا دل عابدہ کے لیے بے چین ہوا جا رہا تھا۔

پھر رینا نے بھی ریتا سے کچھ کہا تو ریتا میرے پاس آکر گویا رینا کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے بولی۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ان حالات کے لیے تیار نہ تھی اور شاک میں آگئی تھی۔ اب وہ سمجھ چکی ہے، لیکن چونکہ وہ تجسس کے ہاتھوں بے چین ہو کر جلدی میری بات سننے آگئی تھی اسی لیے وہاں اب اس کا انتظار ہو رہا ہو گا، وہ ایک ضروری کام نمٹانے کے بعد آدھے گھنٹے کے لیے فارغ ہو کے آئی ہے پھر وہ تفصیل سے بات کرے گی۔"

"ہرگز نہیں....." میں نے قطعیت بھرے انداز میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس سے پوچھو کہ عابدہ کو کہاں رکھا گیا ہے؟"

"بات سمجھنے کی کوشش کرو..... تم....."

"میں اس وقت کچھ نہیں سمجھنا چاہتا....." میں نے تُرش لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ "جو میں نے کہا ہے، وہ اس سے پوچھ کر مجھے بتاؤ..."

"میں نے کہا نا کہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔"

"تو پھر اس سے پوچھو لوکھارٹ اس وقت مینشن میں کہاں اور کس گوشے میں موجود ہے۔ اتنا تو اسے معلوم ہی ہوگا۔"

"دیکھو، ہماری بحث کے دوران کوئی اِدھر آن نکلے گا۔"

"مجھے کوئی پروا نہیں..... ہم نمٹ لیں گے۔ تم وقت ضائع مت کرو اور اس سے وہ پوچھو جو میں نے کہا ہے۔"

"لوکھارٹ اس وقت اپنے آپریشن روم میں موجود ہے۔" معاً رینا نے میرا جارحانہ انداز دیکھتے ہوئے خود ہی بتا دیا۔ "وہاں اس کے مسلح حواری موجود ہیں۔"

"تم ہمیں آپریشن روم تک لے چلو..... آگے ہم جانیں ہمارا کام....."

"نن..... نہیں..... میں یہ کام نہیں کر سکتی۔" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ "وہ مجھے بلا دیر گولی مار دیں گے۔"

"تم ان کے لیے کام کرتی رہی ہو تو اتنا رسک لینا ہی پڑے گا، ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔" غصے سے کہتے ہوئے میں نے اپنی گن کا رخ اس کی جانب کر دیا۔

ریتا ایک دم رینا کے سامنے ڈھال بن گئی اور برہمی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم؟ تمہارا دماغ چل گیا ہے؟"

"ہاں! میرا دماغ چل گیا ہے، اس وقت میری عزیز ترین ساتھی لوکھارٹ جیسے درندے کی قید میں ہے۔ اس کا ایک ایک پل موت کی سختی میں گزر رہا ہے۔"

"ٹھہرو..... ذرا....." ریتا نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور پھر رینا سے مخاطب ہو کر اس سے کچھ کہا۔ اس نے کچھ سوچ کر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

"یہ کہہ رہی ہے کہ اس کے ساتھ تم میں سے صرف ایک آدمی جائے گا۔"

"مجھے قبول ہے۔" میں نے فوراً کہا اور پھر پلٹ کر کھیل دادا اور شکیلہ سے کہا کہ وہ ادھر ہی میری واپسی کا انتظار کریں اور خطرہ محسوس کرتے ہی اپنے دفاع کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ نیز میں نے ریتا کو بھی انہی کے ساتھ یہاں ٹھہرے رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد میں اور رینا کمرے سے باہر نکلے۔ وہ مجھے ایک راہداری میں لیے ہال کے اندر پہنچی..... وہاں درمیان اور دوسرے کونے والی دیوار کے ساتھ ساتھ مختلف پینل اور اسکرینز نصب تھیں۔ اس طرف کچھ لوگ موجود تھے۔ وہ عام لباس میں تھے۔ رینا مجھے قدِ آدم الماریوں کے عقب میں لیے چھپتی چھپاتی ایک چھوٹے سے ملحقہ کمرے میں لے آئی۔

وہاں میں نے دیکھا کہ مختلف قسم کے لباس جھول رہے تھے جو مخصوص وردیوں کی شکل میں تھے۔

"ان میں سے وہ گہرے سبز رنگ کا لباس پہن لو..... اور اسی رنگ کی کیپ بھی چڑھا لو، یہ ہتھیار تمہیں ادھر ہی پھینکنا ہوگا۔" رینا نے کہا۔ میں نے چند منٹوں میں سبز وردی چڑھا لی اور کیپ پہن لی۔ گن میں نے کونے میں ہی کہیں پرانے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپا دی۔

"تمہارا نمبر اے نو ہے، یاد رکھنا۔" اس نے دوبارہ دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے ہدایت کی۔

ہم باہر نکل آئے اور اسی ہال کے درمیان سے گزرنے لگے۔ وہاں کام کرتے ہوئے کچھ لوگوں نے ایک سرسری سی نگاہ ہم پر ڈالی تھی اور اپنے کام میں مشغول ہو رہے۔ رینا اور میں پورے اعتماد کے ساتھ قدم بڑھا رہے تھے۔ وہ سونگ ڈور کو دھکیلتی ہوئی ہال سے نکلی تو ایک اور کمرا آگیا۔

یہاں اس نے ذرا رک کر مجھے ہوشیار رہنے کی سرگوشی کی تھی اور مجھے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی، کیونکہ یہاں مجھے چست وردی والے چند مسلح افراد نظر آئے تھے۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کسی کو مجھ پر شبہ ہو سکتا تھا۔ میں نہتا تھا اور...... میری ٹانگ میں بھی لڑکھڑاہٹ تھی۔ ایک خدشہ اور بھی ریٹا کی صورت میں میرے قدم بہ قدم تھا کہ وہ شور مچا کر مجھے کسی مشکل میں پھنسا سکتی تھی، گویا میں اب اسی کے رحم وکرم پر تھا، لیکن اتنا تر نوالہ میں بھی نہ تھا کہ اس طرح کے "بلف" میں آسانی سے زیر ہو جاتا۔

میں نے دیکھا کہ ریٹا مجھے دائیں جانب لے جا رہی تھی جہاں ایک زینہ نیچے جاتا نظر آتا تھا اور وہاں پر بھی دو مسلح افراد مستعدی سے پہرے میں کھڑے تھے۔

قریب پہنچے تو ایک پہرے دار نے ہمیں روکا، ریٹا سے میرے متعلق پوچھا تو میں نے ریٹا کو "اے لو" آپریشنل ونگ کہتے سنا۔

"اس کی ٹانگ کو کیا ہوا ہے؟" دوسرے پہرے دار نے سوال کیا۔ میرا دل اب جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا۔

"یہ چوٹ لگ گئی تھی۔" میں نے کہا۔

پہلا والا آگے بڑھا اور اس نے میری زخمی ٹانگ کا ایک پائنچا اوپر کیا، وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔

"یہ پٹی کھول کر زخم دکھاؤ۔" اس نے تحکمانہ کہا۔ ریٹا کا چہرہ ستانے لگا۔ خود میرے اندر شدید قسم کی دھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ زخم دیکھتے ہی وہ اس کی نوعیت بھانپ جاتے اور...... پھر معاملہ بگڑ جاتا بلکہ معاملہ بگڑ ہی چکا تھا اور اب میں سمجھ رہا تھا کہ بھونچال آنے ہی والا ہے۔

"ضرور، کیوں نہیں، میں ابھی پٹی کھول دیتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا اور پٹی کھولنے کے لیے ایک ٹانگ پر اکڑوں بیٹھا۔

تب تک دو اور پہرے دار کچھ بھانپتے ہوئے وہاں آنے لگے۔ صورت حالات سنگین تر ہونے لگی تھی۔

اگلا لمحہ ان کے لیے جیسے برق پاش ثابت ہوا۔ میں نے جھکتے ہی اپنے سامنے اور قریب والے پہرے دار کی ٹانگ دبوچ کر کھینچی...... وہ گرنے کے انداز میں میرے اوپر آ رہا تو اس کی گن میرے ہاتھ میں آ چکی تھی، دوسرے نے مجھ پر گن سیدھی کی ہی تھی کہ میں نے لٹھ کی طرح گن گھما دی، جو اس کی کنپٹی پر لگی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہماری طرف آتے ہوئے دو پہرے داروں نے برسٹ فائر کر دیا۔ جبکہ میں اس متوقع خطرے کو بھانپتے ہی نیچے جانے والے زینے کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔

میں اندازہ کر چکا تھا کہ لڑھکتا اور خود کو سنبھالتا ہوا میں کس حد تک نیچے جا سکتا ہوں اور کتنی دیر میں دائیں جانب کی ریلنگ والی دیوار کی آڑ میں پہنچ سکتا ہوں، کیونکہ زینے کے قدمچے مختصر تھے اور وہ آگے جا کر دائیں جانب گھوم رہے تھے۔

گولیاں نیچے کی زینے والی دیوار کے سامنے "ژناژٹ" کی آواز کے ساتھ پیوست ہوتی چلی گئیں۔ میں پیراٹروپنگ کے انداز میں لڑھکنیاں کھاتا سنبھلتا ہوا دائیں جانب گھوما تو مجھے اوپر ہی ان میں سے ایک پہرے دار کی جھلک نظر آ گئی۔ میں نے اسی پر ایک اندھا برسٹ فائر کر دیا۔ وہ چھلنی ہو کر نیچے آ رہا۔

مجھے اب آگے کا ہوش کرنا تھا۔ وہاں ایک دروازہ نظر آیا اور میں نے کاندھے کی ٹھوکر مار کے کھولنا چاہا مگر نہ کھلا تو چند قدم پیچھے ہٹ کر میں نے اس پر برسٹ فائر کر دیا۔

اسی وقت تیز سائرن بجنے کی سمع خراش آوازیں گونجنے لگیں، دروازہ وا ہو کر دوسری جانب گرا۔ میں درانہ وار اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ہی ایک بڑے سے ونگ ہال کا منظر تھا۔ جس کی دیواریں سفید تھیں۔ دائیں بائیں کچھ کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے جن کے اوپر نمبرز لکھے تھے۔ فرش چکنا تھا اور وہاں عام سے لباس میں چند لوگ ہی نظر آئے ...... جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی بدحواسی کے عالم میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

ایک شخص میرے قریب سے دوڑتا ہوا گزرنے لگا تو میں نے اسے جھاپ لیا اور وحشت لہو رنگ لہجے میں اس سے لوکہارٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ میں جلد سے جلد لوکہارٹ پر قابو پانا چاہتا تھا ورنہ وہ عابدہ کو میرے پاؤں کی زنجیر بنا کر مجھے اس جارحانہ کارروائی کو رکوانے پر مجبور کر سکتا تھا۔

"وہ...... وہ...... اس طرف......" اس نے دائیں جانب تین کمروں کے درمیان والے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

میں اسے چھوڑ کر لپک کے اسی طرف دوڑا تھا کہ عقب سے زینے کی جانب تین چار مسلح افراد مجھ پر فائرنگ کرتے اترے۔ میں نے فرش پر لڑھکنی لگائی اور اس طرح کہ تیزی سے پھسلتا ہوا مذکورہ کمرے کے دروازے سے ٹکرایا، وہ سونگ ڈور تھا شاید ٹکراتے ہی کھلا اور میں اندر جا

پڑا۔

میرے عقب میں فائر کی ہوئی گولیاں چکنے فرش پر ژناژٹ کی آواز سے پڑی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے مزید متعدد دوڑتے ہوئے قدموں کی بھی آوازیں سنائی دیں، جیسے ادھر اُدھر سے ان کے مزید مسلح پہرے دار ادھر ہی پہنچنا شروع ہو گئے ہوں۔

مجھے اس ہنگامے کے بعد کیپل دادا اور شکیلہ کی فکر ستانے لگی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ وہ بھی فائرنگ اور سائرن کی آوازیں سن کر حرکت میں آ جائیں گے۔

کمرا بڑا تھا۔ وہاں ...... مجھے تین افراد جن میں ایک پکی عمر کی عورت بھی تھی، مخصوص لباس میں ایک جانب دبکے ہوئے نظر آئے ...... پتا نہیں یہ ملازم تھے یا پھر یہاں قائم دفتری اور دیگر معاملات میں مصروف افراد تھے، میں نے اٹھ کر گن ان پر تان لی اور غرا کر لوکہارٹ ...... کے بارے میں دریافت کیا۔ ساتھ ہی میں نے بائیں جانب گھوم کر ایک برسٹ بھی داغ دیا۔ وہ سب کریہہ انگیز چیخیں خارج کرتے ہوئے گرتے چلے گئے، اس پر مزید دہشت بیٹھ گئی۔

"وہ...... وہ...... اس طرف سے نن...... نیچے نکل گیا ہے......" اس نے خوف سے ہکلاتے ہوئے سامنے ایک سپاٹ دیوار کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"یہ دیوار سپاٹ ہے۔" میں نے درشت لہجے میں اس سے کہا۔ اس وقت میری رگوں میں خون کی گردش جیسے حل پارا کے دوڑ رہی تھی اور لوکہارٹ کے نکل جانے کی تشویش نے مجھے پاگل بنا دیا تھا۔

"میں کھولتا ہوں۔" وہ بولا اور آگے بڑھا۔ وہ شاید میری خوں ناکی کے دباؤ میں آ گیا تھا اور بلا چون وچرا...... حکم مان رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے بائیں جانب دیوار کے ایک ہاتھ مارا تو...... وہ شق ہو گئی، میں تیزی سے اس طرف لپکا اور اسے بھی ساتھ ہی لیتا ہوا، ایک نیچے جاتے زینے میں اتر گیا۔ وہاں روشنی تھی اور عقب میں دیوار کے برابر ہونے کی مخصوص سرسراہٹ مجھے سنائی دی تھی۔

میں تیزی سے نیچے اترتا چلا گیا اور بائیں جانب گھومتے زینے سے دوسری طرف میرے قدم فرش پر جا لگے، وہ ایک چھوٹا سا کمرا نما کوئی چیمبر سا ہی نظر آتا تھا۔ وہاں مجھے شیشے کا ایک کیپسول نما کیبن نظر آیا...... اس کے اندر کوئی لمبا سیاہ چغہ پوش کھڑا نظر آیا۔

"لوکہارٹ۔"

میرے اندر کوئی زور سے چیخا تھا۔ میں نے اپنی گن کا رخ اس طرف کرتے ہی برسٹ فائر کیا۔ مگر کیپسول نما کیبن کا کچھ نہیں بگڑا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اس کیپسول کو زمین میں دھنستے دیکھا اور وہ چغہ پوش لوکہارٹ سمیت میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

وہاں اب فرش سپاٹ تھا۔ نہ اوپر چیمبر کی چھت پر ایسی کسی لفٹ کا کنکشن نظر آتا تھا نہ ہی فرش پر ......

میں نے اپنے شکار کو پھر دبوچ لیا۔ "میں اس کے تعاقب میں جانا چاہتا ہوں۔ جلدی بتاؤ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ خودکار نظام صرف فادر کے کنٹرول میں ہے۔ وہ جا چکا نیچے۔"

"میں تمہیں اوپر پہنچا دوں گا اگر تم نے مجھے نیچے جانے کا راستہ نہیں بتایا تو......" کہتے ہوئے میں نے گن کی نال اس کے سینے سے لگا دی۔

"میں اب مجبور ہوں۔" اس نے کہا اور میں بے بسی سے دانت پیس کر رہ گیا۔

اچانک مجھے لگا جیسے تھوڑی دیر پہلے ڈرپوک دکھائی دینے والا یہ شخص ایک دم بدل سا گیا تھا۔

پل کے پل میری چھٹی حس نے کسی اسرار بھرے خطرے کی گھنٹی بجائی تھی کہ سارا ہی کمرے میں ایک تیز سی آواز گونجی اور ابھی میں سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ کمرے میں تیز، گاڑھا اور کثیف سا دھواں بھرنے لگا۔ مجھے اس چیمبر نما کمرے سے بھاگنے کا بھی موقع نہ مل سکا اور میرے حواس مختل ہوتے چلے گئے۔

میں شاید فرش پر بے سدھ ہو کر گر پڑا تھا۔

☆☆☆

ہوش میں آیا تو سب سے پہلا احساس مجھے شدید قسم کی تکلیف کا ہوا تھا۔ اس قدر...... کہ بے اختیار میرے منہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ عقدہ کھلا کہ میرا پورا جسم سخت فولادی تاروں میں بندھا ہوا نہیں بلکہ کسا ہوا تھا۔ جیسے میرا وجود کسی شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔

یوں میں نے خود کو چکنے فرش پر بے سدھ سا پڑے محسوس کیا۔ آنکھوں سے دھند ہٹانے کے لیے جب میں نے اپنے سر کو جھٹکنا چاہا تو میرے منہ سے ایک اور کراہ خارج ہو گئی۔

پتا چلا میرا سر بھی اسی طرح کسا گیا ہے۔ گویا میں اپنے جسم کے کسی بھی حصے کو جنبش دینے سے ... قاصر تھا اور درد اسی وجہ سے تھا۔

ناچار میں بے بسی و بے کسی کے عالم میں اسی طرح پڑے پڑے آنکھوں سے دھند چھٹنے کا منتظر رہا۔ جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوا تو خود کو ننگے اور چکنے فرش پر پڑے پایا۔ جہاں تک فرش پر میں یا میرا سر لٹکا ہوا تھا بس اسی حد تک ہی میں دیکھ سکتا تھا، پورے کمرے میں موجود افراد کی تعداد کا احاطہ میری نظریں نہیں کر سکتی تھیں۔

جتنا بھی د [illegible] ا تھا اس کے مطابق ... مجھے چغہ پوش لوکہارٹ اور ا[illegible] کے قریب کھڑے چار مسلح افراد نظر آرہے تھے۔ وہ خود ایک اونچی پشت والی کرسی پر بڑے کروفر کے ساتھ براجمان تھا اور اس کے سر اور چہرے پر اس وقت چغے کا گھونگھٹ ہٹا ہوا تھا۔ وہ میری طرف بڑی سفاک، نفرت بھری نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

"تم......! اپنے بھیانک انجام کو پہنچ چکے ... شہزی!" دفعتاً اس کی شیطانی اور گونج دار آواز ابھری۔ "ماسٹر کے لیے میری طرف سے تمہاری صورت میں یہ ایک بہترین تحفہ ہوگا، جو میں عنقریب اس کی مکمل صحت یابی کے موقع پر دینے والا ہوں اور وہی تمہاری اور عابدہ کے بھیانک انجام کا فرمان جاری کرے گا۔"

لوکہارٹ اپنی بکواس کیے جا رہا تھا اور میرا رُواں رُواں اس وقت کسی جوالہ مکھی کے مانند کھولنے لگا تھا۔ میں ہنوز تکلیف میں تھا اور یہ مردود مجھ سے اس قدر خائف تھا کہ مجھے لوہے کی خاردار تاروں کے ذریعے بندھوا دیا تھا۔

"ماسٹر بالکل صحیح کہتا تھا کہ تم اس کے دشمنوں میں ایک خطرناک ترین اور دلیر دشمن ہو...... میں ہی تمہیں خاطر میں نہ لاتا تھا مگر آج...... تم نے گولڈ کوسٹ مینشن میں یہ افراتفری مچا کر مجھے بھی پریشان کر کے رکھ دیا تھا، میں بہت کم اس طرح کے اعتراف کرتا ہوں۔"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر آواز میرے حلق سے برآمد ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ مجھے کیبل دادا اور شکیلہ کی بھی فکر ستا رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو مگر میں تمہاری کچھ بھی نہیں سننا چاہتا اس لیے کہ" وہ ذرا رک کر پھر ڈرامائی انداز میں آگے بولا۔ "......تم جان کی بھیک نہیں مانگ سکتے۔ تم ہماری منتیں سماجتیں کرنے والے دشمن بھی نہیں ہو، ماسوائے اس حالت میں بھی تم گیدڑ بھبکیاں دینے کے...... اور وہ میں سننا نہیں چاہتا۔"

پھر وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند قدم میری جانب بڑھا۔ اپنے چغے میں ہاتھ ڈالا اور جب باہر نکالا تو اس میں کوئی شے چمک رہی تھی، وہ اس نے قدرے جھک کر مجھے دکھائی تو میں...... سکتے میں آگیا۔ وہ وہی طلسمی ہتھیار والی انگوٹھی تھی۔

"مجھے اسی کی ضرورت تھی جو تم نے پوری کر دی۔ یہ تمہارا احسان ہے ہم پر اور ماسٹر (لولوش) پر...... اسی لیے تم رعایت کے تو مستحق ہو ہی...... مگر......" اتنا کہتا ہوا وہ واپس اپنی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

"رعایت صرف اسی قدر ملے گی کہ تمہاری اور تمہاری محبوبہ کی زندگی کے کچھ دن اور بڑھا دیں۔"

میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا اس انگوٹھی کی مدد سے لوکہارٹ، لولوش کا علاج کر چکا تھا؟ نیز میرے ساتھیوں کیبل دادا اور شکیلہ کا کیا بنا تھا؟ ریتا اور رینا کہاں چلے گئے تھے؟

اب یہ بدبخت مجھے کچھ بولنے دیتا تو میں اس سے ایسے سوالات کرتا کہ اس کی باتوں سے میں خود ہی اپنے سوالوں کے جواب اخذ کر لیتا، ایک عجیب تکلیف دہ سی بے بسی کا شکار ہوا تھا میں اس بار...... اور شاید برا بھی پھنسا تھا......

"دل تو کرتا ہے کہ میں اسی انگوٹھی سے تمہیں اسی وقت ختم کر ڈالوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ تم اور عابدہ ماسٹر کے خاص شکار ہو اور ماسٹر اس انگوٹھی سے پہلے تمہاری نظروں کے سامنے تمہاری محبوبہ کو ڈسوا کر اپنا انتقام لے گا اور یہی میں چاہتا ہوں۔"

اس کمینے کی بکواس جاری تھی اور میں کچھ نہیں کہہ پا رہا تھا۔ ورنہ یہ میری سرشت میں ہی شامل نہ تھا کہ میں...... چاہے مغلوب ہی کیوں نہ ہوں، پھر بھی دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے للکارتا، دھمکاتا ضرور تھا۔ جسمانی مجبوری اپنی جگہ سہی مگر زبان آزاد ہوتی تھی تو جملوں سے ہی دشمن کا سکون تہ و بالا کر دیا کرتا تھا لیکن اس وقت میری ہیئت کذائی قابلِ رحم حد تک ناگفتہ بہ تھی، آہنی باڑ جیسی تاریں میرے پورے جسم کے گرد ہی نہیں بلکہ جسم کے اوپر گردن سے لے کر ٹھوڑی اور گالوں تک لپٹی ہوئی تھیں۔ لوہے کی ایک خاردار تار کو میرا منہ کھول کر باچھوں سے بھی گزارا گیا تھا۔

یہ میرے تصور میں بھی نہ تھا کہ میں کبھی اپنے دیرینہ دشمن کے سامنے اس طرح بھی بے بسی کے عالم میں ملوں گا، کہ مجھے حرکت کرنا تو کجا کچھ بولنے کا بھی یارا نہ رہے گا۔

ایک خواہش بڑی شدت کے ساتھ میرے دل و دماغ میں ابھری تھی کہ کاش دشمنی کے بہانے ہی سہی، عابدہ کو ایک بار...... صرف ایک بار میری پیاسی نظروں کے سامنے لایا جاتا۔ اس کا دیدار کروا دیا جاتا۔ صرف ایک بار...... صرف ایک بار......

لوکہارٹ، میری آنکھوں سے میری بے بسی سے جیسے حظ اٹھاتے ہوئے ہنس بھی رہا تھا اور کبھی ایک آدھ قہقہہ بھی لگا دیتا تھا۔ اس کی شیطانی مسرت اور طمانیت بھری خوشی سے مجھے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ جس انگوٹھی سے میں نے لولوش کو جہنم واصل کرنے کی کوشش کی تھی، اب اسی انگوٹھی کے زہر سے ہی تریاق یعنی "اینٹی ڈوٹ" تیار کیا جانے والا تھا یا ابھی تیاری کے عمل سے گزر رہا تھا۔ تاہم یہ بات اب طے تھی کہ میں اپنے انگوٹھی جیسے طلسماتی ہتھیار سے محروم کر دیا گیا تھا اور یہ وہ ہتھیار تھا جس کے لیے لولوش کا ایک اور اہم گماشتہ سے جی کوہارا بھی مصر پہنچا تھا لیکن بازی میں نے ماری تھی اور وہ خود میرے ہاتھوں واصل جہنم ہوا تھا۔

"جی تو چاہ رہا ہے کہ کم از کم تمہارا منہ کھول دوں، تمہاری باتیں بھی سنوں کہ تمہاری اس کتے جیسی حالت کے بارے میں تمہارا اظہارِ خیال کیا ہو سکتا ہے؟ ہاہا...... ہاہا......! لیکن نہیں...... مجھے تم سے ڈر بھی لگتا ہے، بقول ماسٹر کے تم قسمت کے ہی دھنی نہیں بلکہ باتوں کے بھی دھنی ہو۔ خوب بہلاتے پھسلاتے ہو۔"

لوکہارٹ پاگل دیوانہ ہو رہا تھا، شیطانی مسرت نے اسے ایسا ہی بنا دیا تھا، یہ مجھے لولوش کی سیم کاپی لگتا تھا۔ طیش یا خوشی کے عالم میں لولوش کی بھی یہی ذہنی و دماغی کیفیات ہوتی تھیں۔ میں کچھ کہنے سے قاصر تھا۔

پھر وہ وہاں موجود چار مسلح آدمیوں میں ایک سے تحکمانہ انداز میں مخاطب ہو کر بولا۔

"تھیوڈر! تم اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے ہلو گے بھی نہیں۔"

"یس فادر!" تھیوڈر نامی اس آدمی نے مؤدبانہ انداز میں اپنے سر کو قدرے خم دے کر کہا۔ وہ اپنے تین ساتھیوں میں نسبتاً زیادہ تنومند اور قد و قامت کا نظر آتا تھا۔

"ہمارے عظیم شکار کے حلق میں پانی کا ایک قطرہ بھی مت ٹپکانا۔"

"یس فادر!"

لوکہارٹ اٹھ کر ایک دروازے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ وہاں موجود اس کے چاروں مسلح ساتھی، دو مختلف سمتوں میں رکھی ہوئی سادہ سی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔ میں پہلے ہی رسن بستہ بلکہ "خاربستہ" اپنے وجود کو حرکت دینے سے بھی قاصر اسی لیے وہ میری طرف سے بے فکرے تھے۔

اچانک ایک خیال بجلی کی تیزی سے میرے ذہن میں چمکا۔

"سنہری بھونرا......"

میں اسے بھول ہی گیا تھا۔ طلسمی انگوٹھی کے بعد سنہری بھونرا ایک خطرناک ہتھیار تھا میرا...... بلکہ وہ تو ایسا ہتھیار تھا کہ انجانے آدمی کے ہاتھ آ جاتا تو وہ اپنی لاعلمی میں "خود گزیدگی" کا بھی شکار ہو جاتا۔ جیسا کہ اب تک میرے مشاہدے میں ایسا متعدد بار آ چکا تھا۔

سوال اب یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ ہتھیار بھی اس خبیث لوکہارٹ نے مجھ سے اڑا لیا تھا؟ یہاں مجھے اپنی محتاط پسند فطرت سے امید ہونے لگی کہ وہ خاموش موت بکھیرنے والا سنہری بھونرا...... یقیناً لوکہارٹ کے ہاتھ نہیں لگا ہوگا، ورنہ وہ زہریلی انگوٹھی کے ساتھ اس کا بھی تذکرہ ضرور کرتا۔ دوسرا یہ کہ میں نے ان دونوں طلسمی ہتھیاروں کو الگ الگ...... چپ نما چرمی کیسوں میں اپنے وجود کے ساتھ بغلوں میں چھپا رکھا تھا، کہ اگر میں کسی دشمن کے ہتھے چڑھ بھی جاؤں تو وہ صرف مجھے آتشیں ہتھیاروں سے تہی کر سکیں۔

میری اس خوش امیدی کو اس خیال سے بھی تقویت ملتی تھی کہ...... جب میں نے لولوش پر وہ زہریلی انگوٹھی آزمائی تھی تو اس وقت اچانک ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ میں اسے دوبارہ اپنی بغل میں نہیں چھپا سکا تھا اور ایسے ہی چرمی کیس کے ساتھ اپنی قمیص کی جیب میں پڑا رہنے دیا تھا۔ جبکہ دوسرے ہتھیار (بھونرے) کا استعمال ابھی نہیں ہوا تھا اسی لیے وہ میری بائیں بغل میں موجود ہونا چاہیے تھا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ میں کس طرح...... یہ جانچنے کی کوشش کرتا کہ...... میں ابھی دوسرے ہتھیار (بھونرے) سے محروم نہیں ہوا تھا؟

میری حالت ایسی تھی کہ میں اپنے وجود کے کسی بھی ایک حصے کو ذرا سا بھی ہلانے جلانے کی کوشش کرتا تو...... مارے درد کے میری چیخیں نکل جاتیں۔ خاردار آہنی باڑھ نما تاروں سے مجھے کس کر لپیٹ رکھا تھا اور میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ جہاں جہاں سے وہ بندھی ہوئی تھی وہاں سے میرا جسم زخمی ہونے لگا تھا اور خون بھی رِسنا شروع ہو گیا تھا۔

یہ ایک سنگین صورتِ حال تھی۔ میرا جوڑ جوڑ ٹیسوں اور درد کے مارے پکا ہوا پھوڑا بنا ہوا تھا۔ اب تو سانس لینا بھی دشوار ہونے لگا تھا، کیونکہ سانسیں کھینچنے کے لیے سینے کی حرکت بھی ٹیسیں بڑھا رہی تھی۔

ایک ظالم اور بے رحم شکنجہ سا تھا جس سے میرے پورے وجود کو کس دیا گیا تھا۔ ایک ذرا سا ہلنے پر بھی میری کراہیں میرے منہ سے برآمد ہو جاتی تھیں۔

وقت بھاری ہو تو ایک ایک لمحہ بھی صدیوں کے برابر لگتا ہے۔ یوں وہ مجھ پر گویا بھاری سِل کی طرح گزر رہا تھا اور ایک کڑا امتحان بنا ہوا تھا۔

انہی اذیت ناکیوں اور آہوں کراہوں میں نجانے کتنے گھنٹے بیت چلے۔

میرے زخم گزیدہ جسم کا رستا ہوا خون بھی جم گیا تھا اور ان میں گڑھی ہوئی لوہے کی خاردار تاریں اندر کھب کر جیسے کھال میں پیوست ہو چکی تھیں اور ان پر جمے ہوئے خون کی تہ آ گئی تھی۔

اب تو اور زیادہ تکلیف ہونے لگی تھی مجھے... جیسے پورے کھرنڈ میں درد، ٹیس کے علاوہ اب جلن بھی ہونے لگی تھی۔

میں سمجھتا تھا کہ زندگی میں دوسری بار میں اس قدر بے بس اور شدید جسمانی تکلیف کا شکار ہوا تھا اور پہلی بار...... سے جی کوہارا کے ہاتھوں اس کی ٹارچری یوٹ ...... میں میرے ساتھ ایسا ہوا تھا جب سے جی کوہارا نے مجھے رسن بستہ کر کے میرے مضروب جسم پر مچھلی اور جھینگوں پر چھڑکنے والے مصالحے کا لیپ کیا تھا۔

پیاس نے بھی ہلکان کر رکھا تھا۔ منہ اور گلا سوکھ کر جیسے کانٹا ہو رہا تھا۔

اس دوران وہاں میری "کڑی" نگرانی پر مامور چاروں پہرے دار بھی باری باری باہر آتے جاتے رہے...... وہ کھاپی بھی رہے تھے اور میری اذیت زدہ حالتِ زار پر ہنسی ٹھٹھول بھی کرتے جاتے تھے۔

کمرے میں روشنی تھی، کھڑکی بھی تھی جو اندر ہی کھلتی تھی۔ یعنی باہر کا منظر نہیں تھا۔ روشن دان بھی بند تھا۔ دن تھا یا رات...... کچھ پتا نہیں۔ میری اپنی حالت غیر ہونے لگی تھی، اب تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا بھی چھانے لگا تھا۔ سر گھوم رہا تھا۔ تشنگی کا احساس ہوتا تو جی ڈوبنے لگتا۔

مزید اور وقت بیتا۔ پہرے داروں میں سے دو باہر گئے تھے، جن میں تھیوڈر بھی تھا۔ باقی اندر دو اونگھ رہے تھے۔ میں تو بس جیسے نہ زندوں میں تھا نہ مردوں میں...... یک ٹک چھت کو یا سامنے کی دیوار کو گھور رہا تھا۔ ایسے میں جب ساری راہیں مسدود اور راستے مفقود نظر آنے لگے تو مایوسی گھر کرنے لگتی ہے، مجھے اس سے چڑچڑاہٹ ہوتی تھی۔ دل و دماغ کی عجیب کیفیات تھیں۔ خود پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ میں... شاید جوش و جذبات اور غیظ و غضب میں آ کر جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھا تھا۔

اچانک کمرے کے دروازے پر آہٹ اُبھری۔ دونوں اونگھتے ہوئے پہرے داروں میں سے ایک اکس بھرے انداز میں اٹھا۔ میری طرح شاید وہ بھی یہی سمجھا تھا کہ باہر اس کا کوئی ساتھی ہوگا۔ اس نے جیسے دروازے کے قریب پہنچ کر اسے کھولا تو اگلے ہی لمحے اوغ سے مشابہ کراہ آمیز چیخ کے ساتھ اندر آ رہا تھا، اس کی پیشانی پھٹ چکی تھی اور وہاں سے بھل بھل خون بہہ جا رہا تھا۔ میری نیم باز آنکھوں نے ایک اور منظر دیکھا، شکیلہ اور کھیل دادا...... اندر گھستے چلے آئے۔ اپنے ان دونوں جاں نثار ساتھیوں کو دیکھ کر میرے اندر جیسے مسرتوں کے سوتے پھوٹ چلے۔ پھر میں نے فوراً ہی ان کے عقب میں ریتا کی بھی جھلک دیکھی۔

اندر گھستے ہی ان کی تیز گردشی نگاہ سب سے پہلے مجھ پر پڑی، اس کے بعد اندر موجود دوسرے پہرے دار پر، جو سنبھالا لینے کی کوشش میں تھا کہ شکیلہ نے نجانے کس جوش غیظ تلے چیخ ماری اور اس پر پروانہ وار چھلانگ لگا دی۔

وہ اس پہرے دار پر جیسے بجلی بن کر کڑکی اور...... گن کی ایک ہی لٹھ مار ضرب سے اس پہرے دار کا سر کھول کر رکھ دیا۔ وہ پشت سے گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

"ششش...... شہزی......!" وہ دکھ بھرے انداز میں یہ کہتے ہوئے میری جانب لپکی۔ کھیل دادا بھی مجھے اس حالت میں دیکھ کر تڑپ گیا تھا۔ شکیلہ نے میری ہیئت کذائی کا غیظ دوسرے پہرے دار پر خوب نکالا تھا۔

"دادا......! کچھ کرو، شہزی کو خاردار تاروں میں جکڑا ہوا ہے۔" شکیلہ نے تڑپ کر کھیل دادا سے کہا، وہ میری جانب لپکا، دونوں اکڑوں فرش پر بیٹھ گئے۔ ریتا بھی مجھے تکلیف دہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

پھر دادا نے میرے گرد کس کر لپٹی ہوئی تاروں کا جائزہ لیا، اس دوران شکیلہ اٹھ کر فرش پر گرے پڑے پہرے دار کے پاس آئی اور جلدی جلدی اس کی تلاشی لی، مگر اس کے لباس سے کوئی ایسی شے دستیاب نہ ہو سکی جس سے لوہے کی تاروں کو کاٹا جاتا۔

خود کھیل دادا نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے تاروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی اور پھر میں نے ہی نہیں شکیلہ نے بھی دیکھا کہ کھیل دادا اپنے ہاتھ زخمی ہونے کی پروا کیے بغیر میرے مضروب جسم کی تاریں کھولتا چلا گیا۔

میرے منہ سے کراہیں بھی خارج ہوتی رہیں، وجہ یہی تھی کہ تاریں کس کر چپک گئی تھیں، جن میں خون رس رس کر کھرنڈ کے مانند چپک گیا تھا، وہ پھر رسنے لگا۔ سب سے پہلے اس نے میرے منہ میں لگی تار کھولی تھی۔

میں دیکھ سکتا تھا کہ...... اس کوشش میں خود کھیل دادا کے ہاتھ بھی زخمی ہونے لگے تھے۔ ایک جوش تھا ایک جنون جاں نثاری تھا جس کے تحت وہ اپنے زخموں اور تکلیف کی پروا کیے بغیر کیے جا رہا تھا، بعد میں شکیلہ بھی اس کی مدد میں شامل ہو گئی تھی۔

یوں تھوڑی دیر بعد میں آزاد ہو چکا تھا۔

اس آزار اور بے بسی سے نجات پاتے ہی میرے اندر عجیب سا جوش گھر کرنے لگا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا، سر میں چکر آئے، تھوڑا لڑکھڑایا، شکیلہ نے مجھے ایک دم بڑھ کر سنبھال دیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی داہنی بغل چیک کی اور طمانیت بھری سانس لی۔ دوسرے ہتھیار سے میں محروم نہیں ہوا تھا۔

انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہاں پہنچنے میں ریتا نے ہی ان کی مدد کی تھی۔ ریتا کا میں نے تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور جب رینا کے بارے میں پوچھا تو ان کے چہرے غمناک سے ہو گئے، پتا چلا کہ اسے شبے کی بنا پر گولی مار دی گئی تھی۔ مجھے رینا کی موت کا دکھ ہوا۔ اس نے مجھ سے سچ کہا تھا کہ یہاں پھیلے ہوئے کتے ذرا سا بھی شبہ ہوتے ہی مار دیے جاتے ہیں اور اب ریتا کو بھی یہی خطرہ لاحق ہو چکا تھا، شاید اس لیے بھی وہ اب آر یا پار کے مصداق ہماری مدد کے لیے مجبور ہو گئی تھی۔

ہم نے دشمن سے چھینے ہوئے ہتھیار سنبھال لیے تھے اور دروازے کی جانب لپکے۔ اسے کھول کر جیسے ہی باہر راہداری میں آئے، ہماری نظر تھیوڈر پر پڑی، اس کے ہمراہ مزید دو آدمی بھی تھے۔ اسے شاید کسی گڑبڑ کا شبہ ہو چکا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکے تھے مگر ہماری گنیں پہلے ہی سیدھی تھیں۔

"فائر۔" میں چیخا اور ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ کھیل دادا اور شکیلہ نے بھی میری تقلید کی تھی جبکہ میری حالت پتلی ہو رہی تھی۔

وہ تینوں تڑپنے لگے۔ میں نے ریتا سے پوچھا لوکھارٹ کہاں مل سکتا ہے۔

"آگے بڑھتے رہو، میں وہیں لیے جا رہی ہوں......" اس نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

اس کی رہنمائی میں ہم آگے بڑھے... ایک اور زینے طے کرتے ہوئے ایک بڑے ہال کی دیوار کے عقب سے ہوتے ہوئے بائیں موڑ پر رک گئے۔ ریتا بولی۔

"اس طرف ایک چیمبر ہے۔ وہاں کیپسول لفٹ لگی ہے۔ ہم اسی کے ذریعے نیچے جائیں گے۔ آشا (امید) ہے کہ نیچے ہمیں اولووش سمیت لوکھارٹ سے بھی ہماری مڈبھیڑ ہو جائے، مقیدی عابدہ بھی وہیں کہیں ہوگی، لیکن کیا......"

"لیکن ویکن کچھ نہیں...... بس! آگے بڑھو۔" میں نے جوش سے اور قدم بڑھائے ہی تھے کہ ریتا ایک دم میرے آگے آ گئی اور مجھے سرزنش کرنے کے انداز میں بولی۔

"جلد بازی مت کرو، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اس طرف لوکھارٹ نے سخت پہرا رکھا ہے، نہ صرف یہ بلکہ...... یہ وہی چیمبر ہے جہاں تمہیں گیس کے ذریعے بے ہوش کر دیا گیا تھا۔"

"اوہو......" میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ میں اس کی مار کھا چکا تھا اور بڑی کڑی سزا بھگتی تھی۔

"اس طرف فائرنگ کی گئی تو نیچے خطرے کا الارم بج اٹھے گا اور خفیہ کیمروں کے ذریعے چیمبر کو مانیٹر بھی کیا جا رہا ہو گا، ہمیں دیکھتے ہی وہاں گیس چھوڑ دی جائے گی۔" اس نے جیسے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"تو اب کیا کیا جائے؟" اس بار کھیل دادا نے قدرے جھلا کر کہا۔

"وہاں زیادہ سے زیادہ چار پانچ پہرے دار ہو سکتے ہیں۔ انہیں جم کر مقابلہ کر کے ہلاک کرنا ہوگا اور اس دوران تمہارا کوئی ایک ساتھی، چیمبر کی چھتوں کے چاروں کونوں پر گولیاں برسائے گا۔ گیس ٹیوب وہیں نصب ہیں۔"

"گڈ......! چلو آگے بڑھو اب......" میں نے کہا۔

مطلوبہ جگہ پہنچے تھے کہ ہم دیکھ لیے گئے۔ ان کی تعداد پانچ چھ سے زیادہ نہیں تھی، دو افراد کی بیک وقت ہم پر نگاہ پڑی تھی اور وہ بُری طرح چونکے تھے، اسی لمحاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ان پر یک بیک برسٹ فائر کر دیے۔ وہ چیخ کر گرے۔ باقی چونکہ چیمبر روم کی دیوار کی آڑ میں تھے، وہ بچ گئے، مگر ہم رکے نہیں تھے، اور دیوانہ وار پیش قدمی کرتے آگے بڑھے۔

چیمبر روم کا دروازہ بائیں جانب کی دیوار پر نصب تھا، ہال کی دیوار دوہری ہو کے اس سے ملحق تھی اور وہاں سے بھی ہمیں یک بیک دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

"جلدی کرو ان کے اور مسلح ساتھی بھی ادھر ہی پہنچنے والے ہیں۔" ریتا نے کہا اور یہ وہ وقت تھا جب ایک جانب

سے اندھا دھند برسٹ فائر ہوا۔

یہ ہال کی دائیں جانب سے گھومتی ہوئی دیوار کی آڑ سے کیا گیا اور وہیں سے ہال کی جانب سے آتے ہوئے کسی نے ریتا پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ بے چاری آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گئی۔

دشمن پر ہمیں دکھ کرنے کا بھی موقع نہ ملا اور شکیلہ نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ خود کو چیمبر روم کی دیوار سے لگاتے ہوئے، پوزیشن بدلی، کیونکہ اگلی بار وہ زد میں تھی کہ اس نے دشمن کو نشانے میں لے لیا اور برسٹ داغا۔ میں اور کھیل دادا اس چھپے ہوئے حملہ آور کی صرف کربیہ انگیز چیخ ہی سن پائے تھے۔

اس کے بعد اس طرف سے بھی ہم اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

”چیمبر کے پہرے داروں کو نشانہ بناؤ۔“ میں نے کہا۔

ہم نے دوبارہ جگہ بدلی..... ہم اب بیک وقت دو سمتوں سے مسلح حملہ آوروں سے برسرِ پیکار تھے اور وقت کا تقاضا تھا کہ ہمیں جلدی یہ کھیل نمٹانا ہے۔

تب ہی میں نے کھیل دادا اور شکیلہ کو..... ہال سے اچانک برآمد ہونے والے مسلح حملہ آوروں سے نمٹنے کا اشارہ دے دیا اور خود چیمبر روم کے حملہ آوروں سے نبرد آزما ہونے کے لیے دیوار سے چپکا چپکا آگے بڑھتا رہا۔

اچانک مجھے چیمبر روم کے دروازے کے پاس دو سائے متحرک نظر آئے۔ میں نے ان پر برسٹ فائر کیا۔ کوئی چیخ نہیں سنائی دی، اس کے برعکس، دو حملہ آوروں نے فرش پر لوٹ لگائی، میں دنگ رہ گیا کہ وہ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ اور ان کی چالاکی دیر سے سمجھا، اب میرے دفاع کا وقت تھا، جس سے میں ذرا بھی تساہل سے کام لیتا تو گیا تھا۔

میں نے خود کو پشت کے بل دیوار سے چپکا دیا۔ یہ ان کا بلف تھا، اگر میں ان پر ایک اور برسٹ فائر کرنے کی غلطی کرتا تو ان کے دوسرے تاک میں بیٹھے ساتھی اور خود یہ لڑھکنیاں کھاتے دونوں حملہ آور مجھ پر بے دریغ فائرنگ کر ڈالتے۔

میرے بچاؤ والی پوزیشن میں آتے ہی ان کا یہ کھیل خود ان کے لیے موت کا کھیل بن گیا اور جب تک وہ سنبھلتے میں ان پر برسٹ فائر کر چکا تھا، وہ تڑپ کر وہیں ٹھنڈے پڑ گئے، جبکہ باقی ان کے ساتھیوں کو طلوع ہوتے ہی میں نے ان پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کر ڈالی، وہ تین کی تعداد میں تھے اور ادھر ادھر جا پڑے تھے۔

میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ جانے دیا تھا اور چیمبر روم کی جانب بڑھا، دروازے کے قریب پہنچا تو، فرش پر بظاہر زخمی حالت میں پڑے ایک حملہ آور نے میری ٹانگ کھینچ لی، میں منہ کے بل گرتے گرتے سنبھلا اور دوسری ٹانگ جو زخمی تھی، چلا دی، جو اس کے جبڑے پر پڑی، بھاری جوتے کی ضرب نے اس کی رہی سہی کسر پوری کر دی اور وہ پل بھر میں بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں چیمبر روم میں گھس گیا اور ریتا کی ہدایت کے مطابق میں نے دس بائی دس کے اس چوکور روم کی دیواروں کے چاروں..... کونوں میں بے تحاشا فائرنگ شروع کر دی۔

چیمبر میں کیپسول لفٹ موجود تھی، میرے پاس شکیلہ اور کھیل دادا کا انتظار میں ٹھہرے رہنے کا وقت بالکل بھی نہ تھا، یوں میں اس کیپسول لفٹ کے اندر اسی طرح گھس گیا تھا جیسے میں نے لوکھارٹ کو گھستے اور اسے آپریٹ کرتے دیکھا تھا۔

لفٹ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک حملہ آور کی لاش سے اپنی گن بدل لی تھی کہ میری گن میں کم راؤنڈ بچے ہوں گے، نیز، ایک خنجر بھی میں نے کچھ سوچ کر اچک لیا تھا۔

چند لمحوں بعد..... میں کیپسول لفٹ کے ذریعے نیچے جا رہا تھا، میرے محتاط اندازے کے مطابق ..... لفٹ لگ بھگ کوئی بیس پچیس فٹ کے بعد ٹھہر گئی۔

جس دوسرے چیمبر میں اترا تھا وہاں بھی مجھے خطرہ تھا، لیکن شکر رہا کہ ریتا کی بتائی ہوئی ترکیب کامیاب گئی تھی، دشمنوں کو پتا ہی نہ چلا کہ میں ان کی شہ رگ کے قریب پہنچ گیا ہوں۔

لفٹ سے نکلتے ہی میں روم کے دروازے کی جانب بڑھا اور..... وہاں سے میں نے باہر قدم رکھا تو..... بُری طرح ٹھٹک گیا..... میرے سامنے دو عدد جبشی درندے..... کوموگاز..... اپنا کریہہ ناک غار سا منہ کھولے کھڑے غرا رہے تھے، ان کی باچھوں سے رال ٹپک رہی تھی۔

میرے اندر کوئی چیخا۔

”افسوس..... شہزی..... ! تم نے ایک بار پھر جوش اور جلد بازی میں آ کر خود کو ہلاکت میں ڈال دیا۔“

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

شجرِ ثمربار

منظر امام

تعلیم و تدریس کے شعبے سے وابستہ افراد کی زندگی بھی بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے... ہر روز انہیں ایک نئے تجربے سے گزرنا پڑتا ہے... گھر گھر جا کے تدریس دینے والے استادوں کی کہانی... ہر استاد کے پاس اپنی اپنی گرتے...

ہمارے اردگرد بکھرے مسائل میں سے ایک سنگین مسئلے کی منظر کشی

رضی کے پاس آج بھی پیسے نہیں تھے اس لیے وہ ایک پارک میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ابھی غزالہ کے گھر جانے میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ اس کا گھر پارک سے کچھ ہی دوری پر تھا۔

رضی، غزالہ کو ٹیوشن پڑھایا کرتا تھا۔ اس کی ماں بہت تیکھے مزاج کی عورت تھی۔ اس ٹیوشن پر ٹیوٹرز ایسوسی ایشن کے چیف ناظم نے اسے بھیجا تھا۔

چیف ایک کمال کا آدمی تھا۔ اسے ٹیوشن کی انسائیکلو پیڈیا کہا جاتا تھا۔ بہت سے نوجوان اچھے مستقبل کی اُمید میں ٹیوشن پڑھانے چلے جا رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں کسی کا مستقبل آگے جا کر بہتر بھی ہو گیا ہو لیکن عام طور پر لوگ ٹیوشن ہی پڑھاتے جاتے تھے۔

چیف ایک فنکار تھا۔ ٹیوشن حاصل کرنے کے کئی گر

www.pklibrary.com

آوارہ گرد

قسط 67:

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ہوا دلچسپ سلسلہ...

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہوگئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہوگئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑپتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ انو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک وجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی نایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں روع ہوجاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی ورس ٹائیگر فیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نو دولتیا سیٹھ نوید سانچے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو دلوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ س کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمسی کا ایک فسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں نفیہ گٹھ جوڑ کرلیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف ل صاف ہوجاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں عل کرنے کی سازش میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی ہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر فیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر فیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر فیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی الیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام چھلگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسمِ نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو دری ہوچکا ہے اور لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹمسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹمسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹمسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، لیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے پ کی حیثیت ڈکلیئر ہوگئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی ل اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ب موقع پر شہزی، اپنی برق تصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوک کو بے بس کردیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس ے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہوجاتے ہیں۔ پولیس ان ونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور ندرناتھ حملہ کردیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ن کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا ی لڑکی کو تنگ کررہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کررہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا ں کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آجاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ سمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا تا ہے اور سی جی بھجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھجوانی، شہزی کے گن کے نشانے پر تھا مگر اسے

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

مار نہیں سکا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کھیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کل منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے۔ جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کل منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھالی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حد نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ منیجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سوتنگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سوتنگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور مظلوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کل منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کل منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر بشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے بشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کھیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لانچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کھیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی ساچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد کاسپاکو کے ہرکارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاسپاکو، شہزی کی بہادری کا قائل ہو جاتا ہے اور خالص سونے کا گوتم بدھ کا مجسمہ جو پہلے ہی بینکاک میوزیم سے چرا لیا گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچانا تھا۔ اور اس کے لیے کاسپاکو شہزی کا انتخاب کرتا ہے اور امریکی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ ہونا تھا کہ اسپیکٹرم کے ایجنٹوں سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور بالآخر ایک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا ہے۔ روڈلف کی دوست یاسمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ کوہارا یہاں بھی شہزی کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور طیارہ ہائی جیک کر لیتا ہے اور طیارے کو موربانغہ کے صحرا میں اتارنا چاہتا ہے مگر فیول ختم ہونے کے باعث طیارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے یہاں شہزی سے دوبدو لڑائی میں کوہارا جہنم واصل ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر شہزی کا جہاز شکاگو ائرپورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

’’تم...... مجھے بے حوصلہ نہیں کر سکتے۔‘‘ میں نے زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اپنی گن سیدھی کر کے، ایک کوتھوگا کے سر کا نشانہ لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

میری گن سے برسٹ فائر ہوا اور اسی وقت دونوں کوتھاگاز نے جمپ لگائی۔ میرے چلائے ہوئے برسٹ کی گولیاں کمرے کی دیوار میں پیوست ہو گئیں۔

نشانہ خطا ہوتے ہی میں نے ان دونوں جہنمی مخلوق کے درمیانی خلا کی طرف بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جمپ لیا اور کمرے کے چکنے فرش پر اس طرح گرایا کہ تیزی سے پھسلتا ہوا ان کے درمیانی خلا سے گزرتا چلا گیا۔

زخمی ہونے کے باوجود یہ سب میں عابدہ کو پانے کی ولولہ انگیزی اور خوداعتمادی کے بل بوتے پر ہی کر رہا تھا۔ اُدھر کمیل دادا اور شکیلہ اوپر دشمنوں کے ساتھ برسرِپیکار تھے۔

بہرکیف اب میرے پاس دوبارہ اُن پر برسٹ داغنے کا موقع ہاتھ آچکا تھا۔ دونوں کوتھاگاز ایک لمحے کے لیے جامد ہو گئے تھے۔ جب تک پلٹتے، میں ایک کے سر کے پچھلے حصے کا نشانہ لے کر لبلبی دبا چکا تھا۔ دھماکا ہوا اور ایک کوتھوگا کا سر اُڑ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔

دوسرا... کوتھوگا ... اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہی اچھلا اور فرش سے فضا میں تقریباً دو تین فٹ بلند ہو کر میری جانب گھوم کے لپکا۔

میں نے خطرہ بھانپتے ہی فرش پر لیٹے لیٹے لوٹ لگائی تھی، بس، ایک لمحے کی دیر ہوتی تو میں اس خونخوار مونسٹر کے شکنجے میں ہوتا، وہ دھپ کی آواز سے میرے قریب آن پڑا تھا۔

میرے قریب آتے ہی وہ تیزی سے گھوما تھا، میں .... تب تک پشت کے بل فرش پر لیٹے لیٹے اس کے سر کے پچھلے حصے کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا چکا تھا۔

میری گن نے آتشیں شعلہ اُگلا اور اگلے ہی لمحے دوسرا کوتھوگا بھی جہنم میں جا پہنچا۔

سر اور گردن اُدھڑے ہوئے دونوں کوتھاگاز کی فرش پر پڑی لاشیں عجیب وحشت ناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ میرا رُواں رُواں فرطِ جوش تلے مرتعش تھا۔

ان دونوں جہنمی مخلوق... سے نمٹنے کے بعد میں دروازے کی جانب لپکا۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ کوتھاگاز کو مجھ پر چھوڑنے کے بعد دشمن مسلح حواری اتنی جلدی سامنے نہیں آئیں گے۔

یہاں آتے ہی میں نے ایک ایک کونے کی تلاش شروع کر دی۔ ایسے حالات میں جبکہ میں چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا، مجھے صرف اور صرف عابدہ کی تلاش تھی، یہ حقیقت تھی کہ مجھے یہاں بہت قریب سے عابدہ کی خوشبو آنے لگی تھی۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ یہیں کہیں ہے، میں اسے یہاں گولڈ کوسٹ مینشن کے چپے چپے میں ڈھونڈ رہا تھا۔

اچانک مجھے بائیں جانب ایک سائیڈوے میں متعدد دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

میں ایک دوہرے کوریڈور سے والے راستے سے گزر رہا تھا، ٹھٹک کر وہیں دبک گیا۔

اسی وقت ایک زوردار شائیں کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ دھواں اُڑاتی ہوئی کوئی شے میرے قریب لڑھکتی ہوئی آن پڑی۔ جب تک میں سنبھلتا، وہ دھماکے سے بلاسٹ ہوئی اور عجیب نارنجی رنگ کا دھواں پھیلنے لگا۔

میں محتاط تھا، لہٰذا اس ’’دھماکے دار‘‘ شے کا مطلب سمجھتے ہی میں اپنی جگہ سے اچھل کر سائڈوے والی راہداری میں آن کودا جو ذرا نیچے کی طرف تھی اور وہاں سے مجھے بائیں جانب ایک تین فٹ کی ’’پردی‘‘ نما دیوار دکھائی دے گئی، دھواں یہاں تک آنے لگا تو میں نے وہاں سے بھی چھلانگ لگائی اور فرش پر آرہا۔

ابھی میں پھینکی ہوئی گیس شل کی زد سے بچا ہوا تھا مگر جانتا تھا کہ زیادہ دیر ایسا نہیں چل سکتا تھا۔ میں نے اس کی رینج سے بچنے کے لیے اندھادھند دوڑ لگا دی۔ ایک راہداری جو پندرہ بیس قدموں کے بعد بائیں جانب کو گھوم رہی تھی، میں بھی اسی طرف کو مڑا مگر اگلے ہی لمحے مجھے چونک کر رکنا پڑا۔

سامنے چار مسلح افراد گیس ماسک لگائے ہاتھوں میں گنز تھامے کھڑے تھے۔ گن تو میرے ہاتھ میں بھی تھی مگر مجھے ان پر فائر کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا، تب تک وہ مجھ پر اندھادھند گولیاں برسا دیتے، کیونکہ ان کی گنز سیدھی تھیں، لہٰذا ایسی خطرناک سچویشن کو دیکھتے ہوئے میں نے خود کو فرش پر گرا دیا۔

گولیاں میرے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ میں نے بھی فرش پر خود کو گراتے ہی گن سیدھی کرنے کے ساتھ ہی ٹریگر بھی دبا دیا۔

ایک تواتر کے ساتھ میری گن نے آتشیں قہقہے اُگلنا

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

شروع کردیے اور دشمن چیخیں مار کے ڈھنے لگے۔

یہ ضروری بھی نہ تھا کہ سب ہی ہلاک ہوئے ہوں اسی لیے میں محتاط تھا۔ سنبھلتے ہوئے بھی میں نے پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش چاہی تھی کہ ایک نے گرتے ہی مجھ پر مین آخری لمحات میں برسٹ چلا دیا۔

میں جو کافی حد تک سنبھل چکا اور اب بھی کسی ایک آدھ کے حملے کی توقع کررہا تھا، اس کی گن کو متحرک دیکھتے ہی میں نے جست بھری اور دائیں جانب کی دیوار سے ٹکرایا، فائر خالی گیا تو میں نے ایک برسٹ دوبارہ فائر کردیا۔ وہ بھی چیخ مار کے بے حس و حرکت ہوگیا۔

میں نے ایک کے سر سے گیس ماسک اتارا اور پہن لیا بلکہ کچھ سوچ کر میں نے جلدی جلدی اس کی وردی بھی چڑھالی اور اس کی لاش باقی تین کی لاشوں کے نیچے دبا کر آگے بڑھ گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ مقام اصل جگہ سے الگ تھلگ تھا اسی لیے یہاں کوتاگاز جیسے خطرناک اور ہلاکت خیز مونسٹرز درندے چھوڑے گئے تھے، نیز خطرناک نارنجی شعاعوں والا مہلک گیس بم بھی پھینکا گیا تھا۔

یہ سوچ کر میں آگے بڑھتا رہا اور جو کمرا مجھے نظر آتا تھا میں اس میں گھس جاتا۔ ایک ایسے ہی کمرے میں گھسا تو ٹھٹک گیا۔ وہ ایک ہال تھا، بلکہ ہال بھی کیا تھا بلند چھت والا کوئی اسٹیڈیم نما میدان ہی لگتا تھا۔

اس کے وسط میں دورُویہ لمبی میزیں تھیں جو فرش میں نصب تھیں اور اس پر مختلف مشینیں، مونیٹرز، میکینکل مشینریز کے علاوہ کمپیوٹرز نصب تھے۔ دائیں بائیں شیشے کے بڑے بڑے جار اور بلندی تک شیشے کے آٹھ فٹ کے قریب دیوہیکل گلاس ٹیوب کیپسولز اور اس کے اندر محلول بھرا ہوا تھا۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔ اتنا بڑا ہال خالی دیکھ کر میں سمجھ چکا تھا کہ میرے آنے کی اطلاع پر یقیناً یہاں اسٹاف یا لوگوں کو یہ ہال فوراً خالی کرنے کا حکم جاری کردیا گیا ہوگا۔

اچانک ایک گونجتی ہوئی آواز پر میں چونک پڑا۔

”مسٹر شہزی!“

یہ آواز لوکہارٹ کی نہیں تھی، اس پکارتی ہوئی آواز میں واضح طور پر ایک کپکپاہٹ سی تھی۔ جیسے کوئی ضعیف آدمی حلق پر زور دے کر بول رہا ہو پھر جلد ہی یہ عقدہ کھل گیا۔

”میں...... لولودش، تم سے مخاطب ہوں۔“

میرا سر گھومنے لگا، دماغ بُری طرح... چکرانے لگا۔

میں تو اس کے مرنے کی خبر کا منتظر تھا اور...... یہ مجھ سے اب لوکہارٹ کی طرح کسی خفیہ لاؤڈ اسپیکر پر مخاطب تھا۔

یکلخت میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ اس بدبخت کو نئی زندگی مل گئی تھی، اللہ نے اس کی رسی کو شاید تھوڑا اور دراز کردیا تھا۔ وہ مجھ سے چھنی ہوئی زہریلی انگوٹھی کے تریاق سے موت کی وادی میں جاتے جاتے واپس لوٹ آیا تھا، جیسا کہ لوکہارٹ نے کہا تھا۔

مجھے سخت پچھتاوا ہونے لگا کہ جس انگوٹھی سے میں نے اس شیطان کی موت کا سامان کیا تھا، اب وہی اس سے زندگی کے لمحات کشید کرچکا تھا۔

بہرحال...... میں خاموش رہا۔

”مجھے پتا ہے تم میری آواز سن رہے ہو۔ بالآخر تم نے آج اپنی محبت کا حق ادا کردیا۔ ایک طرف دشمن کا فرض بھی...... کہ تم آخرکار مجھ تک بھی پہنچ ہی گئے اور اپنی گرل فرینڈ عابدہ تک بھی...... کاش! تم کسی مصالحت کے نتیجے میں یہاں آتے تو میں تمہاری گرل فرینڈ کو پلیٹ میں سجا کر تمہارے سامنے پیش کردیتا لیکن...... تم نے مجھ تک پہنچنے کے لیے میرا بہت سا نقصان کردیا، حتیٰ کہ مجھے بھی موت کے منہ تک پہنچا دیا۔“

”میں تمہاری موت بن کے ہی آیا ہوں لولودش!“

میں بےخوفی سے جوشِ غضب سے بولا۔

اس رذیل سے مخاطب ہونے کے لیے میں نے گیس ماسک چہرے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ تاکہ بوقتِ ضرورت اسے دوبارہ چڑھا سکوں۔

”ابھی یہ مقابلہ جاری ہے، فیصلہ ہونا باقی ہے کہ تم اور ہم میں سے کون زندہ بچتا ہے، پہلے ذرا اپنی گرل فرینڈ عابدہ کی لاش کا دیدار تو کرلو......“

”کک...... کیا......؟ ذلیل! کُتّے! نسلِ خنزیر! تت...... تم نے عابدہ کو...... مم...... میری عابدہ کو ہلاک کر ڈالا ہے...... مم...... میں......“

عابدہ کی ہلاکت کا سن کر میرے اوسان خطا ہونے لگے، دل بیٹھنے لگا، سر کیا یہ پورا ہال ہی مجھے گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہاں تک کہ میں جب گلا پھاڑ کر جذبات کی شدت سے...... چلّا کر بولا تو میری آواز بھی سینے میں گھٹنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہ رہی ہو۔

میں نے ایک قریب ہی ایستادہ کیبنٹ کا سہارا لے

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

لیا۔

''ہاہا...... ہاہا......! ہوا ہو گیا سارا جوش...... ابھی تو میں نے اپنے عزم کا اظہار کیا ہے، میں تو اسے تمہاری نظروں کے سامنے تڑپا تڑپا کر ماروں گا اور پھر تمہیں اس کی لاش کو سینے سے لگا کر آنسو بہانے کا پورا موقع بھی دوں گا۔''

لولوش کی اس دوبارہ ابھرتی ہوئی آواز نے جیسے یکلخت میرے تنِ مردہ میں جان بھر دی...... یہاں سے وہاں تک میرے اندر ڈھتی دنیا کی وہ ساری منزلیں جیسے منہدم ہونے سے بچالیں کہ عابدہ ابھی زندہ تھی۔

''لولوش! عابدہ کو چھوڑ دو، اسے میرے ساتھ کر دو۔'' میں ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''میں اب بھی کہتا ہوں کہ میری تمہارے ساتھ کوئی جنگ کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ جنگ تم نے خود ہی اپنے سر پر مسلط کی ہے۔''

''اچھا......!'' جلتا اٹھاتی ہوئی گر طنز کے زہر میں بجھی اس مردود شیطان کی آواز ابھری۔ ''تم مجھے بچوں کی طرح بہلا رہے ہو؟ میرا اتنا نقصان، اسپیکٹرم کے نیٹ ورک کی تباہی، میرے اہم آدمیوں کی محرومی، پھر یہاں میری راجدھانی کی نصف سے زیادہ بربادی، حتیٰ کہ مجھے بھی موت کے منہ تک پہنچا دیا۔ یہ سب میں بھول جاؤں......؟ کیسے......؟ ہرگز نہیں شہزی! ہرگز نہیں...... تمہیں اب اس کا حساب دینا ہوگا، پہلے عابدہ اور پھر اپنی موت کی صورت میں...... اس سے کم پر بات نہیں بن سکتی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، میں بھی ادھر ہی موجود ہوں۔'' میں نے بھی حوصلہ مند آواز میں چلا کر کہا۔ ''مگر یاد رکھنا، اگر تم نے عابدہ کا بال بھی بیکا کرنے کی کوشش کی تو میں تمہاری یہ بچی کھچی راجدھانی بھی برباد تو کروں گا ہی مگر تمہیں بھی کتے کی موت ماروں گا۔''

میری اس جوابی للکار پر خاموشی چھا گئی، تب ہی اچانک...... سماعتوں تک کو چیخنا دینے والے سائرن کی آوازیں ابھریں۔

میں دہل سا گیا، لامحالہ یہی سمجھا تھا کہ سائرن میری یہاں موجودگی کے لیے اس سیکشن میں بجائے گئے ہیں لیکن تشویش اور پریشانی کو تھوڑی دیر کے لیے بالائے طاق رکھنے کے بعد یہ بات مجھ سے ہضم نہ ہو پائی تھی کہ ایسے پُر شور سائرن میری وجہ سے بج رہے ہوں۔

اس میں کچھ ایسا تھا جس نے مجھے اندر سے دھڑکا دیا تھا۔

کیا تھا آخر ایسا؟ یکلخت میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ ایک بار پھر عابدہ کی طرف سے میری پریشانی اور تشویش فزوں ہونے لگی، اس مردود لوکہارٹ اور اب لولوش کی دھمکیاں بھی میری چیختی ہوئی سماعتوں میں گونجنے لگیں۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اندرونی و بیرونی شور کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جیسے اس سائرن کے مع خراش انداز میں گونجتے ہی ہر طرف بھاگ دوڑ بچ گئی ہو۔

میں ابھی تک نہایت خاموشی کی کیفیات سے دوچار تھا کہ اچانک میرے اندر جھماکا ہوا۔

اب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اگر یہ سب اسی کے سبب تھا تو میرے اور عابدہ کے لیے خطرات کا میدان وسیع ہونے لگا تھا۔

رینا اور ریٹا۔ کے کہنے کے مطابق ٹائیگر ٹیک کا چیف باسکل ہولارڈ اپنی ٹیم سمیت سی آئی اے اور جے بی سی کی مدد سے ہوگ پے پر ہلا بولنے والا تھا۔

''تو کیا یہ سائرن اسی متوقع حملے کی وجہ سے بجائے گئے تھے؟'' میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں یکلخت ابھرا۔

یہ یقیناً میرے لیے خطرناک صورتِ حال تھی۔ تب ہی اچانک میرے پورے وجود میں جیسے پارا دوڑ گیا۔ میں اس میدان نما ہال میں سیدھا دوڑتا چلا گیا۔

اس ہال میں مجھے اَن گنت دروازے نظر آرہے تھے۔ میں محض اندازے کی بنیاد پر ایک نقشہ ذہن میں رکھے ہوئے پیش قدمی کررہا تھا۔

سامنے والا دروازہ مجھے بند ملا۔ میں نے دوسرا دیکھا اور پھر تیسرا، چھٹا دروازہ کھولا تو وہاں مجھے سامنے مختصر راہداری نظر آئی، میں نے وہاں قدم رکھا اور آگے بڑھا، وہ بائیں جانب گھوم رہی تھی۔ میں نے قدموں کی رفتار دھیمی کی اور آہستگی سے اس طرف جھانکنا چاہا تو کوئی دوسری جانب سے اسی طرف کو مڑنے یا تاکنے کی کوشش کررہا تھا، میں یک دم چونکا بلکہ وہ بھی عین اسی وقت میرے سامنے آیا تھا بلکہ ہمارے چہرے ٹکراتے ٹکراتے بچے تھے، پھر میرے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔

وہ کبیل دادا تھا اور اس کے عقب میں شکیلہ......

''تم...... تم لوگ یہاں تک کیسے پہنچے؟'' میں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ مجھے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اُن کے چہرے بھی ایک دم چمک اٹھے تھے۔

''اسی طریقے سے آئے ہیں جیسے تم یہاں تک

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

پہنچے......'' کبیل دادا خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

''یہ سائرن کی آواز سن رہے تھے تم دونوں......؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں! سنی ہے، یہ ٹائیگر فلیک اور بے بی سی کی مشترکہ آرمی کا حملہ ہونے کا سائرن تھا۔'' کبیل دادا نے فوراً سنجیدہ ہوکر بتایا۔

''اس کا مطلب ہے میرا خیال درست تھا۔'' میں نے کہتے ہوئے ہونٹ بھینچ لیے۔

''رینا اور ریتا نے تو ہمیں بتایا ہی تھا مگر اوپر ہم نے چند لوگوں کو یہ شور مچاتے سنا بھی تھا......'' شکیلہ نے بتایا۔

''عابدہ کا کچھ سراغ ملا؟'' کبیل دادا نے پوچھا۔

''ابھی نہیں، میں اسی کو ہی تلاشنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' میں نے بھاری دل سے جواب دیا۔

''اور ان دونوں شیطانوں کا؟'' شکیلہ نے بھی سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا اور یہ بتایا کہ لولوش زندہ ہے اور اس نے مجھ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی خفیہ وائڈ اسپیکر پر بات کی تھی جو شاید ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ خبیث عابدہ کو ہلاک کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

یہ سن کر دونوں کے چہروں پر تشویش کے آثار پھیل گئے۔ تاہم پھر میرا اترا ہوا غم زدہ چہرہ دیکھ کر کبیل دادا تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''تم فکر نہ کرو شہزی! مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ اللہ نے اب تک عابدہ بہن کی حفاظت کی ہے آگے بھی وہی اسے اپنی امان میں رکھے گا۔''

''انشاء اللہ آمین۔'' شکیلہ نے زیرِلب ہولے سے کہا۔

''ان دونوں شیطانوں کو بھی ڈھونڈنا زیادہ ضروری ہے......تم......'' کبیل دادا نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک ان کے عقب میں دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

ہم تینوں چونکے۔ کبیل دادا اور شکیلہ یک دم آگے بڑھے اور میری والی سائڈ پر آن کھڑے ہوئے۔

کبیل دادا اور میں نے ذرا سر ابھار کر دیکھا، تین چست لباس میں ملبوس ہاتھوں میں گنز تھامے افراد اسی رہداری کی جانب گھوم رہے تھے اور ان کے ہمراہ لوکہارٹ بھی تھا۔

اس شیطان کو دیکھتے ہی میرا رُواں رُواں بھڑکنے لگا۔

''شکار آرہا ہے......'' کبیل دادا ہولے سے بولا۔

''خبردار! اسے ہلاک نہیں کرنا ہے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

ہم ایک دم سائڈ میں ہوگئے۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ میری تلاش میں نکلا تھا یا پھر اوپر جانا چاہتا تھا تاکہ حالات کا جائزہ لے۔

وہ جیسے ہی اس راہداری میں گھومے، ہم تینوں بیک وقت اُن پر پل پڑے۔ میں نے ایک گن بردار کو زور سے ٹھڈا رسید کیا تھا اور پھر لوکہارٹ پر شیر کی طرح جھپٹا تھا۔ کبیل دادا اور شکیلہ نے دوسرے شکار کو تھاپنے کی کوشش چاہی تھی۔

لوکہارٹ ایک ضعیف آدمی سہی لیکن اس کے بوڑھے وجود میں بلا کی شیطانی قوت بھری ہوئی تھی۔ میری گرفت میں آتے ہی اس نے تڑپنا شروع کیا تھا کہ میں اپنی گرفت کو برقرار نہ رکھ پایا اور وہ میرے شکنجے سے نکلتا چلا گیا۔ لیکن میں نے بھی اس پر دوبارہ جھپٹا مارا اور اس بار اس کی کمر پر لات رسید کردی۔

وہ چیخ مار کے راہداری کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر پٹ سے گرا، اسی وقت میرے ٹھڈا لگے حملہ آور نے مجھ پر اپنی گن سیدھی کرنی چاہی تھی کہ ایک دھماکا ہوا۔

کبیل دادا نے موقع تاک کر اپنی گن کو سنگل شاٹ پر ایڈجسٹ کرتے ہی اس پر گولی چلا دی تھی۔ وہ کریہہ ناک چیخ کے ساتھ گرا اور وہیں ٹھنڈا پڑ گیا۔

شکیلہ بھی اپنے شکار کو ڈھا چکی تھی اور کبیل پہلے ہی دوسرے کو ختم کر چکا تھا۔

لوکہارٹ نے خود کو بے دست و پا اور بے یار مددگار دیکھا تو اٹھ کر بھاگنے کی کوشش چاہی تھی، میں بھلا اب اُسے کہاں جانے دیتا۔ عقاب کے مانند اس پر جھپٹا اور اسے لیتا ہوا فرش پر گرا۔

اسی وقت شکیلہ کی جوش بھری آواز سنائی دی۔

''مزید کچھ لوگ اس طرف آرہے ہیں۔'' میں چونکا اور لوکہارٹ پر مکّوں کی بارش کر کے اسے نڈھال کر دیا...... پھر اسے گردن سے دبوچ کر اپنے ساتھ لیے پلٹا۔

ہم اُسے لیے تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک قریب والے دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

شکیلہ دروازے پر موجود رہی اور باہر کا جائزہ لیتی رہی۔ میں اور کبیل دادا، لوکہارٹ کو تختۂ مشق بنانے کے لیے تیار تھے۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

''عابدہ کہاں ہے؟'' میں نے وحشت ناک لہجے میں اس سے پوچھا۔

''وہ...... دیکھو، اس وقت ہم سب ایک بڑے خطرے سے دوچار ہیں۔'' وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اٹک اٹک کر بمشکل بولا۔

''جزیرے پر حملہ ہونے والا ہے اور ہم سب......''

''بکواس بند کرو اپنی...... اور مجھے عابدہ کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں پھر اپنا سوال دہرایا۔

''میں اگر اوپر نہیں گیا تو...... ہم سب برباد......''

وہ کسی طور پر بھی عابدہ کا پتا بتانے کو تیار نہ ہوا۔ میں نے غضبناک انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ کر اسے دبوچا اور دیوار سے دے مارا۔ وہ چیخ مار کے گرا۔

میں نے سنہری بھونرا ہاتھ میں پکڑ لیا۔ شکیلہ اور کیمبل وارااب یک ٹک میری طرف دیکھنے لگے۔

وہ جان چکے تھے کہ میں دنیا کا خطرناک داؤ استعمال کرنے لگا ہوں۔

میں نے بھونرے کو اپنے ایک ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور انگوٹھے سے مخصوص انداز میں پکڑ کر اس کا ایک پَر اپنی انگلی کی پور سے ہلکا سا پش کیا اور لوکہارٹ ایک ہاتھ سے پکڑ کر دیوار سے لگا دیا۔

بھونرا میں نے اس کے قریب کر دیا۔ اس کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

''ی ی...... یہ کیا کر رہے ہو تم......؟'' وہ بھونرے کو دیکھ کر ہکلانے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

تب ہی اچانک میں نے اس کے چہرے پر ایسے آثار اُمڈتے دیکھے، جیسے وہ ٹرانس میں آ رہا ہو۔

''عابدہ کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہ ماسٹر لولوڈش کے ساتھ اس کے کمرے میں ہے۔'' اس نے جیسے تنویمی عمل کے زیرِاثر جواب میں کہا۔

''کیوں؟ کیا ماسٹر لولوڈش اُسے فوری ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''پہلے یہ ارادہ تھا بلکہ عابدہ کو قید خانے سے ماسٹر نے نکلوا کر اپنے رُوبرو پیش ہی اسی لیے کیا تھا تاکہ اسے جان سے مار ڈالے۔ مگر اب حملے کا سن کر وہ ایسا نہیں کر سکا۔''

''اس کی وجہ؟''

''شکست کی صورت میں وہ ٹائیگر ٹیگ یا جے بی سی والوں سے عابدہ کے سلسلے میں کوئی ڈیل کر سکے۔''

''لولوڈش کا کمرا کہاں ہے؟''

''اسی راہداری کے آخری سرے کے بائیں جانب...... اور...... آہ...... آہ......''

وہ جواب دیتے ہی چیختا چلا گیا۔ خود مجھے بھی چکر سے آنے لگے تھے، اس کا مطلب واضح تھا کہ میں یہ خطرناک عمل اِدھر ہی ختم کر ڈالوں سو میں نے ایسا ہی کیا اور جلدی سے دوسرے پَر کو ہولے سے پش کر دیا۔

اپنے سر میں چکر آنے کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ میں خود بھی اس کے زیرِاثر آ سکتا ہوں، جیسا کہ مذکور ہو چکا یہ ایک طرح کا ''کاشن'' تھا۔

لیکن لوکہارٹ کی حالت غیر ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس کے ناک منہ اور کانوں سے خون جاری ہو گیا۔

یہ اس طلسمی ہتھیار کی بڑی خرابی تھی، اس سے ایک تو مدِمقابل زندہ نہیں بچتا تھا اور دوسرے یہ اسے استعمال میں لانے والے کو بھی نقصان پہنچا سکتا تھا یعنی اس ہتھیار سے زیادہ دیر تک کام نہیں لیا جا سکتا تھا ورنہ یہ اپنے لیے بھی مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔

لوکہارٹ کراہتا ہوا گرا اور ختم ہو گیا۔

باہر راہداری میں دوڑتے قدموں کی دوبارہ آواز سنائی دی تو شکیلہ نے پلٹ کر دروازے کی جھری سے باہر دیکھا۔

''وہ جا چکے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ہمیں لولوڈش کے کمرے تک پہنچنا ہے اسی وقت......'' میں نے کہا اور جلدی سے کمرے سے باہر آ گئے۔

لوکہارٹ نے جس راہداری کے آخری سرے کے بارے میں بتایا تھا، ہم اسی میں موجود تھے اور تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک لرزہ خیز دھماکے ہونے لگے۔ درودیوار لرزنے لگے، فرش جیسے ہل کر رہ گیا۔ ہم خود گرتے گرتے بچے تھے۔

کئی ایک جگہوں سے تو دیواریں اور چھت بھی تڑخ گئی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ باسکل ہولارڈ اور جے بی سی، لولوڈش پر بُری طرح خار کھائے بیٹھے تھے۔

باسکل ہولارڈ کے غیظ و غضب کی تو بات ہی اور تھی، وہ اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی انجیلا کے سلسلے میں بھی لولوڈش پر

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

زیادہ طیش کھائے ہوئے تھا۔

لولوش سے اُن کی دشمنی کی ایک وجہ اور بھی تھی، لولوش نے ان کے منہ سے شکار (عابدہ کو) چھین کر اپنا قیدی بنا رکھا تھا۔

لہٰذا...... یہ کہا جا سکتا تھا کہ ٹائیگر ٹیگ اور جے بی سی کے مطمحِ نظر ایک اہم مقصد لولوش کو تباہ و برباد کرنے کے علاوہ عابدہ کو بھی اس کے قبضے سے چھڑا کر دوبارہ اپنے پاس یرغمال بنانا تھا۔

ان سب باتوں کے باوجود، یہ صورتِ حالات ہمارے لیے... بھی خطرناک ہی تھی، کیونکہ میں لولوش پر غالب آنے والا تھا اور اس کی جان سمیت اس کی راجدھانی...... (جزیرہ ہوگ بے + گولڈ کوسٹ مینشن) کو بھی تقریباً داؤ پر لگا چکا تھا۔

یقیناً بالکل ہولارڈ اور جے بی سی، یہاں قابض ہونے کے بعد عابدہ کو اپنا قیدی بنانے کی کوشش کر سکتے تھے۔

گویا میرے لیے اب بھی ایک بڑا محاذ تیار تھا۔ دشمنوں کے سلسلے میں یہ یک نہ شد دو شد والی بات تھی۔

لولوش سمیت مجھے ٹائیگر ٹیگ اور جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) سے بھی برسرِ پیکار ہونا تھا۔ بیک وقت دو محاذ میرے لیے تیار تھے اور عابدہ مجھ سے زیادہ دور نہ تھی۔

ان آخری لمحات میں عابدہ کے لیے اپنی جان تک پر کھیل جانے کے لیے تیار تھا بلکہ دل میں ایک عزمِ صمیم کر چکا تھا۔

دوڑتے قدموں کی آواز معدوم ہو گئی تھی مگر یہاں ایک بھونچال کی سی کیفیت طاری تھی۔

”دوڑو......“ میں چیخا اور مطلوبہ جگہ پر جا پہنچا، وہاں پہنچتے ہی ہمیں ٹھٹک کر رکنا پڑا۔ دروازہ خودکار انداز میں کھل رہا تھا اور...... وہاں سے تین چار مسلح افراد... نمودار ہوتے دکھائی دیے اور ان کے پیچھے دس بارہ لوگ وہ تھے جو عام سے تھے۔

ہم پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے ہتھیار سنبھالے ہی تھے کہ ہماری پہلے سے ہی اٹھی ہوئی گنز کی نال قہر اُگلنے لگیں، وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ باقی لوگ چیختے ہوئے...... خوف زدہ ہو کر واپس پلٹے۔

یہ جیسے کوئی سرنگ نما راہداری تھی، اس کی دیواریں اور چھت گول تھیں۔ ہم ان کے پیچھے ہی دوڑتے چلے گئے۔

ایک کو پیچھے سے دبوچ کر میں نے اس سے لولوش کے بارے میں پوچھا اور ساتھ ہی اسے موت کی دھمکی دی۔ اس نے بتا دیا کہ اسی راستے سے دائیں جانب اس کا کمرا تھا۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب تنے ہوئے تھے اور شل ہو رہے تھے، ایک عرصے بعد میرا عابدہ سے سامنا ہونے والا تھا اور یہ کم جذباتی گھڑیاں نہیں تھیں۔

یہ تصور کہ میں ابھی تھوڑے ہی سیکنڈوں بعد اپنی نورِ چشم، منظورِ نگاہ، محبتِ جاں عابدہ کا دیدار کرنے والا ہوں...... مجھ پر عجیب ہیجانی کیفیات طاری ہونے لگی تھیں۔

مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ہم رک گئے، میرا دل اس وقت جیسے سائیں سائیں کرتی کنپٹیوں پر دھڑک رہا تھا۔ میں نے دروازے کا جائزہ لیا، وہ سپاٹ تھا، اس میں بہ ظاہر کوئی ”لاک سسٹم“ نظر نہیں آ رہا تھا، میں نے دائیں بائیں دیوار پر دو تین بار ہاتھ مارا۔

”یہ خودکار ہے، اس پر گولیاں برسانا ہوں گی۔“

”ہم......“ کہتے ہوئے ہم چند قدم پیچھے ہٹے اور کبیل دادا اور میں نے ایک ساتھ اس پر برسٹ فائر کیے۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ ہم اندر داخل ہوئے...... میری بے چین، بے قرار اور متلاشی نظریں عابدہ کو تلاشنے لگیں، سامنے دیکھتے ہی میں چونکا، سامنے ایک بڑی سی آرام کرسی پر لولوش براجمان تھا۔

وہ یوں اطمینان سے بیٹھا تھا جیسے میری ہی آمد کا منتظر ہو، مگر میں دیکھ کر قدرے چونکا بھی تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا، یہ کوئی بھاری ہتھیار نہ تھا، ایک چھوٹا، ہلکا اور بمشکل ہاتھ کی ہتھیلی جتنا پستول تھا جیسا کہ ٹوٹو لیڈیز پسٹل ہوتا ہے۔

اتنے بڑے عالمی مجرم کے ہاتھ میں اس قدر بے وقعت سا اور چھوٹا ہتھیار دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

”آؤ شہزی...... آؤ...... میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ اس کی گونجیلی سی آواز ابھری۔ ساتھ ہی اس نے اپنا پستول والا ہاتھ اٹھایا اور اس کی چھوٹی سی نال سے اپنی کنپٹی ٹھوکنے لگا، مجھے اس کا یہ انداز عجیب ہی لگا تھا۔

اس کے عقب میں لمبی سی دیوار گیر میز تھی اور اس پر پینل، مائیک اور کمپیوٹرز، مونیٹرز دھرے پڑے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ادھر ہی بیٹھے بیٹھے مائیک اور خفیہ وائڈ اسپیکرز سے حکم جاری کرتا تھا۔ یہی نہیں اس کے دائیں جانب بھی ایک بڑی سی میز پر جلتا بجھتا پینل نظر آ رہا تھا، وہاں نصب دو بڑی اسکرینز پر جزیرہ ہوگ بے کا بیرونی اور آس پاس کا

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

منظر بھی نظر آتا تھا، دوسری اسکرین پر چار خانوں میں منقسم شارٹس بھی مختلف مناظر دکھاتے تھے، جو گولڈ کوسٹ مینشن کے بیرونی اور اطراف کے علاوہ اندر کے بھی دکھاتے۔

پہلے والے اسکرین پر جزیرہ ہوگ بے کے آسماں پر ایک ڈبل پنکھ والا مخصوص ساخت کا ہیلی کاپٹر گردش کرتا نظر آرہا تھا اور سمندر کی سطح پر چار تیز رفتار موٹر بوٹس ساحل کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

ہیلی کاپٹر کے دائیں بائیں فولادی نالیں جھانک رہی تھیں اور ایک نسبتاً بڑے ''میگنم'' کی نال اس کے نیچے سے جھلک دکھاتی نظر آرہی تھی۔ اس سے راکٹ داغا جاتا تھا۔ لولوش اس طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔

لولوش کے مسلح ساتھی ان سے نبردآزما تھے۔ شاید اسی لیے اس کے یہاں گوشۂ عافیت میں زیادہ لڑاکا حواری موجود نہیں تھے، جو تھے، انہیں ہم پہلے ہی جہنم واصل کرچکے تھے، باقی عام طرح کے لوگوں نے کسی کونے کھدروں میں پناہ لے لی ہوگی۔

وہ منتظر تھے شاید کہ ''ریڈ'' ہو اور تب انہیں نکالا جائے، جان سے بڑھ کر یہ سودا بھی ان کے لیے گھاٹے کا بہرحال نہ تھا۔

وینٹل والی دیوار کے اوپر اسپیکرز میں سے کسی کے بار بار ''کاشن'' دینے کا اعلان بھی سنائی دیتا تھا۔ شاید ڈبل پنکھ والے ہیلی کاپٹر سے کوئی لولوش کو وارن کررہا تھا کہ وہ ہتھیار ڈال دے۔ یقیناً مینشن میں کچھ ایسے بوسٹرز مائک نصب تھے جو باہر کی آوازوں کو مینشن کے اندر تک بھی پہنچا رہے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ مجھے لولوش کی آواز میں کوئی جوش کوئی دبدبہ محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی جگہ ایک شکست خوردگی کا احساس مترشح ہورہا تھا۔

''عابدہ کہاں ہے؟'' میں نے ایک بار پھر بے چینی سے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اور اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر اس سے سوال کیا۔

میری خوں ناک نظریں اب اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں، وہ مجھے ایک ہی نگاہ میں برسوں کا بیمار نظر آرہا تھا۔

''میری بساط پلٹ چکی شہزی......!'' کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر نال سے اپنی کنپٹی ٹھونکنے لگا۔ ''تم نے مجھے بالآخر برباد کر ڈالا، مگر اب تم بھی نہیں بچ پاؤ گے۔ لیکن میں تمہیں نہیں ماروں گا، خود میں مروں گا اِس پستول سے...... ہاں! میں خودکشی کرنے لگا ہوں اور...... ناں...... ناں......'' وہ ایک دم بولا۔ کیونکہ میں اس پر اپنی گن سیدھی کرنے لگا تھا۔

''ابھی نہیں، یہ کام تو میں خود ہی کرنے لگا ہوں، تم کیوں زحمت کرتے ہو۔ کیا میں تمہیں عابدہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟''

''میں نے اسی کا ہی پوچھا ہے۔'' میں نے غراہٹ سے مشابہ آواز میں کہا مگر حقیقت یہی تھی کہ میں اندر سے دہل گیا تھا، ایک ایسا شکست خوردہ انسان، جو خودکشی پر مائل ہو رہا ہو اور اس کی گرفت میں کسی کی کمزوری ہو تو وہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی لے ڈوبنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا، یوں عابدہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی لولوش تھا، غرور جس کی ناک کا بال تھا، تکبر جس کا عنوان اور طاقت و اثر و رسوخ جس کے گھر کی لونڈی تھی، آج یوں بیمار اور کمزور حالت میں سامنے تھا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ یہی ایسا ہوتا ہے، وہ اپنی شکست کو تسلیم نہیں کر پاتے اور ہٹلر کی طرح اپنے ہی ہاتھوں موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

''اِدھر گولی کی آواز ابھرے گی اور اُدھر میرا ایک جاں نثار ساتھی جو کسی خفیہ گوشے میں، پستول تھامے عابدہ کے قریب...... بالکل قریب، موت کا فرشتہ بنا بیٹھا ہے، اپنے پستول کا ٹریگر دبا دے گا۔'' ایک ذرا ٹھہر کر آخر میں لولوش نے میرے سامنے ایک لرزہ خیز انکشاف بھی کردیا۔

یہ ہولناک جملہ سنتے ہی میرے اندر تک تاریکیاں اترنے لگیں اور میرا پورا وجود اعصاب زدگی کا شکار ہونے لگا۔

مجھے ہی نہیں بلکہ گبیل دادا اور شکیلہ کو بھی ایک چپ سی کھا گئی تھی، یوں جیسے اب بولنے کا اختیار صرف لولوش کے ہی پاس ہو۔

وہ اسی کمزور، نحیف اور شکست خوردہ مگر درونِ خانہ نفرت و انتقام تلے پھر ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

''آخر میری موت کا کم از کم اتنا بڑا اخراج تو ملنا ہی چاہیے کہ میں اپنے ساتھ تمہاری عابدہ کو بھی موت کی تاریک اور ان دیکھی دنیا میں لے جاؤں......''

مجھے اس کے آخری الفاظ نے اندر تک کسی تیز دھار تلوار سے جیسے چیر ڈالا۔

''کیا چاہتے ہو تم......؟'' بالآخر میں نے اُس سے کہا۔

''مجھے نکل جانے دو یہاں سے مگر عابدہ سمیت......''

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

اس نے بھی بالآخر اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔ ''یاد رکھو، ٹائیگر فلک کا باسکل ہولارڈ اپنی لاڈلی بیٹی کی وجہ سے میرے خون کا پیاسا ہو رہا ہے اور جے بی سی والے عابدہ کو میری راجدھانی سمیت مجھ سے چھیننے کے لیے ایک مشترکہ مشن پر یہاں پہنچ چکے ہیں۔ باسکل ہولارڈ سے ٹکر لے کر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی اور بھیانک غلطی کی تھی...... وہ مجھے کسی قیمت پر بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔''

''عابدہ کو میرے حوالے کر دو...... تم خود کو بھی...... ہم یہاں سے بہ حفاظت نکل جائیں گے۔'' میں نے اسے پھیری دینے کی کوشش چاہی۔ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا۔

''تم مجھے اتنا بے وقوف کیوں سمجھتے ہو میرے عظیم دشمن! عابدہ جب تک میرے زیرِ دام ہے۔ میری زندگی کی ضمانت بنی رہے گی۔ وقت نہیں ہے، جلدی فیصلہ کرو۔''

یہ بے حد نازک لمحات تھے، میں اپنی پوری زندگی میں اس قدر کڑے فیصلے کی سولی پر نہیں لٹکا تھا...... حالانکہ اب تک کا وقت اور حالات گواہ تھے کہ میں نے ایسی نازک گھڑیوں میں فوری فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی جس کے نتائج بھی مثبت ہی نکلتے رہے تھے، لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی مختلف تھا، عابدہ کے لیے دونوں جانب موت کی کھائیاں تھیں۔ مجھے ایک تک چپ سی لگ گئی تھی۔

''ہمیں منظور ہے۔'' اچانک کمیل دادا نے لولوش سے کہا اور میں چونکا۔ تاہم میں نے بدستور خاموشی اختیار کیے رکھی۔

کمیل دادا کی حکمتِ عملی پر مجھے پورا بھروسا رہا تھا، اگرچہ ایک لمحے کے لیے میرے اندر جذبات کا طوفان بپا ہوا تھا کہ کمیل دادا ایک بڑا خطرناک رسک لیتے ہوئے عابدہ کی زندگی کو داؤ پر لگا رہا تھا۔ کیوں......؟ لیکن جانے کیا بات تھی کہ مجھ سے کچھ کہا نہ گیا، میں اس سے اختلاف نہ کر سکا۔

یہ خطرناک موت کا کھیل، اب لولوش اور کمیل دادا کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

''گڈ......!'' لولوش کے منہ سے نکلا۔ ''تم کیا کہتے ہو شہزی؟''

اس بدبخت نے میری رائے لینا بھی ضروری سمجھا۔

''جو میرے ساتھی کا فیصلہ ہے وہی میرا بھی ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ مجھے اپنی آواز جیسے دور کہیں آتی محسوس ہوئی تھی۔

''تو پھر تم تینوں میرے کمرے سے نکل جاؤ اور میرے راستے میں آنے کی کوشش مت کرنا، ایک ذرا جھلک بھی میں نے تمہاری دیکھی تو میں نے موت کو تو گلے لگا ہی رکھا ہے، تمہاری عابدہ بھی پھر زندہ نہیں بچے گی، جس کے لیے تم اتنی طویل مسافتیں بھٹکتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔''

وہ خبیث مردود سچ کہہ رہا تھا، میری ساری محنت، جستجو، پُرآلام مسافتیں اور ساتھیوں کی قربانیاں، سب رائگاں چلی جاتیں۔ اگر عابدہ کو خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو میں بھی تو جیتے جی مر جاتا۔

''ٹھیک ہے ہم چلے جاتے ہیں، لیکن ہمیں عابدہ کی ضمانت کیسے ملے گی؟'' کمیل دادا نے سوال اٹھایا۔

''عابدہ میرے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں خود یہاں سے نکلوں گا جس کا میرے پاس بندوبست ہے۔'' وہ بولا۔ ''تھوڑا وقت اور دشواری کا سامنا مجھے کرنا ہی پڑے گا، مگر میں جزیرے سے فرار ہونے میں ناکام نہیں رہوں گا، اس کا مجھے پورا یقین ہے، بس تم میرا پیچھا نہیں کرو گے۔''

''ہمیں کیا معلوم کہ عابدہ کہاں ہے اور تم سچ بول رہے ہو؟'' میں نے بھی پوچھ لیا۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے پینل کے ایک بٹن کو پش کیا اور اسکرین پر ایک کمرے کا منظر ابھرا۔

میری یک ٹک سی نگاہ اس پر جم گئی۔ منظر میں الم نصیب اور مضطرب الحال عابدہ کو دکھایا گیا، اور اس کے ہمراہ ایک شخص ہاتھ میں پستول لیے اس کے سر پر واقعی موت کے فرشتے کی طرح سوار تھا۔

میں ابھی نظر بھر کو عابدہ کو دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ ایک جھماکے سے اسکرین کا منظر بدل گیا۔

''وقت تمام ہونے والا ہے شہزی! اس سے پہلے کہ......'' لولوش نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ...... اچانک کمرے میں ایک گونجتی ہوئی مگر دبی دبی سی آواز ابھری۔ کوئی باہر سے لولوش کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''لولوش! تمہیں اب آخری وارننگ دی جاتی ہے، تمہارے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور بہت سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے...... تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ یہ تھوڑی مہلت بھی ختم ہوتے ہی گولڈ کاسٹ مینشن کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔''

آواز آنی بند ہو گئی، اس آواز کو پہچان کر...... یکلخت میرا پورا وجود سائیں...... سائیں کرنے لگا، یہ باسکل ہولارڈ تھا۔

''خبیث کُتّے! تو لولوش کو کیا دھمکی دے رہا ہے جو

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

خود کو تمہارے جیسے کتوں کے حوالے کرنے کے بجائے بہادری کے ساتھ موت کو گلے لگانے پر ترجیح دیے ہوئے ہے مگر میں تمہیں بھی کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔''

لولوش نے پاگل دیوانے کی طرح بالکل ہولارڈ کو بڑک ماری تھی۔ اس کی حالت واقعی اس وقت کیچڑ کے گندے پانی میں بھیگے ہوئے اس چوہے جیسی ہورہی تھی جو پناہ گاہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر منہ مارنے کی کوشش کررہا ہوتا ہے۔

''تم تینوں دفع جاؤ فوراً...... ورنہ میں خود کو گولی مار دوں گا۔'' لولوش ہماری جانب دیکھ کر دہاڑا۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔

کمبل دادا نے مجھے اشارہ کیا اور ہم اسی دروازے سے...... باہر راہداری میں آگئے۔

اس وقت میرا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے رکھا تھا۔ میری نظریں بار بار کمبل دادا کے چہرے کا طواف کررہی تھیں۔

''وہ کمرا کہاں ہوسکتا ہے؟'' میں نے کہتے ہوئے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے۔

''مجھے کچھ اندازہ تو ہوا ہے۔'' اچانک شکیلہ نے کہا۔ میں اور کمبل دادا اس کا چہرہ تکنے لگے۔ وہ بولی۔

''میں کمرے میں موجود عابدہ اور اس پستول بدست کو دیکھنے کے بجائے غور سے اس کے در و دیواروں کا جائزہ لے رہی تھی...... '' پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، میں نے شدت بے قراری سے اس سے کچھ کہنا چاہا ہی تھا کہ کمبل دادا نے مجھے اشارے سے خاموش کردیا۔

وہ شاید شکیلہ کو سوچنے کا موقع دینا چاہ رہا تھا، درمیان میں بات ڈالنے سے وہ کچھ ذہن سے نکل سکتا تھا جو شکیلہ نے دیکھنے یا بھانپنے کی کوشش کی تھی۔

''اِس طرف آؤ۔'' وہ ایک دم اس سرنگ نما راہداری کے در و دیواروں کا جائزہ لینے کے بعد بولی اور بائیں جانب کو چل دی۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ چند ہی قدم چلنے کے بعد رکی تھی، اس سے ذرا ہی فاصلے پر دائیں بائیں مزید اور کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔

یہ کمرا لولوش والے کمرے کے برابر میں اور ذرا صلے پر تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ شکیلہ کو اس کا اندازہ یے ہوا؟ بہرحال ہم اس کمرے کے دروازے پر طبع زمائی کرنے لگے اسی دوران میں شکیلہ نے خود ہی بتادیا کہ اس سے پہلے ہم نے جتنے کمروں کو دیکھا تھا، ان میں سے چند ایک ہی در و دیواروں کی ساخت، رنگ اور بناوٹ میں اگرچہ معمولی فرق سہی لیکن وہ اتنا ضرور تھا کہ غور سے دیکھنے والی آنکھ کو کھٹک سکتا تھا۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی شکیلہ نے کہی تھی کہ یہ کمرا لولوش والے کمرے سے زیادہ دور بھی نہ تھا اور اس کا ایک اندرونی طرف کا دروازہ بھی اس نے لولوش کے کمرے کے ایک کونے والی دیوار میں ایستادہ دیکھا تھا جو سنگل پٹ تھا۔

یقیناً لولوش اپنے اس موت کے فرشتہ نما حواری کو زیادہ دور والے کمرے میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

بہت احتیاط کے ساتھ اس کمرے کے دروازے پہ زور آزمائی کی گئی۔ اس کا طریقہ بھی ڈرامائی طرز میں اختیار کیا گیا تھا، یعنی پہلے ہم نے دائیں بائیں دوڑ کر راہداری کے فرش پر قدم مارے تھے، پھر دو مختلف سمتوں میں جاکر برسٹ فائر کیے، جس سے اندر والے کو یہ اندازہ ہوجائے کہ حملہ آور...... دائیں بائیں بھاگم دوڑ میں مصروف تھے، یوں اسی دوران ہم نے مختلف جگہوں پر فائرنگ کے دوران مطلوبہ کمرے دروازے کو بھی نشانہ بنایا، لیکن ہم نے اندر گھسنے کی جلد بازی نہیں کی ورنہ اندر موجود عابدہ پر مسلط اس موت کے فرشتے کو شبہ ہوجاتا۔

ایک جھری سی بنا کر میں نے اندر جھانکا تھا اور اگلے ہی لمحے مجھ سے برداشت نہ ہو پایا اور میں نے درانہ وار کاندھے کی ٹھوکر رسید کرکے دروازہ ہی ڈھا دیا، جو پہلے ہی... ایک آدھ برسٹ کے بعد کمزور پڑ چکا تھا۔

دروازہ دھڑ سے ٹوٹتا ہوا گرا اور اندر گھستے ہی میں نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کردیا، یہ کمرا مجھے جھری سے خالی نظر آیا تھا اور اسی پریشانی اور بے قراری میں نے اسے ٹھوکر مار کے کھول دیا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میری نظر اس کونے پر پڑی جہاں سے شکیلہ کو لولوش کے سابقہ کمرے کے ''ملحق'' ہونے کا شبہ ہوا تھا، وہ اب کھلا پڑا جیسے میرا منہ چڑا رہا تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں...... وہ حرام زادہ لولوش، عابدہ کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔'' میں جذبات کی شدت سے گلا پھاڑ کر چلایا۔

ایسے میں کمبل دادا سوچتا بن گیا، شکیلہ پریشان سی نظر آنے لگی۔

میں واپس طوفانی بگولے کی طرح...... پلٹا، اسی

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

وقت مجھے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی...... اور ساتھ ہی دوڑتے قدموں کی آواز ابھری۔

”شہزی......“

یہ آواز...... یہ لہجہ...... یہ بے قرار کرتی صدائے قلب و جاں...... میں اسے کیسے نہ پہچانتا۔ یہ عابدہ کی آواز تھی۔

”عابدہ......“ میں ابھی اسی اندازِ بے قراری سے چیخا تھا اور عابدہ کی صدا کی سمت گولی کی طرح دوڑا۔

کبیل دادا اور شکیلہ بھی میرے عقب میں تھے، میں دوڑتا ہوا راہداری کے پہلے والے سرے پر آ گیا اور وہاں مڑتے ہی میرے ساتھ کوئی ٹکرایا۔

پھر جیسے اُس نے مجھے پا لیا اور میں نے اُسے...... اس نے میرے بدن کی خوشبو کا احساس پاتے ہی مجھے خود سے یوں بھینچ لیا جیسے وہ صدیوں کا مجھ سے بچھڑا ہوا ہو۔ جیسے اسے منزل گوہر و مراد مل گئی ہو۔ جیسے وہ سب کچھ مل گیا ہو جس کی اسے گویا ابتدائے آفرینش سے تمنا رہی ہو اور میری بھی تو اس حرماں نصیب سے حالت و کیفیات کب مختلف رہی تھیں بھلا، میں نے ابھی اس کے شریرِ جاں تک کے لمس کا ادراک کر لیا تھا، یوں جیسے مجھے بھی ایک عرصے بعد منزلِ مقصود و مراد مل گئی ہو۔ میرے جسم اور وجود کا جیسے کوئی اہم حصہ، حتیٰ کہ میری روح تک کو تسکین و راحت پہنچانے کا وہ گم گشتہ اور بچھڑا ہوا ساتھی میرے ساتھ آن ملا تھا۔

ہاں! یہ عابدہ کا ہی لمسِ جاں گداز و جاں فزا تھا جو اس وقت میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست تھے کہ جیسے اب کی بار جدا ہوا تو کبھی نہ مل سکے گا۔

”عابدہ......!“ میں نے جیسے دل کی گہرائیوں سے پکارا۔

”شہزی......!“ اس کی بھی مژدۂ جاں آواز میری سماعتوں سے ٹکرا کے سیدھی دل میں اتر گئی۔

ٹھیک اسی وقت مجھے عقب سے کبیل دادا نے دھکا دیا، شکیلہ نے عابدہ کو سنبھالا دیا۔ ہم دونوں گرے، کے اوپر دو فائر ہوئے اور مجھے اپنے دونوں جاں نثار ساتھیوں کی کرب انگیز چیخ کی آواز سنائی دی۔

فائر سامنے سے عابدہ اور مجھ پر داغے گئے تھے، وہ لولوش تھا، جو ایک خودکار رولنگ چیئر پر تھا جبکہ اس کے ہمراہ ایک حواری بھی تھا، یقیناً یہی وہ موت کا فرشتہ تھا جسے لولوش نے عابدہ پر مسلط کر رکھا تھا۔

کسی طرح عین ایسے ہی وقت میں عابدہ میری موجودگی کی امید اور جلد سے جلد مجھ تک پہنچنے کی آس و بے قراری میں اس سے اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب ہو کے پیچھے کی طرف دوڑی ہو گی اور مجھ سے آن ملی تھی، یوں ہم دونوں ان لمحاتی مگر سنگین تر خطرناک لمحات میں ایک دوسرے میں باہم پیوستہ ہو کر دنیا و مافیہا سے ہی بے خبر ہو گئے تھے کہ اس کا بھی یارا نہ رہا، موت سر پر کھڑی تھی، جو اب بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ہمیں بچا کر کبیل دادا اور شکیلہ نے اپنے ”سر“ لے لی تھی۔

دونوں میرے دیوانے اور جاں نثار ساتھیوں نے یقیناً پل کے پل یہ سوچا ہو گا کہ...... اتنے عرصے بعد میں اور عابدہ ملے تھے تو ان پر قربان جانے کا بھلا اس سے زیادہ اہم وقت اور کیا ہو سکتا تھا۔

ان دونوں کی چیخیں سنتے ہی...... میرے اندر دھواں بھرنے لگا، ایک سناٹے کی سی کیفیت میں آ گیا اور میرا دماغ الٹ گیا۔

میں نیچے گرا تھا اور سر اٹھا کر سامنے دیکھا، لولوش گولی داغنے کے بعد اپنی خودکار کرسی سمیت واپس لوٹ رہا تھا۔ اس کا گماشتہ پستول تھامے ہوئے ہماری جانب تکے جا رہا تھا، فائر انہوں نے ہی کیا تھا اور...... میں کبیل دادا کے دھکا لگتے ہی گرا اور یہ سارا نقشہ پل کے پل تاڑ گیا۔

گرنے کے باوجود گن ابھی تک میرے ایک ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے اس کی نال سیدھی کی، گماشتے نے میری حرکت نوٹ کر لی اور چلتے چلتے رک گیا، ایک بار پھر اس نے پستول والا اپنا ہاتھ اٹھایا تھا کہ میں نے ٹریگر دبا دیا۔

برسٹ فائر ہوا اور وہ گماشتہ چھلنی ہو کے گرا، میں کبیل دادا اور شکیلہ کی طرف متوجہ ہوا۔

دونوں لہولہان ایک دوسرے کے اوپر گرے ہوئے تھے، ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر میرے اندر غمناکیوں کے سناٹے اترتے چلے گئے، عابدہ بھی...... متوحش تھی۔

میں اسے ذرا بھول کر کبیل دادا اور شکیلہ کو سنبھالنے لگا۔ میرے اور عابدہ کے لیے برسوں بعد ملن کی کیسی گھڑی تھی یہ...... کہ ایک جانب عابدہ کے ملنے کی مسرت تھی اور دوسری جانب...... جاں نثار ساتھیوں کے کرب و ابتلا میں پڑنے کا یہ کڑا وقت...... کیا تقدیر کسی اپنے پیارے کے مل جانے کا اس طرح خراج وصول کرتی ہے؟

ایک لمحے کے لیے میں نے یہ سوچا اور پھر اللہ سے خیر کی دعا مانگتے ہوئے سب سے پہلے میں نے ان کے زخموں کا

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

جائزہ لیا۔ مجھے اور عابدہ کو بچاتے ہوئے کبیل دادا کے دائیں شانے میں گولی لگی تھی اور شکیلہ کے بائیں بازو پہ زخم کا نشان نظر آ رہا تھا۔ اس طرح کہ گولی اس کے بازو کی کھال چھیدتی ہوئی --- بائیں جانب کی پسلیوں میں گھس گئی تھی۔ وہ بے چاری دہرے زخموں کا شکار تھی۔ وہ دونوں تکلیف سے کراہ رہے تھے۔

"شش --- شہزی! تم اور --- عابدہ بھاگ جاؤ یہاں سے ---" کبیل دادا نے نیم بے ہوشی کی حالت میں کراہتے ہوئے کہا۔

"ہاں! شہزی! تم --- کبیل --- صحیح کہہ رہا ہے۔" شکیلہ بھی کراہتے ہوئے بولی۔

آفرین تھا ان پر خود موت کے منہ میں تھے اور مجھے اور عابدہ کو چلے جانے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کی بات پر توجہ نہ دی اور نہ کوئی جواب دیا۔

البتہ میرے چہرے پر تشویش و تفکر کے آثار دیکھ کر عابدہ نے مجھ سے کہا۔ "شہزی! انہیں فوراً اٹھا کر میرے ساتھ آؤ......" کوئی اور موقع ہوتا تو عابدہ کی یہ سنگت، اس کا ساتھ اور اس کی آواز و مترنم لہجہ، جسے سنے میرے کان ترس گئے تھے، میں اس کی ایک ایک شے سے سرمستی کشید کرتا، مگر کبیل دادا اور شکیلہ کی حالتِ زار میرے لیے...... باعثِ آزار تھی۔

عابدہ کیا کرنے والی تھی ان کے لیے...... میں نے یہ پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور پھر گرانڈیل کبیل دادا کو کاندھے پر اٹھا لیا، عابدہ نے بھی ہمت سے کام لیا اور اس نے کراہتی ہوئی شکیلہ کو اٹھا لیا۔

ایسے نازک وقت میں عابدہ بھی بہت ہمت و حوصلے سے کام لے رہی تھی، شاید ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کی سنگت میں حوصلہ مل رہا تھا۔

میں نے دیکھا عابدہ، شکیلہ کو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ سہار کے اسی کمرے میں لے آئی جہاں تھوڑی دیر پہلے لولوش موجود تھا۔

اس نے شکیلہ کو زمین پر لٹا دیا۔ تبھی میں نے کبیل دادا کے ساتھ کیا اور اسے شکیلہ کے برابر میں آہستگی سے لٹا دیا۔

عابدہ فوراً ایک کیبنٹ کی طرف لپکی اور میں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

وہاں میں نے ڈریسنگ، بینڈیج حتیٰ کہ چھوٹے موٹے جراحی میں استعمال ہونے والا آلات دیکھے، ان میں میسر بھی تھیں۔

یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں چمک ابھر آئی اور مجھ سے نہیں رکا، یہ سارے لوازمات طب اٹھا کر میں نے زخمی کبیل دادا اور شکیلہ کے قریب فرش پہ پھیلا دیے اور اپنا کام شروع کر دیا۔

ساتھ ہی ساتھ میں عابدہ کو بھی نظر بھر بھر کر دیکھے جا رہا تھا، بڑی پیاس اور آس تھی اسے جی بھر کے دیکھتے رہنے کی، اس سے باتیں کرنے کی، ایک مسرت اور سرور آگیں کا احساس جاگتا تھا مگر ساتھیوں کی حالتِ زار دیکھ کر یہ رنگِ الفت کی دنیا پھیکی پڑنے لگی تھی۔

عابدہ کی حالت کافی بہتر نظر آتی تھی، لولوش نے ایک ہولوگرام کال کے دوران اگرچہ مجھے اس کا دیدار بھی کرایا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ جب سے عابدہ اس کے قبضے میں آئی تھی، اس کی جسمانی و ذہنی حالت بتدریج بہتر ہوتی رہی تھی اور بقول لولوش کے تب جب عابدہ ٹائیگر فیگ اور جے بی سی والوں کی قید میں تھی تو وہ ضرور اسے جسمانی اور ذہنی طور پر ہراساں کیا کرتے تھے۔

بہرحال یہ سارا احوال مجھے عابدہ سے کرنا تھا۔ تاہم اس کی حالت ایسی ... ضرور لگتی تھی جیسے اس نے ایک طویل مدت آلام و مصائب میں گزاری ہو۔ اس کی کشادہ آنکھوں کے چراغ بجھے بجھے محسوس ہوئے تھے مجھے، مگر ان میں زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی، اس کے نرم و گداز لب جنہیں میں گلاب کے پھولوں کی پنکھڑی سے تشبیہ دیا کرتا تھا وہ مرجھائے ہوئے تھے، بال جو کبھی گھنیرے اور ریشم کی طرح بہارِ نو کی درخشاں نوید سناتے تھے وہ کچھ بے رونق سے نظر آ رہے تھے، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے، اس کا کتابی حسین چہرہ جو کھلتے کنول سا تھا اب خزاں میں جاگزیں محسوس ہوتا۔

مجھے عابدہ زندہ اور صحیح حالت میں مل گئی تھی میرے لیے یہی کیا کم تھا...... میرے ساتھ اب عابدہ کی ہمت بھی سوا ہو گئی تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ فرسٹ ایڈ کرنے میں منہمک ہو گئی تھی۔

ساتھ ہی میں اسکرینز پہ بھی نگاہ رکھے ہوئے تھا اور وہاں مجھے نظر آ رہا تھا کہ ٹائیگر فیگ اور جے بی سی کے مسلح اہلکار جزیرہ ہوگ بے پر قابض ہو چکے تھے اور اب لولوش کے بچے کھچے آدمیوں سے مقابلہ کرتے انہیں موت کے گھاٹ اتارتے ہوئے گولڈ کوسٹ مینشن کی جانب پیش قدمی کرنے لگے تھے۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

مجھے لولوش کے نکل جانے کا قلق تو تھا مگر تسلی بھی تھی کہ وہ نیم جاں ہو چکا تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ ان کے نرغے میں بھی آ جاتا لیکن ہمارے لیے خطرہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

کیونکہ ٹائیگر فیک اور سے جے بی سی کے انتہائی تربیت یافتہ اور جدید اور اسلحے سے لیس اہلکاروں سے نبرد آزما ہونا آسان نہ تھا۔

گویا ایک مصیبت (لولوش) سے جان چھوٹی تھی تو دوسری اس سے زیادہ بڑی مصیبت گلے۔ آن پڑی تھی۔ ایسے میں جبکہ میرے دونوں جری ساتھی کھیل دادا اور شکیلہ بھی زخمی ہو چکے تھے، پھر عابدہ میرے ساتھ تھی، یہ کسی کڑی آزمائش سے کیا کم تھا۔

کھیل دادا کا زخم صاف کر کے میں نے...... اس کی ''ڈیپ'' کا جائزہ لیا۔ گولی ہنسلی کی ہڈی توڑتی ہوئی اندر گردن کی اوپری جلد کو چھیدتی چلی گئی تھی جسے طبی اصطلاح میں ''چھاؤ'' کہا جاتا تھا۔

ہڈی کا فریکچر تو ٹھیک کرنا میرے بس میں نہ تھا البتہ فرسٹ ایڈ کے طور پر میں نے اس کے شانے پر ''کریپ بینڈیج'' باندھ دی تھی۔ جس سے کافی سکون اور افاقہ ہو جاتا تھا، جبکہ کچھ میڈیسن اور درد کش انجکشن کھیل دادا کو دینے کے بعد میں شکیلہ کی جانب متوجہ ہوا، تب تک عابدہ نے روئی اور اسپرٹ سے اس کا زخم صاف کر دیا تھا۔

شکیلہ کا زخم بھی کم گہرا نہ تھا، زخم اور خون صاف کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ گولی اس کا بایاں بازو چھید کر قریب پسلیوں میں کہیں گھس گئی تھی، اس زخم کی گہرائی تک میں نہیں جا سکتا تھا، چہ جائیکہ کوئی رگ یا نس وغیرہ کے کٹ جانے کا احتمال تھا۔

میں نے اسے بھی کھیل دادا کی طرح بینڈیج کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ معائنے کے دوران نظر یہی آتا تھا کہ گولی بازو کا گوشت چھیدتی ہوئی سائڈ کی کسی ایک پسلی کو توڑتی ہوئی اندر جا گھسی تھی۔ شکر تھا کہ مین آرگن یعنی پھیپھڑا یا دل کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔

میں ابھی شکیلہ کی مرہم پٹی اور میڈیسن وغیرہ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ دھڑ سے دروازہ کھلا۔

عابدہ کے حلق سے دہشت زدہ چیخ نکل گئی، جس نے مجھے بھی ایک لمحہ کے لیے دہلا کر رکھ دیا۔

میں نے دھڑکتی نظروں سے دیکھا سامنے...... لولوش اپنی خود کار چیئر کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ٹوٹو پسٹل کے بجائے ایک سب مشین گن تھمی ہوئی تھی، میرا ایک لمحہ کو سانس ہی رک گیا۔

یہ سب مشین گن یقیناً اس نے اپنے کسی آدمی کی لاش سے اچکی ہوگی۔

''ہم...... مجھے راہِ فرار کا کوئی موقع...... کوئی راستہ نہیں مل رہا شہزی!'' وہ خبیث گن کا رخ ہم دونوں کی جانب موڑ کر کپکپاتی آواز میں بولا۔

واضح طور پر مجھے اس کی حالت کسی خارش زدہ کتے جیسی نظر آ رہی تھی۔ جو نہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا......

''اب میرے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ میں عابدہ کو......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے عقب میں ایک برسٹ فائر ہوا۔

گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ...... نے پیچھے سے لولوش کا شیطانی وجود چھلنی کر کے رکھ دیا، برسٹ اسکی طاقتور گن سے داغا گیا تھا کہ بیشتر گولیاں اس کے پیچھے پیوست ہو کر سینہ تک کو چھلنی کر لی خون کے لوتھڑے اڑاتی...... نکلی تھیں اور اس کے سینے سے خون اچھلتے ہی میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ خود کو عابدہ سمیت...... ایک طرف گرا دیا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی جہنم واصل ہو گیا تھا، ادھ موا تو میں اسے پہلے ہی کر چکا تھا۔ اگرچہ وہ صحت یابی کی جانب گامزن تھا مگر اسے پوری طرح صحت یاب ہونے کا موقع ہی کب ملا تھا۔

فرش پر زخمی حالت میں پڑے کھیل دادا اور شکیلہ...... نے اس سنگین صورت حالات کو فوراً بھانپ لیا تھا، اب تک فرسٹ ایڈ اور مختلف انجکشن سے انہیں کافی آرام اور سکون مل گیا تھا، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے زخموں سے خون بہنا بند ہو چکا تھا۔

یوں صورتِ حالات کی خطرناکی اور سنگینی پہلے ہی ان کے علم میں تھی، لولوش کا یہ حشر ہوتے اور مجھے پھرتی کے ساتھ عابدہ سمیت ایک طرف جمپ لگاتے دیکھ کر انہوں نے بھی حتی المقدور اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر کہ اتنی جلدی تو اٹھ کر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اسی لیے...... فرش پر ہی لیٹے لیٹے لڑھکنیاں کھاتے ہوئے دروازے اور راہداری والی سمت سے دور ہٹتے چلے گئے، میں بھی ان کی حفاظت کے پیشِ نظر نچلا نہیں بیٹھا تھا اور عابدہ اور خود کو سنبھالا دیتے ہی میں نے...... پھرتی سے اپنی گن تھامے اس طرف کا رخ کیا تھا۔ میں نے دیوار کی آڑ لے رکھی تھی۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

فرارا ہے اور ویسے بھی مجھے یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔ میری پلیٹ بھری ہوئی ہے۔ تمہیں بو اسٹریٹ چھوڑ کر میں نیو گیٹ کی جیل جاؤں گا جہاں ایک شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔“

”ایک منٹ۔“ میتھیو چلتے چلتے رک گیا۔ ”کیا تم جیری پریٹ کی بات کر رہے ہو؟“

بریکن نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو؟“

”ہماری بہت پرانی واقفیت ہے۔ کل ہی مجھے معلوم ہوا کہ پریٹ کو فریڈرک کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا ہے۔“

”تم اس بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”شاید تم سے زیادہ۔ لوگ ہوٹلوں اور شراب خانوں میں باتیں کرتے رہتے ہیں اور جو شخص اپنی نظریں نیچی اور کان کھلے رکھتا ہو، وہ سب سُن لیتا ہے۔“

”مثلاً؟“

”اتنی تیزی مت دکھاؤ اور میں اتنی آسانی سے بتانے والا نہیں ہوں جب تک کہ اس کی قیمت وصول نہ کرلوں۔“

”تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں آزاد کردوں؟“

”میں اتنا بے وقوف نہیں اور جانتا ہوں کہ تمہاری ایک ساکھ ہے۔ تم کسی قیمت پر بھی مجھے آزاد نہیں کرو گے۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو؟“

”اگر مجھے اس سرد موسم میں جیل کی سختی برداشت کرنی ہے تو پھر میں تمہیں کیوں کچھ بتاؤں البتہ اگر تم چاہو تو ایک سونے کے سکے کے عوض میرے لیے بستر سمیت اسٹیٹ ونگ میں رہائش کا بندوبست ہوسکتا ہے جہاں عام وارڈ کی نسبت بہتر سہولتیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں یہ انتظام کرسکتا ہوں بشرطیکہ تمہاری اطلاع درست ہوئی۔“

”گزشتہ ملازمت ختم ہونے کے بعد میرے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور میں کسی اصطبل میں رات گزارنے پر مجبور ہوگیا جہاں سردی سے بچاؤ کا کوئی انتظام نہیں تھا چنانچہ میں جسم کو گرم رکھنے کے لیے وہسکی پینے چلا جاتا تھا۔ کچھ روز قبل میں سینٹ آئیویس کے شراب خانے میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے فریڈرک اور بوٹن کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی۔ اس کا بھی چمڑا رنگنے کا کارخانہ ہے۔“

”میں بوٹن سے مل چکا ہوں۔“ بریکن نے کہا۔

”پھر تو تم جانتے ہو گے کہ وہ کتنا قدآور اور طاقتور شخص ہے۔“

”دیکھنے میں وہ خاصا معقول لگتا ہے۔“

”وہ سنجیدہ ضرور ہے لیکن اسے بے تحاشا پینے کی عادت ہے۔ اس رات میں نے ان دونوں کو بحث کرتے ہوئے دیکھا۔“

”کس بارے میں؟“

”وہ جیری پریٹ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ان دونوں کو کافی عرصے سے کتوں کی غلاظت فراہم کر رہا تھا۔ فریڈرک نے اس سے یہ کہہ کر بے ایمانی کی کہ اس کے فروخت کردہ مال کی کوالٹی اچھی نہیں تھی۔ ذرا سوچو مسٹر بریکن۔ کتوں کی غلاظت کے بارے میں یہ بات کیسے کہی جاسکتی ہے؟“

”آگے بتاؤ۔“

”میں نے سنا کہ فریڈرک، مسٹر بوٹن کے ساتھ مل کر پریٹ سے بے ایمانی کرنے کی سازش کر رہا تھا۔ لگتا ہے کہ پریٹ نے فریڈرک کے ہاتھ یہ کہہ کر مال فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ آئندہ ساری سپلائی مسٹر بوٹن کو دے گا۔ فریڈرک نے تجویز پیش کی کہ وہ اور بوٹن مل کر اس کے مال کی قیمت گرادیں تاکہ وہ دونوں کو سپلائی دینے پر مجبور ہوجائے۔ بوٹن کو اس تجویز پر غصہ آگیا۔ اس نے میز پر اپنا پیالا پٹخا اور کھڑے ہو کر بولا۔ ”میں اس سے پہلے تمہیں مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

میرا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے بارٹینڈر سے ان دونوں کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ ان کے درمیان ماضی میں کوئی تنازعہ ہوا تھا اور اس جھگڑے کی وجہ ایک عورت تھی۔“

”تم اس بارٹینڈر کا نام جانتے ہو؟“ بریکن نے پوچھا۔

”اسمتھ۔ ٹالرس اسمتھ۔ وہ بھاری بھرکم گول مٹول شخص ہے۔“

وہ دونوں بو اسٹریٹ پہنچے۔ بریکن نے میتھیو کو مجسٹریٹ کے حوالے کر کے پانچ پاؤنڈ کا انعام وصول کیا۔ جب وہ جانے لگا تو میتھیو بولا۔ ”میرے پیسوں کا کیا ہو گا؟“

”میں پہلے اسمتھ سے بات کرلوں اگر اس نے تمہاری کہانی کی تصدیق کردی تو میں نیو گیٹ جا کر تمہارے لیے

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

ٹھیک اسی وقت متعدد دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ یقینی طور پر ٹائیگر ٹیک اور جے بی سی کے ہی ہرکارے ہوسکتے تھے۔

اگر وہ اندر گھسے چلے آتے تو پھر ہمارا بچنا ناممکن حد تک مشکل ہی تھا۔

جیسے ہی مجھے چست وردی پوش اسلحہ بدست دکھائی دیے، میں نے ان پر اپنی گولیوں کی بوچھاڑ کردی، کئی چیخیں ابھریں اور چند ایک نے موقع تاک کر برسٹ فائر بھی کیے، جس کی مجھے بھی توقع تھی، میں ایک دم پیچھے ہٹا اور پھر اسی دیوار کے ہی سہارے اکڑوں بیٹھ کر اپنی پوزیشن بدلی اور پھر ابھر کر ان بچے کھچے دشمنوں پر گولیاں برسا دیں۔

راہداری لاشوں سے پٹی پڑی تھی، اس میں لولووش کے گماشتوں کی بھی لاشیں تھیں۔

دشمنوں کی اس نئی اور تازہ دم ''کھیپ'' سے مقابلہ کرنے کے لیے ہم نے دشمنوں کی لاشوں سے ''مالِ غنیمت'' کے طور پر ان کا اسلحہ، گنس وغیرہ اچک لیا تھا، کچھ دستی بم بھی ہاتھ لگے تھے۔

راستہ عارضی طور پر سہی، صاف ہوگیا تھا۔ میں نے عابدہ کو اشارہ کیا اور پھر ہم دونوں کبیل دادا اور شکیلہ کی جانب لپکے۔

حالات اور موقع کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے وہ بےچارے بھی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر اپنی مدد آپ کے تحت سنبھلنے کی کوشش کررہے تھے۔ یقیناً انہیں دکھ بھی تھا کہ وہ ایسی نازک اور فیصلہ کن گھڑیوں میں زخمی ہوگئے تھے۔

ہم چاروں خون آلودہ لاشیں پھلانگتے الانگتے ہوئے سمت بدل کر بائیں جانب مڑے۔ میں انہیں وہیں لے جارہا تھا جہاں سے میں خود آیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں تھوڑا وقت لگا تھا، حالانکہ وہاں تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، مگر نئے اور تازہ دم دشمنوں نے ہلا بول دیا تھا اور وہ لولووش کے کمرے کی جانب رخ کررہے تھے، یقینی طور پر اتنے ہی یا اس سے زیادہ اوپر بھی ہوسکتے تھے۔

''یہاں سے اوپر جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔'' اچانک کبیل دادا نے ہانپتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ...... وہاں اہم ونگز اور ضروری سامان و آلات کا پھیلاؤ موجود ہے، دشمنوں نے وہیں سب سے پہلے قبضہ جمایا ہوگا اور پھر وہ مین راستہ ہے۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں کے بتائے جارہا تھا، پھر ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس طرف سے اوپر جانا زیادہ محفوظ ہوگا جہاں سے میں اور شکیلہ نیچے آئے تھے۔ وہ بوٹ گیراج کے قریب سے نکلے گا۔''

ہم نے اسی طرف کا رخ کیا، لیکن ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اچانک...... اس طرف بھی پانچ چھ مسلح وردی پوش دشمن نکل آئے، ہم جلدی سے ایک جگی جگی چھت کے خلا میں کھسک گئے۔

دشمن گروپ دوڑتا ہوا پیچھے کی جانب نکل گیا، ہم نے آگے پیش قدمی کر ڈالی۔

مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں ہمیں بمشکل سات آٹھ منٹ لگے تھے، یہ اس جگہ کا بعید ترین گوشہ تھا۔

مجھے سامنے زینہ نظر آیا اور پریشان سا ہوگیا، شکیلہ میرے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہی بولی۔

''یہ مختصر زینہ ہے، اوپر ایک اسٹیئر بکس ہے، اس کے اندر لفٹ موجود ہے۔''

''لیکن خیال رہے دشمن وہاں سے بھی آسکتے ہیں۔'' کبیل دادا نے ہوشیاری دلائی۔

''نسبتاً کم...... کیونکہ نئے دشمنوں کی نظروں میں ابھی تک اس مینشن میں داخل ہونے کا وہ خفیہ راستہ نہیں آسکا ہوگا جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے۔'' شکیلہ نے کہا۔

''یعنی گیراج بوٹ......؟'' میں نے یاد دلایا۔

''ہاں!'' شکیلہ نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہم اوپر زینہ چڑھتے چلے گئے، لیکن ابھی ہم اسٹیئر بکس کے پاس پہنچے ہی تھے کہ اچانک فضا میں لاسلکی سی ''ٹوں...... ٹوں......'' کرتی آواز گونجنے لگی۔

''جلدی لفٹ میں داخل ہوجاؤ۔'' میں جیسے اس آواز کو پہچانتے ہی بولا۔ ''دشمن ڈیٹکٹو ڈیوائس استعمال کررہے ہیں، وہ ہمیں یہاں چھاپ لیں گے اور تعاقب میں بھی آسکتے ہیں۔''

ہم تیزی سے لفٹ میں داخل ہوگئے۔

لفٹ آتے ہی کبیل دادا نے اوپر جانے والے ایرو کے نشان والا بٹن دبا دیا۔ لفٹ نے ہلکا سا جھٹکا لیا اور اوپر اٹھنے لگی۔

ہر لمحے ہمیں موت کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دشمن کے حاوی ہونے کا خدشہ اعصاب تک کو چٹخائے دے

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

رہا تھا۔

کیونکہ امریکی سرکاری آرڈرز کی آڑ میں ٹائیگر ٹیک اور جے بی سی کا مشترکہ آپریشن صرف لولوش ٹارگٹ نہیں تھا، عابدہ بھی تھی ہم بھی بلکہ ان کا اہم مشن ہی ہمیں ہلاک کرنا یا گرفت میں لینا تھا۔ بہرحال ان سے کچھ بھی بعید نہ تھا، وہ ہمارے لیے موت ہی تقسیم کر رہے تھے۔

نیچے کی بہ نسبت اوپر زیادہ خطرہ تھا۔ اسی سبب اوپر آتے ہی ہم پہلے سے زیادہ محتاط ہوگئے، لفٹ سے ہم نے نکلنے میں جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ کہیں دشمن تاک میں نہ ہوں، بہرحال شاید ابھی اس طرف کسی کی نظر نہیں پڑی تھی یا کسی نے اِدھر کا رخ نہیں کیا تھا، جس کا مطلب تھا کہ کبیل دادا کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

لفٹ سے ہم باہر نکلے اور سیدھا گیراج بوٹ کا رخ کیا۔ عابدہ کا ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ میں سختی سے پکڑ رکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑا تھا، ڈر تھا کہ کہیں پھر کوئی اسے مجھ سے چھین کر ہزاروں میل دوری پر نہ لے جائے۔

کبیل دادا اور شکیلہ بھی عابدہ کے ملنے پر بے حد خوش تھے اور مجھ سمیت وہ بھی اس سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتے تھے، یہی حال عابدہ کا بھی تھا مگر حالات ایسے تھے کہ ہمیں ابھی یہاں سے نکلنے کی پڑی ہوئی تھی۔

گیراج بوٹ میں آئے تو وہاں اب دو بوٹس کی جگہ ایک ہی بوٹ نظر آئی۔ ہم نے گیراج میں آتے ہی نہ صرف اس کا اندرونی دروازہ بلکہ وہ دروازہ بھی بند کر دیا جس مینشن کے اندر سے یہاں اس کمرے تک آیا جا سکتا تھا۔

گیراج کے اندر ہم کسی حد تک محفوظ تھے مگر زیادہ دیر تک ہم یہاں رک نہیں سکتے تھے، کیونکہ بالکل ہولارڈ اور جے بی سی کو جلد ہی پتا چل جاتا تھا کہ لولوش جہنم واصل ہو چکا ہے اور اب اس کا اگلا مشن ہماری (عابدہ کی) تلاش ہی ہو سکتا تھا۔

گیراج کا وہ دروازہ بھی بند ہی رکھا گیا تھا جو جزیرے کے سمندر کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے وہاں جا کر اسے ذرا کھول کر دیکھا، جھری سے رات کی تاریکی میں بیکراں پھیلا ہوا سمندر اور تاروں بھرا آسمان مقدور بھر نظر آ رہا تھا۔ جتنا نظر آتا تھا، وہاں تک مجھے کوئی ہیلی کاپٹر یا بوٹ نظر نہیں آئی تھی۔

''فوراً نکلو......'' میں پلٹا۔ ''وہ لوگ سب جزیرے میں اترے ہوئے ہیں۔''

میں اور عابدہ جلدی جلدی بوٹ کی رسیاں کھولنے لگے۔ کبیل دادا اور شکیلہ نے ہماری مدد کی کوشش چاہی تھی مگر ان کی حالت کے پیشِ نظر میں انہیں کسی سخت کوشی میں پڑنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں ایک رسے کی آخری گرہ کھول رہا تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری۔ ہم سب ایک لمحہ کے لیے دہل گئے۔ دشمن یہاں تک بھی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ساتھ والے ہال سے کمرے کا دروازہ گولیاں برسا کر توڑ ڈالا تھا۔

''جلدی کرو شہزی! دشمنوں کو یہاں پر شبہ ہوگیا ہے۔'' کبیل دادا نے کہا۔ ساتھ ہی وہ بھی میری مدد کے لیے بدقت تمام بڑھا لیکن تب تک میں اپنا کام نمٹا چکا تھا اور بوٹ کے رسے کھلتے ہی میں نے ہینگر کے ہک ہٹا دیے، آخری ہک رہنے دیا، جب ہم سب اس میں سوار ہوگئے تو بعد میں ہاتھ بڑھا کر میں نے وہ بھی ہٹا دیا، گیراج کا دروازہ میں پہلے ہی وا کر چکا تھا۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں گیراج کے اندرونی دروازے کے باہر سے آتی ہوئی ہمیں اسی طرح محسوس ہوتی تھیں جیسے موت کے ہرکارے دوڑے چلے آ رہے ہوں اور یہ غلط بھی تو نہ تھا۔

شکیلہ اور عابدہ کے چہرے فق ہونے لگے تھے مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ شکیلہ اور کبیل دادا نے اپنی گنز کا رخ دروازے کی جانب ہی رکھا تھا۔ میرے ہاتھ مشین کی طرح چل رہے تھے۔

آخری ہک کے کھلتے ہی بوٹ پھسلتی ہوئی پانی میں آگئی اور پھر میں نے اس کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔

''شہزی! بوٹ کا رخ جنوب مغربی والے ساحل کی طرف رکھنا۔'' کبیل دادا نے مشورہ دیا۔

''اس طرف......'' ساتھ ہی اس نے اپنے ایک ہاتھ کا اشارہ بھی کر دیا۔ بوٹ کی بتیاں میں نے پہلے ہی گل کر رکھی تھیں۔ رات کے گمبھیر سناٹے میں البتہ بوٹ کے انجن کے شور کی آواز ابھر رہی تھی۔ میں مطلوبہ سمت کا اندازہ کرتے ہی بوٹ کا رخ موڑنے لگا۔

دشمن ابھی شاید ہال میں ہی اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے، کیونکہ وہاں اور بھی دروازے تھے، دفعتاً پھر برسٹ فائر ہوا...... میں نے بوٹ سے ہی گردن گھما کر گیراج کی جانب دیکھا تو مجھے کچھ مسلح افراد کی جھلک دکھائی دی۔

''فائر......'' میں چلایا۔ کبیل دادا اور شکیلہ نے کسی متوقع

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

خطرے کے پیشِ نظر پہلے ہی اپنی گن کا رخ اسی طرف رکھا ہوا تھا۔ میری آواز سنتے ہی انہوں نے ٹریگر دبا دیے۔

رات کے سناٹے میں گولیوں کی ہولناک آوازیں ابھری تھیں، میں ان کا حشر نہ دیکھ سکا، کیونکہ میں بوٹ کا وہیل تھامے ہوئے اس کی رفتار بڑھا رہا تھا۔

ہم پر بھی فائرنگ کی گئی تھی مگر ہماری بوٹ کے طاقتور انجن نے جلد ہی رفتار پکڑ لی تھی۔ ہم بوٹ کے گیراج سے ہی نہیں بلکہ فائرنگ رینج سے بھی بتدریج دور ہونے لگے۔

”خطرہ ٹلا نہیں ہے، سر پر منڈلا رہا ہے۔ ہم دیکھ لیے گئے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”شہزی! تم بوٹ کی رفتار آخری حد تک لے جاؤ اور...... جو بھی ساحل دکھائی دے، اس پر لے جا کر بوٹ روک دینا۔“ کبیل دادا بولا۔ ”ہم زیادہ دیر سمندر اور بوٹ میں نہیں رہ سکتے۔“

اس کی بات درست تھی کیونکہ ہم دیکھ لیے گئے تھے اور ہمارے تعاقب میں دشمن بوٹس اور ہیلی کاپٹر بھی آ سکتا تھا۔ ساحل کی جانب گھنا جنگل اور پہاڑیاں تھیں، وہاں ہمیں پناہ مل سکتی تھی۔

”ساحل پر جا کر ہم دھر لیے جائیں گے۔“ شکیلہ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ ہم دوسرے جزیرے کے ساحل پر ہی اتریں، کم از کم وہاں ہم برمودا سے تو نکلنے کی تدبیر کر سکتے ہیں۔“

”میں جس ساحل کا کہہ رہا ہوں، وہاں سے ایک راستہ مختصر آبنائے کی صورت میں دوسرے جزیرے کی طرف ہی نکلتا ہے۔“ کبیل دادا بولا۔ ”لیکن اب ہم سمندر میں زیادہ دیر نہیں سفر کر سکتے، ایک بار اگر دشمن ہمارے تعاقب میں لگ گئے تو مشکل ہو جائے گی۔“

مجھے حیرت تھی کہ کبیل دادا کو یہاں کے حدود اربعہ کا کیسے پتا تھا؟ تاہم جیسا کہ مذکور ہو چکا، کبیل دادا جس علاقے میں قدم رکھتا تھا، خواہ وہ اس کے لیے اجنبی کیوں نہ ہو، وہ سب سے پہلے اس کے بارے میں کسی نہ کسی طرح تجربے اور جغرافیائی تجزیہ ضرور کرتا رہتا تھا۔

کبیل دادا کی بات سے پھر کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ میں بوٹ کو آخری حد اسپیڈ پر دوڑا رہا تھا، رات کی تاریکی میں سمندر کی ہیبت ناکی عروج پر تھی اور اس پر ہماری بوٹ راکٹ جیسی رفتار سے مذکورہ سمت میں گامزن تھی۔

موجودہ حالات کی خطرناکی اور غیر یقینی کو دیکھ کر عابدہ کا چہرہ، جو پہلے مجھ سے ملنے کے بعد کھل اٹھا تھا، اب پھر جوش سا نظر آنے لگا، میں اسے حوصلے دے رہا تھا اور وہ بھی دھیرے سے مسکرا کر اثبات میں اپنے سر کو جنبش دے رہی تھی۔

”دشمن تعاقب میں آ رہے ہیں۔“ کبیل دادا نے اچانک خبردار کیا۔ میں نے کیبن کی کھڑکی سے عقب میں دیکھا، مجھے دور ایک سے زائد بوٹس کی روشنیاں چمکتی نظر آئیں، آسمان خالی تھا، ابھی ہیلی کاپٹر کو ہمارے تعاقب میں نہیں بھیجا گیا تھا۔

میں نے دوبارہ بوٹ کی ونڈ اسکرین پر نظریں جما دیں۔ میں اسکرین کے پار سامنے تاریکی میں بغور دیکھ رہا تھا۔ اوپر تاروں بھرے آسمان کی روشنی میں مجھے ذرا دور دھبے سے نظر آنے لگے، میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، مطلوبہ ساحل قریب آ رہا تھا۔ اسی وقت کبیل دادا کی آواز دوبارہ ابھری۔

”بوٹ کی لائٹس مت جلانا، دشمن بھٹک رہے ہیں۔“

یہ اطلاع سہی مگر مجھے معلوم تھا کہ ایسا زیادہ دیر نہیں رہ سکتا تھا، دشمنوں کے پاس طاقتور انفراریڈ دوربین ہو سکتی تھیں، پھر پانی میں بوٹ اپنے پیچھے دھار اور جوار بھاٹا چھوڑتی ہے، اس سے بھی تعاقب میں آنے والے دشمنوں کو بہت کچھ پتا چل جاتا ہے۔

ابھی میں یہ سب سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کبیل دادا نے کہا۔ ”دشمن نے راکٹ فائر کیا ہے، بوٹ کا رخ بدلو شہزی! جلدی......“

میرا خدشہ درست نکلا تھا، میں نے کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش چاہی تھی اور پھر اندازے سے بوٹ کا رخ دوسری طرف موڑا، عین میرے دائیں جانب ”شائیں“ کی سنسناتی آواز سے راکٹ پانی میں گرا، وہ دھواں چھوڑنے لگا۔ ہلکے سے دھماکے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

میں نے پھر رفتار بڑھا دی۔

”دشمنوں کی بوٹ قریب آ رہی ہے تو جوابی فائرنگ کر ڈالو۔“ میں نے چلا کر کہا۔

”ہم تیار ہیں لیکن دشمنوں کی بوٹس ابھی فائرنگ رینج سے دور ہیں۔“ کبیل دادا نے بتایا۔ ”وہ شاید اسی لیے دور مار راکٹ فائر کر رہے ہیں۔“

”ساحل نزدیک آ رہا ہے۔“ میں نے بتایا اور دوسرے ہی لمحے ایک تیز شائیں کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی سماعت شکن دھماکا ہوا، ہماری بوٹ ہل کر رہ گئی۔

میں وہیل کو خودکار سسٹم پر ایڈجسٹ کر کے کیبن سے

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں، کہیل دادا اور شکیلہ ایک طرف کو لڑھکے ہوئے ہیں اور عابدہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بوٹ کی دنبالے والی جگہ پر دھواں اٹھ رہا تھا، میرے چہرے پر تشویش کے آثار ابھر آئے تھے۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ کہیل دادا اور شکیلہ کمر تھامے اٹھ چکے تھے۔۔۔ میری جانب آئے۔

”دوسرا راکٹ بوٹ کے عقبی حصے سے ٹکرا کر سمندر برد ہو گیا ہے۔ ہم جھٹکے کی وجہ سے گر پڑے تھے۔“

میں نے دیکھا، دشمن بوٹس کی لانچیں ہمارے تعاقب میں تھیں۔ دفعتاً بوٹ کو جھٹکے لگنا شروع ہو گئے، میں اس کی وجہ سمجھ گیا اور انہیں ہدایت دی کہ وہ دنبالے میں پانی بھرنے کے عمل کو روکنے کی کوشش کریں۔ یہ کہہ کر میں تیزی سے کیبن کی جانب بھاگا۔

ہماری بوٹ ڈولنے لگی تھی۔ اس رفتار میں اُلٹ سکتی تھی۔۔۔۔ میں نے جلدی سے جا کر وہیل سنبھالا اور اسے مینول پر کر دیا۔ میں اب اسے زگ زیگ انداز میں آگے بڑھاتا رہا تھا۔

ساحل قریب آ رہا تھا، اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اُبھری۔ میں نے مڑ کر دیکھا، یہ فائرنگ کہیل دادا اور شکیلہ نے کی۔ دشمن بوٹس قریب آنے لگی تھیں۔

جلد ہی مجھے آسمان پر ہیلی کاپٹر کی بتیاں بھی نظر آنے لگیں۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے، گویا دشمنوں نے اب اپنی پوری نفری ہمارے پیچھے لگا دی تھی اور ہیلی کاپٹر میں یقیناً باسکل ہولارڈ خود بھی ہو سکتا تھا۔

ساحل کے قریب آتے ہی میں نے بوٹ کی رفتار کم کر دی تھی مگر روکا نہیں تھا اور وہ ریت پر دور تک پھسلتی چلی گئی اور پھر الٹتے الٹتے بچی، رفتار کم تھی اسی لیے کوئی جانی نقصان یا چوٹ کا احتمال نہ ہوا۔

میں نے عابدہ کا ہاتھ پکڑا اور بوٹ سے نیچے ریت پر اُتر کر سامنے گھنے جنگل کی طرف دوڑ پڑا، میرے عقب میں کہیل دادا اور شکیلہ بھی ساحل کی جانب دشمنوں کی بوٹس لگتے دیکھ کر، فائرنگ کرتے ہوئے دوڑے۔

جنگل میں آتے ہی ہم نے موٹے تنوں والے درختوں کے عقب میں پناہ لے لی۔ یہاں سے ہمیں ساحل صاف نظر آ رہا تھا۔ دشمنوں کی دونوں بوٹس ساحل پر لنگر انداز ہو چکی تھیں اور ہر بوٹ سے چار پانچ مسلح افراد چھلانگیں مار کے اُترتے نظر آئے۔ ہیلی کاپٹر بھی نزدیک پہنچنے لگا تھا۔

”کسی رعایت سے کام مت لینا۔ انہیں بھون ڈالو۔“ میں نے شدت سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔“

عابدہ کو میں نے ایک طرف ہٹا کر نسبتاً محفوظ گوشے میں کر دیا تھا۔ جبکہ کہیل دادا، شکیلہ اور میں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔

بوٹ سے اُترنے والے دشمن یہی سمجھے تھے کہ ہم خوف زدہ ہو کر جنگل میں اندر تک دوڑتے چلے گئے ہیں، اسی لیے لامحالہ انہوں نے بھی جنگل کی جانب تیزی سے پیش قدمی کی تھی، تاہم انداز ان کا محتاط ہی تھا۔

فائرنگ رینج میں آتے ہی ہم تینوں نے بیک وقت فائر کھول دیے۔

جنگل کے اندر بھاگنے کے بجائے ادھر ہی چھپ کر دشمن پر اچانک اٹیک کرنے کی میری یہ حکمت عملی خاصی کارگر ثابت ہوئی۔ ان میں سے کئی کریہہ ناک چیخیں مار کے گرے اور باقیوں نے ریت پر گر کے جان بچائی مگر گرتے ہی انہوں نے جوابی فائرنگ شروع کر دی۔

گولیوں کی پوری باڑ درختوں کے موٹے تنوں میں پیوست ہونے لگی۔ میں نے سرگوشی میں فائرنگ روکنے کا اشارہ دیا۔

ایک دم خاموشی چھا گئی، میں اس کی وجہ نہ سمجھ پایا مگر دوسرے ہی لمحے گولیوں کے اس دھنا دھن طوفان کے بعد تھم جانے والے سناٹے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ انہیں یہ تسلی ہوتے ہی کہ ہم اریب قریب میں ہی ”نشست“ باندھے ہوئے تھے، انہوں نے شاید وائرلیس سسٹم کے ذریعے ہیلی کاپٹر والوں کو ہمارے بارے میں کچھ بتایا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میں نے قریب آتے ڈبل پنکھ والے ہیلی کاپٹر سے ایک راکٹ فائر ہوتے دیکھا۔

اتنا وقت ہی نہ تھا کہ میں کہیل دادا اور شکیلہ سے کچھ کہتا، اگرچہ ان کی بھی نظریں یقیناً اسی پر جمی ہوئی ہوں گی، میں نے پلٹتے ہی عابدہ کی جانب چھلانگ لگائی اور اسے لیے جھاڑی دار زمین پر لیٹ گیا۔ ہمارے آس پاس کہیں وہ راکٹ پھٹا تھا۔

”پیچھے ہٹو...... بھاگو۔“ میں چیخا۔ ہم اٹھ کر دوڑے۔ ہیلی کاپٹر کی منحوس ”ڈگ......ڈگ......“ ہمارے اعصاب شل کیے دے رہی تھی۔

ہم اندھا دھند دوڑتے چلے گئے کہ شاید کہیں کوئی نسبتاً

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

محفوظ پناہ گاہ مل جائے۔ ادھر ہیلی کاپٹر کی گھن گرجنا شروع ہو گئیں اور ہمارے دائیں بائیں درختوں کی شاخیں، پتے اور جھاڑیاں ادھڑنے اور اچھل کر ٹوٹنے لگیں، کئی ہمارے جسموں اور چہروں سے ٹکرائی تھیں۔ وہ ایک جگہ پر تو ہم گرتے گرتے بچے اور پھر سنبھل کر دوڑ پڑے۔

ہیلی کاپٹر ہمارے لیے سب سے زیادہ مصیبت بنا ہوا تھا۔ ورنہ یہ پیدل دشمن ہمارے لیے اتنا مسئلہ نہ تھے۔

''اس طرف آؤ...... جلدی۔'' اچانک کبیل دادا نے چلا کر کہا۔ وہ بائیں جانب مڑا اور ہم نے بھی اسی طرف رخ کیا۔

ہیلی کاپٹر نے ایک مصیبت اور ہمارے لیے کھڑی کر دی۔ وہ ہمارے سروں پر سرچ لائٹ ڈال رہا تھا۔

کبیل دادا کو شاید کوئی محفوظ پناہ گاہ نظر آ گئی تھی، وہ کوئی پرانے کھنڈرات کی بوسیدہ عمارت تھی۔

ہم اس میں داخل ہو کر ایک جگہ ٹوٹی دیوار سے لگ کے دُبک گئے، ہم نے دیکھا ہیلی کاپٹر سامنے فضا میں ملک الموت بن کے معلق ہو گیا۔

میرا دل جیسے رک رک کر دھڑکنے لگا، بچت یا مفر کی کوئی راہ بھائی نہیں دیتی تھی، لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ ہم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ ہم اسے گولیوں کا شانہ بنا سکتے تھے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ گولیاں اس پر ثرانداز ہوتیں؟، جبکہ وہ ہماری پوزیشن کا اندازہ کرتے ہی اکٹوں اور گولیوں کی بارش کر کے ہماری لاشوں کو بھی کھنڈر یں تبدیل کر ڈالتے۔

ابھی ہم اسی اُدھیڑبُن میں تھے کہ اچانک اس کے یگافون پر آواز ابھری۔

''شہزی! اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈال دو...... یں معلوم ہے تم اسی کھنڈر میں پناہ لیے ہوئے ہو۔ صرف اچ منٹ کی مہلت دوں گا اس کے بعد...... آگے تم خود سمجھتے و، میں کیسی قیامت ڈھا سکتا ہوں۔''

ایک ذرا تھمنے کے بعد وہ جیسے الوداعی لہجے میں بولا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا شہزی! کہ تم ہمارے گنتی کے ند آدمیوں کو ہلاک کر کے ہم پر فتح حاصل کر چکے ہو، بہت لد میرے نئے اور پہلے سے بھی زیادہ آدمی پہنچنے والے ں یہاں...... تم تو جانتے ہی ہو گے کہ میرا اصل ٹارگٹ لوش نہیں بلکہ تم اور عابدہ ہو۔''

یہ باسکل ہولارڈ کی آواز تھی۔ میرا دل جیسے کسی نے ٹھی میں جکڑ لیا تھا، میرا یہ خدشہ کہ باسکل ہولارڈ کا اصل شکار میں ہی تھا اور دوسرے یہ کہ وہ مزید کمک منگوانے کی بھی اہلیت رکھتا تھا۔

ایک جیت کے بعد یہ مات ہمارے لیے موت کے مترادف ہو سکتی تھی۔ سخت پچھتاوا ہو رہا تھا کہ کھبیل دادا نے ہمیں ان کھنڈرات میں پھنسا دیا، مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کھبیل دادا کی سرسراتی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔

''اس طرف...... جلدی۔''

وہ ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں منہدم شدہ در و دیوار کے قریب ایک بلند مگر ٹوٹی ہوئی چھت والے گوشے کی جانب بڑھا تھا، اندر تاریکی تھی، شکیلہ نے پنسل ٹارچ روشن کر لی۔

یہاں پتلی سی گلی نظر آئی۔ ہم اس میں گھس گئے پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ٹوٹی پھوٹی دیواروں والی اس گلی کا فرش...... بتدریج گہرائی میں چلا گیا۔ میرے اندر کی مایوسی، امید بن کر جلنا شروع ہو گئی۔ میں نبرد آزما تھا اور کھبیل دادا بیدار مغزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دفاع اور بچاؤ کے راستوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شکیلہ اس کی مددگار تھی۔

ہم اندر تہ خانے میں آ گئے لیکن امید کی جلتی شمع دوبارہ بجھ گئی۔ یہاں خلافِ توقع ہمیں اور کوئی دوسرا خفیہ راستہ باہر جانے کا نہ ملا۔

''مارے گئے......'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اب تو شاید بُرے پھنسے۔'' شکیلہ نے بھی کہہ ڈالا۔

''میرا خیال تھا ہمیں باسکل ہولارڈ کی بات مان لینی چاہیے تھی، کم از کم اس طرح بے بسی کی حالت میں تو نہ مرتے۔'' عابدہ نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ہمیں دھماکے سنائی دیے، تہ خانے کی زمین اور دیواریں لرزنے لگیں بلکہ جو بچی کھچی اور استدادِ زمانہ کے ڈھنے کے قریب تھیں، وہ سب گویا دوبارہ منہدم ہونے لگیں۔ ان میں جیسے ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا تھا۔

''اس طرف سے آگے بڑھو...... جلدی۔'' کھبیل دادا کی ایک بار پھر حوصلے سے بھرپور آواز ابھری۔ اس کی آنکھیں شاید اس وقت مجھ سے زیادہ عقابی حرکات کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ عابدہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے اپنے ساتھ لیے کبیل دادا کے پیچھے دوڑا۔ شکیلہ بھی ساتھ تھی۔

اسی وقت ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور کھنڈریلی زمین سے ہمارے قدم اکھڑ گئے، ہم لڑکھڑائے اور سنبھلے، اس کے بعد تلے اوپر دو دھماکے اور ہوئے، کھنڈر میں دھول

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

مٹی کا غبار سا اٹھنے لگا جس میں ہمیں سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر نے عمارت پر راکٹ برسانا شروع کر دیے گئے تھے۔ ہم سنبھل کر اٹھے اور کہبیل دادا کی تقلید میں ہانپتے کانپتے ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں خودرو جھاڑیوں کی بھرمار تھی اور وہ خاصی اونچی تھیں۔ یہ عمارت کا کوئی خفیہ راستہ تھا جو کھلنا تھا۔

ایک دھماکا یہاں بھی اوپر کہیں آس پاس ہوا اور......

اس بار کئی سنگ ریزے ہمارے چہروں سے بھی ٹکرائے۔

ہم اپنی بقا کے لیے بدستور کوشاں تھے، حالانکہ ہماری حالت بڑی قابلِ رحم ہو رہی تھی، دھول مٹی میں بھوت بن چکے تھے اور ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچانے جا رہے تھے۔

جلد ہی کہبیل دادا ہمیں انہی خفیہ راستوں کی بھول بھلیوں سے لے کر ایک ایسی گپھا سے برآمد ہوا تھا جس کے بعد سرسبز گھاس کی ڈھلانیں اور ٹیلوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

لیکن ہمیں یہاں بھی مفر میسر نہ آ سکی، جیسے ہی ہم ایک ڈھلان پر آئے تھے کہ بائیں طرف سے ہم پر فائرنگ ہوئی، ہم پھرتی سے نیچے جھک گئے اور پھر ڈھلان میں ہی لڑھکتے ہوئے نیچے آنے لگے، ایک جگہ رکتے ہی میں نے اپنے اندازے سے اپنی گن کا رخ کر کے مسلسل برسٹ فائر کرتا چلا گیا، تیسرے یا چوتھے برسٹ کے بعد مجھے دشمن ٹروپ کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے فائرنگ روک دی اور نہایت پھرتی کے ساتھ بیلٹ میں اڑسے ہوئے فالتو کلپس میں سے ایک نکال کر اپنی برین گن کے ساتھ اٹیچ کیا۔

ساتھیوں کی خبر لی تو کہبیل دادا کو میں نے نصف دائرے میں ایک ہاتھ اٹھاتے اور گھماتے ہوئے دیکھا پھر اس کے ساتھ ہی ہم زمین سے چپک گئے۔

ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ساتھ ہی کئی چیخوں کی آوازوں نے کہبیل دادا کے پھینکے ہوئے دستی بم کی کارروائی کا نتیجہ ظاہر کر ڈالا۔

"پیرا ٹروپس ختم ہو گئے، آگے بڑھو۔" وہ پھر چلایا۔

اس وقت کہبیل دادا کی پھرتیاں اور چابک دستیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں جس نے ایک لمحے کے لیے مجھے ہی نہیں بلکہ یقیناً شکیلہ کو بھی حیران کر دیا ہوگا۔

مجھے تسلیم تھا کہ ایسے آخری لمحات میں ذرا دیر کو ہی کبھی میری اپنی عقل قدرے بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتی ہے، مگر کہبیل دادا پہلے ہی سے آنے والے متوقع حالات کا ادراک کرنے میں کمال رکھتا تھا، یہ مجھے اب پتا چلا تھا اور شاید شکیلہ کو بھی۔

ایسے میں وہ جس تیزی کے ساتھ گرد و پیش میں اپنی بیدار مغزی کو بروئے کار لائے ہوئے تھا، وہ دنگ کر دینے والی تھی۔

اس کے پھینکے ہوئے دستی بم نے شاید دشمن کے جتھے کو ہی اڑا کر رکھ دیا تھا۔ اب کہبیل دادا ایک بار پھر اپنے ادراک و فہم سے گرد و پیش کا تیزی سے جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ایک جانب لیے جا رہا تھا۔

"اس طرف سے ہیلی کاپٹر آئے گا، رک جاؤ اور کوشش کرو اسے نشانہ بنانے کی۔" اس نے کہا اور ڈھلان کی نسبتاً اونچائی پر سینے کے بل لیٹ گیا۔ اس نے گن اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی۔

عقدہ کھلا کہ کہبیل دادا کو کیسے اندازہ ہوا تھا، ہیلی کاپٹر کی تیز ہوتی آواز اس کی پہلے سے ہی جمی ہوئی سماعتوں کو سنائی دے گئی تھی جو قریب آتے آتے ہمیں بھی سنائی دینے لگی۔

کھنڈرات کی جس سمت وہ معلق تھا، اس کا رخ اسی جانب تھا کیونکہ پیرا ٹروپس نے اسی طرف سے ہی پیش قدمی کی تھی۔

جیسے ہی ہمیں ہیلی کاپٹر اونچا ہوتا دکھائی دیا، ہم تینوں نے بیک وقت اس پر فائر کھول دیا۔

اس میں رسک تھا اگر ہیلی کاپٹر بلٹ پروف ہوا تو ہم مارے جائیں گے، لیکن نزدیک ہونے کے سبب ہی کہبیل دادا نے اس پر فائرنگ کا کہا تھا تا کہ اس کے کسی حساس حصے میں کوئی گولی لگے تو اس کو کچھ گزند پہنچے۔

ہم تینوں کی گنز ایک ساتھ گرجی تھیں۔

"زنا...... زٹ زٹ......" کی آوازوں سے گولیاں ہیلی کاپٹر سے ٹکرانے لگیں اور پھر ایک دھماکا ہوا۔ ہمارے بجھے دلوں میں آس کا دیا چمکا۔ ہیلی کاپٹر سے بھی فائرنگ شروع ہوئی تھی کہ وہ ڈگمگانے لگا، ہم نے فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا، ہیلی کاپٹر کی دُم سے دھواں نکلنے لگا اور وہ رفتہ رفتہ نیچے آنے لگا اور پیچھے کی جانب گھوم گیا۔ اس نے فائرنگ بند کر دی تھی۔

"یہ کہیں قریب ہی لینڈ کرے گا، اسی طرف چلو۔" میں نے کہا اور پھر ہم اٹھ کر اسی سمت کو تاریکی میں دوڑ

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

پڑے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ ڈھلانوں سے نیچے گھاس کے ایک میدان میں لینڈ کر رہا تھا اور ہم سب نیچے ترائی کی جانب درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہوئے بڑھنے لگے، پھر ایک مناسب فاصلے پر رک کر گویا تماشا دیکھنے لگے۔

ہیلی کاپٹر سے چار مسلح افراد برآمد ہو رہے تھے، ان میں ایک بھاری بھرکم جسامت والے شخص کو میں اس کے ڈیل ڈول سے ہی پہچان گیا، وہ خبیث ابنِ خبیث باسکل ہولارڈ تھا۔

ان میں سے دو آدمی کسی گیس سلنڈر سے ہیلی کے کاپٹر کے عقبی حصے کی آگ بجھانے میں لگ گئے۔

”بس! ان کی تعداد چار ہے۔ اتنے بڑے ہیلی کاپٹر میں یہی سوار تھے؟“ شکیلہ نے سرگوشی کی۔

”کسی خوش فہمی میں مت رہنا شکیلہ!“ کمبل دادا نے ہولے سے مگر گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”وہ کمک کے لیے کہہ چکا ہوگا اور اب کسی بھی وقت یہ جزیرہ ہمارے لیے چوہے دان ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہو انہوں نے پیراشوٹ کے زریعے کچھ آدمی مینشن میں بھی اتارے ہوں۔“

کمبل دادا میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ مدِمقابل پر الب آجانے کے بعد بھی پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا تھا جب تک کہ پوری طرح خطرے سے نہ نکل جائے۔

”ابھی ان سے مقابلہ کرو اور...... آگے دیکھتے ہیں۔“ یں نے کہا۔

جہاں ہیلی کاپٹر لینڈ ہوا تھا، وہاں اچانک ایک تاریک گوشے سے تین چار مزید ان کے مسلح ساتھی برآمد وئے۔ وہ ان سے جا ملے۔ باسکل ہولارڈ انہیں جلدی لدی اپنا ایک ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ ہدایات دے رہا تھا۔

وہ سر ہلانے لگے اور پھر یہ لوگ آگے بڑھنے لگے۔

”واپس پلٹو۔“ کمبل دادا بولا۔ اس وقت اس آخری ہم کی کمان جیسے لامحالہ کمبل دادا کے ہاتھ میں آچکی تھی۔ اس ں سہولتیں ہم پر آشکارا ہو رہی تھیں۔

ہم خاموشی سے پلٹے اور اس کے بتائے ہوئے ستے پر دوڑتے چلے گئے۔

تاریکی میں ہم آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ عابدہ ک چکی تھی اور ہمارا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔

”بس، یہاں پر... جم کر بیٹھ جاؤ مگر نچلا نہیں بیٹھنا ے، انہیں ختم کرنے کے بعد ہی ہم اس ساحلی پٹی تک پہنچ سکیں گے جہاں سے ہمارا واپسی کا سفر شروع ہونے والا ہے۔“

کمبل دادا نے کہا اور ہم نے وہیں پوزیشنیں سنبھال لیں، عابدہ کو میں نے ایک محفوظ جگہ چھپا کر بٹھا دیا۔

ہماری دھڑکتی ہوئی نظریں سامنے تاریک جھاڑیوں اور ڈھلان پر جمی ہوئی تھیں، جلد ہی وہ لوگ دکھائی دے گئے۔ اب تو ایک آدمی کے کاندھے پر راکٹ لانچر بھی نظر آرہا تھا، جبکہ باسکل ہولارڈ نے بھی سب مشین گن نکال کر ہاتھ میں پکڑلی تھی۔

ہم یہاں سے ان پر فائرنگ کا آغاز کر سکتے تھے مگر ابھی میں اور شکیلہ، کمبل دادا کے اشارے کے منتظر تھے۔

”فائر......“ دفعتاً کمبل دادا نے کہا اور پھر خاموش جنگل ایک بار پھر گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

اس آخری معرکہ آرائی میں...... دو دشمن کریہہ تاک چیخیں مار کے گرے تھے، ان میں ایک راکٹ لانچر بردار بھی تھا۔

میں نے اسی کا سب سے پہلے نشانہ لیا تھا، دوسرا میرا نشانہ باسکل ہولارڈ تھا، مگر وہ بچ گیا تھا، باقیوں نے بڑی بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دائیں بائیں چھلانگیں مار کے خود کو گولیوں کی زد سے بچالیا تھا۔

اس کے بعد ان لوگوں نے بھی ہم پر جوابی فائرنگ داغنا شروع کر دی۔ اگلا لمحہ ہولناک ثابت ہوا۔ کسی نے اپنے مردہ ساتھی کا راکٹ لانچر اچک کر ہم پر بجلی کی سی تیزی سے راکٹ فائر کر دیا۔

ایک سنسناتی ہوئی آواز ابھری اور...... راکٹ اپنی دم کے پیچھے دھواں اڑاتا ہوا تیزی سے ہماری جانب لپکا۔

ہم نے فوراً چھلانگیں لگائیں اور زمین پر لیٹ گئے۔

ایک سماعت شکن دھماکا ہوا، موت کی جھپک ہمیں اپنے چہروں پر صاف محسوس ہوئی تھی۔

”پیچھے ہٹتے جاؤ وہ ایک اور راکٹ چڑھا رہا ہے۔“ کمبل دادا نے کہا۔

”ٹھہرو۔“ میں نے اچانک کہا۔

”جتنے بھی دستی بم ہیں، وہ پھینک مارو۔“ کہتے ہوئے میں نے ایک دستی بم نکالا اور ان کی جانب اچھال دیا۔

اونچائی کی وجہ سے ہمیں کسی حد تک دشمن پر فوقیت حاصل تھی۔ شکیلہ کے پاس دو بم تھے، جبکہ کمبل دادا کے پاس ایک بھی نہیں تھا۔

ہمارے تین پھینکے ہوئے دستی بموں نے... تباہی مچا

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

دی۔ وہ تتر بتر ہو گئے۔

”یہ اچھا موقع ہے فرار کا، اب بھاگ چلو، ان کی کمک پہنچنے والی ہوگی، ہمارے پاس اب خاطر خواہ اسلحہ بھی نہیں رہا۔“ کمبل دادا نے یاد دلایا۔ اس کی بات غلط نہ تھی، اسلحہ اب ہمارے پاس اب بس دفاع کی حد تک ہی بچا تھا۔

لہٰذا ہم نے اب مقابلے کے بجائے فرار پر اپنا فوکس کیا اور دھیرے پیچھے ہٹنے لگے، اس کے بعد جھاڑیوں اور ڈھلانوں کی آڑ لیتے ہوئے دوڑ پڑے۔

کمبل دادا آگے تھا، پھر شکیلہ اور اس کے بعد میں اور عابدہ تھے۔ دشمن بھی ہمارے عقب میں فائرنگ بھی کرتے جاتے تھے، لیکن ہم نے کوئی جوابی فائرنگ نہیں کی صرف بچاؤ کرتے رہے اور تاریکی کا بھی خاطر خواہ فائدہ ہو رہا تھا۔

فائرنگ کا جواب دینے کا اب مطلب تھا کہ خود کو دشمنوں کے نشانے پر لگانا ہے۔ ہم ان کا ہیلی کاپٹر بیکار کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور سب سے بڑا خطرہ ہمیں اسی سے تھا۔ لیکن اگر نئی کمک پہنچ جاتی تو ہمارے لیے صورتِ حالات اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتی۔

میری خواہش تھی کہ لولوش کی طرح باسکل ہولارڈ کو بھی جہنم رسید کر ڈالوں، لیکن کمبل دادا نے مجھے ابھی اس انتہائی قدم سے باز ہی رکھا تھا، کیونکہ باسکل ہولارڈ امریکی مشینری کا ایک بااثر آدمی تھا اور ابھی اس کی ہلاکت...... ہمارے لیے بہت سی مشکلات کھڑی کر سکتی تھی، ممکن تھا کہ پوری مشینری ہی حرکت میں آ سکتی تھی اور بات ملکی اور عالمی سطح پر ایک مجرم اور دہشت گرد کی صورت میں ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی۔

تاہم میں کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ باسکل ہولارڈ کو جہنم واصل کر سکوں۔ وہ عابدہ کا ہی نہیں آنسہ خالدہ کا بھی مجرم تھا اور یہودیوں کی خفیہ دہشت گرد تنظیم جے بی سی کا بھی سپورٹر تھا۔

اچانک ہم بھاگتے بھاگتے چونک پڑے، ہماری سماعتوں سے کچھ آوازیں ٹکرائیں اور ہمارے چہروں کے رنگ فق ہو گئے۔

یہ آوازیں آسمان پر اڑنے والے ہیلی کاپٹرز اور سمندر کی سطح پر گامزن موٹر بوٹس کی تھیں۔

کمبل دادا کی تقلید میں ہم ایک جانب تاریک میں مڑے اور ایک ٹیلے کی اوٹ سے جھانکا تو سامنے قدرے دور سمندر دکھائی دے رہا تھا، گویا ہم ساحلِ سمندر کے قریب ساتھ ساتھ ہی دوڑ رہے تھے، وہیں سے ہم نے ان آوازوں کا کھوج لگایا۔ آسمان پر دو چوپر محوِ پرواز تھے اور سطحِ سمندر پر چار موٹر بوٹس تیز رفتاری کے ساتھ گامزن تھیں۔

ہمارے چہرے ست ہو کے رہ گئے، تشویش کے آثار آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی مترشح ہونے لگے۔

اچانک عقب میں ایک فائر ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اردگرد جیسے روشنی کا سیلاب پھیل گیا۔ ہم بھی روشنی میں نہا گئے۔ دشمن نے فلش فائر کیا تھا۔

اسی وقت گولیوں کی آواز ابھری مگر اس سے پہلے ہی ہم نے خود کو ایک ڈھلان سے نیچے گرا دیا اور لڑھکتے چلے گئے۔ گولیاں ہمارے دائیں بائیں ڈھلوانی زمین میں پیوست ہونے لگیں، گھاس اور ذرات اڑنے لگے۔

کمبل دادا اور شکیلہ نے سنبھل کر جوابی فائرنگ داغی تھی اس کے بعد ہم نے اٹھ کر دوڑ لگا دی۔ ایک اور فائر ہوا اور تاریک فضا پھر روشن ہو گئی۔ ہم تب تک گھنی جھاڑیوں میں جا دبکے تھے۔

”روشنی کے سیلاب سے بچ کر بھاگتے رہو، ورنہ دشمن سر پر پہنچ جائیں گے۔“ کمبل دادا بولا۔

ہم ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ ہی دوڑے جا رہے تھے۔ موٹر بوٹ کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ نئی کمک کے افراد نے باسکل ہولارڈ کے لاسلکی رابطوں کی وجہ سے یہاں کا رخ کیا ہے۔ یہ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت تھی۔

ہم دوڑتے رہے اور پھر اچانک ایک جگہ رک گئے، ہم جیسے بند گلی میں آن کھڑے ہوئے۔ علاقے سے آگاہی نہ ہونے کے سبب ایسا ہوا تھا، اب تک محض جغرافیائی اندازوں سے کام چلایا گیا تھا اور اب سامنے سمندر تھا۔ بائیں جانب اور عقب میں دشمنوں کی یلغار تعاقب میں تھی۔

البتہ...... ایک بات کی مجھے حیرت ہوئی تھی، جس موٹر بوٹ کی آواز میں نے سنی تھی، وہ دکھائی نہ دی۔ شاید دشمن نے اسے کہیں ساحل سے دور لنگر انداز کر دیا ہو

یہاں ہم ہکا بکا سے رہ گئے، میں اور شکیلہ کمبل دادا کا منہ تکنے لگے، وہ بے چارہ خود بھی پریشان سا نظر آنے لگا تھا، وہ بہت کم بے حوصلہ ہوتا تھا، پریشانی یا تشویش بھی بس ایک پل کے لیے اس کے چہرے یا پیشانی پر ایک سلوٹ کی طرح ابھرتی تھی اور پھر وہ جلد ہی کوئی راستہ نکال لیتا تھا مگر اس بار

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

وہ خود بھی جیسے جامد ہو کر رہ گیا تھا۔

ساتھ ہی ہم بار بار عقب میں دیکھتے جاتے، دشمن کسی بھی وقت ہمارے سر پر پہنچ سکتے تھے، عابدہ بے چاری زیادہ متوحش نظر آرہی تھی۔ وہ میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ دشمنوں، بالخصوص باسکل ہولارڈ اور جے بی سی والوں سے بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔

اچانک...... ہم چونکے، دائیں جانب سے ایک روشنی کا جھماکا ہوا۔ ہم نے فوراً اپنی گنز اس طرف تان لیں...... پھر کوئی متحرک سایہ نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکی روشنی والی ٹارچ دبی ہوئی تھی۔

کبیل دادا اس کا نشانہ لینا ہی چاہتا تھا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ سایہ تیزی سے ہماری جانب لپکا تھا، اسے غیر مسلح دیکھتے ہی میں نے کبیل دادا کو اس پر فائر کرنے سے منع کیا تھا۔

وہ سایہ جیسے ہی قریب آیا میں دنگ رہ گیا۔

''شہزی......! جلدی اس طرف آؤ...... وقت کم ہے۔'' سائے نے قریب آکر ہم سے کہا اور اسی تیزی سے واپس پلٹا جہاں سے وہ آیا تھا۔

کبیل دادا اور شکیلہ ایک جوان اجنبی عورت کو میرا اس طرح نام پکارتے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے، وہ حیران تھے کہ ایسے نازک لمحات میں یہ کون اچانک خدائی فوجدار بن کے آن ٹپکا تھا؟ البتہ عابدہ اسے قدرے پہچان رہی تھی۔

لیکن انجیلا...... میرے لیے قطعاً اجنبی نہ تھی اور نہ میں اس کے لیے...... مگر وہ یہاں کیسے پہنچی تھی اس پر بھی مجھے بس ایک لمحے کے لیے ہی حیرت ہوئی تھی اور پھر میں نے کبیل دادا اور...... شکیلہ کو بھی اس کی تقلید میں اشارہ کر کے عابدہ کو ہاتھ پکڑے...... مذکورہ سمت کی جانب بڑھ گیا۔

انجیلا ہمارے آگے آگے تیزی سے بھاگی جارہی تھی اور ہم اس کے پیچھے تھے، پھر وہ ساحل کی جانب مڑی اور ...... وہاں ہمیں ایک تیز رفتار بوٹ نظر آئی۔

ہم اس میں سوار ہو گئے۔ اندر کیبن میں کوئی موجود تھا۔ وہ ایک دراز قامت مگر دبلا پتلا شخص تھا۔

انجیلا نے اسے روانہ ہونے کا کہا اور...... اس نے لنگر اٹھا کر بوٹ آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

جو لوگ اپنے رب سے مایوس نہیں ہوتے تو یقیناً وہ بھی انہیں مایوس نہیں کرتا ہے اور اچانک ایسے ذریعے سے انسان کی مدد کرتا ہے کہ جس کی اسے توقع نہیں ہوتی۔ ہمارے لیے یہ بھی ایک غیر متوقع مدد تھی۔ یوں...... دشمنوں کو کمک ملی تھی تو خدا نے دشمنوں ہی کے ایک آدمی کے ذریعے ہماری ''کمک'' کا بھی سامان پیدا کر دیا تھا۔ یہ راموئی رافرعون والی ہی بات تو تھی، باسکل ہولارڈ کی بیٹی انجیلا ہی عین آخری لمحات میں ہمارے کام آئی تھی۔

ہمیں ابھی باتیں کرنے کا موقع تو نہیں ملا تھا مگر انجیلا نے عابدہ کو آزادی کی مبارک باد دی تھی۔ عابدہ اسے پہچانتی تھی۔

ڈرائیونگ کیبن میں موجود شخص انجیلا کا دوست اور قریبی رشتے دار تھا۔ انجیلا نے مجھے اس کا نام ٹالبوٹ بتایا تھا۔

وہ موٹر بوٹ کو ابھی کھلے سمندر کی طرف لے کے نہیں گیا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ جہاں مونگے کی چٹانیں اور ایسی ہی آبی جھاڑیوں کا جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا، ان کی آڑ لیتا ہوا جب وہ کافی آگے نکل آیا تو اس نے ایک دم بوٹ کی رفتار بڑھا دی اور کھلے سمندر میں لے آیا۔

ہم تھوڑی دیر تک اپنے تعاقب کا شبہ دور کرنے کے لیے عرشے پر موجود رہے اور پھر مطمئن ہونے کے بعد ہم سب کیبن میں آگئے۔

میں نے کبیل دادا اور شکیلہ سے انجیلا کا تعارف کروایا۔ حالانکہ میں پہلے ہی اس کا کافی حد تک غائبانہ ذکر کر چکا تھا۔ ٹالبوٹ سے بھی ہم نے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھی دوستانہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔

ہم سب نے انجیلا کا اس نازک گھڑی میں مدد کرنے پر تہِ دل سے شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔

''شکریہ تو میں اب تک تمہارا نہ کر پائی تھی مسٹر شہزی!'' انجیلا بولی۔ ''تم نے مجھے ایک ظالم اور سنگ دل شیطان سے بالآخر نجات دلا دی۔'' مجھے حیرت ہوئی تھی کہ اسے لولوش کے جہنم واصل ہونے کا بھی پتا تھا، اس کے علاوہ بھی اور باتیں جواب طلب تھیں۔ میں اسی کا منتظر تھا۔ اس کے بعد ہی منزل کا تعین کیا جا سکتا تھا۔

پھر اس نے جھجکتے ہوئے اپنے باپ کے بارے میں پوچھا۔ ''پاپا تو خیریت سے ہیں نا......؟ انہیں تو کہیں تم نے......'' اس نے آخر میں میرے چہرے پر نگاہیں جمائے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر فوراً نفی میں سر ہلاتے جواباً بولا۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

"نہیں ۔۔۔ میں نے ان کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا اور نہ ہی میں ایسا کرنا چاہتا تھا، البتہ وہ ہماری جانوں کے درپے ضرور تھے۔"

"ان کی جان بخش کر تم نے اچھا کیا شہزی!" انجیلا ہولے سے بولی۔ ایسے میں کیبن کی فضا عجیب جذباتی سی ہونے لگی۔

"میرا پاپا کے سوا اب اس دنیا میں ہے ہی کون......؟ مگر پاپا تمہاری طرح اس مردود شیطان لولوش پر ضرور خار کھائے بیٹھے تھے۔ جزیرہ ہوگ بے پر حملے اور تمہاری لولوش کے خلاف کارروائیاں ایک ایک کر کے پاپا تک پہنچ رہی تھیں، کیونکہ میں پاپا کے ساتھ اسی لیے تھی کہ مجھے تمہاری اور عابدہ کی خیریت بھی مطلوب تھی اور ساتھ ہی یہ خوش خبری بھی سننے کے لیے بے چین تھی کہ تم نے اس شیطان کا کیا کیا۔" وہ ذرا رکی تو میں نے پوچھا۔

"لیکن یہ تو بتاؤ، تم یہاں کیسے اور کس طرح؟ میں ابھی تک حیران ہوں۔ مجھے یقین کرنے میں بھی تامل ہو رہا تھا جب تمہیں یوں اچانک دیکھا۔۔۔" میرے لہجے میں حیرت تھی۔

میری بات پر انجیلا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ وہ جواب میں بولی۔

"جب تم نے جزیرہ ہوگ بے کا رخ کیا تھا تو میں اپنے پاپا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ میں انہی کے ساتھ اس لیے بھی رہنا چاہتی تھی تاکہ ان کے ساتھ میں بھی حالات سے باخبر رہ سکوں۔

"میں جانتی ہوں شہزی! کہ یہ کارنامہ تمہارا ہی ہے کہ تم نے پاپا والوں کی مدد کی، لیکن اس کا مجھے بھی اندازہ تھا کہ پاپا تمہارے اور عابدہ کے ساتھ بھی ضرور بددیانتی کریں گے، ایک مقصد میرا یہ بھی تھا پاپا کے ساتھ رہنے کا، کہ تمہارے خلاف ان کی سازشوں سے بھی آگاہ رہوں اور وہی ہوا۔ پاپا خود بھی جزیرہ ہوگ بے میں ریڈ کرنا چاہتے تھے، کچھ قانونی رکاوٹیں تھیں مگر تمہاری وجہ سے انہیں موقع مل گیا تھا اور انہوں نے یہ ڈکلیئر کر دیا کہ......لولوش نے کسی خطرناک عالمی مجرم کی محبوبہ کا اغوا کیا ہے اور......لولوش کی وہ ذاتی جنگ ہے جبکہ ہم اسے صرف یہ جزیرہ خالی کرنے کا حکم دینے جا رہے ہیں جو کہ قانونی طور پر آلا یان کیلی کی ملکیت ہے اور اس کا کیس ایک امریکی عدالت میں چل رہا ہے اور اس کا فیصلہ بھی آچکا ہے، وغیرہ۔

"اس طرح وہ لولوش کا جواز بنا کر درحقیقت تمہیں اور عابدہ کو ساتھیوں سمیت اس حملے میں مار ڈالنا چاہتے تھے۔ مجھے پاپا کی ایسی بدنیتی کا پہلے ہی اسے اندازہ تھا مگر اب اس حقیقت کا پتا چلتے ہی میں نے اپنے قریبی عزیز دوست ٹالبوٹ، جو کرائے پر بوٹ اور لانچیں دیا کرتا ہے، سے رابطہ کیا۔ ماضی میں یہ میرا بہت اچھا دوست رہ چکا تھا۔ اس نے میری مدد کا فیصلہ کیا اور پھر جب دوسری کھیپ مدد کے لیے پاپا کو بھیجی جانے لگی تو کسی طرح ہم بھی ان کے تعاقب میں لگ گئے۔ میں تو پاپا کی بیٹی ہوں، یہ ٹائیگر لیگ کو معلوم تھا، اسی لیے مجھ پر کسی قسم کا شبہ نہ کیا گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ میں اپنے پاپا کی لاڈلی بیٹی ہوں اور ان کی جانب سے پریشان اور فکرمند ہوں۔ اسی لیے میرے ساتھ کوئی روک ٹوک نہ کی گئی۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گئی۔

کیبن کی فضا میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ ایک تاثر انگیز سی خاموشی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ انجیلا کی باتوں نے مجھے ہی نہیں بلکہ عابدہ سمیت کیبل دادا اور شکیلہ کو بھی بے حد متاثر کیا تھا۔

توصیفی کلمات کے بعد آپس میں جب اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہوئی تو ٹالبوٹ نے مسکرا کر پوچھا۔

"میرا خیال ہے ہم خطرے سے کافی دور نکل آئے ہیں، مجھے معزز مہمانوں کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر لینا چاہیے۔"

ٹالبوٹ ایک خوش مزاج اور مہمان نواز آدمی ثابت ہوا، اس نے ذرا سی دیر میں ہمارے آگے کھانے پینے کی دو تین ٹریں سجا دیں۔ جن میں خشک خوراک کے ڈبے، ٹن اور اعلیٰ درجے کی وہسکی بھی تھی۔ میں نے اور عابدہ نے کافی کے مگ اٹھا لیے تھے۔

وہسکی دیکھ کر کیبل دادا اور شکیلہ کی آنکھوں میں خاص چمک ابھر آئی تھی، کیبل دادا نے ہاتھ بڑھا کر اپنا پیگ اٹھا لیا جبکہ شکیلہ بے چاری عابدہ کی وجہ سے جھجک رہی تھی۔

"اٹھا لو تم بھی......شکیلہ!" میں نے اس کی "مشکل" حل کرنے کی غرض سے مسکرا کے کہا۔ "عابدہ کو جلد بہ دیر معلوم ہو ہی جائے گا کہ امریکا آ کر تمہاری عادتیں خراب ہو گئی ہیں۔"

"ہائے اللہ......! شکیلہ بھی......؟" عابدہ نے کہتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی ادا پر ہم سب ہی ہنس دیے۔ تھکن اور اعصاب شکن حالات کی اس زبردست

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

کشاکشی میں فلسی خوشی کی یہ ہلکی پھلکی پھواریں جسم و جاں کو تر و تازہ کرنے لگیں۔

"چھوڑو بے چاری کو...... پینے دو...... اب عادت لگ ہی چکی ہے تو کیا کیا جائے۔ ویسے بھی وہ اس وقت اعصاب زدہ ہو رہی ہے۔" میں نے اس کی سفارش کر دی۔

"لو اٹھا لو۔" میں نے اسے پیگ اٹھا کر تھما دیا۔

"امریکا میں رہ کر اب جتنی پینی ہے پی لو۔" عابدہ نے اسے گھور کر کہا۔ "پاکستان میں تم پر مکمل پابندی لگا دوں گی۔"

شکیلہ مسکی سی صورت بنا کر عابدہ کو دیکھنے لگی۔ وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

"اور...... دادا کو کون روکے گا پینے سے......؟" میں نے کھیل دادا کو بھی میدان میں گھسیٹ لیا۔

"اسے تو...... بیگم صاحب ہی...... سمجھائیں گی۔" شکیلہ نے معنی خیز انداز میں چٹکلا چھوڑا۔ کھیل دادا سر جھٹک کر ہنس دیا۔

وطنِ عزیز کا ذکر چلا تو مجھے اپنے بوڑھے والدین یاد آگئے، میرا جی بھر آیا۔ زہرہ بانو (بیگم صاحب) بھی تو میرے انتظار میں ایک ایک دن کا حساب کر رہی ہوں گی اور...... اور...... "او خیر...... کاکا......" اول خیر...... میرا یار بے بدل...... وہ بھی بھلا مجھے کہاں بھول سکتا تھا، میرے بغیر تو بے چارے کی جانے کیا حالت ہو گی۔ اپنے سب پیاروں کو یاد کر کے میرا اندر بوجھل سا ہونے لگا تھا۔

انجیلا اور ٹالبوٹ تو محض مسکرا رہے تھے ہمارے چٹکلوں پر البتہ میں اور عابدہ وغیرہ زیادہ محظوظ ہو رہے تھے۔ بیگم صاحب وغیرہ کے بارے میں اگرچہ ابھی تک عابدہ کو بھی پوری طرح علم نہ تھا، تاہم...... میں وقتاً فوقتاً عابدہ کو "اطفال گھر" کے بعد کے حالات کے بارے میں آگاہی دیتا جا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے اب منزل کا تعین کر لیا جائے تو بہتر ہوگا، ہم سٹی پورٹ کے قریب سے گزر رہے ہیں۔" ٹالبوٹ نے پوچھا۔

ہم نے اسے...... سان ڈیاگو کی بندرگاہ پہنچانے کا عندیہ دے دیا۔

☆☆☆

خدا نے جیسے مجھے بالآخر ایک فتح مبین سے نوازا تھا۔ عابدہ میری سنگت میں تھی اور ہم دونوں ایک دوسرے ...کو پاکر خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، ساری تھکن، تکالیف ہم بھلا چکے تھے۔ کس قدر خوشی کا موقع تھا، بے شک ایک امتحان ابھی اور سر پہ تھا...... یعنی امریکا سے بہ خیریت پاکستان کی جانب واپسی...... اور میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہ تھا۔ جہاں اس نے اتنی مدد اور رہنمائی فرمائی تھی آگے بھی، وہ ہماری دست گیری کرنے والا تھا۔

انجیلا نے ہمیں آخری خطرناک اور جان لیوا لمحات میں ہماری مدد کی تھی۔ وہ اس لائقِ تحسین اور اس کا ایک قابلِ لحاظ عمل تھا۔

عابدہ کو پا کر تو مجھ سے خوشی سمیٹے نہیں سمٹ رہی تھی اور اس کا بھی یہی حال تھا۔

ایک سچی محبت نے دوسری محبت کو پا لیا تھا۔

ٹالبوٹ نے کمپاس اور نقشے کی مدد سے سمندری راستے کا تعین کیا اور موٹر بوٹ کی رفتار بڑھا دی۔

ہم سب تھکے ہوئے بھی تھے۔ وہیں آرام کی غرض سے لیٹ گئے۔

ٹالبوٹ نے ہی ہمیں جگایا تھا۔ آنکھیں کھلیں تو نیلا آسمان خنجر تھا۔ اس پر سفید بادلوں کے ٹکڑے راج ہنسوں کے جوڑے اڑتے پھر رہے تھے، آبی پرندوں اور سی گلز کی مخصوص آوازوں کے شور نے بھی عجیب سماں باندھے ہوئے تھا۔

ٹالبوٹ نے بتایا کہ ہم...... سان ڈیاگو کی ایک جیٹی سے لگنے والے ہیں۔ انجیلا نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتی...... لیکن پھر کسی مدد کی ضرورت پڑے تو اس نے اپنا کونٹیکٹ نمبر دے دیا تھا۔ یوں میں نے بھی اسے عارفہ کی سان ڈیاگو والی رہائش گاہ کا نمبر دے دیا تھا۔

ہم سب نے ان دونوں کا ایک بار پھر تہِ دل سے شکریہ ادا کیا اور ساحل پر اُتر کے سیدھا...... عارفہ کے اپارٹمنٹ کا رخ کیا۔

ذرا ہی دیر بعد ہم وہاں موجود تھے۔ ایک انڈین ملازم نے جو مجھے جانتا تھا، فوراً عارفہ کو آفس فون کر کے ہمارے بارے میں بتا دیا۔

ہم جب تک غسل وغیرہ کر کے تازہ دم ہونے میں مصروف ہو گئے اور عارفہ نے میرے، عابدہ سمیت...... بہ خیریت یہاں پہنچ جانے کی خوش خبری سنتے ہی اپنے اپارٹمنٹ پر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

www.pklibrary.com

www.pklibrary.com

عارفہ تو عابدہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر رو پڑی اور اس کے پیروں پر بھی گرنے لگی تھی کہ عابدہ نے اشکبار آنکھوں سے اسے شانوں سے تھام لیا اور پھر گلے لگا لیا۔

"میں ہی تمہاری اصل مجرم ہوں عابدہ بہن!" عارفہ سرخ آنکھوں سے روتے ہوئے گلوگیر لہجے میں عابدہ سے بولی۔ "تم نے میرے ساتھ بھلائی کی اور میں نے اس کے جواب میں برائی سے کام لیا۔ کس قدر گناہ گار ہوں میں تمہاری عابدہ……! اور شہزی کی بھی…… مجھے تم دونوں معاف کر دینا…… اگرچہ میں معافی کے بھی شاید قابل نہیں ہوں۔"

وہ کہتی جا رہی تھی اور روتی جا رہی تھی۔ کمرے کا ماحول غمناک اُداسی اور جذباتی اضمحلال سا ہو گیا۔ کہیل دادا اور شکیلہ ایک جانب خاموش کھڑے تھے، میں بھی ہونٹ بھینچے… عابدہ اور عارفہ کے قریب ہی چپ چپ سا کھڑا تھا۔

ہم شاید خود بھی یہی چاہتے تھے کہ اتنے برسوں بعد ملے ہیں تو…… یہ غبار بھی دھل ہی جانا چاہیے۔

"نہیں عارفہ بہن! تم نے کچھ نہیں کیا، میری تقدیر میں ہی یہ سب لکھا تھا، اللہ نے آپ کو صحت اور شفا دے دی، اس سے بڑھ کر بھلا خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" عابدہ نے بڑی محبت اور پورے خلوص سے کہا۔

"تم عظیم ہو عابدہ! تمہارا احسان اور تمہاری شہزی کی قربانیاں میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔"

"میں نے یا شہزی نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ آپ کی مدد شامل تھی اور آپ کی مدد سے یہ سب ممکن ہوا کہ آج ہم سب ایک چھت تلے بیٹھے ہیں۔"

"عابدہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے عارفہ!" میں نے بھی درمیان میں کہا۔ "انسان کی تقدیر میں جو ہونا لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اب ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اور دعا بھی کہ اب وہ ہی ہمیں خیریت کے ساتھ واپس پاکستان پہنچا دے۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔" عارفہ دل کی گہرائیوں سے بولی۔

ہم سب نے زیرِ لب آمین کہا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ عابدہ نے صدقِ دل سے عارفہ کو معاف کر دیا تھا۔ عارفہ چونکہ راہِ راست پر آ چکی تھی اور دیارِ غیر میں ہماری مدد کی تھی اور کر رہی تھی، اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا۔ میں تو اسے پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔

سکون کی چند گھڑیاں میسر آتے ہی ہمارا ارادہ پاکستان اپنے ساتھیوں سے بھی ٹیلی فونک رابطہ کرنے کا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سب ہمارے لیے کس قدر پریشان اور فکرمند ہوں گے۔

ابھی میں اس بارے میں عارفہ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک سوال داغ دیا۔

"تم لوگوں کا یوں بھی اب زیادہ دیر تک یہاں امریکا میں قیام… خطرے سے خالی نہ ہو گا۔" عارفہ کہہ رہی تھی۔ "تم لوگوں کا اپنا کوئی پروگرام ہے تو بتاؤ مجھے ورنہ میں کوئی لائحہ عمل تیار کرتی ہوں۔"

سچی بات تو یہ تھی کہ ابھی کہیل دادا یا میں نے واپسی کی حکمتِ عملی کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ لہٰذا میں نے ہولے سے کھنکھارتے ہوئے عارفہ سے ہی پوچھ لیا۔

"تمہارے ذہن میں کچھ ہے تو بتاؤ، باقی ہمیں ابھی اس پر غور کرنے کا موقع نہیں مل سکا ہے۔"

"ہم…… میں جانتی تھی……" عارفہ بولی۔ "میرے ذہن میں البتہ شروع ہی سے یہی لائحہ عمل تھا کہ…… ہم سب……"

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ قریب ایک فینسی اسٹینڈ پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔ ایک ملازم نے اس کا کارڈلیس ریسیور عارفہ کو تھما دیا۔

"ہیلو…… کون؟" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ہم سب کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر شاید دوسری جانب سے کسی نے عارفہ سے کچھ کہا تھا اور…… جسے سُن کر وہ میری ہی جانب تکنے لگی اور پھر بولی۔

"جی ہاں! وہ ادھر ہی موجود ہیں……" کہتے ہوئے عارفہ نے ریسیور اپنے کان سے لگائے ہوئے کہا اور میری جانب بھی نگاہ بھر کے دیکھا تھا۔

نجانے کس کا فون تھا میرے لیے…… میرا دل یکبارگی تیزی سے دھڑکا اور میں اپنے اندر ایک نامعلوم سی بے چینی محسوس کرنے لگا۔

خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

www.pklibrary.com

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہورہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر، سسپنس اور ایکشن سے بھرپور [illegible]

آخری قسط

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ، سوتیلی ماں کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی۔ شہزی کی دوستی وہاں ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگتا ہے۔ شہزی کا ایک دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون زہرہ بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دست راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ کبیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آ رہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش تھی۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ”اسپیکٹرم“ کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولووش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دست راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولووش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولووش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نودولتیا سیٹھ نوید سانجے والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولووش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنے ماں باپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آ جاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولووش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دست راست سے جی کوہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام پھلکری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور لولووش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندرداس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس برمی قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے، وہاں سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد وہاں سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبیوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ موہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ تھا۔ شہزی، ریتا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ریتا،

شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیوٹمسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیوٹمسی کے ہیڈکوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بھوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بھوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور کمبیل دادا اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی ''انڈیمان'' پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں جانا ناممکنات میں سے تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بھوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بھوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو ''کلی منجارو'' پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بھوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات نانا شکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ نانا شکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور نانا شکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ نانا شکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چمائی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے نانا شکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس سانحے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرائی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدِ نگاہ کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشیلا کو جیپ میں چھوڑ کر خود ایک قریبی پہاڑی کا رخ کرتا ہے۔ واپسی کے لیے پلٹتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے بچھو تھے۔ بچھوؤں سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا دھند دوڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے لڑکھڑا کر گر پڑتا ہے اور چٹانی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لانچ میں پاتا ہے۔ وہ لانچ میجر کیم کھلا اور اس کی بیٹی سونگ کھلا کی تھی۔ وہ نایاب کالے بچھوؤں کے شکاری تھے اور بچھوؤں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سونگ کھلا کی نظر بے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان بچھوؤں سے بچا لیتی ہے۔ شہزی خود کو ایک ہندو ظاہر کر کے فرضی کہانی سنا کر باپ بیٹی کو اعتماد میں لے لیتا ہے۔ اس اثنا میں برمی مسلم گروپ کا مجاہد نولا ان پر حملہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کیم کھلا کو بے گناہ اور معصوم برمی مسلمانوں کے قتل کا ٹاسک ملا ہوا ہے تو وہ کیم کھلا اور اس کے ساتھیوں کو جہنم واصل کر دیتا ہے، پھر نارتھ انڈیمان کے ساحل کا رخ کرتا ہے۔ جہاں کلی منجارین سے ٹاکرا ہو جاتا ہے۔ شہزی گھات لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال داس کو قابو کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جنرل کے ایل ایڈوانی کا ہاتھ ہے اور اس کا نائب بلراج سنگھ بھی موجود ہے۔ جنرل ایڈوانی یہاں اپنے خاص مشن کی تکمیل اور ٹھکانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈارک کیسل نام کی عمارت تعمیر کروا رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقتیں تھیں۔ ایڈوانی نے اپنے مکروہ مفادات کے لیے کلی منجارین سے مل کر جاوا قبیلے کے سردار کو مار کر پورے جاوا قبیلے کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ ایڈوانی اور بلراج شہزی کو دیال داس کے بہروپ میں پہچان نہ سکے اور وہ چالاکی سے اپنا اعتماد بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج سنگھ کو جہنم واصل کرتا ہے۔ ایڈوانی ڈارک کیسل سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈوانی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر برد کر کے طلسم نور ہیرا حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی مچھیروں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ملکوں کے کوسٹ گارڈز سے نمٹتے اپنی سرزمین پاکستان پہنچتے ہی زہرہ بانو سے رابطہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڑکانہ پہنچ کر ہشام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زمیندار شاہ نواز خان جو پہلے بھی ہیرا چوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں ہشام کی بیوہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شہزی وغیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھوکے سے ہشام کے قتل اور اس کی بیوہ ارم کے اغوا کے جرم کی رپورٹ کرا دیتا ہے۔ پولیس اول خیر اور کمبیل دادا کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سناٹے میں خطرناک ڈاکو پریل چانڈیو حویلی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ واپسی میں شاہ نواز کی بیٹی سونہڑیں بھی ساتھ ہوتی ہے جو اس کی محبوبہ ہے۔ جاتے ہوئے پریل، شہزی کو بھی اپنے اڈے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات پریل کا نائب لائق ماچھی لالچ میں آ کر سازش کرتا ہے اور پریل کو غائب کرا کر خود سردار بن بیٹھتا ہے اور سونہڑیں کو تاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی، لائق ماچھی کے ساتھی عارب خان کو قابو کر لیتا ہے۔ شہزی، پریل کو بچا لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پریل، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سونہڑیں کو چھڑانے کے لیے تھانے پر حملہ کر دیتا مگر رینجرز کی اینٹی ڈکیت فورس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ مقابلے میں پریل اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔ شہزی اور اس کے ساتھی رینجرز کی تحویل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، میجر وسیم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، میجر وسیم، شہزی پر اعتماد کرتے ہوئے بھاری نفری کے ساتھ شاہ نواز کے خفیہ ڈیرے پر ریڈ کر کے طلسم نور ہیرا برآمد کر لیتے ہیں۔ اس مہم کے بعد شہزی اپنے ساتھیوں سمیت بیگم ولا کا رخ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی نگاہیں منتظر تھیں۔ پاکستان پہنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ، نوید سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو رہائی دلا کر نوید کو قانون کے شکنجے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تعاون اور ماں باپ کی دعاؤں کے سائے میں عابدہ کی رہائی کے لیے کمبیل دادا اور شکیلہ کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانا ہوتا ہے۔ طیارہ ابھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا ٹاکرا وزیر جان سے ہوتا ہے۔ مگر شہزی، وزیر جان کو چکما دے کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک تھائی لڑکی سانچی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاپنگ مال میں کچھ دہشت گرد حملہ آور ہوتے ہیں اور لوگوں کو یرغمال بنا کر اپنے قیدی چھڑانا چاہتے ہیں۔ ان کا سرغنہ، شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاسپاکو کا آدمی ہے۔ ایک مقام پر وزیر جان سے پھر ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ تادیر لڑائی کے بعد وزیر جان کو تہِ آب کر کے اپنے ازلی دشمن سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وزیر جان کے خاتمے کے بعد شہزی، عابدہ کی تلاش میں بالآخر امریکا پہنچ جاتا ہے، کمبیل دادا اور شکیلہ جو وہاں پہلے سے موجود تھے ان کے ساتھ مل کر مخالفین کو دھول چٹاتا ہوا عابدہ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ وہاں لولووش سے پنجہ آزمائی کرتے ہوئے عابدہ کو اس کی قید سے آزادی دلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب اُن کی اگلی منزل پاکستان تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

''لو......! تمہارا فون ہے، انجیلا تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔'' عارفہ نے کارڈلیس ریسیور میری جانب بڑھا دیا۔

عارفہ کے منہ سے ''انجیلا'' کا نام سنتے ہی سب کو ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ اتنی جلدی اس کا مجھ سے فون پر رابطہ کرنا کسی اہم بات کی غمازی کرتا تھا۔

''ہیلو، انجیلا! خیریت......؟'' میں نے عارفہ سے ریسیور لیتے ہی اپنے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت بالکل نہیں ہے شہزی!'' دوسری جانب سے حسب توقع انجیلا کی بوکھلائی ہوئی پریشان کن آواز ابھری اور میری بھویں سکڑ گئیں۔

''تم جہاں کہیں بھی ہو بہت اور بہت زیادہ محتاط رہنا۔'' وہ بتا رہی تھی۔

''بات کیا ہے آخر......؟'' میں نے کہا۔

''سنو۔'' وہ جیسے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''پاپا اور بے جے نیاکن کے خونخوار کتے تمہاری اور عابدہ کے خون کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ تمہیں تو فوراً دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات صادر کر دیے ہیں۔ شہزی! ابھی کسی قسم کی جلد بازی بالکل مت کرنا۔''

''خطرے سے آگاہی دینے کا شکریہ، انجیلا!'' میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو، میں تو اپنے سائے سے بھی محتاط ہوں، اور کچھ؟''

''پلیز، شہزی! اسے معمولی بات خیال مت کرنا۔'' وہ بولی۔ میرے اعتماد بھرے اور پُرسکون لہجے نے شاید اسے فکرمند کر دیا تھا۔ ''ذرا سی بھی بے پروائی سے اگر تم یا عابدہ شکار کر لیے گئے تو یہ دکھ مجھے ساری زندگی بے چین اور اَپ سیٹ رکھے گا، مردود شیطان لولووش مرنے کے بعد بھی فاتح رہا، کیونکہ میں اسے مرنے کے بعد بھی شکست خوردہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہاں! شہزی! وہ ایسا ہی بے حس، رذیل اور کمینہ انسان تھا۔ مرنے کے بعد بھی اس کی شیطانی روح مجھے تڑپاتی رہے گی جب تک تم اور عابدہ خیریت سے امریکا سے واپس اپنے وطن نہیں پہنچ جاتے۔''

اس کی آواز میں میرے اور عابدہ کے لیے فکر و تشویش اپنی جگہ مگر اس کی تہ میں جو لہجہ گونج رہا تھا وہ...... ایک ایسی زخم خوردہ عورت کا ہی محسوس ہوتا تھا، جس کا بس چلتا تو اپنے دشمن کی لاش تک نوچ ڈالے۔

''بے فکر رہو، میں سکون کی سانس اپنے وطن ہی جا کر لوں گا اور......''

''خیال رہے کہ ائرپورٹ کا رخ بالکل بھی مت کرنا، نہ ہی ریلوے اسٹیشن یا کسی بندرگاہ کا......'' وہ جوش تلے بولے جا رہی تھی اور شاید میرے تسلی آمیز جملے نظرانداز کیے جا رہی تھی، ناچار میں بھی اس کی سنتا رہا۔

''بائی روڈ بھی خطرناک ہوگا، بس تم جلد بازی سے کام بالکل بھی مت لینا، جہاں ہو وہیں خود کو اور عابدہ کو محبوس رکھنا، چاہے اس کے لیے دن، مہینوں اور سالوں میں بدل جائیں، جان سے بڑھ کر کوئی شے قیمتی نہیں ہوتی، حالات معمول پر آنے لگیں گے تو میں خود ہی تمہیں انفارم کر دوں گی اور کچھ اپنے طور پر تم دونوں کے امریکا سے بہ خیر و عافیت نکلنے کا بندوبست کرنے کی کوشش کرتی ہوں، لیکن ابھی نہیں......''

''میں تمہاری ساری نصیحتیں اور ہدایات سمجھ چکا ہوں انجیلا ڈیئر! اور اس پر پورا پورا عمل کر دوں گا۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ تب کہیں جا کر اس کی کچھ تسلی ہوئی اور اس نے کچھ اختتامی جملے ادا کرنے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

میں سر کو جھلاتے ہوئے انداز میں دائیں بائیں حرکت دیتا ہوا مسکرایا اور کارڈلیس سامنے تپائی پر رکھ دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی انجیلا؟'' عارفہ نے پوچھا۔ باقی سب بھی سننے کو بے چین تھے۔ اگرچہ انہیں میری اور اس کی گفتگو سے اندازہ تو ہو ہی چکا ہوگا۔ میں نے انہیں بتا دیا۔

''اس خطرے کا تو ہمیں اچھی طرح ادراک ہے۔'' کبیل دادا نے کہا۔

''اور یوں بھی ہم کون سا جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔'' شکیلہ بولی۔

''ہاں! ظاہر ہے، اب سر منڈواتے ہی اولے تو نہیں ڈلوائیں گے ہم اپنے سروں پر......'' عارفہ نے بھی لقمہ دیا۔

''بعض حالات میں جلد بازی سے ہی کام لینے میں کامیابی چھپی ہوتی ہے، دوستو!'' میں نے معا عجیب سے لہجے میں ان کے خیالات کے برعکس اپنا فیصلہ سنایا تو وہ چونک کر ایک ٹک میرا چہرہ تکنے لگے۔

''ہاں! یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی کرمنل ٹائپ حادثہ ہے۔ یہ ایک جنگ ہے، ایک بقا کی جنگ...... اس میں تساہل اور کچی منصوبہ بندی اکثر ناکامی سے دوچار کر دیتی ہے۔''

''تب پھر تم کیا چاہتے ہو؟'' عارفہ نے میری طرف مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں آج رات ہی امریکا سے نکلنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ یقیناً وہ چونکے ہوں گے لیکن کسی نے اختلاف نہیں کیا، وہ جانتے تھے کہ میں اتنے اہم اور بڑے فیصلے جوش اور جذبات میں نہیں بلکہ ایک حکمتِ عملی کے تحت ہی کیا کرتا تھا۔

''آپ کے ہم پر بہت احسانات ہیں عارفہ صاحبہ!'' میں نے ذرا دیر کی خاموشی کے بعد اس سے کہا۔ ''آپ کو ہم پر ایک اور آخری احسان کرنا ہوگا۔''

''یہ کیسی اجنبیوں والی بات کر دی تم نے شہزی؟'' عارفہ نے فوراً اپنائیت بھری خفگی سے کہا۔ ''تمہارے اور عابدہ کے لیے تو میں اپنی جان بھی دے سکتی ہوں لیکن ......''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ہماری روانگی کے لیے آج ہی اپنی کمپنی (اڈیسہ شپنگ کمپنی) کے کسی باربردار جہاز میں ہم چار افراد کے لیے ایک کنٹینر کا بندوبست کر دیں۔''

''وہ تو ہو جائے گا ......لل......''

''میں بتاتا ہوں آگے۔'' میں نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''ٹائیگر ٹیگ اور جے بی سی والے ابتدائی چند گھنٹوں تک صرف ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔ اس کے بعد انہیں ہماری ناکا بندی کی درست سمت نظر آ جائے گی اور میں اس سے پہلے ہی یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ تاخیر کی صورت میں ہمارے خلاف یہ ناکا بندی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جائے گی۔''

''شہزی! ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' کبیل دادا نے بالآخر پر ملا اور مکمل کر میری تائید کر ڈالی۔ ''تم اپنی منصوبہ بندی کی تفصیل جاری رکھو شہزی۔'' اس نے آخر میں خاصے گمبھیر لہجے میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں ایک کنٹینر میں چھپ کر سمندر کا سفر کرنا معمولی بات نہیں ہوتی، لیکن اس سلسلے میں کچھ خصوصی انتظامات کرنا پڑیں گے۔'' میں آگے بولا۔ ''کنٹینر ایسا ہو جس کی باڈی پر خوراک وغیرہ کے اسٹکر اور لیبلو نظر آنے چاہئیں۔ اس میں یقیناً ریفریجریٹر بھی ہوں گے اور اے سی بھی، ریفریجریٹر صرف دکھاوے کے ہوں گے جبکہ اے سی آن ہوں گے اور آکسیجن کا بھی اس میں خاطر خواہ بندوبست ہونا چاہیے، اگلے پلان کے مطابق یہ سفر ایک ملک سے دوسرے ملک تک مختصر ترین ہو تو اور زیادہ بہتر ہوگا کہ کم از کم ہم امریکا سے تو بہ خیر و عافیت نکل جائیں گے، اس کے بعد کسی دوسرے ملک سے ہم بائی ائر وطن عزیز پرواز کر جائیں گے۔''

''یہ سب ہو جائے گا۔'' عارفہ یک دم بولی۔ ''اس کے لیے مجھے شیڈول اینڈ شپمنٹ چارٹ دیکھنا پڑے گا اور اس ضروری ردّوبدل کے لیے مجھے کچھ گھنٹے درکار ہوں گے۔''

''فوراً سے پیشتر یہ کام کر ڈالیے عارفہ صاحبہ!'' میں نے اس سے کہا۔

وہ بے چاری ہماری مدد کے لیے پوری طرح پُرجوش نظر آ رہی تھی، لیکن اس کی خواہش تھی کہ ہم اور بالخصوص عابدہ چند دن یہاں رکتے مگر ہماری ''خطرناک'' مجبوری کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

عارفہ کی ذمے داری نمٹانے تک ہمارے پاس چند گھنٹے تھے۔ ایک گھنٹا میں نے کبیل دادا اور شکیلہ کو دیا کہ وہ ضروری پیکنگ نمٹا لیں...... وہ اٹھ کر کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں عابدہ کو لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔

لمبی جدائی کے مارے ہوئے دو پیاسے دلوں کے لیے ذرا دیر کی اس تنہائی نے گویا جلتی پر تیل کا کام کر ڈالا۔ صدیوں کے بچھڑے ہوئے دو جسم، یکجائی کے لیے اب تک طویل فاصلوں اور کٹھن مسافتوں کا زہر پیے ہوئے تھے، ایک ذرا قربت میسر آتے ہی وہ یک جان۔ دو قالب کے ساتھ انہیں پاٹنے کے لیے بے چین ہو گئے تھے۔

یہ ملن کے وہ سُرور انگیز اور عجیب لمحات ہوتے ہیں، جب فرطِ مسرت سے قوتِ گویائی تک سلب ہو جاتی ہے کہ اب لفظوں میں وقت کا زیاں ہی نظر آنے لگتا ہے اور محبت کے والہانہ انداز کی صرف حرکات و سکنات ہی کام کے لائق بچتی ہیں۔ یہی ''کام'' عابدہ اور مجھ سے گویا سرزد ہو گیا۔

جب میں نے جذبۂ بے اختیاری سے عابدہ کو اپنی جانب کھینچا تو اس کی سانسیں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا نرم و نازک گل شباب بدن دہک رہا تھا اور اس کا ارتعاش بھرا لمس میرے وجود کو اور زیادہ متحرک اور حرارت بخشنے لگا تھا۔ ہم دونوں کھڑے کھڑے ہی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر جیسے یک جان دو قالب کی مثال پیش کرنے لگے۔

ہم دونوں کے جسم باہم پیوست ہولے ہولے جذبات تلے کانپ رہے تھے اور یہ معلوم ہی کب ہوتا تھا کہ ہم زمین پر تھے یا آسمان پر؟ میں دیوانہ وار اسے چومتا جا رہا تھا اور وہ فرطِ جذب و طلب تلے آنکھیں موندے ہوئے تھی۔

''شش...... شش...... شہزی!'' عابدہ کے گلے تک

میں جیسے کیف و نشاط کی رقت بھر آئی تھی، اس نے میرا نام لیا تو اس کی آواز میں ایک لذت آگیں کراہ سی محسوس ہوئی۔ اس کا معصوم اور حسین چہرہ بڑی تب و تاب کے ساتھ سرخی مائل ہو رہا تھا یوں سلگتا ہوا انگارا میں بھی بنا ہوا تھا۔

"اب مجھ سے دور مت ہونا...... اب مجھ میں ٹوٹ کر بکھرنے اور پھر سمٹنے کی سکت نہیں رہی ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"عابدہ! میں وعدہ کرتا ہوں، اب ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میں نے اب بس تمہیں سمیٹ لیا، سارا کا سارا سمیٹ لیا ہے اور خود میں بھر لیا ہے۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے دیکھونا ذرا......" میں محبت پاش لہجے میں بولا۔ وہ کسی نرم و نازک تتلی کی طرح میرے مضبوط بازوؤں کے حصار میں تھی اور میں جانتا تھا کہ اس کی گرفت اسے کس قدر سکون بخش رہی ہوگی۔ وہ بھی تو مجھ میں باہم پیوست تھی۔

"ہاں، عابدہ! اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کرسکتی۔"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی، ہم فوراً ایک دوسرے سے الگ ہو کر سنبھالا لینے لگے۔ اس کے بعد میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے شکیلہ کھڑی تھی اور پھر اس کی نگاہیں میرے اور میرے عقب میں دروازے کی سمت تکتی عابدہ کے چہرے پر پڑیں، جہاں ہنوز جذبات کی شدت شاید اب بھی محسوس ہو رہی تھی۔ تب ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے قدرے جھینپ کر بولی۔

"سوری! میں نے شاید تم دونوں کو ڈسٹرب کر دیا۔"

"چل اب زیادہ بکواس نہ کر اندر آ...... پہلے کتنی بنتی ہے بڑی......" عابدہ نے پیار سے مسکرا کر اسے ڈانٹ پلا دی۔

وہ ہنستی مسکراتی اندر آ گئی اور شرارت سے پھر بھی باز نہ آئی، بولی۔ "حالانکہ کبیل دادا نے مجھے منع بھی کیا تھا کہ......"

"شٹ اَپ۔" عابدہ شرم سے سرخ ہونے لگی اور اسے پھر جھڑک دیا۔

"پیکنگ مکمل ہوگئی؟" میں نے موضوع ختم کرنے کی نیت سے تھوڑا مسکرا کر شکیلہ سے پوچھ لیا۔

"ہاں! اب بس عارفہ باجی کے کام کے مکمل ہونے کا انتظار ہے۔"

"ہمم......" میں نے گوگو کے سے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے۔ اس کے بعد ہم پھر نشست گاہ میں آ گئے۔ کافی کا آرڈر دیا گیا۔

عارفہ کے لوٹنے میں تقریباً ایک گھنٹا باقی تھا۔ اس دوران ہم آپس میں باتیں کرتے رہے۔

اچھی خاصی دیر کے بعد عارفہ بھی آ گئی اور وہ خاصی پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔

"سب ریڈی ہے۔ ایک کارگوشپ نہر پاناما کی ساحلی پٹی کے ساتھ افریقہ روانہ ہوگا۔ یہ بحری راستہ بحرالکاہل اور بحراوقیانوس کو ملاتا ہے...... اس کے ذریعے تم افریقہ کے ساحل کے راستے انڈیا اور پھر پاکستان پہنچ سکتے ہو۔ یہ سب سے شارٹ کٹ اور آسان راستہ ہے۔ تم لوگوں کی منزل چونکہ پاکستان ہے اسی لیے اس کارگوشپ کے طے شدہ روٹس میں مجھے تھوڑی بہت ردّوبدل بھی کروانی پڑی ہے، یوں یہ کارگوشپ بہ ظاہر اپنے کاروباری دورے پر افریقہ اور ہندوستان کے ساحلوں پر "لوڈنگ اور اَن لوڈنگ" کرتا ہوا پاکستان پہنچے گا۔"

"لیکن یہ بحری راستہ تو دنوں بلکہ مہینوں تک محیط ہوگا، اتنا طویل عرصہ ہم کنٹینر میں...... گزار کے سفر کریں گے؟" شکیلہ نے سوال اٹھایا۔

"ہمم...... یہ بات تو ہے۔" عارفہ بولی۔ "لیکن یہ بھی تو سوچو کہ یہ سفر بے شک طویل اور اُکتا دینے والا سہی مگر اس میں حفاظت کس قدر ہے۔ بہ صورت دیگر شارٹ کٹ اختیار کرتے ہیں، اس میں بہت جھمیلے تو اپنی جگہ ہیں ہی، لیکن جان جانے کا خطرہ ننانوے فیصد ہوگا۔

باسکل ہولارڈ اور جے بی سی بھوکے کُتوں کی طرح تم لوگوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ پورے امریکا کی مشینری پر ان کا قبضہ ہے۔ ایک ذرا بھی جائے پناہ یہ رذیل لوگ تمہیں دینے کے لیے روادار نہیں ہیں۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہوائی جہاز کے ذریعے ہی ڈائریکٹ فلائٹ میں کسی طرح بندوبست ہو جائے؟" عابدہ بولی پھر سب کو خاموش پا کر اس نے میری طرف دیکھا۔

"شہزی! تم ہی کوئی ایسا راستہ نکالنے کی کوشش کرونا......؟"

"میرا خیال ہے ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے جس پر ہم نے ابھی تک سرے سے کچھ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے اور ٹائیگر فیگ اور جے بی سی کے دباؤ میں آ گئے ہیں۔"

"کیسے کوشش کی جائے؟" میں نے گوگو سے لہجے

میں کہا۔ ’’انجیلا کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق ائرپورٹ پہنچتے ہی ہمیں دھر لیا جائے گا۔ باسکل ہولارڈ اور جے بی سی ہمیں کسی بھی الزام میں بہ آسانی گرفتار کروا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کا خونی کھیل آسان ہو جائے گا۔‘‘

’’میرے تو خیال میں سیف سائڈ یہی ہے جس پر ہم پہلے ڈسکس کر چکے ہیں۔‘‘ عارفہ نے سنجیدگی سے پھر اپنی بات دہرائی۔ ’’تھوڑی مشکلات تو ہیں مگر حفاظت کے پوائنٹ آف ویو سے یہی بہتر ہوگا۔ ہمیں جلد بازی کا سفر مہنگا پڑ سکتا ہے۔‘‘

میں نے اس کے چہرے کی طرف غور کرنے کے انداز میں دیکھا اور ہونٹ بھینچ لیے۔

بالآخر متفقہ طور پر ہم نے اپنے اول الذکر فیصلے پر ہی عمل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ خوراک راشن کا مسئلہ نہیں تھا جس کنٹینر میں ہم نے محبوس ہونا تھا وہاں خوراک کا ذخیرہ موجود رہتا۔

کارگو عملے کے صرف تین افراد کو ہمارا علم تھا۔ کپتان، اس کا نائب اور ایک خلاصی۔ باقی لوگ اپنے اپنے کاموں اور کیبن تک ہی محدود رہنے والے افراد تھے۔

چائی شن نامی ٹھگنے قد کا کپتان ہانگ کانگ کا باشندہ تھا اور عارفہ کا پرانا وفادار اور خیر خواہ تھا۔ اسی طرح باقی دو افراد بھی عارفہ کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔

مقررہ وقت پر ہم سب میرین سائڈ کی اس برتھ پر آ گئے جہاں کرینیں اور دیوہیکل کنٹینر نظر آ رہے تھے۔ کارگو شپ جیٹی پر لنگر انداز تھا اور بڑی بڑی کرینوں کے ذریعے دیوپیکر کنٹینر اس کارگو شپ پر لادے جا رہے تھے۔

ہم بھی اپنے مطلوبہ کنٹینر میں داخل ہو چکے تھے۔ رخصت ہوتے وقت عارفہ نے ہمیں آنسوؤں اور ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا تھا۔ مجھے اور عابدہ کو ایک خاص نصیحت کی تھی کہ ہم پاکستان پہنچنے کے بعد شادی کے بندھن میں بندھ جائیں، عابدہ شرما گئی تھی۔

عارفہ نے ہماری شادی میں شرکت کرنے کا وعدہ کیا تھا اور یہ بھی کہ وہ ہمارے پاکستان پہنچنے کے بعد خود بھی چند دنوں کے لیے آئے گی۔

ہمارا کنٹینر جس میں ہم موجود تھے، اسے دیگر کنٹینروں کے ساتھ اور درمیانی منزل میں رکھا گیا تھا۔ اس کے نیچے دو کنٹینر اور اوپر دو کنٹینر رکھے تھے۔ درمیان میں روشندان نما کھڑکیاں تھیں۔ اے سی بھی لگا ہوا تھا اور اندر ہمارے آرام سے بیٹھنے کے لیے نشستیں رکھی گئی تھیں اور سونے کے لیے نرم گرم میٹرس بچھا دیے گئے تھے۔

کنٹینر کے اندر داخل ہوتے ہی ہمیں یوں لگا جیسے کسی بند جگہ پر محبوس ہو گئے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے ہمارے دل میں ہول بھی اٹھا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ وغیرہ پیش آ جاتا تو ہماری ادھر ہی زندہ قبریں بن جاتیں۔

ایسے میں وہ لرزہ خیز حادثے ہمیں یاد آنے لگے جن کی رُوداد اکثر و بیشتر ٹی وی اور اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں، یہ انسانی اسمگلنگ کے زمرے میں آتا تھا اور غیر قانونی طور پر کسی دوسرے ملک کی سرحد پار کرنے کی کوشش میں کس طرح کنٹینروں میں گھٹ کر مر جاتے تھے۔ لیکن خیر، یہ ایک پہلے سے تیار شدہ اور ’’بندوبست شدہ‘‘ اور محفوظ منصوبہ تھا جس میں ہر طرح کا انتظام تھا۔

کپتان چائی شن بڑا اچھا اور خوش اخلاق ثابت ہوا تھا۔ اس نے ہمیں شپ کی روانگی کا بتایا اور ساتھ ایک بیل کے بٹن کی جانب اشارہ کر دیا جو ہمارے دائیں جانب کنٹینر کی دیوار پر لگا ہوا تھا کہ بوقتِ ضرورت ہم اسے پش کر سکتے تھے۔

ہم تھکے ہوئے تھے لہٰذا اپنے اپنے بچھے ہوئے میٹرس پر لیٹتے ہی سو گئے۔

نجانے ہم کتنی دیر تک سوئے رہے تھے کہ ہمیں ایک مقرر کردہ ملازم نے جگایا اور کپتان کی طرف سے ہماری خیریت پوچھی۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔

اس سے ہم نے پوچھا تھا کہ اس وقت ہم کہاں تھے اور کیا ہم امریکا کی بحری حدود سے نکل چکے ہیں تو اس نے مایوس کن جواب دیا کہ کلیئرنس نہیں ملا ہے اور ابھی تک ہم سان ڈیاگو کے ساحل کے قریب ہی جیٹی نمبر آٹھ پر لنگر انداز ہیں۔ نیز یہ کہ اب صبح ہو چکی تھی۔

میں تو یہ سوچ کر سویا تھا کہ صبح آنکھ کھلے گی تو یہ مژدہ سننے کو ملے گا کہ ہم شہر خرابہ امریکا سے کئی ناٹیکل میلوں دور جا چکے ہوں گے اور ہمیں دشمنوں کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔

جبکہ خطرہ اب بھی ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ کپتان چائی شن کے مطابق کارگو جہازوں کی آج تعداد زیادہ ہونے کے سبب ایسا ہو رہا تھا ورنہ بظاہر کوئی خطرے والی بات نہیں تھی۔

اس کی بات سے دل کو ذرا تسلی ہوئی تھی۔ پھر کچھ دیر اور گزری، تو کپتان نے یہ خوش خبری بھی دے دی کہ شپ روانہ ہو چکا ہے۔

میرے اور کمیل دادا کے علاوہ شکیلہ اور عابدہ کے

چہروں پہ مسرتیں چمکنے لگیں۔ مجھے ابھی کچھ بے چینی تھی۔ جب تک ہم امریکا سمندری حدود میں تھے، دھڑکا لگا رہتا۔

یہ وقت صدیوں جیسی مسافت کے مانند گزرتا محسوس ہونے لگا، مجھے ایک چپ سی لگ گئی تھی، جبکہ دیگر ساتھی ناشتا وغیرہ کرنے کی تیاری میں مصروف تھے، میں نے بھی زہر مار کرلیا۔

میں نے جو بروقت فوری حرکت میں آنے کی منصوبہ بندی کی تھی، اس کی کامیابی کا مجھے اسی قدر یقین تھا جیسا کہ قیاس کی بدولت کوئی نتیجہ قائم کیا جا سکتا ہے، شاید اسی لیے میں بھی کچھ بے چین سا تھا۔

میں نے بے دلی سے ناشتا ختم کیا اور کنٹینر کی دیوار سے پشت لگا کر بیٹھ گیا۔ عابدہ میری بے چینی سمجھ رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں تھی، کمیل دادا بھی چپ سا تھا۔ شکیلہ اور عابدہ آپس میں باتیں کرلیتیں۔

میں بار بار رسٹ واچ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمیل دادا چونکہ خود بھی میری ہی جیسی بے چین آمیز پریشانی کا شکار تھا اسی لیے میرے قریب سرک آیا اور ہولے سے بولا۔

''شہزی! ہم انشاء اللہ بہ خیریت پاکستان پہنچ جائیں گے۔''

''انشاء اللہ......'' میں ہولے سے زیرِ لب مسکرا کر بولا۔ ''بس ذرا دھڑکا لگا ہوا ہے، ٹائیگر گینگ اور جے بی سی والوں سے اب دوبارہ سامنا نہ ہو جائے، ورنہ یہ جنگ پھر خوں ریز اور طویل ہو جائے گی۔ یار کمیل! پتا نہیں کیا بات ہے جب سے عابدہ ملی ہے اب اس کشاکشی اور ہنگاموں سے دل بھر سا گیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے یار! کہاں تو میں خطرناک سے خطرناک دشمنوں کے سامنے خود جا کر سینہ سپر ہو جاتا تھا لیکن اب ان سے منہ موڑتا اور چھپتا پھر رہا ہوں۔''

''ہوتا ہے ایسا......'' وہ ہولے ہولے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''اس لیے کہ اللہ نے تمہیں ہر محاذ پر کامیابی دی ہے۔ دشمنوں پر تم ہمیشہ غالب رہے اور انہیں شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ یوں تمہارے سامنے جو بھی نیک مقاصد تھے، وہ سب پورے ہوئے، حتیٰ کہ تمہارا سب سے اہم اور آخری مشن عابدہ کا حصول بھی مکمل ہوا تو ایسے میں اب درحقیقت تمہارے سامنے کوئی مشن نہیں رہا ہے، تمہارا یہ سب محسوس کرنا فطری بات ہے پھر دشمنوں کا تم نے خاتمہ بھی کیا جو بچے ہیں اپنی ہی شکست کی خاک چاٹ رہے ہیں۔''

''ہم......'' میرے منہ سے ہولے سے برآمد ہوا۔

☆☆☆

عارفہ نے درست کہا تھا کہ دوستوں اور سب سے بڑی بات عابدہ کی سنگت میں ہمیں اس طویل سفر کا پتا بھی نہیں چلے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ستائیسویں دن شام کو کپتان چائی شن نے بالآخر ہمیں یہ خوش خبر سنائی کہ ہمارا شپ پاکستان کی سمندری حدود میں داخل ہو چکا ہے۔

ہم گویا یہ مژدۂ جانفزا سنتے ہی ایک دوسرے کو مبارک باد دینے لگے اور مارے خوشی کے ایک دوسرے سے گلے بھی ملے۔ بے چاری عابدہ تو فرطِ جذبات سے رو پڑی تھی۔ اس نے سب سے زیادہ اذیتیں جھیلی تھیں اور خود اس کی تلاش اور حصول کی خاطر میں کب چین اور آرام سے بیٹھا تھا۔ میرے ساتھیوں کی قربانیاں، بالخصوص کمیل دادا اور شکیلہ نے میرے اس مشن میں اپنی جان پر کھیل کر پورا پورا ساتھ دیا تھا اور بھی کئی لوگ اس کارواں میں شامل ہوتے اور بچھڑتے رہے تھے۔ ایک طویل فہرست تھی ان کی......

پھر وہ دن بھی آیا جب ہمارا کارگوشپ پاکستان کی سب سے معروف اور مشہور بندرگاہ کراچی (کیماڑی) سے آن لگا۔

جیٹی پر ہی کارگوشپ اَن لوڈ کیا جانے لگا، کپتان چائی شن اور اس کے دونوں قابلِ اعتبار آدمیوں نے ہمیں کنٹینر سے نکال کر اس کے اندر خوراک کے ڈبے اور دیگر ایسا سامان بھر دیا تھا تاکہ یہ خالی محسوس نہ ہو اور ہمیں ایک کشتی کے ذریعے منوڑا اور بھٹ آئی لینڈ کے کسی ساحل پر اتار دیا۔

وہاں سے ہم کرائے کی لانچ کے ذریعے گھومنے کے لیے آئے ہوئے مسافروں کے ساتھ اس میں سوار ہوئے اور پورٹ پر آگئے۔

باہر نکل کر ہم نے ٹیکسی کی اور سیدھا اچھے سے ہوٹل کی راہ لی۔

ہوٹل میں دو کمرے لیے اور...... سب سے پہلے میں نے...... ملتان ''بیگم ولا'' فون کر کے نہایت مختصر گفتگو کے دوران میں زہرہ بانو کو اپنی اور عابدہ سمیت شکیلہ اور کمیل دادا کی آمد کی خوش خبری سنائی، ایک لمحے کے لیے تو زہرہ بانو گنگ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے اسی قدر ہی الفاظ پھسلے تھے۔

”شش...... شہزی! تت...... تم سچ کہہ رہے ہو؟“ اس کی تیز تیز سانسوں کی بازگشت مجھے فون پر اس قدر واضح محسوس ہوئی تھی جیسے وہ میرے سامنے، قریب اور بالکل قریب کھڑی ہو۔

”کسی مجبوری کے سبب میں زیادہ بات نہیں کرسکتا، بہت جلد ہم بذریعہ فلائٹ پہنچیں گے۔“ میں نے کہا اور رابطہ منقطع کردیا۔

کراچی میں میرا یہ دوسرا مختصر ترپ تھا۔ ہم نے وہ سارا دن سوکر گزارا۔ اگلے دن ہم نے ملتان کی فلائٹ میں چار سیٹیں بک کروائیں جو اگلے دن کی تھیں۔

ہم سب کے چہرے خوشیوں سے کھلے ہوئے تھے۔ دل ان مسرتوں سے بے قابو سے ہوئے جارہے تھے اور بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم اڑ کر بیگم ولا جا پہنچیں۔ یقیناً ہماری آمد کی خبر پر وہاں بھی خوشیاں منائی جارہی ہوں گی۔ وہ بھی ہماری طرح بے چین ہوں گے، ہم سے ملنے کے لیے، ہمیں گلے لگانے کے لیے...... اول خیر تو خوشی سے پاگل ہورہا ہوگا۔ اماں اور بادا جان کو بھی یقیناً زہرہ بانو نے میری آمد کی خبر دے دی ہوگی۔ یہ انہی کی دعاؤں کا تو نتیجہ تھا کہ آج خدا نے مجھے ایک فقید المثال کامیابی سے ہمکنار کیا تھا۔

پھر وہ دن بھی آگیا جب...... ہم ملتان ائرپورٹ پر قدم رکھ رہے تھے، ایک ہوک سی دل میں اٹھی اور بہت سی یادیں تازہ ہونے لگیں۔ میں ایک طویل عرصہ اس راہِ پُرخار کی دشتِ سیاہی میں صحرا گردی کرنے کے بعد خود کو یک دم ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ کتنی ہی یادیں وابستہ تھیں میری اس شہر سے...... اطفال گھر کو میں کیسے بھلا سکتا تھا؟ سرمد بابا (سیٹھ منظور وڑائچ) زبیر خان، جاں ورکھنا اور نیلی...... اور...... ثریا اور آسیہ کی جانی قربانیاں میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

لیکن نہیں...... میں شاید بھول رہا تھا...... دو اہم کرداروں کو...... معاشرے کے دو زہریلے کردار...... چوہدری ممتاز اور نوشابہ...... اگرچہ اس کی بیٹی نوشابہ سے میرا سامنا کم ہی ہوا تھا مگر تازہ ترین اطلاعات کے مطابق جب میں عارفہ کے ہاں سان ڈیاگو میں تھا تو فون پر اول خیر نے مجھے نوشابہ کی چیرہ دستیوں کے بارے میں بتایا تھا جو اپنے باپ ممتاز خان کے نقشِ قدم پر چل نکلی تھی۔ دونوں باپ بیٹی اب مجھ سے انتقام لینے کے لیے بے چین بیٹھے تھے۔

بقول اول خیر کے فون پر بتانے پر کہ...... نوشابہ نے زہرہ بانو پر قانونی چارہ جوئیوں کی بھرمار کر رکھی تھی۔ نئے پنڈ والی جائداد، ملتان میں فیکٹریاں اور ایک عدد سالونٹ پلانٹ کہ۔ ان سب پر زہرہ بانو کا حق نہیں بلکہ اس کے باپ ممتاز خان کا حق ہے، اپنے بھائی فرخ کے قتل کیس میں میری اور اول خیر کی ضمانتیں بھی منسوخ کروانے کے لیے وہ سرگرم تھی۔

نوشابہ اپنے باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ مزید یہ کہ اس نے کورٹ میں زہرہ بانو کے خلاف یہ جھوٹا اور شرمناک دعویٰ بھی کرڈالا تھا کہ زہرہ بانو کی ماں ستارہ بیگم اس کے دادا چوہدری الف خان کی دوسری منکوحہ نہیں بلکہ رکھیل تھی...... اس لیے اس کا مذکورہ املاک سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔

نوشابہ کی انہی چیرہ دستیوں اور شرمناک دعوے اور باتوں کے سبب زہرہ بانو بہت پریشان تھی۔ اسے دل کا ایک دورہ بھی پڑ چکا تھا۔

گویا نوشابہ، زہرہ بانو پر ہی نہیں مجھ پر اور اول خیر پر بھی بُری طرح ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ میں نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ دیکھ لوں گا ان دونوں باپ بیٹی کو بھی......

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب ائرپورٹ پر ہمیں لینے کے لیے زہرہ بانو نہیں آئی تھی۔ اول خیر تو پیش پیش تھا اور اس کے ہمراہ چند آدمی تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی ”اوخیر...... کاکا!“ کہہ کر اس بُری طرح لپٹ گیا کہ ہم دونوں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچے۔ کبیل دادا نے مسکراتے ہوئے ہم دونوں کو لڑکھڑا کر گرنے سے ہاتھ آگے کرکے بچایا۔

”او کاکے......! تیری جدائی نے تو مار ہی ڈالا تھا۔“ وہ بدستور مجھ سے لپٹے لپٹے بولا۔ پھر وہ آہستگی سے الگ ہوا اور...... کبیل دادا کی طرف گھوما پھر ”وڈے استاد جی!“ کہتا ہوا اس سے بھی لپٹ گیا۔

عابدہ کو دیکھ کر بھی اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے اور بولا...... ”تو میری بھابی ہے، میری بہن ہے، بھائی کے سینے سے نہیں لگے گی؟“

ان جذباتی مناظر میں...... عابدہ کی آنکھیں بھی نمناک سی ہورہی تھیں۔ وہ ہولے سے ”بھائی“ کہہ کر اول خیر کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی جانب بڑھی اور اپنا سر اس کے پُرشفیق اور مہربان سینے پر رکھ کر سسک پڑی۔ اول خیر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

سب سے آخر میں وہ شکیلہ کی جانب مڑا۔ دونوں کی

لگتی چار ہوئیں اور اول خیر کو ایسے میں ایک چٹکلا سوجھ گیا۔

"یہ زندہ ہے ابھی تک......؟"

"تم جو زندہ ہو ابھی تک۔" شکیلہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔

"ارے...... رے...... یہ تو امریکا کی سیر کے بعد انگارے اپنے منہ میں بھر لائی ہے۔ خیر کی گھڑی ہے، خیر مانگ کڑوی کڑیئے......! چل اوراں آ......"

اول خیر اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور...... پھر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ شکیلہ پہلے تو اسے گھورتی رہی پھر ناچار اول خیر کے ہاتھ میں ہاتھ دے ہی دیا۔

ہم سب مسکرانے لگے، میں نے اول خیر سے زہرہ بانو کا پوچھا۔

"کاکے! جانے کیا بات ہے" مجھے حیرانی ہوئی اس بات پر کہ انہوں نے ائرپورٹ آنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ کسی دباؤ میں محسوس ہوتی تھیں۔

"وہ بہت حساس ہیں۔ میرے جانے کے بعد تو شاید اور بھی ان کا دل رقیق ہو چلا تھا۔ ان میں غم سہنے کی اور خوشی سہنے کی، اب کوئی سکت رہی ہے نہ ہی تاب...... خیر، چلو...... میں اس کی وجہ جانتا ہوں......" میں نے ہولے سے کہا۔

اور...... پھر پارکنگ ایریا کی طرف نکل آئے۔

وہاں ہمیں لانے کے لیے دو گاڑیاں تھیں۔ ہم سب ایک ہی کار میں بیٹھے تھے اور باقی لوگ دوسری جیپ... میں سوار ہو گئے۔

بیگم ولا پہنچے تو میں نے زہرہ بانو کو نشست گاہ میں ہی دیکھ لیا۔ وہ ہلکی پھلکی لون کی پھولدار شلوار قمیص اور اسی انداز کے دوپٹے میں ملبوس تھی، بال سلیقے سے تہ کیے جوڑے کی شکل میں تھے۔ اس کا بیضوی چہرہ...... ہمیشہ کی طرح ایک انوکھی سی بہار دکھاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ کافی کمزور نظر آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر نہ جانے کیا ہوا کہ شاید اُسے چکر سا آ گیا اور وہ دوبارہ اپنی نشست پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ میں یک دم "زہرہ" پکارتا ہوا اس کی جانب بڑھا تھا۔

دیگر ساتھی بھی زہرہ بانو کی اس کیفیت پر پریشان سے نظر آنے لگے۔ اول خیر نے ایک ملازمہ کو جلدی سے پانی لانے کا کہہ دیا۔

میں زہرہ بانو کے قریب بیٹھ گیا۔ ہولے سے اس کے کاندھے پہ اپنا ہاتھ دھر دیا اور بولا۔

"کیا ہوا تمہیں زہرہ......؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟"

اس عرصے میں عابدہ اور شکیلہ بھی ان کے قریب آ بیٹھی تھیں۔ اول خیر نے ببلی دادا کے آگے ایک نشست کھسکا دی تھی تاکہ وہ بھی ان کے قریب قریب رہے۔

زہرہ بانو نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور مضطرب الحال انداز کے تاثرات لیے وہ...... ہم سب کا باری باری چہرہ تکے جا رہی تھی پھر نحیف سی آواز میں بولی۔

"میرے پروردگار نے مجھے ایک دن اتنی بڑی خوشی بھی دینا تھی، مجھے اس کی پوری توقع تو تھی نہ تک میں ایک بڑا غم اپنے دل اور سینے پر سہہ چکی تھی، اسی سے مجھے امید تھی کہ میرا سوہنا رب ایک دن مجھے اتنی ہی بڑی خوشی بھی دے گا۔ لیکن شاید اب مجھ میں اتنی بڑی خوشی سہنے کا حوصلہ نہیں رہا، ہاں، شہزی!" وہ مرتعش سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے میری جانب دیکھ کر بولی۔

"اسی لیے تو مجھے میں ائرپورٹ آنے کی بھی ہمت نہ ہو پائی، دیکھو میں تو ادھر ہی تم لوگوں کو دیکھتے ہی گر پڑی......"

میرا اندر گھٹنے لگا، اس کا "بڑے غم" کا اظہار کرنے کا اشارہ میں سمجھ چکا تھا۔ وہ لئیق شاہ کی دائمی جدائی کا ذکر تھا اور اب مجھ سے ملنے کی اُسے خوشی تھی۔

آہ...... انسان کی شخصیت بھی بنانے والے نے کتنی پرتوں میں رکھ کر بنائی ہے، اس کی نفسیاتی الجھنیں، خوئے وفا و جفا، محبت نفرت، غم و خوشی، اظہارِ تمنا اور خواہشات، گم گشتہ یادوں کی آب یاری اور اس میں اگے غم و اندوہ کے پودے اور یادوں کے وہ پتے بھی جن سے خوشیاں بھی منسلک ہوتی ہیں، وہ سب اس میں سمو دیے گئے تھے۔ کب کس کی اثرپذیری میں اس کی شخصیت ڈھل کر کیا بن جاتی ہے، یہ بعد میں پتا چلتا ہے۔

عابدہ اور شکیلہ زہرہ بانو سے لپٹ گئی تھیں، یوں جیسے اسے سہارا اور سنبھالا دینا چاہتی ہوں۔ اس نے بھی ان دونوں کو اپنے دونوں بازو پھیلا کر خود میں بھر لیا تھا۔ ببلی دادا نے بھی زہرہ بانو کو ہولے سے سلام پیش کیا تھا۔

رفتہ رفتہ جب زہرہ بانو کی طبیعت سنبھلی...... اس کے اعصاب اور حواس اور دل کی دھڑکنیں...... جسم و جاں کا ارتعاش معمول پر آیا تو اس نے کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کر ڈالا۔

اظہارِ مسرت ہی درحقیقت زہرہ بانو سے نہیں ہو پا رہا

تھا، بالکل اسی طرح جیسے انتہائے غم میں کبھی کبھی انسان سکتے میں چلا جاتا ہے، یا اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ پاتے، یہی حال شاید بے پایاں مسرتوں کے سہنے کا بھی ہوتا ہے، جس کی اول الذکر مثال میں دے چکا۔

اس کے بعد میں اماں جانی اور بابا جانی کے کمرے میں گیا، بلکہ ہم سب ہی نشست گاہ سے اٹھ کر وہیں آگئے۔

میرے سایۂ شجر، میرے دونوں بوڑھے ماں باپ، جن کی دعاؤں کے طفیل میں آج تک کامیاب ہوتا رہا، میرا باپ جو وطن کا ایک گمنام سرفروش سپاہی رہ چکا تھا، اسی بہادر اور وطن پرست کا خون میری رگوں میں بھی تو دوڑ رہا تھا، میری بوڑھی ماں، جس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ میری خیر و سلامتی کے لیے اٹھتے رہے، میں کتنا خوش قسمت تھا کہ میرے ماں باپ زندہ تھے۔ ان کی نرم اور ٹھنڈی چھایا میرے سر پر قائم تھی۔

دونوں ایک بڑے سے کشادہ بیڈ پر لحاف اوڑھے تکیے سے پشت لگائے بیٹھے تھے، ان کی بوڑھی آنکھوں میں اپنے انتظار کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ میں دروازے پر ہی ایک ذرا رک کر ان کی جانب بڑی محبت سے دیکھتا رہا۔

''کون ہے؟ کیا شہزی پُتر آگیا ہے، زہرہ......؟'' یہ کپکپاتی اور لرزتی آواز میری ماں کی آواز تھی...... اسے شاید میں پوری طرح نظر تو نہیں آیا تھا مگر شاید اس نے ہمارے ہیولے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ لیے تھے۔

''ہاں، ماں جی! میں آگیا ہوں، تیرا شہزی پُتر......'' فرطِ جذبات سے یہ کہتے ہوئے میں بے اختیار اس کی جانب بڑھا۔

''ہیں، میرا شہزی پُترے......! تو آگیا ہے؟'' یہ میرے باپ کی لرزتی سی آواز تھی اور میں نے ان دونوں کے پاس جا کر جیسے اپنا آپ ان کی گود میں رکھ دیا۔

☆☆☆

ہم ستا بھی چکے تھے اور آرام بھی کر لیا تھا مگر ہماری باتیں ختم نہیں ہوئی تھیں، اسی لیے ہم سب نے نشست گاہ میں ہی ''بیٹھک'' جمالی تھی اور رات گئے تک باتیں کرتے اور چائے کافی پیتے رہے۔

پو پھٹی اور اونگھ آنے لگی تو اول خیر نے یہ بیٹھک انجام پذیر ہونے کا اعلان کر دیا، ساتھ ہی ایک چٹکلا بھی...... اپنے مخصوص لہجے میں چھوڑا۔

''او یاراں دیاں گلی خیرا چلو مہربانو! اور دوستو! یہ نشست اختتام کو پہنچی اور کل سے نئے اور اہم موضوعات کی پٹاری کھلے گی۔''

''اچھا!'' زہرہ بانو خفیف سا مسکرا کے بولی۔

''جی ہاں، بیگم صاحبہ! اس کی بوسیدہ سی پٹاری میں فضول موضوعات کی کوئی کمی نہیں......'' شکیلہ نے بھی حسبِ سابق جوابی وار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

''بائی دے وے، تم کس نئے موضوع کی طرف اشارہ کر رہے ہو؟'' عابدہ نے مسکراتے ہوئے سوالیہ سے نگاہوں سے اول خیر کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسے ہی...... بس ذرا...... میں نے سوچا کہ......'' وہ بوڑھی عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر اور کچھ سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ''مارا ماری اور شعلوں کی گھن گرج بہت ہو گئی اب تھوڑا...... باجے گاجے، سہرا لڑی، ڈھول تاشے...... کا بھی موسم منا لینا چاہیے۔''

اس کی بات کی معنی خیزی سمجھتے ہی، عابدہ بے چاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ ہم سب ہنس پڑے اور اسی طرح اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے دیکھا تھا کہ اول خیر کی اس بات پر کبیل دادا نے بھی کن انکھیوں سے زہرہ بانو کی طرف دیکھا تھا مگر وہاں ـــ ایسے کسی تاثر کی ایک ذرا رمق بھی نہیں اُبھری تھی جیسی عابدہ کے چہرے پر لالی بن کر چمکی تھی۔ یہ سب ایک لمحے میں، میں نے تاڑا تھا اور ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

سب رت جگے کے مارے تھکے ہوئے تھے اسی لیے مزید کوئی گفتگو نہ ہو سکی اور بستروں پر لیٹتے ہی سو گئے۔

دن چڑھے سو کر بیدار ہوئے تو...... اول خیر مجھے جگا رہا تھا۔

''اٹھ اوئے...... کاکے! بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔''

''کک...... کیا ہوا انہیں......؟'' میں یک دم ہڑبڑا کر اٹھا۔ میری رت جگے کی کسلمندی زہرہ بانو کی خرابیِ طبیعت کا سن کر کافور ہونے لگی۔

''عدالت کا پھر نوٹس ملا ہے بیگم صاحبہ کو، کل پیشی ہے۔'' اول خیر نے بتایا۔ ''اس ڈیڑھ چھٹانک کی کُڑی نوشابہ نے ساری خوشیوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا ہے۔''

وہ غصے سے بڑبڑاتا اور نوشابہ کو کوستا رہا، میں واش روم میں چلا گیا اور منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے اس کے ساتھ زہرہ بانو کے کمرے میں آگیا، جہاں ایک ملازمہ اس کی تیمارداری میں مصروف تھی۔ زہرہ بیڈ پر نیم دراز تھی،

ہماری آہٹ پا کر متوجہ ہوئی تو ملازمہ کو اس نے جانے کا اشارہ کر دیا۔ مجھے وہاں چھوڑنے کے بعد اول خیر بھی کمرے سے نکل گیا تھا۔

میں نے دیکھا، زہرہ بہت نیم جاں سی نظر آ رہی تھی، یوں جیسے اندر سے شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے مزید گہرے دکھائی دیے۔ چہرے کی زردی بھی نمایاں تھی۔

''کیا ہوا زہرہ بانو؟ خیریت تو ہے؟ تمہاری طبیعت...... میرا خیال ہے ڈاکٹر کو......'' میری بات اس نے کاٹ دی۔

''نہیں، یہ تو اب معمول بن چکا ہے، ٹھیک ہو جاؤں گی۔'' وہ بڑے سے تکیے پر ذرا سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ ''دوا دے رکھی ہے، ایسی حالت میں وہی لے لیتی ہوں۔ آؤ بیٹھو......'' اس نے قریب کرسی پر اشارہ کیا اور میں اس کی طرف دیکھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے زہرہ؟ تم تو بہت ہمت اور حوصلے والی تھیں۔ تمہاری شخصیت تو ایسی دبنگ ہوا کرتی تھی کہ اچھے بھلے بھی تم سے بات کرتے ہکلا جایا کرتے تھے، لیکن یہ کل کی چھوکری ایک نوشابہ کی گیدڑ بھبکیوں سے تم نے اپنی یہ حالت بنا ڈالی ہے؟'' میں نے ہولے سے کہا۔

زہرہ نے میری جانب دیکھا، پھر سر تکیے پر ٹکا کر چھت کو گھورتے ہوئے ایک گہری سانس بھر کے رہ گئی۔ میں نے پھر کریدا۔

''اول خیر فون پر مجھے نوشابہ کی اوچھی حرکتوں کے بارے میں بتاتا رہا تھا اور تمہاری پریشانی کے بارے میں بھی...... میں خود حیران تھا کہ......''

''شہزی......!'' زہرہ نے پھر میری بات کاٹ دی۔ میں خاموش ہو کے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ ''گولی انسان کے وجود کو زخمی کرتی ہے اور یہ زخم بھرتے رہتے ہیں۔ بولوں کا وار سیدھا روح کو گھائل کرتا ہے اور روح زخمی ہو جائے تو انسان کا پہاڑ سا حوصلہ بھی ڈھنے لگتا ہے۔ یہ زخم بھرتے نہیں۔ نوشابہ کل کی چھوکری ضرور ہے مگر میرے ازلی دشمنوں نے اس کے ہاتھ میں جو چھری تھمائی ہے، وہ دودھاری ہے، جس سے میرا جسم ہی نہیں روح بھی گھائل ہونے لگی ہے۔ ایک شریف زادی کے لیے جھوٹی تہمت کی اذیت بھی سینے میں ترازو ہونے والے خنجر سے کم نہیں ہوتی۔''

میں اس کی بات کا مطلب سمجھ کر بولا۔ ''نوشابہ نے تم

پر جو جھوٹی تہمت لگائی ہے، وہ اس کا خاندانی شیوہ رہا ہے۔ زہرہ بانو! جب انتقام کے مارے ہوئے کمین انسان کو کوئی راستہ نہیں ملتا تو وہ اپنی اوقات پر اتر آنے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔ تم نوشابہ پر بہترے شرمناک الزامات لگا دو، خواہ وہ حقیقی ہی ہوں مگر اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس لیے کہ وہ ہے ہی ایسی، اس کی اور اس کے باپ ممتاز خان کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ تمہارا معاملہ اور ہے۔ اسی لیے تم نے یہ بات دل پر لے لی ہے، لیکن یہی حوصلے کا کمال ہوتا ہے کہ اس طرح کے حالات کا بھی مقابلہ کیا جائے اور کوئی پروا کیے بغیر دشمنوں کے سینوں پر مونگ دلی جائے۔"

"میں اپنی خاندانی نجابت کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دے پا رہی ہوں، شہزی!" زہرہ بانو نے اس بار کھل کر کہا۔ اس کے لہجے کی پژمردگی میں کچھ کمی آئی تھی۔

"تم نے ٹھیک کہا، میں اُسے ویسا جواب دے سکتی ہوں جو حقیقت پر بھی مبنی ہے، اس کا تو مجھ پر الزام جھوٹا ہے۔"

"یہ بات بالکل ٹھیک کہی تم نے......" میں نے فوراً کہا۔ "بہرحال، میں آ گیا ہوں، اب تم فکر نہ کرو، میں نوشابہ کی دم پر پاؤں رکھنا، اور اسے لگام دینا جانتا ہوں۔ اسے اب اوقات یاد دلانی ہی پڑے گی۔"

"نہیں، شہزی! اب تم کوئی ہتھیار بازی نہیں کرو گے، عابدہ آ گئی، اللہ کا شکر ہے، اب بس! تم دونوں شادی کے پاکیزہ بندھن میں بندھ جاؤ...... اور ایک پُرسکون زندگی کی ابتدا کرو، میں اب تھک چکی ہوں اور خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں، تمہاری اور عابدہ کی...... اسی میں میری خوشی ہے اور میرے دل کی راحت بھی......"

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔ اس کی خاموشی کے پردے میں بہت سے کہے اَن کہے سوالوں کی چلمنیں اب بھی مجھے سرسراتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"اب کی بار عدالت سے کیا نوٹس آیا ہے؟"

"پیشی ہے۔"

"وکیل کون ہے؟"

"مراد بخش۔"

"مجھے اُس سے ایک میٹنگ کرنی ہے، ملاقات ہو جائے گی اُس سے؟"

"ہاں! اول خیر کو سب معلوم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اب تم مجھ سے ایک وعدہ کرو......"

"وعدہ؟ کیسا وعدہ؟" اس نے میری جانب دیکھا۔

"یہی کہ اپنے دل و دماغ سے ہر طرح کا فکر و ملال نکال کر پھینک دو۔ میں بہت جلد ان دونوں باپ بیٹی کی چٹنی بنا کے خیراتی اداروں میں لنگر کھانے والوں کو بانٹنے والا ہوں۔"

کہتے ہوئے میں اٹھا اور کرسی کو جھٹکا دے کر پیچھے کیا۔ زہرہ مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی بلکہ میری بات پر خفیف سا ہنس بھی پڑی۔ اسی لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے تم ایسا کر بھی ڈالو گے مگر شہزی! پلیز، اب بس، بہت ہو گیا۔ میں مزید کوئی خون خرابا نہیں چاہتی ہوں، نوشابہ جو مانگتی ہے، وہ میں اس کے منہ پر مار دوں گی، اب بس تم اور عابدہ پُرسکون زندگی......"

"تم آرام کرو۔ اور عابدہ اور شکیلہ کے ساتھ اپنا دل بہلاؤ...... چند دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا اور بیگم ولا میں شادیانے بجیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا، پھر دروازے کے قریب پہنچ کر رکا، پلٹا، زہرہ بانو ہنوز میری ہی طرف تکے جا رہی تھی۔

"ایک اہم بات اور......" میں نے کہا۔ "بیگم ولا میں صرف عابدہ دلہن نہیں بنے گی...... یہاں دو ڈولیاں اٹھیں گی۔" یہ کہتے ہوئے میں دروازہ پار کر گیا۔

میں نے سب سے پہلے عابدہ اور شکیلہ کو پابند کیا کہ وہ زہرہ بانو کو ایک لمحہ کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑیں۔ کبیل دادا کو میں نے مستقل بیگم ولا پر موجود رہنے کی ہدایت کر ڈالی۔ اول خیر کو اپنے ساتھ کیا۔

میری ہدایت پر اس نے وکیل مراد بخش کو بلا لیا۔ میری اس سے ایک نشست ہوئی، میں نے اس کی زبانی کیس کی تفصیل سنی، باتوں ہی کے دوران مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ وہ باتیں کرنا جانتا تھا جو دلائل سے عاری تھیں۔ میں نے اسے فارغ کر ڈالا۔

مجھے ایڈووکیٹ ہیرانی...... کا فون نمبر ازبر تھا، میں نے اس سے رابطہ کیا اور دعا سلام کے بعد اس سے ملنے بلکہ اسے بیگم ولا، پک اینڈ ڈراپ کی سہولت کے ساتھ آنے کی درخواست کر ڈالی۔

یہ سرمد بابا کا عائلی وکیل تھا اور بہت قابل اور ایمان دار بھی۔ بھلا مانس بھی تھا اسی لیے میری درخواست پر اس نے بیگم ولا آنے کی ہامی بھر لی۔

میں نے ملاقات کا وقت اور دن طے کیا اور پھر اول

خیر کو دو آدمیوں کے ساتھ اُسے لینے کے لیے کار میں اس دن روانہ کر دیا۔

ایڈووکیٹ ہیرانی .... سے ملاقات ہوئی تو زہرہ بانو کو بھی میں نے ان کے رُوبرو آنے کا کہا۔

یوں کیس پر نئے سرے سے کاغذی کارروائی کی تیاری کی گئی اور...... سب سے پہلے میں نے ہیرانی صاحب کو زہرہ بانو کی بار بار پیشی سے بچانے کے لیے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کا کہا۔

کیس سے متعلق ساری تفصیل سننے کے بعد ہیرانی صاحب نے اسی وقت مسکرا کر کہہ ڈالا۔ ''لگتا ہے پہلے والے موصوف وکیل اپنی فیس کے چکروں میں اتنے آسان کیس کو بلاوجہ طول دے رہے تھے۔''

''آپ نے صحیح کہا۔'' میں نے ایک تلخ مسکراہٹ سے اس کی بات کی تائید کی۔ ''ایک عام اور سمجھدار آدمی کو بھی اس کیس کی تفصیلات جان کر اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ کتنا آسان یا مشکل کیس ہے، بہرحال...... آپ سب سے پہلے نوشابہ پر ہتک عزت کا نوٹس بھی تیار کریں...... کیونکہ اس کے پاس زہرہ بانو پر لگائے گئے جھوٹے اور گھناؤنے الزام کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہمارے پاس سارے ثبوت موجود ہیں۔''

''میڈیکل سرٹیفکیٹ اور ہتک عزت کا نوٹس تو میں آج ہی تیار کرلوں گا لیکن بہتر ہوگا تھوڑا وقت لے لیا جائے تاکہ میں کچھ ہوم ورک کرسکوں۔'' ہیرانی صاحب بولے۔

''اسی لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ کا میں نے کہا تھا'' میں مسکرایا۔

اس کے بعد ہیرانی صاحب نے وکالت نامے پر زہرہ بانو کے دستخط لیے اور رخصت ہوگئے۔

زہرہ بانو کو اس نئی اور ابتدائی کارروائی نے کافی تسلی بخشی تھی۔ وہ ہنسنے مسکرانے لگی، ہم سب بھی اس کا دل بہلاتے رہے۔ میں نے تھوڑا وقت اماں جان اور باوا جانی کے ساتھ گزارا، اس کے بعد اول خیر کے ساتھ کار میں بیٹھ کر بیگم ولا سے نکل گیا۔

☆☆☆

''اوخیر...... کاکے! اب کدھر کے ارادے ہیں؟'' بیگم ولا سے نکل کر شاہراہ پر کار لاتے ہی اول خیر نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

کار وہی ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔

''کھلاں والی چلو......''

''اوخیر......! زبیر خان کے پاس......''

''ہاں!'' میں نے کہا۔

اول خیر نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

زبیر خان کی رہائش گاہ پر پہنچے تو مسلح گارڈز نے روک لیا۔ میں نے غور سے ان کے چہروں کو دیکھا۔ سب نئے چہرے تھے، پتا نہیں کیوں لوگ اتنی جلدی جلدی محافظ بدلتے ہیں، یہ دانش مندی کا تقاضا نہیں ہوتا۔ محافظ جتنا پرانا ہوا اتنا ہی قابلِ اعتماد ہوتا ہے، بہرحال اپنی اپنی سوچ تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا۔ زبیر خان اندر موجود تھا۔

اس وقت یہ سارے محافظ حیرت زدہ رہ گئے جب میرا نام اندر پہنچتے ہی...... زبیر خان جس حالت میں بھی تھا اسی طرح باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ ایک تنومند آدمی بھی تھا۔ اس کے بغلی ہولسٹر جھول رہا تھا۔

ایک طویل عرصے بعد آج زبیر خان کو دیکھا تو حیران رہ گیا، پہلے پہل تو میں اسے پہچان ہی نہ سکا تھا، کہاں وہ دبنگ جاگیردارانہ انداز اور ٹھسے دار قیمتی پوشاکیں، اکڑی ہوئی گردن اور چہرے پر روایتی رعونت اور سخت مزاجی...... مگر اب اس کے متضاد تھا۔

میرے سامنے تو ایک سادہ سے سفید مگر اُجلے کپڑوں والا کوئی باریش ''بابا'' ٹائپ آدمی کھڑا تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔ گردن بھی بس اسی قدر ہی اٹھی ہوئی تھی کہ کسی کو دیکھ اور بات کرسکے۔ پیروں میں بھی عام سی چپل تھی۔

مجھے دیکھتے ہی زبیر خان ''اوشہزی پُتر!'' کہتا ہوا لپٹ گیا۔ اس کے بعد گارڈز پر برہمی کا اظہار کیا۔

''رہن دو خان جی! ان بے چاروں کو کیا پتا کہ میں کون ہوں کیا ہوں۔'' میں نے اس سے کہا۔

''اوئے...... اس کو اچھی طرح پہچان لو......'' زبیر خان نے اپنے نئے نوکروں اور محافظوں سے تحکمانہ درشتی سے کہا۔ ''یہ میرا بیٹا ہے۔ سگوں سے بڑھ کر، یہ جب یہاں آئے یہی سمجھنا کہ میں آیا ہوں۔''

''جی بہت بہتر خان جی!'' سب نے میری طرف دیکھتے ہوئے فوراً اپنے سروں کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔

ہم سب اندر کشادہ اور آرام دہ نشست گاہ میں آکر بیٹھ گئے، کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، رات ہوگئی اور زبیر خان نے زبردستی ہمیں روک لیا۔

سب سے آخر میں، میں نے زبیر خان کو چوہدری

ممتاز اور اس کی خشم المزاج بیٹی نوشابہ کی چیرہ دستیوں سے آگاہ کیا کہ وہ کس طرح زہرہ بانو کو تنگ کر رہے تھے۔

"تو ایک طرف ہو جا اور اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر۔۔۔ ان دونوں سے میں خود ہی نمٹ لیتا ہوں۔۔۔۔۔ لگتا ہے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد ممتاز خان پھر اندر ہونے کی مرضی رکھتا ہے۔" زبیر خان نے غصے سے کہا۔

"نہیں خان جی! وہ اپنے زخم ہی چاٹ رہا ہے، اس میں دم خم ہوتا تو اپنی بچی کو آگے نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "ان سے تو میں خود ہی نمٹ لوں گا، بس ذرا آپ کو سلام کرنے اور خیر خیریت پوچھنے آ گیا تھا، کیسی چل رہی ہے آپ کی زمینداری؟"

زبیر خان نے ایک گہری ہنکاری بھری اور اس کے بوڑھے چہرے پر اداسی ابھر آئی۔ "بس، شہزی بیٹا! یہ اکیلا بڈھا اپنا دل اب اللہ سے لگائے ہوئے ہے۔ بہت کر لی زمینداری۔۔۔۔۔ اب کرتے رہیں دوسرے، میں نے تو اب اللہ ہی کی زمینداری کرنی ہے کہ دو گز زمین ایسی نصیب کر دے کہ آخری بستر میں آرام مل جائے۔ سو وہ کر رہا ہوں۔"

میں نے اس کی بات سنی اور سوچتا رہ گیا۔ جوان جہان بیٹے شفقت کی دائمی جدائی اور نیلی کی بے وفائی کا داغ اس کے سینے میں انگارے کی طرح سلگتا رہتا تھا، اچھا ہی ہوا کہ اس نے نصیب اور زندگی سے گلہ کرنے کے بجائے اپنے رب سے لو لگا لی۔ اب یقیناً اسے سکون مل گیا ہوگا، اسی لیے میں نے بھی اس کے سینے میں چھپے درد کو مزید چھیڑنا مناسب نہیں جانا اور اس سے رخصتی کی اجازت چاہی۔۔۔۔۔

"نہ۔۔۔ نہ۔۔۔ جائیں تیرے دشمن، شہزی بیٹا! تو کہاں چلا؟ ابھی ہفتہ دو ہفتہ اِدھر میرے ساتھ گزار۔۔۔۔۔ پنڈ کی کھلی اور تازہ ہوا میں جی لے۔۔۔۔۔ جان شان بنا، کتنا ماڑا (کمزور) ہو کر آیا ہے تو باہر کے ملک سے۔۔۔۔۔" وہ ٹھیٹ لہجے میں بولا۔۔۔ تو میں بے اختیار مسکرا دیا اور اسی لہجے میں بولا۔

"ضرور خان جی! میں آتا جاتا رہوں گا ابھی اور بھی ملاقاتیں باقی ہیں، پھر اپنے یاروں عزیزوں کے پاس بھی ابھی تک تفصیل سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔"

"ہاں! اب اس بڈھے کو تو ٹالے گا ہی نا۔۔۔۔۔ اکیلا جو ہوں میں۔۔۔۔۔" زبیر خان پھر دکھی سا ہونے لگا تو میں نے بے اختیار اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا اور بولا۔

"نہیں خان جی! ایسی بات نہیں ہے، دیکھیں آپ کی محبت میرے دل میں جوں کی توں تھی تو یہاں حاضری بھرنے چلا آیا۔۔۔۔۔، بس ذرا تھوڑے ضروری معاملات نمٹانے ہیں اور اپنی شادی کی بھی تیاری کرنی ہے، میں خود آپ کو لینے کے لیے آؤں گا۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ شاوا بھئی شاوا۔۔۔۔۔ شہزی پُتر! تو نے تو یہ بڑی خوش خبری سنا دی۔" وہ ایک دم خوش ہو کر بولا۔ "میں تو بڑے دھوم دھڑکے کے ساتھ تیرا اور عابدہ کا ویاہ کروں گا اور سارا بندوبست خود کروں گا، پر تو عابدہ بیٹی کو کیوں نہیں لایا؟"

"لاؤں گا اُسے بھی ضرور لاؤں گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"دیکھ، پُترے! تو ایسا کر۔۔۔۔۔ بیگم ولا میں تیرے جتنے بھی یار بیلی اور پیارے ہیں سب کو ایک دن اِدھر لے آ۔۔۔ بڑی کھلی ڈلی دعوت کا انتظام کروں گا میں، بڑا مزہ آئے گا۔"

"ضرور۔۔۔۔۔ ایسا ہی کریں گے، بس اجازت دیں کچھ اور کام بھی دیکھنے ہیں۔"

"کوئی گارڈ شارڈ نہیں تیرے ساتھ؟" اس نے آخر میں پوچھا تو میں نے اپنی انگلی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میرا اللہ سے بڑھ کر بھلا اور کون گارڈ ہو سکتا ہے۔"

"ہا۔۔۔۔۔ پُتر! یہ تو تو نے بالکل سولہ آنا ٹھیک بات کہی۔۔۔۔۔"

اس کے بعد ہم دونوں ایک بار پھر گرم جوشی کے ساتھ گلے ملے۔ زبیر خان نے وفورِ جذبات سے۔۔۔۔ میرے گال اور پیشانی پر شفقت بھرا بوسہ بھی دیا۔ اس کے بعد میں اور اول خیر وہاں سے کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

زندگی میں بظاہر ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ نوشابہ والے معاملے کو میں درخورِ اعتنا ہی سمجھتا تھا۔ وہ ایک قانونی جنگ تھی اور ایڈووکیٹ ہیرانی صاحب نے مجھے پوری تسلی دی تھی کہ کیس مضبوط ہے بلکہ الٹا یہ کیس میں انہی کے گلے ڈال دوں گا، نہ صرف یہ بلکہ جھوٹے مقدمے بازی کا بھی ان پر کیس بنا ڈالوں گا۔

جیسا کہ مذکور ہوا، ہیرانی صاحب ایک کہنہ مشق اور قابل وکیل تھے، ان کا میرے حق میں یہ سب کہنا اور اتنا بڑا دعویٰ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ خود مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ ان دونوں زخم کھائے ہوئے باپ بیٹی نے اندھیرے میں آخری تیر چھوڑا ہے اور اب وہی تیر اُن کی گردنوں میں پیوست کرنا چاہتا تھا میں۔۔۔۔۔

میں نے اور کسی سے ملاقات نہ کی، نہ ہی آرمی یا

رینجرز افسران سے ملا، بس! میرا مشن مکمل ہو چکا تھا۔ اب میں خود کو محدود رکھ کر آئندہ کی خوشیوں بھری زندگی عابدہ اور اپنے پیارے عزیزوں کے ساتھ بِتانا چاہتا تھا۔

بیگم ولا میں جیسے بہار آئی ہوئی تھی۔ ہمارے اور بالخصوص عابدہ کی آمد نے تو اس کا رنگ ہی نرالا کر دیا تھا۔ ایسے ماحول میں زہرہ بانو کا بھی دل خوب لگنے لگا تھا۔

پیشی کی تاریخ پڑتی رہی، ابھی شاید چوہدری ممتاز اور نوشابہ کو میری پاکستان آمد کا علم نہیں ہوا تھا۔

پھر جب ہم کچھ دنوں بعد پیشی پر گئے تو میں خاص طور پر زہرہ بانو کے ساتھ ساتھ تھا۔ اول خیر کے علاوہ ایک باڈی گارڈ بھی ہمراہ تھا۔

کمرائے عدالت سے باہر ہی نوشابہ مجھے نظر آ گئی، ہم دونوں کی آنکھیں کیا چار ہوئیں کہ جیسے بجلی کڑک گئی اُس کے چہرے پر......

کمسن ایجر نظر آنے والی وہ نوشابہ اب ایک بھرپور جوان عورت کے روپ میں نظر آ رہی تھی، اس کی معصومیت اور نسوانی پن کی جگہ ایک سختی نے اس کی جوانی کا حسن بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھے دکھ ہوا کہ اس نوجوان لڑکی نے جس کی عمر اپنے خوابوں کے شہزادے کو تلاش کرنے کی ہے وہ ...... کن راہوں پر چل پڑی تھی۔ حسد، نفرت اور بغض و انتقام کی روش نے اسے کیا بنا ڈالا تھا۔ بے شک کسی دانا نے درست ہی کہا ہے کہ اچھی بُری سوچیں شخصیت کا عکس ہوتی ہیں۔ دشمنی کی نفرت اور جلاپے نے اس کے چہرے کا وہ بھولپن ختم کر ڈالا تھا جو اس عمر کا خاصہ ہوتا ہے۔

اس کے ہمراہ تین افراد بھی کھڑے تھے، ایک تو سوٹ بوٹ سے وکیل ہی نظر آتا تھا جبکہ باقی دونوں اس کے چیلے معلوم ہوتے تھے، جن میں ایک خاصا لمبا تڑنگا اور صورت سے ہی بدمعاش نظر آتا تھا، اس کا رنگ سانولا تھا اور...... سر سے گنجا تھا، چونکہ کورٹ کی حدود میں اسلحہ لانا سخت ممنوع تھا ورنہ ان کے کاندھوں پر یا بغل میں اس کی جھلک ضرور دِکھتی۔

''پوری پکی عورت ہی بن گئی ہے۔ عنفوانِ شباب والی بات ہی نہیں رہی سسری کے چہرے پر......'' اول خیر نے ہولے سے تبصرہ کیا۔

''یہ جو اس کے ساتھ غنڈا نما گنجا حواری تھا، کیا نام ہے اس کا......؟'' میں نے اول خیر سے پوچھا۔

''یہ چول جا...... خود کو گوگا پہلوان سمجھتا ہے، نام اس کا توفیق عرف طیفا پہلوان ہے، کسی زمانے میں تو اس چوک میں اس کی بدمعاشی کی دھاک تھی، پھر کوئی چنگا مرد اس سے ٹکرا گیا تو اسے جیل ہو گئی۔ مہردوں کی دکان کا مالک تھا وہ...... امجد کسی بدمعاش کے دباؤ میں نہیں آتا تھا، جیل سے رہائی کے بعد امجد کا قتل ہو گیا اور ہوا بھی اس کے دو دن بعد جب یہ بدمعاش توفیق عرف طیفا جیل سے اپنی سزا بھگتا کر نکلا تھا۔

دکان دار امجد کے قتل میں وہ پھر اندر ہو گیا مگر شبے کا فائدہ دے کر اسے رہا کر دیا گیا، شنید ہے کہ اسے رہائی دلانے میں...... چوہدری ممتاز اور نوشابہ کا ہی ہاتھ تھا۔''

اول خیر، طیفے بدمعاش کا سارا کچا چٹھا مع اس کا حدودِ اربع بتانے کے بعد خاموش ہو گیا۔

''تم لوگوں سے تو اس طفیلے نے کوئی بدمعاشی نہیں کی تھی؟'' میں نے دانستہ طیفے کو ''طفیلہ'' (بچہ) کہا تھا۔ دراصل یہ سب سننے کے بعد میرے اندر کوئی انگڑائی لے کر دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا تھا۔

''او خیر...... ! نہیں کاکے! میرے ہوتے ہوئے یہ ایسی جرأت دکھاتا۔'' اول خیر بولا۔ ''ایک دو بار ایسی نوبت آئی تو تھی اور میں اسے سبق بھی سکھانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ بیگم صاحبہ نے مجھے روک دیا تھا، پر کاکے! سچی بات ہے کہ اس کو دیکھتے ہی میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگتی ہے۔''

''ہم......'' میں نے کچھ سوچنے کے انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

بہرکیف...... نوشابہ مجھے دیکھتے ہی اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھی۔ وہ جیسے آنکھیں جھپکنا ہی بھول گئی، اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا اور آنکھوں میں نفرت کی چنگاریوں کی تپش اگلتی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اسے مزید چڑانے کے لیے مسکرا کر اپنا ایک ہاتھ تھوڑا بلند کیا اور صرف اپنی انگلیاں ہلا دیں۔

پھر تو جیسے اُس کے اندر کا طیش جوالامکھی بن کے پھٹ پڑا۔ وہ غیظ بھرے انداز میں زمین پر قدم مارتی ہوئی میری طرف بڑھی۔ وہ سیاہ رُو گنجا بدمعاش نما حواری بھی اس کے ہمراہ ساتھ تھا۔

''او خیر...... سنبھالیں اِنوں...... کاکے!'' اول خیر نے گھبرا کے ہولے سے کہا اور میں اسی طرح مسکراتا کھڑا رہا۔ وہ تنتناتی ہوئی میرے قریب آ گئی، اس قدر کہ اس کی چڑھی ہوئی سانسوں کی بازگشت تک صاف سنائی دینے لگی۔ اس کا گنجا حواری بھی مجھے گھورنے لگا، میں نے اس

پر ایک استہزائیہ سی نظر ڈالی اور نظر انداز کر دیا۔

"تو تم نازل ہو ہی گئے ہو...... اب زہرہ بانو کے ساتھ اپنی بھی خیر منانا اور ...... دونوں جیل جانے کی تیاری ابھی سے پکڑ لو......" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ "اور ہاں......! بیگم ولا کی ملکیت پر بھی میں آج دعویٰ کرنے والی ہوں، میرا خیال ہے، تم دونوں نے پیکنگ تو شروع کر دی ہو گی؟"

"ہاں! آپ کی بات درست ہے، لیکن ایک ترمیم کر لیں، باقی تو ٹھیک ہے، لیکن میرا اور زہرہ بانو کا نام آپ کے منہ سے غلطی سے نکل گیا ہوگا، پیکنگ یقیناً آپ اور چوہدری ممتاز کر رہے ہوں گے، دوسرے گھر جانے کے لیے نہیں بلکہ سرکاری مہمان خانے کے لیے...... میں نے ٹھیک کہا نا......؟" یوں میں نے بھی جوابی وار کیا تو اس کے ساتھ کھڑا گنجا گماشتہ مجھے گھور کر غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

"اپنی زبان پر قابو رکھو ورنہ......"

"اسے پٹا ڈال کر رکھو، ایسی چیزیں یہاں کورٹ میں نہیں لاتے ہیں، مس نوشابہ۔" میں نے گنجے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نوشابہ سے کہا تو اس نے بھنا کر حرکت میں آنے کی کوشش چاہی تھی کہ میں نے جیسے اس کی پروا کیے بغیر اپنا جملہ مکمل کر دیا۔

"اور یہ کہ اب آپ نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو میری جیب میں اٹکا ہوا قلم آپ کی ساری ویڈیو بنا رہا ہے۔ ہمارا وکیل وہ عدالت میں پیش کر دے گا، کیونکہ قانونی رو سے آپ کا اس انداز میں مجھ سے مخاطب ہونا خلافِ قانون اور نقصِ امن کا موجب بن سکتا ہے۔"

اس کی ساری ہوا نکل گئی۔ وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ اس کا چہرہ نفرت سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ گنجا حواری بھی طیش میں نظر آنے لگا، اس کے لیے شاید اپنے سامنے اپنی "چھوٹی مالکن" کی یوں بے عزتی برداشت کرنا دوبھر ہو رہا تھا لیکن میرے ایک ہی جوابی حملے نے دونوں کی بولتی بند کر دی۔

نتیجتاً وہ دونوں مجھے خوں ناک نظروں سے گھورتے ہوئے پلٹ گئے۔

"اوخیر...... کاکے! ان کو ایک لمحے میں ہی تو نے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔" اول خیر بولا۔

عدالتی کارروائی شروع ہوئی اور ایڈووکیٹ ہیرانی صاحب نے پہلی ہی پیشی میں زہرہ بانو کا ایسا مضبوط دفاع کیا کہ اب اگلی دو ایک پیشیوں میں یہ وبال الٹا نوشابہ ہی کے گلے پڑنے والا تھا۔

یہی نہیں میرے ایما پر ہیرانی صاحب نے نوشابہ کے خلاف زہرہ بانو کی طرف سے ہتکِ عزت کا نوٹس بھی دے دیا تھا۔ ساتھ ہی میں نے فرخ مرڈر کیس میں اپنی اور اول خیر کے لیے دفاعی کیس کی درخواست بھی دے ڈالی۔

اس کیس کے ری اوپن ہونے سے خود چوہدری ممتاز خان پر بھی ضرب پڑتی تھی اور اس کے ملک دشمن عناصر سے خفیہ گٹھ جوڑ، حتیٰ کہ بلیو ٹیکسی (را) سے بھی اس کے رابطے منظرِ عام پر آنے کے قوی امکانات تھے، یوں اس پر ملک سے غداری کا بھی کیس چل سکتا تھا، کیونکہ بھارتی جاسوس سندر داس سکسینہ، پاکستان کی حراست میں تھا۔

اس کیس نے ان دونوں باپ بیٹی کی نیندیں حرام کر دیں...... ابھی اس کیس کی ابتدا تو نہیں ہوئی تھی، جب تک کہ نوشابہ اول خیر اور مجھ پر فرخ مرڈر کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں دکھاتی۔

یوں میری طرح ایڈووکیٹ ہیرانی صاحب کا خیال تھا کہ چوہدری ممتاز اور نوشابہ اس کیس کو اب چھونے کی بھی جرأت نہیں کریں گے، ممکن تھا وہ اپنا کیس جائداد و املاک تک ہی محدود رکھیں......

زہرہ بانو کو بھی اس پیشی کے بعد کافی حوصلہ ملا تھا۔ اس کے دل و دماغ کو تسلی ہوئی تھی جس کا اس روز اس نے کھل کر مجھ سے اظہار کیا۔

"کیسی عجیب بات ہے شہزی! کہ تمہارے کامیاب لوٹ آنے کی مجھے جس قدر خوشی ہوئی ہے، اسی قدر میں نجانے کیوں ایک نامعلوم سی تشویش اور پریشانی کا بھی شکار تھی، لیکن تم نے آتے ہی میرے ذاتی معاملات اس خوش اسلوبی اور کامیابی سے ہینڈل کیے کہ اب لگتا ایسا ہے کہ میں ذاتی معاملات میں بھی تم پر ہی مکمل طور پر انحصار کرنے لگی ہوں۔"

اس وقت ہم دونوں اکیلے ہی... ایک دوسرے کمرے میں موجود تھے، مجھے درحقیقت زہرہ بانو سے ایک اور اہم موضوع پر بھی بات کرنا تھی۔ میں اس کی بات پر خفیف سی مسکراہٹ سے بولا۔

"زہرہ! یہ تو میرے لیے خوشی کی بات اور باعثِ طمانیت ہے، ہم زندگی کے بعض ایسے موڑ پر کسی نہ کسی پر انحصار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب یہ رشتہ ایک سچی اور بے غرض دوستی کا ہو تو خوشیاں اور دکھ بھی سانجھے ہو جاتے ہیں۔ تم اب آئندہ کی بھی بالکل فکر نہ کرو، ہیرانی صاحب کا

کمال تم نے دیکھ ہی لیا، اب بس، دو ایک پیشیوں کی مار ہے اور پھر دونوں باپ بیٹی ٹھنڈے پڑ جائیں گے۔"

"ہاں۔" زہرہ نے ایک ہنکارا بھرا۔ وہ ایک آرام کرسی پر براجمان تھی، اس نے گلابی جوڑا پہن رکھا تھا اور بالوں کو سلیقے سے گوندھ کر جوڑے کی شکل دے رکھی تھی، ایسے میں اس کا بیضوی حسین چہرہ کھلتے گلاب کی طرح دکھائی دے رہا تھا، پھر دلی طمانیت اور خوشی نے اسے اور ہی رنگ بخش دیا تھا۔

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ اپنے سہرے کی تیاریاں کب کر رہے ہو؟" اس نے جیسے اچانک ایک خفیف سے تبسم تلے موضوع بدلا، لیکن پھر جانے اسے ماضی کا کون سا وہ لہو رنگ اور گم گشتہ باب یاد آ گیا کہ اس کے نرم لبوں کی مسکان اداسی میں بدل گئی۔

"ایک عرصہ ہو گیا اس مکان کی در و دیواروں میں مہندی کے رنگوں کی خوشبو پھیلے ہوئے بلکہ وہ مہندی بھی لہو میں رنگ دی گئی تھی جب میرے اور لئیق شاہ کی شادی کے یہاں شادیانے بجے تھے۔ اب دوسری بار تمہاری اور عابدہ کے ملن کے شادیانے گونجیں گے۔"

"ضرور......!" میں نے بھی اس کے اندر کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے کہا اور مقصد کی بات چھیڑی۔ "زہرہ! زندگی دکھ سکھ کا مجموعہ ہے، یہ حقیقت ہے کہ بعض دکھ بھلائے نہیں بھولتے لیکن انسان اگر چاہے تو دکھوں کی اس پوٹ میں بھی خوشیاں تلاش سکتا ہے، اپنے لیے نہ سہی دوسروں کے لیے ہی سہی، کیونکہ وہ دوسرے آپ سے بہت محبت کرتے ہیں، وہ آپ کو غم زدہ نہیں دیکھ سکتے زہرہ! اور پھر یہ زندگی ہے، جو رکتی نہیں، آگے ہی بڑھتی ہے۔ میں چاہتا ہوں بیگم ولا میں ایک نہیں دو سہرے بجیں، ایک میرا اور دوسرا کبیل دادا......کا۔" میں اتنا کہہ کر رکا اور زہرہ بانو کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

"تم پہلے بھی اس موضوع پر مجھ سے بات کر چکے ہو شہزی!" زہرہ نے ہولے سے کہہ کر مجھے یاد دلایا۔

"اور آپ نے بھی مجھ سے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔" میں نے بھی اسے یاد دلا دیا۔

"میں نہیں کر پائی تھی غور......"

"کیوں؟ ہماری خاطر بھی نہیں؟ اور...... اور یہ تو دیکھو، کبیل دادا تمہارا پرانا ساتھی ہے، میرا تو بعد میں بنا، پہلے تو وہ تمہارا اور لئیق شاہ کا ہی ساتھی تھا، ایک جاں نثار ساتھی، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم بھی جانتی ہو کہ وہ ایک سچا اور کھرا آدمی ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ تم لئیق شاہ سے محبت کرتی تھیں اور یہ بھی کہ آج تک تم لئیق شاہ کی محبت اپنے دل و دماغ سے نہیں نکال سکی ہو، اس کا ظرف تو دیکھو بلکہ اطاعت اور وفاداری ہی محسوس کر لو اس کی کہ اسے اس کی بھی کوئی پروا نہیں...... پلیز، زہرہ، دکھ میں اس قدر پتھر نہیں بنتے، یہ میری ہی نہیں، ہم سب کی خواہش ہے۔ بیگم ولا میں اب خوشیوں کے نغمے گونجنے چاہئیں۔"

میں اس کی منتیں سماجتیں کرتا رہا اور ہر طرح سے سمجھاتا رہا۔ آخر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک وہ کبیل دادا سے شادی کے لیے ہاں نہیں کہے گی، میں اور عابدہ بھی شادی کے بندھن میں نہیں بندھیں گے۔

اس کی کوشش عابدہ نے بھی کر ڈالی تھی۔ وہ بھی اسے اپنے تئیں سمجھانے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میں یہاں آنے سے پہلے عابدہ کو بتا چکا تھا کہ میں زہرہ بانو کے کمرے میں اس سے کس اہم موضوع پر گفتگو کرنے جا رہا ہوں۔

میری اس آخری بات پر زہرہ بانو نے میری طرف قدرے چونک کر دیکھا تھا۔ میں اس کے پاس سے اٹھ کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا اور جاتے جاتے سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے کل تک جواب چاہیے، اور اگر آپ کا جواب انکار میں ہوا تو پھر اس موضوع کو دفن ہو جانا چاہیے، اگر آپ کی خوشیوں کے شادیانے یہاں نہیں بجیں گے تو پھر کسی کے بھی نہیں گونجیں گے۔"

یہ کہہ کر میں چلا آیا۔

اول خیر وغیرہ میرے بے چینی سے منتظر تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا تھا۔ میں نے انہیں بتا دیا کہ کل اس کے بارے میں کوئی فیصلہ ہوگا۔ اول خیر اور عابدہ نے مجھے مشورہ دیا کہ اماں جان کو بھی اس "مسئلے" میں شامل کیا جانا چاہیے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج "بیگم ولا" کے لیے صحیح معنوں میں خوشیوں کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔ یہ خوش خبری اماں جان نے ہی سب سے پہلے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر سنائی تھی۔ میں خوش تھا اور اسی عالم میں جب زہرہ بانو کے کمرے میں گیا تو چونک پڑا۔ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی دونوں ہاتھ چہرے پر دیے ہولے ہولے سسک رہی تھی۔ میں متفکر اور بے چین سا اس کی جانب بڑھا۔

اس نے میرے قدموں کی آہٹ پر سر اٹھایا اور شکوہ

کناہ لہجے میں بولی۔ ”بہت ضدی ہو تم شہزی! اپنی بات منوا کر ہی چھوڑتے ہو، اتنا بھی نہیں سوچتے کہ...... میرے لیے یہ فیصلے کی گھڑی کتنی کٹھن اور کڑی ہو سکتی ہے۔“

”ہرگز نہیں، یہ میری ضد نہیں تھی...... زہرہ! ضد تو فضول بات کی کی جاتی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ میرے دل کو تسلی ہوئی تھی کہ معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ورنہ تو میں اس خوشی کے موقع پر اسے روتا دیکھ کر پریشان ہی ہو گیا تھا۔

”تم دیکھنا فیصلے کی یہ گھڑی تمہارے لیے کس قدر خوشیوں بھری ثابت ہوگی۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارے اس فیصلے سے بھائی لئیق شاہ کی روح کو بھی تو کتنا سکون ملا ہوگا، تم اسی طرح تنہائیوں کے عذاب میں پہاڑ سی عمر بتا دیتیں تو کیا اس کی روح خوش ہوتی؟ خود سوچو اور ذرا غور کرو اس بات پر...... شادی نیک اور پاکیزہ فعل کے زمرے میں آتی ہے اور اس کا اللہ اور اس کے پیارے حبیب ﷺ نے حکم بھی دیا ہے۔“

میری بات پر اس نے اشکوں بھرا گلنار سا چہرہ اٹھایا اور...... جب دردانگیز لہجے میں بولی تو مجھے اس کی تہ میں ایک نامعلوم سی سراسیمگی کا بھی احساس ہوا۔

”شہزی! پتا نہیں کیوں مجھے اب مہندی کے رنگوں سے بھری خوشیوں سے ایک خوف سا آنے لگا ہے، وہ بھی تو ایک ایسا ہی خوشیوں بھرا دن تھا جب میں اور لئیق شاہ شادی کے بندھن میں بندھے تھے کہ بزدل دشمنوں نے بڑی سفاکی سے ہماری خوشیوں کو لہو رنگ کر ڈالا تھا، مجھے پتا نہیں کیوں ان خوشیوں سے خوف سا آنے لگا ہے۔ میں نہیں چاہتی شہزی......! میں...... میں نہیں چاہتی کہ ایسا دوسری بار ہو......“ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں نرم و گداز ہاتھوں کے پیالے میں میرا چہرہ بھر لیا۔ اس کے ہاتھوں کے پیالے میں لرزش تھی۔ میں نے اسے تھام لیا اور مسکرا کر بولا۔

”تمہارا یہ خوف بے معنی اور بچوں جیسا ہے۔ دشمنوں میں اب وہ جرأت اور ہمت نہیں رہی ہے کہ دوبارہ ایسا لہو رنگ کھیل کھیل سکیں۔“

”لل...... لیکن شہزی! مجھے اپنی نہیں، تمہاری اور عابدہ کی فکر ستا رہی ہے۔ بزدل دشمن بہت مکار بھی ہے اور سنگ دل بھی...... لئیق شاہ کے بھی وہ دشمن تھے، کیونکہ وہ خم ٹھونک کر بہادری کے ساتھ ان کے سامنے آیا تھا اور اب تم بھی تو......“

”چھوڑو اِن باتوں کو......“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں نے کہا نا کہ بھائی لئیق شاہ کے وہ سارے بزدل دشمن جہنم واصل ہو چکے۔ اب لے دے کر یہ چوہدری ممتاز بچا ہے یا اس کی بیٹی نوشابہ...... یہ کیا بگاڑ سکتے ہیں بھلا ہمارا؟ اب آپ بہانے نہ کریں اور ہاں کر دیں، بس!“ میں نے آخر میں بات کو تفنن ...کا رنگ دیا۔

میں نے دیکھا وہ بے اختیار ہولے سے مسکرا دی اور زیرِ لب بولی۔ ”ایک نمبر کے چالاک اور چرب زبان ہو تم......“

میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھتے ہی کھل اٹھا اور اسی لہجے میں بولا۔ ”شکر ہے خدا کا...... میں ـــ نہ کہتا تھا کہ اس فیصلے کے بعد تمہارے پژمردہ چہرے پر ایک دم خوشیاں لوٹ آئیں گی۔ میں ابھی یہ خوش خبری سب کو سناتا ہوں۔“

میں خوشی کے بے پایاں احساس تلے پلٹا اور وہ مجھے روکتی رہ گئی۔ پھر جب یہ خوش خبری بیگم ولا کے در و دیواروں میں گونجی کہ زہرہ بانو نے کبیل دادا سے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے...... تو جیسے بجھے بجھے چراغوں میں روشنی پڑ گئی۔

عابدہ اور شکیلہ نے...... پہلے ہی سے ایک گوٹا کناری والے کاسنی رنگ کے دوپٹے کا بندوبست کر رکھا تھا، اس خبر پر وہ دونوں دوپٹا نکالے، خوشی سے لہراتی بل کھاتی ہوئی زہرہ بانو کے کمرے کی جانب دوڑیں، ان کی زبان پر بڑے پیارے گیت کے بول تھے۔

ادھر اول خیر نے تو اپنے ”وڈے استاد جی“ کی شادی کی خوش خبری سنتے ہی دونوکروں کو فٹافٹ مٹھائی لانے کے لیے شہر دوڑا دیا تھا جبکہ میں نے یہ خبر کبیل دادا کو ہی سنائی تھی، اس نے فرطِ جذبات سے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

غرضیکہ... بیگم ولا میں خوشیوں کی بہاروں نے ڈیرے ڈال لیے اور گیتوں اور ڈھولک کے ساز ابھی سے ہی گونجنا شروع ہو گئے۔

اول خیر اور میں نے کبیل دادا کو گلے لگا کر ڈھیروں مبارکبادے ڈالیں۔ کبیل دادا میرا بہت احسان مند اور شکر گزار تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہی ممکن ہوا۔

”نہیں وڈے استاد جی! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، یہ تیرے دل میں موجود بیگم صاحبہ کے لیے سچی محبت کا کمال ہے۔“ میں نے آج پہلی بار کبیل دادا کو ”وڈے استاجی“ کہا تھا۔ اس پر وہ ہنس کر بولا۔

”وڈے استاد جی تو تم ہی ہو شہزی! تمہارا بڑا پن تمہیں بڑا استاد بناتا ہے۔“

بیگم ولا میں ہنگامی بنیادوں پر چھوٹا موٹا کنسٹرکشن کا کام کروایا جانے لگا، رنگ و روغن بھی نیا کیا جا رہا تھا۔ یہ کام اول خیر بڑے ذوق و شوق سے انجام دے دے رہا تھا۔

دشمنوں تک شاید بیگم ولا کی خوشیوں کی گونج جا پہنچی تھی کہ اسی روز نوشابہ کا مجھے فون آیا۔

یہ لینڈ نمبر پر تھا اور ایک ملازم نے مجھے کارڈلیس لا کر تھماتے ہوئے بتایا تھا۔

''ہیلو، شہزاد احمد خان عرف شہزی اسپیکنگ......''

میں نے نوشابہ کے فون کا سنتے ہی دانستہ ایسا کہا تھا۔

''تمہیں خوشیاں منانے کے بجائے پیکنگ پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی شہزی!'' دوسری جانب سے نوشابہ کی نفرت بھری پُرطیش آواز ابھری، میں نے بھی اسے مزید جلانے کے لیے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''ایسے بڑے بول تمہارے باپ ممتاز خان نے بھی بولے تھے، اس کا کیا انجام ہوا وہ سب کے سامنے ہے، اب وہ چوہے کی طرح کہاں جا دبکا ہے جو اپنی کل کی چھوکری کو ہمارے ٹکروں لا رہا ہے۔'' میں نے دانستہ آخری جملہ ٹھیٹ پنجابی کا استعمال کیا تھا جس پر نوشابہ جتھے سے ہی اکھڑ گئی۔ زخم کھائی بلی کی طرح غراتے ہوئے بولی۔

''تمیز سے نام لو میرے پاپا کا شہزی! زیادہ خوش فہمی کہیں تمہیں کسی بڑے نقصان سے نہ دو چار کر ڈالے۔''

''ہم تو خوش فہمی نہیں خوشیاں منا رہے ہیں...... اسی لیے میرے پاس اب فالتو بکواس کا بالکل وقت نہیں، مطلب کی بات کرو ورنہ میں فون بند کر رہا ہوں۔''

''یہی کہنا تھا میں نے کہ اب بھی وقت ہے، وہ سب کچھ میرے نام کر ڈالو جو زہرہ بانو......''

میں نے لائن منقطع کر ڈالی اور غصے سے دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے کچھ زیادہ ہی تسلی ہو رہی تھی۔

میں نے اس کے فون کا کسی سے بھی تذکرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

گھر کی در و دیوار کی تیاریوں کے ساتھ ہم نے شادی کی شاپنگ وغیرہ بھی شروع کر دی تھی اور تقریباً ہر روز ہی سب مل جل کر دو گاڑیوں میں سرِ شام نکل جاتے اور رات گئے ہلا گلا کرتے واپس لوٹتے۔

اس دوران میں اگلی پیشی میں ہمارے حق میں فیصلہ صادر ہوا اور دونوں باپ بیٹی اپنا منہ دیکھتے رہ گئے۔ نوشابہ کی حالت تو زخمی ناگن جیسی ہو رہی تھی۔ چوہدری ممتاز خان بھی بھرا ہوا تھا۔

ہتکِ عزت کے کیس میں وہ دونوں باپ بیٹی الگ پھنس گئے تھے اور اب پیشیاں بھگتے پھر رہے تھے۔ اس سلسلے میں ایڈووکیٹ ہیرانی صاحب سے میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ ہاتھ ''ہولا'' رکھیں اور اگر وہ دونوں باپ بیٹی معافی تلافی پر مجبور ہو جاتے ہیں تو معاملہ ادھر ہی ختم کر دیں۔

اُن کے غبارے سے ہوا نکل گئی تھی اور میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ...... اب ایسا کوئی قدم اٹھانے کی دوبارہ جرأت کر سکتے تھے۔ نوشابہ کو نہیں تو اس کے باپ ممتاز خان کو تو ضرور ہی اب تک ہمارے ''پانی'' کا اندازہ ہو ہی چکا ہوگا۔

اس روز جب ہم شاپنگ کر کے رات گئے گھر لوٹے تو بہت تھکے ہوئے تھے اسی لیے حسبِ سابق گفتگو کی محفل وغیرہ جمانے کے بجائے اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو گئے۔

یہ کوئی نصف رات کا وقت تھا کہ اچانک کسی کی چیخ پر میری آنکھ کھلی۔ میں اور اول خیر ایک ہی کمرے میں سوتے تھے، یک دم سب الرٹ ہو گئے اور بتیاں جلا دیں۔

پتا چلا کہ یہ چیخ زہرہ بانو کے کمرے سے ابھری تھی، ہم سب اسی جانب کو دوڑے تو اسے بیڈ پر بیٹھے روتے ہوئے پایا۔

''کک......کیا ہوا زہرہ......؟ خیریت ہے......؟ کیا کوئی خواب دیکھا ہے تم نے......؟'' میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا اور صورتِ حالات کا اندازہ ہوتے ہی میں نے دانستہ باقی سب کو کمرے سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

ان کے جاتے ہی زہرہ کچھ بتانے کے قابل ہوئی اور سسکتے ہوئے بولی۔

''ہاں، شہزی! میں نے .... بہت بھیانک خواب دیکھا ہے، اب میں سمجھی ہوں کہ میرا دل، اتنی خوشیاں ملنے کے بعد بھی کیوں بے چین اور مضطرب رہنے لگا تھا۔''

''کیسا خواب؟ مجھے بتاؤ؟'' میں نے اس کے سراسیمہ سے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، حقیقت یہی تھی کہ میں جب سے آیا تھا، زہرہ بانو کو ایک نامعلوم سے اضطراب اور سراسیمگی میں جکڑے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس نے بتانے سے پہلے میرے چہرے کی طرف دیکھا پھر بولی۔

''ماضی کا وہ بھیانک دن، وہ لہو رنگ لمحات...... جب میں اسی طرح لئیق شاہ کی دلہن بنی تھی اور پھر دشمنوں نے بڑی سفاکی سے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔''

"ایسے خواب کا آنا تمہارے لاشعور میں چھپے اس بھیانک واقعے کی ہی کارستانی ہے اور کچھ نہیں......" میں نے کہا۔

"نہیں شہزی! ایسے خواب یونہی نہیں آتے...... کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے۔ اس بار...... اس بار...... میں نے دیکھا...... خدا نہ کرے کہ ایسا ہوم...... مگر میں نے تت...... تمہیں اور عابدہ کو خون میں لت پت دیکھا ہے۔" وہ یہ بتا کر ایک دم سسک پڑی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور اسے تسلیاں دینے لگا اور آخر میں بڑے یقین اور مضبوطی سے بولا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا زہرہ! تمہارے اس بھیانک خواب کی کوئی تعبیر نہیں ہوگی، یہ محض خواب ہی رہے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" وہ ایک دم بولی۔

"ایسا ہی ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے پورے یقین سے کہا اداس کا نرم و نازک ہاتھ ہولے سے دبایا تھا۔

میں نے زہرہ بانو کے اس خواب کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔

اس روز عابدہ نے ایک عجیب فرمائش کر ڈالی لیکن یہ فرمائش جتنی عجیب تھی، اتنی ہی تاثر انگیز بھی، خود میرا بھی جی چاہتا تھا کہ اس جگہ کو دیکھا تو جائے؟ وہاں اب کیا ہو رہا تھا۔

عابدہ نے اطفال گھر جانے کی مجھ سے فرمائش کر ڈالی تھی۔ میں نے اول خیر کو ساتھ لیا تو شکیلہ بھی تیار ہو گئی۔ ہماری طرح اس کا بھی تو بچپن اطفال گھر میں گزرا تھا اور اسے بھی اس جگہ سے انسیت تھی۔

ہم کار میں سوار ہوئے اور اطفال گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ ہم سب خاموش تھے۔ اطفال گھر کی جانب ہمارا یہ مختصر سفر سہی مگر اس تھوڑی سی مسافت میں تصور ہی تصور نے ہمیں کئی سال پہلے ماضی میں پہنچا دیا تھا۔

چونکے اس وقت جب اول خیر نے اطفال گھر پہنچنے کا اعلان کیا۔ ہم خیالات کے بھنور سے ابھرے اور کار سے نیچے اتر آئے۔

ہمارے سامنے اطفال گھر کا بڑا سا لوہے کا گیٹ تھا۔ ماسوائے اول خیر کے میں، عابدہ اور شکیلہ اسے حیرت بھری اور تاثر انگیز نگاہوں سے تکتے رہ گئے۔

گیٹ لوہے کا تھا مگر زنگ آلودہ ہو رہا تھا، ایک جگہ سے تو اس کا پٹ زمین سے اکھڑ کر جھک گیا تھا، جس سبب آوارہ جانوروں کو اندر آنے جانے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ کچھ سرکنڈے اور کانٹے راہ میں بچھائے گئے تھے، مگر یہ برائے نام ہی تھے۔

عمارت پر نگاہ ڈالی تو دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا، کچھ بھی نہیں بدلا تھا، وہی رنگ و روغن وہی بناوٹ، ایسی ہی کھڑکیاں اور منڈیریں، امتدادِ زمانہ کی مار کھائی نظر آ رہی تھیں۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ایک ہوک سی سینے میں اٹھی۔ وہ جگہ مجھے سب سے پہلے دکھائی دی تھی جب میں چھوٹا تھا اور...... پہلی بار سرمد بابا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جا بجا جھاڑ جھنکاڑ اور رخنے بنے ہوئے نظر آتے تھے، سہ پہر کا وقت تھا اور وہاں جیسے شام ہی اتر آئی تھی۔

ہم اندر کمروں میں گئے، ان کمروں میں بھی جہاں ہم رہا کرتے تھے۔ "آپا جی" کا کمرا بھی دیکھا جو ہماری منتظم ہوتی تھیں۔

"یہ عمارت خالی ہو گئی ہے؟" میں نے اول خیر سے پوچھا۔

"ہاں! کاکے......! اب یہاں آوارہ جانوروں اور نشئی موالیوں کے سوا کوئی نہیں آتا۔" اول خیر نے ایک ہنکارا بھرتے ہوئے جواب میں دیا۔

"لیکن یہ عمارت اب کس کی کسٹڈی میں ہے؟"

"لوکل گورنمنٹ کی تحویل میں ہے۔"

"ہم......" میں نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور پھر ہم وہاں سے لوٹ آئے۔

انسان کی یہ فطرت ہوتی ہے، چاہے وہ کہیں بھی ہو لیکن جہاں اس کا بچپن بیتا ہو، ماہ و سال گزر جانے کے بعد اس کے دل میں یہ خواہش مچلتی ضرور ہے کہ وہ اس جگہ کو دیکھے، سو عابدہ اور میری خواہش پوری ہو چکی تھی ہم واپس لوٹنے کے لیے کار میں آ بیٹھے۔

میں کسی سوچ میں گم تھا۔ عابدہ نے تاڑ لیا۔ مسکرا کر بولی۔ "لگتا ہے تمہیں کچھ زیادہ اداسی ہونے لگی ہے۔"

"ہاں عابدہ! مگر میری اداسی کا سبب کچھ اور ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس اطفال گھر کو دوبارہ فعال بنانے کا سوچ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے اول خیر کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

"او خیر...... کاکے! کیا پھر کسی شہزی پارٹی کو یہاں پہنچانے کا سوچ رہے ہو؟" وہ مسکرایا۔

"ہاں، اول خیر! یتیم اور بے سہارا بچے بچیوں کے

لیے جدید خطوط پر تعمیر ایسے اطفال گھروں کی آج بھی ضرورت ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے یتیم خانے کا نام نہیں دیا گیا تھا تاکہ یہاں رہنے والے بچوں کے دلوں میں کسی قسم کا احساسِ محرومی نہ ابھرے۔ خود میری مثال سامنے ہے، جب میں یہاں تھا تو مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ یہ درحقیقت ایک یتیم خانہ ہے۔"

"شہزی! تمہاری سوچ بالکل ٹھیک ہے۔" شکیلہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ "اس اطفال گھر کو دوبارہ فعال کرنا چاہیے، یہ زمین اور اس کا وسیع رقبے پر پھیلا ہوا پلاٹ آج بھی انہی بے سہارا اور معصوم بچے بچیوں کی ملکیت ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں اس پر کوئی لینڈ مافیا قابض ہو جائے۔"

"ایسی دو بار کوششیں کی جا چکی ہیں۔" اول خیر نے پھر لقمہ دیا۔

"کیا واقعی؟" میں نے چونکا۔

"ہاں! چوہدری ممتاز اس جگہ کو ہتھیانا چاہتا تھا اور اس کی جگہ پلازا تعمیر کرنے کا ارادہ تھا اس کا......"

"اوہ...... یعنی غریب اور مسکینوں کے مال کو بھی ہضم کرنا چاہتا ہے۔" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بس کاکے! اللہ ہی ان کا پیٹ بھرے، کنالوں کی انہیں فکر ہے مگر دو گز زمین کی نہیں۔" عابدہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"توبہ ہے!" میں نے کہا اور اول خیر نے کار آگے بڑھا دی۔

ابھی ہم گیٹ سے تھوڑا ہی دور گئے ہوں گے کہ اچانک اول خیر نے کار ایک جھٹکے سے روک دی۔

"کیا ہوا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"او خیر...... کاکے! وہ دیکھو، گنجا بدمعاش آ رہا ہے۔" اس نے کار کی ونڈ اسکرین سے ہی سامنے دائیں جانب اشارہ کیا جہاں سے مین شاہراہ کی سڑک ملتی تھی۔ وہاں ایک جیپ موڑ کاٹ کر اسی طرف آ رہی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہی گنجا حواری طیفا براجمان تھا اور اس کے ہمراہ چار افراد اور بھی دکھائی دیتے تھے، دو تو عام کاروباری سے آدمی لگتے تھے جبکہ دوسرے دو افراد طیفے کے ہی ساتھی معلوم ہوتے تھے، ان کی وضع قطع ہی ایسی تھی۔

کار آگے بڑھا دوں؟" اول خیر نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں، پہلے دیکھتے ہیں کہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟" میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔ ان کی نظر ابھی ہم پر نہیں پڑی تھی اور میں نے دیکھا کہ ان کی جیپ سیدھا اطفال گھر کے گیٹ کے سامنے جا کر رک گئی۔

"یہ کیا؟ ان کا کیا کام یہاں؟" شکیلہ نے چونک کر کہا۔

"لگتا ہے پھر کوئی قبضے شبضے کا سین پاٹ ہونے والا ہے۔" اول خیر کے منہ سے نکلا اور میرے رگ و پے میں چنگاریاں دوڑنے لگیں۔

"کار واپس گھما لو اول خیر! آج اس گنجے کی اوقات دیکھنا پڑے گی۔"

"او خیر......!" کہتے ہوئے اس نے کار واپس اسی طرف موڑ لی۔ وہ ابھی جیپ سے اترے ہی تھے کہ ہماری کار اُن کے قریب جا پہنچی۔

میں نے عابدہ اور شکیلہ کو کار میں ہی بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور اول خیر سمیت نیچے اتر آیا۔ وہ لوگ بھی کار سے اتر آئے تھے۔ گنجا طیفا میری جانب دیکھ کر تھوڑا چونکا تھا، پھر ہمیں حقارت بھرے انداز میں اپنا سر جھٹک کر نظر انداز کر دیا۔ میں اور اول خیر ان کے قریب کھڑے تھے اور ان کی جانب غور سے دیکھنے لگے۔

میں نے اس کے حواریوں کے علاوہ ان دونوں آدمیوں کو دیکھا، ایک تو ان میں سے کوئی ٹھیٹ کاروباری آدمی ہی نظر آتا تھا، اس نے سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، جبکہ اسی کی طرح دکھائی دینے والا اس کا دوسرا ساتھی بھی توند نکالے کھڑا تھا۔

طیفا شاید ہمیں سنانے کے لیے ان سے ذرا اونچی آواز میں بولنے لگا۔

"ٹھیکے دار صاحب! اچھی طرح دیکھ لو، بڑی موقع کی جگہ ہے یہ...... ہاتھ سے نہیں جانی چاہیے، بس، کام شروع کرا دو، چوہدری صاحب خوش کر دیں گے تم کو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جناب! مگر کاغذات......"

"بھاڑ میں گئے کاغذات، ہمیں کون مائی کا لال منع کرے گا۔" طیفے نے سینہ پھلا کر کہا اور دانستہ اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے میری جانب دیکھا جیسے مجھے تپانے کا سامان کر رہا ہو۔

"لیکن پھر بھی کچھ طریقہ کار تو ہونا چاہیے، کنسٹرکشن کا کام ایک ماہ بعد ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔" ٹھیکے دار اس سے کہہ رہا تھا۔ "میں اس سلسلے میں چوہدری ممتاز سے بات کر چکا ہوں، کل ہی کچھ لوگوں کی جھونپڑیاں یہاں لگوا دوں گا، کرائے کے لوگ ہوں گے، اپنا قبضہ ہو جائے گا، آبادی دیکھ کر لوگ بھول بھال جائیں گے۔"

"چنگا پھر، جیسے مناسب سمجھو، یہ جگہ اب ہماری ہوئی۔" طیفے نے ٹھیکے دار سے کہتے ہوئے پھر میری جانب دیکھ کر اپنی مونچھوں کو مروڑا تو میں جو پہلے ہی اندر سے بُری طرح مشتعل ہو رہا تھا، اس کی جانب بڑھا اور طیفے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ٹھیکے دار سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ٹھیکے دار صاحب! آپ اس جگہ پر کسی صورت میں بھی قبضہ نہیں کروا سکتے۔"

موٹے ٹھیکے دار اور اس کے توندی ساتھی نے گھوم کر میری جانب قدرے حیرت سے دیکھا۔

"آپ کی تعریف......؟" اس نے پوچھا مگر اس سے پہلے ہی طیفا جو پہلے ہی سے مجھ پر ادھار کھائے بیٹھا تھا، پُرطیش انداز میں دانت پیستے ہوئے میری جانب جارحانہ انداز میں لپکا کر اس سے غافل نہیں تھا، اس کی جانب دیکھنے کی بھی زحمت گوارا کیے بغیر میرے دائیں ہاتھ کا گھونسا اس کے جبڑے پر ہتھوڑے کی طرح پڑا اور وہ دور جا گرا۔

"میری تعریف تو آپ نے ملاحظہ فرما لی......" میں نے بدستور موٹے ٹھیکے دار کے سوال کے جواب میں کہا اور دونوں ٹھیکے دار آنکھیں پھاڑے میری بات سننے کے بجائے دیکھنے میں محو تھے، اُدھر طیفے کے دونوں حواری اپنے "استاد" کا میرے ہاتھوں حشر دیکھنے کے بعد کُتّوں کی طرح غراتے ہوئے بیک وقت میری جانب بڑھے تھے کہ اول خیر ان کے درمیان آ گیا، ایک کو اس نے گریبان سے پکڑ کر پرے دھکیلا اور دوسرے کے پیٹ پر لات رسید کر دی۔

"تمہاری تعریف میں خراب کرنا نہیں چاہتا اور دوبارہ یہاں قبضے کا سوچنا بھی نہیں، اب واپس چلے جاؤ خاموشی سے......" میں نے گھورتے ہوئے دانت پیس کر اس سے کہا تو دونوں رتو بلّے کی طرح جیپ کی جانب کھسکنے لگے۔

ادھر طیفا سنبھل کر غراتا ہوا میری جانب دوبارہ لپکا اور اس نے اپنے بغلی ہولسٹر سے پستول بھی نکال لیا تھا، میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکائی دیتے ہوئے لیفٹ کک اس کے پستول والے ہاتھ پر لگائی وہ اُڑ کر دور جا گرا۔ دوسری طرف اول خیر اس کے دونوں گماشتوں کی دھلائی کرنے میں مصروف تھا، شاید بہت عرصے بعد اسے اپنے ہاتھ کی کھجلی مٹانے کا موقع ملا تھا اور وہ اسے ضائع جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

طیفا پھر تیزی سے سنبھلا، وہ پستول اٹھانے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری جانب بڑھا۔

اب کی بار میں نے دوبدو طاقت کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کے پنجوں میں اپنے ہاتھ پھنسا دیے۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے زور آزمائی میں مصروف ہو گئے۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب تلے ---. لال بھبوکا ہو رہا، بلاشبہ اس سانڈ جیسے وجود رکھنے والے طیفے بدمعاش میں بلا کی طاقت تھی، میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت گویا ہاتھوں کے دونوں پنجوں میں صرف کر دی اور اسے موڑتا ہوا طیفے کی دونوں کلائیوں میں بل ڈال دیا، اس کے حلق سے بیل جیسی ہی ڈکراہٹ بلند ہوئی۔ وہ پلٹ کر لڑکھڑایا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔

"خبردار! اب کوئی حرکت نہیں کرے گا۔" اچانک طیفے کے ایک گماشتے کی گونجتی آواز ابھری۔ نجانے کیسے اس کے ہاتھ میں طیفے کا گرا ہوا پستول آ گیا تھا۔ اس نے وہی مجھ پر تان رکھا تھا، اُدھر اول خیر کو بھی بریک لگ گئے، وہ دوسرے سے زور آزمائی کرتے ہوئے جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔

"مار دے گولی اس حرام زادے کو، دیکھ کیا رہا ہے؟" طیفے نے اپنے پستول بدست ساتھی سے غراتے ہوئے کہا اور اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔

یہ گولی ہماری کار سے شکیلہ نے اس پر چلائی تھی جو پستول بدست گماشتے کے اسی ہاتھ پر لگی۔ وہ ایک کراہ بلند کیے ہاتھ اپنا پکڑتے رہ گیا۔

"خبردار! اب اگر کسی نے حرکت کی تو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گی۔" شکیلہ نے وہیں سے زوردار اور دبنگ آواز میں کہا۔

وہ قریب آ گئی تھی۔ طیفا اور اس کے گماشتے بے بسی سے تلملا کر رہ گئے، میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔

"تو جس کا طفیلہ ہے نا، ان سے کہنا کہ رسّی جل گئی پر بل نہیں گئے، کوئی اور میدان میں بھیجے اور یاد رکھنا یہ جو جگہ ہے نا...... یہ میرے لیے مقدس ہے کیونکہ اس پر یتیموں اور معصوم غریب بچوں کا حق ہے، چوہدری ممتاز اور اس کی بیٹی نوشابہ کو اگر تھوڑی بھی شرم ہے نا تو ان سے کہنا چُلّو بھر پانی میں ڈوب مرے کہ اب ان کی اوقات یہ رہ گئی کہ یتیموں کے مال پر قبضہ کریں۔"

میں نے اتنا کہہ کر شکیلہ کو اشارہ کیا، اس نے پستول

میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس کی گولیاں نکال کر میں نے اپنے پاس رکھ لیں اور دوبارہ طیفے کے ہاتھ میں تھما دیا اور اسے گھورتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولا۔

”ان کھلونوں سے کھیلتے ہوئے میری ایک عمر گزری ہے، دوبارہ اسے مجھ پر تانا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب جاؤ اور دوبارہ اِدھر کا رخ مت کرنا۔“

اس کے بعد ہم اپنی کار میں آبیٹھے اور روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

میں نے انہیں منع کر دیا تھا کہ ماسوائے کمیل دادا کے اس تازہ ناخوشگوار واقعے کے بارے میں زہرہ بانو کو کچھ نہ بتایا جائے۔

جیسا کہ مذکور ہو چکا، بیگم ولا میں میری اور کمیل دادا کی شادیوں کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ شاپنگ تقریباً نمٹا دی گئی تھی اور اب عابدہ اور زہرہ بانو کو مایوں کی رسم کے طور پر بٹھا دیا گیا تھا۔

میرا اور کمیل دادا کا پہلے ہی دل للچایا تھا کہ اپنی اپنی خوب صورت دلہنوں کو پیلے رنگوں کی بہار میں دیکھیں، کیسی لگتی ہیں، کیونکہ اس میں دلہن اپنے اوریجنل رنگ و روپ میں ہوتی ہے، یوں عابدہ کا ہی نہیں بلکہ زہرہ بانو کا حسن بھی اوریجنل ہی تھا۔ انہیں میک اپ میں لتھڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر...... ریت روایت کا کیا کیا جائے کہ وہ بھی ضروری ہوتی ہیں، مگر بُرا ہو اول خیر اور شکیلہ کا جنہوں نے ہم دونوں پر عابدہ اور زہرہ بانو کے کمروں میں جانے پر پابندی لگا رکھی تھی۔

کمیل دادا تو بے چارہ زیادہ ہی شرمیلا واقع ہوا تھا کچھ اس لیے بھی کہ اس کے اور زہرہ بانو کے درمیان ”مالکن اور غلام“ کا بھی تعلق رہ چکا تھا اسی لیے وہ تو بے چارہ رعب میں آگیا مگر میں اڑ گیا۔

”میں عابدہ کو اس رنگ میں ضرور دیکھوں گا۔“ میں نے ضد کی۔

”تصویروں میں دیکھ لینا۔“ شکیلہ تنک کر بولی۔

”دیکھتا ہوں، مجھے کون روکتا ہے۔“ میں نے بھی غصے سے آستینیں چڑھالیں۔

”او خیر...... نہیں کاکے! اس بات پر تیری میری یہاں دھینگا مشتی ہو جانی ہے۔“

اول خیر سینہ پھلا کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے کم بخت کی منتیں سماجتیں بھی کیں مگر ان دونوں نے تو پکا تہیہ کر رکھا تھا، ذرا بھی دھونس دھمکی یا لالچ میں نہ آئے۔

زہرہ بانو اور عابدہ، دونوں کو ساتھ ساتھ کے کمروں میں بٹھایا گیا تھا۔ یوں میرے اور کمیل دادا کے ”جارحانہ“ عزائم بھانپتے ہی اول خیر نے زہرہ بانو کے کمرے کا دروازہ سنبھال لیا تھا اور شکیلہ نے عابدہ کا۔

میں جانتا تھا کہ یہ دونوں ہمیں جان بوجھ کر تڑپا رہے تھے۔ میں بھی نچلا بیٹھنے والا کہاں تھا، میں نے کسی ملازمہ کے ذریعے عابدہ کو پیغام بھجوا دیا کہ میں اور کمیل دادا اپنی اپنی دلہنوں کو ابٹن میں دیکھنے کے لیے کس قدر بے چین ہو رہے ہیں مگر شکیلہ اور اول خیر دونوں ”ظالم سماج“ بنے ہوئے ہیں۔ پہرا بٹھا دیا ہے انہوں نے دونوں کے کمروں کے سامنے---- اب تم دونوں ہی اپنے اپنے ہونے والے دولھوں پر رحم کھاؤ اور دیدارِ حسن کا کچھ راستہ نکالو۔“

یہ ملازمہ نجمہ تھی، کمیل دادا تو شرم اور کچھ رعب کے سبب کچھ خاص کوشش نہیں کر پا رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس کے دل و دماغ کی حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں۔ لہٰذا ”فی سبیل اللہ“ میں اس کے ”کام“ بھی آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے رازداری سے بتا دیا تھا کہ میں نے ”اندر“ سے سفارش کروانے کی درخواست بھیج دی ہے۔ وہ بے چارہ خوش ہو گیا۔ کیونکہ اس کے نتائج ناممکن نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر اندر سے ہمارے ”داخلے“ کا حکم نامہ جاری ہو جاتا۔

نجمہ ایک نوعمر لڑکی تھی اور وہ زہرہ بانو کی ذاتی خدمات پر مامور تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ میرا پیغام پڑھ کر ہنس پڑی تھیں۔ تاہم میری اس ”مہم جوئی“ کا حوصلہ افزا نتیجہ یہ برآمد ہوا تھا کہ...... عابدہ اور زہرہ نے ”اجازت“ دے دی تھی مگر صرف ”دیکھنے“ کی حد تک---- ”چھیڑ چھاڑ“ کی بھی سختی سے ممانعت تھی۔ کیونکہ جب یہ خفیہ پیغام شکیلہ اور اول خیر پر آشکارا ہوا تو ان کی مرضی اور کچھ ہماری بے تابی دیکھتے ہوئے بھی کڑی شرطیں لگائی تھیں، نیز دونوں دُلہنوں کو ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں بٹھایا جائے گا اور شکیلہ اور اول خیر بھی ”پہرے“ کے لیے اندر جائیں گے، گویا تنہائی کا موقع بالکل بھی نہیں دیا جائے گا۔

خیر، یہ معاملہ طے پا گیا۔ ہمارے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ ”جھلک“ کا دورانیہ پانچ منٹ سے زیادہ کا نہیں رکھا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں تھیں، مسرتوں کے وہ ستارے تھے جو بیگم ولا کے آسمان پر ٹمٹمانے لگے تھے۔ سب خوش

تھے۔ اسی لیے ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی خوشیاں کشید کی جا رہی تھیں۔

بہر حال...... مجھے اور...... کمیل دادا کو ایک ساتھ لے جایا گیا کہ اپنی اپنی دلہن کو صرف ایک نظر ابٹن اور مایوں میں دیکھ لیں، حالانکہ ایسا دستور تھا نہیں لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

میں اور کمیل دھڑکتے دل کے ساتھ شکیلہ اور اول خیر کے کڑے پہرے میں کمرے میں داخل ہوئے۔ دروازے سے اندر قدم رکھنے کے بعد تین چار قدم اٹھا کے ہمیں رکنے کا اشارہ کر دیا گیا۔

سامنے ہی دو الگ الگ بیڈ پر عابدہ اور زہرہ بانو پیلے رنگ کے لباس میں مشرقی عورتوں کی طرح سر نہوڑائے بیٹھی تھیں۔

کمیل دادا ایک ٹک محویت سے زہرہ بانو کو تکے جا رہا تھا اور میں عابدہ کو......

بے شک عورت خدا کا مرد کو عطا کیا ہوا ایک بہترین تحفہ ہے۔ چاہے وہ ماں کی صورت میں ہو، بہن کی یا پھر بیوی کی...... اس کے سارے ہی رنگ پاکیزہ، مہربان، نرالے اور ایثار پیشہ ہیں۔ عابدہ کا روپ بہت دمک رہا تھا۔ زہرہ بانو کا حسن بھی بہار دکھا رہا تھا۔

پانچ منٹ کا یہ وقفۂ دیدار جیسے پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔ پیاس سوا ہو گئی۔ تشنگی نے دل کو مزید بے چین کر دیا۔ اس کے بعد ہمیں منہ لٹکا کر کمرے سے لوٹنا پڑا۔

☆☆☆

زندگی خوشی کا پیرہن اوڑھ لے تو اسے اتار کر پھینکا نہیں جاتا بلکہ خود سے بھی کشید کیا جاتا ہے، یہی حال ہم سب کا تھا۔ میرے بھائی لئیق شاہ کے سفاکانہ قتل کے بعد بیگم ولا سے ایک عرصہ ہوا خوشیاں جیسے روٹھ چلی تھیں، میں ان روٹھی ہوئی خوشیوں کو دوبارہ لوٹانا چاہتا تھا۔ یہ ایک طرح کا صلہ رحمی بھی تھا کہ خوشیاں نچھاور کی جائیں، ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کی جائے کہ ہر کسی کے چہرے پر مسکراہٹیں ہوں۔

رقابتیں، رنجشیں عمر کم کرتی ہیں جبکہ سب کی محبتیں درازیٔ عمر عطا کرتی ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوصف زہرہ بانو کے دل و دماغ میں ابھی تک لئیق شاہ والے اندوہناک اور خوں ریز واقعے نے قبضہ جما رکھا تھا۔ وہ اس کے اثر سے ابھی تک خود کو نکال نہیں پائی تھی۔ حالانکہ وہ ایک دبنگ خاتون تھی، مگر بعض زخم ایسے ہوتے ہیں، وقت جن پر اندمال کا مرہم بھی رکھ دے، تو وہ محض بیتے وقتوں کی جمی تہ کا ہی کام کرتے ہیں، جنہیں ماضی کے حوالے کی ایک پھونک ہی ہٹانے کے لیے کافی ہوتی ہے، یہی وجہ تھی کہ اب بالکل ویسا ہی معاملہ، ویسی ہی سچویشن، اب ہماری شادیوں کی تقریب میں پیدا ہونے والی تھی تو زہرہ بانو کو ماضی کا وہ دردناک باب سراسیمہ کیے دے رہا تھا۔

حالانکہ ہم سب جانتے تھے کہ ماضی کے حالات اور تازہ کار معاملات زندگی میں بہت فرق...... آ چکا تھا، چوہدری ممتاز کو میں عملی طور پر مفلوج کر چکا تھا۔ وزیر جان اس کی پشت پر ایک بڑی طاقت تھا اور اسے عالمی دہشت گرد تنظیم اسپیکرم کی پشت پناہی حاصل تھی، اب وہ سب جہنم واصل ہو چکے تھے، بلکہ قصۂ پارینہ بن چکے تھے، نوشابہ کی دم پر میں پاؤں رکھ چکا تھا، وہ گلی محلے اور چوراہوں کے بدمعاشوں کے جمگھٹے اپنے گرد جما کر خود کو نجانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔

بہر کیف...... شادی کی ابتدائی جو بھی مروجہ رسمیں تھیں وہ جاری تھیں۔ دور پرے کے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ زبیر خان بھی آ گیا تھا۔ بیگم ولا میں ہی ان سب کو ٹھہرایا گیا تھا۔

عابدہ سے ایک طویل جدائی کے بعد ملن کی یہ قریب ہوتی گھڑیاں مجھے ایک بے پایاں اور ناقابلِ بیاں مسرتوں سے ہمکنار کر رہی تھیں۔

ہمارا نکاح جامع مسجد میں بعد نماز مغرب ہوا، بیگم ولا خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس کے در و دیوار سجائے گئے تھے، بجلی کے رنگین قمقموں کی روشنیوں اور پھلجھڑیوں میں عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ گویا شادی کا جشن عروج پر تھا۔

اول خیر اور دیگر ساتھیوں نے خوشی کے اس بے مثال موقع پر ہوائی فائرنگ کا پروگرام بنا رکھا تھا مگر میں نے سختی کے ساتھ اس بات سے منع کر دیا تھا۔

بینڈ باجے والے پروفیشنل لوگوں نے بیگم ولا میں ہونے والی بیک وقت دو شادیوں کی پُرمسرت تقریبات کو چار چاند لگا دیے تھے۔ میں خود بھی دہری خوشیوں سے دوچار تھا کہ زہرہ بانو کی بھی ڈولی میرے ساتھ ہی سجی تھی۔ اسے بھی کمیل دادا کی صورت، سچا اور پیار کرنے والا جیون ساتھی، اس کی تنہائیوں کا ہم رکاب مل گیا تھا۔ دیکھا جاتا تو بیگم ولا میں میری اور عابدہ کی شادی سے زیادہ زہرہ بانو اور

کبیل دادا کی شادی پر زیادہ خوشیاں محسوس کی جا رہی تھیں اور یہ اُن کا حق بھی تھا۔ خود مجھے بھی اسی بات کی بے حد خوشی تھی۔

اس رات میری اور کبیل دادا کی شب زفاف تھی۔ ہماری دُلہنوں کے الگ الگ کمرے خوب پھولوں اور پتیوں سے سجا دیے گئے تھے، جبکہ دُلہنوں کو سجانے کے لیے شہر کی ایکسپرٹ بیوٹیشنز کو مع ان کے "ساز و سامان" کے بیگم ولا میں ہی بلا لیا گیا تھا۔

میں نے سفید اور گولڈن تاروں والی شیروانی زیب تن کر رکھی تھی، پیروں میں شاہی کھُسے اور سر پر پگ تھی، کبیل دادا کی شیروانی کا رنگ سرخی مائل سیاہ تھا۔ یہ زہرہ بانو کی پسند تھی۔ وہ بھی اس لباس میں اچھا اسمارٹ لگ رہا تھا۔

شکیلہ کی تو چاندی ہو گئی تھی، اس نے جوتا چھپائی کی رسم میں بیک وقت کبیل دادا اور مجھ سے خوب پیسے بٹورے تھے۔ اول خیر نے اسے دھمکی دے رکھی تھی، اس میں نصف حصہ اس کا ہو گا مگر شکیلہ نے اسے "ٹھینگا" دِکھا دیا تھا۔

"یہ خالص عورتوں اور دُلہن کی بہنوں کی رسم ہے، سمجھے تم......! مردوں کا اس میں کوئی کام نہیں۔" شکیلہ نے اسی وقت اول خیر کو ڈانٹ پلا دی تھی۔ بے چارہ اول خیر چپ سادھ کے رہ گیا۔

کبیل دادا اور میں ساتھ ساتھ کرسیوں پر بیٹھے تھے اور پاؤں ہمارے جوتوں سے بے نیاز، ان کے گرد ربن کس کر باندھ دیے گئے تھے۔ شکیلہ کے ساتھ زہرہ بانو کی چند سہیلیاں اور کچھ گھریلو ملازمائیں تھیں۔

کبیل دادا تو بے چارہ شرمایا اور بوکھلایا ہوا تھا، میں نے ایسے میں اول خیر کی وکالت کر ڈالی اور معنی خیز لہجے میں شکیلہ سے بولا۔

"سوچ لو شکیلہ! اول خیر سے دشمنی تمہیں مہنگی پڑ سکتی ہے، کیونکہ عابدہ اور زہرہ سمیت میں اور کبیل دادا تمہیں اول خیر کے پلّے باندھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"پھر میں گن گن کے بدلے لوں گا۔" اول خیر کو جیسے شہ مل گئی۔ اس نے شکیلہ کو گھورا۔

شکیلہ شرمانے یا ڈرنے والی لڑکی نہیں تھی، بے پروائی سے بولی۔ "دیکھا جائے گا، وہ وقت آئے گا تو......"

سب اُس کے جواب اور بے پروائی پر کھلکھلا کر ہنس دیے۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب میں عابدہ کے کمرے میں

سہرا سجائے داخل ہوا۔

عابدہ جہازی سائز بیڈ پر سرخ گٹھڑی بنی سر اپنا جھکائے بیٹھی تھی۔ میں آہستگی سے چلتا ہوا بیڈ کے قریب پہنچا اور اُسے سلام کرکے پاس ہی بیٹھ گیا۔

اپنا سہرا اتار کر ایک طرف رکھا اور پھر اس کا گھونگھٹ اٹھا دیا۔

”چشم بددور......“ اس کا حسین اور دمکتا ہوا سرخ گلابی سا چہرہ دیکھتے ہی بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے حنائی ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ابھرا، میں نے اس کی ٹھوڑی کو آہستگی سے ذرا اوپر کیا اور جیسے چند ماہتاب کا دیدار ہونے لگا، اور پھر یہ چاند بالآخر میرے دامن میں اتر آیا۔

☆☆☆

پہلے یہی ارادہ تھا کہ...... ولیمے اور شادی... وغیرہ کی تقریب بیگم ولا میں ہی کی جائے، لیکن پھر یار احباب نے ضد کی کہ شہر کا اچھا سا بینکوئٹ ہال بک کروایا جائے اور وہاں یہ تقریب منعقد کی جائے۔

لہٰذا یہ شام کے سات بجے کا وقت تھا۔ کبیل دادا اور میں ولیمے کے سوٹ کے طور پر سوٹ بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ بینکوئٹ ہال تک جانے کے لیے ہم دونوں کے لیے الگ الگ گاڑیاں تیار کر رکھی تھیں۔ دونوں گاڑیاں ہمارے بیگم ولا سے باہر نکلنے کی منتظر تھیں۔ میں اور کبیل دادا اپنی اپنی دلہنوں کے ساتھ اور یار احباب کی معیّت میں بیگم ولا کے مین گیٹ کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔

میری اور عابدہ کی کار کی ڈرائیونگ سیٹ اول خیر نے سنبھال رکھی تھی۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ بیگم ولا کے گیٹ کے بیرونی قدمچے طے کر رہے تھے۔ باہر دوست احباب اور مہمانوں کا جمگھٹا تھا، کچھ اور گاڑیاں بھی اریب قریب کھڑی نظر آتی تھیں۔

جب یونہی میری نگاہ اپنے ساتھ کبیل دادا کی سنگت میں دھیرے دھیرے سنگی قدمچے اترتی ہوئی زہرہ بانو پر پڑی اور...... یہی وہ وقت تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں میری نظروں کے سامنے کا حقیقی منظر بدلا اور شاید موقع خاص کی یکساں سچویشن میں زہرہ بانو کی سنائی اس دردناک کتھا کا منظر سامنے آگیا جب وہ لئیق شاہ کی دلہن بنی اسی طرح قدمچے طے کرتی اتر رہی تھی۔ زہرہ بانو کی اس درد انگیز کتھا کا وہ خونی باب اور اس کے بتائے ہوئے اس جانکاہ منظر کا تصور میرے لاشعور میں شاید ثبت رہ گیا تھا کہ وہ میرا حقیقی بھائی ہی تھا۔

میں نے گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سنی، لئیق شاہ اور زہرہ بانو کو چیخیں مار کے گرتے دیکھا، میں ہک دک تھا، عقدہ کھلا کہ یہ تصور نہیں بلکہ حقیقی منظر تھا اور اس وقت زہرہ بانو میرے بھائی لئیق شاہ کے ساتھ نہیں کبیل دادا کے ساتھ تھی، میرا اندر آتش فشاں کے مانند بھڑکا۔ میں نے کبیل دادا اور زہرہ بانو کو گولیوں کی زد میں سنگی قدمچوں سے گرتے دیکھا، ایک بوچھاڑ نے میرا اور عابدہ کا تعاقب بھی کیا، میں سنبھلا، میرے وجود میں یکلخت جیسے بجلی دوڑ گئی، گردشی نظریں مثلِ پارا کی طرح حرکت پذیر ہوئیں اور تب ہی میں نے دائیں جانب ذرا فاصلے پر ایک سیاہ رنگ کی کار میں طپنچے اور اس کے ساتھ بیٹھے تین ہتھیار بند افراد کی جھلک دیکھ لی۔ میں نے عابدہ کو دھکا دیا اور خود ہی نیچے آرہا۔ چند مہمانوں کے زخمی ہونے کی چیخیں ابھریں۔ اس سیاہ کار کے ٹائر چرچرائے اور وہ اس حملے کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی رکنے کے روادار نہیں رہے تھے۔

وہاں چیخ و پکار مچ گئی، میں نے چلّا کر اول خیر کو ان کے تعاقب میں جانے کا کہا۔ اس نے مشینی انداز میں حرکت کی، وہ ایک لمحہ کے لیے خود بھی ہک دک سا رہ گیا تھا، میری چیخ نے اسے ہلا ڈالا۔ محافظوں نے سیاہ کار پر جوابی فائرنگ کی تھی۔

سب کچھ جیسے سلوموشن میں ہوتا نظر آیا، چیخوں، آہوں اور سسکیوں کی آوازیں گویا پس منظر سے آتی محسوس ہونے لگیں، میں عابدہ کو چھوڑ کر زہرہ بانو اور کبیل دادا کی جانب دوڑا۔ وہ دونوں گولیوں کی بوچھاڑ تلے خون میں لت پت ہوگئے تھے، جبکہ خوش قسمتی سے میں نے بروقت عابدہ اور خود کو بچا لیا تھا، انہیں نہ بچا سکنے کی وجہ وہی تھی جو اوّل الذکر تصوراتی منظر بدلنے کی تھی۔

زہرہ بانو اور کبیل دادا کو خون میں لت پت دیکھ کر میرے حواس جیسے مختل ہونے لگے، کچھ ساتھی زخمی کبیل دادا کی جانب دوڑے، میں نے زہرہ بانو کو سنبھالا اور آخری قدمچے پر ہی گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا، زہرہ بانو کا جسم اور چہرہ لہولہان ہو رہا تھا، وہ جیسے آخری اور کھنچی کھنچی سانسوں پر تھی، اس کی قابلِ رحم ہیئت کذائی دیکھتے ہی میرا دل، میرا اندر میرا پورا وجود غرضیکہ روح تک بھیروں بھیر ہونے لگی۔

”زز...... زہرہ......!“ میں بس اسی قدر ہی اُسے پکار

سکا، میری اپنی آواز ہی سینے میں گھٹ کر رہ گئی تھی بھلا حلق تک کیسے آتی۔

”شش...... شہزی! م...... مجھے...... زندگی سے...... اسی کا ہی ڈر تھا......“ زہرہ تکلیف کی شدتوں کو جانے کس جذبے تلے برداشت کرتے ہوئے کراہ کے بولی۔

”کک...... کل...... اُس (لئیق شاہ) کی باری تھی آج شاید میری آگئی، مجھے کوئی دکھ نہیں، تت...... تم لوگ بھی...... کک...... کوئی دکھ نہ کرنا۔“

میں زہرہ بانو کے اِن بجھے بجھے الفاظوں پر تڑپ اٹھا، بہ مشکل بولا۔ ”تت...... تمہیں کچھ نہیں ہو گا، زہرہ! کک...... کچھ نہیں ہوگا۔“

”ہاں! اب کچھ...... ہو بھی تو نہیں سکتا کہ زندگی ہی...... میری سراپا دھوکا رہی......“

وہ اٹک اٹک کر بولے جا رہی تھی اور پھر آخری لمحات میں اس کے کپکپاتے لبوں اور زندگی کے بجھتے چراغ کی آخری ٹمٹماتی لو کی طرح فراق کا یہ شعر سنائی دیا۔

کم سے کم موت سے ایسی مجھے امید نہیں
زندگی تو نے تو دھوکے پہ دیا ہے دھوکا

زہرہ بانو نے ایک آخری ہچکی لی اور اس کا سر میری گود میں ایک طرف کو ڈھلک گیا۔

☆☆☆

غمی، خوشی، زندگی اور موت...... یہ دنیا کے وہ چار موسم ہیں جس سے انسان ابتدائے آفرینش سے متاثر ہوتا چلا آیا ہے اور رہتی دنیا تک اِن موسموں کی زد میں ہی رہے گا۔

ہاں! ایک پانچواں موسم بھی ہے۔ وقت...... یہ ان مذکورہ چاروں موسموں کی شدتوں کو کم کرنے کا سبب بنتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے سخت سردی میں دھوپ کا خوشگوار احساس اور چلچلاتی گرمی میں، چھاؤں اور ٹھنڈی ہواؤں کی موجودگی۔ ان پانچوں موسموں کا کنٹرول تقدیر کے حوالے ہوتا ہے۔ جو جیسا لکھا ویسا ہی ہوا۔

بسا اوقات تقدیر وقت کے ہیر پھیر میں کسی کا ایک سا ہی نصیب لکھتی ہے، لئیق شاہ کے ساتھ زہرہ بانو کی شادی ہوئی اور تقدیر نے اسے چھین لیا، زہرہ زندہ لاش کے شکل ہو گئی، پھر عرصہ بیتا اور کچھ خوشیوں کے مواقع نصیب ہونے لگے، تو تقدیر نے اس سے زندگی کو چھین لیا۔

کبیل دادا کی حالت خطرے سے باہر قرار دے دی گئی تھی۔ اول خیر اور ساتھیوں نے خونی قاتلوں کا تعاقب کر کے انہیں جا لیا تھا، یوں طیفا گنجا اپنے تین مسلح بندوں کے ساتھ دھر لیا گیا تھا۔

میں اب نوشابہ کو کہاں چھوڑنے والا تھا، اب تک جتنی مہلت اسے دی وہ کافی رہی بلکہ میں پچھتا ہی رہا تھا کہ اسے اتنی مہلت دی ہی کیوں؟ شاید اس لیے کہ اول خیر اور میرے ہاتھوں اس کے چھوٹے بھائی کا قتل سرزد ہوا تھا، اگرچہ اس میں بھی نوشابہ کا ہی قصور تھا اور چوہدری ممتاز تو خیر وحشی تھا ہی۔

نوشابہ کی انتقام کی آگ نے اس کے دل کو ہی نہیں بلکہ عقل کو بھی بھسم کر ڈالا تھا، میری آمد کے بعد عدالت میں کیس ہارنے پر وہ بالکل شکست خوردہ ہوگئی تھی، جوشِ جنوں اور آتشِ انتقام کے منفی جذبے تلے وہ یہ بھیانک اور گھناؤنا قدم اٹھا بیٹھی تھی۔ اس پر طرہ یہ بھی تھا کہ اسے بیگم ولا میں خوشیوں کے شادیانے بجنے کی بھی...... گونج سنائی دی تھی۔ وہ جلاپے میں حد سے گزر گئی اور طیفے گنجے کے ذریعے اس نے یہ خونی کھیل کھیلا جس سے ابھی تازہ تازہ ہی میری اطفال گھر پر اس کے غاصبانہ قبضے کے سلسلے میں ٹھیک ٹھاک مارا ماری ہوئی تھی، وہ خود بھی بھرا بیٹھا تھا۔

رنگے ہاتھوں گرفتاری کے بعد طیفے بدمعاش نے اقبالِ جرم کر لیا تھا اور یوں نوشابہ کو عمر قید کی سزا ہو گئی تھی، جبکہ چوہدری ممتاز کو اس غم میں فالج کا اٹیک ہو گیا، اس نے مستقل طور پر بستر یا ڈبکل چیئر سنبھال لی تھی۔

بیگم ولا کی خوشیوں کو ایک بار پھر کسی کی نظر کھا گئی تھی، سیانوں نے صحیح ہی تو کہا کہ نظر پتھر پھاڑ دیتی ہے۔ اس سے بچنے کے لیے چولہے میں جتنی مرچیں جلاؤ، کتنے ہی وظائف کر ڈالو کالے دھاگے باندھ دو، سیاہ ٹیکا لگا دو، کم ہی ہیں۔

اسی سبب میری اور عابدہ کی خوشیاں بھی جیسے گہنا گئی تھیں۔

بیگم ولا میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ زہرہ بانو کے سفاکانہ قتل کے بعد نہ کسی کو کھانے کا ہوش رہا تھا نہ پینے کا۔ ہر کوئی چپ، گنگ، اداس اور سکتے کی سی کیفیت میں ولا کے کونوں کھدروں میں دبکا رہتا تھا۔

زہرہ بانو کی تدفین اس کے آبائی گاؤں کے قبرستان میں لئیق شاہ کی قبر کے پہلو میں کر دی گئی تھی۔ بیگم ولا میں فاتحہ خوانی کی گئی اور زہرہ بانو کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچانے کے لیے لنگر بھی تقسیم کیا گیا۔

کچھ دنوں بعد کبیل دادا بھی اسپتال سے صحت یاب ہو کر واپس لوٹا تو اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی، وہ کسی سے

کوئی بات تک کرنے اور سننے کا روادار نہ رہا تھا۔

''کا کے! عالم تقدیر کیا اس طرح بھی خوشیوں پر شب خون مارتی ہے؟'' اول خیر نے ایک دن انتہائی دکھ سے مجھ سے کہا۔ ''ایک ہی ہلّے میں ساری خوشیوں کو ایک لاش میں بدل ڈالا اس سسری تقدیر نے......؟''

''تقدیر کو مت کوسو اول خیر......!'' میں نے اسے ٹوکا۔

''کیسے نا کوسوں میں۔'' وہ جیسے روح تک کی گہرائیوں سے تڑپ کر بولا۔ ''اس طرح بھی ہوتا ہے بھلا؟ کیا کیتی شاہ اس کے لیے کافی نہ تھا کہ اب بیگم صاحبہ کو بھی......'' انتہائی دکھ تلے وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکا اور سسک پڑا۔ خود میری اپنی حالت غیر تھی۔

''اللہ رحم کرے اپنا۔'' عابدہ بوجھل سی آواز میں بولی۔ ''بندہ تو مجبور ہی ہے۔''

''جانے والا تو چلا گیا، اللہ بیگم صاحبہ کو جنت نصیب کرے، مگر ہمیں اس بے چارے کبیل دادا کی بھی فکر کرنی چاہیے۔'' شکیلہ نے ہماری توجہ دلائی۔ زہرہ بانو کی اس جانکاہ موت سے شکیلہ بھی رنجور تھی۔

''یار اول خیر! تو اور عابدہ جا کر... اس بے چارے کو دیکھ لے، میری تو......''

''میں یہ کر چکا ہوں۔'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''میں، عابدہ بھرجائی اور شکیلہ نے بہت اس سے باتیں کرنے، اسے سمجھانے تسلیاں دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو جیسے بت سا بن گیا ہے، شاید ہم بھی اسی غم کے بوجھ کا شکار ہیں، اسی لیے ہماری تسلیوں میں وہ دم ہی نہ ہو۔''

زہرہ بانو کی موت کے بعد کچھ قانونی معاملات نمٹائے گئے، زہرہ بانو کے شوہر ہونے کی حیثیت سے اب اس کی ساری جائداد اور ملکیت، مع بیگم ولا کا مالک اب کبیل دادا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب شاید کبیل دادا کچھ بول پڑے مگر تب بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ وکیل کے ذریعے سب کچھ اس کے نام کر دیا گیا۔

ہم نے بہت کوشش کر ڈالی کہ کسی طرح کبیل دادا کو بولنے پر اکسا سکیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، زیادہ کوشش کرتے تو وہ اٹھ کر بیگم ولا سے باہر چلا جاتا۔

ایک دن ایسا گیا کہ غائب ہی ہو گیا، ہمیں پریشانی ہوئی، پتا چلا کہ وہ رات سے ہی غائب تھا اور اب پھر شام ہونے کو آئی تھی کہ اسی دوران ایک ملازم کو اس کے اوپر والے پرانے کمرے کے بستر سے ایک پرچہ اور اسٹامپ پیپر ملا۔

میں نے دھڑکتے دل سے وہ رقعہ لیا اور پڑھنے لگا۔

''شہزی! میں کچھ نہیں کہنا چاہتا نہ ہی دل بھی کرتا ہے کچھ کہنے کو...... سننے کو...... بھلا اب رہ بھی کیا گیا ہے۔ خیر! میں جا رہا ہوں، مجھے اگر تم سب زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے تلاشنے کی کوشش کوئی نہ کرے، یہ مال ملکیت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے کہ جب دل کا چراغ ہی بجھ گیا تو ان چیزوں میں کیا رکھا ہے...... یہاں رہا تو مر جاؤں گا، خود کو زندہ رکھنے کے لیے یہاں سے دور جا رہا ہوں، کہاں، یہ مجھے بھی پتا نہیں، زندگی رہی تو شاید کسی موڑ پر مل جائیں، ورنہ رب راکھا...... اور ہاں، ایک اسٹامپ پیپر میرے اس خط کے ساتھ ملے گا .... وہ سب جو میرے نام لکھا گیا تھا وہ تمہارے نام کر دیا ہے۔ اب تم ہی اس کے وارث ہو۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کرنا، سب سے یہی میری گزارش ہے۔

رب راکھا۔
کبیل دادا......''

''ٹپاٹپ...... ٹپ...... ٹپ......'' میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو خط پر گرنے گرنے لگے۔ تو ساتھ کھڑے اول خیر...... وہ خط مجھ سے لے کر پڑھنے لگا۔

☆☆☆

کئی دن بیت گئے۔ اطفال گھر کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ نیا اور ایماندار جذبۂ ہمدردی سے معمور اسٹاف تعینات کیا گیا۔ منتظم عابدہ تھی۔ ہاں! اس اطفال گھر کا نام ہم نے ''پرانا اطفال'' رکھا تھا۔ ''نیا اطفال گھر'' بیگم ولا کو بنا دیا گیا تھا۔

کبیل دادا نے زہرہ بانو کی جو جائداد اور ملکیت میرے نام کی تھی، وہ میں نے اسی ٹرسٹ میں خرچ کر دی تھی، باقی بچی کچھی بھی غریب خانوں اور خیراتی...... اداروں کی نذر کر دی گئی، کیونکہ میرا اس پر ایک پیسے کا بھی حق نہ تھا۔

میں بیگم ولا خالی کر چکا تھا۔ اول خیر اور شکیلہ میرے ساتھ تھے۔ اماں اور بادا جانی کو لے کر میں نے کھلاں والی کا قصد کیا تھا۔ مجھے یقین تھا زبیر خان المعروف خان جی مجھے اپنی زمینوں کی معاملہ داری میں رکھنے پر خوشی محسوس کریں گے۔ اور میں بھی......

کوئی بات تک کرنے اور سننے کا روادار نہ رہا تھا۔

’’کاکے! ظالم تقدیر کیا اس طرح بھی خوشیوں پر شب خون مارتی ہے؟‘‘ اول خیر نے ایک دن انتہائی دکھ سے مجھ سے کہا۔ ’’ایک ہی ہلّے میں ساری خوشیوں کو ایک لاش میں بدل ڈالا اس سسری تقدیر نے……؟‘‘

’’تقدیر کو مت کوسو اول خیر……!‘‘ میں نے اسے ٹوکا۔

’’کیسے نا کوسوں میں۔‘‘ وہ جیسے روح تک کی گہرائیوں سے تڑپ کر بولا۔ ’’اس طرح بھی ہوتا ہے بھلا؟ کیا کلیق شاہ اس کے لیے کافی نہ تھا کہ اب بیگم صاحبہ کو بھی……‘‘ انتہائی دکھ تلے وہ اپنا جملہ بھی پورا نہ کر سکا اور سسک پڑا۔ خود میری اپنی حالت غیر تھی۔

’’اللہ رحم کرے اپنا۔‘‘ عابدہ بوجھل سی آواز میں بولی۔ ’’بندہ تو مجبور ہی ہے۔‘‘

’’جانے والا تو چلا گیا، اللہ بیگم صاحبہ کو جنت نصیب کرے، مگر ہمیں اس بے چارے کھیل دادا کی بھی فکر کرنی چاہیے۔‘‘ شکیلہ نے ہماری توجہ دلائی۔ زہرہ بانو کی اس جانکاہ موت سے شکیلہ بھی رنجور تھی۔

’’یار اول خیر! تو اور عابدہ جا کر… اس بے چارے کو دیکھ لے، میری تو……‘‘

’’میں یہ کر چکا ہوں۔‘‘ اس نے میری بات کاٹی۔ ’’میں، عابدہ بھرجائی اور شکیلہ نے بہت اس سے باتیں کرنے، اسے سمجھانے تسلیاں دینے کی کوشش کی تھی مگر وہ تو جیسے بت سا بن گیا ہے، شاید ہم بھی اسی غم کے بوجھ کا شکار ہیں، اسی لیے ہماری تسلیوں میں وہ دم ہی نہ ہو۔‘‘

زہرہ بانو کی موت کے بعد کچھ قانونی معاملات نمٹائے گئے، زہرہ بانو کے شوہر ہونے کی حیثیت سے اب اس کی ساری جائداد اور ملکیت، مع بیگم ولا کا مالک اب کھیل دادا تھا۔

میرا خیال تھا کہ اب شاید کھیل دادا کچھ بول پڑے مگر تب بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ وکیل کے ذریعے سب کچھ اس کے نام کر دیا گیا۔

ہم نے بہت کوشش کر ڈالی کہ کسی طرح کھیل دادا کو بولنے پر اکسا سکیں مگر کامیاب نہ ہو سکے، زیادہ کوشش کرتے تو وہ اٹھ کر بیگم ولا سے باہر چلا جاتا۔

ایک دن ایسا گیا کہ غائب ہی ہو گیا، ہمیں پریشانی ہوئی، پتا چلا کہ وہ رات سے ہی غائب تھا اور اب پھر شام ہونے کو آئی تھی کہ اسی دوران ایک ملازم کو اس کے اوپر والے پرانے کمرے کے بستر سے ایک پرچہ اور اسٹامپ پیپر ملا۔

میں نے دھڑکتے دل سے وہ رقعہ لیا اور پڑھنے لگا۔

’’شہزی! میں کچھ نہیں کہنا چاہتا نہ ہی دل بھی کرتا ہے کچھ کہنے کو…… سننے کو…… بھلا اب رہ بھی کیا گیا ہے۔ خیر! میں جا رہا ہوں، مجھے اگر تم سب زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے تلاشنے کی کوشش کوئی نہ کرے، یہ مال ملکیت میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے کہ جب دل کا چراغ ہی بجھ گیا تو ان چیزوں میں کیا رکھا ہے…… یہاں رہا تو مر جاؤں گا، خود کو زندہ رکھنے کے لیے یہاں سے دور جا رہا ہوں، کہاں، یہ مجھے بھی پتا نہیں، زندگی رہی تو شاید کسی موڑ پر مل جائیں، ورنہ رب راکھا…… اور ہاں، ایک اسٹامپ پیپر میرے اس خط کے ساتھ ملے گا …. وہ سب جو میرے نام لکھا گیا تھا وہ تمہارے نام کر دیا ہے۔ اب تم ہی اس کے وارث ہو۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کرنا، سب سے یہی میری گزارش ہے۔

رب راکھا۔

کھیل دادا……‘‘

’’ٹپ ٹپ …ٹپ… ٹپ……‘‘ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو خط پر گرنے لگے۔ تو ساتھ کھڑے اول خیر… وہ خط مجھ سے لے کر پڑھنے لگا۔

☆☆☆

کئی دن بیت گئے۔ اطفال گھر کو نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ نیا اور ایماندار جذبۂ ہمدردی سے معمور اسٹاف تعینات کیا گیا۔ منتظم عابدہ تھی۔ ہاں! اس اطفال گھر کا نام ہم نے ’’پرانا اطفال‘‘ رکھا تھا۔ ’’نیا اطفال گھر‘‘ بیگم ولا کو بنا دیا گیا تھا۔

کھیل دادا نے زہرہ بانو کی جو جائداد اور ملکیت میرے نام کی تھی، وہ میں نے اسی ٹرسٹ میں خرچ کر دی تھی، باقی بچی کھچی بھی غریب خانوں اور خیراتی… اداروں کی نذر کر دی گئی، کیونکہ میرا اس پر ایک پیسے کا بھی حق نہ تھا۔

میں بیگم ولا خالی کر چکا تھا۔ اول خیر اور شکیلہ میرے ساتھ تھے۔ اماں اور بابا جانی کو لے کر میں نے کھلاں والی کا قصد کیا تھا۔ مجھے یقین تھا زبیر خان المعروف خان جی مجھے اپنی زمینوں کی معاملہ داری میں رکھنے پر خوشی محسوس کریں گے۔ اور میں بھی……

Nadar Azeem
www.pakistanipoint.com